مجموعۃ

رسائلِ امام شاہ ولی اللہؒ

(تصوف وسلوک کا فلسفہ، تاریخ تصوف اور احکام شریعت کے اسرار ورموز پر مشتمل ومحیط
حضرت امام شاہ ولی اللہ محدثؒ کے متعدد نادر ونایاب رسائل وکتب کا گرانقدر مجموعہ)

جلد اول

تحقیق وتعلیق

مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی

SWI

شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی

مجموعہ

رسائل امام شاہ ولی اللہؒ حصہ اوّل

(تصوف وسلوک کا فلسفہ، تاریخ تصوف اور اسرار و معارف
پر مشتمل حضرت امام شاہ ولی اللہ محدثؒ کے
متعدد نادر و نایاب رسائل و کتب کا گرانقدر مجموعہ)

ترتیب و تقدیم

مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی

شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ

نام کتاب	:	مجموعۂ رسائل امام شاہ ولی اللہؒ حصہ اوّل
مرتبہ	:	مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی
قیمت	:	۳۵۰
طبع ثانی	:	۲۵؍مئی ۲۰۱۵ء
آئی ایس بی این	:	81-901848-7-3
تعداد	:	۵۰۰
کمپوزنگ	:	ریاض احمد
مطبوعہ	:	عفیف آفسیٹ، مدرسہ میر جملہ لال کنواں، دلی۔٦
ناشر	:	**شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ**، مسجد کاکا نگر، کاکا نگر نئی دہلی۔۱۱۰۰۰۳

Title	:	Majmua Rasail-e-Imam Shah Waliullah-1
Editing	:	Maulana Mufti Ataur Rahman Qasmi
Second Edition:		25th May, 2015
Price	:	350/-
ISBN	:	81-901848-7-3
Composing	:	Riyaz Ahmed
Printer	:	Afif Ofset, Madarsa Meer Jumla Lal Kuan, Delhi-110006

Published by

Shah Waliullah Institute

Masjid Kaka Nagar (Near N.D.M.C. Primary School)

Kaka Nagar, New Delhi-110003

Ph. : 011-26953430, Mob.9811740661

Email : shahwaliullah_institute@yahoo.in

فہرست کتب

نمبر شمار	کتب		صفحہ
۱۔	مقدمہ	مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی	۵
۲۔	الجزء اللطیف فی ترجمة العبدالضعیف (امام شاہ ولی اللہ محدث کی خودنوشت سوانح عمری)		۲۱
۳۔	ہمعات	امام شاہ ولی اللہ محدثؒ	۲۷
۴۔	سطعات	//	۱۷۷
۵۔	لمعات	//	۳۰۵
۶۔	الطاف القدس	//	۳۷۷
۷۔	الخیر الکثیر	//	۴۶۷

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

شیخ الاسلام حضرت امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ (المتوفی (۶۲ ۱۷ء) جہاں اسرار دین اور مقاصد شریعت کے رمز شناس اور معیار وکسوٹی تھے، ساتھ میں بحر تصوف وسلوک کے بھی شناور وتیراک تھے۔ خود آپ کے والد ماجد حضرت شاہ عبدالرحیم محدث دہلویؒ بھی تصوف واحسان کے آدمی تھے۔ آپ حضرت ابن عربیؒ سے متاثر ہی نہیں تھے بلکہ حضرت ابن عربیؒ کے متصوفانہ نظریات و معتقدات کے پر جوش حامی و مبلغ بھی تھے حالانکہ حدیث وفقہ میں آپ کا مرتبہ معاصرین میں ممتاز تھا اور سلطان وقت کی نگاہ میں بھی عظیم المرتبت اور رفیع القدر تھے۔ فتاویٰ عالمگیری کے مرتبین ومؤلفین میں آپ کی شمولیت واشتراک اس کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اپنے والد ماجد حضرت شاہ عبدالرحیم محدث دہلویؒ کے صحیح معنی میں جانشین اور ان کے فکر وفن کے امین و پاسبان تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے افکار ونظریات (خواہ فقہ وحدیث سے متعلق ہوں یا قرآنیات والٰہیات سے متعلق ہوں یا تصوف و سلوک سے تعلق رکھتے ہوں) اپنے والد ماجد کے نظریات وتصورات کی اساس و بنیاد پر استوار و قائم ہیں۔ شریعت وطریقت کی بنیادی واساسی چیزوں میں دونوں مشترک ہیں۔ لیکن یہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا فضل وکمال ہے کہ انہوں نے نہ صرف اپنے والد کے ادھورے اور تشنہ کاموں کی تکمیل کی بلکہ بعض ایسے افکار ونظریات کی بھی داغ بیل ڈالی، جن کی وجہ سے اپنے والد ماجدؒ سے بھی فائق ہو گئے ہیں، اور یہ کوئی تعجب خیز امر نہیں ہے۔ وفوق کل ذی علم علیم.

مشہور مجاہد آزادی مولانا عبیداللہ سندھیؒ رقمطراز ہیں:

''شاہ ولی اللہ کی فکری تربیت اور ان کی علمی اساس میں ہم ان کے والد شاہ عبدالرحیم

صاحبؒ کو اصل مانتے ہیں۔ شاہ عبدالرحیم نے خود اپنے نامور صاحبزادے کو تعلیم دی تھی۔ چنانچہ انہوں نے شاہ ولی اللہ صاحب کو قرآن کا ترجمہ، تفسیروں سے الگ کر کے پڑھایا۔ اور اس طرح قرآن کا اصل متن ان کیلئے قابل توجہ بنایا۔ پھر آپ نے وحدۃ الوجود کے مسئلے کو صحیح طریقے پر حل کیا اور اسے اپنے صاحبزادے کے ذہن نشین کیا۔ نیز شاہ عبدالرحیم صاحبؒ نے ہی حکمت عملی کو اسلامی علوم میں ایک باوقار اور اہم مقام دیا۔ اور اپنے صاحبزادے شاہ ولی اللہ کو اس کی خاص طور سے تلقین کی۔ الغرض یہ تین چیزیں قرآن کے متن کو اصل ماننا، وحدۃ الوجود کا صحیح حل اور اسلامی علوم میں حکمت عملی کی غیر معمولی اہمیت شاہ ولی اللہؒ کے علوم میں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں اور یہ تینوں کی تینوں شاہ عبدالرحیم کی تربیت کا نتیجہ ہیں۔'' (شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ ص ۱۴۷، بحوالہ الواح الصنادید حصہ اول ص ۸۶)

حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب کا یہ بھی امتیاز تھا کہ وہ اپنے معاصرین اور اقران کے بر خلاف سلطان وقت اور ارباب اقتدار سے اختلاط و ارتباط کو پسند نہیں کرتے تھے۔ عالمگیر اورنگزیب نے ایک دفعہ حضرت شاہ صاحب سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی تو حضرت شاہ عبد الرحیم صاحب نے صاف صاف فرمایا تھا کہ کسی بھی سلطان وقت کے در پر حاضری مشائخ چشت کے اصول و روایت کے خلاف ہے۔ مشائخ چشت کا مقولہ ہے کہ جو درویش وفقیر اپنا نام بادشاہ وقت کے رجسٹر میں لکھوا دیتا ہے، اس کا نام اللہ کے رجسٹر سے نکالدیا جاتا ہے۔ یہ فقرہ سنکر بادشاہ وقت آبدیدہ ہو گیا تھا۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کو بھی خود اعتمادی، خدا اعتمادی، خود شناسی اور بے نیازی و استغناء وراثت میں ملا تھا۔ آپ نے بھی کبھی سلاطین وقت اور امراء سے کسی قسم کی راہ ورسم کو پسند نہیں کیا تھا۔ حالانکہ قلعہ کی بیگمات اور مصاحبین و شاہزادگان دعاؤں اور مشوروں کے لئے آیا کرتے تھے اور شاہ صاحبؒ سے فیض حاصل کیا کرتے تھے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کا دور بڑا پر آشوب دور تھا، حضرت عالمگیر اورنگزیبؒ کے بعد مغل سلطنت پر زوال و انحطاط شروع ہو چکا تھا، مسلم معاشرہ بھی زوال زدہ اور انحطاط پذیر تھا۔ اس کے

اثرات حضرت شاہ صاحبؒ کے سامنے تھے، حضرت شاہ صاحب قلعۂ معلیٰ کے پہلو میں بیٹھ کر اسلامی معاشرہ کی تشکیل نو واحیائے دین اور زوال وانحطاط کے اثرات سے بچانے کا جتن کر رہے تھے۔اور مسلم معاشرہ میں بڑھتے ہوئے نئے رجحانات کو واضح طور پر محسوس کر رہے تھے آپکے دور میں تصوف کا بڑا چرچا تھا،تصوف، مسلم معاشرہ کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے چکا تھا۔اس کے حصار سے نکلنا خاصاً مشکل کام تھا۔زمانہ کے رسم ورواج کے مطابق خود حضرت شاہ صاحبؒ کی ذہنی وفکری تربیت اسی راہ سے ہوئی۔ حجۃ اللہ البالغۃ اور تفہیمات الٰہیہ وغیرہ میں گاہے بگاہے عہد کے عوامی رجحانات ودینی میلانات کی تصویر کشی وعکاسی کی ہے۔چنانچہ حضرت شاہ صاحب تفہیمات الٰہیہ میں لکھتے ہیں:

''ان کے عہد میں تین چیزوں کی طرف اہل علم کی خصوصی توجہ ہے۔ایک قرآن مجید اور احادیث نبوی۔دوسری چیز علوم عقلیہ اور تیسری چیز وجدان واشراق اور کشف ہے۔''

اس ضمن میں شاہ صاحب مزید فرماتے ہیں۔

''اس زمانے میں لوگ شرقاً وغرباً صوفیہ کے علوم قبول کرنے پر متفق ہیں۔یہاں تک کہ انکے اقوال اور حالات لوگوں کے لئے کتاب اور سنت سے بھی زیادہ مرغوب خاطر ہیں بلکہ عامۃ الناس تو صوفیہ کے رموز واشارات کے بغیر کوئی چیز قبول کرنے کو تیار نہیں ہوتے۔چنانچہ اگر کوئی ان رموز واشارات کو ماننے سے انکار کرے یا ان سے بے توجہی برتتے تو اس کی بات تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہوتے۔اور نہ اسے نیکوکاروں میں سمجھتے ہیں۔'' (ارمغان شاہ ولی اللہ ص ر۱۸۷)

حضرت شاہ صاحب نے قرآن وحدیث اور فنون کی کتابیں اپنے والد ماجد سے پڑھی تھیں۔سلوک کا علم بھی اپنے والد ماجد سے حاصل کیا تھا۔ابھی حضرت شاہ صاحب کی عمر ۱۷ رسال کی تھی کہ حضرت شاہ عبدالرحیم جیسے شفیق مرشد ومربی والد کا سایۂ عاطفت سر سے اٹھ گیا۔حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب نے مرض الموت ہی میں حضرت شاہ صاحب کو بیعت وارشاد کی اجازت مرحمت فرمائی۔اور بار بار فرمایا کہ یدہ کیدہ (انکا ہاتھ میرے ہاتھ کی مانند ہے)۔

حضرت شاہ صاحب نے بہت جلد سلوک کے تمام مراحل کو طے کر لیا تھا۔

رسالہ الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف میں۔ جو کہ دراصل آپ کی خود نوشت سوانح عمری اور آپ بیتی و سرگزشت ہے، لکھتے ہیں کہ۔

و پانزدھم سال بود کہ باوالد بزرگوار بیعت کردم و باشغال صوفیہ خصوصاً نقشبندیہ مشائخ مشغول شدم واز حیثیت توجہ و تلقین و تعلیم آداب طریقت ولبس خرقۂ صوفیہ ارتباط درست نمودم۔

(الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف ۔ص/٦)

پندرھویں سال میں تھا کہ والد بزرگوار سے بیعت ہوا اور اشغال صوفیہ خصوصاً مشائخ نقشبندیہ کے اشغال میں مشغول ہوا۔ اور توجہ، تلقین، تعلیم، آداب طریقت اور خرقۂ صوفیہ پہننے کی راہ سے اپنی نسبت کو درست کیا۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی شریعت وطریقت کہ نہ صرف جامع تھے بلکہ تصوف وسلوک کے مصلح ومجدد بھی تھے۔ تصوف سے متعلق آپ کے تجدیدی کارنامے اس کا ثبوت ہیں۔

آپ کے بارے میں یہ کہنا کہ نفس تصوف کے خلاف تھے، خلاف واقع ہے۔ خود آپ اور آپ کے روحانی خانوادہ کے اکابر بھی تصوف وسلوک سے خصوصی تعلق رکھتے تھے۔ اور اس کوچے کے رہ نورد تھے۔ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں موجود صحیح بخاری کے ایک قلمی نسخے پر حضرت شاہ صاحب نے اپنا مسلک اور اپنا فقہی وتدریسی نقطۂ نظر تحریر فرمایا ہے۔ اتفاق سے مجھے بھی اس کو دیکھنے اور اس سے استفادہ کا شرف حاصل ہوا ہے۔ یہ وہ قلمی نسخۂ بخاری ہے، جو کبھی حضرت شاہ صاحب کے زیر مطالعہ اور زیر درس رہا ہے، جس پر حضرت شاہ صاحب کے حواشی بھی ہیں۔ یہ حواشی اور تعلیقات لائق اشاعت ہیں۔

حضرت شاہ صاحب صحیح بخاری کے آخر میں تحریر فرماتے ہیں۔

"العمری نسباً الدهلوی وطناً الاشعری عقیدة الصوفی طریقة الحنفی عملاً الحنفی والشافعی تدریساً خادم التفسیر والحدیث والفقه والعربیة والکلام۔" ٢٢ شوال المکرم ١١٨٩ھ

اس کے آخر میں آپ کے فرزند ارجمند شاہ رفیع الدینؒ نے تصدیق کی ہے کہ والد محترم کی تحریر ہے۔ انہوں نے اپنے ایک تلمیذ رشید کی سند حدیث میں یہ تصدیق تحریر فرمائی ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے مذکورہ بالا عبارت میں اپنے دوسرے نظریات و معتقدات کے ساتھ خصوصیت سے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ ''الصوفی طریقۃ'' جسکے معنی ہیں کہ طریقت و نسبت کے اعتبار سے صوفی ہیں۔ جیسا کہ حضرت شاہ صاحب نے بڑے عاجزانہ و منکسرانہ انداز میں جہاں خود اپنے بارے میں تفسیر، حدیث، عربی زبان اور علم کلام کے خادم اور عالم ہونے کا ذکر فرمایا ہے، وہاں خود اپنے کو صوفی ہونے کا بھی دعویٰ کیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ صوفی بھی تھے۔ احسان اور تصوف کے حامی بھی تھے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ آپ کا تصوف-مروج تصوف سے مختلف، بلکہ آپ مروج تصوف کے بعض معتقدات و رسوم کے ناقد اور اصلاح کار بھی ہیں۔ اور نام نہاد صوفیا کے غیر اسلامی نظریات و معتقدات کے سخت ترین مخالف بھی ہیں۔ یہ کوئی فکری تضاد نہیں ہے۔ حضرت شاہ صاحب نے جس تصوف کی حمایت کی ہے، وہ اور ہی تصوف ہے اور جس تصوف کی تردید و تغلیط کی ہے، وہ دوسرا تصوف ہے۔

اگر یہ کہا جائے تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا کہ حضرت شاہ صاحب جہاں مجدد دین متین تھے۔ ساتھ ہی مجدد تصوف و سلوک بھی تھے۔ آپ کی اصلاح و تجدید کا دائرہ بڑا وسیع الاطراف ہے۔ آپ نے اسلامی تصوف (جسے احسان سے تعبیر کرتے ہیں) اور غیر اسلامی تصوف جسے ''ہند ایرانی تصوف'' کہہ سکتے ہیں، کے مابین امتیاز پیدا کرنے کی سعی مشکور کی ہے۔ یہ تجدیدی نوعیت کا کام ہے۔ جسے حضرت شاہ ولی اللہ جیسا مجتہد عالم دین اور فقیہ امت ہی کر سکتا تھا۔ جو دل کے صوفی اور دماغ کے فقیہ اور مجتہد تھے۔

حضرت شاہ صاحب باوجود اسکے کہ اعلیٰ پایہ کے صوفی تھے، جاہل صوفیا اور کرامت فروش پیروں کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ آپ نے اپنی بعض کتابوں میں ان پر سخت تنقیدیں کی ہیں۔ اور ان سے برأت کا اظہار بھی کیا ہے۔ چنانچہ حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنے وصیت نامہ میں فرماتے ہیں۔

دست در دست مشائخ ایں زمان کہ بانواع بدعت مبتلا ہستند ہرگز نباید دادوہ بیعت ایشاں نباید کرد و بہ کرامات ایشاں مغرور نبا ید بود کرامات فروشاں ایں زمان ہمہ الا ماشاء اللہ طلسمات و نیرنجات را کرامات دانستہ اند (مقدمہ سطعات ص ۲۴ بحوالہ وصیت نامہ)

اس زمانہ کے مشائخ کے ہاتھ میں جو قسم قسم کی بدعتوں میں مبتلا ہیں، اپنا ہاتھ ہرگز نہیں دینا چاہیے۔ اور انکی بیعت نہیں کرنی چاہئے، اور نہ ان کی کرامات سے دھوکہ کھانا چاہیئے اس زمانہ کے کرامات فروش، باستثناء چند طلسمات اور نیرنجات ہی کو کرامت سمجھ بیٹھے ہیں۔

حضرت شاہ صاحبؒ ایسے صوفیوں اور تصوف کا لبادہ اوڑھنے والوں کو دین کے چور اور ڈاکوؤں سے تشبیہ دیتے ہیں، چنانچہ فرماتے ہیں:

اما الجهال والمجاهدون للتصوف فاؤلئک قطاع الطريق ولصوص الدين

ایسے جاہل صوفی اور مدعیان تصوف دین کے چور اور ڈاکو ہیں۔
(التفہیمات الالٰہیہ جلد ۲۔)

حضرت شاہ صاحب: اپنے عہد کے سجادہ نشینوں، خانقاہ نشینوں اور پیرزادوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"دین میں خشکی اور سختی کی راہ اختیار کرنے والوں سے میں پوچھتا ہوں۔ اور واعظوں، عابدوں اور کنج نشینوں سے سوال ہے، جو خانقاہوں میں بیٹھتے ہیں، ......کہ بہ جبر اپنے اوپر دین کو عائد کرنے والو! تمہارا حال یہ ہے، ہر بری بھلی بات، ہر رطب ویابس پر تمہارا ایمان ہے، لوگوں کو تم جعلی اور گھڑی ہوئی حدیثوں کا وعظ سناتے ہو، اللہ کی مخلوق پر تم نے زندگی تنگ کر چھوڑی ہے، حالانکہ تم تو (اے امت محمدیہ) اس لئے پیدا ہوئے تھے کہ لوگوں کو آسانیاں بہم پہنچاؤ گے، نہ کہ ان کو دشواریوں میں مبتلا کر دو گے، تم ایسے لوگوں کی باتیں دلیل میں پیش کرتے ہو، جو بیچارے مغلوب الحال تھے اور عشقِ محبت الٰہی میں عقل و حواس بھی کھو بیٹھے تھے، حالانکہ اہلِ عشق کی باتیں وہیں کی وہیں لپیٹ

کر رکھ دی جاتی ہیں نہ کہ ان کا چرچا کیا جاتا ہے..... تم نے وسواس کو اپنے لئے گوارا کرلیا ہے، اور اس کا نام احتیاط رکھ چھوڑا ہے..... حالانکہ تمہیں صرف یہ چاہیئے تھا کہ اعتقاداً وعملاً احسان کے مقام کے لئے جن امور کی ضرورت ہے، بس اس کو سیکھ لیتے، لیکن جو بیچارے اپنے اپنے خاص حال میں مغلوب تھے، خواہ مخواہ ان کی باتوں کو احسانی خالص امور میں گڈمڈ کرنے کی حاجت نہ تھی اور نہ ارباب کشف کی چیزوں کو ان میں مخلوط کرنے کی ضرورت تھی۔ چاہئے کہ مقام احسان کی طرف لوگوں کو بلاؤ، پہلے اسے خود سیکھ لو پھر دوسروں کو دعوت دو، کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے، کہ سب سے بڑی رحمت اور سب سے بڑا اکرم اللہ کا وہ ہے جسے رسول اللہ ﷺ نے پہنچایا ہے، وہی صرف ہدایت ہے جو آپ کی ہدایت ہے، پھر تم کیا بتا سکتے ہو، کہ جن افعال کو تم کرتے ہو، وہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرامؓ کیا کرتے تھے"(الفرقان شاہ ولی اللہ نمبر، ص/۱۵۰)

مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم لکھتے ہیں:

"مغلیہ سلطنت کا آفتاب لب بام تھا مسلمانوں میں رسوم وبدعات کا زور تھا۔ جھوٹے فقراء اور مشائخ جابجا اپنے بزرگوں کی خانقاہوں میں مسندیں بچھائے اور اپنے بزرگوں کے مزاروں پر چراغ جلائے بیٹھے تھے ومدرسوں کا گوشہ گوشہ منطق وحکمت کے ہنگاموں سے پرشور تھا۔ فقہ وفتاویٰ کی لفظی پرستش ہر مفتی کے پیش نظر تھی، مسائل فقہ میں تحقیق وتدقیق مذہب کا سب سے بڑا جرم تھا، عوام تو عوام ،خواص تک قرآن پاک کے معانی ومطالب اور احادیث کے احکام وارشادات اور فقہ کے اسرار ومصالح سے بے خبر تھے"۔(مقالات سلیمان، ج/۲)

حضرت شاہ صاحب بڑی متوازن فکر ونظر اور معتدل سوچ کے بزرگ تھے، آپ اگرچہ جاہل صوفیوں کے خلاف تھے، جنہیں جہال، متقشفین اور کرامت فروش وغیرہ کے القاب سے ملقب کرتے ہیں۔ اور انہیں زوال امت کے اسباب میں شمار کرتے ہیں۔ اس کے باوجود آپ کے فکر ونظر میں کمال اعتدال وتوازن تھا۔ اور آپ کا قدم جادۂ اعتدال سے کبھی نہیں ہٹا، آپ

تفہیمات الٰہیہ میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"ونحن لا نزدری أحدامن العلماء فالكل طالبو الحق، ولا نعتقد العصمة فی أحد غير النبی ﷺ، والميزان فی معرفة الخير والشر الكتاب علی تاويله الصريح ومعروف السنة لا أجتهادالعلماء ولا أقوال الصوفية، وليس منا من لم يتدبر كتاب الله ولم يتفهم حديث نبيه ﷺ وليس منا من ترك ملازمة العلماء أعنی الصوفية الذين لهم حظ من الكتاب والسنة أو الراسخين فی العلم الذين لهم حظ من الصوفية ...... أماالجهال من الصوفياء والجاهدون للتصوف فأولئك قطاع الطرق ولصوص الدين فأياك واياهم۔" تفہیمات الٰہیہ بحوالہ اسلام اور عصر جدید، خصوصی شمارہ شاہ ولی اللہ افکار وآثار، ص۔۱۶۳	(ہم کسی عالم کے مخالف نہیں ہیں، حق کے طالب ہیں، البتہ ہم نبی کریم ﷺ کے سوا کسی کو معصوم نہیں سمجھتے ہیں اور خیر وشر سے آگہی کا معیار صرف واضح تاویل کی روشنی میں اللہ کی کتاب اور سنت مشہور ہے، نہ کہ علماء کے اجتہاد اور صوفیاء کے اقوال۔ اور وہ ہم میں سے نہیں ہے جس نے کتاب اللہ میں غور نہیں کیا، اور نبی کریم ﷺ کی حدیث میں فہم، بصیرت حاصل نہیں کی، وہ ہم میں سے نہیں ہے، جس نے کتاب اللہ میں غور وفکر نہیں کیا اور نبی کریم ﷺ کی حدیث میں فہم وبصیرت حاصل نہیں کی، وہ ہم میں سے نہیں ہے، جس نے ایسے علماء یعنی صوفیاء کی صحبت ورفاقت ترک کردی ہو، جنہیں کتاب وسنت میں معرفت حاصل ہو، وہ ہم میں سے نہیں ہے، جو ایسے علماء راسخین سے کنارہ کش ہو گیا جو تصوف آگاہ ہیں باقی رہے جاہل صوفیا اور منکرین تصوف تو یہ دونوں ایمان کے لٹیرے اور دین کے چور ہیں، ان سے بچ کے رہو۔

حضرت شاہ صاحب نے بعض صوفیاء کے عقیدۂ حلول واتحاد کی بھی مخالفت کی ہے۔ اور اسے غیر اسلامی وغیر دینی عقیدہ قرار دیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

ثم نبت فرقة خبيثة وهى الفرقة التيتزعم ان الله عين العالم والعالم عين الله وليس هناك حساب ولاعذاب	اتفاق سے ایک بد باطن فرقہ نمودار ہوا ہے ، جو یہ گمان کرتا ہے کہ اللہ عالم کا عین اور عالم اللہ کا عین ہے اور سرے سے کوئی حساب اور کتاب نہیں ہے۔ التفہیمات الالہیہ۔ا۔۲۰۲

اسی طرح بعض سلسلوں میں رائج نماز معکوس کی بھی تردید کی ہے اور اسے خلاف سنت قرار دیا ہے۔ تصوف میں حضرت شاہ صاحب کی اصلاحات و تنقیحات کا دائرہ بڑا وسیع ہے۔ یہ موضوع مستقل کتاب کا تقاضا کرتا ہے، اللہ تعالیٰ نے توفیق دی تو اس موضوع پر کام کیا جائے گا۔

یہ سچ ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہؒ جیسا متبحر اور عبقری انسان صدیوں کے بعد کہیں مادر گیتی پر جلوہ افروز ہوتا ہے۔ آپ کی تصنیفات کے معیار و انداز کی کتابیں برصغیر ہی نہیں عالم اسلام میں بھی بہت کم نظر آتی ہیں۔

مولانا شبلی نعمانی آپ کے تبحر علمی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''ابن تیمیہؒ'' اور ابن رشدؒ کے بعد خود انہی کے زمانے میں مسلمانوں میں جو علمی تنزل شروع ہوا، اس کے لحاظ سے یہ امید نہ رہی تھی کہ پھر کوئی صاحب دل و دماغ پیدا ہوگا۔ لیکن قدرت کو اپنی نیرنگیوں کا تماشا دکھلانا تھا۔ کہ آخر زمانے میں جب کہ اسلام کا نفس باز پسین تھا۔ شاہ ولی اللہ جیسا شخص پیدا ہوا۔ جسکی نکتہ سنجیوں کے آگے۔ غزالیؒ، رازیؒ اور ابن رشدؒ کے کارنامے ماند پڑ گئے''۔
>
> (تاریخ علم کلام بحوالہ رود کوثر۔ ص ۵۵۱)

حضرت شاہ صاحب کثیر التصانیف تھے، آپ کی مجموعی تصنیفات کی نشاندہی ہی خاصا مشکل کام ہے۔ چونکہ حضرت شاہ صاحب کے بعض ایسے رسائل ہیں، جو کسی ضخیم کتاب کے کسی باب کا حصہ بن گئے ہیں، اگر اس ضمیمہ اور اس جز کتاب کو داخل کتاب رکھا جائے۔ تو لازمی طور پر کتابوں کی تعداد میں کمی واقع ہوگی۔ اور اگر اس کو علیحدہ شمار کیا جائے تو یقینی طور پر کتابوں کی تعداد میں اضافہ ہوگا۔ ایسی صورت میں جنہوں نے جو بھی تعداد کی نشاندھی کی ہے اسکی تردید و تغلیط ممکن نہیں ہے البتہ میری ناقص رائے ہے کہ حضرت شاہ صاحب کی کتابوں کی مجموعی تعداد ۴۶ ہے۔ یہ وہ

کتابیں ہیں جو شہرت عامہ کی حامل ہیں اور جن پر تمام اصحاب علم کا اتفاق ہے،ان کتابوں میں تقریباً ۱۷ر کتابیں تصوف وسلوک سے تعلق رکھتی ہیں۔تصوف و سلوک سے متعلق ان ۱۷ کتابوں میں سے ہمعات ،سطعات ،لمعات ،الطاف القدس اور خیر کثیر ،اس زیر ترتیب ''مجموعۂ رسائل امام شاہ ولی اللہ حصۂ اول'' میں شامل ہیں۔جن کے متعلق مختصر تعارف وتبصرہ پیش ہے۔
اس مجموعہ کے شروع میں بطور تبرک اور تعارف ''الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف'' کو شامل کیا گیا ہے یہ حضرت شاہ صاحب کی خود نوشت سوانح عمری اور آپ بیتی ہے،جس میں انہوں نے اپنے ذاتی احوال وتعلیمی کوائف کو بڑے اختصار وایجاز کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔اور اپنے والد ماجد سے بیعت وارشاد کی اجازت اور تصوف سے متعلق اپنے بعض کتابوں کی تصنیف کا ذکر فرمایا ہے۔اور ابداع ،خلق ،تدبیر اور تدلی جیسے کمالات اربعہ اور مسائل دقیقہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جو فکر ولی اللہی کے مرکزی عناصر اور تصوف کی اساس وبنیاد ہیں۔

ہمعات یہ تاریخ تصوف اور فلسفۂ تصوف پر حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی ایک شاہکار تصنیف ہے جسمیں تصوف کے چار ادوار اور ان میں عہد بہ عہد رونما ہونے والے تغیرات وحالات کا جامع ذکر ہے اور ان چاروں دوروں کے بارے میں اپنی رائے بھی پیش کی ہے۔

تصوف کا پہلا دور ......دراصل احسان کا دور ہے۔یہ حضرت شاہ صاحب کے نزدیک پسندیدہ دور ہے۔حضرت شاہ صاحب تصوف کے دور اول کے بارے میں لکھتے ہیں:

''رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے صحابہ کے زمانے میں چند نسلوں تک اہلِ کمال کی بیشتر توجہ زیادہ تر شریعت کے ظاہری اعمال کی طرف رہی۔ان لوگوں کو باطنی زندگی کے جملہ مراتب شرعی احکام کی پابندی کے ذیل ہی میں حاصل ہو جاتے تھے۔چنانچہ ان بزرگوں کا ''احسان'' یعنی حاصل تصوف یہ تھا کہ وہ نمازیں پڑھتے تھے،ذکر اور تلاوت کرتے تھے،روزے رکھتے تھے،صدقہ اور زکوٰۃ دیتے تھے اور جہاد کرتے تھے۔ان میں سے کوئی شخص ایسا نہ ہوتا جو سر نیچے کیئے بحر تفکرات میں غرق نظر آتا۔ یہ بزرگ خدا تعالیٰ سے قرب وحضوری کی نسبت اعمال شریعت اور ذکر واذکار کے سوا کسی اور ذریعہ سے حاصل کرنے کی سعی نہ کرتے۔بے شک ان اہل کمال بزرگوں

میں سے جو محقق ہوتے ،ان کو نماز اور ذکر واذ کار میں لذت ملتی۔قرآن مجید کی تلاوت سے وہ متاثر ہوتے۔مثلاً وہ زکوٰۃ محض اس لیے نہ دیتے کہ زکوٰۃ دینا خدا کا حکم ہے بلکہ خدا کے حکم کی بجا آوری کے ساتھ ساتھ وہ اپنے آپ کو بخل کے روگ سے بچاتے ، چنانچہ وہ اپنے آپ کو دنیاوی کاموں میں بیحد منہمک پاتے اور انہیں اس کا احساس ہوتا تو وہ دل کو کاروبارِ دنیا سے ہٹانے کے لیے زکوٰۃ دیتے۔اسی طرح شریعت کے دوسرے احکام بجالانے میں بھی ان کی یہی کیفیت ہوتی تھی۔ الغرض یہ بزرگ محض خدا کا حکم سمجھ کر شرعی احکام، ادا نہ کرتے بلکہ شرعی احکام کی بجا آوری کے ساتھ ساتھ ان کے باطنی تقاضوں کی تسکین بھی ہوتی تھی۔ان میں سے کوئی شخص نہ بے ہوش ہوتا اور نہ اسے وجد آتا۔نہ وہ جوش میں آ کر کپڑے پھاڑ نیلکتا اور نہ شطح یعنی خلافِ شرع کوئی لفظ اس کی زبان سے نکلتا۔یہ بزرگ تجلیات استتار اور اس قسم کے دوسرے مسائل پر مطلق گفتگو نہ کرتے تھے۔یہ بزرگ بہشت کی رغبت وآرزو رکھتے اور دوزخ سے خائف وہراساں رہتے۔کشف وکرامات اور خوارق ان سے بہت کم ظاہر ہوتے ، سرمستی و بے خودی کی کیفیت بھی شاذ ونادر ہی ان پر طاری ہوتی اور اگر کبھی کبھی یہ باتیں ان سے صادر بھی ہوتیں تو قصداً نہیں بلکہ محض اتفاق سے ایسا ہوتا۔بات یہ ہے کہ وہ نفسی کیفیات، جن کا نتیجہ کرامات وخوارق اور سرمستی و بے خودی کی قبیل کی چیزیں ہوتی ہیں ،ان بزرگوں کے اندر اتنی راسخ نہ ہوئی تھیں کہ وہ ان کا ملکہ بن جاتیں۔اس ضمن میں جب کبھی ان سے کوئی ایسی بات ظاہر ہوئی تو یا تو اس کی صورت یہ تھی کہ وہ جس چیز کو از روئے ایمان صمیمِ قلب سے مانتے تھے،وہ چیز بے اختیار ان کی زبان پر آجاتی۔جیسا کہ حضرت ابوبکرؓ نے مرض الموت میں اپنے تیمارداروں سے فرمایا تھا کہ ”طبیب ہی نے مجھے بیمار کیا ہے“ یا یہ ہوتا کہ یہ بزرگ خواب میں بعض چیزوں کو دیکھ لیتے یا فراست سے نامعلوم چیز کو معلوم کر لیتے۔لیکن یہ چیزیں ایسی نہ ہوتیں کہ عوام کی ان تک رسائی نہ ہوسکتی۔ قصہ مختصر اس دور میں جسے تصوف یا احسان کا پہلا دور کہنا چاہیے ،اہل کمال کا غالب

طور پر یہی حال رہا"۔(ہمعات ص ۷۲)

تصوف کا دوسرا دور! دراصل سید الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ کا دور تھا جو گروہ صوفیا کے سرخیل تھے۔ اس دور میں بھی عام طبقہ پر قرن اول کا رنگ غالب، تھا البتہ خواص ریاضتوں اور مجاہدوں کی طرف مائل ہو چکے تھے۔ حضرت شاہ صاحب نے اس دوسرے دور کا بھی جائزہ لیا ہے جو لائق مطالعہ ہے۔

تصوف کا تیسرا دور! سلطان الطریقت شیخ ابوسعید بن ابی الخیرؒ اور شیخ المشائخ حضرت ابوالحسن خرقانیؒ سے تعلق رکھتا ہے جو اپنے زمانے کے اجل مشائخ طریقت میں تھے۔ حضرت شاہ صاحب نے اس حصہ پر بھی تفصیلی گفتگو کی ہے۔

تصوف کا چوتھا دور! شیخ اکبر محی الدین بن عربی صاحب فتوحات مکیہ کا دور ہے، ان چاروں دوروں میں طاری ہونے والے احوال وکوائف اور واقعات وتغیرات کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے ، اور معروضی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ اس باب کے آخر میں حضرت شاہ صاحب اپنے ذوق و مذاق کے مطابق بڑے متوازن ومعتدل انداز میں فرماتے ہیں۔

> "تصوف کے ان چاروں ادواروں میں بھی جو اہل کمال بزرگ رہے ہیں، وہ اپنے ظاہری اعمال واحوال میں الگ الگ نظر آتے ہیں لیکن جہاں تک انکی اصل کا تعلق ہے، میرے نزدیک وہ سب ایک ہیں، باقی اللہ تعالیٰ ان کے حال کو ہم سب سے بہتر جانتا ہے۔"

اس کتاب میں تصوف کی تاریخ ،فلسفۂ تصوف ،اصطلاحاتِ تصوف اور صوفیا کے طبقات ومراتب اوران کی نسبتوں کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ حضرت شاہ صاحبؒ کی اہم تصنیف ہے، جو فارسی زبان میں ہے۔ جس کے مترجم پروفیسر محمد سرور مرحوم ہیں جو مولانا عبیداللہ سندھی کے صحبت یافتہ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پرانے اساتذہ میں تھے، اور پاکستان منتقل ہو گئے تھے، انہوں نے وہاں بھی فکرولی اللہی کی شمع کو فروزاں رکھا۔

اس مجموعۂ رسائل میں تصوف کے موضوع پر شاہ صاحب کی دوسری موزوں ترین کتاب سطعات ہے۔ جو ۴۶ سطعات پر مشتمل ہے۔ ہر سطعہ میں تصوف کے کسی نہ کسی دقیق بلکہ ادق

مسئلہ پر بھر پور روشنی ڈالی گئی ہے۔ گرچہ ان سطعات کی تفہیم کوئی آسان امر نہیں ہے۔ پھر بھی صاحب ذوق، صاحب عرفان اور اہل دل کے لئے مینارۂ نور سے بھی کم نہیں۔ یہ جامع کتاب، فلسفۂ الٰہیات سے تعلق رکھتی ہے۔ البتہ فلاسفہ و مناطقہ کی تصنیفات کے برعکس اس میں تصوف کی اصطلاحات بھی درج ہیں۔ بالخصوص وحدۃ الوجود، عام، خاص، اخص الخواص، انسان کامل، ذات بحت، شخص اکبر، اور قبض و بسط کی اصطلاحات بھی استعمال ہوئی ہیں۔ جن سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت شاہ صاحب فلاسفۂ قدیم کے نظریات و معتقدات پر بڑا عبور و درک رکھتے تھے۔

اس کتاب میں جابجا طبی اصطلاحات بھی درج ہیں۔ مجموعی طور پر یہ کتاب تجلیات الٰہیہ کے اہم مباحث پر مشتمل ہے۔ جس کے مترجم مولانا محمد متین ہاشمی صاحب ہیں، جو بڑے دیدہ ور انسان ہیں۔

یہ کتاب ابتداء مطبع احمدی سے سید ظہیر الدین صاحب کے زیر انتظام شائع ہوئی، پھر ۱۹۳۹ء میں بیت الحکمۃ کراچی سے شائع ہوئی۔ جس کے منتظم کار مولوی فضل احمد تھے اور ۱۹۴۶ء میں شاہ ولی اللہ اکیڈمی سندھ سے طبع ہوئی، جس کے ناشر و محقق مولانا محمد مصطفیٰ قاسمی صاحب تھے۔ جو ولی اللّٰہی فکر عالم دین تھے۔

''سلسلۂ کتب تصوف کی تیسری کتاب لمعات ہے، جسے بعض ناشرین نے ''لمحات'' لکھدیا ہے، جو بداہتاً غلط ہے یہ لمعات فارسی میں ہے جس کا اردو ترجمہ ''نفحات'' کے نام سے ہوا ہے، لیکن اردو میں ''لمعات'' ہی مروج ہے، اور ''نفحات'' اردو میں بھی عملاً متروک ہے۔ شاہ صاحب کی اس اہم تصنیف میں سات لمعات ہیں۔ اور ہر لمعہ میں کوئی نہ کوئی لمحۂ فکریہ ہے، ہر لمعہ پر علیحدہ علیحدہ تبصرہ باعث طوالت ہوگا۔ اور اس مختصر مقدمہ کی روح کے منافی بھی البتہ مجموعی طور پر کہا جائے تو اس کتاب میں ابداع، خلق، تدبیر، تدلی، توحید، وحدۃ الوجود وحدۃ الشھود، وجود فی الخارج، وجود فی الاعیان، عالم مثال، شخص اکبر، خطیرۃ القدس اور تصوف و کلام کے دوسرے اہم مسائل بیان کئے گئے ہیں۔ حضرت شاہ صاحب نے بڑی گہرائی و گیرائی کے ساتھ ان مسائل تصوف و کلام پر بحث کی ہے۔ اور ان طبعیات اور مافوق الطبعیات کے اسرار و رموز کی نقاب کشائی کی ہے۔ جو قاری وسامع کے لئے یکساں طور پر چشم کشا ہے۔

حضرت شاہؒ اس کتاب کے آخر میں تجلیات اور فلکیات کے مباحث و مسائل بھی زیر بحث لائے ہیں۔ اس کتاب کے مترجم پیر محمد حسن صاحب ہیں۔ انہوں نے بڑا سلیس و شستہ اور با محاورہ ترجمہ کرنے کی سعی کی ہے۔

سلسلۂ کتب تصوف و عرفان کی چوتھی کتاب، الطاف القدس ہے، جو تصوف و احسان کے اسرار و رموز، لطائف نفس اور روحانی حقائق و معارف پر ایک نادر و نایاب کتاب ہے۔ جس کا شمار تصوف کی اہم کتابوں میں ہوتا ہے۔ اس کتاب کا مرکزی موضوع ''لطائف نفس'' ہے۔ حضرت شاہ صاحب لطائف و معارف کے بیان میں امام الوقت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنے وجدان، وکشف کے ذریعہ ان کا معروضی و الہامی تجزیہ پیش کیا ہے۔ حضرت شاہ صاحب کے نزدیک لطائف نفس میں قلب، عقل، نفس، روح، سر، خفی، اخفی، حجر بحت اور انا وغیرہ شامل ہیں۔ مذکورہ بالا کتاب میں ان امور کے حقائق اور اسرار و رموز بیان کئے گئے ہیں۔

مولانا عبید اللہ سندھی، جو فلسفۂ ولی اللہی کے ترجمان و مبلغ تھے، ''لطائف نفس'' کے بارے میں لکھتے ہیں۔

> ''عام طور پر متصوفین مبادی اخلاق سے اپنا مسئلہ شروع کرتے ہیں۔ انسان کے بدن میں تین عضو ہیں۔ جنہیں علمائے طب اعضائے رئیسہ کہتے ہیں۔ دماغ، قلب، کبد (جگر)، ان اعضائے رئیسہ کی مرکزی قوتوں کو لطیفۂ عقل، قلب، نفس کہتے ہیں۔ پھر ان کی ترکیب و تحلیل سے مختلف حالات و مقامات پیدا ہوتے ہیں۔ جن سے متصوفین اپنی کتب میں پورے بسط سے بحث کرتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ ان لطائف ثلثہ سے پہلے لطیفۂ جوارح بھی تجویز کرتے ہیں''۔ (الفرقان شاہ ولی اللہ نمبر ۳۲۹۔)

خود حضرت امام شاہ ولی اللہؒ اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''یہ چند اوراق جنہیں ''الطاف القدس فی معرفۃ لطائف النفس کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ قلب، عقل، نفس، روح، سر، خفی، اخفیٰ، حجر بحت اور اناؔ کے حقائق اور ان میں سے ہر ایک کی تہذیب و ترتیب کے طریقوں پر مشتمل ہیں۔ اس مضمون

سے مقصود یہ ہے کہ خالص وجدانی اور کشفی مسائل قلمبند کئے جائیں اور اس میں علوم عقلیہ ونقلیہ سے کوئی سروکار نہ ہو۔ واللہ علیٰ مانقول وکیل"۔ (الطاف القدس۔ ص/۱۰)

مولانا عبید اللہ سندھی "امام ولی اللہ دہلوی کی حکمت کا اجمالی تعارف" کے آخر میں اپنے تجربوں اور وسیع مطالعہ کا نچوڑ پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"تجلی الٰہی کی تشریح کے سمجھنے کے لئے کتاب "سطعات" کا پڑھنا لازم ہے اور ادراک انسانی کے تنوع کی حقیقت سے معلوم کرنے کے لئے الطاف القدس کا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ اور اسلام میں تصوف کا فلسفۂ تاریخ کے سمجھنے کے لئے ہمعات کا مطالعہ کرنا چاہئے"۔ (الفرقان شاہ ولی اللہ نمبر ۳۲۰۔)

اور اس سلسلہ کی آخری کتاب "الخیر الکثیر" ہے جو اصلاً عربی زبان میں ہے۔ جس کو اردو زبان کے قالب اور رنگ وروپ میں ڈھالا گیا ہے۔ اس کا موضوع فلسفۂ دینی ہے۔ یہ کتاب ۱۰/ علمی خزانوں پر محیط ہے، جس کے بعض خزانوں میں تصوف کے مسائل زیر بحث آئے ہیں اور بعض خزانوں میں ماوراء الطبعیاتی مسائل اور غیبی امور پر کلام کیا گیا ہے۔ جنہیں الٰہیات بھی کہتے ہیں۔

ان میں بعض خزانوں میں ولایت کی حقیقت، ولایت کے اقسام واحکام، طریقۂ اولیاء کا بیان، ریاضت کی تفصیل، اہل صفا کے مختلف طریقے، اور ان کے مسالک اور اس کے بعض خزانوں میں معرفت ذات، اسماء الٰہی کی حقیقت، وحی، کلام الٰہی اور وحدۃ الوجود پر عارفانہ وفلسفیانہ بحث کی گئی ہے۔ عرش، زبان ومکان، افلاک وعناصر، معدن، نبات وحیوان، اعیان ثابتہ، عالم مثال وغیرہ پر گفتگو کی گئی ہے۔ بعض خزانوں میں حروف مقطعات کے معانی ومطالب اور خواص پر گفتگو کی گئی ہے۔ پانچویں خزانے میں نبی کی بعثت کا مقصد، نبوت کے مزاج وذوق اور انبیاء کے اصناف وغیرہ کا اہم بیان درج ہے۔

اس کے مترجم مولانا عبد الرحیم صاحب ہیں۔ یہ کتاب ۱۳۵۲ھ میں مجلس علمی ڈابھیل سے شائع ہوئی تھی۔

شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کے قیام کے مقاصد میں اولین مقصد و ہدف حضرت شاہ صاحب کی عربی و فارسی کی مطبوعہ و مخطوطہ کتابوں کی از سر نو اشاعت و ترویج ہے۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ برسوں سے اس کام میں مصروف عمل ہے۔ اسی مقصد و منصوبہ کے تحت سب سے پہلے تصوف وسلوک سے متعلق کتابوں مثلاً الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف، ہمعات، سطعات، لمعات، الطاف القدس اور خیر کثیر کو بصورت کلیات ''مجموعۂ رسائل امام شاہ ولی اللہ حصہ اول'' شائع کیا جا رہا ہے، جو تصوف وسلوک کے مسائل پر محیط ہے۔

اب اس کا دوسرا حصہ ''مجموعہ رسائل امام شاہ ولی اللہ حصہ دوم'' ابھی زیر ترتیب و تدوین ہے۔ جس میں فقہ، اصول فقہ، تفسیر و اصول تفسیر، تصوف، تاریخ تدوین علوم اور ترجمہ نگاری کے اصول و مباحث ہیں۔ اللہ نے چاہا تو یہ دوسرا مجموعۂ رسائل بھی جلد ہی منظر عام پر آ جائیگا۔

مجھے خوشی ہے کہ یہ مجموعۂ رسائل امام شاہ ولی اللہ حصہ اول، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے تعاون سے منصۂ شہود پر آیا ہے۔ میں اس خوشگوار موقع پر پروفیسر اختر الواسع صدر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ، ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین ڈائریکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور ڈاکٹر ولی اختر ندوی شعبۂ عربی دلی یونیورسٹی کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اس کتاب کی اشاعت میں بھرپور دلچسپی لی۔ محترمہ مسرت جہاں صاحبہ کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ انہوں نے بھی ہر ممکن تعاون کیا۔ آخر میں پروفیسر مارسیہ ہرمنسن صاحبہ (شکاگو) کا خصوصی طور پر شکر گزار ہوں کہ انہوں نے ان رسائل کو فراہم کرنے میں غیر معمولی مدد کی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان سبھوں کو جزائے خیر دے اور دنیا و آخرت میں سرخرو رکھے۔

عطاء الرحمٰن قاسمی

چیرمین

شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی

الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف

تصنیف

امام شاہ ولی اللہ محدثؒ

ترجمہ

پروفیسر خلیق احمد نظامی

ترتیب

مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی

شاہ ولی اللہؒ کی خودنوشت سوانح عمری

حضرت شاہ صاحب نے اپنے حالات اور سوانح میں ایک رسالہ الجزء اللطیف فی ترجمہ العبدالضعیف، تصنیف فرمایا تھا۔ یہاں اصل رسالہ اردو ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔

بعد حمد وصلوٰۃ کے کہتا ہے فقیر ولی اللہ بن عبدالرحیم۔ اللہ تعالیٰ اس کی اور اس کے والدین کی مغفرت کرے اور اچھا معاملہ فرمائے۔ کہ یہ چند کلمات کا ایک رسالہ ہے جو "جزء اللطیف فی ترجمۃ العبدالضعیف" کے نام سے موسوم ہے۔ جاننا چاہئے کہ اس فقیر کی پیدائش بدھ کے دن سورج کے طلوع ہونے کے وقت ۴ شوال ۱۱۱۴ھ کو ہوئی۔

بعض اختر شناسوں نے علم نجوم کی رو سے میرا زائچہ کھینچا ہے ان کے حساب سے وہ سال شمس وعطارد کے قران کا سال تھا۔

بعض حضرات نے عظیم الدین، تاریخ ولادت نکالی۔ والدین اور صالحین کی ایک جماعت نے بہت سی سچی خوابیں اس فقیر کے حق میں قبل ولادت اور اس کے بعد دیکھیں۔ چنانچہ بعض اعزاء نے اُن واقعات کی تفصیل دوسرے واقعات کے ساتھ ایک رسالے میں لکھی ہے جس کا نام قول جلی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو بہترین جزا دے اور ان کے ساتھ اور ان کے اسلاف واعقاب کے ساتھ اچھا معاملہ کرے اور ان کو دین ودنیا کی حسب دلخواہ ترقی نصیب کرے۔

جب میری عمر کا پانچواں سال ہوا میں مکتب میں بیٹھا اور جب سات برس کا ہوا تو حضرت والد بزرگوار نے مجھ کو نماز پر کھڑا کیا اور روزہ رکھنے کے لئے فرمایا اور ختنہ بھی اسی سال ہوا۔ ایسا یاد پڑتا ہے کہ میں نے اس سال کے آخر میں قرآن عظیم ختم کرلیا تھا اور کتب فارسیہ اور مختصرات پڑھنے شروع کردیئے تھے۔ عمر کے دسویں سال شرح ملا جامی پڑھتا تھا اور راہ مطالعہ کچھ نہ کچھ کشادہ ہوگئی تھی۔ چودھویں سال نکاح ہوا۔ اس سلسلے میں حضرت والد بزرگوار نے بہت زیادہ عجلت فرمائی۔ اور جب میری سسرال میں فقدان اسباب کا عذر ہوا (تاکہ نکاح کچھ تاخیر سے ہو) تو حضرت والد

بزرگوار نے ان لوگوں کو لکھا کہ اس تعجیل میں ایک خاص بھید ہے۔ یہ بھید بعد کو روشن ہوا کہ میرے نکاح کے فوراً بعد میری خوشدامن کا انتقال ہوا اس کے کچھ دن بعد میری زوجہ کے نانا فوت ہوئے اس کے کچھ ہی عرصہ کے بعد میرے تایا شیخ ابوالرضاء محمد قدس سرہ کے صاحبزادے شیخ فخر العالم نے وفات پائی۔ بعد ازاں کچھ ہی عرصہ گزرنے پر، برادر کلاں شیخ صلاح الدین کی والدہ گذر گئیں۔اس کے بعد حضرت ایشاں (والد ماجد) ضعیف و کمزور ہو گئے اور مختلف قسم کے امراض ان پر غالب آ گئے پھر ان کی وفات کا واقعہ پیش آیا۔

غرض یہ ہے کہ خاندانی جمعیت کا شیرازہ منتشر ہو گیا اور سب کو معلوم ہو گیا کہ اگر میرے عقد نکاح کی تقریب اس وقت نہ انجام پاتی تو اس کے بعد سالہا سال ممکن نہ تھا کہ قوت سے فعل میں آ سکے۔

پندرہویں سال میں تھا کہ والد بزرگوار سے بیعت ہوا اور اشغال صوفیا خصوصا مشائخ نقشبندیہ کے اشغال میں مشغول ہوا اور توجہ تلقین، تعلیم آداب طریقت اور خرقہ صوفیہ پہننے کی راہ سے اپنی نسبت کو درست کیا۔اسی سال تفسیر بیضاوی کا کچھ حصہ پڑھا، حضرت والد بزرگوار نے بہت سا کھانا پکوایا اور خاص عام کی دعوت کی اور مجھ کو درس کی اجازت عنایت فرمائی۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس علاقے کی رسم کے مطابق پندرہ سال کی عمر میں تمام علوم متعارفہ سے فراغ حاصل ہو گیا علم حدیث میں مشکوۃ کل پڑھی۔ کچھ حصہ یعنی کتاب البیع سے کتاب الآداب تک رہ گیا تھا، اس کی اجازت بھی مل گئی۔صحیح بخاری کا ایک حصہ تقریباً کتاب الطہارۃ تک اور شمائل ترمذی تمام بعض اصحاب کی قرأت کے ذریعے والد صاحب کے حلقہ درس میں سماعت کی، علم تفسیر میں کچھ حصہ بیضاوی کا اور کچھ تفسیر مدارک کا میں نے پڑھا۔اور اس ضعیف پر اللہ تعالی کے بہت سے احسانات میں سے ایک احسان عظیم یہ بھی تھا کہ چند بار مدرسہ میں قرآن عظیم کو معانی اور شان نزول کے تدبر کے ساتھ اور متعدد تفاسیر کی طرف رجوع کر کے حضرت والد صاحب کی خدمت میں پڑھنے کے واسطے حاضر ہوا۔اور یہ امر فتح عظیم کا سبب بنا والحمد اللہ۔علم فقہ سے شرح وقایہ اور ہدایہ ان دونوں میں سے تھوڑا حصہ چھوڑ کر کل کی کل پڑھی گئیں۔اصول فقہ سے حسامی اور توضیح وتلویح کا معتدبہ حصہ اور منطق سے شرح شمسیہ کل اور شرح مطالع کا کچھ حصہ علم عقائد و کلام میں شرح عقائد نسفی کل اور کچھ حصہ خیالی کا اور شرح مواقف کا کچھ حصہ۔علم سلوک میں عوارف المعارف کا کچھ حصہ نیز رسائل نقشبندیہ وغیرہ کا کچھ حصہ، حقایق میں شرح رباعیات مولانا جامی،

لوائح، مقدمہ شرح لمعات، مقدمہ نقد النصوص پڑھے۔ خواص اسماء وآیات میں حضرت والد صاحب نے اپنے خاص مجموعہ سے چند بار اجازت مرحمت فرمائی۔ علم طب میں موجز القانون اور حکمت میں شرح ہدایۃ الحکمۃ وغیرہ پڑھیں۔ نحو میں کافیہ اور شرح ملا جامی، فن معانی میں بہت بڑا حصہ، مطول کا اور مختصر المعانی کا اس قدر حصہ جس پر حاشیہ ملازادہ چڑھا ہوا ہے اور ہندسہ وحساب سے بھی بعض رسائل مختصر پڑھے۔ اس تعلیم کے دوران میں اونچے درجے کی علمی باتیں ہر فن سے متعلق دل میں گذرتی تھیں اور کوشش سے زیادہ کشادہ کار نظر آتا ہے۔ جب فقیر کی عمر ۱۷ سال کی ہوئی تو حضرت ایشاں بیمار ہو گئے اور بالآخر رحمت حق سے مل گئے مرض موت میں اجازت بیعت وارشاد مرحمت فرمائی اور کلمہ یدہ کیدی (یعنی اس کا ہاتھ میرے ہاتھ کی مانند ہے) بار بار فرمایا۔ وہ نعمت جو سب سے بڑھ کر ہے یہ ہے کہ حضرت ایشاں اس فقیر سے انتہائی رضامند رہے اور رضامندی کی حالت ہی میں اس دنیا سے رخصت ہوئے اگرچہ حضرت والد بزرگوار کی توجہ اس فقیر کے ساتھ اس طرح کی نہ تھی جیسا کہ عام طور پر باپ اپنی اولاد کے ساتھ رکھتے ہیں، اس کے باوجود کسی باپ کو کسی استاد کو اور کسی مرشد کو میں نے نہیں دیکھا کہ وہ اپنے بیٹے اور شاگرد و مرید کے ساتھ اس قدر دقایق شفقت ملحوظ رکھتا ہو جتنی حضرت ایشاں میرے ساتھ ملحوظ رکھتے تھے اے اللہ میری مغفرت فرما اور میرے والدین کی مغفرت فرما اور ان پر رحم فرما جیسا کہ انھوں نے مجھ پر بچپن میں رحم کھا کر پرورش فرمایا اور ان دونوں کو ان کی ہر شفقت اور رحمت ونعمت کے عوض لاکھوں گنی زیادہ رحمت عنایت فرما۔ بیشک تو قریب اور دعا کا قبول کرنے والا ہے۔ حضرت ایشاں کے انتقال کے بعد تقریباً بارہ سال تک کتب دینیہ وعقلیہ کے درس میں پابندی کے ساتھ مشغول رہا ہر علم میں غور وخوض کیا اور حضرت والا کی قبر پر توجہ رکھی۔ ان ایام میں باب توحید کھلا اور راہ جذب کھلی اور سلوک کا بڑا حصہ میسر آیا، نیز علوم وجدانیہ کثرت سے قلب پر وارد ہوئے، کتب مذاہب اربعہ اور ان کے اصول فقہ نیز ان احادیث کے دیکھنے کے بعد جن سے فقہا دلیل پکڑتے ہیں۔ نور غیبی کی مدد سے دل کو فقہاء محدثین کی روش اچھی لگی اور ان بارہ سال کے بعد زیارت حرمین محترمین کا شوق سر میں سمایا اور ۱۱۴۳ھ کے آخر میں حج سے مشرف ہوا۔ ۱۱۴۴ھ میں مجاورت مکہ معظمہ اور زیارت مدینہ منورہ نیز شیخ ابو طاہر قدس سرہ وغیر مشائخ حرمین محترمین سے روایت حدیث کی توفیق نصیب ہوئی۔ اسی عرصے میں روضہ منورہ حضرت سید البشر صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب متوجہ ہوا۔۔۔

فیوض پائے۔حرمین کے باشندوں سے جن میں علماء بھی تھے اور غیر علماء بھی خوب صحبتیں رہیں شیخ ابوطاہر کا خرقہ جامعہ پہنا جو تمام خرق صوفیہ پر حاوی کہا جا سکتا ہے۔اس سال کے آخر میں بھی حج ادا کیا اور ۱۱۴۵ھ کے شروع میں وطن مالوف کی طرف متوجہ ہوا اور بروز جمعہ ۱۴ ررجب کو صحت وسلامتی کے ساتھ وطن پہنچا۔قرآن کی آیت ہے **واما بنعمة ربك فحدث** (اپنے رب کی نعمت کا شکر ادا کر) اس حکم کی تعمیل میں کہتا ہوں کہ منجانب اللہ بڑی نعمت اس فقیر کو یہ عنایت کی گئی ہے کہ اس کو خلعت فاتحیہ دیا ہوا اور اس دور آخر کی کشادہ کا راس کے ہاتھ سے وابستہ کی ہے۔اور فقہ میں پسندیدہ کیا ہے اس کی رہنمائی بھی کردی ہے۔میں نے اس رہنمائی سے اس پسندیدہ فقہ کو جمع کر کے فقہ حدیث کی از سر نو بنیاد رکھی۔اور اسرار حدیث اور مصالح احکام وترغیبات نیز ان تمام امور کے مصالح جو حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم خداوند کریم کی طرف سے لے کر آئے ہیں اور جن کی تعلیم آپ نے فرمائی ہے اور یہ اسرار حدیث اور مصالح احکام دین کا فن کہ فقیر سے پہلے زیادہ مرتب طریقے پر کسی نے نہیں لکھا، باوجودیکہ یہ فن عظیم الشان فن ہے اگر کسی کو میری اس بات میں شبہ ہو تو اس سے کہو وہ کتاب قواعد کبری کو دیکھ لے کہ اس کتاب میں شیخ عزالدینؒ نے کس قدر محنت کی ہے مگر اس فن کے عشر عشیر کو بھی نہ پہنچ سکے۔اور وہ طریقہ سلوک الہام فرمایا جو برہان مرضیٔ حق ہے اور اس دور میں کامیاب ہے۔طریقہ سلوک کو دو رسالوں میں تحریر کیا ہے جن کے نام لمعات اور الطاف القدس ہیں۔میں نے عقائد متقدمین اہل سنت کو دلائل سے ثابت کیا اور معقولیوں کی خس وخاشاک سے ان کو صاف کردیا اور اس طرح ثابت کیا کہ اب بحث ومباحثہ کا موقع باقی نہیں رہا۔علم کمالات اربعہ یعنی ابداع، خلق، تدبیر اور تدلی سے متعلق علم باوجود اس کی وسعت کشادگی کے اور استعداد نفوس انسانیہ کا علم پورے طریقے سے اور ہر کسی کے کمال ومآل کا علم افاضہ فرمایا۔اور یہ دونوں (آخر الذکر) علم بہت اونچے ہیں فقیر سے پہلے کوئی ان علوم کے گرد نہیں پہنچا۔اور حکمت عملی کہ اس دور کی کامیابی ودرستگی اسی میں مضمر ہے بوسعت تمام مجھے بخشی گئی۔اور کتاب وسنت اور آثار صحابہ رضی اللہ عنہم سے اس کو مضبوط ومستحکم کرنے کی توفیق مجھے ارزانی فرمائی۔جو علم دین ہے اور منقول ہے۔حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے، جو علم اس میں داخل کردیا گیا ہے اور تحریف شدہ ہے یا جو کچھ سنت ہے اور جو کچھ ہر فرقے کی بدعت ہے اس کی شناخت اور تمیز مجھے عطا فرمائی گئی ہے۔اگر میرا ہر رونگٹا زبان بن جائے، تب بھی میں اللہ تعالی کی حمد کما حقہ نہیں کرسکتا، والحمد للہ۔

ہمعات

تصنیف

امام شاہ ولی اللہ محدثؒ

ترجمہ

پروفیسر محمد سرور

ترتیب

مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱۔	دین اسلام کی دو حیثیتیں، ظاہری اور باطنی	۳۳
۲۔	تصوف کے چار دور	۳۹
۳۔	سلوک کی پہلی منزل: طاعہ	۴۴
۴۔	ذکر واذکار اوراد و وظائف	۴۷
۵۔	آداب سلوک	۵۰
۶۔	ذکر کے آداب	۵۲
۷۔	مراقبہ اور اس کے احکام	۵۶
۸۔	راہ سلوک کی رکاوٹیں	۶۰
۹۔	توحید افعالی، توحید صفاتی، توحید ذاتی	۶۵
۱۰۔	نسبتیں	۷۳
۱۱۔	نسبت سکینہ	۷۶
۱۲۔	نسبت اویسیہ	۸۶
۱۳۔	نسبت یادداشت	۹۴
۱۴۔	نسبت توحید	۹۹
۱۵۔	نسبت عشق	۱۱۱
۱۶۔	نسبت وجد	۱۱۴
۱۷۔	صوفیائے کرام کے طبقات اور ان کی نسبتیں	۱۱۷
۱۸۔	انسانیت کے چار بنیادی اخلاق	۱۲۴
۱۹۔	بنی نوع انسان کی اصناف اور ان کی استعدادیں	۱۳۲

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۲۰۔	بنی نوع انسان کے لطائف	۱۴۵
۲۱۔	اصحاب یمین	۱۵۴
۲۲۔	کرامات و خوارق	۱۶۱
۲۳۔	جنت کا بیان	۱۷۱

☆☆☆

بسم الله الرحمن الرحیم

اللہ تعالیٰ ہی کے لئے سب تعریف ہے جس نے انسانوں کے ایک گروہ کو اپنے لئے مخصوص فرمایا اسے دوسروں پر فضیلت بخشی۔ اور بشریت کی پستی سے اٹھا کر اسے ملکیت کے بلند مقام پر سرفراز فرمایا۔ اور اس طرح اس کی ترقی کے سامان فراہم کیے پھر اس نے اس گروہ کی 'ہویت' یعنی شخصیت کو ریزہ ریزہ کر کے اس پر موت مسلط کی اور اسے ہست سے نیست کیا۔ پھر اپنی جناب سے اس گروہ کو نئی زندگی کی خلعت پہنائی اور ہمیشہ کے لئے اسے زندۂ جاوید کر دیا۔ بہشت میں اس کو وہ نعمتیں دیں جو نہ کبھی کسی آنکھ نے دیکھی اور نہ کسی کان نے سنی تھیں۔ اور نہ اس برگزیدہ گروہ کے سوا کسی مومن کے دل میں ان نعمتوں کا کبھی خیال گزرا تھا۔

اس زندگی میں یہ برگزیدہ گروہ اللہ تعالیٰ کی طرح طرح کی نشانیوں کا مظہر بنا اور اس کی ذات گرامی سے گوناگوں کرامات کا صدور ہوا۔ لیکن سب سے بڑی نعمت اور سب سے گراں قدر عزت جو اس گروہ کے نفوس قدسی کو عطا ہوئی، وہ یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق فرمایا کہ ان کے ہاتھ میرے ہاتھ اور ان کے پاؤں میرے پاؤں، یہ پکڑتے ہیں تو میرے ہاتھ سے پکڑتے ہیں اور چلتے ہیں تو میرے پاؤں سے چلتے ہیں۔

اس کے بعد میں، اس امر کی شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا اور کوئی معبود نہیں۔ وہ وحدہٗ لاشریک ہے، سب مخلوقات کا خالق اور سب کا مولا و آقا اور میں اس امر کی بھی شہادت دیتا ہوں کہ ہمارے سرور محمد صلی اللہ علیہ وسلم، اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ سب انبیاء و مرسلین سے اکرم و اولیٰ۔ اللہ تعالیٰ کا درود و سلام ہو آپ پر، آپ کی آل پر اور آپ کے صحابہ پر، ہر ایک کے درجے کے مطابق اور ہر ایک کی عزت و منزلت کے مناسب، نیز اس کا درود و سلام ہو، ان پر جنہوں نے بعد میں پورے خلوص نیت سے ان کی پیروی کی اور وہ ان کی راہ ہدایت پر چلے۔

حمد وصلوۃ کے بعد خدا کا یہ ضعیف ترین بندہ ولی اللہ بن عبدالرحیم، اللہ ان دونوں کا ٹھکانا جاویدانی نعمتوں کو بنائے۔

یوں عرض کرتا ہے کہ اس سرگشتہ حقیقت کے دل پر بارگاہ عالی سے الہام کے جو قطرات ٹپکے۔ ان میں سے یہ چند کلمات ہیں۔ جو میں یہاں سپرد قلم کرتا ہوں۔ کہ صراط مستقیم پر چلنے کے لئے یہ کلمات خود میرے لئے نیز میرے تابعین کے لئے دستور کا کام دیں، خدا تعالی نے میرے دل میں طریقت و معرفت کی جو نسبت القاء فرمائی ہے، یہ کلمات اس نسبت کیلئے نمونہ بنیں۔ اور ان کے ذریعے میرے اس مسلک طریقت کی تشریح ہو جائے جس کی مجھے ہدایت فرمائی گئی ہے۔ خدائے علام الغیوب سے پوری امید ہے کہ وہ اس سلسلے میں نفس کی خام خیالیوں سے جو شیطانی وسوسوں سے پیدا ہوتی ہیں عقل و فکر کے ان قضیوں سے جو بحث و استدلال کا حاصل ہوتے ہیں نیز اکتسابی علوم جو دوسروں سے پڑھ کر یا ان کی باتیں سن کر ذہن نشین ہوتے ہیں ان سب چیزوں سے میرے ان الہامی کلمات کو محفوظ و مامون رکھے۔ تاکہ یہ ایک دوسرے سے مل نہ سکیں اور اس طرح حق اور باطل میں گڈ مڈ ہونے کا کوئی شبہ نہ ہو۔

میں اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی محسوس کرتا ہوں کہ میرے دل میں ان الہامی کلمات کو القاء کرنے سے صرف میری ذات کی تکمیل یا محض میری اپنی تعلیم مقصود نہیں بلکہ اس سے عام ملت اسلامی کی خیر و بہبود بھی منظور ہے۔ وَذٰلِکَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَايَشْكُرُوْنَ.

اس مناسبت سے میں نے اس کتاب کا نام ''ہمعات'' رکھا ہے اور اللہ ہی ہے جو ہمارا ملجأ و ماویٰ ہے۔ اور وہی سب سے بہتر وکیل اور نگہبان ہے۔

............☆☆☆............

دین اسلام کی دو حیثیتیں ظاہری اور باطنی

اللہ تعالی نے رسول مقبول علیہ الصلوۃ والسلام کو انسانوں کی ہدایت کے لئے مبعوث فرمایا اور دین کے قیام اور اس کی حفاظت کے سلسلے میں آپ ﷺ سے نصرت و مدد کا وعدہ کیا۔ اللہ تعالی کا ارشاد "اِنَّا لَہٗ لَحَافِظُوْنَ" اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالی کی اس نصرت و مدد کی برکت سے ہی آپ کا دین تمام ادیان پر غالب آیا۔ اس دین کی اشاعت سے دراصل مقصود یہ تھا کہ عرب وعجم کے رہنے والوں کی اصلاح ہو اور ظلم وفساد کا پوری طرح قلع قمع کر دیا جائے۔

مزید برآں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ دین محمدؐ کی دو حیثیتیں ہیں ایک ظاہری اور دوسری باطنی۔ جہاں تک دین کی ظاہری حیثیت کا تعلق ہے اس کا مقصود مصلحت عامہ کی نگہداشت اور اس کی دیکھ بھال ہے اور اس کی صورت یہ ہے کہ وہ احکام و معاملات جو اس مصلحت عامہ کے لئے بطور ذرائع و اسباب کے ہیں ان کا قیام عمل میں لایا جائے اور ان کی اشاعت میں کوشش کی جائے جن چیزوں سے مصلحت عامہ پر زد پڑتی ہو، اور جن امور کی وجہ سے اس مصلحت عامہ میں تحریف ہوتی ہو۔ ان کو سختی سے روکا جائے یہ تو ہوئی، دین کی ظاہری حیثیت۔ اب رہا اس کی باطنی حیثیت کا معاملہ، نیکی و طاعت کے کاموں سے دل پر جو اچھے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ان کے احوال وکوائف کی تحصیل، دین کی باطنی حیثیت کا مقصود اور نصب العین ہے۔

جب یہ امر واضح ہو گیا کہ دین کی ظاہری اور باطنی دو حیثیتیں ہیں، تو لامحالہ ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا پڑیگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دین کی حفاظت کا جو وعدہ کیا گیا تھا۔ اس کی حفاظت کی

بھی لازماً دو حیثیتیں ہوں گی۔ اس کی تفصیل یوں ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوا تو آپ سے حفاظت دین کا جو وعدہ کیا گیا تھا آپ کی وفات کے بعد اس وعدہ کی حفاظت کی دو شکلیں پیدا ہوئیں۔ وہ بزرگ جن کو خدا تعالیٰ کی طرف سے شریعت کی حفاظت کی استعداد ملی تھی۔ وہ تو دین کی ظاہری حیثیت کے محافظ بنے۔ یہ فقہائے محدثین، غازیوں، اور قاریوں کی جماعت ہے چنانچہ ہر زمانے میں اہل ہمت کی یہ جماعت مصروف عمل نظر آتی ہے۔ اگر دین کی تحریف کی کہیں سے کوشش ہو تو یہ لوگ اس کی تردید میں اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ تعلیم وترغیب کے ذریعے یہ بزرگ مسلمانوں کو علوم دین کی تحصیل کی طرف متوجہ کرتے ہیں اور ان ہی میں سے ہر سو سال کے بعد ایک مجدد پیدا ہوتا ہے جس کے ذریعے دین کی تجدید ہوتی ہے(۱)۔ ہمیں یہاں چونکہ اس مسئلے کی تفصیل مقصود نہیں، اس لئے صرف اس اشارے پر اکتفاء کرتے ہوئے ہم آگے بڑھتے ہیں۔ دین کے محافظین کا دوسرا گروہ وہ ہے جسے خدا تعالیٰ نے باطنِ دین کی حفاظت کی، جس کا دوسرا نام ''احسان'' ہے۔ استعداد عطا فرمائی ہر زمانے میں اس گروہ کے بزرگ عوام الناس کے مرجع رہے ہیں، طاعت ونیکوکاری کے اعمال سے باطن نفس میں جو اچھے اثرات مرتب ہوتے ہیں اور دلوں کو ان سے جو لذت ملتی ہے۔ یہ بزرگ، لوگوں کو ان امور کی دعوت دیتے ہیں۔ نیز یہ انہیں نیک اخلاق اختیار کرنے کی تلقین کرتے ہیں، پر عام طور پر یہ ہوتا آیا ہے۔

کہ ہر زمانے میں اولیاء اللہ میں سے کوئی نہ کوئی ایسا بزرگ ضرور پیدا ہوتا ہے جس کو عنایت الٰہی سے اس امر کی استعداد ملتی ہے۔ کہ وہ باطن دین کے قیام اور اس کی اشاعت کی کوشش کرے باطن دین کہ اس کا مغز اور نچوڑ ہے۔ ''احسان'' یعنی اللہ تعالیٰ کی، اس یقین کے ساتھ عبادت کرنا کہ گویا عبادت کرنے والا اسے سامنے دیکھ رہا ہے۔ یا اگر اتنا نہ ہو تو اسے یہ یقین ہو کہ اللہ تعالیٰ اسے دیکھ رہا ہے۔ یہ بزرگ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس صفت ''احسان'' کا مظہر بنتا ہے اور باطن دین کی اشاعت اور اس کی حفاظت کا کام اس طرح اس بزرگ کے ہاتھ سے سرانجام پاتا ہے۔

کارِ زلفِ تست مشک افشانی اما عاشقاں
مصلحت را تہمتے بر آہوئے چیں بستہ اند

(۱) مجددین امت میں حضرت امام غزالیؒ، علامہ ابن تیمیہؒ، حضرت مجدد الف ثانیؒ سرہندی، اور خود مصنف ہمعات وغیرہ بھی شامل ہیں۔ (قاسمی)

اولیاءاللہ میں جو بزرگ اس صفت احسان کا مظہر بنتا ہے اس کی پہچان یہ ہوتی ہے کہ لوگوں میں اس کی رفعت شان کا عام چرچا ہو جاتا ہے۔ خلقت اس کی طرف کھنچتی چلی آتی ہے۔ ہر شخص اس بزرگ کی تعریف کرتا ہے۔ نیز جو اذکار اور وظائف ملت اسلامیہ میں پہلے سے موجود ہوتے ہیں۔ ان میں بعض ایسے جن سے لوگوں کو فطری مناسبت ہوتی ہے۔ اس کے دل میں وارد ہوتے ہیں اس بزرگ کی صحبت اور باتوں میں جذب و تاثیر کی غیر معمولی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اس سے ہر طرح کی کرامات ظاہر ہوتی ہیں، غرضیکہ یہ بزرگ کشف و اشراف کے ذریعے لوگوں کے دلوں کا حال معلوم کر لیتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی مدد و قوت سے دنیا کے عام معمولات میں تصرف کرتا ہے۔ اس کی دعائیں بارگاہ حق میں مقبول ہوتی ہیں۔ یہ اور اس قبیل کی اور کرامات اس کی ہمت و برکت سے معرض وجود میں آتی ہیں اس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ مریدوں اور طالبوں کی ایک کثیر جماعت اس بزرگ کے ارد گرد جمع ہو جاتی ہے۔ اور یہ بزرگ باطن کی تہذیب اور اس کی اصلاح کیلئے اوراد و اشغال کو نئے سرے سے ترتیب دیتا ہے۔ یہاں سے اس بزرگ کے خانوادۂ طریقت کی بنیاد پڑتی ہے۔ اور یہ لوگ اس کے مسلک پر چلنے لگتے ہیں۔ اس خانوادے کی تاثیر و برکت کا یہ عالم ہوتا ہے کہ طالب اور مرید بہت جلد اس مسلک کے ذریعے اپنی مراد کو پہنچ جاتے ہیں۔

اس خانوادے سے جو شخص خلوص رکھتا ہے اور اس کی تائید کرتا ہے وہ تو دنیا میں فائز و کامیاب ہوتا ہے اور جو اس خانوادے کا برا چاہے اور اس سے فریب کرے وہ ناکام و خاسر رہتا ہے۔ عوام تو عوام خواص کے دلوں میں بھی اس خانوادے کے ماننے والوں کی ہیبت چھا جاتی ہے۔ نیز یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کچھ ایسے اسباب پیدا ہو جاتے ہیں اور اس کی قدرت الہام (۱) اور احالہ (۲) کے ذریعے نظام کائنات کی عام معلومات میں کچھ اس طرح تصرف کرتی ہے کہ لوگ اس خانوادے کے مطیع و منقاد ہو جاتے ہیں یہ صورت حال اور اس خانوادے کی

---

(۱) اور (۲) اس کائنات میں تدبیر الٰہی قبض، بسط، احالہ، الہام کے ذریعے مصروف کار ہوتی ہے، قبض کے معنی یہ ہیں کہ ایک چیز کی فطری استعداد کسی مصلحت سے بروئے کار نہیں آتی، بسط سے مراد یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ ایک چیز کی فطری استعداد میں خلاف معمول بہت زیادہ قوت و اثر پیدا کر دیتا ہے۔ احالہ کا مطلب یہ ہے کہ مثلاً آگ میں جلانے کی خاصیت ہے لیکن خدا تعالیٰ کسی مصلحت سے اس خاصیت کو مغلوب کر لیتا ہے۔ اور الہام کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی شخص کے دل میں ایک کام کرنے کی بات ڈال دے۔

سطوت و برکت ایک عرصے تک رہتی ہے لیکن ایک زمانہ گزرنے کے بعد جب عنایت الٰہی کسی دوسرے شخص کی طرف متوجہ ہوتی ہے اور اسے اپنے فیوض و برکات کا مرکز بناتی ہے تو یہاں سے ایک نئے خانوادے کی بنیاد پڑتی ہے۔ چنانچہ نیا خانوادہ معرضِ وجود میں آتا ہے۔ تو اس وقت پہلے خانوادے کی حالت ایسی ہو جاتی ہے کہ گویا کہ ایک جسم ہے جس میں روح نہیں رہی، اور پہلے خانوادے کا مسلک طریقت ایسا ہو جاتا ہے کہ اس میں جذب و تاثیر کا نام تک نہیں رہتا کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی وقت میں ایک سے زیادہ قطب پیدا ہوں (۱) اور وہ اس طرح کہ ہر ملک میں ایک الگ قطب ہو۔

باقی رہا کسی خانوادے میں جذب و تاثیر کا پایا جانا۔ بات یہ ہے کہ اس میں اس خاص خانوادے کی ذاتی خصوصیت کا دخل نہیں ہوتا، جذب و تاثیر محض عنایت الٰہی کا نتیجہ ہے۔ جب تک کوئی خانوادہ عنایت الٰہی کا مرکز اور موضوع رہے۔ جذب و تاثیر اس میں رہتی ہے۔ لیکن جب عنایت الٰہی کا رخ بدل جائے تو پھر اس خانوادے سے جذب و تاثیر بھی غائب ہو جاتی ہے، اس کو یوں سمجھئے کہ ایک تالاب ہے جس میں کہ ستاروں کا عکس پڑتا ہے آپ تالاب کے پانی کو ہزار بار بدلئے ظاہر ہے اس سے ستاروں کے عکس پر تو کچھ اثر نہیں پڑیگا۔

دم بدم گر شود لباس بدل
مردم صاحب لباس راچہ خلل

الغرض جذب و تاثیر کے معاملے میں اصل چیز عنایت الٰہی کی توجہ ہے۔ اور خانوادے تو اپنے اپنے وقت میں صرف اس عنایت الٰہی کی توجہ کے مرکز اور اس کے آلۂ کار بنتے ہیں۔ ایک خاص زمانے میں ایک مخصوص خانوادہ عنایت الٰہی کا مظہر ہوتا ہے اور یہی وہ راز ہے جس کی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ ہر زمانے میں جو بھی قطب ہوا، خود اس کی زبان سے اور اس کے حواریوں کی زبان سے اکثر ایسی باتیں نکلیں جن سے مراد یہ تھی کہ ان کا خانوادہ سب خانوادوں سے اعلیٰ اور مقدم ہے اور اللہ کے قرب و وصل حاصل کرنیکا صرف یہی ایک مسلک اور راستہ ہے، اس ضمن میں ہم اوپر کچھ لکھ آئے ہیں اور عنایت الٰہی کے متعلق جو ہم ابھی بتا چکے ہیں کہ کس طرح ایک وقت

(۱) یہ تکوینی نظام کے قیام کا علمبردار ہوتے ہیں۔ (قاسمی)

میں ایک خاص خانوادہ اس کا مرکز اور مظہر بنتا ہے۔

اگر یہ امور پیش نظر ہوں تو بآسانی یہ بات سمجھ میں آ جائے گی کہ یہ بزرگ اپنے ان دعوں میں سچے تھے۔ ظاہر دین کی تجدید و اصلاح کے ساتھ ساتھ باطن دین کے تزکیہ کیلئے بھی عنایت الٰہی برابر انتظام فرماتی رہی ہے۔ چنانچہ جس طرح شریعت کے مجددین پیدا ہوتے رہے ہیں اسی طرح طریقت کے بھی اب تک بہت سے خانوادے ہو چکے ہیں۔ بہت سے اس وقت بھی موجود ہیں اور امید ہے کہ بعد میں بھی ان کا سلسلہ برابر جاری رہے گا۔ ان سب خانوادوں کا احاطہ کرنا یہاں مقصود نہیں۔ ان میں سے بعض خانوادے تو ایسے ہیں کہ انہوں نے پرانے خانوادوں کی جو بے نام ونشان ہو چکے تھے از سر نو تجدید کر دی۔ اور بعض ایسے ہیں کہ انہوں نے کئی ایک خانوادوں کو یکجا کر کے ایک خانوادے کی شکل دیدی اور بعض نے نئے سرے سے مستقل خانوادوں کی بنیاد رکھی۔ گو خرقہ اور بیعت میں وہ پہلوں سے منسلک رہے۔ اب یہ مسئلہ کہ کل خانوادے کتنے ہیں؟ اس کے بارے میں لوگوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض لوگ چودہ خانوادے بتاتے ہیں۔ جن میں سب سے مشہور زیدی عیاضی، ادہمی، ہبیری، چشتی، جنیدی اور گارڈونی ہیں اور بعض کے نزدیک کل خانوادے بارہ ہیں ان میں سے دس تو مقبول ہیں اور باقی دو مردود، ان دس میں سے مشہور: جنیدیہ حکمیہ، محاسبیہ، حقیقیہ، نوریہ، اور طیفوریہ وغیرہ ہیں۔ الغرض ایک زمانے تک تو یہی خانوادے رہے، اس کے بعد ایک وقت آیا کہ ان کے علاوہ دوسرے خانوادے بھی پیدا ہو گئے مثلاً جامیہ، قادریہ، اکبریہ، سہروردیہ، کبرویہ، ویسویہ اور خانوادۂ خواجگان سرزمین ہند میں چشتی طریقہ کو حضرت معین الدین اجمیریؒ نے از سر نو زندہ فرمایا۔ اور اس سے خانوادۂ معینیہ چلا۔ خانوادۂ خواجگاں سے نقشبندیہ سلسلہ نکلا۔ اور نقشبندی سلسلے آگے چل کر حضرت عبیداللہ احرارؒ سے احراری خانوادہ بنا۔ اس کے بعد جوں جوں زمانہ گزرتا گیا، نئے نئے خانوادے معرض وجود میں آتے گئے جیسے شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ سے قدوسی سلسلہ نکلا، شیخ محمد غوث گوالیاری سے غوثیہ طریقہ چلا، خانوادہ باقویہ جو خواجہ باقی باللہؒ سے منسوب ہے، احمدیہ خانوادہ جس کے بانی شیخ احمد سرہندی ہیں، خانوادہ آدمیہ جو کہ شیخ آدم بنوریؒ کی طرف منسوب ہے اور علائیہ جس کا سلسلہ امیر ابوالعلاءؒ سے چلتا ہے، ان خانوادوں کے علاوہ اور بھی بہت سے خانوادے معرض وجود

میں آئے جن میں سے بعض تو اس وقت تک موجود ہیں اور بعض کا اب کوئی نشان نہیں ملتا۔

مجھ ضعیف (۱) پر حق سبحانہ کا یہ بڑا احسان ہے کہ اس نے مجھے ان خانوادوں میں سے اکثر کے ساتھ ظاہری اعتبار سے ربط پیدا کرنے کی سعادت بخشی، چنانچہ اس کا ذکر میں نے اپنی کتاب ''انتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ'' میں کیا ہے نیز اس سلسلے میں جو کچھ میں نے اس کتاب میں لکھا ہے اگر کسی صاحب کو ان خانوادوں کے حالات کی خبر ہو تو وہ آسانی سے میری ان تحریروں سے اندازہ کر سکتا ہے کہ مجھے کن کن خانوادوں سے ارتباط ہے اس ضمن میں مثال کے طور پر صرف اتنا عرض کرتا ہوں کہ مجھے سلسلۂ امدادیہ سے بواسطہ شیخ حسام الدین مانکپوریؒ جو شیخ بدیع الدین مدارؒ کے اصحاب میں سے تھے جلالیہ اور گازرد ینہ سلسلے میں سے بواسطہ مخدوم جہانیان، اور جامیہ سلسلے سے بواسطہ خواجہ مودود چشتیؒ نیز ویسویہ سلسلے سے بواسطہ خواجہ نقشبند، نسبت حاصل ہے، اکثر اوقات اس عاجز کو ان اصحاب کی ارواح سے بطریقۂ باطنی برابر فیض ملتا رہا ہے۔ چنانچہ اس کا اثر ہے کہ میں نے ان میں سے ہر خانوادے کی نسبت کا اپنے موطن میں علیحدہ علیحدہ ادراک کیا۔ لیکن یہ مسائل ایسے نہیں ہیں کہ میں ضمنی طور پر ان کا ذکر یہاں کروں تو ان کا حق ادا ہو جائے ان کے لئے تو بڑی تفصیل چاہیے۔ بہر حال میرے پیش نظر یہ اصول بھی ہے کہ جب کسی چیز کا پوری طرح احاطہ ممکن نہ ہو تو یہ ضروری نہیں کہ اس کا بالکل ذکر ہی نہ کیا جائے۔

............☆☆☆............

(۱) یہ حضرت شاہ صاحب کا منکسرانہ و عاجزانہ طرز بیان ہے۔ (قاسمی)

تصوف کے چار دور

مجھ فقیر کو اس حقیقت سے بھی آگاہ کیا گیا ہے کہ تصوف کے طریقوں میں سے اب تک بڑے بڑے چار تغیرات ہو چکے ہیں۔

(۱) **تصوف کا پہلا دور:**۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہ کے زمانے میں چند نسلوں تک اہل کمال کی بیشتر توجہ شریعت کے ظاہری اعمال کی طرف رہی۔ ان لوگوں کو باطنی زندگی کے جملہ مراتب شرعی احکام کی پابندی کے ذیل میں حاصل ہو جاتے تھے۔ چنانچہ ان بزرگوں کا احسان یعنی حاصل تصوف یہ تھا کہ وہ نمازیں پڑھتے تھے ذکر اور تلاوت کرتے تھے، روزے رکھتے تھے، صدقہ اور زکوۃ دیتے تھے اور جہاد کرتے تھے۔ ان میں سے کوئی شخص ایسا نہ ہوتا جو سر نیچے کئے بحر تفکرات میں غرق نظر آتا۔ یہ بزرگ خدا تعالیٰ سے قرب و حضوری کی نسبت اعمال شریعت اور ذکر و اذکار کے سوا کسی اور ذریعے سے حاصل کرنے کی سعی نہ کرتے۔ بے شک ان اہل کمال بزرگوں میں سے جو محقق ہوتے ہیں ان کو ذکر و اذکار اور نماز میں لذت ملتی، قرآن مجید کی تلاوت سے متاثر ہوتے مثلاً وہ زکوۃ محض اس لئے نہ دیتے تھے کہ زکوۃ دینا خدا کا حکم ہے۔ بلکہ خدا کے حکم کی بجا آوری کے ساتھ ساتھ وہ اپنے آپ کو بخل کے روگ سے بچاتے۔ چنانچہ وہ جب اپنے آپ کو دنیاوی کاموں میں بے حد منہمک پاتے اور انہیں اس کا احساس ہوتا تو وہ دل کو کاروبار دنیا سے ہٹانے کے لئے زکوۃ دیتے۔ اسی طرح شریعت کے دوسرے احکام بجالانے میں بھی ان کی یہی کیفیت ہوتی تھی۔

الغرض یہ بزرگ محض خدا کا حکم سمجھ کر شرعی احکام ادا نہ کرتے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ان شرعی احکام کی بجا آوری سے ان کے باطنی تقاضوں کی تسکین بھی ہوتی تھی۔ ان میں سے کوئی شخص

نہ بے ہوش ہوتا اور نہ اسے وجد آتا نہ وہ جوش میں آ کر کپڑے پھاڑنے لگتا، نہ شطح یعنی خلاف شرع کوئی لفظ اس کی زبان سے نکلتا۔ یہ بزرگ تجلیات استتار اور اس قسم کے دوسرے مسائل پر مطلق گفتگو نہ کرتے تھے۔ یہ بزرگ بہشت کی رغبت و آرزو رکھتے اور دوزخ سے خائف و ہراساں رہتے۔ کشف و کرامات اور خوارق ان سے بہت کم ظاہر ہوتے، سرمستی و بیخودی کی کیفیت بھی شاذ و نادر ہی ان پر طاری ہوتی۔ اور اگر کبھی کبھی یہ باتیں ان سے صادر بھی ہوتیں تو قصداً نہیں بلکہ محض اتفاق سے ایسا ہوتا۔

بات یہ ہے کہ وہ نفسی کیفیات جن کا نتیجہ کرامات و خوارق اور سرمستی و بیخودی کی قبیل کی چیزیں ہوتی ہیں۔ یہ کیفیات ان بزرگوں کے اندر اتنی راسخ نہ ہوتی تھیں کہ وہ ملکہ بن جاتیں چنانچہ اس ضمن میں جب کبھی ان سے کوئی ایسی بات ظاہر ہوئی تو یا تو اس کی صورت یہ تھی کہ وہ جس چیز کو از روئے ایمان صمیم قلب سے مانتے تھے وہ چیز بے اختیار ان کی زبان پر آ جاتی۔ جیسا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مرض الموت میں اپنے تیمارداروں سے فرمایا تھا کہ طبیب ہی نے مجھے بیمار کیا ہے۔ یا یہ ہوتا کہ یہ بزرگ خواب میں بعض چیزوں کو دیکھ لیتے یا فراست سے نامعلوم چیز کو معلوم کر لیتے۔ لیکن یہ چیزیں ایسی نہ ہوتیں کہ عوام کی ان تک رسائی نہ ہو سکتی۔ قصہ مختصر اس دور میں جسے تصوف یا احسان کا پہلا دور کہنا چاہیے اہل کمال کا غالب طور پر یہی حال رہا۔

(۲) **تصوف کا دوسرا دور:** حضرت جنید جو گروہ صوفیاء کے سرخیل ہیں، ان کے زمانے میں یا ان سے کچھ پہلے تصوف کے ایک اور رنگ کا ظہور ہوتا ہے اس زمانے میں یہ ہوا کہ اہل کمال میں سے عام طبقہ تو اسی طریقہ پر کاربند رہا جس کا ذکر پہلے دور کے ضمن میں ہو چکا ہے۔ لیکن ان میں سے جو خواص تھے انہوں نے بڑی بڑی ریاضتیں کیں دنیا سے بالکل قطع تعلق کر لیا اور مستقل طور پر وہ ذکر و فکر میں لگ گئے۔ اس سے ان کے اندر ایک خاص کیفیت پیدا ہو گئی اس کیفیت سے مقصود یہ تھا کہ دل کو تعلق باللہ کی نسبت حاصل ہو جائے۔ چنانچہ یہ لوگ اس نسبت کے حصول میں لگ گئے وہ مدتوں مراقبے کرتے اور ان سے تجلی استتار انس اور وحشت کے احوال و کوائف ظاہر ہوتے اور وہ اپنے ان احوال کو نکات اور اشارات میں بیان بھی کرتے۔ ان اہل کمال میں سے سب سے صادق وہ بزرگ تھے جنہوں نے اپنی زبان سے وہی کہا جو ان پر گزرا تھا۔

یہ لوگ سماع سنتے، سرمستی و بے خودی میں بے ہوش ہو جاتے، کپڑے پھاڑتے اور رقص کرتے، یہ کشف واشراف کے ذریعہ دوسروں کے دلوں کی باتیں معلوم کر لیتے۔ انہوں نے دنیا سے اپنا رشتہ توڑ کر پہاڑوں اور صحراؤں میں پناہ لی اور گھاس اور پتوں پر زندگی گزارنے اور گودڑیاں پہننے لگے۔ نفس وشیطان کے مکروں اور دنیا کے فریبوں کو یہ خوب سمجھتے تھے۔ اور ان سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے یہ لوگ مجاہدے کرتے تھے۔ الغرض اس دور کے اہل کمال کا تصوف یہ تھا کہ وہ خدا کی عبادت دوزخ کے عذاب سے ڈر کر یا جنت کی نعمتوں کی طمع میں نہ کرتے تھے بلکہ ان کی عبادت کا محرک خدا کے ساتھ ان کی محبت کا جذبہ ہوتا۔

لیکن تصوف کے اس دور میں "توجہ" کی نسبت اپنے درجۂ کمال تک نہیں پہنچی تھی "توجہ" سے یہاں مراد نفس کا پوری طرح حقیقت الحقائق یعنی ذات خداوندی کی طرف متوجہ ہونا ہے اور وہ اس طرح کہ نفس اللہ کے رنگ میں کلیۃً رنگا جائے۔ اور وہ دنیا کی عارضی اور فانی چیزوں پر پوری طرح غالب آ جائے۔ تصوف کے اس دور میں "توجہ" کی نسبت دوسری چیزوں سے ملی جلی ہوئی تھی۔ چنانچہ اس زمانے میں ان اہل کمال میں سے کوئی شخص ایسا نہ تھا جس نے خاص "توجہ" کو ان معنوں میں اپنا نصب العین بنایا ہو کہ وہ ہمیشہ اسی کی بات کرتا ہو اور اسی طرف اس کا ہر اشارہ ہوتا۔ یا اس زمانے میں یہ صورت ہوتی کہ ان میں سے کسی شخص نے "توجہ" کی نسبت حاصل کرنے کی راہ بتائی ہوتی۔ اصل بات یہ ہے کہ ان بزرگوں پر طاعت کا رنگ غالب تھا اور طاعت کے انوار سے سرشار تھے۔ بے شک انہیں "توجہ" کی نسبت حاصل ہوتی لیکن گاہے گاہے جیسے کہ بجلی کی چمک کہ ابھی ہے اور ابھی نہیں

شب خیال طرۂ شوخ بدل پیچیدو رفت
ساعتے ہم چوں شب قدر از بزم جوشید ورفت

(۳) تصوف کا تیسرا دور: سلطان الطریقت شیخ ابوسعید بن ابی الخیرؒ اور شیخ ابوالحسن خرقانیؒ کے زمانے میں طریق تصوف میں ایک اور تغیر رونما ہوتا ہے اس دور میں اہل کمال میں سے عوام تو حسب سابق شرعی اوامر واعمال پر ٹھہرے رہے اور خواص نے باطنی احوال و کیفیات کو اپنا نصب العین بنایا اور جو خواص الخواص تھے انہوں نے اعمال واحوال سے گزر کر جذب تک رسائی حاصل

کی، اس ''جذب'' ہی کی وجہ سے ان کے سامنے ''توجہ'' کی نسبت کا راستہ کھل گیا۔ اسی سے تعینات کے سب پردے ان کے لئے چاک ہو گئے۔ اور انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ وہی ایک ذات ہے جس پر تمام اشیاء کے وجود کا انحصار ہے۔ وہی ذات سب اشیاء کی قیوم (۱) ہے یہ لوگ اس ذات میں گم ہو گئے اور اس کے رنگ میں ان کے نفوس رنگے گئے۔ چنانچہ اس حال میں نہ ان کو اوراد و وظائف کی چنداں ضرورت رہی اور نہ انہیں مجاہدے اور ریاضتیں کرنے اور نفس اور دنیا کے فریبوں کو جاننے کی شُد بد رہی۔ ان کی تمام تر کوشش کا مقصد یہ ٹھہرا کہ جس طرح بھی ہو ''توجہ'' کی نسبت کی تکمیل کریں۔ ''توجہ'' کے علاوہ باقی جو نسبتیں ہیں یہ لوگ انہیں نورانی حجاب سمجھتے تھے۔ اس عہد میں توحید وجودی اور توحید شہودی میں فرق نہیں کیا جاتا تھا۔ دراصل ان بزرگوں کی اصل غایت یہ تھی کہ ذات الٰہی میں اپنے وجود کو گم کر کے اس مقام کی کیفیات سے لذت اندوز ہوں، چنانچہ وہ اس بحث میں نہیں پڑتے تھے کہ کائنات کا وجود الٰہی سے کیا علاقہ ہے؟ انسان خدا کی ذات میں کیسے گم ہوتا ہے؟ اور فناء و بقاء کے کیا حقائق ہیں۔

(۴) **تصوف کا چوتھا دور:** آخر میں شیخ اکبر محی الدین بن عربی اور ان سے کچھ پہلے کا زمانہ آتا ہے۔ اس عہد میں ان اہل کمال بزرگوں کے ذہنوں میں مزید وسعت پیدا ہوتی ہے۔ اور یہ لوگ کیفیات و احوال کی منزل سے آگے بڑھ کر حقائق تصوف کی بحث و تدقیق کرنے لگتے ہیں۔ ذات واجب الوجود سے یہ کائنات کس طرح صادر ہوئی۔ ان بزرگوں نے ظہورِ وجود کے مدارج اور تنزلات دریافت کئے اور اس امر کی تحقیق کی کہ واجب الوجود سے سب سے پہلے کس چیز کا صدور ہوا اور کس طرح یہ صدور عمل میں آیا، الغرض یہ اور اس طرح کے دوسرے مسائل ان لوگوں کے لئے موضوع بحث بن گئے۔

تصوف کے ان چاروں دوروں میں جو بھی اہل کمال بزرگ گزرے ہیں وہ اپنے ظاہری اعمال و احوال میں الگ الگ نظر آتے ہیں لیکن جہاں تک ان کی اصل کا تعلق ہے میرے نزدیک وہ سب ایک ہیں۔ باقی اللہ تعالیٰ ان کے حال کو ہم سب سے بہتر جانتا ہے۔ ان بزرگوں میں سے جب کسی نے اس دنیا سے انتقال فرمایا تو جو باطنی کیفیت اس بزرگ نے اپنی ہمت اور ریاضت

(۱) یعنی اس کی بدولت سب اشیاء قائم ہیں اور عالم کا نظام بھی قائم ہے۔ (قاسمی)

سے دل میں پیدا کر لی تھی۔ وہ کیفیت موت کے بعد بھی اس بزرگ کے نفس میں جاگزیں رہی۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کہ کوئی آئینہ یا پانی کا حوض ہو اور اس میں آفتاب کا عکس پڑ رہا ہو۔ ان بزرگوں کے طفیل مبداء اول یعنی خدا تعالیٰ تک پہنچنے کا راستہ قریب ہو گیا اور ان کے فیوض و برکات کے انوار سے عالم علوی اور عالم سفلی کی فضاء منور ہو گئی۔ جیسے کہ ہماری اس آسمانی فضاء میں جب مرطوب ہوا اور بادل پھیل جاتے ہیں تو اس کا اثر زمین پر بھی پڑتا ہے۔ اسی طرح ان نفوس قدسی کی کیفیات بھی دنیا کے قلوب پر اپنا اثر ڈالتی رہتی ہیں۔ الغرض تصوف کے یہ چاروں طریقے خدا تعالیٰ کے نزدیک مقبول ہیں اور ملاء اعلیٰ میں بھی ان سب کی منزلت مسلم ہے۔

ارباب تصوف پر بحث کرتے وقت ہمیشہ اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ ان بزرگوں کے ہر طبقے کے اقوال و احوال کو ان کے زمانے کے ذوق کے مطابق جانچا جائے۔ اس سلسلے میں یہ کسی طرح مناسب نہیں کہ ہم ایک عہد کے اربابِ تصوف کے اقوال اور احوال کو دوسرے عہد کے معیاروں سے ناپتے پھریں۔

...........☆☆☆...........

سلوک کی پہلی منزل

طاعة

جس شخص کو بھی مشائخِ تصوف کی صحبت میں بیٹھنے کا موقع نصیب ہوا ہوگا یا اس نے اہل تصوف کی کتابیں اور رسائل پڑھے ہونگے اسے اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں ذرا بھی تردد نہ ہوگا کہ تصوف کے سب طریقوں کے بزرگوں اور ارباب ارشاد کی غالب اکثریت یقیناً اس امر پر پورا اتفاق رکھتی ہے کہ طریقت کی اصل ایک ہے گو اہل طرق کے سلوک کی راہیں الگ الگ ہوگئی ہیں۔

طریقت کی یہ اصل جس سے آگے چل کر جملہ طرق تصوف نکلے، سید الطائفہ جنید بغدادیؒ کی طرف منسوب ہے، اس لیے کہ حضرت جنیدؒ ہی وہ پہلے بزرگ ہیں جنھوں نے تصوف کے اکثر قواعد وقوانین کو مدون کیا، چنانچہ موصوف کے زمانے میں جو بھی اہل تصوف تھے ان سب نے اپنے سلوک کی نسبت حضرت جنیدؒ سے ٹھیک کی تھی۔ سچ پوچھیے تو طریقت کا جو بھی سلسلہ اس وقت موجود ہے، اس کا اصل سرچشمہ حضرت جنیدؒ ہی کی ذات گرامی ہے۔ بے شک ایسا بھی ہوا کہ کسی شخص کا طریقہ اویسی (۱) ہو اور ظاہری اعتبار سے اس نے کسی اور طریقہ کا خرقہ پہن لیا جیسا کہ شیخ بدیع الدین مدارؒ تھے۔ یا کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک شخص بہت سے مشائخ کی صحبت میں بیٹھا لیکن اس کی دلی مراد حضرت جنیدؒ ہی کی دست گیری سے برآئی ہو، اس نے اس خیال سے کہ ایک تو حضرت جنیدؒ کا مرتبہ مشہور ومعروف ہے۔ اور دوسرے ان کی وجہ سے قرب الی اللہ کا واسطہ در واسطہ

---

(۱) اویسی طریقہ حضرت اویس قرنیؒ کی طرف منسوب ہے ان کے متعلق مشہور ہے کہ موصوف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں موجود تھے گو آپ سے ملاقات نہیں ہوئی لیکن انہوں نے بغیر ملاقات کے روحانی طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے فیض پایا۔ ایک شخص جب کسی گزرے ہوئے بزرگ کی روح سے فیضان حاصل کرتا ہے تو اس طریق فیض کو اویسی کہتے ہیں۔)

سلسلہ مختصر ہو جاتا ہے۔ مناسب یہ سمجھا ہو کہ حضرت جنیدؒ کو جو اس کے لئے شیخ اول کا درجہ رکھتے تھے دوسرے مشائخ پر مقدم قرار دے اور اپنے آپ کو حضرت جنیدؒ کی طرف منسوب کرے۔ جیسے کہ شیخ ممشاد دینوریؒ نے کیا۔

جس طرح تمام اہل تصوف کا اس بات پر اتفاق ہے کہ طریقت کے سب سلسلوں کی اصل ایک ہے۔ اسی طرح یہ سب بزرگ اس امر میں متفق ہیں کہ سالکِ راہِ طریقت کا سب سے پہلا کام یہ ہونا چاہیے کہ وہ اپنے عقائد کو درست کرے، اس ضمن میں اسے صحابہ، تابعین اور سلف صالحین کے عقائد کو درستی کے لیے مشعل راہ بنانا چاہیے۔ عقائد کے درست کرنے کے بعد اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اسلام کے جملہ ارکان کو بجالائے۔ گناہوں سے بچے، شریعت نے جن مفاسد کو ملعون قرار دیا ہے ان کا سدِ باب کرے، یہ راہ طریقت کا پہلا مقام ہے۔ اور اسی کا نام طاعت ہے طاعت درحقیقت تصوف اور احسان کی اصل جڑ ہے، کہ اس کے بغیر طریقت اور سلوک کبھی درست ہو ہی نہیں سکتے۔

قبل اس کے کہ ہم آگے بڑھیں یہاں تین باتوں کی وضاحت کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ جہاں تک عقائد کی درستی کا تعلق ہے سالک کو اس میں صحابہ، تابعین اور سلف صالحین کے عقائد کو اپنا نمونہ بنانا چاہیے۔ بعدۂ متکلمین نے عقائد میں جو نئی نئی تاویلیں کی ہیں ان سے بچنا ضروری ہے۔

خاص طور پر جن عقائد میں متقدمین نے تاویل کی ضرورت نہیں سمجھی نہ انہوں نے ان عقائد کی اس طرح تاویل کی ہے کہ ایک رائے کو دوسری آراء پر ترجیح دے کر صرف اسے ہی وہ اصل مراد قرار دے دیتے ہیں۔ سالک کو چاہیے کہ وہ بھی اسی طریق پر ان عقائد کو مانے۔

دوسری بات جس کا کہ سالک کو خیال رکھنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ سلوک کی ابتداء میں وہ وحدت الوجود کے تنزلاتِ خمسہ کی بحثوں سے بچے۔ ان بحثوں سے بجائے نفع کے الٹا نقصان ہوگا۔ اللہ کی ذات واجب الوجود سے یہ محسوس کائنات کیسے ظہور پذیر ہوئی؟ اس کو سمجھانے کے لئے اہل طریقت نے پانچ تنزلات مانے ہیں۔ ایک تو ذات احد کا درجہ، اس سے دوسرا تنزل وحدانیت میں ہوا۔ تیسرا تنزل ارواح کا ہے۔ چوتھا عالمِ مثال اور پانچواں تنزل عالم اجسام کا، یہ

ہیں وجود کے تنزلات خمسہ۔ مسئلہ وحدت الوجود میں اس عقدے کو حل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ وجود نے یہ مختلف مراتب حقیقتاً ایک وحدت ہیں یا یہ محض دیکھنے میں ایک نظر آتے ہیں۔ ظاہر ہے تنزلات خمسہ اور وحدت الوجود کے یہ معاملات بے حد نازک اور دقیق ہیں۔ اس لئے سالک کو ابتدائے سلوک میں ان سے بچنا لازمی ہے۔

تیسری بات جس کا سالک کو خیال رکھنا چاہیے وہ یہ ہے کہ اگر وہ اتنی علمی استعداد نہیں رکھتا کہ حدیث کی کتابوں اور صحابہ و تابعین کے آثار کا براہ راست مطالعہ کر سکے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ فقہ کے چار مذاہب میں سے کسی ایک مذہب کی تقلید کرے لیکن اگر سالک میں احادیث و آثار سے استفادہ کرنے کی استعداد موجود ہے تو بہتر ہے کہ وہ خود ان کا مطالعہ کرے اس ضمن میں خاص طور پر وہ اس بات کی احتیاط کرے کہ بعد کے فقہا نے طرح طرح کی جو بیکار فقہی موشگافیاں کی ہیں اور نئے نئے مسائل استنباط کئے ہیں وہ ان میں نہ الجھے۔

............☆☆☆............

ذکرواذکار، اورادووظائف

مقام طاعت کے بعد سالک کو چاہیے کہ وہ اپنا تمام وقت ذکرواذکار، تلاوت، نماز اور نوافل میں صرف کرے۔ نیز وہ اچھے اخلاق حاصل کرنے اور بری باتوں مثلاً ریاکاری، حسد اور غیبت وغیرہ سے بچنے میں کوشاں ہو۔ اس ضمن میں تین باتوں کا جاننا ضروری ہے۔ ایک یہ کہ صوفیاء کے ہرگروہ کے اپنے اپنے اوراد ونوافل کے طریقے ہیں۔

حضرت غوث اعظم قدس سرہ نے اپنی کتاب ''غنیۃ الطالبین'' میں اوراد ونوافل وطاعات کا ایک طریقہ تلقین فرمایا ہے، چشتی مشائخ نے دوسرا طریقہ مقرر فرمایا ہے، شیخ ابوالحسن شاذلیؒ اس سلسلے میں حزب البحر (۱) کا ورد تجویز فرماتے ہیں، میر سید علی ہمدانیؒ کے اپنے وظائف ہیں شیخ الشیوخ

(۱) شاہ ولی اللہؒ اپنی کتاب ''اللوامع شرح حزب البحر'' میں فرماتے ہیں کہ شیخ ابوالحسن شاذلی کو حزب البحر کا الہام کیا جانا ان کے روحانی معجزات میں سے ایک معجزہ (مراد کرامت ہے) اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ اہل ثقہ بیان کرتے ہیں کہ شیخ شاذلی قاہرہ میں تھے کہ حج کا زمانہ قریب آگیا۔ آپ نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا کہ مجھے غیب سے اشارہ ہوا ہے کہ ہم اس سال حج کریں گے۔ جاؤ کوئی کشتی ڈھونڈو، ساتھیوں نے ہرچند کوشش کی لیکن ایک بوڑھے نصرانی کی کشتی کے سوا اور کوئی کشتی ہاتھ نہ لگی الغرض سب لوگ اس کشتی میں سوار ہوگئے۔ اب جب بادبان اٹھا اور قاہرہ کی عمارتوں سے کشتی آگے نکلی تو باد مخالف چلنا شروع ہوگئی۔ چنانچہ یہ ایک ہفتے تک قاہرہ کے نواح میں پڑے رہے۔ یہ دیکھ کر شیخ کے منکروں نے زبان طعن کھولی۔ اور کہنے لگے کہ شیخ کہتے تھے کہ مجھے غیب سے اشارہ ہوا ہے کہ ہم اس سال حج کرینگے۔ لیکن حج کا زمانہ قریب آگیا اور ہم اس باد مخالف میں گرفتار ہیں شیخ کو یہ سن کر قلق ہوا لیکن آپ گھبرائے نہیں ایک دن موصوف قیلولہ میں تھے کہ آپ کو حزب البحر کی یہ دعا الہام کی گئی آپ نیند سے یہ دعا پڑھتے ہوئے اٹھے اور ملاح کو طلب فرمایا اور اسے بادبان اٹھانے کو کہا، ملاح نے جواب دیا، ہوا مخالف ہے۔ اگر میں نے بادبان اٹھایا تو کشتی قاہرہ واپس پہنچ جائے گی۔ شیخ نے فرمایا بے کار کے وسوسوں کو دل میں راہ نہ دو اور جو کچھ میں کہتا ہوں کرو۔ اور پھر صفت الٰہی کا تماشا دیکھو۔ الغرض جونہی بادبان اٹھایا بڑے زور سے موافق ہوا چلنے لگی۔ اور اس سے اتنی بھی فرصت نہ دی کہ کنارے کے ساتھ بندھے ہوئے جو رسے تھے وہ کھولے جاتے چنانچہ وہ ٹوٹ گئے اور کشتی بسرعت تمام روانہ ہوگئی۔ اس طرح سب لوگ امن وسلامتی کے ساتھ اپنے مقصد کو پہنچے یہ دیکھ کر نصرانی کے لڑکے مسلمان ہوگئے۔ اور بعد میں یہ نصرانی ملاح بھی دائرہ اسلام میں داخل ہوگیا)

شہاب الدین سہروردیؒ کے اپنے اوراد مشہور ہیں، امام محمد غزالیؒ نے احیاء العلوم میں ان کے اوراد وظائف کا ایک اور طریقہ لکھا ہے۔ اس فقیر نے آل باعلوی کے بعض سادات سے سنا ہے کہ طریقہ عیدروسیہ کی بنیاد احیاء العلوم کے ان ہی اوراد پر ہے۔ اس طریقے کے بزرگ نسلاً بعد نسل اپنے بعد کے آنے والوں کو احیاء العلوم ہی کے اوراد کی تلقین فرماتے ہیں اور اسی کتاب کے مطالعہ کی ہدایت کرتے رہے ہیں۔ گویہ سب اوراد و وظائف اچھے اور مقبول ہیں لیکن ان میں بہتر اور زیادہ پسندیدہ وہ اوراد ہیں جو صحیح کتب احادیث کے مطابق ہیں۔

دوسرے یہ کہ سالک کو ابتدائے سلوک میں ریا کاری کی چھوٹی چھوٹی تفصیلات میں نہیں پڑنا چاہیے اس ضمن میں کتب حدیث وسنت میں ریا کاری کے متعلق جو موٹی موٹی باتیں بیان کی گئی ہیں۔ اس کے لئے صرف ان کا جان لینا کافی ہے لیکن اگر سالک اس پر اکتفاء نہ کریگا اور ریا کاری کی چھوٹی چھوٹی باتوں کی کرید میں رہیگا تو نہ صرف یہ کہ اس سے کوئی فائدہ نہیں پہونچے گا بلکہ اس کی وجہ سے الٹا اس کا دماغی توازن بھی مختل ہو جائے گا۔

سالک کا ابتدائے سلوک میں ریا کاری کی تفصیلات کی کرید میں لگ جانا ایسا ہی ہے جیسے کہ کوئی شخص اپنے بیٹے کو بھیڑیے سے اتنا ڈرائے کہ بھیڑیے کے خیال ہی سے اس کی نیند اڑ جائے اور اس کے ڈر کے مارے اس کا اطمینان یک سر جاتا رہے۔ اس کے برعکس باپ کا یہ فرض ہے کہ بیٹے تک بھیڑیے کے پہنچنے کے جو بھی ذرائع ہو سکتے ہیں ان کا سد باب کردے اور اسے موقع نہ دے کہ وہ بھیڑیے کے متعلق وہم واحتمال میں پڑ جائے بلکہ باپ کو چاہیے کہ وہ بیٹے کی اچھی طرح تربیت کرے اس کو توانا و تندرست بنائے اور اس پر واضح کردے کہ مضبوط آدمی بھیڑیے کو اپنے بل بوتے پر زیر کر سکتا ہے۔

اس سلسلے میں سالک کی تربیت کا زیادہ مفید اور بہتر طریقہ یہ کہ مرشد اس کو ایسے اذکار و وظائف میں لگائے جو محبت انگیز ہوں۔ جن کی وجہ سے سالک کی توجہ دنیا کی پست اغراض سے ہٹ کر اعلیٰ وارفع مقاصد کی طرف مبذول ہو جائے چنانچہ اس راہ کی سب سے پہلے ضرورت سالک کے اندر اسی توجہ کو پیدا کرنا ہے۔

سالک کیلئے ضروری ہے کہ وہ اپنے دل سے جاہ و مال کی محبت کو کم کرنے کی جہاں تک

ہو سکے کوشش کرے یعنی وہ اپنی توجہ کو جاہ و مال سے اس قدر رہٹائے کہ جب ذکر واذکار میں مشغول ہوتو اسے کوئی چیز دنیا کی طرف نہ کھینچ سکے تا کہ اس سے ذکر واذکار میں پورا اطمینان حاصل ہو اور اس دوران میں ادھر ادھر کے خیالات اس کے دل کی طرف راہ نہ پا سکیں نیز اس ضمن میں اسے اپنے او پر اتنا قابو حاصل ہونا چاہیے کہ جب وہ دعوی کرے کہ اس سے محبت ہے تو صرف خدا سے ہے۔ اور اس کا مقصود و مطلوب ہے تو صرف وہی ذات ہے۔ الغرض جب وہ یہ دعوی کرے تو اس وقت اس کا دل اس دعوی کی تکذیب نہ کرے اس معاملہ میں اس کا دل اس کی زبان کی پوری تائید کر رہا ہو۔ اور اگر یہ نہیں تو خواہ وہ کتنے ورد اور وظائف کریگا اسے حلاوت ذکر کبھی نصیب نہیں ہوگی۔

تیسرے یہ کہ سلسلہ نقشبندیہ کے بعض صوفیاء یہ گمان کرتے ہیں کہ ہمارے طریقہ میں سرے سے اوراد و وظائف نہیں ہیں ان لوگوں کا یہ کہنا اس صورت اور ان معنوں میں ٹھیک نہیں۔ اور یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ صبح وشام اور سوتے وقت کے اذکار و وظائف صحیح احادیث میں مروی ہوں اور یہ روایات اتنی مشہور بھی ہوں اور اس کے باوجود حضرت خواجہ نقشبندؒ اوراد و وظائف کا کلیۃ انکار کر دیں۔ بات دراصل یہ نہیں ہے واقعہ صرف اتنا ہے کہ حضرت خواجہ نقشبندؒ اور ان کے پیروؤں نے اوراد و وظائف کے معاملے میں اپنی طرف سے کچھ کہنے کے بجائے ان کے مسئلے کو کتب حدیث کے حوالے کر دیا۔ وہ خود اوراد و وظائف کی ترتیب اور تعین میں نہیں پڑے اور چونکہ بعد کے صوفیاء نے جو اذکار متعین کر لئے تھے صحیح اور مشہور حدیثوں میں ان اذکار کی کوئی اصل موجود نہ تھی اس لئے خواجہ نقشبند اور ان کے اتباع سے ان اذکار کا حکم نہیں فرمایا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے سنت کے مطابق جو اوراد واذکار تھے۔ صرف ان کی پیروی کو اہم سمجھا اور یہ عام قاعدہ بھی ہے کہ جب ایک ہی معاملے کے متعلق بہت سی مصلحتیں جمع ہو جائیں تو جو مصلحت سب سے اہم ہوگی اسی کو عملاً ترجیح دی جائے گی۔

غرضیکہ اوراد و وظائف کے متعلق خواجگان نقشبندیہ کا یہ فیصلہ اسی قبیل سے ہے لیکن اس کے باوجود بھی اگر کسی صاحب کو اس مسئلے میں شک ہو تو اسے مولانا یعقوب چرخیؒ کا رسالہ "انسیہ" دیکھنا چاہیے نیز اسے خواجہ نقشبند کے اس جامع معانی کلمہ پر کہ ہمارے طریقہ کی بنیاد احادیث و آثار کے اتباع پر ہے، غور و تامل کرنا چاہیے۔

آداب سلوک

سالک کو بالجملہ دن رات میں پچاس رکعتیں ضرور پڑھنی چاہئیں، سترہ رکعتیں فرض نمازوں کی، بارہ رکعتیں سنت مؤکدہ، گیارہ رکعت تہجد، دو رکعتیں اشراق کی اور چار رکعتیں نماز ضحیٰ اور چار رکعتیں نماز زوال کی یہ کل پچاس رکعتیں ہوئیں۔

اس کے علاوہ صبح اور شام اور سوتے وقت کے جواذ کار داوراد صحیح احادیث میں مروی ہیں۔ سالک کو ان کا ذکر بھی کرنا چاہیے، مجھے والد قدس سرہ نے ذکر نفی واثبات یعنی **لاالٰہ الا اللہ** کو ہزار بار روزانہ مستقل طور پر کرنے کی وصیت فرمائی تھی۔ آپ کا ارشاد تھا کہ کچھ ذکر تو بلند آواز سے ہو اور کچھ آہستہ آہستہ خفی طور پر۔ سالک کو چاہیے کہ جتنا وہ زیادہ سے زیادہ درود و استغفار پڑھ سکے پڑھے نیز سحر کے وقت **سبحان اللّٰہ و بحمدہ** کا سو بار اور اسی طرح **لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ** کا سو بار ورد کرنا اپنے اندر برکت رکھتا ہے۔

روزوں کے معاملے میں ضروری ہے کہ سالک حج و عاشورہ کا روزہ رکھے اور ہر مہینے میں جب بھی چاہے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے تین روزے رکھے، اسی طرح شوال کے بھی چھ روزے رکھے صدقہ وخیرات کے ضمن میں سالک کو چاہیے کہ وہ ہر روز اپنے مال سے ایک مسکین کو کھانا کھلائے اور صدقہ فطر اور دوسری ضروری خیراتوں کے علاوہ ہر سال ایک مسکین کو لباس بھی پہنائے اگر سالک قرآن کا حافظ ہے تو ہفتے میں ایک بار قرآن ختم کرنا چاہیے۔ لیکن اگر اسے اوراد و وظائف اور دوسرے باطنی اشغال زیادہ کرنے پڑتے ہوں تو وہ دن میں زیادہ سے زیادہ جتنا بھی قرآن پڑھ سکے، پڑھے جو سالک حافظ قرآن نہ ہو اسے چاہیے کہ ہر روز تقریباً سو آیتیں جو پاؤ پارے یا نصف پارے کے برابر ہوتی ہیں، تلاوت کرے۔

تعلیم وتعلم کے سلسلہ میں سالک کو یہ کرنا چاہیے کہ ہر روز حدیث کے دو تین صفحے پڑھے اور قرآن کے دور کوعوں کا ترجمہ سنے، کھانے پینے کے متعلق اسے چاہیے کہ اگر وہ مزاج کا قوی ہے تو اتنا کھائے کہ اگر وہ اس سے کم کھانے پر رہے تو اسے ضعف محسوس ہو۔ لیکن اگر وہ مزاج کا ضعیف ہے تو اس قدر کھائے کہ اسے پیٹ کے تردد سے نجات مل جائے یعنی نہ اتنا کم ہو کہ اسے بھوک ستائے اور نہ اس قدر زیادہ کہ وہ سیری محسوس کرے۔

جاگنے کے معاملے میں سالک کو چاہیے کہ وہ دن رات کے تین حصے کرے ان میں سے دو حصے میں تو وہ جاگے اور ایک حصہ میں سوئے، اس کے جاگنے اور سونے کی ترتیب یہ ہو کہ دوپہر کو تھوڑی دیر استراحت کرے اور پھر چوتھائی رات تک جاگتا رہے۔ اس کے بعد سوئے اور رات کے آخری حصے میں جاگے۔ اور پھر جب صبح کاذب ہو تو تھوڑا سا اونگھ لے۔ اس کے بعد بیدار رہو اور نماز فجر اداء کرے، رات کے پہلے حصے میں زیادہ جاگے یا آخر رات میں زیادہ جاگے، یہ سالک کے اپنے اختیار میں ہے جیسے اس کے جی میں آئے کرے۔ عزلت اور گوشہ نشینی کے ضمن میں سالک کے لئے ضروری ہے کہ وہ لوگوں میں بہت کم بیٹھے لیکن جماعت کی طرف سے سالک پر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں سالک کی طرف سے ان میں کوتاہی نہ ہونی چاہیے۔ مثلاً اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ بیمار کی عیادت اور مصیبت زدہ کی تعزیت کرے، عزیز و اقارب کے جو صلہ رحمی کے حقوق ہیں، انہیں بجالائے۔ مجالس علم میں بیٹھے سالک کو چاہیے کہ اپنی طبیعت کی درشتگی اور تنگی کو دور کرنے اور اس طرح کے دوسرے امور کی اصلاح کیلئے تو وہ لوگوں سے ضرور ملے جلے لیکن اگر یہ مقاصد پیش نظر نہ ہوں تو اسے لوگوں سے میل جول کم رکھنا چاہیے۔ نیز سالک کیلئے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ اپنے لباس میں یا اپنے پیشے میں دوسروں سے ممتاز اور الگ نظر آئے۔ سالک کو چاہیے کہ وہ اپنے بھائیوں اور خاندان والوں کی سی وضع قطع رکھے۔ چنانچہ اگر وہ علماء کے طبقے میں سے ہے تو اس کیلئے ضروری ہے کہ علماء کی روش اختیار کرے اگر وہ اہل حرفہ میں سے ہے تو ان کی وضع پر رہے۔ اگر وہ سپاہی ہے تو سپاہیوں کی وضع اختیار کرے۔

............☆☆☆............

ذکر کے آداب

سالک کو جب طاعات اور ذکر واذکار کے معنوی نتائج کو اپنے اندر قائم ومستقر کرلے، تو پھر اسے اوراد کو اوراد سمجھ کر وظیفہ نہ کرنا چاہیے۔ بلکہ وہ اس طرح ذکر کرے جس طرح کہ اہل عشق ومحبت ذکر کرتے ہیں۔ ذکر کے معاملے میں سب سے زیادہ خوش نصیب وہ ہے جو صحیح المزاج ہو۔ اس میں جذبہ عشق ومحبت کی شدت ہو۔ لیکن جو شخص طبعا کاہل ہو یا اس کے مزاج میں فطرتا کوئی خلل ہو یا اس پر عشق ومحبت کا زیادہ اثر نہ ہوتا ہو تو اسے ذکر واذکار میں اعلیٰ مقام تک رسائی نصیب نہیں ہوتی۔

جمہور اہل طریقت کے نزدیک سب سے افضل ذکر ذات یعنی ''اللہ'' کا اور نفی اور اثبات یعنی ''لا الہ الا اللہ'' کا ہے لیکن اس ذکر کے بھی اپنے آداب وشرائط ہیں اگر یہ ذکر ان آداب وشرائط کے ساتھ ہو تو پھر اس سے سالک کو جمعیت خاطر حاصل ہوتی ہے اس کے دل کو ادھر ادھر کے بیکار خیالات سے نجات مل جاتی ہے۔ نیز اس کے اندر عشق ومحبت کی گرمی پیدا ہو جاتی ہے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے تو سالک کو یہ چاہیے کہ ذکر کے لئے مناسب اور موزوں وقت نکالے، ذکر کے وقت نہ تو اس کا پیٹ بھرا ہوا ہونا چاہیے اور نہ ایسا ہو کہ اسے بھوک ستا رہی ہو نہ اسے بول وبراز کی ضرورت محسوس ہو رہی ہو، نہ ذکر کرتے وقت وہ غصے میں ہو اور نہ وہ مغموم ومتفکر ہو۔ الغرض اس طرح کے تمام عوارض سے پاک ہو اور اپنے نفس کی ضرورتوں اور گردوپیش کی مشغولیتوں سے فراغت پاچکا ہو اس کے بعد سالک کو چاہیے کہ وہ خلوت میں جائے غسل ووضو کرے، صاف کپڑے پہنے، پوری طرح پاک وصاف ہو پھر اپنے دل کو جوش میں لانے کیلئے ہر ممکن تدبیر کرے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ موت کا تصور کرے عشق ومحبت کی کہانیوں کو پڑھے یا وعظ ونصیحت کی

باتیں یا دل کش نغمے سنے۔

یہ سب کچھ کرنے کے بعد جب سالک اپنے دل کو آمادۂ جوش دیکھے تو اس وقت وہ دو رکعت نماز پڑھے اور جیسا کہ نماز میں دو زانوں بیٹھا جاتا ہے ویسے ہی وہ قبلہ کی طرف منہ کر کے بیٹھے اور زبان سے کلمہ "لاالہ الا اللّٰہ" کہے اور وہ اس طرح کہ "لا" تو حلق کے نیچے شروع کرے اور "الہ" کو دماغ میں کہے "الا اللّٰہ" کو اپنی پوری قوت سے اس طرح نکالے کہ اس کی ضرب بڑے زور سے دل پر لگے "لا الہ الا اللّٰہ" کے ذکر میں اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ لا پر جو مد ہے وہ پوری طرح کھینچی جائے۔ اور "الا اللّٰہ" پر جو تشدید ہے اس پر پورا زور پڑے نیز جب سالک زبان سے "لاالہ الااللّٰہ" کہے تو اپنے دل سے غیر اللہ کی محض محبت نہیں بلکہ غیر اللہ کا سرے سے وجود ہی خارج کر دے، ذکر کرتے وقت سالک کی حالت ایسی ہونی چاہیے جیسے کہ ایک محبت زدہ شخص کا ہوتا ہے جو اپنے دل کا راز چھپانے کی بڑی کوشش کرتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ اس راز کو چھپا نہیں سکتا۔ اب اگر سالک کے اندر وجد و بے خودی کی یہ حالت از خود پیدا نہیں ہوتی تو اسے چاہیے کہ وہ کم سے کم اس وقت تو یہ کیفیت کوشش سے اپنے اوپر ضرور طاری کر لے۔

بہر حال ذکر کیلئے ضروری ہے کہ ذاکر جب ذکر کرنے لگے تو وہ وجد اور بے خودی کی کیفیت میں ڈوبا ہوا ہو۔ اور ذکر کرتے وقت جب سالک اپنے دل میں زیادہ جوش و گرمی محسوس کرے تو اسی کے مطابق وہ "لاالہ الا اللّٰہ" اور زور سے کہے جوں جوں اس کے وجد میں حدت پیدا ہوتی جائے اسی حساب سے وہ ذکر "لاالہ الا اللّٰہ" کو زیادہ بلند اور مسلسل کرتا جائے۔ اور "لا اللّٰہ" کی ضربوں میں زیادہ زور پیدا کرے۔

الغرض اگر سالک مزاج کا کامل اور عشق و محبت کی صلاحیت رکھتا ہوگا اور وہ ان آداب و شرائط کے ساتھ ایک دو گھڑی ذکر کرے گا تو یقیناً اسے پورا اطمینان خاطر نصیب ہو جائیگا۔ اس کے بعد دماغ کو پراگندہ خیالات سے نجات مل جائے گی اور اس سے شوق و محبت کی بے قراری اور گرمی بھی ضرور بالضرور حاصل ہو جائے گی جب ذکر کے دوران میں سالک میں یہ کیفیت پیدا ہو جائے تو اس کو چاہیے کہ وہ اپنی پوری کیفیت کو برابر نگاہ میں رکھے اور اسے اپنی نظر بصیرت سے

اوجھل نہ ہونے دے۔ سالک کو چاہیے کہ وہ اس کیفیت کو اچھی طرح سے جان لے اور اس کو خوب سمجھ لے جہاں تک ممکن ہو اپنی اس کیفیت کی حفاظت کرے اور اگر کبھی اسے محسوس ہو کہ اس کی یہ کیفیت اس کے اندر مفقود ہو رہی ہے۔ یا کمزور پڑ رہی ہے تو وہ اس کیفیت کو بڑھانے کی مزید کوشش کرے۔

جو شخص کہ صحیح الفہم اور مزاج کا کامل ہو گا وہ تو ذکر کی ایک ہی مجلس میں اس کیفیت کو سمجھ جائے گا۔ لیکن اگر کوئی شخص طبیعت کا سخت ہو اور پہلوانوں کے سے قویٰ رکھتا ہو تو مرشد کو چاہیے کہ اسے تین روزے رکھوائے اور روزوں کے درمیان اسے کھانے کو کم دیا جائے اسی طرح وہ چند بار عمل کریگا تو امید ہے کہ اسے ذکر میں یہ کیفیت ضرور حاصل ہو جائیگی۔ وہ اس کیفیت کو ضرور سمجھ لے گا۔ اور اسے اچھی طرح جان لے گا۔ لیکن فرض کیا اگر اتنا کچھ کرنے کے باوجود بھی یہ کیفیت اسے حاصل نہ ہو تو ایسے شخص کو معذور سمجھ کر اسے اوراد و وظائف میں لگا دینا چاہیے۔ اس ضمن میں تین باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے ایک یہ کہ جمہور اہل طریقت ذکر میں سر پھرانے، قلب پر ضربیں لگانے اور ''لا الہ الا اللہ'' میں مدّ اور شدّ کی رعایت کرنے پر متفق ہیں۔ ذکر میں ان چیزوں کی ضرورت اس لئے پڑی کہ اس طرح ذکر کرنے سے سالک کو جمعیت خاطر حاصل ہوتی ہے اس کے دماغ سے پراگندہ خیالات دور ہو جاتے ہیں اور محبت و شوق کے جذبات اس کے دل میں بیدار ہو جاتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ سلسلۂ نقشبندیہ کے بعض پیرو کہتے ہیں کہ خواجہ نقشبند نے بلند آواز سے ذکر کرنے کی ممانعت فرمائی ہے یہ چیز تو اپنی جگہ ٹھیک ہے لیکن کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ خواجہ نقشبند سے پہلے اس سلسلے کے سب بزرگ ذکر جہر اور ذکر خفی دونوں کرتے تھے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو ان بزرگوں پر ذکر خفی سے زیادہ ذکر جہر غالب تھا۔ اور خاص طور پر پیر اور جمعرات کے دن تو یہ بزرگ پوری دل جمعی سے ذکر جہر کیا کرتے تھے۔ جب صورتحال یہ ہے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت خواجہ نقشبند نے ذکر جہر کی کیوں ممانعت فرمائی سو اس کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ ذکر جہر حنفی مذہب میں مکروہ ہے، اس لئے خواجہ نقشبند نے ذکر جہر کے مقابلہ میں ذکر خفی کو زیادہ مناسب اور بہتر سمجھا۔ اور آپ نے اسی کو اختیار کیا اس کے علاوہ خواجہ نقشبند کی صحبت میں غیر معمولی تاثیر و برکت تھی اس لئے انہیں ذکر جہر کی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ بعض حالات

اور بعض اشخاص میں جذب و بے خودی کی کیفیت ذکر جہر کے بغیر پیدا نہیں ہوتی یہ جاننے کے باوجود پھر بھی جو شخص ذکر جہر سے کلیۃ انکار کرتا ہے تو یہ محض اس کی ہٹ دھرمی ہے۔ اس ضمن میں تیسری بات یہ کہ شارع علیہ الصلوۃ والسلام نے اس سلسلہ میں جس بات کا حکم دیا ہے اور مسلمانوں کو جس امر کی ترغیب دلائی ہے وہ دو چیزوں پر مشتمل ہے۔ ایک ذکر اور دوسرے فکر۔ ذکر سے مراد زبانی ہے خواہ وہ بلند آواز سے ہو یا خفی ہو جیسا کہ حدیث میں وارد ہوا ہے۔ ذکر جہر اور ذکر خفی دونوں کا تعلق زبان سے ہے لیکن چونکہ زبان کے اس ذکر سے براہ راست فکر تک پہنچنا دشوار ہے اس لئے مشائخ تصوف نے ذکر زبانی اور فکر کے درمیان ذکر قلبی کو ایک واسطہ مانا ہے۔

ذکر قلبی کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا ایک رخ تو زبان کی طرف ہوتا ہے اور دوسرا رخ دماغ کی طرف۔ الغرض ذکر قلبی کی حیثیت ذکر زبانی اور فکر کے درمیان برزخ کی ہے۔ بے شک شارع علیہ الصلوۃ والسلام نے ذکر زبانی اور فکر کی تو تلقین فرمائی ہے۔ لیکن ذکر قلبی آپ سے مروی نہیں ہے۔ بہر حال ذکر قلبی کا جواز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس مشہور حدیث کے تحت میں آ جاتا ہے جس کو امام محمدؒ نے موطا امام مالکؒ کی روایت میں نقل کیا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ ماراہ المؤمنون حسنا فھو عند اللہ حسن جس چیز کو مومنوں نے اچھا سمجھا وہ چیز اللہ کے نزدیک بھی اچھی ہے۔

............☆☆☆............

مراقبہ اور اس کے احکام

سالک کو جب وجد و شوق کی کیفیت حاصل ہو جائے تو اسے چاہیے کہ لوگوں سے بات چیت کم کر دے اور دنیا کے کاروبار سے کنارہ کش ہو جائے نیز جسمانی لذتوں اور اس طرح کی دوسری باتوں کو ترک کر دے اور اس طرح وجد و شوق کی کیفیت کو اپنے اندر راسخ اور مستحکم کرے تاکہ اس کی یہ کیفیت اس کیلئے کوئی ڈھکی چھپی چیز نہ رہے بلکہ یہ بالکل واضح اور نمایاں ہو جائے جب سالک راہ طریقت میں اس مقام پر پہنچ جائے تو پھر اس کو مراقبہ کرنا چاہیے۔

مراقبے سے بحیثیت مجموعی مراد یہ ہے کہ سالک اپنی قوت ادراک کو پوری طرح اللہ تعالیٰ کی صفات کے تصور میں لگا دے۔ یا نزع کی اس حالت کا دھیان کرے جب روح بدن کو چھوڑتی ہے یا اس طرح کی کسی کیفیت پر سالک اپنی توجہات کو یوں مبذول کر دے کہ اس کی عقل، اس کے وہم وخیال کو قوت اور اس کے تمام کے تمام حواس توجہ کے تابع ہو جائیں۔ اور سالک پر ایسی کیفیت طاری ہو جائے کہ جو چیزیں مشہودات میں سے نہیں ہیں وہ بھی اس کو نظر آئیں، مراقبے کے معاملے میں سب سے خوش نصیب وہ شخص ہے جسے قدرت کی طرف سے غیر مشہور چیزوں پر توجہ کرنے کی طبعاً زیادہ استعداد و دیعت ہوئی ہو۔ چنانچہ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض لوگوں پر قوت خیال غالب ہوتی ہے۔ اور وہ خیال کو اپنے سامنے اس طرح مشہود دیکھتے ہیں کہ اس کی طرف وہ ہاتھ سے اشارہ کرتے ہیں بلکہ بعض تو زبان سے اس سلسلے میں ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں کہ لوگ انہیں پاگل کہنے لگتے ہیں۔

مراقبے کی بہت سی قسمیں ہیں اور ان کا ذکر ہم دوسری جگہ کر آئے ہیں۔ یہاں ہم اس ضمن میں صرف انہیں چیزوں کا ذکر کرتے ہیں جن کا علم ہمیں الہام کے ذریعے عطا ہوا ہے۔ مراقبے میں

سب سے پہلے تو اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ آدمی کو ماسواء اللہ سے کلیۃً فراغت حاصل ہو چکی ہو اور فراغت حاصل کرنے کا طریقہ ہم پہلے بتا آئے ہیں۔ اس کے بعد سالک کو چاہیے کہ وہ اس خیال کو اپنا نصب العین بنائے۔ اور اسی طرف اپنی پوری توجہ مبذول کر دے کہ حق سبحانہ اس کو اور اس کے علاوہ تمام کی تمام چیزوں کو نیچے سے اوپر سے دائیں سے بائیں سے اور اندر سے اور باہر سے الغرض ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ اور گو حق سبحانہ ہر جہت سے پاک اور منزہ ہے لیکن اس کے باوجود سالک کو چاہیے کہ وہ اس ذات اقدس کو مراقبے میں اپنے سامنے یوں دیکھے جیسے کہ فضاء میں ہوا جاری وساری نظر آتی ہے۔ یا جس طرح گارے میں پانی رواں دواں ہوتا ہے۔ غرضیکہ ذات باری کی ہمہ گیری کو وہ چشم بصیرت کے سامنے اس طرح متشکل کرے کہ اس کو ہر طرف حق سبحانہ کا نور جلوہ گر نظر آئے۔ اور وہ پوری دل جمعی سے اس بات پر یقین کر لے کہ کون ومکان میں نور الٰہی کی جلوہ گری میرے فکر ومجاہدہ کا نتیجہ نہیں۔ بلکہ یہ تو راز خود بغیر کسی سعی وکوشش کے جلوہ فگن ہے، مراقبے میں حق سبحانہ کے نور کو اس طرح جلوہ گر دیکھنا ہی مراقبے کا اصل مقصود ہے۔ اب یہ سالک کی اپنی ذاتی استعداد پر منحصر ہے کہ وہ اس کیفیت کو چھ ماہ میں حاصل کر لے۔ یا تین ماہ میں۔ یا اس کے حصول میں صرف ایک ہفتہ لگے۔ مرشد کو چاہیے کہ جب سالک حق سبحانہ کے اس نور کو اس طرح صاف طور پر دیکھنے لگے تو وہ اس کی نسبت بے رنگی کی طرف رہنمائی کرے، اس کا طریقہ یہ ہے کہ مرشدِ سالک کو اس امر کی تلقین کرے کہ وہ حق سبحانہ کے اس نور کے اس مشہور تصور میں سے اشیاء کے وجود کو جنہیں یہ نور گھیرے ہوئے ہے، خارج کر کے اور جہات کے خیال کو ذہن سے کلیۃً نکال کے حق سبحانہ کے نور کو اشیاء اور جہات سے بالکل پاک ومنزہ دیکھے۔ اس طرح اگر وہ تھوڑی سی کوشش کریگا تو اس کو نسبت بے رنگی حاصل ہو جائے گی۔ الغرض ''نور مشہود'' کا تصور مراقبے کا پہلا قدم ہے اور یہ نسبت بے رنگی کا مقام اس کا دوسرا قدم۔

مشائخ تصوف کے ہاں بہت سے مراقبے مروج ہیں بعض مراقبے دل کو ادھر ادھر کے خیالات سے فارغ کر کے پورے اطمینان کیساتھ ذات واحد کی طرف متوجہ کرنے کے لئے استنباط کئے گئے ہیں۔ اس قسم کے مراقبوں کے لئے ناک پر نظر جمائے رکھنے کی مشق کی جاتی ہے۔ بعض مراقبے نفس کی خواہشات کو دبانے اور اسے اس قابل بنانے کیلئے کئے جاتے ہیں کہ وہ ذات

مجرد کی طرف پوری طرح متوجہ ہو سکے۔ اس قسم کے مراقبوں کیلئے آفتاب کو مسلسل دیکھنے یا خلا کی طرف نظر جمانے کی مشق کی جاتی ہے، بعض مراقبوں سے یہ مقصود ہوتا ہے کہ نفس درجہ بدرجہ اپنے اندر استعداد پیدا کر لے کہ وہ تصورات کو اپنے ذہن میں متشکل دیکھ سکے اس غرض کیلئے اللہ کا نام کاغذ پر لکھ کر اس کو برابر دیکھنے کی مشق کیجاتی ہے اسی طرح بعض اور مراقبے ہیں جن میں ذات حق کی طرف توجہ کرنے کے طریقے معین کئے گئے ہیں۔ مشائخ نے اس توجہ کی دو قسمیں کی ہیں ایک توجہ اسم کی طرف دوسرے یہ کہ مسمّٰی کی طرف توجہ کی جائے۔

توجہ بہ اسم کی مثال نبض کی سی ہے کہ اس کی رفتار مسلسل نہیں ہوتی بلکہ آہرن پر ہتھوڑے کی چوٹوں کی طرح اس کی حرکت الگ الگ ہوتی ہے۔ اور توجہ بہ مسمّٰی کو یوں سمجھئے کہ سالک کا خیال دور دراز پہنائیوں کی، جا کر خبر لائے۔ گویا کہ وہ ایک دھاگہ ہے کہ اسے جتنا بھی کھینچے برابر کھنچتا چلا جاتا ہے۔ یا اس کی مثال ایک ایسی آواز کی ہے جو برابر آ رہی ہے اور کان قوت سماعت سے کام لئے بغیر اس آواز کا تصور کر رہا ہے۔

مراقبے سے سالک کے اندر جب یہ کیفیت پیدا ہو جائے تو اس وقت اسے وہ مقام حاصل ہو جاتا ہے، جس کو لطائف کی زبان کھل جانے کا مقام کہتے ہیں۔ یعنی دل و دماغ اور انسان کی دوسری استعدادوں کو گویا قوت گویائی مل جاتی ہے اس ضمن میں بعض مشائخ مراقبوں میں سالک کو کسی ایک نسبت کو ملحوظ نظر رکھنے کی تلقین کرتے ہیں مثلاً وہ اسے، اَنت فوقی انت تحتی کا ذکر کرنے کو کہتے ہیں۔ اس سے سالک کیلئے نسبت توحید کی راہ نزدیک ہو جاتی ہے الغرض یہ میدان بڑا وسیع ہے۔ اور ہر ایک نے اپنے اپنے ذوق اور ادراک کے مطابق مختلف قسم کے مراقبے تجویز کئے ہیں۔

وللناس فیما یعشقون مذاھب

لیکن اس ضمن میں فقیر پر یہ حقیقت ظاہر کی گئی ہے کہ ذکر و اذکار اور مراقبہ و مجاہدہ کے معاملے میں حق سبحانہ کو مطلوب یہ ہے کہ اذکار میں سے وہ ذکر کیا جائے جس کی شریعت نے اجازت دی ہے۔ اور مراقبہ ایسا ہو کہ سالک کی توجہ فوراً ذات باری کی طرف مبذول ہو جائے۔

مراقبے کے سلسلے میں یہ نہیں ہونا چاہیے کہ سالک اس کی تمہیدی مشقوں میں ہی پھنس کر رہ جائے

کیونکہ اگر وہ اس حالت میں مر جائے گا تو اسے آخرت میں حسرت اور رنج ہوگا۔ مثلاً سالک مراقبے کی تمہیدی مشقیں کر رہا ہو یعنی وہ مسلسل آواز سننے میں مصروف ہو یا خدا کی ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے کی مشق میں لگا ہوا ہو یا وہ آفتاب کی طرف دیکھنے یا ناک پر نظر جمانے کی مشق کر رہا ہو اور اس کو موت آ جائے تو اندازہ لگایئے کہ آخرت میں اسے اپنی محرومی کا کتنا صدمہ ہوگا۔

☆☆☆

راہ سلوک کی روکاوٹیں

جب سالک یہ اشغال کر رہا ہو، تو اس سلسلے میں اسے چند روکاوٹیں پیش آتی ہیں۔

(۱) ان میں سے ایک روکاوٹ ادھر ادھر کے خیالات دوساوس کا دل میں پیدا ہونا۔

خیالات ووساوس کی دو قسمیں ہیں ان کی ایک قسم تو یہ ہے کہ انسانی ذہن بالا ارادہ طرح طرح کی قیاس آرائیاں کرے۔ مثال کے طور پر ایک شخص کو دو روٹیاں اور ایک پیالہ شہد کا ملتا ہے وہ دل ہی دل میں سوچتا ہے کہ اگر دو روٹیاں کھالیا کروں اور شہد بچا تا رہوں تو چند دنوں کے بعد میرے پاس شہد کا ایک مٹکا جمع ہو جائیگا۔ میں اسے بیچ کر مرغیاں خریدلونگا اور جب مرغیوں کی نسل بڑھے گی تو ان سے یہ چیزیں خریدلونگا غرضیکہ اس طرح کے خیالات کا سلسلہ چلتا ہے، اسی قسم کے خیالات میں فکر شعر کے لئے تخیل آرائیاں اور نجوم کے زائچے بنانے کے سلسلے میں ذہن کی قیاس آرائیاں داخل ہیں نیز معقولات کی یہ بحثیں کہ ایسا کیوں ہوا؟ اور ہم کیوں تسلیم کریں؟ اسی قبیل سے ہیں۔

(۲) خیالات ووساوس کی دوسری قسم یہ کہ یا تو بلا قصد کے اور بغیر سوچے ہوئے خود بخود خیالات دماغ میں چلے آتے ہیں۔ یا ان کی صورت یہ ہوتی ہے کہ جو چیزیں آنکھوں نے کبھی دیکھی تھیں ان چیزوں کی صورتیں حس مشترک میں بھر جاتی ہیں۔

پہلی قسم کے خیالات ووساوس کا علاج یہ ہے کہ سالک اپنی ہمت کے جذبے کو برانگیختہ کرے اور اس کی شکل یہ ہے کہ وہ کوئی ایسی تدبیر کرے جس سے اس کے دل میں جوش پیدا ہو۔ ان تدابیر کا ذکر ہم اس سے پہلے کر آئے ہیں۔ جب سالک میں اس طرح کی کسی تدبیر سے جوش پیدا ہوگا تو اس کے اندر نئے سرے سے اپنے نفس کی تہذیب و اصلاح کا جذبہ ابھرے گا۔ اس

حالت میں اسے چاہیے کہ وہ خلوت اختیار کرے اور اس امر کی کوشش کرے کہ کم سے کم کچھ وقت کیلئے اپنے دل میں باہر کے خیالات گھسنے نہ دے۔ لیکن اگر اس کوشش کے باوجود ادھر ادھر کے خیالات یورش کر آئیں تو اسے چاہیے کہ قبل اس کا دل اور دماغ ان خیالات کی لذت محسوس کرے وہ ان خیالات کو اپنے آپ سے دور ہٹائے، فرض کیا اگر اس کا دل ان خیالات سے نہیں ہٹنا چاہتا تو اسے چاہیے کہ وہ اپنے دل کو سمجھائے اور اس سے کہے کہ ابھی تو تم ان خیالات سے درگزر کرو تھوڑی دیر بعد پھر ان خیالات سے محظوظ ہو لینا، الغرض اس طرح ٹال مٹول کر کے وہ اپنے دل سے کچھ مدت کیلئے ان خیالات کو دور کر دے پھر جس تدبیر سے پہلے اس نے اپنے اندر جوش اور تہذیب نفس کا جذبہ پیدا کیا تھا، دوبارہ اس تدبیر کو عمل میں لائے، اور اپنے دل سے خیالات ووساوس کو دور کرنے کی سعی کرے دوسری قسم کے خیالات ووساوس کا علاج یہ ہے کہ سالک مذکورہ ذیل طریقوں میں سے کسی ایک طریقے سے اپنے دل میں جذب وشوق پیدا کرے۔ اول وہ کسی قوی توجہ والے بزرگ کی صحبت میں بیٹھے اور اپنے دل کو ادھر ادھر کے خیالات سے خالی کر کے ایک دو گھڑی کیلئے اسے پوری طرح اس بزرگ کی طرف متوجہ کر دے۔ دوم یہ کہ وہ مشائخ کی پاک روحوں کی طرف توجہ کرے ان پر فاتحہ پڑھے۔ ان کی قبروں کی زیارت کرے اور ان بزرگوں کی ارواح سے جذب وشوق کی توفیق چاہے۔

اور تیسرے یہ کہ خلوت میں جائے، غسل کرے نئے کپڑے پہنے دو رکعت نماز پڑھے اور پھر "اللّٰهم نقني من الخطايا الخ اللّٰهم اجعل في قلبي نورا" کا جہاں تک اس سے ہو سکے، ذکر کرے۔ اور نماز کے بعد "یا نور" کا چار ضربی یا سہ ضربی ذکر کرے۔ یہ سب کچھ کرنے بعد بھی اگر خیالات اور وساوس دل میں تشویش پیدا کریں تو سالک کو چاہیے کہ فوراً اٹھے دوبارہ وضو کرے پہلے کی طرح دو رکعت نماز پڑھے اسی طرح پھر ذکر کرے اور اگر پھر بھی وساوس پیچھا نہ چھوڑیں تو پھر پہلے کی طرح وضو کرے، نماز پڑھے اور ذکر کرے، ہمیں اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ اگر سالک دو تین بار اس طرح کریگا تو اسے ایک حد تک دل میں ٹھنڈک، سکون اور اطمینان محسوس ہوگا۔ اس کے بعد سالک کو چاہیے کہ وہ "لا الـه الا اللّٰـه" کا ذکر کرے اور تحصیل شوق میں لگ جائے اس فقیر کو بتایا گیا کہ ان خیالات اور وساوس سے نجات پانیکا یہ حتمی اور مجرب علاج ہے۔ اور

اس کا ہمیشہ ایک سا اثر ہوتا ہے۔

جذب وسلوک کی راہ کی رکاوٹوں میں سے دوسری رکاوٹ قلق واضطراب اور عزم وارادہ کا ضعف بھی ہے۔ اس کی وجہ سے سالک کی یہ حالت ہوتی ہے کہ وہ وظائف قلب میں مشغول ہونا چاہتا ہے، لیکن اس کی طبیعت نہیں مانتی اور اس کے دل میں رہ رہ کے غم افزا جذبات بڑے زور سے فوارہ کی طرح پھوٹ پڑتے ہیں۔ اس فقیر کو بتایا گیا کہ قلق واضطراب اور عزم وارادہ کے ضعف کے حسب ذیل اسباب ہیں۔

اول: مزاج کا اختلال، یعنی طبیعت پر سوداویت کا غلبہ ہو، اس کا علاج یہ ہے کہ فصد یا مسہل کے ذریعے طبیعت میں اعتدال پیدا کیا جائے۔ قلق واضطراب اور عزم وارادہ کے ضعف کا اس کے سوا کوئی اور علاج نہیں۔

دوم: یہ کہ جسم ناپاک ہے اور ایک عرصے سے غسل نہیں کیا گیا، جس کی وجہ سے بدن پر میل کچیل جمی ہوئی ہے، اس کا تدارک غسل سے کرنا چاہیے۔ اور جسم وکپڑوں کی صفائی کا سب سے زیادہ خیال رکھنا چاہیے۔

سوم: گناہوں کے ارتکاب سے بھی طبیعت میں قلق واضطراب پیدا ہوتا ہے۔ یہ گناہ غریبوں پر ظلم کرنے کی شکل میں ہو۔ یا دوسروں کے حقوق مارنے کی صورت میں۔ ان کا علاج یہ ہے کہ سالک ان معاصی سے بچے۔

چہارم: شیاطین اور جادو کا اثر طبیعت کو پراگندہ کر دیتا ہے، اس کا علاج یا اللہ کا ذکر ہے۔ اور سالک اسے زیادہ سے زیادہ جتنا کر سکے، کرے۔ طبیعت میں قلق واضطراب اور عزم وارادہ میں ضعف پیدا ہونے کا پانچواں سبب مشائخ طریقت کی شان میں بے ادبی کا ارتکاب ہے، اس کا تدارک اس طرح ہو سکتا ہے کہ آدمی اس سے باز رہے۔

پنجم: یہ کہ دل میں دنیا کی محبت کی رگیں پوشیدہ ہیں اور اگر وہ برملا طور پر نظر نہیں آتیں، لیکن جب کبھی بھی ان کو موقع ملتا ہے تو وہ ابھر کر اپنے تاریک اثرات دل پر ڈالتی ہیں چنانچہ اس سے طبیعت میں قلق واضطراب اور عزم وارادہ میں ضعف پیدا ہوتا ہے اس کا علاج یہ ہے سالک مستقل طور پر جس طرح کہ ہم پہلے لکھ آئے ہیں، ذکر کرے اور اس کی کوشش یہ ہو کہ جن اطراف وجہات

سے دنیا کی محبت اس کے دل پر اثر ڈالتی ہے وہ ان اطراف و جہات کی نفی کرے۔

ششم: راہ سلوک میں سالک کو طرح طرح کی جو مشقتیں کرنی پڑتی ہیں کبھی ان کے خیال سے اس کا دل ڈر جاتا ہے، اس کا علاج یہ کہ سالک مشائخ کی حکایات سے اور اپنے دل کو آس اور امید سے منقطع نہ ہونے دے۔ الغرض ان تمام امراض کے معاملے میں سالک کو چاہیے کہ پہلے تو وہ اپنے دل کے اصل عارضے کا پتہ لگائے پھر اس عارضے کا علاج کرے لیکن اگر سالک اپنے اس عارضے کی صحیح تشخیص نہ کر سکے تو مرشد کو چاہیے کہ وہ سالک پر نگاہ رکھے، مختلف مجالس میں اس کی حرکات وسکنات بڑے غور و تعمق سے دیکھتا رہے اور اس کی باتوں اور اس کے آثار وقرائن یا خدا تعالی نے مرشد کو جو فراست عطاء فرمائی ہے، اس کی مدد سے وہ اس کے عوارض کا کھوج لگائے اور ان کا تدارک کرے۔

ہفتم: اس سلسلے میں اکثر یہ ہوتا ہے کہ سالک کو خواب میں، بیداری میں طرح طرح کے واقعات اور احوال پیش آتے ہیں نیز ذکر واذکار میں دور دور کے خیالات اس کے دماغ میں آن موجود ہوتے ہیں۔ مزید برآں وہ اپنے سامنے انوار کو روشن اور درخشاں دیکھنے لگتا ہے۔ الغرض جب سالک کو اس قسم کے معاملات پیش آتے ہیں تو وہ انہیں بڑی عظمت وشان کی چیزیں سمجھتا ہے اور اس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ اس کے ہاتھ میں بڑی متاع آ گئی۔ چنانچہ اس کی وجہ سے سلوک کا جو اصل مقصود ہے، اس کے لئے جدوجہد کرنا، چھوڑ دیتا ہے۔ سالک کو چاہیے کہ جب وہ ان حالات میں سے سالک گزر رہا ہو تو اپنے اوپر ضبط رکھے۔

اس سلسلے میں فقیر کو بتایا گیا ہے کہ ان حالات میں سالک پر جو افکار وحوادث رونما ہوتے ہیں ان کی یہ صورتیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو سالک کو یہ یقین ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ دیکھ رہا ہے وہ حق تعالی کی تجلی ہے۔ یا وہ اس تجلی کی طرف منسوب ہے اگر سالک کو اس بات پر یقین ہو تو واقعی وہ تجلی تجلی حق ہوگی۔ اور اگر سالک اس حالت میں اس تجلی کو ملائکہ یا مشائخ کی روحوں کا نتیجہ سمجھتا ہے تو یہ تجلی اسی نوع میں شمار ہوگی، ان تجلیات کی دوسری پہچان یہ ہے کہ اگر ان سے سالک کو انس، سرور اور انشراح قلب حاصل ہو، تو یہ تجلی ملائکہ کی سمجھی جائے گی۔ اگر اس سے سالک کو وحشت اور انقباض ہو تو یہ شیاطین کے وسوسے ہونگے۔ اور اگر اس سے نہ سرور حاصل ہو اور نہ سالک کو کوئی

خاص وحشت وانقباض ہوتو اس کی تجلیات کو طبیعت کا ایک خیالی ابھار سمجھنا چاہیے۔ سالک اپنے ان احوال اور کوائف کو بھی ان صورتوں پر قیاس کر سکتا ہے۔

بعض مشائخ نے جہات کے لحاظ سے بھی ملکی تجلیات اور شیطانی تجلیات میں فرق کرنے کی کوشش کی ہے۔ یعنی اگر فلاں جہت سے افکار و تصورات رونما ہوں، تو انہیں ملکی تجلیات سمجھا جائے اور اگر دوسری جہت سے کوئی چیز نازل ہو تو اسے شیطان کے وسوسوں واثرات کا نتیجہ قرار دیا جائے۔

فقیر کے نزدیک جہات کے لحاظ سے تجلیات کی یہ تقسیم ٹھیک نہیں۔

............☆☆☆............

توحید افعالی، توحید صفاتی، توحید ذاتی

راہ طریقت کے ان مراحل کو طے کر لینے کے بعد جب سالک اپنے اندر ایک حد تک بے نشانی یا بے رنگی کی حقیقت پالے تو اس کے سامنے دو راہیں کھلتی ہیں۔ ایک جذب کی راہ اور دوسری سلوک کی راہ، اس مقام پر مرشد کو اختیار ہے کہ اگر مناسب سمجھے تو سالک کو جذب کے راستے پر چلائے اور اگر چاہے تو اسے سلوک کے راستے پر ڈال دے اس میں شک نہیں کہ تمام اکابر مشائخ کے نزدیک صاحب جذب کو صاحب سلوک پر ترجیح حاصل ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ہر راہ نورد طریقت کو بلا استثناء سلوک کے بجائے، جذب کی راہ پر چلانا چاہیے بعض سالک ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی طبیعت کو راہ سلوک سے زیادہ مناسبت ہوتی ہے، اس لئے ان کے لئے سلوک ہی کی راہ قابل ترجیح ہوگی۔ لیکن بعض سالک ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ان کی طبعی استعداد جذب کا تقاضا کرتی ہے چنانچہ ان کے لئے جذب کا طریقہ اچھا رہتا ہے۔ جذب سے یہاں وہ کیفیت مراد نہیں جس میں کہ سالک کا دل عالم غیب کی طرف یکسر متوجہ ہو جاتا ہے۔ اس کے دماغ سے ادھر ادھر کے خیالات بالکل نکل جاتے ہیں۔ اس کی عقل اپنا کام کرنا چھوڑ دیتی ہے اور وہ شریعت کے احکام اور معاشرت کے آداب سے بالاتر ہو جاتا ہے یہاں جذب سے مراد وہ حالت ہے جس میں کہ وجود کے تعینات کے پردے جن کا سلسلہ اس کائنات سے لیکر ذات باری تک جو حقیقۃ الحقائق ہے، پھیلا ہوا ہے۔ سالک کی نظروں کے سامنے سے ہٹ جاتے ہیں چنانچہ اس جذب ہی کے طفیل انسانی ''انا'' میں یہ استعداد پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اس مقام اصلی کی طرف لوٹ جاتا ہے جو

اس ''اَنا''(۱) کا مبداے اول ہے، اور جہاں سے کہ اس ''اَنا'' کا صدور ہوا ہے۔ غرضیکہ ''جذب'' سے سالک کی نظروں میں اجزائے وجود تحلیل ہوجاتے ہیں اور اس کے سامنے سے تعینات وجود کے پردے اٹھ جاتے ہیں۔

باقی رہا ''سلوک'' سو اس سے مراد خضوع، طہارت اور عشق وغیرہ کی نفسی کیفیات میں سالک کا اپنے آپ کو رنگنا یا ان کیفیات کو اپنے اندر پیدا کرنا ہے۔ ''جذب'' کے حصول کا یہ طریقہ ہے کہ سالک جب اجمالی طور پر عالم غیب سے آشنا ہوجائے تو مرشد کو چاہیے کہ اس سے زبانی یا قلبی ذکر بکثرت کرائے، اس دوران میں سالک اپنی چشم بصیرت کو عالم غیب کی طرف برابر لگائے رکھے۔ اور وہ اپنے دل کو بھی پوری طرح ادھر متوجہ کردے اس میں شک نہیں کہ اگر سالک چندروز عالم غیب کی طرف اس طرح توجہ کریگا تو یقیناً اس پر توحید افعالی کی حقیقت منکشف ہوجائیگی اور وہ محض فکر یا خیال سے توحید افعالی کی حقیقت کا ادراک نہیں کریگا بلکہ اس پر یہ حالت طاری ہوجائے گی کہ وہ کل عالم اور اس کی تمام حرکت اور نمو کو ایک شخص واحد کی تدبیر کا اثر اور ایک ذات کے فعل کا نتیجہ سمجھے گا۔ اور اس کو عالم کی تمام حرکات وسکنات یوں نظر آئے گی جیسے کہ پتلیوں کا تماشہ ہوتا ہے کہ بظاہر تو معلوم ہوتا ہے کہ پتلیاں از خود چل پھر رہی ہیں لیکن اصل میں ان کے پیچھے پتلی والا بیٹھا ہوتا ہے جو تارے سے سب پتلیوں کو حرکت دیتا ہے۔

اگر سالک پہلے ہی سے توحید افعالی کا معتقد ہے تو اس شغل سے اس پر فوراً ہی توحید افعالی کے اثرات نمایاں ہونے لگتے ہیں مثلاً اس میں توکل کی صفت پیدا ہوجاتی ہے اور وہ اپنے معاملات اللہ کے حوالے کردیتا ہے نیز وہ موت وزندگی، شفاء اور مرض کو ان کے جو اسباب وعوارض ہیں، ان میں منحصر نہیں سمجھتا بلکہ کل من عند اللہ یعنی سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے کا قائل ہوجاتا ہے۔ لیکن اس توکل کے یہ معنی نہیں کہ وہ اسباب ونتائج کے سلسلے ہی کو بالائے طاق رکھدے۔ اسباب ونتائج کا سلسلہ تو اللہ کی سنت ہے اور اس پر کاربند ہونا شریعت کی طرف سے فرض ہے اگر

(انا جو فرد انسانی میں شعور ذات کا مظہر ہے یہ انسانی ''انا'' نفس کلیہ سے صادر ہوتا ہے۔ اور نفس کلیہ کی مثال یوں سمجھئے جیسا کہ فرد کا ایک انسانی ''انا'' ہے اس طرح نفس کلیہ کل کائنات کا ''انا'' ہے نفس کلیہ سے اوپر اسمائے الٰہی کے مدارج ہیں۔ اور ان کے اوپر ذات بحت کا درجہ ہے ''انا'' کو نیچے سے اوپر اپنے اصل مقصود کی طرف واپس لے جانا اس ''جذب'' کا مقصود ہے۔

سالک پہلے سے توحید افعالی کا معتقد نہ ہو تو ''جذب'' سے توحید افعالی کا عقیدہ وجدانی طور پر اس کے اندر پیدا ہو جاتا ہے۔

توحید افعالی کے ضمن میں عالم کے جملہ افعال اور اعمال کو تدبیر خداوندی کی طرف منسوب کرنے کے سلسلے میں سالک عمومی افعال اور کلی حوادث کو جیسے فقر، غنا، شفا، مرض، موت، زندگی، عزت، ذلت وغیرہ ہیں اللہ کی طرف منسوب کرے تو یہ مناسب اور عمدہ طریقہ ہے۔ باقی رہا درختوں کے پتوں کے ایک ایک ریشے میں اور اس طرح اور چھوٹی چھوٹی چیزوں میں تدبیر خداوندی کے تصرف وتغیر کا جو عمل جاری ہے اس کو بھی اس کے ضمن میں دیکھنا ہمارے نزدیک ''توحید افعالی'' کے اصل مقصد میں داخل نہیں اگرچہ سالکان راہ طریقت کو اکثر ان امور سے بھی سابقہ پڑتا ہے مشائخ اس منزل میں سالک کو کبھی ذکر کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ اور اسے اس امر کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ وہ ذکر میں ''لافاعل فی الوجود الا اللہ'' یعنی کائنات میں خدا کے سوا اور کوئی موثر وفاعل ذات نہیں ہے، کو ملحوظ نظر رکھے، اس سے دراصل ان کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ سالک کو توحید افعالی کی کیفیت جلد سے جلد حاصل ہو جائے۔ لیکن یہ بات یاد رہے کہ ذکر واذکار میں محض اس خیال کو ملحوظ نظر رکھنے سے کہ وجود کائنات میں اللہ کے سوا اور کوئی ذات موثر وفاعل نہیں سالک کو توحید افعالی کی نسبت حاصل نہیں ہو جاتی بہرحال جس شخص کو توحید افعالی کی نسبت حاصل ہو جائے وہ ناسوت یعنی عالم مادیات کو اپنے سامنے یوں پاتا ہے جیسے کہ وہ عالم غیب کا سایہ اور ظل ہے۔ اب ایک عقلمند آدمی کی مثال لیجئے اگر وہ سائے کو حرکت کرتا ہوا، دیکھتا ہے تو وہ بلا کسی شک وشبہ کے بداہۃً اس بات پر یقین کر لیتا ہے کہ کوئی جسم موجود ہے جس کا میں سایہ دیکھ رہا ہوں بعینہ یہ کیفیت اس شخص کی ہوتی ہے جسے توحید افعالی کی نسبت حاصل ہو یہ شخص جب اس دنیا میں جس کو وہ عالم غیب کا سایہ اور ظل سمجھتا ہے، اعمال وافعال ہوتے دیکھتا ہے تو یقیناً اسے وہ تدبیر غیبی نظر آ جاتی ہے جو ان سب اعمال وافعال کے پیچھے کام کر رہی ہے۔

توحید افعالی اس راہ سلوک کا پہلا قدم ہے اس کے بعد توحید صفاتی کا مرتبہ آتا ہے۔ توحید صفاتی سے مراد یہ کہ سالک مختلف صورتوں اور مظاہر میں صرف ایک اصل کو جلوہ گر دیکھے اور بغیر کسی شک وشبہ کے اس بات کو بداہۃً مان لے کہ سارے کے سارے اختلافات ایک ہی اصل میں

ثابت اور موجود ہیں۔ پھر وہ اس اصل کو نوع بنوع صورتوں میں جلوہ گر بھی دیکھے اور ہر جگہ اس اصل کو پہنچانے، اس کی مثال یوں سمجھئے کہ جیسے کہ کوئی شخص نوع انسان کے تمام افراد میں ایک انسان کلی کا مشاہدہ کرتا ہے یا وہ موم کی مختلف مورتوں میں موم کی ایک ہی جنس کو ہر مورت میں موجود پاتا ہے، الغرض یہ ایک اصل جو وجود کے ہر مظہر میں اور کائنات کی ہر شکل میں مشترک ہے سالک کو چاہیے کہ وہ اس اصل کو ہر چیز میں بے رنگ دیکھے اور کسی مظہر کے مخصوص رنگ کو اس میں موثر نہ مانے لیکن اس کے ساتھ ہی سالک کو اس حقیقت سے بھی بے خبر نہ رہنا چاہیے کہ اصل کی اس بے رنگی اور بعد میں اس نے مختلف مظاہر میں جو الگ الگ صورتیں اور گوناگوں رنگ اختیار کیے ہیں ان دونوں حالتوں میں کوئی تضاد نہیں نیز اصل کی یہ بے رنگی اس امر میں مانع نہیں کہ یہی اصل بعد میں مختلف صورتوں اور مختلف رنگوں میں ظہور پذیر ہو۔ لیکن سالک کو ایک ہی اصل کی یہ ''بے رنگی'' اور ''ہمہ رنگی'' محض غور وفکر کے ذریعے نہیں بلکہ وجدانی طور پر اور بداہتہً مشاہدہ کرنی چاہیے۔ بہر حال ایک ہی اصل کو وجود کے ہر مظہر میں دیکھنا یا تو غور وفکر کے ذریعے ہوتا ہے یا وجدانی طور پر اور بداہتہً اور اصل کے مشاہدے کے یہ دونوں مقام باہم ملے جلے ہیں جہاں ایک ختم ہوتا ہے وہیں سے دوسرے مقام کی ابتداء ہوتی ہے۔ اس راہ میں بعض سالک ایسے بھی ہوتے ہیں کہ وہ ساری عمر مشاہدہ فکری کے مقام میں رہتے ہیں اور اس کے آگے کبھی ان کو ترقی نصیب نہیں ہوتی لیکن جو سالک قوی المحبت اور ذکی الذہن ہو وہ ان حالات کے بعد پوری طرح اس ایک اصل کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے جس سے ہر چیز ظہور پذیر ہوئی ہے۔ وہ مختلف صور اور اشکال کی طرف مطلق التفات نہیں کرتا اور وجود کی کثرت اور مظاہر کی بوقلمونی سے اپنی نظر اس طرح پھیر لیتا ہے گویا وہ انہیں بالکل ہی بھول گیا۔

خدا تعالیٰ کی طرف سے انسانوں کے لئے یہ مقدر ہو چکا ہے کہ وہ اپنے ''اَنا'' میں جو عبارت ہے ان کی ہویت سے توحید صفاتی کا جلوہ دیکھیں یعنی ان کیلئے ان کا یہ ''اَنا'' آئینہ بنتا ہے اس اصل کا جس نے مختلف مظاہر کائنات میں ظہور فرمایا ہے چنانچہ ہوتا یہ ہے کہ جب سالک اپنے ''اَنا'' پر نظر کرتا ہے تو اس کی نظر اپنے ''اَنا'' تک رک نہیں جاتی بلکہ وہ اس ''اَنا'' کے واسطے سے اصل وجود تک جو سب ''اَناؤں'' کا مبدائے اول ہے، پہنچ جاتی ہے۔ جب سالک اس مقام پر

پہنچتا ہے تو اس کی نظر میں صرف اصل وجود ہی رہ جاتا ہے۔ اور یہ تمام کے تمام مظاہر و اشکال بیچ سے غائب ہو جاتے ہیں یہ توحید ذاتی کا مقام ہے لیکن جہاں کہیں ذوق ازلی کے ضمن میں توحید ذاتی کا نام آتا ہے تو اس سے مراد ایک ایسی کیفیت ہوتی ہے جو اچک لینے والی بجلی کی طرح چمکتی ہے۔ پھر چشم زدن میں غائب ہو جاتی ہے بہر حال یہاں ہم جس توحید ذاتی کا ذکر کر رہے ہیں یہ سلوک کے مقامات میں سے ایک مقام ہے جہاں کہ سالک آ کر قرار پذیر ہوتا ہے۔

عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ سالک پہلے توحید افعالی کی نسبت حاصل کرتا ہے پھر اس سے توحید صفاتی کے مقام پر پہنچتا ہے اور وہاں سے وہ توحید ذاتی کا مرتبہ حاصل کرتا ہے لیکن بعض سالک توحید افعالی سے براہ راست ایک جست میں توحید ذاتی تک پہنچ جاتے ہیں۔ اور انہیں اس راہ میں توحید صفاتی سے گزرنا نہیں پڑتا لیکن یہ چیز بہت ہی کم سالکوں کے حصے میں آتی ہے، قصہ مختصر جب سالک توحید ذاتی کی نسبت حاصل کر لیتا ہے تو پھر وہ بلا تاخیر بے نشانی یادداشت اور ذکر خفیہ کی نسبت کو پہنچ جاتا ہے۔ اس نسبت کی حقیقت یہ ہے کہ سالک حقیقۃ الحقائق یعنی ذات باری کی طرف کلیۃ ملتفت ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جب سالک اس مقام پر پہنچ جائے تو اسے چاہیے کہ وہ کچھ مدت اس مقام میں ٹھہرے، اپنے آپ کو ہر خیال اور ہر جہت سے مجرد کر کے پوری ہمت سے زیادہ سے زیادہ ریاضت اور وظیفہ کرے۔ اور نسبت بے نشانی کی اصل حقیقت کی طرف اس طرح متوجہ ہو کہ اس پر یہ بات منکشف ہو جائے کہ یہی ایک حقیقت ہے جس سے ایک ''خاص تعین'' نے صادر ہو کر سالک کی ''ہویت'' یعنی اس کے ''اَنا'' پر نزول کیا نیز اس کے ''اَنا'' پر حقیقت ازلی کے اس ''تعین خاص'' کے نزول ہی کا نتیجہ ہے کہ اسے بقا حاصل ہوتی ہے۔ یہ مقام راہ جذب کی آخری منزل ہے۔

اس ضمن میں چند نکات کا جاننا ضروری ہے۔ ایک یہ کہ جب سالک پر اس قسم کی وحدت منکشف ہو جائے تو اسے یقین کر لینا چاہیے کہ اب اس کی، جذب کی راہ طے ہو چکی ہے خواہ وہ اس مرحلے پر ''توحید وجودی'' کا معتقد ہو یا نہ ہو اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ سالک ''توحید افعالی'' سے ''توحید صفاتی'' حاصل کرتا ہے اس منزل سے جب وہ آگے بڑھتا ہے تو ''توحید ذاتی'' میں پہنچتا ہے اس مقام پر پہنچ کر وہ اس معاملے کی توجیہہ یوں کرتا ہے کہ پہلے میں مغلوبیت کی حالت

میں تھا۔ اور میں نے ذات واجب کو جو ہر شی کی قیوم ہے ''ممکن'' کیساتھ ''اتحاد'' کی نسبت دیدی تھی بالکل اسی طرح جس طرح کہ کوئی شخص درندے کو دیکھتا ہے اور وہاں درندے کا کوئی وجود نہیں ہوتا وہ خواب دیکھنے والے کی اپنی غضبی قوت ہوتی ہے۔ جو اسی درندے کی شکل میں نظر آتی ہے۔ سالک جب اس مقام سے ترقی کرتا ہے تو پھر یہ حقیقت اس کے لئے بالکل منزہ ہو جاتی ہے اور اس وقت وہ سمجھ جاتا ہے کہ ''تشبیہ'' کے مقام سے وہ ''تنزیہہ'' کے مقام میں پہنچ گیا۔ اور ''تشبیہ'' سے اس نے خلاصی حاصل کر لی۔ اب ایک اور سالک ہے اس کو بھی یہی کیفیت پیش آتی ہے وہ اس کی توجیہہ اس طرح کرتا ہے کہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کائنات کے ہر ذرے میں ذات باری کا جلوہ جاری وساری ہے۔ اب جو میں نے ''ذات واجب'' کو ممکن کے ساتھ بصورت ''اتحاد'' دیکھا ہے تو یہ ایک پردہ ہوا دوسرے پردے کا جسے فقط میری نظر دیکھتی ہے ورنہ جہاں تک اصل کا تعلق ہے وہ ان سب تشبیہات سے منزہ ہے۔ ان نکات میں دوسرا نکتہ یہ ہے کہ یہ راہ، سب کے نزدیک مسلم ہے اور اولیائے کاملین سے ہر ایک کو اس راہ سے گزرنا پڑتا ہے گو ان مقامات کی تعبیر میں ان میں آپس میں اختلاف ہے۔

عبارا تنا شتی وحسنک واحد
کلّ الی ذاک الجمال یشیر

لیکن قوی المعرفت اور ذکی الذہن آدمی اگر چاہے تو ان اولیاء کے کلام کا حاصل مطلب سمجھ سکتا ہے اور ان کی تعبیرات میں جو اختلافات ہیں، سب کو ایک اصل کی طرف مرکوز کر سکتا ہے۔ مزید براں اولیاء میں آپس میں محض تعبیرات کا اختلاف نہیں ہوتا بلکہ اس راہ کو طے کرنے کے معاملات میں بھی ان میں اختلاف ہوتا ہے بعض ایک مقام پر تھوڑی دیر رکتے ہیں۔ اور بعض کو زیادہ دیر وہاں ٹھہرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح جیسے جیسے ان کی استعداد ہوتی ہے اسی کے مطابق ان کو مختلف احوال اور واقعات بھی پیش آتے ہیں۔ تیسرا نکتہ یہ ہے کہ اس فقیر کو بتایا گیا ہے کہ شریعت میں سلوک راہ کی تو وضاحت کی گئی ہے۔ لیکن راہ جذب کو بیان نہیں کیا گیا ہے۔ جس طرح شریعت میں اسم اعظم اور لیلۃ القدر کی تصریح نہیں کی گئی۔ لیکن اس کے باوجود جو لوگ شارع علیہ السلام کے احوال کو راہ جذب پر محمول کرتے ہیں تو ان کی مثال ایسی ہے جیسے کہ کوئی علم النحو کی مشہور

کتاب کافیہ ابن حاجب سے تصوف کے قوانین اخذ کرے، باقی رہا راہ سلوک کا معاملہ سو اس کا لب لباب یہ ہے کہ سالک اچھے ملکات میں سے کوئی ملکہ اپنے اندر اس طرح پیدا کرے کہ وہ ملکہ اس کی روح کو پوری طرح احاطہ کرے اور سالک اس کے رنگ میں اس طرح رنگا جائے کہ اس کا جینا ہو تو اسی حال میں اور مرے تو اسی حال میں مرے۔

چو میرد مبتلا میرد چو خیزد مبتلا خیزد

اس راہ میں جو کیفیت اور حالت سالک کے نفس میں اس طرح جاگزیں ہو جاتی ہے گویا کہ وہ اس کی ذات کے لئے لازمی خصوصیت بن گئی اسے ''نسبت'' کہتے ہیں اس لحاظ سے اولیاء کے بہت سے مسلک ہیں اس سلسلے میں فقیر نے باطنی طور پر عالم ارواح کی طرف توجہ کی اور تصوف کے ہر طریقے کی جدا جدا نسبت کا ادراک کیا یہ نسبتیں کیسے حاصل ہوں میں نے یہ چیز بھی بذریعہ الہام(۱) معلوم کی چنانچہ آئندہ صفحات میں میں اس ضمن میں کچھ لکھتا ہوں۔

............☆☆☆............

(۱) یہ حضرت شاہ صاحب کا ذوق و مذاق ہے (قاسمی)

نسبتیں

نسبتوں کی دو قسمیں ہیں' ایک قسم راہ جذب سے زیادہ مشابہ ہے گویا وہ ظل ہے ''جذب'' کا اور دوسری قسم راہ وظیفہ واوراد سے زیادہ قریب ہے گویا وہ اس کا حاصل اور خلاصہ ہے بعض سلف نے نسبت کی اس قسم کو ''نسبت علمیہ'' کا بھی نام دیا ہے۔

اس دوسری قسم میں سے ایک ''انوار طہارت'' کی نسبت ہے اس نسبت کی حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی شخص غسل کرتا ہے، اپنے بدن سے ناپاکی دور کرتا ہے اور وضو کر کے صاف کپڑا پہنتا ہے اور خوشبو لگاتا ہے تو اسے اپنے اندر ایک خاص قسم کا سرور اور انس محسوس ہوتا ہے۔ یہ سرور وانس کا احساس اس شخص کے طبعی قوی کا نتیجہ نہیں ہوتا بلکہ یہ اثر اور پرتو ہوتا ہے نفس کی ملکی قوت کا جب یہ شخص بار بار اس کیفیت سے بہرہ مند ہوتا ہے تو اس شخص کا نفس اس کیفیت کو بطور ملکہ کے اپنا لیتا ہے اور یہ کیفیت اس کے لئے ایک مستقل خصوصیت بن جاتی ہے۔ عارف اس حقیقت کو پہچانتا ہے اور اس سے لذت اندوز ہوتا ہے چنانچہ اس کے برعکس جب وہ ناپاک ہوتا ہے یا اس کا بدن اور اس کے کپڑے نجس ہوتے ہیں تو اس کی وجہ سے اس شخص کو انقباض اور وحشت ہوتی ہے اس کے دل میں قلق اور عزم وارادہ میں انتشار وپراگندی پیدا ہو جاتی ہے اور اس کے دماغ میں طرح طرح کے تشویشناک خیالات اٹھتے ہیں۔ لیکن جونہی وہ اعمال طہارت بجالاتا ہے تو فوراً ہی اس پہ وہی سرور وانس کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور وہ اپنے اندر پہلا سا سکون واطمینان محسوس کرتا ہے۔ الغرض جب یہ شخص طہارت کا حاصل سرور وانس کی شکل میں اور ناپاکی کا اثر رنج ووحشت کی صورت میں جان لیتا ہے اور وہ اول الذکر سے لذت پاتا ہے اور دوسری چیز سے اسے اذیت ہوتی ہے۔ تو طبعاً اس کا میلان اس طرف ہوگا کہ وہ طہارت کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کرے۔ طہارت

سے جو کیفیت پیدا ہوتی ہے اس کو زیادہ سے زیادہ اپنے پیش نظر رکھے اور وضو اور غسل پر ہمیشہ کار بند رہے۔

جب سالک اپنے اندر طہارت کا یہ ملکہ پیدا کر لے تو اس کے سامنے حقیقت ملائکہ اور ان کے انس و سرور کی طرف ایک وسیع راہ کھلتی ہے۔ اور وہ برف، ٹھنڈک اور راحت کا دریائے بے کراں مشاہدہ کرتا ہے۔ چنانچہ اس شخص پر ملائکہ کی طرح الہام ہوتا ہے۔ اور اس کے لئے ملائکہ کو بذریعہ الہام ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ تدبیر الٰہی کے مطابق اس کی بہبود میں کوشاں ہوں۔ مرنے کے بعد جب یہ شخص دار آخرت میں پہنچتا ہے تو وہاں اس کا شمار ملائکہ میں ہوتا ہے۔ اور وہ انہی میں کا ایک ہو جاتا ہے۔

''نسبت طہارت'' کے حصول اور دل میں اس نسبت کے جاگزین ہونے کی علامت یہ ہے کہ سالک پر ملکی واقعات بڑی کثرت سے ظاہر ہوتے ہیں مثلاً وہ اپنے سامنے انوار کو روشن پاتا ہے۔ اور اپنے دل اور منہ میں سورج اور چاند کو داخل ہوتے دیکھتا ہے، نیز خود اپنے آپ کو بلور اور شفاف جواہر کی طرح پاتا ہے۔ مزید برآں اسے یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ لذیذ کھانے کھا رہا ہے دودھ گھی اور اس قسم کی اور لطیف چیزیں اسے میسر ہیں۔ اور وہ ریشمی کپڑوں میں ملبوس باغات میں زندگی گزار رہا ہے۔ لیکن اس حالت میں ضروری ہے کہ اسے اپنے دل میں اطمینان خوشی اور تازگی بھی محسوس ہو۔ اور اس معاملے میں اس کی مثال ایسی ہو جیسے کہ بیداری میں بھوکے کو کھانے مل جائے۔ تو اسے بڑا آرام ملتا ہے۔

ان نسبتوں کے ضمن میں یہ بات بھی ملحوظ رہنی چاہیے کہ یہ نسبتیں اکثر ایک دوسرے سے لازم و ملزوم ہوتی ہیں۔ مثلاً ایک شخص نے ''نسبت عشق'' حاصل کی اور جب یہ شخص اسی نسبت کی فی الجملہ تکمیل کر لیتا ہے تو اس کے ساتھ ہی اس کے اندر ''طہارت'' کی نسبت بھی خود بخود بیدار ہو جاتی ہے۔ چنانچہ جب وہ اپنے اندر نسبت طہارت کے آثار پاتا ہے تو چونکہ اس کے حصول میں اس نے کوئی کوشش نہیں کی تھی اس لئے وہ اس کو محض عنایت الٰہی کی دین سمجھتا ہے۔ اسی طرح نسبت طہارت رکھنے والا جب ملائکہ سے پوری مناسبت پیدا کر لیتا ہے اور اپنے نفس کو پاکیزہ بنا لیتا ہے تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اس کے دل پر اس کیفیت کیساتھ عشق و محبت کا بھی رنگ چڑھ جاتا

ہے چنانچہ اس سے ''نسبت عشق'' کے آثار ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ اس حالت میں وہ نسبت طہارت کے علاوہ اپنے اندر نسبت عشق کو اس طرح موجود پا کر، سمجھتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی مزید عنایت ہے کہ مجھے خود بخود نسبت عشق حاصل ہوگئی۔ اس طرح دوسری نسبتوں کو بھی قیاس کرلو۔ الغرض جن نسبتوں کو سالک اپنی محنت اور کوشش سے حاصل کرتا ہے انہیں تو وہ اکتسابی نسبتیں سمجھتا ہے اور جن نسبتوں کے آثار ضمنی طور پر دوسری نسبتوں کے ساتھ ظاہر ہوجاتے ہیں انہیں وہ عطیۂ الٰہی قرار دیتا ہے۔ ''کل حزب بما لديهم فرحو ن'' ہر جماعت اپنی پونجی اور متاع پر نازاں ہوتی ہے۔

نسبت طہارت کے حصول کا طریقہ یہ کہ سالک خلوت میں جائے پھر غسل کرے۔ نئے کپڑے پہنے اور دو رکعت نماز پڑھے اور جیسا کہ دل سے خیالات اور وسوسوں کو دور کرنے کے ضمن میں ہم لکھ آئے ہیں وہ ''یا نور'' کا ذکر کثرت سے کرے اس طرح وہ بار بار غسل اور بار بار وضو کرے بار بار نماز پڑھے اور ذکر کرے۔ اور پوری توجہ اور ہمت سے سوچے کہ اس کی حالت پہلے جیسی ہے یا اس میں کچھ فرق آ گیا ہے ہمیں یقین ہے کہ اگر وہ دو تین گھڑی تک یہی عمل کریگا تو اسے نسبت طہارت حاصل ہوجائے گی جب یہ نسبت اسے حاصل ہوجائے تو اسے چاہیے کہ وہ اس کی حفاظت کرے اور جن چیزوں سے اس نسبت میں خلل واقع ہوتا ہے ان سے احتراز کرے۔ اس سلسلے میں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ حقیقت طہارت صرف وضو و غسل ہی پر منحصر نہیں۔ بلکہ وضو غسل کے علاوہ بہت سی اور چیزیں بھی ہیں جو ان کے حکم میں داخل ہیں۔ جیسے صدقہ دینا، فرشتوں اور بزرگوں کو نیکی سے یاد کرنا، وہ کام سرانجام دینا جن میں عام لوگوں کا فائدہ ہوا ہو، اور اس کی وجہ سے وہ لوگ دعائے خیر کریں اور ان کے دل خوش ہوں، ڈاڑھی مونچھ اور دوسرے بالوں کی ایسی وضع بنانا جو ملت میں مستحسن سمجھی جاتی ہے اور انہیں بے ترتیب اور پراگندہ نہ رہنے دینا مقدس مقامات، مساجد اور سلف کے آثار و مزارات میں اعتکاف کرنا، پاک اور سفید لباس پہننا، خوشبو استعمال کرنا، طہارت کی حالت میں سونا اور سوتے وقت ذکر کرنا۔ ادھر ادھر کے پریشان کن خیالات سے اپنے آپ کو بچانا، بدن سے موذی مادوں اور تاریک خلطوں کو خارج کرنا، نفس کو خوشگوار ہوا اور خوشبو سے راحت پہنچانا نیز ایسی غذاؤں کا کھانا جو صالح غذائیت پیدا کریں تاکہ

پریشانی اور اضطراب سے دور رہ سکے یہ سب کی سب چیزیں طہارت کی کیفیت پیدا کرتی ہیں یا ان سے اس کو تقویت ملتی ہے۔

ناپسندیدہ شیطانی اوضاع کا اختیار کرنا فحش باتیں کرنا، سلف صالحین پر طعن کرنا، بے حیائی کا ارتکاب، حیوانوں کو جفتی کرتے دیکھنا۔ خوبصورت عورتوں یا بے ریش لڑکوں سے صحبت اختیار کرنا اور اپنے فکر کو ان کے محاسن میں لگائے رکھنا، زیادہ عرصے تک جماع کے خیالات کو دل میں مضمر رکھنا۔ اور جتنی کہ طبعی ضرورت ہے اس سے زیادہ جماع میں مشغول رہنا، کتوں اور بندروں کو اپنے اردگرد رکھنا۔ یہ سب کے سب مفاسد ہیں ان کے علاوہ جلدی اور دموی امراض میں مبتلا ہونا الغرض یہ چیزیں ان عوارض کو پیدا کرتی ہین جو طہارت کی ضد ہیں اس ضمن میں یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ جماع کی دو قسمیں ہیں۔ ایک جماع جو برائے دفع اذیت ہوتا ہے اور جماع کی دوسری قسم وہ ہے جس سے مقصود حصول لذت ہوتا ہے اول الذکر کا شمار باب طہارت میں ہے اور آخر الذکر باب نجاست میں شامل ہے۔

یہ سب چیزیں جن کا ذکر ہم اوپر کر آئے ہیں ان میں سے بعض کو تو شریعت نے صراحتا طہارت اور نجاست کے ذیل میں بیان کر دیا ہے اور بعض کی طرف صرف اشارہ کر دیا ہے۔ بہر حال مجھے ان سب باتوں کا علم بذریعہ وجدان ہوا ہے۔

باقی اللہ اعلم بالصواب

............☆☆☆............

نسبت سکینہ

ان نسبتوں میں سے ایک ''نسبت سکینہ'' ہے ہم نے اسے کہیں نور طاعت کا بھی نام دیا ہے اس نسبت کے تین شعبے ہیں۔

پہلا شعبہ: ''حلاوت مناجات'' کا ہے۔اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ جب انسان اللہ تبارک وتعالیٰ کو نماز، ذکر واذکار اور دعا واستغفار، کے ضمن میں یاد کرتا ہے تو نماز و ذکر واذکار کے اعمال والفاظ میں غیب کا جو رخ پوشیدہ ہوتا ہے لامحالہ سالک کی توجہ ادھر مبذول ہو جاتی ہے۔اس کا نفس ناطقہ اجمالی اور ضمنی طور پر غیب سے آشنا ہو جاتا ہے اور اسے اس میں لذت ملنے لگتی ہے چنانچہ اس طرح ''توجہ غیب'' کا یہ ملکہ اس کے جوہر روح میں داخل ہو جاتا ہے اس سلسلے میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی بظاہر ساکت وخاموش ہے لیکن اس کا دل اس کیفیت سے پر ہے، غیب کی طرف سالک کی یہ توجہ ایک اجمالی حیثیت رکھتی ہے اس لئے اسے ''حلاوت مناجات''، ''آرام دل''، ''رغبت بہ ذکر'' اور اس طرح کے دوسرے ناموں سے تعبیر کیا گیا ہے۔''توجہ غیب'' کی اس اجمالی کیفیت کے حصول کے بعد سالک طبعاً کثرت سے ذکر ودعا کرتا ہے اور بہت زیادہ توبہ واستغفار میں مشغول رہتا ہے۔ان امور کو دلی رغبت سے بجالا کر دراصل وہ اپنا فطری تقاضا پورا کرتا ہے اور اپنی بصیرت اور مطالعہ کی مدد سے اسے فائدہ اٹھاتا ہے اگر ایک گھڑی وہ ان مشاغل کو نہ کرے تو اس کا دل بے قرار ہو جاتا ہے اور اس کی حالت اس عاشق کی سی ہو جاتی ہے جو اپنے محبوب سے جدا ہو گیا ہو۔لیکن اس کے بعد اگر وہ ان اشغال کو کرنے لگے تو اس کو وہی کیفیت حاصل ہو جاتی ہے۔اور پھر وہ اس سے لذت اندوز ہونے لگتا ہے۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی کیفیت کے حصول کے لئے صبح وشام کا ذکر، افتتاحی دعائیں، رکوع سجود، دنیا وآخرت کی بہبود کے لئے اصرار والحاح

سے دعائیں کرنا اور جن وانس کے شر سے خدا کی پناہ چاہنا وغیرہ امور کو لازمی قرار دیا ہے۔

''توجہ غیب'' کی اس کیفیت کے حصول کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ سالک، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مشہور حدیث :قسمت الصلوۃ بینی وبین عبدی، الخ کی حقیقت کو اپنے ملحوظ خاطر رکھے۔یعنی اس بات پر یقین ہو کہ بندہ جو کچھ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کرتا ہے خدائے رب العزت بندے کی ان معروضات کو سنتا اور ان کا جواب دیتا ہے جیسا کہ اوپر کی حدیث میں وارد ہوا ہے۔اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان تقسیم کر دیا ہے جب بندہ الحمد للہ رب العالمین کہتا ہے تو اس کے جواب میں خدا فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری حمد کی اور جب بندہ الرحمن الرحیم کہتا ہے تو فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری ثناء کی اور جب بندہ مالک یوم الدین کہتا ہے تو اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی اور جب بندہ ایاک نعبد وایاک نستعین کہتا ہے تو خدا فرماتا ہے کہ یہ چیز خاص میرے اور میرے بندے کے درمیان مشترک ہے۔اور جب بندہ اھدنا الصراط المستقیم الی آخرہ کہتا ہے تو خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ چیز خاص میرے بندے کے لئے ہے اور میں نے اپنے بندے کا سوال پورا کر دیا ہے۔غرضیکہ جو شخص ''توجہ غیب'' کی اس کیفیت کو حاصل کرنا چاہے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ طویل سجدے کرے، دعا و استغفار میں اصرار و الحاح کرے، کثرت سے ذکر و اذکار کرے، اس بات کا بھی خیال رہے کہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے پیغمبروں نے اللہ کی ذات میں غور و فکر کرنے کا ہرگز حکم نہیں فرمایا۔بے شک آپ نے تعظیمی افعال اور دعائیہ اقوال کے ضمن میں اس بات کی ضرور اجازت دی ہے۔چنانچہ یہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہ کا مسلک تھا۔اور اسی پر تابعین کا عمل رہا۔

''نسبت سکینہ'' کا دوسرا شعبہ شمول رحمت کا ہے، اس کی حقیقت سمجھنے کے لئے ایک مقدمہ کی ضرورت ہے، بات یہ ہے کہ جن نفس ناطقہ میں جبلی طور سے نیز کوشش و ہمت کی بدولت یہ استعداد پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ ملائکہ سے الہام قبول کر سکے تو اس منزل میں اس کے نفس کی صلاحیتیں اپنے کمال کو پہنچتی ہیں۔اور اس کی بہیمی قوت کے شعلے بھی بجھ جاتے ہیں۔اس وقت اس کا مطلب یہ

نہیں ہوتا کہ قوت بہیمی یک سر معدوم ہو جاتی ہے یا اس میں کوئی کمی آ جاتی ہے بلکہ بہیمی قوت کے شعلے بجھ جانے سے مراد یہ ہے کہ نفس پر ملکی قوت کا غلبہ ہوتا ہے اور انسان کی بہیمی قوت ملکی قوت کے رنگوں میں سے کسی رنگ میں رنگی جاتی ہے یہ مقام انسانی کمالات میں سے ایک کمال ہے اور جو شخص اس کمال کی طرف پوری طرح متوجہ ہو جائے اس کے سامنے راحت اور پاکیزگی سے بھرا ہوا ایک دریائے بے کراں ظہور پذیر ہوتا ہے اور اس میں سے جتنا زیادہ سے زیادہ پیتا ہے اسی قدر اس کی پیاس بڑھتی جاتی ہے۔

تعالیٰ اللہ زہے دریائے پر شور | کزو بر تشنہ آرد تشنگی زور
گرازوے تشنئہ صد جرعہ نوشد | برائے جرعہ دیگر خروشد
گذشت ایں گفتگواز چون واز چند | نہ آب آخر شود نے تشنہ خورسند

حق سبحانہ کا یہ فضل و کرم ہیکہ اس نے نسبت شمول رحمت کی اس کیفیت کے اکتساب کے چند طریقے مقرر فرما دئے ہیں جن پر عام و خاص اور ذکی و غبی کے یکساں طور پر عمل کر سکتے ہیں، حق سبحانہ نے ان طریقوں کو انبیاء کی زبانوں سے خلق کیلئے واضح بھی فرمایا۔ شمول رحمت کے ان طرق اکتساب کا لب لباب یہ ہے کہ اول تو سالک کے دل پر ذات حق کے عقیدے کا پورا پورا تسلط ہو، اس کے بعد سالک اپنے اعضاء و جوارح کو ان اعمال کا عادی بنائے جن کی صورتیں مدت ہائے دراز سے ملاء اعلیٰ کے ذہنوں میں متمکن ہیں اور ان کی خوبی کا نقش وہاں پوری طرح جم چکا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ذات میں کامل اعتقاد کے معنی یہ ہیں کہ سالک اس کی مرضی پر پوری دل جمعی اور ثابت قدمی سے راضی ہو، اپنی رضا کو پورے عزم کے ساتھ اس کی مرضی کا پابند کرے اور اپنے آپ کو کلیۃً اس راہ وسط پر لگا دے جس میں کہ نفس کی بھلائی اور بہتری ہے۔ اس کے بعد اس ضمن میں اعضا و جوارح کے اعمال کا معاملہ آتا ہے سو ان کی حقیقت یہ کہ ملاء اعلیٰ جن کی تمام تر توجہ کا مقصود انسانوں کی تکمیل ہے یہ اعمال ملاء اعلیٰ کے ذہنوں میں متشکل ہو چکے ہوتے ہیں، ملاء اعلیٰ میں ان اعمال کے تشکل کی مثال یوں سمجھئے جیسا کہ ہم میں سے ایک شخص تخت بنانے کا مشاق ہو اور وہ اس تخت کی صورت کو اپنے ذہن میں اس طرح جاگزیں کر لے گویا کہ وہ تخت کو مادی شکل میں اپنے سامنے دیکھ رہا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ اعمال ملاء اعلیٰ کے ذہنوں میں کیسے متشکل ہو گئے، اس کی صورت یوں ہوئی کہ خدا کے صالح اور نیکوکار بندوں نے نسلاً بعد نسل ان اعمال کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا قرب ڈھونڈا اور ان بزرگوں کی نیکیوں کے صحیفے ان اعمال سے ہی بھر گئے چنانچہ اس درجہ سے ان اعمال کو ملاء اعلیٰ میں ایک مستقل حیثیت حاصل ہوگئی۔ اب حالت یہ ہے کہ جب کوئی شخص ان اعمال کو بجالاتا ہے تو ملاء اعلیٰ کی جانب سے اس شخص کی طرف رضا و سرور کی ایک رو چلتی ہے اس کے علاوہ یہ بات بھی ہے کہ ان اعمال کی صورتیں صالحین کے ذہنوں اور ان کے جوارح میں موجود ہوتی ہیں اور یہی صورتیں ہیں جو ملاء اعلیٰ میں متشکل ہو چکی ہیں چنانچہ ان اعمال کے کرنے سے آدمی میں یہ استعداد پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ ملاء اعلیٰ کے الہام کو قبول کر سکے اس ضمن میں کبھی کبھی یہ ہوتا ہے کہ ملاء سافل یعنی ادنیٰ درجے کے فرشتے ملاء اعلیٰ سے رضا و پسندیدگی کی کیفیات اخذ کرتے ہیں۔ یہ فرشتے ذکر کرنے والے اشخاص کے ارد گرد حلقہ باندھ لیتے ہیں یا ان کے نیچے اپنے بازو بچھاتے ہیں اور انسانوں اور بہائم کے دلوں میں اس بات کا الہام کرتے ہیں کہ وہ ان ذکر کرنے والوں کو ہر جانب سے نفع پہنچائیں۔ چنانچہ اس طرح یہ سب ان کی جان، ان کے مال اور انکی اولاد کیلئے خیر و برکت اور آسودگی و سلامتی کا باعث بنتے ہیں۔

نسبت شمول رحمت کی اصل حقیقت کی وضاحت سے پہلے جو مقدمہ ضروری تھا اس کا بیان ہو چکا ہے، اس کے بعد اب معلوم ہونا چاہیے کہ بارہا اس امر کا مشاہدہ ہو چکا ہے کہ ذکر کی مجالس میں اور خاص طور پر جب وہ مجالس ذکر مساجد میں قائم ہوں۔ ذاکرین کی جماعت جب نماز و ذکر میں مشغول ہوتی ہے تو ایک گھڑی بھی نہیں گزرتی کہ ان پر ملائکہ کی طرف سے برکات نازل ہوتی ہیں۔ اور یہ برکات نسیم معطر کی طرح ان کے نفوس کا احاطہ کر لیتی ہیں۔ خواہ ذاکرین کی یہ جماعت اس وقت حضوری مناجات کی صفت سے متصف ہو چکی ہو یا نہ ہوئی ہو۔ اس ضمن میں اس امر کا بارہا مشاہدہ ہو چکا ہے کہ جب کوئی شخص اسم ''اللہ'' کا ذکر پوری طرح شدت اور ترتیل کے ساتھ کرتا ہے، تو اس اسم مبارک کی صورت شعلہ نور کی مانند ان ملائکہ کے نفوس میں نقش ہو جاتی ہے جو کہ ذکر پر موکل ہیں۔ جب یہ شخص بکثرت ذکر کرتا ہے تو اسم مبارک کی یہ صورت ان فرشتوں سے اوپر جو اور فرشتے ہیں ان کے نفوس میں نقش ہو جاتی ہے اس طرح یہ صورت ترقی کرتے کرتے

حظیرہ القدس کے مقام میں پہنچ جاتی ہے وہاں سے یہ صورت تجلی الٰہی میں جو شخص اکبر کیلئے بمنزلہ دل کے ہے جاگزین ہو جاتی ہے اور یہ جو ہمارے رسول مقبول صلی اللہ علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا(۱) ہے کہ فرشتہ جب اسے لے کر چڑھتا ہے تو رحمٰن کا چہرہ اس سے شرما جاتا ہے تو اس سے یہی معنی مراد ہیں۔

بعض دفعہ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ نور نے ذاکر کے گردوپیش کا احاطہ کر لیا اور اس سے ذاکر کے اردگرد کی ساری فضاء بقعۂ نور ہو گئی۔ باقی ان معاملات کو اللہ بہتر جانتا ہے۔ محض ذکر سے فضاء کا پرنور ہو جانا یہی وہ بات ہے جس کی بنا پر شارع علیہ السلام نے نماز کے لئے حضوری کی شرط نہیں لگائی بعض دفعہ محض زبان سے خدا کا ذکر کرنا ہی فیضان نور کا باعث ہو جاتا ہے اسی طرح طاعات کی بھی بہت سی قسمیں ایسی ہیں کہ گو بسا اوقات وہ مناجات کی مثیل نہیں ہوتیں لیکن یہ برکات کے نزول کا باعث ضرور بن جاتی ہیں چنانچہ اسی بنا پر ان کے کرنے کا حکم دیا جاتا ہے۔ اس قسم کی طاعات، قربانی دینا، خانہ کعبہ کا طواف کرنا صفا و مروہ کے درمیان سعی، کعبہ کی زیارت، روزہ، صدقہ، جہاد، مریض کی عیادت، جنازے کے ساتھ جانا اور اسی طرح کے اور اعمال خیر ہیں۔

نسبت شمول رحمت کے حصول کے ضمن میں ہوتا یہ ہے کہ جوں جوں انسان ان اعمال واذکار کو کرتا ہے، اس کا نفس بتدریج ''شمول رحمت'' کے رنگ کو قبول کرتا جاتا ہے یہاں تک کہ یہ رنگ اس کے لئے مستقل ملکہ کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ اس فقیر کے نزدیک یہ حدیث، وہ قرب مجھے سب سے زیادہ عزیز ہے جو کسی بندے نے فرائض کو انجام دینے سے حاصل کیا ہو۔ نیز میرا بندہ نوافل سے برابر میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اس کے کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، اس کی آنکھیں بن جاتا ہوں جن سے وہ دیکھتا ہے اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کے پاؤں بن جاتا ہوں جن سے وہ چلتا ہے۔ اسی مطلب کی وضاحت کرتی ہے۔ ''شمول رحمت'' کی یہ صفت چونکہ فرائض میں بیشتر پائی جاتی ہے اس لئے حق سبحانہ کی محبت ملاء اعلیٰ کی وساطت سے فرائض کی اسی جانب زیادہ ملتفت رہتی ہے اور جب کوئی شخص کثرت سے نوافل اداء کرتا ہے تو حق سبحانہ کی طرف سے ایک نور ملائکہ کے نور کے توسط سے

---

(۱) حدیث کے الفاظ یہ ہیں: ''صعد بها ملك فحي بها وجه الرحمن''

اس شخص کی روح میں داخل ہوتا ہے اور اس طرح اس شخص کی روح کو گھیر لیتا ہے کہ اس کی روح کا تمام تر قیام وانحصار اس نور پر ہو جاتا ہے یعنی حق سبحانہ کا یہ نور اس شخص کی روح کے لیے قیوم بن جاتا ہے یہی نور سبب بنتا ہے، اس شخص کی دعاؤں کے قبول ہونے کا اور ذریعہ ہوتا ہے مکروہات اور بری چیزوں سے اس کے بچنے کا اور یہ امر بارہا مشاہدہ میں آچکا ہے، حق سبحانہ کے نور کا ایک شخص کی روح کا قیوم بن جانا، اس کی مثال ایسی ہے جیسے کہ کپڑے کا بنا ہوا ایک شیر یا مچھلی ہو کہ اس میں ہوا بھر دی جائے اور ہوا کی وجہ سے یہ حرکت کرنے لگے اب اس ہوا میں پانی کے اجزاء بھی تھے چنانچہ پانی کا اثر ہوا کے ذریعہ سے کپڑے کے اس شیر یا مچھلی کے ہر ہر عضو میں پہنچ گیا۔

ما ہمہ شیراں ولے شیر علم

جنبشے از باد، باشد دم بدم

نور الٰہی کی قیومت کی اس حقیقت کو سب سے بہتر تو خدا تعالیٰ نے قرآن مجید میں بیان کیا ہے۔ چنانچہ سورہ نور میں ارشاد ہوا ہے "**مثل نورہ کمشکوٰۃ فیھا مصباح**" یعنی اللہ تعالیٰ کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے کہ طاق میں چراغ رکھا ہو۔ حضرت عباس نے اس آیت کو یوں پڑھا ہے" **مثل نورہ فی قلب المومن کمشکوٰۃ فیھا مصباح** "یعنی اللہ تعالیٰ کا نور جب مومن کے قلب میں جاگزین ہو جاتا ہے تو اس کی مثال ایسی ہے جیسا کہ ایک طاق ہو اور اس میں چراغ رکھا ہوا ہو۔

"شمول رحمت" کی نسبت کا تیسرا شعبہ اسماء الٰہیہ کے انوار میں نفس کا رنگا جانا ہے اس کی حقیقت بیان کرنے سے پہلے ایک مقدمہ کی ضرورت ہے، معلوم ہونا چاہیے کہ اسمائے الٰہیہ خواہ وہ اسمائے بسیط ہوں جیسے کہ اللہ، رحمٰن، اور رحیم ہیں۔ یا وہ اسمائے مرکبہ ہوں جیسے قرآن مجید کی وہ آیتیں اور دعائیں ہیں جو ذات واجب کی صفات پر دلالت کرتی ہیں مثلاً آیت الکرسی، **قل ھو اللہ احد**، یا سورہ حشر کی آخری آیتیں۔ الغرض خدا تعالیٰ کے یہ بسیط اور مرکب اسماء عالم مثال میں اپنی مستقل صورتوں کے ساتھ موجود اور قائم ہیں۔ چنانچہ میں نے جب ان کی مثالی صورتوں کو بنظر تعمق دیکھا تو مجھ پر یہ حقیقت آشکارا ہوئی کہ اسمائے الٰہیہ کی ان صورتوں کے عناصر بدن تو قوت مثالیہ سے ہیں اور ان کا تخیل ملا اعلیٰ کی طرف سے ہے۔ اور ان صورتوں کی روح ان اسماء کی

اپنی ذاتی اور اضافی صفات ہیں۔ ذاتی صفات جیسے اللہ، رحمٰن، رحیم اور اضافی صفات جیسے رزاق اور قہار وغیرہ ہیں۔ اس کے ساتھ میں نے یہ بھی دیکھا کہ عالم امثال میں اسماء کی یہ صورتیں اور قالب سرتاپا نور ہی نور ہیں۔

مقدمہ تو یہاں ختم ہوگیا اب ان اسمائے الٰہیہ کے رنگ میں نفس کے رنگے جانے کا بیان شروع ہوتا ہے اس ضمن میں جاننا چاہیے کہ مرد مومن جب ان اسمائے الٰہیہ کا سچی نیت اور پوری توجہ سے ذکر کرتا ہے اور اس کا دل ان اسماء کو اپنے اندر محفوظ کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہو جاتا ہے۔ تو اس شخص کے باطن کی طرف اسمائے الٰہی کی ان مثالی صورتوں سے ایک دروازہ کھلتا ہے۔ جس سے اس کے دل پر نور اور ٹھنڈک کا نزول ہوتا ہے۔ اور وہ اس کیفیت میں بڑی لذت محسوس کرتا ہے۔ اس شخص کو جب ان اسماء کے ذکر میں لذت ملتی ہے تو وہ اور زیادہ تن دہی اور ہمت سے ان کے ذکر میں لگ جاتا ہے۔ چنانچہ جتنی زیادہ تن دہی سے وہ ان اسماء کا ذکر کرتا ہے اسی حساب سے اس پر انوار کا فیضان بڑھتا جاتا ہے۔ دراصل یہی وہ سبب ہے جس کی بنا پر انبیاء علیہم السلام ہمیشہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ جو دعائیں ماثور اور مقرر ہیں دعا کرنے والا ان دعاؤں کے الفاظ اور صیغوں کا پورا پورا لحاظ رکھے، اسی وجہ سے انہوں نے ان اسماء الٰہی میں سے بعض کو اسم اعظم قرار دیا ہے۔ اور بعض دعاؤں کی خاص تاثیرات بیان فرمائیں اسی لئے اس سلسلے میں انہوں نے اس امر کو تسلیم نہیں کیا کہ دعاؤں کی تاثیر صرف اس وقت ہوگی جب کہ دعا کرنے والا، ان دعاؤں کے خواص سے واقف ہو چکا ہو۔ چنانچہ ذکر کی مجالس میں بارہا یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ جوں ہی ذاکر کی زبان سے اللہ کا اسم نکلا تو فوراً ہی اس اسم کے ایک عظیم الشان حقیقت بڑے جوش وخروش سے ظاہر ہوئی اور اس نے ذاکر کے دل کو گھیر لیا۔ ''اللہ'' کے اسم کی اس حقیقت سے ایک شاہراہ جو بڑی کشادہ ہے، ذات حق کی طرف کھلتی ہے۔

اس (۱) ضمن میں فقیر کو اس بات سے بھی آگاہ کیا گیا ہے کہ ''دعوت اسماء'' والوں میں سے

---

(۱) یہ عبارت ''ہمعات کے خطی نسخے میں جو ۱۳۰۱ھ کا لکھا ہوا ہے لیکن کتاب کے ایک مطبوعہ نسخے میں یہ عبارت نیچے حاشیے میں ان الفاظ کیساتھ درج ہے، میں نے بعض نسخوں میں یہاں یہ عبارت بھی دیکھی ہے، معلوم نہیں یہ اصل کتاب میں سے ہے یا بعد کے ملحقات میں سے۔

جب کوئی شخص اسمائے الٰہی میں سے کسی اسم کے ذکر میں مشغول ہو جاتا ہے اور وہ اس اسم کی اس قدر تلاوت کرتا ہے کہ اس اسم کا عالم مثال میں جو قالب ہے اس کو تلاوت کرنے والے کا دل اس مثالی قالب کی حقیقت سے متصل ہو جاتا ہے۔ تو اس کے اور اس اسم کے درمیان ایک کشادہ راہ کھلتی ہے، اس کے بعد اس اسم کے مخصوص آغاز، خواہ وہ عالم انفس میں ہوں یا عالم آفاق میں، اس اسم کی طرف، ذرا سی توجہ کرنے یا اس اسم کے نور سے ربط پیدا کرنے سے، تلاوت کرنے والے پر ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ اسی طرح ایک عبادت گزار جب نماز، ذکر اور دوسری طاعات میں مشغول ہوتا ہے اور کثرت سے نماز پڑھتا ہے اور ذکر و طاعت کرتا ہے تو اس طاعت کا نور جو عالم مثال میں ایک مستقل صورت رکھتا ہے اس عبادت گزار سے اتصال پیدا کر لیتا ہے اور اس کے نفس کا احاطہ کر کے یہ فوراً اس کا مربی بن جاتا ہے الغرض ان احوال میں سے کسی حال میں بھی جب سالک چشم بصیرت کو اس نور سے پیوستہ کر دیتا ہے اور وہ اس کی طرف کلیۃً متوجہ ہو جاتا ہے تو اس مقام پر پہنچ کر یہ شخص قوائے الٰہی کو انفس یعنی لوگوں کے نفوس اور آفاق یعنی عالم کائنات میں برسر کار لانے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ بنی اسرائیل کے عابدوں کو یہی نسبت حاصل تھی۔ اور ان کی دعاؤں کا قبول ہونا اور اس طرح کے اور عجیب عجیب آثار و کرامات جو ان سے ظاہر ہوتے تھے اس نسبت کی برکت سے ان کو یہ خصوصیت حاصل تھی۔

اس نسبت کو حاصل کرنے کا سب سے یقینی طریقہ یہ کہ اسم ''اللہ'' کا ذکر کیا جائے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ ذکر کے وقت ادھر ادھر کے پریشان کن خیالات سے خالی اور اس کا پیٹ، بول و براز اور ریح سے فراغت پا چکا ہو۔ ذاکر کو چاہیے کے ذکر کرتے وقت نئے سرے سے وضو و طہارت کرے۔ اور ایک ہزار بار اسم ''اللہ'' کا ذکر کرنے کے بعد درود پڑھے، ذکر کرتے وقت وہ لفظ اللہ کی تشدید پر زور دے اس لفظ کو اس کے صحیح مخرج سے نکالے اور تھوڑی دیر کے بعد دوران ذکر میں وہ اس نور کا تصور کرتا جائے جو فضا میں پھیلا ہوا ہے۔ چنانچہ جب وہ اس طریق سے چند ہزار بار اسم اللہ کا ذکر کریگا تو یقیناً اس نور سے اس کا اتصال ہو جائے گا۔ اس کے بعد یہ حالت ہوگی کہ اگر یہ شخص تسبیح تحمید، تہلیل، استغفار اور لاحول پڑھنے کی طرف ذرا سی توجہ کرے گا تو وہ نور ان صفات کے رنگ میں جن کی طرف تسبیح و تحمید کے یہ کلمات اشارہ کرتے ہیں

متشکل ہو کر اسے نظر آنے لگے گا۔ اور اس کے آثار بھی جہاں انفس و آفاق میں ظاہر ہوں گے۔

اس نسبت کو نماز میں حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ سالک نماز کو تو مختصر کرے اور نماز کی رکعات زیادہ سے زیادہ ہوں۔ نماز کے دوران میں وہ بار بار تازہ وضو کرے اور فضا میں نور الٰہی پھیلا ہوا ہے اس کا برابر تصور کرتا جائے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ جملہ ارکان کے ساتھ نماز میں زیادہ رکعتیں پڑھنا اس نور کو پیدا کرتا ہے۔ نیز استفتاحی دعاؤں کے پڑھنے سے بھی حلاوت مناجات کی نسبت حاصل ہو جاتی ہے۔ چنانچہ شارع علیہ السلام نے ان امور میں سے ہر ایک کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔

یہاں اس امر کی بھی صراحت کر دینا ضروری ہے کہ ہمارے زمانے کے بعض صوفیاء یہ سمجھتے ہیں کہ چونکہ نماز میں کمال خشوع وخصوع نہیں ہوتا اس لئے نماز سے کوئی فائدہ نہیں ان لوگوں کی باتیں محض از قسم ظن ہیں۔ اور ان کا نماز کو بے فائدہ سمجھنا اس لئے ہے کہ یہ لوگ "حلاوت ذکر" کی نسبت سے واقف نہیں۔ الغرض اسم اللہ کا ذکر، ذات باری کی طرف تین جہت سے پرواز کرتا ہے ایک ملائکہ کی جہت سے، جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں۔

دوسرے خود اس اسم اور عالم مثال میں جو اسکی شکل ہے اس جہت سے اور تیسرے نفس ناطقہ میں اس ذکر سے ہمت پیدا ہوتی ہے۔ اور ترقی کر کے حظیرۃ القدس کے مقام تک پہنچ جاتا ہے۔ باقی ان امور کو اللہ بہتر جانتا ہے۔

قصہ مختصر حلاوت مناجات، شمول رحمت اور انوار اسمائے الٰہی یہ تینوں کے تینوں شعبے طاعات کا مقصد ہے۔ بعض طاعات ایسی ہوتی ہیں جن میں "حلاوت، مناجات" زیادہ ہوتی ہے۔ بعض ایسی ہیں جن میں شمول رحمت زیادہ اور بعض میں "انوار اسماء" کا غلبہ ہوتا ہے۔

اس فقیر کو اس امر سے بھی مطلع کیا گیا ہے کہ مجذوب وغیر مجذوب دونوں کے دونوں عالم برزخ، عالم قیامت اور اس کے بعد جو منازل ہیں ان سب میں یکساں ہونگے۔ جس طرح کہ آج اس زندگی میں شرعی اور عرفی احکام کے معاملے میں عارف اور مبتدی میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا اور ان میں ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دیجاتی۔ اسی طرح مجذوب وغیر مجذوب کے درمیان کوئی تفاوت نہیں ہوگا۔ باقی رہا مجذوب کی مجذوبیت کا مسئلہ سو وہ اس کا اپنا ایک ذاتی کمال ہے جس کا

معاملہ اس کے اور اللہ کے درمیان ہے۔ مجذوب نے یہ مجذوبیت کسی غرض کے لئے حاصل نہیں کی تھی۔ اس کا مقصود تو مجذوبیت کا محض مجذوبیت کی خاطر حاصل کرنا تھا۔ نہ کہ اس سے کسی دوسری چیز کے حصول کا ذریعہ بنانا۔ الغرض اس زندگی کے بعد آخرت میں انسان کو جو بھی عزت و رفعت ملے گی وہ اس کی اسی ''نسبت سکینہ'' کا نتیجہ ہوگی جس کے تین شعبے ''حلاوت مناجات، شمول رحمت، اور انوار اسمائے الٰہی'' ہیں۔ اس ضمن میں مجھے اس شخص کی حالت پر بڑا تعجب ہوتا ہے جو سکینہ کی اس نسبت کی طرف مطلق التفات نہیں کرتا بلکہ اس کے خلاف وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس نسبت سے اس کے کاروبار میں خلل پڑتا ہے۔ چنانچہ اس کا یہ کہنا ہے کہ اس علمی نسبت سے میرے خیالات میں تشویش پیدا ہوتی ہے لیکن کیا یہ شخص نہیں جانتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام اور ان کے بعد جو تابعین تھے ان کی زندگیوں میں یہی نسبت سب سے روشن تھی۔ بہرحال ''کل حزب بما لدیهم فرحون'' ہر شخص اپنی اپنی پسند پر نازاں ہوتا ہے۔ اور جو کچھ بھی اسے مل جائے وہ اسی پر پھولا نہیں سماتا۔

............☆☆☆............

نسبت اویسیہ

ان نسبتوں میں سے جو ارباب تصوف کے یہاں معتبر ہیں ایک نسبت اویسیہ ہے۔ نسبت اویسیہ کو ''طہارت، اور سکینہ'' نسبتوں کے درمیان برزخ سمجھئے یعنی یہ ان دونوں سے ربط رکھتی ہے۔

''نسبت اویسیہ'' کی تفصیل یہ ہے کہ انسان میں ایک نفس ناطقہ ہے جو بمنزلہ ایک آئینے کے ہے، جس میں انسان کی روحانی کیفیات کا بھی عکس پڑتا ہے اور اس کے جسمانی احوال کا بھی۔ انسان کی ان روحانی کیفیات اور اس کے جسمانی احوال میں سے ہر کیفیت اور ہر حالت میں قدرت نے ایک استعداد رکھی ہے چنانچہ اسکی وہ استعدادیں جن کا تعلق جسمانی احوال سے ہے اور وہ استعدادیں جو اس کی روحانی کیفیات سے متعلق ہیں ان دونوں میں کلی تنافر اور اختلاف ہے روحانی کیفیات میں سے ایک کیفیت یہ ہے کہ سالکین راہ طریقت جب عالم ناسوت کی پستی سے نکل کر عالم ملکوت کی بلندی پر فائز ہوتے ہیں۔ اور خسیس اور ناپاک اعتبارات کو کلیۃً ترک کر دیتے ہیں، تو اس حالت میں وہ لطیف اور خوشگوار کیفیات میں اس طرح سرشار ہو جاتے ہیں گویا ان کے نفوس ان کیفیات میں ڈوب کر بالکل فنا ہو گئے۔ چنانچہ اس مقام میں ان سالکوں کی حالت اس مشک کی سی ہو جاتی ہے جس میں پوری قوت سے ہوا بھر دی گئی ہے اور اس کی وجہ سے وہ اس طرح پھول گئی ہے کہ خواہ اسے پانی میں ڈال دیں وہ کسی طرح تہہ آب نہیں ہوتی۔ ان نفوس کو جب یہ کیفیت حاصل ہو جاتی ہے تو اس وقت ان کے آئینہ دل پر اوپر سے ایک رنگ کا فیضان ہوتا ہے۔ جس کی برکت سے ان کو نیک روحوں سے خاص مناسبت پیدا ہو جاتی ہے اور ان نیک روحوں کی کیفیات مثلاً انس وسرور وانشراح قلبی، عالم غیب کی طرف جذب وتوجہ اور ان حقائق اشیاء کا انکشاف جو دوسروں کے لئے راز سربستہ کا حکم رکھتے ہیں۔ غرضیکہ ان نیک روحوں کے ساتھ اس

طرح کی مناسبت سے یہ نفوس ان کیفیات سے بہرہ مند ہو جاتے ہیں۔ اب یہ دوسرا سوال ہے کہ یہ مناسبت انبیاء کی نیک روحوں سے ہو یا اولیاء امت کی روحوں سے یا فرشتوں سے۔

بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ سالک کو کسی خاص روح سے خصوصی مناسبت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اس طرح کہ سالک نے اس بزرگ کے فضائل سنے اور اسے اس بزرگ سے غیر معمولی محبت ہو گئی۔ چنانچہ اس محبت کی وجہ سے سالک اور اس بزرگ کی روح کے درمیان ایک کشادہ راہ کھل جاتی ہے یا یہ ہوتا ہے کہ یہ خاص روح جس سے کہ سالک کو مناسبت خصوصی پیدا ہو گئی۔ اس کے مرشد یا آباواجداد میں کسی بزرگ کی روح تھی اور اس بزرگ کی روح میں ان لوگوں کے لیے جو اس سے منسوب ہیں ارشاد و ہدایت کی ہمت موجود ہے۔ یا یوں ہوتا ہے کہ سالک اپنے فطری جذبے یا جبلی تقاضے سے جس کا سمجھنا نہایت مشکل ہے کسی خاص روح سے مناسبت پیدا کر لیتا ہے۔ چنانچہ سالک اس بزرگ کو خواب میں دیکھتا ہے اور اس سے مستفید ہوتا ہے یہ فقیر جب عالم ارواح کی طرف متوجہ ہوا تو اس نے وہاں ارواح کے یہ طبقے دیکھے۔

ایک ملاء اعلیٰ کا طبقہ: اس طبقے میں میں نے عالی مرتبہ اور کائنات کا انتظام کرنیوالے فرشتوں مثلاً جبرئیل اور میکائیل کو پایا۔ نیز میں نے اس مقام پر بعض ایسے انسانی نفوس کو دیکھا کہ وہ ان ملائکہ کبار سے ملحق ہیں اور سرتاپا ان کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں جب کسی سالک کو اس طبقے کیساتھ ''نسبت اویسی'' حاصل ہوتو اس کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ سالک کے لوح دل پر ذات باری کی ''صورت علمی'' اس طرح منقش ہو جاتی ہے کہ کائنات کے انتظام کے سلسلے میں قدرت الٰہی کے یہ چار کمالات یعنی ابداع (۱) خلق، تدبیر، اور تدلی ایک ہی بار اس صورت علمی کے ضمن میں اس کے دل پر ظاہر ہو جاتے ہیں اور سالک کو قدرت الٰہی کے ان چار کمالات کا علم بغیر کسی ارادے اور قصد کے اور بدون غور و فکر سے کام لئے، حاصل ہو جاتا ہے، بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ نظام عالم کے متعلق جو کلی تدبیریں اور عمومی فیصلے حظیرۃ القدس میں طے ہوتے ہیں۔ ''نسبت اویسی'' کی تاثیر سے یہ خود بخود سالک کے دل پر نقش ہو جاتے ہیں یہ نسبت بیشتر انبیاء کو

(۱) ابداع: عدم سے عالم کو وجود میں لانا ابداع ہے۔ اسباب کے توسط سے کسی چیز کو معرض وجود میں لانا خلق ہے۔ مصالح کے پیش نظر تخلیق کے اسباب میں تصرف کرنا تدبیر کہلاتا ہے۔ اس عالم اسباب سے اوپر جو عالم ہے اس میں جو تدبیر الٰہی مصروف کار ہے اسے تدلی کہتے ہیں۔

حاصل ہوتی ہے۔ جوعلوم ومعارف انبیاء سے ظاہر ہوتے ہیں وہ اکثر اسی نسبت کے سرچشمے سے پھوٹتے ہیں۔

ملاءاعلیٰ کے بعد میں نے عالم ارواح میں ایک دوسرا طبقہ ملاء سافل کا دیکھا جس شخص کو اس طبقے سے نسبت اویسی حاصل ہو،اس کی علامت یہ ہے کہ اسے خواب و بیداری دونوں حالتوں میں فرشتے نظر آتے ہیں،فرشتوں کی یہ جماعت جن کاموں پر مامور ہے۔سالک انہیں ان کاموں کو کرتا ہے۔اوراس ضمن میں ان کو آتے جاتے دیکھتا ہےاورانہیں جانتااور پہچانتا بھی ہے۔

عالم ارواح کا تیسرا طبقہ مشائخ صوفیاء کی ارواح کا ہے۔ یہ ارواح خواہ مجموعی طور پر یک جا ہوں یا فرداً فرداً،الگ الگ جس شخص کو اس طبقے سے نسبت اویسی حاصل ہوتی ہےضروری ہے کہ اسے اس نسبت کی وجہ سے صوفیا کی ان ارواح سے عشق ومحبت پیدا ہو۔

اوروہ ''فنافی الشیخ'' ہوجائے اس حالت میں فنافی المشائخ کی یہ کیفیت اس کی زندگی کے ہر ہر پہلو میں موثر ہوتی ہے جیسے کہ درختوں کی جڑوں میں پانی دیا جاتا ہےتو اس پانی کا اثر تازگی کی صورت میں درخت کی ہر شاخ، ہر پتی اوراس کے پھولوں اور پھل تک میں سرایت کر جاتا ہے۔ لیکن فنافی الشیخ کی اس نسبت سے ہر شخص میں ایک سی کیفیت پیدا نہیں ہوتی چنانچہ اس کی وجہ سے ایک شخص پر ایک حال وارد ہوتا ہے دوسرے پر ایک دوسری کیفیت طاری ہوتی ہے۔فنافی الشیخ کی نسبت کے سلسلے میں مشائخ کے عرسوں کا قیام،ان کی قبروں کی پابندی سے زیارت کرنا وہاں جاکر فاتحہ پڑھنا،ان کی ارواح کے نام صدقہ دیناان کے آثار وتبرکات ان کی اولاد اوران کے متعلقین کی تعظیم وتکریم میں پوراپورا اہتمام کرنا یہ سب امور داخل ہیں۔

اوپر کی ان نسبتوں میں سے جس شخص کو کوئی بھی نسبت حاصل ہوگئی وہ لازمی طور پر اس خاص نسبت کے آثار کی طرف طبعاً میلان رکھے گا۔خواہ اس نے اس نسبت کے متعلق کسی سے کچھ سنایا نہ سنا ہو۔یا کسی کو اس حال میں دیکھا ہو یا نہ دیکھا ہو۔اس شخص کا اس خاص نسبت کی طرف یہ میلان طبعی اورفطری ہوتا ہے بالکل اسی طرح جس طرح کہ ایک شخص جوان ہوتا ہے اس کے اندر مادۂ منویہ پیدا ہو جاتا ہےتو لامحالہ اس کو بیوی کی خواہش ہوتی ہے۔اوراس کے دل میں بیوی کے لئے عشق ومحبت پیدا ہو جاتی ہے۔

الغرض سالک جب ان نسبتوں میں سے کسی ایک نسبت سے بہرہ مند ہو جاتا ہے تو عالم ارواح کے طبقوں میں سے جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے جس طبقے کی وہ نسبت ہوتی ہے اس طبقے کی ارواح کو وہ خواب میں دیکھتا ہے۔ان کے فیوض سے متغیر ہوتا ہے اور جب کبھی زندگی میں اسے خطرات اور مصائب پیش آتے ہیں تو عالم ارواح کے اس طبقے کی صورتیں اس کے روبرو ظاہر ہوتی ہیں اس ضمن میں اس کی جو بھی مشکل حل ہوتی ہے وہ اسے ارواح کی ان صورتوں کی طرف منسوب کرتا ہے مختصراً یہ اور اس طرح کی اور چیزیں جو اسے حاصل ہوتی ہیں۔وہ اسی نسبت کا ثمرہ ہوتا ہے۔

اس سلسلے میں یہ بھی ملحوظ رہے کہ نسبت اویسی رکھنے والے کو اس خاص نسبت کی جو ارواح ہیں ان سے اس طرح کا ربط پیدا ہو جاتا ہے کہ یہ چیز اس شخص کی روح کے جوہر اصلی میں داخل ہو جاتی ہے اور وہ بیداری اور حالت خواب میں اس کیفیت کو اپنے اندر پاتا ہے لیکن جب یہ شخص سوتا ہے اس کے ظاہری حواس،نفسانی خواہشات کے اثر وتصرف سے امن میں ہوتے ہیں اور وہ فی الجملہ طبیعت کے تقاضوں اور اس کے احکام سے رہائی حاصل کر لیتا ہے۔تو اس حالت میں وہ تمام صورتیں جو اس کے دل کے اندر جمع ہوتی ہیں،خواب میں برملا طور پر اس کو اپنے سامنے نظر آتی ہیں اور وہ ان کی طرف پوری طرح متوجہ ہو جاتا ہے۔چنانچہ سالک پر اس مقام میں عجیب عجیب چیزیں اور طرح طرح کے معاملات ظاہر ہوتے ہیں۔

الغرض ان ''اویسی نسبتوں'' میں سے سالک کو کسی نسبت سے بھی تعلق ہو،مجموعی طور پر ان سب نسبتوں کا حاصل یہ ہے کہ سالک رویا میں طرح طرح کے واقعات دیکھتا ہے اور اچھی اچھی خوشخبریاں سنتا ہے،دوسرے لوگ اس کے متعلق جو خواب میں دیکھتے ہیں ان خوابوں میں اس شخص کی عظمت و جلال کے جو شواہد انہیں نظر آتے،اس وجہ سے یہ لوگ اس کے معتقد ہو جاتے ہیں نیز اس شخص کو مصائب اور پریشانیوں میں غیب سے مدد ملتی ہے اور وہ اکثر اپنی معاش کے معاملات میں تائید غیبی کو مصروف عمل پاتا ہے اسی طرح وہ سالک جو کسی ظاہری پیر کے بغیر صوفیاء کرام کے طریقے پر گامزن ہیں۔انہیں اس ضمن میں ''جذب'' اور راحت کی کیفیات بھی میسر ہیں۔ان کی توجہ غفلت اور مصروفیت کے تمام مواقع کے باوجود غیب سے نہیں ہٹی،ان سالکوں کی یہ حالت یقیناً اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ان کو ارواح کے ساتھ نسبت اویسی حاصل ہے۔اب یہ دوسری بات

ہے کہ وہ اس تفصیلی نسبت سے واقف ہوں یا انہیں اس نسبت کا سرے سے علم ہی نہ ہو۔

اس ضمن میں یہ بھی واضح رہے کہ اس سے پہلے اولیائے امت کی پاک روحوں کی بڑی کثرت تھی اور فضا ان سے بھری ہوئی تھی۔ وہ لوگ جن میں استعداد ہوتی، انہیں ان پاک روحوں کے توسط سے ملائکہ مقربین کی یہ نسبت حاصل ہو جاتی اور اس مقام سے ان کے لئے نبوت اور حکمت کے علوم مترشح ہوتے چنانچہ اس نسبت رکھنے والوں میں سے جسے انسانوں کیلئے مبعوث کیا جاتا، اسے لوگ نبی کہتے۔ اور جو اس طرح انسانوں کیلئے مبعوث نہ ہوتا وہ حکیم اور محدث کہلاتا لیکن جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت عمل میں آئی اور آپ کی بعثت کی جو صورت عالم مثال میں تھی، وہ اس عالم اجسام میں منتقل ہوگئی اور اس سے یہ ساری فضا بھر گئی اور یہاں کثرت سے ارواح امت بھی پیدا ہوگئیں تو اس کی وجہ سے وہ کیفیت جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے تھی لوگوں کی نظروں سے روپوش ہوگئی، بعینہ اس طرح جس طرح کہ فضا میں گھٹا چھا جانے سے آفتاب آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالی کے اسرار میں سے جو بھی چیز اس عالم میں ظاہر ہوتی ہے لامحالہ دوسرے عالم میں جسے عالم مثال کہتے ہیں، اس چیز کی ایک نہ ایک شکل اور صورت ہوتی ہے جس کی طرف یہ چیز منسوب ہوتی ہے چنانچہ جب کوئی شخص عالم غیب کی طرف توجہ کرتا ہے تو عالم غیب کی بھی اس طرف توجہ ہوتی ہے۔ لیکن عالم غیب کی یہ توجہ اسے ہمیشہ متشکل نظر آتی ہے عالم غیب کی توجہ کے اس مثالی مظہر کا قالب رسول اللہ علیہ الصلوۃ والسلام کی ذات تھی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں سے جس شخص نے کہ سب سے پہلے جذب کا دروازہ کھولا اور اس راہ پر وہ سب سے پہلے گامزن ہوئے وہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صوفیا کے تمام سلسلے ان کی طرف منسوب ہیں۔ مگر ان سلسلوں کا تعلق باعتبار روایت حضرت علی (۱) سے ثابت نہیں کیا جا سکتا اور نہ یہ معلوم ہو سکا کہ آخر حسن بصریؒ کے ساتھ حضرت علیؓ کا کونسا

(تصوف کے سلسلوں کا شجرہ یوں بیان کیا گیا ہے کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے تصوف کے معارف لدنی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حاصل کئے اور ان سے حضرت حسن بصریؒ نے ان معارف کو اخذ کیا پھر ان سے تمام صوفیاء کے سلسلے چلتے ہیں امام شاہ ولی اللہ قرۃ العینین میں لکھتے ہیں کہ حضرت علیؓ سے حضرت حسن بصریؒ کا اتصال اور ان سے آپ کا خرقہ خلافت پہننا نہ اہل تشیع کے ہاں ثابت ہے نہ اہل سنت کے یہاں)

خصوصی علاقہ تھا۔ جو آپ کا دوسروں کیساتھ نہ تھا۔ لیکن اس کے باوجود تمام کے تمام صوفیا کا نسلاً بعد نسل اس بات پر اتفاق چلا آتا ہے کہ طریقت کے سارے سلسلے حضرت علیؓ کی طرف راجع ہیں۔ ظاہر ہے ان بزرگوں کا یہ اتفاق بغیر کسی وجہ کے نہیں ہوسکتا۔ فقیر کے نزدیک چونکہ حضرت علیؓ اس امت کے پہلے مجذوب(۱) ہیں اس لئے طریقت کے تمام سلسلے آپ کی طرف منسوب ہیں حضرت علیؓ کے بعد اولیائے کرام اور اصحاب طرق کا سلسلہ چلتا ہے ان میں سب سے زیادہ قوی الاثر بزرگ جنہوں نے راہ جذب کو باحسن وجوہ طے کر کے نسبت اویسی کی اصل کی طرف رجوع کیا اور اس میں نہایت کامیابی سے قدم رکھا وہ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی ذات گرامی ہے اسی بنا پر آپ کے متعلق کہا گیا ہے کہ موصوف اپنی قبر میں زندوں کی طرح تصرف کرتے ہیں۔ اس ضمن میں فقیر کو اس حقیقت سے بھی آگاہ کیا گیا ہے کہ شیخ عبدالقادرؒ کا مسلک طریقت یہ ہے کہ جذب کی راہ طے کرنے کے بعد "نسبت اویسی" کا جو حاصل مقصود ہے اس کے رنگ میں سالک اپنے آپ کو رنگ دے۔ مزید برآں ملت مصطفویؐ میں بالعموم اور اس زمانے میں خاص طور پر ان دونوں بزرگوں یعنی حضرت علیؓ اور شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے بڑھ کر کوئی اور بزرگ خرق عادات و کرامات میں مشہور نہیں ہیں۔ اس لئے ان کی یہ شہرت اس امر کا تقاضا کرتی ہے کہ سالک جب عالم غیب کی توجہ اپنی طرف مبذول پائے تو وہ اس توجہ کو ان بزرگوں میں سے کسی نہ کسی صورت میں متشکل دیکھے، الغرض ان امور کے پیش نظر آج اگر سالک کو کسی خاص روح سے مناسبت حاصل ہو جائے اور وہاں سے اسے فیض پہونچے تو اس واقعہ کی اصل حقیقت غالباً یہ ہوگی کہ اسے یہ فیض یا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے حاصل ہو یا امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی نسبت سے یا یہ فیض حضرت غوث اعظمؒ کی نسبت سے ملا۔

راہ طریقت کے بعض سالک ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں تمام ارواح سے نسبت حاصل ہوتی ہے اس طرح کی یہ نسبت بالعموم عارضی اسباب کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ مثلاً سالک کو اس بزرگ سے غیر معمولی محبت ہے اور اس بزرگ کی قبر پر وہ اکثر جاتا ہے۔ اس نسبت کا انحصار یا تو سالک کی اپنی استعداد پر ہوتا ہے کہ اس میں فیض حاصل کرنے کی خود کتنی قابلیت ہے دوسری چیز اس خاص بزرگ

(۱) تصوف کی زبان میں، (قاسمی)

کا اثر ونفوذ ہے جس سے سالک کو ربط ہوتا ہے۔ اب اگر وہ بزرگ اپنے سلسلے کے متعلقین کی تربیت میں بڑی ہمت دیکھتا تھا اور اس دنیا سے انتقال کے بعد بھی اس کی روح میں تاثیر وتصرف کی یہ ہمت ہنوز باقی ہے تو اس اعتبار سے سالک کے باطن میں اس نسبت کو پیدا کرنے میں مرشد کا اثر بڑا کام کریگا۔ اس سلسلے میں بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ سالک کو "اویسی نسبت" گو تمام عالم ارواح سے بالا جمال حاصل ہوتی ہے لیکن بعض اسباب ایسے ہوتے ہیں جن کی وجہ سے یہ نسبت تمام ارواح کے بجائے کسی خاص بزرگ کی صورت میں متشخص نظر آتی ہے۔

یہ فقیر جب مشائخ صوفیا کی ارواح کی طرف متوجہ ہوا تو اس نے ان کی توجہ اور اس کے اثرات کو مختلف صورتوں میں اپنے اندر منعکس پایا اس توجہ کے اثرات میں سے ایک اثر یہ تھا کہ اس سے طبیعت کی بہیمی قوتیں یکسر ملکی رنگ میں اس طرح رنگی گئی گویا کہ بہیمیت ملکیت میں بالکل فنا ہوگئی اس سلسلے میں فقیر کو بتایا گیا ہے کہ جب مشائخ صوفیاء کو انتقال فرمائے چار سو سال یا پانچ سو سال یا اس کے قریب گزر جاتے ہیں تو ان کے نفوس کی طبعی قوتیں جو زندگی میں ان کی ارواح کو خالص مجرد صورت میں ظاہر ہونے نہیں دیتی تھیں۔ اتنا عرصہ گزرنے کے بعد یہ طبعی قوتیں بے اثر ہو جاتی ہیں اور اس دوران میں ان نفوس کے "نسمہ" یعنی روح ہوائی کے اجزاء منتشر ہو جاتے ہیں اس حالت میں جب ان مشائخ کی قبور کی طرف توجہ کی جاتی ہے تو ان مشائخ کی ارواح سے اس توجہ کرنے والے کی روح پر ایک رنگ کا فیضان ہوتا ہے۔ اس فیضان کی مثال ایسی ہے جیسے آفتاب کسی مرطوب چیز پر اپنی شعاعیں ڈالے، اس کی گرمی سے یہ رطوبت تحلیل ہو جائے۔ اور اس مرطوب چیز سے پانی کے قطرات ٹپکنے لگیں۔ یا اس کی مثال یوں سمجھئے کہ توجہ کرنے والے کی روح ایک حوض کے مشابہ ہے جو پانی سے بھرا ہوا ہے اور آفتاب کی روشنی نے ہر طرف سے اس کا احاطہ کر لیا ہے۔ چنانچہ وہ حوض آفتاب کی شعاعوں سے اس طرح چمک اٹھتا ہے گویا کہ وہ سرتاپا ایک شعاع بن گیا ہے، ارواح مشائخ کی طرف توجہ کرنے والا سالک جب اس منزل میں پہنچتا ہے تو اس میں "یادداشت" یا "توجہ بجانب غیب" کی کیفیت ظاہر ہوتی ہے اور یہ کیفیت اس شخص کی روح کو ہر طرف سے گھیر لیتی ہے۔

ان امور کے ضمن میں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ توجہ ارواح کا اثر دو طرح ہوتا ہے، ایک تو یہ

کہ توجہ کرنے والا اپنی روح کی اس حالت کا تصور کرے جو حالت مرنے کے بعد قبر میں اس کی ہوگی۔ اس کے بعد وہ روح کی اس حالت کو اپنے اوپر طاری کرے۔ اس سے اس شخص پر ایک رنگ کا فیضان ہوگا۔ سالک کو چاہیے کہ وہ اس رنگ میں غور وتامل کرے اور اس کی حقیقت کو پہچاننے کی کوشش کرے بالکل اسی طرح کہ سایہ ناپنے والے آلہ سے آفتاب کی بلندی ناپی جاتی ہے یا جیسے ایک شخص اپنے چہرہ کو آئینے میں دیکھتا اور اسے پہچاننے کی کوشش کرتا ہے۔

توجہ ارواح کی اثر آفرینی کی دوسری قسم یہ ہے کہ مثلاً سالک نے ایک بزرگ کی قبر پر توجہ کی چنانچہ صاحب قبر کی روح اس پر منکشف ہوگئی اور سالک نے اس بزرگ کی روحانی کیفیات کا واضح طور پر مشاہدہ کرلیا بعینہٖ اسی طرح جیسے کوئی شخص آنکھ کھولے اور اس کے سامنے جو چیز پڑی ہو، اسے وہ اچھی طرح سے دیکھ لے۔ لیکن سالک کا یہ دیکھنا چشم ظاہر سے نہیں بلکہ چشم باطن سے ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ اس سلسلے میں یہ بھی جاننا ضروری کہ انبیاء علیہم السلام کو فطری طور پر ملائکہ مقربین سے جو کائنات کے مدبر اور منتظم ہیں۔ خاص نسبت حاصل ہوتی ہے۔ اور اسی وجہ سے انبیاء کے سامنے نفوس افلاک، ملاءاعلیٰ نیز اس ''تجلی حق'' کی طرف جو کہ شخص اکبر(۱) کے دل پر قائم ہے ایک کشادہ راہ کھل جاتی ہے۔ اور وہاں سے ان کے نفوس پر کلی علم کی صورت کا فیضان ہوتا ہے۔ چنانچہ کلی علم کی موجودگی میں انبیاء کو تفصیلی علوم کی ضرورت نہیں رہتی، علمی صورت کا یہ فیضان انبیاء کے نفوس پر جس طریق سے ہوتا ہے یہ طریق راہ جذب وسلوک سے ایک الگ چیز ہے۔

لیکن یہ جاننے کے باوجود جو لوگ انبیاء کے کلام کو وحدت الوجود پر حمل کرتے ہیں وہ نہ تو انبیاء کی حقیقت کو پہچانتے ہیں۔ اور نہ انہیں انبیاء کے خصوصی مسلک کی کچھ خبر ہے۔

............☆☆☆............

(۱) عالم علوی اور سفلی دونوں کے مجموعے کا نام شخص اکبر ہے، شخص اکبر کو نفس کلیہ کہتے ہیں اور اس کے جسد یا جسم کو جسد کل، ان اصطلاحات تصوف کو ذہن نشین کرنا ضروری ہے۔ (قاسمی)

نسبت یادداشت

ان نسبتوں سے جن کا تعلق راہ جذب سے ہے، ایک نسبت ''یادداشت'' کی بھی ہے۔

نسبت یادداشت کی وضاحت سے پہلے چند تمہیدی امور بطور مقدمہ کے بیان کرنا ضروری ہے۔

جب ہم کسی چیز کا علم حاصل کرتے ہیں خواہ وہ چیز از قسم مجرد ہو یا وہ چیز متحیز یعنی جگہ گھیرنے والی ہو یا متحیز کے متعلقات میں سے ہو تو ہمارے اس علم کی نوعیت یہ ہوتی ہے کہ ہمارے ذہن میں اس چیز کی ایک صورت منقش ہو جاتی ہے اور یہ ذہنی صورت آگے چل کر ذریعہ بنتی ہے، اس چیز کی اصل حقیقت کے انکشاف کا۔ یعنی جب ہم نے کسی چیز کا علم حاصل کیا تو گویا ہماری نظر اس صورت سے جو اس چیز کی ہمارے ذہن میں تھی۔ گزر کر اس چیز کی حقیقت تک پہنچ گئی اس کی مثال تو یوں سمجھئے جیسا کہ عینک میں سے ہم کسی چیز کو دیکھتے ہیں تو ہماری نظر عینک میں سے گزر کر اصل چیز تک پہنچ جاتی ہے اس وقت عینک کا وجود ہمارے خیال سے بالکل غائب ہو جاتا ہے اور ہم یوں محسوس کرتے ہیں کہ ہماری نظر براہ راست اس چیز کو دیکھ رہی ہے اس کی دوسری مثال یہ ہے کہ ایک درخت، نہر کے کنارے کھڑا ہے اور اس کا سایہ پانی میں پڑ رہا ہے۔ اب ایک شخص ہے جو اس درخت کے سایے کیطرف ٹکٹکی لگا کر دیکھ رہا ہے۔ اور وہ اس کے دیکھنے میں اتنا محو ہو گیا کہ پانی کا خیال اس کے ذہن سے بالکل جاتا رہا۔

کسی چیز کا علم حاصل کرنے کی یہ شکل جو اوپر مذکور ہوئی اس کے متعلق اہل حکمت کے دو گروہ ہیں۔ قدیم حکماء کا تو یہ خیال تھا کہ جب نفس ناطقہ کسی چیز کا علم حاصل کرتا ہے تو اس وقت نفس ناطقہ اس چیز کیساتھ جس کا اس نے علم حاصل کیا متحد ہو جاتا ہے بعد کے حکماء کہتے ہیں کہ کسی چیز کو معلوم کرنے کے سلسلے میں ذہن میں ان چیز کی جو صورت بنتی ہے تو یہ صورت علمی بعینہٖ وہ اصل چیز ہوتی

ہے جو معلوم ہوئی، الغرض کسی چیز کو معلوم کرتے وقت اس چیز کی جو علمی صورت ہمارے ذہن میں نقش ہوتی ہے تو اس ضمن میں مندرجہ ذیل دو حالتیں پیش آتی ہیں۔

ایک یہ کہ شئ معلوم کی طرف ہماری پوری توجہ ملتفت ہو جائے اور اس شئے کی جو علمی صورت ہمارے ذہن میں پہلے سے موجود ہے اس کی حیثیت عینک کی سی ہو جائے کہ ہماری نظر اس میں سے گزر کر شئ معلوم کا علم حاصل کرتی ہے اس نوعیت علمی کو ''علم شئے'' کا نام دیا گیا ہے۔

دوسری حالت یہ ہوگی کہ ''شئ معلوم'' کے بجائے اس شئے کی جو علمی صورت ذہن میں ہو اس کی طرف ہماری پوری توجہ ہو، اس دوران میں اگر اصل شئ کی طرف ہماری نظر جائے بھی، تو محض ضمنی اور اجمالی طور پر اس نوعیت علمی کو ''علم العلم'' کہا جاتا ہے اس میں شک نہیں کہ دوسری حالت اور پہلی حالت میں زیادہ فرق نہیں بلکہ واقعہ یہ ہے اگر دوسری حالت کی پوری نگہداشت کی جائے تو اس سے پہلی حالت کی استعداد بھی پیدا ہو جاتی ہے اور اس کے روپوش ہونے کے بعد یہ اس کی قائم مقام بن جاتی ہے۔

الغرض شئ مجرد ہو یا شئ متحیز ان دونوں کا علم حاصل کرنے کی تو اوپر کی یہ صورتیں ہونگی۔ اب سوال یہ ہے کہ انسان کا ذہن حق سبحانہ کی تجلی کا علم کیسے حاصل کر سکتا ہے؟ اس سلسلے میں یہ جاننا چاہیے کہ جب تجلی حق صورتوں اور اشکال کے رنگ میں ظہور پذیر ہوا اور اس وقت انسان کے حواس نفسانی تقاضوں سے امن میں ہوں تو اس کی روح تجلی کی صورت کی طرف کلیۃً متوجہ ہو جاتی ہے اور یہ صورت اس کے لئے نصب العین کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ انسان کو تجلی کی صورت کا مشاہدہ صرف خواب ہی میں ہو۔ بلکہ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدمی جاگ رہا ہے اور اس کے حواس نفس کی خواہشات سے آزاد ہیں تو اس بیداری میں بھی اس کو تجلی کی صورت نظر آ جاتی ہے۔ لیکن یہ لازمی نہیں ہوتا کہ تجلی کی علمی صورت ہمیشہ کسی قسم کی شکل، کیفیت اور تحیز کے بغیر ہی انسان کو نظر آیا کرے۔

تجلی اشکال اور صورتوں میں کیوں ظہور پذیر ہوتی ہے؟ اس ضمن میں معلوم ہونا چاہیے کہ انسان میں اللہ تعالیٰ نے دو قوتیں ودیعت فرمائی ہیں ان میں سے ایک تخئیل کی قوت ہے۔ وہ چیزیں جو ذاتی طور پر کوئی شکل نہیں رکھتیں۔ اس قوت کا کام یہ ہے کہ وہ ان چیزوں کو نظروں کے

سامنے متشکل کردیتی ہے۔ چنانچہ قوت تخیل کی مدد سے انسان، غضب اور غصے کو درندے کی شکل میں اور حرص وطمع کو کوے کی صورت میں مجسم کر لیتا ہے۔ دوسری قوت متوہمہ ہے۔ یہ قوت اشیاء کو شکل ورنگ سے مجرد کر کے انہیں معانی میں تبدیل کردیتی ہے۔ قوت متوہمہ جس طرح کام کرتی ہے اس کی مثال یہ ہے۔ ہم نے ایک شخص کو جسے ہم ایک عرصہ پہلے دیکھ چکے تھے جونہی یاد کیا تو معا ہمیں اشتیاق ہوا کہ اس شخص کی صورت چشم تصور کے سامنے لائیں اب یوں ہوتا ہے کہ سب سے پہلے اس شخص کی ایک اجمالی اور کلی صورت ہمارے سامنے آتی ہے۔ یہ صورت اتنی عام ہوتی ہے کہ نہ صرف اس شخص پر بلکہ اس کے علاوہ اور بہت سے اشخاص پر بھی یہ صورت منطبق ہوجاتی ہے اس کے بعد آہستہ آہستہ یہ صورت سمٹتی جاتی ہے اور آخر کار نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ خاص اس شخص کی صورت جسے ہم نے یاد کیا تھا ہمارے روبرو آموجود ہوتی ہے اس طرح بعض دفعہ ایک حافظ قرآن کو اجمالی طور پر یاد آتا ہے کہ فلاں آیت اس سورت میں ہے۔ اس ضمن میں پہلے تو اس کے ذہن میں اس آیت کی ایک اجمالی سی صورت نظر آتی ہے یہ اجمالی صورت اس مخصوص آیت کے علاوہ اور بہت سی آیات پر بھی محمول ہوسکتی ہے بعد ازاں بتدریج یہ معین ہوجاتی ہے۔ یہاں تک کہ آخر میں اس آیت کی خاص صورت ذہن میں آجاتی ہے۔ الغرض انسان کی قوت متخیلہ اگر مجرد معانی کو اشکال اور صورتوں کا لباس پہناتی ہے تو اس کی قوت متوہمہ متحیز اشیاء کو مجرد معانی میں بدل دیتی ہے۔ چنانچہ ذہن کا سلبی مفہومات کا ادراک اور افراد سے کلی امور کا استخراج کرنا یہ سب کچھ انسان کی اسی قوت متوہمہ کی عجوبہ کاریوں کا نتیجہ ہے۔

''نسبت یادداشت'' کی وضاحت سے پہلے جن تمہیدی امور کا جاننا ضروری تھا، ان کا اس مقدمہ میں بیان ہوچکا۔ اب ہم ''نسبت یادداشت'' کے متعلق اصل مبحث پر آتے ہیں۔ عارف مجذوب جب نسبت بے نشانی کی حقیقت سے واقف ہوچکتا ہے اور اس کے بعد جب کبھی وہ اس نسبت کی طرف پوری دل جمعی سے متوجہ ہوتا ہے تو اس حالت میں اس کے تمام قوئ اور احساسات کلیۃ اس حقیقت کے تابع ہوجاتے ہیں جو اس کے ذہن نے ادراک کیا تھا۔ یہاں عارف کی قوت متوہمہ میں ایک خیال پیدا ہوتا ہے جو اجمالی طور پر اس حقیقت بے نشانی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس منزل میں اس خیال کی کوئی مخصوص وضع، شکل یا صورت نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کی نوعیت ایک

خاص معنوی ہیئت کی ہوتی ہے۔ یہی معنوی ہیئت تجلی حق ہے، جو عارف کی قوت متوہمہ میں نازل ہوئی۔ اسی طرح جب یہ معنوی ہیئت قوت متوہمہ کے بجائے عارف کی قوت متخیلہ کو اپنا آماجگاہ بناتی ہے تو عارف کے خیال میں ایک صورت آ موجود ہوتی ہے اور اسے عارف ''تجلی حق'' سمجھتا ہے البتہ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ پہلی قسم کی تجلی وہمی ہوتی ہے اور دوسری قسم کی تجلی ''تجلی تخئیلی''۔

عارف جب تجلی وہمی کو پالیتا ہے، تو پھر وہ اس کی باقاعدہ حفاظت کرتا ہے اور اس پر برابر نظر رکھتا ہے تجلی وہمی کی اس طرح حفاظت اور نگہداشت کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عارف کے سامنے مرتبہ بے نشانی کی طرف ایک کشادہ راہ کھل جاتی ہے اور اس سے اس کے اندر بڑی استعداد پیدا ہو جاتی ہے۔ مشائخ میں سے جس بزرگ نے سب سے پہلے یہ راہ اختیار کی، اس طریقے کو اپنا مسلک بنایا۔ اس کی طرف اپنے اصحاب کو متوجہ کیا اور وہ خود بھی ہمہ تن اس میں لگ گئے۔ چنانچہ اس ضمن میں جو کچھ انہوں نے کہا اس مقام سے کہا اور جو کچھ کیا اسی مقام سے کیا وہ بزرگ خواجہ نقشبندؒ ہیں۔ اس طریقے کو وہ ''دوام مراقبہ'' کہتے تھے۔ اور اسے انہوں نے ''وجہ خاص'' کا نام دیا تھا۔ خواجہ نقشبندؒ کے بعد خواجہ عبید اللہ احرار آئے انہوں نے جذب کے اس طریقے کو اور مختصر کر دیا۔ دل کا مرتبہ ''بے نشانی'' کی طرف مائل ہونا اس کے سواء دل میں کسی اور خواہش کا باقی نہ رہنا نیز جذبہ محبت کی انتہائی کیفیت میں سرشار ہو کر چشم دل کو مسلسل اسی جانب متوجہ کر دینا۔ خواجہ احرارؒ نے ان کیفیات کو راہ جذب کا خلاصہ قرار دیا۔ چنانچہ اس طرح راہ جذب کا یہ مختصر طریقہ پیدا ہو گیا۔ اس طریقے میں فیض پانے اور دوسروں کو فیض پہنچانے کا سارا دارومدار، اصل صحبت پر ہے۔

خواجہ احرارؒ کے بعد ایک زمانہ دراز گزر گیا اس دوران میں راہ جذب کی اس کیفیت میں جو سینہ بہ سینہ برابر چلی آتی تھی، تغیر رونما ہوا۔ چنانچہ اس کیفیت میں ''مرتبہ نشانی'' کی طرف جو میلان پایا جاتا تھا۔ وہ مفقود ہو گیا اور اس کے بجائے سالکوں نے اس چیز کو جو اصل ایمان میں داخل ہے اور جس پر وہ پہلے سے ایمان لا چکے تھے اپنا نصب العین بنایا۔ یہاں سے وہ آگے نہیں بڑھے بلکہ، اسی مقام میں رک گئے۔ اور اصل ایمان کی اس چیز کی حفاظت میں کوشاں ہوئے۔ انہوں نے اسی نسبت (۱) کی تکمیل کی۔ اور اسی کے قیام میں مصروف ہو گئے۔ اور سمجھے کہ ہم نے

---

(۱) نسبت یادداشت

اصل مقصود کو پالیا۔ میر ابوالعلیٰ کے متبعین میں سے عوام یہی نسبت رکھتے تھے فقیر نے ان میں سے ایک بڑی جماعت کو دیکھا بھی ہے۔ ان میں سے وہ لوگ جو اسم "اللہ" کو اپنے خیال میں موجود اور حاضر پاتے ہیں اور وہ اس کی حفاظت بھی کرتے ہیں۔ ان کی یہ "نسبت" زیادہ مناسب اور موزوں ہے۔ اور جن کے خیال میں اسم "اللہ" کا تصور قائم نہیں ہے ان کے نزدیک یہ "نسبت" اس شخص کے مشابہ ہے جس کے حواس سکر اور مستی کی کیفیات سے سرشار ہوں۔ غرضیکہ اہل جذب کے نزدیک اس "نسبت کے دو رخ ہیں۔

ایک ظاہری اور دوسرا باطنی۔ اس "نسبت" کے ظاہری رخ سے مراد ایک ایسی کیفیت ہے جو انسان کے نسمہ میں جاگزیں ہو کر اس سے کلیۃ ملحق ہو جاتی ہے۔ اور اسی نسبت کا باطنی رخ بے نشانی محض ہے جس کو صرف روح مجرد ہی ادراک کر سکتی ہے لیکن وہ لوگ جن کو جذب کی توفیق نہیں ملتی، وہ اس "نسبت" کو صرف اپنے نسمہ ہی میں موثر اور غالب دیکھتے ہیں۔ اس لئے وہ اس مقام سے اوپر اس "نسبت" کا کوئی اور وجود تسلیم نہیں کرتے۔

اس "نسبت" کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ ہے کہ جس شخص کو یہ "نسبت" حاصل ہو وہ "وجود عدم" کی استعداد رکھتا ہے۔ "وجود عدم" کے معنی یہ ہے کہ عارف جب "مرتبہ بے نشانی" کی طرف متوجہ ہو تو اس میں نہ تو گرد و پیش کی اشیاء کا کچھ ادراک باقی رہے اور نہ ادھر ادھر کے خیالات اس کے ذہن میں داخل ہوں اس نسبت کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس نسبت کی وجہ سے سالک پر ایسی قوی تاثیر طاری ہو جاتی ہے کہ وہ ایک نگاہ یا معمولی سی "توجہ" سے "وجود عدم" کے مقام پر پہنچ جاتا ہے۔ اور حواس کی تشویشات سے اسے کلی طور پر نجات مل جاتی ہے۔ اسی "نسبت" کا ایک اثر یہ بھی ہوتا ہے کہ اس سے سالک کی ہمت میں تیزی اور حدت اس حد بڑھ جاتی ہے کہ اس کی قوت عزم شخص اکبر تک جا پہنچتی ہے۔

چنانچہ کم ہمتوں کو ہمت بندھانا، امراض کو دور کرنا اور اس طرح کے اور تصرفات کرنے کی توفیق اسی "نسبت" کے طفیل حاصل ہوتی ہے اور کشف و اشراف کے ذریعے دوسروں کے دلوں کے احوال جاننا بھی اسی "نسبت" کا ثمرہ ہوتا ہے۔

نسبت توحید

ان نسبتوں میں سے ایک نسبت توحید ہے اور ''نسبت توحید'' کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے سب سے پہلے چند امور کا جاننا ضروری ہے۔

یہ تو ایک مسلمہ امر ہے کہ زید، عمر اور بکر وغیرہ سب کے سب انسان ہیں اور یہ بھی معلوم ہے کہ یہ اور ان کے علاوہ باقی تمام افراد انسانی اس ایک بات میں کہ یہ سب کے سب انسان ہیں، ایک دوسرے سے مشترک ہیں اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان میں سے ہر ایک فرداً فرداً ایک دوسرے سے جدا جدا بھی ہیں الغرض یہ سب باعتبار انسانیت کے تو آپس میں مشترک ہیں۔لیکن ان میں سے ہر ایک اپنی انفرادی خصوصیات کی وجہ سے ایک دوسرے سے ممتاز ہے اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ زید، عمرو اور بکر وغیرہ میں فرداً فرداً جو خصوصیات پائی جاتی ہیں یہ انفرادی خصوصیات عین انسان نہیں ہیں کیونکہ اگر یہ خصوصیات عین انسان ہوتیں تو زید من حیث الکل مشابہ ہوتا عمرو کے اور عمرو مشابہ ہوتا بکر کے اور اسی طرح ہر انسان کلیۃً دوسرے انسان کی مثل ہوتا۔اور ان میں فرداً فرداً ایک دوسرے سے کوئی امتیاز نہ پایا جاتا لیکن ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ کہ زید بعینہٖ بکر نہیں اور نہ بکر بعینہٖ عمرو ہے علیٰ ہذا القیاس ہر انسان وہ نہیں جو دوسرا ہے اس کے باوجود اگر ہم نوع انسانی کے ان افراد کی الگ الگ خصوصیات کو عین انسان قرار دیتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ ایک چیز بیک وقت دوسرے کی عین ہے اور اس سے مختلف بھی۔اور ظاہر ہے یہ بات صریحاً و بداہۃً غلط ہے۔

لیکن افراد کی یہ انفرادی خصوصیات ہر حیثیت سے غیر انسان بھی نہیں ہیں کیونکہ جس ذات میں یہ خصوصیات جمع ہوتی ہیں، اس پر انسان کا اطلاق ہو سکتا ہے اور یہ انفرادی خصوصیات اس امر میں مانع بھی نہیں ہیں کہ ان پر انسان کا اسم صادق نہ آسکے۔الغرض کل انسانیت میں بحیثیت مجموعی

اور افراد کی ان جدا جدا خصوصیات میں ایک خاص نسبت پائی جاتی ہے جسے ظاہریت اور مظہریت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مثلاً یہ کالا بھی انسان ہے اور یہ سفید رنگ کا بھی انسان ہے۔ پہلی صورت میں یہ ہوا کہ جوہر انسانیت کالی شکل سے مرکب ہو کر ایک خاص مظہر میں ظاہر ہوا اور دوسری صورت میں وہی جوہر سفید شکل سے مخلوط ہو کر دوسرے مظہر میں معرض ظہور میں آیا۔

انسانیت میں بحیثیت مجموعی اور افراد کی انفرادی خصوصیات میں جو نسبت ہے اس نسبت کو کبھی مادہ وصورت کی مثال دے کر بھی واضح کیا جاتا ہے۔ مثلاً ایک بھبکا ہے جو آگ پر رکھا ہوا ہے اس کے اندر پانی ہے پانی حرارت سے بخارات یعنی ہوا بنا اور ہوا سے پھر عرق یعنی دوبارہ پانی بن گیا اب واقعہ یہ ہے کہ ایک صورت جسمیہ ہے جو تمام اجسام میں مشترک ہے یہ صورت جسمیہ پہلے پانی تھی پھر یہ ہوا ہوئی اور اس کے بعد پھر پانی ہوگئی اس حالت میں کوئی نہیں کہتا کہ پانی اور ہوا کوئی الگ چیز تھی جو صورت جسمیہ سے ضم ہوگئی ہے کیونکہ صورت جسمیہ تو خود اپنی جگہ متعین ہے اور اس تعیین میں نہ وہ پانی کی محتاج ہے اور نہ ہوا کی۔ بے شک یہ صورت جسمیہ جب انواع کے مرتبے میں ظہور پذیر ہوتی ہے، تو اس کیلئے متشکل اور متلون ہونا ضروری ہوتا ہے اور ظاہر ہے اس صورت جسمیہ کا اس حالت میں پانی یا ہوا کے علاوہ کسی اور شکل میں متشکل ہونا ممکن نہیں۔ الغرض جب ہم صورت جسمیہ کو صورت جسمیہ کے مرتبے میں دیکھیں گے تو بے شک وہ تمام اجسام میں مشترک نظر آئے گی۔ لیکن جب صورت جسمیہ کو ہم اس اعتبار سے دیکھیں کہ مرتبہ انواع میں وہ کیونکر متشکل ہوئی تو اس حالت میں اس صورت جسمیہ کا خود پانی یا ہوا ہونا ضروری ہوگا۔ یہ نہیں کہ صورت جسمیہ ایک الگ چیز ہے اور پانی اور ہوا الگ۔ اور پانی اور ہوا بعد میں اس سے ضم ہوگئے۔ اگر چہ اپنی جگہ ان کے ضم ہونے کی وجہ ہوسکتی ہے۔

الغرض صورت اور مادے کے درمیان جو خاص نسبت ہے اس کیلئے ایک نام کی ضرورت ہے جس سے اس نسبت کو تعبیر کیا جائے۔ ہم نے اس نسبت کو ''ظہور'' کا نام دیا ہے۔ اور ظہور سے مراد یہ ہے کہ ایک چیز اپنی جگہ ایک موطن اور مرتبے میں قائم اور متحقق ہے۔ اور پھر وہی چیز اس مرتبے سے نکل کر دوسرے مرتبے میں ایک اور وجود کا جامہ پہن لیتی ہے اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک چیز کی ایک نوعی صورت ہے جو اس نوع کے ہر ہر فرد میں ظہور کرتی ہے یا پھر موم کی مثال لیجئے

کہ اس سے مسدس اور مربع شکلیں اور انسان اور گھوڑے کے مجسمے بنائے جاسکتے ہیں۔ اس طرح ان تمام چیزوں میں موم اپنے مومی جسم کا اظہار کرتا ہے یا پھر اس کی مثال ملکۂ علم کا اس علمی صورت میں جو ابھی ہمارے ذہن میں نقش پذیر ہوئی، ظہور کرنا ہے اس ضمن میں اس طرح کی اور بہت سی مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ اور اگر حقیقت ظہور کی مزید توضیح درکار ہو اور اس کی اقسام کا مفصل بیان چاہیے تو اس کیلئے ہماری دوسری تصانیف ملاحظہ کیجئے۔

قصہ مختصر انسان ہو یا گھوڑا، گائے ہو یا بکری، اونٹ ہو یا گدھا، ان میں سے ہر ایک کی صورت اپنے اپنے مرتبہ نوع میں متعین ہے۔ اور وہاں ہر ایک کے اپنے اپنے نوعی احکام و آثار بھی مقرر ہیں لیکن ان میں سے ہر ایک پر فرداً فرداً جو احکام وارد ہوتے ہیں ان کے لئے ہر نوع کے افراد کی صورتوں میں لامحالہ ظہور پذیر ہونا پڑتا ہے اس طرح اس نوعی صورت کے افراد کی الگ الگ صورتیں وجود میں آئیں۔ اور ہر صورت میں اس نوع کے جو انفرادی آثار و خصائص تھے وہ مرتب ہوئے۔ یہ سب انواع و افراد خواہ وہ از قبیل انسان ہوں۔ یا گھوڑے، گائے، بکری اونٹ اور گدھے وغیرہ کی قسم سے۔

الغرض یہ سب انواع و مظاہر ہیں جنس حیوان کے، اس کے بعد یہ سلسلہ اور آگے بڑھتا ہے یہاں تک کہ یہ جوہر عرض تک جا پہنچتا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ مثلاً زید ایک فرد ہے اس سے اوپر نوع انسان ہے اور نوع سے اوپر جنس کا مرتبہ ہے یہ جنس حیوان ہے۔ حیوان کی جنس میں نوع انسان بھی داخل ہے اور جملہ حیوانات کی انواع بھی جنس سے آگے کے جنس عالی کا مرتبہ ہے، اس میں حیوانات کیساتھ ساتھ نباتات بھی شامل ہیں اور اس سے اوپر جسم یعنی عرض کا مرتبہ ہے اور عرض سے اوپر جوہر ہے، اس معاملے میں حکماء کا حال ہے کہ وہ مظاہر وجود اور اس کے تعینات کی اصل کا سراغ لگاتے لگاتے اس مقام پر پہنچے اور یہاں پہنچ کر نہ صرف یہ کہ وہ رک گئے بلکہ انہوں نے قطعی طور پر یہ سمجھ لیا کہ جوہر و عرض کے درمیان کوئی ایسا علاقہ نہیں جو دونوں کو ایک جنس کے تحت جمع کر دے۔ لیکن اس کے برعکس اہل حق نے معلوم کر لیا کہ جو جوہر و عرض دونوں کو ایک اور اعلیٰ تر حقیقت احاطہ کئے ہوئے ہے۔ لیکن حکماء اس حقیقت کا ادراک کرنے سے عاجز رہے اور حقائق کی طرح اس حقیقت کے احکام و آثار متعین نہیں کہ ان کی مدد سے یہ حکماء اس حقیقت کا سراغ لگا لیتے

جو عرض و جوہر دونوں پر حاوی ہے اس حقیقت جامع کا موزوں ترین نام حقیقت وحدانیت ہے گو کبھی کبھی ہم اس حقیقت کو ''وجود'' بھی کہہ لیتے ہیں۔ یہ ''وحدانیت'' یا ''وجود'' ایک بسیط حقیقت ہے۔ چنانچہ ''وجود'' کے اس مرتبہ بسیط میں اور اس کے بعد کے تعینات میں جن میں یہ ''وجود'' ظہور پذیر ہوتا ہے۔ الغرض اس کے ان دونوں مراتب میں کوئی تصادم یا تضاد نہیں پایا جاتا۔

اس مسئلے کو ذہن نشین کرنے کے بعد پھر کائنات پر ایک نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں اس نوع بہ نوع کے قدرتی اور صنعتی مرکبات مثلاً درخت، حیوان، گائیں، تخت، کپڑے اور اس طرح کی دوسری چیزیں دکھائی دیتی ہیں۔ ان چیزوں میں ایک تو حقائق ہیں جو نفس اشیاء سے جن سے کہ آثار و احکام ظاہر ہوتے ہیں متمیز اور الگ ہیں۔ ان حقائق کو ہم صور کا نام دیتے ہیں۔ لیکن ان حقائق پذیر یا صور کو وقوع پذیر ہونے کیلئے جسم عنصری کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ جسم عنصری ان صورتوں کا مادہ ہے۔ ان قدرتی اور صنعتی مرکبات سے اوپر عناصر و افلاک کا مرتبہ ہے ان عناصر اور افلاک بھی ایک خاص صورت ہے ان سب سے اوپر اور سب کو جمع کرنے والی اور جو ان سب کا موضوع ہے، صورت جسمیہ ہے۔ جسے اشراقین نے ''مادۂ اولیٰ'' کہا ہے۔ یہ صورت جسمیہ جو اثر پذیر مادہ بھی ہے اور علت فاعلیہ بھی۔ یہ صورت جسمیہ جیسا کہ ہم پہلے لکھ آئے ہیں۔ وجود کے اصل مرکز کی طرف راجع ہے الغرض انواع کے ایک ایک فرد سے لے کر، وجود اقصیٰ تک نظام کائنات کا یہ سارا سلسلہ نہایت مرتب اور منظم ہے اور نیچے سے اوپر تک اس کی ہر کڑی دوسری کڑی سے ملی ہوئی ہے۔

یہ وجود اقصیٰ اور بعد میں جن مظاہر اور تعینات میں اس وجود کا ظہور ہوتا ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے کہ لکھے ہوئے حروف کے مقابلے میں سیاہ لکیر ہو۔ یعنی ان حروف کی اصل تو سیاہ لکیر ہی ہے گو بعد میں اس لکیر نے حروف کی شکل اختیار کر لی یا جیسے مختلف اعداد کی نسبت اکائی سے ہوتی ہے۔ یعنی اکائی سے ہی تمام اعداد نکلتے ہیں اور ایک ہی وجود میں مظاہر اور تعینات کی اس قدر کثرت کا واقع ہونا، اس کی مثال دریا کی سمجھئے کہ اس میں لاتعداد اور بے حساب موجیں ہوتی ہیں۔

الغرض اوپر کی اس بحث سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا کہ ان مظاہر اور تعینات میں دو چیزیں اصل ہیں ایک وجود اور دوسرے ان چیزوں کی ماہیات، اب سوال یہ ہے کہ اس وجود اور

ان ماہیات کی آپس میں کیا نسبت ہے؟ ارباب معقولات نے اس کے متعلق بڑی طویل طویل بحثیں کی ہیں۔ لیکن اس مسئلے میں صحیح ترین رائے یہ ہے کہ وجود وہ ہے جو خود اپنی ذات میں قائم ہے۔ اور مرتبہ وجود میں جبکہ کوئی اور چیز اس کے ساتھ ملحق نہیں ہوتی اور وہ خالص وجود ہوتا ہے تو وہ کسی دوسری چیز کا محتاج نہیں ہوتا۔ یہ وجود مختلف ماہیات میں ظہور کرتا ہے چنانچہ یہ ماہیات اس وجود کے لئے قوالب بن جاتی ہیں۔ ان ماہیات میں سے ہر ماہیت کی اپنی حیثیت اور اس کے اپنے احکام ہوتے ہیں۔ مطلب یہ نکلا کہ وجود ماہیات میں ظہور پذیر ہوتا ہے لیکن ماہیات میں وجود کا ظہور پذیر ہونا، موقوف ہوتا ہے۔ بہت سی چیزوں پر اس میں سے ایک یہ ہے کہ بعض ماہیات میں وجود کے ظہور کے لئے ضروری ہے کہ اس سے پہلے وہ دوسری ماہیت میں ظہور پذیر کا ہو چکا ہو۔ یعنی وجود کا ایک ظہور مشروط اور مقدم ہوتا ہے، اس کے دوسرے ظہور پر چنانچہ یہ بے شمار ماہیات ظہور وجود کے اس طرح کے ایک با قاعدہ سلسلے میں جکڑی ہوئی ہیں۔ اور ہر ماہیت اس سلسلہ ظہور کی ایک کڑی ہے اور یہ ممکن نہیں کہ اسی سلسلے میں ایک کڑی دوسری کڑی سے مقدم یا مؤخر ہو سکے، اب اصل وجود کو لیجئے اصل وجود کے دو وصف کمال ہیں۔ ایک ظاہری، دوسرا باطنی۔ ہم یہاں ایک مثال سے اس کی وضاحت کرتے ہیں۔ ایک حساب کرنے والا ہے وہ حساب کرتے وقت اپنے ذہن میں حساب کی یہ عددوں کو موجود اور حاضر کرتا ہے اور وہ اس طرح کے پہلے اعداد کی یہ صورتیں اس کے ذہن میں موجود نہ تھیں۔ اب جو وہ حساب کرنے لگا تو یہ عدد اس کے ذہن میں آن موجود ہوئے۔ محاسب یہ تو کر سکتا ہے کہ اعداد جو اس کے ذہن میں موجود نہ تھے، انہیں وجود میں لے آئے لیکن یہ اس کے بس کی بات نہیں کہ دس کے عدد کو وہ طاق بنا دے۔ اور گیارہ کو جفت کر دے یا وہ شمار میں چھ کو پانچ سے مقدم کر دے، الغرض گنتی کے جو اعداد ہیں ان کا ایک مستقل سلسلہ ہے اور اس سلسلے میں ہر عدد کا ایک متعین مقام ہے اس مقام کے مطابق ہر عدد کے اپنے احکام ہیں جن میں حساب کرنیوالا کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔

ماہیات کے اس مرتب سلسلے اور مظاہر وجود کے اس با قاعدہ نظام کو دیکھ کر عقل انسانی لامحالہ اس نتیجے پر پہنچتی ہے کہ ماہیات کے سلسلے کی یہ ترتیب بالضرور کسی نہ کسی موطن میں پہلے ہی سے مقرر اور متعین ہو چکی ہے۔ اور پہلے سے اس مقرر شدہ ترتیب ہی کا نتیجہ ہے کہ ہر ماہیت کے ظہور کے

اپنے احکام ہیں جن میں کوئی تغیر نہیں ہو سکتا، چنانچہ جس طرح محاسب کا کام صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے ذہنی عمل سے اعداد پر تاثیر ڈالتا ہے اور انہیں عدم سے وجود میں لاتا ہے لیکن چونکہ اعداد کی ترتیب پہلے کسی موطن میں مقرر ہو چکی ہوتی ہے اس لئے وہ اسی ترتیب سے اعداد کو اپنے ذہن میں منحصر کرتا ہے اور اس ضمن میں عدم سے وجود میں لاتے وقت وہ ان میں اپنی طرف سے کوئی تبدیلی نہیں کرتا چنانچہ اس دنیا میں یہ ماہیات پہلے کی طے شدہ ترتیب کے مطابق ظاہر ہوتی ہیں وجود کے ایک مرتبے کی تو محاسب کی یہ مثال ہوئی کہ اس نے اپنے ذہن میں اعداد کو غیر موجود سے موجود کر لیا۔ اور نابود سے بود بنا دیا اس مرتبہ وجود کو ہم ظاہر کہتے ہیں لیکن وجود آخر بذات خود بھی تو ایک چیز ہے اور یہی مبدأ اور اصل ہے وجود کے ان دونوں کمالوں یعنی ظاہر اور باطن کا۔

اب یہ سوال باقی رہا کہ یہ جامع حقیقت جو عرض و جوہر کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے جس کا موزوں ترین نام ہم ''حقیقت وحدانیت'' بتا آئے ہیں، جسے ہم کبھی کبھی ''وجود'' بھی کہتے ہیں یہ جامع حقیقت جس کے اندر کائنات کی یہ ساری کثرت داخل ہے اور یہ ساری کی ساری ماہیات اسی کی استعدادیں ہیں۔ اسی حقیقت کے ظہور کے ہم ماہیات فعلیت کہتے ہیں اور کلمات ''ہست'' ''خارج'' اور ''عین'' سے اسی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ آخر یہ حقیقت ہے کیا؟ ایک قوم کا کہنا یہ ہے کہ یہ حقیقت عین ذات الٰہی ہے چنانچہ انہوں نے اسی حقیقت کو ''لا بشرط لشیٔ'' ذات بحت (۱) سمجھا۔ اور اسی کو وہ ''بشرط لاشی'' احدیت کہتے ہیں۔ اور یہی ان کے نزدیک بشرط شی واحدیت ہے۔ ہمارے خیال میں ان لوگوں میں عقل و تدبیر کی کمی تھی کہ انہوں نے غلط بات پر یقین کر لیا۔ ان کے برعکس فقیر نے اس امر کی تحقیق کی تو اس پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ وجود کے جس مرتبے پر جا کر ان لوگوں کی نظر رکی اور اسے ہی انہوں نے غلطی سے ذات بحت، احدیت اور واحدیت سمجھ لیا وہ مرتبہ ظاہر الوجود کا تھا۔ جس کو ہم نفس کلیہ کہتے ہیں۔ اسی کو بعض اہل

---

(۱) ذات الٰہی سے کائنات کے تنزل کی صورت یوں بیان کی جاتی ہے ایک مقام تو خود ''ذات'' کا بحیثیت ذات کے ہے، اس مقام پر ہر شرط کی نفی کے ساتھ خود ذات کو اپنی ذات کا ادراک ہوتا ہے یہاں سے تنزلات کی ابتداء ہوتی ہے اس میں پہلا مرتبہ ''احدیت'' کا ہے اور ''احدیت'' کے بعد ''واحدیت'' کا مرتبہ ہے۔ اس ''واحدیت'' کو ''باطن الوجود'' بھی کہتے ہیں۔ باطن الوجود سے ''وجود منبسط'' کا ظہور ہوا جس کا دوسرا نام ''ظاہر الوجود'' بھی ہے اس مرتبہ ظاہر الوجود کو نفس کلیہ کا نام دیا گیا ہے۔ ''نفس کلیہ'' سے ارواح، امثال، اور اجساد ظاہر ہوئے۔

کشف نے وجود منبسط کا بھی نام دیا ہے، حقیقت میں اس وجود منبسط کی حیثیت تو محض اصل وجود کی طبیعتوں میں سے ایک طبیعت ہے۔

بے شک وجود کی یہ طبیعت سب چیزوں سے زیادہ بسیط ہے اور یہی سب کا مبداء اور اصل بھی ہے۔ بہر حال یہ نفس کلیہ یا وجود منبسط یا اسے آپ کوئی اور نام دید یجئے، اس کی کیفیت یہ ہے کہ یہ ہر شئی میں جاری وساری اور ہر شئی سے قریب ہے۔ اور اس کے باوجود یہ سب اشیاء سے پاک اور ان کی تمام آلائشوں سے منزہ ہے۔

نفس کلیہ کے مقابلے میں جو حیثیت ان اشیاء کی ہے وہی حیثیت ذات الٰہی کے مقابلے میں اس نفس کلیہ کی ہے بلکہ نفس کلیہ اشیاء سے باوجود قرب کے جس قدر دور ہے اس سے سوگنا زیادہ ذات الٰہی نفس کلیہ سے دور ہے، اسی طرح وہ اس کے تمام تعینات اور تقیدات کی حد بندیوں سے بھی مبرّا ہے۔ ہاں اس ضمن میں ایک بات کا ضرور خیال رہے نفس کلیہ اور اس سے اوپر وجود کے جو مراتب ہیں، ان پر ذات الٰہی از قبیل ابداع موثر ہوتی ہے۔ نہ کہ از قسم خلق۔ ابداع سے مراد یہ ہے کہ مادہ کے بغیر عدم سے وجود کا صدور ہو اور ایک چیز سے دوسری چیز کا پیدا ہونا خلق کہلاتا ہے۔

الغرض نفس کلیہ اور ذات الٰہی میں خلق کی نہیں بلکہ ابداع کی نسبت ہے اور ابداع کی نسبت کی حالت یہ ہے کہ اسے عقل انسانی ادراک کرنے سے کلیۃً قاصر ہے اس لئے نفس کلیہ اور ذات الٰہی میں فرق مراتب کرنا، عقلاً ممکن نہیں۔ اس لئے کوئی شخص تسامح سے یا آسانی کے خیال سے یہ کہدے کہ نفس کلیہ ذات الٰہی کا تنزل ہے تو اس کا یہ کہنا اجمالاً ایک وجہ رکھتا ہے۔ (۱)

اس سلسلے میں فقیر کو بتایا گیا کہ وہ لوگ جن کے دلوں میں کثرت سے وحدت کی دید کا شوق

---

(۱) نفس کلیہ اور ذات الٰہی میں آپس میں کیا تعلق ہے یہ تصوف کا اہم اور نازک ترین مسئلہ ہے اور اس کو صحیح طور پر سمجھنے، بغیر تصوف کے دقیق مسائل کو حل کرنا ناممکنات میں سے ہے۔ یہاں ہم اس مسئلے کی مزید وضاحت کیلئے مولانا عبیداللہ سندھی کی تصنیف ''شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ'' سے ایک عبارت نقل کرتے ہیں۔

''الغرض کائنات کی کثرت پر غور کرنے کے بعد انسان اس نتیجے پر پہنچا کہ ایک نفس کلیہ یا جنس الاجناس ہے جہاں سے ہماری ساری موجودات کا سرچشمہ پھوٹتا ہے شاہ صاحب کے نزدیک یہ نفس کلیہ بطریق ابداع ذات حق سے صادر ہوا ہے، ظاہر ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ ذات حق اس عالم سے ماوراء ہے۔ یہ طریق ''ابداع'' کیا ہے؟ اس پر شاہ صاحب نے بدور بازغہ، تفہیمات اور الطاف القدس میں مفصل بحث کی ہے۔ چنانچہ فرماتے کہ ''مبدِع'' یعنی جس سے ابداع کا عمل صادر ہوا، ومبدَع یعنی جو ابداع کے عمل کا نتیجہ ہے غرضیکہ مبدَع (بقیہ اگلے صفحہ پر)

فوارے کی طرح جوش زن ہوتا ہے تو ان کی نظریں جس وحدت تک پہنچتی ہیں، وہ نفس کلیہ کی وحدت کے بجز کوئی دوسری وحدت نہیں ہوتی، لیکن جب چشم بصیرت ذات الٰہی کو اپنا مطمح نظر بنائے تو یہ "توحید ذاتی" کی کیفیت ہے۔ "توحید ذاتی" کے معنی یہ ہیں کہ ذات حق کو ہر نسبت اور ہر چیز سے الگ کر کے صرف حق میں دیکھا جائے، باقی ذات الٰہی اور نفس کلیہ میں جو نسبت ہے اسے "ام النسبات" کا نام دیا گیا ہے اور ان دونوں کے باہمی علاقے کو کسی خاص نسبت سے متعین کرنا، ایک طرح کی زیادتی ہے۔

ذات الٰہی اور نفس کلیہ کے درمیان جو علاقہ ہے، اس کی نسبت حقیقت کو سمجھانے کے لئے ایک مثال دی جاتی ہے ذات الٰہی اور نفس کلیہ میں وہی نسبت ہے جو چار کے جوڑے اور عدد میں ہوتی ہے چنانچہ جب ہم چار کے عدد کو اس کے اصلی مرتبے میں جہاں وہ بحیثیت چار کے بذات

(بقیہ حاشیہ) اور مبدَع میں جو علاقہ اور نسبت ہے وہ ایسی چیز نہیں کہ اس کو عالم مشہود میں سے کوئی مثال دیکر سمجھایا جا سکے۔ یہ نسبت مادی نہیں کہ مبدِع میں اس کی طرف اشارہ کیا جا سکے۔ اور نہ ابداع کی یہ نسبت مبدِع اور مبدَع میں اس طرح کی وحدت پر دلالت کرتی ہے کہ یہ کہا جا سکے کہ یہ سابق ہے اور یہ لاحق۔ اور زمانے کے اعتبار سے اس کو تقدم حاصل ہے اور یہ مؤخر ہے۔ الحاصل اس معاملے میں امر محقق یہ ہے کہ ابداع سے مراد ایک ایسی نسبت ہے جس کی حقیقت یعنی "انیت" تو معلوم ہے لیکن اس کی کیفیت معلوم نہیں۔ ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اس کائنات کے نفس یعنی نفس کلیہ اور ذات باری دوسرے لفظوں میں مبدِع اور مبدَع میں بے شک ایک طرح کی وحدت پائی جاتی ہے۔ مگر وہ وحدت حقیقی نہیں انسانی عقل نفس کلیہ تک تو پہنچ جاتی ہے اور موجودات کی اس کثرت کو ایک نقطہ پر جمع کر لیتی ہے لیکن اس سے آگے اس کی پرواز نہیں۔ چنانچہ نفس کلیہ اور ذات الٰہی کے درمیان جو علاقہ اور نسبت ہے اور شاہ صاحب "ابداع" سے تعبیر کرتے ہیں، عقل اس کے احاطے سے یکسر عاجز ہے اور وہ مبدِع اور مبدَع کے درمیان کسی اور امتیاز کو قائم کرنے پر قادر نہیں اس لئے بعض دفعہ مُبدِع اور مُبدَع یا ذات الٰہی اور نفس کلیہ پر مجازاً، وحدت یعنی باہم ایک ہونے کا اطلاق کیا جاتا ہے۔

اب مسئلہ بالکل صاف ہو گیا بے شک کائنات کی ہر چیز نفس کلیہ کی عین ہے اس لئے صوفیاء اس حالت کو بحر اور موج کی مثال دیکر سمجھاتے ہیں۔ لیکن اس سے اوپر نفس کلیہ سے لیکر واجب الوجود تک جو منزل ہے اور جسے "ابداع" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کی کیفیت معلوم کرنا عقل کے بس کی بات نہیں۔ البتہ اس کی "انیت" یعنی حقیقت معلوم ہے۔ چنانچہ نفس کلیہ اور واجب الوجود میں جو نسبت ابداع ہے وہ "معلوم الانیہ مجہول الکیفیۃ" کہلاتی ہے یہ مقام چونکہ عقل کے احاطے سے خارج ہے، اس لئے اس کی تعبیر میں ہر قسم کے مشتبہ الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔

(نوٹ) پروفیسر محمد سرور مرحوم نے حضرت شاہ صاحب کی اصل کتاب میں مذکورہ بالا حواشی بھی شامل کر دیا تھا۔ میں نے حواشی کو کتاب سے نکال کر اس کی اصل جگہ پر رکھ دیا ہے تا کہ کسی کو اشتباہ نہ ہو سکے۔ (قاسمی)

خود قائم ہے، دیکھتے ہیں تو سوائے چار کے وہاں اور کوئی چیز نظر نہیں آتی لیکن اس کے بعد اس کو خالص چار کے عددی مرتبے سے نیچے دیکھا جاتا ہے۔ اور گو اس مرتبے میں باہر سے کوئی اور چیز اس میں ضم نہیں ہوتی تو یہ چار ہمیں دو جوڑے نظر آتے ہیں۔

بہر حال اس طرح چار کے عدد کے دو مرتبے ہوئے۔ ایک خاص چار کا مرتبہ اور دوسرے دو اور چار کا مرتبہ۔ اب اگر کوئی شخص یہ کہے کہ "دو اور دو" نام ہے اس حقیقت کا جو چار ہے تو اس شخص کی یہ بات بے جا نہ ہوگی۔ اور فرض کیا اگر وہ "دو اور دو" کو چار کا عنوان بنائے تو یہ چیز بھی ممکن ہے۔

اب اگر اس مرتبے سے ایک درجہ نظر اور نیچے اترے اور وہ چار کو اس مرتبے میں دیکھے جہاں چار کا خالص عدد چار کے نام سے مخلوط ہے تو بیشک اس نام کو جو کہ چار کے عدد پر دلالت کرتا ہے ہم چار کی صفت کہیں گے اور اگر نظر اس سے بھی ایک درجہ اور نیچے اترے اور وہ دیکھے کہ کس طرح "چار ہونا" یعنی چار کے عدد کی صفت اپنے وجود کے لئے موصوف یعنی چار کے عدد کی محتاج ہے اور اس موصوف کا صفت مقدم ہونا اور پھر اس موصوف کے صرف اپنی صفت کے ہی ذریعے سے قیام پذیر ہونا نظر کے سامنے آجائے اس وقت ہم چار کے عدد کو "مبدِع یا جاعل" یعنی ابداع کرنے والا دوسرے لفظوں میں بنانے والا کہیں گے۔ اور "دو اور دو" یعنی جفت کو چار کے عدد کا مبدَع اور "مجعول" یعنی پیدا کردہ قرار دیں گے۔

اگر ہم چار کے عدد کو عام اور مطلق اور جفت کو خاص اور مقید مانیں اور اس ضمن میں دونوں میں تناقض اور تصادم کا خیال بیچ میں نہ لائیں تو اس صورت میں جفت چار کے عدد کا ایک تعین اور مظہر ہوگا۔ الغرض نفس کلیہ اور ذات الٰہی کے درمیان ایک ایسی نسبت ہے جو بسیط ہونے کی وجہ سے ان تمام القاب اور ناموں سے موسوم ہو سکتی ہے۔ آپ جس جہت سے اس نسبت کو دیکھیں گے۔ اسی اعتبار سے آپ اس کو نام دیں گے۔ چنانچہ ذات الٰہی اور نفس کلیہ میں جو نسبت ہے اس کو مختلف ناموں اور القاب سے تعبیر کرنے کا باعث دراصل اس نسبت کو مختلف جہتوں سے دیکھنا ہے۔ اب جو لوگ وحدت وجود کے قائل ہیں اگر اس سے ان کی مراد نفس کلیہ کی وحدت ہے تو ان کی یہ بات درست ہوگی۔ اور جو تنزیہ ذات کو مانتے ہیں اگر ان کے اس قول کو نفس کلیہ سے اوپر جو

ذات الٰہی کے مانتے ہیں ان پر اطلاق کیا جائے تو یہ بڑی مناسب بات ہوگی۔

نفس کلیہ اور ذات الٰہی میں جو نسبت ہے سالک کو چاہیے کہ اس نسبت کو اس نسبت کے ساتھ جو افراد اشیاء اور نفس کلیہ کے درمیان ہے خلط ملط نہ ہونے دے، ورنہ اس کی حالت اس شخص کی سی ہو جائے گی جس نے کہ سبز یا سرخ شیشہ آنکھ پر لگالیا اور وہ ہر چیز کو سبز اور سرخ دیکھنے لگا۔ اس طرح شیشے کا رنگ اس چیز کے رنگ سے جس کو وہ شیشے میں دیکھ رہا ہے، مخلوط ہو گیا۔ اور وہ اس چیز کا صحیح رنگ نہ دیکھ سکا۔ سالک کی یہ حالت اس وقت ہوتی ہے جبکہ وہ صحیح معنوں میں فنا فی الحال نہیں بلکہ حال کے ساتھ اس کے دماغ کی سوچ بچار بھی تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس سلسلے میں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ اگر سالک نفس کلیہ کا مشاہدہ چشم جہاں سے کرتا ہے تو لامحالہ اسے مظاہر کائنات میں اتحاد و وحدت نظر آئے گی اور اگر وہ ذات الٰہی کو چشم حال سے دیکھتا ہے تو کائنات کا وجود اس کی نظر سے یکسر غائب ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر وہ ''نظر شامل'' رکھتا ہے اور نفس کلیہ اور ذات باری دونوں کا مشاہدہ چشم حال سے کرتا ہے تو یہ وجود کے ایک مظہر کو دوسرے مظہر کے حکم سے خلط ملط نہیں ہونے دیتا۔ الغرض نفس کلیہ اور ذات باری ہر دو کو اپنے مشاہدے میں جمع کر لینا یہ مقام افراد کاملین کا ہے۔ باقی ہر شخص کی اپنی اپنی راہ ہوتی ہے۔

چنانچہ قرآن مجید میں خدا تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ''لکل وجهة هو موليها فاستبقوا الخيرات'' ہر شخص کا اپنا اپنا رخ ہے جس کی طرف وہ منہ کرتا ہے۔ باقی تم تو نیکیوں میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کرو۔

اب افراد انسانی کو لیجیے گو ان میں طرح طرح کی صورتیں ایک دوسرے سے ملی جلی اور مخلوط شکل میں پائی جاتی ہیں لیکن اس کے باوجود اگر آپ ان میں سے ایک ایک فرد کو دیکھیں تو ہر فرد پر ایک خاص حکم صادق آتا ہے جس کو عقل سلیم چاہے تو بڑی آسانی سے دریافت کر سکتی ہے۔ چنانچہ ان میں سے بعض افراد ایسے ہوتے ہیں جن پر ایک مرتبہ کے احکام زیادہ واضح طور پر صادق آتے ہیں۔

لیکن دوسروں میں آپ انہیں احکام کو سرے سے غائب پائیں گے ان افراد میں سے جن کو بلند اور عمومی و کلی حیثیت سے مراتب حاصل ہوتے ہیں۔ وہ فنا و بقا کے مقامات پر فائز ہوتے ہیں۔

چنانچہ ان کاملین کو اس مرتبے کے علوم سے فطری طور پر لگاؤ پیدا ہو جاتا ہے جنہیں نیچے کے جزوی مراتب سے حصہ ملتا ہے ان کو انہی جزوی مراتب کے مطابق علم حاصل ہوتا ہے اور انہی مراتب کے مطابق ان پر کوائف واحوال وارد ہوتے ہیں۔ ان امور کی وضاحت کے بعد ''نسبت توحید'' کے لئے بطور ایک مقدمے کے ہیں۔ اب ہم اصل مقصد پر آتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ نوع انسانی میں بعض افراد ایسے بھی ہوتے ہیں جن پر وجود کا حکم زیادہ موثر ہوتا ہے یعنی ان کی طبیعت کا اقتضا فطری طور پر کچھ ایسا ہوتا ہے کہ وہ کائنات کی تمام اشیاء کو اصل وجود میں فنا ہوتے ہوتے دیکھتے ہیں۔ وہ ہر چیز میں اسی وجود کو جاری وساری دیکھتے ہیں اور وہ محسوس بھی کرتے ہیں کہ دنیا میں جو چیز بھی موجود ہے اس کے موجود ہونے کا تمام تر انحصار اسی وجود پر ہے الغرض یہ لوگ ''مقام وجود'' پر فائز ہوتے ہیں۔ چنانچہ جو کچھ وہ بولتے ہیں اسی مقام سے بولتے ہیں۔ اور جو کچھ سمجھتے ہیں اسی مقام سے سمجھتے ہیں۔ بے شک مظاہر وجود کے جو دوسرے مراتب ہیں یہ لوگ ان مراتب کے احکام کو بھی جانتے ہیں اور انہیں پہچانتے بھی ہیں لیکن ان کا یہ احساس علم کہ ایک ہی وجود سب مظاہر اور اشیاء میں جاری وساری ہے ان کی باقی تمام معلومات اور ان کے کل دوسرے رجحانات پر ہمیشہ غالب رہتا ہے۔ چنانچہ ایک ہی وجود کے ہر چیز میں جاری وساری ہونے کا یہ احساس لحظہ بہ لحظہ ان کے علم وشعور کے اس خرمن کو جو دوسرے مراتب وجود کے متعلق وہ اپنے ذہنوں میں جمع کرتے ہیں، جلاتا رہتا ہے۔ اور انہیں نسیا ومنسیا کرتا رہتا ہے۔ گو ضرورت کے وقت ان لوگوں کے ذہنوں میں دوسرے مراتب وجود کے احکام بھی نقش ہو جاتے ہیں لیکن ان کی طبیعت کا فطری تقاضا رہ رہ کر ابھرتا ہے اور وہ ان مراتب کے وجود کے احکام کو بجلی کی طرح جلا دیتا ہے۔ چنانچہ ان کا یہ احساس علم کہ ایک ہی وجود ہر شی میں جاری وساری ہے از سر نو ان پر غالب آ جاتا ہے۔

شروع شروع میں تو یہ ہوتا ہے کہ سالک وجود کے ہر شیٔ میں جاری وساری ہونے کا ادراک کرتا ہے لیکن آہستہ آہستہ یہ ادراک ملکہ کی صورت اختیار کر لیتا ہے، چنانچہ سالک اس ملکہ کے رنگ میں رنگا جاتا ہے۔ یہ ملکہ جب اپنے کمال کو پہنچتا ہے تو اس کے دو رخ ہوتے ہیں ایک ظاہری اور دوسرا باطنی رخ۔ وجود کے اس علم کا یہ رنگ اور اس کا یہ ملکہ صرف سالک کے نسمہ میں جاگزین ہوتا ہے اور اس کا اثر نسمہ سے آگے نہیں بڑھتا تو یہ اس کے کمال کا ظاہری رخ اور اس کا باطنی کمال یہ ہے

کہ سالک کے اندر نسمہ سے پرے جو نقطہ موجود ہے وہ نہ صرف خود اپنے تمام آثار و احوال کے ساتھ بیدار ہو بلکہ اس کے اس نقطے سے بیداری کے اثرات و احکام بھی رونما ہوں۔ نیز سالک کی نظر سے تعینات کے سب پردے اٹھ جائیں راہ طریقت کے سالکوں میں سے جو غیر کامل ہوتے ہیں وہ تو اس ضمن میں صرف ظاہری کمال تک ہی پہنچ پاتے ہیں اور باطنی کمال سے آشنا نہیں ہوتے۔ گویا کہ وہ وجود کے اس علم کی صورت کو تو پالیتے ہیں لیکن اس کے معنی کو نہیں جان سکتے اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ایک شخص اپنی سوچ بچار سے یا عارفوں کی تقلید سے اس نتیجہ پر پہونچا کہ تمام اشیاء ایک وجود میں فنا پذیر ہیں۔ اور یہ وجود سب اشیاء میں جاری وساری بھی ہے اب وہ بار بار اس نتیجہ کو اپنے ذہن میں حاضر کرتا ہے یہاں تک کہ یہ چیز اس کے اندر ایک ملکہ کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور وہ اس کے ملکہ کے رنگ میں رنگا جاتا ہے۔ گو اس کا نقطہ وجود بیدار نہیں ہوتا۔ غرضیکہ علم وجود کی یہ ساری کشش اور اس کی دھن میں سالک کی یہ تمام محویت اسے اس مرتبے تک نہ پہنچا سکی جہاں کہ اس علم کا ملکہ سالک کے اصل نفس اور اس کی جڑ میں جاگزیں ہو جاتا اس سالک کی مثال اس تالاب کی سی ہے کہ وہ سیلاب کے پانی سے بھر گیا لیکن اس میں زمین کے مسامات سے پانی نہیں پھوٹا۔ سالک کا اس طرح وجود کو ایک ماننا "توحید علمی" کہلاتا ہے۔

اور علم وجود کی پہلی شکل جب کہ یہ علم سالک کے نسمہ سے پڑے اس کے اندر جو نقطہ موجود ہے اسے بیدار کر دیتا ہے توحید حالی کہلاتی ہے۔

فقیر کو اس حقیقت سے بھی آگاہ کیا گیا ہے کہ بعض لوگوں کے لئے "توحید علمی" نفع مند نہیں ہوتی بلکہ اس سے الٹا انہیں نقصان ہوتا ہے۔ بات یہ ہے کہ بیکار کی دلیل بازی جسے سوفسطائیت کہتے ہیں اس "توحید علمی" سے پیدا ہوتی ہے۔ اسی توحید علمی کیوجہ سے لوگ شرعی اور عرفی احکام ومصالح میں تساہل کے مرتکب ہوتے ہیں باقی رہا "توحید حالی" کا معاملہ سو "توحید حالی" تو ایک بہت بڑا کمال ہے کہ زبان اس کے مطالب کو ادا کرنے سے عاجز ہے۔

ذلک فضل اللہ یو تیہ من یشاء

............☆☆☆............

نسبت عشق

ان نسبتوں میں سے ایک ''نسبت عشق'' ہے۔اوراس نسبت کی حقیقت یہ ہے کہ مومن جب حق سبحانہ کے متعلق یہ یقین کرلے کہ وہی ذات تمام اوصاف کمال کی حامل ہے وہ حق سبحانہ کے ذکرکواپنے لئے وجہ کمال سمجھے۔وہ ہمیشہ اس کے مبارک نام کا ذکر کرتا ہےاورحق سبحانہ کی نعمتوں اور بخششوں کو بھی پیش نظر رکھے۔تو ذکر وفکر میں اس کا برابر اس طرح لگا رہنا۔اس کے دل میں بے قراری، اضطراب شوق وقلق کا جذبہ پیدا کر دیتا ہے۔اوراس کی حالت روز بروز اس شعر کے مصداق ہوتی جاتی ہے۔

ويدركني في ذكرها قشعريرة

لها بين جلدي والعظام دبيب

جب میں اس کا ذکر کرتا ہوں تو اس کے ذکر سے مجھ پر کپکپاہٹ سی طاری ہوجاتی ہےاوراس کا اثر میری ہڈیوں اور میری جلد میں سرایت کرجاتا ہے۔حق سبحانہ کا ذکر کرتے کرتے آخرکار نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ جب بھی مومن کی زبان پر اللہ تعالی کا مبارک نام آتا ہےتو اس پر اس طرح کی کیفیت طاری ہوجاتی ہے گویا کہ ابھی روح بدن سے نکلی چنانچہ جب یہ کیفیت مومن کے نفس میں متمکن ہوجائے اوراس کا نفس اسی کیفیت کے رنگ میں یکسر رنگین ہوجائے تو اس کیفیت کو''نسبت عشق'' کہتے ہیں۔

افراد کاملین کا وہ گروہ جوفنا وبقا کے مقامات پر فائز ہےان کے نزدیک اس ''نسبت عشق'' کا ایک ظاہر ہےاورایک باطن۔اس نسبت کا ظاہر تو یہ ہے کہ جس طرح نفس کی اور کیفیتیں انسان کے نسمہ میں اپنی جگہ بنالیتی ہیں اسی طرح ''نسبت عشق'' بھی اسی نسمہ میں جاگزیں ہوجاتی ہے۔

''نسبت عشق'' کا باطن عبارت ہے اس محبت ذاتی سے جس کا حامل انسان کا نفس مجرد باطن ہوتا ہے بلکہ یہ محبت ذاتی تو انسان کے اندر روح کے وجود میں آنے سے پہلے ہی پیدا ہوگئی ہوتی ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ قدرت نے جس طرح مٹی اور پانی میں یہ خصوصیت رکھی ہے کہ وہ ہمیشہ نشیب کی طرف اپنا رجحان رکھتے ہیں۔ اور ان کے برعکس ہوا اور آگ کا رخ ہمیشہ اوپر کی طرف ہوتا ہے، اسی طرح موجودات میں سے ہر ایک چیز میں خواہ وہ چیز محسوسات میں سے ہو یا معقولات میں سے اللہ تعالیٰ نے کوئی نہ کوئی ذاتی کمال ضرور رکھا ہے۔ اسی بنا پر ہر چیز اپنے ذاتی کمال کے حصول کے لئے مشتاق رہتی ہے اور جب تک وہ اپنا مقصود حاصل نہیں کر لیتی برابر بے چین اور مضطرب رہتی ہے اور آخر میں جب وہ اپنے فطری کمال کو پا لیتی ہے تو اسے راحت نصیب ہو جاتی ہے۔ بعینہ یہی مثال مظاہر عالم کی اس کثرت کی بھی ہے، کائنات کی یہ ساری کثرت چونکہ ایک وحدت سے نکلی ہے اس لئے اس کثرت کا فطری تقاضا یہ ہے کہ وہ اس وحدت کی طرف ذاتی میلان رکھے اور اس کی طرف اس کی پرواز ہو۔ علاوہ ازیں کائنات کی یہ کثرت جس وجہ سے وجود کے مظاہر میں سے ہے ان مظاہر اور ان میں ظاہر ہونے والے اصل وجود میں بھی ایک خاص ربط پایا جاتا ہے۔ یہ ربط ان مظاہر میں سے ایک مظہر کی اصل فطرت اور اس کی جبلت میں داخل ہے اس ربط اور میلان سے مقصود نفس یا طبیعت کی وہ حالت یا کیفیت نہیں جو کوشش اور ریاضت کے بعد کہیں حاصل ہوتی ہے اور نہ یہ ربط اور میلان نتیجہ ہے اس ذکر و فکر کا جو ایک شخص اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور بخششوں کے متعلق کرتا ہے۔ الغرض یہ ربط کسی خارجی کوشش کا صلہ نہیں ہوتا بلکہ یہ ہر چیز کی اصل فطرت اور جبلت میں پایا جاتا ہے اور اسی کو ''محبت ذاتی'' کہتے ہیں۔

اب یوں ہوتا ہے کہ نفس کی اور کیفیات کی طرح مومن کے نسمہ میں ''نسبت عشق'' جاگزیں ہو جاتی ہے، اس کے ساتھ اس میں ''محبت ذاتی'' بھی شامل ہوتی ہے۔ اور اس طرح دونوں کے ملنے سے وہاں ایک مرکب سا بن جاتا ہے اس مرکب کا جسم تو نسمہ کی یہ ''کیفیت عشق'' ہوتی ہے اور اس مرکب کی روح ''محبت ذاتی'' بن جاتی ہے۔ لیکن جس شخص پر یہ احوال و کوائف وارد ہوتے ہیں وہ ان دونوں میں کوئی فرق نہیں کر پاتا۔ بہرحال اگر نسمہ کی اس کیفیت اور محبت ذاتی کا فرق سمجھ میں آ جائے تو پھر صوفیاء کے ان متضاد اقوال میں مطابقت کرنا ممکن ہو جاتا ہے۔ صوفیاء کا

ایک گروہ کہتا ہے کہ قلق واضطراب ایک عذاب ہے جسے محبوب کا وصل نصیب ہو گیا۔ اسے پھر یہ عذاب کیوں دیا جانے لگا۔ دوسرے گروہ کا یہ قول ہے کہ عشق، قلق واضطراب ایسی کیفیات ہیں کہ نہ سالک سے یہ اس دنیا میں چھٹیں گی اور نہ دوسری دنیا میں، یہ کیفیات اس سے دور ہوں گی، بات یہ ہے کہ پہلا گروہ جب یہ کہتا ہے کہ وصال محبوب کے بعد قلق واضطراب کیسے باقی رہیگا؟ تو اس سے دراصل ان کا مطلب نسمہ،قلق واضطراب ہوتا ہے۔ کیونکہ وصال کے بعد نسمہ میں قلق واضطراب کا رہنا تصور میں نہیں آسکتا۔ دوسرا گروہ جب کہتا ہے کہ نہ صرف اس دنیا میں بلکہ دوسری دنیا بھی قلق واضطراب کی کیفیت برقرار رہے گی تو اس سے ان کی مراد ''محبت ذاتی'' ہے لیکن اس ضمن میں صورت حال یہ ہے کہ اکثر عارفوں کو نسمہ اور ''محبت ذاتی'' باہم مخلوط نظر آتے ہیں۔ اور وہ ایک دوسرے سے الگ نہیں کر سکتے چنانچہ اسی بنا پر جب وہ اصل حقیقت کو تعبیر کرنے لگتے ہیں تو وہ ٹھیک طرح اس کی وضاحت نہیں کر پاتے۔

اس مقام پر دو نکتوں کا سمجھنا ضروری ہے۔ ایک یہ کہ اگر کسی عارف میں ''محبت ذاتی'' کم ہو جائے خواہ یہ کمی اس وجہ سے ہو کہ اس نے ذات حق کو وجود کے تمام اشیاء میں جاری وساری دیکھا۔ اور اس سے اس کے دل میں وہ اضطراب وشوق نہ رہا۔ جو محبوب کی دوری سے پیدا ہوتا ہے۔ بہرحال محبت ذاتی کی کمی کی کوئی بھی وجہ ہو یہ کمی عارف کے حق میں نقصان کا باعث ہوتی ہے۔ خواہ یہ عارف کسی مرتبہ کمال ہی پر کیوں نہ فائز ہو۔ دوسرا نکتہ یہ ہے کہ استقامت مزاج اور وفود عقل کے ہوتے ہوئے کسی شخص کا دنیا وآخرت کو ترک کر دینا اس سے تجرد اختیار کر لینا اور اہل وعیال کی فکر سے درگزر کرنا، اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ نسبت عشق کی کیفیت اس شخص کے نسمہ میں موثر نہ ہو جس شخص کو یہ نسبت حاصل ہوتی ہے، وہ تمام ماسوائے اللہ پر پورا قابو پالیتا ہے۔ اور ان سب چیزوں سے جو ماسواء اللہ کے حکم میں آتی ہے کلیۃ اعراض بھی کر سکتا ہے۔

چنانچہ اسی وجہ سے ''نسبت عشق'' رکھنے والے عارف کی شان یہ ہوتی ہے کہ جو بھی اسے دیکھتا ہے، اس سے عجز وفروتنی سے پیش آتا ہے۔

............☆☆☆............

نسبت وجد

ان نسبتوں میں سے ایک ''نسبت وجد'' کی ہے۔ ''نسبت وجد'' کی حقیقت سمجھنے سے پہلے نفس ناطقہ کے متعلق اتنا جاننا ضروری ہے کہ یہ اپنی فطرت میں کچھ اس طرح واقع ہوا ہے کہ جو حالات اس پر گزرتے ہیں یہ ان حالات کا رنگ قبول کر لیتا ہے۔ مثال کے طور پر محبت ونفرت، غصہ ورضا مندی اور خوف وطمانیت کی کیفیات کو لیجئے۔ ان میں سے بعض کیفیات تو پاک اور ملکی ہیں۔ اور بعض ناپاک اور حیوانی وبہیمی، جب ان میں سے کوئی کیفیت نفس ناطقہ پر موثر ہوتی ہے تو اس سے دوسری کیفیت جو اس کی ضد ہے نفس ناطقہ سے ازخود زائل ہو جاتی ہے۔

انسان کی یہ کیفیات نفسی، مختلف حالات کا نتیجہ ہوتی ہیں اور ان حالات کے اپنے اسباب ہوتے ہیں۔ جب سالک ان اسباب پر دسترس حاصل کر لے جو ملکی اور الٰہی حالات کو پیدا کرتے اور ان کو تقویت بخشتے ہیں تو لامحالہ اس سے اس کے نفس ناطقہ میں اسی قبیل کی کیفیات کی استعداد بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس ضمن میں اس کا نفس ناطقہ اتنا حساس ہو جاتا ہے کہ ایک ذراسی تحریک جسے عرف عام میں ہم کسی حساب میں نہیں لاتے۔ اس کے اندر غیر معمولی تاثیر پیدا کر دیتی ہے۔

الغرض جس شخص کا نفس ناطقہ ملکی اور الٰہی موثرات قبول کرنے میں اس قدر حساس ہو اس کے لئے ادنیٰ سا محرک بھی بڑی تاثیر رکھتا ہے۔ لیکن جو شخص کند ذہن اور جامد طبیعت کا ہو، اس کے نفس ناطقہ میں کسی ایسی کیفیت کا پیدا ہونا جو بے حد لطیف ہو، مشکل ہوتا ہے۔ اس شخص کو اپنے اندر اس قسم کی کیفیات پیدا کرنے کے لئے کسی سے عشق ومحبت کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ لیکن اس کے لئے شرط یہ ہے کہ یہ عشق ومحبت پاک ہو اور اس میں شہوانیت کا دخل نہ ہو، یہ شخص جب اپنے محبوب کو آتا جاتا دیکھتا ہے تو محبوب کی موزوں اور متناسب چال ڈھال اور اس کی رنگین عبارتیں

اس پر بڑا اثر کرتی ہیں۔ اس شخص کو محبوب کے وصال سے راحت اور اس کے فراق سے وحشت ہوتی ہے۔

جب محبوب اس کی طرف التفات کرے، تو اس کے دل کی کلی کھل جاتی ہے اور جب وہ اس سے بے التفاتی برتے، تو وہ پژمردہ سا ہو جاتا ہے۔ غرضیکہ عشق و محبت کے سلسلے میں اس شخص کو اس طرح کے یا ان سے ملتے جلتے اور احوال و معاملات سے سابقہ پڑتا ہے۔ نفس ناطقہ میں لطیف کیفیات پیدا کرنے کے لئے کند ذہن اور جامد طبیعت والے کو سماع کی بھی ضرورت پڑتی ہے، بہتر یہ ہے کہ سماع میں رنگین اشعار ہوں وہ نغمے اور زیر و بم کے ساتھ گائے بھی جائیں۔ خاص طور پر وہ اشعار زیادہ موثر ہوتے ہیں جن میں اچھے استعارے ہوں، ان کے قافیے بہت عمدہ ہوں۔ اور ان کا اسلوب بیان بڑا وجد آور ہو۔

چہ راہ میز ند ایں مطرب مقام شناس
کہ درمیان غزل قول آشنا آورد

اس ضمن میں اس شخص کیلئے رباب و طنبورے کی موسیقی بھی مفید ہے کیونکہ موسیقی سرور و مستی پیدا کرنے میں وہی تاثیر رکھتی ہے جو تاثیر کہ شراب میں ہوتی ہے۔

عشق پاک باز ہو یا سماع شعر و نغمہ اگر کند ذہن اور جامد طبیعت والا برابر اس سے متمتع ہوتا رہے تو وقتاً فوقتاً اس کے نفس ناطقہ میں اس سے ایک نہ ایک کیفیت پیدا ہوتی رہتی ہے اور آہستہ آہستہ اس کا نفس ناطقہ ان کیفیات سے متصف ہوتا جاتا ہے۔ چنانچہ اس طرح سے کند ذہن آدمی کی طبیعت کا جمود ٹوٹ جاتا ہے۔

نفس ناطقہ کو متاثر کرنیکا جو طریقہ اوپر بیان ہوا، ارباب وجد میں سے اکثر لوگ اس کی طرف راغب نظر آتے ہیں۔ لیکن اس سلسلے میں شارع علیہ السلام نے وجد کے طالبوں کیلئے جو راہ تجویز فرمائی ہے وہ یہ کہ آدمی وعظ سنے قرآن شریف کی تلاوت کرے اور ساتھ ساتھ اس کے معانی پر غور کرے، دوران تلاوت میں جہاں جہاں اللہ تعالیٰ کی بخشش و رحمت کا ذکر آئے وہاں وہ اس سے رحمت چاہے۔ جہاں عذاب کا ذکر ہے وہاں اس کے عذاب سے پناہ مانگے اور جن آیات میں صفات الٰہی کا بیان ہے ان کی تلاوت کرتے وقت خدا تعالیٰ کی تسبیح و تحمید کرے۔ اس

کے علاوہ رقت پیدا کرنے والی احادیث اور حکایات کو پڑھے اور ان کے مطالب کو اپنے ذہن میں بار بار دہرائے۔

طبیعت کا جمود دور کرنے اور نفس ناطقہ کو متاثر کرنیکے صرف یہی طریقے نہیں ہیں جو اوپر بیان ہوئے بلکہ بعض دفعہ دریا کے جوش وخروش اور صحرا اور سمندر کی بے کنارہ وسعت دیکھ کر یا دل میں کسی خیال کے آنے سے جو کسی کیفیت کی یاد تازہ کر دیتا ہے انسان پر یہ کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اور اسی طرح بعض لطیف مضامین سننے سے بھی انسان کو وجد آ جاتا ہے۔

اہل کمال کے نزدیک ''نسبت وجد'' کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن ''نسبت وجد'' کے ظاہر سے مراد وجد کی کیفیت کا صرف نسمہ میں جاگزیں ہونا ہے۔ اس کے باطن کی حقیقت یہ ہے کہ انسان کا لطیفہ مجردہ یعنی اس کی روح ایک معرفت کے بعد دوسری معرفت حاصل کرے اور خدا تعالی کے ایک اسم میں فنا ہونے کے بعد دوسرے اسم میں فنا ہو۔ خواجہ نقشبند نے اس کا نام قبض وبسط رکھا ہے۔

خلاصہ مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں کو یہ نسبت حاصل ہوتی ہے ان میں سے اکثر سماع و وجد پر فریفتہ ہوتے ہیں۔ ان میں سے جو فنا و بقا کے مقام پر سرفراز ہوتے ہیں ان پر ''نسبت وجد'' کی وجہ سے ایسے حقائق ومعارف کا فیضان ہوتا ہے کہ زبان ان کو ادا کرنے سے قاصر ہے۔

............☆☆☆............

صوفیائے کرام کے طبقات اور ان کی نسبتیں

اس فقیر کو بتایا گیا کہ صحابہ، تابعین اور جمہور صالحین کی ''نسبت احسان'' ہے۔ ''نسبت احسان'' مرکب ہے، ''نسبت طہارت'' اور ''نسبت سکینہ'' سے اور اس کے ساتھ عدالت، تقوی اور سماحت یعنی حسن اخلاق کے انوار اور ان کی برکتیں بھی شامل ہیں چنانچہ ان بزرگوں کے کلام کا اصل مفہوم اور ان کے ارشادات کا صحیح مقصود اسی نسبت احسان پر دلالت کرتا ہے۔

میں نے ائمہ اہل بیت کی ارواح کو دیکھا کہ وہ عالم ارواح میں ایک دوسرے کا دامن مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہیں۔ اور حظیرۃ القدس میں ان کو بڑی منزلت حاصل ہے، میں نے وہاں یہ بھی مشاہدہ کیا کہ اہل بیت کی ارواح کی قوت خارج سے زیادہ عالم ارواح کے باطن میں ہے۔

(۱) وہ صوفیاء متقدمین جن کا طبقات (۱) سلمی اور رسالہ قشیری (۲) میں ہے، ان کی مختلف نسبتیں ہیں۔ ان میں سے بعض بزرگ ''نسبت احسان'' رکھتے ہیں اور بعض ''نسبت عشق و وجد''

---

(۱) ابوعبدالرحمٰن محمد بن حسین بن محمد بن سلمی نیشاپور کے مشہور صوفی تھے۔ موصوف کو صوفیہ کے حالات اور اخبار سے بڑی دلچسپی تھی۔ اپنے تصوف کے نقطہ نظر سے سنن، تفسیر اور تاریخ میں کتابیں لکھیں۔ آپ کی حلقہ صوفیاء میں بڑی عزت تھی، موصوف نے ۴۱۲ھ میں انتقال فرمایا۔

(۲) ابوالقاسم عبدالکریم بن ہوزان بن عبدالملک القشیری۔ آپ بھی نیشاپور کے رہنے والے تھے۔ ۴۴۸ھ میں بغداد میں آئے۔ موصوف مفسر، محدث، فقیہ، متکلم، اصولی، ادیب، نحوی، انشاپرداز، شاعر، صوفی، اپنے زمانے کی زبان اور اپنے عہد کے سردار تھے آپ کی تفسیر بہترین اور واضح ترین تفسیروں میں سے ہے، تصوف میں آپ کا رسالہ ''قشیریہ'' کے نام سے مشہور ہے۔)

ان میں سے ایک جماعت ''نسبت تجرد'' رکھتی ہے اور ان میں سے ایک گروہ ایسا بھی ہے جن میں کا ہر شخص ان نسبتوں میں سے ایک نہ ایک نسبت اس طرح رکھتا ہے کہ وہ نسبت ''نسبت یادداشت'' سے ملی ہوئی ہے، ان سب نسبتوں کا لب لباب ہم اس کتاب کے شروع میں بیان کر آئے ہیں۔

(۲) حضرت غوث اعظم ''نسبت اویسی'' رکھتے ہیں۔ ان کی اس نسبت کے ساتھ ''نسبت سکینہ'' کی برکات بھی ملی ہوئی ہیں۔ حضرت غوث اعظمؒ کی اس نسبت کی تفصیل یہ ہے کہ شخص اکبر کے دل پر ذات الٰہی کی تجلی ہوئی اور تجلی نمونہ بنی باری تعالیٰ کی ذات کا جس شخص کو یہ نسبت حاصل ہوتی ہے وہ شخص اکبر کے اس نقطۂ تجلی کا محبوب ومقصود بن جاتا ہے۔ اب چونکہ نفوس افلاک، ملاءاعلیٰ اور ارواح کاملین کی محبت شخص اکبر کے اسی نقطے کے ضمن میں آتی ہے۔ اس لئے یہ نسبت رکھنے والا شخص اکبر کے نقطۂ تجلی کی وساطت سے سب کا محبوب ومقصود بن جاتا ہے، الغرض جب اس کی نسبت کا حامل شخص اکبر کی اس تجلی کا محبوب ٹھہرا تو اس محبوبیت کی وجہ سے اس پر تجلیات الٰہی میں سے ایک تجلی کا فیضان ہوا۔ اور یہ تجلی جامع ہوتی ہے، قدرت الٰہی کے ان چار کمالات یعنی ابداع، خلق، تدبیر، اور تدلی کی اور یہ چار کمالات اس نظام کائنات میں مصروف عمل ہیں۔ چنانچہ اس تجلی کے طفیل اس نسبت رکھنے والے شخص سے بے انتہا خیر وبرکت کا ظہور ہوتا ہے۔ خواہ وہ اس کمال کے اظہار کا قصد کرے یا نہ کرے۔ اور اس فیض کی طرف اس کی توجہ ہو یا نہ ہو۔ گویا کہ اس خیر وبرکت کا یہ صدور ایک طے شدہ امر ہے۔ اور یہ اس کے ارادے کے بغیر ہی معرض وجود میں آرہا ہے۔

حضرت غوث اعظمؒ کی زبان سے فخر اور بڑائی کے جو بلند آہنگ کلمات نکلے اور آپ کی ذات گرامی سے تسخیر عالم کے جو واقعات رونما ہوئے یہ سب کچھ آپ کی اسی نسبت کا نتیجہ تھا۔ اس ضمن میں بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب یہ نسبت تکمیل کو پہنچتی ہے تو اس کی وجہ سے کسی قدر ''نسبت یادداشت'' بھی جو نسبت توحید سے ملی ہوئی ہوتی ہے، حاصل ہوجاتی ہے۔ ان سب نسبتوں کے جن کا اوپر بیان ہوا، آثار جیسے کہ ان نسبتیں رکھنے والوں کے اپنے احوال وطبائع ہوتے ہیں، انہیں کے مطابق ہی ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

(۳) خواجہ نقشبندؒ کی اصل ''نسبت یادداشت'' ہے اور بیشتر اور بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ یہ

''نسبت احسان'' کی نسبت تک پہنچا دیتی ہے۔ چنانچہ اسی بنا پر خواجہ نقشبند کا یہ ارشاد وارد ہوا ہے کہ:

''مسلمانی اور طاعت وانقیاد سر تا پا نور و صفا ہیں''

(۴) خواجگان چشت میں سے مشائخ متقدمین کو نور و طہارت و سکینہ کی نسبت جو ''نسبت عشق'' سے ملی ہوئی ہے، حاصل تھی جو دور متوسط کے مشائخ ہیں ان کی ''نسبت'' نسبت عشق تھی جس میں نور و سکینہ کی نسبت کی آمیزش تھی۔ ان بزرگوں کی نسبت میں خاص طور پر اسمائے الٰہیہ کے انوار اور ان کی برکات کا بڑا اثر تھا۔ خواجگان چشت میں سے جو آخری دور کے مشائخ ہیں ان کو ''نسبت عشق'' جس میں کسی قدر ''نسبت توحید'' بھی ملی ہوئی تھی، حاصل تھی۔

(۵) سہروردی طریقے کے بزرگوں کی نسبت نور طہارت اور نور سکینہ کی تھی اور ان کی اس نسبت کے ساتھ ''نسبت یادداشت'' بھی شامل تھی۔

(۶) سلسلۂ اکبریہ کے مشائخ کی نسبت توحید تھی جس میں کے بعض کے نزدیک تو عشق و وجد کی نسبت ملی ہوئی تھی۔ دوسروں کے خیال میں ان مشائخ کی اس ''نسبت توحید'' کے ساتھ نور سکینہ کی آمیزش تھی۔

(۷) طبقۂ کبرویہ کی نسبت ایک سی نظر نہیں آتی متقدمین میں اس نسبت کی کیفیت اور تھی اور متاخرین میں کچھ اور۔

(۸) طریقۂ شاذلیہ (۱) کی نسبت کی تفصیل یہ ہے کہ وہ نقطہ جو شخص اکبر کے قلب میں ہے اور وہ نمونہ ہے باری تعالیٰ کی ذات کا۔ اس نسبت کی وجہ سے سالک کا نفس ناطقہ اس نقطے کی مثالی

---

(۱) یہ طریقہ امام ابی الحسن علی بن عبداللہ الشاذلی کی طرف منسوب ہے۔ شاذلہ شمالی افریقہ میں ایک گاؤں تھا جہاں موصوف پیدا ہوئے نابینا ہونے کے باوجود آپ نے علوم شرعیہ میں بڑا درک حاصل کیا پھر موصوف تصوف کی راہ پر بھی گامزن ہوئے اور اس میں بڑا نام پیدا کیا۔ آپ مغرب سے اسکندریہ میں منتقل ہو گئے تھے آپ نے ۶۵۶ھ میں انتقال فرمایا ابن دقیق العید لکھتے ہیں کہ میں نے ان سے بڑھ کر کسی کو اللہ تعالیٰ کی معرفت رکھنے والا نہیں پایا لیکن اس کے باوجود اہل مغرب نے انہیں اذیتیں دیں۔ اپنے یہاں سے نکال دیا اور اسکندریہ کے حاکم کو لکھا کہ تمہارے یہاں ایک مغربی زندیق آرہا ہے جس کو ہم نے اپنے شہر سے نکال دیا ہے لیکن اس کے باوجود انہیں اسکندریہ میں پناہ مل گئی۔ بے شک میرا محافظ و نگران اللہ تعالیٰ ہے جس نے قرآن اتارا اور وہ نیکو کاروں کا محافظ و نگران ہے۔

صورت ہے۔ نیز اس کے ارد گرد ملاء اعلیٰ کے جو فیوض پھیلے ہوئے ہیں۔ ان سے اتصال پیدا کر لیتا ہے اس اتصال کی نوعیت یہ ہوتی ہے کہ سالک کو اس تدبیر پر پورا پورا اعتما حاصل ہو جاتا ہے جو انسان کو مدارج قرب الٰہی تک پہنچانے میں برابر مصروف کار ہے۔ اور جسے تدلی کا نام دیا گیا ہے۔ اس تدلی سے ''فاکون سمعه الذی یسمع به وبصره الذی یبصر به'' کی نسبت یعنی خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں اس کا کان ہو جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے۔ اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے سالک کے اندر یہ چیز پیدا ہو جاتی ہے۔ قرآن مجید کی اس آیت ''ان ولی الله الذی نزل الکتاب وهو یتولی الصالحین'' میں اسی نسبت کی طرف اشارہ ہے، باقی اللہ ان امور کو بہتر جانتا ہے۔

مزید برآں یہ بھی یاد رہے کہ ان سب طریقوں کی نسبتیں ہمیشہ ایک طریق پر وقوع پذیر نہیں ہوتیں۔ اس معاملے میں سالکوں کی اپنی کوشش اور رجحان کا بھی بڑا دخل ہوتا ہے بہر حال جسے کسی سالک کی کوشش ور رجحان ہوتا ہے اسی کے مطابق اسے کسی نسبت کے حصول کی استعداد ملتی ہے۔ مزید برآں ایک خاص نسبت کے آثار کی تحقیق صرف اسی وقت ممکن ہو سکتی ہے، جب کہ یہ نسبتیں بالکل خالص ہوتیں۔ اور ایک نسبت میں دوسری نسبت کی آمیزش نہ ہوتی یہ خصوصیت متاخرین کے یہاں شاذ و نادر ہی پائی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں ہر نسبت کے جدا جدا اثرات کی تحقیق اس وقت ممکن ہو سکتی تھی جب کہ سالک ائمہ طریقت سے ان کی مخصوص نسبت کو بجنسہ بغیر کسی تبدیلی و تغیر کے لیتے۔ اس طرح نہ ہوتا کہ مثلاً خرقہ یا بیعت کے ذریعے انہوں نے ایک نسبت درست کی۔ ریاضت و مجاہدہ سے دوسری نسبت حاصل کر لی۔ اور یہ بات بہت سے لوگوں میں جو تصوف کے طریقوں سے منسوب ہیں عام طور پر پائی جاتی ہے۔

الغرض اگر تصوف کے ان مختلف طرق کی نسبتوں اور انکی خصوصیات پر نظر ہو تو ایک ذہین آدمی بڑی آسانی سے اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ خواجہ نقشبندیہ قبروں کی باقاعدہ زیارت کو کیوں قابل اعتبار نہیں سمجھتے۔ ان کے نزدیک وہ واقعات اور معاملات جو سالک سے اس کی طاعات کی قبولیت سے قبل ظاہر ہوتے ہیں۔ کسی بنا پر درخور اعتنا نہیں ہیں۔ اور وہ یہ بھی جان لے گا کہ چشتی طریقے کے بزرگ سماع کی طرف کیوں رغبت رکھتے ہیں۔ ان باتوں کو سمجھنے کیلئے تمہیں غور و تدبر

کرنا چاہیے۔

اس فقیر کو بتایا گیا کہ کہ حضرت غوث اعظمؒ کے طریقے کی مثال ایک ایسی ندی کی ہے کہ کچھ دور تو وہ زمین کی سطح کے اوپر بہتی رہی پھر وہ زمین کے اندر غائب ہوگئی۔ اور اندر ہی اندر دور تک بہی۔ اور اس نے زمین کے اندورنی مسامات کو نمناک کر دیا، اس کے بعد وہ دوبارہ چشمے کی شکل میں پھوٹ نکلی، پھر دور تک زمین کی سطح کے اوپر، اوپر بہتی چلی گئی۔

الغرض اس کے، زمین کی سطح پر ظاہر ہونے اور پھر زیر سطح غائب ہونے کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ بعینہ یہی حال طریق جیلانیہ کا ہے۔ گو اس طریقے کا سلسلۂ خرقہ تو مسلسل چلا آ رہا ہے۔ لیکن اخذ نسبت کا سلسلہ اس طریقے میں متصل نہ رہا چنانچہ اکثر ایسا ہوا کہ ایک بار یہ طریقہ رونما ہوا۔ اور اس کے بعد مفقود ہو گیا۔ پھر دوبارہ بطریق اویسی بغیر کسی مرشد کے توسط سے اس طریق کا کسی بزرگ کے باطن سے ظہور ہوا۔ سچ پوچھئے تو یہ طریقہ جیلانیہ تمام تر اویسیہ ہی ہے اور اس طریقے سے انتساب رکھنے والے بزرگ بڑی رفعت اور سطوت کے مالک ہوتے ہیں۔

باقی رہا طریق نقشبندیہ تو وہ بمنزلہ اس ندی کے ہے جو برابر سطح زمین کے اوپر اوپر بہتی چلی جائے۔ جو بزرگ اس طریقے سے منتسب ہوتا ہے، اس کی ذات اس عالم ناسوت میں خدا تعالی کی قوی اور مقتدر اسماء کی مظہر ہوتی ہے۔ مختصراً طریق نقشبندیہ کی مثال یوں سمجھئے جیسے کوئی نقاش کسی دیوار پر خوشنما نقوش بنا دیتا ہے۔ طریقہ جیلانیہ کی مثال ایسی ہے کہ کوئی شخص آئینے کو صاف اور مجلّا کرتا ہے تا کہ باہر سے اس پر خوشنما نقوش کا اثر پڑ سکے۔ یا جیسے کوئی تلوار اس طرح صیقل کرے کہ اس کا اصلی جوہر نمایاں ہو جائے۔ چنانچہ جس شخص کو طریقہ جیلانیہ کی نسبت حاصل ہوتی ہے وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ جو کچھ اس پر باہر سے عکس پڑ رہا ہے یہ کمال دراصل اس کی خود اپنی فطرت میں موجود ہے اور یہ اسے بغیر کسی محنت اور ریاضت کے حاصل ہو گیا۔

طریقۂ چشتیہ مقبولوں کا طریقہ ہے۔ اس طریقے کے متوسلین عوام الناس میں بڑے مقبول ہوتے ہیں۔ نیز صوفیاء میں سے چشتی بزرگ عام لوگوں سے زیادہ مشابہ ہوتے ہیں، باقی جو اصل حقیقت ہے وہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ اب رہا فقیر کا طریقہ جب فقیر نے ''جذب'' کی راہ طے کر لی تو اس کے سامنے ان تمام اکابر کی طرف ایک کشادہ راستہ کھل گیا۔ اور اس نے اوپر کی یہ

ساتوں کی ساتوں نسبتیں بطریق ذوق و وجدان اور بواسطہ بحث و نظر معلوم کیں۔ اور ان میں خوب تحقیق بھی کی چنانچہ اس فقیر کو جو نسبت عطاء کی گئی ہے وہ انہیں ساتوں نسبتوں سے مرکب ہے۔ اس کی کیفیت یہ ہے کہ جب میں خود اپنے آپ میں ہوتا ہوں تو مجھ پر ایک ایسی اجمالی صورت ظاہر ہوتی ہے جو ان ساتوں نسبتوں کا خلاصہ ہے۔ جب میں اپنے آپ کو ان نسبتوں میں سے کسی ایک نسبت کے سپرد کر دیتا ہوں اور اس کی طرف پوری طرح اپنے دل کو متوجہ کر لیتا ہوں تو مجھے خاص اس نسبت میں استغراق حاصل ہو جاتا ہے چنانچہ ان دو حالتوں میں سے جہاں تک پہلی حالت کا تعلق ہے اس میں مجھ پر ان سات نسبتوں میں سے ہر نسبت کے آثار اجمالی طور پر اور ایک دوسرے سے ملے جلے ظاہر ہوتے ہیں۔ اور دوسری حالت میں جبکہ میں صرف ایک نسبت کی طرف متوجہ ہوتا ہوں تو خاص اس نسبت کے آثار بڑی تفصیل سے اور علیحدہ حیثیت میں مجھ پر ظاہر ہوتے ہیں۔ بہر حال ان تمام نسبتوں میں اور خاص طور پر ان میں اجمالی لحاظ سے مجھے بڑا رسوخ اور ثبات عطا کیا ہے۔

ولو ان لی فی کل منبت شعرة

لسانا لما استوفیت واجب حمده،

''اگر میرے ہر بال کی جڑ زبان بن جائے اور میں اس کی حمد بیان کرنے لگوں تو پھر بھی میں اس کی حمد کا حق ادا نہیں کر سکتا۔''

اب اگر کوئی شخص ہماری نسبت کا طالب ہے تو سب سے پہلے اسے یہ کرنا چاہیے کہ وہ ''راہ جذب'' کو تا آخر تمام کرے لیکن یہ چیز غالباً کسی مجذوب کے فیض تربیت کے بغیر میسر نہیں آتی اس کے لئے سالک کو چاہیے کہ وہ کسی مجذوب کے زیر عاطفت اس کی پر تاثیر شخصیت کی مدد سے اس مرحلے کو طے کرے۔ یاد رہے کہ اس معاملے کا تعلق تعلیم و تعلم اور گفت و شنید سے زیادہ نہیں۔ جب سالک ''راہ جذب'' کو تمام کر لے تو پھر اوپر کی ان سات نسبتوں میں سے ایک ایک علیحدہ علیحدہ حاصل کرے۔ اور ہر ایک سے فرداً فرداً اپنا ربط پیدا کرے۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد جب وہ مراقبے میں جائے تو سب سے پہلے طہارت سکینہ اور اویسیہ نسبتوں کی طرف متوجہ ہو۔ جب اس کی چشم بصیرت ان نسبتوں کو دیکھنے لگے تو سالک ان نسبتوں کو جاننے اور ان کے رنگ میں رنگے

جانے کے بعد ایک قدم اور آگے بڑھے۔ اور ''نسبت یادداشت'' کو اپنا مطمح نظر بنائے۔ اور کوشش کرے کہ اس کا اپنا نقطۂ وجود یعنی وہ اصل حقیقت جس سے خود اس کی اپنی ذات عبارت ہے یا دوسرے لفظوں میں اس کا ''انا'' ذات باری تعالیٰ کی طرف جو تمام وجودوں کی سرچشمہ یعنی وجود خالص ہے، متوجہ ہو۔ اور اس امر میں وہ پوری طرح کوشاں رہے یہی لب لباب ہے توحید کا اور یہی مقصود ہے عشق سے۔

جب سالک تکمیل کی یہ منزل طے کر لے گا تو لامحالہ اس کے اندر ''حقیقت وجد'' بروئے کار آئیگی۔ کیونکہ اس نسبت کا یہ لازمی نتیجہ ہے۔ الغرض جن طرق تصوف کے متعلق ہم نے ابتداء کلام میں اشارہ کیا تھا یہاں ان کا بیان ختم ہوتا ہے۔

درس شرف نبودز الواح ابجدی

لوح جمال دوست مرا رو برابراست

تصوف وطریقت کے مسائل تو اوپر بیان ہو چکے۔ اب ہم (الف) ان چار اخلاق پر بحث کرینگے جن کی تکمیل واشاعت ہی انبیاء کی بعثت کا اصل مقصود تھا۔ اس کے بعد (ب) بنی نوع انسان کی فطری استعدادوں کا ذکر ہوگا اور ہم بتائیں گے کہ کس استعداد والے کیلئے کونسا کام مناسب اور موزوں ہوتا ہے۔ (ج) قدرت کی طرف سے انسان کے اندر جو لطائف ودیعت کئے گئے ہیں ان پر گفتگو ہوگی۔ (د) اصحاب یمین کے مختلف طبقات کا ذکر ہوگا اور (ہ) خوارق عادت امور اور کرامات کیسے ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ ان پر ہم بحث کریں گے۔

بات یہ ہے کہ یہ سب چیزیں تصوف وطریقت کے مسائل کو پوری طرح سمجھنے کیلئے نہایت ضروری ہیں۔ اس لئے ہم یہاں ان کو مختصر طور پر بیان کر رہے ہیں۔ اولیاء کے احوال وکوائف میں عام طور پر جو اختلاف پایا جاتا ہے ان میں سے بعض ایسے ہوتے ہیں جو بہت زیادہ ریاضت کرتے ہیں بعض بہت کم اور بعض سے کرامات ظاہر ہوتی ہیں اور دوسروں سے سرے سے کوئی کرامت ظاہر نہیں ہوتی۔ یہ چیزین جاننے کے بعد سالک کو ان میں اور اس طرح کے جو اور مسائل ہیں ان مین تشویش لاحق نہیں ہوگی۔

☆☆☆

انسانیت کے چار بنیادی اخلاق

اس فقیر کو بتایا گیا ہے کہ تہذیب نفس کے سلسلے میں شریعت کا مقصود دراصل یہ ہے کہ انسانوں میں یہ چار خصلتیں پیدا ہوں۔ اور جو چیزیں ان چار خصلتوں کے خلاف اور ان کی ضد ہیں ان کی نفی کی جائے۔ چنانچہ اللہ تعالی نے انبیاء علیہم السلام کو انہی چار خصلتوں کو بروئے کار لانے کیلئے مبعوث فرمائے اور تمام شرائع الٰہی کا یہی مقصد ہے کہ وہ ان چار خصلتوں کی تلقین کریں۔ اور انہیں کو حاصل کرنے کی طرف لوگوں کو رغبت دلائین نیز جن رسوم اور اعمال سے یہ خصلتیں پیدا ہوسکتی ہیں۔ ان کی لوگوں میں ترویج کرین۔

الغرض شرائع الٰہی میں ترغیب وتحریص کا سارا زور انہی چار خصلتوں کے پیدا کرنے پر مرکوز ہے۔ اور جن چیزوں سے لوگوں کو ڈرایا گیا ہے وہ حقیقت میں ان چار خصلتوں ہی کی ضد ہے۔

''بر'' یعنی نیکی، عبارت ہے ان اعمال اور ذرائع سے جن سے یہ چار خصلتیں پیدا ہوتی ہیں۔ وہ اعمال اور وسائل جو ان خصلتوں کے خلاف اثر پیدا کرتے ہیں ان میں پڑنا ''اثم'' یعنی بدی ہے۔ وہ اخلاق جو اس زندگی کے بعد دوسری دنیا میں انسانوں کے کام آئیں گے۔ اور ان کے نہ ہونے سے انسانوں کو وہاں نقصان پہنچے گا، یعنی اخلاق حسنہ وہ یہی چار خصلتیں ہیں جس شخص نے ان چار خصلتوں کی اصل حقیقت کو اپنے ذوق وجدان سے جان لیا اور وہ اس راز کو بھی پا گیا کہ ہر زمانے میں اور ہر قوم میں جو بھی شریعت بنی۔ اس شریعت کے پیش کردہ احکام اور اعمال کس طرح ان چار خصلتوں تک پہنچے۔ اور وہ ان کی تکمیل کے ذرائع اور واسطہ بنے۔

الغرض جس شخص نے اس راز کو معلوم کرلیا وہ صحیح معنوں میں فقیہ فی الدین'' اور ''راسخ فی العلم'' ہے۔ وہ شخص جس نے کہ شریعت کے ظاہری اعمال میں ان خصلتوں کا سراغ لگایا ان کے

رنگ میں رنگا گیا اور اس نے اپنی ذات کے اصل جوہر میں ان خصلتوں کا اثر جذب کر لیا تو اس کا شمار "محسنین" میں سے ہوگا۔

قصہ مختصر ان چار خصلتوں کی معرفت بہت بڑی بات ہے اس بندہ ضعیف پر خداوند کریم کا یہ عظیم الشان احسان ہے کہ اس نے مجھے ان کی معرفت عطا فرمائی۔ "ذلک من فضل اللہ علینا وعلی الناس ولکن اکثر الناس لایشکرون"

ان چار خصلتوں میں سے پہلی خصلت طہارت ہے۔ قدرت نے ہر سلیم النفس انسان میں یہ خصلت ودیعت کی ہے اور اس میں فطری طور پر طہارت کی طرف میلان رکھا ہے۔ اگر ایک شخص اپنی سلامتی فطرت پر رہے اور باہر سے کوئی چیز اس کے نفس میں خلل انداز نہ ہو تو لامحالہ وہ طہارت کی خصلت کا حامل ہوگا۔ لفظ طہارت سے کہیں یہ غلط فہمی نہ ہو کہ اس جگہ طہارت سے ہماری مراد وضو اور غسل سے ہے۔ طہارت سے دراصل یہاں مقصود وضو اور غسل کی روح اور ان سے انسان کو جو نور وانشراح حاصل ہوتا ہے، اس سے ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ آپ ایک پاکیزہ طبیعت والے ایسے آدمی کو لیجئے کہ اس کی حرکات وسکنات اور آثار وقرائن سے یہ قیاس لگایا جا سکے کہ اس کا مزاج صحیح اور اس کی فطرت سلامت ہے۔ اور اس میں بحیثیت ایک انسان کے وہ مادہ استعداد موجود ہے۔ جو انسانیت کے فطری تقاضوں اور اس کے نوعی احکام کو قبول کر سکتا ہے۔ فرض کیا کہ یہ شخص نفس کے ذلیل رجحانات اور بھوک، غضب، وغصہ اور جماع وغیرہ کی جبلی خواہشات سے جو انسان کو تشویش میں ڈال دیتی ہیں، فارغ ہو چکا ہے۔ اس کے بعد یہ شخص نجاستوں میں ملوث ہو جائے اس کے بدن پر میل کچیل جمی ہو، جہاں بال نہ ہونے چاہیں وہاں بال بڑھ گئے ہوں، اسے پیشاب اور پاخانہ نہ لگ رہا ہو اور اس کے پیٹ میں ریح کا زور ہو، جس کی وجہ سے اسے معدے میں گرانی محسوس ہو رہی ہو یا اس نے ابھی ابھی جماع اور اس کے خیالات ومسببات سے فراغت پائی ہو۔ ان حالات میں اگر یہ شخص اپنے صحیح وجدان کی طرف متوجہ ہوگا تو لامحالہ اسے اپنی اس حالت سے کراہیت ہوگی۔ اور وہ اپنے اندر چڑچڑاپن، تنگی اور رنج وغم محسوس کرے گا۔

اب یہی شخص بول وبراز سے فراغت حاصل کر لیتا ہے وہ غسل کرتا ہے، زائد بالوں کو جسم سے دور کرتا ہے، نئے کپڑے پہنتا ہے اور خوشبو لگاتا ہے۔ اس حالت میں وہ اپنے صحیح وجدان کی

طرف متوجہ ہوتا ہے تو اسے بڑی مسرت محسوس ہوتی ہے۔ اور وہ اپنے اندر سرور وانشراح پاتا ہے۔ اب اس کی پہلی حالت ناپاکی اور حدث کی تھی جس کی وجہ سے اس کی طبیعت پر تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اور یہ دوسری حالت نور طہارت کی ہے جس سے اس کی طبیعت پُرمسرت اور ہشاش بشاش تھی۔

انسان کے نفس کو جب ناپاکی کی تاریکی گھیر لیتی ہے تو اس کے اندر شیطانی وسوسے پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ وہ خوفناک خواب دیکھتا ہے اور اس کے دل پر سیاہی ہجوم کر آتی ہے۔ جب اس پر نور طہارت کا غلبہ ہوتا ہے تو اس کے لئے فرشتوں کے الہامات ہوتے ہیں۔ وہ اچھے اچھے خواب دیکھتا ہے اور نیند اور بیداری دونوں حالتوں میں ایک نور اس کے دل کا احاطہ کئے رہتا ہے۔ نور طہارت والوں میں سے بعض ایسے ہوتے ہیں کہ وہ خواب میں دیکھتے ہیں کہ آفتاب ان کے دل میں یا منہ میں داخل ہو رہا ہے اس سے ان کو بڑی خوشی حاصل ہوتی ہے۔

ان میں سے بعض خواب میں ماہتاب اور ستاروں کو اپنے ماتھے اور جسم کے دوسرے اعضاء سے چمٹا ہوا، دیکھتے ہیں۔ اور بعض خواب میں نور کو بارش کی طرح برستا دیکھتے ہیں۔ الغرض یہ اور اس طرح کی اور چیزیں حقیقت میں آثار ومظاہر ہوتے ہیں۔ ایک وجدانی کیفیت جس کو انس ونور سے بہتر کسی اور لفظ سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ اس وجدانی کیفیت کو ہم تفصیل سے نسبت طہارت کے ضمن میں پہلے بیان کر آئے ہیں۔ نور طہارت کی یہ کیفیت انسان کی جملہ کیفیات میں سے سب سے زیادہ ملاء اعلیٰ سے ہی مشابہ ہوتی ہے ملاء اعلیٰ کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ بہیمیت کی تمام آلائشوں سے پاک ہے اور انہیں بذات خود اپنے آپ سے سرور وانبساط ملتا ہے نیز ان کو اپنے اس مقام سے جو انہیں خدا تعالیٰ کی طرف سے تفویض کیا گیا ہے، بڑا انس ہوتا ہے۔ انسانوں میں سے جب کوئی شخص ملاء اعلیٰ سے اپنا رشتہ جوڑتا ہے تو اس کی وجہ سے اسے بے حد خوشی ومسرت محسوس ہوتی ہے۔ جب خوشی ومسرت کی یہ حالت اس کے نفس میں راسخ ہو جاتی ہے تو یہ ایک ملکہ کی صورت اختیار کر لیتی ہے چنانچہ اس شخص کو ملاء اعلیٰ سے مناسبت پیدا ہو جاتی ہے اور اس پر جنت کی کیفیات کی روح اور اس کی نعمتوں کے حاصل مقصود کا دروازہ کھل جاتا ہے۔

طہارت کے بعد دوسری خصلت اللہ تعالیٰ کی جناب میں عجز وخضوع اور اس کی طرف اپنی

چشم دل کو یکسر متوجہ کر دینے کی ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک سلیم النفس آدمی کو جب وہ اپنی طبیعت کی داخلی ضرورتوں اور گردوپیش کی خارجی پریشانیوں سے فراغت حاصل کر چکا ہو۔ اگر اسے اس حالت میں اللہ کی صفات، جلالت شان، اور کبریائی یاد دلائیں اور اس کو کسی نہ کسی طریق سے ذات باری کی طرف متوجہ کر دیں تو اس وقت اس شخص پر حیرت و دہشت کی سی ایک کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور مادیات سے ماوراء جو مقدس اور مجرد عالم ہے اس عالم کے رنگوں میں سے ایک نہ ایک رنگ اس شخص کو اپنے احاطہ میں لے لیتا ہے چنانچہ جب یہ شخص حیرت و دہشت سے گزر کر اس سے نیچے جو مقام ہے اس میں آتا ہے تو اس مقام میں اس شخص کی یہی حیرت و دہشت خشوع و خضوع اور عجز و نیاز مندی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اس وقت اس شخص کی کیفیت ایسی ہوتی ہے کہ جیسے کہ ایک غلام اپنے آقا کی حضوری میں ہوتا ہے یا ایک دہقان بادشاہ کے روبرو حاضر ہوتا ہے۔ یا جس طرح ایک محتاج سائل ایک فیاض آدمی کے در پر کھڑا ہو۔

انسان کی خشوع و خضوع اور دعا و مناجات کی یہ کیفیت اس کی باقی تمام کیفیات سے زیادہ ملاء اعلیٰ کے وفور شوق کی اس کیفیت سے مشابہ ہے۔ جو ان میں اللہ تعالیٰ کی جلالت شان اور اس کی کبریائی کیلئے ہے جب انسان کا دل خشوع و خضوع کی کیفیت میں بالکل رنگا جاتا ہے اور خشوع و خضوع کا ملکہ اس کی فطرت کے جوہر اصلی کا ایک حصہ بن جاتا ہے تو اس حالت میں اس شخص کے نفس اور ملاء اعلیٰ کے درمیان ایک دروازہ کھل جاتا ہے جس کے راستے سے اس شخص پر ملاء اعلیٰ کی طرف سے جلیل القدر علوم و معارف نازل ہوتے ہیں۔ ان علوم و معارف کیلئے تجلیات الٰہی قالب بنتی ہیں۔

طہارت اور خشوع و خضوع کے بعد تیسری خصلت سماحت کی ہے۔ سماحت کے معنی یہ ہیں کہ انسان، لذتوں، انتقام، بخل، حرص، اور اس طرح کی اور بری باتوں کے پیچھے اپنے نفس کی سفلی خواہشات کا غلام نہ ہو۔ انسان میں جتنی خواہشات ہیں۔ اسی قدر سماحت کے بھی شعبے ہیں۔ چنانچہ ہر خواہش کے مقابلے میں سماحت کے اس شعبے کو الگ نام دیا گیا ہے۔ مثلاً شہوانی اور کھانے پینے کی خواہشات کا اثر قبول نہ کرنا، عفت ہے۔ تن آسانی اور ترک عمل کی خواہش سے مغلوب نہ ہونا، اجتہاد ہے۔ گھبراہٹ اور پریشانی کی خواہش کو روکنا، صبر ہے۔ انتقام کی خواہش سے مغلوب

نہ ہونا عفو ہے۔ حرص کی خواہش سے بچنا، قناعت ہے۔ شریعت نے جو حدود مقرر کی ہیں ان سے تجاوز کرنے کی خواہشات کو دبانا، تقوی ہے۔

الغرض یہ تمام کی تمام چیزیں سماحت میں داخل ہیں۔ لیکن ان سب کی اصل صرف ایک چیز ہے اور وہ یہ کہ عقل کے عمومی اور کلی احکام کو نفس کی بہیمی وخسیس خواہشات پر پورا غلبہ حاصل ہو جائے اس کے علاوہ سماحت کے ضمن میں جن اعمال اور افعال کا ابھی ذکر ہو چکا ہے انسان ان اعمال وافعال کو اس طرح کرے اور اتنا عرصہ برابر کرتا رہے کہ سماحت کی اصل حقیقت بطور ایک کیفیت کے، نفس انسانی میں جاگزیں ہو جائے اور نفس سماحت کی اس کیفیت کو ایک مستقل ملکہ بنا لے۔ جس شخص کے نفس میں سماحت کی یہ کیفیت راسخ ہو جاتی ہے اس کی حالت یہ ہوتی ہے کہ جب وہ مرتا ہے تو اس دنیا کی زندگی میں ادھر ادھر کے جو برے اثرات اس کے نفس پر ہجوم کئے ہوئے ہوتے ہیں، وہ موت کے وقت اس سے یک سر چھٹ جاتے ہیں۔ وہ اس دنیا سے نکھر کر دوسری دنیا میں پہنچتا ہے۔ جیسے کہ سونا کٹھالی سے کندن بن کر نکلتا ہے انسان کا عذاب قبر سے محفوظ رہنا، غالبًا اسی سماحت کی خصلت پر موقوف ہے۔ صوفیاء نے اس خصلت کا نام زہد، حریت اور ترک دنیا، رکھا ہے۔ ان چار خصلتوں میں سے آخری خصلت عدالت کی ہے۔ اور عدالت ہی پر دنیا میں عادلانہ نظام اور سیاسی اصول وکلیات کا دارومدار ہے۔ عدالت کے بہت سے شعبے ہیں ان میں سے ایک شعبۂ ادب کا ہے ایک آدمی اپنی حرکات وسکنات پر برابر نظر رکھتا ہے اور اس ضمن میں جو بہترین وضع ہوتی ہے، اسے وہ اختیار کرتا ہے اور اس پر چلتا ہے جو بھی معاملہ اسے پیش آتا ہے اس میں وہ مناسب ترین پیرایہ اختیار کرتا ہے اور اس کی طبیعت کا فطری طور پر اسی طرف میلان بھی ہوتا ہے۔ اس شخص میں جب یہ کیفیت بطور عادت کے پیدا ہو جاتی ہے تو اسے ادب کہتے ہیں۔ انسان کا اپنے کاموں کی دیکھ بھال اور آمد وخرچ، خرید وفروخت اور اس طرح کے دوسرے معاملات میں عدالت کو ملحوظ رکھنا، کفایت ہے۔ گھر کو ٹھیک چلانا حریت ہے، شہروں اور لشکروں کا، اچھی طرح سے انتظام کرنا، سیاست مدنیہ ہے، ساتھیوں میں اچھی طرح زندگی گزارنا ہر شخص کا حق ادا کرنا ہر ایک کے ساتھ حالات کے مطابق الفت برتنا اور اس سے خندہ پیشانی سے ملنا، حسن معاشرت ہے۔

الغرض یہ تمام خصلتیں عدالت کے شعبے ہیں اور ان سب کی اصل ایک اور صرف ایک ہے وہ یہ کہ انسان کا نفس ناطقہ خود اپنی فطرت کے تقاضے سے عادلانہ نظام اختیار کرے اور نہ صرف اختیار کرے بلکہ وہ اس نظام کو برسر کار لانے میں کوشاں بھی ہو۔ جس شخص میں عدالت کی خصلت بدرجہ اتم پائی جاتی ہے اس شخص کو ملاء اعلیٰ کے ان افراد سے جو دنیا میں حق سبحانہ کی فیض رسانیوں کا واسطہ بنتے ہیں، جنکی اصل فطرت میں عادلانہ نظام کے قیام کی استعداد ودیعت ہوتی ہے، نیز ان میں عادلانہ نظام کو مقبول عام بنانے کے لئے بڑی ہمت ہوتی ہے۔ الغرض اس شخص کو ملاء اعلیٰ کے ان افراد سے بڑی مناسبت پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس شخص پر ملاء اعلیٰ ان افراد کے دلوں سے سورج کی شعاعوں کی طرح نور کی بارش ہوتی ہے۔ اور اس کی وجہ سے اس شخص کو دنیا میں بڑی آسودگی اور کشائش میسر آتی ہے۔

اس آسودگی اور کشائش کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں۔ ہر شخص کی جیسی استعداد ہوتی ہے اسی کے مطابق اس کو ان میں حصہ ملتا ہے۔ اور وہ اپنی طبیعت کے اعتبار ہی سے ان سے محظوظ ہوتا ہے۔ مثلاً ایک کو اپنے ساتھیوں کی صحبت مرغوب ہے، دوسرا خوشگوار کھانا، عمدہ لباس، پاکیزہ گھر اور چہیتی بیوی پسند کرتا ہے۔ اور اسی پر دوسروں کے رجحانات کا بھی قیاس کیا جا سکتا ہے۔

ایک شخص ہے جو عادلانہ نظام کی مخالفت کرتا ہے۔ وہ شریعت کے احکام کو بجا نہیں لاتا اور ایسے کام کرتا ہے۔ جن سے عام لوگوں نقصان پہنچتا ہے، چنانچہ اس شخص کے اور ملاء اعلیٰ کے ان افراد کے درمیان جو دنیا میں فیوض الٰہی اور نعمت ہائے خداوندی کو پہنچانے کا ذریعہ ہیں۔ نفرت اور وحشت پیدا ہو جاتی ہے اور ملاء اعلیٰ کی طرف سے اس شخص پر ظلمت و تاریکی کی بارش ہوتی ہے، چنانچہ وہ محسوس کرتا ہے کہ ہر جانب سے اس پر تنگی یورش کر رہی ہے۔ بعینہ یہی حال اس شخص کا بھی ہوتا ہے، جو اس دنیا میں خشوع و خضوع کی خصلت سے آشنا نہیں ہوتا بلکہ اس کے برعکس ایسا ہوا کہ اس نے اپنے اندر خشوع و خضوع کے خلاف جو بری عادتیں تھیں وہ پیدا کر لیں جب یہ شخص اس دنیا سے انتقال کرتا ہے تو اس کو تاریکیوں کی تہ بہ تہ گھٹائیں گھیر لیتی ہیں۔

لیکن آخر یہ راز کیا ہے اور یہ کیسے ہوتا ہے؟ بات دراصل یہ ہے کہ اس زندگی کے بعد جو دوسرا عالم ہے اس کا تقاضا ہے کہ وہاں عالم جبروت کے حقائق کا انکشاف ہو۔ اب جو شخص اس عالم

میں خشوع وخضوع سے متصف نہیں ہوتا بلکہ اس کے عکس وہ خشوع وخضوع کے خلاف عادتیں لے کر دوسرے عالم میں پہنچتا ہے تو اس پر وہاں عالم جبروت کے حقائق منکشف نہیں ہو پاتے اس کی وجہ سے اسے اس عالم میں بڑی اذیت اور کوفت ہوتی ہے جو شخص اس زندگی میں سماحت کے برعکس جو برے اخلاق ہیں ان میں مبتلا ہوتا ہے۔اس کی یہ حالت ہوتی ہے کہ دنیا کے علائق مثلاً حب جاہ ومال اور اولاد کی محبت اور اسی قبیل کی اور خواہشات بھوک اور پیاس کی طرح اس کے دل پر یورش کرتی رہتی ہیں چنانچہ یہ چیزیں اس شخص کے دل پر اس طرح کے اثرات چھوڑتی ہیں جیسے ہم مہر کو زور سے موم پر لگائیں اور مہر کے نقوش موم پر چھپ جائیں، اس کے برخلاف جو شخص سماحت کے اوصاف کا حامل ہوتا ہے، اس کے نفس کی مثال پانی کی سی ہوتی ہے کہ جس طرح پانی پر کوئی نقش نہیں ٹھہرتا اسی طرح اس کا نفس بھی دنیا کے تعلقات کا اثر قبول نہیں کرتا، اسی مضمون کا مولف کا ایک شعر ہے۔

بوسعت مشربان رنگ تعلق درنمی گیرد
اگر نقشے زنی برروئے دریا بے اثر باشد

شارع علیہ الصلوۃ والسلام نے صفت طہارت کے اکتساب کیلئے وضو، غسل اور اس طرح کی اور چیزیں جنہیں ہم نسبت طہارت کے ضمن میں بیان کر آئے ہیں، ضروری قرار دی ہین خشوع وخضوع کی خصلت کے حصول کے لئے نمازیں، دعا، مناجات، تلاوت قران، ذکر واذکار وتوبہ واستغفار وغیرہ اعمال مشروع فرمائے ہیں۔اسی سماحت کے حصول کے لئے عفو، حسن خلق اور اس طرح کے اخلاق حسنہ معین کئے ہیں اور عدالت کی خصلت پیدا کرنے کے لئے شارع علیہ الصلوۃ والسلام نے بیماروں کی عیادت کا حکم دیا ہے۔ ہر ایک کو سلام علیکم کہنے کی تلقین فرمائی ہے اور اس کے علاوہ اور حدود وآداب بھی معین کئے ہیں۔الغرض ان امور کا مفصل بیان بڑی طوالت چاہتا ہے۔جس شخص کو تفصیلات کا شوق ہو وہ ہماری کتاب ''حجۃ اللہ البالغۃ'' کی طرف رجوع کرے۔ یہاں تو ہمارا مقصد صرف ان چار خصلتوں کا تعارف کرانا ہے، تاکہ راہ طریقت کے سالک ان سے اچھی طرح واقف ہو جائیں اور خوب سوچ سمجھ کر اور پوری تحقیق کے بعد وہ ان خصلتوں کے حصول کا اپنا نصب العین بنائیں۔ نیز اپنے اعمال ومعمولات میں وہ ان خصلتوں

سے بے تعلق نہ ہونے پائیں اور اپنی طبیعت کو ان بری عادتوں کی طرف جو ان فضائل کے خلاف ہیں متوجہ نہ ہونے دیں۔ اب ایک شخص ہے جس نے ''صفت احسان'' کو جو عبارت ہے نور، طہارت اور خلاصہ مناجات سے، جان لیا پھر اس نے ''احسان'' کی اس صفت کو حاصل بھی کر لیا لیکن اس کے بعد ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ وہ کسی وجہ سے ''احسان'' کی کیفیت کو اپنے اندر نہیں پاتا، اگر پاتا بھی ہے تو بہت کم درجے میں۔ اس شخص کو چاہیے کہ وہ اس امر کی تحقیق کرے کہ ایسا کیوں ہوا؟ اگر اس کا سبب اس شخص کی طبیعت کی سرکشی ہے تو وہ اس کا تدارک روزوں کے ذریعے کرے۔ اگر شہوانیت کا غلبہ ہے، تو اس کا مداوا نکاح یا کنیز سے کرے۔ اگر صفت احسان کی یہ حالت لوگوں کے ساتھ بہت زیادہ اٹھنے بیٹھنے سے ہوئی ہے تو وہ اعتکاف میں بیٹھے۔ اور لوگوں سے ملنا جلنا بھی کم کر دے۔ اگر اس کے دماغ میں ادھر ادھر کے چند پریشان کن خیالات جمع ہو گئے ہیں اور انہیں کا اس کی ''صفت احسان'' پر برا اثر پڑا ہے تو وہ کافی عرصہ تک ذکر واذکار کرے، اگر اہل وطن کے رسوم ورواج نے طبیعت پر غلبہ پا لیا ہے اور یہی چیز کیفیت ''احسان'' میں مخل ہو رہی ہے، تو اسے چاہیے کہ وطن سے ہجرت کر جائے۔

............☆☆☆............

بنی نوع انسان کی اصناف اور ان کی استعدادیں

اس فقیر کو بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالی نے انسانوں کو مختلف استعدادوں کا پیدا کیا ہے۔ اور ہر انسان اپنی فطری استعداد کے مطابق ہی کمال حاصل کرتا ہے۔ اور کوئی شخص ایسا نہیں ہے کہ اس میں جتنی استعداد ہے، اس سے زیادہ وہ حاصل کرے۔ یہ خدائے عزیز و علیم کا اندازہ ہے چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ اگر تم سنو کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل گیا تو اس کو مان لو لیکن اگر کسی شخص کے متعلق یہ سنو کہ اس نے اپنی خصلت چھوڑ دی تو کبھی یقین نہ کرو کیونکہ ہر انسان اپنی فطرت اور جبلت ہی کی طرف ہمیشہ لوٹتا ہے۔ اس حدیث میں مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم کا اشارہ دراصل انسانوں کی انہی استعدادوں کی طرف ہے۔

اب ایک شخص ہے جسے خاص روش پر چلنے اور ایک مخصوص طریقے کو اخذ کرنے کی قدرت سے استعداد ملی ہے اگر وہ اس کو چھوڑ کر کوئی دوسری راہ اختیار کرنی چاہے تو خواہ وہ کتنی بھی محنت کرے اور اس میں کس قدر بھی مشقت اٹھائے، وہ کبھی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوگا۔

ترسم نہ رسی بہ کعبہ اے اعرابی
ایں راہ کہ تو میروی بترکستان است

اسی طرح ایک اور شخص ہے جو ایک چیز میں کمال حاصل کرنا چاہتا ہے لیکن اس کی فطرت اور جبلت دوسری قسم کے کمال کا تقاضا کرتی ہے اب وہ اس کے لئے خواہ کتنی بھی کوشش کرے، اس کی کوشش ہر حال میں رائگاں جائے گی۔

کسے در صحن کا جی قلیہ جوید
اَضَـاعَ الـعُـمَـرُ فی طلب المحال

ان عالی مرتبہ علوم ومعارف میں سے جو اس بندہ ضعیف کو عطاء کئے گئے ہیں، ایک علم بنی آدم کی استعدادوں کی معرفت اور ان کی تعداد نیز ان میں سے ہر ایک کی علامت اور ان کے مبلغ کمال کے جاننے کا ہے۔ اس علم کا فائدہ یہ ہے کہ ایک سمجھدار سالک اپنی استعداد کی حدود معلوم کر کے انہی کے مطابق اپنی راہ تجویز کر سکتا ہے اور اس راہ کو برابر اپنی نظر کے سامنے رکھ سکتا ہے۔ یا اگر سالک خود یہ کام نہ کر سکتا ہو تو اس کے مرشدِ مشفق کو چاہیے کہ وہ اس علم کی مدد سے سالک کی جبلی استعداد کو دیکھے پھر اس کے مطابق اس کو مناسب راہ پر لگائے۔ الغرض یہ ہم پر اور دوسرے لوگوں پر اللہ کا احسان ہے لیکن اکثر لوگ ہے کہ اس کا شکر یہ ادا نہیں کرتے۔

بنی آدم کی ان جبلی استعدادوں کے بیان سے پہلے اس ضمن میں چند تمہیدی امور کا جاننا بہت ضروری ہے کیونکہ ان استعدادوں کی معرفت کا انحصار ان تمہیدی امور ہی پر ہے، معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان میں دو قوتیں ودیعت کی ہیں ایک قوت ملکیہ اور دوسری قوت بہیمیہ ان کی تفصیل یہ ہے کہ انسان میں ایک تو نسمہ ہے، یہ نسمہ عبارت ہے روح ہوائی سے اور روح ہوائی کا مطلب یہ ہے کہ یہ روح جسم میں طبعی عناصر کے عمل اور ردعمل سے پیدا ہوتی ہے، اس نسمہ یا روح ہوائی سے اوپر انسان میں ایک اور چیز بھی ہے جسے نفس ناطقہ کہتے ہیں۔ اور جو نسمہ پر تصرف کرتا ہے، نفس ناطقہ اس حالت میں جبکہ وہ نسمہ پر تصرف کر رہا ہوتا ہے دو رجحان رکھتا ہے۔ ایک رجحان انسان کو بھوک، پیاس، شہوت، غضب، حسد، غصے، اور خوشی کے جبلی تقاضوں کی طرف اس طرح مائل کر دیتا ہے کہ انسان انسان نہیں بلکہ حیوان ہو جاتا ہے۔

نفس ناطقہ کا دوسرا رجحان انسان کو فرشتوں کی صف میں کھڑا کر دیتا ہے وہ اس حالت میں حیوانی تقاضوں سے رہائی حاصل کر لیتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس مادی عالم سے اوپر جو عالم تجرد ہے، وہاں سے اس پر انس وسرور کا نزول ہوتا ہے اور ملاء اعلیٰ کے وہ افراد جو اہل دنیا کو فیوض وبرکات پہنچانے کا ذریعہ ہیں۔ یہ شخص ان کی طرف گوش برآواز ہو جاتا ہے۔ اس مقام سے اس پر الہامات کا فیضان ہوتا ہے۔ اب اگر یہ الہامات حقائق قدرت کے انکشاف کے متعلق ہوں تو ان

سے دنیا میں علوم طبیعہ کی بنا پڑتی ہے اور اگر یہ الہام کسی نئے نظام کو شروع کرنے اور اس کو رواج دینے کے متعلق ہوں تو وہ شخص جسے یہ الہامات ہوتے ہیں وہ ان کاموں کو اس طرح کرتا ہے گویا کہ وہ ان کیلئے اوپر سے مامور ہے اور خود اس کو ان کاموں کی کوئی ذاتی خواہش نہیں۔

الغرض انسان کا نفس ناطقہ جب اس کے نسمہ پر تصرف کرتا ہے تو اس سے انسان کے اندر جیسا کہ ہم نے ابھی بیان کیا دو رجحانات پیدا ہوتے ہیں۔ایک رجحان کا رخ نیچے کو ہوتا ہے، جسے سفلی رجحان کہنا چاہیے اور دوسرے کا رخ اوپر کو ہوتا ہے جو علوی (۱) رجحان کہلاتا ہے، جب انسان پر سفلی رجحانات کا غلبہ ہوتا ہے تو وہ سرتاپا حیوانیت اور بہیمیت کا پیکر بن جاتا ہے۔اور اس میں علویت اور ملکیت کا اثر تک باقی نہیں رہتا۔جب علوی رجحان اس پر غلبہ پائے تو وہ بالکل فرشتہ بن جاتا ہے اور اس میں بہیمیت سرے سے غائب ہو جاتی ہے، انسان کی بھی طبعی خصوصیات ہیں، جن کی وجہ سے اسے چند باتوں کے کرنے اور چند باتوں کے نہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔اور اس معاملے میں چارپایوں اور فرشتوں کی طرح آزاد نہیں چھوڑا گیا ہے۔

بات یہ ہے کہ چارپایوں میں اگر بہیمیت ہے تو سرتاپا بہیمیت ہی بہیمیت ہے، اور وہ طبعی طور پر اسی خالص بہیمیت کے تقاضے پورا کرنے پر مجبور ہیں۔اس طرح فرشتے ملکیت ہی ملکیت ہیں اور ان مین بہیمیت کا شائبہ تک نہیں لیکن ان دونوں کے برعکس انسان کا معاملہ ہے، وہ بیک وقت فرشتہ بھی ہے اور حیوان بھی، اس میں ملکیت کے رجحانات بھی ہیں اور حیوانیت کے تقاضے بھی، اس لئے ملکیت کو ابھارنے کیلئے اسے نیک کاموں کا حکم دیا گیا ہے۔اور ان کے حیوانی تقاضوں کو دبانے کی خاطر برے کاموں سے بچنے کی فہمائش کی گئی ہے۔اللہ تعالی نے قرآن مجید کی اس آیت میں

---

(۱) بعینہ یہی تقسیم ڈاکٹر یونگ نے کی ہے جو علم تجزیہ نفس کے موجد ڈاکٹر فرائڈ کا مشہور شاگرد ہے، وہ لکھتا ہے جب تک اور جہاں تک لحاظات انسانی 'خواہشات حیوانی' پر غالب رہتے ہیں، یعنی ان کو دبا رکھتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں، انسان کے نیک کردار رہتے ہیں اور جب کبھی خواہشات حیوانی، لحاظات انسانی پر غالب آجاتے ہیں ہیں تو افعال بد اور چال بھی بد ہو جاتی ہے۔اس مضمون کو ایک فارسی شاعر نے اس طرح ادا کیا ہے۔

آدمی زادہ طرف معجون است   از فرشتہ سرشت واز حیوان
گر کند میل ایں شود کم ازیں   ور کند قصد آں، شود بہ ازاں

ماخوذ از فلسفۂ فقرا مصنفہ، امین جنگ

"حملها الانسان انه کان ظلوما جهولا"(۱) فطرت انسانی کے اسی راز کو بیان فرمایا ہے۔

چنانچہ "ظلوم" کے معنی یہ ہیں کہ انسان کی فطرت میں عدل کی صلاحیت تو موجود ہے مگر وہ عدل نہیں کرتا اور جہول سے یہ مراد ہے کہ وہ علم تو حاصل کر سکتا ہے لیکن بالفعل علم سے عاری ہے۔

خلاصہ مطلب یہ ہے کہ ملکیت اور بہیمیت یہ دونوں کی دونوں قوتیں تمام بنی نوع انسان میں پائی جاتی ہیں، لیکن انسان میں بہیمیت کی قوت زیادہ ہوتی ہے اور ملکیت نسبتاً کم۔ اور کسی میں بہیمیت کم پائی جاتی ہے اور ملکیت نسبتاً زیادہ پھر قوت ملکیت کے بے شمار مدارج ہیں، اسی طرح بہیمیت کے بھی لاتعداد درجات ہیں۔ اب بہیمیت اور ملکیت کا کہیں زیادہ کہیں کم پایا جانا اور پھر کسی میں ان کا ایک درجے میں اور کسی میں دوسرے درجے میں موجود ہونا یہ وہ اسباب ہین جن کی وجہ سے ایک انسان میں ایک استعداد ہوتی ہے اور دوسرے میں بالکل دوسری۔ چنانچہ اس طرح بنی نوع انسان میں الگ الگ استعدادیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ یہ تو استعدادوں کا ایک اجمالی بیان ہوا، اب ان کی تفصیل سنئے۔

ملاء اعلیٰ کی دو قسمیں ایک ملاء اعلیٰ کے ملائکہ اور دوسرے ملاء اسفل کے ملائکہ۔ ملاء اعلیٰ کے فرشتے اسمائے الٰہی کے علوم میں رنگے ہوتے ہیں، وجود مطلق سے یہ کائنات جس طرح ظہور پذیر ہوئی، یہ ملائکہ اس ظہور وجود کے اصول ومبادی سے واقف ہیں۔ اور خدا تعالیٰ کی قدرت خلق، تدبیر اور تدلی کے ذریعے اس دنیا میں جس طرح برسر کار ہے۔ ملاء اعلیٰ کے یہ ملائکہ اس نظام الٰہی کے اصول وکلیات اور اس کی حکمت کا علم رکھتے ہیں اور اس سے انہیں بڑی وابستگی اور محبت بھی ہوتی ہے۔ باقی رہے ملاء سافل کے ملائکہ، ان کا کام یہ ہے کہ جو کچھ اوپر سے ان پر احکام وارد ہوں، وہ انہیں بجالائیں اور الہام اور احالہ کے ذریعے دنیا کے معاملات میں تصرف کریں۔ ملاء سافل کے فرشتوں کو ان احکام کو جو اصل مصلحت ہوتی ہے اس کا علم نہیں ہوتا اس کے علاوہ یہ فرشتے ہر اس حادثے کی صورت کو جو دنیا میں ہونے والا ہوتا ہے اور جس کے متعلق حظیرۃ القدس میں فیصلہ ہو چکا ہوتا ہے، اخذ کر لیتے ہیں، ملاء سافل کا حظیرۃ القدس سے ہونے والے واقعات کی صورت کا اخذ کرنا اس طور پر ہے جیسے کہ آئینے میں ایک چیز کا عکس پڑ رہا ہے اور وہاں سے یہ عکس

---

(۱) انسان نے وہ ذمہ داری اٹھائی جو زمین اور آسمانوں نے اٹھانے سے انکار کر دیا تھا۔ کیونکہ انسان ظلوم وجہول ہے۔

دوسرے آئینے میں منتقل ہو جاتا ہے اس ضمن میں یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ ان میں سے ہر فرشتہ صرف اسی واقعہ کا ادراک کر سکتا ہے جس کی اس کی فطرت میں مناسبت ہوتی ہے۔

جس طرح ملائکہ کی دو قسمیں ہیں اسی طرح بہائم کی بھی دو قسمیں ہیں ایک وہ جن کی قوت بہیمیت زبردست ہوتی ہے دوسرے وہ جن کی بہیمیت ضعیف ہے۔ مثال کے طور پر ایک نر کو لیجئے وہ صحیح مزاج لے کر پیدا ہوا پھر مناسب غذا اسے ملتی رہی ہے، اسے پینے کو خوب دودھ ملا اور کھانے کو بافراط چارا اور بعد میں اسے کوئی ایسا عارضہ بھی لاحق نہ ہوا، جس سے اس کے قویٰ میں خلل آتا، یہ نر جب اپنی جوانی کو پہنچے گا تو ظاہر ہے وہ عظیم الجثہ بلند آواز اور زور آور ہو گا۔ اپنے عزم و ارادہ میں بڑا باہمت اور غصے اور ارادے میں بڑا سخت ہو گا اور اسے کبھی یہ گوارا نہ ہو گا کہ کوئی دوسرا نر اس سے بہتر، اس سے زیادہ بہادر اور اس سے بڑھ کر دل والا اور اس پر غالب و قاہر ہو۔ چنانچہ اس کی نظروں میں اپنے سوا کوئی اور دوسرا نر نہیں جچے گا۔ نیز اس میں یہ ہمت ہو گی کہ وہ سخت سے سخت محنت کر سکے۔ لیکن اگر ہم اس نر کو خصی کر دیں یا نر پیدائشی طور پر کمزور اور ناتواں ہو، اسے بعد میں مناسب تربیت بھی نہ ملے اور وہ انہیں حالات میں جوان ہو، تو لامحالہ یہ نر اپنی شکل و شباہت میں جسمانی بناوٹ میں نیز اپنی عادات اور اپنے اخلاق میں پہلے نر سے بالکل مختلف ہو گا۔

ان دو نروں کی مثالوں سے صاف ظاہر ہے کہ قوت بہیمیہ جب اپنے عروج کو پہنچتی ہے تو اس کے دو مظہر ہوتے ہیں۔ اس کا ایک مظہر تو شدت عزم اور ہمت کی تندی ہے۔ دوسرا مظہر خلق یعنی شکل و بناوٹ اور خلق یعنی عادات و اخلاق میں اس کا کامل اور مکمل ہونا ہے۔ بہیمیت کے پہلے مظہر کا یہ اثر ہوتا ہے کہ بہیمیت روح کے چہرے کیلئے اس طرح کا حجاب بن جاتی ہے کہ روح اس کے اندر چھپ جاتی ہے گو وہ بہیمیت میں یکسر فنا نہیں ہوتی لیکن جب بہیمیت کا غلبہ کم ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے شدت عزم اور ہمت تندی میں تبدیلی آ جاتی ہے تو پھر روح کو بھی بقا نصیب ہوتی ہے۔ بہیمیت کے دوسرے مظہر کا اثر یہ ہے کہ اس میں بہیمیت کے اخلاق و عادات کی تکمیل میں صرف ہوتی ہے۔ اور اس کی وجہ سے نفس بغیر شدت اور تندی کے مبلغ کمال کو پہنچ جاتا ہے۔

الغرض بہیمیت کے پہلے دو قسمیں ہوئیں ایک بہیمیت شدید اور دوسری بہیمیت ضعیف۔ پھر بہیمیت جب کمال پر ہوتی ہے تو اس سے دو اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ایک عزم و ارادہ میں پختگی

اور ہمت میں تندی اور دوسرے جسمانی بناوٹ اور اخلاق و عادات کی تکمیل۔

ملکیت اور بہیمیت کی ان تفصیلات کے بعد ہم اصل مقصد کی طرف آتے ہیں اس پہلے ہم بیان کر آئے ہیں کہ ہر انسان میں ملکیت اور بہیمیت کی دو قوتیں رکھی گئی ہیں۔ یہ دو قوتیں جب ایک شخص میں جمع ہوتی ہیں تو لامحالہ اس سے دو صورتیں پیدا ہوں گی۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ ملکیت اور بہیمیت میں آپس میں ٹھنی رہے اور دونوں میں برابر رسہ کشی ہوتی رہے۔ اس کو ''تجاذب'' کہتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ملکیت اور بہیمیت میں آپس میں ہم آہنگی اور ایک دوسری سے کوئی نزاع نہ ہو، اس حالت کو اصطلاح کا نام دیا گیا ہے۔ تجاذب کے معنی یہ ہیں کہ بہیمی قوت اپنے مخصوص مطالبوں کا تقاضا کرے۔ اور ملکیت اپنے فطری رجحانات کی طرف مائل ہو اور ایک کا دوسرے سے بالکل امتزاج نہ ہو، اور ان میں سے ہر قوت اپنی اپنی راہ پر چلنے کی کوشش کرے۔ تجاذب کی حالت میں اگر قوت بہیمیہ کا غلبہ ہوتا ہے تو انسان دنیاوی لذات میں منہمک ہونا چاہتا ہے۔ اس صورت میں وہ ملکیت کی طرف مطلق کوئی التفات نہیں کرتا۔ اس کے برعکس اگر تجاذب کی حالت میں ملکیت غالب ہو تو انسان بہیمیت کے تمام اعمال و رجحانات سے یکسر کنارہ کش ہو کر ملاء اعلیٰ کے ساتھ منسلک ہو جاتا ہے، اور عالم جبروت کے رنگ میں رنگا جانا چاہتا ہے، اس صورت میں وہ ان احکام کی طرف جو بہیمیت اور ملکیت کے درمیان برزخ کا حکم رکھتے ہیں، بالکل توجہ نہیں کرتا۔

''اصطلاح'' سے مراد یہ ہے کہ قوت ملکیہ اپنے طبعی تقاضوں اور اس کا جو کمال کا درجہ ہے اس سے قدرے نیچے اترتے، قوت بہیمیہ اپنی سفلی اور نامناسب خواہشات کو دبا کر ملکیت کی طرف ترقی کرے اور یہ دونوں ایک ایسے مقام پر باہم ملیں کہ اس مقام سے بہیمیت کو بھی مناسبت ہو اور اس کا ملکیت سے بھی لگاؤ ہو۔ اس ضمن میں بدنی عبادتیں، دعا، مناجات، سخاوت، عفت نفس، نفع عام کے کام کرنا، ساتھیوں سے اچھی طرح ملنا جلنا، ہر ایک کا حق ادا کرنا، فکر کی صحت و سلامتی، سچے خواب دیکھنا، فراست سے ٹھیک ٹھیک بات معلوم کر لینا ہاتف سے سچی باتیں سننا اور اس طرح کے دوسرے اعمال و احوال مفید ہوتے ہیں۔

ہر ہر فرد میں ملکیت اور بہیمیت کی اس طرح کی الگ الگ نوعیت کا خیال کرتے ہوئے انسانوں کو بے شمار اصناف و اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ہم انسانوں کی ان تمام اصناف

واقسام کو آٹھ بنیادی صنفوں کے تحت جمع کر سکتے ہیں۔ ان میں سے چار صفتیں اہل اصطلاح کی ہونگی۔ اور چار اہل تجاذب کی۔

اہل اصطلاح کی چار صنفیں حسب ذیل ہوں گی۔

(۱) ملکی قوت شدید اور بہیمی قوت شدید اور دونوں میں ہم آہنگی اور توازن
(۲) ملکی قوت شدید اور بہیمی قوت ضعیف اور دونوں میں ہم آہنگی اور توازن
(۳) ملکی قوت ضعیف اور بہیمی قوت شدید اور دونوں میں ہم آہنگی اور توازن
(۴) ملکی قوت ضعیف اور بہیمی قوت ضعیف اور دونوں میں ہم آہنگی اور توازن

اسی طرح اہل تجاذب کی بھی حسب ذیل چار صنفیں ہوں گی۔

(۱) ملکی قوت شدید اور بہیمی قوت شدید اور دونون میں نزاع اور تصادم
(۲) ملکی قوت شدید اور بہیمی قوت ضعیف اور دونوں میں نزاع اور تصادم
(۳) ملکی قوت ضعیف اور بہیمی قوت شدید اور دونوں میں نزاع اور تصادم
(۴) ملکی قوت ضعیف اور بہیمی قوت ضعیف اور دونوں میں نزاع اور تصادم

ان تمہیدی امور کو جان لینے کے بعد اب انسانوں کی ان آٹھ صنفوں پر غور کرو، تم دیکھو گے کہ ان میں سے ہر ہر صنف کے اپنے اپنے احکام ہیں جس شخص میں قوت بہیمی بہت شدید ہو، اسے سخت ریاضتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے لئے کمال حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ وہ فاقے کرلے، راتوں کو جاگے اور عاجزی، مسکنت اختیار کرے۔ شدید بہیمیت والے سے جو بھی آثار و اعمال ظاہر ہوتے ہیں وہ اپنے اندر بڑی قوت و شوکت رکھتے ہیں۔ اس شخص کی توجہ میں بھی بڑی تاثیر ہوتی ہے، اور اس پر اس زور کا وجد طاری ہوتا ہے کہ سرمستی اور بے خودی میں اس کے ہوش و حواس گم ہو جاتے ہیں چنانچہ کئی کئی دن تک اسے دنیا کی کوئی خبر نہیں رہتی۔

جس شخص کی قوت بہیمی ضعیف ہو، اسے سخت ریاضتوں کی مطلق ضرورت نہیں ہوتی بلکہ اس کے لئے سخت ریاضتیں الٹا باعث تشویش خاطر بنتی ہیں۔ اس شخص کو کثرت سے اور بہت عرصے تک ذکر کرنا چاہیے۔ اور اس پر کمال کا دروازہ اسی طرح ہی کھل سکتا ہے۔ ضعیف بہیمیت والے سے جو کرامات ظاہر ہوتی ہیں وہ اتنی کم اہمیت رکھتی ہیں کہ ان کا ہونا اور نہ ہونا، برابر ہوتا ہے۔ نیز اگر اس

شخص کو وجد اگر آتا ہے تو بہت معمولی اور اس میں اگر معمولی سی چیز بھی مخل ہو جائے تو وجد کا اثر زائل ہو جاتا ہے گویا کہ وہ وجد ایک درد کی طرح تھا کہ اٹھا اور فوراً غائب ہو گیا۔ یا وہ حیا کے رنگ کی طرح تھا کہ آیا اور پھر ختم ہو گیا۔

جس شخص کی ملکی قوت شدید ہو، وہ بڑے بڑے کمالات مثلاً نبوت، فردیت، فنا و بقا اور اس طرح کے دوسرے بلند مرتبہ احوال و مقامات کا اہل ہوتا ہے اس کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ ''لسان قدم'' یعنی زبان الٰہی کا ترجمان بنتا ہے۔ اور مادی عالم سے ماوراء عالم تجرد ہے اس کے حالات کی وہ خبر دیتا ہے۔ جس شخص میں ملکی قوت ضعیف ہو، اس کی تمام تر کوشش کا ثمرہ یہ ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کے دلوں کی باتیں معلوم کر سکتا ہے اور وہ اپنے سامنے ملکی انوار کو درخشاں دیکھتا ہے۔

الغرض یہ آثار و علامات ہیں (۱) شدید قوت بہیمی کے، (۲) ضعیف قوت بہیمی کے (۳) شدید قوت ملکیہ کے (۴) ضعیف قوت ملکیہ کے، ہم نے ان میں سے ہر ایک قوت کی الگ الگ تاثیر بیان کر دی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اہل اصطلاح اور اہل تجاذب کے نفوس میں یہ قوتیں کس طرح اثر انداز ہوتی ہیں۔ آئندہ سطور میں ہم اس پر گفتگو کریں گے۔

جو شخص اہل اصطلاح میں سے ہو گا اس کی طبیعت کا عام انداز یہ ہے کہ وہ اعضاء و جوارح کے اعمال اور دل و دماغ کے احوال میں بے حد مودب ہوتا ہے وہ اپنے اندر حق شناسی کا جوہر رکھتا ہے نیز وہ دین و دنیا دونوں کے مصالح کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور عام طور پر ایسے لوگوں میں قلق و اضطراب کی کیفیت نہیں ہوتی۔ جو شخص اہل تجاذب میں سے ہو، اسے دنیا کے کاموں سے بالکل کنارہ کش ہونے کا عشق ہوتا ہے اس کی بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ مادی دنیا سے تجرد اختیار کرے، اس شخص کی طبیعت کا قدرتی میلان اس عالم چارسو سے الگ ہونے اور اس سے نجات پانے کی طرف ہوتا ہے۔ چنانچہ اس شخص کی مثال اس پرندے کی سی سمجھئے جسے قفس میں بند کر دیا گیا ہو۔

اہل تجاذب میں جس کی قوت بہیمی ضعیف ہو۔ وہ اگر کسی چیز کی طرف میلان رکھتا ہے تو اس کے میلان میں بھی بیقراری اور زور نہیں ہوتا۔ اور جس کی قوت بہیمی شدید ہوتی ہے اس کی طبیعت میں بے چینی اور اضطراب زیادہ ہوتا ہے۔ اہل تجاذب میں سے اگر کسی شخص میں بہیمی قوت زیادہ

شدید ہو تو وہ بڑے بڑے کاموں پر نظر رکھتا ہے اس کے ساتھ ساتھ اگر اس میں ملکی قوت بھی شدید ہو تو وہ انبیاء کرام کی طرح ان جلیل القدر مقامات اور مناصب کو حاصل کرتا ہے جو عمومی اصول وکلیات کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ لیکن اگر اس شخص میں صرف قوت بہیمی ہی بہت زیادہ شدید صورت میں موجود ہوگی اور اس کے ساتھ شدید قوت ملکی نہ ہوگی تو یہ شخص میدان جنگ میں غیرت وحمیت کے معاملات میں اور اسی طرح کے دوسرے کاموں میں غیر معمولی جرأت وبہادری دکھائے گا۔

اہل تجاذب میں سے جس شخص میں قوت بہیمی ضعیف ہو۔ اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ دنیا میں سب لوگوں سے زیادہ بڑے کاموں سے بے رغبتی برتتا ہے، لیکن اگر ضعیف بہیمیت کے ساتھ ساتھ میں اس قوت ملکی شدید ہے تو اس طبیعت کا شخص خدا تعالیٰ کی رضا جوئی کیلئے دنیا کو ترک کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، لیکن اگر بہیمیت کے ساتھ ساتھ اس کی ملکیت بھی ضعیف ہو اور یہ شخص اپنی استعداد کے مطابق کمال حاصل کرنے میں کامیاب بھی ہو جائے تو یہ اتنا کر سکتا ہے کہ دنیا کو آخرت کے لئے ترک کر دے، لیکن اگر حالات سازگار نہ ہوئے اور وہ اپنی استعداد کو حصول کمال میں نہ لگا سکا تو اس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ وہ سستی، عجز اور ناتوانی کیوجہ سے سب چیزوں سے دست بردار ہو جاتا ہے۔

دنیا میں احکام شرع کے سب سے زیادہ فرمانبردار اہل اصطلاح ہوتے ہیں ان میں سے جن لوگوں میں ملکی قوت شدید ہوتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود اور اس کے دستوروں کے محقق اور ان کی حکمتوں کو جاننے والے ہوتے ہیں لیکن اہل اصطلاح میں سے جن میں ملکی قوت ضعیف ہو وہ محض ان حدود کے مقلد ہوتے ہیں ان کا کام صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ ظاہری اعمال کو بجا لائیں۔ اور اس ضمن میں بالواسطہ وہ شرعی احکام کی روح سے بھی لذت یاب ہو جاتے ہیں۔

اہل تجاذب اگر بہیمیت کے بندھنوں کو توڑنے میں کامیاب ہو جائیں اور اس کے ساتھ ان کی ملکی قوت بھی شدید ہو تو ان کی ہمت اللہ تعالیٰ کے اسماء صفات اور فنا و بقاء کے مقامات کی معرفت کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر ان میں ملکی قوت ضعیف ہو تو وہ شریعت میں سے سوائے ریاضتوں اور اوراد وظائف کے جن سے کہ مقصود محض طبیعت کے بہیمی زور کو توڑنا ہوتا ہے اور کچھ نہیں جانتے۔ اس قسم کی طبیعت والوں کیلئے انتہا درجے کی مسرت یہ ہوتی ہے کہ وہ ملکی انوار کو اپنے

سامنے درخشاں دیکھتے ہیں وہ دوسروں کے دلوں کی باتوں کو معلوم کر لیتے ہیں اور وقائع الٰہی کا بھی ان کو علم ہو جاتا ہے۔ نیز اجابت دعاء تاثیر توجہ اور اس طرح کے دوسرے کمالات ان کو حاصل ہوتے ہیں۔

مجذوبیت، ظاہری پیر کی تربیت کے بغیر معرفت کا حصول اور اگر پیر موجود بھی ہو تو اس کا زیادہ ممنون احسان نہ ہونا۔ یہ سب باتیں اس شخص کی خصوصیات میں سے ہیں جو اہل تجاذب میں سے ہوتا ہے اگر اس میں ملکی قوت شدید ہو اور اس کے ساتھ قوت بہیمی بھی شدید ہو تو بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اس طبیعت والے شخص کو کوئی عجیب سا واقعہ پیش آتا ہے جس کی وجہ سے اس کا دل دنیا سے یک سر سرد ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی محبت اس پر غالب آ جاتی ہے۔ یہ واقعہ خواہ کوئی خطرناک سانحہ ہو یا اس نے کسی واعظ کا وعظ سنا ہو یا اس کی طرف کسی بزرگ نے توجہ فرمائی ہو۔ بہر حال ان میں سے کوئی چیز بھی ہو، اس شخص پر اس واقعہ کا اتنا اثر ہوتا ہے کہ اس کی وجہ سے اس کا دل کلیۃ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ عامۃ الناس اس شخص کی، اس تغیر حالت کو خرق عادت سمجھنے لگتے ہیں۔ لیکن اہل تجاذب میں سے جس شخص میں ملکی قوت شدید تو ہو لیکن قوت بہیمی ضعیف ہو تو اس شخص کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ محسوس کرتا ہے گویا کہ وہ مادر زاد ولی ہے اور یہ وصف خود اس کی اصل فطرت میں ودیعت کیا ہوا ہے لیکن جوں جوں وہ جوان ہوتا ہے اور اس میں طاقت آتی ہے تو اس شخص سے اور کمالات بھی ظاہر ہونے لگتے ہیں۔

منازل کمال طے کرنے میں اہل اصطلاح کا یہ حال ہے کہ وہ اس راہ میں بہت آہستہ آہستہ چیونٹی کی چال چلتے ہیں اور یکبارگی اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی لیکن اہل اصطلاح میں سے جس میں قوت بہیمی شدید ہو اس کا معاملہ دوسرا ہوتا ہے وہ لوگ جو اہل تجاذب میں سے ہیں اور ملکی قوت ان کی ضعیف ہے اگر اس کی قوت بہیمی شدید ہے تو جب وہ ریاضتیں کرتے ہیں یا کوئی قوی التوجہ بزرگ ان پر اپنی تاثیر ڈالتا ہے تو ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ خواب میں اور حالت بیداری میں انوار کو اپنے سامنے درخشاں پاتے ہیں۔ سچی خوابیں دیکھتے ہیں۔ ہاتف کی آوازیں سنتے ہیں اور ان پر الہامات ہوتے ہیں اور یہ سب کچھ انہیں اس طرح پیش آتا ہے کہ ان پر ان واقعات کا بہت زیادہ اثر ہوتا ہے اور وہ اس سلسلے میں غیر معمولی استقامت وصدق کا ثبوت دیتے

ہیں۔اگر عام لوگوں کو اس قسم کے افراد کی خبر ہو جائے تو وہ حد درجہ ان کے معتقد ہو جاتے ہیں۔

اہل تجاذب میں سے جن میں ملکی قوت ضعیف ہے،اور انکی بہیمی قوت بھی ضعیف ہے ان پر زیادہ تر معنوی تجلیات اور نکات وحقائق سمجھنے کی کیفیت غالب رہتی ہے۔اس ضمن میں ان پر جو کچھ وارد ہوتا ہے،اس کا اثر ان کے دل پر کچھ زیادہ قوی نہیں ہوتا بلکہ ان کے واردات کی حیثیت ایسی ہوتی ہے گویا کہ ان کا کوئی وجود ہی نہیں ہے کبھی کبھی تو ان کو اپنے ان واردات پر شکوک وشبہات ہونے لگتے ہین۔اہل تجاذب میں سے اس گروہ کی کیفیت یہ ہے کہ اگر عامۃ الناس ان کی کرامات سے واقف بھی ہو جائیں تو وہ کچھ زیادہ ان کے عقیدت مند نہیں ہوتے۔

اہل اصطلاح میں وہ لوگ جن کی ملکی قوت شدید ہے وہ انبیاء کرام کے علوم حاصل کرنے کی استعداد رکھتے ہیں مثلاً وہ ملاء اعلیٰ کے فرشتوں کو دیکھتے ہیں عبادات کے اسرار،اقوام وملل کی سیاست کے رموز،گھر بار اور شہروں کے نظم ونسق کے اصولوں اور اخلاق وآداب کے اساسی مقاصد سے وہ واقف ہوتے ہیں اور اس زندگی کے بعد دوسری زندگی میں جو کچھ پیش آئیگا،انہیں اس کا بھی علم ہوتا ہے لیکن اگر ان کی ملکی قوت شدید نہ ہو تو خواہ وہ کتنی ریاضتیں کریں،ان کرامات اور خوارق میں سے کوئی چیز بھی حاصل نہیں ہوتی۔ہاں اس میں شک نہیں کہ عبادات کے ضمن میں انہین دعا ومناجات کی لذت ضرور محسوس ہوتی ہے۔

اہل اصطلاح میں سے اس طبیعت کے لوگ شریعت کے احکام کے پابند ہوتے ہیں ان احکام کو بجالانے سے انہیں اطمینان ملتا ہے اور وہ اسی پر خوش رہتے ہیں۔قصہ مختصر یہ ہے کہ دنیا میں بہترین وہ لوگ ہیں جن میں ملکی قوت شدید ہوتی ہے،اب اگر یہ شدید ملکی قوت والے اہل اصطلاح میں سے ہوں تو یہ قوموں کی قیادت اور امامت کے مستحق ہوتے ہیں اگر یہ اہل تجاذب میں سے ہونگے تو علم الٰہیات کی شرح وترجمانی میں ان کی زبان بڑی فصیح ہوگی۔وہ لوگ جن میں بہیمی قوت شدید ہوتی ہے وہ لوگوں کے سردار ومقتدا بنتے ہیں۔اور لوگ بھی ان کے معتقد ہوتے ہیں لیکن جن لوگوں کی قوت بہیمی ضعیف ہوتی ہے،انہیں دنیا میں کوئی نہیں جانتا اور نہ خلق میں زیادہ مشہور ہوتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ شدید ملکی قوت والے،تو لوگوں میں خال خال پیدا ہوتے ہیں البتہ جن میں ملکی

قوت ضعیف ہوتی ہے وہ دنیا میں بڑی کثرت سے پائے جاتے ہیں اس طرح شدید بہیمیت والے خال خال ہی نظر آتے ہیں۔اور جن کی بہیمیت ضعیف ہوتی ہے ان کی بڑی کثرت ہوتی ہے اہل تجاذب میں سے جن کی ملکی قوت شدید ہو اور ان کی قوت بہیمیہ بھی شدید ہو ان کو لوہے کے آئینے کی طرح سمجھئے کہ باوجود سخت ہونے کے اس میں جلا ہوتی ہے اور صیقل کرنے سے اس میں صورت منعکس ہو جاتی ہے۔لیکن اہل تجاذب میں سے جن کی ملکی قوت تو شدید ہو اور قوت بہیمیہ ضعیف ہو تو ان کی مثال روئی کے گالے کی ہوتی ہے کہ اسے پانی میں بھگویا گیا ہو اور اس میں سے پانی کے قطرے ٹپک رہے ہوں۔

باقی رہے اہل تجاذب میں سے وہ لوگ جن کی ملکی قوت ضعیف ہے اور ان کی بہیمی قوت شدید ہے،تو ان کی مثال اس آئینے کی سی ہے کہ اس کے اصلی جوہر کے اندر زنگ ہے۔اب اگر آپ اسے صیقل کرتے ہیں تو وہ تھوڑا تھوڑا چمکتا ہے،لیکن کسی طرح بھی اس قابل نہیں ہوتا کہ اس میں صورت منعکس ہو سکے۔لیکن اگر ان میں ضعیف ملکی قوت کیساتھ ساتھ بہیمی قوت بھی ضعیف ہے،تو ان کی مثال اس بچے کی ہوتی ہے کہ خواہ آپ اسے کتنی بھی تعلیم دیں وہ کچھ یاد نہیں رکھتا اور نہ وہ کسی چیز کا احاطہ کر سکتا ہے،

چنانچہ اس بچے کو ایک مدت چاہیے کہ جو چیزیں اسے پڑھائی جا رہی ہین وہ ان کی صورتوں کو اپنے متخیّلہ میں جاگزیں کر سکے۔

جو شخص اہل اصطلاح میں سے ہے اس کیلئے عالم تجرد بمنزلہ ایک خواب فراموش کے ہوتا ہے۔اگر وہ شخص ملکی قوت شدید رکھتا ہے تو عالم تجرد کے حقائق مناسب صورتوں میں اس کے لئے متشکل ہوتے ہیں۔اس کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ عالم تجرد سے الفاظ کے ذریعے مکالمات کر سکتا ہے،اہل اصطلاح میں سے جس کی ملکی قوت ضعیف ہوتی ہے اس کو عالم تجرد کی کوئی چیز بھی متشکل نظر نہیں آتی۔

یہ ہے ایک مختصر سا بیان بنی نوع انسان کی بعض استعدادوں کا،ان استعدادوں کو جاننے کے بعد یہ بات سمجھ میں آ جاتی ہے کہ اہل اللہ کے احوال و مقامات میں جو اکثر اختلافات دیکھنے میں آتے ہیں دراصل ان کی وجہ ان کی استعدادوں کا یہ اختلاف ہوتا ہے۔چنانچہ اہل اللہ میں سے

بعض بزرگ صاحب ارشاد ہوتے ہیں وہ عامۃ الناس کو اپنی طرف مائل کر لیتے ہیں اور بحث و مناقشہ کے دوران میں یا بطور دعوی کے کرامات اور خوارق دکھاتے ہیں، ان اہل اللہ کی جماعت میں بعض ایسے بزرگ بھی ہوتے ہیں جو بالکل گمنام رہے، نہ کوئی ان کو جانتا ہے اور نہ کوئی انہیں پہچانتا ہے، بعض ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے وجد و حال کی کیفیت ان کے علم سے قوی تر ہوتی ہے ان میں سے کسی کا وجد تو بڑے زور کا ہوتا ہے اور بعض کو معمولی سا وجد آتا ہے۔ الغرض اسی پر دوسروں کا بھی قیاس کیا جا سکتا ہے۔

ایک بار یہ فقیر اس بات کو معلوم کرنے کے لئے عالم غیب کی طرف متوجہ ہوا کہ آخر کیا وجہ ہے کہ پہلے زمانے کے اولیاء بڑی تاثیرات اور عجیب عجیب توجہات کے مالک تھے۔ لیکن آج اس زمانے میں گو ارباب تصوف و طریقت کے، انہیں راستوں پر گامزن ہیں۔ ان کو پہلوں کے، ان کمالات سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اس ضمن میں حظیرۃ القدس کی طرف سے مجھے بتایا گیا کہ عراقی گھوڑے اور خچر کو دیکھو کہ دونوں کے دونوں ایک نوع سے ہیں اور ان دونوں کی نشو و نما بھی ایک ہی طرح سے ہوتی ہے چنانچہ چھٹپن سے دونوں آگے بڑھتے ہیں پھر وہ جوان ہوتے ہیں اور جوانی کے بعد جب وہ بڑھاپے کی حد میں قدم رکھتے ہیں تو دونوں یکساں طور پر عمر کی ان منزلوں کو طے کرتے ہیں۔ اور کسی منزل میں بھی ان میں ایک دوسرے سے کوئی تفاوت نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ ان کے دانتوں کا گرنا، جوانی میں ان پر شہوانیت کا غلبہ، عمر کے دوسرے حصوں میں شہوانیت کا نہ ہونا پھر جوانی میں ان کے مزاج کی خشکی اور تندی اور بڑھاپے میں دونوں میں بلغم اور رطوبت کا پیدا ہونا، الغرض ان دونوں کو اپنی عمر کے ہر حصے میں ایک سے حالات میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اور عمر کی ہر منزل میں دونوں کے قدم ایک ہی سے پڑتے ہیں۔ لیکن اس یکسانیت کے باوجود عراقی گھوڑے کو دیکھو کہ وہ کتنا تیز دوڑتا ہے اور کس قدر مسافت طے کرتا ہے۔ اس کے مقابلے میں خچر سے ان میں کوئی چیز بھی ممکن نہیں باقی، اللہ ہر معاملے کو بہتر جانتا ہے۔

...........☆☆☆...........

بنی نوع انسان کے لطائف

فقیر کو بتایا گیا کہ اللہ تعالی نے انسان میں چند لطیفے ودیعت فرمائے ہیں۔اوران میں سے ہر ہرلطیفہ کی الگ الگ خاصیت ہے،سالک راہ طریقت طے کرتے وقت ایک لطیفہ سے ترقی کر کے دوسرے لطیفہ میں پہنچتا ہے، یہاں تک کہ اس کی سلوک کی منزل پوری ہو جاتی ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ انسان کا نفس ناطقہ جب اس کے نسمہ یعنی روح ہوائی سے پیوست ہوااوراس نسمے اوراس کی قوتوں کا تمام اثر بدن میں پھیلا تو لامحالہ اس سے چند صورتیں پیدا ہوں گی۔ان صورتوں میں سے ہر ہر صورت میں نسمہ کا اثر الگ الگ ہوتا ہے۔

نسمہ کے اصلی شعبے تین ہیں۔ان میں سے ایک قلب ہے،قلب نفس کی کیفیات واحوال مثلاً غصے، جرأت، حیا، محبت، خوف، انقباض، انبساط، رضا اور نفرت وغیرہ کا مرکز ہے۔اوراس کا صدر مقام سینے کے بائیں طرف پستان سے دوانگل نیچے ہے۔نسمے کے دوسرے شعبے کا نام عقل ہے۔عقل علوم کی حامل ہوتی ہے اس کی حد وہاں سے شروع ہوتی ہے جہاں حواس کی حد ختم ہوتی ہے۔عقل کا کام یہ ہے کہ وہ ان چیزوں کا جن تک انسان کی قوت احساس کی دسترس ہوتی ہے نہ اس کے وہم کی، تصور کر لیتی ہےاوران میں سے جس کی تصدیق اسے کرنا ہوتی ہےاس کی تصدیق کرتی ہے، انسان کی عقل کا مرکز اس کا دماغ ہے، نسمے کا تیسرا شعبہ طبیعت ہے۔وہ چیزیں جن کے بغیر یا جن کی جنس کے بغیر انسان کی زندگی قائم نہیں رہ سکتی جیسے کھانا، پینا، نیند، اور شہوانیت، وغیرہ طبیعت انسان ان جبلی تقاضوں کی حامل ہےاوراس کا مرکز جگر ہوتا ہے۔

انسان پر اگر بہیمی قوت کا غلبہ ہو جائے تو اس کا قلب قلب بہیمی بن جاتا ہےاور قلب بہیمی سے مراد یہ ہے کہ انقباظ وانبساط اور غصہ ورضا جیسی لطیف کیفیات قلب بہیمی والے کے لئے لطیف

نہیں رہتیں۔ بلکہ وہ ٹھوس مادی نفسانی لذتوں کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ قلب بہیمی والا کبھی اس سے بھی نیچے اتر آتا ہے اس حالت میں شیطانی وسوسے، اسکو اپنا مرکب بنا لیتے ہیں، اور اس کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ خارجی اسباب اور بیرونی اثرات کے بغیر ہی اس کے دل سے طرح طرح کے شیطانی وسوسے پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ اور ان کی وجہ سے اس کی عقل اس حد تک ماؤف ہو جاتی ہے کہ وہ ہمیشہ نفس کی ادنی خواہشات کی طرف مائل رہتی ہے، اب اگر اس شخص میں شہوت کا غلبہ ہوگا تو یقینی طور پر اس کے دماغ میں جماع کے خیالات کثرت سے آئیں گے اگر اسے بھوک ہوگی تو اس کا خیال انواع و اقسام کے کھانوں کا تصور کریگا۔ اسی پر نفس کی دوسری خواہشات کا بھی قیاس کیا جا سکتا ہے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ قلب بہیمی والا اس مقام سے بھی نیچے گر جاتا ہے اس حالت میں وہ شیطانی وسوسوں کو کھلے بندوں تسلیم کرتا ہے۔ کبھی اسے اچھے نظام کو توڑنے کی فکر ہوتی ہے اور کبھی اعتقادات حقہ میں شکوک پیدا کرتا ہے۔ غرضیکہ وہ اس طرح کے مفاسد میں اتنا منہمک ہو جاتا ہے کہ اس کی طبیعت سرتاپا نفس امارہ بن جاتی ہے پھر جو بھی اس کے جی میں آتا ہے، کرتا ہے اور جس راہ پر چاہتا ہے چل دیتا ہے، نہ اس کی عقل اس میں مانع ہوتی ہے اور نہ شرع کی کوئی قید اس کا راستہ روکتی ہے۔

اب ایک شخص ہے، جس کی ملکی اور بہیمی قوتوں میں ہم آہنگی ہے اور یہ دونوں قوتیں آپس میں ایک ایسے مقام پر مل گئی ہیں جو ملکیت اور بہیمیت کے لئے بیچ کی منزل ہے، ان دونوں قوتوں کی ہم آہنگی کی وجہ سے اس شخص کے مزاج میں اعتدال پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسے شخص کا قلب قلب انسانی کہلاتا ہے۔ اس شخص کی محبت اس کا خوف اس کی رضا مندی اور اس کی ناراضگی یہ سب چیزیں حقانیت پر مبنی ہوتی ہیں یہ شخص دوزخ سے ڈرتا ہے، بہشت کی، اسے تمنا ہوتی ہے، علیٰ ہذا القیاس اسی طرح اس کی دوسری باتوں کا قیاس کر لو۔

جس شخص میں قلب انسانی ہوتا ہے، اسے مجاہدے کی ضرورت پڑتی ہے تاکہ وہ مجاہدے کے ذریعے دل کو غفلت سے باز رکھ سکے، وہ شخص جس کا قلب بہیمی ہے، اس کا نفس نفس امارہ ہوتا ہے، لیکن قلب انسانی والے کا نفس، نفس لوامہ ہوتا ہے، اس شخص کے نفس کی مثال یوں سمجھئے جیسے ایک

سرکش گھوڑا ہو اور اسے لگام کے ذریعے قابو میں رکھنے کی ضرورت پڑتی ہے اس شخص کی عقل، عقل انسانی کہلاتی ہے۔ چنانچہ یہ ہر اس چیز کی تصدیق کرتی ہے جس کی تصدیق کرنی چاہیے۔ اور تصدیق ہی کی کیفیت اس شخص کے جملہ احوال و کوائف پر غالب رہتی ہے۔

"قلب انسانی، نفس لوامہ"، اور "عقل انسانی" کا مقام نیکوکاروں اور علمائے دین کا ہے۔ اور احکام شریعت کا عمل دخل اس مقام کے لوازم میں سے ہے۔

جس شخص میں ملکوتی قوت کا زور ہو اور اس کے مقابلے میں اس کی بہیمی قوت اس طرح زیر ہو جائے گویا کہ اس کا کہیں وجود نہ تھا تو اس شخص کا قلب "روح" بن جاتا ہے اس مقام میں اسے مجاہدوں اور ریاضتوں سے نجات مل جاتی ہے اسے "قبض" کے بغیر "بسط" کی کیفیت میسر آتی ہے، قلق اور اضطراب کے بغیر وہ الفت و محبت سے بہرہ یاب ہوتا ہے، بے ہوش ہوئے، بغیر اسے وجد آتا ہے۔ اور اس طرح اس شخص کی عقل ترقی کر کے "سر" بن جاتی ہے۔

عقل جب "سر" کی منزل میں پہنچتی ہے تو وہ غیب سے بلند مرتبہ علوم و معارف حاصل کرتی ہے، لیکن اس کا ان علوم کے حصول کا طریقہ وہ نہیں ہوتا، جو عام طور پر جاری و ساری ہے۔ یعنی یہ کہ فراست سے کوئی بات معلوم کر لی یا کشف سے کسی علم کو حاصل کر لیا، یا ہاتف سے کوئی بات سن لی، وہ شخص جس کی عقل "سر" بن جاتی ہے وہ "مقام بے نشانی" کو اپنا نصب العین بناتا ہے، اس شخص کا نفس "نفس مطمئنہ" ہوتا ہے کہ شرع و عقل کی مرضی کے خلاف وہ کسی خواہش کا خیال تک نہیں کرتا۔ اور اس کے دل میں جو خیالات اٹھتے ہیں وہ بھی صراط مستقیم کے مطابق ہوتے ہیں۔ باقی اس شخص کے اعمال کا تو کیا کہنا، یہی ولایت صغریٰ کا مقام ہے۔

ولایت صغریٰ کے بعد اگر عنایت الٰہی اس شخص کے جس کا نفس "نفس مطمئنہ" "قلب روح" اور عقل "سر" ہوتی ہے، شامل حال رہے تو وہ اس سے آگے اور ترقی کرتا ہے۔ چنانچہ یہاں سے اس کے سامنے دو راہیں کھلتی ہیں۔ ایک ولایت کبریٰ کی راہ۔ دوسرے مفہمیت کی راہ۔ مفہمیت کو نور نبوت اور وراثت نبوت کا بھی نام دیا گیا ہے۔

ولایت کبریٰ کی حقیقت یہ ہے کہ جس انسان نسمہ اور اس سے متعلقہ قوتوں کو اپنے آپ سے الگ کر دے لیکن اس ضمن میں یہ ملحوظ رہے کہ نسمہ اور اس سے متعلقہ قوتوں کو اپنے اپ سے جسمانی

طور پر الگ کرنا ممکن نہیں ہوتا بلکہ علیحدگی کا یہ عمل صرف بصیرت اور حال وکیفیت ہی کے ذریعے ہوتا ہے الغرض جب انسان نسمہ اور اس سے متعلقہ قوتوں کے اپنے سے الگ کردے اس کے بعد وہ اپنے آپ میں غور کرے اور اپنے باطن کی گہرائیوں میں ڈوب جائے تو اس حالت میں نفس کلیہ جو کل کائنات کی اصل ہے اس شخص پر منکشف ہوجاتا ہے۔ لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر نفس کلیہ اس شخص پر کیسے منکشف ہوگیا؟

بات یہ ہے کہ انسان میں جو نفس ناطقہ ہے وہ اصل میں نفس کلیہ کے تنزلات میں سے ایک تنزل ہے اور اس کے ظہورات میں سے ایک ظہور ہے جب انسان کا نفس ناطقہ سب چیزوں سے پورا انقطاع کرکے اپنے متعلق غور کرتا ہے اور اپنے آپ کو جاننے اور اپنی اصل تک پہنچنے کے لئے پیچھے کی طرف جاتا ہے، جہاں سے کہ اس کے وجود کی نمو ہوئی تھی تو وہ اپنے سامنے نفس کلیہ کو پاتا ہے، جو کائنات میں ہر جگہ جاری وساری ہے۔ عام اہل اللہ نے اس نفس کلیہ کا نام ''وجود'' رکھا ہے، کائنات میں اس کے ہر جگہ جاری وساری ہونے کے علم کو وہ ''معرفت سریان وجود'' کہتے ہیں۔ الغرض انسان کا نفس ناطقہ جب نسمہ اور اس سے متعلقہ قوتوں کے اثرات سے پاک اور خالص ہو کر نفس کلیہ کے ساتھ اپنا الحاق قائم کرلیتا ہے تو نفس ناطقہ کو اس خاص حالت میں ''خفی'' کا نام دیا جاتا ہے۔

فقیر کو بتایا گیا کہ ولایت کبریٰ کے حصول کا سب سے قوی ذریعہ یہ ہے کہ جب سالک پر مقام بے نشانی منکشف ہوجائے تو پھر وہ ''مراقبہ احاطہ'' یعنی **ان اللّٰہ علی کل شئ محیط** کا مراقبہ کرے۔ بعدازاں وہ **لا الٰہ الا اللّٰہ** کا ذکر کرے لیکن یہ ذکر کرتے وقت **لا الٰہ الا اللّٰہ** کے ضمن میں ''**لا موجود الا اللّٰہ**'' کو مفہوم کو ملحوظ نظر رکھے۔

مفہمیت کی حقیقت یہ ہے کہ جب نفس ناطقہ نسمہ کی غیر لطیف قوتوں سے اعراض کرلیتا ہے تو وہ ملاء اعلیٰ سے ملحق ہوجاتا ہے، اس حالت میں نفس ناطقہ میں وہ علمی صورتیں منکشف ہوجاتی ہیں جو ملاء اعلیٰ میں موجود ہوتی ہیں اس طرح انسان کا نفس ناطقہ اس قابل ہوجاتا ہے کہ وہ واجب الوجود کی معرفت کو ان معنوں میں کہ اس ضمن میں قدرت خداوندی کے جملہ کمالات ازقسم ابداع، خلق، تدبیر، اور تدلی کا علم بھی آجائے، اجمالی طور پر حاصل کرسکتا ہے۔ مقام مفہمیت کی ان

خصوصیات کا ہی نتیجہ ہے کہ وہ افراد کاملہ جن کو یہ مقام عطا ہوتا ہے ان کے کلام میں تشبیہات کی بڑی کثرت ہوتی ہے۔ گو تشبیہات کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں ان کے کلام میں تنزیہی پہلو بھی ملے ہوتے ہیں نیز ان لوگوں کو نوامیس الٰہیہ یعنی اللہ کے شرائع وقواعد کے احکام کا علم حاصل ہوتا ہے۔ اور حظیرۃ القدس میں نئے نئے حالات کے مطابق جو فیصلے ہوتے ہیں یہ لوگ ان سے بھی باخبر رہتے ہیں۔

ہم ابھی بیان کر آئے ہیں کہ ولایت صغریٰ کے مقام سے سالک جب ترقی کرتا ہے تو اس کے سامنے دو مقام آتے ہیں۔ ایک ولایت کبریٰ کا مقام دوسرا مقام مفہمیت اور مفہمیت کو نور نبوت اور وراثت نبوت بھی کہتے ہیں جہاں تک اصل نبوت کا تعلق ہے، اس کی حقیقت یہ ہے کہ نبوت دو جانب سے معرض وجود میں آتی ہے۔ اس کی ایک جانب تو نبوت قبول کرنے والے کی ہوتی ہے یعنی نبی کے نفس ناطقہ کی، جب نفس ناطقہ، مقام مفہمیت حاصل کر لیتا ہے تو نبوت کی ایک شرط ایک جانب پوری ہو جاتی ہے۔ نبوت کی دوسری جانب اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی کا مبعوث کیا جانا ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی تدبیر اس امر کی متقاضی ہوتی ہے کہ وہ کسی قوم کو اس کے اعمال بد سے ڈرائے، اس کو ہدایت کی طرف بلائے اس میں مفاسد ومظالم کو دور کرنے اور اس قبیل کے دوسرے امور کو سرانجام دینے کیلئے کسی شخص کو مبعوث کرے تو اس طرح نبوت کی دوسری شرط یا دوسری جانب بھی پوری ہو جاتی ہے۔ الغرض نبوت دو امور سے ترکیب پاتی ہے۔ ایک نبی کے نفس ناطقہ کی ذاتی صلاحیت، اسی کا نام مفہمیت ہے۔ اس کو نور نبوت اور وراثت نبوت کہنے کی بھی، یہی وجہ ہے۔ دوسری چیز اللہ تعالیٰ کا کسی شخص کو نبی مبعوث کرنے کا ارادہ ہے۔

ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے، بعد گو نبوت ختم ہو گئی لیکن اجزائے نبوت کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ اجزائے نبوت سے یہاں مراد مفہمیت سے ہے جس کا سلسلہ اب تک منقطع نہیں ہوا۔ وہ بزرگ جو مقام مفہمیت پر سرفراز ہوتے ہیں وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب کی حیثیت سے دین کی تجدید فرماتے ہیں، نیز وہ سلوک وطریقت میں ارشاد وہدایت کے منصب پر فائز ہوتے ہیں۔ اور جو برائیاں لوگوں میں پھیلی ہوتی ہیں۔ ان کا وہ سد باب کرتے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ جو حالات واسباب اس امر کے متقاضی ہوتے

ہیں کہ ایک نبی دنیا میں مبعوث ہو بعینہ اسی طرح کے حالات واسباب ان افراد مفہمین کے ظہور کا بھی تقاضا کرتے ہیں کہ وہ نبی کے بعد آئیں۔ اس کے دین کی تجدید کریں۔ سلوک وطریقت کی طرف لوگوں کو ہدایت دیں اور مفاسد کا قلع قمع کریں۔

افراد مفہمین کی اس جماعت میں سے جوذکی ہوتے ہیں وہ تو منصب مفہمیت کے اس ''سر'' کو سمجھ لیتے ہیں۔ اور جو ذکی نہیں ہوتے ان کو تدبیر الٰہی، لکڑی اور پتھر کی طرح ایک حالت سے دوسری حالت میں برابر چکر دیتی ہے اور رد وبدل کرتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ قدرت کو جو کام ان سے لینا مقصود ہوتا ہے۔ وہ اس سرانجام دیدیتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علی وسلم کی بعثت کی ایک صورت عالم مثال میں موجود تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب مبعوث ہو گئے تو نبوت کی یہ مثالی صورت بھی منتشر ہوگئی۔ اور اسی طرح نبوت کی حقیقت اپنے انجام کو پہنچ گئی۔ گو اب کوئی نبی نہیں آئیگا، لیکن افراد مفہمین پر جن چیزوں کا فیضان ہوتا رہتا ہے وہ سب نبوت ہی کے انوار اسی کی اشباح اور تمثیلیں ہوتی ہیں۔

یہاں طریقت اور سلوک کے صرف ان پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے جن کا تعلق سالک کے ارادہ وقصد اور اس کے مجاہدے اور ریاضت سے ہے، اسی لئے ''مقام فردیت'' کے ان کمالات کا بیان کرنا، جو سرتا پا وہبی ہیں۔ اور سالک کے قصد وارادہ کا ان میں مطلق دخل نہیں، یہاں کوئی معنی نہیں رکھتا۔

آسودہ شبے باید وخوش ماہتابے　　　　تا با تو حکایت کنم از ہر بابے

خلاصہ مطلب یہ ہے کہ انسانی لطائف یعنی لطیفۂ قلب، لطیفہ عقل اور لطیفۂ طبیعت کے مدارج ترقی سمجھنے کیلئے اصل اصول یہ ہونا چاہیے کہ راہ سلوک کے جن مقامات اور احوال کا ہم ابھی ذکر کر آئے ہیں ان کو پیش نظر رکھا جائے۔ اور پھر اہل اللہ کے وہ معاملات اور واقعات جو ان احوال اور مقامات پر دلالت کرتے ہیں وہ بھی ملحوظ خاطر رہیں۔ اس ضمن میں انسانی لطائف کو سمجھنے کیلئے کیفیات والوں اور اس قبیل کی اور چیزوں کو جاننے کی ضرورت نہیں ہے۔ جیسا کہ عام طور پر بعد کے صوفیاء کہتے ہیں۔

آخر میں ہم اس امر کی بھی وضاحت کر دیتے ہیں کہ اس مسئلے میں کہ ''سر'' مقدم ہے۔

''روح'' سے یا ''روح'' مقدم ہے ''سر'' سے اس بارے میں صوفیائے متقدمین میں اختلاف رہا ہے۔ ''سر'' اور ''روح'' دونوں کا آپس کا تعلق یوں سمجھئے جیسے کہ گھوڑ دوڑ میں گھوڑے دوڑ رہے ہوں۔ اور دونوں ہم عنان اور برابر ہوں۔ ان میں سے کبھی ایک اپنی استعداد کی وجہ سے آگے بڑھ جائے اور دوسرا اس کے پیچھے پیچھے آئے۔ اور کبھی دوسرا آگے بڑھ جائے اور پہلا اس کے پیچھے پیچھے آئے۔

☆☆☆

اصحابِ یمین

اس فقیر کو بتایا گیا ہے کہ ''سلوک الی اللہ'' کی دو قسمیں ہیں۔ اسکی ایک قسم تو وہ ہے کہ شرعی احکام واوامر کی پابندی پر اس کا انحصار وقیام ہے۔ سلوک کی اس قسم کی تبلیغ ودعوت اللہ تعالی نے علماء پر جو انبیاء علیہم السلام کے وارث ہیں، فرض کی ہے۔ اسی کے متعلق یہ حکم ہے کہ اگر علماء اس فرض کو پورا نہ کریں اور دعوت الی الحق کو چھپائیں تو اس پر ان سے مواخذہ کیا جائیگا۔ سلوک الی اللہ کی یہی وہ قسم ہے جس کے متعلق قرآن مجید میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں بڑی وضاحت کی گئی ہے۔

اب اگر کوئی شخص کتاب وسنت پر عمل کرتا ہے، جو ضروری اوراد ووظائف ہیں ان کا پابند ہے اس کی اصل فطرت میں دجالیت نہیں ہے تو ضروری ہے کہ ان اعمال کی وجہ سے جو وہ بجالاتا ہے ''اصحاب الیمین'' کی راہوں میں سے ایک راہ اس کی حسب استعداد اس کے سامنے کھلے۔ سلوک الی اللہ کی اس راہ پر چلنے والوں میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہوتا، جس کو اس ایک راہ کے علاوہ دو یا دو سے زیادہ راہیں دی گئی ہوں، یہی وہ لوگ ہیں جن میں سے اکثر کے متعلق اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ وہ ایک عمل کی برکت سے یا ایک مصیبت میں پڑنے کی وجہ سے نجات پا گئے۔

سلوک الی اللہ کی دوسری قسم وہ ہے کہ جن لوگوں کی طبیعتیں اور مزاج عالی ہوتے ہیں وہ محض اپنی افتاد فطرت سے سلوک کی، اس دوسری قسم کی طرف ہدایت حاصل کر لیتے ہیں۔ ان لوگوں کا خدا تعالی خود متکفل اور کارساز ہوتا ہے اور وہ اپنی تدبیر سے کوئی نہ کوئی ایسی تقریب ضرور بہم فرما دیتا ہے کہ ان تک دانائی وحکمت جو حکیم کی گمشدہ متاع ہوتی ہے، پہنچ جائے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ وہ لوگ جو نفوس ناقصہ رکھتے ہیں حتی کہ جن کی ملکی قوت ضعیف ہوتی ہے، خواہ ان کی بہیمی قوت شدید ہو یا ضعیف اور وہ اہل تجاذب میں سے ہوں یا اہل اصطلاح میں سے بہر حال ان نفوس ناقصہ میں بعض عجیب باتیں پائی جاتی ہیں۔ گویا اہل اللہ کی اکثریت ان کی طرف کفالت نہیں کرتی اور نہ وہ ان کو شمار میں لاتی ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ جمہور عوام تو آخر یہی نفوس ناقصہ والے ہی ہوتے ہیں۔ اس لئے علماء متبحرین اور خود شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نظر اوروں سے زیادہ ان لوگوں کے احوال پر ہوتی ہے چنانچہ وہ ان لوگوں ہی کے حالات ومقامات کو زیادہ سامنے رکھتے ہیں۔ اور ان کو زندگی میں جو عوارض اور حوادثات پیش آتے ہیں، شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام اور علماء متبحرین بیشتر انہیں کی وضاحت فرماتے ہیں۔ ان جمہور عوام میں سے اکثر تعداد اصحاب یمین کی ہوتی ہے اور اصحاب یمین کے بھی بہت سے طبقے ہیں، ہم اس ضمن میں ان میں سے بعض کا ذکر نمونہ کے طور پر یہاں کرتے ہیں، اب جن کا ذکر کیا جا رہا ہے ان پر دوسروں کو قیاس کیا جا سکتا ہے، جن کا ہم یہاں ذکر نہیں کر رہے ہیں۔

(الف) ان میں سے پہلا طبقہ وہ ہے، جو سابقین کا متقلد اور ان کی تمثال ہے۔ ان سابقین میں سے ایک مقام ''فردیت'' رکھنے والوں یعنی ''مفردین'' کا گروہ ہے۔ ''مفردین'' وہ لوگ ہوتے ہیں جن کی نظر تمام تر عالم غیب کی طرف رہتی ہے اور جب وہ ذکر و اذکار کرتے ہیں تو ان کے دل میں عالم غیب کی طرف ایک کشادہ اور وسیع راہ کھل جاتی ہے۔ چنانچہ اصحاب یمین سے ایک طبقہ ان مفردین کا متقلد اور ان کی تمثال ہوتا ہے اس طبقے کی حالت یہ ہے کہ کبھی کبھی ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ ذکر و اذکار کے وقت اللہ تعالیٰ کی عام رحمت کے طفیل یا اس کے برگزیدہ بندوں میں سے کسی کی برکت سے ان اصحاب یمین کو ''مفردین'' کی کیفیت میسر آتی ہے پھر تھوڑی دیر کے بعد ان سے یہ کیفیت مفقود ہو جاتی ہے۔ لیکن ان لوگوں سے اس کیفیت کے مفقود ہونے کے بعد یہ نہیں ہوتا کہ ان کے دل پر ایسے احوال طاری ہو جائیں جو پہلی کیفیت سے متضاد ہوں۔

اصحاب یمین کی ایک جماعت صدیقین کی متقلد اور تمثال ہوتی ہے ''صدیقین'' وہ لوگ ہیں جو دین کی اطاعت و فرمانبرداری اور اس میں حد درجہ ثبات واستقلال رکھنے کی وجہ سے سب مسلمانوں میں ممتاز ہوتے ہیں۔ ''صدیقین'' کے اس وصف کمال کو یوں سمجھئے جیسے کہ ملاء اعلیٰ کا

ایک پرتو ان کے دلوں میں جاگزیں ہے اور اسی کی وجہ سے ان کو دین میں اس قدر ثبات اور استقلال حاصل ہے۔ الغرض اصحاب یمین کے جو لوگ ان ''صدیقین'' کے مقلد ہوتے ہیں وہ احکام دین کے معاملے میں بڑے فرمانبردار ہوتے ہیں۔

لیکن اگر ان کے اس فرمانبرداری کے رجحان کو بنظر تحقیق دیکھا جائے، تو معلوم ہوگا کہ ان کی یہ فرمانبرداری دین واسباب پر مبنی ہے، اس کا سبب ایک تو ان کا اپنا ایمان و یقین ہے۔ ان کی اس فرمانبرداری کا دوسرا سبب یہ ہے کہ یہ لوگ دینی اعمال اس حد تک بجالاتے ہیں کہ آخر میں یہ اعمال ان کے لئے بطور ایک عادت کے بن جاتے ہیں اور ان اعمال کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو اسلاف کی راہ پر چلتے ہوئے پاتے ہیں، یہ اور اس طرح کی اور بھی باتیں ہیں جو ان لوگوں میں احکام دین کی فرمانبرداری کا رجحان پیدا کرتی ہیں۔

بے شک ان لوگوں کی فرماں برداری کے دو اسباب ایک سے نہیں ہیں۔ اور ان دونوں میں ایک دوسرے سے فرق پایا جاتا ہے لیکن عملاً ان دو اسباب، کا الگ الگ ہونا کوئی نقصان نہیں دیتا۔ کیونکہ ان میں سے ہر ایک سبب ان لوگوں کے اصل جوہر روح میں جو کیفیت پیدا کرتا ہے وہ اس کیفیت سے جو دوسرے سبب سے پیدا ہوتی ہے مختلف نہیں ہوتی بلکہ دونوں کیفیات باہم ملی جلی ہوتی ہیں اور ان میں کسی قسم کی تفریق ممکن نہیں الغرض اصحاب یمین کی یہ جماعت جب اس دنیا سے انتقال کر کے دوسری دنیا میں پہنچتی ہے تو وہاں بھی یہ لوگ فرمانبرداری دین کی اس صفت کو جو اس دنیا میں انہوں نے حاصل کی تھی اپنے اندر موجود پاتے ہیں اور اس سے وہ مستفید ہوتے ہیں۔

اصحاب یمین کا ایک طبقہ شہداء کا مقلد اور ان کی تمثال ہوتا ہے ''شہداء'' کی خصوصیات یہ ہیں کہ وہ کفار پر شدید اور مومنین پر رحیم ہوتے ہیں۔ وہ برائیوں کو سختی سے روکتے ہیں اور انہیں اعلائے کلمۃ الحق سے بہت بڑی رغبت ہوتی ہے۔ ''شہداء'' کے نفوس پر ان سب خصوصیات کا انبیاء علیہم السلام کے دلوں اور ملاء اعلیٰ سے فیضان ہوتا ہے۔ یہ لوگ ان کاموں میں بڑے ثابت قدم اور ان کے بے حد پابند ہوتے ہیں۔ اصحاب یمین کے اس گروہ کو ایمان کے ساتھ ساتھ طبیعت کی بے قراری واضطراب اور مزاج کی تندہی اور سختی بھی ودیعت ہوتی ہے اسی وجہ سے وہ برائیوں کو مٹانے اور کفر کے لشکروں کو پامال کرنے میں بڑے کوشاں اور سرگرم رہتے ہیں۔ یا ایسا

بھی ہوتا ہے کہ ان کے مزاج میں فطری طور پر "جذب" کی کیفیت مرکوز ہوتی ہے۔ اور یہ کیفیت "جذب" ان کے ایمان سے مخلوط ہو جاتی ہے۔ "جذب" اور "ایمان" کی یہ مخلوط کیفیت جو ان کے اندر جاگزیں ہوتی ہے، وہ انہیں اس امر پر ابھارتی رہتی ہے وہ کافروں اور ملحدوں سے مناظرے کریں اور ان کے مذاہب باطلہ کے قلع قمع میں کوشاں ہوں۔

اصحاب یمین میں سے ایک جماعت "راسخین فی العلم" کی مقلد اور ان کی تمثال ہوتی ہے۔ "راسخین فی العلم" وہ لوگ ہیں کہ عالم غیب سے ان کے باطن میں فیض و مدد کا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے، اور اس کی مدد سے وہ کتاب اللہ اور سنت رسول علیہم السلام کے معانی پر اس طرح آگاہی حاصل کرتے گویا کہ پردہ کے پیچھے سے کوئی انہیں سب حقائق کی خبر دے رہا ہے؟ اصحاب جنس کا وہ طبقہ، جو ان "راسخین فی العلم" کا مقلد ہوتا ہے وہ بیشتر کتاب وسنت کے علوم اور علماء کے اقوال و روایات کی حفاظت میں انہماک رکھتا ہے بے شک ایک حد تک ان لوگوں پر کتاب وسنت کے معانی کا دروازہ بھی کھلتا ہے۔ لیکن اس سلسلے میں میں جو کچھ انہیں حاصل ہوتا ہے وہ سب کا سب ان کے صرف ذاتی غور وفکر اور اپنے حفظ و مطالعہ کا نتیجہ ہوتا ہے۔ الغرض جب یہ لوگ دوسری دنیا میں پہونچتے ہیں اور وہ علم جو اللہ تعالی کی طرف منسوب ہیں وہ اس دنیا میں ان لوگوں کے دلوں میں محفوظ ہو چکے ہوتے ہیں۔ اس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ ان علوم الہی کا لب لباب ان کے باطن میں ایک اجمالی کیفیت کی شکل میں جاگزیں ہو جاتا ہے۔ اور اس ذریعے سے ان پر "راسخین فی العلم" کے مقام کا ایک رخ بے نقاب ہوتا ہے۔

اصحاب یمین کی ایک جماعت "عباد متطہرین" کی مقلد اور ان کی تمثال ہوتی ہے۔ "عباد متطہرین" سے مراد وہ لوگ ہیں جو نور عبادت اور نور طہارت کا جن کا ذکر ہم پہلے کر آئے ہیں کثرت سے ادراک کرتے ہیں اور اس وجہ سے ان کو تمام مسلمانوں میں خاص طور پر امتیاز حاصل ہوتا ہے۔ اصحاب یمین کی اس جماعت کی خصوصیت یہ ہے کہ طہارت اور عبادت کی جو مختلف صورتیں اور شکلیں ہیں، اس جماعت کے لوگوں کو ان میں سے کسی ایک صورت اور شکل سے حد درجہ کی وابستگی اور الفت ہوتی ہے۔ چنانچہ عبادت یا طہارت کی اس خاص شکل کے ذریعے یہ وہ اپنے مقصود کو بھی پا لیتے ہیں۔ اور اس وجہ سے طبعا وہ اس بات کے عادی ہو جاتے ہیں کہ اس خاص شکل

کے علاوہ عبادت اور طہارت کی دوسری شکلوں اور صورتوں سے بے توجہی برتیں۔ مثلاً ایک شخص ہے جس نے صبح کو نماز فجر کے لئے وضو کیا۔ اس وقت وہ بول و براز اور ریح سے فارغ ہو چکا تھا اور اسے کسی قسم کی پریشان خیالی یا کوئی اور تشویش بھی نہ تھی جو اس کی توجہ میں خلل انداز ہوتی۔ اس حالت میں یہ شخص وضو کے ذریعے کسی حد تک تو طہارت سے بہرہ ور ہو جاتا ہے۔ گویا شخص طہارت اور عبادت کے دوسرے اعمال بھی بجالاتا ہے۔ لیکن جو کیفیت اس وضو سے حاصل ہوتی ہے وہ کسی چیز سے میسر نہیں آتی۔

اسی طرح ایک اور شخص ہے جس نے کسی موقع پر کوئی خاص ذکر واذ کار کیا یا کسی مخصوص طریقے سے اس نے کوئی مناجات کی یا اس سے نمازوں میں سے کوئی نماز پڑھی اور اس سے اس کی توجہ کلیۃ سب چیزوں سے ہٹ کر صرف اسی خاص ذکر یا مناجات یا اس نماز کی طرف ہوگئی۔ ہوسکتا ہے کہ اس شخص نے اس خاص ذکر و مناجات یا نماز کی کسی بزرگ سے تعریف سنی ہو۔ الغرض یہ بات ہو یا اس کے علاوہ کوئی اور وجہ ہو بہر حال اس ذکر، مناجات یا نماز کا اس شخص پر یہ اثر ہوا کہ اسے اس میں ''نور عبادت'' کی کیفیت حاصل ہوگئی۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس زندگی میں تو اصحاب یمین کی اس جماعت کو صوم وصلوۃ سے کوئی نور میسر نہیں ہوتا، لیکن ان کی وجہ سے ان میں اس نور کو حاصل کرنے کی تھوڑی بہت استعداد ضرور پیدا ہو جاتی ہے۔ اب یہ لوگ جب اس دنیا سے دوسری دنیا میں پہنچے اور وہاں ان کے نفوس سے عالم تجرد کی بو سونگھی تو ان کے اندر صوم وصلوٰۃ کی وجہ سے اس دنیا میں نور عبادت کو حاصل کرنے کی جو مخفی استعداد پیدا ہوگئی تھی وہ یہاں دوسری دنیا میں ان کے کام آئی۔ اور دنیاوی زندگی میں انہوں نے جو نیم پختہ ریاضت کی تھی اس نے یہاں ان کو نفع پہنچایا اصحاب یمین کا ایک گروہ ''اصحاب خلق حسن'' کا مقلد اور ان کی تمثال ہوتا ہے اور خلق حسن والے وہ لوگ ہوتے ہیں جو جود وسخاوت، انکسار د تواضع، عفو و بشاشت اور عامہ خلائق کی نفع رسانی کی وجہ سے امتیاز رکھتے ہیں، اصحاب یمین میں سے جو گروہ ان ''اصحاب خلق حسن'' کی تمثال ہوتا ہے ان کی یہ خصوصیت یہ ہے کہ وہ جبلی طور پر نرم مزاج واقع ہوتے ہیں

اور نرمی کے اظہار میں انہیں کسی قسم کا باک بھی نہیں ہوتا نیز وہ اچھے کاموں کو خلوص نیت سے

سرانجام دیتے ہیں۔ اوران کاموں کو کرتے وقت ان کے پیش نظر عمومی اور کلی اصول ہوتے ہیں۔

اصحاب یمین کی ایک جماعت ''زہاد'' کی مقلد اور ان کی تمثال ہوتی ہے۔ ''زہاد'' کی خصوصیت یہ کہ وہ عالم عقبیٰ ومعاد میں بہت زیادہ یقین رکھتے ہیں اور اس معاملہ خاص میں باقی تمام مسلمانوں پر انہیں امتیاز ہوتا ہے۔ ''زہاد'' دنیا کی تمام لذتوں کو حقیر سمجھتے ہیں اور ان کے نزدیک نہ دنیا والوں کی کوئی اہمیت ہوتی ہے نہ ان کے طور طریقوں اور رسم ورواج کے کچھ پروا کرتے ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ''زہاد'' کی روح یا ان کا ''سر'' عالم اعلیٰ کی طرف ہمیشہ مائل رہتا ہے اس لئے دنیا کی چیز ان کی نظروں میں نہیں جچتی۔ اصحاب یمین میں سے وہ لوگ جو ان زہاد کے مقلد اور ان کی تمثال ہوتے ہیں۔ ان میں زہد وتعبد کیساتھ ساتھ طرز معاش کی کرختگی، طبیعت کی سختی اور اس طرح کی اور باتیں جمع ہوتی ہیں چنانچہ جو اعمال وافعال ''زہاد'' کرتے ہیں یہی کچھ ان لوگوں سے بھی صادر ہوتا ہے۔

اصحاب یمین کے پہلے طبقے کے مختلف گروہوں کا بیان یہاں ختم ہوا۔

(ب) اصحاب یمین کا دوسرا طبقہ وہ ہے جس نے ''اولیاء اللہ'' کی نسبت حاصل کرنے کی کوشش کی اور گو وہ اپنے مزاج کے ضعف کی وجہ سے یا کندذہن ہونے کی بنا پر یا پوری ریاضت نہ کر سکنے کے سبب سے، اولیاء اللہ کی اس نسبت کو تو حاصل نہ کر سکا، لیکن اس نسبت سے انہیں مناسبت ضرور پیدا ہو گئی۔ اب اصحاب یمین کے اس طبقے میں سے ایک تو وہ لوگ ہیں جنہوں نے محض درود وسلام کے ذریعے اویسی نسبت حاصل کر لی اور ان پر اس بارگاہ سے انس وسرور کا فیضان ہو گیا۔ یا وہ کسی اور طریق سے اس ذات گرامی کے مورد عنایت ہو گئی۔ ان میں سے دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو بعض قبروں کی برابر زیارت کرتے اور ان پر فاتحہ پڑھتے رہے یا انہوں نے کسی بزرگ کے نام کا صدقہ دیئے دیتے اس بزرگ کی روح سے مناسبت پیدا کر لی۔ بغیر اس کے وہ ''نسبت اویسی'' کے اصول وفروع کے کماحقہ واقف ہوتے۔

''اولیاء اللہ'' کی نسبت سے مناسبت حاصل کرنے والے اصحاب یمین میں سے تیسرا فرقہ ان لوگوں کا ہے جو ایسے اشغال اور اس قسم کی توجہات میں لگ گئے جن سے کہ ''نسبت یادداشت'' پیدا ہوتی ہے ان اشغال اور توجہات کے ضمن میں ہی ان کو اطمینان خاطر نصیب ہو گیا۔ گویہ لوگ

ابھی ''نسبت یادداشت'' کی اصل حقیقت سے آشنا نہیں ہوئے تھے۔ ان اصحاب یمین میں سے چوتھا فرقہ ان لوگوں کا ہے جن کو ''نسبت یادداشت'' رکھنے والوں کی صحبت نصیب ہوئی۔ اور محض ان کی صحبت کی برکت سے ان کو دعا و مناجات کی حلاوت میسر آ گئی۔ ان کا پانچواں گروہ ان لوگوں کا ہے جن کو شعائر اللہ میں سے کسی ایک سے یا اللہ کی محبوب چیزوں میں سے کسی سے مثلاً قرآن مجید سے یا کعبہ معظمہ سے عشق ہے وہ بڑے شوق سے قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہیں۔ اور کعبہ معظمہ کی تعظیم اور اس کے طواف میں بڑا اہتمام کرتے ہیں۔ یا پھر یہ ہوتا ہے کہ اس گروہ والوں کو ''اولیاء اللہ'' میں سے کسی ولی سے خاص محبت ہوتی ہے اور وہ اس محبت میں ''فنافی الشیخ'' ہو جاتے ہیں۔ اس گروہ میں سے وہ لوگ بھی ہیں جنہوں نے نسبت توحید کے حصول کا قصد کیا گو وہ اس نسبت کی حقیقت کو نہیں پہنچ سکے، لیکن انہوں نے اپنے فکر کی سلامتی اور اپنے اعتقاد کی صحت پر رہتے ہوئے ''علم توحید'' کو گرفت میں لانے کی ایک حد تک کوشش ضرور کی۔

(ج) اصحاب یمین کا تیسرا طبقہ ان لوگوں کا ہے جو خود اپنے ارادے یا قصد سے تو راہ سلوک اختیار نہیں کرتے لیکن ایک وقت ان پر ایسا آتا ہے کہ ان کی طبیعت میں ایک رجحان پیدا ہو جاتا ہے۔ جو ان کو خود بخود اس راہ پر ڈال دیتا ہے۔ مثلاً ایک شخص مسلمان ہے اور گو وہ اسلام کے تمام ارکان بجا لاتا ہے، لیکن اسلام سے آگے ''احسان'' کی جو منزل ہے اس شخص کی توجہ اس کی طرف بالکل نہیں جاتی اور مسلمان ہونے کے باوجود اور اسلام کے تمام ارکان ادا کرتے ہوئے اس کی طبیعت میں سختی رہتی ہے۔ اس دوران میں وہ ایک سخت حادثے سے دوچار ہوتا ہے۔ مثلاً وہ کسی مزمن مرض میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس مرض کے دنوں میں رفتہ رفتہ یہ ہوتا ہے کہ اس شخص پر ملاء سافل کا ایک دروازہ کھل جاتا ہے یا خود اس کے اندر ''ملاء سافل کی یہ استعداد پیدا ہو جاتی ہے اور وہ بیماری کی حالت میں عجیب عجیب واقعات دیکھتا ہے، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص فقر و فاقہ ذلت و ناکامی یا اولاد و عزیز و اقارب کے صدمات کا نشانہ بنا گو شروع شروع میں وہ بہت رویا پیٹا اور بڑی آہ و زاری کی۔ لیکن جب اس نے یہ دیکھا کہ اس سے کچھ حاصل نہیں ہوتا تو سچے دل سے وہ اللہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس کی جناب میں اس نے بڑی عاجزی کی اور اس سے اس شخص کے دل میں دنیا والوں سے فی الجملہ نفرت پیدا ہو گئی۔

(د) اصحاب یمین کا چوتھا طبقہ ان لوگوں کا ہے کہ کسی فطری کمزوری کی وجہ سے ان کے لطائف سہ گانہ یعنی ان کے "لطیفۂ قلب"، "لطیفۂ عقل" اور "لطیفۂ طبع" میں آپس میں جیسی کہ ہم آہنگی اور مناسبت ہونی چاہیے نہیں ہوتی اور ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ان کا ایک لطیفہ تو ترقی کر کے اپنے کمال کو جا پہنچتا ہے درانحالیکہ ان کا دوسرا لطیفہ اپنے اسی اصلی حال ہی پر رہتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص میں ایک لطیفہ اپنے درجہ کمال میں ہے اور اس کے ساتھ اس شخص میں اس لطیفے کے بالکل خلاف بعض مذموم چیزیں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً ایک شخص میں تقویٰ و عفت تو موجود ہے لیکن اس کی عقل میں کوئی نقص ہے یا ایک آدمی ہے جسے خدا تعالیٰ سے محبت تو ہے، لیکن شہوانی اعمال اور ان کے متعلقات سے وہ باز نہیں رہ سکتا۔

"شارب خمر" کے متعلق جو حدیث مروی ہے اس میں اسی نفسی کیفیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "شارب خمر" کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں "الا تری انہ یحب اللہ و رسولہ" یعنی اس کے دل میں تو خدا اور رسول کی محبت موجود ہے لیکن اس کا نفس طبیعت کی کمزوری یا مزاج کی نادرستی کی وجہ سے افعال بد سے باز نہیں رہ سکتا۔

اصحاب یمین کے اسی طبقے میں بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ان میں ایک ہی لطیفے کی بیک وقت مناسب اور نامناسب صفتیں جمع ہو جاتی ہیں یا اس کو یوں کہہ لیجئے کہ ان کی عقل ایک چیز میں تو مؤثر ہوتی ہے لیکن دوسری چیز پر اس کا مطلق کوئی اثر نہیں پڑتا۔

مثلاً ایک شخص مومن ہے اور وہ ایمان کی تصدیق کرنے والا اور توبہ گزار بھی ہے لیکن ڈاڑھی کٹوانے اور مونچھیں بڑھانے میں اس ایمان کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا، اب اس کا سبب ایک تو یہ ہو سکتا ہے کہ وہ شروع ہی سے ڈاڑھی کٹوانے اور مونچھیں بڑھانے کا خوگر ہے۔ اور اس فعل کے متعلق اس تک ایسی وعید نہیں پہنچی جو اسے اس کے ارتکاب سے باز رکھ سکے۔ یا یہ ہو کہ اس کے دل میں ایسی وعید کے بارے میں کوئی شک و شبہ باقی رہا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کے نزدیک خدا کا کوئی مقبول بندہ ایسا گزر چکا ہو جو اس کے خیال میں ڈاڑھی کٹواتا اور مونچھیں بڑھاتا تھا، اور اس سے اس نے یہ سمجھ لیا ہو کہ یہ فعل اتنا برا نہیں۔ الغرض اس سلسلے میں یہ چند مثالیں درج کیجاتی ہیں۔ انہیں پر آپ دوسرے معاملات کو قیاس کر سکتے ہیں۔ قصہ مختصر۔ اصحاب یمین کی بہت سی قسمیں

ہیں یہ تمام کے تمام لوگ نفس کی کجی اور طبیعت کی نادرستی سے مامون ہو چکے ہوتے ہیں۔ اور ان میں ایک حد تک نجات پانے کی استعداد بھی موجود ہوتی ہے۔ ان اصحاب یمین میں سے ہر گروہ اپنی خاص نسبت رکھتا ہے۔ ان میں ہر نسبت کی ایک تو صورت وہ ہوتی ہے جیسے مکمل ترین صورت کہنا چاہیے اور اسی کی ایک دوسری ادنیٰ صورت بھی ہوتی ہے۔

اہل اللہ میں سے جو بزرگ کسی نسبت کاملہ کے مالک ہوتے ہیں ان کو اس نسبت کا قطب کہا جاتا ہے۔ اب اگر ہم یہاں ان قطبوں کے احوال وآثار بیان کرنے لگیں تو یہ ایک بڑی طویل بحث ہوگی۔ اس لئے فی الحال ہم اس طرف نہیں آتے۔ اہل اللہ کی ان نسبتوں کو بعض عارف قرآن مجید کی آیات کے ناموں پر معنون کرتے ہیں مثلاً جو آیت کسی نسبت پر دلالت کرتی ہے یہ عارف اس نسبت کو اس آیت کی طرف منسوب کر دیتے ہیں پھر اس نسبت کے قطب کو اس آیت سے موسوم کر دیا جاتا ہے۔ شیخ اکبر محی الدین بن عربی نے اپنی کتاب ''فتوحات'' میں یہی پیرایہ بیان اختیار کیا ہے لیکن یہ تسامح کی زبان ہے۔ یعنی انہوں نے بغرض سہولت ان امور کو بیان کرنے کے لئے یہ طریقہ پسند فرمایا ہے۔ کبھی کبھی ان نسبتوں میں سے ہر نسبت کو اس نبی سے بھی معنون کر دیا جاتا ہے جس کی ذات سے خاص اس نسبت کے احکام وآثار زیادہ ظاہر ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس نسبت کے قطب کو اس نبی کی طرف منسوب کر دیا جاتا ہے لیکن یاد رہے کہ یہ طرز بیان بھی از قبیل تسامح ہے۔ بہر حال ''ولكل وجهة هو موليها'' ہر شخص کی اپنی اپنی پسند اور ہر ایک کا کوئی نہ کوئی رخ ہوتا ہے۔

............☆☆☆............

کرامات وخوارق

فقیر کو بتایا گیا ہے کہ کرامات وخوارق جنہیں عام طور پر خلاف عادت امور سمجھا جاتا ہے، خود اپنی جگہ اور اپنی حدود میں بالکل مطابق عادت ہوتے ہیں۔ ان کرامات اور خوارق کے مطابق عادت ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ایک طے شدہ امر ہے کہ انسان کا نفس ناطقہ اپنی فطری خصوصیات کی وجہ سے ریاضتوں اور مجاہدوں کے بعد جب منازل سلوک طے کر کے اس مرتبے پر پہنچتا ہے جہاں کہ امور غیب اس کے سامنے منکشف ہو جاتے ہیں۔ تو اس حالت میں جو بھی وہ دعا کرتا ہے، قبول ہوتی ہے اس عالم نفس میں اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ دستور کی بالکل وہی نوعیت ہوتی ہے جس طرح ہم عالم آفاق میں اس کو برسر کار دیکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک شخص ہے جو تریاق کھاتا ہے۔ لامحالہ اس تریاق کا اثر ہوگا۔ اور اس سے زہر کا اثر زائل ہو جائیگا یا ایک شخص گوشت اور گھی کھاتا ہے یقینی طور پر یہ شخص مضبوط ہوگا۔ علیٰ ہذا القیاس اسی طرح کائنات کے دوسرے معاملات میں بھی اللہ کا قانون جاری وساری ہے۔

اب سوال یہ کہ اگر یہ کرامات اور خوارق مطابق عادت ہی ہوتے ہیں تو پھر ان کو کس بنا پر خوارق اور خلاف عادت کہا جاتا ہے؟ ان امور کو خوارق عادت کہنے کی وجہ یہ ہے کہ ہم عام طور پر چیزوں کو اپنے سامنے آئے دن جس طرح ہوتے دیکھتے رہتے ہیں یہ کرامات اور خوارق ہمارے ان مشاہدات سے جن کے ہم عادی ہو چکے ہوتے ہیں مختلف ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس بنا پر انہیں خوارق کہا جاتا ہے۔

اس سلسلے میں مجھے بتایا گیا ہے کہ یہ جو خوارق عادت واقعات رونما ہوتے ہیں ان میں سے ہر نوع کے لئے ایک نہ ایک ریاضت مقرر ہے۔ چنانچہ جب کوئی شخص ریاضت کرتا ہے تو اس

ریاضت کی نوع کے خرق عادت واقعات ظاہر ہونے لگتے ہیں۔

خوارق کی جو ریاضتیں ہیں، ان کا ایک حصہ تو وجدان کے ذریعے معلوم ہوسکتا ہے۔ اور ایک حصہ انسان، فراست کی مدد سے جان سکتا ہے۔ نیز اصحاب کرامت کو صحبت میں بیٹھے اور ان سے جو خوارق ظاہر ہوتے ہیں ان کے آثار و قرآئن میں غور و خوض کرنے سے بھی ان ریاضتوں کا بہت کچھ علم حاصل ہوسکتا ہے۔ ان خوارق میں سے ایک چیز مستقبل کے واقعات کا جاننا ہے، انسان مستقبل کے واقعات کو کئی طرح سے جان سکتا ہے، کبھی تو ہونے والے واقعات کو خواب میں اپنی آنکھوں کے سامنے متشکل دیکھ لیتا ہے۔ اور وہ اس کی تعبیر یا تاویل کر کے اصل حقیقت سے آگاہ ہوجاتا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدمی جاگ رہا ہے کہ یک بارگی کوئی واقعہ اس کے سامنے صورت پذیر ہوجاتا ہے۔ پھر فوراً ہی یہ صورت سامنے سے غائب بھی ہوجاتی ہے۔

کبھی یوں ہوتا ہے کہ وہ نیند اور بیداری کے درمیانی لحات میں آنے والے واقعہ کی شکل دیکھتا ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اس کی قوت متوہمہ ہونے والے حادثے کی ایک تصویر بنا لیتی ہے۔ اس وہمی تصویر کی نہ تو کوئی خاص شکل ہوتی ہے نہ کوئی مخصوص رنگ۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ جیسے کوئی شخص اپنے ذہن میں قوت متوہمہ کی مدد سے محبت یا نفرت کی ایک تصویر بنا لے علاوہ ازیں مستقبل کے واقعات کے جاننے کا ایک ذریعہ یہ بھی ہے کہ آدمی باہر سے ہاتف کی آواز سنتا ہے اور اس کی وجہ سے اسے آنے والے واقعات کی خبر ہوتی ہے۔

الغرض یہ اور اس قبیل کے دوسرے واقعات کے رونما ہونے کی صورت یہ ہوتی ہے کہ دنیا میں جو حادثہ رونما ہونے والا ہوتا ہے، وہ پہلے ملاء اعلیٰ میں متشکل ہوتا ہے، اور وہاں سے کبھی کبھی ملاء سافل کے فرشتے اس ہونے والے واقعے کا علم حاصل کر لیتے ہیں اب ایک شخص ہے، جس کا نفس ناطقہ کسی نہ کسی طریق سے اس عالم اور اس عالم کے بہیمی تقاضوں سے بلند ہو کر ایک موقع پر ملاء اعلیٰ کی طرف متوجہ ہوگیا اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک آئینے کا رخ پہلے زمین کی طرف ہو، پھر اسے پھیر کر اس کا رخ آسمان کی طرف کر دیا جائے۔ جب کوئی شخص اس طرح ملاء اعلیٰ کی طرف متوجہ ہوگیا تو اس کے نفس ناطقہ پر ہونے والے حادثے کا انکشاف ہوتا ہے۔ لیکن اس انکشاف کے لئے دو چیزیں لازمی ہیں۔

ایک یہ کہ اس خاص حادثے کے ساتھ اس شخص کی طبیعت کو اور حوادث سے زیادہ مناسبت نہ ہوگی، ممکن نہیں کہ اس کا علم اس شخص کو حاصل ہو سکے۔ کیونکہ قدرت کے کارخانے میں کسی چیز کو کسی سبب اور وجہ کے بغیر دوسری چیز پر ترجیح نہیں دی جاتی، کسی خاص حادثے سے ایک شخص کی طبعی مناسبت کے بھی کئی اسباب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس شخص کی طبیعت کو خود اس حادثے کا علم حاصل کرنے کا اشتیاق ہو۔ اب یہ اشتیاق خواہ مخفی ہو یا ظاہر اور برملا طور پر جیسے قدرتی طور پر ایک فاقہ زدہ شخص آسودہ گی و کشائش کا مشتاق ہوتا ہے۔ گو اس کے ذہن میں اس اشتیاق کی صورت بالفعل موجود نہ بھی ہو، دوسرے ایک شخص میں کسی حادثے سے طبعی مناسبت فرشتوں کی طرف سے بھی پیدا کی جاتی ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کسی کو مصیبت سے نجات دینا چاہتا ہے یا اس قبیل کی کوئی اور بات ہے جس کا تدبیر الٰہی تقاضا کر رہی ہے۔ اب یوں ہوتا ہے کہ فرشتے خواہ مخواہ ایک شخص کو یہ بات سمجھا دیتے ہیں اور اس طرح اس شخص کی طبیعت کو اس سے مناسبت پیدا ہو جاتی ہے۔

تیسرے یہ کہ ہونے والے حادثے میں کوئی ایسی خصوصیت ہے جس سے اس شخص کی طبیعت میں فطری مناسبت موجود ہے۔ مثال کے طور پر ایک شخص کو اس دنیا میں جو عمومی وکلی تدبیریں کام کر رہی ہیں ان سے مناسبت ہے۔ چنانچہ اس کو ان کا علم عطا ہوتا ہے، دوسرے کو جزوی واقعات وحوادث سے فطری لگاؤ ہے۔ چنانچہ وہ ان کو جان لیتا ہے اسی پر آپ اس قسم کے واقعات کو قیاس کر سکتے ہیں۔ کبھی مستقبل کے کسی واقعے کے انکشاف کی یہ صورت بھی ہوتی ہے کہ ہونے والے واقعے کے متعلق حظیرۃ القدس میں حتمی فیصلہ ہو چکا ہوتا ہے اور حظیرۃ القدس کے اس فیصلہ کا اثر تمام نفوس انسانی میں سرایت کر جاتا ہے بعینہٖ اسی طرح جیسے آفتاب کے طلوع ہوتے ہی اس کی شعاعیں ہر طرف پھیل جاتی ہیں۔ اب ایک شخص ہے جو بہیمیت کے تقاضوں سے آزاد ہو چکا ہے اور اس کی چشم بصیرت ہے تو لامحالہ اس شخص پر حظیرۃ القدس کے اس فیصلے کا انکشاف ہو جائیگا لیکن یہ صورتیں زیادہ تر بڑے بڑے واقعات ہی میں پیش آتی ہیں۔ اور اہل کشف کو ان بڑے واقعات ہی میں سے کسی نہ کسی واقعے کا علم کشف کے ذریعے ہوتا ہے۔

کسی خاص حادثے سے ایک شخص کی طبعی مناسبت کے کچھ اسباب تو یہ ہیں جن کا اوپر بیان ہوا۔ اس ضمن میں دوسری بات یہ ہے کہ کسی واقعے کا خاص صورت اور کیفیت میں رونما ہونا کچھ مخفی

اسباب کا بھی نتیجہ ہوتا ہے یہ مخفی اسباب بالکل اسی طرح کے ہوتے ہیں جس طرح کے اسباب کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔یعنی مستقبل کے کسی واقعے کا خاص صورت اور کیفیت میں منکشف ہونا یا تو اس شخص کی اپنی طبیعت کے تقاضے کا اثر ہوتا ہے یا ملائکہ کی طرف سے اس شخص کے دل میں اس واقعے کا یہ تقاضا ہوتا ہے کہ وہ اس شخص پر فطری طور پر منکشف ہو جائے۔علاوہ ازیں کسی خاص موقعے پر ایک شخص کا طبیعت کے بہیمی اثرات سے آزاد ہونا بھی ان مخفی اسباب میں داخل ہے۔

اس قسم کے خوارق کے اکتساب کا طریقہ یہ ہے کہ ایک شخص جب ''نسبت بے نشانی'' سے ایک حد تک بہرہ یاب ہو جاتا ہے، اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے آپ کو بہترین حالت میں بھی پاتا ہے یعنی نہ وہ بھوکا ہوتا ہے نہ حد سے زیادہ سیر۔نہ وہ فکر مند ہوتا ہے اور نہ اسے ادھر ادھر کی تشویش ہوتی ہے۔وہ پاک وصاف ہوتا ہے اور گناہوں کا رنگ اس کی طبیعت پر چڑھا نہیں ہوتا۔

الغرض یہ شخص اس حالت میں جب حظیرۃ القدس یا ملائکہ عظام کی طرف اپنی پوری ہمت سے توجہ کرتا ہے اور اس دوران میں اس کے دل میں کبھی کبھی ہونے والے واقعے کو معلوم کرنے کا خیال بھی گزرتا ہے تو دیر یا سویر اس شخص پر یہ واقعہ ضرور منکشف ہو جاتا ہے۔خوارق کے اسباب میں سے ایک سبب شخص اکبر میں ایک ہی قوت واحدہ کا جاری وساری ہونا ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ہمارے نزدیک یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ عالم علوی اور سفلی دونوں مل کر مثل ایک شخص کے ہیں۔اس شخص اکبر کے نفس کو ہم نفس کلیہ کہتے ہیں اور اس کے جسد یا جسم کو جو کہ عبارت ہے عرش اور پانی سے جسد کل کا نام دیا گیا ہے اب صورت یہ ہے کہ اس جسد کل کے تمام احوال واعراض میں صرف ایک تدبیر کام کر رہی ہے۔بعینہ اسی طرح جس طرح کہ نباتات وحیوانات میں نشوونما اور غذا کا ایک نظام ہے۔چنانچہ نباتات اور حیوانات کے کسی فرد میں جب اس کا ایک عضو حرکت کرتا ہے تو ضروری ہوتا ہے کہ اس سے اس کا دوسرا عضو بھی حرکت کرے۔

اب جب ''امر کن'' صادر ہوا اور تدبیر الٰہی کے سلسلے کی طرف پڑی تو اس تدبیر الٰہی کے بڑے بڑے امور بصفت فوارہ ملاء اعلیٰ اور ملاء سافل میں جوش زن ہوئے۔تو اس سے جمادات، نباتات، حیوانات اور خاص طور پر بنی نوع انسان میں، جو تدبیریں برسرکار ہیں ان میں

ایک طرح کی وحدت پیدا ہو گئی۔

اس ضمن میں یہ ہوتا ہے کہ ایک قوت تو اس عالم اسفل سے اوپر کی طرف کو جاتی ہے اور حظیرۃ القدس سے جا کر مل جاتی ہے اور وہاں ایک طرح کا تصرف کرتی ہے ایک قوت حظیرۃ القدس سے نیچے اس عالم اسفل میں نزول کرتی ہے اور اس عالم میں اور خاص طور پر افراد انسانی میں مؤثر ہوتی ہے۔ چنانچہ اس کی وجہ سے تمام نفوس اس کے اشارے پر چلنے کیلئے مجبو ہو جاتے ہیں۔

اس سلسلے میں تمہیں یہ گمان نہ گزرے کہ جس مقام کو ہم حظیرۃ القدس کہہ رہے ہیں شاید وہ بنی آدم سے کئی مسافت دور ہوگا۔ یا وہ اس دنیا سے کہیں بلندی پر یا کسی اور طرف واقع ہوگا۔ بات یہ نہیں ہے بلکہ دراصل حقیقت یہ ہے کہ حظیرۃ القدس اور بنی آدم میں اگر فرق و تفاوت ہے تو صرف مرتبہ و مکانیت کا ہے بعد مسافت کا نہیں۔ اور حظیرۃ القدس کی ہم سے وہی نسبت ہے جو روح کو جسم سے ہوتی ہے۔

چو جاں اندر تن و تن جاں ندیدہ

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اس زمین میں بسنے والے جب طلسمات اور اس قسم کی اور تدبیروں سے کام لیتے ہیں یا کسی نہ کسی طرح وہ اپنی ہمتوں کو حظیرۃ القدس تک پہنچا دیتے ہیں۔ مثلاً جب لوگ بارش کے لئے نماز استسقاء میں جمع ہوتے ہیں یا حج میں مقام عرفات میں رحمت کی دعا مانگتے ہیں۔ تو یقینی طور پر یہ چیزیں نظام عالم میں مؤثر ہوتی ہیں۔ اسی قبیل سے ہمت اور توجہ کا قائم کرنا بھی ہے۔ اس کی تفصیل یوں ہے کہ ایک شخص ہے، جو بڑا قوی العزم ہے اور اس کی جبلت میں تصرف کی قوت ودیعت کی گئی ہے، اس کے بعد اس نے محنت اور ریاضت کے ذریعے اس قوت تصرف سے اور بھی مناسبت پیدا کر لی ہے۔ اب یہ شخص ایک کام کی طرف متوجہ ہوتا ہے اس ضمن میں وہ جو عزم وارادہ کرتا ہے تو اس کا یہ عزم وارادہ حظیرۃ القدس تک جا پہنچتا ہے اور وہاں سے کسی نہ کسی طرح اپنی تاثیر ڈالتا ہے۔ چنانچہ حظیرۃ القدس کی یہ تاثیر اس شخص کی ہمت نیز اس شخص کے پیش نظر کام کے جیسے اسباب وحالات ہوتے ہیں ان کے مطابق عالم اسفل میں ظہور پذیر ہوتی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عالم اسفل کی قوتیں حظیرۃ القدس میں کیسے تصرف کرتی ہیں۔

ان قوتوں کے اس تصرف کی مثال یوں سمجھئے جیسا کہ خیال ہمارے اندر تصرف کرتا ہے۔ یعنی پہلے تو خیال قوائے مدرکہ کے ذریعے ہمارے اندر معرض وجود میں آتا ہے۔ پھر اس سے ہمارے اندر عزم وارادہ پیدا ہوتا ہے اور اس طرح خیال ہمیں متاثر کرتا ہے۔ یا عالم اسفل کی ان قوتوں کے تصرف کی مثال قوت منویہ کی سی ہے کہ وہ ہمارے دل اور حواس کو جنسی اعمال کی طرف مائل کر دیتی ہے۔ اور اس سے ہمارے شہوانی جذبات کو تسکین ہو جاتی ہے۔ حظیرۃ القدس میں عالم اسفل کے ان اثرات ہی کا نتیجہ ہے کہ ملائکہ، جن اور روحیں جو اپنے جسموں سے الگ ہو کر دوسرے عالم میں پہنچ چکی ہوتی ہیں، مختلف شکلوں میں انسانوں کیلئے ظہور پذیر ہوتی ہیں۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ملائکہ، جن اور یہ روحیں اس عالم میں ظہور پذیر ہونے کے لئے کوئی نہ کوئی شکل اختیار کرنے کی محتاج ہوتی ہیں چنانچہ یہ بڑی کوشش اور ہمت سے اپنے آپ کسی نہ کسی شکل میں صورت پذیر متصور کرتی ہیں۔ اور ان کا یہ تصور اس قوت کی وساطت سے، جو حظیرۃ القدس میں ودیعت کی گئی ہے، عالم مثال کے دروازوں سے ایک دروازہ کھول دیتا ہے، اور اس کی وجہ سے ان کے اس تصور میں بڑی برکت پیدا ہو جاتی ہے، بعد ازاں بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ملائکہ، جن اور یہ روحیں ایک خاص صورت میں رونما ہوتی ہیں۔

اس صورت کی ہیئت اور کیفیت تمام لوگوں کی حس مشترک کو متاثر کر دیتی ہے، اور اس طرح یہ لوگ اس صورت کا ادراک کرنے لگتے ہیں۔ الغرض ملائکہ، جن اور روحوں کی صورتیں انسانوں کے ادراکات میں اس طرح اپنا نقش بناتی ہیں جس طرح کہ ان کے دلوں میں فرشتوں کے الہامات، ہدایت وارشاد اور شیاطین کے وسوسے اور پریشان کن خیالات جاگزیں ہو جاتے ہیں۔ انسانوں کی حس مشترک میں ملائکہ، جن اور ان روحوں کی تشکل پذیری کی مثال ایسی ہے جیسے کہ ہم ایک جلتی ہوئی چنگاری کو گھمائیں تو ہمیں آگ کا ایک دائرہ نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کو ملائکہ، جن اور ان روحوں کی صورتوں میں سے کسی کا ادراک حد کمال میں صرف اسی وقت ہوتا ہے جب کہ وہ گرد و پیش کے علائق اور ان کے اثرات سے یکسر منقطع ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ہر شخص کے لئے ان صورتوں کے ادراک کی بھی ایک سی کیفیت نہیں ہوتی۔ بلکہ ہر شخص اپنی استعداد کے مطابق ہی ان صورتوں کو اپنے سامنے ظہور پذیر دیکھتا ہے، چنانچہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک ہی مجلس

میں بعض افراد ان صورتوں میں سے کسی صورت کو دیکھ رہے ہوتے ہیں، بعض ایسے ہوتے ہیں جن کو کچھ نظر نہیں آ رہا ہوتا، بعض اس صورت کو ایک رنگ میں دیکھتے ہیں۔ اور بعض کو دوسرے رنگ میں یہی صورت نظر آتی ہے۔

اس ضمن میں بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان چیزوں کی صورتیں، ہوا، پانی، آگ اور خاک، کے یہ چار عناصر ہیں۔ ان میں عنصر اول میں نقش ہو جاتی ہیں۔ اس عنصر اول کی خاصیت یہ ہے کہ وہ چاروں عناصر میں مشترک ہوتا ہے اور روحانیت میں اس کی تاثیر قوی تر ہوتی ہے۔ چنانچہ عنصر اول کی دوسرے عناصر کے ساتھ وہی نسبت ہوتی ہے، جو نسبت ان عناصر کی جمادات، نباتات، اور حیوانات کے عالموں سے ہے۔ خلا کا محال اور شیشے کے برتن کا خاص حالت میں ٹوٹ جانا، حقیقت میں عنصر اول ہی کی خصوصیت کا اثر ہوتا ہے۔ مشائین یعنی ارسطو کے پیروؤں نے اسی عنصر اول کو ہیولائے عنصری کا نام دیا ہے۔

الغرض ملائکہ، جن اور ان روحوں کی صورتیں جب اس عنصر میں منعکس ہوتی ہیں تو اس کے بعد یوں ہوتا ہے کہ نفوس مقدسہ میں سے ایک شخص جو مبدائے اول کے جوارح میں سے ایک جارحہ ہوتا ہے، یعنی تدبیر الٰہی جن ذریعوں سے اس کائنات میں تصرف کرتی ہے یہ شخص ان ذریعوں میں سے ایک ذریعہ بن جاتا ہے، یہ شخص پوری ہمت سے ملائکہ، جن اور ان روحوں میں سے کسی ایک کی طرف متوجہ ہوتا ہے، اور ان کی صورت کا تصور کرتا ہے اس شخص کی اس ہمت وتوجہ کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ تدبیر مثال اور حظیرۃ القدس سے بے نہایت قوتیں اس موقعہ پر نزول فرماتی ہیں۔ اور ان کی وجہ سے ایک صورت ظہور پذیر ہوتی ہے۔

لیکن یہ صورت عناصر کی تاثیر کا نتیجہ نہیں ہوتی، اس صورت کی ایک مثال تو وہ آگ ہے جو طور میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مشاہدہ کی تھی۔ اس کی دوسری مثال وہ واقعہ ہے جو صحیح مسلم میں حضرت جبرئیلؑ کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آنے کا مروی ہے۔ جس میں آپ سے حضرت جبرئیل علیہ السلام نے ایمان اور احسان کے متعلق سوالات کئے تھے۔ اس طرح کا واقعہ تو شاذونادر ہی کبھی ہوتا ہے۔ البتہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو طور پر آگ دیکھی تھی، اس قسم کے واقعات کثرت سے معرض وجود میں آتے رہے ہیں۔

خوارق وکرامات کے سلسلے میں یہ اساسی اموراور مقدمات ہیں۔جن کا کہ اوپر بیان ہوا۔ اس ضمن میں صوفیاء سے اس قسم کے جو واقعات رونما ہوتے ہیں کہ ان میں سے کسی نے عالم تدبیر وخلق میں کوئی تصرف کردیا یا اپنی توجہ سے کسی گنہگار کو توبہ کی طرف مائل کردیا، یا انہوں نے کسی کا دل مسخر کرلیا یا کسی شخص کے ذہن میں کسی ہونے والے واقعہ کا علم القاء کردیا یا اولیاء کی نسبتوں میں سے کوئی نسبت کسی شخص کے دل میں پیدا کردی یا بیمار کی بیماری دور کردی یا اس طرح کے کوئی اور چیز ان کی بدولت ظہور میں آ گئی۔ الغرض صوفیاء کے اس قسم کے واقعات خوارق کے ان اساسی اموراور مقدمات ہی کی شاخیں اور فروع ہوتے ہیں۔

خوارق اور کرامات کے اسباب میں سے ایک سبب برکت کا فیضان بھی ہے برکت کی حقیقت یہ ہے کہ ملاء اعلیٰ اور ملاء سافل اس شخص پر اپنی رحمت کی نظریں ڈالتے ہیں اور اس شخص کے حق میں دعائیں کرتے ہیں انکی نظر رحمت اور دعاؤں کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ملاء اعلیٰ اور ملاء سافل میں سے ایک قوت اس شخص سے جا کر متصل ہوجاتی ہے۔اس کا احاطہ کرلیتی ہے اور اس شخص کے وجود میں گھل مل جاتی ہے، ملاء اعلیٰ اور ملاء سافل کے اس فیضان کی وجہ سے اس شخص کے لئے طبعی اسباب میں ''بسط'' ہوتا ہے۔یعنی ان اسباب میں اس کے لئے خلاف معمول قوت واستعداد پیدا ہوجاتی ہے۔اس حالت میں اس شخص سے ایسے ایسے نفع مند کام اور آثار خیر ظاہر ہوتے ہیں کہ جن کی کہیں نظیر نہیں مل سکتی۔ملاء اعلیٰ اور ملاء سافل سے اس فیضان برکت کی مثال یہ ہے کہ عام طور پر دیکھنے میں آیا ہے کہ انسان کی طبیعت کا تقاضا یہ ہے کہ جب وہ کسی مرض کے دفع کرنے میں مشغول ہو یا وہ ندامت اور خوف میں مبتلا ہو یا اسے کسی بات پر غیرت آ گئی ہو تو اس حالت میں اسے بھوک کا بالکل احساس نہیں رہتا، اور جب تک اس کی یہ حالت رہتی ہے اس کے اجزائے بدن کی تحلیل کا فعل بھی رک جاتا ہے لیکن اس حالت میں بھوک کا یہ عدم احساس اجزاء بدن کا تحلیل نہ ہونا ایک خاص حد تک ہوتا ہے۔اب صورت یہ ہے کہ جب ملاء اعلیٰ اور ملاء سافل سے اس شخص پر برکت کا فیضان ہوتا ہے اور اس شخص میں اور اس برکت میں پوری ہم آہنگی ہوجاتی ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس شخص میں بھوک کے عدم احساس کی استعداد اور اجزائے بدن کی تحلیل نہ ہونے کی قوت پہلے سے بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ چنانچہ اس حالت میں وہ ایک عرصے تک بغیر

کھائے زندہ رہ سکتا ہے اور اس سے اس کے جسم میں کوئی ضرر نہیں پہنچتا۔ بعض دفعہ ملاء اعلیٰ اور ملاء سافل کی برکتوں کے نزول کے لئے اسمائے الٰہی میں سے صمد قدوس اور سبوح کا ذکر ایک ذریعہ بن جاتا ہے۔ اور کبھی کسی بزرگ کی توجہ بھی ایک شخص کو ان برکتوں کا حامل بنا دیتی ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ انسان جب حالت انبساط میں ہوتا ہے تو اس کی طبیعت میں قدرتی طور پر استعداد پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ پہلے سے زیادہ کام کر سکتا ہے۔ اور زیادہ عرصے تک بیدار رہ سکتا ہے، اس حالت میں انبساط میں زیادہ کام کرنے اور زیادہ دیر تک جاگنے کی وجہ سے اس کی صحت پر کوئی برا اثر نہیں پڑتا۔ لیکن اس کی بھی ایک حد ہوتی ہے یہی شخص جب انقباض کی حالت میں ہوتا ہے، تو اس میں پہلے کے مقابلے میں نصف اور تہائی قوت عمل نہیں رہتی، اگر وہ اس حالت میں اپنی طبیعت پر زبردستی کر کے زیادہ کام کرتا اور زیادہ عرصے تک جاگتا ہے تو اس کی صحت پر برا اثر پڑتا ہے۔

الغرض ایک شخص پر جب ملکی برکتوں کا فیضان ہوتا ہے اور اس شخص میں اور اس برکتوں میں کلی مطابقت اور پوری ہم آہنگ ہو جاتی ہے تو حالت انبساط سے کہیں زیادہ اس شخص میں زیادہ کام کرنے کی اور زیادہ عرصے تک جاگتے رہنے کی استعداد پیدا ہو جاتی ہے۔

علاوہ ازیں فطرت انسانی کا یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ انسانوں میں سے جو ذکی ہوتے ہیں، ان کا ذہن یا تو استدلال عقلی کے ذریعہ ایک چیز سے دوسری چیز کا ادراک کر لیتا ہے یا وہ چونکہ ایک چیز کے بعد لازماً دوسری چیز کو ہوتے دیکھتے آتے ہیں اس لئے وہ عادتاً ایک چیز سے دوسری چیز کو سمجھ لیتے ہیں۔ یا وہ ایک شخص کی ظاہری شکل وصورت سے اس کے باطنی اخلاق کا پتہ لگا لیتے ہیں۔ یا جو کچھ کسی شخص کے دل میں خیالات آتے ہیں وہ ان کا اندازہ اس شخص کے چہرے کی خاص ہیئت اس کی آنکھوں کی کیفیت اور اس طرح کے دوسرے آثار وقرآئن سے جان لیتے ہیں۔ لیکن ایک شخص خواہ کتنا بھی ذکی کیوں نہ ہو وہ ان چیزوں کو اس طرح کے آثار وقرآئن سے صرف ایک حد تک ہی معلوم کر سکتا ہے اب یہ ہوتا ہے کہ اس ذکی شخص پر جب ملاء اعلیٰ و ملاء سافل کی برکتوں کا نزول ہوتا ہے اور یہ برکات اس کے نفس کا احاطہ کر لیتی ہیں، تو ان کی وجہ سے اس شخص کی ذکاوت بہت بڑھ جاتی ہے چنانچہ اس حالت میں اس سے فراست وانتقال ذہن کے عجیب

عجیب واقعات ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ اور اسی کا نتیجہ ہوتا ہے کہ اس شخص میں "اشراف" اور "کشف" کی بعض استعدادیں پیدا ہو جاتی ہیں اور وہ ان کے ذریعے دوسروں کے دلی اسرار معلوم کر سکتا ہے۔

خوارق و کرامات کے ضمن فیضان برکات کی ایک اور شکل بھی ہوتی ہے اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ دنیا میں جتنے بھی انسان ہیں، اس میں سے ہر ایک کوئی نہ کوئی اعتقاد ضرور رکھتا ہے اب ہوتا یہ ہے کہ اس اعتقاد کی ہر شخص کے اندر ایک صورت مضمر ہوتی ہے، جب کبھی یہ شخص اپنے اس اعتقاد کی طرف متوجہ ہوتا ہے، تو یہ توجہ اس کے اعتقاد کو متشکل طور پر اس کے سامنے لا حاضر کرتی ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اعتقاد کی یہ شکل اس شخص کی قوت متخیّلہ کی طرف خود بڑھتی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس شخص کی قوت متخیلہ اعتقاد کی اس شکل کو طرح طرح کے اوضاع واقطاع اور رنگوں کا لباس پہنا دیتی ہے، جب کسی شخص میں اپنے اعتقاد کو اس طرح متشکل دیکھنے کی استعداد پیدا ہو جاتی ہے تو اس حالت میں اس شخص پر ملاء اعلیٰ اور ملاء سافل کی برکتوں کا نزول ہوتا ہے۔ اور ان کی وجہ سے عجیب عجیب تجلیات دیکھتا ہے اور خواب میں اسے رویائے صالحہ نظر آتے ہیں۔

خوارق و کرامات کے ضمن میں جو کچھ ہم بیان کر آئے ہیں اس ذیل میں یہ بھی ملحوظ رہے کہ تصوف کے ہر طریقے میں بعد میں ایسے لوگ پیدا ہوتے رہے ہیں جنہوں نے گرمی بازار کے لئے اور خود اپنی کرامات اور خوارق کے اظہار کی خاطر ہمت و توجہ کی تاثیر، دعوت اسماء اور اسی طرح کی عجیب عجیب چیزیں اپنی طرف منسوب کر لی ہیں۔ اس کے علاوہ بعض لوگوں نے جو زبردستی شیخ طریقت بن بیٹھے ہیں، ان چیزوں کے ساتھ ساتھ طلسمات، نیرنجات اور رمل و جفر وغیرہ کا بھی اپنی طرف سے اضافہ کر لیا ہے۔ بہر حال یہ جان لینا چاہیے کہ یہ اور اس طرح کی اور چیزیں ہمارے اس موضوع سے جو خوارق و کرامات کے متعلق ہے بالکل خارج ہیں۔

............☆☆☆............

بخت کا بیان

فقیر کو بتایا گیا ہے کہ دنیا میں جو حوادث رونما ہوتے ہیں ان کے منجملہ اور اسباب میں سے ایک سبب بخت بھی ہے۔ بعض لوگ جو بخت کا سرے سے انکار کرتے ہیں وہ دراصل بخت کی حقیقت نہیں جانتے ہوتے، نیز مجھے بتایا گیا ہے کہ بعض دفعہ اہل عرفان اور اصحاب ارشاد سے جو عجیب عجیب آثار و کرامات صادر ہوتے ہیں ان کا حقیقی سبب دراصل یہی بخت ہی ہوتا ہے۔ لیکن جو لوگ ظاہر بین ہوتے ہیں وہ اس بات کو نہیں سمجھ سکتے، وہ ان آثار کو اہل عرفان اور اصحاب ارشاد کی کرامات قرار دے لیتے ہیں، بے شک اس سلسلے میں کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ اہل عرفان اور اصحاب ارشاد کے یہ آثار نتیجہ ہوتے ہیں بخت کا۔ اور اس کے ساتھ ان بزرگوں کی خصوصی نسبت بھی مخلوط ہوتی ہے۔ اس حالت میں ان آثار کو ان اہل عرفان و اصحاب ارشاد کے خوارق اور کرامات کہنا، ایک حد جائز ہو سکتا ہے۔ اس سلسلے میں مجھے اس حقیقت سے بھی آگاہ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مقناطیس کی اصل فطرت میں یہ خاصیت رکھی ہے کہ وہ لوہے کے اجزا کو اپنی طرف کھینچتا ہے، اسی طرح کہربا گھاس کو اپنی طرف جذب کرتی ہے۔ اور پانی کی یہ فطرت ہے کہ وہ نشیب کی طرف بہے، یہ سب خاصیتیں ان چیزوں کے فطری تقاضے ہیں کہ ان میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا۔ لیکن اس ضمن میں بعض خارجی اسباب ایسے پیش آ جاتے ہیں کہ ان کی وجہ سے ان چیزوں کے یہ فطری تقاضے مختلف اثرات قبول کر لیتے ہیں۔

مثال کے طور پر مقناطیس کو لیجئے اس میں لوہے کو اپنی طرف کھینچنے کی فطری قوت تو موجود ہے لیکن فرض کیا جس لوہے کو وہ کھینچ رہا ہے، اس کا وزن بہت زیادہ ہے پھر وہ مقناطیس سے بھی دور پڑا ہوا ہے، ظاہر ہے لوہے کے وزن اور مقناطیس سے اس کے دور ہونے کا اثر مقناطیس کی قوت

جذب پر لازمی طور پر پڑے گا۔ یا مثلاً پانی کی یہ خاصیت ہے کہ وہ نشیب کی طرف بہتا ہے لیکن فرض کیا کہ وہ پانی کے بہاؤ کے خلاف ہوا چل رہی ہے، یا کوئی اور سبب ہے، جو پانی کی روانی کو روک رہا ہے، یقینی بات ہے کہ اس کا اثر پانی کی اس فطری استعداد پر پڑے گا۔ الغرض جب کبھی اس طرح کی کوئی صورت پیش آ جائے تو اس کو سمجھنے کیلئے ضروری ہے کہ ایک تو نظر اس چیز کی اصل فطرت کی طرف ہو کہ وہ کیا تقاضا کرتی ہے پھر ان خارجی اسباب کو دیکھنا چاہیے کہ وہ اس چیز کی اصل فطرت کے اظہار میں کس حد تک مانع ہیں۔

یہ جو کچھ ''عالم آفاق'' کی چیزوں کی خصوصیات کے متعلق بیان ہوا، بعینہ یہی کیفیت ''عالم انفس'' کی بھی ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ نے لوہے، گھاس کے اور پانی کے نفس ناطقہ میں بھی ایک نقطہ ودیعت کیا ہے۔ اور اس میں اس نے ایک قوت رکھی ہے، نفس ناطقہ کے اس نقطے اور اس کی قوت کا فطری تقاضا یہ ہے کہ وہ ودیعت دوسرے دلوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ اس نقطے کی وجہ سے اکثر اوقات لوگوں کے دلوں میں بذریعہ الہام یہ بات ڈال دی جاتی ہے کہ وہ اس نقطے والے کو آرام اور آسائش کے لئے کوشش کریں۔ مثلاً اس کے لئے کسی کے دل میں رحم پیدا کر دیا جاتا ہے۔ یا اس شخص کو کسی خزانے کی خبر دیدی جاتی ہے یا ایسا ہوتا ہے کہ وہ شخص اپنے راستے پر جا رہا ہوتا ہے اچانک اسے ٹھوکر لگتی ہے اور اس کا پاؤں کسی دفن شدہ مال پر پڑ جاتا ہے۔ اس ضمن میں بارہا یہ بات بھی مشاہدہ میں آئی ہے کہ ایک سعادت مند شخص ہے، اس کے نفس ناطقہ میں یہ نقطہ ہے جو چمکتے ہوئے ستارے کی طرح درخشاں ہے اور اس سے ہر جانب کو شعاعیں نکل رہی ہیں اب اسی نقطے کی ان شعاعوں کا اثر ایک موقع پر ہی شعاعیں ان آدمیوں پر بے اثر رہتی ہیں۔ نیز ان شعاعوں کا اثر بعض نفوس پر تو بڑی قوت اور شدت سے پڑتا ہے اور بعض پر ان کا اثر محبت و جذب کی راہ سے ہوتا ہے۔ الغرض اس شخص کے نفس ناطقہ کے نقطے کا اثر دوسروں پر خواہ قوت و شدت کے ذریعے ہو یا محبت و جذب کی راہ سے ہر دو حالت میں اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جس شخص پر یہ اثر پڑتا ہے اس کے دل میں یہ الہام ڈال دیا جاتا ہے کہ وہ اثر ڈالنے والے شخص کا معتقد اور محب بن جاتا ہے۔ وہ ہر طرح سے کوشش کرتا ہے کہ اس شخص کی کوئی خدمت بجا لائے، اثر ڈالنے والے شخص کو مقابلے میں اس اثر لینے والے کی حیثیت ایسی ہوتی ہے جیسے کہ سورج کی شعاع حرارت

پیدا کرنے کا واسطہ بنتی ہے۔

بعض دفعہ نفس ناطقہ کا یہ نقطہ اس کائنات میں جو غیبی تدابیر کام کر رہی ہے ان پر بھی اپنا اثر ڈالتا ہے، اور اس کی وجہ سے یہ غیبی تدابیر، نقطے والے شخص کی بہتری کے لئے کوشاں ہو جاتی ہیں۔ لیکن اس طرح کے امور اکثر کلی مصلحتوں ہی کے ذیل میں وقوع پذیر ہوتے ہیں۔

اب ایک شخص ہے، جو قوی الاثر سعادت والا ہے وہ اولیائے صالحین میں سے ہے اور اس نے ''نسبت سکینہ'' حاصل کر لی ہے یا وہ ''نسبت یادداشت'' سے بہرہ یاب ہے یہ شخص جب کسی مجلس میں جاتا ہے، تو مجلس کا ہر فرد بہ اعتقاد کمال اس کا مطیع و فرمانبردار ہو جاتا ہے، جب یہ شخص کوئی بات کرتا ہے تو اس کی بات لوگوں کے دلوں میں جو کچھ ان میں ہوتا ہے اس کے مطابق ہوتی ہے۔ دراصل یہ شخص اہل مجلس کے دلوں کے اسرار کو کشف و اشراف کے ذریعے معلوم کر لیتا ہے اور وہ انہیں اسرار کے متعلق گفتگو کرتا ہے بسا اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک شخص ہلاکت کے گڑھے پر کھڑا ہے، لیکن مصلحت کلیہ کا تقاضا یہ ہے کہ یہ شخص ہلاک نہ ہو، اس حالت میں اس کے سامنے قوی الاثر سعادت والے بزرگ کی صورت آ گئی اور وہ اس کی وجہ سے ہلاک ہونے سے بچ گیا، قدرتی طور پر یہ شخص اپنی نجات کو اس بزرگ کی اس صورت کی طرف منسوب کر دیتا ہے۔

اکثر اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص ہے جس میں آنے والے واقعات کا علم حاصل کرنے کی الہامی استعداد پہلے سے موجود ہے، اب اس شخص کو خواب میں اس قوی الاثر سعادت والے بزرگ کی صورت دکھائی دیتی ہے۔ چنانچہ وہ آنے والے واقعات کے متعلق تمام خوشخبریاں اور وعیدیں اسی بزرگ کی طرف منسوب کر دیتا ہے۔ حالانکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ حصول الہام کے جو بھی ذرائع ہیں اس شخص کو ان میں سے کسی نہ کسی ذریعے تک پہلے سے دسترس حاصل ہوتی ہے اور وہ مختلف اشکال اور صورتوں کے توسط سے الہام حاصل کرنے کی استعداد بھی رکھتا ہے۔

لیکن ہوتا یہ ہے کہ یا تو اس قوی الاثر سعادت والے بزرگ کا نقطۂ بخت زیادہ درخشاں اور روشن ہوتا ہے یا لوگ عام طور پر اس بزرگ کو پہلے سے جانتے ہوتے ہیں۔ اور انہیں اس بزرگ سے عقیدت ہوتی ہے یا اس قسم کی کرامات اس شخص کے متعلق بہت مشہور ہوتی ہیں یا اسی بزرگ کا نام ملاء اعلیٰ میں راسخ ہو چکا ہوتا ہے یا کوئی اور وجہ ہوتی ہے۔ الغرض یہ اسباب ہیں جن کی وجہ

سے یہ شخص باوجود خود اپنے اندر واقعات آئندہ کو الہام کے ذریعے معلوم کرنے کی استعداد رکھتے ہوئے کسی بزرگ کی وساطت سے ان واقعات کا علم حاصل کرتا ہے۔ اس ضمن میں اس بات کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ جب تک زمانے کی یہ دوڑ جاری ہے آنے والے واقعات کے متعلق ڈرانے اور خوشخبری دینے کا یہ سلسلہ برابر قائم رہے گا۔ اور اس ذیل میں خوارق و کرامات بھی ظاہر ہوتی رہیں گی۔ لیکن ان معاملات میں اب تک یہ ہوتا آیا ہے کہ جب تک مجوسیوں کا دور رہا ہے۔ انذار و بشارت اور خوارق و کرامات کو ستاروں کی طرف منسوب کر دیا جاتا ہے۔

لیکن حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد جب حنفیت کا زمانہ آیا تو ان چیزوں کو ارواح کاملہ کی طرف منسوب کیے جانے لگا۔ اس کے بعد ہر حنفی ملت میں ان حقائق کا عنوان مختلف بزرگوں کی روحیں بنتی چلی آئی ہیں یعنی ان روحوں کی طرف ان حقائق کے انکشاف کو منسوب کر دیا جاتا تھا، اگر یہ قوی الاثر سعادت والا شخص اولیائے صالحین میں نہیں بلکہ بادشاہ ہے یا امیر یا وزیر ہے تو اس کو امور سلطنت کے ضمن میں جو معرکے اور حادثے پیش آتے رہتے ہیں اس کے نفس ناطقہ کا یہ نقطۂ بخت ان میں کارفرما ہوتا ہے، اس کے لشکروں میں اس کے اہل و اقارب میں اور اس کے مال و جاہ میں نت نئی ترقیاں اور بے شمار برکات اس طور پر ظاہر ہوتی ہیں کہ لوگوں کو اس امر میں کوئی شک نہیں رہتا کہ دوسروں کے مقابلے میں اس شخص کو کوئی خاص امتیاز حاصل ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس قوی الاثر سعادت والے شخص کا نقطۂ بخت اتنا روشن نہیں ہوتا کہ بغیر کسی اور واسطے اور کسی اور کی تائید کے اس کی ذات سے یہ تاثیرات صادر ہو سکیں۔ یہ شخص بعض ان اسمائے الٰہیہ سے وابستہ ہو جاتا ہے جو بلند مرتبہ، برکت والے حروف سے مرکب ہیں۔ چنانچہ ان اسمائے الٰہیہ کی عالم مثال میں جو صورتیں ہیں یہ مثالی صورتیں کسی نہ کسی لحاظ سے اس شخص کے لئے نقطۂ بخت کا کام کرنے لگتی ہیں۔

یا ایسا ہوتا ہے کہ یہ شخص ریاضتیں کرتا ہے اور توجہات میں مشغول ہوتا یا طلسمات اور تعویذات سے مدد لیتا ہے اور اس طرح اس کے نقطۂ بخت کو ظلمت کے بعد روشنی اور غبار و کدورت کے بعد جلا نصیب ہوتی ہے، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ موت کے بعد اس شخص پر نقطۂ بخت کے حقائق میں سے ایک حقیقت ظاہر ہوتی ہے۔ اور کبھی جمادات میں سے کوئی چیز لوگوں میں اس شخص کی

رفعت شان کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ چنانچہ وہ تبرکات جو بعض لوگوں کو خواب میں عطا کیے جاتے ہیں وہ بھی اسی قبیل میں سے ہیں۔ الغرض یہ اور اس طرح کے اور بہت سے آثار ہیں جو بخت کے اس نقطۂ نورانی سے صادر ہوتے ہیں اور لوگ ان کو خوارق و کرامات سمجھتے ہیں اور ان کو اس شخص کے کمالات شمار کرتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت میں یہ سب محض اس کے نقطۂ بخت کے نتائج ہوتے ہیں۔ یا زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا ہے کہ بخت کے ساتھ اس شخص کی نسبت بھی ملی ہوئی ہوتی ہے۔

بعدازاں میں نے اس امر میں غور وخوض کیا کہ آخر یہ نقطۂ بخت ہے کیا؟ اس ضمن میں مجھے بتایا گیا ہے کہ جہاں تک اس نقطے کی اصل کا تعلق ہے اس کا قریبی سبب تو قوائے ملکی کا اثر ہے اور ان میں بھی خاص طور پر اس قوت کا جس کا منبع سورج ہے، نقطۂ بخت کے دور کا سبب وہ تاثیری نقطہ ہے جو مرکز جبروت میں واقع ہے۔ اب اگر میں ان امور کی شرح کرنے لگوں تو یہ بڑی طول طویل بحث ہو جائے گی۔ نقطۂ بخت اور جس شخص میں کہ یہ نقطۂ بخت روشن ہو، اس کا حال تو ہم نے بیان کر دیا۔ اسی ''صاحب بخت'' سے اس شخص کا بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے جس میں یہ بخت مفقود ہے۔

خداوند کریم جو حکیم مطلق ہے۔ اس کے ہاں نہ تو کسی کی بے جا رعایت ہوتی ہے اور نہ بلاوجہ کسی پر زیادتی روا رکھی جاتی ہے۔ ایک شخص اگر ''صاحب بخت'' ہے اور اس لحاظ سے وہ محبوب اور پسندیدہ ہے، تو ضروری ہے کہ اسے یہ الہام کیا جائے کہ وہ دنیا سے اعراض کرے، لوگوں کی صحبت سے متنفر ہو، اس سے خوارق و کرامات ظاہر ہوں۔ اور گوشہ نشینی سے اسے رغبت ہو، اس کے بعد یہ شخص اپنے آپ کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو وہ اپنے نفس ناطقہ میں کہ وہ ایک لطیفہ نورانی ہے، خلا سا محسوس کرتا ہے۔ اس خلا کی وجہ سے اس کے سامنے ایک ایسی راہ کھل جاتی ہے جو اسے ان علوم و معارف کی طرف لے جاتی ہے جو تشبیہات اور تمثیلات سے ماوراء سلبی اور تنزیہی حیثیت رکھتے ہیں، بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ نفس ناطقہ میں خلا محسوس کرنے کے طفیل یہ شخص باری تعالیٰ کے اسماء وصفات کو پیچھے چھوڑ کر اصل ذات کو اپنا مقصود بنا لیتا ہے۔ اس ضمن میں یہ بات بھی معلوم ہونی چاہیے کہ طلسمات اور تعویذات وغیرہ جن پر غیر انبیاء کا عمل ہوتا ہے اور وہ دعائیں اور اسمائے الٰہیہ جن کی تلقین انبیاء کرتے ہیں ان دونوں چیزوں میں بہت بڑا فرق ہے۔

غیر انبیاء کے طلسمات اور تعویذات کا سب سے پہلا مقصد ان قوتوں کو متأثر کرنا ہوتا ہے، جو اس عالم میں پھیلی ہوئی ہیں اور انبیاء کی تلقین کردہ دعاؤں اور ان کے بتائے ہوئے اسمائے الٰہیہ سے مقصود ملاءِ اعلیٰ کی توجہ کا حصول ہوتا ہے جو شخص انبیاء کی بتائی ہوئی ان دعاؤں اور اسمائے الٰہیہ کا ذکر کرتا ہے اس پر حظیرۃ ۸۱ القدس کی رحمت کا نزول ہوتا ہے تا کہ ملاءِ اعلیٰ کی یہ توجہ اور حظیرۃ القدس کی یہ رحمت اس شخص کیلئے ساز و مددگار ہو۔ باقی اللہ تعالیٰ ان امور کو بہتر جانتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا شکر و احسان ہے کہ ''ہمعات'' ختم ہوگئی اور اس کی ابتداء میں ہم نے جو شرط کی تھی کہ ان وجدانی علوم کے ساتھ منقولات اور معقولات کو خلط ملط نہیں ہونے دیا جائے گا وہ شرط پوری ہوئی۔ ''ہمعات'' ۱۱۴۸ھ جمادی الآخر میں اختتام کو پہنچی۔

و آخر دعواھم ان الحمد للہ رب العالمین

...........☆☆☆...........

سطعات

تصنیف

امام شاہ ولی اللہ محدثؒ

ترجمہ

مولانا سید محمد متین ہاشمی

ترتیب

مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱۔	سطعہ۔۱	۱۸۵
۲۔	سطعہ۔۲	۱۹۰
۳۔	سطعہ۔۳	۱۹۴
۴۔	سطعہ۔۴	۱۹۶
۵۔	سطعہ۔۵	۱۹۸
۶۔	سطعہ۔۶	۲۰۲
۷۔	سطعہ۔۷	۲۰۵
۸۔	سطعہ۔۸	۲۰۷
۹۔	سطعہ۔۹	۲۰۹
۱۰۔	سطعہ۔۱۰	۲۱۳
۱۱۔	سطعہ۔۱۱	۲۱۴
۱۲۔	سطعہ۔۱۲	۲۱۹
۱۳۔	سطعہ۔۱۳	۲۲۰
۱۴۔	سطعہ۔۱۴	۲۲۲
۱۵۔	سطعہ۔۱۵	۲۲۴
۱۶۔	سطعہ۔۱۶	۲۲۶
۱۷۔	سطعہ۔۱۷	۲۲۸
۱۸۔	سطعہ۔۱۸	۲۳۱
۱۹۔	سطعہ۔۱۹	۲۳۳
۲۰۔	سطعہ۔۲۰	۲۳۶
۲۱۔	سطعہ۔۲۱	۲۳۸

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۲۲۔	سطعہ۔۲۲	۲۴۰
۲۳۔	سطعہ۔۲۳	۲۴۲
۲۴۔	سطعہ۔۲۴	۲۴۳
۲۵۔	سطعہ۔۲۵	۲۴۵
۲۶۔	سطعہ۔۲۶	۲۴۸
۲۷۔	سطعہ۔۲۷	۲۵۱
۲۸۔	سطعہ۔۲۸	۲۵۶
۲۹۔	سطعہ۔۲۹	۲۵۸
۳۰۔	سطعہ۔۳۰	۲۵۹
۳۱۔	سطعہ۔۳۱	۲۶۲
۳۲۔	سطعہ۔۳۲	۲۶۵
۳۳۔	سطعہ۔۳۳	۲۶۸
۳۴۔	سطعہ۔۳۴	۲۷۰
۳۵۔	سطعہ۔۳۵	۲۷۲
۳۶۔	سطعہ۔۳۶	۲۷۴
۳۷۔	سطعہ۔۳۷	۲۷۶
۳۸۔	سطعہ۔۳۸	۲۷۹
۳۹۔	سطعہ۔۳۹	۲۸۲
۴۰۔	سطعہ۔۴۰	۲۸۵
۴۱۔	سطعہ۔۴۱	۲۸۷
۴۲۔	سطعہ۔۴۲	۲۸۹
۴۳۔	سطعہ۔۴۳	۲۹۲
۴۴۔	سطعہ۔۴۴	۲۹۵
۴۵۔	سطعہ۔۴۵	۲۹۷
۴۶۔	سطعہ۔۴۶	۳۰۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمام تعریفیں اس اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جو نعمتوں (۱) کا بخشنے والا ہے اور حکمتوں (۲) کا الہام کرنے والا ہے۔

اور درود وسلام ہو اس کے رسول ﷺ پر جو ان تمام لوگوں سے افضل ہیں جنہیں جوامع الکلم (۳) عطا کیے گئے ہیں۔

اور ان کے آل واصحاب پر جو ان کی امت کے بہترین افراد ہیں۔ ایسی امت جو تمام امتوں سے افضل (۴) واشرف ہے اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ یکہ وتنہا اور لاشریک ہے اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم۔

بعد حمد وثنا کے فقیر ولی اللہ عفی عنہ کہتا ہے کہ یہ چند باتیں ہیں جنھیں سطعات کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ ان میں ان حقائق کا بیان ہے جو مجرد محض اور عالم شہادت (۵) کے درمیان رابطہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے بعض خواص وآثار بھی ذکر کیے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہی سے مدد کی درخواست ہے اور اسی پر بھروسہ ہے۔

---

(۱) یہاں مراد علوم ومعارف کی نعمتیں ہیں۔ جن سے اللہ تعالیٰ نے عالم انسانیت کو نوازا ہے۔ اگر علوم ومعارف کی یہ نعمتیں ہمیں حاصل نہ ہوتیں تو ہماری روح پیاسی اور ہمارے قوائے فکریہ مختل رہتے۔ نہ ہم اپنی ذات کو پہچاننے کے اہل ہوتے اور نہ اپنے خالق کو۔ قرآن کریم در اصل ایسے ہی معارف کا گنجینہ ہے۔

(۲) انسانیت کا براہ راست تعلق ایک مرکز سے ہے جسے حظیرۃ القدس کہا جاتا ہے جب

تک انسانیت اس کائنات ارضی میں موجود رہے گی اس کی حفاظت کی ذمہ داری اسی حظیرۃ القدس پر ہے۔ جب کبھی کوئی ایسی مصیبت انسانیت پر نازل ہو جاتی ہے جس سے کائنات انسانی کے تباہ و برباد ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے تو اسی حظیرۃ القدس سے ایسی تدبیروں کا الہام کیا جاتا ہے جن کی مدد سے اس مصیبت کو رفع کیا جا سکے اور فکر انسانی کے گدلے چشمے کو صاف کیا جائے۔ حظیرۃ القدس کی یہ تدبیر انسانیت میں نبوتوں کے نزول کا باعث بنتی رہتی ہے۔ حظیرۃ القدس ہی کے الہام سے انسانیت میں "خیر" کی اشاعت کا انصرام ہوا کرتا ہے۔ اسی الہام کو حکمت کا نام دے سکتے ہیں۔ حکمت کی تعلیم کے چار درجے ہیں۔ (۱) اس کا ابتدائی درجہ انسان کے انفرادی اخلاق سے تعلق رکھتا ہے۔ (۲) دوسرا درجہ تدبیر منزل سے (۳) تیسرا درجہ تدبیر مدن سے اور (۴) چوتھا درجہ عالمگیر قومیت (Universalism) سے چوتھا درجہ ارتقائے انسانیت کی آخری تحریک ہے۔ بعض انبیاء کی تعلیمات صرف درجۂ اول سے متعلق رہی ہیں بعض کی، دو درجوں سے بعض کی تعلیمات حکمت کے تینوں درجات کی جامع ہیں۔ لیکن ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات تمام درجات پر محتوی اور تمام درجات کی مکمل ہیں۔

(۳) کلمہ ایک معروف لفظ ہے۔ ایک لفظ با معنی کلمہ کو کہتے ہیں۔ کلمہ جامع اسے کہتے ہیں جو اگر چہ مختصر ہو لیکن اس میں حکمت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم طویل تقریریں نہیں فرمایا کرتے تھے اور نہ آپ ﷺ نے باقاعدہ حکمت و فلسفہ کا درس ہی دیا۔ آپ ﷺ نے کئی کئی ضخیم جلدوں پر مشتمل کتابیں تصنیف نہیں فرمائیں۔ لیکن ایسے جامع و مانع "دریا بہ کوزہ" کلمات ارشادات فرمادیئے جو حکمت کے تمام مدارج پر محتوی اور انسانیت کے ہر طبقہ کی رہنمائی کے لیے کافی ہیں۔ وہ کلمات انسان کے انفرادی اخلاق کو سنوارنے، خاندانوں کے اخلاق کی تعمیر اور قومی و بین الاقوامی نظام اقتدار کی تشکیل میں اہم کردار کر سکتے ہیں۔ ممکن تھا کہ آپ ﷺ کے عطا کردہ جوامع الکلم کسی ایسے شخص کے پاس ہوتے جس کی فکر اتنی رسا اور ذہن اس حد تک بالغ نہ ہوتا کہ اس کے رموز و اسرار کا صحیح ادراک کر سکتا اس لئے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ" **نضر الله امرا سمع منا شيئا فبلغه كما سمع فرب مبلغ اوعىٰ من سامع** (مشکوٰۃ) اللہ تعالیٰ اس شخص کو شاد و آباد رکھے، جس نے ہم سے کچھ سنا اور پھر اس بات کو اسی حالت میں دوسروں تک

پہنچایا۔ کیونکہ اکثر وہ لوگ جنھیں کوئی بات پہنچائی جائے سامع اول سے زیادہ قوت دراکہ کے حامل ہوا کرتے ہیں۔

اس حدیث میں ''شیئا'' سے مراد وہی جوامع الکلم ہیں جو نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم سے وقتا فوقتا صادر ہوتے رہے ہیں اور جو آج بھی امتداد زمانہ کے باوجود افراد واقوام کے انفرادی واجتماعی اخلاق کی تعمیر میں خشت اول کی حیثیت سے کام آ سکتے ہیں۔

(۴) اس میں اشارہ کنتم خیر امة اخرجت للناس الخ کی طرف ہے کسی قوم کا فعال طبقہ اس قوم کا بہترین حصہ ہوا کرتا ہے۔ یہی حصہ قومی ترقی کا کفیل ہوتا ہے اور اسے محفوظ رکھتا ہے۔ اس کا تخیل بلند، اخلاق دلنواز، کردار پاک اور اعمال شائستہ ہوتے ہیں۔ اسے دوسرے الفاظ میں قوم کا (Cream) کہا جا سکتا ہے کسی قوم کے لیے اس سے بہتر کوئی چیز نہیں ہوتی۔

جس قوم میں ایسے اخیار کی کثرت ہو وہ ''خیر امۃ'' کہلانے کی مستحق ہوا کرتی ہے۔ اور اسی قوم میں صلاحیت ہوتی ہے کہ دیگر اقوام کو محکم نظریات کی لڑی میں پروئے، ان کی سیادت کے فرائض انجام دے اور حکمت کی آخری منزل یعنی بین الاقوامیت کی طرف کاروان انسانیت کی رہبری کرے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بہترین امت تھے۔ ان کا کردار پاکیزہ اور ان کے افکار عالی تھے۔ وہ آغوش نبوت کے تربیت یافتہ اور سیرت نبویہ ﷺ کے جملہ محاسن کے حامل تھے۔ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن (Mission) کو آگے بڑھانے والے اور آپ ﷺ کی امانت کو بلا کم وکاست امت تک منتقل کرنے والے تھے۔ یہ ان ہی کی محنتوں کا ثمرہ ہے کہ آج تک اس امت کے پاس قرآن حکیم اور سنت مطہرہ بلا کسی غل وغش کے موجود ہے۔ اور آج بھی امت مسلمہ اس بات کی اہلیت رکھتی ہے کہ انسانیت کے گم کردہ راہ قافلہ کے لیے منارۂ نور بن سکے۔

(۵) عالم دو قسم کے ہیں (۱) ایک وہ عالم جو ''مجرد عن المادہ'' ہے۔ اسے مجردات کہتے ہیں۔ (۲) دوسرا عالم وہ ہے جو مادی ہے۔ اسے عالم شہادت کہتے ہیں۔ جو چیز مادہ سے پاک ہونے کے باوجود مادی عالم کا جز بن جائے اور یہاں تک اس میں دخیل ہو جائے کہ عالم مادیات کے تمام تر طاقتوں کا مرکز بن جائے اسے طلسم الٰہی کہتے ہیں۔ اصولا مجردات کا ماننے والا ہی خدا کو مان سکتا ہے۔ اس لیے خدا کی سب سے بڑی صفت اس کا غیر متغیر ہونا یعنی الآن

کما کان (ابھی بھی ویسا ہی ہے جیسا کہ پہلے تھا) ہوتا ہے۔ حالانکہ مادہ ہر آن متغیر ہے۔ لہٰذا اگر خدا کو ماننا ہوگا تو اسے مادہ سے علیحدہ ہی ماننا پڑے گا۔ اس کے باوجود وہ عالم مادیات میں متصرف حقیقی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس کا تصرف بواسطہ مجردات ہوا کرتا ہے۔ اس طرح ایک ایسی ''حقیقۃ الحقائق '' کو تسلیم کرنا پڑے گا جو مجردات و مادیات دونوں پر حاوی اور دونوں میں متصرف ہے۔

☆☆☆

سطعہ ا

گفتگو کی حقیقت یہ ہے کہ وجود (ا) بمعنی حقیقی نہ بمعنی اعتباری تین مراتب میں ہے۔ (ا) ذات بحت و مرتبہ عقل (۲) شخص اکبر (۳)۔ ذات بحت سے مرتبہ عقل کا صدور بطریق لزوم واقتضائے ذات ہے۔ جیسے چار کے عدد میں تصور زوجیت یا جیسے قرص آفتاب سے روشنی کا فیضان۔ اور شخص اکبر (۲) کا صدور ذات بحت سے اس شرط کے ساتھ ہے کہ پہلے مرتبہ عقل کا صدور ہوا۔ اور اس صدور کی مثال یہ ہے کہ ہم نے ایک انگوٹھی پر لفظ ''زید'' نقش (۳) کیا اور ابھی تک ہم نے نہ اس کا ٹھپہ موم پر لگایا ہے اور نہ مٹی پر۔ لیکن لفظ زید کی صورت حظی کا اجمالی طور پر وجود ہو گیا ہے۔ اور یہ وجود (صورت حظی) انگوٹھی کے ساتھ قائم ہے۔ یہ وجود معین ہے اس اعتبار سے کہ یہ (لفظ) زید کی صورت حظی ہے نہ کہ عمرو کی۔ اور دوسرے اعتبار سے غیر معین ہے کہ اگر اس کا ٹھپہ موم پر لگایا جائے تو وہ ہوگا اور اگر مٹی پر لگایا جائے تو یہ ہوگا۔

اس کے بعد ہم موم یا مٹی لائے اور ہم نے اس انگوٹھی کا نقش ان پر اتارا، وہ نقش معین فوراً ہی موم یا مٹی میں پیدا (۴) ہو جاتا ہے۔ وہ (نقش بر خاتم) کلی ہے۔ اور یہ (نقش بر موم یا گل) جزئی وہ مرتبہ عقل میں ہے اور یہ مرتبہ شہادی (مرتبہ شخص اکبر) میں۔

یہ نقش بر خاتم دو رخ (۵) رکھتا ہے۔ ایک رخ تو خاتم (عنایت اولی یا ذات بحت) سے تعلق رکھتا ہے۔ اور اس کا دوسرا رخ موم اور مٹی سے۔ جب یہ دونوں رخ باہم جمع ہو جائے تو شخص اکبر (۶) پیدا ہو گیا اور اس طرح ایک ہی وجود سے دو رخ ظاہر (۷) ہو گئے۔ اچھی طرح (۸) اس پر غور کرو۔

(ا) حضرت شاہؒ صاحب نے وجود کو تین درجوں میں تقسیم کیا ہے۔ (ا) ذات بحت یعنی اللہ

(۲) مرتبہ عقل یعنی صفات (۳) مرتبہ شخص اکبر یعنی کائنات

ذات بحت حقیقۃ الحقائق اور غیب الغیب ہے۔ عقل انسانی اس کے فہم وادراک سے یکسر قاصر ہے۔ ''اس راہ کی ابتدا بھی عجز و حیرت سے ہوتی ہے۔ اور انتہا بھی عجز و حیرت ہی ہے''

اے بروں از وہم وقال وقیل من
خاک برفرق من وتمثیل من

لیکن حکمائے اسلام نے مراتب وجود کو سمجھنے کے لیے چند تشبیہات واستعارات وضع کیے ہیں اگرچہ ان تشبیہات واستعارات کی گرفت میں وہ ذات نہیں آ سکتی ہے۔ اس لیے کہ '' لیس کمثلہ شیء'' (اس جیسی کوئی شے نہیں ہے) شاہ اسماعیل شہیدؒ نے اپنی کتاب ''عبقات'' کے عبقہ (نمبر ۱۷) میں خالق و مخلوقات کے باہمی تعلق کو ایک مثال سے واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ جو کسی حد تک شاہ ولی اللہؒ کے پیش کردہ مراتب وجود کی توضیح کہی جا سکتی ہے۔ تمثیل محولہ بالا کا خلاصہ یہ ہے کہ ''ہم ایک حکیم کا وجود فرض کریں جو جملہ علوم وفنون، اسرار و رموز، لطافت ونفاست اور ہمہ جہتی کمالات کا جامع ہے۔ وہ اپنے خیال میں ایک حکومت قائم کرتا ہے۔ ایسی حکومت جو ارض وسماء اور جملہ موجودات کو محیط ہے۔ اب اس عقلی عمل کے بعد حکیم اپنے خیال میں قائم کی ہوئی اس سلطنت کے تصور میں کچھ اس طرح منہمک ہو جاتا ہے کہ جو چیزیں اب تک اس کے تحت الشعور میں پوشیدہ تھیں، وہ اس اجمالی درجہ سے نکل کر اس کے تفصیلی شعور کے سامنے آ جاتی ہیں۔ یعنی بجائے معقول ہونے کے متخیل ہو گئی ہیں۔''

پہلا لحاظ عقلی تھا جو حکیم کے نفس سے پیدا ہوا اور دوسرا لحاظ خیالی تھا۔ یہ بھی اسی کے نفس سے پیدا ہوا۔ نفس حکیم میں جو چیز عقلی مقام پر تھی اسے حقائق ثابتہ یا اسمائے کونیہ کہتے ہیں، جو ذات الٰہی کے نام کے طور پر استعمال نہیں ہوتے۔ لیکن کمالات ذاتیہ کے عنوان ہوا کرتے ہیں۔ اسی کو عنایت اولیٰ کا درجہ اوّل، یا بالفاظ دیگر درجۂ صفات بھی کہتے ہیں۔ اس کا ذات سے براہ راست تعلق ہوتا ہے اسی لیے اسے ذات کے قائم مقام مان لیا جاتا ہے۔ یہ اپنے صدور کے اندر ذات کی پوری حکایت کرتا ہے۔ جیسے کہ ایک چھوٹا آئینہ جو انسان کا صرف منہ دکھاتا ہے۔ اگرچہ یہ آئینہ محدود ہے لیکن جتنی حکایت کرتا ہے صحیح کرتا ہے۔ ایسی کوئی صفت نہیں جو ذات بحت کی پوری پوری حکایت

کر سکے۔ اس کے کمالات لامتناہی ہیں اور کوئی ایک کمال جملہ کمالات لامتناہیہ کی حکایت نہیں کرسکتا۔ یہی مطلب ہے قرآن کریم کی اس آیت کا قل لو کان البحر مداداً لکلمٰت ربی لنفد البحر قبل ان تنفد کلمٰت ربی لو جئنا بمثلہٖ مددا (آپ کہہ دیجئے کہ اگر میرے رب کے کلمات کو تحریر کرنے کے لیے سمندروں کو بطور سیاہی کے استعمال کیا جائے تو سمندر ختم ہو جائیں گے لیکن میرے رب کے کلمات (یعنی صفات) ختم نہ ہوں گے۔ خواہ اس جیسے کتنے ہی سمندر اول الذکر سمندر میں کیوں نہ شامل کر دیے جائیں۔) (الکہف ۱۰۹)

حکیم کے دوسرے لحاظ خیالی کو عنایت اولیٰ کا مرتبہ خیال کیا جاسکتا ہے۔ اور یہی شخص اکبر ہے۔

عنایت اولیٰ جو ذات الٰہی میں ہے وجوبی شان رکھتی ہے۔ اور اس میں تمام اسمائے کونیہ منعکس ہو جاتے ہیں یعنی عقلیہ وتخیلیہ۔ مرتبہ عقل درجہ صفات میں محدود ہے اور مرتبہ تخیلیہ کے لیے جو فضا قائم ہے اس کا نام شخص اکبر ہے۔ یہ بھی ذات بحت کے لیے ویسا ہی لازم ہے جیسے مرتبہ عقل۔ اس مرتبہ میں تغیر نمایاں ہو جاتا ہے۔ متغیرات عنایت اولیٰ میں بشان وجوبی موجود ہیں۔ مرتبہ عقل میں بشان لزومی اور مرتبہ شخص اکبر میں بشان تبدیلی۔

مذکورہ بالا نقطۂ نظر کو مزید واضح کرنے کے لیے ایک مثال پر غور فرمائیں۔ یوں سمجھئے کہ انسانی بدن میں جو دماغی قوتیں ہیں یہ عنایت اولیٰ کا مرتبہ ہے۔ پھر بدن انسانی پر ایک جلد ہے جو دماغی قوتوں کی حفاظت کرتی ہے۔ اور دماغی قوتیں جلد پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ یہ جلد من وجہ مغائر بدن ہے۔ اور من وجہ بدن ہے۔ یہ مرتبہ عقل ہے۔ اس کے بعد انسانی لباس ہے جو جلد کی اسی طرح حفاظت کرتا ہے۔ جس طرح جلد دماغی قوتوں کی اور دماغی قوتوں کا کسی قدر اثر لباس پر پڑتا ہے۔ یہ مرتبہ شخص اکبر ہے۔ لباس کا وجود اس شرط سے مشروط ہے کہ جلد موجود ہو، اگر جلد موجود نہ ہو تو لباس بھی نہ ہوگا۔ اب اس حدیث پر غور فرمائیں: الکبریاء ردائی والعظمۃ ازاری۔

(۲) انسان کے دل میں جو ارادہ پیدا ہوتا ہے وہ ہاتھ پاؤں کے ذریعہ پورا ہوتا ہے۔ اسی طرح ذات بحت کا ارادہ مرتبہ عقل سے گزرتا ہے اور وہاں اپنی ایک مستقل شان پیدا کر لیتا ہے۔ جو لوگ عنایت اولیٰ کے مرتبہ سے واقف نہیں ہوتے وہ اس مستقل شان ہی کو خدا سمجھ لیتے ہیں کیونکہ مرتبہ عقلی عنایت اولیٰ سے الگ پایا ہی نہیں جاتا اس کی مثال یوں ہے کہ اگر ایک شخص کہتا

ہے ''میں نے زید سے روپیہ پایا'' اور دوسرا شخص کہے کہ ''میں نے زید کے ہاتھ سے روپیہ پایا''۔ دونوں میں زیادہ تفاوت نہیں ہے لیکن پھر بھی ایک لطیف سا فرق موجود ہے۔

ارادہ دل سے پیدا ہوتا ہے۔ جس کی تکمیل ہاتھ کے ذریعہ ہوتی ہے۔ اس کے لیے بھی ایک آلۂ کار ہوتا ہے جس سے وہ کام لیتا ہے۔ مثلاً ہم نے سوچا کہ پستول سے گولی چلائیں۔ اس ارادہ کو بروئے کار لانے کے لیے ضروری ہے کہ ہماری انگلی لبلبی پر کام کرے اور گولی چلائے۔

گولی چلانے کا ارادہ ہمارے دماغ (عنایت اولیٰ) کا کام ہے۔ انگلی بمنزلہ مرتبہ عقل ہے۔ لیکن قوائے ارادیہ (عنایت اولیٰ) بشرط وجود پستول کا کام کریں گے۔ پستول بمنزلہ شخص اکبر ہے۔ پس شخص اکبر ظہور کے لیے مرتبہ عقلی آلہ کا کام کرتا ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ مرتبہ عقلی مرتبہ شخص اکبر میں کیسے کام کرتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح کلی اپنے لیے ایک جزئی بنا لیتی ہے اسی طرح مرتبہ عقل جو ایک کلی ہے اپنے لیے ایک جزئی (شخص اکبر بنا لیتا ہے۔ اس سے یہ بات بھی ظاہر ہوئی ہے کہ مرتبہ عقلی سے بہت سارے شخص اکبر پیدا ہو سکتے ہیں۔

(۳) ''نقش بر خاتم'' کی حیثیت ایک کلی کی ہے جس چیز پر وہ نقش مرتسم کیا جائے گا وہ چیز اس نقش بر خاتم (کلی) کی ایک جزئی ہوگی اور اگر کسی دوسرے محل میں وہ نقش اتارا جائے تو وہ دوسری جزئی ہوگی۔ اور اس طرح تیسری اور چوتھی اور پانچویں جزئیات بنتی چلی جائیں گی۔

گویا اگر انگشتری کو ذات بحت مانا جائے تو اس پر جو نقش ہے وہ مرتبہ عقلی ہوگا۔ اس سے ثابت ہوا کہ مرتبہ عقلی (مرتبہ صفات) اسی طرح ازلی وابدی ہے جس طرح ذات بحت کیونکہ نقش کا قیام ودوام انگشتری کے قیام ودوام سے وابستہ ہو چکا ہے۔

(۴) عنایت اولیٰ کی تاثیر سے مرتبہ عقل ظاہر ہوا اور وہاں اس تاثیر نے اپنا مستقل مقام بنا لیا۔ اس طرح مرتبہ عقل میں عنایت اولیٰ کا ایک اجمالی مرکز قائم ہو گیا تا کہ اس کا انقطاع اصل (عنایت اولیٰ) سے لازم نہ آئے۔ اگر مرتبہ عقل کو مستقل بالذات کا مرتبہ مل جائے اور اس کا انقطاع عنایت اولیٰ سے عمل میں آجائے تو جوں ہی انقطاع ہوگا مرتبہ عقل کا وجود جاتا رہے گا۔ کیونکہ اس کا وجود عنایت اولیٰ ہی کی تاثیر سے ہے چنانچہ اس مرتبہ عقل کے استقلال کے لیے عنایت اولیٰ کی ایک اجمالی تاثیر مرتبہ عقل میں ماننی پڑے گی۔

(۵) مرتبہ عقل کا تعلق دورخا ہے۔ ایک رخ کا تعلق عنایت اولیٰ سے ہے جو عنایت اولیٰ کی مرکزیت کو اپنے اندر جذب کرتا ہے۔ اور دوسرے رخ کا تعلق شخص اکبر سے ہے جسے وہ پیدا کرتا اور سنبھالتا ہے۔ جب تک مرتبہ عقل کے دونوں رخ پورا پورا کام نہ کریں گے اس وقت تک پورے طور پر مرتبہ عقل وجود ہی میں نہیں آ سکتا ہے۔

(٦) اسی طرح شخص اکبر مرتبہ عقل کی تاثیر سے وجود میں آتا ہے۔ اگر اسے مستقبل بالذات فرض کرلیں تو وہ معدوم ہو جائے گا۔ اس عدم سے بچانے کے لیے ضروری ہے کہ اس میں عنایت اولیٰ کا ایک مرکز میں (جو مرتبہ عقل سے نازل ہو) تصور کیا جائے۔ گویا جب تک شخص اکبر عنایت اولیٰ کی کچھ خاصیت بواسطہ مرتبہ عقل جذب نہ کرے وہ نہ قائم ہوسکتا ہے اور نہ قائم رہ سکتا ہے۔ جو تاثیر مرتبہ عقل کے واسطے سے شخص اکبر میں آتی ہے اسے تجلی کہتے ہیں۔ شخص اکبر کا وجود اپنی ذات میں اس تجلی کا متقاضی ہے۔ پس ایجاب بطریق نزول شخص اکبر میں بھی آیا ہے۔

(۷) موم یا مٹی وجود منبسط کا ایک ٹکڑا ہے جو لحاظ اول سے ظاہر ہوا۔

اب صورت حال یوں واضح ہوئی کہ مرتبہ عقل کے اندرونی پہلو (جس کا تعلق ذات بحت سے ہے) اور اس کے بیرونی پہلو (جس کا تعلق شخص اکبر سے ہے) دونوں کی تاثیریں جب وجود منبسط (موم یا مٹی) میں جمع ہوگئیں تو شخص اکبر بالفعل موجود ہوگیا۔

(۸) حضرت شاہؒ صاحب نے اس سطعہ پر خصوصی غور کرنے کے لیے اس وجہ سے کہا ہے کہ یہ ساری کتاب کا خلاصہ ہے اور اس کے فہم پر دیگر سطعات کا فہم مبنی ہے۔

............☆☆☆............

سطعہ ۲

شخص اکبر شئے واحد ہے (حقیقی (۱) معنوں میں نہیں بلکہ اعتباری معنوں میں) کہ وحدتوں میں سے کسی ایک وحدت کے ساتھ متصف ہے لیکن جب ہم اس کا تجزیہ کرتے ہیں تو دو جز ظاہر ہوتے ہیں۔(۱) نفس کل (۲) نفس رحمانی، نفس کل دوسروں میں حلول کرنے والا اور تعیین کرنے والا ہوتا ہے۔اور نفس رحمانی اس نفس کل کا محل وموضوع ہے۔(جس پر صورت طاری ہوتی ہے)

جب ہم نے پانی کو اتنا جوش دیا کہ سارا پانی ہوا بن گیا تو اس کی صورت مائیہ (یعنی پانی والی شکل) معدوم ہوگئی اور صورت ہوائیہ (یعنی ہوا والی شکل) موجود ہوگئی اور دونوں (پانی وہوا) کا مذکورہ بالا انقلاب حال ایک ہی محل (۲) پر ظاہر ہوا، جو ان دونوں کا ہیولیٰ (مادہ) ہے اس ہیولیٰ (مادہ) کا کوئی نام (۳) نہیں تھا اور نہ اس کی کوئی خاصیت (۴) ولازمہ تھی۔اس کو پانی اس لیے کہتے ہیں کہ وہ پانی ہے (اور جب کھولا دیئے جانے کے بعد وہ ہوا بن گیا تو) اس کو ہوا کہنے لگے اس لیے کہ فی الحقیقت وہ ہوا بن چکا ہے۔

(۵) پانی جہاں کہیں بھی ہوگا اس میں برودت ورطوبت (ٹھنڈک اور طراوت) اور مزاحمت (۶) پائی جائے گی۔اور ہوا جہاں ہوگی اس کی تاثیر یعنی حرارت ورطوبت وعدم مزاحمت پائی جائے گی۔یہ نام اور یہ تاثیریں درحقیقت اس حال (صورت) کی وجہ سے ہیں نہ کہ محل (مادہ) کی وجہ سے، اگرچہ ہم سرسری نگاہ میں اس کی تمیز (۷) نہیں کرسکتے ہیں۔اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ حال معین (۸) کرنے والا اور قیام (۹) دینے والا ہے اور محل موضوع وہ مادہ ہے۔پھر ہم پانی اور ہوا کے درمیان ایک قدر مشترک کو نکال لیتے ہیں اور وہ ہے صورت جسمیہ (۱۰)۔

(اور اگر چشم تصور کے سامنے) حال ومحل کے تصور (۱۱) کو بڑھایا جائے تو لامحالہ وہ

دو چیزوں تک منتہی ہوگا۔اس (اول) کو ہم نفس کل کہیں گے۔اور اس (ثانی یعنی محل) کو نفس رحمانی۔

---

(۱) واحد حقیقی اسے کہتے ہیں، جس کی نظیر نہ ہو اور اس کے اجزاء نہ ہو سکیں۔اگر کوئی ایسی چیز ہے جو بظاہر تو واحد ہے۔لیکن اس کی نظیر بھی پائی جاسکتی ہو یا اس کے اجزاء بھی ہو سکتے ہوں تو اسے واحد اعتباری کہیں گے۔لیکن اسے واحد حقیقی نہیں کہا جائیگا۔شخص اکبر بھی ایسا ہی اعتباری واحد ہے یعنی اس کے اجزاء ہو سکتے ہیں۔شخص اکبر (۲) کے دو اجزا ہیں (۱) نفس کل جسے صورت کہہ سکتے ہیں۔(۲) نفس رحمانی جس سے مراد مادہ ہے۔

اول الذکر کی دو اہم ترین خصوصیات ہیں۔پہلی یہ کہ وہ کسی چیز میں حلول کر جاتی ہے یا بالفاظ دیگر وہ مادہ پر طاری ہو جاتی ہے اور دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ مادہ پر طاری ہو کر شی کو معین کر دیتی ہے کہ فلاں چیز ہے، فلاں چیز نہیں ہے مثلاً پھل ہے گھوڑا نہیں ہے۔یہ اسی وقت ممکن ہے کہ پھل کے مادہ پر پھل کی صورت طاری ہو جائے اور اس مادہ میں حلول کر جائے۔

ثانی الذکر یعنی نفس رحمانی یہ مادہ کا نام ہے جو نہ صورت سے الگ دیکھا جاسکتا ہے اور نہ صورت سے علیحدہ اس کی تعیین کی جاسکتی ہے۔بایں ہمہ ہم یہ جانتے ہیں کہ وہی صورت کا حامل ہے، صورت حال (حلول کرنے والی) اور مادہ محل (جس میں کوئی چیز حلول کرے) ہے۔

(۲) پانی کے ہوا بن جانے کے بعد جب صورت مائیہ معدوم ہوگئی اور اس کی جگہ **صورت** ہوائیہ نے لے لی تو ایک چیز نہایت واضح طور پر سامنے آئی کہ صورت مائیہ اور صورت ہوائیہ کے درمیان ایک چیز مشترک ہے اور وہ ہے "مادہ" جس پر آبی اور ہوائی دونوں صورتیں طاری ہوئیں اور وہ ان دونوں صورتوں کا محل یا حامل بنا۔

(۳) لیکن اس ہیولیٰ (مادہ) کا کوئی نام نہیں ہے۔نام تو صورت کا ہوا کرتا ہے اور جب نام بدلتا ہے تو صورت کا بدلتا ہے، نہ کہ مادہ کا۔

(۴) اسی طرح خواص و تاثیرات کی حامل بھی صورت ہی ہوا کرتی ہے نہ کہ مادہ۔

(۵) پانی یا ہوا کا نام اس صورت کو دیا جاتا ہے جو حال ہے نہ کہ اس مادہ کو جو محل ہے۔اسی طرح پانی کے خواص پانی کی طرف اسی وقت تک منسوب رہتے ہیں جب تک وہ مادہ صورت آبی

اختیار کیے ہوئے رہتا ہے۔ جوں ہی وہ صورت آبی چھوڑ کر صورت ہوائی اختیار کرتا ہے اس مادہ کا نام بھی بدل جاتا ہے اور خاصیت بھی۔

(٦) شاہ صاحبؒ نے لفظ "جواز بطش" استعمال کیا ہے اس کے معنی ہیں مزاحمت کے۔ پانی میں جب ہاتھ پھیرا جاتا ہے تو اس پھرتی سے نہیں پھرتا جس پھرتی سے ہوا میں ہلتا ہے۔ اس لیے کہ پانی مزاحمت کرتا ہے۔ مزاحمت تو ہوا بھی کرتی ہے لیکن وہ محل انسان ہو جانے کی وجہ سے اتنی خفیف ہوتی ہے کہ اسے محفل نفی میں رکھا گیا ہے۔

(٧) سرسری نگاہ میں حال و محل اور صورت ہیولیٰ کے مابین تمیز نہیں کی جا سکتی ہے۔ اس لیے کہ وہ الگ الگ نظر کے سامنے آ ہی نہیں سکتے۔ بایں ہمہ عقل کہتی ہے کہ صورت اور ہے اور ہیولیٰ اور، یہ دونوں جداگانہ چیزیں ہیں۔

(٨) مادے کے لیے بیک وقت دونوں صورتیں قبول کرنا ناممکن ہے۔ یعنی یہ کہ وہ ہوا بنے یا پانی بنے۔ لیکن آبی صورت نے اس کا پانی ہونا معین کر دیا اور ہوائی صورت نے اس کا ہوا ہونا معین کر دیا۔ لہٰذا جب مادہ پر صورت آبی طاری ہوگی تو اس پر اس صورت خاص کے احکام نافذ ہوں گے اور وہ اس صورت خاص کی تاثیرات کا حامل ہو جائے گا اور جب دوسری صورت طاری ہوگی تو دوسری صورت کے احکام وخواص اس میں پیدا ہو جائیں گے۔

(٩) صورت یا حال ہی مادہ کے لیے مقوم اور اس کے خواص کو قائم رکھنے والا ہے۔ اگر وہ نہ ہو تو سارے خواص گم ہو جائیں گے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ خواص کا قیام وقوام صورت ہی سے ہے۔

(١٠) آگے کے مباحث سے یہ بات ثابت ہو جائے گی کہ صورت جسمیہ محض پانی وہوا کے درمیان ہی مشترک نہیں ہے بلکہ اس کائنات کی تمام اشیاء کے درمیان قدر مشترک یہی صورت جسمیہ ہے۔

(١١) جس طرح پانی اور ہوا کے درمیان قدر مشترک کو صورت جسمیہ قرار دیا گیا ہے اسی طرح اس کائنات کی تمام اشیاء کے درمیان قدر مشترک یہی صورت جسمیہ رہے گی۔ مگر جوں جوں اشیاء کی تعداد بڑھتی جائے گی، توں توں صورت جسمیہ کا قد بڑھتا جائے گا۔ یہاں تک کہ سارے شخص اکبر کی ایک صورت جسمیہ تصور کرنی پڑے گی۔ اسی کو پانی اور ہوا کی صورت جسمیہ کا تصاعد

کہتے ہیں کہ چشم تصور کے سامنے اسے بڑھاتے بڑھاتے کل کائنات کی صورت جسمیہ کا تصور قائم کرلیا۔ اسی متصاعد صورت جسمیہ کو "نفس کل" کہتے ہیں۔ اسی طرح اگر پانی اور ہوا کا ہیولیٰ بڑھتے بڑھتے تمام کائنات کے مادہ محض کو اپنے اندر سمیٹ لے تو کل کائنات کے مادے یا ہیولیٰ کو "نفس رحمانی" کہیں گے۔

پس حال کی انتہا ----- نفس کل ہے اور

محل کی انتہا -------- نفس رحمانی ہے۔

گویا نفس کل شخص اکبر کی صورت ہے اور نفس رحمانی اس کا مادہ اصل میں نفس کل اور نفس رحمانی دو ہستیاں نہیں ہیں بلکہ ایک ہی چیز (شخص اکبر) کے دو پہلو ہیں۔ ایک اس کی صورت ہے اور دوسرا اس کا مادہ۔ اور مادہ ہی صورت کا حامل ہے اور صورت مادے پر طاری ہے۔

مذکورہ بالا صورت تو "صورت جسمیہ" کے "تصاعد" (بڑھنے چڑھنے) کی ہے، لیکن اگر بر سبیل تنازل (گھٹنے اور اترنے) غور کیا جائے تو کہا جائے گا کہ ہر شئی کو صورت نفس کلیہ ہی سے ملتی ہے۔ اور وہ نفس کلیہ ہی ہے جو ہر صورت کا مرجع ہے۔ یا بالفاظ دیگر یہ کہہ سکتے ہیں کہ شخص اکبر ہی تمام اشیاء کا مرجع ہے۔ کیونکہ شخص اکبر اور نفس کلیہ ایک ہی چیز ہے اور نفس رحمانی شخص اکبر ہی کا داخلی پہلو ہے۔ یہ دونوں لازم وملزوم ہیں۔ یہی ایک چیز ہے جسے "ظاہر الوجود" "الوجود المنبسط" نفس رحمانی اور "نفس کلیہ" کہا جاتا ہے۔ اسی کو "قائم الاسماء الالٰہیہ" کہا گیا ہے۔ یہی "اسمائے کونیہ" کا مظہر ہے۔ یہ ذات پر بھی ایک جہت سے صادق آ سکتا ہے۔ اسی کی معرفت میں ٹھوکر کھانے کی وجہ سے بعض عارفین مادہ کو خدا کہہ دیتے ہیں۔ حالانکہ ان کی مراد مادہ سے نفس رحمانی ہوا کرتا ہے۔ اور نفس رحمانی اور نفس کلیہ ایک چیز ہے۔

............☆☆☆............

سطعہ ۳

نفس کل متنازل ہوا (اور اس کی قسمیں بنیں) تو جنسیں بنیں پھر ان جنسوں کی نوعیں بنیں اور انواع سے فرد بنے۔

نفس کل کے تنازل کے بعد نفس رحمانی متنازل ہوا، اس لیے کہ ہر صورت کا ہیولیٰ ہے جو اس کے ساتھ خاص ہے اور اس واحد (۱) جامع (صورت اور مادہ کے جامع) کا نام ہم نے شخص اکبر رکھ دیا اور اس کے دونوں اجزاء کا نفس کل اور ہیولیٰ۔ تا کہ ہر ایک کے خواص اپنی اصل کی طرف منسوب کیے جائیں۔

جب ہم (شخص اکبر سے) آثار پیدا (۲) ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں تو اس حیثیت سے ہم شخص اکبر کو طبیعت کلی کہتے ہیں اور ہر (ظہور پذیر) نفس جزئی کو طبیعت جزئی ان نفوس جزئیہ میں سے جو جزئیات مجردات (۳) کے قریب ہیں وہ ارواح ہیں۔ جو مجردات سے بہت زیادہ دور ہیں، وہ عالم شہادت ہے اور جو (ابعد و اقرب کے) مابین ہیں ان کا نام مثال ہے۔

---

(۱) سابقہ تشریحات سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ صورت اور ہیولیٰ کے جامع کو شخص اکبر کہتے ہیں اور مذکورہ بالا دونوں چیزیں دراصل شخص اکبر (ذات واحد) کے دو پہلو ہیں۔ لیکن حضرت شاہ صاحبؒ یہ چاہتے ہیں کہ تعیین خواص کے وقت کسی قسم کا التباس یا ابہام نہ رہے۔ اس لیے دونوں پہلوؤں کے دو الگ الگ نام تجویز کر دیئے۔ کیونکہ اگر انتساب درست نہ ہوگا تو آگے چل کر تعیین خواص میں سخت دشواریاں پیش آئیں گی۔

(۲) شخص اکبر سے آثار پیدا ہوتے ہیں اس حیثیت سے اس کا نام طبیعت کلیہ ہے۔ اور

اس کے تقاضوں کو "مصلحت کلیہ" کہا جاتا ہے۔اس "کل اعظم" (شخص اکبر) کے نیچے جو مختلف اجناس مثلاً حیوانات، نباتات، جمادات وغیرہ ہیں۔ان میں سے ہر ایک کو جزئی کہا جاتا ہے۔ نفوس جزئی درحقیقت نفس کلی ہی کے عکوس ہیں۔فرق یہ کہ نفس کلی اپنے موطن میں ہے اور نفوس جزئیہ دوسرے موطن میں ملائکہ بھی اسی نفس کلی کی جزئیات ہیں۔گویا کہ مرتبہ عقل کی جزئی نفس کلی ہے اور نفس کلی کی جزئی کائنات ہے۔جس طرح نفس کلی کے تقاضوں کو مصلحت کلیہ کہا جاتا ہے اسی طرح نفس جزئی کے تقاضوں کو مصلحت جزئیہ کہا جاتا ہے۔

(۳) وہ جزئیات جو مجرد کے قریب ہیں، وہ مرتبہ عقل سے زیادہ مناسبت رکھتی ہیں اور اس کا پورا عکس لے سکتی ہیں، انہیں ارواح کہا جاتا ہے اور جو مرتبہ عقل کا عکس براہ راست نہیں لے سکتی ہیں۔انھیں عالم شہادت کہتے ہیں۔یہ عالم حسیات ہے یعنی اس کا ادراک حواس کے ذریعہ ہوسکتا ہے۔اور وہ جزئیات جو حواس سے ماوراء ہیں اور ان کا حواس سے نہیں بلکہ خیال سے ادراک ہوسکتا ہے، انھیں عالم مثال کہتے ہیں۔یہ عالم، عالم ارواح اور عالم شہادت کے درمیان ایک برزخ کی حیثیت رکھتا ہے۔جو دونوں سے واصل بھی ہے اور دونوں کے درمیان فاصل بھی۔

☆☆☆

سطعہ ۴

جب ہم گٹھلی کو زمین میں گاڑتے ہیں اور پانی اور ہوا گٹھلی میں داخل ہو جاتے ہیں تو ان کی وجہ سے گٹھلی میں ایک طاقت ظاہر ہوتی ہے جس سے وہ عناصر کے چھوٹے چھوٹے ذروں کو جذب کر سکتی ہے۔ اوران کو اپنی نوع کے مناسب شکل میں تبدیل کر لیتی ہے۔ اس کے بعد پتے پیدا ہوتے ہیں، شاخیں ظاہر ہوتی ہیں۔ اور اس طرح بڑھتے بڑھتے مکمل درخت کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اب اگر نگاہ عقل سے دیکھیں تو دو چیزیں شناخت ہوتی ہیں۔

(۱) ایک تو نفس (۱) شجری ہے کہ گٹھلی کے ذریعہ فائض ہوا۔

(۲) دوسری (درخت کی) وہ جسمانیت ہے جو (درخت) کی شکل، رنگ، رگ وریشے، مزہ، بو، گرمی، سردی، اوراس طرح کی چیزوں سے عبارت ہے۔ اور یہ دونوں عناصر کے چھوٹے چھوٹے ذرّات پر طاری ہوتے ہیں۔ ایک تو اس میں نفس ہے جو (ان ذرات میں) حلول کیے ہوئے ہے اور دوسرے (وہ جسمانی) عوارض ہیں جو ان کے ساتھ قائم ہیں۔ اسی طرح جب نر کی منی مادہ کے رحم میں قرار پاتی ہے اور حیض کا خون اس کی مدد کرتا ہے تو اس (نطفہ) کا حکم بھی گٹھلی (۲) کا حکم رکھتا ہے۔

جسمانیات تو بہر حال ظاہر ہیں جن سے ایک نوع دوسری نوع سے متمایز ہوتی ہے لیکن نفس کی ہستی کا ثبوت یہ ہے کہ فطرت سلیمہ جانتی ہے کہ اگر فرد کی جسمانیات ہزار بار بھی تبدیلی اختیار کریں اور متغیر ہوں تو وہ فرد وہی رہتا ہے جو پہلے تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ (فرد کی) فردیت کا تعلق جسمانیت سے نہیں ہے بلکہ کسی اور ہی چیز سے ہے۔

جب یہ تمہید ثابت ہوگئی تو جاننا چاہیے کہ ہر نفس اوران جسمانیات کے درمیان جو اس کے

مناسب حال ہیں اور جن سے یہ شناخت ہوتی ہے کہ فلاں نوع سے ہے فلاں نوع سے نہیں ہے، ایک خاص علاقہ ہے۔

اب غور طلب امر یہ ہے کہ یہ علاقہ کہاں سے آتا ہے؟ اس کی جستجو میں لگ جانا چاہیے۔

---

(۱) درخت کے اندر اجزائے ارضی کو لینے اور اوپر کو نشو ونما پانے کی طاقت ہے، وہ زمین سے غذا لے کر باہر نکلتا ہے تو کہیں ڈنٹھل پیدا کرتا ہے۔ کہیں پھل اور کہیں پھول جو قوت یہ کام کر رہی ہے اسے نفس شجری کہتے ہیں۔ یہ گویا ایک جسمانی روح ہے۔ یہ نفس کلیہ کی ایک جزئی ہے۔ مثلاً ہم نیم کا درخت بوتے ہیں تو وہ چالیس برس میں بڑا ہو جاتا ہے۔ اور ان چالیس برسوں میں اس میں ہزاروں تبدیلیاں آتی ہیں۔ بایں ہمہ ہم جانتے ہیں کہ یہ وہی درخت ہے جسے ہم نے بویا تھا اور جس کا پودا ایک دن زمین سے سر بلند ہوا تھا۔ اس تمام تبدیلی میں کوئی قدر مشترک نکلنا چاہیے جو اس نیم کے درخت کے چالیس سالہ دور ارتقاء میں اس کے وجود کی وحدت کی ذمہ دار ہو۔ ورنہ یہ درخت ایک فرضی چیز ہو جائے گا۔ اب ہم یہ بتلاتے ہیں کہ وہ قوت جو مذکورہ بالا چالیس سالہ دور ارتقاء میں یکساں طور پر کارفرما رہی ہے وہی ''نفس شجری'' ہے۔

(۲) جس طرح درخت میں ''نفس شجری'' کارفرما ہے جو درخت کے چالیس سالہ دور ارتقا میں اس کے وجود کی وحدت کا ذمہ قرار پایا ہے۔ اسی طرح انسان میں بھی ''نفس شجری'' کی طرح ایک حقیقت کارفرما ہے اور اسے ''نسمہ'' کہتے ہیں۔ یہ نسمہ حیوان میں بھی ہوتا ہے۔ لیکن حیوان میں صرف نسمہ ہی نسمہ ہوتا ہے اور انسان کے نسمہ میں روح ملکوتی ہوا کرتی ہے۔

............☆☆☆............

سطعہ ۵

اس علاقہ کی اصل اور اس تخصیص کا مقام عنایت (ا) اولیٰ میں ہے۔ ہاں ہر ایک صورت جوہریہ کا اس کے مناسب حال صورت عرضیہ کے ساتھ تعلق پیدا کرایا جاچکا ہے۔ اور ایک کو دوسرے کی آغوش میں دیا جاچکا ہے۔ ذات بحت نے مرتبہ عقل میں جواہر واعراض کے لیے جو اقتضا مقرر فرمایا اس کے مطابق ان کا باہمی تعلق واجب قرار دے دیا یہ تعلق کسی علت کے ساتھ معلول نہیں ہے۔ لہذا (اب یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ اس عالم میں فلاں چیز کی فلاں صورت یا خاصیت کیوں ہے) مثلاً اب یہ سوال نہیں کر سکتے ہیں کہ آگ کیوں گرم ہے اور پانی کیوں ٹھنڈا بلکہ کشف صریح اس بات کا اثبات کر رہا ہے کہ مجردات مفارقہ کو بعض اجسام وجسمانیات کے ساتھ (ایک قسم کی) خفیہ مناسبت ہے اور ایک جسم کسی خاص مجرد مفارقہ کا محل بن سکتا ہے۔ یہی خفیہ مناسبات ہر ایک فلک کی خاص حرکت اور صفت کا خاص سبب بنی ہیں۔ فلاسفہ ان مناسبات کے اثبات کے لیے مضطر ہیں خواہ اسے سمجھ سکیں یا نہ سمجھ سکیں۔ پھر جب فلک الافلاک پیدا ہو گیا تو انھوں نے اس میں قوت مثال رکھ دی تا کہ وہ قوت کلیات وجزئیات کے مابین واسطے کا کام دے۔ اب وہ قوت مثالیہ اس علاقہ کا محل بن گئی، جو عنایت اولیٰ میں تھی۔ اب ہم اس صورت عرضیہ کے صورت جوہریہ کے محل ہونے کی دو مثالوں سے ثابت کرتے ہیں۔

(ا) چونکہ آدمی عناصر اربعہ سے مرکب ہے۔ اس لیے اس کے اخلاط کو بھی چار قسموں پر منقسم کیا گیا ہے۔ صفرا، قوت ناریہ کا محل ہے اور بلغم قوت مائیہ کا اور اسی پر قیاس کر لیں۔

(۲) دوسری مثال یہ ہے کہ ہم اپنے ذہن میں چند اعداد شمار کرتے ہیں اور خارج میں ان اعداد کے مطابق موتی رکھے جاتے ہیں۔ یعنی ایک کے مقابلے میں ایک موتی اور دو کے مقابلے

میں دوسرا موتی اور تین کے مقابلے میں تیسرا موتی وعلیٰ ہذا القیاس۔

یہ صورت ذہنیہ جو معقولات ثانیہ ہے، اس نے چند خارجی اشیاء کو اپنا محل بنالیا اور ان کے ساتھ مناسبت پیدا کرلی۔

---

(۱) سطعہ ۴ میں حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا تھا کہ ہر نفس کلی اور اس کی مناسب حال جسمانیت کے مابین ایک خفیہ مناسبت ہے۔ سطعہ ۵ میں اسی مناسبت کی تفصیلات بیان فرمارہے ہیں۔ اس کا خلاصہ یہ ہے۔

ذات بحت نے مرتبہ عقل میں عنایت اولیٰ (ارادۂ ذات) کا سارا عکس پیدا کردیا۔ وہاں جواہر واعراض سب موجود ہیں اور ان کے مابین باہمی مناسبت بھی موجود ہے۔ اور یہ مناسبت وتلازم وہاں عنایت اولیٰ کے ایجاب سے مرتبہ عقل میں ثابت ہوا ہے۔ اور پھر شخص اکبر میں آیا اور اس کا ظہور عالم مادیت میں ہورہا ہے۔ پھر یہ امر کشف صریح سے ثابت ہے کہ عنایت اولیٰ میں مجردات مفارقہ کی مناسبت حال صورت عرضیہ سے مناسبت پیدا کرائی جاچکی ہے۔

مجردات مفارقہ کی یہی مناسبت ہے جس کے باعث ایک خالص مادی چیز خالص مجرد چیز کا محل اور آشیانہ بن جاتی ہے۔ مثلاً وادی فاران، وادی طویٰ یا اہل اللہ کی قبریں۔ لہٰذا بقول حضرت شاہ صاحبؒ یہ سوال کہ آگ کیوں گرم اور پانی کیوں ٹھنڈا ہے۔ کسی مادی علت کے ساتھ معلول ہے۔ اس لیے کہ یہ کام بہت پہلے عنایت اولیٰ میں ہوچکا ہے۔ اور آگ کے جوہر (مجرد) اور اس کے عرض کے درمیان نیز پانی کے جوہر (مجرد) اور اس کے اعراض کے درمیان عنایت اولیٰ ہی میں تلازم واقع ہوچکا ہے۔ لہٰذا آگ کی گرمی اور پانی کی ٹھنڈک کے اسباب کی اس عالم مادیات میں تلاش بے سود ہے۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ افلاک کی حرکات اور حرکات کی جہات کے اختلاف یا اس کی کیفیات کا سبب بھی عنایت اولیٰ میں متعین ہوچکا ہے۔ چونکہ فلاسفہ مجردات مفارقہ کی اجسام وجسمانیات کے ساتھ مناسبت کو تسلیم نہیں کرتے، اس لیے وہ سخت الجھن میں گرفتار ہیں۔ اس الجھن کا انھوں نے یہ حل تلاش کیا کہ فلک الافلاک میں ''قوت تمثیل'' مانی۔ جو اپنے تصرف سے (بقول ان کے) جسمانی کو عقلی اور عقلی کو جسمانی یا بالفاظ دیگر مجرد کو مادی یا مادی کو

مجرد بناتی ہے۔ وہ اس قوت تمثیل کو کلیات مجردہ اور جزئیات مادیہ کے درمیان واسطہ بناتے ہیں۔ اس لیے کہ مرتبہ عقل (ان کے نزدیک بھی) محل کلیات ہے اور مرتبہ جسم محل جزئیات بہر صورت خواہی نخواہی انھیں بھی مجردات وجسمانیات کے درمیان ایک علاقہ خفیہ تسلیم کرنا پڑا۔ اب جب ان سے یہ دریافت کیا گیا کہ کلیات وجزئیات کے درمیان یہ علاقہ کہاں سے آ گیا تو وہ حیران ومبہوت رہ گئے۔ کیونکہ اگر اس علاقہ کی بنیاد فلک الافلاک کی قوت تمثیل کو قرار دیا جائے تو پھر یہ سوال پیدا ہوگا کہ فلک الافلاک میں قوت تمثیل کہاں سے آئی؟ فلاسفہ کے پاس اس سوال کا جواب نہیں ہے۔ لیکن شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ مرتبۂ عقل کے بعد مرتبہ ہے عالم مثال کا فلک الافلاک میں جو قوت تمثیل ہے اس کا نام ''مثال'' ہے۔ یہ قوت تمثیل کلیات وجزئیات کے درمیان واسطہ بن جاتی ہے۔ کلیات کا محل مرتبہ عقل اور جزئیات کا محل مرتبہ جسم ہے۔ یہ قوت تمثیل دونوں کے مابین واسطہ ہے اور یہ قوت تمثیل دراصل محل یا آشیانہ ہے اس مناسبت خفیہ کا جو عنایت اولیٰ میں کلیات وجزئیات کے مابین پہلے ہی سے موجود ہے، اس طرح عنایت اولیٰ کا پہلا محل مرتبہ عقل بنا اور دوسرا بواسطہ مرتبہ عقل عالم مثال بنا۔ اس عمل کو عمل تناول کہتے ہیں۔ محل بننے کے لیے آئینہ کی طرح ہو بہو شکل بننا ضروری نہیں ہوتا بلکہ اوپر کی چیز کی تاثیر سے نیچے کے موطن میں چیز پیدا ہونی چاہیے۔ اوپر اور نیچے کی چیز کے درمیان صرف اثر وتاثیر کا علاقہ ہوا کرتا ہے جیسے جسم انسانی میں صفرا آتش کا محل ہے۔ حالانکہ صفرا ایسی چیز ہے کہ اگر آگ پر پڑے تو آگ بجھ جائے۔ لیکن جس طرح آگ کی تاثیر گرم ہے صفرا کی تاثیر بھی گرم ہے۔ یہی تاثیر دونوں کے درمیان علاقہ قرار پائی۔

حضرت شاہ صاحبؒ ایک دوسری نہایت دقیق مثال پیش فرما کر مذکورہ بالا مناسبات خفیہ کو ثابت کر رہے ہیں۔ مگر اس مثال پر غور کرنے سے پہلے حضرت شاہ صاحبؒ کی استعمال کردہ ایک منطقی اصطلاح کو ذہن میں مستحضر کر لینا ضروری ہے اور وہ ہے ''مقولات ثانیہ''۔

''مقولہ'' ایک جملہ ہے جس میں مبتدا اور خبر ہوتے ہیں۔ خبر کو مبتدا پر محمول یا مقول کہا جائے گا۔ جیسے زید بادشاہ ہے۔ اس جملہ میں زید مبتدا ہے جس پر بادشاہ ہونا محمول ہے۔ جو چیز ہمارے ذہن میں آتی ہے اگر اس کا مصداق جس پر وہ محمول یا مقول ہو سکتا ہے، خارج میں ہے۔ تو اس کی ذہنی شکل کو مقولات اولیہ میں سے شمار کیا جاتا ہے اس ذہنی شکل سے جس چیز کا استنباط کیا جائے گا اگر

اس کا مصداق مقولات اولیہ میں سے ہوگا تو اس دوسری چیز کو مقولات ثانیہ میں سے کہا جائے گا۔

مثلاً ہم نے دو آدمی دیکھے اور ہم نے کہا کہ یہ زوج (جوڑا) ہے یہ جوڑے کا لفظ مقولات اولیہ میں سے ہے، اس لیے کہ اس کا مصداق (دو آدمی) ذہن سے باہر پائے جا رہے ہیں۔ اس کے بعد ہم کہتے ہیں کہ زوج دو برابر حصوں میں تقسیم ہوتا ہے۔ اس کا ایسا مصداق ذہن سے باہر نہیں پایا جاتا ہے کیونکہ اس کا مصداق ''دو زوج'' ہے۔ پس زوج جو دو حصوں میں منقسم ہوا کرتا ہے، مقولات ثانیہ میں شمار ہوگا۔

اب شاہ صاحبؒ کی پیش کردہ دوسری مثال کو لیجیے۔

ہم نے اپنے ذہن میں عدد ایک کا تصور کیا اور اس کے مقابلے میں ایک موتی رکھا، عدد دو کے مقابلے میں دوسرا اور عدد تین کے مقابلے میں تیسرا موتی رکھا۔ ظاہر ہے کہ ذہن سے باہر عدد نہیں پایا جاتا بلکہ عدد کا معدود پایا جاتا ہے۔ اب وہ ایک دو یا تین کا عدد جو صرف ہمارے ذہن میں ہے، خارج میں نہیں ہے۔ مقولات ثانیہ بنا۔ اور اس نے ایک مناسبت اس موتی کے ساتھ قائم کر لی جو اس کے مقابلے میں ہم نے خارج میں رکھا تھا۔ وہ تینوں موتی موجود فی الذہن اعداد کے محل اور آشیانے بن گئے اور اس طرح مقولات اولیہ قرار پائے۔ یا یوں سمجھیے کہ ان اعداد مجردہ نے جو ہمارے ذہن میں بصورت مقولات ثانیہ موجود تھے، ان معدودات جسمیہ (یعنی تین موتیوں) سے ایک مناسبت پیدا کر لی اور ان کو اپنا نشیمن بنا لیا ہے۔ بعینہ یہی صورت ''مجردات مفارقہ'' اور اجسام و جسمانیات کے درمیان مناسبت پیدا کرنے کی ہوگی۔

............☆☆☆............

سطعہ ۶

قوت تخیل (۱) یا تمثیل اعظم اجسام (فلک الافلاک) سے جاری ہو کر تمام اجسام فلکی اور قوتِ ارادی رکھنے والے تمام نفوس ارضی پر اثر انداز ہو رہی ہے۔ لہذا آدمی اور حیوان سب کے سب قوت تخیل رکھتے ہیں کیونکہ یہاں معانی (۲) جسمانیت (۳) کا لباس اور اجسام وجسمانیات معانی کا رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔ ان معانی وصورتوں کے درمیان بہت سارے رابطے ہیں جن کی اصل عنایت اولیٰ میں ہے۔

لہٰذا پتھر کو دیکھ کر جو شکل ہمارے ذہن میں آتی ہے وہ اس شکل سے مختلف ہے جو درخت کو دیکھ کر ہمارے ذہن کے پردے پر ابھرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم اس چیز کو دیکھتے ہیں جسے ہم فراموش کئے ہوئے ہوتے ہیں تو اسے دیکھتے ہی ہم قطعیت کے ساتھ پہچان لیتے ہیں کہ یہ فلاں فراموش شدہ چیز ہے۔ نگاہ سے دور ہونے کی صورت میں جو چیز ہمارے خانۂ وہم میں ہوا کرتی ہے رویت کی صورت میں وہی چیز محسوس بن جاتی ہے۔ (گویا پہلے جو چیز معقول تھی بعد رویت محسوس بن گئی) معقول اور محسوس کے درمیان جو علاقہ (۴) ہے اس کی معرفت پر خوابوں کی تعبیر کا علم موقوف ہے۔ جو شخص ان علاقوں اور رابطوں کو جتنا زیادہ جاننے والا ہوگا، علم تعبیر رویاء میں زیادہ مہارت (۵) کا حامل ہوگا۔ اور کبھی افلاک کی صورت (۶) متخیلہ کسی ایسے مادے پر واقع ہوتی ہے جس میں مختلف اشکال اختیار کرنے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ جیسے ہوا یا فضائے کائنات پس اس مادہ پر افلاک کی قوت متخیلہ کی اثر اندازی کے سبب زمینی اسباب کے مادہ میں حرکت پیدا ہوتی ہے۔ اور افلاک کی مذکورہ بالا قوت متخیلہ کے مطابق ایک صورت کا عالم شہادہ میں ظہور ہوتا ہے۔ عناصر مادیہ پر افلاک کی قوت متخیلہ کے اثر انداز ہونے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو

وہ صورت جو ابھی بتلائی گئی یعنی بواسطہ ہوا یا فضائے کائنات، دوسری صورت یہ ہے کہ افلاک کی قوت متخیّلہ بلا واسطہ بعض جسمانیات پر اثر انداز ہو کر زمین پر نقش وصورت بنانے لگتی ہے۔ اور اگر ایسی صورت پیش آ جاتی ہے کہ زمینی عناصر واسباب افلاک کی قوت متخیّلہ بلا واسطہ بعض جسمانیات پر اثر انداز ہو کر زمین پر نقش وصورت بنانے لگتی ہے۔ اور اگر ایسی صورت پیش آ جاتی ہے کہ زمینی عناصر واسباب افلاک کی قوت متخیّلہ سے مطابقت نہ رکھتے ہوں تو وہ قوت متخیّلہ اسباب میں تصرف کر کے اور گھٹا بڑھا کر اپنے حسب حال صورت پیدا کر لیتی ہے۔

(مذکورہ بالا تفاصیل کے حوالے سے) اس قوت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو وہ قوت خیالیہ جو اجسام کی شکل اور رنگ وروپ بناتی ہے اور دوسری وہ قوت وہمیہ جو معانی جزئیہ سے مطابقت رکھتی ہے۔

اب یہ بات جان لینی چاہئے کہ سارے کا سارا شخص اکبر خواہ سب سے بڑے اجسام میں سے ہوں جسے فلسفیوں کی اصطلاح میں فلک الافلاک کہتے ہیں۔ خواہ دوسرے افلاک ہوں یا ملائکہ میں سے یا ملاء اعلیٰ یا ملاء سافل ہوں یا حیوانات کی تمام انواع ہوں۔ یہ سب کی سب قوت مثالیہ سے پر ہیں۔ گویا قوت مثالیہ سارے عالم کے اندر گھسی ہوئی ہے۔ عالم کی دو تہیں ہیں۔ ایک تہ نفس ہے اور دوسری تہ، جسمانیات اور ان دونوں تہوں کے درمیان قوت مثالیہ ہے۔

---

(۱) قوت مثالیہ کا مرکز فلک الافلاک ہے۔ یہ قوت ہر میدان تک پھیلی ہوئی ہے۔ یہ فلک الافلاک کے اوپر ملاء اعلیٰ میں بھی اسی طرح جاری وساری ہے جس طرح دیگر افلاک وجسمانیات میں۔ اس کی مثال قلب کی سی ہے جس کا کام خون کو حرکت دینا اور جسم کے تمام حصوں میں خون پہونچانا ہے۔ قلب جس طرح خون کو پاؤں تک پہنچاتا ہے، اسی طرح اپنے اوپر کے حصوں دماغ وغیرہ تک بھی پہنچا رہا ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ شخص اکبر کی کوئی چیز قوت مثالیہ سے خالی نہیں ہے۔

(۲) جن چیزوں کا احاطہ عقل کرتی ہے انہیں معانی کہا جاتا ہے۔

(۳) جن چیزوں کا احاطہ حس کرتی ہے انھیں جسمانیات کہا جاتا ہے۔

(۴) صورت اور معنی کے درمیان ایک خاص قسم کا ربط ہے ورنہ ایک آدمی کو دیکھ لینے کے

بعد جب ہم بھول جاتے ہیں تو دوبارہ اسے دیکھ کر ہم یہ نہیں کہتے کہ یہ فلاں شخص ہے جسے ہم نے دیکھا تھا۔معلوم ہوا کہ اس آدمی کی معنویت اور اس کی صورت میں ایک رابطہ ہے۔اسکا معنی ہمارے ذہن میں موجود تھا جب دوبارہ ہم نے اس کی صورت دیکھی تو اس خفیہ رابطہ بین الصورة والمعنى کی بنیاد پر ہم نے اسے پہچان لیا۔

حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ صورت (Precept) اور معنی (Concept) کے مابین یہ رابطہ عنایت اولیٰ سے آیا ہے۔اس لیے کہ اگر اس علاقہ ورابطہ کو عنایت اولیٰ کا فرع نہ مانا جائے تو یہ کسی قاعدے میں ضبط نہ ہوگا۔

(۵) عنایت اولیٰ سے صورت اور معانی میں جو تعلق آیا ہے۔جو شخص اسے جانتا ہوگا وہ خوابوں کی تعبیر صحیح بتلادے گا۔اس حقیقت کو یوں سمجھئے کہ ہر معنی کی ایک طبعی صورت عنایت اولیٰ میں مقرر ہے۔جس شخص کو اس علاقے کا علم ہوگا وہ (خواب میں ظاہر ہونے والی) اس صورت سے وہی خاص معنی حاصل کرے گا۔

(۶) یہاں حضرت شاہ صاحبؒ عنایت اولیٰ کی قوت تاثیر کی ایک صورت بتلا رہے ہیں۔

عنایت اولیٰ سے عکس عالم مثال میں آتا ہے اور عالم مثال کے اعلیٰ طبقہ سے نزول کر کے افلاک پر آتا ہے اور پھر وہاں سے اس صورت متخیّلہ کا نزول کسی ایسے مادہ پر ہوتا ہے جس میں اشکال مختلفہ کو اختیار کرنے کی صلاحیت ہے۔پھر ان کے واسطے سے اس صورت متخیّلہ کا نزول زمین پر ہوا کرتا ہے۔اور مادی اسباب کے ملنے سے ہو بہو وہی صورت پیدا ہو جاتی ہے جو افلاک کے متخیّلہ میں یا عنایت اولیٰ میں تھی۔

شاہ صاحبؒ کے بیان کردہ مذکورہ بالا قوت مثالیہ کی تاثیر کو تسلیم کر لینے کے بعد نظام کائنات میں ایک ضابطہ اور ایک ربط سمجھ میں آجاتا ہے۔اگر فعل وانفعال اور تاثیر وتاثر کی اس شکل کو تسلیم نہ کیا جائے تو نظم کائنات میں کوئی ربط ہی نہیں ملے گا۔اور فکر انسانی مختل ومفلوج ہو کر رہ جائے گی۔

...........☆☆☆............

سطعہ ۷

تمام عالم میں ایک جزء معین ہے جو تمام اجزائے عالم میں لطیف ترین، مجردات سے بہت زیادہ مشابہت رکھنے والا اور اس بات کی پوری صلاحیت رکھنے والا ہے کہ مجردات کا آئینہ بن سکے۔ یہی جز شخص اکبر کی قوت مثالیہ کے وہم وخیال کے درمیان جز احدیت الجمع (۱) ہے۔ کیونکہ تمام اجزاء عالم میں قوت مثالیہ اس بات کی پوری صلاحیت رکھتی ہے کہ ہر معنی وصورت کے لیے آئینہ بن سکے، شخص اکبر کی قوت مثالیہ عالم قدس سے سب سے زیادہ قریب ہے اور وہ جز جو وہم وخیال دونوں کے جمع ہونے کی جگہ ہے دونوں (وہم وخیال) کے ساتھ ایک نسبت رکھتا ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ یہ جز جو کہ مجرد محض کا آئینہ بنا ہے۔ اس صیقل شدہ جسم کے مانند ہے جو کسی صحرا میں پڑا ہوا ہے۔ لیکن اپنی خاص استعداد کی وجہ سے آفتاب کا آئینہ بننے کے قابل ہے۔ (اب رہا سوال یہ کہ) یہ جز کس خصوصیت کی بنا پر آفتاب حق کے لیے آئینہ بنا ہوا ہے (تو اس کا جواب یہ ہے کہ) اس کی خصوصیت کی وجہ عنایت اولیٰ میں ہے جہاں علت ودلیل کی گنجائش نہیں ہے (اب یوں سمجھو) کہ اس جز کی خاصیت کہ وہ آئینہ بنے اور حق تعالیٰ کا یہ اختصاص کہ (اس جز کو) آئینہ بنائے بالکل اسی طرح ہے جس طرح میں نے سابقہ صفحات میں بتلایا ہے۔ (کہ مجردات (۲) بعض اجزائے عالم کو اپنا نشیمن بنالیا کرتے ہیں)

---

(۱) احدیت الجمع۔ تمام مراکز کے مرکز کو کہتے ہیں۔ شخص اکبر میں عقل، وہم، خیال، اور حس کے متعدد مراکز ہیں۔ احدیت الجمع وہ ہے جو ان تمام مرکزوں کا مرکز ہے اور یہ احدیت الجمع شخص اکبر کی قوت مثالیہ ہے۔ اس قوت مثالیہ میں یہ صلاحیت ہے کہ حق تعالیٰ کی تجلیات کا نقطۂ

ارتکاز بنے اور حق نے اس کو اپنا آئینہ بنایا ہے۔ اس اعتبار سے قوت مثالیہ قابل اور حق فاعل ہے۔ رہی یہ بات کہ اس قوت مثالیہ ہی کو کیوں آئینہ بنایا گیا تو اس سلسلے میں محض اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ یہ معاملہ ''عنایت اولیٰ'' میں قرار پا چکا ہے۔ اور عنایت اولیٰ میں قرار پانے والے معاملات کے لیے نہ ہم کوئی دلیل بتلا سکتے ہیں اور نہ کسی سبب کا تعین کرنا ہمارے بس میں ہے۔

(۲) گزشتہ سطعات میں یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ مجردات اور مادیت کے درمیان ایک پوشیدہ رابطہ موجود ہے وہ رابطہ اس لئے پیدا ہوا کہ مجردات نے مادیات کو اپنا محل یا نشیمن بنا لیا جیسا کہ تین عددوں اور تین موتیوں کے بیان میں واضح کیا گیا ہے۔ جس طرح اس مقام پر مجردات نے مادیت کو محل بنا لیا تھا، اسی طرح حق تعالیٰ شخص اکبر کی قوت مثالیہ کو اپنا محل و مرکز بنا لیتا ہے۔

...........☆☆☆...........

سطعہ ۸

جس طرح آئینہ (۱) میں ظاہر ہونے والی صورت دو جہت رکھتی ہے، ایک اعتبار سے وہ آئینہ کا کمال ہے اور دوسرے اعتبار سے دیکھنے والے شخص کی صورت کو ظاہر کرنے والی ہے اور جس طرح انسان کی صورت ہمارے (۲) ذہن میں دو جہت رکھتی ہے ایک جہت سے وہ ہمارے نفس کا کمال ہے اور ہمارے اعراض نفسانیہ کے موجودات خارجیہ میں سے ہے اور دوسری جہت سے انسان کی صورت ہے اور انسان اس صورت کی وجہ سے موجود ذہنی ہو گیا۔ اور عدم مطلق (۳) سے نکل آیا۔ اسی طرح حق تعالیٰ کی صورت (۴) جو شخص اکبر کے اجزا میں سے لطیف ترین جز کے آئینے میں ظاہر ہوئی ہے دو جہتیں رکھتی ہے۔ ایک جہت کے اعتبار سے وہ شخص اکبر کا کمال ہے اور عالم میں داخل مانی جائے گی اور دوسری جہت کے اعتبار سے حق کا ظہور ہے اور اس کے وجودوں میں سے ایک وجود ہے۔

اور یہ طلسم (۵) الٰہی ہے جو رابطہ ہے مجرد و عالم شہادت کے درمیان کہ (اوّل الذکر) صورت کے اعتبار سے مجرد اور ظہور حق ہے اور مجردات محضہ میں سے ہے جہاں مادیت کا گزر نہیں ہے۔ اور آئینہ (نقطۂ لطیف شخص اکبر) کے اعتبار سے عالم میں داخل ہے اور عالم میں سب سے افضل بھی۔ لہٰذا وہ (طلسم الٰہی) مجرد اور عالم شہادت کے درمیان برزخ بن گیا مطلق تجلی الٰہی وہی ہے اور ہر دوسری دوسری تجلی اسی تجلی کی تجلی ہے۔

---

(۱) آئینہ میں کسی شخص کی صورت کا ظہور دو حیثیتوں کا حامل ہے۔ (۱) ایک حیثیت کے لحاظ سے وہ آئینہ کا کمال ہے کہ اس نے دیکھنے والے کی شکل کو اپنے اندر محفوظ کر لیا۔ یہ صورت جو آئینہ میں حاضر ہو رہی ہے۔ اب اس آئینہ کی ملک ہے اور اس کے عکس کو قبول کرنے کی استعداد کا اظہار

ہے۔(۲) دوسری حیثیت سے وہ اس شخص سے تعلق رکھنے والی ہے، جس کی وہ صورت ہے۔

(۲) ہمارا ذہن بھی آئینے کی مانند ہے۔ ہم نے کسی شخص کو دیکھا اور اس شخص کی صورت ہمارے ذہن کے پردے پر ابھری، اب دو جہتیں ظاہر ہوگئیں۔(۱) ایک جہت سے تو ہمارے ذہن کا کمال ہے کہ اس نے اس شخص کی صورت کو قبول کر لیا۔(۲) اور دوسری جہت سے وہ انسان کی صورت ہے جو ہمارے ذہن کا موجود ذہنی ہے۔

(۳) عدم مطلق۔ جو چیز نہ ذہن میں موجود ہو اور نہ خارج میں، اسے عدم مطلق کہتے ہیں۔ اگر کوئی شی موجود فی الذھن اور معدوم فی الخارج ہو تو اسے موجود ذہنی کہتے ہیں۔ یا اس کے برعکس کو موجود خارجی۔

(۴) حق تعالیٰ کی صورت تو نہیں ہے، تجلی ہوتی ہے۔ اس کی تجلی کا ظہور ہوا کرتا ہے اور اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ شخص اکبر کے اجزا میں لطیف ترین مرکزی نقطے کو حق اپنا آئینہ بناتا ہے۔ اور اس پر اپنی تجلیات کا ظہور کرتا ہے۔ تجلی اعظم کے ظہور کے ساتھ ساتھ اس کی دو جہتیں ظاہر ہو جاتی ہیں۔ ایک جہت سے تو شخص اکبر کے لطیف ترین مرکزی نقطے کا کمال ہے کہ وہ تجلی اعظم کے ظہور کا آئینہ بنا۔ اس نے حقیقۃ الحقائق کے جلوے کو اپنے اندر جذب کر لیا اور اس طرح وہ تجلی جو اس لطیف نقطے پر ظہور پذیر ہوئی، بواسطہ شخص اکبر عالم کا جز بنی۔ اور دوسری جہت سے وہ حق کا ظہور ہے۔ اس کا وجود مجرد اور آئینہ میں انسانی صورت یا ذہن میں انسانی شکل کی طرح ہے جیسا کہ سابقہ مثالوں میں بتلایا جا چکا ہے۔

(۵) صورت حق یعنی تجلی اعظم کا انعکاس شخص اکبر کے مرکزی لطیف ترین نقطہ پر ہوتا ہے۔ اور گزشتہ صفحات میں واضح کیا جا چکا ہے کہ مذکورہ بالا لطیف ترین نقطہ شخص اکبر کا حصہ ہے۔ اس اعتبار سے وہ عالم ہے جو تجلی اعظم کا اس پر انعکاس ہوا، تو وہ تجلی اعظم عالم میں داخل ہوگئی۔ وہ تجلی اس اعتبار سے تو مجرد محض ہے کہ حق کی تجلی ہے اور اس اعتبار سے جز عالم ہے کہ عالم میں داخل ہوگئی۔ مجرد و عالم شہادت کے درمیان تجلی اعظم کا یہی رابطہ طلسم الٰہی ہے اور برزخ ہے۔ مجرد و مادہ کے درمیان، یہی تجلی اعظم اصل تجلی ہے۔ سب تجلیاں اسی تجلی اعظم کی تجلیاں ہیں۔ یہ تجلی اعظم ازلی و ابدی ہے۔ شخص اکبر کا وہ مرکزی لطیف ترین نقطہ جو تجلی اعظم کے لیے آئینہ ہے، عرش اعظم ہے۔ یہ عالم مثال کی تمام قوتوں کا مرکز ہے۔

سطعہ ۹

حق تبارک وتعالیٰ قابض(۱) وباسط ہے۔ بعض اسباب کو قبض کر لیتا ہے اور نہایت حقیر وقلیل نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ اور بعض اسباب کو بسط کر دیتا ہے اور نہایت ہی عظیم وشاندار نتائج ظاہر ہوا کرتے ہیں۔ (مذکورہ بالا شخص اکبر کے آئینہ لطیف ترین میں) صورت کے ظہور میں بھی اللہ تعالیٰ نے بسط (۲) عظیم فرمایا اور اس صورت کو اس نے اپنے احکام کے اجرا کا بہانہ بنایا اور اپنے افعال کی تکمیل کے لیے اسے واسطہ بنایا ہے۔ اگر آئینہ میں ظاہر ہونے والی اس صورت کا کوئی نام رکھیں تو یہ غلط فہمی (۳) کا موجب ہوگا کیونکہ سامعین کا ذہن اس معنی کی طرف منتقل ہوتا ہے جو مقصود نہیں ہے۔ اس کے لیے مناسب ترین لفظ ظہور ثانی ہے۔

اور مجرد کے تعلق کو عالم شہادت سے ظاہر کرنے کے لیے سب سے زیادہ مناسبت رکھنے والی مثال نفس ناطقہ (۴) کی ہے جو اس روح کے ذریعہ جو قلب میں داخل ہے بدن سے تعلق قائم کرتا ہے۔ اور طلسم الٰہی کو سمجھنے کے لیے جس کا تعلق افعال کے صدور اور ان کے مجرد کی طرف منسوب ہونے سے ہے، انگلیوں میں حرکت ہونے کی قریب ترین نظیر ہے۔ ہم کہتے ہیں ''زید (۵) متحرک الاصابع ہے۔ (اس کی انگلیاں حرکت کر رہی ہیں) لازمی طور پر جب تک وہ کتابت کر رہا ہے، اس معنی میں کہ کاتب کی ذات اور وصف کتابت انگلیوں کی لازمی حرکت میں داخل ہیں۔

جب عارف ظہور الٰہی (تجلی) کو دیکھتا ہے اور دقت نظر سے اس کا مطالعہ کرتا ہے تو اس میں وہ مجرد محض ہی کو دیکھتا ہے۔ آئینہ (۶) اس کی نگاہ میں آتا ہی نہیں ہے۔ بلکہ آئینہ کا تصور بھی اس کے ذہن میں نہیں آتا۔ بالکل اسی طرح جیسے ہم اپنی صورت آئینہ میں دیکھتے ہیں۔ (آئینہ میں اپنی

صورت دیکھتے وقت) تو ہم آئینہ کی دید سے غافل رہتے ہیں۔ خدانخواستہ اگر ہماری توجہ آئینہ کی طرف منعطف ہو جائے تو اس وقت ہم علم سے جہل میں اور معرفت سے بے خبری میں جا پڑیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ حظیرۃ القدس میں جو ملکوت کی وسیع آبادی کے پہلو میں واقع ہے، آئینہ (شخص اکبر) کا کوئی تذکرہ ہی نہیں ہے لہذا اس لطیف تجلی کے بیان کے وقت حق کی ترجمانی کرنے والوں نے لفظ "تجلی الٰہی"، "ظہور ثانی" اور اسطرح کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اس نکتہ کو اچھی طرح پہچان لو اور دوبارہ اسے زبان پر مت لانا۔

---

(۱) قبض وبسط قدرت الٰہی اور اس کی تاثیر ایجابی کا ایک اہم مسئلہ ہے۔ مسبب الاسباب تو اللہ تعالیٰ ہے۔ اسباب کو اپنی مشیت کی تکمیل کے لیے حرکت دینا، اسی کا کام ہے۔ اگر وہ حقیر نتائج پیدا کرنا چاہتا ہے تو اسباب کی لگام کھینچ لیتا ہے اور حقیر نتائج ظاہر ہوتے ہیں اور اگر وہ عظیم نتائج چاہتا ہے تو کثیر اسباب اور اسباب کے درمیان مثمر ومفید توافق پیدا کر دیتا ہے جس کے نتیجے میں عظیم نتائج کا ظہور ہوا کرتا ہے۔

(۲) شخص اکبر کا وہ لطیف ترین نقطہ جو حق تعالیٰ کی تجلیات کا مرکز بنا ہے، بسط عظیم سے مالا مال ہے۔ اسی آئینہ میں حق تعالیٰ اپنی تجلی اعظم کا ظہور فرماتا ہے۔ حق تعالیٰ اپنی مشیت کے اکمال وتکمیل کے لیے اسی تجلی کو واسطہ بناتا ہے۔ اس تجلی میں جتنی تاثیریں ہیں سب حق تعالیٰ کی طرف سے آئی ہیں۔ حق تعالیٰ جو خود کرنا چاہتا تھا وہ سارے کا سارا منصب اس نے اس تجلی اعظم کی طرف منتقل (Delegate) کر دیا۔ جس طرح حق تعالیٰ نے شخص اکبر کی ایجاد کے لیے اس تجلی کو واسطہ بنایا تھا، ایسے ہی شخص اکبر کے ہر جز کی ایجاد کے لیے بھی اسی تجلی کو یا اس کی شعاعوں کو واسطہ بنا رہا ہے۔

(۳) چونکہ تجلی اعظم ذات الٰہی کی نیابت کر رہی ہے اس لیے اس کو اس اسٹیج میں تجلی کہنا یا یہ کہنا کہ حق نے شخص اکبر کے ایک لطیف ترین نقطہ کو اپنا آئینہ بنایا جس میں زبانی تجلی عکس انداز ہے، غلط فہمی پیدا کر دے گا۔ اور اس تجلی اعظم کے منصب کے خلاف فکر پیدا کر دے گا۔ اس لیے اب یہ کہا جائے گا کہ ذات الٰہی کا ایک مرتبہ ظہور تو اس کی ذات بحت ہے اور اس کا دوسرا ظہور اس

تجلی اعظم میں ہو رہا ہے۔ اس لیے اسے ظہور ثانی کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ اور ایسا کہنے سے اس ابہام کا اندیشہ نہیں رہے گا۔ جو نہ کہنے کی صورت میں پیدا ہو سکتا تھا۔ کیونکہ ابہام اسی کو کہتے ہیں کہ سامع کا ذہن اس معنی کی طرف منتقل ہو جو قائل کی مراد نہ ہو۔

(۴) نفس ناطقہ ایک مجرد چیز ہے لیکن روح کے واسطے سے وہ انسان کے بدن (شہادی) میں تاثیر پہنچا رہا ہے۔ بالکل اسی طرح تجلی اعظم قوت مثالیہ کے واسطے سے شخص اکبر پر اثر انداز ہو رہی ہے۔

(۵) اسی مضمون کو سمجھانے کے لیے حضرت شاہ صاحبؒ ایک دوسری مثال پیش کر رہے ہیں۔ منطق میں ایک قضیہ ضروریہ ہوا کرتا ہے۔ اس کی دو قسمیں ہیں (۱) قضیہ ضروریہ مطلقہ مثلاً الانسان حیوان (انسان حیوان ہے) ہر انسان کے لیے بلا کسی قید کے حیوان ہونا ضروری ہے۔ (۲) قضیہ ضروریہ مشروطیہ اسے مقید بھی کہتے ہیں۔ مثلاً زید متحرک الاصابع بالضرورۃ مادام کاتبا (زید لازمی طور پر متحرک الاصابع ہے جب تک وہ کتابت کر رہا ہے) زید کے متحرک الاصابع ہونے کے لیے کاتب ہونا ضروری ہوا۔ گویا فعل کتابت کے صدور کے لیے ضروری ہے کہ زید متحرک الاصابع ہو۔ یعنی زید جب تک فعل کتابت کرتا رہے گا متحرک الاصابع رہے گا۔ یہ قضیہ مشروطیہ ہے۔ تو وصف کتابت جو مجرد ہے، تحرک اصابع (جو شہادی ہے) میں دخیل ہے۔

مذکورہ بالا دونوں مثالوں سے صرف یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ ایک مجرد چیز مجرد رہتے ہوئے شہادی چیز میں اثر انگیزی یا تصرف کر سکتی ہے۔ جب یہ چیز واضح ہو گئی تو یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ تجلی اعظم جو (مجرد محض ہے) مجرد ہونے کے باوجود شخص اکبر کے نقطۂ لطیف (جسے تجلی اعظم اپنا آئینہ بناتی ہے) کے واسطے سے پورے شخص اکبر کے مادی و شہادی وجود میں موثر و متصرف ہوا کرتی ہے۔ اور شخص اکبر کے جملہ تغیرات و تصرفات کے پس پردہ وہی تجلی اعظم کار فرما ہے۔ اسی صورت میں مادی احکام کا انتساب اللہ تعالیٰ کی طرف درست ہو سکتا ہے۔ اگر اسی تجلی کو بیچ سے ہٹا دیا جائے تو پھر ان مادی افعال کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف درست نہیں ہوگی۔

اور یہ بھی واضح رہے کہ تجلی کے اٹھ جانے کے بعد افعال بھی ختم ہو جائیں گے۔ کائنات

مادی میں یہ سارے ظہور احوال تو اسی تجلی اعظم کے فیضان سے ہیں۔

یک چراغ ست دریں خانہ کہ از پر تو آں
ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

قران کریم کی آیت اللہ نور السمٰوٰت والارض الخ کا صحیح مطلب یہی ہے۔

(۶) اگر آئینہ دیکھنے والے کی صورت آئینہ میں نظر آئے اور آئینہ کا کچھ حصہ بچ رہے، جس میں سوائے آئینہ کے دیکھنے والے کی صورت نہ دکھائی دے تو اس وقت امتیاز ہو سکتا ہے کہ آئینہ کے اتنے حصہ پر صورت کا عکس ہے اور اتنا حصہ (آئینہ کا) خالی ہے لیکن اگر کوئی صورت پورے آئینے پر چھا جائے اور آئینہ کا کوئی حصہ خالی ہی نہ بچے، تو اس صورت میں دیکھنے والے کے لیے، آئینہ کے جرم اور منعکس صورت کے درمیان امتیاز کرنا سخت دشوار ہو جائے گا۔

بالکل یہی صورت حال اس وقت پیش آتی ہے جب کہ تجلی اعظم کا انعکاس شخص اکبر کے نقطۂ لطیف پر ہوتا ہے۔ یہ نقطۂ لطیف ایک آئینہ ہے۔ جس پر تجلی اعظم چھا جاتی ہے اور اس نقطۂ لطیف کا کوئی حصہ خالی نہیں بچتا۔ اسی صورت میں جب عارف اس نقطۂ لطیف پر طاری ہونے والی تجلی کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اسے تجلی ہی تجلی اور مجرد ہی مجرد نظر آتا ہے۔ آئینہ نظر نہیں آتا اور نہ کسی (آئینے کے وجود کا مشاہدہ کرنے والے) کو ادنیٰ ادراک ہی ہوتا ہے۔ عارف مجرد کی بوقلمونی میں کھو جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح کوئی شخص آئینہ میں اپنی صورت دیکھے اور یہ جاننا چاہے کہ اس کے چہرے پر کوئی داغ تو نہیں ہے ایسی صورت میں دیکھنے والے کی تمام تر توجہات کا مرکز وہ صورت ہوگی جس پر وہ داغ کو تلاش کر رہا ہے۔ جرم آئینہ کا نہیں ہوگا۔

عارف کی خیر اسی میں ہے کہ وہ تجلی اعظم کا مشاہدہ کرتا رہے اور آئینہ کے جرم کی تلاش کی کوشش نہ کرے کیونکہ جس لمحے اس کی نگاہ تجلی اعظم سے ہٹ کر جرم آئینہ (شخص اکبر کا وہ نقطۂ لطیف جو مرکز تجلی ہے) کی طرف متوجہ ہوگی وہ علم کی رفعتوں سے ہٹ کر جہل کی پستیوں میں اور معرفت کی بلندی سے گر کر بے خبری کے دلدل میں جا پھنسے گا یہی وجہ ہے کہ حظیرۃ القدس میں جو علم و معرفت کا معدن ہے اور جو ملکوت کے پڑوس میں ہے آئینہ کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے۔

............☆☆☆............

سطعہ ۱۰

جونہی ہم "کرہ" کا تصور(۱) کرتے ہیں (اس کے ساتھ ساتھ) "کرہ" کے مرکز کا تصور ہمارے ذہن میں آتا ہے اور جس وقت کرہ کو متحرک تصور کیا جائے ایک عظیم دائرے، اس کے قطر اور اس کے محور کا تصور لازمی ہوگا۔ اسی طرح جب ذات بحت نے مرتبہ عقل میں عالم (شخص اکبر) کے اظہار کا اقتضا کیا تو بطریق لزوم یہ اقتضا ایک ایسے جز کی طرف مفضی ہوا جس میں تجلی اعظم کو قبول کرنے کی صلاحیت تھی۔ پھر فاعل و قابل کی استعداد نے تجلی اعظم کے ظہور کو اس میں (قابل میں) واجب کر دیا۔

تجلی عظیم کی تحقیق میں یہی نکتہ اصل ہے لیکن حکیم کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں ہوتا ہے اس لیے تجلی اعظم کے ظہور پر بے شمار نتائج الٰہیات و امکانیات میں مترتب ہوئے جن کا ہم نے ذکر کیا ہے۔ ابھی تک تو ہم نے بیان کیا ہے کہ باعتبار علت مقتضیہ ذات بحت سے تجلی کیوں پیدا ہوئی اور وہ کیا اسباب تھے جنھوں نے اوپر سے تجلی کے ظہور کو ضروری بنا دیا۔ اب ہم تجلی اعظم کے ظہور پر مرتب ہونے والے نتائج کا جائزہ لیں گے۔ تا کہ پورے طور پر حقیقت ظاہر ہو سکے۔

---

(۱) جس طرح کرہ کے تصور کے ساتھ ساتھ خود بخود کرہ کے مرکز کا تصور ذہن میں آ جاتا ہے اور کرہ کی حرکت کے تصور کے ساتھ اس کے دائرے، قطر اور محور کا تصور لازمی طور پر ذہن میں آتا ہے۔ اسی طرح جب ذات بحت نے مرتبہ عقل کے واسطے سے شخص اکبر میں اظہار کا ارادہ فرمایا تو لازمی طور پر یہ اقتضا اور ارادہ شخص اکبر میں ایک ایسے جز کی طرف مائل ہوا، جس میں ذات بحت کی تجلی اعظم کو برداشت کرنے اور اس تجلی اعظم کے لیے آئینہ بننے کی پوری صلاحیت موجود تھی۔ اب ذات کی قوت تاثیر و فعل اور اس آئینہ کی صلاحیت قبول نے مل کر ذات بحت کی تجلی اعظم کے اس آئینہ میں ظہور کو واجب بنا دیا۔

سطعہ ۱۱

اس (مذکورہ بالا) تجلی کے واسطہ سے ذات الٰہی کے لیے ارادہٴ حادثہ(۱) ومتجد دہ ثابت ہوگیا۔ یہ وہ ارادہٴ الٰہی نہیں ہے جسے حکماعین ذات کہتے ہیں۔ اور نہ وہ ارادہ ہے جس کا متکلمین (بہ ہزار) تاویلات اثبات کرتے ہیں اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ روشنی (۲) آفتاب کے ساتھ لازم ہے اور دوام آفتاب کے ساتھ دائم ہے۔ لیکن روشنی کا ایک مخصوص اثر ایک مخصوص جسم میں کسی خاص ہی وقت میں ظاہر ہوتا ہے۔ دوسرے اوقات میں نہیں (اثر کا یہ ظہور) کسی عارض ہونے والی چیز کے سبب ہوا کرتا ہے۔ پس جس وقت نصف النہار نے پتھر کو گرم کردیا اور (اسی نصف النہار نے) برف کا پگھلا دیا تو اس روشنی کا عمل جو ہمیشہ آفتاب کے ساتھ رہتی ہے متجدد ہوگیا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ روشنی کا یہ تجدد زمین کی صلاحیتوں کی وجہ سے ظاہر ہوا ہے۔ اور اسی بات کی طرف اللہ تعالیٰ کے قول کل یوم ھو فی شان (وہ ہر روز ایک نئے شغل میں ہے) میں اشارہ کیا گیا ہے۔

اب اس نکتہ کو جان لینا چاہیے کہ بعض استعداد کا حدوث ملکوت (۳) میں ہوتا ہے اور آفتاب حقیقت کے فیض سے اس جگہ جو روحانیت پیدا ہوتی ہے اسے اس حادثے یا واقعے کو روحانیت کہا جائیگا یا اسے اس کی ذاتی صورت کہہ لو یا جو جی چاہے کہو اور وہ استعدادات (۴) افلاک میں ایک خاص ڈھنگ اختیار کرتی ہیں۔ یہ قرانات (۵) کلیہ میں ہوتا ہے۔ یہاں افلاک میں جو صورت واقعہ منطبع ہوگی اسے اس واقعہ کی صورت مثالیہ کہیں گے۔ اسی معرفت کی طرف اللہ تعالیٰ کے قول ”اِنَّا اَنۡزَلۡنٰهُ فِیۡ لَیۡلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنۡذِرِیۡنَ“ (الدخان ۳) (ہم نے نازل کیا اس کو لیلہ مبارکہ میں ہم ڈرانے والے ہیں) اور ”فِیۡهَا یُفۡرَقُ كُلُّ اَمۡرٍ حَكِیۡمٍ اَمۡرًا مِّنۡ

عِنْدِنَا اِنَّا کُنَّا مُرْسِلِیْنَ "(الدخان۴)(اسی میں جدا ہوتا ہے ہر جانچا ہوا حکم ہماری طرف سے ہم ہی اس کے بھیجنے والے ہیں) ارشاد کیا گیا ہے۔

پھر یہی امر(٦) ملاء اعلیٰ اور ملاء سافل کے قلوب میں رضامندی، نفرت اور ہمت پیدا کر دیتا ہے۔"اَلَّذِیْنَ یَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ یُسَبِّحُوْنَ" (فاطر۷)(وہ جو حاملین عرش ہیں یا ان کے اردگرد تسبیح کرتے ہیں) اس کے بعد (ملاء اعلیٰ اور ملاء سافل) اس وقت کا انتظار کرتے رہیں گے جسے حکمت الٰہی نے اس روحانیت کو زمین میں جاری کرنے کے لیے مقرر فرمایا ہے۔"فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا یَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا یَسْتَقْدِمُوْنَ" (الاعراف ۳۴) (پھر جب ان کی مدت آ جاتی ہے تو وہ ایک لمحے کی بھی تاخیر و تقدیم نہیں کرتے ہیں) جب وقت موعود آ پہنچتا ہے تو اللہ کے فرشتے نزول کے لیے زمین ہموار کر دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے "وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ "(اور ہم نے لوہا نازل کیا)"وَاَنْزَلْنَا الْاَنْعَامَ "(اور ہم نے چوپائے نازل کیے)

(مذکورہ بالا تفصیلات کے بعد) جب یہ روحانیت زمین پر نازل ہوتی ہے اور ایک خاص قسم کا اثر پیدا کرتی ہے تو اس کی مثال بالکل اس (ہاجس) ارادہ کی ہو جاتی ہے جو ارادہ کرنے والوں کے دلوں میں پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے شریعتوں میں اس کو (ارادۂ الٰہی) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ کیونکہ (انسانی ارادے اپنے پہلے مرحلہ میں ایک صورت علمیہ کی شکل میں اس کے فوائد کے ساتھ ارادہ کرنے والے کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے۔ اس کے دوسرے مرحلہ میں (انسان) اس کو اچھا سمجھنے لگتا ہے اور اس کی طرف اس کا میلان ہونے لگتا ہے۔ انسان کا یہ رجحان و میلان قلبی میلانات سے مل کر"عزم" کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس کے بعد انسان کے بدن کی قوتیں اس عزم کی تابع ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ یہی مدارج "اللہ کے ارادہ" میں بھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے"وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْیَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِیْهَا" (الاسراء۱٦) (اور جب ہم کسی بستی کو برباد کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو اس بستی کے اہل ثروت کو حکم دیتے ہیں الخ) "اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ" (یٰس۸۲)(بے شک جب اس کا امر ہوتا ہے اور وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو وہ "کن" کہتا ہے اور وہ چیز ہو جاتی ہے)۔

(۱) حکما ارادۂ الٰہی کو ذات الٰہی سے الگ کوئی چیز نہیں مانتے ہیں اور چونکہ ذات الٰہی ازلی، ابدی اور قدیم ہے اس لیے ان کے نزدیک ارادۂ الٰہی بھی قدیم ہے۔

ان کے نزدیک ارادۂ الٰہی کا نام ''عنایت'' ہے متکلمین کہتے ہیں کہ ''ارادۂ الٰہی'' صفت خداوندی ہے اور صفت میں حدوث نہیں ہو سکتا ہے لیکن جب ان کے سامنے ''صفات متجددہ'' کا مسئلہ آتا ہے تو وہ مجبوراً تاویل کرتے ہیں۔ مثلاً یہ قول کہ ''اللہ تعالیٰ نے طور پر موسیٰ علیہ السلام سے یہ فرمایا'' یہ اللہ تعالیٰ کا کلام تو ہے لیکن حادث ہے۔ اس موقع پر متکلمین تاویل کرنے پر مجبور ہیں۔ اس طرح کے بہت سارے اقوال خداوندی ہیں جو متجدد اور حادث ہیں۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے اس مسئلہ کو دوسرے انداز میں دیکھا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ تجلی حادث ہے۔ اس صورت میں اگر تجلی کو حادث مان لیا جائے تو تجلی کی تمام صفات وشیون بھی حادث ہوں گی۔ اصل چیز یہ ہے کہ ذات بحت واجب ہے اور اس کے اندر ایک ایجابی تاثیر ہے۔ یہ بھی واجب ہے۔ لیکن یہ ایجابی تاثیر بعض اوقات خاص صورت اختیار کر لیتی ہے۔ جب وہ ایجابی تاثیر تجلی کے واسطے سے عمل کرتی ہے تو اس کی شکل ارادہ کی بن جاتی ہے۔ ایجاب اپنی جگہ پر باقی رہتا ہے۔ صرف اس کی شکل بدل جاتی ہے۔

(۲) اپنے اس نظریہ کو حضرت شاہ صاحبؒ ایک مثال سے واضح کر رہے ہیں۔ ''سورج کے ساتھ روشنی لازم ہے اور اس کی حرارت بھی یکساں ہے۔ لیکن صبح، دوپہر اور شام کے وقت اس کی تاثیر بدل جاتی ہے۔ تاثیر کی یہ تبدیلی کہ وہ دوپہر کو پتھر کو گرم کر دے، برف کو پگھلا دے۔ دراصل اس لیے نہیں ہے کہ روشنی کی حرارت میں کمی بیشی ہوئی ہے۔ تاثیر کی یہ تبدیلی بیرونی وخارجی اثرات کے باعث رونما ہوئی ہے۔ اور اس تبدیلی کا اصل سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بالکل یہی حال حق تعالیٰ کی ایجابی تاثیر کا ہے وہ تو علیٰ حالہ باقی ہے اس میں نہ حدوث ہے اور نہ تغیر، تغیر وحدوث تو تجلی میں ہوتا ہے اور اس میں خارجی اثرات کا دخل ہوا کرتا ہے۔

اب اس مقدمہ کی روشنی میں اللہ تعالیٰ کے قول کل یوم هو فی شان پر غور کریں۔ مطلب یہ ہوا کہ اس کی ذات وصفات کی ایجابی تاثیریں اپنی جگہ قائم ودائم اور ازلی وابدی ہیں۔ تغیرات تجلیات ہو رہے ہیں اور تجلیات کے اسی تغیر کی طرف مذکورہ بالا آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔ تجلی کو

حادث و متجدد مان لینے کے بعد حکما اور متکلمین کی طرح ہمیں تاویلیں نہیں کرنی ہوں گی۔

(۳) شخص اکبر میں تین چیزیں ہیں (۱) ملکوت (۲) افلاک (۳) عناصر "ضو" آفتاب میں جو تغیر خارجی اثرات کے تحت ہوتا ہے وہ کبھی ملکوت سے آتا ہے۔ کبھی افلاک سے اور کبھی عناصر سے ملکوت میں جو روحانیت پیدا ہوتی ہے اسے اس واقعہ کی روحانیت کہا جاتا ہے۔

(۴) ملکوت سے نیچے درجہ افلاک ہے۔ اس میں جو صورت واقعہ پیدا ہوتی ہے، اسے واقعہ کی صورت مثالیہ کہتے ہیں۔

(۵) قرانات کلیہ، جس میں سبعہ سیارات ایک نقطہ پر جمع ہو جاتے ہیں۔ افلاک کی حرکت سے اوقات پیدا ہوتے ہیں۔ اور جب قران کلی ہوتا ہے تو افلاک میں ایک خاص قسم کی تاثیر پیدا ہو جاتی ہے۔ تاثیر کے اسی وقت کو "مبارکہ" کے نام سے ظاہر کیا گیا ہے۔

(۶) افلاک یا ملکوت میں پیدا ہونے والی تاثیرات کے، زمین پر نزول کے لیے ایک وقت معین ہے۔ ملاء اعلیٰ اور ملاء سافل انتظار اس وقت کا کرتے رہتے ہیں جب زمین پر اس تاثیر روحانی کے قبول کرنے کا وقت آئے گا۔ اس وقت تاثیر ڈالی جائے گی اور کسی کام کے لیے ملاء اعلیٰ اور سافل میں نفرت یا محبت کے جذبات پیدا کر دیے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے یہ ملائکہ اس پیش آنے والے واقعہ کے لیے زمین ہموار کرنے لگتے ہیں۔ مثلاً اگر کسی قوم کا عروج ہونے والا ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے ملائکہ اس قوم کے افراد میں جذبہ عمل، خلوص و یگانگت اتحاد و یک جہتی اور نیک سیرتی کے جذبات کا الہام کرنے لگتے ہیں۔ اس طرح وہ قوم عروج کے لیے تیار کی جانے لگتی ہے۔ لیکن اس کا ایک مقرر وقت ہوتا ہے۔ ملاء اعلیٰ اور ملاء سافل اس مقرر وقت کے انتظار میں رہتے ہیں اور جب وہ وقت مقرر آ جاتا ہے تو پھر ایک لمحہ کی تقدیم و تاخیر نہیں ہوتی۔ بالکل یہی حال قوموں کے زوال و تباہی کا بھی ہے۔ جب آسمانوں پر کسی قوم کے زوال کا فیصلہ ہو جاتا ہے تو ملاء اعلیٰ اور ملاء سافل ان اسباب و دواعی اور مہیجات کی تیاری میں منہمک ہو جاتے ہیں۔ جو کسی قوم کے زوال کا باعث ہوا کرتے ہیں۔ اور پھر وقت موعود کے آ جانے کے بعد "امر ربانی" زمین پر ظاہر ہو جاتا ہے۔ زمین پر کسی واقعہ کے ظہور کے لیے پہلے (۱) ارادۂ الٰہی ہوتا ہے۔ (۲) پھر ملکوت میں اس واقعہ کی روحانیت ظاہر ہوتی ہے۔ (۳) افلاک میں اس کی صورت مثالیہ کا ظہور ہوتا ہے۔

(۴) زمین کی قوتیں اس کی تائید میں لگ جاتی ہیں۔ اور واقعہ ظہور پذیر ہو جاتا ہے۔

(۷) انسانی ارادہ اور اس کی تکمیل کے مندرجہ ذیل چار مراحل ہیں۔

(۱) انسان کے ذہن میں کسی شی کا علم پیدا ہوتا ہے۔ (۲) اس علم کو انسان اچھا سمجھنے لگتا ہے۔ (۳) قلب کی قوت اور علم میں موافقت ہو جاتی ہے۔ اور وہ صورت علمیہ عزم کی شکل میں قلب میں قائم ہو جاتی ہے۔ اب تکمیل کا اسٹیج آ گیا ہے۔ (۴) اور انسان کی ساری بدنی قوتیں اس عزم کو مکمل کرنے میں لگ جاتی ہیں۔

بالکل یہی صورت ارادۂ الٰہی کی ہے۔

(۱) پہلا درجۂ علم ہے۔ اسی مقام پر ارادۂ الٰہی کا ظہور ہوتا ہے۔ (۲) دوسرے درجہ میں وہ ارادۂ ملکوت اور افلاک میں آتا ہے۔ یہ اس واقعہ اور ارادہ کی روحانیت اور مثالیت ہے۔ (۳) تیسرے درجہ میں ملاء اعلیٰ کا فیصلہ ہوتا ہے۔ (۴) چوتھے درجہ میں زمینی اسباب اس کی تائید میں ہو جاتے ہیں اور ارادۂ الٰہی ظاہر ہو جاتا ہے۔

چونکہ ارادۂ الٰہی کی مذکورہ بالا چاروں شکلیں انسانی ارادے سے مشابہت رکھتی ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ کے ارادہ کو مذکورہ بالا مشابہت کے باعث "ارادہ" کہنے لگے۔ ورنہ درحقیقت یہ ایجاب کی ایک خاص شکل ہے۔ تمام عالم میں ایجاب الٰہی بواسطہ تجلی اعظم کام کر رہا ہے۔ اس ایجاب کو سمجھانے کے لیے محض مناسبت کی بناپر "ارادہ" کا نام لیا گیا ہے۔ ورنہ حقیقت میں شخص اکبر کے ہر حصے میں تجلی اعظم کے واسطے سے ایجاب الٰہی ہی کام کر رہا ہے۔ عالم مثال ہر جگہ پھیلا ہوا ہے۔ اور ملائکہ اللہ ہر جگہ موجود ہیں۔ اس لیے ارادہ کے چاروں درجے شخص اکبر میں پیدا ہونے والی ہر حرکت اور سکون میں متحقق ہو جائیں گے۔ لہٰذا ہم پورے شرح صدر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ عالم میں کوئی چیز بلا اللہ تعالیٰ کے ارادے اور مشیت کے نہیں ہو سکتی ہے۔

ما شاء الله كان وما لم يشاء لم يكن

............☆☆☆............

سطعہ ۱۲

اگر تم چاہتے ہو کہ تجلی اعظم کے حکم کے عالم میں سرایت کرنے کو مشاہدہ کے انداز میں جان لو تو چنے کے دانے پر غور کرو کہ اس کا ہر جز دیگر جز سے ملا ہوا ہے۔ جب تم اس دنے کو پانی میں ڈال دیتے ہو تو بتدریج پانی ہر جز میں سرایت کر جاتا ہے۔ مگر اس طور کہ دانے کی جو شکل پہلے تھی وہی باقی رہتی ہے۔ بلکہ پانی کے داخل ہونے کے باوجود، دانے کا تناسب طبیعی باقی رہتا ہے۔ ایک جز کی جگہ دوسرے جز کے ساتھ اور ایک جز کی نسبت دوسرے جز کے ساتھ سابق بدستور ہے۔ اسی طرح کائنات میں اسباب سماوی وارضی اور ذوی الارادہ ہستیوں کے اسباب ارادی اپنے طبیعی تناسب پر باقی ہیں ہر سبب اپنے مسبب کے ساتھ متصل ہے۔ اور جس طرح پانی کی طراوت چنے کے دانے کے ہر جز میں داخل ہوگئی ہے، اسی طرح تجلی اعظم کا نور تازہ (قوت مثالیہ کے واسطے سے) ہر سبب اور مسبب میں داخل ہوگیا ہے۔ اور اس نے ہر سبب کو اس کی سببیّت حقیقیہ سے معزول کر رکھا ہے۔ اور سببیت ظاہری کو باقی رکھا ہے۔ پس بظاہر آگ روئی کو جلانے والی ہے لیکن درحقیقت آگ کا جلانا اور روئی کا جلنا دونوں اسی تجلی اعظم کی طرف منسوب ہیں۔ اسباب ومسببات سب کے سب اسی نور کی سطوت کے ماتحت اپنے منصب سے گر گئے ہیں۔ اور یہی معنی ہیں اس بات کے جو تم نے شریعت میں سنی ہے کے فاعل حقیقی حق تعالیٰ ہے اور تمام اسباب حق تعالیٰ کے معنوی سلسلے اسباب کی ظاہری صورت ہیں۔ اس مفہوم کو ادا کرنے کے لیے اس سے زیادہ فصیح کوئی لفظ نہیں مل سکتا ہے۔

............☆☆☆............

سطعہ ۱۳

اسی تجلی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے لیے قدرت (۱) ثابت ہوگئی لیکن وہ قدرت نہیں جسے فلاسفہ عین ذات کہتے ہیں اور نہ وہ قدرت جسے متکلمین نے ملکات بشریہ کے مانند قرار دے رکھا ہے۔
اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جب اسباب سماویہ وارضیہ مرتبہ کمال کو پہنچ جاتے ہیں تو تجلی اعظم سے ایک شعاع ملاء اعلیٰ، ملاء سافل اور نفوس ذوی الارادہ پر پڑنے لگتی ہے۔ اس شعاع کا مقصد صرف مطلوبہ کام کی تدبیر ہوا کرتا ہے۔ (اور یہ تدبیر) بعض اسباب کو قبض کرنے اور بعض کو بسط کرنے اور نفوس پر الہام وافاضہ کے ذریعہ ہوتی ہے۔ (شعاع کے پڑنے کے ساتھ ساتھ) ملائکہ اور نفوس جو اللہ تعالیٰ کی فوجیں ہیں حرکت میں آجاتے ہیں۔ یہاں تک کہ مطلوبہ صورت زمین میں فائض ہوجاتی ہے۔ پس سارا عالم اس تجلی کی شعاع کا تابع بن جاتا ہے۔ اور عالم کے تابع ہوجانے کی وجہ سے اس شعاع میں ایسی صفت پیدا ہوجاتی ہے جس کا بیان ''وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰی اَمْرِهٖ'' (اللہ تعالیٰ اپنے حکم کو نافذ کرنے کی طاقت رکھتا ہے) (یوسف ۲۱) ''وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ'' (المائدة ۱۸) (آسمانوں اور زمینوں کا حاکم اللہ تعالیٰ ہی ہے۔
''وَهُوَ الْقَادِرُ عَلٰی اَنْ یَّبْعَثَ عَلَیْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ یَلْبِسَكُمْ شِیَعًا'' (الانعام۔ ۶۵) (اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ تمہارے اوپر عذاب اوپر سے نازل کرے یا تمہارے نیچے سے یا تمہاری ایک جماعت کو دوسری جماعت سے بھڑادے۔

---

(۱) فلاسفہ قدرت خداوندی کو عین ذات مانتے ہیں اور متکلمین قدرت کی ایسی تعبیریں پیش کرتے ہیں کہ قدرت خداوندی بالکل انسانی قدرت کے مشابہ نظر آنے لگتی ہے۔ حضرت شاہ

صاحبؒ فرماتے ہیں کہ قدرت ویسی نہیں ہے جیسا کہ فلاسفہ و متکلمین نے سمجھا ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے ہر چیز میں تجلی اعظم کے ذریعہ ایجابی تاثیر ثابت کی ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ کے نزدیک قدرت کی حیثیت مرکز المراکز کی ہے۔ اور اس کی شعاع شخص اکبر کے سارے جسد میں ساری ہے۔

(۲) تدبیر قبض وبسط کے ذریعہ عمل میں آتی ہے یعنی اگر اسباب میں کوئی سبب ارادۂ خداوندی کے خلاف ہوتا ہے تو اس جز کو تبدیل کر کے ارادے سے موافقت رکھنے والے جز کو آگے بڑھا دیا جاتا ہے۔ قبض وبسط اسباب کی اسی شکل کو قدرت کہتے ہیں۔ قبض وبسط ہمیشہ ان اشیاء میں ہوا کرتا ہے جو ذوی الا رادہ نہیں ہیں۔ ذوی الارادہ اشیاء کے دماغ میں نئے علوم کا افاضہ کیا جاتا ہے۔ اس سے ان کا ارادہ بدل جاتا ہے۔ اس نئے علم کے افاضے کو الہام کہتے ہیں۔

☆☆☆

سطعہ ۱۴

اس تجلی کے ذریعے ذات الٰہی کے لیے علم، سمع اور بصر، سب ثابت ہو گئے۔ یہ تمام کی تمام صفات فعلیہ (۱) ہیں نہ کہ ان معنوں میں جنھیں فلاسفہ لے کر ان صفات کو عین ذات قرار دیتے ہیں۔ اور نہ ان معنوں میں جن میں متکلمین اپنی تعبیرات پیش کرتے ہیں۔ اور ان کو صفات ذاتیہ کہتے ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اس تجلی اعظم کو تمام اجزائے عالم خواہ وہ علوی ہوں یا سفلی اور ہر پتی، ہر قطرہ اور ہر کنکر کے ساتھ نسبت معیت مقدسہ حاصل ہے۔

ایک ایسی معیت جس کی نہ کیفیت بیان کی جا سکتی ہے اور نہ جس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، اللہ تعالیٰ کو مخلوقات کے ساتھ حاصل ہے۔

اس لیے کہ مجرد محض کی نسبت سارے عالم کے ساتھ ایک (۲) ہی ہے۔ لہذا اس نسبت کو اگر ہم مبصرات کے ساتھ قائم کریں گے تو وہ بصر ہو گی۔ مسموعات کے ساتھ سمع ہو گی۔ اور اگر ان دونوں سے ہٹ کر (کسی چیز کے ساتھ) قائم کریں گے تو وہ علم ہو گی۔ پس یہ تجلی اعظم اس معیت (۳) کے ذریعہ ہر ذرے کے قریب ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کو اسے (اس ذرہ کو) باقی رکھنا مقصود ہوتا ہے تو باقی رکھتا ہے اور اگر اسے تلف کرنا چاہتا ہے تو اسے تلف کر دیتا ہے۔ یا ایک حال سے دوسرے حال میں بدل دیتا ہے۔ لہذا نگراں وہی ہے۔ احوال کا واقف و دانا بھی وہی ہے وہی ہماری باتوں کا سننے والا اور اپنی ذات کے ساتھ دیکھنے والا ہے۔ قرآنی اصطلاح میں اسی لیے علم کو تین قسموں میں منحصر کر دیا گیا ہے۔ سمع (سننا) بصر (دیکھنا) فؤاد (قلب کا احساس) بیشتر آیات میں ان ہی معانی کا اظہار کیا گیا ہے۔ اسی (تمہید) سے رقیب وشہید علیٰ کل شیء کا معنی واضح ہو گیا۔

(۱) یعنی صفات حادثہ متجددہ۔ یہ ارادہ الٰہی کے ماتحت ہوتی ہیں۔

(۲) یہ نسبت تجلی اعظم کے ذریعہ قائم ہوتی ہے اور گزشتہ صفحات میں تجلی اعظم کی نسبت کا عالم میں ساری ہونا ثابت کیا جا چکا ہے۔ اسی تجلی اعظم کی نسبت کے واسطے سے حق تعالی ہر ذرہ، شجر و حجر اور موجودات کے ایک ایک جز کے ساتھ ہے اور یہی مفہوم ہے آیت کریمہ "**وھو معکم اینما کنتم**" (تم جہاں بھی رہو وہ تمہارے ساتھ ہے۔ اس لیے کہ اس کی تجلی تمہارے ساتھ ہے)

(۳) حضرت شاہ صاحبؒ نے تجلی اعظم کی وساطت سے حق تعالی کا مخلوقات سے اتصال اور معیت ثابت کر دی ہے۔ کائنات کا کوئی ذرہ، دریا کا کوئی قطرہ، نباتات کا کوئی پتا، پھول، کلی پنکھڑی، کوئی ذی روح، غیر ذی روح غرض کائنات کی کوئی شی ایسی نہیں ہے جس میں تجلی اعظم جلوہ گر نہ ہو۔ اس تجلی اعظم کے واسطے سے اللہ تعالی کو تمام مخلوقات کی معیت حاصل ہے۔ اس لیے وہ سب کچھ جانتا ہے، دیکھتا ہے اور سنتا ہے۔ وہ سب اعمال واقوال کا نگراں اور گواہ ہے۔ اس لیے کہ وہ ہر وقت ساتھ ہے۔

............☆☆☆............

سطعہ ۱۵

تشریع تتمۂ تقدیر ہے۔ تقدیر سے مراد یہ ہے کہ ہر نوع کے لیے خلقت، اخلاق اور اعمال معین کر دیے گئے ہیں (ان ہی کو تقدیر کہا جاتا ہے) مثلاً انسان بولنے والا اور گفتگو کو سمجھنے والا ہے۔ اس کا چہرہ صاف ستھرا روشن ہے۔ اس کا قد سیدھا ہے اور وہ دو پیروں پر چلنے والا جاندار ہے۔ (اس کے برخلاف) گھوڑا ہنہنانے والا، گفتگو کو نہ سمجھنے والا جاندار ہے۔ جس کے چہرے پر بال ہوتے ہیں۔ قد میں کچھ کجی ہوتی ہے اور وہ چوپایہ ہے۔ غصہ کی حالت میں کاٹ کھاتا ہے۔ اور دولتی جھاڑتا ہے۔ (غصہ میں) گائے سینگ مارتی ہے۔ اتصال جنسی کے وقت ہر نوع کی خاص حرکتیں ہوتی ہیں۔ جو دوسری نوع میں نہیں پائی جاتی ہیں۔ اسی طرح کھانے پینے، اپنے بچے کی پرورش وغیرہ میں بے شمار اختلاف پائے جاتے ہیں۔ (ان عادات کا الہام) تمام نفوس ذوی الارادہ (ارادی اشیاء) میں جبلی الھمات کے ذریعہ فائض ہوا ہے۔

تشریع کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ انسان دو قوتوں سے مرکب ہے ایک قوت ملکیہ اور دوسری قوت بہیمیہ۔ انسان کے عدل نوعی کا تقاضا ہے کہ مذکورہ بالا دونوں قوتیں اپنی اپنی جگہ پر متوازن رہیں اور آخرت میں اس (توازن) کی بدولت اسے سعادت حاصل ہو اور دینوی زندگی میں ارتفاقات ضروریہ کے حصول میں معیشت و نکاح کے آداب کو برتتے اور معاش کے حاصل کرنے اور ملکی سیاست کے نظام کو قائم کرنے میں وہ جادۂ مستقیم سے نہ ہٹے۔ ان تمام احوال و افعال کو نوع انسانی کے لیے قائم کرنے ہی کو تشریع کہتے ہیں۔

تشریع کی حقیقت کا حال یہ ہے کہ تجلی اعظم انسان کی صورت اجمالی پر نظر غائر ڈالتی ہے اور تجلی اعظم و صورت انسانی کے درمیان بے شمار انوار نکلتے ہیں جن کا مقصود بعض افعال کو طلب کرنا

ہوتا ہے۔اوران افعال کے ساتھ تجلی اعظم کی رضا کا قیام ہوا کرتا ہے۔یہ افعال یا تو وجوبی ہوتے ہیں یا استحبابی اسی طرح بعض ایسے افعال ہیں جن سے تجلی اعظم کو نفرت ہے۔یہ نفرت یا ناراضگی حرام کے درجہ کی ہوتی ہے۔یا مکروہ کے درجہ کی۔اسی مقام سے نیکی و بدی کی حکمت ظاہر ہوتی ہے۔کیونکہ "مَا یُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَیَّ" (ق:۲۹) (ہمارے سامنے کوئی بات بدلی نہیں جا سکتی ہے) پھر یہ حکمت مجملہ (نیکی و بدی کی حکمت) بعض اوقات بعض افراد اور امتوں کے حق میں مفصل ہو جاتی ہیں۔بایں طور کہ وہ افراد یا امتیں امور کلیہ کو مقررہ طریقوں کے مطابق بجالائیں۔
پہلی قسم (تشریع کلی) کی طرف آیت "شَرَعَ لَکُمْ مِنَ الدِّیْنِ مَا وَصّٰی بِهٖ نُوْحًا" (الشوریٰ: ۱۳) (مشروع کیں تمہارے لیے دین میں سے وہ باتیں جن کی اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام کو نصیحت فرمائی تھی) اور آیت "لِکُلٍّ جَعَلْنَا مِنْکُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا" (المائدۃ: ۴۸) (تم میں سے ہر ایک کے لیے ہم نے شریعت اور راستے بنائے ہیں) میں دوسری قسم (تشریع مفصل) کی طرف اشارہ ہے۔

☆☆☆

سطعہ ۱۶

اللہ تعالیٰ نے انسان کی صورت پر گہری نظر ڈالی۔ اس نے نوع انسانی کے خواص وافعال کا بخوبی جائزہ لیا اور جن علوم و اعتقادات نیز اخلاق سے نوع انسانی میں اعتدال پیدا ہو سکتا ہے۔ وہ سب اسی نظر فیض آسا سے ظاہر ہوئے ہیں۔ اس موقع پر سات علوم حظیرۃ القدس میں متمثل ہوئے۔

(۱) **علم الٰہیات:** محض اس قدر کہ اس سے نوع انسانی کے عقائد میں اعتدال پیدا ہو اور یہ علم زیادہ تر صفات خداوندی سے متعلق ہے جو تجلی اعظم کے واسطے سے ثابت ہوتی ہیں اس کے علاوہ کسی اور ذریعے سے نہیں۔

(۲) **علم طبعیات:** لیکن اس علم میں ایک فلسفی اور ماہر طبعیات کا نقطۂ نظر دوسرا ہوا کرتا ہے۔ اور قرآن کے طالب علم کا دوسرا۔ مثلاً ایک طبعیات کا ماہر بہائم پر اس لحاظ سے غور کرتا ہے کہ ان کی ہر نوع کے خواص کا پتا چلائے لیکن ایک رئیس اس اعتبار سے اسے دیکھتا ہے کہ ان میں کون سا جانور سواری کے قابل ہے۔ اور کون سا بار برداری کے۔ لہٰذا قرآن کا طالب علم ان بہائم یا کائنات ہست و بود پر اس لیے غور کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا جلوہ دیکھے اور اس کے علم و حکمت اور کاریگری کو سمجھے۔ اس کے سوا اس کا کوئی دوسرا مقصد نہیں ہوتا ہے۔ اس علم کو ''علم تذکیر بآیات اللہ'' کہتے ہیں۔

(۳) **علم کی تیسری قسم:** ''علم ایام اللہ'' ہے یعنی ان واقعات کا علم جن کا تعلق اطاعت گزاروں کے انعام و اعزاز اور نافرمانوں کے عذاب و سزا سے ہے۔

(۴) **علم کی چوتھی قسم:** وہ ہے جس کے ذریعہ ہمیں حشر و نشر اور جنت و جہنم کے بارے میں

معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

(۵) **پانچواں علم:** ''علم مخاصمہ'' ہے۔ یہ مخاصمہ اہل ضلالت کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں چار فریقوں کے ساتھ مخاصمہ کیا گیا ہے۔ (۱) مشرکین، (۲) یہود، (۳) نصاریٰ، اور (۴) منافقین۔

(۶) **چھٹا علم:** ''احکام پنجگانہ'' کا علم ہے مثلاً کسی حکم کے واجب، مستحب، مباح، مکروہ، اور حرام ہونے کا علم۔ اور ان کی حکمتیں یعنی یہ سمجھ لینا کہ ان اعمال کے ہمارے خاندانی امور، ملکی حالات و سیاسیات، آداب معیشت اور ہمارے اخلاق پر کیا اثرات پڑتے ہیں۔

(۷) **ساتواں علم:** وہ علم ہے جو کسی واقعہ کے وقوع کی صورت میں ترغیب و ترہیب کے لیے استعمال کیا جائے یا اس کا مقصد نا اہلوں کو خوف دلا کر اور فعّال افراد کی ہمت افزائی کر کے امور مطلوبہ کی انجام دہی ہو۔ چنانچہ جس وقت اس کی ضرورت پیش آئی یہ علم نازل ہوا۔ یہ ساتواں علم اسباب نزول کا محتاج ہے۔

...........☆☆☆...........

سطعہ ۱۷

اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ایک صفت یہ بھی ہے کہ بندوں کو ان باتوں کی تعلیم دے جن کی انھیں ضرورت ہے۔ اس تعلیم دینے کے بہت سے طریقے ہیں۔

(۱) ایک طریقہ **الھامات جبلّیہ** کا ہے۔ یہ صورت نوعیہ کے واسطے سے نوع کی حاجت کے مطابق اس کی قوت مدرکہ میں الہام کر دیے جاتے ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا قول ”وَاَوْحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحلِ“ (اور تیرے رب نے شہد کی مکھیوں کو وحی کی) (النحل : ۶۸)

(۲) **القاء فی الروع** (دل میں کسی بات کا ڈال دینا)

تعلیم کی یہ دوسری صورت ہے۔ یعنی جس چیز میں کسی شخص کی مصلحت ہوتی ہے، وہ بات قوت فلکیہ یا ان ملائکہ کے ذریعہ جو تکوینی امور کی انجام دہی پر مامور ہیں، انسان کی قوتِ مدرکہ میں اس کی استعداد کے مطابق (اللہ تعالیٰ کی طرف) ڈال دی جاتی ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا قول ”وَاَوْحَیْنَا اِلٰی اُمِّ مُوْسٰی اَنْ اَرْضِعِیْهِ“ (اور ہم سے موسیٰ علیہ السلام کی ماں کو وحی کی وہ ان کو دودھ پلائیں) (القصص : ۷)

(۳) مسامرات، تعلیم دینے کی یہ تیسری شکل ہے۔ یہ وہ افکار و خواطر ہیں، جو سالک کے مقامات مستقرہ مثلاً رضا، تسلیم، صبر، ارادہ، توبہ، زہد، محبت، یقین اور اس کے نفس کی جبلت کے درمیان پیدا ہوتے ہیں۔ نفس عالم قدس کی طرف متوجہ رہتا ہے (اس ٹکراؤ) سے جو خیال دل کے باطن سے پھٹ کر نکلتا ہے، اسے مسامرات کہتے ہیں۔

(۴) تعلیم دینے کی چوتھی شکل، فراست ہے۔ وہم اور بعض خارجی جسمانیات کی ٹکر سے جو خیال دل میں پیدا ہوتا ہے اسے فراست کہتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے کہ کوئی بکری کسی درندہ یا

اس کے مشابہ کوئی چیز دیکھ لے اور اس کے دل میں خوف کی ایک لہر پیدا ہو۔

(۵) تعلیم کی پانچویں شکل رؤیا ہے۔ رؤیا درحقیقت علوم کے خیالی صورت اختیار کرنے کو کہتے ہیں۔ جب انسان کا حواس (نیند کے باعث) معطل ہو جاتا ہے۔ تو وہ ان چیزوں کی خیالی صورتوں کی طرف بڑھتا ہے (ان ہی صورتوں کو رؤیا کہتے ہیں) جو خارج میں پائی جاتی ہیں بعض رؤیا حق ہوتے ہیں، ان کا القاء ملک الرؤیا (خوابوں کا فرشتہ) کرتا ہے۔ ان خوابوں کی حیثیت بالکل وہی ہے جو الہام کی ہے جس کا تذکرہ تعلیم ثانی (القاء فی الروع) میں کیا جا چکا ہے بعض رؤیا ملکی ہوتے ہیں۔ یہ دراصل انسان کی اپنی ملکی صفات ہوتی ہیں جو اپنے سے مناسبت رکھنے والی صورتوں میں خواب میں ظاہر ہوتی ہیں۔ مثلاً ایک صاحب طہارت کا خود کو نورانی دیکھنا اور بعض رؤیا اضغاثہ احلام ہوتے ہیں (یعنی وہ خواب جو نفسانی باتوں یا پریشان خیالات پر مشتمل ہوتے ہیں)۔

تعلیم کی تمام اقسام میں سب سے عظیم القدر تعلیم الٰہی ''وحی'' ہے جو انبیاء کے ساتھ مخصوص ہے۔ الہام اور وحی میں کئی اعتبار سے فرق ہے، سب سے پہلا فرق تو یہ ہے کہ وحی کے نزول کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے کہ ملاء اعلیٰ کی قوتیں اس شخص کی قوت ادراک کو مسخر کر لیتی ہیں اور انتہا میں حظیرۃ القدس سے علوم و معارف کا شخص مذکور پر فیضان ہونے لگتا ہے۔ الہام میں یہ دونوں باتیں (ابتدا اور انتہا) نہیں پائی جاتی ہیں۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ ہر شئ میں دو باتیں لازماً پائی جاتی ہیں ایک قبولیت کی استعداد اور دوسرے یہ کہ فاعل افاضہ کرے۔ اگر کسی خاص شخص کی استعداد الہام کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے اور اسے الہام کیا جاتا ہے، تو اسے الہام کہتے ہیں۔

(یعنی الہام میں یہ ضروری ہے کہ جسے الہام کیا جائے اس میں اس الہام کو قبول کرنے کی استعداد موجود ہو لیکن وحی میں استعداد کی شرط نہیں ہے بلکہ) حظیرۃ القدس کی طرف سے نبی میں وحی کو قبول کرنے کی استعداد پیدا کی جاتی ہے اور مصلحت کلی کے تحت نبی کے نفس قدسی میں علوم و معارف کا فیضان کیا جاتا ہے۔

تیسرا فرق یہ ہے کہ وحی، جبلی اور نفسانی تاثرات سے بہت دور ہوتی ہے اور نہ ان کی تعبیر

میں اور نہ وحی کے مفہوم و مراد کو سمجھنے میں غلطی کا امکان ہے۔ اس لیے کہ (وحی سے) اللہ تعالیٰ کا مقصود عالم کی مصلحتوں کو قائم کرنا ہے۔ اور یہ ممکن ہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ کا مقصود پورا نہ ہو" وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِىْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ" (آل عمران: ۱۷۹) (اور اللہ تعالیٰ تمہیں امور غیبیہ پر مطلع نہیں کرتا ہے۔ لیکن اپنے رسولوں میں سے جسے چاہے وہ اس امر کے لیے (امور غیبیہ پر مطلع کرنے کے لیے منتخب کر لیتا ہے) لہٰذا یہ بات معلوم ہوگئی کہ انبیاء کی وحی علم قطعی کا سبب ہے۔ خواہ (وہ وحی) بطریق فراست ہو یا بذریعہ خواب یا بصورت القاء فی الروع لیکن اولیا کے الہام خواب یا کسی غیبی آواز سے علم قطعی حاصل نہیں ہو سکتا ہے۔ اس مقام پر غلطی نہ کرنا اور نہ مسامرات اولیا کو بمنزلہ وحی سمجھنا؟ اس لیے کہ اس زمانہ میں اکثر گمراہیوں کا سبب یہی غلط خیال ہے۔

............☆☆☆............

سطعہ ۱۸

یہ بات کشف صحیح سے ثابت ہو چکی ہے کہ جس وقت نفس کل نفس ناطقہ (۱) کی شکل اختیار کرتا ہے (یعنی نفس ناطقہ میں نفس کل کی تمام صفات مرتسم ہو جاتی ہیں) یہ اس وقت ہوا کرتا ہے جب کہ بچہ رحم مادر میں ہو اور اس میں روح پھونکی جانے لگتی ہے۔ اس وقت شخص اکبر کی پوری شکل اس نفس ناطقہ (۲) میں آ جاتی ہے اور اجرام علوی و سفلی میں سے ہر جز کے مقابلے میں ایک نقطہ نفس ناطقہ میں مرتسم ہو جاتا ہے۔ اگر اس وقت خارج میں سورج عروج میں ہوگا یا زہرہ عروج کی حالت میں ہوگا تو اس سورج اور اس زہرہ کے بالمقابل نفس ناطقہ میں ایک ایک نقطہ رکھ دیا جائے گا۔ اور علیٰ ہذا القیاس تمام علویات و سفلیات کا نمونہ (لفظوں کی شکل میں) اس نفس ناطقہ میں پیدا ہو جاتا ہے۔ اس بحث میں بہت ساری تفصیلات ہیں جن کا یہ رسالہ متحمل نہیں ہو سکتا ہے۔ مختصر یہ کہ تجلی اعظم اور حظیرۃ القدس کا (جو کہ تجلی اعظم کی شعاعوں کا محل ہے) ایک نمونہ انسان کے نفس (ناطقہ) میں رکھ دیتے ہیں۔ بعض نفوس میں وہ نمونہ ظاہر و باہر ہوتا ہے۔ اور بعض میں مغلوب و مخفی۔ اگر وہ نمونہ ظاہر و باہر ہوگا تو وہ شخص ''شخص کامل'' ہے اور وہ نقطہ جو تجلی اعظم کا نمونہ ہے (اور انسان کے نفس ناطقہ میں موجود ہے) ہماری اصطلاح میں ''حجر بحت'' کے نام سے موسوم ہے۔ تجلی اعظم کے ساتھ اس کی نسبت وہی ہے جو اس آئینہ کو آفتاب کے ساتھ ہے جو زمین پر پڑا ہوا ہے کہ جب آفتاب اس کے سر کی جانب آ جاتا ہے تو آفتاب کی صورت بعینہ اس میں جھلکنے لگتی ہے اور جب آفتاب اس کے محاذی نہیں ہوتا تو اس آئینہ میں ہلکی روشنی ظاہر ہوتی ہے۔ گو آفتاب کی صورت (اس وقت اس میں) ظاہر نہیں ہوتی ہے جب لوگ آئینہ کو چور چور اور ریزہ ریزہ کر دیتے ہیں تو پھر بھی ایک قسم کی سفیدی اس میں ضرور دکھائی دیتی ہے۔ ایسے ہی انسانی نفوس میں بھی حجر

بحت مختلف حجموں کے ہوتے ہیں جس انسان کے حجر بحت میں بعینہ الٰہی تجلیات نمایاں ہوتی ہیں وہ انسان کامل ہوتا ہے اور پھر معاملہ گھٹتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک اہل مقامات تک پہنچ جاتا ہے۔

---

(۱) حقیقت نفس ناطقہ کی تحقیق کے سلسلے میں اہل عقل کے درمیان شدید اختلافات اور طویل بحثیں ہیں۔ لیکن صحیح رائے یہی ہے کہ نفس ناطقہ ایک جوہر ہے اور بدن سے تدبیر وتصرف تربیت وپرداخت کا تعلق رکھتا ہے۔ دوسری بحث یہ ہے کہ آیا وہ بدن میں حلول کیے ہوئے ہے یا اس پر طاری ہے یعنی بدن سے اس کا تعلق سریانی ہے یا طریانی؟ حضرت شاہؒ صاحب کے نزدیک اس کا تعلق طریانی ہے سریانی نہیں ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے آئینہ میں انسان کی شکل نظر آتی ہے وہ شکل جو آئینہ میں نظر آرہی ہے، آئینہ کے جرم میں حلول نہیں کیے ہوئے ہے بلکہ اس پر طاری ہے۔

(۲) گویا ہر نفس ناطقہ اپنی جگہ پر ایک چھوٹا موٹا شخص اکبر بن جاتا ہے۔

(۳) اہل مقامات ان کو کہتے ہیں جن کے حجر بحت میں تجلی بنفس نفیس نہیں آتی بلکہ تجلی کی ہلکی شعاعیں ظاہر ہوتی رہتی ہیں۔ وہ اس آئینہ کی طرح جو آفتاب کے سامنے نہ ہو۔ لیکن اس میں آفتاب کی ہلکی روشنی جھلک رہی ہو۔

............☆☆☆............

سطعہ ۱۹

ان امور(۱) میں سے جو تجلی اعظم کی جانب سے اس عالم پر نازل ہوتے ہیں ایک کام یہ بھی ہے کہ انسانیت کے افراد کی ہدایت کا ارادہ ان کو مبدا و معاد کے بارے میں ضروری علوم کی تعلیم دینے کا نظام اور اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے کے طریقوں کی تعلیم کا نزول ہو یا بتلایا جائے کہ انسانوں میں جو ملعونوں کا گروہ ہے اس کو کس طرح زائل کیا جائے۔ انسانوں پر جو مظالم ڈھائے جا رہے ہیں ان کو کس طرح دور کیا جائے یا کسی قوم کو ہلاکت سے کیسے بچایا جائے۔ مثلاً طوفان نوح سے بچنے کے لیے کشتی بنانے کی تلقین وغیرہ وغیرہ (ان سارے مذکورہ بالا علوم کا نزول تجلی اعظم سے ہوتا ہے۔ تب افراد میں ہدایت حاصل کرنے کا جذبہ ابھرتا ہے مبدا و معاد کا علم لوگوں کو ہوتا ہے۔ اور تقرب الی اللہ حاصل کرنے کی خواہش جنم لیتی ہے) اس کے بعد تدبیر الٰہی (اپنے ارادہ از قسم ہدایت انسانیت و دفع مظالم کی تکمیل کے لیے) عالم بشریت میں سے بہتر سے بہتر آدمی کا انتخاب کر کے اسے "فرد کامل" قرار دیتی ہے اور اسے "بشر جارحہ (۲)" بنا کر اس سے اپنی مراد پوری کراتی ہے۔

تجلی اعظم کے (مذکورہ بالا) ارادے اس شخص کے حجر بحت میں اسی طرح منطبع ہو جاتے ہیں جس طرح آئینہ میں جرم آفتاب۔ اس وقت اس شخص کے عقلی اور قلبی قویٰ حجر بحت کے انوار سے منور ہو جاتے ہیں اور اس پر بے شمار علوم اور الوہی ارادوں کا نزول ہونے لگتا ہے اس آدمی کو ملاء اعلیٰ کے ساتھ ایک عجیب قسم کی مناسبت حاصل ہو جاتی ہے۔ اس کے قلب پر شریعتوں کے علوم اور حکمتیں، بارش کی طرح برسنے لگتی ہیں اور (تجلی اعظم) اپنے مطلوبہ کام اسی کے ہاتھ سے انجام دلواتی ہے اور اس عزت و عظمت والے شخص کا نام "رسول" ہے۔

یہاں یہ نکتہ بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ اگر چہ پیغمبر بہت سے علوم بذریعہ خواب یا بواسطہ فراست حاصل کرتا ہے۔لیکن چونکہ اس کی اصل حجر بحث میں ہوتی ہے۔اس لیے وہ علوم قطعی اور یقینی ہوتے ہیں جن میں تغیر وتبدل یا شک وہم کی قطعاً گنجائش نہیں ہے۔اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:" یُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِکَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ اَنْ اَنْذِرُوْٓا اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاتَّقُوْنِ " (النحل: ۲) (وہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے اس پر اپنے حکم سے فرشتوں کو وحی دے کر نازل کرتا ہے۔وہ یہ کہ لوگوں کو اس بات سے آگاہ کردو کہ میرے سوا کوئی اور عبادت کے لائق نہیں سو مجھ سے ڈرتے رہو)

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

"رَفِیْعُ الدَّرَجٰتِ ذُو الْعَرْشِ یُلْقِی الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ لِیُنْذِرَ یَوْمَ التَّلَاقِ یَوْمَ هُمْ بٰرِزُوْنَ لَا یَخْفٰی عَلَی اللّٰهِ مِنْهُمْ شَیْءٌ لِمَنِ الْمُلْکُ الْیَوْمَ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ" (غافر: ۱۵)

(وہ بلندترین صفات کا مالک اور صاحب عرش ہے۔وہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے اپنے حکم سے وحی بھیجتا ہے،تاکہ وہ صاحب وحی لوگوں کو باہمی ملاقات کے دن سے ڈرائے، وہ دن وہ ہے جس دن سب لوگ نکل کھڑے ہوں گے۔ان لوگوں کی کوئی بات خدا سے پوشیدہ نہیں رہے گی۔کہا جائے گا۔آج کس کی حکومت ہے، جواب دیا جائے گا صرف اللہ تعالیٰ کی حکومت ہے جو یکتا اور غالب ہے)۔

---

(۱) جس طرح اللہ تعالیٰ نے جسم انسانی کی تخلیق فرمائی اور اس کی پرورش و پرداخت کا نظام قائم کیا ہے، وہ اسی طرح اس نے انسان کی ہدایت وسعادت کے سلسلے کے ضروری علوم ومعارف کو بھی نازل فرمایا ہے، تاکہ انسان کی دنیوی اور اخروی دونوں زندگیاں پاکیزہ اور پرسکون ہوں۔ انسان اپنے مقصد حیات کو پہچانے اور اپنے حجر بحث کا رشتہ تجلی اعظم سے قائم کرنے کے لائق بنے۔ساتھ ہی دنیا سے ظلم وفساد دور ہو اور آفات ارضی وسماوی کے نزول کے وقت انسان اپنی حفاظت کرسکے۔

(۲) اپنے مذکورہ بالا مقاصد کو پورا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ انسانوں میں سے کسی انسان کو منتخب کر کے اسے اپنا آلۂ کار بنالیتا ہے۔ اس انسان میں ایسا جذبہ پیدا کر دیتا ہے کہ وہ ربانی مقاصد کی تکمیل کو اپنا کام اور فرض سمجھ کر اس میں جی جان لڑا دیا کرتا ہے۔

............☆☆☆............

سطعہ ۲۰

اور کبھی ارادۂ الٰہی یہ ہوتا ہے کہ ہدایت ربانی انسانوں کے درمیان ہمیشہ باقی رہے اور انسانیت کے تمام طبقات یکے بعد دیگرے اللہ کی اس رسی کو پکڑتے چلے جائیں اور دور ونزدیک والے سب اس سے فائدہ اٹھائیں تو فیض الٰہی پیغمبر کے نفس کی تسخیر کر کے حجر بحت میں اجمالی انداز سے ''کتاب اللہ'' کو داخل کر دیتا ہے۔ اور جس صورت میں وہ کلام الٰہی حظیرۃ القدس میں ظاہر ہوا تھا پیغمبر کے حجر بحت میں اسی شکل میں متشبح ہو جاتا ہے اور قطعی طور پر یہ علم ہو جاتا ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ اس کے بعد تھوڑا تھوڑا کر کے ملائکہ کے ذریعہ (رسول کے) قوائے عقلیہ میں وہ کلام اتارتے ہیں۔

''نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْاَمِيْنُ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ'' (الشعراء: ۱۹۳)

(اس کلام کو جبرئیل علیہ السلام نے آپ کے قلب پر اتارا تا کہ ڈرانے والوں میں سے ہو جائیں)

اس حالت میں رسول پر اللہ تعالیٰ کے خزائن رحمت سے فیوض کا دھارا نازل ہونے لگتا ہے اور وہ نازل ہونے والی شیء کتاب اللہ ہے۔ کاہنوں کے نفوس کو جن مسخر کر لیتے ہیں اور ان میں علوم کا القاء کرتے ہیں اور نبیوں کے نفوس کو ملائکہ علویہ تسخیر کرتے ہیں۔ اور وہ جن علوم کا القاء کرتے ہیں وہ جبروت (۱) سے آتا ہے۔ جیسے کہ مرطوب ہوا میں پانی پوشیدہ ہوتا ہے۔ اور کپڑے کو گیلا کر دیتا ہے۔

---

(۱) جبروت سے مراد یہاں تجلی اعظم ہے۔ یہاں حضرت شاہؒ صاحب نے ایک نہایت

لطیف تشبیہ دی ہے۔ یہاں ہوا سے مراد فرشتے، پانی سے مراد تجلی اعظم اور اس سے مستفاد ہونے والے علوم و معارف اور کپڑے سے مراد نبی کا حجر بحت ہے۔ یعنی جس طرح مرطوب ہوا میں پانی پوشیدہ رہتا ہے اور وہ ہوا کپڑے کو گیلا کر دیتی ہے اسی طرح تجلی اعظم کے علوم فرشتوں کے ذریعہ نبی کے حجر بحت کو مالا مال کر دیتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

سطعہ ۲۱

اللہ تعالیٰ غیب الغیب میں اس بات سے واقف تھا کہ فلاں دور میں انسانیت ہدایت کی محتاج ہوگی اور سب سے زیادہ مفید و موثر تدبیر اس وقت یہ ہوگی کہ کسی ایسے کامل کو مبعوث کیا جائے جس کا حجر بخت، بہت قوی الاثر ہو، اور جس کے حق میں تدبیر سماوی کے مطابق خوش نصیبی اور اپنے دور کے انسانوں پر غلبہ حاصل کر لینے کا اور تدبیر ارضی کے مطابق اس بات کا فیصل کیا جاچکا ہو کہ اس کے قوائے علمی و عملی اتنے معتدل ہوں گے کہ ہر اعتبار سے وہ امام نوع انسانی (صورت نوعیہ) کا مظہر بن سکے گا۔

ارادۂ الٰہی (عنایت اولیٰ) اس بات سے بھی واقف تھا کہ تجلی اعظم سے موج در موج برکات اس کے حجر بخت پر نازل ہوں گی اور اس پر قرآن کریم کا نزول بھی اس کی ذات مقدس کے (لامتناہی) کمالات کے باعث ہوگا اور وہ مہبط وحی اس لیے بنے گا کہ تجلی اعظم کے حقوق ادا کرنے کے قابل ہوگا۔

اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ وہ پیغمبر عربی ہوگا اور اس کے مخاطب عرب ہوں گے۔ اس لیے ضروری ہوا کہ نازل ہونے والا کلام بھی عربی میں ہو اور چونکہ وہ قوم کلام کی بلاغت و فصاحت سے بہت دلچسپی رکھنے والی ہوگی، اس لیے لازم تھا کہ کلام منزل بلاغت کے اعلیٰ ترین معیار پر ہو، تاکہ اس قوم کے لیے موثر ثابت ہو سکے۔ ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہوا کہ قرآن کریم ایسے اسلوب میں نازل کیا جائے جو شعر، نثر، محاورہ اور مکاتیب کی حدود سے ارفع ہو، تاکہ اس کلام میں ان کے افکار پریشان کو دفع کرنے کی صلاحیت ہو۔ عنایت اولیٰ نے ان تمام نکات (کو مدنظر رکھتے ہوئے قرآن کریم کے لیے ایک فقید المثال اسلوب بیان متعین کیا اور اس بے مثال اسلوب کے پردے

میں تشریع کے سربستہ رازوں کو معانی کے روپ میں چھپا دیا۔ یہ (اسلوب و معانی) تمام چیزیں حظیرۃ القدس میں مقرر کر دی گئیں اور ان کا شمار تجلی اعظم کے انوار یا ان کی تشریح و تفصیل میں سے کیا گیا۔

☆☆☆

سطعہ ۲۲

اگر پیغمبر کے نفس میں برکات الٰہی (۱) کا نزول دو پرنالوں کے راستے ہو رہا ہو ایک وہ پرنالہ جو دریائے تشریع سے نکل کر آ رہا ہو اور اپنے ساتھ وہ سات قسم کے علوم لے کر آیا ہو جن کا ذکر میں کر چکا ہوں اور دوسرا وہ پرنالہ جو کلام اور اسلوب کے دریا سے نکلا ہو اور دونوں (بیک وقت) قلب پیغمبر پر نازل ہوں تو وہ "قرآن" ہے۔ اور اگر اول الذکر راستہ پیش دستی کر جائے اور ثانی الذکر پیچھے رہ جائے تو وہ حدیث قدسی ہے۔

اور اگر کلام (ثانی الذکر) پیش دستی کرے اور اول الذکر (تشریع) پیچھے رہ جائے تو اس میں اس بات کا احتمال ہے کہ خلاف واقع ہو (یعنی ناممکن الوقوع) نزول قرآن سے پہلے جو کتب الٰہیہ نازل ہوئی ہیں ان کا انداز باستثنائے چند حدیث قدسی کا تھا۔ اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "انما کان ینزل علی النبی ما مثله امن علیه البشر "(الحدیث) (یعنی انبیائے سابقین پر اس قسم کی چیزیں نازل ہوتی رہی ہیں اور (اس دور کے لوگ) ان پر ایمان لاتے رہے ہیں)۔

کتاب الٰہی کے لیے دو باتوں کا ہونا ضروری ہے ایک تو یہ کہ اس کے ساتھ ملکوت کی برکتیں ہوں اور ملاء اعلیٰ ان آدمیوں سے راضی ہوں جو اس کتاب کو پڑھیں یا اس کی ترویج واشاعت کے لیے کوشش کریں۔ دوسرے یہ کہ وہ کتاب مدت مدید تک باقی رہے اور لوگوں کو اس کے حفظ کرنے کی توفیق بخشی جائے۔

اگر کسی کتاب میں مذکورہ بالا دو باتیں نہ پائی جائیں تو وہ کتاب الٰہی نہیں ہوگی بلکہ اس کی حیثیت کسی انسان کے مرتب کردہ صحیفے کی ہوگی جسے اس نے پیغمبر کے علوم جمع کرنے کی غرض سے

تیار کیا ہو۔ جیسے ہمارے مذہب میں صحیح بخاری و مسلم ہیں۔

---

(۱) حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر تجلی اعظم کے انوار و برکات کے نزول کی کئی صورتیں تھیں سب سے زیادہ کامل اور سب سے زیادہ قطعی وہ صورت تھی جس میں علوم و معارف اور اسلوب بیان والفاظ سارے کے سارے تجلی اعظم سے صادر ہو کر بواسطہ ملاء اعلیٰ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مطہر پر نازل ہوتے تھے۔ اسی کا نام ''قرآن ہے کہ اس کے معانی بھی اللہ تعالیٰ کے ہیں۔ اور اسلوب بھی وہی ہے۔ جو مصلحت کلیہ کے تحت عنایت اولیٰ سے صادر ہو کر حظیرۃ القدس میں متشخص ہوا۔ یہ کلام قطعی ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ معانی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہو گئے، لیکن ان معانی کو پیش کرنے کے وقت ''اسلوب بیان'' حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا اختیار فرمایا۔ یوں سمجھئے کہ معانی و معارف تو تجلی اعظم کے بحر بے پایاں سے آئے ہیں لیکن ان کو الفاظ کا جامہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود پہنایا۔ اس کو ''حدیث قدسی'' کہتے ہیں۔

تیسری صورت یہ ہے کہ اسلوب تجلی اعظم سے آئے، اور معانی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہوں۔ اس کو قطعیت اور یقینیت کا وہ درجہ حاصل نہیں ہے جو اول الذکر دونوں صورتوں کو حاصل ہے۔

حضرت شاہؒ صاحب فرماتے ہیں کہ یہ استثنائے چند سابقہ آسمانی کتب میں زیادہ تر دوسری صورت رہی ہے۔ یعنی ان کتابوں کا مفہوم اور معانی تو تجلی اعظم سے نازل ہوئے، لیکن اسلوب بیان انبیاء کا اپنا تھا۔

............☆☆☆............

سطعہ ۲۳

اگر ہم کہیں کہ گلستان (کتاب) اوراق میں لکھی ہوئی ہے، بچے اپنی زبانوں سے اسے پڑھتے ہیں (یہ کتاب) ان کے سینوں میں محفوظ ہے۔ پانچ سو سال ہوئے یہ کتاب وجود میں آئی۔ اس کے مصنف شیخ سعدی ہیں تو ہماری یہ ساری باتین درست ہیں۔ اس لیے کہ مذکورہ بالا خبروں میں سے ہر چیز کا مصداق ایک دوسرا وجود ہے۔ یہ (گلستان) صورت خطی میں لکھی ہوئی ہے۔ وجود لفظی کے ساتھ پڑھی جاتی ہے اور صورت ذہنی کے ساتھ محفوظ ہے۔ یہ سعدیؒ کی تالیف ہے اس لیے کہ اس کتاب کے کلمات کی ترتیب ان (حضرت سعدیؒ) کی قوت عقلی کے ذریعہ عمل میں آئی اور پانچ سو سال اس گلستان پر گزر گئے۔ اس طرح کی باتیں تمام کتابوں کے بارے میں کہی جا سکتی ہیں۔ کتاب کے علاوہ آدمی، درخت اور پتھر کے بارے میں مذکورہ باتیں نہیں کہی جا سکتیں۔ لیکن قدیم یا جدید (ہر کتاب) کے بارے میں ہر زبان میں یہ باتیں کہی جائیں تو درست ہیں۔ اب ذرا اس پر قیاس کر کے کہو کہ قرآن مصاحف میں لکھا ہوا ہے۔ زبانیں اس کی تلاوت کرتی ہیں ہمارے سینوں میں (یہ کتاب) محفوظ ہے اور اس کلام کا ارشاد فرمانے والا اللہ تعالیٰ ہے اور اس پر اتنا اور زیادہ کر دو کہ ''یہ کتاب قدیم ہے'' اس لیے کہ یہ اس صورت عنایت ازلیہ میں اس کائنات کے وجود سے پہلے موجود تھی۔

............☆☆☆............

سطعہ ۲۴

کشف صحیح سے یہ بات جان لی گئی ہے کہ جو شخص بھی اس عالم شہادت میں آتا ہے، اس کی حرکت حرکت (۱) دوری ہوتی ہے۔ (یعنی گھوم پھر کر اسی مقام پر جا پہنچتا ہے جہاں سے چلا تھا) سب سے پہلے اسکا وجود عنایت اولیٰ کے مرتبہ عقل میں مجرد مفارق کی حیثیت سے تھا پھر جب وقت مقررہ آ پہنچا تو وہ (وجود عقلی مجرد مفارق) نشاء خیالیہ کی راہ سے عالم شہادی میں ظہور پذیر ہوا۔ اس کے ظہور کا پہلا درجہ یہ تھا کہ مجرد محض نے اپنے تعین و تشخص کے اعتبار سے اس کی صورت مثالیہ کو عالم مثال قوائے افلاک اور ملاء اعلیٰ میں مرتسم کر دیا چنانچہ کہا جاتا ہے کہ "کتب اللہ ما کان وما ھو کائن "(اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو لکھ دیا جو ہوئی اور جو واقع ہوگی) اسی نقش مرتسم کو الامام المبین یا اللوح المحفوظ کہتے ہیں۔

اس کے بعد وہ فرد عالم مثال کے مختلف اطوار میں سے گزرتا ہے اور عنایت اولیٰ اس کے ظہور کے لیے اسباب ارضی کو مہیا کرنے لگتی ہے۔ یہاں تک کہ وقت مقررہ آ جاتا ہے اور اس کے لیے ایک مادی جسم معین ہو جاتا ہے۔ پھر اجل موعود آ تی ہے۔ اور وہ فرد ایک جسم کی شکل میں عالم مادیات میں ظاہر ہو جاتا ہے۔ یہاں وہ اپنی مقررہ عمر کو مکمل کرتا ہے (عمر کو مکمل کرنے کے بعد اس پر موت عنصری طاری ہو جاتی ہے) اس کی جسمانی صورت شکست و ریخت کا شکار ہو جاتی ہے۔ اس کا ناطہ زمین کے اجزا سے ٹوٹ جاتا ہے اور وہ (اس کا نفس ناطقہ) مادی علاقوں سے قطع تعلق کر کے افلاک کے قوائے ادراک اور ملاء اعلیٰ میں قیام پذیر ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد جن جن منازل سے گزر کر اس نے اس عالم مادیات میں نزول کیا تھا، پھر ان ہی منازل سے گزرتا ہوا صعود شروع کرتا ہے تا آنکہ پھر اسی نقطۂ مجرد تک پہنچ جاتا ہے جہاں سے اس نے سفر کا آغاز کیا تھا۔ اس

مقام پر پہنچ کر وہ تمام تلویثات سے خالی ہو جاتا ہے۔(وہ تمام چھلکے اس کے اوپر سے اتر جائیں گے جو ضرورتاً اس پر چڑھا دیے گئے تھے) اور عقل مفارق یا مجرد محض بن کر عنایت اولیٰ کے بحر ناپیدا کنار میں گم ہو جاتا ہے۔(سفر دوری یا حرکت دوری کا یہی نقشہ حضرت شاہؒ صاحب سمجھانا چاہتے ہیں)۔

---

(۱) جیسا کہ ابتدائی سطعات میں واضح کیا جا چکا ہے، ذات بحت سے وجود کا صدور سب سے پہلے مرتبہ عقل میں ہوا اور مرتبہ عقل کے واسطے سے مرتبہ شخص اکبر میں آیا اور پھر وجود نے تمام منازل طے کیا۔(تفصیلات بیان کی جا چکی ہیں جن کو دہرانے کی ضرورت نہیں ہے)۔حضرت شاہؒ صاحب یہ بتلانا چاہ رہے ہیں کہ جس طرح وجود ''مجرد مفارق'' کی حیثیت سے شروع ہوا تھا پھر اسی طرح اور اسی راستے اس کی واپسی ہوگی۔تا آنکہ ''ذرہ وجود'' پھر لوٹ کر اپنے مرکز یعنی عنایت اولیٰ اور مرتبہ عقل میں واپس آ جائے گا۔اس حرکت کو حرکت دوری کہتے ہیں۔

☆☆☆

سطعہ ۲۵

جب انسان اپنی طبعی موت سے مر جاتا ہے تو روح طبیعی میں سے اتنا حصہ جو اس کی سواری بن سکتا ہے اپنے ساتھ لے جاتا ہے اور عالم برزخ میں اپنے بقیہ علوم و حالات و ملکات کے ساتھ جو اس میں منطبع ہوتے ہیں، باقی رہتا ہے اور یہ اس سوار کی طرح ہوتا ہے جس کا گھوڑا چھن گیا ہو یا اس کاتب کی مانند جس کا ہاتھ کٹ گیا ہو۔ یہ وہی شخص ہے (جو پہلے تھا) اپنی ہیئت اور جملہ اوصاف کے ساتھ، فرق صرف یہ ہے کہ اس کے مادی ہاتھ پاؤں نہیں ہیں۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ اب (یہ شخص) اپنے علمی قویٰ میں ملاء اعلیٰ کی طرف سے آنے والے پسندیدگی اور ناپسندیدگی کے اثرات کو خواب کی طرح دیکھتا ہے۔ اور اس کی قوت متخیلہ میں گوارا اور ناگوار واقعات کی شکلیں متمثل ہوتی رہتی ہیں۔ یہ کبھی کبھی (۱) ایسا بھی ہوتا ہے کہ مثالی قوتوں میں سے بعض قوتوں کا اس پر انکشاف ہوتا ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث میں ہے "ارواح الشهداء في اجواف طير خضر" یعنی شہیدوں کی ارواح سبز پرندوں کے پیٹ میں رہتی ہیں۔

یہ نکتہ جان لینا چاہیے کہ دنیوی حیات میں انسان کے قوائے طبیعہ اپنی جبلت اور فطرت کے مطابق عالم شہادت کی طرف متوجہ رہتے ہیں۔ کیونکہ اس کا نظام معیشت کھانے پینے پر ہی مشتمل ہے۔ لیکن برزخی زندگی میں اس کے قوائے علمیہ کا رخ عالم (۲) مثال کی طرف ہو جاتا ہے۔

غالباً مثال مقید کی طرف۔ کیونکہ وہ قوت خیالیہ ہے اور انسان اپنے ملکات مستقرہ کو اپنی خیالی اور وہمی صورتوں میں دیکھتا ہے اور عالم برزخ کی طبیعت بھی اسی کا تقاضا کرتی ہے۔ لیکن کسی فرد کی خصوصی استعدادات کی بدولت کبھی (اس کی روح کے ساتھ) مثال مطلق کا معاملہ پیش آ جاتا ہے۔ (لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے) پھر ارواح انسانی پر جو ملائکہ سفلیہ متعین ہیں انھیں ملاء اعلیٰ کی

جانب سے الہامات آتے ہیں کہ فلاں مقبور (میت) کے ساتھ لطف وعنایت سے پیش آئیں اور فلاں کے اوپر سختی کریں۔ مقبور اس بات کو محسوس کرتا ہے اور ملائکہ سفلیہ کو مثالی صورتوں میں دیکھتا ہے اور وہ یہ بھی جان رہا ہوتا ہے کہ یہ ملائکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے میرے اوپر مقرر کیے گئے ہیں۔ مختصر یہ کہ وہ اسی خواب کی حالت میں قیامت تک باقی رہے گا۔

---

(۱) یہ اس وقت ہوتا ہے جب کہ عالم مثال کی قوتیں براہ راست مصروف عمل ہو جاتی ہیں یہ کاملین کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔ ان کے سامنے برزخ میں عالم مثال متمثل ہو جاتا ہے۔ اس مقام کو حاصل کرنے کے لیے سالکین بڑی ریاضت کرتے ہیں۔ یہ مقام شہداء کو خود بخود عطا کر دیا جاتا ہے۔ ان کے لیے نہ کوئی حساب ہے اور نہ کتاب وہ سیدھے جنت میں جائیں گے اور اس کی ابتداء یوں ہے کہ روز اول ہی ان کی ارواح جنت کے سبز پرندوں کے پیٹ میں داخل کر دی جاتی ہیں انھیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جنت کی غذائیں مہیا کی جاتی ہیں۔ اور ان کی برزخی زندگی سکون و سرور سے معمور ہوتی ہے۔

(۲) جس طرح خیالی صورتیں ہمارے ذہن میں پائی جاتی ہیں اور مادہ سے منزہ ہونے کے باوجود مادی لواحق مثلاً شکل وصورت، امتداد و پھیلاؤ سے متصف ہوتی ہیں۔ ان کی جہات بھی ہوتی ہیں اور وہ حسی اشارے بھی قبول کرتی ہیں۔ اسی طرح شخص اکبر میں ایک خاص عالم پایا جاتا ہے۔ وہ بھی ان صفات سے موصوف ہے۔ اور مادہ سے منزہ ہونے کے باوجود تمام مادی لواحق سے متصف ہے۔ اس عالم کو عالم مثال کہتے ہیں۔ یہ اتنا وسیع ہے کہ اس وسعت کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اس عالم کے عجائب وغرائب حد شمار سے خارج ہیں۔ شیخ اکبر محی الدینؒ بن عربی نے اس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"سارے جسمانی عالم کی حیثیت عالم مثال میں ایسی ہے جیسے کسی لق دق صحرا میں کوئی چھلا پڑا ہوا ہو، اس عالم کی نہ کوئی حد ہے اور نہ انتہا۔"

جمہور اہل کشف خواہ ان کا تعلق کسی مذہب وملت سے ہو اس عالم کے ثبوت پر متفق ہیں۔

مثال کے دو درجے ہیں (۱) مقید (۲) مطلق مثلاً آفتاب کی روشنی زمین پر مقید ہے کہ کسی

جگہ ہے اور کسی جگہ نہیں ہے۔ لیکن اگر اوپر جائیں تو آفتاب کی روشنی ہر جگہ ہے۔ اول الذکر صورت کو مقید اور ثانی الذکر کو مطلق کہتے ہیں۔ بالکل یہی حال عالم مثال کا ہے۔

عالم مثال میں مختلف درجات ہیں۔ اس کا سب سے نچلا درجہ برزخ ہے۔ حضرت شاہؒ صاحب نے حجۃ اللہ البالغۃ میں عالم برزخ پر گفتگو کرتے ہوئے اسے عالم رؤیا سے تشبیہ دی ہے۔ یعنی جس طرح ایک شخص خواب میں دیکھتا ہے کہ وہ سنسان چٹیل میدان میں ہے، کڑاکے کی دھوپ ہے، سخت لو چل رہی ہے۔ جو اس کے بدن کو جھلسائے دے رہی ہے اس اثنا میں اسے چاروں طرف سے آگ کے شعلے گھیر لیتے ہیں جن سے نجات حاصل کرنے کے لیے وہ بھاگنا چاہتا ہے، لیکن اس کو کوئی راستہ نہیں ملتا۔ آگ کے شعلے اس کے چہرے کے قریب پہنچ کر اسے جھلس دیتے ہیں۔ وہ سخت اذیت محسوس کرتا ہے کہ اس کی آنکھ کھل جاتی اور وہ اپنے آپ کو چارپائی پر لیٹا ہوا پاتا ہے۔ وہ آنکھیں مل کر بار بار دیکھتا ہے لیکن نہ اسے میدان نظر آتا ہے، نہ دھوپ اور نہ آگ کے شعلے۔

حضرت شاہؒ صاحب کے خیال میں یہ میدان، یہ دھوپ، یہ شعلے، خارج سے نہیں آئے ہیں۔ بلکہ یہ ساری چیزیں پہلے ہی سے اس کی قوت متخیلہ میں محفوظ تھیں جو خواب میں متمثل ہوگئیں۔ حضرت شاہؒ صاحب کے نزدیک عالم برزخ میں جو واقعات رونما ہوئے ہوں گے وہ اسی عالم خواب کی طرح ہوں گے۔ فرق صرف یہ ہے کہ خواب میں آدمی واقعات دیکھ کر بہت جلد عالم مادی کی طرف واپس آجاتا ہے۔ لیکن برزخ کی نیند اس قسم کی ہے کہ قیامت سے پہلے آدمی کو جاگنا نصیب نہ ہوگا۔

............☆☆☆............

سطعہ ۲۶

جب دوسری مقررہ مدت (ا) (قیامت) آئے گی، تو عالم مثال میں فرد انسانی جن اطوار واحوال سے گزرتا ہے اس کی ضرورت کے مطابق اس میں قوائے مثالیہ متمکن ہو جاتے ہیں۔اور جو اخلاق واعمال اس کی مادی حیات کے دوران (نتائج کی صورت میں) اس کے اندر محفوظ تھے اب وہ (فرد انسانی) ان تمام چیزوں کا خالص مثالی صورتوں میں مشاہدہ اور ملاء اعلیٰ سے آنے والے استحسان واستہجان کا پوری طرح احساس کرنے لگے گا اور سارے عالم میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو نظام ہدایت وتدبیر جاری وساری ہے اس کے سامنے مثالی صورتوں میں ظاہر ہوگا۔اس عالم میں اکثر انسان ایک ہی طرز پر ادراک کریں گے۔اس لیے کہ سب کی صورت نوعیہ کی بنیاد ایک ہی ہے۔اور اسی طرح قوت مثالیہ کے ظہور کی تدبیر بھی ایک ہی ہے۔اور فرد کے اکثر احکام جو اس کے قوائے نسمہ میں مضمر ہیں (اس وقت) منتشر ہو جائیں گے۔اسی دن کو ''یَوْمَ التَّلَاقِ'' (ملاقات کا دن) کہتے ہیں۔قرآن کریم میں ارشاد ہے۔''رَفِيعُ الدَّرَجَاتِ ذُو الْعَرْشِ يُلْقِي الرُّوحَ مِنْ أَمْرِهِ عَلَىٰ مَن يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ لِيُنذِرَ يَوْمَ التَّلَاقِ يَوْمَ هُم بَارِزُونَ لَا يَخْفَىٰ عَلَى اللَّهِ مِنْهُمْ شَيْءٌ (غافر: ۱۵)

(یعنی وہ بلند ترین صفات کا مالک صاحب عرش ہے، وحی کی باتیں جس پر چاہے اپنے بندوں میں سے نازل کرتا ہے تاکہ وہ لوگوں کو قیامت کے دن سے ڈرائیں جس دن وہ لوگ نکل پڑیں گے اور ان کی کوئی چیز اللہ پر چھپی ہوئی نہ رہے گی)۔

اس عالم میں حساب وکتاب، میزان، حوض، نامۂ اعمال اور پل صراط کا ظہور ہوگا۔اسی عالم میں تجلی اعظم ایسی صورت مثالیہ میں ظاہر ہوگی جو اس کی شایان شان ہوگی اور جس صورت میں کبھی

بھی دنیا میں اس نے ظہور نہیں کیا تھا اور نہ کسی کے خیال و وہم میں آئی تھی اور لوگ اسے واشگاف دیکھیں گے اور حظیرۃ القدس سے (جو تمام بھلائیوں کا منبع ہے) رحمتوں کا نزول ہوگا اور تمام ارتفاقات معاشیہ از قسم کھانا پینا، پہننا اوڑھنا اور تسکین جذبہ جنسی وغیرہ (فرد انسانی کے سامنے) متمثل ہو جائیں گے۔ کیونکہ یہ ساری باتیں صورت انسانیہ کے تقاضوں میں سے ہیں نہ کہ کسی خاص فرد کے۔ وہ لوگ مذکورہ بالا تمام چیزوں میں لذت پائیں گے اور وہ لذت کسی ایسی نیکی کی علامت ہوگی جو اس نے اپنے اندر محفوظ کر رکھی تھی۔ اور وہ ہر چیز میں اپنے اخلاق، عقائد اور اعمال کی قبولیت کو دیکھیں گے۔ قیامت کے دن اکثر افراد بشر اپنے سابقہ بدن کو جس کی اصل محفوظ ہوگی خواہ وہ ریڑھ کی ہڈی کے ریزہ ہی کے برابر کیوں نہ ہو، اپنی سواری بنائیں گے، نہ اس شکل میں جیسی دنیوی حیات میں تھی بلکہ ایسی حالت میں (اپنے بدن کو سواری بنائیں گے) کہ وہ شکل احکام مثالیہ کا آئینہ بن سکے۔

تاکہ موذن کی گردن کا لمبا ہونا، خوش نصیبوں (نیکوکاروں) کے چہرے کا روشن ہونا اور کھانا پینا متشکل ہو سکے۔ یہ ساری چیزیں عالم مثال میں مختلف اطوار سے پیدا ہوں گی۔ کیونکہ عالم کی گردش کی ضرورت کا یہی تقاضا ہے۔ لہٰذا جب عنصری نظام شکست و ریخت کا شکار ہو گیا تو ضروری ہوا کہ فرد انسانی عالم مثال میں داخل ہو اور (اس عالم میں) انسان کے اندر عالم مثال کے تمام احکام پورے طور پر ظہور پذیر ہوں۔

---

(۱) حضرت شاہؒ صاحب نے اس سطعہ میں قیامت اور حشر کے سلسلہ میں چند اصولی بحثیں کی ہیں۔ حشر کے بارے میں حضرت شاہؒ صاحب کا نظریہ (جیسا کہ انھوں نے حجۃ اللہ البالغۃ میں پیش کیا ہے) یہ ہے کہ حشر اجساد کوئی نئی زندگی نہیں ہے۔ بلکہ اسی زندگی کا تکملہ ہے اور ان دونوں میں وہی نسبت ہے جو سبب و مسبب یا علت و معلول میں ہے۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ حیات عنصری اور حیات برزخی میں فرد انسانی جن احوال و اطوار سے گزرا اور جو اعمال و اخلاق اس کے اندر محفوظ تھے، حشر کے دن وہ فرد ان ہی چیزوں کا مختلف قسم کے تمثلات کے ضمن میں ہزار ہا ہزار سال کے بعد مشاہدہ کرے گا۔ سب سے پہلے محاسبۂ اعمال کا مرحلہ پیش آئے گا اور اس مرحلے کا

آسانی سے گزر جانا یا تکلیف کے ساتھ اس میں پھنسے رہنا ہر ایک کے لیے اس کے اپنے اعمال کی نوعیت کے مطابق ہوگا۔ اس کے بعد ہر انسان کے اعمال کی ذرہ ذرہ حقیقت واشگاف ہو کر نظر آ جائے گی۔ اسی تمثل کا نام میزان ہے اور اسی انکشاف کو وزن اعمال کہا گیا ہے۔ اسی موقع پر جنت کثیب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کے مطابق مومنوں کو حق تعالیٰ کی تجلی اعظم کا نظارہ نصیب ہوگا۔ رحمتوں کی بارش ہوگی۔ انسان کی صورت نوعیہ کے تقاضوں کے مطابق کھانا پینا پہننا اوڑھنا اور جذبہ جنسی تسکین کا ظہور بھی تمثلات ہی کے ضمن میں ہوگا۔ انسان کے اپنے اچھے اعمال، لذیذ غذاؤں اور جنت کے تنعمات کی شکل میں اور برے اعمال جہنم کے عذابوں کی صورت میں متشکل ہوں گے۔ اس لیے کہ اس وقت یہ عنصری عالم بکھر چکا ہوگا اور انسانی حیات دوسری منزل یعنی مثالی عالم میں پوری طرح داخل ہو چکی ہوگی۔ اس لیے ضروری ہوگا کہ عالم مثال کے تمام احکام انسان میں پوری طرح ظہور پذیر ہوں۔

............☆☆☆............

سطعہ ۲۷

کاملین کے نفوس جن کے حجر بحت (۱) ان کے وجودوں کے اندر روشن ہیں۔ اس آئینہ کی مانند ہیں جو آفتاب کے سامنے پڑا ہوا ہو اور آفتاب کی صورت بعینہا اس میں منعکس ہو رہی ہو۔ جب تک وہ (کاملین کے نفوس) اس دنیا میں رہتے ہیں اس تجلی کے احکام (۲) کے خادم بنے رہتے ہیں اور اس تجلی سے دواعی (۳) کلیہ ان کے اوپر اس طرح پڑتے ہیں جیسے چنگاریاں اور ان نفوس پر تجلی اس طرح اثر انداز ہوتی ہے جیسے کے شرارے، روئی میں اثر انداز ہوتے ہیں۔ اور ان میں صفات (۴) جزئیہ بروئے کار آجاتی ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلیم حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا "وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِي (۵)" (میں نے تجھے اپنے لیے چن لیا ہے)

جب یہ (نفوس کاملین) جسم کی چادر اتار کر عالم برزخ میں جاتے ہیں، تو آفتاب (تجلی) کی صورت ان کے تمام نفس پر غالب آجاتی ہے۔ چنانچہ آفتاب کی صورت ان کے (حجر بحت میں) اصلی نقطہ کی صورت میں ہوتی ہے۔ اور دیگر نقطے (۶) زائد اجزاء کی طرح ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد یہ نفوس (کاملین) رفتہ رفتہ تجلی اعظم کی طرف کھینچنے لگتے ہیں۔ اور (ان کی شکل بالکل ایسی ہی ہو جاتی ہے کہ) فرع اپنی اصل سے مل گئی اور غیرت کا پردہ علم میں بھی اٹھ گیا اور خارج میں بھی مگر یہ کہ سوئی چاہتی ہے کہ (کپڑے میں داخل ہو کر) غائب ہو جائے لیکن اس کے سوراخ میں جو دھاگہ (۷) پڑا ہوا ہے وہ اسے نہیں چھوڑتا (کہ غائب ہو جائے) یہی حال کاملین کے اعلیٰ نفوس کا ہے۔

اس عالم میں بھی دواعی کلیہ (تجلی کے تقاضے) ان نفوس میں جزئیہ اضافیہ (۸) پیدا کرتے

ہیں۔لیکن جب تک دوسرے نفوس کا تصرف ان کے ساتھ شامل نہ ہو، وہ زمین تک پہنچنے کے قابل نہیں ہوتے اور ان نفوس (۹) کے ماورئی وہاں دوسرے نفوس بھی ہوتے ہیں جو ایک دوسرے کے مقابلے میں کم یا کم تر درجے کے ہوتے ہیں یہاں تک کہ ان نفوس کا درجہ آ جاتا ہے جنھیں ابرار (۱۰) کہتے ہیں۔

جیسے آفتاب (۱۱) کہ آفتاب کی روشنی کہ وہ کبھی زمین پر بے حجاب پڑتی ہے، کبھی بادلوں کے حجاب میں سے گزر کر پڑتی ہے۔اس کے بعد گھر کے صحن میں آتی ہے۔اور وہاں سے گزر کر کمرے کے اندر پہنچتی ہے۔ یہ ہے تفصیل نفوس کاملہ انسانیہ کی اور ان نفوس کاملہ انسانیہ کے علاوہ نفوس افلاک (۱۲) اور عالی قدر ملائکہ مقربین کے نفوس کے جو زیر بحث ہیں جو اس سلسلے میں اسی صفت کے ساتھ سب سے آگے ہوتے ہیں۔ وہ ایک اعتبار سے مستغرق (۱۳) اور فانی اور دوسرے اعتبار سے ہوش مند و باقی ہوتے ہیں۔

اور اسی طرح درجہ بدرجہ آتے ہوئے ملاء اعلیٰ کا مقام آتا ہے جو تدبیر کلی کو عملی جامہ پہنانے کے اعتبار سے نوع انسانی کے لیے وہی حیثیت رکھتے ہیں جو کسی فرد انسانی کی حس مشترک اور قوتِ خیال کو حاصل ہوتی ہے۔اور ان کا نظام اسی جماعت کے ذریعہ قائم ہوتا ہے۔اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا ہے۔

"اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهُ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُوْنَ بِهِ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِيْنَ تَابُوْا وَاتَّبَعُوْا سَبِيْلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ رَبَّنَا وَاَدْخِلْهُمْ جَنّٰتِ عَدْنِ الَّتِيْ وَعَدْتَّهُمْ وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ وَقِهِمُ السَّيِّاٰتِ وَمَنْ تَقِ السَّيِّاٰتِ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمْتَهُ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ"

(المومن: ۷) یعنی اور جو لوگ اٹھائے ہوئے ہیں عرش کو اور وہ جو ان کے گرد ہیں اپنے رب کی تعریف کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور ان لوگوں کے لیے مغفرت طلب کرتے ہیں جو ایماندار ہیں۔ اے ہمارے پروردگار! تیری رحمت اور علم ہر چیز کو شامل ہے پس تو ان لوگوں کو بخش دے جنھوں نے توبہ کی اور تیرے راستے پر چلے اور انھیں جہنم کے عذاب سے محفوظ رکھ۔اے ہمارے پروردگار

ان لوگوں کوان دائمی باغوں میں داخل فرما جن کا تو نے وعدہ کیا ہےاوران کے باپوں، بیویوں اور اولادوں میں سے جو نیکو کار ہوں (ان کو بھی جنت میں داخل فرما) بے شک تو قوت اور حکمت والا ہے۔ اوران کوتو برائیوں سے بچا۔ (کیونکہ) اس دن جن کو تو نے برائیوں سے بچایا ان پر بڑی مہربانی فرمائی اور یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔

---

(۱) حجر بحت سے متعلق تفصیلات گزر چکی ہیں۔ انھیں دوبارہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ حجر بحت میں تجلی کو قبول کرنے کی صلاحیت کا ہونا بے حد ضروری ہے۔ اگر حجر بحت اس قابل ہے کہ تجلی اس میں قائم ہو سکے تو دوسرا مرحلہ یہ ہوگا کہ وہ حرکت کر کے آفتاب تجلی کے بالمقابل آ جائے یا خود آفتاب تجلی اس کے سامنے ہو جائے۔ جونہی ایسا ہوگا حجر بحت میں تجلی کا انعکاس بالکل اسی طرح ہو جائے گا جس طرح آئینے میں آفتاب کا انعکاس ہوا کرتا ہے۔

(۲) جب حجر بحت میں تجلی کا انعکاس ہو جاتا ہےتو جو صورت اس (حجر بحت) میں ظاہر ہوگی وہ دنیا میں اس تجلی کے احکام ہوں گے۔ اور کاملین کے حجر بحت ان احکام کے تابع اور خادم بن جاتے ہیں۔ ان کی نظر سارے ماسوا سے ہٹ کر احکام پر مرتکز ہو جاتی ہےاور کسی دوسری چیز کی طرف ان کا خیال ہی نہیں جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ان کی حیثیت اس تجلی کے سامنے بالکل کاملیت فی ید الغسال (جیسے مردہ نہلانے والے کے ہاتھ میں ہوتا ہے) کی سی ہو جاتی ہے۔ اسی کے حکم اور اشارے پر ان کا چلنا پھرنا اٹھنا، بیٹھنا اور کھانا پینا ہوتا ہے۔ حضرت شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ فرمانا کہ ''جب تک مجھے نہ کہا جائے کہ کھا، میں کھاتا نہیں'' اسی احکام تجلی کے تابع ہونے کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ مختصر یہ کہ فرد کامل بالکلیہ تجلی کے حکم کے تابع بن جاتا ہے۔

(۳) جب تجلی کاملین کے حجر بحت کے بالمقابل آ جاتی ہےتو اس تجلی کے جو تقاضے ہوتے ہیں حضرت شاہؒ صاحب نے انھیں ''دواعی کلیہ'' کا نام دیا ہے۔ جس طرح آگ کی چنگاری روئی کو متاثر کرتی اور اس پر کامل غلبہ حاصل کر لیتی ہے۔ اسی طرح تجلی کے تقاضے کاملین کے حجر بحت پر

غالب آ کر انھیں اپنا تابع بنا لیتے ہیں۔

(۴) جب دواعی کلیہ یعنی تجلی کے تقاضے کاملین کے حجر بحت میں آتے ہیں اس وقت تو وہ کلی ہوتے ہیں۔ لیکن جب وہ حجر بحت میں ضم ہو جاتے ہیں تو جزئی بن جاتے ہیں اور پھر جزئی بن کر کاملین کے نفوس سے نکلتے ہیں۔

(۵) اس آیت کریمہ میں نفس سے مراد تجلی ہے۔ یعنی تجلی کے احکام تیرے ذریعہ بنی اسرائیل میں پھیلیں گے۔

(۶) جسم کی چادر اتار کر عالم برزخ میں جانے کے بعد حجر بحت پر تجلی اعظم کا غلبہ ہو جاتا ہے اور جتنا غلبہ بڑھتا جاتا ہے تجلی اعظم کی طرف سے کشش بڑھتی جاتی ہے۔ اور زائد اجزاء کٹتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ کاملین کے حجر بحت زائد اجزا سے پاک ہو کر اس قابل ہو جاتے ہیں کہ تجلی اعظم کے ساتھ ضم ہو جائیں۔ کیونکہ تجلی اعظم اصل ہے۔ اور یہ حجر بحت اس کی فرع اور ہر فرع اپنی اصل کی طرف بالفطرت رجوع کرنا چاہتی ہے۔

(۷) دھاگہ سے مراد یہاں فرد انسانی کا وجود نسمی ہے۔ یہی نسمہ فرد کامل کے حجر بحت کو تجلی اعظم کا عین بننے سے روکے رہتا ہے۔ حالانکہ حجر بحت (جسے حضرت شاہؒ صاحب نے سوئی سے تشبیہ دیا ہے) کہ یہ شدید خواہش ہے کہ وہ تجلی اعظم کے بحر ناپید کنار میں اپنے وجود کو اسی طرح گم کر ڈالے جس طرح قطرہ دریا میں مل کر دریا بن جایا کرتا ہے۔

قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے
کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے
(غالبؔ)

(۸) ایسی کلی کو جزئی اضافی کہتے ہیں جو اوپر کے لحاظ سے جزئی اور نیچے کے اعتبار سے کلی ہو، جیسے زید ایک جزئی حقیقی ہے انسان اس کی کلی ہے۔ اس کے اوپر حیوان ایک کلی ہے اور انسان اس کے اعتبار سے جزئی اضافی ہے۔ حیوان کے اوپر جسم نامی ایک کلی ہے اور اس کے اعتبار سے حیوان جزئی اضافی ہے۔

(۹) نفوس کاملہ مافوق کے اعتبار سے جزئی اضافی اور ماتحت کے اعتبار سے کلی ہیں اور زمین

پر جزئی اس وقت تک نہیں پہنچتی ہے جب تک کہ اس میں جزئیت خاصہ نہ پائی جائے۔ مثلاً جب تک زید کا وجود نہیں ہوگا اس وقت تک انسان نہیں پایا جائے گا۔ یعنی کلی کے پائے جانے سے قبل جزئی اضافی کا پایا جانا ضروری ہے۔ اسی جزئی میں کلی بھی مضمر ہوتی ہے۔

(۱۰) ابرار انھیں کہتے ہیں جن کے حجر بحت میں تجلی کا نور تو نہیں ہوتا، ہاں اخلاق حسنہ موجود ہوتے ہیں یہ کاملین کا ادنیٰ ترین درجہ ہے۔

(۱۱) آفتاب کی روشنی کے چار درجے ہیں۔ (۱) پہلا درجہ نور بے حجاب کا ہے۔ (۲) دوسرا وہ جو بادلوں کے بیچ سے گزر کر آتا ہے۔ (۳) تیسرا درجہ یہ ہے کہ روشنی مکان کے صحن میں آئی۔ (۴) چوتھا درجہ یہ کہ کمرے کے اندر پہنچ گئی۔

اسی طرح نفوس کاملین کے بھی چار مدارج ہیں۔

(۱۲) جس طرح کاملین کے احجار بحت ہیں اسی طرح نفوس افلاک اور نفوس ملائکہ کے بھی احجار بحت ہیں۔ عرش اعظم کی تجلی پہلے نفوس افلاک کے احجار بحت پر پڑتی ہے پھر ملاء اعلیٰ پر۔

(۱۳) نفوس افلاک وغیرہ ایک اعتبار سے تجلی اعظم میں فنا ہو جاتے ہیں اور ایک اعتبار سے ہوش مند باقی رہتے ہیں۔

............☆☆☆............

سطعہ ۲۸

(کاملین کے نفوس کے) اس اجتماع (۱) کو اصطلاح شرع میں "رفیق اعلیٰ" "ندی اعلیٰ" اور "حظیرۃ القدس" کہتے ہیں۔ ان کا مقام اوپر یا نیچے نہیں ہے بلکہ شخص اکبر (۲) کے صدر (ارادہ کی جگہ) اور اس کے خیال میں ہے (اگر اس اعتبار سے دیکھا جائے تو) اس کا کسی جہت سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ محسوسات میں جو چیز حظیرۃ القدس سے سب سے زیادہ مشابہت رکھتی ہے، وہ ایسی شعاع ہے جو یاقوت کے گرد نظر آتی ہے۔ یا وہ چراغ ہے جو کسی طاق پر رکھا ہوا ہے۔ اگرچہ یہ نفوس بلحاظ مرتبہ ایک دوسرے سے قریب تر ہونے کے اعتبار سے فضیلت رکھتے ہیں۔ لیکن خارج میں ان کی سطح ایک ہی سی ہے۔ جیسے کہ یاقوت اور چراغ کی ایک ہی متصل سطح ہوتی ہے اور یہ بات کشف صحیح سے جانی جا چکی ہے کہ (ان نفوس کاملہ میں سے) جب ایک نفس اوپر چڑھ جاتا ہے تو ضروری ہوتا ہے کہ دوسرے نفس کو اس کی جگہ پر قائم کر دیا جائے تا کہ سطح کا فرق نہ لازم آ جائے۔ یہ ہے وہ نظام جو اللہ تعالیٰ نے معین فرما دیا ہے۔ لہٰذا (عالم مثال میں) ہر وقت تبدیلی جاری ہے۔

---

(۱) شرع میں یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بندوں میں کچھ ایسے فرشتے بھی ہیں جن کے مدارج بلند ہیں اور ان کو بارگاہ ربوبیت میں تقرب حاصل ہے۔ وہ ہر وقت اللہ تعالیٰ سے مومنین صالحین کی فلاح دارین کے لیے دعا کرتے اور نافرمانوں پر لعنت بھیجتے رہتے ہیں۔ ان مقربین بارگاہ (فرشتوں کی جماعت میں وہ انسان بھی شامل ہو جاتے ہیں جن کا مرتبہ بہت اعلیٰ ہوتا ہے۔ مثلاً انبیاء و مرسلین علیہم السلام اور اولیائے عظام کے بعض کامل و اکمل افراد۔ اس مقدس

جماعت کو مختلف ناموں سے پکارا گیا ہے۔ مثلاً ملاء اعلیٰ، الرفیق الاعلیٰ، الندی الاعلیٰ، حظیرۃ القدس وغیرہ وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ان مقربین کا وقتاً فوقتاً اجتماع بھی ہوتا ہے۔ بخاری شریف کی روایت کے مطابق وفات کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی جماعت میں شامل ہونے کی دعاء فرمائی تھی۔ "اللھم الرفیق الاعلیٰ" (اے اللہ مجھے ملاء اعلیٰ میں شامل ہونے کی سعادت عطا فرما) کسی امر کے بارے میں پہلے ملاء اعلیٰ کے مقربین فیصلہ کر لیتے ہیں، تب اس کا الہام نیچے کے فرشتوں کو کیا جاتا ہے۔ جو ملاء اعلیٰ کے فیصلوں کو نافذ کرنے کے لیے اسباب جمع کرتے ہیں۔

(۲) ملاء اعلیٰ یا حظیرۃ القدس کو شخص اکبر کا دماغ کہہ سکتے ہیں۔ حظیرۃ القدس ملاء اعلیٰ ہی کے ایک بلند مقام کا نام ہے۔

............☆☆☆............

سطعہ ۲۹

نفس کامل کی حرکات میں آخری حرکت یہ ہے کہ وہ اس تجلی میں گم ہو جائے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ صورت الٰہیہ جو ان نفوس کی اصل ہے (جس سے سارے نفوس بنتے ہیں) اور جو تمام اجزائے نقاط میں سب سے طاقت ور جز ہے اپنی معنوی وحدت کے اعتبار سے عین تجلی اعظم ہے۔ جیسے کہ آفتاب کی صورت اگر ہزار آئینوں میں ظاہر ہو تو بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ (آفتاب) ایک ہی ہے۔ فرق صرف آئینے آئینے کا ہے۔ کہ ان میں باہمی تمیز ہے اور اس فرق کی اصل اس امر سے ہے کہ نفس کا تعلق مادہ سے قائم ہوتا ہے۔ پہلے یہ مادہ عنصری یعنی گوشت و پوست کا تھا۔ لیکن جب گوشت و پوست کا بدن نفس سے جدا ہو گیا تو وہ نفس بدن نسمی کے ساتھ متعلق ہو گیا اور جب نسمی بدن بھی منتشر ہونے لگا تو جس قدر نسمی بدن منتشر ہوتا گیا نفس اس سے اتنا ہی ہٹتا اور قوت مثالی کے ساتھ وابستہ ہوتا چلا گیا۔

عالم مثال کے کئی طبقے ہیں۔ ان میں سب سے اعلیٰ طبقہ وہ نقطۂ بسیط وحدانی ہے جو سارے شخص اکبر میں جاری و ساری ہے۔ اس جیسا اور کوئی نہیں مادے کی ترقی کا انتہائی نقطۂ ارتقا یہ ہے کہ وہ لطیف سے لطیف تر ہوتا ہوا اس نقطۂ بسیط وحدانی تک پہنچ جائے اور جب وہ (مادہ) نقطۂ بسیط تک پہنچ گیا اور اس کی صورت تجلی اعظم کے آئینہ میں مل کر ایک ہو گئی تو اس کا طویل سفر ختم ہو گیا۔ ”الفقر اذا تمّ هو الله“ (یعنی فقر جب اپنے کمال کو پہنچ گیا تو وہ اللہ ہی ہوتا ہے) اس قول سے یہی مراد ہے۔

............☆☆☆............

سطعہ ۳۰

خوش نصیب نفوس جن کی سعادت کمال مطلق (۱) تک نہ پہنچی ہو ان کے لیے لازم ہوگا کہ سالہا سال تک عرش حقیقت کے گرد چکر کاٹتے رہیں۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے "وَتَرَى الْمَلٰئِكَةَ حَافِّيْنَ حَوْلَ الْعَرْشِ" (الزمر: ۷۵) یعنی تو دیکھتا ہے ملائکہ کو کہ وہ عرش کے گرد چکر کاٹ رہے ہیں۔ اس بات کا احتمال ہے کہ یہ بہت سارے احوال سے گزرنے کے بعد (اس کیفیت کو پہنچیں گے کہ) نور بحت میں گم ہو جائیں۔

نفوس جزئیہ کا معاد (لوٹنے کی جگہ) انسان کی صورت نوعیہ (۲) (امام نوع انسانی) ہے۔ صورت نوعیہ نے مختلف آئینوں میں ظہور کیا اور وہ سب (صورتیں) صورت کے اعتبار سے ایک اور آئینوں کے اعتبار سے مختلف تھیں۔ جب آئینے مختلف احوال واطوار وامثال کے تبدل اور احوال کی نت نئی تبدیلیوں کے بعد ٹوٹ پھوٹ گئے تو (آئینوں کا اختلاف وتعدد اور) نفوس کا تعدد بھی ختم ہو گیا۔

صورت نوعیہ انسانیہ مجردہ حاملین (۳) عرش میں سے ہے اور تجدد امثال واحوال کی تبدیلی کے اعتبار سے اس کا وہی حال ہے جو حاملین عرش کا ہے۔ اور یہ سب بہشت کے طبقات ہیں کہ ان کے بعض بعض سے بلند ہیں لیکن جو بد نصیب نفوس ہیں ان کے اور مبدائے عالم کے درمیان منافرت ہے، اسلئے عالم مثال سے گزرنے کے دوران انھیں انواع واقسام کی پراگندگی اور انتشار سے گزرنا ہوتا ہے۔ وہ عجیب قسم کی کشمکش میں ہوں گے جس کی شرح ایک تفصیل کی محتاج ہے

---

(۱) کمال مطلق اس بات کو کہتے ہیں کہ نفوس کے حجر بحت میں تجلی پوری طرح جاگزیں

ہو جائے۔ غیریت کے پردے اٹھ جائیں اور نفس اپنے حجر بحت کے آئینے میں تجلی اعظم کا مشاہدہ کرنے لگے۔ اگر کسی خوش نصیب کا نفس اس مقام پر پہنچا ہوا نہیں ہوتا ہے تو اسے حاملین عرش ملائکہ کے ساتھ شامل کر کے عرش کا اس سے طواف کراتے ہیں۔ جہان کی نورانیت رفتہ رفتہ اس کے حجر بحت میں سرایت کرتی رہتی ہے اور اس طرح ایک دن اس نفس سعید کا حجر بحت اس قابل ہو جاتا ہے کہ تجلی اعظم میں اپنے وجود کو گم کردے۔ ''وَذٰلِکَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ'' (اور یہی سب سے بڑی کامیابی ہے)۔

(۲) صورت نوعیہ سے مراد ''امام نوع انسانی'' ہے۔ جو صورتیں شخص اکبر میں نفس کلیہ سے فائز ہوئیں۔ ان کا پہلا درجہ متشخصات کا ہے۔ یعنی ایک زید، ایک احمد، ایک کلیم، لیکن ان شخصی صورتوں سے جب اوپر چلتے ہیں تو ایک ایک نوع کی صورت معین ہو جاتی ہے۔ مثلاً آدمی کی ایک نوعی صورت، گھوڑے کی ایک نوعی صورت، آم کی نوعی صورت، انسان کی صورت نوعیہ تمام مادی، نباتاتی اور حیوانی قوتوں کا مجموعہ ہے۔ یعنی وہ سب ارواح کو جامع ہے۔ تجلی اعظم شخص اکبر کے نفس کلی پر پڑتی ہے اور وہاں سے عرش عظیم پر، وہاں سے وہ تجلی ملاء اعلیٰ میں آتی ہے۔ پھر اس کا عکس امام نوع انسانی (صورت نوعیہ) کے قلب میں آتا ہے۔ امام نوع انسانی اور ہماری نسبت اصل وعکس کی ہے۔ ہماری مناسبت اس کے ساتھ تام ہے۔ ہم جس تجلی کا سب سے پہلے ادراک کر سکتے ہیں وہ تجلی ہے جو امام نوع انسانی کے قلب پر پڑتی ہے۔ جب ہمیں کوئی حاجت ہوتی ہے۔ تو ہماری قوت دراکہ صورت نوعیہ سے علم طلب کرتی ہے۔ اور دونوں کے ملنے سے ایک جبلی الہام طبیعت میں فائض ہوتا ہے اور امام نوع انسانی کی طرف سے فیضان شروع ہو جاتا ہے۔

جس طرح امام نوع انسانی افراد انسانی کا اصل اور منبع ہے اسی طرح امام نوع انسانی (صورت نوعیہ) نفوس جزئیہ کا معاد بھی ہے۔ حقیقت (صورت نوعیہ) واحد ہے جس کے جلوے اور عکس مختلف آئینوں (افراد) میں نظر آ رہے ہیں۔ آئینوں کے ٹوٹ جانے کے بعد نفوس کا تعدد ختم ہو گیا اور نفوس جزئیہ اپنی اصل کی طرف لوٹ گئے۔

(۳) امام نوع انسانی حملۃ العرش میں سے ہے۔ وہ لوگ جو کمال مطلق تک نہیں پہنچ سکے ہیں وہ امام نوع میں ضم ہو کر حافین عرش میں شامل ہو جاتے ہیں، یہ بھی ملاء اعلیٰ تک پہنچنے کا ایک

طریقہ ہے۔ انسان میں دو چیزیں اہم ہیں (۱) حجر بحت (۲) نفس ملکی، اگر انسان بذریعہ حجر بحت ترقی کرتا ہے تو وہ تجلی اعظم میں مل جاتا ہے اور اگر نفس ملکی یا نفس ناطقہ کے ذریعہ ترقی کرے گا تو امام نوع انسانی کے ساتھ ضم ہو کر حملۃ العرش کی جماعت میں شامل ہو جائے گا۔ (اول الذکر کو سلوک نبوت اور ثانی الذکر کو سلوک ولایت کہتے ہیں۔ سلوک نبوت میں نظم وضبط اور اتباع شریعت کا غلبہ ہوا کرتا ہے اور ثانی الذکر میں عشق وسرمستی، بے خودی، وخود فراموشی کا۔

............☆☆☆............

سطعہ ۳۱

آؤ تمہارے سامنے ایک مثال بیان کریں جس سے بہت سے دقیق علوم کا دروازہ کھل جائے گا۔(اور بہت سے اہم مسائل حل ہو جائیں گے) بادشاہ عالم کا ارادہ ہوا کہ وہ ایک جشن برپا کرے جس میں لباس فاخرہ اور جواہرات نفیسہ زیب تن کر کے اپنے حسن و جمال (۱) کی (نمائش کی جائے) اپنے لشکریوں بلکہ (بہ الفاظ دیگر) اپنا حسن و جمال اپنے آپ کو دکھائے، اس نے اپنے قلمرو میں واقع ہونے والے تمام شہروں میں احکام بھیجے کہ جہاں کہیں بھی تلوں کے بونے کے قابل زمین پائیں وہاں تلوں کی کاشت کریں اور جس جگہ چہار مغز بونے کے قابل زمین ہو وہاں چہار مغز بوئیں، جہاں بھی موم پائیں بحق سرکار ضبط کر لیں، جہاں اچھی چربی پائیں خرید لیں، جب یہ حکم اطراف ممالک میں پہنچا تو تمام شہروں کے حاکم (بادشاہ کی ہدایات کے بموجب) تلاش و جستجو میں لگ گئے۔ چنانچہ انھوں نے جس زمین کو تلوں اور چہار مغز کی کاشت کے قابل پایا، اسے بادشاہ کے لیے قرق کر لیا اور اس زمین کی اس انداز میں دیکھ بھال شروع کر دی جو بادشاہوں کے علاوہ کسی دوسرے شخص کی زمین کے ساتھ نہیں ہوتی ہے۔ ماہر کاشت کار اور موٹے تازے بیل لائے گئے اور دریا سے نہر نکالی گئی جو پانی سے لبریز تھی۔

یہ جماعت تمام تر بہتر انتظامات کے ساتھ زراعت میں لگ گئی، جب تلوں کا کھیت تیار ہو گیا اور چہار مغز کے باغ مرتب ہو گئے تو ان جگہوں کی برتری جہاں تل اور چہار مغز بوئے گئے تھے، دوسری جگہوں پر ظاہر ہو گئی اور خاص و عام کی زبان پر یہ کلمہ گردش کرنے لگا کہ بادشاہ کا کھیت اور باغ ایسا ہی ہونا چاہیے۔ اس حالت میں "لولاک (۲) لما خلقت الافلاک" کا خطاب اس باغ اور اس کھیت کی طرف تھا جب تلوں کی فصل کاٹنے اور (درختوں سے) چہار مغز

اتار لینے کا وقت آیا تو وہ کھیت اور باغ نگاہوں میں بے وقعت قرار پائے اور اب " لولاک لما خلقت الافلاک " کا خطاب تلوں (۳) کے دانوں اور چہار مغز کے کھلیان کی طرف ہو گیا۔ اس کے بعد اس کو (تلوں اور چہار مغز کو) تیلی کے حوالے کر دیا گیا اس ماہر روغن کش نے تلوں کے ان دانوں کو ہر ناپسندیدہ چیز سے جو ان کے ساتھ شامل تھی الگ کر دیا اور پھر ان دانوں کو کوٹا اور ان کا خالص مغز نکال کر کولہو میں ڈال دیا اور پھر اس مغز سے خالص تیل نکالا اور جو چیز مطلوب نہیں تھی اسے نظر انداز کر دیا۔

چنانچہ "لولاک لما خلقت الافلاک" کا خطاب اس روغن خالص کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس کے بعد اس روغن کش نے وہ تیل (شاہی) مشعلچی کے حوالہ کر دیا، مشعلچی نے دوسری بہت ساری تدبیریں کر کے اسے قابل استعمال بنایا اور چیتھڑے کو اس روغن میں تر کر دیا اور پھر تیل میں بھیگے ہوئے چیتھڑے سے مشعل جلائی اور آگ کو اس مشعل پر مسلط کر دیا آہستہ آہستہ وہ روغن آگ میں تبدیل ہو گیا اور اس کے شعلوں سے عجیب وغریب روشنی ظاہر ہوئی اور دوسرے افسران (اس عرصہ میں) موم کو اکٹھا کرنے میں لگے رہے اور جہاں کہیں بھی شہد کی مکھی کے چھتے پائے انھیں قبضے میں لے لیا اور اس سے خالص موم نکال لی اور افسران کی دوسری جماعت حیوانات کی چربی کی خریداری میں مصروف رہی اور ان لوگوں نے مختلف قسم کی بہترین چربی اور موم بادشاہ کے مشعلچی کے حوالے کی اور مشعلچیوں کی جماعت نے عجیب وغریب تدبیروں کے ذریعہ ان کو مدبر کر کے مختلف قسموں کی شمعیں تیار کیں اور انھیں بادشاہ کی مجلس میں روشن کیا۔ گزشتہ سارے اعمال وحرکات کا مقصد اصل بادشاہ کی محفل کو روشن کرنا تھا اس کے سوا اور کوئی دوسرا مقصد نہیں تھا بلکہ اگر سچ پوچھو تو بادشاہ کے دل کی خوشی اور اس کے حسن وجمال کی نمائش مطلوب تھی۔ اس کے علاوہ کوئی دوسرا مقصد نہیں تھا۔ یہ پے بہ پے بدلنے والے حالات سوائے اس کے اور کچھ نہیں تھے کہ نقطہ (۴) حبیّہ کو ایک حال سے دوسرے حال میں منتقل کرنے کے ذرائع تھے اور نقطۂ حبیّہ ایک حال سے دوسرے حال میں منتقل ہوتے ہوتے روشنی تک پہنچا لیکن جہاں کہیں بھی وہ نقطۂ حبیّہ پہنچتا تھا "لولاک لما خلقت الافلاک" کا خطاب سنتا تھا، اور جہاں کہیں بھی وہ ہوتا فرق کرنے والے حکام ان کے ساتھ ہوتے اور ہر صنعت کے ماہر کے لیے ضروری ہوتا کہ وہ اس نقطہ حبیہ کی

تعظیم کرے، صورت و آثار میں ایک قسم کی برتری اور ایک نوع کا حسن ہمیشہ اس کے ساتھ رہتا ہے۔

---

(۱) ''کنت کنزا مخفیا فاردت ان اعرف فخلقت الخلق'' (یعنی میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا۔ میں نے چاہا کہ مجھے پہچانا جائے تو میں نے کائنات کو پیدا کیا) مشہور تو یہ ہے کہ یہ ایک حدیث قدسی ہے۔ لیکن غالباً یہ کسی عارف کا قول ہے۔ حدیث نہیں ہے۔ مفہوم کے اعتبار سے یہ بات بالکل درست ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ حسن کامل تھا اور ہر حسن اپنی نمائش چاہتا ہے۔ لہٰذا اس نے اس وسیع وعریض کائنات کو پیدا کیا جس کا گوشہ گوشہ حسن ورعنائی کا مرقع ہے۔ یہ در حقیقت ایک آئینہ ہے جس میں حسن ازل اپنا عکس دیکھتا ہے۔ کائنات کی ساری رنگارنگی اور بوقلمونی اسی حسن کامل واکمل کا ظہور ہے۔

(۲) ترجمہ: اگر تجھے پیدا کرنا نہ ہوتا تو میں آسمانوں کو پیدا نہ کرتا۔

(۳) تمام انبیاء کے ماننے والے اس بات کے مدعی ہیں کہ ان کا نبی ہی باعث تخلیق کائنات ہے، حضرت شاہؒ صاحب نے اس سطعہ میں اس پیچیدہ مسئلے کا حل ایک لطیف تمثیل کے ذریعہ پیش کیا ہے۔ اگر اس تمثیل پر تعصب اور ہٹ دھرمی کی عینک اتار کر غور کیا جائے تو مسئلہ بالکل صاف ہو جاتا ہے کہ اپنے اپنے دور میں ہر نبی اس لائق تھا کہ اسے ''لو لاک لما خلقت الافلاک'' کے خطاب سے نوازا جاتا لیکن قافلہ انسانیت کسی ایک مرحلے پر تو رکنے والا نہیں تھا۔ خوب سے خوب تر کی تخلیق جاری رہی، تا آنکہ وہ تشریف لایا جو مزرع ہستی کا حاصل اور دیدۂ امکان کا نور تھا، صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم۔

(۴) نقطۂ حبیہ سے مراد وہ حقیقت کبریٰ ہے جو مختلف ادوار وتبدلات سے گزری اور ہمیشہ ترقی یافتہ شیء کے ساتھ رہی۔ لہٰذا جو شخص بھی اس نقطۂ حبیہ کا مالک رہا اس کے متعلق کہا جاتا رہا کہ ''ولولاک لما خلقت الافلاک''۔

..........☆☆☆..........

سطعہ ۳۲

جب کوئی کامل عالم مجرد سے شخص اکبر (عالم وجود) میں آتا ہے اور مختلف ادوار واطوار میں سفر شروع کرتا ہے تاکہ اس کھڑکی تک پہنچ جائے جہاں سے وہ آیا ہے تو آغاز سفر ہی میں نقطۂ حبیہ اس میں پیوست ہو جاتا ہے کیونکہ حظیرۃ القدس کے ایک خاص مقام پر اس کا قیام اور وہ سارے کارہائے عظیم جو اس کے ذریعہ انجام پانے والے اور دنیا میں ہمیشہ باقی رہنے والے ہیں سب کے سب مطلوب ہیں اور یہ سب کچھ نظام کلی میں داخل ہیں اور عنایت اولیٰ ان کے ساتھ شامل ہے۔ چنانچہ ان ادوار واطوار کے سفر میں پہلا قدم اٹھاتے ہی وہ تمام نشاٗتیں (۱) جو اس میں داخل ہونے والی ہوتی ہیں عالم ملکوت میں مشخ ہوگئیں اور واضح ہوگیا کہ وہ فلاں حالت تخلیقیہ میں فلاں صفت سے متصف ہوگا اور فلاں حالت میں فلاں صفت سے اور وہ تمام امور معدہ (۲) جو کسی تخلیقی مرحلہ میں اس کے وجود خارجی کے سبب بننے والے ہوتے ہیں اسی جگہ پیدا ہو جاتے ہیں اور وہ استعداد جو اس حالت تخلیق میں اس کے لیے ضروری ہے (اسی حالت میں) وہ اس سے متصف ہو جاتا ہے تاکہ اس میں دوسرے دورۂ تخلیق میں مرتبہ کمال حاصل کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ یہ تمام امور عالم ملکوت ہی میں شکل پذیر ہوگئے۔ اس کا اقتضا اس نقطۂ حبیہ نے کیا۔ اس کی مثال سابقہ تمثیل میں آچکی ہے۔ یعنی یہ کہ تل کا دانہ ابھی ہرا ہی تھا کہ ماہر کاشت کار جانتا ہے کہ بعض قوائے عاملہ اس دور تخلیق میں اس کے لیے مفید ہوں گے۔ تاکہ تل پوری طرح سیراب ہو اور اس میں تیل وافر مقدار جمع ہو جائے۔ ایسے ہی (وہ ماہر کاشت کار یہ بھی جانتا ہے کہ) چند عوامل اس کے برعکس ہوں گے (یعنی ان دانوں کو نقصان پہنچانے والے ہوں گے) لہٰذا وہ ایسی تدابیر اختیار کرتا ہے کہ تل کی ویسی ہی فصل تیار ہو جیسی کہ مطلوب ہے۔ بالکل اسی طرح تدبیر الٰہی اس

کامل کے حق میں وہی تقریبات وحالات اور وہی قوائے عملیہ افاضہ فرماتی ہے جو اس کو (کامل کو) مطلوب تک پہنچا دیں۔ ''کنت نبیا و آدم منجدل بین الماء والطین'' (مسند احمد، تاریخ، بخاری مستدرک) (یعنی میں اس وقت نبی تھا جب آدم (علیہ السلام) کا خمیر تیار (ہورہا) اس روایت میں رویت آدم علیہ السلام کی اسی تخلیقی حالت کی طرف اشارہ ہے اور جب نقطۂ حبیہ تخلیق انسانی کی منزل میں داخل ہوا تو وہ وسائل جو بچے کی بہتر تخلیق وتربیت کے لیے مد ہیں مثلاً والدین کے حالات کا بہتر ہونا وغیرہ وغیرہ حکمت الٰہی کو منظور ہوئے اور وہ بات جو اہل سیر لکھتے ہیں کہ نور محمدی (صلی اللہ علیہ وسلم) حضرت آدم علیہ السلام کی پیشانی میں تھا، پھر حضرت شیث علیہ السلام کی پیشانی میں آیا، پھر فلاں فلاں حضرات کی پیشانیوں میں منتقل ہوتا رہا تا آنکہ حضرت عبدالمطلب اور حضرت عبداللہ کی پیشانی میں آیا۔ بالکل درست ہے اور وہ جو احادیث میں وارد ہے ''انا ابن العواتک'' (میں شریف عورتوں کا بیٹا ہوں) یا یہ کہ ''ما کان الناس فرقتین الاجعلنی اللہ فی فضلهما'' (اللہ تعالیٰ نے نوع انسانی میں کوئی بھی ایسے دو فرقے نہیں بنائے جن کے افضل میں میں نہیں تھا) اور یہ حدیث کہ ''ان اللہ اصطفیٰ العرب و اصطفیٰ مضر و اصطفیٰ کنانة و اصطفیٰ قریشا من بنی کنانة'' (دلائل النبوۃ) (یعنی اللہ تعالیٰ نے عربوں کو منتخب فرمایا اور عربوں میں سے مضر کو منتخب کیا اور مضر میں سے کنانہ کو اور کنانہ میں سے قریش کو منتخب فرمایا)

یہ سب کچھ انہی حقیقتوں کی طرف اشارہ ہے جب اس کامل نے (خلاصہ) کائنات سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم لباس بشریت زیب تن فرمایا اور صورت انسانی میں جلوہ افروز ہوا اور انواع واقسام کی برکتین اور غیبی امور کی اطلاعات ظاہر ہونے لگیں تو یہ امور روحانی ان میں روز بروز بڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ ان کے مقام نبوت پر فائز ہوجانے سے مطلوب صورت پذیر ہوا۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی وہ نقطۂ حبیہ آپ ﷺ کے برگزیدہ خلفا کی طرف منتقل ہوا اور ان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے وعدے پورے ہوئے، ان کے بعد (خلفائے راشدین کے بعد یہ نقطۂ حبیہ عالم برزخ کی جانب منتقل ہوگیا۔ اور وہاں جاکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روح پرفتوح رفیق اعلیٰ سے مل گئی اور اس روح مبارک کو رفیق اعلیٰ (ملاء اعلیٰ) کی سیادت نصیب ہوگئی۔ (اور یہی نقطۂ

حبیہ) حشر کے دن شفاعت کبریٰ کے ظہور کا سبب بنے گا۔ (سچ پوچھو تو یہ معاملہ ہر کامل فرد کے ساتھ کیا جاتا ہے لیکن نقطۂ حبیہ کا ظہور ہر کامل سے اس کے حجرِ بخت کی چمک اور اس امر کے مطابق ہوتا ہے کہ اس سے کتنے کارہائے عظیم انجام پائیں گے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ''اللہ اعلم حیث یجعل رسالته'' (الانعام: ۱۲۴) اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ اپنی پیغامبری کی ذمہ داری کس پر ڈالے)۔

---

(۱) **نشأة**: وجود کی تقسیم اور اس کے مرتبہ میں اس کے ایک خاص مقام پر جو کیفیت ہوتی ہے اسے موطن کہتے ہیں۔ اور اس موطن کی خاص پیداوار اور ترقی کو نشأۃ کہتے ہیں۔

(۲) **معدہ**: اگر ایک چیز فنا ہو کر دوسری طاقت پیدا کر دے تو فنا ہونے والی چیز کو معدہ کہتے ہیں۔ جیسے دانہ فنا ہو جاتا ہے تو پودا پیدا ہوتا ہے ایسی صورت میں دانہ کو معدہ کہیں گے۔

............☆☆☆............

سطعہ ۳۳

کشف صحیح سے یہ بات ثابت ہے کہ سیر وسلوک کا اس کے سوا کوئی اور سبب نہیں ہے کہ ارادۂ الٰہی (۱) میں یہ بات آ جاتی ہے کہ فلاں شخص حظیرۃ القدس کے فلاں مقام کی سطح تک پہنچے گا۔ جب یہ ارادہ قائم ہو گیا تو پھر اس شخص کو مختلف احوال سے گزارا جاتا ہے۔ اور معدات میں اس انداز سے تصرف کیا جاتا ہے کہ (وہ شخص) حظیرۃ القدس کی مطلوبہ سطح تک (خود بخود) منتقل ہوتا جائے۔ ان تغیرات میں اس شخص کے قصد وارادہ کو کوئی دخل نہیں ہوا کرتا۔ بعض اشخاص کو البتہ الہام کر دیا جاتا ہے تا کہ وہ ان عبادات وریاضت بدنیہ ونفسانیہ کو اختیار کریں اور اس مقام بلند کے لائق ہو جائیں۔ ''وَيَتَّخِذَ مِنكُمْ شُهَدَآءَ'' (آل عمران: ۱۴۰) (یعنی اللہ تم میں سے بعض کو گواہ بنا لیتا ہے) کے یہی معنی ہیں اور آیت ''وَيُحِبُّهُمْ (۲) وَيُحِبُّونَهُ'' میں يُحِبُّهُمْ کو يُحِبُّونَهُ پر مقدم کرنے میں یہی راز مضمر ہے۔ اور بعض حالات میں جب کہ نفس پہلے ہی سے مزکیٰ ہوتا ہے اور جس درجہ پر اسے پہنچانا مقصود ہوتا ہے۔ وہ اس کا اہل ہوتا ہے۔ تو اسے نور ایمانی سے یا بذریعہ خواب مطلع کر دیا جاتا ہے۔ ''لَهُمُ الْبُشْرَىٰ فِي الْحَيَوٰةِ الدُّنْيَا'' (یونس: ۶۴) (ان کے لیے دنیوی زندگی ہی میں خوش خبری ہے) کا یہی مطلب ہے۔

اور بعض حالات میں اللہ تعالیٰ شوق اور طریق کے سلوک کا اس کے دل میں الہام فرما دیتے ہیں (جیسا کہ حدیث میں ہے) ہر آدمی کو اسی بات کی توفیق دی جاتی ہے جس کے لیے اسے پیدا کیا گیا ہے۔

اکثر اشخاص چونکہ اس موطن کو جہاں انھیں لے جایا جا رہا ہے اور اس تدبیر الٰہی کو جو الہام کا سبب بنی ہے، نہیں جانتے اس لیے وہ اس خیال خام میں مبتلا رہتے ہیں کہ انھوں نے اپنی کوشش

سے منازل سلوک طے کیے اور اپنے سلوک کی بدولت منزل مقصود پر پہنچے۔

---

(۱) حضرت شاہؒ صاحب نے سیر و سلوک کے طے کرنے کا صرف ایک سبب متعین فرمایا ہے اور وہ ہے ارادۂ الٰہی یعنی ارادۂ الٰہی میں سب سے پہلے یہ بات متعین ہو جاتی ہے کہ فلاں شخص سیر و سلوک کے ذریعہ حظیرۃ القدس کے فلاں مقام تک رسائی حاصل کرے گا۔ اس کے بعد مندرجہ ذیل چار صورتیں ہوتی ہیں۔

(۲) اس شخص کو تدبیر الٰہی کے ذریعہ بلا شخص مذکور کے قصد و ارادہ کے منزل مقصود تک پہنچا دیا جاتا ہے۔

(۲) بعض حضرات کو الہام کر دیا جاتا ہے کہ آپ فلاں فلاں ریاضتیں کریں اور وہ ان ریاضتوں میں مشغول ہو کر ان بلند مقامات کے اہل بن جاتے ہیں۔

(۳) بعض نفوس بالفطرت مزکّی ہوتے ہیں اور ان میں فطری صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ اس لیے انھیں یا تو فراست ایمانی کے ذریعہ یا بذریعہ خواب ان مقامات بلند کی اطلاع دے دی جاتی ہے جن پر انھیں فائز کرنا مقصود ہوتا ہے۔

(۴) اور بعض لوگوں کے دل میں عشق کی آگ بھڑکا دی جاتی ہے اور وہ سیر و سلوک کے منازل کو اپنے جذبۂ قلبی کی حرارت سے خود بخود طے کرنے لگتے ہیں۔

(۵) یحبهم اللہ تعالیٰ ان سے محبت کرتا ہے ویحبونه اور وہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ اس آیت میں یحبهم کو اس لیے مقدم کیا کہ ارادۂ الٰہی پہلے منعقد ہوا۔ اس کے بعد شعلۂ عشق، عاشق کے دل میں پیدا ہوا۔ اس آیت سے حضرت شاہؒ صاحب نے ارادۂ الٰہی کے تقدم کو ثابت قدم فرمایا ہے۔

............☆☆☆............

سطعہ ۳۴

(صوفیوں کی) ایک جماعت کا خیال ہے کہ وصول الی اللہ جو سارے سیر وسلوک کی غرض اصلی ہے سوائے تصحیح خیال کے اور کچھ نہیں ہے (ان کی رائے میں) اصلی مطلوب معرفت خداوندی ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں اور معرفت کی راہ خیال کو ماسوا سے پاک کیے بغیر طے نہیں ہو سکتی۔ اگر راہ طریقت میں کوئی ریاضت کی جاتی ہے تو صرف اس لیے کہ تصحیح خیال بغیر اس کے حاصل نہیں ہو سکتی ہے۔ کہ انسان کم کھائے، لوگوں سے کم میل جول رکھے اور کم سوئے۔

اور اس فقیر (شاہ ولی اللہؒ) کے نزدیک (۱) (سارے سیر وسلوک کا) مقصد یہ ہے کہ حظیرۃ القدس کی سطح کے اس جز تک وصول ہو جائے جو اس (سالک) کے لیے مقرر ہو چکا ہے۔ اور اس منزل پر پہنچنے کے لیے انسان کے بہیمی اوصاف میں تغیر ہونا ضروری ہے تاکہ ظلماتی وجود فنا ہو جائے اور وجود روحانی کے ساتھ بقا حاصل ہو جائے اور اگر کوئی شخص خواص اولیاء اللہ میں سے ہے تو اس (مذکورہ بالا) تغیر کے بعد بھی ایک تغیر اس کے لیے ضروری ہے وہ یہ کہ اس کا وجود روحانی بھی فنا ہو جائے اور اسے حقیقت (۲) لاہوت کے ساتھ اتصال حاصل ہو جائے۔

حقیقت لاہوت کے ساتھ اتصال کا مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ (۳) کی ہستی کا تیری ہستی پر غلبہ ہو جائے اور چونکہ نفس ناطقہ علمی (۴) اور عملی دونوں قسم کے قوئی رکھتا ہے اس لیے اذکار و مراقبات اور تجرید خیال بھی سلوک کی ایک شرط قرار پائے کیونکہ مقصود کا ایک جز اس پر بھی موقوف ہے۔ سیر وسلوک کی مثال (۵) ایسی ہے جیسے کہ برف کے نیچے آگ روشن کر دیں۔ یہاں تک کہ برف پگھل کر پانی بن گئی۔ پھر پانی بھاپ بن گیا۔

(۱) حضرت شاہؒ صاحب کے نزدیک محض تجرید خیال کافی نہیں ہے بلکہ اصل چیز یہ ہے کہ بہیمیت پر ملکیت کو غلبہ حاصل ہو جائے۔ انسان ان دونوں قوتوں کا جامع ہے۔ ملکیت اور بہیمیت کی جبلتوں میں شدید اختلاف ہے۔ انسان کے اندر ان دونوں قوتوں کا تصادم ہوتا رہتا ہے اور تصادم کے وقت ہر قوت یہ چاہتی ہے کہ اس کے سارے تقاضے پورے ہوں۔ اس کشمکش کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جس قوت کو غلبہ حاصل ہو جاتا ہے دوسری مد مقابل قوت کمزور پڑ جاتی ہے۔ حضرت شاہؒ صاحب فرماتے ہیں کہ اصل کام یہ ہے کہ بہیمی قوتوں کو توڑ دیا جائے تا کہ انسان کا ظلماتی وجود فنا ہو جائے اور وجود روحانی حظیرۃ القدس کی سطح تک پہنچ سکے۔

(۲) حقیقت لاہوت سے مراد تجلی اعظم ہے۔

(۳) یعنی انسان کے تمام قوائے عملی وفکری اللہ تعالیٰ کی مرضی کے ماتحت ہو جائیں وہ اسی کی مرضی کے مطابق سوچے اسی کی آنکھ سے دیکھے، اسی کے کان سے سنے، اسی کی زبان سے بولے اور اسی کے ہاتھ سے پکڑے" یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيهِمْ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى" وغیرہ وغیرہ اسی کی مثالیں ہیں۔ مولانا روم نے فرمایا ہے:

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود
گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

(۴) نفس ناطقہ کی علمی قوت کی تکمیل کے لیے تجرید خیال ضروری ہے۔ اور عملی قوت کی ترقی کے لیے ریاضت شاقہ تا کہ نفس مہذب ہو جائے اور سیر و سلوک کی قوت حاصل ہو۔

(۵) کثافت سے لطافت کی طرف اور لطیف سے لطیف تر، کی جانب سفر تا کہ اخلاق کے رذائل فضائل میں بدل جائیں اور انسان حظیرۃ القدس کی محفل میں شریک ہونے کے قابل ہو جائے۔

............☆☆☆............

سطعہ ۳۵

افراد انسان میں سے کبھی کبھی کوئی شخص بظاہر ان اوصاف سے متصف ہوتا ہے جن کے باعث دنیوی زندگی میں وجاہت حاصل ہوتی ہے۔ مثلاً وہ خوبصورت ہے، فصیح ہے، بہادر اور قوی ہے، کمائی بہت کرتا ہے، خوش نصیب ہے، جاہ و حشم والا ہے۔ اس کے خدام بہت ہیں۔ اس کی بات مانی جاتی ہے، صاحب مال و اولاد ہے۔ لیکن جب اس نے مادی دنیا سے عالم برزخ کی طرف سفر کیا تو اس کے پلے کچھ نہیں رہ گیا۔ وہ ایک بدحال مفلس کی طرح ہو گیا۔ کیونکہ "اِنَّ اللّٰهَ لَا یَنْظُرُ اِلٰی صُوَرِکُمْ وَاَمْوَالِکُمْ فَاِنَّمَا یَنْظُرُ اِلٰی نِیَّاتِکُمْ وَاَعْمَالِکُمْ" (الحدیث) (بے شک اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں اور مالوں کی طرف نہیں دیکھتا ہے بلکہ وہ تمہاری نیتوں اور اعمال کی طرف دیکھے گا) اسی طرح اللہ کے بندوں میں سے کوئی ایسا شخص ہوتا ہے جس سے ولایت کے آثار ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ آنے والے امور اس کے سامنے منکشف ہو جاتے ہیں یا سالکین کے قلوب پر اس کی توجہ کا اثر پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی دوسری خصوصیات اسے حاصل رہتی ہیں اور لوگ اس ولی کو اس دوسرے ولی کے مقابلے میں افضل جانتے ہیں جس میں مذکورہ بالا خصوصیات نہیں پائی جاتی ہیں۔ جب یہ دونوں حظیرۃ القدس کی اس سطح پر پہنچتے ہیں جو ان کے نصیب میں ہوتی ہے۔ تو یہ مفضول صاحب فضیلت قرار پاتا ہے۔ اور وہ افضل گھٹیا درجے کا ولی ثابت ہوتا ہے۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی شخص مراقبات کے ذریعہ اپنی قوت خیالیہ کو درست کر لیتا ہے۔ لیکن اپنی قوت عملیہ کو درست نہیں کر پاتا ہے (جس کے نتیجے میں) نہ اس کی قوت سبعیہ اتنی ٹوٹی ہوئی ہوتی ہے (جتنی کہ مطلوب ہے) اور نہ اس کی قوت بہیمیہ پوری طرح مغلوب ہو چکی ہوتی ہے۔ جب (یہ دونوں) شخص حظیرۃ القدس کی سطح پر پہنچتے ہیں تو ان کا آدھا

چہرہ انھیں خوبصورت نظر آتا ہے اور آدھا بدنما، (ایسے ہی لوگوں کے بارے میں قرآن حکیم میں ارشاد ہے) "خَلَطُوْا عَمَلاً صَالِحاً وَّآخَرَ سَيِّئاً" (توبہ: ۱۰۲) (انھوں نے نیک عمل اور دوسرے برے اعمال کو آپس میں خلط ملط کر دیا ہے) لہٰذا سیر و سلوک میں ایسے شخص کو اپنا مرشد بنانا چاہیے جو حظیرۃ القدس سے واقف ہو نہ کہ ایسے شخص کو جس سے زیادہ کشف و کرامات دیکھنے میں آئی ہوں۔

............☆☆☆............

سطعہ نمبر ۳۶

تجلی (۱) سے مراد وہ مخلوق ہے جو خالق کی محاکات اس کے بعض اوصاف کے مطابق کرے اور اس کے سبب سے بعض امور کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی جا سکے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جب کوئی شخص اللہ تعالیٰ کو خواب میں ایک بادشاہ کی شکل میں سر پر تاج رکھے اور تخت پر بیٹھے ہوئے دیکھتا ہے تو وہ شکل بے شک و بلاشبہ مخلوق ہے۔ جس کا مادۂ تخلیق وہ علوم ہیں جو دیکھنے والے کے ذہن میں (پہلے ہی سے) پوشیدہ تھے اور اس تخلیق کا محل دیکھنے والے کی قوت خیال ہے۔ اور یہ صورت ان تعلقات کی بنا پر جو خوابوں کی تعبیر کے علم میں معتبر ہیں۔ مالکیت، بادشاہت اور قوت تصرف پر دلالت کرتی ہے۔ اور (مذکورہ بالا صفات) حق تعالیٰ کی صفات ہیں اور شرع کی زبان نیز عرف عام میں کہا جا سکتا ہے کہ میں نے خدا تعالیٰ کو خواب میں دیکھا یا خدا تعالیٰ نے ایسے ایسے فرمایا۔

پس یہ صورت مخلوق ہے جو خالق (۲) کی ذات کے کشف کا ذریعہ ہے اس کے بعض اوصاف کے لحاظ سے اسی بنا پر خالق کی رویت اور امر و نہی اس صورت کی طرف منسوب ہے۔

اور اگر (وہ صورت) خالق کے بعض اوصاف کے کشف کا ذریعہ نہ ہوتی تو اسے تجلی نہ کہتے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص خواب میں کوئی پتھر یا درخت دیکھے (اور وہ پتھر یا درخت) خالق کے بعض اوصاف کا کشف نہ کریں جیسا کہ اکثر عوام کے خوابوں میں ہوا کرتا ہے تو اسے تجلی نہیں کہتے۔ (اسی طرح) اگر کوئی فرشتہ یا کسی ولی کی روح خارج میں یا خواب میں حق تعالیٰ کی بعض صفات کا کشف تو کرے لیکن اس کا فعل حق تعالیٰ کی طرف منسوب نہ ہو تو اسے بھی تجلی نہیں کہا جائے گا۔

تجلی ان معنوں میں ایک حقیقی شیٔ ہے جس کا ثبوت شرع میں موجود ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا "فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ" (الاعراف: ۱۴۳) (جب موسیٰ علیہ السلام کے رب نے پہاڑ پر تجلی ڈالی) یہ تجلی ویسی ہی تھی جیسی کہ اس سے پہلے درخت پر تھی۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میں نے اپنے رب کو بہترین صورت میں دیکھا" ان کے علاوہ عالم معاد سے تعلق رکھنے والی احادیث میں بہت سی ایسی چیزیں ہیں جو تجلی پر دلالت کرتی ہیں۔

---

(۱) تجلی دراصل مخلوق ہے لیکن وہ خالق کا آئینہ بن جاتی ہے۔ جس میں دیکھنے سے آئینہ تو رفتہ رفتہ گم ہو جاتا ہے، خالق ہی خالق نظر آنے لگتا ہے۔ جس جگہ پر تجلی کا ظہور ہوتا ہے اسے مظہر کہتے ہیں۔ مظہر اور ظاہر کے فرق کو نہ سمجھنے کے باعث لوگ بت پرستی میں مبتلا ہو گئے۔ حضرت موسیٰ جب کوہ طور پر تشریف لے گئے تو انھوں نے درخت سے آواز سنی "اِنِّیْ اَنَا اللّٰہُ" (میں اللہ ہوں) تو بولنے والی شیٔ وہ تجلی تھی جس نے اپنا محل درخت کو بنالیا تھا نہ کہ وہ درخت۔ اب اگر کوئی شخص درخت ہی کو خدا سمجھ لے (اس بنیاد پر کہ اس سے "اِنِّیْ اَنَا اللّٰہُ" کی آواز آئی تھی) تو یہ اس کی غلطی اور گمراہی ہے۔

(۲) تجلی کے لیے دو باتیں ضروری ہیں۔

(۱) اول یہ کہ وہ خالق کی صفات کے کشف کا ذریعہ ہو۔

(۲) دوم یہ کہ اس کے افعال حق تعالیٰ کی طرف منسوب ہوں۔

اگر خالق کے اوصاف کے کشف کا ذریعہ نہ ہو مثلاً وہ درخت اور پتھر جسے عام لوگ خواب میں محض درخت یا پتھر کی شکل میں دیکھتے ہیں تو وہ تجلی نہیں ہوگی۔ یا اس کے افعال حق تعالیٰ کی طرف منسوب نہ ہوں۔ جیسے کسی فرشتے یا ولی کا خواب یا خارج میں حق تعالیٰ کی بعض صفات کا کشف کر دینا، لیکن اس کی نسبت حق تعالیٰ کی طرف نہ کرنا یہ صورت بھی تجلی کی صورت نہیں ہے۔

............☆☆☆............

سطعہ ۳۷

عالم تجلیات (۱) الٰہیہ بہت ہیں بعض کسی انسان کے خیال میں خواب یا بیداری کی حالت میں ظاہر ہوتی ہیں جیسے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش آیا، جب کہ آپ ﷺ نے اپنے رب کو بہترین صورت میں دیکھا اور بعض (تجلیات) خارج میں نظر آتی ہیں۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ (طور)۔

خارج میں تجلی کے ظہور کے بارے میں تحقیقی بات یہ ہے کہ ارادۂ الٰہی کسی بندے کو تعلیم دینے یا کسی امر کی فلاں فلاں صورت میں تدبیر کرنے کا ہوتا ہے اور یہ ارادہ تجلی اعظم سے شرارے کی طرح ملاء اعلیٰ میں نزول کرتا ہے اور وہاں اپنے لیے گنجائش پیدا کر کے اور قوائے مثالیہ کو اپنے ساتھ زمین میں کسی مناسب جگہ پر اترتا ہے اور وہاں اسباب ارضیہ کو بسط، قبض اور احالہ کے ذریعہ مغلوب کر کے اس صورت کے مناسب ڈھال لیتا ہے جو ملاء اعلیٰ میں متخیل ہو چکی ہے (اس لیے کہ اس صورت اور تجلی اعظم سے نازل ہونے والے شرارے کے درمیان مناسبت عظیمہ ہوا کرتی ہے) اور زمین میں اس کا ظہور اسی ملاء اعلیٰ (کے تخیل کے مطابق) ہوتا ہے۔ عناصر میں اس طرح کی صورت کو قبول کرنے کی سب سے زیادہ صلاحیت، ہوا میں ہے اور قبض وبسط کے عمل کے لحاظ سے جو اسباب کام کرتے ہیں ان میں سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ ہوا کا کچھ حصہ کثیف ہوتا ہے اور کچھ لطیف اور ہوا کا تموج ہوائے کثیف کو ایک جگہ جمع کر دیتا ہے اور اسے قابل بنا دیتا ہے کہ وہ سورج (۲) یا چاند وغیرہ شعاعوں کو قبول کر سکے۔ (ہوائے کثیف میں سورج یا چاند کی چمک کا اجتماع) اللہ تعالیٰ کی صفات واجبیہ کی محاکات کرتا ہے اور کبھی بعض اجسام میں تیز یا دھندلی چمک کسی سبب کی وجہ سے پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسی صورت میں عنایت الٰہی متصادم ہوتی ہے اور بعض

پوشیدہ اسباب کا بسط ہو جاتا ہے اور یہ (عنایت الٰہی) وہاں عجیب و غریب حسن و جمال اور فقید المثال نیرنگی کا افاضہ فرماتی ہے۔ اور وہ حسن و نیرنگی خاص علاقوں کی وجہ سے واجب تبارک و تعالیٰ کی بعض صفات کا اسی طرح کا کشف کرتی ہے۔ جیسے کہ خواب میں ہوا کرتا ہے۔

---

(۱) تجلیات الٰہیہ کی نہ کوئی حد ہے اور نہ انتہا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کے سوا ان کی تعداد کو کوئی نہیں جان سکتا ہے۔ صوفیائے کرام کا ایک مشہور مقولہ "لاتکرار فی التجلی" (تجلی میں تکرار نہیں ہے) یعنی جو تجلی آتی ہے وہ چند خصوصیات کی حامل ہوتی ہے۔ جو دوسری تجلی میں نہیں پائی جاتیں۔ مولانا اسماعیل شہید دہلویؒ نے اپنی کتاب 'عبقات' کے عبقہ ۱۴ میں تجلیات کی اقسام پر طویل گفتگو فرمائی ہے۔ ان کے ذاتی خیال کے بموجب تجلی کو دو کلیات میں تقسیم کرنا چاہیے۔ یعنی تجلی جس مقصد سے ہوئی ہے اس کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔

(۱) پہلی چیز یہ ہے کہ آیا اس تجلی سے صرف تدلی کا کمال مقصود ہے یعنی تجلی کا مقصد اگر یہ ہے کہ قرب و نزدیک کے ذریعہ بندوں میں جو کمالات پیدا کیے جا سکتے ہیں، پیدا کیے جائیں۔ تو ایسی تجلی کو "تجلی شہودی" کہنا چاہیے جیسے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کوہ طور پر اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں نظر آئی۔

(۲) اور اگر تجلی سے مقصود تدبیر الٰہی کو نافذ کرنا اور اسباب کے قبض و بسط یا احالہ کے ذریعہ نظم عالم کی تنظیم و بندوبست ہے تو اسے "کمال تجلی" کہنا چاہیے۔ کیونکہ اس کے ذریعہ تجلی اعظم کے کمالات کے اظہار مقصود ہوا کرتا ہے۔ تکوین، تخلیق اور تشریع اسی "کمال تجلی" کے ساتھ وابستہ ہیں۔

(۲) تجلی شہودی کی دو قسمیں ہیں:

(۱) تجلیات شہودیہ صوریہ:

اس میں تجلیات کا ظہور محسوسات کی مختلف صورتوں کے قالب میں ہوتا ہے۔ پھر یہ صورتیں جن کے قالب میں اس تجلی کا ظہور ہوتا ہے کبھی تو اس تجلی کی تابانی اور اشراق کو حسی اشیاء کی شکل میں نمایاں کرتی ہیں۔ مثلاً روشنی، آفتاب، ماہتاب، یا ستاروں کی شکل میں کبھی ان صورتوں کی شکل میں

جن کے دیکھنے کے بعد قلب عظمت وجلال سے معمور ہو جاتا ہے۔ مثلا بادشاہ وغیرہ کی شکل میں کبھی ان صورتوں کی شکل جن میں محبوبیت اور کشش پائی جاتی ہے۔ مثلا کسی حسین نوجوان یا خوبصورت عورت کی شکل میں، اور کبھی ان صورتوں کی شکل میں جن کی اطاعت کی جاتی ہے مثلا پیر، والدین وغیرہ۔

(۲) تجلی شہودی کی دوسری قسم کا نام ''شھودیہ شھادیہ'' یعنی وہ تجلیات جن کا عالم شہادت میں ظہور ہوا۔ جیسے کوہ طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے ''ناری'' تجلی ظاہر ہوئی۔ یہ دراصل آگ نہیں تھی بلکہ وہاں صرف روشنی ہی روشنی اور اشراق ہی اشراق تھا، جس کا ظہور اس ہوا میں ہورہا تھا۔ جو وہاں پائی جارہی تھی۔ یوں سمجھنا چاہیے کہ ملاءاعلیٰ کی ہمتوں اور ان کے تخیل کی قوتوں نے اس مقام کی ہوا کو روشن کر دیا تھا۔

واللہ اعلم بالصواب

☆☆☆

سطعہ ۳۸

جس قسم کی بھی تجلی اس عالم میں آتی ہے اس کا منبع اصلی تجلی اعظم ہے۔ اس (ذیلی) تجلی کی نسبت اس تجلی اعظم کے ساتھ ویسی ہی ہے جیسی کہ زید کی گوشت و پوست سے بنی ہوئی صورت کی نسبت، جس کی تجلی اعظم اس کا نفس (ا) ناطقہ ہے۔ زید کی ان تصویروں کے ساتھ جو کاغذ پر بنائی گئی ہوں اور جو مختلف رنگوں، مخصوص خطوط اور معین شکلوں کے ذریعہ زید کے جسم اس کے کپڑوں اور اس کی خاص وضع قطع کو واضح کر رہی ہیں۔ اسی طرح تجلی اعظم حق تعالیٰ سے مناسبت رکھنے والی ایک صورت ہے اور دیگر تمام تجلیات اس تجلی اعظم کی پہچان کرانے والی اور اس کی بعض صفتوں اور ہیئتوں کا کشف کرانے والی ہیں۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ دو چیزوں کے درمیان صرف کیفیت اور کمیت ہی کی نسبت ہو اور ان کے علاوہ کوئی دوسری نسبت ہی نہ ہو (بلکہ یہ ہوسکتا ہے کہ) ہم کسی مجرد کو یاد کریں (اور اس کا خیال کرتے ہی) ہماری قوت مدرکہ میں اس مجرد کی کوئی متخیلہ یا متوہمہ صورت ابھر آئے۔ (اس وقت) ایک مجرد کی صورت منطبعہ دوسرے مجرد کی انطباع پذیر ہونے والی صورت سے مختلف ہوتی ہے (ان انطباع پذیر ہونے والی دونوں صورتوں میں) ایک صورت کا مجرد سے کوئی خاص تعلق ہوتا ہے اور دوسرے مجرد سے کوئی دوسرا خاص تعلق۔ یہ خصوصی تعلق نہ رنگوں کی مشابہت کی وجہ سے ہے اور نہ کمیت کے تناسب کے باعث۔ اسی طرح ہم مجہول مطلق، معدوم مطلق، اور جمع بین النقیضین کا تصور کرتے ہیں اور ہماری قوت مدرکہ (کے متخیلہ یا واہمہ) میں ہر ایک کی ایک ایسی صورت منطبع ہو جاتی ہے جو دوسرے کی نہیں ہوتی لہذا ایک تصور کا اختصاص ایک حقیقت کے ساتھ اور دوسرے تصور کا اختصاص دوسری حقیقت کے ساتھ (پیدا)

ہو جاتا ہے اور یہ اختصاص کسی مادی صفات کی بنیاد پر نہیں ہوتا۔ اسی مقام سے اس امر کی طرف رہنمائی ہوتی ہے کہ مجرد کی مناسبت ان صورتوں سے جو متخیلہ یا واہمہ میں منطبع ہوتی ہیں۔ محض ہم شکل ہونے یا مشابہت کی وجہ سے ہی نہیں ہوتی۔ مختصر یہ کہ مجرد محض نے ان معانی کے لحاظ سے جو عنایت اولیٰ سے کسی نشأۃ خاصہ کے اقتضا کے بغیر عالم مثال میں وارد ہوئے ہیں تجلی اعظم کے ساتھ مناسبت پیدا کر لی ہے اور اس تجلی کی صورت میں جو عالم میں فائض ہوتی ہے وہاں کی قابلیت نشأۃ اور استعداد کو بڑا دخل ہوتا ہے۔ گول اور برابر سطح والے آئینے میں زید کی حقیقی صورت فائض ہوتی ہے۔ اور محدب (۲) ومقعر شیشے میں زید کی ایسی لمبی اور چوڑی شکل پیدا ہوتی ہے جو زید کی خلقت سے بعید ہے حالانکہ وہ زید ہی کی صورت ہے۔ اسی مناسبت ذاتیہ کا قیاس کرو جو تجلی اعظم مجرد محض کے ساتھ رکھتی ہے۔ جو صورت بھی عالم کے روشن اجزاء میں ظاہر ہوتی ہے وہ تجلی اعظم کی صفات میں سے کسی نہ کسی صفت کا کشف کرتی ہے۔ لیکن (اس ظاہر ہونے والی صورت میں) اس مقام کی طبیعت اور کیفیات اس میں خاص عوارض پیدا کر دیتی ہیں اور ان دونوں (تجلی اعظم و مجرد محض (ذات باری) میں بڑا فرق ہے۔

- لہٰذا تجلی اعظم کے وجود کے آثار میں سے یہ بات بھی ہے کہ وہ (تجلی اعظم) عالم میں فائز ہونے والی دیگر تجلیات خاصہ کا منبع ہے۔

---

(۱) زید کا نفس ناطقہ ایک خالص مجرد چیز ہے اور اس کا بدن ایک مادی چیز لیکن ان دونوں کے درمیان ایسا تعلق ہے کہ زید کے بدن کے اعمال کا انتساب زید کے نفس ناطقہ کی طرف کیا جاتا ہے۔ مثلاً زید اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے لیکن آنکھوں کے دیکھنے کی نسبت زید کے نفس ناطقہ کی طرف کی جاتی ہے اور ایسا کرنا غلط نہیں ہے۔ کیونکہ درحقیقت دیکھنے والی شی تو زید کا نفس ناطقہ ہی ہے۔ زید کے بدن اور اس کے نفس ناطقہ کے درمیان جو نسبت ہے وہی نسبت کم وبیش تجلی اعظم اور مجرد محض یعنی ذات باری کے مابین ہے۔ اب جب زید کی تصویر ایک کاغذ پر بنائی گئی تو چونکہ یہ تصویر زید کی پہچان کرانے والی ہے اس لیے اس تصویر کی ایک نسبت زید کے ساتھ قائم ہوگئی۔ سچ پوچھئے تو ان خطوط اور رنگوں کا ایک علاقہ زید کے نفس ناطقہ کے ساتھ بھی ہے۔

حضرت شاہؒ صاحب فرماتے ہیں کہ تجلی اعظم کی نسبت ذات باری اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایسی ہی ہے۔اب ایک اعتراض وارد ہوتا ہے اور وہ یہ کہ وہ ذات باری تعالیٰ تو ہر قسم کی تعریف سے پاک ہے اور ہر قسم کے احاطہ سے منزہ ہے نہ کوئی شخص اس کا تصور کر سکتا ہے اور نہ کسی ذہن میں اس کا مفہوم آ سکتا ہے۔تو ایسی ذات کی نسبت اس تجلی اعظم کے ساتھ کیسے قائم ہو سکتی ہے۔جو باوجود لطیف تر ہونے کے عقل میں تو آتی ہے۔حضرت شاہؒ صاحب نے اس اعتراض کا یہ جواب دیا ہے کہ دو چیزوں کے درمیان مناسبت کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ دونوں اشیا کے مابین کمیت یا کیفیت میں مشارکت ہو۔یہ ہو سکتا ہے کہ ہم دو مجرد اشیا کا تصور کریں اور ہماری قوت مدرکہ کے متخیلہ یا واہمہ میں دو مختلف تصورات آ جائیں۔مثلاً ہم نے مجہول مطلق کا تصور کیا اور اس کی ایک صورت ہمارے متخیلہ میں مرتسم ہو گئی۔پھر ہم نے معدوم مطلق کا تصور کیا اور اس کی ایک دوسری صورت ہمارے متخیلہ میں منطبع ہوئی۔ظاہر ہے کہ ہماری قوت متخیلہ یا واہمہ میں مجہول مطلق کی جو صورت مرتسم ہے وہ وہ نہیں ہے جو معدوم مطلق کی ہے۔اب صورت اول کا مجہول مطلق سے اور صورت دوم کا معدوم مطلق سے جو اختصاص ہے وہ نہ کیفیت کی مشابہت کے باعث ہے اور نہ کمیت کی مشابہت کے باعث ہے۔بالکل اسی طرح کا اختصاص تجلی اعظم کا ذات باری تعالیٰ کے ساتھ ہے جو مجرد محض ہے۔

(۲) تجلی اعظم دیگر تمام تجلیات کا منبع ہے۔دیگر تجلیات ذیلی میں اختلاف پایا جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ تجلیات اپنے محل کی کیفیت اور طبیعت سے متاثر ہوتی ہیں۔جیسے کہ محدب یا مقعر شیشے میں زید کا چہرہ اصل کجی چہرے میں نہیں ہوتی، بلکہ شیشے کے اثر سے چہرہ لمبوترا یا بہت چوڑا معلوم ہوتا ہے۔یہی حال ذیلی تجلیات کا ہے۔

............☆☆☆............

سطعہ ۳۹

جب کوئی مسلمان "لا الہ الا اللہ اور اللہ اکبر یا سبحٰن اللہ اور اس جیسے اذکار پڑھتا ہے تو اس ذکر کے ضمن میں لازمی طور پر (کسی بھی درجہ پر) اس ذات کو سمجھتا ہے اور ان احکام کو (یعنی اللہ تعالیٰ کی معبودیت اس کی کبریائی اور تنزہ) اس کی ذات کے لیے معین کرتا ہے۔ لہٰذا ایسی صورت میں لازماً موضوع (مذکور) کی صورت اس کے ذہن میں حاضر ہوتی ہے۔ اور یہ صورت حق تعالیٰ کی ہوتی ہے جو اس کی باطنی قوتوں میں سے ایک قوت میں جسے مدرکہ (۱) اور متصرفہ کہتے ہیں قائم ہوجاتی ہے۔ جب وہ شخص ان اذکار کی کثرت کرتا ہے تو اس کے مدرکہ میں قائم ہونے والی ضعیف صورت جڑ پکڑ لیتی ہے۔ حتیٰ کہ ان اذکار کے الفاظ کے استعمال کیے بغیر ہی خود بخود وہ صورت کبھی ذہن میں بیٹھ جاتی ہے، پھر محو ہوجاتی ہے، پھر آ جاتی ہے اور جب وہ اس سے بھی زیادہ اذکار کی کثرت کرنے لگتا ہے تو وہ صورت اس کے قوائے نفس میں سے کسی قوت میں اس طرح مستقر ہوجاتی کہ چلتے پھرتے، کھاتے پیتے، اور ہر حالت میں اس کے ذہن سے دور نہیں ہوتی اور کوئی بھی شغل اس صورت کے حضور میں مانع (۲) نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ وہ اس شخص کی مانند ہوجاتا ہے جو اپنے سر پر پانی کا گھڑا رکھے ہوئے ہے اور راستہ چل رہا ہے۔ کسی سے باتیں کرتا ہے یا جو کچھ گھر میں چاہتا ہے اس کا بھی اس کے دل میں خیال ہے۔ اسی حالت میں وہ سوچ رہا ہے کہ اس پانی میں سے ایک حصہ کھانا پکانے میں صرف کرے گا۔ کچھ حصہ سے کپڑے دھوئے گا، کچھ حصہ پینے کے لیے رکھ چھوڑے گا۔ یہ تمام پراگندہ خیالات اس کے ذہن میں شکل پذیر ہیں اور اس کی قوت مدرکہ نے ان تمام خیالات کے لیے گنجائش پیدا کر رکھی ہے۔ اسی طرز پر سالک کو بھی قیاس کرو جو تمام حالات، حرکات و سکنات کے دوران اپنے قلب کو اجمالی طور پر سہی اپنے مبدا

(خالق) کی طرف متوجہ رکھتا ہے۔

اس کے بعد ایک درجہ اور ترقی کرتا ہے اور رفتہ رفتہ اپنی ان تمام پراگندہ توجہات کو دفع کر دیتا ہے۔ اور اپنی تمام مختلف قوتوں کو صرف ایک قوت کی طرف لوٹا دیتا ہے۔ شعر

کانت لقلبی اھواء متفرقة

فاستجمعت اذا أتک العین اھوائی

ترجمہ: میرے قلب کی مختلف خواہشیں تھیں۔ لیکن جب میری آنکھ نے تجھے دیکھا تو سب خواہشیں تجھ میں جمع ہو گئیں۔

پھر اس جمعیت خاطر میں بھی ترقی ہوتی ہے۔ پہلے تو یہ اپنے آپ کو پاتا ہے کہ اپنی ہمت کاملہ سے مقصود حقیقی کی طرف متوجہ ہے اور آخر میں تو یہ حال ہو جاتا ہے کہ اپنے آپ کو بھی فراموش کر دیتا ہے۔ اس حالت کو غیب (۳) وعدم کہتے ہیں۔ اور اس کی نسبت مجرد کے ساتھ ویسی ہی ہوتی ہے جیسی کسی متحیز چیز کی (یعنی ایسی چیز جو اپنے مقام پر ابعاد ثلاثہ کے ساتھ قائم ہو) نسبت رویت کے ساتھ (یعنی اب وہ غیبت کی حالت میں مجرد کو اسی طرح دیکھے گا جس طرح کوئی مادی آنکھ کسی مادی چیز کو دیکھتی ہے) جب ہماری نگاہ کسی چیز پر پڑی اور ہماری حس مشترک (۴) نے اور اس چیز سے ایک صورت کو اخذ کیا۔ اس کے تمام مادی لواحق مثلاً تحیز اور اس چیز کی نسبت دوسری اشیاء کے ساتھ جو اس کے دائیں بائیں ہیں اور اس کے رنگ شکل، کیفیات اور اس طرح کی چیزوں کے ساتھ تو ہم اس کو رویت (۵) کہتے ہیں۔ اسی طرح صاحب مشاہدہ مجرد حقیقی کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور (بجائے حس مشترک کے) قوت مدرکہ درمیان میں ہوتی ہے، جس طرح کہ مذکورہ بالا مثال میں حس مشترک درمیان میں تھی۔ الغرض وہ قوت مدرکہ جو مجرد کے کشف کا ذریعہ بنتی ہے، وہ دراصل مدرکہ کے آئینہ میں تجلی اعظم کا عکس ہے۔

---

(۱) وہ قوت جو مجردات کے متعلق فیصلہ کرتی ہے اسے مدرکہ کہتے ہیں۔

(۲) اس کیفیت کو "باہمہ و بے ہمہ" کہتے ہیں کہ سب کے ساتھ ہے۔ باتیں کر رہا ہے لیکن اس کی توجہ کا مرکز "ذات باری تعالیٰ" ہے۔ مشائخ نقشبند اس حالت کو "خلوت در انجمن" کہتے

ہیں۔

(۳) پیر ہرات حضرت شیخ عبداللہ انصاریؒ اس خود فراموشی کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتے ہیں ''خداوندا! ایں چہ بوالعجبی است کہ بادوستان خود میکنی، وقتیکہ ترا می جوئیم خود را می یابیم و وقتیکہ خود را می جوئیم ترا می یابیم!''

(بارخدایا یہ کیا تماشا ہے کہ تو اپنے دوستوں کے ساتھ کرتا ہے کہ جب تک کہ تجھے ڈھونڈ تے ہیں، اپنی ذات کو پاتے ہیں اور اب حال یہ ہے کہ ہم اپنی ذات کو ڈھونڈ تے ہیں تو (خود کو نہ پا کر) تجھے پاتے ہیں۔ (میرا وجود خود مجھ سے گم ہو گیا ہے) اسی کیفیت کو فنا فی اللہ و بقا باللہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

(۴) وہ حس جو مختلف حواس کے نتائج کو جمع کر کے فیصلہ کرتی ہے، اس کا تعلق مادی اشیاء سے ہوتا ہے۔

(۵) رویت دراصل نام ہے اس کا کہ انسان کی نگاہ کسی چیز پر پڑے اور اس کی حس مشترک اس کی ایک صورت اس انداز سے اخذ کرے کہ اس چیز کا حیز (Space) متعین ہو جائے۔ اس کے دائیں بائیں جو چیزیں ہوں وہ متعین ہو جائیں۔ اس چیز کا رنگ، شکل اور جملہ کیفیات کا ایک نقشہ حس مشترک میں آ جائے۔ رویت کی یہ تو مادی شکل ہے لیکن رویت (مشاہدہ) کی ایک روحانی صورت بھی ہے۔ یہ اس وقت پیش آتی ہے جب کسی مجرد چیز کا مشاہدہ کیا جائے۔ اس مشاہدے میں حس مشترک کی جگہ انسان کی قوت مدرکہ لے لیتی ہے اور اس کی اس قوت مدرکہ میں تجلی اعظم کا عکس پڑنے لگتا ہے۔ اور یہی عکس مجرد کے کشف کا وسیلہ بن جاتا ہے۔

............☆☆☆............

سطعہ ۴۰

اہل ولایت ایک صفت سے دوسری صفت میں تبدیل ہوتے رہتے ہیں، جیسے کہ برف کے نیچے آگ جلائی گئی یہاں تک کہ برف پگھل کر پانی بن گئی اس کے بعد آگ جلتی رہی یہاں تک کہ پانی کی ٹھنڈک ختم ہوگئی اور اس میں فتور آ گیا۔ اس کے بعد بھی آگ جلنے کا عمل جاری رہا یہاں تک کہ پانی گرم ہوگیا۔ آگ پر بھی جلتی رہی یہاں تک کہ وہ پانی ان خصوصیات کا حامل بن گیا جو آگ میں ہیں۔ مثلاً کسی چیز کو پکا ڈالنا یا انسان کے بدن پر آبلہ ڈال دینا۔ ان تمام تبدیلیوں نے (اس پانی) کو پانی ہونے کی حقیقت سے نہیں نکالا (یعنی آگ کی خاصیتوں کے پیدا ہو جانے کے باوجود وہ گرم پانی پانی ہی رہا آگ نہیں بنا) البتہ یہ ضرور ہے کہ پانی کی حقیقت آگ کی حقیقت کے قریب تر ہوگئی۔ اسی طرح صوفیائے کرام کی فنا و بقا (فانی فی اللہ باقی باللہ) ان کو (حقیقت) انسانیہ سے خارج نہیں کرتی بلکہ اس نے انھیں انسانیت کے ان اوصاف سے دور کر دیا جو بہائم اور پرندوں کے مماثل تھے اور (انسانیت کے ان اوصاف) سے قریب کر دیا جو ملائکہ اور ان کے بعد عالم جبروت سے مناسبت رکھنے والے ہیں۔

اب اصلی بات کی طرف آئیں۔ وہ یہ کہ یہ مشابہت بلا شبہ بہ کے قائم نہیں ہو سکتی ہے۔ اور مشبہ بہ حظیرۃ القدس ہے اور یہ حرکت جو کیفیت کا تحول (۱) ہوتی ہے لازماً اس کا کوئی رخ ہے اور وہ رخ حظیرۃ القدس کا وصف (۲) ہے۔

---

(۱) تحول اس کو کہتے ہیں کہ کسی چیز میں تبدیلی تو آئے۔ لیکن وہ چیز بذات خود نہ بدلے، مثلاً پانی پہلے ٹھنڈا تھا، پھر گرم ہوگیا۔ پانی میں تبدیلی ضرور آئی لیکن وہ پانی ہی رہا۔ لوہا نہیں بن گیا۔

اس کے مقابلے میں ایک لفظ "تبدل" ہے تبدل اسے کہتے ہیں جو شئ کی حقیقت کو تبدیل کردے مثلاً پانی، تیل بن جائے۔

(۲) ساری عبادات وریاضات کا صرف ایک مقصد ہے وہ یہ کہ انسان اپنے اندر کی بہیمی صفات کو شکست دے کر اس امر پر ملکوتی صفات کو غالب کردے یہاں تک کہ اسے مجرد محض کا مشاہدہ حاصل ہو جائے اور اس کی روح حظیرۃ القدس (ملائکہ اور ارواح عالیہ کی اسمبلی) کے ممبر بن جائے۔ یہ مقصد اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب کہ اہل حظیرۃ القدس سے تشبہ حاصل کیا جائے اور آغاز ہی میں اپنا رخ حظیرۃ القدس کی طرف رکھا جائے۔ اس وقت حظیرۃ القدس کی تاثیرات کا بھی نفوذ ہوگا۔

☆☆☆

سطعہ ۴۱

عام مسلمان بلکہ تمام انسان جب اللہ کہتے ہیں تو ان کی قوت ادراکیہ میں ایک حقیقت جامعہ مدبرہ کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ کیونکہ کسی شیٔ پر حکم اس کے بغیر درست نہیں ہوسکتا کہ وہ شے انسان کے قلب میں موجود ہو اور انسان کے قلب میں اس شے کی موجودگی بہت سارے اسباب کا نتیجہ ہے۔ ان اسباب میں سے ایک سبب حظیرۃ القدس اور ملاء اعلیٰ بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ملاء اعلیٰ کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ شخص کبیر یعنی نوع انسانی میں بمنزلہ قوت عملیہ کے اسی طرح رہیں جس طرح شخص یعنی صغیر ایک فرد انسانی کے بدن میں قوت علمیہ رہ کر اس کے بدنی نظام کو چلاتی ہے۔

جس طرح ایک فرد انسانی کے قوائے علمیہ اس کے بدن کی تدبیر کرتے ہیں۔ اسی طرح ملاء اعلیٰ (کے فرشتے) نوع انسانی اور اس کے ہر ہر فرد کی تدبیر کرتے ہیں۔

جب کسی انسان کے دل پر خوف یا شرمندگی چھا جاتی ہے تو اس کا رنگ زرد ہو جاتا ہے۔ بھوک ساقط ہو جاتی ہے اور اس کے بدن پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ یہ سارے اثرات ان قوائے علمیہ کے ہیں۔ جو انسان کے بدن میں موجود ہیں۔ اسی طرح ملاء اعلیٰ کے الہامات افراد انسان میں اثر پیدا کرتے ہیں۔

مختصر یہ کہ جو اللہ کی صورت ذہنیہ ہے جس کے بارے میں ہم کہتے ہیں کہ وہ قلب میں موجود ہوتی ہے تعمق نظر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس صورت الٰہیہ کا ظل ہے جو ملاء اعلیٰ میں اسی طرح متمکن ہے جس طرح بنی نوع انسان کے کامل ترین افراد اور ان کے نفوس میں قائم ہوتی ہے۔ جو ملاء اعلیٰ سے ملحق ہو جاتے ہیں۔ اور ان ہی میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی طرف سے بھی ایک شعاع انسانوں کے قلوب پر پڑتی ہے بالکل ویسے ہی جیسے کے آفتاب کی شعاعین فضائے آسمانی میں

پھیلے ہوئے مختلف الکیفیت بادلوں میں منعکس ہوتی ہیں۔(درحقیقت) یہی شعاع اس حقیقت جامعہ مدبرہ کو انسانوں کے قلوب میں ڈالتی ہے۔اگر یہ شعاع فضائے بسیط میں پھیلی ہوئی نہ ہوتی تو کوئی شخص اللہ نہ کہتا اور نہ اس کے معنی کی شناخت کرنے کے قابل ہوتا۔یہ سب کچھ اس طلسم الٰہی (تجلی اعظم کی برکتیں ہیں جو اس کے (تجلی اعظم کے) ملاء اعلیٰ والوں کے نفوس میں اثر کرنے سے ظاہر ہوتی ہیں۔

............☆☆☆............

سطعہ ۴۲

جب اللہ تعالیٰ نے نوع انسانی کو عنایت (۱) اولیٰ میں ممثل کیا، اس کو تمام دیگر انواع سے افضل قرار دیا اور اس لحاظ سے اس کو اپنا خلیفہ کہا کہ وہ ملکوت اور ناسوت دونوں کا جامع (۲) ہوگا تو ناسوتی جز کے اعتبار سے ضروری ہوا کہ جب وہ (انسان) جسم کا لباس پہنے تو اس کا کوئی منبع ہو اور وہ عناصر ہیں۔ اس کی ایک چراگاہ ہو اور وہ کھانا پینا ہے، اس کی ایک سیرگاہ ہو اور وہ گفتگو کرنا، حکومت کرنا اور مکانات کی تعمیر ہے اور ازیں قبیل دوسرے ارتفاقات اسی طرح ملکوتی جز کے اعتبار سے ضروری ہوا کہ اس کے لیے ایک منبع ممثل ہو اور وہ نفس ناطقہ ہے جو نسمہ (۳) معتدلہ میں حلول کیے ہوئے ہے اور قوائے علمیہ وعملیہ کے ذریعہ اس کی تدبیر کر رہا ہے، اور اس کی چراگاہ ملکوت کا وہ خزانہ ہے جس کا نام ملاء اعلیٰ ہے اور جس کے ساتھ نفس ناطقہ تشبہ پیدا کر لیتا ہے (اور تشبہ کے بعد) اس پر ملاء اعلیٰ کے علوم بذریعہ رویت یا خواب یا الہام فائض ہوتے ہیں اور یہ علوم اس کے قوائے علمیہ کے معیار بنتے ہیں۔

چنانچہ جب کوئی برا عمل اس سے ظاہر ہوتا ہے اور نفس انسانی اپنے اعتدال نوعی سے گر جاتا ہے تو ملاء اعلیٰ میں ایک قسم کی کراہیت پیدا ہوتی ہے اور جب کسی نیک عمل کا اس سے صدور ہوتا ہے تو اس نیک عمل کی مقدار کے مطابق ملاء اعلیٰ سے اس کی مشابہت میں اضافہ ہو جاتا ہے اور ان کی طرف سے ایک طرح کا استحسان (انسان کے نفس پر) فائض ہو جاتا ہے۔ اس استحسان کی (صحت روحانی میں) وہی حیثیت ہے جو غذاؤں اور مشروبات کی بدنی صحت میں ہے۔ (یعنی جس طرح غذاؤں سے بدن طاقتور ہوتا ہے اسی طرح ملاء اعلیٰ کے استحسان سے روح صحت مند اور ترقی یافتہ بنتی ہے)

اس کے لیے ایک سیر گاہ بھی ہے اور وہ صوفیا کے مقامات اور دینی مناصب از قسم قطبیت، ارشادیت، مجددیت، اور وہ چیزیں ہیں (جو ان مناصب سے) متعلق ہیں۔

جس طرح اگر کسی انسان کا پیر کسی چنگاری یا برف کے ٹکڑے پر پڑ جائے تو پاؤں کے پڑتے ہی وہ اپنے دماغ میں گرمی یا سردی اور اذیت کا احساس کرتا ہے، اسی طرح جس وقت کوئی انسان کسی معصیت کا ارتکاب کرتا ہے یا کسی عبادت الٰہی کا عمل کرتا ہے تو اس عمل کے مقابلے میں ملاء اعلیٰ میں استحسان یا استہجان ظاہر ہوتا ہے اور طبیعت کلیہ کی تدبیر اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ وہ نفرت یا محبت پانی کی طرح ملاء سافل (۴) کے نفوس اور ہر ذی روح کے ذہن میں بہہ کر آ جائے اور اس شخص کو دنیا ہی میں اس کا بدلہ مل جائے اور بعینہ یہی الہامات آخرت میں ان ملائکہ کی طرف آئیں گے جن کے نفوس میں قوائے مثالیہ زیادہ قوی ہیں اور یہی (الہامات استحسان واستہجان) آخرت کے عذاب وثواب کا سبب بنیں گے۔

---

(۱) البدور البازغہ میں حضرت شاہؒ صاحب نے عنایت اولیٰ کی ان الفاظ میں تعریف فرمائی ہے:

''اور حاصل یہ ہے کہ عنایت وہ تدبیر جملی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے انواع کی فطرت کے آغاز ہی میں ان میں ودیعت کر دیا ہے۔ ہر قسم کی تدبیر تفصیلی اور مرافق کی طرف ہر قسم کی رہنمائی وہیں سے آتی ہے اور ازلاً وابداً ایک ہے۔ اس کا وجود عین انواع کا وجود ہے لیکن وہ ہر زمانے اور ضرورت کے مطابق مختلف شکلیں اختیار کرتی ہے۔''

(۲) ملکوت وناسوت دونوں کا جامع ہونا یہی وہ خصوصیت ہے جس نے انسان کو خلافت کا مستحق قرار دیا۔ ملائکہ میں یہ جامعیت نہیں ہے۔ اس لیے انھیں خلافت الٰہی نہیں ملی۔

خدا سب پر حاکم ہے خواہ وہ ناسوت ہو یا ملکوت لہٰذا ضروری ہے کہ اس کا جو خلیفہ بنے اس میں دونوں پر حکومت کرنے کی صلاحیت ہو۔ فرشتے صرف ایک نوع یعنی ملکوت پر حکومت کر سکتے ہیں۔ وہ بہیمیت کو سمجھ نہیں سکتے، لہٰذا ان میں ناسوت پر حکومت کرنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔

(۳) انسان کا نسمہ معتدل ہے اور اس میں ایسی تدبیر کر دی گئی ہے کہ علمی اور عملی قوتیں اس

میں جمع ہوگئی ہیں۔اس میں ایک مجرد شے نفس ناطقہ داخل ہو چکی ہے اور اس سے ملکوتیت پیدا ہوتی ہے۔انسان کی دو بڑی خصوصیتیں ہیں: (۱) فکر (۲) نطق اسے نفس ناطقہ کہتے ہیں۔انسان اس دنیا میں کوئی نئی چیز پیدا نہیں کرتا وہ صرف مادے میں تغیرات کر کے ان سے کام لیتا ہے۔نئی چیز جو وہ پیدا کرتا ہے صرف فکر اور لفظ ہیں۔فکر میں مادۂ ایجاد ہے اور لفظ میں مادۂ اظہار چونکہ انسان ایجاد جانتا ہے اس لیے اس میں یہ بھی صلاحیت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ایجاد کو سمجھ سکے۔

(۴) ملاء اعلیٰ سے دوسرے درجہ پر بعض دوسرے نفوس ہیں جنھیں ملاء اعلیٰ والوں کا تو مرتبہ نہیں ملا ہے لیکن ان کا منصب یہ ہے کہ وہ پوری توجہ کے ساتھ اس انتظار میں رہیں کہ ملاء اعلیٰ سے ان پر کیا فائض ہوتا ہے جب وہ کسی امر کی بابت اشارہ پاتے ہیں تو فوراً اس کی تعمیل میں لگ جاتے ہیں۔اور اس تعمیل کے دوران یہ نفوس قدسیہ اپنی خواہش اور ارادے سے بالکل خالی ہوتے ہیں اور کلیۃ اس امر کی انجام دہی میں منہمک ہوتے ہیں۔جو ان پر ملاء اعلیٰ سے فائض ہوا ہے۔چنانچہ ان کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ آدمیوں اور چوپایوں کے ارادے پر اپنا اثر ڈال کر ان کے ارادوں کو اس امر کے مطابق کر دیں جن کے ظہور میں لانے کو ان کا حکم ملا ہے۔یہ لوگ بعض اشیاء کی طبعی حرکات میں بھی تصرف کرتے ہیں۔مثلاً اگر کسی شخص کو ملاء اعلیٰ والے بہتر سمجھتے ہیں تو یہ لوگ وہاں کا اشارہ پا کر انسانوں کے دلوں میں تصرف کرنے لگتے ہیں۔اور ان لوگوں کے دلوں میں اس شخص کا احترام یا محبت پیدا کر دیتے ہیں۔اسی طرح اگر کسی شخص کے بارے میں ملاء اعلیٰ والوں کے دلوں میں نفرت ہوتی ہے تو وہ نفرت ان پر بھی فائض ہوتی ہے اور یہ عوام الناس اور خواص کے دلوں میں ایسے آدمی سے بغض پیدا کر دیتے ہیں۔

اس مخلوق کو حضرت شاہؒ صاحب نے ''ملاء سافل'' کا نام دیا ہے۔ان کے بارے میں بعض تفصیلات آگے آرہی ہیں۔

............☆☆☆............

سطعہ ۴۳

ملاء اعلیٰ (۱) سے بعض نفوس ایسے ہیں جو کواکب ثابتہ کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں اور بعض ایسے ہیں جو نورانی ابدان میں اس وقت پھونک دیے جاتے ہیں جب کہ سیارات مسعودہ کا اتصال مثلاً قران علویین ہورہا ہو۔نورانی ابدان سے مراد وہ لطیف عناصر ہیں جن پر ہوا ہیت (ہوا کی مانند ہونا) غالب ہوتی ہے اور وہ نظر نہیں آتے (اور نورانی ابدان سے) وہ نفوس بشریہ بھی مراد ہیں جو ملاء اعلیٰ سے ملحق ہو جاتے ہیں ملاء اعلیٰ میں نہ کوئی پست ہے اور نہ بالا بلکہ ملاء اعلیٰ (والوں کا) تعلق حظیرۃ القدس سے ہوتا ہے اور چاہے وہ جہاں بھی رہیں ان کا آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ رابطہ رہتا ہے۔لیکن ملاء (۲) سافل وہ نفوس جزئیہ ہیں جو ابدان ہوائیہ میں سیارگان کے جزئی مسعود اتصالات کے وقت مثلاً ایسے وقت جب کہ زہرہ اور مشتری کے نیک مناظرات ہورہے ہوں، پھونک دیے جاتے ہیں یہ اپنی ذات وصفات میں اور ان پر طاری شدہ ہیئتوں کے طاری ہونے کے وقت برکات کے نزول کا باعث بنتے ہیں۔اس جماعت کی بہت سی اصناف ہیں اور ہر صنف اس ستارے کا لشکر ہوتی ہے جس کی سعادت (اس صنف کے نفخ روح کے وقت) غالب تھی، اور ان کے لشکروں کی بہت ساری تفصیلات ہیں، جن کے بیان کی اس رسالہ میں گنجائش نہیں ہے۔"وَمَا یَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّکَ اِلَّا ھُوَ" (المدثر:۳۱) یعنی تیرے رب کے لشکروں کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا ہے) یہ جماعت حیوان اور اس کے معدن کے درمیان واسطہ ہے۔ان کی کوئی ایسی معین خلقت (۳) نہیں ہوتی جو صورت نوعیہ کا تقاضا ہوا کرتی ہے بلکہ ان میں کوئی کرے کی مانند ہے، کوئی شلجمی ہے، تیسرا مثلث ہے، چوتھا چوکور یا مستطیل ہے۔(ان کی نشوونما) ان اتصالات (۴) کے مطابق ہوتی ہے جن کی شبیہ سے ان کے بدنوں میں نفخ روح کا

اقتضا ہوا تھا نہ کہ غذا دینے والی قوت یا قوت ماسکہ سے۔ ان کی حرکات ملاء اعلیٰ سے آنے والے الہامات کے تقاضوں پر مبنی ہوتی ہیں۔ یہ الہامات ملاء اعلیٰ سے پانی کی طرح بہہ کر (خود بخود) آتے ہیں نیز ان پر ان ابدان ہوائیہ یا قوائے فلکیہ کا بھی اثر غالب رہتا ہے۔ (جن میں نفخ روح ہوتا ہے) اس لیے وہ ہوا کی حرکت کے ضمن میں حرکت کرتے ہیں۔ جیسے آدمی اپنے پاؤں سے حرکت کرتا ہے اور جو کام (ملاء سافل) کے مزاج کے مطابق ہوتا ہے وہ ہزاروں کی تعداد میں اس کی انجام دہی کے لیے جمع ہو جاتے ہیں اور (ان کے اجتماعی تعاون کے باعث) دلوں کا اطمینان، ملکی الہامات اور احادیث نفس فائض ہوتی ہیں اور ملاء اعلیٰ کے مخاصمہ (۵) کا مطلب یہ ہے کہ ان میں سے ایک صنف ایک خاص قوت کے ساتھ پیدا کی گئی ہے۔ وہ اسی قوت کے مطابق بنی آدم کے اعمال کی جزا کا تعین کرتی ہے اور ان کے اپنے اپنے قویٰ کے تقاضوں کے مطابق جزا کے تعین کے باعث ان میں اختلاف پیدا ہوتا ہے۔ اسی اختلاف کو اختصام کا نام دیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ آسمانوں اور زمینوں کا مدبر (۶) تمام قوتوں میں تطابق اور توافق پیدا کر کے کوئی امر نازل فرماتا ہے۔ جیسے کہ دیکھنے والے کی صورت اور آئینے کی شکل دونوں کو بیاری طبیعت تطبیق دے کر ایک صورت معین کر لیتی ہے۔

---

(۱) حضرت شاہؒ صاحب نے یہاں ملاء اعلیٰ کی تین قسمیں بیان فرمائی ہیں:

(۲) کواکب ثابتہ کی ارواح، کواکب ثابتہ کی حیثیت ایک وسیع و عریض علاقہ کی ہے جن میں ہر ایک کا ایک مرکز ہوتا ہے اور ہر مرکز کی روح ملاء اعلیٰ میں شامل ہوتی ہے۔

(۲) سیارات مسعودہ کے اتصالات کے وقت جو خاص روحانیت پیدا ہوتی ہے اور وہ نورانی ابدان میں نفوذ کرتی ہے۔

(۳) وہ نفوس بشریہ جو ملاء اعلیٰ میں شامل ہو جاتے ہیں۔ جس طرح انسان کے سارے قویٰ مل کر کوئی کام کرتے ہیں اسی طرح ملاء اعلیٰ بھی اجتماعی کام کرتے ہیں۔

(۲) ملاء سافل (اس کی کچھ تفصیل گزر چکی ہے)۔

(۱) وہ نفوس جزئیہ جو سیارگان مسعودہ کے جزئی اتصالات کے وقت پیدا ہوتے ہیں۔

(۲) وہ نفوس جزئیہ جو معدن اور حیوان کے درمیان واسطہ ہیں۔ معدن سے حیوان بنتا ہے معدن میں روح نہیں ہوتی۔ معدن اور نبات کے درمیان ایک چیز ہونی چاہیے جو ان کے درمیان واسطہ ہو۔ یہ واسطہ ملاء سافل ہیں۔

(۳) ملاء سافل کی کوئی خاص شکل نوعیہ نہیں ہے اس لیے ان میں جلد ہی تبدل ہوسکتا ہے اور ان کی کوئی مخصوص صورت نہیں رہتی۔

(۴) جن کواکب کے اتصال کے وقت ان میں روح پھونکی گئی تھی۔ جب پھر کبھی اسی طرح کا اتصال کواکب ہوتا ہے تو ان کو غذا ملتی ہے۔ اور ان کی نشو ونما ہوتی ہے۔ ان کے لیے کوئی غذا دینے والی قوت نہیں ہوتی ہے۔

(۵) اکثر احادیث میں ملاء اعلیٰ کی مخاصمت کا لفظ آیا ہے۔

حضرت شاہ صاحب نے اس مخاصمت کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ یہ کہ ملاء اعلیٰ کے جتنے اصناف ہیں ہر صنف کو خاص قسم کے قویٰ بخشے گئے ہیں۔ جو دوسری صنف کو نہیں ملے ہیں۔ اس لیے جب کسی انسان کو جزا دینے کا مسئلہ در پیش ہوتا ہے تو ہر صنف اپنے اپنے قوائے مفوضہ کے مطابق جزا تجویز کرتی ہے۔ اور چونکہ قوائے مفوضہ مختلف ہیں اس لیے تجویز کردہ جزائیں بھی مختلف ہوتی ہیں۔ مجوزہ جزاؤں کے اسی اختلاف کو احادیث میں اختصام یا مخاصمت کا نام دیا گیا ہے۔

(٦) مخاصمہ کی صورت میں ارادۂ الٰہی ان میں جامع طور پر نازل ہوتا ہے تاکہ ان میں توافق اور تطابق پیدا ہو جائے۔

............☆☆☆............

سطعہ ۴۴

عالم کو ایک منقش قالین تصور کرو جس میں ایک ماہر کاریگر ایک طرف کی ہر نوک پلک کے مقابلے میں دوسری طرف ویسی ہی نوک پلک بنا کر ہر پھول کا ایک معین اندازہ قائم کرتا ہے، بالکل اسی طرح اس کائنات کے مدبر نے اگر ایک شخص کے طالع میں زہرہ ناظر بر مریخ کا اثر پیدا کیا ہے (تو ٹھیک اسی انداز میں) دوسرے شخص کے طالع میں مریخ ناظر بزہرہ کا اثر رکھا ہے تاکہ ان دونوں اشخاص کے درمیان عشق کی کشش (۱) پیدا ہو جائے اسی طرح اس نے اگر کسی شخص میں شمس کی قوت تسخیر رکھی ہے تو اس کے بالمقابل دوسرے شخص میں (اسی قوت تسخیر کے انداز پر) مسخر ہو جانے کی استعداد بھی ودیعت فرمائی ہے۔ "ذٰلِکَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ" (یہ ایک طاقت ور اور علیم ذات کے اندازے ہیں۔)

جب ان طالعات کے احکام کے ظہور کا وقت آتا ہے تو ملائکہ سفلیہ اور حیوانات ذوی الارادہ کے نفوس کی جانب (ملاءِ اعلیٰ سے) الہام بہہ کر آتا ہے تاکہ مطلوب امور ظہور پذیر ہوں۔ ایسے ہی جب قطع کرنے والی قوتیں حرکت میں آتی ہیں تو موت یا اس سے کم درجہ کی کوئی ہلاکت آفریں حالت پیدا ہو جاتی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس یہ الہامات تمام احوال میں جاری ہیں۔ اس میں فسق و فجور یا صلاح و تقویٰ کا کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ تو درحقیقت جزئی اسباب و دواعی ہیں جن کی بدولت اس کائنات کا نظام چل رہا ہے۔

جب نقطۂ وحدانی (تجلی اعظم) سے حظیرۃ القدس کی طرف اور حظیرۃ القدس کے واسطے سے ملاءِ اعلیٰ کی جانب وہاں سے نظام عالم کی اصلاح اور نوع انسانی کو اعتدال نوعی کی طرف لانے، مظالم سے نجات دلانے، قبر کے عذاب اور روز قیامت کے عذاب سے بچانے کے لیے کسی نفس

میں فیضان آتا ہے۔ تو اس نفس زکیہ کو اس نور کو اتمام تک پہنچانے کی توفیق بھی بخشی جاتی ہے۔ اسے داعیہ کلیہ اور ارادۂ شریعیہ کہتے ہیں۔

جو ملائکہ امور تشریعیہ کے خادم ہیں وہ ملائکہ تکوین سے افضل ہیں اور نورانیت میں ان کے قریب ہیں۔ جب خدا کے رسولوں کی نصرت کا وقت آتا ہے تو یہ دونوں فوجیں (ملائکہ تشریعی وتکوینی) جمع ہو جاتی ہیں اور عجیب وغریب برکات کا ظہور ہوتا ہے۔

---

(۱) یہاں مراد قوت جذابہ ہے۔ یہی قوت شخص اکبر کی تنظیم کا سبب ہے۔ لہٰذا اگر ایک جاذب چیز بنائی گئی تو اس کے مقابل ایک منجذب چیز کا بنایا جانا ضروری ہے۔

............☆☆☆............

سطعہ ۴۵

مجرد (۱) (ذات بحت) کو شخص اکبر کے اس جز معین (جو تجلی کا محل ہے) کے ساتھ ایک خاص قسم کا تعلق ہے جو عرض کے ساتھ جوہر کے خصوصی تعلق یا جوہر کے ساتھ عرض کے تعلق کی طرح نہیں ہے کہ اس کے لیے لغت میں کوئی بنا ہوا لفظ موجود ہو۔ ناچار (اس خصوصی تعلق کو ظاہر کرنے کے لیے) ایسا مجاز اختیار کیا گیا ہے (جو اس معنی کے) زیادہ قریب ہو اور ایسے استعارات کو کام میں لایا گیا (جن کے بارے میں یہ گمان تھا کہ وہ) اس تعلق کو زیادہ سے زیادہ واضح صورت میں پیش کرسکیں گے۔ چنانچہ ہر شخص ایک نیا لفظ لایا ہے۔ کسی (۲) نے ''اقنوم اور صنم'' کہا۔ دوسرے (۳) لوگوں نے (اس تعلق کو ظاہر کرنے کے لیے) لفظ ''حلول'' استعمال کیا۔ تیسری جماعت نے کہا ''لاہوت نے ناسوت کا لباس پہن لیا'' یہ سارے کے سارے الفاظ ایک اعتبار سے تو معنی مطلوبہ کو ذہن کے قریب لے آتے ہیں۔ لیکن دوسرے اعتبار سے حقیقی معنی کو ذہن سے دور بھی کردیتے ہیں۔ (بلکہ میں تو کہوں گا کہ) ان تعبیرات میں اصلاح سے زیادہ فساد کا پہلو غالب (۴) رہا ہے۔

(شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیر ہا)

کیونکہ ان (دوراز کار) تعبیرات کے باعث عام لوگوں کے اوہام نے قسم قسم کے کفریات اور جہل مرکب تیار کرلیے اور گمراہی کے ایسے گڑھوں میں گر پڑے جہاں سے نکلنا انھیں ابد تک میسر نہیں آئے گا۔

جب ''مدبر السموٰت والارض'' نے اپنے فیض کو کتب الٰہیہ میں الفاظ حروف کا جامہ پہنایا تو وہ فیض اپنے طبعی طرز پر سیلان پذیر ہوا اور (مذکورہ بالا) تمام مفاسد حق تعالیٰ کی نظر میں

متمثل ہوئے تو خلق کی ہدایت کے لیے دوسری راہ کا تعین کیا گیا۔اور وہ تعبیرات ہیں ''عرش(۵)'''' ذی العرش''''استواءعلی العرش'' کی (اور کتب ساویہ میں یہ ظاہر کردیا گیا کہ) سبع سماوات کی تخلیق کے بعد استواءعلی العرش ہوا۔کیونکہ شخص اکبر میں یہ ایک ہی مرکزی نقطہ ہے جو سارے شخص اکبر کے تعین کے بعد معین ہوا۔ جیسے کہ(کرہ کا) مرکز کرے کے مکمل ہونے کے بعد معین کیا جاتا ہے۔اللہ تعالیٰ نے ارشادفرمایا ہے''خَلَقَ سَبعَ سَمٰوٰتٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ''(اللہ تعالیٰ نے آسمان پیدا کیےاورپھرعرش پرمستوی ہوگیا۔) ملائکہ کا جوگروہ حظیرۃ القدس میں پیش قدم ہے اس کا نام''حملۃ العرش'' رکھا گیا اور دوسرے گروہ کا نام''حافین حول العرش''اورایک جماعت کا نام''علیین''رکھا گیا ہے۔

محدثین کی تفاسیر میں بعض آثار مروی ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ''حملۃ العرش'' چار(۶) فرشتے ہیں ایک بصورت انسان وہ بنی آدم کا شفیع ہے اور دوسرا بیل کی صورت کا ہے اور وہ بہائم کا شفیع ہے اور تیسرا گدھ کی شکل کا ہے اور وہ پرندوں کا شفیع ہے اور چوتھا شیر کی شکل کا ہے اور وہ درندوں کا شفیع ہے۔مسند داری میں روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں امیہ بن ابی الصلت کا یہ شعر پڑھا گیا:

رجل وثور عند رجل یمینہ
وانسر للاخریٰ ولیس مرصد

(ترجمہ) آدمی اور بیل (عرش کے) دائیں پائے کے نزدیک ہیں اور گدھ بائیں پائے کی جانب ہےاورشیر بھی دیکھا جارہا ہے)۔

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا:''صَدَقَ ''(اس نے سچ کہا) اور بعض اوقات حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں موٹے تازے نرجانوروں کی شکل میں دیکھا۔

دراصل یہ سب عالم مثال کی نیرنگیاں ہیں اور دیکھنے والے کی مناسبات ذاتیہ وعرضیہ کی وجہ سے اس پرطاری ہوتی ہیں۔(اللہ اعلم)

درحقیقت شخص اکبر کے اس درمیانی جز (عالم مثال) میں نہ کوئی فوق ہے اور نہ تحت (یعنی نہ اس میں کوئی اوپر کا حصہ ہے اور نہ نچلا) یہ تو ایک خالص معنوی چیز(۸) ہے۔لیکن چونکہ اس کا

زیادہ خصوصی تعلق فلک اطلس کے ساتھ ہے، جو اجرام ساویہ میں سب سے بڑا جرم ہے۔اس لیے شرائع الٰہیہ میں اللہ تعالی کی طرف فوق کا تصور منسوب کیا جاتا ہے (اس کو اس مثال سے سمجھو کہ) نفس ناطقہ کو روح ہوائی (نسمہ) سے زیادہ مناسبت ہے اور روح ہوائی کا منبع مضغہ قلب ہے لہٰذا روح کو اس مضغہ قلب کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

الا ان في الجسد مضغة اذا صلحت صلح الجسد كله و اذا فسدت فسد الجسد كله الا وهي القلب.

(ترجمہ) اچھی طرح سنو! انسان کے جسم میں ایک گوشت کا ٹکڑا ہے اگر وہ درست ہو تو سارا بدن درست رہتا ہے اور اگر وہ خراب ہو جائے تو سارا جسم خراب ہو جاتا ہے اور اچھی طرح سن لو کہ وہ ''قلب'' ہے)

اور اللہ تعالی ارشاد فرماتا ہے:

لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ.

ترجمہ! آنکھیں تو اندھی نہیں ہوتیں بلکہ وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینے میں ہیں (الحج۔۴۶)

اور چونکہ استوا علی العرش، ہفت آسمان کے وجود پذیر ہونے کے بعد بلکہ اس کے بعد کہ ہر آسمان میں اس کا امر وحی کر دیا گیا اور زمین کے پھیلائے جانے، اس میں مفید اشیا کی تخلیق اور تمام موالید کے وجود پذیر ہونے کے بعد، واقع ہوا۔اس لیے ابو رزین عقیلی کے اس بارے میں سوال (کے جواب میں) کہ: **اَيْنَ كَانَ رَبُّنَا قَبْلَ اَنْ يَخْلُقَ خَلْقَهُ** (ہمارا رب تخلیق کائنات سے پہلے کہاں تھا؟) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **كَانَ فِي عَمَاءٍ مَا فَوْقَهُ هَوَاءٌ وَمَا تَحْتَهُ هَوَاءٌ**۔ (وہ عماء میں تھا جس کے اوپر ہوا تھی اور نیچے ہوا تھی)

یعنی اس کا تعلق نفس رحمانی کے ساتھ تھا اور یہی تعلق ہے جسے (موجودہ بحث میں) استوا علی العرش سے ظاہر کیا گیا ہے۔

(۱) ذات بحت بواسطہ مرتبہ عقل اس جز معین کے ساتھ جو محل تجلی ہے مخصوص تعلق رکھتی ہے اور یہ تعلق اس نوعیت کا نہیں ہے جو جوہر کو عرض کے ساتھ یا عرض کو جوہر کے ساتھ ہے۔ مثلاً ایک سفید دیوار ہے۔ اس میں دیوار جوہر ہے اور سفیدی عرض ہے۔

(۲) فلاسفۂ یونان ''اقنوم'' سے جوہر مجرد اور ''صنم'' سے شخص اکبر کا مرکزی نقطہ مراد لیتے ہیں۔

(۳) ہندو فلاسفہ اس تعلق کو ظاہر کرنے کے لیے کبھی ''حلول'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور کبھی تدرع (یعنی لاہوت نے ناسوت کا لباس اختیار کیا) یعنی اوتار لینا کا تصور پیش کرتے ہیں۔ اسی طرح کے نظریات ''ایرانی فلاسفہ'' کے بھی ہیں۔

(۴) دنیا میں جس قدر بت پرستی، مظاہرہ پرستی یا شرک پیدا ہوا ہے وہ ان ہی تعبیرات کے باعث ہوا ہے۔

(۵) قرآن حکیم نے مذکورہ مفاسد سے محفوظ رکھنے کے لیے ''عرش'' کا تصور پیش کیا۔ یہ ایک آئینہ ہے جو سب سے اونچا ہے جس تک کسی کا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا ہے۔ اس آئینہ میں ذات بحت مرتبہ عقل کے واسطے سے اپنی تجلی کو ظاہر کرتی ہے۔

(۶) یہ ائمۃ النوع ہیں۔ وہاں جو انسان حامل عرش ہے وہ امام نوع انسانی ہے۔ اسی طرح دیگر حاملین عرش۔

(۷) یہ عیسائی شاعر تھا جو عیسائیت کا احیا کرنا چاہتا تھا۔

(۸) یہ استوا اور عرش یہ سارے معنوی امور ہیں۔ جن میں تحت وفوق کی کوئی نسبت نہیں پائی جاتی، لیکن چونکہ اس کا تعلق فلک اطلس سے ہے جو سب سے بلند ہے۔ اس لیے علوم شرعیہ میں خدا تعالیٰ کا انتساب نسبت فوق کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ جیسے کہ نفس ناطقہ کو روح ہوائی (نسمہ) سے زیادہ مناسبت ہے اور روح ہوائی کا منبع قلب ہے لہٰذا روح کو قلب ہی کی طرف منسوب کرنے لگے۔

(۹) عماء سے مراد مرتبہ احدیت ہے جس میں تمام اسماء وصفات مستہلک ہیں اور اس کا نام جمع الجمع ہے اور اسی کو حقیقۃ الحقائق بھی کہتے ہیں۔

............☆☆☆............

سطعہ ۴۶

قال اللہ تعالیٰ: اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مَثَلُ نُوْرِہٖ کَمِشْکٰوۃٍ فِیْھَا مِصْبَاحٌ اَلْمِصْبَاحُ فِیْ زُجَاجَۃٍ اَلزُّجَاجَۃُ کَاَنَّھَا کَوْکَبٌ دُرِّیٌّ یُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَۃٍ مُّبٰرَکَۃٍ زَیْتُوْنَۃٍ لَّاشَرْقِیَّۃٍ وَّلَاغَرْبِیَّۃٍ یَّکَادُ زَیْتُھَا یُضِیْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْہُ نَارٌ نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ یَھْدِی اللّٰہُ لِنُوْرِہٖ مَنْ یَّشَآءُ (النور. ۳۵)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

(اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کی روشنی ہے۔ اس کے نور کی مثال جیسے ایک طاق میں ایک چراغ ہو۔ وہ چراغ ایک شیشے میں دھرا ہوا ہے۔ وہ شیشہ ہے جیسے ایک چمکتا ہوا تارا۔ اس میں ایک برکت والے درخت کا تیل جلتا ہے جو زیتون ہے جو نہ مشرق کی طرف ہے نہ مغرب کی طرف قریب ہے کہ اس کا تیل روشن ہو جائے۔ اگر چہ اس کو آگ بھی نہ لگی ہو، روشنی پر روشنی ہے۔ جس کو اللہ چاہے اپنی روشنی کی راہ دکھا دیتا ہے۔)

اگر غور و فکر کرنے والوں کی کج فہمی مانع نہ ہو تو یہ آیت طلسم الٰہی کو بیان کرنے میں واضح ہے۔ وہی ذات مجردہ ومقدسہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے لیکن طلسم الٰہی کے واسطے سے اور اس قرینے سے جو مثل مذکور میں بیان ہوا۔ جس طرح ہمارا نفس ناطقہ اس قوت کے واسطے سے دیکھتا ہے جو آنکھ کے پردۂ جلیدیہ (۱) اور مجمع النور میں مضمر ہے اور اس قوت کے واسطے سے سنتا ہے جو کان کے سوراخ کے ایک پٹھے میں پھیلی ہوئی ہے اور اس قوت کے واسطے سے پکڑتا ہے جو ہاتھ میں پھیلی ہوئی ہے اور اس قوت کے واسطے سے چلتا ہے جو پاؤں میں رکھی ہوئی ہے۔

آسمانوں اور زمین میں اللہ تعالیٰ کے نور کی کیفیت کا بیان طاق مذکور۔ الیٰ آخرہ کے بیان کی

مانند ہے۔اس آیت میں تقدیم (۲) وتاخیر کا عمل ہوا ہے اور وہ فصحائے عرب کے طرز گفتگو کے مقتضیات کے مطابق ہے جیسے کہ آیت اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰھُمَا فَتُذَکِّرَ اِحْدٰھُمَا الْاُخْرٰی کی تفسیر میں تم نے دیکھا ہوگا اور تقدیم وتاخیر کا سبب یہ ہے کہ کلام کی روانی نور الٰہی کے آسمانوں اور زمین میں پھیلنے کے بیان کے لیے وہ مثل بیان کرتی ہے جو مشکوۃ (طاق) میں چراغ سے پھیلتا ہے، باقی سارا کلام اسی بحث کا اتمام کرتا ہے۔

اصل مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالی کے نور کی صفت چراغ کی مانند ہے جو قندیل میں ہے اور وہ قندیل طاق میں ہے۔وہ چراغ روغن زیتون سے جلتا ہے جو درخت زیتون) نہ شرقی ہے اور نہ غربی۔ بلکہ درختوں کے وسط میں واقع ہے اور آفتاب کی روشنی صبح وشام اسے معتدل بنا دیتی ہے۔ قریب ہے کہ اس درخت کا روغن بغیر آگ کا شعلہ پہنچے ہوئے آگ پکڑ لے۔ یہ چراغ نور کے اوپر نور ہے۔ چراغ سے مراد وہ بتی ہے جو قندیل میں تیل سے جلتی ہے،جس طرح چراغ کی آگ بتی میں تیل کے ذریعہ قائم ہے اور تیل اس کی (آگ کی) سواری ہے۔اسی طرح صورت (۳) الٰہیہ ہے جو عالم کے وسطانی جز کے ساتھ قائم ہے۔یہ عالم مثال درخت زیتون کے قائم مقام ہے جو نہ شرقی ہے اور نہ غربی،یعنی نہ مجرد ہے کہ مبدا کا فیض اولاً قبول کرے اور نہ جسمانیات سے ہے کہ مبدا کا فیض آخر میں قبول کرے بلکہ اس کے اور اس کے درمیان وسط ہے اور نہ جز مجرد محض کے ساتھ پوری مناسبت رکھتا ہے اور اس مناسبت کی وجہ سے اس کے مطیہ اور آئینہ کا کام دیتا ہے۔ شخص اکبر کے اجزا میں سے کوئی دوسرا جز سوائے اس جز کے (مجرد محض) کا آئینہ بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔پس گویا یہ مجرد محض ہے اور نور خالص۔اور جب تجلی الٰہی اس پر مستولی ہوگئی،تو نور علی نور ہوگیا۔(یعنی نور پر نور چھا گیا) وہ روشن بتی شیشے کے اندر بے حد درخشاں ہے۔اسی طرح وہ تجلی الٰہی حظیرۃ القدس میں ہے۔وہ اس تجلی کی ہم رنگ ہے۔ایک اعتبار سے وہ اس کا غیر ہے اور ایک اعتبار سے وہ اس کا عین ہے۔وہ شیشہ طاق میں ہے۔یعنی وہ طاق جو قندیل کے رکھنے کی جگہ ہے۔قندیل سے منتشر ہونے والی کرنیں سارے طاق پر مستولی ہوجاتی ہیں اور وہ (کرنیں) طاق کے تمام اطراف میں پہنچ کر سب کو اپنے انوار سے منور کر دیتی ہیں۔اسی طرح حظیرۃ القدس سے کرنیں چلیں اور ملاء اعلیٰ وملاء سافل کے تمام ملائکہ کے واسطے سے ساری کائنات میں تدبیر

کر کے سب کے اپنے زیر فرمان بنالیا (ان حظیرۃ القدس کی کرنوں نے) تمام کی ظلمت کو دور کر کے انھیں حیز حقیقی کے رنگ میں رنگ دیا اور اسی وجہ سے شخص اکبر کو حیز محض کے ساتھ مشابہت ہوگئی۔

---

(۱) یہ ایک طبی اصطلاح ہے۔

(۲) یعنی بجائے اس کے کہ کہا جاتا کہ کمشکوٰۃ فیھا زجاجۃ فی مصباح (یعنی اس طاق کی طرح جس میں شیشہ ہے اور شیشے میں چراغ ہے) کہا گیا کمشکوٰۃ فیھا مصباح المصباح فی زجاجۃ (یعنی اس طاق کی طرح جس میں چراغ ہے اور چراغ شیشے میں ہے) حضرت شاہؒ صاحب فرماتے ہیں کہ یہ تقدیم وتاخیر فصحائے عرب کے مقرر ومتعارف اصول کے مطابق ہے، اور اس میں حکمت ہے، وہ یہ کہ اس آیت میں نور خداوندی کے آسمان وزمین میں سریان کو بتلانا مقصود ہے اور اس کے سریان نور کو تشبیہ دی جارہی ہے، چراغ کے نور کے طاق میں سریان کے ساتھ۔ اگر کمشکوٰۃ فیھا زجاجۃ کہا گیا ہوتا تو قاری کا ذہن پہلے زجاجہ (شیشے) کی طرف منتقل ہوتا، پھر مصباح (چراغ) کی طرف آتا۔ لہٰذا سریان نور خداوندی کی تشبیہ مکمل نہ ہوتی اور نہ قاری کے پردۂ ذہن پر وہ تصویر ابھرتی جسے اللہ تعالیٰ ابھارنا چاہتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اصل تو مصباح (چراغ) ہے جس کی تنویر سے مشکوٰۃ (طاق) بھی منور ہے اور زجاجۃ (شیشہ) بھی۔ طاق اور شیشہ دونوں روشنی کو بیک وقت قبول کررہے ہیں۔ لیکن یہ روشنی ان کی ذاتی نہیں ہے بلکہ مستفاد ہے نور مصباح سے لہٰذا مصباح (چراغ) کو مقدم کرنا ضروری ہوا۔

اصل چیز جو حضرت شاہؒ صاحب اس سطعہ میں ذہن نشین کرانا چاہتے ہیں یہ ہے کہ جس طرح چراغ شیشہ میں ہے اور شیشہ (قندیل) طاق میں رکھا ہوا ہے اور وہ چراغ اس زیتون سے جل رہا ہے جو درخت زیتون سے ماخوذ ہے اور وہ نہ شرقی ہے نہ غربی (یعنی نہ بالکل مجرد ہے اور نہ بالکل مادی بلکہ دونوں کے درمیان برزخ ہے) یہ چراغ دراصل نام ہے اس بتی کا جو قندیل میں جل رہی ہے۔ اس بتی میں آگ اس تیل کی بدولت قائم ہے جو بتی میں سرایت کیے ہوئے ہے اور وہی بتی اس آگ کی مطیہ (سواری) بنی ہوئی ہے۔ اسی طرح صورت الٰہیہ (تجلی اعظم) عالم مثال

کے ساتھ قائم ہے اور عالم مثال جہات سے پاک ہے۔ یعنی نہ مجرد محض ہے اور نہ جسمانیات سے ہے بلکہ دونوں کے درمیان حد اوسط (برزخ) ہے۔ لیکن اس کے باوجود مجرد محض کے ساتھ کامل مناسبت رکھتا ہے اور اسی لیے اس کا مطیہ اور آئینہ بنا ہے۔ اس اعتبار سے اسے مجرد بھی کہہ سکتے ہیں اور نور محض بھی۔ پس جب تجلی الٰہی اس پر چھا گئی تو نور علی نور کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ شیشہ سے مراد حظیرۃ القدس ہے جس سے تجلی الٰہی گزر کر آ رہی ہے۔ اور تجلی اس طرح شیشے میں سرایت کر گئی کہ شیشہ (حظیرۃ القدس) سرسری نگاہ میں عین تجلی معلوم ہوتا ہے۔ اب جب کہ شیشہ کو طاق (کائنات) میں رکھ دیا گیا تو ساری کائنات اس شیشہ سے چھن چھن کر آنے والی تجلی کی بدولت منور ہوگئی۔ اس تجلی نے ملاء اعلیٰ اور ملاء سافل سب کو زیر فرمان لا کر شخص اکبر سے ظلمت کو دور کر دیا اور شخص اکبر کو خیر محض (ذات باری تعالی) کے ساتھ کامل مشابہت ہوگئی۔ تفصیلات کے لیے حضرت شاہ رفیع الدینؒ صاحب زادۂ گرامی حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی کتاب ''تفسیر آیت النور'' اور التفہیمات الالٰہیہ جلد اوّل (شاہ ولی اللہ محدث دہلوی) کی طرف رجوع فرمائیں۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم وتب علینا انک انت التواب الرحیم وصلی اللہ تعالی علٰی خیر خلقہٖ سیدنا محمد و آلہ و صحبہ اجمعین برحمتک یا ارحم الراحمین.

............☆☆☆............

لمعات

تصنیف

امام شاہ ولی اللہ محدثؒ

ترجمہ

مولانا پیر محمد حسن

ترتیب

مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
١۔	لمعہ۔١	٣١١
٢۔	لمعہ۔٢	٣١١
٣۔	لمعہ۔٣	٣١٢
٤۔	لمعہ۔٤	٣١٢
٥۔	لمعہ۔٥	٣١٣
٦۔	لمعہ۔٦	٣١٤
٧۔	لمعہ۔٧	٣١٤
٨۔	لمعہ۔٨	٣١٥
٩۔	لمعہ۔٩	٣١٥
١٠۔	لمعہ۔١٠	٣١٧
١١۔	لمعہ۔١١	٣١٨
١٢۔	لمعہ۔١٢	٣١٨
١٣۔	لمعہ۔١٣	٣١٩
١٤۔	لمعہ۔١٤	٣٢٠
١٥۔	لمعہ۔١٥	٣٢٢
١٦۔	لمعہ۔١٦	٣٢٢
١٧۔	لمعہ۔١٧	٣٢٣
١٨۔	لمعہ۔١٨	٣٢٣
١٩۔	لمعہ۔١٩	٣٢٤

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۲۰۔	لمعہ۔۲۰	۳۲۴
۲۱۔	لمعہ۔۲۱	۳۲۵
۲۲۔	لمعہ۔۲۲	۳۲۷
۲۳۔	لمعہ۔۲۳	۳۲۸
۲۴۔	لمعہ۔۲۴	۳۳۰
۲۵۔	لمعہ۔۲۵	۳۳۳
۲۶۔	لمعہ۔۲۶	۳۳۴
۲۷۔	لمعہ۔۲۷	۳۳۶
۲۸۔	لمعہ۔۲۸	۳۳۹
۲۹۔	لمعہ۔۲۹	۳۴۰
۳۰۔	لمعہ۔۳۰	۳۴۱
۳۱۔	لمعہ۔۳۱	۳۴۲
۳۲۔	لمعہ۔۳۲	۳۴۳
۳۳۔	لمعہ۔۳۳	۳۴۴
۳۴۔	لمعہ۔۳۴	۳۴۵
۳۵۔	لمعہ۔۳۵	۳۴۷
۳۶۔	لمعہ۔۳۶	۳۴۷
۳۷۔	لمعہ۔۳۷	۳۴۸
۳۸۔	لمعہ۔۳۸	۳۵۰
۳۹۔	لمعہ۔۳۹	۳۵۱
۴۰۔	لمعہ۔۴۰	۳۵۱
۴۱۔	لمعہ۔۴۱	۳۵۴

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۴۲۔	لمعہ۔۴۲	۳۵۵
۴۳۔	لمعہ۔۴۳	۳۵۵
۴۴۔	لمعہ۔۴۴	۳۵۶
۴۵۔	لمعہ۔۴۵	۳۵۷
۴۶۔	لمعہ۔۴۶	۳۵۸
۴۷۔	لمعہ۔۴۷	۳۵۹
۴۸۔	لمعہ۔۴۸	۳۶۰
۴۹۔	لمعہ۔۴۹	۳۶۳
۵۰۔	لمعہ۔۵۰	۳۶۶
۵۱۔	لمعہ۔۵۱	۳۶۷
۵۲۔	لمعہ۔۵۲	۳۶۸
۵۳۔	لمعہ۔۵۳	۳۶۹
۵۴۔	لمعہ۔۵۴	۳۷۰
۵۵۔	لمعہ۔۵۵	۳۷۱
۵۶۔	لمعہ۔۵۶	۳۷۲
۵۷۔	لمعہ۔۵۷	۳۷۳
۵۸۔	لمعہ۔۵۸	۳۷۳
۵۹۔	لمعہ۔۵۹	۳۷۵
۶۰۔	لمعہ۔۶۰	۳۷۶

............☆☆☆...........

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى سَيِّدِ الْمُرْسَلِيْنَ وَآلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ

لمعہ نمبرا

ہر معلول حادث ہے کیوں کہ اس کی علت اس سے پہلے موجود ہوتی ہے اور ہر حادث تغیر پذیر ہے کیوں کہ اس سے پہلے اس کا پیدا کرنے والا اور متغیر کرنے والا موجود ہوتا ہے۔ نیز ہر وہ چیز جو دو چیزوں سے مرکب ہو، اس سے پہلے اس کے اجزا موجود ہوتے ہیں اور ہر وہ چیز جس کی حقیقت اور شخصیت محقق ہو اس سے پہلے اس کی حقیقت کا ہونا ضروری ہے، جس سے یہ نوع معرض وجود میں آئی۔

لہٰذا اول الاشیاء اور مبدءِ کل کے لیے یہ ضروری ہو گیا کہ وہ نہ معلول ہو نہ حادث نہ مرکب ہو اور نہ کسی ماہیت اور وجود سے محقق ہوا ہو۔

لمعہ نمبر۲

یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ اول الاوائل موجود کا ایک فرد ہے اور نہ یہ کہ وجود اسے اسی طرح اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ جس طرح ایک کلی اپنی جزئیات میں سے کسی ایک جزئی اور فرد پر مشتمل ہوتی ہے۔ بات اس طرح نہیں ہے بلکہ اول الاوائل اس بہت ہی عام مفہوم کا تمام جہات سے احاطہ کیے ہوئے ہے اور ہر جہت سے اسے اپنے اندر شامل کیے ہوئے ہے۔ کیوں کہ وجود خود اس وقت مفہوم مستقل کا درجہ حاصل کرتا ہے۔ جب ان حقائق کی طرف سرسری نگاہ پڑے جن سے بہت سے متباین آثار کا ظہور ہوتا ہے اور اس طرح عدم اور وجود میں امتیاز پیدا ہو جاتا ہے۔ مگر اول

الاوائل کی حقیقت کا امتیاز کسی اور حقیقت سے نہیں کیا گیا، لہٰذا اس لحاظ نے ذہنوں میں ایک صورت پیدا کر دی جس کا نام وجود رکھا گیا۔ تمام حقائق کا مرجع اول الاوائل ہے اور اسی میں آ کر وہ ختم ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا جو وجود اس اعتبار سے پیدا ہوا اس کا کیا حال ہوگا؟

لمعہ نمبر۳

یوں خیال نہ کرنا چاہیے کہ اول الاوائل کی ضرورت صرف سلسلہ امکانیہ کے منقطع ہونے پر پڑتی ہے؛ اگر چہ جب ہر طبیعت امکانیہ والے کی طبیعت کا تحقق اول کے ہاں ہوتا ہے تو اسے اول کی ضرورت پڑتی ہے، یہاں تک کہ اگر اول سے کوئی چیز صادر ہو اور پھر اس صادر سے کوئی اور صادر وجود میں آیا ہو تو دوسرے صادر کا احتیاج صرف پہلے صادر کی طرف ہوگا، اگر چہ یہ صادر خود اول الاوائل کا محتاج ہے۔ یہ بات بھی اس طرح نہیں ہے بلکہ طبیعت امکانیہ جب درحقیقت وجود یا ماہیت میں آ جائے (تو اسے اول الاوائل کی ضرورت رہتی ہے) اور ہر چیز جسے تو 'واحد' کی طرف نسبت دے تو یہ نسبت اسی طرح ہوگی جس طرح 'واحد' کی دیگر مراتب اعداد کے ساتھ ہوتی ہے، یعنی 'واحد' 'دو' سے پہلے ہوگا۔ یہی حال ہر عدد کا ہے، یہاں تک کہ دونوں ایک ہو جائیں اور اللہ کی مثال تو اس سے بھی اعلیٰ وارفع ہے۔

لمعہ نمبر۴

ہر چیز جو اس چیز سے متغایر ہو جو اس سے جدا کی گئی ہے تو اس میں دو باتیں پائی جائیں گی۔ یا تو یوں کہیں گے کہ وہ وہی ہے یا کہیں گے کہ وہ وہی نہیں ہے۔ لہٰذا اس صورت میں یہ مرکب ہے اور اپنے اندر کثرت کو لیے ہوئے ہے اور اس سے پہلے اور چیزیں موجود ہیں۔ لہٰذا ضروری ہو گیا کہ اول ایسی چیز ہو جو دیگر اشیاء کے مزاحم نہ ہو۔ اب ہم مادہ اور صورت وغیرہ کی مثال دے کر بیان کرتے ہیں اگر چہ اول الاوائل کا معاملہ ایسا ہے کہ اس کی مثال نہیں دی جا سکتی۔

موم کا وجود ان مورتیوں کے وجود سے نہیں ٹکراتا، جو موم سے بنائی گئی ہوں۔ (اسی طرح) وجود انسانی افراد انسانی کے وجودوں سے نہیں ٹکراتا اور 'ملکہ' کا وجود ان افعال کے وجود سے نہیں

ٹکراتا جو اس سے صادر ہوں۔ اسی طرح ہر اعلیٰ وجود اپنے سے نچلے وجود سے نہیں ٹکراتا بلکہ وہ وہی چیز بھی ہے اور اس کے ساتھ بھی اسی طرح ہے جس طرح اوروں کے اندر اور اوروں کے ساتھ، نہ تو اسے فی نفسہ متعین کیا جا سکتا ہے اور نہ اس پر خصوصیت کے ساتھ کوئی حکم لگایا جا سکتا ہے۔ لہٰذا اس کے ساتھ علم کا تعلق نہیں ہو سکتا، اس لیے علم ہو جانے سے اس کی تعیین ہو جاتی ہے۔ حالانکہ نہ زمان و مکان اس کا احاطہ کر سکتے ہیں اور نہ حس یا وہم اس کا ادراک کر سکتے ہیں۔

لمعہ نمبر ۵

اول کی صفات ایسی ہیں جو فی نفسہ اس کی کبریائی کی تفسیر ہیں، مثلاً وجود، تعین، حیات اور علم، ان صفات کا قانون کلی یہ ہے کہ جب تو کسی پاس والی چیز کو دیکھے اور وہ تجھے پسند آ جائے اور پھر تو اسے 'اول' میں تلاش کرے تو دیکھے گا کہ اول بدوں اس کے کہ وہ کوئی زائد صفت حاصل کرے بذاتہ اس سے مستغنی ہے۔

اس کے افعال محکم اور اس کے اضافات مضبوط ہیں۔ اس کا ضابطہ یہ ہے کہ اگر یہ افعال ابداع کی طرف راجع ہوں تو صادر اول سب کا قائم مقام ہو جائے گا۔ اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ یہ اول سے متصل ہے صادر اول کا صادر ہونا بعینہ تمام عالم کا صادر ہونا سمجھا جائے گا۔

یا ان افعال کا مرجع خلق کی طرف ہوگا تو اس صورت میں شخص اکبر کے فیضان میں تمام اشخاص آ جائیں گے کیوں کہ

ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں [1]

یا ان کا مرجع تدبیر اور تدلی کی طرف ہوگا جس میں یا تو یہ شرط پائی جائے گی کہ اللہ نے انہیں پیدا کیا یا ان پر تجلی ڈالی ہے جس طرح کشتی سوار جو کشتی کی حرکت سے متحرک ہوتے ہیں۔ یا جس طرح لکھنے والا کہ اس حالت میں انگلیوں کا حرکت میں آنا ضروری ہو جاتا ہے۔

---

[1] اصل کتاب میں 'کل الصید جوف الفری' دیا ہے، اسے 'فی جوف الفرا' پڑھیں۔ فرا، دراصل 'گورخر' کو کہتے ہیں۔ 'کل الصید فی جوف الفرا' عربی کی ضرب المثل ہے جس کا اردو میں متقابل 'ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں' ہے۔

اس کا ایک خاص اسلوب ہے جو ہر ہیئت اور نسبت سے اس کی حفاظت کرتا ہے۔ اس کا ضابطہ یہ ہے کہ ایسے امور ہیں جو ادراک کرنے والے کے ذہن میں اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب کہ اس کی توجہ خواہ اجمالی طور پر ہی کیوں نہ ہو، ایک طرف تو اول الاوائل کی کبریائی کی طرف ہوتی ہے اور دوسری طرف متمثلہ ہیئتوں میں سے کسی ایک ہیئت کی طرف ہوتی ہے۔

لمعہ نمبر ۶

واحد کا لفظ کئی معنوں میں مستعمل ہے۔ چنانچہ زید کو شخص کے اعتبار سے واحد کہیں گے، اگرچہ اس کے اجزا بہت ہیں، اور انسان اپنی نوع کے اعتبار سے واحد ہے اگرچہ اس کی انواع بہت ہیں۔ واحد کہلانے کا سب سے زیادہ حق دار، وہ مفہوم ہے بالخصوص مبدا کے اعتبار سے جو لفظ 'کن' کے کہنے سے بیک بار موجود ہو گیا ہو یا ایک ہی اقتضا اور ایک ہی قوت سے پیدا ہوا ہو یا ایک شخص کا سایہ ہو۔ ان میں سے جو تمہارا جی چاہے کہہ لو۔

لمعہ نمبر ۷

حق بات یہ ہے کہ اول سے ایک ہی چیز صادر ہوتی ہے، وگرنہ تمہارا یہ کہنا کہ 'یہ دو چیزیں ہیں' بمقابلہ یہ کہنے کے کہ 'وہ دونوں ایک ہی ہیں' کیسے بہتر ہوا؟ لہٰذا ضروری ہو گیا کہ ان کے صادر ہونے کا دارومدار قوتوں، فاعل اور قابل، پر ہو جن کی روشنی فاعل پر پڑتی ہے اور اس طرح کل میں کثرت پیدا ہو جاتی ہے۔

اس صادر کے لیے یہ ضروری نہیں کہ بعض متقابل چیزوں کو چھوڑ کر دوسری چیزوں کے ساتھ مخصوص ہو جائے، بلکہ اس کی حقیقت کے لیے ضروری ہے کہ وہ دوسرے حقائق سے مزاحم نہ ہو۔ اس کی نسبت اشیاء کی طرف وہی ہوتی ہے جو سیاہ خط کی نسبت کتابت کے نقوش کے ساتھ ہوتی ہے۔ ہم اس کی مثالیں پہلے دے چکے ہیں۔ لہٰذا منبسط وجود ہی ہے جس کی طرف 'زید فی الخارج' (زید خارج ہے) کہنے سے خارج میں اشارہ کیا جاتا ہے۔ جب ہم کہتے ہیں 'زید فی الاعیان' تو لفظ اعیان کے ساتھ اشارہ کیا جاتا ہے اور جب ہم کہتے ہیں 'زید متحقق ہے حالانکہ

پہلے ایسا نہ تھا، تو تحقق کے لفظ کے ساتھ اشارہ کیا جاتا ہے۔ ایسا کیوں نہ ہو جب کہ ہر وہ چیز جو خارج اور اعیان میں موجود ہو اس سے پہلے خارج اور اعیان کا موجود ہونا ضروری ہے؟ اسی طرح ہر تحقق سے پہلے تحقق ہوتا ہے۔ (جو وجود منبسط سے عبارت ہے)۔

لمعہ نمبر ۸

پہلی چیز جو تمہارے فکر میں آتی ہے یہ ہے کہ یہاں ایک ایسی چیز ہے جسے ہم 'وجود فی الاعیان یا وجود فی الخارج' کا نام دیتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں ایک اور چیز ہے جسے ہم عدم کہتے ہیں۔

ہم بعض اوقات کسی ماہیت کا تصور کرتے ہیں۔ اور اس کے وجود میں شک بھی گزرتا ہے یا ہم اس کے معدوم ہونے کا قطعی فیصلہ دے دیتے ہیں مگر اس کے باوجود سچ کے احکام اس پر لگائے جاتے ہیں۔

اور کبھی وجود کا تصور کرتے ہیں مگر ہم کسی قسم کی ماہیت کا تصور نہیں کرتے۔ چنانچہ جب تو یہ کہے 'السواد موجود' تو اس سے وہ مفہوم ادا ہوتا ہے جو 'السواد سواد' کہنے سے ادا نہیں ہوتا۔ برعکس اس کے تو ماہیت کی صفت بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ موجود ہے، اس کے بعد دوسری، اور ان دونوں حالتوں میں ایک ہی مفہوم سمجھ میں آتا ہے۔ یہاں سے ثابت ہو گیا کہ (وجود اور ماہیت) دو الگ الگ چیزیں ہیں اور وجود کا مفہوم ایک ہے جو ماہیات کے اندر ثابت ہے لیکن اس مسئلہ کی تشریح کا حق اسی وقت ادا ہوگا جب تو ان کا کلی طور پر احاطہ کرے اور یہ جان لے کہ یہ دونوں اپنی ذات میں کیا ہیں۔

جو ہم کہہ رہے ہیں اسے غور سے سن لو اور تفصیل کو چھوڑ کر اجمال پر اکتفا کرو۔

لمعہ نمبر ۹

وجود فی الخارج یا وجود فی الاعیان جیسا کہ ان دونوں عبارتوں سے سمجھ میں آتا ہے ایک امر انتزاعی ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں، سوائے اس کے کہ تمہارے ذہن میں اس کی

مثالی صورت ہوتی ہے۔لیکن اس کا انتزاع ایسا نہیں ہے کہ وہم حقیقت نفس الامری پر اعتماد کیے بغیر خود ہی اسے اختراع کرے بلکہ نفس الامر میں اس کی حقیقت موجود ہوتی ہے۔اگر ہوگی تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ یہ 'موجود' ہے اور 'لیس بموجود' کہنا غلط ہوگا۔اگر نفس الامر میں اس کی حقیقت موجود نہ ہوگی تو معاملہ برعکس ہوگا۔زیادہ حق اسی حقیقت کا ہے کہ اس اعتبار کیا جائے گا۔یہ کہنا بھی کوئی صحیح نہیں کہ اس کا حال ان اعراض کا سا ہے جو جواہر پر طاری ہوتے ہیں۔ایسا کیوں نہ ہو جب کہ اعراض اس وقت تک طاری نہیں ہوتے جب تک کہ جواہر جن پر وہ طاری ہوئے ہیں ثابت نہ ہو جائیں، اور نہ اس کا معاملہ کسی شے کے عنصر، طینت اور شمع کا سا ہے جہاں قابل اور مقبول الگ الگ ہوتے ہیں۔اس لیے ان دونوں کے درمیان صرف عقل ہی امتیاز کر سکتی ہے بلکہ حق بات تو یہ ہے کہ جس طرح کہ تو زید اور عمر کو دیکھ کر ان سے 'انسان' کا انتزاع کرتا ہے اور اس انتزاع کا سبب ان دونوں میں موجود اور ثابت ہوتا ہے، یا جس طرح کہ تو انسان اور گھوڑے کو دیکھتا ہے اور ان دونوں سے 'حیوان' کا انتزاع کرتا ہے اور یہاں بھی اس انتزاع کا سبب دونوں میں ثابت ہوتا ہے، اسی طرح تو تمام ماہیات کی طرف اجمالی نظر دوڑاتا ہے اور ان سے 'وجود' کا انتزاع کرتا ہے اور اس التفات کا سبب بھی اس میں ثابت ہوتا ہے۔چنانچہ کہتے ہیں کہ اس انتزاع کا منشا ذات شے ہے۔'من حیث ھو فی الخارج' یا 'من حیث ھو فی الاعیان' بعینہ اسی طرح جس طرح ہم کہتے ہیں کہ 'زید انسان ہے' اس لیے کہ انسانیت عمرو، بکر اور دیگر بنی نوع انسان میں مشترک ہے۔

وجود درحقیقت جنس الاجناس اور ذات الذاتیات ہے مگر چوں کہ اشیا کی پہچان ضد سے ہوتی ہے اور طبیعت الوجود کی کوئی ضد نہیں، اس لیے انسان اسی وقت ان سے آگاہ ہوتا ہے جب احکام میں مخالفت پائی جائے؛ چنانچہ کبھی یہ احکام نہیں پائے جاتے اور کبھی پائے جاتے ہیں۔وجود میں 'من حیث الوجود' کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا اور نہ یہ کسی اعتبار سے معدوم ہوتا ہے۔لہٰذا یہی قرار پایا کہ اسے نہ ذات، نہ جنس اور نہ کوئی اور چیز شمار کیا جائے۔

لمعہ نمبر ۱۰

ہر جنس اور اس کی انواع میں اصلی امتیاز پایا جاتا ہے اور ہر ذات اور اس کی 'ذاتی' کے متعلق بھی امتیاز حاصل ہے اور اگر تو اچھی طرح سے دیکھے تو تجھے معلوم ہو جائے گا کہ تمہارے ادراک میں اس چیز کے تحلیل کرنے کا مادہ پایا جاتا ہے۔ چنانچہ بعض اوقات تو اجمالی طور پر ماہیات کو دیکھتا ہے اور ان سے اجمالی وجود کا انتزاع کرتا ہے اور کبھی تو کسی ماہیت کا ملاحظہ کرتا ہے اور اس سے وجود کے اس حصہ کا انتزاع کرتا ہے جو اس ماہیت کے ساتھ خاص ہے اور اجمالی کچھ اور ہے اور خاص کچھ اور۔ چناں چہ جب 'السواد موجود' کہا جاتا ہے تو اس سے وہ مفہوم ادا ہوتا ہے جو 'السواد لون' سے ادا نہیں ہوتا۔ بعض اوقات کسی ماہیت کے لیے فی نفسہا یا اس کے لوازم یا فاعل یا قابل میں تقرر و تعین پایا جاتا ہے، مثلاً یہ شخص زید ہے اور وہ ابن عمرو ہے، زنگی ہے، عالم ہے، کاتب ہے اور پھر ضاحک (ہنسنے والا) ہے۔ مدارک عالیہ میں اس کے عنصری ظہور سے پہلے ہی اس کے وجود کا تحقق ہو چکا ہے اور اس کا وجود اپنے عنصر قابل میں فیضان سے پہلے 'امکان' کے درجہ میں ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے ہر تقرر کے اعتبار سے کسی مفہوم کا انتزاع درست ہوتا ہے۔ جسے تم وجود کا نام دیتے ہو۔ لہٰذا تم ایک اعتبار سے ماہیت کو موجود پاتے ہو اور تم وجود کے اعتبار سے بالکل بے پرواہ ہو جاتے ہو اور یوں کہتے ہو 'یہ چیز پہلے موجود نہ تھی' پھر موجود ہوئی۔ حق بات یہ ہے کہ تمہارے نزدیک اس کے وجود کے ساتھ اس کی مثال تو صحیح طور پر ظاہر ہو گئی لیکن تو نے بھول جانے کا بہانہ بنا لیا۔ اسی طرح کبھی تم مجہول مطلق اور معدوم مطلق پر صحیح احکام لگاتے ہو جس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ تو اپنے ذہن میں ان پر وجود کا لباس پہنا دیتا ہے۔ اگر تو چاہے تو معدوم مطلق کے بجائے موجود کہہ دے اور مجہول کی بجائے معلوم، جس سے یہ سچے علوم کے لیے انکشاف کا کام دیں مگر اس کے بعد پھر تو انہیں بھلا دے۔

لمعہ نمبر ۱۱

اس جہاں میں صور ہیں اور اعراض ہیں جنھوں نے ان صور کے گرد جال سا بنا رکھا ہے اور ہیولیٰ ہیں جو ان صور کے بالذات محل ہیں مگر ان اعراض کے بالتبع محل ہیں۔ صورت چڑھتی چڑھتی صورت عالیہ تک جا پہنچتی ہے اور تمام صورتیں ان کی شارح و تفصیل ہیں۔ اعراض کا ارتقا اجمالی حکم تک ہوتا ہے۔ ہر حکم کی وسعت دائرہ کی ہوتی ہے اور ہیولوں کا ارتقا ہیولیٰ مطلقہ کی طرف ہوتا ہے اور ہر ہیولیٰ ہیولیٰ مطلقہ کا تعین کرتا ہے اور صورت عامہ ہیولیٰ مطلقہ کے اندر حلول کی ہوئی ہوتی ہے جو اجمالی حکم کو برقرار رکھے ہوئے ہوتی ہے۔ شخص واحد ہوتی ہے اور ایک وجہ سے ظل ہوتی ہے۔ لہٰذا کسی اعتبار سے بھی جو چیز اس شخص میں پائی جائے گی اس کا وہی حکم ہوگا جو 'وجود فی الاعیان یا لاالاعیان' کا اور ہر وہ چیز جو اس سے اوپر ہوگی تو اسے 'وجود فی الاعیان یا للاعیان' کہنا مناسب نہیں۔ البتہ تسامح سے ایسا کہہ سکتے ہیں۔ لہٰذا جو شخص یہ چاہے کہ 'متعالی' اور 'سافلات' کے درمیان ایک جامع امر رکھ دے جس کا نام وجود یا سمع یا بصر یا قدرت وغیرہ ہو تو اس نے حد سے تجاوز کیا۔

ہاں جب کوئی اور راہ ملے تو عقل بھی آرام (استراح) ڈھونڈتی ہے۔ جس طرح کہ شریعت میں 'رخصتیں' ہوتی ہیں جن کی بنا مکلفوں کی کمزوری پر ہوتی ہے اسی طرح عقلی استرواح یہ ہے کہ (اول الاوائل) کو وجود (فی الاعیان) سے موصوف کیا جائے۔ شرعی رخصتوں میں سے یہ قول ہے: اللہ تعالیٰ عرش کے اوپر ہے، اس کے کان ہیں، بصر ہے، ہاتھ ہیں، چہرہ ہے، غضب ہے، رحمت ہے، حالانکہ اس ذات برتر جیسی کوئی چیز نہیں اور وہ سمیع و بصیر ہے۔

لمعہ نمبر ۱۲

کسی شے کا تقرر 'بذاتہ' ہوتا ہے یا 'من ذاتہ' اور یہ کسی اور کی محتاج نہیں ہوتی۔ یا اس کا تقرر 'لغیرہٖ' ہوتا اور یہ اس غیر کی محتاج ہوتی ہے۔ پہلے کو واجب اور دوسرے کو ممکن کہتے ہیں۔ ہر وہ چیز جس کا وجود اور تحقق واجب کے ایجاد کرنے اور تحقق کرنے سے ہو تو اس چیز کے بالمقابل ایک

کمال اور ایک اقتضا ہوگا۔ یہ کمالات اور اقتضائات، جیسا چاہو کہہ لو، ان اشیا کے صادر ہونے کے مبدا ہیں۔ لہذا ہر کمال ایک خاص چیز کا مقتضی ہے اور ہر چیز کا سہارا ایک خاص چیز کا مقتضی ہے اور ہر چیز کا سہارا ایک خاص کمال پر ہے جیسے کہ یہ کمالات اور یہ اشیاء ایک ہی چیز ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کمالات واجب کے لوازم اور اعتبارات ہیں اور اشیا معلومات ہیں جو اس سے صادر ہوتے ہیں۔ لہٰذا یہ جہاں تمام کا تمام کمالات میں لپٹا ہوا ہے۔ اور کمالات کا انکشاف عالم (جہان) سے ہوتا ہے اور اول الاوائل ہر چھوٹی بڑی چیز کو اپنی ذات کے تصرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔ یہی حال شخص اکبر کا ہے۔ باعتبار ان اشیا کے جو اس کے اندر ہیں۔ اب ہم اسی طی و نشر کی مثال بیان کرتے ہیں۔

لمعہ نمبر ۱۳

کیا حساب دان اپنے تصور میں عدد کے مراتب کو موجود نہیں کر لیتا؟ لہٰذا وہ ایک سے ایک اور نکال لیتا ہے اس طرح کہ وہ نظر کو دوبارہ اس طرف کر لیتا ہے جس سے دو بن جاتے ہیں۔ پھر تین بار نظر کرنے سے وہ اس میں سے ایک اور ایک اور ایک نکالتا ہے جس سے تین بن جاتے ہیں۔ چنانچہ وہ اس طرح ایک ایک کر کے نکالتا جاتا ہے جس سے اکائیوں، دہائیوں، سینکڑوں اور ہزاروں کے مراتب بن جاتے ہیں۔ اس کے بعد وہ ان ہندسوں کو جس قدر کہ اس کی عقل میں سما سکیں ایک دوسرے کے ساتھ ملاتا ہے جس سے غیر متناہی امور بن جاتے ہیں۔ مگر نہ تو وہ جفت کو طاق اور نہ طاق کو جفت بناتا ہے اور نہ ان میں تقدیم و تاخیر کرتا ہے۔ برعکس اس کے جس طرح طبیعت عدد یہ کا تقاضا ہے اسی طرح ان کو رکھتا ہے۔ ان سے سرمو انحراف نہیں کرتا اور وہ کر بھی کیسے سکتا ہے؟

یہ سلسلہ جو ہم نے ایجاد کیا ہے اسے ہم اعداد کی طبیعت کو جاننے کے لیے آئینہ بنا لیتے ہیں اور یہ تمام سلسلہ 'واحد' کے اندر ہے۔ یہیں سے معلوم ہو جانا چاہیے کہ اس عددی سلسلہ کا مخفی راز واحد کے اندر پایا جاتا ہے تاکہ یہ تمام اجزا میں ان سے مطابقت کرے، اور یہ پوشیدہ سلسلہ عالم فرض و تقدیر میں مرتبہ بہ مرتبہ لانہایت تک پھیلتا رہتا ہے۔ اس طرح کہ ہر مرتبہ اپنے خواص کے

ساتھ متعین اور ماہیت اور احکام کے لحاظ سے متمیز ہوتا ہے۔ یہ پھیلاؤ مناسب اور حصر کرنے والا ہوتا ہے جو حساب دان کے احاطہ کو مدنظر رکھتے ہوئے غیر متناہی ہوتا ہے مگر واحد کے اعتبار سے متناہی ہوتا ہے اس لیے کہ عدد اسی واحد سے بنا ہوتا ہے۔ کسی اور سے نہیں۔ ہر مرتبہ خاص قسم کے اشتقاق سے نکلتا ہے۔

ہر وہ عدد جس کا صادر ہونا 'واحد' سے ممکن ہو، وہ ہر لحاظ سے صادر ہوتا ہے اور جو صادر نہ ہو وہ ممتنع الصدور (غیر ممکن الصدور) ہوتا ہے۔ جس جہت سے بھی اشتقاق واقع ہو، اس میں سے جو بھی مشتق عدد نکلے گا وہ لازمی طور پر اسی کی پیروی کرے گا۔ یہ سب کے سب حصر و انتہا کے طریقے ہیں خواہ کسی نوع میں ہوں۔ لہٰذا اب عدد کے دو کمال ہوئے۔ ایک کمال ظاہری جو عقلی تحقق اور نفس محاسب کی قیومت کو مدنظر رکھتے ہوئے ہوتا ہے اور دوسرا کمال باطن جو امکان و تقدیر اور واحد کی قیومیت کو خیال رکھتے ہوئے ہوتا ہے۔

لمعہ نمبر ۱۴

وہ امور جو تمہارے سامنے اور تمہارے دیکھنے اور سننے میں آتے ہیں یہ سب کے سب بذات خود اشخاص ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ تو ایسے 'اشخاص' کا ملاحظہ کرے جو تمام حقیقت میں ایک دوسرے سے متفق ہیں اور ان کا اختلاف صرف شخصیت اور اس کے تابع امور میں ہو۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تو ایسے اشخاص کا ملاحظہ کرے جو تمام حقیقت میں تو مختلف ہوتے ہیں مگر حقیقت کے ایک جز میں ان کا پورا اتفاق ہوتا ہے۔ مزید برآں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تو ذہن میں صورت انسانی کو حاضر کرے اور اس کے اور ان اشخاص کے حال پر غور کرے جو اس سے متحد اور اس سے پہلے اس صورت میں ہو چکے ہیں۔ تو یہ پائے گا کہ ان سب اشخاص میں صورت انسانیہ کے وجود کا احتمال ہے اور صورت انسانیہ اپنی ذات کے حدوث کے اندر رہ کر اپنی ذاتیات، قویٰ، آثار اور خواص کے ساتھ ایک متعین چیز ہے اور اس کے فرائض وحدود مقرر ہیں۔ اگر یہ صورت انسانیہ اس مادہ میں پائی جائے جو فلاں عورت کے رحم کے اندر فلاں دن اور فلاں ملک اور فلاں مزاج میں جمع ہو چکا ہو تو وہ زید ہوگا اور اگر کسی اور مادہ میں فلاں دن فلاں ملک اور فلاں مزاج کے ساتھ پایا

جائے تو وہ عمرو ہوگا۔علیٰ ہذا القیاس دیگر انسانوں میں بھی اسی طرح ہوگا، کیوں کہ طبیعت انسانیہ اپنی وحدت کے اندر تمام اشخاص میں بحیثیت انسان کے پائی جاتی ہے، زید، عمرو، بکر کی حیثیت سے نہیں۔اس سے مراد یہ ہے کہ انسان اس طبیعت انسانیہ کی 'ذاتی' ہے اور زید یا عمرو ہونا تو احوال ہیں جو اعراض کی وجہ سے انسان پر طاری ہوتے ہیں۔ انسانیت بمنزلہ جوہر کے ہے اور احوال بمنزلہ ان عوارض کے ہیں جو بعض پر طاری ہوتے ہیں اور بعض پر نہیں۔انسانیت اور انسانیت کے احکام میں اشخاص اور احکام سب کے سب بلحاظ جو ہر ایک جیسے ہیں جو سیدھے قامت، خلقت اور صنعت کا تقاضا کرتے ہیں۔اگر زید اس قامت کے ساتھ سرخ رنگ والا، خوبصورت چہرے والا، موٹی اور سیاہ آنکھوں والا پایا جائے تو یہ ان احکام پر منطبق آئے گا اور اگر عمرو اس سیاہی اور رنگ میں بدصورت اور تنگ آنکھوں والا پایا جائے تو وہ بھی ان احکام پر منطبق ہوگا۔اس طرح اشخاص وافراد کے احکام کی ہر چیز میں احکام نوع کے صرف توسیع وتفصیل ہوتی ہے اور بس۔

اس کے بعد تجھے اختیار ہے کہ تو اس سے حیوانیت کی طرف منتقل ہو جس میں انسانیت اور فرسیت (گھوڑا ہونا وغیرہ) اپنی محدود حدود کے اندر متحد ہو جائیں، اور اس کے پہلو بہ پہلو ان کے بھی چند فرائض ہوں گے۔ ہر وہ امر جو انسان اور فرس کے علیحدہ علیحدہ ہوتے وقت انسان کو متمیز کردے اسے صرف احکام حیوانی کی تفصیل شمار کیا جائے گا۔پھر تجھے اختیار ہے کہ تو درجہ بدرجہ منتقل ہوتا جائے تاکہ یہ سلسلہ اس صورت جسمیہ پر ختم ہو جو اپنے اندر عالم اجسام کے ان تمام امور کو لیے ہوئے ہو جن کے حکم تمام احکام پر مشتمل ہیں۔

لہٰذا تحقیق کا مرجع بالآخر یہ بات ہوگی کہ تمام کا تمام عالم صورت مطلقہ اور اس کے مطلق حکم میں فرضِ مفروضہ ہیں اور یہ امور ایک پھیلا ہوا سلسلہ ہے جس طرح کہ پوشیدہ سلسلہ واحد کے اندر پھیلا ہوا ہے۔ باقی رہا یہ حکم کہ کلی خواہ ہزار کے ساتھ مخصوص کیوں نہ ہو شخص نہیں بن سکتی۔لہٰذا کلی میں شخصیت کہاں سے آگئی؟ اس کی اصل ہیولیٰ اولیٰ سے آئی ہے، اس لیے کہ روح صورت کے لیے ہیولیٰ بمنزلہ جسم کے ہے یا جس طرح گھونسلہ پرندہ کے لیے ہے۔اس کے بعد اپنے اپنے معدات کے اعتبار سے متعدد ہیولیٰ بن جاتے ہیں۔ کیونکہ ہر سابق بعد میں آنے والے کے لیے 'مسعد' ہوتا ہے جس کے مطابق وہ شخصیات کا تقاضا کرتا ہے۔

لمعہ نمبر ۱۵

ایک ماہیت دوسری ماہیت پر اس صورت میں متقدم ہوتی ہے کہ ایک میں کم شروط پائی جاتی ہوں اور ایک نشأۃ دوسری نشأۃ پر غالب آ جائے کیوں کہ بعض نشأتیں ایسی ہوتی ہیں جو عناصر اور قویٰ فلکیہ کے صادر ہونے اور ان دونوں کے امتزاج کے بعد ہی بیدار ہوتی ہیں۔ جیسے موالید۔ بعض ماہیتیں صرف اس وقت پیدا ہوتی ہیں جب عام کے ساتھ تخصیص لگا دی جائے، مثلاً انسان کی جو نسبت حیوان کے ساتھ ہے یا حیوان کی نامی کے ساتھ 'علیٰ ہذا القیاس' اور بعض ایسی ہوتی ہیں جن کا مناسب کمال کسی اور چیز پر موقوف ہوتا ہے جیسے کہ روزمرہ کے حوادث جنہیں حظیرۃ القدس، ملائکہ اعلیٰ اور عالم مثال کے ساتھ نسبت ہے۔

لمعہ نمبر ۱۶

تمام کا تمام عالم شخص واحد ہے جس کے احوال ہمیشہ متغیر ہوتے رہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صورت جسمیہ کو مخصص کرنے والی صورتیں اگر چہ دراصل جواہر ہیں پھر بھی حقیقت اصلیہ کے مقابلہ میں تمام احوال میں کچھ عرصہ کے لیے کیفیتیں اور احوال مفارقہ ہو جاتی ہیں اور تمام احوال چکر لگاتے ہیں۔ اور انتہا کو پہنچ کر پھر سے شروع ہو جاتے ہیں۔ اور ادھر ثابت کے اندر شامل اور اس کا متقاضی ہے اور جو قوت اسے اٹھائے ہوئے ہیں۔ وہ طبیعت کلیہ ہے۔ اس کا تقاضہ مصلحت کلی میں اس وقت ہوتا ہے جب اسے مبداء المبداء اعتبار کیا جائے۔

جب تو غور سے دیکھے گا تو بیشتر موجودات کے لیے طبیعت کلیہ، مصلحت اور عنایت کے سوا کوئی علت نہ پائے گا، مثلاً آگ کی حرارت، پانی کی ٹھنڈک، اور فلاں جز کا قطبیت کے ساتھ مختص ہونا اور اس جہت کا حرکت کے ساتھ۔ وہ شخص اکبر ہی ہے جو ان کا حامل اور ان کیفیتوں سے متکیف ہے اور وہی مندرج مکنون بھی ہے۔ ایک ایک کر کے سب واحد میں منحصر ہیں۔

لمعہ نمبر ۱۷

مجھے معلوم ہوا ہے کہ ہندوستان کے کسی دور دراز علاقہ میں ایک لمبی گردن والا پرندہ ہے جس کی نوع ایک ہی نوع پرندہ میں منحصر ہے جسے ققنس کہتے ہیں۔ یہ ہر وقت ایک جہت سے دوسری جہت میں پلٹتا رہتا ہے تا آنکہ پورا جوان ہو جاتا ہے۔ اس وقت اس کے اندر عشق جوش مارتا ہے اور وہ گانے لگتا ہے، اس کے بعد وہ اس سے بہت متاثر ہوتا ہے جس کی وجہ سے یہ اور زیادہ گانے لگتا ہے۔ یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہتا ہے یہاں تک کہ وہ اس سے جل جاتا ہے اور گانا بند ہو جاتا ہے اور وہ پرندہ راکھ ہو جاتا ہے۔ پھر موسم بہار کی بارش اس پر پڑتی ہے تو ایک کیڑے کے پیدا ہونے سے اس کا وجود پیدا ہوتا ہے اور یہ سلسلہ اسی طرح لانہایت تک چلا جاتا ہے۔[۱]

لمعہ نمبر ۱۸

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ برہان تطبیق اس قسم کے تسلسل کو باطل قرار دیتی ہے مگر میرے نزدیک یہ ایک مغالطہ ہے، اس لیے کہ کسی ممکن کے لیے ممکن حالت کا فرض کر لینا اس بات کا موجب نہیں کہ اس کا علم ہی محال ہو جب کہ ان دونوں کے درمیان کسی لحاظ سے بھی تناقض اور تضاد نہ پایا جاتا ہو۔ لیکن جب تناقض یا تضاد پایا جاتا ہو تو پھر یہ قطعی طور محال کا سبب بنے گا جیسا کہ اس صورت میں کیوں کہ اس کی ایک طرف غیر متناہی ہے اور دوسری طرف متناہی اور معلوم الابتدا اور غیر متناہی ہونا کمی بیشی کی نقیض ہے۔ لہٰذا جب اس کمی یا بیشی کو غیر متناہی جہت سے فرض کر لیا جائے تو محال لازم آئے گا، اس لیے بیک وقت نقیضین کو فرض کر لیا گیا ہے۔ لیکن جب تو انھیں متناہی ہونے کے اعتبار سے فرض کرے جس کے لیے بغیر تطبیق ایک کا باقی رہنا ضروری ہے تو پھر محال لازم نہ آئے گا۔

---

[۱] حضرت شاہ صاحب نے اس نادر الوجود پرندہ کا ذکر کیا ہے۔ ہندوستان کے کس خطہ میں پایا جاتا ہے مجھے اس کا علم نہیں ہے۔ یہ موضوع تحقیق طلب ہے۔ (قاسمی)

لمعہ نمبر ۱۹

تمہیں اختیار ہے کہ ایک وجود فی الاعیان لے لے بایں معنی کہ یہ وجود، مادے میں صورت کے حلول کے بعد حاصل ہوا ہو۔ لہٰذا یہ درست نہ ہوگا کہ صرف مادہ کو یا صرف صورت کو 'موجود فی الاعیان' کہا جائے۔ البتہ تو اسے فی الجملہ اس شخص کے اندر تحصل کے معنی میں لے سکتا ہے۔ لہٰذا تو دونوں کو موجود کہہ سکتا ہے۔

مگر حق بات یہ ہے کہ اصل میں موجود ایک ہی ہے، ثنویت (دو) نہیں۔ ثنویت کی بھی وجہ ہوسکتی ہے۔ زمانہ حرکت اور تغیر کی مقدار کا نام ہے خواہ یہ حرکت حرکت وضعی ہو خواہ کیفی جیسا کہ فطرت سلیم حکم لگاتی ہے۔ لہٰذا زمانہ کی اصل یہی شخص ہے جو غیر نہایت تک تغیرات کو قبول کرتا ہے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ زمانہ جوہر ہے تو اس کا کلیتاً انکار نہ کر اور اس کا محل اس شخص کو قرار دے۔ اور جو یہ کہے بعد مفطور (مکان) جوہر ہے تو اس کا بھی کلی طور پر انکار نہ کر۔

لمعہ نمبر ۲۰

جب یہ شخص (جزئی) ایک صورت کے سوا تمام صورتوں سے خالی ہو جائے، پھر کوئی اور صورت پیدا ہو جائے اور کوئی کہے کہ یہ صورت پہلے کیوں نہ تھی اب پیدا ہوگئی، یا یوں کہا جائے کہ غیر متغیر نے (حدوث صورت) کے لیے ایک متعین وقت کو کیوں چنا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ غیر متغیر نے ایسا شخص پیدا کیا ہے جو ہر حالت میں ہے اور اس کے اندر ایسی طبیعت پیدا کر دی جو اس کی مدبر ہے اور طبیعت کے اندر ایک پوشیدہ سلسلہ بھی پیدا کر دیا جو اس کا حکم ہے اور اس شخص کے لیے اس کے مطابق جاری رہنا بھی نہایت ضروری ہے۔ ان تمام تغیرات کی کوئی صورت نہیں لیکن یہ کہ طبیعت اپنے پوشیدہ حکم کی وجہ سے شخص کو تنہا نہیں رہنے دیتی بلکہ اس میں مسلسل صورتیں حاصل ہوتی رہتی ہیں تا آنکہ شان مکمل ہو جاتی ہے۔ ہر سابق صورت بعد میں آنے والی کو تیار کرنے والی ہے اور یہ سب مل کر ان کے انحلال کے ظہور کا سبب بنتی ہیں اور ہر انحلال ان چیزوں کو تیار کرتا ہے جن کے اثر سے یہ خود پیدا ہوا ہے تا آنکہ صرف اشارہ جائے کہ واحد کی کوئی

صورت ممثل نہیں، مثلاً گیند کہ اس کا ہر چکر دوسرے چکر کو تیار کرتا ہے اور ہر دور بعد میں آنے والی حرکت دوریہ کا جز ہے، یا اس کی مثال درخت کی جڑ کی ہے کہ ابتدا ہوتے ہی اس کی طبیعت کے اندر یہ بات پائی جاتی ہے۔ یہ نشوونما پا کر پورا جوان ہوگا۔ پھر یہ بات نہ رہے گی تا آنکہ درخت کی بنیاد ہی ختم ہو جائے گی۔

لمعہ ۲۱

اللہ کی جود و حکمت کے لیے یہ ضروری ہے کہ پہلی چیز جو اس سے صادر ہو وہ واحد عقلی شخص اکبر ہی ہے جسے لواحق مادہ سے الگ کر لیا گیا ہو، اس لیے کہ عالم کی اپنے پیدا کرنے والے کے ساتھ وہی نسبت نہیں جو عمارت کو اپنے بنانے والے کے ساتھ ہوتی ہے کہ اس نے مٹی میں کچھ اپنا کام کیا اس کے بعد اس کا کام ختم ہو گیا۔ پھر اگر بنا کنندہ مر جائے یا کسی اور ملک کو چلا جائے تو بنا اپنی حالت پر رہے گی۔ بلکہ اس کی مثال تو سورج کی سی ہے کہ زمین اس کے نور سے روشن ہوتی ہے اور جب تک روشنی پھیلتی رہے یہ روشنی ایک لمحہ کے لیے بھی اس سے زائل نہیں ہوتی اور اگر سورج اور زمین کے درمیان کوئی چیز حائل ہو جائے تو اس سے روشنی بدل جائے گی۔ لہٰذا صورتوں کو پیدا کرنے والے کا فعل اول تو اصل کو ایجاد کرنا ہے یعنی شخص اکبر کا جو دو قوتوں— فاعلہ اور قابلہ— سے مرکب ہے؛ دوسرے یہ کہ ان تمام چیزوں کو وجود میں لایا جائے جو اسے تیار کرنے میں شامل تھیں اور تیسرے یہ کہ ان تمام چیزوں کو باقی رکھا جائے جو اس وقت تک باقی رہیں جب تک یہ باقی رہے۔ لہٰذا قدر صادر یہ ہوگی کہ کبھی اِسے روشن کر دیا اور کبھی اُسے، اور اول سے اس کا ہمیشہ صادر ہونا اس کے دائم ہونے کی وجہ سے ضروری ہے۔ یہی ہے جو شخص اکبر ہو جاتا ہے۔ پھر جب اس کا وقت آتا ہے تو مخلوقات میں سے ایک مخلوق بن جاتا ہے۔ اور اگر تو حق کی جانب جھکے تو تو دیکھے گا کہ یہ اس سے صادر نہیں ہوتا اور یہی اس کے نزدیک شخص اکبر ہے، اور ہر وہ چیز جس کی طرف یہ منسوب کیا جاتا ہے کہ یہ اس سے صادر ہوا ہے وہ دراصل اسی کی طرف منسوب ہے کیوں کہ یہ اس سے مختلط ہے۔ اور اگر تو حق کی جہت سے اترے تو دیکھے گا کہ صرف یہی اس سے صادر ہوا ہے اور اس کے نزدیک یہی شخص اکبر ہے اور یہی نفس کلی ہے۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ شخص اکبر

وہی صادر اول ہے تو وہ سچا ہوگا مگر اس نے اجمال کو پسند کیا ہے۔ نیز وہ شخص بھی سچا ہوگا جو یہ کہے کہ صادر اول عقل ہے۔ اس شخص نے تفتیش کی اور اللہ نے اسے توفیق دی۔ یہی وجہ ہے کہ حق ان تمام افعال پر مشتمل ہوگا جنھیں شخص اکبر نے کیا ہو، اور ان افعال میں سے ذرہ بھر نہیں چھوڑے گا۔ لیکن بعض لوگوں نے حرکات افلاک کی علت معلوم کرنے کو اہم سمجھا اور وہ ان اشخاص تک پہنچ گئے جو وحدۃ العقل کے اندر شامل ہیں مگر ان دیگر اشخاص سے غافل ہو گئے، جو وہاں ہیں۔ بعض نے ان کی بہت زیادہ کثرت کو سمجھ لیا اور اس وحدت کو نہ سمجھا جو کثرت کی جامع ہے:

''ہر کس بخیال خویش خبطے دارد''

کیا 'زوج'[1] کے چار اعتبار نہیں ہیں؟ پہلا یہ ہے کہ تو کہے کہ یہ 'زوج' ایسا ہے اور تیری مراد چار سے ہے۔ لہذا اس لحاظ سے زوج عدد چار کا ایک نام ہے جس کے ساتھ چار کا امتزاج ہے۔ چنانچہ شدت امتزاج کی وجہ سے ممکن نہیں کہ ایک کو دوسرے پر محمول کیا جائے۔ لہذا چار اپنی ذات کے مرتبہ میں چار نہیں ہے۔ جب تک وہاں زوج ہو اور نہ زوج ہے لیکن یہ اس طرح ہے کہ اگر تو اس کی تشریح کرے اور اس کے کمال ذات کی طرف توجہ دے تو یہ زوج ہوگا نہ کچھ اور۔ یہ لحاظ تمام اعتبارات کے مقابلہ پر نفس الامر کو زیادہ روشن کرتا ہے اور اس کی کیفیت صدور اور احیا کو زیادہ واضح کرتا ہے۔

دوسرا اعتبار یہ ہے کہ تو اس امتزاج متاکد کی طرف توجہ دے اور کہے 'چار جفت ہے'۔ اس طرح تو جفت کا وہ مفہوم لیتا ہے۔ جو چار پر صادق آتا ہے۔ ان دونوں کے درمیان ایک اعتبار سے تفارق پایا جاتا ہے اور ایک اعتبار سے اختلاط۔ پھر تو دونوں اعتباروں سے دیکھے تو ایک کا دوسرے پر محمول کرنا صحیح ہوگا۔ اس صورت میں تمہارے قول کہ یہ معنی ہوں گے کہ چار اور زوج اگرچہ اس مرتبہ میں دو مقرر مفہوم ہیں۔ مگر دونوں ایک مرتبہ میں متحد ہیں۔ کیوں کہ اس تنزل میں ان کا اجمالی تصور آجاتا ہے، مثلاً یہ کہنا 'سرت من البصرۃ' میں 'من' حرف اور رابطہ ہے۔ جب اس کی حرفیت اور رابطیت کی طرف توجہ کی جاتی ہے تو نفس میں اس قضیہ کا قصد کرتا ہے کہ 'من' حرف اور رابطہ ہے اور یہ حرف رابطہ کی طرف قصداً متوجہ ہوتا ہے اور حرفیت سے بری ہو کر اسم بن

---

[1] زوج: جوڑا (۲) جفت: طاق۔ جو جوڑا نہ ہو۔

جاتا ہے۔

تیسرا اعتبار یہ ہے کہ تو اس حمل (تعریف یا حد) کی طرف متوجہ ہو اور اس میں ایک قسم کی تحلیل کے ذریعہ سے تصرف کرے اور کہے زوج جو چار کے عدد سے سمجھ میں آتا ہے اس صفت کے لیے قائم ہے۔ اس طرح 'زوج' کو اپنے حقیقی طریقہ سے بدل دیا ہے اور تو اسے ایسی چیز سمجھتا ہے جو اسے وہ تقسیم دیتی ہے جو اسی عدد میں واقع ہے اور جس سے یہ دو چیزوں کی طرف منقسم ہو جاتا ہے اور وہ چیز نہیں سمجھتا جو اسے 'اربعہ' کا لفظ بالخصوص دیتا ہے۔ تو اس انفکاک کا قصد کرتا ہے جو اس کے اندر 'حمل' کے مرتبہ میں چھپا ہوا ہے اور تو اسے ظاہر کر دیتا ہے، اور اس امتزاج کا قصد کرتا ہے جو ظاہر تھا مگر تو نے اسے چھپا دیا۔ اس اعتبار کے مقابلہ میں ایک اور نام مشتق ہوتا ہے اور وہ اس کا 'زوج' ہونا ہے اور تو کہتا ہے کہ زوجیت اربعہ کی وہ صفت ہے جو اس کے ساتھ قائم، اس کے لیے موجود اور اس میں متحقق ہے۔

چوتھا اعتبار یہ ہے کہ تو 'اربعہ' کی طرف بحیثیت صفت موصوف کے دیکھے اور تو اس قیام اور تحقق کو اس میں ملاحظہ کرے اور دونوں کے درمیان جو نسبت ہے اس کا مطالبہ کرے اور کہے پہلا علت ہے اور دوسرا معلول، پہلا مبدا[1] اور اصل ہے اور دوسرا صادر اور اس سے پیدا شدہ۔ اگر تو ان کی تحقیق کرنے میں انتہائی غایت کو تلاش کرے تو تو جان لے کہ صادر اول اول الاوائل کا نام اور عنوان ہے اور اگر تو اس کی طاقت نہ رکھے تو پھر تو کسی اور مرتبہ کی طرف اتر کر چلا جا۔

لمعہ نمبر ۲۲

جب عالم صورتِ فلکیہ یا عنصریہ یا نفس معدنیہ یا نباتیہ یا حیوانیہ یا انسانیہ کے ساتھ ہو جائے اور یہ صورت پھیل جائے یا کوئی محل کسی ہیئت کے وجود کا مستوجب ہو اور یہ ہیئت مالوف ہو جائے تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ نفس کلیہ مادہ کے لیے قیومیت کا کام کر رہا ہے۔ جب امر کی کیفیت یہ ہو جائے کہ اس صورت کی قیومت سے اتر کر عالم کی قیومت کی طرف آ جائے یا اس کے برعکس اس طرح کہ یہ تمام امور کسی اور صورت میں ظاہر ہوں جس طرح انسانیت اس شخص اور اس شخص

[1] حضرت شاہ صاحب نے مبداء کا استعمال بکثرت کیا ہے، مبداء سے مراد اصل الشئ ہے۔ (قاسمی)

میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس ابقا کی حقیقت یہ ہے کہ نفس مادہ کے اندر حلول[1] کی وجہ سے تشخص تنقید کے احکام پیدا کر دیتا ہے۔ پھر جب مادہ کوئی اور قسم کی کیفیت اختیار کر لیتا ہے تو اس کا اجمالی حکم اتر کر خاص حکم کی طرف آ جاتا ہے۔ لہٰذا حیوان مادہ کے اندر خلقت اور عام آثار پیدا کرتا ہے اور جب یہی حیوان انسان میں اتر کر آتا ہے تو اس کی خلقت اور آثار بھی خاص ہو جاتے ہیں۔

یہ انسان اور ان سب کے احکام ہیں جو مادہ اور نفس کلی پر وقتاً فوقتاً ظاہر ہوتے ہیں اس لیے کہ اس سے پہلے یہ نفس کلی اور مادہ میں شامل تھا۔

لمعہ نمبر ۲۳

ظہور کی حقیقت یہ ہے کہ شئے ایسی وحدت سے موصوف جو اس حالت کے مناسب ہو، طاری ہونے والی ہیئتوں سے ملتبس ہو خواہ وہ اپنی ذات میں ایک ایک کر کے جوہر ہی کیوں نہ ہوں۔ اس طرح کہ یہ تمام وہ چیز بن جائے اور وہ یہ بن جائے مگر یہ تقسیم کی صورت میں نہ ہو۔ جب کوئی چیز اپنی حد ذات میں اپنے تعین اور وحدت کے ساتھ جن سے اس کا قیام ہے متعین نہ ہو، اس کے بعد اسے بعد میں آنے والی ہیئت میں تصور کیا جائے اور اس کا اعتبار اس شرط کے ساتھ اس مظہر میں اول کے ظہور سے پہلے کیا جائے اور وہ ہر حالت میں اپنے تعین وجود میں اور وحدت میں جیسے بھی ہو دائمی ہوگی کیوں کہ یہ اعلیٰ اور الطف ہے۔ تعین وجود اور وحدت نے مظاہر کو قائم رکھا ہے اور وہ مظہریت میں جز ذاتی ہوگا۔ تو ایک مظہر کا دوسرے مظہر سے افتراق ہوگا کیوں کہ ظاہر کی نسبت کا خیال کرتے ہوئے یہ ایک عرض مفارق ہے، مثلاً انسان، گھوڑا اور حیوان اپنے اشخاص اور افراد کی نسبت کے اعتبار سے، لہٰذا بہت سے اشخاص کے اندر انسان کی نوع ظاہر ہے، اگر چہ جو شخص بھی ہوگا اس پر نوع اس اعتبار کو صادر کرے گی جو 'لا بشرط شئ' ہے، اور جو کثرت مظاہر کے اندر

---

[1] ''حلول'' صوفیا کے یہاں ایک مخصوص کیفیت کا نام ہے۔ جب کسی سالک کے اندر کوئی نسبت یا کوئی چیز داخل ہو جائے۔ اور اس پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے تو اس وقت بولتے ہیں کہ یہ نسبت یا چیز اس میں حلول کر چکی ہے۔ (قاسمی)

مادہ کی طرف سے آئی ہے وہ ظاہری وحدت کے مخالف نہیں ہے، اور یہ ظاہری وحدت تمام کے ہوتے ہوئے بھی محفوظ رہتی ہے۔ یہ ایک قسم کا ظہور ہے۔ یا اس شمع کی طرح جسے کبھی مربع بنالیا جاتا ہے تو اس سے مربع کے آثار صادر ہوتے ہیں، اور کبھی مسدس بنالیا جاتا ہے تو بھی یہ آثار صادر ہوتے ہیں۔ اگر چہ ان تمام حالات میں شمع کا وجود باقی رہتا ہے اور مربعی اور مسدسی وجود تو آتے جاتے رہتے ہیں۔ یہ بھی ایک قسم کا ظہور ہے۔ یا مثلاً ملکہ جہاں تک اس کا تعلق افعال سے ہے۔ علم بھی ایک ملکہ ہے جس کا قیام عالم یعنی جاننے والے پر ہے۔ اسی طرح آہن گری اور نجاری افعال کے تبدیل ہونے کے باوجود باقی رہتی ہیں۔ ایک عالم میں طویل مدت سے یہ ملکہ چلا آتا ہے، اور یہ ملکہ وہ راسخ کیفیت ہے جسے نفس قبول کرتا ہے۔ اور اس کی وجہ سے مختلف رنگ اختیار کرتا ہے اور ملکہ حاصل ہوجانے کے بعد خاص توجہ پر موقوف نہیں ہوتا۔ لہٰذا جب اس کی توجہ کسی مخصوص شے کی طرف ہوگی، اور اس کی صورت تختۂ ذہن پر منقوش ہوجائے تو نفس ناطقہ کو اس کی قدرت اسی ملکہ کی وجہ سے ہوئی۔ یہی ملکہ اس کے اور صورت مشتقہ کے درمیان واسطہ بنتا ہے۔ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ یہ صورت کے ساتھ مختلط اور اس میں غوطہ زن ہو۔ جب یہ ملکہ ان سے خالی ہوکر نفس ناطقہ کے قریب پہنچ جائے تو اسے وہ بات حاصل ہوجاتی ہے جو ملکہ کے اندر شامل ہے۔ اس وقت جاکر تو اس کا نام 'علم بالشی الفلان' رکھتا ہے۔ اس کے بعد جب ملکہ کسی دوسرے معلوم کی طرف منتقل ہوجاتا اور اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور تمہارے تختۂ ذہن میں اور صورت میں منتقش ہوجاتی ہے اور اس کے ساتھ مل جاتا ہے تو اسے بھی 'علم بذلک الشی' کہہ دیتے ہیں، 'علیٰ ہٰذا القیاس' اور امور بھی۔ یہ بھی ایک قسم کا ظہور ہے۔ یا مثلاً عدد ایک جس میں نصف بننے کی قوت ہوتی ہے اگر اس کے ساتھ ایک اور مل جائے، اور تہائی بننے کی قوت ہوتی ہے اگر اس کے دو واحد اور مل جائیں اور چوتھائی بننے کی اگر اس کے ساتھ تین اور مل جائیں۔ لہٰذا واحد کے اندر اعداد کے تمام مراتب شامل ہیں۔ اس کے بعد یہ مرتبہ اسی طرح چلا جاتا ہے۔ یہ بھی ایک قسم کا ظہور ہے۔ یاد رکھو کہ ظہور کی بہت سی قسمیں ہیں اور ہر ظہور کے بالمقابل ایک اندماج[1] ہے۔ اس پر غور کریں۔

---

[1] اندماج: ملنا، استوار ہونا، پیوست ہونا۔

لمعہ نمبر ۲۴

وجود فی الاعیان یا وجود فی الخارج ایک ایسا امر ہے جس میں تفاوت پایا جاتا ہے جس طرح سورج کی شعاع یا چاند کی شعاع میں تفاوت ہوتا ہے۔ پھر جو شعاع چاند سے آئینہ پر پڑتی ہے وہ منعکس ہو جاتی ہے۔ پھر وہ شعاع منعکس ہوتی ہے جو زمین پر پڑتی ہے۔ وہ منعکس ہو جاتی یا جس طرح برف اور ہاتھی دانت وغیرہ کی سفیدی میں تفاوت پایا جاتا ہے۔

وجود اعلیٰ لاہوت[1] کے قوی ہیں، اور اس کے بعد وجود عقلی ہے۔ جب تو لاہوت تک اوپر چڑھ جائے گا تو وہاں ایک انتزاعی صفت پائے گا۔ اور اس کا مصداق لاہوت ہے، اور یہ صفت اس کے اعتبار سے عدم کے حکم میں ہے، پھر جب تو لاہوت کے بعد قوی ترین موجودات عقل کی طرف اترے گا تو تو اسے ایسا وسیع عالم پائے گا جو اپنے وجود عقلی کے اعتبار سے مبدءِ اول کے کمالات کا شارح ہے۔ اور اس کا تابع بھی ہے جس کا وجود اس کی شرط کے ساتھ ہوگا، مثلاً زید کا ضروری طور پر متحرک[2] الاصابع ہونا، اور یہ اسی صورت میں ہوگا جب وہ لکھ رہا ہوگا، کتابت سے الگ ہو کر نہیں۔ یا جس طرح زمانے کا وجود جو حرکت کے وجود کی وجہ سے ہوتا ہے، یا سکون کی وجہ سے جو حرکت کی ضد ہے، اور یہی تابع نفس کلی ہے۔ لہٰذا جب تو اتر کے اس کی طرف جائے گا تو اس متقرر اور متحقق پائے گا۔ اس کے درجہ میں نہ کوئی اس کی ضد ہے اور نہ ہم سر، بلکہ یہ تنہا ہے کیوں کہ وجود اور تحقق دونوں میں موافقت ہے۔ اور ان کے ساتھ جزئی نفوس ہوتے ہیں جن کی مثال اپنی والدہ کی نسبت کے اعتبار سے ان بچوں کی سی ہے جو ماں کے پیٹ میں ہوتے ہیں، جب وہ باہم مل جائیں اور انسانی جسم کے ساتھ نسبت کے اعتبار سے ان کی مثال اعضا کی سی ہوتی ہے اور یہ افلاک اور عناصر ہیں۔ موالید[3] کی، افلاک اور عناصر سے وہی نسبت ہے جو شخص انسان کے ساتھ

---

[1] لاھوت: معرفت الٰہی کی جدوجہد میں سالک کی وہ منزل جہاں سے مقام فنا فی اللہ حاصل ہو جائے اور جہاں سے وہ زمان و مکان کی قید سے بالکل آزاد ہوتا ہے۔

[2] متحرک الاصابع: انگلیوں کو حرکت کرنا۔

[3] موالید: جمع مولد۔ جائے پیدائش، پیدائش کی جگہ، آج کل جدید عربی میں "المولید الکہربائی" بجلی پیدا ہونے کی جگہ، پاور ہاؤس کے معنی ہیں، حضرت شاہ صاحب بھی "موالید" سے منبع و سرچشمۂ فیض روحانی ہی مراد لیتے ہیں (قاسمی)

پھنسیوں، ورم، بخار، اور سر درد کو ہے۔ دیگر حوادث بدنیہ کا بھی یہی حال ہے۔ بعض سادہ اور بدبودار ہوتے اور موجودات مثالیہ کی ان سے وہ نسبت ہے جو ان اجرام کو جو خیال میں منتظم ہوتے ہیں معمار کے ساتھ ہے۔

اس کے بعد جب تو موالید کی طرف اترے تو تو انھیں اپنے مرتبہ میں ایک قسم کا جڑ پکڑتا ہوا پائے گا۔ پھر اس کے بعد وہ اعراض آتی ہیں جو ان کو اپنے اندر لیے ہوئے ہیں، اور یہ تو عام اعراض کی وہ جزئیات ہیں جو پودے پر لپٹی ہوئی ہیں، اس حیثیت سے کہ وہ جسم ہے، جس طرح کہ یہ جواہر[1] جسم مطلق کے لیے فرض کیے ہوئے امور ہیں۔ اس کی مثال شکل خاص، کم خاص اور کیف خاص کی ہے۔

اعراض[2] کے بعد دو اور مرتبے ہیں۔ ان میں سے ایک وجودِ تشبیہی ہے۔ اسی میں سے یہ ہے کہ محلِ گمان کو احکام شرعیہ کے اندر حکم کے قائم مقام خیال کیا جائے۔ چنانچہ شراب کا اپنے جوہری وجود کے علاوہ ایک اور وجود بھی ہے، اور یہ مصلح کو فاسد کر دیتا ہے جس سے یہ مراد کہ اگر شراب کو ایک رسم بنالیا جائے تو تمام اقترائی، منزلی، معاشی اور مدنی مصلحتیں فاسد ہو جائیں۔ لہٰذا اسی 'افساد' کی وجہ سے شراب 'وجود تشبیہی' میں آ گئی۔ کتابی نقوش اور لفظی اصوات کو اپنے مدلولات کی جگہ رکھنا بھی اسی میں سے ہے۔ اس تشبیہ کے اعتبار سے علوم جفر[3] اسی کے اندر آ گئے۔ اسی میں سے افعال کو ملکات کے قائم مقام رکھنا ہے اور نذر و نیاز کو عاجزی کے قائم مقام رکھنا اور اذکار کو ان معانی کے قائم مقام رکھنا۔ لہٰذا اس کا حکم ''اصحاب الیمین ''میں ظاہر ہوا۔ اسی میں یہ بھی ہے کہ بلند اسباب بعض اوقات ایک حادثہ کے حادث ہونے سے متفق ہو جاتے ہیں، مثلاً زید کا مر جانا۔ اس کے بعد لوگوں کی دعائیں اور فریادیں بلند ہو کر ملائے اعلیٰ تک چلی جاتی ہیں تو وہ صرف ہلاکت کے وجود تشبیہی پر ہی اکتفا کر لیتی ہیں۔ مثلاً اذیت پہنچنا اور بہت سے مال کا کھو جانا۔

اور دوسرا مرتبہ ان عوالم[4] کا ہے جو وہم مطلق کے اندر پیدا ہوتے اور اعراض کے امتزاج

---

[1] جوہر: وہ جو مستقل بالذات ہو۔

[2] اعراض جمع عرض، وہ ہے جو کسی مستقل ذات کے ساتھ قائم ہو، جیسے سفیدی جو کسی دیوار سے لگی ہو۔

[3] علم جفر: ایک مشہور علم کا نام ہے، جس سے احوال غیب پر آگاہی ہوتی ہے۔ حالانکہ یہ یقین کا فائدہ نہیں دیتا ہے۔

[4] عوالم جمع عالم بمعنی جہان، دنیا

میں ظاہر ہوتے ہیں کیونکہ باوجود اس کے کہ ملائکہ عنصریہ اور شیاطین کا درحقیقت وجود پایا جاتا ہے، وہم مطلق میں ان کے عجیب وغریب اتفاقات اور اجتماعات ہو جاتے ہیں اور بنی آدم کے حرکات، امراض اور خیالات کے ضمن (میں) ناسوت[1] کے اندر ان کے آثار پائے جاتے ہیں۔ اور بعض اوقات ان ملائکہ اور شیاطین میں سے ایک فرد کسی ناسوتی کیفیت کا مشتاق ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے ایک چیز دوسری چیز کو اپنی طرف کھینچتی ہے، اور اس خیال میں مدد دیتی ہے۔ اور اس سے لذت حاصل ہوتی ہے، اور اس کا نام دوسری چیز رکھ دیا جاتا ہے۔ اس قسم کے حالات میں ان کی عجیب زبان ہوتی ہے، اور ناسوت کے ساتھ ان کے اجتماعات اور اصطلاحات ہوتے ہیں جنھیں صرف وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جنھوں نے اس وجود کا گہرا مطالعہ کیا ہو۔

یاد رکھیں کہ ہر وجود صرف اسی صورت میں پہچانا جاسکتا ہے جب اس وجود کو واجب قرار دے دیا گیا ہو۔ لہٰذا لاہوت کی پہچان لاہوت ہی کے ذریعہ سے ہوگی، اور عقل عقل ہی کے ذریعہ سے پہچانی جائے گی۔ یہی حکم ہر طبیعت نوعیہ کا ہے کہ اس کا ادراک بھی اسی کے ذریعہ سے ہوگا، لہٰذا عارف ہر چیز کو اس چیز کے ذریعہ سے کلی طور پر پہچان لیتا ہے، اور دیگر لوگ ان چیزوں کا ادراک کرتے ہیں جو اپنے وجود کی ترکیب میں قوی ہوں، مثلاً اکثر افراد بشریہ کے لیے مرکبات ارضیہ لیکن جو بلند ہو، مثلاً نفس عامہ اور عقل تو اسے یہ صرف دور ہی سے دیکھ سکتے ہیں۔ گویا کہ یہ ایک بہتر خیال ہو، اور جو پست ہو، جس طرح دیگر دو وجود، تو ان کے پہچاننے کے لیے ارواح کا کمزور ہونا اور نفس کا بیدار ہونا شرط ہے۔ اس طرح عارف اور معروف میں ایک قسم کی مطابقت پائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تو دیکھے گا کہ جو لوگ جنوں کو حاضر کرنے کا کام کرتے ہیں وہ جن کے کاغذ، بیوقوفوں اور بچوں کی طرف دیکھنا شرط قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح تو لوگوں کو دیکھے گا کہ جب وہ کسی عارف کو یہ کہتے ہوئے سنتے ہیں کہ 'زمانہ موجود ہے اور عالم ایک خیال ہے' تو لوگ اسے جھٹلاتے ہیں، حالانکہ یہ درست بات ہے۔

---

[1] ناسوت: عالم اجسام کہ مراد اس سے، دنیا اور یہ جہان ہے، مجازاً شریعت اور عبادت ظاہری کے بھی آتا ہے۔

لمعہ نمبر ۲۵

کبھی کسی چیز کے دو وجود ہوتے ہیں اور ایک وجود دوسرے وجود کی شرط ہوتا ہے۔ بعض اوقات عالم قویٰ فلکیہ اور عنصریہ کے لحاظ سے کسی موجود کے فیضان سے تیار ہو جاتا ہے، نیز اس لیے بھی کہ یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ وجود ناسوتی ناسوت سے اعلیٰ مقام پر اسی وجود کا فیضان ہے، اسی طرح بعض اوقات کوئی واقعہ ملاء اعلیٰ میں واقع ہونا قرار پاتا ہے، مثلاً کسی ملت کا ظاہر ہونا یا زید کا وجود یا اس کی موت یا فلاں دن اسی پر کسی جب سختی کا واقع ہونا اس کے بعد۔ اس کے ناسوتی وجود کا وقت آتا ہے تو اس کا روحی وجود ناسوتی وجود کے ساتھ اس طرح مل جاتا ہے جس طرح کے ملکہ کسی خاص فعل کے ساتھ، بعض اوقات کوئی چیز فاعل کے اقتضا کے مطابق موجود ہوتی ہے یا اس لیے کہ قابل کی انتہا ہو جاتی ہے۔ یا اس وجہ سے کہ وہ کسی چیز کا 'مقبول' ہے یا اس لیے کہ فاعل کی انتہا ہو جاتی ہے۔

مختصر یہ کہ ایک شے اپنی فاعلیت یا قابلیت کے اعتبار سے کسی دوسری چیز کی مقتضی ہوتی ہے یا یوں ہوتا ہے کہ قابل اور فاعل تو دونوں موجود ہوتے ہیں مگر اس شے کے وجود کا ابھی وقت نہیں آیا ہوتا ہے اس لیے کہ اسے تیار کرنے والا یا اس کی بیرونی شرط معدوم ہوتی ہے۔ یا کوئی مانع وجود ہوتا ہے۔ مثلاً یہ کہ کوئی کاریگر موم کا ایک خوبصورت جسم بنائے اور اسے اس قدر خوبصورت بنائے کہ دیکھنے والے خوش ہو جائیں اور لوگ یہ کہنے لگیں: یہ کس قدر خوبصورت ہے، اس کا صانع کس قدر ظریف انسان ہے! لہٰذا اس میں ہیئت کا ہونا ضروری ہے اور یہ بات کاریگری سے پہلے موجود نہ تھی اور یہ کاریگر کے نفس کے اندر شامل تھی کیوں کہ اس کا ملکہ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اس سے افعال صادر ہوں۔ پس اگر اس ملکہ کا کوئی فعل اس محل کے ساتھ تعلق رکھے تو یہ خاص قسم کا صنم ہوگا۔ اسی طرح موم ایک 'قابل' ہے جس پر یہ ظاہر ہوتا ہے، اس لیے کہ یہ اصل خلقت کے ساتھ یعنی رنگ اور شکل کا لباس پہنے ہوئے تھا۔ یہ معاملہ کبھی تو اس صورت سے حل ہوتا ہے جو پہلے اسے حاصل تھی یا کبھی اس صورت سے۔ لہٰذا یہ صنم اگر چہ بادی النظر میں موم اور اس صورت کے احکام کو جمع کیے ہوئے ہے، لیکن نظر دقیق اس بات کی وضاحت کرتی ہے کہ وہاں دو وجود ہیں جن کا وجود

یہاں آ کر انسانی صورت سے مل گیا ہے خواہ یہ موم ہو یا لکڑی یا پتھر۔ اور ان کا وجود بھی وہی موم ہے، خواہ انسانی صورت ہو یا گھوڑے کی یا درخت کی۔ وجود اول کا قیام فاعل کے ساتھ ہے۔ اگر اس کا وجود فاعل کے 'وصف متجدد' پر ہوگا تو فاعل کے دوام کے ساتھ اس کا بھی دوام ہوگا یا اس لیے دائم ہوگا کہ اس وصف کے ساتھ موصوف ہونے کی شرط اس میں پائی جاتی ہے۔ اور دوسرے وجود کا قیام قابل پر ہوگا یا اس کے دوام سے بھی دائم ہوگا یا اس شرط پر کہ وہ اس کے وصف سے موصوف ہے۔ یہ مثال ایک لحاظ سے قاصر ہے کیونکہ یہاں فاعل اس شے کے ساتھ اپنے تعلق کو تیار کر رہا ہے اور اس شی سے اس کا تعلق زائل ہو جاتا ہے اور عالم کے اندر جو فاعل ہے وہ فاعل حقیقی ہے۔ اس کا تعلق اور قیومیت زائل نہیں ہوتی۔ لہٰذا جب ایسا وصف پایا جائے گا جس پر یہ موقوف ہے تو عالم روحانی میں اس وجود کا صادر ہونا واجب ہو جائے گا۔ اور یہ وصف روحیات افلاک اور عناصر کے قویٰ ہی ہیں اور جب یہ وجود پایا گیا تو ملاء اعلیٰ اس شے کو موجود خیال کر لیتے ہیں۔ لہذا یہ وجود فلکی قوتوں، خوبصورت عنصری ملاء اعلیٰ اس شیٔ کو موجود خیال کر لیتے ہیں۔ لہذا یہ وجود فلکی قوتوں، خوبصورت عنصری طبائع اور تخیلات مثالیہ سے مرکب ہوتا ہے۔ اس کے بعد جب کوئی واقعہ ناسوت میں پایا جاتا ہے اور بعض اوقات اول مجمل ہوتا ہے احتمال ہوتا ہے کہ اس کی تفسیر اس کے ساتھ ہو یا اسے چھوڑ دیا جائے۔ یہی اختلاط وہ 'انزال حدید' 'میزان' اور انعام کا آسمان سے اترنا ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے۔ نیز مصیبت کا نازل ہونا اور دعا کا اس کے ساتھ ٹکراؤ اور فتنوں کا، بارش کی طرح نازل ہونا عربی ممالک میں جیسا کہ سنت صحیحہ میں آیا ہے۔

لمعہ نمبر ۲۶

یاد رکھیں کہ روزمرہ کے حوادثات کے واقع ہونے کے لیے علت تامہ کا ہونا نہایت ضروری ہے تاکہ معلول ضرور واقع ہو کر رہے ورنہ یہ لازم آئے گا کہ یہ وجود علل تامہ کے واجب قرار دینے کے بغیر ہی واقع ہو گیا۔ اور یہ بھی ناممکن ہے کہ وہ فقط قدیم ہو ورنہ یہ قدیم اور غیر حادث ہوگا۔ لہٰذا تحقیق نے اس بات کی طرف مجبور کیا کہ ایسی چیز کی تلاش کی جائے جو قدیم کے ساتھ منظم ہو کر علت تامہ بنے۔ اسی لیے عقل مند لوگ اس علت تامہ کی تلاش کرتے رہے ہیں۔

چنانچہ انہوں نے عنصری طبائع کی طرف دیکھا اور ان کا شور وغوغا دیکھا۔ حوادث کا تکرار ہوا اور قیاسات کیے گئے۔ یہاں تک کہ اس میں کسی کو شک باقی نہ رہا۔ اس کے بعد انھوں نے سیارات[1] کی حرکات میں غور کیا اور اس بات میں غور کیا کہ ایک سیارہ دوسرے سیارے کی طرف دیکھ رہا ہے اور دیکھا کہ ان میں سے بعض محسوسات پر تاثیر پیدا کرتے ہیں جیسے زمین کے ساتھ نسبت کے اعتبار سے سورج کی گرمی اور سردی میں اختلاف کا ہونا، اور رطوبات[2] کے معانی کا اختلاف اور اسی میں مدوجزر اور زمین سے چاند کی نسبت کے اختلاف کا وقوع آجانا ہے۔ اور بعض ایسے امور ہوتے ہیں جو ایک جماعت کے نزدیک محسوس نہیں ہوتے باایں ہمہ وہ اس کے متعلق جستجو کرنے میں لگے رہتے ہیں اور اسے سمجھتے بھی ضرور ہیں اور جزئیات سے اس کلی کی طرف منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ جو انھیں جمع کرتی ہے اور ان آثار کے اجتماع کا قیاس کر کے جو دوسرے آثار کے ساتھ مل کر حادثہ کی صورت پیدا ہوتا ہے، مثلاً ستاروں کی نگاہ کے اختلاف کی وجہ سے لوگوں نے ایسے علوم کی تدوین کی جن کے ذریعہ سے ان کے بیان کے مطابق مکمل معرفت حاصل ہو جائے۔ مثلاً علم ہندسہ، حساب، خواص نباتات وحیوانات۔ اس کے بعد ان علوم کی تدوین کی جو ان کی فرع ہیں اور ان سے پیدا ہوتے ہیں جیسے سحر[3] طلسمات[4] اور طب[5]۔

ان کے بعد وہ لوگ آئے جو اشیا کی لِمّ[6] (اسباب وعلل) کی تفتیش کرتے ہیں اور انھوں نے ہر ایک کی وجہ نکالی۔ نیز انھوں نے اپنی کتابوں میں یہ ذکر کیا ہے کہ حرکت متدیرہ نہ حرکت شہودیہ ہے اور نہ طبیعہ لیکن یہ رائے کلی اور وہمی ہے۔ افلاک کے یقیناً نفس ہیں اور یہ موالید (ثلاثہ) میں اس طرح تاثیر کرتے ہیں۔ یہ اپنی پوری کوشش سے اس چیز کی تلاش کرتے ہیں جس میں عالم

---

[1] سیارات ج سیارہ۔ ستارہ

[2] رطوبات ج رطوبت۔ نمی، تازگی

[3] سحر: جادو، ٹونہ

[4] طلسمات: جمع طلسم وہ جادو کا پتلا جو وہمی خیالات سے بنایا جائے یا وہ علم جو خیالات موہومہ کو بہ شکل عجیب وغریب نظر میں لائے۔ فرہنگ آصفیہ ۱۳۲۵ جلد دوم

[5] طب: علم حکمت، ڈاکٹری

[6] لم: حقیقت، ماہیت، علت

موالید کی بھلائی ہو۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ان کی ہمت، الہام اور اس کے تغیر کا سبب بنتی ہے۔ اور لوگوں کا ان سے مدد مانگنا اور سخاوت کے نازل ہونے کی درخواست کرنا، سخاوت کے دروازہ پر دستک دینے کے مترادف ہے بعینہٖ اسی طرح جس نے سخی کے دروازے پر دستک دی، اس کے لیے دروازہ کھل جاتا ہے اور یہی رسولوں کو بھیجنے، ملتوں کے قائم کرنے، معجزات کے ظاہر ہونے اور دعاؤں کے قبول ہونے کا سبب بنتے ہیں۔

لمعہ نمبر ۲۷

محققین کے نزدیک حوادث کے اسباب کی دو قسمیں ہیں، قویٰ سماویہ اور قویٰ ارضیہ۔ سماویہ کی چار قسمیں ہیں۔ پہلی قسم ان کے نفوس کے وہ انفعالات[1] ہیں جو مبادیٔ عقلیہ کے اثر سے پیدا ہوتے ہیں۔ میرے نزدیک ان کلمات کی تاویل یہ ہے کہ 'اشخاص' ان احکام کے ظاہر ہونے کا محل ہیں اور ان انواع کے لیے امام ہیں جو مادہ سے مجرد اور ذات الٰہی کے اقتضا کی طرف رجوع کرتے ہیں جیسا کہ تجھے معلوم ہے۔

دوسری قسم ستاروں کی طبائع ہیں جو مختلف آثار کے ساتھ موالید میں تاثیر پیدا کرتے ہیں۔ ان کا اختلاف ان کی حدود کی وجہ سے ہوتا ہے، اسی مقام پر جہاں ستارے ان کو گھیرے ہوئے ہوتے ہیں، اور یا تو ان کے خواص میں ان کی مدد کرتے ہیں، یا ان سے باز رکھتے ہیں، یا یہ اختلاف ان کی شعاعوں کے اختلاف کی وجہ سے ہوتا ہے۔ لہٰذا زمین پر صرف وہی امر واقع ہوتا ہے جس میں ان کی نظر کے اعتبار سے اس میں اس کی قوتوں کا اجتماع ہو گیا ہو، یا یہ اختلاف ان کی شعاعوں کے مستقیم ہونے کی وجہ سے، یا عدم استقامت کی وجہ سے ہوتا ہے۔

قدما کہتے ہیں کہ اگر کسی شخص کا نکاح اس وقت ہو جب زہرہ برج حوت میں اور چاند اپنے نور کی 'تسدیس' میں ہو اور اس وقت دونوں نحس سیارے (مریخ وزحل) اس کی طرف دیکھ بھی نہ رہے ہوں تو ان دونوں (میاں بیوی) میں اس قدر محبت اور اتفاق ہوگا کہ انسان کو اس سے تعجب ہوگا۔ اور اگر کوئی شخص اس وقت نکاح کرے جب کہ زہرہ سنبلہ یا برج حمل میں چل رہا ہو، اور

---

[1] انفعالات ج انفعال، شرمندگی، اپنے برے فعل پر خجالت۔

مریخ (نحس اصغر) ان کے بالمقابل ہو یا چوتھے خانہ میں ہو، یا زحل (نحس اکبر) اس سے ملا ہو یا بالمقابل ہو، اور مشتری ساقط ہو تو اس اتصال میں سخت مصائب آئیں گے، اور ان دونوں میاں بیوی کے درمیان انتہائی بغض ہوگا کہ لوگوں کو اس سے تعجب ہوگا۔ انھوں اسی قسم کی اور بہت سی باتیں ذکر کی ہیں۔[1]

تیسری نوع وہ قوتیں ہیں جو ادراکیہ، عقلیہ، متوہمہ، اور تخیلیہ ہوں، جن کو سلسلہ موجودات، خواہ موافق ہوں یا مخالف، حاصل کرتا ہے، اور عنایت خداوندی سے ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ ان قویٰ کے صادر ہونے کو وہ بنظر استحسان دیکھیں۔ لہٰذا اگر یہ کوئی ایسی چیز ہو جو سلسلہ کے اندر ہے مگر کسی ارضی سبب کی وجہ سے نہیں ہے تو اس کا سبب بھی زمین میں پیدا کر دیا جاتا ہے، یا یہ کہ اس کا کمزور سبب ہو، اور اپنی عادت کے مطابق اس کی تاثیر اس حد تک نہیں ہوتی کہ مراد کو پہنچ سکے تو ان کا استحسان اس سبب کو قوی بنا دیتا ہے۔ یہاں تک کہ یہ مراد تک پہنچنے کا فائدہ دیتا ہے۔ یا یہ کہ وہاں کوئی نقصان دہ سبب ہو تو یہ 'استحسان' اس کو پکڑ لیتا ہے، تا کہ اس سے نقصان پہنچانے کی قدرت کا اظہار نہ ہو۔ اسی سلسلہ کی یہ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس ہوا میں جو نار ابراہیم کے اردگرد تھی قوت زمہریر[2] پھیلا دی۔ اور بعض اوقات بنی آدم کے دلوں میں الہام کے امر کا اثر ہوتا ہے، یا کبھی بہائم[3] کے دلوں میں بھی ایسا ہوتا ہے، اس وقت اگر مقصد یہ ہو کہ کثیر التعداد لوگوں کی اصلاح کی جائے اور نفس اس الہام کو سمجھ رہا ہو اور قصد بھی نہ ہو، تو اس انسان کو نبی کہا جاتا ہے۔

چوتھی قسم وہ قوتیں ہیں جن میں حوادث زمین کا ایک قسم کا سبب پایا جاتا ہو اور یہ اپنی تاثیر کی وجہ سے نہیں ہوتا بلکہ اس شے کی ایک نوع کی وجہ سے ہوتا ہے، اس لیے کہ یہ ایک مخصوص اثر قبول

---

[1] حضرت شاہ صاحب خواص اشیاء کے قائل ہیں۔ البتہ ان کے نزدیک ان اشیاء میں موثر بالذات اللہ کی ذات ہے۔ وہی تاثیر پیدا کرتا اور تاثیر کو سلب بھی کر لیتا ہے۔ حضرت شاہ صاحب علم فلکیات کے بھی ماہر ہیں۔ آپ نے بعض ستاروں کے بعض برجوں میں داخل ہونے پر اچھے اثرات اور بعض برجوں میں داخل ہونے پر برے اثرات مرتب ہونے کا ذکر کیا ہے۔ (قاسمی)

[2] زمہریر: سخت سردی، سردی کی شدت، برفیلی حالت

[3] بہائم ج بہیمہ، جانور

کرتی ہے۔ جس طرح ہم پانی کی نہر کھود کر پانی کو مسخر کر لیتے ہیں، اور راستے بنا کر ہوا کو مسخر کر لیتے ہیں کیوں کہ پانی کی طبیعت ڈھلان کو بہنے کی ہے۔ لہٰذا جب زمین کو ایسا کھودا جائے کہ جہاں پانی پہنچانا مقصود ہے، اس سے پست اور کوئی جہت نہ ہو تو پانی اپنی طبیعت کی وجہ سے اسی طرف ہو لیتا ہے۔ یہی حال ہواؤں کا ہے کہ انھیں بھی وہ چیزیں مزاحم ہوتی ہیں جن سے ان کا چلنا رک جاتا ہے۔ لہٰذا جب ہوا کے مقابلہ میں راستے قائم کر دیے تو ہوا کی طبیعت میں مزاحمت پیدا ہوگئی۔ اسی مزاحمت کی وجہ سے کشتیاں مطلوبہ جہت کو چلتی ہیں۔ نفوس بشریہ کے لیے افلاکی قوتیں ان کے اجزاء اور اعضا کی طرح ہیں، بلکہ بذات خود انھیں ان کا علم ہوتا ہے۔ انسان ان انوار کے سامنے عاجزی کرتا ہے جو ان پر غلبہ پائے ہوئے ہیں۔ میری مراد نفوس افلاک کی قوتوں سے ہے، خواہ ان کا نام نفوس **فلکیہ** یا **ملکیہ** یا **نفوس مفارقہ من الابدان** وغیرہ رکھا جائے۔ جب اس کی عاجزی بہت زیادہ ہو جاتی ہے تو اس کے افکار اور قوتیں اس طرف ہو لیتی ہیں۔ جس کی خاطر انھوں نے عاجزی کی تھی۔ ان کے نزدیک اس استحسان کی مثال وہی ہے جو ہمارے ہاں کھانے کی صورت اور سیری اور اس کی لذت کی صورت میں حاضر ہوتی ہے۔ اور ہمارے شوق کو برانگیختہ کرتی ہے۔ ہاتھ پاؤں کو حرکت دینے کا شوق بمنزلہ ان امور کے ہوتا ہے جو مبادیٔ عالیہ سے نتیجہ کے فیضان کے لیے، مقدمات کو حاضر کرنے کے لیے تیار کرتے ہیں۔

قویٰ ارضیہ بھی چار قسم کے ہیں۔ ایک قسم طبعی اور فعلی قوتیں ہیں جو عناصر اور عنصریات میں ودیعت کی گئی ہوتی ہیں، یا خاص طور پر ہر صورت نوعیہ میں ہوتی ہے۔ چنانچہ آگ گرم کرتی ہے اور پانی ٹھنڈا کرتا ہے۔ دوسری قسم طبعی اور منفعل قوتیں ہیں۔ مثلاً درخت جلتا ہے اور لوہا پگھلتا ہے اور پتھر نہ جلتا ہے اور نہ پگھلتا ہے۔ تیسری قسم ارادی اور فعال قوتیں ہیں، مثلاً گویائی کی قوت جو انسانوں میں پائی جاتی ہے۔ یا ضعف جسم کا پیدا ہونا، اور نفس میں خوف اور شرم لاحق ہونا، نفس کو غصہ آتے وقت جسم کا سرخ ہو جانا، اسی طرح یہ کمزور نفوس کے اندر بھی اثر کرتی ہیں۔ جس طرح چشم بد لگنا۔ چوتھی قسم وہ ارادی قوتیں ہیں جو ان سماوی قوتوں یا نفوس ارضیہ سے متاثر ہوتی ہیں۔ جو ان سے زیادہ قوی ہوں۔ اس حد تک تو محققین فلاسفہ کا اتفاق ہے۔

لمعہ نمبر ۲۸

ان کے بیان کے مطابق کچھ اور اسباب ہیں۔ بعض اسباب کے متعلق تو ان کے محققین نے سکوت اختیار کیا، اس لیے نہیں کہ انہوں نے دلائل کے ساتھ ان کی نفی کی ہے۔ ان اسباب میں سے نفس کلی کے احوال ہیں۔ جب یہ ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ ان کی ایک حالت وہ ہوتی ہے جب ان کی استعداد کا ظہور شروع ہوتا ہے، پھر دوسری حالت استعداد کے مکمل ہونے سے لے کر ان کے الگ ہو جانے تک ہوتی ہے اور ان میں سے انواع کے 'ائمہ' ہیں۔ یہ وہ وجود ہوتے ہیں جن کے بدن تو صور مثالیہ ہوتے ہیں اور ان کے ارواح وہ قوتیں ہوتی ہیں جن کا افادہ نفس کلیہ سے ہوتا ہے۔ انہی میں سے عالم مثال ہے، انہی میں سے ملاء اعلیٰ، ملائکہ سفلیہ اور شیاطین ہیں۔ انہی میں سے بنی آدم کے اعمال ہیں کیونکہ کہ ان کے جزئی ہونے کے اسباب ہوتے ہیں۔ اور انہی میں سے اسمائے الٰہیہ ہیں جو عابد انسانوں اور فاضل فرشتوں سے اٹھتے ہیں اور عالم مثال میں نورانی وجود بن جاتے ہیں۔ پھر جب کوئی پھیرنے والا اپنے نفس کو اس کی طرف ایک قسم کی حرکت دے کر اور انہیں کھینچ کر مطلوب کی طرف مائل کر لیتا ہے تو یہ بھی مائل ہو جاتے ہیں اور ملائکہ جو ان اسماء کے خادم ہوتے ہیں، ان کے مطیع ہو جاتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ ایسے بہت سے امور ہیں جن میں سے ہم کچھ کا بعد میں ذکر کریں گے، انشاء اللہ تعالیٰ۔

ہم نے مشاہدہ کیا ہے کہ قویٰ سماویہ اور قویٰ ارضیہ میں کوئی تناقض نہیں ہے بلکہ دونوں قسم کی قوتوں کے لیے ضروری ہے کہ ان کا فیض کلی ہو۔ اسی طرح ایک صورت میں کلیات جمع ہو جائیں اور امر حادث میں ان کے حق کی رعایت رکھی جائے گی، مثلاً آئینہ میں دیکھنے والا، اور وہ صورت جو آئینہ میں دکھائی دیتی ہے کیونکہ آئینہ اور دیکھنے والے میں ضروری بات وہ امر کلی ہے جو صورت پر منطبق ہوتا ہے۔ اسی طرح ان نظام میں جس کو ہم نے قویٰ سماویہ اور قویٰ ارضیہ کے لیے واجب قرار دیا ہے، اور ان اسباب میں جن کا ہم نے ذکر کیا ہے کوئی تناقض نہیں۔ البتہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک امر دوسرے کے مقابلے پر زیادہ شدید موجب ہوتا ہے اور دوسرا موجب نہیں ہوتا، صرف مساعد ہوتا ہے، اور کبھی کوئی امر دوسرے امر کے مقابلہ میں زیادہ تقاضا کرنے والا ہوتا جس کی وجہ

سے صارف حادث کو زیادہ قوی کی طرف منسوب کر دیتا ہے۔حق بات تو یہ ہے کہ اسباب ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔مگر اسی نے یہ چاہا ہے کہ ہر حق دار کے حق کا لحاظ رکھا جائے۔

لمعہ نمبر ۲۹

جب امور ایک دوسرے سے ٹکرائیں اور فعال قوتیں منفعل قوتوں کے ساتھ مختلف اطوار اور لاتعداد طریقوں سے مل جائیں تو مختلف امور پیدا ہو جاتے ہیں اور بعض افعال و حالات۔ان امور میں کوئی شر نہیں پایا جاتا، جس سے مراد ایسی چیز کا وجود ہے جس کا کوئی سبب نہ ہو، یا ایسی چیز کا علم جس کی علت مکمل نہ ہو چکی ہو۔لیکن کبھی اس میں شر ہوتا ہے، بایں معنی کہ اس میں ایک نظام کی مخالفت ہوتی ہے اور دوسرے کی نہیں ہوتی۔جس طرح کہ جلانا بہ نسبت نار کے خیر ہے اس لیے کہ یہ اس کا کمال ہے، اور اپنی نوع کے اقتضا کی تکمیل ہے، اور اس حیوان کی نسبت سے شر ہے جو جل رہا ہو۔

پھر بعض شرور جارہ ایسے ہوتے ہیں جو شر محض ممتنع کے قریب ہوتے ہیں۔یہ اس طرح ہوتا ہے کہ وہ ان نظامات کے خلاف ہوں جو بلند قوتوں کے نزدیک محبوب ہیں۔بعض شر ایسے ہوتے ہیں جو اس خیر محض کے قریب ہوتے ہیں جو انسان کے جسم کے لیے اعتدال حقیقی کی طرح ہوتے ہیں، اور یہ اس طرح ہوتا ہے کہ وہ ان نظامات کے موافق ہوں جو بلند قوتوں کے نزدیک جلیل القدر اور محبوب ہوں، خواہ وہ بعض ضعیف اور مٹنے والی قوتوں کے مخالف ہی کیوں نہ ہوں۔اور بعض ایسے ہوتے ہیں جن کا کمال انسانی جسم کے لیے نقاہت اور مرض کا سبب ہوتا ہے۔اور جب ایسی چیز ہو جو فلکی اور ارضی اسباب کے لیے شر ہے، اور ان اسباب کا پکڑ لینا قبیح بھی نہ ہو، تو اللہ تعالیٰ کی سخاوت اس بات کی مقتضی ہوتی ہے کہ اس پر قبضہ کر لیا جائے۔جب ایسی بات نہ ہو جو فلکی یا ارضی سبب کی کمزوری کا سبب ہے، اور اس کا کھلا چھوڑ دینا قبیح نہ ہو، تو اللہ تعالیٰ کی سخاوت یہ تقاضا کرتی ہے کہ اسے وسعت دے دی جائے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ سلسلہ فائضہ مندمجہ (یعنی فیضان والا اور محکم سلسلہ) جس طرح ان اسباب پر مشتمل ہوتا ہے اسی طرح ان امور پر بھی مشتمل ہوتا ہے جو اس سے پیدا ہوں۔جس طرح ذات بعینہٖ ان اسباب کا تقاضا کرتی ہے اسی طرح اس

وحی کا بھی تقاضا کرتی ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ بعض امور کے اجتماع کے وقت فیصلہ کرتا ہے۔ ان کی مثال مراتب اعداد کے خواص کی سی ہے، اس لیے کہ خود مراتب کی طرح طبیعت عدد یہ کا تقاضا بھی یہی ہے۔

لہٰذا رحمٰن اپنے اس فعل کے مطابق جو طبیعت مدبرہ کلیہ کے اندر موجودات میں ہوتا ہے۔ اپنے ہاتھ میں میزان لیے ہوئے ہے جس سے اسباب کا وزن ہوتا ہے، چنانچہ یہ نیچے اور اوپر ہوتے ہیں اور راجح کو معلوم کرلیا جاتا ہے، اور راجح مرجوح پر حکم کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: 'ہر روز وہ ایک نہ ایک شان میں ہوتا ہے، زندہ کرتا ہے، مارتا ہے، (کسی کو) پست کرتا ہے اور کسی کو بلند کرتا ہے۔' نیز فرمایا: 'ہم نے آسمان اور زمین کو بے کار پیدا نہیں کیا، اس قسم کا خیال تو کافروں کا ہے، یعنی بے کار و مہمل نہیں بنایا کہ بغیر تدبیر کے ہو اور کسی چیز کے وجود سے پہلے خاص طور پر اس کا تعین نہ کیا گیا ہو۔ لہٰذا وہ ہر وقت، ہر نفس اور ہر سبب کا نگہبان رہتا ہے اور ہر چیز کی حالت اس کے ساتھ مخصوص کرتا ہے۔ ان کے ساتھ اس کا معاملہ کبھی قبض کبھی بسط[1] کا ہوتا ہے، اور جہاں کے جس قدر موالید ہیں انھیں تبدیل کیا جاتا ہے تاکہ معاملہ خیر کی طرف لوٹ آئے۔ اس کی مثال اس فلسفی کی ہے جو پردہ کے پیچھے بیٹھ کر سامان و آلات کو حرکت دیتا رہتا ہے، اور ان کی حرکت دیکھنے والوں کی نگاہیں اس طرف لگ جاتی ہیں۔ اور یہ بھی ضروری نہیں کہ 'کون' کے اندر طبیعت مدبرۂ کلیہ کا یہ فعل اس ترجیح کے لئے متجدد ارادوں اور بدلنے والے عزائم کے ساتھ ہو، بلکہ یہ فعل اس سے بہت بلند و بالا ہوتا ہے کہ تو اپنے ذاتی خیالات کا اعتبار کرے۔

لمعہ نمبر ۳۰

جب پانی ہموار و نرم زمین میں واقع ہو، اور اس کی طبیعت ان تمام جوانب کا وزن کرے جن سے یہ پانی بہہ کر اس میں آتا ہے، نیز ان تمام مواقع کا وزن کرے جو وہاں اس کے طبعی میل کو

---

[1] قبض و بسط: واردات کا جو کسی مصلحت سے ہوتا ہے قبض کہلاتا ہے، آثار لطف و کرم اور فضل کے ورود سے قلب کو سرور و فرحت ہوتا ہے، یہ بسط کہلاتا ہے۔ سالک پر کبھی قبض کی کیفیت ہوتی ہے، کبھی بسط کی کیفیت طاری ہوتی ہے یعنی غم و سرور کی کیفیت۔ (قاسمی)

روکنے والے ہیں، تو یہ ممکن نہ ہوگا کہ پانی کسی جہت کو جا سکے، حالانکہ وہاں پست جہت موجود ہے، اور نہ ہی یہ ممکن ہے کہ وہ کسی سے مزاحم ہو، جب کہ وہاں پانی کے بہنے کا راستہ موجود ہے، نہ یہ ممکن ہے کہ وہ نرم زمین سے پہلے سخت زمین کو اکھاڑے۔ اس کے تمام افعال اس کی طبیعت کے اصلی تقاضے کے مطابق اس کے اندر پائے جاتے ہیں جن سے یہ تجاوز نہیں کرتا۔ جب درخت کی جڑ اپنے اجزا کے مادہ کو پی لے تو اس کی مدبر طبیعت اس کا وزن کرے گی۔ اس میں مادہ کی رقت، غلظت، حرارت، رطوبت اور تمام وہ چیزیں پائی جاتی ہیں جنھیں درخت سے پیدا کرنا اس کے لیے ضروری ہے، مثلاً ٹہنیاں، پھول پتے، پھل گوند وغیرہ۔ لہٰذا یہ مادہ ان چیزوں میں حکمت کے مطابق تقسیم ہو جائے گا۔ اس لیے یہ ممکن نہ ہوگا کہ پتوں میں پھلوں کے مقابلہ میں زیادہ تصرف کر سکے، سوائے اس حالت کے مادہ انکار کرے۔

جب انسان کے پیٹ میں موذی اخلاط پیدا ہو جاتے ہیں اور اگر اس کی اصلاح ممکن ہو تو طبیعت انسانیہ اس کے سبب کی اصلاح کر لیتی ہے، اور اسے جزبدن بنا لیتی ہے، ورنہ نکسیر یا اسہال کے ذریعہ سے اسے نکال دیتی ہے۔ اور اگر مادہ کی نافرمانی کی وجہ سے یہ نہ پھیلے تو طبیعت بدن کی گہرائیوں سے اسے نکال کر جلد کی طرف لے آتی ہے اور پھنسیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اور اگر یہ بھی نہ تو بخار یا کوئی خاص مرض کسی عضو کو لاحق ہو جاتا ہے، لہٰذا تمام طبائع ان مادوں کو، جو ان پروارد ہوتے ہیں طبعی میزان میں وزن کرتی رہتی ہیں اور ان میں کسی قسم کی ترجیح بلا مرجح نہیں پائی جاتی۔

لمعہ نمبر ۳۱

موجودات میں طبیعت مدبرۂ کلیہ اس بات کی زیادہ حق دار ہے کہ ہر چیز کا وزن کر سکے اور پست اور اونچا کرے۔ بلکہ اگر تو حق بات معلوم کرنا چاہتا ہے تو طبائع کے میزان تمام کے تمام اس کے کلی میزان کا جزو ہیں۔ جو اس بات کے قریب ہیں کہ وہ حوادث جو خلا کے محال ہونے پر متفرع ہوتے ہیں اس کے مقتضیات میں سے ہوں، مثلاً اس بوتل کا ٹوٹ جانا جسے چوسا گیا ہو اور پانی کا اوپر چڑھ جانا، اور اس نالی کا چوسنا جس کا منہ اس پانی میں ہے۔ پھر یہ کہ جب ہوا، درمیان میں نہ ہوگی تو پانی اوپر کو چڑھتا رہے گا۔ یہ اس طبیعت کلیہ کا تقاضا ہے جو سب میں ایک ہی چیز کی طرح

سرایت کیے ہوئے ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جو مبداء اولیٰ کے بالکل قریب ہوگا اس کی طبیعت اس کا عین ارادہ ہوگی، اور ارادہ عین طبیعت، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جس چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس کا ارادہ دائمی ہوتا ہے، اور مصلحت کلی اس کا منشا ہوتا ہے۔ اب اصطلاح میں سلسلہ مندمجہ کو 'قدر' کا نام دیا جاتا ہے، اور جو امور طبیعت کلیہ کے احکام سے وقتاً فوقتاً ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں انھیں 'قضا' کہا جاتا ہے۔

لمعہ نمبر ۳۲

کشف صحیح کے ذریعہ سے یہ بات ہمارے نزدیک ثابت ہو چکی ہے کہ وجود کے اندر روحانی موطن ہوتا ہے جو اکثر حوادث کا مبداء ہوتا ہے۔ مثلاً رسولوں کا بھیجنا اور ملتوں کا قائم کرنا۔ سلف نے روحانی موطن کا نام حظیرۃ القدس رکھا ہے اور ہمارے لیے یہ لوگ اچھا نمونہ ہیں۔ اگر تو ان کی حقیقت کو پہنچنا چاہے تو جان لے کہ جس طرف ہر نفس جزئی کے اندر بہت سے نقطے پائے جاتے ہیں اور ہر نقطہ کے مقابلے میں خاص احکام اور خاص آثار ہوتے ہیں اور نفس جزئی کا مبداء ہوتا ہے جو ان نقاط کو واجب قرار دیتا ہے، لہٰذا اگرچہ بادی النظر میں ان نقاط کا معاملہ مشتبہ ہوتا ہے لیکن ایسی گہری نظر جو ہر حق دار کا حق ادا کرے کسی چیز کو دوسری چیز کے ساتھ نہیں ملاتی، مثلاً ہم کہیں کہ انسانی فرد ناطق ہے، چلنے والا ہے، ہنسنے والا ہے، کاتب ہے، سفید ہے، وغیرہ وغیرہ۔ چنانچہ وہ نقطہ جس کے اعتبار سے وہ سفید ہے وہی نہیں ہے جس کی وجہ سے وہ ناطق ہے اس لیے کہ تو ہر انسان کو ناطق دیکھتا ہے۔ اس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ وہ نقطہ جو نطق کو واجب قرار دیتا ہے تمام افراد انسانی میں مشترک ہے۔ کیوں کہ ہم دیکھتے ہیں کہ کئی ایک پتھر بھی سفید ہیں اور بہت سے انسان سیاہ ہیں۔ لہٰذا یہ نقطہ وہ نقطہ نہیں جس کی وجہ سے وہ بولتا ہے، اگرچہ محل کے اعتبار سے دونوں اکٹھے وارد ہوتے ہیں۔ اسی طرح نفس کلیہ کے بھی بہت زیادہ نقطے ہوتے ہیں جو ہر اس حالت کے بالمقابل ہوتے ہیں جو اس پر عمر بھر میں ایک دن طاری ہوں اور نفس کلیہ کے بعض نقاط وہ ہوتے ہیں جو 'تحقق' اور 'فعلیت' کے بالمقابل واقع ہوتے ہیں اور یہ نقطہ واجب لذاتہ کی تمثال، اس کی تجلی اور اس کی حکایت میں پایا جاتا ہے اور یہ حظیرۃ القدس کی اصل ہے۔

اور جب افلاک اپنے علوم اور قوتوں سمیت پائے جاتے ہیں تو پہلی چیز جس کا انھیں تصور ہوتا ہے وہ واجب لذاتہ ہوتی ہے۔ لہٰذا واجب لذاتہ کی صورت ایک ایسا امر ہوتا ہے جس پر اس کے تمام علوم کا اتفاق ہوتا ہے اور چونکہ وہاں لاعلمی اور اشتباہ نہیں ہوتا لہٰذا ضروری ہے کہ واجب لذاتہ کی یہ صورت ان نقاط پر کسی حد تک صادق آئے۔ یہ حظیرۃ القدس کا پہلا ظہور ہے۔ پھر جب اسباب نے اس بات کا تقاضا کیا کہ ملائکہ علوی اور ان نفوس عارفہ کو پیدا کیا جائے جو ملائکہ علوی کے ساتھ لاحق ہیں تو یہ اپنی سرشت کی وجہ سے اس بات پر مجبور ہو گئے کہ یہ حظیرۃ القدس کی طرف مائل ہوں، جس طرح کہ ہر ذی طبیعت اپنے حیز کی طرف مائل ہوتا ہے۔ اور جب یہ اسباب اس نقطہ تک پہنچ گئے اور اس کو گھیر لیا، اور اس کے سامنے ہو گئے، اس وقت جا کر حظیرۃ القدس کا دائرہ وسیع ہو جاتا ہے۔ اگرچہ حیز کے اعتبار سے یہ حظیرہ کسی خاص مکان کے ساتھ مخصوص نہیں ہوتا، لیکن اس کی حالت کی قریب ترین تعبیر یہ ہے کہ یہ رحمان ہے جو عرش پر بیٹھا ہے، اور ملاء اعلیٰ عرش کو اٹھائے ہوئے ہے، اور قضا وہیں سے نازل ہوتی ہے۔

لمعہ نمبر ۳۳

جس طرح نباتات کے شخص کی طبیعت ہے جس کے اندر اس کا تمام نظام پایا جاتا ہے، اسی طرح نفس کلی کی بھی طبیعت ہوتی ہے جس میں موجودات کی تمام اشیا کا نظام مشتمل ہوتا ہے۔ اسی کے اندر افلاک وعناصر بھی ہوتے ہیں۔ پھر ان دونوں کے ازدواج سے موالید پیدا ہوتے ہیں، پھر موالید ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں تو وہ اطوار پیدا ہوتے ہیں جن میں سے بعض خیر نسبی سے قریب اور بعض بعید ہوتے ہیں۔ جہاں تک بھی ہو سکے سخاوت میں بھلائی کا پہنچانا واجب ہوتا ہے۔ اسی قیاس پر بعض امور دیگر امور پر موقوف اور مترتب ہوتے ہیں۔ ان آثار میں نہ اختلاف ہوتا نہ اتفاق، اور نہ وسعت فعل اور علت تامہ کے مطابق ترک فعل ہوتا ہے، بلکہ وہاں ایک سلسلہ ہوتا ہے جس سے طبیعت سرمو انحراف نہیں کر سکتی۔ پھر یہ سلسلے اسی طریقہ پر ظاہر ہوتا ہے، اس سے تجاوز نہیں کرتا۔

اور جب نفس کلی اور اس کی طبیعت کا فیضان 'اول' سے ہے اور اس کے برقرار رکھنے سے یہ

برقرار ہے تو یہ ضروری ہو گیا کہ اس طبیعت کا سہارا اس جزء پر ہو جو 'اول' کے مشابہ ہے، نیز اس نقطہ پر ہو جو مبداء کو اپنے نقاط کے قریب کر دیتا ہے۔ یہی چمک دار نقطہ ہے جس کے نور نے موجودات کے تمام نقاط کو مغلوب کر رکھا ہے، اور اپنی تاثیر کی وجہ سے ہر حادث کے اندر گھس گیا ہے۔ تمام وہ امور جنہیں ہم نے طبیعت کی طرف منسوب کیا ہے، اسی سے نکلتے ہیں۔ لہٰذا ہر اس شخص کی زبان، جس نے اس نقطہ کا مشاہدہ کر لیا ہو اور اسے کائنات کی تمام چیزوں پر غلبہ دیا ہو، اس سوال پر کہ 'مخلوق' کو پیدا کرنے سے پہلے ہمارا رب کہاں تھا؟ یہ جواب دے: 'عماء[1] میں تھا جس کے نہ نیچے ہوا اور نہ اوپر۔ عماء میں ہونے کی وجہ سے پیشتر اس کے کہ یہ نوع یا جنس میں منقسم ہو، اس کلی نقطہ کا تعلق اترتا ہے، خواہ اللہ تعالیٰ کے لیے ایسا نیا ارادہ ہی کیوں نہ ثابت ہو جائے جو حوادث کا سبب بنتا ہے۔ پھر جس طرح آگ کے 'جلانے والی' ہونے کے لیے طبیعت ناریہ کے سوا کسی اور علت کا سہارا لینا پڑتا ہے اس ارادہ کو کسی اور چیز کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں ہوتی، یا یہ کہ قضا کے نازل ہونے کا اعتماد عرش پر ہے، نیز وہ یہ کہے کہ فرشتے اس کے مطیع ہو جاتے ہیں۔

لمعہ نمبر ۳۴

حق تعالیٰ کے افعال اگرچہ بہت ہی زیادہ ہیں مگر یہ چار جنسوں سے باہر نہیں ہیں: ابداع، خلق، تدبیر اور تدلی۔ کسی چیز کا عدم محض سے وجود کی طرف لانا ابداع کہلاتا ہے اور یہ فعل اللہ تعالیٰ اور ان چیزوں کے درمیان جاری ہے جو ایک حالت سے دوسری حالت میں متغیر ہوتی ہوں، اور اس کی طرف حاجت کا باعث امکان اور کسی چیز کا لذاتہ غیر واجب ہونا ہے۔ اس کا مرجع لزوم اور ضرورت کی طرف ہے۔

اور خلق یہ ہے کہ کسی چیز سے کوئی اور چیز بنا دی جائے اور یہ اللہ اور ان چیزوں کے درمیان ہوتا ہے جو ایک حالت سے دوسری حالت میں بدلتی ہوں۔ اس پر جو اثر مرتب ہوتا ہے وہ افلاک، عناصر اور دیگر تمام انواع کا اپنے خواص اور آثار کے ساتھ ظاہر ہونا ہے۔ اس میں اس بات کی

---

[1] الاعماء: غیر آباد مقامات جہاں آبادی کا نام ونشان نہ ہو۔ العماء بمعنی بادل، لمعہ ۳۲ میں حضرت شاہ صاحب نے عماء استعمال کیا ہے جو بادل کے معنی میں ہیں، اعماء کے معنی ہیں غیر آباد مقامات جہاں آبادی کا نام ونشان نہ ہو۔ (قاسمی)

حاجت ہوتی ہے کہ ایک چیز کا پہلے مادہ موجود ہو اور اس پر مدت گزر چکی ہو، اور نفس کلی میں تمام حالتیں شامل ہوں، لہٰذا جب قوتیں قوتوں کے ساتھ ملتی ہیں تو یہ امتزاج اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ نفس کو جسم کے اس حصہ کے تناسب کی طرف اتار دے اور مرجع اس چیز کے ظاہر کرنے کی طرف ہوتا ہے جو چھپی ہوئی ہو، اور یہ کہ ایک چیز جو وجود کے ساتھ موجود ہو کوئی اور وجود پہن لے۔ اس کی فاعل ذات الٰہی ہوتی ہے بشرطیکہ نفس کلی میں اس کا دائمی فیضان ہوتا ہو، اور نفس کلی اپنے خواص اور احکام کے ساتھ اس کا قبول کرنے والا ہوتا ہے۔

تدبیر یہ ہے کہ جہاں میں اس طرح ردوبدل کیا جائے کہ حوادث مصلحت کلی کے مطابق ہو جائیں، اور یہ فعل اللہ اور ان امور کے درمیان ہوتا ہے جو کثرت تعداد کا محل ہیں، مثلاً نوع اور اشخاص، اور یہاں قویٰ کے قویٰ کے ساتھ امتزاج کی ضرورت ہوتی ہے۔ بشرطیکہ یہ تدبیر اس شر تک نہ لے جائے جس کو دور کرنے کو اللہ کی حکمت میں واجب سمجھا جاتا ہے، اور اس کا مرجع ذوارادہ اشخاص کی طرف الہام کرنا ہوتا ہے مثلاً، ملائکہ، انسان اور بہائم، نیز اس طرف ہوتا ہے کہ موالید کی طبع کا احاطہ کیا جائے، اور وہ تقریبات ہیں جو ان دونوں قسموں سے مرکب ہیں۔ اور فاعل ذات الٰہی ہوتی ہے۔ بشرطیکہ نفس میں اس کا فعل صنف اور جنس بنانے کا ہو، نیز اس شرط پر کہ مصلحت کلی اور موالید کے قبول کرنے والے کا خیال رکھا جائے۔

تدلی کی اصل اللہ تعالیٰ کا جہاں میں مدبر ہو کر ظاہر ہونا ہے جس طرح نفس ناطقہ جسم کی تدبیر کرتا ہے۔ خواب یا بیداری یا معاد میں اس تجلی کے عکس ظاہر ہونا بھی اسی ظہور کی فرع ہے۔ لہٰذا پہلی قسم کا ظہور جہاں میں تدبیر کا منشا ہے، اور دوسرا اللہ اور بنی آدم کے اشخاص کے درمیان۔ اور جو اثر اس پر مرتب ہوتا ہے، وہ علم اور رشد یا تکمیل نفوس کا ظاہر ہونا ہے۔ اور یہاں حاجت یہ ہوتی ہے کہ ان مذاہب اور ان کی تکمیل مصلحت سے ہو، اور یہ اس دن تدلی کے سوا مکمل نہ ہوگی۔ اس کا فاعل حق تعالیٰ ہوتا ہے، بشرطیہ وہ تدبیر کے ساتھ موصوف ہو، اور اس فعل کا قبول کرنے والا تمام کی تمام نوع انسانی اور بذات خود اشخاص انسانی ہیں۔

لمعہ نمبر ۳۵

خلق ابداع کی تکمیل ہے، تدبیر خلق کی تکمیل اور تدلی تدبیرات کی تکمیل ہے۔ یہ اس طرح کہ خلق سے مراد مادہ اور صورت میں وہ تصرف ہے جس سے بہت سی صورتیں حاصل ہوں اور یہ تمام نفس کلی اور مادہ کے اندر شامل ہیں۔ لہٰذا جب مخلوق ظاہر ہوگئی تو یہ امتزاج قویٰ اور مشتمل چیزوں کے ظاہر ہونے کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا، لہٰذا جب اللہ تعالیٰ نے 'مبدع اول' کو ایجاد کیا تو اس میں تھوڑا سا اجمال ظاہر کیا جو ابد تک ظاہر ہوتا رہے گا۔ پھر جب انواع اور اشخاص اپنے آثار اور احکام کے ساتھ ظاہر ہو گئے اور مزاحمت واقع ہوئی تو طبیعت کلی نے ان تمام کا وزن کیا اور اس نے اس مصلحت کلی کو جو، اس طبیعت کی اصل سے پیدا ہوتی ہے، راجح قرار دیا۔ تدبیر کے اندر صرف یہ چیزیں پائی جاتی ہیں: علوم اور ارادت کا پیدا کرنا، طبیعتوں کا بدلنا اور تکلیف شرعی کے لیے مستعدوں کی تدبیر کرنا، جو آخر میں حظیرۃ القدس میں عکس اور تجلی اعظم کی تجلیات کے ظاہر ہونے پر منتہی ہوتی ہے۔ اسی لیے کہ کون کی طبیعت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ جن امور کو فعل 'خلق' نے مضبوط کر رکھا ہے انھیں تدبیر باطل نہ کرے، اور نہ تدلی ان امور کو باطل کرے جنہیں تدبیر نے مضبوط کر رکھا ہے۔ لہٰذا تدبیر سے جنس شیاطین اور نفوس امارہ کی جنس باطل نہ ہوگی بلکہ ملائکہ اور انبیاء مبعوث ہوں گے جو ان امور کے خلاف کوشش کریں گے جن کی کوشش شیاطین کرتے ہیں۔

لمعہ نمبر ۳۶

سب سے بڑا سبب جس کا خیال جہاں میں رکھا جاتا ہے مصلحت کلی ہے اور مبداء سے ان اشیاء کا لازمی طور پر صادر ہونا جن کا مطالبہ اسباب کرتے ہیں۔ علیٰ ھذا القیاس دیگر امور، اور ان کا ارادۂ واجبہ سے ظاہر ہونا۔ ہمارے نزدیک ان دونوں میں کوئی تزاحم نہیں۔ چنانچہ جس طرح نباتات کے وجود کے اندر ایک قوت ایسی ہوتی ہے جو جسم کے مناسب حال غذا کو بدلنے کا مبدا ہے، نیز یہ قوت پتے، پھول، ٹہنیوں اور پھلوں کو ایک ایک طرز میں اگانے کا مبدا ہے کہ یہ اس طرز سے تجاوز نہیں کرتا ہے۔ پھر یہ محدود وقت کا مبدا ہوتا ہے جس میں نباتات ایک معلوم حد تک نشوونما

پاتی ہے۔ پھر محدود وقت تک اسی نمونہ پر قائم رہتی ہے۔ اس کے بعد اس مبدا کا وقت آتا ہے جس میں نباتات مرجھا کر خشک ہو جاتی ہے۔ پھر وقت آتا ہے کہ اس کے آثار سے نفع حاصل ہوتا ہے۔ اسی طرح شخص اکبر کی طبیعت کلی ہوتی ہے، جس کا حکم یہ ہوتا ہے کہ اعضا کے لیے اس طرز پر ہونا ضروری ہے۔ نیز ہر نوع، بلکہ ہر چیز جو ایسی ہو، اس حکم سے انحراف نہیں کرتی۔

جب ایک ہی چیز کے اندر دو سببوں کا تنازع ہو جائے تو ضروری ہے کہ حکم ایسا ایسا ہو، اور جب خیر عظیم کا سبب مفقود ہو اور اس نظام کل کے مطابق، جو طبیعت کے اندر مندرج ہے اس کا موجود کرنا قبیح نہ ہو تو سبب بعید کا پھیلا دینا ضروری ہو جاتا ہے یہاں تک کہ یہ سبب مفید ہو جائے، اور بالآخر معاملہ خیر عظیم پر ختم ہو جاتا ہے۔ کبھی ابتدا اور انتہا کو زمانے کے ادوار کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ 'بدایت' اور 'نہایت' میں ادوار زمانہ کی تاثیر پائی جاتی ہے۔ اس بیان میں تسامح پایا جاتا ہے، لیکن صریح اور حق بات یہ ہے کہ یہ بدایات ونہایات اس طبیعت کلیہ کے جوار کی طرف منسوب ہیں جو کبھی ان ادوار کے اندر شامل تھیں اور کبھی ان میں پھیلی ہوئی تھیں، لیکن چوں کہ ان کا مآخذ بہت دقیق ہے، یہ ان سے اتر کر زمان تک پہنچ جاتے ہیں، مگر حق بات اہل حق سے مخفی نہیں ہوتی۔

لمعہ نمبر ۳۷

ان اسباب میں سے جن کا خلق اور تدبیر میں لحاظ رکھا جاتا ہے افلاک کے طبائع بھی ہیں کیوں کہ موالید کو صرف اس وقت پیدا کیا جا سکتا ہے جب قویٰ مولدہ کا اجتماع ہو۔ پھر مولود کی تعین میں ان قوتوں کی حالت کا لحاظ رکھا جاتا ہے اور جب نطفہ رحم میں جاتا ہے اور کئی قسم کے ابتلا کے بعد علقہ (خون کا لتھڑا) پھر گوشت کا غیر مخلقہ لتھڑا، پھر مخلقہ لتھڑا بن جاتا ہے، تو یہ لتھڑا اس بات کے لیے تیار ہوتا ہے کہ اس میں وہ طیب اور معتدل ہوا پیدا ہو جائے جو روحانیات کے مشابہ ہو جاتی ہے اور جب یہ ہوا پیدا ہو جاتی ہے تو نفس کلی بذات خود ایک ایسی جزئی بن کر وہاں نازل ہوتا ہے جو اس دن ہیئت عالم کے مناسب ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب تو نفس ناطقہ کا اعتبار فاعلی اور قابلی جہت کے خیال سے کرے گا تو یہ ایک گیند کے متشابہ ہوگا جس کی نچلی میخ کی انتہا

والدین کی اصل میں ہوگی اور اس کی اوپر کی منبع وہ ہوگی جہاں سے اس کی اصل کا انتشار لوگوں میں ہوا اور لوگوں نے اس کے فضل کو قبول کیا اور آخری دو میں سے ایک نے خود اپنے آپ کو قبول کیا اور جو اس میں اثر کرتا ہے یا اثر پذیر ہوتا ہے اس کا مقابلہ کرنا، ان امور کی طرف توجہ دلاتا ہے جن کی شان ہی یہ ہے کہ وہ اس کی طرف سخت کھنچیں اور مائل ہوں، نیز ان کی طرف جو اس سے کم جذب کرتے ہیں، وعلیٰ ہذا القیاس۔ ان جہات کا وہی جانشین ہوسکتا ہے جس کا تقاضا اس دن عالم کرتا ہے۔ لہذا جب طالع صاحب السباع (درندوں والے) پر ہوگا۔ تو لازمی طور پر اپنی فاعلی جہت کے اعتبار سے نفس قوی پیدا ہوگا۔ اس طرح کہ وہ اپنے دشمن پر غالب آئے گا اور دشمن اس کا مقابلہ نہ کرسکے گا۔ اسی طرح اس کی ہر جہت اس طرح پیدا کی جاتی ہے جس طرح عالم ہیئت اسے عطا کرتی ہے۔ ان جہات نفس کا نام بخت رکھا جاتا ہے۔ چنانچہ جب بچہ بڑا ہو جاتا ہے اور دشمنوں کے ساتھ اس کے معاملے کا وقت آتا ہے تو حق تعالیٰ اس کے بخت کی حالت کو نگاہ میں رکھتے ہیں اور اس کی مخالفت کے لیے صرف ان لوگوں کو برانگیختہ کرتے ہیں جن کے متعلق انہیں علم ہوتا ہے کہ یہ عنقریب ان کے دلائل کو باطل کردے گا۔ نیز اللہ تعالیٰ ایسے اسباب برانگیختہ کرتا ہے جن کی وجہ سے یہ غالب ہو جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ وہ اس شخص کی حالت کا خیال اس کے بخت کے عطیہ کے مطابق رکھتا ہے۔ نیز ان تمام لوگوں کی حالت کا خیال رکھتا ہے جو اپنے بخت کے عطیہ کے مطابق معاملہ کرتے ہیں۔ اور نفس کے اندر جہات اس وقت پیدا کی جاتی ہیں جب کہ جنین میں نفس ناطقہ کے ظہور کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس لئے صادق مصدق صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ نفخ روح کے وقت اللہ کے حکم سے چار باتیں لکھی جاتی ہیں: نر ہے یا مادہ، بد بخت ہے یا خوش بخت، اس کے اعمال کیسے ہوں گے اور اس کا رزق کیا ہوگا؟ نطفہ کے گرنے کا وقت اس کی بنیاد کے ظہور کا وقت ہوتا ہے اور بچے کے گرنے کا وقت اس کے فعل کی دلیل ہے۔ اسی طرح حوادث کے پیدا کرنے اور ان کے پورا کرنے میں کواکب کے حال کا خیال رکھا جاتا ہے۔ چنانچہ جب حالت جنگ یا دوستی کا اقتضا کرے تو اسے پورا کردیا جاتا ہے اور ہر چیز کے لیے وہ اسباب مہیا کردیئے جاتے ہیں جو اس کے مناسب ہوں۔

لمعہ نمبر ۳۸

جہاں تک کرۂ ارض اور کرۂ ما کا تعلق ہے۔ زحل[1] کی طبیعت ان کے حال کے ساتھ نفرت کا تقاضہ کرتی ہے اور ان پر ایسا مرض طاری نہیں ہوتا جو انہیں اپنی طبیعت سے نکال کر موالید کی طبیعت کی طرف لے جائے۔ اس زحل میں اس قدیم کی طرف بھی نسبت پائی جاتی ہے جو صورت سے بلند و بالا ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو شعائر اللہ کی تعظیم بھی نہ ہوتی اور نہ موالید میں سے کوئی چیز قدیم کی طرف ہی منسوب ہوتی۔ مریخ[2] کا خزانہ غضب اور جنگ ہے اور اس حرارت اور طبیعت کا شعلہ زن ہونا ہے جسے غضب اور جنگ بھڑ کاتے ہیں۔ جہاں تک مشتری[3] کا تعلق موالید کے ساتھ ہے یہ سعد ہے۔ وہ بات جس کا فیضان اس سے ہوتا ہے یہ ہے کہ موالید کی صورت نوعیہ کا حکم اپنی صحیح حالت میں ظاہر ہو۔ لہٰذا مشتری کی قوت کے وقت جب صورت انسانیہ کسی جسم میں ظاہر ہوگی تو اس کا حکم یہ ہوگا کہ وہ کامل اور وافر ہو۔ سورج کا حکم غلبہ کا ہے اور اس میں تعظیمی طور پر آسمان اور زمین کے چاندوں کی طرف توجہ اور عبادت کا مفہوم مضمر ہے۔ زہرہ[4] کا فیضان ان تمام چیزوں کا ہوتا ہے جو تکمیل صورت کی فرع بنتی ہے۔ مثلاً جب اس میں صورت نوعیہ کی تکمیل ہو جائے تو وہ خوبصورت ہوگا۔ اسی طرح زہرہ روح پر دلالت کرتی ہے۔ اس لحاظ سے کہ یہ نکل کر عالم قدس کے مشابہ ہو جاتی ہے اور اس کے رنگ میں رنگی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر عارف کو اس سے حصہ ملتا ہے۔ علوم مرتبہ و مدونہ عطارد[5] کے لئے ہیں اور وہ توجہ جو اس تک پہنچاتی ہے۔ وہ اس قسم کی ہوتی ہے جسے بیدار ہونے والا پہلی بار بیدار ہوتے ہوئے محسوس کرتا ہے۔ جب کہ وہ اچھل کر تکلف

---

[1] زحل: وہ ستارہ ہے جو ساتویں آسمان پر ہوتا ہے اور نہایت ست و نحس اکبر خیال کیا جاتا ہے۔

[2] مریخ: ایک ستارہ کا نام ہے جو پانچویں آسمان پر ہوتا ہے۔

[3] مشتری: وہ ستارہ کا جو چھٹے آسمان پر ہے۔ اس کو نجومی لوگ سعد اکبر کہتے ہیں۔

[4] زہرہ: ایک مشہور ستارہ کا نام ہے جس کو سوک بھی کہتے ہیں۔

[5] عطارد: یہ مشہور ستارہ ہے۔ جو دوسرے آسمان پر ہوتا ہے۔ اس کو دبیر فلک بھی کہتے ہیں۔ علم و عقل اس سے متعلق ہیں۔

سے بیدار ہوتا ہے۔ چاند کا حکم معتدل نسبت ہے اور اسی نسبت میں پاکیزگی کے معنیٰ بھی پائے جاتے ہیں۔ ان ستاروں کے معانی کئی جہتوں سے ہر نفس ناطقہ میں پائے جاتے ہیں لیکن غلبہ اور مغلوبیت ان اتصالات کے حکم سے ہوتا ہے جو روح پھونکنے کے وقت حاضر ہوتے ہیں اور اس میں نفس فلکی اترتا ہے۔

لمعہ نمبر ۳۹

ملک کا لفظ مختلف حقیقتوں پر کئی معنوں میں مستعمل ہے، ایسے معنی جو آثار و خواص میں ہیں اور صفات نفسیہ میں سے نہیں ہیں۔ لہٰذا اس حیثیت سے کہ نفوس کلیہ کے ساتھ خلق اور تدبیر کے احکام وابستہ ہیں، انہیں ملائکہ کہا جاتا ہے۔ ان ملائکہ کے فیوض اور علوم کی مشابہت طبائع کے ساتھ ہے۔ چنانچہ نہ تو ان میں متجدد ارادے پائے جاتے ہیں نہ تغیر اور نہ ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیلی، لیکن انسانی نفوس اپنی ہمتوں کی وجہ سے ان تک پہنچ جاتے ہیں اور ان کے علوم ان کے ساتھ جا ملتے ہیں اور ان کے مشابہ ہیں۔ لہٰذا ان نفوس کی قوتیں نفوس انسانی کے لیے طبعی مثالیں پیش کرتی ہیں۔ حکمت کلی میں یہی تشخص کا سبب بن جاتا ہے۔ اسی طرح روزمرہ کے حوادث بھی ان کے بہت سے علوم مشخص کر دیتے ہیں۔

لمعہ نمبر ۴۰

جان لیں کہ نفس فلکی میں گزشتہ اور آئندہ امور کے متعلق ایک قسم کا ادراک پایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ اپنے نفس میں ادراک کے زمانہ میں اپنے رب سے ان حوادث یومیہ کا ادراک پالیتے ہیں جو ان کے قول سے منتظم ہوتے ہیں۔ نیز ان اسباب کے ادراک کو پالیتے ہیں جو اس ادراک کو پہنچاتے ہیں۔ حوادث کے اسباب یا تو طبعی ہوتے ہیں اور نفوس فلکیہ ان کا ادراک اسی طرح کر لیتے ہیں جس طرح ہم اپنے بدن کے عوارض کے ادراک کر لیتے ہیں یا ارادیہ ہوتے ہیں جو نفوس فلکیہ سے پیدا ہوتے ہیں اور کسی ایسے طبعی یا الٰہی سبب تک پہنچتے ہیں جس کا فیضان اس دن صرف خیر کی رعایت رکھتے ہوئے کیا گیا ہو اور اس قسم کے فیضان کے لیے وہ

قوی ترین قوتیں جن کے حال کی رعایت رکھی جاتی ہے۔ افلاک کی قوتیں ہیں۔ لہٰذا نفوس فلکیہ قریب ترین چیز ہیں جن پر باری تعالیٰ کی طرف سے ماضی اور مستقبل کے علوم کا فیضان ہوتا ہے اور ان نفوس فلکیہ میں سے قوی ترین فلک اطلس (فلک الافلاک) کا ہے کیونکہ یہ اپنے سے نیچے کے تمام افراد پر قاہر ہے۔ چنانچہ تو دیکھتا ہے کہ یہ حرکت یومیہ میں جو مشرق سے مغرب کو ہے ان پر غالب آتا ہے۔ اس کے بعد دیگر افلاک آتے ہیں، پھر نفوس عالیہ ان کے ساتھ ملے ہوتے ہیں۔ نفوس کی مدت کا ادراک عقلی ہی ہوسکتا ہے لیکن جب ادراک عقلی کلی کی چیز کو تمام اطراف سے گھیرے ہوئے ہوتو یہ 'شخص' کے جزئی ادراک سے بہت ہی قریب ہوتا ہے۔ پھر جب 'نفوس سافلہ' اس کے ساتھ مل جاتے ہیں تو تخیل اور توہم واقع ہوتا ہے اور نفوس فلکیہ عمدہ مناسبت کی وجہ سے ان کی واضح مدد کرتے ہیں۔

القصہ جب عالم واقع ہونے والے علوم کے فیضان کی وجہ سے آمادہ ہو جاتا ہے تو بیدار ہو جاتا ہے۔ یہ اس وقت ہوتا ہے کہ جب کوئی دور پایا جائے اور اس کی نوعیت کی طرح کی چیز پیدا ہو جائے اور علوم ان چیزوں میں پلٹ جائیں جو ان کے مناسب ہیں تو تمہارے 'مدارک' میں ایک صورت کا وجود آجاتا ہے اور تمام مدارک اس کے تصور میں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ یہ صورت اس وقت اپنے رب کے سامنے فضا میں معلق ہو کر کھڑی ہو جاتی ہے اور اس نے نہ کسی اس چیز پر سہارا کیا ہوتا ہے اور نہ کسی مخصوص نفس پر، اس وقت اس کا نام 'صورت مثالیہ' رکھا جاتا ہے۔ جہاں کے لیے اس کا حکم یہ ہے کہ جو بھی زمین کا 'حادث' ہے وہ زمین میں پیدا ہونے سے ایک مدت پہلے اس جہاں میں پایا جاتا ہے۔ رہا وجود اجمالی جسے 'لوح محفوظ کی لکھت' سے تعبیر کیا جاتا وہ پچاس ہزار سال کے قریب ہوتا ہے۔ بڑے اہم امور کا تفصیلی وجود ایک ہزار سال کے قریب ہوتا ہے جسے 'وجود الارواح قبل الاشباح' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ہر واقعہ کی ایک روح ہوتی ہے جو اس کے مناسب ہوتی ہے۔ اس کے بعد جب اس کے واقع ہونے کا وقت آتا ہے اور اللہ تعالیٰ عرش پر سے اس کا فیصلہ کر دیتے ہیں ملائکہ اس کے فرمان کے مطیع ہو جاتے ہیں تو یہ زمین میں اترتے ہیں۔

ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ بعض اوقات بلند نفوس کسی وجود یا تدلی کو خاص مکان میں اپنی

طرف کھینچتے ہیں جس سے پانی جسم طلق کا رنگ اختیار کر لیتا ہے۔ اور ایک ایسا وجود پیدا ہو جاتا ہے جو خرق[1] والتیام[2] کو قبول نہیں کرتا، مثلاً موسیٰ علیہ السلام کی آگ اور مریم کے لیے جبرئیل کا بشر کامل بن کر سامنے آنا اور جبرئیل کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایمان، احسان، اسلام، اور قیامت کی علامات کے متعلق سائل بن کر آنا۔

ان میں سے جنت اور دوزخ کا ظاہر ہونا ہے مگر جنت اور دوزخ کا منبع عرش کے نیچے ہے جہاں عرشی قوتیں فلکی قوتوں کے ساتھ ملتی ہیں۔ اب رہا ان کا مظہر تو کبھی یہ زمین کا ایک ٹکڑا ہوتا ہے جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے صلوٰۃ کسوف پڑھتے ہوئے آپ ﷺ کے اور قبلہ کی دیوار کے درمیان ظاہر ہوا۔ کسی کو یہ کہنا جائز نہیں کہ یہ چیزیں صرف اپنی صورت میں ظاہر ہوئی تھیں، اس لیے کہ صورت میں حرارت اور روح نہیں پائی جاتی۔

اس میں ایک بات یہ بھی ہے کہ فرشتوں کی ایک قسم ایسی ہے جن کے سینوں میں ان کی استعداد کے مطابق الہام اور عالم مثال کی نقل اور تشبیہات کا فیضان ہوتا ہے۔ چنانچہ انہیں ان کا الہام ہوتا ہے۔ نیز ان کے سینوں میں دعائیں ڈال دی جاتی ہیں۔ تو یہ جود الٰہی کے تیار کرنے والے دروازوں میں سے ایک دروازہ بن جاتا ہے۔ بعض اوقات انہیں اس بات کی بھی قدرت حاصل ہو جاتی ہے کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق شکل اختیار کر لیں۔ یہ اس طرح ہوتا ہے کہ خوف کا تخیل مختلف درجوں پر قوت مثالیہ سے تائید حاصل کرتا ہے۔ اسی میں سے ہے کہ دیکھنے والے کی نگاہ مطلوبہ صورت پر پڑے۔ اسی میں سے ہے کہ پانی جسد مثالی کے ذریعہ ایسا جسم مطلق بن جاتا ہے جس کی روح مثالی طور پر یہ شخص اور اس کا جسم ہوتا ہے۔

---

[1] خرق: خرق الشیء خرقا پھاڑنا، ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا، سوراخ کرنا

[2] التیام: ملنا۔ گڈمڈ ہو جانا، گتھم گتھا ہونا۔ الخرق والالتیام۔ فلاسفہ کے قول کے مطابق بھی آسمان و زمین میں محال ہے۔ ورنہ آسمان و زمین میں فساد وافتراق لازم آئے گا۔ (قاسمی)

لمعہ نمبر ۴۱

اسی طرح ملائکہ کا اسم ان نفوس پر بولا جاتا ہے جن کا پیدا ہونا طبیعت کلی کے نظم کو ضروری قرار دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح یہ اسم، افلاک، عناصر اور کواکب سے انواع اور اجسام کلیہ کے صادر ہونے کا مطالبہ کرتا ہے، اس طرح اس کا یہ بھی مطالبہ ہوتا ہے کہ ایسے اشخاص صادر ہوں جن کے بغیر اپنے اصل وجود یا کمال مطلوب میں کوئی بڑی نوع منتظم نہیں ہوسکتی۔ اس کی مثال یہ ہے کہ اللہ کو ازل میں ہی اس بات کا علم تھا کہ جب لوگوں کو فلاں فلاں مزاج پر پیدا کیا جائے گا اور ان کی تدبیر کو افلاک کی فلاں فلاں شکل دی جائے گی تو اس سے یہ ضروری ہو جائے گا کہ ان میں عام فساد برپا ہو اور ان کا اکثر امور میں مناسب طریقہ کے خلاف طرز اختیار کرنا اللہ تعالیٰ کی حکمت میں اس بات کو واجب قرار دیتا ہے کہ ان میں ایک ذکی انسان بھیجا جائے جو اللہ تعالیٰ کے حکم اور شان کو بلند کرے اور اس کے طریقوں کو مدت دراز تک رکھے۔ نیز یہ کہ فلاں شخص میں یہ (ذکی) انسان بننے کی سب سے زیادہ صلاحیت پائی جاتی ہے۔ لہٰذا فلاں ایک ایسا وجود بن گیا کہ جب پہلی بار اس کی مثال بنی تو نوع کی سی مثال بنی۔ لہٰذا یہ فرد انواع کے حکم میں ہوا۔ اسی طرح لوگوں کو بھی یہ معلوم ہے کہ جب انہیں قیامت کے دن اکٹھا کیا جائے گا تو ان میں سے اکثر لوگ بداعمالیوں میں ملوث ہوں گے۔ لہٰذا ان کے سدباب کا اختیار اس 'وجود اعظم' کو دیا گیا جو ان کی میل کچیل دھوڈالے ان سے گندگی دور کردے۔ لہٰذا ان کی جہالت کی نگہداشت اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کا ظہور ایسے ذکی نفس کے بغیر ممکن نہ تھا جو اللہ تعالیٰ کی مخلوق کی شفاعت کرنے میں اللہ تعالیٰ کی طرف ہمہ تن توجہ کے رنگ میں رنگا ہوا ہو اور اس نے نور الٰہی کی خدمت کرنے کی اس قدر مشق کی ہو کہ وہ مخلوق کا ایک عضو اور ان کا ترجمان بن جائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کو ازل ہی میں اس کا علم تھا اور اس کی صورت مثال بن کر جب سامنے آئی تو وہ انواع کی صورت تھی۔ اسی طرح معاملات بھی نوری جسموں میں پھونکے ہوئے نفوس کے ظہور کے بغیر منتظم نہیں ہوتے۔ ان کا بھی اللہ کو ازل میں علم تھا اور ان کی صورتیں بھی جب مثال بن کر سامنے آئیں تو انواع کی طرح بن کر آئیں۔ انہیں میں سے جبرئیل، میکائیل، اسرافیل، عزرائیل، اور وہ حاملین عرش ہیں جو لوگوں

کے لیئے دعا کرتے ہیں۔ ملاءاعلیٰ کے سردار بھی ان ہی میں سے ہیں۔

لمعہ نمبر ۴۲

اسی طرح ملائکہ کا اسم 'شخص اکبر' کی ان قوتوں اور استعدادات کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جن کا مرجع جہاں کا ایسے طریقہ پر صادر ہونا ہے کہ جس کا اقتضا وجود ذاتی کرتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ یہ قوتیں عالم مثال میں تعینات اور تمثیلات کا لباس پہن لیتی ہیں۔ لہٰذا یہ لباس پہننے کے بعد انہیں ملائکہ کا نام دیا جاتا ہے۔ چنانچہ حدیث میں مروی ہے کہ ہر قطرہ جو اترتا ہے اس کے ساتھ ایک فرشتہ اترتا ہے، پھر وہ کبھی بھی اوپر نہیں چڑھتا۔ نیز یہ بھی روایت کی جاتی ہے کہ فلاں خواب میں فلاں چیز کی مثال دی گئی ہے۔

لمعہ نمبر ۴۳

اس صنف کی عظیم ترین صنفوں میں سے انواع کی مثالیں (مثل الانواع) ہیں کیوں کہ اس سلسلہ میں ان کا بہت بڑا اثر ہے۔ اس لیے کہ جب نفس کلی نوعیت کے نظامات کو سمجھ لیتا ہے اور پھر ان میں غور کرنے اور ان کیفیتوں کے ذریعہ سے جو اسے حاصل ہوتی ہے اپنی عقل میں ان کی تشریح کرتا ہے اور اس پر نفوس افلاک وغیرہ کا تعلق وارد ہوتا ہے۔ تو یہ مثالی صورتوں میں مثل انواع اپنے رب کے سامنے کھڑی ہوں گی اور اس کے فیض سے ناسوت میں جہاں تک ہو سکے ان کے وافر و کامل ظہور اور ان کے احکام کے ظہور کا مطالبہ کریں گی۔ پھر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ان کے ظاہر ہونے پر سماوی اور ارضی اسباب کا اجتماع ہو جاتا ہے اور جو کچھ یہ مثالیں مدت سے مانگ رہی ہوتی ہیں انہیں دے دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد کوئی رکاوٹ درمیان میں حائل ہو جاتی ہے تو وہ چیز ممنوع و مبغوض ہو جاتی ہے، اس لیے کہ مثالیں شدت کے ساتھ اس کا مطالبہ کرتی ہیں اور اپنی مراد حاصل کرنے کے لیے جھگڑتی ہیں اور اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ اسباب کسی ایسے طوفان کے لیے اکٹھے ہو جاتے ہیں جس میں نوع کے افراد ہلاک ہوں تو اس وقت یہ مثالیں زبان قال سے نہیں بلکہ زبان حال سے یہ مطالبہ کرتی ہیں کہ زمین میں ان کا بت باقی رہ جائے۔ یہی وجہ تھی کہ نوح علیہ

السلام نے حکم دیا تھا کہ ہرنوع میں سے دو دو جوڑے لاد لیئے جائیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے کتوں کو قتل کرنے کا حکم دیا، پھر اسے ناپسند کیا اور فرمایا کہ یہ بھی ایک امت ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ مثالیں اپنے رب کے سامنے کھڑی زمین میں بت کی صورت کے وجود کی درخواست کر رہی تھیں۔ اسی طرح ملک کا نام ان نفوس انسانیہ کے لئے بولا جاتا ہے جو ملائکہ کی اجناس میں سے پہلی دو جنسوں کے ساتھ لاحق ہوگئی ہیں۔ پھر عرش کے گرد چکر لگاتی ہیں اور وہاں کی کیفیت میں مکمل طور پر جذب ہو چکی ہیں۔ اور اس سے انہیں کوئی چیز نہیں روک سکتی۔ لہٰذا وہ اللہ تعالیٰ کی سخاوت کے لیے تیار ہو جاتی ہیں اور اہل زمین کی بہت سی دعاؤں کو سنتے ہیں اور بہت سے الہامات کی زبانیں بن جاتے ہیں۔ گردش کے آخری نصف میں نفوس کی کثرت کے وقت اس قسم کی چیزیں کثرت سے واقع ہیں جس کی وجہ سے اکثر ان میں جھگڑا پیدا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں 'مجھے ملاء اعلیٰ کے متعلق کچھ خبر نہیں جب وہ جھگڑ رہے تھے۔' ان کی مخاصمت، جھگڑے اور باتوں کے ذریعہ سے نہیں اور نہ ہی ایک دوسرے کو للکارنے اور دھکیلنے سے ہے لیکن ہر جزئی نظام کے مطابق حق کی دو عنایتیں ہیں اور ہر ایک کے لیے ملاء اعلیٰ سے خارجی عنایت ہوتی ہے جو اسے سپرد کی گئی ہوتی ہے۔ ان پر اکسایا گیا ہوتا ہے اور ان کے لیے دعا کرنے کا حکم دیا گیا ہوتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ دونوں ارادے بدوں اس کے کہ وہ مخالفت کا ارادہ کریں ایک دوسرے کے مخالف ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اس مصلحت کلی کے مطابق جس کی مثال اس کے پاس ہوتی ہے ان کے درمیان قطعی فیصلہ کر دیتے ہیں۔

لمعہ نمبر ۴۴

اسی طرح ملک کا نام ان نفوس کے لئے بھی بولا جاتا ہے جو ایسے لطیف اجسام میں پھونکے جاتے ہیں جن پر ستاروں کے محمود اتصال کے وقت ہوا غالب آ جاتی ہے، بالخصوص مشتری، زہرہ اور چاند کے اچھے اختلاط کے وقت۔ ان کے کئی طبقات ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض زحل، مشتری، مریخ وغیرہ کواکب کی فوج بن جاتے ہیں اور بعض اپنے حالات کے اختلاف کے مطابق ملائے اعلیٰ کے سامنے ہوتے ہیں۔ مثلاً جبرئیلؑ کی فوج اور میکائیلؑ کی فوج اور بعض اپنی سرشت

کے مطابق اسمائے الٰہیہ اور آیات قرآنیہ وغیرہ کے خادم ہوتے ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض لوگ ایسی چیزوں کے استعمال سے جو کواکب کی قوتوں کو متحرک کردیں، کواکب کی فوجوں کو مسخر کرلیتے ہیں۔ اور ملاء اعلیٰ کی فوجوں کو ان اذکار کے ساتھ مسخر کرلیتے ہیں جو نفس انسانی کو ان کے ساتھ مشابہ بنادیتے ہیں اور وہ خدام کی فوجوں کو ان کلمات کو بہت زیادہ تعداد میں پڑھ کر مسخر کرلیتے ہیں۔

لمعہ نمبر ۴۵

میں نے ان ملائکہ کے حال کی بہت بڑی بات دیکھی۔ ایک نہایت سعادت مند شکل آئی جو مزاج لطیف میں اس حد تک سرایت کرنے کا تقاضہ کرتی تھی کہ معاملہ روح پھونکنے تک پہنچ جائے اور اس روز زمین اور آسمان کے درمیان جس قدر لطیف عناصر تھے ایک دوسرے سے لطیف طور پر مل گئے اور ان میں ایسا تعفن پیدا ہوگیا جیسا کہ حشرات الارض[1] مثلاً مینڈک، مچھر، وغیرہ میں روح پھونکنے کے وقت عناصر کی کیفیت کے اختلاط میں پایا جاتا ہے لیکن یہ تعفن ارکان لطیف کے مناسب ہوا۔ ان کے مناسب روح پھونک دی جاتی ہے اور اشکال فلکیہ اور ارکان عنصریہ کی وجہ سے ان کے حالات میں اختلاط ہوتا ہے۔ چنانچہ ان میں تغذیہ اور تنمیہ کی قوت نہیں ہوتی لیکن ارواح کے دو رخ ہوتے ہیں۔ ایک صرف بدن کی حفاظت کی طرف اور دوسرا مبادیٔ عالیہ کی طرف۔ ان میں سے بعض جسم لطیف کی شکل ہوتے ہیں۔ مثلاً گول یا شش پہلو وغیرہ، جیسے کہ زمین پر واقع گھر جن کی شکلیں اور پیمائش مختلف ہوتی ہے۔ لہٰذا جب اوپر سے کوئی ایسا روحانی حکم نازل ہوتا ہے جو ان نفوس کے مناسب ہو خواہ کواکب کی طرف سے خواہ ملاء اعلیٰ سے یا شخوص مثالیہ اور ان ارواح کی طرف سے تحریک ہو جو مثال میں متمثل ہوکر واقع ہوئی ہیں جس طرح طبیعت کی وجہ سے حشرات کے اسباب حرکت میں آتے ہیں اسی طرح ان کے باطن میں بھی اسباب متحرک ہوجاتے ہیں۔ جس طرح کہ جب حشرات نور دیکھتے ہیں تو اس داعیہ کی وجہ سے جو ان کے اندر

---

[1] حشرات الارض۔ زمین کے کیڑے مکوڑے

اصل طبیعت سے پیدا ہوا ہوتا ہے۔ اس کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں، اسی طرح جب وہ گرمی محسوس کرتے ہیں تو گرم زمین سے بھاگ کر سرد زمین کو چلے جاتے ہیں۔ اسی طرح وہ کبھی نمی سے خشکی کی طرف اور کبھی خشکی سے نمی کی طرف بھاگتے ہیں اسی طرح ان کے باطن سے بھی داعیہ اٹھتا ہے جیسے کہ ایک طبعی مذہب ہو جس کی وجہ سے یہ ملائکہ کی عظیم فوجیں جہاں اللہ کا ارادہ ہوا کھنچی ہو جاتی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک میں یا کسی چیز کی محبت ہوتی ہے یا دشمنی۔ چنانچہ جو انسان اور بہائم وہاں ہوتے ہیں ان کے نفوس میں اس داعیہ کی ہیئت کا نقشہ آ جاتا ہے اور پھر وہ اس داعیہ کے مطابق کام کرتے ہیں۔

لمعہ نمبر ۴۶

اسی طرح ملک کا لفظ ان الفاظ اور اعمال کی صورت مثالیہ پر بولا جاتا ہے جو انسانوں سے صادر ہوتے ہیں۔ اس کی تحقیق یوں ہے کہ نفوس کے درمیان نفوس انسانیہ کی عظیم اور عجیب حالت ہے، اس لیے کہ انہیں حظیرۃ القدس سے قریب الماٰخذ پیدا کیا گیا ہے۔ اس حظیرۃ القدس کے گرد جو حاملین عرش اور معاملات کی تدبیر کرنے والے فرشتے (مدبرات امر) ہیں وہ (نفوس) طبعی طور پر اس کی طرف کھنچ آتے ہیں اور جو چیزیں انسانی نفوس میں دیر تک جگہ پکڑے رہتی ہیں وہ حظیرۃ القدس کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔ لہٰذا بہت سے اعمال اور کلمات ایسے ہیں جن کی انسان مدت مدید سے مشق کرتے چلے آتے ہیں۔ وہ حظیرۃ القدس اور ملائکہ عظام کے مدارک میں ایک شکل اختیار کر لیتے ہیں اور افلاک اس صورت کو ان سے قبول کر لیتے ہیں جس کی وجہ سے افلاک کے مدارک بمنزلہ اس ہیولیٰ کے ہوتے ہیں جو ملائکہ کے قویٰ کے لیے ہے اور علوم الافلاک منطبق ہو کر ایسی صورتیں بن جاتے ہیں جو حق تعالیٰ کے سامنے کھڑی ہوں۔ یہ علوم نہ تو کسی خاص فلک کی طرف منسوب ہوتے ہیں اور نہ کسی خاص فرشتے کی طرف۔ اس وقت ان کا نام ملائکہ رکھا جاتا ہے، اس لیے کہ ان کے جسم مثالی اور قائم صورتیں ہیں۔ ان کی ارواح بھی ہوتی ہیں جو وہی معانی ہیں جو ان الفاظ سے سمجھ میں آتے ہیں اور جو ملائکہ عظام اور نفوس کے پاس حاضر اور دیکھے جاتے ہیں۔

یقیناً یہ اشخاص جواہر مثالیہ میں ملائکہ کے ہم شکل ہوتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ پڑھنے والا ان اسما کو پڑھتا ہے اور عامل ان اعمال کو کرتا ہے تو اس کے نفس کے جذر کی وجہ سے ایک وسیع سڑک نکل کر اپنی حقیقت مثالیہ کی طرف آجاتی ہے اور وہاں ایسی برکات حاصل کرتی ہے جو اس کے مناسب ہوں اور یہ بھی اسی قسم کی ہوسکتی ہیں۔ نفوس بشریہ میں اس کا بہت بڑا اثر ہوتا ہے کیوں کہ ان کے ہاں شرائع طے پاچکے ہیں۔

لمعہ نمبر ۷۴

اسی طرح ملک کا نام انسانوں کی قوم کے لئے بولا جاتا ہے جن کی شان یہ ہوتی ہے کہ انہیں ایسا الہام ہوتا ہے کہ ان کے نفس اس الہام کو قبول کرتے ہیں اور اس کے مطابق چلنے میں متحیر ہوتے ہیں۔ لہٰذا جس طرح ہیئت طبیعت کے داعیہ کے ساتھ کرتی، مثلاً بھوک، پیاس اور شہوت وغیرہ اور یہ ہیئت اس داعیہ میں فنا ہوجاتی ہے۔ اور وہ چیزیں باقی رہ جاتی ہیں جن کے ذریعہ سے یہ اپنے نفس مدارک اور مشاعر پر غالب آجاتی ہے تاآنکہ اس کا ظاہر و باطن پُر ہوجاتا ہے۔ لہٰذا اگر اس وقت کوئی ایسا لطیف ادراک والا ہو جس کا نفس اس کے ساتھ چمٹ گیا ہو تو وہ اس کا ظاہر د باطن اس داعیہ کے رنگ میں رنگا ہوا دیکھے گا۔ اسی طرح اس 'شخص' کے نفس میں خاطر الٰہی یا خاطر ملکی بھڑک اٹھتا ہے۔ پھر یہ خاطر اس کے نفس کی بلندیوں تک چڑھ جاتا ہے اور اس میں فنا ہوجاتا ہے اور باقی رہتا ہے اور اس پر اور اس کے مدارک پر غالب آجاتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ مبہوت، مدہوش اور مخبوط ہے۔ تاآنکہ اللہ تعالیٰ ان کاموں کا فیصلہ کرتا ہے جنہیں وہ کرنے والا ہے۔ لہٰذا وہ جب تک اس ہیئت پر رہتا ہے اسے ملک کہا جاتا ہے۔ بسا اوقات وہ ایک چوپایہ ہوتا ہے جو الہام کو قبول کرتا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ ملک نے چوپائے کی شکل اختیار کرلی[1]

---

[1] حضرت شاہ صاحب کی تحقیق کے مطابق چوپایوں کو بھی الہام اور القاء کیا جاتا ہے جیسا کہ قرآن کریم میں آیا ہے۔

لمعہ نمبر ۴۸

تدبیر کی یہ صورت ہوتی ہے کہ جملہ اسباب، مقتضیات اور عنایت کو ہر سبب کے مطابق نگاہ میں رکھا جائے اور یہ اس طرح ہوگا کہ جہاں تک ممکن ہو، ان امور کو اس پر وافر کر دیا جائے جن کا تقاضہ ایسا 'خیر نسبی' کر رہا ہو جو اس روز حسب امکان خیر مطلق کے قریب ہو۔ لہٰذا اگر وہاں ایسے اسباب ہوں جو شر کے مقتضی ہیں حالانکہ یہ سب خیر کے بغیر ظاہر نہیں ہوتے اور عناصر کو چھوڑ کر ملاء اعلیٰ اور ان عقلوں کے تخیلات کا منشا بھی یہی ہوں تو اس وقت ضروری ہوگا کہ یہ مناسب نظام کے فیضان میں اس طرح شامل ہو جائے کہ افلاک کی روحانیت اور عناصر کے طبائع کے حکم میں کسی قسم کا خلل نہ پڑتا ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ 'مولود علم' اپنے سے اعلیٰ علم سے کمزور تر اور ادنیٰ تر ہوتا ہے، نیز اس لئے کہ تدبیر ایک ایسی صفت ہے جو خلق پر ثابت قرار دی جا چکی ہے۔ لہٰذا مناسب یہی ہے کہ کسی حکم کو نہ توڑا جائے۔ پھر اگر اس کے ساتھ روحانیت کا کمزور سا اتصال ہو جائے اور 'مولود' کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کیا جائے تو اسے زمین کی خبروں میں جاری کیا جائے گا اور ان کا اثر کچھ مدت کے بعد ہی مکمل ہوگا۔ تب جا کر یہ روحانیت کی قوت بنیں گی اور وجود ناسوتی اس قوت سے مرکب ہوگا تب جا کر کہیں تکمیل ہوگی اور اگر زمین کا اتصال ایسا ہو جو کسی محبوب چیز کی ہلاکت کا موجب ہے اور فلکی قوتوں کے مطابق اس کے الگ الگ ہونے کا وقت بھی نہ آیا ہو تو اسے کسی اور سبب میں پائیں گے۔ اس طرح بیان کا تصادم ہوگا اور اس کے حکم سے ناراضگی کا اظہار ہوگا اور محبوب اپنی حالت میں رہے گا، جس طرح نار ابراہیم کہ اس پر مبارک زمہریر ہوا چلی اور اس ہوا کو آگ پر مسلط کر دیا گیا تو اس نے آگ کو ٹھنڈی اور سلامتی بنا دیا۔

اور آگ اسباب کا تقاضہ کریں تو یہ وجوں پر منطبق ہوگا، مثلاً 'وجہ منبسط' اور 'وجہ منقبض'۔ اس پر 'نظام خیر' حکم لگائے گا۔ جس طرح آگ کبھی جلا کر اثر کرتی ہے تو اس چیز کو راکھ کر دیتی ہے اور کبھی اسے سیاہ اور خاکستر بنا دیتی ہے یا اس کا اثر اس طرح ہوتا ہے کہ چیز درد محسوس کرے مگر الگ الگ نہ ہو۔

پھر اس میں برکت نہیں ہوتی تو یہ بجھ جاتی ہے بلکہ یہ بھی حکم ہوتا ہے کہ ہر سبب کے

مطابق 'عنایت' کا خیال رکھا جائے۔ لہٰذا جب کواکب کے اتصالات اس کی موت کے طالب ہوں اور اس آفت کا فیصلہ بھی کر دیا گیا ہو تو صحیح بات یہ ہے کہ اس کے بدن کے مزاج کے مطابق اس کے بدن میں موت کی علت کا ہونا ضروری ہے خواہ یہ بیماری معمولی ہی کیوں نہ ہو مثلاً گر پڑنا یا درد، حتیٰ کہ اگر طبعی حکیم نے ایک ہزار سال بھی وقائع کا تجربہ کیا ہو، وہ بھی نظام بدنی کی مخالفت کو نہ سمجھ سکے گا، سوائے قبض اور بسط کے ذریعہ کے اور جب مزاج بدنی کے لحاظ سے مرنے والے کے متعلق کواکب اتصالات اس کے زندہ رہنے کے داعی ہوں اور اس کے شفایاب ہونے کا فیصلہ بھی ہو چکا ہو تو اس وقت کسی بدنی علت کا ہونا ضروری ہے جو اس کی طبیعت کی قوت کو قائم رکھے یا تریاق مل جائے یا کوئی اور چیز۔ اسی طرح ریاضی دان اگر ہزار سال بھی تجربہ کرتا ہے نظام سماوی کی مخالفت کو نہ دیکھ سکے گا۔ البتہ اسی صورت میں دیکھ سکے گا جب قبض یا بسط ہو۔ بہت سے انسان بہیمی لذات میں منہمک ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کو ہدایت کرنا چاہتا ہے۔ لہٰذا اگر اس وقت کوئی مانع نہ ہو مثلاً قساوۃ النفس اور شیطان کی اطاعت تو اس کے دل میں صریح الہام کر دیا جاتا ہے یا کسی ایسی بات کے ضمن میں جو اس بات کی یاد دہانی کرتی ہو کہ اس کی فطرت میں کیا ہے تو یہ ضرور اسے راہ راست کی طرف دعوت دے گا اور اگر وہاں دو صورتیں ہوں، ایک فرمانبرداری کی اور دوسری نافرمانی کی تو صرف فرمانبرداری کے راستے سے ہی الہام کے دوشالے منور ہوں گے اور اور وہ اپنے معاملہ میں متردد رہے تا آنکہ مدد ظاہر ہو گی۔

کئی ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں کہ وہ ہلاکت میں گرفتار ہو جاتے ہیں اور اس میں گھر جاتے ہیں۔ پھر خواہ وہ اللہ کے سامنے عاجزی کریں یا نہ کریں لیکن چونکہ اسباب سماوی کا ارادہ ان کو مارنے کا نہیں ہوتا تو اللہ تعالیٰ ان کے دل میں اس ہلاکت سے نجات پانے کا حیلہ ڈال دیتے ہیں یا کوئی ایسی بات ان کے دل میں ڈال دی جاتی ہے جو نجات کے اسباب تیار کرنے والی ہو اور پھر یہاں تک کہ یہ سب مل کر ان کی نجات کے مقتضی ہوں یا کسی طبعی امر کو ان کے کمزور کرنے پر لگا دیا گیا ہو۔ چنانچہ وہ اسے جلا دیں اور نجات حاصل ہو جائے۔ یہ امر نظام کو تباہ کرنے والا تھا لہٰذا اسے ہی تباہ کر دیا گیا۔

بہت سے لوگ اچانک گھر گئے تو انہیں خواب یا الہام یا نبی یا محدث کے ڈرانے سے اس

سے تحفظ کرنے کی ہدایت کی گئی۔ اسی قسم کا وہ قصہ ہے جس میں ایک مومن نے احساس سعی کے کشف سے بادل کی طرف دیکھا کہ (کہہ رہا ہے کہ) فلاں شخص کے باغ کو پانی دو جیسا کہ حدیث میں آیا ہے۔

بہت سے ایسے لوگ بھی ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے نیک بخت فلکی قوتوں کا اثر دیکھا تو اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے دلوں میں جن کے ساتھ اس کا معاملہ ہوتا ہے مثلاً ساتھی، بیویاں، غلام، ایسی بات ڈال دیتا ہے جس میں اس کی بہتری اور خوش بختی ہوتی ہے یا اس کی رائے میں برکت ڈال دی جاتی ہے، تو یہ اچھی زندگی کی طرف راہ پالیتا ہے یا یہ کہ یہ خیر کے قریب ہو جاتا ہے۔ مثلاً یہ کہ کسی دوست کی طرف گیا تو اسے اچانک ایسا شخص مل گیا جس نے اس کے ساتھ نیک سلوک کیا یا وہ چل کر پھسلنے والی جگہ تک گیا اور اتفاق سے اس کی ٹانگیں کمزور ہو گئیں (اور وہ گرا اور) ایک خزانے کا اسے پتہ چل گیا۔ چنانچہ اس وقت لوگ کہیں گے کہ وہ نیک بخت انسان ہے۔

اور بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ اللہ نے ان میں وبالی فلکی قوت کا اثر دیکھا تو لوگوں کے دلوں میں اس کا بغض ڈال دیا۔ لہٰذا اس کا مقصود بر نہ آیا اور وہ سوچ بچار کرتا رہتا ہے مگر وہ موافق نہیں آتا اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ اپنے کسی دوست کے پاس جاتا ہے تو اسے اچانک اس کا دشمن مل جاتا ہے جس سے اسے دکھ پہنچتا ہے۔ یا اس کے دل میں اس کے ساتھیوں کا بغض ڈال دیا جاتا ہے جو اسے مارتا ہے اور گالیاں دیتا ہے۔ لہٰذا یہ مار اور گالیوں کے وبال کو بہت ہی سخت خیال کرتا ہے یا وہ کسی کیچڑ والی زمین پر چلے گا (اور گر کر) اس کی ٹانگ ٹوٹ جائے تو اس وقت کہا جائے گا کہ وہ بد بخت ہے۔

جس بات کا جاننا ضروری ہے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی چیز کا ارادہ کرتے ہیں اور حکمت الٰہیہ اسے بہت جلد ہونے کا مطالبہ کرے اور اسباب ارضی اس کی موافقت نہ کرتے ہوں تو یہ اسباب کسی قسم کے ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ہر واقعہ میں غیر متناہی علوم کا علم ہے کہ اگر وہ اس کو قبض کرے اور اس کو بسط دے تو یوں ہو جائے گا اور اگر فلاں کو قبض کرے اور دوسرے کو بسط تو یوں ہو جائے گا اور یہ سلسلہ لانہایت تک چلا جائے گا۔

لمعہ نمبر ۴۹

اللہ تعالیٰ حی و قیوم (بذات خود قائم) ہے اور اسے تمام کلیات اور جزئیات کا علم ہے بدوں اس کے کسی اور شئے کا علم اسے مزاحم ہو، سمیع ہے، بصیر ہے، اور تمام ممکنات پر قادر ہے۔ جس چیز کا فیصلہ کرتا ہے اس کا ارادہ کرتا ہے اور جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ اپنے بندوں کے دلوں میں وحی کر کے کلام کرتا ہے، یا پردہ کے پیچھے سے انہیں پکارتا ہے یا فرشتہ بھیجتا ہے جو مثال بن کر سامنے آتا ہے۔ پھر وہ اللہ کے حکم سے جو چاہتا ہے وہی کرتا ہے۔ ہر نفس جو کچھ بھی کمائے اس کا نگہبان ہے۔ لوگوں کے اعمال کا شمار کرتا ہے۔ پھر ان اعمال کو ان پر لوٹائے گا اور مطیع کو ثواب دے گا اور عاصی کو سزا۔ وہ راضی ہوتا ہے اور ناراض بھی ہوتا ہے، بلند بھی کرتا ہے اور پست بھی۔ مجبوروں کی دعا سنتا ہے اور مصیبت زدوں کی مصیبت دور کرتا ہے۔ ہدایت دینے والا ہے، حکمت والا ہے، عادل ہے، وہی کرتا ہے جو حق ہو اور جس میں کسی چیز کے لیے عمومی مصلحت ہو۔ (ان سب امور کو) وہ تفصیلاً جانتا ہے اگر چہ ہمارا علم اس سے قاصر ہے۔

ان کلمات کی تفسیر میں غور کرنے سے پہلے یہ جان لینا چاہیے کہ ان صفات کے تحقق کا یہ مطلب نہیں لیا جا سکتا ہے کہ یہ ان صفات کے ان مبادی کا وجود ہے جو 'انفعالات' اور تجددات' ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سے بالا و بلند ہے، بلکہ ان صفات سے مراد ان کی غایات کا موجود ہونا ہے اور غایات تمام کی تمام تدبیر، نظام خیر کی رعایت اور ہر حال اور وقت کے مطابق سخاوت کے اندر شامل ہیں۔ ان امور میں تجددات پائے جاتے ہیں اور یہ سب ایسی قدیم صفت کی طرف لوٹتے ہیں جو فی نفسہا نہ تو جدید بنتی ہے اور نہ اس میں تغیر ہوتا ہے اور یہ جود اور حق کی محافظ ہے۔ اس کا تجدد صرف یہ ہے کہ یہ ہر اس علم کے حال کے مطابق جو اس کے فیض کو قبول کرنے والا ہو بہت ہی صورتوں اور عجیب تدلیات میں ظاہر ہو۔ اس نکتہ کو یوں بیان کیا جاتا ہے کہ صفات تو قدیم ہیں مگر ان کے تعلقات حادث ہیں اور یہ صفات اس اعتبار سے کہ اللہ طبیعت کلی کا قائم رکھنے والا ہے اس کے لئے ثابت ہیں تا آنکہ یہ طبیعت کلیہ تمام ناسوت اور اس کے اعضا اور قویٰ میں سرایت کر جائے، اپنی ذات کے اعتبار سے نہیں چونکہ تمہارے سامنے تین چیزیں ہیں۔ زندہ، مردہ اور جماد،

اور حی (زندہ) عالم بالا سے قریب ترین ہے اور اس کے عالم اور مخلوق میں اثر انداز ہونے نے ضروری قرار دیا کہ اسے حی (زندہ) کہا جائے اور چونکہ ہمارے نزدیک اشیاء کے منکشف ہونے کا نام علم ہے اور حی پر تمام اشیا مع ان چیزوں کے جو اس کی ذات میں شامل ہیں، نیز ان چیزوں کے موجود ہیں، تفصیلاً منکشف ہو گئیں۔ لہٰذا ضروری ہو گیا کہ اسے علیم کہا جائے۔

چونکہ علیم رؤیت (آنکھوں سے دیکھنا) اور سمع (کانوں سے سننا) دیدنی وشنیدنی چیزوں کے لئے مکمل انکشاف ہے اسی طرح وہاں بھی ہے مگر زیادہ مکمل طور پر۔ لہٰذا اسے سمیع وبصیر کہنا بھی ضروری ہو گیا اور جب ہم یوں کہتے ہیں: 'فلاں نے ارادہ کیا' اور ہماری مراد کسی فعل کے کرنے اور اس کے ترک کرنے پر اس کا حسن عزم ہے اور رحمان اکثر افعال اس فعل کی شرط کے پیدا ہونے یا جہاں میں استعداد کے پیدا ہونے کے وقت کرتا ہے۔ لہٰذا اس وقت وہ ان امور کو واجب قرار دیتا ہے جو واجب نہ تھے۔ اور بعض بلند چیزوں میں باوجود اس کے وہ اس کے اذن اور حکم سے نہ تھا، اجماع ہو جاتا ہے۔ اس لیے ضروری ہو گیا کہ اسے 'مرید' کہا جائے۔ نیز یہ کہ 'ارادۂ واحدۂ ازلیہ' جسے اقتضائے ذات سے تعبیر کیا جاتا ہے جب اس کا تعلق تمام کے تمام جہاں کے ساتھ بہ یک بار ہوا۔ پھر ہر روز حوادث آتے رہے تو اس ارادہ کا ہر حادثہ کی طرح علیحدہ نسبت دینا بھی درست ہوا اور کہا جاتا ہے کہ اس نے ایسا ایسا ارادہ کیا۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ فلاں نے قدرت رکھی، اس سے ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ اسے فلاں کام کرنے کی قدرت حاصل ہوئی اور اسے اس کام سے کوئی خارجی سبب نہیں روک سکتا۔ صرف اتنا ہوتا ہے کہ بعض مقدور چیزوں کو قادر کے لیے ترجیح دی جاتی ہے تو اس وقت قدر کا نام نہیں رہتا۔ رحمان ہر چیز پر قادر ہے اور اپنی مہربانی اور اقتضائے ذاتی سے بعض افعال کو ان کے اضداد پر ترجیح دیتا ہے۔ لہٰذا اس کا قادر کہلانا ضروری ہو گیا۔

اور جب ہم یوں کہتے ہیں کہ فلاں نے فلاں سے بات کی تو اس سے ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ ہم نے ان معانی کو جن کا ہم ارادہ کرتے ہیں ایسے الفاظ کے ساتھ جو ان معانی پر دلالت کرتے ہوں، دوسرے تک پہنچائیں اور رحمان اپنے بندے پر بعض اوقات بہت سے علوم کا فیضان کرتا ہے اور ان کے ساتھ ان الفاظ کو بھی ان کے خیال میں مرکوز کر دیتا ہے جو ان علوم پر دلالت کرتے ہیں تاکہ اسے ان الفاظ کی تعلیم دینے کی ضرورت پڑے۔ لہٰذا ضروری ہو گیا کہ اسے

متکلم کہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ کسی بندے کو یہ حق حاصل نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ کلام کرے مگر بذریعہ وحی یا پردہ کے پیچھے سے، یا رسول بھیجے جس پر اللہ جو چاہے وحی کردے۔ اللہ ہر شئے پر قادر ہے۔

لہٰذا وحی دل میں کسی بات کے پھونک دینے کا نام ہے خواہ یہ بذریعہ خواب ہو، خواہ اس طرح کہ جب انسان غیب کی طرف متوجہ ہو تو ضروری علم اس کے اندر پیدا کر دیا جائے یا پردہ کے پیچھے سے وہ ایک منظّم کلام سنے اور ایسا معلوم ہو کہ وہ کہیں باہر سے کچھ سن رہا ہے اور اس کا کہنے والا دکھائی نہیں دیتا یا قاصد بھیج کر، تو وہ فرشتہ ایک شکل بن کر سامنے آجاتا ہے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب نبی کی توجہ غیب کی طرف ہوتی ہے اور حواس خمسہ مغلوب ہو چکے ہوتے ہیں تو اسے گھنٹی کی زنجیر کی آواز سنائی دیتی ہے جس طرح غشی طاری ہوتے وقت سرخ وسیاہ رنگوں کے تخیل سے عارض ہوتا ہے۔

چونکہ حظیرۃ القدس میں ایسا نظام ہے جس کا انسانوں سے قائم رکھنا مطلوب ہے، لہٰذا اگر انسان اس کے موافق ہو گئے تو ملاء اعلیٰ سے جا ملے اور انہیں تاریکیوں سے نکال کر اللہ کے نور اور اس کے 'بسط' کی طرف لے جایا جاتا ہے اور وہ اپنی ذات میں خوش ہوتے ہیں اور ملائکہ اور بنی آدم کو الہام کیا جاتا ہے کہ ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کریں۔ اگر وہ اس کی مخالفت کرتے ہیں تو ملاء اعلیٰ ان پر لعنت کرتے ہیں اور ان کی ناراضگی کی سزا ملتی ہے اور ان کو عذاب ہوتا ہے جیسا کہ ذکر کیا گیا۔ لہٰذا ضروری ہو گیا کہ یوں کہا جائے: راضی ہو گیا اور شکر گزار ہوا یا ناراضگی ہوئی اور لعنت کیا گیا اور یہ سارا نظام عالم بہ تقاضائے مصلحت جاری ہے۔ اکثر نظام عالم میں یوں بھی ہوتا ہے کہ جس چیز کے لیے دعا کی جاتی ہے اسے پیدا کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے دعا قبول کرلی۔ پھر یوں بھی ہوتا ہے کہ رؤیت کا لفظ ہمارے استعمال میں مرئی چیز کے مکمل طور پر منکشف ہونے کے لیے ہوتا ہے اور لوگ جب منتقل ہو کر معاد کے ان بعض امور کی طرف جائیں گے تو وہ اس تجلی کے ساتھ جا ملیں گے جو عالم مثال کے وسط میں قائم ہے اور سب کے سب اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔ لہٰذا یوں کہنا واجب ہو گیا کہ تم عنقریب اپنے آپ کو اس طرح دیکھو گے جس طرح تو چودھویں رات کو دیکھتے ہو۔ واللہ اعلم بالصواب

لمعہ نمبر ۵۰

ان احکام کے ظہور کے مطابق جو گزشتہ زمانہ میں اپنے اپنے وقت پر گزر چکے ہیں اس تدلی کے کئی دور اور کئی طریقے ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان: 'ہر روز وہ ایک نئی شان میں ہوتا ہے' سے بھی یہی مراد ہے۔ ہم جس دور میں ہیں اس کی ابتدا کے اختلاف کی تشریح اور اس کے آخری دور کی تشریح ہم کریں گے تاکہ اختلاف معلوم کرنے کے لیے یہ ایک قانون بن جائے۔

یادرکھو اس دور کی ابتدا میں حوادث صرف افلاک اور عناصر کی قوتوں سے صادر ہوتے ہیں۔ لہٰذا ادریس علیہ السلام کے دل میں یہ بات پیدا ہوئی کہ وہ کواکب کی حرکات اور خواص کو جان لیں اور ان حرکات وخواص کی وجہ سے واقعات کے وقوع پذیر ہونے سے پہلے ہی ان واقعات کو جان لیں۔ زمانہ کچھ عرصہ تک اسی طرح چلتا گیا۔ پھر ملاء اعلیٰ کی تعداد بڑھ گئی اور ان کی کثرت اس لئے ہوئی کہ ایسے اتصال پیدا ہوگئے جو ایسے طبیعی ہیکلوں میں (جو عناصر مجاز سے مرکب ہیں) فیضان نفس کو واجب قرار دیتے ہیں اور نفوس انسانی پیدا ہوگئے، اور وہ ان اوصاف سے موصوف ہوگئے۔ جو نفوس فلکیہ کے عالم کے مناسب ہیں۔ پھر مرا تو ملاء اعلیٰ کے ساتھ ایسے بہت سے اسباب لاحق ہوگئے جن کا ہم نے ذکر کیا ہے،۔ لہٰذا جب ملاء اعلیٰ کی کثرت ہوگئی اور ان کے علوم اور ہمتیں ایک دوسرے سے مل گئیں تو حکمت نے یہ واجب قرار دیا کہ ان کی ہمتین 'شخص اکبر' کے احکام مشخص کردیں اور کسی نہ کسی صورت میں ان کے مقتضیات کو لازمی طور پر تیار کردیں۔ لہٰذا اسی دن احکام نجوم باطل ہوگئے۔ میری مراد یہ ہے کہ ہر چیز کے اندر ان کا صریح حکم باطل ہوگیا۔ لہذا بڑے بڑے معاملات اور ان کلی ارتفاقات کے علاوہ جن کی شکلیں منجم کے پاس نہیں ہوتیں، علم کا قبل از وقت حاصل کرلینا (خواہ وہ وہمی طور پر ہی کیوں نہ ہو) ممکن نہیں۔

وہ امور جن کا ان قوتوں میں (بحیثیت وقوع وعدم وقوع) اختلاف ہوتا ہے اور اس بات کا احتمال ہوتا ہے کہ یہ واقع نہ ہوں اور واقع ہونے کا احتمال قوی ہوتا ہے تو اس قسم کے امور میں منجم کوئی فیصلہ نہیں دے سکتا اور جب انسان ملاء اعلیٰ کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو نازل ہونے والی فضا کو پہچان لیتا ہے۔ لہٰذا (اسے) نجوم کے قواعد اور حرکات کو جاننے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہی وجہ تھی کہ

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل میں علوم پھوٹے اور انہوں نے ملاء اعلیٰ کی طرف متوجہ ہو کر سیاروں سے اعراض کر لیا اور ملاء اعلیٰ کی ہمت قوی ہو گئی اور اعمال پر مجاز کا فیصلہ ہو چکا اور حوادث اور وقائع میں فلکی قوتوں کا رکن کمزور ہو گیا۔ شریعت کا حکم مطلق العنان ہو گیا اور قبض ملکی انسان کے بہت ہی قریب آ گیا۔ اور تدلی اعظم ملت کے لباس میں ظاہر ہوئی اور توجہ الی اللہ کو نماز، طہارت، ملائکہ، کتابوں اور رسولوں پر ایمان کا لباس پہنا دیا گیا اور یہ انوار الٰہی میں لپٹ گئے۔ پھر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود (دنیا میں) آیا اور یہ لباس مثالی بن کر اترا، تو اس معاملہ کی تکمیل ہو گئی۔ اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکارم اخلاق کی تکمیل کرنے والے تھے۔

لمعہ نمبر ۵۱

اس تدلی کے انوار اور عکس ہوتے ہیں جنہیں یہ سورج اور دیگر روشن سیاروں کے اس عکس کی سی شکل میں پیش کرتا ہے جو مختلف مقدار کے آئینوں میں دکھائی دیتے ہیں۔ ان عکسوں اور انوار کو تجلی اور تدلی بھی کہا جاتا ہے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ان تجلیات کے ثابت ہونے کی وجہ سے یا ان کے خارج میں تحقق کی وجہ سے سچے احکام کا سہارا حق پر ہوتا ہے۔ لہٰذا کئی بار ایسا ہوتا ہے کہ کوئی شخص خواب دیکھتا ہے تو کہتے ہیں کہ فلاں نے اپنے رب کو خواب میں یا بیداری میں دیکھا اور بعض اوقات حق تعالیٰ اسی تجلی کے واسطہ سے ہم سے ہم کلام ہوتے ہیں تو کہا جاتا ہے کہ فلاں نے اپنے رب سے کلام کیا، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ علم کی تجلی کے مطابق کسی مقام پر آئندہ ہونے والے کچھ واقعات واقع ہونے سے پہلے ہی ظاہر ہو جاتے ہیں تو کہا جاتا ہے کہ 'حق کے لیے ایسا ایسا ظاہر ہوا' اور بعض اوقات کسی ایسی جگہ پر جہاں ان انوار کا عکس پڑتا ہے اور تجلیات آپس میں ٹکراتی ہیں ایک قسم کا انبساط و خوشی حاصل ہوتی ہے اور مثال میں اسے ایسی شکل میں پیش کیا جاتا ہے جو افق میں صبح کے پھوٹنے کی شکل میں ہوتی ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ حق مانوس ہوا، ہنسا، راضی ہوا اور خوش ہوا اور بعض اوقات ایسی حالت حاصل ہوتی ہے کہ جو اس کی ضد ہوتی ہے۔ جو انتقام اور بغض کی مثال پیش کرتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ حق نے لعنت کی، ناراض ہوا، غصہ ہوا اور غضب میں آیا۔ شریعت نے اور الفاظ چھوڑ کر ان الفاظ کو محض اٹکل سے استعمال نہیں کیا کیوں کہ

شریعت نے اس لغت میں جسے وہ جانتے ہیں ان سے زیادہ واضح الفاظ نہیں پائے۔

لمعہ نمبر ۵۲

یاد رکھو کہ تجلیات کا مرجع خواہ ان کی تعداد کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو، تین اصول ہیں۔ ایک یہ کہ وہ صورت علمیہ جو معلوم کے مدارک میں حاصل ہوتی ہے انہی کی صورت ہوتی ہے اس طرح کہ اس کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک لحاظ سے یہ ایک عرض ہوتی ہے جو نفس عالم کے ساتھ قائم ہوتی ہے لیکن اس وجہ سے یہ معلوم پر صادق نہیں آتی۔ دوسری وجہ سے معلوم کے ساتھ اس کا ایک قسم کا اتحاد ہو جاتا ہے۔ اس وجہ سے یہ 'نشاۃ ادراکیہ' میں معلوم کی تجلی ہوتی ہے۔ اس اصول کی بنا پر کہا جاتا ہے کہ میں نے فلاں کو خواب میں دیکھا اور میں نے سورج کو پانی کے پیالے میں دیکھا۔ لہٰذا جب عارف کی توجہ کسی ایسی صورت کی طرف ہوتی ہے جس کے متعلق اس کا یہ اعتقاد ہو کہ وہ اس کا رب ہے تو وہ ایسی صورت بن کر سامنے آتا ہے جو اس کے اعتقاد کے مطابق ہوتی ہے اور وہ صورت اس کے رب کو اچھی طرح سے ظاہر کر دیتی ہے۔ نیز یہ صورت عارف کے لیے اپنے نفس کو جاننے کا آلہ بنتی ہے۔ لہٰذا جب تک یہ توجہ، یہ اعتقاد یہ تعرف باقی رہے گا یہ صورت واجب کی ہوگی اور اسی کی تدلی ہوگی۔

دوسرا اصول یہ ہے کہ ملائکہ یا کسی فاضل انسان کے قوی نفس کی ہمت کا تعلق یا عنصری مادہ کے ایک حصہ سے ہوتا ہے یا قوتِ مثالیہ کے ساتھ، اس لیے کہ یہ موجوداتِ مثالیہ کے لئے بمنزلہ ہیولیٰ کے ہیں۔ اگر ان کا تعلق اس طرح ہو کہ یہ حصہ حق کی تعریف اور اس کی صورت ہو تو یہ صورت اس کی تجلی ہوگی اور اگر اس کا تعلق اس طرح ہو کہ یہ ان کی ملت میں ان کی جمعیت کو اکھٹا کرنے کا باعث بنے، مثلاً ایسا معاملہ جو تدبیر الٰہی کے حکم سے ہو تو اگر یہ صورت اعراض سے مشابہ ہوگی، تو برکت کی باعث ہوگی اور اگر جواہر میں سے ہوگی تو شعائر اللہ کہلائے گی، جیسے کعبہ، قرآن، صلوٰۃ، اور شریعت اور کبھی ملائکہ کی ہمتوں کا عزم ایک مکان کے ساتھ ہوتا ہے تو وہاں ایک قسم کی برکت ظاہر ہوتی ہے اور اس برکت میں نور الٰہی ظاہر ہوتا ہے۔

تیسرا اصول یہ ہے کہ ہر موجود شے میں ایک مخفی حکمت پائی جاتی ہے جو ذات الٰہی کے

بالمقابل ہونے سے ابھرتی ہے۔اس کی مثال یہ ہے کہ جب ہم گہری نظر سے زید کو دیکھیں تو اس میں ہمیں انسان، حیوان، جسم ناطق، حساس، ذوارادہ، نامی، ماشی، کاتب، ضاحک، شاعر، رومی، حبشی، وغیرہ امور کا علم ہوگا۔ان تمام کا اس پر حکم لگ سکتا ہے اور وہ ہے بھی درست۔ان احکام کا درست ہونا اس لیے نہیں کہ اعتبار کرنے والے نے اعتبار کرلیا اور فرض کرنے والے نے فرض کرلیا، بلکہ اس لیے کہ وہاں خارج میں اس حکم کا منشا موجود ہے جس کی وجہ سے یہ امور صادق آئے نیز یہ کہ یہ کسی اور حکم کا منشا نہیں ہیں جس کی وجہ سے جھوٹ بن جائیں اور ان میں سے ہر ایک خواہ ذاتیات میں سے ہو خواہ عرضیات میں سے امر کلی ہے جو اس فرد کی نسبت سے متشخص ہوتا ہے اور اس پر منطبق ہوتا ہے۔لہٰذا ہر ایک کے بالمقابل اس کی حقیقی جگہ میں کوئی نہ کوئی دقیقہ پایا جاتا ہے اور جو دقیقہ ہمارے اس قول سے پیدا ہوتا ہے وہ موجود بالواجب ہے، اسی سے جاری ہوتا ہے اور اسی کے فیض سے ایک چمک دار نقطہ صادر ہوتا ہے جس کا اشارہ ذات الٰہی کی طرف ہوتا ہے، اسی کی حکایت کرتا ہے اور اسی کا نمونہ ہے۔افراد اور اشخاص سب ایک جیسے نہیں ہیں بلکہ بعض افراد تو ایسے ہیں جن میں دقائق ذاتیہ سافلہ کے احکام غالب ہوتے ہیں۔اور کچھ ایسے ہوتے ہیں جن میں دقائق عالیہ کے وہ احکام غالب آتے ہیں جو تدبیر کلی اور مصلحت کلی اور تجرد کے پہلو سے مناسبت رکھتے ہیں۔واجب کا ان دقائق کا منعکس کرنے سے نہ صرف ہر عارف کے دل میں بلکہ ہر مخلوق کے لیے تجلی الٰہی ہوتی ہے۔جب ان تینوں اصولوں میں اتفاق ہوجاتا ہے اور یہ ایک ہی جگہ پروارد ہوں تو یہ تجلی تام اور نورالٰہی ہوتا اور اگر صرف ایک ہی اصل ہو تو اس میں تجلی کے معانی کا ایک معنی پایا جائے گا۔اس میں غور کریں، کیوں کہ یہ ایک دقیق مسئلہ ہے۔

لمعہ نمبر ۵۳

عظیم تجلیات میں سے ایک تجلی وہ ہے جو لوگوں کے لیے قیامت کے دن ظاہر ہوگی۔چنانچہ وہ اللہ تعالیٰ کو اسی طرح دیکھیں گے جس طرح وہ دنیا میں سورج اور چاند کو دیکھتے ہیں۔اور اس میں کوئی کمی نہ ہوگی اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ جس نور کا ہم نے ذکر کیا ہے وہ ایسی صورت میں ظاہر ہو جو نوع انسان کے امام عطا کرے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ نوع انسان کا امام ان تمام امور کے لیے

قانون اور امام ہے جو اس نوع کے اشخاص کو عطا کی جاتی اور تو کسی فرد کو اس میزان سے تجاوز کرتا ہوا نہ پائے گا۔ لہذا افراد انسان کا اپنے رب کے متعلق اعتقاد اور اس کی معرفت ہر فرد کے لیے ایک حد رکھتی ہے جس سے ان کا اعتقاد کسی طرح تجاوز نہیں کر سکتا۔ حق تعالیٰ قیامت کے دن اسی حد کی صورت میں تجلی کریں گے۔ یہ ایک کلی جملی تجلی ہوگی جس میں ان کے لیے ظہور میں کوئی کمی نہ ہوگی لیکن اس تجلی کی حقیقی تشخیص میں ان میں اختلاف ہوگا۔ چنانچہ ہر ایک نے اپنے خاص اعتقاد کی صورت کے مطابق دیکھے گا۔ حدیث میں جو یہ بات آئی ہے کہ حق تعالیٰ منافقین کے لیے ایسی صورت میں ظاہر ہوں گے جسے موحد لوگ نہ پہچان سکیں گے تو اس کا یہی مفہوم ہے۔

تجلی کلی جملی، خارج میں موجود ہے اور اس کی مثال بہت عظیم ہے۔ اس کی اصل شخص اکبر اور وہ اعتقاد کلی ہے جو انسان کو دیا جاتا ہے۔ اب رہی تجلیات خاصہ تو وہ انہیں ان کی نگاہوں میں دکھائی دی جائیں گی۔ مثلاً اگر انسان اپنی آنکھوں پر سرخ رنگ کا شیشہ رکھے تو اسے ہر چیز سرخ دکھائی دے گی اور اگر دوسرا شخص سبز رنگ کا شیشہ رکھے گا تو وہ اسے سبز دیکھے گا حالانکہ دونوں حالتوں میں چیز ایک ہی ہے۔

لمعہ نمبر ۵

تجلیات میں سے ایک تجلی وہ ہے جو ہر رات کے آخری تیسرا حصہ باقی رہ جانے پر دنیا کے آسمان پر نازل ہوتی ہے۔ اس کی تحقیق یہ ہے کہ شمس اور زہرہ میں اسرار غیب میں سے ایک راز پایا جاتا ہے۔ اس راز کا قوی ترین اثر زمین میں اس وقت ہوتا ہے جب یہ دونوں 'اوتاد اربعہ' میں ہوں۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ساری تشریح فرمائی ہے اور ہر چیز کو اپنی مخصوص کیفیت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ چنانچہ زمین کے اوپر جو وتد ہے اس میں یہ خاصیت ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کے سامنے اعمال پیش ہوتے ہیں جس سے مراد اعمال کا مقبول ہونا ہے۔ اس لیے کہ سخت ترین وقت وہ ہوگا جب ان کی شعاعوں کا ظہور ہوگا اور وتد میں بھی طبائع ہیں اور قریب بات یہ ہے کہ ملائکہ زمین میں منتشر ہو جاتے ہیں اور باری باری آتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے پاس اعمال لے جاتے ہیں کیوں کہ ملائکہ کو زہرہ کے ساتھ مناسبت ہے اور عبادت کو شمس کے ساتھ مناسبت ہے اور

جو وتد زمین کے نیچے ہے اس میں ملائکہ منتشر ہوتے ہیں اور ان میں نور الٰہی کی تجلیاں چمکتی ہیں۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا کے آسمان کی طرف اتر کر آتا ہے اور پھر فرماتا ہے: ہے کوئی مغفرت چاہنے والا؟

اوتاد میں سورج کے استقامت کے وقت کا تعین اسی لیے نہیں کیا گیا بلکہ اس امر میں ان دونوں حالتوں کے درمیان جو استقامت سے ذرا پہلے اور ذرا بعد ہوتی ہیں تردد پایا گیا کیونکہ سورج زہرہ کے کبھی آگے ہو جاتا ہے اور کبھی پیچھے جیسا کہ کوئی کشتی میں سوار ہو۔ یا تو یہ ان کی خاصیت میں مدد کرتی ہے یا کوئی فائدہ نہیں پہنچاتی، مگر اس لمبی ساعت کے متعلق انہیں غلطی نہیں لگتی تحقیق سے یہ معلوم ہوا کہ اس گھڑی کا مرکز بہت کم جزو ہے۔ آنحضر صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس امید کی گھڑی کے متعلق یہی فرمایا ہے۔

لمعہ نمبر ۵۵

بعض تجلیات ایسی ہوتی ہیں جو ملائکہ اور فاضل لوگوں کے نفسوں میں پھیلی ہوتی ہیں۔ اس کی تحقیق یہ ہے کہ وہ نفوس جو انتہا درجہ کے بلند نفس ہیں اس تجلی کی طرف اپنی استعداد کے مطابق متوجہ ہوتے ہیں اور ان کا معاملہ مختلف رنگ اور مختلف مقدار کے آئینوں کا سا ہے جنہیں چراغ کے گرد رکھ دیا جائے تو اس طرح ہر آئینہ کے مناسب اس میں شکل دکھائی دے گی اور ان سب میں پھیلنے والی شعاع جمع ہو جائے گی۔ یا اس کی مثال اس سورج کی سی ہے جو مختلف مقدار اور مختلف رنگوں کے حوضوں اور تالابوں پر چمکے تو ان سب میں سورج کی شکل دکھائی دے گی اور جب زمین میں کوئی ایسی صورت پیدا ہو جسے ملاء اعلیٰ پسند کرتے ہوں تو وہ صرف حق میں باقی ہوگی اور ملاء اعلیٰ میں فانی۔ لہٰذا جس طرح اس تجلی سے نفسوں کے شعاعوں کے مختلف رنگ اترتے ہیں اور یہ رنگ انہیں اپنے اندر شامل کر لیتے ہیں اسی طرح کبھی ان سے ایسی ہیئتوں کا تصور کیا جاتا ہے جو ان شعاعوں میں ایک قسم کی تاثیر کرتی ہیں۔ اس سے ایک فرضی ہیئت ظاہر ہوتی ہے جسے انس سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اسی طرح کبھی غصہ کی ہیئت اوپر کو اٹھتی ہے تو اسے ناراضگی اور غصہ کہا جاتا ہے اور کبھی ان شعاعوں میں عنقریب پیدا ہونے والی صورت ظاہر ہوتی ہے تو کہا جاتا کہ حق کے لیے نئی

صورت حال پیدا ہوئی اور یہ صورت حال انبیاء کے لیے تکلیف دہ ہوتی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: کیا تمہارا خیال ہے کہ تمہیں یونہی چھوڑ دیا جائے گا حالانکہ اللہ کو ابھی یہ معلوم نہیں ہوا کہ تم میں سے کون مجاہد اور کون صابر ہے؟

چنانچہ یہ اور دیگر آیات اس بات کی تصریح کرتی ہیں کہ ان کے متعلق علم کا تجدد ہوتا رہتا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ یہ متجدد علم اللہ کے لیے صرف اسی تجلی کے ذریعہ سے ثابت ہوسکتا ہے کیونکہ جب مومنین کے نفس تزکیہ کے رنگ میں رنگے جائیں تو اسی ہیئت میں بلند ہوکر ملاء اعلیٰ تک پہنچ جاتے ہیں۔ اس کے بعد اس تجلی کی ہیئت بلند ہوتی ہے تو اس بات کے سوا کہ یوں کہا جائے' حق تعالیٰ کو معلوم تھا کہ وہ جہاد کریں گے اسی لیے اس نے انہیں پسند کیا' کوئی اور چیز اس مفہوم کو زیادہ وضاحت کے ساتھ ادا نہیں کرسکتی۔

لمعہ نمبر ۵۶

تجلیات میں سے ایک تجلی وہ بھی ہے جسے آنحضرت ﷺ نے خواب میں بہترین صورت میں دیکھا۔ پھر آپ ﷺ نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھا، وغیرہ وغیرہ اس تجلی کے راز کی تشریح یہ ہے کہ ایک عارف باللہ انسان یقینی طور پر اللہ تعالیٰ کے متعلق ایسی صفات کاملہ کا اعتقاد رکھتا ہے جن کی نہ کوئی شکل ہے نہ رنگ حالانکہ ہر صفت کی خاص شکل اور رنگ ہوتا ہے۔ مثلاً شجاعت کی مثال اگر ذہن میں آئے تو اس کی صورت شیر کی ہوگی یا ایک نوجوان انسان کی جس نے زرہ پہن رکھی ہو اور ہاتھ میں تلوار ہو، علی ہذا القیاس (دیگر صفات بھی اسی طرح ہوں گی)۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اس کے حسِ مشترک میں حق تعالیٰ کی صفات شکل اور رنگ کی صورت میں ظاہر ہوتی ہیں۔ لہٰذا جب یہ صورت ان صفات کی وضاحت کرنے والی اور ان کے جاننے کا ذریعہ ہو تو یہ تجلیات حق میں سے ہوں گی۔ ایسی صورت میں یہ کہنا درست ہوگا کہ اس نے حق کو دیکھا یا اسی قسم کے اور الفاظ۔

لمعہ نمبر ۵۷

تجلیات میں سے ایک تجلی وہ بھی ہے جسے موسیٰ علیہ السلام نے طور پر آگ کی صورت میں دیکھا۔ اس راز کی تشریح یوں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے لیے یہ واجب ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ انہیں فرعون کی طرف بھیجے، نیز یہ کہ اللہ انہیں جس قدر چاہے ایسا یقینی علم عطا کرے جس سے بڑھ کر یقین نہ ہو سکتا ہو اور موسیٰ علیہ السلام نے آواز اور شکل کے ذریعہ جن علوم کو حاصل کیا تھا ان میں سے ان کے نزدیک یہ حسی علم ہی سب سے بڑا علم تھا۔ لہٰذا حکمت الٰہی کا یہ تقاضہ ہوا کہ انہیں ایسی آواز سے مخاطب کیا جائے جس کے اللہ کی طرف سے ہونے میں انہیں شک نہ ہو اور غیر محسوس چیز کو محسوس آواز میں اتارا جائے۔ لہٰذا ملاء اعلیٰ کے ایک گروہ کے دل میں یہ بات ڈال دی گئی کہ وہ اسی درخت کی طرح جا کر انوار حق میں سے ایک نور اور اس کی صورتوں میں ایک تمثال اور صورت کا تصور کریں۔ چنانچہ انہوں نے ایک مضبوط تصور (اور ادراک) کیا۔ ان کے اس تصور نے عالم مثال کا ایک باب کھول دیا جس سے اس مکان کے عنصر یعنی ہوا وغیرہ نے آگ کی صورت اختیار کر لی تاکہ اس سے خطاب حق کی وضاحت ہو جائے اور یہ بمنزلہ اس صورت کے ہے جو آئینہ میں نظر آتی ہے تاکہ دیکھنے والے کی وضاحت کرے۔ اس قسم کی مثالوں میں ضروری ہے کہ ملاء اعلیٰ کی طرف توجہ ہوتا کہ اس مکان میں جو عنصری رنگ ہیں یہ انہیں اختیار کر سکے۔

لمعہ نمبر ۵۸

تجلیات میں سے ایک تجلی وہ بھی ہے جس کے متعلق عیسائیوں کا خیال ہے کہ لاہوت نے ناسوت کا لباس پہن لیا اور ہندوؤں کا خیال ہے کہ یہ حق تعالیٰ کا کامل انسانوں میں حلول ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس اشکال کو قرآن مجید میں یہ فرما کر دور کر دیا: "ہم نے اس کی تائید روح القدس سے کی"۔ تو واضح ہو گیا کہ یہ فی الحقیقت روح القدس کی تائید ہے جسے باطل پرستوں نے اوتار اور حلول بنا لیا۔ اللہ تعالیٰ ظالموں کے اس قول سے بہت بلند ہے۔

اس تجلی کی حقیقت یہ ہے کہ نفوس کلیہ جزئی نفس ہو کر صرف عالم کی اس صورت میں نازل

ہوتے ہیں جو اس روز ہو۔ لہٰذا اگر نفس کلی ایسے دن اترے جس دن سورج اپنے گھر میں ہو تو یوں معلوم ہوگا کہ نفس جزئی میں سورج اپنے گھر میں ہے اور اگر اس وقت اترے جب کہ مشرق میں ہو تو یوں معلوم ہوگا کہ سورج مشرق میں ہے اور اس وقت اترے جب کہ یہ اپنے جیسے گھر میں ہے تو یوں معلوم ہوگا کہ سورج اپنی مثال میں ہے۔ یہ قوت شمس کے درجات اور نفس میں اس کے اثر کے ظاہر ہونے کے مراتب ہیں۔ اس کے نمونے پر یہ جاننا چاہیے کہ جب کلی نفس جزئی نفس میں اترتا ہے تو جزئی نفس میں تجلی اعظم کی صورت ظاہر ہوگی۔ ایسا کیوں نہ ہو، جب کہ یہ تجلی اعظم نفس کلی کا دل ہے۔ اور اسی پر اس کا دارومدار ہے؟ لہٰذا سورج اور چاند وغیرہ کے مقابلہ میں اس کے ظاہر ہونے کا زیادہ حق ہے اور نفس جزئی میں تجلی اعظم کے بالمقابل نقطہ کو ہماری اصطلاح میں 'حجر بحت' کہا جائے گا۔ ظہور تجلی اعظم کے مراتب کے اختلاف کی وجہ سے لوگوں کا اس 'حجر بحت' کے بارے میں اختلاف ہے جس طرح ہم نے سورج کے مراتب کے اختلاف کی صورت بیان کی ہے تاکہ یہ 'حجر بحت' بعض لوگوں کے لیے چمک دار اور براق بن جائے اس کے اور تجلی اعظم کے درمیان ایک وسیع گھاٹی ہے۔ تجلی اعظم کا سایہ اس 'حجر بحت' پر پڑتا ہے۔ اس کے بعد اسی 'حجر بحت' کی شعاع روح اور سر اور ان دونوں کے درمیانی لطائف پر پڑتی ہے جس کی وجہ سے ایک لحاظ سے انسان 'الٰہی' بن جاتا ہے اور ایک لحاظ سے ناسوتی اور معجز نما کمال کی طرف نکل آتا ہے اور اس کے ناقص نفوس کی تکمیل، خداوندی بلند برکات کے فیضان اور گناہوں کے کفارہ کے سلسلہ میں خاص طور پر خارق عادت آثار ظاہر ہوتے ہیں اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ مخلوق کے اندر نکلنے والی تجلیوں میں سے ایک تجلی نکلتی ہے اور وہ ذرا کم درجہ کی چمک ہوتی ہے اور کبھی اس میں اختلاف نہیں ہوتا، جب لوگوں کا انتہائی گمان یہی ہو کہ یہ خداوندی اوتار ہے یا کسی نفس کے اندر حق تعالیٰ کا حلول ہوگیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس شبہ کو دور کرتے ہوئے فرمایا: 'یہ تو نفسوں کے اندر روح القدس کی تائید ہے اور روح القدس یہی تجلی اعظم ہے اور اس کی تائید یہ ہے کہ یہ اس کی برکات میں داخل ہوجائے اور اس کا سایہ ایک صورت اختیار کرلے جس سے یوں معلوم ہو کہ یہ وہی ہے۔

لمعہ نمبر ۵۹

تجلیات میں سے ایک تجلی وہ بھی ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن میں فرمایا گیا ہے: ’’آسمان سے لے کر زمین تک کے معاملات کی تدبیر کرتا ہے، پھر عرش کو چڑھ جاتا ہے ایک دن میں جس کی مقدار تمہارے شمار کے مطابق ایک ہزار سال ہے۔‘ نیز اس قول میں: ’ہر روز وہ ایک نئی شان میں ہوتا ہے۔ اس طرح کہ جب آسمانوں اور زمینوں کے احوال اس حد تک پہنچ چکے ہوں کہ مصلحت کلی واجب قرار دے کہ تجلی اعظم اپنے پہلے رنگ کے علاوہ کسی اور رنگ میں رونما ہو۔ اس وقت اس کی کلی شان ہوگی اور تجلی اعظم ہوگی۔ یہ اسی طرح ہے جس طرح عالم مثال کے اندر ایک انسانی مورتی ہو۔ اس بات نے کہ ایک چیز حق کی بنا پر کسی اور چیز کی مورتی ہے بعض اعراض اور جواہر کو بعض موجودات کے لیے فطری طور پر مناسب بنا دیا ہے جس طرح تو زید کو خیال کرے کہ وہ سرخ اور لمبا ہے اور عمرو سیاہ اور کوتاہ ہے تو اس طرح تمہارے ذہن کے اندر دو مختلف صورتیں آئیں گی۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ ان کے رنگ اور مقدار مختلف ہیں بلکہ اس لیے کہ وہاں کچھ فطری مناسبت پائی جاتی ہے، ایک کی ایک کے ساتھ اور دوسرے کی دوسرے کے ساتھ، تا کہ تمام مخلوقات کا فطری طور پر ایک دوسرے سے امتیاز ہو سکے۔ یہی حال عالم مثال کا ہے، کہ وہاں بھی بعض دیگر مخلوق سے ممتاز ہیں، بر خلاف تجلی اعظم کے۔ پھر یہ تجلی بعض فلکی قرانات میں زمین کی طرف اترتی ہے تو ملائکہ اس تنزیل کے حکم کی مدد کرنے میں لگے رہتے ہیں اور ان تمام امور کی مدد کرنا، ترک کر دیتے ہیں جن کا رسوا کرنا اس تنزیل نے واجب قرار دیا ہو، اس لیے کہ مطیع وہ ہے جو تنزیل کے مطابق حق کے حکموں کی اطاعت کرے اور عاصی وہ ہے جو اس تنزیل کے مطابق حق کی نافرمانی کرے تا آنکہ تجلی اعظم کی صورت پلٹ جائے اور وہ کوئی اور طرز بدل لے اور جب تجلی اعظم کوئی اور طرز اختیار کر لیتی ہے تو کوئی اور تنزل اوپر کو چڑھ جاتا ہے اور اس کے احکام پھیل جاتے ہیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے فرمان: ’وہ آسمان سے زمین تک کے امور کی تدبیر کرتا ہے‘ کا مطلب یہ ہے کہ وہ جہان اور اس کے نظام کی تدبیر کرتا ہے جس کی یہ صورت ہوتی ہے کہ یہ حکم شخص مثالی بننے کے بعد زمین کی طرف اترتا ہے، پھر ملائکہ اس کے لیے مسخر کر دیے جاتے ہیں اور جہان کو اس کے لیے تیار کر دیا جاتا ہے یہاں تک کہ جب اس کی مدت ختم ہو جاتی ہے تو یہ حکم

بلند ہو کر اللہ کی طرف چلا جاتا ہے اور اسی قسم کا دوسرا حکم آ جاتا ہے۔ اس طرح نزول اور عروج کا اجتماع ایک لمبی مدت تک ہوتا رہتا ہے۔ جب آخری[1] (نزول یا عروج) ختم ہو جاتا ہے تو پہلا لوٹ آتا ہے۔ بالعموم اس مدت کی مقدار تخمیناً ایک ہزار سال ہوتی ہے۔ اور اسی طور کے ہوتے ہوئے اکابر انبیاء مبعوث ہوتے ہیں جس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو علم ہے کہ کون سی شرع ان قرنوں کے مناسب ہے۔ لہٰذا وہ لوگوں کے لیے اس شخص کو کھڑا کر دیتا ہے جو انہیں اس شریعت کی خبر دے اور اس طور کا ترجمان ہو۔ غیر انبیاء کو پہلی شریعت کا صرف مجدد بنا کر بھیجا جاتا ہے کہ وہ ان لوگوں کے لیے رحمت بنیں اور ان کے نفسوں کی تکمیل کریں۔

لمعہ نمبر ۶۰

جب تو نے ان چاروں کمالات کو جان لیا تو تو جان لے کہ حقائق کی تعریف کرنے میں تمام انبیاء کا مسلک یہی رہا ہے کہ وہ لاہوت، عقل، نفس، اور ہیولیٰ کے متعلق خاموش رہیں۔ چنانچہ پہلی بات جو وہ اپنی امتوں کو بتاتے ہیں یہ ہے کہ مفہوم دو لفظوں پر منحصر ہے۔ موجود اور معدوم، موجود سے ان کی مراد وہ ہے جو خارج اور اعیان میں ہو۔ یعنی جو نفس اور ہیولیٰ میں ثابت ہو چکا ہو اور یہی وہ چیز ہے جسے ہم 'خارج' کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں اور معدوم سے وہ چیز مراد ہے جو خارج میں نہیں، خواہ وہ درحقیقت خارج میں ہو یا وجود سے پہلے ثبوت کے مرتبہ میں ہو اور موجود یا تو واجب اور قدیم ہوگا یا ممکن اور حادث۔

لہٰذا واجب جو خارج میں موجود ہے، وہ ہے جس کا وجود بذات خود ہو۔ ان کی واجب سے مراد وہ تجلی ہے جسے خارج نے شروع شروع میں ظاہر کیا اور وہ مجرد ہے اور جانب اعلیٰ کی جہت سے نفس سے پاک ہے اور ممکن سے ان کی مراد وہ ہے جو نفس کی نچلی جانب کے ساتھ ملا ہو اور ممکن سے ان کی مراد وہ تغیر پذیر ہے جس کے وتد میں کون و فساد واقع ہو اور ہر ممکن حادث ہے اور ہر ممکن اللہ کے ارادہ سے ہوتا ہے اور حوادث کے اندر حکم لگانا کچھ اور چیز ہے اور ارادہ کچھ اور، کیوں کہ ان کا ثابت کرنا ان کے مباحث میں شامل نہیں۔

الحمد للہ اولا و آخرا و ظاھرا و باطنا

---

[1] اصل کتاب میں 'کل من انقض' دیا ہے۔ میں نے 'کلھا انقضی' پڑھ کر ترجمہ کیا ہے۔

الطاف القدس

تصنیف

امام شاہ ولی اللہ محدثؒ

ترجمہ

مولانا سید محمد فاروق قادری

ترتیب

مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
فصل ۱	علم لطائف کی فضیلت اور اس کے فوائد	۳۸۱
فصل ۲	حقیقتِ لطائف	۳۸۵
فصل ۳	لطائف ظاہرہ کی تہذیب کا بیان	۳۹۳
فصل ۴	جوارح اور لطائف ثلاثہ ظاہرہ کی تہذیب کا بیان	۳۹۹
فصل ۵	لطائف خمسہ کی تہذیب کا بیان	۴۱۱
فصل ۶	لطائف خفیہ کی تہذیب کا بیان	۴۳۵
فصل ۷	اقسامِ خواطر اور ان کے اسباب کی معرفت	۴۶۰

............☆☆☆............

بسم اللہ الرحمان الرحیم

سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں، جس نے اپنے مخلص بندوں کو کائناتِ عالم کے ساتھ ساتھ خود ان کو اپنے نفوس میں اپنی علاماتِ عظمت اور آثارِ قدرت کا مشاہدہ کرایا، یہاں تک کہ یہ حقیقت ان پر واضح ہو گئی کہ اس کی ذات حق ہے، اور جہان کی تمام اشیاء ظاہری ہوں یا باطنی کی ذوات و صفاتِ کے قیام کا سبب ہے، پس اللہ کے سوا ہر شیٔ فانی ہے اور وہی ہر چیز کو تمام اطراف سے احاطہ کیے ہوئے ہے، جدھر رُخ کرو اس کی ذات جلوہ گر ہے اور میں اس بات کی شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں، اللہ تعالیٰ آپ کی ذاتِ اقدس، آپ کے اھلبیت اور صحابہ پر اپنی برکات اور رحمتیں نازل فرمائے۔

حمد وصلوٰۃ کے بعد فقیر ولی اللہ بن عبدالرحیم العمری الدہلوی (اللہ تعالیٰ اس کے، اس کے مشائخ اور والدین کے ساتھ حُسنِ سلوک کی عنایت کرے) عرض پرداز ہے کہ یہ چند اوراق جنہیں ''الطاف القدس فی معرفتہ لطائف النفس'' کے نام سے موسوم کیا گیا ہے قلب، عقل، نفس، رُوح، سرّ، خفی، حجرِ بحت اور انا کے حقائق اور ان میں سے ہر ایک کی تہذیب و تربیت کے طریقوں پر مشتمل ہیں۔ اس مضمون سے مقصود یہ ہے کہ خالص وجدانی اور کشفی مسائل قلمبند کیے جائیں، اور اس میں علوم عقلیہ ونقلیہ سے کوئی سروکار نہ ہو، **واللہ علیٰ مانقول وکیل**۔

...........☆☆☆...........

فصل ۱

علمِ لطائف کی فضیلت اور اس کے فوائد

علم لطائف وہ کسوٹی ہے کہ اس کا شرف، اللہ تعالیٰ نے متاخرین صوفیا کو عطا فرمایا ہے مشائخ صوفیا میں سے تہذیب نفس کے طریقوں پر اسی شخص کو زیادہ بصیرت حاصل ہے، جو لطائف کا زیادہ علم رکھتا ہے اور در حقیقت ایسا شخص ہی صحیح معنوں میں طالبانِ راہ کی رشد و ہدایت کا فریضہ انجام دے سکتا ہے، صوفیا میں سے جو لوگ مدتوں راہِ تصوف کی کوچہ گردی کے باوجود لطائف کو حاصل نہیں کر پائے، لطائف سے آشنا حضرات کے مقابلے میں ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک ماہر طبیب علمِ تشریح سے واقف، مختلف امراض ان کے اسباب و علامات اور ان کے علاج کا اچھی طرح علم رکھنے والے اور اس کے ساتھ سلف کے مجرب اصولوں کے ماہر کے مقابلے میں معمولی سمجھ بوجھ کی بوڑھی عورتیں جو محض اٹکل پچو سے دوا دارو کرتی ہیں، یا پھر لطائف کا علم جاننے والوں کی مثال اس راہبر کی ہے جس نے طویل عمر بیابانوں میں گزار کر راستے کے تمام نشیب و فراز سے پوری طرح آگاہی حاصل کر رکھی ہے اور وہ جاری راستے اور لق و دق صحرا میں بخوبی تمیز کر سکتا ہے، ظاہر ہے کہ یہ ان لوگوں کے برابر کیسے ہو سکتے ہیں جو محض تفریح کی خاطر یا کسی مصیبت میں مبتلا ہو کر اس پریشانی میں پھنس گئے، کوئی مقصد پیشِ نظر نہ تھا اور نہ ہی راستے سے آگاہی، کچھ تو ان میں سے ہلاک ہو گئے ہوں اور کچھ منزلِ مقصود تک پہنچ گئے ہوں عرصہ دراز کے بعد جب یہ لوگ وطن واپس لوٹے تو ہر ایک نے اپنی بپتا سنائی، پوری بات کسی سے بھی نہ بن آئی، سامعین ان کی مختلف اور متعارض باتوں سے دل برداشتہ ہو گئے ان میں سے کوئی شخص پوری کہانی بیان کر سکا اور نہ ہی راستہ کے مقامات کی نشاندہی مکمل بات کسی سے نہ بن پڑی۔ الغرض اگر تم اہل تمکین (۱) کا راستہ

(۱) تمکین مقام رسوخ و استقرار ہے جس میں سالک صاحبِ مقام ہوتا ہے اور مغلوب الحال نہیں ہونے پاتا، اس مقام میں سالک انبیاء کے معنوی کمالات سے فیضیاب ہوتا ہے۔

معلوم کرنا چاہتے ہو جو انبیاء علیہم السلام کے وارث ہیں، تو وہ لطائف کا علم حاصل کیے بغیر ممکن نہیں، اسی طرح اگر تم ہر قسم کی آمیزش اور بے فائدہ باتوں سے پاک وصاف راہِ سلوک کے طالب ہو تو وہ بھی علم لطائف کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی، لطائف کا علم وہ عظیم نعمت ہے جو متاخرین صوفیا کے حصے میں آئی ہے یہ ہم پر بلکہ اکثر لوگوں پر فضل ایزدی ہے مگر بیشتر لوگ اس کا شکر ادا نہیں کرتے، ذکر وفکر کا وہ طریقہ جس پر آج کل لوگ عمل پیرا ہیں اور اسے اپنے اسلاف سے نقل کرتے ہیں دو اقسام پر مشتمل ہے، پہلی قسم یہ ہے کہ کسی سالک کو راہِ حقیقت کا شوق گلوگیر ہوا اور جس طرح اس سے بن پڑا وہ اس راہ پر چل پڑا، بالآخر وہ ایک جائے اطمینان پر پہنچ گیا، اور اس سے رشد و ہدایت کے آثار شروع ہو گئے، طالبانِ راہ اس کی طرف بڑھے تو اس نے اپنے حاصل کردہ مقام کی طرف ان کی رہنمائی کی، گویا اس کی نگاہ میں اس کے علاوہ کوئی مقام ہے اور نہ کمال! چنانچہ اس کے مسترشدین اس کے بتائے ہوئے طریقِ کار پر پابند ہو گئے، اور اسی کیفیت ہی کو مقصود سمجھ کر اس پر اعتماد کر کے بیٹھ گئے، اس گروہ کی اکثریت، صرف کسی ایک نسبت کی حامل ہوتی ہے، مثلاً نسبتِ شوق واضطراب، نسبتِ اویسیہ روحیہ، ملائکہ سفلیہ سے مشابہت کی نسبت، یا اسی قبیل کی دوسری نسبتیں، اس صورت میں ان کے لطائف میں سے کوئی ایک لطیفہ تو اس نسبت کی وجہ سے تربیت حاصل کر کے مہذب ہو جاتا ہے لیکن باقی لطائف اپنی جہالت پر قائم رہتے ہیں، اگر ایسے حضرات کے کمال کی مثالی صورت تمہارے سامنے آئے تو ایک ایسی شکل نظر آئے گی جس کا آدھا چہرہ سیاہ اور آدھا سفید ہوگا، خَلَطُوْا عَمَلاً صَالِحاً وَّاٰخَرَ سَیِّئاً (۱) (انہوں نے کچھ اچھے عمل کیے تھے کچھ برے)۔

اس گروہ کے اکثر لوگ شریعت کی پابندی نہیں کرتے، اور کہتے ہیں کہ یہ سارے احکام شریعت کا ظاہر ہیں، شرع کی حقیقت اور خلاصہ تو وہی ہے جسے ہم نے پایا ہے، وَسَیَعْلَمُوْا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ (۲)

(اور عنقریب ان لوگوں کو معلوم ہو جائے گا جنہوں نے ظلم کر رکھا ہے کہ کیسی جگہ ان کو لوٹ

---

(۱) التوبہ

(۲) الشعراء: ۲۲۷

جانا ہے) دوسری قسم وہ کامل و مکمل شیوخ ہیں جنہیں تدبیر کلی نے مسندِ رشد و ہدایت پر فائز کیا، ان کے سبب اُمّتِ مرحومہ کا افتراق و انتشار ختم ہوا اور ان کے ذریعے مرادِ الٰہی کا ظہور ہوا، تمام ضروری باتیں انہیں الہام کے ذریعہ بتادی گئیں اور سالکانِ راہ کی رہنمائی کا فریضہ انہیں سونپ دیا گیا، ان کے معتقدین مسترشدین نے نسلاً بعد نسلٍ اپنے شیوخ سے یہ طریقہ ایسے ہی حاصل کیا، جس طرح اس عظیم راہ جس پر ہزاروں لوگ گامزن رہے ہیں، ان بزرگوں نے مناسب طریق پر اس راہ کے قواعد مقرر کیے، ہر بیماری کے لئے دوا، اور ہر درد کے لئے علاج ڈھونڈے لیکن اس کے باوجود بھی اگر ان حضرات کے طلبا اور پیروکار علم لطائف سے بے خبر ہوں، تو انہیں کئی طرح کے نقصانات اٹھانا پڑتے ہیں۔

مثلاً ان نقصانات میں سے ایک یہ ہے کہ بہت سے مریدین مسترشدین کہ جن کا کوئی ایک لطیفہ فطری طور پر قوی ہوتا ہے، اور دوسرا کمزور اگر ایسے لوگ بلا سوچے سمجھے اشغال و اذکار میں مشغول ہو جائیں، اور وہ سمجھیں کہ اس طرح تمام لطائف کی تربیت ہو جائے گی تو اس کے لئے طویل عرصہ کے بعد وہ لطیفۂ قوی تکمیل کو پہنچے گا، اسے جوش و خروش حاصل ہوگا، اور اس کی تہذیب و تربیت کی علامات ظاہر ہوں گی، اور سالک اپنے مقام طمانیت پر پہنچ جائے گا، اور یہ مقامِ طمانیت جو کئی مراتب کے عبور اور بہت ساری فناؤں کے بعد حاصل ہوتا ہے، درحقیقت وہی لطیفہ ہے جو سالک کی فطرت میں قوی تھا، دوسرا نقصان یہ ہے کہ سالک پر کئی احوال اور فنا و بقا کے مختلف مقامات کا ظہور ہوتا ہے اور وہ کسی حالت کی نسبت کسی ایک لطیفہ سے نہ سمجھنے کی وجہ سے حیران ہو جاتا ہے، اور اس وہم میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ شاید اسے کچھ بھی حاصل نہیں ہوا، اور جو کچھ اس سے پہلے حاصل ہوا ہے وہ خود فریبی کے علاوہ کچھ نہیں، اس وجہ سے اس پر غم و اندوہ چھا جاتا ہے اور اس کے واردات بند ہو جاتے ہیں، اگر شروع ہی میں وہ ہر حالت کی نسبت کسی خاص لطیفے کی طرف کرتا اور فنا و بقا کے تمام واروات ایک خاص امر کے تحت سمجھتا، تو اس روحانی قبض سے چھٹکارا حاصل کر لیتا۔

تیسرا نقصان یہ ہے کہ علم لطائف سے بے خبر شخص جس وقت اولیائے کرام کے حالات دیکھے گا اور اس کی نظر ان کے احوال و اقوال کے اختلافات پر پڑے گی تو وہ شک میں پڑ جائے گا

کسی وقت ان کی ایک حالت کو دیکھے گا اور کسی وقت دوسری! اس طرح وہ کام کرنے سے رُک جائے گا، اور اس بات کا بھی امکان ہے کہ یہ کسی شخص کی انتہائی حالت دیکھ کر سمجھ بیٹھے کہ سلوک کی حقیقی اور آخری منزل شاید یہی حالت ہے، حالانکہ اصل میں ان کے احوال واقوال کے اختلافات اور انتہائی مقامات کا تنوع تو فطری طور پر ان کے لطائف کی قوت وضعف کے اختلافات اور تنوع پر مبنی ہوتا ہے۔

چوتھا نقصان یہ ہے کہ جو کام کسی چیز کے حقیقی مقصد معلوم کر لینے اور اس مقصد کے ساتھ اس کام کی مناسبت کا علم حاصل کر لینے کے بعد، کیا جائے، اس میں معمولی سی کاوش بھی کافی ثابت ہوتی ہے اور ایسا شخص روز بروز اس کا فائدہ دیکھتا ہے اور اپنی بصیرت اور معرفت کے ساتھ اس میں غور وخوض کرتا ہے، چنانچہ وہ ایک کشادہ راہ پا لینے میں کامیاب ہو جاتا ہے، الغرض علم لطائف کے فوائد اور فضائل بے شمار ہیں، انہی چند باتوں سے اس علم کے فوائد کا بآسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

............☆☆☆............

فصل ۲

حقیقتِ لطائف

لطائف کی حقیقت اور ان کی خصوصیات کا بیان، حقیقتِ رُوح کے بیان کی تفصیلات پر مبنی ہے اور حقیقتِ رُوح کا مسئلہ علم سلوک سے نہیں بلکہ علمِ حقائق سے تعلق رکھتا ہے اور شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے علم حقائق کے بارے میں کوئی اشارہ نہیں فرمایا، اور نہ ہی آپ نے علم سلوک اور تہذیب نفس کے علاوہ اور کسی چیز کی تبلیغ فرمائی ہے، لیکن اس کے باوجود علم حقائق ایسا مشہور علم ہے کہ عرب وعجم کی کوئی جماعت اس سے بے خبر نہیں، اور نہ ہی کوئی ایسا گروہ ہے، جس کی زبان پر اس علم کا چرچا نہ ہو، اگرچہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان مشہور علوم (علومِ حقائق) کی طرف اجمالی طور پر اشارہ فرمایا ہے تاہم ان کی تفصیل اور تشریح میں غور وخوض سے شدت کے ساتھ منع فرمایا ہے اور انبیا علیہم السلام کی یہی سنت رہی ہے۔

اس سے تمھیں یہ خیال پیدا نہ ہو کہ شاید یہ علوم انسانی طاقت سے باہر ہیں، نہیں نہیں! ایسی کوئی بات نہیں، بلکہ اصل بات یہ ہے کہ عام لوگوں کے سامنے ایسے علوم کا اظہار مصلحت کے خلاف ہے۔

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد
ورنہ در محفل رنداں خبرے نیست کہ نیست

(خلافِ مصلحت ہے کہ راز پردہ سے باہر نکلے ورنہ وہ کونسا راز ہے جو محفلِ رنداں سے مخفی ہے)

لہٰذا ہم ایسے لوگوں کے لئے لائق اور مناسب ترین بات یہی ہے کہ ہم بھی اس علم کی قیل و قال سے اجتناب کریں، اور دیکھی ہوئی باتوں کو نادیدہ سمجھیں۔ لیکن چونکہ اس مسئلے میں صوفیائے

کرام کا اختلاف خاصا وسیع ہو گیا ہے، اور حقائق معلوم کرنے کے سلسلے میں وہ بے تاب ہو گئے، اور علم لطائف کی بنیاد بھی، یہی مسئلہ تھا، اس لئے اس پر بحث کی ضرورت محسوس ہوئی، اور ضرورت تو ممنوعات (منع کردہ اشیاء) کو بھی مباح کر دیتی ہے۔

روح اس چیز سے عبارت ہے کہ جس کے جسم کے ساتھ ملنے سے جسم میں زندگی پیدا ہوتی ہے اور اس کی جدائی سے جسم مُردہ ہو جاتا ہے، تم نے دیکھا ہوگا کہ جس وقت گوبر میں بدبو پیدا ہوتی ہے اور جوش پیدا ہو جاتا ہے تو اس تعفن اور سڑاند سے گوبر کے اجزا میں ایک کیڑا پیدا ہو جاتا ہے اور ایک حس اور حرکت ظاہر ہوتی ہے اس حس و حرکت کا قریبی سبب رُوح ہے، جس وقت آدمی مر جاتا ہے، تو اس میں موجود حس و حرکت زائل ہو جاتی ہے اور وہ پتھر کی طرح بے جان بن جاتا ہے وہ چیز جس کی جدائی سے یہ کیفیت پیدا ہوتی ہے، رُوح ہے، اب اس رُوح کی حقیقت پر غور کرنا چاہیے۔

واضح رہے کہ روح تین اجزا سے مرکب ہے، پہلا جزو وہ پاکیزہ ہوا ہے جو کئی دفعہ تحلیل ہونے کے بعد عناصر کے لطیف بخارات سے پیدا ہوتی ہے اور یہ غذا، نشوونما اور ادراک کی قوتوں کی حامل ہوتی ہے، اسے ہم نسمہ، رُوح طبعی، اور بدن ہوائی کے ناموں سے بھی موسوم کرتے ہیں، اور یہ ہڈیوں اور گوشت میں اس طرح سرایت کیے ہوئے ہے جس طرح آگ کوئلے میں اور گلاب کا پانی اس کے پھول میں، اور جسم کا روح ہوائی کے ساتھ تعلق بھی اسی جز کی وجہ سے ہے، اور جسم اس کی جدائی سے اس طرح مردہ ہو جاتا ہے جس طرح کہ وہ خود بھی جسم کی جدائی سے رنج و تکلیف اٹھاتی ہے، اس لطیف بخار کا اصل مرکز دل، دماغ اور جگر ہے، یہ خون کے جوش سے قلب میں پیدا ہوتا ہے، اور اس کے گاڑھے، پتلے، صاف اور مکدّر، گھٹنے اور بڑھنے کے سلسلے میں طبی تدابیر کے تصرفات جاری ہیں، اطباء کے ہاں ان میں سے ہر حالت کے اثرات اور نتائج معروف، اور تجربہ کی روشنی میں مشہور ہیں، قلب سے اس تعلق کے انقطاع ہی کا نام موت ہے، اور جسم موت کی وجہ سے اس درخت کی مانند ہو جاتا ہے جسے جڑ سے کاٹ ڈالا جائے، اگرچہ اس کے کاٹنے کی وجہ سے درخت کی خوراک اور ضائع شدہ چیز کا بدل ضائع کر دیا جاتا ہے، تاہم اس لکڑی کے پھٹنے اور اس کی ساخت کے درہم برہم ہونے کے لئے ایک مدت درکار ہوتی ہے بالکل اسی طرح نفس ناطقہ کا

ان لطیف بخارات کے ساتھ تعلق موت کے بعد بھی باقی رہتا ہے اور یہ لطیف بخارات لحمی بدن کی صورت کے ساتھ قائم رہتے ہیں، ہاں آہستہ آہستہ اس کے بعض اجزا منتشر ہو جاتے ہیں۔

دوسرا جز نفس ناطقہ ہے، اسے بھی اچھی طرح سمجھنا چاہیئے، جب ہم کسی چیز کی گٹھلی زمین میں بوتے ہیں اور پانی، ہوا اور زمین کے لطیف اجزا اسے ہر طرف سے گھیر لیتے ہیں، تو وہ گٹھلی اپنی خداداد قوت سے اجزائے لطیفہ کو اپنی طرف کھینچ کر انہیں ایک دوسری صورت میں بدل دیتی ہے، اور پھر اسے ایک باقاعدہ نظام اور مقررہ قاعدے کے مطابق اپنے جسم کی نشو و نما میں صرف کرتی ہے، پھر اس میں برگ و بار ظاہر ہوتے ہیں اور رفتہ رفتہ پھل، پھول، پتے اور شاخیں نکل آتی ہیں، بالآخر اس میں ضعف پیدا ہو جاتا ہے ہر گٹھلی کا دائرہ کار ہمیں بالکل علیحدہ معلوم ہوتا ہے اور ہر درخت کا نظام الگ، چنانچہ اس مقام پر عقل ایک ایسے نفس کے اثبات پر مجبور ہو جاتی ہے، جو ان قوتوں کا حامل ہے۔ اسی طرح جب مرکباتِ ارضیہ کی عفونت (۱) اپنے انتہا کو پہنچ جاتی ہے مثلاً مادۂ منویہ اور خونِ حیض رحم میں جمع ہو جاتے ہیں اور والدہ کا نفس اس میں تدبیر کرتا ہے، تو دل، جگر اور دماغ ظاہر ہو جاتے ہیں، اور اس میں روح ہوائی پھونک دی جاتی ہے، ہر دو صورتیں آپس میں بدل جاتی ہیں، اور ان اجزا کی صورت سے ایک دوسری صورت نمودار ہو جاتی ہے اس صورت کے احکام بھی دوسری نوعیت کے ہوتے ہیں اسی طرح ایک نفس ہے، جو انسانی نظام کا تقاضا کرتا ہے، اور خواص انسانی مثلاً رائے کلی اور لطائف خمسہ سے پوری تفصیل کے ساتھ پھوٹتے ہیں، اسے نفسِ ناطقہ کہا جاتا ہے، اس کے علاوہ تمام نفوس بالخصوص نفسِ ناطقہ، نفس کلیہ کے بحر کے بلبلے اور اس کی موجیں ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اہلِ وجدان کے مطابق عالم میں ایک نفس ہے جو تمام موجودات کی تدبیر کرتا ہے۔ عرش سے فرش تک سب کچھ اسی نفس کا مقتضیٰ ہے، اور اسے نفسِ کلیہ کہتے ہیں، اور افعالِ خاصہ کی ابتدائیت کے اعتبار سے اسے طبیعتِ کلیہ، اور وہ نظام جو اس نفس کا مقتضیٰ ہے، اسے مصلحت کلیہ کہتے ہیں، اور افلاک کے نفوسِ جزئیہ، طبائع عناصر، نفوسِ نباتیہ اور حیوانیہ کو اعضا کے مختلف مزاجوں اور قوتوں کی حامل ارواح کے مانند سمجھنا چاہیئے، اور یہ ساری کی ساری ایک ہی نفس میں اکٹھی اور ایک ہی مدبّر کی تدبیر کے ماتحت ہیں اور پیدائش کے مختلف

---

(۱) عفونت: بدبو، سڑاند

طریقوں اور ادوار میں ظاہر اور مخفی وہی ایک ہی نفس ہے جس وقت پانی ہوا ہو جاتا ہے اور ہوا پانی، نفس کلیہ تو دونوں حالتوں میں ایک ہی طرح پر باقی ہے فرق صرف یہ ہے کہ ایک صورت میں وہ مخفی ہو گیا ہے اور دوسری وضع میں ظاہر، پس نفسِ ناطقہ کی حقیقت وہی نفس کلیہ ہے مگر ایک خاص قسم کے ظہور کے ساتھ جو اس میں ہیولیٰ کی استعداد کے تقاضے سے موجود تھا اس نے مکمل ظہور کیا ہے اور نفسِ کلیہ میں نفسِ ناطقہ کے اضمحلال کی وجہ سے وجودِ روحانی سے فنا پیدا ہو جاتی ہے۔ تیسرا جز رُوحِ ملکوت ہے اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ نفس کلیہ کی بعض قوتیں آئندہ ہونے والی صورتوں کا ان کے وقوع سے پہلے ادراک کرتی ہیں، جس طرح انسان کوئی کام کرنے سے پہلے اس کا تصور اپنے ذہن میں قائم کرتا ہے اس کی مثال یوں بنتی ہے کہ مثلاً ایک مربع شکل جس وقت ہم خارج میں بناتے ہیں، تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ یقیناً وہی صورت ہے جو ہمارے ذہن میں موجود تھی، بعینہ اسی طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ خارج میں جو صورت ظاہر ہوئی ہے یہ بالکل وہی صورت ہے جو ان قوتوں میں موجود تھی۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے نوعِ انسانی کی تخلیق کا ارادہ فرمایا تو بہت عرصہ پہلے اس نے ان قوتوں میں نوعِ انسانی کی صورت اجمالیہ پیدا کر دی اور سالہا سال بعد اس کی خاص عنایت سے تازہ حالت میں ایک دوسرا فیض انسانی صورت تک پہنچا، تو وہ ایک ہی چیز بہت ساری چیزوں میں اس طرح ظہور پذیر ہو گئی جیسے ایک آئینے میں آفتاب کی صورت ظاہر ہو، لیکن اس کے اردگرد مختلف رنگوں اور سائزوں کے کئی آئینے رکھ دیے جائیں تو ہر ایک آئینے میں وہ صورت جلوہ گر ہو گی۔ اب ایک حیثیت سے تو وہ ساری صورتیں اپنا مستقل وجود رکھتی ہیں، لیکن دوسری حیثیت سے یہ ساری صورتیں اسی ایک اجمالی صورت کی رہین منت ہیں، لہٰذا ان صورتوں میں سے ہر صورت ایک انسان کی روح ہے، طویل عرصہ کے بعد ایک تازہ فیض اس صورت کے ساتھ آملتا ہے اور بعض نازل قوتوں میں اس کا نزول ہوتا ہے جب انسانی جسم میں روح ہوائی پھونک دی جاتی ہے اور نفس کلیہ ظہور سے خفا میں چلا جاتا ہے اور پھر دوسری شکل میں ظاہر ہوتا ہے اور نفس کلیہ ظہور کی صورت میں مقید ہونے کے اعتبار سے نفسِ ناطقہ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور وہ روحانی صورت اس کے ساتھ متحد ہو جاتی ہے، اسی جز کی وجہ سے وہ حظیرۃ القدس میں حاضر ہوتا ہے اور

اس شخص کے اعمال علیین یا سجین میں لکھے جاتے ہیں، اگر وہ کوئی نیک عمل کرتا ہے تو اس مثالی صورت میں ایک سفید نقطہ ظاہر ہوتا ہے، اور اگر برے عمل کرتا ہے تو اس مثالی صورت میں سیاہ نقطہ نمودار ہوتا ہے اور یہ قیامت میں انسانی جسم کے ساتھ متحد ہو جائے گا۔ چنانچہ جسم کے اعضاء جوارح کے تکلم اور نامہ ہائے اعمال کے ظہور کا واقعہ ہوگا۔ جب روح کے اجزاء معلوم ہو گئے تو اس کے ساتھ یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ ان میں سے ہر ایک جز کی الگ خصوصیات ہیں اور پھر دو دو کی علیحدہ خاصیتیں ہیں۔ معاش اور معاد کے احکام میں سے رُوح پر جو باتیں وارد ہوتی ہیں وہ ساری انہی خصائص کی طرف منسوب ہوتی ہیں اور لطائف نفس بھی اجزا کی اسی کثرت سے پھوٹتے ہیں پس روح ہوائی کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ عناصر سے امداد حاصل کر کے ناسوت میں اپنا ٹھکانہ بنا لیتی ہے، اور روح ہوائی کی تین حالتیں ہیں:

پہلی یہ کہ وہ جوارح کے تابع اور اس کی مغلوب ہوتی ہے اور اس کا کام جوارح سے جدا شدہ افعال کی تکمیل ہے، بایں طور کہ طبیعت کے اقتضا سے عادت کے طور پر جوارح سے افعال جاری ہوتے ہیں اور رُوح پوری طور پر ان میں ڈوب جاتی ہے۔ اس حالت میں یہ نفسِ بہیمی ہوگا۔

دوسری حالت یہ ہے کہ روح ہوائی جوارح کے ذیل میں مستغرق ہونے سے رہائی حاصل کر لے اور وہ اخلاق وصفات جو ارواح قلبیہ اور دماغیہ سے متعلق ہیں، اس پر غلبہ حاصل کر لیں یا پھر اعمالِ جوارح ان اخلاق کی صورت میں ہوں یا ان کے متمم ہوں اور وہ اخلاق اعمالِ جوارح کے بغیر ممکن نہ ہوں۔ ایک صورت یہ ہے کہ وہ اخلاق تو فی نفسہا مکمل ہوں اور جوارح کے اعمال ان اخلاق کے مقتضیٰ اور ان کی تشریح ہوں، جو بھی صورت ہو اس حالت میں نفسِ انسانی ہوگا۔

روح ہوائی کی تیسری حالت یہ ہے کہ وہ روح القدس کے سامنے جو حظیرۃ القدس میں قائم ہے موجود ہو، اور اس کے ساتھ اپنا ربط پیدا کر لے۔ ملأ اعلیٰ کا ساکن اور ملاء اعلیٰ کے فرشتوں کا اپنی استعداد کے مطابق ہم زبان ہو، اس کے دل پر رُوحِ افلاک سے اسرار و رموز کا فیضان ہو۔ جزا کا باعث درحقیقت اپنی خاصیت سے حظیرۃ القدس کی طرف اسی جز کی کشش ہے لہٰذا وہ صفات جو اس مقام کے مناسب ہیں رُوح ہوائی پر مرتکز ہوں تو راحت و انس پائے گا۔ اور اگر ایسی صفات جو اس مقام کے حسبِ حال نہیں، روح ہوائی میں پائی جائیں تو وحشت اور نفرت محسوس

کرے گا، اس روح ہوائی کا روح علوی کے ساتھ وہی رابطہ ہے جو پارے میں چاندی کے جوہر سے رطوبت مائیہ کا ہوتا ہے۔ رطوبت اور چاندی آپس میں ایسے یکجان ہو گئے ہیں کہ ان کا جدا ہونا بہت مشکل ہے، باسمجھ لوگ یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس کا بہاؤ رطوبت کی وجہ سے ہے اور ثقل چاندی کی وجہ سے۔ اسی طرح روح علوی اور روح ہوائی باہم ایسے مل گئے ہیں کہ ان میں تفریق ممکن نہیں، اور کشش کے تقاضے سے ان میں سے ہر ایک دوسرے کی طرف کھنچتا ہے اور ہر ایک دوسرے کی صفات مثلاً درد سے رنجیدہ اور راحت سے مسرور ہوتا ہے۔ اور نفسِ ناطقہ کی خصوصیت اس روح ہوائی کے ساتھ اس کے بدن کے مختلف اجزا کو جمع کرنا اور ان میں گرہ لگانا ہے جیسے کہ ہم نفسِ نبات میں دیکھتے ہیں کہ مختلف اجزا کو یک صورت بنا کر ان میں گرہ لگاتا ہے، اور اگر اسے جڑ سے کاٹ ڈالا جائے تو بھی اس کے اجزا کے منتشر ہونے کے لئے ایک مدت درکار ہے۔ اسی طرح نفسِ ناطقہ روح ہوائی کے اعضاء کو باہم ملا کر ان میں ایک مزاج پیدا کر دیتا ہے۔ پھر اگر روح ہوائی اور بدن لحمی کے درمیان موت حائل ہو جائے تو وہ بدن کی غذا اور اس کے نشو ونما کے نظام کو درہم برہم کر دیتی ہے، اس وقت روح ہوائی کی مثال اس شخص کی ہوگی جس کے ہاتھ پاؤں کٹے ہوئے ہیں، اور نفس بدستور اس کی تدبیر میں مصروف رہتا ہے، اور روح ہوائی میں حسِ مشترک، متصرفہ، واہمہ، خیال اور حافظہ بدستور باقی رہتے ہیں، اسی طرح اخلاقِ فاضلہ اور ہر آن پیدا ہونے والا عزم بھی اپنی حالت پر قائم رہتا ہے۔ اگر بصر اور سمع ختم ہوگئی ہے تو حسِ مشترک اس کی قائم مقام بن جاتی ہے کیونکہ دنیا میں عرصہ دراز تک سمع و بصر کے ذریعہ ادراک ہوتا ہے، اور آدمی اس صورت سے آشنا اور اس کا خوگر ہوتا ہے، تو اب جدائی کے بعد نفس ناطقہ کے فیضان بلکہ مصلحت کلیہ کے سبب جو اس جگہ مصلحت جزئیہ کی طرف منتقل ہوگئی ہے، وہی حسِ مشترک سمع و بصر کا کام دیتی ہے اور معمولی سی توجہ سے مبداء فیاض کی عنایت سے وہ سنی اور دیکھی جانے والی صورت اس پر اس طرح فائض ہوتی ہے جیسے نتیجے کا فیضان قوت دراکہ پر جس وقت وہ حدس (۱) کی صورت میں بعض مقدمات کا ملاحظہ کرتی ہے۔

نفس ناطقہ کی خاصیت یہ ہے کہ وہ اپنی اصل کے اعتبار سے نفسِ کلیہ میں فانی ہے، اور عروق

(۱) حدس: دانائی، تیزفہمی، زیرکی۔

ماساریقا(۱) کے راستے انانیت کبریٰ کے داعیہ کو قبول کرتا ہے، اور روح ملکوت کی راہ سے ملائکہ سے الہام اور حظیرۃ القدس کا مشاہدہ کرتا ہے، اگر روح ہوائی روح ملکوت سے مغلوب ہو جائے تو وہ فرشتوں کے مشابہ ہو جاتا ہے، ملاء اعلیٰ کے فرشتے ہوں، خواہ ملاء سافل کے، ان دو لطیف اجزا اور روح ہوائی کے درمیان پانچ لطائف پیدا ہوتے ہیں، اور ان کی پیدائش کا راز یہ ہے کہ یہ دونوں لطیف اجزا روح ہوائی کے ساتھ قائم ہوتے ہیں اس پر اعتماد کرتے ہیں، اور اس کے ساتھ عشق و محبت کے تعلق پیدا کر لیتے ہیں، پس لامحالہ ہر دو اجزا کا فیض رُوح ہوائی کی قوتوں کے تنوع کے باعث متنوع ہوگا، لہٰذا وہ قوت کہ جس کا زیادہ حصہ جگر میں ہے وہ نفسِ شہوانی ہے، اور وہ قوت کہ جس کا زیادہ حصہ اس صنوبر جیسی شکل والے گوشت کے ٹکڑے میں ہے جو ملکات اور اخلاق کا حامل ہے، قلب ہے، اور وہ قوت کہ اس کا بہتر حصہ دماغ میں ہے اور اس کا خاصہ، معقولات اور متوہمات کا ادراک ہے، عقل ہے نفس، قلب اور عقل ان تمام کا مَسکن اور مقر، روح ہوائی ہے مگر دو لطیف اجزا کا فیض اس زمین کی طرح قبول کرتی ہے، جو کسی چشمے سے متصل ہونے کی وجہ سے تر و تازگی حاصل کرتی رہتی ہے یا جس طرح بدن عروق ماساریقا کے ذریعے جگر سے تر و تازگی حاصل کرتا ہے، ان تینوں قوتوں سے یہ تین چیزیں پیدا ہوتی ہیں، لیکن نفس روح ہوائی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے، اور عقل روح سماوی سے اور قلب نفسِ ناطقہ سے، اس لئے متقدمین صوفیا نے اپنی تمام شاخوں سمیت اصل لطیفۂ انسانیہ قلب ہی کو قرار دیا ہے، اور انہوں نے عقل کو رُوح کی زبان فرض کیا ہے، جب سالک رُوح ہوائی کے تسلط سے چھٹکارا حاصل کر لیتا ہے، اور اس کا واسطہ دو لطیف اجزا سے پڑتا ہے تو اس کا قلب روح بن جاتا ہے اور اس کی عقل سرّ ہو جاتی ہے پھر قلب اور روح کے درمیان فرق یہ ہے کہ قلب روح ہوائی کی وہ قوت ہے، جو جسم کی گہرائیوں سے پھوٹ کر پھیل جاتی ہے مگر وہ ہر دو لطیف اجزا کے فیضان کی رہینِ منّت اور ان کی تری سے سیراب ہوتی ہے، اور روح انہی دو لطیف اجزا سے عبارت ہے جو آپس میں ملی ہوئی ہیں، روح ہوائی کے لباس میں اور اس پر بھروسہ کیے ہوئے ہیں۔

عقل اور سرّ کے درمیان فرق یہ ہے کہ عقل روح ہوائی کی وہ قوت ہے جو دماغ میں

---

(۱) عروق ماساریقا: وہ باریک رگیں جو آنتوں سے رطوبت جذب کر کے جگر تک پہنچاتی ہیں۔

جاگزیں ہے لیکن ان دو لطیف اجزا کے فیض سے مستفید اور ان کی تری سے سیرابی حاصل کرتی ہے اور سرّ آپس میں مربوط ان دو اجزائے لطیف سے عبارت ہے جو روح ہوائی کے لباس میں ملبوس اور اس پر اعتماد کیے ہوئے ہیں، اس لیے روح قلب سے کہیں زیادہ لطیف ہے، اور سرّ عقل سے زیادہ منور ہے قلب کا کام وجد، روح کا کام محبت، عقل کا کام یقین، اور سرّ کا کام مشاہدہ ہے، ہر دو مراتب میں فرق نمایاں ہے۔

جب سالک روح ہوائی سے مکمل طور پر فراغت حاصل کر لیتا ہے اور اسے ان دو لطیف اجزا سے واسطہ پڑتا ہے جو آپس میں سیماب کی شکل میں ملے ہوئے ہیں، تو اس وقت سالک تین حالتوں سے خالی نہیں ہوگا۔ یا روح ملکوت اسے اپنی طرف کھینچے گی اور وہ روح القدس میں مل کر محو ہو جائے گا، اس کے بعد از سرِ نو بقا حاصل کرے گا۔ اور اس کی یادداشت بحال ہو جائے گی اور یہ طریق نبوت ہے۔

یا نفس ناطقہ اسے اپنی طرف کھینچتا ہے اور وہ انانیت کبریٰ میں فنا ہو جاتا ہے اور پھر از سرِ نو بقا حاصل کر کے اپنے آپ میں واپس آ جاتا ہے اور یہ ولایت کبریٰ کا مقام ہے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ وہ مذکورہ دونوں صورتوں کا پوری طرح جامع بن جاتا ہے اور یہ مرتبہ الجمع (۱) اور جمع الجمع کے مقام پر فائز ہونے والا دو طرح پر الہام سے فیضیاب ہوتا ہے کبھی نفس کلیہ کی طرف سے اس پر الہام ہوتا ہے۔ اور انانیت کبریٰ کا داعیہ اس پر طراوت کا فیضان کر رہا ہوتا ہے، اور کبھی روح القدس کی طرف سے اس پر الہام کیا جاتا ہے اور ملأ اعلیٰ کے ارادے عروق ماساریقا کی طرح اس پر نازل ہوتے ہیں۔ مجھے (۲) امید ہے کہ میں اس آخری قسم پر فائز ہوں گا۔

وراء ذاک فلا اقول لانہ　　　　سرّ لسان النطق عنہ اخرس

(اس کے علاوہ کیا ہے اس کے بارے میں مَیں کچھ نہیں کہتا کیوں کہ یہ ایک ایسا راز ہے کہ جس کے بیان سے نطق کی زبان عاجز ہے۔)

---

(۱) اس حقیقت کا انکشاف کہ خلق حق سے قائم ہے، اس مقام پہ حق کا جمیع موجودات میں مشاہدہ ہوتا ہے۔ سالک یہاں حق کو خلق سے اور خلق کو حق سے دیکھتا ہے اور حق و خلق کو خلق میں دیکھتا ہے یعنی خلق کو خلق اور حق کو حق دیکھتا ہے اور ہر ایک کو دوسرے کا عین پاتا ہے۔

(۲) مراد حضرت شاہ صاحب کی ذات گرامی ہے۔ ان کے یہاں عموماً اس قسم کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔ (قاسمی)

فصل ۴

حکمتِ تخلیق کے مطابق برسہ

لطائف ظاہرہ کی تہذیب کا بیان

نقل سے یہ بات ثابت ہے کہ " لطیفہ انسانیہ کی تین شاخیں ہیں، قلب، نفس اور عقل، حدیث میں حضرت خاتم النبین صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے آپؐ نے فرمایا:

'بلاشبہ انسان کے جسم میں ایک لوتھڑا ہے۔ اگر وہ صحیح ہوتا ہے تو سارا جسم درست رہتا ہے اور اگر اس میں خرابی پیدا ہو جاتی ہے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے۔ اور وہ لوتھڑا قلب ہے۔" ایک دوسری روایت میں ہے۔

" دل کی مثال اس پر کی طرح ہے جو بیابان میں پڑا ہو اور اسے ہوائیں ایک سے دوسری طرف الٹتی پلٹتی رہیں۔"

ایک اور حدیث میں وارد ہے کہ:

" نفس ارادہ و خواہش کرتا ہے، لیکن کبھی اس کی پیروی کی جاتی ہے اور کبھی نہیں کی جاتی۔"

اسی طرح ایک روایت میں ہے:

" آدمی کا دین اس کی عقل ہے، جسے عقل نہیں اس کا دین نہیں۔"

اور ان الفاظ کے استعمال کے مواقع پر نظر ڈالنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اتباعِ خواہشات اور تقاضائے لذات کی نسبت نفس کی طرف کی گئی ہے۔ اور کسی کام کا عزم، ارادہ، محبت، عداوت، بہادری، اور بزدلی اور اس قسم کی دوسری صفات دل کے اوصاف ہیں، اور فہم و معرفت اور جن چیزوں پر یقین کرنا چاہئے ان پر یقین و اعتماد عقل کے کام ہیں، حکماٗ نے نفس ناطقہ کی تین قسمیں بیان کی ہیں قوئی طبیعہ، قوئی حیوانیہ اور قوئی ادراکیہ، قسم اول کا مقام جگر ہے، دوسری کا دل اور تیسری کا دماغ!

یہ مباحث انہوں نے اپنی کتابوں میں تفصیل کے ساتھ بیان کیے ہیں، اور یہ ان کے مشہور مسائل میں سے ایک ہے لیکن ان کے تفصیلی مباحث اس کتاب کے موضوع سے خارج ہیں۔

دراصل نفس کا اصلی کام اقتضائے خواہشات اور اتباع لذات ہے، اسی طرح جسم کی ساخت کو قائم رکھنا اور اس کے لئے جو چیزیں ضروری ہیں، انہیں فراہم کرنا، اور ان چیزوں کا دفع کرنا کہ جنہیں دور کرنا بدن کا طبعی تقاضا ہے، بھوک، پیاس، بول و براز کی ضرورت، کسل والم اور نیند اور غلبۂ شہوت سب نفس کی وجہ سے ہوتے ہیں، اور یہ مقدار ضروریاتِ زندگی میں سے ہے البتہ سخت ریاضتوں اور مجاہدوں سے اس کی فطرت بدل کر اسے اس کے مزاج سے نکال لیتے ہیں، اور قلب کا کام، غصہ وندامت، خوف و جرأت، فیاضی و بخل اور محبت، عداوت ہے، ہر شخص یہ بات بخوبی جانتا ہے کہ کسی چیز سے ناپسندیدگی کس طرح پیدا ہوتی ہے اور اسے اپنے آپ سے دفع کرنے میں اس کا دل کس قدر پُر جوش ہوتا ہے، رُوح باہر کی طرف متوجہ ہوتی ہے اور آدمی کی رگیں کیوں کر پھول جاتی ہیں۔ اسی طرح ڈر کی حالت میں انسان کا دل لرزتا ہے، روح اندرونِ بدن چلی جاتی ہے، چہرے کا رنگ زرد پڑ جاتا ہے اور حلق خشک ہو جاتا ہے، اسی طرح دل کی دوسری صفات ہیں، اور عقل کا کام گزشتہ باتوں کا یاد رکھنا اور آئندہ امور کے متعلق سوچنا ہے، ہر شخص بذاتِ خود ان باتوں کا تجربہ حاصل کر لیتا ہے۔

لطیفہ انسانیہ کی یہ تینوں شاخیں ایک حیثیت سے ایک دوسرے سے جدا اور دوسری حیثیت سے متحد ہیں، ان کے تباین کی وجہ یہ ہے کہ نفسِ ناطقہ نے نسمۂ ہوائیہ اور ارواحِ طبیعہ میں حلول کیا ہوا ہے، ان کا مُقوِّم اور معتمد ہے اور یہ ارواح مختلف مقامات اور متعدد مزاجوں کی حامل ہیں، ایک شخص کی طبعی قوت بہت طاقتور اور مضبوط ہوتی ہے، وہ کھانا بھی اچھی طرح ہضم کر لیتا ہے اس کی اخذ وبطش اور جماع کی قوت بھی بہت مضبوط ہوتی ہے، لیکن اس کے باوجود قلبی صفات اور عقلی ادراکات کے اعتبار سے وہ انتہا درجے کا کند ذہن، احمق اور بے وقوف ہوتا ہے، غصہ و جرأت یا خوف وخجالت اس میں بہت دیر سے ظہور پذیر ہوتے ہیں، اور بہت جلدی ختم ہو جاتے ہیں، اسی طرح گزشتہ باتوں کی یادداشت، مستقبل کی سوچ بچار، مفید چیز کے فائدے اور مُضر باتوں کے ضرر و نقصان کی پہچان کے سلسلے میں وہ بالکل ناکارہ ہوتا ہے، ایسے شخص کو نباتات سے تشبیہ دی

جا سکتی ہے۔

ایک دوسرا شخص جرأت وغیرت، سخاوت ووقار ایسے صفات سے مُتّصِف بلکہ ان صفات میں اپنے اقران واماثل سے بھی بلند ہوگا، مگر طبعی اور عقلی قوتوں کے اعتبار سے دوسروں کے عُشر عشیر نہیں ہوگا، اس شخص کی مثال نر جانوروں اور درندوں کی ہے، ایک اور شخص یادداشت انتظامی امور اور اس قسم کی دوسری باتوں میں اپنے ہمسروں سے کہیں زیادہ فائق ہوگا، مگر قوئ طبیعہ اور عقلیہ سے بے بہرہ ہوگا، ایسے شخص کو ملائکہ سفلیہ کے ساتھ تشبیہ دی جا سکتی ہے، اگر لوگوں کے حالات پھر ان کے بعض پہلوؤں کی قوت اور بعض کے ضعف کا جائزہ لیا جائے اسی طرح ان کے مقامات کے اختلاف اور ان میں سے ہر ایک میں خلل پیدا ہونے سے جبکہ ان میں اخلاط کے رویہ کا غلبہ ہو، تو لازمی طور پر یہ بات ماننا پڑتی ہے کہ یہ شعبے باہم مختلف اور ایک دوسرے سے جدا ہیں، اور ان میں اتحاد کی وجہ یہ ہے کہ نفس ناطقہ جو ان شعبوں کا مقوِم ہے وہ ایک ہے اور اس کے اصل مزاج میں کوئی فرق نہیں، یہ تینوں فوارے ایک ہی منبع سے فیضیاب اور یہ نہریں ایک ہی دریا سے سیراب ہو رہی ہیں، اس کے باوجود ان میں سے ہر ایک اپنے دائرۂ کار میں دوسرے کا محتاج ہے، اگر نفس قلب کی موافقت نہ کرے تو رگیں پھولیں گی اور نہ ارواح کا ظہور وغلبہ ہوگا، اور اسی طرح جب تک عقل دل پر خطرے کی گھنٹی نہ بجائے، نفرت اور جذبہ انتقام کا ظہور کیونکر ہوگا؟ ایسی معرفت کہ جس کے ساتھ عزمِ قلب شامل نہیں، وہ صرف حدیث نفس کا حکم رکھتی ہے، اور ایسا ادراک جو طبعی قوتوں کی بدولت حاصل ہوا ہے جو حواس کا خاصہ ہیں، اگر اسکے ساتھ تصدیق وایقان شامل نہیں، تو اس کی مثال، لُولے لنگڑے انسانوں کی ہے، اور وہ نفس کہ افعال طبیعہ کے صدور کے سلسلہ میں جس کے ساتھ قلب وعقل کی موافقت نہیں ہے، اس دو تین ماہ کے بچے کی طرح ہے جس میں سلامتی اور متانت ہے اور نہ قوت! پس دونوں کے اجتماع کی وجہ سے کہ ان میں باہم تباین بھی ہے اور اتحاد بھی! ''عروق، ماساریقا ان میں پھیلی ہوئی ہیں، ان کا تعلق قائم ہے۔ ان میں سے ہر ایک اپنا حکم دوسرے کی طرف القا کرتا ہے، اور اپنا وسوسہ ڈالتا ہے، چنانچہ یہاں سے بہت سارے اخلاق اور ملکات پیدا ہوتے ہیں، ان کی تشریح تفصیل کی متقاضی ہے البتہ اس مضمون کے لئے اس میں جو کچھ ضروری ہے وہ قلمبند کیا جاتا ہے، قلب وعقل کے نفس کے تابع ہو جانے کی وجہ سے کئی قسم کے

بُرے اخلاق پیدا ہوتے ہیں، اجمالی طور پر اسے نفس بہیمیہ سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے، مثلاً جماع سے لذت حاصل کرنا یا نظر ولمس سے لطف اندوزی ایسے امورِ قلب کو اپنا تابع بنا لیتے ہیں، اور ان امور کی محبت پورے طور پر دل میں جاگزیں ہو جاتی ہے، پھر عقل کو صورتِ محبوب کے تصور، اس کی یاد اور اس کے وصال کے طریقوں پر غور وفکر کا حکم کرتا ہے، انہی چیزوں کے مجموعے کا نام عشق ہے، اسی طرح کھانے پینے کی لذتیں عقلی اور قلبی قوتوں کو اپنے تابع بنا لیتی ہیں، ان صورتوں کو انسان ذرا سی توجہ سے پہچان سکتا ہے، اور نفس وعقل کے قلب کے تابع ہو جانے سے کئی طرح کے رذائل پیدا ہوتے ہیں اسے نفسِ سبعیہ کہا جاتا ہے، یہ نام ایک جز بول کر کُل مراد لینے کے قاعدے کے تحت ہے، ورنہ جوشِ غضب کے علاوہ نفسِ سبعی میں تو اور بھی بہت ساری چیزیں آتی ہیں۔ مثلاً دل کہ جس کی روح کا قوام گاڑھا ہے تاریک نہیں، اپنے ہمسروں پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور یہ ایک ایسی صفت ہے جو دل میں ودیعت کی گئی ہے، اور نفس اس کا معاون بن جاتا ہے، اگر کشتی لڑنے کا موقع درپیش آ جائے تو وہ نئی طاقت بہم پہنچاتا ہے اور ارواحِ طبیعہ کو ان کی مدد کے لئے روانہ کرتا ہے، اور اگر کھانے پینے اور مکان میں کچھ وقت کے لئے رکاوٹ پڑ جائے تو بغاوت وسرکشی اختیار نہیں کرتا، عقل بھی اس کی مدد کرتی ہے، اس کے لئے باریک تدبیریں اور لمبے چوڑے منصوبے سوچتی ہے، اور اگر قلب ونفس عقل کے مطیع وفرمانبردار ہو جائیں تو صفاتِ پسندیدہ ظاہر ہوتی ہیں، اور یہ نفسِ مطمئنہ کہلاتا ہے، مثلاً کوئی شخص عقل سے یہ بات سمجھ لے کہ نیک کاموں میں اس کی سعادت، اور بداعمالی میں بدبختی وشقاوت ہے، تو نفس اس کے حکم سے سرتابی کرے گا اور نہ ہی اس کی مخالفت پر کمربستہ ہوگا، بلکہ دل بھی محبت اور شوق سے اس چیز کے حصول میں کوشش کرے گا، اکثر دیکھا جاتا ہے کہ ایک ایسا آدمی جو بہت عقلمند اور ذہین ہے کوئی مصلحت سوچتا ہے مگر اسکے بعض اسباب وعوارض کی وجہ سے اس کے دل میں اس کام سے نفرت وکراہت پیدا ہوگئی، ایک عجیب لذت اس کے ہاتھ سے نکل رہی ہے تاہم قلب ونفس اس کی نافرمانی نہیں کرتے، مضبوط دل والے آدمی کو جب غصہ یا غیرت آتی ہے یا اس میں غم اور حیا کا ظہور ہوتا ہے تو نفس اپنے کام سے رُک جاتا ہے بھوک پیاس کا احساس ختم ہو جاتا ہے طعام کو ہضم کرنے اور فضلات کو خارج کرنے کی طاقت باقی نہیں رہتی، عقل اسے ہر چند ڈانٹ ڈپٹ کرتی ہے کہ غم وغصہ نہیں کرنا

چاہئے کیونکہ اس میں بہت نقصان ہے کوئی فائدہ نہیں، اس کے باوجود قلب کے حکم سے اسے سرتابی میسر نہیں ہوتی، اور قوی النفس مرد جو عورت سے وصال یا لذیذ طعام میں محو ہے، اگر چہ اس فعل پر لوگوں کے مواخذہ کا خوف بھی اس کے دل میں گزرتا ہے، اور عقل اس کے سامنے گالی گلوچ اور مار پٹائی کی ساری متوقع صورتیں بھی پیش کرتی ہے تاہم اس کی مثال اُس خر کی ہے جو اپنی ہم جنس کے اتصال یا گھاس چارے پر ٹوٹا ہوا ہے اس وقت وہ مار پیٹ سے بے نیاز ہو کر اپنے کام میں مشغول ہوتا ہے، یہ ساری صورتیں عقلمند اور دانا شخص کو آگاہ کرتی ہیں کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کو مغلوب اور اس کی امداد و اعانت کرتا ہے، کبھی عقل اس فعل کی برائی معلوم کر لیتی ہے، اور اس کے برے انجام سے باخبر ہو جاتی ہے، مگر اس کا حکم نافذ نہیں ہو سکتا اور کبھی عقل عروق ''ماساریقا'' کے راستے اس غالب ہونے والے نفس کے مناسب علوم کو جذب کرتی ہے، اور وہ اسی چھٹکارے کو مصلحت اور تدبیر حقیقی سمجھتی ہے، اور اپنے پہلے یقین سے رجوع کر لیتی ہے، چنانچہ خطاء اجتہادی کی سی ایک کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور اس برائی سے بسا مشکل نجات حاصل ہوتی ہے، اور کبھی دل معشوق کی محبت سے معمور ہوتا ہے لیکن مادۂ منویہ مفقود ہوتا ہے یا دل غیرت اور انتقام کے جذبات میں سرگرم ہوتا ہے مگر جسمانی طاقت ساتھ نہیں دیتی، اور کبھی نفس اس کا معاون بن کر جسم کی گہرائیوں سے مادۂ منویہ اور کثیف ریاح آلۂ تناسل میں گراتا ہے اور اس میں ایک ایسی نئی طاقت پیدا کرتا ہے جو آرام کی حالت میں محسوس نہیں ہوتی تھی، اس بیماری کا علاج بھی بہت ہی مشکل ہے، یہ اخلاق و خصائل جبلی ہوتے ہیں اور ان کا زائل کرنا ناممکن ہے، البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ شدید ریاضتوں سے یہ پردۂ خفا میں چلے جائیں، اور پھر بقا کے وقت ظاہر ہو جائیں، ہاں ان کی تہذیب و تربیت کی صورت یہ ہے کہ انہیں ان کے مصرف میں استعمال کیا جائے صرف ضروری مقدار پر اکتفا کرتے ہوئے زائد سے احتراز کیا جائے یا ایسی ہی دوسری تدابیر اختیار کی جائیں واللہ اعلم۔

الغرض یہ بات اچھی طرح جان لینی چاہیے کہ نفس کا شعبہ جگر میں اقامت پذیر ہے، قلب کا شعبہ اس گوشت کے لوتھڑے (دل) میں، اور عقل کا شعبہ دماغ میں، اور نفس بہیمی سارے بدن میں جاری و ساری ہے، البتہ جگر میں اس کے پاؤں زیادہ مضبوط ہیں، اسی طرح نفسِ سبعی سارے

جسم میں جاری ہے لیکن دل میں اس کا قدم زیادہ پختہ ہے اور نفسِ مطمئنہ بھی سارے بدن میں نافذ ہے البتہ اس کا پختہ قدم دماغ میں ہے، نیز یہ بھی معلوم رہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان میں دو قوتیں پیدا فرمائی ہیں ایک قوت ناسوتیہ ارضیہ، اسے ہم قوتِ بہیمیہ کے نام سے بھی موسوم کرتے ہیں، اسی قوت کی وجہ سے انسان جانوروں اور درندوں کی برابری کرتا اور ان کے دائرے میں داخل ہوتا ہے، اور دوسری قوت ملکیہ ہے جس کی وجہ سے انسان فرشتوں کی برابری کرتا اور ان کے زُمرے میں داخل ہو جاتا ہے، اور تہذیبِ نفس سے مراد یہ ہے کہ قوت ملکیہ کے ذریعے قوتِ ناسوتیہ میں تصرف کیا جائے، قوتِ ملکیہ کے احکام ظاہر ہوں اور قوت بہیمیہ کے آثار کم ہو جائیں یا پردۂ خفا میں چلے جائیں اور یہ مسئلہ حکمتِ خلقی سے نہیں بلکہ تہذیب شرع سے تعلق رکھتا ہے البتہ حکمتِ خلقی سے قریب تر ہے، اللہ ہی حقیقت حال بہتر جانتا ہے۔

چونکہ لوگ تینوں شعبوں اور نفوسِ مذکورہ میں مختلف ہیں، اس لیے تہذیب کے شعبے بھی مختلف ہوں گے، اس سلسلے میں بات کافی طویل ہوگئی ہے، نیز یہ بھی معلوم رہے کہ بسا اوقات ان تینوں طبقوں کے شعبے اور ان کی تہذیب کے مراتب ایک دوسرے سے متمیز ہوں گے، ہر ایک کی علیحدہ صورت اور ڈھانچہ ہوگا، یہاں تک کہ بعض سالکین اشتباہ میں پڑ جاتے ہیں اور انہیں حیرت ہوتی ہے کہ ان مختلف صورتوں اور شکلوں میں اتحادِ شعبہ کیا ہے؟ لیکن پختہ کار سالکین ان کو جدا جدا صورتوں میں اچھی طرح جانتے اور ان کے اصول و فروع سمیت ان کے اتحاد سے باخبر ہوتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ حق بات فرماتا ہے اور راہِ ہدایت کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

............☆☆☆............

فصل ۴

طبِ روحانی جسے اللہ تعالیٰ نے خاص و عام سب لوگوں کے لئے نازل فرمایا ہے اور اسے شریعت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے

جوارح اور لطائف ثلاثہ ظاہرہ کی تہذیب کا بیان

ان لطائف کی تہذیب و تربیت کا پہلا مرتبہ طبیعت سے شریعت کی طرف خروج ہے، اور اگر شریعت کی حقیقت سمجھنا چاہتے ہو تو خوب یاد رکھو کہ لوگ نفس امارہ کے اسیر تھے، شیطان پوری طرح ان پر غالب ہو چکا تھا، اور یہ اس مقام پر پہنچ گئے تھے کہ اگر اسی حالت میں مر جائیں تو سارے کے سارے عذاب قبر اور یوم حساب کی سزاؤں میں مبتلا ہو جائیں اور چند لوگوں کے سوا ان میں سے کوئی بھی نجات حاصل نہ کر سکے، چنانچہ زمین و آسمانوں کے منتظم حقیقی نے اس مشتِ خاک پر اپنی رحمتِ کاملہ کا نزول فرمایا، اور اس کے لئے تدبیر کلی کا ایک حصہ عنایت کیا، اور بعض حالات میں تدبیر کلی تدبیر جزئی تک پہنچاتی ہے، چنانچہ اس نے انسانوں میں سے ایک ہستی کو منتخب فرما کر اس کے دل میں اُن اشیاء کے علوم کا فیضان کیا جن سے اس عمومی بیماری کا علاج ہو سکتا ہے، اور چار و ناچار اسے اس بات پر تیار کیا کہ وہ علوم لوگوں کو سکھلا دے، چاہے وہ اسے پسند کریں یا نہ کریں، اور لوگوں کو اس کا پابند بنائے، اس بیماری کے لئے جو علاج تجویز ہوا اسے شریعت کہتے ہیں، اس علاج میں توجہ اس نوع کی صورت نوعیہ اور اس کے کلی خواص (عالم انسان) کی طرف ہوتی ہے، کسی ایک فرد کی خاص استعداد کی طرف توجہ نہیں ہوتی، اور اس علاج سے بنیادی مقصد یہ ہے کہ انسانیت دنیا میں ظلم، اور آخرت میں قبر اور حشر کے عذاب سے بچ جائے، واضح رہے کہ اس سے لطیفہ فنا و بقا کا وصال یا بقا مطلق اور تمکین تام کا حصول ہر گز مقصود نہیں ہے، خلاصۂ بشر علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیمات کی ذاتِ گرامی سے جو بات بھی تمہیں پہنچے اس کا اصلی محمل یہی ہے جو شخص اسے کسی دوسرے مراتب پر محمول کرتا ہے وہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اوامر و نواہی کے متقاضی و مصالح کو نہیں سمجھا، ہاں یہ علیحدہ بات ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سارے مراتب

ایک دوسری طرح سے ذکر فرمائے ہیں، اور ان تمام کمالات کی طرف رہنمائی فرمائی ہے، اور اس کی مثال اس طرح ہے، سورج خربوزے کو پکا دیتا ہے اگرچہ سورج کو اس بات کا علم نہیں کہ زمین میں خربوزہ بویا ہوا ہے، اور نہ خربوزہ یہ بات جانتا ہے کہ اس کی تکمیل آفتاب پر موقوف ہے یا موسم سرما گرم مزاج آدمی کو تر و تازہ بنا دیتا ہے۔ اگرچہ ان میں سے ہر ایک ایک دوسرے کو پہچانتا ہے اور نہ اس کے احسان کا قائل ہے، اسی طرح وہ نفوس کلیہ کہ جنہیں مبداء فیض نے مصلحت کلیہ سے زمین پر اتارا ہے۔ نفوسِ ناقصہ کی تکمیل کرتے ہیں، اور اس مقام پر ان کے درمیان پیغام و کلام کا کوئی رابطہ نہیں ہوتا۔ ہاں البتہ ان نفوس میں سے ذکی لوگ کسی نہ کسی طرح اس احسان کا عرفان حاصل کر لیتے ہیں، اور اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس برزخ (آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی) کے کلمات اور فرمودات سے اشارہ کنایہ کے طور پر ان اسرار و رموز کا استنباط کرتے ہیں۔

بہر طور جو بات میں نے اس برزخ اعظم (۱) صلی اللہ علیہ وسلم سے معلوم کی ہے وہ یہ ہے کہ ان اعتبارات سے اس قصد کے ساتھ جس طرح لوگ لفظ قصد سے سمجھتے ہیں اور ہر لحظہ تجدد اس کا خاصہ۔ ہے ان معانی کا ارادہ بھی نہیں فرمایا جیسا کہ آگ کا ارادہ اوپر کی طرف اور زمین کا ارادہ نیچے کی طرف ہوتا ہے، یہ الگ ہے، چونکہ میرے دل میں یہ خیال پختہ طور پر ڈالا گیا ہے کہ میں قصدِ طبعی کو قصدِ متجدد سے متمایز کروں! اور ہر باب میں صوفیا کی تعبیرات کے تسامح سے جو خرابیاں پیدا ہوئی ہیں، انہیں نظر انداز کر دوں! اس لئے ان باریکیوں میں اہلِ بصیرت کے نزدیک، میں معذور سمجھا جاؤں گا، اور جو کچھ ہم کہتے ہیں اللہ تعالیٰ اس پر نگران ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اس تدبیر کا حاصل یہ ہے کہ انسان کے اندر دو قوتیں ودیعت کی گئی ہیں، قوت ملکیہ اور قوتِ بہیمیہ، پھر ہر ایک کے علیحدہ علیحدہ خواص ہیں جو اس کی امداد کرتے ہیں، اس لئے مناسب ہے کہ انسان خواص ملکیہ اختیار کرے تا کہ یہ قوت قوی تر ہو جائے اور قوتِ بہیمیہ قوتِ ملکیہ کے تابع اور اس کے رنگ میں رنگی جائے نہ یہ کہ قوتِ بہیمیہ اپنی طبیعت اور مزاج سے ہی نکل آئے یا قوتِ بہیمیہ قوتِ ملکیہ میں بدل کر قلبِ حقیقت اختیار کر لے، پس اللہ تعالیٰ نے

(۱) وہ چیز جو دو مختلف چیزوں، کے درمیان واصل و فاصل ہو، "برزخ البرازخ" "برزخ جامعہ"، برزخِ اعظم، برزخ اکبر، برزخ کبریٰ سب حقیقتِ محمدیؐ کے نام ہیں جو ظہور و بطون کے درمیان واسطہ ہے۔

چار خصلتوں کے بارے میں خاص طور پر آگاہ فرما کر ان کی حفاظت کا حکم دیا ہے اور ان کی مخالف خصلتوں سے منع فرمایا ہے اگر تم غور سے دیکھو تو برّ کی تمام قسمیں درحقیقت انہی چار خصلتوں کی تشریحات و تفصیلات پر مبنی ہیں اور اثم (گناہ) کی تمام تفصیلات ان چار خصلتوں کے اضداد پر مشتمل ہیں، یہ چار وہ خصائل ہیں کہ تمام انبیائے کرام علیہم السلام ان کی دعوت دیتے اور انہیں اختیار کرنے کا حکم دیتے رہے ہیں، نہ یہ منسوخ ہو سکتی ہیں اور نہ ان میں کسی قسم کے تغیر و تبدل کی گنجائش ہے۔ شارع کا اختلاف ان کی ظاہری صورت میں ہے ان کی حقیقت اور اصلیت میں کوئی اختلاف نہیں۔

دم بدم گر شود لباس بدل
مرد صاحب لباس را چہ خلل

(اگر ہر لحظہ لباس بدلتا ہے تو اس سے صاحبِ لباس میں کیا نقص واقع ہو سکتا ہے)

ان چار خصلتوں میں سے پہلی طہارت ہے، اس کے ذریعے انسان فرشتوں سے مناسبت پیدا کرتا ہے، دوسری خصلت عاجزی ہے اس کے سبب انسان ملاءِ اعلیٰ کے ساتھ مشابہت حاصل کرتا ہے، تیسری خصلت سخاوت ہے اس کے ذریعے ان خسیس بشری صفات جو انسان کو درندگی اور خواہشات نفس کی بنا پر دامن گیر ہوتے ہیں سے اپنی جان چھڑاتا ہے اور پاکیزگی و صفائی کی نعمت حاصل کرتا ہے، چوتھی خصلت عدالت ہے اور اس کے ذریعہ انسان ملأ اعلیٰ کی رضامندی، ان کی موافقت اور ان کی شفقت و رحمت حاصل کرتا ہے، شریعت کی تدبیر دو طرح سے انسانیت کی فلاح کے لئے سرگرم عمل ہے ایک یہ کہ اچھے اعمال کے اکتساب اور برے اعمال جنہیں کبائر کہا جاتا ہے کے ترک سے انسان کی اصلاح اور ملتِ حقہ کے شعائر کا قائم کرنا، مگر یہ تینوں باتیں وقت اور حد کی پابند ہیں، اور تمام مکلفین کے لئے ان کی پابندی لازمی قرار دی گئی ہے یہی ظاہر شرع ہے جسے اسلام بھی کہا جاتا ہے، دوسرے ان چار خصلتوں کے ذریعے نفوس کی تہذیب، برّ کی مثالی صورتوں سے ان کے حقیقی انوار تک رسائی، اور گناہ کی ظاہری صورتوں کے ساتھ ساتھ ان کی معنوی صورتوں سے پرہیز یا وہ دوسری خرابیاں کہ جن کی نہی وارد ہوئی ہے کہ ترک کا نام باطنِ شرع ہے اور اسی کو احسان کہتے ہیں، اور جب شریعت نے ان تدابیر کے ذریعہ لوگوں کی تربیت کی

اور چار و ناچار انہیں اس پر آمادہ کیا تو یہ سمجھنا چاہئے کہ لوگ ان اثرات کو قبول کرنے کے سلسلے میں فطری اور کسبی طور پر مختلف واقع ہوئے ہیں، یہ تین قسم کے افراد ہیں چنانچہ قرآن مجید کی اس آیت میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے:

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ وَ مِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرَاتِ. (۱)

(پھر یہ کتاب ہم نے ان لوگوں کو پہنچائی جن کو ہم نے تمام دنیا کے بندوں میں سے پسند فرمایا پھر بعضے تو ان میں سے اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہیں اور بعض ان میں متوسط درجے کے ہیں، اور بعضے ان میں خدا کی توفیق سے نیکیوں سے ترقی کیے چلے جاتے ہیں)

یعنی ہم نے اُمتِ محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ کو کتاب کا وارث بنایا ہے جو اپنی ہیئت اجتماعیہ میں تمام امتوں سے بہتر اور برگزیدہ ہے، اس میں سے بعض نے تھوڑا اثر قبول کیا ہے اور بعض پورے طور پر متاثر ہوئے ہیں اور کچھ دوسرے درمیانی حالت میں ہیں، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جب قوت ملکیہ قوت بہیمیہ کے متصادم ہوتی ہے تو تین حالتوں سے باہر نہیں ہوتی، یا قوتِ بہیمیہ غالب ہوگی، اور قوتِ ملکیہ اس کی مغلوب و مقہور، خاص اوقات کے علاوہ قوتِ ملکیہ کا کوئی اثر ظاہر نہیں ہوتا، اور نہ ہی اپنی خاص صفات سے محظوظ ہوتی ہے، اس شخص پر اگر برے اعمال اور ضرر رساں افعال غالب ہوں گے تو اسے فاسق کہا جائے گا، اور اگر اس میں ملکات سیئہ اور اخلاقِ فاسدہ قوی ہوں تو وہ عملی منافق ہے، اور اگر قوتِ بہیمیہ اور قوتِ ملکیہ باہم متصادم ہوں اور قوتِ ملکیہ نے قوتِ بہیمیہ کا گلا مضبوطی سے دبا رکھا ہو لیکن ابھی تک قوتِ بہیمیہ کے ہاتھ پاؤں کھلے ہوں اور وہ اس سے نجات حاصل کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہی ہے اور قوتِ ملکیہ اس کی پکڑ دھکڑ سے فارغ ہے اور نہ اس کے مقابلے سے دست کش ہوئی ہے، تو ایسے شخص کو ''صاحب الیمین'' کہتے ہیں۔

اس صورت میں بعض بہیمی قوتوں کے باقی رہ جانے کا سبب ان دو باتوں میں سے ایک بات ہوگی، پہلی یہ کہ فطری طور پر قوتِ سبعیہ یا قوتِ عقلیہ کمزور واقع ہوئی ہے، اس کے باوجود وہ

---

(۱) فاطر: ۳۲

کثرت سے نیک عمل کرتا ہے اس طرح ان نیک اعمال سے وہ نتیجہ اور فائدہ حاصل نہیں ہوتا جس کی ضرورت ہے، دوسری یہ کہ فطری طور پر تو یہ قوت صحیح پیدا ہوئی ہے لیکن اس نے نیک اعمال کی کثرت نہیں کی اور معاش وغیرہ میں کھو گیا ہے، اور اگر قوتِ ملکیہ مظفر و منصور ہو کر قوتِ بہیمیہ کو اسیر بنا ڈالے اور اسے زنجیروں میں جکڑ لے یا مسلسل فاقوں سے اس کی خواہشات ختم کر دے تو ایسا شخص ''سابق'' اور ''مقرب'' کے القابات سے یاد کیا جاتا ہے، اور اس شخص میں دو باتیں ضروری ہیں، سابق مذکور دونوں قوتیں اس میں صحیح طور پر پیدا کی گئی ہوں، اور نیک اعمال کی بھی کثرت کرے تا کہ عقل عقائد حقہ کی تربیت اور شائستگی حاصل کر لے اور قوتِ عازمہ قلبیہ کو اپنی گرفت میں لے کر اپنا تابع بنا لے، اور یہ قوتِ عازمہ جسے ہم سبعیہ کا نام دیتے ہیں، نفس کو ضبط میں رکھے تا کہ انسان ہر طرح قُربِ بارگاہ کے لائق ہو۔

اس مبحث میں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم تینوں اقسام میں سے ہر ایک کی علامات بیان کریں، اور ان قاعدوں کی تفصیلات بتائیں جو شارع علیہ السلام نے ان تینوں شعبوں کی تہذیب، اور ان تین قوتوں کے بارے میں ارشاد فرمائی ہیں، اس کے بعد وہ تہذیب جو اصلاح سے عبارت ہے اور وہ تہذیب کہ جس کا حاصل جبلت کی تبدیلی ہے کہ درمیان امتیاز اور ان میں وہ فرق جو شارع علیہ السلام نے بیان فرمایا ہے، بیان کریں گے، اور اللہ ہی سیدھے راستے کی طرف راہنمائی کرتا ہے، ظاہر شریعت میں جسے اسلام بھی کہا جاتا ہے اور جس کا بیان اس آیت میں ہے:

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا. (۱)

(یہ گنوار کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے، آپ فرما دیجئے کہ تم ایمان تو نہیں لائے لیکن یوں کہو کہ ہم مخالفت چھوڑ کر مطیع ہو گئے)

زیر بحث لطیفہ جوارح ہے جس چیز کا اقرار ضروری ہے اس کا اقرار کرنا اور جس چیز پر عمل کرنا لازمی ہے اس پر عمل کرنا اس لطیفہ کی تحقیق یہ ہے کہ قلب، نفس اور عقل اس حیثیت سے کہ جوارح کا قیام ان سے وابستہ ہے، اور افعال جوارح کی تکمیل کا آلہ، اور جوارح میں فنا ہیں، لطیفۂ جوارح کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، اسی لطیفے کی تفہیم کے لئے اس فقیر (شاہ ولی اللہ) کو ایک اونٹ دکھا

(۱) الحجرات: ۱۴

گیا جو قریب المرگ تھا، اور اس میں ایک معمولی سی رمقِ حیات کے علاوہ کچھ بھی باقی نہیں تھا، اس کے تینوں لطائف ظاہرہ، کمزور ہو گئے تھے لیکن شتر بانوں نے ابھی تک اسے اونٹوں کی قطار میں باندھ رکھا تھا اس میں چلنے کے علاوہ اور کچھ بھی طاقت نہیں تھی، وہ روح نکلنے کے آخری وقت تک چلتا رہا اور اس کے بعد مر گیا۔ اس کا چلنے سے رکنا عین وہی تھا جو اس کی موت تھی، چنانچہ اس حال میں مجھے آگاہ کیا گیا کہ یہ اونٹ لطیفہ جوارح میں فانی تھا، اعمالِ شریعت کا مواخذہ بھی اسی لطیفے پر ہوتا ہے اور شریعت کے اندر بحث بھی اسی لطیفے سے ہوتی ہے۔

الغرض شریعت میں فاسق کا علاج خارجی طور پر مقرر کیا گیا ہے، ہر طرف سے اس کا گھیراؤ کیا گیا ہے تا کہ وہ مجبوراً اس بُرے کام سے باز رہے مثلاً پہلے پہل عورتوں اور مردوں میں پردے کا حکم دیا گیا، اگر اس کی پابندی کی جائے تو کسی قسم کی برائی پیدا نہیں ہو گی، اس کے بعد اسبابِ بدکاری مثلاً حُسن نساء کے نظارے اور مردوں عورتوں کے باہمی اختلاط کو قابلِ سزا جرم قرار دیا گیا، پھر بدکاری پر ایک مقررہ سزا قائم کی گئی، اسی طرح شراب بنانے اور بیچنے پر پابندی عائد کی گئی، پھر شراب پینے والے پر حد مقرر کی گئی، اسی طرح دوسری باتیں سمجھ لیجئے، اگر خلافت کا نظام پورے طور پر نافذ ہو جائے تو فسق کا نام ہی باقی نہ رہے، یہ بحث ہماری اس کتاب کے موضوع سے خارج ہے۔

اصولی طور پر منافق کی تین قسمیں ہیں، پہلا وہ ہے کہ جس پر قوتِ طبیعہ اور نفسِ شہوانیہ نے غلبہ حاصل کر لیا ہے، قلب و عقل اس کے تابع اور نفسِ سبعیہ اور نفسِ دڑا کہ بھی اس کے مدد و معاون بن گئے ہوں، اس شخص کی کیفیت یہ ہے کہ یہ شریعت اور عقل کی اجازت اور منشا کے خلاف جہاں چاہے گا، جائے گا اور جو اس کے جی میں آئے گا وہ کر گزرے گا، مثلاً یہ شخص اپنی معشوقہ سے چمٹ جائے گا، چاہے عقل و شرع اسے روک رہے ہوں اور رواج و سماج میں یہ بات باعث ننگ و عار ہو! یہ اپنے کام میں مصروف رہے گا، اور کبھی یہ شخص شریعت کی کسی رخصت کو آڑ بنا کر لوگوں کی گرفت سے چھٹکارا حاصل کرتا ہے، اپنے طور پر بھی اپنے اس فعل کے جواز کے لئے کوئی نہ کوئی عذر تلاش کر لیتا ہے، پھر اس عذر کے ذریعہ شریعت کے تقاضے کو جو خود دل میں اس کے کمزور ایمان کے برابر ضعیف ہے، ٹالتا رہتا ہے، ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ نے اپنے اس فرمان میں ''دھوکہ باز''

فرمایا ہے:

يُخَادِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ.(۱)

(چالبازی کرتے ہیں اللہ سے حالانکہ اللہ اس چال کی سزا ان کو دینے والے ہیں)

اور ان کے سینے تنگ کرنے کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے:

اَلا اِنَّهُمْ يَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ . (۲)

(وہ لوگ دوہرا کیے دیتے ہیں اپنے سینوں کو)

کیونکہ اس مقام پر صدر سے مراد علوم صدر ہیں اور سینوں کو دوہرا کرنے سے مراد یہ ہے کہ حق کے خیال کو باطل نظریات سے چھپاتے ہیں اور اپنے علم کو جہالت میں تبدیل کر لیتے ہیں، اور کبھی یہ شخص اس مقام سے بھی نیچے اُتر آتا ہے، شریعت اسے تنبیہ کا کام نہیں دیتی اور وہ اسی ناقابلِ قبول عذر پر مطمئن ہو رہتا ہے، بلکہ حق و باطل کی کشمکش تک اس کے سینہ سے نکل جاتی ہے اور کبھی وہ اس درجے سے بھی نیچے آتا ہے، کسی رخصت کی آڑ لیتا ہے اور نہ شرعی حکم کی کوئی پرواہ کرتا ہے بلکہ اسے فراموش کر دیتا ہے، اور بعض اوقات وہ اس مرتبے سے بھی تنزل میں آتا ہے، یہاں وہ برائیوں اور گناہوں کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور ان میں اسے خوبیاں نظر آتی ہیں، اس صورت میں گناہوں نے مکمل طور پر اسے گھیر رکھا ہوتا ہے۔ فرمانِ خداوندی ہے:

وَاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْئَتُهٗ فَاُولٰئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خَالِدُوْنَ. (۳)

(اس کو اس کی خطا اور قصور اس طرح احاطہ کرے سو ایسے لوگ اہل دوزخ ہیں، اور وہ اس راہ میں ہمیشہ رہیں گے)

تنزّل کے انہی درجات میں انسان لذیذ طعاموں، نشہ آور، خمار انگیز مشروبوں، گانے بجانے، شطرنج، کبوتر بازی، ریس کورس، آرام و آسائش، عمدہ لباس، منقّش و مزّین بنگلوں، خوشنما باغوں، بہترین سواریوں جو انسان اپنے دماغ میں تصور کر سکتا ہے کہ طلب میں وارفتہ ہو جاتا ہے،

---

(۱) النساء:۱۴۲

(۲) النساء:۵، البقرہ:۸۱

(۳) البقرہ:۸۱

ان میں سے ہر ایک سے نفس کی لذّت اندوزی، قلب کے اشتیاق اور عقل کی سعی و کاوش محتاج بیان نہیں، اس سے یہ بات بخوبی معلوم کی جاسکتی ہے کہ دل کس طرح ان امور کے ارتکاب پر رضامندی ان کے مخالف امور پر غصہ و ناراضگی کا اظہار کرتا ہے، اور کس طرح ہر اس چیز سے محبت جو ان ممنوعات تک پہنچاتی ہے، اور جو ان سے باز رکھتی ہے اس سے نفرت کرتا ہے پھر دوستی کی صورت میں مال صرف کرنے، جسمانی طور پر اس کی خدمت کرنے اور نفرت کی صورت میں گالی گلوچ سے بڑھ کر مار پیٹ بلکہ قتل تک کو کچھ نہ سمجھنے اور طویل عرصے تک دل میں کینہ رکھنے کا اظہار ہوتا ہے، پھر عقل کیسے کیسے بہانوں سے اس کی اچھی اور نفع مند صورتیں پیش کرتی ہے، اور اس کی رکاوٹیں دفع کرنے کی کوشش کرتی ہے، اور عقل ایسی چیزوں سے رخصت حاصل کرتی ہے، جن کی وجہ سے وہ اپنے لیے عذر رکھتی ہے، اور یہ ساری صورتیں معمولی غور وفکر سے جانی جاسکتی ہیں۔

دوسری قسم کا منافق وہ ہے کہ جس کی قوتِ سبعیہ حد سے متجاوز اور نفس و عقل اس کے تابع ہوتے ہیں، ایسا شخص ہمیشہ اپنے اقران و اماثل پر غلبہ حاصل کرنے کی دُھن میں رہتا ہے اور مخالفت کرنے والوں سے انتقام لینے پر آمادہ رہتا ہے یہ شخص مدتوں اپنے دل میں کینہ رکھتا ہے اور مسلسل قتل کرنے، مار پیٹ یا مال و اسباب چھیننے یا اپنے دشمنوں کی توہین و تذلیل کی فکر میں لگا رہتا ہے، جو اس کا مطیع ہو، اسے سراہتا ہے، اور جو اس کا ہمسر ہو، اسے پاؤں تلے روندنا چاہتا ہے، معمولی معمولی باتوں پر بھڑک اٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ میں ان نالائق لوگوں میں سے نہیں کہ کسی کی بات برداشت کرلوں! یا اپنی بے عزتی گوارا کرلوں! ہر چہ باد، اباد، اس کا مسلک ''آگ کو شرم پر اختیار کرلینا'' ہوتا ہے، طلب عزت اور اس راہ میں اپنے مشرب سے ہٹ جانے میں نفس اُس کا موافق اور عقل اس کا مُعاون ہوتی ہے، اپنے غصے کے نکالنے میں وہ ہر تکلیف گوارا کرلیتا ہے، اور کینہ اور انتقام لینے کے سلسلے میں اس کے سامنے ہر منصوبہ اور پروگرام ہر وقت تیار ہوتا ہے، یا ایسا شخص کسی قوم کی دوستی یا کسی خاص رسم و رواج کا اسیر ہے، اور اس سلسلے میں وہ اپنی تمام تر کوششیں صرف کرتا ہے، اور عقل و شریعت کی پابندی و رکاوٹ کو کوئی اہمیت نہیں دیتا، اور کہتا ہے کہ دوستوں سے وفاداری میرا دین اور اپنی وضع کی پابندی میرا آئین ہے، میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو ہر روز نئے دوست بناتے اور ہر روز نئی وضع اختیار کرتے ہیں، جاہلوں کے خیال میں قوتِ سبعیہ

والے قوتِ مردمی کے اوصاف سے متصف ہوتے ہیں، اور ان کے نزدیک یہ قوتِ شہوانیہ والوں سے زیادہ بلند مرتبہ دکھائی دیتے ہیں، ع

پسند اپنی اپنی خیال اپنا اپنا

تیسری قسم کا منافق وہ ہے جس کی قوتِ درّاکہ منتشر ہوگئی ہو، ایسا شخص یا تو صحیح المزاج عقل کا مالک ہوگا، مگر تجسم (جسمانیت باری) تشبیہ (مثال باری)، شرک اور تعطیل (ذات باری کو معطل سمجھنا) ایسے شبہات میں حیران و درماندہ ہوگا، یا پھر قرآن مجید، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم، قیامت اور جزا و سزا کے بارے میں شکوک و شبہات میں مبتلا ہوگا، اگرچہ ابھی تک وہ دائرہ اسلام سے خارج نہ ہوا ہو، یا اس کی قوتِ درّاکہ پر بے فائدہ اور ظلمانی افکار غالب آ گئے ہوں، جن کی بنا پر اس کے دل میں کوئی یقین بیٹھتا ہے اور نہ وہ کسی عزم و ارادے کی تکمیل کر سکتا ہے، اگرچہ ابھی تک اس کا دوسرا پہلو بھی پختہ اور راسخ نہیں ہوا، یا وہ شعر و شاعری اور علوم ریاضی وغیرہ میں اس قدر منہمک ہو گیا ہے کہ شریعت میں غور و فکر کے لئے اس کی عقل میں گنجائش اور وسعت ہی نہیں ہے الغرض اصولی طور پر منافقین کی تین قسمیں ہیں البتہ قلت و کثرت اور ایک جہت و کام کا ایک قسم سے ہونا اور دوسری جہت و کام سے دوسری قسم میں اس کی شمولیت کے اعتبار سے ان کی کئی اقسام بن جاتی ہیں، جن کا شمار عقل کی طاقت سے باہر ہے اور شارع نے منافقین کے لئے جو علاج مقرر کیا ہے وہ یہ ہے نفس شہوانیہ پر نفسِ سبعیہ کو غالب کیا جائے اور جو اعمال اس کے موئید ہوں اس عمل میں انہیں ساتھ شامل کیا جائے، پس اس کے لئے لازمی ہے کہ معبود برحق کا اثبات کرے اسے رسولوں کا مُرسِل، کتابوں کا مُنزِل، حلال کو حلال اور حرام کو حرام کرنے والا، لوگوں کو ان کے اعمال پر جزا دینے والا، اور ہر ظاہر و مخفی چیز کا جاننے والا سمجھے، اسے اللہ تعالیٰ نے تذکیر بآلاء اللہ، تذکیر بایام اللہ اور موت اور اس کے بعد کے واقعات سے مضبوط و مستحکم کیا ہے، اور اس اعتقاد سے نماز، روزہ وغیرہ ایسے جو بھی اعمال صادر ہوں گے، اسے ان کے ساتھ مربوط کر دیا ہے، تاکہ جس وقت عقل کو ان امور پر یقین حاصل ہو جائے تو نفسِ سبعیہ کی طبیعت اصلاح پذیر ہو جائے گی، اسے ثواب کی اُمید اور عذاب سے خوف پیدا ہوگا، اللہ تعالیٰ اور اس کے شعائر سے محبت ہوگی، فطری طور پر نفس میں جو زور اور جوش ہے وہ اسی امید و خوف اور محبت الٰہی میں صرف ہوگا،

اس طرح قوت بہیمیہ مغلوب ہوکر اپنے افعال سے باز رہے گی، اللہ تعالیٰ نے عقل پر خصوصی مہربانی فرمائی ہے کہ اس کے ساتھ اس کی فطرت اور جبلت کے مطابق خطاب فرمایا ہے اور اپنی صفات کے سمجھنے میں اس کی باگ ڈھیلی کردی ہے اور اس کے شکوک وشبہات رفع کردیے ہیں نیز اس نے اپنے لطف وعنایات سے عقل کو سبعیہ پر اس طرح غلبہ عطا فرمایا کہ اس کے ساتھ سبعی جبلت کے مطابق معاملہ کیا، بایں طور کہ اس نے امید ثواب، خوفِ عذاب اور محبتِ منعم کی راہ دکھائی، صفاتِ سبعیہ میں سے صرف انہیں صفات کو منتخب فرما کر انہیں آخرت کے بارے میں صرف کیا۔ پھر اس نے کمالِ مہربانی سے قوتِ سبعیہ کو قوتِ بہیمیہ پر مسلط کردیا اور قوتِ بہیمیہ کے پسندیدہ امور آخرت کے حوالے کردیے، گویا جو چیز فوری مطلوب تھی اسے دیر سے حاصل ہونے والے منافع پر فروخت کردیا، حاصلِ کلام یہ کہ علاج فطرتِ سلیمہ کے ساتھ مشابہت پیدا کرنا ہے، یہاں وہ مثال صادق آتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ صناعت طبیعت کی اقتدا کا نام ہے، لہٰذا جسمانی طب طبیعتِ بدن کے اقتدا اور روحانی طب قوی اور سلیم نفس کی جبلت کی پیروی کا نام ہے، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ہر نوع کے افراد باہم دگر مختلف ہوتے ہیں، بعض صورت نوعیہ کا مظہرِ کامل ہوتے ہیں، بعض مادہ میں نقص کی وجہ سے آثار نوع پوری طرح قبول نہیں کر پاتے، اور بعض میں احکام نوع کے خلاف ایک ہیبت پیدا ہوجاتی ہے مثلاً انسان کی صورتِ نوعیہ کا تقاضا ہے کہ ہر مرد میں غلبۂ خواہشات اور غصہ وجرأت کے اوصاف پورے طور پر پائے جائیں چنانچہ بعض افراد میں تو یہ چیزیں پورے طور پر پائی جاتی ہیں اور بعض میں کم درجے اور کچھ دوسرے لوگوں میں مادہ کے بگاڑ کی وجہ سے غصہ اور بہت زیادہ بزدلی پیدا ہوجاتی ہے اسی طرح نفس انسانی کے مزاج کا تقاضا ہے کہ عقل، نفس سبعیہ پر اور نفسِ سبعیہ، نفس شہودیہ پر غالب ہو۔ عقل کی مثال اس گھوڑے سوار شکاری کی ہے جس نے اپنے پیچھے چیتا بٹھا رکھا ہو، اس صورت میں طبعی تقاضے کے مطابق مرد چیتے پر اور چیتا اپنے شکار پر غالب ہوگا، پس انسان کی طبع سلیم ہی کی موافقت کا نام شریعت ہے، چنانچہ اس حدیث میں اس کی پوری طرح وضاحت کی گئی ہے:

مامن مولودٍ الاّ یولد علی الفطرة ثم ابواه یهودانهٖ و ینصرانهٖ و یمجسانهٖ کما تنتج البهیمة جمعا هل تحس فیها من جدعا.

(ہر بچہ فطرت سلیمہ پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے والدین اسے اپنے مذہب کے مطابق یہودی ،نصرانی یا مجوسی بنا لیتے ہیں، جیسے جانور کا ہر بچہ صحیح وسالم پیدا ہوتا ہے کیا کبھی تازہ پیدا ہونے والے بچھڑے کے تم نے ناک کان کٹے دیکھے ہیں)

اگر عقل نفس سبعی پر اور نفسِ سبعی قوت بہیمی پر غلبہ حاصل کر لے تو اس سے انسانی اعتدال پیدا ہوتا ہے اور قوتِ بہیمی کے لئے ایک مصرف مقرر ہو جاتا ہے تاکہ اس مصرف میں کھانے پینے، لباس مکان اور نکاح وغیرہ میں سے جو چیزیں ضروری ہیں، انہیں اس طرح استعمال کرے کہ عقل کی مخالفت ہو اور نہ قوتِ سبعیہ کی مزاحمت پیش آئے اور تقاضائے مزاحمت سے بھی باز رہے اور یہ قوتِ بہیمیہ کی اصلاح ہے، پھر قوتِ سبعیہ کو وسعت دیتے ہیں تاکہ وہ دو کاموں میں مشغول ہو، ایک یہ کہ اپنی معاش کے سلسلے میں اس طرح اعتدال اختیار کرے کہ نہ عقل کی نافرمانی ہو اور نہ قوتِ بہیمیہ پراگندہ ہو، دوسرے اپنے پروردگار کے ساتھ محبت ووفاداری اور خوف ورجا کا سلسلہ استوار رکھے، اسی طرح عقل بھی انہی دو امور کی تکمیل میں اپنی سعی وکاوش دکھائے، اور قوتِ بہیمیہ کو قوتِ سبعیہ اور عقل کے تابع بنانے کے لئے صیام اور کفارات کی ورزش مقرر کی گئی ہے، تاکہ عقل اور قوتِ سبعیہ مشترک طور پر کام کا تقاضا کریں، اور چار ونا چار بہیمیہ کو اس پر عمل پیرا ہونے پر مجبور کریں، پھر قوتِ سبعیہ کی تہذیب وتربیت کے لئے دائمی عبودیت اور ابدی سخاوت کی راہ متعین کی، الغرض اس تہذیب سے تربیت حاصل کرنے والوں کی بھی اصولی طور پر تین قسمیں ہیں: پہلی قسم ان لوگوں کی ہے جن کا لطیفۂ قلبیہ زیادہ مہذب اور شائستہ ہے، یہی وہ لوگ ہیں جو صدیق، شہید اور عابد کہلاتے ہیں، اللہ اور رسول کے ساتھ دوستی اور دائمی عبودیت کا ان پر غلبہ ہوتا ہے، اور یہ لوگ اپنی قوتِ غضبیہ اللہ تعالیٰ کے دشمنوں کے ساتھ جہاد میں صرف کرتے ہیں۔

دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جن کا لطیفۂ شہوانی زیادہ شائستہ ہوتا ہے۔ یہ زُہاد کہلاتے ہیں۔ فانی خواہشات سے کنارہ کشی ان پر غالب ہوتی ہے۔

تیسری قسم ان لوگوں کی ہے جن کا لطیفۂ عقلیہ زیادہ قوی اور طاقت ور ہے، انہیں ''راسخین فی العلم'' کہا جاتا ہے، اور وُہ گروہ جو پوری تہذیب وتربیت تو حاصل نہیں کرسکا۔ البتہ اس نے نفاق کی برائی سے کسی قدر گلو خلاصی کرالی ہے ''اصحاب الیمین'' کے نام سے موسوم ہوتا ہے۔ تہذیب و

تربیت کے اعتبار سے لوگوں کی اقسام خاصی طوالت کی متقاضی ہیں، مگر یہ اس کتاب کا موضوع نہیں، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منافقین، مقربین اور اصحابِ یمین کی علامات ونشانیاں پوری طرح بیان فرمائی ہیں، آپؐ کا فرمان ہے:

''جس شخص میں تین باتیں پائی جائیں وہ خالص منافق ہے:

۱- جب کسی سے عہد کرے تو وعدہ شکنی کرے،

۲- اگر کسی سے جھگڑے تو فحش کلامی کرے،

۳- اگر اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کا مرتکب ہو۔''

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں تینوں فریقوں کی علامات وخصائل پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے اور جاہلوں نے اس طبِ روحانی میں جو چیزیں خلط ملط کر دی تھیں انہیں الگ کر دیا ہے، اسی وجہ سے ''صوم وصال'' اور متواتر روزوں سے منع فرمادیا، اسی طرح ترک سحور کو مکروہ اور ترکِ دنیا کو برائی اور قباحت قرار دیا تا کہ اس سے اعتدالِ مزاج اور طبیعت سلیمہ کے ساتھ صناعت کی موافقت جو طب روحانی کی کسوٹی ہے، ہاتھ سے نہ جائے۔ **ذٰلک تقدیر العزیز العلیم.**

............☆☆☆............

فصل ۵

سیّد الطائفہ حضرت جنید قدس سرّہٗ کے طریق پر

لطائفِ خمسہ کی تہذیب کا بیان

اور اسے طریقت و معرفت سے موسوم کیا جاتا ہے

صحابہ اور تابعین کے مبارک دور کے بعد کچھ ایسے لوگ پیدا ہو گئے جنھوں نے تعمق (ہر بات میں بال کی کھال اتارنا) اور تشدد کا طریقہ اختیار کیا، احتیاط اور کسرِ نفس کے بارے میں شریعت سے ایک بھنک ان کے کانوں پر پڑ گئی تو انہوں نے تشخیص اور مقدار کا لحاظ کیے بغیر ہر بیماری کے لئے ہر دوا تجویز کر دی اور کہنے لگے کہ اس راہ میں نفس و عادت اور رسوم و رواج کے علاوہ کوئی دوسری چیز مانع نہیں ہے، لہٰذا انتہائی کوشش کر کے نفس سبعی و شہوی کو مغلوب کرنا چاہیے، ان لوگوں نے نفسانی خواہشات، لذیذ طعام اور عمدہ لباس ترک کر دیے اور ان کی طبیعت ان بیماری زدہ لوگوں کی سی ہو جاتی ہے جو مسلسل بیماری کی وجہ سے نفس کے تمام تقاضوں کو فراموش کر چکے ہوتے ہیں یا پھر ان کی طبیعت ان خشک مزاج زاہدوں کی سی ہو جاتی ہے جو متمدن لوگوں کی تہذیب سے بالکل بے خبر ہوتے ہیں، ان تمام باتوں کے بعد انہوں نے ضروریاتِ زندگی میں سے کچھ چیزیں نفس کو دیں، جیسے کڑوی دوا دی جاتی ہے تا کہ جسمانی نظام ٹوٹ پھوٹ نہ جائے، اس طرح انہوں نے خود اپنے آپ کو ذلت میں ڈالا اور نفس کو ایسے کاموں میں مشغول کر دیا جن کی وجہ سے وہ عزت و مرتبے کی محبت، غلبہ و شوکت کی ہوس، اور خواہشِ مال فراموش کر دے ہمیشہ ویرانوں اور جنگلوں میں زندگیاں بسر کرنے لگے اور انہوں نے موتِ احمر (۱)، موتِ ابیض اور

۱؎ موتِ احمر، سُرخ موت یعنی خواہشات پر غلبہ پالینا یہاں لذائذ و خواہشات کی قربانی کی جاتی ہے اور ان کا خون بہایا جاتا ہے، اس لئے اسے موتِ احمر کہتے ہیں۔ موتِ ابیض، سفید موت یعنی بھوک پیاس اور نیند پر قابو پالینا۔ اس سے اشراقیت بڑھتی ہے اسے موتِ ابیض کہتے ہیں۔ موت اسود، سیاہ موت یعنی دارین سے منہ پھیر لینا الفقر سواد الوجه فی الدّارین یہ موت تصفیہ سے متعلق ہے۔

موتِ اسود اختیار کر لی، نہ انہیں دنیا سے کوئی سروکار باقی رہا اور نہ دنیا کو ان سے کوئی تعلق اور انہوں نے قوتِ دراکہ کی ایسی تربیت کی کہ وہ معانی اذکار کے علاوہ اور کچھ نہ اخذ کرے اور نہ دل میں ''احادیثِ نفس'' کا گزر ہو، اور عبادات و معاملات میں اختلاف فقہا سے اجتناب اور شبہات سے کنارہ کشی انہوں نے اپنا مقصود ٹھہرایا، اور اپنے سارے اوقات اس طرح عبادات کی نذر کر دیے کہ اس سے زیادہ متصور نہیں ہوسکتا، اور یہ سب عام لوگوں کا تصوف ہے جنہوں نے بے فائدہ ریاضتوں کی مشقتیں اٹھائیں، انہیں اس راہ کے آغاز کا علم ہوا اور نہ انجام سے آگاہی! اور سب سے پہلے شخص جنہوں نے اسے ایک قاعدہ قرار دیا حارث محاسبیؒ ہیں اور ہم نے ان چند کلمات میں اس مسلک کا بہترین خلاصہ بیان کیا ہے صاحبِ فہم اسے اچھی طرح سمجھ لے گا!

بعض مستعد لوگ سخت ریاضتوں کے بعد ملائکہ سفلیہ کی سی ایک حالت پیدا کر لیتے ہیں اور بعض کو الہام ہوتا ہے کہ وہ ملائکہ سفلیہ کی طرح لوگوں کے امور میں دخل اندازی کریں، اور یہ ابدال ہوتے ہیں اور بعض کو اس قسم کا الہام تو نہیں ہوتا، مگر ان میں بعض مثالی قوتوں کا جستہ جستہ ظہور ہوتا ہے، اور ان سے کشف، سچے خواب، غیبی آوازوں کی سماعت، تھوڑے وقت میں لمبی مسافت طے کرنے، اور پانی پر چلنے ایسے امور کا صدور ہوتا ہے۔

سید الطائفہ حضرت جنیدؒ وہ پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے باریکیوں کو چھوڑ کر درمیانی راہ اختیار کی ہے اور ہر ریاضت کو اپنے مقام پر رکھا ہے، حضرت جنیدؒ کے بعد جس قدر صوفیائے کرام آئے ہیں وہ سب آپ ہی کی راہ پر چلے ہیں، اس لئے ان میں سے کوئی یہ بات سمجھے یا نہ سمجھے مگر وہ حضرت جنیدؒ کے زیرِ احسان ہیں اور ''قوت القلوب'' کے مولف (جو صوفیا کے ابوحنیفہ ہیں) نے حضرت جنیدؒ کے اس طریق کی شرح تفصیل کے ساتھ بیان کی ہے، مگر مجموعی طور پر انہوں نے حارث محاسبیؒ کے طریق کو بھی اس میں خلط ملط کر دیا ہے کیونکہ اس دور میں تصوف ابھی تک تشدد کے دائرے سے باہر نہیں نکلا تھا، اللہ ہی حقیقتِ حال زیادہ بہتر جانتا ہے۔

سید الطائفہ حضرت جنیدؒ کے سلوک کی بنیاد پانچ لطائف کی تہذیب پر ہے اور وہ لطائف یہ ہیں: نفس ۱، قلب ۲، عقل ۳، روح ۴ اور سرّ ۵، ان میں سے ہر ایک کے لئے ایک تہذیب، خاصیت اور انسانی جسم میں مقرر مقام ہے، نفس قلب اور عقل کی تہذیب و تربیت ان کی اصطلاح

میں طریقت کہلاتی ہے، اور روح اور سِرّ کی تہذیب معرفت کے نام سے موسوم کی جاتی ہے یہاں صوفیا کی تعبیرات کے تسامح کی وجہ سے گڑبڑ پیدا ہوگئی ہے ہم چاہتے ہیں کہ اس کی حقیقت سے پردہ اٹھادیں تاکہ ہر باب میں ان کی تفصیلات کی تکلیف نہ اٹھانا پڑے، خوب اچھی طرح جان لو کہ ان الفاظ (نفس، قلب، عقل) کا اطلاق کئی معانی پر ہوتا ہے کبھی نفس بول کر مبداءِ حیات مراد لیتے ہیں، اس اعتبار سے یہ روح کے مترادف ہوگا، اور کبھی نفس بول کر طبیعت بشریہ مراد لیتے ہیں، جس کا خاصہ اکل وشُرب ہے، اور کبھی نفس سے نفسِ شہوانی مراد لیتے ہیں، اس کی تشریح ہم گزشتہ اوراق میں کرچکے ہیں کہ طبیعت بشریہ قلب وعقل پر حکمرانی کرتی ہے، اور ان دونوں کو اپنا محکوم بنالیتی ہے، یہاں سے بہت سارے رذائل (اخلاق سیئہ) پیدا ہوتے ہیں جن کے مجموعے کو نفس کہا جاتا ہے۔

اور اسی طرح کبھی قلب بول کر مضغۂ صنوبری (صنوبر کی شکل والا لوتھڑا) مراد لیتے ہیں، جبکہ بعض اوقات اسے نفسِ درّاکہ کے معنی میں لیتے ہیں، اس معنی کے اعتبار سے یہ عقل کے مترادف ہوگا، لیکن جو ہمارا مقصود ہے۔ وہ یہ ہے کہ ارواحِ قلبیۂ نفسانی صفات مثلاً غضب اور حیا وغیرہ کو اٹھاتی ہیں اور عقل ونفس اس کے معاون بن جاتے ہیں، اور اسی کو ہم قلب کہتے ہیں، اور عقل کا اطلاق کبھی جاننے کے معنی پر اور کبھی اس قوت پر ہوتا ہے، جس کی وجہ سے جاننا ہوتا ہے، اس معنی کے اعتبار سے عقل جو ہر قائم بنفسہٖ نہیں بلکہ اعراض میں سے ایک عرض ہوگا، اور کبھی عقل بول کر جوہرِ رُوح مراد لیتے ہیں، یہ اس کے بعض افعال کی وجہ سے ہے جو ادراک ہے، اور عقل سے ہماری مراد یہ ہے کہ ادراکی قوتیں تصور اور تصدیق کو ظاہر کریں، اور قلب ونفس اس کے تابع ہوں، اور قوتِ درّاکہ کے مزاج اور قلب ونفس کے تعاون کے درمیان ایک ہیئت اجتماعیہ پیدا ہوجائے، اس تحقیق سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ تینوں لطائف تمام بدن میں جاری وساری ہیں لیکن قلب کے پاؤں مضغۂ صنوبری کے ساتھ، نفس کے پاؤں، جگر کے ساتھ اور عقل کے پاؤں، دماغ کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں، اسی طرح رُوح کا اطلاق کبھی تو مبداءِ حیات پر ہوتا ہے اور کبھی اس پاکیزہ ہوا پر جو گوشت پوست کے اس جسم میں سرایت کیے ہوئے ہے، اور کبھی اس سے روح ملکوت مراد لی جاتی ہے جو انسان کی پیدائش سے دو ہزار سال پہلے پیدا کی گئی اور میثاق بھی اسی کے بعض تنزلات

کی نمائش میں سے تھا، اور یہاں روح سے ہماری مراد وہی قلب ہے جو احکامِ سفلی ترک کر چکا ہے اور روح ملکوت اور نفس ناطقہ کی مشابہت اس پر غالب آ گئی ہے! اسی طرح سرّ لغت اور شریعت میں کسی خاص معنی کے لئے وضع نہیں کیا گیا، لفظی اعتبار سے یہ پوشیدگی کے معنی پر دلالت کرتا ہے، لطائف نفس میں سے ہر طبقہ مخفی ہے، اسی بنا پر کبھی عقل کو سِرّ کہتے ہیں اور کبھی روح کو، لیکن ہمارے نزدیک سِرّ سے وہی عقل مراد ہے جو زمین کی طرف جھکاؤ، چھوڑ کر علوی احکام کا اثر قبول کر چکا ہے، اور اسے تجلی اعظم کا مشاہدہ نصیب ہے، اس تحقیق سے معلوم ہوا کہ لطیفۂ روح جسم سے برتر ہے لیکن وہ قلب کی طرف متوجہ ہے، اسی طرح لطیفۂ سِرّ بھی جسم سے بلند ہے، مگر اس کی توجہ دماغ پر ہے، الغرض صوفیا کرام کی اصطلاحات میں اختلافات کی وجہ سے اصل مقصود کے سمجھنے میں خاصی دشواری پیدا ہو جاتی ہے، بعض صوفیائے کرام دل کے حالات میں سے کوئی ایک حالت مقرر کر کے اس کے بیان میں غور کرتے ہیں اور روح کے حال کو اس کا بطن قرار دیتے ہیں، مثلاً قلب کے لئے محبت کو مقرر کر کے الفت دانس اور کشکش کو باطن گردانتے ہیں حالانکہ وہ قلب کی کیفیات میں سے نہیں بلکہ روح کے حالات میں ہے، اسی طرح یقین کو جو عقل کا کام ہے کھینچتے ہیں اور اس کے کئی بطون قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پہلا مرتبہ علم الیقین، دوسرا مرتبہ عین الیقین اور تیسرا مرتبہ حق الیقین ہے، اس لئے عقلمند اور سمجھدار آدمی کو چاہیے کہ وہ اس کلیہ کو ذہن نشین رکھے اور صوفیائے کرام کی عبارات کے اختلاف سے پریشان خاطر نہ ہو، اور جاننا چاہیے کہ قلب و نفس اور عقل و قلب کے مابین گہرا تعلق ہے اور یہ آپس میں اس طرح یکجا اور متصل ہیں جیسے کمان میں لکڑی اور جانوروں کے سینگ آپس میں ایک دوسرے کا جز ہوتے ہیں، اس اتصال اور قرب کی وجہ سے ان میں سے ہر ایک دوسرے کی خاصیت کا اثر قبول کر لیتا ہے، حقیقت میں آگ سے نرمی سینگ کا خاصہ ہے۔ لیکن اس کی گردش سے لکڑی بھی پھر جاتی ہے اور اس کے ساتھ مڑنے لگتی ہے، اسی طرح صلابت اور سختی لکڑی کے اوصاف ہیں مگر اس کے ساتھ مل کر سینگ بھی یہی خاصیت اپنا لیتے ہیں جس وقت کمان کی درستی کا ارادہ کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اسے کسی کمان کی صورت کی میزان میں رکھ کر تیار کریں، تو لازمی ہے کہ ہر حکم کو اس کے منبع سے منسوب کریں، اور ہر اثر کے ظاہر ہونے کے مقدار کو اس کی اصل قوت کے اندازے کے ساتھ متعلق کر دیں، یا پھر اس اتصال کی مثال پارہ کی

سی ہے جس میں دو جز اکٹھے ہو گئے ہیں، اس کا سیلان، پانی اور ثقل چاندی کی وجہ ہے اور پارے سے جو کرشمے ظاہر ہوتے ہیں وہ اسی اتصال کا نتیجہ ہیں، اگر بالغرض پانی اور چاندی ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں تو پارہ اس درہم کی طرح ہوگا جو چلّو بھر پانی میں پڑا ہو، اس کے سارے کرشمے باقی رہیں گے اور نہ ظاہری شکل وصورت کی نمائش! اسی طرح صوفیا کے بہت سارے حالات اسی گرہ کی وجہ ظاہر ہوتے ہیں، اور جب صحو خالص، تمکین محض اور بقا مطلق کا ظہور ہوتا ہے اور کسی دوسرے سے اختلاط کے بغیر ہر لطیفہ اپنے دائرہ کار میں مصروف ہوتا ہے تو یہ ساری نمائشیں ختم ہو جاتی ہیں وجد (۱) باقی رہتا ہے اور نہ شطح (۲) اور نہ عام آدمی سے صوفی کی تمیز کی جا سکتی ہے۔

واضح رہے کہ "مقام" ایک صفت ہے جو راہِ خداوندی کے سالک کو حاصل کرنی چاہیے تا کہ اس کا سلوک مکمل ہو، اور ایک ایسی وسیع حد لازمی ہے جو اپنے اندر احوال و واقعات کے تمام اختلافات اور استعداد کی گنجائش رکھتی ہو، زید کے لئے ایک طریقہ اختیار کرنا پڑتا ہے اور عمرو کے لئے دوسرا، اور حال اس مقام کے ثمرہ یا اس کی اس خاص وضع کا نام ہے جو اس شخص میں اس کی خاص استعداد کے مطابق اس وقت ظاہر ہوتی ہے، اس لئے وہ مقام کو کسی اور حال کو وہبی گردانتے ہیں مثلاً نفس سبعیہ اور شہوانیہ کے مقتضیات کا ترک مقام کہلاتا ہے اور جنسِ نورانیت، اور صفائی روح کی صورت میں اس کے بعد جو ثمرہ اور نتیجہ نکلتا ہے وہ حال کہلاتا ہے، اور اسی طرح سالک کے دل میں نصیحت کے اثر کی صورت، اور مقامِ توبہ تک اس کی رسائی بھی حال ہے، چونکہ نفس کی اصل فطرت تقاضائے خواہشات ہے اس لیے ضروری ہے کہ توبہ اور زہد سے اس کی تربیت کی جائے، اسی طرح اپنے مقتضیات کی طلب میں اس کی سرشت، ہٹ دھرمی اور غیظ وغضب ہے، اس لئے اس کا علاج اس طرح ہوگا کہ اس پر نفس سبعیہ مسلط کر دیا جائے تا کہ انسان اپنے اوپر جوش کرے، اپنے آپ کو مکروہ سمجھے اور اسے اپنے اوپر حکمرانی حاصل ہو۔

ہم اکثر دیکھتے ہیں کہ انسان خود اپنے اوپر عتاب کرتا ہے اور اپنا احتساب کرتا ہے چنانچہ

---

(۱) کسی ارادہ وکوشش کے بغیر قلب پر کسی حالت کے طاری ہونے کو وجد کہتے ہیں۔

(۲) وہ کلمات جو غلبۂ حال اور مستی وشوق میں صوفیائے کرام سے بے اختیار صادر ہو جاتے ہیں جو بظاہر خلاف شرع معلوم ہوتے ہیں، لیکن حقیقت میں ان میں کسی سِرّ کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔

اسے ندامت و شرمندگی محسوس ہوتی ہے، یہ نفس شہوانی پر نفسِ سبعی کا تسلط ہے اور یہ ایک ایسا معنیٰ ہے جو نکتہ کو سمجھے، اسے دل میں اتارے، اور پیوست کیے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا، چنانچہ ہم اکثر دیکھتے ہیں کہ بعض باتیں دل میں اثر کرتی ہیں اور یہ اثر ایک عرصے تک باقی رہتا ہے، یہ قلب پر قوتِ دراکہ کا تسلط ہے، اس لئے اکابر صوفیہ نے زاجر (گناہوں سے منع کرنے والا جذبہ) کو توبہ کی کنجی قرار دیا ہے، ممکن ہے کہ دنیا کے تغیرات اور حوادثات کو دیکھ کر دل خود بخود دھڑک اٹھے اور گناہوں سے دستبردار ہو جائے، یا کسی واعظ کی بات پر اسے وقت لگ جائے اور یک دم دل اس کی طرف پھر جائے، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اہل اللہ کے ساتھ طویل صحبتیں اسے آہستہ آہستہ استقامت کی طرف لے جائیں، اس صورت میں زاجر فوری نہیں بلکہ تدریجی ہوگا، اور زاجر وجد کا سبب بنتا اور وجد کی حقیقت یہ ہے کہ قلب میں ایسا تغیر پیدا ہو جو تمام اطراف کو گھیر لے، اور دل کو جوارح پر جو گرفت حاصل تھی اسے درہم برہم کر دے اور یہ وجد کبھی بے ہوشی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، اور کبھی اچھلنے کودنے اور کپڑے پھاڑنے کی شکل میں، کبھی رونے دھونے اور غمگینی کی صورت میں نمودار ہوتا ہے تو کبھی حق تعالیٰ کی طرف کشش اور اس کے ماسوا سے نفرت کے روپ میں! اور زاجر قلب پر عقل کے فیضان کا نام ہے، اور وجد دل کا کام، اور دل کے ہاتھوں نفس کی قید ہونے کا نام ہے، اس کے بعد بیداری کا مرحلہ آتا ہے، یہ ہوشیار اور خبردار ہونے کا نام ہے، یعنی انسان مخالف چیزوں کو مخالف سمجھے ان سے بدظن ہو اور نفرت کرے، یہ عقل کی امداد، اس کا قلب کے حکم کے مطابق چلنا اور اس کے ادراک کا مقتضیات قلب میں مصروف و مشغول ہوتا ہے، اس کے بعد تمام مخالف چیزوں سے مکمل طور پر الگ ہو جائے، تمام پرانے طور طریقے بدل دے، عبادات و طاعات میں مشغول ہو جائے، نفس کو اس کے فریب پر صبر دلائے اور اس کی سرکشی زائل کرے، یہ جوارح و عادات کو قلب کے مسخر کرنے، اپنے تابع فرماں بنانے اور اپنے مذہب و مسلک کے پابند کرنے کا عمل ہے، اس کے بعد زُہد ہے اور یہ اُن مباح چیزوں سے کنارہ کشی کا نام ہے جو دل کو یادِ الٰہی کی مشغولیت سے روکتی ہیں، خواہ وہ چیزیں خارجی ہوں، مثلاً کوئی ایسا کام جو انسان کا سارا وقت کھا جائے اور اسے اتنی فرصت نہ دے کہ وہ آخرت کی طرف توجہ کر سکے! یا وہ چیزیں نفسانی ہوں، مثلاً اہل و عیال اور مال کی مشغولیت، کیونکہ ان کی محبت اور اُنس، ذکر کی چاشنی

اور حلاوت سے رکاوٹ کا باعث بنتی ہے اسی طرح لوگوں کے ساتھ یاوہ حق گوئی یا شعر وشاعری اور علوم عقلیہ سے دلچسپی ایسی باتیں بھی محبوب سے دل کی رُوگردانی کا باعث ہیں، اس کے بعد محاسبہ اور ''ہوش دردم'' (۱) کا مرحلہ ہے، یعنی ہر لحظہ اپنے حال پر مطلع رہنا کہ یہ وقت غفلت میں گزر رہا ہے یا حضور میں، معصیت میں بسر ہو رہا ہے یا اطاعت میں، پھر اگر وقت حسبِ منشا گزر رہا ہے تو اس پر شکر ادا کرنا، اور اس کیفیت کے باقی رہنے بلکہ اس میں اضافے کی فکر کرنا اور اگر خلاف منشا ہے تو توبہ کی تجدید کرنا۔

الغرض جو کچھ بیان کیا گیا ہے یہ تہذیب نفس کا بیان ہے، خواہ پہلے حاصل ہو، خواہ قلب و عقل کی تہذیب وتربیت کے بعد اس مجموعے کو ہم توبہ کہتے ہیں، پھر مقام توبہ کی کئی صورتیں ہیں، مثلاً جب ایک مرد جوان ہوتا ہے تو اس میں عورتوں کا میلان پیدا ہوتا ہے، اور آہستہ آہستہ اس سے محبت کی ساری مقتضیات کا ظہور ہوتا ہے، مثلاً اپنا سارا وقت اس خیال کی نذر کرتا ہے، اور اس کے حاصل کرنے کے لئے جان ومال تک کی بازی لگا دیتا ہے، اس سلسلے میں جو چیزیں ظاہر ہوتی ہیں، ہر شخص میں ان کا ظہور جدا نوعیت کا ہوتا ہے، لیکن عقل ان کی اصل کے ایک ہونے کی وجہ سے سب کو متحد جانتی ہے، چنانچہ جس وقت اس مرد کا نفس شہوانی مطیع ہو جاتا ہے اور قلب وعقل کا حکم مان لیتا ہے تو اس وقت جو بھی حالات اور کیفیات ظاہر ہوں گی۔ دانا لوگ انہیں ایک ہی نام سے یاد کرتے ہیں، اور وہ نام ہے ''توبہ''۔ پس توبہ کا مقام تو ایک ہے لیکن اس کے نتائج اور احوال زیادہ ہیں، اور نفس کو مسخر کرنے کے سلسلے میں قلب کی چار خصلتوں سے امداد واعانت کی جاتی ہے، وہ چار خصلتیں یہ ہیں (۱) کم کھانا (۲) کم سونا (۳) کم بولنا اور (۴) لوگوں سے کم ملنا۔ اور یہ امداد و اعانت، ایسی ہی ہے جیسے سرکش گھوڑے کو رام کرنے کے لئے کوڑے یا چوک سے امداد حاصل کی جاتی ہے۔ قلب کی جبلت ایک تو تسخیر جوارح، اطوار واوضاع کی تبدیلی اور اشغال میں مشغولیت سے ہوتی ہے اس اعتبار سے اثرِ تہذیب صدق وادب کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

اور دوسرے حیا، شرمندگی، بے چینی، شوق، ندامت، اور اپنے آپ پر پیچ وتاب کھانے سے ، اور اس اعتبار سے تہذیب کا اثر وجد ہے، اور نفس شہوانی پر غلبہ حاصل کرنا، حرص وغصہ کو خاطر

---

(۱) ہوش دردم: نہایت ہی انہماک، غایت تعمق۔

میں نہ لانا، اور طوعاً وکرہاً اُسے استقامت پر رکھنا، اس اعتبار سے تہذیبِ نفس کا اثر صبر ہے، اور عقل کی موافقت اور اس کی بات سُن کر اُسے قبول کرنا اس اعتبار سے تہذیب کا اثر توکل اور تقدیر پر رضا مندی ہے، اور دوستوں کے ساتھ وفاداری، اور ان کے طور وطریق کی پابندی کرنا اس اعتبار سے تہذیب کا اثر تقویٰ اور شعائر الٰہی سے محبت ہے، اور مطلوب کے مقابلے میں دوسروں کو معمولی سمجھنا اور قلب کے اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے کی وجہ سے لمبی خواہشات، حبِ جاہ اور غضب و بخل ایسے جذبات پر قابو پانا اس اعتبار سے تہذیب نفس کا اثر فیاضی ہے، اس تحقیق سے معلوم ہو گیا کہ قلب کے اصلی مقامات، صدق، صبر، توکل، تسلیم، تقویٰ، محبت شعائر اللہ اور سماحت ہیں، یہی وجہ ہے کہ صوفیا نے ان مقامات کے بارے میں طویل گفتگو کی ہے، اور ان کی تفصیلات پوری شرح وبسط کے ساتھ بیان کی ہیں۔

اپنے مافوق کے تابع ہونے کے اعتبار سے تہذیب عقل کا ثمرہ دو باتیں ہیں: ایک یہ کہ احیانِ عالیہ سے وہ یقین جو تجلی اعظم کے ساتھ حظیرۃ القدس میں ثابت ہے، اس پر عروق ماساریقا کے ذریعہ نمودار ہو، اور اس کے دل میں یقین پیدا ہو جائے مگر اسے یہ پتہ نہ چل سکے کہ یہ یقین اسے کیونکر حاصل ہوا ہے؟ اور نہ اس یقینی چیز کے بارے میں تفصیل کے ساتھ کچھ بیان کر سکے ۔

داند اعمیٰ کہ مادرے وارد
لیک چونے بخاطرش ناید

(نابینا کو یہ تو علم ہے کہ اس کی ایک والدہ ہے مگر وہ کیسی ہے اس سے وہ بے خبر ہے)

اور یہ یقین توکل اور تسلیم تک پہنچاتا ہے، اور دل اور نفس کو اپنے رنگ میں رنگ دیتا ہے، دوسری یہ کہ علم عالی کے ظروف میں سے جسے شرع میں "لوح" اور اصطلاحِ صوفیا میں عالمِ مثال سے تعبیر کرتے ہیں جو چیز واقع ہونے والی ہے اس کا خواب، بیداری یا صورتِ خیالیہ یا وہمیہ جسے کشف کہتے ہیں، کی صورت میں اس پر فیضان ہو! اور اپنے ماتحت میں تصرف کرنے کے اعتبار سے بھی تہذیب عقل کا ثمرہ دو چیزیں ہیں، پہلی یہ کہ مقدمات سے نیچے تک انتقال اور فراست اس کے ذہن میں راسخ ہو جائے اپنے معاملات کے بارے میں فراستِ صادقہ حاصل ہو جائے دل کے کھٹکوں اور مخفی باتوں پر اسے اطلاع نصیب ہو جائے، دوسری یہ کہ کتاب وسنت اور سلف کے

اقوال واحوال جو عادتاً اس کے کانوں تک پہنچے ہیں، عقل بڑی برکت سے تصرف کرتی ہے چنانچہ ہر کلمے کا مقصد ہر حدیث کی تاویل، اور ہر آیت کے اعتبارات واشارات کا ادراک کر لیتی ہے، اور اس کے ذہن پر اسما صفات کی صورت پر تو افگن ہوتی ہے، اور فوری طور پر اس کے ظاہر و باطن کو اپنا مطیع بنا لیتی ہے، اور تجلیات معنویہ پوری طرح ظہور پذیر ہوتی ہیں، یہ سب تہذیب وتربیت کے نتائج اور فوائد ہیں، اور تہذیب کی اصل دائمی عبودیت ہے، اس کا فائدہ تینوں لطیفوں کے لئے عام اور اس کا نفع اس کی ساری اقسام کو شامل ہے، اس مقام میں متقدین اور متاخرین صوفیہ میں اختلاف ہے، متقدمین صوفیہ نفس، عقل اور قلب کو اپنی ذوات اور خصوصیات کے اعتبار سے مہذب بنانا مقدم اور زیادہ ضروری سمجھتے ہیں، اور دائمی عبودیت کو ان ریاضتوں کا تتمہ اور تکملہ سمجھتے ہیں اور متاخرین صوفیہ دوام عبودیت کے بغیر آغاز ہی نہیں کرتے اور نہ اس کے علاوہ کسی دوسری چیز کو ایسا اہم اور مفید سمجھتے ہیں۔ اس نسبت کی تکمیل کے بعد وہ دیکھتے ہیں کہ سالک کے دل میں یہ تخم کیا برگ و بار لاتا ہے؟ اور یہ پودا کیونکر پھلتا پھولتا ہے؟ اگر استقامتِ طبع اور سلامتِ فطرت کی بنا پر سارے مقامات نے ظہور کیا ہے تو درست! ورنہ جو مقامات ظاہر نہیں ہوئے ان کے اظہار کی کوشش کرتے ہیں حقیقت میں متاخرین صوفیا اس معاملے میں صحیح طریقے پر کاربند ہیں، اور بلاشبہ یہ وہ عجیب وغریب نعمت ہے، جو متاخرین صوفیا کے لئے محفوظ تھی، پس اگر تہذیب نفس اور توجہ ریاضت، یقین اور جذبۂ محبت سے پہلے ظاہر ہو تو یہ شخص ''سالک'' اور ''مرید'' ہے۔

الغرض دوام عبودیت کی دو قسمیں ہیں، ایک کا تعلق زبان اور جوارح سے ہے یعنی اپنے اوقات ذکر وتلاوت، اور حضور قلب اور توجہ خاطر کے ساتھ نماز میں بسر کرے یہ تصوف کے ابواب میں سے ایک مشہور باب ہے جس کی مکمل تفصیلات ''قوت القلوب''، ''احیاء العلوم''، ''غنیۃ الطالبین'' اور ''عوارف المعارف'' میں شرح وبسط کے ساتھ بیان کی گئی ہیں، اور دوسری قسم عقل اور قلب سے متعلق ہے، یعنی دل کارِ محبت سنبھالے اور محبوب کے ساتھ پیوستہ و وابستہ ہو جائے اور عقل ''یاد کرد'' اور ''ہوش دردم'' میں مصروف ہو، اور اس بارے میں حضرت خواجگانِ نقشبندیہ کے طریق سے زیادہ مفید اور موثر ہم نے کوئی دوسرا طریقہ نہیں دیکھا۔

اور اس مسئلے میں اختلاف ہے ایک گروہ تو باطن کی درستگی پر اکتفا کرتا ہے اور ظاہر کو زیادہ

اہمیت نہیں دیتا بلکہ اسے آسان اور معمولی بات سمجھتا ہے، اور یہ متاخرین صوفیا کی غلطیوں میں سے ایک غلطی ہے، حضرت خواجہ نقشبندیؒ نے جو کچھ فرمایا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

''ظاہر کی اس قدر مقدار کافی سمجھی جائے جو سنت سے ثابت ہے۔''

آپ کے فرمان کا یہ ہرگز مقصد نہیں کہ سرے سے بنیاد ہی کی نفی کر دی جائے، اور اشغال و اذکار میں ہر لطیفے کی پرورش اور مقام کی رعایت کا نکتہ پوشیدہ ہے اور ظاہری عبودیت کے بغیر مقامِ صدق اور نفس و جوارح کی تہذیب و تربیت محال ہے، جب سالک دائمی عبودیت پر کاربند ہو جاتا ہے، اپنا ظاہر و باطن اس کے لئے وقف کر دیتا ہے، کسی وقت بھی اپنے احتساب سے غافل نہیں ہوتا، اور یہ صنعت اس کے قلب کی گہرائیوں اور عقل و نفس کی گیرائیوں میں اتر جاتی ہے، اور باطن کے بطن میں قرار پکڑ لیتی ہے تو لامحالہ یہ سارے مقامات اپنے تمام خواص کے ساتھ ظاہر ہو جاتے ہیں، فنِ سلوک میں یہ کیفیت مادہ کا حکم رکھتی ہے اور مقاماتِ مذکورہ صورت کا جیسے کسی بھی قسم کی شبیہ بنانے کے لئے پہلے موم کی ضرورت پڑتی ہے اسی طرح سب سے پہلے دائمی عبودیت کو استوار اور محکم کیا جائے بعد میں جو بھی مقام ہے وہ درست ہو سکتا ہے ع

ثبت العرش اولاً ثمّ انقش

(پہلے تخت مکمل کر لو پھر اس پر نقش و نگار بناؤ)

دوامِ عبودیت کے درست ہو جانے کے بعد مقامات کا ظہور ان تینوں شعبوں کے اصلی مزاج کے مطابق ہوگا۔ پس مقامِ صدق اس شخص کو حاصل ہوگا کہ جس کا قلب فطری طور پر جوارح اور اوضاع پر غالب ہے اور اس سے سرزد حرکات میں جوارح اور اوضاع پر قلب کے تسلط کا اظہار ہو رہا ہے۔

اور جو شخص اپنی اصل فطرت کے اعتبار سے ناقص واقع ہوا ہے اگر اس کے دل میں کسی قوم کی محبت پیدا ہو تو اس کا دل اس قوم کے رسوم و رواج اختیار کرنے پر مائل ہوگا اور ظاہری اطوار مثلاً آدابِ گفتگو، میل ملاقات، اور اچھی چیزوں کے تحفے تحائف وغیرہ کے سلسلے میں اپنی کسی عادت میں تبدیلی نہیں کرے گا، ایسے شخص کو مقامِ صدق کی تکمیل سے معذور سمجھنا چاہیے، اور جس شخص کا دل متانت سے خالی ہے اور ہجومِ مصائب کے وقت بے قابو اور بے صبر ہو جاتا ہے، ایسے شخص کو

مقامِ صبر کے کمال اور اس کے حقوق کی ادائیگی سے مایوس سمجھنا چاہیے، دوامِ عبودیت ایک ایسا تخم ہے جس کا پھلنا پھولنا اور برگ و بار زمین کی استعداد پر موقوف ہے، دیکھنا چاہیے کہ اصل فطرت کے اعتبار سے زمین اچھی ہے یا شور وکلر! اسی اصل کے مطابق آگے اس میں عمل کیا جائے گا، ارشادِ باری ہے:

"وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَحْوِيْلاً."

(اور آپ خدا کے دستور کو کبھی منتقل ہوتا ہوا نہ پائیں گے)

اور اگر دوامِ عبودیت پورے طور پر حاصل ہوگئی لیکن مقامات جلوہ گر نہ ہوئے تو کوئی خوف نہیں، شیخ بایزیدؒ نے اسی نکتے کی وجہ سے ایک ایسے شخص کو جو دوامِ عبودیت کا مرتبہ تو حاصل کر چکا تھا لیکن ابھی مقامات سے خالی تھا، سلطان الذاکرین کا لقب عطا فرمایا تھا اس عمومی قاعدے کو سمجھ لینے کے بعد مناسب ہے کہ ان مقامات کی تشریح اور ان میں سے ہر ایک کی طرف توجہ کا اجمالی بیان بھی ہو جائے۔ صدق ظاہر کی باطن کے ساتھ موافقت کا نام ہے یہ صدقِ احوال سے ماخوذ ہے صدقِ اقوال سے نہیں، اور اس کے وجود کی اصلیت مزاجِ قلب کی صحت اور قلب کا جوارح پر غلبہ ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"اگر تیرے دل میں عاجزی ہوتی تو تیرے جوارح میں ضرور اس کے آثار پائے جاتے۔"

قلب جوارح پر فرمانروائی کرتا ہے اور اپنی محبت کے مطابق جوارح کے آداب اور اوضاع کی کیفیت پیدا کر لیتا ہے، اور جب قلب کی یہ صفت فطری ہو، اور عرصۂ دراز تک وہ دوامِ عبودیت پر کاربند رہے تو اس صفت اور عبودیت کے درمیان ایک مقام پیدا ہو جاتا ہے اور وہ صدق ہے، اس کے بعد جوارح میں خشوع، گفتگو میں آداب، اور محبوب کے ساتھ نسبت رکھنے والے تمام لوگوں کی تعظیم کرتا ہے، اگرچہ اس نے یہ بات کسی سے سنی تک نہ ہو کہ جس ورق پر اللہ تعالیٰ کا نام لکھا ہوا ہو، اس کی تعظیم کرنی چاہیے اور اگر کسی شخص سے اللہ نام سنتا ہے تو جلّ جلالہٗ کہہ کر سر جھکا دیتا ہے، گویا سبق اسے کسی نے پڑھایا بھی نہ ہو، جس وقت دوامِ عبودیت حاصل کر لے، مرشد اسے تفصیل کے ساتھ آدابِ جوارح کی تعلیم اور ان کی نگہداشت کرائے اور مناسب ہے کہ دل کے انقیاد کے ساتھ اس سے مسلسل آداب کی محبت ظاہر ہوتا کہ اس راہ کے فیض کا در، اس پر کھل

جائے، اور وجد دل کو جو غم، ندامت اور دنیا سے نفرت ایسے احوال میں مشغول کرنے سے عبارت ہے، مگر شیؑ کہ جوارح اس شغل سے مغلوب ہو جائیں، جب دوامِ عبودیت انسان میں یہ استعداد اور موافقت پیدا کر دے اور ارواحِ قلبیہ اپنی بنا میں تھوڑی سی رقت بھی رکھتے ہوں، تو یہ سارے احوال اللہ تعالیٰ کی نسبت اور اس کی طرف توجہ کرنے سے پیدا ہوں گے اور ارواح کے قوام میں رقّت کی وجہ سے ان حالات کا دفع کرنا دل پر سخت ہوگا۔

اور اس سے جوارح کے انقیاد میں زیادتی، بیہوشی اور کپڑوں وغیرہ کے پھاڑنے کی کیفیت پیدا ہوگی، اور یہ دونوں قسم کے وجد اپنی خصوصیات کے ساتھ حال ہوں گے، اور وجد کی استعداد اور قابلیت جو اس شخص کے نفس میں پائی جاتی ہے "مقام" ہے اور اس کا حصول روح کی رقت پر مبنی ہے، اور روح کی رقت، غذا میں کمی، اپنے اوپر غم واندوہ کی کیفیت طاری کرنے، اچھے لباسوں سے احتراز اور خوشی وتن آسانی کے ترک کرنے سے حاصل ہوتی ہے اور وجد لوگوں کے ساتھ کم آمیزی سے نصیب ہوتا ہے، بالخصوص ان لوگوں سے جو وجد کے منکر ہوں، یا کم از کم ایسے لوگوں سے حجاب کرنا چاہیے، نیز وجد کی بہتری کے خیال کرنے، خیالات کو اس کی طرف اُبھارنے، دل کو دوسری تمام اطراف سے بند کر کے اسبابِ وجد میں مصروف ہونے سے بھی وجد پیدا ہوتا ہے نیز پاکیزہ نغمے اور موثر زیر و بم جو طبعًا دل میں اُتر جاتے ہیں، یہ بھی وجد کا باعث بن جاتے ہیں، ان چند کلمات میں وجد کے تمام اسباب بیان کر دیے گئے ہیں، ان پر غور کیجئے!

یہاں یہ ایک ایسی فاش غلطی ہے کہ جس کا اکثر جاہل اہل وجد ارتکاب کرتے ہیں، اور وہ یہ ہے کہ ان کی طبیعت بشریہ، اطاعت اور دوامِ عبودیت اختیار کیے بغیر اسی طرح اس یقین کو تابع کیے بغیر جس کا نزول عقل پر ہوتا ہے پسندیدہ نغمات اور راگوں کے زیر و بم سے متاثر ہو جاتی ہے جس طرح جانور گانوں اور پُرکشش راگوں سے متاثر ہوتے ہیں، یہ جہلا اسے ایک بلند مرتبہ اور مقاماتِ اولیاً میں سے اونچی منزل سمجھتے ہیں حاش للہ ثمّ حاش للہ ایک ایسی منزل جس میں انسان اور جانور مشترک ہیں، کیونکر بلند ہو سکتی ہے اور جب یہ طبیعت دوامِ عبودیت سے مل جائے تو غور کرنا چاہیے کہ ان کے ملاپ سے جو نتیجہ برآمد ہوا ہے اس کا میلان ارضی اور سفلی مادہ کی طرف ہے جو بمنزلہ ماں کے ہے یا اس کا میلان عالم علوی یعنی حظیرۃ القدس کی طرف ہے جو بمنزلہٗ باپ

کے ہے اگر سچ پوچھتے ہو تو صبر بھی قلب کے مزاج کی متانت پر موقوف ہے یعنی صبر اسی متانت اور دوام عبودیت کے درمیان پیدا ہوتا ہے اور یہ بھی دوسرے مقامات کے حصول کی طرح عقل کو قلب پر مسلط کرنے سے حاصل ہوتا ہے، اور اس کی اعانت مواقع صبر میں پڑنے، صابرین کے اجر و ثواب پر نگاہ رکھنے، اور بے صبری کرنے والوں کی حقارت و برائی کا خیال کرنے سے ہوتی ہے۔

اعتماد و توکل کی دو قسمیں ہیں، پہلی یہ کہ وعدۂ خداوندی پر اعتماد ہو، اور یہ اس الہام یا کشف سے پیدا ہوتی ہے، جو اوپر سے عقل پر اس طرح نازل ہوتا ہے کہ اس میں جانب مخالف کا احتمال تک باقی نہیں رہتا، یہاں ایک بری خصلت ہے جو توکل سے مشابہ ہے، اسی وجہ سے عام لوگ اسے توکل سے اس طرح خلط ملط کر دیتے ہیں کہ ان میں تمیز نہیں کر پاتے اور وہ خصلت بدتہوّر ہے یعنی انجام کار کا لحاظ کیے بغیر اقدام کرنا، یا عیش کوشی میں مبتلا ہو کر معاش کی فکر سے بے پرواہ ہو جانا۔

اور تقویٰ حدود شرع کی حفاظت کا نام ہے، اسی طرح شعائر اللہ کی محبت سے مراد قرآن مجید، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم، اور کعبۃ اللہ سے محبت ہے بلکہ ہر اس چیز سے محبت جو اللہ تعالیٰ سے نسبت رکھتی ہے، یہاں تک کہ اولیا اللہ سے محبت بھی شعائر الٰہی کی محبت میں شامل ہے، اسے بعض حضرات فنافی الرسول یا فنافی الشیخ کہتے ہیں، اور سماحت و حریت سے مراد یہ ہے کہ دل غصہ حرص اور بے صبری ایسے ان مقتضیاتِ قلب کا مطیع نہ ہو، جنہیں نفس قلب پر القا کرتا ہے متاخرین صوفیا بالخصوص مشائخ نقشبندیہ نے قلب کے احوال سے ایک دوسرا حال مستنبط کیا ہے جس سے متقدمین صوفیا آشنا نہ تھے البتہ کسی قاعدے، قانون کے بغیر کبھی کبھار اس کے بارے میں ان سے کچھ چیزیں ظاہر ضرور ہوئیں مثلاً تلمیذ میں تاثیر، اور حیز عالی میں ہمت کی تاثیر، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ انسان میں غلبہ حاصل کرنے اور عزم کی قوت رکھی گئی ہے، صاحب قوت و عزم جس چیز کی طرف متوجہ ہوتا ہے اسے بہت حقیر اور اپنے آپ کو اس پر غالب جانتا ہے اور اس شخص کا جب کسی کے ساتھ کوئی جھگڑا ہوتا ہے تو یہ اس پر غالب آ جاتا ہے اور مخالف مغلوب، پریشان، خوفزدہ اور ہراساں ہو جاتا ہے، اور اگر قوت و عزم کا مالک کسی شخص کے ساتھ نشست و برخاست رکھے اس وقت اس پر جو بھی کیفیت طاری ہو، مثلاً غم یا خوشی وغیرہ وہ اس شخص میں سرایت کر جاتی ہے لوگ قوت غلبہ کے اعتبار سے مختلف الحال واقع ہوئے ہیں، بعض میں یہ قوت پوری طرح پائی جاتی ہے

اور بعض میں سرے سے ہوتی ہی نہیں، اور کچھ لوگوں میں یہ قوت درمیانہ درجے کی ہوتی ہے لیکن عادات کے جاری ہونے کے وقت یہ قوت معاملات یا گفتگو کے دوران یا ذمہ داری اور لڑائی جھگڑے کے وقت ظاہر ہوتی ہے، اور عادات کے جاری کرنے میں غم وخوشی کی سرایت، گفت وشنید کے ساتھ ملی ہوئی ہوتی ہے جو اس صفت کی طرف مشعر ہوتی ہے، اسی وجہ سے عوام اس قوت کو دوسری تمام قوتوں سے جدا نہیں کر سکتے، اور نہ ہی ان کے دل میں اس کی تصویر آتی ہے، جب یہ شخص دوامِ عبودیت میں مشغول ہوتا ہے، اور اس کی صفاتِ قلبیہ مثلاً محبت، وجد، شوق، بغیر کسی قسم کی بات کیے، اور کام کیے مستقل ہوں، اور ان صفات کو ان چیزوں کے ساتھ ملانے کی احتیاج بھی باقی نہ رہے اور یہ خصلت اس کی تمام صفات قلبیہ میں نفوذ کر جائے اور قوتِ غلبہ بھی اپنا حصہ پا لے تو جب یہ شخص اپنے شاگرد کی طرف متوجہ ہوگا، اپنی قوتِ غلبہ اور تاثیر کے ذریعے شاگرد کی روح کو قابو میں لے لے گا، اور اپنی چشم ہمت کو اس کے دل ودماغ میں پیوست کر دے گا تو محبت ویقین وغیرہ سے جو صفت بھی چاہے گا اپنے شاگرد کے دل میں اس کا فیضان کر دے گا، اور اسی کا نام تاثیرِ توجہ اور نظر قبولیت سے دیکھنا ہے، اور سچ بات تو یہ ہے کہ قوتِ غلبہ سے توجہ کرنا، اور اپنے طالب کو صفاتِ محمودہ، میں سے کسی صفت سے متصف کر دینا ایک بہت بڑی نعمت اور درجے کی بات ہے، اس کی مثال اس شخص کی ہے جو چقماق پر لوہے کا ٹکڑا رگڑتا ہے تاکہ آگ سُلگائے، کبھی تو اس سے آگ بھڑک اٹھتی ہے اور کبھی نہیں نکلتی، پھر کبھی آگ کی چنگاری نیچے چلی جاتی ہے اور کبھی روئی کے پلیے میں پڑ کر اسے جلا ڈالتی ہے، اس کے مقابلے میں ایک دوسرا شخص ہے جس نے بہت ساری آگ اکٹھی کر رکھی ہے اور وہ ہر خشک وتر چیز کو ہر وقت بلا لحاظ صفات وشرائط بھسم کر ڈالتی ہے، ظاہر ہے کہ ان دونوں میں بہت فرق ہے اور جب سالک کلمات واذکار سے ملے ہوئے یقین اور حرف آواز کے ضمن میں پیدا شدہ التفات سے گزر جاتا ہے تو اکثر قوت مدرکہ اور قوتِ واہمہ اس کی خدمت کرتی ہے اور وہ ایک ایسی وہمی صورت تراشتا ہے کہ جس کی کوئی شکل ورنگت ہوتی ہے اور نہ جہت، اور یقین کے لئے ایک صورت قائم کرتا ہے، تاکہ اس کی شرح وتفصیل پیش کرے اور اس صورت کی مثال اس تعلق کی ہے جو قید وبند سے آزاد کردہ سفید باز کو دوبارہ اپنے ٹھکانے پر واپس لاتا ہے، اور بعض اذہان میں یہ یقین صرف صورتِ خیالیہ کی شکل میں پھیل جاتا ہے اور اس کو تجلی

صوری کہتے ہیں چاہے بیداری میں ہو یا نیند میں اور کبھی کشف کی ایک عجیب استعداد پیدا ہو جاتی ہے اور کشف حروف کے خواص، حرکات اور اشکال تک پہنچا دیتا ہے، اور یہ خواص کبھی تو دائمی تاثیر رکھتے ہیں، اور کبھی کسی خاص مقام سے مخصوص ہوتے ہیں اس مقصد کی خاطر حیوانات کو ترک کر کے ملائکہ سفلیہ پر اپنی توجہ مرکوز کرنے سے کافی فائدہ ہوتا ہے، اس مقام پر عام صوفیا ایک بڑے اشتباہ میں مبتلا ہو گئے اور دونوں کے درمیان فرق کو نہیں سمجھ سکے، اعتبار یہ ہے کہ کوئی عارف ایک آیت یا حدیث سنتا ہے اور اس کا ذہن وہاں سے ایسی معرفت کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جس کے لئے دلالت وضعی جاری نہیں کی گئی، دلالت وضعی عبارۃ النص، اشارۃ النص، ایما النص اور ان کی قِسم سے استدلال کرنے کو کہتے ہیں، بلکہ اس راہ سے کہ حدیث النفس میں ایک خیال سے دوسرا خیال اور ایک چیز سے دوسری چیز پیدا ہوتی ہے، اعتبار حاصل ہوتا ہے اور نیند یا بیداری میں خطرات کا انتقال اسی طرح ہوتا ہے جیسا کہ ظاہر ہے، ماسوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ تمام انتقالات کبھی تو حدیث النفس ہوتے ہیں اور کبھی شیطانی وسوسہ اور کبھی خاطرِ عقل، اور عارف کے حق میں یہ سچا الہام اور صحیح تعلیم ہوتی ہے، اور اعتبار مقامِ عارف اور اس کلمہ کے سماع کے درمیان پیدا ہوتا ہے، تم نے تجربہ کیا ہوگا کہ اگر کبھی کوئی گویا لیلیٰ مجنوں کا قصہ چھیڑے تو عاشق اپنی درد مندی، محبوب کی بے پروائی یا اس کی مہر و محبت اور توجہ کے فسانے دل میں دہرانے اور یاد کرنے لگ جاتا ہے اور اس طرح وہ بہت لطف اٹھاتا ہے حالانکہ یہ لیلیٰ کا قصہ ہے اور نہ اس سے مستنبط کوئی بات! بلکہ یہ سننے والے کے مقام سے اس کلمے کے ملنے کی بنا پر پیدا شدہ صورت ہے لہٰذا اعتبار میں اہم بات ذہن کا انتقال ہے نہ کہ دلالت کے طریقوں کا لحاظ، تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید میں تدبر و تفکر کے لئے فنِ اعتبار کو ملحوظ خاطر رکھا ہے، اور اسی کے مطابق ایک بحرِ بے پایاں چھوڑ دیا ہے مگر اس علم سے بحث ہماری اس کتاب کے موضوع سے خارج ہے۔ الغرض اعتبار ایک ایسا فن ہے جس کے اطراف و جوانب بہت وسیع ہیں، تفسیر عرائس البیان، حقائق سلمی اور شیخ اکبرؒ اور شیخ الشیوخ سُہروردیؒ کے کلام کا ایک خاصہ حصہ اعتبار کے موضوع سے متعلق ہے۔

جب سالک نفس، عقل اور قلب کی تہذیب سے فارغ ہو گیا، اور اس راہ کے دروازے اس

پر کھل گئے تو اس کے بعد نفس، روح اور سرّ کی ضرورت ہے، وہ تہذیب نفس جو اس نے پہلے حاصل کر لی ہے، اس تہذیب نفس سے جو مطلوب ہے بالکل جداگانہ چیز ہے، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ نفس کی شرارت دو قسم پر ہے ایک یہ کہ نفس مرغوبات طبیعہ یا مرغوبات سبعیہ ایسی اپنی مقتضیات طلب کرتا ہے اور عقل وقلب کو پریشان کر دیتا ہے اور اپنا بیشتر وقت ان بُری عادات میں صرف کرتا ہے، اس کا علاج عقل کو قلب پر غالب کرنا اور قلب کو نفس پر مسلط کرنا اور دونوں کے درمیان مقامات کا پیدا ہونا ہے، جیسا کہ گزر چکا ہے۔

دوسری یہ کہ نفس اپنے شہوانی اور سبعی مرغوبات فراموش کر چکا ہو، اس صورت میں نفس کو جتنا کریدو، اس میں معشوق کی صورت اور لذتِ وصال نہ پاؤ گے، اور جس قدر ٹٹولو اس میں حب جاہ و مال کا کوئی اثر تمہیں دکھائی نہ دے گا، لیکن اس میں سے ایک سیاہ دھواں اٹھے گا، جو روح اور سرّ کو مکدر کر دیگا اور اس میں سے ایک ایسا غبار اٹھے گا جو ان دونوں آئینوں کو تاریک کر دیگا۔ اور اس سے ایسی تلخی پیدا ہوتی ہے جو روح اور سر کو جو آپس میں شیر وشکر ہوتے ہیں بدمزہ کر دیتی ہے اس غبار کی حقیقت میں جس قدر غور وخوض کرو گے سمجھ نہیں آئے گی کہ کیا چیز ہے؟ اور اس دھوئیں کی اصلیت معلوم کرنے میں عقل حیران اور درماندہ رہ جائے گی، اس کا مطلقاً پتہ نہیں چل سکے گا کہ یہ کہاں سے اٹھتا ہے لیکن عارف ناقد بخوبی جانتا ہے کہ یہ وہی نفس ہے جس کی بری عادتیں کبھی نہیں چھوٹتیں، اور اسے کسی وقت بھی اس نفس کے ساتھ جہاد کرنے سے فراغت نصیب نہیں ہوتی، جاننا چاہیے کہ اصولی طور پر روح کی دو صفتیں ہیں، ایک یہ کہ وہ حظیرۃ القدس کے وسط میں قائم تجلی اعظم کی طرف منجذب ہوتی ہے، اور اس تجلی کے مقابل، نفس کلیہ سے چمٹ جاتی ہے اور وہاں سے اس پر اطمینان اور بے کیف آرام کا فیضان ہوتا ہے اور یہ صفت روح کے لئے بہت اونچے درجے کی حیثیت رکھتی ہے، اور اپنے ٹھکانے کی طرف اس کی انتہائی حرکت ہے، دوسری صفت اس کا ارواح طیبہ اور ملاء اعلیٰ کے ساتھ جمع ہونا، اور ان کی طرف کھنچنا ہے، اس صفت کا اثر یہ ہے کہ یہ ان سے اس طرح اثر قبول کرتی ہے جس طرح موم اس انگوٹھی کا اثر قبول کرتی ہے جو اس پر رکھی جائے، انگوٹھی کے نقوش موم کے جسم پر چھپ جاتے ہیں اور یہ اثر اصل میں ایک اجمالی امر ہے، جس میں احوال وواقعات کے تقاضوں کے مطابق مختلف آثار کی طرف وسعت پیدا ہو جاتی ہے کبھی باہمی

مخاطبت کا سلسلہ ہوتا ہے، اور اس کا سبب عقل کی مبادرت ہے اور کبھی واردات کا سلسلہ ہوتا ہے، اس کا سبب قلب کی پیش دستی ہے اور یہ صفت مراتب روح کے پست ترین درجات میں سے ہے، اور اس کا منشا اس کا اپنے منازلِ اعلیٰ سے پیچھے رہ جانا ہے اور یہ بعض آلائشوں کی وجہ سے ہوتا ہے جن میں طبیعت ملوث ہو جاتی ہے، اور بعض اوقات اپنے اوپر تجربہ کیا گیا ہے کہ تجلی اعظم سے روح پر ایک نور کا فیضان ہوتا ہے جسے ایک طرح آفتاب کی ایسی شعاع سے تشبیہ دے سکتے ہیں، جو جسم آفتاب کے بغیر ہو، الغرض یہ انجذاب تجلی اعظم کی نسبت سے ہو یا ملاء اعلیٰ کی نسبت سے، محبت خاصہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، اور یہ محبت ایمان کے علاوہ ہے جس کا مقصود عقائد حقہ پر عمل کا یقین واعتماد، اور ان عقائد پر قلب کی اتباع ہے، اور یہ محبت اس شوق اور تڑپ کے بھی علاوہ ہے جس کا منشا قلب اور جوش ایسے مقولہ وجد کے ساتھ متصف ہوتا ہے، بلکہ محبت خاصہ تو زمین کی طرح ہے جو اپنے مرکز کی طرف میلان رکھتی ہے، یا اس ہوا کی طرح ہے جو اپنے مقر کی طرف مائل ہے، دانا لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ میلان ایک چیز ہے جو دو شکلوں میں متشکل ہوتی ہے، فراق کے وقت تو یہ شوق وحرکت سے متمثل ہوتی ہے، اور وصل کی حالت میں اطمینان وسکون کے روپ میں، پس محبت خاصہ یہی میلان ہے بلکہ یہی میلان جبکہ وہ اطمینان وسکون کے ساتھ متمثل ہوتا ہے اور اس کا منشاء وہ جذب ہے جو بنی آدم کی ارواح کی نسبت سے تجلی اعظم میں موجود ہے اور اس کا منشاو انجذاب ہے جو اس تجلی اعظم کی بہ نسبت طبائع ارواح میں رکھا گیا ہے۔

اس جذب وانجذاب کی مثال اس نسبت کی ہے جو مقناطیس اور لوہے میں ہے، پس محبت خاصہ تجلی اعظم کے ساتھ پیوستگی، نزدیکی، ہم آغوشی اور شعلہ ہائے الفت کی انگیخت اور ایسے دوسرے امور ہیں، اللہ تعالیٰ ہی حقیقتِ حال زیادہ بہتر جانتا ہے۔

بلبلے برگ گلے خوش رنگ درمنقار داشت
واندراں برگ ونواخوش نالہائے زار داشت
گفتمش درعینِ وصل ایں نالہ وفریاد چیست
گفت مارا جلوۂ معشوق دریں کار داشت

(ایک بلبل نے خوش رنگ پھول کا پتا اپنی چونچ میں پکڑ رکھا تھا اور اس کے باوجود وہ بدستور

فریاد وفغاں میں مصروف تھا، میں نے اس سے پوچھا کہ وصال میں یہ فریاد وفغاں کیسی؟ کہنے لگا یہ جلوۂ معشوق کی نیرنگیاں ہیں)

اسی طرح اصولی طور پر سِرّ کی بھی دو صفتیں ہیں، ایک یہ کہ وہ تجلی اعظم کا مشاہدہ کرکے اس کا ادراک حاصل کرنے اس کے حضور حاضر ہو، اور اس بارے میں جو بات بھی کہی جاسکتی ہو، اسے حاصل ہو، اور یہ سِرّ کے مراتب میں سے سب سے بلند مرتبہ ہے، اور دوسری یہ کہ ارواح طیبہ اور ملاء اعلیٰ کا جو تجلی اعظم کے گرد مجتمع اور اس کی طرف منجذب ہیں، دیکھنا، ملاقات کرنا اور ان کا مشاہدہ کرنا ہے، اور یہ سِرّ کے مراتب میں سے ادنیٰ مرتبہ ہے، اور اس کا منشا یہ ہے کہ سِرّ بعض طبعی آلائشوں کی وجہ سے اپنے اعلیٰ مراتب کے حصول سے پیچھے رہ گیا ہے، اور اس صفت کا اثر اس تجلی کی خبر دینا اور اس سے آگاہ ہونا ہے، اور اس کو غیر سے ممتاز کرسکنا ہے، یہ اثر پذیری انگوٹھی کے موم میں اثر سے مختلف ہے، اگر عقل سبقت کرے تو کشف ہوگا اور اگر قلب بھی اس کا موافق بن جائے تو معرفت ہوگی، پھر مشاہدۂ سِرّ اور اس یقین کے درمیان جس کا فیضان عقل پر ہوتا ہے، فرق ہے، اور وہ فرق یہ ہے کہ مشاہدہ اس چیز کے حضور وظہور کو کہتے ہیں جس کی تلاش کی جارہی ہوتی ہے مگر یقین تو پسِ پشت باور کرنے اور اَن دیکھی چیز کو جاننے کا نام ہے، یہاں ایک بہت بڑا مغالطہ ہے جسے ہر صاحبِ وجدان حل کرنے کی طاقت نہیں رکھتا، اور وہ یہ ہے کہ کبھی قوتِ واہمی عقل کی خدمت کرتی ہے اور یقین کے لئے شرح وتفصیل گھڑ لی اور ایک صورت وہمی تراش لیتی ہے، چنانچہ جس وقت صاحبِ وجدان پر یہ صورتِ وہمیہ غالب آتی ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ یہ مشاہدہ ہے، ان دونوں میں امتیاز کے لئے وہ ہر چند اپنے علوم ومعارف کے گھوڑے دوڑاتا ہے، مگر اس کی پیش نہیں جاتی، اس لئے کہ اگر یہ کہیں کہ مشاہدہ آمد ہے اور صورت وہمیہ آورد، تو یہ بات بھی درست نہیں، کیونکہ آورد زیادہ عمل کی وجہ سے خود آمد کی مانند ہوجاتی ہے، اور آمد ابتدائی مرحلے میں آورد سے مشابہ ہوتی ہے، اگر کہیں کہ وہم طبیعت، وضع اور مکان میں مقید ہوتا ہے اگرچہ وہ خیر (مکان) انتہائی لطیف ہو اور تجلی اعظم تو کسی طرح بھی کسی مکان میں مقید ہوتی ہے اور نہ کسی خاص وضع کی پابند ہے، تو یہ بات بھی سودمند نہیں، کیونکہ خیر وہمی انتہائی لطافت اور نزاکت کی وجہ سے مجرد محض کے مشابہ ہوگیا ہے اور صوفی کے لئے اس میں فرق کرنے کا کوئی امکان باقی نہیں رہا، اور اگر کہیں

یہ صورت وہمیہ حواس میں ہے اور مشاہدہ تو حواس سے باہر بلکہ شش جہات سے بھی خارج ہے، تو اس کا کیا فائدہ؟ اس لئے کہ وہ خود حواس کی احاطہ کردہ اشیاء کو غیر احاطہ شدہ سے ممتاز نہیں کر سکتا۔

الغرض یہ ایک ایسا مشکل مسئلہ ہے جسے کسی کامل، صاحبِ تمکین شخص کے علاوہ کوئی دوسرا حل نہیں کر سکتا، اس کے باوصف اگر یہ صورت اپنی لطافت اور نزاکت میں مجرد محض کے مشابہ ہو جائے تو یہ بجائے خود ایک ایسی کیمیا ہے جو سرّ کے مراتب کے قریب پہنچاتی ہے، اور روح اور سرّ کے درمیان عجیب حالات پیدا ہوتے ہیں، پس اگر یہ دونوں اپنے اصلی مستقر پر پہنچ جائیں اور اپنے اوج پر ترقی کریں اور نفس بھی اپنی شرارتوں سے رُک جائے تو اسے تجلی اعظم کا مشاہدہ حاصل ہوگا، اور یہ مشاہدہ اسے ایک عجیب کشش، نادر الفت، بے مثال محبت اور الفت کی جلوہ ریزیوں کے ساتھ نصیب ہوگا اس کیفیت کا نام ''ہئیت اجتماعیہ سے اتصال'' ہے اور اگر اس حالت کا اثر قلب و عقل پر پڑے تو حواس اور جوارح اپنے اپنے کام سے معطل ہو جاتے ہیں، اسے غیبت اور ''وجود و عدم'' کے ساتھ اتصال سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اگر سرّ اپنے بعض امور سے پہلو تہی کرے اور روح نے اپنے اوج پر ترقی کی ہوتی ہو، تو ایک حالت کا ظہور ہوتا ہے جسے ''ہبوط'' کہتے ہیں جس طرح بلبل پھول کا سامنا ہوتے ہی بیقرار ہو جاتا ہے اس وقت اسے پھول کی طرف توجہ اور اس کے مشاہدے کا بھی ہوش نہیں رہتا، اگر سرّ اس سے بھی زیادہ پہلوتہی کرے تو اس کیفیت کا ظہور ہوتا ہے جسے ''انس'' سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور اگر سرّ بدستور اپنے کام میں مصروف ہے، مگر روح نے تخلف کیا ہے تو یہ حالت ''معرفت'' ہے، اگر روح کا تخلف بڑھ جائے تو تفرقہ ظاہر ہوگا وہ دیکھے گا، سہی لیکن مشاہدۂ ادراک کی لذت محسوس نہیں کرے گا، اور اگر اس حالت میں نفس کا دھواں اٹھے اور روح سرّ سے مل جائے اور انہیں پریشان کر دے تو یہ حالت ''قبض'' کہلاتی ہے، اور اگر نفس اس حال کا مطیع بن جائے اور اپنے آپ سے ہی خوش و مسرت محسوس کرے اور اس انس کی شرح و تفصیل خوشی سے کرے تو یہ کیفیت ''بسط'' کے نام سے موسوم ہوتی ہے، اور اگر بعض حالات میں اتصال نصیب ہو اور بعض میں نہ ہو تو اسے تجلی و استتار کہتے ہیں، اور اگر اتصال کی ایک قسم ایک وقت ظہور پذیر ہو اور دوسرے وقت مٹ جائے تو اسے لوامع اور سواطع کہتے ہیں، اور یہ سب مقام قلب اور عقل سے روح اور سرّ کی طرف ترقی کے ابتدائی مرحلے میں ہوتا ہے اور کبھی

’’اتصال‘‘ نسمہ کے بعض حجابات میں پوشیدہ ہوتا ہے اور اس کا باقی حصہ مخاطبات، واردات، خواطر اور دواعی حق کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، اگر قلب سبقت کرے تو وہ نکتہ حال کے ساتھ زیادہ مشابہ ہوتا ہے اور اس نکتہ سے جو علم نکلتا ہے، وہ قلب کے ذریعے نکلتا ہے، اور اگر عقل سبقت کرے، تو وہ نکتہ ادراک اور ذکاوت سے زیادہ مشابہ ہوگا، اور اس کے ذریعے دل پر جو حالت گزرے گی وہ عقل کے واسطے سے ہوگی، اور اگر روح و سرّ اپنے پست مقام میں نیچے اتر آئیں، تو انہیں ملاء اعلیٰ کے ساتھ اتصال اور ان کے زمرے میں شرکت نصیب ہوتی ہے، ارشاد باری ہے:

يٰاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِي فِي عِبَادِيْ وَادْخُلِي جَنَّتِي۔ (۱)

(اے نفس مطمئنہ! اپنے پروردگار کی طرف رجوع کر لے اس حال میں کہ تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی۔ پھر میرے (خاص) بندوں میں داخل ہو کر میری جنت میں چلا آ۔)

اور اگر یہ اتصال اور شرکت نسمہ کے بعض پردوں میں مستور ہو جائے تو پھر مخاطبات، خواطر اور دواعی ملکیہ کی صورت میں ظہور پذیر ہوتا ہے، اور کبھی سرّ اپنے بلند مراتب میں اور روح اپنے پست مراتب میں ہوتا ہے اور کبھی اس کے برعکس ہوتا ہے ان میں سے ہر ایک کی تفصیلات ہیں، جنہیں ان کا اہل ہی سمجھ سکتا ہے ع

ہر سخن وقتے و ہر نکتہ مکانے دارد

واضح رہے کہ صوفیا نے فنا و بقا کے مسئلے میں خاصی طویل بحثیں کی ہیں، تاہم نص یا اجتہاد سے انہوں نے اس کی توضیح نہیں کی، اس بارے میں جو کچھ اس فقیر (۲) نے سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ جوارح اور ان لطائف میں سے ہر ایک اپنی اپنی جگہ علیحدہ حکم رکھتا ہے اور جس وقت یہ آپس میں مل جائیں تو دو حال سے خالی نہ ہوں گے، یا ان کی کیفیت یہ ہوگی کہ باہم پارے میں پانی اور چاندی، یا کمان میں لکڑی اور سینگ کی طرح ایک دوسرے کے متصل اور مدغم ہوں گے، یا پھر ان میں سے

---

(۱) سورہ الفجر، آیت ۲۷، ۲۸

(۲) شاہ ولی اللہ محدثؒ

ہر ایک اپنے حکم میں مستقل ہوگا، البتہ جسم کی ترکیبی ضرورت کے مطابق دوسرے کی امداد و اعانت کرے گا، حالت اول میں غلبہ، سکر، محو اور وجد، پیدا ہوں گے اور دوسری صورت میں صحو(۱)، تمکین اور استقامت حاصل ہوگی اور لوگوں میں سب سے بڑا اور عظیم وہی آدمی ہے جو تمکین خالص کا مالک ہے، اور جس کا ہر لطیفہ اپنے حال میں مستقل ہے، امتزاج کی صورت میں اگر جوارح، نفس شہوانی، اور نفس سبعی کا غلبہ ہو تو ایسا شخص فاسقین اور منافقین میں شمار ہوگا، اور ان کا مختصر بیان پیچھے گزر چکا ہے، اور اگر دوام عبودیت دل میں اثر کرے، اور اس صفت کی وجہ سے دل، عقل، جوارح اور نفس پر غلبہ حاصل کرلے تو غلبہ، سکر اور وجد پیدا ہوتا ہے، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ صاحب دل کی عقل مغلوب ہوتی ہے، اور وہ اس ہیجان کے وقت دنیا کی کوئی بات سمجھتا ہے اور نہ آخرت کی اور نہ ہی اپنے فائدے کی کسی بات کا ادراک کرسکتا ہے، بلکہ سردی، گرمی، درد والم کے احساس تک سے بے نیاز ہو جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اکثر اہل وجد اپنے آپ کو زمین پر یا پتھر پر پٹک دیتے ہیں یا بلندی سے نیچے گرا دیتے ہیں، اور اگر عقل غالب آجائے تو استقامت اور علم میں پختگی حاصل ہوتی ہے اس لیے پہلی حالت کو فنا اور دوسری کو بقا کے نام سے موسوم کرتے ہیں، اسی طرح پہلی کو غلبہ اور سکر، اور دوسری کو تمکین اور صحو بھی کہتے ہیں، قلب، جوارح، عقل اور نفس پر روح کے غلبے کا نام محو اور ان تمام پر سرّ کے غلبے کا نام غیبت ہے، اور یہ ساری ''وجود ظلمانی'' کی فنا اور وجود روحانی کی بقا کی تفصیلات ہیں، اس کے بعد ایک اور فنا ہے جس کا ذکر اگلے باب میں آرہا ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ ان تمام لطائف کی تہذیب و تربیت کا طریقہ اجمالی طور پر یہ ہے کہ اپنے ظاہر کو دائمی عبودیت کا پابند بنائے اور باطن کو ''یاد کرو'' میں مصروف رکھے، تاکہ ہر ایک اپنا حصہ حاصل کرلے، اس کی مثال یوں ہے کہ جس طرح پانی درخت کی زیر زمین جڑ میں ڈالتے ہیں، لیکن درخت کی طبعی افتاد کی بنا پر ایک مقررہ نظم و ترتیب کے مطابق اس میں شاخیں اور پتے پھوٹتے ہیں اور پھل پھول نمودار ہوتے ہیں، اور تفصیلی طور پر ان لطائف کی تربیت یوں سمجھئے کہ ''ذکر بالجہر'' ضربات شدیدہ کے ساتھ کرے، اسی طرح ''حبسِ نفس'' اور وہ باطنی تعلیم اختیار کرے جو مشائخ

---

(۱) صحو: ہوشیار ہونا، مستی سے ہوش میں آنا، آسمان کا صاف ہونا، اصطلاح صوفیا میں خود کو گم کرنا، نابود کرنا اور اپنے امتیازات و اوصاف اور روعادات و خصوصیات کا یعنی اوصاف بشری کا مٹا دینا۔ (قاسمی)

نقشبندیہ کے ہاں منقول ومتوارث چلی آئی ہے۔اس کے علاوہ روح پرور اور شوق انگیز نغموں سے اپنے دل کو زندہ رکھے! اور دائمی طہارت اور تلاوت اور اوراد کی نورانیت سے اپنے آپ کو منور کرے، اسی طرح اولیائے کرام کے ارواح کی نسبت اویسیہ روح کی بالیدگی اور پرورش کا باعث ہے، اور صفات الٰہی کا مراقبہ اور اسمائے الٰہی میں تدبر وتفکر عقل کو مجلّا اور مصفا کرتا ہے اور یادداشت محض جس میں حروف وآواز کا دخل نہ ہو جیسا کہ نقشبندیہ کا معمول ہے، سرّ کو ہوشیار اور متنبہ کرتا ہے، اور اکثر دیکھا گیا ہے کہ نفس شہوات، غلبہ یا اپنے ہم جنسوں پر تفوق ایسے مرغوبات کا تقاضہ کرتا ہے، مگر یہ شخص نفس کو ان رذائل سے روکتا ہے، اور اس کی مخالفت کرتا ہے، چنانچہ ایک لمبا جھگڑا قائم ہو جاتا ہے اور معاملہ نفس کے ساتھ جہاد، ٹکر، اور گتھم گتھا ہوتے تک پہنچ جاتا ہے، اس وقت بڑی بے مزگی پیدا ہو جاتی ہے، لیکن جس وقت یہ غبار بیٹھ جاتا ہے اور شورش تھم جاتی ہے تو روح سے ایک عجیب قسم کا نور نازل ہوتا ہے جو سالک کے ظاہر وباطن کو گھیر لیتا ہے، یہ وہ عجیب کیمیا ہے جس سے عوام آشنا نہیں، اور وہ نادر دولت ہے جس کی طرف اس راہ کے راہیوں کے علاوہ کسی کی راہ نہیں، شیخ ابراہیم بن ادہمؒ نے بلاشبہ اپنی اس واردات میں اسی نورانیت وحلاوت کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ "میں نے دو دفعہ نفس کو اپنے مقصود میں کامیاب ہوتے دیکھا ہے۔" پھر آپ نے مخالفتِ نفس کے دو قصے بیان فرمائے۔

ہمارے نزدیک چند چیزوں سے لطائف کی تہذیب وتربیت کی پہچان ہو سکتی ہے، ایک یہ کہ وہ چیز جو ہم نے ہر لطیفے کے لئے متعین کی ہے، اس میں حلاوت پانا اس سے محظوظ ہونا اور اس میں لذت پانا، دوسری یہ کہ ہر ایک کی نسبت مختصر اور ہر ایک کے مقام کے ساتھ اس کی پہچان ہوگی، صاحب یقین، صاحب عقل ہے، اور صاحبِ وجد وشوق، صاحبِ قلب ہے، اور جو یادداشت کی نسبت رکھتا ہے وہ صاحبِ سرّ ہے، اور جو نسبتِ اویسیہ یا نسبت طہارت وعبادت رکھتا ہے وہ صاحب روح ہے، اور تہذیب لطائف کی معرفت کے لئے تیسری بات ان حالات وواقعات کو ملحوظ رکھنا ہے جو ان لطائف کی تہذیب پر دلالت کرتے ہیں، اور واضح رہے کہ سالک پر لطائف کی تکمیل سیر کے بعد اسی لطیفے کا غلبہ ہوتا ہے جو اصل فطرت میں زیادہ قوی ہوگا، پس جس شخص کا قلب زیادہ قوت کا ہوگا وہ انتہا تک وجد وشوق اور اضطراب پاتا رہے گا، اگرچہ تمام لطائف کی تہذیب کی

فضیلت حاصل کر چکا ہو اور صاحبِ عقل ہمیشہ اعتبارات اور معنوی تجلیات سے فیضیاب ہوتا رہے گا، اگر چہ وہ بھی اپنی سیر میں تمام لطائف کا احاطہ کر چکا ہو، اسی وجہ سے اس قسم کے معارف شیخ محی الدین محمد بن عربیؒ کے کلام میں بکثرت ملتے ہیں، اور صاحب روح، مناسباتِ روح سے لطف اندوز اور صاحبِ سر احکامِ سر سے لذت یاب ہوتا ہے، ارشادِ خداوندی ہے:

كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ.

اس مقام پر کسی غلطی کا ارتکاب نہ کر بیٹھو! اور نہ ہی کسی کامل سے آغاز کار کی کوئی باتیں۔ دیکھ کر بدگمانی میں پڑو، کیونکہ وہ تو اس لطیفے کی خبر دے رہا ہوتا ہے جو اس پر غالب ہوتا ہے۔ اس مقام پر دو اور گہرے اور باریک نکتے ہیں، ایک یہ کہ لطائف کی سیر کرنے والوں میں ایک گروہ ایسا ہوتا ہے کہ ان کے مزاج کی افتاد ہی اس طرح ہوتی ہے کہ ان کا قلب نفس شہویہ کی قید میں مقید ہوتا ہے اور اسے کبھی بھی نفس شہویہ کی قید سے کامل رہائی نصیب نہیں ہوتی، جس وقت یہ گروہ نفس کے غلیظ حجابات سے چھٹکارا حاصل کر لیتا ہے، تو لامحالہ ان لوگوں کے نفس شہوانی کے تقاضے انتہائی لطیف اور نازک ہو جاتے ہیں، چنانچہ ان لوگوں پر امارد کو دیکھنے کی خواہش کا غلبہ ہوتا ہے یا مزامیر کے سماع کی خواہش پیدا ہوتی ہے اور یہ لذت دل اور عقل کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور اس بری خصلت اور دائمی عبودیت کے درمیان عجیب وغریب نتائج ظاہر ہوتے ہیں جن کے حل کرنے میں عوام حیران ودرماندہ رہ جاتے ہیں، یہی وہ مقام ہے جس کے متعلق اسلاف میں سے کسی نے دوسرے کے متعلق کہا ہے کہ ع

"کاش کردے و گزشتے"

اور یہ مصرعہ بھی انہی لوگوں کے حق میں کہا گیا ہے ع

کفر گیرد کاملے ملت شود

اسی طرح باقی باتوں کو سمجھنا چاہیے، اور احکام سبعیہ جو بعض کاملین سے منقول ہیں، اور توجہ کرنے اور کسی سے بوجھ اتارنے کے سلسلے میں ظہور پذیر ہوتے ہیں، کو بھی اسی پر قیاس کرنا چاہیے، دوسرا نکتہ یہ ہے کہ ملت مصطفویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے مختلف ادوار میں سے پہلے دور میں لطیفۂ جوارح غالب تھا، یعنی لطیفہ قلب، جوارح اور قویٰ میں مضمحل ہونے کے اعتبار سے اور ان کی

تقویم کے لحاظ سے، پس ان لوگوں کی باتیں ظاہر شرع پر محمول ہیں، اگرچہ ان چیزوں کے ضمن میں خواص کو اجمالی طور پر لطائف کی سیر بھی میسر ہوتی رہی، ان اوراق میں جو کچھ تحریر کیا گیا ہے یہ سید الطائفہؒ کے علوم کے اصول وکلیات کا خلاصہ ہے۔ اللہ ہی حقیقت حال زیادہ بہتر جانتا ہے اور وہی آخری پناہ گاہ اور انجام کار کا مالک ہے۔

............☆☆☆............

فصل ٦

لطائف خفیہ کی تہذیب کا بیان

اسے علوم حقائق اور اشارات سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے

لطائف خفیہ کے مباحث میں غور وفکر سے پہلے یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ حقائق اور ان لطائف کے احکام سے ذہن مالوف ہیں اور نہ کان ان سے مانوس ہیں، اس لیے ان سے صرف دو قسم کے لوگ فائدہ حاصل کر سکتے ہیں، پہلے وہ جو ان کے کمال کے قریب پہنچے ہوئے ہیں اور ان کی تہذیب کی صلاحیت رکھتے ہوں، ایسے لوگ اگر یہ بحث سنیں تو یہ اسے صحیح اور مستقیم صورت میں تصور کریں گے، اور یہ تصور ان کی فتح وکامرانی کا سبب بنے گا، اور دوسرے وہ جوان لطائف خفیہ کی اجمالی معرفت رکھتے ہوں، لیکن تفصیلی معرفت کے لئے ان کے حوصلے میں گنجائش نہیں ہوتی، ایسے لوگ اگر یہ مباحث پڑھیں تو ان کی اجمالی معرفت، تفصیلی بن جائے گی، اور عمل وریاضت سے حاصل کردہ چیز اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہبی چیز کے ساتھ مل کر متحد ہو جاتی ہے، جو شخص ان مباحث کی باریکیاں سن کر سمجھ لے تو درست ورنہ اسے اس کے قائل پر چھوڑ دے اللہ اس پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے تا کہ جس روز ہر شخص اپنے پروردگار کے سامنے اپنے اسرار وبھید پیش کرے گا، تو وہ بھی ان علوم کو پیش کرے اور ہر شخص پر واضح ہو جائے کہ حق کیا ہے اور باطل کیا تھا؟

الغرض جس وقت سالک مذکورہ لطائف پنجگانہ سے فارغ ہو جاتا ہے تو اس کا سابقہ روحِ علوی سے پڑتا ہے اور یہ روح علوی دو چیزوں سے مرکب ہے، ایک نفسِ ناطقہ جو نفس کلیہ کے بحر کا ایک بُلبُلہ، یا نفس کلیہ کی شمع کا عکس یا فردِ کلّی، یا کسی نہ کسی طور پر حقیقت کا حصہ ہے، یہ ساری مثالیں اس پر منطبق ہوسکتی ہیں اور نفوسِ معدنیہ، نفوسِ نباتیہ، نفوسِ ملکیہ، اور نفوسِ شیطانیہ میں سے ہر نفس

اس نفس کلیہ کا ایک بلبلہ یا عکس ہے، البتہ ہر نفس کا حکم علیحدہ ہے، اور نفوس کا آخری دورہ نفوس کاملہ ہیں، جس طرح نفوس فلکیہ نفوس کا پہلا دورہ ہیں، پس جس طرح نفوس فلکیہ نفسِ کلیہ سے قریب تر ہیں، اسی طرح نفوس کاملہ بھی کسی نہ کسی وجہ سے نفس کلیہ سے قریب تر ہیں تاہم ایک قرب سے دوسرے قرب تک فاصلہ ہوگا، اگر اس مسئلے کو اچھی طرح سمجھنا چاہتے ہو تو جان لو کہ ہر نفس کا ایک خاص مادہ ہوتا ہے، اور نفس کلیہ اس مادے کی استعداد کے مطابق ظاہر ہوتا ہے، اور اسی مادہ کے لئے ایک خاص علامتی لباس پہن لیتا ہے، جس وقت مادہ ایک دفعہ نفس کلیہ کے فیض کی تہذیب سے بہرہ ور ہو جاتا ہے تو وہ نفس کے قابل ہو جاتا ہے، جب دوسری بار فیض سے مہذب ہوتا ہے تو لازماً ایسے نفس کے قابل ہو جاتا ہے جو پہلے سے زیادہ، لطیف، مصفا اور عقلمند ہوتا ہے، پھر جس وقت عناصر آپ میں مل کر متحد ہو گئے اور زمین و آسمان کی درمیانی کائنات ظہور پذیر ہوئی تو بحرِ نفس موجزن ہوا، اور زمین و آسمان کی درمیانی کائنات کے سب سے بلند حصے میں ایک خاص لباس میں جلوہ گر ہوا، اور اس ظہور کا اعتماد کائنات جو یہ کے مزاج پر تھا پھر تازہ فیض ظاہر ہوا اور اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اجزائے عناصر، خواص عنصریہ سے الگ ہو جائیں، اور وہ خواص اس صورت فائضہ میں مستور ہو جائیں اور تمام چھوٹے اجزا ایک فیض میں اکٹھے اور ایک حکم میں منسلک ہو جائیں۔

چنانچہ اس تازہ فیض کا نام نفسِ معدنی تجویز کیا گیا، اور جب نفوس معدنیہ نے دنیا میں پوری طرح ظہور کیا، اور بہت سے مخلوط عناصر اس نور کے ساتھ منور ہو گئے اور نفسِ کلیہ دوبارہ جوش میں آیا، تو معدنیات سے افضل اور اقرب نے مجردات کے ساتھ ایک خاص شکل میں متشکل ہو کر ظہور کیا، اور اس ظہور کا اعتماد اس صورت معدنیہ پر تھا، اور اس تازہ فیض کا منشا عناصر کو معدنی جسم میں جذب کرنا اور اسے اس کے حسب حال لباس پہنانا ہے، اور اسی طرح نشو ونما اور غذا کے بارے میں تصرف کرنا ہے جو مصلحت کلیہ کے قاعدے کی تقسیم کے مطابق اس کے لئے مقرر ہوا ہے، اور جب نفوس نباتیہ زیادہ ہو گئے اور مخلوط بھی نور سے منور ہو گئے تو نفس کلیہ پھر ایک دفعہ جوش میں آیا، اور ایک خاص صورت میں ملبوس ہو کر نباتات کے بہتر حصے میں ظہور پذیر ہوا، اس کے اس جگہ آنے اور خاص صورت اختیار کرنے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس میں بالا رادہ حس و حرکت نمودار ہوتی ہے، پھر یہ فیض بھی جس وقت خالص مادہ میں داخل ہوا، اور دنیا کو اس تدبیر سے آراستہ کیا تو نفس کلیہ

نے پھر ایک دفعہ جوش مارا اور ایک اور لباس میں نمودار ہو کر حیوانات کے بہترین حصے میں جلوہ گر ہوا، اس تجلی کا اثر عقل، قلب، نفس اور ان کے مخصوص صفات کا ظہور ہے، جیسا کہ پہلے ایک باب میں اس کے متعلق ہم بیان کر چکے ہیں، جس وقت یہ فیض بھی جہان پر اپنی نور باری کر چکا تو نفس کلیہ پھر ایک دفعہ موجزن ہوا، اور ایک خاص لباس پہن کر انسانیت کی اعلیٰ شکل میں جلوہ گر ہوا، اور اس جلوہ گری کا اثر مدبر مافی الکون یعنی نفس کلیہ کے تقاضوں کا اس خاص اَنا میں ظہور ہے اور اس صورت اور حباب میں علوم و مقامات کا فیضان ہے، درحقیقت ان ماہیات کی فصول وہی فیض جدید ہے جو نفس کلیہ سے نازل ہوتا ہے اور ان کی جنس وہی مادہ ہے جو تدبیر اول سے فیض یافتہ ہے مگر چونکہ اہل عرف اس فصل و جنس کی تفصیلات کے بیان سے عاجز ہو گئے تھے اس لئے وہ نیچے اتر آئے اور بعض ایسے عوارضات کو جو جنس و فصل کے مقام پر رکھ دیا، اور اسی کی بات کرنے لگے اور ہمارے نزدیک انسان کی مختلف اقسام میں انسان کامل ایک علیحدہ قسم ہے، جس طرح انسان اپنے ابنائے جنس میں علیحدہ نوع ہے اور جس طرح انسان نے کلی ہونے کے اعتبار سے حیوان پر تفوق حاصل کیا ہے، اسی طرح انسان کامل نے ان لطائف پنجگانہ کی وجہ سے اپنے غیر پر ترجیح حاصل کی ہے، اور یہ انانیت خاص میں نفس کلیہ کے ظہور کی وجہ سے ہے، اور انانیت خاص نے نفس کلیہ کو اپنا حصہ بنا لیا ہے، اور اس طرح کی اور بھی انسان کامل کی کئی دوسری خصوصیات ہیں جن کی تفصیل طوالت کی متقاضی ہے۔

حاصل یہ کہ نفوس جزئیہ میں سے انسان کامل نفس کلیہ سے قریب تر ہے اور اس قرب و بعد میں اختلاف کی بنیاد وہ فیض جدید ہے جو متجلیٰ لہٗ کے حال کے مطابق ہے اور دوسرا جز روح سماوی ہے، اور وہ بھی نفس کلیہ کے بحر کا ایک بلبلہ ہے، مگر یہ نفس کلیہ کی موجزنی اور اس کے ایک عالم پیدا کرنے کے بعد ہے، اور یہ نشاۃ نفوس فلکیہ ہی کی شاخ ہے، جسے عالم مثال کے ساتھ موسوم کرتے ہیں، حباب نے پہلے انسانِ کلی کی صورت میں ظہور کیا، اور عرصۂ دراز کے بعد یہ ایک صورت پھٹ کر کئی صورتوں میں پھیل گئی اور صورت انسان کے بارے میں تحقیقی بات یہ ہے کہ وہ اپنی حد ذات میں کلی نہیں ہے بلکہ وہ عالم مثال کے ہیولیٰ میں ایک متشخص فرد ہے لیکن اسے اس طرح بنایا گیا ہے کہ جس انسان کے ساتھ اسے کھڑا کریں، وہ اس سے مختلف نہیں، اسی لئے ہم اسے انسانِ کلی کہتے

ہیں، اور یہ متعدد صورتیں اپنی خاصیت نوعیہ کے ساتھ اس تجلی اعظم کی طرف منجذب ہیں، جو نفس کلیہ کے قلب میں قائم ہے، اور اس انجذاب کا سبب یہ ہے کہ تمام پیدا ہونے والے نفوس میں نفوسِ بشریہ نفس کلیہ سے زیادہ قریب ہیں، الغرض اس روح علوی میں دو جز موجود ہیں، اور یہ دونوں جز آپس میں اس طرح متحد اور مخلط ہیں کہ ایک مادہ کا قائم مقام ہے اور دوسرا صورتِ نفسِ ناطقہ کا جو ایک ایسا حباب ہے جو نفوسِ ارضیہ کی سطح سے ظاہر ہوا ہے، یہ بمنزلہ مادہ کے ہے، اور روح سماوی بھی ایک حباب ہے جو عالم مثال کی سطح سے ظاہر ہوا ہے اور یہ بمنزلہ صورت کے ہے۔

جس طرح ایک مصور پہلے اپنے دماغ میں تصویر کا نقشہ بناتا ہے، اور یہ صورت یا نقشہ ایک موجود حقیقی کو جو وجودِ مطلق کے ساتھ موجود ہوتا ہے ظاہر کرنے اور کھولنے کا سبب بنتا ہے، یہ موجود حقیقی وجود ذہنی اور وجود خارجی کے ساتھ موجود نہیں ہوتا بلکہ ایسے وجود کے ساتھ جس کا منشا، انتزاع مصلحتِ کلیہ کی تقسیم میں سے ایک حصے کا خروج ہے، اور وہ نفس کلیہ کی ذات سے قائم ہے، چنانچہ وہ مصور موم کو مختلف صورتوں میں بدلتے بدلتے اپنی ذہنی تصویر اور نقشے کے مطابق بنالیتا ہے، اسی طرح حکیم مطلق نے نفوس کو ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیل کیا، یہاں تک کہ وہ نفس ناطقہ نکل آیا جو اس صورت مثالیہ کے عین مطابق تھا جو نفسِ ناطقہ کے وجود سے سالہا سال پہلے ظاہر ہو چکی تھی، سنتِ الٰہی یہی ہے کہ ہمیشہ صورت ظاہر اور ہیولیٰ مستور ہے۔

عشق معشوقاں نہاں است و تیر
عشق عاشق بادو صد طبل و نفیر

(عشق محبوباں ہمیشہ مخفی و مستور ہوتا ہے لیکن عاشق کے عشق کے تو ہر جگہ نقارے ہوتے ہیں)

اسی لئے عارف کی سب سے پہلی سیر تجلی اعظم کی طرف اور اس کی آخری سیر انانیتِ مطلقہ کی طرف ہوتی ہے، اور اس روح علوی کے قلب میں ایک نقطہ شعشانیہ رکھا ہوا ہے جو روح علوی کا روح ہے، اور یہ روح علوی اس کا جسم ہے اس نقطہ کو حجر بحت کہتے ہیں۔

اور اس کی تفصیلات کی گنجائش اس رسالے میں نہیں ہے، البتہ اتنی بات کرتے ہیں کہ اس میں ذات بحت نے اپنا نمونہ رکھا ہے، یا یوں کہیں کہ ذاتِ بحت کا خاصہ ہے کہ ایک مرتبہ وہ اپنی

خالص ہُویت کے ساتھ ہوتی ہے، اور پھر دوسرے مراتب میں اپنی بحیثیت کے باوجود تنزل فرماتی ہے، اور اس کی یہ بحیثیت عین تنزل میں بھی قائم رہتی ہے، بخلاف دوسری تمام چیزوں کے کہ ان میں بحیثیت تنزل کے منافی ہے، یا یوں کہیں کہ جب عارف کی نگاہ خود اپنے آپ پر پڑتی ہے اور وہ اپنے اصل اصول پر غور کرتا ہے، تو اس کا منتہائے نظر نقطۂ شعشانی ذاتیہ ہوتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ یہ نقطہ میری روح کے درمیان واقع ہے حالانکہ حقیقت میں وہ نقطہ اپنے مقام عزت وعظمت اور محل بساطت میں ہوتا ہے، اس مشتِ خاک کی حیثیت ہی کیا ہے کہ اس نادرالوجود کو اپنا مہمان بنا سکے، لیکن حقیقۃ الحقائق میں اپنی نظر کے نفوذ کی بنا پر وہ یہ سمجھ بیٹھتا ہے کہ یہ نقطہ اس کے روح کے قلب میں موجود ہے، یہاں تین احتمال ہیں، پہلا بہت زیادہ مؤدّب ہوتا ہے اور اس کا قائل وہ شخص ہوتا ہے جس کا حجر بحت اس کے روح علوی کے پردوں میں لپٹا ہوا ہوتا ہے اور اپنی اصل ساخت میں روح کے ساتھ اس طرح یکجان ہوتا ہے جیسے پارے میں چاندی اور پانی یک جز ہوتے ہیں، یہ شخص جس وقت اپنے وجدان کی طرف رجوع کرتا ہے، تو اسم ذات کو جو نمونۂ ذات اور ہویت اولی کی میراث ہے، تنزلات لاحقہ اور ایسے دوسرے مراتب میں زیادہ لائق پاتا ہے، دوسرا احتمال سُکر سے زیادہ قریب ہے، اور اس کا قائل وہ شخص ہوگا جس کا حجر بحت اصل فطرت میں اس کے پردۂ روح سے جدا واقع ہے، اور اس کے تمام لطائف حجر بحت میں فنا ہوگئے ہوں، اور تیسرا احتمال صحوِ خالص، تمکینِ تام، اور بقائے مطلق سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے، اور اس کا قائل وہ شخص ہے کہ جس کا کوئی لطیفہ کسی دوسرے لطیفہ پر غالب نہ ہو، اور زبانِ حال سے اس کی دعا یہ ہو:

ارنا حقائق الاشیاء کما ھی.

(اے اللہ ہمیں چیزوں کی حقیقتیں اس طرح سمجھا جیسا کہ واقع میں ہیں)

الغرض تعبیرات کا اختلاف استعداد کے اختلاف سے پیدا ہوتا ہے، صوفیائے کرام کے اختلاف کے سلسلے میں یہی نکتہ ملحوظِ خاطر رکھنا چاہئے اللہ ہی حقیقتِ حال زیادہ بہتر جانتا ہے۔ اسی بنا پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جب یہ تین اجزا دیکھے اور ان میں سے ہر ایک کی حقیقت، بلند مقام اور رفیع مرتبے سے آگاہی حاصل کی تو انجیل کے معارف نے اقانیم ثلٰثہ کا اثبات کر ڈالا، ایک کا نام اَب رکھا وہ نقطۂ ذات ہے، دوسرے کو ابن سے موسوم کیا، اور یہ نفسِ کلیہ ہے، اور

تیسرے کو روح القدس کہا، اور وہ تجلی اعظم ہے جو حظیرۃ القدس کے قلب میں قائم ہے، اس مقام پر انتہائی باریکی اور گہرائی کی وجہ سے نصاریٰ نے بہت ہاتھ پاؤں مارے لیکن ضلالت اور گمراہی کے سوا انہیں کچھ ہاتھ نہیں آیا، وہ گدھے کی طرح دلدل میں پھنس گئے، قرآن مجید نے وضاحت کے ساتھ ان کی اس گمراہی کا رد کیا ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عبدیت کے مفہوم کو مدلل طور پر ثابت کیا ہے، سُبحان اللہ! مردانِ طریقت زبانِ حق سے کیسے کیسے باریک نکتے سنتے ہیں، اور ہر ایک نکتے کو اپنے مقام و محل میں رکھتے ہیں، لیکن یہ کس قدر احمق اور بے عقل فرقہ ہے کہ حضرت روح اللہ سے صادر شدہ ایک ہی باریک نکتے میں سرگرداں ہو کر رہ گیا ہے، ہر طرف ہاتھ پاؤں مار رہا ہے لیکن اسے کسی طرف بھی راستہ نہیں ملتا ۔

شربت الحب کاساً بعد کاسٍ

فما نفد الشرابُ وما رویت

(میں نے شرابِ محبت کے جام پر جام لنڈھائے لیکن شراب ختم ہوئی اور نہ ہی میری پیاس بجھی)

یہ بحث بہت طویل اور ہمارے موضوع سے غیر متعلق ہے۔

جب یہ تین اصول واضح ہو گئے تو جاننا چاہیے کہ لطائف خفیہ جو حقیؔ، نور القدسؔ، اخفیٰ اور انا سے عبارت ہیں، کے احکام انہی تین اصولوں سے نکلتے ہیں، عارف جب اپنی سیر میں ولایت صُغریٰ (جس کی تشریح حضرت جنیدؒ کے مسلک میں گزر چکی ہے) سے بلند ہو جاتا ہے، تو یہ کیفیت دو حال سے خالی نہیں ہوتی، یا تو روح سماوی کا حکم غالب آتا ہے، اور وہ تجلی اعظم کی طرف منجذب ہوتا ہے اور اسے تجلی اعظم کے ساتھ عجیب قسم کا اتصال حاصل ہوتا ہے، اور عین اس اتصال میں حجر بحت تجلی اعظم کے ساتھ مل جاتا ہے اور وہاں سے ذات بحت کی طرف ایک بے کیف صعود حاصل ہوتا ہے اور اسے ذات بحت سے وہ کچھ ملتا ہے، جسے تنگ ہائے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا، اگر اسے مشاہدہ کہیں تو یہ بھی درست نہیں، اگر اسے وصول کا نام دیں تو یہ بھی غلط، کیونکہ اسے قبیلۂ وصول سے نہیں کہا جا سکتا، بس ایک ایسا خوابِ فراموش ہے جس کے بارے میں وہ اتنا تو جانتا ہے کہ کچھ ہے، لیکن وہ کیا ہے؟ کیسا ہے؟ اس کی تشریح نہیں کر سکتا، اس راہ کو وراثتِ نبوت سے تعبیر

کرتے ہیں یا نفسِ ناطقہ کا حکم غالب ہوگا، اور یہ بلبلہ دریائے کلیہ کی سطح میں بیٹھ جائے گا اس بلبلے کے بیٹھ جانے کی نشانی یہ ہے کہ اس نفس کے فوارے میں حکم کلی آجاتا ہے، اور یہ خاصیت عام ہوجائے گی کبھی یہ عموم فقط علم میں ہوگا ایسے میں اس کی نظر اس حقیقت مطلقہ تک جا پہنچے گی جس میں تمام متعینات کا تعین ہے، اور کبھی بعض دواعی کلیہ کا انتقال بھی ہوگا، پس ان دو مقامات میں سے ایک نہ ایک مقام پیش آتا ہے، یا تو سالک اپنے آپ کو اپنے اور اپنے مشمول کے درمیان قصدِ اول اور حقیقتِ مطلقہ کو قصدِ ثانی میں دیکھتا ہے، یا حقیقت مطلقہ کو قصد اول میں ادراک کر کے اپنے سمیت سارے عالم کو اس سے ایسے قائم دیکھے جیسے جوہر کے ساتھ عرض قائم ہوتا ہے، یا ان اعتبارات کی طرح جو موجود فی الخارج سے پیدا ہوتے ہیں، یا ان صورتوں کی طرح جو ظاہر و مخفی ہونے کی صورت میں مادہ کو عارض ہوتی ہیں، دوسرے اس حباب سے اس کی نگاہیں بالکل پھر جاتی ہیں، اور حقیقتِ مطلقہ کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا، اس مقام پر بھی دو احتمال ہیں، یا انانیت مطلقہ انانیت خاص کے قائم مقام ہوجائے گی، اور سالک انانیتِ خاص کو ہی انانیت مطلقہ سمجھ رہا ہوگا، یا وہ انانیت خاص کو سرے سے بھلا بیٹھے گا اور نفیاً و اثباتاً اس سے کوئی تعرض ہی نہیں کرے گا، انانیتِ مطلقہ کو انانیت خاصہ کے مقام میں رکھے گا اور نہ علیحدہ طور پر اسے یاد کرے گا، اہلِ سلوک کی اصطلاح میں اسے تجلی ذات کہتے ہیں، اس حالت میں عارف کی بصیرت کا منتہاء اور اس کا مطمحِ نظر نفس کلیہ ہوتا ہے، اور اسی مقام سے ذاتِ بحت کی طرف صعود کرتا ہے، اور اسے وہ کچھ نصیب ہوتا ہے، کہ وہ اس کی تعبیر و توضیح سے عاجز اور درماندہ رہ جاتا ہے، اسے سمجھ نہیں آتا کہ وہ اس خوابِ فراموش کو کن الفاظ کا جامہ پہنائے، اور اس ذاتِ وراء الوراء کا تصور کس طرح کرے، اس راہ کو ولایتِ کبریٰ کہتے ہیں۔ جو بھی صورت ہو وارثِ نبوت ہو یا ولایتِ کبریٰ، روح علوی حجر بحت پر اس طرح لپٹا ہوا ہوتا ہے جیسے کسی قیمتی ہیرے پر روئی لپٹی ہوئی ہوتی ہے، ظاہر ہے کہ جب تک یہ پردہ نہ ہٹایا جائے ہیرے کی صفائی اور لطافت کا پتہ نہیں چل سکتا، روح علوی کا حکم غالب ہوتا ہے، روح سماوی کا حکم ہو خواہ نفس ناطقہ کا چاہے ان دونوں کا ہو، اور حجر بحت کا حکم مغلوب، زیر اور اس کے پردہ میں مستور ہوگا، اسی لئے ذات بحت کے ادراک میں حیرت کے سوا کچھ بھی ہاتھ نہیں آتا، اور اس ادراک کو خوابِ فراموش کے علاوہ اور کوئی نام نہیں دیا جا سکتا، اس مقام پر جس راستے سے

بھی پہنچا ہو، اس راستے سے گیا ہو خواہ اس راستے سے، خواہ دونوں راستوں سے بہر طور وہ مقام و منزل اور رتبے کے لحاظ سے اکمل و اعظم ہے، بسا اوقات حجر بحت استقلال پیدا کر لیتا ہے، اپنے اندر پھرتا اور اپنے آپ پر جوش میں آتا ہے چنانچہ کسی نہ کسی طرح وہ اپنے پردے کو پھاڑ ڈالتا ہے، اور اس کی صفائی و لطافت ظاہر ہو جاتی ہے، اور کسی نہ کسی وجہ سے یہ سارے لطائف فنا ہو جاتے ہیں، اور صرف حجر بحت باقی رہ جاتا ہے، ایسے شخص کے ساتھ دو اطراف سے گفتگو کی جاتی ہے، ایک تجلی اعظم کی طرف سے اور دوسرے نفس کلیہ کی جانب سے یہ ہر ایک کو الگ الگ پہچانتا ہے، اور یہ دونوں جہات اس سے اوپر ہوتی ہیں، گویا اس پر اوپر سے بات نازل ہوتی ہے، اور الہام پہنچتا ہے، گزشتہ گفتگو سے تم نے یہ بات سمجھ لی ہوگی کہ ان اعتبارات کے تغائر کی طرح حقیقت انسان میں تعدّد پیدا ہو جاتا ہے، اور لطائف پھوٹتے ہیں، اور ہر لطیفہ کا نام جدا رکھا جاتا ہے۔

جز سماوی کے غلبے اور اس حکم میں حجر بحت کے حکم کے اضمحلال کے اعتبار سے روح علوی کا ایک نام مناسب ہے، اور وہ نام ''نور القدس'' ہے، اسی طرح نفس ناطقہ کے غلبے اور اس کے حکم میں حجر بحت کے حکم کے مضمحل ہونے کے اعتبار سے روح علوی کا ایک علیحدہ نام چاہئے اور وہ ''لطیفہ خفیہ'' ہے، پھر حجر بحت کے ظہور، ان دونوں روحوں پر اس کے غلبے اور ان پر اس کے حکم کے نافذ ہونے کے اعتبار سے ایک اور نام ہونا چاہیے اور وہ ''اخفیٰ'' ہے، یہ اخص خواص سالکین کے سیر کی آخری انتہائی منزل ہے، زیادہ اللہ بہتر جانتا ہے۔

بعض افراد پر ایک اور حالت طاری ہوتی ہے جس کے ادراک سے عقل قاصر ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ عقل کی ایک خاص حد ہے، وہ اپنی حد میں بھاگ دوڑ کرتی دور ہاتھ پاؤں مارتی ہے اپنی اس حد سے ورے عقل کا گزر ہے اور نہ اس مقام کے احوال سے اسے کوئی آگاہی حاصل ہے، یوں بھی نہیں کہ پہلے عقل احاطہ کر لیتی ہو اور پھر اس کی تکذیب کرتی ہو، حاش اللہ جب رفتہ رفتہ بات باریک نکتوں اور گہرے حقائق تک جا پہنچی ہے، تو مناسب ہے کہ کنایات و اشارات ہی میں بات کی جائے، جیسا کہ مشہور مثل ہے کہ ''جب پانی سر سے گزر گیا تو کیا ایک نیزہ، کیا دس نیزے؟'' یعنی پیمائش کا کیا فائدہ؟ جس وقت عارف کا کمال حجر بحت سے بلند ہو جاتا ہے، نفس کلیہ اس کا جسم اور ذات بحت اس کے روح کے بمنزلہ ہو جاتی ہے تو وہ تمام عالم کو تبعاً علم حضوری

کے ساتھ اپنے اندر دیکھتا ہے، اور علم حضوری اصولی طور پر ذاتِ بحت سے متعلق ہوتا ہے، اور سالک اس خاصہ کو دوسری انانیت کی طرح جدا سمجھتا ہے، یا یہ صورت ہوتی ہے، کہ وہ اس انانیتِ خاصہ سے ایک بسیط ذہول اختیار کر لیتا ہے، اس پر اوپر سے کوئی معرفت یا الہام مترشح نہیں ہوتا، بلکہ جوشِ قضا وقدر اور علوم والہامات سب اپنے سے اپنے اندر ملاحظہ کرتا ہے جیسے ایک حدیثِ نفس دوسری حدیث کو اپنی طرف کھینچتی ہے، اور جس طرح ایک تخیل سے قبض اور دوسرے سے نشاط وسرور کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اس حالت کو تجلی ذات کہتے ہیں، اور اس کے حقوق کی ادائیگی اس جہان میں تو کیا آخرت میں بھی نہیں ہو سکتی، اسی لئے صوفیا نے کہا ہے۔

توحیدہ ایاہ توحید

وتوحید من وحدہٗ لاحد

اس حالت سے ایک اور رنگ نمودار ہوتا ہے، اور ایک چیز تھوڑے سے وقفے سے پس پردہ سے جلوہ نمائی کرتی ہے، اور انشاء اللہ عنصری حجابات اٹھنے کے بعد یہ زیادہ واضح ہو جائے گا۔

حجاب چہرہ جان می شود غبار تنم

خوش آں زمان کہ ازیں چہرہ پردہ برفگنم

(میرا خاکی جسم میری جان کے چہرے کا نقاب اور پردہ ہے وہ کیا ہی قیمتی لمحہ ہوگا جب اس چہرے سے یہ پردہ اتار پھینکوں گا)

عجیب کیفیت ہے ہم جانتے ہیں کہ اس مقام کے حقوق کی ادائیگی ہماری طاقت سے باہر ہے نیز یہ بھی جانتے ہیں کہ ہم نے اس کا احاطہ کر لیا ہے اور اس مقام کی بلندی تک پہنچ گئے ہیں، تاہم وہ کیا ہے عقل اس کی تعبیر سے قاصر اور زبانیں اس کے بیان سے گنگ ہیں، حجر بحت کے جوش وخروش کے سلسلے میں جو کچھ کہا گیا ہے یہ اس سے دوسری بات ہے وہ سب ظل اور عکس تھا اور یہ اس کی اصل ہے وہ صرف گفتار تھی اور یہ کردار ہے، وہ سب خبر وحکایت تھی اور یہ حقیقت واقعہ ہے۔

وجود روحانی کی فنا اور لاہوت کی بقا سے مراد مخلوق کی ہستی پر غلبہ حق ہے، اور معنوی طور پر اس کا مقصد یہ ہے کہ لطیفہ خفیہ تمام لطائف پر غالب ہو جائے، یا لطیفہ نور القدس اور لطیفہ حجر بحت میں سے کوئی ایک لطیفہ غالب ہو جائے یا ان لطائف خفیہ کے ضمن میں انانیت کبریٰ کے ساتھ تمام

لطائف کا خاص ارتباط پیدا کیا جائے، اور یہ غلبہ دو قسم پر ہے، ایک غلبۂ آثار، دوسرا غلبۂ ذات، غلبۂ آثار یہ ہے کہ انانیتِ مطلقہ کا رنگ انانیت خاص پر مسترشح ہو، اور کون مطلق کی تراوت ان لطائف کے مسامات کی راہ سے کون خاص میں سرایت کر جائے، اور تشبیہ اور محاکات کے وجود میں سے کسی وجہ سے عالم اطلاق سے احکام عالمِ تعین میں اتر جائیں، اور جس طرح سودا کو زمین کے ساتھ صفرا کو آگ کے ساتھ اور بلغم کو پانی کے ساتھ نسبت دی جاتی ہے اور جیسے حقیقت انسان میں بہت سے لطائف ہیں جنہیں محاکات کی کسی نہ کسی وجہ سے شیاطین، ملائکہ، نر جانوروں اور اجسام نامیہ سے نسبت دی جاتی ہے، اسی طرح بعض علوم اور حالات انانیت خاصہ میں پائے جاتے ہیں اور محاکات کی کسی نہ کسی وجہ سے وہ انانیت مطلقہ کی طرف منسوب ہوتے ہیں، اور وہ اسی مقام کی میراث اور اسی مقام سے متعلق ہوتے ہیں، اس کے علاوہ دوسری مناسب تعبیرات کو بھی اسی معنیٰ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اور ان احکام میں اصل بات یہ ہے کہ عالم کو حق میں یا حق کو عالم میں دیکھے یا مشاہدۂ حق میں محو ہو کر عالم سے نظریں پھیر لے اور ذہول اختیار کر لے، یا اس پر کسی نہ کسی حیثیت میں نظامِ کُلی منکشف ہو جائے اور جب تک دونوں حکم باہم مل نہ جائیں پہلی دونوں صورتیں ثابت نہیں ہو سکتیں، کیونکہ اگر صرف کونِ مطلق کا حکم ہوتا تو عالم کی خصوصیات ظاہر نہ ہوتیں اور اگر کونِ خاص کا حکم ہوتا تو حقیقت مطلقہ جلوہ نمائی نہ کرتی، یہ آپس میں مل کر ایک عجیب قسم کی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں، صوفیا کے اکثر جوش اور حلول و اتحاد سے متعلق ان کی شطحیات اسی امتزاج کی وجہ سے ہوتی ہیں، سالک جب حق کو حق میں دیکھ لیتا ہے تو اسے ان خیالات سے کیا سروکار باقی رہ جاتا ہے۔

اور اس سے زیادہ اہم بات تو تجلی اعظم یا نفس کلیہ کی اصل سے داعیۂ الٰہیہ کا منتقل ہونا ہے یا اس مقام سے کہ جس میں تجلی اور نفس کلیہ کے لئے تعدّد کی گنجائش نہیں ہوتی، اس مقام پر تو سب وحدت ہی وحدت اور بساطت ہی بساطت ہے، پس یہ داعیہ الٰہیہ ان بلند مقامات میں سے کسی ایک مقام سے نیچے اتر کر انانیتِ خاص کے ساتھ چمٹ جاتا ہے، اور اس حباب کے جوہر کے ساتھ مل جاتا ہے اور یہ شخص مصلحتِ کلیہ اور تدبیر اکبر کے سامنے ایک آلہ کی طرح بن جاتا ہے اور عقل، قلب اور نفس میں ایک ایسی حالت پیدا ہو جاتی ہے، جو اصل میں تو حالات نفسانیہ کے قبیل

سے ہوتی ہے مگر ملاء اعلیٰ کے حالات سے بہت زیادہ مشابہت رکھتی ہے، اور تدبیر کلی کے مقتضیٰ کے مطابق نفوس بنی آدم کو اس کی طرف متوجہ کرتے ہیں اور لوگوں میں اس نفس کی طرف سے وہ رنگ پہنچاتے ہیں جو تجلی اعظم کے مطابق ہے جو شخص اکبر کے قلب میں واقع ہے جیسا کہ ارشادِ باری ہے: کل یوم ھو فی شان۔ اس شخص کو کامل کہتے ہیں، اور جس رنگ کا فیضان ہوتا ہے وہ ملت کا رنگ ہوتا ہے یا کسی جدید علم کا، طریقہ ہائے سلوک میں سے کسی طریقے کا، یا رفع مظالم اور لوگوں کی عادات ورسوم کی تبدیلی کا، صاحبِ ملت نبی ہوگا، اور مظالم کو اٹھانے والا، خلیفۃ اللہ۔

اور یہاں پر ایک بہت بڑا اشتباہ واقع ہو جاتا ہے، جسے اصحابِ تمکین کے علاوہ کوئی بھی حل نہیں کرسکتا، اور وہ یہ ہے کہ کبھی دواعی الٰہیہ مقاماتِ عالیہ سے نہیں ہوتے بلکہ عالم مثال میں کسی وقت وہ داعیہ پیکر عظیم کی شکل میں متمثل ہو کر بعض نفوس بشریہ جزئیہ پر نازل ہوتا ہے، اور یہاں پر عارف اس داعیہ کے درمیان جو خاص نفس کے لئے مقاماتِ عالیہ سے اٹھتا ہے، اور اس داعیہ کے مابین جو عالم مثال سے کسی بھی نفس کے لئے اٹھتا ہے، گو اتفاق سے یہ نفس اس کا حامل بھی ہو، فرق نہیں کر پاتا، اور ایک کو دوسرے کی جگہ سمجھ بیٹھتا ہے اور جس وقت کامل کے نفس پر داعیہ خاص طور پر متوجہ ہوتا ہے، تو شخص اکبر کے تمام اعضاء مصلحت کلیہ کے اشتراک کی وجہ سے اس داعیہ سے معمور ہو جاتے ہیں، اور اس کامل کے عقل وقلب تک عالمِ مثال سے ایک وسیع راہ کھل جاتی ہے، یہ بات اشتباہ کو مزید تقویت دیتی ہے اور امتیاز اور بھی مشکل ہو جاتا ہے، اور اپنی ذات کا غلبہ عبارت کے تحت نہیں آسکتا، اور عقول کو ان چیزوں کے ادراک میں سوائے محرومی کے کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا، لیکن جو چیز مقدور میں ہے وہ یہی دو تین کلمات ہیں، مثلاً حجر بحت ایک ایسا سرّ ہے جو ذات سے پھوٹتا ہے اور اس کا یہ پھوٹنا ایک ایسا امر ہے جو اپنے طور پر ثابت اور محقق ہے لیکن اس کی کیفیت کا کچھ پتہ نہیں، اسی طرح حجر بحت سے بھی ایک سرّ نکلتا ہے، اور اس کا بھی یہی حال ہے کہ وہ ثابت اور محقق تو ہوتا ہے، لیکن اس کی کیفیت مجہول ہوتی ہے، اور یہ تمام ظاہری و باطنی لطائف کو گھیر لیتا ہے، اور لطائف کے علاوہ جوارح پر بھی غالب اور مسلط ہو جاتا ہے اور محاکات کی کسی نہ کسی وجہ سے اسے اپنا عین بنالیتا ہے، اور اپنے رنگ میں رنگ لیتا ہے، اس کے علاوہ اس قسم کی دوسری مناسب تعبیرات سے اسے موسوم کیا جاسکتا ہے، اور لطائف کو اس سرّ کی معرفت سے

جو حجر بحت سے پھوٹتا ہے اور خود بحر بحت کو بھی انانیتِ کبریٰ سے خاص ربط پیدا ہوتا ہے اس کی مثال اس آفتاب کی ہے جو مختلف اشکال، مقدار اور رنگوں کے آئینوں پر چمک رہا ہو، اور وہ سارے آئینے ایک عجیب چمک اور نور پھیلا رہے ہوں، یا اس کی مثال اس چمکدار یاقوت کی سی ہے جسے بلوری جسم کے درمیان جڑ دیں، اور اس یاقوت کے رنگ کا عکس سارے بلوری جسم میں آ جائے، اور اگر حقیقتِ حال کی تحقیق کرو تو معلوم ہوگا کہ غلبۂ آثار اور غلبۂ ذات بنیادی طور پر ایک ہی چیز ہے، فرق صرف قلت اور کثرتِ غلبہ کا ہے، قلت کے وقت امتزاج کے بغیر اس کے اور عالم کے احکام کو نہیں جان سکتا، اور غلبہ کے وقت بغیر امتزاج کے اس کے احکام کا ظہور ہوتا ہے، اللہ ہی حقیقتِ حال زیادہ بہتر جانتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ اس سے زیادہ بیان کا کوئی فائدہ نہیں، اس سلسلے میں پہلی اور آخری بات یہی ہے کہ ہم سرے سے اس بھنور سے کنارہ کشی اختیار کریں، اور لطائف کی ضروری بحثوں میں توجہ کریں۔

قلم بوقلموں در کف اندیشہ گداخت
رنگ آخر شد و نیرنگ تو تصویر نہ شد

(میرا ابوقلموں قلم اندیشے کی ہتھیلی میں گل گیا، رنگ ختم ہو گیا لیکن تیری نیرنگی تصویر نہ بنی)

واضح رہے کہ جس طرح جوارح کے اعمال ظاہر، روشن اور محسوس ہوتے ہیں، اور نفس، قلب، روح اور سّر کے احوال مخفی اور پوشیدہ ہوتے ہیں، ایک کا تعلق عالمِ شہادت سے ہے اور دوسرے کا عالمِ غیب سے، اسی طرح جو کچھ ان لطائف پر گزرتا ہے وہ بھی ظاہر اور روشن ہوتا ہے، اور جو کچھ ان لطائف خفیہ پر واقع ہوتا ہے، وہ مخفی اور مستور ہوتا ہے، عقل و وجدان سے اسے محسوس نہیں کیا جا سکتا، ان کا حاسہ الگ ہے جو انتہائی لطیف اور نازک ہے، اور اسے صوفیا کی اصطلاح میں "ذوق" کہتے ہیں اس مقام پر بہت سے لوگ غلطی کر جاتے ہیں، جو چیز عقل و وجدان کی مالوف ہے، اگر وہ ایسے حاسے سے دریافت ہو جو اس سے کہیں زیادہ باریک ہے تو وہ اس کے ادراک کی لذت محسوس نہیں کرتے اور یوں بھی ہو سکتا ہے کہ اس کا ادراک تو کریں لیکن ادراک کا انکار کر دیں، جس طرح وہ پست ہمت لوگ جو لذتِ محسوسہ کے علاوہ کچھ بھی نہیں پہچان سکتے، اور

جو چیز ظاہری حواس سے معلوم نہ ہو، اسے معدوم سمجھ بیٹھتے ہیں، اس نفسانی مرض کا علاج یہ ہے کہ پہلے ہر چیز کا حاسہ اور اس کے ادراک کی علامات سمجھ لینی چاہئیں اس کے بعد پوری ہمت کے ساتھ مالوف کو چھوڑ دینا چاہیے، اور لطیف مدرک کی عادت اختیار کرنی چاہیے، حاسّہ قوتِ واہمہ کی وجدانیت ہے نہ کہ حواسِ ظاہرہ، اور اس ادراک کی علامت یہ کہ وہ کسی شکل و مقدار کا حامل نہ ہوگا، اور فی الجملہ اسے حیز سے تعلق ہوگا، اور امور مجردہ کا حاسّہ قوت مدرکہ متخیلہ اور واہمہ نہیں بلکہ محض نفسِ ناطقہ ہے، اور اس کی صفت یہ ہے کہ وہ لواحق مادہ سے مطلقاً آزاد ہوگا۔

واضح رہے کہ روح علوی کی تہذیب کا انحصار اس بات پر ہے کہ وہ تجلی اعظم کی طرف متوجہ ہو، اس کے ساتھ اتصال اور اس کے سامنے عاجزی اختیار کرے، اسی طرح روح علوی کی تہذیب ملاء اعلیٰ کا اثر قبول کیے اور اس کے رنگ میں رنگین ہوئے بغیر بھی محال ہے، اور اس مسئلہ کا راز یہ ہے کہ تہذیب سے مراد ہے فاسد صفت کی صالح صفت سے تبدیلی، اور ہر چیز کی صفت اس کی لطافت کے مطابق ہوتی ہے، اور اس تبدیلی کا قریبی سبب بھی اس کے مناسب اور حسبِ حال ہوگا، اور تجلیِ اعظم کے ماسوئی نفسِ انسانی کے قریب کوئی دوسری چیز نہیں، اور لاہوت کی صفات میں سے کوئی صفت جو روح کی صفت کے موافق ہو، اس تجلی کے ساتھ اپنا ربط پیدا کرنے اور اس کے سامنے عاجزی اختیار کرنے کے علاوہ کچھ نہیں، جو شخص توحیدِ خالص یا توحید خالص کے مقدمات سے نفس کی تہذیب چاہتا ہے، وہ غلطی پر ہے، اسی لیے تمام شرائع اسی تجلی اعظم کی طرف توجہ ہی کے بیان پر مبنی ہیں، یہاں پر ایک نہایت عمدہ تحقیق ہے، ذرا اس کی طرف توجہ فرمائیے: اہلِ زمان کا اس امر میں اختلاف ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس اختلاف میں فیصلہ کرنا بجائے خود بہت مشکل ہے ایک گروہ کا خیال ہے کہ اصل مطلوب، فنا، لاہوت میں اپنے آپ کو مٹا دینا، اور عالمِ مادّی سے خود کو باہر نکال لینا ہے، اور شارع نے ان لطائف خفیہ کی مقتضیات اور ان کی بنیاد بیان فرمادی ہے اور خواص کو ان کی دعوت دی ہے، اور ان کی تفصیل، ان کے گوش گزار کردی ہے، اور شریعت میں معاش کی رعایت، اور جسمانی عبادات کی بجا آوری کا حکم اس لئے ہے، کہ ہر شخص اس اصل اور بنیاد کو بجا نہیں لاسکتا، اور مثل مشہور ہے کہ **مالا یدرک کلہ لایترک کلہ** (جو چیز مکمل حاصل نہیں کی جاسکتی وہ ساری کی ساری چھوڑی بھی نہیں جاسکتی) وہ عزیمت کا حکم رکھتی ہے، کیونکہ وہ

مطلوبِ اولین ہے اور یہ رخصت کے حکم میں ہے کیونکہ یہ بندوں کے اعذار پر مبنی ہے، اور بعض حضرات کا خیال ہے کہ جس چیز پر ظاہر شریعت دلالت نہیں کرتی وہ سرے سے مطلوب ہی نہیں، اور اس کا اثبات کرنا شریعت کے خلاف ہے، اور ان لطائف خفیہ کے معارف میں بحث و تمحیص بجائے خود الحاد اور گمراہی ہے ہمارا خیال ہے کہ انسان کی صورت نوعیہ کے اعتبار سے اصل مقصود یہی ہے کہ انسان اعمال سے جوارح کی تہذیب اور احوال و مقامات سے لطائف بارزہ کی تربیت حاصل کر لے، نوع انسانی اس طرح واقع ہوئی ہے کہ اس کی سعادت تجلی اعظم اور ملاء اعلیٰ کی طرف توجہ کرنے اور اس کی شقاوت اس سے اعراض کرنے میں ہے، انسانی افراد اس مقام پر پہنچ گئے تھے کہ ان کی اکثریت عالمِ برزخ اور اس کے بعد پیش آنے والے حالات میں عذاب میں مبتلا ہو جائے، ظاہر ہے اس عذاب سے انہیں محض اپنے فکر سے چھٹکارا کبھی حاصل نہ ہوتا، چنانچہ اللہ تعالیٰ جلّ جلالہٗ نے اپنے خصوصی کرم سے ان کی چارہ سازی کی، ان کے لئے راہِ مستقیم کھول دی، اور اپنی نعمتوں کی تکمیل کے طور پر انہیں کی شکل و صورت میں حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو لسانِ الوہیت کا ترجمان بنا کر بھیجا۔

دراصل جو ربوبیت ابتداءً ان کی تخلیق کا موجب بنی تھی، اس آڑے وقت میں بھی اسی نے ان کی دستگیری فرمائی، انسان کی صورت نوعیہ اپنی زبان حال سے شریعت، تہذیب جوارح اور لطائف بارزہ کی تہذیب کے علاوہ مبداء فیاض سے اور کسی بھی چیز کی دریوزہ گری نہیں کرتی، اور نوع انسانی کے افراد پر ان کے احکام کے علاوہ اقتضائے نوع اور خواص نوع کے سریان کے احکام وغیرہ لازم نہیں ہوتے، شرع اور لطائف بارزہ کی تہذیب کو جو کچھ لازم ہے اصولی طور پر ان کی حامل صورت نوعیہ ہے، اگرچہ وہ افراد کے ضمن میں بھی کیوں نہ تقاضا کر رہی ہو، افراد کی خصوصیت کو وہاں کوئی دخل نہیں، اور فنائے وجود روحانی، بقائے لاہوت اور لطائف ظاہرہ کا لطائف خفیہ میں فنا ہونا نوع کے اعتبار سے نہیں، بلکہ کبھی یہ بعض ایسے افراد کی خصوصیات کی وجہ سے مطلوب ہوتا ہے جن کی تخلیق انتہائی بلند اور لطیف ہوتی ہے اور ان مقامات کی طرف ان کے اندر طبعی میلان رکھ دیا جاتا ہے، اور ان پر شوق و اضطراب کا نزول ہوتا ہے، اور انفرادی خصوصی کے ساتھ انہیں اس کی دعوت دی جاتی ہے، چنانچہ یہ منہ کے بل بلکہ سر کے بل اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں، چونکہ حکیم

مطلق کی حکمت کا تقاضا ہے کہ جس شخص کے اندر کسی کمال کے حصول کی استعداد موجود ہے اس کے لئے کمال کی حقیقت اور خواص منکشف ہوجاتے ہیں چنانچہ یہ راہ ایسے لوگوں کے لئے آسان ہوجاتی ہے اور وہ منزلِ مقصود تک پہنچ جاتے ہیں ارشادِ باری ہے:

كُلًّا نُمِدُّ هٰؤُلَآءِ وَهٰؤُلَآءِ مِنْ عَطَاءِ رَبِّكَ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا. (۱)

(آپ کے رب کی اس عطا میں سے تو ہم ان کی بھی امداد کرتے ہیں، اور ان کی بھی اور آپ کے رب کی یہ عطا کسی پر بند نہیں)

حاشا للہ ثمّ حاشا للہ ! یہ حکم نہ تو ان احکام میں سے ہے، جو ہر شخص کے لئے مقرر ہیں، اور نہ ہی اس کا تعلق اس عمومی دعوت سے ہے، جس کے مخاطب تمام عوام و خواص ہیں، اور جو صورتِ نوعیہ کے راستے سے ظاہر ہوئی ہے، بلکہ یہ تو ایک مخصوص قانون ہے جو بعض افراد پر لاگو ہوتا ہے اور بعض پر نہیں، اور یہ وہ دعوتِ صُغریٰ ہے جو انانیت خاصہ کے وزن سے ظاہر ہوئی ہے، اور شارع کے کلام کو اشارتاً کنایتاً کسی طرح بھی اس پر محمول نہیں کیا جاسکتا، ہاں یہ علیحدہ بات ہے کہ بعض لوگ شارع کا کلام سن کر یہ مطالب مستحضر کر لیتے ہیں، جس طرح کوئی عاشق لیلیٰ مجنوں کا قصہ سُن کر اپنا قصہ دہرانے لگتا ہے، بلکہ جو کچھ ہم نے سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ شارع کا مقصد خود ان اسرار کی پردہ پوشی اور ان کے بیان سے پہلو تہی کرنا ہے، تاکہ جو شخص اس کا اہل اور ان کے لئے تیار ہو تو وہ اسے جان لے اور جو اس کے لئے تیار نہ ہو وہ اپنی طبیعت و مزاج کی فطرت پر رہے کسی جہل مرکب ایسی بیماری میں مبتلا نہ ہو، صوفیا کے رسائل اور کتابیں ہر چند خاص لوگوں کے لئے اکسیر بے نظیر ہیں تاہم عوام کے لئے یہ کتابیں سمِ قاتل کا حکم رکھتی ہیں، اللہ اس شخص پر اپنی رحمت نازل فرمائے جو نااہل لوگوں سے اسرار و رموز کی یہ کتابیں مخفی رکھتا ہے، جب سارا راز طشت از بام ہوگیا اور اس دور میں اس کا اخفا بھی ممکن نہ رہا تو داعیۂ ایزدی نے اس فقیر کے دل میں یہ خیال ڈالا کہ ان کے مدلول کو متمیّز کرے، اور یہ معارف اور حقائق اس طرح منظرِ عام پر لائے کہ آج تک کوئی بھی اس طرح انہیں بیان کر سکا ہو اور نہ انکی ایسی تفصیل و تشریح کسی سے بن آئی ہو، پھر اس

---

(۱) بنی اسرآئیل: ۲۰

فقیر کو یہ توفیق بھی دی گئی کہ وہ یہ بات ثابت کردے کہ یہ شرع کا مدلول ہے اور نہ اس پر کلام شارع کا حمل کرنا درست ہے، ذٰلک تقدیر العزیز العلیم۔

ہر چند آج کل ہماری یہ بات بہت سے صوفیا کو ناگوار گزرے گی تاہم مجھے جس بات کا حکم دیا گیا ہے میں اسے بیان کرنے پر مجبور ہوں، مجھے زید و عمرو سے کچھ سروکار نہیں،

اگر طمع خواہد زمن سلطان دیں

خاک برفرق قناعت بعد ازیں

واضح رہے کہ ان لطائف کامِنہ کے معارف میں گہرائی اور باریکی کی وجہ سے بہت سی غلطیاں واقع ہوگئی ہیں، سالکین نے اس اضطراب میں ہر طرف ہاتھ پاؤں مارے ہیں، اور ان سے شطحیات کا صدور ہوگیا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ہم ان غلطیوں کے اسباب کا جائزہ لیں اس کے بعد اگر گنجائش ہو تو بعض غلطیوں کے حل کی طرف بھی توجہ کریں، وگرنہ کم از کم اصل الاصول تو ترک نہ ہو، اللہ تعالیٰ تمہیں سعادت کی توفیق ارزانی کرے اور حقائق امور پر بصیرت عطا فرمائے، خوب اچھی طرح جان لو کہ حواس ظاہرہ سمع و بصر وغیرہ ہر ایک کے لئے خاص مدرک ہے، اور وہ رنگ، اشکال، مقدار اور آوازیں ہیں، اگر کسی حِس ظاہر کو اس کے مدرکات کے علاوہ کسی دوسری طرف لگا دیں تو وہ کچھ بھی ادراک نہیں کرے گی، بلکہ اپنے مدرک کے علاوہ اس حس کے نزدیک دوسری چیز معدوم محض ہوتی ہے مثلاً اگر آنکھ کو ہم بھوک، غصہ یا ندامت کے ادراک کے لئے استعمال کریں، تو وہ انہیں معدوم محض خیال کرے گی اور اس کے ہاتھ کچھ بھی نہیں آئے گا، اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ ان کی معدومیت پر دلیل قائم کرے اور کہے کہ موجود چیز سُرخ ہے یا سبز یا ایسی ایسی، اور بھوک، غصہ، ندامت وغیرہ تو ان میں کہیں ہیں نہیں۔ لہٰذا یہ سرے سے موجود ہی نہیں، اور اس مقام پر کئی اطراف سے وہ اجتماع نقیضین یا رفع نقیضین سمجھے گا اور موجودیت کے محل سے دور جا پڑے گا، باسمجھ لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ ایک مغالطہ ہے، اور اس کی بنیاد غائب کو حاضر پر قیاس کرنا اور احکامِ مالوفہ کو غیر مالوفہ میں جاری کرنا ہے اسی طرح حس باطن کے لئے خیال، وہم اور متصرفہ میں سے مدرک ہیں، اگر حسِ باطن کو ہم ان مدرکات کے علاوہ دوسری طرف لگا دیں تو وہ حیران و درماندہ رہ جائے اور اس کے سارے احکام میں خلل پڑ جائے اور ممکن ہے کہ

محفوظ قواعد کی مدد سے وہ ان کی معدومیت پر کوئی دلیل گھڑ لے، مثلاً یہ کہے کہ مجرد اگر موجود ہوتا اور جہات ستہ میں سے کسی جہت میں نہ ہوتا تو اس سے اجتماع نقیضین لازم آتا، کیونکہ موجود ہونا اور جہات ستہ میں نہ ہونا باہم متناقض ہیں، باخبر حضرات اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ ایک مغالطہ ہے جس کی بنیاد غائب کو حاضر پر قیاس کرنا اور مالوف احکام کو غیر مالوف میں جاری کرنا ہے، اسی طرح روح علوی کی زبان عقل کا بھی ایک مدرک ہے جس میں یہ تصرف کرتی ہے اور ایک حد ہے جہاں تک وہ ہاتھ پاؤں مارتی ہے، جس وقت اس مدرک سے گزر جاتی ہے اور اپنی حد سے تجاوز کر جاتی ہے تو عقل پریشان ہو جاتی ہے، اور اس کے احکام میں خلل پڑ جاتا ہے، ممکن ہے ان چیزوں کی معدومیت پر وہ دلائل قائم کرے اور اپنے علوم محفوظہ مالوفہ سے ایک دلیل قائم کر کے مطمئن ہو جائے، ایسے مواقع پر عقلا ایک دوسرے سے الجھ پڑتے ہیں بلکہ بعض اوقات تو کوئی دانشور مختلف اوقات میں رائے میں تبدیلی کی وجہ سے خود ورطۂ حیرت میں مبتلا ہو جاتا ہے، اس سے یہ عقدہ حل ہوتا ہے اور نہ اس کی کوئی پیش جاتی ہے۔

اس الجھاؤ کا سبب یہ ہے کہ مافوق عقل کو تشبیہ اور محاکات کی کسی نہ کسی وجہ سے ان معقولات کے حساب میں اخذ کرتا ہے، لہٰذا یہ شخص مافوق عقل کو ان معقولات کے قبیل سے جانتا ہے اور اسی معقولہ سے شمار کرتا ہے، اور محاکات کے تعلق کے ضعف کو نہیں سمجھتا، اور اس کے تمام احکام کو اس کے ساتھ ملا دیتا ہے، اور اسی راستے سے بہت سارے احکام کو مافوق عقل میں یقین کر لیتا ہے، اور پھر خود دوسرے وقت میں یا دوسرے عاقل کے ساتھ اس معقول کے بعض لوازمات کو نہیں پاتا، اپنے پہلے نظریے کو باطل قرار دے کر حیران ہو جاتا ہے، یا پھر اس کے غلط ہونے کا یقین کر لیتا ہے، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خود دوسرے وقت یا دوسرے عاقل کے ساتھ اسے دوسرے معقول سے سمجھے، تو ہر دو افکار کے درمیان تناقض پیدا ہو جائے گا اور اصل میں وہ ان میں سے ایک معقول میں سے بھی نہیں، رہی یہ محاکات تو اس پر تہمت ہے اور ایک شاعرانہ تخیل، تحقیق کی صورت میں اختلاف کی بنیاد یہی نکتہ ہے، وہ گروہ اس اختلاف کی حقیقت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے جنگ وجدال کا شکار ہو گیا ہے۔

آں یکے را ہمی زند مخلب
واں دگر را ہمی زند منقار

(اس کی برہمی کی کیفیت یہ ہے کہ کسی کو پنجے سے زخمی کرتا ہے تو کسی کو چونچ مارتا ہے)

فلاسفہ کے پیروکار انبیاء علیہم السلام کے عقائد کی مخالفت کی وجہ سے میرے نزدیک کُتے بلکہ کتوں سے بھی زیادہ برے ہیں کیونکہ کتا بوسیدہ ہڈی کے قریب بھی نہیں جاتا مگر یہ احمق دو ہزار سالہ پرانی ہڈیوں سے چمٹے ہوئے انہیں چاٹ رہے ہیں۔

ان کی گمراہی کا سبب یہی ناقص عقل ہے، جس پر یہ مسرور ہیں، **وفرحوا بما عندھم من العلم**، اور یہ عقل تو ایک عظیم حجاب اور بہت ہی دبیز پردہ ہے، اے میرے پروردگار اور مالک! میں تجھ پر اور ہر اس چیز پر جو تو نے اپنے حبیب اور نبی حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل فرمائی، ایمان لایا۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ عقل روح کی زبان ہے اور عقل کا دائرہ حکومت انہیں اشیاء تک محدود ہے جو روح کی طرح لطیف ہیں اور یہ بات کسی قدر مبنی برصداقت ہے کہ ہر شے خود اپنے آپ کو یا اپنی ہی قسم کی اشیاء کا ادراک کرتی ہے اور روح مجرّد محض ہے اور نہ خارج کہ موجودات خارجیہ کا ظرف ہو، بلکہ خارج میں متعین اور دریا سے خارج حباب ہے اور ایک خصوصیت ہے خارج میں، پس عقل کی رسائی تو خصوصیات اور خارج اور متحیّز و مجرد کے مابین احکام امتزاج تک ہے، مثلاً انسان اور گھوڑے گدھے کے افراد کو دیکھتی ہے اور ہر نوع پر وارد ہونے والے احکام کا ادراک کرتی ہے، پھر عقل اس مقام سے ترقی کرتی ہے اور صورتِ نوعیہ کا عرفان اور تیقن حاصل کرتی ہے، پس عقل کی دلیل اپنے ادراک میں ان موجودات کا باہم رنگ و شکل اور مقدار و آواز کے اعتبار سے متغائر ہونا ہے، اور دوسری حیثیت سے ان کا اتحاد ہے، جس جگہ اس تعدّد کو نظر انداز کرنا چاہیے اور وحدت کا ادراک وحدت میں کرنا چاہیے وہاں عقل کے پاؤں لنگ اور اس کے ہاتھ شل ہو جاتے ہیں۔

مثلاً عقل کا کام یہ ہے کہ وہ امور محسوسہ میں سے وہ صورتیں تراشتی ہے، جن کا عین تو خارج میں موجود نہیں ہوتا، البتہ ان کا منشاء انتزاع خارج میں ہوتا ہے، اور تحلیل و ترکیب کی ایک قسم سے کئی ماہئیتیں ظاہر کرتی ہے آسمان کو دیکھ کر بلندی کا مفہوم گھڑتی ہے، زمین پر نگاہ ڈال کر تحت کا تصور تراشتی ہے، زید کو باپ کے ساتھ دیکھ کر ابن کی ماہیت کا اشتقاق کرتی ہے، انسانی افراد میں

غور وخوض کرتی ہے، تو اس سے انسان کی صورتِ کلیہ کا ادراک کرتی ہے، اور انسان، گھوڑے، گدھے، اُونٹ، گائے اور بکری پر غور کر کے حیوان کی صورت اخذ کرتی ہے، اور حیوان وشجر پر نظر کر کے نامی کی صورت متحضر کرتی ہے علیٰ ہذا القیاس ان تمام مفہومات میں سے ہر ایک کا ایک منشاء انتزاع ہے کہ جس پر ان صورتوں کے انتزاع میں اعتماد کیا گیا ہے، اور یہ تمام مقاصد اور نوعی صورتیں اس کے پاس بالکل حاضر نہیں ہوتیں، اور نہ ہی اس کے سامنے متمثل ہوتی ہیں، یہ اعراض واشکال کے علاوہ کچھ نہیں، لیکن اعراض کو اپنے جواہر کے ساتھ ایک تعلق ہے اور عقل کے لئے اعراض سے جواہر کے ساتھ رہائی کا ایک خاص طریقہ ہے، انتزاعی امور میں بہت سے محالات بھی ممکن ہو جاتے ہیں اور بہت سے ممتنعات جامۂ وجود پہن لیتے ہیں، اور دور، اور تسلسل بھی اسی قبیل سے ہیں، جنہیں مفہومات انتزاعیہ میں جائز، اور انتزاع کے منقطع ہونے کی صورت میں ممتنع سمجھا گیا ہے اور معدوم مطلق اور مجہول مطلق بھی اسی قبیل سے ہیں جو عقل کے اندر ظہور پذیر ہوتے ہیں اور کئی احکام صادقہ کا مصداق قرار پاتے ہیں، درحقیقت اس مفہوم کے عین اور اس پر جو احکام صادق آتے ہیں کے درمیان بھی تناقض اور تبائن ہے، اگر معدوم مطلق ہے تو ذہن میں کیوں موجود ہو گیا؟ اور جو ذہن میں موجود ہے اسے معدم مطلق کیونکر کہا جاتا ہے؟ لیکن عقل نے ایک ذہنی صورت تراشی ہے اور اسے معدوم کی جگہ سمجھ لیا ہے، اور اس قائمقام کے ساتھ وہی باتیں منسوب کر دی ہیں جو اصل کا خاصہ تھیں، یہاں عقل کی مثال اس بھینگے شخص کی ہے جو ایک کو دو دیکھتا ہے، اور اپنے اس دو دیکھنے کو جانتا بھی ہے اور خارجی حکم میں کوئی غلطی نہیں کرتا، یا اس کی مثال اس شخص کی ہے جو سبز رنگ کی عینک لگا کر ساری دنیا کو سبز دیکھتا ہے، اسے اس وقت اچھی طرح علم ہوتا ہے کہ دنیا سبز نہیں ہے، بلکہ یہ ساری کارستانی اس عینک کی ہے جو میں نے لگا رکھی ہے، اسی طرح وہ غلط عقل کو غلط سمجھتا ہے اور راہِ ہدایت سے نہیں بھٹکتا، الغرض ہم عقل اس قوت کو کہتے ہیں کہ جس میں معقولات اولیٰ اور ثانیہ متمثل ہوتے ہیں، اور جہاں قول شارح اور برہان اکٹھے ظہور پذیر ہوتے ہیں، بعض حقائق کا ادراک خود بخود کرتی ہے اور بعض کا ادراک پس پردہ کسی نہ کسی اعتبار سے، ہر چند یہ لطافت سے نزدیک تر ہے تاہم اس کا تعلق اور توجہ قوتِ مدرکہ اور متصرفہ کے ساتھ ہے جو دماغ کے وسط میں ودیعت ہیں، اور یہ عقل روح علوی کی زبان، اور اس کی قوتوں

میں سے ایک قوت ہے، اور تمیز و تفتیش کے تمام امور اسی کے سپرد ہیں، اور اس کا باطن سرّ ہے تجلی اعظم یا ملاء اعلیٰ سے اتصال کے وقت اس کا ادراک کرتی ہے اور یہ ادراک اختلاط و امتزاج سے مشابہ ہوتا ہے، جب اس مقام سے ذرا نیچے آتا ہے، تو وہی ادراک روح کی سمع و بصر بن جاتا ہے، اور اگر کوئی شخص عقل کا لفظ ذوق کی جگہ بولتا ہے تو وہ عرف اور لغت دونوں کی مخالفت کرتا ہے، اس کے باوجود اصطلاح میں کوئی حرج نہیں، ہمارے نزدیک ذوق کا اطلاق اس ادراک پر ہوتا ہے جس میں معقولات کا انتزاع ہو اور قول شارح اور برہان کی گنجائش ہو، اور وہاں پر ادراک بھی حضور شی بذاتہٖ لذاتہٖ فی ذاتہٖ کی صورت میں ہو اور وہ ہر اس چیز سے متعلق ہوتا ہے جو اس حباب کی سطح ہے اور خارج میں ہے اور اجزا اولیٰ سے اس حیثیت سے خارج ہے کہ یہ حباب ان کے درمیان سے نمودار ہوئے ہیں، پھر جب صفات حاضر کا ملاحظہ کرتے ہیں، غیب پر نگاہ ڈالتے اور جستجو کرتے ہیں، کہ وہ صفات ہیں یا نہیں، تو عین وہ صفات نہیں پائی جاتیں، البتہ وہ سر جو مدح سے متعلق ہے، حاضر میں محاکات کی ایک قسم سے پایا جاتا ہے، اور یہ صفات اسی محاکات کے اعتبار سے بولی جاتی ہیں، اور عقل ہر صفت سے جدا معنیٰ ادراک کرتی ہے، اور ہر معنیٰ کے لوازمات کو الگ الگ پہچانتی ہے، اور بعض لوازمات بعض سے تبائن رکھتے ہیں، اس مقام پر عقل حیرت میں ڈوب جاتی ہے اور اسے کچھ نہیں سوجھتا! اصل میں یہ عقل کی غلطی کی تفصیل اور مدرک ذوق کا اجمالی بیان ہے۔

یہ اختلاف حاسّہ کے اختلاف سے پیدا ہوتا ہے، اور اس سلسلے میں صحیح بات یہ ہے کہ یہ تفصیل حس کی غلطی سے متعلق ہے، لہٰذا اس بارے میں اس احوال کا طریق کار اپنانا چاہیے جسے ایک کے دو نظر آتے ہیں لیکن وہ بات اچھی طرح جانتا ہوتا ہے کہ میں بھینگا ہوں لہٰذا وہ دو کو ایک ہی قرار دیتا ہے، یہ نہ سمجھنا کہ قول شارح اور استدلال عقلی کو اس غلطی سے بچا سکتا ہے، نہیں نہیں، قول شارح اور برہان تو عقل میں جمع شدہ باتوں میں ترتیب اور ان کا استحضار ہے تا کہ اللہ تعالیٰ اس مادہ سے وہ مخلوق پیدا فرمائے، جسے نتیجہ کہتے ہیں، چنانچہ پانی، ہوا اور مٹی سے درخت یا کوئی معدنی صورت پیدا فرماتا ہے، تو یہ مخلوق اپنے مادہ کے مطابق اور اس کی مانند ہے، اس سے زیادہ لطیف اور اعلیٰ نہیں ہے، اپنے مادے سے کسی مخلوق کو زیادہ لطیف اور اعلیٰ تلاش کرنا ایسے ہے جیسے کوئی شخص

میٹھی ڈش میں گوش ڈھونڈھ رہا ہو، ظاہر ہے کہ وہ اپنا قیمتی وقت ایک ناممکن چیز کے حصول میں ضائع کر رہا ہے، جب یہ مقدمہ ذہن نشین ہو گیا تو جاننا چاہیے کہ اس سلسلے میں صوفیا کی سب سے بڑی غلطی ہمہ اوست ہے، جس وقت وہ یہ بات کہہ کر لوازماتِ عبودیت اور ربوبیت کے درمیانی فرق کو دیکھتے ہیں، تو حیرت میں مبتلا ہو جاتے ہیں، اس غلطی کا حل دو مقدمات پر موقوف ہے، ایک یہ کہ نسبت کی معرفت کے سلسلے میں اس حباب اور خارج میں جو غلطی ہوئی ہے اس کا بیان، اور دوسرا اس سہو کا بیان جو خارج اور ذات بحت کی نسبت کے سلسلے میں واقع ہوا ہے، مقدمہ اول۔ واضح رہے کہ ظہور وہ نسبت ہے جو ظاہر اور مظہر کے درمیان واقع ہے، اس نسبت کا حکم دوسری تمام نسبتوں سے مختلف ہے، ظاہر عین مظہر تمام اعتبارات کے لحاظ سے نہیں ہوتا، اس کی مثال افراد انسانی کی نسبت سے نوع انسان ہے، اگر نوع تمام وجوہ سے اس فرد کا عین ہو، تو پھر وہ دوسرے فرد پر بھی محمول ہو، جیسا کہ نوع محمول ہوتا ہے، اور اگر تمام وجوہ سے اس فرد کا غیر ہو، تو ھذا انسانٌ صحیح نہ ہوتا، جیسے کہ ھذا حجر کا اطلاق اس پر درست نہیں، اسی طرح نوعِ انسان اور نوعِ فرس بہ نسبت حیوان کے، اور حیوان و شجر نامی کی نسبت سے، اور نامی و جماد جسم کی نسبت سے اور جسم و مجرد جوہر کی نسبت سے، اور جوہر و عرض نفسِ کلیہ کی نسبت سے، ہم اس تحقیق کو نظر انداز کرتے ہیں، اس کی حقیقت اس قدر تو بدیہی ہے کہ ان مقامات میں حمل اور تغایر دونوں کے مصداق پائے جاتے ہیں اسی لیے دونوں قسم کے احکام کی گنجائش ہے، خصوصیات عالم کو نفس کلیہ کے ساتھ جو نسبت ہے جس وقت ہم اس کی جستجو کرتے ہیں، اور صحیح تجزیہ کرتے ہیں، اور بلند سے بلند مقام تک جاتے ہیں تو یہ حقیقت آشکارا ہوتی ہے کہ یہ نسبتِ ظہور ہے اور احکام متباینہ میں عقل کا تردد عقل کے قصور، اور ان کے مقدمات بدیہیہ کے متصادم ہونے کی وجہ سے ہے، جنہیں ہم پہلے ہی نشان خاطر کر چکے ہیں۔ اب اگر کہیں کہ یہ سارے ایک ہی چیز میں متعین ہیں، تو پھر احکام میں تبائن کس طرح پیدا ہوا؟ اور اگر تمام اصول اپنی اپنی جگہ مستقل ہیں، تو پھر انہیں ایک اصل میں تلاش کرنے کا کیا جواز باقی رہ جاتا ہے؟ اس صورت میں مقدمہ بدیہیہ کا انکار لازم آئے گا، کیونکہ ہم نے افراد میں بہ نسبت نوع کے اور نوع میں بہ نسبت جنس کے اسی نسبت کو تسلیم کیا تھا، اور اگر کہیں کہ کثرت کا مبداء اصل میں واحد میں ہے یا نہیں؟ پہلی صورت میں وہ اصل واحد نہ ہوگی اور دوسری صورت میں کوئی

ایسا مرکز نہیں جہاں سے یہ آئی ہو، اس طرح بھی مقدمہ بدیہیہ کا انکار ہوگا، آخر یہ اصل واحد وہ اصل واحد تو نہیں جو وحدت حقیقیہ رکھتی ہے اور مبدائیت سے جس کا صدور حضرت وحدت سے اور مرتبہ ثانیہ میں ہونا اتنی کثرتوں کے لئے کفایت کرتا ہے، ناقص عقلیں کبھی اسے تمام حیثیتوں سے عین شی کے قبیل سے سمجھتی ہیں، اور جب عین کے بعض لوازمات نہیں پائے جاتے تو وہ اپنا یہ نظریہ بدل لیتی ہیں، اور تمام وجوہ سے اسے دوسرے قبیل سے سمجھنے لگتی ہیں، اور جب بعض لوازم غیریت نہیں پائے جاتے تو وہ تحیّر میں آجاتی ہیں، سلیم عقلیں یہ بات اچھی طرح جانتی ہیں کہ ایک نسبت ہے جو نہ تو نسبت عینیت ہے اور نہ نسبتِ غیریت، خصوصیات اشیا سے جو کچھ ظاہر ہوا ہے نفس کلیہ کا صاف میدان اس کے عیب سے پاک ہے، جیسے سیاہ رنگت، کوتاہ قامتی، اور لکنت زبان سے نوعِ انسانی معیوب نہیں ہوتی، اگر چہ سیاہ رنگ، کوتاہ قد اور لکنت والا بھی انسان ہے، اور جو کچھ من حیث المطلقیت مرتبۂ اطلاق سے ظاہر ہوتا ہے، اسے خصوصیات سے منسوب نہیں کر سکتے، جیسے کہ نوعِ کُلّی اور مطلق ہونے کی نسبت فرد سے نہیں کر سکتے، اگر چہ مطلق مقید میں ہے۔

اگر حقیقتِ نفس کلیہ کا لابشرط کے درجے میں اس حیثیت سے لیں کہ وہاں حقیقت نفس کلیہ کے علاوہ، نفی و اثبات میں کوئی دوسرا اعتبار ملحوظ نہ ہو، تو احکامِ اطلاقیہ اور تقیدیہ کی گنجائش اس طرح پیدا کر دیتی ہے کہ ان دونوں مرتبوں کو حقیقت صرفہ کی طرف دست دراز کرنے کی نوبت نہیں آتی، باقی رہے دو نکتے، ایک یہ کہ انسان کے علاوہ اور بہت سی انواع پائی جاتی ہیں، اور انسانی خواص کے علاوہ ان انواع میں دوسرے خواص پائے جاتے ہیں یہاں تک کے عقل ان امور متغائرہ کی دستاویز پر مختلف انواع کے ثبوت کا یقین کر لیتی ہے، اور ہر ایک کو دوسری نوع سے علیحدہ پہچانتی ہے، اور نفس کلیہ کے علاوہ خود کوئی چیز معقول و محسوس نہیں تا کہ ''ہر چیز اپنی ضد سے جانی جاتی ہے'' کے مطابق عقل اس میں تصرف کریں، اور اسے دوسروں سے جدا پہچان لیں، جس وقت سے وہ ہے، اسی کے ساتھ، اور اسی کے اندر موجود ہے اور جہاں بھی نگاہ ڈالتی ہے اسے دیکھتی ہے اور اسی کے ذریعے دیکھتی ہے، اس پر کوئی جدید توجہ نہیں ڈالی گئی، اور کسی بھی حال میں اس کا تازہ جستجو کا قصد نہیں کیا گیا، اس کے باوجود لطافت میں لطافت اور بساطت ہی بساطت ہے ع

ز ہر چہ رنگ تعلق پذیرد آزادست

اگر بالفرض عقل اس کا قصد کرے تو اس کی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتی، اور حیرت کے سوا اس کے ہاتھ کچھ نہیں آتا، البتہ اہلِ ذوق حاسۂ ذوق کے ساتھ حضور شی لذاتہٖ بذاتہٖ فی ذاتہٖ کے طور پر اس کا ادراک کر لیتے ہیں اور اس کا ایک عکس ان کی عقلوں پر پڑ جاتا ہے، اور اس احول کی طرح جسے اپنی کمزوری کا اچھی طرح علم ہوتا ہے، کسی نہ کسی طرح یہ لوگ حقیقت سے آگہی حاصل کر لیتے ہیں، اور اس نا آشنا سے آشنائی کی راہ پیدا کر لیتے ہیں۔

در قافلہ کہ او است دانم نرسم
ایں بس کہ رسد ز دور بانگ جرسم

(مجھے علم ہے کہ جس قافلے میں میرا محبوب جا رہا ہے وہاں تک میری رسائی ممکن نہیں، مگر میرے لیے یہ بات بھی کیا کم ہے کہ میرے کانوں میں جرسِ قافلہ کی آواز پہنچتی رہے)

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ فلاسفہ نے جوہر اور عرض کے درمیان حقیقتِ مشترکہ کا اثبات نہیں کیا، اور نہ ہی انہوں نے نفسِ کلیہ کو جنسِ اعلیٰ شمار کیا ہے، اس کی بنیاد یہ ہے کہ ان کی عقلوں میں نفسِ کلیہ کا حضور نہیں ہو سکا۔ ان کے ہاں جو مشہودلہ، مشہود علیہ اور مشہود بہ کو نہ پہچان سکے اس کی شہادت پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا، اور ہم خود جانتے ہیں کہ ایک حقیقت دو لباسوں میں متشکل ہوتی ہے، کبھی قیام بنفسہٖ کے روپ میں ظاہر ہوتی ہے، اسے جوہر کہا جاتا ہے اور کبھی قیام بغیرہ کے لباس میں نظر آتی ہے، اسے عرض کہتے ہیں۔

گہے در کسوت لیلیٰ فروشد
گہے در صورت مجنوں برآمد

(وہ حسنِ ازل کبھی لیلیٰ کی شکل میں جلوہ نمائی کرتا ہے تو کبھی مجنوں کے روپ میں)

اعراض کا عالم مثال میں جوہر ہو جانا اور وہم کے مقام میں جوہر کا عرض ہو جانا، اور صورت ذہنیہ کا موجود خارجی پر صدق اور ایسی باتیں اسی معنیٰ کی نیرنگیاں ہیں،

مقدمہ دوم، مُبدِع اور مُبدَع کے درمیان ایک ایسی نسبت واقع ہے کہ شہادت میں اس کی مثال موجود نہیں، تاکہ مادّہ میں مبدع کا تحقق ہو اور اس طرح وہ ایک امتیاز اور استقلال پیدا کر لے، ایسا کوئی وقت نہیں کہ سابق و لاحق اور تقدم و تاخر زمانی کی وجہ سے ایک دوسرے سے ممتاز

ہوں، اور اس کے لئے مبداء کے بغیر اور کوئی قیوم نہیں، اور خود اپنے اندر، اپنے ساتھ اور اپنے آپ کے بغیر اس کا تحقق نہیں ہوتا، مبداء نے ہر طرف سے اسے گھیر کر اپنی گرفت میں لے رکھا ہے، عقل یہاں متحیّر ہو کر مفلوج ہو گئی اور صانع اور عالم شہادت کی مصنوعات کے درمیان عقل کے تراشیدہ مفہومات انتزاعیہ کو اس نے اپنے سامنے رکھا، اور وہ اختراعی صورتیں جن سے مانوس تھی اپنے پیش نظر لے آئی، الغرض اس نے اپنی ترکش کے سارے تیر ایک ایک کر کے پھینک دیئے۔

حاشا للہ! مُبدِع اور مُبدَع کے مابین جو گوشہ متخیّل ہوتا ہے اس میں تو ایک بال کی بھی گنجائش نہیں، چہ جائیکہ اس قدر فضول مقدمات کی گنجائش ہو۔ ع

درون دیدہ اگر نیم موست بسیار است

(آنکھ کے لئے آدھا بال بھی کافی ہوتا ہے)

حاضر میں جو القاب تاثیر کے لئے مقرر تھے وہ صرف کر دیئے کبھی اسے مخلوق و مجعول کہا، اور کبھی اسم و صفت کا نام دیا، اور کبھی مظہر و تنزّل سے موسوم کیا، اور ہر ایک کا وہاں ایک طرح کے محاکات سے ثبوت پایا، اور کسی ایک کی بھی حقیقت تفصیلیہ کی پوری طرح گنجائش نہ دیکھی تو واپس آیا اور اپنے آپ پر پیچ و تاب کھانے لگا، اور پکار اٹھا ''میں اپنی بات سے باز آیا، کیونکہ بات میں حقیقت اور حقیقت میں بات نہیں۔'' پس مسئلہ ابداع میں تحقیقی بات یہ ہے کہ وہ ایک معلوم الإنیۃ اور مجہول الکیفیت نسبت ہے، من جمیع الوجوہ نہ تنزّل ہے اور نہ ظہور، اس کے بعد ایسے تمام اشکال جو کہ حقائق میں ہر حقیقت مفصلہ کے ثبوت سے پیدا ہوتے ہیں، کوئی وقعت نہیں رکھتے، اور نہ ان کا اس مرتبے میں ورود ہے، اہلِ وجدان میں سے ایک گروہ نے جب اپنے اندر نگاہ ڈالی، تو انہیں نفسِ کلیہ کا مشاہدہ ہوا، چنانچہ انہوں نے اس کا نام وجود رکھ دیا، اور انہوں نے اس میں وہ لطافت اور بساطت پائی جو عقل کے حاشیۂ خیال میں نہیں آسکتی، چنانچہ وہ اسے واجب الوجود سمجھ بیٹھے، اور بساطت و لطافت سے انہیں جو چیز پہنچی انہوں نے اسے وجود پر منطبق کیا، اور ہمیشہ کے لئے اس معرفت میں کھو گئے، انہیں یہ علم نہ ہو سکا کہ ع

ہنوز ایوان استغنا بلند است

اگر اس مسلک کی زیادہ وضاحت مطلوب ہو تو ''مقدمۂ قیصری (۱)'' ملاحظہ کیجئے۔

اس غلطی کی بنیاد نفس کلیہ پر توقف، کسی نہ کسی وجہ سے اس پر ہی اکتفا، اور اس کی حقیقت کو اچھی طرح نہ سمجھنا ہے، اگر وہ نفس کلیہ کی حقیقت کا ادراک حاصل کر لیتے، تو اسے کبھی بھی مبداء المبادی نہ کہتے، اور دوسرا گروہ جو نفسِ کلیہ سے آگے گزر گیا ہے اور اس نے اول الاوائل ذات بحت کو جانا ہے، اس نے نفسِ کلیہ کو صادر اول اور ایسے وجود جو موجودات کے تمام ہیاکل پر پھیلا ہوا ہے، کا نام دیا، لیکن انہوں نے سب کو باہم خلط ملط کر دیا ہے، انہیں ایک ہی نام سے موسوم اور ایک ہی حساب میں شمار کیا ہے، بعض حقائق کو بعض سے ملا دیا، اور جو زیادہ لطیف ہے اسے دوسرے کا بطن قرار دیا، ایک نام سے موسوم کرنا تو صوفیا کا قدیمی طریقہ ہے، یہ کوئی نئی بات نہیں، اور نہ یہ پہلا شیشہ ہے جو توڑا گیا ہے، چنانچہ روح اور سِرّ کے باب میں اس کے متعلق اشارہ کیا جا چکا ہے۔

تعبیر میں تساہل کی وجہ سے بعض عُجلت پسندوں نے اس تحقیق میں دخل اندازی کی ہے اور انہوں نے کہہ دیا ہے کہ اصل میں وہی ایک وجود ہے اور وہ اعتبارات کے اختلاف کی وجہ سے مختلف ہو گیا ہے، مختلف حقائق سے متعلق ہونے کے اعتبار سے اسے وجود منبسط کہتے ہیں اور اپنی صرافت کے لحاظ سے ذاتِ بحت ہے، اس اختلاف کی اصل بنیاد نفسِ کلیہ کے ساتھ حقائق مختلفہ کی نسبت اور نفس کلیہ کی مبداء المبادی سے نسبت کے درمیان فرق نہ کرنا ہے، اور کچھ لوگ جن کا وجدانِ تجلی اعظم کے ساتھ وابستہ تھا یا انہوں نے برہان کے ساتھ واجب میں صفاتِ تاثیریہ قویہ کا اثبات کیا تھا، یا انہوں نے شرائع کی تقلید میں تقلید تشبیہی صفات کا اعتقاد قائم کر رکھا تھا، ان خواص کو نفسِ کلیہ میں نہ پا سکے، اور نہ ہی انہیں اس چیز کا مصداق نظر آیا جو اہلِ معرفت ذات بحت میں ثابت کرتے تھے، نتیجہ یہ نکلا کہ وہ ان دونوں نسبتوں کے منکر ہو گئے، البتہ جو کچھ ہمارے نزدیک ثابت ہے وہ یہ ہے کہ ذات بحت کے اس حیثیت سے کہ تجلی اعظم کو اس سے نسبت ہے اور تجلی اعظم سے پھوٹنے والے انوار اور عکوس کے ساتھ اس کا ربط ہے کئی احکام ہیں، وجدان و برہان اور تقلید شرائع کا اس میدان سے ورے گزر رہے، اور نہ انہیں اس کے ماسوا سے کوئی آگاہی زیادہ، حقائق اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

............☆☆☆............

فصل ۷

اقسامِ خواطر اور ان کے اسباب کی معرفت

خواطر کی معرفت علم لطائف کا تتمّہ ہے، اس لئے اس بارے میں بھی چند ضروری نکتے سمجھ لینے چاہییں، انسان کے باطن میں جو کھٹکا پیدا ہوتا ہے، اس کی تین صورتیں ہیں، یا تو صرف قلب میں پیدا ہوگا اور اسے احوالِ اوقات کہتے ہیں، مثلاً خوف، اُمید، قبض وبسط محبت وندامت اور حزن وغم وغیرہ یا وہ کھٹکا صرف عقل میں پیدا ہوگا، اس صورت میں یہ کبھی کشف اور آئندہ پیش آنے والے واقعات کے بارے میں ہوگا، اور کبھی حدیث نفس (وسوسوں) کی قسم سے، یا یہ خطرہ قلب اور عقل دونوں میں پیدا ہوگا، عقل کسی چیز کا ادراک کرتی ہے، اس کا تصور قائم کرتی ہے، اور قلب اسے سرانجام کرنے کا عزم کرلیتا ہے اسے ''خواطر ودواعی'' کہتے، حقیقت کا عرفان اور خواطر کا بطلان بہت ہی اہم بات ہے تاکہ خواطر سے نکلنے والے احکام میں کوئی غلطی واقع نہ ہو، اور یہ بات خواطر کی معرفت کے بغیر حاصل نہیں ہوتی، اس لئے اسباب خواطر کا تذکرہ بہت ہی ضروری ہے، کبھی خطرہ عقل، قلب اور نفس کی طبیعت سے پیدا ہوتا ہے، جیسے بھوک، پیاس، غلبہ، شہوت، سردی، گرمی، کوئی داعیہ پیدا کرے، یا مثلاً کسی سے محبت اس کی ملاقات کا تقاضا کرتی ہے، یا سوداوی خلط بیہودہ وسوسہ پیدا کرتی ہے اور اس کے مطابق اعمال پر ابھارتی ہے یا صفراوی خلط زرد خیالات پیدا کرے، اور گرمی، تنگ دلی اور بسیار گوئی پر آمادہ کرے، اور عادت بھی نفسانی حرکات کا باعث ہوتی ہے، عقل کو ادراک کی قوت ودیعت کی گئی ہے اور دل میں یقین وارادے کی طاقت رکھی گئی ہے، اس جبلّت کی وجہ سے تصرف کرتے ہیں، اور یہ سب خوابِ پریشاں ہیں، جن سے سالک کو کوئی سروکار نہیں ہوتا، لیکن اگر یہ حلاوت سے مانع ہو تو پھر سالک اس کی بیخ کنی کرتا ہے، اور کبھی اس شخص کے نفس میں شیاطین کے تصرف کی وجہ سے ایک کھٹکا پیدا ہوتا ہے اور شیاطین سے

مراد وہ شریر نفوس ہیں جنہیں کواکب کے ظلمانی اجتماعات کے وقت عناصر کے لطائف میں پھونکا جاتا ہے اور اس گروہ کی طبیعت کا اقتضا وحشت، غصہ، حرص اور صالح نظام کا بگاڑ ہے، یہ صالح نظام نفسانی ہو، خواہ منزلی، مدنی ہو یا ملی الغرض بہتر نظام جو بھی ہو، اس کا مقتضیٰ رحمتِ الٰہی ہے اسے بگاڑنا یا توڑنا غضب خداوندی کا باعث اور شیطانی امر ہے، جس وقت انسان ساوی اور کسبی اسباب کی وجہ سے اس قسم کے دواعی اور خطرات کے فیضان کے قابل ہو جاتا ہے، تو شیاطین اپنی فطرت کی وجہ سے اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، اور اپنے حسب حال دواعی اس کے دل میں ڈال دیتے ہیں، اور اس موقع پر بعض دوسری ارواحِ خبیثہ بھی شیاطین کے ساتھ مل جاتی ہیں، اور ان کی امداد کرتی ہیں، اور شیاطین کا داعیہ تو وحشت، غصے، سنگدلی اور نیکی سے دوری کے بغیر وجود میں ہی نہیں آتا، اور ان کی دعوت رذیل اعمال اور نظامِ صالح میں بگاڑ کے علاوہ کچھ ہے ہی نہیں، اور جو کچھ ان ارواحِ خبیثہ اور شریر و طرار نفوس سے خاطر پر مترشح ہوتا ہے، وہ خوف اور ڈر سے خالی نہیں ہوتا، یہ بھی باطل ہے سالک کا کام ان کی معرفت سے ان سے دوری اختیار کرنا اور اپنے آپ کو بچانا ہے، اور کبھی خواطر عالم مثال سے ان فرشتوں کے ذریعے نیچے اترتے ہیں، جو اس مقام میں مقرر ہیں، یا ان کے واسطے کے بغیر نازل ہوتے ہیں، اور عالم مثال سے مراد نفوس افلاک اور نفوس ملائکہ کی ہمتوں اور بطون کی صفائی ہے، جو مجتمع ہو کر ایک وحدانی ہیئت پیدا کر لیتے ہیں، جیسے کسی ایک مکان میں مختلف مقدار اور انوار والے کئی چراغ روشن کر دیئے جائیں، اور ان سب میں سے ذات اور صفات کے لحاظ سے ایک ہی نور جلوہ فگن ہو، اسی طرح اس گروہ کی ہمتیں اور سرائر تجلی اعظم کے ہاں اکٹھی ہو جاتی ہیں، اور بغیر تخصیص ہر چیز کے اپنی اصل سے ان ہمتوں کا اقتضا متمثل ہو جاتا ہے۔

جب اہلِ وجدان پر وہ صورت ظاہر ہوئی اور انیّت کی تفصیل ان پر واضح نہ ہو سکی، تو انہوں نے اس کا ایک نام مقرر کر لیا اور وہ نام ''مثال'' ہے، اور وہ ملائکہ جو مثال کے خادم ہیں، وہ نفوس مطمئنہ ہیں، جو لطائف عناصر سے مرکب جسم میں سعادت کواکب کے وقت اور عالم علوی کی حیز بخت سے مشابہت کے وقت پورے اعتدال کے ساتھ منفوخ ہوتے ہیں، یہ نفوس اطمینان ہی اطمینان اور سعادت ہی سعادت ہیں، اور عالم مثال کے لئے مکمل انقیاد اور خضوع ہوتے ہیں، اور

فرشتوں کا حدوث مختلف اوقات میں ہوتا ہے بعض طبعی طور پر فلک قمر کے قبیل سے ہوتے ہیں اور بعض فلک عطارد کے، اسی طرح دوسرے افلاک سے! اور ہر ملک کے لئے اپنی اصل طبع کے اعتبار سے ایک خاص قسم کے معاملے کے الہام کی استعداد ہوتی ہے، اور تمام وہ دواعی مثالیہ جو ملائکہ کے قلوب میں نازل ہوتے ہیں، دو قسم ہیں، پہلی یہ کہ کواکب کا اتصال ہوتا ہے اور ان کی طبائع سے کوئی عام حادثہ متمثل ہوتا ہے اور تجلی اعظم کے سامنے اپنے مثالی وجود میں قائم ہوتا ہے، اس صورت میں کہتے ہیں کہ ''اللہ نے یوں لکھا ہے اور اس نے یوں فیصلہ کیا ہے''، یہ حادثہ عامہ مناسب وقت اور مکان میں نازل ہوتا ہے، اور ملائکہ اس کی خدمت میں سعی وکاوش دکھاتے ہیں، اور جسے بھی اپنے ذوق کے مطابق اس حادثہ کے لئے تیار پاتے ہیں اسے قبض وبسط کے قریب کر دیتے ہیں، اور ان کی ہمتوں سے تغیر اور الہام پیدا ہوتا ہے، اور مقصود کی جلوہ نمائی ہوتی ہے۔

دوسری قسم یہ ہے کہ ہر جوہر اور عرض کی ایک خاصیت اور مقتضیٰ ہے اور انسانی نفوس کے لئے ایک بخت ہے، کیونکہ نفسِ کُلّیہ نفسِ جزئیہ میں اس روز کے عالم کی صورت کے علاوہ تنزل نہیں کرتا، پس نفس جزئیہ کی صورت کا مقتضیٰ جو لامحالہ صورت عالم کی شکل میں ہوگا بخت کہلاتا ہے، اور ہر شخص کے ساتھ اس بخت کے مطابق عمل ہوگا، قوتوں کی باہمی مزاحمت اور خواص اشیاء کے تبائن کے وقت قضا حادث ہوتی ہے، اور طبیعت کلیہ جزی تک پہنچاتی ہے مثلاً اگر پانی ایسی زمین پر بہائیں جس میں خس وخاشاک، ناہمواری اور پتھر وکنکر وغیرہ ہوں تو پانی کی طبیعت اور ان موانعات کی طبع میں مزاحمت پیدا ہوگی، اور پانی کی طبیعت سے حکم مترشح ہوگا، اسی طرح ان قوتوں میں مزاحمت کے وقت قضا طبیعت کلیہ سے نیچے اترتی ہے، اور اس کے ساتھ مناسبت رکھنے والے ملائکہ گروہ در گروہ دوڑ کر اس معرکے میں شامل ہوتے ہیں، اور الہام واحاطہ اور قبض وبسط کی صورت میں تصرف کرتے ہیں، یہاں تک کہ قضا عمل کرتی ہے، اور وہ متخیل نقش موجود ہو جاتا ہے، اس صورت میں ملائکہ کا تصرف بحران کے وقت طبیعت کے بدن میں تصرف کے مشابہ ہے، یا اس کی مشابہت اپنی طبائع کے مطابق حشرات الارض کے تقلب یا شمع پر پروانوں کے ہجوم کے ساتھ ہوتی ہے، پس اس تدبیر کے مطابق انسانوں کے دل میں دواعی نازل ہوتے ہیں، کبھی کسی شخص کے دل میں ہلاکت سے نجات کی تدبیر ڈال دیتے ہیں، اور کبھی خواب یا ہاتف کے ذریعے اسے

حقیقت حال پر مطلع کر دیتے ہیں، اور کبھی کسی شخص یا جانور کو اس مقام پر لے آتے ہیں کہ اسے اطلاع دے دے یا اس کا کام سرانجام دے، اور اکثر خواطر مثالی قوتوں سے مترشح ہوتے ہیں اور خیر و شر قوانین ایزدی کے حکم کے مطابق اس الہام اور تغیر میں فرق نہیں کرتے، ملائکہ الانس اور ارواح طیبہ کا ایک گروہ ملائکہ کا کام کرتا ہے، اور اس کا شمار بھی اسی زمرے میں ہوتا ہے، اور علم طلسم، علم حروف، اور علم خواصِ اسماء اسی تدبیر کی معرفت یا اس تدبیر کے کسی شعبے سے پھوٹتے ہیں، اور اللہ ہی حقیقتِ حال زیادہ بہتر جانتا ہے۔

لیکن جو دواعی اور خواطر مقامات کمال میں شمار ہوتے ہیں تین اقسام پر مشتمل ہیں، ایک یہ کہ انانیت کبریٰ سے خطرہ انانیت صغریٰ میں نازل ہو، اور انانیت کبریٰ سے اس کے نزول کا سبب صفت تدبیر ہے، کیوں کہ مصلحت کلیہ جہان میں خیر اور بھلائی کے قیام کا تقاضا کرتی ہے، اور اس خیر کی اقامت نفوس انسانی میں سے کسی نفس کے توسط کے بغیر ممکن نہیں، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جس وقت عالم کی ہیئت بدل جاتی ہے اور اس کے اعضائے اولیہ کا حال متغیر ہو جاتا ہے، تو ضروری ہو جاتا ہے کہ تجلی اعظم ایک حال سے دوسرے حال میں منتقل ہو، چنانچہ ارشادِ باری ہے:

كُلَّ يَوْمٍ هُوَفِي شَأْنٍ . (۱)

(وہ ہر وقت کسی نہ کسی کام میں رہتا ہے)

ملاءِ اعلیٰ یہی رنگ قبول کر لیتے ہیں، اور اس رنگ میں رنگین ہوئے بغیر حیز بحت کے ساتھ مشابہت حاصل نہیں ہو سکتی، تو اس حالت میں ضروری ہو جاتا ہے کہ اس بارگاہ سے نفوسِ بشریہ میں ایک خاص رنگ پہنچے، اور اس گروہ میں ایک خاص شگفتگی پھیل جائے جیسے پانی سے قریبی زمین میں لازمی طور پر پانی کی نمی اور بعض دوسرے اجزا سرایت کر جاتے ہیں، اور درمیانی پردے اور آڑ سے گزر کر مسامات زمین کی راہ سے اس پر تری پھیل جاتی ہے اور اس راہ کے مسام ملاءِ اعلیٰ کے نفوس ہیں یا پھر گروہِ کاملین کا وجود کیونکہ یہی نفوسِ قدسیہ اپنے درمیان اور انانیتِ کبریٰ اور اس کے قلب تجلی اعظم کے درمیان مسامات اور عروق ماساریقا کا حکم رکھتے ہیں۔

یہ داعیہ طبیعتِ کلیہ کے حکم سے ان نفوس میں پہنچتا ہے، اور وہاں سے تمام نفوس کے ساتھ

(۱) الرحمٰن: ۲۹

واصل ہو جاتا ہے، پھر ہمت ملاء اعلیٰ ایک خاموش موج کی مانند ہے جسے جب تک جنبش نہ دی جائے، نہیں ہلتی، اور چشمۂ آب کی طرح ہے جس سے جب تک چلّو نہ بھرا جائے پیاسے کے منہ تک نہیں پہنچتا، ان کی اور ان کے کسی ایک فرد کی ہمت میں وہی فرق ہے جو ایک منجم جسے کلی طور پر گرہن سے پہلے اس کا علم ہوتا ہے اور اس عام آدمی کے درمیان فرق ہے جسے مشاہدہ کے وقت گرہن کا علم ہوتا ہے، اور جب تک یہ ہمت کلیہ ہمت جزئیہ نہ بن جائے مصلحتِ کلیہ مصلحتِ جزئیہ میں نازل نہیں ہوتی، اور اس بارگاہ کی تر و تازگی کا فیضان ایک مسام سے دوسرے مسام میں اتصال کے ساتھ جاری نہیں ہوتا، پس یہ داعیہ نفوس میں سے کامل نفوس کو اختیار کرتا ہے پہلے حجر بحت میں وسعت پیدا کرتا ہے، اور تجلی اعظم سے حجر بحت کا اتصال اور امتزاج پیدا کرتا ہے، وہاں سے یہ داعیہ حجر بحت میں نازل ہوتا ہے، جیسے مُہر کو موم پر رکھنے سے مہر کا سارا نقشہ موم میں آ جاتا ہے، اس کے بعد سرّ اور روح کو اپنا مطیع بناتا ہے، اور ملاء اعلیٰ سے اس داعیہ کا رنگ موم میں مُہر کے نقش کی طرح منتقل ہوتا ہے، اور اس کے بعد عقل و قلب میں نازل ہوتا ہے، اور وساوس اور احوال قلب کو اپنے رنگ میں رنگ دیتا ہے، اور یہ داعیہ خطاب ہو جاتا ہے، اور مختلف حالات اور اوقات کے تقاضوں کے مطابق تازہ صورتیں بروئے کار لاتا ہے، اس کے بعد جوارح میں نازل ہوا ہے اور لوگ اس حق کی اتباع کرتے ہیں، اور اس سے ملت، مذہب یا خلافت وجود میں آ جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ اس کامل کے علوم اور مذہب و ملت میں تازہ فیض نازل فرماتا ہے جسے حوادثاتِ زمانہ بھی نہیں مٹا سکتے، اور یکے بعد دیگر مُجدّد ان کا احیاء کرتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ تجلی اعظم کا رنگ تبدیل ہو جاتا ہے اور کسی دوسرے کامل کے دل میں کوئی اور رنگ نمودار ہوتا ہے، غالباً اس کامل کو تجلی اعظم اس داعیہ کے رنگ میں رنگی ہوئی نظر آتی ہے اور وہ تجلی اعظم کی ہر جز میں اسی رنگ کی طرف اشارہ کرتا ہے، ارشاد خداوندی ہے: اِنْ تَنْصُرُوْا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ ۔(۱)

وَاِنَّ جُنْدَنَا هُمُ الْغَالِبُوْنَ (۲)

(اگر تم (دین) خدا کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور بیشک ہمارا لشکر ہی غالب

(۱) سورۂ محمد، آیت ۷

(۲) سورۂ الصّٰفّٰت، آیت ۱۷۳

آنے والوں میں سے ہے)

یہاں ایک نکتہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ صحیح ترجمان وہ شخص ہے جس کی عقل احادیثِ نفس اور جبلّتِ عقل سے پیدا ہونے والے خواطر جبلیہ سے ساکت ہو اور اس داعیہ کے بغیر کوئی چیز اس کی عقل کو ہلا سکے، اور نہ کوئی خیال پیدا کر سکے، اور یہ معنیٰ حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی میں کامل طور پر پایا گیا ہے، حضرت عیسیٰ علیٰ نبیّنا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی حجرِ بحت کی تجلی سے اتصال کی خبر دی ہے اور انتہائی جوش وخروش کا مظاہرہ فرمایا ہے، مگر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صراحتاً اشارتاً کہیں بھی یہ بات نہیں چھیڑی، آپ نے جو کچھ ارشاد فرمایا اطمینان اور مکمل صحو کی حالت میں فرمایا۔

گرچہ شیریں دہناں بادشہا وندولے
اوسلیمان زمان است کہ خاتم باوست

(اگر چہ اس کے ساتھ بہت سے شیریں زباں موجود ہیں تاہم سلیمان زمانہ تو وہی ہے کیونکہ مُہر اسی کے پاس ہے)

دوسری قسم یہ ہے کہ عالمِ مثال میں نفوس بشریہ کی تربیت متمثل ہوتی ہے اور وہ داعیہ کلیہ کی شکل میں ہوتی ہے، اور وہ داعیہ جزئیہ کا الحاق بھی اس کے ساتھ ضروری ہوتا ہے، چنانچہ ان صالحین کے قلوب میں جنھیں ہر لحظہ عالم مثال اور ان ملائکہ کے ساتھ جو اس سرّ کے حامل ہوتے ہیں، خلوص ہوتا ہے، یہ داعیہ اتر آتا ہے، اور ایک بڑا گروہ اس کام کا شوق بہم پہنچاتا ہے، اور اسی کے ہاتھوں یہ کام سرانجام پاتا ہے۔

قطب ارشاد اور مُجدّدِ دین، بلکہ وہ قطب جو روئے زمین کا مدار (وتد) ہے، بھی اسی مشرب سے سیراب ہوتے ہیں، اور یہ بھی ممکن ہے کہ نفوسِ کاملہ یہ سرّ بارگاہ مثال سے اخذ کریں، اور اسی کے مطابق کوشش کریں، مگر یہ بات ان کے مقام سے فروتر ہے، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بعض وہ امورِ جزئیہ جن کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے بعض ملائکہ الانس پر نازل ہوں، اور وہ اس کے موافق سعی وکاوش دکھائیں، اور ہوسکتا ہے کہ کسی شخص پر الہام کا فیضان ہو، اور بالکل وہی بات کسی دوسرے شخص کی زبان پر آجائے، چاہے یہ دوسرا شخص اس بات کی حقیقت اور غرض وغایت جانتا ہو

یا نہ جانتا ہو ایسے حال میں یہ شخص پہلے کے لئے ملائکہ میں سے ایک ہوگا، اور اس بات کا بھی امکان ہے، کہ وہ الہامی معنیٰ سے کبوتر کی آواز، چڑیا کی چوں چوں یا کسی جسم کی بھنبھناہٹ سے سمجھا دی جائے۔

تیسری قسم یہ ہے کہ وہ نورانی فرشتے جو ذکر و عبادت کے لئے مقرر ہیں، اس ذاکر کو گھیر لیں، اور ان کی طرف سے ذاکر کے قلب اور عقل میں ایک نور کا فیضان ہو، اگر دل سبقت حاصل کرے تو انس اور اطمینان کے قسم کی کیفیت پیدا ہوگی، اور عقل سبقت کرے تو حدیثِ نفس میں برکت ہوگی اور دل میں نیک اعمال کا جذبہ ابھرے گا جو احاطہ سے مناسبت رکھتا ہے اسے خاطر ملکی کہتے ہیں۔

اور کبھی یہ حال یا یہی خاطر خواب میں اس کی بصیرت کے پیشِ نظر متمثل ہو جاتا ہے، یہ خواب پہلی صورت میں انوار و طیبات، اور انس و اطمینان کی قسم کا رویا ہوگا، اور دوسری صورت میں وہ خطاب ہوگا، جس کا مقصود اس عمل کے کرنے یا نہ کرنے کا حکم ہوگا، اور اصل میں یہ ایک نفسی کشف ہے جس نے اس کی عقل میں ظاہر ہو کر داعیہ کی صورت پیدا کر لی ہے، اسی پر رسالہ الطاف القدس کا اختتام کیا جاتا ہے، اور اول و آخر ظاہر و باطن تمام تعریفیں بارگاہِ الوہیت کے شایاں ہیں اور درود و سلام کا ہدیہ ہمارے آقا و مولیٰ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی اور آپ کی آلِ اطہار کی خدمت میں پہنچے۔

............☆☆☆............

الخیر الکثیر

تصنیف

امام شاہ ولی اللہ محدثؒ

ترجمہ

مولانا عبدالرحیم

ترتیب

مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱۔	پہلا خزانہ	۴۷۳
۲۔	دوسرا خزانہ	۴۸۵
۳۔	تیسرا خزانہ	۵۰٦
۴۔	چوتھا خزانہ	۵۲۷
۵۔	پانچواں خزانہ	۵۴۵
٦۔	چھٹا خزانہ	۵٦۱
۷۔	ساتواں خزانہ	۵۷۹
۸۔	آٹھواں خزانہ	۵۹۹
۹۔	نواں خزانہ	٦۱۴
۱۰۔	دسواں خزانہ	٦۳۲

............☆☆☆............

بِسْمِ اللّٰہ الرحمٰنِ الرحیم

رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ وَیَسِّرْلِیْ اَمْرِیْ وَاحْلُلْ عُقْدَۃً مِّنْ لِّسَانِیْ یَفْقَھُوْا قَوْلِیْ.

اے ہمارے خدا! تیری ذات اقدس عزیز ہے اور اس لئے تو العلی العظیم ہے اور حمد وتعریف کا مستحق ہے۔ تیرے اسماء پاک بزرگ ہیں اور اس لئے تو بہت بابرکت ہے اور حمد وتعریف تیرے ہی لئے ہے۔ تیرا جود عام اور ہمہ گیر ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ تو نے کائنات کو پیدا کیا اور اس لئے ہر طرح کی حمد وثناء کے لائق تو ہے۔ تیرا نورِ کامل ہے۔ چنانچہ تو نے (اپنے بندوں کو حق کا راستہ دکھایا اور اس لئے تمام حمد وثناء تیرے ہی لئے ہے۔ تو ہی حکم دینے اور تصرفات کرنے اور کائنات کو نیست سے ہست کرنے والا ہے۔ ظاہر اور باطن کی بادشاہت تیرے ہی لئے ہے۔ قدرت قاہرہ، تصرف کامل، اور عظمت وکبریائی، تیرے ہی شایان شان ہے۔ میرا سب کچھ تجھ سے ہے اور میرا رجوع تیری ہی طرف ہے۔ ہر قسم کی بھلائی اور خیر وبرکت تیرے ہاتھ میں ہے۔ تو ہی اول ہے جس سے پہلے کوئی چیز نہیں، تو ہی آخر ہے جس کے بعد (باقی رہنے والی کوئی چیز نہیں) (ازلی اور ابدی ہے) تو ہی ایسا ظاہر اور غالب ہے جس سے بالاتر کوئی ہستی نہیں، اور تیری ہی ذات اقدس اس قدر باطن، دور از ادراک اور ہمارے قریب ہے کہ کوئی دوسری چیز اس سے ہمارے قریب تر نہیں۔

میں تجھ سے درخواست کرتا ہوں کہ تو اس ذات گرامی پر درود اور رحمت نازل کر جس کا اسم سامی محمدؐ ہے۔ اولین اور آخرین کا سردار ہے، اور قیامت کے دن گناہ گاروں کے لئے شفاعت کرنے والا ہے۔ یہ رحمت خاص (جس کے نزول کی میں استدعا کرتا ہوں) ایسی ہو، جو اس کی یکتائی کی جلالت شان کے مناسب ہو، اور اس کے احسانات میں ہمارے مستغرق ہونے کی جزا

ہو سکے نیز دوسرے انبیاء اور مرسلین پر بھی اپنی رحمت خاص نازل فرما، جو اس کے بھائی ہیں۔ اسی طرح اس کے طیب و طاہر خاندان، اس کے کامل اور مکمل صحابہ، اس کے ہدایت یافتہ اور دوسروں کے رہنما اتباع کو بھی اس میں شامل فرما۔ اے ارحم الراحمین خدایا میری اس التماس کو اپنی مہربانی سے قبول فرما۔ آمین۔

امابعد بندۂ عاجز ولی اللہ، دنیا اور آخرت میں اللہ پاک ہی اس کے حصہ میں آئے، اور اپنی بڑی نعمتیں اور عظیم رحمت اس کے لئے کامل کرے، یہ کہتا ہے کہ جو کچھ میں نے اس کتاب میں لکھا ہے وہ سراسر حکمت کے علوم ہیں جن کے متعلق ارشاد خداوندی عز اسمہ یہ ہے وَمَنْ یُؤْتَ الْحِکْمَۃَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا ۔جس کو حکمت سے بہرہ ور کیا گیا یقیناً اس کو خیر کثیر عطا کیا گیا۔" اس کے رسول صلعم کا یہ قول ہے کہ اَلْحِکْمَۃُ ضَالَّۃُ الْمُؤْمِنِ اَیْنَمَا وَجَدَھَا فَھُوَ اَحَقُّ بِھَا حکمت مومن کی گم کی ہوئی چیز ہے، جہاں کہیں بھی وہ اس کو پائے وہ اس کا سب سے زیادہ مستحق ہے۔" لیکن جس کو فطرۃً ذہن وفا نہ ملا ہو اور نہ ہی اس نے اپنی قوت تعقل کو صرف کر کے اکتسابی استعداد حاصل کی ہو۔ اس کو اس کتاب کا مطالعہ سے پرہیز کرنا چاہئے تاکہ غلطیوں میں مبتلا نہ ہو۔ یہ کتاب حکمت ربانیہ پر مشتمل ہے اس لئے اس کے غلط طور پر سمجھنے کو معمولی غلطی نہیں سمجھنا چاہئے۔ ایک مشہور مقولہ ہے کہ نااہل کے سامنے علم و حکمت کے حقائق بیان کرنا علم کی اضاعت ہے اور اہل استحقاق کو (جن میں علم اور حکمت اخذ کرنے کی استعداد ہو) علم سے محروم رکھنا ظلم ہے۔ (ومن مسخ الجهال علما اضاعهٔ. ومن منع المستوجبين فقد ظلم حسبي الله و نعم الوكيل ولاحول ولاقوة الابالله العلي العظيم)۔ (حکمت پر مشتمل ہونے کی مناسبت سے) ہم نے اس کتاب کا نام الخير الكثير رکھا ہے اور اس کا لقب خزائن الحکمۃ ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو غبی الطبع کجرووں کے فتنہ سے اور نامعقول جھگڑالوؤں کے مکاید سے محفوظ رکھے۔ آمین

............☆☆☆............

پہلا خزانہ

کیا کبھی یہ بات بھی تمہارے گوش گزار ہوئی کہ اہل معقول نے نہایت کوشش کر کے یہ بنیادی اصول قائم کیا ہے کہ وجود کا مفہوم انتزاعی ہے (جس طرح کلیات کے مفہوم کی کوئی علیحدہ ہستی نہیں جس کو ذہن کے باہر عالم خارجی میں مشارالیہ بنایا جاسکے۔ کسی کلی کا مفہوم ہمیشہ اس کے افراد ہی کے ضمن میں پایا جاتا ہے۔ افراد کے مفہوم کو پیش نظر رکھ کر وہ عام تصور جو ذہن میں قائم ہوتا ہے اور جس کا اطلاق ہر ایک فرد پر ہوسکتا ہے مفہوم انتزاعی (۱) کہلاتا ہے اور اس کے وجود کو وجود انتزاعی کہتے ہیں) تم اس مفہوم کا ادراک صرف اپنی قوت عاقلہ سے کر سکتے ہو اور یہی ادراک اس کی کُنہ اور اس کی حقیقت ہے۔ اس مفہوم انتزاعی کے عین بالمقابل عالم خارجی میں اس کا مصداق ہوتا ہے جس کی ہستی متحقق اور نفس الامری ہوتی ہے، اہل معقول کی اصطلاح میں اس کو فعلیت ماہیت (ماہیت ذہنی کا قوۃ سے فعل میں آنا) کہتے ہیں، کبھی اس کو ''تقرّرِ ذات'' سے بھی تعبیر کرتے ہیں بہر حال وجود کے مفہوم کو دو قسموں میں منحصر سمجھا گیا ہے۔

(الف) ''موجود بالذات'' جس کا مفہوم یہ ہے کہ وجود کا اطلاق اس پر براہ راست ہوتا ہے اور مفہوم انتزاعی کا منشاء، (اور مبدا) فقط اس وجود کی ذات ہوتی ہے۔ کسی خاص حیثیت یا اعتبار کو قطعاً ملحوظ نہیں رکھا جاتا، اس لئے اس کا مفہوم ہی نفس تحقق کا مقتضی ہوتا ہے اور عین ماہیت سمجھا جاتا ہے۔

(ب) ''موجود بغیرہ'' یا من غیرہ. اس قسم پر وجود کا اطلاق براہ راست نہیں ہوتا اور نہ

---

(۱) انتزاعی مفہوم: انتزع الشئ کسی شی کو کھینچنا، اکھیڑنا، سلب کرنا، حضرت شاہ صاحب نے مفہوم انتزاعی کی بڑی لطیف تشریح کی ہے۔ فلاسفہ واہل معقول کے نزدیک اس کا جو مفہوم ہے۔ اس کی وضاحت کی ہے۔ (قاسمی)

ہی اس کے مفہوم انتزاعی کا منشاء فقط اس کی ذات خالی از حیثیات و اعتبارات ہوتی ہے، بلکہ اس کا وجود کسی دوسرے موجود "متحقق فی نفسہٖ" اور "موجود بالذات" سے منسوب ہوتا ہے۔ اس کو ہم فاقد الذات کہتے ہیں۔ یعنی اپنی ذات سے اس کی کوئی ہستی نہیں۔ اس کا وجود دراصل اس کی علت فاعلیہ کے وجود میں مدغم ہوتا ہے۔

عالم امکان میں ماہیت اور فعلیتِ ماہیت میں یہ فرق ہے کہ اگر کسی چیز کو اس حیثیت سے ملحوظ رکھا جائے کہ کوئی حیثیت ملحوظ نہ ہو، بالفاظ دیگر اس کے نفس مفہوم کو حیثیات اور اعتبارات سے الگ کر کے پیش نظر رکھا جائے تو کہا جائے گا کہ اس کی ماہیت کو ملحوظ رکھا گیا۔ لیکن جب کسی چیز کو اس حیثیت سے دیکھا جائے کہ وہ کسی دوسری ذات کی طرف منسوب ہے۔ جس نے اس کو ہستی بخشی ہے تو اس مفہوم کو فعلیت ماہیت سے تعبیر کریں گے۔

(تمہید کے طور پر یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ لغت عرب میں جعل کے دو معنی ہیں۔

(الف) پیدا کرنا۔ ہست کرنا۔ معرض ظہور میں لانا۔

(ب) بنانا۔ کسی چیز کو کسی وصف خاص سے بہرہ ور کرنا۔ کسی خصوصیت سے ممتاز کرنا۔ پہلے مفہوم کی مثال **جعل الظلمات و النور** اور دوسرے کی مثال **جعل لکم الارض فراشا** وغیرہ ہے دونوں میں استعمال کا فرق یہ ہے کہ پہلا متعدی بہ یک مفعول اور مؤخر الذکر متعدی بہ دو مفعول ہے۔ یہ علماء نحو کی اصطلاح ہے۔ اہل معقول کی اصطلاح میں یہ دونوں قسمیں بالترتیب جعل بسیط اور جعل مرکب کہلاتی ہیں۔ جعل بسیط میں فعل کا اثر فقط وہی قبول کرتا ہے جو اس کا مفعول ہے اور اگر اس جعل کے مفہوم سے قطع نظر کر لی جائے تو اس چیز کا وجود تک باقی نہیں رہتا، وہ معدوم محض ہو جاتی ہے ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھو کہ جاعل کو اپنے مجعول کے ساتھ ایک خصوصیت ہوتی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جاعل ہی اس کے ظہور کا موجب ہو سکتا ہے، اسی طرح مجعول کو اپنے جعل کے ساتھ خصوصیت ہوتی ہے اور اس لئے وہ مجعول اسی جاعل ہی سے صادر ہو سکتا ہے۔ اس کو ہم دوسرے الفاظ میں اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ جاعل میں ایک حیثیت ہے جو اس کے مجعول کے ظہور میں آنے کی بنیاد ہے، اس کی کُنہ اور حقیقت ہے، یہ حیثیت ایجاد اور اس چیز کا وجود دونوں ایک دوسرے پر یکسر منطبق ہوتے ہیں (جس طرح سیپ کے دونوں نصف)۔

مجعول اسی حقیقت کا تجسم ہوتا ہے اور وہ اگر چہ اپنے درجۂ وجود میں کامل بنفسہ ہوتا ہے، بایں ہمہ مجعول کی تکمیلی حیثیت اپنے جاعل سے بے نیاز نہیں ہوسکتی۔

چونکہ ہر ایک ممکن کی طبیعت اور اس کے نیچر میں یہ بات موجود ہے کہ وہ اپنی فعلیت میں (قوۃ سے فعل میں آنے کے لئے) اپنے جاعل اور خالق کا محتاج ہے، اور ہر ایک مجعول کا نیچر یہ ہے کہ جاعل ہی کی ایک حیثیت اس کے ظہور میں آنے کی بنیاد ہے، اس لئے عام فعلیت میں خواہ کسی قسم کا تحقق ہو کسی ایسی چیز کا ظہور میں آنا ممتنع اور ناممکن ہے جس کی حیثیت ایجاد کی بنیاد واجب الوجود جل مجدہ کی ذات اقدس میں نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کی تمجید و تقدیس کے اظہار کا پیرایہ یہ ہے کہ وہ غیر متناہی پر محیط ہے اور اس کا احاطہ متناہی ہے۔ یہ کہنے سے اس کی تقدیس نہیں ہوتی کہ برہان منطق کا ضروری اقتضاء یہ ہے کہ تمام ممکنات اپنی ہستی میں اسی کے محتاج ہیں، چاہے عقل نے اس کی نقیضِ مقابل کو ذہن میں فرض کرلیا ہو۔ یہ تو فقط ''تقرر ذات'' اور تحقیق نفس الامری کا ثبوت ہے۔ اسی طرح یہ بھی نہیں کہنا چاہئے کہ ذات اقدس سے آگے بھی کوئی مفہوم یا فعلیت ہے، کیوں کہ ہم لکھ چکے ہیں کہ کوئی چیز جس کی حیثیت تخلیق و ایجاد کی بنیاد ذات اقدس جلّ وعلا میں نہ ہو وہ ممتنع بالذات ہے اور اس کا معرض ظہور میں آنا اور موجود ہونا محض ناممکن ہے۔

نیز اس کی ذات اقدس اس سے بالاتر ہے کہ اس پر کلی یا جزئی کا اطلاق کیا جائے۔ کلی کا مصداق تو وہ اس لئے نہیں کہ عدم اور نقض کو اس کی ذاتِ اقدس میں دخل نہیں، وہ تو سراسر وجود اور کمال ہے۔ عدم اور نقض کا مفہوم عقل کا پیدا کیا ہوا ہے، جب وہ کسی ایسی چیز کا تصور کرتا ہے جو کبھی وقوع میں نہ آئے۔ یعنی جہاں تک تعقل اور علم کا تعلق ہے کسی جاعل کی طرف منسوب نہ ہو تو ایسی حالت میں جو تصور ذہن میں آتا ہے اسی کو ہم نے لیس اور خداج (عدم اور نقض) سے تعبیر کیا ہے۔ اسی طرح ہم اس کو جزئی بھی نہیں کہہ سکتے کیوں کہ جزئی کے مفہوم میں عموم نہیں ہوتا لیکن اس کی ذات اقدس سے کوئی چیز عام تر نہیں، نہ ہی کسی چیز کو اس کیساتھ اشتراک ہے۔ (تا کہ وہ دونوں کسی کلی کی جزئیات کہلائیں) وہ تو واحد حق ہے اور جو ہر حیثیت سے واحد ہو، اس سے ایک ہی چیز صادر ہوسکتی ہے اور ایک ہی چیز اس کے لوازم سے ہوسکتی ہے۔ اس نظریہ میں اس لئے شک کرنے کی گنجائش نہیں کہ واحد کے معنی ہی یہ ہیں کہ اس کا صدور واحد بسیط سے ہو اور فقط اس کی وحدت کی

حیثیت ملحوظ ہو۔ اس بات کو خوب سوچ لو اور اچھی طرح یاد رکھو۔

کیا ان لوگوں کا فلسفہ پڑھ کر تم پر یہ بات واضح نہیں ہوئی کہ کسی چیز کے تمام عوارض کا مرجع اس کا لازم ذاتی ہے، جو اس کے نفس ذات کا تقاضا ہے اور تمام لوازم کا سلسلہ ایک ہی لازم پر منتہی ہوتا ہے جو اس کی ذات کا اقتضاء ہو اور اس کی حیثیت ایجاد کا تجسم ہو۔ بے شک کسی چیز کا تقرر اور تحقق (یعنی عدم سے وجود میں آنا)، ماہیت کا اول ترین تمثّل ہے، ماہیت کو اگر اس پر تقدم حاصل ہے تو وہ فقط اس کی ذات کے لحاظ سے ہے (جس کو تقدم ذاتی کہتے ہیں) اور جو اشیاء اس ماہیت کے تمثُّلات اور ظہورات ہیں وہ سب بلحاظ ذات اس سے متاخر ہیں۔ ''ممکن'' کی ماہیت اور ''واجب الوجود'' کی حقیقت میں بڑا فرق ہے، گو یہ بات ان میں قدر مشترک ہے کہ لازم ذاتی دونوں کا ایک ہوتا ہے اور دیگر تمام لوازم اور عوارض کا مرجع وہی ہوتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ ممکن کی ماہیت انفعالی ہے (دوسری ہستی اس پر اثر انداز ہو کر اس کے ظہور کا باعث ہوتی ہے) درجۂ تقدم میں اس کے ضروری اور غیر ضروری کمالات کے ظہور میں آنے سے خود اس کی ذات مانع ہے، کیونکہ وہ بلحاظ اپنی ذات کے ناقص ہے، وہ فاقد الذات ہے، اس کی اپنی کوئی ہستی نہیں، وہ ہر ایک بات میں دوسری ہستی کا دست نگر رہتا ہے جو انتہائی ذلت ہے۔ برخلاف اس کے واجب الوجود کی حقیقت اور ماہیت فعلی ہے۔ (دوسروں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ کسی دوسری ماہیت سے اثر پذیر نہیں ہوتی) اس کے لئے درجۂ تقدم میں اس کے ضروری اور غیر ضروری کمالات کے ظہور میں آنے سے خود اس کی ذات مانع نہیں بلکہ اس کا علو و کبریا، اور اس کی انتہائی عزّت مانع ہے، وہ ہر ایک چیز سے پہلے ہے۔ (ازلی ہے)، ہر ایک قسم کی خیر و برکت اس کے سامنے جھکتی ہے اور ہر ایک فعلیّت اسی کی اقتداء کرتی ہے۔ کلی اور جزئی کا مفہوم عقل کی اختراع ہے اور عاقلہ و مدرکہ کی صناعی ہے۔ کوئی بھی جزء ہو، فی نفسہ ان دونوں کے مفہوم سے بری ہے۔ کیوں کہ کسی چیز کے معرض وجود میں آنے کی حقیقت اور اس کا راز مجعول کی وہ حیثیت ہے، جو جاعل کے لئے اس کے ایجاد اور تخلیق کا باعث ہوئی ہے۔ یہ حیثیت اور اس جز کا وجود سراسر ایک دوسرے پر منطبق ہیں۔ یہ مجعول نہ تو اس سے عام تر ہے اور نہ ہی اس سے اخص ہے۔ موطن جعل میں کوئی امر اور کوئی مفہوم اس حیثیت مذکورہ سے قطع نظر کر کے وقوع میں نہیں آتا۔ جنس اور فعل اور تعینات، ان سب کا مفہوم عقل انسانی

کی اختراع ہے جن کا تعلق ان امور سے منقطع ہے جو اللہ تعالیٰ کے یہاں ہیں۔

جو جز موجود ہے وہ خیر محض ہے اور جو چیز عقل میں آتی ہے وہ محض فعلیّت ہے۔ کسی چیز کا معدوم ہونا یا شر کا مصداق ہونا، صرف اس لئے ہے کہ اس کو جاعل کی طرف منسوب ہونے کا فخر حاصل نہیں، اور اس لئے وہ دعوت حق سے محروم ہے (اس آیت کی طرف اشارہ ہے لَـهُ دَعْـوَةُ الْحَقِّ وَ الَّذِيْنَ يَدْ عُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ) عدد کی وجہ سے دو چیزوں کا یا زیادہ اشیاء کا آپس میں مختلف ہونا، حدوث کے ساتھ آلودہ ہونے کا ثبوت ہے۔ برخلاف اس کے جو کائنات قدسیہ ہیں ان میں افتراق اور اختلاف کا مبداء خود ان کی ماہیت ہوتی ہے۔

جو چیز اس نشأۃ دنیویہ میں ظہور پذیر ہوتی اور معرض وجود میں آتی ہے، ممکن ہے کہ اس کی اصل جس کا وہ اپنے کمال کے اصول اور فروع میں اقتداء کرتی ہے، عالم بالا میں موجود ہو۔ یہاں تک کہ فلاسفہ نے افلاک یعنی سورج چاند اور ستاروں کے مدارات تک کے لئے یہ نظریہ تسلیم کیا ہے۔ یعنی یہ کہ ان کے لئے عوالم علیا میں ان کی اصل موجود ہے جس کی اقتداء میں ان کا یہ نظام ظہور میں آیا ہے اشراقیین نے اپنی جہالت سے کچھ ایسے ہی وجوہات پیش نظر رکھ کر نور اور نار کی پرستش اختیار کی ہے۔ کسی چیز کے لوازم اور ذاتیات کے متعلق کیوں کا لفظ استعمال کرنا، اس قدر بیہودہ سوال ہے کہ وہ قطعاً اس لائق نہیں کہ اس کا جواب دینے کی کوشش کی جائے۔ بھلا یہ بھی کوئی معقول سوال ہے کہ انسان ناطق کیوں ہے؟ یا اس میں تعجب کا اظہار کرنے کی خاصیت کیوں رکھی گئی ہے؟ اور یہ کہ آگ جلاتی کیوں ہے؟ کیوں کہ جو حیثیت ایجاد اور تخلیق کی جاعل میں ہے وہ کسی مجعول اور اس کے لوازم اور ذاتیات دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا ہوا ظہور میں لاتی ہے۔ کسی چیز کے لوازم اس کی مجمل ماہیت کی شرح اور تفصیل ہوتی ہے اور جاعل ان دونوں کو ایک ہی لڑی میں پرو کر اس لئے ظہور میں لاتا ہے کہ ان میں کوئی امر جامع ہوتا ہے (یہی امر جامع وہ گہرا راز ہے جس کا جاننے والا سوائے عالم الغیب خدا جل وعلا کے اور کوئی نہیں)۔ جوہر اور عرض میں جو فرق ہے وہ صرف تمثیل کے میدان میں ہے لیکن جس حیثیت کو ہم نے جاعل اور مجعول کی حیثیت قرار دیا ہے اس کے لحاظ سے دونوں کا نیچر اور نوعیت ایک ہے۔ کیا تمہیں فلاسفہ کا وہ نظریہ یاد نہیں جو افلاک کے لئے حرکت دوریہ لازم قرار دینے کے بارے میں وہ بیان کیا کرتے ہیں۔ یہ

وہ مسائل ہیں جو اگرچہ اہل عقل کا مذہب ہے لیکن حکیم ربانی ان کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا اور ان کی تنقیح اور تمحیص کرتا ہے۔ اچھی طرح سوچ لو اور غافل نہ بنو۔

اب ہم ایک ایسا اہم مسئلہ ذکر کرتے ہیں جو حکمت کی جڑ اور تحقیق کا تخم ہے۔ یہ تو تم جانتے ہو گے کہ کسی چیز کا نام اس (کی حقیقت) کا عنوان ہوتا ہے اسم اور مسمّٰی میں سوائے اس کے اور کوئی فرق نہیں کہ اسم کا مفہوم مجمل ہوتا ہے اور مسمّٰی کی حقیقت اس کی شرح اور تفصیل ہوتی ہے۔ (بعینہ جس طرح عنوان اس تفصیل کا اجمال ہوتا ہے جس کا وہ عنوان قرار پایا ہے۔) اس کے بعد تمہیں یہ جان لینا چاہئے کہ (فلاسفہ کا) صادر اول اللہ تعالیٰ کے اسماءِ حسنیٰ میں سے ایک اسم ہے۔ اس کی دو وجہیں ہیں۔

(۱) اس پر سب کا اتفاق ہے کہ واجب الوجود تعالیٰ وتقدس اور صادر اول میں ماہیت کا فرق ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ (صادر اول) ایک عنوان نہیں جس کو دیکھ کر دیکھنے والے کی نظر واجب الوجود جل مجدہ کی حقیقت تک پہنچ جاتی ہے؟ اس سے الگ رہنا "ممکن" کی طبیعت اور اس کے نیچر کے خلاف ہے، خصوصاً جب منزہات (کائنات قدسیہ) کو ملحوظ رکھا جائے۔ اور میں پوچھتا ہوں کہ کیا اس کی حیثیت ظہور واجب الوجود تعالیٰ وتقدس کی ذات اقدس میں نہیں؟ اور کیا وہ اس کی شرح اور تفصیل اور اس کا تمثل نہیں؟ اس لئے ہم اس کو باری تعالیٰ کا اسم پاک سمجھتے ہیں۔

(۲) کیا یہ درست نہیں کہ واجب الوجود جل مجدہ کی خالص وحدت کے اندر جملہ ممکنات کی حیثیتیں پنہاں ہیں خواہ وہ ممکنات خارج میں موجود ہوں یا موجود نہ ہوں بلکہ مفروض ہوں (ان کا وجود عالم خارجی میں نہ ہو، بلکہ صرف فرض کر لیا گیا ہو)۔ صادر اول کی بھی یہی کیفیت ہے، اس کا اور واجب الوجود کا مفہوم یکسر ایک دوسرے پر منطبق ہے، جس کو ہم اطلاق سے تعبیر کرتے ہیں۔

یاد رکھو تمام ماسوائے اللہ کا وجود، اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس میں مستہلک ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر ایک حیثیت سے ہر ایک فعلیت پر محیط ہے باعثِ امتیاز صرف خصوصیات لازمہ ہیں جو مرۃً بعد اخریٰ ظہور میں آتی ہیں اور ظاہر ہے کہ ہر ایک چیز جو کسی دوسری ذات میں مستہلک ہو وہ اس پر محمول ہو سکتی ہے اور اس کو اس کا عنوان قرار دیا جا سکتا ہے بشرطیکہ اس کا مطلق مفہوم لیا جائے۔ کیونکہ (جیسے کہ ابھی مذکور ہوا) باعثِ امتیاز تو اس کی خصوصیات ہی ہیں اور بحالتِ اطلاق

دونوں میں کسی قسم کا تضاد پیدا نہیں ہوتا۔ اتنی بات ضرور ہے کہ وہ اس حیثیت کی شرح اور تفصیل ہوتی ہے جو جاعل اور مجعول کی امتیازی خصوصی ہے یہ دیگر لوازم سے اس بات میں ممتاز ہے کہ وہ اپنے اصل (اور مسمّٰی) پر یکسر منطبق ہوتا ہے اور اس کا اصل اس پر یکسر منطبق ہوتا ہے، ذرّہ بھر ان دونوں کے مفہوم میں فرق نہیں ہوتا عالم تحقق اور مرتبۂ لزوم میں سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہوتا، خواہ ہم اس کے خصوص کے قائل ہوں یا عموم کے، حقیقت یہ ہے کہ وہاں پر عموم اور خصوص کا گزر نہیں۔ بعض خیال کرتے ہیں کہ اصل کو تقدم حاصل ہے، کیونکہ ہر ایک قسم کی خیر و برکت کا وہی منبع ہے اور خیر و برکت کی ہر ایک قسم اس کے ساتھ لازم ہے وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ بلحاظ ماہیت یہ صادر اول جزئیات میں سے ایک جزئی ہے۔ یہ خیال اور یہ قول سراسر لغو اور بیہودہ ہے، اس کے حق میں یہ خیال کرنا قطعاً باطل ہے اور طبعاً ممتنع اور ناممکن ہے۔ کیونکہ سوائے اس حیثیت مخصوص کے (جو ایجاد اور تخلیق کی حیثیت ہے) اس کی کوئی کنہ اور حقیقت نہیں۔ وجہ امتیاز صرف اس کی شرح اور تفصیل کی نوعیت ہے۔ یہ ایک ایسی حق بات ہے جس کے سامنے باطل کی کچھ ہستی نہیں۔

یاد رکھو اسماء پاک کے دوسرے تیسرے ظہور کا بھی یہی حکم ہے اور چونکہ واجب الوجود تعالیٰ و تقدس کی ذات اقدس میں تناہی کو قطعاً دخل نہیں۔ اس لئے اس کا یعنی صادر اول کا عرض بھی غیر متناہی اور بے پایاں ہے، رسول خدا صلعم کی ایک دعائے ماثورہ کے یہ الفاظ ہیں **اسألک بکل اسمٍ ھولک سمَّیتَ بہ نفسک او انزلتہ فی کتابِک او علّمتہ احداً من خَلقک او استاثرت بہ فی علم الغیب عندک.** ''میں تیری جناب میں ہر ایک ایسے اسم کا واسطہ لاتا ہوں جو تیرا اسم مقدس ہے اور تو نے اس کو اپنے لئے مقرر فرمایا ہے یا تو نے اس کو اپنی کتاب مجید میں نازل فرمایا یا اپنی مخلوق میں سے کسی کو اس کا علم دیا یا اپنے علم میں اس کا جاننا اپنے لئے مخصوص فرمایا۔'' برخلاف اس کے اس کے طول کی حد، وہ ہے جہاں پر کہ تمثُّلاتِ مجردہ ازلیہ ختم ہو کر ان میں وحدت پیدا ہوتی ہے اور ارادہ کی صفت ظہور میں آتی ہے۔ اسی مقام پر عالم حادث ظہور میں آتا ہے جو ارادۂ قاہرہ کے تابع اور اس کے زیر حکم ہے، یہاں پر اسماء پاک کے احکام خلط ملط ہو جاتے ہیں اور اس موطن میں انطباق کلّی مفقود ہو جاتا ہے، اور نہ تقدیس اور عنوانیت کا کچھ دخل ہے اس کی مُغایرت اور اس کے حادث اور معلول ہونے کی یہی وجہ ہے۔

اس کے بعد تصرف فی العالم کی جانب میں تمثُّلات مجردہ اور حقائق مقدسہ کا اثبات کیا جاتا ہے جن کا ایصال اور ان کا عنوان تام اور کامل ہوتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے کہ الی اللّٰہ المصیر، انا للّٰہ و انا الیہ راجعون، الا الی اللّٰہ یرجع الامور وغیرہ۔ یہ وہ اسماء الٰہیہ مقدسہ ہیں جن کو ''اسماء عودیہ'' کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ (کیونکہ ان کا مفہوم ذات اقدس سے ظہور پذیر ہو کر مختلف مظاہر اختیار کرنے کے بعد پھر اسی ذات اقدس تک پہنچ کر اس میں مدغم ہو جاتا ہے)۔ (تنگی عبارت ملحوظ ہے) جس کو اس سلسلہ دوریہ کے سمجھنے کی توفیق نصیب ہوئی اور اس کے احکام کو اس کا علم حاصل ہوا۔ سمجھ لے کہ اس کے لئے خیر اور بھلائی کے دروازے چوپٹ کھول دیئے گئے۔ ایک حکمت کے نزدیک ایک جامع کلمہ یہ ہے کہ ''تمام عالم غیر اللہ ہے'' لیکن اس کا وہ معنی نہیں جو عوام کے ذہن میں سمائے ہوئے ہیں اور جس کو وہ استقلال فعلیت اور اس کے مقابلے میں تحقُّق وجود کے سمٹ آنے سے تعبیر کرتے ہیں حاشا وکلاّ۔ بلکہ یہ تو واجب الوجود تعالیٰ و تقدس کی حیثیت ایجاد و تخلیق کی تصویر اور اس کے کمال کی شرح اور تفصیل ہے۔

غیریت کا انحصار اس پر ہے کہ وہ چیز (جسے ہم غیر اللہ کہتے ہیں) بلحاظ اپنی ذات کے متناہی اور متعیّن ہو۔ اس تناہی اور تعیّن کا منشأ (واجب الوجود جل شانہٗ کی) بے پایانی۔ اس کے اطلاق کا ہر ایک قید سے آزاد ہونا، اور احاطہ کا ہمہ گیر ہونا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو پھر ہم کس بنا پر اس کو غیر متناہی کہہ سکتے ہیں؟ غیریت کا دارومدار، اس پر ہے کہ وہ چیز بلحاظ اپنی ذات اور نیچر کے طہارت قدس سے بے بہرہ ہو۔ قدّوس اور سبّوح کے یہی معنی ہیں کہ کمال قدس میں اس کا کوئی بھی شریک نہیں۔ ورنہ پھر قدوسیت کا کیا مفہوم باقی رہ جاتا ہے؟ عنوان اور ایصال کا مفقود ہونا اس کی شدّتِ ظہور کا نتیجہ ہے، عنوان اور ایصال کے ہوتے ہوئے اس پر ''ظاہر'' کا اطلاق کرنا، بے معنی ہے۔ اس کی مثال حیوانِ مطلق کا مفہوم ہے جو ہر ایک قسم کی شرط سے معرّا ہے، جس کو منطق کی اصطلاح میں ''لابشرط شیٔ'' کہتے ہیں۔ اب اس مفہوم کے ساتھ حیوان کلّی اور حیوان جزئی کے مفہوم کا موازنہ کرو۔ اوّل الذکر کا مفہوم بشرط لاشیٔ کے ساتھ مقیّد ہے اور مؤخر الذکر کے ساتھ بشرط شیٔ کی دم لگی ہوئی ہے لیکن حیوان مطلق اپنی شدّت اطلاق اور قطعاً غیر مقید ہونے کی وجہ سے ان دونوں کے مفہوم کو شامل ہے۔ برخلاف اس کے حیوان کلّی اور حیوان جزئی کا مفہوم متناہی

اور متدنس ہونے کی وجہ سے اس قابل نہیں کہ اس کو عنوان قرار دیا جائے اور پھر دونوں ایک دوسرے پر یکسر منطبق ہوں۔ اب ہم یہ فیصلہ تم ہی پر چھوڑتے ہیں کہ کیا صادر اوّل کو اس کی طبیعت اور اس کے نیچر کے لحاظ سے ہم غیر کہہ کر ''عقل اوّل'' سے موسوم کر سکتے ہیں؟ (جیسے کہ فلاسفہ میں مشہور اور مقبول عام ہے)۔ حاشا وکلّا۔ ثم حاشا وکلّا۔ یہ بات کہ متدنس اور غیر مقدس کائنات ظہور اور تمثل کے طریقہ پر قدوسیت کے منبع سے معرض وجود میں آئی۔ تم کو ناگوار اور خوفناک معلوم نہیں ہونی چاہئے۔ کیونکہ ہر ایک متدنس کی قدوسیت اگرچہ اس کی شہ رگ سے بھی اس کے زیادہ قریب ہے۔ (وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ کی طرف اشارہ ہے) لیکن وہ اس ذات اقدس سے اس قدر دور ہے جس کو بعد المشرقین کہہ سکتے ہیں۔

دوست نزدیک تر از من بہ من است

ویں عجب ترکہ من از وے دورم (سعدیؒ)

یاد رکھو اللہ تعالیٰ اپنے علم اور ارادہ کے مطابق جس کسی کی بھی تخلیق فرماتا ہے وہ تخلیق اس کی ذات کی حیثیت سے ہوتی ہے، جس کے یہ معنی ہیں کہ اس کا وجود خیر محض ہے اور ذات اقدس کے اسماء پاک کا پرتو ہے۔ یہ ایک دقیق مسئلہ ہے جس کو صرف وہی شخص سمجھ سکتا ہے جو اس سے فطری مناسبت رکھتا ہو۔ پھر بھی ہم اس پر کسی قدر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں جس سے دوسرے مسائل بھی حل ہو سکیں گے۔ کیا کبھی تم نے اس پر غور کیا کہ زوج (جو فرد کے مقابل ہے) کے چار مختلف الحیثیۃ مفہوم ہیں۔

(۱) پہلی صورت یہ ہے کہ تم زوج کے مفہوم کی تعریف کرو اور تمہارے پیش نظر چار کا عدد ہو۔ بالفاظ دیگر تمہارا زوج کے مفہوم کی تعریف کرنا اس کا عنوان ہو۔ ایسی صورت میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ لفظ زوج چار کے عدد کا مظہر اور اس کی تجلی ہے۔ (یعنی اس کے ضمن میں چار کا عدد جلوہ گر ہے) اسی کا اسم ہے اور وہ اس کا مسمّٰی۔ شدت اتحاد کی وجہ سے اس قسم کا اطلاق کرنا ناممکن ہے کہ زوج چار کا عدد ہے یا چار کا عدد زوج ہے۔ زوج کے مفہوم کی یہ حیثیت سب حیثیات سے افضل اور حقیقت نفس الامری کے مطابق تر ہے۔ حکماء ربانیین الٰہیات میں اسی نظریہ کے قائل ہیں چنانچہ ان کے نزدیک علیم کا مفہوم علم سے مقدم ہے، اور سمیع کے مفہوم کو سمع پر تقدم حاصل ہے۔ ان

کا مذہب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حق میں (اس کی صفات عالیہ بیان کرنے کی) بہترین عبارت یہ ہے کہ وہ علیم ہے، حکیم ہے، سمیع و بصیر ہے، وغیرہ وغیرہ۔ بقول ان کے قرآن مجید نے بھی اسی طریقۂ تعبیر کو استعمال فرمایا ہے۔ ان کے مذہب کی بناء پر ایک لحاظ سے تو اسم کو عین مسمیٰ کہنا چاہئے، دوسرے لحاظ سے یہ کہیں گے کہ اسم نہ تو عین مسمیٰ ہے اور نہ غیر مسمیٰ ہے۔

(۲) دوسری صورت یہ ہے کہ ہم کہیں چار کا عدد زوج ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ زوج کا مفہوم چار کے عدد پر صادق آتا ہے یعنی اگرچہ چار کے عدد اور زوج کا مفہوم (فی حد ذاتہ) مختلف ہے لیکن دونوں اس حیثیت سے متحد ہیں کہ چار کا مفہوم زوج کے مفہوم میں شامل ہے۔ یہ حیثیت پہلے کی نسبت ناقص ہے متکلمین نے الٰہیات میں اسی نظریہ کو اختیار کر لیا ہے۔ ان کے نزدیک علم کا درجہ علیم سے مقدم ہے اور حکمت کے مفہوم کو حکیم پر تقدیم حاصل ہے۔ بقول ان کے تعبیر کی بہترین شکل یہ ہے کہ باری تعالیٰ علم اور حکمت کی صفت سے موصوف ہے، یہ نہیں کہ وہ علیم اور حکیم ہے۔ وہ علیم اور حکیم کو عین علم اور عین حکمت کہتے ہیں۔

(۳) تیسری صورت یہ ہے کہ ہم چار کے مفہوم کو زوج کے مفہوم خصوصی میں ظہور کرتا ہوا اور تجلی کرتا ہوا دیکھیں۔ ان دونوں کے مفہوم میں اس سے پہلے جو اتحاد تھا اور جس کا منشأ نفوذ نظر کی سرعت تھی، اس کو نظر انداز کر دیں، اور تخلیطات ذہن کی وجہ سے اس وحدت کا جو عنوان تھا اس پر موٹے موٹے پردے ڈال دیں یہ صوفیہ کا مذہب ہے اور ان کے نزدیک بہترین عبارت اظہار مقصد کے لئے یہ ہے کہ زوج عدد چار کا ایک تعیّن (اور تمثل) ہے اور اس کا مظہر ہے۔ یہ حیثیت پہلی دونوں حیثیتوں کے بین بین ہے۔

(۴) چوتھی صورت یہ ہے کہ پہلے چار کے مفہوم کو اپنے ذہن میں محفوظ کر لو، اس کے بعد زوج کے مفہوم کو ذہن کے کسی دوسرے کونہ میں جگہ دے دو، پھر دیکھو کہ انکی آپس میں کون سی نسبت ہے۔ غور کرنے پر معلوم ہوگا کہ پہلے لفظ کا مفہوم دوسرے کے وجود کی علّتِ فاعلہ ہے اور دوسرے لفظ کا مفہوم اس کا معلول ہے۔ اگر یہ علت نہ ہوتی تو معلول کا معرض وجود میں جلوہ گر ہونا محال اور ناممکن تھا۔ فلاسفہ کا یہی مذہب ہے۔ بقول ان کے علم اس کا (علیم کی ذاتِ اقدس کا) معلول اور اس کا محتاج ہے۔ بہترین طریقہ تعبیر کا ان کے نزدیک یہ ہے کہ اگر واجب الوجود جل

وعلانہ ہوتا تو علم بھی نہ ہوتا، اس کے وجود کا مقتضی وہی ذات اقدس ہے۔ اے عقلمند سامع! اب میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ اگر کوئی کہے کہ عالم حادث کی تخلیق عقل فعال کی طرف منسوب ہے تو اس قضیہ کو غلط نہ سمجھو۔ لیکن اس قضیہ کو جو عنوان قرار دیا گیا ہے وہ باطل ہے۔ بدعت کا لباس اس سے اتار کر اس قضیہ کی حقیقت کو دیکھا جائے تو اس کا ملخص مفہوم یہ ہے کہ واحد فیاض تعالیٰ وتقدس نے جو خلاق جواد ہے۔ عالم پر اپنا فیض نازل فرما کر اس کو نیست سے ہست کیا۔ اسی طرح یہ لوگ (فلاسفۂ یونان) اپنی اصطلاح کے مطابق اپنی فلسفیانہ زبان میں یہ کہتے کہ دہی عقل فعال کی تعلیم ہے، اسی بات کو سیدھے طور پر اس طرح کہیں گے کہ وہ ربّ تعالیٰ جو متکلم اور جواد ہے، وحی اسی کا افاضہ ہے۔ خلاصہ یہ کہ عقول عشرہ کا مسئلہ عقل کی ایک بدعت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ منصب ایجاد و تخلیق سوائے باری تعالیٰ کے اور کسی کے شایان شان نہیں۔ سبھی اس کے اسماء پاک کا جلوہ اور ظہورات ہیں۔ جس کو خدائے پاک نے سمجھدار دل اور توجہ کے ساتھ سننے والے کان عطا کئے ہوں، اس کے لئے انشاء اللہ تعالیٰ یہی دلیل جو ہم نے بیان کی ہے، کافی ہے۔ ہاں یہ یاد رکھو کہ جب کبھی ہم اسماء پاک کا ذکر کرتے ہیں تو ہماری مراد ان کے حقائق مقدسہ اور منزّہ ماہیات، اور واجب الوجود تعالیٰ وتقدس کی تجلیات ہوتی ہیں۔ ان حقائق مقدسہ کے لئے بعض اہل کشف اور بعض اہلِ نظر جس عدم کا اثبات کرتے ہیں وہ قطعاً باطل ہے۔ کیوں کہ اگر اسماء پاک کا کماحقہ اثبات کیا جائے تو عدم کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ عقل کسی امر غیر واقع کا تصور باندھتے ہوئے اس کا بھی تصور کر لے، جو عقل کی وہم پرستی ہی کا نتیجہ ہوگا۔ بے شک اگر اسماء پاک کے مفہوم اور حقیقت کو کماحقہ ذہن میں ملحوظ نہ رکھا جائے اور ان کو صفات اور عقول سمجھ لیا جائے تو ایسی صورت میں نظروں میں ان کا تعلق واجب الوجود تعالیٰ وتقدس سے منقطع ہو جاتا ہے اور یہی ان کے متعلق عدم کا تصور باندھنے کا باعث ہوتا ہے۔ حکماء کی یہ اصطلاح جو ان کے وجدان پر مبنی ہے، قابل تعریف ہے کہ حقائق مقدسہ کے ظہور کو اتصاف ذات اقدس سے تعبیر کرتے ہیں یا یہ کہتے ہیں کہ باری تعالیٰ ان سے موسوم ہے اور غیر مقدس حقائق کے معرض ظہور میں آنے کو خلق اور ایجاد سے تعبیر کرتے ہیں ان کو حادث کہتے ہیں، کیونکہ ان کا ظہور ارادۂ قاہرہ کے ماتحت ہوا ہے، اسماء پاک کے احکام ان میں مخلوط طور پر پائے جاتے ہیں، اور انطباق کلی ان کے حق میں

ناممکن ہے۔ اگر نفس ادراک میں کوئی اختلاف نہ ہو صرف اس مفہوم میں اختلاف پایا جائے جس کا ادراک کیا گیا ہے تو ایسی صورت میں براہین صحیحہ استعمال کرنے پر اقوال میں تطبیق کی جاسکتی ہے۔ لیکن اگر نفس ادراک میں اختلاف ہو تو پھر تطبیق بہت مشکل ہے۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو مطلع کردے۔ سبحانک اللّٰھمّ و بحمدک. لا احصی ثناء علیک، انت کما اثنیت علی نفسک.

............☆☆☆............

دوسرا خزانہ

حکمت کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس کی معرفت اسی کی ذات اقدس کے ذریعہ حاصل کر کے اس کے اسماء پاک، ان کی خصوصیات اور ان کے احکام کی معرفت حاصل کی جائے (حکمت سے مراد متعارف فلسفۂ الٰہیات نہیں، حکمت ربانیہ مراد ہے) اس کے بعد اس عالم کون وفساد کی نشو ونما اور ارتقاء کی حقیقت کا علم حاصل کیا جائے اور یہ کہ اسماء پاک نے کن خاص خاص حیثیتوں سے اس میں ظہور کیا ہے اور تجلی افگن ہوئے ہیں۔ سب سے آخر میں ''اسماء عودیہ'' اور ان کے احکام اور ایصال الی اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرنے کا درجہ ہے۔ جس کسی کو اس سلسلہ دوریہ کا علم ذوق اور وجدان کے طریقہ پر عطا کیا گیا یقیناً اس کو خیر کثیر نصیب ہوا (اس آیت کی طرف اشارہ ہے وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا)۔ اللہ تعالیٰ کے حسن توفیق سے ہم اس کی تفصیل لکھتے ہیں:۔ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ اقدس اس سے بہت بالاتر ہے کہ کوئی اپنے ادراک سے اس پر احاطہ کر سکے (يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِهٖ عِلْمًا)۔ اس تک پہنچنے کا واحد ذریعہ تجلی ذاتی ہے جس سے قطعاً ادراک حاصل نہیں ہوتا، وہ تو سراسر حیرت در حیرت ہے۔

دور بینان بارگاہ اَلَسْت
غیر ازیں پی نہ بردہ اند کہ ہست
(سعدیؒ)

دوسرا طریقہ وصول الی اللہ تعالیٰ کا یہ ہے کہ اس کو کسی تعین سے موصوف کیا جائے لیکن اس کی ذات اقدس کو تعینات سے کیا واسطہ؟ وہاں تو محض اطلاق اور وحدتِ صرف کا دور دورہ ہے۔ یاد

رکھو اطلاق کا لفظ استعمال کرنے سے ہمارا یہ مقصد نہیں کہ وہ کلی ہے۔ اس کا تو ہم پہلے ابطال کر چکے ہیں۔ اطلاق کا لفظ ہم فقط اس لئے استعمال کرتے ہیں کہ تمام حیثیات اور اعتبارات اس کی ذات اقدس میں شامل ہو کر مٹ جاتے ہیں۔ (شامل کا لفظ بھی تنگی عبارت کی وجہ سے استعمال کیا گیا ہے۔) یہ شمول اور اندراج اس قسم کا ہے کہ اس میں ایک لفظ یا حرف تک کی گنجائش نہیں، وہ فعلیت کے افق پر ایک سرے سے دوسرے سرے تک چھا جاتا ہے اور اقلیم تحقق کو ہر طرف سے گھیر لیتا ہے۔ (تمام عالم پر اس کا اثر محیط ہوتا ہے) اسی طرح وحدت سے مراد وہ مفہوم نہیں جس کے مقابلہ میں کثرت کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے، کیوں کہ کثرت کا مفہوم مابعد کی تجلیات کی پیدا کردہ بدعت ہے۔ یہ ایک ضابطہ کلیّہ (ہمہ گیر اصول) ہے۔ جس کے ماننے پر جملہ حکماء کا اتفاق ہے، کہ اضداد کے درمیان جو تضاد پایا جاتا ہے وہ ان دونوں کی خصوصیات کا نتیجہ ہوتا ہے، اس کو ہم رحمان جل وعلا کی ذات اقدس کی طرف منسوب نہیں کر سکتے۔ ہم سب متفق الکلمہ ہو کر اس بات کے قائل ہیں کہ جو ذات اقدس وحدت اور کثرت دونوں کے مفہوم سے بالاتر ہے وہی واحد حق کہلانے کی مستحق ہے اور ہر ایک واحد کی اصل وہی ہے۔ (دیگر تمام وحدتیں اس کی فروع ہیں) اس کی ذات پاک ہر دو اضداد سے منزّہ اور مبرّا ہے۔ دونوں کے مفہوم اور حقیقت میں جو اختلاف اور تضاد نظر آتا ہے وہ ان کی خصوصیات کا نتیجہ ہے۔ (جیسے کہ ابھی مذکور ہوا) ذات اقدس کی نسبت دونوں کے ساتھ یکساں ہے (وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ۔ اچھی طرح سمجھ لو)۔

اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس حقائق امکانیہ سے بہت بلند ہے، یہ حقائق سراسر عالم ارادہ کا ظہور، اور سب کائنات اسی کے ماتحت مسخر اور مقہور ہیں ان ممکنات کو الوہیت محض کے مرتبہ سے بہت دور سمجھیں اور سادہ طور پر اس کی نفی کریں۔ یہ خیال کرنا غلط ہے کہ وہ ایسے حقائق یا موجودات ہیں جن کا اس مرتبۂ منزہہ سے نفی کرنا لازم ہے۔ اس قسم کا ادراک فقط عقل انسانی کی کارستانی ہے۔ البتہ ان ممکنات میں سے ہر ایک کی اصل جس کے ساتھ اس ممکن کو سایہ کی نسبت ہے اور گویا اس کا مقتدی ہے۔ اس کے متعلق اگر امعان کے ساتھ غور کیا جائے اور نظر دور رس کو عالم ارادہ سے آگے پار ہونے دیا جائے تو معلوم ہوگا کہ باری تعالیٰ کی ذات اقدس مرتبہ اتصاف میں اس کے ساتھ موصوف ہے۔ اسی مرتبہ کے بالمقابل (اس کی حقیقت کا اظہار کرنے کے لئے) یہ جامع

الفاظ ہیں۔ **اللّٰہ لا الہ الاھو** ۔اللہ تعالیٰ کا اسم مقدس اس مرتبہ کے لئے اس لحاظ سے وضع کیا گیا ہے کہ اس کی لا تناہی کا اظہار کرے۔اعتبارات اور حیثیات عنوان ہی میں ہوتے ہیں، معنون سے ان کا کیا واسطہ؟ **لا اِلہ الاھو** کو اس مرتبہ کے لئے وضع کیا گیا تا کہ یہ ظاہر ہو کہ اس کو من حیث ھی ھی لیا گیا ہے یعنی کسی حیثیت خاص سے قطع نظر کر کے اس مفہوم کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ ذات اقدس کی معرفت سب سے زائد اس شخص کو حاصل ہوتی ہے جو غایت درجہ کا مقرب ہو، قلب سلیم رکھتا ہو، اس کی صورت مٹ چکی ہو، اور اس کو اس اسم مطلق کی تائید حاصل ہو، جس کا منشا اس کا سینۂ مبارک ہے۔ یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جو خاتم النبیین اور امام المرسلین ہیں۔ دیگر انبیاء کرام کو استعداد کے مطابق یہ دولت نصیب ہوتی ہے، اور اولیاء اللہ اپنی صورت مزاجیہ کے مطابق اس سے بہرہ ور ہوتے ہیں، لیکن اطلاق اور عدم تقید کے دریا میں غوطہ زن ہو کر متحیّر اور انگشت بدنداں رہ جانا ان کی قسمت میں نہیں لکھا ہے۔ برخلاف ان کے حکماء کا علم، قرب وجود کے میدان تک محدود ہوتا ہے۔(غالباً ان سے مراد حکماء ربانیین ہیں)۔

دوسرا مرتبہ **الحی القیوم ، الحق النور** کا ہے۔سب سے پہلی اور سب سے بڑی گرامی ترین تجلّی کا مظہر یہی اسماء پاک ہیں۔ سب تجلیات میں یہ سادہ ترین تجلّی ہے، مرتبۂ ذاتیہ کا یہ وہ لازم ہے جو یکسر ملزوم پر منطبق ہوتا ہے اور اس کی کامل شرح اور تفصیل ہے۔ بہت سے لوگوں نے غلطی کھا کر اس تجلّی کو عین ذات سمجھا، لیکن حقیقت میں بیش ازیں نیست کہ یہ اس کی شرح اور تفصیل ہے، کیوں کہ اس تقرر اور تحقق کا عنوان ہے جو ماہیت کا اول ترین تمثّل ہے اور ہر ایک قسم کی خیر و برکت اسی سے صادر ہوتی اور اس کا اقتدار کرتی ہے۔ تیسرا مرتبہ **المجید العظیم، العلی الکبیر ، الجلیل** کا ہے عالم تقرر کی مختلف حیثیات میں سے ایک ہی حیثیت کی شرح اور تفصیل ہے اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ نفسِ تحقق میں کبریاء کی خصوصیت پیدا ہوگئی۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے ایک حدیث قدسی میں اپنی چادر بتایا ہے۔ چوتھا مرتبہ **الغنی الواسع ، القوی ذوالطول المتبارک** کا ہے۔ یہ کبریاء کی ایک خاص حیثیت کی شرح اور تفصیل ہے۔ پانچواں مرتبہ **الرحمن الرحیم، البر القادر** کا ہے، اس میں فیض اضافی کی حیثیت سے صفت اغناء کو متمثّل کر کے دکھایا گیا ہے۔ چھٹا مرتبہ **المرید** کا ہے، جس کی جزئیات (اور تفصیلات) ذیل کے

اسماءپاک ہیں۔ الباری. الرازق. المصوّر الهادی، الغفار، القابض، الباسط، الخافض الرافع، المبدئ المعید، المحی الممیت.

خلاصہ یہ کہ ہرایک نوع کی ایک مقدس حیثیت ہوتی ہے۔ جس پر ان اسماء حسنی میں کوئی اسم پاک بلحاظ افاضۂ اضافیہ کے مشتمل ہوتا ہے، اور یہ سب کے سب ایک ایسے اسم پاک کی جزئیات ہیں جو ان سب اضافات کا جامع ہے یعنی المرید۔ ان ہی اسماء پر سلسلۂ بدئیہ ختم ہو جاتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ العلی العظیم مثلاً جمیع اطوار کے لحاظ سے الحی القیوم کی شرح اور تفصیل ہے بلکہ میرا کہنا یہ ہے کہ یہ اس کی ایک خاص حیثیت کی شرح اور تفصیل ہے لیکن عقل دور بین کی آنکھ اس کی حقیقت دیکھنے سے قاصر ہے اور اس کے تحقق کو کماحقہ نہیں سمجھ سکتی۔ تمام اسماء حسنی کے احکام کو ان کے طبقات کے موافق اسی پر قیاس کرو۔ تمہیں علم میں ثابت قدم رہ کر یہ سمجھنا چاہئے کہ ہر ایک اسم پاک میں اس کے مقدم کی نسبت بلحاظ اس کی شرح اور تفصیل کے ایک خصوصیت ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ تقرر اور تحقق جس کو (کلام مجید میں) حیات سے تعبیر کیا گیا ہے، جس کے معنی حضور ذاتی کے ہیں اور جو صوفیہ کی اصطلاح میں علم حضوری کہلاتا ہے اور حکماء اس کو اپنی زبان میں تقوّم اور تحقق کہتے ہیں اور کبھی نوریت سے تعبیر کرتے ہیں، جس کا مفہوم ہے ہیئت انکشافیہ ذاتیہ الغرض یہ صفت حیات مرتبۂ ذاتیہ کا تعیّن اور تمثل ہے اور اس کی شرح اور تفصیل ہے، دونوں ایک دوسرے پر یکسر منطبق ہیں اور دونوں میں سوائے اس کے اور کوئی امتیازی بات نہیں کہ مرتبہ ذاتیہ میں سخت اجمال ہے اور تمام حیثیات اور ملحوظات یہاں پر سراسر مٹ جاتے ہیں۔ وہ صفت جس کا عنوان عظمت اور علو و کبریاء ہے اسم پاک الحیُّ کی ایک ہی حیثیت کا تمثل ہے۔ اس کا اطلاق ایک خاص حیثیت کے ساتھ مقید ہو کر عظمت اور علو و کبریاء کی شکل میں متمثل اور نمودار ہوا ہے۔ اسی طرح وہ خصوصیات جن کو غنےٰ، سعۃ، رحمت، برکت اور عطاء سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اسم پاک عظیم کی ایک جہت خاص یعنی حیثیت خاص کی شرح اور تفصیل ہے۔ اس کا مفہوم اطلاق اور اجمال کی حالت میں سب کو شامل ہے۔ غنیٰ اور برکت اگرچہ ہر ایک قسم کے فیض کا منبع اور اس کے مختلف انواع کی جامع ہے۔ لیکن اس کا منبع ہونا اس شمول کے اندر مٹ کر رہ جاتا ہے۔ رحمت اور قدرت اس کے اسم پاک المتبارک (جس کا اشارہ تبارک الذی بیده الملک اور اسی قسم کی دوسری

آیات میں پایا جاتا ہے) کی ایک حیثیت خاص کی شرح اور تفصیل ہے۔اس اسم پاک میں تمام کمالاتِ افاضیہ کی استعداد بطور ملکہ پائی جاتی ہے لیکن افاضہ بالفعل نہیں۔

یادرکھو رحمت اور قدرت دراصل ایک ہی چیز ہے۔ ہر ایک چیز پر قادر ہونا اس کی رحمت کا نتیجہ ہے۔قرآن پاک میں ہے وَرَحْمَتِيْ وُسِعَتْ كُلَّ شَئٍْ میری رحمت نے ہر ایک چیز کو گھیر رکھا ہے"۔اس کے بعد اس کے تمثل اور تعین کو ملحوظ رکھتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ... اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَ الْاُمِيِّ. اس تمثل کو رحمت کا مظہر سمجھا جاتا ہے اور اس کو چھوڑ کر باقی تمام صورتوں میں قدرت کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر رحمت اور قدرت میں جو فرق ہے وہ فقط عنوان اور تمثل میں ہے، حیز اطلاق میں اور اس عنوان کے مُعَنْوَنْ میں کچھ بھی فرق نہیں پایا جاتا۔ پھر جب رحمت میں اضافہ بالفعل کی صورت نمودار ہوئی تو صفت ارادہ کو کارفرمائی کا موقع ملا۔یہ ایک ہیئت وحدانیہ ہے جو لاتناہی اور اطلاق کا "ختام مسکی" (مہر مشکین) ہے۔کسی بلند ارادہ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اوّلاً بالذات کسی دوسری طرف نظر اٹھا کر دیکھے، مناسب اس کے لئے یہ کہ مقصد اولین کے طور پر سب باتوں کا مرجع اسی صفت رحمت و ارادہ کو قرار دے، جس کے اندر تمام اسماء حسنی کی تجلیات پرتو افگن ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اسماء پاک کے مفہوم میں اطلاق اور لاتناہی بدرجۂ غایت پائی جاتی ہے، اس لئے ان کی مثال صیقل کردہ آئینہ کی ہوتی ہے جس میں ان کے ظاہر اور غیر ظاہر استعدادات جلوہ گر ہوتے ہیں۔تمام اسماء پاک کے لئے یہ نظریہ مسلمہ حقیقت ہے، لیکن لوگوں کی معرفت صرف انہیں صورتوں تک محدود رہتی ہے جو ارادہ کے ضمن میں منعکس ہوتی ہیں۔ اگر اطلاق کا مفہوم اور اس کی حقیقت اچھی طرح تمہارے ذہن نشین ہو چکی ہے تو اس مسئلہ کا سمجھنا تمہارے لئے نہایت آسان ہوگا۔کیا تم نے کبھی اس پر غور نہیں کیا کہ نفس الامر یعنی واقع میں کاتب کے مفہوم کے اندر وہ تمام صورتیں عکس انداز ہوتی ہیں جن کے ساتھ اس کو تصادق کی نسبت ہے (یعنی ایک کا مفہوم دوسرے پر صادق آتا ہے) چنانچہ ناطق، حیوان، جسم، جوہر، متعجب، ضاحک، ماشي على القدمين وغیرہ وغیرہ سب پر کاتب کا یکساں طور پر اطلاق ہوتا ہے۔ حالانکہ ان میں سے ہر ایک کا مفہوم ایک مستقل حقیقت ہے اور کاتب کا مفہوم کے ساتھ اس کو جو اتحاد حاصل ہے وہ اتحاد ذاتی نہیں بلکہ عرضی ہے اسی لئے

انواع بلکہ افراد کے صدور اور ظہور کا باعث مختلف حیثیتیں قرار پائیں۔ ان ہی جہات مختلفہ اور حیثیات متنوعہ کو اہل تصوف ''اعیان ثابتہ'' کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ ہر ایک مختلف حیثیت یا جہت کے بالمقابل ایک اسم جزئی ہوتا ہے۔ یہ صفات فعلیہ کہلاتی ہیں، جس طرح کہ متقدم الذکر صفات کو اطلاق کے باعث صفات ذاتیہ کہا جاتا ہے۔ اور ان کا مفہوم یکسر ذات اقدس پر منطبق ہوتا ہے۔ تکوین کی اصل اور حکمت کی جڑ یہی ہے۔ پھر یہ بھی جان لو کہ اللہ تعالیٰ اس عالم پر ہر طرح سے محیط ہے، خواہ اس کے معرض وجود میں آنے کی حیثیت ملحوظ رکھی جائے یا جس نظام پر وہ چل رہا ہے اس کے تصرفات کو پیش نظر رکھا جائے۔ یہ سب کچھ حقائق مقدسہ ازلیہ ابدیہ کامل الاطلاق کا نتیجہ ہے جو ''اِنّیات عودیہ'' کہلاتی ہیں۔

پہلے طبقہ کے اسماء پاک یہ ہیں۔ العلیم، السمیع، الخبیر، البصیر الشھید. ان کی حقیقت یہ ہے کہ تمام عالم کون وفساد اپنے احکام وآثار کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے علم میں حاضر ہے اور وہ اس پر محیط ہے لیکن یہ احاطہ پہلے احاطہ سے مختلف ہے۔ علاوہ ازیں کس قدر تحلیل کے بعد یہ احاطہ غیر اللہ قرار پاتا ہے اور شفاف وبرّاق دکھائی دیتا ہے۔ جس کے آر پار نظر نفوذ کرتی ہے۔ دوسرا طبقہ ان اسماء پاک کا ہے الملک. الدائم. المتعالی. الصبور. الشکور. الحلیم. الرشید. الحمید. الباقی. الواحد. الوارث. ان کی حقیقت طبقۂ اولیٰ کے اسماء حسنیٰ کا تمثل ہے جس میں اطلاق اور تعرّی کا پہلو ملحوظ ہے، اس کہنے سے میرا مقصد یہ نہیں کہ وہ اپنے پہلے اطلاق اور عدم تقیّد کی حالت پر باقی ہوں، کیوں کہ یہ تو بعینہ اللہ تعالیٰ کے ''اسماء بدئیہ'' ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر ایک تخلیط کے بالمقابل تقدیس ظہور میں آئی۔ تیسرا طبقہ ان اسماء حسنیٰ کا ہے القدوس. السلام. الصمد. السبوح۔ ان کی حقیقت کامل تقدس ہے اور انکی قوتِ ایصال بہت گہری ہے، ان کے بعد ذات اقدس جلّ شانہ کا رتبہ ہے۔ تجلّی ذاتی کی تحلیل کی جائے تو انہیں اسماء مقدسہ پر منتہی ہوگی، اس بات کو ہم نے پہلے بھی اشارۃً ذکر کیا ہے۔ اس میں ''عود'' کا پہلو ملحوظ ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے جو اسماء پاک پہلے مذکور ہوئے وہ بلحاظ عود کے نہیں بلکہ ''بدر'' کی حیثیت سے تجلّی مذکور کی تحلیل کا منتہیٰ قرار پاتے رہیں۔

پہلے طبقہ کے اسماء پاک تمام عالم کی مختلف صورتوں اور اس کی اشکال متنوعہ کی جامع ہیں۔

اس جامعیت کا ظہور دو مرتبہ ہوتا ہے ایک تو اس وقت جب کہ اضافۂ اضافیہ کی تفصیل وقوع میں آتی ہے۔ اس کی تشریح آگے آتی اور اس کا لقب کلام ہے۔ دوسرے اس وقت جبکہ وہ نظام انعکاس کے طور پر پرتو افگن ہوتا ہے جس کی ترتیب اس اسم پاک کے اندر ہے اور جس کا حامل لوح محفوظ تھا۔ یہاں پر یہی قسم مراد ہے اور ہم اس کو علم انفعالی کہتے ہیں۔ اسم پاک قدوس کے تمثل کی حقیقت یہ ہے کہ جو تمثلات الحی القیوم کے ضمن میں منطوی تھے۔ ان سب سے اس کی تجرید کی گئی ہے۔ الملک الدائم کا مفہوم اور حقیقت مراتب مختلفہ کے تنزلات کے مطابق القدوس کی شرح اور تفصیل ہے۔

حکمت کی ابتداء اس سے ہوتی ہے کہ انسان اس کی ذات اقدس جل وعلا کی معرفت میں حیران ہو کر رہ جائے اور اسماء بدئیہ کی معرفت اس کو حاصل ہو۔ بالآخر انتہا اس پر ہوتی ہے کہ اسماء عودیہ کی طرف منکسرانہ طور پر رجوع کیا جائے جس کے وہ مستحق ہیں۔ کیونکہ اس عالم کا عنقریب خاتمہ ہونے والا ہے۔ اسی بناء پر رسول خدا صلعم کبھی تو بدء کو ملحوظ رکھ کر **اللہ لا الٰہ الا ھو الحی القیوم** کو اسم اعظم بتاتے اور کبھی حالت عودیہ کو پیش نظر رکھ کر **الاحد الصمد الذی لم یلد ولم یولد ولم یکن لہ کفوا احد** کو اسم اعظم قرار دیتے۔ آن حضرت صلعم کی اکثر ادعیہ ماثورہ میں **اسماء عودیہ** کی طرف عاجزانہ اور منکسرانہ رجوع پایا جاتا ہے۔ آپ کی تسبیح وتقدیس میں یہی اسماء پاک ملحوظ رہتے تھے۔

اسماء حسنیٰ میں سے بعض اسم ایسے ہیں جن کو حادث کہا جاتا ہے جو نظام حوادث کا موجب ہیں۔ اس قول کی حقیقت جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو خاص طور پر سمجھائی ہے یہ ہے کہ قرب کے اقسام میں سے ایک قسم "قرب فرائض" ہے۔ اس کی کنہ اور حقیقت یہ ہے کہ اس کے بندوں کو جب قرب وجود حاصل ہوتا ہے تو باری تعالیٰ اعیان عباد میں تجلی فرماتا ہے، اس تجلی سے ایک طرح کا تحقق ظہور میں آتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات مقدس تمام اشیاء کے تحقق کی اصل اور منبع ہے۔ اس تحقق کو ظہور میں لانے کا انحصار عالم غیب میں عین پر ہوتا ہے (اعیان ثابتہ پر ہوتا ہے) اور عالم شہادت میں اس کا مدار نفس ناطقہ پر ہے۔ جس طرح کہ روح انسانی کے تحقق کا دارومدار اخلاط جسم پر ہوتا ہے۔ (**ان اللہ خلق ادم علی صورتہ** کی حدیث کو پیش نظر رکھو تو اس تمثیل کے سمجھنے میں آسانی ہوگی) اس اسم پاک کے تعلق اور تحقق کی مثال بعینہ یہی نفس انسانی (بالفاظ دیگر روح

انسانی) کے بدن کے ساتھ تعلق رکھنے کی ہے۔ ظاہر ہے کہ نفس یا روح بسیط اور مجرد عن المادہ ہے۔ لیکن اس کا تجرد اور اس کی یہ بساطت اس امر سے مانع نہیں کہ وہ جسم سے تعلق پیدا کرے۔ اسی طرح یہ اسم پاک باوجودیکہ وہ امر الٰہی ہے اور اس کا اولین تعلق عالم غیب سے ہے لیکن اعیان ثابتہ اور نفس ناطقہ کے ساتھ تعلق پیدا کرنے سے وہ مانع نہیں اور اس سے اس کے تالّہ (اللہ تعالیٰ کے ساتھ منسوب ہونے) اور تقدس میں فرق آتا۔ قرآن مجید میں ہے۔ يُلْقِي الرُّوحَ مِنْ أَمْرِهِ عَلَىٰ مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ لِيُنْذِرَ يَوْمَ التَّلَاقِ. اس آیت کے معنی بطن رابع کے مطابق یہی اسم پاک ہے۔ جس کی تحقیق ابھی میں نے تم کو بتائی (ایک حدیث میں ہے کہ ہر ایک آیت کے ایک ظاہری معنی ہیں، ایک باطنی۔ پھر باطن کے بھی کئی اقسام ہیں۔)

ملائکہ کی ایک جماعت ایسی ہے جن کو قرب وجود کا درجہ حاصل ہوا۔ اور ان کے اعیان میں کمال آ گیا تو انہوں نے قرب فرائض حاصل کرنے کی کوشش کی۔ جس کے حصول پر اللہ تعالیٰ نے ان پر تجلی فرمائی اور اس کی الوہیت متحقق ہوئی۔ یہ تحقق تکوین اور اثر انداز ہونے کا مقتضی ہوا۔ جس کے سامنے ان کے نفوس مجردہ اور ان کی جسم پذیر روحیں اطاعت کے طور پر جھک گئیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس تحقق کے ذریعہ ان کے نفوس اور ان کی روحوں کی تخلیق فرمائی، انہیں ملائکہ میں سے ایک میکائیل علیہ السلام ہیں جن کو ہر ایک قسم کی تکوین اور ایصال ارزاق کا کام سپرد کیا گیا ہے۔ کئی ایک دوسرے ملائکہ اس کے منقاد اور مطیع ہیں، رحم میں جنین کی تصور اعضاء اور پودوں اور درختوں کے اگانے اور نشو ونما دینے کے اعمال اور ہمچو دیگر اعمال ان کے حوالے ہیں۔ عزرائیل علیہ السلام کو قبض ارواح کا فرض انجام دینے پر مقرر کیا گیا ہے، اور اسرافیل علیہ السلام کے اعمال ان دونوں سے عام تر ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے، گویا ان دونوں کا کام اس کے کام کی شرح اور تفصیل ہے۔ ایجاد بطریق عموم اور افناء واعدام بطریق عموم اسی کا کام ہے۔ نفخۂ اولیٰ جو اعدام کے لئے ہے اور نفخۂ ثانیہ جو احیاء کے لئے ہے اسی بناء پر اسی سے منسوب ہیں۔ جبرئیل علیہ السلام کو تربیت کمالیہ یا بالفاظ دیگر اضافۂ کمالات کا کام سپرد کیا گیا ہے۔ اس کے لشکر میں بہت ملائکہ شامل ہیں۔ جو ملائکہ بنی آدم کے دلوں میں القاء خیر کرنے میں مشغول ہیں وہ اسی کے اعوان وانصار میں سے ہیں۔ اور تمام رسل وانبیاء کرام علیہم السلام اسی کی تربیت کمالیہ سے فیض یاب ہوئے ہیں۔ ہر ایک رسول کے لئے

ایک اسم پاک مخصوص ہوتا ہے جو اس کے قلب مطہر پر تجلّی انداز ہوتا ہے، اسی پر اس کا کمال متفرع ہوتا ہے اور یہی اسم پاک اس کا مرجع اور مآل ہوتا ہے۔ اس اسم پاک کے دامن عاطفت میں جس کی بعض تفصیلات عنقریب تم سے بیان کروں گا۔ تمام انبیاء پناہ گزین ہوتے ہیں، جس کا باعث اس اسم پاک کا عموم اور اطلاق ہے۔ یہ بات تو تمہیں یاد ہوگی کہ ہماری مراد اسماء پاک کا مفہوم انتزاعی کبھی نہیں ہوتا، ہمارے پیش نظر حقائق مقدسہ اور تجلیات ازلیہ ہوتی ہیں۔ نیز یاد رکھو کہ ان ہی جہات اور حیثیات میں جن کا ہم نے ذکر کیا ہے۔ بعض کا مفہوم انتزاعی ہے جس سے کہ ہم نے ان امور غیبیہ کو تعبیر کیا ہے جو تجلیات کی اصل ہیں۔ جب ہم اسماء پاک کے متعلق گفتگو کرنے لگتے ہیں تو ہر ایک مفہوم انتزاعی کو پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ لیکن اس کا کیا علاج ہے کہ ٹھیک حقیقت کو ظاہر کرنے سے الفاظ متعارفہ کی تنگ دامانی مانع ہوتی ہے، اسلئے ہمیں مجبوراً مفہومات انتزاعیہ کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ بعض صفات مقدسہ کا علیحدہ ذکر کریں۔ مثلاً علم جس کے متعلق کثرت سے آیات قرآنیہ وارد ہوئی ہیں، یا ارادہ جس کی صحیح معرفت انبیاء علیہم السلام اور اساطین حکماء کو حاصل ہوتی ہے۔ یا مثلاً کلام جو وحی اور شریعت کی بنیاد ہے۔ ہم اس ضمن میں مسئلہ وحدت وجود پر بھی بحث کریں گے، کیوں کہ (اہل تصوف اور فلاسفہ کے ہاں) یہ ایک معرکۃ الآراء بحث ہے۔ لفظ مشترک کے طور پر علم کا اطلاق دو مختلف معانی پر ہوتا ہے۔

(الف) تجلی الٰہی جل شانہٗ جس کا تعلق سلسلۂ بدئیہ سے ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ تمام فعلیتیں باری تعالیٰ کی فعلیّت میں مندرج ہیں اور چونکہ اس کو اپنی ذات اقدس کا علم حضوری حاصل ہے اس لئے یہ ضروری ہے کہ سب اشیاء کا علم حضوری اس کو حاصل ہو ان کے تمام امتیازات اور خصوصیات اور احکام و آثار ہر وقت اس کے علم میں حاضر رہتے ہیں۔ اس کا علم ایک حضور مقدس ہے جس کا تعلق اس کی ذات اقدس اور دیگر اشیاء کے ساتھ نفس علم کے لحاظ سے یکساں ہے، اس پر اچھی طرح غور کرنا ہوگا، کیوں کہ یہ ایک دقیق مسئلہ ہے۔ اور جس کو صحیح طور پر حکیمانہ ذوق سلیم حاصل نہ ہو، اس کی تہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ ہم اس کا اشارہ پہلے کر چکے ہیں۔

(ب) علم کے دوسرے معنی احاطۂ عودیہ کے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ سب اشیاء اللہ تعالیٰ کے علم میں حاضر ہیں لیکن وہ عنقریب زوال پذیر ہونے والی ہیں۔ اس کا تعلق سلسلۂ عودیہ

سے ہے جس کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر ایک حیثیت سے ہر ایک فعلیت پر محیط ہے۔ قطع نظر اس سے کہ وہ حیثیت مفروضہ کیا ہے۔ کسی فعلیت کا ظہور میں آنا اور زوال پذیر ہونا اس بارے میں یکساں ہے۔ رسول خدا صلعم نے مسئلہ تقدیر کا عقدہ حل کرتے ہوئے یہ الفاظ فرمائے تھے۔ **جف القلم بما هو كائن** ''جو کچھ ہونے والا ہے قلم اس کو لکھ کر خشک ہو چکا ہے۔ آدم علیہ السلام کا عالم روحانی میں موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مباحثہ ہوا تو اول الذکر نے اپنی تائید میں اپنی حمایت کرتے ہوئے یہی دلیل پیش کی کہ اللہ تعالیٰ کو اس کے گناہ کرنے کا علم تھا۔ بالفاظ دیگر ہمارے رسول صلعم اور آدم علیہ السلام دونوں نے سب کا مبدء باری تعالیٰ کو قرار دیا اور اثبات کے طور پر ماضی کا صیغہ استعمال کیا۔ جس کا ملخص یہ ہوا کہ باری تعالیٰ کے لئے المبدیٔ کا اسم پاک شایان ہے۔ قرآن پاک میں ہے فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكَاذِبِيْنَ. اللہ تعالیٰ جھوٹوں اور سچوں کو ضرور جان لے گا۔'' اس آیت میں فاء تعقیب (یعنی وہ ف جس کا مفہوم ماقبل کا نتیجہ بیان کرنا ہوتا ہے۔) کے بعد مستقبل کا صیغہ استعمال فرمایا ہے اور ذات اقدس جل وعلا کو علت غائیہ قرار دیا ہے اسی کو ہم عودی (سلسلۂ عودیہ کہیں گے۔ سورۂ لقمان میں حضرت لقمانؑ کی حکمت کا کمال ظاہر کرنے کے لئے جو اقتباسات دیئے ہیں۔ ان میں یہ الفاظ بھی ہیں یَا بُنَیَّ اِنَّهَا اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ الخ۔ خلاصہ یہ کہ قرآن مجید میں جہاں بھی علم کا ذکر آیا ہے۔ اس کا پیرایہ ''عودی'' ہے۔ یہ ضرورت وحی کے اقتضاء سے پیدا ہوئی ہے، ورنہ اس کا ظہور ذات اقدس سے ہوا ہے، بعد میں تم اس کو سمجھ لو گے۔ باقی رہا یہ کہ علم انفعالی میں تاخیر کیوں ہوتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تأخر طبعی ہے جو اس کی ازلیت کے منافی نہیں (یعنی یہ تأخر زمانی نہیں جس سے ازلیت کے متعلق شک پیدا ہو)۔

صفت ارادہ کا ظہور اس سے ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اس نظام میں جو افاضہ کی حیثیت سے معرض ظہور میں آیا۔ سررشتۂ وحدت کو قائم رکھنا چاہا۔ یہ اس لئے کہ ہر ایک حالت سابقہ حالت لاحقہ یعنی مابعد کی حالت کے ظہور میں آنے کی مقتضی ہوتی ہے اور حالت سابقہ اس کے اندر مدغم ہو کر رہ جاتی ہے۔ وعلیٰ ہذا القیاس، یہاں تک کہ یہ سلسلہ ارادہ ہی منتہی ہوتا ہے جس کا مفہوم اضافہ بالفعل ہے، اور اسی مقام پر تمام نظام میں وحدت پیدا ہوتی ہے۔ اس ارادہ کے نفاذ کے سلسلہ میں

جو اشیاء ظہور میں آتی ہیں وہ قید امکان سے مقید اور ارادۂ قاہرہ کی معلول ہوتی ہیں۔ بس اتنی بات ہے۔ یہ نہیں کہ ان کا تدنّس ان کے حق میں اس بات سے مانع ہو کہ ان کو اللہ تعالٰی سے منسوب کیا جائے۔ بے شک ارادہ کا اصل بات سے مانع ہو کہ ان کو اللہ تعالٰی سے منسوب کیا جائے۔ بے شک ارادہ کا اصل جوہر اس بات کا مقتضی ہے کہ اطلاق کا سلسلہ اس پر ختم ہو جائے لیکن اس سے اس کے تقدس میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا بلکہ اس کا عموم اور نفوذ ویسا ہی رہتا ہے جس طرح دوسری صفات الٰہیہ اطلاقیہ کا عموم اور نفوذ تعیّن پذیر کائنات میں پہنچ کر قائم رہتا ہے کیا تم نے کبھی اس امر واقع پر غور نہیں کیا کہ انسان کے ذہن میں پہلے کسی پری جمال کے چہرۂ زیبا اور حسن صورت کا تصور قائم ہوتا ہے اس کے بعد جذبۂ شوق میں لازمی طور پر ہیجان پیدا ہوتا ہے، اور ان دو مرحلوں کے بعد ارادہ میں حرکت ظاہر ہوتی ہے جس کا مفہوم افاضہ بالفعل کے مرادف ہے۔ حرکات قولیہ اور فعلیہ کا منبع یہی ارادہ ہے۔ اس لئے یاد رکھو کہ اس صفت ازلیہ افاضیہ کو، جو ان اسماء پاک کا فیض ہے جو اس سے متقدم ہیں، یہ حق حاصل ہے کہ اس کو تمثلات کلامیہ میں ارادہ سے موسوم کیا جائے، اور اولا و بالذات ان تمثلات کو اسی کی طرف منسوب کیا جائے۔ البتہ ثانیاً و بالعرض ان کی نسبت اسماء متقدسہ کی طرف کی جا سکتی ہے۔ یہ نسبت اس نسبت کے موافق ہوگی جو اس مجعول کو صور معلومہ کے ساتھ ہے، جس کی مثال ہم بیان کر چکے ہیں۔ اسی طرح چونکہ علم انفعالی کا مفہوم یہ ہے کہ کسی چیز کی صورت انطباعیہ اس طرح حاضر ہو کر وہ حضور اس پر محیط ہو جس طرح کوئی چیز دوسری کو گھیرے ہوئے ہوتی ہے۔ اس لئے یہ مناسب ہے کہ اسماء عودیہ کے پہلے طبقہ کو تمثلاتِ کلامیہ میں اسی نام سے موسوم کیا جائے۔ یہ ایک لطیف راز ہے، اس کو اپنے پاس محفوظ رکھو۔ مابعد کے مباحث میں تم کو اس سے بڑا فائدہ پہنچے گا۔

پھر یہ بھی یاد رکھو کہ انبیاء علیہم السلام چونکہ عقل کی بدعتوں سے محفوظ ہیں (ان کے علوم کا مأخذ وحی الٰہی ہوتی ہے جس کے متعلق ارشاد ہے کہ **وانہ لکتب عزیز لایأتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ. تنزیل من حکیم حمید**) اور اللہ تعالٰی کی توحید اسماء وصفات ان کے سامنے جلوہ گر ہوتی ہے۔ اس لئے سلسلۂ بدئیہ میں ان کا منتہائے نظر ارادہ ہی رہتا ہے اور سلسلۂ عودیہ میں ان کی نظر طبقات ثلاثہ سے ادھر نہیں پڑتی۔ ان کے فطری کمال کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ

علت فاعلیہ اور علت قابلہ کی تفاصیل کو ملحوظ نہیں رکھتے۔ کیوں کہ علت فاعلیہ کو ملحوظ رکھنا توحید کے منافی ہے اور علت قابلہ کو وہ اس لئے نظر انداز کر دیتے ہیں کہ وہ بھی ایک حکیم دانشور کی نظر میں درحقیقت علت فاعلیہ سے وابستہ ہے۔ ارادہ کی ایک قسم وہ ہے جس کا ارادہ مجددہ کہتے ہیں۔ حوادث یومیہ اسی سے منسوب ہوتے ہیں۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ وہ ملائکہ مقربین جن کو تدبیر کائنات سپرد کی گئی ہے ان کا سینہ میں اسماء حادثات بالفعل کا افاضہ ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امام ابوالحسن اشعری جب اعتراضات سے تنگ آ گئے تو انہوں نے صفت ارادہ کی دامن میں پناہ لیکر اپنے خصوم سے پیچھا چھوڑایا اور اس آیت سے استدلال کیا کہ **لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَ هُمْ يُسْـَٔلُوْنَ** ''اللہ تعالیٰ کو اس کے افعال کی بابت کوئی بھی نہیں پوچھ سکتا اور ان کو پوچھا جاتا ہے۔'' امام موصوف کا قول ہے کہ ارادہ بذات خود کسی چیز کے معرض ظہور میں آنے کا مخصص ہوتا ہے۔ (دوسرا مرجح ڈھونڈھنے کی ضرورت نہیں)، اور نیز یہ کہ اللہ تعالیٰ کے افعال معلل بالاغراض نہیں ہوتے۔ یعنی ان کا وقوع میں آنا کسی غرض پر مبنی نہیں ہوتا۔ بالفاظ دیگر متساویات کی ترجیح اور تخصیص کا منبع بذات خود ارادہ کی صفت ہے، جو تمام دیگر اسماء پاک کی جامع ہے۔

اہل حق تقدیر کی بحث میں عموماً قضاؤ قدر کا لفظ استعمال کرتے ہیں ارادۂ ازلیہ کے اقتضاء کو وہ قدر سے تعبیر کرتے ہیں اور ارادہ مجدّدہ کا اقتضاء ان کے نزدیک قضا کہلاتا ہے۔ حدیث نبوی علی صاحبہ الصلوۃ والتسلیم میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ آسمانوں میں کسی امر کا فیصلہ کر لیتا ہے تو ملائکہ اس کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے طور پر اپنے پروں کو پھڑ پھڑاتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی سپاٹ پتھر پر لوہے کی زنجیر گر پڑی ہے (اور اس سے جھنکار کی آواز پیدا ہوئی۔) جب ان کے دلوں کی گھبراہٹ زائل ہوتی ہے تو وہ کہتے ہیں (اپنے سے بالاتر رتبہ کے ملائکہ سے پوچھتے ہیں) تمہارے رب نے کیا حکم صادر فرمایا وہ جواب میں فرماتے ہیں کہ اس کا حکم اور ارشاد حق ہے یعنی اس کے تمام احکام (کونیہ وشرعیہ) مبنی بر حکمت وصواب ہیں، اور وہی علوو کبریا سے موصوف ہے۔'' یہ حدیث بخاری اور ترمذی میں ہے۔ اس حدیث کا مقصد یہ ہے کہ جس طرح انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام اپنے علاوی کو وحی شرعی کے منبع سے اخذ کرتے ہیں۔ اسی طرح ملائکہ مقربین ''صور قضائیہ'' کے احکام ''قدر'' کے منبع سے اخذ کرتے ہیں۔

قرآن پاک میں ہے اِنَّمَآ اَمْرُہٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ ''اس کے حکم صادر کرنے کی یہ کیفیت ہے کہ جب وہ کسی امر کو انجام دینے کا ارادہ فرماتا ہے تو بے شک اس کو حکم دیتا ہے کہ ہو جا، اور وہ ہو جاتا ہے''۔ اکثر لوگوں کے اذہان اس آیت کی حقیقت سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں، کیوں کہ وہ تکوین کے راز کو نہیں سمجھ سکے۔ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ تکوین، ارادہ کے مرادف ہے اور ان کا باہمی تعلق ازلی ہے۔ ازل کسی محدود وقت کو نہیں کہتے جس کے بعد ''زمان کا مفہوم ظہور میں آیا ہو، وہ تو ان کائنات کے لئے ایک ظرف (وقت ظہور) کے طور پر استعمال ہوا ہے جن کا وجود بلحاظ ان کی قدامت اور مجرد عن المادہ ہونے کے متعالی عن الزمان والمکان ہے (زمان اور مکان کے متعارف مفہوم سے بالاتر ہے)۔ زمان کے مفہوم میں ہر چند وسعت پیدا کی جائے وہ ایک وحدت (یونٹ) ہے جو بہمہ حال باری تعالیٰ کے حضور میں ہے اور وہ اپنے حسب ارادہ اس میں اپنا مقدس تصرف فرماتا رہتا ہے۔ تجدّد وفنا اور زوال کا مفہوم صرف اس وقت پیدا ہوتا ہے جب ہم اپنے سے اس کی نسبت کرتے ہیں (جب تک اس کی نسبت ذات اقدس سے ہے اس میں کوئی تجدد وفنا نہیں) اس لئے حدوث عالم کو مستلزم محال سمجھنا غلط ہے۔

ہمارا عقیدہ تو یہ ہے کہ تمام عالم اپنے زمان و مکان اور ہیولیٰ سمیت حادث ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ارادۂ ازلیہ اس کی علّت ہے اور وہ اس کا معلول، اس لئے وہ متدنّس کہلاتا ہے اور طہارت قدس سے محروم ہے۔ اس کی ذات میں حرکت و انتقال اور ایسی زمانیت اور مکانیت کا اقتضاء موجود ہے۔ جس سے پہلے ایک موہوم بعد کا تصور کیا جاتا ہے۔ یہ بُعد جو اس عالم کو ذات اقدس سے حاصل ہوا ہے اس کا تصور قوت واہمہ کے تمثلات سے ہے۔ اگر اس نکتہ کو سمجھ لیا جائے تو کوئی جھگڑا باقی نہیں رہتا۔ اس بحث کے متعلق قول فیصل یہ ہے کہ حدوث کی دو قسمیں ہیں۔ ایک حدوث تو وہ ہے جس کا انحصار تقید اور تعین پر ہے۔ اس کو صرف اس لئے حدوث کہتے ہیں کہ تکوین کے سلسلہ میں اس کا درجہ الٰہیات سے متاخر ہے۔ اس حدوث کا مفہوم تمام ممکنات کو شامل ہے۔ حدوث کی دوسری قسم حدوث زمانی ہے۔ اس قسم کا حدوث چوں کہ ''زمان'' کے اندر واقع ہوتا ہے اس لئے نفس زمان اور وہ اشیاء جو اس کے ہم عصر ہیں اس کے مفہوم سے خارج رہتے ہیں۔ جو کچھ ہم نے کہا اہل سنت کے علماء کو اس سے مطلق اختلاف نہیں۔ کیونکہ ان کے نزدیک حدوث کا مفہوم

اوّل ترین تمثلات میں شامل ہے۔ اس لئے وہ قوت واہمہ کو اس کا ظرف بتاتے ہیں ان کا یہ ادراک فلاسفہ کے ادراک ماہیات کے مشابہ ہے، کیوں کہ ماہیات بھی اپنی ذات کے لحاظ سے امور وہمیہ ہیں۔ صرف اتنی بات ہے کہ انواع اور اجناس کی صور مختلفہ پر وہ صادق آتی ہیں جن کو واقع اور نفس الامر میں تحقق حاصل ہے یا ان کا اطلاق ان خصوصیات فعلیت پر ہوتا ہے جن کا حقائق فعلیات کے کوچہ میں گزر نہیں۔ اس کو اچھی طرح سمجھ لو۔ یہ ایک دقیق مسئلہ ہے۔

اگر تمہارے دل میں کسی قسم کا انکار پیدا ہو تو یہ خیال کر کے اس کو ہٹا دو کہ ائمہ اہل سنت بہت سے مسائل میں ایسی باتیں معرض بحث میں لائے جن کے متعلق صحابہ اور تابعین سے کچھ بھی منقول نہیں۔ بایں ہمہ وہ علماء سنّت کہلائے۔ اسی طرح اگر ہم اپنے ذوق اور وجدان سے ایسی باتیں سپرد قلم کریں جن کے متعلق قرون اولیٰ میں کسی نے لب کشائی نہیں کی، فقط اجمال (اور اشارہ) پر اکتفا کیا، کیوں کہ ابھی تک ایسی باتوں کو زبان پر لانے کا موقع نہیں آیا تھا تو اس سے ہماری سنیت میں کیوں فرق آنے لگا۔

کلام مقدس بھی صفت ارادہ کا ایک شعبہ ہے۔ فرق صرف اجمال اور تفصیل کا ہے۔ مواطن علم میں افاضہ کے لحاظ سے ارادہ مجمل ہوتا ہے اور افاضۂ کلامیہ میں ہر ایک فعلیت کی ایک صورت مقدسہ ہوتی ہے، خواہ وہ فعلیت اس سے سابق ہو یا لاحق، لیکن اتنی بات ضروری ہے کہ مؤخر الذکر فعلیتیں سابق فعلیات کے ضمن میں شامل ہوتی ہیں۔ اور جیسے کہ تم بعد میں جان لوگے مواطن تخلیط میں یہ کلام نفسی حروف اور ان کی اشکال کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے زبان کو اسلئے پیدا کیا کہ وہ نفس انسانی کے تصورات یا بالفاظ دیگر اس کے مافی الضمیر کی جو در حقیقت صور علمیہ ہیں نقل اتارے (اور ان کا خاکہ مخاطب کے سامنے پیش کرے) اس نقل و حکایت کی نوعیت ایسی ہے کہ اس کی حقیقت کا حکیم دانا کے بغیر کوئی بھی ادراک نہیں کر سکتا۔ کلام کی ایک قسم کلام مجدّد ہے، بعینہٖ جس طرح ارادہ کی ایک قسم ارادۂ مجدّد ہے۔ انبیاء کرام علیہم السلام جو شریعت لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں اس کا سرشتۂ نظام وحی منزّل کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس موطن میں ارادۂ غیبیہ حروف اور الفاظ کی صورت میں متمثل ہوتا ہے۔ جس کا مفہوم وہ وجدان کے طور پر محسوس کرتے ہیں۔ اچھی طرح سوچ لو۔ یاد رکھو اللہ تعالیٰ کے کلام کا یہ مفہوم ہے کہ وہ صور علمیہ کا اس

طرح انسان پر افاضہ فرماتا ہے کہ صور مذکورہ سامع کے نفس میں ایک ایسے کلام کی صورت اختیار کرتے ہیں جو حروف اور الفاظ سے مرکب ہو کر مسموع ہوتا ہے۔ اسی کو شیخ ابوالحسن اشعری نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلام درحقیقت کلام نفسی ہے۔ لیکن اس کا اطلاق حروف اور الفاظ پر بھی جائز ہے جو اسی کلام نفسی کا تمثّل ہے۔

مخاطب مختلف ہو تو وحی کی نوعیت بھی اسی کے مطابق مختلف ہوتی ہے۔ وحی سے ہماری مراد یہ ہے کہ کلام مقدس کو (موطن وحدوث) تمثل حاصل ہو۔ کسی حکیم کے دل میں جو القا ہوتا ہے اس میں کلام مقدس کا تمثل نہیں پایا جاتا وہ صرف ذوق اور وجدان کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اولیاء کا الہام اگرچہ کلام مقدس کا تمثل ہوتا ہے۔ لیکن اس میں سخت کثافت پائی جاتی ہے۔ وحی کا مورد صرف نبی ہو سکتا ہے جس کا کامل انسلاخ (عن المادہ) حاصل ہوتا ہے، بدعات عقل کی جنایت سے وہ محفوظ ہوتا ہے، اور اس کی معرفت شامل تر ہوتی ہے۔ غیر رسل و انبیاء علیہم السلام کو بھی بعض اوقات وحی ہوتی ہے لیکن اس کا تمثل ضعیف ہوتا ہے، رسل اور انبیاء علیہم السلام کی وحی میں یہ ضعف نہیں پایا جاتا۔ بعض انبیاء کو وحی آتی ہے تو اس میں صلابت ہوتی ہے، ان ہی کو رسل کہتے ہیں۔ بعض افراد ایسے بھی ہیں جن کی وحی میں صلابت کے بعد ملائمت ہوتی ہے۔ یہ وہ اصحاب ہیں جن کو اپنے درجۂ کمال میں دوبار ارتقاء حاصل ہوا۔ اس کا بیان آگے ہے۔ بعض کامل افراد ایسے بھی ہیں جن کی وحی میں صلابت اور ملائمت کے علاوہ فصاحت بھی ہوتی ہے۔ مثلاً ہمارے رسول جو خاتم النبیین اور امام المرسلین ہیں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔ اللہ تعالیٰ نے آپ پر جو وحی نازل فرمائی اور اپنے بندوں کو ممنون فرمایا وہ آیات بینات محکمات ہیں جن کی فصاحت و بلاغت حد اعجاز تک پہنچی ہوئی ہے چوں کہ قرآن متلوِ دائمی اور زبردست معجزہ ہے اس لئے اس کے دین اور شریعت کو بھی عموم اور دوام حاصل ہوا، جس سے لازمی طور پر ہدایت وارشاد میں وسعت پیدا ہوئی اور آپ خاتم الرسل قرار پائے۔ اکثر آیات اور احادیث میں لازم کو ذکر کیا جاتا ہے اور اس کا ملزوم مراد ہوتا ہے۔ اس بات کو یاد رکھو۔

الہام اور وحی میں یہ ایک بڑا فرق ہے کہ اوّل الذکر کو جو معنوی لباس الفاظ اور حروف کا پہنایا جاتا ہے اور جو تعیّن اور تمثّل اس کا موطن کلام میں حاصل ہوتا ہے وہ صورت مزاجیہ کا اختراع ہے۔

برخلاف اس کے وحی اس بدعت سے محفوظ ہے وہ سراسر حق ہے اور باطل اس کے گرد تک پہنچنے سے قاصر ہے۔ایک ذی عقل سمجھدار آدمی اس سے اس حدیث کی تہ تک پہنچ سکتا ہے۔جس میں قرآن کریم کو سات مختلف طریقوں سے پڑھنے کی اجازت ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ جس قلب مبارک پر وحی قرآنی فائض ہوئی اس کو غیر معمولی وسعت حاصل تھی اور آپ کی نظر نافذ تمثّل کے مختلف انواع پر حاوی تھی۔وحی کی ایک قسم وہ ہے جس کا، لانے والا جبرئیل علیہ السلام ہوتا ہے۔ جس کو عالم ملکوت سے خاص تعلق حاصل ہے۔بعض اوقات وحی کا اطلاق عام تر ہوتا ہے خواہ اس میں تمثّل ہو یا نہ ہو۔جہاں تک ہمارا خیال ہے اسی اطلاق عام کی بناء پر مریم علیہا السلام کے حق میں وحی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔واللہ تعالیٰ اعلم۔بعض اوقات وحی کا مفہوم اس سے بھی عام تر ہوتا ہے جس میں انسلاخ (عن المادّہ) تک کا لحاظ نہیں ہوتا۔موسیٰ علیہ السلام کی ماں اور شہد کی مکھی کے حق میں وحی کا لفظ اسی اصطلاح کی بناء پر استعمال ہوا ہے۔

ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم تم کو دوبارہ اسماء مجدّدہ کی حقیقت سے آگاہ کریں۔کیا تم یہ نہیں جانتے کہ ہر ایک ارتقاء تخلیقی میں خواہ اس کی حیثیت کلّی کی ہو یا جزئی کی، تمام الٰہیات (صفات مقدسہ باری تعالیٰ و تقدس) کا تمثّل پایا جاتا ہے۔ظاہر ہے کہ ''ذات بحت'' (خالص ذات اقدس جس کے ساتھ صفات کو ملحوظ نہ رکھا جائے) بطریق اولیٰ اس کی مستحق ہے، اگرچہ یہ ضروری ہے کہ یہ تجلّی ذاتی اس تمثّل کے رنگ میں جلوہ نما ہو جس سے یہ ارتقاء تخلیقی ظہور میں آیا، بجز اس کے تجلّی ذاتی کا ظہور ناممکن ہے۔یہ ارتقاء دو قسم کا ہوتا ہے۔ایک وہ جس کو ہم مطلق اور منزّہ کہیں گے۔ دوسرا وہ جو مقید اور متدنّس ہے یعنی طہارت قدس سے محروم ہے۔اول الذکر قسم میں جو تجلّی ذاتی ظہور پذیر ہوتی ہے اس کو بجا طور پر اسم پاک سے تعبیر کیا جاتا ہے، لیکن جو تجلّی متمثّل اور متدنّس ہو کر اس درجۂ ارتقاء میں خیال اور وہم کے طور پر ادراک میں آتی ہے وہ اس قابل نہیں کہ اس پر اسم پاک کا اطلاق کیا جائے۔لیکن باوجودیکہ اس پر اسم پاک کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا۔پھر بھی اگر کوئی اس سے توسّل کرے اور اس کے دامن میں پناہ لے تو یقیناً وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کو شہ رگ سے قریب تر پائے گا۔یہ سمجھ لینے کے بعد یہ یقین کرنا تمہارے لئے بہت آسان ہے کہ ارتقاء عینی میں جو تجلّی ذاتی ظہور میں آتی ہے وہ باری تعالیٰ کا اسم پاک ہے۔جس سے حدوث کے رنگ میں

آثار الٰہیہ صادر ہوتے ہیں، کیوں کہ اس کے نیچے کی طرف میں ایسی وسعت پائی جاتی ہے جو نفس ناطقہ کے نیچے کی طرف موجود ہے۔ اسماء حسنیٰ کے متعلق ہم تجدد کا یہی مفہوم مراد لیتے ہیں۔ تجدّد زمانی سے ہمارا کچھ سروکار نہیں۔ سلف صالحین نے اس کے متعلق کوئی جامع تصریح نہیں فرمائی۔ جس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ وہ ان کو اسماء فعلیہ کے ضمن میں شامل سمجھتے تھے یا یہ کہ انہوں نے خاص افراد کے وجدانی تاثرات پر اکتفا کیا۔ لیکن میری رائے میں اس تحقیق کو مہمل چھوڑ دینا ایک ایسی بات ہے کہ جب حقائق کی خوب چھان بین کی جاتی ہے تو بہت سی فصیح اور بلیغ زبانوں پر گرہ پڑ جاتی ہے۔ شیخ السنۃ (امام ابوالحسن اشعریؒ) نے قاضی حکمت کی عدالت میں اس کی شہادت دی ہے جہاں وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا کلام نفسی ہے اور صفت ارادہ وغیرہ کا تعلق حادث کائنات کے ساتھ حادث ہے اس کو اچھی طرح سمجھ لو۔

اب ہم وحدۃ الوجود کے مسئلہ کو لیتے ہیں۔ ایک حکیم کے ذوق اور وجدان کے مطابق اس کا جو مفہوم ہے وہ دوسروں کے عندیہ سے مختلف ہے۔ ایک حکیم اس کی اس طرح تشریح کرتا ہے کہ ہر ایک ممکن کے لئے خواہ وہ موجود ہو یا مفروض، ایک فعلیت اور ماہیت ہوتی ہے۔ فعلیت سے مراد اس کے معرض وجود میں آنے کی نوعیت ہے، اسی حیثیت سے وہ نفس الامر میں ''عدم صرف'' سے امتیاز حاصل کرتا ہے۔ ماہیت کا مفہوم وہ امر ہے جس کو ملحوظ رکھ کر انسان کی ظلمانی قوت واہمہ اس کے تحقق یعنی معرض وجود میں آنے سے قطع نظر کر کے اس کا تصور باندھتی ہے اور جس کے ذریعہ وہ اپنے مغائر سے ممتاز نظر آنے لگتا ہے۔ لیکن یہ اس سے پیشتر ہوتا ہے کہ اس کو اس کے اللہ تعالیٰ کے ساتھ وابستہ ہونے کا علم حاصل ہو۔ حکیم کا فیصلہ یہ ہے کہ ماہیت میں ثبات نہیں ہوتا اور وہ واقع اور نفس الامر کے مطابق بھی نہیں، اس لئے وہ اس کو پس پشت ڈال دیتا ہے۔ پھر یہ بھی یاد رکھو کہ جس فعلیت کے صادر ہونے کی حیثیت اور اس کی تکوین پر قدرت رکھنے کی اصل اور منبع واجب تعالیٰ کی ذات اقدس میں نہ ہو وہ ممکن نہیں، ممتنع الوجود ہے، فعلیّت کے دائرہ سے باہر ہے، اور اس کو ایک ایسی چیز کے مشابہ کہا جا سکتا ہے جس سے اس کی تمام ذاتیات سلب کر لی جائیں۔ اس تمام مبحث کا ملخص یہ ہے کہ ہر ایک فعلیت کے ظہور کی حیثیت واجب تعالیٰ کی ذات اقدس میں ہے، یہ فعلیت اور حیثیت یکسر ایک دوسرے پر منطبق ہوتی ہے۔ اتنی بات ہے کہ اوّل الذکر اس حیثیت کے

اجمال کی شرح اور تفصیل ہے، یا یوں کہو کہ اس کے عین کا تمثل ہے۔ پھر اس میں بھی شک نہیں کہ یہاں پر تین باتیں ہوتی ہیں ایک تو وہ امر مشترک ہے جو اس حیثیت کا اور اس چیز کا جو اس سے صادر ہوئی ہے، جامع ہوتا ہے۔ اگر یہ جامع اور امر مشترک بیچ میں نہ ہوتا تو اس چیز کا، خصوصیت کے ساتھ اس خاص حیثیت سے صادر ہونا، کسی اور چیز کا صادر نہ ہونا، ترجیح بلا مرجح ہوتا۔ یہ صادر اگر مخلوق اور معلول ہے تو ہم اس وجہ جامع کو "نفس رحمانی" سے تعبیر کرتے ہیں لیکن اگر وہ صادر واجب تعالیٰ وتقدس کا کوئی اسم پاک ہے، تو اس کو نفس عینی کہیں گے دوسرے وہ امر جو اس حیثیت کے ساتھ اس لئے مخصوص ہے کہ وہ حیثیت تمثل کے داغ سے عاری ہے۔ چوں کہ اس امر کا کوئی خاص حکم نہیں جو اس پر مترتب ہو۔ اس لئے ہم نے اس کو کسی خاص نام سے موسوم نہیں کیا۔ تیسرا وہ امر جو اس صادر کے ساتھ مخصوص ہے جس سے اس کی صورت صادرہ کا اظہار ہوتا ہے۔ اس امر خصوصی کو ہم "خصوصیات موطن" کا نام دیتے ہیں۔

عالم کون وفساد کے صدور کی حیثیتیں اس لئے متعدد ہیں کہ اسماء حسنےٰ بے شمار ہیں۔ چوں کہ یہ مقدس حقائق ہیں، اس لئے ان میں سے ہر ایک کی جہت اور حیثیت مختلف ہے، اور جیسے کہ پہلے مذکور ہوا تمام لوازم ایک ہی لازم پر منتہی ہوتے ہیں اور تمام حیثیات اور جہات کی انتہاء ایک ہی جہت پر ہوتی ہے، جو واجب الوجود تعالیٰ شانہ کی ذات اقدس سے فقط عنوان اور حکایت کے لحاظ سے مختلف ہے، مُعَنْوَن اور محکی عنہ کی حیثیت سے کوئی اختلاف نہیں۔ اس سے ثابت ہوا (جیسے کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں) کہ واحد بسیط واجب الوجود جلّ شانہ ہر ایک فعلیّت پر ہر ایک حیثیت سے احاطہ کئے ہوئے ہے، کیوں کہ یہ ظاہر ہے اور تم جانتے ہو کہ ان فعلیتوں کا تشخص (متمثّل ہونا) اسی ذات اقدس کی طرف منسوب ہے۔ ان کی نوعیت خاص کا موجب علّت قابلہ کی مختلف حیثیتوں میں پنہاں ہے، جس کو ہم نے اپنی اس کتاب میں کبھی تو "واقع" اور کبھی "مرآۃ" یعنی آئینہ سے تعبیر کیا ہے۔ ان فعلیتوں کے انتساب کو بھی تشخص کے انتساب پر قیاس کریں۔ اسی طرح ان کی جنسیّت اور جوہریت اور ہیئت جامعہ (قدر مشترک) کی بھی یہی کیفیت ہے۔ خلاصہ یہ کہ سوی اللہ واللہ زور وباطل۔ "سوائے اللہ تعالیٰ کے جو کچھ بھی ہے بخدا کہ وہ جھوٹ اور باطل ہے" اسی حکمت سے تجلّی ذاتی کا ظہور ہوتا ہے۔ اچھی طرح سمجھ لو۔

شیخ صدر الدین قونوی اپنی ایک تصنیف میں لکھتے ہیں ''اللہ تعالیٰ کی وحدت وجود کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہم اس بات کے قائل ہیں کہ واحد حق سے واحد ہی صادر ہو سکتا ہے، کیوں کہ واحد کی حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ تصور کرنا ناممکن ہے کہ اس سے سوائے واحد کے کچھ اور صادر ہو۔ اس واحد کا مفہوم جو واحد حق سے صادر ہوا۔ ہمارے نزدیک وہ ''وجود عام'' ہے جو اعیان کائنات پر فائض فرمایا گیا، خواہ وہ موجود ہو گئے ہوں یا ابھی تک نہاں خانۂ عدم میں مستور ہوں، بشرطیکہ ان کا موجود ہو جانا، اس کے علم میں ہو۔ ''وجود عام'' کا مفہوم اس قدر ہمہ گیر ہے کہ وہ قلم اعلیٰ تک کو شامل ہے جو سب سے پہلے معرض وجود میں لایا گیا اور جس کو (فلاسفہ) عقل اول سے تعبیر کرتے ہیں۔ نیز تمام کائنات ''وجود عام'' کے مفہوم میں داخل ہے۔ وحدت وجود کا وہ مفہوم نہیں جس کا ذکر اہل نظر فلاسفہ نے کیا ہے، کیوں کہ محققین کے نزدیک سوائے واحد حق تعالیٰ شانہ اور کچھ بھی لباس ہستی میں جلوہ گر نہیں۔ عالم کا مفہوم صرف اس قدر ہے کہ وہ پہلے اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا، پھر اس کو موجود ہونے کا فخر حاصل ہوا'' اس کے بعد اس نے اس کا ابطال کیا ہے کہ ماہیات کو فی نفسہا مجعولیت سے موصوف کہا جا سکتا ہے۔ اس کے کلام کا ملخص یہ ہے کہ وجود کا مفہوم بہت عام ہے، تمام کائنات پر حاوی ہے (**لا یغادر صغیرۃ ولا کبیرۃ**) یہ کائنات حقیقت واجب تعالیٰ وتقدس کا تمثل اور اسی حقیقت سے صادر ہوتی ہے۔'' مولانا عبدالرحمٰن جامی نے (اپنی ایک تصنیف میں) سب سے پہلے شرح وبسط کے ساتھ اس بات کا عقلاً جائز ہونے پر بحث کی ہے کہ ''وجود عام'' جس کا مفہوم سب کائنات کو شامل ہے عین واجب ہے جل مجدہ۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ جو صوفیہ وحدت وجود کے قائم ہیں جب ان پر یہ حقیقت واضح ہوئی کہ واجب تعالیٰ اور ''وجود مطلق'' دراصل ایک ہیں تو انکو اس بات کی ضرورت محسوس نہ ہوئی کہ وہ اس کی وحدانیت اور نفی شریک پر دلائل قائم کرتے پھریں، کیونکہ اس کے حق میں اثنینیت اور تعدد کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا، بجز اس کے تعین اور تمثل کو ملحوظ رکھا جائے۔ جو چیز بھی تم دیکھتے ہو یا تمہارے مدرکہ اور متخیلہ میں سما سکتی ہے اور جس کے تصور سے تمہارے ذہن میں تعدد کا مفہوم پیدا ہوتا ہے، ہر ایک ایسی چیز وجود اضافی کے ساتھ موجود ہے۔ وجود مطلق کا شرف اس کو حاصل نہیں۔ ہاں اس کا مقابلہ میں عدم ہے جو کچھ بھی نہیں۔'' یہ اس کے کلام ماقبل کا نتیجہ ہے جس کا ملخص یہ ہے کہ وجود عام کا

مفہوم تمام کائنات میں مشترک ہے اور وہ حقیقت واجب تعالیٰ کا عین ہے یعنی عین ذات اقدس ہے۔ ایسے علماء اعلام کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ذات اقدس باری تعالیٰ کو (منطقی اصطلاح میں) کلی سمجھتے ہیں بلکہ اس سے ان کا مقصد جیسے کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں یہ ہے کہ اس کا مفہوم افق فعلیت کو گھیرے ہوئے ہے اور اقلیم تحقق پر ہر طرف سے محیط ہے۔ بالفاظ دیگر تحقق کے مفہوم کی طبیعت اور اس کا اقتضاء ذاتی یہ ہے کہ اس کی نسبت واجب تعالیٰ کی ذات اقدس تک محدود ہو۔ چنانچہ ممکن کا تحقق اور اس کا وجود کیا اوّلاً بالذات اور ثانیاً بالعرض، واجب تعالیٰ ہی کی ذات اقدس کی طرف منسوب ہے، ممکن کی جہت اور حیثیت ایجاد اور اس کی تکوین کی قدرت یا جن الفاظ میں بھی تم اس کی تعبیر کرو۔ بالفعل واجب تعالیٰ کی حقیقت میں شامل ہے اور اس کا تحقق باری تعالیٰ کی طرف منسوب ہے۔ اس میں کسی شک کرنے والے کے لئے شک کی گنجائش نہیں۔ تحقق ممکن کی حقیقت یقیناً اسی جہت اور حیثیت کا تمثل ہے۔ اس تمام مبحث کا ملخص یہ ہے کہ تحقق کی اصل اور اس کا منبع واجب تعالیٰ کی ذات اقدس ہے، اس طرح نہ کہا جائے کہ تحقق نے اس کو فوق کی جانب سے گھیر رکھا ہے اور وہ کبریا کی چادر اوڑھے ہوئے ہر ایک قسم کے تمثّل سے بری اور بالاتر ہے، پھر یہ کہ تمام تمثلات اس کے مظاہر کمال اور آئینہ ہائے جمال ہیں اور اس کی عظمت اور جلال کی شرح اور تفصیل ہیں یہ ایک ایسی بات ہے جس میں کوئی حکیم اختلاف نہیں کر سکتا۔

یہ بات قابل تسلیم نہیں کہ ''ماہیات مجعول نہیں یا یہ کہ صادر اول اس وجود عام کا نام ہے جو تمام کائنات کو اپنے مفہوم میں لئے ہوئے ہے، موجود بسیط فقط اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس ہے، اور وجود ایک ایسی چیز ہے جو ماہیات سے آ کر مل جاتی ہے۔'' ان نظریوں کے قابل تسلیم ہونے کے متعلق ہم پہلے بحث کر چکے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کے یہ اقوال تاویل پر مبنی ہیں۔ میرے خیال میں انہوں نے اس تغایر اعتباری کو ملحوظ رکھنے پر اکتفا کی ہی جو ماہیت اور فعلیت کے درمیان پایا جاتا ہے، لیکن وہ یہ نہیں سمجھ سکے کہ یہ فرق فقط حیثیت اور جہت ملحوظ رکھنے تک محدود ہے۔

حق بات یہ کہ وجود ماہیت کا مفہوم ایک ہے اور حقیقت تقرر کے مرادف ہے، جیسے کہ امام اہل السنّت نے اس کی تشریح کی ہے۔ چوں کہ وجود کا مفہوم بلحاظ اس کے اطلاق عام کے واجب

تعالیٰ وتقدس کی لا تناہی کو شامل ہے اس سے ان کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ وہ عین واجب ہے اور دونوں یکسر ایک دوسرے پر منطبق ہیں۔ وہ اس نکتہ کو سمجھنے سے غافل رہے کہ تمام عالم متعین ہے، اس میں ہر چند اطلاق کا تصور کیا جائے واجب تعالیٰ کے اطلاق سے اس کو کوئی نسبت نہیں۔ نسبت اگر ہے تو صرف اتنی کہ وہ اس کے علم اور اس کی تکوین سے معرض وجود میں آیا۔ جس شخص کا یہ خیال ہے کہ وجود اس عالمِ کون وفساد میں پھیلا ہوا ہے وہ عین واجب ہے اس کو بہت بڑا اشتباہ ہوا ہے اور وہ ظاہر اور مظہر میں فرق نہیں کر سکا۔ بار خدایا! میں تجھ کو ہر ایک اسم پاک کا واسطہ دیکر تجھ سے سوال کرتا ہوں کہ تو مجھ کو متقیوں کا امام اور حکمائے ربانیین کے لئے جائے پناہ بنا دے۔

............☆☆☆............

تیسرا خزانہ

''انجاس''(۱) کی حقیقت یہ ہے کہ جاعل اپنے مجعول خصوصی کے لئے وجوب کے طور پر اس کے ظہور کا باعث ہوتا ہے جو ہیئت مخصوصہ کے اصل تحقق کا اقتضاء ہے۔ (آسان تر الفاظ میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ ہر ایک مجعول اپنے جاعل کی حیثیت خصوصیہ کا نتیجہ ہوتا ہے۔ حیثیت خصوصیہ اقتضاء ذاتی کے طور پر اس مجعول خاص کا ظہور چاہتی ہے اور اس لئے اس کا ظہور میں آنا لازم ہوتا ہے)۔ یہی جہت وحیثیت خصوصیہ کسی مجعول کی حقیقت ہوتی ہے اور اس کا قوام یا اس کی ہستی کا نظام اسی پر موقوف، اور اس کا تحقق وجوب مذکور کا نتیجہ ہوتا ہے۔ فحص وتمحیص کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ تحقق مجعول کے یہ معنی ہیں کہ اس کا وجود اپنا نہیں، بلکہ جاعل کے لئے ہے۔ اس کی ذات کا انحصار اس پر ہے کہ وہ ازل سے ابد تک جاعل (تعالیٰ وتقدس) اور فاعل (جل شانہ) کی طرف منسوب رہے اس کے کمال کا منبع اس کا مبدء ہوتا ہے، اور اس کا وجود اس جہت اور حیثیت خصوصی کی شرح اور تفصیل ہوتی ہے۔ اصل جہت اور حیثیت کے موطن میں عدم امتیاز کی وجہ اس جہت کا علوم شان اور اس کی انتہائی سبقت ہے''انجاس'' کے دو معنی ہیں۔

(الف) مطلق کا مطلق سے ظہور میں آنا۔ اس کی حقیقت کسی مفہوم کا اس طرح مستقل ہونا ہے کہ دونوں میں تصادق پایا جائے۔ (دونوں کا ماصدق علیہ ایک ہو) اور ایک دوسرے کے لئے عنوان ہو۔ مثلاً متعجب اور ضاحک (یہ تصادق کی مثال ہے) اگر چہ ان کا اتحاد عرضی ہے جس کی کیفیت خزانۂ دوم میں بتائی جا چکی ہے۔

(ب) کسی متعین اور مقید کا مطلق سے مشتق ہو کر ظہور میں آنا۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ

---

(۱) انجاس کے لفظی معنی ہیں پھوٹ نکلنا یعنی ظہور میں آنا۔

مطلق اجناس کی حدود ختم ہو کر تقید اور تعین کی سرحد تک پہنچ جائیں جس کے بعد صرف یہی رہ جاتا ہے کہ مختلف مفہومات اپنی اپنی جہات اور حیثیات خصوصیہ کے ضمن میں علیحدہ ہستی اختیار کریں۔ یہاں پر نہ تو تصادق ہوتا ہے اور نہ عنوانیت۔ پہلی قسم کی مثال منطقی اصطلاح کے مطابق حیوان مطلق ہے جس کا مفہوم ہر ایک طرح کی شرط اور قید سے آزاد ہے۔ دوسری قسم کی مثال حیوان بشرط شیئ اور حیوان بشرط لاشیئ ہے (اس کی تشریح عام کتب منطق میں موجود ہے)۔

ہم چاہتے ہیں کہ اس خزانہ میں اس امر کی تشریح کریں اس لئے جو کچھ تم کو بتایا جائے اس کو گوش ہوش سے سنو۔ جب اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو پیدا کرنا چاہا تو اس نے خالص تجرّد اور عین اطلاق سے عرش عظیم کو پیدا کیا۔ اس کا مفہوم ہمارے نزدیک ایک جسم کامل ہے جس نے تمام جہات (جہات ستہ؟) کو گھیرا ہوا ہے اور اس میں خرق والتیام کا ہونا ناممکن ہے۔ اس کو اگرچہ ہم نے جسم کہا ہے۔ لیکن اس حیثیت سے وہ روحانی ہے کہ اس کو خدائے قدوس تعالیٰ شانہ سے کامل ترین قرب حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ کی تدبیر عام کا وہ مظہر ہے۔ (اس کو ہم انسانی دماغ سے تشبیہ دے سکتے ہیں کما صرح به الغزالي رحمة الله عليه وغيره) اور اس میں ایک روح کلّی موجود ہے۔ ان ہی وجوہ کی بناء پر ثُمَّ استوى على العرش وارد ہوا ہے۔ اس کے بعد اس نے ایک دوسرا جسم پیدا کیا جو غیر کامل اور محدّد (بفتح الدال بصیغۂ اسم مفعول) بالجہات، قابل خرق والتیام ہے۔ اس مؤخر الذکر لفظ سے ہماری مراد یہ ہے کہ جو حالت بھی اس پر طاری ہو اس کو قبول کرتا ہے اور کوئی صورت جس کو ذہن میں فرض کیا جائے وہ صورت اختیار کر سکتا ہے۔ یہ جسم پانی ہے (خلق السموات والارض في ستة ايام وكان عرشه على الماء)۔ یہ وہ جسم محض ہے جس کو کوئی قرب حاصل نہیں، تدبیر الٰہی کا منبع اور مظہر نہیں اور روح سے معرّا ہے، اس لئے اس پر ثم استوى على الماء کا جملہ صادق نہیں آتا۔ اس مؤخر الذکر جسم کو پانی سے اس لئے تعبیر کیا کہ وہ اطلاق اور استعداد و قابلیت میں اسی کے مشابہ ہے، جس طرح عرش سے تعبیر کرنا استوار علی العرش اور تمام جہات پر محیط ہونے کے مفہوم پر مشتمل ہے۔ ایک حکیم اپنے ذوق اور وجدان سے اسی نتیجہ پر پہنچتا ہے جو مذکور ہوا، جس کو لامحالہ تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ اس کو نہ ماننے کی صرف وہی شخص جرأت کر سکتا ہے جو اس راز کی حقیقت سے بے خبر ہے۔ آیات اور احادیث بکثرت اس بارے

میں وارد ہوئے ہیں مثلاً یہ آیت وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ وَّ کَانَ عَرْشُهٗ عَلَی الْمَآءِ لِیَبْلُوَ کُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلاً ''یہ وہ خدائے قدوس ہے جس نے آسمانوں کواور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا اور اس کا عرش عظیم پانی پر تھا، تا کہ تم کو آزمائے کہ کون تم میں بلحاظ عمل کے سب سے بہتر ہے'' امام بخاری نے عمران بن حسین سے جو روایت کی ہے اس میں رسول خدا صلعم نے اس آیت کی یہ تفسیر فرمائی ہے کہ ''اللہ تعالیٰ موجود تھا اور کوئی چیز اس سے پہلے نہیں تھی۔ اس کا عرش بریں پانی پر تھا جس کے بعد اس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا اور لوح محفوظ میں ہر ایک چیز لکھ دی۔'' ایک روایت میں ہے کہ زمین و آسمان کو پانی سے پیدا کیا۔'' انبیاء اور حکماء کے ذوق اور وجدان کو یہی تک رسائی حاصل ہے لیکن وہ فلاسفہ جو لایعنی مباحث میں مشغول رہتے ہیں ان کے نقطۂ نظر کو جب ہم دیکھتے ہیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ عرش موجود ہے، اس کی ہیولیٰ اس کی صورت پر اور اس کی صورت اس کے ہیولے پر موقوف ہے۔ پانی ایک ایسا جسم ہے جس نے ہیولے اور صورت عامہ سے ترکیب پائی ہے۔ صورت عامہ کا یہ مفہوم ہے کہ وہ ہر ایک شکل کو قبول کرتی ہے ان کا یہ قول اس قول کے مشابہ ہے جو یہ لوگ ہیولیٰ ثانیہ اور صورت نباتیہ کے متعلق ذکر کرتے ہیں۔

تمام جسمانی اشیاء پر ایک ایسا جوہر احاطہ کئے ہوئے ہے (جوہر کے معنی منطقی اصطلاح میں مستقل بنفسہ کے ہیں) جو امتداد ذاتی کے ساتھ موصوف ہے۔ اس سے ہماری مراد ''زمان'' ہے۔ اسی طرح ایک اور جوہر ہے جس میں اتساع ذاتی کی وصف پائی جاتی ہے یہ وہ چیز ہے جس کو ''مکان'' کہا جاتا ہے۔ ان دونوں کا تمام جسمانیات کے ساتھ ایسا گہرا تعلق ہے کہ ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا اور دونوں کا محل جس میں کہ وہ حلول کئے ہوئے ہیں۔ ہر ایک ایسی چیز ہے جو جسم رکھتی ہے۔ بالفاظ دیگر زمان اور مکان کا مفہوم کسی جسمانی چیز کے ضمن میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اسی لئے بعض کا خیال ہے کہ یہ دونوں جوہر نہیں، عرض ہیں۔ (عرض وہ چیز ہے جس کا اپنا مستقل وجود نہ ہو بلکہ کسی دوسرے موجود بنفسہ کے ساتھ اس کا وجود وابستہ ہو) لیکن حکماء کا ذوق اور وجدان اس کو تقسیم نہیں کرتا۔ چوں کہ زمان کے مفہوم میں اس قدر امتداد ہے کہ معمولی طور پر اس کا تصور نہیں کیا جا سکتا اس لئے اس کے تصور کو مشکل سمجھا گیا ہے۔ یاد رکھو اللہ تعالیٰ نے ان

دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ پیدا فرمایا ہے۔ اگر یہ تعلق اور وابستگی ان کے درمیان نہ ہوتی تو ہیولیٰ دوڑ کر اطلاق صرف کے ساتھ جا ملتا جو خدائے قدوس کے اسماء پاک میں سے ایک اسم ہے اور صورت بھاگ کر اس اسم پاک کے ساتھ جا ملتی، جس کا وہ تمثل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت بالغہ سے دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح وابستہ فرمایا کہ نظام عالم میں خلل نہ آئے۔

عالم کے تمام اجزاء حادث ہیں۔ زمان اور اس کے معاصرات (وہ اشیاء جو اس کی ہمعصر ہیں) کا حدوث تو فقط تقییدی ہے۔ (اطلاق میں تقید آنے کی وجہ سے ان کو حادث کہا جاتا ہے، یہ حدوث زمانی نہیں) لیکن دوسری اشیاء حدوث کے دونوں معانی کے لحاظ سے حادث ہیں۔ جنہوں نے ''زمان'' اور اس کے معاصرات کے لئے (معاصرات سے مراد یہ ہے کہ جب سے ''زمان'' کا وجود ہے یہ اشیاء بھی موجود ہیں) حدوث زمانی ثابت کرنے کی سعی لاحاصل کی ہے، وہ ایک ناممکن چیز کو ممکن بنانا چاہتے ہیں۔ آیات اور احادیث میں ان کی تائید کے لئے کوئی دلیل نہیں۔ یاد رکھو ہر ایک اسم پاک کی خصوصیت سے عالم امکان میں صورت خصوصیہ ظہور میں آتی ہے، کیوں کہ ان دونوں کے درمیان گونہ مناسبت اور ارتباط ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک امر واقع ہے۔ رسول خدا صلعم کی اس حدیث میں کہ **خلق اللہ تعالیٰ اٰدم علی صورتہ** ''اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس کی صورت (خصوصیہ) پر پیدا کیا'' اسی کا اشارہ ہے۔ اسی طرح افلاک (اجرام علویہ) اور عناصر کی بھی خصوصیہ صورتیں ہیں اور ارتقاء جزئی میں ہر ایک فلک اور ہر ایک عنصر کی ایک صورت خصوصیہ ہے (جن کا منبع اسماء پاک کی جہات خصوصیہ ہیں۔)

''معدن'' (جس کا دوسرا نام جماد ہے اور موالید ثلاثہ کی ایک قسم ہے) محض جسمانی چیز ہے جس کی روح معدنی (یا یوں کہو روح جمادی) نہایت کمزور ہے۔ اس کا عمل صرف اس قدر ہے کہ اپنی صورت خصوصیہ اور اپنی طبیعت یعنی نیچر کو قائم رکھ سکے۔ اتنی بات ضرور ہے کہ افلاک کے معدن ہونے کی نوعیت عناصر کے معدن ہونے کی نوعیت سے کامل تر ہے۔ ''معدن'' کے مفہوم کو ارضیات سے مخصوص سمجھا جاتا ہے۔ لیکن حکماء اپنے ذوق اور وجدان کی بناء پر تمام معدنیات کی اصل یعنی ''پانی'' کی طرح جملہ معدنیات کے لئے عموم ثابت کرتے ہیں (پانی سے مراد وہ پانی ہے

جس کا ذکر ابھی ہوا اور جو اس آیت میں مذکور ہے وکان عرشه علی الماء اور جس کے متعلق بعض روایت حدیث میں ہے کہ آسمان اور زمین کی تخلیق اسی سے ہوئی (۱)۔

''نبات'' (جو موالید ثلاثہ کی دوسری قسم ہے) ایک ایسا جسم ہے جس میں روح ہے (۲)۔ جس کا عمل یہ ہے کہ فقط صورت کے علاوہ تغذیہ اور نشو ونما کے نظام کو بھی قائم رکھے۔ حیوانات بلکہ حیوان ناطق تک کے احکام کے ساتھ اس کا التباس حاصل ہے گو یہ التباس صرف بعض حالتوں میں ہوتا ہے۔ لیکن اس وقت ہم نفس طبائع میں گفتگو کر رہے ہیں۔

''حیوان'' (جو موالید ثلاثہ کی کامل ترین قسم ہے) بھی جسم یا روح ہے، اور اس کی روح کا عمل یہ ہے کہ مذکورہ بالا فرائض کے علاوہ احساس، تخیل، توہم، ادراک، رضاؤ غضب وغیرہ جذبات کے نظام کو قائم رکھے۔ ''ناطق'' ایک ایسا جسم ہے جس میں روح مدبّرہ فرماروا ہے اور اس کا عمل تعقل ہے۔ اس سے ہماری مراد یہ ہے کہ بلحاظ علم اور عمل کے وہ (روح انسانی) اصول عوالم یعنی اسماء حسنٰی تک رسائی حاصل کر سکتی ہے۔ وہ ناطق جس میں بلحاظ مقدار کے ارضی جز غالب ہو۔ لیکن کیفیت کے لحاظ سے اس کے عناصر اربعہ میں اعتدال ہو، گو یہ اعتدال ''اعتدال حقیقی'' نہیں ہوتا۔ صرف اعتدال کے نام سے مشہور اور مسلم ہے، اس قسم کا حیوان ناطق ''انسان'' کہلاتا ہے۔ مطلق ''ناطق'' کی کئی قسمیں ہیں۔

(۱) جس میں ناطق میں کمیّت یعنی مقدار کے لحاظ سے، ہوا کا عنصر غالب ہو، اور کیفیت کے لحاظ سے چاروں عناصر میں اعتدال اور مساوات ہو وہ ملائکہ سفلیہ ہیں جو ملائکہ علویہ کے اعوان وانصار ہیں اور ان کا تمثال کہلاتے ہیں۔ موکل ان ہی ملائکہ کو کہتے ہیں۔ (علم العزائم میں اکثر ان کا ذکر آتا ہے) یہ ملائکہ سفلیہ انسان کی بہ نسبت عفت اور عصمت کے قریب تر ہیں اور ان کا نفس نفس انسانی سے قوی تر ہوتا ہے۔

---

(۱) یہ نکتہ قابل غور ہے کہ سائنس کا جدید ترین نظریہ یہ ہے کہ اجرام علویہ کی ترکیب وتخلیق بھی بعینہ انہیں عناصر سے ہوئی ہے جن کی ترکیب وامتزاج سے ہماری دنیا ظہور میں آئی ہیکٹر وسکوپ وغیرہ کے مشاہدات کی بناء پر اس نظریہ کو یقینی سمجھا جاتا ہے۔

(۲) علماء بیالوجی کا بھی یہی نظریہ ہے کہ نباتات ذی حیات اشیاء میں شامل ہیں ان میں نر اور مادہ کا ہونا اور ان کے درمیان تلقیح کا عمل میں آنا علم الحیات (بیالوجی) کی مسلمہ، ناقابل انکار حقیقت ہے

(۲) وہ ناطق جس میں پانی کا عنصر غالب ہو اور بلحاظ کیفیت کے چاروں عناصر میں اعتدال اور مساوات ہو۔ انسانی آبی ہے، لیکن سوائے اس کے کہ اہل ذوق واعظ کبھی کبھی ان کا ذکر کر دیا کرتے ہیں کہیں ان کا ذکر نہیں سنا گیا۔

(۳) وہ ناطق جس میں بلحاظ مقدار یعنی کمیّت کے لحاظ سے عنصر آتش غالب ہو۔ لیکن کیفیت کے لحاظ سے چاروں عناصر برابر ہوں، تو م جن ہے۔ نسمہ کے لحاظ سے جو اثرات ان سے ظہور پذیر ہوتے ہیں انسان ان کے اظہار سے قاصر رہتا ہے۔ البتہ سخت ریاضتوں کے بعد ممکن ہے کہ اس سے بھی کوئی اس قسم کا کارنامہ ظاہر ہو۔

(۴) وہ ناطق جس کا تکون عناصر فلکیہ سے ہوا ہو، یہ ملائکہ علویہ ہیں۔

ملائکہ کی حقیقت یہ ہے کہ ان کے نفوس چونکہ نفوس انسانی سے کامل تر ہوتے ہیں۔ اس لئے ان میں اسماء پاک کا تمثّل اور ظہور کامل تر، اور ان کا مادۂ تخلیق انسان کے مادہ تخلیق سے لطیف تر ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ سراپا علم اور روحی ہیں، اور اپنے اصول یعنی اسماء مقدسہ الٰہیہ کی وہ کامل اقتداء کرتے ہیں۔ بعض ملائکہ ان میں سے کلّیین کہلاتے ہیں جو تدبیر کلّی کے سرانجام دینے پر مامور ہیں۔ اس تدبیر کلّی کا ظہور کبھی تو ارتقاءات طبعیہ میں اور کبھی ارتقاء علمی میں ہوتا ہے ان کے مقابلہ میں ملائکہ جزئیین ہیں جو پہاڑوں، دریاؤں، بادلوں، اور ایسے ہی اشیاء پر مؤکل ہوتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ چوں کہ ان کے حقائق میں وسعت پائی جاتی ہے اور ان کو ذات اقدس کا قرب حاصل ہے اس لئے ان اسماء پاک کے بعد جن کا ظہور ان کے سینوں میں ہوا ہے، انہیں کو کائنات کی تدبیر تفویض کی گئی۔ ایک حکیم کا ذوق اور وجدان یہ کہتا ہے کہ ان کو انسان پر مطلقاً تفوق اور فضیلت حاصل ہے۔ جزئی فضیلت کی بات اور ہے۔ بعض ملائکہ اسم مطلق کی تجلّی سے محروم ہیں۔ ان سے یقیناً انبیاء کرام علیہم السلام افضل ہیں۔ لیکن جن ملائکہ کو یہ شرف حاصل ہے کہ کوئی اسم پاک کلّی ان میں جلوہ نما ہوا ہے ان کو مفضول بنانے کے لئے جزئی وجوہات ڈھونڈتا استدلال شعری کے قسم سے ہے۔

جن ملائکہ نے آدم علیہ السلام کو سجدہ کیا وہ ہمارے نزدیک ملائکہ عنصرین میں سے تھے اور ابلیس ان ہی میں سے ایک تھا۔ یہ ملائکہ فلکیین (ملائکہ علویہ) نہیں تھے۔ اس سے وہ عقدہ حل ہو جاتا

ہے جواس آیت کے پڑھنے سے پیدا ہوتا ہے کہ کان من الجنّ ففسق عن امر ربہٗ وہ جن کی قوم سے تھا اس لئے اس نے اللہ تعالیٰ کے حکم سرتابی کی ''الا ابلیس کی استثناء'' استثناء منقطع'' نہیں بلکہ متصل ہے۔

قلم ایک جوہر مجرد عن المادّہ ہے یا بشکل مجرد ہے جس کی حقیقت علم فعلی کا تمثل ہے، برخلاف اس کے لوح محفوظ علم انفعالی کا تمثال ہے۔ قلم بھی لوح کی طرح تمام ممکنات کی جہات اور حیثیات کا جامع ہے۔ زبان شرع میں کتابت کا لفظ اس لئے استعمال کیا گیا ہے کہ علم انفعالی کی بہ نسبت علم فعلی کے ساتھ اس کو زیادہ مناسبت ہے۔ عالم تخلیط میں قلم ہی کی جزئیات میں سے ایک قوم ہے جن کو کتبہ (کاتبان اعمال)، اور حفظہ کہتے ہیں۔ لوح کی جزئیات میں بعض ایسے امور ہیں جن کو الواح سے تعبیر کیا جاتا ہے (غالباً الواح موسیٰ علیہ السلام کی طرف اشارہ ہے) لوح کی یہ کیفیت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ میں سے ہر ایک اسم پاک میں ایک جداگانہ آیت ہے اور ہر آیت میں اس اسم پاک کی صورت لکھی ہے، نیز اس میں فاعل اور قابل کی جہاتِ متعددہ اور حیثیات مختلفہ دکھائی گئی ہیں، چنانچہ صورت ایک ہے لیکن جہات اور حیثیات مختلف ہیں لوح کا مفہوم تمام کائنات کو شامل ہے۔ ہاں یہ دوسری بات ہے کہ کسی سے ان جہات کا علم مخفی رہے۔ وہ صحیفے جو کاتبان اعمال کے سپرد ہیں ان کی شان یہ ہے کہ انسان سے جو قول یا فعل صادر ہوتا ہے اس کی صورت ان صحف میں ثبت ہوتی ہے جس میں کہ اس کی جہالت اور حیثیاتِ مختلفہ نشأۃ اخرویہ کے لحاظ سے نمایاں ہوتی ہیں۔ الواح کا علم فقط انبیاء اور حکماء ربانیین کے ذوق کا نتیجہ ہے۔

یاد رکھو جس طرح اولاد کا بدن اس کے والدین کے ابدان کا مجموعہ ہوتا ہے یعنی دونوں کے بدن کے خلاصہ اور جوہر سے اس کا بدن تکوین پاتا ہے، جیسے کہ کلام مجید میں اس کا ذکر مکرر آیا ہے اور رسول خدا صلعم نے بن مسعود اور بن سلام کی حدیث میں اس کی تشریح فرمائی ہے، اسی طرح اولاد کا نفس بھی ہر دو والدین کے نفوس سے متولد ہوتا ہے۔ (ان کے اخلاق اور خصائص نفسیہ کی جھلک اس میں پائی جاتی ہے)۔ تولید روحانی اور قوت مصودہ قدسیہ کی تکوین کو تولید جسمانی اور صورت جسمانیہ پر قیاس کرو۔ اگر کہیں قیاس کا گھوڑا جولان کرنے سے عاجز آجائے، کوئی ایسی صورت پیش آئے جو خلاف قیاس ہو تو وہاں پر کوئی مانع قدسی یا مرضِ روحی موجود ہوگا۔ کبھی ایسا بھی

ہوتا ہے کہ جو بات والدین کے نفوس میں اجمال کی بناء پر نظر سے اوجھل تھی، وہ ان کی اولاد میں نمایاں طور پر نظر آ جاتی ہے، کبھی یہ ہوتا ہے کہ نفس رحمانی کے اپنی پہلی کیفیت پر باقی رہنے کے باوجود ایک امر دوسرے امر کی صورت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ مثلاً بعض اوقات والدین کا غصہ یا ان کی جرأت بہت زیادہ ہوتی ہے لیکن انکی اولاد غصہ اور شجاعت میں ترقی پذیر ہونے کے بجائے علم و معرفت اور حکمت کے اعلیٰ ترین مقام پر فائز ہوتی ہے۔ بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ والدین کے نفوس میں مخفی طور پر بے شرمی کا مادہ موجود ہوتا ہے جو خیال اور قول تک محدود رہتا ہے، ان کے افعال اور اعمال میں اس کا اثر نمایاں نہیں ہوتا۔ لیکن ان کی اولاد میں بالفعل صفت خبیثہ ظہور پذیر ہوتی ہے۔ جو آدمی وسیع النفس اور عالی منش ہو، اس کی اولاد بھی اس محمود وصف سے موصوف ہوگی و علیٰ ہذا القیاس غلیظ النفس سے غلیظ النفس اور لطیف سے لطیف پیدا ہوگا۔ کوئی حکیم اگر یہ چاہا ہے کہ اس کا بیٹا الحی القیوم کی صفات کا مظہر ہو تو پہلے وہ خود اپنے آپ کو قانون حکمت کے مطابق ایسا ثابت کرے۔ انشاء اللہ تعالیٰ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگا۔

یہ بھی یاد رکھو کہ یہ صور جوہر یہ دوسری صور عرضیہ کے ظہور میں آنے کی مقتضی ہوتی ہیں۔ ہمارے نزدیک تحقیقی بات یہ ہے کہ وہ صورت جو کسی سفید چیز میں حلول کئے ہوئے ہے، اس کو اگر چہ وہم کا اتباع کر کے عامۃ الناس بیاض کہتے ہیں۔ ہم اس کو ابیض کہیں گے۔ ابیض کے مفہوم میں خصوصی طور پر ایک طرح کا تحقق پایا جاتا ہے۔ (جو بیاض کے مفہوم میں نہیں) اور یہی بات اس کو جوہریات اور مفہوماتِ انتزاعیہ سے ممتاز بناتی ہے۔ کیا تم نے کبھی اس امر پر غور نہیں کیا کہ جسمیت کا مفہوم کسی شخص کے ساتھ اس طرح گھل مل جاتا ہے کہ اس پر اول الذکر کو محمول کیا جا سکتا ہے۔ (مثلاً ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ شخص جسم ہے) ہم جانتے ہیں کہ بیاض کا مفہوم بھی کسی چیز کے ساتھ اس طرح گھل مل جاتا ہے البتہ اپنے تحقق کی مخصوص نوعیت کے لحاظ سے وہ جوہریات سے ممتاز رہتا ہے۔

فلکیات اور کواکب کے بارے میں صحیح مذہب یہ ہے کہ وہ عنصری چیزیں ہیں (۱)۔ سورج

---

(۱) جدید سائنس کا بھی یہی نظریہ ہے، اور جیسے کہ پہلے مذکور ہوا بعض آلات علمیہ مثلاً سپیکٹر وسکوپ وغیرہ کے ذریعہ اس کو اس طرح ثابت کیا گیا ہے کہ اس کے صحیح اور یقینی ہونے میں شبہ نہیں رہتا۔

اور چاند اور تمام اجرام فلکیہ اپنے اپنے مدار پر اس نظام کے مطابق گردش کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے ان کے طبائع کے مطابق مقدر فرمایا ہے۔ ان کی بھی ذوات ہیں اور ان میں روح ہے، چنانچہ آفتاب کا عرش کے نیچے سجدہ کرنا صحیح ہے لیکن اس سجدہ کی نوعیت اسی کے مناسب حال ہے۔ معدنیات (جمادات) نباتات، حیوانات اور امور جزئیہ کے متعلق جو کچھ ان فلاسفہ نے ذکر کیا ہے جو لایعنی مباحث میں مشغول رہتے ہیں وہ نظام طبائع کے لحاظ سے تو درست ہے لیکن اسماء پاک کی تجلیات کے لحاظ سے ان کے تکوین یعنی ظہور میں آنے کے اسباب کچھ اور ہیں جن کی تفصیل کرنا ذرا ٹیڑھی کھیر ہے۔ تمام عقول اور اعیان ان اسماء خاصہ کا عکس ہیں جن کا ظہور صفت ارادہ سے ہوتا ہے (یا بالفاظ دیگر اس کے فروغ ہیں)۔ اعیان میں سے ہر ایک عین کا ظہور متعدد مظاہر میں ہوتا ہے اور ہر ایک مظہر کے احکام جداگانہ ہوتے ہیں، کبھی وہ جوہر اور کبھی عرض ہوتا ہے اسی بناء پر ہم کہتے ہیں کہ عوائم باوجود ان کے تعدد اور وسعت کے ایک دوسرے کے متحادی ہیں، اور انواع کا مفہوم یہ ہے کہ وہ ان اعیان کی خصوصیات ہیں۔ اعیان ظاہرہ ان انواع میں تشخص پیدا کر کے ظہور افراد کا باعث ہوتے ہیں۔

حکیم کی رائے میں تمثلات کی تین قسمیں ہیں

(الف) وہ تمثل جو کسی جوہر کی خصوصیت میں واقع ہوتا ہے۔ اس قسم میں سے انطباقیات ہیں جن سے ہماری مراد وہ نفوس اور اجسام ہیں جن میں وحدت حقیقیہ پائی جاتی ہے۔ مثلاً یہ انسان اور وہ انسان۔ اسی طرح اندراجیات بھی اسی قسم میں شامل ہیں۔ مثلاً اعضاء آن حضرت صلعم فرماتے ہیں "جب تم کسی سے لڑو تو اس کے منہ پر تھپڑ مارنے سے پرہیز کرو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آدمی کے چہرہ کو اپنی صورت کے مطابق پیدا کیا ہے۔" چنانچہ یہ آنکھ "بصیر" کا اور یہ ہاتھ "صانع" کا تمثل ہے۔ (ب) وہ تمثل جو کسی "عرض" کی خصوصیت میں واقع ہوتا ہے۔ اس قسم میں بھی بعض انطباقیات اور بعض اندراجیات ہیں۔ انطباقیات سے ہماری مراد رنگ اور شکل اور شجاعت اور سخاوت وغیرہ اعراض ہیں جن کی کسی خاص عضو کے ساتھ تخصیص نہیں، وہ کل پر من حیث الکل طاری ہوتے ہیں۔ اندراجیات کی مثال حلق کے اندر آواز باصرہ میں بصارت، اور سامعیہ میں قوت سمع ہے۔ (ج) وہ تمثل جس کا ظہور عالم وجود ذہنی میں ہوتا ہے۔ اور عنقریب تم کو معلوم

ہوگا کہ اہل حکمت کے نزدیک یہ عالم ذہن کے پرے واقع ہے۔ اس تمثل کی پہلے ہر دو تمثلات کی طرح دو قسمیں ہیں، انطباقیات اور اندراجیات۔ پہلی قسم مثلاً اذعان اور دوسری جیسے تصدیقاتِ جزئیہ جن کا تعلق مخصوص احکام سے ہے۔ عین کے احکام کے متعلق ہمارے نزدیک ان کی عینیت کی حیثیت سے بحث کرنا مناسب ہے۔ کبھی تو یہ حیثیت جمالی ہوتی ہے جس کا طبعی اقتضاء یہ ہے کہ اہل اور مال واولاد اور دوستوں کے بارے میں اس سے سراسر جمالیات کا ظہور ہو، برخلاف اس کے کبھی یہ حیثیت جلالی ہوتی ہے جو جلالیات کے ظہور میں آنے کی مقتضی ہوتی ہے۔ یمن اور نحوست کا ظہور یہیں سے ہوا۔ جو تمثل تجرد اور تعرّی کے قریب تر ہے۔ وہ نفس انسانی، حیوانی، نباتی اور معدنی ہے۔ وحی میں ان کا ذکر اس لئے نہیں آتا کہ انبیاء اور حکماء کے نزدیک یہ متفرق تمثلات کی وہ صور جامعہ ہیں جن پر مستقل طور سے کوئی حکم شرعی مترتب نہیں ہوتا۔ نیز یہ صورتیں عالم حدوث میں اعیان کی قائم مقام ہیں سکوت کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ اس کا تعلق مسئلہ تقدیر کے راز سے ہے (جس کا افشاء ممنوع ہے۔)

اس کے بعد عالم تمثال ہے۔ مثال کا اطلاق ہمارے نزدیک تین مختلف معانی پر ہوتا ہے۔ ایک مثال مقید۔ اس سے مراد وہ صورت ہے جو وہم یا خیال یا ادراک میں منقوش ہوتی ہے۔ یہ انطباع اور انتقاش ارتقاء علمی کا جزئی ارتقاء ہے، اس میں اسماء پاک کی صور منقوش ہوتی ہیں۔ دوسری قسم مثال مطلق ہے یہ قسم اجسام کی اصل ہے۔ اس مثال کا انطباع پانی اور ہوا میں ہوتا ہے۔ اس لئے اس کو بجا طور پر اسماء پاک کا ظہور سمجھا جاسکتا ہے۔ یہ مثال جسم سے لطیف تر ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کی صورت خیالی ہے۔ تیسری قسم مثال متحقق ہے۔ یہ ایک امر جسمانی ہے جس کا ظہور خارج میں ہوتا ہے اور اس کو ثبات اور استقلال حاصل ہوتا ہے۔

اجسام اخرویہ اسی قسم کے اور اجسام دینویہ سے ان کو دو وجہوں سے امتیاز حاصل ہے۔ (۱) پہلی وجہ یہ کہ اجسام اخرویہ کا کمال بدرجہ اتم ہوتا ہے اور وجوباتِ مشمولہ کا ظہور بکثرت ہوتا ہے۔ (۲) دوسری یہ کہ اس عالم میں جو احکام انسان پر صادق آتے ہیں۔ وہ دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جن کا تعلق اس کی روح سے ہے اور جسم کو اس میں کسی قسم کا دخل نہیں۔ مثلاً سادہ طور پر ادراک عقلیہ۔ دوسری قسم وہ ہے جس کا تعلق بدن اور جسم سے ہے، روح کو اس میں دخل نہیں۔ مثلاً اٹھنا

بیٹھنا اور کسی جگہ میں سما جانا جس کو تحیّز کہتے ہیں۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ پہلی قسم کے ساتھ جسم کو کسی حالت میں موصوف نہیں کیا جا سکتا، خواہ عوام کا نقطۂ نظر لیا جائے یا خواص کا مسلک اختیار کیا جائے۔ مثلاً ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ میرا بدن یا میرا جسم تعقل و ادراک کرتا ہے۔ صرف یہ کہیں گے کہ میرے نفس ناطقہ نے اس کا ادراک کیا یا میرے قلب نے اس کا ادراک کیا۔ (۱) غزالیؒ کی کتاب الاحیاء میں دیکھ لیجئے۔ انہوں نے باب عجائب القلب میں یہ دلائل اس بات کو ثابت کیا ہے کہ روح اور نفس اور قلب دراصل ایک ہی چیز ہے (ومن شاء التفصیل فلیرجع الیه)۔ دوسری قسم کے ساتھ، عوام اور خواص دونوں کے مذہب کے مطابق ہم نفس کو موصوف کر سکتے ہیں۔ مثلاً آدمی کہہ سکتا ہے اور کہتا ہے کہ میں کھڑا ہوں (اس کی تحقیق بھی غزالیؒ کی احیاء میں پڑھ لیجئے جس کا ملخص یہ ہے کہ ''میں'' کا لفظ اور انسان کا نفس ادراً کہ مرادف الفاظ ہیں یا یوں کہئے کہ ''میں'' کا مشار الیہ انسان کا نفس ہے۔) کہہ سکتے ہیں کہ نفسي قائمة او نسمتي قائمة (واضح تر مثال انا قائم کی ہے)۔ بعینہٖ جس طرح یہ کہہ سکتے ہیں کہ بدني قائمٌ اور جسمي قائمٌ۔ برخلاف اس کے عالم اعلیٰ (عالم آخرت) میں سب احکام برابر ہیں۔ ایک کو دوسرے کے اوصاف سے موصوف کر سکتے ہیں۔ چنانچہ وہاں پر ہم یہ کہہ سکیں گے کہ میرا جسم اس بات کا تعقل اور ادراک کرتا ہے۔ بعینہٖ جس طرح یہ کہتے ہیں کہ میرا نفس اور قلب اس کا ادراک کرتا ہے۔ فلاسفہ نے اس عالم کا نام ''مینو'' رکھ چھوڑا ہے، اسی طرح بعض صوفیہ اس کو عالم مثال کہتے ہیں۔ مینو کی وجہ تسمیہ (غالبًا) یہ ہے کہ مینا شیشے کو کہتے ہیں جس میں منہ دیکھا جاتا ہے اور یہ لفظ اسی سے مشتق ہے۔ اب اگر ان کی (۱) مراد یہی دو فریق ہیں پھر تو درست ہے، ورنہ غلط ہے۔ بعض کے کلام سے یہ متبادر ہوتا ہے کہ مثال اوسط کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ ہر ایک جسم کے لئے پائی جائے۔ ہم اس کے قائل نہیں۔ وہ تمثّل جو سب سے زیادہ تجرد سے دور ہے وہ جسم حقیقی ہے، چنانچہ اس لحاظ سے سب اجسام میں تجرد سے بعید ترین اجسام عناصر ہیں، ان کے بعد بالترتیب افلاک اور معدنیات اور نباتات اور حیوانات اور انسان کا درجہ ہے۔

یاد رکھو اہل حکمت جزماً یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ جس طرح خارج میں ایک عالم ہے جس کا ادراک صرف آنکھ کر سکتی ہے یعنی روشنی اور رنگ و شکل اسی طرح ایک اور عالم ہے جس کا ادراک

کان تک محدود ہے۔ مثلاً اصوات، ایک اور عالم ہے جس کا ادراک قوت لامسہ کے لئے مخصوص ہے، قوت ذائقہ اور شامہ کا بھی اپنا اپنا دائرۂ عمل ہے، اسی طرح ایک عالم ہے جس کے ادراک کا ذریعہ حس مشترک ہے، ایک دوسرا عالم ہے جس تک وہم ہی کی رسائی ہوسکتی ہے۔ ایک تیسرا عالم ہے جو فقط قوت مدرکہ کا جولان گاہ ہے جیسے کہ تمہیں عنقریب معلوم ہوگا ان تینوں عوالم کے ادراک کا تعلق بدن ہوائی (نسمہ) سے ہے، جو اس کے خصائص میں سے ہے۔ اہل حکمت کو جب معلوم ہوا کہ نفس مجرد عن المادہ کے علاوہ ایک اور روح ہے جس کا ظہور اخلاط بدن سے ہوتا ہے اور وہ نفس مجردہ کے لئے حجاب اور لباس ہے (جس کے اندر وہ مستور رہتا ہے) اس لئے اس کا ضروری نتیجہ یہ ہے کہ وہ علم اور عمل دونوں پہلوؤں کو شامل ہو، تو انہوں نے یہ بھی یقین کرلیا کہ وہ محسوسات کی طرح خارج میں موجود ہے۔ جن موجودات کو ادراک کرنے کا ذریعہ صرف حس مشترک ہے۔ انہیں میں سے قوم جن ہے۔ یہ بات اکثر اذہان پر مشتبہ ہوتی ہے۔ چنانچہ ان کے حس مشترک میں اکثر خبط سا واقع ہوتا ہے اور وہ ان کو ان صورتوں میں متشکل دیکھتے ہیں جو آنکھ سے ادراک کرنے کے ذریعہ ان کے پاس مخزون و محفوظ ہیں۔ برخلاف اس کے اقویاء بغیر خبط کے ان کا ادراک کرتے ہیں۔ وضو اور غسل کا نور اور بے وضو رہنے اور جنابت کی ظلمت اسی قبیل سے ہے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ نزول شرع سے پہلے بھی وضو اور غسل نور محسوس کیا جاتا تھا جس کی شرع نے تصدیق کرکے اس کی توثیق کردی۔ اسی طرح بے وضو رہنے اور جنابت کی ظلمت بعثت سے پہلے ادراک کی جاتی تھی۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ دانشوران زمانۂ جاہلیت وضو اور غسل کے پابند تھے اور حدث یعنی بے وضو رہنے اور جنابت سے نفرت کرتے تھے۔ یہ ان کی فطرتی عصمت کا تقاضا تھا۔ جن موجودات کا ادراک قوت واہمہ تک محدود ہے وہ امور عزمیہ وجدانیہ ہیں مثلاً بھوک، پیاس، محبت و نفرت، اور غصہ وغیرہ۔ ابرار طریقت جس چیز کو نسبت کہتے ہیں اور ہر ایک طریقہ میں اس کی کیفیت مختلف ہوتی ہے وہ بھی اسی قسم میں داخل ہے۔ (کبھی تم نے اس پر بھی غور کیا کہ) جب کوئی ذکی الحس کسی مصیبت زدہ مغموم کے پاس بیٹھتا ہے تو اس پر بھی پریشانی طاری ہوتی ہے اس سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ فقط قوت عاقلہ پر غم اور پریشانی کا اثر نہیں ہوتا بلکہ قوتِ عاملہ پر بھی اس کا اثر پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغموم کی اشتہا ماری جاتی ہے اور اس کا رنگ زرد چڑھ جاتا ہے۔ دوسری

یہ بات کہ یہ عرض ایک امر موجود ہے جس کا ادراک قوت واہمہ تک محدود ہے۔ ملخص یہ کہ ایک عالم موجود جس کا ذریعۂ ادراک وہم ہے اور اس کا ادراک عوام کا حصہ ہے۔ خواص کو نماز اور روزہ وغیرہ عبادات تک کا نور محسوس ہوتا ہے۔ حکیم ربّانی بعض اوقات ان انوار میں فرق بھی محسوس کرتا ہے مثلاً جو نور نماز کا ہے وہ اس سے مختلف ہے جو روزہ یا تلاوت قرآن کا نور ہے۔ جن موجودات تک قوت مدرکہ ہی کی رسائی ہوتی ہے ان میں سے ہیولیٰ اور صورت عامہ اور زمان اور مکان ہے۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہی چار چیزیں ہیں جن کا ادراک قوت مدرکہ کرتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ کسی شخص جزئی یعنی فرد، صورت انسانیہ، اور صورت حیوانیہ سب کا ادراک قوت عاقلہ یعنی مدرکہ ہی کا کام ہے، آنکھ تو صرف ان کی ظاہری شکل وصورت کا احساس کر سکتی ہے۔ یاد رکھو کہ شرع کا تحقق اور تقرر اسم حادثات مجرد کے مطابق چونکہ انتہاء تک پہنچ چکا ہے اس لئے اس عالم میں اس کو تشریع کی حیثیت سے ثبات اور قرار حاصل ہو چکا ہے جس کا وجود عرضی ہے۔ یہ تحقق اس تحقق کے بالمقابل ہے جس کو بدن میں رسوخ حاصل ہے اور جیسے کہ ہم اشارہ کر چکے ہیں اسی تحقق سے وہمی اور حسّی تحقق ظہور میں آئے ہیں۔

کون وفساد کے مطلق اسباب کی دو قسمیں ہیں۔

(الف) صور اسماء کا پرتو افگن ہونا۔ کیوں کہ تم جان چکے ہو کہ ہر ایک ارتقاء جو ظہور میں آیا اس کی صورت مخصوصہ کا تعلق ایک خاص اسم پاک سے ہوتا ہے اور وہ صورت مخصوصہ کسی دوسرے اسم پاک کا مظہر نہیں ہو سکتی۔

(ب) دوسرا سبب اس ارتقاء کی خصوصیت ہے۔ کیونکہ تم جان چکے ہو کہ ہر ایک ارتقاء میں ایک ایسا امر موجود ہوتا ہے جس کے خواص جداگانہ ہوتے ہیں اور کسی دوسری چیز میں نہیں پائے جاتے۔ مثلاً جوہر اور عرض بلکہ ہر ایک ''نوع''۔ چنانچہ تمام ''انواع'' اپنے لوازم اور خصوصیات کے ساتھ اسماء پاک کے مطابق (جو ان کی اصل اور منبع ہیں) مختلف طور سے متشخص ہوتے ہیں۔ جزئیات کے اپنے تشخصات کے ساتھ ظہور میں آنے اور پھیلنے کا راز یہی ہے۔

حوادث یومیہ کے ظہور پذیر ہونے کے اسباب مختلف ہوتے ہیں۔ منجملہ ان مختلف استعدادات کا ظہور ہے جو کسی نوع میں مخفی طور پر موجود تھے۔ مثلاً آگ میں قوت احراق پائی جاتی

ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جس چیز سے وہ چھو جائے اس کو جلا ڈالتی ہے۔ اس قسم کے استعدادات کو قوائے طبیعہ کہتے ہیں۔ من جملہ اس متمثّل کے خواص ہوتے ہیں۔ مثلاً اسم پاک الحی کے ظہور اور تجلّی کا تقاضا یہ ہے کہ جو چیز اس کا مظہر قرار پائے اس میں کسی نہ کسی شکل میں حیات ضرور موجود ہوگی جو اس نوع کے ساتھ مخصوص ہے جس میں اس کا ظہور ہوا ہے اسم پاک الولی کا ظہور اور تجلّی اس بات کا مقتضی ہے کہ اس کے مظہر کو حُب مقدس کے ساتھ لوگ چاہتے ہوں، اس کے اپنے فضائل اور اخلاق کی خوبی ان کے مدِ نظر نہ ہو۔ چنانچہ اگر لوگ کسی وجہ سے (اپنے ذاتی اغراض کی بناء پر) اس کو مبغوض بھی سمجھتے ہوں۔ لیکن ان کے صمیم دل میں اس کی محبت موجود ہوتی ہے۔ من جملہ کسی صاحب ارادہ کی وہ تحریک قاہر ہے جو نفس مجرد یا غیر مجرد سے صادر ہو۔ اگر اس کا ظہور نسمہ سے ہوا ہے جس سے مراد وہ نفس انسانی ہے جو لباس ادراک میں ملبوس ہے تو اس کا نام ہمت ہے اور اگر اس کا ظہور کسی ایسے نفس سے ہوا ہے جو متخلق باخلاق اللہ تعالیٰ ہے تو اس کو خرق عادت (معجزہ اور کرامت) کہتے ہیں۔ من جملہ کسی ایسی صورت کا تمثّل ہے جس کا اندراج صحیفۂ اعمال میں ہو، مثلاً دعا، عمل صالح یا قبیح۔ ساتھ ہی تمثّل نوعی اور معدات سابقہ اور اس شخص کے کمال یا عدم کمال کو بھی ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ اس تمثّل میں اس قسم کے امتزاجات پائے جاتے ہیں جو عالم رؤیا میں ہوتے ہیں۔ اسی لئے آپ فرماتے ہیں صلعم کہ لوگ سوئے ہوئے ہیں، جب وہ مریں گے تب بیدار ہوں گے (۱)۔

اگر قوم سبا ساحل بحر ہند پر آباد نہ ہوتی تو ان کا عذاب، غرق نہ ہوتا۔ کسی اور قسم کا عذاب ان پر نازل ہوتا جو ان کے ماحول کے مطابق ہوتا۔ (فرعون کو بحیرۂ قلزم میں غرق کرنا اس کی واضح تر مثال ہے) اسی طرح لوط اور شعیب علیہما السلام کی قوم کو جس عذاب کے ساتھ ہلاک کیا گیا ماحول کی نوعیت ہی کا تقاضا تھا۔ (قوم عاد کی ہلاکت کا باعث آندھی کا شدید ترین طوفان تھا، کیونکہ وہ ایک ایسے ملک میں رہتے تھے۔ جہاں طوفان آئے دن بکثرت آتے تھے۔ ان کا علاقہ کا نام

(۱) معدّات سابقہ سے شاہ صاحب یہ مراد لیتے ہیں کہ جو واقعات ظہور میں آتے ہیں ان کی کیفیت ان اسباب ظاہری کے مطابق ہوتی ہے جو اس واقعہ کے ماحول کے مناسب اور اس ماحول میں موجود ہوں۔ چنانچہ آگے کی عبارت میں اس کی مثالیں بیان کی ہیں۔

احقاف مذکور ہے)معدّات کا لفظ ہم نے اسی مطلب کے لیے استعمال کیا ہے۔

اگر تم چاہتے ہو کہ اس بات کا راز تم پر منکشف ہو جائے تو یہ بات یاد رکھو کہ ایک ایسے عالم کا ہونا ضروری ہے جس میں لوگوں کے اعمال محفوظ ہوں، خواہ یہ عالم مجرد ہو یا تمثّل مجرد۔ اسی کا ایک جزو وہ ہے جس میں ایک ایک فرد کے اعمال محفوظ رہتے ہیں۔ اس سے ہماری مراد وہ صحف ہیں جن کی کتابت کو باری تعالیٰ نے کلام مجید میں ملائکہ کی طرف منسوب فرمایا ہے، کیوں کہ یہ کام انہیں کے سپرد ہے۔ اسی عالم کا ایک حصہ وہ ہے جس میں کہ قوم اور ملک کے مجموعی اعمال محفوظ کیے جاتے ہیں۔ اسی طرح اس کا حصہ وہ بھی ہے جو بنی آدم کے تمام افراد کے سب اعمال کا مخزن ہے۔ پہلی قسم کے اعمال کا نتیجہ فتن جزئیہ ہیں جن کا تعلق افراد سے ہوتا ہے۔ اس آیت میں اسی کا اشارہ ہے وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْ عَنْ كَثِيْرٍ ''جو مصیبت بھی تم پر نازل ہوتی ہے، وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہے اور اللہ تعالیٰ بہت (قابل سزا اور مستحق پاداش) باتوں کو معاف بھی کر دیتا ہے۔'' دوسری قسم کی مثال حضرت ہودؑ۔ صالحؑ۔ شعیبؑ۔ اور لوط علیہ السلام کی اقوام پر عذاب کا نازل ہونا ہے۔ قوم ثمود کی اونٹنی ان کی شرارتوں کا ایک مجسمہ تھے۔ جب انہوں نے اس کو قتل کیا تو ان کی یہ حرکت شنیعہ شرور اور فساد پھیلنے کا باعث ہوئی۔ تیسری قسم کی توضیح دجّال کے واقعہ سے ہوتی ہے۔ چنانچہ اس کی حقیقت یہ ہے کہ قوم نوح اور قوم ہود اور قوم صالح اور دیگر اقوام مُعذبہ کے اعمال ایک صحیفۂ عام محفوظ کیے گئے۔ اور جب بنی اسرائیل میں فساد اور معصیت کی کثرت ہوئی تو چوں کہ یہ ایک بہت بڑی قوم تھی جن میں ہزاروں انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوئے اور ان کی قوم میں ہر ایک دور کے اندر حافظ شریعت اور قائم بالامر آتے رہے ہیں، اس لئے وہ تمام شرور ایک (خبیث مخبث) آدمی کی شکل میں مجسم ہوئے۔ (جس کو دجّال سے تعبیر کیا گیا ہے یا موسوم کیا گیا ہے۔)اور قیامت تک کے شرور اور فسادات اس کے ساتھ ملحق ہو گئے (اس کی شخصیت اور شرور آپس میں لازم ملزوم ہیں) اس کے مرنے پر شرور اور فساد کا سرچشمہ پھوٹ پڑے گا۔ تمام دنیا میں بدعملی اور بدعقیدگی پھیل جائے گی۔ جس کے بعد قیامت قائم ہوگی۔ یہ جو حدیث میں آیا ہے کہ نوح علیہ السلام نے بھی اپنی قوم کو دجّال کے آنے سے ڈرایا تھا۔ اس کا یہی راز ہے۔ اچھی طرح سمجھ لو۔

خلاصہ یہ کہ جب عالم حادث ظہور میں آیا تو ضرورۃً اس کے ساتھ ایک عالم مجرد کا بھی ظہور

ہوا جس میں اس عالم حادث کے لوگوں کے اعمال اور اخلاق محفوظ کیے جاتے ہیں۔ یہ مسئلہ علم تکوینات کا بڑا رکن ہے۔ لیکن غفلت کا بُرا ہو۔ لوگوں نے اس کو سمجھنے کی بہت کم کوشش کی ہے۔ تقدیر ایزدی جل شانہٗ کی دو قسمیں ہیں۔ (الف) تقدیر مبرم۔ (ب) تقدیر مُعلق۔ مؤخر الذکر کا موجب استعداد شخصی ہے اور اسی میں دعا اور تدبیر نافع اور مفید ثابت ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے اوّل الذکر کا باعث تمام عالم کی مجموعی استعداد ہے، اس میں کبھی تخلّف واقع نہیں ہوتا۔ حذیفہ بن اسید کی روایت ہے۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں جب نطفہ پر چالیس دن گذر جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اس کے پاس اپنا ایک فرشتہ بھیجتا ہے کہ جنین کی تصویر بندی کرے، اس کے کان اور آنکھیں اور اس کا گوشت پوست اور ہڈیاں بنائے۔ جب وہ یہ فرائض انجام دے چکتا ہے تو بارگاہِ الٰہی و تقدس میں عرض کرتا ہے۔ بار خدایا! کیا یہ جنین نر ہوگا یا مادہ؟ اس کے متعلق اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے فیصلہ فرماتا ہے، اور فرشتہ اسی کے مطابق لکھتا ہے۔ پھر وہ عرض کرتا ہے کہ اس کی عمر کیا ہوگی؟ اس کے متعلق بھی اللہ تعالیٰ اپنے ارادہ کے مطابق فیصلہ صادر فرماتا ہے اور فرشتہ اس کو لکھ لیتا ہے۔ پھر وہ فرشتہ اس لکھے ہوئے صحیفہ کو لیکر نکلتا ہے، اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے مقدّر فرمایا ہوتا ہے اس میں کچھ بھی کمی بیشی نہیں کرتا'' یہ حدیث صحیح مسلم میں ہے۔

یاد رکھو عین ثابتہ اگرچہ تمام جہات اور حیثیات مختلفہ پر مشتمل ہے۔ لیکن اس کے احکام اس وقت نمایاں ہوتے ہیں جبکہ اس کا ظہور اس نشأۃ میں ہوتا ہے۔ اس لئے ہمارے نزدیک بعض صوفیاء کا یہ کہنا غلط ہے کہ جن باتوں پر عین ثابتہ مشتمل ہوتی ہے مستقبل قریب میں ان کا ظہور میں آنا ضروری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عین ثابتہ کے احکام اسماء پاک کے آثار ہیں جو اس عین ثابتہ کے قوام کا موجب ہیں۔ ان احکام کا ظہور ان استعدادات حادث اور معدّات و اسباب لاحقہ پر موقوف ہے جو عین ثابتہ کے ہر ایک مظہر میں نمایاں ہوتے ہیں۔ بااین ہمہ ظہور کے مراتب مختلف ہیں، اور وہ احکام جو اسماء پاک کے آثار ہیں اور عین ثابتہ میں مخفی رہتے ہیں۔ ضرورتِ اطلاقیہ کا تقاضہ ہے۔ اسی بناء پر ہم کہتے ہیں کہ ان کا ظہور استعدات حادث اور معدّات و اسبابِ لاحقہ پر موقوف ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حکماء کی دعا ان کے اشراق علمی کا نتیجہ ہوتی ہے، اگرچہ اس کی تفصیل کا ذریعہ عین ثابتہ ہے۔ نصوص کا متبادر مفہوم اس کے خلاف ہے (؟) یاد رکھو

بعض اشیاء ایسی ہیں جن کی صورت کا تعیّن اُن کے دور سے پہلے ہوتا ہے، برخلاف اس کے بعض دوسری اشیاء میں ایسا نظر آتا ہے گویا امر مستانف ہے۔ (یعنی ان کے معرض وجود میں آنے سے پیشتر ان کی صورت کا تعیّن نہیں ہوتا)۔ اسی طریقہ پر وہ عقدہ حل کیا جا سکتا ہے، جو اس حدیث کے سننے سے پیش آتا ہے، رسول خدا صلعم فرماتے ہیں۔ اگر بقائے دنیا کا صرف ایک دن بھی رہتا ہو تو اس ایک دن کے اندر اللہ تعالیٰ میرے خاندان نبوت سے ایک ایسے شخص کو مبعوث فرمائے گا جو زمین کو عدل وانصاف سے اس طرح بھر دے گا جس طرح وہ ظلم اور ستم کے اعمال سے بھر گئی تھی۔'' اس حدیث کو ابوداؤد نے نقل کیا ہے۔ اس حدیث کا ملخص یہ ہے کہ مہدی کا ظہور بہر حال ہونے والا ہے، یہ ایک ناگزیر واقعہ ہے۔ البتہ اس کے ظہور میں آنے کا وقت گردوپیش کے حالات اور معدات واسباب حاضرہ پر منحصر ہے۔ آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول بھی جو آپ نے ام المؤمنین امّ حبیبہ سے فرمایا تھا اسی قبیل سے ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ایسی باتوں کا سوال مت کرو جن سے وہ فارغ ہو چکا ہے (قضاء مُبرم کے ساتھ مقدر فرما چکا ہے۔) اس سے درجاتِ جنت کی بابت درخواست کرو۔''

اس تمہید کے بعد اب ہم پھر اصل مضمون کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ جب جنین پر مدت گذر چکی ہے اور اس کے اخلاط بدن کا مزاج متعین ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس فرشتہ کے سینہ میں جس کے متعلق اس جنین کی تدبیر ہے تجلّی فرماتا ہے کہ مثلاً یہ جنین مذکر ہو۔ یہ اس حالت میں ہوتا ہے جبکہ صنفی تعلق کے وقت شوہر کا مادّہ تولید غالب ہو، اور اگر بیوی کا مادّہ تولید غالب ہو تو اس فرشتہ کے دل میں یہ القا کیا جاتا ہے کہ وہ جنین مادہ ہو۔ اور جنین کی طبیعت میں مادہ تخلیق کی شدت اور ضعف اور صلابت اور ملائمت کو ملحوظ رکھ کر اللہ تعالیٰ کی تجلّی جس کا ہم نے ابھی ذکر کیا۔ اس کی عمر کی تعیین کرتی ہے۔ یہ اس لئے کہ ہر ایک چیز ایک خاص وقت میں مقدار مخصوص پر ظہور میں آتی ہے، معارج کمال میں ترقی کر کے اس کا انحطاط اور زوال شروع ہوتا ہے، اور بالآخر اس کو فنا کا مرحلہ پیش آتا ہے۔

اس مقدار مخصوص کو انواع میں سے ہر ایک نوع کے لئے تحدیدِ کلّی کے طور پر اور ہر ایک نوع کے افراد کے لئے تحدیدِ جزئی کے طور پر محدود کر دیا گیا ہے۔ مؤخر الذکر تحدید اس کی نوع کے آئینہ

میں (آئینہ کی صورت مرئیہ کی طرح) منقوش ہوتی ہے۔ جو عمر جنین کے لیئے اس وقت مقرر کی جاتی ہے اس کو کلام مجید میں ''اجلِ مسمّٰے'' کہا ہے اور اس عمر کو وہ لامحالہ پورا کر کے رہے گا۔ بشرطیکہ خارج میں بواعث اور موانع اس کے خلاف نہ ہوں۔ بواعث میں سے نیکی کرنا اور رشتہ کا جوڑنا یعنی صلۂ رحم کرنا ہے جن کی بدولت عمر میں اضافہ ہوتا ہے۔ (جیسے کہ حدیث میں آیا ہے، برخلاف اس کے ظلم اور قتل، تنقیص عمر کا باعث ہوتے ہیں۔ قرآن مجید میں ہے۔ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَ يُؤَخِّرْكُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ''اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو (نوح علیہ السلام اپنی قوم سے خطاب کرر ہے ہیں، اللہ تعالیٰ تم کو بخش دیگا اور میعاد مقررہ تک تم کو مہلت دے گا''۔

یہ مرحلہ طے ہونے کے بعد بلحاظ احوال آخرت کے سعادت اور شقاوت لکھی جاتی ہے۔ یہاں پر سعادت اور شقاوت کا مفہوم تمام اعمال واخلاق اور حسن خاتمہ یا سوء خاتمہ کو شامل ہے۔ لیکن یاد رکھو اس کتابت سے مراد امر کلی ہے، سعادت اور شقاوت کا تشخص معدّات اور اسباب خصوصیہ پر منحصر ہے۔ اس کے بعد رزق لکھے جانے کا مرحلہ پیش آتا ہے۔ یہ کتابت بھی ایک امر کلی ہے۔

یاد رکھو بعض باتیں ایسی آسان ہوتی ہیں کہ برائے نام اسباب پیدا ہو جانے پر وہ ہو جاتی ہیں، برخلاف اس کے بعض امور ایسے مشکل ہوتے ہیں کہ ان کے تکوّن اور ظہور کے اسباب بہ مشکل فراہم ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایک حدیث میں ہے۔'' میں نے کسی چیز کے بارے میں اتنا تردّد نہیں کیا جس قدر تردّد مجھ کو کسی عبد صالح کی روح قبض کرنے کے متعلق پیش آتا ہے، وہ (طبعًا) موت کو ناپسند کرتا ہے اور میں یہ نہیں چاہتا کہ وہ ناخوش ہو۔ حالانکہ موت کا پیش آنا لازمی ہے'' اس کا مفہوم ہمارے نزدیک یہ ہے کہ اسماء پاک کے تقاضاؤں میں تصادم ہوتا ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ ہر ایک اسم پاک کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے مظہر خاص میں اس کے احکام کا ظہور ہو۔ اب چونکہ اللہ تعالیٰ کو اپنے عباد صالحین سے محبت ہے اور وہ ان کی مرضی کے خلاف احکام اور واقعات کا ظہور میں لانا پسند نہیں فرماتا، جیسے کہ عنقریب 'وجاہت' کے متعلق بحث کرتے ہوئے ہم تمہیں بتائیں گے، اس لئے وہ مؤمن کو اس کی مرضی کے خلاف موت دینا نہیں چاہتا لیکن اس

کے اسم اعظم کا تقاضا یہ ہے کہ انسان کے تمام افراد موت کا ذائقہ چکھیں اس لئے اس کو موت دینا لازم ہے۔

ابوسعید خُدری کی روایت سے صحیح بخاری میں ایک حدیث ہے ابوسعید کہتے ہیں کہ ایک دن آپ منبر پر تشریف فرما تھے اور ہم (صحابہ) آپ کو حلقہ میں لئے ہوئے تھے۔ آپ نے ارشاد فرمایا۔ سب سے زیادہ خوف مجھے اس بات کا ہے، کہ ملکوں کو فتح کر کے تم دنیا کی شادابی اور اس کی رونق پر ریجھ جاؤ گے۔" ایک شخص نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! کیا خیر اور بھلائی سے بھی شر پیدا ہوسکتا ہے؟ یہ سن کر آپ چُپ رہے (اور وحی کا انتظار کرنے لگے)۔ صحابہ نے اس شخص کو ملامت کیا کہ یہ تم نے کیا حرکت کی کہ رسول خدا صلعم ناراض ہوکر خاموش ہوگئے۔ اسی اثناء میں ہم نے قرائن سے معلوم کیا کہ آپ پر وحی نازل ہورہی ہے چنانچہ آپ نے اپنی پیشانی مبارک سے پسینہ کو پونچھتے ہوئے فرمایا کہ وہ سائل کہاں ہے۔ آپ کے اندازِ تکلّم سے معلوم ہوتا تھا کہ آپ نے اس کے سوال کو بنظر استحسان دیکھا۔ بہرحال آپ نے یہ فرمایا' یہ سچ ہے کہ خیر سے شر پیدا نہیں ہوتا۔ (لیکن اس کے غلط استعمال سے برے نتائج ظہور میں آتے ہیں جس کی مثال آپ نے یہ بیان فرمائی کہ) جو سبزہ موسم بہار میں اگتا ہے جانوروں کے لئے اس کا چرنا وبال جان ہوتا ہے، جس سے وہ ہلاک ہوتے یا ہلاکت کے قریب ہوجاتے ہیں۔ اس آفت سے صرف وہ جانور محفوظ رہتا ہے جو نورُوئیدہ سبزہ کا کھانا اور ہضم کرنا جانتا ہے۔ وہ اس وقت تک چرتا ہے کہ اس کی کھوکھیں (پیٹ بھر جانے کی وجہ سے) باہر نکل آتی ہیں۔ اس حالت پر پہنچ کر وہ دھوپ سینکنے لگتا ہے جس سے اس کو خوب کھل کر پاخانہ آجاتا ہے اور پیشاب بھی کر لیتا ہے۔ اس کے بعد وہ پھر چرنے لگتا ہے" الی آخرالحدیث۔ یہ سوال و جواب جس کا ذکر اس حدیث میں اہل حکمت ہی کے مسلک پر ٹھیک بیٹھ سکتا ہے۔ سوال کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت جو اس کی صفت جمال کا تمثّل ہے کس طرح جلالیات کے ظہور میں آنے کا موجب ہوسکتی ہے جس سے آدمی خائف ہو، کیوں کہ تمثّل ہمیشہ اپنی اصل کے مطابق ہوتا ہے۔ جواب کا ملخص یہ ہے کہ بے شک یہ ناممکن ہے کہ عین اس جمالی تمثّل سے جلالیات کا ظہور ہو، وہ تو سراسر خیر و برکت ہے۔ لیکن جو حرص اور فزون طلبی شخصِ قابل (بمعنی قبول کنندہ) میں ہے۔ اسی سے شر کا ظہور ہوتا ہے یہ شر کا ظہور یا تو اس اسم پاک کے

تقاضا کے مطابق ہوتا ہے جس کا تمثل وہ نعمت ہے یا کوئی اور باعث ہوتا ہے۔ جماعت حکماء کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ سراسر خیر و برکت ہے، اس میں کسی قسم کی برائی نہیں۔ کیونکہ وجود ہی ہر ایک طرح کی خیر و برکت کا منبع ہے۔ شر کا ظہور ان عدمات کے ہجوم کا نتیجہ ہے جو صور مزاجیہ میں پائی جاتی ہیں۔ بالفاظ دیگر فقط عالم تخلیط میں اس قسم کے ظہورات ہوتے ہیں۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے۔ **فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا** ''اللہ تعالیٰ کی اس فطرت کو ہاتھ سے نہ جانے دو جس پر کہ اس نے سب لوگوں کو پیدا کیا'' رسول خدا صلعم کی حدیث ہے۔ ''ہر ایک بچہ فطرتِ اسلام پر پیدا کیا جاتا ہے۔ پھر اس کے ماں باپ ہی اس کو یہودی اور عیسائی اور آتش پرست بنالیا کرتے ہیں۔''

یاد رکھو! صورت انسانیہ (انسان کی صورت نوعیہ) کا اقتضاء ذاتی یہ ہے کہ جسم عنصری میں اس کی مخصوص ہیئت ہو۔ اس کا مستوی القامت ہونا اس کے بدن پر اس کے جسم کو ڈھانکنے والے بالوں کا نہ ہونا، اس کھوپڑی کی گولائی (اور اس کے دماغ کی خاص وضع اور مقدار) اس کے ناخنوں کی چوڑائی، اس کا نطق اور ضحک، اس کی بینائی اور اس کی قوت سماعت، اس کا بھوک اور پیاس کو محسوس کرنا اور دیگر احساسات، بالفاظ دیگر اس کے تمام خط و خال اور اوصاف و خصائص جن کا تعلق جسم سے ہے اس کی صورتِ نوعیّہ کا تقاضا ہے۔ اسی طرح اس کے باطن کی بھی ایک ہیئت خصوصیہ ہے جس کا تعلق نسمہ سے ہے۔ چنانچہ خوشی اور ناخوشی، رضاؤ غضب، عاقبت بینی، اور بواطن اشیاء کی کیفیت کا ادراک کرنا اسی ہیئت باطنیہ کے اوصاف اور خصائص ہیں اس قدر بات جو مذکور ہوئی، عوام اور خواص سب سمجھتے ہیں۔ لیکن خواص یہ بھی جانتے ہیں کہ ان ہی اوصاف و خصائص مذکورہ کی طرح اللہ تعالیٰ نے ہر ایک نسمہ کے اندر عفت اور فراست اور تقرب الی اللہ تعالیٰ کی قسم کے اوصاف بھی ودیعت فرمائے ہیں۔ تمام احکام اور تعلیمات شرعیہ بالا جمال اسی صنف میں داخل ہیں۔ قرب الوجود کا مفہوم یہ ہے کہ قدّوسیت کی جہت اور حیثیت کو ملحوظ رکھ کر ان امور کو درجۂ کمال تک پہنچایا جائے اور ایمان کا مفہوم یہ ہے کہ اس نشاۃ تخلیطیہ کی حیثیت سے ان میں کمال حاصل کیا جائے۔

ان خصوصیات نوعیہ سے بے بہرہ رہنے کے دو سبب ہیں۔ ایک یہ کہ مادۂ قابلہ میں نقص واقع ہونے کی وجہ سے ناقص صورتوں کا اس پر افاضہ ہو۔ اس کی مثال یہ ہے کہ انسان کے بعض

افراد ولادت کے وقت ماں کے پیٹ سے اندھے یا گونگے باہر آتے ہیں یا ان کے دم لگی ہوئی ہوتی ہے یا ناک کے بجائے لمبی تھوتھنی ہوتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح بلحاظ صفات باطنیہ کی بعض لوگ پیدائشی طور پر کافر اور جاہل ہوتے ہیں، یا ان میں عیش پرستی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے۔ جس لڑکے کو خضر علیہ السلام نے قتل کیا تھا وہ اسی طرح کا تھا۔ دوسرے یہ کہ اس کے اپنے افعال کج اور کجروی کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ اس کے اقتضاء نوعی کو پورا نہیں ہونے دیتا۔ مثلاً بعض لوگ ارادۃً ریاضت کے طور پر (غلط فہمی سے اس کے قرب الٰہی کا موجب سمجھ کر) پانی پینا قطعاً چھوڑ دیتے ہیں جس کا نتیجہ (قوانین قدرت کے مطابق) یہ ہوتا ہے کہ اس کے مزاج میں غیر معمولی بے اعتدالی پیدا ہو کر وہ خمیدۂ قامت ہو جاتا ہے، اس کا سر ٹیڑھا ویڑھا اور اس کی آنکھوں کی بصارت زائل ہو جاتی ہے۔ اوصاف باطنی کے لحاظ سے مثلاً ایک شخص کو اس کے ماں باپ یہودیت کی تعلیم دیتے ہیں جس کے نتیجہ کے طور پر اس میں ایک ایسی ذہنیت پیدا ہو جاتی ہے جو اس کو حق سے رو گردانی پر آمادہ کرتی ہے۔ بحالیکہ اس حق کی نوعیت یہ ہوتی ہے کہ عقل سلیم اس کو فوراً قبول کر لیتی ہے کیونکہ اس کی سچائی بدیہات کی طرح ایک کھلی حقیقت ہوتی ہے۔ اس تقریر بالا سے دو جلیل القدر نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ نظر اور استدلال عقلی کا طریقہ ایک بدعت ہے جس کو ناقص الخلقت اور فاسد المزاج لوگوں نے اختراع کیا ہے۔ دوسرے یہ کہ انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام کی تصدیق الہام باطنی اور نوعیت مزاج کا نتیجہ ہے۔ متکلمین کا یہ کہنا غلط ہے کہ لوگ بعض ایسی بدیہیات کا بھی انکار کر لیتے ہیں جو ان کے سامنے حاضر اور موجود رہتی ہیں مثلاً وجود اور علم وغیرہ۔ اللھم ربنا لک الحمد انت نور السموات والارض و من فیھن ولک الحمد انت قیام السموات و الارض و من فیھن و لک الحمد انت ربّ السموات والارض ومن فیھن.

............☆☆☆............

چوتھا خزانہ

نشأۃ عامیہ اور نشأۃ کمالیہ کے متعلق اصول کلّیہ کا بیان

عام طور پر مطلق علم کے مفہوم کو چار اقسام میں منحصر سمجھا جاتا ہے۔(۱) حواس خمسہ کے ذریعہ جو احساسات حاصل ہوں، اس کا تعلق لطیفۂ قالبیہ یعنی جسم سے ہے۔(۲) تخیّل۔ جس کا تعلق لطیفۂ خیالیہ سے ہے۔ اس کا کام یہ ہے کہ کسی امر غالب (غیر مرئی) کو رنگ و شکل کے قالب میں ظاہر کرنے کی طرف متوجہ ہو۔(۳) توہم۔ اس کا تعلق لطیفۂ واہمہ سے ہے۔ اس کا کام وہ جزئی ادراکات ہیں جن کا تعلق محسوسات سے ہے ان کا ادراک کرنا اور ان کو محفوظ رکھنا، اس کے فرائض میں داخل ہے۔(۴) تعقل۔ اس کا تعلق لطیفۂ نفسیہ سے ہے۔ اس کا کام کلیّات طبیعہ اور امور مجردہ کا ادراک کرنا ہے۔ لیکن ہم یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں کہ اس تعقل کا تعلق نفس سے ہے، بلکہ اس کا تعلق اس لطیفۂ ادراکیہ سے ہے، جو عالم تحیّز میں نفس کا خلیفہ اور تمام جسمانیات میں اس کے قریب تر ہے، اس نظریہ کا ثبوت ہمارے پاس یہ ہے کہ تعقل کے اگر یہی معنی لئے جائیں جو بعض دوسرے لوگ کہتے ہیں تو بعض اوقات اس کا مفہوم کاذب ثابت ہوتا ہے لیکن مجردات میں کذب کا دخل نہیں (اس لئے ہم نے اس بات کا انکار کیا ہے کہ اس کا تعلق نفس سے ہے)۔

اگر چہ علم کے یہ ہر چہار اقسام ایک مکان خاص کے ساتھ اختصاص رکھتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک ہمہ پوش لباس ہے جو تمام تر نفس کو اوڑھے ہوئے ہے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ تمام جسم پر بھی وہ مشتمل ہو، اس کا ثبوت یہ ہے کہ جیوش طبیعہ خیال اور وہم سے مغلوب رہتے ہیں، جیسے کہ رضا و غضب اور حب و بغض یا گھبراہٹ طاری ہونے کی حالت میں تم دیکھتے ہو۔ اسی بات کو

ملحوظ رکھ کر امام اہل سنت (ابوالحسن اشعریؒ) نے اس بات کے تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے کہ ان ادراکات کا تعلق خاص خاص جگہوں سے ہے۔ خلاصہ یہ کہ انہوں نے (فلاسفہ نے) مُدرکہ اور وہم اور تخیل کو قوت عاقلہ کے ساتھ مخصوص سمجھا ہے، لیکن ہم نے قوت عاقلہ اور قوت عاملہ دونوں کے ساتھ ان کا تعلق ثابت کیا ہے اسی طرح ان کا قول یہ ہے کہ نفس مجرد تمام کلیات کا ادراک کرتا ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک نفس کو علم حضوری کے ذریعہ صرف اپنے نفس کا ادراک حاصل ہوتا ہے اتنی بات ضرور ہے کہ وہ تمام قوائے عاقلہ اور عاملہ کی اصل اور ان کا منبع ہے، اگر اس راز کی حقیقت معلوم کرنا چاہو تو اس بات کو یاد رکھو کہ جب اللہ تعالیٰ نے کائنات کو پیدا کرنا چاہا تو پانی پر (جو تخلیق کائنات کا مادۂ عام ہے) مختلف صورتیں افاضہ فرمائیں۔ جن میں سے بعض صور نوعیہ ہیں اور بعض شخصیہ۔ وہ صورت شخصیہ جو کسی صورت نوعیہ کے اندر منقوش ہوتی ہے، اس سے مراد ایک فرد معیّن ہے یہ صورتیں اس شخص کے ظہور میں آنے کے وقت سے ابد تک باقی رہتی ہیں، اور ان صورتوں کی قائم مقام دوسری صورتیں ہوتی ہیں جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ ان کی امداد فرماتا ہے۔

ن جملہ ان قائم مقام صورتوں کے ایک تو وہ جسم ہے جس کا تکوّن محسوس طور پر عناصر سے ہوتا ہے۔ نیز وہ جسم جس کا تکوّن غیر محسوس طور پر عناصر سے ہوتا ہے۔ تشخص (اور تعین) کا انحصار پہلے حالتِ حیات میں اور ثانیاً حالت ممات میں اسی پر ہے۔ اس انحصار کا باعث یہ ہے کہ کوئی ایسی دوسری چیز موجود نہیں جس کی طرف اس کو منسوب کیا جائے۔ اور یہ تو تم جانتے ہو کہ اس کا اقتضاء ذاتی یہ ہے کہ کسی دوسری چیز پر اس کا اعتماد ہو۔ یہ تشخص اور تعین کسی چیز سے اس وقت تک تجاوز نہیں کرتا جب تک کوئی دوسری چیز اس کے بدل کے طور پر ظہور میں نہ آئے۔ دوسری چیز کا ظہور نہ ہو تو اس میں بھی تغیر و تبدل واقع نہیں ہوگا۔ یادرکھو یہ بدن جو غیر محسوس ہے بدن محسوس کے ساتھ متحد ہے۔ من جملہ ان قائم مقام صورتوں کے ان اعراض کا مجموعہ ہے جن کے ذریعہ آنکھ اس شخص معین کا ادراک کرتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ بدن تین ہیں اور وقتاً فوقتاً ایک ان میں سے دوسرے کے ساتھ تبدیل ہوتا رہتا ہے جو اس کے مناسب حال ہو لیکن صورت شخصیہ بحال خود باقی رہتی ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ صورت بدل جانے پر بھی ہیولیٰ باقی رہتا ہے اور اس کا اعتماد اسی صورت متبدّلہ پر ہوتا ہے، بدن خواہ کوئی ہو، اس کا کوئی جز بھی مٹنے نہیں پاتا جب تک اس کا بدل ظہور میں

نہ آئے۔ بایں ہمہ اوّلین اعتماد غیر محسوس بدن ہوائی پر ہوتا ہے، جس کا انحصار عناصر متبدّ لہ پر ہے، اسی طرح یہ بدن بدن عرضی پر موقوف ہے یا یوں کہو کہ وہ دونوں لازم ملزوم ہیں۔

صورت شخصیہ دراصل نفس ناطقہ کے مرادف ہے۔ لیکن اس میں کامل طور پر تجرّد عن المادّہ نہیں پایا جاتا۔ تاہم ہم نے اس کتاب میں اس کو مجرد کہا ہے تاکہ ابدان ثلاثہ سے اس کو امتیاز حاصل ہو۔ یہ جو حدیث میں آیا ہے کہ ''روحوں کو اجسام سے دو ہزار سال پہلے پیدا کیا گیا۔'' اس سے مراد اعیانِ ثابتہ ہیں، دو ہزار کا لفظ تحدید کے لئے نہیں، اس سے صرف مدّت مدیدہ کا اظہار مقصود ہے۔ ممکن ہے عین ثابتہ کو کوئی تعین بسیط حاصل ہوا ہو، اور یہاں پر وہی مراد ہو۔

جب آدمی مرجاتا ہے تو اس کا نفس غیر محسوس بدن کے ساتھ تعلق پذیر ہوتا ہے۔ اور اس کے ساتھ گویا چمٹ جاتا ہے۔ اس حالت میں اس کے ادراک کا ذریعہ حس مشترک 'وہم' اور مدرکہ ہوتے ہیں، جن کا تعلق باطن کے ساتھ ہے جب قیامت قائم ہوگی تو کون وفساد کے بعض اسباب مُعدِّہ کی وجہ سے وہ ابدان محسوسہ کے ساتھ تعلق پیدا کرلے گا۔ یوم الحساب کے ظہور میں آنے پر روح سے اس کی تکمیل ہوگی اور عین اس نفس سے ارتقاء کے طور پر جسم معرض وجود میں آئے گا۔ اس حالت میں وہ بدن عنصری کو دور پھینک دیگا۔ (جس طرح کپڑے کو اتار کر دور پھینک دیا جاتا ہے) جس کے بعد یا تو وہ جنت میں داخل ہوگا، یا دوزخ اس کا قرار گاہ ہوگا۔ جو علوم مجردہ اس نے حاصل کئے تھے۔ وہ سب کے سب علوم زمانیہ اور مکانیہ تھے۔ علم حضوری بھی اسی قبیل سے ہے۔ لیکن وہ تو (اس کا مشار الیہ غالباً عالم آخرت ہے) ممکن کو ممتنع اور موجود کو معدوم بنادیتا ہے، اس لئے مکانی کو بھی مجرد عن المادہ بنادے گا۔ لہذا تمہیں فلاسفہ کی تشویش آفریں باتوں سے نہیں گھبرانا چاہئے۔
اس بدن غیر محسوس کے ذرائع ادراک تین ہیں، جیسے کہ پہلے مذکور ہوا۔ لیکن اس کے عمل کی شکلیں مختلف اور کثیر التعداد ہیں۔ خلاصہ یہ کہ یہ بدن (غیر محسوس) نفس ناطقہ کے لئے ایک کامل لباس ہے جو پورے طور سے اس کو ڈھانپ لیتا ہے۔

یاد رکھو ہم نے وجود ذہنی کی بابت خوب تفتیش کی لیکن ہمارے ہاتھ کچھ بھی نہ لگا۔ اس لئے ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ بعض وہ اشیاء جن کو موجود ذہنی کہا جاتا ہے وہ درحقیقت ایک صورت موجود فی الخارج ہوتی ہے جس کا قوت مدرکہ کے ذریعہ نفس ادراک کرتا ہے۔ مثلاً صورتِ حیوانیہ، اور

صورت انسانیہ (یعنی حیوان اور انسان کی صورت نوعیہ، جس کا مفہوم کلّی ہے اور افراد کے ضمن میں اس کا تشخص ہو کر وہ محسوس ہوتا ہے) بعض ان میں سے سلبیات اور بعض اضافیات ہیں۔ ہمارے نزدیک تحقیقی بات یہ ہے کہ مثلاً زید ایک اندھا شخص ہے۔ جب ہم اپنی قوت مدرکہ سے اس کا ادراک کرتے ہیں تو ہمارا مدرکہ کی بینائی کے مفہوم سے بھر جاتا ہے۔ (کیونکہ جب تک بینائی کے مفہوم کو پیشِ نظر نہ رکھا جائے، اندھے کا مفہوم کس طرح ذہن میں آ سکتا ہے۔) بعض اوقات ہم مسمّی سے قطع نظر کر کے فقط صفت کو ملحوظ رکھتے ہیں جس کو "اندھاپن" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ اختلافِ مُدرَک (بفتح الراء) میں نہیں بلکہ نفسِ ادراک میں ہے۔ اسی طرح ہم اپنی قوتِ مُدرکہ سے اس مفہوم کا ادراک کرتے ہیں کہ زید عمرو کا بیٹا ہے۔ یہاں پر بھی ہمارے مدرکہ میں اس کے باپ کا مفہوم ہمارا ذہنی مشار الیہ ہوتا ہے۔ لیکن بعض اوقات اس کی اسمیّت سے (یعنی ابن کے مفہوم سے) قطع نظر کر کے ہم ابنیّت کا مفہوم سامنے رکھتے ہیں۔ اس سے بعض منطقیوں کا یہ قول تمہاری سمجھ میں آ سکتا ہے کہ کلیات اور جزئیات میں صرف ادراک کی حیثیت سے اختلاف پایا جاتا ہے، ورنہ دونوں حالتوں میں مدرَک (بفتح الراء) ایک ہے۔ اسی طرح (یعنی سلبیّات اور اضافیات کی طرح) بعض ان میں سے معدوم فی الخارج ہیں۔ مثلاً ممتنعات۔ اس کے متعلق ہماری تحقیق یہ ہے کہ عالمِ ادراک میں بہت زیادہ وسعت پائی جاتی ہے۔ کوئی امر موجود یا مفروض ایسا نہیں۔ جس کی صورت پر وہ مشتمل نہ ہو۔ یاد رکھو اس صورت سے مراد صورت عرضیہ ہے۔ ہمارا قول یہ ہے کہ ان ابدان کے لئے وہاں پر ایک صورتِ علمیہ عرضیہ ہے۔ اگر معلوم اس کے ذریعہ موجود ہو گیا ہے تو کیا وجہ ہے کہ ممتنع اور معدوم اور مجہول کے حقائق میں تبدیلی واقع نہ ہو۔

عالم اعلیٰ میں سوائے تصدیق کے اور کچھ نہیں پایا جاتا (تصور کا اس کے کوچوں میں گزر نہیں)

کیوں کہ تصورات تو اس ناقص عالم مادّی کی بدعات سے ایک بدعت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تصدیق سے قلب کو اطمینان اور یقین حاصل ہوتا ہے۔ وہ اذعان بھی اس کے مفہوم میں شامل ہے جس کا تعلق مفرد کے ساتھ جملہ کی طرح ہو۔ ایک عجیب بات یہ بھی ہے کہ وہاں کوئی جملہ ہے ہی نہیں، وہاں پر تو مفرد ہی مفرد کا وجود ہے، جس کو محمول کے ساتھ اختلاط حاصل ہے۔ گو کہ تمام حیوانات تصدیق کی نعمت سے بے بہرہ ہیں۔ ان کے اذہان (اگر ان کی قوت مدرکہ کو ذہن کہنا

درست ہے) تو ظنون اور اوہام ہی کا مخزن ہوتے ہیں۔ کند ذہن اور چھوٹے آدمیوں کو بھی ایسا ہی سمجھو۔ لیکن عامۃ الناس کے اذہان میں تصدیق اور تصور دونوں قسمیں موجود ہوا کرتی ہیں۔

یاد رکھو عالم میں جو کچھ بھی متحیزات اور مجردات موجود ہیں، نیز اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس اور اس کی صفاتِ متعالیہ جن کا وجود حقیقی اور نفس الامری ہے۔ ان میں سے ہر ایک کی صورت مختلف نشأت میں (مختلف مدارجِ ارتقاء میں) اسی نشأۃ کے مناسب حال ہوتی ہے۔ ان صورتوں میں سے ہر ایک صورت کے دو رخ ہوتے ہیں، ایک حواس کی طرف اور دوسرا عقل کی جانب، اور ہر ایک صورت ان دونوں رخوں سے مستفیض ہوتی ہے، جن کو انسلاخ یعنی تجرد عن المادہ یا فنا کی وجہ سے اپنے مبادی یعنی اسماء پاک کے ساتھ طوق حاصل ہو جائے، ان پر جہت عالیہ کا غلبہ ہوتا ہے، برخلاف اس کے عالم مادّی کی متدنس اشیاء عموماً اسفل کی طرف متوجہ رہتی ہیں۔ نفسِ رحمانی کے لباس خاص میں جلوہ گر ہونے میں کسی شخص کے مزاج اور اس کی عادات کو بھی دخل ہوتا ہے۔ چنانچہ یہی چار باتیں ہیں جن کے مختلف طور پر آپس میں مل کر ظہور پانے اور نیز ان کی شدت اور ضعف کے لحاظ سے بے شمار اشخاص معرض وجود میں آتے ہیں۔ صرف چار چیزوں کے آپس میں ترکیب اور امتزاج پانے سے بیشمار اشخاص کے ظہور میں آنے پر تمہیں متعجب نہیں ہونا چاہئے۔ کیا تم نے عالم صوت کے عجائبات پر کبھی غور نہیں کیا؟ ہر ایک حیوان کی ایک مخصوص آواز ہوتی ہے جو اس عالم میں اس کی حقیقت کا تمثل ہے۔ خوشی اور ناخوشی، خوف و ہراس، اور بھوک پیاس کی حالت ظاہر کرنے کے لئے الگ الگ آوازیں ہوتی ہیں جو ان کیفیات کو متمثل کرتی ہیں۔ علی ہذا القیاس جذبۂ غصب یا جذبۂ عشق کے اظہار کے لئے ان مذکورہ آوازوں سے مختلف آوازیں ہوتی ہیں جو ان جذبات کا تمثل ہوتی ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کو الہام فرمایا کہ وہ اپنی آواز کو مختلف مخارج سے نکالے، جس سے مختلف مختلف حروف تہجی کی آوازیں پیدا ہوں (ان آوازوں یا ان حروف کی ترکیب سے کلام اور نطق پیدا ہوا، جو انسان کے تمام خیالات اور اس کے مافی الضمیر کو واضح طور پر سامع کے ذہن نشین کرتا ہے۔) ان ہی حروف کو اس نے اسماءِ حسنٰی کا مفہوم ظاہر کرنے کے لئے وضع کیا جس پر نظام عالم کا دارومدار ہے۔ چنانچہ ہر ایک مظہر کے بالمقابل وہ ایک حرف زبان پر لایا، پھر تحصیل اور تشخیص کا مفہوم ظاہر کرنے کے لئے بالترتیب دوسرا اور تیسرا حرف زبان

پرلایا۔اس سے کلماتِ ثلاثیہ پیدا ہوئے جو تمام الفاظ اور کلمات کی اصل ہیں۔

چونکہ اظہار معانی کا ذریعہ یہی اصواتِ مسموعہ ہیں۔اس لئے ہر ایک مفہوم کو ظاہر کرنے کے لئے ایسے الفاظ وضع کئے گئے جن کا تلفظ بطریق نقل و حکایت اسی مفہوم کا اظہار کرے۔مثلاً لفظ ضرب اور قہقہہ کی آواز انہیں افعال کے مشابہ ہے۔جن کے لئے یہ افعال وضع کئے گئے ہیں۔اسی طرح اس نے (انسان نے) اشیاء مرئیہ، ملموسات، مذوقات، متخیلات، اور متوہمات کے لئے کچھ ایسے ہی الفاظ وضع کئے جن کو سن کر ان حواس اور ان مُدرِکات (بکسر الراء) پر جن کے ذریعہ ان کا احساس اور ادراک کیا جاتا ہے کچھ ایسا اثر پڑتا ہے جس سے اس چیز کا مفہوم فوراً ذہن میں آجاتا ہے۔طریق نقل و حکایت میں بھی واضع کے مزاج اور اس کی نوعیت ادراک کے مطابق اختلاف پایا جاتا ہے۔مثلاً ایک عربی شخص پتھر کے گرنے کی آواز کو نقل کرنا چاہتا ہے تو وہ اس کو طق طق سے تعبیر کرتا ہے، برخلاف اس کے فارس کا آدمی اس کے لئے دہ دہ کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ چنانہ قدسی اور دنیی حیثیتوں کے اختلاف اور معارف و امزجہ کے تغایر اور تباین کی وجہ سے بے شمار زبانیں پیدا ہوئیں اور کچھ عرصہ کے بعد وہی چیز جو پہلے مجازتھی حقیقت کی صورت میں جلوہ گر ہوئی اور جو کنایہ تھا وہ صریح ہوگیا۔خلاصہ یہ کہ وضع الفاظ کی حقیقت یہی ہے جو ہم نے بیان کی۔ **والعاقل تکفیہ الاشارة**۔(جیسے کہ پہلے ہم کہہ چکے ہیں) سب عوالم متحاذی ہیں اور بعض ارتقاءات بعض دوسرے ارتقاءات کی فروع ہیں۔

جو علوم لوگوں کو حاصل ہوتے ہیں۔ان کی دو قسمیں ہیں۔ایک وہ جن کا ادراک ان کے مجاری عادت کے مطابق ہے، مثلاً مختلف صنعتوں کے دقائق دریافت کرنا اور اپنی عقل سے مختلف نظریے قائم کر کے ان کے اثبات کے لئے عقلی استدلال کرنا۔دوسری قسم کے علوم وہ ہیں جن کو خارق عادت تصور کیا جاتا ہے، اگرچہ حکماء جانتے ہیں کہ کوئی بات بھی خارق عادت نہیں۔ہر ایک چیز جو معرض وجود میں آتی ہے اس کے ظہور کی کوئی علت موجبہ ضرور ہوتی ہے اس لئے یہ سمجھنا غلط ہے کہ نظام کلی کے قوانین توڑے گئے۔(اسی غلط فہمی کی بناء پر اس کو خارق عادت سے موسوم کیا جاتا ہے)۔یہ خرق عادت کا لفظ صرف مدارک مشہورہ (یعنی عوام کے ادراکات اور ذہنیت) کے لحاظ سے استعمال کیا جاتا ہے۔بہرحال اس صنف کی کئی قسمیں ہیں۔یا تو اس قسم کے علوم کا

القاء بحالتِ بیداری لطیفۂ خیالیہ میں ہوتا ہے، جس کو اصطلاح مشہور کے مطابق کشف کہا جاتا ہے۔ یا ان کا القاء حالت خواب میں ہوتا ہے جس کو عربی میں رؤیا کہتے ہیں۔ تیسری صورت ان علوم کے القاء اور تلقّی کی غیبیہ کہلاتی ہے۔ چنانچہ حواس پر گونہ کسل اور سستی طاری ہو کر نیند کے مشابہ حالت پیدا ہو جاتی ہے۔ فرق یہ ہے کہ نیند ایک طبعی حالت ہے اور یہ حالت خود انسان اپنے اختیار سے اپنے اوپر طاری کرتا ہے۔ اس لئے اس کو صناعی کہا جاتا ہے۔ اس کا ظہور کسی امر مقدس پر کامل طور سے توجہ مرکوز کرنے کا نتیجہ ہوتا ہے (اصل چیز ترکیز توجہ ہے، یہ ضروری نہیں کہ جس چیز کو توجہ کا مرکز بنایا جائے وہ خواہ مخواہ امر مقدس ہو (۱) یہ تینوں اقسام دراصل ایک ہیں، کیوں کہ ان کا ظہور ''مثال مقیّد'' میں ہوتا ہے۔ ان تینوں قسموں کے انکشافات کے اسباب (جن کی بناء پر ان کی نوعیت مختلف ہوتی ہے) بھی تین ہیں۔ (الف) عادت اور ماحول۔ مثلاً ایک شخص لوہار ہے تو اس کو حالت کشف ورؤیا میں بھی آگ اور لوہے پگھلانے کی بھٹی وغیرہ لوازم آہنگری نظر آئیں گے۔ بڑھئی لکڑیاں، بسولی، اور ارّہ وغیرہ مشاہدہ کرے گا اور ان ہی چیزوں کے ضمن میں (کنایہ اور استعارہ کے طور پر) ان پر (لوہار اور بڑھئی پر) علوم غیبیہ کا افاضہ ہوگا۔ (ب) امزجہ کا اختلاف۔ مثلاً جس کا مزاج دموی ہے وہ عالم میں سرخ چیزیں مشاہدہ کرتا ہے، برخلاف اس کے صفراوی مزاج کو زرد اشیاء نظر آتی ہیں۔ بعض اوقات حقائق غیبیہ کا القاء ایسے ہی مشاہدات کے ضمن میں ہوتا ہے، جو اس دیکھنے والے کی نوعیت مزاج کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ (ج) تیسرا اس علم کی نوعیت ہے جس کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے افاضہ ہوتا ہے اس کی توضیح یہ ہے کہ ہر ایک امر کی خواہ وہ قدسی ہو یا متدنّس اور مادّی ہو، منازل ارتقاء کے ہر ایک مرحلہ پر نوع مخصوص کے لحاظ سے اس کی مخصوص صورت ہوتی ہے۔ (اور یہ انواع انکشافات بعض اوقات برہنہ حقیقت کا اظہار نہیں کرتے، بلکہ تعبیر اور تاویل کے محتاج ہوتے ہیں۔ بعض اوقات نہیں۔ مُعبّر کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ منازل ارتقائیہ کا پورا پورا علم رکھتا ہو۔ اور مزاجیات اور عادیات (یعنی وہ امور جن کا تعلق مزاج اور عادت

---

(۱) مسمریزم اور ہپناٹزم جس کا آج یورپ میں چرچا ہے۔ اسی مسئلہ کی بسط وتفصیل ہے۔ حضرت شاہ صاحب نے امر مقدّس کی تخصیص اپنے مذاق اور ما نحن فیہ کے مطابق فرمائی ہے۔ ان کا موضوع بحث اس کتاب میں امور مقدسہ اور حقائق حکمیہ ہیں۔

سے ہے) میں تمیز کر سکے۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقعہ پر دودھ کی تعبیر علم سے فرمائی تھی۔ کیونکہ جس طرح دودھ جسمانی حیثیت سے کامل غذا ہے، اسی طرح علم روحانی حیثیت سے غذاءِ کامل ہے، جس سے انسان کے عقائد اس کے خیالات وافکار، اور اس کے اخلاق کی تربیت ہوتی ہے۔ ایک صحابی نے رافع بن عقبہ کے گھر میں ''ابدہ طاب'' قسم کی تازہ کھجوریں خواب میں دیکھیں تو آپ نے اس کی تعبیر یہ فرمائی کہ ہمارا دین طیب اور پاکیزہ ہے اور انجام کار اس کو رفعت اور بلندی حاصل ہوگی اور اس کا بول بالا ہوگا۔ یہاں پر الفاظ کی صورت میں حقیقت غیبیہ متمثل ہوئی ہے۔ بہر حال اکتشافِ علمِ غیب کے ان انواع ثلاثہ کا انحصار کمال تخیل پر ہے جس کا ظہور امور مرئیہ کی صورت میں ہوا ہے۔ لیکن جب اس قسم کے علوم کا القاء سمع کے ذریعہ ہو تو اس کو الہام کہتے ہیں۔ الہام اس کلام کو کہتے ہیں کہ جب آدمی کلیتہً اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اس کا متخیلہ اس کلام کو سننے لگتا ہے جب حدیث النفس کے ضمن میں کوئی بات آدمی کے دل میں القاء کی جاتی ہے اور جس کی حقیقت کا علم اس کو بعد میں ہوتا ہے اس کو (اصطلاح صوفیہ میں) خاطر کہتے ہیں۔ اور جب یہ القاء اس قسم کا ہو کہ نفس ناطقہ کو وقیع معلوم ہو اور آدمی کے قلب اور اس کے قویٰ پر مسلط ہو جائے اس کو ''واقعہ'' کہتے ہیں۔ جس کلام کے متعلق یہ ظن غالب ہو کہ اس کو کان سے سن لیا ہے اسے ''ہاتف'' کہتے ہیں۔ عامۃ الناس ظنّ غالب کی بناء پر اس کو حق خیال کرتے ہیں اور اولیاء کاملین اس کی ارتقائی خصوصیات کو ملحوظ رکھ کر اس کی حقانیت کو تسلیم کرتے ہیں۔ مبصرات اور مسموعات کے قیاس پر ذائقہ اور شامّہ اور لامسہ کے ذریعہ بھی بعض اوقات ان علوم کا القاء ہوتا ہے اور ان کے مراتب مختلف ہوتے ہیں۔

جن علوم کا افاضہ قوت واہمہ پر ہوتا ہے۔ ان کو فراست سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ''اشراف'' بھی اسی کی ایک قسم ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ دوسرے کے ذہن میں جو بات ہو۔ اس کا آدمی ادراک کرے(۱)۔ جن علوم غیبیہ کا القاء قوت مُدرکہ (قوت عاقلہ) پر ہوتا ہے ان کا منبع قوت قدسیہ ہے جس کو اہل صفا علم لدنی کہتے ہیں۔ جو شخص فنافی اللہ ہو جائے اور اس پر علم کا افاضہ ہو اس کو معرفت کہتے ہیں۔

(۱) آج کل یورپ میں یہ مسئلہ زیر بحث وتحقیق ہے۔

وہ علوم جن کا مبدء سرّ وجود ہے، ذوق اور حکمت سے تعبیر کیئے جاتے ہیں لیکن جن علوم کا افاضہ قرب فرائض کا نتیجہ ہے اوران کا القاء فرشتہ کے ذریعہ ہوتا ہے، ان کو وحی کہتے ہیں۔ یاد رکھو نفس کو مختلف ارتقائی حالتیں پیش آتی ہیں اور ہر ایک کا نام پیش آمدہ مرحلہ کے لحاظ سے مختلف ہوتا ہے۔ چنانچہ اگر اس کا تعلق وہم وخیال اورادراک سے ہوتو اس لحاظ سے اس کو نسمہ کہتے ہیں، قوم کی اصطلاح میں اس کو نفس کہتے ہیں۔ لیکن اس کو تجرّ دعن المادہ کی حیثیت سے لیا جائے اور اس کی تربیت کو ملحوظ رکھا جائے، تو فلاسفہ اس کو نفس کہتے ہیں اور قوم کی اصطلاح میں روح ہے۔

یاد رکھو نشأۂ اخرویہ کی مخلوق اجسام اور اعراض کے نشأۂ اخرویہ کو ملحوظ رکھا جائے تو وہاں کی مخلوق دو قسم کی ہے۔ ایک وہ جس میں آثار ظاہرہ اوران کے احکام اس قدر مستحکم اور راسخ ہیں کہ حقیقت تک پہنچنے کا راستہ مسدود ہے۔ جس سے ہر ایک کمال علمی اور عملی فائض ہوتا ہے۔ اس لئے فطرت کے مطابق ایک ناقص جماعت ظہور میں آتی ہے جس میں کہ تلبیسی اجنبیت (؟) پائی جاتی ہے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ ارباب دانش وبینش کے نزدیک یہ ایک امر محقق ہے کہ صفراء آگ کی نقل ہے، سودا خاک کی، خون ہوا کی اور بلغم پانی کی حکایت کرتی ہے۔ حاکی اور محکی عنہ کا فرق سمجھ لو۔ کیا صفراء کی حرارت اور یبوست حقیقی آگ کے مقابلہ میں برودت اور رطوبت معلوم نہیں ہوتی؟ حالانکہ عالم تخلیط میں وہ اس کا تمثل ہے۔ یہ تلبیسی اجنبیت کی مثال جو ہم نے بیان کی ہے اس پر خوب غور کرو اور دقت نظر سے کام لو۔ یہ غور کرنا تمہارے لئے رشد وہدایت کا موجب ہوگا انشاء اللہ تعالیٰ۔ دوسری قسم وہ مخلوق ہے جس کے آثار ظاہرہ اس قدر مستحکم نہیں کہ حقیقت تک پہنچنے کا راستہ مسدود ہو، میرے سامنے فطری طور پر اس کے شاندار احکام واضح ہو چکے ہیں جن کی تائید براہین سے ہوتی ہے۔ اس میں صورت اجنبیہ کا مطلق دخل نہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ جسم دنیاوی اور جسم اُخروی کے درمیان برزخ ہے۔ مؤخرالذکر کی بناء ازلی استعدادات پر ہے اور اول الذکر کی بنیاد دنیا میں حاصل کردہ کمالات ہیں۔ یہ ایک واضح فرق ہے جس میں بہت کچھ وسعت ہے۔

سب سے بڑا درجہ انبیاء علیہم السلام کا ہے، انکے بعد حکماء ربانیین کا مرتبہ ہے، اوران کا کمال اس میں ہے کہ ان کو انسلاخ حاصل ہے، اور وہ غیر متأکد لباسوں سے معرّا ہیں۔ ان کا کمال

اکتسابی نہیں، فطری اور وہبی ہے یہ مضمون بھی بڑا وسیع الاطراف ہے۔ جن لوگوں نے اپنے آپ کو مؤثر حقیقت میں فنا کر دیا ہے وہ اولیاء ہیں جنہوں نے اپنے اجسام کو اپنے نفوس صافیہ کا مقہور بنا رکھا ہے وہ بررۂ اتقیا ہیں۔ جن لوگوں نے سرے سے اکتساب کمال کی طرف توجہ ہی نہیں کی وہ اشقیاء ہیں۔ ان کے بھی مراتب مختلف ہیں۔ اس بات کو یقین کے ساتھ مان لو کہ سوائے اس کمال کے جس پر کہ عین ثابتہ مشتمل ہو اور کوئی کمال نہیں، اسی کو جسم کی صورت میں تمثل حاصل ہوا ہے۔ نیز جسم دنیاوی اس سے مبرّا نہیں ہو سکتا کہ کوئی صورت اس کا مظہر ہو اور یہ ظہور بڑے استحکام کے ساتھ ہو۔ اس میں بھی بمثل سابق تنوع پایا جاتا ہے۔ اوّل الذکر کا تعلق جور سے اور مؤخر الذکر کا مزاج سے ہے۔

غالباً تم اس بات کے منتظر ہو گے کہ میں تم کو انسلاخ اور فنا اور صفا کے معنی بتاؤں، پھر ہر دونوں مؤخر الذکر کے آپس میں جو فرق ہے اس سے تم کو آگاہ کروں، اور فناء مقبول اور صفاء حسن کا مفہوم بھی بیان کروں۔ ہمارے نزدیک انسلاخ کا یہ مفہوم ہے کہ نفس ناطقہ عین ثابتہ کو مقہور کر کے اس کے تمثلات کو مفقود کر دیتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عین ثابتہ اسی حالت کی طرف عود کرتی ہے جو اس کی ازل میں تھی اور سوائے فیضان وجود کے اس کا کوئی کمال باقی نہیں رہتا، اس کے سمع اور بصر کا کوئی مستقل وجود نہیں ہوتا اور اس کی صورت حادثہ میں ایک قسم کا تاکد پیدا ہو جاتا ہے، گویا وہ جسم اخروی ہے، فناء کے معنی اللہ تعالیٰ کو اس حیثیت سے پہنچاننا ہے کہ وہ ہر ایک موجود کی اصل ہے۔ اور سب کا رجوع اسی کی طرف ہے، چنانچہ تمام ماسوا اس کی عظمت اور کبریا کے سامنے مستہلک ہو کر ایک ہی ذات اقدس واحد احد جل شانہٗ باقی رہ جاتی ہے۔ یہ مشاہدہ سالک اور عارف کے رگ و پے میں سرایت کر جاتا اور اپنا اثر دکھاتا ہے۔ علم اور وجود میں ایک ازلی ربط پایا جاتا ہے۔ جس کا مبدء فعلی علم ہے ایسا شخص جس کو فنا کا رتبہ حاصل ہو، اللہ تعالیٰ کے رنگ میں (صبغة الله و من احسن من الله صبغة) رنگا جاتا ہے۔ جس طرح وہ لوہا جس کو صیقل کر کے آئینہ بنا لیا جائے۔ آفتاب کا نور اس میں منعکس ہو کر اس کو نورانی بنا دیتا ہے حتیٰ کہ آفتاب کی صفت احراق بھی اس میں پیدا ہو جاتی ہے، باوجودیکہ اس کی ظاہری صورت آئینہ کی اور دراصل وہ لوہا ہوتا ہے۔ اس میں صفتِ احراق کا پیدا ہو جانا ایک تدلیسی اجنبیت ہے، صفا کے معنی یہ ہیں کہ انعکاسِ نور

تو حاصل ہو۔لیکن پہلی ہیئت نفسانی میں کوئی تغیر وتبدل واقع نہ ہواور اگر کوئی تبدیلی ہوتو وہ صرف موطن علم تک محدود ہو۔ کہتے ہیں کہ اس کی توضیحی مثال یہ ہے کہ شراب کو ہر چند صاف سے چھان لیں اور فلٹر کریں، اس کی حقیقتِ خمریہ بحال خود باقی رہتی ہے۔لیکن نمک کی چٹکی ڈالنے سے وہ سرکہ بن جاتا ہے اور قلب ماہیت ہوکر خمریت کا نام ونشان تک باقی نہیں رہتا، فناء مقبول وہی ہے جس کا منبع نورِ نبوت ہو۔ ورنہ اس کو مردود سمجھو۔

ہمارے نزدیک نور نبوت کے مختلف چار طبقے ہیں۔(۱) وہ نورِ نبوت جو فطرۃً حکماءِ امت کے حصے میں آیا ہے۔یعنی ان کے تمثّلات عین ثابتہ کے مقہور ہوکر رہ گئے۔ ان کے علوم اور عبادات اور عادات سب خیر محض ہوتے ہیں۔(۲) یہ کہ نفس ناطقہ پر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے نفس ناطقہ کا رنگ چڑھ جائے۔کیونکہ تم جان چکے ہو کہ جو کوئی معرفت میں کامل ہوتا ہے۔فطری طور پر اس میں یہ ذہنیت ہوتی ہی ہوتی ہے یا اکتسابی طور پر پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ تمام لوگوں کو اپنے دائرۂ ہدایت کے اندر سمجھتا ہے۔اب جو کوئی بھی تام المعرفت ہوگا۔اس پر رسول خدا صلعمؐ کے انوار پرتو افگن ہوں گے۔شیخ اکبر (محی الدین بن عربی) جس کا علم سب اولیاء سے وسیع تر ہے اسی قسم میں داخل (بلکہ اس کے سرخیل) ہیں۔(۳) یہ کہ کسی کو سُنن رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور طاعاتِ شرعیہ کی پابندی نے اس رنگ میں رنگ دیا ہو (نور نبوّت سے منوّر کردیا ہو) کیونکہ تم جانتے ہو کہ فرائض میں فطری طور پر انسلاخ ہوتا ہے اور سنن کو تحقق حاصل ہوتا ہے۔کیونکہ ایک عبد معصوم جو سب سے زائد اس مقام کا مستحق ہے (علیہ الصلوۃ والسلام) ایک جزئی کو عمل میں لایا اور اس کی پابندی فرمائی۔اس لئے اس جزئی کو کلّی بھی اسی رنگ میں رنگا گیا۔اصحاب طریقت میں سے شیخ عبدالقادر جیلانی، شیخ شہاب الدین سہروردی، شیخ نجم الدین کبریٰ، شیخ بہاؤ الحق والدین، بلکہ شیخ ہروی، مخدوم علی مہایمی، اور مولانا جامی اسی طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔(۴) وہ نور نبوت جو صحابہ کو حاصل ہوا۔اس کی تفصیل آگے آتی ہے۔یاد رکھو ہر ایک موجود حق اور باطل کو بارگاہ وجوب کے ساتھ ایک نسبت خاصہ حاصل ہے، اسی نسبت کے تمثّلات کا نام فناء ہے، صفاء حسن سے ہماری مراد یہ ہے کہ جس شخص کو یہ درجہ حاصل ہو، وہ دل و جان سے صاحب شریعت کا مطیع اور متبع اور اسی کے نور سے منوّر ہوگا۔عام طور پر شرائع میں ظاہری محسوس صفائی اور طہارت کی تاکید کی جاتی ہے،

اور اسی کے متعلق ہدایات دی جاتی ہیں، تزکیۂ باطن اور عقلی طہارت کو نظر انداز کیا جاتا ہے، کیونکہ اس کے تحقق میں پائیداری نہیں ہوتی۔ اس کا ثبوت مطلوب ہو تو ان سفہاء قوم کے خبطی اقوال کو بنظر امعان دیکھ لو جو اپنے آپ کو (برعکس نہند نام زنگی کافور) حکماء کہتے ہیں۔

یاد رکھو اللہ تعالیٰ کا قرب یہ ہے کہ غفلت کا پردہ درمیان سے اٹھ جائے اس سے میری مراد یہ ہے کہ آدمی کو اللہ تعالیٰ کی کنہ ذات کا علم حاصل ہو، گو یہ علم کسی پردے کی آڑ میں ہو اور اس میں احاطہ نہ ہو۔ علم سے بھی ہر ایک علم مراد نہیں بلکہ وہ جو نظر نافذ کا نتیجہ ہو۔ ہم نے خزانۂ نہم میں سرخ نگینہ اور جسم مخروطی کی مثال بیان کی ہے، توضیح مقصد کے لئے اس کا استحضار مناسب بلکہ لازم ہے۔ کامل قرب کے تین قسمیں ہیں، اس سے زائد نہیں۔ کیونکہ (۱) انسان کو یا تو اپنے نفس کا علم حضوری حاصل ہوگا۔ جس کے ضمن میں اس کو اللہ تعالیٰ کی کنہ ذات کا بھی علم ہو جائے گا۔ اسی طرح جو امر واجب تعالیٰ کی ذاتِ اقدس کے ساتھ مخصوص ہے وہ اس پر پرتو افگن ہوگا۔ اس کا نام قرب نوافل ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس قرب کا حصول کامل توجہ اور ہمچو امور کا نتیجہ ہوتا ہے جو فرائض کے قسم سے نہیں بلکہ ایسی عبادات ہیں جو فقط قرب حاصل کرنے کے لئے عمل میں لائی جاتی ہیں او. جب وہ فرائض نہیں تو یقیناً نوافل ہیں۔ (۲) دوسری صورت یہ ہے کہ کسی کو اللہ تعالیٰ کا علم اور اس کی معرفت حاصل ہو۔ لیکن یہ تو ممکن نہیں کہ کوئی اس کی ''ذات بحت'' کی کنہ کو جان سکے، اس لئے اس کو جاننے اور اس کی معرفت کے معنیٰ یہ ہیں کہ کسی ایسے امر مجرد (غیر مادی) کے ضمن میں یہ علم حاصل ہو جس کا تجرد عن المادہ ہونا فقط اسی ہے، گویا وہ اس عالم میں ''ذات بحت'' کا تمثل ہے اور چوں کہ اس علم کا منبع اس کی عین ثابتہ ہے۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اس عین کے رنگ کے مطابق ہو جو درحقیقت بمنزلہ آئینہ کے ہے اور ہر قسم کے واقعات اس میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ عالم تحقق کے من و عن کی وہ جامع ہے، کیوں کہ تم اس سے پہلے جان چکے ہو کہ عین ثابتہ کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ کسی اسم مطلق کے لئے بمثل سایہ کے اس کا عکس ہو۔ اس قسم کے قرب کو قرب فرائض کہتے ہیں۔ یہ نام اس قسم کا اس لئے پڑ گیا ہے کہ جو امور اس پر متفرع ہوتے ہیں۔ وہ از قسم فرائض ہیں جن کے عمل میں لانے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دے رکھا ہے اس قرب سے جو کمال حاصل ہوتا ہے اس کا آخری درجہ منصب نبوت ہے۔ یہ انتہائی کمال اس کا نتیجہ ہوتا ہے کہ وہ

شخص جس کو اس منصب عالی کے لئے تیار کیا جاتا ہے۔ اس تجلی کی طرف کامل طور سے متوجہ ہوتا اور وہ اس کے لئے ایک امر متحقق ہوتا ہے۔ پھر اس کو اسماء ملائکہ کا تقابل حاصل ہوتا ہے، جس کے بعد اس کا ارتقاء ایک اور رنگ اختیار کرتا ہے اور وہ اس نظام کلّی کا ایک رکن بن جاتا ہے۔ جس کی بنا سراسر خیر و برکت اور سعادت پر ہے۔ (۳) تیسری قسم کا قرب اس سے حاصل ہوتا ہے کہ آدمی کو اللہ تعالیٰ کی کنہ ذات کا علم فیضان وجود کے ضمن میں بغیر کسی تخلیط کے حاصل ہو، چنانچہ اس کی عین ثابتہ کو اس کے وجود پر علم حضوری وغیرہ کے ذریعہ احاطہ ہوتا ہے وہ اسم پاک جو اس عین ثابتہ کی اصل ہے مجید و علیم خدا کی ذات اقدس سے مل کر اس بارے میں اس کی مدد کرتا ہے۔ اس قسم کے قرب کا نام قرب وجود ہے۔ یہ قرب اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس کے علم تک محدود نہیں، دوسرے امور کو بھی شامل ہے۔ اب ہم ان اقسام ثلاثہ میں سے ہر ایک کی کسی قدر تفصیل لکھتے ہیں۔

قرب وجود کا مفہوم یہ ہے کہ آدمی اپنی عین ثابتہ کا مقہور ہو اور وہ قرب ذاتی کے اسی درجہ پر قائم رہے جو ازل میں اس کو حاصل تھا۔ قرب فرائض کے مردمیدان آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام ہیں رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔ ان کا دور گزر جانے کے بعد کمال کی سرزمین بنجر پڑی رہی۔ البتہ اہل صفا کی جماعت موجود تھی۔ اس کے بعد اذکیاء قوم قرب نوافل کی طرف مائل ہوئے۔ اور اس کو درجۂ کمال تک پہنچایا۔ ہجرت کی گیارہ صدیاں گزرنے پر ایک مرد خدا نے قرب وجود کا کمال حاصل کرنے پر خاص توجہ کی۔ اور خدائے پاک نے اس کو امام المتقین اور حکماء ربانیین کے لئے جائے پناہ بنادیا۔ اللہ تعالیٰ نے فضل و کرم سے اس نے یہ التجا کی کہ اس کو حکماء معصومین کا خاتم الحکماء بنادے۔ شاید اس کی یہ دعا قبول ہوئی۔ والفضل بید اللہ یؤتیہ من یشاء۔ کیونکہ (اس میں اس کی استعداد موجود تھی) وہ قوی الجذب، شدید الانسلاخ، صحیح النظر، اور سریع السیر تھا۔ جب اس کو عین ثابتہ کا علم حاصل ہوا تو اس کے لئے مقہور ہونے کا طریقہ خود بخود اس کی سمجھ میں آگیا۔ اس کے باطن سے ایک ندا آئی کہ اس کو لے لو۔ کیوں کہ اس زمانہ میں اس سے بالاتر کوئی کمال نہیں اور یہ وہ کمال ہے جو بہت درست اور واقع کے مطابق ہے۔ چنانچہ اس کو بعض ایسے اوقات نصیب ہوئے کہ اس کی عین ثابتہ بعینہ اس حالت پر ہوتی تھی جیسے کہ ازل میں تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کو سیادت باطنی اور حکمت کے ساتھ عصمت بھی حاصل ہوئی والحمد للہ رب

العلمین (۱)۔

خوشتر آن باشد کہ سر دلبراں
گفتہ آید درحدیث دیگراں

اس کی بنا اس علم پر ہے جس کی خصوصیات لازمہ کا ذکر ہم نے وحدت وجود کے مسئلہ میں کیا ہے۔ من جملہ ان خصائص کے ایک یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو اپنے بہت قریب جانتا ہے۔ اس کے اس علم کا ذریعہ اس کی عین ثابتہ ہوتی ہے۔ جب وہ اس پر نظر ڈالتا ہے تو اس کی نظر پار گزر کر اللہ تعالیٰ پر جا پڑتی ہے۔ نیز اسکو عصمت اور وجاہت حاصل ہوتی ہے۔ ساتویں خزانہ میں ہم اس کی مزید تفصیل کریں گے۔

قرب نوافل کا مفہوم یہ ہے کہ تم اپنے نفس کو حق تعالیٰ کے آئینہ میں دیکھ لو۔ اور اسی آئینہ کا رنگ تم پر چڑھ جائے۔ اس رنگ سے ہماری مراد مرتبۂ وجوب کی سطوت اور اس کا جلال ہے۔ اس کی بناء اس پر ہے کہ ممکن کے تقرر اور تحقق کا مرجع واجب الوجود تعالیٰ و تقدس کا تحقق اور تقرر ہے۔ چنانچہ بسیط علم اسی تقرر کا تمثیل ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کو اپنے نفس کا علم حضوری حاصل ہوتا ہے اور اس کے ضمن میں اس کو علم باللہ تعالیٰ حاصل ہوتا ہے، جیسے کہ شیشہ کے پار کسی چیز کو دیکھیں تو نظر شیشہ کے پار گزر کر اس چیز تک جا پہنچتی ہے۔ جس کو اس قسم کا قرب حاصل ہو۔ اس کو بعض اوقات یہ دھوکہ ہوتا ہے کہ میں نے کنہ ذات کو پا لیا۔ اس اشتباہ کا سبب یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے نفس کی کنہ پر نظر ڈالتے وقت اس کو حق تعالیٰ سے ڈھانپا ہوا پاتا ہے۔ ایسے شخص کو دو حالتیں پیش آتی ہیں۔ جب اس کو کامل وصول کا مقام حاصل ہو تو اس کو اپنے نفس کا بسیط سا علم حاصل ہوتا ہے اور یہی علم بعینہ بسیط علم باللہ ہوتا ہے۔ جس میں کسی قسم کا تعدّد اور تکثر نہیں ہوتا۔ برخلاف اس کے ہبوط اور نزول کی حالت میں وہ اپنے نفس کو حق تعالیٰ سے ڈھانپا ہوا دیکھتا ہے اور اس کو یہ بھی خیال گزرتا ہے کہ میرے نفس نے بھی اس کو گھیرا ہوا اور اس پر احاطہ کیا ہوا ہے۔ اسی سے دو مختلف حیثیتیں پیدا ہو گئیں۔ اس قرب کی ایک تو حقیقت ہے اور چند ایک حقیقت کی پرچھائیاں ہیں۔ چنانچہ اس کی حقیقت تو یہی علم حضوری ہے جس کا ہم نے ابھی ذکر کیا۔ اشباح یعنی پرچھائیوں سے

---

(۱) اس میں شاہ صاحبؒ نے اپنا حال بیان کیا ہے۔

ہم یہ مراد لیتے ہیں کہ واقع میں اس علم کو کسی نہ کسی طرح تمثل حاصل ہو۔ اشباح میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کسی شخص کو اپنی فکر کا گھوڑا دوڑانے سے توحید کی معرفت حاصل ہو جائے۔ اب جس کو اس کی حقیقت نصیب ہوئی وہ تو محرم راز بن گیا لیکن جس کو اشباح میں سے حصہ ملا (اور حقیقت سے بے بہرہ رہا) وہ بھی اللہ تعالیٰ کا شکر کرے۔ اس قرب کے نتائج میں سے خود بینی اور خودستائی اور ''ربوبیت'' ہے تفصیل آگے آتی ہے۔

قرب فرائض کا مفہوم یہ ہے کہ حق تعالیٰ تمہاری عین ثابتہ کے آئینہ میں تجلّی فرمائے اور تم اس کو اسی رنگ میں مشاہدہ کرو جو اس آئینہ کا ہے یعنی اس پر تجدد اور عدم ثبات کا گمان ہونے لگے۔ کلام پاک میں ماضی اور مضارع کے صیغے اس کے حق میں اسی بنا پر استعمال ہوئے ہیں۔ اس کی اصلیت یہ ہے کہ ممکن کا معرض وجود میں آنا اللہ تعالیٰ کی مختلف تجلیات کا نتیجہ ہے اس لئے اس کا کمال فقط وہی ہوتا ہے جو عین ثابتہ اس کو عطا کرے۔ کیوں کہ اس کا رابطۂ وجود اس کی عین ثابتہ کے عطیات میں سے ہے۔ چنانچہ اس کے علم باللہ اور معرفت کی مقدار بھی عین ثابتہ کے جود وسخا کی حدود تک محدود ہے۔ اس کو خوب سمجھ لو۔ اس قسم کا قرب رکھنے والا اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کا مدّ مقابل سمجھتا ہے۔ یہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اپنے مرتبہ وجوب کو سطوت اور جلال کی حیثیت سے اس کے (سالک یا عارف کے) نفس کے احاطہ میں نہیں آسکتا۔ چنانچہ نظر کا اس کے پار نافذ ہونا ناممکن ہے اور اس کی وجہ یہ ہے اسی کی ذاتِ اقدس جل شانہ منتہائے انظار ہے۔ ایسے شخص کو بھی دو حالتیں پیش آتی ہیں جب اس کو کامل عروج حاصل ہو تو اس کی صورتِ جو یہ (؟) مضمحل ہو جاتی ہے اور پھر اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے اس کے حق میں فیصلہ فرماتا ہے۔ اس حالت میں ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس کو علم باللہ حاصل ہے، بلکہ یہ کیفیت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی زبان سے کلام فرماتا ہے جیسے کہ شعیب علیہ السلام سے منقول ہے اسی طرح حدیثوں میں آتا ہے **قال اللہ تعالیٰ علی لسان نبیّہ، یتھنی اللہ تعالیٰ علی نبیّہ**۔ برخلاف اس کے حالت ہبوط ونزول میں اس کی معرفت کی انتہاء اللہ تعالیٰ کے حضور میں حاضر رہنے کا تصور ہوتا ہے۔ اس مقام کی بھی ایک تو حقیقت اور چند ایک اس کی اشباح یعنی پرچھائیاں ہیں۔ چنانچہ اس کی حقیقت تو وہ عروج ہے جس کا ابھی ہم نے ذکر کیا۔ اور من جملہ اس کے اشباح کے ایک تو وہ واقعات ہیں جو اس مقام پر

دلالت کرتے ہیں۔ دوسرے اس قرب کے معارف ہیں۔ ضعف اور عجز کا احساس اور عبودیت کا اعتراف اس مقام کے آثار ہیں۔

یاد رکھو قرب کے یہ تینوں اقسام ایک دوسرے کے ساتھ پیوستہ اور وابستہ ہیں۔ اس کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جس کو ایک قسم کا قرب حاصل ہو وہ دوسرے دونوں اقسام سے بے بہرہ نہیں ہوتا۔ بشرطیکہ وہ صاحبِ تمیز ہو۔ لیکن اس کو منسوب صرف اس قرب کی طرف کیا جاتا ہے جس کا اس پر غلبہ اور جس میں کہ اس کو اضمحلال حاصل ہو۔ اسی بناء پر ہم نے یہ لکھا ہے کہ انبیاء کو قرب وجود کے بعد قربِ فرائض حاصل ہوتا ہے اور حکماء قربِ نوافل کے بعد اس مرتبہ پر فائز ہوتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اس سے بھی ہماری مراد یہی اضمحلال اور استغراق یا عدم اضمحلال و استغراق ہے۔ کمال کا اس پر مشتمل ہونا تجدّد اور اطلاق کا تقاضا ہے۔ نیز یہ بھی یاد رکھو کہ اگر کسی پر لطیفۂ خیالیہ یا ادراکیہ یا قوت تمیز غالب ہو اور وہ ان ہی کے اشارہ پر چلتا ہو تو ایسے شخص کو فناء کے مقام سے مایوس ہو جانا چاہئے۔ زیادہ سے زیادہ وہ مقام صفا کا امیدوار رہ سکتا ہے۔ بعض لوگوں پر ان کے اس جہاں فانی میں آنے کا راز منکشف ہو کر غالب ہو جاتا ہے۔ اس آنے سے میری مراد اس کی ذات کا تشخص ہے۔ اس حالت میں اسی انکشاف کا حکم چلتا ہے اور دونوں لطائف رعیت کے طور پر اس کے ماتحت رہتے ہیں۔ یہ مقام حسب استعداد ولایت کا مقتضی ہے۔ بعض لوگ فراخ چشم لاغر بدن ہوتے ہیں اور وہ اسی کے تقاضاؤں کے محکوم ہوتے ہیں۔ ایسا شخص حکیم ہوتا ہے بشرطیکہ اس کو فہم کامل حاصل ہو۔ اور اگر وہ ان جیسی تقاضاؤں کا محکوم نہیں بلکہ خدائے بزرگ و برتر کے احکام کا منتظر اور ان کا متبع رہتا ہے تو وہ نبی ہے یا وہ جو قوم کی اصطلاح میں کامل کہلاتا ہے۔ یہ بھی یاد رکھو کہ اس تمام تقریر سے ہماری مراد ان مزاجوں کی تحدید کرنا ہے جن کا کمال میں قدم راسخ ہے۔ برخلاف اس کے جو اشخاص دوسروں کے کندھوں پر بوجھ ہو کر زندگی بسر کرتے ہیں ان کی اقسام کی تفصیل سے ہم نے تعرض نہیں کیا۔ بس اتنا سمجھ لو کہ ہر ایک ذی استعداد کا مزاج انعکاس کے طور پر ہر ایک کمال کو قبول کر سکتا ہے۔ یہ بھی یاد رکھو کہ سلف کے کلام میں قرب وجود کا ذکر نہیں پایا جاتا، کیوں کہ وہ اس کو قربِ فرائض کے مرادف خیال کرتے تھے۔ حکیم ربانی کو بالآخر قربِ فرائض حاصل ہو ہی جاتا ہے۔ بایں ہمہ یہ کہیں گے کہ تحقیق حقائق میں ان سے فروگذاشت ہوئی ہے۔

اللھم ارنا حقائق الاشیاء کما ھی.

یاد رکھو ان تینوں اقسام میں فضیلت کلّیہ قرب فرائض کو حاصل ہے۔ خصوصاً مقام نبوت اس کا منتہائے کمال ہے۔ اس کی دو وجہیں ہیں (الف) انبیاء کے احکام براہ راست اللہ تعالیٰ سے ماخوذ ہوتے ہیں۔ برخلاف اس کے حکماء کے احکام کا منبع ان کی عین ثابتہ اور اولیاء کے لئے ان کی دنیاوی وجود کا سرِ وجود ہوتا ہے۔ یہ فرق مبدء کے لحاظ سے ہے۔ (ب) اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کے سینوں میں اسم حادث کے ساتھ تجلّی فرمائی اور یہی اسم پاک ان کے تمام امور کا والی اور متصرف ہے۔ برخلاف اس کے حکماء پر قرب ازلی حکمران ہے اور اولیاء پر اس امر کا تصرف ہے کہ انہوں نے اپنے وجود دنیاوی کی حقیقت باطنی کو اللہ تعالیٰ کی ذاتِ اقدس میں فنا کر دیا ہے قرآن مجید میں ہے وَاُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِھِمُ الْعِجْلَ ''ان کے دلوں میں اور ان کے رگ وریشہ میں بچھڑے کی محبت اور اس کے ساتھ وابستگی سرایت کی گئی۔'' اس کے معنی ہمارے نزدیک یہ ہیں کہ مظاہر مادّیہ میں ذات اقدس کی جو تجلّی ہوتی ہے گوسالہ پرستوں نے اپنی آپ کو اس میں فنا کر دیا تھا، اس فناء کا انحصار ان کا لطیفۂ عنصریہ پر تھا۔ یہی بات تھی جس کی وجہ سے ان کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنے نظام عنصری کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیں، تاکہ حقیقت کمال تک پہنچنا انکے لئے آسان ہو جائے۔ ہم بار بار تم کو یہ بتا چکے ہیں کہ ہر ایک فانی کے لئے کسی نہ کسی طرح کا تحقق ضرور ہوتا ہے۔ نفس کو اگر اس سے پیشتر فناء کا مرحلہ پیش آئے کہ وہ اپنے وجود کو فنا کر کے خاک میں ملا دے، تو وہ ربوبیت کا اظہار کرنے لگتا ہے۔ (موتوا قبل ان تموتوا میں غالباً یہی راز ہے)۔ یاد رکھو جب شیطان نے اللہ تعالیٰ کے فرمان واجب الاذعان سے سرتابی کر کے سرکشی اختیار کی تو اس پر بہت بڑی لعنت نازل ہوئی اس کے بعد جتنے شرور معرض ظہور میں آئے سب اس کے ساتھ ملحق ہوتے رہے۔ چنانچہ اس کا کمال حقیقی یہی ہے کہ وہ شرور کا مجسّمہ ہے اس کے سینہ میں یہ شرور بعینہٖ اسی طرح تجلّی افگن ہوئے جس طرح ملائکہ مقربین کے سینوں میں اسم پاک کی تجلّی ہوتی ہے۔ اس کا رازِ عمیق ہے اور اس کا ملخص یہ ہے کہ ہر ایک معنی وحدانی کو سلسلہ ''انجاس'' میں اللہ تعالیٰ و تقدس سے گونہ قرب حاصل ہے، کیوں کہ، ہر ایک چیز جس کو معنوی طور پر وحدانیت حاصل ہو، خواہ وہ چیز حق ہو یا باطل، وہ ربوبیّت کا مظاہرہ کرتی ہے۔ اسی بناء پر اس سے شیاطین جزئیہ اور القاءات شیطانیہ

ظہور میں آئے۔ یہ شیاطین اس کے اسی طرح مسخر رہتے ہیں جس طرح کلّی کو جزئی پر تسلط حاصل ہوتا ہے۔ شیطان کا سریان اس عالم مادی میں سریان کلّی کی قسم سے ہے۔ خوب سمجھ لو۔ ذرا عمیق مسئلہ ہے۔ یاد رکھو خاتم الاولیاء وہ شخص ہے جو صورت مزاجیہ کی تخلیطات میں خاتم الانبیاء کا مدّ مقابل ہے۔ یہ ضروری ہے کہ وہ خاتم الانبیاء کے نور سے منور ہو اور صاحب علم ہو۔ اگر وہ سخت ذکی الطبع نہ ہوتا تو باوجود ان تخلیطات مادیہ کے وہ ذات اقدس کے بحر معرفت میں غوطہ زن ہونے کے قابل کیونکر ہوتا۔

یاد رکھو جہاں کہیں بھی ہم نے جنایت کا لفظ ذکر کیا ہے۔ اس سے ہماری مراد یہ ہے کہ ''حال'' پر کسی کا علم، مقدم ہو۔ ''حال'' کا مفہوم اس کا وجود فی نفسہ ہے۔ جبکہ اس کے ارتقاء علمی سے قطع نظر کر لی جائے۔ برخلاف اس کے اُمّیت سے مراد یہ ہے کہ علم پر ''حال'' مقدم ہو۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ایک خالص عرب عربی بولتے وقت تمام قواعد صرف ونحو کا بالطبع اس میں اجراء کرتا ہے اور کبھی غلطی نہیں کرتا۔ لیکن اگر اس سے پوچھا جائے کہ مثلاً تم نے فاعل کو مرفوع اور مفعول کو منصوب کیوں پڑھا تو وہ اس کا جواب نہیں دے سکے گا۔ (کیوں کہ وہ غالباً اس سوال کا مطلب ہی نہیں سمجھا)۔ لیکن جس کا عربی بولنا اکتسابی ہے۔ وہ کبھی اس خالص عرب کی طرح روانی کے ساتھ عربی نہیں بول سکتا جس کی مادری زبان عربی ہے اور جو بالطبع صرف ونحو کی غلطی نہیں کرتا (اور یوں صرف ونحو کے قواعد میں وہ بیسیوں موشگافیاں کرتا ہے)۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ اس میں زبان دانی کا ملکہ اس قدر قوی ہو جائے کہ عربی زبان اس کے لئے بمنزلہ مادری زبان کے ہو۔ اَللّٰھُمَّ انی اسألک علما نافعا و قلبا خاشعا برحمتک یا ارحم الراحمین.

............☆☆☆............

پانچواں خزانہ

انبیاء علیہم السلام کے تعینات کے مبادی، ان کے فطری اور اکتسابی کمالات کی شرح اور تفصیل، اور ان کا (انبیاء کا) طریقہ سلوک

نبی کی حقیقت اور اس کے اسم کی تشریح جس طرح کہ حکماء ربانیین سمجھتے ہیں یہ ہے کہ اسکی عین ثابتہ کو بہ نسبت دوسری اعیان ثابتہ کے اس اسم پاک سے زیادہ قرب حاصل ہو جو اس کا منشأ وجود ہے، اس کی عین ثابتہ ان وجوہ اور اعتبارات، (حیثیات) کی جامع ہو جن سے اس کی فطرت بنی ہے، صورت مزاجیہ سے اس کو انسلاخ حاصل ہو اور قرب کے اقسام سہ گانہ یعنی قرب فرائض اور قرب نوافل اور قرب الوجود سے وہ بہرہ ور ہو۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ ہر ایک قسم میں وہ تفصیلی طور پر قدم راسخ رکھتا ہو۔ بلکہ ان کے اجمال اور ما حصل کا جامع ہو۔ ہر ایک قسم اس کی عین ثابتہ اور تشخص اور خیال کا تمثل ہو۔ نبی کے اوصاف میں سے یہ بھی ہے کہ وہ اُمّی ہو، جنایت سے مبرا ہو۔ وہ اپنے کسی علم کا تابع نہ ہو بلکہ خدائے بزرگ و برتر کے احکام کی تعمیل اور تنفیذ کرتا ہو۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی عین ثابتہ میں جو ملکوت سے ملحق ہے، تجلی فرمائی۔ اس کے اسم اور دیگر اسماء میں (جو ملکوت کا منشأ وجود ہیں) تصادق کی نسبت پیدا ہوئی۔ اس کے بعد اس کو ایک اور ارتقاء ہوا جو ان تمام کمالات کا زبدہ اور اجمال ہے جو اس اکتسابی طور پر حاصل کئے تھے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کامل توجہ کے ساتھ راغب ہوا، جس کے نتیجہ کے طور پر اللہ تعالیٰ نے اس پر اپنی شریعت نازل فرمائی اور اس کو وحی کے ذریعہ ان امور کی تعلیم دی جن میں کمال حاصل کرنا اس نظام عالم کا جز ہے جس کی بناء خیر و برکت پر ہے۔ اور اس میں ایک خاص حکیمانہ ترتیب اور تقسیم پائی جاتی ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کو یہ منظور تھا کہ نبی کے ذریعہ برائیوں کا استیصال کرے۔ اور لوگوں کو

تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آئے۔ اس لئے اس کو ایک ایسی شریعت عطا فرمائی جو لوگوں کے لئے ہدایت کا باعث ہو اور اس کی پابندی کرنا ان پر فرض ہو۔ نبی کا ادنٰی ترین فرض یہ ہے کہ جو اس کے سامنے آئے اس کے ارشاد و ہدایت میں کوتاہی نہ کرے۔

پھر انبیاء اور رسل کی بھی کئی قسمیں ہیں۔ بعض رسول وہ ہیں جو کافروں سے بحث و مناظرہ کرنے اور ان کو قائل معقول کرنے پر مامور ہوئے۔ احکام شرعیہ کی تقنین (احکام شرع کے اصول اور قوانین بیان کرنا۔ کیوں کہ جزئیات پر احاطہ کرنا تو ناممکن ہے خصوصاً اگر کسی نبی کا دین قرون متطاولہ تک باقی رہنے والا ہو)۔ اس قسم کے نبی کے عین ثابتہ کو بہ نسبت تمام دیگر انبیاء علیہم السلام کے زیادہ قرب حاصل ہوتا ہے، اور اس کا تعلق اور رابطہ بہت زیادہ مستحکم ہوتا ہے۔ اولوالعزم ان رسولوں کو کہتے ہیں جن کوئی شریعت دی گئی ہو اور ایک مستقل کتاب ان پر نازل ہوئی ہو۔ ان کے طریقہ کی اصل وہ تجلّی ہے جو ان کے ایجاد کے مطابق ہوتی ہے۔ ایسے رسول کا اُمّی ہونا نہایت ضروری ہے، جس سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنی رائے اور اپنی صوابدید کا مطلق اتباع نہ کرے، اس کی تعلیمات اور اعمال میں سراسر خدائے وحدہ لاشریک لہ کا حکم جاری اور نافذ ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ان کے سینوں میں اس اسم پاک کے ساتھ جلوہ گر ہوا جو ان کے عین ثابتہ کے رنگ میں رنگا ہوا اور احکام حدوث کے ساتھ موصوف ہے۔ تشریعات اور دیگر امور کا نظام اسی اسم پاک سے متعلق ہے۔ ان کے اپنے کسب و اکتساب کو اس میں کچھ بھی دخل نہیں۔ اگر ان کا کچھ کسب ہے تو یہی کہ وہ جس حالت میں ہیں اسی پر ٹھہرے رہیں (اور مزید ترقیات کا انتظار کریں) یہاں تک کہ اس اجمال میں وسعت پیدا ہو جو ان کی عین ثابتہ کے ضمن میں مستور تھا اور وہ اجمال واضح ہو جائے (تفصیل کی صورت اختیار کرے۔ امام اہل السنۃ (ابوالحسن اشعری) کا اسی نظریہ کی طرف اشارہ ہے جہاں وہ کہتے ہیں کہ نبوت غیر اکتسابی چیز ہے۔ یاد رکھو ان انبیاء کی عین ثابتہ کبھی کبھی نبوت کے علاوہ کسی دوسرے کمال کی بھی مقتضی ہوتی ہے۔ جس کو وہ حاصل کر لیتے ہیں۔ مثلاً اقتراب ملکی جس کی بدولت ہمارے نبی صلعم کو حسب ضرورت حکیمانہ نظام کلّی سے بہرہ وافی ملا۔ مثلاً عالم شہادت میں جس کو (ملکوت کے مقابلہ میں) عالم ملک بھی کہتے ہیں۔ ان کے کمالات متمثل ہوں، لیکن یہ تمثل فطری نہ ہو۔ اس کی ایک اور مثال یہ ہے کہ ادریس علیہ السلام کو بذریعہ کائناتِ علویہ کے، اور نوح

علیہ السلام کو بذریعۂ کائناتِ سفلیہ کے اور سلیمان علیہ السلام کو تسخیر جن اور تسخیر ریح وغیرہ کے ذریعہ قرب حاصل ہوا۔ ان میں سے ہر ایک اپنے کمال اور قرب کی حیثیت سے خاتم ہے قرب سے میری مراد یہ ہے کہ ان کے عین ثابتہ کو ان اشیاء کے ساتھ مناسبت تھی۔ اس لئے تمثّلاتِ اشیاء مادّی کی مناسبت کو نظر انداز کیا گیا۔

مزاج نبوت کی پانچ قسمیں ہیں (۱) تــراکـم ۔ جس سے مراد یہ ہے کہ صورت جو یہ (؟) اور صورت مزاجیہ میں مشابہت ہو۔ کمالاتِ ولایت کا انحصار اسی پر ہے اور نوح علیہ السلام اس قسم مزاج رکھنے والوں کے امام ہیں۔ ان کے انذار کی بناء ان اسماء حادثہ کی روشنی پر تھی جو کبھی کبھی انبیاء کے سینوں سے ظہور پذیر ہوتی ہے۔ (۲) قـربیّـت ۔ جس سے یہ مراد ہے کہ صورت جو یہ اس کی عین ثابتہ کے احکام کی بدرجۂ غایت تابع ہو، اور اس کی عین ثابتہ کو غایت درجہ کا قرب حاصل ہو۔ اس مقام کے امام ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم ہیں۔ فطری کمالات کا انحصار اسی پر ہوتا ہے۔ فطرت کو ان کی طرف منسوب کرنے اور شبِ معراج میں ان کے اس حالت میں متمثّل ہونے میں کہ گویا وہ معلّم صبیان ہیں۔ یہی نکتہ ہے۔ اس نکتہ کو یاد رکھو۔ (۳) صلابت۔ یہ اس صفت کا نام ہے جس کو تمام دیگر صفات سے وہی نسبت ہے جو اذعان کو کسی قضیہ کی ہیئتِ جامعہ سے ہوتی ہے۔ یہ واجب تعالیٰ کی ذات اقدس کا قریب ترین تمثّل ہے کیونکہ اس میں وحدت پائی جاتی ہے۔ اس کے امام موسیٰ علیہ السلام ہیں اور کمالات میں تبحر حاصل کرنا اسی پر موقوف ہے۔ چنانچہ اہل ولایت اس شخص کو جس کے مزاج میں صلابت ہو مجازاً موسوی المشرب کہتے ہیں وشتّان مابینہما (۴) سبوغ لہ۔ (درجۂ کمال تک پہنچا ہوا ہونا۔ امور غیر محسوسہ میں اس کو وہی رتبہ حاصل ہے جو عالم شباب میں تنومندی اور تناسب اعضاء کا ہے (جس کی بناء پر ایک نوجوان نہایت خوبصورت اور جاذبِ نظر ہوتا ہے)۔ قرب کے لحاظ سے یہ صلابت کی طرح ہے۔ انصباغ کے کمالات اسی پر موقوف ہیں اور اس کے امام حضرت مسیح علیہ السلام ہیں۔ اس مقام کو انہوں نے جبرئیل علیہ السلام کی نفخ کے بدولت پایا۔ ان کے نزول کو قتل دجّال کے لئے مخصوص کرنے میں یہی نکتہ ہے۔ (۵) امیّیت۔ یہ ایک ہیئت مخصوصہ ہے جس کو دیگر امزجہ سے وہی نسبت ہے جو صورت جو یہ کہ صورت مزاجیہ سے ہے۔ اس بناء پر یہ نہایت ضروری ہے کہ جس کا مزاج اس قسم کا ہو تو وہ اسم مقدس جس کا

مظہر اس کا سینۂ مبارک ہے شدید الاطلاق ہوگا اور اس کو غایت درجہ کا قرب حاصل ہوگا۔ اس درجہ کے امام سیّد المرسلین شفیع المذنبین اور وسیلۃ المقربین سیدنا و مولانا حضرت مصطفٰے صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہیں ختم نبوت کا اسی پر انحصار ہے، اور آپ کا مزاج اور کمال وہی اسم مطلق ہے جو آپ کے سینۂ بے کینہ میں متجلّی ہے۔ اسی لئے ہم آپ کو بزرگ ترین پیغمبر کہتے ہیں ؎

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

یاد رکھو! انبیاء علیہم السلام کی اعیان ثابتہ سب کی سب پانچ قسموں میں محصور ہیں۔ (۱) جس کو اولیاء کی زبان میں علم فعلی کا تمثّل کہتے ہیں۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ انہوں نے اس کو علم فعلی کے ذریعہ پایا۔ لیکن ہماری اصطلاح میں، جو قرب انبیاء کی نوعیت کے مطابق ہے۔ اس کو الحی القیوم (۱) کا تمثل کہنا چاہیے۔ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے بطریق اجمال اور ہمارے نبی صلعم نے بطریق تفصیل اس مقام کو پایا تھا۔ اسی بنا پر امّت مرحومہ کو خطاب کیا گیا کہ ملّۃ ابیکم ابراھیم، اور حضرت ابراہیم نے بارگاہ خداوندی عزّ اسمہ سے یہ دعا کی کہ ربّنا وابعث فیھم رسولاً منھم الخ، اور رسول خدا صلعم نے ایک موقعہ پر یہ ارشاد فرمایا کہ میں تمام انبیاءؑ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ زیادہ مشابہ ہوں۔ (۲) دوسری قسم شؤن کا تمثّل ہے جس سے مراد اسماء پاک کی اجمالی قسمیں ہیں۔ اس مقام پر یعقوب علیہ السلام اجمالاً اور موسیٰ علیہ السلام تفصیلاً فائز ہوئے، اور اسی لئے مؤخر الذکر کی شریعت کو یعقوب علیہ السلام کی شریعت کی شرح سمجھا گیا اور تورات میں گوشت شتر کو جو یعقوب علیہ السلام نے اپنے اوپر حرام کیا تھا حرام قرار دیا گیا۔ (۳) تیسری قسم ارادہ کا تمثّل ہے جس کے معنی ہیں افاضہ بالفعل۔ یہ مقام حضرت آدم علیہ السلام کو حاصل ہوا، اور وہ ابو البشر قرار پائے۔ یہ تینوں اقسام ابداع کے سلسلہ میں ہیں۔ (۴) چوتھی قسم ثبوتیات ہیں جو تمام انبیاء مثلاً یوسف علیہ السلام وغیرہ کے حصہ میں آئیں۔ (۵) پانچویں قسم سلبیات ہیں۔ ادریس اور نوح علیہما السلام وغیرہ انبیاء کو یہ مقام حاصل ہوا۔ یاد رکھو یہ دونوں اقسام جن کا ہم نے ذکر کیا ہے اصول کی حیثیت سے ہیں ورنہ انبیاء علیہم السلام میں ایسے اصحاب بھی ہیں جن کا مبدء خالص نہیں اور نہ ہی ان کا مزاج خالص ہے کامل افراد میں بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو

(۱) زندہ جاوید اور نظام عالم کو سنبھالنے والا۔ مراد ذات الٰہ، ذات باری تعالیٰ

اپنے کمال کے امام اور اس کے خاتم ہوتے ہیں۔ سمجھ لو۔

آدم علیہ السلام کے تعیّن کا مبدء اسم پاک المرید ہے جس کا اقتضاء ذاتی کائنات کا معرض وجود میں آنا ہے۔ اسی بناء پر وہ ابوالبشر قرار پائے، کیونکہ اَبْ یعنی باپ اور خالق کی حیثیت عالم مادّی میں ایک جیسی ہوتی ہے۔ حضرت آدم کی زیادہ تر توجہ نسل افزائی اور زمین کی پیداوار بڑھانے پر مبذول رہتی تھی، یہ دونوں باتیں صفت تخلیق کے تمثّلات ہیں۔ قرآن مجید میں ہے **وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَاءَ كُلَّهَا۔** "اس نے آدم علیہ السلام کو سب کے سب نام بتادیئے" اس تعلیم کی کیفیت ہمارے نزدیک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر ان اسماء پاک حقیقت ظاہر فرمائی جن کی تخلیطات سے حوادث عالم ظہور میں آئے ہیں، اور عالم صوت کی وسعت کا اس پر انکشاف ہوا۔ اس بات کا بھی اس کو علم دیا گیا ہر ایک جزئی خواہ وہ مقدّس ہو یا متدنّس، موجود ہو یا معدوم، اسکی ایک مخصوص صورت ہوتی ہے، چنانچہ آدم علیہ السلام نے اصوات میں تقطیع پیدا کر کے اصول تکوین کے لئے حروف وضع کیے، پھر ان کو آپس میں ترکیب دی (تاکہ الفاظ اور کلمات ظہور میں آئیں)۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا سب سے پہلا صحیفہ حروف تہجّی پر مشتمل تھا۔ چوں کہ اس کا سبوغ کامل تھا۔ خصوصاً اس کا وہ کمال جو ابوالبشر ہونے کی حیثیت سے اس کو حاصل تھا، اس لئے قوت حال کا تقاضا یہ ہوا کہ غلبۂ حال کے اوقات میں اس سے اس کی نسل ظاہر ہو اس حالت میں جو واقعات اس کے سامنے تھے وہی واقعات بعینہ اس کی نسل کو پیش آئے۔ کسی آدمی کا بیٹا اس کی عین ثابتہ کے ضمن میں شامل ہوتا ہے۔

شیث علیہ السلام کے تعیّن کا مبدء الوھاب کا اسم پاک ہے جو ارادہ کی اوّل ترین جزئی کا مظہر ہے۔ آدم علیہ السلام کی طرح اس کی بھی زیادہ تر توجہ نسل افزائی اور زمین کی پیداوار بڑھانے پر مبذول رہتی تھی۔ وہ اپنے باپ (حضرت آدم) کا وصی اور اس کے کمالات کا آئینہ تھا۔ اس کے باپ کا مزاج متراکم تھا اور اس اکتسابی کمالات میں سے تجلّی سلبی تھی جس کے ذریعہ تراکم میں اضافہ ہوا۔ شیث علیہ السلام فطرت وفطری اور اکتسابی طور پر اپنے باپ کا وارث تھا، جب کمال سلبی کو تحقق خاص ہوا اور دونوں حیثیتوں سے اس کا تقرر ثابت ہوا تو اس میں تمثیل کی قابلیت پیدا ہوئی۔

ادریس علیہ السلام کا مبدء تعیّن السبّوح کا اسم پاک ہے جس کا درجہ القدّوس سے بلند تر ہے۔ ان دونوں میں وہی فرق ہے جو عدم اور سلب وجود کے درمیان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی قوم پر نوح علیہ السلام کی قوم کی طرح مہلک اور مستأصل عذاب نازل نہ ہوا۔ اس کا مزاج بھی متراکم تھا لیکن سلبیّت کی وجہ سے اس میں ضعف پیدا ہوا۔ اس کا اکتسابی قرب کائنات علویہ کے ذریعہ تھا۔ اس بارے میں اس کی شان بہت بڑی ہے۔ وہ اس قسم کے قرب کا خاتم تھا۔ جب اس کے متفرقات میں وحدت پیدا ہوئی تو اس نے کائنات علویہ کے عین وسط یعنی آفتاب کو اپنا وطن بنالیا(۱)۔

نوح علیہ السلام کا مبدء تعیّن القدّوس کا اسم پاک ہے جو السبّوح کی شرح اور تفصیل ہے۔ اس سلسلہ میں ان متدنسات اور ملوّث بہ مادہ باشیاء کا بھی ذکر آتا ہے جن کے اوصاف سے اس کی ذات اقدس کو منزّہ ومبرّا سمجھنا لازم ہے۔ اس کا مزاج متراکم تھا۔ لیکن سلبیّت نے اس کی شدّت کو کم کردیا۔ اس کے کمالات مکتسبہ میں سے تجلّی ارادی ہے۔ آدم علیہ السلام کو یہ کمال فطرۃً حاصل تھا۔ اس کا قرب کائنات سلفیہ کے ذریعہ تھا، جیسے کہ ادریس علیہ السلام کو کائنات علویہ کے ذریعہ قرب حاصل ہوا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسم پاک سبّوح کے مفہوم کو علویات سے خاص مناسبت ہے، برخلاف اس کے سفلیات کو قدّوس کے اسم پاک سے خاص نسبت ہے۔ اس کی قوم کے عذابِ استیصال سے ہلاک ہونے میں یہی راز تھا۔ ہلاکت قوم کے بعد وہ نسل افزائی اور زمین کی پیداوار بڑھانے میں مصروف رہا اور آدم ثانی کا لقب پایا۔

نوح علیہ السلام کی طرح ہود علیہ السلام کے تعین کا مبدء سلبیات ہیں۔ کمالات مبدء میں سے اس کا ایک کمال اکتسابی ہے۔ اس کے فروع میں سے علم توحید ہے۔ چنانچہ کلام مجید میں اس کا یہ قول منقول ہے ان ربی علی صراط مستقیم۔ جہاں تک ہم جانتے ہیں ہود علیہ السلام کا مبدء تعین خالص نہیں تھا اور وہ متراکم المزاج تھا۔ اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء کے مراتب کو اچھا جانتا ہے۔ صالح علیہ السلام کا مبدء تعیّن اور اس کا کمال مکتسب ہود علیہ السلام کی طرح تھا اور اس کو تجلّی اضافی حالی کی خصوصیت حاصل تھی۔ اسی بناء پر اس کی قوم کی شرارتیں اونٹنی کی صورت میں

---

(۱) ہیئت جدیدہ کی بھی یہی تحقیق ہے کہ آفتاب کی حیثیت مرکزی ہے۔

نمودار ہوئیں۔ جیسے کہ اشارۃً مذکور ہو چکا ہے۔ اور یہ ایک قاعدہ کلیہ ہے کہ جن انبیاء کا مبدء تعین سلبی ہے ان کی قوم پر عذاب استیصال نازل ہوتا ہے اور ان کی دعا ان کے حق میں زیادہ مؤثر نہیں ہوتی۔ اس کے بالعکس کبھی نہیں ہوتا۔ تراکم اور سلبیات کا سلسلہ صالح علیہ السلام پر ختم ہو گیا۔ چنانچہ انبیاء سلبیین کا وہ خاتم ہے۔

ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی شان بہت بڑی ہے۔ تعری اور ایجاب کا سلسلہ انہیں سے شروع ہوا۔ اور ان کے تعین کا مبدء بحیثیت اجمالی الحی القیوم ہے۔ ان کا مزاج میں سبوغ اور صلابت دونوں شامل ہیں ورنہ ان کو یہ انتہائی کمال حاصل نہ ہوتا، اور اگر یہ دونوں اوصاف یعنی سبوغ اور صلابت ان میں بدرجۂ کمال پائی جاتیں تو ان کو اجمال کا تمثل نہ کہا جا سکتا۔ اس سے ان کے دل میں انقباض پیدا ہوا اور انہوں نے بارگاہ کبریا جل وعلا سے بیٹے کی درخواست کی، جو بوجھ اٹھانے میں اس کا دست راست ثابت ہو اور ان کے مرتبۂ اجمال کی شرح وتفصیل کرے۔ چنانچہ آپ کی یہ دعا مستجاب اسمٰعیل علیہ السلام اسم پاک العلی کا تمثل تھے جس سے ان کو (ابراہیم علیہ السلام کو) تمکین اور شرح صدر حاصل ہوا۔ اس کے بعد وجدانی غلبہ کی حالت میں جو آپ کی استعداد فطری کا تقاضا تھا۔ اس بات پر مامور ہوئے کہ ان سے کوئی ایسا عمل صادر ہو جس کا نتیجہ ان کے کمال مطلق کا تمثل ہو اور اسمٰعیل علیہ السلام بھی اس میں ان کا ہاتھ بٹائیں۔ چنانچہ آپ کو سخت انسلاخ کی حالت پیش آئی اور انہوں نے خانہ کعبہ تعمیر کیا ہو۔ جو عالم حس میں متفرقات کا جامع ہے۔ پھر لوگوں کے دلوں میں محبت ڈالی گئی کہ وہ اس خانۂ خدا کی طرف کھنچ کر آئیں۔ عوام کو تو شرع نے اس پر مامور کیا اور خواص نے اپنی استعداد سے اپنے آپ کو اس پر مائل پایا۔ یہ اجمال سابق کی تفصیل تھی۔ چونکہ آپ کے کمال تفصیلی کا کوئی ضابطہ نہیں تھا اس لئے آپ پھر گرفتہ خاطر ہو گئے اور آپ کو اسحٰق علیہ السلام کی ولادت کی بشارت دی گئی، جو اسم پاک العظیم کا تمثل تھے۔ اس سے آپ کی طبع مبارک میں شگفتگی پیدا ہوئی۔ اس کے بعد وجدانی غلبہ کی حالت میں آپ کو پھر حکم دیا گیا کہ ایک دوسرا گھر عبادت کا تعمیر کریں جو متفرقات کا جامع ہو اور انہوں نے بیت المقدس تعمیر کیا۔ ہمارا ذوق سلیم یہی کہتا ہے اور اس حدیث کے کہ ''کعبہ اور بیت المقدس کی تعمیر کے درمیان چالیس سال کا عرصہ تھا'' ہم یہی معنی سمجھتے ہیں۔ ہمارے نزدیک ذبیح اسمٰعیل علیہ السلام

تھے، کیونکہ اسحق علیہ السلام کی ذات میں ان کی نسبت زیادہ اجمال تھا۔ اس کی تھوڑی سی تفصیل بعد میں آئے گی۔ خلاصہ یہ کہ اسحق علیہ السلام کمال تفصیلی کے اور اسمٰعیل علیہ السلام اجمالی کے منبع تھے۔

یعقوب علیہ السلام مبدء شؤن تھے اور اس لئے وہ (بنی اسرائیل میں) ابوالانبیاء اور انبیاء بنی اسرائیل کے مقتدا قرار پائے۔ چنانچہ تمام انبیاء بنی اسرائیل کے اجمال کے احکام انہیں کی طرف منسوب ہوتے ہیں۔ آپ کو موسیٰ علیہ السلام سے وہی نسبت ہے جو ابراہیم علیہ الصلوۃ والتسلیم کو ہمارے نبی کریم صلعم سے ہے۔ یوسف علیہ السلام کا مبدء تعین الولی کا اسم پاک تھا اور صفت جمال نے انتہائی۔ درجہ تک ان میں سرایت کی تھی۔ یہاں تک کہ ان کا ظاہری جسم بھی جمال ظاہر کا اعلیٰ ترین نمونہ تھا۔ آپ اس وقت تک یعقوب علیہ السلام کے کمال کی شرح و تفصیل نہیں تھے اور نہ ہی وہ نبی مرسل تھے جب تک کہ وہ کمال شفافیت کی بنا پر ان کے فیض سے موئید نہ ہوئے۔

عوام کا خیال ہے کہ الولی کے تین معنی ہیں اور ان معانی ثلاثہ پر علی سبیل الاشتراک اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ (الف) قریب۔ (ب) سرپرست۔ اسی معنی کے لحاظ سے وصی اور حاکم اور بادشاہ کو ولی کہا جاتا ہے۔ (ج) محب اور محبوب۔ لیکن ہمارے نزدیک اس کے ایک ہی معنی ہیں۔ وہ یہ کہ اس کو (اللہ تعالیٰ کو) اپنے بندں سے قرب ذاتی ازلی حاصل ہے، محبت اور سرپرستی کے معنے اس کے ضمن میں آجاتے ہیں۔ لیکن یادرکھو مطلق قرب ذاتی ازلی اور الولی کے مفہوم میں جو یوسف علیہ السلام کا مبدء تعین ہے، بڑا فرق ہے۔ موخر الذکر جمال در جمال ہے اور خالص ہیئت جمالیہ کے ساتھ مخصوص ہے یہ فرق بعینہ ایسا ہے جو ہم نے اپنی بعض تصانیف شرعیہ میں الفت اور مہمانی کے معانی کے درمیان بیان کیا ہے۔ یہ وہ ولی ہے جو عین یوسف ہے، لیکن وہ ولی جس سے وہ تمثل تھے وہ اس سے لطیف تر، اعلیٰ اور زیادہ شاندار ہے۔ آپ کی دعا یہ تھی انت ولیّ فی الدنیا والاخـــــرہ۔ بطن رابع میں اس کے معنی یہ ہیں کہ تو ہی میرا ولی ہے کہ مجھے پیدا کیا، تو ہی دنیا اور آخرت میں میرا سرپرست ہے، اور تیرے ہی اسم پاک الولی سے میر اظہور ہوا، چنانچہ میں معرض وجود میں آیا اور دنیا و آخرت میں ولایت کا مظہر ہوا۔ اسی کے بطن خامس کا یہ مفہوم ہے کہ انہوں نے بارگاہ الٰہی جلّ شانہٗ سے درخواست کی کہ قرب قیامت پر ایک مرتبہ وہ پھر اسم پاک الولی کے لباس میں ظہور فرمائے تاکہ وہ شخص اسم جامع محمدی اور اسم جامع عیسوی کے رنگ میں رنگا

جائے۔ جو پہلے حکیم معصوم اور ذی وجاہت تھا، تمام انواع ارتقاء پر احاطہ کئے ہوئے تھا، جمال اس کے تمام اجزاء میں سرایت کئے ہوئے تھا چنانچہ اس کے ہاتھ پاؤں اور اس کی زبان اور دل سب ہی مجسم جمال تھے تاکہ یہ شخص یوسف علیہ السلام کے اجمال کے لئے بمنزلہ تفصیل کے ہو اور اس کی شفافیت کے حقوق بجالائے، غوامض اسرار کے قلعے اس کے لئے فتح کرے۔ اور اقالیم علوم کو اس کے زیر نگین کردے جس سے اس کی آنکھ کو نور اور دل کو سرور پہنچے گا۔ شاید اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کی اس دعا کو شرف اجابت بخشا والحمد للہ تعالیٰ رب العالمین۔ (یہاں پر پھر میں وہی شعر دہراؤں گا۔

خوشتر آن باشد کہ سر دلبراں
گفتہ آید در حدیث دیگراں

آگے خود سمجھ لیجئے)۔ غالباً یوسف علیہ السلام کو شفافیت سے گہرا تعلق تھا۔ اس لئے تمام انبیاء علیہم السلام میں یہ صفت انہیں کے لئے مخصوص تھی۔ اس کا اقتضاء لحوق بالصالحین ہے، جس کی انہوں نے اپنی دعا میں درخواست کی ہے۔ اب تم جانتے ہو کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کس کی صلاح کامل تر ہو سکتی ہے، اور اگر آپ کا کوئی ایسا خلیفہ نہ ہو جس کو آپ سے لحوق حاصل ہو تو پھر ان کی دعا مستجاب ہونے کی کچھ بھی حقیقت باقی نہیں رہتی۔

ایوب علیہ السلام کا مبدء تعین خالص نہیں تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ بعض شوؤں کا وہ تمثل تھے جس سے وہ بے خبر تھے، اس لئے وہ بلاء عظیم وجسیم میں مبتلا ہوئے۔ اسی طرح شعیب علیہ السلام کا مبدء تعین بھی خالص نہیں تھا، اس میں سلب کی آمیزش تھی۔ اور میرا خیال ہے کہ وہ قوم کی ہلاکت کا باعث نہیں تھے۔ انہوں نے خود اپنے آپ کو ہلاک کیا تو شعیب علیہ السلام کو ان کی ہلاکت کا باعث قرار دیا گیا۔ کیوں کہ ان کو قرب فرائض کا کمال بدرجۂ غایت حاصل تھا۔ اس کے بعد ان کو امیّت کا کمال بھی حاصل ہوا۔ ان ہی دو مذکورہ پیغمبروں کی طرح لوط علیہ السلام کا مبدء تعین بھی خالص نہیں تھا، وہ ابراہیم علیہ السلام کی تخلیطات سے تھے (۱)۔ جس طرح کی شعیب علیہ السلام

---

(۱) جس طرح بعض مرکب دوائیوں کو ان کے جزء اعظم کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ مثلاً کہتے ہیں کہ رسکپور پارہ کے مرکبات سے ہے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کی تخلیطات سے تھے۔ وہ بھی قوم کی ہلاکت کا باعث نہیں ہوئے بلکہ انہوں نے خود اپنے آپ کو ہلاک کیا اور پھر لوط علیہ السلام کو ان کی ہلاکت کا باعث قرار دیا گیا، کیونکہ قرب فرائض میں وہ قدم راسخ رکھتے تھے۔

موسیٰ علیہ السلام کے تعین کا مبدءِ ثبوتیات ہیں، لہٰذا آپ پر جو کتاب نازل ہوئی وہ سب سے بڑی تھی، آپ کا علم سب سے وسیع اور آپ کی امت بہت زیادہ تھی، ان کا طریق ہدایت وارشاد سب سے اچھا تھا۔ ان کو مقامات میں قدم راسخ حاصل تھا، اور اکتساب کمالات میں وہ پیش از بیش تھے۔ اس لئے وہ مامور بہ جہاد ہوئے اور بڑے حسن تدبّر اور حسن سیاست کے ساتھ اپنی قوم کی قیادت وسیادت کے فرائض بجالائے انواع، کمالات میں تبحر کے لحاظ سے آپ ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مشابہ تھے۔ صرف اتنی بات ہے کہ وہ خاتم الانبیاء نہیں تھے ہارون علیہ السلام کی نبوت (حقیقی نہیں بلکہ) حکمی تھی۔ وہ تو موسیٰ علیہ السلام کے معاون اور ان کے دست وبازو تھے۔ جب موسیٰ علیہ السلام شدّت فرماتے تو وہ نرمی کرتے، کیوں کہ حضرت موسیٰ کے مزاج میں شدت اور صلابت (کڑاپن) بہت زیادہ تھی۔ خضر علیہ السلام نے آپ کو یہ سبق دیا کہ قرب نوافل میں بھی ایسے مقامات ہیں جو قرب فرائض کے مقامات کے مدّ مقابل ہیں، چنانچہ اسکا ایک لڑکے کو قتل کرنا اغراق فرعون کے مقابلے میں تھا، دیوار کو بغیر اجرت کے بنا دینا موسیٰ علیہ السلام کے اس فعل کے مرادف تھا کہ اس نے شعیب علیہ السلام کے ریوڑوں کو پانی پلایا، اور کشتی میں شگاف کرنے کی مثال یہ تھی کہ حضرت موسیٰ کی ماں نے اس کو تابوت میں بند کر کے دریا میں ڈال دیا تھا۔ چوں کہ وہ آتشیں مزاج تھے اور ان کے اخلاق میں شدت تھی۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کے سامنے آگ کی صورت میں تجلی فرمائی اور چونکہ قرب فرائض میں ان کو کمال حاصل تھا۔ اس لئے ان سے بلا واسطہ کلام فرمایا۔ موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں اللہ تعالیٰ نے کلام مجید میں شعیب علیہ السلام کا ذکر نہیں فرمایا، کیوں کہ ابتداء میں ان کا تعین خالص خالی از شوائب نہیں تھا۔ ان کی قوم پر عذاب نازل ہونے اور ان کی ہلاکت ہی کے وقت قرب فرائض میں ان کا درجہ نمایاں ہوا۔ یوشع اور شموئیل علیہما السلام کا مبدءِ تعین خالی از شوائب نہیں تھا۔ الیاس علیہ السلام کے مزاج میں موسیٰ علیہ السلام کی طرح کڑاپن تھا۔ اس لئے ان کا معجزہ آگ کا مسخر ہونا تھا، اور دریاؤں اور بیابانوں

میں گھومتے تھے۔

داؤد علیہ السلام کا مبدء تعین الملک کا اسم پاک تھا، اور ان کے مزاج میں سبوغ تھا، سلیمان علیہ السلام ان کے وارث اور تسخیر اور بادشاہت کے خاتم تھے۔ میری رائے تو یہ ہے کہ ان کا یہ خاتم ہونا بالقوہ اور بالفعل دونوں لحاظ سے تھا۔ اُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ۔ ''اسکو ہر ایک چیز سے بہرہ ور کیا گیا'' جو بلقیس کے قصہ میں آیا ہے۔ اس سے مراد حسن و جمال اور معارف حکمت کا اکتساب وغیرہ کمالات ہیں۔ شعیب اور یونس علیہما السلام کا مبدء تعین خالص نہیں تھا۔ یونس علیہ السلام پر قرب فرائض اس قدر غالب تھا کہ اگر اس کی قوم کا تمرد وطغیان ملحوظ نہ ہوتا تو اس کو رسالت سے سرفراز نہ کیا جاتا۔ اسی طرح یحیٰ اور ذکریا علیہما السلام کا مبدء تعین بھی خالص نہیں تھا۔

عیسیٰ علیہ السلام کی شان بہت بڑی تھی، ان کو زبردست دلائل اور کھلی نشانیاں دے کر رسول بنایا گیا۔ انکے مزاج میں سبوغ تھا۔ اس لئے ان کو جو معجزات عنایت کئے گئے ان کا تعلق سبوغ سے تھا، چنانچہ ان کے معرض وجود میں آنے کی نوعیت بھی ان کے سبوغ کا نتیجہ تھا اور اسی بنا پر سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے انوار ان کی ذات میں منعکس ہوئے۔ عوام کا خیال ہے کہ جب وہ دوبارہ زمین پر اتریں گے تو ان کی حیثیت ایک امتی کی ہوگی۔ یہ بات غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کا نزول اسم جامع محمدی کی شرح اور تفصیل ہے، اسم مذکور کی نقل اور اس کا خاکہ ہے۔ اس لئے ان کے اور ایک امّتی کے درمیان بہت بڑا فرق ہے۔ اتنی بات ضرور ہے کہ وہ قرآن مجید کا متبع ہونگے اور خاتم الانبیاء کے نقش قدم پر چلے گے، لیکن ان سے اس کے کمال میں کچھ بھی فرق نہیں آتا، بلکہ ان سے اس کے کمال میں اضافہ ہوتا ہے۔ سمجھ لو۔ وہ بلحاظ اپنی ذات کے یہودیوں کے شرور اور برائیوں کے لئے بمثل محاق کے تھے۔ قرب قیامت میں ان کے دوبارہ دنیا میں آنے کی بھی یہی وجہ ہے۔ اس کی مزید تفصیل آگے آئے گی (۱)۔

ہمارے نبی کریم سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک اسم پاک الحی القیوم کا تفصیلی تمثل ہے جو سبوغ اور وسعت کے ساتھ تمام وجوہ مختلفہ کا جامع ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کے

---

(۱) مہینہ کے آخر ایک دو دن میں جب کہ چاند بالکل بے نور ہو کر آنکھوں سے بھی اوجھل ہو جاتا ہے۔ اس حالت کو محاق کہتے ہیں۔

سب کمالات انتہائی درجہ تک پہنچے ہوئے تھے، آپ خاتم النبیین قرار پائے، اور آپ کو سب انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام پر فضیلت بخشی گئی۔ جس کی وجہیں ہیں۔ آپ کی ہیئت عینیہ ایک جامع اُمیت تھی، اور جو اسم پاک آپ کا مبدء تعین ہے وہ آپ کے قلب مبارک سے طلوع کئے ہوئے رہتا تھا۔ آپ کا یہ قول کہ ''یونس بن متی سے مجھ کو افضل نہ کہو'' اس کے معنی عمیق ہیں۔ (وہ معنی نہیں جو سرسری نظر میں ظاہر الفاظ سے متبادر ہوتے ہیں) اس کہنے کا راز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس نے اعیان رسل میں تجلّی فرمائی۔ جس کی بدولت نظام تشریعی مکمل ہوا، چنانچہ حقیقت اور ثبات کے لحاظ سے سب شریعتیں برابر ہیں، موطن تفاضل ازلی کمالات ہیں۔ (جن کا نفس شرائع سے کچھ تعلق نہیں) ویسے ہر ایک پیغمبر نے جو احکام خداوندی لوگوں تک پہنچائے ہیں۔ ان کی سچائی میں ذرہ بھر بھی شک نہیں۔ البتہ طریق تلقی اور اخذ عن اللہ کی نوعیت اعیان کے مختلف ہونے کے لحاظ سے ہر ایک پیغمبر کے حق میں مختلف ہے۔ خلاصہ یہ کہ تفاضل کی نفی اس لئے کی گئی ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام کی شریعتیں دوسری حیثیات سے قطع نظر کر کے نفس سچائی کے لحاظ سے بالکل برابر ہیں، کیونکہ سب کا مأخذ اور منبع ایک ہے۔ تفاضل صرف اس حیثیت سے ہے کہ ان کے اعیان کی استعدادات مختلف ہیں۔ اس کی مثال یہ ہے کہ زید عمرو بکر نفس انسانیت کے لحاظ سے ایک ہیں۔ لیکن اولاً بالذات اعیان کے لحاظ سے اور ثانیاً و بالعرض صفات کے لحاظ سے ان میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ مساوات انسانیت کے لحاظ سے ہے اور تفاضل کی بناء اختلاف اعیان پر ہے۔ (جس میں نفس انسانیت کے علاوہ دوسری حیثیتیں اور خصوصیات ملحوظ ہوتی ہیں)۔ یہ بات تمہاری سمجھ میں آگئی ہے تو پھر تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ حدیث تفاضل کے منافی ہے۔ اس کی مثال وہ دو حدیثیں ہیں جن میں سے ایک میں آپ فرماتے ہیں کہ:- ''بیماری سرایت نہیں کرتی'' اور پھر سب سے پہلے اونٹ میں مرض کس کے ذریعہ سرایت کی؟'' (یہ اس وقت فرمایا تھا جب کہ ایک بدوی خارشتی اونٹوں کی مثال دے کر مرض متعدی کا ثبوت دینا چاہا)۔ پھر ایک موقعہ پر یہ بھی ارشاد فرمایا کہ اپنے خارشتی اونٹوں کو تندرست اونٹوں سے الگ رکھو (تاکہ انکو مرض نہ لگ جائے)۔ ''نیز یہ بھی آپ کی حدیث ہے کہ کوڑھی سے اس طرح بھاگو جس طرح آدمی شیر سے بھاگتا ہے۔'' اگر چہ بظاہر ان حدیثوں میں تناقض معلوم ہوتا ہے لیکن ان میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ پہلی دوسری

حدیث میں اسباب ظاہری سے قطع نظر کر کے نفس سرایت کو غیر اللہ کی طرف منسوب کرنے کی نفی کی گئی ہے اور مؤخر الذکر حدیثوں کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو مؤثر حقیقی سمجھتے ہوئے اسباب کی پابندی کرنا شرع کے منافی نہیں۔ جن معانی پر ہم نے اس آیت کو محمول کیا ہے کہ مَا نَنْسَخْ مِنْ ایٰۃٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْهَا اَوْ مِثْلِهَا اس میں بھی یہی راز ہے ''اقاویل شرعیہ'' کی ذیل میں تم کو اس کی تفصیل ملے گی۔ یاد رکھو حکیم ربانی کہ قرب الوجود اور ولی کو قرب نوافل اور نبی کو قرب فرائض کے مقام میں توغل (۱) اور قدم راسخ حاصل ہوتا ہے۔ بعض انبیاء ایسے ہیں جن کو ان کے اعیان کے اقتضاء ذاتی کی وجہ سے نبوت ملی اور بعض دوسرے ایسے ہیں جن کو بدیں وجہ نبوت سے سرفراز کیا گیا کہ ان کی قوم نے تمرد اور سرکشی اختیار کی۔ اس کا راز یہ ہے کہ جب کوئی قوم اپنے طغیان اور عصیان کے باعث نزول عذاب کی مستحق ہوتی ہے اور ایک ایسی شخصیت اس وقت موجود ہو جو ذات اقدس کی تجلی گاہ ہے تو مقام وجوب کی سطوت و جبروت کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ اس کو تبلیغ کے ساتھ مامور فرمایا جائے وہ ان لوگوں سے جھگڑا کر کے اور بحث و مناظرہ کر کے ان کو راہ راست پر لائے اور اگر وہ کسی طرح نہ مانیں تو ان کے اہلاک اور استیصال کے لئے بارگاہ کبریاء جل و علا میں دست بدعا ہو۔

لوگوں میں مشہور ہے کہ کسی کو چالیس سال سے پہلے نبوت نہیں ملتی۔ لیکن ہمارے دل کو یہ بات نہیں لگتی (قرآن مجید میں حضرت یحییٰؑ کے حق میں صریحاً وارد ہوا ہے **واٰتینٰہ الحکم صبیًا**۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی اپنی رائے کا اتباع کرے تو کرنے دو)۔ نیز یہ بھی مشہور ہے کہ نبی کی سچائی معجزہ سے ثابت ہوتی ہے۔ (جس کا مفہوم عام طور پر کوئی امر خارق عادت سمجھا جاتا ہے)۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ بھی قاعدہ کلّیہ نہیں۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ اس کو ایسی کھلی نشانیاں دی جائیں جن کو دیکھ کر اکثر لوگ (جو اکھڑ اور ضدی طبیعت کے نہ ہوں) ایمان لائیں، عام اس سے کہ وہ عقلی دلائل ہوں یا کوئی خارق عادت امر ہو یا یہ کہ اس کو کتاب معجز دی گئی ہو یا اس کے

---

(۱) توغل: توغل فی الشیء داخل ہو کر چھپ جانا۔ دور ہو جانا۔ توغل فی البلاد ملک میں دور تک چلا جانا۔ نبی اپنے منصب نبوت میں راسخ العقیدہ اور راسخ القدم ہوتا ہے۔ اور عمق و گہرائی میں غرق اور ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔ جسے ''توغل'' کہتے ہیں۔ (قاسمی)

اخلاق عالیہ تمام دوسرے لوگوں سے اعلیٰ تر ہوں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اظہار معجزات میں عموماً دعا کرنے کا طریقہ اختیار فرمایا۔ یہاں پر ایک اشکال وارد ہوتا ہے وہ یہ کہ ہر ایک عہد میں انبیاء علیہم السلام کو نئی شریعت عطا کی جاتی ہے جس کا حکم دینے والا ازلی خدائے قدوس ہے۔ لیکن تم جانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کے حق میں تجدّد اور زوال ناممکن ہے۔ اہل حکمت کے مسلک پر اس کا جواب یہ ہے کہ شریعت جدیدہ کا حکم دینا خدائے بزرگ و برتر کے اسم حادث سے تعلق رکھتا ہے، جس سے ہماری مراد اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس ہے۔ جس نے اس رسول کے عین پر تجلّی فرمائی ہے جیسے کہ قرب فرائض کی بحث میں تم معلوم کر چکے ہو۔ اس قسم کی تجلی کے ساتھ صورت امکانیہ شامل ہوتی ہے جس کی وجہ سے اس کو تجدد اور زوال سے موصوف کیا جا سکتا ہے۔

قرآن پاک میں آیت ہے مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَاءِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَاءُ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ ”کسی بشر کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ کلام کرے مگر وحی کے ذریعہ یا پردہ کے پیچھے یا یہ کہ اپنا رسول بھیجے جو اس کے ارادۂ عالیہ کے مطابق اس کی مرضی سے اس کی وحی پہنچائی، بے شک اس کی شان بہت بڑی اور وہ حکمت والا خدا ہے۔“ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس بات کی توضیح فرمائی کہ اللہ تعالیٰ کے کسی بندہ کے ساتھ کلام کرنے کی تین صورتیں ہیں (۱) اس کے سامنے اسماء پاک کی حقیقت کھل جائے اور اس سے اس کو کوئی ایک باتیں سوجھ جائیں۔ اسی کو وحی سے تعبیر فرمایا ہے، جس کے معنی ہیں چھپے طور پر کوئی اشارہ کرنا۔ (۲) اللہ تعالیٰ اپنے کلام کو اس کو مدرکہ متمثل فرمائے (اور اس کی سمع اس کو واضح طور پر سن لے) یہ دوسری صورت ہے جس کو مِنْ وراء حِجَاب سے تعبیر فرمایا ہے (۳) فرشتہ ایک جیتے جاگتے انسان کی شکل میں اس کے سامنے متمثل ہو (اور اللہ تعالیٰ کا پیغام اس تک پہنچا دے۔)

قرآن پاک میں ایک جگہ پر یہ بھی ارشاد ہوا ہے وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّا اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ”ہم نے تم سے پہلے جتنے بھی رسول اور نبی بھیجے ہیں (ان کی یہ کیفیت رہی کہ) جب وہ کوئی آرزو کرتے تو شیطان ان کی اس آرزو میں دخل دیتا۔ پھر

اللہ تعالیٰ شیطانی القاء کو تو مٹا دیتا اور اپنی آیات کو پائداری اور استحکام بخشتا۔ وہ تو جاننے والا، حکمت والا ہے۔'' شیطان سے مراد عالم مادّی کی برائیاں (اور اس کی تلویثات) ہیں۔ یاد رکھو ہر ایک مقرب بندہ کو اس کی جسمانیت کے لحاظ سے تخلیط حاصل ہوتی ہے، چنانچہ اس کے سینہ میں اس قسم کا وسوسہ پیدا ہوتا ہے جس پر ذوق اور وجدان کا شبہ ہوتا ہے۔ لیکن بہت جلد وہ مضمحل ہو جاتا ہے اور وہ وسوسہ اس کے دل سے دور ہو جاتا ہے۔ اسی کو نسخ سے تعبیر فرمایا ہے۔

ابن عباسؓ نے اس آیت میں لفظ نبی کے بعد مُحدَّث (بفتح الدال) کا لفظ بڑھایا ہے۔ (محدّث اس شخص کو کہتے ہیں کہ اس کے دل میں جو خیال پیدا ہو، اسی کے مطابق وحی نازل ہو۔ جس طرح حضرت عمر کو کئی موقعوں پر ایسا ہی پیش آیا اور جن کو موافقات عمر کہتے ہیں)۔ اور مثال کے طور پر آل فرعون کے مؤمن اور شیخ انطاکیہ کا نام لیا ہے، جس کا یہ قول قرآن مجید میں منقول ہے **ومالی لا اعبدالذی فطرنی والیہ ترجعون**۔'' کیا وجہ ہے کہ میں اس پاک خدا کی عبادت نہ کروں جس نے مجھ کو پیدا کیا اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک حدیث میں فرماتے ہیں'' جو اقوام تم سے پہلے گزر چکی ہیں ان میں مُحدَّث لوگ ہوتے تھے۔ بغیر اس کے کہ وہ انبیاء ہوں۔ میری امت میں اگر کوئی اس قسم کا شخص موجود ہے تو وہ عمر ہے۔'' یہ حدیث صحیحین میں ہے میں کہتا ہوں محدّث کے دو معنی ہیں۔ (الف) وہ شخص جس کو صحابہ جیسا قرب حاصل ہو، وہ اس اسم متجدد کے رنگ میں رنگا ہوا ہو۔ جس کا مظہر اور مطلع نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا عین سینہ مبارک تھا اور جس میں اس اسم پاک کے تمام تمثلات موجود ہوں حضرت عمر اسی قسم سے تھے۔ (ب) جس کی حکمت وسیع ہو اور جس کو بالآخر قرب فرائض کا مقام حاصل ہو گیا ہو، اور اس کے مقامات انبیاء علیہم السلام کے مقامات عالیہ کے مشابہ ہوں مثلاً حکمت، عصمت، دعوت الی اللہ، تبلیغ وارشاد، برائیوں کی مزاحمت کرنا اور ان کو روکنا، اور پاکیزہ عقائد رکھنا، فرق صرف اتنا ہے کہ وہ مورد وحی نہیں ہوتا اور ملائکہ سے اس کو وہ قرب حاصل نہیں ہوتا جو انبیاء کو ہوتا ہے۔ یہ بھی یاد رکھو کہ وہ حدیث جس میں کثرت انبیاء کا ذکر ہے وہاں پر اس تعداد میں محدّث کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ مرسل (رسول) اور نبی کا مفہوم ایک ہے اور یہ دونوں لفظ مرادف ہیں۔ یہ ضروری ہے کہ جس حکیم ربانی کو علم و حکمت میں تبحر حاصل ہو وہ محدَّث ہوگا۔ مقامات کا شمار کرتے ہوئے ہم نے

قرب وجود کا اس لئے علیحدہ ذکر کیا ہے کہ ان تمام مقامات کی فہرست مکمل کر لی جائے جو کبھی نہ کبھی تھوڑی دیر کے لئے خلوِ عین کے وقت پیش آتے ہیں۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ سچا خواب نبوت کا ۱/۴۶ حصہ ہے یہ حدیث صحیحین میں ہے۔ چنانچہ صالحانہ وضع قائم رکھنا جس کو سمت صالح کہتے ہیں۔ ان ہی اجزاء میں سے ایک ہے۔ میں کہتا ہوں ہر ایک چیز جس کو ویسے تو واحد تصور کیا جائے لیکن وہ متعدد شعبوں پر مشتمل ہو اور مختلف تمثلات کی جامع ہو، ایسی حالت میں شارع کا اصول یہ ہے کہ ان فروع اور تمثلات کو اس کے اجزاء قرار دے۔ مثلاً حدیث میں ہے کہ ایمان کی کچھ اوپر ستر شاخیں ہیں۔ بہر حال حدیث مندرجہ بالا کا مفہوم یہ ہے کہ سچا خواب بھی نبوت یا بالفاظ دیگر قرب فرائض کی ایک فرع ہے۔ اسی طرح سَمْتِ صالح (نیک روش) عصمت کی ایک شاخ ہے۔

یاد رکھو اللہ تعالیٰ نے شرائع نازل فرما کر تحصیل قرب کی جو حدّ اور مقدار مقرر فرمائی ہے۔ وہی ایمان حقیقی ہے۔ اس کی تفسیر اور توضیح یہ ہے کہ جن امور پر اللہ تعالیٰ نے اصل فطرت کے لحاظ سے اپنے بندوں کو پیدا فرمایا وہ معرض ظہور میں آجائیں یا بالفاظ دیگر جن باتوں کے مُلہم فطرت ہے اور بطریق اجمال اس کے اندر موجود ہیں۔ وہ منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوں (آشکارا ہو کر سامنے آجائیں)۔ خضر علیہ السلام، اولیاء کے زمرہ میں سے ہیں اور ان کو قرب نوافل حاصل تھا۔ لقمان ایک حکیم ربانی تھا، وہ حکمت کے اصول پر چلتا رہا، اور اللہ تعالیٰ نے اس کو عصمت اور وجاہت بخشی تھی۔ **اللھم الحقنی بالصالحین و اجعلنی من ورثۃ النبیین برحمتک یا ارحم الراحمین.**

............☆☆☆............

چھٹا خزانہ

ہمارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات

یادرکھو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم بعثت سے پہلے حکیم معصوم اور قطب باطنی تھے۔ حکیم کے معنی ہمارے نزدیک یہ ہیں کہ کسی میں جنایت باطنیہ (عالم مادی کی تلویثات سے آلودہ ہونا) معدوم ہو، جس کا اثر اس کی عین ثابتہ اور تشخص یعنی شخص جزئی میں کچھ بھی نہ پایا جائے۔ ایسا شخص تجلّی ذاتی کا مورد ہوتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے لئے حقائق علمیہ اور دقائق عملیہ کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں وہ معاد کی حقیقت کو سمجھنے لگتا ہے اور اس کو وہ علوم حاصل ہوتے ہیں جن کا بیان قرآن مجید میں ہے، یا جن کا اشارہ اس حدیث میں ہے کہ مجھ کو قرآن اور اس کی مانند اور علوم اس کے ساتھ شامل کر کے عطا کئے گئے نیز جس کا اشارہ اس قسم کی آیات میں ہے۔ **ویعلمهم الكتاب والحكمة** عصمت سے ہماری مراد تجلّی مذکور کے وہ نتائج ہیں جو رذائل اعمال و اخلاق کو اپنے سے دور رکھنے اور اعمال صالحہ اور اخلاق محمودہ اختیار کئے رکھنے کی صورت میں نمودار ہوتے ہیں۔ چنانچہ فرائض و واجبات کی پابندی اور محرمات قطعیہ سے پرہیز کرنا تو اس کی لازمی صفت ہوتی ہے، علاوہ ازیں تقوی میں توغّل کرنا بھی اس کے لئے شایان ہے۔ عصمت کا راز وہی ہے جس کو ہم اشارۃً پہلے بیان کر چکے ہیں کہ اعمال اور اخلاق ان جہات و حیثیات مختلفہ کا تمثّل ہے جو کسی کی عین ثابتہ کے ضمن میں اجمالاً موجود ہوں۔ اور پھر وجوہ ترجیح کے پیش آنے پر ان کا ظہور ہوتا رہے۔ یادرکھو جو شخص خیر کامل یعنی ذات اقدس جلّ وعلا سے جو سرچشمۂ خیرات ہے مرتبۂ ذاتیہ کے ذریعہ قرب حاصل کرتا ہے۔ خصوصاً جب کہ اولاً و بالذات اصول یعنی اسماء مقدسہ کے سلسلہ میں اور ثانیاً و بالعرض حقائق امکانیہ ظلالیہ کے سلسلہ میں اس کا یہ اقتراب فطری ہو، تو وہ

فطرۃً ہر ایک ایسے خلق اور عمل سے اجتناب کرتا ہے جو ہجوم عدمات کی وجہ سے شرّ کے اقسام میں داخل ہے۔

قطب باطنی کا مفہوم یہ ہے کہ جس شخص کو تجلّی مذکور نصیب ہو، اس کے نتیجہ کے طور پر اس کو اسماءِ مقدسہ کا قرب اور لحوق بلکہ مرتبۂ ذات کا لحوق اور قرب حاصل ہو۔ اسی کو ریاست مجردہ کہتے ہیں اور وجاہت عنداللہ تعالیٰ کا بھی یہی مفہوم ہے۔ وجاہت کا راز فطری تجلّی خاص میں مضمر ہے۔ چنانچہ جب ہم ممکنات میں تفاضل مراتب کا بیان کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ فلاح فلاں سے افضل ہے تو اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ اس کو اوّلیت اور ثانویت دونوں لحاظ سے سلسلۂ ''انجاس'' میں مرتبۂ ذات کے ساتھ زیادہ قرب حاصل ہے جیسے کہ پہلے اس کی تفصیل ہو چکی ہے۔ اس لحاظ سے جو افضلیت کسی کو حاصل ہو وہ بعینہٖ وجاہت ہے۔ یہ خیال نہ کرو کہ یہ تین صفات (حکمت، عصمت اور قطبیت باطنیہ) حکماء کی مخصوص صفات ہیں، یہ صفات حکماء اور انبیاء میں مشترکہ طور پر پائی جاتی ہیں۔ ان میں امتیاز کے وجوہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

چوں کہ آپ کی عین ثابتہ میں وسعت تھی اور عالم مادّی کی تلویثات سے آپ کو نجات حاصل تھی، عالم مادی کے کسی تقاضا کے سامنے وہ نہیں جھکتے تھے، بلکہ اللہ تعالیٰ ہی کے حکم کے مطیع رہتے تھے، اللہ تعالیٰ نے اس کی عین ثابتہ میں کامل ترین اور عظیم ترین تجلّی فرمائی۔ چنانچہ قرب فرائض کے مقام عالی اور اس کی تینوں فروع میں آپ کو پورا کمال حاصل ہوا۔

یاد رکھو انبیاء علیہم السلام ابتداءِ فطرت سے اجمال کے طور پر ہر ایک کمال کے جامع ہوتے ہیں، بعد میں مُعدات لاحقہ یکے بعد دیگرے ظہور میں آ کر ان کے ان کمالات کو بالتفصیل منظر عام پر لاتے ہیں۔ چنانچہ آپ (صلعم) ابتداءِ فطرت سے قرب ذاتی، قرب فرائض اور اقتراب بالملائکہ کے جامع تھے۔ جو حکمت آپ کو قبل از بعثت حاصل تھی اور وہ خصال سہ گانہ جو آپ کے لوازم صفات تھے، مؤخر الذکر عموماً اور اوّل الذکر نے خصوصاً آپ کو اس بات پر آمادہ کیا کہ آپ یکے بعد دیگرے وسائط کی جانب اپنی توجہ مبذول فرمائیں، یہاں تک کہ آپ منتہائے مقصود تک پہنچ گئے۔ **الآ الی اللہ المصیر** ۔ پھر جب ان وسائط نے مجتمع ہو کر آپ کے لئے ہیئت اجتماعیہ اختیار کی تو رسل ملائکہ کے ساتھ آپ کو شدید تعلق پیدا ہوا، جو عموم کی صورت میں پہلے موجود تھا۔ اس

قسم کے ملائکہ جو رسالت پر مامور ہیں موجودات علویہ امکانیہ کے اقطاب ہیں۔ جس طرح کہ انسان موجودات سفلیہ کا قطب ہے۔ یہ تعلق اسی طرح بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ انتہائے کمال تک پہنچ گیا اور ملائکہ مقربین میں ایک ہلچل سی پڑ گئی، چنانچہ بعض اوقات وہ مجسم ہو کر آپ کو دکھائی دیتے اور بعض اوقات آپ کے قلب مبارک پر القاءات کرتے جس کو "نفث فی الروع "(۱) کہتے ہیں۔ اس حالت میں آپکو لطیفۂ روحیہ اور لطیفہ قلبیہ میں امتزاج پیدا ہو۔ اور ملااعلیٰ کے ساتھ شدید تعلق پیدا کرنے کی وجہ سے حقیقت علیا کے اثرات آپ نے پورے طور پر قبول کر لئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ میں یہ قابلیت پیدا ہوئی کہ کبھی چشم سر اور کبھی حس مشترک سے ان ملائکہ کو آپ دیکھتے تھے۔ جب یہ تمام اسباب اکتسابیہ وفطریہ ہوئے تو وہ وقت آپہنچا کہ جبرئیل علیہ الصلوۃ و السلام آئیں اور آپ کو وحی پہنچائیں۔

چنانچہ آپ کی ذات میں ان تین آفتابوں کے مقابلہ میں جو پہلے سے آپ کی ذات مبارک میں تھے، تین ستاروں کا ظہور ہوا (۲)۔ پہلا ستارہ وحی ظاہری ہے جو آپ پر نازل ہوئی۔ وحی کا مفہوم ہے وہ علم الہٰی جو فرشتہ کے ذریعہ کلام کی صورت میں آپ تک پہنچا ہو یا نفث فی الروع کا نتیجہ ہو۔ وحی کی حقیقت اور اس کا راز تم پہلے جان چکے ہو۔ نفث فی الروع کی حقیقت اس مثال سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ جو صورت ایک شیشہ میں منقوش ہو۔ اگر دوسرا شیشہ اس کے سامنے لایا جائے۔ تو اس میں بھی وہی صورت نظر آنے لگتی ہے۔ دوسرا ستارہ آپ کی محفوظیت ہے۔ ملاءاعلےٰ کے ساتھ تعلق رکھنے کی وجہ سے قدرت نے آپ کو تمام اعمال رذیلہ اور اخلاق سیئہ خبیثہ سے محفوظ رکھا اور اور حمائد اخلاق سے متحلّی ہونا آپ کی صفت لازمہ تھی۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ نفوس اور ان کے اجسام میں ہمیشہ مطابقت پائی جاتی ہے اور تم جانتے ہو کہ ملائکہ علویہ کے اجسام (جن میں کہ وہ متمثل ہو کر دکھائی دیتے ہیں) اجسام عنصریہ سے لطیف تر ہوتے ہیں۔ اس لئے سلسلۂ وجود کے

---

(۱) نفث فی الروع: دل میں القاء کرنا، ڈالنا۔

(۲) تین ستاروں سے مراد تین قسم کے مختلف باطنی انوار ہیں جن کی تفصیل آگے آتی ہے۔ لیکن آفتابوں کا ذکر اس کتاب میں نہیں آیا۔ نہیں کہا جاسکتا کہ شاہ صاحب کی مراد اس سے کیا ہے۔ ممکن ہے اس سے مراد آپ کی وہ تین صفات ہوں۔ جن کا ابھی ذکر ہوا (یعنی حکمت اور عصمت اور قطبیت۔

مراتب میں یہ نفوس حقیقت واجب تعالیٰ و تقدس کے قریب تر ہوتے ہیں اور عالم کون و فساد کی تخلیطات میں وہ ہجوم عدمات سے دور تر رہتے ہیں۔ نفوس کی حقیقت اور ان کے عالم مادی کے آئینوں میں متمثل ہونے کے موضوع پر تم نے غالباً اچھی طرح غور کر لیا ہوگا بہر حال ملائکہ مقربین کے ساتھ شدید وابستگی اور مناسبت پیدا کرنا اس کا باعث ہے کہ آدمی اخلاق حسیہ اور اعمال دنیہ سے دور رہے، ان باتوں کو اختیار کرے جن کے حق میں وجہ ترجیح کوئی امر قدسی ہو۔ تیسرا قطبیت ارشاد ہے۔ یہ بھی اسی تعلق اور مناسبت مذکورہ کا نتیجہ ہے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ تمام لوگوں کے دلوں کا باطنی حیثیت سے مالک ہو۔ اگر اس قسم کا کوئی شخص یعنی قطب ارشاد دنیا میں موجود ہو تو سب لوگ اس کے نور سے مستفیض ہوتے ہیں، گو ان کو اس بات کا احساس تک نہ ہو۔ اس کا راز یہ ہے جو کامل افراد اس مرتبۂ جلیلہ پر فائز ہوں۔ ان کے حقائق کا تقاضا فضیلت اور سبقت (الی الخیرات) ہوتی ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کو اس عالم میں ایجاد کا واسطہ مقرر فرمایا ہے اور عالم کون و فساد کو انکا قبضۂ اقتدار میں دیدیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ انہیں کے سینوں میں ذات اقدس کی جو تجلّیات ہوتی ہیں، وہی اس عالم میں تصرت الٰہی تعالیٰ شانہ کا مظہر ہوتی ہیں، اور ملأ اعلیٰ سے ان کو جو تعلق حاصل ہوتا ہے وہ اس صفت کے دوسروں پر پرتو افگن ہونے کا باعث ہوتا ہے۔ اس کی بہترین مثال یہ ہے کہ بیع سلم میں باوجود مبیع کے غائب ہونے کے آدمی اس کا مالک ہوتا ہے۔ یاد رکھو یہ تین ستارے ان تین آفتابوں کے تمثلات اور عالم اسباب میں ان ہی کا تجسّم ہیں۔ اس عالم کون و فساد میں متمثل اور متجسم ہونے کے لحاظ سے معصوم کی ایک صورت جو یہ ہوتی ہے (ممکن ہے اس سے نسمہ مراد ہو) لیکن محفوظیت کی صفت اس کو مضمحل کر دیتی ہے۔ حکیم کو اس کی طبیعت بشریہ کے بموجب جو حضرت لاہوت سے بہت دور واقع ہے۔ فطری طور پر حیرانی حاصل ہوتی ہے جو وحی ظاہری نازل ہونے پر زائل ہو جاتی ہے۔ اسی طرح وجیہ کی وجاہت اجمالی صورت میں ہوتی ہے۔ جس سے کمالات کا ظہور میں آنا ممکن نہیں ہوتا۔ لیکن قطب ارشاد کا مرتبہ حاصل ہونے کے بعد وہ اجمال باقی نہیں رہتا۔ جب آپ کے یہ تینوں ستارے اچھی طرح درخشاں ہوئے، جو پہلے سے تین آفتابوں کے نور سے منوّر تھے، تو آپ کی دعوت الی اللہ پر مامور کیا گیا اور آپ نبی ہوگئے۔

دعوت کا راز اس میں مضمر ہے کہ وجاہت اور قطبیت ارشاد کی ریاست معنویہ ظہور میں آتی ہے۔اس مقام سے اس طرح تعبیر کی جاتی ہے کہ آپ ہادی بن گئے۔ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے جود وکرم کی کوئی حد وانتہا نہیں جو کوئی بھی زبان استعداد سے اس سے سوال کرے وہ رد نہیں کیا جاتا۔ آپ کی استعداد بآواز بلند یہ پکار رہی تھی کہ وہ جن وانس کی ہدایت وارشاد کا رتبۂ جلیلہ سنبھالنے پر مامور ہوں۔آپ کے ارشاد کی یہ کیفیت تھی کہ جو کوئی آپ کے احباء اور مخلصین میں سے ذرا بھی آپ کی طرف توجہ کرتا۔آپ اس کو صراط مستقیم بتانے میں دریغ نہیں کرتے تھے۔اس حالت پر ایک عرصہ گزر گیا اور اس اثناء میں عالم ملائکہ مقربین سے آپ کا تعلق رفتہ رفتہ بڑھتا گیا اور آپ کی فطرت زیادہ سے زیادہ صیقل ہوتی رہی،اور ان کواکب ثلاثہ کے دوائر نوریہ میں وسعت پیدا ہوتی چلی گئی،یہاں تک کہ یہ نورانیت منتہائے کمال تک پہنچ گئی اور وہ ستارے ''بدر کامل'' نظر آنے لگے تب آپ کو حکم ہوا کہ **فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ** ''جس بات کا تمہیں حکم دیا گیا ہے اس کو کھلے طور سے بیان کرو'' اس کے بعد آپ کو یہ بھی حکم ملا کہ وہ کافروں کے عقائد اور اعمال کا معارضہ کرکے ان سے بحث اور مناظرہ کریں۔معارضہ اور مجادلہ کا راز یہ ہے کہ ارشاد کا تقاضائے ذاتی یہ ہے کہ دوسروں کو رشد وہدایت حاصل ہو اور جو چیز اس مقصد میں مزاحمت کرے،اس کو راستہ سے ہٹا دیا جائے۔اس سلسلہ میں ایک خاص صفت عالم قدسی میں ظہور پذیر ہوتی ہے۔جس کو اس عالم مادّی میں (تنگی عبارت کی وجہ سے) عداوت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔انبیاء علیہم السلام پر ان کے انواع قرب کی بدولت اس صفت قدسیہ کا افاضہ ہوتا ہے اور اس عالم مادی میں اس کا ظہور عداوت ہی کی صورت میں ہوتا ہے۔حدیث میں ہے'سعد ایک غیور شخص ہے۔لیکن میری غیرت اس سے زائد ہے اور اللہ تعالیٰ تو مجھ سے بھی غیور تر ہے۔اسی کی غیرت کا یہ تقاضا تھا کہ تمام ظاہری اور پوشیدہ بے حیائیوں سے منع فرمایا۔''

اس حالت پر پہنچ کر آپ کو رسول بنایا گیا اور ہودؑ،صالحؑ،لوطؑ اور شعیب علیہم السلام کی طرح آپ کو اپنی قوم کی طرف بھیجا گیا۔اس پر کچھ مدت گزری اور ملاء اعلیٰ کے ساتھ شدید تعلق رکھنے کی وجہ سے یہ بدور کاملہ باطنی شموس بن گئے یہی وقت تھا جب آپ پر یہ آیت نازل ہوئی **أُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا الخ** ''جن مؤمنوں پر ظلم کیا گیا اور کافران سے لڑتے رہے ان کو اب

اجازت ہے کہ وہ بھی کافروں سے لڑیں۔" چنانچہ آپ نے مدینہ کی طرف ہجرت کی، جس کے بالفاظ دیگر یہ معنی ہیں کہ اپنے ملک اور وطن اور قوم کو کلیۃً ترک کر دیا اور کافروں کے ساتھ جہاد کرنے پر مامور ہوئے جس سے (کافروں کے ساتھ) عداوت کاملہ کا اظہار ہوتا ہے۔ اسی وقت سے آپ کے ارشاد کا دائرہ نورانیہ وسعت پذیر ہونے لگا اور اللہ تعالیٰ کی غیرت اور اس کے سخط و غضب کے مظاہر وقوع میں آنے لگے۔ یاد رکھو اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس تمام خیرات و برکات کا سرچشمہ ہے، شر ور اور نقائص کو اس سے منسوب کرنا اس کی قدوسیت کے منافی ہے۔ کیوں کہ شرور کا منبع یہ عالم مادّی اور اس کی تخلیطات ہیں، اور صورت مزاجیہ ہی نقائص کے ظہور میں آنے کا باعث ہوتی ہے۔ اس وقت آپ اولوالعزم پیغمبروں کی جماعت میں شامل ہوئے اور آپ کا کمال مطلق پورے اوج پر جلوہ گر ہوا۔

آپ کا کمال چونکہ انتہاء تک پہنچا ہوا تھا، آپ کی شان بہت بڑی اور اس کے براہین دقیق تھے۔ لہٰذا آپ کو ایک اور ارتقاء حاصل ہوا۔ اس کے متعلق دوٹوک بات یہ ہے کہ جب بعض وجوہ فطریہ اور اکتسابیہ کی بنا پر آپ کی استعداد صیقل ہو کر اس میں کامل جلا اور نورانیت پیدا ہوئی تو اس اسم پاک نے جو آپ کے سینہ مبارک میں تجلّی فرما تھا، بڑی وسعت پیدا کی، اور آپ پر اسی اسم مقدس کی حکومت قائم ہوگئی، جس میں کوئی دوسرا آپ کا مساہم اور شریک نہیں تھا اور اس کو آپ پر عظیم تسلط حاصل ہوا، چنانچہ اسماء مطلقہ قدیمہ کی طرح اس میں صفت اطلاق پیدا ہوگئی۔ جب آپ کے کمالات مختلفہ ایک ہی کمال کی صورت میں نمایاں ہوئے اور اسم مذکور میں اسماء قدیمہ مطلقہ کی طرح اتساع آ گیا، تو عالم وجود کے کونے کونے تک یہ نور مقدس کامل ترین طریقہ پر پہنچ گیا لہٰذا کمال کا کوئی مرتبہ اور مقام نہیں جس کے امام رسول خدا صلعم نہ ہوں۔ یہ تمام باتیں اس کا نتیجہ تھیں کہ اسماء مقدسہ کے عالم عکوس اور ظلال میں ایک "انجباس" قدسی ظہور میں آیا، جس کا محرک یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے درمیان واسطہ بننے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا ترجمان ہونے کا منصب ظہور میں لانا ضروری تھا۔ لہٰذا یاد رکھو کہ جس طرح آپ کے اس دنیا میں تشریف لانے سے پیشتر کسی ایسی حقیقت کا "انجباس" (منبع اسماء حسنیٰ سے اس عالم میں اس کا ظہور پذیر ہونا) ممکن نہیں تھا جو آپ کی حقیقت سے کامل نہ ہو۔ لیکن حقیقت علیا کا عدم تمثل اس بات سے

مانع نہ ہوا کہ بعض افراد کو منصب نبوت سے سرفراز کیا جائے جس کا مفہوم یہ ہے کہ ان کا اخذ عن اللہ میں قدم راسخ حاصل ہو اور کسی دوسرے کی وہ تقلید نہ کریں۔ اسی طرح آپ کا عالم حادث میں ظہور ہوا تو کسی کمال کی حقیقت کو بغیر اس کے کہ آپ کو ذریعہ اور واسطہ، بنایا جائے اور آپ کو جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ترجمان حقائق ہیں اپنا رہبر مقرر کیا جائے کوئی شخص بھی کسی طرح ادراک نہیں کر سکتا۔ (ونعم ما قال السعدیؒ۔

پندرار سعدی کہ راہِ صفا

تواں رفت جز برپے مصطفےٰ

البتہ یہ منصب اس سے مانع ہے کہ کسی دوسرے کو بھی بغیر آپ کے توسط کے بنوت حاصل ہو۔ اگر بالفرض کوئی اس آسمان رفعت پر بلند پروازی کرنا چاہے تو آپ اس کو اپنی طرف جذب کرتے ہیں اور وہ آپ کی تربیت کے جال میں اس طرح پھنس جاتا ہے جس طرح مقناطیس لوہے کو کھینچ کر اپنے سے چمٹا دیتا ہے۔ جب جہت قدسیہ اور حیثیت تمثیلی ہر دو نے ایک دوسرے کی معاونت کی اور انطماس کے کچھ بھی آثار نہیں تھے۔ اس لئے آپ کے بعد مستقل نبی کا مبعوث ہونا ممتنع ٹھیرا۔ اسی بناء پر ہم کہتے ہیں (اور حدیث میں ہے) کہ اگر موسیٰ علیہ السلام ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں موجود ہوتے تو آپ کے اتباع کے بغیر ان کے لئے اور کوئی چارۂ کار نہ ہوتا۔ یہ بھی ہم علانیہ کہتے ہیں کہ اس طریقہ پر فیض اخذ کرنا فنافی الرسول نہیں سمجھا جاتا۔ علاوہ ازیں آپ قرب قیامت میں تشریف لائے اور آپ کا ظہور سب انبیاء علیہم السلام کے ظہور سے قیامت کے قریب تر تھا، آپ کی بعثت تکمیل اخلاق کے لئے تھی اور آپ کی شریعت کے اصول اور فروع کا ماٗخذ بڑا عمیق اور دقیق ہے۔ یہ سب باتیں آپ کی خاتمیت کی مقتضی ہیں، سمجھ لو۔

جلالت قدر کے لحاظ سے ہم آپ کو ایک آفتاب کہتے ہیں جس سے بادی النظر میں چھ ستارے ظہور میں آئے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم آپ کی کنہ تک نہیں پہنچ سکتے اور اس کے نور کو دیکھ کر ہماری آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ جو ستارے آپکے نور سے ظاہر ہوئے، ان کا بھی شمار کرنا مشکل ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ان کی کثرت تعداد سے خبر دی ہے۔ جہاں آپ فرماتے ہیں کہ حوض کوثر پر جو برتن رکھے ہوں گے، ان کی تعداد آسمان کے ستاروں سے زائد ہے۔ یہ

ستارے جن کا اس حدیث میں ذکر ہے آپ کے انتہائی کمال کے تمثلات ہیں۔ ظاہری تین ستاروں کے علاوہ تین ستارے باطنی ہیں۔ جو پہلے دو اقترابات یعنی قرب فرائض اور قرب نوافل کے فروع سہ گانہ کا تمثل ہیں۔ (الف) اعمال اور اخلاق میں کمال تقوی کا التزام۔ یہ عصمت کے مقابلہ میں ہے۔ (ب) اجتہاد فقہی اور تجربی فراست۔ یہ حکمت کے مقابلہ میں ہے (ج) عنایات جزئیہ۔ اس سے ہماری مراد یہ ہے کہ جب کوئی آپ کے جسم ظاہر پر نظر ڈالتا تو اس کی نظر یہاں سے گزر کر تجلی ذاتی پر جا پڑتی۔ یہ قطبیت ارشاد کے بالمقابل ہے۔ علاوہ اس کے تین ستارے اور ہیں جو گویا اقتراب ثالث (قرب وجود) کے فروع سہ گانہ کے تمثلات ہیں۔ (۱) ملک وسلطنت جس کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحاً مُّبِیْناً ''ہم تم کو کھلی فتح عنایت کی'' یہ قطبیت ارشاد کے مقابلہ میں ہے (۲) مزاج مدنیت کے اعتدال کو قائم رکھنا۔ یعنی سمجھا بجھا کر اور برے اعمال کے ارتکاب پر سزائیں دے کر اہل مدینہ کے اعمال میں خرابی پیدا نہ ہونے دینا۔ یہ محفوظیت کے مقابلہ میں ہے۔ (۳) خوش بیانی اور خلوص کے ساتھ وعظ ونصیحت کرنا، یہ وحی ظاہری کے بالمقابل ہے۔ یہ ستارے بھی بتدریج بدر کامل بنے اور پھر شموس ہو گئے۔ جب آپ غزوہ تبوک سے تشریف لائے تو آپ نے فرمایا۔ چھوٹے جہاد کو پورا کر کے ہم بڑے جہاد کی طرف لوٹے ہیں'' اس کا مفہوم یہ ہے کہ ہم نے کثرت چھوڑ کر وحدت کی طرف رجوع کیا، عالم تمثل سے عالم تجرد کی طرف لوٹ آئے اور تفصیل علم کی بارگاہ کو ترک کر کے بارگاہ اجمال کو اپنا مستقر ٹھہرایا۔ اس کی تفصیل ہم نے حضرت ابراہیمؑ کی حقیقت میں بیان کی ہے۔ یہ مشکل ترین سفر ہے (تب ہی تو اس کو جہاد اکبر سے تعبیر فرمایا ہے) کیوں کہ اس کا مبدء تعین موطن فطرت سے بالاتر ہے۔ اس سے آپ کو ہر ایک اجمالی اور تفصیل کمال حاصل ہوا۔ انتہائی کمال کا کوئی مرحلہ باقی نہ رہا۔ اور آپ سے کہا گیا کہ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْناً ''آج میں نے تمہارے دین کو مکمل کر دیا۔ کامل انعام سے تم کو بہرہ ور کیا اور دین اسلام کو بحیثیت دین تمہارے لئے پسند کیا'' اسی اثناء میں آپ نے حج کیا، یہ فرمایا کہ بیشک اللہ تعالی نے مجھ کو اپنا خلیل بنالیا جیسے کہ ابراہیم علیہ الصلوۃ والتسلیم کو اپنا خلیل بنایا تھا، اور سورۂ نصر نازل ہوئی۔ ہمارا ذوق تو یہی کہتا ہے۔ لیکن جس نے اپنے ذوق کی بنا پر یہ لکھا ہے کہ آپ

کو اُمت مرحومہ کے ایک فرد کے ذریعہ ہجرت کے ہزار سال کے بعد خلّت کا مرتبہ حاصل ہوا، اس کا یہ کہنا نبوت کے منافی ہے اور نص صریح کے مخالف ہے اس لئے یہ قول سند نہیں۔ (یہ قول جس کا یہاں ذکر ہے شیخ احمد سرہندی المعروف مجدّد الف ثانی کا ہے)۔

ان ہی کمالات فطریہ اور اکتسابیہ کی بدولت آپ سے انواع و اقسام کے معجزات صادر ہوئے۔ (الف) غیب کی خبریں بتانا۔ اس کا راز یہ ہے کہ جس کو قرب حاصل ہو، خواہ اس کی نوعیت کچھ ہو، اس کے سامنے دو دروازے کھل جاتے ہیں، ایک علم فعلی اور دوسرا علم انفعالی کی طرف۔ جس کو قرب نوافل حاصل ہو، اس کے سامنے تو اس لئے کہ اس نے اپنی ہستی کو ذات اقدس جل سلطانہ میں مضمحل کر دیا ہوتا ہے، قرب فرائض والے کے سامنے اس لئے کہ اس کی عین ثابتہ اللہ تعالیٰ کی تجلّی گاہ ہوتی ہے جس سے اس کا مناسب احکام ظہور میں آتے ہیں، قرب الوجود والے کے سامنے اس لئے کہ وہ عین ثابتہ کا مقہور ہوتا ہے اور اس کے حکم کے ماتحت رہتا ہے، کیوں کہ عین ثابتہ کی حقیقت یہ ہے کہ وہ سراسر خیر ہے اور کسی نہ کسی حیثیت سے وہ خیر ہی کا تمثل ہوتا ہے۔ اسی بنا پر اس کو پہلوں اور پچھلوں کا حال کُلّاً یا جزءً معلوم ہوتا ہے۔ مستزاد برآں جو صفائی قلب کی اکتسابی ہوتی ہے وہ بھی حوادث مادیہ جاننے کا باعث ہوتی ہے۔ (ب) دعا کا بہت جلد شرف پذیرائی حاصل کرنا۔ اس کا راز وہی ہے جو ہم لکھ چکے ہیں کہ اقوال اور اعمال کو صحف میں ثبت کیا جاتا ہے اور مرتبۂ سبوغ کے مطابق ان کا ظہور ہوتا ہے۔ میری رائے میں اسماء حسنیٰ کی تلاوت اس کا بڑا سبب ہے۔ دیگر انواع معجزات کے لئے بھی یہ ایک تائیدی سبب ہے (ج) کھانے اور پینے کی اشیاء میں خارق عادت زیادتی کا ظاہر ہونا (برکت کا یہی مفہوم ہے)۔ اس کا راز تجلّی ایجادی کا دروازہ کھلنے میں مضمر ہے جو اقترابات مذکورہ کا نتیجہ ہے اور جس کا ظہور ربوبیت کمالیہ میں ہوتا ہے۔ (د) بے زبان جانوروں اور جمادات کا کلام کرنا اور مطیع و منقاد ہونا۔ اس کا راز بھی اسی ایجاد تجلّی میں ہے جس کا ظہور ربوبیت کمالیہ میں ہوتا ہے۔ (ہ) دشمنوں کے شر کو اس سے روکنا اور اس کے منکروں پر عذاب نازل کرنا۔ اول الذکر کا راز مرتبۂ سبوغ کی حمایت ہے اور مؤخر الذکر میں یہ فلسفہ ہے کہ اہل قرب کی مخالفت کرنا، ذلت کا موجب ہے۔

وحی کے متعدد اقسام ہیں۔ مثلاً معراج کی حالت میں جو وحی ہوئی۔ اہلِ حکمت کے نزدیک

معراج بحالت بیداری اس جسم کے ساتھ واقع ہوا، جو کمالات کا تجسم تھا۔ اس بدن کے ساتھ نہیں جو ترکیب عناصر سے بنتا ہے۔ اس کا راز یہ ہے کہ عین ثابتہ کا تقاضا قرب فرائض اور قرب بالملائکہ دونوں لحاظ سے معارف میں تبحر حاصل کرنا ہے۔ شق صدر کا عقدہ اس سے حل ہو جاتا ہے۔ تجسم کمالات کی حقیقت کا مسئلہ ایک عمیق راز ہے۔ جب تمام جداگانہ کمالات ایک وحدانی صورت اختیار کرتے ہیں تو وہ ایک ایسی چیز ہوتی ہے جس کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ گونہ قرب حاصل ہوتا ہے، اس لئے یہ ضروری ہے کہ ارتقاء کی ہر ایک منزل میں ایک صورت حقیقیہ ہو جو بعض اوقات صورت جو یہ ہوتی ہے اور بعض اوقات مثالیہ آگے حدیث دجال کی تشریح میں یہ آئے گا کہ وہ شرور کا تجسم ہے۔ اس کو بھی اسی پر قیاس کر لینا۔ وحی کی ایک قسم رویائے صادقہ ہے۔ مثلاً کفارات اور درجات کی حدیث۔ اس کا راز وہی ہے، جو معراج میں مذکور ہوا۔ ایک قسم وحی کی یہ بھی ہے کہ جبرئیل علیہ السلام آدمی کی صورت میں متمثل ہو اور تمام حاضرین مجلس نبوت اس کو دیکھ لیں مثلاً وہ حدیث (جو صحیحین میں ہے) کہ جبرئیل علیہ السلام نے آدمی کی شکل میں متمثل ہو کر ایمان اور اسلام اور احسان کی حقیقت دریافت کی۔ اس کا راز بھی ہم پہلے اشارۃً بیان کر چکے ہیں کہ ملائکہ میں جب تاتف استعدادی کی وجہ سے ہتزاز پیدا ہوتا ہے تو اس کے بعد وہ کبھی کبھی بدن مثالی میں متجسد ہوتے ہیں۔ وحی کی ایک قسم نفث فی الروع ہے۔ مثلاً اس حدیث کا استثنائی فقرہ کہ شہید کے تمام گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔ لیکن قرض معاف نہیں کیا جاتا۔ اسی طرح یعلی بن امیہ کی حدیث اور ابو سعید کی وہ حدیث، جس میں مذکور ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا کہ کیا خیر سے بھی شر پیدا ہوتا ہے۔ (یہ حدیث مفصلاً گزر چکی ہے) اس حالت میں آپ اپنے حواس ظاہری سے غائب ہو جاتے تھے۔ کیونکہ قرب فرائض اور قرب ملکوتی میں آپ کو استغراق حاصل ہوتا اور ان کا اثر آپ پر اسی طرح چھا جاتا کہ گویا آپ ان کے قبضہ میں ہیں۔ ایک قسم وحی کی اشراف (دوسرے کا مافی الضمیر جان لینا) اور کشف ہے۔ مثلاً گندم بیچنے والے کی حدیث یا مثلاً اونٹنی والا واقعہ جو جنگ تبوک میں پیش آیا۔ ایک قسم کو وحی باطنی کہا جاتا ہے۔ یہ وہی چیز ہے جس کی قرآن مجید میں حکمت سے موسوم کیا گیا ہے۔ (**ویعلمهم الکتاب والحکمة**)۔ نیز اس کی ایک قسم وہ بھی ہے جو اس اسم پاک کا مقتضی ہے۔ جس کا آپ کے قلب مبارک سے طلوع ہوا۔ یہ دونوں قسمیں ہم پہلے ذکر

کر چکے ہیں۔ سب سے بڑی وحی اور افضل ترین قسم وحی کی کلام مجید ہے۔ لیکن قرآن مجید کا اجمال اس وقت تک تمہارے سامنے واضح نہیں ہو سکتا جب تک تمہید کے طور پر ذیل کا مقالہ نہ پڑھ لو۔

قرآن مجید کے منازل ارتقاء پانچ ہیں۔ (۱) ارتقاء ازلی یعنی افاضہ بالفعل۔ (۲) کلام قدیم کا وہ ارتقاء جو صفت ارادہ کی جزئیات سے ہے۔ اس سے ہماری مراد وہ افاضہ بالفعل ہے جس کا تعلق علمی تربیت کمالیہ سے ہے۔ (۳) متجدّد ارتقاء، جس کی مثال اسم حادث متجدّد ہے۔ (۴) آپ کے نسمہ کا ارتقاء۔ یاد رکھو ان تمام ارتقاءات میں انتہاء تک پہنچ جانے کا منبع آپکا اپنا کمال ہے صلی اللہ علیہ وسلم۔ پہلے تین قسم کے ارتقاءات میں آپ کا جو درجۂ عالیہ تھا۔ وہ اس طرح متمثل ہوا کہ آپ کو اصول علوم پر احاطہ حاصل ہوا، جیسے کہ عنقریب اس کا بیان آئے گا۔ ارتقاء چہارم میں آپ کا درجۂ عالیہ فصاحت و بلاغت اور حسن ادا، اسلوبِ بیان کی صورت میں متمثل ہوا۔ اس کا راز یہ ہے کہ ظہور کی بہترین قسم یہ ہے کہ اس میں کامل ترین امور نمایاں ہوں جن کا تعلق اس نشأۃ سے ہے۔ (۵) پانچواں مدرکہ کا ارتقاء ہے۔ چنانچہ ایک نور تو آپ کو اپنی اصلیت کے لحاظ سے حاصل تھا اور ایک نور آپ کو سابقین اور سابقین کے ساتھ تعلق رکھنے کی وجہ سے حاصل ہوا۔ ارتقاء تشریعی کا تعلق اسی سے ہے۔

قرآن پاک جن علوم پر مشتمل ہے اس کی سات قسمیں ہیں۔ (۱) الٰہیات یعنی ذات اقدس جل شانہٗ اسماء ذاتیہ، اسماء فعلیہ، اور اسماء متجدّدہ کا بیان۔ (۲) تکوینیات ان کو آیات بھی کہتے ہیں۔ (کلام مجید میں ان کا یہی نام ہے) مثلاً زمین و آسمان کی تخلیق، مظاہر جویہ، عناصر اور موالید ثلاثہ یعنی جمادات اور نباتات اور حیوانات، تخلیق انسان کا بیان، اور مقامات انبیاء کے عجائبات۔ (۳) وعظ و ارشاد۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جہالت کی تاریکیوں کو معارف قدسیہ سے منور کیا جائے۔ ترغیب و ترہیب کی بہترین صورت یہ ہے کہ دنیا اور آخرت کے عبرت آموز واقعات، وہ قصص جن کو سن کر نفس کی سرکشی کم ہو، تمثیلات جن کا پیرایۂ بیان بہت مؤثر ہو، سنائے جائیں۔ اسی طرح برائیوں کی مذمت، خوبیوں کو سراہنا اور ان کی تعریف، اور بعض اوقات ایسی تسلی آمیز باتیں کرنا، جن سے دلوں کو تسکین حاصل ہو۔ (۴) شرعیات۔ عبادات کی جملہ انواع، اعمال اور عادات، اخلاق، معاملات، تدبیر منزل اور سیاست مدنیہ، یہ سب اس عنوان میں شامل ہیں۔

(۵) تذکیر بالمعاد۔ آخرت کی چار بڑی منزلیں ہیں، قبر، حشر، روز قیامت اور جنت و دوزخ (۶) مجادلہ۔ یعنی کافروں کو دلائل کے ذریعہ قائل معقول کرنا۔ مسائل توحید، اثبات نبوت، اثبات معاد، اور منکروں کی تحریفات کا ابطال، اسی قسم میں داخل ہے۔ (۷) قصص۔ اس سے مراد انبیاء علیہم السلام کے حالات اور بعض دیگر احوال و حوادث کا بیان کرنا ہے۔ مثلاً ذوالقرنین کا قصہ وغیرہ۔ ان علوم کا راز یہ ہے کہ حکمت وحی کی صورت میں تبدیل ہو۔ مجادلہ بھی (جب طریق احسن پر ہو جیسے کہ قرآن مجید کی تعلیم ہے وجادلھم بالتی ھی احسن) وعظ و تذکیر کی ایک قسم ہے۔ دونوں کا مقصد ہدایت وارشاد اور تربیت علیہ ہے۔

فنون حکمت میں سے ایک فن حروف کا ہے۔ اس فن کے اصول پر ہمارے نزدیک الٓمّ کے یہ معنی ہیں، وہ غیب جس نے عالم متدنّس میں تعیّن قبول کیا۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ عادات اور اعمال اور اخلاق کی بدعات کے ضمن میں تشریع اور تحقیق مقدس کو تعیّن حاصل ہوا۔ الٓمرٰ کے یہ معنی ہیں کہ غیب کو عالم تخلیط میں تعین حاصل ہوا۔ لیکن یہ تعین مستحکم اور برقرار نہیں، وہ بار بار ظہور میں آتا ہے۔ اس سے مراد انبیاء علیہم السلام کے مقامات ہیں، اس حیثیت سے کہ وہ شرور دنیہ یعنی اس عالم مادّی کی برائیوں سے بار بار ٹکراتے رہتے ہیں۔ طٰہٰ کی معنی یہ ہیں کہ ذات اقدس کا کامل تنزیہ حاصل ہے جس نے اس عالم تخلیط کے غیب میں نزول فرمایا۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اسماء متجدّدہ کے احکام نے کس طرح مدارک انسانیہ میں ظہور فرمایا طٰسٓمّ کے یہ معنی ہیں کہ ذات اقدس کما حقہ منزّہ ہے۔ جس کا سریان عالم تخلیط میں تنزیہی ہے اس سے مراد اسماء متجدّدہ اور ان کے احکام کا ظہور ہے جس کا یہ مفہوم ہے کہ عالم متدنّس یعنی عالم مادی میں ان کا سریان مقدس ہے۔ حٰمٓ کے معنی یہ ہیں کہ غیب نے عالم متدنّس میں ظہور کیا۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ جب کافروں کے عقائد باطلہ اور اعمال واقوال خبیثہ نے عالم غیب کی طرف صعود کیا تو ان کا قطع قمع کرنے کے لئے حق کا نزول ہوا۔ وحی اترتی رہی اور آپ، ترغیب و ترہیب کے ذریعہ ان کی ہدایت وارشاد کا حق ادا کرتے رہے اور بالآخر ان کے نظام فاسد کو توڑ دینے کا باعث ہوئے عٓسٓقٓ کے معنی اس ظہور پُرنور کے ہیں جو اس عالم مادّی متدنّس میں جاری وساری ہے۔ قٓ کے معنے قباحات کا تجسّم ہے۔ جس کا مقابلہ قوت قدسیہ کے ساتھ ہوا۔ اس کا مفہوم وعظ و نصیحت ہے۔ نٓ کے معنی ہیں تاریکی کے اندر

نور۔ اس کا بھی وہی وعظ اور نصیحت کا مفہوم ہے۔ حٓ کوئی صاحب مقام قدسی جس نے ذات اقدس کا قرب قدسی حاصل کیا، اور اس کے اثرات اس پر فائز ہوئے۔ اس کا مفہوم انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے علوم اور مقامات ہیں جو وجاہت کے مطابق ان کو عطا کئے گئے۔ یٰسٓ کے معنی ہیں وہ چیز جو ظہور اور استتار میں متردّد ہو اور اس عالم میں اس کو سریان حاصل ہو۔ اس میں اسماء متجدّدہ اور ان کے علوم کی طرف اشارہ ہے۔ (سعدیؒ کا یہ شعر کہ ؎

دیدار مے نمائی و پرہیز مے کنی

بازار خویش و آتش ما تیز مے کنی

اس کے حسب حال ہوسکتا ہے، بشرطیکہ اس کو مجاز پر محمول نہ کریں اور سراسر حقیقت کی طرف مائل ہوں، جس کے بعد اس شعر کا مقصد بآسانی واضح ہو جائے گا انشاء اللہ تعالیٰ)۔ یاد رکھو ''ط'' کا مفہوم ہمارے نزدیک اس طرح ہے جس طرح منطق میں حیوان لاشیء، ح کا مفہوم اس طرح ہے جیسے حیوان بشرط شیء، اور الف کا مفہوم ہے بمثل حیوان لابشرط شیٔ (یہ منطق باریکیاں جن کی تفصیل کتب منطق میں موجود ہے ان کو سمجھ لیا جائے تو پھر اصل مضمون کو سمجھنا دشوار نہیں)۔ یہ بھی ہماری رائے ہے کہ (۱) حروف مقطعات ان سورتوں کے نام ہیں جن کے شروع میں یہ آئے ہیں اور ان کے مضمون کا ماحصل اور اجمالی خاکہ ہے (جس طرح کسی باب کے عنوان سے اس کے تمام مضمون کا مجمل سا تصور پیش نظر ہو جاتا ہے) (۲) ممکن ہے کلام مجید کی دو جگہیں بلحاظ مفہوم ایک جیسی ہوں لیکن دونوں سے مختلف نتائج اخذ کئے جائیں۔ مثلاً انبیاء علیہم السلام کے قصص مختلف جگہوں پر مختلف اغراض کے لئے مذکور ہیں، کبھی انکا مقصد وعظ وارشاد ہوتا ہے، کبھی ان کے مراتب کا اظہار مقصود ہوتا ہے، اور کبھی وہ آیات قدرت پر توجہ دلانے کے لئے مذکور ہوتے ہیں۔ معاد وغیرہ کی آیات کو بھی اسی پر قیاس کرلیجئے۔ (۳) مضامین اور اسالیب کے ابداع میں طرز تجدّد کو دو چیزوں سے مشابہت دی جاسکتی ہے ایک اتفاقیات، چنانچہ تمام مقامات فرائضیہ کی یہی نوعیت ہے۔ دوسرے یہ کہ انشاء پردازی کا اصول اختیار کیا جائے۔ مثلاً ایک انشاء پرداز پہلے اس مضمون کا اپنے ذہن میں خاکہ باندھتا ہے جس کے لکھنے کے لئے اس نے قلم اٹھایا ہے۔ مثلاً یہ کہ اس کی سجع کیا ہوگی، اسلوب بیان کس طرح ہوگا، (کون کون سے نکتے اور دلائل کس

ترتیب کے ساتھ قارئین کے سامنے پیش کئے جائیں) وغیرہ وغیرہ، وجہ ظاہر ہے، کیونکہ مواطن نسمیہ میں قرآن مجید کا مقام اعلیٰ ترین ہے۔

اسالیب سور کے متعلق بالاختصار یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہر ایک سورت کے تین حصے ہوتے ہیں۔ (الف) مطلع (ب) مقطع (ج) دونوں کے درمیان جس کو حشو سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ (بشرطیکہ یہ لفظ موہم ثابت نہ ہو یا کلام مقدس کے متعلق اس کا استعمال کرنا سوءادب نہ ہو)۔ مطلع کے مختلف اسالیب یہ ہیں۔(۱) آیات عظام سے قسم کھا کر سورت کو شروع کرنا۔ اس کا مقصد مقسم بہ کی حلالت قدر کا اظہار ہوتا ہے اور عقول انسانیہ کو انکی طرف متوجہ کرنا مقصود ہوتا ہے۔ بسا اوقات یہ قسمیں، جواب قسم سے بے نیاز ہوتی ہیں، جس طرح ان متصلہ اور حرف لَو برائے تمنّی کو جواب کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ذیل کی آیات میں جو اشکال اس قسم کا پیدا ہوتا تھا وہ حل ہو جاتا ہے حٰـمٓ والکتاب المبین انا انزلناہ فی لیلة مبارکة. والفجر ولیالٍ عشر الخ. والصافات صفاً وغیرہ وغیرہ (۲) ابتدائے سورت میں ہولناک اوقات کا ذکر کرنا۔ جن کا تصور کرکے دل پگھل جائیں اور بدن پر رونگٹے کھڑے ہوں۔ اس قسم کا مطلع وعظ وارشاد کے لئے بمنزلہ براعت استہلال کے ہے۔ (یہ علم بدیع کی اصطلاح ہے جس کی تشریح اسی علم کی کتب میں سے لی گئی)۔ اس کے استعمال کی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس کو جملہ شرطیہ کی صورتِ میں لایا جائے مثلاً اذا وقعت الواقعة اور اذا السماء انشقت وغیرہ۔ اس قسم کی شرط کو جزا کی ضرورت نہیں ہوتی، جیسے کہ ابھی قسم کے بارے میں مذکور ہوا۔ دوسرا طریق ادا، اس قسم کے الفاظ ہیں الحاقة ماالحاقة اور القارعة ماالقارعة وغیرہ۔ (۳) تیسری شکل مطلع کی یہ ہے کہ وہ سرنامہ کی طرح ہو، جیسے کہ پروانوں میں مثلاً لکھا کرتے ہیں از پیش گاہ اعلیٰ حضرت والی افغانستان۔ چنانچہ یہ مطلع کہ تنزیل الکتاب من اللّٰہ العزیز العلیم اور تنزیل من الرحمن الرحیم وغیرہ اسی قبیل سے ہیں۔ اسی طرح قبالوں میں لکھا کرتے ہیں یہ بیعنامہ یا طلاقنامہ ہے۔ اس کی مثال کلام مجید میں یہ ہے ذلک الکتاب لاریب فیہ ھُدیً للمتقین (۴) حمد و تسبیح کے ساتھ شروع کرنا۔ کاتبوں کے ہاں بھی آغاز رسائل و مکاتیب کی یہ ایک صورت ہے۔ (۵) بغیر کسی عنوان یا تمہید کے شروع کرنا مثلاً یہ کہ اتی امر الیہ الخ اور

سأل سائل بعذاب واقع۔ لیکن اس طرح کے افتتاح میں بھی ایک طرح کا ابداع ہوتا ہے۔ مطلع اور مقطع کے درمیانی حصہ میں عموماً مضمون کا تنوع ہوتا ہے۔ مثلاً کسی نبی کا قصہ ذکر کرتے کرتے احوال معاد کا ذکر شروع ہو جاتا ہے، کبھی اس اثناء میں منکروں کی ردّ و قدح کا جواب دیا جاتا ہے، کبھی دنیا میں نزول عذاب اور اہلاک اُمم کے مخوّف واقعات بیان ہونے لگتے ہیں۔ ان سب انواع کلام کے بعد پھر اصل قصہ کا بیان ہونے لگتا ہے اور اس کی تکمیل کی جاتی ہے وعلی ھذا القیاس۔ یہ طرز بیان زیادہ مؤثر ہوتا ہے اور مضمون کے تسلسل اور یکسانی سے طبعاً جو ملال پیدا ہوتا ہے وہ پیدا ہونے نہیں پاتا۔ یہ اسلوب بیان، قسم ثانی سے ہے، جس کو ہم نے طرز انشاء پردازی سے تشبیہ دی ہے۔ لیکن قسم اول حدود ضرورت تک محدود ہے۔ سورتوں کے مقطع میں عموماً کوئی نصیحت یا تسلّی آمیز بات یا اجمالی تخویف ہوتی ہے۔ علم تفسیر کے متعلق ان اصول کو (اچھی طرح سمجھ کر) یاد رکھو، جن کو ہم نے مختصراً بیان کیا ہے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ نے توفیق بخشی تو ممکن ہے کہ کبھی ان کو مفصل طور پر قلمبند کریں (۱)۔

ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلعم فرماتے ہیں ''قرآن مجید سات حروف پر نازل ہوا۔ ہر ایک آیت کے لئے ظہر او بطن ہے اور ہر ایک حدّ کے لئے ایک وزن ہے'' یہ حدیث بغوی کی شرح السنۃ میں ہے۔ اس حدیث میں جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں ان کی ذرا تفصیل سن لیجئے۔ باری تعالیٰ کے کلام نفسی کو الفاظ مترادفہ اور متقاربہ کے لباس میں جو تمثلات حاصل ہوتے ہیں ان کو احرف سے تعبیر کیا ہے، اس کی تحقیق یہ ہے (یا اس کی مثال یہ ہے) کہ بیشتر اس سے کہ انسان اپنے منہ سے کوئی بات نکالے اس کا مجمل خاکہ اس کے دل و دماغ میں موجود ہوتا ہے۔ (اسی کے نام کلام نفسی ہے، کیونکہ اس کا وجود نفسی یعنی قوت مدرکہ میں ہوتا ہے) اموات کی روحیں چونکہ اجسام سے قطع تعلق کر چکی ہوتی ہیں اور ایک نفس ناطقہ ان کی پونجی ہوتی ہے، اس لئے ان کا کلام نفسی ہوتا ہے، جس میں اجمال ہوتا ہے تفصیل نہیں ہوتی۔ اہل اشراق نطق ظاہری سے پہلے اسی کا ادراک کیا

---

(۱) غالباً شاہ صاحب نے اس موضوع پر الفوز الکبیر کو لکھ کر اپنا یہ وعدہ پورا کیا ہے۔

(۲) جس کو عام طور پر کشف القلوب اور اشراف علی الخواطر کہتے ہیں۔ یعنی دوسروں کے باطنی خیالات کا مطالعہ کرنا اور مافی الضمیر پر مطلع ہونا۔ اسی کتاب میں اشراف کا کئی جگہ ذکر آیا ہے۔ (قاسمی)

کرتے ہیں۔اور اسی کو ہم کلام نفسی کہتے ہیں۔ جو وحی از قسم کلام ہوتی ہے۔اس کو اسم حادث کے ساتھ نسبت دی جائے تو اس کی قریب ترین مثال یہی کلام نفسی ہے۔جس کی ابھی تشریح کی گئی ہے)اس لئے علماء متکلمین کلام پاک کی اس حالت کو کلام نفسی سے موسوم کرتے ہیں۔امام اہل السنۃ (۱) پر جب یہ اعتراض کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کی صفات تو قدیم ہیں، پھر کلام مجید کے حادث ہونے کے کیا معنی اس کا انہوں نے یہ جواب دیا کہ صفت قدیم ہے،لیکن اس کا تعلق حادث ہے۔ صفت سے ان کی مراد اس کی حالت ازلیہ ہے اور حادث ہونے سے ان کی مراد عالم مادی میں اس کا ظاہر ہونا ہے، پہلے یہ صفت عالم خیال میں بہ صورت الفاظ متجلّی ہوتی ہے،اور دوسری تجلّی اس کی عالم تلفظ میں ہوتی ہے۔

یہ حقائق ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ تمام عوالم متحاذی ہیں،نفس رحمانی کو بقا حاصل ہے، خصوصیات کے بقایا بعض ایسی بھی ہیں جو بڑھتی رہتی ہیں اور عالم اسفل کا تولّد عالم بالا سے ہوا ہے، ان باتوں کو یاد رکھو۔ جب تجلیات متعدد ہوں اور کلام نفسی کو مختلف لباس پہنائے جائیں تو یہی وہ ''حروف'' ہیں، جن کا ذکر روایت بالا میں ہے۔ظہر کے معنی وہ مفہوم ہے جو ظاہر کلام سے سمجھا جائے یعنی وہ معرفت جس پر حدوث کا رنگ چڑھ چکا ہو،اس سے مراد وہ علم ہے جس کا منبع اسم حادث ہو۔بطن کا مفہوم اس اسم کی وہ اصل ہے جو عالم غیب قدیم میں ہے اور جس نے کہ اس اسم (حادث) پر تجلّی فرمائی ہے۔ظہر اور بطن کے یہ معنی وجود کے مطابق ہیں،لیکن دلالت کے لحاظ سے ان میں یہ فرق ہے کہ لازم ظہر ہے اور اس کا ملزوم بطن ہے،معلول ظہر ہے اور علت بطن۔(اسی کتاب میں متعدد جگہوں پر تم کو بطن کی مثالیں ملیں گی)۔حدّ سے مراد غموض حقیقت کا ایک خاص درجہ ہے،جس کا وہی شخص ادراک کر سکتا ہے جس کو اس کے سمجھنے کی استعداد بخشی گئی ہو۔اسی استعداد کو روایت مذکورہ میں روزن (۲) سے تعبیر کیا ہے۔

یاد رکھو اللہ تعالیٰ نے سب انبیاء علیہم السلام، ہمارے رسول صلعم کو خصوصاً شعر و شاعری اور موسیقی سے دور رکھا ہے اور ان چیزوں کو ان پر حرام کیا ہے، کیونکہ یہ چیزیں حسن باطنی کے کسی کمال

(۱) ابوالحسن اشعری مشہور عالم دین اور متکلم اسلام تھے۔

(۲) رَوْزَنْ: یہ معرب ہے روزَن کا جس کے معنی ہیں سوراخ دیوار اور کھڑکی۔

کی مُظہر نہیں۔ شعروشاعری اور موسیقی کا ارتقاء جداگانہ طور پر مستقل ہستی کی حیثیت سے ظہور میں آیا ہے یعنی حسن باطن سے ان کا کچھ بھی تعلق نہیں۔ باقی رہا جسم کا معاملہ۔ سو تم جانتے ہو کہ ان کو اس عالم مادی سے انسلاخ (۱) کلی حاصل ہوتا ہے اور ان کے اعیان لاغر اور کمزور ہوتے ہیں (اس لئے ان کے جذبات نفسانیہ ابھرنے نہیں پاتے)۔ علوم حدیث کی فروع الٰہیات، اخلاق، علم تکوین، احکام شرعیہ، احوال معاد اور قصص ہیں جن کا ہم نے ذکر کیا ہے اور ان کے اسرار بھی بیان کئے ہیں۔ علاوہ بریں من جملہ انکے ایک علم دعا ہے۔ تاثیر دعا کا واضح ہونا اور صحف اعمال میں اس کا تمثل، یہی اس علم کا راز ہے۔ من جملہ ان کے علم فضائل الاخلاق ہے۔ صحف پر اطلاع پر پانا، اطراف اعمال کا پیش نظر ہو جانا اور صحف میں ہیأت اعمال کا مشاہدہ کرنا، اس علم کا منبع ہے۔ من جملہ ان کے علم مناقب ہے۔ حکمت سے جو فراست ظہور میں آتی ہے یہ علم اس کا نتیجہ ہے۔ من جملہ ان کے علوم متعلق تفسیر قرآن اور متعلق استنباط احکام ہیں۔ ان علوم کا درجہ سب سے بڑھ کر ہے اور اس کے متعلق ہم بقدر ضرورت بیان کریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے جو حکم دیئے ہیں وہ بسا اوقات مطلق ہوتے ہیں۔ مثلاً نماز ادا کرنے یا زکوۃ دینے کا حکم۔ یا مثلاً یہ کہ **سبح اسم ربک الاعلیٰ** اور **سبح بحمد ربک**۔ آپ نے ان کے لئے اوقات کی تعیین کی۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اس قسم کی آیات نازل فرمائیں **قوموا للّٰہ۔ کبّرہُ تکبیرا، اتل ما اوحی الیک ارکعوا واسجدوا**۔ آپ نے تصریح فرمائی کہ یہ نماز کے ارکان ہیں۔ اسی طرح بعض جگہوں پر کلام مجید میں قسم کھائی گئی ہے۔ (بعض اوقات پر قسم کھائی گئی ہے) مثلاً **والفجر، والضحی، واللیل اذا سجی، لا اقسم بالشفق، ولیال عشر**۔ اس سے آپ نے یہ استنباط کیا کہ یہ مختلف عبادات کے اوقات ہیں۔ جن کی تفصیل کتب حدیث میں موجود ہے۔ صلوۃ سریہ اور جہریہ کو آپ نے اسی طریقہ پر استنباط فرمایا۔ خلاصہ یہ کہ آپ ان ہی اصول پر اور انہیں طریقوں سے استنباط فرمایا کرتے تھے (۲)۔ ہم نے ان تمام احادیث کا متتبع کیا جو نماز کے بارے میں آئی ہیں تو ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ ان سب کا مأخذ کتاب اللہ ہے اور شاید ان احادیث اور ان کے طریق

(۱) انسلاخ: انسلخ النھار من اللیل۔ دن کا رات سے علیحدہ ہونا، انسلاخ، علاحدگی، مراد مادی اشیاء سے خالی ہونا۔

(۲) حجۃ اللہ البالغہ میں اس موضوع پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔ (قاسمی)

استنباط کو ایک مستقل رسالہ کی صورت میں لکھنے کی ہمیں توفیق نصیب ہو۔ ایک حدیث میں ہے، آپ فرماتے ہیں بعض اعمال کے متعلق کاتب اعمال فرشتوں کو تردد ہوتا ہے کہ اس کو کس مد کے تحت میں لکھیں تو اللہ تعالیٰ ان کو حکم دیتا ہے کہ اس کو اسی طرح لکھ دو جس طرح کہ اس نے کہا۔'' اس کا مفہوم ہماری رائے میں یہ ہے کہ ملائکہ کو اس بارے میں تردد ہوتا ہے کہ اس عمل کو کس ہیئت میں ظاہر کیا جائے تا کہ اس کی جزا یا سزا واضح طور پر معلوم ہو سکے۔ اللہ تعالیٰ کے حکم دینے کا مفہوم یہ ہے کہ نفس عمل کا صحیفۂ اعمال ثبت کریں اور کسی خاص ہیت میں اس کا اظہار نہ کریں۔ دارالسیوغ میں اس کا جو کمال (یا عدم کمال) ہے خود بخود ظہور پذیر ہو گا۔ جو علوم زمانہ بعثت میں قریش میں مروج تھے مثلاً علم الانساب وغیرہ، ان میں بھی آپ کو کافی دسترس تھا۔ جہاں تک ممکن تھا ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات کو تفصیلاً بیان کر دیا ہے۔ لیکن انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے کمالات کو اللہ تعالیٰ خود ہی اچھا جانتا ہے۔

............☆☆☆............

ساتواں خزانہ

عالم ولایت کے احکام

ولایت کے چار مختلف طریقے ہیں۔(۱) صحابہ کا طریقہ۔ان کے مسلک کی اصلیت یہ ہے کہ جب ذات اقدس نے رسول اللہ صلعم کی عین ثابتہ میں تجلّی فرمائی تو اس کو اسم کی طرح تقرر اور تحقق حاصل ہوا۔اس قسم کے تعینات اور تحققات کو ہم اسماء حادثہ سے موسوم کرتے ہیں۔ان کے ساتھ کبھی صورت امکانیہ بھی شامل ہوتی ہے، جیسے کہ تورات میں ہے۔''پاک ہے وہ خدا جس نے طور سینا میں ظہور فرمایا، ساعیر پر جلوہ افگن ہوا۔اور جبل فاران سے اس کا ظہور ہوا۔'' قرآن مجید میں ہے لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰي لِسَانِ دَاوٗدَ ۔'' کافران بنی اسرائیل کو داؤد علیہ السلام کی زبان پر ملعون قرار دیا گیا۔'' (یعنی اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ اسلام کی زبان سے کلام کیا جو اس کے باطن میں اس کی تجلّی فرمانے کا نتیجہ تھا)۔اس اسم حادث کو قرب کا ذریعہ قرار دینا اللہ تعالیٰ تک رسائی حاصل کرنے کا نزدیک ترین راستہ ہے۔صحابہ کرام کا یہی طریقہ تھا اور ان کی فناء اور بقاء اسی طریقہ پر تھی۔بعض ان میں سے ایسے بھی تھے جو اسماء حادثہ کے راستہ سے اسماء قدیمہ تک پہنچ گئے۔یہ تم کو واضح طور پر سمجھ لینا چاہیے کہ صحابہ کرام فطرۃً ایک اُمّی قوم تھی، پھر ان کی حالت اکتساب اور مقام کمال میں بھی یہ وصف نمایاں رہا۔اس کی تحقیق یہ ہے کہ صحابہ کا کامل ترین فرد، جس کو انتہائی قرب حاصل ہوتا محض مقلّد ہوتا۔اس تقلید سے میری مراد تقلید فطری ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ باطن رسول صلعم کا رنگ اس پر چڑھا ہوا ہوتا، اور جس کی اپنی کوئی قوت ممیزہ نہیں ہوتی تھی۔کیوں کہ قوت ممیزہ کے ارتقاء پذیر ہونے کے اسباب حسب ذیل ہیں۔یا تو حقیقت اور تمثلات کے درمیان جو اتصال اور وابستگی ہے وہ بودی اور پھسپھسی ہو یا یہ کہ ہر ایک ان

میں سے بجائے خود ایک مستقل ہستی ہو یا یہ کہ خصوصیت مقام کے لحاظ سے اس میں جدّت مزاج اور صلابت اطراف پیدا ہوگئی ہو۔ اور یہ تو ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ جس شخص کے متخیّلہ میں کامل طور پر قوت ممیّزہ موجود ہو، اس کو کبھی مقام فنا میسّر نہیں ہوتا، اسی طرح جس کا نفس قوی ہو وہ ہرگز انسلاخ حاصل نہیں کر سکتا، لیکن حکماء ربانیین کو قوت قدسیہ حاصل ہوتی ہے۔ بہرحال صحابہ کی فطری اُمیّت یہی تھی جو مذکور ہوئی۔

پھر یہ بھی یاد رکھو کہ یہ ''کمال مطلق مجرد'' ضروریات دین کے ضمن میں ان کو حاصل ہوا۔ انہوں نے امور عامہ سے کوئی بہرہ وافی حاصل نہیں کیا تھا، اس لئے وہ اپنی حالت کا اس طرح واضح طور پر اظہار نہ کر سکے کہ جو ان کی زبان نہ سمجھتا ہو، وہ اس کو اچھی طرح سمجھ لے۔ زیادہ سے زیادہ یہی کہتے کہ فلاں شخص کو بڑا قرب میسّر ہے، اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کو عزت کا درجہ حاصل ہے، اس کو اللہ تعالیٰ نے توفیق نصیب کی ہے، اس کی رائے وحی اور کتاب کے موافق ہے، یا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا سینہ کھول دیا ہے۔ یا مثلاً یہ کہتے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو شیطان سے محفوظ رکھا، اور اس کے رگ و پے میں تقویٰ سرایت کئے ہوئے ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ وہ یہ سمجھتے ہوں کہ یہ علم کی کوئی خاص قسم نہیں اور اس کے اظہار کے لئے کوئی خاص لفظ یا الفاظ نہیں وضع کئے گئے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ مقصد کے طور پر خاص ارادہ کر کے اس کی طرف متوجہ نہ ہوتے ہوں، صرف اتنا جانتے ہوں کہ یہ ایمان کا کمال ہے اور بس۔ صحابہ کرام سے کرامات (خوارق عادت) کا بہت کم ظہور ہوتا تھا۔ یہ ان کی اکتسابی اُمیّت تھی، اسی طرح ان کی ایک اُمّیّت کمال کے لحاظ سے تھی۔ کیونکہ ان کا کمال یہ تھا کہ وہ اسم حادث کے ذریعہ تحصیل قرب کرتے تھے جو تمام اسماء کا جامع ہے۔ اب اگر ان میں سے بعض کی اسماء قدیمہ تک رسائی ہو بھی جاتی تھی تو اس کے یہ معنیٰ نہیں کہ اس سے ان کی اُمیّت زائل ہو جاتی۔ یاد رکھو یہ نور جو باطن رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے فائض ہوتا ہے بعض اوقات آدمی کی عین ثابتہ اور اس کے تمام تمثلات اس کے رنگ میں رنگے جاتے ہیں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کے یہی معنی ہیں ''اگر میرے بعد کوئی پیغمبر ہوتا تو وہ عمر ہی ہوتا۔'' اس قسم کے کمال پر وہی افراد فائض ہوتے جو قوم میں بیش از بیش سابقین ہوتے۔ سوچ لو۔

یہ لوگ جو نور نبوت سے منوّر ہوئے ان کے تین طبقے ہیں، صرف ایک امر جامع ان کا رشتہ

اتحاد جوڑے ہوئے ہے۔اس کی حقیقت یہ ہے کہ جوفیض واحد تعالیٰ وتقدس کی جانب سے نازل ہوتا ہے وہ ہیئت تخلیطیہ میں ہوتا ہے۔توضیح کے لئے ہماری اس مثال کو یاد کرو جو صفراء کے بصورت نار متمثل ہونے وغیرہ کی، ہم نے لکھی تھی۔اس لئے یہ معلوم رہے کہ جوحکمت فائض ہوتی ہے وہ خالص نہیں ہوتی، عالم تخلیط کے اثرات سے مبرّا نہیں ہوتی۔(۱) پہلا طبقہ حکمت، عصمت، اور وجاہت کا وارث ہے آپ (صلعم) کے خدام اور اہل بیت سب اسی طبقہ میں شامل ہیں۔سنت الٰہیہ یہ ہے کہ ہر ایک پیغمبر کے خاندان کے لوگ اس نمایاں فضیلت کے وارث ہوں ان کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جن کو فطرت کی پاکیزگی، وسعتِ صدر، اور صورت جزیہ کے باعث یہ میراث ملی۔ چنانچہ حضرت علی، ان کی اولاد، بی بی فاطمہ، حمزہ، عباس اور ان کی اولاد رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین اسی زمرہ میں سے ہیں۔اس کا راز وہی ہے، جس کا ذکر ہم تیسرے خزانہ میں کر چکے ہیں کہ جو لطیف النفس ہو، اس سے لطیف النفس کی ولادت ہوتی ہے اور یہ کہ ولادت روحانیہ بھی بمثل ولادت جسمانیہ کے لئے۔یہ اصحاب اس طبقہ کے اقطاب اور ائمہ ہیں۔دوسری قسم وہ لوگ ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بہت زیادہ میل جول رکھنے کے باعث ان چیزوں کے وارث بنے۔یہ لوگ قبض وبسط اور رنج وراحت ہر ایک حالت میں آپ کے ساتھ رہے۔یہ زمرہ آپ کی ازواج مطہرات اور آپ کے خدام پر مشتمل ہے۔اس کا راز یہ ہے کہ ان کو فطرت کی جانب سے بہرۂ دانی ملا، اور حکمت دراصل فطرت ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے اپنے برگزیدہ بندوں کو پیدا فرمایا۔ ان لوگوں کی حکمت گویا ایک طرح کی تلقین ہے۔اس کو اچھی طرح سمجھ لو۔عام لوگوں کا خیال ہے کہ چوں کہ اس آیت کا کہ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَ يُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا۔ ''اے اہل بیت! بے شک اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ تمہاری نجاست (باطنی) دور کردے اور تمہیں اچھی طرح پاکیزہ بنادے۔'' مقتضا یہ ہے کہ ازدواج مطہرات اہل بیت میں شامل ہیں لیکن ایک حدیث ہے کہ بنو ہاشم اور بنو مطلب ہی اہل بیت ہیں، نیز ایک حدیث میں ان کی تفصیل پانچ اشخاص طاہرین سے کی گئی ہے (جو بعد میں شیعہ لوگوں کے ہاں پنج تن پاک کے نام سے مشہور ہوئے۔آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت علی، بی بی فاطمہ اور حسنین) اس لئے (ان لوگوں کے خیال میں) آیت مذکورہ بالا اور ان احادیث میں تناقض ہے۔جو معلومات ہم تم کو

دے چکے ہیں ان کی بنا پر اس کا حل کرنا چنداں دشوار نہیں۔ قوانین حکمت اور تثلیثِ قسمت کو پیش نظر رکھو اور اچھی طرح سوچ لو:

(۲) دوسرا طبقہ حفظ و تلقین اور ہدایت و ارشاد کا وارث ہے۔ یہ خلفاء راشدین اور دوسرے انہیں کے طرز کے اصحاب ہیں خلافت عظمیٰ انہیں کا حق ہے اور ہم ڈنکے کی چوٹ پہ کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ کو اگر چہ یہ فضیلت عالیہ بھی حاصل تھی لیکن اگر شیخین کی جگہ وہ ہوتے تو یہ فتوحات نہ ہوتیں (جو شیخینؓ کے عہد میں ہوئیں) اور اسلام کا دائرہ اس قدر وسیع نہ ہوتا۔ علاوہ بریں خلفاء نے تکلیفیں برداشت کر کے اس فضیلت عظمیٰ کو حاصل کیا یہاں تک کہ اس مقام میں ان کا قدم راسخ ہوا۔ صدیق اکبرؓ سے منقول ہے کہ کاش میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک گناہ ہوتا'' اہل حکمت کے مسلک اور ان کے مذاق پر یہ اس کی دلیل ہے۔ (۳) تیسرا طبقہ ابو ہریرہؓ اور انس بن مالکؓ وغیرہ علماء اور مفتیین صحابہ کا ہے۔ یہ لوگ فروع سہ گانہ باطنیہ کے وارث ہیں، بالمقابل ان کے خالد بن ولید اور امیر معاویہ وغیرہ فروع سہ گانہ ظاہریہ کے وارث تھے۔

حضرت علی نے آپ سے روایت کی ہے کہ ہر ایک پیغمبر کے سات نجباء رقباء ہوتے ہیں۔ لیکن مجھ کو چودہ دیئے گئے ہیں۔ ہم نے عرض کیا وہ کون، آپ نے فرمایا میں، میرے دونوں بیٹے، جعفر، حمزہ، ابو بکر، عمر، مصعب بن عمیر، بلال، سلمان، عمار، عبداللہ بن مسعود، ابوذر اور مقداد۔ یہ حدیث ترمذی میں ہے اور اس کا راز یہ ہے کہ ہر ایک پیغمبر کے حلقۂ احباب میں ایسے اشخاص کا ہونا لازم ہے جو اس سے حکمت اخذ کریں، اور ایسے اشخاص بھی ہوں جو اس کی تلقین کا طریقہ سیکھیں، نیز ایسے اشخاص جن کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کے دشمنوں کی عداوت بدرجۂ اتم راسخ ہو چکی ہو جس کا ظہور ان سے مجادلہ (بحث و مناظرہ) ہجرت اور جہاد کی صورت میں ہو۔ نیز ایسے اشخاص بھی اس کے حلقۂ اصحاب میں ہوں جو تفقہ، (اور استنباط احکام شرعیہ، قضا و افتاء) اور حکمرانی کے فرائض سنبھال سکیں۔ کیونکہ ہر ایک کمال کے لئے ضروری ہے کہ مستقل اور جداگانہ طور پر اس کا تمثل ہو، تاکہ وہ شخص بھی جو دریائے تخلیط میں ڈوبا ہوا ہے اس کمال کا عیاناً مشاہدہ کر سکے۔ اہل حکمت کی رائے میں نجباء وہ ہیں جو حکمت کے وارث ہوں۔ خلفاء وہ ہیں جو حفظ و تلقین اور ہدایت و ارشاد کے وارث ہوں، اور رقباء وہ ہیں جو ہجرت اور جہاد کے شہسوار ہیں۔ چونکہ حضرت علیؓ حکماء اور نجباء

کے امام تھے۔اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان ہی کو ان کے عدد اور تفصیلات سے مطلع فرمایا۔آپ کے نجباء کا تعداد میں زیادہ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ آپ کا درجہ تمام دیگر انبیاء سے بلند تر ہے جن کے اسماء گرامی اس حدیث میں مذکور ہیں ان کو یہ مقام عالی طول صحبت اور انوار ارشاد کی بدولت حاصل ہوا۔ ابن عباس سے روایت ہے۔ آنحضرت صلعم فرماتے ہیں ''میری امت میں سے ستر ہزار بغیر حساب کے جنت میں داخل ہوں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو منتر نہیں پڑھواتے اور جھاڑ پھونک نہیں کرواتے، براشگون نہیں لیتے، اور اللہ تعالیٰ ہی پر ان کا بھروسہ رہتا ہے۔'' یہ حدیث صحیحین میں ہے۔یاد رکھو صحابہ میں کامل ترین وہی ہیں جن کو تجلی افعال سے مخصوص فرمایا گیا ہے۔ کیوں کہ ان کا تقرب اسم متجدّد کے ذریعہ ہوتا ہے اور حوادث یومیہ کا ظہور میں آنا اسی تجدّد کا نتیجہ ہے جب ان کو یہ کمال حاصل ہوتا ہے تو وہ توکل کرتے ہیں اور اپنے تمام امور کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیتے ہیں۔

اولیاء میں سے جو علمیین یعنی صاحب علم ہیں ان کا کمال یہ ہے کہ وہ اس نشأۃ کی حقیقت اسی طرح سمجھ لیں جس طرح کہ وہ ہے۔اس قسم کے کمال کا نتیجہ ایک یہ بھی ہے کہ وہ توسل بہ تدبیر کرتے اور اسباب ومسبّبات کے نظام کو نظر انداز نہیں کرتے۔ جب وہ درجۂ کمال، تک پہنچتے ہیں تو ان کو اسباب کا علم ہو جاتا ہے اور اسلئے باوجود توحید کی حقیقت جاننے کے وہ تعلق بالاسباب کو ترک نہیں کرتے۔ برخلاف اس کے جو اولیاء حالیین یعنی اصحاب حال ہیں وہ ایک گہری غفلت میں پڑے ہوئے ہیں، ان کا نصب العین اور مرکز توجہ صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی دنیاوی ہستی کے سرّ باطنی کو حکم ازل کا مقہور کر دیں۔ان لوگوں کو اگر صفتِ توکل حاصل ہوتی ہے تو اس کا باعث غلبۂ حال ہوتا ہے اور وہ توکل بالذات نہیں، بالعرض ہوتی ہے۔ بہر حال وہ انکی قوت کمال نتیجہ نہیں ہوتی۔ سمجھ لو۔

دوسرا طریقہ حکماء کا ہے جو اولیاء اور انبیاء کے طریقہ کے درمیان گویا ایک برزخ ہے یا یوں کہو کہ نبوت عقل بالفعل ہے اور یہ طریقہ اس کا عقل ہیولانی ہے ان کے مذہب کی بنیاد یہ ہے کہ ہم عقل مضاعف کے ساتھ یہ سمجھ لیں کہ تجلی ذاتی کے بعد وصول الی اللہ کا ایک اور بھی پایہ ہے اس کی تحقیق یہ ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ اشتراک لفظی کے طور پر تجلّیات کے دو دو معنی ہیں (الف) بعض

ان میں سے وجودیات ہیں۔ان سے جو کچھ ظہور میں آتا ہے وہ وجود مُفاض ہے۔تیسرے خزانہ میں تم اس کی تفصیل پڑھ چکے ہو۔(ب) بعض ان میں سے شہودیات ہیں۔ان سے آدمی کو علم اور معرفت حاصل ہوتی ہے۔صوفیہ کرام کے کلام سے پایا جاتا ہے کہ ان کی تین قسمیں ہیں۔صوریہ اور معنویہ اور ذاتیہ۔اور یہ کہ شہودیات وجودیات کے لئے بمنزلہ ان کے سایہ کے ہیں،ان ہی کے تمثلات ہیں،یا ان وجوہ کے تمثلات ہیں جو اُن کے ضمن میں مخفی و مستور ہیں۔اس سے یہ ثابت ہوا کہ وصول کے معنی ہیں شہودیات کا وجودیات کے ضمن میں مندرج ہونا۔جس طرح وسط گرما میں دوپہر کے وقت صورتوں کا سایہ ان کے اندر مدغم ہو جاتا ہے۔اس سے معلوم ہوا کہ اصحاب تدقیق نے بہت تکالیف اٹھا کر وصول علمی کا جو راستہ نکالا ہے،اس کا رشتہ منقطع ہو جاتا ہے۔نیز اس وصول کے معنی یہ ہیں کہ حقائق کو ان کے تمثلات سے الگ کرنے پر مجبور کیا جائے۔یہاں تک صورت جو یہ منسلخ ہو کر کالعدم ہو جائے۔نیز یہ کہ ان کی معرفت کا منتہا وہ نسبت قدسیہ ہو جو ازل سے ابد تک اللہ تعالیٰ اور اس کے درمیان ہے نفس ربط ایک ہے،لیکن دونوں حیثیتیں مختلف ہیں۔یہی وصال کی بنیاد اور کمال کی اصل ہے اور مقامِ حکمت کا آخری درجہ ہے۔اس کے بعد جو کچھ ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ حجب واقعیہ علمیہ کو رفع کیا جائے۔یہ باتیں کسی حکیم کے سامنے بہت کم واضح ہوتی ہیں۔اِلاّ یہ کہ اس پر اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا فضل ہو۔اس کمال مطلق تک ان کے پہنچنے کا طریقہ یہ ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی جانب جذب حاصل ہوتا ہے (اوپر کھینچے چلے جاتے ہیں) اور نور غیب وغیرہ مقامات کو طے کرتے ہوئے اسماء پاک کے میدان تک پہنچ جاتے ہیں۔چنانچہ اس مقام پر پہنچ کر بہت جلد ان کی نظر میں نفوذ پیدا ہو جاتا ہے۔پھر وہ تجلّی ذاتی میں مضمحل ہو جاتے ہیں۔لیکن ان کا یہ اضمحلال اولیاء کی طرح نہیں ہوتا۔اس کے بعد وہ قرب فرائض کی طرف لوٹتے ہیں اور وہ وصول ان کو نصیب ہوتا ہے جس کا ہم نے اثبات کیا ہے۔کامل ترین حکیم کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے نور کا عکس قبول کر کے بالآخر قرب فرائض میں مضمحل ہو جائے،کیونکہ اس کو آپ کی عین اور اس کی وسعت پر کامل اعتماد ہوتا ہے اور وہ جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نبی کریم صلعم کے کمال باطنی کے راستہ سے اس پر تجلّی فرمائی ہے۔سمجھ لو۔

اس سے تین شاخیں نکلتی ہیں۔ایک شعبۂ حکمت کا ہے۔یہ فطری علم ہے،اکتسابی نہیں۔یعنی

اس کا سرچشمہ وہی اسم پاک ہے جو اس کے اصول وجود کا منبع ہے۔ یہ اسم تمام الٰہیات اور تکوینیات وغیرہ پر مشتمل ہے، جن کا ذکر ہم نے اس کتاب میں کیا ہے۔ اس کا راز یہ ہے کہ مجردات میں علم عین ذات ہوتا ہے اور جب تک وہ تمثّلاتِ تحیز یہ کی صورت اختیار نہ کرے اس میں امتیاز پیدا نہیں ہوتا، جب قرب وجودی کو ثبوت اور استقرار حاصل ہوتا ہے تو تمثّلات کی وسعت کی بنا پر ان میں علوم ثبت ہو جاتے ہیں۔ حکمت کا خلیفہ اور نائب اس عالم حسّی میں فراست اور تیقظ اور ذکاء ہے۔ ان کا وجود ایک ایسے عالم میں ہے، جس کا اثبات حکماء کے ساتھ مخصوص ہے، اس کا ہم نے پہلے بھی ذکر کیا ہے۔ لوگوں کو یہ تخیل ہوتا ہے کہ ان کا ہر ایک کمال خواہ شجاعت ہو یا سخاوت اور ذکاء، ایک ایسا امر ہے جو آسمان سے نازل ہوا اور تدبیر امر کر کے لوٹ گیا۔ دوسرا شعبہ عصمت ہے۔ اسکی حقیقت یہ ہے کہ اس کی عین ثابتہ کا یہ تقاضا ہو کہ تمام تر اعمال صالحہ اور اخلاق جمیلہ اس سے صادر ہوں، اور کوئی برا فعل یا عمل اس سے ظہور میں نہ آئے اس کا راز یہ ہے کہ جس شخص کو خیر کامل (ذات اقدس باری تعالیٰ) سے قرب وجود حاصل ہو، اس کے اخلاق اور اعمال میں کسی برائی کا متمثّل ہونا محال اور ناممکن ہے، اس کا خلیفہ اور نائب عفت ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ کھانے پینے اور خواہشات نفسانی میں منہمک ہونے سے اپنے آپ کو باز رکھے۔ تیسرا شعبہ وجاہت ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کسی کو اللہ تعالیٰ کے ہاں درجۂ عالیہ نصیب ہو اور دوسرے لوگوں سے اس کا رتبہ بلند ہو۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ عالم مادی میں بھی لوگ اس کے مطیع اور منقاد ہوں۔ اس کا راز یہ ہے کہ صورمزاجیہ سے آدمی کا انسلاخ حاصل ہو اور نیکیوں کے سلسلہ میں اس کو قرب الی اللہ نصیب ہو۔ اس کا نائب اور خلیفہ وقار و سکینہ اور تسلّط ہے۔ اس کی ایک فرع ارشاد ہے۔ جوں جوں کسی کی وجاہت میں اضافہ ہوتا ہے اس کا دائرہ ارشاد وسیع ہوتا ہے اور اس کا کمال بڑھتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو اجازت دی ہے کہ وہ اظہار خوارق کے لئے توسّل بالاسماء کریں۔

ہمارے نزدیک توسل بالاسماء کا یہ طریقہ نہیں کہ اعداد اور اوقات سے ان کا مقید کیا جائے، جیسے کہ اہل دعوت اور ارباب عزائم کہتے ہیں۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ اسماء حسنیٰ کو پڑھو، ان کے معانی اور حقائق کا علم اور پھر ان میں فنا اور ان کے ساتھ بقا حاصل کرو۔ اس کے بعد بارگاہ کبریاء جل وعلا سے خشوع وخضوع کے ساتھ گڑ گڑا کر دعا مانگو۔ ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے یہ بھی اجازت دی ہے کہ

وہ کشف مافی الکون کے لئے ریاضات اختیار کریں مثلاً کثرت سے نوافل پڑھنا، خیرات ومبرات کرنا، روزے رکھنا، اعتکاف میں بیٹھنا اور بے ضرورت کلام ترک کر دینا وغیرہ۔ حکیم کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ وسیع الصدر ہو۔ اس سے ہماری مراد یہ ہے کہ کسی وصف اور حال کو اتنا عظیم نہ سمجھے کہ بس یہی منتہائے کمال ہے بلکہ بڑھتے چلو، بڑھتے چلو کہ اصول پر عامل ہو۔ وہ شعر گوئی اور موسیقی جیسی حسّی تفریحات کو مزاج میں راسخ نہ ہونے دے اور دین و دنیا کے امور میں کسی کا منّت کش نہ ہو۔ صرف انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو مقتدا سمجھے اور انہیں پر جو وحی نازل ہوئی، اسی کی تقلید کرے، اور حکمت کے عنوان سے جو کچھ بتایا جا چکا ہے ان تمام باتوں کو اپنے میں پیدا کرے، قوۃ سے فعل میں لائے۔

تیسرا طریقہ ان اولیاء کا ہے جو اصحاب فنا ہیں۔ ولایت کے دو معنی ہیں۔ ایک تو اس کے عام معنی ہیں۔ یعنی ہر ایک قسم کا قرب جو درجۂ نبوت سے کمتر ہو۔ حکمت صحابیّت، ولایت خاصہ، اور مقام صفا سب اس کے مفہوم میں داخل ہیں۔

دوسرے معنی ولایت کے خاص ہیں یعنی صورت مزاجیہ قائم رہنے کے باوجود ذاتِ اقدس میں آدمی کو فنا حاصل ہو۔ لیکن یاد رکھو، الفاظ کی تحقیق مقصود نہیں، صرف حقائق کا جاننا مقصود ہے۔ ان کے مذہب کا اصل ایسے اعمال ریاضیہ ہیں جن کی بدولت ان کے نفس کو تزکیہ حاصل ہو کر ایک عظیم الشان راز کا انکشاف ہوتا ہے جس کے درجات مختلف ہیں۔ سب سے پہلے ان کو یہ حقیقت عیاناً نظر آنے لگتی ہے کہ اس عالم کون وفساد کے تمام چھوٹے بڑے تصرفات کی باگ اللہ تعالیٰ کے دست قدرت میں ہے۔ اس مشاہدہ کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے تمام امور میں اللہ تعالیٰ پر کامل بھروسہ رکھتے ہیں جس کو توکّل کہتے ہیں۔ نیز اللہ تعالیٰ کے بغیر اور کسی کا خوف ان کے دل میں نہیں ہوتا (سعدیؒ نے اس مقام کے متعلق مختلف اشعار لکھے ہیں۔ ایک جگہ پر لکھا ہے ؎

موحد چہ در پائے ریزی زرش — چہ شمشیر ہندی نہی برسرش

امید و ہراسش نباشد زکس — کہ بنیاد توحید این ست و بس

دوسری جگہ اس حقیقت کا ایک دوسرے رنگ میں اظہار کیا ہے، کہتے ہیں ؎

گر گزندت رسد، ز خلق مرنج — کہ نہ راحت رسد ز خلق نہ رنج

از خدا دال خلاف دشمن و دوست | کہ دل ہر دو در تصرفِ اوست
گرچہ تیرا ز کماں ہمے گذرد | از کماندار بیند اہل خرد)

اس حقیقت کا انکشاف پہلے درجہ کا ظہر ہے۔اس کا بطن یہ ہے کہ ہر ایک فعل اور تصرف جو اس عالم میں واقع ہو، اس میں اس کو خدائے بزرگ و برتر نظر آئے اور اس فعل کو ایک طرح کا حجاب اور نقاب اور اس کا تعیّن تصور کرے۔اس انکشاف کو پہلے درجہ میں اس لئے رکھا گیا ہے کہ نفس الامر میں یہ افعال جو دنیا میں واقع ہوتے ہیں فنا پذیر ہیں اور موطن علمی اس موطن کے تمثلات سے ہے اس کو صوفیہ کی اصطلاح میں محاضرہ کہتے ہیں۔دوسرا درجہ یہ ہے کہ تمام صفات کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہوتا ہوا دیکھے اور اس کو صاف نظر آئے کہ ہر ایک آنکھ کی بینائی کا منبع اس کی بینائی ہے جل سلطانہ۔ہر ایک کان کی شنوائی کا منبع اسی کی شنوائی ہے وغیرہ وغیرہ۔اس کی ثانویت کی وجہ اور اس کے وہ معنی جو بطن کی قسم سے ہیں تم پر مخفی نہیں رہیں گے۔(غور و تدبّر کی ضرورت ہے)۔ اس مقام کو اہل معرفت مکاشفہ کہتے ہیں۔تیسرے درجہ میں سب ذوات اسی کی ذات اقدس کی طرف منسوب نظر آتی ہیں۔سالک کے لئے یہ نظر آنا سچ مچ کا مشاہدہ ہوتا ہے۔اس کا بطن یہ ہے کہ واجب تعالیٰ وتقدس کائنات کی ہر ایک چیز کی اصل ہے اور ہر ایک موجود کا نہاں خانۂ عدم سے معرض ظہور میں آنا، اسی کے مقدس افاضہ کا نتیجہ ہے اس کے بعد سیر الی اللہ کا مقام ہے اس درجہ کے انکشاف کو مشاہدہ کہتے ہیں جس کے بعد اللہ تعالیٰ کی جانب سے وقتاً فوقتاً اس کو (سالک طریقت کو) جذب ہوتا ہے، یہاں تک کہ تمام تقیّدات اور پردے اٹھ جاتے ہیں، صرف خدائے پاک ذوالجلال والاکرام اپنی وحدت اور کبریاء کے ساتھ باقی رہ جاتا ہے اور مُدرّک (بالفتح) اور مُدرِک (بالکسر) اس حالت میں عین ایک دوسرے کے ہوتے ہیں۔چنانچہ اس کا علم حضوری سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کسی سے متعلق نہیں ہوتا اور مرایا کالعدم ہو جاتے ہیں۔اس کی مثال ہم نے نویں خزانہ میں بیان کی ہے کہ جب آدمی اس صورت کو جو شیشہ میں نظر آتی ہے بہت دیر تک ٹکٹکی باندھ کر گھورتا ہے تو شیشہ کا وجود نظر سے محو ہو کر فقط صورت مرئیہ سامنے رہ جاتی ہے۔جب سالک اس مقام تک پہنچ جاتا ہے، تو اس کی سیر فی اللہ ختم ہو جاتی ہے جو شخص اس بیابان میں قدم رکھے اس کو چاہئے کہ اتنی دیر تک ٹھہرا رہے کہ سیر فی اللہ کے ذریعہ نورانیت حاصل کرنے کے بعد اسماء پاک

کے احکام کو ثبات واستقرار حاصل ہو۔ آدمی کا سبوغ (مرتبۂ کمال تک پہونچنا) اس کی پہلی فطرت کے مطابق ہوتا ہے۔ کیونکہ کثرت اسماء حسنیٰ کی وجہ سے قبول کرنے والوں کی استعدادیں بھی مختلف ہیں۔ اگر کوئی شخص علم فطری کے اصحاب سے ہے تو سب سے پہلے اس پر اسماء پاک کی حقیقت، مظاہر کی خصوصیات، اور ظہور کی نوعیت منکشف ہوتی ہے، لیکن اگر وہ اہل تقلید فطری میں سے ہے، تو اس کو ان باتوں کا علم نہیں ہوتا بلکہ احکام واستقرار وثبات حاصل ہو کر سالک طریقت کو ایک ارتقاء جدید حاصل ہوتا ہے۔

قبض وبسط کی حقیقت یہ ہے کہ خدائے بزرگ وبرتر کے جلال اور جمال کے احکام معرض ظہور میں آئیں۔ اس کو سیر من اللہ کہا جاتا ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر آدمی ارشاد میں راسخ القدم ہو جاتا ہے، کیوں کہ وہ خدائے پاک کا رنگ قبول کر چکا ہے اور اللہ تعالیٰ کامل الصفات مفیض بالذات ہے، اس لئے اس نشاۃ دنیویہ میں کم از کم موطن علمی کے مطابق افاضہ کا تمثل ضروری ہے، کیوں کہ اب سیر فی الخلق کے تمام مقامات طے ہو چکے ہیں اور سالک طریقت مقام فنا میں انتہائی کمال تک پہنچ چکا ہے۔ طائفہ علیہ (صوفیہ کرام) میں سے ذیل کے اشخاص اسی مقام کے ممتاز افراد ہیں۔ ابو یزید، ابوالحسن، ابوالعباس، ابوسعید ابواسمٰعیل، ابوعبداللہ اور جن کے اسماء گرامی سے اصحاب معرفت کے طرق مروجہ منسوب ہیں۔ مثلاً شیخ عبدالقادر جیلانی۔ شیخ شہاب الدین سہروردی، شیخ نجم الدین کبریٰ، خواجہ بہاء الدین نقشبند اور خواجہ معین الدین چشتی۔ مضمون بالا کے متعلق پوری تحقیق بتانے سے پہلے مقدمہ کے طور پر یہ سمجھ لینا چاہئے کہ وجود علمی اور وجود خارجی میں مناسبت لازم ہے۔ مناسبت کا مفہوم ہمارے نزدیک نفس رحمانی اور خصوصیت موطن کا اشتراک ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم پہلے ثابت کر چکے ہیں کہ مجرد عن المادہ میں علم اور وجود خارجی میں امتیاز نہیں ہوتا۔ موطن امتیاز وہ تمثلات ہیں جو بعد میں ظہور میں آتے ہیں۔ بالفاظ دیگر ہم اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ تمام عوالم ایک دوسرے کے متحاذی ہیں، جو چیز خارج میں موجود ہوتی ہے وہ پہلے نشاۃ ذہنیہ میں متجلی ہوتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ اگر کسی نہ کسی ریاضت کے ذریعہ وسائط کو مٹا دیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی حقیقتِ وجوب کے رنگ میں رنگا جاتا ہے جس کی نوعیت اور طریقہ ہم بیان کر چکے ہیں۔

فنا کی دوقسمیں ہیں۔ شفاہی اور جمالی۔ شفاہی کے معنی یہ ہیں کہ تجلیات سے نہیں بلکہ حقیقت ذات اقدس سے آدمی رنگا جائے اور یہ انصباغ قوی اور کامل ہو۔ یہ اس شخص کے لئے مخصوص ہے جو قوی المزاج ہو اور اس کے مزاج کی حدت تجلیات کے بغیر مقہور نہ ہوسکے۔ ایسا شخص کسی "حال" اور "مقام" کو مغلوب اور مقہور کئے بغیر نہیں چھوڑتا اور اس وقت تک کسی چیز کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ جب تک اس میں انتہائی کمال حاصل نہ کرلے۔ یاد رکھو، فنا کا بھی وزن ہوتا ہے ، جس طرح کوئی دریا میں ڈوب کر مرجائے اور دریا اس کو باہر کنارے پر پھینک دے تو اس کی موت اور اس کے پھینکے جانے کا وزن ہوتا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ پہلے نفس کی حدت کو توڑا جائے اور اس کو لذائذ اور خواہشات نفسانی سے باز رکھا جائے، اس کے بعد فنا کا مقام حاصل ہوسکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر ایسا نہ کیا جائے تو ممکن ہے فناء شفاہی حاصل نہ ہو اور نفس ربوبیت کا مظہر میں نمایاں ہو۔ اس صورت میں اس کی انانیت اور ربوبیت کا مظہر میں نمایاں ہو۔ اندریں صورعت اس کی انانیت اور ربوبیت کو مٹانا مشکل ہوگا۔ اس کا نتیجہ اسی دنیا میں بڑی ذلت اور رسوائی ہوتی ہے۔ نیز یہ ضروری ہے کہ پہلے دوام حضور حاصل کرے، جس کے بعد وہ فنا کا مقام حاصل کرسکتا ہے۔ کیونکہ اگر فنا شفاہی حاصل نہ ہوئی تو آدمی پر ایک حیرت طاری ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کا کوئی رشتہ نہیں ہوتا اور حضور سے وہ محروم ہوتا ہے۔ اس سے اس کے ارشاد میں نقص آجاتا ہے اور اس کا دل ٹوٹ جاتا ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ مال واولاد کی محبت اور حبّ جاہ کے رشتے توڑ ڈالے نہیں تو ممکن ہے فنا شفاہی حاصل نہ ہو جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ ہمیشہ طامع اور حریص رہے گا۔ جیسے کہ کہا گیا ہے کہ جس نوع کی زندگی بسر کروگے اسی حالت پر تمہاری موت ہوگی اور جس حالت پر مروگے اسی حالت پر اٹھائے جاؤ گے۔" اولیاء کا مسلک اس بارے میں مختلف ہے۔ بعض تو ان شرائط سہ گانہ کے حصول میں اپنی بصیرت پر اعتماد کرتے ہیں جب ان کو یقین ہوتا ہے کہ مرید نے یہ شرائط پوری کردی ہیں تو وہ اس کو مقام فنا تک پہنچادیتے ہیں۔ بعض ان میں سے مرید کے واقعات یا اپنے واقعات پر اعتماد رکھتے ہیں۔ جب ان کو بذریعہ واقعات یا منامات کے معلوم ہوجاتا ہے کہ مرید نے علائق کا رشتہ توڑ دیا ہے، اس کے دوام حضور حاصل ہوگیا ہے، اور اس کے نفس کی تیزی ٹوٹ گئی ہے تو وہ اس کو مقام فنا تک پہنچادیتے ہیں۔ بعض کا اعتماد

فراست ہوتا ہے اور وہ مرید کو قسم قسم کی آزمائشوں سے آزماتے ہیں۔ جب اس کا خلوص ثابت ہوتا ہے اور وہ امتحان میں پورا اترتا ہے تو اس کو فنا کے مقام تک پہنچا دیا جاتا ہے۔ ان امور کی تحصیل کے لئے اولیاء کے مختلف طریقے ہیں جو ان کے ہاں محفوظ ہیں اس لئے ان کی تفصیل ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ بہر حال مقام ارشاد کے یہ وہ ضوابط اور آداب ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ہم کو عنایت فرمائے ہیں اور کبریت احمر سے زیادہ قیمتی ہیں، اس لئے ان کو اچھی طرح یاد رکھو۔ دوسری قسم فنا حجابی ہے۔ حجاب کی دو صورتیں ہیں (الف) یا تو مواطن علم میں سالک کو فنا حاصل ہوتی ہے اور وہ ادنیٰ جذبہ سے مغلوب ہو جاتا ہے یا یہ کہ اس کے حق میں جذب بہت کم ہوتا ہے۔ (ب) وہ اسماء پاک میں سے کسی اسم میں فنا ہوتا ہے۔ لیکن اس کی یہ فنا ذات اقدس میں نہیں ہوتی۔ تقریر بالا میں ہم نے ایک جگہ پر تقلید فطری کا لفظ استعمال کیا ہے، اس کی تشریح یہ ہے کہ نشآت کی دو قسمیں ہیں یا بالفاظ دیگر ارتقاءات کی دو منزلیں ہیں۔ ایک مجرد عن المادہ کا ارتقاء ہے جس میں علم اور وجود خارجی آپس میں متمیز نہیں ہوتے۔ دوسرا ارتقا وہ ہے جو عمل اور ''حال'' کی صورت میں ظاہر ہو۔ اب جس کا علم اس کے عمل اور ''حال'' سے کامل تر ہو وہ ذکی کہلاتا ہے۔ اور جو بالعکس ہے وہ مقلّد ہے اصحاب علم کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ ملائکہ اور انبیاء میں سے جس کو چاہیں اور جس وقت چاہیں بلالیں، ان سے جو چاہیں پوچھ لیں اور بعض مسائل معرفت کے متعلق ان کی رائے معلوم کریں۔ اصحاب العمل سے از قسم احیاء و اماتہ بڑی عجیب اور خارق عادت باتیں صادر ہوتی ہیں، مقامات خواجہ نقشبند، بہجۃ الاسرار، اور مقامات شیخ احمد جام وغیرہ جیسی کتابیں ان ہی خوارق کے بیان پر مشتمل ہیں (۱)۔

............☆☆☆............

---

(۱) آج کل یورپ میں روحوں کے بلانے (تحضیر الارواح) اور ارواح کی مدد سے خوارق اظہار کرنے کا بڑا چرچا ہے اور اس کو سائنٹیفک اصول پر ثابت کرنے کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔ اگر تفصیل چاہیں، تو ہپناٹزم اور اسپر یچوئلزم کے موضوع پر انگریزی میں لکھی ہوئی کتابیں پڑھیں یا علامہ طنطاوی مرحوم کی کتاب الارواح بزبان عربی اور علامہ فرید وجدی کی دائرۃ المعارف القرن العشرین میں اس موضوع پر جو مقالہ لکھا ہے۔ مطالعہ کریں۔

کمالاتِ نبّوت، صحابیت، ولایت اور حکمت کے درمیان کیا فرق ہے

من جملہ ان فروق کے ایک یہ ہے کہ انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام اللہ تعالیٰ کو موجب بالا ارادہ سمجھتے ہیں، اس ارادہ سے مراد ارادۂ متجدد ہے۔ یہ لوگ ارادہ میں مضمحل رہتے ہیں ان کے امرونہی اور بیم وامید کا تعلق اسی سے ہوتا ہے۔ صحابہ کرام اللہ تعالیٰ کو مرید کی حیثیت سے جانتے تھے۔ اسی میں ان کا اضمحلال حاصل تھا، اور ان کے خوف ورجا کا مرکز اسم پاک المرید تھا۔ حکماء اللہ تعالیٰ کو موجب اور مرید سمجھتے ہیں لیکن اس میں مضمحل نہیں ہوتے برخلاف اس کے اولیاء اللہ تعالیٰ کو فقط موجب جانتے ہیں اور اس میں مضمحل ہو جاتے ہیں۔ یاد رکھو جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے ان کے اصل کمال کی حیثیت سے بیان کیا ہے، ورنہ بعض اوقات اولیاء بھی انبیاء کی تقلید سے اس کو مرید جانتے ہیں یا جہل اسرار کی وجہ سے اس کو ایسا سمجھتے ہیں۔ ان کے طریقوں میں اسی وجہ سے اختلاف پیدا ہوا۔ انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام سرّ قدر (تقدیر کا راز) جانتے تھے۔ لیکن صحابہ سے اس کو مخفی رکھا۔ نیز اللہ تعالیٰ نے ان کو اہلّہ (ہلال کی جمع ہے اور اس آیت کی طرف اشارہ ہے ویسئلونک عن الاھلّہ) وغیرہ کا راز نہیں بتایا، اور اس لئے ان کے کلمات اور اقوال ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اس فرق کا راز اسم متجدّد کے ظہور میں مضمر ہے۔ من جملہ ان فروق کے ایک یہ ہے کہ احکام حدوث سے اللہ تعالیٰ کا کلام کرنا انبیاء کے حق میں صادق ہے، نیز صحابہ کے حق میں بھی درست ہے لیکن اولیاء کے حق میں نہیں۔ برخلاف اس کے حکماء دونوں طریقوں کے جامع ہیں۔ اللہ تعالیٰ اولیاء کو جب کوئی حکم دیتا ہے تو وہ صورت مزاجیہ کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس کا راز وہ

فرق ہے جو ہم نے صورت مزاجیہ اور صورت جو یہ کے درمیان بیان کیا ہے (کہاں؟) من جملہ ان فروق کے ایک یہ ہے کہ اولیاء کو دونوں مواطن یعنی موطن علم اور موطن عمل میں احکام اسماء کے ثابت اور برقرار رکھنے کی طاقت نہیں۔ چنانچہ جوان میں سے عالم ہیں ان کو اشارہ کا حق نہیں اور جو صاحب ارشاد ہیں وہ علم سے دور ہیں۔ ان کے مقابلہ میں صحابہ کا کمال علمی نہیں (عملی ہے) برخلاف اس کے انبیاء علیہم السلام اور حکماء ربانیین کا علم اور عمل ایک برابر ہوتے ہیں۔ اس فرق میں راز یہ ہے کہ اولیاء کی فنا نفس کیساتھ مخصوص ہے نفس کی دو قوتیں ہیں، ایک عاقلہ دوسری عاملہ۔ اور یہ ظاہر ہے کہ آدمی کو فطرۃً یا تو قوت عاقلہ میں تقدم حاصل ہوگا یا اس کی قوت عاملہ غالب اور قوی تر ہوگی۔ حکماء کا قرب الوجود ہی میں کمال ہے۔ اور یہ وجود اس سے پہلے تھا کہ قوت عاقلہ اور عاملہ میں امتیاز پیدا ہو کر ہر ایک ان میں سے مستقل ہستی تصور کی جائے برخلاف اس کے انبیاء علیہم السلام کا کمال قرب الفرائض میں ہے (جیسے کہ حکماء کا کمال قرب الوجود میں تھا)۔ من جملہ ان فروق کے ایک یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے مناسب حال ازدواجی تعلقات کا پیدا کرنا ہے۔ کیونکہ ان کی وجاہت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ تدبیر منزل اور سیاست مدنیہ کے بھی فرائض انجام دیں۔ برخلاف اس کے اولیاء کے شایان شان یہ ہے کہ وہ ہمیشہ مجرد رہیں۔ کیونکہ ان پر صمد قدوس کا رنگ چڑھا ہوا ہے۔ (جس کی شان ہے **لم یتخذ صاحبةً ولا ولداً**) حکماء کی حالت دونوں (انبیاء اور اولیاء) کے بین بین ہے۔ یہ ایک بڑا اشکال ہے۔ ان کی یہ حیثیت کہ ان کے حق میں عصمت کا خلیفہ اور نائب عفت ہے۔ اس بات کی مقتضی ہے کہ وہ مجرد رہیں اور چونکہ انکو بھی وجاہت کا مقام حاصل ہے اس لئے ازدواجی تعلق پیدا کرنا ان کے مناسب حال معلوم ہوتا ہے۔ اس اشکال سے اس طرح مخلصی حاصل ہو سکتی ہے کہ وہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر عمل کریں، چنانچہ آپ غار حرا میں عزلت اختیار کر کے عبادت میں مشغول رہتے اور کچھ دنوں کے بعد گھر لوٹ کر ازدواجی حقوق بجالاتے۔ اولیاء میں سے جو لوگ نکاح پر آمادہ ہوتے ہیں اور ازدواجی زندگی بسر کرنا اختیار کرتے ہیں، ان کی تین قسمیں ہیں۔ ایک تو وہ جس پر خواہش نفسانی غالب آجائے۔ اس کی مثال یہ ہوگی جس طرح کسی مہلک مرض کا علاج زہر سے کیا جاتا ہے۔ دوسرا وہ شخص جس کو اجمال نے ڈھانپ لیا ہے اور وہ تفصیل کی طرف رجوع کرتا ہے جس طرح بعض اوقات آپ فرمایا کرتے

تھے کلمنی یا حمیراء ''اے عائشہ! (آپ اکثر بی بی عائشہؓ کو حمیرا سے مخاطب فرمایا کرتے تھے جو حمراء کی تصغیر ہے) مجھ سے بات چیت کرو۔'' تیسرا وہ شخص جو نور نبوت سے منوّر رہو اور اس نے آپ کا اتباع کر کے نکاح کر لیا۔

چوتھا طریقہ ابرار کا ہے جو اہل صفا میں سے ہیں۔ اس کی حقیقت ہے جسم کو نفس کا مغلوب و مقہور کر دینا اور اس میں فنا ہو جانا۔ ان کے مذہب کی اصلیت یہ ہے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ انسان میں کئی ایک لطائف ہیں۔ ایک لطیفۂ قالبیہ ہے جس کا یہ کام ہے کہ محسوسات کا ادراک کرے۔ دوسرا لطیفہ خیالیہ ہے اس کا کام یہ ہے کہ کسی ذی لون اور ذی شکل چیز کو جو نظر سے غائب ہے، قوتِ متخیّلہ میں حاضر کر دے۔ تیسرا لطیفۂ وہمیہ ہے اس کا کام یہ ہے کہ معانی جزیہ محسوسہ کا ادراک کر کے ان کو اپنے پاس محفوظ رکھے۔ چوتھا لطیفہ ادراکیہ ہے جس کا کام یہ ہے کہ امر کلّیہ طبیعہ اور امور مجردہ کا ادراک کرے۔ یہ ادراک من وجہ احساس کے مشابہ ہوتا ہے۔ یہ لطیفہ عالم تحیز میں نفس ناطقہ کا خلیفہ اور نائب ہے اور سب جسمانیات سے اس کے قریب تر ہے۔ یہ لوگ (ابرار اہل صفا) طرح طرح کی ریاضتیں کرنے کی تکلیفیں برداشت کر کے اس کوشش میں مصروف رہتے ہیں کہ ان لطائف کو نفسِ ناطقہ کا مغلوب و مقہور کر دیں اور اس کے ساتھ ان کو کامل مشابہت حاصل ہو، اس مقصد تک پہنچنے کا طریقہ تخلیہ اور تحلیہ ہے (اوّل الذکر کے معنی ہیں تزکیہ یعنی اپنے آپ کو اوصاف ذمیمہ سے پاک وصاف کر دینا، اور تحلیہ کا مفہوم ہے مذموم اخلاق واوصاف کے زائل ہونے پر آدمی اپنے آپ کو اخلاق محمودہ سے آراستہ کر دے۔ ان کی ریاضت کا طریقہ یہ ہے کہ سب سے پہلے وہ اپنی آنکھوں اور کانوں کو بند کر لیتے ہیں (تاکہ کسی ایسی چیز پر ان کی نظر نہ پڑے اور کوئی ایسی آواز ان کے کان میں نہ آئے جو ان کے ذکر فکر میں خلل انداز ہو)، اپنے جوارح اور اعضاء کو سرکشی سے باز رکھتے ہیں، زبان کو خاموش کر دیتے ہیں، بھوک پیاس کی تکالیف برداشت کرتے ہیں، اور شب بیداری ان کی عادت مستمرہ ہوتی ہے۔ اس حالت میں وہ نہایت ذوق وشوق کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس کی عبادت میں مشغول رہتے ہیں یہاں تک کہ انکا بدن مغلوب و مقہور ہو کر اپنے مالوفات کو ترک کرنے کا خوگر ہو جاتا ہے۔ دوسرا مرحلہ ان کی ریاضت کا یہ ہے کہ خیالات اور وسوسے دل میں پیدا ہوتے ہیں، یا گزشتہ واقعات کی یاد میں دل مشغول ہوتا

ہے، یا مستقبل کی فکر میں منہمک ہوتا ہے، ان باتوں سے اس کو دور رکھنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ اس کی توجہ میں فرق نہ آئے۔ اس کا آسان ترین طریقہ ان کے نزدیک یہ ہے کہ وہ اس تاک میں رہتے ہیں کہ جوں ہی کوئی مشوش خیال یا وسوسہ دل میں پیدا ہوا، ابتداً ہی اس کا استیصال کر دیا جائے۔ دل کے اندر اس کے راہ یاب ہونے کے راستے بند کر دیئے جائیں اور اس کی بجائے کسی امر قدسی کا تصور باندھا جائے (کیونکہ بیک وقت دو باتوں کا تصور کرنا ناممکن ہے۔ **ما جعل اللّٰہ لرجل من قلبین فی جوفہ**) مثلاً اللہ تعالیٰ کے اسم پاک کے زبانی ذکر میں آدمی مشغول ہو جائے (اور اس کے معنی کا استحضار کرے) جو سب سے احسن طریقہ ہے یا لکھے ہوئے اسم مقدس پر اپنی توجہ مرکوز کرے یا قلب کا تصور کر کے یا شیخ کا تصور کر کے اپنی توجہ کو اس تشویش انگیز خیال سے ہٹا کر اس پر مرکوز کرے۔ حتی کہ وہ خیال قطعاً دل سے محو ہو جائے۔ تیسرا مرحلہ ان کی ریاضت کا یہ ہے کہ وہ غصہ اور لالچ اور حرص، مال و اولاد کی محبت اور حبّ جاہ وغیرہ کو اپنے دل سے نکال دینے میں کامیاب ہوں۔ جن کے اسباب وعلل اور طرقِ ازالہ کا مفصل بیان ان کی تصنیفات میں موجود ہے، چنانچہ احیاء العلوم اور کیمیاء سعادت وغیرہ (مثلاً) ابوطالب مکی کی قوت القلوب میں) یہ مباحث بسط اور تفصیل کے ساتھ لکھے ہیں اس کے بعد وہ تہلیل کی کثرت یا ادعیہ ماثورہ کے التزام سے، جس طرح ان کے ہاں معروف اور مروّج ہے، اپنے دل کو اللہ تعالیٰ کی محبت سے بھر دیتے ہیں اور اس کو اپنا ملکہ راسخیہ بنا کر چھوڑتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ذکر و دعا ان کے حق میں اس طرح ہوتی ہے جس طرح سخت پیاسے کے لئے ٹھنڈا پانی ہوتا ہے چوتھا مرحلہ ان کے طریقہ کا یہ ہے کہ وہ اپنے مدرکہ کو ذکی بنانے کی کوشش کرتے ہیں، یا اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اس کے جلالہ و کبریاء کا تمثل ہر وقت اپنے پیش نظر رکھتے ہیں یا خالص معقولات کے ادراک کی مشق و تمرین کرتے ہیں، یا یہ کہ اللہ تعالیٰ کو بہر حال و بہمہ اوقات حاضر و ناظر سمجھتے ہیں اور اس کی ذات اقدس کو محبوب ترین چیز تصور کرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک اس کو نور غیب کہتے ہیں۔ جب یہ تصور اور یہ استحضار ان پر اس قدر غالب آجاتا ہے کہ ان کے رگ و پے میں سرایت کر لیتا ہے تو ان کو وہ ''صفاء مشاعری'' حاصل ہوتی ہے جس کی شارع نے ترغیب وتحریص دلائی ہے۔ اپنی اشراقیت کو بڑھانے کا ان کے ہاں ایک اور طریقہ بھی ہے۔ وہ یہ کہ اپنا کامل تزکیہ کر کے اور صفائی حاصل کر

کے پوری توجہ کے ساتھ علم حضوری کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اس سے ان کے نفس ناطقہ کو تجرد حاصل ہوتا ہے اور علوم مجردہ کی روشنی سے وہ منور ہونے لگتا ہے۔لیکن ہمیں ان علوم سے طمانیت قلب حاصل نہیں ہوتی، جو کوئی ان میں سے فرد کامل اور صاحب صفا ہوتا ہے وہ منبع البرکات ہوتا ہے۔نزول باران رحمت اور دشمن پر فتح پانے کے لئے اس سے توسّل کیا جاتا ہے، کبھی وہ اپنی صورت مثالیہ سے اور کبھی اپنے اقوال اور افعال سے لوگوں کے لئے ہدایت کا باعث ہوتا ہے۔وہ صاحب قبول واقبال اور صاحب عنایات ہوتا ہے۔اس کے نسمہ کی خصوصیت کی حیثیت سے اس کی صحبت نورانی ہوتی ہے۔جس کو بھی یہ صحبت نصیب ہو وہ اپنے آپ میں قرب اور توفیق معلوم کر لیتا ہے جو مذکورہ ذات بابرکات کا فیض ہوتا ہے۔اس کی وجہ بھی سمجھ لو۔انبیاء اور اولیاء کی صحبت کا یہ فیض ہے کہ جو لوگ ان کے ہم نشین ہوتے ہیں ان کے باطن سے خود بخود کمال کے فوارے جوش زن ہوتے ہیں، کیوں کہ ان کی ہمت نسمیہ بدرجۂ غایت مؤثر اور نافذ ہوتی ہے۔ایسا شخص ہشاش بشاش رہتا ہے، اس کے دل میں کسی کے لئے حسد اور کینہ نہیں ہوتا، وہ کسی سے کسی چیز کی طمع نہیں رکھتا اور نہ اس کے دل میں کوئی لالچ پیدا ہوتا ہے، اس کا امر کلی اور رائے کلی ہوتی ہے اور وہ براہ راست اللہ تعالیٰ کا شاگرد ہوتا ہے۔اللہ تعالیٰ خود اس کی تعلیم کا کفیل ہوتا ہے۔

اہل صفا کے طریقے مختلف ہیں۔(۱) ایک طریقہ علم کا ہے۔اس کی حقیقت یہ ہے کہ کوئی شخص سکینہ اور طمانیت قلب کے انوار میں اس قدر مضمحل ہو جائے کہ وہ مصائب اور حوادث کے پیش آنے پر سررشتۂ صبر کو ہاتھ سے نہ جانے دے طاعات اور فرائض کی بجا آوری میں جن تکلیفات کا سامنا ہو، ان کو خوشی سے برداشت کرے۔امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں بے دھڑک مشغول رہے۔حدود اللہ کی محافظت کرے، اور قولاً فعلاً دشمنان خدا سے جہاد کرے ہم نے اس کو ''شعبۃ العلم سے اس لئے موسوم کیا ہے کہ علماء مجتہدین محققین اسی طریقہ پر تھے۔(۲) دوسرا طریقہ عبادت کا ہے۔اس کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی عبادت کے نور میں مضمحل ہو جائے اس سے پہلے ہم بتا چکے ہیں کہ نماز اور روزہ وغیرہ طاعات وعبادات کا الگ الگ نور ہوتا ہے اور فراست سے اس کا ادراک کیا جا سکتا ہے۔اس طریقہ کے مفصل آداب کتب قوم میں مذکور ہیں۔سہروردیہ کو اس طریقہ میں خاص امتیاز حاصل ہے۔ہم نے نور کی تعبیر اس لئے اختیار کی ہے کہ

واقعات میں وہ نور حسّی کی صورت میں متمثل ہوتا ہے۔(۳) تیسرا طریقہ خضوع وخشوع کا ہے اس کی حقیقت دائمی انکسار اور اخبات ہے جس میں کہ آدمی مضمحل ہو جاتا ہے۔ مجازاً یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ طریقہ اہل بیت کا ہے۔لیکن حقیقت کے طور پر ہم یہ نہیں کہہ سکتے۔(۴) چوتھا طریقہ خوف ورجا اور بیم وامید کا ہے، جن کا تعلق یا تو جنت ودوزخ سے اور یا اللہ تعالیٰ کے غضب اور اس کی رحمت سے ہوتا ہے اس طریقہ کے لوگ سلف صالحین میں پائے جاتے ہیں۔لیکن آج کل ہم نے کوئی اس قسم کا بزرگ نہیں دیکھا۔اللہ تعالیٰ نے کلام مجید میں ان چاروں طریقوں کا ذکر فرمایا ہے جہاں مؤمنوں کے اوصاف بیان فرمائے ہیں۔یہ معنی ان آیات کے حروف سبعہ میں سے بطن اول کے مذہب کے مطابق ہیں اور یہ طریقے صحابہ کے طریقہ سے وابستہ ہیں۔(۵) محبت کا طریقہ ہے۔اس کی حقیقت یہ ہے کہ عشق کو ہیجان میں لاکر اس کو سارے بدن پر مسلط ہونے دیا جائے۔ تم نے کسی عاشق زار کو دیکھا ہوگا؟ کس طرح اس کے رگ وپے میں عشق سرایت کئے ہوئے ہوتا ہے اس کا دل دھڑکتا رہتا ہے، اس کا رنگ متغیر ہو جاتا ہے اور اس کی آنکھیں اندر کی طرف گھس جاتی اور خشک رہتی ہیں۔یہ بھی بھوک پیاس کی طرح ایک وجدانی کیفیت ہے۔جس کا ادراک قوت واہمہ کے ذریعہ ہوتا ہے۔اس طریقہ کے علم بردار چشتیہ اور احرار یہ ہیں۔(۶) توحید کا طریقہ ہے۔اس سے وہ توحید مراد نہیں جس کا ذکر ہم نے ولایت کے ذیل میں کیا ہے۔ہمارے ہی زمانہ میں بہت سے اصحاب عجیب طرز پر اس کے رنگ میں رنگے گئے ہیں اس سے سلوک کی مسافت گھٹ جاتی ہے،لیکن ساتھ بہت سی استعدادات مدہم پڑ جاتی ہیں۔(۷)''یادداشت'' کا طریقہ ہے۔اس کی حقیقت یہ ہے کہ امر مجرد کے ادراک میں آدمی محو ہو جائے اور اسی امر مجرد کو اپنا مشارٌ الیہ بنالے۔اس کو نور غیب کہتے ہیں اور نقشبندیہ حضرات کا یہی طریقہ ہے۔(۸) رابطہ کا طریقہ ہے۔اس کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی کسی روح کو اپنی توجہ کا مرکز بنا کر اپنے آپ کو اس میں محو کردے۔اس کی صورت یہ ہے کہ یا تو اولیاء کی قبور پر اپنی توجہ مرکوز کرے یا رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارک کی طرف متوجہ ہو، یہ اساتذۂ اہل حدیث کا طریقہ ہے، یا کسی ولی کی روح کی طرف متوجہ ہو۔سلف عموماً ابتداء میں اسی طریقہ میں مشغول ہوتے تھے۔ان مؤخر الذکر چار طریقوں کا تعلق حقیقت ولایت سے ہیں اور یہ اس کے تمثلات ہیں۔ولایت کے یہ وہ مسائل

ہیں کے ذکی الطبع کے لئے تو بہت مفید ثابت ہوتے ہیں۔لیکن غبی کے لئے زیادہ سے زیادہ تصریح بھی بے سود ہے

یہاں پر چند فوائد کا ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔(۱) جب صحابہ کا عہد گزر چکا اور محققین صحابہ کا انتقال ہو گیا تو سب کے سب یا اکثر لوگ ''صفاء علمی'' اور ''نوری'' میں مشغول ہوئے۔پھر ان میں سے جو اذکیاء اور اہل جذب تھے وہ فناء اور کشف حجاب کی طرف مائل ہوئے، اس سے اولیاء کا طریقہ ظہور میں آیا۔

(۲) ضلالت میں بھی ہدایت کی طرح انسلاخی کمالات ہوتے ہیں جس کی مثال ہماری رائے میں شیطان اور دجال ہے۔اسی طرح مقام ضلالت میں کمالات فنائیہ بھی ہوتے ہیں۔ یہ ان لوگوں میں ظہور پذیر ہوتے ہیں جو نورِ نبوت سے منور نہیں ہوئے تھے۔شراب نوشی ان کا شیوہ تھی اور نماز کی پابندی نہیں کرتے تھے۔علاوہ ازیں مقام ضلالت میں کمالات صفائیہ کا ظہور بھی ہوتا ہے۔جس کی مثال ہندوستان کے یوگی اور اہل نیرنگ ہیں۔(۱)۔

(۳) عام لوگ جس کو قبلۂ توجہ ٹھہراتے ہیں اس میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے چنانچہ محققین فلاسفہ اضافیات کو عقل فعال سے موسوم کرتے ہیں، کیوں کہ وہ من حیث الاجمال ایک امر مجرد فیضی ہے اور شؤون کو یہ لوگ رب واجب کہتے ہیں کیونکہ وہ ایک ایک امر مجرد بسیط ہے، من حیث الاجمال اس میں کسی نہ کسی طرح کی بساطت ضرور پائی جاتی ہے۔متکلمین میں سے بعض تو فلاسفہ کی طرح شؤون کی پرستش میں مبتلا ہیں۔لیکن اکثر ان میں سے ثبوتیات کو اپنا معبود ٹھہرائے ہوئے ہیں۔ برخلاف ان دونوں کے اشاعرہ کا مذہب طریق صحابہ کے تمثلات میں سے ہے۔لیکن جو اصحاب سکینہ راسخین فی العلم ہیں، وہ تنزیہات کی عبادت کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ من حیث الاجمال ایک امر تنزیہی قدسی ہے۔

جب تم ائمہ ولایت کو یہ کہتے ہوئے سنو کہ فلاں شخص عیسوی المشرب ہے اور فلاح موسوی المشرب ہے تو اس کے دو معنی ہوتے ہیں یا تو ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ اس لطیفہ میں فنا ہوا جو بعینہ اس اسم پاک کا تمثل ہے جس کا تمثل وہ نبی ہے جس کی طرف اس کو منسوب کیا جاتا ہے۔

---

(۱)(زمانۂ حال کا مسمریزم، ہپناٹزم، اور اسپر یچوئلزم بھی ان ہی کمالات کے علم وعمل کا بیان ہے)۔

(مثلاً عیسیٰ علیہ السلام یا موسیٰ علیہ السلام)۔ یا ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ اس روش میں فنا ہو گیا جو انسلاخ کی حیثیت سے اس نبی کے ساتھ مخصوص ہے۔ اندریں حال وہ ولی کی صورت مزاجیہ کے ساتھ وابستہ رہتا ہے۔ (۵) قرآن مجید یا احادیث میں جہاں کہیں روح القدس کا ذکر آیا ہے اس سے مراد اسم متجدّد ہے جس کو روح کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام کی تخصیص اس کے سیوغ کا ثبوت ہے۔ اللّٰھمّ انت اعلم بغیب السمٰوات والارض.

............☆☆☆............

آٹھواں خزانہ

نشأۂ شرعیہ یا بالفاظ دیگر ارتقاء تشریعی کے احکام

اعمال میں ایسے اسرار مخفی ہوتے ہیں کہ اگر تم کو ان کا علم ہو جائے تو تم حیران رہ جاؤ اور تمہارے ہوش اڑ جائیں۔ چنانچہ ہدایت کی جانب میں بعض ایسے اعمال ہیں جو انبیاء عظام علیہم الصلوٰۃ والسلام ہی سے صادر ہو سکتے ہیں اور ضلالت کی جانب میں بعض ایسے اعمال ہیں جو شیطان یا دجّال ہی سے ظہور میں آسکتے ہیں اس کی اصلیت یہ ہے کہ بعض اعمال ایسے ہوتے ہیں جن کا عامل کے ساتھ اخوت کا رشتہ ہوتا ہے۔ مثلاً آگ اور اس کی حرکت صعودیہ یا آسمان اور اس کی حرکت دوریہ، چنانچہ دونوں بمنزلہ لازم وملزوم کے ہوتے ہیں اور دونوں کا منبع فیضان ایک ہوتا ہے۔ اس لئے وہ خارج میں بھی باہم پیوستہ رہتے ہیں۔ برخلاف اس کے بعض اعمال اور ان کے عامل کا آپس میں تضاد ہوتا ہے، کیونکہ طبعاً ان میں مناسبت معدوم ہوتی ہے مثلاً انسان کے لئے ہنہنانا۔ پھر جان لو کہ بعض اعمال ایسے بھی ہوتے ہیں جو قدسی حیثیت سے ان کے اور ان کے عامل کے درمیان لزوم ہوتا ہے۔ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ اس عمل کا منبع بعینہٖ انسان کا منبع ہے لیکن صورت تخلیطیہ نے ان کے درمیان جدائی ڈال دی تھی۔ جب آدمی کو اس سے انسلاخ حاصل ہوتا ہے اور آدمی کی وہی حالت ہو جاتی ہے جو ازل میں تھی تو اس کے ساتھ وجود خارجی لازم ہو جاتا ہے جسکی کوئی صورت بغیر اس کے نہیں ہوتی کہ نماز کی طرح ایک کمزور ہویّت باقی رہ جائے کیوں کہ اس کا (اس عمل کا) منبع الحی القیوم ہوتا ہے جو بعینہٖ انسان کے معرض ظہور میں آنے کا منبع ہے، اس لئے جب آدمی کو انسلاخ حاصل ہوتا ہے اور وہ انواع ارتقاءات کا عالم ہوتا ہے چاہے وہ علم فطری ہو یا علم حصولی، وہ اعمال اس کے ساتھ چمٹ کر رہ جاتے ہیں۔ دوسری قسم کے اعمال وہ ہیں جو اس کے

وجود کے منافی اور متضاد ہوں، لیکن یہاں پر قدسی حیثیت کا دخل نہیں ہوتا۔ اس کی مثال ارتکاب قتل کی ہے چونکہ قتل کا مفہوم یہ ہے کہ کسی کو نعمت وجود سے محروم کر دیا جائے، اس لئے اس فعل شنیع کو رب تعالیٰ کے ساتھ تضاد ہے جس کا وصف افاضہ وجود ہے۔ جب آدمی صورتِ مزاجیہ سے منسلخ ہو کر ربّ تعالیٰ کے حکموں کا مطیع اور منقاد ہو جاتا ہے تو قتل سے اجتناب کرنا اس کا فرض قرار پاتا ہے، کیونکہ اس کو ارتقاءات کا علم حاصل ہوتا ہے۔ اس کا ماحصل یہ ہے کہ بعض اعمال ایسے ہیں کہ نبی اور حکیم کو اس وقت تک چین نہیں آتا جب تک وہ ان کو بجا نہ لائیں۔ یہی ان کے حال کا تقاضا ہوتا ہے۔ اسی طرح حسب اقتضائے کمال وہ اس وقت تک نچلے نہیں بیٹھتے جب تک وہ دوسری قسم کے اعمال کو جن کو جناب باری تعالیٰ سے تضاد ہے، بالفاظ دیگر منہیات شرعیہ) ترک نہ کر دیں اس کی مثال یہ ہے کہ جو شخص گرم دوا کھالیتا ہے وہ طبعاً آب سرد کا خواہاں ہوتا ہے اور جب تک وہ اپنی یہ خواہش پوری نہ کرے۔ اس کو چین نصیب نہیں ہوتا یا جیسے کوئی شخص پیٹ بھر کر کھالے، تو اس کو مزید کھانے سے طبعاً نفرت ہو جاتی ہے۔ یہ نبی اور حکیم کی وجاہت کی ایک مثال ہے۔ جب ارادہ میں تحیز پیدا ہوا اور نشأۃ قدیمہ میں وہ متمثل ہوا۔ جس سے ربوبیت کو کمال کی نوعیت کے مطابق انحیاز حاصل ہوا۔ اس سے ہر ایک فعل اور عمل کے مطابق ایک خاص جہت اور حیثیت ظہور میں آئی۔ چنانچہ ایک حیثیت وجوب عمل کی اور دوسری اس کی حرمت کی ہے اسی سے شریعت پیدا ہوئی جو ازل سے ابد تک قائم اور جاری ہے۔ جس کو بھی اس کا سامنا ہوا، اس پر اس کی پابندی واجب ہوگئی۔ یہ مثال قطبیت ارشاد کی ہے۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے رسل علیہم الصلوٰۃ والسلام کے اعیان میں تجلی فرمائی اور اس کے تحقق حاصل ہوا۔ حکمت نے وحی کی صورت اختیار کی اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے اوامر کی پابندی کا حکم صادر ہوا۔ اس تجلّی کے تحقق کا یہ نتیجہ ہوا کہ یہ اوامر عالم تجرد میں متحقق ہوئے جہاں نہ زمان ہے نہ مکان۔ اس کی مثال یہ ہے کہ قطبیت ارشاد لازمی دعوت کی صورت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ پھر جب ہر ایک نبی کے عہد میں خصوصاً ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ رسالت میں وہ تحقق کثرت کی حد تک پہنچ گیا۔ اس کو ایک ایسا وجود حاصل ہوا، جس کا تقاضا اسی نشاۃ دنیویہ میں ان کے کمال کے مطابق ایجاب اور تحریم کا وقوع میں آنا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شریعت کی پابندی ہر ایک شخص پر فرض ہوگئی، چاہے وہ منسلخ ہو یا نہ ہو۔ یہ خاتمیت کی مثال

ہے۔ چنانچہ نشأتِ قدیمہ اور حدیثہ میں ہر ایک استعداد کے مطابق تحقیق کا کوئی بھی ایسا کونا باقی نہ رہا جس میں اس نے دخل نہ پایا ہو۔ یہاں تک کہ اس نے آفاق اسماء کو گھیر لیا یہ اس کے کمال وجوب کا ثبوت تھا۔

یاد رکھو تمام عبادات میں چار باتیں پائی جاتی ہیں۔(۱) ان کا وہ مبدء جو ازل سے ابد تک قائم اور برقرار رہتا ہے۔ اس سے ہماری مراد وہ جہت اور حیثیت ہے جس کے ظہور کی ابتداء کمال کی نوعیت کے مطابق رب تعالیٰ سے ہوئی۔(۲) یہ جہت نشأۃ دنیویہ میں اثر انداز ہوتی ہے جس کو ہم دعوت تامّہ کہتے ہیں، اس کا راز یہ ہے کہ بعض اعمال اسی دنیا میں صحف سے نکل آتے ہیں۔ جن لوگوں کو آخرت کے لحاظ سے سبوغ تام حاصل ہے، ان کی خصوصاً یہی کیفیت ہوتی ہے۔(۳) ان کی جزاء ایک امر ثابت ہوتی ہے۔ احکام معاد میں ہم اس کا راز بیان کریں گے۔(۴) اس میں مصلحت عامہ ہوتی ہے جس کی تین مختلف حیثیتیں ہیں (الف) یا تو اس سے تہذیب نفس کا فائدہ حاصل ہوتا ہے، چنانچہ آدمی خدائے بزرگ و برتر کی طرف متوجہ ہوتا ہے، یا نور کامل اس کو گھیر لیتا ہے۔ یہ ایک ایسے نشأۃ کا کمال ہے جس کا عوام انکار کرتے ہیں، اور یا یہ کہ حسّی طور پر اسے عفت اور شجاعت اور سخاوت ظاہر ہوتی ہے۔(ب) دوسرے یہ کہ وہ فائدہ تدبیر منزل کے متعلق ہو۔ چنانچہ اگر سب لوگوں کو قبلۂ توجہ ایک جہت قدسیہ ہو تو ان میں نہ صرف قدسی اور روحانی طور پر وحدت پیدا ہوگی بلکہ عالم ظاہر میں بھی وہ متحد ہوں گے اور ہر ایک کا نور دوسرے پر پرتو افگن ہوگا۔ اس سے تجلّی میں تکمیل پیدا ہوگی۔ کیونکہ انسانی طبائع کی مثال شیشوں کی سی ہے، ایک کی روشنی دوسرے میں منعکس اور جلوہ گر ہوتی ہے۔(ج) تیسری حیثیت کا تعلق ترقی مدنیت سے ہے۔ کیونکہ اندریں صورت ان کے معاملات اصلاح پذیر ہونگے، انوار قدسیہ کی ان پر حکومت ہوگی، اور ظلم اور غفلت کے موقعہ پر وہ ربّ تعالیٰ کو یاد کر کے ظلم سے باز آئیں گے۔ اور غفلت ترک کر کے فرائض کی بجا آوری میں مشغول ہوں گے عوام تو بس اتنا ہی جانتے ہیں کہ اس میں مصلحت ہے۔ لیکن ہمارا کہنا یہ ہے کہ یہ مصلحت اس لئے ظہور میں آئی کہ مبادی میں اس کا قدم راسخ تھا۔

اسی طرح کبائر ذنوب میں چار باتیں ہوتی ہیں۔ ایک ان کا مستحکم مبدء۔ وہ یہ کہ ان کا وجود صور مزاجیہ کی حیثیت سے اسماء پاک کے تقاضا کے مخالف ہے۔ دوسرے ان کے سزا اور عقوبت

ایک امر ثابت ہے۔ تیسرے ان کو دعوت تامّہ حاصل نہیں، تاہم دعوت واجبہ سے وہ بے بہرہ نہیں۔ چوتھے یہ کہ وہ مصلحت عامہ کے منافی ہوتے ہیں۔

اگرچہ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ "ممکن" کے لئے جہاں تک اس کے لئے ممکن ہے۔ رب تعالیٰ سے قرب کامل حاصل کرنا ضروری ہے لیکن تحصیل قرب کے طریقوں میں بڑا اختلاف ہے۔ مجوسیوں نے ایک ایسی مخلوق کو اپنا معبود ٹھہرایا جو ان کے زعم میں عقول (مجردہ) کا تمثّل ہے۔ مشرکوں نے ان بتوں کو اپنا معبود مقرر کیا جو ان کے خیال میں مقربین بارگاہ کبریاء جلّ وعلا کے مجسّمے ہیں اور ان سے احیاء دامانہ اور دوسرے خوارق عادت ظہور میں آتے ہیں۔ مجسمہ فرقہ والے ہر ایک ایسی مخلوق یا موہوم چیز کی پرستش کرتے ہیں۔ جس میں ان کو (معبود حقیقی کا) حسن و جمال نظر آتا ہے۔ مجوسیوں کا قول ہے کہ بھلا خیر کامل (خدائے بزرگ و برتر) سے ہمیں کیا نسبت؟ (ماللتراب و ربّ الارباب) ہمارے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ ہم کسی ایسی مخلوق کا تقرب حاصل کریں جو خیر کا تمثل ہے۔

فی الجملہ نسبتے بہ تو کافی بود مرا
بلبل ہمیں کہ قافیۂ گل شود بس است

اس کا جواب ہماری طرف سے یہ ہے کہ کیا ہر ایک مادّی چیز میں قدوسیت موجود نہیں؟ جو اس کی شاہ رگ سے بھی قریب تر ہے (تو پھر آگ کی کونسی خصوصیت ہے) مشرک کہتے ہیں کہ مصاحبوں کا توسل حاصل کئے بغیر کسی عظیم القدر بادشاہ کا قرب حاصل کرنا محال اور ناممکن ہے۔ خدائے بزرگ و برتر کے ندماء (مصاحبین) ارواح مقدسہ اور ملائکہ ہیں جو جسمیت سے منزّہ اور بالاتر ہیں اس لئے یہ ضروری ہے کہ ہم ان کے تمثال اور مجسمے (بت بنا کر اپنے سامنے رکھا کریں اور ان کی پرستش اور تعظیم میں کوتاہی نہ کریں)۔ ہمارے معبود کو ہماری عبادت کا علم ہوتا ہے، کیونکہ وہ حی علیم اور بہت بڑی قدرت والا ہے۔ اس کا جواب ہماری طرف سے یہ ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ ہر ایک فعلیّت پر ہر ایک حیثیت سے محیط نہیں؟ **اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ** "کیا وہ اپنی اس مخلوق کا حال نہیں جانتا جس کو اس نے پیدا کیا، وہ لطیف اور باخبر ہے۔" **اَتَدْعُوْنَ بَعْلًا وَّ تَذَرُوْنَ اَحْسَنَ الْخَالِقِیْنَ** "کیا تم بعل کو (اپنی مرادوں کے لئے) پکارتے ہو اور جو

بہترین خالق ہے اس کو چھوڑتے ہو۔" مجسمہ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ صاحب حسن و جمال ہے اس لئے جو چیز بھی حسن اور جمال کا مظہر ہو وہ اس لائق ہے کہ اس کو معبود ٹھہرایا جائے۔ ہم کہتے ہیں کیا یہ تقیید اور تحدید قبیح ترین تحدید نہیں؟ (ہر چہ بینی بداں کہ مظہر اوست)۔ یہ تینوں گروہ جہنمی ہیں، سوچ لو۔

اصحاب ولایت کہتے ہیں کہ خدائے بزرگ و برتر سے قرب حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ نشاۂ ہذا کی صورت سے بقدر امکان منسلخ ہو کر فنا ہو جائیں۔ حکماء اور انبیا علیہم السلام کا عبادات میں اتحاد ہے اور ان کی رائیں مختلف ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کے سینوں میں اسم پاک نے تجلی فرمائی اور ضرورت استعداد یہ کے راستہ سے انہوں نے خیر کامل (خدائے بزرگ و برتر) سے قرب فرائض کے ذریعہ قرب حاصل کیا۔ اس اسم پاک نے ان کو بعض باتوں پر مامور کیا اور بعض سے منع کیا۔ چنانچہ انہوں نے ان اوامر و نواہی میں اس کی کامل اطاعت کی۔ برخلاف اس کے حکماء کو قرب وجود کی توفیق ملی۔ جس کا نتیجہ عبادات اور شرائع ہوتے ہیں۔ کیونکہ تم پہلے جان چکے ہو کہ اس قرب کے تین شعبے حکمت کا خلیفہ عقل ہے اس لئے جو چیز اس کے متضاد ہو۔ مثلاً سکر وہ حرام ہے۔ عصمت کا خلیفہ عفت ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ آدمی لذات حسیہ میں انہماک نہ پیدا کرے۔ یہ انہماک (اور مطلق العنانی) حرام ہے۔ وجاہت کا خلیفہ اس حیثیت سے دین حق ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے وہ جاہ جس کا تشکل اس عالم میں ہوتا ہے وہ بھی وجاہت کی نائب ہے۔ دین حق سے مراد یہ ہے کہ اسماء حسنیٰ کے آثار کا ان کے طریقہ پر آدمی مطیع اور منقاد ہو جائے چنانچہ قتل، سرقہ، اور قذف محصنات حرام قرار دیا گیا۔ ان کی تحریم کی وجہ یہ ہے کہ اس سے لوگوں میں آدمی کی تفضیک ہوتی ہے۔ حکمت کے تقاضا سے کچھ عقائد کا ماننا لازم ٹھہرا، عصمت ایجاب صوم کا باعث ہوئی، اور وجاہت کے لئے نماز اور روزہ کو فرض قرار دیا گیا۔ یہ اس جہت کی تشریح ہے جو کمال کے مطابق ربّ تعالیٰ کی طرف سے منبع شریعت ہے۔ ارتقاءات کے ظہور میں آنے کے بعد حدود شرعیہ کا ظہور ہوا۔ حدود سے مراد وہ بات ہے جو ظہور کے لحاظ سے اس نشاۃ کے درجہ کمال پر ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زنا اور لواطت کے حرام کیا جانا ضروری قرار پایا، اور صنفی تعلق کو صرف اس حالت میں فرض کیا گیا جب کہ شہوت نفسانی کا غلبہ ہو یا نسل بڑھانا مقصود ہو

یا بیویوں کے حقوق ادا کرنا پیش نظر ہو قتل کو کبیرہ قرار دیا اور اس کو حرام ٹھہرایا۔ لیکن جہاد اور قصاص کو اس کے عموم سے مستثنیٰ کیا۔ بہرحال ہر ایک امر کے متعلق اسی طرح تعینات واقع ہوئے اچھی طرح سوچ لو۔

یہاں پر ایک اشکال وارد ہوتا ہے کہ کسی کو قتل کرنا اللہ تعالیٰ کے اسم پاک اُلممیت کا حکم بجالانا ہے۔ اسی طرح تمام منہیات شرعیہ کسی نہ کسی اسم پاک کے مظاہر ہیں۔ سوال یہ ہے کہ انکو حرام کیوں قرار دیا گیا؟ میں کہتا ہوں الممیت کا مفہوم یہ ہے کہ وہ موت کے اسباب بہم پہنچاتا ہے، لیکن اس میں شر کا دخل پانا، عالم تخلیط کی بدعات سے ہے۔ اسم پاک القابض کو بھی اسی پر قیاس کرو۔ ایک جامع اصول ہمارے نزدیک یہ ہے کہ ہر ایک اسم پاک جس کے ضمن میں ایجاد کا کوئی پہلو پایا جائے حقیقۃً اسم ہے۔ اور جس کے ضمن میں افناء کا مفہوم ہو، اس کو ہم مجازاً اسم کہتے ہیں۔ یہ بات اسماءِ قدیمہ کے متعلق ہے، اسمائے متجدّدہ میں حقیقۃً بھی نفی ہوتی ہے۔ لیکن دین کا مفہوم یہ ہے کہ آدمی اسم قدیم کے حکم کا تابع ہو جائے۔

یاد رکھو جس شخص یا قوم کی حالت کسی حکم شرعی کے نزول کا باعث ہوتی ہے اس میں عادت اور ماحول کو بڑا دخل ہوتا ہے، کیونکہ اصول میں استنباط کا منبع کوئی امر کلّی ہوتا ہے، اور موطن وحی میں جو تنوع پیدا ہوتا ہے وہ نسمہ میں ہوتا ہے جس پر ماحول اور عادات اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس کا درجہ اس سے بلند تر ہے، کیونکہ آمر اور ناہی دراصل وہ اسم ہوتا ہے جو اس شخص کی عین ثابتہ پر تجلّی فرماتا ہے جس پر وحی نازل ہوتی ہے اور تجلّی کی نوعیت بقدر اس شخص کی استعداد کے ہوتی ہے جس پر اسم پاک نے تجلّی فرمائی۔ اسی بناء پر حدیث میں انبیاء علیہم السلام کو بنوعلّات کہا ہے بنواخیاف نہیں کہا (۱)۔ بالفاظ دیگر شرائع کا نزول وجود ازلی کے مطابق ہوتا ہے اور ہر ایک صاحب استعداد کو اس کی استعداد کے موافق بجزہ ملتا ہے۔ چنانچہ نفس رحمانی تشریعی موطن علمی کے مطابق اس صورت میں متمثّل ہوتا ہے۔ جس کا افاضہ عین ثابتہ سے ہوتا ہے لیکن اس کی حیثیت تجنیس اور تنویع کی نہیں ہوتی بلکہ تعین جزئی اور تصنیف کی ہوتی ہے (یہاں پر تصنیف کے معنی ہیں کسی نوع کو اس

---

(۱) بنوعلّات ان بھائیوں کو کہتے ہیں جن کا باپ ایک اور مائیں مختلف ہوں، برخلاف اس کے جن کی ماں ایک اور باپ مختلف ہوں ان کو بنواخیاف کہتے ہیں)

کے اصناف میں تقسیم کرنا، صنف بندی کرنا جیسے کہ تجنیس اور تنویع کے معنی ہیں اجناس اور انواع میں تقسیم کرنا، پھر اس کو موطن خارجی کے لحاظ سے ایسے امور کے ضمن میں تمثل حاصل ہوتا ہے جن کے صور اور آداب بلحاظ حسن اور عرف کے پسندیدہ ہوں۔ عوام کے اس قول کا راز اسی سے منکشف ہو جاتا ہے جو کہا کرتے ہیں کہ زمان اور مکان کے لحاظ سے شریعتیں بدل جاتی ہیں، اور جمعہ کی حدیث کا راز بھی اسی میں مضمر ہے۔ چونکہ سید المرسلین کی حقیقت کامل ترین تھی آپ کے اسم میں ہمہ گیری تھی، آپ کو اُمیّت میں قدم راسخ حاصل تھا اور آپ کی قوم بھی امی تھی اور آپ کے سامنے وہ وہ باتیں واضح ہوئیں جو کسی نبی پر واضح نہیں کی گئی تھیں۔ اس لئے آپ نے تغیرات اور تحویلات اور تلاحق اذکار کے بعد، جن کی تفصیل کتب سیرۃ میں ہے، سنتیں قائم کیں۔ آداب بنائے اور اوقات کی تعیین فرمائی۔

نسخ احکام کی کئی قسمیں ہیں۔ (۱) ایک تو یہ کہ نبی صلعم کو اس مقام سے ترقی حاصل ہو جس مقام پر کہ وہ پہلے تھے۔ اس کی مثالیں جہاد کے احکام میں ملتی ہیں۔ چھٹے خزانہ میں ہم اس کا راز بتا چکے ہیں۔ (۲) بعض اوقات تقاضائے عین میں مستغرق رہنے کے بعد حقیقت پر اطلاع حاصل ہوتی ہے۔ اس کی مثال حضرت ابراہیم علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیم کا قصۂ ذبح ولد ہے جب آپ حضرت ذات اقدس کے بہت قریب تھے۔ ذبح کلّی کا مفہوم آپ کی قوت مدرکہ یا متخلیہ میں بیٹے کی ذبح کی صورت میں متمثل ہوا۔ کیونکہ اس کا بیٹا اس کا مظہر اتم تھا اور اس کی شان بہت بڑی تھی۔ یعنی وہ اسم پاک جو اس کی عین ثابتہ میں متجلی ہوا، اسی سے یہ حکم صادر ہوا۔ آپ کو اسلئے ذبح ولد کا حکم دیا گیا کہ اقربیت اور اجمال میں مناسبت ہے۔ پھر آپ کو عین ثابتہ کے تقاضا میں مستغرق ہونے سے افاقہ حاصل ہوا اور آپ نے بالا جمال کسی جانور کا ازہاق روح کرنے پر اکتفا کی۔ (۳) تیسری قسم اس لحاظ سے وقوع میں آتی ہے کہ لباس عادات میں ملبوس ہونے اور اس لباب کے اتار پھینکنے کی حیثیت سے حالات اور نوعیت میں اختلاف پیدا ہوتا ہے۔ اس کی مثال زکوٰۃ کی تحویلات ہیں۔ ابتداء میں رجب کے مہینے میں کوئی بھیڑ بکرا یا اس کا بچہ ذبح کرنا فرض ہوا جس کو عتیرہ کہتے تھے۔ اس کے بعد وقت کی قید اٹھا دی گئی اور مطلق ذبح کی فرضیت باقی رہ گئی۔ بالآخر نصاب کا تعیّن کیا گیا ابوداؤد نے صوم وصلوۃ وغیرہ کے جو تغیرات بن ابی لیلیٰ سے نقل کئے ہیں ان کا

استحضار کرلو۔ جو کلام مجید میں مَا نَنسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا اَوْ مِثْلِهَا ”جس آیت کو ہم منسوخ کرتے یا بھلا دیتے ہیں اس سے بہتر یا اسی کے مانند کوئی اور آیت لے آتے ہیں۔“ ہمارے نزدیک اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ ”اس سے بہتر“ کا لفظ بلحاظ عادات کے استعمال کیا گیا ہے اور ”مثلہا“ اس لحاظ سے کہ وہ نبی صلعم کی عین ثابتہ اور اس کی ترقی کا اقتضاء ہے۔

یاد رکھو، بعض اعمال خیر کی جانب میں اور بعض شر کی جانب میں منسلخ الصورۃ ہوتے ہیں اس سے مراد یہ ہے کہ ان اعمال کا خیر و شر ہونا بالکل واضح ہوتا ہے اور ہر ایک حالت میں ان کی یہ وصف قائم رہتی ہے اول الذکر قسم کے اعمال کو شرع کی اصطلاح میں واجبات اور دوسری قسم کے اعمال کو محرمات کہتے ہیں۔ بعض اعمال ایسے ہیں جن کے ضمن میں شر پایا جاتا ہے۔ مثلاً نامحرم عورت پر نظر ڈالنا یہ نظر آدمی کو بعض اوقات (یا اکثر اوقات) بدکاری کے ارتکاب پر آمادہ کرتی ہے۔ اسی طرح بعض اعمال سے نیکی میں تاکید پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً نماز کے آغاز میں سبحانک اللّٰھم پڑھنا عظمت باری تعالیٰ کے تصور کو تقویت بخشتا ہے۔ اول الذکر کو شرع میں مکروہ اور مؤخر الذکر کو مندوب یا مستحب سے تعبیر کیا جاتا ہے ان کے علاوہ جو اعمال ہیں ان کو مباح کہا جاتا ہے جن کے کرنے یا نہ کرنے میں کوئی بھلائی یا برائی نہیں۔ ہر ایک مندوب جس کو کوئی ایسا شخص عمل میں لائے جو منبع خیرات ہے اور جس کے قلب سے اسم اعم مطلق کا ظہور ہوا ہے لوگوں کو چاہئے کہ اس قسم کے مندوب کی پابندی کرنے میں کوتاہی نہ کریں۔ کیوں کہ کسی جزئی کے ساتھ تعلق پیدا کرنا کلّی سے تعلق حاصل ہونے کا موجب ہوتا ہے۔ اس سے کلّی کو ایک ایسے عالم میں تحقق حاصل ہوتا ہے جس کے تحقق کو وہم ادراک کر لیتا ہے۔

کلمۂ شہادت دین حق کی بنیاد ہے اور اس کی اصل ہویّت محض ہے۔ نشأۃ قدیمہ میں اس کی صورت تمام جہات اور اعتبارات وحیثیات کی جامعیت تھی اسی بنا پر وردہ دین کی بنیاد قرار پایا۔ صفات نفس کے ارتقاء کے دوران میں حکماء اور صحابہ کے اصول معرفت کے مطابق وہ اخلاص ہے (یعنی یہ کلمہ عین اخلاص ہے اس کا تجسم ہے) اور اولیاء کے مذہب میں وہ کامل توحید ہے۔ اس کلمہ کو زبان پر لانا تمام عبادات کے قوۃ سے فعل میں لانے کا باعث ہے۔ یاد رکھو، یہ جان کر اموات سے استمداد کرنا، ان سے مرادیں مانگنا، کہ ہمارا یہ پکارنا مقصد براری کا موجب ہوگا، کفر ہے جس سے

احتراز کرنا لازم ہے۔ ایسا کرنا (اور اس قسم کے اعتقاد رکھنا) اس کلمہ کے مفہوم کے منافی ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ آجکل عام طور پر لوگ اس میں مبتلا ہیں۔

نماز کی اصل تفصیل کی حیثیت سے الحی القیوم اور پھر العلّی العظیم ہے۔ جیسے کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور بھی انہیں اسماء حسنی کے تجلی فرما ہونے کا نتیجہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی کوئی ایک فروعی حیثیتیں ہیں جن کا حس میں تمثل ہوتا ہے۔ چنانچہ تفصیل کے لحاظ سے قیام اور رکوع اور سجود الحی القیوم کے تمثلات ہیں۔ اصول تو یہی ہیں لیکن تلاوت قرآن کو بھی ان کے ساتھ ملحق کر دیا گیا ہے جس کی وجہ آگے چل کر تو معلوم ہوگی۔ طہارت کو صفات تنزیہیہ کے لئے نماز کے ساتھ شامل کیا گیا ہے۔ اسی طرح اس کی اور متعدد حیثیتیں نمایاں کی گئیں جن سے اس کے ارکان کی تکمیل ہوئی۔ نماز کی صورت محض نفس میں الفت ہے، واہمہ اور مدرکہ میں اس کا تصور محبت ہے۔ متخیلّہ میں تعظیم، زبان میں حمد اور تسبیح اور تکبیر ہے اور جسم میں مخصوص افعال اور ارکان ہیں۔ الفت سے میری مراد وہ ربط ہے جو اصول وجود سے نازل ہوتا ہے۔ جیسے کہ حدیث میں ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ''روحوں کی ایک فوج ہے۔ جن کا ایک جگہ پر اجتماع ہوا ہے جن کو آپس میں تعارف حاصل ہوا، ان میں اُلفت پیدا ہوئی اور جو روحیں ایک دوسرے سے بیگانہ رہیں ان میں اختلاف ظہور پذیر ہوا۔''

روزہ سلبیات کا تمثل ہے۔ مثلاً اسم پاک صمد اور سبوح وغیرہ جیسے کہ حضرت ادریسؑ کا منشاً ظہور وارتقاء یہی اسم پاک ہیں۔ روزہ کی صورت محض نفس میں شور وغل حسیہ سے تجرّد حاصل کرنا ہے۔ مدرکہ اور واہمہ اور متخلیہ میں اس کا تصور ان اشیاء سے قطع تعلق کرنا ہے جو ان کے ماتحت ہیں، زبان میں تسبیح و تقدیس اور جسم میں اکل وشرب اور صنفی تعلق سے اجتناب کرنا ہے۔ ہر ایک موطن میں صوم کو قدم راسخ حاصل ہے۔ لیکن بدن میں نہیں۔ کیوں کہ بھوک پیاس اس کا جزاعظم ہے اس لئے اس کا تدارک صدقۃ الفطر سے کیا گیا اور مسکینوں کو کھانا کھلانا مسنون ہوا۔ رمضان شریف میں آں حضرت صلعم بہت زیادہ فیاضی فرمایا کرتے تھے۔ قرآن مجید ہے وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ اس کے معنی یہ ہیں کہ جن کو کھانا کھلانے کی استطاعت ہے، وہ کھانا کھلائیں۔ صدقۃ الفطر اس میں شامل ہے۔ زکوٰۃ اضافیات کا تمثل ہے۔ جیسے کہ حضرت آدم

کا منشأ ظہور وارتقا بھی اضافیات تھے۔ زکوٰۃ کی صورت محض نفس میں کمالات علمیہ اور عملیہ کا افاضہ ہے واہمہ میں وہ سخاوت کا تمثل ہے جس سے رذیلہ بخل کا دفع کرنا مقصود ہے اور خارج میں وہ صنوف اموال کے اصول سے متعلق ہے۔ یعنی چوپائے جانور، نقدی، زراعت کی پیداوار، اور اموال تجارت۔ یاد رکھو، ہر ایک عالم اسفل کی تولید عالم اعلیٰ سے ہوئی ہے۔ چنانچہ نفس رحمانی محفوظ رہتا ہے اور نشأۃ کے بعض احکام مردود بھی ہوتے ہیں۔ بہر حال حکماء کا روزہ تجرد نفس کا موجب ہوتا ہے اور ان کی زکوٰۃ کا نتیجہ افاضہ بالفعل ہے۔

حج اجمالی حیثیت سے الحی القیوم کا تمثل ہے۔ نشأۃ قدیمہ میں اس کے وجوب کی صورت عام تھی۔ کعبہ وغیرہ کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔ یہ تعیین اس اسم حادث کا نتیجہ ہے جس کا طلوع حضرت ابراہیم علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیم کے سینہ مبارک سے ہوا۔ اس لئے اس کی اصل وہی اسماء مقدسہ ہیں جو حضرت ابراہیم کے ظہور وارتقاء کی اصل ہیں۔ اس کی صورت نفس میں سرگشتگی اور بے خودی ہے جو الفت کی ایک صورت ہے اور قرب و مشاہدہ کے ساتھ مخصوص ہے۔ مدرکہ وغیرہ میں اس کا تصور حضور اور تنزل ہے، خارج میں اس کی صورت بیت اللہ شریف کا طواف ہے اور یہی حج کا اصل رکن ہے۔ احرام سے اس کی تعظیم ظاہر ہوتی ہے اور وقوف عرفات اس کا موئید ہے۔ اس کی متعدد حیثیتوں کو نمایاں کیا گیا جس سے اس کے ارکان کی تکمیل ہوئی۔

............☆☆☆............

تلاوت اور ذکر الٰہی

کلام مجید کی اصل کو نشاۃ کے مطابق سمجھنا چاہئے اور ہم ذکر کر چکے ہیں کہ نشات کی تعداد پانچ ہے۔ دلالت کے لحاظ سے وہ مختلف علوم کا جامع ہے۔

جمیع العلم فی القرآن لکن
تقاصر عنہ افہام الرجال

اس لئے نماز میں اس کی تلاوت فرض قرار دی گئی، اور دوسرے موقعوں پر اس کا پڑھنا سنت قرار پایا۔ تسبیح اور تکبیر اس آیت کے تمثلات ہیں۔ وَالباقیات الصالحات خیر عند ربک ثوابا خیر املا۔ اس کی تفصیل رسول خدا صلعمؐ نے سبحان اللہ اور الحمدللہ وغیرہ سے فرمائی ہے۔ صحف اعمال میں ان کے بقاء کا راز تم معلوم کر چکے ہو۔ جویریہؓ اور صفیہؓ کی حدیث میں ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز صبح کے بعد جبکہ سورج طلوع ہو چکا تھا اور بی بی صفیہؓ ابھی تک ذکر اور تسبیح میں مشغول تھیں ان کے پاس تشریف لائے اور فرمانے لگے وہ چند تسبیحیں جو میں نے پڑھی ہیں ان کا ثواب تمہاری ان تسبیحات کے ثواب سے کہیں زیادہ ہے جس میں کہ تم اتنی دیر تک مشغول رہیں، وہ کلمات یہ ہیں سُبحٰنَ اللّٰهِ مِلأ ما عَلِمَ اللّٰه الخ (بعض روایات میں وہ یہ کلمات ہیں سبحن اللہ و بحمدہ عدد خلقه و زنة عرشه و رضٰی نفسه و مداد کلماته)، اس کا راز یہ ہے کہ ان کلمات و تسبیحات کو صحف اعمال میں ثبت کر دیا جاتا ہے تو ان کا رخ ان الفاظ کے مدلولات کی طرف رہتا ہے اور یہ ایسے باقیات صالحات ہوتے ہیں کہ اگر ان کی حقیقت نمایاں ہو تو آفاق سماویہ کو گھیر لے۔

صلہ رحم کی اصل رحمان کا اسم پاک ہے، جیسے کہ اس حدیث میں اس کی تصریح ہے ''رحم

رحمان (جل وعلا سے نکلی ہوئی ایک شاخ ہے الخ'' (صلۂ رحم کے معنی ہیں رشتہ داروں اور اہل قرابت سے اچھا سلوک کرنا۔ رحم رشتہ اور قرابت) ازل میں رحمان اور قادر ایک تھے۔ جب اس کا ظہور نشأۃ شرعیہ میں ہوا تو اپنے ارتقاء وصفی کے مطابق صلۂ رحم میں رغبت کرنے کی صورت میں متمثل ہوا۔ عتق کی اصل کمال کے مطابق ''ربّ تعالیٰ'' کا اسم مقدس ہے اور یہ بھی ایک طرح کی زکوٰۃ ہے۔ جیسے کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ جہاد کی حقیقت عداوتِ قدسیہ کا قتل واسر کی صورت میں متمثل ہونا ہے۔ قَسم اور منّت کی یہ حقیقت ہے کہ بندوں کے بعض افعال کو اسم پاک کے ساتھ وابستہ کیا جاتا ہے۔ جس کا نتیجہ ان کا تحقق ہوتا ہے۔ اس کا نزول فقط نشأۃ شرعیہ میں ہوا، کیونکہ اس سے اللہ تعالیٰ کے اسماء مقدسہ کی تعظیم اور ان کا احترام مقصود ہے۔

............☆☆☆............

کفارات اور حدود

کفارات کی دو قسمیں ہیں۔ ایک یہ کہ حسنات کی تکمیل کے ذریعہ خصوصاً جبکہ عالم حس میں ان کو تمثل حاصل ہو برائیوں کا ازالہ کیا جائے دوسری قسم یہ ہے کہ اپنی کسی برائی کو نیکیوں سے مضمحل اور محو کر دیا جائے۔ اسی سے تم کو استغفار کا راز معلوم ہوگا جو ارتکاب خطایا کی حالت میں واجب ہے۔ حدّ کی حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک سبوغی ایجابی چیز ہے۔ حدود کا تعلق فقط اسی نشأۃ دنیویہ سے ہے اور ان کا تمثل شرع میں ارادی ہے۔ حدود ان کے افعال کے لئے مقرر کئے گئے ہیں جن کی برائی واضح اور نمایاں ہے اور وہ ایسے افعال ہیں جن کے متعلق لوگوں کو زجر و توبیخ کرنا لازم ہے۔

ذبح للہ کا راز سمجھنے کے لئے پہلے تمہیں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ حمد کی حقیقت یہ ہے کہ ضرورت امکانی کی بناء پر اللہ تعالیٰ کو جو برتری نفس الامر میں حاصل ہے تم اپنے ارادہ سے اس کا اعتراف کرو۔ یہ اعتراف تمہارے صحیفۂ اعمال میں ثبت ہوگا اور معاد میں تمہارے لئے نافع ہوگا۔ اس اعتراف کے اظہار کی دو صورتیں ہیں۔ (الف) قول۔ اس کا راز تم جان چکے ہو کہ قول ارتقاءات نفس الامری کا ایک شعبہ ہے اور جملہ امور کا اس کے ذریعہ اظہار ہو سکتا ہے۔ (ب) یہ اظہار اس طریقہ پر ہوگا کہ تم اپنے قلب اور قالب کو خالص اللہ تعالیٰ کی تعظیم کے لئے مخصوص کر دو یا یہ اظہار کسی فعل کے ذریعہ ہوگا۔ ذبح اللہ اسی میں داخل ہے، جس کی حقیقت یہ ہے کہ تم اپنے ارادہ سے مذبوح کی روح کو اس ذات اقدس کی بارگاہ میں پیش کرتے ہو جس کا قرب حاصل کرنے کے لئے تم نے یہ ذبح کی ہے اور اس روح کو تم قفس عنصری سے نجات دیتے ہو۔ یہ عمل حقیقت ابراہیمیہ کے ساتھ مخصوص ہے اور اسی لئے آپ اس کے امام قرار پائے ہیں، اور چونکہ حضرت ابراہیم علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیم نے یہ عمل دسویں ذی الحجہ کو انجام دیا تھا اس لئے ہمارے حق میں بھی اسی دن

کی تعیین کی گئی۔ یہاں پر ایک اور عمیق راز ہے۔ وہ یہ کہ ذبح ازہاق روح کو کہتے ہیں، اس میں روح کی صورت شامل ہے، اور تم جانتے ہو کہ روح کا ایک مستقل عالم ہے، لہٰذا اس کے معنی یہ ہیں کہ تم نے تمام عالم کے ذریعہ حمد کا حق ادا کیا۔ امور مجردہ کی تخلیق اور ان کا ارتقاء اس طرز پر ہوا ہے کہ ان میں الوہیت کی خوبو آگئی ہے۔ اور وہ لوگوں سے اپنی معبودیت کے طالب رہتے ہیں۔ چنانچہ ہر ایک روح چاہتی ہے کہ اسی کے لئے ذبح کی جائے۔ لہٰذا تمہیں چاہئے کہ اس دھوکے سے بچو، ورنہ تم اس خدائے پاک کے منکر ہوجاؤ گے جس نے تم کو پیدا کیا اور تمہارے اعضاء درست کئے (۱)۔

سب سے بڑا کبیرہ شرک ہے اس کی حقیقت یہ ہے عبادات میں کسی دوسرے کو اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرایا جائے۔ مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، عتق وغیرہ۔ ذبح اور ذکر بھی عبادات میں داخل ہیں۔ ایسا کرنا بہ تقاضائے وجاہت حرام قرار پایا ہے جس کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ کے حکم کا منقاد اور مطیع ہونا۔ دین کی بنیاد یہ ہے کہ آدمی سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کا شکر کا مستحق نہ سمجھے (**وما بکم من نعمة فمن الله**) اور اسی لئے کسی دوسرے کی خدمت اور تعظیم میں قطعاً مشغول نہ ہو۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے از راہ کرم اس کا کچھ بقیہ اپنے بندوں کے لئے مستثنیٰ فرمایا ہے۔ دوسرا کبیرہ قتل ناحق ہے۔ وجود کے مطابق ربّ تعالیٰ کا مطیع اور منقاد ہونا قتل کی حرمت کا مقتضی ہے۔ دین کی بنیاد یہ ہے کہ ہر ایک قسم کا قتل حرام ہے اور ہر ایک ایجاد (اعطاء حیات) امر مستحسن ہے جب وحی کے ذریعہ اس کا ظہور ہوا تو قصاص اور جہاد کو اس سے مستثنیٰ قرار دیا۔ تیسرا کبیرہ سرقہ ہے۔ غناء کے مطابق اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور انقیاد اس کی حرمت کی مقتضی ہے، چنانچہ اسی کے مطابق احکام نازل ہوئے، چوتھا کبیرہ زنا ہے عصمت کا اقتضاء یہ ہے کہ وہ حرام ہو۔ جب یہ اقتضاء نزول وحی کی صورت میں متمثل ہوا، تو چار بیویوں تک کی اجازت دی گئی۔ پانچواں کبیرہ قذف محصنات ہے غیبت وغیرہ بھی اسی کے فروع ہیں۔ ان کو ربّ تعالیٰ نے جاہ کے مطابق حرام قرار دیا ہے۔ (جاہ کے معنی ہیں کسی شخص کی وہ حیثیت اور پوزیشن جو اس کو اپنی سوسائٹی میں حاصل ہے اور اس کی عزت و آبرو ظاہر ہے کہ کبائر مذکورہ کا تعلق آدمی کی عزت و آبرو اور اس کی حیثیت کے ساتھ

(۱) اس آخری فقرہ میں شاہ صاحبؒ نے ذبح لغیر اللہ سے تحذیر فرمائی ہے۔

ہے)۔اکل خبائث ایک ایسا فعل ہے جس کو وجاہت حرام قرار دیتی ہے۔اس کے متعلق جو وحی نازل ہوئی وہ عادات عرب کی معزز سوسائٹی کے آداب معاشرت) کے مطابق نازل ہوئی ہے۔ طیّب اور خبیث کا مفہوم وہی معتبر ہے جس کو عرب کے لوگ طیب یا خبیث سمجھتے تھے۔سکر کی حرمت کا موجب حکمت ہے (جیسے کہ پہلے بھی مذکور ہوا) جس سے نبیذ وغیرہ مستثنیٰ ہیں۔خرید وفروخت میں ربّ تعالیٰ نے بوا رسوی کو عناء کے مطابق حرام قرار دیا ہے اور اس کے احکام خوراک کی اشیاء، یا نقد اور نسیئہ میں ظاہر ہوتے ہیں۔سوچ لو اظہار کے الفاظ ایک جھوٹی بات ہے جو صرف معنی مجازی کو محفوظ کر صحیح اور درست سمجھی جاسکتی ہے۔لیکن چوں کہ یہ علاقہ مجاز کا بہت کمزور تھا۔اس لئے وحی نے اس کو نظر انداز کیا۔بہرحال جو کچھ ہم نے اسبارے میں بیان کیا ہے۔وہ نشاۃ شرعیہ کا اجمال ہے، دعوت کو ہم نے مختصر چھوڑ دیا ہے۔اور جزا سزا کا ذکر ہم اس خزانہ میں کرینگے جس میں کہ معاد کا بیان ہے۔اہل حکمت کے نزدیک کلمۂ جامعہ یہ ہے کہ احکام شرعیہ کی تخصیص اور ان کا یہیں نفس رحمانی تشریعی اور اس جہت اور حیثیت کا نتیجہ ہے جو ربّ تعالیٰ سے کمال کے مطابق صادر ہوتی ہے۔پھر وحی کے مقام میں مصالح عباد اور ان کی عادات کے مطابق ان احکام کی تنقیح ہوتی ہے، خلاصہ یہ کہ ہم نے تم کو مسائل کے اصول بتادیئے ہیں۔ان سب باتوں میں حکیم ربّانی کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔لیکن انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اس اسم پاک کی اطاعت وانقیاد میں جو آمر اور ناہی ہے اس قدر محو رہتے ہیں کہ ان احکام کے متعلق ان کو بحث وتمحیص کرنے کی فرصت نہیں ہوتی۔حکماء ربانیین وحی کی حیثیت سے اس اسم مقدس کے مطابق جو ان میں تجلّی فرما ہے، ان کے مطیع اور منقاد رہتے ہیں، اچھی طرح سوچ لو۔

............☆☆☆............

نواں خزانہ

نشأۃ اخرویہ یعنی عالم معاد کے احکام

معاد کی چار منزلیں ہیں۔ پہلی منزل عالم روح کی ہے جس کو رسول اللہ صلعم نے قبر سے تعبیر فرمایا ہے۔ میرے نزدیک اس کی تحقیق یہ ہے کہ نفس ناطقہ کی تخلیق اس طرز پر ہوئی ہے کہ وہ جسم کی تربیت کرے اور وہ عین تربیت ہے۔ اس لئے کسی ایسے نفس ناطقہ کا وجود ممکن نہیں جو ابتداء یا بقاء کی حالت میں کسی نہ کسی بدن کی تربیت میں مشغول نہ ہو۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے روح طبعی سے تعلق پیدا کیا جو خارج از بدن ہے اس تعلق کی حالت میں اس کا کام یہ ہے کہ وہ اس مؤخر الذکر کے مواد کو محفوظ رکھے۔ اس کے اقتضاء مصرف کو پورا کرے اور جن ادراکات خیالیہ یا وہمیہ سے وہ مالوف ہے۔ ان کو حاصل کرے۔

موت کے بعد لوگوں کے طبقات مختلف ہوتے ہیں بعض ان میں سے ملائکہ علویہ کلیہ کے زمرہ میں شامل ہو جاتے ہیں۔ یہ وہ کامل افراد ہوتے ہیں جن کی شان اور جن کا فیض کلی ہوتا ہے۔ بعض ملائکہ علویہ جزئیہ سے جانتے ہیں۔ اکثر شہداء سابقین مثلاً حمزہ وغیرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اسی قسم سے ہیں۔ ان کی شان جزوی میں کلی ہے۔ بعض کا لحوق ملائکہ سفلیہ سے ہوتا ہے جن کے مراتب مختلف ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو شہداء ابرار کہا جاتا ہے جو فناء اول کے مقام میں صاحب حال ہیں ان کی شان جزوئی ہوتی ہے۔ مثلاً مظلوم کی مدد کرنا، ایسے امور جزئیہ کی تبلیغ کرنا جن سے لوگوں کو فائدہ ہو، فتنہ ہائے جزئیہ کا دفع کرنا، اور فتح میں معاون ہونا، بعض وہ ہیں جو کامل طور پر جنوں سے ملحق ہوتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ارتکاب رذائل میں عمریں بسر کیں، جن کے مجموعہ

سے ایک ہیئت وحدانی حاصل ہوئی اور ان کا نفس اس میں فنا ہو کر رہ گیا۔ بعض رذائل کے غلبہ کی وجہ سے اس طبقہ کے اقسام مختلف ہیں چنانچہ بعض ان میں سے وہ ہیں جو لوگوں کو ایذا دینے میں مشغول رہتے ہیں۔ یا بعض دوسرے قبائح میں مشغول رہنا ان کی زندگی کی نمایاں خصوصیت ہوتی ہے۔ بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو زمرۂ جن میں شامل ہوتے ہیں لیکن ان کا یہ لحوق کامل نہیں ہوتا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو عمر بھر ایک ہی رذیلہ میں منہمک رہے اور اس کو ملکۂ راسخہ بنالیا، جس کی وجہ سے ان کا نفس ناطقہ اس میں محو ہو گیا، رذائل کی نوعیت کے مطابق ان کے اقسام مختلف ہیں۔ بعض ان میں سے وہ ہیں جن کو کسی ایک نیکی میں فنا ہونا میسر ہوا۔ جس طرح کوئی آدمی ایک برائی میں انہماک کی زندگی بسر کرتا ہے۔ بعض لوگ ایسے بھی ہیں جن کو کسی خاص نیکی یا برائی میں استغراق نہیں ہوتا۔ اکثر لوگ اس قسم کے ہوتے ہیں۔ لیکن یاد رکھو، کسی ملکۂ فاضلہ یا ملکۂ سیئہ میں فنا ہو جانا، ذوق اور وجدان کے مطابق بڑی اہمیت رکھتا ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ جس طرح انسان کو اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس اور اس کے اسماء حسنٰی میں فنا حاصل ہو سکتی ہے۔ اسی طرح کسی روح طیّب یا خبیث میں بھی اس کا فنا ہو جانا ممکن ہے۔ چنانچہ یونان کے اشراقیین اپنے آپ کو افلاک اور کواکب کی ارواح عالیہ (بزعمهم) میں فنا کر دیا کرتے تھے۔ اگرچہ اہل حق کے نزدیک ایسا کرنا باطل ہے۔ علیٰ ہذا القیاس آدمی اپنے آپ کو کسی ملکۂ فاضلہ یا رذیلہ یا مُباحہ میں فنا کر سکتا ہے۔ آخر یہ چیزیں بھی کسی نشأہ میں موجود ہیں اور ان کی بھی خصوصیات ہیں جن سے ان کی ماہیت متعین ہوتی ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ہر ایک موجود کو دوسرے موجود کے ساتھ کسی نہ کسی طرح مناسب ہوتی ہے اور ایک سے دوسرے کی طرف راستہ ہوتا ہے اور یہ مناسبت باہمی یا تو اتحاد نشأہ کی وجہ سے ہوتی ہے یا ان میں کوئی دنیاوی مجانست ہوتی ہے۔ اب جو ملکہ (خواہ وہ ملکۂ فاضلہ ہے یا خبیثہ یا مباحہ) کسی کی نظر میں اچھا معلوم ہوتا ہے وہ اس کے دل میں گھر جاتا اور اس کے رگ و پے میں سرایت کر لیتا ہے اور نفس اسی کا رنگ قبول کر لیتا ہے۔

چنانچہ لوگوں کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) جن کے مزاج میں یہ رنگ قبول کرنے کی صلاحیت ہے۔ یہ لوگ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوں تو ایک گھڑی میں ان کو فنا حاصل ہو سکتی ہے۔ ان لوگوں کو فنائے شفاہی حاصل نہیں ہوتی جس کے لئے اس بات کی ضرورت ہے، کہ یکے بعد

دیگرے وہ تجلی سے مشرف ہوں اور مرۃً بعد اخری ان کو جذب حاصل ہو، اس قسم کے لوگ ہمیشہ خطرہ میں رہتے ہیں۔ اگر ان کو فنا فی اللہ کا مقام حاصل نہ ہو تو ممکن ہے کہ وہ بجائے اس کے کسی ملکہ فاضلہ یا رذیلہ میں فنا ہو جائیں۔ (۲) جن لوگوں کے مزاج میں یہ رنگ قبول کرنے کی صلاحیت نہیں۔ یہ لوگ اگر ذات اقدس کی طرف توجہ کریں تو ان کو فنا شفاہی حاصل ہوتی ہے۔ اس قسم کے لوگوں کو کسی قسم کا خطرہ نہیں۔ یاد رکھو کبھی کبھی مزاج بدن کو ایک ایسی ہیئت حاصل ہوتی ہے جس میں نفس اور حواس کے اثرات آپس میں مخلوط ہوتے ہیں۔ چنانچہ کلام مجید میں ارشاد ہے وَلٰـكِنَّـهٗٓ اَخْـلَدَ اِلَى الْاَرْضِ "لیکن وہ زمین (سفلیات) کی طرف جھکا۔" ایسے شخص کو جس کا مزاج بدن اس قسم کا تجرد حاصل ہے اور اس میں اس کی استعداد نہیں ہوتی بعض اوقات یہ حالت موروثی ہوتی ہے کیونکہ ہم ذکر کر چکے ہیں کہ اولاد کا نفس اس کے والدین کے نفس سے متولد ہوتا ہے۔ اس مزاج کے لوگ دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک وہ جو قوت تخلیط کی وجہ سے خبیث اور طیب کے حامل نہیں ہوتے۔ برخلاف اس کے دوسری قسم کے لوگ اس کے حاسہ (۱) ہو سکتے ہیں۔ جو لوگ ان میں سے خبائث کے حامل ہیں وہ سرکش جنوں کے زمرہ میں شامل ہیں۔ ان دونوں کا قبلۂ توجہ ایک ہوتا ہے۔ عرفان کے نتائج میں سے یہ بھی ہے کہ کوئی ایسی تدبیر کی جائے کے خبیث مزاج کا آدمی ملکات حسنہ میں فنا ہو جائے۔ اس مقام پر عجیب و غریب علوم و معارف اور تاثیرات کا ظہور ہوتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ شواغل حسیہ رفع ہو کر خلل انداز نہیں ہوتے اور ادراکات دنیاویہ زائل ہو جاتے ہیں خلاصہ کلام یہ ہے کہ انسان کو اس عالم مادی میں تین قوتیں عطا کی گئی ہیں۔ متخیلہ واہمہ اور ادراک۔ یہی قویٰ اس کی تعلیم و تعلم کے ذرائع ہیں۔ اسی لئے فنا کا ظہور یہاں پر نہیں بلکہ وہاں پر ملکات میں ہوتا ہے۔ ہاں یہ بھی یاد رکھو کہ عالم برزخ میں لوگ اخلاق اور ملکات سے پوچھے جائیں گے لیکن عالم حساب میں اعمال اور عقائد کی بابت ان سے باز پرس ہوگی۔

ہمارے ذوق اور وجدان کے مطابق تحقیقی بات یہ ہے کہ میت کو ذیل کے چار طریقوں میں سے کسی طریقہ پر نفع پہنچایا جا سکتا ہے۔ اس کے بغیر اور کوئی طریقہ جائز اور مشروع نہیں۔ (۱) میّت کے اقارب اور احباب کے ساتھ نیک سلوک کیا جائے۔ یہ خود اس میت کے ساتھ احسان

(۱) ظہور مہدی کی طرف اشارہ ہے۔

کرنے کے مرادف ہے۔ (۲) میت کی زیارت کو جائیں اور اس کے پاس قرآن مجید کی تلاوت کی جائے۔ اس سے اس کو انس حاصل ہوتا ہے۔ (۳) اس کی طرف سے نائب ہو کر صدقہ کریں، یا حج کریں یا لونڈی، غلام آزاد کریں، جسے کہ میّت کی طرف سے حوالہ دیا جاتا ہے (یعنی میت نے حوالہ دیا ہو)۔ (۴) میّت کے لئے مغفرت کی دعائیں کریں اس کو اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے قبول فرما کر اس کے گناہوں کو بخش دیتا اور اس کے درجہ کو بلند فرما دیتا ہے۔ لیکن یہ جو استمداد اور فاتحہ وغیرہ مروّج ہے۔ کچھ بھی نہیں۔ (بس میّت کو فائدہ پہنچانے کے یہی چار طریقے ہیں)۔

بعض حدیثوں میں تحتر ارواح کا ذکر ہے اور یہ وہ ملائکہ کے ساتھ پرواز کرتی ہیں اس کو ہماری تقریر کا موئید سمجھو۔ کیوں کہ ہم تم کو بتا چکے ہیں کہ روحوں کا مکان اور ان کی قرارگاہ مختلف ہوتی ہے۔ مثلاً آسمان کے اوپر، قبر کے پاس، اور کرۂ ہوائیہ میں، واللہ تعالیٰ اعلم۔ تخصیص مکان کی بنا اس پر ہے کہ بعض روحیں بعض خاص جماعتوں میں جا شامل ہوتی ہیں اور انہیں کا مستقر ان کی قرارگاہ ہوتی ہے۔

عذاب کی قسمیں مختلف ہیں۔ علمی، حسّی اور جسمی۔ کسی خاص قسم کے عذاب میں مبتلا ہونے کی وجہ سے وہ ملکات ہوتے ہیں جن سے کہ آدمی اپنی اپنی استعداد کی وجہ سے موصوف ہوتا ہے۔ ثواب کی اقسام کو بھی اسی پر قیاس کرو۔ بعض اوقات میت کا جسم محفوظ رہتا ہے جس کی وجہ نفس کا قوی ہونا اور قبر کی طرف رجوع کرتا ہوتا ہے۔ اکثر شہداء اور حملۃ القرآن اسی صفت میں داخل ہیں۔ عذاب محسوس کے بھی کچھ اسی قسم کے اسباب ہوتے ہیں۔

دوسری منزل بعث بعد الموت کی ہے

(جس کو قیامت کبریٰ کہا جاتا ہے)

جب یہودیوں کی سرکشی اور ان کا نمرود و عصیان حدّ سے بڑھ گیا، چنانچہ وہ قتل انبیاء کے مرتکب ہوئے اور حضرت مسیح کی انہوں نے توہین کی، تو ان کے صحف اعمال ان کے ظلم اور بے اعتدالیوں سے بھر گئے اور ان کے گناہوں کے اثرات آسمان تک پہنچ گئے۔ اس سے پہلے عاد و ثمود اور دیگر اقوام طاغیہ کے گناہ بھی آسمان تک کی فضا کو بھر چکے تھے اور ان کے آثار خصوصی نمایاں ہو چکے تھے اب یہود کی برائیاں بھی ان کے ساتھ مل گئیں تو ان سب شرور میں ایک وحدت پیدا

ہوئی اور ایک ایسے عالم میں ان کو تحقق حاصل ہوا۔ جو اس عالم مادی سے کامل تر ہے۔ یہ برائیاں ایک جیتے جاگتے مجسمے کی صورت میں نمایاں ہوئیں جس کا نام شرع کی زبان میں ''المسیح الدجال'' ہے۔ دجّال کو شر کی جانب میں انسلاخ حاصل ہے اور انسلاخ خواہ کسی جانب میں ہو، ارتفاع کا موجب ہوتا ہے۔ چنانچہ برائیاں نہور میں آتی رہیں اور دجال کامل سے کامل تر ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے اور اسم مطلق آپ کے قلب مبارک سے طلوع ہوا تو دجال مجبور ہو کر کنارہ کش ہو گیا۔ لیکن جب عہد نبوت پر ایک زمانہ دراز گزر گیا، شرور کی کثرت ہوئی اور برائی کے واقعات کثرت سے ہونے لگے تو دجال کے کمالات شریہ میں پھر ترقی شروع ہوئی اور جو برائی دنیا میں ہوتی تھی اس کے ساتھ جا ملتی۔ جس طرح ہر ایک جزئی اپنی کلّی کے ساتھ، ملحق ہوتی ہے۔

جب اس طرح تمام زمین ظلم اور بے اعتدالیوں سے بھر جائیگی اور اس اُمّت مرحومہ کے اکثر لوگ ضلالت میں مبتلا ہوں گے تو اسم جامع محمدی اس حالت میں ان کی دستگیری فرمائے گا اور وہ اسم پاک ایک ایسے شخص پر تجلی فرما ہوگا (۱) جس کا نام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم گرامی کے موافق ہونے کے علاوہ اس کا حلیہ اور اس کے اخلاق بھی آپ کے موافق ہوں گے اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ مبتلائے ضلالت امت کو راہ راست پر لائے گا اور وہ زمین کو عدل وانصاف کے ساتھ بھر دے گا۔ (جس طرح کہ وہ ظلم و بے راہ روی سے بھر گئی تھی)۔ اس حالت میں دجّال سے نہیں رہا جائے گا اور وہ گوشۂ عزلت سے نکل کر دعویٰ الوہیت کرے گا۔ زمین میں فساد مچاتا پھرے گا اور ہر طرح سے لوگوں کو گمراہ کرنے میں ہمہ تن مصروف ہوگا۔ جب اس کی یہ دوڑ دھوپ انتہا تک پہنچ جائے گی تو اسم پاک عیسوی اس کے مٹانے پر متوجہ ہوگا۔ اس تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام یہودیوں کے شرور کے لئے بمنزلہ محاق کے تھے (۲)۔

حالت ۲۷-۲۸ قمری تاریخ کو پیش آتی ہے) اور دجال ان ہی شرور کا مجسم ہے، اسم جامع محمدی سے اس کو مزید تقویت حاصل ہوگی، اور حضرت عیسیٰ نازل ہو کر دجال کو قتل کر دیں گے۔ اور زمین پر حکومت کر کے اسم جامع کا حق ادا کریں گے۔ تھوڑے عرصہ کے بعد دجال کی روح جو مجموعۂ شرور کی وحدت تھی یاجوج ماجوج کی شکل میں ظہور کرے گی، جس کے آثار پھر عیسیٰ علیہ

السلام کی توجہ سے محو ہو جائیں گے۔لیکن جب عیسیٰ علیہ السلام وفات پائیں گے تو لوگ پھر برائیوں میں منہمک ہو جائیں گے، دجال کی روح مطروح ان میں سرایت کر جائے گی اور اس کا نتیجہ شر مستطیر ہوگا جو تمام روئے زمین پر چھا جائے گا، جس کا قلم زبان اور زباں قلم سے بیان نہیں ہو سکتا۔ اسی حالت میں قیامت کا ظہور ہوگا جس سے تمام نظام عالم درہم برہم ہو جائے گا۔اور کوئی چیز موجود نظم ونسق پر باقی نہیں رہے گی۔ اس پر ایک مدت گزر جانے کے بعد اللہ تعالیٰ ایک اور ستاہ (ارتقاء) کا آغاز فرمایا اور معدات یعنی پیش آمدہ اسباب وبواعث کے مطابق (جن کی تفصیل خدائے عالم الغیب جل وعلا ہی جانتا ہے) احسام کو پھر ارواح کیساتھ تعلق حاصل ہوگا۔یہی جنت ہے اور اس حالت میں لوگ پھر ویسے ہی جیتے جاگتے انسان ہوں گے جس طرح وہ اس عالم میں تھے کچھ عرصہ کے بعد ان پر سبوغ کا افاضہ ہوگا اور ان کو اور ارتقاء حاصل ہوگا۔ایک حدیث میں ہے کہ یہ ارتقاء باران رحمت کے نزول سے ظہور میں آئے گا اگر یہ حدیث صحیح ہے تو اس کو مُعدّات کا اشارہ سمجھو۔بعض دیگر احادیث میں ہے کہ ان پر سخت حیرت طاری ہوگی۔ جس کے بعد ان کو موقف (میدان قیامت) میں بلا لیا جائیگا۔ یہ روایت بھی اسی ارتقاء دوم کے مظہر ہیں۔

قرب قیامت میں لوگوں کی مختلف قسمیں ہوں گی۔ بعض ان میں سے ایسے کامل ہوں گے جن کے کمال میں ذرہ بھی کمی نہیں ہوگی۔ اس کے بالمقابل بعض ایسے لوگ ہوں گے جو ناقص ہونے کے لحاظ سے اول نمبر پر ہوں گے (اور ان میں کسی قسم کا کمال نہیں ہوگا) چونکہ دجّال ملعون کامل طور سے شر کا مظہر ہے اور امام مہدی اور حضرت عیسیٰ کے خیر کامل مظاہر ہیں، اس لئے ہر ایک کو اس کے موافق پیرو مل جائیں گے۔اس حالت میں (قرب قیامت میں) توحید کی حقیقت تمام لوگوں پر منکشف ہوگی۔ نیکوں پر تو اس لئے کہ ان کو انسلاخ حاصل ہوگا اور اشرار پر اس لئے کہ وہ حسب استعداد دجال کے منقاد ہوں گے حکومت اور سلطنت ظاہر کے لحاظ سے مختلف اعصار میں مختلف اقوام کے حصہ میں آئی۔ حجاز، عراق اہل فارس اور اہل ہند سب اس سے بہرہ یاب ہوئے۔ آج کل افاغنہ اس منصب پر فائز ہیں۔ باطنی حکومت کی بھی یہ کیفیت ہے۔لیکن اہل فارس اور افاغنہ دولت انسلاخ سے بے بہرہ واقع ہوئے ہیں۔ان کے کمالات مزاجی ہیں۔

تیسری منزل۔ جزا سزا کا دن

اس دن میں وہ عجیب واقعات پیش آنے والے ہیں جن کی نظیر اور مثال دوسرے مواطن نہیں ملتی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک جسمانی منزل ہے جس کی جسمانیت اس عالم مادّی کی جسمانیت سے مختلف ہے یہ اختلاف دو وجہوں سے ہے اور صُحف کے بیان میں یہ دونوں وجہیں مذکور ہیں۔ میدان قیامت میں صحف اعمال کو حاضر کیا جائے گا اور جلالی جمالی دونوں حیثیتوں سے ان پر سبوغ کا افاضہ ہوگا، تو وہ صورتیں (صُور اعمال) اجساد میں متمثّل ہوں گی۔ مباح افعال جن سے کوئی خبیث ملکہ پیدا نہیں ہوتا اور نہ ہی ان کے ظہور کا باعث کوئی خبث باطنی ہوتا ہے اسی طرح وہ کسی ملکۂ طیبہ کے ظہور میں آنے کا باعث بھی نہیں ہوتے اور نہ ہی ان کے صادر ہونے کا موجب کوئی باطنی فضیلت ہوتی ہے، ان سب کو نامہ ہائے اعمال سے محو کر دیا جائیگا۔ سبوغ کا افاضہ ان افعال پر نہیں ہوگا۔

یاد رکھو اللہ تعالیٰ کی صفات عالیہ میں سے ایک صفت علم تمیزی ہے جس کا مفہوم (ہمارے ہاں) وہ ملکہ ہے جس کے ذریعہ دو مشتبہ اور ملتبس چیزوں میں فرق کیا جا سکے۔ واقعۂ احد کی یہ آیت وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا "تا کہ اللہ تعالیٰ مومنوں کو جان لے" اور یہ آیت کہ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جَا هَدُوا مِنكُمْ وَيَعْلَمِ الصَّابِرِيْنَ "ابھی تو اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ بات نہیں آئی کہ تم میں سے مجاہد کون ہیں اور نہ ہی اس کو صابرین کا علم ہوا۔" (اور کچھ دیگر آیتیں مثلاً سورۂ عنکبوت کی یہ آیت فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَ قُوْ اوَلَيَعْلَمَنَّ الْكَاذِبِيْنَ "یقیناً اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جان لے گا جنہوں نے سچ کہا اور جھوٹوں کو بھی جان لیگا) اس صفتِ علم تمیزی پر محمول ہے۔ یعنی یہی صفت اس واقعہ کے ظہور میں آنے کا سبب اور اس کا مبدء تھی، جیسے کہ دیگر صفات عالیہ کا بھی اس واقعہ میں مظاہرہ ہوا۔ اس صفت کے عکوس اور مظاہر میں سے ایک جوہری چیز ہے جس کو میزان سے مشابہت ہے اور جو حسنات اور سیئات میں فرق کرنے کا ذریعہ ہے۔ آخرت کا حساب کتاب بھی اسی صفت کا مظاہرہ ہے۔ جس وقت میزان قائم ہوگا۔ تمام موجودات پر اس صفت تمیزی کا اجمالی افاضہ ہوگا وہ اپنے اپنے اعمال کو دیکھیں گے اور ان کا اعتراف کریں گے اور جزا سزا کا مرحلہ پل بھر میں طے ہو جائے گا۔ واللہ سریع الحساب کے یہی معنی ہیں۔

عظیم الشان عالم آخرت کے عجائبات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جس شخص نے بہت سے لوگوں کے حقوق غصب کئے ہوں گے اور ان پر ظلم کیا ہوگا، وہ بیک وقت ان سب کی جوابدہی کے لئے متعدد جگہوں پر مجرم کی حیثیت سے کھڑا ہوگا اور اس کا نفس ان سب جرائم کی پاداش میں الوان عذاب سے معذب ہوگا۔ یہ وہ مقام ہے جب کہ ہر ایک آدمی اپنے معبود اور اپنی ہوائے نفس کے پیچھے جائے گا۔ مسلمانوں میں جو فاسق فاجر ہیں اور غفلت کی زندگی بسر کرتے ہیں وہ اس صورت وہمیہ یا حسیہ یا عقلیہ کی پیروی کریں گے جس کا انہوں نے اس دنیاوی زندگی میں معبود کی بابت تصور باندھ رکھا تھا۔ یہ لوگ آگ میں ڈالے جائیں گے۔ یہاں تک کہ وہ صورت ان کے ذہن سے مٹ جائے اور وہ اللہ تعالیٰ کو منزہ عن الصورۃ والجسم اعتقاد کرنے لگیں۔ یہ کلمۂ شہادت کی برکت ہے جس کو وہ زبان سے دہرایا کرتے تھے۔ لیکن عام لوگ جن کے اعمال نیک ہیں اور جو ابرار کہلاتے ہیں۔ ان کا ادراک حسی ہویت مطلقہ کو کسی نہ کسی طرح متمثل کر دیتا ہے جس کو ہم نور غیب کہتے ہیں۔ ان لوگوں کو اپنے ادراکات میں ارتقاء حاصل ہوگا جس کی حقیقت یہ ہے کہ ان پر سبوغ کا افاضہ ہوگا تو ان کا وہ ادراک جو مبہم اور غیر واضح تھا، بیّن اور واضح ہو جائے گا اور ان کو کما حقہ اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہوگی۔ اسی طرح عابد لوگ جنہوں نے اپنا وقت عزیز عبادات الٰہیہ میں صرف کیا ہوگا اپنی عبادات کے حقائق میں مستغرق ہو کر شاہ راہ توحید پر گامزن ہوں گے یہ ایک عمیق علم ہے۔

شفاعت کی حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک سبوغ جمالی ہے جس کے نزول کا موجب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مبدء تعین یعنی الحی القیوم کا اسم پاک ہے اس کی شان یہ ہے کہ جو برائیاں صحف اعمال میں ثابت ہو چکی ہیں وہ محو ہو جائیں گی ہر ایک نبی کے لئے اس کے سبوغ اور قرب باللہ کے مطابق شفاعت ہے، شفاعت سے زیادہ تر وہی لوگ بہرہ اندوز ہوتے ہیں جن کو انبیاء علیہم السلام سے زیادہ قرب حاصل ہو۔ (من ترک سُنّتی لم ینل شفاعتی کی حدیث میں اسی کا اشارہ ہے۔) درود اور سلام کے شروع ہونے کا یہی راز ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سب شفاعتوں سے عام تر (ہمہ گیر) اور کامل تر ہے، گویا یہ اصل ہے اور دوسرے انبیاء کی شفاعتیں اس کی فروع ہیں۔ میرے نزدیک یہ بات محقق ہو چکی ہے کہ اگرچہ اس عالم مادی میں بھی آپ

کے سبوغ کی برکتیں۔ کچھ کم ظہور میں نہیں آئیں۔لیکن عالم آخرت میں ان برکات کا اس قدر ظہور ہوگا کہ اس عالم کی برکات اس کے مقابلہ میں ہیچ نظر آئیں گی۔اسی بناء پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قیامت کے دن کا حال بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔" آدم علیہ السلام وغیرہ سب میرے ہی جھنڈے کے تلے ہوں گے اور مجھے اس پر کچھ فخر نہیں۔"

حوض کوثر درحقیقت آپ کی ہدایت کا تمثل ہے اور چونکہ بلحاظ افاضہ کے پانی اور علم میں قریب کی مشابہت ہے۔اس لئے وہ ہدایت پانی کی صورت میں متمثل ہوگی۔میری رائے میں ہر ایک نبی کے لئے (اس کا درجۂ ہدایت کے مطابق) حوض ہوگا۔لیکن یادرکھو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا حوض سب سے بڑھ کر ہے۔اسی طرح پل صراط وہی صراط مستقیم ہے جس پر چلنے کی تاکید کی گئی ہے وَاَنَّ ھٰذا صِراطِی مُسْتَقِیما فَا تَّبِعُوْہُ وَلَا تَتَّبِعُو االسُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِکُمْ عَنْ سَبِیْلِہٖ "یہی میرا سیدھا راستہ ہے۔اسی پر چلے چلو اور دوسرے راستہ پر مت پڑو،نہیں تو اس کے راستہ سے بھٹک جاؤ گے۔" اس کا خاکہ آپ نے لکیریں کھینچ کر صحابہ کے سامنے پیش کیا اور ان کو سمجھایا تھا۔یہی راستہ عالم آخرت میں ایک پُل کی صورت میں متمثل ہوگا جو حدیث نبوی علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کے مطابق بال سے باریک تر اور تلوار سے تیز تر ہوگا۔

چوتھی منزل جنت اور دوزخ

میرے نزدیک اصل بات یہ ہے کہ عین ثابتہ ان تمام وجوہ کی جامع ہے جو اجمال کے ضمن میں پائی جاتی ہیں۔آخرت میں عین مذکورہ پر سبوغ کا افاضہ ہوگا تو یہ تمام وجوہ (عین ثابتہ کی) متجسد اور متمثل ہونگی لیکن یہ تجسد اور جسمانیت اس عالم مادی کی جسمانیت سے دو حیثیتوں سے مختلف ہوگا۔دونوں وجہیں بتائی جاچکی ہیں۔یہ سبوغ اگر جمالی ہے تو اس کا نام جنت ہے،اور اگر جلالی ہے تو وہ دوزخ ہے ان دونوں قسموں کے سبوغ کا باعث اور موجب بالترتیب شہادتین کا اعتراف واقرار یا ان کا انکار واستکبار ہے(ذٰلِکُمْ بِاَنَّکُمْ اِذَادُعِیَ اللّٰہُ وَ حْدَہٗ کَفَرْ تُمْ وَ اِنْ یُّشْرَکْ بِہٖ تُؤْ مِنُوْا فَالْحُکْمُ لِلّٰہِ الْعَلِیِّ الْکَبِیْرِ)۔ہمارے رسول صلعم کی شان اس بارے میں بہت بلند ہے۔جنت میں جمالیات کا تمثل لذائذ اکل وشرب اور حور وقصور وغیرہ کی صورت میں ہوگا۔اس کی حقیقت یہ ہے کہ (جس طرح پہلے مذکور ہوا) جو اعمال صحائف میں ثبت کئے گئے

تھے۔ تیسری منزل میں صحف مذکورہ سے مباح اعمال کو محو کر دیا جائے گا۔ صرف ان اعمال کو رہنے دیا جائے گا جن کی جڑیں اعماق قلب میں راسخ تھیں (اور جو ملکات فاضلہ یا خبیثہ کے نتائج یا ان کے ظہور میں آنے کا موجب تھے۔) پھر ان کو (چوتھی منزل میں) سبوغ حاصل ہوگا۔ جو لوگ متقی اور نیکوکار ہونگے۔ ان کی برائیاں اجمال کے ضمن میں شامل ہو کر مضمحل اور نابود ہو جائیں گی۔ برخلاف اس کے ان کی نیکیاں متجسد اور نمایاں ہونگی۔ یہ تجسد اور ان کے اعیان ثابتہ کی وجوہ مختلفہ اور دیگر دقیق مناسبات کے مطابق ہوگا۔ اس مبحث کی ہم کسی قدر تفصیل کرنا چاہتے ہیں۔

کلمۂ شہادت تین درجہ سبوغ کی تکمیل کا باعث ہے۔ لیکن اس کی کوئی جداگانہ صورت نہیں۔ کیونکہ اس کی صورت میں جب سبوغ پیدا ہوتا ہے تو اس سے دو شعبے ظہور میں آتے ہیں۔ ایک شعبۂ تجلّی ذاتی اور عرفان کامل پر جا کر منتہی ہوتا ہے۔ یہ دونوں مؤخر الذکر چیزیں موطن معیت میں جہاں اسباب اور وسائط کا کچھ بھی دخل نہیں سبوغ کامل کے نزول کا باعث ہوتی ہیں۔ دوسرا شعبہ آدمی کو رسل علیہم الصلوات والتسلیمات کی حقیقت تک پہنچا دیتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ ان کی ہدایت سے ڈھانپ لیا جاتا ہے جس طرح بادل گھرا ہوا ہو اور آدمی اس کے پاس جائے تو وہ بادل اس کی طرف جھک پڑتا ہے۔ یہ شعبہ عالم اسباب و وسائط میں نزول سبوغ کا باعث ہے۔ میں نے کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ کی اس صورت کو دیکھا جو نامۂ اعمال میں ثبت ہوتی ہے تو مجھے یہ معلوم ہوا کہ اس کی ایک ہیئت وحدانی ہے اور وہ اس قدر خالص ہے کہ ان دونوں شعبوں میں سے کسی شعبہ کے بھی مشابہ نہیں۔ جب میں نے صلوٰۃ و سلام کو غور سے دیکھا تو مجھے معلوم ہوا کہ اس سے دوسرے شعبہ کی تکمیل ہوتی ہے اور بس۔ اس فرق کی تائید میں میرے پاس کوئی خاص دلیل نہیں۔ بجز اس کے کہ صحف اعمال کو ہمارے سامنے پھیلا دیا گیا ہے اور ان میں نظر کر کے ہم جو کچھ چاہتے ہیں دیکھ لیتے ہیں والحمد للہ رب العالمین۔

نماز آخرت میں حور و قصور کی صورت میں متمثل ہوتی ہے۔ جب میں نے اس کی اس صورت کو بنظر امعان دیکھا جو صحف اعمال میں شامل ہے تو میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس کے دو شعبے ہیں۔ ایک تو ہیئت انسانی ہے جس کا مبدء انتزاع وہ خشوع اور خضوع ہے جو آدمی کے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہوتا ہے۔ حور و غلمان اسی شعبہ کا تمثل ہے۔ دوسری ہیئت جمعیہ احاطیہ ہے

جس کا مبدء انتزاع قیام وقعود اور رکوع و سجود ہے۔ جنت کے عالیشان محلات اور اس کے دلکش باغات اسی شعبہ کا تمثل ہے۔ نیز نماز میں ایک ہیئت تعظیمیہ ہے جس کا نتیجہ تجلی ذاتی ہے، ایک اس کی وہ ہیئت بھی ہے جو اعراض عن الغیر سے پیدا ہوتی ہے اس کا نتیجہ تکفیر سیئات (گناہوں کا مٹانا) ہے۔ میرے خیال میں تسبیح اور تہلیل وغیرہ کو داخل نماز کرنے اور بعد از نماز مشروع کرنے میں یہ راز ہے کہ حدائق جنان کے اشجار و اثمار اور پھل پھول میں اضافہ ہو (ایک حدیث میں آیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے شب معراج میں آپ سے فرمایا ''اپنی امّت سے یہ کہہ دینا کہ جنت میں درخت نہیں ہیں، تسبیح و تحمید کی کثرت ہی سے وہ درختان میوہ دار سے مالا مال ہوں گے۔'') خشوع اور سکون و طمانیت کا نماز میں التزام کرنا حور و غلمان کے حسن و جمال کو بڑھاتا ہے۔ میرا ذوق اور وجدان یہ کہتا ہے کہ بعض اوقات نماز میں سبوغ کامل نہیں ہوتا تو سب نماز میں ایک ہی حور کی صورت میں متمثل ہوتی ہیں۔ برخلاف اس کے سبوغ کامل ہو تو ہر ایک نماز کے لئے کیا، ہر ایک رکعت کے لئے علیحدہ حور ہوتی ہے جس کی خدمت کے لئے اور ستر حوریں کمربستہ رہتی ہیں اس کی حقیقت یہ ہے کہ جس طرح عین ثابتہ سبوغ کی وجہ سے ان وجوہ مختلفہ کے ظہور کی مقتضی ہے جو اس کے ضمن میں مستور نہیں۔ اسی طرح بعض اوقات ایک ہی وجہ کے اندر دوسری کئی وجوہ مستور رہتی ہیں جن کا ظہور سبوغ پر موقوف ہوتا ہے۔ یہ ایک قاعدہ کلیہ ہے جو تمام اعمال حسنہ اور اعمال سیئہ پر حاوی ہے۔

صحف اعمال میں نظر کرنے پر معلوم ہوا کہ روزہ کے تمثل کی دو صورتیں ہیں۔ ایک ہیئت اسا کیہ تنزیہیہ جس کا انجام تجلی ذاتی پر ہوتا ہے۔ آں حضرت صلعم کا یہ حدیث قدسی منقول فرمانا کہ ''روزہ خالص میرے لئے ہے اور میں ہی اس کی جزا دونگا۔'' اور نیز آپ کا یہ فرمانا الصوم جُنّة ''روزہ ایک ڈھال ہے'' جس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ آدمی کو فواحش کے ارتکاب اور آتش دوزخ سے بچاتا ہے، یہ دونوں احادیثیں اسی ہیئت کو ملحوظ رکھنے پر مبنی ہیں۔ دوسری اس کی ہیئت طلبیہ ہے جو بالطبع حظوظ اور لذائذ کی مقتضی ہے۔ باب الریّان کی حدیث اور آپ کا بلال سے مخاطب ہو کر یہ فرمانا کہ تمہاری ہڈیاں خدائے پاک کی تسبیح میں مشغول ہیں، یہ اس وقت فرمایا جب بلال روزہ دار تھا اور اس کے سامنے کھانا کھایا جا رہا تھا، اسی طرح آخرت میں اطعمۂ لذیذہ سے چاشنی اندوز ہونا

اور حوروں کی مصاحبت اور راگ رنگ سے محظوظ ہونا وغیرہ اسی ہیئت سے متعلق ہیں۔ رسول خدا صلعم کی اس حدیث میں کہ للصائم فرحتان الخ ان دونوں شعبوں کی طرف اشارہ ہے۔

زکوٰۃ اور دیگر صدقات کے تین شعبے ہیں، ایک وہ ہیئت وحدانیہ جس میں کہ زکوٰۃ دہندہ اور خیرات کنندہ کی صورت علی وجہ التقدس شامل ہوتی ہے اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ جو چیز راہ خدا جل وعلا میں صرف کی گئی اس کو بعینہ جنّت میں حاضر کر دیا جائے گا۔ دوسری وہ ہیئت وحدانیہ ہے جس کے ضمن میں اس غریب محتاج کی صورت علی وجہ الکمال شامل ہوتی ہے۔ جس کو خیرات دی گئی۔ جیسے کہ شہادتین کی تفصیل میں گزر چکا ہے۔ ہر ایک چیز میں وہاں پر (عالم آخرت میں) سبوغ ہوگا اسی سے تم کو اس حدیث کا راز معلوم ہوگا کہ نیکی کرنے سے عمر میں زیادتی ہوتی ہے تیسری ہیئت نفس کو مقہور و مغلوب کرنے کی ہے۔ اس کا نتیجہ برائیوں کا مٹ جانا ہے۔

حج اور عمرہ کے دو شعبے ہیں۔ ایک طلب مقدس کی ہیئت شوقیہ۔ اس کا نتیجہ تجلّی ذاتی ہے دوسری ہیئت عنائیہ یعنی وہ ہیئت نفسانیہ جو ان اعمال کی بجا آوری میں تکلیفات برداشت کرنے سے پیدا ہوتی ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ حج اور عمرہ گزشتہ گناہوں کو مٹا دینے کا موجب ہوتے ہیں۔

جہاد کی تین ہیئتیں ہیں ایک ہیئتِ عنائیہ جو تکفیر ذنوب کا موجب ہوتی ہے۔ دوسری ہیئت اعلائیہ۔ کیونکہ جہاد کا مقصد اعلاء کلمۃ اللہ یعنی خدائے پاک کا بول بالا کرنا ہے جزاءً وفاقاً کے قانون کے مطابق اس کا تمثل عالیشان سر بفلک محلات اور بالا خانوں کی صورت میں ہوگا، تیسری ہیئت ہدائیہ ہے (جہاد ہی دین حق کی تبلیغ اور اشاعت اور ہدایت پھیلنے کا ذریعہ ہے)۔ جنّت کی انہار جاریہ اسی کا تمثل ہے۔ اعتاق کی صرف ایک صورت تنزیہی ہے جو انسان کے مشابہ ہوتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آزاد کردہ لونڈی غلام کے ہر ایک عضو کے بدلے میں آزاد کنندہ کے اسی عضو کو اللہ تعالیٰ عذاب سے نجات دے گا۔

تسبیح و تحمید، تکبیر و تہلیل، اور حوقلہ وغیرہ اذکار میں سے ہر ایک کی ایک ہیئت وحدانیہ بسیط اور علوی ہے۔ اس کا تمثل خوبصورت اشجار کی صورت میں ہوتا ہے لیکن اس میں کسی قدر تفصیل ہے۔ تسبیح و تہلیل اور حوقلہ (لاحول ولاقوۃ الا باللہ کہنا) کا تمثل غیر میوہ دار مستقیم القامت درختوں کی صورت میں ہوتا ہے۔ (مثلاً سرو اور شمشاد وغیرہ) سبحان اللہ وبحمدہ ایک ایسا کلمہ ہے جو دونوں

فضیلتوں کا جامع ہے۔ تلاوت قرآن کی دو ہیئتیں ہیں ایک اس کی ہیئت علویہ ہے جس کا تمثل رفع درجات کی شکل میں ہوتا ہے۔ یہ اس لئے کہ اس کی اصل کلام مقدس ہے (جس کو علوّ اور رفعت حاصل ہے) دوسری ہیئت عرفانیہ لطیفہ ہے جس کا تمثل خوشبو اور پھولوں کی صورت میں ہوتا ہے۔ اوراد متنوعہ قرآن مجید کی ان آیات کے مقابلہ میں ہیں (انہیں کا حکم رکھتے ہیں) جو لطائف علوم پر مشتمل ہیں۔ الغرض جو صحف اعمال ہمارے سامنے پھیلائے گئے انہیں کو دیکھ کر بادی النظر میں ہمیں جو کچھ معلوم ہوا وہ ان سطور بالا میں تمہارے سامنے رکھ دیا ہے۔

وہ عادتیں جو طبیعت میں راسخ ہو چکی ہیں اور جو ''یوم الحساب'' کے وقت نامۂ اعمال سے محو نہ کی جائیں۔ بعض اوقات نوعیت جزاء کی ترجیح کا موجب ہوتی ہیں۔ جیسے کہ کھیتی اور کھجور کے درختوں والی حدیث یا اونٹ اور اولاد والی حدیث۔ انسان کا اپنا ارادہ بھی اکثر مؤثر ہوتا ہے۔ چنانچہ ہم نے اپنے بعض مکاتیب میں اس کی وجہ بیان کی ہے کہ الولد سرّ لابیه اور بتایا ہے کہ انسان کی ان ہی وجوہ میں سے ہے جو اس کی عین ثابتہ کے ضمن میں مندرج ہوتی ہیں۔ جب ہم نے جنت کی مقتضیات، اور عین ثابتہ کی وہ وجوہ بتا دی ہیں جو ترجیح نوعیت جزاء کا موجب ہوتی ہیں تو اب دوزخ کی مقتضیات اور کسی عقوبت خاص کی وجوہ ترجیح کو بھی اسی پر قیاس کرو چنانچہ جس کے جرائم کا تعلق ان امور سے ہے جن کو معنوی طور پر بڑی عظمت حاصل ہے۔ مثلاً تکذیب قرآن، رسول صلعم کو ایذا پہنچانا، اور لوگوں کو گمراہ کرنا۔ ایسے شخص کو صعود کے پہاڑ پر (دوزخ کے ایک پہاڑ کا نام ہے) چڑھنے اترنے کے عذاب میں مبتلا کیا جائے گا، جس کی عادت بخل اور منع زکوٰۃ ہے چونکہ اس کے عمل کی صورت وحدانیہ میں اس چیز کی صورت (مثالیہ) شامل ہے جس کے دینے میں اس نے بخل کیا تھا۔ اس لئے آخرت میں وہی اشیاء متجسم ہو کر اس کے عذاب کا باعث ہوں گی۔ مثلاً اونٹ، گائے بیل، اور بھیڑ بکری اس کو اپنے پاؤں سے کچلیں گے اور مال دولت (گنج خزانہ) ایک گنجے اژدہے کی صورت میں متمثل ہو کر اس کو بار بار کاٹے گا اور اس کے گلے کا ہار بنا رہے گا۔ عالم آخرت میں مال و دولت (زر و سیم) سانپ کی شکل میں متمثل ہوتے ہیں۔ جن سے مانع زکوٰۃ کی پیشانیوں اور پہلوؤں اور پیٹھ کو داغا جاتا ہے۔ عذاب کی نوعیت کا اختلاف اس پر مبنی ہے کہ اگر کسی کو عمومی اور کلی طور پر مال سے محبت ہے اس کا مال اژدہے کی صورت میں متمثل

ہوکر اس کے گلے کا ہار بنتا ہے اور داغنے کا عذاب اس کے لئے مقرر ہے جو مال و دولت کی جزئیات کے متعلق شب و روز غلطان و پیچان رہتا اور تکلیفیں اٹھاتا پھرتا ہے۔ جس نے کوئی خاص مہلک اوزار استعمال کر کے خودکشی کی وہ ہمیشہ کے لئے اسی اوزار سے اپنے آپ کو ہلاک کرتا رہے گا۔ (یہی اس کے عذاب کی نوعیت ہے)۔ ربا خوار کو بھوکے دریا میں ڈالا جائے گا کیونکہ سود خور نے حقیقت میں مقروض کا خون کا چوسا ہے۔ اگر یہ سود کی رقم اس کے پاس بچ جاتی تو اس کی غذا ہوکر اس کا خون اور اس کا گوشت اس سے بنتا۔ نیز اس سود لینے سے مقروض کو بعینہٖ ایسی ہی تکلیف پہنچتی ہے گویا اس کا خوں چوسا گیا ہے۔ جس نے کسی کی زمین چھینی ہو، وہی زمین اس کے گلے کا طوق ہوگی، کیونکہ اس کے اس غاصبانہ عمل میں زمین کی صورت محفوظ ہے۔ آیات کلام مجید اور احادیث میں جن جن عقوبتوں کا ذکر آیا ہے ان سب کے لئے ایسے ہی مناسبات تلاش کرو۔

ہمارا ذوق اور وجدان یہ کہتا ہے کہ جو معرفت انسان کو عالم آخرت میں حاصل ہوگی وہ اس قدر اتم اور اکمل ہوگی کہ اس کی نظیر اس دنیا میں کسی نبی تک کو حاصل نہیں ہوسکتی۔ عارف کو وہاں پر بہ نسبت عامی کے زیادہ حور و قصور ملیں گے اور تجلی ذاتی سے سب بہرہ یاب ہوں گے۔ فرق صرف اتنا ہوگا کہ عوام کو یہ دولت عظمٰی وقتاً بعد وقتٍ نصیب ہوگی۔ برخلاف اس کے خواص کو یہ نعمت کبریٰ اکثر اوقات حاصل ہوگی، اور اخص الخواص کے لئے یہ تجلّی دائمی ہوگی کوئی دوسرا شغل ان کی اس عظیم ترین روحانی لذت میں خلل انداز نہیں ہوگا۔ جو لوگ اس دنیا میں ہدایت یاب ہوئے وہ سب کے سب جنت کی نعمتوں سے محظوظ ہوں گے۔

اس کے متعلق تحقیقی قول کی بنیاد دو جلیل القدر مقدمات پر ہے۔ (۱) ذات اقدس جلّ مجدہ اور اس کی صفات عالیہ تک پہنچانے کا ذریعہ علم حضوری ہے۔ علم حصولی کو اس مقام شریف تک رسائی نہیں۔ علم حصولی میں استدلال استعمال کیا جاتا ہے اور اس سے جو یقین اور طمانیت دل میں پیدا ہوتی ہے اس کی صورت، صاحب صورت سے مغائر ہوتی ہے اس کا عین نہیں ہوتی۔ اس لئے (ہم کہتے ہیں کہ) علم حصولی ایک جہل ہے جس پر ملمع کے طور پر سونا منڈھ دیا گیا ہے، اور اس میں تو کوئی بھی شک نہیں کرسکتا کہ جو صورت ذہن میں جاگزین ہوتی ہے۔ اس پر ''امکان'' کا رنگ چڑھا ہوا ہوتا ہے۔ اس کے یہ معنیٰ ہوئے کہ اگرچہ یہ صورت ایک امر واقع کی محاکی ہوتی ہے۔

لیکن اس کی یہ محاکات ناقص اور غلط یعنی خلاف واقع ہوتی ہے لیکن علم حضوری میں ''امکان'' کی تلونیات دخل یاب نہیں ہوسکتیں۔ البتہ قرب فرائض میں یہ نقص واقع نہیں ہوتا، لیکن وہ بھی اگرچہ بظاہر علم حصولی ہوتا ہے تاہم عین ثابتہ کے لحاظ سے وہ علم حضوری ہوتا ہے ذات اقدس عزّ مجدہ تک وصول کی وجہ یہ ہے کہ آدمی کو جب تقرر اور تحقق حاصل ہوتا ہے تو اس کی عین ثابتہ سے علم حضوری اسی طرح اُبل پڑتا ہے جس طرح کوئی چشمہ پانی سے بھر جاتا ہے تو اس پر کف آجاتی ہے۔ اس تقرر اور تحقق کا خود بخود ظہور میں آنا تو ناممکن ہے، وہ تو واجب تعالیٰ وتقدس کے افاضۂ جود کا نتیجہ ہے جس کا گھڑی گھڑی نزول ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے یہ عبارت کی تنگی ہے، ورنہ وہ تو زمان و مکان سے بالاتر ہے۔ بہر حال اسی رابطہ کی وجہ سے انسان کو فیاض مطلق برحق تک پہنچنے کا راستہ مل جاتا ہے۔ اس کی مثال ایک جسم مخروطی کی ہے جس کے مرکز پر گہرے سرخ رنگ کا نگینہ جڑ دیا گیا ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ قاعدۂ مخروط کا بعینہ وہی رنگ ہوگا جو اس کے مرکز کا ہے، اس لئے اگر تم نور مقدس کو نظر امعان سے دیکھنے لگو تو یقیناً تمہاری نظر قیوم برحق تعالیٰ وتقدس اور اس کی صفات عالیہ مقدسہ تک پہنچ جائے گی۔ اب جس نے اپنے آپ کو علم حضوری جان لیا اس کو اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہوگئی۔ لیکن یاد رکھو عارف اور جاہل میں بڑا فرق ہے۔ مثال مذکورہ بالا پر غور کرو گے تو تمہیں معلوم ہوگا کہ جسم مخروطی کو دیکھنا دو طرح پر ہے۔ ایک اس شخص کا دیکھنا جس کا اصل مقصد جسم مخروطی کا دیکھنا ہے۔ مرکز کا دیکھنا بالتبع اور بالعرض آجاتا ہے، برخلاف اس کے ایک دوسرا شخص ہے جس کے نزدیک اہم چیز مرکز پر نظر جمائے رکھنا ہے اور جسم مخروطی کا دیکھنا اس کے کئے بالتبع اور بالعرض ہے۔ اس قابل قدر تحقیق سے ہماری ان تحریرات کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے جو تو حید افعالی وغیرہ کے موضوع پر ہم نے لکھی ہیں۔ وہاں پر بھی ہمارا مقصد کسی وحدت کی بناء پر اللہ تعالیٰ کا علم حضور کا علم حضوری حاصل ہونا ہے جو اس کی ذات اقدس یا کسی صفت عالیہ مقدسہ تک پہنچا دے۔ سلف کے اس قول کے معنی بھی اس تحقیق سے واضح ہو جاتے ہیں کہ ''خدارا بہ خدائے می تواں شناخت، اللہ تعالیٰ کی معرفت اس کی الوہیت کی معرفت سے حاصل ہوتی ہے۔'' اس طائفہ عالیہ کے بعض دیگر اقوال کا بھی تم اس میں حل ڈھونڈھ سکتے ہو۔ جہاں میں نے ارتفاع غفلت کا ذکر کیا ہے۔ وہاں پر میری مراد علم حضوری کے دوسرے معنی ہیں۔ (۲) دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم حضوری

میں جس کا تعلق ذات اقدس سے اس کی صفات مقدسہ اور تمام کائنات کا علم شامل ہے، نہ صرف اس حیثیت سے کہ اس میں اتحاد ہے بلکہ مغایرت کی حیثیت سے بھی مؤخر الذکر کا علم، اول الذکر میں شامل ہے۔ کیونکہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی صفات عالیہ بمنزلہ لوازم ماہیت کے ہیں اور اس کی مخلوقات کی حیثیت لوازم وجود کی ہے۔ یہ اس کے مقدس تحقق کی وجوہ میں سے ایک وجہ اور اس کی ذات اقدس شؤون ذاتیہ میں سے ایک شان ہے، کیا عرفان (اہل معرفت کا وجدان) اور برہان (دلیل عقلی) دونوں اس بات کا اثبات نہیں کرتے کہ صفات عینیہ اور لوازم ماہیت کا علم نفس کے علم حضوری میں داخل ہے جس کسی نے اس علم حضوری میں واجب تعالیٰ کے ساتھ مشابہت حاصل کی اس کو کامل خوشی اور سرور حاصل ہوگا۔ جس کی نوعیت مقدس ہوگی (اس مشابہت سے کہیں مشابہت شرکیہ نہ سمجھ لیں۔ یہ اس قسم کی مشابہت ہے جس کا اشارہ اس حدیث میں ہے تخلّقو ابا خلاق اللّٰہ تعالیٰ)

ان دونوں مقدمات کو بطور تمہید ذکر کرنے کے بعد ہم اصلی مقصد سے تم کو آگاہ کرتے ہیں۔ ہر ایک شخص جو جنت میں داخل ہوگا۔ اس کو حور و غلمان اور قصور و اشجار و اثمار کا تفصیلی علم حاصل ہوگا جو اس کے نفس کے علم حضوری میں داخل ہے۔ اسی طرح ہر ایک چیز جو اپنی اس اصل تک آدمی کو پہنچادے جو اللہ تعالیٰ کی صفات مقدسہ میں سے کسی صفت کا تمثل ہے تو علم بالنفس کے ضمن میں یقیناً اس کو معرفت باللہ حاصل ہوگی (من عرف نفسہ فقد عرف ربہ) یہ معرفت یقیناً تفصیلی ہوگی، کوئی ایک شغل دوسرے شغل کے لئے سنگ راہ نہیں ہوگا، اور اس کی مثال واجب تعالیٰ جل مجدہ کے علم کی ہوگی۔ (اس کی بھی یہی صفت ہے کہ لا یشغلہ شان عن شان) یہ سب کچھ سبوغ اتم و اکمل کی برکت ہے۔ ہر ایک چیز جو جنت میں موجود ہوگی اس کے لحاظ سے اس کو ربوبیت حاصل ہوگی کیوں کہ ذات اقدس ہی اس کے تقرر اور تحقق کی اصل ہے اور اس کے مظاہر میں سے ہر ایک مظہر کو دیکھ کر اس کو خوشی اور سرور حاصل ہوتا ہے۔ یہ وہ نعمت ہے جو کسی ولی یا نبی تک کو نہیں عطا کی جاتی جب تک وہ اس جلیل القدر گھر (جنت) میں داخل نہ ہو۔ یہ تو تم پہلے معلوم کر چکے ہو کہ تجلّی ذاتی تک پہنچنے کے لحاظ سے لوگوں کے تین طبقے ہیں۔ میرا ذوق اور وجدان یہ کہتا ہے کہ جن کامل افراد کو فنا اور بقا کا مقام حاصل ہوا، وہ صفات اسے ایک اور طریقہ پر لذت

یاب ہوں گے۔ جس طرح کہ اللہ تعالیٰ کو اپنی صفات مقدسہ سے ابتہاج حاصل ہوتا ہے۔ ان لوگوں کیلئے کوئی شغل دوسرے شغل سے مانع نہیں ہوتا (جیسے کہ ابھی مذکور ہوا)۔

رؤیت کی حقیقت علم حضوری اور انکشاف کامل ہے۔ یہ انکشاف کبھی تو ذات اقدس کا اور کبھی صفات عالیہ مقدسہ کا ہوتا ہے۔ اس کی کیفیت یہ ہے کہ آدمی کا اپنا تقرر اور تحقق محو ہو کر ایک ہی واحد صمد کی ذات اقدس باقی رہ جاتی ہے۔ اس عالم مادی میں جو ایک ناقص عالم ہے یہ توحید (اور یہ انکشاف) کبھی مکمل نہیں ہو سکتا۔ شاباش ہے، اہل سنت پر کہ انہوں نے وہی بات کہی جو حق اور مطابق واقع تھی۔ بقول ان کے آنکھ کو بھی اس انکشاف کامل میں کسی نہ کسی طرح دخل ہے۔ یہ ہدایت ان کو رسول خدا صلعم کی تقلید کی برکت سے حاصل ہوئی جس کے دامن کو انہوں نے مضبوطی کے ساتھ پکڑے رکھا اس کی تحقیق میرے اپنے ذوق اور وجدان کے مطابق یہ ہے کہ بعض اوقات تجلی ذاتی جو علم اور انکشاف ہوتا ہے اس کا ذریعہ یہی ظاہری آنکھ ہی ہوتی ہے۔ کیوں کہ ہمارے نزدیک یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ اعضاء و جوارح اور اعراض کے لئے ایسی صورت علمیہ نہیں ہوتیں جن کو ہم اعیان سے موسوم کر سکیں، بلکہ وہ اعیان (ثابتہ) کی وجوہ اور حیثیات ہوتی ہیں۔ چنانچہ ظاہری آنکھ اس انکشاف کامل کا تمثل ہے جس کی حیثیت (جو اس کا مبدء ہے) عین ثابتہ میں مندرج ہے۔ جس طرح آدمی کا ہاتھ اس قوت عملیہ کا تمثل ہے جو صنع اور خلق کی جزئیات میں سے ہے۔ یہ بات بھی ہمارے نزدیک پایۂ ثبوت تک پہنچ چکی ہے کہ وہاں پر حقیقت اور تمثل میں اتحاد پایا جاتا ہے جو یہاں پر نہیں، اس کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ اس لئے ہم رسول خدا صلعم کا یہ قول سن کر کہ ''میں یمن کی طرف سے ایمان کی خوشبو محسوس کر رہا ہوں'' آپ کے قول کی حقانیت میں شک نہیں کرتے۔ شک کرنا بے وقوفوں سے مخصوص ہے۔ مثلاً فلاسفہ اور معتزلہ وغیرہ۔

بہت کچھ ردّ و قدح کے بعد ہمیں یہ یقین حاصل ہوا ہے کہ ہمارے رسول صلعم نے معراج کی رات اپنے ربّ تعالیٰ و تقدس کو اپنی آنکھوں سے دیکھا، اور موسیٰ علیہ السلام نے اپنے کانوں سے اس کا کلام سنا۔ ان باتوں پر ذرا بھی تعجب نہ کرو بلکہ ان کو تسلیم کرو اور ان پر ایمان لاؤ۔ ان باتوں کا انکار کرنا اپنی جہالت اور چھچھورا پن کا ثبوت دینا ہے۔ **سبحانک لا علم لنا الّا ما علّمتنا انک انت العلیم الحکیم** ''بار خدایا! ہم تو کچھ بھی نہیں جانتے، بجز اس کے کہ تو ہی ہمیں کسی

بات کا علم دے، بے شک تو ہی علیم وحکیم ہے۔'' بارخدایا میں تجھ سے درخواست کرتا ہوں کہ مجھ پر اپنی نعمت کو کامل کردے، تاویل الاحادیث سے مجھ کو بہرہ ور بنادے، دنیا اور آخری میں تو ہی میرا ولی وکارساز ہے، مجھ کو ایسی حالت میں اپنی طرف اٹھائیو کہ میں فناء تام کی وجہ سے دل وجان سے تیرا تابع فرمان رہوں، اور مجھ کو زمرۂ صالحین میں شامل فرمائیو، بے شک تو ہی قاضی الحاجات اور درجات کا بلند کرنے والا ہے۔

............☆☆☆............

دسواں خزانہ

فوائد متفرقہ کے بیان میں

رسول خدا صلعم کی ایک حدیث ہے ''میری امت میں تہتر مختلف فرقے پیدا ہونگے ایک ان میں سے جنت میں جائے گا، دوسرے سب دوزخ میں جھونکے جائیں گے۔'' ہمارے نزدیک سنی کا یہ مفہوم ہے کہ اس کا علم اور عمل سنت نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے موافق ہو۔ یہی فرقہ سب سے پہلے جنت میں جائے گا۔ جو باتیں متکلمین نے بدعت کے طور پر ایجاد کی ہیں وہ سراسر باطل ہیں اور اس قابل نہیں کہ ان کا اتباع کیا جائے اسی طرح جن احکام شرعیہ کی بناء قیاس پر ہے ان سے بھی ہم مطمئن ہیں۔

امام ابوالحسن اشعریؒ کے مذہب کو ہم بہ نظر وقعت دیکھتے ہیں اور ہماری رائے میں وہ صحابہ کے مذہب کے موافق ہے اور اسی کا تمثل ہے۔ اس کا مسلک ارادۂ متجددہ کے فروع اور اس کے ماتحت ہے۔ اس کے علم و معرفت کا دارومدار اسی پر ہے۔ یہ اصول اس کے پیش نظر رہتا ہے کہ ہر ایک غیر ضروری تفصیل کو نظر انداز کیا جائے۔ اگر تم کو صحابہ کے مذہب پر عبور حاصل ہے تو تم اسی نتیجہ پر پہنچو گے کہ امام موصوف کا مذہب درحقیقت اس کے مطابق ہے۔ مثلاً اس کا قول ہے کہ وجود عین ماہیت ہے اس سے اس کی مراد یہ ہے کہ ''عدم بسیط'' اور ''وجود'' کے درمیان جو فرق پیدا ہوتا ہے۔ اس کا دارومدار کسی چیز کی ذات پر ہے۔ اس کا قول ہے کہ اسم اور مُسمّیٰ عین یکدگر ہیں۔ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ اسم اپنے مسمّیٰ پر پورے طور سے صادق آتا ہے اور اس کا عنوان ہوتا ہے۔ اس کا قول ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو ملائکہ پر فضیلت حاصل ہے۔ اس کی مراد وہ افضلیت ہے جس کا تعلق اسم حادث سے ہے۔ ایک حکیم ربانی بھی اسی اسم پاک کے لحاظ سے انبیاء علیہم السلام

خصوصاً ہمارے رسول صلعم کو ملائکہ سے افضل سمجھتا ہے۔ ابن ماجہ کی حدیث میں جن انبیاء کا خصوصیت سے ذکر کیا گیا ہے۔ان کے اسم میں زائد سبوغ اور ظہور پایا جاتا ہے۔امام موصوف کا قول ہے کہ اعمال کا حسن اور قبح (عقلی نہیں) شرعی ہے۔اس سے مراد یہ ہے کہ تحقق حادث کو ملحوظ رکھا جاتا ہے تو اعمال کے حسن و قبح کو شرعی ہی کہنا پڑے گا۔ ہمارے نزدیک اس بارے میں فصل الخطاب یہ ہے کہ درحقیقت کسی فعل کا حسن اور قبح ازلی ہے عقل اس حکم ازلی کی تبیین اور اس کا اظہار کرتی ہے۔ پھر جب شریعت کا نزول ہوا تو ایک اور حیثیت سے حسن اور قبح کو تحقق حاصل ہوا، چنانچہ شیخ اشعریؒ کی نظر اسی پر پڑی ہے۔ برخلاف اس کے معتزلہ نے حسن و قبح اعمال کو عقلی تصور کیا ،کیونکہ وہ اپنی عقل کو کافی رہنما خیال کرتے ہیں اور صحابہ کی تقلید نہیں کرتے۔

شیخ موصوف عصمت انبیاء کے قائل ہیں۔ حکیم ربانی کا بھی یہی مسلک ہے۔البتہ عصمت کے مراتب حکیم کے نقطہ نظر سے مختلف ہیں۔ ہماری رائے میں عصمت فقط کبائر ذنوب سے مانع ہے اور ارتکاب صغائر کرتے ہوئے بھی طبیعت کو قلق ہوتا ہے،خلق افعال اور استطاعت مع الفعل کے مسئلہ میں بھی امام مذکور حق بجانب ہیں۔ کیونکہ ہم اس بات کی توضیح کر چکے ہیں کہ تمام ممکنات کا معرض ظہور میں آنا، اللہ تعالیٰ کے ساتھ وہی نسبت رکھتا ہے جو سورج کی روشنی کو عین آفتاب کے ساتھ ہے۔ بلکہ یہ نسبت اس سے بھی کامل تر اور زیادہ مستحکم ہے۔(جامی علیہ الرحمۃ نے بھی اسی نسبت کو مدنظر رکھ کر غالباً یہ شعر کہا ہے۔

وجودش آں فروزاں آفتاب است
که ذره ذره ازوے نور یاب است

ممکنات کے نفس وجود اور ظہور کی طرف ان کے افعال بھی اسی کے تصرف کا نتیجہ ہیں شیخ موصوف نے اپنی صفت ''امیّت'' کی وجہ سے افعال پر اکتفاء کی، شیخ موصوف کلام نفسی کے قائل ہیں۔اس کا مفہوم اور مراد ہم مبحث کلام میں بیان کر چکے ہیں۔ان کے شاگردوں اور پیروؤں نے جو توجیہات اس کے قول کی کی ہیں۔وہ نا قابل التفات ہیں۔اشعریؒ کا یہ کہنا بھی درست ہے کہ الـمُسَـعِرّ (نرخ مقرر کرنے والا) وغیرہ بھی اسماء حسنیٰ میں سے ہیں، کیونکہ وسائط کے سلسلہ کو آخر تک پہنچایا جائے تو وہ اللہ تعالیٰ ہی کی ذات اقدس پر منتہی ہوتا ہے۔ممدوح اپنی ''اُمیّت'' کی وجہ

سے ان کو اسماء اور صفات حقیقیہ سمجھتا ہے، لیکن اس کا کچھ مضائقہ نہیں۔ شیخ موصوف احوال آخرت کے متعلق عذاب القبر، حساب کتاب، میزان، رؤیت، اور شفاعت کے قائل ہیں اور ان کا یہ قول حق ہے۔ ان مسائل کے اسرار تم اس کتاب میں معلوم کر چکے ہو۔ وہ تحیّز نفس کا بھی قائل ہیں اور اس میں بھی وہ محقق ہیں۔ تحیز نفس کا بھی ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ ان کا قول ہے کہ عالم حادث زمانی ہے۔ اور حادثات کے لئے حدوث شرط ہے۔ یہ سب باتیں اس کی 'اُمیّت' کا نتیجہ ہے اور یہ کہ وہ ارادۂ متجدّدہ میں محو ہو چکا تھا۔ اسی بناء پر وہ یہ کہتے ہیں کہ ارادہ قدیم ہے لیکن اس کے تعلقات حادث ہیں۔ اصبع اور یمین اور وجہ کو صفات الٰہی تصور کرنا بھی اس کی ''امیّت'' کی دلیل ہے۔ ان کا یہ بھی قول ہے کہ نبی کے لئے کسب اور استعداد شرط نہیں۔ اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ بہ تکلف کوئی بھی نبوت کا اکتساب نہیں کر سکتا۔ یہ اس کی ''اُمیّت'' ہی کا تقاضا ہے کہ استعداد اس کے سامنے نمایاں نہیں ہوئی۔ ایمان اور اسلام اور تصدیق کے مفہومات میں جو اختلاف کیا گیا ہے وہ فقط نزاع نفسی ہے، معنوی اور حقیقی نہیں۔ بااین ہمہ اشعریہ کے طریق تعبیر کو ہم حق سمجھتے ہیں۔ کیوں کہ صدر اول (عہد صحابہ) کی یہی اصطلاح ہے۔ خلافت راشدہ تیس سال تک رہی۔ خلیفہ اول ابوبکر صدیق ہیں اور آپ کے بعد وہی ترتیب، خلافت کی ٹھیک ہے جو ظہور میں آئی۔ کبیرہ کا مرتکب ایمان اقراری سے خارج نہیں سمجھا جا سکتا۔

یہ وہ چوبیس مسائل ہیں جن میں اشعریہ اور دوسرے طوائف کلامیہ (مثلاً ماتریدیہ اور معتزلہ وغیرہ) کا اختلاف ہے۔ ہم نے اہل سنت کی تحقیق ان مسائل میں بیان کر دی ہے۔ بہرکیف اگر تم صحابہ کی حالت کو پیش نظر کر لو تو اشاعرہ ہی کا مذہب تم کو تحقیق پر مبنی معلوم ہوگا۔ (اور صحابہؓ اور انکے مذہب میں کچھ زیادہ تفاوت نہیں پاؤ گے) اسی حالت کی (جس پر صحابہ کرام تھے۔ تقلید کرنا تمام مقلدین پر لازم ہے اور جس نے اس سے روگردانی کی، وہ گمراہ اور خطا کار ہے۔

اعمال کے متعلق ہمارا نظریہ یہ ہے کہ احادیث کی چھان بین کی جائے اور فقہ اور درایت کے ساتھ ان ہی کے مطابق اپنے اعمال کو درست کیا جائے۔ حکیم ربانی کے نزدیک قیاسات میں سے صرف وہی مقبول ہے جو قیاس جلی ہو یا وہ قیاس خفی جس کی بناء مصلحت عامہ پر ہو جو لوگ اتباع رائے میں تعمق کرتے ہیں وہ قطعاً اہل سنت نہیں۔ مذاہب اربعہ میں اقرب الی السنۃ امام شافعی کا

مذہب ہے بشرطیکہ اس کی تنقیح اور تمحیص کی جائے۔ امام ممدوح کی عقابی نظر علل اور اسباب کی حقیقت تک فوراً پہنچ جایا کرتی ہے۔

صحابہ سے جو اختلاف احادیث کی روایت کرنے میں واقع ہوا ہے۔ اس کی کئی وجہیں ہیں (۱) ایک تو یہ کہ وہ اکثر روایت بالمعنی کرتے تھے (جس کی وجہ سے اختلاف کا ظہور میں آنا ناگزیر تھا)۔ (۲) دوسرے کہ ایک راوی کسی عبارت یا کسی فقرے کو حدیث میں سے حذف کر دیتا، برخلاف اس کے دوسرا راوی اس کو بیان کر دیتا۔ (۳) ایک راوی کو کچھ وہم سا ہو جاتا ہے اور اس لئے اس کی تعبیر دوسرے راویوں سے مختلف ہوتی تھی۔ مثلاً ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول خدا صلعم (حجۃ الوداع کے موقعہ پر) جب اونٹنی پر سوار ہوئے تو آپ نے لبیک کہہ کر اپنی آواز مبارک بلند کی اور جب ٹیلے پر چڑھے تب بھی تلبیہ باآواز بلند کہا۔ اب بعض راویوں کو یہ وہم ہوا کہ آپؐ نے اونٹنی پر سوار ہو کر احرام باندھا اور بعض نے یہ خیال کیا کہ ٹیلے پر چڑھ کر احرام باندھا اور تلبیہ کہا، بحالیکہ آپ اس وقت احرام باندھ چکے تھے۔ جب آپ نے مسجد ذی الحلیفہ میں دو رکعت نماز ادا کی (۴) بعض اوقات نسیان کی وجہ سے اختلاف پڑ جاتا ہے اور ایک لفظ دوسرے سے بدل جاتا ہے مثلاً واقعہ کسوف میں ایک راوی کی روایت ہے کہ ایک شخص (مرد) نے آپ سے عرض کیا، دوسرا کہتا ہے ایک عورت نے عرض کیا۔

آیات کے شان نزول میں اس لئے اختلاف پیدا ہوا کہ بسا اوقات جب صحابہ کرامؓ کسی آیت کی تفسیر کرنے لگتے تو اس کا مصداق واضح کرنے کے لئے کوئی فرضی قصہ (بطور مثال) بیان کرتے یا کوئی ایسا واقعہ سناتے جو عہد نبوت میں واقع ہوا ہوتا اور اس آیت کے متضمنہ حکم کلی کی جزئیات میں سے ہوتا، یہ سن کر راوی خیال کرتا کہ آیت کے نزول کا سبب بعینہ وہ قصہ یا واقعہ ہے اور اسی کے بارے یہ آیت یا آیات نازل ہوئیں۔ وقت نزول میں اختلاف پیدا ہونے کا باعث یہ ہے کہ رسول خدا صلعم کسی واقعہ کے پیش آنے پر کلام مجید کی کسی آیت یا آیات سے استشہاد فرماتے یا اس واقعہ کا حکم اس آیت یا آیات سے استنباط فرماتے۔ اس سے راوی کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ اسی واقعہ کے لئے یہ آیات یا یہ آیت نازل ہوئی ہے۔ احکام شرعیہ کے متعلق جو اختلاف صحابہ میں پیدا ہوا اس کا باعث یہ ہے کہ آپ کی سنتیں مختلف ہیں؟ کسی نے ایک پر عمل کیا۔ کسی نے

دوسری سنت کی پابندی کی اور اس پر عمل پیرا ہوا (ممکن ہے بلکہ اغلب ہے کہ رفع یدین اور آمین بالجہر وغیرہ اختلافات اسی قسم کے ہوں۔ ورنہ ممکن نہیں کہ اسلام کا ایک رکن جس کو روزمرہ پانچ دفعہ عمل میں لایا جاتا ہے اور جس کو عہد بنوت میں سینکڑوں نہیں، ہزاروں دیکھنے والے تھے اس کی کیفیت میں اختلاف پیدا ہو۔ رکعات کی تعداد اور ارکان نماز میں کیوں اختلاف پیدا نہیں ہوا؟ اچھی طرح سمجھ لو)۔ یا یہ کہ دو صحابیوں نے بیک وقت آنحضرت صلعم کو کوئی عمل کرتے ہوئے دیکھا یا آپ کی حدیث سنی۔ لیکن ایک نے اس کی ایک طرح پر توجیہ کی، دوسرے نے اس کو کسی اور علّت یا جہت پر محمول کیا۔ وقت اور جگہ اور آراء مختلفہ کی بنا پر اکثر مصالح میں اختلاف پڑ جاتا ہے، اس لئے ایک ہی سوال کے دو مختلف جواب ہو سکتے ہیں۔ راوی اکثر اس بات کو نظر انداز کر دیا کرتے ہیں۔ صحابہ کا درجۂ کمال بھی مختلف ہے۔ کوئی تو متوحد معتدل ہے، کوئی خلیفہ ہونے کی استعداد رکھتا ہے، کوئی فقیہ اور کوئی اس سے بھی فقیہ تر ہے۔ ہم نے پہلے بھی ان کے بعض اقسام بیان کئے ہیں۔ صحابہ ہی کا اختلاف بعد کے لوگوں کیلئے اختلاف کا موجب ہوا۔ اچھی طرح سمجھ لو۔

اس بات کو خاص طور پر یاد رکھو کہ ایمان کی اصل (حقیقت) یہ ہے کہ آدمی کا ظاہر و باطن اللہ تعالیٰ کا مطیع اور منقاد ہو جائے۔ اس لئے کسی نہ کسی شکل میں حکمت، عصمت اور وجاہت اس کا اقتضاء ذاتی ہے۔ اگر چہ یہ عالم مادی ان صفات کے کماحقہٗ ظہور میں آنے سے مانع ہے۔ اسی طرح کفر کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی ظاہر اور باطن میں اللہ تعالیٰ کے حکموں نے روگراں ہو، اس لئے اس کا ذاتی اقتضاء یہ ہے کہ وہ ان اوصاف کی اضداد سے موصوف ہو۔ جب شرائع نے احکام کی تعیین کر دی تو ایمان کا لفظ شہادتین کے لئے مخصوص ہو گیا اور کفر کا یہ مفہوم قرار پایا کہ کوئی شہادتین سے منکر ہو، اس اصطلاح کو مدنظر رکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایمان فقط اقرار باللسان ہے اور کفر کے معنی یہ ہیں کہ زبان سے شہادتین کا انکار کرے۔ جان و مال کے محفوظ ہونے اور مستحق جہاد و قتل ہونے یا نہ ہونے کے احکام شرعیہ کی بنا اسی اصطلاح پر ہے۔ شرع کی ایک اور اصطلاح بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ مؤمن کا لفظ اس کے لئے مخصوص ہے جس میں یہ صفات مذکورہ بالا کسی نہ کسی شکل میں موجود ہوں۔ اس کے مدّ مقابل کو منافق اور مریض القلب سے موسوم کیا گیا ہے۔

اس سے تمہیں معلوم ہو گیا ہو گا کہ شرع کی اصطلاح میں منافق کے دو معنی ہیں۔ ایک وہ جو

دل اور زبان سے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کے رسول کی رسالت کی تصدیق کرے، لیکن اس کی زبان اور اس کی شرمگاہ وغیرہ کو گناہوں نے اس کو گھیر رکھا ہو۔ امراض قلوب میں سے ایک وہ شرک باللہ ہے جس میں غیر اللہ سے اپنی مرادیں مانگتے ہیں۔ غیر اللہ کی پرستش کرتے ہیں۔ ان کے لئے ذبح کرتے ہیں، ان کے لئے منتیں مانتے ہیں، اور ان کے نام کی قسمیں کھاتے ہیں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کو خالق مانے، آخرت کا قائل ہو اور رسول کی رسالت کا اقرار کرتا اور اس کی اطاعت پر آمادہ ہو۔ یہ سخت ترین قسم کا نفاق ہے۔ اس قسم کے منافق عذاب پانے کے بعد داخل جنت ہوں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ، دوزخ میں ہمیشہ نہیں رہیں گے، کیونکہ اگرچہ وہ خطا کار ہیں، ضلالت پر ہیں، پھر بھی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلعم کو اپنی جائے پناہ تصور کرتے ہیں۔ لیکن یہ حکم اس قسم کے لوگوں کا اس وقت تک ہے جب تک کہ کوئی رسول مبعوث ہو کر ان کو حقیقتِ حال نہ سمجھا دے۔ بعثت رسول اور اتمام حجت کے بعد اگر کوئی تکذیب پر مُصِر رہا تو وہ یقیناً مخلّد فی النار ہوگا۔ رسول اللہ صلعم کی بعثت سے پہلے جو یہود اور نصاریٰ تھے وہ اسی قسم کے لوگ تھے جب آپ مبعوث ہوئے تو انکار اور جحود کی وجہ سے (اتمام حجت ہونے پر) وہ کافر مطلق قرار پائے۔ کلام مجید کی یہ آیت اسی بارے میں ہے وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ''ہم کسی قوم کو اس وقت تک عذاب نہیں دیتے جب تک کوئی رسول (ان کے پاس) نہ بھیجیں۔'' حسد اور حقد اور خواہشات نفسانی کا اتباع بھی امراض قلب میں سے ہے۔ آپ نے جس حدیث میں نفاق کی علامات بیان فرمائی ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جو کچھ ہم نے لکھا ہے وہ درست ہے جن امراض باطنیہ کا تعلق اعضاء جوارح سے ہے ان کا شمار مشکل ہے۔ خلاصہ یہ کہ جس کو گناہوں نے گھیر لیا، بالفاظ دیگر اس کو کسی گناہ میں فنا حاصل ہوئی (وہ اس میں محو ہو گیا) وہ اسی پہلے معنی کے لحاظ سے منافق ہے۔ صحابہ کا خوف اسی قسم کے نفاق سے تھا۔ دوسری قسم منافق کی وہ ہے جو زبان سے تصدیق کرتا ہو۔ لیکن اس کے دل میں تکذیب ہو۔ اسی قسم کے منافق ہیں جن کے حق میں یہ آیت نازل ہوئی۔ اِنَّ الْمُنَافِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ''بے شک منافق لوگ دوزخ کے سب سے نچلے طبقے میں ہونگے۔'' استغفرت لهم او لا تستغفرلهم الخ کی آیت بھی انہیں کے حق میں ہے۔ الغرض منافق کا لفظ ان دونوں معانی میں مشترک ہے۔ اسی فرق کو نہ سمجھنے

کی وجہ سے بہت سے لوگ گومگو میں پڑ جاتے ہیں۔

کفر کی انواع اگر چہ مختلف ہیں اور ان سب کے لئے ایک حکم متفق علیہ ہے کہ ان کا ٹھکانا، دوزخ ہے، لیکن ہر ایک نوع کے مخصوص احکام شرع میں نہیں، اس لئے اصطلاح مذکور بالا کے بموجب ان کے معانی مختلف نہیں۔ حدیث میں ہے کہ بعض کافروں کے عذاب میں تخفیف کی جائے گی، یہ کافر اسی قسم کا ہوگا۔ جس طرح مؤمنوں کے اندر منافق ہوتا ہے۔ اچھی طرح سوچ لو، انشاء اللہ تعالیٰ ہدایت پاؤ گے۔

یہ بات بھی خاص طور پر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ صدر اول (عہد صحابہؓ) میں نسخ کے لفظ کو مطلق مٹانے کے معنی میں استعمال کیا جاتا تھا۔ (اس کے کوئی خاص اصطلاحی معنی نہیں تھے) اب خواہ اس مٹ جانے کا سبب یہ ہو کہ اس کے عالم صفحۂ زمین پر باقی نہ رہیں مثلاً علم نجوم اور رمل، یا کسی قیاس باطل کو ردّ کیا جائے۔ جس طرح کہ بحیرہ اور سائبہ کا نسخ عمل میں لایا گیا۔ (یہ بت پرستوں کے مقرر کئے ہوئے جانور تھے جن کو ذبح کرنا یا تو وہ جائز نہیں سمجھتے تھے یا اس پر خاص قیود اور پابندیاں عائد کر رکھی تھیں)، یا یہ کہ جو حکم شرعی نافذ تھا اس کی مدت نفاذ کے ختم ہو جانے کا اعلان کیا جائے یا مثلاً یہ بتایا جائے کہ کسی لفظ کا مفہوم موافق یا مخالف (جو متبادر الی الفهم ہے) مراد نہیں، وغیرہ وغیرہ اکثر مفسرین اس جلیل القدر نکتہ سے غافل رہے اور خبط میں پڑ گئے (بہت جگہوں پر ٹھوکریں کھائیں)۔ یہ بھی یاد رکھو کہ قرآن مجید میں جہاں ارادہ اور مشیئت کا لفظ استعمال ہوا ہے نیز امر اور اذن کا لفظ، یہ چاروں الفاظ اس کی رضامندی کا اظہار کرتے ہیں۔

یاد رکھو جن کافروں کے ساتھ قرآن مجید میں مجادلہ کیا گیا ہے وہ دو قسم کے لوگ ہیں ایک مشرکین۔ یہ لوگ اپنے اصنام کو عبادت میں اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہراتے تھے ان سے مرادیں مانگتے تھے۔ ان کے نام پر ذبح کرتے تھے، ان کی یاد میں مشغول رہتے۔ (ان کا نام جپتے رہتے) اور استعانت واستغاثہ کے طور پر ان کو پکارتے تھے ان کے لئے منتیں مانتے تھے، اور ان کے نام کی قسمیں کھاتے تھے۔ ان کی گمراہی کی بنیاد یہ تھی کہ انکے باپ دادا کو بعض مقرب لوگوں کی صحبت حاصل ہوئی، اور بعض ملائکہ سے انہوں نے رشتۂ عقیدت جوڑا، ان کی کرامات مشاہدہ کیں اور ان کو واجب التعظیم سمجھا۔ انکی اس تعظیم کا باعث یہ تھا کہ ان کے دلوں میں یہ عقیدہ جم گیا تھا کہ ان کو

واسطہ اور وسیلہ قرار دیئے بغیر کسی کو اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل نہیں ہو سکتا اس لئے وہ اس کے مستحق ہیں کہ ان کی تعظیم کی جائے اور اپنی مرادیں اور حاجتیں ان سے طلب کی جائیں۔ یہ باتیں ان میں شائع ہو گئیں۔ چنانچہ ان کی نسلوں میں یہ عقیدہ اس قدر استحکام پکڑ گیا کہ وہ من کل الوجوہ پکے مشرک ہو گئے اور اپنے دلوں میں ان مقربین کو تقریباً معبود اور خالق سمجھنے لگے۔ انہوں نے عالم قدس کو اسی عالم مادی محسوس پر قیاس کیا۔ انہوں نے دیکھا کہ عظیم الشان شہنشاہ کا قرب حاصل کرنے کی سوائے، اس کے اور کوئی صورت نہیں کہ پہلے اس کے مصاحبین اور مقربین، خلفاء ونواب کا قرب اور ان کی خوشنودی حاصل کی جائے (**ما نعبدهم الا ليقربونا الى الله زلفى**)۔ یہ لوگ ارسال رسل اور بعثت انبیاء کو تسلیم کرتے تھے، اور ملت ابراہیمی کے اتباع کے مدعی تھے، لیکن ہمارے رسول صلعم کی بنوت سے اس لئے انکار کرتے تھے کہ بشر میں وہ ہماری طرح کھاتے پیتے صنفی تعلقات میں مبتلا ہیں اس لئے اس کا خیال تھا کہ اس کو ہم پر کسی قسم کی فوقیت حاصل نہیں (ہم کیوں اس کا اتباع کریں) جاہلوں کی عادت ہے کہ جس کسی کو انہوں نے دیکھا نہیں ہوتا (اور نادیدہ اس کے مناقب سنتے ہیں) تو وہ اس کو مقدس اور فوق البشر ہستی خیال کرتے ہیں۔ برخلاف اس کے اگر کوئی صاحب کمال ان کے سامنے ہو اور وہ یہ دیکھ لیں کہ یہ بھی ہماری طرح کی زندگی بسر کرتا ہے اور اس کی عادات ہم سے مختلف نہیں تو وہ اس کے تفوق اور اس کی فضیلت کا انکار کرتے ہیں۔ ان لوگون کے دیگر انبیاء علیہم السلام کو ماننے اور رسول خدا محمد مصطفیٰ صلعم کی رسالت سے انکار کرنے میں یہی راز تھا۔ یہ لوگ بعث بعد الموت اور جزا وسزا کے بھی منکر تھے۔ ان کے دلوں میں یہ عقیدہ پیدا ہونے کی وجہ یہ تھی کہ وہ مدت ہائے دراز سے اس بات سے مالوف تھے کہ اس عالم کا نظام جوں کا توں قائم ہے حقیقت کی تہ تک پہنچنے سے ان کی نگاہیں قاصر تھیں۔ انہوں نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ یہ نظام دائمی ہے۔ (**وقالوا ماهي الا حياتنا الدنيا نموت و نحيا الخ**) اور اس کیلئے زوال نہیں۔ وہ اس بات کو بھی بعید از صواب اور دور از عقل سمجھتے تھے کہ جب آدمی مر کر اس کے اجزاء پراگندہ اور منتشر ہو جائیں تو پھر وہ کونسی طاقت ہے جو ان اجزاء متفرقہ کو فراہم کر کے ان کو حیات جدیدہ عطا کرے۔ علاوہ ازیں انہوں نے اپنی رائے اور اسلاف کی تقلید سے بعض ایسی چیزوں کو حرام قرار دے رکھا تھا جو اللہ تعالیٰ کے حکم میں حلال تھیں

اور ایسی چیزوں کو حلال سمجھتے تھے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک حرام تھیں۔ اس بدعت کی بنیاد عمرو بن لحی نے ڈالی تھی، جس نے سب سے پہلے سوائب کو رواج دیا(۱)۔ جاہلوں کا دستور ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی پروا نہ کرتے ہوئے اپنی رائے فاسد سے بعض امور کو واجب قرار دیتے ہیں۔ دوسرے جہلاء جب دیکھتے ہیں کہ دنیاوی زندگی میں ان کی آسائش اور عزت حاصل ہے تو وہ (ان کی عزت وخوشحالی اور ان کے رسوم میں لازم ملزوم کا رشتہ فرض کرکے) انہیں کے نقشِ قدم پر چلنے میں اپنی سعادت سمجھتے ہیں۔ یہ وہ پانچ بڑے بڑے مسائل ہیں جن کے متعلق قرآن مجید میں مشرکین سے مجادلہ اور ردّ وقدح کی گئی ہے۔

دوسرا گروہ جن کے ساتھ قرآن مجید نے مجادلہ اور مباحثہ فرمایا ہے اہل کتاب (یہود ونصاریٰ) ہیں۔ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے لئے اثبات ولد کرتے تھے۔ اس غلط اور باطل عقیدہ کی بنیاد یہ تھی کہ عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک خاص منزلت حاصل ہے اور وہ (حضرت مسیحؑ) اس خصوصیت سے ممتاز تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو بغیر باپ کے پیدا کیا، جس کا کوئی سبب ظاہری نہیں تھا، فقط یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کا مجرب بندہ تھا۔ عزیر علیہ السلام کو بھی اسی طرح بارگاہ کبریا جلّ وعلا میں خصوصیت حاصل تھی ان ہی خصوصیات کو اہل کتاب نے ابنیت سے تعبیر کیا، جن کے اخلاف اس کو حقیقی ابنیت سمجھنے لگے لیکن اول الذکر تعبیر بھی (باوجود مجاز ہونے کے) غلط ہے کیونکہ خصوصیت کو ابنیت سے تعبیر کرنا مجاز ہے لیکن یہاں پر کوئی امر جامع نہیں جس سے دونوں کے مفہوم میں اشتراک پایا جائے، بالفاظ دیگر ان کے درمیان علاقات مجاز میں سے کوئی ایسا علاقہ نہیں جس کو مستند خیال کیا جائے۔ اس سے قطع نظر کرکے ابنیت کو ان مجازی معنوں میں استعمال کرنا مصلحت کے خلاف اور اللہ تعالیٰ وتقدس کے حق میں سوءادب ہے۔ جب پہلی (مجازی) تعبیر باطل ٹھیرتی ہے تو پھر حقیقی ابنیت کا بطلان تم خود سمجھ لو۔ اہل کتاب آنحضرت صلعم کی بعثت کے بھی منکر تھے، جس کے بواعث مختلف تھے (الف) وہ اپنے زعم باطل میں سمجھتے تھے کہ نبوت پر فائز ہونا بنی اسرائیل کے لئے مخصوص ہے۔ (ب) غرض پرستی اور حسد اس انکار کا دوسرا باعث تھا۔ (ج) تورات اور انجیل کی

(۱) سوائب جمع سائبہ کی ہے جس کے معنی ہیں وہ جانور جو بتوں کے نام پر کھلا چھوڑ دیا جاتا تھا اور کوئی اس سے تعرض نہیں کرتا تھا۔ جیسا کہ ہندوؤں کے یہاں سانڈ وغیرہ، اس کی واضح مثال ہے)

پیشین گوئیاں ایسے الفاظ میں تھیں جن کو مختلف معانی پر محمول کیا جا سکتا تھا۔ خصوصاً جب کہ انکے اسلاف اور قدماء نے انکو باطل معانی پر محمول کیا تھا (اندریں صورت ان کا اپنے اسلاف کی تقلید چھوڑ کر حق کے سامنے گردن جھکا دینا، ناممکن نہیں تھا تو دشوار ضرور تھا)۔

یہ لوگ اپنی کتاب مقدس میں دو طرح کی تحریف کرتے تھے۔ ایک یہ کہ وہ اس کی عبارتوں کی غلط توجیہیں کرتے اور جب ان توجیہات کو لکھ لیتے تو اپنی ان تحریرات کو جو دراصل کتاب اللہ کا محرّف ترجمہ اور تفسیر ہوتی تھی حقیقی تورات اور انجیل سے موسوم کرتے تھے۔ (مثلاً یہ کہتے کہ تورات میں اسی طرح لکھا ہے یا خدائے پاک کا یہ حکم ہے)۔ دوسری صورت یہ تھی کہ وہ قیاس یا استنباط کر کے کوئی حکم شرعی بیان کرتے، بحالیکہ وہ قیاس اور استنباط اصول صحیحہ پر مبنی نہیں ہوتا تھا بلکہ قیاس فاسد اور استنباط باطل ہوتا تھا۔ اسی کو وہ اس طرح ظاہر کرتے تھے گویا وہ تورات اور انجیل کا حکم ہے۔ (یعنی حقیقتہً یہی حکم شرعی ہے)۔ بہرحال اہل کتاب کے ساتھ ان ہی تین اہم مسائل کے متعلق قرآن مجید میں بحث کی گئی ہے جن کی اصلیت اور غلط فہمی کی وجہ ہم نے بیان کر دی ہے۔

یاد رکھو تفسیر کی دو قسمیں ہیں۔ ایک اہل ظاہر کی تفسیر ہے، دوسری قسم کی تفسیر حکماء ربانیین کے ساتھ مخصوص ہے۔ تفسیر ظاہر کے لئے یہ ضروری ہے کہ آدمی کو عربیت میں کامل دسترس حاصل ہو اور اسی طرح حدیث میں کافی دستگاہ رکھتا ہو اس سے اس میں اس بات کا ملکہ پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ موارد کلام کو سمجھ سکے اور قرآن مجید کی آیات سے صحیح طریقہ پر استنباط کر سکے (جو نہ تو اہل زبان کے محاورات کے خلاف ہو اور نہ ہی کوئی حدیث مرفوع اس کے خلاف ہو) دوسری قسم کی تفسیر ان کے حصہ میں آتی ہے جنہوں نے رسول خدا صلعم کی کامل پیروی کر کے حکمت اور عصمت اور وجاہت کے اقتضاءات کو کما حقہ پورا کیا ہو۔ الٰہیات اور معادیات وغیرہ کے حقائق پر ان کا علم محیط ہو، آیات کلام مجید کے مرکزی مفہوم پر (۱) ان کی نظر رہتی ہو، اور وہ اپنی تیز فہم بصیرت سے ہر ایک آیت کے متعلق یہ کہنے کے قابل ہو کہ اس کا صدور کونسی بارگاہ سے ہوا۔ قرآن مجید پر کامل ایمان رکھنے کی حقیقت یہی ہے اور تصدیق کا یہ منتہائے کمال ہے۔

علیٰ ہذا القیاس حدیث کا جاننا بھی دو طرح پر ہے۔ ایک طریقہ اہل ظاہر کا ہے جس کا

(۱) شاہ صاحبؒ نے اس کو مناط سے تعبیر فرمایا ہے

دار و مدار راویوں کے ثقہ یا غیر ثقہ ہونے اور غریب الحدیث جاننے پر ہے۔ برخلاف اس کے حکماء ربانیین کا مطمح نظر تشریع (کے اصول) اور علم کی حقیقت جاننا ہوتا ہے۔ یادرکھو علم آنے جانے والی چیز نہیں، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک ازلی ابدی (حقیقت) ہے جس نے اس کو پالیا اس نے بہت بڑی کامیابی حاصل کی۔ اسی طرح قیاس کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک طریقہ اہل ظاہر اور اہل نظر کا ہے (مثلاً اصولیوں اور منطقیوں کے قیاسات) جس کی حقیقت یہ ہے کہ کسی چیز کے علل و اسباب کا علم حاصل کیا جائے اور مقیس کو مقیس علیہ پر تطبیق دی جائے۔ لیکن اہل حکمت کے قیاس اوران کے افکار عالیہ کی حقیقت اس سے بالاتر ہے کہ معمولی اذہان اس کا ادراک کرسکیں۔ ممکن ہے ہم ان علوم کو ایک مستقل تصنیف کی صورت میں شائع کریں۔ و اللہ تعالیٰ ھو الموفق و بیدہ الخیر۔

انواع حکمت میں سے حقائق حروف کا جاننا ہے۔ چنانچہ الف کا مفہوم غیب محض ہے بشرط لاشیٔ۔ (ب) کے معنی لزوم تدنس کے ہیں۔ (ت) میں غالبًا اس کی تکمیل ہے یعنی وہ تدنس جس کی حقیقت متعین نہیں۔ (ث) غالبات کا بدل ہے اور اس کے بعینہ وہی معنی ہیں۔ فرق یہ ہے کہ اس مفہوم لطیف تر ہے۔ (ج) کا مفہوم وہ تخلیط ہے جس کی ماہیت میں نورانیت نہیں۔ (ح) کے معنیٰ ہیں غیب بشرط شیٔ، (خ) اور (ح) کے ایک معنی ہیں لیکن اس میں لزوم اور تخلیط اس سے زائد ہے۔ (د) کا مفہوم وہ لزوم ہے جس میں وہ نفکاک نہیں ہوتا۔ (ذ) کے بھی یہی معنی ہیں، لیکن اس میں ایک موہوم جیسی لطافت ہے۔ (ر) کے معنی ظہور کے ہیں جس میں تکرار اور تردد کا مفہوم شامل ہے۔ اس سے ہمارا مطلب یہ ہے کہ کبھی اس کا ظہور اور کبھی استتار ہوتا ہے یا اس سے دو طرح کے اثرات ظہور میں آتے ہیں ظاہر اور باطن۔ (د) اور (ج) کے ایک معنی ہیں لیکن اس میں لطافت اور نیز کسی قدر لزوم کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ (س) کا مفہوم سریان ہے خواہ موہوم ہو یا حقیقی۔ (ش) کے معنی انطباق اور شمول کے ہیں۔ (ص) کے معنی رفعت کے ہیں جس میں کہ عود کا مفہوم پایا جائے۔ (ض) کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی صورت ناقص سے ناقص تر ہو جائے۔ (ط) کا مفہوم غیب ہے بشرط لاشیٔ۔ (ظ) اس ظہور کا نام ہے جس میں لطافت تو ہو لیکن نورانیت نہ ہو۔ (ع) اور (ح) کے ایک معنی ہیں لیکن اس میں چمک اور نورانیت پائی جاتی

ہے۔ (غ) کے معنی گری ہوئی اور بے نور چیز کے ہیں۔ (ف) کے معنی (ت) کی طرح ہیں اور اس میں لکنت کا مفہوم ہے۔ (ق) کا مفہوم سخت تحجر ہے جس کے معنی کنایہ کے طور پر قوت کے ہیں۔ (ک) کے بھی یہی معنی ہیں لیکن اس کا مفہوم کسی قدر خفیف اور کمزور ہے۔ (ل) کے معنی ہیں ابہام کے بعد تعیین۔ (م) کے معنی کامل تدنس کے ہیں۔ (ن) کے معنی نور اور روشنی کے ہیں۔ (و) کے معنی کبھی مبہم اور کبھی (ب) کی طرح ہوتے ہیں۔ (ہ) وہ غیب ہے جس کا وجود عالم تخلیط میں ہے۔ (ی) کے معنی ظہور اور خفاء میں تردد کرنا ہے۔ یاد رکھو ہمزہ اور ہ کے ایک معنی ہیں۔ لیکن (ہ) کے مفہوم میں تخلیط زیادہ ہے۔ (ح) اور (ع) کے ایک معنی ہیں۔ لیکن ع میں اشراق اور نورانیت زیادہ ہے۔ (خ) اور (غ) کے ایک معنی ہیں۔ لیکن (خ) کے مفہوم میں ملزوم اور (غ) کے مفہوم میں غفلت زیادہ ہے۔ (ق) اور (ک) کے ایک معنی ہیں۔ لیکن مؤخر الذکر خفیف تر ہے۔ (ل) اور (ر) کے ایک معنی ہیں۔ لیکن (ل) میں نزول اور پھر تعیّن کے معنی پائے جاتے ہیں اور (ر) کا مفہوم اس سے بالاتر ہے۔ اس لئے اس میں تردد اور تکرار کے معنی پیدا ہو گئے۔ (د) اور (ت) کے معنی ایک ہیں لیکن (د) میں لزوم اور فصاحت اور (ت) میں ابہام کا مفہوم زائد ہے۔ (ج) اور (ز) کے ایک معنی ہیں۔ لیکن (ز) کے مفہوم میں زیادہ لطافت پائی جاتی ہے۔

اب ہم انہیں معانی کو پیش نظر رکھ کر بعض مرکب الفاظ کے معنی تم کو بتاتے ہیں۔ (ال) کے معنی ہیں وہ غیب جو متعین ہو گیا۔ اسی بناء پر بعض صوفیا کہتے ہیں کہ (ال) اسم اعظم ہے بلکہ یہ معنی ہیں کہ اسی متعین کو اپنے ماقبل سے اتصال حاصل ہوا۔ (ھل) وہ مجہول چیز ہے جس کا تعین (ک) مطلوب ہے۔ (ای) کے معنی ہیں وہ غیب متردد جس کا جنس معلوم لیکن اس کا عین مجہول ہے۔ (ذا) کا مفہوم ہے وہ مبہم ذات جس میں کہ غیب متعین ہوا۔ جس کی صورت سر دست منکر (بفتح الکاف) کی ہے۔ لیکن عنقریب یہ ابہام زائل ہوا چاہتا ہے سری۔ سار۔ سرّ ۔ سیح اور ساح، ان سب میں س کی وجہ سے سریان کے معنی پائے جاتے ہیں حقل۔ ضرّ ۔ امھدّ وغیرہ سب الفاظ میں جو (ض) پر مشتمل ہیں فساد کے معنی پائے جاتے ہیں۔ بعض اوقات محض کیفیت صوریہ کا اظہار کرنے کیلئے ض لا یا جاتا ہے مثلاً ابیض کا مفہوم وہ لازم ہے جس کے انفکاک میں تردد ہے اور اخضر اس تخلیط کے لئے ہے جو صورت کی کیفیات سے ہے۔ طوو، طور، طغی، طاف، اور طار سب میں بعد

اور تقدس کا مفہوم پایا جاتا ہے، نیز وہ غیبی احساس جس کے سریان میں تعمق ہے، ادراک کے معنی ہیں وحی غیبی جس کے سریان کے بعض اثرات ظہور پذیر ہوئے اور بعض اثرات مخفی رہے۔ جدّ، ودّ، ردّ، اور مدّ سب میں لزوم کے معنی پائے جاتے ہیں۔ صدف، صلح، صار، اور صبر سب میں عود کا مفہوم ہے، یا تو فقط عود کا مفہوم ہے یا بعض دیگر مفہومات بھی اس کے ساتھ شامل ہیں۔ نیز وہ اشراقی علم جس میں اس لئے تعین پیدا ہوا کہ اس میں اور متدنّس میں لزوم ہے۔ محی، محض اور محص میں متدنّس کا مفہوم ہے جو غیب کی طرف منتقل ہوا۔ نور۔ نار، نہر اور نھار میں روشنی کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ لمع، عین، اور عنا چمک اور نورانیت کے معنی ہیں۔ قرّ اور حق ثبوت کے لئے ہے۔ خلاصہ یہ کہ حقائق حروف کا علم اس قدر مختصر نہیں کہ اس کو کلام استطرادی میں (یعنی کسی دوسرے مبحث کے بالتبع بیان کیا جاسکے)۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ ؎

اللہ نے مجھ پہ فضل کیا بحر بن گیا
حق جلوہ گر ہے پردہ جہالت کا چاک ہے
میری زباں کو سیف رواں سمجھو اے عزیز
ہے علم میرا صاف کدورت سے پاک ہے

بارخدایا! میرے حق میں تیرے یہ سب انعامات بغیر استحقاق کے ہیں فلک الحمد ربنا۔

وصیّت

میری وصیت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے پر اپنی پوری توجہ صرف کرو اور پوری کوشش کے ساتھ اس کی اطاعت میں مشغول رہو۔ ہر ایک قسم کی خیر و فلاح کی بنیاد یہی ہے اور حقیقی کامیابی کا دارومدار اسی پر ہے، حنیف بننے میں کوتاہی نہ کرو اور شرک جلی اور خفی سے کامل طور پر محترز رہو۔ بدعات سے اپنے آپ کو بچائے رکھو، کیونکہ ہر ایک بدعت گمراہی ہے جو لوگ اپنے آپ کو علماء فلسفہ کہتے ہیں ان کی باتوں پر مطلق کان نہ دھرو۔ یہ لوگ راندۂ درگاہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جان بوجھ کر ان کو گمراہی میں چھوڑ رکھا ہے اور وہ اپنے محدود مدرکہ کی تنگ و تاریک کوٹھری میں محبوس ہیں، جس سے نکلنے کا کوئی راستہ ان کو سوجھائی نہیں دیتا۔ اگر تم کو تحقیق حق مطلوب ہو تو ان

لوگوں کا علم اوران کی لفاظیاں تمہارے لئے کسی مصرف کی نہیں، حقیقی علم و معرفت وہ ہے جس کا مأخذ اور منبع وحی ہو اور طاعات بجالانے اور باری تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے بعد اس کا ظہور ہو۔ میرا کہنا مان لو، میں تم کو ہدایت کا راستہ بتارہا ہوں۔ جو کچھ ہم نے اپنی اس تصنیف ''خیر کثیر'' میں لکھا ہے اس کو پڑھ کر انکار سے پیش نہ آنا، نہیں تو دنیا اور آخرت میں ذلیل ہو گے۔ اس کا مضمون علم ربانی ہے جس کے آگے پیچھے کی طرف سے باطل آکر اس پر اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ کسی نے فارسی میں خوب کہا ہے۔

چو بشنوی سخن اہل دل مگو کہ خطا است
سخن شناس نہ دلبرا خطا ایں جا است

اگر میرے بعض بزرگ دوست اور عزیز بھائی اصرار نہ کرتے تو بہت ممکن تھا کہ ہم ان دقیق عسیر الفہم مضامین کے معرض تحریر لانے میں پس و پیش کرتے لیکن جو کچھ اللہ تعالیٰ مہربان کو منظور تھا وہی ہوا۔ اور اسی میں بھلائی ہوگی۔ والحمد اللّٰہ تعالیٰ اوّلاً و اخراً وظاہراً وباطناً قلباً و قالباً سرًّا و علانیۃً۔

ہاتھ اٹھا کر مانگتا ہوں یہ دعا
حق پہ قائم رکھ ضلالت سے بچا

..................☆☆☆..................

خوشخبری

مجموعہ رسائل امام شاہ ولی اللہؒ حصہ دوم

(تصوف، تاریخ فقہ، تفسیر، اصول تفسیر، فن ترجمہ نگاری، تاریخ علوم، نظریۂ تعلیم
اور وصیت نامہ پر مشتمل
حضرت امام شاہ ولی اللہ محدثؒ کے نادر و نایاب رسائل و کتب کا گرانقدر مجموعہ)

شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی کے زیر اہتمام
جلد ہی منظر عام پر آ رہا ہے

شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی کی مطبوعات

دلی کی تاریخی مساجد (حصہ اول)	مولانا مفتی عطاء الرحمن قاسمی	200.00
دلی کی تاریخی مساجد (حصہ دوم)	〃 〃	100.00
پنجاب و ہریانہ کی تاریخی مساجد	〃 〃	200.00
امام شاہ ولی اللہ اور ان کے افکار و نظریات	〃 〃	250.00
الواح الصنادید (حصہ اول)	〃 〃	150.00
الواح الصنادید (حصہ دوم)	〃 〃	100.00
مولانا عبدالماجد دریابادی، خدمات و آثار	〃 〃	200.00
ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کا حصہ		200.00
ہندو منداور اورنگ زیب کے فرامین (اردو)	〃 〃	20.00
ہندو منداور اورنگ زیب کے فرامین (ہندی)	〃 〃	20.00
نقوش خاطر (قلمی خاکوں کا مجموعہ)	〃 〃	70.00
۱۸۵۷ء اور ہریانہ	〃 〃	250.00
شاہ ولی اللہ خصوصی نمبر (ماہنامہ براہین)	〃 〃	195.00
۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی میں ہریانہ کا حصہ (خصوصی شمارہ ماہنامہ براہین)	〃 〃	50.00
الامام الدهلوی خصوصی شمارہ (ماہنامہ براہین)		195.00
مرد یدہ ور (ڈاکٹر اخلاق الرحمن قدوائی)		125.00
مجموعہ رسائل امام شاہ ولی اللہ حصہ اوّل (تصوف و سلوک کے اہم رسائل و کتب)		325.00
متشابہ القرآن	ڈاکٹر ابوالنصر محمد خالدی (مرتبہ) مولانا مفتی عطاء الرحمن قاسمی	300.00
الاشباہ والنظائر فی القرآن الکریم	〃 〃	350.00
وفیات اعیان الہند	〃 〃	300.00
مضامین خالدی	〃 〃	300.00
قرآنی تشبیہات و استعارات	〃 〃	150.00
نشریات	مولانا جنید احمد بنارسی	100.00
سفر وسیلہ ظفر	خورشید انوار عارفی	100.00

SHAH WALIULLAH INSTITUTE

Masjid Kaka Nagar, kaka Nagar, New Delhi-110003
Ph:9811740661,9811615455,26953430
E-mail:shahwaliullah_institute@yahoo.in

شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کی اہم مطبوعات

مجموعہ رسائل امام شاہ ولی اللہؒ (جلد اول)	مولانا مفتی عطاء الرحمن قاسمی	350.00
مجموعہ رسائل امام شاہ ولی اللہؒ (جلد دوم)	//	300.00
مجموعہ رسائل امام شاہ ولی اللہؒ (جلد سوم)	//	300.00
مجموعہ رسائل امام شاہ ولی اللہؒ (جلد چہارم)	//	300.00
مجموعہ رسائل امام شاہ ولی اللہؒ (جلد پنجم)	//	300.00
مجموعہ رسائل امام شاہ ولی اللہؒ (جلد ششم)	//	300.00
مجموعہ رسائل امام شاہ ولی اللہؒ (جلد ہفتم)	//	زیر طبع
دلی کی تاریخی مساجد (حصہ اول)	//	200.00
دلی کی تاریخی مساجد (حصہ دوم)	//	100.00
پنجاب و ہریانہ کی تاریخی مساجد	//	200.00
امام شاہ ولی اللہ اور ان کے افکار و نظریات	//	250.00
الواح الصنادید (حصہ اول)	//	150.00
الواح الصنادید (حصہ دوم)	//	100.00
مولانا عبدالماجد دریابادی، خدمات و آثار	//	200.00
ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کا حصہ	//	200.00
ہندو مندر اور اورنگ زیب کے فرامین (اردو)	//	20.00
ہندو مندر اور اورنگ زیب کے فرامین (ہندی)	//	20.00
نقوش خاطر (قلمی چہرے)	//	100.00
۱۸۵۷ء اور ہریانہ (ہریانہ کے مجاہدین آزادی کا تذکرہ)	//	250.00
المساجد التاریخیه بدهلی	//	500.00
معمار قوم ڈاکٹر اخلاق الرحمن قدوائی	//	300.00
مرد مومن ڈاکٹر اخلاق الرحمن قدوائی	//	300.00
شاہ ولی اللہ خصوصی نمبر (ماہنامہ براہین)	//	195.00
الامام الدہلوی خصوصی شمارہ (ماہنامہ براہین)	//	195.00
وقف ترمیمی بل ۲۰۱۰ء منظر، پس منظر	//	زیر طبع
ضمائر القرآن (ضمائر قرآن اور ان کے مراجع)	ڈاکٹر ابونصر محمد خالدی مرتبہ مولانا مفتی عطاء الرحمن قاسمی	300.00
الاشباہ والنظائر فی القرآن الکریم (قرآن کے مرادف الفاظ اور امثال و نظائر)	//	350.00
وفیات اعیان الہند (امراء و سلاطین کی تاریخ ہائے وفات اور مختصر حالات)	//	300.00
مضامین خالدی (اسلامیات، قرآنیات اور دکنیات پر مشتمل مقالات)	//	300.00
قرآنی تشبیہات و استعارات	//	150.00
نشریات (ریڈیائی تقریروں کا مجموعہ)	مولانا جنید احمد بنارسی	100.00
سفر وسیلہ ظفر	خورشید انور عارفی	100.00

SHAH WALIULLAH INSTITUTE

Masjid Kaka Nagar, Dr. Zakir Husain Marg,(Near NDMC Primary School),
Kaka Nagar, New Delhi-110003
Ph.: 9811740661, 9811615455, 26953430
Email: shahwaliullah_institute@yahoo.in, swiinstitute26gmail.com

مجموعۂ

رسائل امام شاہ ولی اللہؒ

(فقہ، تاریخ فقہ، اجتہاد وتقلید، تفسیر واصول تفسیر، تاریخ علوم وفنون، نظریۂ تعلیم اور وصیت نامہ پر مشتمل امام شاہ ولی اللہؒ کے نادر ونایاب رسائل وکتب کا گراں قدر مجموعہ)

جلد دوم

ترتیب وتقدیم

مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی

علم الانسان مالم یعلم

SWI

شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ

شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی

مجموعۂ

رسائل امام شاہ ولی اللہؒ

جلد دوم

(فقہ، تاریخ فقہ، اجتہاد وتقلید، تفسیر واصول تفسیر، تاریخ علوم وفنون، نظریہ تعلیم اور وصیت نامہ پر مشتمل حضرت شاہ ولی اللہؒ کے نادر ونایاب رسائل وکتب کا گرانقدر مجموعہ)

ترتیب وتقدیم

مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی

شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ

نام کتاب	:	مجموعۂ رسائل امام شاہ ولی اللہؒ حصہ دوم
مرتبہ	:	مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی
قیمت	:	۳۰۰
سن اشاعت	:	۱۸؍مارچ ۲۰۱۳ء
آئی ایس بی این	:	81-901848-8-1
تعداد	:	۵۰۰
کمپوزنگ	:	ریاض احمد
طباعت	:	
ناشر	:	شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ، مسجد کاکا نگر، کاکا نگر نئی دہلی ۔۱۱۰۰۰۳

بہ تعاون قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

Title	:	Majmua Rasail-e-Imam Shah Waliullah-II
Editing	:	Maulana Mufti Ataur Rahman Qasmi
First Edition	:	18th March, 2013
Price	:	300/-
ISBN	:	81-901848-8-1
Composing	:	Riyaz Ahmed
Printer	:	

Published by

Shah Waliullah Institute

Masjid Kaka Nagar (Near N.D.M.C. Primary School)

Kaka Nagar, New Delhi-110003

Ph. : 011-26953430, Mob.9811740661

Email : shahwaliullah_institute@yahoo.in

فہرست رسائل امام شاہ ولی اللہ حصہ دوم

نمبر شمار	کتب		صفحہ
۱۔	مقدمہ	مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی	۱۷
۲۔	عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید	امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ	۱
۳۔	الانصاف فی سبب الاختلاف	// // //	۱۲۱
۴۔	الفوز الکبیر فی وصول التفسیر	// // //	۲۴۷
۵۔	فتح الخبیر بما لا بد من حفظہ فی علم التفسیر	// // //	۳۲۷
۶۔	فیوض الحرمین	// // //	۳۹۹
۷۔	السر المکتوم فی اسباب تدوین العلوم	// // //	۴۹۷
۸۔	رسالہ دانشمندی	// // //	۵۱۳
۹۔	وصیت نامہ	// // //	۵۲۳

مقدمہ

مولانا مفتی عطاء الرحمن قاسمی

شیخ الاسلام حضرت امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اٹھارویں صدی عیسوی کی نابغہ روزگار شخصیت ہیں، آپ فی الحقیقت حجۃ اللہ فی الارض اور آیۃ من آیات اللہ ہیں، برصغیر میں تحریک رجوع الی القرآن والحدیث، اصلاح و دعوت اور اسلامی علوم وفنون کے احیاء وتجدید کی تاریخ پر آپ نے بڑے گہرے اور دورس اثرات چھوڑے، آپ نے امت کی اصلاح وتربیت کیلئے جو الہامی نقشہ اور لائحہ عمل مرتب و مدون کیا تھا اور اپنی مساعی جمیلہ سے اس میں رنگ بھرے، اسکے نقوش وخطوط اور اثرات صدیاں گزرنے کے باوجود آج بھی زندہ وتابندہ ہیں اور آئندہ بھی مشعل راہ رہیں گے، آپ نے مختلف علمی میدانوں میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں چنانچہ آپکے علمی و تجدیدی کارناموں کا دائرہ بڑا وسیع الاطراف ہے، امام غزالیؒ اور علامہ ابن تیمیہؒ کے بعد امت میں کوئی ایسی شخصیت نظر نہیں آتی جو حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی جیسی جامعیت، ہمہ گیری اور ہمہ جہتی کی حامل رہی ہو۔

حضرت شاہ صاحب ایک کثیر التصانیف مصنف اور عظیم مفکر ہیں، حضرت شاہ ولی اللہ نے جہاں حجۃ اللہ البالغہ، التفہیمات الالہیہ، البدور البازغہ، فتح الرحمن فی ترجمۃ القرآن، ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء اور قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین جیسی ضخیم ومطول کتابیں تصنیف فرمائی ہیں، وہیں عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید، الانصاف فی بیان سبب الاختلاف، الفوز الکبیر فی اصول التفسیر، فتح الخبیر، بمالا بد من حفظہ فی علم التفسیر، فیوض الحرمین، السر المکتوم فی اسباب تدوین العلوم

اور رسالہ دانشمندی جیسے متعدد مختصر رسائل بھی تحریر فرمائے ہیں۔

ان رسائل میں ''عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید'' حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا شاہکار رسالہ ہے جو اجتہاد اور تقلید کے موضوع پر ایک معرکتہ الاراء رسالہ ہے، یہ رسالہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے، باب اول میں اجتہاد کی حقیقت اور اس کی شرائط واقسام کو بیان کیا گیا ہے، باب دوم میں اختلاف مجتہدین کے اسباب وعلل پر روشنی ڈالی گئی ہے، باب سوم میں مسالک اربعہ اور ابن حزمؒ کی رائے پر محاکمہ کیا گیا ہے، باب چہارم میں فقہی مسالک کی تقلید اور اختلاف آراء کو بیان کیا گیا ہے، باب پنجم میں تقلید میں میانہ روی کا ذکر ہے۔ کتاب مذکور کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت شاہ صاحب جس طرح نفس تقلید کے مخالف ومنکر نہیں ہیں، اسی طرح بعض شرائط کے ساتھ اجتہاد کے بھی قائل وعلمبردار ہیں چنانچہ آپ بعض حالات میں اجتہاد کو امت کے لئے ضروری قرار دیتے ہیں۔

عقد الجید میں قاضی بیضاویؒ، امام رافعیؒ، امام بغویؒ اور ابوشامہؒ کے حوالے مختصراً اور علامہ ابن الھمامؒ (متوفی ۸۶۱ھ) کی فتح القدیر اور قاضی جگن گجراتی (متوفی ۹۲۰ھ) کی کتاب خزانۃ الروایات کے حوالے تفصیل سے ملتے ہیں۔ یہ دونوں اصحاب حنفی مکتبہ فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔

عقد الجید اصلاً عربی میں ہے جس کے ایک نے زائد ترجمے ہوئے ہیں، میری محدود معلومات کے مطابق اس کا سب سے قدیم ترجمہ مولانا محمد احسن صدیقی نانوتویؒ کے قلم سے ہوا ہے اور ''مسلک مروارید'' کے نام سے ۱۳۴۴ھ میں مولانا حافظ محمد عبدالاحد دہلوی کے زیر اہتمام و انصرام مطبع مجتبائی دہلی سے شائع ہوا تھا، مولانا حافظ محمد عبدالاحد مرحوم کی فرمائش پر مولانا محمد احسن نانوتوی نے اس کا اردو ترجمہ کیا تھا جس کو اس زمانہ کے اردو محاورات اور اردو زبان کے اعتبار سے عمدہ اور سلیس ترجمہ قرار دیا جا سکتا ہے، جس کے ایک طرف عربی عبارت ہے اور دوسری طرف اردو ترجمہ ہے۔ اس کے بعد دوسرا ترجمہ ڈاکٹر محمد میاں صاحب صدیقی کے قلم سے معرض وجود میں آیا۔ آخر الذکر ترجمہ اول الذکر سے قدرے آسان اور سہل ہے، اس مجموعہ رسائل میں دوسرا اہم رسالہ الانصاف فی بیان سبب الاختلاف ہے، یہ رسالہ بھی عربی زبان میں ایک شاہکار فقہی رسالہ ہے، جو اگرچہ مختصر ہے لیکن معنوی حیثیت سے بڑی بڑی ضخیم کتابوں پر بھاری ہے۔ حضرت شاہ

صاحب نے اس رسالہ میں جہاں فقہ کی ابتدائی تاریخ بیان کی ہے، وہیں صحابہ رضوان اللہ علیہم، تابعین، تبع تابعین، ائمہ مجتہدین اور فقہائے امت کے درمیان فقہی اختلافات کے اسباب وعلل کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ حضرت شاہ صاحب کی نگاہ میں ائمہ مجتہدین کے درمیان ہونے والے فقہی اختلافات کے کیا اسباب تھے اور کیوں اختلافات ونزاعات رونماء ہوئے ان امور پر آپ نے سیر حاصل بحث کی ہے، اس کا صحیح اندازہ اور قدر وقیمت کتاب کے مطالعے کے بعد ہی ہوسکتا ہے۔

مولانا محمد احسن نانوتوی نے عقد الجید کے ترجمے سے قبل الانصاف فی بیان سبب الاختلاف کا ترجمہ کیا تھا اور وہ بھی دہلی کے مطبع مجتبائی سے شائع ہوا تھا۔ جس کے مالک مولانا حافظ محمد عبد الاحد دہلوی تھے۔ اہل علم جانتے ہیں کہ مولانا محمد احسن نانوتوی نے اس کا ترجمہ علمی طرز و انداز پر کیا ہے۔ جو صرف اہل علم کے استفادہ کے لائق ہے۔ عام آدمی کے لئے بڑی حد تک ناقابل فہم ہے۔ آپ کے ترجمے کے ایک عرصہ بعد اسی ترجمے کو سامنے رکھ کر مولانا صدرالدین اصلاحی صاحب نے ''اختلافی مسائل میں اعتدال کی راہ'' کے نام سے ترجمہ کیا جسے اسلامک پبلیکیشنز پرائیویٹ لمیٹڈ لاہور نے شائع کیا ہے، مولانا صدرالدین اصلاحی صاحب کا ترجمہ عام فہم اور سلیس ہے۔ اسی ترجمے کو پیش نظر مجموعہ میں شامل کیا گیا ہے، حضرت شاہ صاحب ''الانصاف فی بیان سبب الاختلاف'' کے دیباچہ میں رقمطراز ہیں

''ایک وقت اللہ تعالیٰ نے میرے قلب میں ایک ایسی میزان حق وعدل کا القا فرمایا جس سے میں امت محمدیہ کے مابین واقع ہونے والے تمام اختلافات کے اسباب معلوم کرسکوں اور جان لوں کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے نزدیک حق کیا ہے۔ ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے مجھے وہ قدرت بیان بھی عطا فرمائی جس سے کام لے کر میں اس مسئلہ کی بہترین وضاحت کرسکوں، ایسی وضاحت کہ پھر کوئی شک اور اشکال باقی نہ رہ جائے۔ بعد ازاں مجھ سے یہ دریافت کیا گیا کہ صحابہ کرام اور ان کے بعد کے اکابر ملت کے درمیان خاص طور سے احکام فقہیہ میں اختلاف کی وجہ کیا ہے؟ میں وقت کی گنجائش اور رسائل کی قوت فہم وحفظ کا لحاظ کرتے ہوئے اسی آن، حقائق کا، جو اللہ کی عنایت خاص سے مجھ پر کھولے گئے تھے ایک حصہ بیان کرنے پر آمادہ ہوگیا اور اس مسئلہ پر ایک مفید رسالہ تیار ہوگیا، جس کا نام میں نے ''الانصاف فی بیان سبب الاختلاف'' رکھا۔

حضرت شاہ صاحب نے بصراحت لکھا ہے کہ عہد نبوی اور دور صحابہ میں فقہی اصطلاحات اور فقہی اختلافات موجود نہیں تھے۔ پیش آمدہ مسائل کے سلسلہ میں صحابہ کا طریقہ کار اور منہج فطری اسلوب پر مبنی ہوا کرتا تھا۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''معلوم ہونا چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں فقہ ایک فن کی طرح مدون نہیں تھا، اور نہ اس وقت احکام کے باب میں بحث کا یہ طریقہ تھا جو اب ہمارے فقہا میں رائج ہے کہ وہ اپنی انتہائی دماغی قابلیتیں صرف کرکے دلائل کے ساتھ ایک ایک چیز کے علیحدہ علیحدہ ارکان اور شرائط اور آداب بیان کرتے ہیں، مسائل کی فرضی صورتیں سامنے رکھ کر ان پر بحث کرتے ہیں، جن چیزوں کی تعریف کی جا سکتی ہو ان کی منطقیانہ تعریف بیان کرتے ہیں اور جن کا حصر بیان کیا جا سکتا ہو ان کا حصر واضح کرتے ہیں، وغیر ذلک۔ اس کے بجائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہ تھا کہ آپؐ مثلاً وضو فرماتے اور صحابہ کرام آپ کا طریقہ وضو دیکھ کر اسے اختیار کر لیتے، بغیر اس کے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس بات کی توضیح فرمائیں کہ یہ وضو کا رکن ہے اور فلاں چیز اس کے آداب میں سے ہے، اسی طرح آپ نماز پڑھتے، لوگ آپؐ کے نماز پڑھنے کا طریقہ دیکھ لیتے اور اسی طرح خود پڑھنے لگتے، آپؐ نے حج ادا فرمایا، لوگوں نے آپ کے حج کرنے کے طریقے اور مراسم دیکھے اور اسی طرح خود حج کرنے لگے۔ الغرض آنحضرت ﷺ کا عام طریقہ تعلیم یہی تھا، آپ ﷺ نے کبھی یہ توضیح نہیں فرمائی کہ وضو میں چار فرض ہیں یا چھ اور نہ کبھی آپ نے یہ خیال کیا کہ ہوسکتا ہے کہ کبھی کوئی آدمی اعضائے وضو کو لگاتار نہ دھوئے، اس لیے ایسے وضو کے ہونے یا نہ ہونے کا پیشگی حکم دے دینا چاہیے۔ اس قسم کی فرضی اور غیر واقعی صورتوں کے احکام کی بابت آپ نے شاذ و نادر ہی کبھی کچھ فرمایا ہے۔ دوسری طرف اصحاب رسول کا بھی یہ حال تھا کہ وہ اس طرح کی باتوں کے متعلق آنحضرت ﷺ سے بہت کم سوال کرتے تھے، چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''میں نے اصحاب رسول سے بہتر کسی جماعت کو نہیں پایا، انہوں نے رسول خدا کی پوری زندگی میں آپ سے صرف تیرہ سوال کیے جو سب کے سب قرآن میں مذکور ہیں''۔

حضرت شاہ صاحب فقہ کی تعریف اور اسکی تاریخ کا پس منظر بیان کرنے کے بعد اپنے زمانے کے نام نہاد فقیہوں کے طریقوں اور رویوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس زمانہ میں فقیہ اس شخص کا نام ہے، جو باتونی ہو، زور زور سے ایک جبڑے کو دوسرے جبڑے پر پٹختا ہو، جو فقہاء کے اقوال قوی ہوں یا ضعیف سب کو یاد کر کے بغیر کسی امتیاز کے اپنی زبان درازی سے سب کو بیان کرتا چلا جاتا ہو''۔

حضرت شاہ صاحب کے وہبی کمالات اور تجدیدی امتیازات میں سے ایک اہم کمال و امتیاز انکا اعتدال و توازن ہے۔آپ اجتہاد و تقلید کے مابین بھی نقطۂ اعتدال و توازن کے قائل ہیں۔حضرت شاہ صاحب نے اجتہاد اور تقلید کی حمایت کرنے والوں کے دونوں گروہوں کی انتہا پسندی و بے اعتدالی کا جائزہ لیا ہے اور ان دونوں گروہوں کو راہ اعتدال سے تجاوز کرنے والوں میں شمار کیا ہے۔اس رسالہ میں مختلف عنوانات ہیں، مثلاً عہد نبوی میں اختلاف رائے، فروعی مسائل میں اختلاف آراء امت کے حق میں باعث آسانی و سہولت، عہد صحابہ کے بعد اختلاف رائے بصرف فروعات میں، اختلاف آراء کے اسباب، مختلف احادیث میں تطبیق، مذاہب اربعہ کی خصوصیات اور فقہی مسالک میں تطبیق۔ان کے علاوہ دوسرے اہم مباحث ہیں۔

حضرت شاہ صاحب نے مذاہب اربعہ کو برحق قرار دیا ہے اور اس کے دائرہ میں رہتے ہوئے زندگی بسر کرنے کی تاکید کی ہے۔حضرت شاہ صاحب نے عقد الجید میں ایک باب قائم کیا ہے، **تاکید الاخذ بهذه المذاهب الاربعه والتشديد في تركها، والخروج عنها،** مذاہب اربعہ کو اختیار کرنے کی تاکید اور ان کو ترک کرنے کی ممانعت۔اسی عنوان کے ذیل میں آپ کا معنی خیز فقرہ بھی ہے **اعلم ان في الاخذ بهذه المذاهب الاربعه مصلحه السيعة و في الاعراض عنها كلها مفسدة كبيرة۔** جان لینا چاہئے کہ ان مذاہب اربعہ کے اختیار کرنے میں عظیم مصلحت اور ان کے چھوڑ دینے میں بہت بڑا فساد ہے۔

حضرت شاہ صاحب اصلاً رجوع الی القرآن والحدیث کے داعی تھے۔فقہاء کرام کے اقوال اگرچہ اخلاص پر مبنی ہوتے ہیں اور عموماً ان پر عمل بھی کیا جاتا ہے اور جیسا کہ ذکر ہوا کہ حضرت شاہ صاحب نے ان مذاہب اربعہ کو برحق قرار دیا ہے۔لیکن اگر ان فقہا کے فقہی اقوال قرآن و حدیث سے صریح متصادم ہوں تو ایسی صورت میں کسی بھی امام کی تقلید جائز نہیں ہے۔موجودہ مسلکی اختلافات کے دور میں یہ ایک بصیرت افروز و چشم کشا رسالہ ہے۔جسکے بارے میں ڈاکٹر شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں:

''اس کتاب کو اگر تاریخ فقہ و علم الحدیث کہا جائے تو بجا ہے لیکن فی الحقیقت یہ کتاب عہد سعادت سے لے کر پانچویں صدی ہجری تک فقہ کی تدوین'' کتب احادیث کی فراہمی اور مختلف فقہی مذاہب کے آغاز کی ایک نہایت دلچسپ منصفانہ اور پراز معلومات تاریخ ہے۔ شاہ صاحب کے اس مختصر رسالے کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ انہیں اسلام کی علمی تاریخ سے کتنی واقفیت تھی۔ اس میں نہایت وضاحت اور انصاف پسندی سے تقریباً ان سب بنیادی مسائل کا ذکر آ گیا ہے۔ جن میں علمائے دین میں اختلافات ہوئے، ان اختلافات کی توضیح کی ہے، ساتھ ساتھ مذاہب اربعہ یعنی حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی طریقوں کی خصوصیات اور ان کی جداگانہ تشکیل کی نہایت عالمانہ تاریخ لکھی ہے۔ جمع احادیث اور محدثین مثلاً بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی کے مجموعوں کی خصوصیات بیان کی ہیں۔ اجتہاد و تقلید کے مسئلے پر روشنی ڈالی ہے اور ان وجوہ کا ذکر کیا ہے جن کی بنا پر مسلمانوں میں تقلید کا رواج ہو گیا، یہ دونوں رسائل تاریخ فقہ کے نشیب و فراز سے متعلق ہیں''۔

اس مجموعہ رسائل میں تیسرا رسالہ اصول تفسیر سے متعلق ہے، جس کا نام الفوز الکبیر فی اصول التفسیر ہے۔ یہ فن اصول تفسیر میں ایک مختصر مگر جامع رسالہ ہے جو اصلاً عربی زبان میں ہے۔ اب اردو میں اس کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ جس کے مترجم مولوی رشید احمد انصاری مرحوم ہیں جسے مکتبہ برہان اردو بازار جامع مسجد دلی نے شائع کیا۔ الفوز الکبیر ہمارے دینی مدارس کے نصاب تعلیم میں داخل ہے۔ اس کتاب سے صحیح معنوں میں قرآن فہمی اور قرآن شناسی ہوتی ہے۔ حضرت شاہ صاحب الفوز الکبیر کے مقدمہ میں لکھتے ہیں

''فقیر ولی اللہ بن عبدالرحیم (خدا ان دونوں سے اپنی مہربانی کے ساتھ معاملہ کرے) کہتا ہے کہ جب اس فقیر پر کتاب اللہ کے سمجھنے کا دروازہ کھولا گیا تو میں نے چاہا کہ بعض مفید نکات جو کتاب اللہ کے سمجھنے میں دوستوں کیلئے کارآمد ہو سکتے ہیں، ایک مختصر رسالہ میں منضبط کرے، خداوند تعالیٰ کی عنایت بے غایت سے امید ہے کہ طالب علموں کو صرف ان قواعد کے سمجھ لینے سے ایک وسیع شاہراہ کتاب اللہ کے سمجھنے میں کھل جائے گی کہ اگر وہ ایک عمر کتب تفاسیر کا مطالعہ کرنے یا ان کو مفسروں سے ''جن کی تعداد اس زمانہ میں بہت ہی کم ہو گئی ہے'' پڑھنے میں صرف کریں تو اس قدر ضبط کے ساتھ حاصل نہیں ہو سکتی۔ اور میں نے اس رسالہ کا نام الفوز الکبیر فی اصول التفسیر رکھا ہے''۔

الفوز الکبیر پانچ ابواب پر مشتمل ہے، پہلا باب ان علوم پنجگانہ میں ہے جن کی طرف قرآن نے صراحت کے ساتھ رہنمائی کی ہے۔اور گویا قرآن کے نزول کا مقصد دراصل وہی علوم پنجگانہ ہیں، دوسرا باب وجوہ خفاء نظم قرآن کے بیان میں ہے جس میں ان وجوہ کا بیان نہایت وضاحت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ تیسرا باب نظم قرآنی کے لطائف اور اس کے اسلوب بدیع کی تشریح بقدر طاقت بشری پر مشتمل ہے۔ چوتھا باب فنون تفسیر کے بیان میں ہے۔اس طرح الفوز الکبیر کی تکمیل ہوتی ہے جو تفسیر کے باب میں گنج گرانمایہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

مولانا عبدالحی حسنی مرحوم اپنی کتاب ''الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند'' میں اس کتاب کے متعلق لکھتے ہیں: ''علوم قرآن پر اس کتاب سے بہتر کوئی تصنیف نہیں''۔ حضرت مولانا علی میاں ندوی مرحوم اپنی کتاب تاریخ دعوت وعزیمت ج ۵ میں تحریر فرماتے ہیں۔ ''شاہ صاحب کی ایک تجدیدی وانقلابی خدمت اور کارنامہ الفوز الکبیر'' کی تصنیف ہے، جو اپنے موضوع پر ہمارے علم میں پورے اسلامی کتب خانہ میں منفرد تصنیف ہے''۔

اسی طرز و آہنگ میں فتح الخبیر بمالا بد حفظہ فی التفسیر بھی ہے، یہ بھی ایک اہم رسالہ ہے جو حل مشکلات وغرائب اور قرآنی لغات ومحاورات پر مشتمل ہے۔ فتح الخبیر کے مترجمین میں مولانا سید محمد مہدی الحسینی اور مولانا حبیب الرحمٰن صدیقی کاندھلوی شامل ہیں۔ مکتبہ قرآن محل کراچی سے شائع ہوئی ہے فتح الخبیر کی بڑی تعریف کی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اصول تفسیر میں ایک گوہر نایاب کا درجہ رکھتی ہے اور اس کی افادیت مسلم ہے۔ فتح الخبیر سورہ الفاتحہ سے لے کر سورہ الناس تک تمام سورتوں پر محیط ہے۔ حضرت مصنف علام نے اس میں صرف انہی الفاظ وغرائب کی تشریح وتوضیح پر توجہ دی ہے جو طالب علم کے لئے مشکل معلوم ہوتے ہیں۔ چونکہ یہ کتاب درس نظامی کے نصاب تعلیم میں داخل ہے، شاہ صاحب نے اس احساس کے ساتھ اس کتاب کو مرتب کیا ہے کہ اگر طالب علم بنظر غائر اس کا مطالعہ کرلیں تو ان کے لئے قرآن فہمی کی راہ یقیناً آسان ہو جائے گی، حضرت شاہ صاحب کے گرانقدر رسائل وکتب میں ایک فیوض الحرمین ہے جو آپ کے مکاشفات آپ کے اور مشاہدات پر مبنی ہے، یہ تمام مشاہدات ومکاشفات اور حرمین شریفین کے قیام روضۂ اطہر پر حاضری کے دوران ہوئے ہیں۔اس کتاب میں باطنی حقائق، کلامی مسائل اور

مبشرات ورویا بھی ہیں، اسی کتاب فیوض الحرمین میں حضرت شاہ صاحب نے ائمہ اربعہ کے فقہی مسالک کو برحق ہونے کا مشاہدہ فرمایا ہے۔ جس سے شاہ صاحب کی فقہی توسع پسندی اور وسعت نظری سامنے آتی ہے۔ فیوض الحرمین ۴۷ مشاہدات پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے مباحث بھی ہیں۔ فیوض الحرمین کا سب سے قدیم اردو ترجمہ "سعادت کونین" کے نام سے پایا جاتا ہے جسے سید ظہیر الدین احمد عرف سید احمد ولی اللہی نے مطبع احمدی مدرسہ عزیزی دہلی سے شائع کرایا تھا۔ پھر لوگوں کے پے در پے اصرار سے سید عبدالغنی جعفری ولی اللہی نواسہ وجانشین حضرت شاہ صاحب نے بے تاب پرنٹنگ ورکس چاہ رہٹ دہلی سے طبع کرایا، لیکن اس ترجمہ میں ترجمہ نگار کا نام درج نہیں ہے البتہ ترجمہ کے بیان وزبان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سب سے قدیم ترجمہ ہے۔ جس کے ایک کالم میں عربی عبارت اور دوسرے میں اردو ترجمہ ہے۔ اس کے ایک عرصہ کے بعد فیوض الحرمین کا دوسرا ترجمہ منظر عام پر آیا۔ جس کے ترجمہ نگار مولانا عابد الرحمن کاندھلوی صاحب ہیں۔ انہوں نے ایک طرف باعراب عربی عبارت دی ہے اور دوسری طرف اردو ترجمہ دیا ہے۔ یہ ترجمہ زبان وبیان کے اعتبار سے قدرے آسان ہے اور پرانے ترجمے سے ماخوذ ہے۔ میں نے اس مجموعہ میں اسی آخری ترجمہ کو شامل کیا ہے۔

پیش نظر مجموعہ میں السر المکتوم فی اسباب تدوین العلوم بھی شامل ہے جو حضرت شاہ صاحب کا ایک مختصر جامع رسالہ ہے۔ جس میں تدوین علوم وفنون کی تاریخ منضبط کی گئی ہے اور فنون مختلفہ کی اصطلاحات وتعبیرات کی تشریح اور وضاحتیں کی گئی ہیں۔

یہ رسالہ عربی زبان میں ہے جس کے ترجمہ نگار مولانا ابو یحیی امام خاں مرحوم ہیں۔ اردو ترجمہ ۱۳۲۱ھ مطابق ۱۹۰۳ء میں مطبع احمدی مدرسہ عزیزی دہلی سے طبع ہوا تھا اور اس کے ناشر وطابع سید ظہیر الدین عرف سید احمد ولی اللہی مالک مطبع احمدی دہلی تھے۔

یہ قدیم مطبوعہ نسخہ میرے پیش نظر ہے جسکے ایک کالم میں عربی عبارت اور دوسرے میں اردو ترجمہ ہے۔ پھر یہ رسالہ حیدرآباد سندھ کے ماہنامہ الرحیم میں دو قسطوں جون ۱۹۶۴ء اور جولائی ۱۹۶۴ء میں چھپا لیکن ماہنامہ الرحیم میں صرف اس کا اردو ترجمہ شائع کیا گیا، عربی شامل نہیں ہے۔ میں نے ان دونوں نسخوں کے موازنہ اور تقابل سے رسالہ السر المکتوم کو مرتب ومدون کیا ہے

اوراس رسالہ کی اہمیت وافادیت کے پیش نظر اسکو بھی مجموعہ میں شائع کیا ہے۔

اس گرانقدر مجموعہ رسائل میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا ایک شاہکار ''رسالہ دانشمندی'' بھی شامل ہے۔ یہ حضرت شاہ صاحب کا ایک غیر معمولی اہمیت کا حامل رسالہ ہے جس میں اصول تعلیم، نظریۂ تعلیم اور طریقہ تعلیم کی نشاندھی کی گئی ہے، جسے حضرت شاہ صاحب نے فن دانشمندی سے موسوم کیا ہے۔ حضرت شاہ صاحب فن دانشمندی کے متعلق لکھتے ہیں:

اس فقیر کے دل میں آیا کہ فن دانشمندی کے قواعد واصول مرتب کرے۔ اور اپنے زمانے والوں کو ان سے متعارف کرائے۔ اگر تم یہ پوچھو کہ دانشمندی سے میں کیا مراد لیتا ہوں تو دانش مندی سے میری مراد کتاب دانی ہے۔ اور اس کے تین درجے ہیں۔ اس کا ایک درجہ تو یہ ہے کہ کتاب کا مطالعہ ہو، اور اس کی حقیقت بدرجہ تحقیق حاصل کی جائے۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ استاد کتاب کو پڑھائے اور اس کی حقیقت شاگردوں کو سمجھائے۔ اور اس کا تیسرا درجہ یہ ہے کہ وہ اس کتاب پر شرح یا حاشیہ لکھے اور اس کی حقیقت کے انکشاف میں مبالغہ کرے۔

رسالہ دانشمندی ۱۳۲۱ھ مطابق ۱۹۰۳ء میں السر المکتوم فی اسباب تدوین العلوم کے ساتھ ہی مطبع احمدی دہلی سے طبع ہوا تھا۔ رسالہ دانشمندی کا قدیم مطبوعہ نسخہ میرے پیش نظر ہے جس کے ایک طرف فارسی عبارت اور دوسری طرف اردو ترجمہ ہے۔ مزید برآں رسالہ دانشمندی ماہنامہ الرحیم حیدرآباد سندھ دسمبر ۱۹۶۴ء کے شمارہ میں بھی طبع ہوا۔ میں نے ان دونوں نسخوں کو پیش نظر رکھ کر رسالہ دانشمندی کو مرتب ومدون کیا اور اس مجموعہ میں شامل کیا ہے۔

اس مجموعہ رسائل امام شاہ ولی اللہ جلد دوم میں شامل آخری رسالہ ''وصیت نامہ'' موسوم بہ المقالہ الوضیہ فی النصیحۃ والوصیۃ ہے۔ یہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا ایک اہم و پرمغز رسالہ ہے جسے حضرت شاہ صاحب نے تفہیمات الالٰہیہ جلد ثانی کا ایک حصہ بنایا ہے۔ پھر اس وصیت نامہ کا اردو ترجمہ ارمغان شاہ ولی اللہ مطبوعہ سندھ ساگر اکادمی لاہور میں چھپا تھا جسکے فاضل مرتب پروفیسر محمد سرور مرحوم سابق استاذ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی تھے۔ اس رسالہ میں حضرت شاہ صاحب کی آٹھ وصیتیں ہیں جو نہایت موثر وکارآمد ہیں۔ ان میں سے ساتویں وصیت کے چند کلمات ملاحظہ فرمائیں:

"ہم عربی ہیں۔ ہمارے آباؤ اجداد ہندوستانی شہروں میں مسافروں کی حیثیت سے آئے۔ ہمارے لئے ہمارا عربی النسب اور عربی اللسان ہونا باعث فخر ہے۔ کیونکہ یہ دونوں چیزیں ہمیں سید اوّلین وآخرین، افضل الانبیا والمرسلین، فخر موجودات علیہ وعلی آلہ الصلوٰۃ والتسلیمات سے نزدیک کرتی ہیں۔ اس عظیم نعمت کا شکر یوں ادا کیا جائے کہ ہم بقدر امکان عربوں کی عادات و رسوم کو، جن میں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے اور آپؐ نے نشو ونما پائی، ہاتھ سے نہ جانے دیں اور عجم کی رسوم اور ہنود کی عادات کو اپنے اندر سرایت نہ ہونے دیں۔

بغوی نے ابوعثمان النہدی سے روایت کی ہے کہ ہمارے پاس عمرؓ بن خطاب کی طرف سے ایک خط آیا۔ ہم اس وقت عتبہ بن مرقد کے ساتھ آذربائیجان میں تھے۔ (خط کے عربی متن کو نقل کرنے کے بعد شاہ صاحب اس کا فارسی ترجمہ کرتے ہیں) لکھتے ہیں، یعنی جب عرب جہاد کرنے کے لئے سرزمین عجم میں مختلف اطراف میں پھیلے تو حضرت عمرؓ ڈرے کہ عرب کہیں عجمیوں کی رسمیں اختیار نہ کرلیں اور عربوں کی رسمیں نہ چھوڑ دیں۔ اس لئے انھوں نے اپنے خط میں لکھا کہ وہ تہ بند باندھیں، چادریں اوڑھیں، جوتے (نعل) پہنیں۔ موزے ترک کردیں، شلواریں چھوڑ دیں۔ اپنے دادا اسماعیل کا لباس اپنے لئے لازم کریں۔ اپنے آپ کو ناز ونعم اور ٹھاٹ باٹھ اور عجمیوں کے طرز رہائش سے دور رکھیں، دھوپ میں بیٹھنا اپنے لئے لازم ٹھہرائیں۔ بے شک دھوپ عربوں کے لئے حمام ہے۔ بنومعد کی رسمیں اختیار کریں، سخت لباس پہنیں، مشقت کی زندگی گزاریں۔، پرانے کپڑے پہننے کی عادت ڈالیں، اونٹوں کو پکڑیں اور انھیں رام کریں، چھلانگ مار کر گھوڑوں پر سوار ہوں اور نشانوں پر تیراندازی کریں۔

ہنود کی بری عادتوں میں سے ایک عادت یہ ہے کہ جب کسی عورت کا شوہر مرجائے تو وہ اجازت نہیں دیتے کہ وہ عورت کسی اور مرد سے شادی کرے، یہ عادت سرے سے عرب میں نہ تھی، نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے، نہ آپ کے زمانے میں اور نہ آپ کے بعد۔ خدا تعالیٰ اس شخص پر اپنی رحمت نازل کرے جو اس بری عادت کو ختم کرے۔ اگر اس کو تمام لوگوں سے دور کرنا ممکن نہ ہو تو خود اپنی جماعت میں نکاح بیوگان کی اس عربوں کی عادت کو رائج کرنا چاہئے۔ اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو بیوگان کا نکاح نہ کرنے کی اس عادت کو برا سمجھے اور دل سے اس کا مخالف ہو کیونکہ

نہی عن المنکر کا سب سے ادنیٰ درجہ یہی ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ کی مختلف ومنتشر کتب و رسائل کو ''کلیات'' کی صورت میں ترتیب و تدوین اور تقدیم وضروری حواشی کے ساتھ شائع کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے تاکہ یہ عظیم سرمایہ محفوظ ہو سکے۔

شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ نے اس جہت پر خصوصی توجہ مرکوز کیا ہے اور اس کے اشاعتی منصوبوں میں یہ کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔

اسی عظیم مقصد وہدف کے تحت اس سے قبل تصوف وسلوک سے متعلق حضرت شاہ صاحب کے مختلف رسائل وکتب کو ''مجموعہ رسائل امام شاہ ولی اللہ جلد اوّل'' کے نام سے مرتب کیا گیا تھا۔ جسکی اشاعت ہو چکی ہے۔ اب یہ مذکورہ بالا رسائل وکتب جو تاریخ فقہ، اجتہاد وتقلید، تفسیر، اصول تفسیر، تاریخ علم وفن، نظریہ تعلیم اور وصایا کے موضوعات پر ہیں، الحمد للہ اب ان مختلف رسائل وکتب پر مشتمل یہ اہم مجموعہ طبع ہو رہا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ اس مجموعہ رسائل کی اشاعت وترویج سے فقہ وتفسیر اور دوسرے علوم وفنون کے مختلف نئے زاویے اور مخفی گوشے امت وملّت کے سامنے آئیں گے۔

اس ''مجموعہ رسائل امام شاہ ولی اللہ جلد دوم'' کی اشاعت میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا تعاون حاصل رہا ہے۔ جس کے لئے میں ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین ڈائریکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا شکرگزار ہوں۔ اسی طرح اپنے دوست مولانا عقیدت اللہ قاسمی کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ بھی اس مجموعہ کی ترتیب میں گاہ بگاہ اپنے مشوروں سے نوازتے ہیں۔ آخیر میں محترمہ مسرت جہاں صاحبہ کا بھی بے حد ممنون ومشکور ہوں کہ اس مجموعہ رسائل کی اشاعت میں بھرپور دلچسپی لیتی ہیں اور ممکنہ تعاون کرتی ہیں۔ یہ دلّی والی ہیں انہیں حضرت شاہ صاحب کی تعلیمات سے خصوصی طور پر دلچسپی رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں صحت وعافیت سے رکھے۔

عطاء الرحمٰن قاسمی

چیرمین

شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ

عقد الجید
فی احکام الاجتہاد والتقلید

تصنیف

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ

ترجمہ

ڈاکٹر محمد میاں صدیقی

ترتیب

مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱	باب:۱	۲۲
۲	اجتہاد کی حقیقت، شرائط واقسام	۲۲
۳	شرائط اجتہاد	۲۳
۴	اقسام مجتہد	۲۵
۵	باب:۲	۳۲
۶	اختلاف مجتہدین، اسباب وعلل	۳۲
۷	جواب مصنف	۳۳
۸	مقامات اختلافات	۳۷
۹	کتب اصول فقہ میں مذکور مسائل	۳۸
۱۰	باب:۳	۵۸
۱۱	تقلید مسالک اربعہ	۵۸
۱۲	تقلید کے بارے میں ابن حزمؒ کا مسلک	۶۱
۱۳	ابن حزمؒ کی رائے پر محاکمہ	۶۲

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱۴	باب:۴	۷۲
۱۵	فقہی مسالک کی تقلید، اختلاف آراء	۷۲
۱۶	فصل:۱ مجتہد مطلق منتسب	۷۴
۱۷	فصل:۲ مجتہد فی المذہب	۷۷
۱۸	فصل:۳ متبحر فی المذہب	۸۴
۱۹	تقلید واجب	۹۹
۲۰	تقلید حرام	۱۰۱
۲۱	عام آدمی کا مسلک	۱۰۵
۲۲	باب:۵	۱۱۲
۲۳	تقلید میں میانہ روی	۱۱۲
۲۴	اقسام مقلد	۱۱۶
۲۵	فتویٰ صرف مجتہد دے سکتا ہے	۱۱۷

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمام تعریفیں اس اللہ رحمٰن ورحیم کے لیے ہیں جس نے ہمارے سردار حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو عرب اور عجم کی طرف رسول بنا کر بھیجا تا کہ ان کی ذاتِ بابرکات سے لوگ جہالت اور گمراہی کی تاریکیوں میں روشنی حاصل کریں، جن افراد کو اللہ جل جلالہ نے بلند ہمتیں عطا کی ہیں اور توفیق سے ہم کنار کیا ہے وہ حضرت محمد ﷺ کی پیروی کر کے بلند مقامات پر فائز ہوں، میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ جل جلالہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ وحدہ لاشریک ہے اور اس بات کی بھی گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ جل جلالہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں، ان کے بعد قیامت تک کوئی نبی آنے والا نہیں، نبیوں اور رسولوں کا سلسلہ ان کی ذاتِ اقدس پر ختم ہو گیا۔

اللہ جل جلالہ کی حمد وثنا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح وستائش کے بعد اللہ جل جلالہ کا یہ کمزور بندہ، جو ہر لحظہ اس کی رحمتوں کا محتاج وطلب گار ہے، ولی اللہ بن عبدالرحیم کہتا ہے، اللہ جل جلالہ اسے ایسی باتوں سے محفوظ رکھے جو اس کے لیے مناسب نہ ہوں اور اس کے دل اور اعمال، افعال کو صحت اور سلامتی عطا فرمائے، یہ ایک رسالہ، جو میں ہدیۂ قارئین کر رہا ہوں اس کا نام میں نے ''عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید'' تجویز کیا ہے۔

بعض دوستوں نے اجتہاد وتقلید کے بارے میں مجھ سے سوالات کیے اور بعض اہم مسائل کی وضاحت چاہی، ان کے سوالات اور اس اہم موضوع پر تشریح مسائل کی طلب نے مجھے اس تحریر کے لکھنے پر آمادہ کیا۔

باب:۱

اجتہاد کی حقیقت، شرائط واقسام

علماء کے کلام سے اجتہاد کی جو حقیقت سمجھی گئی وہ یہ ہے کہ شریعت کے فروعی احکام کو ان کے تفصیلی دلائل سے سمجھنے کے لیے مقدور بھر کوشش کرنا، ان تفصیلی دلائل کا مآخذ چار چیزیں ہیں۔

(۱) کتاب اللہ (۲) سنت رسول اللہ (۳) اجماع (۴) قیاس (۱)

اس تعریف سے یہ بات سمجھ میں آئی کہ اجتہاد اس سے عام ہے کہ وہ اس حکم کے معلوم کرنے میں مقدور بھر کوشش کرنا ہو جس میں پچھلے علماء کاوش کر چکے ہیں یا اس حکم کے علاوہ کسی اور حکم کے معلوم کرنے میں کوشش کرنا مقصود ہو، مجتہد اپنے اس اجتہاد میں پچھلے علماء کے موافق ہو یا مخالف، نیز اس سے بھی عام ہے کہ یہ اجتہاد کسی دوسرے کی مدد سے کیا گیا ہو، مثلاً کسی نے مسائل کی صورتوں کی نشان دہی کر دی ہو اور احکام کے مآخذ ومصادر پر تفصیلی دلائل سے اشارہ کر دیا گیا ہو یا یہ اجتہاد کسی دوسرے کی مدد سے کیا گیا ہو۔

اس صورت حال کے پیش نظر کسی ایسے عالم کے بارے میں جو اکثر مسائل میں اپنے امام سے مطابقت رکھتا ہو اور اس کے ساتھ ہر کسی کی دلیل سے بھی واقف ہو اور ان دلائل پر اسے یقین کامل بھی ہو اور جس کام کی انجام دہی میں وہ مصروف ہے اس پر وہ پوری دسترس بھی رکھتا ہو، یہ سمجھتا ہے کہ اس دور میں مجتہد کا وجود نہیں ہے وہ ایک غلط اور بے بنیاد نظریہ قائم کرنے کا مرتکب ہوتا ہے۔(۲)

شرائط اجتہاد

اجتہاد کی شرط یہ ہے کہ جن مسائل میں اجتہاد کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ انْ مسائل کے بارے میں قرآن وسنت میں جو کچھ ہے اس سے پوری طرح واقف ہو، یہ بھی جانتا ہو کہ کن مسائل میں اجماع منعقد ہو چکا ہے، قیاس صحیح کی کیا شرائط ہیں یہ بھی اسے معلوم ہو، کن اصول اور مقدمات کو جوڑ کر اور ترتیب دے کر اجتہاد کیا جا سکتا ہے، وہ اس سے بھی بے خبر نہ ہو، عربی زبان پر کامل دسترس رکھتا ہو۔ قرآن میں ناسخ ومنسوخ کا بھی علم ہو۔ راویوں کے حالات سے بھی باخبر ہو۔ البتہ اجتہاد میں علم الکلام اور فقہ کی ضرورت نہیں۔ (۳)

غزالی (۴) کہتے ہیں کہ:

''ہمارے زمانے میں اجتہاد، فقہ میں مہارت اور گہرے شغف کے بغیر ممکن نہیں''۔

مسائل کو صحیح طور پر سمجھنے کا یہی ایک طریقہ ہے مگر صحابہؓ کے زمانے میں صورت حال اس سے مختلف تھی۔

میں کہتا ہوں: غزالی کی مراد یہ ہے کہ اجتہاد مطلق منتسب اس وقت مکمل ہوتا ہے جب مجتہد مستقل کی تصریحات سے ہر منتسب کو واقفیت حاصل ہو، جیسا کہ مجتہد مستقل کے لیے صحابہؓ، تابعین اور تبع تابعین کے کلام سے ابواب فقہ میں واقفیت ضروری ہے، اجتہاد کی یہ مذکورہ بالا شرائط اصول فقہ کی کتابوں میں تفصیل کے ساتھ ذکر کی گئی ہیں۔

اس موقع پر بغویؒ (۵) کی رائے نقل کر دینے میں بھی کوئی حرج نہیں، وہ کہتے ہیں ''مجتہد وہ ہے جو پانچ علوم کا جامع و ماہر ہو۔

(۱) کتاب اللہ کا وسیع علم

(۲) سنت رسول اللہ کا وسیع علم

(۳) علمائے سلف نے جو کچھ لکھا اس سے آگہی جو بخوبی جانتا ہو کہ علمائے سلف نے کس مسئلہ میں اتفاق کیا ہے اور کس مسئلے میں ان کی آراء مختلف ہیں۔

(۴) قیاس کے طریقۂ کار کو جانتا ہو اور یہ کہ قیاس، قرآن وسنت سے کسی مسئلہ کا حکم معلوم کرنے کا ایک طریقہ ہے، اس صورت میں جب مجتہد کو مطلوبہ حکم نہ قرآن وسنت کے نصوص میں

ملے اور نہ اس کے بارے میں کوئی اجماع منعقد ہوا ہو۔

(۵) عربی لغت میں مہارت۔

(ان علوم پنج گانہ کو کیسے حاصل کیا جائے اس کی تفصیل حسب ذیل ہے)

مجتہد کے لیے قرآن حکیم کے علوم میں سے ان علوم کا جاننا ضروری ہے، ناسخ ومنسوخ، مجمل ومفسر، عام وخاص، محکم ومتشابہ، نیز یہ جاننا ضروری ہے کہ صحیح، ضعیف، مسند اور مرسل کی تعریفات کیا ہیں اور ان کے درمیان کیا فرق ہے۔

حدیث کو قرآن کے ساتھ اور قرآن کو حدیث کے ساتھ تطبیق دینے کی کیا صورت ہے؟ ضروری ہے کہ مجتہد یہ بھی جانتا ہو کہ وہ اگر کوئی ایسی حدیث جس کا ظاہری مفہوم قرآن کے مطابق نہیں ہے تو یہ کھوج لگائے اور اس حقیقت تک پہنچے کہ اس حدیث کی قرآن کے ساتھ مطابقت کس طرح ممکن ہے؟ کیونکہ حدیث قرآن کی توضیح وتشریح ہے، وہ قرآن کے مخالف نہیں ہو سکتی۔

ہاں یہ بات ہے کہ مجتہد کے لیے صرف ان احادیث کا جاننا ضروری ہے جن کا تعلق شرعی احکام سے ہے، ان احادیث کا علم ضروری نہیں جو قصص، واقعات اور وعظ ونصیحت پر مشتمل ہیں۔

اسی طرح عربی لغت کا بھی اس حد تک جاننا ضروری ہے جس کے سبب قرآن وسنت میں وارد احکام ومسائل کا علم ہو سکے، پورے عربی لغت کا احاطہ ضروری نہیں ہے!

بہتر یہ ہے کہ عربی زبان میں اتنی مہارت حاصل کرے کہ اس کے معانی ومطالب اور مدلول کو بخوبی سمجھ سکے، وہ اس بات سے آگاہ ہو کہ سیاق وسباق کی مناسبت سے فلاں لفظ اور جملے کے فلاں مقام پر یہ معنی ہیں۔(۶)

عربی زبان پر اس حد تک عبور اس لیے ضروری ہے کہ شریعت عربی زبان میں نازل ہوئی ہے۔(خواہ وہ قرآن کی صورت میں ہو یا حدیث کی شکل میں) جو شخص عربی زبان سے پوری طرح واقف نہ ہوگا وہ شارع علیہ السلام کے مقصود کو نہیں پہچان سکے گا۔

صحابہؓ اور تابعینؒ کے ان اقوال وآراء کا علم ضروری ہے جو ان سے احکام کے بارے میں منقول ہیں۔(۷)

مختلف مسائل کے بارے میں (قدیم) فقہاء نے جو فتوے دیئے ہیں۔ ان کا جاننا بھی

ضروری ہے تاکہ اس کی کوئی رائے اور فیصلہ اسلاف کے فتاویٰ اور فیصلوں کے خلاف نہ ہو کیوں کہ
کہ اگر ایسا ہو تو اسلاف کے اجماع کے خلاف ایک نئی رائے دینے کا مرتکب ہوگا۔

جب ان مذکورہ پانچ علوم میں مہارت حاصل کرے گا تو پھر مجتہد کہلائے گا، لیکن ان علوم میں مہارت اس حد تک ضروری نہیں کہ ان کا کوئی جز اور معمولی حصہ بھی اس کے علم سے خارج نہ ہو، البتہ اگر ان پانچ علوم میں سے کسی ایک علم سے کلی طور پر ناواقف ہو تو پھر اس کے لیے تقلید کا راستہ اختیار کرنا ہی بہتر ہے، اگرچہ وہ شخص ائمہ سلف میں سے کسی ایک کے فقہی مسلک پر مکمل عبور رکھتا ہو۔ ایسے شخص کے لیے عہدۂ قضا کو قبول کرنا اور مفتی کے منصب پر فائز ہونا جائز نہیں ہے۔(۸)

جو شخص ان پانچ علوم کا جامع ہو، نفسانی خواہشات اور بدعات سے اپنے آپ کو بچاتا ہو، تقویٰ اور پاکیزگی اس کا شعار ہو، کبیرہ گناہوں سے دور رہتا ہو اور صغیرہ گناہوں پر اصرار نہ کرتا ہو، وہ قاضی بھی بن سکتا ہے اور مسائل شریعت میں اس کے لیے اجتہاد بھی جائز ہوگا، اور جو شخص ان شرائط کا جامع نہ ہو اس کے لیے ضروری ہے کہ پیش آمدہ واقعات و حوادث میں سے کسی ایک امام مجتہد کی تقلید کرے۔ (بغویؒ)

اقسام مجتہد

رافعی (۹) اور نوویؒ (۱۰) وغیرہ نے وضاحت کی ہے کہ مجتہد مطلق کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) مجتہد مستقل (۱۱) (۲) مجتہد منتسب (۱۲)

ان علماء کے کلام سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ مجتہد مستقل تین امور میں دوسرے مجتہدین سے ممتاز ہوتا ہے۔

الف۔ وہ اصول میں تصرف اور تبدیلی کرتا ہے جن پر اس کے اجتہاد کی بنیاد ہوتی ہے۔

ب: جن مسائل کا حکم پہلے معلوم کیا جا چکا ہے ان کی تہہ تک پہنچنے کے لیے ان آیات، احادیث اور آثار کی تلاش و جستجو میں ممکنہ حد تک اپنی قوت و صلاحیت صرف کرتا ہے جن پر اس حکم کی بنیاد ہے، متعارض دلائل میں سے کسی ایک کو اختیار کر کے اس کے راجح معانی بیان کرتا ہے اور ان دلائل کی مدد سے احکام کے مآخذ و مصادر سے آگہی حاصل کرتا ہے، اللہ زیادہ بہتر جانتا ہے لیکن

ہمارا گمان ہے کہ یہ بات امام شافعیؒ (۱۳) کے علم کا دو تہائی حصہ ہے۔

ج: ان دلائل کی مدد سے ان مسائل میں گفتگو کرنا جن کا ابھی تک کوئی حکم دریافت نہیں کیا جا سکا۔

مجتہد منتسب وہ ہے کہ جو اپنے استاذ و امام کے اصول کو برقرار رکھ کر عموماً دلائل کی تلاش اور ماخذ تک رسائی حاصل کرنے کے لیے اس کے اقوال و آراء سے مدد لے اور اس کے ساتھ ان دلائل پر کامل یقین رکھتا ہو جن کو اس کے شیخ نے مسائل کا حکم معلوم کرنے کے لیے بنیاد بنایا ہو، وہ خود بھی ان دلائل کی مدد سے مسائل کے احکام معلوم کرنے کی قدرت رکھتا ہو خواہ وہ کم ہوں یا زیادہ۔

جاننا چاہیے کہ مذکورہ بالا امور صرف مجتہد مطلق میں شرط ہیں اور جو مجتہد منتسب سے کم درجہ رکھتا ہو وہ مجتہد فی المذہب کہلاتا ہے، جن مسائل میں اس کے امام کی رائے وضاحت کے ساتھ مذکور ہو اس میں اپنے امام کی تقلید کرتا ہے لیکن تقلید کے باوجود امام کے مقررہ اصول و قواعد اور اس کے مسلک کی بنیاد سے بخوبی واقف ہوتا ہے۔ چنانچہ جب ایسا کوئی مسئلہ سامنے آتا ہے جس میں امام کی کوئی واضح رائے موجود نہیں تو یہ مجتہد فی المذہب اپنے امام کے اقوال و آراء کی روشنی میں اسی کے طریقے پر اجتہاد کر کے مسئلہ کا حکم معلوم کر لیتا ہے۔

مجتہد فی المذہب سے کم درجہ مجتہد فی الفتویٰ کا ہوتا ہے، یہ اپنے امام کے مذہب (مسلک) سے پوری طرح واقف ہوتا ہے اور اس بات پر قادر ہوتا ہے کہ امام کے ایک قول کو اس کے دوسرے قول پر اور اس کے اصحاب کی ایک دلیل کو دوسری دلیل پر ترجیح دے سکے، حق کیا ہے؟ اسے اللہ جل جلالہ ہی زیادہ بہتر جاننے والا ہے۔

باب(۱)

حواشی وحوالہ جات

الکتاب:

امام ابوالحسن علی بن محمد حسن بزدویؒ (م:۴۸۲ھ) نے کتاب اللہ کی حسب ذیل تعریف کی ہے۔اما الکتاب فالقرآن المنزل علی رسول اللہ المکتوب فی المصاحف والمنقول عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم نقلاً متواترا بلا شبھة. (بہرحال الکتاب، اس سے مراد وہ قرآن ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا گیا، صحیفوں میں لکھا ہوا ہے، کسی شک وشبہ کے بغیر نقل متواتر کے ذریعہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا گیا ہے)۔
(اصول بزدوی)

السنة:

لغت میں سنت اس راستے یا طریقے کو کہتے ہیں جس پر لوگ پابندی کے ساتھ چلتے ہوں۔ لفظ سنت کی نسبت جب کسی انسان کی طرف کی جاتی ہے تو اس سے مراد وہ طریقہ ہوتا ہے جس کو وہ تمام افعال میں جو اس سے صادر ہوں، لازم سمجھتا ہو اور ان کو ہمیشگی کے ساتھ کرتا ہو، اس کا تعلق خواہ ان کاموں سے ہو جن کے سبب اس کی تعریف کی جائے یا ان کاموں سے ہو جن کی وجہ سے اس کی برائی کی جائے۔

علمائے اصول کی اصطلاح میں سنت سے مراد قرآن حکیم کے علاوہ وہ قول، فعل یا سکوت ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صادر ہوا ہو، سکوت یا تقریر کا مطلب یہ ہے کہ نبی علیہ السلام کے سامنے اور ان کی موجودگی میں صحابہ رضی اللہ عنہ نے کوئی کام کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر خاموشی اختیار فرمائی یا اس کی تعریف کی اور اس کام کو اچھا سمجھا، اس اعتبار سے سنت مآخذ احکام میں سے ایک مآخذ اور تشریع احکام کے سرچشموں میں سے ایک سرچشمہ ہے۔ ابن حزمؒ (م:۴۵۶ھ) نے سنت کی تعریف یوں کی ہے:

''کسی قول یا عمل کو ایک ثقہ راوی دوسرے ثقہ راوی سے نقل کرتے ہوئے نبی علیہ السلام تک پہنچائے اور اس کی نسبت نبی علیہ السلام کی طرف کرلے اور نقل کرنے

والے کے درمیان اور نبی علیہ السلام کے درمیان کوئی فصل نہ ہو۔" (یعنی روایت کا تسلسل ٹوٹنے نہ پائے)

(ارشاد الفحول محمد بن علی بن محمد شوکانی (م: ۱۲۵۵ھ) الاحکام فی اصول الاحکام۔ علی بن محمد بن حزم (م: ۴۵۶ھ)۔ ۱: ۲۳۰، الفقہ الاسلامی۔ ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ ص: ۴۴)

اجماع:

لغت کی رو سے اجماع کے دو معنی اور دو صورتیں ہیں۔ اول: کسی چیز کا ارادہ کرنا اور اس پر پختگی کے ساتھ جم جانا، دوسرے معنی اتفاق کے ہیں، فقہاء کی اصطلاح میں اجماع کسی معاملے میں اہل حل وعقد کے اتفاق کو کہتے ہیں، اصول کی کتابوں میں اجماع کی یہ تعریف کی گئی ہے۔

الاجماع هو اتفاق المجتهدين من الامة الاسلامية في عصر من العصور على حكم شرعي بعد وفاة النبي صلى الله عليه وسلم.

(اجماع سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد کسی خاص زمانے میں امت مسلمہ کے مجتہدین کا کسی شرعی حکم پر متفق ہو جانا ہے)

ارشاد الفحول۔ شوکانی ص: ۶۳، الاحکام فی اصول الاحکام۔ ابوالحسن سیف الدین علی بن محمد آمدی (م: ۶۳۱ھ۔ ۱: ۲۸۰، ۲۸۱)۔

قیاس

لغت میں ایک چیز کو دوسری چیز سے ناپنے یا مقدار معلوم کرنے کو کہتے ہیں۔ علمائے اصول کی اصطلاح میں قیاس کی تعریف یہ ہے:

"جس مسئلہ کے بارے میں قرآن یا سنت میں کوئی حکم موجود نہ ہو، اس کو کسی دوسرے حکم کے ساتھ جو قرآن یا سنت میں موجود ہو، علت میں مشترک ہونے کے سبب ملانے کو قیاس کہتے ہیں۔" (ارشاد الفحول، شوکانی، ص: ۱۷۴)

۲) کوئی وقت اور کوئی زمانہ اجتہاد سے خالی نہیں۔ ہر زمانے میں اجتہاد لازم ہے، کیونکہ ہر آن اور ہر لحظہ ایسے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں اور ایسی جزئیات پیش آتی رہتی ہیں جن کا حکم صراحتاً کتاب وسنت میں موجود نہیں ہوتا، ان کا حکم معلوم کرنے کے لیے اجتہاد کے سوا کوئی ذریعہ

نہیں۔اجتہاد اپنی تمام شرائط کے ساتھ قیامت تک باقی رہے گا۔اجتہاد کو کسی خاص زمانے کے ساتھ مخصوص ومحدود کرنا اسلامی شریعت کی ابدیت کا انکار کرنے کے مترادف ہے،شوکانی ،بعض علماء کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ:

''اگر کسی زمانے میں ایک ہی مجتہد ہے تو اس پر اجتہاد کرنا فرض عین ہے تاکہ پیش آمدہ جزئی مسائل کے احکام معلوم کر کے لوگوں کی رہنمائی کرتا رہے اور اگر اس دور میں ایک سے زائد مجتہدین موجود ہوں تو ان پر اجتہاد فرض کفایہ ہوگا،اگر کوئی بھی اجتہاد نہیں کرے گا تو سب گناہگار اور تارک فرض ہوں گے۔'' (ارشاد الفحول ص:۲۵۱)

۳)علماء ،فقہاء،اور خود مجتہدین نے اجتہاد کی جو شرائط بیان کی ہیں وہ کم از کم چھ ہیں:

(۱)عربی زبان میں مہارت۔(۲)قرآنی علوم کا وسیع علم۔(۳)سنت کا علم۔(۴)اصول فقہ کا علم۔(۵)مواقع اجماع کا علم۔(۶)مقاصد شریعت کا علم۔

ناچیز راقم (محمد میاں صدیقی) کہتا ہے کہ علماء اور فقہاء کی محولہ بالا شرائط کے علاوہ فطری استعداد اور صلاحیت کا ہونا بھی ضروری ہے بلکہ یہ شرط اول ہے،آدمی میں اگر فطری صلاحیت نہ ہو تو باہر کی تعلیم وتعلم سے کچھ بھی نہیں ہوتا،نبی علیہ السلام سے فیض صحبت تو بہت سوں نے اٹھایا مگر ہر آدمی ابوبکرؓ،عمرؓ،عثمانؓ،علیؓ،ابن مسعودؓ،ابن عباسؓ اور معاذ بن جبل (رضی اللہ عنہم) نہ بن سکا۔

آمدیؒ نے ایک اور شرط بیان کی اور اسے سب شرائط پر مقدم رکھا۔وہ کہتے ہیں کہ:

''مجتہد کے لیے سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ اللہ پر،اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر اور یوم آخرت پر پختہ یقین رکھتا ہو۔'' (احکام:۴،۲۲۰)

۴)محمد بن محمد الغزالیؒ۔(متوفی:۵۰۵ھ)

۵)ابومحمد حسین بن مسعود بن محمد الفراء البغویؒ۔(متوفی:۵۱۶ھ)

۶)لغت کی رو سے ایک لفظ کے ایک یا دو معانی ہوتے ہیں لیکن سیاق وسباق کی تبدیلی سے معنی بدل جاتے ہیں بلکہ گفتگو میں لہجہ کی تبدیلی سے بھی معنی مختلف ہوجاتے ہیں۔لفظ ''دین'' یا ''الدین'' قرآن حکیم میں مختلف مقامات پر آیا ہے اور مختلف معانی میں استعمال ہوا ہے۔

''ولی'' ۴۵ جگہ آیا ہے۔ کہیں اضافت کے بغیر اور کہیں اضافت کے ساتھ، سیاق وسباق کی تبدیلی سے مختلف معانی میں استعمال ہوا ہے اور قرآن حکیم کے فاضل مترجمین نے اس کی رعایت کی ہے، یہ ممکن نہیں ہے کہ ہر جگہ اس کا ایک ہی ترجمہ کیا جائے، اس لیے ضروری ہے کہ اجتہاد کرنے والا زبان کے اسلوب اور اس کی باریکیوں سے پوری طرح واقف ہو۔

۷) صحابی اس شخص کو کہتے ہیں جس نے ایمان کی حالت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہو یا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو دیکھا ہو اور وہ ایمان کی حالت میں فوت ہوا ہو۔ تابعی اس شخص کو کہتے ہیں کہ جو ایمان کی حالت میں کسی صحابی سے ملا ہو اور ایمان ہی کی حالت میں مرا ہو۔

۸) امام ابوحنیفہؒ نے تدوین فقہ اسلامی کے لیے جو چالیس ارکان پر مشتمل مجلس بنائی تھی اس کے بارے میں ان کا تجزیہ تھا کہ:

''میں نے اپنی مجلس فقہ کے لیے جن افراد کا انتخاب کیا ہے ان میں اٹھائیس اس درجے کے ہیں کہ قاضی کے منصب پر فائز ہو سکتے ہیں اور چھ افراد ایسے ہیں جو فتویٰ دینے کی اہلیت رکھتے ہیں۔''

صدیوں تک مفتی کا یہی معیار قائم رہا جس شخص میں اجتہاد کی اہلیت نہیں ہوتی تھی وہ نہ مفتی بن سکتا اور نہ قاضی کے منصب پر فائز ہو سکتا تھا، اسی معیار کے پیش نظر شاہ ولی اللہؒ نے یہ بات کہی ہے کہ جو شخص ان پانچ علوم میں مہارت نہ رکھتا ہو جو مجتہد کے لیے ضروری ہے تو اس کے لیے مسند افتاء پر بیٹھنا جائز نہیں ہے۔

آج کے ماحول میں یہ بات بڑی عجیب سی معلوم ہوتی ہے کیونکہ اب تو صورت حال یہ ہے کہ جو آدمی مذکور پنجگانہ علوم میں سے کسی ایک میں بھی مہارت نہ رکھتا ہو وہ بھی گزشتہ دو ڈھائی سو سال کے فتاویٰ کو سامنے رکھ کر فتوے دینا شروع کر دیتا ہے، علوم القرآن اور علوم الحدیث تو درکنار اسے قدیم فقہاء کے اقوال اور فقہی آراء کا بھی علم نہیں ہوتا۔

گزشتہ سو سال میں برصغیر میں جو فتاویٰ مرتب ہوئے ان سب کے بنیادی مصادر فتاویٰ شامی، فتاویٰ عالمگیری اور درمختار ہیں، قرآن، سنت اور قدیم فقہاء کی آراء کے حوالے ان میں شاذ

و نادر ہی نظر آتے ہیں۔

۹) ابو القاسم عبد الکریم بن محمد بن عبد الکریمؒ۔ (۶۲۳ھ) فقیہ، شافعی المسلک۔

۱۰) ابو زکریا محی الدین یحییٰ بن شرف نوویؒ، (متوفی: ۶۷۲ھ) محدث، فقیہ۔

۱۱) مجتہد مستقل اس کو کہتے ہیں کہ جو ان اصول وکلیات یعنی اجتہادی مآخذ ومصادر میں رد وبدل اور تصرف کا اختیار رکھتا ہو جن پر احکام ومسائل کی بنیاد قائم ہوتی ہے۔

۱۲) مجتہد منتسب وہ ہے جو کسی تصرف کے بغیر، مقررہ اصول وکلیات کو تسلیم کرتا ہو اور مسائل کے استخراج واستنباط میں انہی سے کام لیتا ہو، لیکن مسائل کے حل کرنے میں جس امام کے مقرر کردہ اصول سے زیادہ کام لیتا ہو اس کی طرف اس کی نسبت ہوتی ہے۔

یہ مجتہد بعض مسائل میں اپنے امام سے اختلاف بھی کرتا ہے لیکن اصول میں اتفاق کی وجہ سے اپنے امام کے دائرے میں سمجھا جاتا ہے۔

۱۳) امام محمد بن ادریس الشافعیؒ۔ امام مالکؒ بن انس (م: ۱۷۹ھ) کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں۔ مجتہد مطلق کا درجہ پایا، ۱۵۰ ہجری میں پیدا ہوئے، ۲۰۴ ہجری میں وفات پائی۔

باب ۲:

اختلاف مجتہدین، اسباب وعلل

جن فروعی مسائل میں کوئی قطعی حکم نہ ہو، اس میں اگر دو مجتہد مختلف ہو جائیں اور کسی ایک رائے پر دونوں متفق نہ ہوں تو اس بارے میں علماء کا اختلاف ہے کہ دونوں کو صحت اور صواب پر مانا جائے یا ان میں سے ایک کو۔

ابوالحسن اشعری، قاضی ابوبکر، ابویوسف، محمد بن حسن اور ابن شریح (رحمہم اللہ) (۱) کی رائے ہے کہ دونوں مجتہد حق پر ہیں اور صواب کو پانے والے ہیں۔ اشاعرہ (۲) کے جمہور متکلمین اور معتزلہ (۳) کی یہ رائے ابویوسفؒ کی کتاب الخراج میں وضاحت کے ساتھ نقل کی گئی ہے کہ اختلاف آراء کے باوجود دونوں مجتہد حق پر تصور کیے جائیں گے، ائمہ اربعہ (ابوحنیفہؒ، مالکؒ، شافعیؒ اور احمد بن حنبلؒ) اور جمہور فقہاء کی رائے یہ ہے کہ دونوں مجتہدین میں سے ایک حق کو پانے والا ہے اور ایک حق کو نہ پانے والا۔

ابن سمعانی (۴) کتاب ''قواطع'' میں لکھتے ہیں کہ امام شافعیؒ کی رائے یہ ہے کہ اختلاف آراء کی صورت میں ایک مجتہد حق پر سمجھا جائے گا۔

بیضاویؒ ''منہاج الاصول'' (۵) میں کہتے ہیں کہ:

''مجتہدین کے حق پر ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں اختلاف، اس اختلاف کی بنیاد پر ہے کہ ہر مسئلہ میں ایک ایسا حکم معین ہوتا ہے جس پر کوئی قطعی یا ظنی دلیل موجود ہوتی ہے اور پسندیدہ رائے وہی ہے جو مستند طریقے سے امام شافعیؒ سے نقل کی

گئی ہے کہ ہر واقعے میں ایک معین حکم ہوتا ہے، جس کے لیے کوئی نہ کوئی قرینہ اور علامت موجود ہوتی ہے۔ جس نے اس علامت کو پہچان لیا، اس نے حق کو پالیا اور جو اس علامت اور قرینے کو نہ پہچان سکا وہ غلطی کا مرتکب ہوا۔ اس لیے کہ دلائل اجتہاد سے مقدم ہیں۔ اجتہاد، دلائل کی تلاش وجستجو ہی کا نام ہے اور دلالت، حکم سے مؤخر ہے۔ تو اگر ایک ہی مسئلے میں دو اجتہاد جمع ہو جائیں تو یہ دونقیضوں کا اجتماع ہوگا (اور یہ محال ہے)۔''

ایک ہی مسئلہ میں کیے جانے والے دونوں اجتہادوں کو درست ماننا اس لیے بھی ممکن نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''جو مجتہد حق کو پالے اس کے لیے دو اجر ہیں اور جو اس غلطی کا مرتکب ہو اس کے لیے ایک اجر ہے''

اس رائے اور موقف پر ایک اعتراض کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ جب ہر مسئلے کا ایک معین حکم ہے تو اس حکم کے خلاف دوسرا حکم لگانے والا، اللہ کی طرف نازل کیے جانے والے حکم کے خلاف ایک حکم معین کرنے کا مرتکب قرار پائے گا اور یہ فسق ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

''جو اللہ کے نازل کیے ہوئے حکموں کے مطابق فیصلہ نہیں کرتا وہ فاسق ہے۔''(۶)

اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اجتہاد کرنے والے نے اگرچہ غلطی کی مگر اپنی کوشش اور خیال کے مطابق صحیح حکم تلاش کیا، قطع نظر اس سے کہ وہ اللہ کے نازل کردہ حکم کے مطابق نہیں ہے۔

ایک اعتراض یہ کیا گیا کہ اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ ہر مجتہد کا اجتہاد حق وصواب پر مبنی ہے تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا مخالف کو حاکم مقرر کرنا درست نہیں ہوگا، انھوں نے حضرت زید رضی اللہ عنہ کو حاکم مقرر کیا تھا۔

اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ اس کو منصب سونپنا اور حاکم بنانا درست نہیں جس کا باطل پر ہونا اور واضح اور ظاہر ہو، اور جو مجتہد غلطی کا مرتکب ہوتا ہے وہ باطل پر نہیں ہوتا۔ (بیضاویؒ)

جواب مصنف:

بیضاویؒ کا کہنا ہے کہ ہر مسئلہ کا ایک معین حکم ہوتا ہے، بے دلیل بات اور دعویٰ ہے اور ایک

ایسی چیز پر حکم لگانا ہے جو فی الواقع موجود ہی نہیں ہے۔

نیز انھوں نے امام شافعیؒ کا جو قول نقل کیا ہے کہ "ہر واقعہ کے لیے ایک معین حکم ہے" اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر واقعہ کے بارے میں ایک رائے ایسی ہوتی ہے جو اصول اور اجتہاد کے قواعد وضوابط سے زیادہ مطابقت رکھتی ہے، اجتہاد کے لیے کیے جانے والے دلائل اس بات کی واضح نشان دہی کرتے ہیں کہ (یہ رائے اصول اجتہاد کے زیادہ مطابق ہے) جو ان تمام امور کی تہ تک پہنچ گیا، اس نے حق کو پالیا اور جو ان امور کی تہ تک نہ پہنچ سکا، وہ غلطی کا مرتکب ہوا لیکن خطا اور غلطی کے باوجود یہ نہیں کہا جائے گا کہ وہ گنہگار رہا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ امام شافعیؒ نے اپنی کتاب "الام" (۷) کے آغاز میں کہا ہے کہ:

> "جب ایک عالم دوسرے عالم سے کہے کہ تم نے غلطی کی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اس راستے پر نہیں چل سکے جس پر چلنا علماء کی شان کے مطابق تھا اور تمہیں اس راستے پر چلنا چاہیے تھا"۔

امام شافعیؒ نے اس مسئلہ کو "الام" میں بہت وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے اور اس کی متعدد مثالیں بھی دی ہیں۔

امام شافعیؒ نے جو کہا ہے کہ اس کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ اگر کسی امر او رواقعہ کے بارے میں خبر واحد موجود ہو (۸) اور مجتہد کی اس تک رسائی ہو جائے تو وہ حق کو پالینے والا سمجھا جائے گا اور جو خبر واحد کو نہ پا سکے وہ غلطی کا مرتکب کہلائے گا۔

امام شافعیؒ نے اس بات کو بھی "الام" میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔

بیضاویؒ کہتے ہیں کہ: دلائل، اجتہاد سے مقدم ہوتے ہیں اور اجتہاد بعد میں وقوع پذیر ہوتا ہے، اس کے جواب میں ہمارا کہنا یہ ہے کہ اللہ تعالی نے ہمارے لیے اس بات کو عبادت بنا دیا ہے کہ ہم اس چیز کو پانے کی مقدور بھر کوشش کریں جس کو اجتہاد کے ذریعے پا سکتے ہیں، چنانچہ جس چیز کو ہمیں اجمالی علم ہوتا ہے ہم اس کو تفصیلی طور پر جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔

بیضاویؒ نے یہ بات بھی کہی ہے کہ اگر دونوں مجتہدوں کو حق اور صواب پر مانا جائے تو دو نقیضوں کا بیک وقت جمع ہونا لازم آئے گا۔

اس بات کے جواب میں ہم یہ کہتے ہیں کہ اس معاملے کی صورت بالکل کفارہ کی سی ہے کہ اس کی ایک سے زائد صورتوں میں سے ہر صورت واجب بھی ہے اور واجب نہیں بھی۔ بیضاوی نے کہا: ''جو مجتہد حق اور صواب کو پالے اس کے لیے دو اجر ہیں۔''

ہم کہتے ہیں: یہ دلیل ان کے موقف کی مؤید نہیں بلکہ مخالف ہے، اس لیے کہ جس خطا اور غلطی کے نتیجے میں اجر و ثواب واجب ہوتا ہو وہ گناہ کیسے ہوسکتی ہے؟

اس صورت حال سے یہ بات یقینی ہوئی کہ دونوں اجتہاد اللہ جل جلالہ کے لیے ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ ان میں سے ایک دوسرے سے افضل ہے۔ جیسے عزیمت اور رخصت (کہ دونوں درست ہوتی ہیں اور دونوں پر عمل جائز ہوتا ہے) یا یہ کہا جا سکتا ہے کہ دو اجتہادوں میں سے ایک کا حق پر ہونا قاضی کے حکم اور فیصلے کے لحاظ سے ہے اور خارج میں یا تو مدعی کا قول ثابت ہوتا ہے یا منکر کا۔ بیضاوی نے کہا: ''مجتہد نے جس رائے کو صحیح سمجھا اس کا حکم دیا۔'' اس کا جواب یہ ہے کہ ان کا یہ کہنا ہمارے مقصود اور مدعا کا اعتراف کر لینے کے مترادف ہے۔ (کیونکہ ہم بھی اس کو مخالف حق نہیں کہتے)۔ بیضاوی نے کہا: ''غلطی کرنے والا مجتہد باطل پر نہیں ہوتا۔''

ہم کہتے ہیں کہ جب باطل پر نہیں ہوتا تو حق کے مخالف بھی نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ جو حق کے مخالف ہوگا وہ باطل پر ہوگا اور حق کے بعد سوائے گمراہی کے اور کیا باقی رہ جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ائمہ اربعہ کی جانب جو قول منسوب کیا گیا ہے وہ ان کی بعض تصریحات سے اخذ کیا گیا ہے، وضاحت کے ساتھ ان سے منقول نہیں ہے اور جس مسئلے میں نص یا اجماع کی رو سے اختیار ہو اس میں دونوں مجتہدوں کے حق اور صواب پر ہونے میں امت کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے، جیسے قرآن کریم کی سات قرائتیں، دعاؤں کے مختلف کلمات اور صیغے، نماز وتر کی رکعتیں سات ہیں، نو ہیں یا گیارہ، لہٰذا جس مسئلے میں از روئے دلالت اختیار ہو، اس میں اختلاف کرنا مناسب نہیں۔

اختلاف چار قسم کا ہوتا ہے۔

(۱) جس معاملے میں حق قطعی اور یقینی طور پر متعین ہو اس صورت میں اختلاف کا کوئی جواز نہیں، معین اور طے شدہ حق کے سوا جو بھی صورت ہوگی وہ باطل ہوگی۔

(۲) جس مسئلے میں غالب رائے کی مدد سے حق کا تعین ہو جائے اور باطل گمان غالب کے درجے میں ہو۔

(۳) جس مسئلے کے دونوں پہلوؤں میں کلی طور پر اختیار ہو، کوئی ایک پہلو اور سمت دوسرے سے راجح نہ ہو۔

(۴) جس کے دونوں اطراف میں غالب رائے کے ذریعے اختیار دیا گیا ہو۔

ان اقسام کی تفصیل اس طرح ہے کہ اگر مسئلہ کی نوعیت ایسی ہے کہ اس سے قاضی کے فیصلے کو منسوخ کیا جا سکتا ہے، مثلاً اس بارے میں کوئی صحیح اور مشہور حدیث موجود ہے تو اس صورت میں جو بھی اجتہاد اس حدیث کے خلاف ہوگا وہ باطل ہوگا۔ البتہ غلطی کے مرتکب مجتہد کو اس وقت تک معذور تصور کیا جائے گا جب تک اس کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث نہیں ملتی۔

اگر اجتہاد کسی ایسے واقعہ سے متعلق ہے جو گزر چکا اور اب مشتبہ ہو گیا، مثلاً کسی خاص شخص کی موت یا زندگی اس میں شک پیدا ہو گیا اس معاملے میں حق اور یقینی امر ایک ہی ہے (وہ شخص زندہ ہے یا مر چکا) مگر غلطی کا ارتکاب کرنے والے مجتہد کو معذور سمجھا جائے گا۔

اگر اجتہاد کسی ایسے معاملے میں ہے جسے مجتہد کی کوشش اور عقل کے حوالے کر دیا گیا ہو اور دونوں مآخذ قریب قریب ہیں، دونوں میں سے کوئی بھی ذہن سے اتنا دور نہیں کہ کسی ایک مآخذ والے کو قصوروار ٹھہرایا جائے کیوں کہ ایسا کرنا لوگوں کے عرف و عادت کا حصہ نہیں ہے، جیسے دو آدمیوں میں سے ہر ایک سے کسی نے یہ کہا کہ تمہیں جو فقیر ملے اسے میرے مال میں سے دو درہم دے دو، اس نے کہا: مجھے کیسے معلوم ہوگا کہ فلاں آدمی فقیر ہے؟

صاحب مال نے کہا: جب کسی شخص کے حالات اور قرائن سے تمہیں یقین ہو جائے کہ یہ فقیر (اور ضرورت مند) ہے تو اسے دو درہم دے دو، اب ان دو شخصوں کے درمیان کسی ایک آدمی کے بارے میں اختلاف ہو گیا۔ ایک کہتا ہے کہ یہ فقیر ہے دوسرا کہتا ہے فقیر نہیں ہے اور مآخذ دونوں کے ذہن سے اتنے قریب ہیں کہ دونوں میں سے ہر ایک پر عمل کیا جا سکتا ہے۔ اس صورت میں یہ دونوں شخص حق تک رسائی حاصل کرنے والے سمجھے جائیں گے، اس لیے کہ مال والے نے اپنے حکم کو اسی پر محمول کیا تھا کہ اس کی سوچ اور تحقیق کے لحاظ سے جو فقیر ہو اسی کو دو درہم دے دیے

جائیں اور اس کے ذہن میں کسی ظاہری تصور کے بغیر یہی آیا۔

بخلاف اس صورت کے کہ کسی بڑے تاجر کو دے جس کے نوکر چاکر ہوں (اور قرائن اس کے فقر اور تنگ دستی کی نفی کرتے ہوں) تو اس تاجر کو فقیر کہنے اور سمجھنے والا غلطی کا مرتکب گردانا جائے گا اور جس شبہ کی طرف اس کا ذہن گیا ہے اس پر عمل کرنا غیر معقول ہوگا۔

اب یہاں دو صورتیں ہیں:

(۱) جس شخص کو دو درہم دینے کے لیے منتخب کیا، یا تو حقیقت میں فقیر ہے یا فقیر نہیں ہے اور اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ اس معاملے میں حق ایک ہی ہے (کہ وہ فقیر ہے یا امیر ہے) اور دو نقیضوں اور دو متضاد حقیقتوں کا ایک جگہ جمع ہونا ممکن نہیں ہے۔

(۲) مال دار کے کہنے کے مطابق اس شخص نے فقیر کو فقیر سمجھتے ہوئے دو درہم دے دیئے تو کیا اس نے مال دار کی تعمیل حکم کی یا نہیں؟ یقیناً تعمیل حکم کی، اب صورت حال یہ ہے کہ جس کی سوچ اور فیصلہ حقیقت اور واقعہ کے مطابق ہوا اس نے پورا پورا ثواب حاصل کر لیا۔

اگر اجتہاد ان امور میں سے کسی ایک کو ترجیح دینے میں ہو جن میں اختیار دیا گیا ہے، جیسے قرآن حکیم کی سات قرائتیں، دعاؤں کے کلمات اور وہ افعال جن کو نبی اکرم ﷺ نے لوگوں کی سہولت کی خاطر مختلف طریقوں سے انجام دیا، باوجودیکہ ان طریقوں میں سے ہر طریقہ کسی مصلحت پر مبنی ہے تو اس صورت میں دونوں مجتہد مصیب یعنی حق پانے والے سمجھے جائیں گے۔

محولہ بالا نقطہ نظر بالکل واضح اور ظاہر ہے اس میں کسی کے لیے سوچ بچار اور شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

مقامات اختلاف

فقہاء اور مجتہدین کے درمیان جو اختلافات ہوئے اس کے چار بنیادی اسباب ہیں:

(۱) ایک مجتہد کو کسی واقعہ کے بارے میں ایک حدیث ملی اور دوسرے مجتہد کو نہ مل سکی اس صورت میں حق کو پانے والا مجتہد معین ہے۔

(۲) ہر مجتہد کے پاس احادیث نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آثار صحابہ رضی اللہ عنہ موجود ہیں اور ہر ایک نے ایک حدیث کو دوسری حدیث کے ساتھ اور ایک اثر کو دوسرے اثر کے ساتھ تطبیق دینے

میں یا ترجیح دینے میں اجتہاد سے کام لیا ہے اور اس اجتہاد نے ہر مجتہد کو ایک معین حکم تک پہنچا دیا ہے، جس کے سبب اس طرح کا اختلاف رونما ہوا۔

(۳) مجتہد نے حسب ذیل امور میں اختلاف کیا:

الف مستعمل الفاظ ومحاورات کی تشریح وتوضیح اور ان کے مفہوم کا تعین۔

ب مستعمل الفاظ وکلمات کی جامع ومانع حدود کا تعین اور نشان دہی۔

ج اشیاء کے ارکان اور شرائط کی صحیح پہچان مثلاً ذکر، حذف، تخریج مناط (9) موصوف کا وصف عام سے، وصف خاص پر صادق آنا، کلیہ کا اپنی تمام جزئیات پر منطبق ہونا، وغیرہ وغیرہ۔

اس طرح ہر مجتہد کے اجتہاد نے اسے ایک جدا اور مستقل مسلک (اور رائے) تک پہنچا دیا۔

(۴) مجتہدین نے مسائل کے اصول میں اختلاف کیا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ فروعی مسائل میں بھی اختلاف پیدا ہو گیا۔

مذکورہ بالا تمام صورتوں میں تمام مجتہدین حق پر ہیں جب کہ سب کے ماخذ ہمارے ذکر کردہ معنی اور طریقہ کے قریب ہوں۔ یعنی ذہن کسی دشواری کے بغیر ان کو قبول کر سکے، عقلی نقطۂ نظر سے ان میں کوئی پیچیدگی نہ ہو۔

کتب اصول فقہ میں مذکورہ مسائل

اصول فقہ کی کتابوں میں جن مسائل کا ذکر ہے، ان کو دو حصوں اور قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

(۱) ایک قسم کا تعلق عربی الفاظ کی تلاش وجستجو سے ہے جیسے خاص، عام، نص اور ظاہر اور یہ ایسے ہے جیسے نحوی کا قول کہ یہ اسم نکرہ ہے اور معرفہ ہے، یہ علم ہے اور یہ جنس ہے، فاعل پر رفع (پیش) آتا ہے اور مفعول منصوب ہوتا ہے۔

مسائل کی اس پہلی قسم اور صورت میں زیادہ اختلاف نہیں ہے۔

(۲) دوسری قسم کے مسائل، ذہن کو ان امور کی طرف لے جاتے ہیں جنھیں عقل ودانش والا شخص اپنی صلاحیت اور سلیقہ سے انجام دے۔

اس کی تفصیل اس طرح ہے کہ آپ نے ایک سمجھدار آدمی کے سامنے پھٹی پرانی ایک کتاب رکھ دی جس کے بعض حروف اور جملے مٹ چکے تھے، آپ نے اس سے کہا کہ وہ یہ کتاب پڑھے،

اس نے کتاب پڑھنی شروع کی جہاں حروف مدہم ہیں یا مٹے ہوئے ہیں اور ان کا پڑھنا دشوار ہے، انھیں وہ سیاق وسباق اور قرینے کی مدد سے صحیح پڑھنے کی کوشش کرے گا۔

ایسی صورت میں دو عقل مند افراد کے درمیان اختلاف ہوسکتا ہے، جب کسی صاحب عقل ودانش کے سامنے دو راستے ہوں گے تو وہ اس راستے کو اختیار کرے گا جو دلائل اور مصالح کی رو سے محفوظ تر ہوگا، یا کم سے کم یہ کہ اس میں دوسرے راستے کے بالمقابل خطرات کم ہوں گے۔

بالکل ایسی صورت حال سے علماء بھی دوچار ہوتے ہیں، ائمہ مجتہدین کے سامنے مختلف قسم کی احادیث آئیں، انھوں نے ان میں غور وخوض کیا، ان کی قوت اجتہاد نے ان کو یہ راستہ دکھایا کہ ایسی صورت میں جب کہ ایک ہی مسئلے میں ایک سے زائد احادیث ہوں کہ وہ دلیل وبرہان یا قرینے کی بنیاد پر کسی ایک حدیث کو اس راجح حدیث کے ساتھ تطبیق دے لیں۔

اسی طرح ان کے سامنے بعض ایسے مسائل آئے جو سلف کے سامنے نہیں آئے تھے یا ان مسائل کا ظہور تو ہو چکا تھا مگر سلف نے ان کے بارے میں نہ گفتگو کی تھی اور نہ کوئی اجتہادی فیصلہ کیا تھا، ایسے مسائل کے بارے میں متاخرین علماء نے یہ طریقہ اپنایا کہ ان جیسے دوسرے مسائل میں غور وفکر کیا اور دیکھا کہ سلف نے ان کا کیا حکم تلاش کیا ہے سبب اور علت کا اشتراک ڈھونڈا، اگر سبب اور علت میں اشتراک یا یکسانیت پائی گئی تو وہی حکم پیش آمدہ مسئلہ کا معین کردیا جو اس کے مشابہ پہلے سے موجود کسی مسئلہ کا تھا۔

خلاصہ یہ کہ ائمہ مجتہدین میں جو فطری صلاحیتیں تھیں ان کی بدولت وہ ابلاغ وتفہیم کے لیے ایسی تدابیر وضع کرنے پر قادر ہوگئے تھے جیسے ایک انتہائی زیرک ودانا اپنی عقل ودانش کی مدد سے کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آنے کی صورت میں اس کے حل کے لیے اختیار کرتا ہے۔

اس تناظر میں اہل علم ودانش کی ایک جماعت نے ارادہ کیا کہ سلف کی ان تدابیر وطرق کو زیادہ وضاحت سے بیان کیا جائے جو انھوں نے اپنی کتابوں میں ذکر کی ہیں یا جن کی طرف انھوں نے اپنی تحریروں میں اشارہ کیا ہے یا جو انھوں نے بعض مسائل سے اخذ کی ہیں، اگرچہ اپنی کتابوں میں انھوں نے ان کا تفصیل کے ساتھ ذکر نہیں کیا۔

حل مسائل کے لیے سلف نے جو تدابیر اختیار کی تھیں بعد میں آنے والے اہل علم نے انہیں

قبول کرلیا اور کسی نئی کاوش، کوشش کی راہ ترک کردی، اس کی بنیادی وجہ بظاہر یہ تھی کہ وہ تدابیر اور طریقے ان میں موجود فطری صلاحیت اور سلیقے سے پوری مطابقت رکھتے تھے۔

بعد میں آنے والے اہل علم کی طرف سے سلف کے طریقہ ونہج کو کلی طور پر قبول کر لینے کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے بعد جو فقہاء آئے، انھوں نے انہی تدابیر وطرق کو مسلمہ اصول کا درجہ دے دیا۔

اسی طرح جب علمائے حدیث نے روایت حدیث میں صحیح کو سقیم سے اور مستفیض کو غریب سے ممتاز کرنے، جرح وتعدیل کی رو سے راویوں کے حالات معلوم کرنے اور کتب حدیث کی ترتیب وتدوین اور کتابت میں مقدور بھر کوشش کی اور ان تمام میدانوں میں اپنی ان صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کیا جو ان کو عطا کی گئیں تھیں تو ان کے بعد آنے والے ان اہل علم نے جنھوں نے ان کے موضوع کو اپنایا اور ان کے ہموار کیے ہوئے میدان میں چلنے کا فیصلہ کیا، ان کی تدابیر وطرق کو مرتب ومدون اصول وکلیات کی صورت دے دی اور ان میں کسی ترمیم واضافے کی کوشش نہیں کی۔

یہاں ایک اہم اور قابل غور نکتہ ہے وہ یہ کہ اس قسم کے کلی اور اصولی مقدمات پر عمل کرنے کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ جو جزئی صورت اور مسئلہ زیر بحث ہو وہ ان صورتوں اور ان مسائل میں سے نہ ہو جن کی اضداد کا حکم اہل علم ودانش پہلے معین کر چکے ہیں، کیوں کہ بسا اوقات ایسے مخصوص قرائن ہوتے ہیں جو کلیات کے طے کردہ حکم کے خلاف کسی دوسرے حکم کی نشان دہی کرنے والے ہوتے ہیں۔

نزاع اور اختلاف کی بنیاد، کلیات کی پیروی کر کے ایسا حکم صادر کر دینا ہے جس کے خلاف عقل مخصوص حالت وموقع کی وجہ سے کوئی فیصلہ کر چکی ہو۔

اور یہ ایسا ہے جیسے آپ نے ایک پتھر دیکھا اور اسے دیکھ کر یقین کرلیا کہ یہ پتھر ہے، لیکن ایک مناظر آیا اس نے اعتراف کو رد کرنے یا کمزور کرنے کے لیے دلائل دینے شروع کر دیئے اور کہنے لگا کہ چیزیں اپنے رنگ اور مخصوص شکل وصورت کی وجہ سے پہچانی جاتی ہیں اور بہت سی چیزیں ایک دوسرے کے مشابہ ہوسکتی ہیں، لہٰذا یہ ضروری نہیں ہے کہ جس کو آپ نے دیکھا ہے وہ پتھر ہی ہے، مطلب یہ کہ وہ آپ کے مشاہدے اور یقین کو ایک قانون کلی کے زور سے توڑنا اور ختم کرنا چاہتا ہے لیکن حقیقت سے نا آشنا اس مناظر کی نظر سے یہ بات اوجھل ہے کہ دیکھنے والے کو جو

یقین اس مخصوص صورت میں (یعنی مشاہدے کے سبب) حاصل ہو چکا ہے وہ کلی قواعد وضوابط اور نظری دلائل وبراہین سے کہیں زیادہ مضبوط اور بے غبار ہے۔

ان حالات میں آپ کو ہر لحظہ اور ہر مرحلہ پر اس بات سے باخبر رہنا چاہیے کہ علماء کے اقوال کو حدیث وسنت نہ سمجھ بیٹھیں۔

اس طرح کے مسائل ومعاملات میں انتہائی سکون، اطمینان قلب اور یکسوئی کے ساتھ غور وفکر اور فیصلے کی ضرورت ہے۔

مشاہدا ور قرائن اس بات کی نشان دہی کرتے ہیں کہ فقہ کے اصول، قواعد وضوابط اور اجتہاد میں اختلاف کا سبب، تعقل وتدبر اور اطمینان قلب ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات میں بھی اس طرف اشارہ فرمایا ہے کہ شریعت کا حکم اسی طرف جھک جاتا ہے جس طرف انسان کو اس کا غور وفکر اور کوشش پہنچادے، مثلاً نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

> ''تمہارا روزہ افطار کرنا اسی روز درست ہے جس روز تم نے روزہ افطار کیا اور تمہاری قربانی اسی روز درست ہے جس روز تم نے قربانی کی''۔

خطابیؒ (۱۱) کہتے ہیں کہ حدیث کے معنی یہ ہیں کہ جن مسائل کا مدار اجتہاد پر ہے ان میں لوگوں کی غلطی اور خطا معاف ہے۔ مثلاً کچھ لوگوں نے چاند دیکھنے کی مقدور بھر کوشش کی مگر تیس تاریخ سے پہلے چاند نظر نہ آیا، ۲۹ تاریخ کو چاند نظر نہ آنے کی بنیاد پر انھوں نے ۳۰ رمضان کو روزہ رکھا اور پورے تیس روزے کیے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ رمضان انتیس روز کا تھا تو ان کا تیس تاریخ کا روزہ درست ہوگا اور ان پر کوئی گناہ بھی نہ ہوگا۔

اسی طرح مناسک حج کی ادائی کے دوران یوم عرفہ کے تعین میں غلطی ہو جائے تو حج کا اعادہ واجب نہیں ہے (حالانکہ وقوف عرفہ تمام فقہاء کے نزدیک حج کا رکن ہے) اور جو افعال ومناسک ادا کر چکے ہیں وہی کافی ہوں گے، یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے بندوں کے لیے ایک سہولت اور نرمی ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ ''مجتہد جب اپنے اجتہاد میں حق اور صحت کو پالے تو

اس کے لیے دو اجر ہیں اور اگر اجتہاد میں غلطی کا مرتکب ہو جائے اور حق کو نہ پا سکے تو اس کے لیے ایک اجر ہے۔"

جو شخص بھی شارع علیہ السلام کے نصوص اور فتاویٰ کا احاطہ کرے گا وہ ایک قاعدہ کلیہ سے آگاہ ہوگا، وہ یہ کہ شارع علیہ السلام نے نیکی اور بھلائی کے تمام احکام کو امکانی حد تک تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا، خواہ ان کا تعلق ارکان وشرائط سے ہے یا آداب سے، جیسے وضو، نماز، زکوۃ، روزہ اور حج وغیرہ نیز ان امور کو بھی واضح کر دیا جن سے یہ عبادات باطل ہو جاتی ہیں یا ان میں کوئی خرابی اور نقص واقع ہو جاتا ہے اور ان امور کی بھی نشان دہی کر دی جن کے ذریعے ان عبادات میں خرابی کی تلافی ہو سکے۔ لیکن اس تمام تر تفصیل کے باوجود ان ارکان واعمال کی تعریفات کے بارے میں زیادہ بحث وتمحیص اور غیر ضروری تفصیل سے گریز کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ اور طرز عمل ہمیشہ یہ رہا کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہ جب بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مسائل کی جزئیات کے بارے میں سوال کرتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو ایسے ہلکے پھلکے الفاظ اور پیرایۂ بیان میں جواب دیتے جو خود ان کا اپنا روز مرہ کا اسلوب ہوتا اور جس میں وہ ایک دوسرے کو بات سمجھاتے، بسا اوقات وضاحت کی خاطر جزئی مسائل کو کلی مسائل پر محمول کر کے بتا دیتے، اس کے باوجود بھی اگر صحابہ رضی اللہ عنہ معاملہ کی تہ تک نہ پہنچتے تو پھر بقدر ضرورت تفصیل فرماتے تاکہ مخاطب مسئلہ کو اچھی طرح سمجھ جائے۔

جیسا کہ وضو میں آپ ﷺ نے چار اعضاء کا دھونا تو ضروری قرار دیا مگر اتنی وضاحت اور تفصیل نہیں فرمائی جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ ملنا اور پانی بہانا وضو کی حقیقت میں داخل ہے یا نہیں؟ پانی کے بارے میں بھی یہ وضاحت نہیں فرمائی کہ مطلق ہو یا مقید؟ نہ کنویں اور تالاب کے تفصیلی احکام ذکر فرمائے۔

یہ مسائل ایسے ہیں جو کثرت سے واقع ہوتے ہیں، یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یہ واقع نہ ہوتے ہوں۔

ایک سوال کرنے والے نے جب آپ ﷺ سے بئر بضاعہ اور حدیث قلتین (۱۲) کے بارے میں سوال کیا تو آپ ﷺ نے اتنی ہی وضاحت کی جتنی وہ ان الفاظ کی از خود سمجھتے تھے، اس

پر آپ ﷺ نے کوئی اضافہ نہیں فرمایا۔

اسی بنا پر سفیان ثوریؒ نے کہا کہ ہم نے دین میں پانی کے مسائل کے بارے میں بہت گنجائش اور وسعت پائی جب ایک بار آپؒ سے ایک عورت نے ایسے کپڑے کے بارے میں سوال کیا جسے حیض کا خون لگ گیا ہو تو اسے کیسے پاک کیا جائے تو سفیان ثوریؒ نے جواب دیا کہ ''خشک ہونے کے بعد اسے کھرچ دو، پھر خوب اچھی طرح کپڑے کو مل دو، اس کے بعد اس کپڑے میں نماز پڑھ لو۔'' اس کے علاوہ مزید تفصیل نہیں بتائی۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دورانِ نماز قبلہ کی طرف رخ کرنے کا حکم فرمایا مگر یہ نہیں بتایا کہ قبلہ کا رخ معلوم کرنے کا طریقہ کیا ہے۔

صحابہ رضی اللہ عنہ سفر کرتے، اور دورانِ سفر انہیں قبلہ کا رخ معلوم کرنے میں سخت دشواری پیش آتی۔ اس دشواری کو دور کرنے کا طریقہ معلوم کرنا ان کے لیے بے حد ضروری تھا لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو قبلہ کا رخ معلوم کرنے کا طریقہ نہیں بتایا۔

اس کی بنیادی وجہ اور حکمت یہ تھی کہ قیامت تک سمتوں کو معلوم کرنے کے بے شمار عقلی اور سائنسی طریقے ایجاد ہونے تھے اس لیے یہ بات آپ ﷺ نے لوگوں پر چھوڑ دی تھی کہ جیسے حالات ہوں، جو ذرائع موجود ہوں، لوگ ان کے ذریعہ قبلہ کا رخ معلوم کر لیں (اگر آپ ﷺ قبلہ کا رخ معلوم کرنے کا کوئی ایک طریقہ بتا دیتے تو بعد میں آنے والے ظاہر پرست، اس ایک طریقہ کے علاوہ باقی تمام طریقوں کی حرمت کا فتویٰ دیتے اور امت کے لیے دشواری کا سبب بنتا)۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اکثر فتاویٰ، ارشادات اور ہدایات کی یہی صورت حال ہے، جزوی اور اضافی معاملات کو امت کے اہل علم کے حوالے کر دیا ہے کہ وہ حالات اور اپنی سہولت کے مطابق ان کو حل کریں۔ اہل فکر و نظر پر حقیقت پوشیدہ نہیں ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام وارشادات میں غور و فکر کے بعد یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاملات کی بہت زیادہ گہرائی میں جانے سے گریز کیا ہے۔ عموماً آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسائل کی جزئیات بھی بیان نہیں کیں، اصول اور کلی قواعد کے بیان پر اکتفا کیا۔ نیز احکام و مسائل کے اقسام کے حصر اور احاطے سے بھی گریز فرمایا۔ (۱۳)

نبی علیہ السلام کے اس طرز عمل میں عظیم مصلحت پوشیدہ ہے۔ وہ یہ کہ اکثر و بیشتر مسائل کا انجام ایسے حقائق پر ہوتا ہے جو عرف و عادت میں اجمال واختصار کے ساتھ رائج و مستعمل ہیں، لوگ تفصیلات کے بغیر ہی ان پر عمل کرتے ہیں، اگر ان مسائل واحکام کی جامع ومانع اور محکم تعریف کی جائے اور ایک حتمی منطوق ومفہوم معین کرلیا جائے تو شدید دشواریوں کا سامنا ہو اور لوگوں کے لیے ان پر عمل کرنا مشکل ہو جائے اور ان احکام ومسائل کی جامع ومانع تعریف بذات خود ایک مشکل مرحلے کی صورت اختیار کرلے۔

بسا اوقات تعریف کرتے وقت دو مشکل حقائق میں فرق وامتیاز پیدا کرنے کے لیے ایسے قواعد واحکام وضع کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے جن کا بیان کرنا بہت دشوار ہوتا ہے، ان حقائق کی توضیح وتشریح کی اگر کوشش بھی کی جائے تو وہ ممکن نہیں ہوتی۔

اگر تکلف اور دشواری کا راستہ اپنا کر ایسا کر بھی لیا جائے تو پھر ایک مرحلے پر انہی جیسے حقائق سے ان کی تفسیر وتوضیح کی ضرورت پیش آئے گی اور اس طرح تشریح در تشریح کا ختم نہ ہونے والا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔

اس سلسلے کو ختم کرنے کی صرف ایک صورت رہ جائے گی، وہ یہ کہ معاملے کو ماموراور مبتلیٰ کی رائے پر چھوڑ دیا جائے، حالانکہ بعض دوسرے حقائق ایسے ہیں جنھیں ماموراور مبتلیٰ کی رائے پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔

اسی مصلحت کی بنا پر شارع علیہ السلام نے جزئیات کی تعبیر وتشریح اور تعیین کا کام مامور اور مبتلیٰ افراد کی رائے پر چھوڑ دیا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سعید اور موجودگی میں جب کسی ایسے مسئلے میں ان لوگوں کے درمیان اختلاف ہوا جو مامور ومکلّف تھے اور اس مسئلے میں اختلاف کی گنجائش بھی تھی۔ (شارع علیہ السلام نے پہلے سے اس کا کوئی حکم معین نہیں فرمایا تھا اس میں اجتہاد کی گنجائش تھی) وہاں کسی سختی کا مظاہرہ نہیں کیا گیا۔ مثلاً عمر بن العاص رضی اللہ عنہ نے قرآن حکیم کی آیت وَ لَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ (۱۴) (اپنے تئیں اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو) سے یہ مطلب نکالا کہ اگر کسی کو نہانے کی صورت پیش آجائے اور ٹھنڈے پانی سے نہانے کی صورت میں اسے بیماری یا ہلاکت

کا اندیشہ ہو تو وہ تیمم کر کے نماز پڑھ لے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو عمرو بن العاص ؓ کے اس اجتہاد اور رائے کا علم ہوا تو آپ ﷺ نے نہ ان کی رائے کو رد کیا اور نہ ناراضگی اور ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا۔

اسی طرح حضرت عمر فاروق ؓ نے قرآن حکیم کی آیت اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ (یا یہ کہ تم نے عورتوں کو چھوا) سے یہ حکم اخذ کیا کہ تیمم کی اجازت صرف عورت کو چھونے کی صورت میں ہے ازدواجی تعلق کی ادائیگی کی صورت میں تیمم کی اجازت نہیں۔

عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے اس اجتہاد و استنباط سے یہ ثابت ہوا کہ جس شخص کو غسل کی حاجت ہو وہ غسل ہی کرے، تیمم اس کے لیے کافی اور جائز نہیں ہے۔

نیز عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا یہ اجتہاد اور رائے عمرو بن العاص ؓ کی رائے اور اجتہاد کے خلاف ہوا، سنن نسائی نے ایک واقعہ نقل کیا کہ "ایک شخص کو غسل کی ضرورت پیش آئی، اس نے نہ غسل کیا اور نہ نماز پڑھی، مسئلہ پوچھنے کی خاطر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو نے ٹھیک کیا، اسی طرح ایک اور شخص کو غسل کی ضرورت پیش آئی، اس نے تیمم کیا اور نماز پڑھ لی (سردی کی وجہ سے غسل نہ کیا) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر صورت حال عرض کیا آپ ﷺ نے اس سے بھی فرمایا کہ "تو نے ٹھیک کیا۔"

آپ ﷺ نے ان لوگوں پر ناراضگی کا اظہار نہیں فرمایا جنھوں نے نماز عصر کو مؤخر کر دیا تھا یا جن لوگوں نے نماز عصر غروب آفتاب سے پہلے وقت میں ادا کر لی تھی۔ جب کہ ان سب سے نبی علیہ السلام نے یہ فرمایا تھا کہ نماز عصر بنی قریظہ میں جا کر پڑھنا۔ (۱۶)

جو شخص نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم اور کلام کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لے گا اور ان کو اچھی طرح سمجھے گا نیز اس حکم سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو مقصد اور منشا تھا، اس کو پالے گا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے حکم اور کلام کے مفہوم کو سمجھنے کا معاملہ مخاطبین پر چھوڑ دیا تھا کہ وہ اس مجمل کلام کا وہی مفہوم مراد لیں جو عموماً عرف اور محاورے میں لیا جاتا ہے۔

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک کلام کو دوسرے کلام کے ساتھ اور ایک حکم کو دوسرے حکم کے ساتھ تطبیق دینے کا معاملہ صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کی عقل و فہم اور قوت اجتہاد کے حوالے فرما دیتے تھے، اس کی مثال یوں سمجھیے کہ فقہاء بہت سے مسائل میں فیصلہ مامور اور مکلّف کی تحری،

کوشش اور عرف کے حوالے کرتے تھے اور جب مختلف افراد ایک ہی مسئلہ میں دو مختلف فیصلوں اور نتیجوں پر پہنچتے تھے تو ان میں سے کسی کو ہدف ملامت نہیں بناتے تھے۔

اس کی مثال وہ مسئلہ بھی ہے جس میں کسی ایک فریق پر گرفت نہ کرنے پر فقہاء کا اجماع ہے، وہ یہ کہ تاریکی کی صورت میں مختلف لوگوں نے کوشش اور جستجو سے قبلہ کا رخ معلوم کیا اور اس کے مطابق نماز ادا کی، ان کے فیصلے اور عمل میں اختلاف کے باوجود کسی کو مورد الزام نہیں ٹھہرایا جائے گا۔

اس مصلحت کی ایک مثال وہ بھی ہے کہ جو اہل مناظرہ نے بیان کی کہ دلائل کے مبادی اور مقدمات کے بارے میں بحث نہ کی جائے کیوں کہ اس بحث سے انتشار لازم آئے گا، جو شخص اس مسئلے کی حقیقت کو بخوبی جان لے گا اس پر یہ بات اچھی طرح عیاں ہو جائے گی کہ:

الف: اجتہاد کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں اور حق ان مختلف صورتوں میں دائر ہوتا ہے۔

ب: دین میں تنگی نہیں بلکہ وسعت اور گنجائش ہے۔

ج: کسی ایک چیز پر بغیر دلیل کے جم جانا اور مخالف کی نفی پر یقین کرنا، بے اصل بات ہے۔

د: اگر حقائق و معاملات کی ایسی تعریفات کی گئی ہیں جو ذہن کو ایسے معانی کے قریب لے آتی ہیں جنھیں ہر صاحب زبان سمجھ سکے تو وہ علم کا مددگار کرنے والا کہلائے گا اور اگر اس کی تعریفات لوگوں کے ذہنوں سے دور ہیں اور ان کے ذریعے من گھڑت مقدمات میں فرق و امتیاز مشکل ہے تو ہو سکتا ہے کہ یہ ایک نئی شریعت بن جائے۔

ہ: عزالدین بن عبدالسلام (۱۷) نے یہ بات بالکل درست کہی ہے کہ:

وہ شخص کامیاب ہے جو ان باتوں پر عمل کرتا رہا جن پر علماء کا اتفاق ہے اور ان باتوں سے بچتا رہا جن کو علماء نے بلا کسی اختلاف کے حرام قرار دیا اور ان امور کے جواز کا قائل ہوا جن کے جواز کا علماء اور فقہاء نے فتویٰ دیا، جن اعمال وافعال کے استحباب پر علماء متفق ہوئے، انہیں یہ بھی مستحب سمجھتا رہا جن کی کراہت پر اتفاق کیا، انہیں مکروہ جانا۔

البتہ جن امور میں علماء نے اختلاف کیا اور کسی ایک رائے پر متفق نہ ہو سکے ان کو دو حصوں اور دو صورتوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) جس امر میں اختلاف کیا گیا ہے اس کا تعلق ان مسائل سے ہو جن سے حکم دینے والے

کا حکم کالعدم ہو جاتا ہو تو اس صورت میں تقلید کی کوئی گنجائش نہیں رہتی بلکہ یہ حکم واضح غلطی اور خطا سمجھا جائے گا اور اس حکم کو کالعدم اس لیے قرار دیا جائے گا کہ یہ غلطی نفس شریعت میں ہے اس کے مآخذ ومصدر میں ہے اور شریعت کا جو حکم اور منشا ہے اس غلطی نے اس حکم کو اس سے ہٹا دیا ہے۔

(۲) دوسری صورت یہ ہے کہ جس امر میں اختلاف کیا گیا ہے اس کا تعلق ان مسائل سے نہیں جن سے حکم دینے والے (شریعت) کا حکم ختم ہو جاتا ہے، ایسے حکم کو بجا لانے یا اس کو چھوڑ دینے میں کوئی حرج نہیں، مگر شرط یہ ہے کہ وہ کسی عالم کی تقلید کرے (بے دلیل رائے پر نہ چلے) کیوں کہ عہد اول میں امت مسلمہ کا طریقہ یہی رہا کہ وہ کسی خاص فقہی مسلک کی پیروی (تقلید) نہیں کرتے تھے بلکہ مسلک کی تحقیق کیے بغیر، علماء سے رجوع کرتے تھے اور ان کے فتاویٰ کو معتبر جانتے تھے، اسی طرح علماء بھی اس بات کو برا نہیں سمجھتے تھے کہ ایک عام آدمی کسی خاص مسلک کی تقلید نہیں کرتا بلکہ جو عالم اور فقیہ اس سے قریب تر ہے اور اس تک اس کی رسائی ہے وہ دینی مسائل میں فتویٰ لینے اور سوال کرنے کے لیے اسی کی طرف رجوع کرتا ہے، یہاں تک کہ فقہی مسالک نمایاں اور معروف ہو گئے اور ان کی تقلید کرنے والوں میں تعصب اور تنگ نظری پیدا ہو گئی اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ لوگوں نے ایک امام اور مجتہد کی تقلید کو ضروری قرار دے لیا جو شخص جس امام کا مقلد ہے وہ ہر مسئلے میں اسی کی تقلید کرتا ہے خواہ اس کا مسلک اور اجتہاد دلائل سے کتنا ہی دور کیوں نہ ہو۔ گویا وہ امام اور مجتہد، ایک عالم اور فقیہ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجا ہوا ایک رسول ہے۔

تعصب اور فکر وذہن کی یہ تنگی انسان کو حق سے دور پھینک دینے والی ہے، جس شخص کو بھی اللہ تعالیٰ نے عقل سے نوازا ہے وہ اس تعصب اور تنگ نظری کو نہ پسند کر سکتا ہے اور نہ اپنا سکتا ہے۔

عزالدین بن عبدالسلامؒ نے یہ بھی کہا:

''کسی نے ابتدا میں کسی ایک امام کی تقلید کی، کچھ عرصہ بعد اس نے اس امام کے فقہی مسلک کو چھوڑ کر کسی دوسرے فقہی مسلک کی تقلید کرنا چاہی تو کیا یہ امر اس کے لیے جائز ہے؟ اس میں اختلاف ہے، اس اختلاف کی تفصیل یہ ہے کہ وہ فقہی مسلک جس کو وہ اختیار کرنا چاہتا ہے اگر ان مسالک میں سے ہے جن میں حکم کو توڑا جاتا ہے تو اسے ایسے حکم کو اختیار کرنا جائز نہیں جس کو توڑنا واجب ہو، اس لیے کہ اس کو

توڑنا اس کے باطل ہونے کی وجہ سے ہے۔

اگر وہ فقہی مسلک جسے وہ چھوڑ رہا ہے اور وہ فقہی مسلک جسے وہ اختیار کرنا چاہتا ہے، ماخذ ومصدر کے اعتبار سے ایک دوسرے کے قریب ہیں دونوں مسالک کے مصادر میں زیادہ فرق نہیں، تو پھر ایک مسلک کو چھوڑ کر دوسرے فقہی مسلک کی پیروی کرنا جائز ہے، اس لیے کہ عہد صحابہؓ سے لے کر اس وقت تک جب تک چار فقہی مسالک عالم اسلام میں رائج نہیں ہو گئے اور مسلمانوں نے ان کو اپنا نہیں لیا اس وقت تک کسی ایک مسلک کے بجائے علماء کی پیروی کرتے رہے، جو شخص جس عالم کو علم وتقویٰ میں افضل سمجھتا اسی سے فتویٰ لیتا اور اس پر عمل کر لیتا، قطع نظر اس سے کہ وہ حنفی ہے، مالکی ہے، یا شافعی (پیش نظر علم اور تقوی ہوتا تھا خاص مسلک نہیں)۔''

کسی ایسے شخص نے اس عمل اور رویہ کو ناپسندیدہ قرار نہیں دیا جس کی ناپسندیدگی کو وقیع سمجھا جاتا، اگر یہ طریقہ باطل اور غلط ہوتا تو اہل علم یقیناً اس کو رد کر دیتے اور لوگوں کو اسے اپنانے سے روک دیتے۔''

اور اللہ تعالیٰ حق کو زیادہ جاننے والے ہیں۔

ہم نے جو تفصیل اور تجزیہ آپ کے سامنے پیش کیا اس سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ وہ حکم جس کے بارے میں مجتہد اپنے اجتہاد کی بنیاد پر کلام کرتا ہے وہ صاحب شریعت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہوتا ہے یا ان کے الفاظ واقوال کی طرف یا کسی ایسی علت کی طرف جو شارع علیہ السلام کے الفاظ سے ماخوذ ہے۔

اس صورت حال کے پیش نظر ہر اجتہاد میں دو صورتیں ہیں۔

(۱) اول یہ کہ مجتہد نے اپنے اجتہاد سے جو نتیجہ اخذ کیا ہے کیا شارع علیہ السلام نے اپنے کلام سے وہی معنی مراد لیے ہیں یا اس کے علاوہ کوئی اور معنی مراد ہیں؟ اور جب شارع علیہ السلام نے ایک واضح اور مخصوص حکم صادر فرمایا تھا تو کیا ذہن مبارک میں یہی علت تھی یا اس کے علاوہ کوئی اور؟ اگر اس صورت حال کی روشنی میں مجتہد کے حق پر یا غلطی پر ہونے کا فیصلہ کرنا ہے تو کسی تعیین

کے بغیر دو مجتہدوں میں سے ایک حق پر ہے اور ایک خطا پر ہے۔

(۲) شریعت کے احکام میں سے ایک حکم یہ بھی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صراحت ووضاحت کے ساتھ، یا دلالت اور اشارہ کے ذریعہ یہ فرمایا کہ جب ایسی صورت حال پیش آئے کہ میری امت کے افراد میرے کسی حکم اور نص یا کسی حکم اور نص کے مفہوم ومصداق کے تعین میں اختلاف اور شک وشبہ میں مبتلا ہو جائیں، اس کے کسی ایک معنی اور مدلول پر اتفاق نہ ہو سکے تو پھر اس پر واجب ہے کہ وہ اجتہاد کرے اور حق کو پہچاننے کے لیے امکانی حد تک اپنی قدرت وصلاحیت کو بروئے کار لائے۔

مجتہد نے اپنی مقدور بھر کوشش سے جب شارع علیہ السلام کے مجمل حکم اور نص کا ایک مفہوم معین کر لیا تو اس پر لازم ہو گیا کہ وہ اس کی پیروی کرے (کیوں کہ اس کے اجتہادی فیصلے کی رو سے وہی حق ہے)۔

جیسا کہ نبی علیہ السلام نے امت کو یہ ہدایت کی کہ جب تاریک رات میں رخ قبلہ کا تعین دشوار ہو جائے تو پھر واجب ہے کہ کوشش اور اجتہاد سے سمت قبلہ کا تعین کریں اور اس کے مطابق نماز ادا کر لیں۔

اس حکم کو شریعت نے وجود تحری یعنی کوشش اور اجتہاد پر معلق کیا ہے، جیسے نماز کو وقت پر یا جیسے بچے کے احکام کی بجا آوری کا مکلف ہونے کو اس کے بالغ ہونے پر معلق کیا ہے۔

اگر اس مقام کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ مسئلہ زیر بحث جس میں مجتہد کے اجتہاد کو رد کیا جا سکتا ہے تو اس کا اجتہاد قطعی طور پر باطل ہے۔

اور اگر اس مسئلے میں صحیح حدیث موجود ہے اور مجتہد کا اجتہاد اس کے خلاف ہے تو بھی اس کے اجتہاد کو باطل قرار دیا جائے گا۔

اگر دونوں مجتہد قواعد وضوابط کی پاسداری کرتے ہیں، حزم واحتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے اور کسی ایسی حدیث یا کسی ایسے ضابطے کے خلاف کوئی رائے قائم نہیں کرتے جس کے سبب مجتہد کا اجتہاد، قاضی کا فیصلہ اور مفتی کا فتوی کالعدم قرار پاتا ہے تو پھر دونوں مجتہدوں کو حق پر تصور کیا جائے گا۔ اور اللہ تعالی ہی حق کو زیادہ جاننے والا ہے۔

باب نمبر (۲)

حواشی وحوالہ جات

۱) ابوالحسن علی بن اسمٰعیل الاشعریؒ کا شمار تیسری صدی ہجری کے ممتاز علماء میں ہوا، رئیس المعتزلہ جبائی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے، اگر مسلک اعتزال کو چھوڑ کر جماعت اہل السنہ میں شامل نہ ہوتے تو اس کے جانشین ہوتے وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے قدیم اہل السنہ کے عقائد کی تائیدو اثبات کے لیے علم کلام کو استعمال کیا۔

ایک عرصہ تک مسلک اعتزال سے وابستہ رہنے کے باعث وہ معتزلہ کے اصول اور عقائد سے پوری طرح آگاہ تھے، ان کی آراء کا گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا اس لیے علم کلام میں مہارت تھی، ان باتوں کے اجتماع سے ان کو یہ قدرت حاصل ہوئی کہ وہ ان کا مسلک چھوڑنے کے بعد مؤثر انداز سے اس کا رد کریں۔

جن لوگوں نے ابوالحسن اشعریؒ سے براہ راست استفادہ کیا ان کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہوئے وہ ''اشاعرہ'' یا ''اشعری'' کہلائے اور اس طرح ''اشاعرہ'' کے عنوان سے ایک مستقل علمی حلقۂ فکر وجود میں آ گیا۔

ابن عساکرؒ اور ابن فورکؒ نے ان کی تصانیف کی تعداد ساٹھ تک بیان کی ہے ''مقالات الاسلامیین'' نے بہت شہرت پائی۔ اس میں مختلف مسلم فرقوں کا تعارف وتذکرہ ہے۔

۲۶۰ ہجری میں بصرہ میں پیدا ہوئے، ۳۲۴ ہجری میں بغداد میں وفات پائی۔

قاضی ابوبکر بن العربیؒ۔ پورا نام: ابوبکر محمد المعافری الاندلسی القاضی (متوفی: ۵۴۶ھ)

قاضی ابو یوسف یعقوب بن ابراہیمؒ۔ (متوفی: ۱۸۲ھ)

ابن شریحؒ، بظاہر ابوامیہ شریح بن الحارث بن قیس بن جہم بن معاویہ مراد ہیں۔ (متوفی ۷۸ھ)

۲) اشاعرہ حاشیہ نمبر ''ایک'' دیکھئے۔ بضمن ''ابوالحسن اشعریؒ''

۳) معتزلہ: علم کلام کا ایک مدرسۂ فکر جس نے عقل اور نقل کے درمیان تطابق اور توافق کی کوشش کی۔

اعتزال کے معنی کسی شخص یا گروہ سے الگ ہو جانے کے ہیں، قرآن حکیم نے اس معنی میں

استعمال کیا۔ فَإِنْ لَّمْ تُؤْمِنُوا لِي فَاعْتَزِلُونِ (الدخان،۲۱) اگر تم مجھ پر ایمان نہیں لاتے تو مجھ سے الگ ہو جاؤ)

معتزلہ کے بہت سے شیوخ نے اپنے آپ کو ''معتزلہ'' کہنے میں کوئی تردد محسوس نہیں کیا لیکن انھوں نے اپنے لیے ''اہل العقل والتوحید'' کے لقب کو زیادہ پسند کیا۔ اسکے باوجود علمی دنیا میں یہ طبقہ ''معتزلہ'' ہی کے نام سے روشناس ہوا۔

معتزلہ کا کہنا ہے کہ کوئی شخص اس وقت تک ہمارا ہم مسلک نہیں کہلائے گا جب تک وہ ان پانچ اصولوں کو تسلیم نہ کرے۔ (۱) توحید، (۲) عدل، (۳) وعدہ و وعید، (۴) منزلہ بین المنزلتین، (۵) امر بالمعروف و نہی عن المنکر۔

ان کے بنیادی عقائد میں سے ہے۔

(۱) اللہ کی صفات اس کی ذات سے جدا نہیں ہیں، مطلب یہ کہ اس کے لیے فقط ذات ہے صفات نہیں ہیں۔

(۲) قرآن میں اللہ کے ''ید'' (ہاتھ) اور ''وجہ'' (چہرہ) کا جو ذکر آیا ہے اس سے مراد اس کا فضل اور ذات ہے۔

(۳) حقیقی معنی میں اللہ تعالی کی رویت ممکن نہیں، آخرت میں بھی اس کا دیدار نہ ہوگا۔ اللہ کی رویت کو اگر ممکن مان لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ جسم رکھتا ہے۔

(۴) قرآن مخلوق ہے۔

(۵) انسان اپنے افعال کا خود خالق ہے اور اپنے افعال میں اختیار کا مالک ہے۔

(۶) ایک مومن، گناہ کبیرہ کے ارتکاب سے نہ مومن رہتا ہے اور نہ کافر ہوتا ہے۔

ان میں دو گروہ ہوئے، بصری اور بغدادی، بصری گروہ زمانی اعتبار سے مقدم ہے اور اعتزال کے اصول و فروع متعین کرنے کا سہرا بھی بصری شاخ کے سر ہے، بغدادی گروہ نے انہی کے نقوش پا کی پیروی کی، ان کے اہل علم میں واصل بن عطاء (متوفی ۱۳۱ھ)، ابوعلی محمد بن عبدالوہاب جبائی (متوفی: ۳۰۳ھ) عمرو بن عبید (متوفی: ۱۴۲ھ)، محمد بن ہذیل العلاف (متوفی: ۲۳۵ھ)، ابراہیم بن سیار بن ہانی النظام بصیر (متوفی: ۲۳۱ھ) اور ابوعثمان عمرو بن بحر الجاحظ

(متوفی: ۲۵۵ھ) بہت نمایاں ہیں۔

الملل والنحل (عبدالکریم شہرستانی)، وفیات الاعیان (ابن خلکان)، الاعلام (زرکلی)

۴) ابن سمعانی: الحافظ عبدالکریم بن محمد سعد بن سمعانیؒ۔ (متوفی ۵۶۲ھ)

۵) بیضاویؒ: ابوسعد عبداللہ بن عمر بن محمد بن علی شیرازی البیضاوی، مفسر، تفسیر انوار التنزیل واسرار التاویل جو تفسیر بیضاوی کے نام سے مشہور ہے۔

۶) سورۃ المائدہ کی آیت نمبر ۴۷ ہے، یہ نصاریٰ سے خطاب ہے، آیت کا ابتدائی حصہ ہے۔

وَلْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ

(انجیل والوں کو چاہیے کہ جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے اسی کے مطابق فیصلے کریں)۔

۷) خبر واحد: راویوں کی کثرت تعداد اور قلت تعداد کے لحاظ سے حدیث کی ایک قسم، ایک تعریف یہ کی گئی کہ جس کے روایت کرنے والے ایک نسل اور ایک طبقے میں تین سے کم رہ گئے ہوں، بعض محدثین نے یہ تعریف کی کہ: جس کے راویوں کی تعداد اتنی زیادہ نہ ہو جن کا جھوٹ پر متفق ہونا محال سمجھا جائے۔

۸) مناط کے معنی مدار اور علت کے ہیں کسی معاملے اور مسئلے میں علت کو پہچاننے اور اس کا پتہ لگانے کے لیے فقہاء نے تین اصطلاحیں ایجاد کیں۔

(۱) تنقیح مناط، (۲) تخریج مناط، (۳) تحقیق مناط۔

"تنقیح مناط" کی اصطلاحی تعریف یہ ہے کہ الحاق انواع بالاصل بالغاء الفاروق (فرق کرنے والے کو لغو قرار دے کر اصل کے ساتھ فرع کو ملا دینا)

(ارشاد الفحول، محمد بن علی بن محمد شوکانی، متصدق، فصل رابع)

یعنی جس واقعہ میں حکم موجود ہے اس کے مجموعہ پر نظر ڈالنے سے مختلف قسم کے اوصاف سامنے آتے ہیں، ان میں بعض "حکم" میں مؤثر ہوتے ہیں اور بعض مؤثر نہیں ہوتے، اجتہاد کے ذریعہ مؤثر اور غیر مؤثر میں امتیاز قائم کرنا، غیر مؤثر کو مؤثر سے جدا کرنا اور بحیثیت علت مؤثر کو واضح اور منقح کرنا "تنقیح مناط" کہلاتا ہے۔ مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک دیہاتی آیا اور کہنے لگا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ہلاک ہو گیا، آپ ﷺ نے پوچھا: کس وجہ سے

ہلاک ہوئے؟ بولا: رمضان میں قصداً اپنی بیوی سے جماع کرلیا، آپ ﷺ نے اسے کفارہ ادا کرنے کا حکم دیا، اس واقعہ میں کئی اوصاف ہیں جن پر حکم کے مدار اور علت ہونے کا گمان ہوسکتا ہے۔ مثلاً دیہاتی ہونا (ان پڑھ) اپنی بیوی سے جماع کرنا، قصداً کرنا، رمضان کے روزے میں کرنا، مجتہد ان سب میں غور وفکر کرکے پہلے یہ دیکھتا ہے کہ ان اوصاف میں کون سا وصف حکم کی علت بننے کی صلاحیت رکھتا ہے اور کون سا وصف یہ صلاحیت نہیں رکھتا، پھر دلائل کے ذریعے دونوں میں امتیاز کرتا ہے اور جس میں علت بننے کی صلاحیت دیکھتا ہے اس کو واضح اور منقح (نمایاں) کرتا ہے۔ چنانچہ ''تنقیح مناط'' کے ذریعہ مذکورہ بالا صورت میں وصف جماع جو قصداً رمضان کے روزے میں ہو، علت قرار پایا اور باقی اوصاف کو حکم کی علت بننے کے اعتبار سے لغو قرار دیا گیا۔

''تخریج مناط'' (علت نکالنا) کی اصطلاحی تعریف یہ ہے: استخراج علة معينة للحكم ببعض الطرق المقدمة. (مقررہ طریقوں کے ذریعے حکم کی معین علت نکالنا اور معلوم کرنا)۔ (منہاج الاصول، ابو حامد بن محمد الغزالی)۔

''تنقیح'' میں حکم کے مدار اور علت کی حیثیت سے ان اوصاف کو مسترد کیا جاتا ہے جو علت بننے کی صلاحیت نہیں رکھتے اور ''تخریج'' میں اس وصف کو دلائل کے ذریعے متعین کیا جاتا ہے جو علت بننے کی صلاحیت رکھتا ہے جیسے مذکورہ بالا مثال میں، دیگر اوصاف کو لغو قرار دے کر وصف جماع (جو قصداً رمضان کے روزے میں کیا گیا) کو علت کے لیے مخصوص و معین کیا گیا یا جیسا کہ قصاص کی علت قتل کو قرار دیا گیا۔

''تحقیق مناط'' (علت جاری کرنا) کی اصطلاحی تعریف یوں کی گئی۔ ان يقع الاتفاق على وصف بنص او اجماع فيجتهد الناظر في صورة النزاع التي خفي فيها. (نص یا اجماع کے ذریعے جو علت متعین ہوچکی ہو اس کو اجتہاد کے ذریعہ زیر بحث نئے مسئلے میں جاری کرنا)۔ (حصول المامول۔ صدیق حسن خانؒ)

حکم کے نفاذ کے لیے موقع ومحل کی تعیین بھی تحقیق مناط میں داخل ہے۔

تحقیق کی ایک شکل یہ ہے کہ حکم موجود ہے، اس کی علت متعین ہے، اجتہاد کے ذریعے اس کو نئے مسئلے میں جاری کرنا ہے تاکہ نئے مسئلہ کا بھی وہی حکم ہو، مثلاً سود کی علت کیل (ناپ) یا وزن

مع الجنس تسلیم کی جائے تو جن چیزوں کا ذکر حدیث میں نہیں ہے اجتہاد کے ذریعہ ان میں غور وفکر کرنا کہ وہ علت کس میں پائی جاتی ہے جس کی بنا پر اسے سود والی اشیاء میں شمار کیا جائے اور کس میں نہیں پائی جاتی کہ اسے سود سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔

۹) راویوں کی تعداد کے لحاظ سے محدثین نے احادیث کی مختلف اقسام بیان کی ہیں۔

(۱) متواتر: وہ حدیث جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے لے کر بعد کے ادوار تک اتنے راویوں نے بیان کی ہو کہ جن کا عقلاً اور عادتاً جھوٹ پر متفق ہونا ممکن نہ ہو۔

(۲) مشہور: وہ حدیث جس کے روایت کرنے والے کسی بھی نسل اور کسی بھی طبقے میں تین سے کم نہ ہوں۔

فقہاء اور محدثین کی اکثریت نے کہا کہ خبر مشہور کو خبر مستفیض بھی کہا جاتا ہے، بعض محدثین نے کہا کہ مشہور مستفیض کی نسبت عام ہے، خبر مستفیض کی ایک تعریف یہ بھی کی گئی: مستفیض وہ ہے جس کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر بعد کے ادوار تک ایک کثیر جماعت نقل کرے۔

خبر واحد: اس حدیث کو کہتے ہیں جس کے روایت کرنے والے ایک نسل اور ایک طبقے میں تین سے کم رہ گئے ہوں۔

خبر غریب: تعداد رواۃ کے لحاظ سے حدیث کی ایک قسم ''خبر غریب'' بھی ہے اس کی تعریف یہ کی گئی: وہ حدیث ہے جس کے سلسلۂ سند میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر بعد کے ادوار تک ایک ہی راوی ہو۔

صفات رواۃ کے لحاظ سے حدیث کی دو قسمیں بیان کی گئیں۔

(۱) صحیح (۲) حسن

صحیح: وہ حدیث جو عدل، کامل حافظے اور اتصال سند کے ساتھ نقل کی گئی ہو اور علت وشذوذ سے پاک ہو۔

حسن: ہر وہ حدیث جو اس خصوصیت سے بیان کی جائے کہ اس کی سند میں کوئی ایسا راوی نہ ہو جس پر جھوٹ کی تہمت لگائی گئی ہو، وہ حدیث شاذ نہ ہو اور ایک سے زائد طریقوں سے منقول ہو۔

(شرح نخبۃ الفکر (ابن حجر عسقلانیؒ)، کتاب العلل (ترمذی) تیسیر مصطلح الحدیث (محمود طحان)

۱۰) خطابی ابوسلیمان احمد بن محمد بن ابراہیم بن خطاب بستی خطابیؒ۔ فقیہ، محدث، متوفی: 388ھ۔

۱۱) ماء طاہر کے حوالہ سے ایک فقہی مسئلہ ہے کہ پانی کی وہ کون سی مقدار ہے جس میں اگر نجاست گر جائے تو پانی ناپاک نہ ہو، بلکہ پاک ہی رہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ: ''جو پانی قلتین سے زیادہ ہو اس کو کوئی نجاست ناپاک نہیں کرے گی''۔ دلیل میں یہ حدیث پیش کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اذا کان الماء قلتین لم یحمل الخبث'' کہ جب پانی دو قلہ کی مقدار ہو جائے تو نجاست گرنے سے وہ ناپاک نہیں ہوگا، یہ حدیث ''حدیث قلتین'' کے نام سے مشہور ہے۔ فقہاء نے قلتین میں پانی کی جس مقدار کا اندازہ لگایا وہ آج کل کے اوزان کے اعتبار سے کم وبیش سوا دو سو لیٹر بنتی ہے۔

۱۲) کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ میں ایسے اجمال کی بے شمار مثالیں موجود ہیں مثلاً قرآن نے جہاں احکام صوم بیان کیے اور یہ کہا کہ اگر کوئی شخص مریض ہو یا مسافر ہو تو روزہ چھوڑ سکتا ہے، رمضان کے بعد اس کی قضا کرے، یہاں قرآن نے مرض کی وضاحت نہیں کی کہ کس درجے کا مرض ہو تو روزہ چھوڑنے کی اجازت ہوگی، اسی طرح سفر کی بھی وضاحت نہیں کی کہ کتنا سفر ہوگا اور کس قسم کا ہوگا جس میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہوگی۔

مرض کی وضاحت سنت رسول اللہ ﷺ نے بھی نہیں ہے، مصلحت کا تقاضا بھی یہی تھا، لوگوں کے مزاج مختلف ہوتے ہیں، ایک آدمی ایک تکلیف برداشت کر سکتا ہے لیکن دوسرا آدمی اسی تکلیف کو برداشت نہیں کر سکتا بلکہ ایک ہی آدمی ایک عمر میں ایک تکلیف کو برداشت کر لیتا ہے مگر بڑی عمر میں پہنچ کر اتنی ہی تکلیف برداشت کرنا اس کے لیے ممکن نہیں ہوتا، انسان خود اپنے ضمیر کو مفتی بنائے اور اس سے فیصلہ کرائے کہ وہ کس مرض میں روزہ رکھ سکتا ہے، اگر نہیں رکھ سکتا تو ''فعدۃ من ایام اخر'' پر عمل کرنے والا ہوگا۔

سفر کی ایک گونہ وضاحت سنت رسول اللہ ﷺ نے کی، صرف مسافت کا اندازہ بتایا کہ کم از کم اتنی مسافت ہو تو مسافر کہلاؤ گے اور ترک صوم کی اجازت ہوگی لیکن یہ تجزیہ نہیں کیا کہ سفر اگر تکلیف دہ اور دشوار ہے تو روزہ قضا کرنے کی اجازت ہوگی اور اگر سفر آرام دہ ہے تو ترک صوم کی

اجازت نہیں ہوگی یہ اجمال بھی حکمت پر مبنی ہے، ترک صوم کی جو رعایت دی گئی ہے اس کی بنیادی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ سفر سے آدمی کے معمولات بگڑ جاتے ہیں، ذریعہ سفر خواہ آرام دہ ہو یا تکلیف دہ۔ گھر کے معمولات سفر میں باقی نہیں رہتے، اسی سے آدمی کو تکلیف ہوتی ہے، سفر میں روزہ نہ رکھنے کی رعایت دے کر بندۂ مومن کو اسی تکلیف سے بچانا مقصود ہے، احکام صوم کی جو آیات ہیں ان کے درمیان سیاق وسباق اور مضمون کے تسلسل کو توڑ کر ''یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر'' کہنے کا یہی منشا معلوم ہوتا ہے۔

۱۳) القرآن: البقرہ (۲)، ۱۹۵۔

۱۴) یہ سورۃ النساء کی طویل آیت (آیت نمبر: ۴۳) ہے۔ جس کا ترجمہ یہ ہے کہ اے ایمان والو! تم اس وقت نماز کے قریب بھی مت جاؤ جب نشے کی حالت میں ہو، یہاں تک کہ جو پڑھ رہے ہو اسے سمجھنے لگو اور نہ اس وقت نماز کا ارادہ کرو جب ناپاکی کی حالت میں ہو یہاں تک کہ غسل کرلو، مگر حالت سفر میں (اسی کا حکم مختلف ہے) اور اگر تم مریض ہو، یا سفر کی حالت میں ہو، یا تم میں سے کوئی پیشاب، پاخانے سے فارغ ہو کر آئے، یا عورتوں کے پاس گیا ہو۔''

''لامستم النساء'' کے مفہوم ومنطوق میں فقہاء کا اختلاف ہوا۔ لغت کی رو سے ترجمہ ہوگا کہ ''تم نے عورتوں کو چھوا ہو'' یا تم ان کے پاس گئے ہو۔ اکثر فقہاء نے قرائن اور سیاق وسباق کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کہا کہ یہاں عورتوں کو چھونا مراد نہیں اور نہ ان کے پاس جانا مراد ہے، بلکہ ان سے صحبت کرنا مراد ہے، غسل اسی سے واجب ہوتا ہے، عورت کے پاس جانے سے اس سے ملنے سے یا اس کو چھونے سے غسل واجب نہیں ہوتا، امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس آیت مین ملامسۃ (چھونے سے) صحبت مراد ہے، حضرت علی رضی اللہ، عبداللہ بن عباس رضی اللہ، قتادہؒ، مجاہدؒ اور حسن بصریؒ کی رائے یہی ہے۔

امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ جسم کا چھونا مراد ہے (احکام القرآن)۔

۱۵) یہ بات اجتہاد کے اصول میں داخل ہے کہ عبارت کے الفاظ اور معانی میں کس کو ترجیح دی جائے، ذہین اور نکتہ رس صحابہؓ (جن کو فقہائے صحابہ بھی کہا گیا) اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ الفاظ اظہار مقصد کا ایک ذریعہ ہیں، ہر موقع پر لفظ کے ظاہری مفہوم پر عمل ممکن نہیں ہوتا بلکہ بعض

مواقع ایسے ہوتے ہیں کہ وہاں معنی ومفہوم کو ترجیح دینا ضروری ہوتا اور الفاظ کے ظاہری مفہوم کو ثانوی حیثیت دینا ہوتی ہے، یہی صورت حال غزوۂ احزاب کے موقع پر پیش آئی، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے چند صحابہ کو ایک مخصوص پیغام دے کر قبیلہ بنی قریظہ کی طرف بھیجا اور ان سے فرمایا دیکھو، عصر کی نماز بنی قریظہ میں جاکر پڑھنا اس سے پہلے کوئی نماز ادا نہ کرے۔'' صحابہؓ روانہ ہوئے، راستے میں نماز عصر کا وقت ہوگیا اور غروب آفتاب سے پہلے قبیلہ بنی قریظہ میں پہنچنا ممکن نظر نہ آیا اور اندیشہ ہوا کہ بنی قریظہ تک پہنچتے پہنچتے نماز عصر قضا ہو جائے گی۔ آپس میں مشورہ کیا کہ کیوں نہ نماز عصر ادا کر لی جائے، بعض ساتھیوں نے کہا کہ ہم تو بنی قریظہ میں پہنچ کر ہی نماز عصر پڑھیں گے کیوں کہ حضور علیہ السلام نے ہمیں یہی حکم دیا تھا لیکن دوسرے ساتھیوں نے کہا کہ حضور علیہ السلام کا مقصد یہ نہیں تھا کہ ہم بنی قریظہ ہی میں پہنچ کر نماز عصر ادا کریں بلکہ آپ ﷺ کا مقصد اس بات کی تاکید کرنا تھا کہ ہم تیز تیز چل کر راستہ طے کریں اور ایسے وقت تک بنی قریظہ پہنچ جائیں کہ وہاں نماز عصر ادا کرسکیں، اس رائے کے حامل افراد نے نماز عصر راستے میں ہی ادا کی، پھر بقیہ سفر پورا کیا اور پہلی رائے کے حامل افراد نے راستے میں نماز عصر ادا نہیں کی، سفر جاری رکھا، بنی قریظہ میں پہنچ کر نماز عصر قضا پڑھی۔ واپسی پر یہ واقعہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سنایا تو آپ ﷺ نے کسی کے بارے میں یہ نہیں فرمایا کہ تم نے غلط کیا۔

۱۶) عز الدین بن عبد السلامؒ، الشافعی، فقیہ، (متوفی: ۶۶۰ھ)

باب:۳

تقلید مسالک اربعہ

یہ بات انتہائی اہم اور غور وفکر کی ہے کہ فقہی مسالک کی پیروی میں عظیم مصلحت، حکمت پوشیدہ ہے اور ان کو کلی طور پر چھوڑ دینے میں بہت سے مفاسد اور خرابیاں ہیں، ہم اس حقیقت کو مختلف طریقوں سے دلائل کے ساتھ بیان کریں گے۔

(۱) امت مسلمہ نے اس بات پر اتفاق کیا کہ وہ احکام شریعت کو پہنچانے اور سمجھنے میں سلف پر اعتماد کریں گے اور ان کے عمل اور تشریحات کو حجت جانیں گے، چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور سے نہ صرف عامۃ مسلمین بلکہ اہل علم نے بھی اسی طریقہ کو اپنایا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس تنہا منبع رشد وہدایت تھی، مہبط وحی تھی، صحابہ کرامؓ انہی کے اقوال واعمال کو نمونہ بناتے۔

اللہ تعالیٰ کی کتاب نے بھی نبی کریم علیہ السلام ہی کی ذات کو نمونۂ عمل بنانے کا حکم دیتا ہے۔ صحابہؓ کے بعد تابعین کا دور آیا، انھوں نے صحابہؓ پر بھروسہ کیا، نبی کریم علیہ السلام کی توضیح وتشریح نہ ملی تو صحابہؓ سے رجوع کیا اور ان کی تشریحات پر اپنے عمل، فیصلے اور فتوے کی بنیاد رکھی، تبع تابعین نے تابعین پر اعتماد کیا اور ان کے علم اور عمل سے رہنمائی حاصل کی، اسی طرح یہ سلسلہ چلتا رہا اور ہر دور کے علماء نے اپنے سے پہلوں کا حوالہ دیا اور ان کی آراء اور فتاویٰ کو معتمد جانا۔

عقل بھی اسی روش اور طرز عمل کی تحسین وتوثیق کرتی ہے، اس لیے کہ شریعت کا علم نقل اور اخذ واستنباط سے ہوا۔

نقل کے قائم اور باقی رہنے کا اس کے سوا کوئی طریقہ نہیں کہ ہر فرد اپنے سے پہلے فرد سے اور ہر طبقہ اپنے سے پہلے طبقہ سے ایک بات کو حاصل کرتا رہے اور کسی مرحلہ پر یہ تسلسل ٹوٹنے نہ پائے۔

یہی صورت حال اخذ واستنباط میں بھی ضروری ہے، اگر ایک مفتی اور مجتہد کو قدیم فقہی مسلک کا اور اپنے مسلک سے پہلے علماء اور فقہاء کی آراء اور فتاویٰ کا علم نہ ہوگا تو اس بات کا خطرہ ہوگا کہ ان کی کوئی رائے، فتویٰ یا اجتہاد، متقدمین کے اجماع کو توڑنے کا سبب بن جائے۔

ہر بعد میں آنے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے سے پہلے صاحب علم کی آراء اور فتاویٰ پر اپنے قول کی بنیاد رکھے اور کسی مسئلے میں اجتہاد واستنباط کرنا چاہتا ہے تو سلف کے اقوال اور اجتہاد واستنباط سے مدد لے۔

یہ طریقہ اور اسلوب صرف احکام شریعت کے جاننے اور ان کی فہم میں مہارت حاصل کرنے کے لیے ضروری نہیں ہے، یہ طریقہ تمام علوم وفنون میں اختیار کرنا پڑتا ہے، مثلاً صرف، نحو، طب، شعر وشاعری، آہن گری، بڑھئی گیری اور رنگ ریزی، غرضیکہ کوئی بھی فن اور ہنر ہو اس وقت تک نہیں آتا جب تک اسے کسی کامل وماہر سے سیکھا نہ جائے اور پھر ایک عرصہ تک اس کی نگرانی میں کام نہ کیا جائے۔

اس مشق اور عمل کے بغیر اگرچہ کسی فن میں مہارت حاصل کرنا ناممکن نہیں ہے لیکن دشوار تر ضرور ہے اور عموماً ایسا ہوتا ہے۔

جب یہ بات طے ہوگئی کہ سلف کے اقوال پر اعتماد کرنا ضروری ہے تو پھر لازم ہوا کہ ان کے اقوال، فتاویٰ اور آراء صحیح اور معتبر سند کے ساتھ کتابوں میں مدون، موجود ہوں۔ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہوا کہ ان کے ان اقوال اور آراء کو زیر بحث بھی لایا گیا ہو، بایں طور کہ اس کے محتملات میں سے راجح قول کو واضح کر دیا گیا ہو، جہاں ضروری ہو وہاں عام کو خاص اور مطلق کو مقید کیا گیا ہو (۱)۔ اور جہاں اقوال وآراء میں اختلاف ہے وہاں ان کے درمیان تطبیق کی کوئی صورت نکالی گئی ہو۔

اس کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ ان کے احکام کے علل بھی بیان کر دیے ہوں کیونکہ ان

کے مبہم ہونے کی صورت میں ان پر اعتماد کرنا ممکن نہیں ہے۔

اب بعد کے ادوار میں رائج شدہ فقہی مسالک کے علاوہ کوئی ایسا فقہی مسلک نہیں ہے جس کی تقلید کی جاسکے، لے دے کر مسلک امامیہ اور مسلک زیدیہ رہ جاتے ہیں، مگر یہ فقہی مسالک اہل بدعت اور اہل تشیع کے ہیں، ان کے اقوال اور فتاویٰ پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔

(۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ: سوادِ اعظم (بڑی جماعت) کی پیروی کرو، ان چار فقہی مسالک (حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی) کے علاوہ حق پر مبنی کوئی اور فقہی مسالک عملاً دنیا میں موجود نہیں ہیں، لہٰذا ان کی پیروی سوادِ اعظم کی پیروی کہلائے گی اور ان چاروں مسالک کو چھوڑ دینا اور ان سے باہر ہوجانا سوادِ اعظم سے نکل جانے کے مترادف ہوگا۔

(۳) جب خیر القرون، یعنی عہد نبوت ورسالت سے بعد ہوگیا اور لوگوں میں امانت ودیانت کی صفت مضمحل ہوگئی تو پھر اس بات کا کیا جواز باقی رہ گیا کہ خودغرض عالموں، ظالم قاضیوں اور ہواوہوس کے اسیر مفتیوں کے اقوال، فتاویٰ اور فیصلوں پر اعتماد کیا جائے، الا یہ کہ ان کا کوئی فتویٰ یا فیصلہ صراحت یا دلالت واشارت کے ساتھ اسلاف میں سے کسی ایسے فرد کے فتوے یا رائے کے مطابق ہو جس کے علم، فتویٰ اور دیانت پر اعتماد کیا جاتا ہو اور اس کا وہ فتویٰ یا رائے محفوظ بھی ہو۔

ایسے کسی شخص کی رائے اور فتوے پر بھی اعتماد نہیں کیا جاسکتا جس کے بارے میں ہمیں یہ معلوم نہیں کہ اس میں شرائط اجتہاد پائی جاتی ہیں یا نہیں۔

جن علماء میں ہم پختہ علم کے ساتھ یہ بھی دیکھیں کہ وہ اسلاف کے فقہی مسالک سے پوری طرح آگاہ ہیں اور ان پر ثابت قدم بھی ہیں، وہ اسلاف کے اقوال وآراء سے احکام اخذ کرتے ہیں یا براہِ راست قرآن وسنت سے احکام کا استنباط کرتے ہیں تو ایسے علماء کی آراء اور استنباطات کی تصدیق کی جائے گی۔

اس حقیقت کی طرف حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اشارہ فرمایا کہ:

''منافق کا کتاب اللہ سے احکام کا غلط اخذ واستنباط اسلام کی عمارت کو منہدم کردے گا''۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا ارشاد ہے کہ:

''جو شخص کسی دوسرے کی پیروی کرنا چاہے (یا دوسرے کی پیروی کا محتاج ہو) اسے چاہیے کہ سلف کی پیروی کرے''۔

تقلید کے بارے میں ابن حزمؒ کا مسلک

ابن حزمؒ کہتے ہیں کہ (۲):

''تقلید حرام ہے اور کسی کے لیے جائز نہیں کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا بے دلیل کسی شخص کی رائے کو اپنائے اور اس پر عمل کرے''۔

اللہ جل شانہ کا ارشاد ہے:

''لوگو! جو تمہارے رب کی طرف سے نازل کیا گیا ہے، اس کی پیروی کرو اور اپنے رب کو چھوڑ کر دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرو''۔ (۳)

ارشاد ہے:

''جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ان حکموں کی پیروی کرو جو اللہ نے نازل کیے ہیں تو جواب میں کہتے ہیں کہ ہم تو اسی کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے''۔ (۴)

جو لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے سوا کسی اور کی پیروی نہیں کرتے، ان کی تعریف میں اللہ جل شانہ فرماتے ہیں:

''اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم! میرے ان بندوں کو خوش خبری دے دیجیے جو بات سنتے ہیں تو اس میں جو بہتر ہوتی ہے اس کی پیروی کرتے ہیں۔ انہی لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت بخشی ہے اور یہی لوگ عقل والے ہیں''۔ (۵)

ایک اور جگہ ارشاد فرمایا:

''اگر کسی معاملے میں تمہارے درمیان نزاع پیش آجائے تو اللہ تعالیٰ کی طرف اور اس کے رسول ﷺ کی طرف رجوع کرو۔ اگر تم اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہو''۔ (۶)

کسی معاملے میں نزاع اور اختلاف کے وقت اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کے سوا کسی کے قول اور عمل کی طرف رجوع کرنے کی اجازت نہیں دی۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین اور تبع تابعین کا ہمیشہ اس امر پر اجماع رہا ہے کہ اس بات سے کلی طور پر بچا جائے کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ کو اور اس کے رسول ﷺ کو چھوڑ کر اپنوں میں سے کسی عالم اور امام کی پیروی کرے یا اسلاف میں سے کسی کے اقوال وآراء کو اپنے عمل کی بنیاد بنائے۔

جو شخص ابوحنیفہؒ، مالکؒ، شافعیؒ اور احمد بن حنبلؒ کے اقوال وفتاویٰ کو حجت مانتا ہے، انہی کی پیروی کرتا ہے ان کے سوا کسی کے فیصلے، فتوے اور رائے کو اہمیت نہیں دیتا، نہ اسے قبول کرتا ہے، قرآن اور سنت پر بھی اس وقت تک عمل نہیں کرتا جب تک اسے کسی خاص امام کے قول کے ساتھ مطابقت نہیں دے لیتا، ایسے شخص کو جان لینا چاہیے کہ وہ بلاشک اجماع امت کی مخالفت کا مرتکب ہوا ہے۔

اسے یہ بھی جان لینا چاہیے کہ جب وہ ابتدائی تین بہترین زمانوں میں اپنی رہنمائی اور پیشوائی کے لیے کوئی امام اور مقتدا نہیں پاتا تو وہ مسلمانوں کے راستے سے ہٹ کر کوئی اور راستہ اپنا رہا ہے، ہم اس صورت حال سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتے ہیں۔

اس حقیقت کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ خود فقہاء اور مجتہدین نے اپنی اور کسی دوسری معین شخص کی تقلید سے منع کیا ہے اور اس بات کی مخالفت کی ہے کہ لوگ آنکھیں بند کر کے ان کے پیچھے چل پڑیں۔

نیز اس بات کی کوئی دلیل سمجھ میں نہیں آتی کہ عمر بن خطابؓ، علی بن ابی طالبؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن عباسؓ اور ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو چھوڑ کر بعد کے فقہاء کی تقلید کی جائے، اگر تقلید جائز ہوتی تو دوسری، تیسری صدی ہجری کے علماء کی بہ نسبت کہیں زیادہ بہتر تھا کہ اکابر صحابہؓ کی تقلید کی جاتی۔

ابن حزمؒ کی رائے پر محاکمہ

ابن حزمؒ نے جو کچھ کہا اس کے مصداق تین طرح کے افراد ہو سکتے ہیں۔

(۱) ایک تو وہ افراد جو اجتہاد کی کچھ نہ کچھ صلاحیت رکھتے ہیں اگرچہ وہ ایک مسئلہ میں کیوں

نہ ہو۔

وہ یہ بات بخوبی جانتا ہو کہ رسول اللہ ﷺ نے فلاں کام کا حکم دیا یا اس سے منع فرمایا اور اس مسئلہ میں جو حدیث ہے وہ منسوخ نہیں ہے اور صورت حال یہ ہے کہ اس نے اس مسئلہ کے بارے میں جتنی احادیث تھیں ان سب کا احاطہ کیا اور موافق و مخالف جتنے اقوال تھے وہ بھی چھان مارے لیکن اس تفحص اور تلاش کے باوجود اس حدیث کی نسخ کا، اس کو کوئی ثبوت نہیں ملا۔

یا اس نے دیکھا کہ جید علماء کی ایک جماعت اس حدیث کی طرف مائل ہے اور ان کا مخالف صرف اپنے قیاس واجتہاد کو دلیل بنا کر حدیث کو رد کرنا چاہتا ہے تو اس صورت حال میں بجز اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کا سبب باطنی نفاق اور ظاہری حماقت ہے۔

شیخ عزالدین بن عبدالسلامؒ (۷) نے اسی طرف اشارہ کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ:

"یہ بات انتہائی تعجب خیز ہے کہ بعض مقلد علماء اس بات سے واقف ہوئے ہیں کہ فلاں مسئلہ میں ان کے مقتدا اور امام کی رائے اور موقف کا ماخذ بہت کمزور ہے، اس حد تک کمزور ہے کہ وہ اس کی تاویل کرنے پر بھی قادر نہیں ہوئے لیکن یہ سب کچھ جاننے اور سمجھنے کے باوجود وہ اسی کی تقلید کرتے ہیں اور جس دوسرے امام ومجتہد کے فقہی مسلک پر قرآن، سنت اور قیاس صحیح واضح طور پر شاہد ہوں، اسی کے مسلک کو اپنے معین امام کے مسلک پر جمے رہنے کے باعث چھوڑ دیتے ہیں۔

بات صرف یہیں تک نہیں رہتی بلکہ اپنے معین امام کے مسلک کی اس حد تک وکالت کرتے ہیں کہ کتاب وسنت کے ظاہری منطوق اور سیاق وسباق میں تاویلیں کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ اپنے امام کے مسلک کو صحیح اور حق ثابت کرنے کے لیے دوراز کار تاویلوں کا سہارا لیتے ہیں۔

اسلام کے عہد اول میں لوگوں کا یہ طریقہ اور عمل رہا کہ وہ کسی خاص اور معین فقہی مسلک کا لحاظ کیے بغیر علماء سے رجوع کرتے تھے، جن مسائل کا انہیں علم نہ ہوتا وہ اس کا حکم کسی مستند عالم سے پوچھتے، یہ تحقیق کیے بغیر کہ یہ حنفی ہے یا مالکی، علماء بھی

سوال کرنے والوں پر اعتراض نہیں کرتے تھے لیکن ایک ایسا دور آیا کہ فقہی مسالک کی تقلید میں تعصب پیدا ہو گیا لوگوں میں سے وسعت نظر جاتی رہی، اب لوگ ایک معین امام و مجتہد کی پیروی کرتے ہیں، ہر معاملہ میں خواہ کسی مسئلہ میں اس کی رائے دلائل سے خالی ہو، فقیہ اور مجتہد کو رسول کا درجہ دے دیا، اس تعصب اور غلو نے لوگوں کو حق سے دور کر دیا، یہ ایسی روش اور طرز عمل ہے جسے کوئی بھی عقل و خرد والا انسان پسند نہیں کر سکتا''۔

ابو شامہؒ (۸) کہتے ہیں:

''جو شخص فقہ کے مطالعہ میں مشغول ہے، اس کے لیے بہتر ہے کہ وہ کسی ایک امام کے فقہی مسلک میں منحصر اور محدود نہ ہو بلکہ یہ دیکھے کہ کتاب اور سنت سے قریب تر کیا ہے، مسئلہ کا جو پہلو یا فقہاء کی آراء میں سے جو رائے کتاب وسنت سے قریب تر ہو اسی پر اپنے اعتقاد اور عمل کی بنیاد رکھے، جو شخص سابقہ علوم پر وسیع نظر رکھتا ہو، قرآن وسنت کے نصوص اور ان کے سیاق وسباق سے واقف ہو، ایک ہی مسئلہ میں فقہاء کی اگر مختلف آراء ہیں ان کا بھی علم ہو، تو اس کے لیے یہ بات آسان ہے کہ وہ اپنے آپ کو ایک مخصوص فقہی مسلک میں محدود نہ کرے، البتہ ایسے شخص کے لیے ضروری ہے کہ وہ تعصب سے گریز کرے اختلاف آراء کے جو اسباب ہیں ان میں بھی غور و فکر سے کنارہ کش رہے، کیونکہ یہ چیزیں وقت کو ضائع کرتی ہیں اور طبیعت میں تکدر پیدا ہوتا ہے، امام شافعیؒ کا یہ قول مستند طریقے سے ہم تک پہنچا ہے کہ انھوں نے اپنی اور اپنے علاوہ کسی بھی عالم وفقیہ کی تقلید سے منع کیا ہے''۔

امام شافعی کے شاگرد مزنیؒ کہتے ہیں کہ:

''میں نے اپنی کتاب ''المختصر'' میں امام شافعیؒ کے علوم کا خلاصہ بیان کیا ہے اور ان کے اس قول کی توضیح وتشریح کی ہے کہ: ''میری کوشش ہے کہ علم کو اس کے طلب کرنے اور حاصل کرنے والوں کے قریب کر دوں''۔ اس بات کی بھی وضاحت کی ہے کہ امام شافعیؒ نے اپنی اور اپنے علاوہ کسی دوسرے فقیہ و مجتہد کی تقلید سے منع کیا

ہے تا کہ وہ دینی مسائل میں غور وفکر کر کے احتیاط سے کام لے۔

بہر کیف جو شخص بھی امام شافعیؒ کے علوم کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے اور اس کی خواہش ہے کہ ان کے فتاویٰ اور آراء تک اس کی رسائی ہو، اس پر میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ وہ ایک مخصوص و معین عالم کی تقلید سے منع کرتے تھے۔

(۲) دوسرے ابن حزمؒ کا قول اس شخص پر بھی صادق آتا ہے جو فقہاء میں سے کسی ایک فقیہ کی تقلید کرتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ اس سے کسی اجتہادی رائے قائم کرنے میں غلطی ہونا ممکن نہیں ہے۔ اس نے جو اجتہاد کیا، جو رائے قائم کی اور جو فتویٰ دیا وہ بلا شک وشبہ صحیح ہے اور دل میں یہ بات بھی رکھتا ہے کہ وہ اس کی تقلید کبھی نہیں چھوڑے گا اگر چہ اس کی کسی رائے میں دلیل اس کے خلاف ہو۔

قرآن وسنت رسول ﷺ نے اس طرز عمل کی قباحت بیان کی جیسا کہ عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ آیت پڑھتے سنا: **اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ** (۱۰) کافر لوگ اللہ کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور راہبوں کی بندگی نہیں کرتے تھے لیکن ان پر اتنا اندھا اعتماد تھا کہ وہ جس چیز کو حلال کہتے اسے حلال سمجھتے اور جس چیز کو حرام کر دیتے اسے اپنے اوپر حرام کر لیتے۔

(۳) ابن حزمؒ کی رائے تیسرے اس شخص سے متعلق ہے جو اس بات کو جائز نہیں سمجھتا کہ حنفی فقیہ، شافعی فقیہ سے فتویٰ لے یا شافعی فقیہ، حنفی فقیہ سے اور نہ اس بات کو جائز سمجھتا ہے کہ حنفی مسلک کا پیروکار امام شافعیؒ کی اقتداء کرے۔

درحقیقت یہ وہ شخص ہے جس نے عہد اول کے طریقے اور صحابہ رضی اللہ عنہم وتابعین کے اجماع کے خلاف کیا۔

ابن حزمؒ نے جو کچھ کہا اس کی زد میں وہ شخص نہیں آتا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق دین اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جس چیز کو حلال کر دیا اس کے حلال ہونے پر ایمان رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جسے حرام قرار دے دیا اس کے حرام ہونے کا اعتقاد رکھتا ہے۔

لیکن جب کسی شخص کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات پر وسیع نظر نہ ہو، وہ یہ بھی نہ جانتا ہو کہ آپ ﷺ کے ایسے ارشادات میں تطبیق کیسے دی جائے جن میں بظاہر کسی قسم کا کوئی اختلاف ہے، اسے یہ بھی علم نہ ہو کہ آپ ﷺ کے کلام سے احکام کیسے اخذ و مستنبط کیے جاتے ہیں، ایسا شخص اگر کسی جید اور راسخ عالم کی تقلید کرتا ہے، وہ کوئی فتویٰ دیتا ہے اس میں اسے حق پر سمجھتا ہے اور یہ گمان رکھتا ہے کہ یہ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرنے والا ہے، ان سب باتوں کے ساتھ وہ یہ عزم رکھتا ہے کہ اگر کسی وقت مجھے کوئی حدیث، اس عالم کے کسی قول یا فتوے کے خلاف ملی تو میں اس کے قول اور فتوے کی پیروی چھوڑ دوں گا اور کسی بحث و تکرار کے بغیر حدیث رسول ﷺ کو اپنا لوں گا، اس طرز عمل پر کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا، یہ طریقہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک سے چلا آرہا ہے کہ اہل علم فتویٰ دیتے تھے اور جن لوگوں کا گہرا اور وسیع علم نہیں ہوتا تھا وہ ان کے فتاویٰ پر اعتماد کرتے تھے۔

البتہ یہ ضروری نہیں کہ ہمیشہ ایک ہی عالم اور ایک ہی مفتی سے فتویٰ لیتا رہے، ایک ہی عالم اور ایک ہی مفتی سے مسئلہ پوچھے یا کبھی کسی ایک عالم سے فتویٰ لے لیا اور کبھی کسی دوسرے عالم سے اس میں کوئی حرج نہیں، لیکن شرط یہ ہے کہ سارا عمل اس اصول کے مطابق ہو جو ہم نے ابھی ذکر کیا ہے۔(۱۱)

اگر ہم فقہاء میں سے کسی ایک فقیہ کی تقلید کرتے ہیں تو یہ سمجھ کر کرتے ہیں کہ یہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عالم ہے، اس کی رائے اور فتویٰ قرآن اور سنت کے کسی واضح حکم اور نص کے مطابق ہوگا یا ان دونوں کے کسی نص کے یا دونوں میں سے کسی ایک کے نص سے مستنبط ہوگا یا اس عالم نے قرآن و سنت میں موجود قرائن سے کوئی حکم معلوم کیا ہوگا کہ یہ حکم فلاں صورت میں فلاں علت کی وجہ سے ہے اور اس کو اپنی اس ساری کوشش اور معرفت پر اطمینان قلب حاصل ہوا ہوگا، اس بنیاد پر اس نے غیر منصوص کو منصوص پر قیاس کیا، اس کا یہ سارا عمل اس بات کا گواہ ہے کہ گویا وہ یہ کہہ رہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہے کہ جہاں تم یہ علت پاؤ وہاں یہ حکم ہوگا اور جس مسئلہ میں قیاس کیا گیا ہے وہ اس عموم میں داخل ہے، لہٰذا یہ بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہے، لیکن اس کا طریق کار شک وشبہ سے خالی نہیں اگر یہ نہ ہوتا تو کوئی بھی

صاحب ایمان کسی مجتہد کی تقلید نہ کرتا۔

اب اگر ہمیں اس امام کے مسلک کے خلاف صحیح اور مستند سند سے کوئی حدیث ملی اور ہم نے اس حدیث کو چھوڑ کر امام و مجتہد کی رائے اور مسلک کو ترجیح دی اور اس پر جمے رہے تو ہم نے اپنے اوپر ظلم کیا، کیونکہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی ہم پر فرض ہے جب کہ کسی امام اور مجتہد کی اطاعت فرض نہیں ہے۔

اگر ہم اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت چھوڑ کر کسی امام، فقیہ یا مجتہد کے اقوال، آراء کی پیروی کریں گے تو اس روز کیا عذر ہوگا جب اللہ رب العالمین کے حضور کھڑے ہوں گے اور وہاں صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی فرماں برداری کے بارے میں سوال ہوگا۔

باب (۳)

حواشی و حوالہ جات

۱) خاص کی اصطلاحی تعریف یوں کی گئی: کل لفظ وضع لمعنی واحد علی الانفراد (ہر وہ لفظ جو تنہا ایک مخصوص معنی کے لیے وضع کیا گیا ہو) خاص میں یہ خصوصیت، جنس، نوع اور شخصیت ہر اعتبار سے ہوتی ہے جیسے انسان، رجل (مرد) اور نعمان، ارشد، شاہد وغیرہ۔

عام کی اصطلاحی تعریف یہ ہے: کل لفظ ینتظم جمعاً (ہر وہ لفظ جو متعدد افراد کو شامل ہو)۔

''عام'' کبھی لفظ اور معنی دونوں کے اعتبار سے ہوتا ہے جیسے رجال، رجل کی جمع ہے اور کبھی صرف معنی کے اعتبار سے ہوتا ہے لفظاً جمع نہیں ہوتا جیسے قوم، رہط، (گروہ) من، ما (شرطیہ وموصولہ) الذی، کل، جمیع اور الف لام استغراق جو تمام افراد کے احاطے کے لیے آتا ہے وغیرہ۔

عام کے محل استعمال میں غور کرنے سے اس کی تین قسمیں وجود میں آتی ہیں۔

الف: وہ عام جس کے ساتھ ایسا قرینہ موجود ہو جو تخصیص یعنی بعض افراد کو عام کے حکم میں داخل نہ ہونے کے احتمال کو کلی طور پر ختم کر دے۔ جیسے: وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا۔ (القرآن: ۶/۱۲) ''زمین پر کوئی چلنے والا نہیں ہے مگر یہ کہ اس کی روزی اللہ کے ذمہ ہے''۔ دابة (چلنے والے) کا لفظ عام ہے اس میں تخصیص کا کوئی قرینہ نہیں ہے۔

ب: وہ عام جس کے ساتھ تخصیص کا ایسا قرینہ موجود ہو جو سب افراد کے عام میں شامل ہونے کی نفی کرتا ہو، جیسے: وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا (القرآن)۔ ''لوگوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ جو اس کے گھر تک پہنچنے کی قدرت رکھتا ہو وہ اس کا حج کرے''۔

آیت میں ''الناس'' عام ہے لیکن ''من استطاع الیه سبیلا'' ایسا قرینہ موجود ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے وہ تمام افراد کو شامل نہیں ہو سکتا اس میں صرف وہی افراد شامل ہوں گے جو وہاں پہنچنے کی قدرت رکھتے ہوں۔

عام کی ان دو قسموں میں فقہاء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔

ج: وہ عام جس میں نہ تخصیص کو ختم کرنے والا کوئی قرینہ موجود ہو اور نہ کوئی ایسا قرینہ ہو جو عام کو عمومیت پر باقی رہنے کی نفی کرتا ہو، مطلب یہ ہے کہ وہ عام دونوں قسم کے قرینوں سے خالی ہو اس قسم کے عام میں فقہاء کی مختلف آراء ہیں۔

امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک ایسے عام کی دلالت ظنی ہوتی ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ایسے عام کی دلالت اس کے افراد پر قطعی ہوتی ہے۔

مطلق کی اصطلاحی تعریف ہے: المتناول لواحد لابعينه باعتبار حقيقة شاملة لجنسية. (جو افراد میں کسی کو غیر معین طور پر شامل ہو اس میں جنس حقیقت کا اعتبار کیا گیا ہو)

مقید کی اصطلاحی تعریف یہ ہے: المتناول لمعين او غير معين موصوف بأمر زائد على الحقيقة الشاملة لجنسية. (جو افراد میں سے کسی کو معین یا غیر معین طور پر شامل ہو اور اس میں جنس حقیقت سے زائد وصف کا اعتبار کیا گیا ہو)۔

مطلق میں صرف انہی اوصاف کا لحاظ ہوتا ہے جو حقیقت کی جنس میں پائے جاتے ہیں لیکن مقید میں ان اوصاف کے علاوہ کسی زائد کا بھی وصف ہوتا ہے، صفت، حال، شرط، غایت یا کوئی اور قید، سب زائد وصف کے عموم میں داخل ہیں لیکن مطلق اس سے خالی ہوتا ہے۔

(کشف الاسرار، شرح اصول بزدوی، التقریر والتحبیر (ابن امیر الحاج)، نور الانوار (ملاجیونؒ) المستصفی (غزالیؒ)

۲) ابن حزمؒ: ابومحمد علی بن احمد بن سعید بن حزمؒ۔ محدث، فقیہ ابتداء میں شافعی المسلک تھے بعد میں مسلک اہل ظاہر اختیار کیا۔ متوفی: ۴۵۶ھ۔

۳) القرآن: الاعراف (۷)، ۳،

۴) القرآن: بقرہ (۲)، ۱۷۰

۵) القرآن: الزمر ()، ۱۸،

۶) القرآن: النساء (۴)، ۵۹،

۷) عزالدین بن عبدالسلامؒ، محدث، فقیہ، فقہ شافعی کے مؤثر نمائندے متوفی: ۶۶۰ھ

۸) ابوشامہؒ، شہاب الدین متوسی و دمشقی

اہم تصانیف:: کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین، ضوء القمر الساری الی معرفة الباری، نور المسرا فی تفسیر آیة الاسراء. متوفی: ۶۶۵ھ۔

۹) مزنیؒ، احمد بن عبداللہ بن محمد المزنی معقلی ہروی۔

محدث، فقیہ، شافعی مسلک کی نمائندگی کرتے تھے۔ متوفی: ۳۵۶ھ

۱۰) یہ سورۂ توبہ کی آیت نمبر ۳۱ ہے۔ اس آیت میں یہود و نصاریٰ کی ایک گمراہی کا ذکر ہے کہ انھوں نے اپنے علماء اور دینی پیشواؤں کو اپنا رب بنالیا۔

قرآن کریم نے یہود و نصاریٰ پر علماء اور دینی پیشواؤں کو رب بنانے کا الزام عائد کیا ہے، وہ ان لوگوں کو صراحتاً اپنا رب نہیں کہتے تھے لیکن ان کے حکموں کی پیروی اس طرح آنکھیں بند کر کے کرتے تھے جیسے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے حکموں کی پیروی کا حکم ہے، عملاً یہود و نصاریٰ اپنے علماء اور عباد و زہاد کے اقوال و احکام کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام پر ترجیح دیتے تھے، اس رویے اور طرز عمل کو قرآن شرک سے تعبیر کر رہا ہے اسی سے ملتا جلتا طرز عمل آج فقہی مسالک کے بارے میں ہے جو شخص جس امام کو اگر کھلم کھلا رد نہیں کرے گا تو اس میں تاویل ضرور کرے گا مگر اپنے امام کی رائے کو چھوڑنے پر تیار نہیں ہوگا۔

۱۱) جو بات شاہ ولی اللہؒ کہہ رہے ہیں وہی بات جب آج کہی جاتی ہے تو علماء اور مفتی حضرات اس رائے کو فسق اور 'ہوائے نفس' سے تعبیر کرتے ہیں۔

شاہ صاحبؒ نے یہ بات ''عقد الجید'' کے علاوہ ''حجۃ اللہ البالغہ'' اور ''الانصاف فی بیان سبب الاختلاف'' میں بھی مختلف انداز اور غیر مبہم طریقے سے کہی ہے۔ ''ازالۃ الخفاء'' خلافت راشدہ کے موضوع پر ہے، اس میں بھی شاہ صاحبؒ نے ایک مقام پر افسوس اور تعجب کے انداز میں یہ بات کہی ہے کہ اسلام کے ابتدائی عہد میں کئی صدیوں تک فقہی مسالک کا وجود نہیں تھا عام لوگ اپنے شہر کے عالم اور مفتی سے مسئلہ پوچھتے اور فتویٰ لیتے، وہ اس تحقیق میں نہیں پڑتے تھے کہ یہ عالم اور مفتی حنفی ہے یا شافعی لیکن بعد کے علماء نے اس کو فسق سے تعبیر کرنا شروع کر دیا ہے۔

اجتہادی مسائل میں مختلف مسلمہ فقہی مسالک سے استفادے کو 'ہوائے نفس' سے تعبیر کرنے کا رجحان گزشتہ چند صدیوں میں ابھرا۔

اس صورت حال کا نتیجہ یہ نکلا کہ فقہی مسالک کو دین اور شریعت کا درجہ دے دیا گیا اور اسلاف کا یہ فیصلہ کہ: ''حق چاروں فقہی مسالک میں دائر ہے۔'' صرف کتابوں میں محدود ہو گیا اور آہستہ آہستہ اجتہادی مسائل میں ایک دوسرے کو قبول کرنے کی رسم ختم ہو گئی۔

شاہ ولی اللہ نے ازالۃ الخفاء میں جو بات کہی وہ یہ ہے کہ

''مذاہب اربعہ میں جو مسلک آسان ہو چن کر اس پر عمل کر لینا، بشرطیکہ وہ نص قرآن، حدیث، اجماع سلف اور قیاس جلی کے خلاف نہ ہو، مستحسن ہے۔''

(ازالۃ الخفاء مع اردو ترجمہ۔طبع کراچی۔ص:۵۲۲)

شاہ صاحبؒ سہولت کی خاطر فقہی مسالک میں سے کسی ایک مسلک کو اختیار کرنے کی صرف اجازت نہیں دے رہے ہیں بلکہ اسے مستحسن اور پسندیدہ قرار دے رہے ہیں۔

اور یہ امر مسلم ہے کہ ائمۂ مجتہدین میں سے کسی کی کوئی فقہی رائے ان اصول سے باہر اور ہٹ کر نہیں ہے جن کا شاہ صاحبؒ نے ذکر کیا ہے۔

باب:۴

فقہی مسالک کی تقلید: اختلاف آراء

مسلم امہ میں اہل سنت کے جو چار فقہی مسالک رائج ہوئے، انہیں کس حد تک اختیار کیا جائے اور ان کے اخذ و قبول کی کیا صورت ہو؟ اس بارے میں اہل علم و فضل کا اختلاف ہے۔

معلوم ہونا چاہیے کہ ان چار فقہی مسالک کو اختیار کرنے میں لوگوں کے چار درجے اور مرتبے ہیں اور ہر طبقے کے لیے ایک حد مقرر ہے، کسی کے لیے یہ جائز نہیں کہ اس حد سے آگے بڑھے۔

(۱) اول مجتہد مطلق کا مرتبہ جس کی طرف ان فقہی مسالک میں سے کوئی ایک فقہی مسلک منسلک ہے۔

(۲) دوسرے مسائل کی تخریج کرنے والے کا مرتبہ، یعنی مجتہد فی المذہب۔

(۳) تیسرے متبحر فی المذہب کا مرتبہ ہے، جو اپنے مسلک کا حافظ ہے، اس کی جزئیات اور اصول پر پوری دسترس رکھتا ہے، اپنے حفظ اور مہارت کی مدد سے اپنے ائمہ کے مسلک کے مطابق فتویٰ دیتا ہے۔

(۴) چوتھے مقلد محض، جو اپنے مسلک کے علماء سے فتوے لے کر ان پر عمل کرتا ہے۔

اہل علم کی بیشتر کتابوں میں ہر مرتبے کی شرائط اور احکام تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں، لیکن اس کے باوجود بعض لوگ ان مراتب میں جو باہمی فرق ہے نہ اس کو سمجھتے ہیں اور نہ اس کے درمیان کوئی امتیاز کرتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ احکام کی پہچان ان کے لیے دشوار ہو جاتی ہے اور وہ

ان احکام کو ایک دوسرے سے متناقض سمجھنے لگتے ہیں۔

لوگوں کے اس تحیر اور خلط مبحث کو دور کرنے کے لیے ہم نے ارادہ کیا کہ ہر مرتبے کے لیے ایک مستقل فصل رکھی جائے اور اسمیں اس مرتبے سے متعلق احکام کی وضاحت کے ساتھ نشان دہی کی جائے۔

فصل :۱

مجتہد مطلق منتسب

مجتہد مطلق کی کیا شرط ہے؟ اس کو ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں، اس لیے اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

مذکورہ بالا بیان کا حاصل یہ ہے کہ وہ علم حدیث اور اپنے ائمہ سے مروی فقہ اور اصول فقہ کا جامع ہوتا ہے، جیسے شافعی مسلک کے اکابر علماء اگرچہ بذات خود ان کی تعداد خاصی ہے لیکن دوسرے مراتب کے مقابلے میں زیادہ نہیں ہے، جب ہم نے ان کے کلام کا بغور مطالعہ کیا تو ان کے طریق کار کا یہ نقشہ سامنے آیا کہ: جو مسائل، مالکؒ، شافعی اور ثوری رحمہم اللہ سے منقول ہیں، ان کا موطا امام مالکؒ اور صحیحین، اس کے بعد ترمذی، ابوداؤد اور نسائی میں تلاش کیا (۱)، جو مسئلہ حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق ہوا خواہ اس کی مطابقت نص کی رو سے ہو یا اشارۃ النص کی رو سے، اس پر اعتماد کیا اور اس کو لے لیا اور جہاں کسی حدیث کو اس کے خلاف پایا تو اس کو رد کر دیا اور اگر پہلے سے اس پر عمل تھا تو اس عمل کو چھوڑ دیا۔

جس مسئلے میں احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور آثار صحابہؓ (۲) کو مختلف پایا وہاں ایک حدیث کو دوسری حدیث کے ساتھ، یا ایک اثر کو دوسرے اثر کے ساتھ تطبیق دینے میں اجتہاد کیا۔

اگر ایک مضمون کی دو حدیثیں یا دو اثر ملے، ان میں ایک مجمل و مبہم ہے اور ایک تفصیل و وضاحت ہے تو واضح اور مفصل کو مجمل و مبہم کی تفسیر قرار دے کر عمل کی بنیاد اس پر رکھ لی اور اسی کو فیصلہ کن تصور کر لیا۔

جس مسئلے میں ایک سے زائد احادیث یا ایک سے زائد آثار آئے ہیں، اس کا تعلق اگر آداب وسنن سے ہے تو اختلاف کی صورت میں منقول دونوں طریقوں کو سنت سمجھا گیا، اگر اس مسئلے کا تعلق حلال وحرام سے تھا یا اس کا تعلق کسی عدالتی معاملے سے تھا اور اس میں صحابہؓ کے، تابعین کے، یا مجتہدین کے درمیان اختلاف تھا تو دین میں سہولت اور وسعت کے اصول کو پیش نظر رکھتے ہوئے سب اقوال وآراء کو معتبر اور قابل عمل مانا گیا اور لوگوں کو یہ اجازت دی گئی کہ وہ ان مختلف اقوال میں سے جس قول کو چاہیں اختیار کرلیں اور پھر مختلف اقوال میں سے جس نے کوئی ایک قول اختیار کرلیا اس کو برا نہیں سمجھا گیا اور نہ ایسے شخص پر زبان طعن دراز کی گئی، مگر یہ اس صورت میں ہے جب کہ ہر رائے کے حق میں بطور دلیل کوئی حدیث موجود ہو یا اثر صحابیؓ اس کی تائید کرتا ہو۔

انھوں نے مختلف اقوال میں اولیٰ اور راجح قول کو معلوم کرنے کے لیے مقدور بھر کوشش کی، اولیٰ اور راجح اس قول کو قرار دیا جس کی سند سب سے قوی تھی یا جس پر اکثر صحابہ کا عمل تھا یا جمہور مجتہدین نے اس قول کو اپنایا تھا یا وہ قیاس کے زیادہ مطابق تھا اور اس کے دوسرے نظائر موجود تھے، جب انھوں نے اولیٰ اور راجح کا تعین کرلیا تو اپنے عمل کی بنیاد اسی پر رکھی اور کسی نے ان کے معین کردہ راجح قول کو اختیار نہیں کیا، دوسرے قول کو اپنایا اور اس پر عمل کیا تو انھوں نے اس پر اعتراض نہیں کیا۔

اگر انہیں صحابہؓ اور تابعین سے کوئی حدیث نہیں ملی تو تبع تابعین کے اقوال وآثار کا مطالعہ کیا، ان کے اقوال وآثار سے جو دلائل اور علل سمجھ میں آتے تھے ان میں غور کیا، اگر اس تمام جائزے اور تفحص سے اطمینان نہ ہوا اور مسئلہ ایسا ہے جس میں مجتہد کے لیے اجتہاد کی گنجائش اور اجازت ہے اور اس میں پہلے کبھی اہل علم کا اجماع بھی نہیں ہوا اور ان کے پاس اس قول اور رائے کو اختیار کرنے کی کوئی واضح دلیل بھی موجود ہے تو پھر وہ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتے ہوئے اسے اختیار کرلیتے ہیں لیکن یہ صورت شاذ ونادر ہی وقوع پذیر ہوتی ہے، ان کی کوشش ہوتی ہے کہ اس طرح کی مشکل صورت حال سے بچا جائے۔

اور جب اپنے پاس کوئی واضح اور قوی دلیل نہیں پاتے تو جمہور اہل علم کی پیروی کرتے ہیں،

جس مسئلے میں سلف سے کوئی وضاحت نہیں ملی اور نہ ہی ان کے کلام سے کسی ایک سبب اور علت کی نشان دہی ہوئی جس پر اجتہاد کی بنیاد رکھی جا سکتی تو پھر ان فقہاء نے جو مجتہد مطلق کے درجے پر فائز تھے، کتاب و سنت یا صحابہ اور تابعین کے آثار سے کوئی نص یا اشارہ حاصل کرنے کی ممکنہ کوشش کی، اگر ان کے اقوال و آثار میں کوئی نص یا اشارہ مل گیا تو اسی کو اختیار کر لیا، انھوں نے کبھی اس طرز عمل کو نہیں اپنایا کہ ہمیشہ ایک ہی امام کی تقلید کرتے رہیں، خواہ اس کی آراء اور اجتہادات پر اطمینان قلب ہو یا نہ ہو۔

ہم نے جو کچھ بیان کیا اگر کوئی شخص اس پر مطمئن نہیں ہے تو وہ کتاب معالم السنن، بغوی کی شرح السنہ اور بیہقی (رحمہم اللہ) کی کتابوں کا مطالعہ کرے، ان کتب کی طرف رجوع سے قاری کو ہمارا موقف سمجھنے میں مدد ملے گی۔

بہر کیف فقہ و حدیث میں گہری سمجھ رکھنے والوں کا طریقہ کار یہی تھا، ظاہریہ (۳) کے علاوہ علمائے حدیث میں ایسے افراد بہت کم ہیں جو نہ قیاس کے قائل ہیں اور نہ اجماع سلف کو مانتے ہیں، یہ حضرات اپنے آپ کو ان متقدمین اصحاب حدیث سے بھی وابستہ نہیں کرتے جنھوں نے مجتہدین کے اجتہاد اور اقوال و آراء کی طرف کوئی توجہ نہیں دی لیکن یہ حضرات اصحاب حدیث سے زیادہ مشابہ اور قریب تر ہیں، کیوں کہ انہوں نے بھی مجتہدین کے اقوال و آراء کے بارے میں وہی رویہ اختیار کیا جو محدثین نے صحابہ اور تابعین کے مسائل کے بارے میں کیا ہے۔

فصل ۲:

مجتہد فی المذہب

یہاں تین مسائل قابل غور ہیں:

(۱) اول یہ جاننا ضروری ہے کہ مجتہد فی المذہب پر سنن اور آثار کا اس حد تک جاننا واجب ہے کہ وہ اپنے آپ کو کسی صحیح حدیث کی مخالفت سے محفوظ کر لے، سلف نے جن مسائل میں اتفاق کیا ہے ان کا علم بھی ضروری ہے، اس کے ائمہ نے اپنے اقوال و آراء میں جن احادیث اور آثار کو ماخذ اور دلیل کے طور پر استعمال کیا ہے ان کا جاننا بھی ضروری ہے۔ ''فتاویٰ سراجیہ'' کی اس عبارت کا مطلب یہی ہے۔ اس میں ہے کہ:

''کسی عالم کے لیے اس وقت تک فتویٰ دینا مناسب نہیں ہے جب تک اسے اپنے سے مقدم علماء کے اقوال اور فتاوی کا علم نہ ہو اور اس کے ساتھ وہ یہ بھی جانتا ہو کہ انہوں نے یہ اقوال کیوں اختیار کیے؟ معاشرے میں جو عرف و عادت ہے اور لوگ جس طرح معاملات طے کر رہے ہیں اسے اس کا علم ہو، اگر وہ علماء کے اقوال سے تو واقف ہے لیکن ان کے فقہی مسالک کا علم نہیں رکھتا، اگر اس سے کسی مسئلہ میں رجوع کیا جائے اور وہ مسئلہ ایسا ہو کہ اس کے بارے میں ان مجتہدین کی متفقہ رائے ہو جن کا فقہی مسلک تسلیم کیا جاتا ہے، تو ایسی صورت میں اگر یہ (مجتہد فی المذہب) کہہ دے کہ: ''یہ جائز ہے اور یہ ناجائز ہے''، تو کوئی حرج نہیں، اس کا یہ کہہ دینا کہ ایک واقعہ کا بیان ہو گا اور اس کی حیثیت خبر کی سی ہو گی، اس کا یہ کہنا مستقل رائے

اور فتویٰ شمار نہیں ہوگا۔

اور اگر اس مسئلے میں جو اس سے پوچھا گیا ہے مجتہدین کا اختلاف ہو تو اس کے لیے یہ کہہ دینا مناسب ہے کہ: ''فلاں کے نزدیک جائز ہے اور فلاں کے نزدیک جائز نہیں ہے''۔ یا اس مسئلے میں فلاں مجتہد کی یہ رائے ہے اور فلاں کی یہ رائے۔ از خود کسی مجتہد کے قول کو راجح قرار دے کر اور اختیار کر کے سوال کرنے والے کو جواب نہیں دے سکتا جب تک ان اقوال اور آراء کے مآخذ اور دلائل کا علم نہ ہو۔

فصول عمادیہ کی فصل اول میں یہ بات کہی گئی ہے کہ:

''جو شخص درجۂ اجتہاد پر فائز نہیں ہے اس کو فتویٰ دینا جائز نہیں ہے، البتہ جس کو مجتہدین کے اقوال و آراء پوری طرح محفوظ ہوں اور اس بات کا اندیشہ نہ ہو کہ وہ مختلف فقہاء کی آراء کو آپس میں گڈمڈ کر دے گا اس کے لیے صرف اس حد تک اجازت ہے کہ وہ ان اقوال، آراء اور فتاویٰ کو حکایت کے طور پر نقل کر سکتا ہے، اس وضاحت کے ساتھ کہ یہ فلاں امام کا قول یا فلاں کا فتویٰ ہے، میری اپنی رائے نہیں ہے''۔

ابو یوسف، زفر بن ہذیل اور عافیۃ بن زید (۴) رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ:

''کہ کسی عالم اور مفتی کو ہمارے قول کو اپنے فتوے کی بنیاد بنانا اور اس کے مطابق فتویٰ دینا اس وقت تک جائز نہیں ہے جب تک اسے یہ علم نہ ہو کہ ہم نے یہ رائے کس بنا پر اختیار کی اور ہمارے اس قول کا مآخذ کیا ہے۔''

فصول عمادیہ نے بعض ائمہ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ:

''اگر کسی نے ہمارے اساتذہ کی کتابوں کو حفظ بھی کر لیا لیکن ان میں سے کسی کے آگے زانوئے تلمذ تہہ نہیں کیا تو اس کو بھی فتویٰ نہیں دینا چاہیے، مفتی کے منصب پر بیٹھنے کے لیے کسی امام اور عالم کا شاگرد بننا ضروری ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض مسائل ایسے ہیں کہ اس میں فقیہ، مجتہد یا عالم جو فتویٰ دیتا ہے اپنے شہر اور علاقے کے حالات اور عرف و عادت کو ملحوظ رکھ کر دیتا ہے، کسی دوسرے علاقے کے مفتی کے

لیے مناسب نہیں کہ وہ اپنے علاقے کے حالات اور عرف کو ملحوظ رکھے بغیر اسی فتوے کو دہرائے، اس کو معلوم ہونا چاہیے کہ بعض مسائل کے احکام حالات اور زمانے کے تغیر سے بدل جاتے ہیں، ان باتوں کا علم کتابوں سے نہیں، اساتذہ کے ساتھ رہنے سے ہوتا ہے، اسے اپنے شہر کے حالات کا علم ہونا چاہیے اور یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ وہ کون سے مسائل ہیں جن میں حالات کے تغیر سے فتویٰ تبدیل کیا جاسکتا ہے۔"

عمدۃ الاحکام نے محیط کے حوالے سے یہ بات نقل کی ہے کہ:

"مجتہد وہ ہے جو کتاب، سنت، آثار اور فقہی اصول وقواعد سے واقف ہو اور ان سب پر اس کی گہری نظر ہو"۔

"خانیہ" نے بعض علماء کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:

"اجتہاد کے لیے ضروری ہے کہ کتاب مبسوط پر پورا عبور ہو، اس میں مذکور مضامین اور مباحث اس کی نظروں سے اوجھل نہ ہوں، ناسخ ومنسوخ اور محکم ومؤول میں فرق وامتیاز پر پوری طرح قادر ہو اور اس کے علاوہ اپنے علاقے کے عرف وعادت سے بھی واقف ہو"۔

"سراجیہ" میں ہے:

"بعض علماء کا کہنا ہے کہ اجتہاد کی کم سے کم شرط یہ ہے کہ اسے کتاب مبسوط کے مضامین ومباحث پر مکمل عبور ہو"۔

یہ تمام روایات "خزانۃ المفتین" میں ذکر کی گئی ہیں۔

میں (ولی اللہ بن عبدالرحیمؒ) کہتا ہوں کہ ان عبارات کا مقصد یہ ہے کہ مفتیوں کی جو قسمیں ہیں، ان کے درمیان فرق کیا جائے، ایک وہ مفتی ہیں جو صاحب تخریج ہیں، یعنی از خود مسائل کا حکم اخذ کرتے ہیں اور پھر فتویٰ دیتے ہیں۔

(۲) مجتہد فی المذہب کے بارے میں دوسرا مسئلہ یہ جاننا ضروری ہے کہ فقہائے محققین کہتے ہیں کہ مسائل چار قسم کے ہیں۔

پہلی قسم: وہ مسائل جو ظاہر مذہب میں ثابت ہو چکے ہیں، ان کا حکم یہ ہے کہ فقہاء انہیں ہر حال میں قبول کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ صاحب ہدایہ اور بعض دوسرے فقہاء نے مسائل تجنیس کے درمیان فرق بیان کرنے کا اہتمام کیا ہے۔

دوسری قسم: ابوحنیفہؒ اور صاحبین (ابو یوسفؒ، محمدؒ بن حسن شیبانیؒ (۵) کی وہ آراء جو شاذ کا درجہ رکھتی ہیں، ان کا حکم یہ ہے کہ انہیں صرف اس صورت میں قبول کیا جائے گا جب کسی اصول سے ان کی مطابقت ثابت ہو جائے، صاحب ہدایہ (۶) نے ایسی آراء کے دلائل بیان کیے ہیں جن کی وجہ سے ابوحنیفہؒ اور صاحبین کی بہت سی شاذ آراء اور روایات کی تصحیح و توثیق ہو گئی ہے۔

تیسری قسم: فقہائے متاخرین کے تخریج کردہ وہ مسائل جن پر علماء نے اتفاق کیا، اس کا حکم یہ ہے کہ وہ ہر حال میں اسی کے مطابق فتویٰ دیں گے۔

چوتھی قسم: فقہائے متاخرین کے تخریج کردہ وہ مسائل جن پر جمہور علماء کا اتفاق نہ ہو سکا، ان کو سلف کے اقوال و آراء پر پیش کیا جائے گا اور دیکھا جائے گا کہ انھوں نے جو اصول بیان کیے ہیں، ان کے مسائل ان سے مطابقت رکھتے ہیں یا نہیں؟ نیز ان کے فتاویٰ میں متاخرین کے اقوال وفتاویٰ کے نظائر تلاش کیے جائیں گے، اگر پائے گئے تو ان کے فتاویٰ اور اقوال کی توثیق کی جائے گی، ورنہ نہیں۔

''خزانۃ الروایات'' نے ''بستان'' کے حوالہ سے فقیہ ابواللیثؒ کا قول نقل کیا ہے:

> ''اگر کسی نے حدیث رسول ﷺ سنی یا کسی عالم کا کوئی قول سنا اور سنانے والا ثقہ اور قابل اعتماد آدمی نہیں ہے تو اس کی روایت کو قبول نہیں کیا جائے گا، البتہ اس نے جو بات نقل کی ہے وہ اصول کے مطابق ہے اور دوسری روایات و واقعات اس کی نقل کردہ روایت کی نفی نہیں کرتے تو پھر اس کی روایت کو قبول کیا جا سکتا ہے اور اگر کسی اصول سے ٹکراتا ہے یا دوسری کوئی ثقہ اور مستند روایت اس کی نفی کرتی ہے تو پھر اس پر عمل کرنا جائز نہ ہوگا''۔

ایسے ہی اگر کوئی حدیث یا مسئلہ کسی کتاب یا مضمون میں لکھا ہوا پایا تو اگر اصول کے مطابق ہے اور دوسری کوئی مستند روایت اس کے مخالف نہیں تو پھر اس پر عمل کی اجازت ہوگی۔

''بحرالرائق'' نے بھی ابواللیثؒ سے ایک روایت نقل کی ہے۔ کہتے ہیں کہ:

''کسی نے ابونصرؒ (۷) سے اس مسئلے کے بارے میں پوچھا جوان ے پاس آیا تھا۔ کہنے لگا اللہ تعالیٰ تم پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے۔ تمہارے پاس خلیفہ ہشام کی طرف سے چار کتابیں ہیں۔ (۱) کتاب ابراہیم بن رستم، (۲) خصاف کی کتاب آداب القاضی، (۳) کتاب ''المجرد'' اور کتاب ''النوادر''۔ یہ بتایئے کہ ہم ان کتابوں میں سے فتویٰ دے سکتے ہیں یا نہیں؟ اور ابونصرؒ نے کہا: ہمارے ائمہ سے جو باتیں اور مسائل ہم تک پہنچے ہیں اور مستند طریقے سے پہنچے ہیں ان کی حیثیت تو ہمارے نزدیک پسندیدہ اور قابل قدر علم کی ہے، لیکن ان پر فتویٰ دینا میری رائے میں مناسب نہیں، میں کسی ایسے مسئلے میں فتویٰ دے کر جسے میں سمجھتا ہی نہیں، لوگوں کا وبال اپنی گردن پر اٹھانا نہیں چاہتا۔

ہمارے ائمہ کے جو مسائل ہمارے پاس ہیں اور وہ واضح اور غیر مبہم ہیں ان کے بارے میں میرا طرز عمل یہ ہے کہ آئے دن جو واقعات پیش آتے ہیں ان میں ان مسائل سے رجوع کرتا ہوں اور ان سے جو رہنمائی ملتی ہے اس پر اعتماد کرتا ہوں''۔

(۳) تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ یہ بات سمجھیے کہ جب کسی مسئلے میں امام ابوحنیفہؒ اور صاحبین (ابو یوسفؒ، محمد بن حسنؒ) کے درمیان اختلاف ہو تو مجتہد فی المذہب کو اختیار ہے کہ ان حضرات میں سے جس کا قول دلیل کے اعتبار سے سب سے قوی علت کے اعتبار سے قیاس سے قریب تر اور زیادہ موافق اور لوگوں کے لیے زیادہ سہولت پیدا کرنے والا ہو، اسے اختیار کر لے، خود بھی اس پر عمل کرے اور دوسروں کے لیے بھی اس کے مطابق فتویٰ دے۔

یہی وجہ ہے کہ بہت سے حنفی فقہاء نے ماءِ مستعمل کی پاکی کے مسئلے میں امام محمدؒ کے قول کے مطابق فتویٰ دیا ہے۔

عصر اور عشا کے وقت کی ابتداء کب ہوتی ہے، اس مسئلے میں صاحبین رحمہم اللہ کا قول اختیار کیا ہے۔

نیز مزارعت کے جواز کے بارے میں حنفی فقہاء نے صاحبین کی رائے کو ترجیح دی ہے اور

اسی پر فتویٰ دیتے ہیں، فقہ حنفی کی کتابیں اس طرح کی مثالوں سے بھری پڑی ہیں، یہاں اسے دہرانے کی ضرورت نہیں۔

یہی حال فقہ شافعی کی کتابوں کا ہے ان میں بھی بے شمار ایسی مثالیں مذکور ہیں کہ امام شافعیؒ کا جو نقطۂ نظر ہے بعد میں آنے والے شافعی فقہاء نے اس سے اختلاف کیا ہے، مثلاً میراث کے مسائل میں امام شافعیؒ کی رائے یہ ہے کہ ذوی الارحام کو وراثت نہیں ملے گی، لیکن بعد میں آنے والی شافعی فقہاء نے تبدیل شدہ حالات کو سامنے رکھا اور بیت المال نہ ہونے کی صورت میں یہ فتویٰ دیا کہ ذوی الارحام کو وراثت میں حصہ دیا جائے گا۔

فقیہ یمن بن زیادؒ (۸) نے ایسے مسائل کو حوالہ دیا ہے جن میں متاخرین شافعی فقہاء نے اصل شافعی مسلک سے انحراف کرتے ہوئے فتوے صادر کیے ہیں۔

جن مسائل میں بعد کے شافعی فقہاء نے قدیم فقہی مسلک سے انحراف کیا، انہی میں سے ایک سونے، چاندی اور اموال تجارت کی زکوٰۃ ادا کرنے کا مسئلہ ہے، امام شافعیؒ کے نزدیک نقد روپے سے ان کی زکوۃ ادا نہیں ہوتی لیکن شافعی فقیہ بلقینیؒ (۹) نے فتویٰ دیا کہ نقد روپے کے ذریعہ ان کی زکوۃ ادا کی جاسکتی ہے۔

قدیم فقہی مسلک سے اختلاف کرنے میں بلقینیؒ نے امام محمد بن اسماعیل بخاریؒ کی پیروی کی ہے، اسی طرح کے مسائل میں سے اشراف علویین کو زکوٰۃ دینے کا مسئلہ ہے۔

امام فخر الدین رازیؒ نے فتویٰ دیا تھا کہ ان لوگوں کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے کیونکہ بیت المال سے ان کے وظیفے بند ہوگئے تھے اور تنگدستی نے ان کو گھیر لیا تھا۔ (اموال زکوٰۃ سے ان کی مدد کرنا اس سے بہتر تھا کہ وہ دوسروں کے آگے دست سوال پھیلانے پر مجبور ہوتے، وہ ان کی نجابت و شرافت کو زیادہ مجروح کرنے والی صورت حال ہوتی)۔

ایسا ہی ایک مسئلہ شہد کا چھتہ فروخت کرنے کا ہے، بلقینیؒ نے اس کے جواز کا فتویٰ دیا ہے۔

ابن زیادؒ، ابن عجیلؒ سے نقل کرتے ہیں کہ شافعی مسلک کے متاخر فقہاء زکوٰۃ سے متعلق تین مسائل میں اصل شافعی مسلک کے خلاف فتویٰ دیتے ہیں۔

(۱) زکوٰۃ کا روپیہ ایک شہر سے دوسرے شہر لے جانا اور وہاں کے لوگوں میں اسے تقسیم کرنا۔

(۲) زکوۃ کی رقم ایک ہی آدمی کو دے دینا۔

(۳) زکوۃ کے آٹھ مصارف میں سے کسی ایک مصرف میں زکوۃ دے دینا۔

میرے (ولی اللہ بن عبدالرحیمؒ) کے نزدیک اس بارے میں بہتر صورت یہ ہے کہ اگر شافعی مسلک کے کسی عالم اور مفتی کو دوسرے مسلک کے کسی مسئلے، رائے اور فتوے کو اختیار کرنے کی ضرورت پیش آئے تو وہ امام احمد بن حنبلؒ (۱۰) کے فقہی مسلک سے استفادہ کرے، یہ شافعی عالم ومفتی خواہ مجتہد فی المذہب ہو یا متبحر فی المذہب۔

ترجیحی طور پر فقہ شافعی کے مقلد کو فقہ احمد بن حنبلؒ کی طرف رجوع کرنا اس لیے بہتر ہے کہ احمد بن حنبل رحمہ اللہ، امام شافعی رحمۃ اللہ کے سب سے نمایاں اور قابل اعتماد شاگرد ہیں، علم اور تقوی کا پیکر ہیں اور ان کے فقہی مسلک کی تحقیق وتجزیہ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان کا فقہی مسلک، شافعی مسلک ہی کا ایک حصہ اور اس کی شاخ ہے، تمام حقائق کو اللہ زیادہ بہتر جاننے والا ہے۔

فصل:۳

تبحر فی المذہب

تبحر فی المذہب کا اپنے فقہی مسلک کی کتابوں پر مکمل عبور رہتا ہے، کلیات اور اصول وقواعد کے علاوہ جزئیات پر بھی اس کی نظر ہوتی ہے۔

(۱) جو عالم تبحر فی المذہب ہو، اس میں چار اوصاف وشرائط کا پایا جانا ضروری ہے۔

الف: صحیح فہم رکھنے والا ہو، علمی مسائل اور عملی معاملات دونوں کا بہتر شعور وادراک رکھتا ہو۔

ب: عربی زبان میں مہارت۔

ج: اسالیب کلام پر وسیع نظر، کلام عرب میں جو محاورے اور ضرب الامثال ہیں، ان سے واقف ہو کیوں کہ اسلوب کلام کی تبدیلی سے الفاظ کے معانی ومطالب بدل جاتے ہیں۔

د: وہ اس فرق وامتیاز پر قادر ہو کہ کس مقام پر مطلق کلام سے مقید مراد لینا ہے، اور کہاں مقید کلام کو مطلق پر محمول کرنا ہے۔

ابن نجیمؒ (۱۱) نے ''بحر الرائق'' میں ان شرائط پر بہت زور دیا ہے۔

تبحر فی المذہب پر واجب ہے کہ وہ صرف دو صورتوں میں فتویٰ دے۔

یا تو اس کے پاس اس فتوے کے لیے کوئی معتمد اور مستند دلیل ہو اور اس دلیل کی سند اس کے امام تک پہنچتی ہو یا وہ مسئلہ کسی معروف اور مستند کتاب میں مذکور ہو۔

کتاب ''نہر الفائق'' میں بھی یہی بات کہی گئی ہے کہ:

ایسے مفتی کے لیے جو مقلد ہو، مجتہد کا قول یا فتویٰ نقل کرنے کی صرف دو صورتوں

میں اجازت ہے۔

(۱) یا تو اس کے پاس ایسی سند ہو جو اس کے امام اور مجتہد تک پہنچتی ہو۔

(۲) یا وہ مسئلہ کسی معروف اور مستند کتاب میں موجود ہو، جیسے امام محمد بن حسن شیبانیؒ کی کتابیں یا انہی کے ہم رتبہ دوسرے ائمہ اور مجتہدین کی کتب، اس لیے کہ محمد بن حسنؒ جیسے ائمہ کی کتابوں کا درجہ خبر متواتر و مشہور کے برابر ہے۔

امام فخر الدین رازیؒ کا بھی نقطۂ نظر یہی ہے۔'' وہ کہتے ہیں کہ ایسی صورت میں اگر کسی ایسی کتاب کا کوئی نسخہ مل جائے جو غیر معروف ہو اور نادر کے درجے میں ہو تو اس کے مسائل کو امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کی طرف منسوب کرنا غیر مناسب بات ہے، کیوں کہ نادر کتب یا نادر اقوال نہ ہمارے زمانے میں مشہور ہوئے اور نہ اہل علم نے ان پر عمل کیا، البتہ اگر کسی نادر کتاب کے مسائل کسی معروف و مستند کتاب میں ملیں جیسے ہدایہ اور المبسوط تو ایسی صورت میں ان کتابوں پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔''

(۴) اگر مجتہد فی المذہب اپنے فقہی مسلک کے خلاف کسی مسئلے میں کوئی حدیث پائے تو کیا اس کے لیے اس بات کی اجازت ہے کہ وہ اس مسئلے میں اپنے فقہی مسلک اور رائے کو چھوڑ کر حدیث کو اختیار کرے؟ اسی پر عمل کرے اور اسی کے مطابق فتویٰ دے؟

صاحب ''خزانۃ الروایات'' نے اس مسئلے میں ''دستور مساکین'' سے طویل روایت نقل کی ہے اور خاصی تفصیل سے کلام کیا ہے، ہم اس میں سے کچھ حصہ نقل کرتے ہیں۔

''اگر سوال کیا جائے کہ ایک مقلد، جو مجتہد نہیں ہے لیکن عالم ہے، صاحب استدلال ہے، اصول اور قواعد و ضوابط سے واقف ہے، نصوص و اخبار کے معانی و مطالب پر اس کی نظر ہے، کیا اس کے لیے جائز ہوگا کہ وہ اپنے امام کی کسی رائے کو چھوڑ کر حدیث پر عمل کرے؟

اپنے امام کے مسلک کو چھوڑ کر کسی حدیث پر عمل کرنا اس کے لیے جائز ہوگا جب کہ اہل علم یہ بات کہہ چکے ہیں کہ غیر مجتہد کو صرف اپنے فقہی مسلک کی روایات اور اپنے

مسلک کے فتاویٰ پر عمل کرنا ہوگا، وہ ان سے باہر نہیں جا سکتا اور اس کے لیے یہ بھی درست نہ ہوگا کہ وہ نصوص واخبار کے معانی ومفاہیم کا خود تعین کرے کیوں کہ مجتہد نہ ہونے کے سبب اس کی حیثیت ایک عام آدمی کی سی ہے۔

یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ یہ حکم ایسے عام اور جاہل آدمی کے لیے ہے جو نصوص کے معانی اور ان کی تاویل سے واقف نہ ہو، لیکن جو عالم ہوگا وہ نصوص واخبار کو بھی پہنچانتا ہوگا اور اصول روایت سے بھی واقف ہوگا، اسے یہ بھی معلوم ہوگا کہ متعلقہ حدیث کی صحت، محدثین کے اقوال اور ان کی کتابوں سے ثابت ہے، اس بنیاد پر اس کے لیے اپنے امام کی رائے کو چھوڑ کر حدیث پر عمل کرنا جائز ہوگا۔

امام ابوحنیفہ، امام محمد اور امام شافعی رحمہم اللہ کے اقوال سے اسی موقف کی تائید ہوتی ہے۔

''روضة العلماء الزندویسیه فی فضل الصحابة''میں صاحب ہدایہ کا یہ قول بھی اسی کا موئید ہے، کہ امام ابوحنیفہؒ سے سوال کیا گیا کہ: جب آپ کا کوئی قول کتاب اللہ کے مخالف ہو تو کیا کیا جائے، فرمایا: اسے چھوڑ دو، پوچھا گیا'' جب آپ کا قول سنت رسول اللہ کے خلاف ہو؟ فرمایا: میرے قول کو چھوڑ دو اور حدیث پر عمل کرو، سوال ہوا اگر آپ کا قول، اقوال صحابہ کے خلاف ہو؟ فرمایا صحابی کے قول (یا فتوے) کو لے لو اور میرے قول کو چھوڑ دو''۔

''اقناع''میں ہے کہ بیہقیؒ نے اپنی سند سے ''السنن الکبریٰ''میں ''الکلام علی القراءۃ'' کے ذیل میں روایت کیا ہے کہ امام شافعیؒ نے فرمایا کہ: اگر میرے کسی قول یا فتوے کے خلاف کوئی حدیث مل جائے اور وہ حدیث علماء کے نزدیک پایۂ صحت کو پہنچتی ہو تو اس حدیث پر عمل کرنا اور میرے قول اور فتوے کو ترک کر دینا۔''

امام الحرمینؒ (۱۲) نے اپنی کتاب ''النہایہ''میں امام شافعیؒ سے نقل کیا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ: جب کوئی صحیح حدیث تمہیں میرے مسلک کے خلاف ملے تو اس کی پیروی کرو اور یہ سمجھو کہ وہی حدیث میرا مسلک ہے۔

یہ بات بھی وضاحت کے ساتھ ثابت ہے کہ امام شافعیؒ ہمیشہ یہ کہا کرتے کہ جو لوگ میرے فقہی مسلک کی پیروی کرنے والے ہیں ان کو جب بھی کوئی صحیح حدیث میرے مسلک کے خلاف ملے تو میرے مسلک کو ترک کر کے حدیث پر عمل شروع کر دیں اور یاد رکھو صحیح حدیث ہی میرا مسلک ہے۔

خطیبؒ (۱۳) اپنی سند سے بیان کرتے ہیں کہ دارکی الشافعیؒ (۱) سے لوگ فتویٰ لیتے، وہ بسا اوقات امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ دونوں کے مسلک کے خلاف فتویٰ دیتے، جب ان سے کہا جاتا کہ آپ کا فتویٰ تو ابوحنیفہؒ اور شافعیؒ دونوں اماموں کے مسلک کے خلاف ہے تو کہتے: تمہارا ستیاناس ہو میں نے جو فتویٰ دیا ہے یہ مجھ سے فلاں نے اور فلاں نے فلاں سے اور اس نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی طرح بیان کیا ہے، میں اس قول رسول ﷺ کے مطابق فتویٰ دے رہا ہوں جب ابوحنیفہؒ اور شافعیؒ دونوں کی آراء حدیث کے خلاف ہوں تو حدیث کو اختیار کرنا ان کے اقوال کو اختیار کرنے سے زیادہ بہتر ہے۔

روزہ میں پچھنے لگوانے والے کا مسئلہ ہے، اس کے بارے میں صاحب ہدایہ نے جو بات کہی ہے اس سے بھی اس موقف کی تائید ہوتی ہے جو ابھی امام الحرمینؒ اور خطیبؒ کے حوالہ سے بیان کیا گیا۔

مسئلہ یہ ہے کہ کسی شخص نے اس حال میں پچھنے لگوائے کہ اس کا روزہ تھا، اس نے یہ خیال کیا کہ پچھنے لگوانے سے روزہ ٹوٹ گیا اور اس خیال کی بنا پر اس نے عمداً کھا پی لیا، اس صورت میں اس شخص پر روزہ کی قضا بھی لازم ہوگی اور کفارہ بھی، کیونکہ اس نے جو خیال اور گمان کیا اس پر کوئی شرعی دلیل نہیں ہے، ہاں اگر کوئی فقیہ یا مفتی فتویٰ دے دے کہ تمہارا روزہ ٹوٹ گیا تو پھر عمداً کھانے پینے سے اس پر کفارہ لازم نہیں ہوگا۔

یا اس کے علم میں کوئی ایسی حدیث ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ پچھنے لگوانے سے

---

(۱) اس حوالہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ دارکی الشافعی مشہور فقیہ ہیں، مگر ان کے حالات زندگی دستیاب نہیں ہیں (قاسمی)

روزہ ٹوٹ جاتا ہے اور اس نے اس مفتی کے فتوے یا اس حدیث پر بھروسہ کیا اور یہ سمجھ کر کھا پی لیا کہ روزہ ٹوٹ چکا ہے، ایسی صورت میں امام محمدؒ بن حسن شیبانیؒ کی رائے ہے کہ اس پر کفارہ لازم نہیں ہوگا، امام محمدؒ کہتے ہیں کہ مفتی اور فقیہ کو فتوے کی بنا پر جب کفارہ ساقط ہو جاتا ہے تو حدیث کی صورت میں بدرجہ اولیٰ ساقط ہو جائے گا، کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول مبارک کسی مفتی اور فقیہ کے فتوے سے کہیں زیادہ معتبر و مستند ہے اور اس لائق ہے کہ اس پر عمل کو ترجیح دی جائے۔

''الکافی'' اور ''الحمیدی'' میں ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ قول رسول اللہ ﷺ قول مفتی سے کس طرح کم رتبہ ہو سکتا ہے، جب مفتی کا قول اور فتویٰ شرعی دلیل بننے کی صلاحیت رکھتا ہے تو قول رسول ﷺ بدرجہ اولیٰ شرعی دلیل کا درجہ پائے گا بلکہ قول رسول اللہ تو بلا شبہ اور بلا اختلاف شرعی دلیل ہے۔

امام ابو یوسفؒ سے جو رائے منقول ہے وہ اس رائے کے خلاف ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک عام آدمی پر (جو عالم نہ ہو) کسی فقیہ کی اقتداء لازم ہے، کیوں کہ علم نہ ہونے کی وجہ سے احادیث کو پہنچاننے کا اس کے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے اور اگر وہ حدیث کی اقسام اور معنی و مفہوم سے واقف ہے تو اس پر کفارہ واجب ہوگا اور ''منددی'' میں ہے کہ اس مسئلہ میں فقہاء کا اتفاق ہے۔

امام ابو یوسفؒ کے قول کا جواب کہ ''عام آدمی پر کسی فقیہ کی اقتداء واجب ہے'' یہ ہے کہ عام آدمی سے وہ شخص مراد ہے جو حدیث کے معنی و مفہوم سے بالکل ناواقف ہو۔ ان کے اپنے اس قول میں اس کی طرف واضح اشارہ موجود ہے، انھوں نے یہ وضاحت کی ہے کہ یہ حکم اس شخص کے لیے ہے جو حدیث اور معنی حدیث سے بالکل ناواقف ہو، نیز انھوں نے یہ بھی کہا کہ ''اگر عام آدمی کو بھی حدیث کے معنی کا علم ہو جائے تو اس صورت میں اس پر کفارہ واجب ہو جائے گا''۔

اس قید اور اضافے سے بھی یہ امر معین ہو گیا کہ عام آدمی سے غیر عالم مراد ہے۔

''حمیدی'' میں ہے کہ: عام آدمی سے مراد جاہل آدمی ہے جو کسی طرح کا علم نہ رکھتا ہو۔

ان اشارات نے یہ واضح کر دیا کہ امام ابو یوسفؒ کی مراد عام آدمی سے یہ ہے کہ وہ نص کی تاویل، مفہوم و معنی اور پس منظر سے بالکل ناواقف ہو۔

امام ابو حنیفہؒ، امام شافعیؒ اور امام محمدؒ کے اقوال سے کہنے والے کا یہ قول نامعتبر ہو گیا کہ نص کے خلاف کوئی روایت مل جائے تو اس پر عمل واجب ہے۔ (''خزانۃ الروایات'')

اس مسئلے میں ایک اور قول بھی ہے، وہ یہ کہ اگر عالم کے پاس اجتہاد کے وسائل نہ ہوں تو اس کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے فقہی مسلک کے خلاف کسی حدیث پر عمل کرے، اس لیے کہ وہ یہ نہیں جانتا کہ جس حدیث سے میں واقف ہوا ہوں وہ منسوخ ہے یا مؤول، اپنے ظاہری معنی پر محمول کی گئی ہے یا کسی دوسری حدیث کی توضیح و تشریح ہے۔

ابن حاجبؒ نے اپنی ''مختصر'' میں اسی قول کو ترجیح دی ہے اور ان کے پیروکار بھی اسی قول کی طرف مائل ہیں۔

لیکن ابن حاجبؒ کی اس رائے کو رد کیا گیا ہے کیونکہ ان احتمالات سے اگر عدم تیقن مراد ہے تو مجتہد کو کسی مرحلے پر قطعی اور کلی یقین حاصل نہیں ہوتا، بلکہ اکثر مواقع پر مجتہد اپنے اجتہاد کو ظن اور گمان پر مبنی سمجھتا ہے۔

اور اگر یہ مراد ہے کہ غالب رائے سے نہیں جانتا تو اس کو ہم ان صورتوں میں سے نہیں مانتے جو متنازعہ ہیں، کیونکہ جو شخص اپنے فقہی مسلک میں مہارت رکھتا ہو، وسیع تر مطالعہ ہو، بالخصوص حدیث اور فقہ کے ذخیرے پر اس کی گہری نظر ہو تو عموماً اسے ظن غالب حاصل ہو ہی جاتا ہے اور یہ بات اس کے علم میں آجاتی ہے کہ فلاں حدیث منسوخ نہیں ہے اور اس میں کسی طرح کی کوئی تاویل بھی نہیں کی گئی، وہ اپنے ظاہری مدلول پر قائم ہے اور یہاں بحث اسی شخص کے بارے میں ہے جسے ظن غالب حاصل ہو چکا ہو۔

اس معاملے میں پسندیدہ قول ایک تیسرا قول ہے، جسے ابن الصلاحؒ نے ترجیح دی ہے، نوویؒ نے بھی اسی قول کو اختیار کیا ہے، کہتے ہیں کہ:

''شافعی مسلک کے پیروکار کسی شخص کو اگر کوئی ایسی حدیث ملے جو اس کے مسلک کے خلاف ہو تو پھر اس شخص کے علمی رتبے اور مقام کو دیکھا جائے گا، اگر اس میں

اجتہاد مطلق کی استعداد ہے، یا جس مسئلہ میں اپنے مسلک کے خلاف حدیث ملی ہے اس میں اُسے شرائط اجتہاد حاصل ہوں، یعنی اس موضوع پر احادیث اور فقہاء کی آراء کا اتنا علم ہو کہ اس مسئلہ میں اجتہاد کر سکتا ہو، تو ایسی صورت میں خود اس کو اس حدیث پر عمل کرنے کی اجازت ہوگی اور اگر اس شخص میں اجتہاد کی شرائط نہیں پائی جاتیں اور پوری تحقیق وتفحص کے بعد یہ حدیث کی مخالفت سے ڈرتا ہے اور اپنے مسلک کی حمایت میں اس حدیث کا کوئی تسلی بخش جواب بھی اس کے ذہن میں نہیں آتا، اس صورت میں اگر اس بات کا علم اور ثبوت ہو جائے کہ کسی مجتہد نے اس حدیث پر عمل کیا ہے جس پر یہ مطلع ہوا ہے تو پھر اس کے لیے جائز ہوگا کہ یہ اپنے امام کے مسلک کو چھوڑ دے اور حدیث پر عمل کرے''۔

(۲) اگر متبحر فی المذہب کسی مسئلے میں اپنے امام کی رائے کو چھوڑ کر کسی دوسرے امام کی رائے کو اختیار کرنا اور اس پر عمل کرنا چاہے تو کیا وہ کر سکتا ہے؟

اس بارے میں بھی اہل علم وفضل کی آراء مختلف ہیں، غزالیؒ اور دوسرے بہت سے اہل علم نے اس سے منع کیا ہے۔

جمہور علماء کہتے ہیں کہ غزالیؒ اور ان کے ہم رائے اہل علم کا نقطۂ نظر بہت کمزور ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان پر مذہب کا دلیل کے ساتھ قبول کرنا واجب ہے اور جب دلیل نہ رہی تو مذہب کو قبول کرنے کا اختیار ختم ہو گیا۔

ہم نے اس کے امام کی افضلیت کے اعتقاد کو دلیل کے قائم مقام بنا دیا لہٰذا اب اس کے لیے جائز نہیں ہوگا کہ وہ اپنا مذہب چھوڑ کر کوئی دوسرا مذہب اختیار کرے۔

اپنے فقہی مذہب (مسلک) کو چھوڑنا اس کے لیے بالکل اس طرح ناجائز ہوگا جیسے کسی دلیل شرعی کی مخالفت جائز نہیں ہے۔

اس رائے اور موقف کو اس طرح رد کیا گیا کہ صحت تقلید کے لیے یہ ضروری نہیں کہ کوئی مقلد یہ اعتقاد رکھے کہ اس کا امام دوسرے تمام ائمہ مجتہدین سے افضل ہے، کیونکہ یہ حقیقت کسی سے پوشیدہ نہیں کہ تمام صحابہؓ اور تابعین یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ پورے طبقۂ صحابہؓ میں ابوبکر وعمر (رضی اللہ

عنہما) سب سے افضل ہیں، لیکن اس کے باوجود وہ بعض مسائل میں ان کی آراء پر بعض دوسرے صحابہؓ کی آراء کو ترجیح دیتے تھے، اور صحابہؓ اور تابعین کے اس عمل پر اہل علم میں سے کسی نے تنقید نہیں کی اور اس کو برا نہیں سمجھا اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ ہم نے جو موقف اختیار کیا وہ سب کے نزدیک پسندیدہ ہے اور اس پر اہل علم کا اتفاق ہے۔

رہا اس مسئلہ میں امام کے قول کا افضل ہونا تو مقلد محض کے لیے اس کی معرفت کی کوئی صورت نہیں اس لیے یہ ممکن نہیں کہ اس کو تقلید کی شرط قرار دیا جائے، اگر اس شرط کو درست قرار دیا جائے تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ عام مقلدین کی تقلید درست نہ ہو۔

اگر اس بات کو تسلیم کر لیا جائے کہ جو شخص جس امام کی پیروی کرتا ہے وہ اس کی دوسرے اماموں پر افضلیت کا بھی قائل ہو تو اس مسئلے میں یہ نظریہ خود ان کے خلاف پڑے گا، جو اس کے قائل ہیں، اور وہ اس طرح کہ جب وہ کسی مسئلے میں اپنے امام کے مسلک کے خلاف کوئی حدیث پاتا ہے یا کوئی قوی قیاس اس کے سامنے آتا ہے تو وہ اس وقت اس مسئلے میں اپنے امام کے علاوہ دوسرے امام کی افضلیت کا قائل ہوتا ہے۔

اکثر اہل علم اس کے جواز کے قائل ہوئے، ان میں آمدیؒ، ابن حاجبؒ، ابن ہمامؒ اور نوویؒ نمایاں اور قابل ذکر ہیں، ابن حجرؒ، رملیؒ اور مالکیؒ اور حنبلیؒ فقہاء میں بھی بہت سوں کی یہی رائے ہے۔

طوالت کے خوف سے ان کی تفصیل یہاں بیان نہیں کی، مسالک اربعہ کے متاخر مفتیوں کا اسی پر فتویٰ ہے، یہ جواز انھوں نے سلف کے کلام اور ان کے اقوال سے اخذ کیا ہے۔

بعض اہل علم نے یہ موقف اختیار کیا کہ کوئی شخص جس مسئلے میں اپنے امام کی رائے اور فتوے کی تقلید کر چکا ہو اس میں اپنے امام کی رائے اور فتوے سے رجوع نہ کرے، ابن ہمامؒ نے کہا کہ ''تقلید کر چکا ہو'' سے مراد یہ ہے کہ اس پر عمل کر چکا ہو۔

ابن ہمامؒ کی اس توضیح وتشریح کے بارے میں بعض شارحین نے اختلاف کیا کہ اس سے ان کی کیا مراد ہے؟ کسی نے کہا: اس کے معنی یہ ہیں کہ جس خاص عمل کو اپنے امام کی رائے اور فتوے کے مطابق انجام دے لیا ہو، اس میں رجوع نہ کرے۔ مثلاً جو نمازیں اپنے امام کے مسلک کے مطابق ادا کی تھیں ان کی قضا کرنے لگے (ان کو دوبارہ پڑھے) یہ قول زیادہ صحیح ہے اور غور وخوض

کے بعد اس سے بہتر کسی رائے کی نشاندہی نہیں ہوتی۔

بعض اہل علم نے ابن ہمامؒ کے قول کے یہ معنی بیان کیے کہ جس عمل کی جنس سے کوئی کام کر چکا ہو، اسی جنس کے کسی کام میں اپنے امام کے قول اور فتوے سے رجوع نہ کرے۔

اس قول کو رد کیا گیا کیوں کہ یہ قول اتفاقی نہیں ہے بلکہ اکثر سلف سے روایت کیا گیا کہ وہ جس فقہی مسلک پر پہلے عمل کر چکے تھے اس کے خلاف کیا۔

بعض نے کہا کہ جواز کی شرط یہ ہے کہ سہولتیں تلاش نہ کرے، کسی نے کہا کہ اس پر عمل کرے جو اسے آسان معلوم ہو۔

اس قول کو بایں طور رد کیا گیا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب دو باتوں کے درمیان اختیار دیا جاتا تو آپ ﷺ اس بات کو اختیار فرماتے جن میں آسانی ہوتی بشرطیکہ وہ گناہ نہ ہو۔

کسی نے رخصت سے یہ معنی مراد لیے کہ جس کو ثابت کرنے والی کوئی دلیل نہ ہو، بلکہ دلیل اس کے خلاف ہو، جیسے متعہ اور بیع صرف اور یہ بہت معقول وجہ ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ کی کتاب ''التخلیص فی تخریج احادیث الرافعی ''(باب النکاح) میں، میں نے دیکھا کہ وہ ''علوم الحدیث'' مصنفہ حاکمؒ سے اپنی سند کے ساتھ جو اوزاعیؒ تک متصل ہے، یہ بات نقل کرتے ہیں کہ:

> اہل حجاز اور اہل عراق کی پانچ باتوں سے بچنا بہت ضروری ہے، گانے بجانے کی محفلوں میں شریک ہونا، متعہ کرنا، عورتوں کے ساتھ دبر میں وطی کرنا، بیع صرف اور بلاضرورت جمع بین الصلوٰتین کرنا۔
>
> اہل عراق کا نبیذ پینا، نماز عصر میں اتنی تاخیر کہ ہر چیز کا سایہ اس کے چار مثل ہو جائے، صرف شہروں میں نماز جمعہ کا قائل ہونا، جہاد سے کنارہ کشی اختیار کرنا اور رمضان میں فجر کے بعد کھانا۔
>
> ابن حجرؒ کہتے ہیں کہ معمر کے حوالہ سے عبدالرزاقؒ کی روایت ہے کہ:
>
> ''اگر کسی نے غنا کے بارے میں اور عورتوں سے دبر میں وطی کرنے کے بارے میں اہل مدینہ، متعہ اور بیع صرف کے بارے میں اہل مکہ اور مسکر کے بارے میں اہل

کوفہ کا قول اختیار کیا تو سمجھ لو کہ وہ اللہ کا بدترین بندہ ہے۔‘‘

بعض اہل علم نے اپنے امام کے فقہی مسلک کو چھوڑ کر کسی دوسرے امام کا مسلک اختیار کرنے کی یہ شرط بیان کی کہ عمل کرنے والا دونوں مجتہدوں کے مسلک کے درمیان اس طرح کی تطبیق نہ کرے کہ مسئلہ کوئی ایسی صورت اختیار کرے جو دونوں اماموں کے نزدیک ناپسندیدہ اور ممنوع ہے۔

بعض اہل علم نے کہا کہ ایک ہی مسئلے میں ایسی صورت پیدا ہو جانا جو دونوں اماموں کے نزدیک ممنوع ہو ممکن نہیں ہے، جیسے کسی نے بلا ترتیب وضو کیا اور پھر جسم کے کسی حصہ سے بہنے والا خون نکل آیا۔

دو مسئلوں میں بھی اس طرح کی صورت پیدا ہو جانا ممکن نہیں ہے جیسے کسی نے شافعی مسلک کے مطابق ناپاک کپڑے کو پاک کیا اور پھر اسے پہن کر حنفی مسلک کے مطابق نماز ادا کی، اس صورت کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ اس میں غور وفکر کی ضرورت ہے کیونکہ اگر اس قید سے یہ مقصد ہے کہ عمل کرنے والے نے جو بھی کیا ہے وہ اتفاق ہے تو یہ صورت حال دونوں مسئلوں میں موجود ہے اور اگر مقصد یہ ہے کہ صرف یہ مسئلہ اجماع سے خارج نہ ہو تو اس سے بہتر شرط یہ ہے کہ وہ مسئلہ ایسا ہو جس میں اجتہاد کرنا درست اور ممکن ہو۔

کسی نے امام کے فقہی مسلک کو چھوڑ کر دوسرے امام کا مسلک اختیار کرنے کی یہ شرط رکھی کہ وہ مسئلہ ایسا نہ ہو جس میں قاضی کے فیصلے کے خلاف عمل کرنا لازم آتا ہو اور قاضی (عدالت) کا فیصلہ متاثر ہوتا ہو اور یہ شرط سب سے بہتر اور معقول نظر آتی ہے، اس شرط سے احتراز اس وقت ممکن ہے، جب معروف ومتداول چار فقہی مسالک میں سے کسی ایک کی تقلید کرے۔

کسی نے یہ شرط عائد کی کہ کسی شخص کو اپنے امام کا مسلک چھوڑ کر دوسرے امام کی تقلید اس صورت میں جائز ہے جب اسے دوسرے امام کی رائے پر شرح صدر اور اطمینان ہو جائے۔

مذکورہ بالا صورت میں محلِ نظر یہ بات ہوگی کہ شرح صدر ہر کس وناکس کا معتبر نہیں ہو سکتا، صرف اس شخص کے شرح صدر کا اعتبار کیا جائے گا جو فقہی مسالک پر وسیع نظر رکھتا ہو۔

بعض اہل علم نے یہ کہا کہ جو شخص مختلف ائمہ اور مجتہدین کے فتاوی اور آراء پر عمل کرتا ہے اور

ان میں بھی بالعموم قول مشہور کو اختیار کرتا ہے تو اس کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنے مخصوص امام کے مسلک کو چھوڑ کر کسی دوسرے مجتہد اور امام کے مسلک پر عمل کرے، لیکن جو شخص ہمیشہ ایک ہی امام کی تقلید کرتا ہے اور اس کے فرق مسالک کا بھی علم نہیں تو اس کے لیے ایک امام کے مسلک کو ترک کر کے دوسرے امام کے مسلک پر عمل کرنا جائز نہیں ہے۔

اوپر جو کچھ نقل کیا گیا وہ پوری تحقیق و تنقیح کے ساتھ ان تحریروں کا خلاصہ ہے جو اس موضوع پر اہل علم نے لکھیں۔

میں (ولی اللہ بن شاہ عبدالرحیمؒ) ایک فقہی مسلک کو چھوڑ کر دوسرے فقہی مسلک پر عمل کرنے کو اس شرط کے ساتھ مشروط کرتا ہوں کہ اس عمل سے عدالت کا فیصلہ متاثر نہ ہوتا ہو، اگر عدالت کا فیصلہ متاثر ہوتا ہو تو وہ دو ایسے معنی کے اجتماع سے ہوتا ہو جن میں سے ہر ایک معنی صحیح ہو، مثلاً گواہوں اور اعلان کے بغیر نکاح یا کسی اور وجہ سے۔ اس شرط کو اختیار کرنے یا پسند کرنے کی وجہ یہ ہے کہ:

''مضبوط اور معقول دلیل کی بنیاد پر اپنے مخصوص امام کی فقہی رائے اور فتوے کے خلاف کسی دوسرے امام کی فقہی رائے پر شرح صدر اور اعتماد ہونا''۔

جو نئی رائے اپنائی ہے اور دوسرے امام کا فقہی مسلک اختیار کیا ہے اس میں احتیاط کا پہلو زیادہ ہے۔

یا صورتِ حال یہ ہے کہ مخصوص امام کے مسلک میں کسی مسئلے میں سختی اور تنگی ہے اور اس طرح کے حالات درپیش ہیں کہ اس پر عمل کرنا دشواری کا سبب ہوگا تو دوسرے امام کی فقہی رائے کو اختیار کرنے سے اس سختی اور تنگی سے نجات ممکن ہے اور مخصوص امام کے مسلک پر عمل کرنے سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی کی بھی نفی ہوتی ہو کہ:

''میں تمہیں جب کسی بات کا حکم دوں تو اس کی اس حد تک تعمیل کرو جس حد تک تم سے ممکن ہو۔''

اس سارے معاملے میں بنیادی بات یہ ہے کہ ایک امام کی رائے کو چھوڑ کر دوسرے امام کی رائے کو اختیار کرنے میں احکام شریعت پر بہتر طریقہ سے عمل کرنا مقصود ہو نہ ذاتی خواہش کارفرما

ہو اور نہ عمل سے فرار کی نیت ہو۔

اس عمل میں یہ بات بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ ایسا کرنے سے کسی دوسرے کا حق پامال کرنا مقصود نہ ہو، مثلاً عدالت میں کوئی مقدمہ ہے، ایک فریق کا خیال ہے کہ میں اپنا قدیم فقہی مسلک چھوڑ کر اگر فلاں امام کا مسلک اپنالوں گا تو مقدمہ کا فیصلہ میرے حق میں ہو جائے گا اور فریق مخالف کو شکست ہو جائے گی، ایسی صورت میں مسلک کی تبدیلی جائز نہ ہو گی۔

''خزانۃ الروایات'' نے ''کشف القناع'' کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ:

''ایک شخص ایک مسئلے میں کسی فقیہ کی تقلید کرتا ہے تو کیا کسی دوسرے مسئلے میں وہ کسی دوسرے فقیہ کی تقلید کر سکتا ہے؟''

ایسی صورت میں معاملے کی دو شکلیں ہیں:

(۱) اس نے کسی معین اور مخصوص فقہی مسلک کا التزام نہ کیا ہو، جیسے امام ابوحنیفہؒ کا فقہی مسلک، امام مالکؒ کا فقہی مسلک یا امام شافعیؒ کا۔

(۲) یا ان مسلمہ فقہی مسالک میں سے کسی ایک فقہی مسلک کا التزام کیا ہو اور کہتا ہو کہ فلاں فقہی مسلک کا مقلد ہوں اور صرف اسی کی تقلید کرتا ہوں۔

پہلی صورت کے بارے میں ابن حاجبؒ کہتے ہیں کہ جس مسئلے میں کسی امام کی تقلید کر چکا ہے، اس مسئلے میں رجوع نہ کرے اور جس فقہی مسلک کے مطابق عمل کر چکا ہے اسے ترک کر کے کسی دوسرے فقیہ کی رائے پر عمل نہ کرے۔

دوسری صورت میں مختار اور راجح قول یہ ہے کہ رجوع کر سکتا ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اگر تم نہیں جانتے تو علم والوں سے پوچھ لیا کرو''۔ تو جس امام کی اولاً تقلید کی تو اس کی طرف وجوب رجوع کا قول، نص کو مقید کر دینا ہے اور یہ امر اصول کے مقررہ قانون کے مطابق نسخ کے قائم مقام ہے۔

نیز اس بنا پر بھی رجوع کر سکتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ

''میرے ساتھی ستاروں کی طرح ہیں، جس کی بھی پیروی کرو گے ہدایت پا جاؤ گے۔''

اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ اسلام کے ابتدائی دور میں (کم وبیش تیسری صدی ہجری کے اختتام تک) عوام اپنے مسائل میں یہ جانے بغیر علماء سے رجوع کرتے اور ان سے فتوے حاصل کرتے تھے کہ وہ حنفی ہیں، مالکی ہیں یا شافعی اور اس طریقہ اور عرف ورواج کو اہل علم میں سے کوئی برا نہیں سمجھتا تھا، اس طرز عمل کی حیثیت ایک امام کے فقہی مسلک سے رجوع کے جواز پر اجماع کی سی ہوگی، شرح ابن حاجبؒ میں اسی طرح بیان کیا گیا ہے۔

دوسری صورت جس میں اس نے کسی معین فقہی مسلک کا التزام کیا ہے، جیسے فقہ حنفی اور فقہ شافعی، اس میں ابن حاجبؒ نے اپنے فقہی مسلک کے اختلاف کے سبب، اختلاف کی طرف اشارہ کیا ہے، کہتے ہیں کہ

علماء کے اس بارے میں تین قول ہیں، اول یہ کہ کسی حال میں جائز نہیں، دوسرے بغیر کسی شرط کے جائز ہے، تیسرا قول یہ ہے کہ پہلی اور دوسری صورت میں حکم یکساں ہے، لہٰذا کسی ایک فقیہ کی کسی عمل میں تقلید کے بعد اس کے مسلک سے رجوع جائز نہیں ہوگا، بصورت دیگر جائز ہوگا۔''

''عمدۃ الاحکام'' میں ''فتاویٰ صوفیہ'' سے نقل کیا گیا ہے کہ ابن حاجبؒ سے عید الفطر کے روز بعض لوگوں نے سوال کیا کہ ہم بعض لوگوں کو مسجد میں زوال آفتاب کے وقت نفل نمازیں پڑھتے ہوئے دیکھتے ہیں، ہم انہیں روکتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ تین وقتوں میں نماز پڑھنا منع ہے اور ان میں سے ایک وقت زوال بھی ہے، وہ جواب میں ہم سے کہتے ہیں کہ نماز پڑھنے سے مت روکو، مبادا ایسا نہ ہو کہ اللہ کے اس فرمان میں داخل ہو جاؤ ''أرأیت الذی ینھی عبدا اذا صلی'' (کیا تم نے اس شخص کو دیکھا جو بندہ کو نماز پڑھنے سے روکتا ہے؟) پھر تمہارے لیے اس امر کا تعین اور یقین بھی مشکل ہے کہ یہی خاص وقت زوال ہے، زوال کا وقت اس سے کچھ مقدم بھی ہوسکتا ہے اور مؤخر بھی جب وہ نماز پڑھ رہا ہے۔

اور اگر مان بھی لیا جائے کہ وہی وقت زوال ہے تو امام ابو یوسفؒ کا قول ہے کہ زوال آفتاب کے وقت نفل نماز پڑھی جاسکتی ہے اس میں کراہت نہیں ہے۔

امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ عید الفطر کے دن کی تخصیص نہیں، کسی بھی دن زوال آفتاب کے وقت

نفل نماز پڑھنا مکروہ نہیں ہے۔

اگر تم زوال آفتاب کے وقت نماز پڑھنے والے پر اعتراض کرو گے تو تمہیں یہ جواب دے سکتا ہے کہ اس نے اس مسئلے میں اس فقیہ کی تقلید کی ہے جو اس کے جواز کا قائل ہے، یا اس فقیہ و مجتہد کی دلیل تمہارے سامنے پیش کر دے جو زوال آفتاب کے وقت نماز پڑھنے کو جائز سمجھتا ہے اور تمہیں اس بات کا کوئی اختیار نہیں کہ کسی مجتہد کے مقلد پر یا ایسے شخص پر اعتراض کرو جو اپنے عمل کے لیے کوئی دلیل رکھتا ہے۔

''عمدة الاحکام'' ہی میں ''التجنیس'' اور ''المزید'' کے حوالہ سے یہ بات نقل کی گئی ہے کہ بسا اوقات عید الفطر کے دن زوال آفتاب کے وقت نفل نماز ادا کرنے والا اس امام کی تقلید کرتا ہے تو جو اس کے جواز کا قائل ہے، تو ایسے شخص پر کوئی اعتراض نہ کیا جائے جو کسی مجتہد کے فعل یا قول کی تقلید کرتا ہے۔

''فتاوی ظہیریہ'' میں ہے:

جو شخص ایسا کام کرے جس میں اجتہاد کیا جا سکتا ہو یا ایسے کام میں کسی مجتہد کی تقلید کرے تو یہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں اور نہ ہی اس میں قباحت کا کوئی پہلو ہے۔

قاضی بیضاویؒ کی ''منہاج الاصول'' میں ہے کہ:

''اگر شوہر نے طلاق دیتے وقت اس لفظ کو جس کے ذریعہ طلاق دی ہے، کنایہ خیال کیا اور بیوی نے صریح لفظ سمجھا تو شوہر کو مطالبہ صحبت کا اور بیوی کو اس سے باز رہنے کا حق حاصل ہوگا، ایسی صورت میں یہ دونوں کسی دوسرے سے مسئلہ پوچھیں''۔

کتاب ''الانوار'' کی دو متضاد عبارتوں کا سمجھنا ایک شافعی المسلک شخص کے لیے بہت دشوار ہوا ہے، ان دونوں عبارتوں کے درمیان تطبیق اس کے لیے ممکن نہ ہوئی تو اس نے مجھ (ولی اللہ دہلویؒ) سے پوچھا، میں نے اسے اس انداز سے جواب دیا کہ اس کا اشکال دور ہو گیا۔

کتاب الانوار کی ایک عبارت کا خلاصہ اور ماحصل تو یہ ہے، اور یہ عبارت ''کتاب القضاء'' میں ہے۔

''جب چار فقہی مسلک (حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی) مدون و رائج ہو گئے تو ان میں

سے کسی ایک مسلک کی پیروی کرنے والے کے لیے جائز ہو گیا کہ وہ کسی ایک مسئلے میں ایک امام و مجتہد کی رائے اور مسلک کو چھوڑ کر دوسرے امام کو اختیار کرے اور اس پر عمل کرے۔"

اسی طرح ایک شخص کا عمل یہ ہے کہ وہ بعض مسائل میں ایک امام کی پیروی کرتا ہے اور بعض مسائل میں کسی دوسرے امام کی، یہاں تک کہ اس نے یہ طریق عمل اپنا لیا کہ جس مسئلے میں وہ جس فقہی مسلک میں سہولت اور آسانی دیکھتا ہے، اسے اپنا لیتا ہے، مثلاً ایک شخص حنفی مسلک کا مقلد ہے، اسے فصد کھلوانے کی ضرورت پڑتی ہے اس وقت وہ شافعی مسلک کو اختیار کر لیتا ہے، کیوں کہ حنفی مسلک میں فصد کھلوانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے اور شافعی مسلک کی رو سے وضو باقی رہتا ہے، وہ اس سہولت کو حاصل کرنے کی خاطر حنفی مسلک کو چھوڑ کر شافعی مسلک اختیار کر لیتا ہے کہ از سرِ نو وضو کرنے سے بچ جائے گا۔

یا ایک شافعی المسلک ہے، اس نے اپنی شرمگاہ کو یا عورت کو ہاتھ لگایا اور حنفی مسلک کو اختیار کر لیا تا کہ وضو قائم رہے، اس لیے کہ حنفی مسلک میں شرم گاہ کو یا عورت کو ہاتھ لگانے سے وضو نہیں ٹوٹتا جب کہ شافعی مسلک میں ان دونوں میں وضو ختم ہو جاتا ہے۔ تو "الانوار" کتاب القضاء میں ہے کہ ایسا کرنا جائز ہے۔"

لیکن اسی کتاب کے باب الاحتساب میں ہے کہ:

"اگر ایک شافعی المسلک شخص نے کسی شافعی کو دیکھا کہ وہ نبیذ پیتا ہے یا کسی شافعی کو دیکھا کہ اس نے ولی کی اجازت کے بغیر کسی لڑکی سے نکاح کر لیا اور اس نے ازدواجی تعلق بھی قائم کر لیا تو اس شافعی المسلک کو یہ حق ہے کہ ایسا کرنے والے شافعی پر اعتراض کرے، اس لیے کہ ہر مقلد کے لیے ضروری ہے کہ وہ اسی امام کی پیروی کرے جس کا وہ مقلد ہے، اس کے لیے یہ جائز نہیں کہ اپنے امام کے مسلک کو چھوڑ کر دوسرے کسی امام کے مسلک پر عمل کرے، اگر ایسا کرے گا تو گنا ہگار ہو گا۔"

اور اگر کسی شافعی نے حنفی کو دیکھا کہ وہ گدھے کو یا ایسے جانور کو کھا رہا ہے جس کو اللہ تعالیٰ کا نام لے کر ذبح نہیں کیا گیا تو وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ:

''یا تو اس بات کا اعتقاد رکھو کہ شافعی، تقلید اور اتباع کے زیادہ لائق ہیں یا ان کی تقلید چھوڑ دو۔''

صاحب ''الانوار'' کا یہ قول کتاب الاحتساب میں ہے اور جو دو اقوال نقل کیے گئے ان میں آپس میں اختلاف ہے۔

اللہ تعالیٰ کا علم سب کو محیط ہے، کوئی اس سے زیادہ جاننے والا نہیں، میں (ولی اللہ بن عبدالرحیم دہلویؒ) اپنے محدود علم کی بنا پر کہتا ہوں کہ اس اختلاف کے حل کی صورت یہ ہے کہ الانوار کے ان الفاظ کے معنی کہ ''مخالفت سے گناہگار رہوگا'' یہ ہیں کہ جب وہ تمام مسائل میں، یا صرف ایک مسئلے میں اس کی تقلید کا پختہ ارادہ کر چکا ہو، پھر اس کی مخالفت شروع کر دے تو بلاشبہ یہ معصیت ہوگی اور ایسا کرنے والا گناہگار رہوگا لیکن جب اس مسئلے میں کسی دوسرے امام کی تقلید کی تو یہ اسی کا مقلد ہوگا اور اس کی مخالفت نہیں کر سکتا۔

یا اس بارے میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ مسئلہ دوم امام غزالی اور بعض دوسرے اہل علم کے قول پر مبنی ہے اور مسئلہ اول کی بنا جمہور علماء کی آراء پر ہے۔

اس مسئلے پر خوب غور وخوض کیجیے، اس کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیجیے اور پھر کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کیجیے، کیوں کہ اکثر اہل علم پر اس اختلاف کا حل بہت دشوار گزار رہا ہے اور مختلف آراء کے درمیان تطبیق میں مشکل کا سامنا ہوا ہے۔

(۴) یہ بات اپنے فکر و ذہن میں اچھی طرح جما لیجیے کہ کسی مجتہد کی تقلید کرنے کی دو صورتیں اور قسمیں ہیں۔ (۱) واجب۔ (۲) حرام۔

تقلید واجب

جو دا صحیح طور پر حدیث سے ثابت ہو، اس کی تفصیل یہ ہے کہ جو شخص قرآن، سنت اور فقہ کا علم نہیں رکھتا، اس میں اس بات کی قطعاً کوئی اہلیت وصلاحیت نہیں کہ وہ مسائل کا حل قرآن وسنت سے معلوم کرے، فقہاء کی آراء، فتاویٰ اور ان کے مسالک کو سمجھے، اس کے لیے واجب ہوگا کہ جب بھی اسے کوئی معاملہ درپیش ہو تو ہو کسی فقیہ، مفتی، یا عالم سے پوچھے کہ اس کا قرآن وسنت کی رو سے کیا حل ہے اور کیا حکم ہے؟ وہ اس کا جو حکم بتائے اس پر عمل کرے، وہ حکم خواہ صریح نص سے

مستنبط ہو یا کسی نص پر قیاس کیا گیا ہو، ان میں سے جو بھی صورت ہوگی وہ حکم بہر صورت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی حدیث پر مبنی ہوگا اور جو حکم حدیث رسول ﷺ پر مبنی ہوگا اس کی صحت پر پوری امت مسلمہ کا اتفاق ہے، اس بارے میں مسلم علماء کی کبھی دو رائیں نہیں ہوئیں۔

اس تقلید کی بنیاد اس بات پر ہوگی کہ فقیہ اور مفتی کا قول یا فتویٰ، سنت رسول کے مطابق ہے، وہ اپنی قدرت اور صلاحیت کی حد تک سنت کا متلاشی رہے گا، جب بھی اس کے علم میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ایسا قول یا عمل آئے گا جو فقیہ اور مفتی کے قول اور فتوے کے خلاف ہو تو وہ اس فقیہ اور مفتی کے قول اور فتوے کو چھوڑ دے گا اور حدیث رسول ﷺ پر عمل کرے گا، تمام فقہاء اور مجتہدین نے یہی بات کی ہے۔

امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ:

> ''کسی شخص پر جب یہ بات واضح ہو جائے کہ میری اجتہادی رائے حدیث رسول ﷺ کے خلاف ہے تو میری رائے کو دیوار پر پھینک مارو اور حدیث پر عمل کرو۔''

امام مالکؒ بن انس کا قول ہے کہ:

> رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث اور سنت کے علاوہ ہر چیز کو رد کیا جا سکتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کے علاوہ کوئی ایسا کلام نہیں، جس کے ترک کرنے پر مواخذہ کیا جا سکے۔

امام ابوحنیفہؒ نے بھی وہی کہا جو شافعیؒ اور مالکؒ نے کہا اور ان سے آگے بڑھ کر یہ بھی کہا کہ:

> ''جو شخص میری اجتہادی رائے کی دلیل سے واقف نہیں ہے اس کے لیے جائز نہیں ہے کہ میرے اقوال اور اجتہادی آراء کی بنیاد پر فتویٰ دے۔''

امام احمد بن حنبلؒ نے کہا:

> نہ میری تقلید کرو نہ مالکؒ کی نہ کسی اور کی، اپنے مسائل کا حکم قرآن اور سنت رسول ﷺ سے تلاش کرو، ان حضرات نے بھی مسائل کے احکام قرآن وسنت ہی سے اخذ کیے ہیں۔''

تقلید حرام

اس صورت میں تقلید حرام ہو جاتی ہے جب اس امام اور فقیہ کے بارے میں جس کا وہ مقلد ہے، یہ گمان کرے کہ وہ اس رتبے پر فائز ہے کہ اس سے غلطی سرزد نہیں ہو سکتی حتیٰ کہ اگر اس کے قول اور فتوے کے خلاف کوئی صحیح حدیث بھی ملے تو وہ اس کے اندر تاویل کرے اور اس فقیہ کے قول اور فتوے کو نہ چھوڑے، یا یہ سمجھے کہ جب میں نے اس فقیہ کی تقلید کر لی تو اللہ تعالیٰ نے مجھے اس کے اقوال وفتاویٰ کی پیروی کا مکلّف بنا دیا ہے، میرے لیے اب اسی کی پیروی ضروری ہے، یہ شخص اس بے وقوف کی طرح ہے جس کو تصرفات اور لین دین سے روک دیا جائے۔

ایسے شخص کا حال یہ ہوتا ہے کہ اسے جب کوئی حدیث ملتی ہے اور اسے یہ بھی یقین ہو جاتا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے، تب بھی وہ اس پر عمل کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتا اور مخصوص امام کی تقلید پر ہی جما رہتا ہے۔

ایسا عقیدہ اور عمل فاسد ہے، اس پر کوئی عقلی اور نقلی دلیل موجود نہیں ہے، اسلام کے ابتدائی دور میں کسی نے اس طرح کا طرزِ عمل اختیار نہیں کیا، جو شخص حقیقت میں معصوم نہیں ہے اور اس سے کسی وقت بھی غلطی کا صدور ہو سکتا ہے، اس کے بارے میں یہ عقیدہ رکھ کر کہ یہ غلطی نہیں کر سکتا، یہ شخص خود بہت بڑی غلطی کا مرتکب ہوا ہے اور یہ سمجھ کر بھی اس نے ٹھوکر کھائی کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اس بات کا پابند کر دیا ہے کہ یہ اس مخصوص امام کی پیروی کرے، اسی طرح کی تقلید کرنے والوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وَاِنَّا عَلٰٓی اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ (ہم انہی کے آثارِ قدم پر چلنے کے پابند ہیں)۔ پچھلی امتوں کی تحریفات بھی اسی قسم کی تھیں۔

(۵) اس بارے میں علماء کا اختلاف ہے کہ کیا نادر اور متروک اقوال وروایات پر فتویٰ دیا جا سکتا ہے؟

''خزانۃ الروایات'' میں ''سراجیہ'' سے ایک رائے یہ نقل کی گئی کہ:

''فتویٰ دینے میں امام ابوحنیفہؒ کی رائے اور قول کو دوسرے حنفی فقہاء کے اقوال پر ترجیح دی جائے گی، اس کے بعد ابو یوسفؒ کے قول پر، پھر محمد بن حسن شیبانیؒ کے قول پر، پھر زفر بن ہذیلؒ کے قول پر اور سب سے مؤخر حسن بن زیادؒ کے قول کو رکھا

جائے گا۔"

بعض علماء نے کہا کہ اگر کسی مسئلہ میں ابوحنیفہؒ کی رائے ایک طرف ہو اور صاحبین (ابویوسفؒ، محمد بن حسن شیبانیؒ) کی دوسری طرف، تو مفتی اگر مجتہد ہے تو اسے اختیار ہے کہ ابوحنیفہؒ کے قول پر فتویٰ دے یا صاحبین کے قول پر، لیکن اگر مفتی مجتہد نہیں ہے تو پھر اس کو قول اول کو اختیار کرنا چاہیے کیونکہ امام ابوحنیفہؒ اپنے دور کے سب سے بڑے عالم اور سب سے بڑے مجتہد تھے، ان کے بارے میں امام شافعیؒ کا قول ہے کہ:

"فقہ میں تمام لوگ امام ابوحنیفہؒ کا کنبہ اور تربیت یافتہ ہیں"۔

(اس لیے ان کے اقوال کی پیروی مقدم ہے)۔

بعض علماء نے یہ بھی کہا کہ اگر کسی مسئلہ میں امام ابوحنیفہؒ ایک طرف ہوں اور ابویوسفؒ اور محمد بن حسنؒ ایک طرف تو مفتی کو اختیار ہے، چاہے وہ ابوحنیفہؒ کے قول کو ترجیح دے لے اور چاہے صاحبینؒ کے قول کو، اگر صاحبینؒ میں سے ایک امام ابوحنیفہؒ کی رائے سے متفق ہو تو پھر ضروری ہے کہ ابوحنیفہؒ کی رائے کو اختیار کیا جائے اور اسی کے مطابق فتویٰ دیا جائے۔

مشائخ نے اگر ان فقہاء میں سے کسی ایک کا قول اختیار کرنے اور اس پر فتویٰ دینے پر اتفاق کرلیا ہو تو پھر اسی کا قول اختیار کیا جائے گا، اسی پر فتویٰ ہوگا اور اسی کی تقلید کی جائے گی، جیسا کہ ابواللیث فقیہؒ نے اس بارے میں کہ مریض اگر بیٹھ کر نماز پڑھ رہا ہے تو کیسے بیٹھے؟ امام زفر بن ہذیلؒ کا قول اختیار کیا ہے، امام زفرؒ کہتے ہیں کہ مریض نماز میں اسی طرح بیٹھے گا جس طرح عام نمازی تشہد میں (یعنی قعدہ میں) بیٹھتا ہے، کیوں کہ مریض کے لیے اس طرح بیٹھنا نسبتاً آسان ہے، اگرچہ علماء احناف کا قول یہ ہے کہ مریض حالت قیام میں متربعاً یا محتبیاً بیٹھے گا تاکہ اس قعدہ میں اور اس قعدہ میں فرق ہوجائے جو قیام کے حکم میں ہے لیکن اس طرح مریض پر دشوار ہے کیوں کہ اسے اس طرح بیٹھنے کی عادت نہیں ہے۔

اسی طرح جس نے عدالت یا حاکم کی اجازت کے بغیر کسی کی چغلی کھائی ہو، امام زفرؒ نے اس چغل خور کو چغلی کا دروازہ بند کرنے کے لیے ضامن ٹھہرایا ہے، اگرچہ ہمارے اصحاب کا قول ضمان کے عدم وجوب کا ہے، اس لیے کہ اس نے کوئی مال ضائع نہیں کیا اور مشائخ کے لیے جائز ہے کہ وہ

مصلحت زمانہ پر عمل کرتے ہوئے ہمارے ائمہ میں سے کسی ایک کا قول اختیار کر لیں۔

قنیہ، باب ما یتعلق بالمفتی من النوادر. میں مذکور ہے کہ قضاء سے متعلق فتویٰ ابو یوسفؒ کے قول پر ہے کیوں کہ ان کو قضاء کا زیادہ تجربہ تھا۔

مضمرات میں ہے:

''مفتی کے لیے جائز نہیں کہ کسی منفعت کے لیے متروک اقوال پر فتویٰ دے، کیوں کہ اس کا نقصان دنیا و آخرت میں پورا پورا اور عام ہے، بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ مشائخ کے اقوال اختیار کرے، سلف کی سیرت پر چلے اور اسی فضیلت و شرف کے حصول کی کوشش کرے۔''

قنیہ، کتاب ادب القاضی باب مسائل متفرقہ میں یہ مسئلہ مذکور ہے، قضاء سے متعلق مسائل میں فتویٰ ابو یوسفؒ کے قول پر ہے کیونکہ انہیں تجربہ سے زیادتی علم حاصل ہوگئی تھی اور عمدۃ الاحکام میں کشف بزودی سے منقول ہے، ''مفتی کے لیے رخصتوں کا اختیار کرنا مستحب ہے تاکہ عوام پر آسانی ہو، مثلاً حمام کے پانی سے وضو کرنا، پاک جگہ بغیر جائے نماز کے نماز پڑھنا اور سڑکوں کی وہ کیچڑ جن کی طہارت کا فتویٰ ہو چکا ہو، اس سے بچنا، اہل عزیمت کو یہ خصلتیں نامناسب ہیں، ان کے لیے احتیاط اور عزیمت پر ہی عمل بہتر ہے'' اور قنیہ میں ہے ''مفتی کے لیے مناسب ہے کہ لوگوں کو آسان ترین فتویٰ دے'' جیسے بزودی نے شرح جامع صغیر میں ذکر کیا ہے، ''مفتی کے لیے مناسب ہے کہ دوسروں کے حق میں آسان بات کو اختیار کرے خصوصاً ضعیف اور کمزور لوگوں کے حق میں، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوموسیٰ اشعریؓ اور معاذؓ کو جب یمن بھیجا تھا تو فرمایا: ''لوگوں کے لیے آسانیاں پیدا کرنا، انہیں مشکلات میں نہ ڈالنا، ان سے اچھی اچھی باتیں کرنا، انہیں دین سے بیزار نہ کر دینا۔'' اور عمدۃ الاحکام، کتاب الکراھیۃ میں ہے کہ کتے اور خنزیر کا جھوٹا نجس ہے، امام مالکؒ وغیرہ کا اس سے اختلاف ہے اگر کسی نے قول مالکؒ پر فتویٰ دیا تو جائز ہے۔

قنیہ میں ہے ایک فقیہ سعید بن مسیبؒ (۱۴) کے مذہب پر فتویٰ دیتا ہے اور مطلقہ ثلث کا نکاح شوہر اول سے کرتا ہے تو عورت مطلقہ ثلث رہے گی اور فقیہ کو سزا دی جائے گی، اور ایک فقیہ تین طلاق میں حیلہ کرتا ہے اور اس بہانے رشوت لیتا ہے اور شوہر ثانی سے عورت کے جنسی تعلقات قائم ہوئے بغیر عورت کا شوہر اول سے نکاح کر دیتا ہے، کیا نکاح صحیح ہے اور ایسا کرنے

والے کی کیا سزا ہے؟ بعض علماء نے کہا کہ منھ کالا کر کے نکال دیا جائے، فتاویٰ اعتمادیہ میں فتاویٰ سمرقندیہ سے نقل ہے کہ سعید المسیبؒ نے اپنے اس قول سے رجوع فرمالیا تھا۔ کہ حلالہ میں دخولِ محلل یعنی عورت کے لیے شوہر ثانی سے جنسی تعلق ضروری نہیں، اب اگر کوئی قاضی ان کے اس قول پر فیصلہ کرے تو اس کا فیصلہ نافذ نہیں ہوگا اور اگر فقیہ اس کا حکم کرے، صحیح نہیں اور فقیہ کو سزا دی جائے گی۔

اور تحفۃ شرح المنہاج میں ہے کہ:

> عراقی نے اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ اگر مقلد کو اپنے امام کے دو اقوال میں ترجیح نہ معلوم ہو تو جس کو چاہے اختیار کرے، دونوں اقوال کو جمع نہیں کرسکتا، شاید اجماع سے اس نے اپنے مذہب کا اجماع مراد لیا، کیونکہ ہمارے مذہب کا مقتضی سبکیؒ کے قول کے مطابق قضاء اور افتاء میں اس کی ممانعت ہے، ہاں از خود عمل میں یہ ممنوع نہیں اور اسی سے ماوردیؒ کے قول سے بھی مطابقت ہوتی ہے، اور غزالیؒ نے بھی ماوردیؒ کی تائید کی ہے۔
>
> اور امام کا قول اس شکل میں ممانعت کا ہے، جب دونوں قول دو متضاد حکموں کے بارے میں ہوں جیسے ایجاب اور تحریم، بخلاف کفارہ کی رخصتوں کے اور سبکیؒ نے اختیار قول میں اپنے حق میں عمل کرنے کے جواز کو اس مجتہد کے لیے جاری کیا ہے جس کی تقلید درست ہو اور تمام شرائط اجتہاد اس میں مکمل ہوں اور لوگوں نے بھی سبکیؒ کی پیروی کی ہے، یعنی ان اعمال میں جن پر سنت کے مطابق عمل ہو اور ابن صلاحؒ کا یہ قول کہ ائمہ اربعہ کے علاوہ کسی کی تقلید جائز نہیں، اسی پر محمول ہے کہ قضاء وفتویٰ میں جائز نہیں اور اس کا اور دوسری تقلید کی صورتوں کا محل اس وقت تک ہے جب تک رخصتیں نہ تلاش کرے۔
>
> ماوردیؒ کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک جائز نہیں، مثلاً جس کے اجتہاد میں دونوں سمت برابر ہوں تو اسے جائز ہے کہ جس سمت چاہے نماز پڑھ لے کہ تقلید کا پھندا اس کی گردن سے نکل جائے ورنہ اس سے گناہگار ہوگا، بلکہ بعض علماء نے تو کہا کہ فاسق

ہو جائے گا، بعض علماء نے کہا کہ اگر یہ اس صورت میں ہے کہ جب وہ مدونہ فقہی مذاہب میں رخصتیں تلاش کرے۔ گر مدونہ فقہی مذاہب کو چھوڑ کر متروک یا شاذ آراء کو اختیار کرتا ہے تو یقیناً فاسق ہو جائے گا۔

عام آدمی کا مسلک؟

یہ بات اپنے احاطۂ علمی میں لے آیئے کہ عام آدمی کا کوئی فقہی مسلک معین نہیں ہوتا، اس کا مذہب صرف مفتی کا فتویٰ ہے، بحرالرائق میں ہے کہ اگر کسی نے پچھنے لگوائے یا غیبت کی اور یہ گمان کیا کہ اس کا روزہ ٹوٹ گیا ہے، کھالیا، تو اگر کسی فقیہ سے فتویٰ نہیں لیا اور نہ اس کے پاس کوئی حدیث ہے تو اس پر کفارہ واجب ہے، کیونکہ یہ محض جہالت کی وجہ سے ہوا اور جہالت دارالاسلام میں عذر نہیں اور اگر کسی فقیہ سے فتویٰ لیا اور اس نے فتویٰ دے دیا کہ اس پر کفارہ واجب نہیں ہے کیونکہ عام آدمی جب کسی عالم کے فتوے پر اعتماد کرے، اگر وہ عالم اپنے فتویٰ میں غلطی پر ہی کیوں نہ ہو تب بھی اس کی تقلید واجب ہے، اس شکل میں یہ اپنے فعل میں معذور ہے اور اگر اس نے فتویٰ تو نہیں لیا مگر اس کے پاس حدیث موجود ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''پچھنے لگانے والے اور لگوانے والے دونوں کا روزہ ٹوٹ گیا'' اور فرمایا: ''غیبت سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے'' اور اس عامی کو نسخ یا تاویل معلوم نہیں، تو امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک اس پر کفارہ واجب نہیں، اس وجہ سے کہ ظاہر حدیث پر عمل واجب ہے، ابو یوسفؒ اس میں مختلف ہیں کیونکہ عامی کو عمل بالحدیث نازیبا ہے کیونکہ اسے ناسخ و منسوخ کا کوئی علم نہیں۔

اور اگر روزہ دار نے شہوت سے عورت کو ہاتھ لگایا، بوسہ لیا، یا سرمہ لگایا اور خیال کیا کہ ان کاموں سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے، روزہ توڑ دیا، تو اس پر کفارہ واجب ہے لیکن اگر اس نے کسی فقیہ سے معلوم کیا اس نے روزہ ٹوٹ جانے کا فتویٰ دیا یا اس بارے میں اسے کوئی حدیث ملی تو کفارہ واجب نہیں اور اگر زوال سے پہلے روزہ کی نیت کی پھر افطار کر لیا تو ابوحنیفہؒ کے نزدیک واجب نہیں، امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کی رائے ان سے مختلف ہے۔

بحرالمحیط نے اسی طرح نقل کیا ہے۔

ان تفصیلات اور فقہاء کی آراء سے یہ ثابت ہوا کہ عام آدمی کا مذہب، مفتی کا فتویٰ ہے کیونکہ

وہ احکام ومسائل سے کلی طور پر ناواقف ہے۔

بحرالرائق ، قضاالفوائت میں مصنف کے اس قول کے تحت (۱۵) ویسقط بضیق الوقت والنسیان ، مذکور ہے مقلد عامی ہے اور اس کا کوئی مذہب معین نہیں تو اس کا مذہب مفتی کا فتویٰ ہے، جیسا کہ علماء نے اس کی تصریح کی ہے، اگر اس نے فتویٰ حنفی سے لیا تو عصر ومغرب کا اعادہ کرے گا اور اگر شافعیؒ سے فتویٰ لیا تو اعادہ نہیں کرے گا، اس کی رائے کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا اور اگر کسی سے فتویٰ نہیں لیا گیا لیکن کسی مجتہد کے مذہب کے مطابق نماز ہوگئی تو یہ نماز صحیح ہے اور اعادہ واجب نہیں۔

شرح منہاج البیضاوی مصنفہ ابن امام الکاملیہؒ میں ہے:

''ایک عامی کو کوئی واقعہ پیش آیا اور اس نے کسی مجتہد سے فتویٰ لے کر اس پر عمل کیا تو اس کو بالاجماع اس واقعہ میں دوسرے کے فتویٰ کی طرف رجوع جائز نہیں۔''

جیسے کہ ابن الحاجبؒ وغیرہ نے نقل کیا اور جمع الجوامع میں اس بارے میں خلاف ہے اور اگر عمل سے پہلے رجوع کرنا چاہے تو نوویؒ کہتے ہیں کہ مختار وہ شکل ہے جو خطیبؒ وغیرہ نے نقل کی ہے کہ اگر وہ دوسرا مفتی بھی موجود ہے تو صرف اسی کے فتویٰ سے لازم نہ ہوگا، کیونکہ اسے اجازت ہے کہ وہ دوسرے سے دریافت کرے اور اس شکل میں کبھی وہ اس کی مخالفت کرے گا تو اس حکم میں اختلاف دو مفتیوں کے اختلاف کی وجہ سے پیدا ہوا لیکن جب اسے اور کوئی واقعہ پیش آئے تو اسے جائز ہے کہ اس کو چھوڑ کر جس سے پہلے واقعہ میں فتویٰ لیا تھا کسی دوسرے سے لے لے اور کرابسیؒ قطعی طور پر کہتے ہیں کہ اس پر واجب ہونا پسند کیا ہے، لیکن التزام صرف خواہشات کے لیے نہیں بلکہ ایک مذہب کی تقلید کر کے اسے ہر چیز میں راجح یا دوسرے کا مساوی اعتقاد رکھے مرجوح نہیں۔

نوویؒ نے فرمایا کہ دلیل کا مقتضی یہ ہے کہ کسی مذہب کا التزام نہ کرے بلکہ جس سے چاہے بغیر رخصتوں کو تلاش کیے فتویٰ دریافت کرے، شاید جس نے اس سے منع کیا ہے اس نے عامی کی رخصت نہ تلاش کرنے پر اعتماد نہیں کیا اور جب اس نے کسی مذہب معین کا التزام کر لیا تو صحیح تر یہی ہے کہ اس سے خروج جائز ہے اور کتاب زید بن رسلان میں یہ دو شعر مذکور ہیں۔

والشافعیؒ ومالکؒ ونعمانؒ   واحمد بن حنبلؒ وسفیانؒ

وغیرھم من سائر الائمة   علی ھدی والاختلاف رحمة

جن کا ترجمہ یہ ہے کہ ابوحنیفہؒ اور مالکؒ، شافعیؒ، احمد بن حنبلؒ اور سفیانؒ بھی اور ائمہ، حق پر ہیں تمام، اختلاف ان کا ہے رحمت والسلام، شرح غایۃ البیان میں ہے اگر برابر درجہ کے دو مجتہدین کا قول مختلف ہو تو صحیح تر قول یہی ہے کہ مقلد کو دونوں میں اختیار ہے جس کو چاہے لے اس مسئلہ میں تحفہ کی عبارت گزر چکی۔

باب (۴)

حواشی وحوالہ جات

۱) ''المؤطا'' احادیث صحیحہ کے اولین مجموعوں میں سے ایک مجموعہ جو تسلسل کے ساتھ امت مسلمہ کے ہاتھوں میں موجود ہے، امام مالک بن انسؒ (۹۳۔۱۷۹ھ) نے مرتب کیا، امام شافعیؒ نے اس کے بارے میں کہا:

''کتاب اللہ کے بعد دنیا کی صحیح تر کتاب''۔

عقدالجید کے مصنف شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے مؤطا کی دو شرحیں لکھیں۔

''المسوی'' عربی زبان میں اور ''المصفی'' فارسی میں۔

شروح، حواشی اور تراجم وتعلیقات کی صورت میں مؤطا پر علمی کام کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔ امام مالکؒ کو مجتہد مطلق کا درجہ بھی حاصل ہے۔

صحیح بخاری، امام محمد بن اسمٰعیل بخاریؒ (۱۹۴۔۲۵۶ھ) نے احادیث صحیحہ کا ایک مجموعہ مرتب کیا'' جو الجامع الصحیح'' کے نام سے مشہور ہوا، صحاح ستہ (یعنی حدیث کے چھ صحیح مجموعے) کے نام سے جن چھ مجموعہائے حدیث نے شہرت پائی ان میں صحیح بخاری سرفہرست ہے، اس کے بارے میں بھی علماء نے وہی کہا جو امام شافعیؒ نے امام مالکؒ بن انس کی المؤطا کے بارے میں کہا تھا۔

صحاح ستہ کی دوسری کتاب امام مسلم بن حجاج قشیریؒ (۲۰۶۔۲۶۱ھ) کا مرتبہ مجموعۂ حدیث ہے، یہ بھی الجامع الصحیح اور ''صحیح مسلم'' کے نام سے معروف ومقبول ہوا، صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے لیے علماء کے درمیان ''صحیحین'' کی اصطلاح وضع ہوئی، مطلق صحیحین جہاں بھی بولا اور لکھا جاتا ہے اس سے یہی دو کتابیں مراد ہوتی ہیں۔

صحاح ستہ کی تیسری کتاب ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورہ ترمذیؒ (۲۰۹۔۲۷۹ھ) کا مرتبہ مجموعۂ حدیث ہے۔ ''جامع ترمذی'' کے نام سے اہل علم میں معروف ہے، اس پر بھی شروح، حواشی اور تراجم کی صورت میں علمی کام کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔

صحاح ستہ کی کتب میں ابوداؤد سجستانیؒ کا مرتبۂ مجموعۂ حدیث بھی ہے۔ ان کا پورا نام سلیمان

بن اشعث بن اسحٰقؒ (۲۰۲۔۲۷۵ھ) ہے۔امام احمد بن حنبلؒ کے خصوصی تلامذہ میں سے ہیں،امام ترمذیؒ اور امام نسائی کو ابوداوٗدؒ سے تلمذ حاصل ہے۔

امام نسائی کا مرتبہ مجموعۂ حدیث بھی صحاح ستہ میں شمار ہوتا ہے،ان کا پورا نام ابوعبدالرحمٰن احمد بن شعیب نسائی خراسانی (۲۱۵۔۳۰۳ھ) ہے۔ان کا مجموعۂ حدیث ''سنن نسائی'' کے نام سے معروف و متداول ہے،اس کے حواشی،شرح اور تعلیقات کا سلسلہ بھی تاحال جاری ہے۔

۲) قول رسول ﷺ،عمل رسول ﷺ اور توثیق رسول ﷺ کو ''حدیث'' کہتے ہیں (جیسا کہ اس کی تفصیل سابقہ حواشی میں گزر چکی) اور اقوال صحابہ کو ''آثار'' کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، محدثین کے ہاں یہ معروف اور متفق علیہ اصطلاح ہے۔

۳) ظاہریہ 'ظاہریہ' ان لوگوں کو یا اس طبقہ کو کہا گیا جو اس بات کے قائل ہوئے کہ قرآن وحدیث کے ظاہری معنی پر عمل کیا جائے،اس مسلک کی نسبت داوٗد بن علی اصفہانیؒ معروف داوٗد ظاہری یا ابوسلیمان ظاہریؒ کی طرف کی گئی،داوٗد ظاہریؒ ۲۰۲ ہجری میں پیدا ہوئے،کوفہ جائے پیدائش ہے،بغداد میں تعلیم حاصل کی،ابتدا میں شافعی مسلک کے پیروکار تھے پھر اپنا مسلک اختیار کیا،جو ظاہری مسلک کہلایا،ظاہریہ نہ قیاس کے قائل ہیں اور نہ اجماع کے،صرف اس اجماع کے قائل ہیں اور اسے قابل استدلال سمجھتے ہیں جس پر تمام علمائے امت متفق ہوں،استحسان،مصالح مرسلہ اور دوسرے عقلی مصادر کو دلیل شرعی تسلیم نہیں کرتے،چوتھی صدی ہجری میں ان کے بیٹے محمد بن داوٗدؒ (م: ۲۹۷ھ) اور ابن مفلس (م: ۳۲۴ھ) نے اس مسلک کی نمائندگی کی۔

اس مسلک کی سب سے بھرپور نمائندگی ابومحمد علی بن حزم اندلسیؒ (م: ۴۵۶) نے کی،ابن حزمؒ قوی الاستدلال عالم و مصنف تھے،انداز تحریر بہت جارحانہ تھا،ان کی تین کتابوں نے عالمی شہرت حاصل کی۔ (۱) المحلی فی فروع الفقہ، (۲) الاحکام فی اصول الاحکام، (۲) کتاب الفصل فی الملل والاہواء والنحل،اپنے ظہور کی ابتدا میں یہ مسلک اندلس میں پھیلا لیکن آٹھویں صدی ہجری تک بالکل ختم ہوگیا، (فلسفۃ التشریع فی الاسلام، ڈاکٹر صبحی محمصانی، وفیات الاعیان۔ ج:۱، ص:۱۷۵۔ابن خلکان)

۴) قاضی ابویوسفؒ۔امام ابوحنیفہؒ کے رفقاء میں ممتاز و معتمد،ان کی مجلس فقہ کے اہم رکن،

پورا نام: ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم بن حبیب انصاریؒ (۱۱۳۔۱۸۲ھ) خلافت بنو عباس میں امام ابو حنیفہؒ کی وفات کے بعد عہدۂ قضاء پر فائز ہوئے اور اسلامی تاریخ میں پہلی بار "قاضی القضاۃ" کا منصب سنبھالا۔

زفر بن ہذیلؒ (۱۱۰۔۱۵۸ھ) امام ابو حنیفہؒ سے علمی استفادہ کیا، ان کے رفقاء میں شامل ہوئے، امام ابو حنیفہؒ کی قائم کردہ اس دس رکنی کمیٹی کے رکن تھے جس نے فقہ کی تدوین میں مدد کی، امام ابو حنیفہؒ ان کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ:

ہمارے اصحاب میں زفرؒ قیاس کے سب سے زیادہ ماہر ہیں۔

عقد الجید کے جس نسخے میں میں نے زیر نظر ترجمہ و تعلیقات کا کام کیا ہے اس میں "عافیۃ بن زید" کا حوالہ ہے، حنفی اور شافعی فقہاء میں مجھے اس نام کے کوئی فقیہ نہیں ملے۔ "عافیۃ بن زید" معروف فقیہ ہیں، امام ابو حنیفہؒ کی مجلس تدوین فقہ کے رکن تھے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ طباعت کی غلطی سے یزید کا زید چھپ گیا، قرین قیاس یہی ہے کہ عافیۃ بن یزید مراد ہیں، کیونکہ ابو یوسفؒ اور زفر بن ہذیلؒ کے ساتھ ان کے نام اور رائے کا ذکر کیا گیا ہے۔

۵) امام ابو حنیفہؒ کے دو تلامذہ اور رفقاء قاضی ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ بن حسن شیبانیؒ کو صاحبین کہا جا سکتا ہے۔

۶) شیخ برہان الدین ابو الحسن علیؒ بن ابی بکر فرغانی مرغینانیؒ۔ ہدایہ کے مصنف جو کہ فقہ حنفی کی مشہور و مستند کتاب ہے۔ متوفی: ۵۹۶ ہجری۔

۷) ابو نصر احمد بن حسین بخاریؒ۔ شافعی فقیہ کوفہ میں قاضی رہے۔ متوفی ۴۳۹۔

۸) ابن زیادؒ: ابراہیم بن محمد بن ابراہیم بن عبداللہ ابن زیاد، فقیہ متوفی: ۲۸۹ ہجری۔

۹) بلقینیؒ: سراج الدین عمر عسقلانی بلقینیؒ۔ فقیہ، مالکی المسلک، مدرسہ مالکیہ قاہرہ میں استاذ رہے، دمشق میں عہدہ قضاء پر بھی فائز ہوئے، فقہ میں کئی مؤلفات ہیں، متوفی: ۱۴۰۳ء۔

۱۰) امام ابو عبداللہ احمد بن حنبلؒ۔ مسالک اہل سنت میں سے چوتھے فقہی مسلک کے بانی، امام شافعیؒ کے شاگرد، محدث، فقیہ، مجتہد، بغداد میں پیدا ہوئے۔ وہیں وفات پائی۔ ولادت: ۱۶۴ھ، اور وفات ۲۴۱ھ آپ کے مرتبہ مجموعۂ حدیث نے دوامی شہرت پائی جو کہ 'مسند امام احمد بن

حنبلؒ" کے نام سے موسوم ہے۔

۱۱) ابن نجیمؒ: شیخ عمر بن ابراہیم بن محمد۔ الشہیر با بن نجیم مصری، فقیہ، محقق، شرعی علوم میں ماہر، حنفی المسلک، مصنف: نہر الفائق شرح کنز الدقائق، اجابۃ السائل فی اختصار النفع الوسائل، ان کے بڑے بھائی نے "بحرالرائق" کے نام سے کنز الدقائق کی شرح لکھی، ابن نجیمؒ نے اپنی شرح میں اپنے برادر بزرگ کی شرح پر سخت تنقید اور مناقشے کیے ہیں۔ متوفی: ۱۰۰۵ ہجری۔

۱۲) امام الحرمین ابوالمعالی جوینیؒ، امام غزالیؒ کے استاذ ایک عرصے مکہ اور مدینہ میں مسند درس وافتاء پر فائز رہے، اس مناسبت سے "امام الحرمین" کہلائے، مدرسہ نظامیہ بغداد کے بانی، متوفی: ۱۰۵۸ عیسوی

۱۳) خطیب سے معروف مؤرخ خطیب بغدادیؒ مراد ہیں، متوفی: ۴۶۳ھ دارکی الشافعی۔ عبدالعزیز بن عبداللہ، محدث، فقیہ، دارک، اصبہان میں ایک گاؤں تھا اس کی طرف نسبت ہے، متوفی: ۳۷۵ ہجری

۱۴) سعید بن مسیبؒ، تابعی، فقہائے مدینہ میں شمار ہوتا ہے، محدث، مفسر، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے داماد، متوفی: ۹۴ ہجری۔

۱۵) بھول چوک اور تنگی وقت کی بنا پر قضا نمازوں میں ترتیب واجب نہیں رہتی، بالغ ہونے کے بعد اگر کسی کی پانچ سے زائد نمازیں قضا نہ ہوئی ہوں تو اگر اس کی چند نمازیں قضا ہو جائیں گی تو فقہائے احناف کے نزدیک اس پر ترتیب واجب ہوگی، مثلاً ایسے شخص کی عصر اور مغرب کی نمازیں قضا ہو گئیں، اس نے پہلے نماز مغرب کی قضا کی پھر نماز عصر کی قضا پڑھی اور کسی حنفی فقیہ سے فتویٰ لیا تو وہ اعادہ کا فتویٰ دے گا کیونکہ ان کے نزدیک ترتیب واجب ہے، اس فتوے کی رو سے اسے ان دونوں نمازوں کا اعادہ کرنا پڑے گا، اگر شافعی فقیہ سے فتویٰ لیا تو نمازوں کے صحیح ہونے کا فتویٰ دے گا، اس صورت میں اسے ان دونوں نمازوں کا اعادہ نہیں کرنا پڑے گا، شافعی فقہاء کے نزدیک قضا نمازوں کی ادائیگی میں ترتیب واجب نہیں ہے، یہ اس صورت میں ہے کہ جب فوت شدہ نمازوں کی ترتیب یاد ہو، نسیان (بھول چوک) کی صورت میں ترتیب کسی کے نزدیک بھی واجب نہیں رہتی۔

باب:۵

تقلید میں میانہ روی

ہم نے جو افراط وتفریط کے درمیان شکل ذکر کی، مذاہب اربعہ کو اختیار کرنے والے تمام جمہور علماء اسی پر چلے ہیں اور ائمہ مذاہب نے اپنے اصحاب کو اس کی وصیت کی ہے، شیخ عبدالوہاب الشعرانیؒ (۱) ''الیواقیت والجواہر'' میں امام صاحبؒ سے روایت کرتے ہیں، فرماتے ہیں۔

''جو شخص میرے کلام کی دلیل سے واقف نہیں اسے میرے کلام سے فتویٰ دینا بھی درست نہیں'' اور جب آپ فتویٰ دیتے تو اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے، ''یہ نعمان بن ثابت کی رائے ہے، جتنا ہمیں معلوم ہے، اس کے لحاظ سے بہتر ہے، اگر کوئی اس سے اچھی رائے دے، تو وہ زیادہ لائق صحت ہے''۔

اور امام مالکؒ فرمایا کرتے:

''سوائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر شخص اپنے کلام پر ماخوذ ہے، اور اس کا کلام رد کیا جا سکتا ہے'' اور حاکمؒ وبیہقیؒ نے شافعیؒ سے روایت کی ہے، فرماتے ہیں ''جب حدیث کی صحت ثابت ہو جائے تو وہی میرا مذہب ہے'' ایک روایت ہے، ''جب تم میرا کلام مخالف حدیث دیکھو، تو حدیث پر عمل کرو، اور میرے کلام کو دیوار پر دے مارو'' اور ایک روز آپؒ نے مزنی (۲) سے فرمایا: اے ابراہیمؒ: ہر بات میں میری تقلید نہ کرو بلکہ اپنی نجات کی فکر کرو، یہ دین ہے اور فرماتے، سوائے فرمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی کا قول حجت نہیں اگر چہ کہنے والے کثیر ہوں نہ ہی

قیاس اور نہ ہی کسی اور شے میں حجت ہے، تم پر اللہ تعالی اور رسول اللہ کی اطاعت واجب ہے۔

امام احمدؒ (۳) فرمایا کرتے:

''کسی کو اللہ تعالی اور اس کے رسول اللہ کے ساتھ کلام کی گنجائش نہیں،'' نیز ایک شخص سے فرمایا، ''نہ میری تقلید کرو، نہ مالکؒ، اوزاعیؒ اور نخعیؒ وغیرہ کی کرو، بس کتاب وسنت سے احکام حاصل کیا کرو، جہاں سے انھوں نے حاصل کیے ہیں۔''

اس کے بعد انھوں نے علماء مذاہب کی ایک عظیم جماعت سے نقل کیا اور اصحاب مذاہب کے زمانہ سے اس زمانہ تک بغیر کسی مذہب معین کا التزام کیے، مذاہب پر عمل کرتے اور فتوی دیتے تھے، اور کچھ اس طرح بیان کیا، کہ اس کے کلام کا مقتضی یہ معلوم ہوتا ہے کہ علماء سلف اور حال ہمیشہ سے اسی پر ہیں، یہاں تک یہ امر متفق علیہ اور گویا مسلمانوں کا ایسا طریق ہو گیا کہ اس سے مختلف ہونا صحیح نہیں، چونکہ عبدالوہابؒ نے اقوال کے نقل کرنے میں کافی تفصیل سے کام لیا ہے، تو ہمیں ان کے ذکر کی ضرورت نہیں، لیکن جو اس وقت ذہن میں آ گئے، ان کے ذکر میں بھی کوئی نقصان نہیں، بغویؒ، شرح السنہ، کے شروع میں کہتے ہیں:

''میں اپنے اکثر بیان بلکہ تمام ہی میں دوسروں کا متبع ہوں، ہاں اگر کہیں کلام محتمل کی تاویل یا مشکل کی وضاحت یا ایک قول کو دوسرے قول پر ترجیح دینے میں کوئی مجھ پر واضح ہو گئی، تو وہ دوسری بات ہے۔''

اور باب الدعاء الذی یستفتح به الصلوة میں انی وجهت اور سبحانک اللّٰھم کے ذکر کے بعد کہتے ہیں۔

''اس کے علاوہ افتتاحِ صلوۃ کے بارے میں اور بھی قابل ذکر روایات ہیں، یہ اختلاف مباح ہے، جس سے بھی نماز شروع کر لے صحیح ہے'' اور باب المرأة لاتخرج الامع محرم میں ذکر کیا ہے۔

'' یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے، کہ عورت اگر محرم نہ پائے تو اس پر حج لازم نہیں یہی قول نخعیؒ، حسن بصریؒ، ثوریؒ، احمدؒ، اسحٰقؒ اور اہل رائے کا ہے، اور ایک جماعت

اس طرف گئی ہے، کہ اس پر عورتوں کی جماعت کے ساتھ جانا واجب ہے، یہ قول مالکؒ اور شافعیؒ کا ہے اور قول اول ظاہر حدیث سے مطابقت کی وجہ سے اولیٰ ہے''۔

بغویؒ نے حدیث بروع بنت واشق کے بارے میں امام شافعیؒ کا قول نقل کیا ہے:

''اگر حدیث بروع بنت واشقؓ ثابت ہے تو بجز نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی کا کلام حجت نہیں، یہ حدیث مضطرب ہے، راوی کبھی معقل بن یسار کبھی معقل بن سنان اور کبھی اشجع سے روایت کرتا ہے اور اگر حدیث غیر ثابت ہے تو عورت کے لئے مہر نہیں، البتہ میراث ہے۔(۴)

اور حاکم نے امام شافعیؒ کا یہ قول:

''اگر حدیث بروع بنت واشق صحیح ہو تو میں اس کا قائل ہو جاؤں'' ذکر کر کے کہا کہ میرے بعض مشائخ نے کہا:

''اگر میں شافعیؒ کے پاس ہوتا، تو ان کے شاگردوں میں کھڑا ہو کر کہتا کہ حدیث صحیح ہو چکی، تم اس کے قائل ہو جاؤ۔

اور اسی طرح امام شافعیؒ نے بریدۃ الاسلمی (۵) کی اس حدیث میں توقف کیا ہے جو اوقات صلوٰۃ کے بارے میں ہے چونکہ مسلم کے نزدیک حدیث صحیح ہے، اس لیے محدثین کی جماعتوں نے توقف سے رجوع کیا ہے اور ایسے ہی ثوب مصفر (کسم کا رنگا ہوا کپڑا) کے بارے میں بیہقیؒ نے شافعیؒ پر عبداللہ بن عمرؓ کی حدیث سے اعتراض کیا ہے، اور قلتین سے کم پانی کی نجاست کے مسئلہ میں غزالیؒ نے کلام کثیر میں امام شافعیؒ کا پیچھا کیا ہے، یہ کلام احیاء العلوم میں مذکور ہے اور نوویؒ نے امام شافعیؒ کے خلاف اس مسئلہ کی دلیل بیان کی کہ بیع معاطاۃ جائز ہے، (یعنی بغیر زبان سے کچھ کہے قیمت دے دینا اور چیز لے لینا)

اور زمخشریؒ نے بعض مسائل میں امام صاحبؒ کا تعاقب کیا ہے، ان میں ایک یہ ذکر کیا کہ سورۂ مائدہ کی آیت تیمم کی تفسیر میں زجاجؒ نے کہا کہ، صعید کے معنی سطح زمین کے ہیں، خواہ مٹی ہو یا نہ ہو، اگرچہ پتھر ہی کیوں نہ ہو جس پر کوئی مٹی نہ ہو، تو اگر متیمم نے اس پر ہاتھ مارا اور مسح کیا، تو بھی اس کی طہارت ہوگی، یہ مذہب ابوحنیفہ کا ہے، اگر تم کہو تو اس آیت کا جواب کیا دو گے فامسحوا

بـو جـو هـكـم و ايـديكم منه یعنی کچھ اس میں سے اور یہ صورت اس پتھر میں جس پر مٹی نہ ہو، ہو نہیں سکتی، تو ہم یہ جواب دیں گے کہ علماء نے ''من'' کے معنی ابتداء غایت کے لیے ہیں، پھر اگر تم کہو، کہ ''من'' کے معنی ابتداء غایت لینا'' قول ضعیف ہے اور عرب کے ان محاورات، ''مسحت براسي من الدهن ومن التراب ومن الماء'' سے تبعیض ہی کے معنی سمجھے جاتے ہیں، تو میں کہوں گا، آپ ٹھیک کہتے ہیں اور حق کو مان لینا جھگڑے سے بہتر ہے۔

اس قسم کے علماء کی اپنے ائمہ پر گرفت اور بالخصوص محدثین کی حد وشمار سے زیادہ ہے، میرے استاذ علامہ ابو طاہر شافعیؒ نے اپنے شیخ حسن العجیمی الحنفیؒ سے نقل کیا، کہ وہ ہمیں حکم دیا کرتے تھے کہ ہم نجاست قلیلہ میں زیادتی وتنگی سے بچنے کے لیے عورتوں پر زیادہ تشدد نہ کریں اور اس بارے میں ہم ابو حنیفہؒ کا مذہب اختیار کریں کہ درہم سے کم مقدار معاف ہے اور ہمارے شیخ ابو طاہرؒ اسی قول کو پسند فرماتے تھے اور اسی پر عامل تھے، انوار میں ہے کہ اہلیت اجتہاد مندرجہ ذیل امور کے جاننے پر موقوف ہے۔

اول: کتاب اللہ تعالیٰ، قرآن میں جو آیات واحکام سے متعلق ہیں ان کا جاننا شرط ہے، تمام قرآن کا جاننا اور اس کا حفظ ہونا ضروری نہیں۔

دوم: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث جو احکام سے متعلق ہیں، تمام نہیں، البتہ احادیث وقرآن میں سے مندرجہ باتوں کا جاننا شرط ہے، خاص وعام، مطلق ومقید، مجمل ومبین اور ناسخ ومنسوخ اور حدیث کے جملہ اقسام، متواتر، احاد، مرسل، مسند، متصل اور منقطع اور جرح وتعدیل کے اعتبار سے راویوں کے حالات۔

سوم: علماء، فقہاء، صحابہ اور ان کے بعد والوں کے اقوال، کہ کون سا قول اجماعی ہے اور کونسا اختلافی۔

چہارم: قیاس کی جلی وخفی دونوں اقسام اور صحیح وفاسد کی تمیز۔

پنجم: عربی زبان، باعتبار لغت وترکیب، ان تمام علوم میں مہارت کاملہ بھی شرط نہیں، بلکہ ان میں سے کسی قدر جاننا کافی ہو جائے گا اور تمام احادیث متفرقہ کی بھی جستجو کی کوئی حاجت نہیں بلکہ اس کے پاس ایسی صحیح کتاب جو تمام احکام کو جمع کرے، ہونا کافی ہے۔ مثلاً سنن ترمذی، نسائی

اور ابوداؤد اور تمام اجماع و اختلافات کے مقامات اور ایسے ہی معرفت ناسخ و منسوخ، تمام کا ضبط و محفوظ ہونا ضروری نہیں، صرف اس مسئلہ میں جس میں وہ فیصلہ کر رہا ہے، اس کا قول اجماع کے مخالف نہ ہو، اسے یہ معلوم ہو کہ اس نے بعض متقدمین کے موافق فیصلہ کیا ہے، یا اس کا غالب ظن یہ ہو کہ متقدمین نے اس بارے میں کوئی کلام نہیں کیا ہے، بلکہ یہ واقعہ اسی کے زمانہ میں پیش آیا ہے۔ وہ حدیث جس کے قبول پر سلف نے اجماع کیا ہو یا اس کے راویوں کی اہلیت درجہ تواتر کو پہنچی ہوئی ہو تو اس کے راویوں کی عدالت سے متعلق بحث کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی، اس کے علاوہ دیگر احادیث میں بحث عدالت ضروری ہے۔

ان تمام علوم کا اجتماع اس مجتہد مطلق میں شرط ہے تو تمام ابواب شرع میں فتوی دے سکتا ہے، اگرچہ یہ ممکن ہے کہ وہ کسی باب میں مجتہد ہو اور کسی میں نہ ہو، اور اجتہاد کی ایک شرط اصول اعتقاد کی معرفت بھی ہے۔ غزالیؒ نے فرمایا:

> ''اصول اعتقاد کی معرفت متکلمین کے طریقے پر شرط نہیں، کیونکہ وہ ہر ایک عقیدہ کی دلیل رکھتے ہیں اور بدعتیوں میں سے جس کی شہادت مقبول نہیں، اسے قاضی بھی بنانا درست نہیں اور ایسے ہی جو خوارج کی طرح اجماع کا، قدریہ کی طرح اخبار احاد اور شیعہ کی طرح قیاس کا قائل نہ ہو، وہ بھی قاضی نہیں بنایا جاسکتا، انوار میں مذکور ہے۔ ''مجتہد کے لیے مذہب مدون ہونا شرط نہیں اور جب مذاہب مدون ہو گئے تو مقلد کے لیے دوسرے مذہب کی طرف منتقل ہونا جائز ہوگیا۔

اور اصولیین کے نزدیک اگر کسی واقعہ میں مذہب اول پر عمل کر چکا، تو اس واقعہ میں تبدیلِ مذہب جائز اور معاملات میں درست ہے اور اگر عمل نہیں کیا تو اس میں اور اس کے علاوہ تمام واقعات میں جائز ہے اور اصولیین کے نزدیک ناجائز ہے اور اگر ہر مذہب میں آسان ترشقوں کو اختیار کرلیا تو ابواسحٰقؒ کہتے ہیں کہ فاسق ہو جائے گا اور ابن ابی ہریرہؒ نے کہا کہ: فاسق نہیں ہوتا، بعض شروع میں اسی کو ترجیح دی گئی ہے۔

اقسام مقلد

اور الانوار میں ہے کہ جو حضرات ابوحنیفہؒ، مالکؒ اور احمدؒ کے فقہی مذہب کی طرف منسوب

ہیں ان کی چند اقسام ہیں۔

اول: عوام اور ان کا امام شافعیؒ کی تقلید کرنا مجتہد منتسب کی تقلید پر متفرع ہے۔

دوم: درجۂ اجتہاد حاصل کرنے والے اور مجتہد دوسرے مجتہد کی تقلید نہیں کرتے، وہ تو صرف اپنے اجتہاد، دلائل کے استعمال اور ترتیب دلائل میں اپنے امام کے طریقے پر چلنے کی وجہ سے ان کی طرف منسوب ہو جاتے ہیں۔

سوم: درمیانہ لوگ جو رتبۂ اجتہاد کو نہیں پہنچے لیکن وہ اصول امام سے واقف اور اس پر قادر ہیں کہ جس مسئلہ کو وہ غیر منصوص پائیں اس کو منصوص پر قیاس کر سکیں یہ لوگ مقلد ہیں اور ایسے ہی وہ لوگ جو ان کا قول اختیار کرتے ہیں اور مشہور یہ ہے کہ ان کی بذات خود تقلید نہیں کی جاتی کیونکہ وہ تو خود مقلد ہیں۔

اور ابوالفتح الہرویؒ (۷) جو امام اعظمؒ کے تلامذہ میں ہیں، کہتے ہیں:

''اصول میں ہمارے اکثر ائمہ کا یہ مذہب ہے کہ عامی کا کوئی مذہب نہیں ہوتا، اگر مجتہد مل جائے تو اس کی تقلید کرے ورنہ کسی ماہر مذہب کی تقلید کرے، کیونکہ وہ اسے اپنے مذہب پر فتویٰ دے گا اور یہ اس بات کی صاف دلیل ہے کہ ماہر مذہب کی خود تقلید کی جا سکتی ہے اور فقہاء کے نزدیک راجح یہ ہے کہ جو عامی کسی مذہب کی طرف منسوب ہو اس کا وہی مذہب ہوتا ہے اس کو مذہب کی مخالفت جائز نہیں اور اگر کسی مذہب سے منسوب نہ ہو تو کیا اسے اختیار ہے کہ جس مذہب کی چاہے تقلید کرے؟ اس میں اختلاف ہے جو اس پر مبنی ہے کہ اسے مذہب معین کی تقلید لازم ہے یا نہیں؟ اس میں دو صورتیں ہیں۔ نوویؒ نے کہا کہ دلیل کا مقتضی یہ ہے کہ عامی کو تقلید لازم نہیں بلکہ جس سے چاہے اور جو مل جائے اس سے فتویٰ پوچھ لے لیکن رخصتوں کا متلاشی نہ ہو۔

فتویٰ صرف مجتہد دے سکتا ہے

فتح القدیر، کتاب آداب القاضی میں ہے؟ معلوم ہونا چاہیے کہ مصنفؒ نے قاضی کے بارے میں جو ذکر کیا، وہی مفتی کے بارے میں بھی ذکر کیا ہے کہ مجتہدین کے سوا کوئی فتویٰ نہ دے۔

اور اصولیین کی رائے یہ ہے کہ مفتی مجتہد ہوتا ہے، رہا غیر مجتہد جو اقوال مجتہد کو یاد کر لیتا ہے وہ

مفتی نہیں اس پر واجب ہے کہ اس سے فتوی لیا جائے تو مجتہد کا قول مثلاً ابوحنیفہؒ کا قول حکایتا نقل کر دے، اس سے معلوم ہوا کہ ہمارے زمانے میں علماء کا فتویٰ، فتویٰ نہیں بلکہ وہ مفتی کے کلام کی نقل ہے تا کہ فتوی دریافت کرنے والا اس پر عمل پیرا ہو۔

اور ایسے مفتی کے مجتہد سے طریق نقل کی دو صورتیں ہیں یا تو مفتی کے پاس مجتہد تک متصل کوئی سند ہے یا کسی مشہور متداول کتاب سے نقل کرتا ہے، جیسے کتب محمد بن حسن وغیرہ اور دیگر مجتہدین کی مشہور تصانیف، اس لیے کہ یہ بھی درجہ میں غیر متواتر یا مشہور کے ہے، (جیسا کہ رازیؒ نے بیان کیا)۔

اس لیے کہ اگر ہمارے زمانہ میں کوئی نسخہ نوادر کا دستیاب ہو تو اس کے اقوال کو محمدؒ اور امام ابو یوسفؒ کی طرف منسوب کرنا درست نہیں ہے، کیونکہ وہ ہمارے زمانے اور ہمارے وطن میں نہ مشہور ہے اور نہ متداول، ہاں اگر نوادر کی کوئی نقل کسی مشہور و معروف کتاب میں ملے جیسے ہدایہ اور مبسوط تو اس کتاب پر اعتماد کیا جائے گا۔

اگر کوئی اقوالِ مجتہدین کا حافظ ہے لیکن ان کے دلائل سے ناواقف ہے اور کسی قول کو ترجیح دینے کے لیے اسے اجتہاد پر بھی قدرت نہیں تو کسی قول کو قطعی سمجھ کر اس پر فتوی نہ دے بلکہ مستفتی (فتویٰ پوچھنے والے) کے سامنے بیان کر دے مستفتی جسے صحیح تر سمجھے گا اس کو اختیار کرے گا (بعض جوامع میں یہ قول مذکور ہے) میرے نزدیک اس پر تمام اقوال کا بیان واجب نہیں بلکہ ایک قول بیان کر دینا کافی ہے کیونکہ مقلد کو اختیار ہے کہ جس مجتہد کی چاہے تقلید کرے جب اس نے ایک قول ذکر کیا اور مستفتی نے اس کی تقلید کر لی تو مقصود حاصل ہو گیا۔ ہاں مفتی کو چاہیے کہ ایک قول کو قطعاً اس طرح بیان نہ کرے کہ تمہارے سوال کا بس یہی جواب ہے، بلکہ یہ کہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے اس صورت میں یہ حکم دیا ہے، البتہ اگر مفتی تمام اقوال بیان کر دے تو جو مستفتی کے دل میں صحیح صواب تر معلوم ہو اس کو اختیار کر لے اور عامی کا کوئی اعتبار نہیں کہ اس کے دل میں صواب حکم واقع ہوا ہے یا خطائے حکم۔

اسی طرح اگر دو مجتہدوں سے فتویٰ لیا اور دونوں نے اختلاف کیا تو دونوں اقوال میں جس طرف طبیعت مائل ہو اس کو اختیار کر لینا بہتر ہے۔

اور میرے نزدیک اگر اس نے وہ قول لے لیا جس کی طرف اس کا میلان نہیں ہے تب بھی

جائز ہے، اس لیے کہ اس کا میلان وعدم میلان سب برابر ہے، اس پر تو صرف تقلید مجتہد واجب ہے اور تقلید یہ کر چکا ہے، اب خواہ مجتہد غلطی پر ہو یا صحت پر، علماء نے کہا کہ ایک مذہب سے دوسرے میں اجتہاد اور دلیل سے جانے والا بھی گناہگار اور قابل سزا ہے، بغیر اجتہاد و دلیل کے توجہ درجہ اولیٰ گناہگار ہوگا اور اس اجتہاد سے تحری اور دلیل کا فیصلہ مراد ہے، کیونکہ عامی کو اجتہاد حاصل ہی نہیں ہوتا اور حقیقت انتقال مذہب اس مسئلہ خاص کے حکم میں ثابت ہو سکتی ہے، جس میں اس نے تقلید کر کے اس پر عمل بھی کر لیا ہو ورنہ مقلد کا صرف یہ کہہ دینا کہ میں نے ابوحنیفہؒ کی ان مسائل میں تقلید کی ہے جس نے انھوں نے فتوی دیا ہے اور میں نے اجمالاً ان کے فتویٰ پر عمل کو لازم کر لیا حالانکہ یہ شخص مسائل کی صورتیں بھی نہیں جانتا، تو یہ واقع میں تقلید نہیں بلکہ یہ حقیقت میں تقلید کو مشروط کرنا یا اس کا وعدہ کرنا ہے، گویا کہ اس نے یہ التزام کر لیا کہ جو مسائل مخصوص واقعات میں اسے پیش آئیں گے ان میں وہ امام ابوحنیفہؒ کے قول پر عمل کرے گا۔

اگر علماء کی مراد یہ التزام ہے تو مجتہد معین کے وجوب اتباع پر کوئی دلیل نہیں جس سے قولاً یا نیتاً مقلد اس کو شرعی طریقہ پر اپنے ذمہ لازم کرے، بلکہ دلیل اور جن مسائل میں ضرورت ہو ان میں مجتہد کے قول کے ساتھ اقتضاء عمل میں یہ ارشاد خداوندی ہے، فاسئلوا اهل الذكر ان كنتم لا تعلمون، (اگر تم واقف نہیں تو اہل علم سے پوچھ لو) اور سوال اسی وقت ہوگا جب کسی معین واقعہ میں حکم کی ضرورت اور جب اس کے نزدیک قول مجتہد ثابت ہو جائے گا، اس پر علم واجب ہو جائے گا اور غالب یہ ہے کہ فقہاء کی جانب سے یہ شرائط لوگوں کو رخصتوں کی تلاش سے روکنے کے لیے ہیں، ورنہ ہر مسئلہ میں عامی کا قول مجتہد کو لینا اس کے لیے آسان ہے اور ہمیں معلوم نہیں کہ نقل اور عقل میں سے کون سی دلیل اس سے مانع ہے کہ انسان اس مجتہد کے ان اقوال میں سے کسی ایک قول کو جو اس کے لیے آسان ہو، اختیار کرے، ہمیں شریعت کی جانب سے کوئی علم نہیں کہ اس نے اس پر مذمت کی ہو اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خود ان امور کو پسند فرماتے تھے جب آپ ﷺ کی امت کے لیے سہولت کا باعث ہوں، واللہ اعلم

اور یہ اس مضمون کا آخر ہے جس کو ہم اس رسالہ میں بیان کرنا چاہتے تھے۔

والحمدلله اولاً و آخراً

باب (۵)

حواشی وحوالہ جات

۱) عبدالوہاب شعرانیؒ، عقلی علوم میں ان کی مہارت مسلم تھی، تصوف میں بلند مقام کے حامل تھے۔ مصر سے تعلق تھا، حنفی، اہم تصانیف طبقات الصوفیہ، لطائف المنن، الجواہر المصون۔ متوفی: ۱۵۶۵ء۔ ۹۷۳ھ۔

۲) مزنیؒ۔ احمد بن عبداللہ محمد بن عبداللہ المزنی الہرویؒ۔ شافعی المسلک، جامع العلوم، متوفی: ۳۵۶ھ۔

۳) مراد۔ امام احمد بن حنبلؒ، محدث، فقیہ، مجتہد۔ متوفی: ۲۴۱ھ۔

۴) بروع بنت واشق کی حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اس سے اس کے شوہر نے بغیر ذکر مہر کے نکاح کیا اور بغیر جنسی تعلقات قائم ہوئے وفات پا گیا، ایسا ہی واقعہ جب عبداللہ بن مسعودؓ کے زمانہ میں پیش آیا تو آپ نے حدیث نہ ملنے کی بنا پر اپنی رائے سے فیصلہ کیا کہ بیوی کے لیے مہر مثل اور میراث ہے اور اس پر عدت واجب ہوگی۔ اس پر معقل بن سنانؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بروع بنت واشق کے مسئلہ میں یہی فرمایا تھا۔ تب عبداللہ بن مسعودؓ نے اللہ اکبر کہا اور نہایت خوش ہوئے، یہ حدیث نسائی نے علقمہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے۔

۵) نسائی نے اس حدیث کو بریدہ الاسلمی سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور نمازوں کے اوقات معلوم کیے تو آپ نے دو روز نماز پڑھ کر دکھائی، ایک روز اول وقت میں اور دوسرے روز آخر وقت میں نمازیں پڑھائیں اور فرمایا ان کے درمیان نمازوں کے اوقات ہیں۔

۶) شاہ ولی اللہ کے استاذ، ان سے حرمین شریفین میں سند حدیث لی۔

الانصاف

فی بیان سبب الاختلاف

تصنیف

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ

ترجمہ

مولانا صدرالدین اصلاحی

ترتیب

مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
	عدم اختلاف کا دورِ سعید (عہد نبوت)	
۱	دور نبوی میں فقہی مباحث کا فقدان	۱۲۸
	تاریخ اختلاف کا ابتدائی دور (عہد صحابہؓ)	
۲	شیخین کا طرز عمل	۱۳۱
۳	بنائے اختلاف	۱۳۳
۴	آغاز و وجوہ اختلاف	۱۳۳
۵	(۱) حدیث نبوی سے واقفیت اور عدم واقفیت کا اختلاف	۱۳۴
۶	(۲) فعل رسول کی تعیین نوعیت میں اختلاف	۱۳۶
۷	دوسری مثال	۱۳۷
۸	(۳) وہم تعبیر کا اختلاف	۱۳۷
۹	(۴) سہو ونسیان کا اختلاب	۱۳۸
۱۰	(۵) ضبط مدعائے حدیث کا اختلاف	۱۳۸
۱۱	(۶) تعیین علت کا اختلاف	۱۳۹

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱۲	(۷) طرز تطبیق کا اختلاف	۱۳۹
۱۳	دوسری مثال :-	۱۴۰
	تاریخ اختلاف کا دوسرا دور (عہد تابعین)	
۱۴	تابعین کا اختلاف	۱۴۱
۱۵	تدوین فقہ کی ابتداء	۱۴۲
	تاریخ اختلاف کا تیسرا دور (عہد تبع تابعین)	
۱۶	علمائے تبع تابعین	۱۴۴
۱۷	ان علماء کا طرز فکر وعمل	۱۴۵
	مشہور عام فقہی مذاہب	
۱۸	(۱) امام مالکؒ اور مذہب مالکی	۱۴۹
۱۹	(۲) امام ابوحنیفہؒ اور مسلک حنفی	۱۵۰
۲۰	(۳) امام شافعیؒ اور مسلک شافعی	۱۵۲
	اہل الحدیث	
۲۱	اتباع حدیث کا التزام	۱۵۸
۲۲	تدوین حدیث کا دور	۱۶۰
۲۳	علمائے حدیث کی توجہ فقہ کی طرف	۱۶۲
۲۴	نئے اصول فقہ	۱۶۳
۲۵	ان اصولوں کا ماخذ	۱۶۴
۲۶	اس طریق فقہ کی کامیابی	۱۶۸
۲۷	تنقیح احادیث کا دور	۱۶۹
۲۸	امام بخاریؒ	۱۷۰
۲۹	امام مسلمؒ	۱۷۰

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۳۰	امام ابوداؤدؒ	۱۷۱
۳۱	امام ترمذیؒ	۱۷۲
	اہل الرائے	
۳۲	اجتہاد ورائے کا رجحان	۱۷۳
۳۳	ظہور تخریج کے اسباب	۱۷۴
۳۴	تخریج کیا ہے؟	۱۷۵
۳۵	مجتہد فی المذہب	۱۷۷
۳۶	بعض مذاہب کے پھیلنے اور بعض کے مٹنے کے اسباب	۱۷۷
	مسلکِ حق وراہِ اعتدال	
۳۷	حق کا درمیانی راستہ	۱۷۸
۳۸	اہل الحدیث کی افراط وتفریط	۱۷۹
۳۹	اہل الرائے کی افراط وتفریط	۱۸۰
	مسئلہ تقلید	
۴۰	عدم تقلید کا زمانہ	۱۸۷
۴۱	شخصی تقلید کا آغاز	۱۸۹
۴۲	تقلید کا وجوب اور اس کے مفہوم کی وسعت	۱۹۳
۴۳	ایک اعتراض اور اس کا جواب	۱۹۸
۴۴	تقلید امام معین کب واجب ہے	۲۰۰
	مسئلۂ اجتہاد	
۴۵	اجتہاد مطلق	۲۰۱
۴۶	مجتہد مطلق کی اقسام	۲۰۲
۴۷	مجتہد مطلق مستقل اور اس کی خصوصیات	۲۰۲

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۴۸	مجتہد مطلق منتسب	۲۰۴
۴۹	اجتہاد مقید اور مجتہد فی المذہب	۲۰۵
۵۰	سلف نے اصول فقہ کی تدوین کیوں نہ کی؟	۲۰۷
۵۱	مذاہب چہارگانہ کی تاریخ اجتہاد	۲۰۷
	فقہی اختلافات کا رُخ (چوتھی صدی ہجری کے بعد)	
۵۲	فتنوں کا ہجوم	۲۱۱
۵۳	(۱) فقہی مجادلے	۲۱۱
۵۴	(۲) ائمہ مجتہدین کی حقیقی بنائے اختلاف سے عدم آگہی	۲۱۳
۵۵	(۳) فقہی اقوال کی حقیقت سے بے خبری	۲۱۷
۵۶	(۴) ''رائے'' اور ''ظاہریت'' کے مفہوم سے ناواقفی	۲۱۸
۵۷	(۵) اندھی تقلید کا زور	۲۱۹
۵۸	(۶) غیر ضروری فنی کاوشوں کا زور	۲۲۳
۵۹	اختلافی مسائل اور ان کا نقطہ عدل	۲۲۵

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حمد وصلوٰۃ کے بعد!

ایک وقت اللہ تعالی نے میرے قلب میں ایک ایسی میزان حق وعدل کا القا فرمایا جس سے میں امت محمدیہ کے مابین واقع ہونے والے تمام اختلافات کے اسباب معلوم کر سکوں اور جان لوں کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے نزدیک حق کیا ہے، ساتھ ہی اللہ تعالی نے مجھ کو وہ قدرت بیان بھی عطا فرمائی جس سے کام لے کر میں اس مسئلہ کی بہترین وضاحت کر سکوں، ایسی وضاحت کہ پھر کوئی شک اور اشکال باقی نہ رہے، بعد ازاں مجھ سے یہ دریافت کیا گیا کہ صحابہ کرام اور ان کے بعد کے اکابر ملت کے درمیان اختلاف کی، خاص کر احکام فقہیہ میں اختلاف کی وجہ کیا ہے؟ میں وقت کی گنجائش اور سائل کی قوت فہم وحفظ کا لحاظ کرتے ہوئے اسی آن ان حقائق کا، جو اللہ کی عنایت خاص سے مجھ پر کھولے گئے تھے ایک حصہ بیان کرنے پر آمادہ ہو گیا اور اس مسئلہ پر ایک مفید رسالہ تیار ہو گیا، جس کا نام میں نے ''الانصاف فی بیان سبب الاختلاف'' رکھا۔

عدم اختلاف کا دورِ سعید

(عہد نبوت)

دور نبوی میں فقہی مباحث کا فقدان

معلوم ہونا چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں فقہ ایک فن کی طرح مدون نہیں تھی، اور نہ اس وقت احکام کے باب میں بحث کا یہ طریقہ تھا جو اب ہمارے فقہا میں رائج ہے کہ وہ اپنی انتہائی دماغی قابلیتیں صرف کر کے دلائل کے ساتھ ایک ایک چیز کے علیحدہ علیحدہ ارکان اور شرائط اور آداب بیان کرتے ہیں، مسائل کی فرضی صورتیں سامنے رکھ کر ان پر بحث کرتے ہیں، جن چیزوں کی تعریف کی جاسکتی ہو ان کی منطقیانہ تعریف بیان کرتے ہیں اور جن کا حصر بیان کیا جاسکتا ہو ان کا حصر واضح کرتے ہیں، وغیر ذلک، اس کے بجائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہ تھا کہ آپؐ مثلاً وضو فرماتے اور صحابہ کرام آپ کا طریقہ وضو دیکھ کر اسے اختیار کر لیتے، بغیر اس کے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس بات کی توضیح فرمائیں کہ یہ وضو کا رکن ہے اور فلاں چیز اس کے آداب میں سے ہے، اسی طرح آپ نماز پڑھتے، لوگ آپؐ کے نماز پڑھنے کا ڈھنگ دیکھ لیتے اور اسی طرح خود پڑھنے لگتے، آپؐ نے حج ادا فرمایا، لوگوں نے آپ کے حج کرنے کے طریقے اور مراسم دیکھے اور اسی طرح خود حج کرنے لگے، الغرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عام طریقہ تعلیم یہی تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی یہ توضیح نہیں فرمائی کہ وضو میں چار فرض ہیں یا چھ اور نہ کبھی آپ نے یہ خیال کیا کہ ہوسکتا ہے کہ کبھی کوئی آدمی اعضائے وضو کو لگاتار نہ دھوئے اس لیے

ایسے وضو کے ہونے یا نہ ہونے کا پیشگی حکم دے دینا چاہیے، اس قسم کی فرضی اور غیر واقعی صورتوں کے احکام کی بابت آپ نے شاذ و نادر ہی کبھی کچھ فرمایا ہے، دوسری طرف اصحاب رسول کا بھی یہ حال تھا کہ وہ اس طرح کی باتوں کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت کم سوال کرتے تھے، چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''میں نے اصحاب رسول سے بہتر کسی جماعت کو نہیں پایا، انہوں نے رسول خدا کی پوری زندگی میں آپ سے صرف تیرہ سوال کیے جو سب کے سب قرآن میں مذکور ہیں۔ مثلاً:-

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ

اے نبی یہ لوگ تم سے حرمت کے مہینوں میں جنگ کرنے کی بابت سوال کرتے ہیں۔

اور

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ

تم سے حالت حیض کے احکام پوچھتے ہیں۔

وغیرہ اس کے بعد حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ''صحابہ صرف ان ہی مسائل کو پوچھتے تھے جو ان کے لیے نفع رساں ہوتے'' حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ ''کسی ایسی بات کے متعلق سوال نہ کرو جو فی الواقع پیش نہ آئی ہو، کیونکہ میں عمرؓ بن الخطاب کو اس شخص پر لعنت بھیجتے ہوئے سنا ہے جو اس طرح کے سوالات کرے'' قاسمؒ نے لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ ''تم لوگ ایسی چیزوں کی بابت سوال کیا کرتے ہو جن کی بابت ہم نے کبھی زبان استفسار نہیں کھولی، نیز تم ایسی باتوں کی کھود کرید کرتے ہو جن کے متعلق ہمیں کوئی علم و واقفیت نہیں اور اگر ہم کو ان کے بارے میں کوئی علم ہوتا تو حسب فرمان نبوی (۱) ہم تمہیں ضرور بتا دیتے''۔ عمر بن اسحاقؒ کا قول ہے کہ ہم کو آدھے سے زائد اصحاب رسولؐ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہے، میں نے اس گروہ سے بڑھ کر کسی گروہ کو اینچ پینچ سے خالی اور تشدد سے مجتنب نہیں پایا'' عبادہ بن بسر کندیؒ سے یہ فتویٰ پوچھا گیا کہ ''اگر کسی عورت کا ایسی جگہ انتقال ہو جائے جہاں اس کا کوئی ولی نہ ہو تو اس کو غسل کیونکر

---

(۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اس عالم کے منہ میں قیامت کے دن آگ کی لگام لگائی جائے گی جو کسی چیز کا علم رکھتا ہو مگر پوچھنے والے کو نہ بتائے۔

دیا جائے گا آپ نے جواب دیا کہ "میں ایسے لوگوں (۱) سے ملا ہوں جو تمہاری طرح تشدد نہیں کرتے تھے نہ تم لوگوں کی طرح (فرضی) مسائل کے متعلق سوالات کرتے تھے (ان تمام آثار کو امام دارمیؒ نے نقل کیا ہے)۔

الغرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں استفسار اور افتاء کا دستور صرف یہی تھا کہ لوگ پیش آمدہ واقعات کے متعلق آپ سے استفسار کرتے تھے اور آپ ان کا حکم بیان فرما دیتے، اسی طرح معاملات ومقدمات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش ہوتے اور آپ ﷺ ان کا فیصلہ کر دیتے، لوگوں کو اچھے کام کرتے دیکھتے تو ان کی مدح ومنقبت فرماتے اور برے کام کرتے دیکھ کر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے۔

(۱) مراد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ہے۔

تاریخ اختلاف کا ابتدائی دور

(عہد صحابہؓ)

شیخین کا طرز عمل

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہ ساری باتیں بالعموم اجتماع عام ہوتی تھیں، یہی وجہ ہے کہ جب حضرات شیخین (ابوبکرؓ وعمرؓ) کو (اپنے زمانۂ خلافت میں) کسی مسئلہ میں حکم شریعت معلوم نہ ہوتا تو وہ دوسرے صحابہ سے دریافت فرماتے کہ کیا تم میں سے کسی نے اس امر کے متعلق پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی فرمان سنا ہے؟ چنانچہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے سامنے جب دادی کی وراثت کا مسئلہ پیش ہوا تو آپ نے فرمایا کہ ''میں نے اس کے حصہ کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ارشاد نہیں سنا ہے اس لیے میں اس کے متعلق اوروں سے پوچھتا ہوں''، جب نماز ظہر آپ نے ادا کر لی تو لوگوں سے پوچھا کہ ''کیا تم میں سے کسی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دادی کے حق وراثت کے بارے میں کچھ فرماتے سنا ہے؟'' مغیرہؓ بن شعبہ نے کہا کہ ''ہاں! میں نے سونا ہے'' پوچھا ''کیا سنا ہے؟'' جواب دیا کہ ''رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے دادی کو میت کے مال کا چھٹا حصہ دیا ہے''۔ حضرت ابوبکرؓ نے پھر پوچھا ''یہ بات تمہارے سوا اور کسی کو بھی معلوم ہے؟'' محمد بن سلمہؓ نے کہا ''مغیرہؓ صحیح فرماتے ہیں''، یہ سن کر حضرت ابوبکرؓ نے اس عورت کو (جس کا معاملہ پیش تھا، اس کے پوتے کے ترکہ میں سے) چھٹا حصہ دے دیا، اس طرح کے ایک دونہیں

بے شمار واقعات ہیں جو حدیث کی کتابوں میں مذکور ہیں مثلاً ''غرہ'' (جنین کے خون بہا (۱) کے بارے میں حضرت عمرؓ نے عام لوگوں سے استفسار کے بعد مغیرہ بن شعبہؓ کی روایت پر عمل کیا، وبا (۲) کے متعلق حضرت عبدالرحمنؓ بن عوف کے بیان کردہ ارشاد نبوی کے مطابق فیصلہ فرمایا۔ مجوسیوں (۳) کے معاملہ میں ان ہی عبدالرحمنؓ بن عوف کی بیان کی ہوئی حدیث پر اپنے فیصلہ کی بنیاد رکھی حضرت عبداللہ (۴) بن مسعود معقلؓ بن یسار کی روایت سن کر جو ان کی رائے کے بالکل مطابق نکلی تھی از حد خوش ہوئے حضرت ابوموسیٰ اشعری (۵) فاروق اعظم کے دروازے پر تین بار آواز دینے کے بعد جب واپس جانے لگے تو آپ نے گھر سے نکل کر ان سے ان کی وجہ دریافت کی اور جب انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد پیش کیا تو حضرت ابوسعیدؓ کی تصدیق کے

---

(۱) حضرت عمرؓ کے سامنے جنین کے خون بہا کا مسئلہ آیا تو چونکہ آپ کو اس کے بارے میں کوئی نص شرعی معلوم نہ تھی اس لیے آپ نے صحابہؓ سے استفسار کیا، مغیرہؓ بن شعبہ نے فرمایا کہ ''پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا خون بہا 'غرہ' مقرر کیا ہے'' یہ سن کر حضرت عمرؓ نے اس کے مطابق فیصلہ دے دیا۔ ''غرہ'' کا مطلب یہ ہے کہ ایک غلام آزاد کیا جائے، یا جنین کے ولی کو پچاس دینار، یا پانچ سو درہم دیے جائیں۔

(۲) حضرت عمرؓ کے واقعہ سفر شام کی طرف اشارہ ہے جب کہ آپ شام پر حملہ آور ہونے کے لیے لشکر لیے جا رہے تھے اور راستہ میں معلوم ہوا کہ وہاں وبا پھیلی ہوئی ہے، تو لوگوں سے مشورہ کیا کہ کیا کرنا چاہیے، کوئی بات طے نہیں ہو رہی تھی، جب حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے آکر یہ روایت بیان کی آنحضرتؐ نے وبائی مقامات پر جانے سے منع فرمایا ہے'' تو یہ سن کر حضرت عمرؓ نے لشکر کو واپسی کا حکم دے دیا۔

(۳) حضرت عمرؓ اپنے زمانہ خلافت میں مجوسیوں سے جزیہ نہیں لیتے تھے، حضرت عبدالرحمنؓ بن عوف نے یہ بتایا کہ آنحضرت ہجر کے بعد مجوسیوں سے جزیہ لیتے تھے تو آپ نے بھی ان پر جزیہ لگا دیا۔

(۴) یہ ایک ایسی عورت کا معاملہ ہے جس کا شوہر اس حال میں مر گیا تھا کہ نہ تو ابھی اس نے اس کا مہر مقرر کیا تھا نہ اس سے مقاربت کی تھی، اس واقعہ کی تشریح آگے آتی ہے۔

(۵) حضرت ابوموسیٰؓ حضرت عمرؓ کے دروازے پر گئے اور جب تین بار آواز دینے کے باوجود کوئی جواب اندر سے نہ ملا تو واپس چلے، چند قدم گئے ہوں گے کہ حضرت عمرؓ نے خادم سے کہا کہ ان کو اندر بلا لو، مگر خادم نے باہر آکر ابوموسیٰؓ کو دروازہ پر نہ پایا۔ حضرت عمرؓ نے ان کو پکار کر بلوایا اور واپس جانے کی علت پوچھی، انھوں نے کہا کہ آنحضرتؐ کا ارشاد ہے کہ ''جب تین آوازیں دینے کے باوجود اجازت نہ ملے تو دروازہ سے ہٹ جاؤ'' حضرت عمرؓ نے کہا کہ اپنی اس روایت پر کوئی گواہی لاؤ ورنہ ٹھیک نہ ہوگا، چنانچہ حضرت ابوسعیدؓ خدری نے حضرت ابوموسیٰؓ کی توثیق کی تو حضرت عمرؓ نے اس کو تسلیم کر لیا۔

بعد آپ نے اسے تسلیم کر لیا۔

بنائے اختلاف

مختصر یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور مبارک بالعموم یہی تھا کہ آپ مسائل واحکام شرع، مجامع عام میں بیان فرمایا کرتے تھے، اب ہر صحابیؓ نے آپ کی عبادت کے ان ہی طریقوں اور آپ کے ان ہی فتووں اور فیصلوں کو یاد کر لیا جن کو اسے دیکھنے اور سننے کا موقع نصیب ہوا تھا، پھر اس نے ان میں سے ہر حکم کے قرائن حال پر نظر ڈال کر، علت متعین کی اور موقع ومحل کے ان قرائن وعلامات کو سامنے رکھ کر، جو اس کے نزدیک تعیین علت ومقصد کے لیے کافی اور اطمینان بخش تھے، کسی حکم کو مباح ٹھہرایا، کسی کو مستحب اور کسی کو منسوخ، اس باب میں ان لوگوں کا اعتماد صرف اپنے دل کے اطمینان پر تھا، استدلال کے (پر پیچ منطقیانہ) طریقوں سے ان کے ذہن آشنا نہ تھے، جیسا کہ تم سیدھے سادے دیہاتی باشندوں کو دیکھتے ہو کہ وہ آپس کی گفتگوؤں کا مطلب بآسانی سمجھتے جاتے ہیں اور (ان گفتگوؤں کے اندر استعمال ہونے والے) اشارات وکنایات اور تصریحات سے ان کو گفتگو کا مدعا سمجھنے میں آپ سے آپ اس طرح طمانیت حاصل ہوتی جاتی ہے کہ ان کو اس کی خبر بھی نہیں ہوتی۔

آغاز ووجوہ اختلاف

عہد رسالت تک تو لوگوں کا یہی حال رہا، اس کے بعد یہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہ مختلف اطراف وممالک میں پھیل گئے، اوران میں سے ہر ایک الگ الگ علاقے میں عوام کا رہنما بن گیا، اب ان کے سامنے زندگی کے بیشمار واقعات اور مسائل پیش ہونے شروع ہوئے، جن میں ان سے فتوے پوچھے جاتے، ہر صحابی اپنی منصوص معلومات یا اپنے استنباط کے مطابق ان کے جوابات دیتا اور اگر اس کو اپنے معلومات واستنباط میں کوئی چیز ایسی نہ ملتی جس سے وہ مسئلہ کا جواب دے سکتا تو اپنی رائے سے اجتہاد کرتا اور اس علت کو معلوم کرتا جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے منصوص احکام کی بنیاد رکھی تھی، پھر جس مقام پر اس کو وہ علت نظر آتی وہاں وہی حکم لگا دیتا مگر ایسے قیاسات کرتے وقت یہ لوگ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصد کا لحاظ کرنے میں اپنے مقدور بھر کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھتے تھے، اب یہاں سے ان کے درمیان اختلاف کا آغاز ہوتا ہے، جس کی

مختلف بنیادیں تھیں۔

(۱) حدیث نبوی سے واقفیت اور عدم واقفیت کا اختلاف

پہلی بنیاد یہ تھی کہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہ کو کسی امر کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم وارشاد معلوم تھا، لیکن دوسرے اس سے نابلد تھے، اس لیے انھوں نے مجبوراً اس مسئلہ میں اپنے اجتہاد سے کام لیا جس کی چند صورتیں یہ ہوتیں ہیں۔

اولاً یہ کہ یہ اجتہاد حدیث نبوی کے عین مطابق نکلا، اس کی مثال وہ روایت ہے جس کو امام نسائیؒ وغیرہ نے بیان کیا ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ سے ایک ایسی عورت کو (حق مہر وغیرہ کے) بارے میں استفسار کیا گیا جس کا شوہر مہر مقرر کرنے اور اس سے مقاربت کرنے سے پہلے ہی وفات پا گیا تھا، آپ نے جواب دیا کہ ایسے معاملے میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی فیصلہ مجھے معلوم نہیں، لوگ مہینہ بھر ان کے ہاں آتے اور اصرار کرتے رہے کہ کوئی حکم بیان کر دیں، تب انھوں نے اجتہاد کر کے یہ فیصلہ دیا کہ اس عورت کو اتنا مہر ملنا چاہیے تھا جتنا اس کی ہم مرتبہ عورتوں کا ہوا کرتا ہے، نہ کم نہ زیادہ، نیز اس کو عدت گزارنی ہوگی اور وہ شوہر کے ترکہ میں سے حصہ پائے گی''۔ یہ سن کر حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور انھوں نے بطور شہادت فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے قبیلہ کی ایک عورت کے بارے میں ایسا ہی حکم دیا تھا، حضرت ابن مسعودؓ کو یہ معلوم کر کے اتنی مسرت ہوئی کہ مشرف بہ اسلام ہونے کے بعد سے اب تک ایسی مسرت ان پر کبھی بھی نہ طاری ہوئی تھی۔

ثانیاً یہ کہ دو صحابیوں میں کسی مسئلہ کے متعلق بحث ہوئی اور اس سلسلہ میں اس طریقہ سے کوئی حدیث نبوی سامنے آئی جس سے اس کی صحت کا ظن غالب ہوتا تھا، اس لیے مجتہد نے اپنے اجتہاد کو چھوڑ کر حدیث رسولؐ کو اختیار کر لیا، مثال کے طور پر اس روایت کو لے لو جس کو ائمہ حدیث نے بیان کیا ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ کے خیال میں ''جو شخص طلوع صبح کے وقت جنبی رہا اس کا روزہ نہیں ہوتا''۔ لیکن جب بعض ازواج مطہرات نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل اس خیال کے خلاف بیان کیا تو حضرت ابو ہریرہؓ نے اپنے خیال سے رجوع کر لیا۔

ثالثاً یہ کہ اجتہاد کرنے والے صحابی کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث تو پہنچی مگر ایسے قابل

اطمینان طریقے سے نہیں پہنچی کہ اس کے صحیح ہونے کا اسے گمان غالب ہوتا، اس لیے مجتہد نے روایت کو ناقابل اعتبار سمجھتے ہوئے اپنے اجتہاد ہی پر عمل کیا، اس کی مثال فاطمہؓ بنت قیس کی اس حدیث سے ملتی ہے جس کو اصحاب اصول (یعنی صحاح ستہ کے مؤلفین) نے اپنی کتابوں میں درج کیا ہے کہ "فاطمہؓ نے حضرت عمرؓ کے روبرو آکر کہا "مجھ کو تین طلاقیں دی گئی تھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ تو مجھ کو زمانہ عدت کا نفقہ دلایا اور نہ مکان" آپ نے ان کی گواہی ماننے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ ہم ایک عورت کے قول کی بنا پر کتاب (۱) الٰہی کو نہیں چھوڑ سکتے، جس کے متعلق نہیں کہا جا سکتا کہ وہ صحیح کہہ رہی ہے یا غلط، تین طلاقیں پانے والی عورت کو نفقہ بھی ملنا چاہیے اور قیام گاہ بھی" نیز ان ہی فاطمہؓ بنت قیس کے قول "لا نفقة لها ولا سكنى" کو سن کر حضرت عائشہؓ نے فرمایا فاطمہ کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ اللہ کا خوف نہیں کرتی"۔

دوسری مثال بخاری ومسلم کی اس روایت میں موجود ہے کہ "حضرت عمرؓ بن خطاب کے خیال میں اگر جنبی کو غسل کے لیے پانی نہ ملے تو وہ تیمم سے پاکی حاصل نہیں کر سکتا، حضرت عمارؓ بن یاسر نے ان کے سامنے اپنا واقعہ بیان کیا کہ میں ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہم سفر تھا،

---

(۱) قرآن مجید کی آیت وَلَا تُخْرِجُوهُنَّ مِنْ بُيُوتِهِنَّ اور آیت اَسْكِنُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِنْ وُجْدِكُمْ سے معلوم ہوتا ہے کہ مطلقہ عورت کو زمانہ عدت تک گھر سے نہیں نکالنا چاہیے، بلکہ شوہر کو لازم ہے کہ اتنے وقت کے لیے اس کے لیے مکان مہیا کرے پھر آیت وَاَنْفِقُوا عَلَيْهِنَّ سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ عورت کو زمانہ عدت تک نفقہ بھی ملنا چاہیے، یہ آیات اپنے مفہوم میں بالکل مطلق اور عام ہیں، ان میں طلاق رجعی والی عورت کی کوئی تخصیص موجود نہیں ہے، اس لیے ان کا حکم ہر قسم کی مطلقہ عورتوں کے حق میں عام اور نافذ العمل ہوگا، حضرت عمرؓ نے قرآن کے اسی عموم کو سامنے رکھتے ہوئے فاطمہؓ بنت قیس کی روایت رد کر دی کیونکہ وہ آیات قرآنی کے خلاف پڑتی تھی۔

حضرت عمرؓ کے اس طرز عمل سے ہمیں ایک اہم اصول ہاتھ آتا ہے ظاہر ہے فاطمہ صحابیہ تھیں، اصول حدیث کی رو سے "الصحابة كلهم عدول" سے خارج نہ تھیں لیکن اس کے باوجود جب قرآن کے متبادر مفہوم سے ان کی روایت ٹکرائی تو حضرت عمرؓ نے اس کو تسلیم نہیں کیا، معلوم ہوا کہ احادیث میں صرف سند ہی قابل لحاظ شے نہیں ہے بلکہ متن بھی دیکھا جانا چاہیے، سند بالکل سلسلۃ الذہب ہی کیوں نہ ہو، پھر بھی حدیث میں غلطی کا امکان ہو سکتا ہے، سند کی صحت ہر حال میں صحت حدیث کو مستلزم نہیں، آخر فاطمہؓ بنت قیس کی روایت میں ضعف اسناد کا کون سا احتمال تھا؟

مجھ کو غسل کی حاجت ہوگئی، لیکن پانی نہ پا سکا، اس لیے (تیمّم کی خاطر) دھول میں لوٹ پوٹ لیا۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی اس کارروائی کا تذکرہ کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ تم کو صرف اتنا کرلینا کافی تھا (یہ کہتے ہوئے) آپؐ نے اپنے دونوں ہاتھ زمین پر مارے اوران کو اپنے منھ اور اپنے ہاتھوں پر مل لیا، حضرت عمرؓ نے عمارؓ کے اس بیان کو قبول نہیں کیا اور کسی پوشیدہ ضعف کی بنا پر جو ان کو اس روایت میں نظر آیا، ان کے نزدیک یہ روایت حجت نہیں ٹھہری اگرچہ آگے چل کر دوسرے طبقہ میں یہ حدیث اور بہت سے طریقوں سے مشہور ہوگئی اور اس کے ضعیف ہونے کا گمان ماند پڑ گیا اس لیے لوگ اس پر عمل پیرا ہوگئے۔

رابعاً یہ کہ اجتہاد کرنے والے صحابی کو حدیث سرے سے پہنچی ہی نہیں مثلاً مسلم کی یہ روایت کہ ''حضرت ابن عمر عورتوں کو یہ حکم دیتے تھے کہ وہ جب غسل کریں تو اپنے سر کے بال کھول لیں، حضرت عائشہؓ کو اس کی اطلاع ہوئی، تو انھوں نے فرمایا تعجب ہے ابن عمرؓ پر کہ وہ عورتوں کو بال کھول ڈالنے کا حکم دیتے ہیں! اگر ایسا ہی ہے تو سیدھے سے یہ کیوں نہیں کہہ دیتے کہ عورتیں اپنے سر ہی منڈا ڈالیں حالانکہ میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہی برتن سے غسل کرتے تھے اور میں اپنے بالوں کے سلسلہ میں اس کے سوا کچھ نہیں کرتی تھی کہ ان پر تین بار پانی بہا دیتی اور کبھی ان کو کھولتی نہیں تھی''۔

دوسری مثال امام زہریؒ کے بیان کردہ اس واقعہ میں ہے کہ ''ہندؓ کو یہ اطلاع نہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مستحاضہ کی حالت میں بھی نماز پڑھنے کی اجازت دی ہے، اس لیے وہ اس حالت میں نماز نہیں پڑھتیں اور (ترک نماز کے غم سے) رویا کرتیں''۔

(۲) فعل رسولؐ کی تعیین نوعیت میں اختلاف

اختلاف صحابہؓ کی دوسری بنیاد یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک کام کرتے تو سب نے دیکھا، (مگر افکار بشری میں فطری تفاوت کی وجہ سے اس فعل کی نوعیت سمجھنے میں اختلاف ہوگیا) پھر کسی نے تو اس فعل رسول کو عبادت سمجھا اور کسی نے اس کو صرف اباحت پر محمول کیا، مثلاً ''تحصیب''، یعنی سفر حج کے دوران ابطح کی وادی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اترنا، جسے اصحاب رسول نے روایت کیا ہے، اب آپ کا یہ اترنا حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور ابن عمرؓ کے

نزدیک تو بحیثیت عبادت تھا، اس لیے یہ لوگ اس کو حج کی سنتوں میں شمار کرتے ہیں لیکن حضرت عائشہؓ اور ابن عباسؓ کے خیال میں یہ اتر نا محض ایک اتفاقی امر تھا نہ کہ کسی سنت کے طور پر۔

دوسری مثال

''جمہور کے نزدیک خانۂ کعبہ کا طواف کرتے وقت ''رمل'' یعنی اکڑ کر چلنا سنت ہے، لیکن حضرت ابن عباسؓ کا فرمانا یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو رمل کیا تھا وہ محض اتفاقی طور پر اور ایک عارضی سبب سے تھا، یعنی مشرکین مکہ کا یہ طعن کہ ''مسلمانوں کو یثرب (مدینہ) کے بخار نے بالکل چور کر ڈالا ہے'' (اسی طعن کے جواب میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو اکڑ کر چلنے کا وقتی حکم دیا تھا ورنہ) یہ فعل حج کی کوئی مستقل سنت نہیں ہے۔

(۳) وہم تعبیر کا اختلاف

اختلاف کی تیسری بنیاد یہ ہے کہ افعال رسولؐ کے بیان کرنے میں لوگوں نے مختلف گمانوں سے کام لیا مثلاً رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے حج ادا فرمایا اور تمام صحابہؓ نے اس کا مشاہدہ کیا لیکن اس حج کی نوعیت بیان کرتے وقت کسی نے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تمتع (۱) کیا تھا۔ کسی نے کہا آپؐ نے حج قران (۲) ادا کیا تھا اور کسی کو یہ خیال ہوا کہ آپ کا حج حج افراد (۳) تھا۔

اس کی دوسری مثال حضرت سعیدؓ بن جبیر کی یہ روایت ہے جس کو ابوداوٗد نے نقل کیا ہے کہ:

''میں نے (حضرت سعیدؓ) نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اے ابوالعباسؓ: یہ دیکھ کر مجھے بڑی حیرانی ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احرام حج باندھ لینے کے بعد جو تلبیہ فرمایا تھا اس کے متعلق اصحاب رسول میں بیان اور رائے کا اتفاق موجود نہیں ہے، ابن عباس

---

(۱) حج تمتع کی شکل یہ ہوتی ہے کہ آدمی حج کے مہینوں میں جا کر عمرہ ادا کرے اور سر منڈا کر احرام کھول دے پھر ذی الحجہ کی آٹھویں تاریخ کو از سر نو حج کا احرام باندھے اور حج ادا کرے۔

(۲) ''قران'' کی شکل یہ ہے کہ آدمی عمرہ اور حج دونوں کا احرام بیک وقت باندھے اور دونوں کو ادا کر کے احرام کھولے۔

(۳) ''افراد'' صرف حج ادا کرنے کو کہتے ہیں، جس کے ساتھ عمرہ نہ کیا جائے۔

رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں اس واقعہ کی حقیقت سب سے بہتر جانتا ہوں، اصل بات یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ایک ہی حج ادا فرمایا اس لیے لوگوں میں اس کی (تفصیلات) کے متعلق (قدرتی طور پر) اختلاف ہو گیا، صورت واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حج کی خاطر مدینہ سے چلے اور جب مسجد ذی الحلیفہ میں آپؐ نے دوگانۂ احرام اداء فرمایا تو اسی جگہ حج کا احرام باندھا، اور فوراً تلبیہ (۱) کیا، اس تلبیہ کی آواز کچھ لوگوں کے کانوں تک پہنچی جنھوں نے اس کو یاد کر لیا، اس کے بعد آپؐ اونٹنی پر سوار ہو گئے، جب اونٹنی آپؐ کو لے کر اٹھی تو آپ نے پھر تلبیہ کیا اور اس تلبیہ کو بھی کچھ لوگوں نے سنا، بات یہ تھی کہ لوگ مختلف گروہوں کی شکل میں خدمت رسالتؐ میں چلے آتے تھے، پس جب ایک گروہ نے اونٹنی کے کھڑے ہونے کے وقت آپؐ کو تلبیہ کرتے سنا تو وہ یہ سمجھ بیٹھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تلبیہ صرف اس وقت کیا جو ناقہ آپ کو لے کر اٹھی، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس جگہ سے آگے بڑھے، جب بیدا (نامی مقام) کی بلندی پر چڑھے تو آپؐ نے پھر تلبیہ کیا، کچھ اور لوگوں نے آپؐ کو یہ تلبیہ کرتے ہوئے سنا اور وہ اپنی جگہ یہ خیال کر بیٹھے کہ آپؐ نے تلبیہ صرف اس وقت کیا جب بیدا کی بلندی پر چڑھ رہے تھے حالانکہ بخدا آپؐ نے اپنی جائے نماز ہی پر حج کی نیت کر لی تھی اور جب آپؐ کو لے کر اونٹنی کھڑی ہوئی اس وقت بھی آپؐ نے تلبیہ کیا اور جب بیدا کی بلندی پر چڑھے اس وقت بھی کیا۔

(۴) سہو ونسیان کا اختلاف

اختلاف صحابہ کی چوتھی بنیاد ان کی بھول چوک ہے (جو لازمۂ بشریت ہے)، اس کی مثال حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق اس روایت میں موجود ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عمرہ ماہِ رجب میں کیا" حضرت عائشہؓ کو اس کی اطلاع ہوئی تو فرمایا کہ "ابن عمر کو سہو ہو رہا ہے" (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رجب میں کوئی عمرہ نہیں کیا)

(۵) ضبط مدعائے حدیث کا اختلاف

پانچویں بنیاد اختلاف کی یہ ہے کہ بسا اوقات آپؐ جو کچھ فرماتے اس کے اصلی اور پورے

---

(۱) تلبیہ حج یہ ہے: لبیک اللھم لبیک لاشریک لک لبیک، ان الحمد والنعمۃ لک والملک لا شریک لک ۔

مفہوم کو ہر شخص یکساں طور پر اپنی گرفت میں نہ لیتا، مثلاً جب حضرت ابن عمرؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت بیان کی کہ ''میت کے پسماندگان کو نوحہ کرنے سے اس پر عذاب ہوتا ہے'' حضرت عائشہؓ نے ان کے یہ الفاظ سنے تو فرمایا کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ نے ارشاد رسالت کو اس کے اپنے صحیح موقع و محل اور مدعا کے ساتھ محفوظ نہیں رکھا، اصل واقعہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک یہودی عورت کی قبر سے گزرے جس کے اعزہ رو دھو رہے تھے، آپؐ نے فرمایا یہ لوگ یہاں اس کا نوحہ و ماتم کر رہے ہیں اور وہ قبر میں مبتلائے عذاب ہے''۔ دیکھو کہ واقعہ کس طرح ایک خاص میت سے متعلق تھا لیکن حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس مخصوص موقع بیان کو ذہن سے نکال دیا اور اعزہ کی گریہ وزاری ہی کو میت پر عذاب کی علت گمان کر بیٹھے، اس طرح اس بات کو انھوں نے ہر میت کے سلسلے میں ایک عام اصول کی حیثیت دے دی۔

(۶) تعیین علت کا اختلاف

چھٹی بنیاد یہ ہے کہ احکام شرع کی علت معین کرنے میں حضرات صحابہؓ کی رائیں مختلف ہوگئیں، جیسے جنازہ کے لیے اٹھ کھڑے ہونے کا مسئلہ بعض صحابہؓ کا کہنا یہ ہے کہ ایسا فرشتوں کی تعظیم میں کیا جاتا ہے (کیونکہ ہر جنازہ کے ساتھ فرشتے ہوتے ہیں) تو اس خیال کے مطابق ہر جنازہ کے لیے کھڑا ہو جانا چاہیے، خواہ مومن کا جنازہ ہو یا کافر کا، لیکن بعض دوسرے حضرات کا خیال یہ ہے کہ یہ تمام قیام موت کے ہول کی وجہ سے ہے، تو اس صورت میں بھی اُٹھ کھڑے ہونے کا یہ حکم ہر جنازہ کے لیے عام ہوگا لیکن کچھ صحابہ کا فرمانا یہ ہے کہ ایک مرتبہ ایک یہودی کا جنازہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب سے گزرا تو آپؐ کو اس بات سے تنفر ہوا کہ ایک یہودی لاش میرے سر سے اونچی ہو کر گزرے، اس لیے آپ کھڑے ہوگئے اگر اس علت کو صحیح مانا جائے تو یہ قیام صرف جنازہ کفار کے لیے مخصوص ہوگا۔

(۷) طرز تطبیق کا اختلاف

ساتویں بنیاد صحابہؓ کا وہ اختلاف رائے ہے جو مختلف احکام شرع کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے میں پیش آیا، مثلاً یہ کہ جنگ خیبر کے موقع پر آنحضرتؐ نے متعہ کی اجازت دی، بعد میں

اس کی ممانعت کر دی، پھر جنگ اوطاس کے زمانہ میں دوبارہ یہ رخصت عطا فرمائی اس کے بعد پھر اس سے روک دیا، اب حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا یہ کہنا ہے کہ ضرورت کی بنا پر یہ اجازت دی گئی تھی اور جب ضرورت جاتی رہی تو اجازت بھی واپس لے لی گئی، مگر حکم اپنی جگہ باقی ہے لیکن جمہور کا یہ کہنا ہے کہ متعہ کی رخصت بطور اباحت تھی جس کو ممانعت نے ہمیشہ کے لیے منسوخ کر دیا۔

دوسری مثال:۔

''رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے استنجا کرتے وقت قبلہ رو ہونے سے منع فرمایا ہے، اس کے متعلق کچھ صحابہ کا مذہب یہ ہے کہ یہ حکم بالکل عام اور غیر منسوخ ہے لیکن حضرت جابرؓ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو وفات سے ایک سال قبل قبلہ کی طرف منھ کر کے پیشاب کرتے دیکھا، اس لیے ان کا خیال یہ ہے کہ آپؐ کے اس فعل نے اس پہلی ممانعت کو منسوخ کر دیا، اسی طرح حضرت ابن عمرؓ نے آنحضرتؐ کو قبلہ کی طرف پشت اور شام کی طرف منھ کر کے قضائے حاجت فرماتے ہوئے دیکھا تھا اس لیے انھوں نے آنحضرتؐ کے اس فعل سے ان لوگوں کے قول کی تردید فرمائی (جو کہتے تھے کہ قبلہ کی طرف پشت کر کے استنجا کرنا شرعاً ممنوع ہے) پھر کچھ لوگوں نے دونوں روایتوں میں مطابقت پیدا کرنے کی سعی کی، چنانچہ امام شعبیؒ وغیرہ نے یہ رائے قائم کی کہ یہ ممانعت صرف کھلے میدانوں سے متعلق ہے ورنہ اگر آدمی پاخانوں کے اندر ہو تو اس کے لیے قبلہ کی طرف پشت یا رخ کرنے میں کوئی حرج نہیں لیکن بعض دوسرے حضرات اس طرف گئے ہیں کہ آنحضرتؐ کا یہ قول (جس میں ممانعت موجود ہے) اپنی جگہ بالکل قائم و ثابت ہے اور اس کا حکم عام ہے۔ رہ گیا آپؐ کا فعل سو ہو سکتا ہے کہ وہ آپ کے مخصوصات میں سے ہو، اس طرح وہ فعل رسول قول رسول کا نہ منسوخ کرنے والا ہوگا نہ اس کو بعض جگہوں کے ساتھ مخصوص کرنے والا۔

تاریخ اختلاف کا دوسرا دور
(عہد تابعین)

تابعین کا اختلاف

اس طرح صحابہؓ کرام کے مذاہب مختلف ہوگئے۔ پھر یہی اختلافات وراثتاً تابعین تک پہنچے۔ ہر تابعی کو جو کچھ مل سکا اسی کو اس نے اپنالیا اور آنحضرتؐ کی جو حدیثیں اور صحابہؓ کے جو مذاہب اس نے سنے ان کو محفوظ اور ذہن نشین کرلیا، نیز صحابہ کے جو مختلف اقوال اس کے سامنے آئے ان میں اس نے اپنی فہم کی حد تک مطابقت پیدا کی، اور کبھی بعض اقوال کو بعض پر ترجیح دی، حتی کہ اس ضمن میں ایسا بھی ہوا کہ بعض اقوال ان کی نگاہوں میں بالکل ہی ناقابل اعتنا ہو کر رہ گئے، اگرچہ وہ صف اوّل کے صحابہ سے مروی تھے، چنانچہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ و ابن مسعودؓ کا یہ قول کہ جنابت کے لیے تیمم نہیں ہے، تابعین تک پہنچا مگر ان احادیث کی بنا پر ان کے نزدیک وہ کوئی اہمیت نہ حاصل کرسکا جو عمارؓ اور عمرانؓ بن حصین وغیرہ اصحاب سے مروی ہو کر مشہور ہو چکی تھیں، پس اس حالت میں قدرتی طور پر علمائے تابعین میں سے ہر ایک کا علیحدہ مذہب ہوگیا اور مختلف شہروں میں مختلف ائمہ کی علیحدہ علیحدہ امامتیں قائم ہوگئیں، مثلاً مدینہ میں سعید بن مسیّب اور سالم بن عبداللہ عوام کے مرجع و امام بن گئے، پھر ان کے بعد زہریؒ اور قاضی یحییٰؒ بن سعید اور ربیعہ بن عبدالرحمن نے یہ حیثیت حاصل کی، مکہ میں عطاءؒ بن ابی رباح اور کوفہ میں ابراہیم نخعیؒ اور شعبیؒ

نے مسند امامت سنبھالی، اسی طرح حسن بصریؒ بصرہ میں، طاؤسؒ بن کیسان یمن میں اور مکحولؒ شام میں پیشوائے دین اور ترجمان شرع تسلیم کیے گئے، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے کچھ دلوں میں ان حضرات کے علوم و معارف کی پیاس پیدا کی اور انہیں ان علوم کی تحصیل کا شوق پیدا ہوا، چنانچہ انھوں نے ان علمائے کبار سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں، صحابہ کے اقوال اور فتاویٰ اور خود ان کے اپنے مذاہب اور تحقیقات کو جمع کیں، پوچھنے والوں نے ان سے فتوے پوچھے، (زندگی کے بے شمار) مسائل ان کے سامنے آئے اور کتنے ہی معاملات ان کے روبرو پیش ہوئے (جن میں انہیں فتوے دینے پڑے)

تدوین فقہ کی ابتداء

سعیدؒ بن مسیّب اور ابراہیم نخعیؒ وغیرہ نے باقاعدہ فقہ کے تمام ابواب جمع کیے، ہر باب میں وہ اپنے کچھ اصول رکھتے تھے، جن کو انھوں نے سلف سے حاصل کیا تھا۔

سعیدؒ بن مسیب اور ان کے تلامذہ اس امر کے قائل تھے کہ حرمین کے باشندے تفقہ میں سب سے بلند مقام رکھتے ہیں۔ اس لیے ان کے مذہب کی بنیاد حضرت عمرؓ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے فتاویٰ اور احکام پر قائم ہے یا پھر حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عائشہؓ اور حضرت بن عباسؓ کے فتووں اور قضاۃ مدینہ کے فیصلوں پر، چنانچہ جہاں تک اللہ تعالیٰ نے ان کو توفیق عطا فرمائی، انھوں نے ان احکام اور فتاویٰ کو جمع کیا، پھر ان پر بصیرت اور تحقیق کی نگاہ ڈال کر ان کا جائزہ لیا، جس پر علمائے مدینہ کا اتفاق نظر آیا اس پر تو پوری مضبوطی سے جم گئے اور جس چیز میں ان کا اختلاف دکھائی دیا اس کے بارے میں انھوں نے اس رائے کو اختیار کیا جو کسی بھی وجہ سے ان کے نزدیک زیادہ مضبوط اور قابل ترجیح تھی، خواہ اس وجہ سے کہ اکثر علماء نے اسی کو اختیار کیا ہے یا اس بنا پر کہ وہ کسی مضبوط قیاس کے یا کتاب و سنت کے کسی صریح استنباط کے موافق پڑتی ہے یا کسی اور بنا پر پھر جب ان لوگوں کو علمائے مدینہ سے حاصل کیے ہوئے مجموعۂ فتاویٰ میں کسی مسئلہ کا جواب نہ ملتا تو ان کے اقوال سے استنباط کرتے اور ان اقوال کے اشارات اور مقتضیات کا سراغ لگاتے، اس طرح ان کے ہاں ہر ہر باب کے متعلق مسائل کا انبار لگ گیا۔

براہیم نخعیؒ اور ان کے تلامذہ کا خیال تھا کہ عبداللہ بن مسعودؓ اور ان کے فیض یافتگان فقاہت

میں سب سے ممتاز ہیں، چنانچہ علقمہؒ نے مسروقؒ سے کہا تھا کہ ''کیا کوئی صحابی عبداللہ بن مسعودؓ سے بھی بڑا فقیہ ہے''؟ اسی طرح امام ابوحنیفہؒ نے امام اوزاعیؒ سے فرمایا کہ ''ابراہیم نخعیؒ، سالم بن عبداللہ سے زیادہ فقیہ ہیں اور اگر عبداللہ بن عمرؓ کو صحابیت کا شرف حاصل نہ ہوتا تو میں کہہ دیتا کہ علقمہؒ ان سے زیادہ فقیہ ہیں، رہے عبداللہ بن مسعودؓ تو وہ عبداللہ بن مسعود ہی ہیں، ان کا کیا پوچھنا'' ان حضرات کے مسلک فقہی کی بنیاد حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت علیؓ کے فتووں اور فیصلوں پر، نیز قاضی شریحؒ وغیرہ قضاۃ کوفہ کے فیصلوں پر ہے، ابراہیم نخعیؒ نے اپنے مقدور بھر ان احکام وفتاویٰ کو اکٹھا کیا اور ان کے ساتھ وہی طرز عمل اختیار کیا جو سعید بن مسیبؒ وغیرہ نے علمائے مدینہ کے آثار واقوال کے متعلق اختیار کیا تھا، نیز اس ذخیرہ سے ان لوگوں نے مزید مسائل کی تخریج بھی اسی طرح کی جس طرح انھوں نے کی تھی، انجام کار ان کے پاس بھی فقہ کے ایک ایک باب میں بے شمار مسائل منضبط ہوگئے۔

سعید بن مسیبؒ فقہائے مدینہ کے ترجمان تھے اور ان کے درمیان، حضرت عمرؓ کے فیصلوں اور حضرت ابوہریرہؓ کی روایتوں کا ان سے بڑا کوئی حافظ نہ تھا، اسی طرح ابراہیم نخعیؒ فقہائے کوفہ کے ترجمان تھے، جب یہ دونوں حضرات کسی کی طرف منسوب کیے بغیر کوئی مسئلہ بیان کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ فی الواقع مسئلہ کسی کی طرف منسوب نہیں اور بہرحال ان کا اپنا ہی اجتہاد ہے، بلکہ ایسے مسائل بالعموم کسی نہ کسی سابق فقیہ سے اشارۃً یا صراحتاً ضرور منسوب ہوتے ہیں۔ بالآخر یہ دونوں اپنے اپنے قرب وجوار کے فقہا کا مرکز بن گئے، جنھوں نے ان سے فقہ کا علم حاصل کیا، اس میں تفکر کیا اور اس سے مزید مسائل اور جزئیات نکالے۔

تاریخ اختلاف کا تیسرا دور
(عہد تبع تابعین)

علمائے تبع تابعین

عہد تابعین کے ختم ہونے پر اللہ تعالی نے علم دین کے خادموں کا ایک گروہ پیدا کر دیا، تاکہ وہ وعدہ پورا ہو جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے اس علم کے متعلق نکلا تھا کہ "آنے والی نسلوں میں سے ہر نسل کے عادل لوگ اس علم کے امانت دار ہوں گے" چنانچہ ان خدام دین نے ایسا ہی کیا، انھوں نے ان علمائے تابعین سے، جن سے وہ مل سکے، وضو، غسل، نماز، حج، نکاح، لین دین، وغیرہ ان تمام مسائل کے، جو زندگی میں عام طور سے پیش آتے ہیں، شرعی طریقے اخذ کیے، رسولؐ خدا کی حدیثیں نقل کیں، مختلف شہروں کے قاضیوں کے فیصلے اور مفتیوں کے فتوے جمع کیے، مسائل دریافت کیے اور پھر ان سارے اُمور میں بطور خود اجتہاد کیا حتی کہ ایک گروہ نے انہیں اپنا پیشوا تسلیم کر لیا اور وہ امور شرعیہ میں مستند قرار پا گئے، یہ لوگ بھی اپنے اپنے شیوخ کے طریقے پر چلے اور انھوں نے سلف کے اقوال وفتاوی کے اشارات اور مقتضیات معلوم کرنے میں پوری دیدہ ریزی سے کام لیا، لوگوں کو فتوے دیئے، احکام سنائے، روایتیں بیان کیں اور علم سکھائے۔

ان علماء کا طرزِ فکر و عمل

اس طبقہ کے علماء کا طرزِ فکر و عمل بالکل ایک ہے جس کی مختصر تشریح یہ ہے کہ:۔

(۱) ان کے نزدیک مسند اور مرسل دونوں ہی قسم کی حدیثیں لے لینے کے قابل تھیں۔

(۲) ان کا فیصلہ یہ تھا کہ صحابہؓ اور تابعین کے اقوال سے شرعی استدلال ہوسکتا ہے، کیونکہ ان بزرگوں کے متعلق یہ معلوم ہے کہ ان کے اقوال کی دو ہی حیثیتیں ہوسکتی ہیں۔

یا تو وہ فی نفسہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کی ہوئی حدیثیں ہیں جن کو انھوں نے (بعض مصالح کا لحاظ کرتے ہوئے) مختصر کر کے موقوف (۲) بنالیا ہے چنانچہ جب ابراہیم نخعیؒ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ روایت بیان کی جس میں محاقلہ (۳) اور مزابنہ (۴) کی ممانعت ہے اور اس کے بعد ان سے کہا گیا ''کیا آپ کو اس کے سوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث (مرفوع) یاد نہیں''؟ تو انھوں نے فرمایا کہ ''یاد کیوں نہیں ہے، مگر میں حدیث مرفوع بیان کرنے کے مقابلے میں یوں کہنا زیادہ مناسب سمجھتا ہوں کہ ''عبداللہ نے یہ فرمایا ہے'' یا ''علقمہ کا یہ قول ہے'' اسی طرح امام شعبیؒ سے جب ایک حدیث کے متعلق استفسار کیا گیا اور یہ کہا گیا کہ اس کی سند کو براہ راست پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچایا جاتا ہے تو انھوں نے جواب دیا ''ایسا کرنا ٹھیک نہیں بلکہ ہم کو زیادہ مناسب (اور محتاط) طریقہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ سند روایت کو صحابہ تک پہنچا کر چھوڑ دیا جائے، تاکہ اگر اس کے الفاظ میں کوئی کمی بیشی ہوگئی ہو تو وہ آنحضرتؐ کی طرف منسوب نہ ہوسکے بلکہ صحابہ ہی تک رہ جائے۔

---

(۱) مسند وہ حدیث ہے جس کی سند بیان کی جائے اور مرسل وہ جس کی سند بیان کیے بغیر کوئی تابعی یا تبع تابعی یوں کہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا یا ایسا کیا ہے۔

(۲) موقوف مرفوع کے بالمقابل حدیث کی ایک قسم کا نام ہے، مرفوع وہ روایت ہے جس میں تصریح ہو کہ حضورؐ نے ایسا فرمایا ہے اور موقوف وہ جس میں صحابی ایک بات کہے اور صراحت کے ساتھ اسے حضورؐ کی طرف منسوب نہ کرے۔

(۳) محاقلہ کے معنی ہیں خوشوں سمیت گندم کو صاف کی ہوئی گندم کے عوض بیچنا یا کچی کھیتی بیچنا۔

(۴) مزابنہ کے معنی ہیں درخت پر لگی ہوئی تر کھجوروں کو توڑی ہوئی خشک کھجوروں کے عوض بیچنا۔

یا پھر وہ کتاب وسنت سے ان کے استنباط کیے ہوئے احکام، اوران کی اپنی اجتہادی رائیں ہیں (لیکن ان کے استنباط اور اجتہاد کے سلسلہ میں یہ بھولنا نہ چاہیے کہ) یہ بزرگ اِن اُمور میں طرزِ عمل کی جوخوبی اور فکر ورائے کی جو درستگی رکھتے تھے اس میں بعد کے آنے والے حضرات ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے، نیز وہ ان سے باعتبار زمانہ مقدم اور باعتبار علم افضل بھی تھے، اس لیے ان کے اقوال پر عمل کرنا کوئی ایسا مسئلہ نہ تھا جس میں دو رائیں ہوتیں، بجز اس صورت کے جب کہ ان میں خود اختلاف رائے ہو جائے، یا کوئی حدیث ان کے اقوال کے بالکل مخالف واقع ہو۔

(۳) اگر کسی مسئلہ میں انہیں احادیث باہم مختلف نظر آتیں تو وہ (اصل حکم شرع معلوم کرنے کے لیے) اقوال صحابہ کی طرف رجوع کرتے اگر وہاں یہ نظر آتا کہ صحابہ نے کسی حدیث کو منسوخ یا قابل تاویل قرار دیا ہے، یا نسخ وتاویل کی کسی تصریح کے بغیر ہی اس کے ترک کر دینے پر متفق الرائے ہو گئے ہیں کہ اس کا مطلب بھی دراصل حدیث کو ضعیف یا منسوخ یا قابل تاویل ہی قرار دینا ہے، تو ان تمام صورتوں میں یہ علماء حضرات صحابہ ہی کی پیروی کرتے، یعنی اس حدیث کو وہی حیثیت اور وزن دیتے جو صحابہ کے یہاں پاتے، یہی وہ حقیقت ہے جو کتے کے جھوٹے برتن کا حکم بیان کرنے والی حدیث (۱) کے متعلق حضرت امام مالکؒ کے منہ سے نکلی تھی کہ "یہ حدیث روایت تو ہوئی ہے مگر میں نہیں کہہ سکتا کہ اس کی حقیقت کیا ہے" اس کا مطلب یہ تھا کہ میں نے اس پر فقہائے سلف کو عمل کرتے ہوئے نہیں پایا۔

(۴) اگر صحابہؓ اور تابعین کے درمیان کسی مسئلہ میں اختلاف رائے نظر آتا تو ہر عالم اُس رائے اور مسلک کو اختیار کرتا جو اس کے اپنے شہر کے علماء اور اس کے اساتذہ کا مسلک ہوتا، کیونکہ وہ ان کے اقوال کی کمزوریوں اور مضبوطیوں سے زیادہ باخبر اور ان اقوال سے مناسبت رکھنے والے اصولوں کا بہتر راز داں ہوتا، پھر اس کا دل اپنے اساتذہ کے فضل وکمال اور تبحر علمی سے زیادہ متاثر بھی ہوتا (اس لیے اس کا ایسا کرنا ایک قدرتی امر تھا) چنانچہ حضرت عمرؓ، عثمانؓ، ابن عمرؓ، عائشہ صدیقہؓ، ابن عباسؓ، زید بن ثابتؓ وغیرہ صحابہ عظام اور ان کے شاگردانِ جلیل مثلاً سعیدؒ بن

---

(۱) پوری حدیث یہ ہے کہ جب کتا کسی برتن میں منہ ڈال دے تو سات بار دھوؤ، اس کے بعد ایک بار مٹی سے مانجھ کر صاف کرو۔

مسیب، جو حضرت عمرؓ کے فیصلوں اور حضرت ابو ہریرہؓ کی روایتوں کے سب سے بڑے حافظ تھے۔ اور عروہؒ، سالمؒ، عطاءؒ، عکرمہؒ اور عبیداللہؒ بن عبداللہ وغیرہ کا مذہب اہل مدینہ کے لیے دوسرے مذاہب کی بہ نسبت زیادہ قابل قبول ٹھیرا، اس وجہ سے بھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ (۱) کے بڑے فضائل بیان فرمائے ہیں، اور اس سبب سے بھی کہ مدینہ ہر زمانہ میں فقہاء اور علماء کا مرکز رہا ہے، یہی وجہ ہے کہ امام مالکؒ علماء مدینہ کی شاہراہ سے ہٹ کر کبھی کوئی قدم نہیں اٹھاتے، اور ان کے متعلق یہاں تک مشہور ہے کہ وہ اہل مدینہ کے اجماع کو حجت شرعی مانتے تھے، اسی طرح امام بخاریؒ نے اپنی کتاب میں ایک باب باندھا ہے جس کا نام ہے "**باب فی الاخذ بما اتفق علیہ الحرمان**" یعنی جس بات پر اہل مکہ اور اہل مدینہ دونوں کا اتفاق ہو، اس کو اختیار کر لینا چاہیے اس کے بالمقابل حضرت عبداللہؓ بن مسعود اور ان کے شاگردوں کے اقوال اور حضرت علیؓ اور قاضی شریحؒ اور شعبیؒ کے فیصلے، اور ابراہیم نخعیؒ کے فتاویٰ اہل کوفہ کی نگاہ میں دوسرے اقوال و مذاہب کی بہ نسبت زیادہ ترجیح اور پیروی کے لائق قرار پائے۔ چنانچہ یہی نقطۂ نگاہ تھا جس کے باعث علقمہؒ نے تشریک (۲) کے مسئلہ میں مسروقؒ کو زید بن ثابتؓ کے قول کی طرف مائل دیکھ کر یہ الفاظ کہے تھے کہ "کیا کوئی صحابی عبداللہؓ بن مسعود سے زیادہ علم و تفقہ رکھتا ہے؟" مسروقؒ نے جواب دیا کہ "نہیں، ایسا تو نہیں ہے، لیکن میں نے زید بن ثابتؓ اور دوسرے باشندگان مدینہ کو تشریک کرتے دیکھا ہے (اس لیے میرا خیال ہوا کہ یہ جائز ہے) الغرض اس دور کے ہر عالم کے نزدیک اس کے اپنے ہی شیوخ اور علماء شہر کے اقوال مرجح اور قابل اتباع ہوتے تھے، اہل شہر جس امر پر متفق ہوتے اس کو تو یہ علماء دانتوں سے پکڑ لیتے، چنانچہ امام مالکؒ ایسے ہی مسائل کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ "جس سنت میں (اہل مدینہ کا) کوئی اختلاف نہیں ہے وہ ہمارے نزدیک ایسی اور ایسی ہے" یعنی (بالکل ثابت اور واجب العمل ہے) اور اگر یہ فقہائے شہر کسی مسئلہ میں مختلف الرائے دکھائی پڑتے تو ان مختلف رایوں میں سے یہ حضرات اس رائے کو اختیار کرتے جو ان

---

(۱) آپؐ نے فرمایا تھا کہ جلد ہی لوگ طلب علم کی خاطر سواریاں دوڑائیں گے اور مدینہ کے عالم سے بڑھ کر کوئی صاحب علم و فضل نہ پائیں گے۔

(۲) تشریک کا مطلب یہ ہے کہ مالک زمین اپنی زمین بٹائی پر کاشت کرنے کے لیے دوسرے کو دیدے۔

کے خیال میں زیادہ مضبوط اور راجح ہوتی'' اس امر کا فیصلہ کہ کون سی رائے مضبوط اور راجح ہے، اس بات سے ہوتا کہ اکثریت کس طرف ہے یا یہ کہ کون سا قول مضبوط قیاس پر مبنی ہے، یا یہ کہ کون سا مذہب کتاب وسنت کی تخریجات سے زیادہ موافقت رکھتا ہے جہاں امام مالکؒ یوں فرماتے کہ ''یہ بات ان تمام باتوں میں سب سے بہتر ہے جو اس مسئلہ کے متعلق میرے علم میں آئی ہیں'' تو در اصل اسی طریق فکر وطرز عمل کا اظہار کرتے ہیں لیکن اگر تیسری صورت پیش آتی یعنی اگر یہ علماء اپنے شہر کے صحابہ اور تابعین کے مجموعۂ اقوال میں کسی مسئلہ کا کوئی جواب سرے سے پاتے ہی نہ تو بھی ان سے صرف نظر کر کے اس مسئلہ کا حل نہ ڈھونڈتے بلکہ اس وقت بھی وہ ان ہی کے اقوال کو بنیاد قرار دے کر اس سے استنباط کرتے اور ان کے اشارات ومقتضیات کی پوری جستجو کر کے جواب مسئلہ کا سراغ لگاتے۔

علماء امت کا یہی وہ طبقہ ہے جس کے دل میں یہ بات ڈالی گئی، کہ فقہ پر کتابیں مرتب کی جائیں، چنانچہ مدینہ میں امام مالکؒ اور محمدؒ بن عبدالرحمن بن ابی ذئب نے، مکہ میں ابن جریجؒ اور ابن عیینہ نے۔ کوفہ میں امام ثوریؒ نے اور بصرہ میں ربیعؒ بن صبیح نے فقہ میں مستقل کتابیں لکھیں۔ ان تمام حضرات کا طریقۂ تدوین وہی تھا جس کی تفصیل اوپر بیان ہو چکی ہے۔

مشہور عام فقہی مذاہب

(۱) امام مالکؒ اور مذہب مالکی

خلیفہ منصور جب حج کے لیے گیا تو اس نے امام مالکؒ سے کہا ''میرا قصد یہ ہے کہ آپ کی تصنیفات کے متعدد نسخے نقل کراؤں اور مسلمانوں کے ہر ہر شہر میں ایک ایک نسخہ بھجوادوں، اور حکم دے دوں کہ سب لوگ بس ان ہی کتابوں کے مطابق عمل کریں اور ان کو چھوڑ کر کسی اور طرف نہ جائیں'' امام مالکؒ نے جواب دیا کہ ''اے امیر المومنین! ایسا نہ کیجیے کیونکہ لوگوں میں (سلف کے مختلف) اقوال پھیل چکے ہیں اور (مختلف اقسام کی) حدیثیں ان تک پہنچ چکی ہیں، اب ان مختلف اقوال واحادیث میں سے ہر گروہ ان چیزوں پر عمل پیرا ہے جو اس کے کانوں میں پہلے پڑ گئیں، پس لوگوں کو آزاد چھوڑ دیجیے اور ہر بستی کے مسلمانوں کو اسی مسلک پر عمل کرنے دیجیے جو انھوں نے (خود احادیث رسول اور اقوال صحابہ ہی کی روشنی میں) اپنے لیے اختیار کر لیا ہے۔

بعض لوگوں نے اس قصہ کو منصور کے بجائے ہارون الرشید کی طرف منسوب کیا ہے اور اس کی روایت اس طرح کی ہے کہ ہارون نے امام مالکؒ سے بطور مشورہ پوچھا ''کیا آپ کی موطا خانۂ کعبہ میں آویزاں کر دی جائے اور لوگوں کو اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ تمام اختلافات چھوڑ کر اسی کے مطابق عمل کریں؟'' امام مالکؒ نے فرمایا کہ ''ایسا نہ کیجیے (یہ اختلاف تو اصحاب رسول کے زمانہ سے چلا آرہا ہے) فروع میں صحابہ خود مختلف الرائے تھے اور وہ (اپنے مختلف مذاہب لیے ہوئے) اطراف ملک میں بکھر گئے تھے اور اب یہ ان ہی کے مختلف طریقے ہیں جو مختلف علاقوں

میں چل پڑے ہیں'' یہ سن کر ہارون الرشید نے کہا ''اے ابوعبداللہ! اللہ تعالیٰ آپ کو (حکمت دین کی) اور زیادہ توفیق دے''۔ اس واقعہ کو امام سیوطیؒ نے نقل کیا ہے۔

امام مالکؒ ان احادیث کے سب سے بڑے عالم ہیں جو اہل مدینہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہیں، اور ان کی روایت کی ہوئی یہ حدیثیں بلحاظ اسناد سب سے زیادہ معتبر ہیں، نیز حضرت عمرؓ کے فیصلوں اور عبداللہ بن عمرؓ اور عائشہ صدیقہؓ اور ان حضرات کے ساتوں شاگردوں (۱) کے اقوال کا ان سے بڑا کوئی عالم اور جامع نہیں، اسی ہستی اور اسی جیسی دوسری مبارک ہستیوں کے ہاتھوں علم روایت وافتاء کی بنیاد پڑی، مسند علم وارشاد پر بیٹھنے کے بعد امام موصوف نے روایت حدیث، افتاء اور افادۂ علمی کے وہ عظیم الشان کارنامے انجام دیئے جن کے باعث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس پیشین گوئی کے مصداق سمجھے گئے کہ ''وہ زمانہ قریب ہے جب لوگ اونٹوں پر سوار ہو کر علم کی جستجو میں دوڑ دھوپ کریں گے اور اس وقت وہ مدینہ کے عالم سے بڑھ کر کسی کو صاحب علم وفضل نہیں پائیں گے، ابن عیینہؒ اور عبدالرزاقؒ جیسے صاحب الرائے علماء کا خیال ہے کہ یہ پیشین گوئی امام مالکؒ پر صادق آتی ہے، امام موصوف کے بعد ان کے شاگردوں نے ان کی تمام روایات اور اقوال کو اکٹھا کیا، جن کی انھوں نے تلخیص اور تنقیح کی، شرحیں بیان کیں، ان کے اصول ودلائل پر بحثیں کیں، ان کی بنیاد پر مزید مسائل کی تخریج کی اور پھر ان تمام چیزوں کو لے کر یہ لوگ مختلف ممالک میں خصوصاً مغرب کی طرف پھیل گئے اور ان کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے کتنی ہی مخلوق کو نفع پہنچایا، ہم نے مذہب مالکی کی جو اصلیت بیان کی ہے اگر تم اس کی صداقت معلوم کرنی چاہتے ہو تو مؤطا امام مالکؒ کو نظر غائر سے دیکھو، تم پر یہ حقیقت خود بخود واضح ہو جائے گی۔

(۲) امام ابوحنیفہؒ اور مسلک حنفی

امام ابوحنیفہؒ، ابراہیم نخعیؒ اور ان کے ہم خیال علمائے تابعین کے مسلک پر مضبوطی سے جمے

(۱) ان شاگردوں کو فقہائے سبعہ کہا جاتا ہے، ان کے نام حسب ذیل ہیں۔

(۲) سعیدؒ بن مسیب (۲) عروہؒ بن زبیر (۳) قاسمؒ بن محمد بن ابی بکر صدیق (۴) ابوبکر بن عبدالرحمن مخزومی (۵) خارجہؒ بن زید بن ثابت (۶) عبیداللہؒ بن عبداللہ بن عتبہ مسعودی (۷) سلیمانؒ بن یسار ہلالی۔

ہوئے تھے اور شاید ہی کبھی اس سے انحراف کرتے ہوں، اس مسلک کی بنیادوں پر مسائل کی تخریج کرنے میں ان کو بڑا کمال حاصل تھا، تخریجات کے طریقوں میں وہ انتہائی دقت نظر سے کام لیتے تھے اور انھوں نے اپنی پوری توجہ جزئیات کی توضیح واستنباط میں لگا رکھی تھی اگر تم ہماری اس بات کی تصدیق چاہتے ہو تو امام محمدؒ کی کتاب الآثار، عبدالرزاقؒ کی جامع اور ابوبکرؒ بن ابی شیبہ کی مصنف میں سے ابراہیم نخعی کے اقوال چن کر جمع کرلو، پھر امام ابوحنیفہؒ کے مذہب سے ان کا مقابلہ کرو تو تم دیکھو گے کہ سوائے چند مقامات کے کہیں بھی ان کا قدم ابراہیم نخعیؒ کے جادۂ فقہی سے ہٹ کر نہیں پڑتا، اور چند مقامات بھی ایسے نہیں ہیں کہ امام مذکور نے ان میں کوئی اپنی الگ راہ نکالی ہو، بلکہ ان میں بھی دیگر فقہائے کوفہ میں سے کوئی نہ کوئی ان کے آگے موجود ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کے شاگردوں میں سب سے زیادہ مشہور ابویوسفؒ ہیں جو ہارون الرشید کے عہد حکومت میں قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) مقرر ہوئے تھے ان کا یہی منصب تھا جس کے باعث حنفی مذہب ہر چہار طرف پھیل نکلا اور عراق، خراساں اور توران کے حدود میں حکومت کا آئین قرار پا گیا۔

آپ کے دوسرے شاگرد، جو تصنیف و تالیف کے لحاظ سے آپ کے دوسرے تمام شاگردوں میں ممتاز اور حصول علم میں سب سے زیادہ انہماک رکھنے والے تھے، امام محمدؒ بن حسن ہیں، انھوں نے پہلے تو امام موصوف اور امام ابویوسفؒ سے فقہ حاصل کی، پھر مدینہ جا کر امام مالکؒ سے موطا پڑھی۔ اس کے بعد بطور خود غور وفکر شروع کیا، اور اپنے شیوخ کے مذہب کے ایک ایک مسئلہ کو موطا سے مقابلہ کرکے دیکھا، اگر اس کے مطابق نظر آیا تو خیر، ورنہ (اختلاف کی شکل میں) صحابہ اور تابعین کے مختلف مذاہب واقوال کی جستجو کی، اگر کسی کے ہاں اپنے مذہب کے موافق قول مل گیا تو اس صورت میں بھی وہ اپنے مذہب حنفی پر قائم رہے۔ لیکن اگر کوئی مسئلہ ایسا نکلا جس کی بنیاد کسی کمزور قیاس یا بے جان استنباط پر تھی اور اکثر علماء کے عمل سے یا کسی ایسی حدیث صحیح سے اس کی مخالفت بھی ہو رہی تھی جس پر فقہاء نے عام طور سے عمل کیا ہو تو ایسی حالت میں انھوں نے اپنی رائے بدل دی اور امام ابوحنیفہؒ اور ابویوسفؒ کے مذہب سے ہٹ کر مذاہب سلف میں سے کسی ایسے مذہب کو اختیار کرلیا جو ان کی نگاہ میں سب سے زیادہ فائق اور مرجح نظر آیا۔

امام ابوحنیفہؒ کے ان دونوں تلامذہ نے بھی ابراہیم نخعیؒ کے مذہب کی حتی الامکان اسی طرح پیروی کی جس طرح امام ممدوح نے کی تھی، صرف دو نقطہ ہائے اختلاف تھے جو استاذ امام اور ان کے ان تلامذہ کے مابین واقع ہوئے، کبھی تو ایسا ہوتا کہ امام ابوحنیفہؒ نے ابراہیم نخعیؒ کے مذہب پر کسی مسئلہ کی تخریج کی، لیکن امام ابویوسفؒ اور امام محمدؒ نے اس تخریج کو تسلیم نہیں کیا اور کبھی یہ صورت ہوتی کہ ابراہیم نخعیؒ فقہائے کوفہ کے کسی مسئلہ میں مختلف اقوال ہوتے جن میں سے کسی ایک کو ترجیح دینے کا سوال ہوتا تو بسا اوقات اس معاملہ میں ان کی رائیں وہ نہ ہوتیں جو امام صاحب کی ہوتی۔

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، امام محمدؒ کی پوری توجہ تصنیف وتدوین کی طرف تھی، انھوں نے اپنے اور ان دونوں کے اقوال اکٹھے مرتب کیے، جس سے بیشمار لوگوں کو فائدہ پہنچا، پھر بعد کے حنفی علماء ان کی تصانیف کی طرف پوری سنجیدگی سے متوجہ ہوئے، جنہیں انہوں نے چھانٹا اور صاف کیا، ان کے مطالب کی وضاحت کر کے ان کو بآسانی سمجھ لینے کے قابل بنایا، ان کی بنیادی مسائل مستنبط کیے، ان کو دلائل سے آراستہ کیا، پھر یہ لوگ (ان تمام تصانیف کو لے کر خراسان اور توران کی طرف سے جا نکلے اور ان کے اندر کے سارے مسائل امام ابوحنیفہؒ کا مذہب کہے جانے لگے، اس طرح امام ابویوسفؒ اور امام محمدؒ کے مذاہب بھی امام ابوحنیفہؒ کے مذہب کے ساتھ مل گئے اور ان سب کو ایک ہی مذہب شمار کر لیا گیا، حالانکہ یہ دونوں حضرات بجائے خود مجتہد مطلق ہیں اور امام ابوحنیفہؒ سے ان کے اختلافات کی فہرست کافی طویل ہے، نہ صرف فروع میں بلکہ اصول میں بھی۔
لیکن اس کے باوجود ایسا کیا گیا جس کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ مذکورہ بالا اصل ان تینوں اماموں میں مشترک ہے (یعنی یہ تینوں ہی حضرت ابراہیم نخعیؒ کے مذہب کو اپنی بنیاد قرار دیتے ہیں) اور دوسری یہ کہ مبسوط اور جامع کبیر میں ان تینوں مذاہب کو ایک ہی ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

(۳) امام شافعیؒ اور مسلک شافعی

ان دونوں مذاہب، مذہب مالکی اور مذہب حنفی کی شہرت و اشاعت اور ان کے اصول وفروع کی ترتیب کا آغاز ہی تھا کہ اس بزم میں ایک تیسرے امام، امام شافعیؒ بھی تشریف لائے، آپ نے اگلے لوگوں کے طریق فکر و استنباط کا گہری نظر سے جائزہ لیا تو اس میں انہیں بعض قابل اعتراض باتیں نظر آئیں، جنھوں نے ان کو اس راہ پر گامزن ہونے سے روک دیا، ان باتوں کا ذکر

امام موصوف نے اپنی تصنیف "کتاب الام" کے ابتدائی اوراق میں (بڑی وضاحت سے) کیا ہے۔ان کے اعتراضات کا ماحصل یہ ہے:

(۱) یہ لوگ (فقہائے مدینہ اور فقہائے کوفہ) مرسل اور منقطع احادیث کو بھی لے لیتے ہیں، جن کی وجہ سے ان کے اقوال میں لغزشیں راہ پالیتی ہیں کیونکہ جب حدیث کے تمام طریقوں کو جمع کیا جاتا ہے (اور محدثانہ چھان بین کی جاتی ہے) تو معلوم ہوتا ہے کہ کتنی ہی مرسل حدیثیں ایسی ہیں جن کی کوئی اصل نہیں اور کتنی ہی ایسی ہیں جو مسند اور مرفوع احادیث کے خلاف پڑتی ہیں، اس لیے امام شافعیؒ نے فیصلہ کیا کہ مرسل روایتوں کو اس وقت تک قبول نہ کریں گے جب تک کہ ان میں چند خاص شرطیں نہ پائی جائیں، ان شرطوں کی تفصیل کتب اصول میں موجود ہے۔

(۲) ان حضرات کے ہاں مختلف نصوص میں مطابقت پیدا کرنے کے قواعد منضبط نہ تھے، جس کے باعث ان کے اجتہادات غلطیوں سے محفوظ نہ رہ سکتے تھے، اس لیے امام شافعیؒ نے پہلے یہ اصول وقواعد وضع کیے اور ان کو باقاعدہ ایک کتاب کی شکل میں مرتب کیا، اصول فقہ کی یہ پہلی کتاب ہے جو عالم وجود میں آئی۔

اس امر کی مثال میں (کہ امام شافعیؒ کے خیال کے مطابق پہلے فقہا کے اجتہادات اصول تطبیق کی رعایت نہ کرنے کی وجہ سے راہ راست سے ہٹ جاتے تھے) ایک واقعہ کا بیان کردینا کافی ہوگا، ایک دن امام شافعیؒ امام محمدؒ کے ہاں آئے۔ امام محمدؒ اپنی تقریر میں فقہائے مدینہ پر اعتراض کر رہے تھے کہ یہ لوگ فصل مقدمات کے لیے دو گواہوں کی شہادت ضروری نہیں سمجھتے، بلکہ صرف ایک ہی گواہ کی گواہی، اور مدعی کی قسم پر بھی فیصلہ کر دیتے ہیں، حالانکہ یہ کتاب اللہ پر اضافہ(۱) ہے امام شافعیؒ نے یہ سن کر کہا "کیا آپ کے نزدیک یہ طے شدہ ہے کہ خبر واحد سے کتاب اللہ پر اضافہ جائز نہیں؟" انھوں نے فرمایا کہ "ہاں"۔ امام شافعیؒ نے کہا "تو پھر آپ

---

(۱) اضافہ کا مطلب یہ ہے کہ اس سے قرآن کے حکم پر ٹھیک ٹھیک عمل نہیں ہوسکتا، بلکہ اس میں کسی نہ کسی طرح کی ترمیم یا تخصیص کرنی پڑتی ہے۔ مثلاً یہی شہادت کا مسئلہ ہے جس کی بابت قرآن میں عام حکم ہے کہ فصل مقدمات کے لیے دو شاہد چاہئیں، مگر حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر دو شاہد مہیا نہ ہوسکیں تو مدعی کی قسم اور ایک گواہ کی گواہی بھی کافی ہے۔ گویا حلف دوسرے گواہ کی قائم مقام ہوجاتی ہے۔

حدیث لا وصیة لوارث کو لے کر، جو ایک خبر واحد ہے، یہ کیوں کہتے ہیں کہ وارث کے حق میں وصیت جائز نہیں، حالانکہ کتاب اللہ کہتی ہے کہ کُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِيْنَ (تم پر یہ فرض کیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت قریب آئے تو وہ.......... اگر اس نے مال چھوڑا ہو....... اپنے والدین اور رشتہ داروں کے حق میں وصیت کر دے) کیا یہ خبر واحد سے کتاب اللہ پر اضافہ نہیں ہے؟ اس کے بعد انھوں نے اسی طرح کے اور بھی چند اعتراضات امام محمدؒ پر کیے جن کے جواب میں انہیں انجام کار خاموش ہونا پڑا۔"

(۳) وہ علمائے تابعین، جن کو فتویٰ دینے کی خدمت سپرد تھی، بعض صحیح حدیثوں سے لاعلم تھے، اس لیے انھوں نے ان مسائل کے پیش آنے پر، جن کا ارشاداتِ نبویؐ میں واضح حکم موجود تھا، لیکن جن سے وہ خود بے خبر تھے، یا تو وہ اپنی رائے سے اجتہاد کیا یا عام خیالات کو لے لیا، یا کسی صحابی کے طرز عمل کو اختیار کر لیا اور اسی کے مطابق فتوے دے دیا، پھر کبھی تو ایسا ہوا کہ آگے چل کر تیسرے طبقہ میں وہ حدیثیں منظر عام پر آئیں لیکن پھر بھی ان فقہا نے ان کو نہیں لیا، نہ ان پر عمل کیا، صرف اسی خیال سے کہ یہ حدیثیں ہمارے علمائے شہر کے عمل اور مذہب کے مخالف ہیں، اور یہ مخالفت بتائی ہے کہ ان حدیثوں میں کوئی نہ کوئی کمزوری اور علت ضرور موجود ہے جس نے ان کو پایۂ اعتبار سے گرا دیا ہے اور کبھی ایسا ہوا کہ یہ احادیث تیسرے طبقہ میں بھی شہرت عام حاصل نہ کر سکیں، بلکہ اس کے بعد کے زمانوں میں مشہور ہوئیں جب کہ علمائے حدیث نے حدیث کے مختلف طریقوں اور سندوں کو جمع کرنے میں پوری کاوش دکھلائی اور اس کے لیے زمین کا ایک ایک گوشہ چھان کر وہ ارباب علم تک پہنچے، اس طویل گمنامی کی وجہ یہ تھی کہ بیشتر حدیثیں ایسی ہی جن کی روایت کرنے والے صحابہ کی تعداد ایک یا دو سے اوپر نہیں، پھر ان صحابہ سے یہ حدیثیں سن کر دوسروں کو سنانے والے بھی دو ہی ایک آدمی ہیں، اور اسی طرح آگے تک راویوں کی یہ قلت تعداد چلی گئی ہے جس کے سبب سے یہ احادیث اس دور کے عام اہل فقہ کی نگاہوں سے پوشیدہ رہ گئیں اور کہیں ان حفاظ حدیث کے زمانہ میں جا کر پردۂ خفا سے باہر نکلیں جنھوں نے حدیثوں کو ان کے ایک ایک طریقے اور اسناد کے ساتھ جمع کیا، پھر ایک دوسری شکل یہ بھی تھی کہ کتنی ہی حدیثیں ایسی

ہیں جن کے روایت کرنے والے صرف ایک خاص خطۂ ملک کے لوگ ہیں، مثلاً اہل بصرہ نے ایک حدیث روایت کی اور باقی تمام دیگر مقامات کے لوگ اس سے بالکل بے خبر رہ گئے۔

ان حقائق کے پیش نظر امام شافعیؒ کا کہنا ہے کہ ہمیں علمائے صحابہ وتابعین کا رویہ اختیار کرنا چاہیے، جن کا برابر یہ دستور رہا ہے کہ جب ان کے سامنے کوئی مسئلہ آتا تو پہلے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث تلاش کرتے جب کوئی حدیث نہ ملتی تب جاکر کسی اور طریقۂ استدلال سے کام لیتے، مگر اس کے بعد بھی قبول حدیث کا دروازہ اپنے اوپر بند نہیں کر لیتے تھے، بلکہ بعد میں جب بھی کوئی حدیث ان کو مل جاتی فوراً اپنے اجتہاد کو ترک کر دیتے اور حدیث کو اختیار کر لیتے۔ جب صورت واقعہ یہ ہے تو ان علمائے تابعین کا کسی حدیث کو نہ لینا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ وہ حدیث ہی کمزور ہے، الا آنکہ انہوں نے صراحت کے ساتھ اس کو کمزور اور ناقص ٹھیرا دیا ہو۔

حدیث ''قلتین (۱)'' اس کی واضح مثال ہے۔ یہ ایک صحیح حدیث ہے جو بہت سی سندوں سے مروی ہے، جن میں سے اکثر کی ابتدائی کڑیاں یوں ہیں۔ ''یہ حدیث ولیدؒ بن کثیرؒ نے محمدؒ بن جعفر بن زبیر سے یا محمدؒ بن عباد بن جعفر سے روایت کی، اور انھوں نے عبیداللہؒ بن عبداللہ سے نقل کی۔ اور عبیداللہؒ نے ابن عمرؓ سے بیان کی''۔ پھر آگے چل کر اس سلسلہ اسناد سے شاخ در شاخ سند کے بہت سے سلسلے پیدا ہوگئے، یہ دونوں راوی (محمدؒ بن جعفر اور محمدؒ بن عباد) اگرچہ پوری طرح قابل اعتبار ہیں مگر چونکہ ان لوگوں میں نہیں ہیں جو فتوے دینے کے منصب پر سرفراز تھے اور اس لیے مرجع عوام بھی نہ تھے، اس وجہ سے یہ حدیث نہ تو سعیدؒ بن مسیّب کے زمانہ میں مشہور ہوسکی نہ ہی امام زہریؒ کے زمانہ میں اور نہ تو مالکیہ نے اس پر عمل کیا نہ حنفیہ نے، مگر امام شافعیؒ کے زمانہ میں یہ حدیث مشہور ہوچکی تھی، اس لیے انھوں نے اس کو قابل عمل ٹھیرایا۔

ایک اور مثال ''خیار مجلس (۲)'' والی حدیث کی لے لو، جو ایک صحیح حدیث ہے اور بہت سے

---

(۱) اس حدیث کے الفاظ یہ ہیں: اذا کان الماء قلتین لم یحمل خبثا۔ یعنی جب پانی ''دو قلہ'' ہو تو وہ کسی نجاست کے پڑنے سے ناپاک نہیں ہوتا۔ ''قلہ'' اس بڑے مٹکے کو کہتے ہیں جس میں پانچ سو رطل یعنی سوا چھ من پانی آسکے یا بقول بعض دو مشک پانی۔

(۲) وہ حدیث یہ ہے کہ جب تک خریدار اور فروخت کنندہ باہم الگ نہ ہو جائیں اس وقت تک دونوں میں سے ہر ایک کو معاملۂ بیع فسخ کر دینے کا اختیار ہے۔

طریقوں سے روایت ہوتی ہے اور صحابہ میں سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اس پر عمل بھی کیا ہے، لیکن چونکہ فقہائے سبعہ اور ان کے ہم عصر دوسرے علمائے تابعین تک نہ پہنچ سکی اس لیے انھوں نے اس کو اختیار نہیں کیا اور یہ چیز امام مالکؒ اور امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک حدیث کے مجروح ہونے کی علت بن گئی، لیکن امام شافعیؒ نے اس پر عمل کیا۔

(۴) صحابہؓ کے اقوال امام شافعیؒ کے زمانہ میں کثرت سے اکٹھا ہوئے جن میں کافی اختلاف اور انتشار تھا، آپ نے ان پر تنقید و تحقیق کی نظر ڈالی تو ان کا ایک بڑا حصہ احادیث صحیحہ کا مخالف نظر آیا، جس کی وجہ یہ تھی کہ صحابہؓ کو یہ حدیثیں پہنچی ہی نہ تھیں، پھر انھوں نے علمائے سلف کو دیکھا کہ ایسے حال میں وہ برابر اقوال صحابہؓ کو چھوڑ کر احادیث صحیحہ کی طرف رجوع کرتے رہے ہیں، اس لیے انھوں نے ان اقوال کو تو قابل حجت و عمل مانا جن پر عام صحابہ کا اتفاق تھا، مگر باقی کو قابل قبول تسلیم کرنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ صحابہ بھی انسان (۱) تھے اور ہم بھی (ان ہی کی طرح کے) انسان ہیں۔

(۵) امام شافعیؒ نے دیکھا کہ فقہا کا ایک گروہ ''رائے'' کو گڈمڈ کر رہا ہے، اور ان میں فرق و امتیاز نہیں کرتا، حالانکہ شریعت نے رائے کو ناجائز اور قیاس کو جائز و مستحسن ٹھیرایا ہے، یہ لوگ اس ''رائے'' کو کبھی استحسان بھی کہتے ہیں، ''رائے'' سے میری مراد یہ ہے کہ کسی نقصان یا کسی مصلحت کے مظنۃ (۲) کو کسی حکم کی علت ٹھیرا دیا جائے اور قیاس یہ ہے کہ ایک حکم منصوص کی علت دریافت کی جائے اور اس علت کی بنا پر اسی طرح کے دوسرے معاملات میں بھی وہی حکم لگایا جائے امام شافعیؒ نے فقہا کے اس طرز عمل کا پوری قوت سے ابطال کیا اور کہا کہ جو ''استحسان یعنی رائے سے کام لیتا ہے وہ اصل شارع بننا چاہتا ہے''، ان کے اس قول کو عضدؒ نے مختصر الاصول کی شرح میں

---

(۱) یعنی ہماری ہی طرح وہ بھی فہم و نظر کی فکری لغزشوں سے مامون نہ تھے کہ ان کے اقوال کو ایک نبی معصومؐ کے کلام کی طرح آنکھیں بند کر کے مان لیا جائے، نصوص کتاب و سنت سے جس طرح وہ مسائل کا استنباط کر سکتے تھے ہم بھی کر سکتے ہیں۔ ہم ہر حال میں ان کے استنباط کے پابند نہیں ہو سکتے۔

(۲) کسی شے کے ''مظنۃ'' سے مراد وہ وقت یا جگہ یا بات یا حالت یا کوئی بھی چیز ہے جس کے اندر اس شے کے موجود ہونے کا غالب گمان ہو

درج کیا ہے، اس کی مثال رشد یتیم کا مسئلہ ہے، یتیم کا معاملہ فہم ہو جانا ایک مخفی امر ہے (جس کے لیے کوئی متعین تاریخ نہیں بتائی جا سکتی) لیکن بعض فقہا نے یہ دیکھ کر کہ بالعموم حد سے حد پچیس سال کی عمر میں انسان کے اندر معاملہ فہمی آ جاتی ہے، اس مظنۂ رشد (یعنی پچیس سالہ عمر) کو اس کا قائم مقام قرار دے کر یہ اصول بنا دیا کہ ''جب یتیم کی عمر پچیس سال کی ہو جائے تو اس کا مال لازماً اس کے حوالہ کر ہی دیا جائے'' اور کہا کہ یہ ''استحسان'' ہے اس کے بالمقابل اس مسئلہ میں قیاس یہ ہے کہ مال اس کو سپرد نہ کیا جائے (تاوقتیکہ وہ واقعتاً معاملہ فہم نہ ہو جائے)

مختصر یہ کہ جب امام شافعیؒ نے اپنے پیشروؤں میں اس قسم کی باتیں دیکھیں، تو (ان سے غیر مطمئن ہو کر) انھوں نے علمِ فقہ پر نئے سرے سے نظر ڈالی اور بطور خود اس کے اصول مرتب کیے پھر ان اصولوں کے مطابق جزئیات کا استنباط کیا اس فن پر مستقل اور بہترین کتابیں لکھیں، جو لوگوں کی فیض یابی کا ذریعہ بنیں، فقہائے وقت آپ کے گرد جمع ہو گئے اور آپ کی تصنیفات کو لے کر انھوں نے ان کا اختصار کیا، ان کی شرحیں لکھیں، ان سے دلیلیں اخذ کیں اور ان کو سامنے رکھ کر مزید مسائل مستنبط کیے، پھر (ان سب چیزوں کو لے کر) وہ مختلف ممالک میں منتشر ہو گئے۔ اس طرح یہ فقہ کا ایک الگ اسکول قرار پایا جس کی نسبت امام شافعیؒ کی طرف تھی۔ (۱)

---

(۱) مصنف نے حنبلی مذہب کو یہاں ایک مستقل فقہی اسکول کی حیثیت سے بیان نہیں کیا ہے جس کی وجہ آگے چل کر ایک مقام پر وہ خود واضح کریں گے۔

اہل الحدیث

اتباع حدیث کا التزام

حضرت سعید بن مسیّبؒ، ابراہیم نخعیؒ اور امام زہریؒ کے زمانہ میں، نیز امام مالکؒ اور سفیانؒ ثوری کے عہد میں، اور اس کے بعد بھی، برابر علماء کا ایک گروہ ایسا رہا جو مسائل شرعیہ میں غور وفکر کرتے وقت رائے (۱) کے استعمال کو سخت ناپسند کرتا تھا، اور ناگزیر صورتوں کے ماسوا، فتوے دینے اور مسائل کا استنباط کرنے کی کبھی ہمت نہ کرتا تھا، ان کی توجہات کا سب سے بڑا مرکز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کا بیان کرنا تھا، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے کوئی مسئلہ پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا، ''مجھے یہ گوارا نہیں کہ تمہارے لیے کوئی ایسی چیز حلال کردوں جس کو اللہ نے تم پر حرام کیا ہے، یا کسی ایسی چیز کو حرام کردوں جس کو اللہ نے تمہارے لیے حلال (۲) کیا ہے۔ حضرت معاذؓ بن جبل کا ارشاد ہے ''لوگو! بلا کے نازل ہونے سے پہلے اس کے لیے جلدی (۳) نہ مچاؤ کیونکہ ہر زمانہ میں ایسے مسلمان موجود رہیں گے، جو (اپنے وقت کے پیش آمدہ مسائل میں)

---

(۱) ''رائے'' ایک اصطلاحی لفظ ہے جس کی تعریف اوپر متن کے مضمون میں گزر چکی ہے۔

(۲) مطلب یہ ہے کہ جب تک مجھ کو کسی آیت یا کسی حدیث سے ایک چیز کی علت یا حرمت معلوم نہ ہو جائے محض اپنی رائے سے اس کو حلال یا حرام نہیں کہہ سکتا، ورنہ خدشہ ہے کہ کہیں ایسی چیز کو حلال نہ کہہ دوں جو فی الواقع خدا کے نزدیک حرام ہے، یا اس کے برعکس

(۳) یعنی جو معاملہ حقیقتاً پیش نہ آیا ہو اس کے متعلق سوال نہ کرو، قبل از مرگ واویلا سخت بے عقلی کی بات ہے۔

پوچھنے پر صحیح جواب دے دیا کریں گے" اسی طرح کے اقوال حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابن مسعودؓ سے بھی منقول ہیں، جن میں فرضی مسائل پر سوال و جواب کو مکروہ قرار دیا گیا ہے، حضرت ابن عمرؓ نے حضرت جابرؓ بن زید سے فرمایا کہ تم بصرہ کے فقہا میں سے ہو، دیکھو جو فتوے بھی دینا، قرآن ناطق یا سنت جاریہ ہی سے دینا، اگر تم نے اس کے خلاف کیا تو خود بھی ہلاک ہو گے اور دوسروں کو بھی ہلاک کرو گے" ابونضرؒ کہتے ہیں کہ جب حضرت ابوسلمہؒ بصرہ تشریف لائے تو میں اور حسن بصریؒ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے انھوں نے حسن بصریؒ سے فرمایا" آپ ہی حسنؒ ہیں؟ بصرہ میں آپ سے زیادہ کسی کی ملاقات کا مجھے شوق نہ تھا، مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ آپ اپنی رائے سے فتوے دیتے ہیں، ایسا نہ کیجیے۔ فتویٰ صرف سنت رسولؐ سے دیجیے یا اللہ کی اتاری ہوئی کتاب سے، ابن المکندر فرماتے ہیں کہ" عالم، اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان داخل ہوا کرتا ہے، اس کو چاہیے کہ اس (نازک اور پرخطر) مقام سے (صحیح سلامت) نکلنے کی راہ تلاش کر رکھے(۱)،" امام شعبیؒ سے سوال کیا گیا کہ" جب آپ لوگوں سے مسائل پوچھے جاتے تھے تو آپ کیا کیا کرتے تھے؟" امام موصوف نے سائل سے فرمایا" (اچھا ہوا) تم نے بڑے ہی واقف کار سے بات پوچھی (ہم کرتے یہ تھے کہ جب ہم میں سے کسی شخص کو مخاطب کر کے فتویٰ پوچھا جاتا تو وہ اپنے کسی صاحب علم رفیق سے کہتا کہ آپ اس کا جواب دے دیجیے، پھر وہ دوسرا، کسی تیسرے پر اس فرض کو ڈال دیتا، یہ سلسلہ یوں ہی آگے چلتا رہتا یہاں تک کہ وہ استفتاء پھر گھوم کر پہلے ہی شخص کے پاس آ پہنچتا"، یہی امام شعبیؒ ایک اور مقام پر فرماتے ہیں کہ" یہ لوگ (یعنی فتویٰ دینے والے) جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے تم کو سنائیں اس کو لے لو، اور جو کچھ اپنی رائے سے کہیں اسے کوڑے پر پھینک دو"۔ ان تمام آثار کو امام داریؒ نے نقل کیا ہے۔

---

(۱) مطلب یہ ہے کہ عالم شرع کی ذمہ داریاں سخت نازک ہیں، وہ اللہ اور بندوں کے درمیان کا واسطہ ہوا کرتا ہے، جس کے ذریعہ سے بندوں کو اللہ تعالیٰ کی مرضیات کا علم ہوتا ہے پس اگر کسی عالم نے اپنی اس گراں ذمہ داری کی ادائی میں سہل انگاری سے کام لیا اور احکام شرع کی تعیین و تبلیغ میں اپنے ذاتی رجحانات کو دخل دیا تو بدترین انجام سے دوچار ہوگا، اس کو پوری احتیاط اور خداترسی کے ساتھ اس نازک ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا چاہیے۔

تدوین حدیث کا دور

ان اسباب اور حالات کے ماتحت اسلامی ممالک میں احادیث رسولؐ اور اقوال صحابہ کے اکٹھا کرنے اور رسالوں اور کتابوں میں انہیں لکھ لینے کا رواج بہت عام ہوگیا، حتی کہ شاید ہی کوئی عالم حدیث ایسا باقی بچا ہو جس نے احادیث کے کسی نہ کسی مجموعہ یا رسالے یا کتاب کا فراہم کر لینا اپنی اہم ترین ضرورت نہ سمجھا ہو (یہ ذوق والہانہ شیفتگی کی اس حد کو پہنچ گیا تھا کہ) علم حدیث کے جو اکابر اس زمانہ میں موجود تھے انھوں نے حجاز، شام، عراق، مصر، یمن اور خراسان کے باقاعدہ دورے کیے اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر حدیث کی کتابوں کو جمع کیا اور اس کی تصنیفات کا کھوج لگایا حتی کہ ان احادیث اور آثار کو بھی ڈھونڈ نکالنے میں انہوں نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی جو غریب (۱) اور نادر تھے، اس طرح ان لوگوں کی کوششوں سے احادیث اور آثار کا اتنا بڑا ذخیرہ اکٹھا ہوگیا جس کی مثال اب تک کی تاریخ علم حدیث میں ناپید تھی، اس طرح قدرتاً ان لوگوں کو وہ بات حاصل ہوگئی جو پچھلوں کو نصیب نہ ہوسکی تھی، انہیں ایک ایک حدیث مختلف سندوں سے ملی، یہاں تک کہ بعض حدیثوں کی سندیں تو سو، بلکہ سو سے بھی اوپر جا پہنچیں (اس کثرت اسانید کا سب سے بڑا افائدہ یہ ہوا کہ) حدیث کے بعض وہ ٹکڑے، جو ایک سند کی روایت میں مخفی رہ گئے تھے، دوسری سند کے ذریعہ روشنی میں آگئے، اور یہ متعین کرنا آسان ہوگیا کہ کون سی حدیث غریب ہے اور کون سی مشہور (۲)۔ پھر یہ بھی کہ ان علماء کے لیے مختلف حدیثوں کے شواہد (۳) اور متابعات (۴) میں غور و فکر کرنا ممکن ہوگیا، اور ان کے دائرۂ معلومات میں بے شمار ایسی صحیح اور مستند حدیثیں آگئیں جن سے اب تک کے اہل فتویٰ بے خبر تھے، چنانچہ علامہ ابن ہمامؒ کا بیان ہے کہ امام شافعیؒ نے امام احمدؒ

(۱) ''غریب'' اس حدیث کو کہتے ہیں جس کو صرف ایک راوی بیان کرتا ہے۔

(۲، ۳) ''مشہور'' اس حدیث کو کہتے ہیں جو صحابہ اور تابعین کے زمانہ میں تو زیادہ نہ پھیل سکی مگر بعد میں کسی خاص وجہ سے شہرت عام پاگئی۔

(۴۔۴) ان حدیثوں کو یک دوسرے کا شاہد کہا جاتا ہے جن کا مضمون تو ایک ہی ہو مگر وہ مختلف راویوں کے ذریعہ بیان ہوں اور مختلف صحابہ سے روایت کی گئی ہوں، اور اگر راوی تو مختلف ہوں مگر سب کے سب ایک ہی صحابی سے روایت کرتے ہوں اور مضمون بھی سب روایتوں کا ایک ہی ہو تو اس طرح کی حدیثوں کو ایک دوسرے کا متابع کہا جاتا ہے۔

سے صاف فرمایا تھا کہ ''آپ لوگ احادیث صحیحہ کے ہم سے زیادہ جاننے والے ہیں، اس لیے آپ کے پاس جو بھی حدیث صحیح ہو مجھ کو بتا دیا کیجیے، تاکہ میں اس کی پیروی کا شرف حاصل کر سکوں (خواہ وہ حدیث کسی قسم کی ہو) کوفی ہو یا بصری، یا شامی''۔

احادیث سے ایک گروہ کی واقفیت اور دوسرے کی عدم واقفیت کی چند وجہیں تھیں۔

اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ کتنی ہی صحیح حدیثیں ایسی ہیں جن کے روایت کرنے والے (اس وقت تک) صرف ایک ہی مقام کے لوگ تھے۔ مثلاً وہ غریب حدیثیں جن کو صرف اہل شام بیان کرتے ہیں یا صرف اہل عراق، اسی طرح بہتیری حدیثیں ایسی ہیں جن کی روایت صرف ایک خاص خاندان میں محصور رہی ہے مثلاً وہ مجموعۂ احادیث جس کو ''نسخۂ برید'' کہا جاتا ہے، اور جس کے بیان کرنے والے صرف بریدؒ ہیں جو ابی بردہؒ سے اور ابی بردہ حضرت ابوموسیٰؓ سے روایت کرتے ہیں ایسے ہی وہ مجموعۂ احادیث جو ''نسخۂ'' عمر بن شعیب کے نام سے مشہور ہے اور جس کے راوی صرف عمر بن شعیبؒ ہیں، جو اپنے باپ سے، اور ان کے باپ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ بعض صحابہ گمنام تھے، انہیں حدیثیں بھی کم ہی معلوم تھیں اور اس لیے بیان بھی انھوں نے تھوڑی ہی کیں، ان صحابہ سے قدرتاً صرف چند لوگ ہی روایتیں لے سکے۔

اسی طرح کی حدیثیں تھیں جو عام اہل فتویٰ کی نظروں سے اوجھل رہ گئیں (لیکن ان کے بالمقابل اصحاب حدیث کا حال یہ تھا کہ نہ صرف احادیث ہی کا پورا ذخیرہ ان کے سامنے آ چکا تھا بلکہ) ایک ایک بستی کے فقہائے صحابہ وتابعین کے آثار بھی ان کے پاس جمع ہو گئے تھے، درآنحالیکہ ان سے پہلے کوئی بھی شخص صرف ان روایتوں کو جمع کر سکتا تھا جو اس کے اپنے اہل شہر اور اپنے شیوخ کے توسط سے مل سکتی تھیں، (پھر ایک دوسرا فرق احوال یہ بھی تھا کہ اب تک راویوں کے نام اور ان کے مراتب عدالت (۱) سے واقفیت کا سارا دارومدار حالات اور قرائن کے اس سرسری مشاہدہ پر تھا جو بالعموم نگاہِ انسانی کو حاصل ہوا کرتا ہے، لیکن اب اس گروہ نے اس فن میں پوری طرح دادِ تحقیق دے کر اس کو تصنیف وتالیف اور بحث وتمحیص کا ایک مستقل موضوع بنا دیا،

(۱) ''عدالت'' اصول حدیث کی ایک اصطلاح ہے جس سے مراد یہ ہے کہ راوی عاقل، بالغ مسلمان ہو، فسق اور بے حیائی وغیرہ عیوب سے پاک ہو، ثقاہت سے گری ہوئی حرکتیں نہ کرتا ہو۔

اور پوری چھان بین کر کے اس کے ایک ایک عیب وصواب کا فیصلہ کیا، اس تصنیفی اور تحقیقی جدوجہد کا نتیجہ یہ نکلا کہ احادیث پر سے ابہام کے وہ پردے اٹھ گئے جن کے نیچے ان کے اتصال (۱) یا انقطاع کی کیفیتیں پوشیدہ تھیں (اور صریحی طور پر معلوم ہو گیا کہ کون سی حدیث متصل ہے اور کون سی منقطع) چنانچہ امام سفیان ثوریؒ اور وکیعؒ اور ان کی طرح کے دوسرے خادمان علم حدیث سے اگر چہ (جمع حدیث میں) سرتوڑ کوششیں کیں، مگر اس کے باوجود وہ ایسی ایک ہزار احادیث بھی نہ جمع کر سکے جو متصل اور مرفوع ہوں، جیسا کہ ابوداوٗدؒ سجستانی کے اس خط سے معلوم ہوتا ہے جو اہل مکہ کے نام لکھا گیا تھا، اس طبقہ کے لوگوں کی روایت کی ہوئی حدیثوں کی تعداد مجموئی طور پر چالیس ہزار یا اس کے لگ بھگ پہنچتی ہے (باقی کو انھوں نے تحقیق کی کسوٹی پر پرکھ کر متروک اور نا قابل قبول قرار دے دیا) امام بخاریؒ سے تو یہاں تک مروی ہے، اور بروایت صحیح مروی ہے کہ انھوں نے اپنی کتاب ''صحیح بخاری'' کو چھ لاکھ حدیثوں میں سے انتخاب کر کے مرتب کیا ہے۔ اسی طرح امام ابوداوٗد کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے اپنی کتاب ''سنن ابی داوٗد'' کو پانچ لاکھ کے ذخیرہ سے چن کر مدون کیا ہے، امام احمد بن حنبلؒ نے اپنی کتاب ''مسند احمد بن حنبل'' کو ایک ایسی میزان کی حیثیت سے لوگوں کے سامنے پیش کیا جس کے ذریعہ حدیث نبوی کی صحت کا وزن معلوم کیا جا سکتا ہو، یعنی جو حدیث اس کتاب کے اندر موجود ہو، وہ تو اپنی واقعی بنیاد رکھتی ہے اگر چہ صرف ایک ہی طریقہ سے مروی ہو، اور جو حدیث اس میں نہ پائی جا سکے اس کے متعلق سمجھ لینا چاہیے کہ وہ بالکل بے اصل ہے۔

علمائے حدیث کی توجہ فقہ کی طرف

ان علمائے حدیث میں جن کا یہاں ذکر ہو رہا ہے) عبدالرحمٰنؒ بن مہدی، یحییٰؒ بن سعید قطان، یزیدؒ بن ہارون، عبدالرزاقؒ، ابوبکر بن ابی شیبہؒ، مسددؒ، ہنادؒ، احمد بن حنبلؒ، اسحٰقؒ بن راہویہ، فضل بن دکین اور علیؒ بن مدینی اور ان ہی کے ہم پلہ کچھ اور بزرگوں کے اسمائے گرامی نمایاں حیثیت کے مالک ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کا طبقہ طبقات محدثین کا سرعنوان ہے، ان میں سے

---

(۱) اتصال کا مطلب یہ ہے کہ سند حدیث میں تمام راویوں کا نام مذکور ہو، اور ''انقطاع'' مطلب یہ ہے کہ کوئی راوی چھوٹ گیا ہو۔

وہ جو تحقیق وتدبر کی اونچی صلاحیتوں سے بھی سرفراز تھے، فن روایت کو جب باقاعدہ حاصل اور مستحکم کر چکے اور مراتب حدیث کی پوری واقفیت بھی انھوں نے بہم پہنچائی تو فقہ کی طرف متوجہ ہوئے، یہاں ان کے لیے یہ قابل قبول نہ ہو سکا کہ فقہ کے پچھلے ائمہ میں سے کسی خاص شخص کی تقلید پر اتفاق کر لینا چاہیے، جب کہ وہ اپنی آنکھوں سے ایسی احادیث اور آثار دیکھ رہے تھے جو گرد و پیش پھیلے ہوئے تمام فقہی مذاہب کے (کتنے ہی مسائل میں) صریح مخالف تھے، اس لیے انھوں نے احادیث رسولؐ اور آثار صحابہ وتابعین اور اقوال مجتہدین، سب پر تحقیق وتجسس کی نگاہ ڈالنی شروع کی (تاکہ ہر مسئلہ میں شرع کا صحیح حکم معلوم ہو سکے) اس کے لیے ان کے ذہنوں میں کچھ پختہ اصول متعین تھے، ہم اس موقعہ پر ان اصولوں کا ایک اجمالی تذکرہ کیے دیتے ہیں۔

نئے اصول فقہ

مسائل کے بارے میں ان کا دستور یہ تھا:-

(الف) اگر کسی مسئلہ میں قرآن کچھ (صراحت کے ساتھ) کہہ رہا ہے تو اس وقت کسی اور شے کی طرف متوجہ ہونا جائز نہیں۔

(ب) اگر فرمودۂ قرآنی (اپنے مفہوم میں بالکل واضح اور صریح نہ ہو بلکہ مختلف پہلوؤں کا احتمال رکھتا ہو تو حدیث نبوی کو کسی ایک پہلو کی تعیین کے لیے حکم بنایا جائے گا۔

(ج) جب کسی مسئلہ کے متعلق قرآن بالکل خاموش ہو تو اس وقت حدیث رسول کو اختیار کرنا چاہیے، خواہ یہ حدیث مشہور ہو اور فقہا کے درمیان قبول عام کا مقام رکھتی ہو یا اس کے برعکس اس کی شہرت اور اس سے واقفیت کا دائرہ کسی ایک شہر یا ایک خاندان یا ایک سلسلۂ روایت تک محدود ہو، چاہے اس پر صحابہ اور فقہا نے عمل کیا ہو یا نہ کیا ہو، غرض جب کوئی حدیث موجود ہوتی تو اس کے سامنے اس کے مخالف کسی اثر یا کسی اجتہاد کو کوئی اہمیت نہ دی جاتی۔

(د) پھر جب کسی مسئلہ کے متعلق یہ لوگ انتہائی جستجو کے باوجود کوئی حدیث بھی نہ پاتے تو صحابہ اور تابعین کی کسی ایک جماعت کے اقوال کو لے لیتے (لیکن یہ حقیقت ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ) اس بارے میں ان لوگوں کا دستور پہلے کے ائمہ فقہ کا سا نہ تھا کہ دوسرے تمام صحابہ وتابعین کو چھوڑ کر ہر حال میں اور ہر مسئلہ میں بس کسی ایک مخصوص جماعت یا کسی خاص شہر کے اہل

علم ہی کے اقوال کولیا کریں، بخلاف اس کے ان کا قاعدہ یہ تھا کہ اگر کسی مسئلہ میں وہ جمہور فقہا اور تمام خلفائے راشدین کو ایک رائے پر متفق پاتے تو اس رائے کو بلا چوں و چرا تسلیم کر لیتے، اور اگر ان میں باہم دیگر اختلاف نظر آتا تو اس صورت میں اس شخص کی رائے کو ترجیح دیتے جو علم، خدا ترسی اور ضبط احادیث کے لحاظ سے سب میں اونچا ہوتا، یا پھر ان اقوال میں سے اس قول کو اختیار کرتے جو زیادہ مشہور ہوتا، اور اگر کوئی مسئلہ ایسا پاتے جس میں ہر حیثیت سے دو برابر کے قول ہوتے تو وہ ان کے نزدیک دو قولوں والا مسئلہ کہلاتا (اور ہر قول یکساں قابل اتباع ہوتا)

(ہ) لیکن جب اس طرف سے بھی ان کی نگاہ جستجو ناکام واپس ہوتی (اور صحابہ و تابعین کے اقوال میں بھی ان کو کسی مسئلہ کا جواب نہ ملتا) تو آیتوں اور صحیح حدیثوں کے عموم، ان کے اشارات اور ان کے مقتضیات میں غور کرتے اور مسئلہ کے نظائر کو سامنے رکھ کر اس کا جواب معلوم کرتے، بشرطیکہ مسئلہ اور نظیر مسئلہ میں واضح مشابہت نظر آتی، اس باب میں وہ کچھ لگے بندھے اصولوں کی غلامی نہیں کرتے تھے، بلکہ ان کا سارا انحصار اور اعتماد محض اپنی فہم اور طمانیت قلب پر ہوتا تھا، جس طرح کسی حدیث کے متواتر ہونے کا فیصلہ کرنے والی چیز راویوں کی کوئی تعداد اور ان کی عدالت کی نوعیت نہیں ہے بلکہ اس حدیث کو بالکل سچ مان لینے کا وہ یقین ہے جو سامعین کے دلوں میں اس حدیث (کو اس کے تمام سلسلوں کے مان لینے) کے بعد آپ سے آپ پیدا ہو جاتا ہے، جیسا کہ صحابہ کے احوال بیان کرتے وقت ہم بتا چکے ہیں۔

ان اُصولوں کا مآخذ

علمائے حدیث کے یہ اصول و قواعد، جن کا اوپر ذکر ہوا، سلف کے طریق فکر و عمل اور ان کی واضح تصریحات سے ماخوذ تھے، سلف کا یہ طریقہ کیا تھا؟ اسے میمونؒ بن مہران کی زبانی سنیے:۔

''جب کوئی شخص حضرت ابو بکرؓ کے سامنے اپنا مقدمہ پیش کرتا تو فیصلہ کے لیے قرآن کو بنظر غائر دیکھتے، اگر وہاں کوئی ہدایت موجود ملتی تو اسی کے مطابق فیصلہ کر دیتے اور اگر ایسا نہ ہوتا اور اس معاملہ کے متعلق کوئی حدیث ان کے اپنے علم میں ہوتی تو اس حدیث کو اپنے فیصلہ کی بنیاد قرار دیتے، لیکن جب اپنا ذخیرۂ احادیث بھی اس معاملہ میں رہنمائی کرنے سے انکار کر دیتا تو اس وقت آپ باہر تشریف لاتے اور

عام مسلمانوں سے پوچھتے ''میرے سامنے فلاں معاملہ پیش ہوا ہے کیا تم میں سے کسی کو اس طرح کے معاملہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی فیصلہ معلوم ہے''؟ ایسے موقعوں پر بالعموم آپ کے اردگرد لوگوں کی ایک بڑی تعداد جمع ہو جاتی اور ہر شخص اپنے علم کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ بیان کر دیتا، جس کو سن کر حضرت صدیق اکبرؓ فرماتے کہ ''خدا کا ہزار ہزار شکر ہے جس نے ہمارے اندر ایسے افراد پیدا کیے ہیں جو ہمارے پیغمبرؐ کے ارشادات محفوظ رکھے ہوئے ہیں'' لیکن اگر کبھی اپنی امکانی کوششیں صرف کرنے کے بعد بھی حضرت موصوف کو کوئی حدیث نہ ملتی تو پھر آپ سر برآوردہ اور بہترین دل ودماغ رکھنے والے افراد ملت کو جمع کر کے ان سے مشورہ کرتے اور جب وہ سب کسی رائے پر اتفاق کر لیتے تو اسی کے مطابق اپنا فیصلہ صادر فرماتے''۔

اسی طرح حضرت عمرؓ کے متعلق قاضی شریحؒ کی روایت ہے کہ:-

''انہوں نے (یعنی حضرت عمرؓ نے) ان کے پاس (یعنی قاضی شریحؒ کے پاس) فرمان بھیجا تھا کہ اگر تمہارے پاس کوئی ایسا معاملہ آئے جس کا حکم اللہ کی کتاب میں موجود ہو تو اسی کے مطابق فیصلہ کرنا، خبردار! زید وبکر کی رائیں اس کی طرف سے تمہاری توجہ نہ ہٹائیں، اور اگر کوئی ایسا معاملہ تمہاری عدالت میں پیش ہو جس کے بارے میں کتاب الٰہی کوئی حکم نہ دے رہی ہو تو سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھو اور اس کی رہنمائی میں فیصلہ کرو، لیکن اگر کسی معاملہ میں نہ کتاب الٰہی کا کوئی حکم موجود ہو، نہ ہی سنت کا، تو پھر یہ دیکھو کہ جمہور کا اتفاق اس قسم کے معاملہ میں کس چیز پر ہے۔ (اگر کوئی متفق علیہ رائے مل جائے تو) اسی کو اپنے فیصلہ کے لیے اختیار کر لو اور اگر یہ صورت پیش آجائے کہ کتاب الٰہی میں بھی معاملہ کا کوئی فیصلہ نہ ملے، سنت نبوی بھی خاموش ہو، اور اس بارے میں اپنے کسی پیشرو کا کوئی قول بھی تم کو نہ دستیاب ہو سکے تو دو باتوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرو، اگر چاہو کہ اپنی رائے سے اجتہاد کر کے فوراً معاملہ کا فیصلہ سنا دو تو ایسا بھی کر سکتے اور اگر چاہو کہ (اجتہاد کے بعد

فیصلہ نافذ کرنے میں) تاخیر اور مزید غور وفکر سے کام لو تو اس کی بھی اجازت ہے (لیکن جہاں تک میری رائے کا تعلق ہے) میں دوسری ہی راہ کو تمہارے حق میں بہتر سمجھتا ہوں۔

حضرت عبداللہؓ بن مسعود فرماتے ہیں:-

ایک زمانہ ہم پر ایسا گزرا ہے جب کہ ہم معاملات کا فیصلہ نہیں کرتے تھے اور نہ ہی اس کے اہل (۱) تھے، لیکن اب مشیت ایزدی نے ہم کو اس جگہ لا کھڑا کیا ہے جہاں تم ہم کو دیکھ رہے ہو، تو سنو! آج کے بعد جس کسی کے سامنے کوئی معاملہ پیش ہو اس کو چاہیے کہ اس کا فیصلہ کتاب الٰہی کے مطابق کرے، اور اگر کوئی ایسا معاملہ آئے جس کے متعلق کتاب الٰہی میں حکم مذکور نہ ہو تو رسول اللہ ﷺ کے ارشادات پر نظر کرے اور ان ہی کے بموجب فیصلہ دے لیکن جب کوئی ایسا معاملہ سامنے آئے جس کے بارے میں نہ تو کتاب الٰہی کچھ کہہ رہی ہو نہ ہی رسول اللہ ﷺ کا کوئی ارشاد معلوم ہو تو علمائے صالحین کے فیصلے کو اختیار کرے اور اس سلسلہ میں یہ نہ کہے کہ ''میں ڈرتا (۲) ہوں، اور میری رائے یہ ہے'' کیونکہ حرام اپنی جگہ واضح ہے اور حلال بھی واضح ہے اور کچھ چیزیں ان دونوں کے درمیان ہیں جن کی حلت اور حرمت واضح نہیں، سو (ان چیزوں کے حلال یا حرام قرار دینے میں یہ اصول سامنے رکھو کہ) جو چیز دل میں کھٹکے اس کو چھوڑ دو اور جو ایسی نہ ہو اس کو اختیار کر لو''۔

حضرت ابن عباسؓ سے جب کوئی مسئلہ پوچھا جاتا تو حکم قرآنی کے مطابق اس کا جواب بتا دیتے، اور اگر قرآن میں اس کا حکم نہ ملتا اور سنت رسولؐ میں مل جاتا تو وہ سنا دیتے اور جب ان دونوں کو خاموش پاتے تو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے فیصلوں کو سامنے رکھ کر جواب دیتے، لیکن جب یہاں سے بھی کوئی چیز نہ ملتی تو بطور خود اجتہاد کر کے اپنی رائے سے فیصلہ کرتے، ان ہی حضرت ابن عباسؓ نے (ایک موقع پر) لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے انہیں تنبیہ کی:-

---

(۱) اس زمانے سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اور خلفائے راشدین کا زمانہ ہے۔

(۲) مطلب یہ ہے کہ جب قرآن یا سنت یا اجماع صالحین سے کسی مسئلہ کا حکم معلوم ہو جائے، تو خواہ مخواہ اس کے بیان کرنے میں تجھک سے کام نہ لینا چاہیے۔

''کیا تمہیں یہ کہتے ہوئے کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمانا یہ ہے کہ فلاں شخص کا کہنا یہ ہے کہ اس امر کا خوف نہیں آتا کہ تم پر عذاب آ دھمکے یا تمہیں زمین میں دھنسا دیا جائے؟ (۱)''

حضرت قتادہؒ سے مروی ہے کہ ''ابن سیرینؒ نے ایک شخص کو رسول اللہ ﷺ کی کوئی حدیث سنائی تو اس نے کہا کہ ''اس مسئلہ کے متعلق فلاں شخص یہ کہتا ہے؟'' ابن سیرینؒ نے جواب دیا کہ ''میں تجھ کو رسول کریم ﷺ کی حدیث سناتا ہوں اور تو کہتا ہے کہ فلاں کا قول یہ ہے۔''

امام اوزاعیؒ سے منقول ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے فرمان صادر کیا تھا کہ ''کتاب اللہ کے حکم کے سامنے کسی شخص کی رائے کا کوئی وزن نہیں، ائمۂ مجتہدین کی رائے صرف اس مسئلہ میں قابل لحاظ ہے جس کے متعلق نہ تو خدا کی کتاب میں کوئی حکم نازل ہوا ہو اور نہ ہی کوئی ارشاد نبوی وارد ہوا ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو سنت مقرر فرما دی ہو، اس میں کسی شخص کی رائے بال مگس کے برابر بھی وقعت نہیں رکھتی۔

اعمشؒ کا بیان ہے کہ ابراہیم نخعیؒ تنہا مقتدی کو امام کے بائیں جانب کھڑے ہونے کا فتویٰ دیتے تھے۔ میں نے ان کو سمیع زیات کے حوالہ سے حضرت ابن عباسؓ کی یہ روایت سنائی کہ (جب ایک بار نماز تہجد میں وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بائیں طرف کھڑے ہو گئے تھے تو) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو وہاں سے ہٹا کر دائیں طرف کھڑا کر لیا، ابراہیم نخعیؒ نے یہ روایت سن کر اپنے خیال سے رجوع کر لیا''۔

بیان کیا جاتا ہے کہ ''امام شعبیؒ کے پاس کوئی آدمی ایک مسئلہ پوچھنے آیا، امام موصوف نے جواب دیا کہ اس مسئلہ میں حضرت عبداللہؓ بن مسعود کی رائے یہ ہے'' اس نے کہا ''آپ اپنی رائے بتائیے'' یہ سن کر امام شعبیؒ نے فرمایا ''لوگو! کیا تمہیں اس شخص پر حیرت نہیں ہوتی؟ میں نے تو اس کو ابن مسعودؓ کا فتویٰ بتا دیا اور یہ ہے کہ میری رائے پوچھ رہا ہے! میں تو جواب کے اس طریقہ کو اپنی ذاتی رائے کے اظہار سے کہیں بہتر سمجھتا ہوں، خدا کی قسم میری زبان سے کسی گیت (۲) کا نکلنا

---

(۱) یعنی قول رسولؐ کے مقابلہ میں کسی اور کا قول پیش کرنا موجب ہلاکت ہے۔

(۲) گیت نکلنے سے مراد یہ ہے کہ زبان سے کوئی گناہ کی بات نکل جائے۔

مجھے پسند ہے مگر یہ پسند نہیں کہ (ابن مسعودؓ جیسے جلیل القدر صحابی کے فتوے کے مقابلہ میں) اس سے اپنی کسی رائے کا اظہار کرو"۔

ان تمام آثار کو دارمی نے نقل کیا ہے۔

اسی طرح امام ترمذیؒ نے ابوسائب کی یہ روایت نقل کی ہے کہ "ہم لوگ وکیعؒ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، انھوں نے ایک شخص سے، جو رائے سے کام لینے کے حق میں تھا، فرمایا "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِشعار(۱) کیا ہے، مگر امام ابوحنیفہؒ کہتے ہیں کہ اِشعار مثلہ ہے"۔ اس شخص نے جواب دیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ ابراہیم نخعیؒ نے اِشعار کو مثلہ قرار دیا ہے" میں نے دیکھا کہ یہ الفاظ سنتے ہی وکیعؒ غصہ سے بیتاب ہو گئے اور فرمایا، میں تجھ سے کہتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا ہے۔ اور تو اس کے مقابلہ میں ابراہیم نخعیؒ کا قول سنا رہا ہے، یقیناً تو اس قابل ہے کہ قید میں ڈال دیا جائے اور اس وقت تک باہر نہ نکالا جائے جب تک کہ اپنے اس قول سے رجوع نہ کر لے"۔

حضرت عبداللہ بن عباس، عطاء، مجاہد اور مالک بن انس رضی اللہ عنہم فرمایا کرتے تھے کہ "کوئی شخص ایسا نہیں ہے (جس کی ہر بات آنکھ بند کر کے مان لی جائے اور) جس کی کچھ باتیں قابل تسلیم اور کچھ قابل رد نہ ہوں، بجز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے"۔

اس طریق فقہ کی کامیابی

(غرض سلف صالحین کے یہ اُسوے تھے جن کو سامنے رکھ کر علمائے حدیث نے استنباط مسائل کے مذکورۂ بالا قواعد کا تعین کیا) پھر جب انہوں نے اصول فقہ کو ان جدید بنیادوں پر مرتب کر کے مسائل پر نظر ڈالی تو ان مسائل میں سے، جن پر پہلے گفتگو ہو چکی تھی یا جواب ان کے سامنے پیش آ رہے تھے، کوئی مسئلہ ایسا نہ تھا جس کے متعلق کوئی نہ کوئی حدیث انہیں نہ مل گئی ہو، خواہ وہ مرفوع اور متصل ہو، خواہ مرسل، خواہ موقوف، صحیح ہو، خواہ حسن (۲)، خواہ (کسی اور طرح کے) قابل اعتبار یا (اگر کوئی حدیث نہ مل سکی ہو تو) شیخین (ابوبکرؓ و عمرؓ) یا دوسرے خلفائے راشدین، یا

---

(۱) "اشعار" ایک شرعی اصطلاح ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ قربانی کے اونٹ کی کوہان دائیں طرف سے کسی دھاردار آلہ کے ذریعہ اس طرح زخمی کردی جائے کہ وہ خون میں لت پت ہو جائے۔

(۲) "حسن" فن حدیث کی اصطلاح میں اس روایت کو کہتے ہیں جس کی سند متصل ہو، شذوذ اور علت سے محفوظ ہو، لیکن اس کے راوی اعلیٰ درجہ کے نہ ہوں۔

فقہا وقضاۃ اسلام کے اقوال میں سے کوئی نہ کوئی قول نہ مل گیا ہو، یا (کوئی حدیث اور اثر نہ ملنے کی شکل میں نصوص کتاب وسنت کے) عموم، اشارات اور مقتضیات سے انہوں نے خود استنباط نہ کرلیا ہو۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے حقیقی اتباع سنت کی شاہراہ باز کردی، ان علماء میں کمال کی بلندی، احادیث کی زیادتی فقیہانہ بصیرت اور مراتب حدیث کی واقفیت کے لحاظ سے سب سے زیادہ نمایاں امام احمدؒ بن حنبل ہیں اور ان کے بعد اسحاقؒ بن راہویہ۔

فقہ کا یہ طریقہ کوئی آسان طریقہ نہیں ہے بلکہ اس طرز پر مسائل شرعیہ میں رائے قائم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی کے پاس احادیث اور آثار کا ایک بڑا ذخیرہ اکٹھا ہو، چنانچہ امام احمد بن حنبلؒ سے جب پوچھا گیا کہ کیا ایک لاکھ حدیثوں کا علم ایک شخص کے مفتی بننے کے لیے کافی ہے؟ تو آپ نے فرمایا ''نہیں'' (پوچھنے والا اس تعداد کو برابر بڑھاتا رہا) یہاں تک کہ جب پانچ لاکھ تک یہ تعداد پہنچ گئی تب جاکر امام موصوف نے کہا کہ ''ہاں اب توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ مفتی بن سکے گا (غایۃ المنتہیٰ) یہاں مفتی بننے سے امام احمدؒ بن حنبلؒ کی مراد اسی طرز پر فتویٰ دینے کی تھی جس کا ذکر ہم اس وقت کررہے ہیں۔

تنقیح احادیث کا دور

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ایک اور گروہ پیدا کیا، اس گروہ نے جب دیکھا کہ پچھلوں نے ہم کو احادیث کے جمع کرنے اور مذکورۂ بالا اصل پر فقہ کی بنیادیں استوار کرنے کے فرض کی ادائیگی سے بے نیاز کردیا ہے تو وہ فن حدیث سے تعلق رکھنے والے دوسرے کاموں کے لیے یکسو ہوگیا۔ مثلاً روایت کے ذخیرہ میں سے ان حدیثوں کو چھان پھٹک کر الگ کرنا جن کی صحت پر یزیدؒ بن ہارون، یحییٰؒ بن سعید قطان، احمدؒ بن حنبل اور اسحٰقؒ بن راہویہ وغیرہ اکابر اہل حدیث کا اتفاق ہو، یا ان احادیث فقہ کو چن کر جمع کرنا جن پر فقہا اور علماء نے اپنے اپنے مذہب کی بنیاد رکھی ہے، یا ان شاذ (۱) اور غریب قسم کی روایتوں میں سے جو پچھلوں کے دائرۂ نقل وزبان میں نہیں آسکی تھیں، ہر ایک حدیث کے متعلق یہ فیصلہ کرنا کہ وہ کس پایہ کی ہے یا ان سندوں کا کھوج لگانا جن کے واسطے

---

(۱) ''شاذ'' اس حدیث کو کہتے ہیں جس کی سند اگرچہ متصل ہو اور جسکے راوی معتبر ہوں مگر وہ صرف ایک طریقہ سے مروی ہو اور کسی دوسری صحیح اور مضبوط حدیث کے مخالف واقع ہو۔

سے پہلے جامعین حدیث نے حدیثیں نہ پائی ہوں لیکن ان میں کوئی نہ کوئی فنی اہمیت موجود ہو مثلاً یہ کہ اسناد متصل ہوں (جب کہ پہلے اس طرح کی کوئی سند نہ مل سکی ہو) یا یہ سند زیادہ عالی مرتبت ہو یا اس کے اندر فقیہ راوی، فقیہ راوی سے یا حافظ حدیث راوی، حافظ حدیث راوی سے روایت بیان کر رہا ہو۔

یہ مقدس گروہ بخاریؒ، مسلمؒ، ابوداؤدؒ، عبد بن حمیدؒ، دارمیؒ، ابن ماجہؒ، ابویعلیٰؒ، ترمذیؒ، نسائیؒ، دارقطنیؒ، حاکمؒ، بیہقیؒ، خطیبؒ، دیلمیؒ اور ابن عبدالبرؒ وغیرہ! اساطین علم پر مشتمل ہے جہاں تک میری رائے کا تعلق ہے علم کی وسعت تصانیف کی افادیت اور عام شہرت کے لحاظ سے ان میں سے چار حضرات اس گروہ کے گل سرسبد ہیں، جو قریب قریب ہم عصر بھی ہیں (ہم یہاں ان کا اور ان کی بعض ممتاز خصوصیات کا مختصر تذکرہ کیے دیتے ہیں)

امام بخاریؒ

ان میں سب سے پہلے شخص ابوعبداللہ بخاریؒ ہیں، احادیث کے بارے میں ان کا زاویہ نگاہ یہ تھا کہ جو حدیثیں متصل، مشہور اور صحیح ہوں ان کو دوسری احادیث سے چھانٹ کر الگ کر لیا جائے اور ان ہی کو فقہ، سیرت اور تفسیر کا اصل سرچشمہ قرار دے کر ان سے مسائل کا استنباط کیا جائے اس مقصد کو سامنے رکھ کر انھوں نے اپنی کتاب ''جامع صحیح بخاری'' مرتب کی، اور ان ہی شرائط کے مطابق مرتب کی جن کو پہلے سے انھوں نے متعین کیا تھا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مرد بزرگ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ آپ فرما رہے ہیں، تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ میری کتاب کو چھوڑ کر محمد بن ادریسؒ (یعنی امام شافعیؒ) کی فقہ میں مشغول ہو!'' عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی کتاب کون سی ہے؟'' فرمایا ''صحیح بخاری''

بخدا اس کتاب نے جو کمالِ شہرت اور حسن قبول حاصل کیا اس سے اوپر کسی شہرت اور مقبولیت کی آرزو بھی نہیں کی جا سکتی۔

امام مسلمؒ

دوسرے شخص مسلم نیشاپوری ہیں، ان کا مطمح نظر یہ تھا کہ ان متصل اور مرفوع حدیثوں کا

انتخاب کیا جائے جن کی صحت پر تمام محدثین کا اتفاق ہو اور جن سے سنت رسولؐ کی صحیح نشاندہی ہوتی ہو، ساتھ ہی انھوں نے یہ عزم بھی کیا کہ ان احادیث کو اس انداز سے مرتب کیا جائے جس سے عام دماغوں کے لیے ان کا سمجھ لینا آسان ہو جائے اور ان سے مسائل نکالنے میں زحمت کم سے کم ہو، الحمدللہ کہ (ان عزائم میں وہ پوری طرح کامیاب رہے اور ان مقاصد کے لحاظ سے) انہوں نے اپنی کتاب کو بہترین ترتیب کے ساتھ مرتب کیا، یعنی ہر حدیث کی تمام سندیں ایک ہی جگہ جمع کر دیں تاکہ ایک ہی حدیث کے مختلف متنوں کا اختلاف پوری طرح روشنی میں آجائے اور یہ بھی معلوم ہو جائے کہ اس کی مختلف سندیں کس طرح ایک ہی جڑ سے شاخ در شاخ ہوئی ہیں پھر جو حدیثیں بظاہر ایک دوسرے کی مخالف تھیں ان میں تطبیق بھی دیدی، اس طرح اپنی ان مبارک کوششوں کے ذریعہ امام مسلمؒ نے کسی ایسے شخص کے لیے جو زبان عربی سے واقفیت رکھتا ہو، سنت کی شاہراہ چھوڑ کر کسی اور طرف جانے کا عذر باقی نہیں رہنے دیا۔

امام ابوداؤدؒ

تیسرے بزرگ امام ابوداؤد سجستانیؒ ہیں، جن کے سامنے یہ مقصد تھا کہ ان حدیثوں کو ایک جگہ جمع کیا جائے جو فقہا کا مدار حجت ہیں اور ان میں زیادہ مشہور ہیں، اور جن پر عام علماء نے احکام کی بنیاد رکھی ہے، اس مقصد کے پیش نظر انہوں نے اپنی کتاب مرتب کی اور اس میں صحیح اور حسن حدیثوں کے ساتھ ساتھ ایسی ضعیف حدیثیں بھی جمع کی ہیں جو کمزور ہونے کے باوجود قابل عمل تھیں، چنانچہ امام مذکور خود فرماتے ہیں کہ ”میں نے اپنی کتاب میں کوئی ایسی حدیث درج نہیں کی ہے جو تمام علمائے حدیث کے نزدیک قابل ترک ہو“۔ پھر جمع حدیث کے ساتھ ساتھ، آپ نے ضعیف روایتوں کے ضعف کی تصریح بھی کردی ہے، اور جن روایتوں میں کوئی علت (۱) تھی اس کے بیان میں ایسا انداز اختیار کیا ہے کہ فن حدیث میں نظر رکھنے والا اس کو اپنی نگاہِ تعمق سے ضرور ہی بھانپ لے اور (سب سے بڑی بات یہ کہ) ہر حدیث بیان کرنے سے پہلے انہوں نے کسی ایک ایسے مسئلہ فقہی کو بطور عنوان ضرور درج کردیا ہے جس کو کسی نہ کسی عالم نے اس حدیث سے

---

(۱) ”علت“ حدیث کے متن یا اس کی سند کے اس پوشیدہ نقص کو کہتے ہیں جو نگاہ تحقیق کی گرفت میں بمشکل آسکے۔

مستنبط کیا ہو اور جو کسی نہ کسی کا مذہب ہو یہی وجہ ہے کہ امام غزالیؒ وغیرہ کے اس خیال کی کہ "ابوداوٗد کی کتاب مجتہد کے لیے کافی ہے"۔

امام ترمذیؒ

چوتھے بزرگ ابوعیسیٰ ترمذیؒ ہیں، جن کے متعلق ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے ایک طرف تو روایتوں کی توضیح میں امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ کے طریقہ کو پسند کیا تھا، دوسری طرف فقہاء اور علماء کے مذاہب جمع کرنے میں امام ابوداوٗدؒ کی روش کے گرویدہ تھے، اس لیے انہوں نے اپنی کتاب کی تالیف میں ان دونوں ہی خوبیوں کو سمیٹ لیا، مزید برآں یہ بھی کیا کہ صحابہ اور تابعین اور دوسرے علمائے ملت کے مذاہب بھی بیان کر دیے، اس طرح ایک ایسی جامع تصنیف تیار کی جس میں نہایت خوبی کے ساتھ حدیث کی مختلف سندوں کا اس طور پر اختصار کیا گیا ہے کہ ایک سند تو ذکر کر دی ہے اور باقی کی طرف صرف اشارے کر دیے ہیں۔

ہر حدیث کے متعلق اس کے صحیح یا حسن، یا ضعیف، یا منکر(۱) ہونے کی نیز ضعیف روایتوں کے سبب ضعف کی وضاحت بھی کر دی ہے تا کہ طالب فن کو پوری بصیرت حاصل ہوتی رہے، اور وہ معتبر و غیر معتبر احادیث میں امتیاز کر سکے۔

ہر حدیث کے بارے میں یہ تصریح بھی کر دی ہے کہ وہ مشہور ہے یا غریب۔

صحابہ اور فقہائے اسلام کے مذاہب بھی نقل کرتے گئے ہیں اور اس سلسلہ میں حسب ضرورت اگر کسی کا نام تحریر کیا ہے تو کسی کی کنیت بیان کی ہے۔

غرض فن حدیث کے طالبان باہمت کے لیے کوئی حجاب اس کتاب میں باقی نہیں رہنے پایا ہے، اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ "وہ مجتہد کے لیے کفایت اور مقلد کے لیے بس کرتی ہے"۔

---

(۱) "منکر" اس ضعیف حدیث کو کہتے ہیں جو کسی حدیث صحیح یا حسن کی مخالف ہو۔

اہل الرائے

اجتہاد رائے کا رجحان

ان لوگوں کے مقابلہ میں (جن کا ذکر اوپر گزرا اور جن کو اہل الحدیث کہا جاتا ہے) ایک دوسرا گروہ ہے جس کا تعلق امام مالکؒ اور سفیانؒ ثوری کے عہد، اور اس کے بعد کے زمانوں سے ہے۔ یہ لوگ نہ (فرضی) مسائل پر سوال وجواب کو برا سمجھتے تھے نہ فتویٰ دینے میں کوئی ڈر (اور ہچکچاہٹ) محسوس کرتے تھے، ان کا کہنا یہ تھا کہ فقہ ہی پر دین کی بنیاد ہے، اس لیے ضروری ہے کہ اس کو وسیع پیمانہ پر لوگوں تک پہنچایا جائے، لیکن حدیثیں بیان کرنے اور ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنے سے یہ لوگ بہت ڈرتے تھے جیسا کہ امام شعبیؒ فرماتے ہیں:۔

''کسی حدیث کا (بجائے رسول اللہؐ کے) صحابہؓ تک پہنچ کر رہ جانا ہمیں زیادہ پسند ہے، تاکہ اگر اس کے الفاظ میں کوئی کمی بیشی ہوگئی ہو تو وہ دوسروں ہی کی طرف منسوب ہو کر رہ جائے (اور ذاتِ نبویؐ کی طرف اس کے منسوب کردینے کے گناہ سے انسان بچ جائے''۔

ابراہیم نخعیؒ کا قول ہے کہ:۔

''مجھ کو (احادیث رسول سنانے کے بجائے) یہ کہنا زیادہ پسند ہے کہ عبداللہ بن مسعودؓ نے یہ فرمایا ہے، علقمہؒ نے یہ کہا ہے''۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث بیان کرتے تھے تو

ان کا چہرہ (روایت حدیث کی بھاری ذمہ داریوں کی ہیبت سے متغیر ہو جاتا اور (سہم سہم کر) فرماتے:-

''رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے) ایسا ہی (فرمایا ہے) یا اسی کے قریب قریب۔
ایسا ہی (فرمایا ہے) یا اسی کے قریب قریب''۔

حضرت عمرؓ نے جب انصار کا ایک وفد کوفہ بھیجا تو اسے ہدایت کی کہ:-

''تم کوفہ جارہے ہو، جہاں تم ایسے (باخدا) لوگوں سے ملو گے جو قرآن پڑھ کر رو پڑتے ہیں، یہ لوگ تمہارے پاس آ کر کہیں گے کہ ''محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھی آئے، محمدؐ کے ساتھی آئے''! غرض وہ تمہارے پاس آ کر تم سے حدیثیں سننی چاہیں گے تو تم حتی الوسع کم سے کم حدیثیں بیان کرنا''۔

ابن عونؒ فرماتے ہیں کہ ''جب امام شعبیؒ کے پاس کوئی مسئلہ آتا تو وہ اس کا جواب دینے سے پہلوتہی کرتے، ان کے بالمقابل ابراہیم نخعیؒ کا دستور یہ تھا کہ مسائل کا جواب دینے میں ان کی زبان خاموش ہونا جانتی ہی نہ تھی''۔

ان تمام آثار کو امام دارمیؒ نے نقل کیا ہے۔

ظہور تخریج کے اسباب

(اس اختلاف نظر کی وجہ سے) حدیث اور فقہ اور مسائل کی وہ تدوین، (جو پہلے لوگوں کے ہاتھوں سرانجام پا چکی تھی) ان لوگوں کے جس طرح کام آئی اس کی نوعیت جداگانہ تھی (اور یہ لوگ اس سے وہ فائدہ حاصل نہ کر سکے جو گروہ اوّل یعنی علمائے حدیث نے حاصل کیا تھا) جس کی تفصیل اور جس کی وجوہ یہ ہیں:-

ان کے پاس احادیث و آثار کا وہ ذخیرۂ عظیم نہ تھا جس کے ذریعہ وہ اہل الحدیث کے اختیار کیے ہوئے اصول پر مسائل فقہ کا استنباط کر سکتے۔

ان کے سینے اس بات کے لیے کھل نہ سکتے تھے کہ (مختلف الخیال) علمائے سلف کے اقوال کو گہری نگاہ سے دیکھتے، ان کو جمع کرتے اور ان پر بحثیں کرتے (اور اس کے بعد مسلک حق کا انتخاب کرتے، بلکہ اس کے برعکس) انھوں نے اس بارے میں وہ طریقہ اختیار کیا جس سے

اتہامات کا ہدف بن گئے یعنی انھوں نے صرف اپنے ائمہ کو لے لیا اور ان کے متعلق دلوں میں یہ نقش عقیدت بٹھا لیا کہ انہیں تحقیق کا بلند ترین مقام حاصل تھا (مختصر یہ کہ) ان لوگوں کے دل اپنے شیوخ کی طرف انتہائی حد تک جھک گئے تھے، چنانچہ علقمہؒ نے کھلے بندوں فرمایا:۔

”کیا کوئی صحابی عبداللہ بن مسعودؓ سے زیادہ پختہ نظر رکھتا ہے“؟۔

امام ابوحنیفہ کا قول ہے کہ:

”ابراہیم سالمؒ سے زیادہ فقیہ ہیں اور اگر صحبت رسولﷺ کی فضیلت کا سوال نہ ہوتا تو میں کہہ دیتا کہ علقمہ (تابعی) ابن عمرؓ (صحابی) سے بڑے فقیہ ہیں۔“

ان لوگوں کو قدرت کی طرف سے ایسی ذہانت اور زود فہمی عطا ہوئی تھی اور ان کا ذہن ایک بات سے دوسری بات کی طرف بسرعت منتقل ہونے کا اتنا ملکہ رکھتا تھا کہ وہ اپنے شیوخ کے اقوال پر جواب مسئلہ کی بآسانی ”تخریج کر سکتے تھے۔

حق یہ ہے کہ جس کام کے لیے جو پیدا کیا گیا ہے اس کے لیے اسی کام کی راہ آسان بھی کی جاتی ہے، اور ہر گروہ اپنے ہی سرمایہ فکر ونظر میں مگن رہتا ہے، الغرض یہ اسباب تھے جن کی بنا پر ان حضرات نے تخریج کو اپنی فقہ کی عمارت کا سنگ بنیاد قرار دے دیا۔

تخریج کیا ہے؟

تخریج کا قاعدہ یہ ہے کہ آدمی اُس صاحب علم کی تصنیف اپنے حافظہ میں منتقل کرے جو اس کے شیوخ واساتذہ کی بہترین وکالت کرنے والا، ان کے اقوال سے سب سے زیادہ واقفیت رکھنے والا اور ان کے مختلف اقوال میں سے (ایک کو دوسرے پر) ترجیح دینے میں سب سے بڑھ کر فکر صائب رکھنے والا ہو، پھر ہر مسئلہ میں حکم کی علت پر غور کرے اور جب کوئی بات اس سے پوچھی جائے یا خود اس کو کسی امر میں حکم شریعت معلوم کرنے کی ضرورت پیش آئے تو اپنے شیوخ کے اقوال کے اُس ذخیرہ پر، جس کو اس نے اپنے حافظہ میں محفوظ رکھا ہے، نگاہ ڈالے، اگر اس سے مسئلہ جواب صریح طور پر مل جائے تو خیر، ورنہ ان اقوال صریحہ کے عموم کو دیکھے اور مسئلہ زیر بحث کو کہیں نہ کہیں اس عموم کے دائرے میں لے لے، یا ان کے کسی قول کے کسی ضمنی اشارہ پر اپنی نظریں جما دے اور اس سے مسئلہ کا جواب مستنبط کرے، چنانچہ یہ اپنی جگہ ایک حقیقت بھی ہے کہ بعض اوقات

ایک کلام اپنے اندر ایسا اشارہ یا اقتضا رکھتا ہے جس سے مسئلۂ زیرِ غور کی گرہ کھل جاتی ہے، کبھی ایک شے اس مسئلہ کی جس کی تصریح اس کے اپنے شیوخ کے اقوال میں ہوتی ہے، نظیر ہوتی ہے، اس لیے اس کو اس پر محمول کر دیا جاتا ہے اور بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس مسئلہ کی علت کا سراغ لگاتے ہیں (جو اقوال شیوخ میں صراحت کے ساتھ مذکور نہیں ہوتا بلکہ) جس کی تصریح تخریج یا ''سبر''(۱) یا حذف سے ہوئی ہوتی ہے اور (اشتراک علت کو دیکھتے ہوئے) اس مسئلہ پر بھی وہی حکم لگا دیتے ہیں جس کی تصریح (ابھی تک کے مجموعۂ اقوال وفتاوی میں) نہیں ہوئی ہوتی (گویا تخریج درتخریج کی جاتی ہے) بعض اوقات اس مسئلہ مصرحہ کے متعلق اس طرح کی دو تقریریں ہوتی ہیں کہ اگر وہ دونوں قیاس (۲) اقترانی یا قیاس شرطی (۳) کے طور پر ایک مرکز پر جمع ہو جائیں تو اس سے جو نتیجہ برآمد ہو، وہی اس مسئلہ کا جواب ہو جائے۔ پھر کبھی صورت حال یہ ہوتی ہے کہ ایک بات، شیوخ کے فرمودات میں، مثال کی حیثیت سے اور تصنیفی تقسیم کے اعتبار سے تو بالکل بے نقاب ہوتی ہے مگر بلحاظ تعریف ایسی تعریف جو جامع بھی ہو اور مانع بھی، وہ نامعلوم اور غیر متعین ہوتی ہے تو اس شکل میں وہ اہل زبان کی طرف رجوع کرتے ہیں اور پوری کاوش سے اس امر کی ذاتیات (۴) معلوم کرتے ہیں، اس کی جامع اور مانع تعریف معین کرتے ہیں، اس کے مبہم حصوں کو واضح اور اس کے متشابہ پہلوؤں کو ممیز کرتے ہیں، کبھی شیوخ کا کوئی قول دو صورتوں کا احتمال رکھتا ہے تو یہ اہل تخریج غور کر کے ایک صورت کو ترجیح دیتے ہیں، کبھی مسائل اور ان کے

---

(۱) ''سبر'' تخریج کی طرح ایک اصطلاحی لفظ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اصل کے تمام اوصاف کو اس فرع کے سامنے جس پر اصل کو قیاس کیا جا رہا ہے، رکھ کر دیکھا جائے اور اس وصف کو لے کر جو اصل اور فرع میں مشترک طور پر موجود ہے، باقی سے صرف نظر کر لیا جائے تا کہ حکم کی علت متعین ہو جائے۔

(۲) ''قیاس اقترانی'' علم منطق کی اصطلاح میں اس قیاس کو کہتے ہیں جس کے مقدمات کے بیان کے بعد ان مقدمات کا نفس نتیجہ یا اس کا نقیض مذکور ہو۔

(۳) ''قیاس شرطی'' ''قیاس اقترانی'' ہی کی ایک مخصوص قسم ہے، جس کے دونوں مقدمے شرطی ہوں، مقدمہ شرطی سے مراد وہ مقدمہ ہے جس میں کسی چیز کے لیے کسی دوسری چیز کے ثبوت یا اس کی نفی کا حکم لگایا گیا ہو۔

(۴) ''ذاتیات'' سے مراد کسی امر کے وہ بنیادی اوصاف ہیں جو اس کی حقیقت اور جوہریت سے تعلق رکھتے ہوں۔

دلائل میں جو تعلق ہوتا ہے، اس پر پردہ پڑا ہوا ہوتا ہے تو یہ لوگ اپنی انگشت بحث وفکر سے اس پردہ کو ہٹا دیتے ہیں، بعض اہل تخریج نے اپنے ائمہ کے (اقوال وتصریحات کے علاوہ ان کے) کسی کام کے کرنے یا کسی کام پر سکوت اختیار کرنے سے بھی استدلال کیا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

مجتہد فی المذہب

غرض یہ ہیں استنباط مسائل کے وہ طریقے جن کو تخریج کہا جاتا ہے اور جو مسئلہ اس طرح مستنبط کیا جاتا ہے اس کا ذکر یوں کرتے ہیں کہ ''فلاں شخص کا تخریج کیا ہوا مسئلہ یہ ہے'' یا اس طرح کہ ''فلاں امام کے مذہب پر، یا فلاں کی قائم کردہ بنیاد کے لحاظ سے، یا فلاں کے قول کے مطابق مسئلہ کا جواب یہ ہے'' اور وہ لوگ (جو یہ تخریج کرتے ہیں) مجتہد فی المذہب کہے جاتے ہیں، اور یہ جو کسی نے کہا ہے کہ ''جس نے مبسوط یاد کرلی وہ مجتہد ہے'' یعنی اگرچہ وہ علم روایت سے بالکل بے بہرہ ہی کیوں نہ ہو اور ایک حدیث بھی نہ جانتا ہو، تو اس قول سے اس کی مراد دراصل اس اجتہاد سے ہے جس کی بنیاد اسی قاعدہ تخریج پر ہو۔

بعض مذاہب کے پھیلنے اور بعض کے مٹنے کے اسباب

یہ تخریج ہر مذہب میں ہوئی اور پورے زور شور سے ہوئی لیکن پھر ہوا یہ کہ جس مذہب کے اہل علم شہرت عام کے مالک تھے، قدرتاً قضا اور افتاء کے مناصب ان ہی کو سپرد کر دیئے گئے، جس کی وجہ سے ان کی تصنیفات عوام الناس میں مشہور ہوگئیں، اور ہر طرف لوگ ان کو پڑھنے پڑھانے لگے، اس طرح وہ مذہب اطراف عالم میں پھیل نکلا اور برابر پھیلتا رہا، اس کے برعکس جس مذہب کے علمبردار گوشۂ گمنامی میں پڑے رہے، اور نہ ان کے ہاتھوں میں قضا وافتاء کے عہدے آئے نہ عام لوگوں نے ان سے کسی گہری وابستگی کا اظہار کیا، وہ مذہب چند ہی دنوں بعد صفحۂ ہستی سے ناپید ہوگیا۔

مسلکِ حق وراہِ اعتدال

حق کا درمیانی راستہ

حقیقت یہ ہے کہ استنباط کے مذکورہ بالا دونوں طریقوں، طریق تخریج اور طریق تتبع احادیث، میں سے ہر طریقہ اپنے لیے ایک مضبوط دینی بنیاد رکھتا ہے، اور علمائے محققین ہر زمانہ میں بیک وقت ان دونوں طریقوں کو اختیار کرتے رہے ہیں (فرق صرف تناسب میں ہوتا تھا یعنی) بعض نے طریق تخریج سے زیادہ کام لیا اور الفاظ حدیث کے اتباع کا کم لحاظ کیا، اور بعض کا رجحان اتباع روایات کی طرف زیادہ اور طریق تخریج کی طرف کم رہا، پس یہ مناسب نہیں ہے کہ ان دونوں میں سے کسی ایک طریقہ کو بالکلیہ چھوڑ دیا جائے، جیسا کہ (بدقسمتی سے اہل الحدیث اور اہل فقہ) دونوں جماعتوں کے عام لوگوں کا شیوہ ہے، حق خالص یہ ہے کہ (ان دونوں طریقوں کو جمع کیا جائے) ان میں باہم مطابقت پیدا کی جائے اور ایک کے اندر جو نقص ہے، دوسرے کی مدد سے اس کی تلافی کی جائے، یہی مدعا ہے حضرت حسنؒ بصری کے اس ارشاد کا کہ:۔

> ''اس خدا کی قسم، جس کے سوا کوئی معبود نہیں، تمہارا راستہ غالی (حد سے تجاوز کرنے والے) اور جافی (حد واجب تک پہنچنے میں کوتاہی کرنے والے) دونوں کے درمیان ہونا چاہیے''۔

پس جو اہل حدیث ہیں، ان کو چاہیے کہ اپنے اختیار کیے ہوئے مسائل اور مذاہب کو عہد تابعین اور اس کے بعد کے ائمہ مجتہدین کی رایوں پر پیش کریں (اور ان کے تفقہ سے فائدہ

اٹھائیں) اور جو اہل تخریج ہیں ان کا فرض یہ ہے کہ احادیث کے ذخیرہ سے فکر ونظر کا وہ لگاؤ پیدا کریں جس کے ذریعہ وہ کسی صریح اور ثابت شدہ (حدیث) کی مخالفت سے بچ سکیں اور کسی ایسے مسئلہ میں جس سے متعلق کوئی حدیث یا اثر موجود ہو، رائے زنی نہ کر جائیں۔

اہل الحدیث کی افراط وتفریط

کسی محدث کو ان اصول وقواعد کے استعمال میں، جن کو ائمۂ حدیث نے گو اپنے پورے اطمینان کے ساتھ وضع کیا ہے لیکن بہر حال ان کی قطعیت پر شارع کی کوئی نص موجود نہیں ہے، اتنا غلو اور تشدد نہ کرنا چاہیے کہ اس سے کسی حدیث کو (جو ان قواعد پر پوری نہ اترتی ہو) یا کسی قیاس صحیح کو ٹھکرا بیٹھے، مثال کے طور پر ہر اس حدیث کا انکار کر دینا جس کے مرسل یا منقطع ہونے کا معمولی شبہ بھی موجود ہو، جیسا کہ علامہ ابنؒ حزم نے امام بخاریؒ کی روایت کی ہوئی ''تحریم معازف'' (گانے بجانے کو حرام قرار دینے) والی حدیث کو رد کر دیا ہے، صرف اس بناء پر کہ اس کی سند میں انقطاع کا شبہ موجود ہے، حالانکہ یہ حدیث فی الواقع متصل اور صحیح ہے (اس لیے ایک ایسے شبہ کو جس کی واقعیت پر کوئی ثبوت موجود نہیں، اتنی اہمیت دینا کسی طرح مناسب نہیں ہو سکتا کہ حدیث کو بالکل نا قابل قبول ٹھیرا دیا جائے) اس قسم کے شکوک کو صرف اسی وقت درخور اعتناء سمجھا جانا چاہیے جب کہ کوئی دوسری صحیح حدیث اس کے مخالف پڑتی ہو۔

یا محدثین کا یہ کہنا کہ ''فلاں راوی فلاں شخص کی روایات کا سب سے بڑا حافظ ہے''۔ اس بات کا ان کے طرز فکر وعمل پر اتنا گہرا اثر ہوتا ہے کہ وہ اس راوی کی بیان کی ہوئی حدیثوں کو دوسروں کی بیان کردہ حدیثوں پر لازماً ترجیح دے دیا کرتے ہیں، اگرچہ دوسرے راویوں میں (دیگر اعتبارات سے) ترجیح کے ہزاروں وجوہ پائے جاتے ہوں اور جب کہ (یہ بات بھی معلوم ومسلم ہے کہ) روایت (۱) بالمعنی کرتے وقت عام راویان حدیث کی نگاہیں معانی پر مرکوز رہا کرتی تھیں نہ کہ ادب وزبان کے ان نقطوں پر جو صرف بال کی کھال نکالنے والے عربی دانوں کے جاننے پہچاننے کی چیزیں ہیں پس (ایسی حالت میں اس سب سے بڑے ''حافظ'' راوی کے ایک

---

(۱) ''روایت بالمعنی'' کا مطلب یہ ہے کہ ارشادات رسول کے الفاظ سے قطع نظر کرتے ہوئے ان کے اصل مقصود کو اپنے لفظوں میں ادا کر دیا جائے۔ اکثر وبیشتر راویوں کا طریقۂ روایت یہی تھا۔

ایک لفظ کو مدارِ حجت بنانا اور) ''ف'' ''یا'' ''وَ'' وغیرہ جیسے حروف تک سے، یا کسی لفظ کی تقدیم وتاخیر سے استدلال کا رخ متعین کرنا، اور اسی طرح کی دوسری باتیں ان کے تکلف بے جا اور تشدد ناروا کی آئینہ دار ہیں، (جن کو اصل مقصد روایت سے کوئی تعلق نہیں) ورنہ تم دیکھتے ہو کہ عموماً جب کوئی دوسرا راوی اسی روایت کو بیان کرتا ہے تو اس حرف کو چھوڑ کر (جس کو راوی اوّل نے استعمال کیا تھا) اس کی جگہ کوئی دوسرا حرف لاتا ہے۔

اس باب میں قول فیصل یہ ہے کہ راوی جو کچھ بیان کرتا ہے، اس کے متعلق بظاہر یہی سمجھنا چاہیے کہ وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، ہاں اگر کوئی دوسری حدیث یا کوئی اور دلیل (اس کے خلاف) منظر عام پر آجائے تو ضروری ہے کہ اس کو چھوڑ کر اس کی طرف رجوع کر لیا جائے۔

اہل الرائے کی افراط وتفریط

اسی طرح اہل تخریج کے لیے بھی یہ مناسب نہیں کہ وہ (اپنے ائمہ کے کلام کو کرید کرید کر) کسی ایسے قول کی تخریج کریں جو اس کلام کی روح اور مزاج سے ہم آہنگ نہ ہو اور اہل زبان وعلمائے لغت کا عام اسلوب سخن فہمی اس قول کو اس کلام کا نتیجہ قرار دینے سے انکار کر رہا ہو، یعنی اس قول کی بنیاد (اصل اور فرع کی) جس علت مشترک کی تخریج پر رکھی گئی ہو یا اس کو جس مسئلہ کی نظیر مان کر اس پر محمول کیا گیا ہو (وہ متفق علیہ نہ ہو بلکہ ان کے علت مشترک ہونے یا نظیر مسئلہ ہونے میں) ارباب نظر اختلاف رکھتے ہوں، اور اسکے بارے میں ایک سے زائد رائیں پائی جاتی ہوں۔ پھر (اس تخریج کی صحت کے غیر یقینی ہونے کی حد یہ ہو کہ) اگر بالفرض خود ان ائمہ مذہب سے (جن کے اقوال کو سامنے رکھ کر یہ تخریج کی گئی ہے) یہی مسئلہ پوچھا جاتا تو شاید وہ بھی کسی رکاوٹ کی وجہ سے اس معاملہ کو اس مسئلہ کی نظیر قرار دے کر اس پر محمول نہ کرتے، یا اپنے قول کی کوئی ایسی علت بتاتے جو ان حضرات کی معین کی ہوئی اور نکالی ہوئی علت کے ماسوا ہوتی تخریج تو جائز صرف اس وجہ سے ہے کہ وہ دراصل مجتہد کی تقلید کا دوسرا نام ہے، اس لیے وہ نقص سے پاک اسی وقت ہو سکتی ہے جب کہ کلام مجتہد کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر کی گئی ہو۔

اسی طرح ان لوگوں کے لیے یہ بات بھی زیبا نہیں کہ صرف ایک ایسے اصول کی پیروی میں

(جو اپنی قطعیت پر کوئی نص نہیں رکھتا اور) جس کو خود انہوں نے یا ان کے شیوخ نے اپنی فہم سے مقرر کر رکھا ہے، کسی ایسی حدیث یا اثر کو رد کر دیں جس کو تمام علمائے حدیث صحیح کہتے اور مانتے آئے ہوں۔ جیسا کہ بعض حضرات نے (اپنے قیاس اور اپنے اصول کی پیروی میں) حدیث مصراۃ (۱) کو ٹھکرا دیا، یا جس طرح اموال غنیمت میں قرابت (۲) داران رسولؐ کے حصہ کو ساقط کر دیا۔ ایک خود ساختہ اصول کے مقابلہ میں حدیث رسولؐ کا پاس بہرصورت زیادہ ضروری ہے۔

یہی وہ رازِ حقیقت ہے جس کی طرف امام شافعیؒ کے یہ الفاظ اشارہ کر رہے ہیں:۔

"میں نے جو رائے بھی دی ہو یا جو اصول بھی مقرر کیا ہو (حدیث رسولؐ کے مقابلہ میں اس کی کوئی حیثیت نہیں) اگر رسول اللہ صلعم کا کوئی ارشاد اس کے خلاف مل جائے تو لینے کے قابل وہی بات ہے جو رسولؐ کی طرف سے ملی ہو"۔

(اہل الحدیث اور اہل تخریج کی افراط وتفریط کے بارے میں) ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں، قریب قریب بالکل وہی حقیقت ان الفاظ سے بھی ٹپک رہی ہے جو امام ابو سلیمان خطابیؒ نے اپنی کتاب "معالم السنن" کے آغاز بحث میں تحریر کیے ہیں، چنانچہ وہ کہتے ہیں:

"میں دیکھتا ہوں کہ ہمارے زمانہ میں ارباب علم دو گروہوں میں بٹ گئے ہیں۔

---

(۱) "مصراۃ" اس دودھ والے جانور کو کہتے ہیں۔ جس کے بیچنے کے لیے اس کے تھن سے چند اوقات دودھ نہ نکالا گیا ہوتا کہ خریدار اس کے تھن کی بڑائی دیکھ کر دھوکہ میں پڑ جائے۔

حدیث مصراۃ کا مفہوم یہ ہے کہ "جو شخص ایسا جانور خریدے اس کو دوہنے اور حقیقت حال سے واقفیت ہو جانے کے بعد اسے اختیار ہے کہ چاہے جانور کو رکھے یا واپس کر دے، اگر واپس کرے تو نکالے ہوئے دودھ کے عوض اس کے مالک کو ایک صاع خرما دیدے۔

فقہائے حنفیہ نے اس حدیث پر عمل کرنے سے اس وجہ سے انکار کر دیا کہ وہ کوئی عام قانون نہیں بن سکتی، یعنی وہ خلاف قیاس ہے، قیاس تو یہ کہتا ہے کہ نکالے ہوئے دودھ کا ضمان (بدلہ) اس کے برابر ہونا چاہیے، لیکن اس حدیث کا کہنا یہ ہے کہ چاہے دودھ کتنا ہی نکالا ہو، ایک سیر نکالا ہو یا دس بیس سیر، بہرحال اس کا ضمان ایک ہی صاع خرما ادا کرنا چاہیے۔

(۲) "قرابت داران رسولؐ" سے مراد بنی ہاشم اور بنی مطلب ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کو فتح خیبر کے بعد کل مال غنیمت کا پچیسواں حصہ دیا تھا لیکن خلفائے راشدین کے زمانہ میں اس پر عمل نہ ہونے کے باعث بعض فقیہان ان لوگوں کے اس حصہ کو تسلیم نہیں کیا۔

ایک گروہ تو اہل حدیث و اثر حضرات کا ہے اور دوسرا اہل فقہ و نظر کا۔ ان کا حال واقعی یہ ہے کہ (دو مخالف کیمپ ہونے کے باوجود) یہ دونوں ایک دوسرے کے برابر کے محتاج ہیں، اور اپنا مقصود حاصل کرنے میں ان دونوں میں سے کوئی بھی دوسرے گروہ سے بے نیاز نہیں، کیونکہ حدیث کی حیثیت بنیاد کی سی ہے جس کو اصل کہنا چاہیے اور فقہ کی حیثیت عمارت کی سی ہے جو اصل کے لیے فرع کا مقام رکھتی ہے (سبھی جانتے ہیں کہ) جو عمارت کسی بنیاد کے اوپر نہ اٹھائی گئی ہو وہ کبھی ٹھہر نہیں سکتی، اسی طرح ہر وہ بنیاد جس کے اوپر کوئی عمارت نہ ہو، ایک چٹیل میدان اور اجڑے ہوئے کھنڈر سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی، اگرچہ ان دونوں گروہوں میں اپنے مقام و محل کے اعتبار سے چولی دامن کا ساتھ ہے، اور ہر ایک دوسرے کی (اعانت کی) عمومی احتیاج رکھتا ہے، اور کسی لمحہ بھی کوئی گروہ دوسرے کی محتاجی سے مستغنی نہیں ہوسکتا، مگر (ان تمام باتوں کے باوجود) میں ان کو باہم دگر کھنچا ہوا پا رہا ہوں، حالانکہ راہ حق میں تعاون ان پر لازم ہے لیکن وہ ایک دوسرے کی پشت پناہی نہیں کرتے، ان میں سے جو طبقہ ''اہل حدیث'' کہلاتا ہے اس کے سواد اعظم کی معراج سعی و عمل صرف یہ ہے کہ روایتوں کو بیان کرے، مسندوں کو جمع کرے اور ایسی ایسی غریب شاذ حدیثوں کو بھی جن کی عبارتوں کا بڑا حصہ موضوع یا مقلوب (۱) ہے، تلاش کرتا رہے یہ لوگ بس سند کے دلدادہ ہوتے ہیں) نہ تو متن روایت کا کوئی لحاظ کرتے نہ اپنی نگاہ کو مدعائے حدیث سے آشنا کرتے نہ اس کے اسرار کا سراغ لگاتے، نہ ان کی گہرائیوں میں چھپے ہوئے خزانوں کو ڈھونڈ نکالنے کی سعی کرتے، بسا اوقات فقہا پر عیب لگانے اور انہیں مطعون کرنے اور ان پر سنت رسولؐ کی مخالفت کا الزام لگانے سے بھی نہیں چوکتے حالانکہ انہیں یہ نہیں معلوم کہ فقہا کو علم و فہم شریعت کی جو دولت بخشی گئی تھی وہ اس سے کہیں زیادہ ہے جو ان کے اپنے حصہ میں آئی ہے، ان کے خلاف اس قسم کے برے کلمات نکال کروہ (مفت میں) گناہ گار ہوتے ہیں۔

---

(۱) ''مقلوب'' اس حدیث کو کہتے ہیں جس کے الفاظ یا جملوں میں راوی نے اپنی غلطی سے تقدیم و تاخیر کر دی ہو۔

رہا دوسرا طبقہ، یعنی اہل فقہ ونظر حضرات کا طبقہ، تو اس کا حال یہ ہے کہ اس کے اکثر افراد حدیث کے ساتھ کچھ یوں ہی سا لگاؤ رکھنے میں نہ تو صحیح حدیثوں کو ضعیف حدیثوں سے علیحدہ کر پاتے ہیں، نہ کھری اور کھوٹی روایتوں کو پہچان کر دیتے ہیں (احادیث سے ان کی بے اعتنائی کا عالم یہ ہے کہ) اگر ان لوگوں کو اپنے اختیار کردہ مذہب اور اپنی محبوب رایوں کے موافق (بھی) کوئی حدیث مل جائے تو بھی وہ اس سے اپنے مخالفوں کے خلاف حجت قائم کرنے کی کوئی پرواہ نہیں رکھتے، حدیث کے رد وقبول کے بارے میں ان لوگوں نے باہم یہ طے کر رکھا ہے کہ ضعیف اور منقطع روایتیں (بھی)، اگر وہ اپنے ائمہ اور شیوخ کے درمیان مشہور ومقبول رہی ہوں تو قبول کر لی جائیں، خواہ ان کی بنیاد کتنی ہی ناپائیدار اور ان کی صحت کتنی ہی موہوم کیوں نہ ہو یہ ''رائی'' کی ایک (کھلی ہوئی) لغزش اور نارسائی ہے، پھر (ان لوگوں کی ایک عجیب وغریب ستم ظریفی یہ ہے کہ) اگر ان کے سامنے، ان کے مذہب کے کسی بڑے شخص اور ان کے اسکول کے کسی ممتاز فکر کا اجتہاد کیا ہوا کوئی قول بیان کیا جاتا ہے تو اس کو قبول کر لینے کے لیے ضرور دیکھتے ہیں کہ اس قول کے راویوں میں سب سے زیادہ قابل اعتماد راوی کون ہے؟ (بس اسی کی روایت کو لیتے ہیں، گویا اس قول کے قول امام ہونے کی بابت تحقیق کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہونے کی پوری کوشش کرتے ہیں، چنانچہ مالکیوں کو تم پاؤ گے کہ وہ اپنے مذہب کے بارے میں صرف ان ہی اقوال کو معتبر مانتے ہیں جو ابن قاسمؒ، اشہبؒ اور ان ہی کے ہم پایہ دوسرے مالکی علمائے عظام کے روایت کردہ ہوں، اور اگر عبداللہؒ بن عبدالحکیم جیسے (نسبتاً کم درجے کے) علماء کے ذریعہ (ان بڑے علماء کی روایتوں کی مخالف) کوئی روایت بہم پہنچی ہو تو اس کو کوئی حیثیت نہیں دیتے، اسی طرح امام ابوحنیفہؒ کے پیرو، امام موصوف کے صرف انہی اقوال کو قبول کرتے ہیں، جو ان کے تلامذہ میں سے امام ابو یوسفؒ، امام محمدؒ بن حسن اور ان ہی جیسے دوسرے بلند مرتبہ علماء کے نقل کیے ہوئے ہوں، ان اقوال کی روایت کو یہ شرف کبھی نہیں بخشتے جو حسنؒ بن زیاد اور ان

سے کم تر درجہ کے لوگوں کے واسطے سے ملے ہوں اور مذکورہ بالا نامور علمائے احناف کی روایتوں کے خلاف پڑتے ہوں، شوافع کا بھی یہی حال ہے، یہ لوگ اقوال شافعیؒ میں سے صرف ان ہی اقوال کو تسلیم کرتے ہیں جو مزنیؒ اور ربیع بن سلیمان مرادیؒ کے روایت کیے ہوئے ہوں، اور اگر حرملہؒ اور بکریؒ وغیرہ (جیسے نسبتاً کم مرتبے کے شافعی علماء) نے امام ممدوح کا کوئی قول (ان قوال کے خلاف) نقل کیا ہوتو اس کی طرف مطلق توجہ نہیں کرتے حتی کہ اس کو اقوال شافعی میں شمار کرنے کے بھی روادار نہیں ہوتے، الغرض اپنے ائمہ اور اساتذہ کے اقوال (کے قبول وعدم قبول) میں ہر فرقہ کے اہل علم کا یہی دستور ہے، پھر ذرا غور تو کرو، اگر ان جزئیات میں، اور ان ائمہ کے اقوال کی روایتوں میں ان ''اصحاب فقہ ونظر'' (کی تحقیق واحتیاط) کا یہ عالم ہے کہ ان کو قبول کرنے کے لیے ان کی صحت کا پختہ اور قابل اعتماد ہونا ضروری سمجھتے ہیں تو ان کے لیے یہ کس طرح جائز ہے کہ (نہ صرف اس سے اہم تر بلکہ) سب سے اہم معاملہ میں سہل نگاری سے کام لیں اور امام کے ارشادات کے نقل وبیان میں (روایات کی قوت اور ضعف) اور راویوں کی حیثیت کا لحاظ کیے بغیر کچھ لوگوں کے ذاتی رجحانات پر تکیہ کرلیں، جو تمام اماموں کا امام اور اللہ رب العزت کا نمائندہ ہے، جس کی تعمیل ارشاد ہر حال میں ہم پر فرض ہے، جس کے فرمان کے آگے سر تسلیم جھکا دینا ہمارے لیے ضروری ہے، ایسا ضروری کہ اس کے فیصلوں کے خلاف دلوں میں کوئی تنگی اور اس کے فرامین کی طرف سے اپنے سینوں میں کوئی جذبہ عناد محسوس کرنا بھی موجب ہلاکت ہے؟ اگر ایک آدمی اس بات کا مجاز ہے کہ وہ اپنے نجی معاملہ میں غفلت اور بے پروائی سے کام لے اور اپنے قرض خواہوں سے معاملہ کرنے میں اپنے حق کو مسامحت کی نذر کردے، مثلاً ان سے لے تو کھوٹی چیز، مگر ادائے قرض میں دے انہیں کھری چیز تو کیا اس کو کسی دوسرے کے حق کے بارے میں بھی اس طرز عمل کا مجاز گردانا جاسکتا ہے، جب کہ وہ صرف اس کا نائب بنایا گیا ہو؟ مثلاً وہ کسی ضعیف کا ولی ہو، یا کسی یتیم کا وصی، یا کسی شخص نا موجود کا

وکیل، ظاہر ہے کہ اگر وہ اس وقت ایسا کرے گا تو اس کا یہ فعل صریح خیانت اور عہد شکنی قرار پائے گا، لیکن افسوس کہ بعینہٖ یہی طرز عمل ہے جو حدیث کے بارے میں اختیار کیا گیا، بچشم سر یا بچشم دل، جس طرح بھی تم چاہو، اس حقیقت کو بے نقاب دیکھ سکتے ہو، لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ کچھ گروہوں نے اس جادۂ حق کے طے کرنے میں وقت محسوس کی اور دیکھا کہ اس طور پر (احکام شریعت کے علم سے) بہرہ مند ہونے کے لیے ایک مدت درکار ہے، درآنحالیکہ وہ چاہتے یہ تھے کہ منزل مقصود پر جلد جا پہنچیں، اس لیے انھوں نے تحصیل علم کے طریقے کو مختصر کرلیا، اور چند محدود باتوں اور اصول فقہ کی تہوں سے نکلی ہوئی کچھ مخصوص چیزوں کو اپنے لیے کافی سمجھ لیا، جن کا نام انہوں نے ''علل'' رکھا اور اس غرض سے کہ ہم بھی علم کے پانچوں سواروں میں گنے جائیں، ان ''حقائق عالیہ کو اپنی دستار فضیلت کا طرۂ امتیاز بنالیا، اب یہ ''حقائق'' ان کے لیے ایک ڈھال ہیں جس کو اپنے مخالفین سے مقابلہ کرتے وقت وہ استعمال کرتے ہیں، ایک پردہ ہیں جس کی آڑ میں موشگافیوں اور ہنگامہ آرائیوں کا طوفان اٹھاتے ہیں، ان ہی کے ذریعہ مناظرے کے میدان گرم ہوتے ہیں اور ان ہی کے اوپر باہم ہاتھا پائی ہوتی ہے، اس کے بعد جب میدان مناظرہ سے باہر تشریف لائی جاتی ہے تو اس شخص کے سر پر دانائی اور بزرگی کا سہرا باندھ دیا جاتا ہے جو اس معرکہ میں بازی لے گیا ہو، اب وہی اپنے وقت کا نامور فقیہ ہے اور وہ ہی اپنے مقام کا عالی مرتبہ امام۔

یہ تو رہا ایک طرف، پھر (اس پر مزید ستم) یہ کہ شیطان نے چپکے سے ان کے دلوں میں ایک لطیف حیلہ ڈال دیا اور ان کو ایک کاری فریب میں لا پھنسایا، یعنی انہیں یہ پٹی پڑھائی کہ جو تمہارے پاس علم کا سرمایہ ہے وہ بہت ہی کم اور حقیر ہے، جس سے تمہاری ضرورت پوری نہیں ہو سکتی، اور نہ وہ تمہارے لیے کافی ہو سکتا ہے، اس لیے علم کلام سے اس کو تقویت دو اور ادھر ادھر کے کچھ کلامی مباحث کا اس میں پیوند لگاؤ اور متکلمین کے (پر پیچ) اصولوں کو اس کی پشت پناہ بناؤ تاکہ انسان کے آگے غور کی

شاہراہ باز، اور فکر کا میدان وسیع ہو سکے۔ (افسوس کہ) شیطان کا خیال پورا ہو کر رہا، اور مسلمانوں کے ایک مختصر گروہ کو چھوڑ کر باقی سب نے اس کی اطاعت اور پیروی اختیار کر لی، حیرت ہے لوگوں پر اور ان کی عقلوں پر! (کیا وہ نہیں دیکھتے کہ) شیطان لعین انہیں کہاں لیے جا رہا ہے؟ اور ان کے اصل مقصود اور مرکز ہدایت سے ہٹا کر انہیں کس کھڈ میں ڈال گیا ہے؟ اللہ ہماری مدد کرے"۔

مسئلہ تقلید

عدم تقلید کا زمانہ

معلوم ہونا چاہیے کہ پہلی اور دوسری صدی ہجری میں کسی مخصوص فقہی مذہب کی تقلید کا دستور نہ تھا، چنانچہ ابو طالب مکی اپنی کتاب ''قوت القلوب'' میں فرماتے ہیں:۔

''لوگوں کی یہ (فقہی) تصنیفات اور تالیفات تو بعد کی چیزیں ہیں، پہلی اور دوسری صدی ہجری میں لوگوں کے اقوال (بطور حجت شرعی) پیش کرنے کا رواج نہ تھا، اور نہ یہ قاعدہ تھا کہ کسی ایک ہی شخص کے مذہب پر فتویٰ دیا جائے، ہر مسئلہ اور معاملہ میں اسی کی رایوں کو مانا اور بیان کیا جائے اور اسی کے مذہب کو مدار یقین قرار دے لیا جائے''۔

بلکہ لوگوں کا حال اس کے بالکل برعکس تھا، اس وقت لوگوں کے دو طبقے تھے، ایک طبقۂ علماء دوسرا طبقۂ عوام، عوام کا حال یہ تھا کہ وہ ان اجتماعی اور اصولی مسائل میں، جو تمام مسلمانوں یا عام ارباب اجتہاد کے درمیان متفق علیہ تھے، براہ راست شارع علیہ السلام ہی کی تقلید کرتے تھے، (نہ کسی امام و مجتہد کی) اور وضو و غسل کے طریقے اور نماز و زکوٰۃ وغیرہ کے احکام یا تو اپنے بزرگوں سے سیکھ لیتے یا اپنی بستیوں کے اصحاب درس و تدریس سے اور اسی کے مطابق خود عمل کرتے اور جب کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آتا تو جس مفتی کو پاتے، بلا لحاظ مسلک و مذہب اس سے فتویٰ پوچھ لیتے، امام ابن ھمامؒ اپنے رسالہ ''التحریر'' کے آخر میں لکھتے ہیں:۔

’’لوگ کبھی ایک عالم سے فتویٰ پوچھتے، کبھی دوسرے عالم سے، ایک ہی مفتی سے فتویٰ پوچھنے کا التزام نہ تھا‘‘۔

رہے علماء تو ان کے دو گروہ تھے:

ایک گروہ ان علماء کا تھا جنھوں نے کتاب و سنت اور آثار صحابہ کی تلاش (و تحقیق) میں پوری کاوش فکر صرف کی اور بالقوۃ ایسی بالقوۃ جس کو بالفعل ہی کہنا چاہیے، اتنی استعداد بہم پہنچائی تھی کہ عوام کے سامنے ایک (صاحب علم و نظر) مفتی کی حیثیت سے آسکیں، ایسے صاحب فکر و نظر مفتی کی حیثیت سے جو مسائل کا جواب بالعموم دے سکے اور جس کو خاموشی اختیار کرنے کی مجبوری کم ہی پیش آئے، یہ لوگ مجتہد مطلق کہے جاتے ہیں۔

یہ (اجتہادی) استعداد دو طرح حاصل ہوتی ہے، کبھی تو اس طرح کہ ہر امکانی کوشش صرف کر کے روایات کو جمع کیا جائے، کیونکہ احکام کا ایک بڑا حصہ احادیث میں، اور ایک بڑا حصہ صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے آثار و اقوال میں موجود ہے (اس لیے ایک مجتہد بڑی کامیابی کے ساتھ اس ذخیرۂ روایات سے مسائل کا جواب معلوم کر سکتا ہے) اور یہ ایک حقیقت ہے کہ ایک سوجھ بوجھ رکھنے والا عالم زبان مواقع کلام کی معرفت سے بے بہرہ نہیں ہوتا اور نہ ایک عالم روایات مختلف روایتوں میں مطابقت دینے کے اصول اور ترتیب دلائل وغیرہ امور کی فہم و صلاحیت سے کبھی بیگانہ ہوتا، (اس لیے صاحب نظر انسان کے لیے روایات کے ذخیرے سے مسائل کا جواب معلوم کر لینا چنداں مشکل نہیں) اس استعداد اجتہاد کی زندہ مثال امام احمد بن حنبلؒ اور اسحاق بن راہویہؒ ہیں۔

کبھی یہ استعداد تخریج کے طریقوں کو پوری طرح ذہن میں جما لینے اور ان اصول، قواعد و ضوابط کو دماغ میں محفوظ کر لینے سے پیدا ہوتی ہے جو ہر باب کے متعلق ائمۂ فقہا سے منقول ہیں، بشرطیکہ اس کے ساتھ ہی احادیث اور آثار کا ایک معقول اندوختہ بھی انسان کے پاس موجود ہو۔ اس اجتہادی استعداد کی کامل مثال تم کو امام ابو یوسفؒ اور امام محمد بن حسنؒ کی ذات ہائے گرامی میں ملے گی۔

(۲) دوسرا گروہ ان علماء کا تھا جو قرآن و سنت پر اتنی نظر تو رکھتے تھے جس سے فقہ کے اصول

ومبادی اور اس کے بنیادی مسائل کو ان کے تفصیلی دلائل کے ساتھ معلوم کرسکیں، لیکن (جو جزئی مسائل ان کے سامنے آتے تھے) ان میں سے کچھ پر اگر وہ خود دلائل کی روشنی میں رائے قائم کر لیتے تھے تو باقی میں توقف اختیار کرنے پر مجبور بھی ہو جاتے اور بالآخر دوسرے ارباب علم ونظر کی رایوں کے محتاج ٹھیرتے کیونکہ وہ اپنے اندر اجتہاد کامل کی پوری شرائط نہیں رکھتے تھے جس طرح کہ ایک مجتہد مطلق رکھتا ہے، پس اس قسم کے علماء بعض مسائل کے لحاظ سے مجتہد اور بعض کے لحاظ سے غیر مجتہد تھے، صحابہؓ اور تابعینؒ کے متعلق یہ چیز تواتر کے ساتھ ثابت ہے کہ جب ان کو کوئی حدیث پہنچتی تو وہ بغیر کسی شرط اور قید کے ان پر عمل کرنا شروع کر دیتے۔

شخصی تقلید کا آغاز

تیسری صدی ہجری تقلید شخصی کا پیام لے کر آئی اور لوگوں کے اندر کسی ایک ہی متعین مجتہد کے مذہب کی پابندی نے اپنے ظہور کا اعلان کیا، اب ایسے لوگ انگلیوں پر گنے جاسکتے تھے جو اس شخصی تقلید کے دائرے سے باہر ہوں، اس وقت یہ چیز وجوب کا مرتبہ حاصل کر چکی تھی، جس کا ایک خاص سبب تھا، اس سبب کی تفصیل یہ ہے کہ فقہ کے کسی طالب علم کو دو ہی صورتیں پیش آسکتی ہیں۔

یا تو اس کی تمام تر توجہ اس بات پر سمٹ آئے گی کہ وہ ان مسائل سے واقفیت بہم پہنچائے، ان پر نقد کرے، ان کے مآخذ کی تحقیق کرے اور ان میں باہم ترجیح دے، جن کا جواب ائمہ مجتہدین تفصیلی دلائل کے ساتھ پہلے دے چکے ہوں، یہ ایک بڑا بھاری کام ہے اور اس وقت تک کامیابی کے ساتھ سرانجام نہیں پاسکتا جب تک کہ اس فقیہ کو کسی ایسے امام مجتہد کی رہنمائی میسر نہ ہو جس نے فقہ کے ایک ایک باب میں مسائل کو پھیلا کر بیان کرنے اور ان کے دلائل مہیا کرنے کی زحمتوں سے اس کو بے نیاز کر دیا ہوتا کہ وہ امام کی ان تصریحات سے مدد لے کر نقد و تحقیق اور بعض اقوال کو بعض پر ترجیح دینے کی مہم میں (یکسو ہو کر) مشغول ہو سکے، ورنہ اگر بالغرض کسی امام کی اقتداء اسے میسر نہ ہو تو ایک کامیاب فقیہ بننا یقیناً اس کے لیے دشوار ہو جائے گا، اور ظاہر ہے کہ سہل راہ ہوتے ہوئے دشوار گزار راہ اختیار کرنا کھلی ہوئی لغویت ہے۔

یہ ایک امر واقعی ہے کہ علم فقہ کا یہ طالب (جس امام کی پیروی میں دادِ تحقیق دے رہا ہے) اس کے بعض اقوال کو پسندیدہ سمجھ کر ان سے اتفاق کرے گا تو بعض سے اختلاف بھی کرے گا

(اب دیکھنا یہ ہے کہ اس کے اتفاق، اور اختلاف کا تناسب کیا ہے) اگر اختلاف اتفاق سے کم ہے تو ایسی صورت میں یہ فقیہ اسی امام مجتہد کے مذہب کے اندر ''اصحاب (۱) وجوہ'' میں سے شمار کیا جائے گا۔ اور اگر صورت حالات اس کے برعکس ہو تو اس وقت (وہ اصحاب وجوہ میں سے نہ شمار کیا جائے گا یعنی) اس کی انفرادی رائیں مذہب مذکور کا ایک جز نہ قرار پائیں گی لیکن اس کے باوجود فقیہ فی الجملہ اسی امام مذہب کی طرف منسوب رہے گا اور (اسی نسبت کے ذریعہ) ان لوگوں سے ممیز رہے گا جو کسی اور امام کی، اس کے مذہب کے اکثر اصول وفروع میں اقتدار کر رہے ہوں (۱)۔

پھر اس قسم کے صاحب علم کے بعض اجتہادی مسائل لازماً ایسے بھی پائے جائیں گے جن کے جواب سے اب تک کی فقہی تصنیفات بالکل خاموش ہوں گی، کیونکہ انسانی زندگی میں نت نئے واقعات پیش آتے ہی رہتے ہیں اور اجتہاد کا دروازہ بھی کھلا ہوا ہے (لہٰذا بعض مسائل میں اس صاحب علم کا اپنے نجی اجتہاد سے کام لینا ایک امر ناگزیر ہے) اس لیے وہ ان مسائل کا جواب اپنے امام مجتہد کی رہنمائی کا خیال ترک کر کے براہِ راست کتاب وسنت اور اقوال سنت سے معلوم ومستنبط کرے گا، اگرچہ یہ حقیقت ہے کہ اس قسم کے نئے مسائل کی تعداد ان مسائل کے مقابلہ میں بہت کم ہوگی جن کا (کوئی نہ کوئی) جواب پہلے کے علماء وائمہ دے چکے ہیں، ایسے شخص کو ''مجتہد مطلق منتسب'' کہا جاتا ہے۔

(۲) یا پھر اس کی ساری توجہات کا مرکز یہ ہوگا کہ وہ ان مسائل پر دسترس حاصل کرے جن

---

(۱) ''اصحاب وجوہ'' سے مراد وہ علماء ہیں جو ہوں تو کسی امام مجتہد کے مقلد، اور اسی کے اصول واقوال سامنے رکھ کر مسائل کا استنباط کرتے ہوں مگر جزئی مسائل میں کچھ اپنے مخصوص دلائل کی بناء پر اپنے امام کی رائے سے اختلاف بھی کر جاتے ہوں۔ اس قسم کی یہ اختلافی رائیں بھی اسی امام کے مذہب کا ایک جز سمجھی جاتی ہیں۔

(۲) مطلب یہ ہے کہ جس طرح ایک عالم کسی ایک امام مجتہد کی اقتداء میں یہ روش اختیار کر سکتا ہے کہ اس کے اکثر وبیشتر اصولوں کو ماننے کے باوجود بے شمار مسائل میں اس سے اختلاف کرے، اسی طرح دوسرے ائمہ کی اقتداء میں دوسرے علماء بھی یہی روش اختیار کر سکتے ہیں تو اگرچہ اس قسم کے علماء کو ان ائمہ کا مقلد نہیں کہنا چاہیے مگر اس کے باوجود ہر عالم اپنے امام کی طرف اس وجہ سے منسوب کر دیا جاتا ہے تاکہ یہ انتساب اسی قسم کے دوسرے علماء کے مقابلہ میں باعث امتیاز بن سکے۔

کو فتویٰ پوچھنے والے اس سے دریافت کریں اور جن کے متعلق علمائے سلف کا کوئی جواب منقول نہ ہو، ایسا عالم فقہ ایک ایسے امام کی اقتداء کا مذکورہ بالا فقیہ سے بھی زیادہ محتاج ہے جس کی مرتب شدہ فقہی اصولوں میں رہبری سے وہ فائدہ حاصل کر سکے، کیونکہ فقہ کے مسائل باہم گتھے ہوئے ہیں اور ان کی فروع و جزئیات ان کے اصول سے گہری وابستگی رکھتی ہیں، ایسی حالت میں اگر کوئی شخص بطور خود تمام مذاہب فقہ کی جانچ پڑتال اور تمام مجتہدین کے اقوال کی چھان بین از سر نو شروع کرے تو وہ اپنے کو ایک ایسی گھاٹی میں لا ڈالے گا جس کو طے کرنے کی اس کے قدموں میں ہرگز سکت نہ ہوگی، اور جس سے غالباً وہ ساری عمر چل کر بھی باہر نہ نکل سکے گا، پس اپنا مقصد حاصل کرنے کی خاطر اس کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ جن مسائل کا جواب پہلے دیا جا چکا ہے ان ہی جوابوں پر غور و فکر کی نگاہ ڈالے (اور ان کے سامنے رکھتے ہوئے مزید جزئیات کی) تفریع میں ہمہ تن مشغول ہو جائے لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ایسا فقیہ کبھی بھی اپنے امام مجتہد سے اختلاف نہیں کرتا، نہیں بلکہ) بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ کتاب و سنت اور اقوال سلف اور اپنے ذاتی قیاس کی بنا پر اپنے امام کے خلاف رائے قائم کرتا ہے، لیکن یہ اختلاف موافقت کے مقابلہ میں بہت کم ہوتا ہے، ایسا عالم "مجتہد فی المذہب" کہلاتا ہے (یہی دو صورتیں ہیں جن میں سے کوئی ایک علم فقہ کے کسی طالب کو عملاً اس وقت پیش آ سکتی تھی) رہ گئی تیسری صورت، یعنی یہ کہ وہ پہلے تو اپنی ساری کوشش ان مسائل کی دلیلیں معلوم کرنے میں صرف کر ڈالتا جن کا جواب پہلے کے علماء دے چکے ہیں، پھر کہیں جا کر ان میں سے اپنے پسندیدہ اور منتخب مسائل کو سامنے رکھ کر مزید مسائل کی تفریع کی طرف قدم بڑھاتا تو یہ صورت عملاً ایک ناممکن اور غیر واقعی صورت تھی کیونکہ نزول وحی کا بابرکت زمانہ گزرے ہوئے ایک مدت بیت چکی تھی جس کے باعث ہر عالم کے لیے اُن امور میں سے، جن پر علم اور عالمیت کا دارومدار ہے، اکثر کے اندر علمائے سلف کا دست نگر ہونا ضروری ہو چکا تھا، مثلاً یہ بات کہ کون حدیث کتنے طریقوں سے، اور کن مختلف عبارتوں میں مروی ہے؟ کون راوی کس پایہ کا ہے؟ کون حدیث کس مرتبہ میں صحیح یا ضعیف ہے؟ مختلف احادیث و آثار میں مطابقت کیوں کر پیدا کی جائے؟ کون سی احادیث فقہ کا مآخذ ہیں؟ اسی طرح مشکل اور غریب الفاظ کے معنی کی تحقیق کرنا، فقہ کے اصولوں کا علم حاصل کرنا، ان تمام بے شمار مسائل کو پوری شرح

وبسط اور توضیح اختلاف باہمی کے ساتھ بیان کرنا، جن میں علمائے سلف کلام کر چکے ہیں، پھر ان مختلف روایات (اور مسائل) کے اندر غور وفکر کے بعد راجح اور مرجوح کا فیصلہ کرنا اور ان کو دلائل کی کسوٹی پر رکھ کر پرکھنا (یہ سب بے شمار کام ایسے تھے جن میں متقدمین کے افکار وتحقیقات پر اعتماد اور ان سے استفادہ کرنے کے سوا اس کے لیے کوئی چارۂ کار ہی نہ تھا) ورنہ اگر وہ بطور خود ان کاموں میں اپنی زندگی کے لمحات ختم کر ڈالتا تو پھر (مزید مسائل ضروریہ کی) تفریع کا حق کیونکر پورا ہوسکتا؟ جب کہ انسانی دماغ کے متعلق یہ ایک ناقابل انکار مسلمہ ہے کہ خواہ وہ کتنا ہی ذکی کیوں نہ ہو مگر اس کی ایک متعین حد ہے جس کے آگے وہ پرواز نہیں کرسکتا، ہاں فکر ونظر کا یہ کمال اُن علماء کو ضرور حاصل ہوسکا تھا جو باعتبار زمانہ بزم اجتہاد کی صف اول میں تھے، جس کی وجہ یہ تھی کہ وحی کا زمانہ گزرے ہوئے کچھ زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی علوم کی یہ گوناگونی اور مسائل کی یہ فراوانی تھی لیکن اس کے باوجود بھی یہ کمال چند نفوس سے زیادہ کو حاصل نہ ہوسکا، اور وہ چند نفوس بھی اپنے تمام اوصاف کمال کے باوصف (دوسروں کی علمی رہنمائی اور اعانت سے یکسر بے نیاز نہ تھے بلکہ) اپنے اساتذہ ہی کی پیروی اختیار کیے ہوئے تھے اور ان ہی کے سہارے راہِ اجتہاد میں قدم اٹھاتے تھے، لیکن چونکہ اس علم میں انھوں نے کافی تصرفات کیے (اور اپنی ذاتی تحقیقات کا ایک بڑا ذخیرہ پیدا کر گئے) اس لیے وہ مستقل امام اور مجتہد ہوگئے۔

تقلید کا وجوب اور اس کے مفہوم کی وسعت

مختصر یہ کہ ائمہ ومجتہدین کے مذاہب کو اختیار کر لینا ایک قدرتی راز تھا جس کو اللہ تعالیٰ نے (بعض حکمتوں اور مصلحتوں کے پیش نظر) علماء کے دلوں میں ڈالا اور وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر متفق ہوگئے ہمارے اس خیال کی تائید (دیگر علماء کے علاوہ) مشہور شافعی فقیہ ابن زیادؒ یمنی کے الفاظ سے بھی ہوتی ہے، وہ ایسے دو مسئلوں کے متعلق استفسار کے جواب میں، جن کے اندر امام بلقینیؒ نے امام شافعیؒ کے خلاف فتویٰ دیا ہے، ارشاد فرماتے ہیں:-

> ''تم بلقینی کے کلام کی توجیہ نہیں سمجھ سکتے جب تک تمہیں یہ نہ معلوم ہو کہ ان کا علمی مقام کیا تھا۔ (پہلے جان لو کہ) وہ امام مجتہد مطلق منتسب، غیر مستقل، صاحب تخریج وترجیح ہیں ''مجتہد مطلق منتسب'' میں اس شخص کو کہتا ہوں، جو اپنے اس امام کے

مذہب میں، جس کی طرف وہ منسوب ہے، ترجیح کا اختیار رکھتا ہو، حتیٰ کہ اس قول کی مخالفت بھی کر سکتا ہو جو (عام طور سے) راجح مانا جاتا ہو، اکابر علمائے شافعیہ میں سے، متقدمین میں سے بھی اور متاخرین میں سے بھی، اکثر کا یہی حال ہے جن کا تذکرہ اور جن کے درجات کی ترتیب کا بیان آگے آتا ہے، اچھا تو بلقینیؒ کو جن ارباب نظر نے مجتہدین مطلق منتسب کے زمرہ میں شامل کیا ہے، ان میں سے ایک ان کے شاگرد ابوزرعہ بھی ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے اپنے استاذ امام بلقینیؒ سے یہ پوچھا ''آخر یہ کیا بات ہے کہ شیخ تقی الدین سبکیؒ اجتہاد سے کتراتے ہیں، حالانکہ ان کے اندر اجتہاد کی تمام شرائط موجود ہیں؟ پھر وہ تقلید کیوں کرتے ہیں؟'' ابوزرعہؒ کہتے ہیں کہ ''(اتنا کہہ کر میں خاموش ہو گیا اور) لحاظ کی وجہ سے خود ان کا نام نہ لیا (حالانکہ یہی سوال خود ان کے متعلق بھی پیدا ہو رہا تھا) جس کی مصلحت میرے نزدیک یہ تھی کہ (اس طرح دوسروں کے نام پر) میں اس امر کے حقیقی (وجوہ معلوم کر سکوں گا، لیکن امام بلقینیؒ میرا یہ سوال سن کر خاموش ہو رہے، بالآخر میں خود ہی بولا کہ ''میرے نزدیک تو اس کی وجہ صرف وہ سرکاری ملازمتیں ہیں جو (حکومت کی طرف سے) چاروں فقہی مذاہب کے مقلد علماء کے لیے (مخصوص اور) مقرر ہیں، اور اگر کوئی شخص ان مذاہب کی تقلید سے آزاد ہو کر بطور خود اجتہاد کرنے لگے تو پھر وہ اس حق سے محروم ہو جائے گا قضاء کے عہدے اسے نہ مل سکیں گے، لوگ اس سے استفسار کرنا چھوڑ دیں گے اور وہ بدعتی مشہور ہو جائے گا''۔ میری یہ بات سن کر امام بلقینیؒ مسکرا اٹھے اور اس سے اتفاق کا اظہار کیا'' (لیکن ابوزرعہؒ کی بات میرے دل کو نہیں لگتی) میرے لیے ایسا سمجھنا دشوار ہے کہ ان لوگوں نے اجتہاد سے اس (ذلیل) مصلحت کی بناء پر اجتناب کیا جس کی طرف ابوزرعہؒ نے اشارہ کیا ہے، ان بزرگوں کا مقام اس سے کہیں بلند ہے کہ وہ اجتہاد کی مکمل صلاحیتیں رکھنے کے باوجود عہدۂ قضا اور ذرائع معاش کی خاطر اجتہاد سے رُکے رہتے، ان بزرگوں کے متعلق ایسا سوءِ ظن کسی طرح بھی مناسب نہیں کیونکہ، جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا اس بارے

میں جمہور کا مختار اور راجح مذہب یہ ہے کہ جو شخص اجتہاد کی حقیقی صلاحیت رکھتا ہو، اس کے لیے اجتہاد کرنا واجب ہے (اس لیے یہ کس طرح باور کیا جائے کہ ملازمت اور مشاہرہ کے لالچ میں آ کر انھوں نے ایک امر واجب کو زندگی بھر ترک کیے رکھا؟ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ) ابوزرعہؒ کے لیے یہ کس طرح مناسب تھا کہ ان لوگوں کے بارے میں اتنی بھاری بات منہ سے نکالیں اور اس پر امام بلقینیؒ کو اپنا موافق بھی ظاہر کریں؟ حالانکہ علامہ جلال الدین سیوطیؒ "کتاب التنبیہ" کی شرح کے اندر، باب الطلاق میں ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ:-

"ائمہ کے خود اپنے اقوال میں جو اختلافات واقع ہوئے ہیں (۱) ان کی وجہ ان کے اجتہاد کا تغیر ہے، جس موقع پر وہ جس چیز کو صحیح قرار دیتے ہیں وہ وہی چیز ہوتی ہے جو ان کے اجتہاد کی نظر میں اس وقت صحیح معلوم ہوتی ہے (۲) اور اس کتاب کا مصنف وہ شخص ہے جس کے رتبۂ اجتہاد کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ کتنے ہی علماء نے اس امر کی تصریح کی ہے کہ مصنف مذکور، ابن الصباغؒ، امام الحرمین اور امام غزالی اجتہاد مطلق کے مقام پر فائز تھے، اور یہ فتاویٰ ابن صلاحؒ میں مرقوم ہے کہ یہ لوگ اجتہاد فی المذہب کا مرتبہ رکھتے تھے نہ کہ اجتہاد مطلق کا، تو اس کا مطلب دراصل یہ ہے کہ یہ لوگ اجتہاد مطلق "مستقل" کا درجہ نہیں رکھتے تھے بلکہ ان کا مقام "اجتہاد مطلق منتسب" کا تھا، کیونکہ "اجتہاد مطلق" کی دو قسمیں ہیں ایک تو مطلق مستقل، دوسرا مطلق منتسب، چنانچہ خود ابن صلاحؒ نے اپنی کتاب "آداب الفتیا" میں، اور امام نوویؒ نے شرح "المذہب" میں اس کی تصریح کی ہے ان میں سے پہلی قسم کے اجتہاد کا دروازہ تو چوتھی صدی ہجری کے اوائل ہی میں ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا، جس

---

(۱) یعنی ایک ہی امام نے ایک ہی مسئلہ میں کبھی ایک فتویٰ دیا ہے اور کبھی اپنی پہلی رائے کے خلاف دوسرا فتویٰ دیا ہے، مثلاً امام شافعیؒ کے اقوال میں یہ بات اکثر ملتی ہے کہ یہ ان کا پہلا قول ہے اور یہ دوسرا قول۔

(۲) یعنی ان ائمہ کے احساس ذمہ داری کا تو یہ حال تھا کہ جس وقت ان کا اجتہاد کسی مسئلے میں ایک بات کو حق پاتا تھا وہ بے تکلف اس کا اظہار کر دیتے تھے اور اس کی بھی پروا نہ کرتے تھے کہ ہم خود پہلے دوسری رائے ظاہر کر چکے ہیں۔

کے کھلنے کا اب کوئی امکان نہیں، باقی رہی دوسری قسم تو وہ اب باقی ہے اور آثار قیامت نمودار ہونے تک باقی رہے گی (کسی زمانہ میں بھی) اس کا موقوف ہو جانا شرعاً جائز نہیں، کیونکہ وہ فرض کفایہ ہے، یعنی اگر کسی زمانہ کے مسلمان ایسا اجتہاد کرنے سے ہچکچانے لگیں یہاں تک کہ اسے یکلخت چھوڑ بیٹھیں تو سب کے سب گناہگار ہوں گے، جیسا کہ ہمارے علماء نے مثلاً امام ماوردیؒ نے اپنی کتاب ''الحاوی'' میں، ردیانیؒ نے ''البحر'' میں، بغویؒ نے ''التھذیب'' میں اور اسی طرح کے اور بہت سے اکابر علماء نے صراحت کے ساتھ لکھا ہے۔ یاد رہے کہ یہ فرض کفایہ اجتہاد مقید (یعنی اجتہاد فی المذہب) سے ادا نہیں ہو سکتا، جیسا کہ ابن صلاحؒ اور امام نووی کی تصریحات بتلاتی ہیں، ہم نے بھی اپنی کتاب ''الرد الی من اخلد الی الارض وجھل ان الاجتھاد فی کل عصر فرض'' میں اس مسئلہ پر مفصل اور سیر حاصل بحث کی ہے، یہ ارباب علم (جن کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں) محض اس وجہ سے کہ وہ اجتہاد مطلق منتسب کا درجہ رکھتے تھے، دائرۂ شافعیت سے باہر نہ شمار کیے جائیں گے، امام نوویؒ اور ''طبقات'' میں ابن صلاحؒ نے واضح لفظوں میں اس حقیقت کا اظہار کیا ہے اور ابن سبکیؒ نے بھی ان کی ہمنوائی کی ہے، چنانچہ تم دیکھتے ہو کہ ان حضرات نے مذہب شافعی کی کتابیں تصنیف کیں (اور ان کی فقہی تصنیفات فقہ شافعی کی کتابیں کہی اور مانی جاتی ہیں، پھر بحیثیت ایک شافعی فقیہ کے انھوں نے فتوے دیے اور شافعی مناصب پر مقرر کیے گئے، مثلاً اس کتاب کے مصنف اور ابن الصباغ کو بغداد کے مدرسہ نظامیہ میں تدریس کی خدمت سپرد کی گئی اور امام الحرمین اور امام غزالیؒ کو نیشاپور کے مدرسہ نظامیہ میں اور ابن عبدالسلامؒ کو قاہرہ کے مدرسہ جابیہ اور مدرسہ ظاہریہ میں تعلیم کا انچارج بنایا گیا، اور ابن دقیق العیدؒ کو مدرسہ صالحیہ میں، جو ہمارے امام (امام شافعیؒ) کے مقبرہ سے متصل واقع ہے نیز مدرسہ فاضلیہ اور مدرسہ کاملیہ میں فرائض تعلیم حوالے کیے گئے، ہاں جو شخص اس مقام سے بھی اونچا ہو کر ''اجتہاد مطلق مستقل'' کے مقام بلند پر جا پہنچا ہو وہ البتہ حلقہ

شافعیت میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ نہ اس کے اقوال فقہ شافعی کی کتابوں میں درج کیے جا سکتے ہیں لیکن جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، اصحاب شافعی میں سے سوائے ابو جعفر بن جریر طبریؒ کے کوئی شخص بھی اس مقام تک نہیں پہنچا۔ ابن جریرؒ البتہ پہلے شافعی تھے، پھر ایک مستقل مذہب فقہی کے امام مجتہد ہو گئے، اسی وجہ سے علامہ رافعیؒ وغیرہ نے فرمایا کہ ابن جریرؒ کا ''تفرد'' مذہب شافعی کے ''وجوہ'' میں سے کوئی وجہ نہیں شمار ہوتا۔(۱)

سیوطی نے مذکورہ بالا الفاظ میں جو بات کہی ہے اور جس میں دیگر علماء کے ساتھ علامہ ابن سبکی کی حیثیت بھی واضح کر دی ہے وہ میرے نزدیک ابو زرعہ کے خیال سے زیادہ اچھی ہے (اور اسی کو میں حقیقت کی ترجمانی سمجھتا ہوں) لیکن ان کے الفاظ سے جو یہ بات نکلتی ہے کہ ابن جریر طبریؒ کو شافعی نہ شمار کرنا چاہیے، وہ قابل قبول نہیں، کیونکہ یہی علامہ رافعی (جن کی رائے کا سیوطی نے حوالہ دیا ہے) کتاب الزکوٰۃ کے آغاز میں لکھتے ہیں کہ ''ابن جریر طبری کا تفرد مذہب شافعی کے وجوہ میں سے کوئی وجہ نہیں شمار ہوتا، اگرچہ وہ خود اصحاب شافعی کے طبقات میں شمار ہوتے ہیں''۔ اسی طرح امام نووی اپنی تصنیف ''التہذیب'' میں لکھتے ہیں کہ ''ابو عاصم عبادی نے ابن جریر کا تذکرہ فقہائے شافعیہ کے سلسلہ میں کیا اور کہا ہے کہ وہ ہمارے صف اوّل کے علماء میں سے ہیں۔ انھوں نے فقہ شافعی علامہ ربیع مرادی اور حسن زعفرانی سے حاصل کی تھی'' (پس وہ بہر حال ایک شافعی عالم تھے اور ان کے شافعیت کی طرف منسوب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان کا طریقہ اجتہاد ان کا اسلوب استقراء اور ان کا طرز ترتیب دلائل قریب قریب بالکل وہی تھا جو امام شافعیؒ کا تھا، اور ان کے اجتہادات بالعموم امام موصوف کے اجتہادات سے ہم آہنگ تھے۔ اور اگر کبھی مخالف

(۱) ''تفرد'' کا مطلب ہے کہ کسی مسئلہ میں تمام فقہائے مذہب کے خلاف رائے قائم کرنا، اس جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ جس طرح امام غزالیؒ، علامہ ابن عبدالسلامؒ اور امام الحرمین وغیرہ علمائے شافعی کے منفرد اقوال (جن میں وہ تنہا ہوتے ہیں اور دوسرے تمام علمائے شافعی بلکہ خود امام شافعیؒ کی رائے بھی ان کے خلاف ہوتی ہے) اپنے تفرد کے باوجود مذہب شافعی ہی کے اقوال مانے جاتے ہیں اور ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ''مذہب شافعی میں ایک قول یہ بھی ہے'' اس طرح ابن جریر طبریؒ کے اختلافی اقوال کو (جن میں وہ تنہا ہوتے ہیں) مذہب شافعی کے اقوال نہیں مانا جاتا، اور ان کے متعلق یہ نہیں کہا جاتا کہ اس مسئلہ میں مذہب شافعی کے اندر ایک قول یہ بھی ہے۔

پڑے بھی تو ایسے ہی کہ وہ کوئی خاص اہمیت حاصل نہ کر سکے۔ مختصر یہ کہ ایسے مسائل بہت کم ہیں جن میں انھوں نے امام شافعیؒ سے الگ کوئی راہ اختیار کی ہو (اور ظاہر ہے کہ) یہ چیز ان کے دائرۂ شافعیت میں داخل سمجھے جانے کے خلاف کوئی حجت نہیں بن سکتی۔

امام محمد بن اسماعیل بخاریؒ کا فقہی مقام بھی یہی نوعیت رکھتا ہے، اور ان کا شمار بھی طبقات شافعیہ میں ہے، ان لوگوں میں سے جنہوں نے امام بخاریؒ کو طبقات شافعیہ میں شامل کیا ہے۔ ایک علامہ تاج الدین سبکیؒ بھی ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ "امام بخاریؒ نے فقہ حمیدیؒ سے سیکھی اور حمیدیؒ نے امام شافعیؒ سے"۔ ہمارے استاذ علام نے بھی امام بخاری کے شافعیؒ ہونے پر یہی دلیل دی ہے کہ تاج الدین سبکیؒ نے ان کا تذکرہ طبقات شافعیہ میں کیا ہے۔ نوویؒ کی جو عبارت ہم نے اوپر نقل کی ہے اس سے بھی اس (طرز استدلال کی صحت) کو پوری تائید ہوتی ہے شیخ تاج الدین سبکیؒ اپنی کتاب "طبقات" میں فرماتے ہیں:۔

"کسی ایسے تخریجی مسئلہ کے سلسلہ میں، جس کی تخریج بالکل اچھوتی ہو، دیکھنا چاہئے کہ تخریج کرنے والا کن لوگوں میں سے ہے؟ اگر وہ ان لوگوں میں سے ہے جن پر عموماً شافعیت اور تقلید غالب رہتی ہے مثلاً شیخ ابو حامد غزالیؒ اور قفالؒ، تو اس کا شمار شوافع میں ہوگا، اور اگر اس کے برعکس وہ ان لوگوں میں سے ہے جو حدود شافعیت سے اکثر باہر نکل جایا کرتے ہیں۔ مثلاً محمدؒ بن جریر، محمدؒ بن خزیمہ، محمدؒ بن مرموزی اور محمدؒ بن منذر، تو پیروان شافعیت میں نہ گنا جائے گا، رہا مزنیؒ اور ان کے بعد ابن شریحؒ کا معاملہ تو ان کے بارے میں تحقیق یہ ہے کہ ان کا مقام بین بین سا ہے، نہ تو وہ مذکورہ بالا چاروں حضرات کی طرح عموماً مذہب شافعی سے باہر ہی رہتے ہیں اور نہ عراقیوں اور خراسانیوں کی طرح حدود شافعیت کی پابندی ہی کرتے ہیں"۔

نیز یہی علامہ سبکیؒ "طبقات" میں شیخ ابوالحسن المشعری امام اہل السنۃ والجماعۃ کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ وہ شافعی کہے جاتے ہیں، کیونکہ فقہ انھوں نے شیخ ابواسحٰق مروزی سے حاصل کی تھی (فتاوی ابن زیاد) تقلید کے بارےمیں ہمارے نقطۂ نظر کی تائید وشہادت کتاب الانوار کے صفحات میں بھی موجود ہے چنانچہ اس کا

مصنف کہتے ہیں:

''جولوگ شافعیت یا حنفیت یا مالکیت یا حنبلیت کی طرف منسوب ہیں (اور ائمہ اربعہ کے پیرو کہے جاتے ہیں) ان کے چند طبقے ہیں:۔

(۱) ایک تو طبقۂ عوام ہے، جس کا (اپنے امام مثلاً) امام شافعیؒ کی تقلید کرنا، (براہ راست نہیں ہوتا بلکہ) ان مجتہدوں کے توسط سے ہوتا ہے جو امام مذکور کی طرف منسوب ہوتے ہیں۔

(۲) دوسرے وہ لوگ ہیں جو مرتبۂ اجتہاد کو پہنچے ہوئے ہیں، اگرچہ ایسا شخص، جو خود مجتہد ہو، کسی دوسرے مجتہد کی تقلید نہیں کیا کرتا، مگر اس کے باوجود یہ لوگ ایک امام کی طرف اس بنا پر منسوب کر دیئے جاتے ہیں کہ وہ طریق اجتہاد اور انداز استدلال اور اسلوب ترتیب دلائل وہی اختیار کرتے ہیں جو اُس امام مجتہد مطلق کا ہوتا ہے۔

(۳) تیسرا طبقۂ متوسطین کا ہے، یعنی وہ لوگ جن کو اگرچہ اجتہاد کا مقام حاصل نہیں ہو سکا مگر اجتہاد کے وہ اصول ان کے سامنے روشن ہوتے ہیں جن کا امام نے اختیار کیا تھا۔ اور اس کی پوری قدرت رکھتے ہیں کہ جو مسئلہ (اقوال امام میں) تصریح کے ساتھ موجود نہیں، جس کو امام کے مصرح اقوال پر قیاس کر کے جواب دے سکیں، یہ لوگ بھی بہر حال امام کے مقلد (ہی) ہوتے ہیں، اور ان ہی کے ساتھ وہ عوام بھی، جو ان کے استنباط کیے ہوئے اقوال کو اختیار کریں (اب رہا یہ سوال کے عوام ان کے قیاس کردہ اقوال پر عمل کرتے ہیں اس لیے ان کو بھی امام و مقتدی کہا جائے یا نہ کہا جائے تو اس کے بارے میں) مشہور یہ ہے کہ ان کو یہ حیثیت حاصل نہیں، کیونکہ وہ تو خود ہی دوسرے کے مقلد ہیں''۔

ایک اعتراض اور اس کا جواب

(ان دلائل و شواہد کی روشنی میں اگر تم کسی متعین مذہب فقہی سے انتساب کے مفہوم اور حدود تقلید کی وسعت پر غور کرو گے تو تمہیں محسوس ہو جائے گا کہ دوسری صدی ہجری کے بعد تقلیدی رجحانات کے ہمہ گیر اور تقلید کے واجب ہونے کے متعلق ہمارا بیان واقعیت کی سچی ترجمانی ہے)

اور اگر تم یہ اعتراض کرو کہ ''جب شریعت ایک ہی ہے تو جو چیز ایک وقت میں واجب نہ تھی وہ کسی دوسرے وقت میں بھی واجب نہیں ہو سکتی، اس لیے تمہارا یہ کہنا کہ ''مجتہد مستقل کی پیروی پہلے واجب نہ تھی، پھر واجب ہو گئی''۔ ایک ایسی بات ہے (جو اپنی تغلیط آپ کر رہی ہے کیونکہ) اس کے اندر کھلا ہوا تناقض موجود ہے'' تو اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اصل میں جو چیز واجب ہے وہ تو یہ ہے کہ امت کے اندر ایسا شخص یا اشخاص ضرور موجود رہنے چاہئیں جو فروعی احکام پر ان کے تفصیلی دلائل کے ساتھ عبور رکھتے ہوں، اس وجوب پر تمام اہل حق کا اجماع ہے (اسی طرح یہ اصول بھی بالکل مسلم اور بدیہی ہے کہ) جس چیز پر کسی امر واجب کے حصول کا دارومدار ہوتا ہے وہ خود بھی واجب ہوتی ہے، پھر اگر کسی امر واجب کے حصول کے کئی ایک طریقے ہوں تو ان میں سے کسی ایک طریقہ کا حاصل کرنا واجب ہو گا، (کسی متعین طریقہ کی خصوصیت نہ ہو گی) لیکن اگر طریقہ ایک ہی ہو تو بالخاصہ اسی طریقہ کا حصول واجب ہو گا، مثلاً ایک شخص بھوک کی شدت سے جاں بلب ہو اور اس بھوک کے دور کرنے کے متعدد ذرائع اس کے بس میں ہوں، جیسے کھانا خرید سکتا ہو، جنگل سے میوے چن سکتا ہو، اور کھانے کے قابل جانوروں کا شکار کر سکتا ہو تو اس کے لیے ان تینوں ذرائع میں سے بلا تعیین کسی ایک کو اختیار کرنا واجب ہو گا لیکن اگر وہ شخص ایسے مقام پر ہو جہاں نہ تو کوئی شکار مل سکتا ہو نہ ہی میوے دستیاب ہو سکتے ہوں (اور بھوک دور کرنے کا ایک ہی چارۂ کار ہو) تو اس کے لیے واجب یہی ہے کہ پیسے خرچ کر کے کھانا خریدے، (اسی مثال پر مسئلہ زیر بحث کو بھی قیاس کر لو) اس واجب اصلی کے حاصل کرنے کے لیے جس کا ہم نے ابھی ذکر کیا، سلف کے پاس چند راستے تھے۔ سو ان کے لیے واجب یہ تھا کہ ان راستوں میں سے کسی ایک راستہ کو اختیار کر لیں، کسی خاص راستہ کی تعیین نہ تھی۔ پھر (کچھ قدرتی اسباب کے ماتحت) یہ تمام راستے ماسوا ایک (۱) کے بند ہو گئے، اندریں حالات سب کے لیے خاص اسی ایک راستہ کا اختیار کرنا ضروری ہو گیا، مثال کے طور پر دیکھو کہ سلف حدیثیں لکھا نہیں کرتے تھے لیکن اب ہمارے زمانہ میں حدیثوں کی کتابت واجب ہو چکی ہے، کیونکہ (زبانی نقل و بیان کا دستور اور سلسلہ مدت ہوئی ختم ہو چکا اور) آج روایت احادیث کا اس کے سوا کوئی ممکن طریقہ باقی نہیں رہ گیا ہے کہ ان

---

(۱) اس ''ایک'' راستے سے مراد تقلید کا راستہ ہے، مگر تقلید اپنے اسی وسیع معنی میں جس کی تفصیل ابھی گزری۔

کی کتابوں کو سامنے رکھا جائے، یہی حال علوم نحو ولغت کا ہے، کہ یہ علوم بھی ایک لمحہ کے لیے سلف کی توجہ کو جذب نہ کر سکتے تھے کیونکہ عربی ان کی اپنی زبان تھی، ان علوم (میں سر کھپانے) کی ان کو حاجت ہی کیا تھی، لیکن اب اس زمانہ میں، زبان عربی سے باقاعدہ واقفیت بہم پہنچانا واجب ہو چکا ہے اس لیے کہ یہ زمانہ ابتدائی اہل عرب کے زمانہ سے (جو عربی زبان کے ماہر اور نکتہ شناس تھے) کافی دور ہو چکا ہے۔ اسی طرح اس اصول کی بے شمار مثالیں دی جا سکتی ہیں۔

تقلید امام معین کب واجب ہے

اسی اصول پر تقلید (کی آخری صورت اور حد یعنی تقلید) شخصی کے وجوب کو بھی قیاس کرنا چاہیے، کہ اس کا بھی یہی حال ہے۔ کبھی وہ واجب ہوتی ہے اور کبھی نہیں (مثال کے طور پر فرض کر لو کہ) اگر ہندوستان یا ماوراء النہر کے کسی خطہ میں ایک جاہل مسلمان رہ رہا ہے اور اس کے قرب وجوار میں کوئی شافعی یا مالکی یا حنبلی عالم موجود نہیں، نہ ہی ان تینوں مذاہب کی کوئی کتاب موجود ہے، تو ایسے شخص کے لیے ضروری ہے کہ مذہب ابوحنیفہ کی تقلید کرے، اور حرام ہے کہ دائرہ حنفیت سے قدم باہر نکالے، کیونکہ اگر اس نے ایسا کیا تو (دائرہ حنفیت کے ساتھ ہی) دائرۂ اسلام سے بھی باہر جا پڑے گا اور اس کے دین وایمان کا کوئی وزن باقی نہ رہ جائے گا بخلاف اس کے اگر ایسا حرمین میں ہو تو مخصوص طور پر کسی ایک ہی امام کی تقلید واجب نہ ہوگی، کیونکہ وہاں اس کے لیے ہر مذہب فقہی سے رہنمائی حاصل کرنا ہمہ دم ممکن ہے (پہلی صورت میں ایک ہی امام معین کی تقلید کے واجب ہونے کی وجہ بالکل کھلی ہوئی ہے، ظاہر بات ہے کہ جب کسی دوسرے مذہب فقہی کا کوئی عالم موجود ہی نہیں تو فتوے کس سے پوچھے گا؟ رہ گیا یہ امر کہ ظن وتخمین سے کام لے کر کسی دوسرے مذہب کی پیروی کرے، تو کسی مذہب کے احکام پر عمل کرنے اور اس کا حق تقلید ادا کرنے کے لیے) ظن وتخمین کفایت نہیں کر سکتا، اس کے لیے یقینی واقفیت ضروری ہے، اسی طرح اس کے لیے یہ بھی کافی نہیں کہ عوام کی سنی سنائی باتوں (کو کسی امام کے اقوال سمجھ کر ان) پر عمل کرے یا یہ کہ کسی غیر معروف کتاب (پر اعتماد کر لے اور اس) سے مسائل لے کر ان کی اقتداء کرنے لگے۔ چنانچہ نہر الفائق شرح کنز الدقائق میں یہ تمام تصریحات موجود ہیں۔

مسئلہ اجتہاد

اجتہاد مطلق

(اب مسئلہ اجتہاد کو لیجیے، اجتہاد دو طرح کا ہوتا ہے، مطلق اور مقید) مجتہد مطلق وہ شخص ہوتا ہے جو پانچ علوم پر دسترس رکھتا ہو، جن کی تفصیل امام نوویؒ کی کتاب ''منہاج'' کے اس فقرے میں موجود ہے۔

''قاضی ہونے کے شرائط یہ ہیں کہ آدمی مسلمان ہو، عاقل اور بالغ ہو، آزاد ہو، مرد ہو، عادل ہو، سننے، دیکھنے اور گویائی کی قوتوں سے پوری طرح بہرہ مند ہو اور (آخر میں یہ کہ) مجتہد ہو''۔

مجتہد وہ شخص ہوسکتا ہے جو:

(۱) کتاب اور سنت کے ان حصوں پر، جن کا تعلق احکام سے ہے، گہری نظر رکھتا ہو اور یہ بھی جانتا ہو کہ ان کے اندر کون سے نصوص خاص ہیں اور کون سے عام؟ کون نص مجمل ہے اور کون مبین؟ کون حکم ناسخ ہے اور کون منسوخ؟

(۲) (روایتی حیثیت سے) احادیث کے متعلق یہ علم رکھتا ہو کہ کون کون سی حدیثیں متواتر ہیں اور کون احاد؟ کون حدیث متصل ہے اور کون مرسل، نیز یہ کہ کون راوی کس درجہ میں قوی یا ضعیف ہے؟

(۳) زبان عربی پر لغوی اور نحوی دونوں حیثیتوں سے پورا عبور رکھتا ہو۔

(۴) علمائے صحابہ وتابعین وغیرہم کے اقوال کے بارے میں یہ خبر رکھتا ہو کہ کون مسئلہ اجماعی ہے اور کون اختلافی؟

(۵) قیاس کی حقیقت اور اس کی تمام اقسام کو جانتا ہو۔

مجتہد مطلق کی اقسام

اجتہاد مطلق کی شرائط جان لینے کے بعد دوسری چیز معلوم کرنے کی یہ ہے کہ مجتہد مطلق دو طرح کے ہوتے ہیں، ''مجتہد مطلق مستقل'' اور ''مجتہد مطلق منتسب''

مجتہد مطلق مستقل اور اس کی خصوصیات

مستقل مجتہد وہ ہوتا ہے جس کے اندر تین باتیں پائی جائیں، اور ایسی مخصوص شان پائی جائیں کہ وہ اس کے باعث باقی تمام ارباب اجتہاد سے الگ نظر آنے لگے، مثلاً امام شافعیؒ، جن کے اندر تم ان صفات کو نمایاں طور پر محسوس کر سکتے ہو، یہ تین باتیں یا صفتیں یہ ہیں۔

(۱) پہلی بات یہ کہ ان اصول وقواعد میں، جن کے مطابق فقہی مسائل کا استنباط ہوتا ہے، وہ بطور خود تصرف (۱) کرے، امام شافعیؒ کی مشہور تصنیف ''الام'' کے ابتدائی صفحات میں اس حقیقت کو اچھی طرح بے حجاب دیکھا جاسکتا ہے جہاں انھوں نے اپنے پیشرو علماء کے کارنامہ استنباط (وطریق اجتہاد) کو ذکر کرتے ہوئے ان کے بعض اصولوں پر مخالفانہ تنقید کی ہے، نیز اس حقیقت کی شہادت امام موصوف کے اس قول سے بھی ملتی ہے جس کو مجھ سے میرے استاذ شیخ ابوطاہر محمد بن ابراہیم مدنیؒ نے نقل فرمایا ہے، استاذ ممدوح نے امام شافعیؒ سے جن درمیانی واسطوں کے ذریعہ ان کا یہ قول سنا اور پھر مجھ سے بیان کیا ہے وہ ترتیب وار یہ ہیں۔

شیخ حسنؒ بن علی عجمی مکی اور شیخ احمد نخلیؒ مکی، شیخ محمدؒ علاء بابلی، شیخ ابراہیمؒ بن ابراہیمؒ لقانی اور عبدالرؤفؒ طبلاوی، جلالؒ ابوالفضل سیوطی۔ ابوالفضلؒ مرجانی (بطور اجازت (۲) ابوالفرجؒ

---

(۱) ''تصرف'' کرنے کا مطلب یہ ہے کہ دوسرے مجتہدین نے اجتہاد واستنباط کے جو اصول مقرر کیے ہیں ان کو جوں کا توں قبول نہ کرے، بلکہ غور وفکر کے بعد اپنے طور پر ان میں آزادانہ ترمیم وتغیر کرنے اور اپنا ایک مستقل دستور اجتہاد ترتیب دے لے۔

(۲) اصول حدیث کی اصطلاح میں ''اجازت'' کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شیخ اپنے شاگرد کو کسی لکھی ہوئی حدیث کے روایت کرنے کی اجازت دیدے، خواہ زبانی طور پر یا تحریری طور پر۔

غزیؒ، یونسؒ بن ابراہیم ربوی، ابوالحسنؒ بن مقیر، فضلؒ بن سہل اسفرائنی، حافظؒ حجت (۱) ابوبکر احمدؒ بن علی خطیب، حافظؒ ابونعیم، ابومحمدؒ عبداللہ بن محمد بن جعفر بن مدان، عبداللہؒ بن محمد بن یعقوب ابوحاتم یعنی رازی، یونسؒ بن عبدالاعلیٰ، محمدؒ بن ادریس یعنی خود امام شافعی، امام موصوف کے اس قول کے الفاظ یہ ہیں:-

''اصل (سرچشمۂ ہدایت) قرآن اور سنت ہیں، لیکن اگر کسی مسئلہ کا صریح جواب ان میں نہ ملے تو ان (کے اصول اور نصوص صریحہ) کو سامنے رکھ کر قیاس کرنا چاہیے اور (سنت کے متعلق اصول یہ ہے کہ) اگر کسی روایت کی سند اتصال کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتی ہو اور صحیح بھی ہو تو وہ سنت ہے لیکن خبر مفرد کے مقابلہ میں اجماع زیادہ وزنی شے ہے، پھر (حدیث کا مطلب بیان کرنے میں صحیح طریقہ یہ ہے کہ تاحدامکان) اس کا ظاہری (اور متبادر) مفہوم لیا جائے اور اگر ایک حدیث بہت سے معانی کا احتمال رکھتی ہو، تو وہی معنی لینا زیادہ مناسب ہے جو حدیث کے ظاہری پہلو سے قریب تر ہو، اور اگر بہت سی حدیثیں ہم پلہ (اور باہم متعارض) ہوں تو سزاوار ترجیح وہ حدیث ہوگی جس کی سند سب سے زیادہ مضبوط ہو (حجت شرعی کی ترازو میں) منقطع حدیث کوئی وزن نہیں رکھتی، سوائے سعیدؒ بن مسیّب کی منقطع حدیثوں کے، کسی اصل (شرعی) کو کسی دوسری اصل پر قیاس نہیں کرنا چاہیے، نہ کسی اصل کے بارے میں ''کیوں'' اور ''کس طرح'' کا سوال اٹھانا چاہیے، اس طرح کے سوالات صرف فروع میں اٹھائے جاسکتے ہیں اور قیاس کی ضرورت بھی فروع ہی کو ہوتی ہے سو اگر (تحقیق کی نگاہ میں) کسی اصل پر کسی فرع کا قیاس صحیح اترتا ہو تو وہ فرع صحیح اور قابل حجت تسلیم ہوگی۔

(۲) دوسری چیز یہ ہے کہ وہ مجتہد (ممکن حد تک) احادیث اور آثار کا ایک بڑا ذخیرہ جمع کرلے، ان کے احکام اپنے دائرۂ معلومات میں اچھی طرح سمیٹ لے اور اس امر سے پوری

---

(۱) ''حافظ'' سے مراد حافظ حدیث ہے اسی طرح ''حجت'' الفاظ تعدیل میں سے ایک لفظ ہے، جو بہت اونچے درجے کے راوی کے لیے بولا جاتا ہے۔

طرح باخبر ہو کہ کون کون سی حدیثیں فقہ کا مآخذ ہیں، پھر یہ کہ وہ مختلف روایات میں باہم تطبیق، اور ایک حدیث کو دوسری پر (دلائل کے ساتھ) ترجیح دے سکے، اور (اگر کسی حدیث کے کئی ایک معانی ہو سکتے ہوں تو) ایک مفہوم کی تعیین کر سکے (علمی نقطۂ نظر سے یہ استعداد بڑی اہم اور بلند پایہ ہے، حتیٰ کہ) ہمارے خیال میں یہ شئے امام شافعیؒ (جیسے جلیل القدر امام و مجتہد) کے قریباً دو تہائی سرمایہ علمی کے برابر ہے۔

(۳) تیسری چیز یہ ہے کہ وہ ان فروعی مسائل کا اپنے اجتہاد اور استنباط سے جواب دیتا جائے جو اس کے سامنے لائے جائیں اور جن کا اس سے پہلے یعنی ان تینوں زمانوں میں جن کے سراپا خیر و برکت ہونے پر زبان رسالتؐ گواہی دے چکی ہے، جواب نہ دیا گیا ہو۔

الغرض مجتہد مطلق وہی شخص ہو سکتا ہے جو ان تینوں امور میں نمایاں حد تک تصرف رکھتا ہو اور اس معاملہ میں اپنے ہم سروں سے فائق ہو، اور میدان مسابقت میں پیچھے چھوڑ کر کافی آگے نکل گیا ہو۔

ان سہ گانہ صفات کے بعد، ان ہی سے لگی ہوئی، ایک خاص صفت اور بھی ہے (جس سے ایک مجتہد مستقل سرفراز ہوتا ہے، اور وہ یہ کہ عالم بالا سے اس مجتہد کے لیے قبول عام کا نزول ہو (اور وہ اس شکل میں) کہ مفسرین، محدثین، علمائے اصول اور حفاظ کتب فقہ) گروہ کے گروہ، اس کے علم کی طرف جھک پڑیں، اور اس قبول عام اور مرجعیت انام پر مدتوں کی مدتیں گزر جائیں، یہاں تک کہ دلوں کے عمیق ترین گوشوں میں یہ حسن عقیدت مضبوطی سے اپنی جڑیں پھیلا لے (۱)

مجتہد مطلق منتسب

مجتہد منتسب اس مجتہد کو کہتے ہیں جو (مذکورہ بالا تینوں صفات میں سے) پہلی صفت میں بجائے خود کوئی مستقل مقام نہ رکھتا ہو بلکہ) کسی مجتہد مستقل کا پیرو ہو اور (اصول اجتہاد میں تصرف کرنے اور اپنی صوابدید سے مستقل اصول وضوابط مرتب کرنے کے بجائے) اسی کے مقرر کیے

---

(۱) یہ چوتھی بات جس کا شاہ صاحب نے ذکر فرمایا ہے ظاہر ہے کہ ایک مجتہد مطلق مستقل کی ایک صفت تو ہو سکتی ہے لیکن مجتہد مستقل ہونے کی شرط ہرگز نہیں ہو سکتی۔ بخلاف پہلی تین باتوں کے یہ فرق خود شاہ صاحب کی نگاہ سے بھی پوشیدہ نہیں چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اس بات کا انہوں نے الگ سے ذکر کیا ہے۔

ہوئے اصولوں کو اس نے جوں کا توں مان لیا ہو، مگر دوسری اور تیسری صرف سے خود متصف ہو اور (ان امور میں اس کی تقلید اختیار کرنے کے بجائے) اسی کی طرح خود بھی اپنے مستقل کارنامے رکھتا ہو۔

اجتہاد مقید اور مجتہد فی المذہب

(اجتہاد مطلق کے مقابلہ میں اجتہاد مقید ہوتا ہے اور اس شخص کو جس نے اس قسم کے اجتہاد کی صلاحیت ہوتی ہے مجتہد فی المذہب کہتے ہیں یہ ایسا مجتہد ہوتا ہے جو مذکورہ بالا پہلے اور دوسرے دونوں امور میں امام مجتہد مستقل (کے اقوال ونظریات اور اس کی تحقیقات) کا پابند رہتا ہے اور صرف تیسرے امر میں اپنے کچھ جدید کارنامہ پیش کرتا ہے، یعنی امام مجتہد کے طریق تفریع پر خود بھی مسائل کا استنباط کرتا ہے۔

آؤ ہم ایک مثال دیں (تاکہ یہ مسئلہ اچھی طرح سمجھ میں آجائے)

آج کل جو شخص طبابت کے میدان میں قدم رکھتا ہے وہ یا تو قدیم اطبائے یونان کی رہنمائی میں فرائض طبابت انجام دیتا ہے یا پھر قدیم اطبائے ہند (پرانے ویدوں) کی رہنمائی میں، تو ان پرانے اطبائے یونان وہند کو بمنزلہ مجتہد مستقل کے سمجھو، (رہا یہ شخص، تو اس کی دو حیثیتیں ہوسکتی ہیں)

(۱) ایک حیثیت تو یہ ہے کہ وہ دواؤں کے خواص اور بیماریوں کی اقسام اور شربتوں اور معجونوں کے بنانے کی ترکیبوں سے پوری واقفیت رکھتا ہے اور وہ اس طرح کہ اس سلسلہ میں اطبائے قدیم نے جو کچھ ہدایتیں دی ہیں ان پر عمل پیرا ہوتے ہوئے اس فن کا خود رمز شناس ہو چکا ہے، یہاں تک کہ (اس کے اصول ونظریات اور اسرار وحقائق کا) تقلیدی طور پر نہیں بلکہ براہِ راست علم حاصل کر چکا ہے، نیز ان ہی اطباء کی طرح خود بھی جدید فنی کارنامے سرانجام دینے پر قدرت رکھتا ہے، یعنی یہ کہ ایسی دواؤں کے خواص معلوم کر سکتا اور کرتا رہتا ہے جن کے تذکرے سے اب تک کا پورا طبی لٹریچر خالی ہے، اور امراض کے ایسے اسباب اور علامات اور معالجات کا انکشاف کرتا ہے جن کی اب تک کسی طبیب نے نشان دہی نہیں کی ہے، حتیٰ کہ وہ پرانے اطباء کی رایوں سے اختلاف بھی کرتا ہے (اور ان کو غلط ثابت کر کے ان کے مقابلہ میں اپنی رائیں پیش کرتا

ہے) خواہ وہ مخالفت چند ہی ایک رایوں تک محدود ہو یا وسیع پیمانے پر ہو، تو ایسا طبیب بمنزلہ ''مجتہد مطلق منتسب'' کے ہے۔

(۲) اس کے برخلاف اس کی دوسری حیثیت یہ ہے کہ وہ ان تمام امور متعلقہ علم طب کو بغیر ذاتی یقین کے محض پچھلے اطباء کے کہنے کی وجہ سے مان لیتا ہے، اور اس کے فکر و عمل کی سب سے اونچی معراج یہ ہے کہ ان ہی کے مقرر کردہ اصولوں کے مطابق شربت اور معجون بنایا کرتا ہے، جیسا کہ آج کل کے اکثر طبابت پیشہ حضرات کا حال ہے، تو ایسے طبیب کی حیثیت ''مجتہد فی المذہب'' کی سی ہے۔

اسی طرح (ایک دوسری مثال لو) آج کل جو شخص بھی شعر کہتا ہے وہ شعر گوئی کے فن میں یا تو شعرائے عرب کی اقتدا کرتا اور ان ہی کے اوزان و قوافی اور اسالیب کو اختیار کرتا ہے یا پھر شعرائے عجم کی پیروی کرتا ہے تو یہ شعرائے عرب و عجم بمنزلہ ''مجتہد مستقل'' کے ہیں، رہا یہ شاعر، تو اگر وہ ان کی قائم کی ہوئی حدود میں ہی اپنی جولانیٔ فکر کو مقید نہیں رکھتا بلکہ خود بھی) غزل، تشبیب، مدح، ہجو اور نصیحت (وغیرہ اصناف شعر کی نئی نئی قسمیں ایجاد کرتا ہو، اور بدائع و استعارات ایسے اچھوتے انداز سے لاتا ہو جس کی طرف ابھی تک کسی کا مرغ تخیل پرواز نہ کر سکا ہو، بلکہ شعرائے قدیم کی بعض شعری صنعتوں کو دیکھ کر اس کا ذہن خود بخود اس طرف منتقل ہوا ہو اور اس نے ایک چیز کو اس کی مشابہ چیز پر ڈھال لیا ہو، یا ایک شئے کو دوسری شے پر قیاس کر لیا ہو، پھر اسی طرح یہ کہ وہ کوئی ایسی بحر ایجاد کر سکا ہو جس میں اب تک کوئی نظم نہ کہی گئی ہو یا دنیائے شعر و شاعری میں سخن گوئی کی کوئی نئی طرح ڈال گیا ہو مثلاً مثنوی، یا رباعی کا لکھنا یا ردیف کا التزام کرنا، یعنی کسی ایک ہی لفظ یا ایک سے زائد الفاظ کو ہر شعر میں قافیہ کے بعد لاتے رہنا، تو بشرطیکہ یہ باتیں عربی شاعری میں کی گئی ہوں۔ ایسا شاعر (گویا عربی شاعری کا) ''مجتہد مطلق منتسب'' ہوگا، لیکن اگر یہ شاعر ایجاد و اختراع کے کارنامے نہیں رکھتا اور صرف ان پرانے شعراء کی بنائی ہوئی روشوں ہی پر چلا جا رہا ہے تو اس کا مقام ''مجتہد فی المذہب'' کا سا ہوگا، ان ہی مثالوں پر علم تفسیر اور علم تصوف و دیگر علوم (کے ماہرین) کو بھی قیاس کر لو۔

سلف نے اصول فقہ کی تدوین کیوں نہ کی؟

اس جگہ اگر تم یہ سوال کرو کہ ابتدائی دور کے علماء نے اصول فقہ کے متعلق کوئی خاص اور تفصیلی گفتگو نہیں کی، یہاں تک کہ جب امام شافعیؒ عالم ظہور میں آئے تو ان کے ذریعہ پہلے پہل اس فن پر سیر حاصل، مفید اور پر مغز بحثوں کا وجود ہوا، اس کی کیا وجہ ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ علمائے سلف میں سے ہر ایک کے پاس جو کچھ سرمایہ تھا وہ سب کا سب صرف اس کے اپنے ہی شہر والوں کی بیان کردہ احادیث و آثار پر مشتمل تھا، تمام بلاد اسلامیہ میں پھیلی ہوئی روایتیں کسی کے پاس اکٹھی جمع نہ تھیں (اس لیے ان کو کسی بڑے پیمانہ پر مختلف اور متعارض روایات کی الجھنیں دور کرنے کی زحمتیں نہیں اٹھانی پڑتی تھیں اور) اگر کبھی ایسا ہوتا کہ اس کے شہر کی روایتیں ہی باہم ٹکرا جاتیں جس کے باعث ایک مسئلہ کی دلیلوں میں تعارض واقع ہو جاتا تو (کسی مرتب اور متعین ضابطہ کے بجائے) وہ صرف اپنی عام فراست سے کام لیتا اور اس طرح اس تعارض کا جو فیصلہ بن پڑتا کر لیتا تھا، اس کے بعد امام شافعیؒ کے زمانہ میں (جب صورت حالات بدل گئی اور) تمام اطراف کی حدیثیں اکٹھی جمع ہو گئیں تو ان حدیثوں کے اندر (بھی) اور پھر ان کے ساتھ ساتھ وہاں کے فقہا کی رایوں میں (بھی شدید قسم کا) تعارض رونما ہو گیا، (اور تعارض بھی ایسا) جو دو گونہ تھا، ایک تو وہ تعارض دو مختلف مقام کی روایتوں میں تھا اور (اس پر مزید ستم یہ ہوا کہ) بلا استثناء تمام لوگوں نے اپنے اپنے شیوخ کی رایوں کی، جن کو ان بزرگوں نے اپنی اپنی فہم کے مطابق اختیار کیا تھا، حمایت شروع کر دی، انجام کار اختلاف کا رخنہ وسیع سے وسیع تر ہونے لگا، ملت کی پراگندگی حد سے تجاوز کر گئی، اور اس کو اتنے اختلافات کے طوفان نے آن گھیرا جن کا کوئی شمار نہ تھا۔ لوگ اس طوفان کے نرغہ میں حیران و ششدر کھڑے تھے اور اس سے نکلنے کی کوئی راہ نہیں پاتے تھے، یہاں تک کہ نصرت الٰہی نے ان کی دست گیری کی اور امام شافعیؒ کے دل میں کچھ ایسے اصول و قواعد الہام فرمائے گئے جن کے ذریعہ انھوں نے مختلف اور متعارض حدیثوں میں تطبیق دے کر (اس طوفان اختلاف کو روک دیا اور) اپنے بعد والوں کے سامنے ایک عجیب و غریب راہ کھول دی۔

مذاہب چہارگانہ کی تاریخ اجتہاد

(۱) تیسری صدی ہجری کے بعد امام ابو حنیفہؒ کے مذہب میں ''مجتہدین مطلق منتسب'' کے

ظہور کا سلسلہ ختم ہوگیا جس کی وجہ یہ تھی کہ علمائے احناف ہمیشہ سے علم حدیث کے ساتھ وابستگی کم رکھتے رہے ہیں اور کوئی شخص مجتہد مطلق منتسب ہو نہیں سکتا تاوقتیکہ وہ ایک متبحر عالم حدیث بھی نہ ہو، یوں (تیسری صدی کے بعد) اس مذہب میں صرف مجتہد فی المذہب ہی ہوا کیے ہیں، اور اسی اجتہاد فی المذہب ہی کی طرف اشارہ تھا اس شخص کا جس نے یہ کہا تھا کہ مجتہد ہونے کی کم سے کم شرط یہ ہے کہ مبسوط یاد ہو۔

(۲) مذہب مالکیؒ میں بھی ''مجتہد مطلق منتسب'' بہت کم ہوئے ہیں اور جو لوگ اس مقام کو پہنچے بھی ان کی جداگانہ اجتہادی رائیں مذہب مالکی کے اقوال شمار نہیں ہوتیں۔ مثلاً قاضی ابوبکر ابن عربیؒ اور علامہ ابوعمرؒ، ابن عبدالبرؒ کے نام سے مشہور ہیں۔

(۳) رہا مذہب حنبلیؒ، تو اس کا پھیلاؤ پہلے بھی کچھ زیادہ نہ تھا اور نہ اب اس سے زیادہ ہے (لیکن اس کے باوجود یہ ایک امر واقعی ہے کہ) اس مذہب کے اندر برابر ہر دور میں مجتہد (مطلق منتسب) پیدا ہوتے رہے اور یہ سلسلہ نویں صدی ہجری تک پہنچ کر ختم ہوا، اور (پھر اس کے بعد) اکثر مقامات میں اس کے اقتدار کی جڑیں ہل گئیں، (اور انجام کار وہ وہاں سے ناپید ہوگیا) ہاں مصر و بغداد میں ابھی کچھ پیرو اس کے ضرور موجود ہیں، مگر بہت تھوڑے)

(ویسے حقیقت یہ ہے کہ) حنبلی مذہب کو مذہب شافعی (ہی میں شامل سمجھنا چاہیے کیونکہ اس کی اگر اس کے مقابلہ میں اپنی کوئی مستقل حیثیت ہے تو بس اسی قدر جس قدر مستقل حیثیت کہ امام ابویوسفؒ اور امام محمدؒ کے مذاہب کو امام ابوحنیفہؒ کے مذہب کے مقابلہ میں حاصل ہے، ہاں ایک فرق ضرور ہے، اور وہ یہ کہ مذہب حنبلی مذہب شافعی کے ساتھ ضم کر کے مدون نہیں کیا گیا، جیسا کہ امام ابویوسفؒ اور امام محمدؒ کے مذاہب کو باہم پاتے ہیں کہ ان کی تدوین امام ابوحنیفہؒ کے مذہب کی تدوین ہی میں ضم ہے، ہمارے خیال میں یہی وہ بات ہے جس کے باعث مذہب شافعی اور مذہب حنبلی دونوں کو ایک مذہب نہیں شمار کیا گیا، ورنہ ایک ایسے شخص کے لیے، جس نے ان دونوں مذاہب کی گہرائیوں میں اتر کر ان کو اپنی حقیقی شکل میں دیکھا ہو، انہیں ایک ہی مذہب کی حیثیت سے (ماننا اور) مدون کر دینا چنداں دشوار نہیں۔

(۴) اب مذہب شافعی کو لو (یہ مذہب اس حیثیت سے تمام مذاہب میں ممتاز ہے کہ)

اوروں کی بہ نسبت اس میں مجتہد مطلق منتسب اور مجتہد فی المذہب زیادہ ہوئے ہیں، اسی طرح علمائے اصول وارباب علم کلام اور مفسرین قرآن وشارحین حدیث کی کثرت میں بھی کوئی دوسرا مذہب اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا، پھر اس لحاظ سے بھی وہ نمایاں خصوصیت کا مالک ہے کہ اس کی روایتیں اور سندیں دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ قوی ہیں، اس کے امام کے اقوال زیادہ صحت کے ساتھ منضبط ہیں، امام مذہب کے اقوال کو اصحاب وجوہ کے اقوال سے ممیّز کرکے بیان کرنے کا خاصا اہتمام کیا گیا ہے، اور مختلف اقوال وآراء میں سے) ایک قول اور رائے کو دوسرے پر ترجیح دینے میں زیادہ توجہ صرف کی گئی ہے، ان حقائق سے کوئی بھی ایسا شخص بے خبر نہیں جس نے ان تمام مذاہب کا تحقیقی مطالعہ کیا ہو اور ان کے پیچھے اپنی عمر کا معتد بہ حصہ گزارا ہو۔

امام شافعیؒ کے ابتدائی تلامذہ سب کے سب مجتہد مطلق (منتسب) تھے ان میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جس نے امام مذکور کے تمام مجتہدات میں ان کی تقلید کی ہو، یہاں تک کہ ابن سریج کا زمانہ آیا اور انہوں نے تقلید اور تخریج کے قواعد مرتب کیے، پھر ان کے شاگرد آئے اور وہ اسی راہ پر چلتے رہے جو ابن سریجؒ تیار کر گئے تھے، اسی بناء پر ان کو ان مجددین میں شمار کیا جاتا ہے، جن کی ہر صدی کے آغاز میں پیدا ہونے کی خبر دی گئی ہے۔

پھر اس شخص سے (جس نے تمام مذاہب کا مسلسل تحقیقی مطالعہ کیا ہو) یہ بات بھی پوشیدہ نہیں رہ سکتی کہ جن احادیث اور آثار پر مذہب شافعی کی یہ بنیاد ہے وہ باقاعدہ مدون ہیں، سارے اہل علم ان سے بخوبی واقف ہیں اور انہوں نے ان کی خدمتیں کی ہیں۔ یہ ایک ایسا خصوصی شرف ہے جو کسی دوسرے مذہب کو حاصل نہیں، ان مدون کتابوں میں سے جن پر مذہب شافعی کی بنیاد ہے، ایک تو مؤطا شریف ہے، جو امام شافعیؒ سے پہلے کی ہے اور جسے امام موصوف نے اپنے مذہب کے لیے اساس قرار دیا ہے، باقی کتابیں یہ ہیں۔

صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، جامع ترمذی، سنن ابن ماجہ، اور سنن دارمی، پھر مسند شافعی، سنن نسائی، سنن دارقطنی، سنن بیہقی، اور امام بغویؒ کی شرح السنہ، ان میں سے (صحیح بخاری کے مؤلف) امام بخاریؒ اگرچہ شافعیت کی طرف منسوب ہیں اور اکثر فقہی مسائل میں امام شافعیؒ کے ہم نوا ہیں، مگر اس کے باوجود بہت سے مسائل میں ان سے اختلاف بھی رکھتے ہیں، چنانچہ اسی

وجہ سے ان کے وہ اقوال ومسائل، جن میں وہ تنہا ہیں (اور تمام شوافع کے خلاف رائے رکھتے ہیں) مذہب شافعی میں شمار نہیں ہوتے اور امام ابوداؤدؒ اور امام ترمذیؒ مجتہد منتسب ہیں، جن کا انتساب امام احمدؒ بن حنبل اور امام اسحاقؒ کی طرف ہے، ابن ماجہ اور امام دارمی بھی، ہمارے خیال میں یہی حیثیت رکھتے ہیں، باقی رہے امام مسلمؒ اور امامؒ ابوالعباس اصم جنھوں نے مسند شافعی اور کتاب ''الام'' کے جمع وترتیب کی خدمت انجام دی ہے، نیز وہ حضرات، جن کی کتابوں کا اوپر مسند شافعی کے ذکر کے بعد نام آیا ہے، تو یہ سب لوگ اپنا جداگانہ مسلک رکھتے ہیں اور شافعیت سے آزادراہ رکھنے والے ہیں، جن کے اپنے مستقل فقہی اصول ہیں (جو مذہب شافعی کے اصولوں سے کافی تفاوت رکھتے ہیں)۔

اگر ہماری اس تقریر کا ٹھیک ٹھیک مدعا تمہاری سمجھ میں آگیا ہوگا تو تم پر یہ حقیقت روشن ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی کہ اجتہادِ مطلق کی سعادت سے بے بہرہ ہے وہ شخص جو مذہب شافعیؒ کا دشمن ہو، اور حدیث کا علم انکاری ہے اس بدنصیب کی خیر سگالی سے جو امام شافعیؒ اور اصحاب شافعی (کے فیض علمی) سے بے نیاز ہو۔

وکن طفيليتهم على ادب

فلاارى شافعا سوىٰ لادب

(ادب کے ساتھ ان کا دامن پکڑلو، ادب ہی اس مقصد میں تمہارا سفارشی ہوسکتا ہے۔

فقہی اختلافات کا رُخ
چوتھی صدی ہجری کے بعد

فتنوں کا ہجوم

اب اس کے بعد وہ دور آتا ہے جب مسلمانوں کی ایک نئی نسل وجود میں آتی ہے، اس نسل کے افراد اِدھر اُدھر پھیل جاتے ہیں (اور ان کے علمی ذوق میں ایک تباہ کن انقلاب برپا ہوجاتا ہے) اس دور میں اور دور مابعد میں جو خاص بیماریاں ان کے ذہنوں میں گھر کر لیتی ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) فقہی مجادلے

پہلی بیماری فقہ اور اس کی تفصیلات سے متعلق اہل علم کی باہمی نزاع اور ہنگامہ آرائی کی تھی جس کی تفصیل امام غزالیؒ کے لفظوں میں یہ ہے:-

''خلفائے راشدین کا مبارک دور جب ختم ہوگیا تو زمام خلافت ایسے لوگوں کے ہاتھ میں آئی جو نہ اس امانت کے اٹھانے کی صلاحیت رکھتے تھے اور نہ علم فتاویٰ اور احکام شریعت سے گہرا لگاؤ رکھتے تھے، اس لیے وہ مقدمات فیصلہ کرنے اور قضائے شرعی جاری کرنے کے لیے مجبور ہوئے کہ فقہا سے مدد لیں اور ہر وقت انہیں اپنے ساتھ رکھیں، (گو خیر القرون کا دور ختم ہو چکا تھا مگر پھر بھی) ایسے علماء سے دنیا خالی

نہ تھی جو قدیم رنگ پر مضبوطی سے قائم تھے اور جو اخلاص دینی کو اپنی عزیز ترین متاع سمجھتے تھے، حکومتیں (ان کی طرف لپکیں مگر وہ) انہیں جتنا ہی اپنی طرف کھینچتیں وہ ان سے اتنا ہی زیادہ کھنچتے جاتے۔

جاہ پسند لوگوں نے جب دیکھا کہ ان کی بڑی عزت ہے اور وہ اپنے اعراض اور استغنا کے باوجود ارباب حکومت کے مطلوب خاطر بنے ہوئے ہیں تو ان کے دلوں میں اس (ذریعۂ عزت واقبال یعنی) علم دین کے حاصل کرنے کا انتہائی شوق پیدا ہوگیا تاکہ اسے بازار میں لاکر عزت وشرف کا سودا کریں، نتیجہ یہ ہوا کہ اب علماء وفقہاء ڈھونڈے نہ جاتے تھے، اگر کل تک وہ سلاطین سے منہ موڑنے کی بدولت باعزت تھے تو اب جب کہ انہوں نے خود سلاطین کا رخ کیا، ان کی عزت ذلت سے بدل گئی، الا ماشاءاللہ

ان سے پہلے کچھ لوگ علم کلام کی داغ بیل ڈال چکے تھے اور اس فن میں کتابیں تیار کر گئے تھے، قیل وقال اور اعتراض وجواب کا بازار گرم ہو چکا تھا اور بحث ومناظرے کی راہیں ہموار کی جا چکی تھیں، ان فقہا کے لیے یہ چیزیں خاص توجہ اور دلچسپی کا مرکز بن گئیں اور ایک مدت تک بنی رہیں، یہاں تک کہ بعض ایسے خلفاء اور سلاطین پیدا ہوئے جو فقہی مناظروں کے بڑے دلدادہ تھے جنہیں اس وضاحت کے سننے کا بڑا شوق تھا کہ فلاں مسئلہ میں اولیٰ مسلک مسلک حنفی ہے یا مسلک شافعی؟ نتیجہ یہ ہوا کہ تمام ارباب فن، کلام اور دیگر علوم کے میدان تحقیق وجستجو سے نکل کر اختلافی مسائل فقیہ کے معرکے میں اتر آئے جہاں خاص طور سے حنفی اور شافعی مذاہب کو مناظروں کے لیے منتخب کرلیا گیا، امام مالکؒ، احمد بن حنبلؒ، سفیانؒ اور دوسرے ائمہ کے مذاہب سے یہ دلچسپی نہیں لی گئی (جس کی وجہ کھلی ہوئی ہے کہ امراء وخلفاء کو صرف حنفیت اور شافعیت ہی کے مناظروں سے دلچسپی تھی)

ستم یہ کہ (وہ اپنی ان مساعی پر نازاں بھی تھے) ان کا خیال تھا کہ وہ اس طرح شریعت کے اسرار ودقائق کا استنباط کررہے ہیں، ہر مذہب کے علل اور مصالح بیان

کر رہیں اور اصول فتویٰ کی راہ کو ہموار کر رہے ہیں اس خیال کے ماتحت انہوں نے تصنیفات اور استنباطات کا ڈھیر لگا دیا اور بحث وجدال کے گوناگوں اسلحہ ایجاد کر ڈالے، افسوس کہ یہ اب تک اسی روش پر چلے جا رہے ہیں، نہیں معلوم اب مستقبل میں کیا ہونے والا ہے''۔

(۲) ائمہ مجتہدین کی حقیقی بنائے اختلاف سے عدم آگہی

بہت سے لوگ اس غلط فہمی میں پڑ گئے کہ امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ کے اختلافات کی اساس وہ اصول ہیں جو امام بزودی وغیرہ علماء کی کتابوں میں درج ہیں، حالانکہ ان میں سے بیشتر اصول ایسے ہیں جو ان ائمہ کے اقوال وفتاویٰ کو سامنے رکھ کر بعد میں وضع کیے گئے ہیں، مثلاً میرے نزدیک فقہ کے حسب ذیل اصول (حنفی ائمہ کے کلام سے بعد والوں نے نکالے ہیں۔

''خاص اپنے حکم میں خود واضح اور مبین ہے، اس کے ساتھ کوئی تشریحی بیان ملحق نہ کیا جائے گا''

''کسی حکم (قرآنی) پر اضافہ اس حکم کا نسخ ہے''۔

''خاص کی طرح عام بھی قطعی ہے''۔

''راویوں کی کثرت لازمہ ترجیح نہیں''۔

''غیر فقیہ راوی کی روایت اگر قیاس کے خلاف ہو تو واجب العمل نہیں''۔

''مفہوم شرط اور مفہوم وصف کا کوئی اعتبار نہیں''۔

''امر کا صیغہ حکم کے واجب ہونے کا متقاضی ہے''۔

یہ اور اس قسم کے بہت سے اصول فقہ ایسے ہیں جو حنفی ائمہ کے معین کیے ہوئے نہیں بلکہ ان کے فتووں کو سامنے رکھ کر بعد میں وضع کیے گئے ہیں، امام ابوحنیفہؒ یا صاحبین سے ان اصولوں کی کوئی صحیح روایت منقول نہیں، پس امام بزدوی وغیرہ کی طرح ان کی محافظت کرنا اور ان پر وارد ہونے والے ان اعتراضات کا بہ تکلف جواب دینا جو خود ان ہی ائمہ متقدمین کے اپنے اجتہادات کے پیش نظر ان پر وارد ہوتے ہیں، کسی طرح بھی ان کے مخالف اصولوں کی مخالفت اور مدافعت سے زیادہ سزاوار التفات نہیں۔

اب ہم چند مثالیں دے کر اس حقیقت کو واضح کرنا چاہتے ہیں۔

(۱) ان حضرات (متاخرین علمائے احناف) نے فقہ حنفی کا یہ اصول قرار دیا ہے کہ "لفظ خاص اپنے حکم میں خود واضح ہے۔ کسی تشریحی بیان کو اس کے ساتھ ملحق نہ کیا جائے گا" یہ قاعدہ در اصل ائمہ متقدمین کے اس رویہ سے نکالا گیا ہے جو انھوں نے آیت وَاسْجُدُوْا وَارْكَعُوْا (سجدہ کرو اور رکوع کرو) اور حدیث "آدمی کی نماز نہیں ہوتی جب تک وہ رکوع و سجود میں اپنی پیٹھ کو پوری طرح ٹھیرائے نہیں" کے باب میں اختیار کیا ہے، یعنی یہ کہ انہوں نے (الفاظ آیت کے پیش نظر) صرف مطلق رکوع اور سجدے کو فرض مانا (رکوع و سجود میں اطمینان کو فرض نہیں ٹھیرایا) اور حدیث کو آیت کا وضاحتی بیان نہیں قرار دیا، متاخرین نے اس سے مذکورہ بالا قاعدہ کلیہ وضع کر لیا، مگر دیکھو کہ متعدد مسائل میں ائمہ متقدمین نے جو رویہ اختیار کیا ہے اس سے ان کا یہ اصول کس طرح ٹوٹ ٹوٹ جاتا ہے۔

آیت وَامْسَحُوْا بِرُؤُسِكُمْ میں محض سر پر مسح کرنے کا حکم ہے (اس کی کوئی حد مقرر نہیں کی گئی ہے) مگر حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ناصیہ کا مسح فرمایا، متقدمین نے اس حدیث کو آیت مذکورہ کا بیان تسلیم کرتے ہوئے چوتھائی سر کے مسح کی فرضیت کا فتویٰ دیا، اسی طرح آیت اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا الخ (زنا کار عورت اور زنا کار مرد کو سو کوڑے مارو) اور آیت اَلسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْا الخ (چور مرد اور چور عورت کے ہاتھ کاٹ لو) اور آیت حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجاً غَيْرَه (یہاں تک وہ کسی اور مرد سے نکاح کرلے) وغیرہ میں خاص الفاظ موجود ہیں (اگر ان الخاص مبين فلا يلحقه البيان کا اصول امام اعظمؒ وغیرہ کے سامنے تھا تو لازماً انہیں کسی حدیث کی بنا پر ان خاص لفظوں کی مزید وضاحت قبول نہیں کرنی چاہیے تھی) مگر انہوں نے ان احادیث کو ان الفاظ خاص کی توضیح کی حیثیت سے قبول کیا ہے جو ان مسائل سے متعلق تھیں (۱) اب جب متاخرین کے بنائے ہوئے مذکورہ فقہی ضابطہ پر اس بنیاد پر اعتراض

---

(۱) تینوں آیتوں میں جو خاص الفاظ ہیں وہ یہ ہیں:- "الزانية والزاني" "السارق والسارقة" "تنكح" ان میں مطلق زنا، چوری اور نکاح کا حکم ہے اس امر کی کوئی قید نہیں کہ زنا کرنے والا شادی شدہ نہ ہو، چوری کا مال دس درہم سے کم نہ ہو، نکاح کے بعد ملاقات بھی ہو چکی ہو، ان قیود کا پتہ صرف احادیث سے ملتا ہے۔

وارد ہوا تو انہوں نے اس کے جواب میں عجیب عجیب سخن سازیاں کیں جن کی تفصیل ان کی تصنیفات میں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔

(ب) قرأت نماز کے متعلق نص قرآنی ''فَاقْرَءُوْا مَا تَیَسَّرَ مِنَ الْقُرْآن (جتنا قرآن آسانی سے پڑھ سکتے ہو پڑھ لو) میں ''ما تیسر'' کا عموم چاہتا ہے کہ جتنا بھی اور جہاں بھی قرآن پڑھ لیا گیا نماز ہو جائے گی اور حدیث ''لاصلوٰۃ الا بفاتحۃ الکتاب'' کا ظاہری مفہوم چاہتا ہے کہ سورۂ فاتحہ کی قرأت ہر رکعت میں فرض ہے، لیکن قدماء نے آیت کے عموم کو اپنی جگہ رکھا اور حدیث کو اس کا مخصص نہ مانتے ہوئے فتویٰ دیا کہ قرأت فاتحہ فرض نہیں ہے، اسی طرح ایک حدیث میں ہے کہ ''جن کھیتوں کو دریا اور چشمے سیراب کریں ان کی پیداوار کا دسواں حصہ بطور زکوٰۃ نکالا جائے'' دوسری حدیث میں ہے کہ ''پانچ وسق سے کم پیداوار میں عشر نہیں، قدماء نے پہلی صورت کے عموم کو سامنے رکھتے ہوئے فتویٰ دیا کہ ہر مقدار کی پیداوار میں عشر واجب ہے گویا انھوں نے دوسری حدیث سے مقدار کی تحدید و تخصیص نہیں کی، ائمہ کے اسی طرح کے چند واقعات اور اقوال سے متاخرین نے یہ ایک کلی اصولی مستنبط کر لیا کہ ''العام قطعي كالخاص ''یعنی لفظ عام بھی اپنے حکم اور مفہوم میں خاص کی طرح قطعی ہوتا ہے، اس کے عموم کو محدود نہیں کیا جائے گا۔

لیکن جب اس پر اعتراض وارد ہوا کہ آیت فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ کے عموم کو تو قدما نے قطعی نہیں مانا ہے (کیونکہ ''فَمَا اسْتَيْسَرَ کا لفظ عام ہے جس کو اگر وہ اپنے عموم پر قائم رکھتے تو انہیں فتویٰ دینا چاہیے تھا کہ جو چھوٹی بڑی ہدی (قربانی کا جانور) بھی میسر آجائے اس کی قربانی کی جاسکتی ہے، لیکن انھوں نے ایسا نہیں فرمایا بلکہ ارشاد نبوی کی بنا پر ان کا فتویٰ یہ ہے کہ ہدی کے لیے بکرا یا بکرے سے بڑا کوئی جانور ہونا چاہیے تو اس اعتراض کے جواب میں انھوں نے زبردستی کی باتیں کہنی شروع کر دیں۔

(س) یہاں حال ان کے اس اصول کا بھی ہے کہ لاعبرة بمفهوم الشرط والوصف یعنی اگر کوئی حکم شرعی خاص موقع پر دیا گیا ہو تو اس حکم کے اطلاق میں اس خاص موقع کی خصوصیات اور شرائط کا اعتبار نہ کیا جائے گا یہ قاعدہ دراصل متقدمین کے اس مسلک سے نکالا گیا ہے جو انھوں نے آیت ''فمن لم يستطع منكم طولا ''کے بارے میں اختیار کیا ہے (اس آیت کا ظاہری

مفہوم یہ ہے کہ جو لوگ آزاد عورت سے نکاح کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے اور بوجہ ناداری اس کے اخراجات کے متکفل نہیں ہو سکتے وہ لونڈی سے نکاح کر سکتے ہیں لیکن متقدمین نے عدم استطاعت کی اس شرط کو قید جواز نہ مانتے ہوئے استطاعت والوں کو بھی لونڈی سے نکاح کی اجازت دے دی)۔

لیکن اب ان ہی متقدمین کے دوسرے اقوال وفتاویٰ حضرات متاخرین کے اس اصول سے ٹکراتے ہیں، مثلاً ایک حدیث ہے کہ ''فی الابل السائمۃ زکوٰۃ'' (چرنے والے اونٹوں میں زکوٰۃ ہے) اس حدیث میں ''چرنے والے'' کی شرط مذکور ہے جس کا ائمہ متقدمین نے لحاظ فرمایا ہے اور صرف چرنے والے اونٹوں میں زکوٰۃ کی فرضیت کا فتویٰ دیا ہے۔ (اور اس شرط کو کالعدم قرار دے کر جنگل میں چرنے والے اور باندھ کر کھلائے جانے والے ہر قسم کے اونٹوں پر زکوٰۃ کو واجب نہیں ٹھیرایا ہے) متاخرین کے سامنے جب ان کے اصول مذکورہ بالا پر یہ اعتراض ہوا تو وہ زبردستی کی تاویلیں کرنے کے سوا کچھ نہ کہہ سکے۔

(د) اسی طرح حدیث مصراۃ (۱) میں ائمہ سلف نے جو مسلک اختیار کیا تھا اس کے پیش نظر متاخرین نے یہ کلی اصول بنالیا کہ جب کوئی غیر فقیہ راوی کسی ایسی حدیث کی روایت کرے جو قیاس سے متصادم ہوتی ہو تو وہ واجب العمل نہ ہوگی، مگر جب ان پر یہ اعتراض ہوا کہ اگر یہ اصول صحیح ہے تو قدماء نے حدیث قہقہہ (۲) کو نیز بھول کر کھالینے سے روزے کے نہ ٹوٹنے والی حدیث کو کیوں واجب العمل مانا (حالانکہ یہ حدیثیں خلاف قیاس بھی ہیں اور غیر فقیہ راوی کی روایت بھی) تو اس کا وہ کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکے۔

اسی طرح کی ایک دو نہیں کتنی ہی مثالیں موجود ہیں جو کسی صاحب نظر سے پوشیدہ نہیں، البتہ جو یہ نظر نہ رکھتا ہو اور فقہی ذخیروں کی چھان بین نہ کر سکتا ہو اس کے لیے تو یہ چند اشارات درکنار

(۱) ''مصراۃ'' اس جانور کو کہتے ہیں جس کا تھن بن دوہا ہوا چھوڑ دیا جائے تاکہ خریدار کو وہ بڑا نظر آسکے اور وہ دھوکا کھا کر زیادہ دام لگا دے، حدیث مصراۃ یہ ہے: جس نے کوئی بکری خریدی جس کے تھن میں دودھ روک کر اسے بیچا گیا ہو، اس کو تین دن تک یہ اختیار ہے کہ چاہے تو بکری لے لے، چاہے ایک صاع غلہ کے ساتھ واپس کر دے۔

(۲) اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی آدمی نماز میں زور سے ہنس دے تو اس کی نماز ہی نہیں بلکہ وضو بھی فاسد ہو جاتا ہے۔

طویل تحریریں بھی کافی نہیں۔

مسئلہ کی اصل حقیقت بالکل ہی بے نقاب ہوسکتی ہے اگر تم صرف ایک ہی اصول کے متعلق علماء محققین کی رائیں سن لو، فقہ حنفی کا مشہور اصول ہے کہ کسی ایسے راوی کی خلاف قیاس روایت قبول نہ کی جائے گی جو ضابطہ اور عادل تو ہو مگر فقیہ نہ ہو، مثلاً ''حدیث مصراۃ'' محققین فرماتے ہیں کہ (یہ اصول متفق علیہ نہیں ہے بلکہ اس میں دو مذہب ہیں، ایک عیسیٰ بن ابانؒ کا مذہب ہے اور وہ وہی ہے جس کی اصول مذکور ترجمانی کرتا ہے اور اکثر متاخرین نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے، دوسرا مذہب امام کرخیؒ کا ہے، جن کے نزدیک خبر واحد کے مقبول ہونے کے لیے راوی کا فقیہ ہونا شرط نہیں کیونکہ حدیث بہر حال قیاس کے مقابلہ میں واجب الاتباع ہے، بہت سے علماء نے اسی دوسری رائے کو مانا ہے، اس تشریح کے بعد فرماتے ہیں کہ:-

''یہ قول (یعنی قول اوّل) ہمارے ائمہ سے منقول نہیں، ان سے تو یہ منقول ہے کہ خبر واحد قیاس پر مقدم ہوگی، کیا تم نہیں دیکھتے کہ انھوں نے بھول کر کھانے پینے سے روزہ نہ ٹوٹنے کے متعلق حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کو واجب العمل تسلیم کیا ہے، حالانکہ روایت قیاس کے خلاف تھی، یہاں تک کہ امام ابوحنیفہؒ نے صریحاً فرمایا کہ اگر یہ حدیث نہ ہوتی تو میں قیاس کو اختیار کرتا۔

پھر یہ واقعہ بھی حقیقت کی طرف تمہاری رہنمائی کرسکتا ہے کہ ائمہ متقدمین کے افکار و اقوال کو سامنے رکھ کر متاخرین نے جو تخریجات کی ہیں ان میں اچھا خاصا اختلاف پایا جاتا ہے اور وہ ایک دوسرے کی جی کھول کر تردید کرتے ہیں (ظاہر ہے کہ اگر یہ اصول تخریج واستنباط ائمہ کے ہوتے تو ان تخریجات میں یہ اختلاف نہ ہوتا، نہ باہم ردوقدح ہوتا)

(۳) فقہی اقوال کی حقیقت سے بے خبری

کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ فقہ کی وہ تمام جزئیات جو ان لمبی لمبی شرحوں اور فتاویٰ کی موٹی موٹی کتابوں میں موجود ہیں، سب کی سب امام ابوحنیفہؒ اور صاحبین رحمھم اللہ کے اقوال ہیں، وہ ان فتووں میں یہ تمیز نہیں کرتے کہ فلاں قول ان ائمہ کا واقعی قول ہے اور فلاں قول ان کی رایوں اور فتووں کو سامنے رکھ کر بعد میں مستنبط کیا گیا ہے، اور یہ جو ان کتابوں میں ''علی تخریج الکرخی کذا'' (امام کرخیؒ کی تخریج کے مطابق یوں) اور ''علی تخریج الطحاوی کذا''

(امام طحاوی کی تخریج کے مطابق یوں) کے الفاظ آیا کرتے ہیں ان کو وہ گویا بے معنی سمجھتے ہیں، اسی طرح "قال ابو حنیفه کذا" (امام ابوحنیفہؒ نے یوں فرمایا ہے) اور جواب المسئلة علی مذهب ابی حنیفه کذا (امام ابوحنیفہؒ کے مذہب کے موافق مسئلہ کا جواب یوں ہے) کے درمیان وہ کوئی فرق و امتیاز نہیں کرتے، اور امام ابن الہمامؒ و ابن النجیمؒ وغیرہ محققین حنفیہ کا مسئلہ دہ دردہ (۱) اور مسئلہ شرط تیمّم (۲) اور ایسے ہی دوسرے مسائل کے بارے میں یہ فرمانا کہ "دراصل یہ امام ابوحنیفہؒ کا مسلک نہیں ہے بلکہ بعدوالوں کی تخریجات ہیں" ان کے نزدیک بالکل نا قابل اعتناء ہے۔

اسی طرح بعض لوگوں اس وہم میں مبتلا ہیں کہ مذہب حنفی کی بنا ان ہی جدلی بحثوں پر قائم ہے جو المبسوط، الہدایہ اور التبیین وغیرہ کتابوں کے صفحات میں پھیلی ہوئی ہیں، وہ نہیں جانتے کہ ان کے مذہب کی بنا ان منطقی بحثوں پر نہیں ہے اور ان کے اندر بحث و جدال کے اس طرز کی ابتداء تو دراصل معتزلہ سے ہوئی ہے جسے متاخرین نے اس خیال سے اختیار کر لیا تھا کہ فقہی مباحث میں اس قسم کی باتوں کی بھی گنجائش ہے، نیز یہ کہ اس سے طلبہ کے ذہن میں تیزی اور وسعت پیدا ہوگی۔

ہم اس جگہ ان اوہام اور شکوک کی تردید میں لمبی گفتگو نہیں کرنی چاہتے، کیونکہ اس باب کی تمہید میں جو کچھ ہم بیان کر چکے ہیں اس کی روشنی ان میں سے اکثر کا خود بخود ازالہ کر دیتی ہے۔

(۴) "رائے" اور "ظاہریت" کے مفہوم سے ناواقفی

ایک غلط فہمی یہ ہے کہ "فقاہت کے لحاظ سے محض دو گروہ ہیں:- ایک اہل الظاہر دوسرے اہل الرائے، اور جو شخص بھی قیاس اور استنباط سے کام لے وہ اہل الرائے میں سے ہے"۔ حاشا کہ حقیقت سے یہ انتہائی بے خبری ہے، لفظ "رائی" کا مفہوم نہ تو نفس عقل و فہم ہے کیونکہ کوئی بھی عالم اس صفت سے عاری نہیں ہوسکتا، نہ ہی وہ رائے محض ہے جس کا رشتہ سنت سے یکسر منقطع ہو۔

---

(۱) یعنی "ماء کثیر" جو ناپاکی گرنے سے ناپاک نہیں ہوتا اس کی حد حنفی علماء نے یہ بیان کی ہے کہ وہ کم از کم دس ہاتھ لمبا اور دس ہاتھ چوڑا ہو۔

(۲) حنفیہ کے یہاں "تیمّم" کی اجازت اس وقت مل سکتی ہے جب کہ آدمی پانی سے ایک میل دور ہو۔

کیونکہ ایسی رائے کوئی متبع اسلام اختیار نہیں کرسکتا، اور نہ اس سے مراد قیاس واستنباط کی صلاحیت ہے، کیونکہ امام احمدؒ اور اسحاقؒ بلکہ امام شافعیؒ کا بھی بالاتفاق اہل الرائے میں شمار نہیں، حالانکہ وہ قیاس سے بھی کام لیتے ہیں اور مسائل کا استنباط بھی کرتے ہیں، دراصل رائی اور اہل الرائے کا مفہوم ان تمام سے جداگانہ ہے، اہل الرائے ان لوگوں کو کہتے ہیں جنھوں نے جمہور مسلمین کے متفق علیہا مسائل کے بعد فروعی اور اختلافی مسائل میں کسی امام کے اقوال واصول کو سامنے رکھ کر تخریج واستنباط پر اکتفا کرلیا اور احادیث وآثار کی تلاش وتحقیق سے تقریباً بے نیاز ہوکر حل مسائل کے لیے عموماً یہ دیکھتے رہے کہ یہ مسئلہ فقہاء کے ٹھیرائے ہوئے اصول میں سے کس اصل کے تحت آتا ہے؟ اور اقوال امام کے ذخیرے میں اس کے اشباہ ونظائر کیا ہیں؟ ان کے مقابلہ میں اہل الظاہر وہ لوگ ہیں جو نہ قیاس سے کام لیتے ہیں اور نہ آثار صحابہ اور اقوال تابعین سے، جیسے امام داؤدؒ اور علامہ ابن حزمؒ ان دونوں گروہوں کے درمیان محققین، اہل سنت کا گروہ ہے، جیسے امام احمدؒ وامام اسحاق۔

(۵) اندھی تقلید کا زور

پانچویں مہلک بیماری اس زمانہ میں یہ پیدا ہوئی کہ تقلید جامد پر لوگ مضبوطی سے جم گئے، اور وہ غیر شعوری طور پر ان کے ایک ایک رگ وریشہ میں سرایت کرگئی، جس کے چند اسباب تھے۔

پہلا سبب فقہاء کی باہمی جنگ وجدل ہے، کیونکہ فتووں میں جب ان کے مابین آپس کی مناظرانہ چپقلش اور ردوقدح شروع ہوئی تو نوبت یہ آگئی کہ جہاں کسی فقیہ نے کوئی فتویٰ دیا دوسرے نے فوراً اس کی تردید کردی، اور اپنی رائے الگ پیش فرمادی، اس نزاع میں جب تک کسی قدیم امام مجتہد کا قول بطور حجت نہ پیش کیا جاتا، جھگڑے کا تصفیہ ہی نہ ہو پاتا (اس طرح ارباب علم وافتاء کے لیے ناگزیر ہوگیا کہ کسی نہ کسی امام کی تقلید محض کے حصار میں پناہ لیں)۔

دوسرا سبب اس زمانے کے قاضیوں کا ظلم وجور ہے چونکہ ان کے فیصلے (اکثر سنۃ عادلہ سے بے پرواہوکر) جوروستم پر مبنی ہوا کرتے تھے اور ان پر سے اعتبار اٹھ گیا تھا اس لیے ان کی کوئی بات اس وقت تک قابل قبول نہ ہوتی جب تک عام لوگوں کے نزدیک وہ شک وشبہے سے بالاتر نہ ہوجائے، یعنی وہ ایسی رائے ہو جو ائمۂ سلف سے بھی منقول ہو۔

تیسرا سبب یہ ہے کہ اس زمانہ میں خواص علم ودین سے کورے ہو چکے تھے اور ایسے لوگوں کی طرف فتوے حاصل کرنے کی خاطر رجوع ہونا پڑ رہا تھا جو نہ علم حدیث سے کوئی بہرہ رکھتے تھے اور نہ تخریج واستنباط کی اہلیت رکھتے تھے، جیسا کہ تم اکثر متاخرین کے اندر یہ نقص بآسانی دیکھ سکتے ہو، علامہ ابن ہمامؒ وغیرہ نے اس علمی وفقہی زوال پر شدید احتجاج کیا ہے (ایک وقت وہ تھا جب فقیہ اور مجتہد کے الفاظ ایک ہی معنی میں بولے اور سمجھے جاتے تھے مگر اب فقاہت کا معیار بدل چکا تھا) اس زمانے میں غیر مجتہد بھی فقیہ ہونے لگا تھا (۱)۔ اور پھر یہی وہ زمانہ ہے جس میں فقہی تعصبات لوگوں کے دماغوں پر بری طرح چھا گئے حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ان فقہی اختلافات میں سے اکثر، خصوصاً جن مسائل میں صحابہؓ بھی مختلف تھے، اور دونوں طرح کی رائیں ان سے منقول ہیں، مثلاً تشریق کی تکبیروں اور عیدین کی تکبیروں کے اختلاف، نکاح محرم کے جواز کا اختلاف، ابن عباسؓ کے تشہد اور ابن مسعودؓ کے تشہد کا اختلاف، آمین اور بسم اللہ کو نماز میں آہستہ یا بلند آواز سے پڑھنے کا اختلاف، اقامت میں کلمات اذان کو ایک بار یا دو بار کہنے کا اختلاف وغیرہ، ایسے اختلاف ہیں جن کی نوعیت بس ایک رائے اور مسلک کو دوسرے مسلک پر ترجیح دینے کی ہے، ورنہ ان کی اصل مشروعیت میں ائمہ سلف کا کوئی اختلاف نہیں (یہ بھی مانتے ہیں کہ یہ تمام مذاہب کتاب وسنت سے مستنبط ہیں اور جائز ومشروع ہیں) ان کا آپس کا اختلاف جو کچھ تھا صرف اس امر میں تھا کہ فلاں مسئلہ میں جو دو پہلو ہیں ان میں اولیٰ کون ہے؟ ان کے اس اختلاف کی نوعیت بالکل ویسی ہی ہے جیسی کہ قرأت قرآن کے اختلافات کی ہے، چنانچہ وہ اپنے اکثر اختلافات کی تعلیل بھی یہی کرتے ہیں کہ صحابہ کرام آپس میں اختلاف رائے رکھتے تھے (اور اس مسئلہ میں فلاں صحابی نے یہ فرمایا ہے) جب کہ صحابہ سب کے سب ہدایت کی روشن شاہراہ پر تھے (یعنی کسی صحابی کا اختیار کیا ہوا مسلک خلاف شرع نہیں ہوسکتا) یہی وجہ ہے کہ علمائے حق مسائل اجتہادیہ میں تمام ارباب افتاء کے فتووں کو جائز سمجھتے اور قضاۃ کے فیصلوں کو تسلیم کرتے آئے ہیں، اور بسا اوقات اپنے مذہب کے خلاف بھی عمل کرتے رہے ہیں، چنانچہ تم اس قسم کے مواقع پر تمام ائمہ مذاہب کو دیکھو گے کہ وہ

---

(۱) لیکن شاید یہ دور پھر بھی غنیمت تھا، اب تو وہ دور آیا ہے جس میں فقیہ بننے کے لئے قوت اجتہادی نہ صرف یہ کہ ضرورت نہیں بلکہ جیسے وہ کچھ ممنوع بھی ہے۔

مسئلہ کو پھیلا کر بیان کرتے اور مخالف مسلک کو بھی ذکر کر دیتے ہیں، پھر بعد میں اپنے مسلک کے بارے میں یہ بھی فرما دیتے ہیں کہ "یہ میرے خیال میں زیادہ محتاط مسلک ہے" "یہ رائے زیادہ قابل اختیار ہے" "یہ میرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے" اور کبھی یوں کہتے ہیں کہ "ہم تک صرف یہی حکم پہنچا ہے" المبسوط، آثار محمدؒ اور اقوال شافعیؒ میں اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں، اس مبارک دور کے بعد ان وسیع النظر ائمۂ دین کے پیروؤں کا زمانہ آیا تو انہوں نے اختصار کی راہ اختیار کر کے صرف اپنے ہی مسلک و مذہب کے ذکر و بیان پر اکتفا کر لی (اور دوسرے مجتہدین کی رایوں کو یکسر نظر انداز کر دیا) اس طرح اختلاف کی جڑوں کو مضبوط کر کے وہ محض اپنے ہی ائمہ کے اقوال پر سختی سے جم گئے۔

اور یہ جو بعض علمائے سلف سے ان کے اپنے ہی امام کے مذہب پر ہمیشہ قائم رہنے کی تاکید منقول ہے، سو یہ یا تو ایک طبعی رجحان کی بنا پر ہے، کیونکہ ہر انسان اپنے پیشواؤں اور بزرگوں کی پسندیدہ چیزوں کو بڑی قدر اور محبت کی نگاہ سے دیکھتا ہے یہاں تک کہ غذا اور لباس بھی اسے وہی مرغوب ہوتے ہیں جو اس کے بزرگوں کے مرغوب خاطر رہے ہوتے ہیں، یا پھر اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے مذہب کے دلائل کی عظمت اور قوت سے مرعوب تھے، یا پھر اسی طرح کی کوئی اور وجہ ہوگی جسے بعض لوگوں نے یہ گمان کر لیا کہ یہ دراصل ان کے گروہی تعصب کا نتیجہ ہے، مگر حاشا وکلا انھوں نے تعصب کی بنا پر ہرگز یہ بات نہیں کہی۔

(اب ذرا ان اختلافات کی اصلیت پر غور کرو جن پر فرقہ بندیوں کا محاذ جنگ قائم ہو رہا ہے اور دیکھو کہ صحابہ، تابعین اور ان کے بعد کے ائمہ سلف نے ہمارے لیے کون سا اسوہ چھوڑا ہے؟) ان تمام کا حال یہ تھا کہ ان میں سے بعض لوگ (نماز میں قرأت سے پہلے) بسم اللہ پڑھتے تھے بعض نہیں پڑھتے تھے، کچھ لوگ زور سے پڑھتے تھے کچھ آہستہ سے، بعض لوگ نماز فجر میں دعائے قنوت پڑھتے تھے بعض نہیں پڑھتے تھے، اگر ان میں ایک جماعت ایسی تھی، جو قے کرنے یا پچھنے لگوانے، یا نکسیر ٹوٹنے کے بعد تجدید وضو کو ضروری خیال کرتی تھی تو ایک جماعت ایسی بھی تھی جس اس کی مطلقاً ضرورت نہ سمجھتی تھی، کچھ لوگ شرم گاہ کے چھو دینے یا عورت کو شہوت کے ساتھ ہاتھ لگا دینے کو ناقض وضو سمجھتے تھے تو کچھ کا مسلک اس کے خلاف بھی تھا، بعض لوگ اگر آگ سے پکی

ہوئی چیز کھانے کے بعد از سرنو وضو کرنا ضروری خیال کرتے تھے تو بعض ایسا خیال نہیں رکھتے تھے، اونٹ کا گوشت کھانا اگر کسی کے نزدیک وضو کا ناقض تھا تو دوسروں کے نزدیک ناقض نہیں تھا، یہ اور اسی قسم کے بیسیوں اختلافات موجود تھے، لیکن اس کے باوجود وہ سب ایک دوسرے کے پیچھے نمازیں پڑھتے تھے۔ (کسی نے کسی کی اقتداء سے کبھی انکار نہیں کیا) مثلاً امام ابوحنیفہؒ اور ان کے تلامذہ اور امام شافعیؒ وغیرہ اہل مدینہ کے پیچھے نمازیں پڑھا کرتے تھے، حالانکہ اہل مدینہ (نماز میں) سرے سے بسم اللہ پڑھتے ہی نہ تھے، نہ آہستہ اور نہ زور سے، امام ابو یوسفؒ نے ہارون الرشید کے پیچھے نماز پڑھی اور پھر دہرائی نہیں حالانکہ اس نے پچھنے لگوانے کے بعد وضو کی تجدید نہیں کی تھی، جس کا فتوی اسے امام مالکؒ نے دیا تھا۔ (اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک پچھنے لگوانے سے وضوٹوٹ جاتا ہے) اسی طرح امام احمد بن حنبلؒ پچھنے اور نکسیر کو ناقض وضو مانتے تھے لیکن جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا آپ ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھیں گے جس نے بدن سے خون نکلنے کے بعد پھر سے وضو نہ کیا ہو؟ تو آپ نے جواب دیا ''یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ امام مالکؒ اور سعیدؒ بن المسیب کے پیچھے میں نماز نہ پڑھوں؟'' (جن کے نزدیک یہ چیزیں نواقض وضو میں سے نہیں ہیں)۔

روایت ہے کہ امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ عیدین میں حضرت ابن عباسؓ کے مذہب کے مطابق تکبیریں کہا کرتے تھے (حالانکہ ان دونوں اماموں کا مذہب اس کے خلاف تھا) وجہ صرف یہ تھی کہ خلیفہ ہارون الرشید کو اپنے دادا حضرت ابن عباسؓ) ہی کی تکبیر پسند تھی۔

امام شافعیؒ نے امام ابوحنیفہؒ کے مقبرے کے قریب فجر کی نماز پڑھی تو محض ان کے لحاظ اور ادب سے دعائے قنوت کو ترک کر دیا، اور فرمایا کہ ''بسا اوقات ہم اہل عراق کے مسلک پر بھی عمل کر لیتے ہیں''۔

خلیفہ ہارون یا منصور کو امام مالکؒ نے مؤطا کے سلسلے میں جو جواب دیا تھا، اس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔

امام ثانیؒ (امام ابو یوسفؒ) کے متعلق البزازیہ میں ہے کہ آپ نے جمعہ کے روز حمام میں غسل کیا اور لوگوں کو نماز پڑھائی، نماز پڑھ کر جب لوگ اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے تو آپ کو اطلاع دی گئی کہ حمام کے کوئیں میں ایک مرا ہوا چوہا موجود ہے امام موصوف نے یہ سن کر فرمایا کہ ''تو پھر اس

وقت ہم اپنے مدنی بھائیوں (یعنی مالکیوں) کے مسلک پر عمل کرتے ہیں کہ جب پانی دو قلہ کی مقدار میں ہوتو وہ نجس نہیں ہوتا، اس کا حکم ماء کثیر کا ہو جاتا ہے(۱)۔

(۶) غیر ضروری فنی کاوشوں کا زور

اس دور میں ایک اور چیز پیدا ہوگئی جس نے اکثر لوگوں کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی، وہ (علوم شریعت کے اصل سرچشمہ سے اک گونہ بے پروا ہوتے گئے اور) مختلف فنوں میں موشگافیاں کرنے لگے، کچھ لوگوں نے اپنی کاوشوں کے متعلق یہ گمان کیا کہ ہم علم اسماء الرجال اور فن جرح وتعدیل کی بنیادیں بھر رہے ہیں، پھر وہ جدید وقدیم تاریخ کی تدوین میں منہمک ہو رہے، کچھ لوگ غریب اور نادر حتی کہ موضوع احادیث واخبار کی چھان بین میں مصروف ہو گئے، ایک گروہ نے اصول فقہ کے مباحث کو پھیلانا شروع کیا اور ان میں سے ہر ایک نے اپنے امام واصحاب کی تائید کے لیے بے شمار جدلی قواعد ایجاد کر ڈالے، دوسروں پر جی کھول کر اعتراض کیے، دوسروں کے اعتراضات کے خوب خوب جواب دیے ایک ایک چیز کی تعریف بیان کی، مسائل ومباحث کی تقسیم کی، اور اس طرح اس فن پر ان کے قلم سے کبھی طویل اور کبھی مختصر کتابیں تحریر ہوتی رہیں، پھر ان میں سے اکثر ایسے تھے جنھوں نے یہ ساری دماغی کاوشیں یا تو ایسی فرضی صورتوں کو سامنے رکھ کر کیں جو حد درجہ مستبعد اور بے اصل تھیں، اور جو اس قابل نہیں کہ ان کی طرف کوئی معقول آدمی نظر بھی ڈالے یا پھر ائمۂ تخریج کے بلکہ ان سے کم مرتبہ علماء کے عموم عبارت اور اشارات کو کرید کرید کر کیں، جن کا سننا نہ کسی عالم کو پسند ہو سکتا ہے نہ کسی عامی کو۔

(یہ دور اتنے فتنوں کو ساتھ لے کر آیا تھا) اختلاف ونزاع اور لاطائل تعمق وتدقیق کا یہ فتنہ قریب قریب ویسا ہی (خطرناک اور مہلک) تھا جیسا کہ تاریخ اسلام کا پہلا (سیاسی) فتنہ، جو اس وقت اٹھا تھا جب اقتدار حکومت کے لیے لوگوں میں کش مکش شروع ہوگئی تھی اور ہر شخص اپنے ساتھی (لیڈر) کو برسر تخت لانے کی (جا وبے جا) سرتوڑ کوششوں میں مصروف تھا، جس طرح اس فتنہ کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ ''ملک عضوض'' (جابر وظالم بادشاہ) امت کے سر پر مسلط ہو گئے اور تاریخ اسلام

---

(۱) ائمۂ دین کے اس اسوہ کو دیکھیے اور پھر اس زمانے کے ان حنفیوں اور غیر حنفیوں کے طرز عمل پر نگاہ ڈالیے جنھیں ان ائمہ کی پیروی کا دعویٰ ہے۔

میں نہایت سخت اور ہولناک واقعات پیش آئے، اسی طرح یہ جدید فتنہ بھی جہل تاریکی، شکوک اور اوہام کا ایک ایسا طوفان بپا کر گیا جس کی پنہائیوں کا کوئی حساب نہیں۔

پھر ان کے بعد ان کی جو نسلیں آئیں وہ اسی اندھی تقلید کی تاریک فضا میں پروان چڑھیں، اس لیے انہیں حق و باطل میں تمیز کرنے اور جدل محض اور استنباط صحیح کی حدود الگ کرنے کا مطلق شعور نہ رہا، اب فقیہ نام ہونے لگا اس شخص کا جو الجھی ہوئی بکواس کر سکتا ہو، جو کسی بات پر چپ رہنا اور حق و ناحق کا لحاظ کرنا جانتا ہی نہ ہو، جس نے بلا امتیاز رطب و یابس، فقہاء کے تمام اقوال رٹ رکھتے ہوں اور اپنے جبڑے چیرے ان کی دھواں دھار تلاوت کر سکتا ہو، اسی طرح اصطلاحی محدث نام تھا اس شخص کا جس نے غلط اور صحیح ہر قسم کی روایتوں کو شمار کر رکھا ہو اور زبان کی پوری طاقت سے جس طرح قصے سنائے جاتے ہیں، ان کو فرفر سنا سکتا ہو۔

میں یہ نہیں کہتا کہ یہی حال سب کا تھا، نہیں اس قحط کے باوجود اللہ کے کچھ (نیک نہاد) بندے باقی تھے جن کا کوئی دشمن حق کچھ نہ بگاڑ سکا، اگرچہ بہت کم تھے، ایسے ہی لوگ اللہ کی زمین پر اس کی حجت ہیں۔

اس دور کے بعد جوں جوں وقت گزرتا گیا فتنہ آرائی اور متعصبانہ تقلید پرستی کا طوفان بڑھتا ہی گیا اور دلوں سے علم و بصیرت کی امانتیں نکلتی گئیں، حتی کہ لوگ اب امور دین میں غور و تدبیر کی ''بدعت'' کو مٹا کر اطمینان کا سانس لے رہے ہیں اور زبان حال سے کہہ رہے ہیں کہ:

إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَ نَا عَلٰى أُمَّةٍ وَّإِنَّا عَلٰى آثَارِهِمْ مُقْتَدُوْنَ

ہم نے اپنے آباء کو ایک روش پر پایا ہے اور ہم انہیں کے نقوش قدم کی پیروی کرتے رہیں گے۔

اب سوائے اللہ کے، اور کس سے اس کا گلہ کیا جائے، وہی ہمارا مددگار ہے اور صرف اسی کی ذات کا بھروسہ ہے۔

اختلافی مسائل اور ان کا نقطۂ عدل

اسلام وحدت کا پیام لے کر آیا تھا مگر اس وقت جہل و تعصب کے ہاتھوں میں پڑ کر وہ اختلاف و نزاع کی خدمت سرانجام دے رہا ہے، مذہب کے چند جزئی مسائل نے باہمی ہنگامہ آرائیوں کا جو طوفان عظیم بپا کر رکھا ہے ان کی حقیقت پر جب میں نے پوری طرح غور کیا تو یہ پایا کہ ہر گروہ حق و اعتدال کے مرکز سے کچھ نہ کچھ ہٹا ہوا ہے اور بے جا تعصب اور غلو سے کام لے رہا ہے، ہر ایک اتباع حق کا مدعی ہے، مگر سچائی کی اخلاص طلب شاہراہ پر چلنے کے بجائے جذبات کی لہروں میں بہہ رہا ہے، مجھے رحمت الٰہی کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ اس نے مجھے عدل کی میزان بھی بخش دی ہے جس پر حق اور باطل کو تول کر میں اندازہ کر رہا ہوں کہ حق کی سیدھی اور صاف راہ کون سی ہے اور وہ اس وقت کس طرح اختلافات کی خارزار بن گئی ہے اور ان نزاعات و اختلافات کی بنیاد کیا ہے۔

اہل زمانہ کی اس افسوسناک حالت کو دیکھ کر ضروری معلوم ہوا کہ ان مسائل کی اصل نوعیت انہیں سمجھا دی جائے جن کے اندر ان کے افکار الجھ کر رہ گئے ہیں، اور جن کی تائید و تردید میں ان کے قلم بغیر کسی سچی بصیرت کے بیجا جوش و خروش کا اظہار کر رہے ہیں۔

ان میں سب سے اہم مسئلہ تقلید کا ہے، ائمۂ اربعہ کی تقلید کا جواز قریب قریب ساری امت کا اجماعی مسئلہ ہے اور اس کے اندر جو مصالح ہیں انہیں ہر دیکھنے والی آنکھ دیکھ سکتی ہے، خصوصاً اس پرآشوب زمانہ میں جب کہ عام قوائے فکریہ پر جمود اور دوں ہمتی کی موت سی طاری ہے، دلوں میں

طلب حق کا کوئی جوش اور ولولہ باقی نہیں، شریعت کے قوانین انسانی آراء پر قربان کیے جا رہے ہیں، اور ہر کس و ناکس خود پرستی اور خود رائی کے نشہ میں چور ہے۔

تقلید کے بارے میں ابن حزمؒ کے اس قول نے کہ ''آیات قرآنی اور اجماع سلف کی رو سے تقلید حرام ہے اور خود ائمۂ مجتہدین نے اپنی تقلید سے منع فرمایا ہے'' لوگوں کو عجیب غلط فہمی میں مبتلا کر رکھا ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ یہ حکم عام ہے اور ہر عامی و جاہل پر اس کا اطلاق ہوتا ہے، حالانکہ یہ قول بجائے خود بالکل برحق ہے۔ اپنا ایک خاص محل اور معنی رکھتا ہے اور اس کا اطلاق ایسے شخص پر ہوتا ہے:-

(۱) جو اپنے اندر اجتہاد کی اہلیت رکھتا ہو، خواہ ایک ہی مسئلہ میں سہی۔

(۲) جو اچھی طرح جانتا ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فلاں بات کا حکم دیا ہے، یا فلاں بات سے روکا ہے، اور یہ حکم منسوخ نہیں ہے، اس بات کا علم خواہ اسے احادیث کے تتبع اور مخالف و موافق دلائل کے استقراء سے حاصل ہو، یا یہ دیکھ کر کہ ارباب علم و بصیرت کا سواد اعظم اس طرف جا رہا ہے اور مخالف کے پاس قیاس آرائیوں اور منطقی وقیقہ سنجیوں کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے، وہ اس نتیجہ پر پہنچ جائے کہ ایسی صورت میں حدیث نبوی کی مخالفت کا سبب یا تو کھلا ہوا حمق ہو سکتا ہے یا کوئی چھپا ہوا نفاق۔

شیخ عزالدین بن عبدالسلامؒ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں،

''حیرت ہوتی ہے ان تقلید پرست فقہا پر جو اپنے امام کی اجتہادی غلطی سے واقف ہونے کے بعد اس کے قول پر سختی سے جمے رہتے ہیں اور اسے ترک کر کے کسی ایسے قول کو اختیار نہیں کرتے جو اپنی صحت پر کتاب و سنت اور قیاس صحیح کے بے شمار شواہد رکھتا ہو، بلکہ بعض اوقات تو یہ نادان اس اندھی تقلید کے اندھے جوش میں عملاً ظواہر کتاب و سنت کی بھی مخالفت پر تل جاتے ہیں اور اپنے امام کی اصابت رائے بلکہ ''معصومیت'' ثابت کرنے کے لیے نصوص شرعیہ کی ایسی رکیک، مہمل اور فاسد تاویلیں کرتے ہیں کہ ان سے بڑھ کر تحریف کلام کی مکروہ اور حیرت انگیز مثال شاید ہی مل سکے''۔

پھر ایک مقام پر لکھتے ہیں:-

صدر اوّل میں جس سے بڑھ کر مبارک اور حق شناس دور شاید قیامت تک نہ آئے، لوگوں کا حال یہ تھا کہ جس عالم دین کو پا جاتے اسی سے فتویٰ پوچھ لیا کرتے تھے، بغیر اس تحقیق و تجسس کے کہ یہ عالم کس خیال اور مسلک کا پیرو ہے لیکن اس دور کے بعد حالت میں ایک عظیم الشان فرق پیدا ہو جاتا ہے، چار مذاہب اور ان کے جامد مقلدین کا ظہور ہوتا ہے اور ہدایت کے اصل مرکز سے بالکل بے پرواہ ہو کر صرف ائمہ کے اقوال پر اعتماد کر لیا جاتا ہے خواہ ان کا کوئی قول کتنا ہی کمزور اور بے دلیل و حجت ہو، گویا مجتہد، مجتہد نہ رہا، اللہ کا رسول بنا لیا گیا، جو خود معصوم ہے اور اس کی ہر بات وحی الٰہی ہے، یہ راستہ حق کا راستہ نہیں ہے بلکہ سراسر جہل اور باطل کا راستہ ہے"

امام ابوشامہؒ کا فیصلہ بھی سننے کے لائق ہے، فرماتے ہیں:-

"جو شخص فقہ سے دلچسپی رکھتا ہو اسے چاہیے کہ کسی ایک ہی امام کے مذہب پر اکتفا نہ کرے بلکہ ہر مجتہد کے اقوال پر نظر ڈالے، تمام کے اندر ڈوب کر حق کا سراغ لگائے اور اس غواصی میں اسے جو قول قرآن و سنت سے زیادہ اقرب ملے اسی کو اختیار کرے، اگر علوم اوائل کے ضروری حصوں پر اس کی نگاہ ہوگی تو انشاء اللہ یہ قوت تمیز اسے بآسانی حاصل ہو جائے گی اور کسی دقت اور ناکامی سے دوچار ہوئے بغیر وہ شریعت کی اصل شاہراہ پالے گا، ایسے شخص کو چاہیے کہ تعصب کے مہلک جراثیم سے اپنے دماغ کو پاک رکھے اور اختلاف و نزاع کی ان پر خطر وادیوں میں ہرگز قدم نہ رکھے، جسے متاخرین نے تیار کر رکھا ہے، کیونکہ وہاں تضیع اوقات اور انتشار طبع کے ماسوا کچھ نہیں مل سکتا، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے خود اپنی اور ہر دوسرے امام کی تقلید سے منع فرمایا ہے، جس کا ذکر مزنی نے اپنی کتاب میں بہت تفصیل سے کیا ہے"۔

(۳) ابن حزم کا فتویٰ اس شخص پر بھی منطبق ہوتا ہے جو عامی اور علم دین سے بے بہرہ ہونے کی بنا پر تقلید کرنے میں تو حق بجانب ہو، مگر وہ کسی خاص امام کی تقلید اس اعتقاد کے ساتھ کرتا ہو کہ اس سے خطا کا اعتقاد کا ارتکاب غیر ممکن ہے اور اس کا امام جو کچھ کہتا ہے وہ حق ہی ہوتا ہے،

نیز اس اعتقاد کے ساتھ وہ اپنی جگہ یہ فیصلہ بھی کر لے کہ اس خاص امام کی تقلید پر وہ ہر حال میں قائم رہے گا، خواہ کسی مسئلہ میں اس کے قول کا خلاف قرآن وحدیث ہونا ثابت ہی کیوں نہ ہو جائے۔ یہی وہ یہودیت ہے جس نے بنی اسرائیل کی توحید کو بالکل شرک سے بدل دیا تھا جیسا کہ امام ترمذیؒ نے عدی بن حاتمؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ:

> ''آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَاباً مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ پڑھ کر فرمایا کہ یہود اپنے احبار (علماء) اور رہبان (مشائخ) کی عبادت تو نہیں کرتے تھے، مگر ان کا حال یہ تھا کہ جس چیز کو ان کے علماء اور مشائخ حلال کہہ دیتے اسے وہ (بغیر کسی شرعی دلیل کے) حلال مان لیتے تھے اور جس شے کو وہ حرام قرار دے دیتے تھے اسے وہ حرام سمجھ لیتے تھے''۔

پس کسی امام کی تقلید اس اعتقاد کے ساتھ کرنا کہ اس کی زبان عین شریعت کی زبان ہے یقیناً غیر اللہ کی پرستش ہے۔

(۴) جو شخص اس بات کو جائز نہیں سمجھتا کہ ایک حنفی کسی شافعی فقیہ یا شافعی کسی حنفی فقیہ سے فتویٰ پوچھے یا اس کے پیچھے نماز پڑھے، وہ بھی ابن حزمؒ کے فتوے کی زد میں آ جاتا ہے، اس لیے کہ یہ اجماع سلف اور صحابہ و تابعین کرام کے عمل کی کھلی ہوئی مخالفت ہے جو کسی حال میں بھی جائز نہیں ہو سکتی۔

یہ ہے ابن حزمؒ کے قول کا منشا ان قیود اور شرائط کو ملحوظ رکھ کر اس کا اطلاق کیا جائے گا، اور جہاں صورت حال یہ نہ ہو وہاں تک اس کا دائرہ وسیع نہیں ہو سکتا، مثلاً ایک شخص ہے جو محض اقوال رسولؐ ہی کو دین سمجھتا ہے، صرف اسی چیز کی حلت کا اعتقاد رکھتا ہے جسے اللہ اور اس کے رسول نے حلال کیا ہو، اور صرف اسی شئے کو حرام سمجھتا ہے جسے اللہ اور رسول نے حرام قرار دیا ہو، یعنی تحریم وتحلیل کا حق وہ ایک لمحہ کے لیے بھی کسی اور کو نہیں دیتا، لیکن اس ایمان اور اعتقاد کے باوجود چونکہ وہ اقوال رسولؐ پر وسیع نظر نہیں رکھتا، نہ متعارض نصوص کو تطبیق دینے کی قدرت رکھتا ہے اور نہ نصوص شرعیہ سے احکام کو استنباط کر سکتا ہے، اس لیے اگر وہ ایک ایسے ثقہ اور صحیح النظر عالم دین کا اتباع کرتا ہے جو اس کے نزدیک سنت رسول کے مطابق فتویٰ دینے والا ہے، اور یہ اتباع بھی وہ اس نظریہ کے ساتھ کرتا ہے کہ جب کبھی کوئی نص شرعی اس کے خلاف ملے گی تو بغیر کسی تعصب اور

اصرار کے وہ اس قول کو ترک کر دے گا، تو پھر نہیں معلوم کہ کوئی شخص کیونکر ایسی تقلید یا اتباع کو نا جائز کہہ سکتا ہے، جب کہ عہد نبوی سے لے کر اب تک تمام مسلمانوں میں افتاء اور استفتا کی یہی سنت متواترہ چلی آ رہی ہے، اب خواہ کوئی انسان کسی ایک ہی فقیہ سے ہمیشہ فتویٰ پوچھا کرتا ہو یا کبھی ایک فقیہ سے اور کبھی دوسرے سے، دونوں فعل جائز ہیں، بشرطیکہ مستفتی، فقیہ اور رسولؐ کے فرق کو ہمیشہ ملحوظ رکھے۔

پس ہماری تقلید پر کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے جب کہ ہم کسی امام کے متعلق یہ ایمان نہیں رکھتے کہ وہ معصوم ہے، اللہ تعالی نے اس پر علم فقہ کی وحی نازل فرمائی ہے اور اس کی اطاعت ہم پر فرض کر دی ہے، ہم تو اگر کسی امام کا اتباع کرتے ہیں تو یہ جان کر کرتے ہیں کہ وہ کتاب وسنت کا عالم اور روح شریعت کا مزاج شناس ہے، اس لیے اس کا قول یا تو آیات واحادیث کے صریح دلائل پر مبنی، یا ان سے ماخوذ اور مستنبط ہے، یا پھر قرائن سے اس نے یہ بات تحقیق کر لی ہے کہ یہ حکم فلاں علت کی بناء پر ہے اور جب اسے اپنی فہم کی صحت پر پورا اطمینان ہو گیا ہے تب ہی اس نے غیر منصوص کو منصوص پر قیاس کر کے فتویٰ دیا ہے، گویا وہ دراصل زبان حال سے اس حقیقت کا اعلان کر رہا ہے کہ میرے خیال میں شارع علیہ السلام نے ایسا فرمایا ہے کہ جہاں کہیں یہ علت پائی جائے گی وہاں یہی حکم جاری ہوگا اور ایسے تمام قیاسی احکام اسی عموم میں داخل ہوں گے، یا بالفاظ دیگر یہ اقوال بھی شارع علیہ السلام کی طرف منسوب شمار کیے جائیں گے اگرچہ ان کی قطعیت یقینی اور شکوک سے بالکل پاک نہیں کہی جا سکتی۔

اگر یہ بات نہ ہوتی تو کوئی مسلمان کسی مجتہد کی تقلید نہ کرتا، پس اگر رسول معصوم، کہ صرف آپ ہی کی اطاعت اللہ نے ہم پر فرض کی ہے، ہمیں کوئی ایسی صحیح روایت مل جائے جو قول امام کی مخالفت کرتی ہو، اور پھر بھی ہم اس کو درخور اعتنا نہ سمجھتے ہوئے نص قطعی کو چھوڑ کر ظن انسانی کی تقلید پر جمے رہیں، تو ہم سے بڑھ کر شقی اور نامراد کون ہوگا اور کل خدائے قہار کے سامنے ہم کیا جواب دیں گے؟

جائز تقلید کی صحیح تصویر یہی ہے جو ان چند لفظوں میں کھینچی گئی ہے، اگر امت مسلمہ غلو سے اپنے قوائے فکریہ کو آزاد کر لے اور اپنی آنکھوں پر سے تعصب کے پردے ہٹا کر اصل تصویر دیکھنے لگے تو بہت سے لفظی نزاعات ختم ہو جائیں اور مذہبی اختلافات کی شورانگیز فضا کسی قدر امن وسکون

کی خوش گواریوں سے بدل جائے۔

مسئلۂ تقلید کے بعد دوسرا اہم مسئلۂ استخراج مسائل کا ہے، جس کے دو اصول ہیں:

ایک تو یہ کہ الفاظ حدیث کا تتبع کیا جائے، دوسرا یہ کہ فقہاء کے اصول کو سامنے رکھ کر مسائل کا استنباط کیا جائے، شرعاً ان دونوں اصلوں کی اہمیت مسلم ہے، ہر دور کے فقہائے محققین کا طریقہ یہی رہا ہے کہ وہ ان دونوں اصلوں کا لحاظ رکھتے تھے، کوئی ایک کی رعایت زیادہ کرتا کوئی دوسرے کی، لیکن ایسا کبھی نہ کرتے کہ کسی اصل کو بالکلیہ ترک کر دیں، پس کسی جویائے حق کے لیے سزاوار نہیں ہے کہ وہ بالکل ایک ہی طرف جھک جائے جیسا کہ آج دونوں فریق کا عام شیوہ ہے، اور یقین کرو کہ ان کا یہی "شیوہ" ان کی ساری ضلالتوں کا ذمہ دار ہے ان دونوں اصلوں کو الگ الگ کر کے ہدایت کی سیدھی راہ پانا بہت مشکل ہے، حق کا راستہ یہ ہے کہ ان میں تفریق کرنے کے بجائے دونوں میں مطابقت پیدا کی جائے، اور ایک سے دوسرے کی عمارت ڈھانے کے بجائے اس کے کمزور مقامات کی اصلاح اور تشئید کا کام لیا جائے، اس طرح احکام دین کا جو قصر تعمیر ہوگا، نہایت مستحکم اور حق کی ٹھوس بنیادوں پر قائم ہوگا، اور اس میں باطل کے راہ پانے کی کوشش قریب قریب بیکار ثابت ہوگی، اسی محتاط اور حکیمانہ نکتہ کی طرف امام حسن بصریؒ ہماری رہنمائی کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

سنتكم والله الذى لا اله الا هو بينهما بين الغالى والجانى

اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں کہ تمہارا راستہ حد سے بڑھنے والے اور حد تک (بوجہ سہل انگاری کے) نہ پہنچنے والے دونوں کے بیچ میں ہے۔

یعنی حق کا مرکز افراط وتفریط کے بیچ میں ہے، جو اہل حدیث ہیں انھیں چاہیے کہ اپنے اختیار کردہ مسلک کو مجتہدین سلف کی رایوں پر پیش کر لیا کریں، اسی طرح جو اہل تخریج ہیں اور مجتہدین کے اصولوں پر مسائل کا استنباط کیا کرتے ہیں، انہیں بھی چاہیے کہ حتی الوسع صحیح اور صریح نصوص کو اپنے اصول اور رائے پر قربان نہ کریں اور نہ ایسا طریقہ اختیار کریں کہ فرمودۂ نبوی کی صریحی مخالفت کا انہیں بار اٹھانا پڑے۔

کسی محدث کے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ ان اصول حدیث کے اتباع میں بے جا تعمق

اور تو عقل سے کام لے، جنھیں پرانے محدثین نے وضع کیا ہے، کیونکہ بہر حال وہ بھی انسان ہی تھے، فکر و نظر کی لغزشوں سے ان کے بنائے ہوئے قواعد محفوظ نہیں کہے جا سکتے، اور نہ شارعؑ کی طرف سے ان کی صحت اور قطعیت پر کوئی سند پیش کی جا سکتی ہے۔ اس اصول پرستی کے تشدد آمیز رویہ سے بسا اوقات حدیث اور قیاس صحیح، دونوں کو رد کر دینا پڑتا ہے مثلاً انقطاع یا ارسال کے ایک ذرا سے شک کی بنا پر کتنی ہی حدیثیں متروک اور نا قابلِ استناد ٹھیرا دی جاتی ہیں حالانکہ فی نفسہٖ وہ قولِ رسول ہوا کرتی ہیں، چنانچہ ابن حزمؒ نے اسی طریقہ کی پیروی کرتے ہوئے تحریم معازف (باجوں کو حرام قرار دینے) والی حدیث کو نا قابلِ حجت قرار دے دیا، صرف اس وجہ سے کہ امام بخاریؒ کی روایت میں انقطاع کا شبہ پایا جاتا ہے، حالانکہ حدیث فی نفسہٖ صحیح اور اس کا سلسلہ اسناد متصل ہے، ہاں اگر کوئی قوی نص سے تعارض ہو تو البتہ انقطاع کے شبہ کی بنا پر اسے مرجوع قرار دیا جا سکتا ہے لیکن حدیث کو سرے سے متروک ٹھیرا دینا یقیناً زیادتی ہے۔

اسی طرح ارباب حدیث کا ایک اصول یہ ہے کہ اگر ایک شخص کسی محدث کی روایتوں کو عموماً زیادہ صحت کے ساتھ محفوظ رکھتا ہے اور دوسری ظاہری صحت کی حفاظت سے اتنا اعتناء نہیں کرتا، تو کلیتہً پہلے شخص کی ہر روایت (جو اس محدث سے کی گئی ہو) دوسرے راوی کی روایت پر مقدم اور مرجح مانی جائے گی، خواہ اس دوسرے راوی کے اندر ترجیح اور برتری کے کتنے ہی واضح دواعی کیوں نہ موجود ہوں، لوگوں کی یہ ظاہر پرستی سخت تنقید کے قابل ہے، کون نہیں جانتا کہ عام رواۃ، حدیثوں کو بالمعنی بیان کرتے تھے، الفاظ و حروف کے محفوظ رکھنے کا چنداں رواج نہ تھا۔ پس ادبی تصانیف میں جس طرح اہل ادب و بلاغت ایک ایک حرف کے تقدیم و تاخر اور اس کی وضع و ترتیب سے نکتہ آفرینیاں کیا کرتے ہیں، ویسا ہی تعمق متن حدیث میں برتنا، حتی کہ ایک کلمہ کی تقدیم یا تاخیر، الفاظ کی نشست اور ناء اور واؤ جیسے حروف کے دقیق معنوی خصائص سے استدلال کا رخ متعین کرنا، جب کہ عام روایتیں بالمعنی بیان کی گئی ہیں، ایک طرح کی لغویت اور الفاظ کی ناروا غلامی ہے۔ ورنہ تم دیکھتے ہو کہ ایک ہی روایت میں ایک راوی ایک لفظ استعمال کرتا ہے، اور بعینہٖ اسی روایت میں اُسی سند کے ساتھ دوسرا راوی ایک دوسرے ہی لفظ کے ذریعہ حدیث کا مفہوم ادا کرتا ہے۔

متن احادیث کے بارے میں صحیح مسلک یہی ہونا چاہیے کہ راوی جو کچھ بھی اپنی زبان سے

کہے، اسے کلام نبوی کی حیثیت سے مان لیا جائے، ہاں اگر کوئی اور قوی حدیث یا شرعی دلیل اس کے خلاف مل جائے تو مقدم الذکر کو ترک کر کے اسے اختیار کرنا ضروری ہے۔

ایسی ہی ذمہ داری اور احتیاط اُن فقہا پر بھی عائد ہوتی ہے، جو ائمہ مجتہدین کے اصول اور فتاویٰ کو سامنے رکھ کر مسائل کا استخراج کرتے ہیں، ان کے لیے بھی یہ جائز نہیں کہ وہ دنیا جہان کے سارے مسائل کا حل انہیں اصولوں میں تلاش کیا کریں، اور ان میں سے کرید کرید کر ایسے اقوال نکالیں جن سے نہ تو خود ان کے ائمہ کے اصول اور ان کی تصریحات سے کوئی دور کا تعلق ہو، نہ علمائے لغت ان سے یہ معانی سمجھ سکیں اور نہ عرف عام میں ایسا طریقۂ سخن فہمی رائج ہو، بلکہ محض اپنے ذہن سے ایک علت متعین کر لی جائے، یا ایک ادنیٰ مشابہت تلاش کر لی جائے اور اسے قول مجتہد مان کر صدہا مسائل میں اس خود آفریدہ علت یا مشابہت کو معیار حکم ٹھہرادیا جائے، ستم پر ستم یہ ہے کہ ان تمام تدقیقات کو نہایت دیدہ دلیری کے ساتھ امام کیطرف منسوب کر دیا جاتا ہے، حالانکہ اگر وہ امام جس کے قول سے یہ تصریحات کی گئی ہیں، آج زندہ ہو کر آجائے اور یہ مسائل براہِ راست اس سے پوچھے جائیں، تو باوجود اپنی تمام فہم و بصیرت اور مجتہدانہ ژرف نگاہی کے، ان بلند دقائق تک اس کا تخیل پرواز نہ کر سکے گا، جنھیں اس کے پیچھے چلنے والوں نے اسی کے اقوال سے مستنبط کر رکھا ہے۔

تخریج کا یہ طریقہ نہایت غیر ذمہ دارانہ ہے، تخریج تو محض اس وجہ سے جائز ہے کہ وہ درحقیقت مجتہد کی تقلید اور پیروی ہے، نہ کہ اس کی غلط ترجمانی اور اس کے اشارات پر جابجا حاشیہ آرائی، اور وہیں تک اس کا تحقق ہوسکتا ہے جہاں تک امام کے اقوال عام اصول فہم و تدبر کے مطابق اجازت دے سکیں ورنہ اگر قائل کے کلام کا رخ کسی طرف ہو اور اس کا ترجمان و مفسر کوئی اور رخ متعین کرے تو یہ تفسیر اور ترجمانی یا مقلدانہ تخریج نہ ہوگی بلکہ کوئی اور ہی چیز ہوگی۔

اس کے علاوہ ایسے فقہاء کو اس بات کا خیال رکھنا بھی بہت ضروری ہے کہ وہ اپنے اصول کی پیروی کے جوش میں ایسی مستند احادیث یا آثار کو نہ رد کر دیا کریں جنہیں عام امت میں مقبولیت حاصل ہو چکی ہو، مثال کے طور پر حدیث مصراۃ کو لو، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ:-

''جو شخص ایسی بکری خریدتا ہے جس کا دودھ تھن میں پہلے سے روک لیا گیا تھا (تاکہ

خریدار دھوکہ میں آ کر زیادہ دام لگائے) تو اسے تین روز تک اختیار رہتا ہے، خواہ بکری رکھ لے یا ایک صاع گندم کے ساتھ واپس کر دے"۔

یہ حدیث متعدد طرق سے ثابت ہے اور ثقات نے اس کی روایت کی ہے، لیکن احناف نے چونکہ یہ اصول وضع کر رکھا ہے کہ اگر راوی غیر فقیہ ہو اور اس کی روایت عام اصول کے مخالف ہو، اور کوئی عام قاعدہ نہ بنا سکتی ہو تو سرے سے وہ حدیث متروک العمل ہوگی، اس لیے باوجود صحیح اور مستند ہونے کے یہ حدیث ان کے نزدیک، متروک العمل ہے کیونکہ وہ کوئی عام قانون نہیں بن سکتی اور راوی غیر فقیہ ہے۔

یہ طریقہ ارباب حق کا طریقہ نہ ہونا چاہیے، اس میں شریعت پر ایک طرح کی جسارت پائی جاتی ہے، فرمانِ رسالتؐ کا احترام بہرحال انسانوں کے بنائے ہوئے اصول وقواعد کی رعایت سے بالاتر ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی غلط روی سے بچانے کے لیے فرمایا ہے:

"جب میں کسی مسئلہ میں کوئی رائے دوں یا کوئی اصول مقرر کروں پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی فرمان اس کے خلاف مل جائے تو میری رائے کالعدم سمجھو۔ رسول اللہؐ کا فرمانا ہی اصل اصول ہے بقیہ سب ہیچ"۔

اب ہم موجودہ مسائل مہمہ میں سے تیسرے مسئلہ پر جو قرآن وسنت کے تتبع سے متعلق ہے بحث کرنی چاہتے ہیں۔

احکام شرعیہ کی معرفت حاصل کرنے کے لیے کتاب وسنت کا جو تتبع کیا جاتا ہے اس کے مختلف مدارج ہیں، سب سے اعلیٰ مرتبہ یہ ہے کہ انسان کو بالفعل احکام شرعیہ کی معرفت پر اتنا عبور ہو جائے کہ وہ مستفتیوں کے اکثر سوالوں کا جواب بآسانی دے سکے، اور انسانی زندگی میں پیش آنے والے تمام واقعات کا شرعی حل معلوم کرنے میں اسے توقف اور خاموشی سے بہت کم کام لینا پڑے، یہی مقام اجتہاد ہے، اس استعداد اور قابلیت کے حصول کے چند طریقے ہیں۔

۱۔ کبھی یہ استعداد احادیث میں غائر تفکر اور شاذ وغریب روایتوں کے تتبع سے حاصل ہوتی ہے، جیسا کہ امام احمد بن حنبلؒ کا خیال ہے، لیکن یہ نہ سمجھ لینا کہ اس ملکہ کے حاصل کرنے کے لیے بس یہی تفکر اور تتبع کافی ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ انسان کے لیے ضروری ہے کہ ایک ماہر لغت

وادب کی طرح مواقع کلام اور اسالیب بیان سے پوری واقفیت رکھتا ہو اور ایک وسیع النظر عالم کی طرح یہ بھی جانتا ہو کہ ائمۂ سلف متعارض نصوص میں جمع وتطبیق کی صورت کس طرح پیدا کرتے تھے اوران کے استدلال کا طریقہ کیا ہوا کرتا تھا۔

۲۔ کبھی یہ قابلیت اصول تخریج کو پوری طرح ضبط کرنے سے حاصل ہوتی ہے لیکن اس کے لئے صرف یہی کافی نہیں ہے کہ انسان کسی امام کے اصول کو سامنے رکھ کر استنباط مسائل کا طریقہ جان جائے، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ احادیث اور آثار کے ایک معتد بہ حصہ پر اس کی نظر ہو، تاکہ اسے معلوم ہو سکے کہ کہیں اس کا قول اجماع سے ٹکرا تو نہیں رہا ہے، یہ طریقہ اہل تخریج کا ہے۔

۳۔ تیسرا راستہ جو مذکورہ بالا دونوں راستوں کی بہ نسبت اعتدال کا راستہ کہا جاتا ہے یہ ہے کہ ایک طرف آدمی قرآن وسنت سے اتنی آگاہی رکھتا ہو کہ فقہ کے اصولی اور اجمالی مسائل اوران کے تفصیلی دلائل کا علم اسے بآسانی حاصل ہو سکے، دوسری طرف بعض اجتہادی مسائل پر کامل دسترس رکھتا ہو ان کے تمام گوشوں پر اس کی نگاہ ہو، ایک قول کو دوسرے قول پر ترجیح دے سکتا ہو، لوگوں کے طریقۂ تخریج پر نقد اور کھرے کھوٹے کی تمیز کر سکتا ہو، خواہ اس کے اندر وسعت نظر اور تبحر کے وہ شرائط اور لوازم نہ پائے جائیں جو ایک مجتہد مطلق کے لیے ضروری ہوا کرتے ہیں، اس مقام پر پہنچ کر اس کے لیے جائز ہے کہ مختلف رایوں کو تنقیدی نگاہ سے دیکھے، اور دو مختلف مذہبوں کے دلائل سے واقف ہو کر کچھ باتیں ایک مذہب کی اور کچھ دوسرے مذہب کی لے لے (یعنی تلفیق کرے) اور بعض ایسی تخریجات کو ترک کر دے، جو اگرچہ متقدمین کے نزدیک قابل قبول رہی ہوں، لیکن وہ اپنی تنقید اور تحقیق کی روشنی میں انہیں غلط پائے۔ اسی وجہ سے تم دیکھتے ہو کہ جن علماء کو مجتہد مطلق ہونے کا دعویٰ نہ تھا، وہ اپنی فقہی تصانیف میں خود مسائل کی تخریج کرتے ہیں اور اکابر سلف کی آراء میں موازنہ کر کے ایک رائے کو دوسری رائے پر ترجیح دیتے ہیں۔ جب اجتہاد اور تخریج دونوں قابل تجزیہ وتقسیم ہیں، اور کسی جزئی مسئلہ میں اجتہاد کرنے کے لیے آدمی کا مجتہد مطلق ہونا شرط لازم نہیں ہے تو پھر مسائل کی تحقیق میں اس طریقہ کا اختیار کرنا لوگوں کی نگاہ میں کیوں مستبعد اور ناقابل قبول دکھائی دیتا ہے؟ تحقیق کا مقصود تو محض ظن غالب کے حصول تک ہے اور اسی پر تکلیف کا دار و مدار ہے۔

رہ گئے وہ لوگ جو اتنی گہری نظر نہیں رکھتے اور جنھیں اللہ نے اتنی فہم وبصیرت عطا نہیں کی ہے کہ قرآن وسنت پر غور کر کے بطور خود مسائل کی چھان بین کر سکیں، انہیں چاہیے کہ اپنی زندگی کے عام معاملات میں مذاہب مروّجہ کے اُن طریقوں اور فیصلوں کو اپنا مذہب سمجھیں جنھیں انھوں نے اپنے آباو اجداد کے سلسلے سے اخذ کیا ہے لیکن جو واقعات معمولی نہ ہوں بلکہ اہم اور نادرالوجود ہوں ان میں اپنے کسی قریب کے مفتی کا اتباع کریں اور قضایا میں قاضی کے حکم کی تعمیل کریں، بس یہی ان کے لیے سب سے مصوّن راہ ہے۔

اسی خیال پر ہم نے ہر مذہب کے قدیم اور جدید علماء محققین کو پایا ہے اور تمام ائمۂ مذاہب نے اپنے پیروؤں کو اسی کی وصیت بھی کی ہے الیواقیت والجواہر میں ہے:

''ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص میری دلیل سے واقف نہ ہوا سے میرے قول پر فتویٰ دینے کا کوئی حق نہیں۔ خود امام موصوف جب کوئی فتویٰ دیا کرتے تو کہتے یہ نعمان بن ثابت کی (یعنی میری) رائے ہے جسے ہم نے اپنے علم وفہم میں بہتر سمجھ کر اختیار کیا ہے، اگر کوئی اس سے بہتر اور احسن رائے پیش کرے تو پھر ہماری رائے کے مقابلہ میں اس کی رائے صائب اور حق سے زیادہ قریب ہوگی''۔

''امام مالک رحمتہ اللہ علیہ کہا کرتے تھے کہ ہر شخص کے اقوال دو قسم کے ہوتے ہیں کچھ لے لینے کے قابل اور کچھ رد کر دینے کے قابل، صرف ایک ذات اس کلیہ سے مستثنٰی ہے اور وہ رسول اللہﷺ کی ذات معصوم ہے''۔

''حاکم اور بیہقی نے امام شافعیؒ سے روایت کی ہے کہ وہ فرمایا کرتے تھے جب کوئی حدیث پایۂ صحت کو پہنچ جائے تو اسی کو میرا مذہب سمجھو، ایک دوسری روایت میں امام صاحب کا یہ قول منقول ہے کہ جب تم یہ دیکھو کہ میرا قول حدیث نبوی کی مخالفت کر رہا ہے تو احادیث پر عمل کر و اور میرا قول دیوار پر دے مارو، ایک روز امام مزنیؒ سے آپ نے فرمایا کہ ابراہیمؒ میری ہر بات کی کورانہ تقلید نہ کرو بلکہ بذات خود اس میں غور کر لیا کرو کیونکہ یہ دین کا معاملہ ہے''۔

''امام احمد بن حنبل رحمتہ اللہ علیہ کا قول ہے کہ اللہ اور رسولؐ کے مقابلہ میں کسی کی

رائے کو کوئی وقعت حاصل نہیں، تم نہ میری تقلید کرو اور نہ کسی اور امام کی جس طرح انھوں نے کتاب وسنت سے احکام دین کی معرفت حاصل کی، تم بھی حاصل کرو، کسی شخص کو فتویٰ دینے کا استحقاق نہیں تاوقتیکہ وہ تمام ائمہ کے مذاہب اور اقوال سے پوری طرح واقف نہ ہو، اگر اس سے کوئی ایسا مسئلہ پوچھا گیا جس کے متعلق اسے معلوم ہے کہ اس میں وہ تمام ائمہ جن کی عموماً پیروی کی جاتی ہے، متفق ہیں تو وہ یوں کہہ سکتا ہے کہ یہ جائز ہے اور وہ ناجائز ہے، کیونکہ ایسی صورت میں اس کا اپنا قول اور فتویٰ نہ ہوگا بلکہ ائمہ مجتہدین کے قول کی ترجمانی ہوگی، لیکن اگر مسئلہ ایسا ہے جس میں علماء کی رائیں مختلف ہیں تو وہ اس کے جواب میں یہ تو کہہ سکتا ہے کہ فلاں امام کے نزدیک یہ جائز ہے اور فلاں کے نزدیک ناجائز مگر اسے یہ حق نہیں ہے کہ بقیہ اقوال کو چھوڑ کر کسی ایک رائے کو اختیار کر کے فتویٰ یوں دے دے، الا آنکہ اس رائے اور مذہب کے دلائل سے بخوبی باخبر ہو''۔

''امام ابویوسفؒ اور زفرؒ وغیرہ علماء سے منقول ہے کہ جب تک کوئی شخص یہ معلوم نہ کرے کہ ہم نے یہ رائے کہاں سے اخذ کی ہے اس وقت تک وہ ہمارے اقوال پر فتویٰ دینے کا مجاز نہیں''۔

''عصام بن یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے جب کہا گیا کہ آپ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی رایوں سے اکثر اختلاف کرتے ہیں تو انھوں نے جواب دیا کہ اس کی وجہ کھلی ہوئی ہے۔ انہیں جو فہم اور دقت نظر حاصل تھی وہ ہمیں حاصل نہیں، وہ ڈوب کر جن گہرائیوں سے حقائق نکال لاتے ہیں وہاں تک ہماری کمزور نگاہوں کی رسائی نہیں ہوسکتی اور ہمارے لیے جائز نہیں کہ بغیر سمجھے بوجھے ان کے اقوال پر فتویٰ دیں''۔

''ابوبکرؒ الاسکاف البلخی سے پوچھا گیا کہ ''کیا ایسے شخص کے لیے جو اپنے شہر کا سب سے بڑا عالم ہو، جائز ہے کہ فتویٰ دینے سے رُکا رہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ اگر وہ عالم درجۂ اجتہاد رکھتا ہو تو جائز نہیں۔ لوگوں نے کہا کہ درجۂ اجتہاد کب حاصل ہوتا ہے؟ جواب دیا کہ جب ایک شخص مسائل کے تمام پہلوؤں پر نگاہ رکھتا ہو اور

معترضین کو معقول اور تسلی بخش دلیلوں سے خاموش کر سکے تو وہ مجتہد ہے''۔

ابن الصلاح کا قول ہے کہ ''اگر کوئی شافعی ایسی حدیث پائے جو اس کے مذہب کے خلاف ہو تو اسے اپنے علم اور تفقہ کا جائزہ لینا چاہیے اگر وہ اپنے اندر اجتہاد مطلق کی یا خاص اسی ایک مسئلہ میں اجتہاد کرنے کی پوری استعداد پائے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ غور کرنے کے بعد اس حدیث پر عمل کرے اور تقلید کا خیال ترک کر دے، لیکن اگر وہ اپنے کو اس مقام سے فروتر محسوس کر رہا ہے اور اجتہاد کی طاقت سے بے بہرہ ہے مگر غور و فکر کرنے کے بعد کوئی معقول دلیل نہ پانے کی وجہ سے حدیث کی مخالفت بھی اس پر شاق گزر رہی ہے تو بھی حدیث ہی کا اتباع کرنا چاہیے بشرطیکہ امام شافعیؒ کے بجائے کسی اور امام نے اس پر عمل کیا ہو، کیونکہ اس صورت میں دوسرے امام کا اتباع امام شافعیؒ کے اتباع کا قائم مقام ہو جائے گا''۔ یہ ابن الصلاحؒ کی رائے ہے اور امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی کو مستحسن اور مختار قرار دیا ہے۔

چوتھا مسئلہ جسے ہماری جاہلانہ اور متعصبانہ ذہنیتوں نے اختلاف اور شقاق کی رزمگاہ بنا لیا ہے، وہ فقہاء کا باہمی اختلاف ہے، حالانکہ ان اختلافات میں سے اکثر (خصوصاً جن میں صحابہ بھی مختلف تھے اور دونوں طرح کی رائیں ان سے منقول ہیں مثلاً تشریق اور عیدین کی تکبیروں کا اختلاف، نکاح محرم (حج کے لیے احرام باندھ لینے والے) کے جواز کا اختلاف، ابن عباس رضی اللہ کے تشہد اور ابن مسعودؓ کے تشہد کا اختلاف بسم اللہ اور آمین کو آہستہ یا بلند آواز سے کہنے کا اختلاف وغیرہ) فی نفسہٖ آپس میں نہ کوئی اساسی تبائن رکھتے ہیں اور نہ ان کی اصل مشروعیت میں ائمہ سلف کا کوئی اختلاف ہے، بلکہ اختلاف جو کچھ ہے وہ محض ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے میں ہے، یہ بھی مانتے ہیں کہ یہ تمام مذاہب کتاب و سنت سے مستنبط ہیں لیکن چونکہ ہر شخص کی نظر تحقیق اور قوت اجتہاد جداگانہ ہوا کرتی ہے، اس وجہ سے جو مذہب دوسرے کے نزدیک مرجوع تھا اس کے نزدیک راجح اور اولیٰ ثابت ہوا اور اس نے اسے اختیار کر لیا، مثال کے طور پر قرأت کو لو اور دیکھو کہ قراء ایک ہی لفظ اور آیت کی قرأت میں کس قدر مختلف ہیں، یہی حال علمائے ائمہ کے اختلاف کا ہے، چنانچہ وہ اکثر اپنے اختلاف کی تعلیل بھی یہی کرتے ہیں کہ صحابہ کرام کی یہ رائے بھی تھی اور وہ بھی، یعنی وہ بھی آپس میں اختلاف رائے رکھتے تھے، حالانکہ وہ سب کے سب

ہدایت کی روشن شاہراہ پر تھے، کون ہے جو ان کے کسی فرد پر کجروی اور سنت نبوی کی مخالفت کا الزام عاید کرسکتا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ علمائے حق مسائل اجتہادیہ میں تمام ارباب افتاء کے فتووں کو جائز سمجھتے اور قضاۃ کے فیصلوں کو تسلیم کرتے آئے ہیں اور بسا اوقات اپنے مذہب کے خلاف بھی عمل کرتے رہے ہیں، چنانچہ تم اس قسم کے اختلافی مسائل کے بارہ میں تمام ائمہ مذہب کو دیکھو گے کہ وہ مسئلہ کو پھیلا کر بیان کرنے اور تمام اختلافی پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے بعد یہ بھی فرمادیتے ہیں کہ "یہ میرے خیال میں احوط طریقہ ہے۔ یہ رائے مختار ہے۔" "یہ میرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے"۔ اور کبھی یوں کہتے ہیں کہ "ہم تک صرف یہی حکم پہنچا ہے"۔ اس کے شواہد المبسوط، آثار محمدؒ اور اقوال شافعیؒ میں بے شمار موجود ہیں، یہ وہ مبارک دور تھا جب دین کا چشمہ صافی شقاق ونزاع کے مہلک جراثیم سے قریب قریب پاک تھا اور اجتہادی اختلافات جامۂ ملت کے لیے مقراض کا کام نہیں دے رہے تھے لیکن اس کے بعد تعصب کا طوفانی سیلاب آیا۔ نگاہوں کی وسعت کم ہونے لگی، لوگوں نے بقیہ اختلافی پہلوؤں سے صرف نظر کر کے صرف ایک پہلو کو لے لیا، اب اختلافات کی نوعیت پہلی سی نہ رہی انہیں بے حد اہمیت دے دی گئی، ان کی آڑ میں فرقہ پرستی وجود میں آگئی، لوگوں کا ذوق تحقیق، جمود سے بدل گیا اور وہ اپنے ائمہ کے اختیار کردہ مسلک پر سختی سے جم گئے۔

اور یہ جو بعض علمائے سلف سے اپنے ائمہ کے مذاہب پر ہمیشہ قائم رہنے کی تاکید منقول ہے، سو یہ یا تو ایک رجحان فطری کی بنا پر ہے کیونکہ ہر انسان اپنے پیشواؤں اور بزرگوں کی مختار اور پسندیدہ چیزوں کو بڑی قدر اور محبت کی نگاہ سے دیکھتا ہے یہاں تک کہ ہم عام رسوم ورواج کے اندر بھی اس رجحان فطری کا مشاہدہ کرسکتے ہیں، یا پھر اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے مذہب کے دلائل کی عظمت اور قوت سے مرعوب تھے اور ان کے خیال میں یہ دلائل بہت ہی مضبوط اور ناقابل تردید تھے، یہ اور اسی قسم کی اور وجہیں ہوسکتی ہیں، لیکن بعض لوگوں کا یہ خیال کہ تعصب کی سرشاری میں انھوں نے یہ کلمات کہے، محض وہم بلکہ سراسر بہتان ہے۔

اب ذرا ان اختلافات کی اصلیت پر غور کرو جن پر فرقہ بندیوں کا محاذِ جنگ قائم ہو رہا ہے، اور دیکھو کہ صحابہ، تابعین اور ان کے بعد کے ائمہ سلف نے ہمارے لیے کون سا اسوہ چھوڑا ہے؟ ان تمام کا حال یہ تھا کہ ان میں سے بعض لوگ بسم اللہ پڑھتے تھے بعض لوگ نہیں پڑھتے تھے، اگر ان

میں ایک جماعت ایسی تھی جو تے کرنے اور پچھنے لگوانے کے بعد تجدید وضو کو ضروری خیال کرتی تھی تو ایک جماعت ایسی بھی تھی جو اس کی مطلقاً ضرورت نہ سمجھتی تھی، یہ اور اسی قسم کے بیسیوں اختلافات موجود تھے لیکن اس کے باوجود وہ سب ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھتے تھے، کسی نے کسی کی اقتداء سے کبھی انکار نہیں کیا، امام ابوحنیفہؒ اور ان کے تلامذہ اور امام شافعیؒ وغیرہ مدینہ والوں کے پیچھے نمازیں پڑھا کرتے تھے حالانکہ اہل مدینہ سرے سے بسم اللہ پڑھتے ہی نہ تھے، نہ آہستہ اور نہ زور سے، امام ابو یوسفؒ نے ہارون الرشید کے پیچھے نماز پڑھی، حالانکہ اس نے حجامت (پچھنے لگوانے) کے بعد وضو کی تجدید نہیں کی تھی، امام ابو یوسفؒ کے مذہب میں پچھنے کے بعد تجدید وضو لازم ہے، مگر امام مالکؒ کے مذہب میں لازم نہیں ہے، اسی طرح امام احمد بن حنبلؒ جماعت اور نکسیر کو ناقض وضو مانتے ہیں لیکن جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا آپ ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھیں گے جس نے بدن سے خون نکلنے کے بعد وضو نہ کیا ہو تو آپ نے جواب دیا، یہ کیونکر ہوسکتا ہے کہ امام مالکؒ اور سعید بن المسیبؒ کے پیچھے میں نماز نہ پڑھوں؟ (جن کے نزدیک یہ چیزیں نواقض وضو میں سے نہیں ہیں)

روایت ہے کہ امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ عیدین میں خلیفہ ہارون کی رعایت سے حضرت ابن عباسؓ کے مذہب کے مطابق تکبیریں کہا کرتے تھے حالانکہ ان دونوں اماموں کا مذہب اس کے خلاف تھا۔

امام شافعیؒ نے مقبرۂ امام ابوحنیفہؒ کے قریب فجر کی نماز پڑھی تو محض ان کے لحاظ اور ادب سے دعائے قنوت کو ترک کر دیا، اور فرمایا کہ بسا اوقات ہم اہل عراق کے مسلک پر بھی عمل کر لیتے ہیں۔

امام ثانیؒ (امام ابو یوسفؒ) کے متعلق البزازیہ میں ہے کہ آپ نے جمعہ کے روز حمام میں غسل کیا اور لوگوں کو نماز پڑھائی، نماز پڑھ کر جب لوگ اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے تو آپ کو اطلاع دی گئی کہ حمام کے کوئیں میں ایک مرا ہوا چوہا موجود ہے، امام موصوف نے یہ سن کر فرمایا کہ "تو پھر اس وقت ہم اپنے مدنی بھائیوں کے مسلک پر عمل کرتے ہیں کہ جب پانی دو قلہ کی مقدار میں ہو تو وہ نجس نہیں ہوتا اس کا حکم ماء کثیر کا ہو جاتا ہے"۔

امام خجندیؒ سے پوچھا گیا کہ اگر ایک شافعی المذہب آدمی نے دو ایک برس کی نماز چھوڑ دی

ہو اور اس کے بعد وہ حنفی مذہب اختیار کر لے تو پھر وہ کس طرح نماز کی قضا کرے؟ آیا امام شافعیؒ کے مذہب کے مطابق یا حنفی مذہب کے مطابق؟ جواب دیا کہ کہ جس مذہب کے مطابق اس نے قضا کر لیا جائز ہے، بشرطیکہ اس کے جواز کا اعتقاد رکھتا ہو۔

جامع الفتاوی میں ہے کہ اگر کسی حنفی نے یہ کہا کہ ''اگر میں فلاں عورت سے نکاح کروں تو اس پر طلاق، اس پر طلاق (یعنی تین طلاقیں دیں) پھر اس نے کسی شافعی المذہب فقیہ سے فتویٰ پوچھا اور اس نے جواب دیا کہ ''اس پر طلاق نہ پڑے گی اور تمہاری یہ قسم لغو مانی جائے گی''۔ تو اس مسئلہ میں امام شافعی کی اقتداء کرنے میں اس کے لیے کوئی مضائقہ نہیں، کیونکہ اکثر صحابہ کرام کی تائید اسی مسلک کو حاصل ہے۔

امام محمدؒ نے اپنی امالی میں فرمایا ہے کہ ''اگر کوئی فقیہ اپنی بیوی کو ان لفظوں میں طلاق دے کہ انت طالق البتّة اور وہ اپنے مذہب کے مطابق ایسی طلاق کو تین طلاق یعنی طلاق بائن سمجھتا ہو، لیکن قاضی وقت فیصلہ کر دے کہ یہ طلاق رجعی ہے تو اس کے لیے رجعت کرنے کی گنجائش ہے۔

اسی طرح تحریم و تحلیل اور معاشرۃ اور لین دین کے ان تمام معاملات میں جن کے اندر فقہاء اور ائمہ کی رائیں مختلف ہیں، ہر فقیہ پر لازم ہے کہ اگر دارالقضاء سے اس کے مذہب فقہی کے خلاف فیصلہ ہو تو وہ اپنی رائے اور اپنے مسلک کو چھوڑ کر قاضی کے فیصلہ پر عمل کرے۔

چند مسائل اور ہیں جن کی اصلیت کے بارے میں ایک عام اور عجیب غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے اور درحقیقت یہی غلط فہمی موجودہ اختلاف کا سرچشمہ ہے، ہم انہیں یہاں مجملاً بیان کرنا چاہتے ہیں۔

ا۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ فقہ کی وہ تمام تفریعات جو ان لمبی لمبی شرحوں اور فتاوی کی موٹی موٹی کتابوں میں موجود ہیں، سب کی سب امام ابوحنیفہؒ اور صاحبین رحمہم اللہ کے اقوال ہیں، وہ ان اقوال میں یہ تمیز نہیں کرتے کہ فلاں قول ان ائمہ کا واقعی قول ہے اور فلاں قول ان کی رایوں اور فتووں کو سامنے رکھ کر بعد میں مستنبط کیا گیا ہے، اور یہ جو ان کتابوں میں تخریج الکرخی کذا اور علی تخریج الطحاوی کذا کے الفاظ آیا کرتے ہیں ان کو وہ گویا بے معنی سمجھتے ہیں، اسی طرح قال ابو حنیفه کذا (امام ابوحنیفہ نے یوں فرمایا ہے) اور جواب المسئلة علی مذهب ابی حنیفه کذا (امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کے مطابق مسئلہ کا جواب یوں

ہے) کے درمیان وہ کوئی فرق و امتیاز نہیں کرتے اور ابن الہمام وابن النجیم وغیرہ محققین حنفیہ کا مسئلہ دہ دردہ اور مسئلہ شرط تیمم اور ایسے دوسرے مسائل کے بارے میں یہ فرمانا کہ "دراصل یہ امام ابوحنیفہؒ کا قول نہیں ہے بلکہ بعد والوں کی تخریجات ہیں"۔ ان کے نزدیک بالکل ناقابل اعتنا ہے۔

اسی طرح بعض ارباب علم و مشیخت اس وہم میں مبتلا ہیں کہ مذہب حنفی کی بنا انہی جدلی بحثوں پر قائم ہے جو المبسوط، الہدایہ اور التبیین کے صفحات میں پھیلی ہوئی ہیں وہ نہیں جانتے کہ ان کے مذہب کی بنا ان بحثوں پر نہیں ہے بلکہ اس طریق بحث و جدل کے بانی دراصل معتزلہ ہیں، جسے متاخرین نے اس خیال سے اختیار کر لیا تھا کہ اس سے طلبہ کے ذہن میں تیزی اور وسعت پیدا ہوگی، اگرچہ ان کی تمنا بارآور نہ ہوئی اور ان کے اس طرز عمل نے دماغوں کو جلا اور وسعت دینے کے بجائے انہیں بے بصیرتی اور تعصب کی تنگنائیوں میں گھیر کرنا کارہ بنا دیا۔

ہم اس جگہ ان اوہام اور شکوک کی تردید میں لمبی گفتگو نہیں کرنی چاہتے، کیونکہ اس باب کی تمہید میں جو کچھ ہم بیان کر چکے ہیں اس کی روشنی ان میں سے اکثر کا خود بخود ازالہ کر دیتی ہے۔

۲۔ بہت سے لوگ اس غلط فہمی میں پڑے ہوئے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ کے اختلافات کی اساس وہ اصول ہیں جو اصول بزدوی وغیرہ کتابوں میں درج ہیں، حالانکہ ان میں سے اکثر اصول ایسے ہیں جن کا ذکر ان بزرگوں نے کبھی نہیں کیا، بلکہ وہ ان کے اقوال و فتاویٰ کو سامنے رکھ کر بعد میں وضع کیے گئے ہیں، مثلاً میرے نزدیک فقہ کے حسب ذیل اصول ائمہ کے کلام سے بعد والوں نے نکالے ہیں اور امام ابوحنیفہؒ یا صاحبینؒ سے کوئی صحیح روایت ایسی منقول نہیں جس میں یہ اصول مذکور ہوں:

"خاص اپنے حکم میں خود واضح اور مبین ہے اس کے ساتھ کوئی تشریحی بیان ملحق نہ کیا جائے گا"۔

"کسی حکم پر اضافہ اس حکم کا نسخ ہے"۔

"خاص کی طرح عام بھی قطعی ہے"۔

"کثرت رواۃ لازمہ ترجیح نہیں"۔

"غیر فقیہ راوی کی روایت اگر اصول و قیاس کے خلاف ہو تو واجب العمل نہیں"۔

''مفہوم شرط اور مفہوم وصف کا کوئی اعتبار نہیں''۔

اس قسم کے بہت سے اصول فقہ ایسے ہیں جن کی تعیین وتفریع سے ائمہ کو کوئی تعلق نہیں، اور ایسے اصولوں کی محافظت کرنا اور ان پر وارد ہونے والے اعتراضات کو بڑے تکلفات کے ساتھ رفع کرنا متقدمین کا طریقہ نہ تھا، ان کی محافظت ومدافعت ہماری توجہ کی صرف اسی قدر مستحق ہے جس قدر ان کے خلاف اصول وقواعد فقہ کی، اگر ان پر وارد ہونے والے اعتراضات کا جواب دینے میں تکلف سے کام لیا جائے جیسا کہ عام لوگوں کا شیوہ ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ دوسرے اصول کو اس جوش حمایت سے محروم رکھا جائے۔

اب ہم چند مثالیں دے کر اس حقیقت کو واضح کرنا چاہتے ہیں۔

(الف) ان حضرات نے یہ اصول قرار دیا ہے کہ ''لفظ خاص اپنے حکم میں خود واضح ہے، کسی تشریحی بیان کو اس کے ساتھ ملحق نہ کیا جائے گا'' یہ قاعدہ دراصل متقدمین کے اس فعل سے نکالا گیا ہے کہ انہوں نے آیت واسجدوا وركعوا کی بنا پر نماز میں صرف رکوع وسجود کو فرض قرار دیا اور اطمینان کو فرض نہیں ٹھہرایا درآنحالیکہ حدیث میں یہ ارشاد موجود تھا کہ'' آدمی کی نماز نہیں ہوتی جب تک وہ رکوع وسجود میں اپنی پیٹھ کو پوری طرح ٹھیرائے نہیں'' اس ایک معاملہ میں متقدمین نے جو مسلک اختیار کیا، متاخرین نے اس سے ایک قاعدۂ کلیہ وضع کرلیا، مگر دیکھو کہ متعدد معاملات میں وہ خود اپنے مقرر کیے ہوئے اس قاعدے کو کس طرح توڑتے ہیں۔

آیت وامسحوا بروسکم میں محض سر پر مسح کرنے کا حکم ہے، اس کی کوئی حد مقرر نہیں کی گئی ہے۔''وامسحوا'' کا لفظ خاص ہے، قاعدۂ مذکور کی رو سے چاہیے تھا کہ سر کے مسح کی مطلق فرضیت کا فتویٰ دیا جاتا، لیکن حنفیہ یہاں اپنے اس قاعدہ کی پابندی نہیں کرتے اور اس حدیث کی بنا پر جس میں مذکور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ناصیہ کا مسح فرمایا، مسح کے لیے سر کے چوتھائی حصہ کی حد مقرر کردیتے ہیں، سوال یہ ہے کہ یہاں حکم خاص کے ساتھ اس کی تشریح کو کیوں ملحق کیا گیا؟

قرآن کا حکم ہے اور لفظ خاص کے ساتھ ہے کہ ''زانی اور زانیہ کو کوڑے مارو'' مذکورۂ بالا قاعدہ کا اقتضاء تھا کہ شادی شدہ اور غیر شادی شدہ سب کو کوڑے ہی مارنے کی سزا دی جاتی، مگر یہی

احناف حدیثوں کو اس آیت کا بیان مانتے ہوئے فرماتے ہیں کہ غیر شادی شدہ کو تو کوڑے مارے جائیں، لیکن شادی شدہ مجرم کو سنگسار کیا جائے، کیا یہ لفظ خاص کے ساتھ تشریح کا الحاق نہیں؟

آیت السارق والسارقة فاقطعوا ایدیھما میں مطلقاً چور کا ہاتھ کاٹنے کا حکم ہے، قاعدۂ مذکورہ کے مطابق چاہئے تھا کہ ایک پیسہ کی چوری پر بھی ہاتھ کاٹ ڈالا جاتا، لیکن اپنے مقرر کیے ہوئے اصول کو بالائے طاق رکھ کر انہی حضرات نے دس درہم کی شرط لگائی اور حدیث کو آیت کا بیان قرار دیا۔

طلاق مغلظ دینے کے بعد شوہر اگر از سر نو مطلقہ کو اپنے نکاح میں لانا چاہے تو قرآن ''حتی تنکح زوجا غیرہ '' کے الفاظ کے ساتھ حکم دیتا ہے کہ یہ صرف اس وقت ہو سکتا ہے جب کہ اس کے طلاق دینے کے بعد کوئی دوسرا شخص اس عورت سے نکاح کر چکا ہو، اس حکم کا لفظ یعنی ''تنکح'' خاص ہے جو اپنے متعارف مفہوم میں ایجاب وقبول تک محدود ہے، پس آیت سے صرف اتنی شرط نکلتی ہے کہ وہ عورت کسی دوسرے مرد سے نکاح بمعنی ایجاب وقبول کر لے لیکن فقہائے احناف نے حدیث ''حتی تذوق عسیلته ویذوق عسیلتک '' کو اس حکم کا بیان تسلیم کر کے نکاح کے ساتھ یہ شرط بھی لگا دی کہ وہ دوسرا شوہر اس عورت سے جماع بھی کرے۔

بتاؤ ان مثالوں میں اصول الخاص مبین لا یلحقه البیان کا کتنا لحاظ کیا گیا ہے۔

(ب) قرأت نماز کے متعلق نص قرآنی ''فاقرء وا ما تیسر من القرآن'' میں ''ماتیسر'' کا عموم چاہتا ہے کہ جتنا بھی اور جہاں سے بھی قرآن پڑھ لیا گیا نماز ہو جائے گی، اور حدیث ''لاصلوۃ الا بفاتحة الکتاب '' کا ظاہری مفہوم چاہتا ہے کہ سورۂ فاتحہ کی قرأت ہر رکعت میں فرض ہے، لیکن قدماء نے آیت کے عموم کو اپنی جگہ رکھا اور حدیث کو اس کی مخصص نہ مانتے ہوئے فتوی دیا کہ قرأت فاتحہ فرض نہیں ہے، اسی طرح کے بعض اور اقوال سے متاخرین نے ایک کلی اصول یہ مستنبط کر لیا کہ ''العام قطعی کالخاص ''یعنی لفظ عام بھی اپنے حکم اور مفہوم میں خاص کی طرح قطعی ہوتا ہے، اس کا عموم تخصیص کا متحمل نہیں بلکہ وہ ایک مستقل حکم ہوتا ہے۔

اس اصول کا تقاضا تھا کہ آیت ''فما استیسر من الھدی کے عموم کو بھی قطعی مان کر کہا جاتا کہ ہر چھوٹی بڑی ھدی جو بھی بآسانی میسر آ سکے قربانی کے کام آ سکتی ہے، کیونکہ ''فما

استیسـر '' کا لفظ عام ہے اس لیے اس کے مدلول اور مقصود میں بھی عموم اور وسعت کو باقی رکھنا چاہیے، لیکن احناف حدیث سے خود ہی تخصیص فرماتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ھدی کے لیے بکرا یا بکرے سے بڑا کوئی جانور ہونا چاہیے، کیا یہاں لفظ عام کی قطعیت خاص کی طرح قائم رہی؟

(س) اصول فقہ کی ایک محکم دفعہ یہ بھی ہے کہ **لاعبرة بمفهوم الشرط والوصف** '' یعنی اگر کوئی حکم کسی خاص موقع پر دیا گیا ہو، تو اس حکم کے اطلاق میں اس خاص موقع کی خصوصیات اور شرائط کا اعتبار نہ کیا جائے گا، یہ قاعدہ دراصل سلف کے اس مسلک سے نکالا گیا ہے جو انھوں نے آیت ''**فمن لم يستطع منكم طولا**'' کے بارے میں اختیار کیا ہے، اس آیت کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ جو لوگ آزاد عورت سے نکاح کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے اور بوجہ ناداری اس کے اخراجات کے متکفل نہیں ہو سکتے وہ لونڈی سے نکاح کر سکتے ہیں لیکن متقدمین نے اس شرط عدم استطاعت کو قید جواز نہ مانتے ہوئے ذی استطاعت اور صاحب مقدرت انسان کو بھی لونڈی سے نکاح کی اجازت دے دی، ان کے اس فتویٰ سے مندرجہ بالا اصول منضبط کر لیا گیا۔

لیکن اونٹ کی زکوٰۃ کے بارے میں یہ لوگ خود اس اصول کو توڑ دیتے ہیں، نص کے الفاظ (**في الابل السائمة زكوة**) ہیں جن میں یہی قید شرط مذکور ہے، اصول مذکورہ کے لحاظ سے چاہیے تھا کہ سائمہ اور غیر سائمہ ہر نوع کے اونٹوں میں زکوٰۃ فرض قرار دی جاتی اور اس لفظ ''**السائمة**'' کے مفہوم سے حکم کو مقید نہ کیا جاتا مگر ایسا نہیں کیا گیا اور صرف چرنے والے اونٹوں میں زکوٰۃ کی فرضیت کا فتویٰ دیا گیا۔

(د) حدیث مصراۃ (جس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے) میں ائمہ سلف نے جو مسلک اختیار کیا تھا اس کے پیش نظر متاخرین نے یہ کلی اصول بنا لیا کہ جب کوئی غیر فقیہ راوی کسی ایسی حدیث کی روایت کرے جو قیاس سے متصادم ہوتی ہو تو وہ واجب العمل نہ ہوگی، مگر انہیں واضعین اصول نے حدیث قہقہہ کو جو خلاف قیاس بھی ہے اور غیر فقیہ راوی کی روایت بھی، واجب العمل مانا اور فتویٰ دیا کہ نماز میں بآواز بلند ہنسنے سے نماز ٹوٹنے کے ساتھ ساتھ وضو بھی ٹوٹ جاتا ہے، حالانکہ وضو اور قہقہہ کا کوئی تعلق معنوی اب تک دائرۂ قیاس میں نہیں آ سکا، اسی طرح افطار صوم کے بارے میں بھی یہ اصول پس پشت ڈال دیا گیا، ظاہر ہے کہ جب کھانا پینا روزہ کو توڑ دیتے ہیں تو چاہیے

بھول کر کھایا جائے یا عمداً، بہرحال روزہ ٹوٹ جانا چاہیے لیکن اس کھلے ہوئے قیاس کو انہوں نے ایک ایسی حدیث کی وجہ سے ترک کر دیا۔ جو خلاف قیاس بھی ہے اور غیر فقیہ راوی کی روایت بھی۔

صاحب نظر کے لیے یہ چند اشارات کافی ہیں، ورنہ اس کے شواہد بے شمار ہیں جو بتاتے ہیں کہ ان اصولوں کی حقیقت کیا ہے، اور خود ان کے واضعین نے کس طرح ان کی خلاف ورزی کی ہے۔ پھر جب اس خلاف ورزی پر اعتراض کیا گیا تو اس کا جواب انہوں نے جن تکلّفات اور سخن پروریوں کے ساتھ دیا ہے ان کی داستان بھی ہر ناظر ان کی کتابوں میں دیکھ سکتا ہے۔

مسئلہ کی اصل حقیقت بالکل بے نقاب ہو سکتی ہے اگر تم صرف ایک ہی قاعدہ کے متعلق علماء محققین کی تصریحات دیکھ لو، وہ فرماتے ہیں کہ شرط فقاہت والے اصول میں دو مذہب ہیں۔ ایک تو عیسیٰ بن ابان کا ہے جن کے نزدیک غیر فقیہ راوی کی روایت ضابط اور عادل ہونے کے باوجود خلاف قیاس ہونے کی صورت میں ناواجب العمل ہے اور اکثر متاخرین نے اسی رائے کو اختیار کر لیا ہے، دوسرا مذہب امام کرخیؒ کا ہے جن کے نزدیک خبر واحد کے قیاس پر مقدم ہونے کے لیے راوی کا فقیہ ہونا شرط نہیں، حدیث بہرحال قیاس کے مقابلہ میں واجب الاتباع ہے، بہت سے علماء نے اسی دوسری رائے کو مانا ہے، چنانچہ وہ صاف لفظوں میں فرماتے ہیں کہ:

> ''یہ قول (یعنی قول اوّل) ہمارے ائمہ سے منقول نہیں، ان سے تو یہ منقول ہے کہ خبر واحد قیاس پر مقدم ہوگی، کیا تم نہیں دیکھتے کہ انہوں نے بھول کر کھانے سے روزہ نہ ٹوٹنے کے متعلق حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کو واجب العمل تسلیم کیا ہے۔ حالانکہ روایت قیاس کے خلاف تھی، یہاں تک کہ امام ابوحنیفہؒ نے صریحا فرمایا کہ اگر یہ حدیث نہ ہوتی تو میں قیاس کو اختیار کرتا''۔

خود ان متاخرین کا اکثر تخریجات میں مختلف ہونا اور ایک دوسرے پر اعتراض کرنا ہمارے خیال کی ایک ناقابل تردید شہادت ہے۔

(۳) ایک غلط فہمی اور ہے جس کا ازالہ ضروری ہے، کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ فقاہت کے لحاظ سے محض دو گروہ ہیں، ایک اہل الظاہر، دوسرے اہل الرائے، اور جو شخص بھی قیاس اور استنباط سے کام لے وہ اہل الرائے میں سے ہے، حاشا کہ حقیقت سے یہ انتہائی بے خبری ہے، لفظ ''رائی'' کا

مفہوم نہ تو نفس عقل وفہم ہے کیونکہ کوئی عالم اس صفت سے عاری نہیں نہ رائے کا مطلب وہ رائے محض ہے، جس کا رشتہ سنت سے منقطع ہو، کیونکہ ایسی رائے کوئی متبع اسلام اختیار نہیں کر سکتا، اور نہ رائے سے مقصود قیاس واستنباط کی قدرت ہے، کیونکہ امام احمدؒ اور اسحاقؒ بلکہ امام شافعیؒ کا بھی بالاتفاق اہل الرائے میں شمار نہیں، حالانکہ وہ قیاس سے بھی کام لیتے ہیں اور مسائل کا استنباط بھی کرتے ہیں، رائی اور اہل الرائے کا مفہوم ان تمام سے جداگانہ ہے، اہل الرائے کہتے ہیں ان لوگوں کو جنھوں نے جمہور مسلمین کے متفق علیہ مسائل کے بعد فروعی اور اختلافی مسائل میں کسی امام کے اقوال واصول کو سامنے رکھ کر تخریج واستنباط پر اکتفا کرلیا اور روایات وآثار کے تتبع سے تقریباً بے نیاز ہو کر اصول وقیاس کی مدد سے جزئیات نکالنے لگے، وہ حل مسائل کے وقت نصوص آثار وسنن کی طرف مراجعت کرنے کے بجائے زیادہ تر یہ دیکھتے ہیں کہ یہ مسئلہ فقہاء کے ٹھیرائے ہوئے اصول میں سے کس اصل کے تحت آتا ہے، اس کے اشباہ ونظائر کیا ہیں، کس مسئلہ کی علت اس میں پائی جاتی ہے، ان کے مقابلہ میں ظاہر یہ وہ لوگ ہیں، جو نہ قیاس سے کام لیتے ہیں اور نہ آثار صحابہ اور اقوال تابعین سے، جیسے امام داؤدؒ اور ابن حزمؒ، ان دونوں گروہوں کے درمیان محققین اہل سنت کا گروہ ہے جیسے امام احمدؒ وامام اسحاقؒ۔

یہ بحث اگرچہ اس تفصیل واطناب کے ساتھ عنوان کتاب سے خارج تھی، لیکن اس کے باوجود مذہبی فرقہ آرائیوں کی موجودہ خلفشار اور حقیقت حال سے عام بے خبری کو دیکھ کر میں نے ضروری سمجھا کہ عدل وتوسط کا نقطہ جوان ہنگاموں میں گم ہو گیا ہے، اس کو افراط وتفریط اور تعصب کی الجھنوں سے نکال کر ارباب نظر کے سامنے پیش کردوں۔

عدل پسند اور حق طلب کے لیے یہی کافی ہے، متعصب کے لیے کچھ بھی کافی نہیں۔

وَرَبُّنَا الرَّحْمٰنُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ.

حضرت شاہ صاحب کا یہ فقہی ذوق بظاہر فقہ حنفی کے خلاف ہے، لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ آپ اگرچہ نظریاتی اعتبار سے اس فکر ونظر کے حامل تھے، لیکن عملاً حنفی تھے اور آپ کا پورا خانوادہ حنفی تھا، آپ فقہ کے میدان میں درجۂ اجتہاد وتجدید پر فائز تھے، آپ کو اس منصب عالی سے الگ نہیں کیا جا سکتا ہے، اور جو تفقہ کا حق ہے، اسے سلب نہیں کیا جا سکتا ہے۔ (قاسمی)

الفوز الکبیر
فی اصول التفسیر

تصنیف

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ

ترجمہ

مولانا رشید احمد انصاریؒ

ترتیب

مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی

فہرست مضامین

صفحہ	مضمون	نمبر شمار
۲۵۲	باب اوّل (علومِ پنجگانہ کے بیان کے میں)	۱
۲۷۳	باب دوم (وجوہِ خفائے نظم قرآن کے بیان میں)	۲
۳۰۳	باب سوم (قرآن مجید کے اسلوب بدیع کے بیان میں)	۳
۳۱۵	باب چہارم (فنون تفسیر کے بیان میں)	۴

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اس بندۂ ضعیف پر خداوند تعالیٰ کی بے شمار نعمتیں ہیں جن میں سب سے زیادہ عظیم الشان نعمت یہ ہے کہ اس نے مجھ کو قرآن مجید کے سمجھنے کی توفیق عطا فرمائی اور حضرت رسالتؐ پناہ کے احسانات اس کمترین امت پر بہت ہیں جن میں سب سے بڑا احسان قرآن مجید کی تبلیغ ہے، آنحضرتؐ نے قرآن کریم کی تلقین قرنِ اول کو فرمائی اور انہوں نے قرنِ ثانی تک پہنچائی اور اسی طرح درجہ بدرجہ ہو کر اس خاکسار کو بھی اس کی روایت اور درایت سے حصہ ملا، اللّٰھم صلی علی ھذا النبی الکریم سیدنا ومولانا وشفیعنا افضل صلواتك وایمن برکاتك وعلی آلہ واصحابه وعلماء امته اجمعین برحمتك یا ارحم الراحمین۔

اما بعد کہتا ہے فقیر ولی اللہ بن عبدالرحیم'' خدا ان دونوں سے اپنی مہربانی کے ساتھ معاملہ کرے'' کہ جب اس فقیر پر کتاب اللہ کے سمجھنے کا دروازہ کھولا گیا تو میں نے چاہا کہ بعض مفید نکات جو کتاب اللہ کے سمجھنے میں دوستوں کو کارآمد ہو سکتے ہیں ایک مختصر رسالہ میں منضبط کرے، خداوند تعالیٰ کی عنایت بے غایت سے امید ہے کہ طالب علموں کو صرف ان قواعد کے سمجھ لینے سے ایک وسیع شاہراہ کتاب اللہ کے سمجھنے میں کھل جائے گی کہ اگر وہ ایک عمر کتب تفاسیر کا مطالعہ کرنے یا ان کو مفسروں سے جن کی تعداد اس زمانہ میں بہت ہی کم ہوگئی ہے'' پڑھنے میں صرف کریں تو اس قدر ضبط کے ساتھ حاصل نہیں ہو سکتی اور میں نے اس رسالہ کا نام ''الفوز الکبیر فی اصول التفسیر'' رکھا، وما توفیقی الا باللہ علیه توکلت وھو حسبی ونعم الوکیل۔

اس رسالہ کے مقاصد پانچ باب میں منحصر ہیں۔

(۱) پہلا باب ان علومِ پنجگانہ کے بیان میں جن کی طرف قرآن عظیم نے صراحت کے ساتھ رہنمائی کی ہے اور گویا قرآن مجید کے نزول کا مقصد دراصل وہی علوم پنجگانہ ہیں۔

(۲) دوسرا باب وجوہِ خفاءِ نظم قرآن کے بیان میں اور ان وجوہ کا علاج نہایت وضاحت کے ساتھ۔

(۳) تیسرا باب نظم قرآنی کے لطائف اور اس کے اسلوب بدیع کی تشریح بقدرِ طاقت بشری

(۴) چوتھا باب فنون تفسیر کے بیان میں۔

باب اول

ان علوم پنجگانہ کے بیان میں
جن کو قرآن عظیم نے صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے

جاننا چاہیے کہ معانی جو قرآن مجید سے مفہوم ہوتے ہیں وہ پانچ علموں سے باہر نہیں ہیں، اول علم احکام، ازقسم واجب، مستحب، مکروہ اور حرام، یہ احکام خواہ عبادت میں سے ہوں یا معاملات میں سے، تدبیر منزل سے متعلق ہوں یا سیاست مدن سے، اس علم کی تفصیل فقہاء کے ذمہ ہے۔ دوم علم مناظرہ چاروں گمراہ فرقوں کے ساتھ مثلاً یہود، نصاریٰ، مشرکین اور منافقین، اس علم کی تفریع متکلمین کا کام ہے، سوم علم تذکیر بآلاء اللہ مثلاً زمین وآسمان کے پیدا کرنے اور بندوں کو ان کی ضروریات کا الہام کرنے اور نیز خداوند تعالیٰ کی صفات کاملہ کا بیان، چہارم علم تذکیر بایام اللہ یعنی ان واقعات کا بیان جن کو خداوند تعالیٰ نے ایجاد فرمایا ہے مثلاً اطاعت کرنے والوں کو انعام وجزا اور مجرموں کے لیے تعذیب وسزا، پنجم علم تذکیر موت اور اس کے بعد کے واقعات کا بیان مثلاً حشر ونشر، حساب، میزان، دوزخ، جنت، ان علوم کی تفاصیل کو محفوظ رکھنا اور ان کے مناسب احادیث اور آثار ملحق کرنا، واعظوں اور مذکروں کا کام ہے۔

قرآن مجید میں ان علوم کا بیان قدیم عربوں کی روش پر ہوا ہے، متاخرین کا اسلوب اختیار نہیں کیا گیا، اور آیاتِ احکام میں اختصار جیسا کہ متن نویسوں کا قاعدہ ہے اور غیر ضروری قیود کی تنقیح کا التزام جیسا کہ اصول والوں کا قاعدہ ہے، نہیں کیا، اور علم مباحثہ کے آیات میں اقوال

مشہورہ مسلّمہ اور خطابیاتِ نافعہ کا التزام کیا ہے اور ترتیب براہین میں منطقیوں کے اسلوب کی پیروی اور ایک مضمون کے بعد دوسرے مضمون کے شروع کرنے میں مناسبت کی رعایت جیسا کہ ادبائے متاخرین کا قاعدہ ہے، نہیں کی گئی بلکہ خداوند تعالیٰ نے جس حکم کو بندوں کے لیے مہتم بالشان سمجھا اسی کو بیان کیا، خواہ کوئی حکم مقدم ہو جائے یا مؤخر، عام مفسرین نے ہر ایک آیت کو خواہ مباحثہ کی ہو یا احکام، کی ایک قصہ کے ساتھ ربط دیا ہے اور اس قصہ کو اس آیت کے لئے سببِ نزول مانا ہے، لیکن حق یہ ہے کہ نزولِ قرآن سے مقصودِ اصلی نفوسِ بشریہ کی تہذیب اور ان کے باطل عقائد اور فاسد اعمال کی تردید ہے، اس لیے آیات مباحثہ کے نزول کے لیے مکلفین میں عقائد باطلہ کا وجود اور آیات احکام کے لیے ان میں اعمال فاسدہ اور مظالم کا شیوع اور آیاتِ تذکیر کے نزول کے لیے ان کا بغیر ذکر آلاء اللہ وایام اللہ اور موت اور اس کے بعد ہولناک واقعات کے بیدار نہ ہونا اصلی سبب ہوا ہے۔ خاص خاص واقعات جن کو بیان کرنے کی زحمت اٹھائی گئی ہے، اسباب نزول میں چنداں دخل نہیں ہے، مگر صرف بعض آیات میں جہاں پر کسی ایسے واقعہ کی جانب اشارہ ہے، جو رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں یا اس سے پیشتر واقع ہوا ہو کیوں کہ سننے والے کے دل میں اس اشارہ سے ایک گہرا انتظار پیدا ہو جائے گا جو بدون قصہ کی تفصیل معلوم کئے زائل نہ ہوگا بدیں وجہ ہم پر لازم ہے کہ ان علوم وتفسیر کی اس طرح تفصیل کریں کہ خاص خاص (یعنی بے تعلق) واقعات کے بیان کرنے کی تکلیف نہ کرنی پڑے۔

پہلی فصل

علم مباحثہ کے بیان میں

قرآن مجید میں چاروں گمراہ فرقوں سے مباحثات ہوئے ہیں یعنی مشرکین، یہودی، نصاریٰ اور منافقین، اور یہ مباحثے دو طرح پر واقع ہوئے ایک تو یہ کہ فقط باطل عقیدہ کو بیان کر کے اور اس کی قباحت کو ظاہر فرما کر اس سے نفرت ظاہر کرتے ہیں، دوسرے یہ کہ گمراہوں کے شبہات کو بیان کر کے ان کو ادلۂ قطعیہ یا خطابیات سے حل کرتے ہیں، مشرکین اپنے آپ کو حنیف کہتے ہیں، حنیف اسکو کہتے ہیں جو ملت ابراہیمؑ کا پابند اور اس کے علامات کو سختی کے ساتھ اختیار کرنے

والا ہو، ملت ابراہیمی کی علامات یہ ہیں، حج، کعبہ، استقبال کعبہ، غسل جنابت، ختنہ، اور باقی فطری خصائل اشہر حرم (شوال، ذیقعدہ، ذی الحجہ کی حرمت) مسجد حرام کی تعظیم نسبی اور رضاعی محرمات کو حرام جاننا اور عام جانوروں کا ذبح حلق میں اور اونٹ کا نحر لبہ میں اور ذبح اور نحر سے خدا تعالیٰ کی رضاء جوئی خصوصاً حج کے زمانہ میں اور ملت ابراہیمؑ میں وضو نماز اور روزہ طلوع فجر سے لے کر غروب آفتاب تک، اور یتیموں اور فقیروں کو صدقہ دینا، اور مشکلات میں ان کی اعانت کرنا اور صلۂ رحم مشروع تھا، اور مشرکین کے یہاں ان امور کے کرنے والے کی مدح سرائی کی جاتی تھی، لیکن مشرکین نے عام طور پر ان امور کو ترک کر دیا تھا اور ان میں یہ خصائل کان لم یکن ہو گئے تھے اور قتل، چوری، زنا اور ربا، غصب کی حرمت بھی اصل ملت میں ثابت تھی اور ان افعال پر ان کے یہاں کچھ نہ کچھ اظہار نفرت بھی جاری تھا لیکن جمہور مشرکین ان کو کرتے اور نفس امارہ کے اشاروں پر چلتے تھے اور خدا تعالیٰ کے وجود کا عقیدہ اور اس بات کا کہ وہ آسمان اور زمین کا خالق ہے اور زبردست حوادث کا مدبر اور رسولوں کے بھیجنے پر قادر اور بندوں کو ان کے اعمال کی جزا دینے والا اور حوادث کو ان کے وقوع سے پیشتر معین کرنے والا، اور یہ کہ فرشتے خدا کے مقرب بندے اور تعظیم کے مستحق ہیں، ان کے نزدیک ثابت تھا۔ چنانچہ ان کے اشعار ان مضامین پر دلالت کرتے ہیں، مگر جمہور مشرکین نے ان عقائد میں بہت سے ایسے شبہات کو جو کہ ان امور کے استبعاد اور ادراک کی طرف رغبت نہ ہونے سے پیدا ہوتے تھے، بہم پہنچائے تھے، مشرکین کی گمراہی یہ تھی کہ وہ شرک اور تشبیہ اور تحریف کے قائل اور معاد کے منکر تھے اور نبی کریم ﷺ کی رسالت کو بعید از قیاس کہتے اور اعمال قبیحہ اور مظالم علانیہ کرتے اور نئے نئے فاسد رسوم ایجاد کرتے اور عبادات کو مٹاتے تھے۔

شرک یہ ہے کہ ماسوا اللہ کے لیے ان صفات کو ثابت مانا جائے جو خدائے تعالیٰ کے ساتھ مختص ہوں مثلاً عالم کے اندر تصرفات ارادی جس کو کن فیکون سے تعبیر کرتے ہیں یا علم ذاتی جس کا اکتساب نہ حواس کے ذریعہ سے ہو نہ عقل کی رہنمائی سے اور نہ خواب اور الہام وغیرہ کے واسطہ سے یا مریضوں کو شفا دینا یا کسی شخص پر لعنت کرنا اور اس سے ناراض ہونا جس کے باعث سے اس کو تنگدستی اور بیماری اور شقاوت گھیر لیں، یا رحمت بھیجنا جس سے اس کو فراخ دستی، تندرستی

اور سعادت حاصل ہو مشرکین بھی جواہر اور عظیم الشان امور کے پیدا کرنے میں کسی کو خدا کا شریک نہیں جانتے تھے انکا اعتقاد تھا کہ جب خدا تعالیٰ کسی کام کے کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو کسی میں اس کے روکنے کی قدرت نہیں ہے بلکہ ان کا شرک فقط ایسے امور کی نسبت تھا جو کہ بعض بندوں کے ساتھ مخصوص تھے، ان لوگوں کا گمان تھا کہ جیسے شاہان عظیم القدر اپنے مقربان خاص کو ملک کے مختلف حصوں کا فرمانروا مقرر کرتے ہیں اور بعض امورِ خاصہ کے فیصل کرنے میں جب تک کوئی شاہی حکم صریح موجود نہ ہو ان کو مختار بنا دیتے ہیں اور اپنی رعایا کی چھوٹی چھوٹی باتوں کا خود انتظام نہیں کرتے اور اپنی کل رعایا کو حکام کے سپرد کر دیتے ہیں اور حکام کی سفارش ان کے ماتحت ملازمین اور متوسلین کے حق میں قبول کی جاتی ہے، ایسے ہی بادشاہ علی الاطلاق جل مجدہ نے بھی اپنے خاص بندوں کو رتبۂ الوہیت کے خلعت سے سرفراز کیا ہے، اور ایسے لوگوں کی رضامندی و ناراضی دوسرے بندوں کے حق میں مؤثر ہے اس لیے وہ ان بندگان خاص کے تقرب کو ضروری خیال کرتے تھے تاکہ بادشاہ حقیقی کی درگاہ میں مقبولیت کی صلاحیت پیدا ہو جائے اور جزاء اعمال کے وقت ان کے حق میں شفاعت درجۂ قبولیت حاصل کرے اور ان خیالی ضرورتوں کو دیکھتے ہوئے وہ لوگ ان کو سجدہ کرنا اور ان کے لیے قربانی کرنا اور ان کے نام کی قسم کھانا اور ضروری امور میں انکی قدرت کن فیکون سے مدد لینا جائز سمجھتے تھے، اور پتھر، پیتل اور شیشہ وغیرہ کی مورتیں بنا کر ان (بندگان خاص) کی روحوں کی طرف متوجہ ہونے کا ایک وسیلہ قرار دیا تھا۔

لیکن رفتہ رفتہ جہلاء نے ان پتھروں ہی کو اپنا اصلی معبود سمجھنا شروع کر دیا اور خلط عظیم واقع ہوا۔

اور تشبیہ سے مراد ہے صفاتِ بشریہ کو ذات پاک کے لئے ثابت کرنا، چنانچہ مشرکین، ملائکہ کو خدا تعالیٰ کی بیٹیاں بتلاتے اور کہتے تھے کہ وہ اپنے بندوں کی شفاعت کو قبول کرتا ہے اگرچہ اس کی مرضی کے خلاف ہو جیسا کہ بادشاہ بڑے بڑے امراء دولت کی نسبت گاہ گاہ کیا کرتے ہیں اور چونکہ ایسے علم و سمع و بصر کا ادراک جو کہ شان الوہیت کے لائق ہو ان کے ذہن میں نہ آ سکتا تھا اس لیے انہوں نے اس کو بھی اپنے علم و سمع و بصر پر قیاس کر لیا اور خدا تعالیٰ کی جسمیت اور جزء کے قائل ہو گئے، اور تحریف کا واقعہ اس طرح ہوا کہ حضرت اسمٰعیل کی اولاد اپنے بزرگوار دادا کی

شریعت پر برابر قائم چلے آئے تھے حتیٰ کہ عمرو بن لحی (۱) لعنۃ اللہ علیہ نے پیدا ہو کر انکے لیے بت بنائے اور ان کی عبادت کو لازم قرار دیا اور بحیرہ (۲) اور سائبہ (۳) اور حام (۴) کا چھوڑ دینا اور پانسوں کے ذریعہ سے تقسیم کرنا اور مثل ان کے دیگر باتیں ان کے لیے ایجاد کیں اور یہ واقعہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے قریباً تین سو سال پیشتر ہوا۔

اور یہ جہلاء بالعموم اپنے آباء و اجداد کے آثار سے استدلال کرتے اور اس کو اپنے قطعی دلائل میں شمار کرتے تھے، انبیاء سابقین نے بھی اگرچہ حشر و نشر کے احوال بیان فرمائے ہیں لیکن نہ اس شرح و بسط سے جیسا کہ قرآن مجید میں مذکور ہے اس لیے جمہور مشرکین ان مزید حالات پر مطلع نہ تھے بلکہ ان کو فہم سے بعید جانتے تھے، اس جماعت کو اگرچہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل بلکہ حضرت موسیٰ علیہم السلام کی نبوت کا بھی اعتراف تھا لیکن صفاتِ بشری (جو انبیاء میں ہیں) انکے جمال باکمال کے لئے حجاب ہیں، ان کو مشوش کر دیتی تھیں اور وہ اس تدبیر الٰہی کی حقیقت سے جو بعثت انبیاء کے لیے مقتضی ہے ناآشنا رہ کر کارِ رسالت کو استبعاد کی نظر سے دیکھتے تھے کیونکہ یہ لوگ رسول کو مرسل یعنی اپنے بھیجنے والے کے ساتھ مماثل جانتے تھے (چنانچہ) وہ اس باب میں واہی اور ناقابل سماعت شبہات پیش کرتے تھے مثلاً وہ کہتے تھے کہ جو شخص کھانے اور پینے کا محتاج ہو وہ نبی کیسے ہو سکتا ہے اور خدا تعالیٰ نے کیا وجہ جو فرشتہ کو رسول بنا کر نہ بھیجا اور کیا وجہ کہ ہر شخص پر الگ الگ وحی نہیں بھیجتا علیٰ ہذا القیاس ایسے ہی اور شبہات اور اگر تم کو مشرکین کے عقائد اور اعمال کے اس بیان کے صحیح تسلیم کرنے میں کچھ توقف ہو تو چاہیے کہ اس زمانہ کے تحریف کرنے والوں کو علی

---

(۱) دیکھو سیرۃ ابن ہشام جلد اول۔

(۲) بحر عربی زبان کان چھدنے کو کہتے ہیں، اور بحیرہ سے وہ اونٹنی مراد ہے جو پانچ بچے جن چکی ہو۔ پانچواں بچہ اگر نر ہوتا تو اس کو ذبح کر کے صرف مرد کھاتے تھے عورتیں اس میں شریک نہ ہوتی تھیں اور اگر وہ بچہ مادہ ہوتا تو اس اونٹنی کا کان کاٹ کر چھوڑ دیتے تھے۔

(۳) سائبہ سے مراد وہ مویشی ہے جس کو اہل جاہلیت بتوں کی نذر کر کے چھوڑ دیتے تھے نہ اس پر سوار ہوتے اور نہ اس کا دودھ پیتے اور نہ اس سے اون حاصل کرتے۔

(۴) حام سے مراد وہ نر اونٹ ہے جس کو مثل سانڈ کے چھوڑ دیتے تھے نہ اس پر سوار ہوتے نہ اس سے اون حاصل کرتے اور کسی چراگاہ یا حوض سے اس کو نہ روکتے تھے۔

الخصوص جو دارالاسلام کے نواح میں رہتے ہیں دیکھو کہ انہوں نے ولایت کی نسبت کیا خیال باندھ رکھا ہے، وہ لوگ باوجودیکہ اولیاء متقدمین کی ولایت کے معترف ہیں مگر اس زمانہ میں اولیاء کے وجود کو قطعاً محال شمار کرتے ہیں اور قبروں اور آستانوں پر پھرتے ہیں اور طرح طرح کے شرک میں مبتلا ہیں اور کہ تحریک اور تشبیہ نے کس قدر ان میں رواج پکڑا ہے حتی کہ موافق حدیث صحیح لتتبعن سننا من قبلکم ان آفات میں سے کوئی بھی نہ رہی جس پر آج کوئی نہ کوئی جماعت کاربند اور اس کے مانند دیگر امور کی معتقد نہ ہو''۔

اعاذ نا الله سبحانه عن ذلك

بالجملہ خدا تعالیٰ نے اپنی خاص رحمت سے آنحضرتؐ کو عرب میں مبعوث کیا اور آپ کو ملت حنیفیہ کے قائم کرنے کا حکم فرمایا، اور قرآن مجید میں جہلاء عرب کے ساتھ مباحثہ کیا اور مباحثات میں ان کے مسلمات سے جو ملتِ حنیفیہ کی بقایا تھے استدلال کیا تاکہ الزام ان پر پوری طرح ثابت ہو جائے اور شرک کا جواب اول تو ان سے اس پر دلیل کا مطالبہ کرنا اور تقلید آباء کے استدلال کو توڑتا ہے اور دوسرے ان بندگان خاص کا خدا کے برابر نہ ہونا اور خدا تعالیٰ کا برخلاف ان بندگان خاص کے انتہائی مراتب تعظیم کے لیے مستحق ہونا اور تیسرے تمام انبیاء کا اس مسئلہ پر اجماع وما ارسلنا(۱)من قبلك من رّسول الا نوحی اليه انه لا اله الا انا فاعبدون، اور چوتھے بتوں کی عبادت کی خرابی اور پتھروں کے مرتبۂ انسانی سے بھی گرے ہوئے ہونے کا بیان (اور مرتبۂ الوہیت کا تو ذکر ہی کیا ہے) اور یہ جواب خاص ان اقوام کے مقابلہ میں دیا گیا ہے جو بتوں کو بالذات معبود خیال کرتے ہیں اور تشبیہ کا جواب اولاً تو اس پر دلیل کا مطالبہ، اور استدلال تقلید آباء کو توڑنا اور دوسرے یہ کہ اولاد کا اپنے باپ کے ساتھ جنس ہونا ضروری ہے، اور وہ یہاں مفقود ہے، اور تیسرے ایسے امور کو جن کو وہ اپنے نزدیک مکروہ اور مذموم خیال کرتے ہیں حق تعالیٰ کے لیے ثابت ماننے کی قباحت کا بیان (الربك(۲) البنات ولكم

(۱) تم سے پیشتر ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر یہ کہ ہم نے اس کی طرف وحی کی کہ سوائے میرے کوئی معبود نہیں پس تم میری ہی عبادت کرو۔

(۲) کیا تیرے پروردگار کے لیے بیٹیاں ہیں اور تمہارے لیے بیٹے۔

البنون) اور یہ جواب خاص ایسے اقوام کے لیے دیا گیا ہے جو مشہورات اور متوہمات شعری کو تسلیم کرنے کے خوگر تھے اور جن کی بڑی تعداد کی یہی حالت تھی اور تحریف کا جواب یہ ہے کہ ائمہ مذہب ہے یہ معانی مذکور نہیں ہیں اور نیز یہ ایسے لوگوں کی اختراعات اور جدت پسندیاں ہیں جو معصوم نہ تھے اور حشر ونشر کے مستبعد ہونے کا جواب اولاً تو زمین وغیرہ کے حیوا ت پر قیاس، اور مدار حشر ونشر کی تنقیح ہے جو کسی شے کا فقط تحتِ قدرت اور ممکن الاعادہ ہونا ہے اور دوسرے ان امور کی خبر دینے میں اہل کتاب کی موافقت ہے، اور استبعاد رسالت کا جواب انبیائے سابقین میں بھی ہو چکا ہے۔

"وما ارسلنا من قبلك الا رجالاً نوحيٓ اليهم و يقول (۱) الذين كفروا لست مرسلا قل كفى بالله شهيداً بيني وبينكم ومن عنده علم الكتب"

اور دوسرے ان کے استبعاد کو یہ کہہ کر رد کرنا کہ یہاں پر رسالت سے مراد فقط وحی ہے، قل (۲) انما انا بشرٌ مثلكم يوحىٰ اليَّ ۔ اور وحی ایسی شے ہے جو محال نہیں ہے ماكان لبشر ان يكلمه الله (۳) الخ اور تیسرے یہ بیان کر دینا کہ ان معجزات کا ظاہر ہونا جن کی وہ ضد کرتے ہیں اور خدا تعالیٰ کا ایسے شخص کو نبی معین کرنے میں ان کی موافقت نہ کرنا جس کی پیغمبری کے وہ خواہشمند ہیں، یا فرشتہ کو پیغمبر نہ بنانا یا ہر کسی پر وحی نازل نہ کرنا ایک ایسی کلی مصلحت کی بنا پر ہے، جس کے ادراک سے ان لوگوں کا علم وفہم قاصر ہے، اور چونکہ مکلفین اکثر مشرک تھے اس لیے ان مضامین کو بہت سورتوں میں مختلف طریقوں اور نہایت تاکیدات کے ساتھ ثابت فرمایا اور ان باتوں کے بار بار اعادہ کرنے میں کوتاہی نہیں کی، لاریب حکیم مطلق کا خطاب ان جاہلوں کے لیے ویسا ہی ہونا چاہیے تھا، اور ان بے عقلوں کے مقابلے میں انہیں شدید تاکیدات کی ضرورت تھی...... ذلك تقدير العزيز العليم اور یہودی توریت پر ایمان رکھتے تھے اور ان کی بے راہی

(۱) کفار کہتے ہیں کہ تم رسول نہیں ہو تم اس کے جواب میں کہہ دو کہ میرے اور تمہارے درمیان خدا گواہ ہے اور جس کے پاس آسمانی کتابوں کا علم ہے۔

(۲) اے پیغمبر کہہ دو کہ میں مثل تمہارے انسان ہوں مگر یہ کہ مجھ پر وحی کی جاتی ہے۔

(۳) کسی انسان کا یہ مقدر نہیں کہ خدا اس کے ساتھ کلام کرے مگر بطور وحی کے۔

احکامِ توریت میں عام تحریف لفظی یا معنوی تھی، اور نیز بعض آیات کو چھپانا، اور یہ افترا پردازی کو جو احکام اس میں نہ تھے اس میں ملانا اور نیز ان احکام کی پابندی واجرا میں تساہل اور تعصبِ مذہبی میں شدت، اور ہمارے پیغمبر ﷺ کی رسالت میں تامل، اور بے ادبی اور طعنہ زنی رسول اللہ ﷺ بلکہ خدا تعالیٰ کی شان میں اور ان کا بخل وحرص میں مبتلا ہونا وغیرہ وغیرہ یہودی تحریفِ لفظی توریت کے ترجمہ وغیرہ میں کیا کرتے تھے نہ کہ اصل توریت میں، کیونکہ فقیر کے نزدیک ایسا ہی محقق ہوا ہے اور ابن عباس کا بھی یہی قول ہے کہ تحریف معنوی تاویلِ فاسد کا نام ہے۔ یعنی سینہ زوری اور راہ مستقیم سے انحراف کر کے کسی آیت کو اسکے اصل معنیٰ کے خلاف پر حمل کرنا، اور اسکی ایک مثال یہ ہے کہ ہر مذہب میں درمیان فاسق دیندار اور کافر منکر مذہب کے فرق بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً کافر کے لیے ثابت مانا گیا ہے کہ وہ عذابِ شدید میں ہمیشہ مبتلا رہے گا، اور فاسق کے لیے جائز رکھا گیا ہے کہ وہ انبیاء علیہم السلام کی شفاعت سے دوزخ میں سے نکالا جائیگا، اور اس آخری حکم کے اثبات کے وقت ہر ایک مذہب نے اپنے پیرو کے نام کی تصریح کی ہے۔ مثلاً توریت میں یہودی اور عبری کو یہ مرتبہ بخشا گیا ہے، اور انجیل میں نصرانی کو اور قرآن مجید میں مسلمانوں کو یہ شرف عطا ہوا ہے، اس حکم کا مدار فقط خدا تعالیٰ اور محشر پر ایمان لانے اور اس رسول کی جو ان میں مبعوث کیا گیا ہوتا تابعداری اور مشروعاتِ مذہبی پر عمل کرنے اور منہیات سے اجتناب کرنے پر ہے اور ہرگز کسی فرقہ کی ذاتی خصوصیت نہیں، لیکن بایں ہمہ یہودیوں کا گمان ہے کہ جو شخص یہودی یا عبری ہوگا وہ ضرور جنتی ہوگا (۱) اور شفاعت انبیاء اس کو دوزخ سے نجات دیگی حتیٰ کہ چند روز کے سوا وہ دوزخ میں نہ رہ سکیں گے گو مدار حکم کا وجود نہ ہو اور گو خدا تعالیٰ پر ایمان صحیح طریقہ سے نہ ہو اور آخرت اور رسالت پر ایمان کا ان کو کچھ بھی ادراک نہ ہوا ہو۔ حالانکہ یہ محض غلط اور خالص جہالت ہے۔

چونکہ قرآن مجید تمام کتب سابقہ کا محافظ اور ان کے اشکالات کو واشگاف کرنے والا ہے، اس لیے اس نے اس گرہ کو بھی پوری طرح کھول دیا ہے، بلیٰ (۲) من کسب سیئۃ واحاطت

---

(۱) وقالوا لن تمسنا النار الا ایاما معدودات

(۲) ہاں جس نے بدی کمائی اور اس کی خطاؤں نے اس کو گھیر لیا تو ایسے ہی لوگ دوزخی ہیں، وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے۔

به خطیئته فاولٓئك اصحاب النار هم فیها خلدون۔

مثال ثانی ہر مذہب میں اس زمانہ کے مصالح پر نظر کر کے احکام بھیجے گئے ہیں اور تشریع یعنی شریعت کا قانون بنانے میں اقوام کی عادات کی موافقت کا لحاظ رکھا گیا ہے، اور نہایت تاکید کے ساتھ ان کے اتباع اور ان پر ہمیشہ عمل کرنے و اعتقاد رکھنے کا حکم فرمایا ہے اور انہیں میں دائمی طور پر انحصار حق فرمایا ہے، لیکن اس سے صرف یہ غرض ہے کہ فقط اس زمانہ میں ان اعمال میں حق منحصر ہے غرضیکہ دوامِ ظاہری مراد ہے نہ کہ دوامِ حقیقی یعنی مراد یہ تھی کہ تاوقتیکہ دوسرا نبی مبعوث نہ ہو اور اس کے چہرۂ نبوت سے پردۂ خفا نہ اٹھ جائے، یہ احکام واجب العمل رہیں گے مگر انہوں نے اس ظاہری دوام سے یہ سمجھا کہ گویا یہودیت ناقابلِ نسخ ہے اور درحقیقت یہودیت کے اتباع کی وصیت کے یہ معنی تھے کہ ایمان اور نیک اعمال کا التزام کیا جائے اور اس مذہب کی کوئی ذاتی خصوصیت ہرگز معتبر نہیں ہے لیکن ان لوگوں نے خصوصیت کا اعتبار کر کے غلطی سے یہ گمان کرلیا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنی اولاد کو یہودیت ہی کی وصیت فرمائی ہے۔

مثال ثالث خدا تعالیٰ نے ہر ایک ملت میں انبیاء اور ان کے متبعین کو مقرب اور محبوب کا خطاب عطا کیا اور منکرین کو صفات مبغوضہ سے یاد فرمایا ہے، اور ان خطابات میں ایسے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جن کا استعمال ہر ایک قوم میں شائع تھا، تو اگر محبوب کے بجائے لفظ ابن ذکر کیا ہو تو کچھ تعجب نہیں، اس سے یہودیوں نے یہ گمان کیا کہ یہ عزت صرف یہودی اور عبری اور اسرائیلی کے ناموں کے ساتھ مخصوص ہے، اور وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ اس سے کامل اتباع اور خضوع اور انبیاء کی بتائی ہوئی سیدھی راہ پر چلنے کے سوا اور کچھ مراد نہیں اور ایسی ہی بہت سی تاویلات فاسدہ، ان کے قلوب میں راسخ ہوگئی تھیں جن کو وہ اپنے باپ دادوں سے سنتے چلے آئے تھے، قرآن مجید نے ان شبہات کو پوری طرح رفع کردیا۔

کتمانِ آیات کی یہ صورت تھی کہ بعض احکام اور آیات کو کسی ذی عزت اور شریف کے اعزاز کی حفاظت یا کسی ریاست کے حاصل کرنے کی غرض سے پوشیدہ کر دیتے تھے کہ عوام کا اعتقاد ان سے زائل نہ ہو جائے اور یہ لوگ اس پر عمل ترک کر دینے سے نشانۂ ملامت نہ بن سکیں، مثلاً زانی کو سنگسار کرنے کا حکم توریت میں مذکور تھا، مگر ان لوگوں نے اس وجہ سے کہ ان کے تمام علماء نے

رجم کو موقوف کر کے اس کی جگہ پر دڑے مارنا اور منہ کالا کر دینا تجویز کر رکھا تھا اس حکم کو ترک کر دیا اور رسوائی کے خوف سے اس کو چھپا لیا تھا یا مثلاً جن آیتوں میں حضرت ہاجرہ و اسمٰعیل علیہما السلام کو بشارت دی گئی ہے کہ ان کی اولاد میں ایک نبی مبعوث ہوگا اور جن میں اشارہ ہے ایک ایسے مذہب کی جانب جو سرزمین حجاز میں کامل اشاعت پائے گا، اور اسکے سبب سے عرفات کی پہاڑیاں صدائے لبیک سے گونج اٹھیں گی اور تمام اقلیموں کے لوگ اس مقام کی زیارت کا قصد کریں گے باوجودیکہ یہ آیتیں توریت میں اب تک موجود ہیں، یہودی ان کی یہ تاویل کرتے تھے کہ یہ تو فقط اس مذہب کے آنے کی خبر دی گئی ہے اس کے اتباع کا امر کہاں ہے، اور یہ مقولہ ان کے زبان زد تھا ملحمة (۱) كتبت علينا لیکن چونکہ اس رکیک تاویل کو کوئی نہ سنتا تھا اور نہ کسی کے نزدیک یہ صحیح تھی اس لئے وہ آپس میں ایک دوسرے کو اس راز کے اخفاء کی وصیت کرتے اور ہر کس و ناکس کے روبرو اس کا اظہار نہ کرتے تھے، اتحدثونهم بما فتح الله عليكم ليحاجوكم به عند ربكم۔

افسوس یہودی کس بلا کے جاہل تھے، کیا خدا تعالیٰ کا ہاجرہ و اسمٰعیل علیہ السلام پر اس مبالغہ کے ساتھ احسان رکھنا کوئی دوسرے معنی بھی رکھتا ہے جن پر ان آیات کو حمل کر کے یہ کہہ سکیں کہ ان سے اس مذہب کے اتباع کی تحریص نہیں نکلتی، سبحنك هذا افك عظيم افترا اس کا سبب وہ بے حد پر تشدد ہے جس نے ان کے علماء اور مشائخ کے اطوار میں راہ پائی تھی اور استحسان یعنی بدون شارع کی تصریح کر کے بعض احکام کا صرف اس لیے کہ ان میں کوئی مصلحت ہے، استنباط کرنا اور ان بیہودہ استنباطات کو اول رواج دینا۔

اور پھر ان کو اصل کتاب میں ملا دینا اور اپنے سلف کے اتفاق کو دلیل قطعی خیال کرنا، خاص حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کے انکار پر ان کے یہاں سوائے اقوالِ سلف کے اور کوئی دلیل نہ تھی، علیٰ ہذا دوسرے بہت سے احکام ہیں مگر احکامِ توریت میں سہل انگاری اور بخل اور حرص کا

---

(۱) ملحمة بمعنی جنگ، یہود کہتے تھے کہ مسلمان جو ہم پر غالب آ رہے ہیں تو ہم پر کفار یعنی غیر یہود کا غلبہ ہونا خود توریت میں لکھا ہے۔ (۲) کیا جو کچھ خدا نے تم پر توریت میں ظاہر کیا ہے اس کی خبر تم مسلمانوں کو کئے دیتے ہو کہ تمہارے پروردگار کے روبرو اسی بات کی سند پکڑ کر تم سے جھگڑا کریں۔

ارتکاب صاف ظاہر ہے کہ یہ سب نفس امّارہ کے اقتضاءات ہیں، نفس امّار بلاشبہ ہر شخص پر غالب ہے، الا ماشاء اللہ۔

ان النفس (۱) لامّارۃٌ بالسوءِ الا مارحم ربی مگر اس مصلحت نے اہل کتاب میں دوسرا ہی رنگ چڑھایا تھا، یعنی وہ اپنے استنباطات کی تصریح میں تاویلاتِ فاسدہ کے ذریعہ سے بڑا زور لگاتے تھے اور اس کو شریعت کے رنگ میں ظاہر کرتے تھے۔

استبعاد رسالت پیغمبر ﷺ اس کا سبب وہ باہمی اختلاف ہے جو انبیاء علیہ السلام کی عادات اور احوال میں پایا جاتا ہے، مثلاً نکاح کے زیادہ یا کم کرنے میں فرق اور اسی کے مثل اور باتیں اور ان کے شرائع کا باہم اختلاف، اور معاملات انبیاء میں سنۃ اللہ کا اختلاف، اور پیغمبر ﷺ کو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد میں مبعوث فرمانا حالانکہ اب تک جمہور انبیاء بنی اسرائیل (اولاد یعقوب) سے ہوتے آئے ہیں وغیرہ وغیرہ، اس مسئلہ میں حق یہ ہے کہ نبوت دراصل نفوس عالم کی اصلاح اور عادات اور عبادات کی درستی کا مرتبہ رکھتی ہے، وہ نیکی اور بدی کے اصول کے ایجاد کا منصب نہیں رکھتی قاعدہ کی بات ہے کہ ہر ایک قوم اپنی عبادات، تدبیر منزل، اور سیاست مدنی میں خاص عادات کی پابند ہوتی ہے، اگر نبوت اس قوم میں آئے تو وہ ان کی تمام قدیم عادات کو اکھاڑ کر ان کے بجائے جدید اصول قائم نہ کرے گی بلکہ اس کا یہ کام ہوگا کہ وہ ان خصائل کو باہم متمیز کر دے جو با قاعدہ اور خدا کی مرضی کے موافق ہوں ان کو جاری رہنے دے اور جو اس کے مخالف ہوں ان میں بقدر ضرورت تغیرات کرے، اور تذکیر بآلاء اللہ اور تذکیر بایام اللہ بھی اسی اسلوب پر کی جاتی ہے جو ان کے یہاں شائع ہو اور جس سے وہ مانوس ہوں، یہی نکتہ ہے جس کے باعث انبیاء کی شریعتیں باہم مختلف ہوگئی ہیں، اور اس اختلاف کی مثال اس طبیعت کے اختلاف علاج کے مانند ہے، جبکہ وہ دو مختلف الحال مریضوں کی تدبیر کرتا ہے، ان میں سے ایک کے لئے تو سرد دوائیں اور غذائیں تجویز کرتا ہے اور دوسرے کے واسطے گرم غذا اور دوا کا حکم دیتا ہے، طبیب کی غرض دونوں جگہ متحد ہے یعنی طبیعت کی اصلاح و ازالۂ مرض کے سوا اس کو اور کچھ منظور نہیں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہر اقلیم میں وہاں کے باشندوں کے مناسب دوائیں اور غذائیں الگ الگ تجویز

(۱) بلاشبہ نفس برائی کی ترغیب دینے والا ہے، مگر میرا پروردگار جس پر رحم کرے۔

کرتا اور ہر فصل و موسم میں اس کے مقتضاء کے موافق تدبیر اختیار کرتا ہے، اسی طرح جب حکیم حقیقی نے بیماران امراض نفسانی کا معالجہ کرنا چاہا، ان کی تقویت طبع اور تقویت ملکہ، اور ازالۂ مفاسد اس کو منظور ہوا تو ان اقوام اور ان کی عادت کے اختلاف کے باعث اور ہر زمانہ کے مشہورات و مسلمات کی وجہ سے معالجہ مختلف ہو گیا۔

غرضیکہ اگر تم اس امت میں یہود کا نمونہ دیکھنا چاہو تو ان علماء سو کو دیکھ لو جو دنیا کے طالب اور اپنے اسلاف کی تقلید کے خوگر اور کتاب و سنت سے روگردانی کرنے والے ہیں اور جو عالموں کے تعمق اور تشدد یا ان کے بے اصل استنباط کو سند ٹھیرا کر معصوم شارعؐ کے کلام سے بے پروا ہو گئے ہیں، اور موضوع حدیثوں اور فاسد تاویلوں کو اپنا مقتدا بنا کر رکھا ہے۔

نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھتے تھے، ان کی گمراہی یہ تھی کہ انہوں نے خدائے تبارک و تعالیٰ کو تین ایسے حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا جو بعض وجوہ سے متغایر اور بعض وجوہ سے متحد ہوں، ان حصوں کو وہ اقانیم ثلثہ کہتے تھے۔ یعنی ایک اقنوم باپ جو ان کے نزدیک مبدأیتِ عالم کے ہم معنی تھا، اور ایک اقنوم بیٹا جو بمعنی صادر اول تھا جو ایک امر عام اور تمام موجودات میں شامل، اور ایک اقنوم روح القدس تھا جو عقول مجرّدہ کے ہم معنی، ان کا عقیدہ تھا کہ اقنوم ابن نے حضرت مسیح کی روح کا لباس اختیار کر لیا تھا یعنی جیسا کہ جبریل علیہ السلام آدمی کی شکل میں آتے تھے ایسے ہی ابن نے عیسیٰ علیہ السلام کی صورت میں ظہور کیا تھا اس لیے عیسیٰ علیہ السلام خدا بھی ہیں، اور ابن اللہ بھی اور بشر بھی اور اسی لیے احکامات بشری اور خداوندی دونوں ان کی نسبت جاری ہوتے ہیں اور اس عجیب عقیدہ میں ان کا تکیہ انجیل کی بعض ایسی آیتوں پر ہے جن میں لفظ ابن مذکور ہوا ہے اور جن میں حضرت مسیح نے بعض افعال الٰہیہ کو اپنی جانب منسوب کیا ہے، پہلے اشکال کا جواب اس امر کے مان لینے کی صورت میں کہ یہ کلام فی الحقیقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ہے تحریف شدہ نہیں ہے یہ ہے کہ قدیم زمانہ میں لفظ ابن مقرب اور محبوب اور مختار کے ہم معنی تھا، چنانچہ اس دعوت پر کثرت سے قرائن انجیل میں پائے جاتے ہیں، اور دوسرے اشکال کا جواب یہ ہے کہ یہ نسبت بطریق نقل و حکایت ہے، مثلاً کسی بادشاہ کا ایلچی اس کے کلام کو یوں نقل کرے کہ ہم نے فلاں ملک فتح کیا، فلاں قلعہ توڑا، اس صورت میں ظاہر ہے کہ ایلچی ترجمان سے زیادہ وقعت

نہیں رکھتا اور ممکن ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر وحی کا یہ طریقہ ہو کہ عالمِ بالا سے ان کے لوحِ دل پر مضامین خود منقش ہو جاتے ہوں اور حضرت جبریل علیہ السلام صورت انسانی میں آ کر کلام القا نہ فرماتے ہوں اس لئے اس نقش کی وجہ سے عیسیٰ علیہ السلام سے وہ کلام صادر ہوگا جس میں افعال الٰہیہ کو اپنی جانب نسبت کرنے کا اشارہ ہو" والحقیقة غیر خفیة "بالجملہ خدا تعالیٰ نے اس باطل مذہب کا رد فرمایا، اور کہا کہ عیسیٰ خدا کا بندہ، اور اس کی وہ پاک روح ہے، جس کو اس نے مریم صدیقہ کے رحم میں ڈالا، اور اس کی روح القدس سے تائید فرمائی اور نیز خاص عنایتیں اس پر رکھیں، اور بالفرض اگر خدا تعالیٰ ایسی روح کے قالب میں جو باقی ارواح کے ہم جنس ہے آیا ہو اور بشریت کا لباس اختیار کیا ہو، اور ہم اچھی طرح اس نسبت کو واشگاف کریں تو لفظ اتحاد اس وقت ہرگز مستعمل نہ ہو سکے گا مگر تسامح بلکہ الفاظ تقویم (۱) وغیرہ ان معنی کے قریب تر ہیں، تعالی عما یقول الظّالمون علوّاً کبیراً۔

اگر اس گروہ کا نمونہ اپنی قوم میں دیکھنا چاہو تو آج اولیاء اللہ اور مشائخ کی اولاد کو دیکھ لو کہ وہ اپنے آباء کے حق میں کس قسم کے خیالات رکھتے ہیں اور ان کو کہاں تک طول دیا ہے" وسیعلم الذین ظلموآ ایّ منقلب ینقلبون" (اور بہت جلد جانیں گے وہ لوگ کہ ظلم کرتے ہیں کون سی پھرنے کی جگہ پھر جائیں گے)۔

اور نیز ایک گمراہی نصاریٰ کی یہ ہے کہ وہ یقین رکھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مقتول ہو گئے ہیں حالانکہ فی الواقع ان کے قتل کے واقعہ میں ایک اشتباہ ہو گیا تھا، جس سے انہوں نے آسمان پر اٹھا جانے کو قتل سمجھ لیا اور نسلاً بعد نسلٍ اس غلط روایت کو مسلسل نقل کرتے رہے، خداوند تعالیٰ نے قرآن شریف میں اس شبہ کا ازالہ فرمایا۔" وماقتلوہ (۲) وماصلبوہ ولکن شبه لهم "اور انجیل میں اس قصہ کے متعلق جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مقولہ ہے اس سے مراد یہودیوں

---

(۱) مقوم وہ ہے جس کے ذریعہ سے کوئی دوسری چیز قائم ہو جیسے جو ہر عرض کا مقوم ہے یا طلسمی کاغذ کسی تماشہ کا مقوم ہو، عام غلطی یہ ہے کہ تقویم کو جو ہر و عرض کی نسبت میں منحصر کر دیا ہے اور چونکہ جو ہر و عرض میں ایک طرح کا اتحاد ہے اس لیے تقویم کو اتحاد سمجھ لیا ہے، حالانکہ طلسم اپنے تماشہ سے بالکل صاف علیحدہ ہوتا ہے اور یہ نسبت تقویم ہی کی ہے اگر اس کو بھی اتحاد ہی کہا جائے تو پھر کوئی چیز علیحدہ ہی نہیں کیونکہ کوئی نہ کوئی نسبت آخر پائی ہی جائے گی۔

(۲) حال یہ ہے کہ انہوں نے مسیح کو نہ تو قتل کیا اور نہ سولی پر چڑھایا مگر یہ کہ انکو ایسا ہی معلوم ہوا۔۱۲

کی دلیری اور ان کے اقدام قتل کی خبر دینا ہے باوجودیکہ خدا تعالیٰ نے اس سانحہ سے ان کو نجات عطا فرمائی اور جو کہ حواریین کا مقولہ مذکور ہے اس کا منشا یہ ہے کہ ان کو اشتباہ ہو گیا اور رفع کی حقیقت پر ان کو اطلاع نہ تھی جس سے کہ ان کے ذہن اور ان کے کان اب تک مانوس نہ تھے۔

اور نیز ان کی ضلالت میں سے ایک یہ امر بھی ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ فارقلیط موعود سے وہ عیسیٰ علیہ السلام مراد ہیں، جو قتل ہو جانے کے بعد اپنے حواریین کے پاس آئے اور ان کو انجیل کے کامل اتباع کی وصیت فرمائی، اور کہتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ میرے بعد مدعیان نبوت بکثرت ہوں گے لیکن ان میں جو شخص میرا نام لے اس کی تصدیق کرنا ورنہ نہیں، قرآن شریف سے ثابت ہے کہ عیسیٰ کی بشارت ہمارے نبی کریم ﷺ پر منطبق ہے نہ کہ حضرت عیسیٰ کی روحانی صورت پر کیوں کہ انجیل میں کہا گیا ہے کہ فارقلیط تم میں مدت دراز تک رہ کر علم سکھادے گا اور لوگوں کے نفوس کو پاک کریگا اور یہ بات ہمارے پیغمبر ﷺ کے سوا اور کسی سے ظاہر نہیں ہوئی، باقی عیسیٰ کا نام اختیار کرنا اس سے یہ مراد ہے کہ ان کی نبوت کی تصدیق کرے نہ یہ کہ ان کو خدا یا خدا کا بیٹا کہے۔

منافقین دو قسم کے تھے ایک وہ جو زبان سے کلمۂ ایمان کہتے تھے مگر ان کا قلب کفر اور سرکشی پر پختہ تھا اور کفر وجحود ان کے دل میں چھپے ہوئے تھے، ایسے لوگوں کے حق میں فِي الدَّرْكِ (۱) الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ، فرمایا دوسرا گروہ جس نے اسلام قبول کیا مگر ان کا ایمان ضعیف تھا مثلاً وہ اپنی قومی خصائل وعادات کے پابند تھے اگر وہ مسلمان ہوں تو یہ بھی مسلمان ہو جاتے ہیں اور وہ کافر رہے تو یہ بھی کافر رہتے ہیں اور یا مثلاً دنیاوی لذات کا اتباع ان کے قلوب میں بھر گیا کہ اس نے خدا اور اس کے رسول کی محبت کے لیے جگہ ہی باقی نہیں رہنے دی، یا حرص مال اور حسد و کینہ وغیرہ ان کے دلوں پر اس قدر مسلط ہو گیا تھا کہ اس نے ان کے دلوں میں مناجات کی حلاوت اور عبادت کی برکات کے لیے جگہ نہیں چھوڑی تھی، اور یا مثلاً امور دنیا میں وہ ایسے منہمک ہو گئے تھے کہ ان کو معاد کی امید اور اسکے لیے فکر کرنے کی فرصت تک باقی نہ رہی تھی، اور یا مثلاً ہمارے پیغمبر ﷺ کی رسالت کی نسبت بیہودہ خیالات اور رکیک شبہات ان کے قلوب میں گزرتے تھے

(۱) دوزخ کے پست ترین طبقہ میں ہوں گے۔

باوجودیکہ وہ اس حد تک نہ پہنچے تھے کہ وہ اسلامی طوق کو گردن سے نکال کر اس کشاکش سے صاف نکل جائیں، منافقین کے ان شبہات کا سبب یہ ہوا کہ ہمارے پیغمبر ﷺ میں بشری احکام پائے جاتے اور اسلام کا ظہور شاہی غلبہ وغیرہ کی صورت میں ہوا، اور یا ان کو اپنے قبائل اور گھرانوں کی محبت نے ان کی امداد اور تقویت اور تائید پر ایسا ثابت قدم رکھا کہ گو اہلِ اسلام کے خلاف ہی کیوں نہ ہو مگر وہ سعی بلیغ کر کے اسلام کو ضعف پہنچاتے تھے۔

نفاق کی یہ دوسری قسم نفاق عمل اور نفاق اخلاق ہے، رسول اللہ ﷺ کے بعد اب نفاق کی پہلی صورت کا علم نہیں ہوسکتا کیوں کہ وہ منجملہ علم غیب ہے اور ظاہر ہے کہ دلوں کے مخفی خیالات کی اطلاع نہیں ہوسکتی، اور نفاق ثانی کثرت سے پایا جاتا ہے، خصوصاً ہمارے زمانہ میں اور حدیث میں جو علامات مذکور ہیں وہ اسی نفاق کی جانب اشارہ ہے "ثلث(۱) من کن فیه کان منافقاً خالصاً اذا حدث کذب واذا وعد اخلف واذا خاصم فجر" "وهم المنافق بطنه وهم المؤمن فرسه (۲) الی غیر ذلك من الاحادیث" خداتعالیٰ نے ایسے منافقوں کے اخلاق واعمال کو قرآن مجید میں خوب آشکارا کیا ہے اور ان ہر دو گروہ کے احوال بکثرت بیان فرمائے ہیں تاکہ تمام امت ان سے احتراز کرے۔

اگر تم کو ان منافقین کے نمونہ کے دیکھنے کا شوق ہے تو امراء کی مجالس میں جا کر ان کے مصاحبین کو دیکھ لو جو امراء کی مرضی کو شارع کی مرضی پر ترجیح دیتے ہیں، اور انصاف کی رو سے ایسے منافقین میں جنہوں نے رسول اللہ ﷺ سے بلا واسطہ کلام سن کر نفاق اختیار کیا اور ان میں جو اب پیدا ہوئے مگر انہوں نے یقینی ذرائع سے احکامِ شارع کی اطلاع پا کر مخالفت اختیار کی، کوئی فرق نہیں ہے علی ہذا القیاس معقولیوں کی وہ جماعت بھی جن کے دلوں میں بہت سے شکوک اور شبہات پیدا ہوگئے ہیں اور جنہوں نے معاد کو نسیا منسیا کر دیا ہے اگروہ منافقین میں داخل ہے۔

بالجملہ قرآن مجید کی تلاوت کے وقت یہ گمان نہ کرنا چاہئے کہ اس میں مباحثہ ایک خاص قوم

---

(۱) تین خصلتیں ہیں جس میں یہ پائی جائیں گی وہ خالص منافق ہوگا جب بات کہے تو جھوٹ بولے اور جب وعدہ کرے تو خلاف کرے اور جب جھگڑا کرے تو گالی بکے۔

(۲) منافق صرف اپنے پیٹ کی فکر کرتا ہے اور مومن اپنے گھوڑے کی فکر رکھتا ہے۔

سے تھا جو گزر چکی، بلکہ بمصداق حدیث لتتبعن سنن من قبلکم زمانہ نبوی میں کوئی بلا نہ تھی مگر یہ کہ اس کا نمونہ آج بھی موجود ہے، اس لئے مقصود اصلی ان مقاصد کے لیے کلیات کا بیان ہے نہ کہ ان حکایات کی خصوصیات یہ وہ تقریر ہے جو اس کتاب کے لیے ان گمراہ فرقوں کے عقائد کی تفصیل اور ان کے جوابات میں مجھ سے ہو سکی اور میرے نزدیک یہ تحقیق آیات مباحثہ کے معانی سمجھنے کے لیے بالکل کافی ہے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

فصل دوم

باقی علوم پنجگانہ کے مباحث میں

جاننا چاہئے کہ قرآن مجید کا نزول انسان کی مختلف جماعتوں کی تہذیب کے لیے خواہ عربی ہوں یا عجمی، شہری ہوں یا بدوی ہوں، بدیں وجہ حکمت الٰہی اس امر کو مقتضی ہوئی کہ تذکیر بالاء اللہ میں اکثر افراد بنی آدم کی معلومات سے زیادہ بیان نہ کرے اور زیادہ بحث اور تحقیق سے کام نہ لے، اور اسماء اور صفات الٰہی کو ایسے سہل طریقہ سے بیان فرمایا کہ افراد انسانی بغیر مہارت حکمۃ الٰہی اور بدون مزاولت علم کلام کے صرف اس فہم وادراک کے ذریعہ سے جو اصل فطرت میں ان کو عطا ہوا ہے بخوبی سمجھ سکیں پس ذاتِ مبدأ (خالق) کا اثبات اجمالاً فرمایا، کیونکہ اس کا علم تمام افراد بنی آدم کی فطرت میں ساری ہے اور معتدل اور قریب باعتدال ممالک میں بنی آدم کا کوئی گروہ تم ایسا نہ پاؤ گے جو اس کا منکر ہو اور چونکہ صفاتِ الٰہیہ کا اثبات بطریقہ تحقیق حقائق اور امعانِ نظر ان کے لیے محال تھا، اور اگر وہ صفاتِ الٰہیہ پر بالکل اطلاع نہ پاتے تو معرفتِ ربوبیت جو ہمارے نفوس کی تہذیب کے لیے سب سے زیادہ سودمند شے ہے نہ حاصل ہو سکتی اس لیے حکمت باری مقتضی ہوئی کہ ان بشری صفات کاملہ میں سے جن کو ہم جانتے ہیں اور جو ہمارے نزدیک قابل تعریف سمجھے جاتے ہیں چند صفات کا انتخاب کیا جائے اور ان کو ایسے دقیق معانی کے بجائے استعمال کیا جائے جن کی عظمت اور جلال کی بلندی تک انسانی عقل کی رسائی نہیں ہو سکتی اور لیس کمثلہ شئ کو جہل مرکب کے سخت اور مزمن مرض کے لیے تریاق مقرر کیا جائے، اور جن بشری صفات کے

ذاتِ الٰہی کے لیے ثابت کرنے سے اوہام کی طغیانی، عقائدِ باطلہ کی جانب ہوتی ہے مثلاً اثبات ولد، گریہ وزاری، جزع وفزع، ان سے منع فرمایا، اگر آپ زیادہ غور وخوض کریں گے تو معلوم ہوگا کہ انسان کے لیے اپنے فطری اور غیر مکتسب علوم کی شاہراہ پر قدم زن ہونا اور ان صفات کو جن کا اثبات کیا جا سکتا ہے اور ان سے کوئی خلل نہیں آتا، ان صفات سے تمیز کرنا جن سے اوہامِ باطلہ کی طغیانی ہوتی ہے ایک نہایت دقیق امر ہے جس کی تہ کو عوام کے ذہن نہیں پہونچ سکتے، اس لیے یہ علم یعنی علمِ ذات وصفات توقیفی قرار دیا گیا اور آزادانہ بحث وگفتگو کی اجازت اس باب میں نہیں دی گئی۔

اور آلاء اللہ اور آیاتِ قدرت میں سے صرف وہی باتیں بیان کی گئی ہیں جن کو شہری، بدوی اور عرب وعجم یکساں طور پر سمجھ سکیں، لہٰذا نفسانی نعمتیں جو اولیاء اور علماء کے ساتھ مخصوص ہیں اور ارتفاقی لذتیں (۱) جو صرف بادشاہوں کا حصہ ہیں، ذکر نہیں کی گئیں بنا بریں جن نعمتوں کا ذکر مناسب تھا یہ ہیں، مثلاً آسمان وزمین کی پیدائش، بادلوں سے پانی برسانا اور زمین سے پانی کے چشمے جاری کرنا اور اس سے طرح طرح کے پھل پھول اور غلے اگانا اور ضروری صنعتوں کا الہام اور پھر ان کے جاری کرنے کی قدرت بخشنا اور اکثر مقامات میں ہجوم مصائب اور ان کے دور ہونے کے وقت لوگوں کے رویہ کے بدل جانے پر اکثر مقامات میں تنبیہ فرمائی ہے، اس لیے کہ یہ امراضِ نفسانی میں سے کثیر الوقوع ہے۔

اور ایام اللہ یعنی وہ واقعات جن کو خداوند تعالیٰ نے ایجاد فرمایا ہے مثلاً فرمانبرداروں کے لیے انعام، اور نافرمانوں کے لیے عذاب، ان میں سے ایسی جزئیات کو اختیار فرمایا کہ جو پیشتر سے ان کے گوش زد ہو چکی تھی، اور وہ اجمالی طریقہ سے ان کا تذکرہ سن چکے تھے مثلاً قوم نوح وعاد وثمود کے قصے جن کو عرب اپنے باپ دادا سے مسلسل سنتے آئے اور حضرت ابراہیمؑ اور انبیاء بنی اسرائیل کی مختلف داستانیں جن سے بوجہ یہود اور عرب کے قرنہا قرن کے اختلاط کے ان کے کان آشنا تھے، نہ تو غیر مشہور اور غیر مانوس قصوں کو بیان کیا اور نہ فارس ویہود کی جزا وسزا کے واقعات کی خبریں دیں، اور مشہور قصوں میں سے بھی صرف ان ضروری حصوں کو جو تذکیر میں کار آمد ہوں، ذکر

(۱) الارتفاق التدبیر النافع۔

فرمایا ہے اور تمام قصوں کو ان کی تمام خصوصیات کے ساتھ بیان نہیں کیا اس میں حکمت اور مصلحت یہ ہے کہ عوام الناس جب کوئی عجیب وغریب داستان سنتے ہیں یا کوئی داستان اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ ان کے سامنے بیان کی جاتی ہے تو ان کی طبیعت محض اس داستان کی طرف مائل ہو جاتی ہے اور تذکیر کا مقصد جو داستان کے بیان کرنے کی اصل غرض ہے، فوت ہو جاتا ہے۔ اور اس کی مثال ایسی ہے کہ کسی عارف نے کہا ہے "جب سے لوگوں نے تجوید کے قواعد سیکھے ہیں خشوع کے ساتھ تلاوتِ قرآن مجید سے محروم ہو گئے اور جب سے مفسرین نے بعید وجوہ میں موشگافی کی ہے، علمِ تفسیر "النادر کالمعدوم" ہو گیا ہے۔

جو قصے قرآن مجید میں بہ تکرار ہوئے ہیں یہ ہیں، آدم علیہ السلام کی پیدائش زمین سے، ان کو تمام فرشتوں کا سجدہ کرنا، شیطان کا اس سے انکار کر کے ملعون ہونا اور اس کے بعد سے بنی آدم کے اغواء میں سعی کرنا، حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ہود علیہ السلام حضرت صالح علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہم السلام، حضرت لوط علیہ السلام، حضرت شعیب علیہ السلام کا اپنی اپنی اقوام سے توحید اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر میں مباحثات کرنا، اور ان اقوام کی سرکشی، اور رکیک شبہات اور پیغمبروں کے جوابات، اشقیاء پر عذاب الٰہی کا نزول اور خداوندی نصرت کا ظہور، انبیاء اور ان کے پیروؤں کے حق میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مختلف قصے فرعون اور بنی اسرائیل کے نادانوں سے، اور ان کا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جناب میں مکابرہ کے ساتھ پیش آنا، خدا تعالیٰ کا ایک عرصہ تک ان بدبختوں کو عقوبت میں مبتلا رکھنا اور پیہم ان برگزیدۂ حق تعالیٰ کے حق میں ظہورِ نصرتِ خدوندی ہونا، حضرت سلیمان وحضرت داؤد علیہما السلام کا قصہ خلافت اور انکے معجزات اور کرامتوں کے احوال، حضرت ایوب وحضرت یونس علیہما السلام کی شفقت کا واقعہ اور ان پر خداوندی رحمت کے نزول کا ذکر، دعاء حضرت زکریاؑ کا مستجاب ہونا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے عجیب عجیب قصے، ان کا بغیر باپ کے پیدا ہونا اور گہوارہ میں کلام فرمانا اور ان سے خود ان عادات کا ظہور یہ تمام قصے اجمالاً اور تفصیلاً ہر سورہ کے اسلوب کے اقتضاء کے موافق مختلف طریقوں سے بیان کئے گئے ہیں۔

اور جو واقعات فقط ایک یا دو جگہ مذکور ہیں، یہ ہیں، حضرت ادریس علیہ السلام کا آسمان پر اٹھایا جانا، حضرت ابرہیم علیہ السلام کا نمرود سے مناظرہ اور پرندہ کو زندہ کرتے دیکھنا، اور اپنے

فرزند (اسمٰعیل) کو ذبح کرنا اور حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش، ان کو دریا میں ڈال دینا، ان کا ایک قبطی کو قتل کرنا، اور پھر مدین کو فراری، وہاں جا کر نکاح کرنا، اور وہاں سے واپسی میں ایک درخت پر آگ کو روشن دیکھنا اور اس سے باتیں سننا، اور بنی اسرائیل کا گائے کو ذبح کرنے کا قصہ حضرت موسیٰ کا حضرت خضر سے ملاقات کرنا، اور طالوت و جالوت اور بلقیس اور ذوالقرنین اور اصحاب کہف کے قصص اور ان دو شخصوں (۱) کا قصہ جنہوں نے باہم نزاع کیا تھا، اور اصحاب جنت (۲) کا قصہ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تین رسولوں (۳) کا قصہ اور اس مومن کا قصہ جس کو کفار نے شہید کیا تھا، اور اصحاب فیل کا واقعہ پس ان تمام قصوں سے یہ مقصود نہیں کہ صرف ان واقعات سے آگاہی حاصل ہو جائے بلکہ مقصود یہ ہے کہ ان سے سننے والوں کے ذہن شرک اور معاصی کی برائی کی جانب منتقل ہوں، اور وہ کفار پر عذابِ خداوندی کا اور مخلصین کے خدا تعالیٰ کی عنایت سے مطمئن ہونے کا ادراک کریں۔

اور موت اور اس کے بعد واقعات میں سے یہ امور بیان فرمائے، انسانی موت کی کیفیت اور اس وقت کی بے چارگی کا عالم اور بعد موت کے جنت و دوزخ کو سامنے کرنا اور عذاب کے فرشتوں کا آنا، اور علاماتِ قیامت جو بیان کی گئی ہیں وہ یہ ہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان سے نزول، دجال اور یاجوج و ماجوج کا ظہور اور صورِ فنا اور صورِ حشر و نشر اور سوال و جواب اور میزان اور نامۂ اعمال کا دائیں یا بائیں ہاتھ میں لینا اور مومنین کا جنت میں اور کفار کا دوزخ میں داخل ہونا اور دوزخیوں میں پیشواؤں اور مقلدوں کا باہمی تکرار، اور ایک دوسرے کا راہ مارنے سے انکار، اور آپس میں ایک دوسرے کا لعنت ملامت کرنا اور مومنین کا دیدارِ خداوندی کے شرف سے مختص ہونا، اور عذاب کی نوعیتوں کی تعداد کہ وہ بیڑیاں، طوق، کھولتا ہوا گرم پانی، غساق اور زقوم ہے اور نعمتہائے جنت کی انواع کہ وہ حورانِ بہشتی اور عالیشان قصر اور آبِ سرد و شیریں وغیرہ کی نہریں، اور نہایت خوشگوار کھانے اور لباسہائے فاخرہ اور خوش جمال عورتیں اور جنتیوں کی باہمی دل کشا

---

(۱) وقال له صاحبه وهو يحاوره انا اكثر منك مالاً واعز نفراً۔ (سورۂ کہف)۔

(۲) انا بلوناهم كما بلونا اصحب الجنة (سورۂ نون)

(۳) سورۂ یٰسین۔

صحبتیں ہیں، ان قصوں کو مختلف صورتوں میں ان کے اسلوب کے اقتضاء کے حسب حال اجمالاً یا تفصیلاً متفرق طریقہ سے بیان کیا گیا ہے۔ مباحثِ احکام کے لیے قاعدۂ کلیہ یہ ہے کہ چونکہ رسول اللہ ﷺ ملت حنفی (ابراہیم) پر مبعوث ہوئے ہیں اس لیے اس ملت کے طریقوں کا باقی رکھنا ضروری ہے، تاکہ اس کے امہاتِ مسائل میں سواء تخصیص تعلیمات اور اوقات وحدود کی زیادتی وغیرہ کے اور کسی قسم کے تغیرات کا گزر نہ ہو سکے، اور چونکہ عرب کو آنحضرت ﷺ کے ہاتھ سے اور باقی تمام اقالیم کو عربوں کے ہاتھ سے پاک کرنے کا ارادہ فرمایا ہے، اس لیے ضروری ہوا کہ شریعت محمدی کا مواد انہیں کی رسوم وعادات سے لیا جائے اگر کوئی شخص ملت حنفیؑ کے جملہ احکام اور عربوں کے رسوم وعادات دیکھے اور پھر شریعت محمدیؐ پر جو کہ اصلاح وتکمیل کا رتبہ رکھتی ہے ایک غائر نظر ڈالے تو وہ ہر ایک حکم کے لیے کوئی سبب اور ہر امر ونہی کے لیے کسی خاص مصلحت کا ادراک کرے گا، اس کی تفصیل بہت طویل ہے جس کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔

غرضیکہ ملت ابراہیمیؑ کی تمام عبادات میں خواہ وہ طہارت ہو یا نماز، روزہ ہو یا زکوۃ، حج ہو یا ذکر، ایک فتورِ عظیم برپا ہو گیا تھا، کیونکہ اس کے احکام کے اجراء میں تساہل برتا جاتا تھا اور بوجہ اکثر آدمیوں کے ناواقف ہونے کے باہم اختلاف کرتے تھے اور اہلِ جاہلیت نے اس میں تحریف کر دی تھی قرآن مجید نے اس تمام بدنظمی کو دور کر کے کامل اصلاح اور درستی، اور تدبیر منزل کے قواعد میں بھی نقصان وہ رسوم اور ظلم وسرکشی نے بری طرح دخل پا لیا تھا، اور احکام سیاست مُدن بھی بالکل مختلف ہو چکے تھے۔ قرآن مجید نے آ کر ان کے اصول کو بھی منضبط کیا اور ان کی پوری حد بندی فرمائی، اس قسم کے انواع، کبائر اور بہت سے صغائر مذکور ہوئے ہیں، اور مسائل نماز کا اجمالی تذکرہ کیا گیا، اور لفظ اقامت صلوٰۃ بولا گیا ہے، رسول اللہ ﷺ نے اذان وجماعت اور اوقاتِ نماز اور بنائے مساجد سے اس کی تفصیل فرمائی ہے اور مسائلِ زکوۃ بھی مختصر طریقہ سے ذکر کیے گئے جن کی رسول اللہ ﷺ نے تفصیل فرمائی ہے اور روزہ، سورۂ بقرہ میں اور حج کعبہ سورۂ بقرہ اور سورۂ حج میں مذکور ہوا اور جہاد کا سورۂ بقرہ اور انفال اور دوسرے متفرق مقامات پر اور حدود کا سورۂ مائدہ اور نور میں اور میراث کا سورۂ نساء اور نکاح وطلاق کا سورۂ بقرہ اور سورۂ طلاق وغیرہ میں ذکر کیا گیا ہے، جبکہ یہ قسم جس کا فائدہ تمام افراد امت کے لیے عام ہے، ختم ہو گئی تو اس کے بعد دوسری قسم یہ

ہے کہ مثلاً کوئی سوال رسول اللہ ﷺ کی جناب میں پیش کیا گیا اس کا آپ نے جواب فرمایا، یا کسی خاص حادثہ میں جبکہ اہل ایمان نے اپنا جان و مال بے دریغ صرف کیا، اور منافقین نے بخل اختیار کیا، خدا تعالیٰ نے مومنین کی تعریف اور منافقین کی مذمت فرمائی اور ان کو تہدید کی ہے، اور یا کوئی حادثہ مثل دشمنوں پر فتح دینے اور ان کے ضرر سے محفوظ رکھنے کے مانند واقع ہوا ہو تو خدا تعالیٰ نے مسلمانوں پر اس کا احسان جتایا اور ان کو وہ نعمتیں یاد دلائی ہوں، اور یا کوئی ایسی خاص کیفیت پیدا ہوئی جس پر زجر و تنبیہ یا تعریض و ایماء اور یا امر و نہی کی ضرورت تھی اور خدائے تعالیٰ نے اس بارہ میں اس کے مناسب حکم نازل فرمایا، ایسی خاص حالتوں میں مفسر کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان قصوں کو بطریق اختصار بیان کر دے جن کی جانب، اشارہ کیا گیا ہے، سورۂ انفال میں قصۂ بدر کی جانب اور آل عمران میں احد کی جانب اور احزاب میں غزوۂ خندق کی جانب، اور سورۂ فتح میں حدیبیہ کی طرف اور سورۂ حشر میں بھی بنی نضیر کی جانب اشارات کیے گئے ہیں۔ اور سورۂ براءت میں فتح مکہ اور غزوۂ تبوک پر آمادہ کیا گیا ہے اور مائدہ میں حجۃ الوداع کی طرف، اور احزاب میں نکاح حضرت زینب کی طرف اور سورۂ تحریم میں تحریم سریہ(۱) کی طرف، اور نور میں قصۂ افک عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی طرف اور سورۂ جن و احقاف میں جنات کے حضرت کی تلاوت سننے کی طرف، اور براءت میں قصۂ مسجد ضرار کی طرف، اور سورۂ بنی اسرائیل کے شروع میں واقعۂ معراج کی طرف اشارے کیے گئے ہیں، اگر چہ یہ قسم بھی درحقیقت تذکیر بایام اللہ میں داخل ہے، لیکن چونکہ اس کی تعریضات کا حل اصلی قصہ سننے پر موقوف ہے اس لیے اس کو باقی اقسام سے علیحدہ رکھا گیا۔

(۱) سورۂ تحریم میں جس چیز کی حرمت کا ذکر ہے اسکی نسبت روایات مختلف ہیں، ایک روایت یہ ہے کہ ماریہ قبطیہ جو آنحضرتؐ کی کنیز تھیں ان کو کسی ام المؤمنین کے اصرار سے آپ نے حرام کیا تھا۔

باب دوم

وجوہِ خفائے نظم قرآن کے بیان میں اور ان وجوہ کا علاج نہایت وضاحت کے ساتھ

جاننا چاہئے کہ قرآن مجید ٹھیک ٹھیک بلا کسی تفاوت کے محاورہ عرب کے موافق نازل ہوا اور اہلِ عرب اپنی زبان کے سمجھنے میں جو سلیقہ رکھتے تھے اس سے قرآن مجید کے معنی منطوق کو سمجھ لیتے تھے چنانچہ خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے، والکتاب المبین۔ اور قرانا عربیا لعلکم تعقلون واحکمت ایاتہٗ ثم فصلت شارع کی یہ مرضی ہے کہ متشابہاتِ قرآنی کی تاویل اور صفاتِ خداوندی کے حقائق کی صورت آفرینی اور مبہمات کی تعین اور قصوں کی تفصیل میں غور وخوض نہ کیا جائے، یہی وجہ ہے کہ صحابہ رضوان اللہ علیہم رسول اللہ ﷺ کی جناب میں سوالات کم پیش کرتے تھے اور یہی وجہ ہے آنحضرت ﷺ سے سلسلۂ سوالات کچھ کم ہی منقول ہوا ہے لیکن جبکہ اس طبقہ کا دور گزر چکا اور رسومِ تفسیر میں عجمیوں نے دخل دینا شروع کیا، اور نیز وہ پہلی زبان بھی متروک ہوگئی تو اس وقت بعض مقامات پر شارع کی مراد سمجھنے میں دشواری پیدا ہوئی، اور ضرورت پڑی کہ لغت اور علمِ نحو کی چھان بین کی جائے اور سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا، اور تفسیر کی کتابیں شروع ہوئیں، بدیں وجہ ہمارے ذمہ لازم ہے کہ مشکل مقامات اور ان کے امثلہ بیان کر دیں، تاکہ معانیٔ قرآنی میں غور وخوض کے وقت طولِ بیان کی حاجت نہ پڑے اور ان مقامات کو مبالغہ کے ساتھ حل کرنے کے لئے مجبور رہوں۔

کسی لفظ کے معنی معلوم نہ ہونے کا سبب کبھی لفظ نادر کا استعمال ہوتا ہے، اس کا علاج یہ ہے کہ اس لفظ کے معنی صحابہ اور تابعین اور باقی واقف کارانِ معانی سے نقل کئے جائیں، اور کبھی اس کا سبب ناسخ ومنسوخ میں شناخت نہ کر سکنا اور اسباب نزول کا یاد نہ رہنا، اور کبھی مضاف وموصوف وغیرہ کا محذوف ہونا، اور کبھی کسی شے کو کسی شے سے یا کسی حرف کو کسی حرف سے اور یا اسم کو کسی اسم سے یا فعل کو کسی فعل سے یا جمع کو مفرد سے یا مفرد کو جمع سے یا غائب کے اسلوب کو مخاطب سے بدل دینا اس کا باعث ہوتا ہے اور کبھی مستحق تاخیر کی تقدیم یا اس کا عکس، اور کبھی اس کا سبب ضمائر کا انتشار اور ایک لفظ کے متعدد معانی اور کبھی تکرار اور مفید ضروری طوالت ہوتا ہے اور بعض اس کا سبب اختصار اور کسی وقت کنایہ اور تعریض یا تشابہ یا مجاز عقلی کا استعمال ہوتا ہے۔

سعادت مند دوستوں کو چاہئے کہ وہ علمِ تفسیر میں گفتگو کرنے سے پہلے ان امور کی حقیقت اور ان کی بعض مثالوں سے آگاہی حاصل کریں اور مقامِ تفصیل میں رمز واشارہ پر اکتفاء کریں۔

فصل اول

قرآن مجید کے الفاظ نادرہ کی شرح کے بیان میں

غرائب قرآن کی شرح میں بہترین شرح مترجم القرآن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی ہے جو ابن ابی طلحہ کے طریق روایت سے صحت کے ساتھ ہم کو پہونچی ہے، اور غالباً امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی صحیح بخاری میں اس طریق پر اعتماد فرمایا ہے اور اس کے بعد ابن عباسؓ سے ضحاک کے طریق اور نافع ابن الازرق کے سوالات پر ابن عباس رضی اللہ عنہ کے جوابات کا مرتبہ ہے، ان تینوں طریقوں کو علامہ سیوطی نے اپنی کتاب اتقان میں ذکر کیا ہے، اسکے بعد شرح غرائب کا رتبہ ہے جس کو امام بخاری نے ائمہ تفسیر سے نقل کیا ہے، اس کے بعد وہ شروح غرائب قرآنی ہیں جن کو دوسرے مفسرین نے حضرت صحابہ اور تابعین اور تبع تابعین سے روایت کیا ہے، مجھ کو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کے پانچویں باب میں غرائب قرآنی کے تمام معتبر شروح کو مع شانِ نزول بیان کروں، اور اس باب کو ایک مستقل رسالہ قرار دوں تا کہ جو چاہے اس کو اس رسالہ میں شامل کر لے (۱) اور جو چاہے اس کو جداگانہ یاد کر لے، ع وللناس فیما یعشقون مذاھب۔

فائدہ:۔ حضرات صحابہ اور تابعین کبھی لفظ کی تفسیر اس کے معنی لازمی سے کرتے ہیں اور متاخرین لغات کے تتبع اور مواقع استعمال کے تفحص کی بناء پر اس قدیم تفسیر میں شبہات کرتے ہیں، اس رسالہ میں ہماری غرض صرف تفسیر سلف کا کامل اتباع ہے، اور تنقیحات وتنقیدات کے لیے اس مختصر رسالہ کے علاوہ دوسرا موقع ہے، کیوں کہ۔

''ہر سخن وقتے و ہر نکتہ مکانے دارد''

(۱) یہاں حضرت شاہ صاحب نے اپنے رسالہ فتح الخبیر کی طرف اشارہ کیا ہے جو اس مجموعہ رسائل میں شامل ہے۔

فصل دوم

ناسخ و منسوخ کی معرفت فن تفسیر میں ایک ایسا مشکل مسئلہ ہے جس کے اندر بڑی بڑی بحثیں اور بے شمار اختلافات ہیں، اور اس کے اشکال کے اسباب میں سب سے زیادہ قوی سبب متقدمین اور متاخرین کی اصطلاح کا باہمی اختلاف ہے، اس باب میں حضرات صحابہ اور تابعین کے کلام کے استقراء سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ حضرات نسخ کو اس کے لغوی معنی (یعنی ایک چیز کا ازالہ دوسری چیز کے ذریعہ سے) میں استعمال کرتے تھے نہ کہ اصطلاحِ اہل اصول کے موافق، بدیں وجہ ان کے نزدیک معنیٔ نسخ ایک آیت کے بعض اوصاف کا ازالہ کرنا دوسری آیت کے ساتھ ہوگا، یہ ازالۂ اوصاف عام ہے کہ مدت عمل کی انتہا ہو یا کلام کو اس کے متبادر معنی سے غیر متبادر کی جانب پھیر دینا ہو، یا یہ بیان کہ قید سابق اتفاقی تھی، اور یا لفظِ عام کی تخصیص ہو، اور یا منصوص اور مقیس علیہ ظاہری میں امرِ فارق کا بیان، یا جاہلیت کی کسی عادت اور یا شریعتِ سابقہ کا ازالہ ہو۔

چونکہ ان حضرات کے نزدیک نسخ باب وسیع رکھتا ہے، اس لیے عقل کو اس میں جولانی اور اختلاف کی گنجائش مل گئی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ منسوخ آیات کی تعداد پانچ سو تک بیان کرتے ہیں، لیکن اگر مزید غور وخوض کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کی تعداد حد شمار سے باہر ہے۔ مگر متاخرین کی اصطلاح کے موافق آیاتِ منسوخہ کی تعداد کچھ زیادہ نہیں ہے، علی الخصوص اس توجیہ کی رو سے جس کو ہم نے اختیار کیا ہے، علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے بیانِ مذکورہ بالا کو بعض علماء سے لے کر اپنی کتاب میں مناسب بسط کے ساتھ بیان کیا ہے، اور جو آیات متاخرین کی رائے پر منسوخ ہیں ان کو شیخ محی الدین بن عربیؒ کے موافق تحریر کر کے قریباً بیس منسوخ آیتیں گنوائی ہیں، لیکن فقیر کو ان بیس میں بھی اکثر کی نسبت کلام ہے، ہم اس موقع پر علامہ سیوطی کے کلام کو مع اپنے شبہات کے بیان کرتے ہیں، سورۂ بقرہ (۱) کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت، یہ آیت منسوخ ہے اس کے ناسخ کے تعین میں بعض سے منقول ہے کہ آیتِ میراث سے منسوخ ہے اور بعض کہتے کہ حدیث لا وصیة الوارث سے، اور بعض کا قول ہے کہ اجماع سے، یہ ابن عربیؒ نے بیان کیا ہے،

میں کہتا ہوں کہ ایسا نہیں ہے بلکہ یہ آیت یوصیکم اللہ فی اولادکم سے منسوخ ہے، اور حدیث لاوصیۃ اس نسخ کو بیان کرتی ہے، (۲) وعلی الذین یطیقونہ فدیۃ بیان کیا گیا ہے یہ آیت فمن شھد منکم الشھر فلیصمہٗ سے منسوخ ہے اور یہ بھی قول ہے کہ یہ آیت محکمہ ہے اور اس میں لامقدر ہے، میں کہتا ہوں میرے نزدیک ایک دوسرا طریقہ ہے، جو یہ ہے کہ آیت کے معنی ہیں، وعلی الذین یطیقونہ فدیۃ ھی طعام مسکین یعنی جو لوگ کھانا دینے کی طاقت رکھتے ہیں، ان پر فدیہ ہے جو ایک مسکین کا کھانا ہے، یہاں ضمیر کو اس کے مرجع کے پہلے اس لیے ذکر کیا کہ مرجع باعتبار رتبہ کے مقدم ہے اور ضمیر کو اس لیے مذکر لائے کہ درحقیقت فدیہ سے مراد طعام ہی ہے اور طعام سے مراد صدقۃ الفطر ہے، اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے روزوں کے حکم کے بعد صدقۃ الفطر کو اس طرح بیان فرمایا ہے جیسا کہ دوسری آیت فمن شھد منکم الاشھر کے بعد تکبیرات عید (ولتکبروا اللہ علی ماھداکم) (۳) احل لکم لیلۃ الصیام الرفث آیت کما کتب علی الذین من قبلکم کے لئے ناسخ ہے کیونکہ مقتضائے تشبیہ یہ ہے کہ شب کے وقت بھی سوجانے کے بعد کھانے پینے اور وطی کی حرمت میں جو اگلی امتوں پر تھی موافقت ہو، یہ ابن عربیؒ نے ذکر کیا ہے، اور اس کے علاوہ ایک دوسری بات بھی بیان کی ہے جو یہ ہے کہ آیت اس حکم حرمتِ وطی کے لئے ناسخ ہے جو ارشاد نبوی سے ثابت تھا، میں کہتا ہوں کہ کما کتب سے نفس وجوب صوم میں تشبیہ دینا مقصود ہے، نہ کہ نسخ کیونکہ یہاں روزے داروں کے اس حال کو بدلا ہے جو اس اجازت سے پہلے تھا، اور ہم کو کوئی دلیل نہیں ملی جس سے یہ ثابت ہو کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کے حق میں وطی حرام کردی تھی، اور اگر اسے مان بھی لیا جائے تو بس یہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ ثابت بالسنۃ تھا، اس آیت سے اس کی تنسیخ ہوگئی، (۴) یسئلونک عن الشھر الحرام الآیہ وقاتلوا المشرکین کافۃ الایۃ سے منسوخ ہے، اس روایت نسخ کو ابن جریر نے موطا میں میسرہ سے نقل کیا ہے، میں کہتا ہوں کہ یہ آیت مشرکین سے جنگ کی حرمت پر نہیں بلکہ اس کے جواز پر دلالت کرتی ہے، اور یہ آیت اس قبیل سے ہے کہ حکم کی علت کو مان کر اس کے موانع بھی ظاہر کیے جائیں، اب اس آیت کے یہ معنی ہوگئے کہ اگرچہ شہر حرام میں قتال نہایت سخت ہے لیکن فتنۂ کفر و شرک اس سے بھی زیادہ سخت ہے اس لیے اس کی روک تھام کے لیے

جنگ جائز ہے، اور یہ معنی سیاقِ کلام اللہ سے عیاں ہے، کما لا یخفی (۵) والذین یتوفون متاعاً الی الحول تک یہ حکم آیت اربعۃ اشھر وعشراً سے منسوخ ہے اور نسخِ وصیت، آیت میراث سے ہوا، اب صرف سکنیٰ ایک جماعت کے نزدیک باقی ہے اور ایک جماعت کے نزدیک وہ بھی حدیث لاسکنیٰ سے منسوخ ہے، میں کہتا ہوں یہ آیت جیسا کہ علامہ نے بیان کیا جمہور مفسرین کے نزدیک منسوخ ہے اور ممکن ہے کہ اس آیت کے معنی یوں بیان کئے جائیں "وصیت میت کے لیے تو مستحب یا جائز ہے مگر عورت پر زمانہ وصیت میں سکونت واجب نہیں، یہی حضرت ابن عباس کا مذہب ہے اور یہ معنی آیت سے ظاہر ہیں (۱) (۶) قولہٗ تعالی :۔ وان تبدوا ما فی انفسکم او تخفوہ یحاسبکم بہ اللہ، آیت لا یکلف اللہ نفساً الا وسعھا سے منسوخ ہے، میں کہتا ہوں، یہ تخصیص عام کی قسم سے ہے، اور پچھلی آیت نے بیان کردیا کہ ما فی انفسکم سے مراد اخلاص ونفاق ہے نہ خطرات نفس جن پر انسان کا کچھ اختیار نہیں کیونکہ تکلیف شرعی ان ہی چیزوں میں دی گئی ہے جن پر انسان کو قدرت حاصل ہے۔

سورہ آل عمران:۔ اتقوا اللہ حق تقاتہ اس میں دو قول ہیں ایک تو یہ کہ فاتقوا اللہ ما استطعتم سے منسوخ ہے اور دوسرا یہ کہ منسوخ نہیں بلکہ محکم ہے آل عمران میں اس کے سوا اور کوئی آیت نہیں ہے، جس کی نسبت دعوائے نسخ صحیح ہو، میں کہتا ہوں کہ حق تقاتہ سے مراد شرک اور کفر یعنی امور اعتقادیہ میں تقویٰ مراد ہے، اور ما استطعتم میں اعمال ہیں یعنی جس کو وضو کی قدرت نہ ہو وہ تیمم کرلے، اور قیام کی طاقت نہ ہو بیٹھ کر نماز پڑھ لے یہ مضمون سیاق آیت یعنی "ولا تموتن الا وانتم مسلمون" سے ظاہر ہے۔

سورۂ نساء:۔ والذین عقدت ایمانکم فاتوھم نصیبھم اس آیت سے منسوخ ہے واولوا الارحام بعضھم اولی ببعض، میں کہتا ہوں کہ آیت کے ظاہری معنی یہ ہیں کہ میراث مولیٰ کے لیے اور صلۂ نیک مولی الموالات کے لیے ہے، اب نسخ نہیں رہا، (۷) قولہ

---

(۱) اس صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ مرد کے ذمہ اپنی زوجہ کے لیے ایک سال کا نفقہ اور سکنیٰ کی وصیت کرنا ضروری ہے، مگر عورت پر خواہ مخواہ ایک سال تک اس کے گھر میں رہنا ضروری نہیں بلکہ صرف چار مہینے دس دن، اس توجیہ کی بنا پر کوئی آیت منسوخ نہ ہوگی قال بہ ابن عباس والبخاری وابن تیمیہ۔

تعالی اذا حضر القسمة الآیة اسمیں تین قول ہیں ایک یہ کہ منسوخ ہے اور دوسرا یہ کہ منسوخ تو نہیں مگر لوگ اس پر عمل کرنے میں سستی کرتے ہیں، حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ آیت محکم ہے اور اس میں امر استحبابی ہے یہی معنی ظاہر ترین ہیں، (۸) قولہ تعالی والآ تی یاتین الفاحشة الایة آیت نور (۱) سے منسوخ ہے میں کہتا ہوں اس میں نسخ نہیں ہوا بلکہ یہ حکم اپنی نہایت تک پہونچ گیا ہے اور جب اس کی انتہا کا وقت آ پہونچا تو رسول اللہ ﷺ نے راہِ موعودہ کی تفصیل فرمادی کہ یہ ہے تو اب نسخ نہیں رہا۔

سورہ مائدہ:۔ (۹) ولا الشهر الحرام ،شہور محرمہ اباحتِ قتل کے حکم سے منسوخ ہے، میں کہتا ہوں اس آیت کا ناسخ نہ قرآ مجید میں ہے اور نہ حدیث صحیح میں، البتہ اس کے یہ معنی ہیں کہ جو قتال حرام ہے، وہ شہورِ محرمہ میں اور زیادہ سنگین ہو جاتا ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ایک خطبہ میں فرمایا کہ تمہاری جان و مال تم لوگوں کے اوپر اس طرح حرام ہیں جیسے تمہارا یہ دن تمہارے اس مہینہ میں تمہارے اس شہر میں حرمت رکھتا ہے۔ (۱۰) قولہ تعالیٰ فان جاؤك فاحكم بينهم اواعرض عنهم یہ آیت وان احكم بينهم بما انزل الله سے منسوخ ہوئی ہے، میں کہتا ہوں کہ آیت ھذا کے یہ معنی ہیں کہ اگر تجھے خود حکم دینا منظور ہو تو قانونِ خداوندی بما انزل اللہ کے موافق حکم کرنا اور ان کی خواہشوں کی پیروی مت کرنا، الحاصل ہمارے لیے دونوں باتیں جائز ہیں، اگر ہم چاہیں تو ذمیوں کو اجازت دے سکتے ہیں کہ وہ مقدمات کا مرافعہ اپنے عمائد کے یہاں کریں تا کہ وہ اپنے شرائع کے موافق اس کا فیصلہ کردیں اور چاہیں تو ہم خود اپنے منزل من اللہ احکام سے ان کا قضیہ چکا دیں۔

(۱۱) قولہ تعالی واخران من غیرکم منسوخ ہے آیت واشهدوا ذوی عدلٍ منکم سے، میں کہتا ہوں کہ امام احمد کا قول آیت کے ظاہر معنی کے مطابق ہے۔ اور دوسرے ائمہ کے نزدیک اس کے یہ معنی ہیں، اور آخران میں غیر اقاربکم اس توجیہ پر گواہان وصیت مسلمانان غیر قرابت داروں میں ہوں گے۔

سورۂ انفال:۔ (۱۲) ان یکن منکم عشرون صابرون الآیة ، اپنی مابعد والی

(۱) الزانية والزانی فاجلدوا ۔الخ

آیت سے منسوخ ہے۔ میں کہتا ہوں کہ بیشک منسوخ ہے۔

سورۂ براۃ :۔ (۱۳) انفروا خفافاً وثقالاً آیات عذر یعنی لیس علی الاعمیٰ حرج الآیہ اور لیس علی الضعفآءِ سے منسوخ ہے، میں کہتا ہوں مراد خفافا سے یہ ہے کہ ضروریات جہاد (مثلاً) مراکب، غلامانِ خدمت، سامانِ خورونوش کی کم از کم مقدار موجود ہو اور ثقالاً سے کہ یہ اشیاء نہایت وافر ہوں، اب نسخ نہیں رہا اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہاں نسخ متعین نہیں بلکہ دوسرا احتمال بھی موجود ہے۔

سورۂ النور:۔ الزانی لاینکح الا زانیة الایه، یہ آیت وانکحو الایامی منکم سے منسوخ ہے، میں کہتا ہوں کہ امام احمد نے اس آیت کے ظاہری معنیٰ پر حکم دیا ہے اور دوسرے ائمہ کے نزدیک اس کے یہ معنیٰ ہیں کہ مرتکب کبیرہ زانیہ ہی کا ہم کفوء ہے، اور یا یہ کہ زانیہ سے نکاح کرنا مستحب نہیں ہے، اور آیت میں حرّم ذلك سے زنا و شرک کی جانب اشارہ ہے اس لیے نسخ نہیں کہہ سکتے، اور آیت وانکحو الایامی عام ہے، وہ خاص کو منسوخ نہیں کر سکتی، (۱۴) قوله تعالی لیستاذنکم الذین ملکت ایمانکم ۔الآیه اس میں دو قول ہیں، ایک یہ کہ منسوخ ہے دوسرا یہ کہ منسوخ تو نہیں مگر لوگوں نے اس پر عمل کرنے میں تساہل سے کام لیا ہے، میں کہتا ہوں ابن عباسؓ کا مذہب ہے، کہ وہ منسوخ نہیں اور یہی زیادہ قابل اعتبار ہے۔

سورۂ احزاب:۔ (۱۵) لا یحلّ لك النسآء من بعد الآیہ یہ آیت انا احللنا لك ازواجك الآتی سے منسوخ ہے، میں کہتا ہوں ممکن ہے ناسخ باعتبار تلاوت منسوخ سے مقدم ہوا ور میرے نزدیک یہی بات زیادہ ظاہر ہے۔

سورۂ مجادله:۔ (۱۶) اذا ناجیتم الرّسول فقد موا الآیة یہ اپنے بعد والی آیت سے منسوخ ہے میں یہ کہتا ہوں یہ قول ٹھیک ہے۔

سورۂ ممتحنه:۔ (۱۷) فاتو االذین ذهبت ازواجهم مثل ما انفقوا اس آیت میں تین قول ہیں (۱) آیت سیف سے منسوخ ہے۔ (۲) آیتِ غنیمت سے منسوخ ہے، (۳) محکم ہے، میں کہتا ہوں کہ اس کا محکم ہونا ظاہر تر ہے، لیکن یہ حکم صلح اور قوت کفار کے وقت کے لیے خاص ہے۔

سورۂ مزمل:۔ (۱۸) قم اللیل الا قلیلاً ۔ یہ حکم سورۃ کی آخری آیتوں سے منسوخ ہے، اور پھر وہ بھی فرضیتِ نماز پنجگانہ سے منسوخ ہو گیا، میں کہتا ہوں نماز پنجگانہ سے نسخ کا دعویٰ مدلل نہیں ہے، بلکہ حق بات یہ ہے کہ سورۂ مزمل کے ابتدا میں استحبابِ قیام لیل کی تاکید ہے، اور آخر میں صرف اس تاکید کا نسخ کر کے استحباب غیر مؤکد کو باقی رکھا گیا ہے، علامہ سیوطیؒ نے ابن عربیؒ کے ساتھ اتفاق کر کے کہا ہے کہ اکیس آیتیں منسوخ ہیں باوجودیکہ ان میں بھی بعض کی نسبت اختلاف ہے اور ان کے علاوہ اور کسی آیت کے لئے دعوائے نسخ صحیح نہیں اور آیت استیذان اور آیتِ قسمت اور آیت احکام میں عدم نسخ صحیح ہے، اب صرف انیس آیتیں منسوخ رہ گئیں، میں کہتا ہوں ہماری تحریر کے موافق پانچ ہی آیتوں میں نسخ ثابت ہو سکتا ہے۔

علم تفسیر کا دوسرا دشوار ترین مسئلہ معرفتِ اسبابِ نزول ہے اس میں بھی بعض اشکال وہی متقدمین اور متاخرین کی اصطلاحات کا اختلاف ہے، کلامِ حضرات صحابہ اور تابعین رضوان اللہ علیہم کے استقراء سے جس قدر ثابت ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ان کا یہ کہنا نزلت فی کذا (یہ آیت فلاں کے بارہ میں نازل ہوئی) کسی ایسے قصے کے ساتھ مخصوص نہیں ہوتا جو زمانۂ نبوی میں واقع ہو کر نزول آیت کا سبب ہوا۔

ان کی عادت ہے کہ مصداقہائے آیت میں سے کسی ایسے مصداق کو جس کا وجود زمانہ نبوی اور یا اس کے بعد ہوا ہو، ذکر کر کے نزلت فی کذا کہہ دیا کرتے ہیں، ایسے موقع پر تمام قیود کے ساتھ منطبق ہونا کچھ ضروری نہیں ہے ہاں اصل حکم میں انطباق چاہیے اور بس، اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی جناب میں کوئی سوال پیش کیا یا آپ کے زمانۂ مبارک میں کوئی حادثہ واقع ہوا ہو اور آنحضرت ﷺ نے اس کا حکم کسی آیت سے استنباط فرمایا اور اس آیت کو اس موقع پر تلاوت کیا ہو تو ایسے واقعات کو بھی بیان کرتے ہوئے وہ کہہ دیا کرتے ہیں نزلت فی کذا، ایسی خاص صورتوں میں کبھی، ...... فانزل اللہ تعالیٰ قولہٗ کذا یا صرف فنزلت بھی استعمال کرتے ہیں، ان کا یہ کہنا اس بات کا اشارہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کا کسی آیت سے استنباط اور آپ کے قلب مبارک میں اس وقت اس آیت کا القاء بھی وحی اور نفث فی الروح کی ایک قسم ہے، یہی وجہ ہے کہ جو اس موقع پر لفظ فانزلت کا استعمال جائز ہے، اگر کوئی شخص تکرارِ نزول کے

ساتھ اس کو تعبیر کرے یہ بھی ممکن ہے۔

محدثین آیات قرآنی کے ذیل میں ایسی بہت اشیاء ذکر کر جاتے ہیں جو فی الحقیقہ اسباب نزول میں داخل نہیں ہوتیں، مثلاً صحابہ کا اپنے باہمی مناظرات میں کسی آیت سے استشہاد کرنا یا آیت سے تمثیل دینا یا اپنے کلام کے استشہاد میں حضور اکرم ﷺ کا کسی آیت کو تلاوت فرمانا اور یا محدثین کا کسی ایسی حدیث کا روایت کرنا جس کو آیت کے ساتھ اس کی غرض یا موقع نزول یا اسماء مذکورہ فی الآیت کے مبہم کی تعین میں موافقت حاصل ہو، یا کسی کلمۂ قرآنی کے لیے ادائے تحفظ کا طریقہ یا سورتوں اور آیات کے فضائل یا آنحضرتؐ کے امثال امر قرآنی وغیرہ کی صحیح تصویر درحقیقت یہ تمام باتیں اسبابِ نزول میں شمار نہیں ہیں اور نہ ان کا احاطہ کرنا مفسر کی شرائط میں داخل ہے مفسر بننے کے لیے دو چیزوں کی معرفت شرط ہے، ایک وہ واقعات جن کی طرف آیات مشیر ہوں، کیوں کہ ایسی آیات کے ایماء کا سمجھنا بغیر علمِ واقعات کے میسر نہیں آسکتا، اور دوسرے وہ قصے جن سے عام کی تخصیص یا اور کوئی فائدہ حاصل ہوتا ہو مثلاً آیت کو اس کے ظاہری معنیٰ سے پھیرتے ہوں وغیرہ وغیرہ، کیونکہ آیات کے اصل مقصد کا علم ان قصص کی موافقت کے بدون ممکن نہیں۔

یہاں پر یہ جان لینا مناسب ہے کہ حضرات انبیاء سابقین کے قصے احادیث میں کم مذکور ہیں، اور ان کے وہ لمبے چوڑے تذکرے جن کے بیان کرنے کی تکلیف عام مفسرین برداشت کرتے ہیں، وہ سب الا ماشاء الله علماء اہل کتاب سے منقول ہیں، صحیح بخاری میں مرفوعاً مروی ہے، لا تصدقوا اهل الكتب ولا تكذبوهم (تم اہل کتاب کی نہ تصدیق کرو اور نہ تکذیب کرو) اور یہی جان لینا چاہیے کہ حضرات صحابہ اور تابعین مشرکین و یہود کے مذاہب اور ان کی جاہلانہ عادات کے بارہ میں قصہ ہائے مخصوصہ اس لیے بیان فرماتے ہیں کہ وہ عقائد و عادات زیادہ روشن ہو جائیں، اور ایسے موقع پر وہ اکثر کہہ دیتے ہیں نزلت الاية في كذا اس سے ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ فلاں آیت اس طرح کے واقعات کی نسبت نازل ہوئی انکی مراد اس سے عام ہوتی ہے کہ سبب نزول وہی واقعہ ہو یا اس کے مانند اور کوئی، اور یا آیت اس کے قریب نازل ہوئی ہو، اس صورت خاص کے اظہار سے ان کا مقصد اس کی تخصیص کا اظہار نہیں ہوتا، بلکہ فقط یہ غرض ہوتی ہے کہ یہ صورت ان امورِ کلیہ کے لیے (جن کا اظہار و بیان ضروری ہے) ایک اچھی

تصویر ہے، اس لیے بسا اوقات ان کے اقوال باہم مختلف اور اپنی اپنی طرف سے کھینچے ہوئے نظر آتے ہیں حالانکہ حقیقت میں سب کا مطلب ایک ہی ہوتا ہے، حضرت ابو درداءؓ نے جس مقام پر یہ کہا ہے کہ کوئی شخص ہرگز فقیہ نہیں ہوسکتا جب تک اس میں ایک آیت کو متعدد معانی پر حمل کرنے کا ملکہ نہ پیدا ہوجائے وہاں اسی نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔

علیٰ ہذا قرآن مجید میں یہ اسلوب بکثرت اختیار فرمایا گیا کہ دو صورتیں بیان ہوتی ہیں، ایک سعید کی جس کے ذیل میں بعض اوصاف سعادت ذکر کئے جاتے ہیں، اور ایک شقی جس کے تحت میں بعض اوصاف شقاوت کا مذکور ہوتا ہے، مگر ایسے مقامات میں عام طور پر صرف ان اوصاف واعمال ہی کے احکامات کا اظہار منظور ہوتا ہے اور کسی خاص شخص کی جانب تعریض نہیں ہوتی چنانچہ ۲۶ ع میں ارشاد فرمایا۔

ووصینا الانسان بوالدیه احساناً حملته امّهٗ کرها وّوضعته کرھا، اور اس کے بعد شقی اور سعید کی دو صورتیں ذکر فرمائیں اور اسی کے مانند یہ دو آیتیں پ۱۴ کی ہیں، واذا قیل لهم ماذا انزل ربکم قالوا اساطیر الاولین اور وقیل للذین اتقوا ماذا انزل ربکم قالوا خیراً اور آیاتِ ذیل کو بھی اسی قاعدہ پر حمل کرنا چاہیے، ضرب الله مثلاً قریةً کانت اٰمنةً مطمئنّةً اور آیت پ ۲۶ نمبر ۱۴ ھو الذی خلقکم من نفس واحدة وجعل منها زوجها لیسکن الیها فلما تغشّٰھا الآیة پ ۱۸ قد افلح المؤمنون الذین هم فی صلوتهم خشعون اور ولا تطع کل حلافٍ مهین۔

اور اس صورت میں یہ بات کچھ ضروری نہیں ہے کہ بعینہ وہ خصوصیات کسی فرد میں پائی بھی جاتی ہوں، چنانچہ آیت کمثل حبّةٍ انبتت سبع سنابل فی کلّ سنبلة مأة حبةٍ میں لازم نہیں آتا کہ اس صفت کا کوئی بیج پایا بھی جائے، یہاں پر کثرتِ اجر کی تصویر کھینچنے کے سوا اور کچھ مقصود نہیں ہے، اور اگر کوئی صورت اس کے ساتھ اکثر یا تمام خصوصیات میں موافق بھی پائی جاتی ہو تو وہ لزوم مالا یلزم کے قبیل سے سمجھی جائے گی، اور کبھی ظاہر الورود شبہ کو دور کیا جاتا یا کسی قریب الفہم سوال کا جواب محض کلام سابق کے ایضاح مطلب کے قصد سے دیا جاتا ہے، حالانکہ اس زمانہ میں نہ کسی کا کوئی شبہ ہوتا ہے نہ کوئی سوال، بسا اوقات صحابہ ایسے مقام کی تقریر کرتے

ہوئے کوئی سوال بطور خود تجویز کر لیتے اور مطلب کو سوال و جواب کی صورت میں بیان فرماتے ہیں اور اگر بغرض تحقیق خوب چھان بین کی جاتی تو یہ تمام کلام باہم متصل اور مربوط معلوم ہوتا ہے جس میں ترتیب نزول کے اعتبار سے قبلیت اور بعدیت کی گنجائش نہیں ہے، اور ایک ایسا منتظم جملہ نظر آتا ہے جس کی قیود کا تجزیہ کسی قاعدہ پر نہیں ہوسکتا بعض اوقات صحابہ تقدم و تاخر کا ذکر کرتے ہیں ،اور اس سے ان کی مراد تقدم و تاخر باعتبار مرتبہ کے ہوتا ہے چنانچہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے آیت والذین یکنزون الذھب والفضۃ میں کہا ہے، (۱)ھذا قبل ان تنزل الزکوۃ فلما نزلت جعلھا اللہ تعالی طھرۃ للاموال یہ معلوم ہے سورہ براۃ (جس میں آیت ہے) سب صورتوں سے بعد میں نازل ہوئی اور یہ آیت ان قصص میں ہے جو سب میں متاخر ہیں اور زکوۃ کی فرضیت اس سے سالہا سال پہلے ہو چکی ہے۔ لیکن ابن عمرؓ کی مراد یہ ہے کہ اجمال مرتبۂ تفصیل سے مقدم ہے۔

بالجملہ جو امور مفسر کے لیے شرط ہیں وہ ان دونوں نوعوں سے زیادہ نہیں ہیں ایک غزوات وغیرہ کے قصے جن کی خصوصیات کی جانب مختلف آیتوں میں ایسی تعریضات ہیں کہ تا وقتیکہ ان واقعات کا علم نہ ہو اسوقت تک آیات کی حقیقت تک رسائی ممکن نہیں ہوسکتی، اور دوسرے بعض قیود کے فوائد اور بعض مقامات میں تشدد کے ایسے اسباب جن کا علمِ کیفیت نزول کی معرفت پر موقوف ہوتا ہے اور یہ بحث اخیر دراصل فنون توجیہ میں سے ایک فن ہے اور توجیہ کے معنیٰ ہیں صورت کلام کا بیان اور اس کلمہ (تعریف توجیہ) کا حاصل یہ ہے کہ کبھی کسی آیت میں کوئی شبہ پیدا ہوتا ہے یا تو اس صورت کے استبعاد کی وجہ سے جو مدلول آیت سے آیا دو آیتوں کے باہمی تناقض سے، اور یا اس وجہ سے مبتدی کے ذہن پر مصداقِ آیت کا تصور دشوار ہوتا ہے یا کسی قید کا فائدہ اس کے ذہن نشین نہیں ہوتا، ان صورتوں کے پیدا ہونے پر جب مفسر ان اشکالات کو حل کرتا ہے تو اس کا نام توجیہ رکھا جاتا ہے مثلاً آیت یا اخت ھارون میں سوال کیا گیا کہ حضرت موسیٰ و حضرت عیسیٰ علیہما السلام کے درمیان میں ایک طویل مدت کا فاصلہ ہے تو کیونکہ ہوسکتا ہے کہ ہارون مریم علیہا السلام کے بھائی ہوں، گویا کہ سائل نے اپنے ذہن میں یہ ٹھہرا لیا تھا کہ یہ ہارون (جو آیت میں مذکور ہیں وہی

(۱) یہ نزولِ زکوۃ سے پہلے ہے پس جبکہ زکوۃ نازل ہوئی تو خداوند تعالیٰ نے اس کو مالوں کے لیے پاکی بنایا۔

حضرت موسیٰ کے بھائی ہیں، اس پر رسول اللہ ﷺ نے جواب دیا کہ بنی اسرائیل اپنی اولاد کے نام ایسے صلحاء کے نام پر رکھا کرتے تھے جوان سے پہلے گزر چکے اور مثلاً آپ سے سوال کیا گیا کہ محشر میں آدمی منہ کے بل کس طرح چلیں گے آپ نے فرمایا، ان الذی امشاہ (۱) فی الدنیا علی رجلیه لقادرٌ ان یمشیه علیٰ وجهه اور مثلاً ابن عباسؓ سے سوال کیا گیا کہ ایک آیت میں لا یتسآئلون ہے) اور دوسری میں واقبل بعضهم علی بعضٍ یتسائلون، ان دونوں میں صورت تطبیق کیا ہے، انہوں نے جواب دیا کہ عدم سوال میدان حشر میں اور سوال جنت میں جانے کے بعد ہوگا، حضرت عائشہؓ سے پوچھا گیا کہ صفا و مروہ کے درمیان اگر سعی واجب ہے تو لفظ لا جناح (گناہ نہیں) کیوں فرمایا گیا، انھوں نے فرمایا کہ اس وقت ایک جماعت نے گناہ سمجھ کر اس سے پرہیز اختیار کیا تھا اس لیے لا جناح فرمایا گیا، حضرت عمرؓ نے رسول اللہؐ سے دریافت کیا کہ قید ان خفتم کے کیا معنی ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ صدقةٌ تصدق الله بها (یعنی ہم بندے کے صدقہ میں تنگی روا نہیں رکھتے) ایسے ہی خدا تعالیٰ نے اس قید کو تنگی (احتراز) کے لیے ذکر نہیں فرمایا بلکہ یہ قید اتفاقی ہے، علم تفسیر میں توجیہ کی مثالیں بکثرت ہیں اور ہمارا مقصود تنبیہ ہے۔

ہم کو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جن اسباب نزول اور توجیہاتِ مشکل کو بخاری اور ترمذی اور حاکم نے اپنے اپنے ابواب تفسیر میں اسناد صحیحہ سے صحابہ یا رسول اللہ تک پہنچایا ہے ہم بھی ان کو بطور تنقیح و اختصار باب پنجم میں نقل کریں، اس سے دو فائدے ہوں گے، اول یہ معلوم ہو جائے گا کہ اتنے آثار کا حفظ کرنا مفسر کے لیے ضروری ہے، چنانچہ غرائب قرآن کی شرح جس قدر ہم نے ذکر کی ہے وہ نہایت ضروری ہے دوسرے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ اکثر اسبابِ نزول کو آیات کے معانی دریافت کرنے میں کسی قسم کا دخل نہیں البتہ صرف ان قصص کو کچھ دخل ہے جن کا ان ہرسہ تفاسیر میں ذکر ہے جو محدثین کے نزدیک صحیح تر ہیں، اور محمد بن اسحاق واقدیؒ اور کلبیؒ نے قصہ آفرینی میں جس قدر افراط کی ہے (یعنی وہ ہر ایک آیت کے تحت میں ایک قصہ لائے ہیں) محدثین کے نزدیک ان کا اکثر حصہ صحیح نہیں ہے، اور ان کے اسناد میں نقصانات ہیں، ان

---

(۱) جس نے دنیا میں انسان کو پاؤں کے بل چلایا وہ بلاشبہ اس پر قادر ہے کہ اس کو منہ کے بل چلا دے۔

لوگوں کے افراط کو علم تفسیر کے لیے شرط سمجھنا صریح غلطی ہے، اور اس کے حفظ پر فہم کتاب اللہ کو موقوف خیال کرنا دراصل کتاب اللہ سے اپنا حصہ کھونا ہے، وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت وھورب العرش العظیم۔

فصل سوم

اس باب کے باقی مباحث کے بیان میں

جو اشیاء کلام میں خفا پیدا کرتی ہیں یہ ہیں، (۱) کلام سے بعض اجزاء یا حروف کا حذف کرنا، (۲) دوسرے ایک شے کو دوسری شے سے بدلنا (۳) مستحق تاخیر کی تقدیم (۴) مستحق تقدیم کی تاخیر (۴) متشابہات تعریضات، کنایات کا استعمال، علی الخصوص معنی مقصود کی تصویر ایسی محسوس صورت کے ذریعہ سے جو عادۃً ان معانی کے لیے لازم ہو کر کھینچنا، (۶) استعارہ مکنیہ اور مجاز عقلی کا استعمال۔

ہم مختصر طور پر ان اشیاء کی بعض مثالیں اس غرض سے بیان کرتے ہیں کہ طالب کو ایک قسم کی بصیرت حاصل ہو جائے۔

حذف: اس کی کئی قسمیں ہیں۔ مثلاً حذفِ مضاف یا حذفِ موصوف یا حذفِ متعلق وغیرہ

حذف کی مثالیں:

مثال (۱) پ ر ۲ ولکنّ البر من اٰمن ای بِرُّ من اٰمن، لیکن نیکی اس شخص کی ہے جو ایمان لایا۔

مثال (۲) پ ر ۱۵ ۶۔ واٰتینا ثمود الناقة مبصرة ای آیة مبصرة لا انها مبصرة غیر عمیاء۔ — اور ہم نے ثمود کو کھلا ہوا معجزہ دیا تھا، یعنی نشانی کھلی ہوئی۔

مثال (۳) پ ۱ رکوع ر ۱۱ واشربوا فی قلوبھم العجل ای حب العجل — اور وہ اپنے دلوں میں بچھڑے کی محبت پلائے گئے۔

مثال(۴)پ ۱۵ رکوع ۲۲ اقتلت نفساً زكيتةً ،بغير نفسٍ اى بغير قتل النفس او فسادٍ اى بغير فساد	کیا تو نے ایک نفس معصوم کو بغیر نفس کے، قتل کیا یعنی بدون قتل نفس کے بغیر فساد کے
مثال(۵)من فى السموت والارض اى من فى السموت ومن فى الارض لان شيئاً واحداً هوَ فى السموت والارض۔	جو شخص کہ آسمانوں اور زمین میں ہیں یعنی جو شخص کہ آسمانوں اور جو شخص زمین میں ہے، کیونکہ شے واحد ہی آسمانوں اور زمین میں ہے۔
مثال(۶)پ ۱۵ ع ۸: ضعف الحياة وضعف المماة اى ضعف عذاب الحياة وضعف عذاب الممات .	دونا زندگی کا اور دونا موت کا یعنی دو ناعذاب زندگی اور دونا عذاب موت کا۔
مثال(۷)پ ۱۳ ع ۴ واسئال القرية اى اهل القرية	اور گاؤں سے سوال کر یعنی گاؤں والوں سے سوال کر۔
مثال(۸)پ ۱۳ رکوع ۸ بدّلو انعمة الله كفراً اى فعلو امكان شكرنعمته الله كفراً۔	اللہ کی نعمت کو کفر سے بدلا یعنی بجائے شکر نعمت اللہ کی انہوں نے کفر کیا۔
مثال(۹)پ ۱۵ رکوع ۱ يهدى للتى هى اقوم اى للخصلة التى هو اقوم۔	البتہ وہ ہدایت کرتا ہے اس کی طرف جو سیدھا ہے، یعنی اس خصلت کی طرف جو سیدھی ہے ہدایت کرتا ہے۔
مثال(۱۰)پ ۱۴، ع ۲۲: بالتى هىَ احسن بالخصلة التى هى احسن۔	یعنی ساتھ اس خصلت کے جو احسن او زیادہ عمدہ ہے۔

مثال پ/۷، ع/۷ سبقت لهم منّا الحسنٰی ای الکلمة الحسنٰی والعدة الحسنٰی۔
ان کے لیے ہماری طرف سے حسنٰی یعنی کلمۂ حسنٰی یا وعدۂ حسنٰی نے سبقت کی۔

مثال پ/۱، ع/۱۲ علی ملك سلیمان ای علی عهد ملك سلیمان
حضرت سلیمان علیہ السلام کی حکومت کے زمانے میں

پ/۴۔ ع/۱: وعدتنا علی رسلك ای علی السنة ورسلك،
تو نے ہم سے اپنے رسولوں کی زبان پر وعدہ کیا ہے، اس مثال میں رسلک سے پیشتر السنہ جو مضاف ہے، محذوف ہے۔

انا انزلنه في ليلة القدر ای انزلنا القرآن وان لم یسبق له ذکر۔
ہم نے قرآن شریف کو شبِ قدر میں نازل کیا۔

پ/۲۳، ع/۱۲: حتی توارت بالحجاب ای توارت الشمس
یہاں تک کہ سورج پردہ میں چھپ گیا۔

پ/۲۰، ع/۱۱: ومایلقاها ای خصلة الصبر۔

پ/۶، ع/۱۳: وعبد الطاغوت فیمن قرأ بالنصب ای جعل منهم من عبد الطاغوت۔

اس مثال میں ظاہر کیا گیا ہے کہ حرف جار محذوف ہے۔

پ/۱۹، ع/۱۳: فجعله نسباً وصهراً ای جعل له نسباً و صهراً

اس مثال میں مفعول سے پیش تر حرف جر محذوف نکالا گیا ہے۔

پ/۹، ع/۹: واختار موسی قومه ای من قومه اور موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے اختیار فرمایا یہ مثال بھی نزع خافض یعنی خلاف جر کی ہے۔

پ/۸، ع/۵: الآ ان عاداً کفروا ربهم ای کفروا نعمة ربهم اوکفروا بربهم بنزع الخافض
مگر تحقیق قوم عاد نے اپنے رب کا کفر کیا یعنی نعمتوں کا کفر کیا، یا خدا کے ساتھ کفر کیا، اس مثال میں یا مضاف یعنی نعمت یا حرف جر یعنی با محذوف ہے۔

پ۱۳، ع۴: تفتؤ ای لا تفتؤا ومعناه لاتزال — ہمیشہ رہے تو اس مثال میں لفظ لا محذوف ہے۔

پ۲۳، ع۱۵: ما نعبدھم الا لیقربونآ الی اللہ زلفی ای یقولون مانعبدھم۔ — کہتے ہیں کہ ہم ان کی عبادت صرف اسلئے کرتے ہیں تاکہ ہم کو اللہ سے نزدیک کریں اس مثال میں یقولون محذوف ہے

پ۹، ع۹: ان الذین اتخذوا العجل ای اتحذوا العجل الھاً — تحقیق ان لوگوں نے کہ بچھڑے کو معبود بنالیا ہے، یہ مثال حذف مفعول کی ہے۔

پ۲۳، ع۶: تاتوننا عن الیمین ای وعن الشمال — تم ہمارے پاس داہنے اور بائیں لے آتے تھے...... یہ مثال حذف معطوف کی ہے۔

پ۲۷۔ ع۲: لو نشاء لجعلنا منکم ملٰئکۃ ای بدلاً منکم — اگر ہم چاہتے البتہ تم سے یعنی تمہارے بدلے فرشتے کرتے، یہ مثال حذف معطوف کی ہے۔

پ۲۷، ع۱۵: فظلتم تفکّھون انا لمغرمون ای یقولون انا لمغرمون — اور تم باتیں بناتے رہ جاؤ کہ ہم تاوان میں آگئے، یہ مثال حذفِ قول کی ہے۔

پ۹، ع۱۵: کمآ اخرجك ربك. ای امض۔ — جس طرح تجھے تیرے رب نے نکالا۔

جاننا چاہئے کہ حذفِ خبر انّ یا حذف جزائے شرط یا حذفِ مفعول، یا حذف مبتداء وغیرہ (جس وقت ان کا مابعد حذف کی جانب مشیر ہو) قرآن مجید میں عام طور پر شائع ہے۔

پ۱۸، ع۹: فلو شاء لھداکم ای لوشاء ھدایتکم لھداکم — اگر خدا چاہتا البتہ تم کو ہدایت کرتا یعنی اگر تمہاری ہدایت چاہتا البتہ ہدایت کرتا مثال ہذا میں مفعول حذف ہو رہا ہے۔

مثال حذف مبتداء

پ۱۱، ع۵: الحق من ربك ای ھذا الحق من ربك — یعنی حق تیرے رب سے ہے یعنی یہ حق تیرے رب سے ہے۔

پ۲۷،ع۷: لایستوی منکم من انفق من قبل الفتح وقاتل اولٰئك اعظم درجة من الّذین انفقوا من بعد وقاتلوا ای لایستوی من انفق من قبل الفتح و من انفق بعد الفتح فحذف الثانی لدلالة قوله اولٰئك اعظم درجة من الذین انفقوا من بعد۔ یہ مثال حذف خبر جملہ کی ہے۔

نہیں برابر ہے تم سے وہ شخص جس نے پہلے فتح سے خرچ کیا اور مقاتلہ کیا وہ باعتبار درجہ کے اعظم ہے ان لوگوں سے جنہوں نے بعد فتح خرچ کیا اور مقاتلہ کیا یعنی نہیں برابر وہ شخص جس نے پہلے فتح سے خرچ کیا اور جس نے بعد کو خرچ کیا پس دوسرا یعنی من انفق من بعد الفتح بوجہ دلالت آیت بالا حذف کر دیا گیا۔

پ۲۳،ع۲: واذا قیل لھم اتقوا ما بین ایدیکم و ماخلفکم لعلکم ترحمون وما تاتیھم من اٰیات ربھم الا کانو عنھا معرضین ای اذاقیل لھم اتقوامابین ایدیکم وما خلفکم عرضوا.

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آفتیں تم کو تمہارے آگے اور تمہارے پیچھے سے گھیرے ہوئے ہیں ان سے بچو تاکہ تم پر رحم کیا جائے، تو اس کی وہ مطلق پروا نہیں کرتے اور ان کے پروردگار کی کوئی سی نشانی ان کے پاس آوے مگر وہ اس سے منہ موڑتے ہیں۔

اس مثال میں اعرضوا محذوف ہے، جس پر آیت متأخرہ دلالت کر رہی ہے۔

اور نیز جاننا چاہیے کہ اذ قال ربك للملٰئكة اور اذ قال موسیٰ کی مثال میں لفظ اذ حقیقة ظرفِ فعلی ہے لیکن بعد میں اس کو تہویل و تخویف (ڈرانے ودھمکانے) کے معنی میں نقل کر لیا گیا ہے اور اسی کے مانند یہ بھی ہے کہ مثلاً کوئی شخص خوفناک مواضع یا واقعات کو اس طرح گنواتا ہے کہ نہ ان میں جملہ کی ترکیب دیتا ہے اور نہ ان کے اعراب ہی کہتا ہے کیونکہ وہ ان واقعات یا مواضع کو اس واسطے ذکر کرتا ہے کہ ان کی صورت ذہن سامع میں اچھی طرح جم جائے اور ان کے ذریعہ سے اس کے قلب پر ایک گہرا خوف چھا جائے۔ ایسے مقامات کے لیے تحقیق یہ ہے کہ ان میں عامل کی جستجو

ضروری نہیں واللہ اعلم۔

جاننا چاہیے کہ آن مصدریہ کے شروع سے کلمۂ جارّہ کو حذف کرنا کلام عرب میں شائع ہے اس کے معنی کبھی لاَن اور کبھی باَن اور کبھی وقت ان ہوتے ہیں اور نیز جاننا چاہیے کہ ولو تری اذالظلمون فی غمرات الموت ولویری الذین ظلموا کی امثال میں اصل یہ ہے کہ شرط محذوف کا جواب ہوتا ہے، مگر اہلِ عرب نے اس قسم کی ترکیب کو معنی تعجب کے لیے نقل کرلیا ہے اس لیے یہاں شرط محذوف کے تلاش کی کوئی حاجت نہیں رہی، واللہ اعلم۔

ابدال ایک کثیر الانواع تصرف کا نام ہے، ابدال میں کبھی ایک فعل کو دوسرے کی جگہ میں مختلف اغراض کے لیے رکھتے ہیں، ان اغراض کا احاطہ کرنا اس کتاب کا مقصد نہیں ہے۔

پ ۱۷/۸ھذاالذی یذکر الھتکم ای یسبّ الھتکم.	یعنی کیا یہ وہی شخص ہے جو تمہارے معبدوں کو ذکر کرتا یعنی گالی دیتا ہے۔

یہ کلام اصل میں اس طرح تھا، ھذا الذی یسب الھتکم

لیکن چونکہ لفظ سب کا ذکر کرنا مکروہ معلوم ہوا اس لیے اس کے بدلے لفظ ذکر لائے اس قسم کے محاورات عرف عام میں شائع ہیں مثلاً کہا جاتا ہے کہ فلاں صاحب کے دشمن بیماری میں مبتلا ہوگئے یا بندگان جناب یہاں تشریف لائے یا بندگانِ عالی جناب اس امر سے واقف ہیں اس کا مطلب یہی ہے کہ فلاں صاحب بیمار ہوگئے اور آپ یہاں تشریف لائے اور آپ اس امر سے واقف ہیں۔

مثال ثانی پ ۱۸، ع ۴: منا لا یُصعبون. اے منا لا ینصرون چونکہ نصرت بلا ملاقات وصحبت نہیں ہوسکتی اس لیے یصحبون اس کے بدلے لائے۔

پ ۹، ع ۱۳: ثقلت فی السّمٰوٰت والارض ای خفیت لان الشئ اذا خفی علمہ ثقل علی السموٰتِ والارض۔	ثقیل ہوئی یعنی قیامت آسمانوں اور زمینوں میں پوشیدہ ہوئی کیونکہ جب کسی کا علم پوشیدہ ہوا کرتا ہے تو آسمان اور زمین والوں پر دشوار ہوتا ہے۔

پ۴/، ع ۲/:فان طبن لکم شیٔ منه نفساً ای عفون لکم من شیءٍ من طیبةٍ من نفوسهنّ۔ | اگر تم کو بطیّبِ خاطر کچھ معاف کر دیں، اور کبھی ایک اسم کو دوسرے اسم کے مقابل لاتے ہیں۔

پ۱۹/، ع ۵/:فظلت اعناقهم لها خاضعین ای خاضعة ،فکانت من القانتین ای من القانتات۔ | پس ہوگئیں گردنیں ان کی واسطے ان کے، جھکنے والی اسے خاضعۃ، پس ہو گئے قنوت کرنے والوں سے۔

۳۔۱۱ ومالهم من ناصرین ای من ناصر ،اور نہیں ان کے لئے کوئی مددگار نہیں۔

۴۔۲۹ فما منکم من احدٍ عنه حاجزین ای حاجز، پس نہیں کوئی تم میں سے اسے روکنے والا۔

والعصر ان الانسان لفی خسرٍ | قسم ہے عصر کی تحقیق انسان البتہ نقصان میں ہے اے افراد بنی آدم۔

یہاں انسان کو مفرد اس لیے لائے کے وہ اسم جنس ہے۔

یا ایها الانسان انك کادِحٌ الی ربك کذحاً المعنی یا بنی ادم انکم۔ | اے آدم زاد تو اسی طرح گھسٹ گھسٹ کر اپنے پروردگار کی طرف چلا جارہا ہے۔

یہاں پر بھی لفظ انسان کے مفرد لانے کی وہ ہی وجہ اسم جنس ہوتا ہے وحملها الانسان یعنی بنی آدم کذبت قوم نوح اِلمرسلین ای نوحاً وحدهٗ کیونکہ تمام رسول وحدانیت کی تعلیم کرتے ہیں تو گویا ایک کی تکذیب تمام کی تکذیب ہے، انّا فتحنا لك بجائے انی فتحت لك انا لقادرون ای انی لقادرولکن الله یسلط رسله یسلط محمداً علیہ یعنی محمدؐ کے رسل لائے ہیں،اَلّذین قال لهم الناس اور عروة الوثقی وحدهٗ یہاں اسم جنس سے خاص فرد یعنی عروۃ الوثقی مراد ہے اور الناس بجائے اس کے مستعمل ہے۔

پ۱۴/، ع ۲۱/:فاذاقها الله لباس الجوع ۔یعنی ذائقہ جزع اور گھبراہٹ کا یہاں پر طعم کو لباس سے اس لیے بدلا گیا ہے تا کہ ظاہر ہو جائے کہ لاغری اور پژمردگی انسان کے لیے بھوک کا اثر ہے جو تمام بدن کو مثل لباس کے عام اور شامل ہوتی ہے۔

پ۱، ع۱۶: صبغة الله ای دین الله ، یہاں پر دین کو صبغۃ سے اس لیے بدلا ہے تا کہ ظاہر ہو جائے کہ دین سے نفوس ایسے رنگے جاتے ہیں، جیسا رنگ سے کپڑا یا قول نصاریٰ کی مشاکلت ہے کہ وہ بوقت ولادت رنگ میں غوطہ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دین میں داخل ہو گیا، وطور سینین ای طور سینا سلا م علی الیاسین ای علی الیاس دونوں اسم رعایت قافیہ کی وجہ سے بدلے گئے ہیں۔

اور کبھی کسی حرف کو دوسرے حرف کی جگہ لاتے ہیں۔

أمثلہ پ۹، ع۷: فلمّا تجلّی ربه للجبل ای علی الجبل کوہ طور پر تجلی ربانی کی وہی صورت تھی جو اس سے پہلے شجر پر ہو چکی ہے، هم لها سابقون الیها السابقون بجائے الی کے لام آیا ہے۔

پ۱۹ ع۱۶ لا یخاف لدیَّ المرسلون الا من ظلم ای لکن من ظلم استیناف یعنی علیحدہ کلام ہے، لا صلبنکم فی جزوع النخل بجائے علی فی آیا ہے ام لهم سلم یستمعون فیه ای یستمعون علیه یہاں پر بھی فی علی کی جگہ آیا ہے، الاسماء منفطر به ای منفطر فیه بجائے فی کے با لائے ہیں، متکبرین به ای عنه یہاں عن با سے بدلا گیا ہے اخذته العزة بالاثم حلمته العزة علی الاثم یہاں با علیٰ کے بجائے آئی ہے، اخذ بمعنی حمل ہے فاسأل به خبیراً ای فاسال عنه یہاں عن کی جگہ با آیا ہے لا تاکلوا اموالهم الی اموالکم ای مع اموالکم الی المرافق ای مع المرافق ہر دو مثال میں الی مع کی جگہ مستعمل ہوا ہے، یشرب بها عباد الله یشرب منها با من جگہ لائی گئی ہے وماقدروا الله حق قدره اذقالوا ما انزل الله علی بشرٍ من شئٍ ای ان قالوا یہاں اذ بجائے ان لایا گیا ہے اور کبھی کسی جملہ کو دوسرے جملہ کی جگہ رکھتے ہیں، مثلاً اگر ایک جملہ دوسرے جملہ کے حاصل معنی اور اس کے وجود کے سبب پر دلالت کرتا ہے تو ایسے موقع پر جملہ اولیٰ کو دوسرے جملہ سے بدل دیا جاتا ہے۔

مثلاً پ۲، ع۱۲: وان تخالطوهم فاخوانکم ای ان تخالطو هم لا باس بذلك کیونکہ وہ تمہارے بھائی ہیں اور بھائی کی شان باہمی مخالطت اور میل جول ہے مثال ہذا میں

چونکہ فاخوانکم، لاباس کے حاصل معنی پر دلالت کرتا ہے لہٰذا بجائے لا باس بذلك فا خوانكم في الدين لے آئے۔

پ ۱/ ، ع ۱۲: لمثوبة من عبد الله خير اى لوجدوا ثواباً مثوبة من عند الله خيرا، اس آیت میں بھی لمثوبة چونکہ لوجدوا کے حاصل معنی پر دلالت کرتا ہے لہٰذا اولیٰ بجائے ثانیہ کے رکھا گیا۔

پ ۱/ ، ع ۱۲: ان يسرق فقد سرق اخٌ له من قبل اى ان سرق فلا عجب لانه سرق اخٌ له من قبل اس آیت میں بھی آیت ثانیہ سے چونکہ وہ معنی سمجھے جاتے تھے اس لئے جملہ اولیٰ کی ضرورت نہ رہی، من كان عدواً لجبريل فانّه نزله على قلبك باذن الله اى من كان عدواً لجبريل فانّ الله عدوله یعنی جو شخص جبریل کا دشمن ہے تحقیق اللہ اس کا دشمن ہے کیونکہ جبریل تیرے قلب پر اسی کے حکم سے نازل کرتا ہے پس جبریل کا دشمن اس امر کا مستحق ہے کہ اللہ اس سے دشمنی کرے، یہاں آیت ثانیہ کی وجہ سے فان الله عدو له حذف کر دیا ہے اور اس کو بدل فانه نزله على قلبك لائے ہیں۔

اور بعض اوقات ابدال کی یہ صورت ہوتی ہے کہ اصل کلام تنکیر کو چاہتا ہے لیکن اس میں لام یا اضافت کو داخل کر کے تصرف کرتے ہیں، مگر وہ کلام اپنی اسی سابق تنکیر پر رہتا ہے۔

پ ۲۵/ ، ع ۱۲: وقيلهٖ يارب اى قيل له يارب قيله يارب سے اس لیے بدلا گیا ہے کہ یہ لفظ اس کے اعتبار سے زیادہ مختصر ہے حق اليقين اى حق يقين اس لیے اضافت کیا گیا ہے کہ تلفظ میں زیادہ آسان ہے، اور کبھی کلام کی صفت طبعی کا اقتضاء تذکیر ضمیر یا تانیث یا افراد ہوتا ہے مگر اس کو اقتضاء طبعی سے ہٹا کر مذکر کے بدلے مؤنث اور مؤنث کے بدلے مذکر اور مفرد کے عوض جمع صرف معنوں کا خیال کر کے لاتے ہیں، مثلاً فلما راى الشمس بازغة قال هذا ربى هذا اكبر، ما من القوم الظلمين اس آیت میں اس اشارہ مذکر بجائے مؤنث کے استعمال کیا گیا ہے، مثلهم كمثل الذى استوقد ناراً فلمّآ اضآء ت ماحوله ذهب الله بنورهم اس آیت میں ضمیر جمع بجائے ضمیر مفرد لائے ہیں اور کسی وقت بجائے تثنیہ کے مفرد ذکر کرتے ہیں، جیسے ما نقموا الآ ان اغنهم الله ورسوله من فضلهٖ میں ان كنت على

بينة من ربى واتانى رحمة من عنده فعميت عليكم اصل میں فعميتا تھا، مفرد اس لئے لائے کہ دونوں مثل شے واحد کے ہیں، اور اسی کے مثل الله ورسوله اعلم ہے۔

اور کبھی کلام کی صفتِ طبعی کا اقتضاء ہوتا ہے کہ جزا کو صورتِ جزا میں اور شرط کو صورت شرط میں اور جواب قسم کو اس کی اصلی صورت میں ذکر کیا جائے کسی خاص معنی کی جانب میلان کی وجہ سے اس میں تصرف کرتے اور ان اجزاء کو مستقل بنا دیتے ہیں، اور ساتھ ہی ایک قرینہ بھی قائم کر دیتے ہیں تا کہ وہ اس کے اصل (عدم استقلال) کی جانب کسی نہ کسی طریقہ سے دلالت کرتا ہے، والنازعات غرقاو الناشطات نشطاوّ السابحات سبحاً فالسابقات سبقاً فالمُدبّرات امراً يوم ترجف الراجفة معنی یہ ہیں کہ حشر ونشر حق ہے يوم ترجف اس پر دلالت کرتا ہے، والسماء ذات البروج واليوم الموعود وشاهدٍ ومشهودٍ قتل اصحاب الاخدود النار معنی یہ ہیں کہ اعمال کی مجازاۃ حق ہے اذا السماء انشقت واذنت لربها وحقت واذاالارض مدت والقت مافيها وتخلت واذنت لربها وحقت يا ايها الانسان معنی یہ ہیں کہ حساب اور جزا ہونے والے ہیں۔

اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اسلوب کلام کو منقلب کر دیا جاتا ہے مثلاً اسلوب کلام خطاب کو مقتضی ہوتا ہے اور غائب لے آتے ہیں جیسا کہ حتى اذا كنتم فى الفلك وجرين بهم بريح طيبة میں بهم بجائے بکم کے لایا گیا ہے اور کبھی انشا کو خبر کے اور خبر کو انشا کی جگہ استعمال کرتے ہیں۔

مثال پ ۲۶/، ع ۲/: امثوفي مناكبها اى تمشوا ان كنتم مومنين اى ايمانكم يقتضي هذا اس مثال میں جملہ انشائیہ جملہ خبریہ کی جگہ مستعمل ہوا ہے، من رجل ذلك كتبنا على بنى اسرائيل معنی یہ ہیں کہ بنی آدم کے حال پر قیاس کر کے فرض کیا اولاد آدم کی مثال حال پر قیاس کر کے فرض کیا ہے۔ مثال حال سے من اجل ذلك بدلا گیا ہے کیونکہ قیاس بدون ملاحظہ علت نہیں ہوتا گویا کہ قیاس تعلیل کی قسم ہے، ارایت اصل رویت سے استفہام ہے کیونکہ ہمزہ استفہامیہ ہے مگر یہاں پر اس لیے تا کہ استماع کلام آئندہ پر تنبیہ ہوا استفہام سے نقل کرلیا ہے، چنانچہ بیچ ے بٹی، بیچ ے شنودی کچھ دیکھتا ہے کچھ سنتا ہے) عام طور سے بولتے ہیں

اور تقدیم وتاخیر سے بھی معنی کے سمجھنے میں دشواری پیدا ہوتی ہے اس کی مثال یہ مشہور شعر ہے ۔

بثینة شانها سلبت فؤادی		بلا جرم اتیتُ به سلاماً

یہاں پر بثینة جو فاعل سلبت مقدم کیا گیا ہے اس کی وجہ سے فہم معنی میں کچھ دشواری ہوگئی ہے اور امر بعید سے تعلق اور اس کے مماثل اشیاء بھی کلام میں گنجلک پیدا کرتے ہیں۔

مثال س۱۴/، ع۴/:الا آل لوطٍ انا لمنجوهم اجمعین الا امر أته یہاں استثناء پر استثناء لایا گیا ہے اس سے دشواری پیدا ہوگئی فما یکذبك بعد بالدین قول سابق یعنی لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم سے متصل۔

س۱۷/، ع۱/:یدعو لمن ضره اقرب من نفعه ای یدعو من ضره یعنی اس کے ضرر سے پکارتا ہے۔

س۲۰/، ع۱۱/:لتنوء بالعصبة اولی القوة ای لتنواء العصبة بها۔

س۶/، ع۶/: فامسحوا برؤسکم وارجلکم ای اغسلوا ارجلکم مکسور نہیں جو امسحو کے تحت میں ہو بلکہ منصوب ہے۔

س۲۶/، ع۱۷/:ولولا کلمةٌ سبقت من ربك لکان لزاماً و اجل مسمی ای ولولا کلمةٌ سبقت واجل مسمیً لکان لزاماً یعنی اجل مسمی کلمة پر معطوف ہے لزاماً پر نہیں۔

س۱۰/، ع۶/:ان لا تفعلوه تکن فتنةٌ فعلیکم النصر سے متصل ہے۔

س۱۱۰، ع۷/:الا قول ابراهیم، لقد کانت لکم اسوة حسنةٌ فی ابراهیم سے متصل ہے۔یسئلونك کانك حفی عنها ای یسئلونك فیها کانك حفی سنن طبعی پر زیادتی کی چند اقسام ہیں یہ زیادتی کبھی صفت سے حاصل ہوتی ہے۔

۷، ع۱۰/:ولا طائر یطیر بجناحیة۔

۲۹،۷:خلق الانسان هلوعاً اذا مسه الشر جزوعا واذا مسه الخیر منوعا اور کبھی ابدال سے

۸ـ۷ للذین استضعفوا لمن امن منهم اور کبھی عطف تفسیری سے

۲۶-۲۔ حتی اذا بلغ اشدّہ وبلغ اربعین سنۃً اور کسی وقت تکرار سے

۱۱-۱۲۔ وما یتبع الذین یدعون من دون اللہ شرکاءَ ان یتبعون الا الظن۔ یہاں اصل کلام یوں ہے وما یتبع الذین یدعون من دون اللہ شرکآء الا الظن۔

۱-۱۱ ولماجاء ھم کتٰب من عنداللہ مصدق لما معھم وکانوا من قبلُ یستفتحون علی الذین کفروا فلما جآء ھم ماعرفوا کفروا بہ ۴-۱۲ ولیخش الذین لوترکوا من خلفھم ذریۃ ضعافاً خافوا علیھم فلیتقوا اللہ اس آیت میں تکرار معنی ہے یعنی خشیہ اور خوف ایک معنی میں ہے اور خافوا مکرر آیا ہے۔

۲-۸۔ یسئلونک عن الاھلۃ قل ھی مواقیت للناس بالحج یعنی اہلہ (ہلال) لوگوں کے لیے۔ لیے مواقیت ہیں کہ خداوند تعالیٰ نے ان کے ساتھ ان کے لیے توقیت اور حج شروع فرمایا ہے اس اعتبار سے کہ حج کے لیے ان کے ساتھ توقیت حاصل ہے، اگر ھی مواقیت للناس فی حجھم کہا جاتا تو مختصر ضرور ہوتا ہے۔ لیکن اس مقام پر کلام طویل لایا گیا ہے۔ ۲-۲۷۵۔ لتنذر ام القریٰ ومن حولھا وتنذر یوم الجمع ای تنذر ام القریٰ یوم الجمع ۔۳۰-۱ وتری الجبال تحسبھا جامدۃً چونکہ رویت چند معنی کے لیے آتی ہے اس واسطے حسبان زیادہ کردیا گیا تاکہ معلوم ہوجائے کہ رویت بمعنی حسبان ہے، ۲-۱۲۔ کان الناس امۃً واحدۃً فبعث اللہ النبیین مبشرین ومنذرین وانزل معھم الکتاب بالحق لیحکم بین الناس فیما اختلفوا فیہ ومااختلف فیہ الا الذین اوتوہ من بعد ماجآئتھم البینات بغیاً بینھم فھد اللہ الذین اٰمنوا لما اختلفوا فیہ من الحق باذنہ واللہ یھدی من یشاء الی صراط مستقیم۔ مابین کلام منتظم کے جو جملہ ومااختلف فیہ الا الذین اوتوہ داخل کیا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے تاکہ ضمیر اختلفوا کا بیان اور مراد اختلاف کا اظہار ہوجائے کہ یہاں پر اختلاف سے کیا مراد ہے، امت دعوت میں نزول کتاب کے بعد جو اختلاف واقع ہوا ہے کہ بعض ایمان لائے اور بعض نہیں یہی اختلاف مراد ہے، اور بعض اوقات اضافت کے لیے فاعل یا مفعول پر حرف جر زیادہ کرتے ہیں اور حرف جر کے

ذریعے سے اس کو مفعول فعل تاکید اتصال کی وجہ سے بناتے ہیں۔ ۱۔۱۱۔ یوم یحمٰی علیها ای یحمٰی هی۔ آیت ہذا میں علیٰ زیادہ کیا گیا ہے۔

۲۔۱۱۔ وقفینا علیٰ آثارهم بعیسٰی ابن مریم ای قفینا هم بعیسی ابن مریم اس آیت میں علیٰ آثارهم بڑھایا گیا ہے۔

یہاں پر یہ نکتہ معلوم کر لینا چاہیے کہ حرف واؤ بہت جگہ تاکید اتصال کی غرض سے آتا ہے اور عطف کے لیے نہیں ہوتا اذا وقعت الواقعة وکنتم ازواجاً ثلثة وفتحت ابوابها ولیمحص الله یہ تمام مثالیں تاکید اتصال کی ہیں یہاں پر واؤ عطف کے لیے نہیں ہے اور حرف فا بھی یوں ہی زائد آتا ہے، قسطلانی نے باب اللمعتمر اذا طاف طواف العمرة ثم خرج هل یجزئه من طواف الوداع میں بیان کیا ہے کہ صفت اور موصوف کے درمیان میں ان کی تاکید اتصال کے لیے حرف عاطف کا لانا درست ہے مثلاً۔

۱۔۱۳ اذ یقول المنافقون والّذین فی قلوبهم مرض، اس آیت میں منافقون اور الذین موصوف صفت ہیں حرف واؤ جو درمیان میں ہے عطف کے لیے نہیں تاکید اتصال کے واسطے ہے۔ سیبویہ یہ کہتا ہے کہ یہ مررت بزید وصاحبك کے مثل ہے، جب اس کلام میں صاحب سے زید ہی مراد ہے۔

اور ۱۴۔۱۔ وما اهلکنا من قریةٍ الا ولها کتاب معلوم کے ذیل میں زمخشری کہتا ہے کہ یہ جملہ (لها کتاب معلوم) لفظ قریہ کی صفت ہے اور قاعدہ یہ ہے کہ صفت و موصوف کے درمیان واؤ نہ آئے، مثلاً قولہ تعالیٰ وما اهلکنا من قریة الا لها منذرون لیکن یہاں پر واؤ صفت و موصوف کے اتصال کی تاکید کے لیے آیا ہے جیسا کہ حال میں بھی کہا جاتا ہے۔ جاء نی زید علیه ثوب وجاء نی وعلیه ثوب انتهی۔

اور کبھی ضمیر کی پراگندگی، اور ایک کلمہ سے دو معنی کا مراد لینا فہم مراد میں دشواری لاتا ہے

۲۸۔۱۵۔ انهم لیصدونهم عن السبیل ویحسبون انهم مهتدون، یہ انتشار ضمیر کی مثال ہے یعنی ان الشیاطین لیصدون الناس عن السبیل یحسبون انهم مهتدون، یہ شیاطین آدمیوں کو راستہ سے روکتے ہیں اور وہ یعنی انسان اپنے مہتدہونے کا گمان

کرتے ہیں، ہم کی ضمیر شیاطین کی جانب پھرتی ہے اور یصدونھم کی ناس کی طرف اور یحسبون سے ناس ہی مراد ہیں۔ یہ انتشار ضمیر کی صورت ہے، وقال قرینہ ایک جگہ شیطان مراد ہے اور دوسری جگہ فرشتہ یہ مثال ایک کلمہ سے وہ معنی مراد لینے کی ہے۔

۲۔۱۰۔یسئلونک ماذا ینفقون قل ما انفقتم من خیر ہر دو آیت کے دو معنی ہیں، اول معنی انفاق۔

۲۔۱۱۔ویسئلونک ما ذاینفقون قل العفو، ماینفقون دوم وای نوع من الانفاق ینفقون یعنی خرچ کرنے کی جس قسم سے وہ خرچ کرتے ہیں اور یہ مصرف دریافت کرنے پر صادق ہے کیونکہ خرچ کرنا مصارف کے اعتبار سے چند قسم ہے۔ معنی ثانی ای مالٍ ینفقون یعنی جو مال تقسیم کرتے ہیں۔

اور لفظ جعل و شیٔ وغیرہ کا معانی مختلفہ کے لیے مستعمل ہونا بھی اسی قبیل سے ہے یعنی فہم مراد میں صعوبت پیدا کرتا ہے، جعل کبھی تو خلق کے معنی میں آتا ہے جیسے جعل الظلمات والنور میں یعنی تاریکی اور روشنی کو پیدا کیا اور کبھی بمعنی اعتقد کے

۸۔۳۔ وجعلوا اللہ مما ذرأ اور لفظ شی کبھی فاعل اور کبھی مفعول مطلق کی جگہ آتا ہے۔

۵۲۔۳۰ أم خلقوا من غیر شئ غیر خالق یعنی کیا وہ بغیر خالق کے پیدا کئے گئے ہیں یہاں پر شے بجائے خالق کے مستعمل ہوئی ہے۔

۱۵۔۱۶۔فلا تسئلنی عن شئ مما تتوقف فیہ من امری یعنی اور میرے کاموں میں سے اچھی چیز کی نسبت جس میں تجھ کو تامل ہو سوال نہ کر اور لفظ امر و نباء و خطب سے کسی وقت مخبر عنہ وقصہ مراد لیتے ہیں ھو نباء عظیم ای قصۃ عجیبۃ یعنی وہ عجب قصہ ہے، علی ہذا ،الفاظ خیر و شر اور ان کے ہم معنی الفاظ ہر مقام پر بدلے جاتے ہیں اور انتشار آیات بھی اسی قبیل سے ہے، مثلاً ایک آیت جس کا اصلی موقع قصہ کے ختم کرنے کے بعد ہے اس کو کبھی قصہ کے تمام ہونے سے پیشتر ہی بیان کر دیتے ہیں اور پھر قصہ کی طرف رجوع کرتے اور اس کو تمام کرتے ہیں، اور کوئی آیت کبھی نزول میں مقدم اور تلاوت میں مؤخر ہوتی ہے۔

۲۔۱۔قد نری تقلب وجھک نزول میں مقدم ہے اور سیقول السفھآء متاخرۃ

لیکن تلاوت میں قصہ برعکس ہے، اور کسی وقت جواب کو کفار کے کلام کے درمیان میں ذکر کیا جاتا ہے، ولا تومنوا الا لمن تبع دینکم قل ان الهدی هدی الله ان یوتی احدٌ مثلَ ما اوتیتم۔

الحاصل یہ مباحث تفصیل چاہتے ہیں لیکن ہم نے جس قدر بیان کیا وہ کافی ہے، سعادت مند طالب علم اگر ان مسائل کو دل میں جاگزیں کرلے گا تو وہ کلام اللہ پڑھتے وقت ادنیٰ غور سے بات کی تہ کو پہونچ جائے گا اور امور غیر مذکور پر قیاس کرکے ایک مثال سے دوسری مثالوں تک اس کی رسائی ہوسکے گی۔

جاننا چاہئے کہ محکم اس کلام کو کہتے ہیں جس سے زبان کا جاننے والا سوائے ایک معین معنی کے نہ سمجھ سکے مگر اس کے سمجھنے میں اعتبار پہلے عربوں کا ہے نہ کہ ہمارے زمانے کے بال کی کھال نکالنے والوں کا جن کی موشگافی ایک ایسا سخت ترین مرض ہے جس کے ذریعہ سے وہ محکم کو متشابہ اور معلوم کو مجہول بناڈالتے ہیں۔

اور متشابہ وہ کلام ہے جس میں دو معنی کا احتمال ہو، یا ضمیر کے دو مرجعوں کی جانب لوٹنے کے احتمال کی وجہ سے جیسا کسی نے کہا ہے ''اما ان الامیر امرنی ان العن فلاناً لعنه الله یعنی مجھ کو امیر نے حکم کیا ہے کہ فلاں شخص کو لعنت کروں اللہ اس کو لعنت کرے یہاں اشتباہ ہے کہ اس کو لعنت کرنے سے کیا مراد ہے آیا شخص مامور ہے یا آمر اور یا اس وجہ سے کہ وہ کلمہ ذو معنی میں مشترک ہے مثلاً لامستم جماع اور چھونے میں مشترک ہے اور یا اس وجہ سے کہ قریب اور بعید دونوں پر عطف کا احتمال ہو مثلاً وامسحو برؤسکم وارجلکم درصورت قرأۃ کسرہ یا یہ کہ عطف اور استیناف دونوں کا احتمال ہو جیسے لایعلم تاویله الا الله والراسخون فی العلم

اور کنایہ اس کلام کو کہتے ہیں جس میں کسی حکم کو ثابت تو کیا جائے مگر خاص اس حکم کا اثبات مقصود نہ ہو بلکہ یہ منظور ہو کہ اس سے مخاطب کا ذہن ایسی شے کی طرف منتقل ہو جائے جو اس حکم کو عادۃً یا عقلاً لازم ہو، مثلاً عظیم الرماد سے مہمانداری کی کثرت اور یداہ مبسوطتانِ سے سخاوت سمجھ میں آتی ہے، اور اپنے مراد کی تصویر پر تو محسوسات سے کھینچنا بھی کنایہ کے ہی قبیل سے ہے، اور یہ ایک نہایت وسیع باب ہے جس سے عربوں کے اشعار وخطبات اور کلام اللہ واحادیث

نبوی ﷺ پر ہیں، مثلاً واجلب علیهم بخیلك ورجلك اس جگہ ڈاکوؤں کے سردار سے تشبیہ دی گئی جیسا کہ وہ (غارت گری کے وقت) اپنے ساتھیوں کو پکارتا ہے کہ ادھر سے حملہ کرو اور اس طرف سے گھس پڑو۔ وجعلنا فی اعناقهم اغلالا اس آیت میں تدبیر آیات سے کفار کے اعراض کو ایسے شخص سے تشبیہ دی گئی ہے جسکو یا تو زنجیروں سے جکڑ دیا ہو یا اس کے چاروں طرف دیواریں کھڑی کردی گئی ہوں تاکہ وہ کچھ نہ دیکھ سکے اور مثلاً، واضمم الیك جناحك من الرهب یعنی خاطر جمع رکھ اور پریشانی کو دور کر دے۔

اور عام محاورہ میں اس کی نظیر یہ ہے کہ مثلاً اگر کسی شخص کی شجاعت کا بیان کرتے ہیں تو تلوار کے ایک دو ہاتھ ادھر ادھر جھاڑ کر بتاتے ہیں کہ وہ یوں تلوار چلاتا ہے گو اس نے مدت العمر تلوار ہاتھ میں نہ پکڑی ہو، لیکن اس فعل سے مقصود اس امر کا اظہار ہوتا ہے کہ فلاں شخص اپنے زمانہ میں سب سے زیادہ بہادر ہے یا کسی کا مقولہ بیان کرتے ہیں کہ وہ کہتا ہے کہ زمین پر کسی کو ایسا بہادر نہیں پاتا جو مجھ سے مقابلہ کی تاب رکھتا ہو یا کہتے ہیں کہ فلاں شخص ایسا کرتا ہے اور ایسی ہیبت کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس کا اظہار فتحمند پہلوان اپنے حریف کے مغلوب ہونے کے وقت کرتا ہے، اگرچہ اس نے کبھی یہ کلمہ نہ کہا ہو یا یہ فعل نہ کیا ہو، یا مثلاً کہتے ہیں کہ فلاں شخص میرا گلوگیر ہو رہا ہے یا فلاں شخص نے میرے گلے میں ہاتھ ڈال کر لقمہ نکال لیا ہے، ان تمام صورتوں کو از قسم تصویر سمجھنا چاہئے۔

تعریض یہ ہے کہ حکم تو عام ہو لیکن مقصود کسی خاص شخص کا حال بیان کرنا یا کسی خاص شخص کے حال پر تنبیہ کرنا ہو اور اس کی بعض خصوصیات کلام میں لائی جائیں اور مخاطب کو اس شخص سے واقف نہ کیا جائے، اس قسم کے مقامات میں قرآن مجید کا پڑھنے والا نگران خاطر رہتا اور اس قصہ کا محتاج ہوتا ہے، رسول خدا ﷺ جب کسی خاص شخص کے فعل پر انکار کرنا چاہتے تھے تو فرمایا کرتے تھے، کیا حال ہے ان لوگوں کا جو ایسا کرتے ہیں، اسی طرح اس آیت میں وماکان لمؤمن ولا مؤمنةٍ اذا قضی اللہ ورسولهٗ امراً ان یکون لهم الخیرة من امرهم "(اور کسی مسلمان مرد اور عورت کو یہ شایاں نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول (ان کے بارے میں) کوئی بات ٹھہرا دیں تو اس بات میں اس کا اپنا اختیار باقی رہے) حضرت زینب اور حضرت زید رضی اللہ

عنہا کے قصہ کی طرف اشارہ ہے اور آیت ولا یاتل اولو الفضل منکم والسعة " میں حضرت صدیق اکبرؓ کی طرف اشارہ ہے۔ایسی صورتوں میں جب تک قصہ نہ معلوم ہو مطلب سمجھ میں نہیں آتا۔

مجاز عقلی یہ ہے کہ فعل کو ایسے شخص کی طرف منسوب کریں جو حقیقت میں اس کا فاعل نہیں ہے اور ایسی چیز کو مفعول بہ بنائیں جو در حقیقت مفعول بہ نہیں ہے، اس مشابہت کے علاقہ کی وجہ سے جو ان دونوں کے درمیان ہوتا ہے متکلم اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ یہ بھی ان میں داخل اور ان کی جنس سے ہے، کہا جاتا ہے کہ بادشاہ نے محل بنایا حالانکہ بنانے والے معمار ہوتے ہیں، بہار نے سبزہ اگایا، حالانکہ حقیقت میں اگانے والا حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

باب سوم

قرآن مجید کے اسلوب بدیع کے بیان میں
اور یہ بحث تین فصلوں میں بیان کی جائے گی

فصل اول: ۔قرآن مجید کو مثل معمولی کتابوں کے ابواب اور فصول میں اس طرح مرتب نہیں کیا گیا کہ ہر مبحث ایک جداگانہ باب یا فصل میں بیان کیا جاتا، بلکہ قرآن مجید کو مثل مجموعۂ مکتوبات کے فرض کرنا چاہیے جس طرح کہ بادشاہ اپنی رعایا کو حسب ضرورت وقت ایک فرمان لکھتے ہیں، اس کے بعد دوسرا اور تیسرا فرمان لکھتے ہیں یہاں تک کہ بہت سے فرمان جمع ہو جاتے ہیں اور کوئی شخص ان کو جمع کر کے ایک مجموعہ مرتب کر دیتا ہے اسی طرح اس بادشاہ علی الاطلاق نے رسول اللہ ﷺ پر بندوں کی ہدایت کے لیے حسب ضرورت قرآن مجید کی سورتیں یکے بعد دیگرے نازل فرمائیں، حضرت ﷺ کے زمانہ مبارک میں ہر ایک سورۃ جداگانہ مرتب اور محفوظ تھی، آپ نے ان کو مدون نہیں فرمایا تھا حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے زمانہ میں تمام سورتیں ایک جلد میں ایک خاص ترتیب کے ساتھ جمع کی گئیں، اور یہ مجموعۂ مصحف کے نام سے موسوم ہوا صحابہ رضی اللہ عنہم کے درمیان قرآن مجید کی سورتیں چار قسموں پر منقسم تھیں، اول طوال جو سب سے بڑی سورتیں ہیں، دوم مائتین جن میں سے ہر ایک کی سو آیتیں یا سو سے کچھ زیادہ ہیں، سوم مثانی جن کی آیتیں سو سے کم ہیں چہارم مفصل، قرآن مجید کی ترتیب میں دو تین سورتیں جو مثانی کی قسم سے تھیں وہ مائتین میں داخل کی گئیں اس لیے کہ ان کا سیاق مائتین کے سیاق سے مناسبت رکھتا

تھا علیٰ ہٰذا القیاس بعض اقسام میں کسی قدر اور بھی تصرف کیا گیا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس مصحف کے مطابق چند نسخے لکھوا کر اطراف میں بھیج دیئے تاکہ مسلمان ان سے فائدہ اٹھائیں اور کسی دوسری ترتیب کی طرف مائل نہ ہوں۔

چونکہ سورتوں کا اسلوب بیان شاہی فرامین کے اسلوب سے پوری مناسبت رکھتا تھا اس لئے سورتوں کی ابتدا اور انتہا میں مکاتیب کے طریقہ کی رعایت رکھی گئی جس طرح بعض مکاتیب خدا کی تعریف سے شروع کئے جاتے ہیں اور بعض بیان غرض سے اور بعض کاتب یا مکتوب الیہ کے نام سے اور بعض رقعے اور شقے بغیر عنوان کے ہوتے ہیں، نیز بعض مکتوب طویل اور بعض مختصر ہوتے ہیں، اسی طرح خداوند جلت عظمتہ، نے بعض سورتوں کو حمد یا تسبیح سے شروع فرمایا اور بعض کو بیان غرض سے، چنانچہ فرمایا، ذلك الكتب لاريب فيه هدىً لِلمتقين، سورة انزلنا ها وفرضنا ها، یہ قسم اس عنوان کے مشابہ ہے جو دستاویزوں کے آغاز میں لکھا جاتا ہے مثلاً هذا ماصالح عليه فلان وفلان (۱) وهذا ما اوصى به فلان۔" یا جیسا کہ رسول خدا ﷺ نے واقعۂ حدیبیہ میں لکھا تھا ہٰذا (۲) ما قاضی علیہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔

بعض مرسِل و مرسَل الیہ کے نام سے شروع کی گئیں جیسا کہ فرمایا ہے۔ (۳) "تنزيل الكتب من الله العزيز الحكيم .كتاب اُحكمت اٰيته ثم فصلت من لدن حكيم خبير ." یہ قسم اس کے مشابہ ہے جیسا کہ لکھا جاتا ہے، "حکم بارگاہ خلافت سے صادر ہوتا ہے یا باشندگان فلاں شہر کو بارگاہ خلافت سے آگاہ کیا جاتا ہے"، اور جیسا کہ حضرت رسول خدا ﷺ نے تحریر فرمایا تھا، "من محمد رسول الله الى هر قل عظيم الروم" اور بعض سورتیں بطور رقعوں اور شقوں کے بغیر عنوان کے ہیں جیسا کہ اذاجاءك المنفقون قدسمع الله قول التي تجادلك في زوجها، يا ايها النبي لم تحرم مآ أحل الله لك۔

---

(۱) یہ وہ ہے جس پر فلاں فلاں نے باہم صلح کی، یہ وہ ہے جس کی فلاں شخص نے وصیت کی۔

(۲) یہ وہ ہے جس پر محمد رسول اللہ ﷺ نے فیصلہ کیا۔

(۳) یہ فرمان تحریری پیشگاہ خداوندی سے صادر ہوتا ہے جو زبردست اور حکمت والا ہے، یہ قرآن ایسی کتاب ہے کہ حکمت والے باخبر اللہ کی طرف سے اس کی آیتیں مستحکم اور مفصل کی گئی ہیں۔

چونکہ عرب کی مشہور فصاحت کا نمونہ قصائد ہیں اور وہ اپنے قصیدوں کے آغاز میں عجیب وغریب مقامات اور ہولناک واقعات کے ساتھ تشبیب کرتے تھے اور یہ رسم قدیم سے ان کے یہاں چلی آتی تھی، خداوند تعالیٰ نے بعض سورتوں میں اس اسلوب کو اختیار فرمایا، مثلاً والصافات صفا فالزاجرات زجراً، والذاریات ذرواً فالحاملات وقراً. "اذالشمس کورت واذالنجوم انکدرت۔" اور جس طرح مکاتیب کوکلمات جامعہ اور وصایائے نادرہ اور احکامات سابقہ کے لیے تاکیدات اور ان کی مخالفت کرنے والے لیے تہدیدات پر تمام کرتے ہیں ایسی ہی خداوند تعالیٰ نے بھی سورتوں کے آخری حصہ کوکلمات جامعہ اور حکمت کے سرچشموں اورتاکیدات بلیغہ اورتہدیدات عظیمہ پر ختم فرمایا۔

اور کبھی سورۃ کے درمیان میں کوئی نہایت مفید اورنرالے اسلوب کا بلیغ کلام مثلاً حمد وتسبیح یا بیان انعام واحسان شروع کیا جاتا ہے، مثلاً اس آیت میں خداوند تعالیٰ نے خالق اور مخلوق کے مرتبہ کے فرق سے شروع کیا ہے۔

قل الحمد لله والسلام علىٰ عباده الذين اصطفىٰ الله خيراً ما يشركون

اوراس کے بعد (۱) پانچ آیتوں میں اسی مدعا کونہایت بلیغ طریقوں اورنرالے اسلوب کے ساتھ بیان فرمایا۔اور مثلاً خداوند جل شانہ نے سورۃ بقرہ کے اندر بنی اسرائیل سے مناظرہ، یبنی اسرائیل اذکروا نعمتي التي انعمت عليكم سے شروع فرمایااور آگے جا کراس مناظرہ کو اسی کلمہ پر ختم فرمایا۔

مناظرہ کی ابتدا جس کلام سے ہو، اسی پر اس کا ختم کرنا بلاغت کے اعتبار سے نہایت زبردست مقام رکھتا ہے، اور ایسے ہی اہل کتاب سے مناظرہ سورۂ آل عمران کے ابتدائی حصہ میں اس آیت سے شروع فرمایا، ان الدين عند الله الاسلام اس کی وجہ یہ ہے کہ محل نزاع (مبحث) کی تعیین اول ہوجائے اور آئندہ گفتگو اسی ایک مدعا پر کی جائے، والله اعلم بحقيقة الحال۔

فصل دوم

جیسا کہ قصائد اشعار پر منقسم ہوتے ہیں ایسے ہی اکثر سورتوں میں سنت اللہ یوں جاری ہے کہ وہ آیات پر منقسم ہوتی ہیں مگر آیات اور اشعار میں فرق ہے، آیات اور ابیات دونوں جواز قسم نشید ہیں، متکلم اور سامع کے التذاذ نفس اور حظ طبعی کے لیے انشاء کی جاتی ہیں لیکن ابیات عروض اور قافیہ کی پابند ہوتی ہیں جن کو خلیل نحویؒ نے مدون کیا ہے، اور عام شعرا نے انہیں اس سے حاصل کیا ہے اور آیات کی بنیاد ایک ایسے اجمالی وزن و قافیہ پر ہوتی ہے جو امر طبعی سے زیادہ تر مشابہ ہے اور عروضیوں کے افاعیل، تفاعیل اور ان کے معین کردہ قوافی پر نہیں ہوتے جو محض مصنوعی اور اصطلاحی امور ہیں، اور اس امر عام کی تنقیح جو آیات اور ابیات میں مشترک ہے اور جس کو ہم نے نشید سے تعبیر کیا ہے اور پھر ان تمام امور کو ضبط کرنا جن کا آیات میں التزام کیا گیا ہے اور جو بمنزلہ فصل کے ہے، زیادہ تفصیل چاہتا ہے، واللہ ولی التوفیق۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ فطرت سلیم موزوں اور مقفی قصائد اور نفیس جزوں وغیرہ سے ایک خاص لطف اور خاص ذوق وحلاوت کا احساس کرتی ہے، اگر اس احساس کے سبب کی جستجو کی جائے تو معلوم ہوگا کہ ایسا کلام جس کے اجزا باہم موافقت رکھتے ہوں مخاطب کے نفس میں ایک قسم کی لذت دیتا اور اس کے مثل دوسرے کام کا انتظار اس کے دل میں پیدا کر دیتا ہے، اور جب اس کے بعد دوسرا شعر اسی موافقت اجزا کے ساتھ مخاطب کے نفس پر واقع ہوتا ہے اور جس کا انتظار تھا وہ موجود ہو جاتی ہے تو وہ لذت سابق دوبالا ہو جاتی ہے اور اگر وہ دونوں بیت قافیہ میں بھی شریک ہوں تو وہ لذت سہ چند ہو جاتی ہے پس انسان کی قدیم فطرت کا یہی راز ہے جس کی بنا پر اس کو اشعار سے لذت حاصل ہوتی ہے اور معتدل اقالیم کے تمام سلیم المزاج اشخاص اس اصول میں باہم متفق ہیں لیکن ہر بیت کے اجزا کے موافق اور قافیہ کے شرائط کی نسبت جو اشعار میں مشترک ہوتا ہے ان کے مسلک باہم مختلف اور ان کے عادات متباین ہو گئے ہیں، اہل عرب ایک خاص قانون رکھتے ہیں جس کی تشریح خلیلؒ نے کی ہے، اور ہندوؤں کے ہاں دوسرا طریقہ ہے جو ان کے سلیقے اور مذاق کے تابع ہے، علیٰ ہذا القیاس ہر زمانے کے

لوگوں نے ایک خاص وضع اختیار کی اور ایک خاص شاہراہ قائم کر کے اس پر چلے ہیں اگر ہم ان متبائن عادات اور مختلف رسوم میں امر جامع اور سر مشترک کی دریافت کرنا چاہیں تو معلوم ہوگا کہ وہ اجزائے کلام میں تخمینی موافقت ومناسبت کے سوا کوئی دوسری شے نہیں ہے، مثلاً عرب مستفعلن کی جگہ مفاعلن اور مفتعلن لے آتے ہیں اور فاعلاتن کے بجائے فعلاتن اور فاعلتن کو لانا باقاعدہ خیال کرتے ہیں اور وہ ایک بیت کی ضرب کی موافقت دوسری بیت کی ضرب کے ساتھ اور ایک کے عروض کی دوسری بیت کے عروض کے ساتھ ضروری خیال کرتے ہیں اور حشو میں بکثرت زحافات تجویز کرتے ہیں مگر شعرا فارس کے نزدیک زحافات مکروہ اور قبیح سمجھے جاتے ہیں، علیٰ ہذا شعراءعرب اگر ایک بیت میں ''قبورا'' ہو تو دوسری بیت میں ''منیرا'' اچھا سمجھتے ہیں مگر شعراء عجم اس کے خلاف ہیں علی ھذا شعرائے عرب حاصل وداخل ونازل کو ایک ہی قسم شمار کرتے ہیں بخلاف شعراء عجم کے وہ ان الفاظ کو ایک قسم شمار نہیں کرتے، ایک کلمہ کا دونوں مصرعوں کے درمیان اس طرح واقع ہونا کہ وہ آدھا اول مصرع میں اور آدھا دوسرے میں شامل ہو، عربوں کے نزدیک صحیح ہے مگر شعراء عجم اس کو جائز نہیں رکھتے غرضیکہ ان تمام مذاہب میں امر مشترک (جس سے نفس کو التذاذ ہوتا ہے) وہ تخمینی موافقت الفاظ ہے نہ کہ حقیقی، دیکھو باوجود یہ کہ ہنود نے اپنے اشعار کے اوزان کی بنیاد حرفوں کی تعداد پر رکھی ہے اور ان کے یہاں حرکات وسکنات کا لحاظ اوزان میں نہیں کیا جاتا مگر تاہم اس سے لذت حاصل ہوتی ہے ہم نے بعض دیہاتیوں کے راگ سنے ہیں جن کو وہ حصول لذت کے لیے گاتے ہیں وہ ایک ایسا کلام ہے جس نے اجزا میں تخمینی موافقت ہوتی ہے یا ردیف ہوتی ہے جو کبھی ایک کلمہ اور کبھی زیادہ کلمات سے مرکب ہوتی ہے وہ اس کلام کو مثل قصائد کے گاتے اور اس سے لطف حاصل کرتے ہیں غرضیکہ ہر ایک قوم کا اپنی نظم کے متعلق ایک خاص قانون ہے علی ہذا القیاس تمام اقوام دلکش آوازوں اور دلفریب نغمات سے لذت پانے میں متفق ہیں مگر گانے کے طریقہ اور اس کے قواعد میں وہ باہم اختلاف رکھتی ہیں، یونانیوں نے کچھ اوزان مقرر کئے ہیں جن کو وہ مقامات کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور ان مقامات سے آوازیں اور شعبے نکال کر انہوں نے نہایت ہی مبسوط اور مفصل فن اپنے لیے منضبط کیا ہے، اہل ہند نے چھ راگ بنائے اور ان سے راگنیاں نکالی ہیں ہم نے اہل دیہات کو دیکھا ہے جو ان دونوں اصطلاحوں سے

بیگانہ ہیں انہوں نے اپنے سلیقہ اور ذوق کے موافق ایک خاص ترکیب اور خاص تال ایجاد کر کے چند اوزان کلیات کے انضباط اور جزئیات کے انحصار کئے بغیر مرتب کر لیے ہیں جن سے وہ اپنی محفلوں کو گرماتے اور لذت پاتے ہیں۔

پس جب ہم ان اختلافات کو دیکھتے اور غور وفکر سے کام لیتے ہیں تو امر مشترک بجز موافقت تخمینی کے اور کوئی شے نہیں نکل سکی، عقل کی نظر صرف اس اجمال امر پر ہے اور تفصیل سے اس کو کوئی بحث نہیں، اور ذوق سلیم کی محبت فقط اس خالص حلاوت کے ساتھ ہے اور بحر طویل اور مدید سے اسکو غرض نہیں، خداوند جل وعلیٰ شانہ نے جب اس مشتِ خاک (انسان) سے ہمکلام ہونا چاہا تو اس نے اسی اجمالی حسن کی رعایت فرمائی نہ ان مصطلحہ قواعد کی جن کو ایک قوم پسند کرتی اور دوسری ناپسند کرتی ہے اور خداوند مالک الملک نے جب چاہا کہ آدمیوں کی روش پر کلام فرمائے تو اس نے صرف اسی اصل بسیط کو اپنے کلام منضبط فرمایا نہ ان قوانین کو جو کہ زمانہ اور مذاق کے بدل جانے پر ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں۔

فی الحقیقت اصطلاحی قوانین کی پابندی، عجز اور جہل کی دلیل ہے اور حسن اجمالی کی ایسی پابندی کہ وہ کلام کی ہر حالت اور بیان کے ہر ایک نشیب وفراز میں جلوہ گر رہے بغیر استعمال قواعد مصطلحہ کے بے شک اعجاز اور بشری حد اختیار سے خارج ہے، خداوند تعالیٰ نے اسی طریقہ کا استعمال فرمایا ہے۔ اس سے ہم ایک قاعدہ کا استنباط کرتے ہیں اور وہ قاعدہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے اکثر سورتوں میں آواز کی کشش کا اعتبار کیا ہے نہ کہ بحر طویل ومدید وغیرہ کا، اور فاصلوں میں سانس کا ٹھہرنا حرف مدہ پر یا جس پر مد ٹھہرے اس کا اعتبار کیا ہے نہ کہ فن قوافی کے قواعد کا یہ کلیہ نہایت بسط چاہتا ہے تم کو اس میں سے تھوڑا بہت سن لینا چاہیے۔

نرخرے میں سانس کی آمد ورفت انسان کے لیے ایک جبلی بات ہے، گو سانس کی درازی اور کوتاہی ایک حد تک آدمی کے اختیار میں ہے لیکن اگر اس کو اپنی طبیعت پر چھوڑ دیا جائے تو اس وقت اس کا ایک خاص طول ہوگا، سانس کے اول بار لینے میں ایک نشاط وفرحت حاصل ہوتی ہے اور وہ آہستہ آہستہ زائل ہونی شروع ہوتی ہے حتی کہ بالکل زائل ہو جاتی ہے اور دوسرے تازہ سانس لینے کی ضرورت پڑتی ہے سانس کی یہ درازی مبہم حدود سے محدود اور ایک ایسی منتشر مقدار

کے ساتھ معین ہے کہ اگر دو تین کلموں یا اس امتداد خاص کی تہائی یا چوتھائی مقدار کی کمی بیشی اس مقدار سے باہر نہیں کر دیتی اور اس میں اوتاد اور اسباب کی تعداد میں بھی فرق کی اجازت ہے اور نیز بعض ارکان کے تقدیم کی گنجائش بھی ہے، پس سانس کے اسی امتداد کو خدا تعالیٰ نے وزن قرار دیا اور اس میں تین قسمیں کیں، طویل اور متوسط اور قصیر، طویل کی مثال سورۂ نساء اور متوسط کی مثال سورۂ اعراف و انعام، اور قصیر کی مثال سورۂ شعراء اور دخان ہیں، اور سانس کا اختتام ایسے حرف مدہ پر رکھا گیا ہے جس کا اعتماد کسی حرف پر ہو، یہ ایک وسیع قافیہ ہے جس کا طبیعت ادراک کرتی اور اس کی تکرار سے متلذذ ہوتی ہے اگر چہ وہ حرف مدہ کہیں الف اور کہیں واؤ اور کہیں ی ہوتا ہے، گو وہ حرف اخیر کسی جگہ ی ہوتا ہے اور کہیں ج یا ق، اس قاعدہ کی رو سے یعلمون اور مومنین اور مستقیم باہم موافق ہیں اور خروج اور مریج اور تحید اور تبار و فواق و عجاب سب با قاعدہ علیٰ ہذا، حرف الف کا آخر کلام میں آنا بھی ایک وسیع قافیہ ہے جس کا احاطہ پوری حلاوت بخشتا ہے اگر چہ حرف روی مختلف ہو، دیکھو حضرت حق تعالیٰ ایک جگہ کریما اور دوسرے جگہ حدیثا اور تیسرے مقام پر بصیرا فرماتے ہیں، اگر حرف روی کی موافقت کا التزام اس موقع پر کیا جائے تو گویا خود کو ایک غیر لازمی شے کا پابند بنانا ہے جیسا کہ سورۂ مریم اور سورۂ فرقان کے ابتداء میں واقع ہوا ہے علیٰ ہذا آیات کا اتحاد ایک حرف پر مثلاً میم سورۂ قتال میں اور نون سورۂ رحمٰن میں حلاوت بخشتا ہے، علیٰ ہذا ایک مخصوص جملہ کو کلام کے درمیان میں پانا ہی لذت پیدا کرتا ہے، جیسا کہ سورۂ شعراء، سورۂ قمر اور سورۂ رحمٰن و مرسلات میں واقع ہے اور کبھی ذہن سامع کی نشاط اور اس کلام کے لطافت کی جانب اشارہ کرنے کے لیے سورتوں کے آخری فواصل اول سے مختلف کیے جاتے ہیں، مثلاً ادا او ھدا سورۂ مریم کے آخر میں اور سلاما و کراما سورۂ فرقان کے آخر میں اور وطین اور ساجدین و ینظرون آخر سورۂ صاد میں واقع ہے حالانکہ ان تمام سورتوں کے شروع میں دوسری طرف کے فاصلے ہیں، اکثر سورتوں کے اندر اس وزن و قافیہ کی رعایت جسکو ہم بیان کر چکے ہیں۔

مہتم بالشان سمجھی گئی ہے، اور آیت کے آخر میں کوئی لفظ قافیہ بننے کی صلاحیت رکھتا ہے اس کو قافیہ بنا دیا جاتا ہے ورنہ کسی ایسے جملہ سے اس کا اتصال کر دیا جاتا ہے جس میں اللہ کا ذکر یا مخاطب کے لیے تنبیہ ہو، مثلاً فرماتے ہیں: وھو الحکیم الخبیر، وکان اللہ علیماً حکیماً

.وکان اللہ بما تعملون خبیراً ۔لعلکم تتقون، ان فی ذٰلک لاٰیاتٍ لا ولی الالباب۔ان فی ذٰلک لاٰیاتٍ لقومٍ یتفکرون۔ اور ایسے ہی مقامات پر کہیں کہیں کسی قدر اطناب سے کام لیا گیا ہے،مثلاً واسئل به خبیراً اور کسی جگہ تقدیم وتاخیر بھی مستعمل ہوئی ہے اور کبھی قلب اور زیادتی مثلاً الیاسین وطور سینین کے بجائے الیاس وطور سینا کے۔

یہاں پر یہ جاننا ضروری ہے کہ کلام کی روانی اور سہولت جو بوجہ ضرب المثل ہونے یا آیاتِ مکرر مذکور ہونے سے حاصل ہوئی ہے؟ کلام طویل کو مختصر کلام کے ہم وزن بنادیتی ہے اور بعض اوقات پہلے فقروں کو بعد کے فقیروں سے کم لاتے ہیں تاکہ کلام اس کے سبب سے شیریں ہو جائے، مثلاً خذوہ فغلوہ ثم الجحیم صلوہ ثم فی سلسلة ذرعها سبعون ذراعاً فاسلکوہ، ایسے کلام میں گویا متکلم کا دلی مدعا یہ ہوتا ہے کہ پہلے اور دوسرے فقرہ کا مجموعہ تنہا تیسرے فقرے کے برابر اور ہم پلہ ہے،ایسے ہی کبھی آیت کے تین رکن ہوتے ہیں مثلاً یوم تبیض وجوهٌ وتسود وجوہ، فاماالّذین اسودّت وجوههم الآیه و أماالّذین ابیضت وجوههم الآیه، ایسی صورت میں رکن اول دوسرے رکن کے ساتھ جمع کر کے ایک طویل آیت شمار کرتے ہیں،اور کبھی ایک آیت میں دو فاصلے لاتے ہیں۔ چنانچہ اشعار میں بھی کبھی ایسا ہوتا ہے۔ بیت ؎

کالزهر فی ترف والبدر فی شرف
والبحر فی کرم والدهر فی همم

اور کبھی ایک آیت کو دوسری آیتوں سے زیادہ لمبی لاتے ہیں اور اس میں نکتہ یہ ہے کہ جس وقت اس حسن کلام کا جو کہ وزن اور قافیہ سے پیدا ہوا ہے اس حسن کلام سے موازنہ کریں جو اداء کی بے ساختگی اور سادگی اور اس کی طبعی ترکیب اور عدم تغیر سے حاصل ہوا ہے،تو فطرت سلیمہ حسن معنوی کو ترجیح دے گی تو ایسے مقامات میں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ ایک قسم کے حسن کے انتظار کو ترک کرکے دوسری قسم کے انتظار کا پورا حق ادا کیا گیا ہے۔

ہم نے شروع بحث میں یہ بات کہ اکثر سورتوں میں سنت اللہ جاری ہے اس واسطے کہی تھی کہ بعض سورتوں میں وزن اور قافیہ مذکورین کی رعایت نہیں معلوم ہوتی اس سے معلوم ہوا کہ کلام

اللہ کا ایک حصہ خطباء کے خطبوں اور عقلائے نکتہ رس کے مراسلات کی طرح پر واقع ہے، عورتوں کا قصہ جس کی روایت حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ضرور سنا ہوگا اور اس کے قوافی بھی معلوم ہوں گے، اور قرآن شریف بعض مواقع میں اہل عرب کے مراسلات کی طرح بلا کسی امر کی رعایت کے واقع ہے جیسا کہ بعض لوگوں کی گفتگو آپس میں ہوتی ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ ہر ایک کلام ایسی چیز پر ختم کیا گیا ہے جو ختم کرنے کے قابل تھا، اس جگہ یہ نکتہ ہے کہ لغت عرب میں رباؤ ایسے موقع پر ہوتا ہے جہاں سانس ختم ہو جائے اور کلام میں نشاط باقی نہ رہے اور وقف کے لیے کلام کا حرف مدہ پر خاتمہ ہونا مستحسن ہے یہی وجہ ہے جس سے آیات کی موجودہ صورت بنی ہے، یہ وہ رموز ہیں جو اس فقیر کو القاء ہوئے ہیں واللہ اعلم۔

اگر کوئی پوچھے کہ پنجگانہ علوم کے مطالب کو قرآن شریف میں بار بار کیوں ذکر کیا گیا ہے ایک ہی جگہ پر اکتفا کیوں نہیں کی گئی اس کا جواب میں یہ دیتا ہوں کہ ہم مخاطب کو جو کچھ سمجھانا چاہتے ہیں اس کے دو مرتبے ہیں، ایک یہ کہ ہمارا مقصود یہ ہے کہ فقط اس کو ایک نامعلوم چیز کی خبر دیں، اس صورتِ خاص میں مخاطب کو یہ حکم پہلے سے معلوم نہ ہوگا اور اس وقت اس کا ذہن اسکے ادراک سے خالی ہوگا اس لیے ہمارے کلام سے سنتے ہی اس کو وہ مجہول شے معلوم ہو جائے گی اور وہ انجان سے واقف ہو جائے گا، دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ ہم کو کسی علم کی تصویر مخاطب کے دل میں اس طرح ذہن نشین کرنا ہے کہ اس سے مخاطب کو بے حد لذت حاصل ہو اور اس کے قلبی اور ادراکی قوی اس علم میں بالکل فنا و محو ہو جائیں اور اس علم کا رنگ اس کی تمام قوتوں پر غالب ہو جائے یہ ایسا ہے جیسا کہ ایک شعر جس کے معنی ہم کو معلوم نہیں ہم بار بار پڑھتے اور ہر بار لذت پاتے ہیں اور اس لذت کی خاطر اسکو مکرر، سہ کرر پڑھنا ہم کو بھلا معلوم ہوتا ہے قرآن شریف میں بھی علوم پنجگانہ کی تعلیم میں دونوں مرتبوں کا لحاظ فرمایا گیا ہے، ناواقفوں کے لیے تعلیم مجہول کا طریق اختیار فرمایا، اور علماء کے نفوس کو ان علوم کی تکرار سے رنگنا چاہا ہے، مگر اکثر مباحث احکام میں تکرار واقع نہیں ہوا۔ اس لیے کہ وہاں دوسری قسم کا فائدہ مطلوب نہ تھا یہی وجہ ہے کہ شریعت میں قرآن کو بار بار تلاوت کا حکم دیا گیا ہے، اور صرف سمجھ لینے پر اکتفا نہیں کیا گیا۔ فرق صرف اس قدر رکھا گیا ہے کہ اکثر حالتوں میں ان مسائل کی تکرار تازہ عبارت اور جدید اسلوب میں اختیار فرمایا کہ وہ نفس

پر زیادہ موثر اور ذہن کے لیے زیادہ لذت بخش ہو، اگر ایک ہی لفظ کی تکرار کی جاتی تو یہ تکرار مثل وظیفہ کے ہو جاتی لیکن اختلاف تعبیرات اور بغیر اسلوب بیان کی صورت میں ذہن کو اس میں پورا خوض کرنے کا شوق ہوتا، اور ذہن مخاطب میں وہ مضمون بالکل اتر جاتا ہے۔

اگر کوئی سوال کرے کہ ان علوم پنجگانہ کو قرآن مجید میں کیوں منتشر کیا گیا اور کسی خاص ترتیب کی رعایت نہیں فرمائی، مثلاً ایسا کیوں نہیں کیا گیا کہ اول آلاء اللہ کا ذکر کر کے اس کا بیان پورا فرماتے بعد ازاں ایام اللہ کی بحث پوری ذکر کرتے اور اس کے بعد علم مخاصمہ کی تفصیل ہوتی، اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ خدا تعالیٰ کی قدرت تمام ممکنات کو شامل ہے لیکن اس قسم کے امور کا دار و مدار حکمت اور مصلحت پر ہے اور وہ حکمت اور مصلحت یہ ہے کہ قرآن مجید میں مبعوث الیھم یعنی عربوں کی زبان اور ان کے اسلوب بیان کے ساتھ موافقت کی گئی ہے اور آیت لقالوا لولا فصلت آیاته أ أعجميٌ و عربيٌ میں اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اہل عرب کے پاس قرآن شریف کے نازل ہونے تک کوئی کتاب نہ آسمانی نہ انسان کی مرتب کی ہوئی موجود تھی اور جو ترتیب ابواب وفصول مصنفین نے اب اختراع کی ہے عرب اس سے ناواقف تھے اگر اس امر کا یقین نہ ہو تو مخضر مین کے قصائد کو بغور دیکھ لو اور آنحضرتؐ کے مراسلات اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مکتوبات کو مطالعہ کر و تا کہ یہ مسئلہ ان کے ذریعہ سے تم پر منکشف ہو جائے پس اگر قرآن شریف کی زبان ان کے اسلوب کے خلاف ہوتی تو وہ متحیر رہ جاتے، اور ایسے کلام کے سننے سے جس سے ان کے کان آشنا نہ تھے ان کی عقلیں پریشان ہو جاتیں علاوہ ازیں مقصودِ باری فقط یہ نہیں کہ علم ہو جائے بلکہ یہ مقصود ہے کہ علم استحضار اور پختگی کے ساتھ ہو اور یہ مقصود غیر مرتب سے زیادہ قوت اور کمال کے ساتھ حاصل ہوتا ہے۔

اگر کوئی سوال کرے کہ شعراء کا وزن و قافیہ جو زیادہ لذیذ معلوم ہوتا ہے اس کو کیوں اختیار نہیں کیا گیا، جواب یہ ہے کہ لذت کی زیادتی ہر قوم اور ہر ذہن و مذاق کے اعتبار سے مختلف ہے، اور اگر یہ بھی مان لیا جائے (کہ شعراء کا وزن لذیذ تر ہے) تو رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے باجودیکہ آپ امی تھے، ایک عدیم المثال وزن وقافیہ کی ایجاد آپ کی نبوت کا کھلا ہوا نشان ہے کیونکہ اگر شعراء کے وزن اور قافیہ میں قرآن مجید نازل کیا جاتا تو کفار بھی خیال کرتے کہ یہ تو ایسے

ہی اشعار ہیں جو کہ عرب میں مارے مارے پھرتے ہیں اوران کوکسی شمار وقطار میں نہ رکھتے، نظم ونثر کے بلغاء بھی اگر اپنے ہمعصر فضلاء میں اپنے آپ کو نمایاں اور ممتاز کسی ظاہر دلیل کے ساتھ ثابت کرنا چاہتے ہیں تو وہ بھی کوئی تازہ زمین یا جدید اسلوب اختراع کرتے اور کہتے ہیں کہ کوئی ہے کہ ایسی غزل اس زمین میں یا کوئی مراسلہ اس اسلوب میں لکھ سکے، اگر یہ لوگ اسی پرانی طرز انشاء میں طبع آزمائی کریں تو اس سے ان کے اعلیٰ کمال کا ادراک محققین کے سوا عام طور پر نہیں ہوسکتا۔

اگر پوچھا جائے کہ قرآن مجید کا اعجاز کس وجہ کے اعتبار سے ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ ہمارے نزدیک ثابت ہے کہ اعجاز قرآن کے بہت سے وجوہ ہیں جن میں سے بعض بیان کئے جاتے ہیں اول اسلوبِ بدیع، کیونکہ عربوں کے پاس بلاغت کے چند میدان تھے جن میں وہ اپنی فصاحت کے گھوڑے کو بگٹٹ اڑاتے اور ہمعصروں سے بڑھنے کی سعی کرتے تھے وہ میدان قصائد، اور خطبے، اور رسائل اور محاورات ہیں، عرب لوگ ان چار اسلوب کے علاوہ اور کچھ نہیں جانتے تھے اور نہ کسی پانچویں اسلوب کے اختراع پر قادر تھے، بدیں وجہ حضور اکرم ﷺ کی زبانِ مبارک پر حالانکہ آپ امی تھے ایک خاص اور ممتاز اسلوب کی ایجاد جو کہ ان کے مروجہ اسالیب کے علاوہ ہے، بے شک اعجاز ہوگا، دوم گزشتہ تواریخ اور امم سابقہ کے احکام کے بغیر پڑھے لکھے ایسی تفصیل بیان کرنا جو کتب سابقہ کی مصدق ہو، سوم پیشین گوئیاں اور پیشگوئیوں میں سے جو واقعہ ظہور پذیر ہوگا، اعجاز تازہ ہوگا چہارم بلاغت وہ مرتبہ جو کہ انسانی طاقت سے بالاتر ہے، ہم لوگ چونکہ عرب اول کے بعد میں پیدا ہوئے ہیں اس لیے مرتبۂ بلاغت کی حقیقت تک نہیں پہونچ سکتے لیکن اتنا ضرور جانتے ہیں کہ شیریں کلمات اور چست بندشوں کا استعمال جس لطافت اور سادگی اور بے تکلفی کے ساتھ جیسا کہ ہم قرآن شریف میں پاتے ہیں اس قدر متقدمین اور متاخرین کے کسی قصیدہ میں نہیں پاتے اور یہ ایک وجدانی بات ہے جس کو ماہر شعراء ہی جان سکتے ہیں، عوام اس میں کچھ حصہ نہیں لے سکتے اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ علمِ تذکیر اور مخاصمہ جہاں کہیں معانی کو الفاظ کا دوسرا لباس سورۃ کے اسلوب خاص کے موافق پہناتے ہیں اس میں ایک عجیب کیفیت اور ندرت ہوتی ہے کہ ہماری عقول کا دست حرص اس کے ادراک کے دامن تک نہیں پہونچ سکتا۔

اگر کوئی ہمارے بیان بالا کو نہ سمجھا ہو تو اس کو چاہئے کہ انبیاء کے ان قصوں میں جو کہ سورۂ

اعراف، سورہ ھود و سورہ شعراء میں واقع ہیں، اول تامل کرے اور پھر انہی قصوں کو سورۂ صافات میں اور بعد ازاں ذاریات میں دیکھے تاکہ باہمی فرق اسلوب منکشف ہو جائے، علیٰ ہذا گناہگاروں کے عذاب اور فرمانبرداروں کے ثواب کو ہر موقع پر ایک خاص رنگ دیا جاتا ہے، اور دوزخیوں کے جھگڑوں کا جلوہ ہر جگہ نرالی صورت میں دکھایا جاتا ہے تفصیل اس کی بہت طویل ہے اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ مقتضائے حال اور استعارات و کنایات کی رعایت جن کی تفصیل علم معانی و بیان میں ہے اور اس کے ساتھ مخاطبین کی حالت کی رعایت جو کہ محض ان پڑھ اور ان فنون سے ناآشنا تھے جس قدر قرآن مجید میں موجود ہے اس سے بہتر مافوق متصور نہیں ہو سکتی کیونکہ یہاں مقصود یہ ہے کہ مشہور مخاطبات میں جن سے سب آدمی واقف ہیں چند عام فہم اور خواص پسند نکات ودیعت رکھی جائیں یہ بات اجتماع نقیضین کی نظیر ہے۔ ؎

زپائے تابسرش ہر کجا کہ مے نگرم
کرشمہ دامنِ دل مے شد کہ جا ایں جاست

منجملہ وجوہ اعجاز کے ایک وجہ ایسی ہے جس کو سوائے ان لوگوں کے جو اسرار شریعت میں تدبر اور تفکر کرتے ہیں، کوئی نہیں سمجھ سکتا، اور وہ یہ ہے کہ یہ علوم پنجگانہ ہدایت انسانی کی رو سے خود قرآن شریف کے منجانب اللہ ہونے کی دلیل ہیں اس کی ایسی مثال ہے کہ کوئی طبیب حاذق کسی ایسی طب کی کتاب کو دیکھے جس میں امراض کے اسباب و علامات اور ادویہ کے خواص کی تحقیقات نہایت اعلیٰ پیمانہ پر کی گئی ہو تو اس باب میں کسی قسم کا شک نہیں ہو سکتا کہ اس کا مؤلف فنِ طب میں نہایت کامل ہے ایسے ہی اسرار شرائع کا عالم خوب واقف ہے کہ تہذیب نفس کے لیے کیا کیا چیزیں انسان کو تعلیم کی جا سکتی ہیں، اس کے بعد اگر علوم پنجگانہ میں وہ غور کرے گا تو اس کو بغیر کسی قسم کے شک کے معلوم ہو جائیگا کہ یہ علوم اپنے معانی کے اعتبار سے اس اعلیٰ مرتبہ پر واقع ہوئے ہیں جن پر اضافہ قطعاً محال ہے۔ ؎

آفتاب آمد دلیل آفتاب
گر دلیلت باید ازوے رومتاب

باب چہارم

فنون تفسیر اور صحابہ اور تابعین رضوان اللہ علیہم کے اختلاف فی التفسیر کے حل میں

جاننا چاہئے کہ مفسرین کی جماعتیں مختلف ہیں، ایک جماعت صرف ان آثار کی روایت پر کمر بستہ ہے جو آیات سے مناسبت رکھتی ہوں خواہ احادیث مرفوعہ ہوں یا موقوفہ یا کسی تابعی کا قول ہو یا اسرائیلی روایت یہ طریقہ محدثین کا ہے اور ایک گروہ اسماء وصفات کی آیات میں تاویل کرتا ہے کہ ان میں سے جس آیت کو مذہب تنزیہ حق جل وعلی شانہ کے موافق نہیں خیال کرتے اس کے ظاہری معنی نہیں لیتے، یہی گروہ مخالفین کے ایسے اعتراضات کو جو کہ بعض آیات پر وہ کرتے ہیں، رد کرتا ہے، یہ شان متکلمین کی ہے اور ایک قوم مسائل فقہیہ کا استنباط کرتی اور بعض مجتہدات کو بعض پر ترجیح دیتی اور مخالف دلیل کا جواب دیتی ہے، یہ فقہاء اور اہل اصول کی روش ہے اور ایک جماعت قرآن مجید کے لغات کی تشریح کرتی ،اور ہر محاورہ کے باب میں کلامِ عرب کی نہایت کثرت کے ساتھ سندیں پیش کرتی ہے، یہ نحویین اور اہل لغت کی وضع ہے، اور ایک گروہ علم معانی اور علم بیان کر کے نکات کو تمام تر بیان کرتا ہے اور کلام اللہ کی داد ان علوم کے اعتبار سے دیتا ہے یہ ادیبوں کا آئین ہے، اور بعض لوگ قرآن مجید کی ان قرأتوں کو جو ائمہ سے مسلسل منقول چلی آرہی ہیں نہایت ایضاح وتفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں، یہ قراء کی حالت ہے، اور کچھ آدمی علم سلوک یا حقائق کے نکات کو ادنیٰ مناسبت سے بیان کرتے ہیں یہ صوفیوں کی روش ہے، الحاصل تفسیر کا میدان نہایت وسیع ہے اور اس میں چلنے والے ہر مسلمان کا قصد اس کے معانی سمجھنے کا ہے اور ہر

ایک نے ایک خاص فن میں غور وخوض کیا اور اپنی قوت فصاحت اور سخن فہمی کے مطابق بیان کیا ہے اور اپنی جماعت کے افراد کے مذہب کو منظور نظر رکھا ہے، یہ وجہ ہے جس سے فن تفسیر نے ایسی وسعت بے پایاں حاصل کی جس کا ٹھیک ٹھیک اندازہ نہیں کیا جا سکتا، اور نیز اسی وجہ سے تفسیر میں اس کثرت سے کتابیں لکھی گئیں جن کا شمار ممکن نہیں، مفسرین کے ایک گروہ کا خیال ان تمام علوم کے یکجا کرنے کا بھی ہوا ہے، اور کبھی عربی میں اور کبھی فارسی میں کتابیں لکھیں اور ان کے طول واختصار میں بھی فرق ہے، جس نے علم کے دامن کو اور بھی وسیع کر دیا ہے، اس فقیر کو الحمدللہ ان تمام فنون میں خاص مناسبت حاصل ہے اور علوم تفسیر کے اکثر اصول اور ایک معقول مقدار اس کے فروع کی معلوم ہے اور اس کے ہر فن میں اجتہاد فی المذہب کے قریب قریب تحقیق و استقلال حاصل ہو گیا ہے ان کے علاوہ فنون تفسیر کے دو تین اور فن بھی فیض الٰہی کے نامتناہی دریا سے القاء ہوئے ہیں اگر سچ پوچھنا ہے تو میں قرآن مجید کا بلا واسطہ ایسا ہی شاگرد ہوں جیسا کہ روح پرفتوح حضرت رسالت مآب رسول اللہ ﷺ کا اویس ہوں اسی طرح کعبہ حسنٰی سے بے وسیلہ مستفید اور صلوٰۃ عظمیٰ سے اثر پذیر ہوں۔ شعر

ولو ان لی فی کل منبت شعرۃ

لسانا لماء استوفیت واجب حمدہ

ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان علوم میں سے دو دو تین تین حرف رسالہ ھذا میں لکھیں جائیں۔

فصل

ان آثار کے بیان میں جو کتب تفسیر اہل حدیث میں مروی ہیں اور اس کے متعلقات کتب تفسیر میں مذکور آثار میں سے بعض آثار اسباب نزول کے بیان کے متعلق ہوتے ہیں، سبب نزول کی دو قسمیں ہیں، ایک قسم یہ کہ کوئی ایسا حادثہ ہوا جس میں مومنوں کے ایمان اور منافقوں کے نفاق کی جانچ ہو گئی چنانچہ احد و احزاب میں ایسا ہوا اور خدا تعالیٰ نے مومنوں کی مدح اور منافقین کی مذمت نازل فرمائی تاکہ ان دونوں گروہوں میں امتیاز ہو جائے، اور اس مدح و ذم میں اس خاص حادثہ کی جانب تعریضات بکثرت مذکور ہوئی ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ پہلے اس واقع کی مختصر تاریخ لکھ دی جائے تاکہ ان آیات کا سیاق پڑھنے والے کو منکشف ہو جائے، دوسری قسم یہ ہے کہ

آیت کے معنی اس حادثہ کے معلوم کیے بغیر ہی جو کہ سبب نزول ہوا ہے اپنے عموم کے اعتبار سے مستقل ہیں اور اس میں حکم عموم لفظ کا معتبر ہے نہ خصوص سبب نزول کا مگر متقدمین مفسرین نے یہ ارادہ کر کے کہ اس آیت کے مناسب احادیث کو جمع کر دیا جائے یا کتاب کے مفہوم و حکم عام کا کوئی مصداق ذکر کیا جائے اس قصہ (سبب نزول) کو ذکر کیا ہے، اس قسم کے قصوں کا ذکر کرنا چنداں ضروری نہیں ہے، اس فقیر کے نزدیک یہ محقق ہوا ہے کہ حضرات صحابہ اور تابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین اکثر فرماتے ہیں کہ یہ آیت فلاں فلاں حادثہ میں نازل ہوئی۔ مگر ان کا مقصود صرف آیت کے افراد و مصداق کی تصویر اور بعض ایسے مخصوص حادثات کا ذکر مقصود ہوتا ہے جن کو آیت اپنے عموم حکم کی وجہ سے شامل ہے اس سے عام ہے کہ وہ واقعہ جس کو انہوں نے سبب نزول کہا ہے، نزول آیت سے مقدم ہو یا مؤخر اسرائیلی ہو یا جاہلی یا اسلامی آیت کے تمام قیود کو حاوی ہو یا بعض کو واللہ اعلم۔

ہماری اس تحقیق سے معلوم ہوا کہ اجتہاد کو بھی اس سبب نزول میں کچھ دخل ہے اور اسباب نزول میں متعدد قصوں کے ذکر کرنے کی گنجائش ہے، جس شخص کو یہ نکتہ محفوظ ہو تو ظاہر ہے کہ مختلف اسباب نزول کا حل ادنیٰ تامل اور تھوڑی توجہ سے کر سکتا ہے۔

اور بعض ان میں سے یہ ہے کہ کسی قصے کی تفصیل کی جائے جس کی طرف نظم آیت میں کوئی اشارہ موجود ہے اس صورت میں مفسرین رحمہم اللہ کا قصد یہ ہوتا ہے کہ اخبار بنی اسرائیل یا سیرو تاریخ سے اس قصہ کو مع اس کی جملہ خصوصیات کے ذکر کریں، اس موقع پر ایک اور بھی تفصیل ہے، وہ یہ ہے کہ اگر کوئی قصہ ایسا ہو جس کی طرف آیت کے ظاہر الفاظ میں ایسا اشارہ ہے کہ زبان کا جاننے والا اس پر آ کر رک جاتا اور اس کی تلاش کرنے لگتا ہے تو ایسے واقعات کا بیان کرنا مفسرین کا فرض ہے اور جو قصہ اس قسم سے خارج ہے مثلاً بنی اسرائیل کی گائے کا حال کہ نر تھی یا مادہ یا اصحاب کہف کے کتے کی رنگتیں کہ وہ چتلا تھا یا سرخ، یہ امور بے فائدہ تکلفات ہیں، صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ ایسی بحثوں کو مکروہ جانتے اور تضیع اوقات خیال فرماتے تھے، یہاں پر دو نکتے یاد رکھنے کے قابل ہیں اول یہ کہ واقعات کی نقل میں قاعدہ یہ ہے کہ ان کو جیسا سنا ہے بغیر عقلی تصرف کے بیان کیا جائے، مگر متقدمین مفسرین کی ایک جماعت اس تعریض کو اپنا پیشوا بناتی اور اس کا کوئی

مناسب محل فرض کر کے برنگ احتمال اس کی تقریر کرتی ہے جس کی وجہ سے متاخرین کو اشتباہ ہو جاتا ہے اس لیے کہ اس وقت تقریر کے اسلوب زمانہ حال کے موافق منقح نہیں ہوئے تھے، اکثر ایسا ہونا ممکن ہے کہ تقریر علی سبیل الاحتمال تقریر بالجزم کے ساتھ مشتبہ ہو جائے یا ایک کو دوسری جگہ اختیار کر لیا جائے اور یہ مسئلہ اجتہادی ہے عقل لگانے کی اس میں گنجائش اور قیل وقال کا وسیع میدان ہے، اگر کوئی اس نکتہ کو یاد رکھے تو وہ بہت سے مقامات پر مفسرین کے اختلاف کا فیصلہ کر سکتا ہے۔ اور نیز بیشتر مناظرات صحابہ کے متعلق معلوم کر سکتا ہے کہ وہ ان کا مذہب نہیں ہے، ایک علمی تفتیش ہے جس کو بعض مجتہدین دوسرے مجتہدین سے بیان کرتے ہیں، حضرت ابن عباسؓ کے قول کو آیت فامسحوا برؤسکم وارجلکم الی الکعبین میں فقیر اسی پر حمل کرتا جو یہ ہے لا اجدفی کتاب الله الا المسح لکنهم ابوا الا الغسل (مجھکو تو کلام اللہ میں پیروں کا مسح ہی ملتا ہے مگر لوگ اس سے دھونا ہی سمجھتے ہیں) قول ابن عباس کا مطلب فقیر کے نزدیک یہ ہے کہ یہاں پر وہ مسح کی فرضیت کی طرف نہیں گئے کہ وہ آیت کو مسح کی رکنیت پر حمل کرنے کا یقین رکھتے ہوں، حضرت ابن عباس کا مذہب بھی وضو میں پیر دھونے کا ہی ہے لیکن یہاں وہ ایک اشکال کو بیان اور ایک احتمال کی تقریر کرتے ہیں تا کہ دیکھیں، علماء زمانہ اس تعارض کی تطبیق میں کون سی راہ اختیار کرتے ہیں لیکن جو لوگ سلف کے روزمرہ سے واقفیت نہیں رکھتے انہوں نے اسکو ابن عباسؓ کا قول سمجھ کر ان کا مذہب قرار دے لیا حاشا وکلاّ۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ اسرائیلی روایات کا نقل کرنا ایک ایسی بلا ہے جو ہمارے ذہن میں داخل ہوگئی ہے حالانکہ قاعدہ یہ ہے کہ ان کی نہ تصدیق کرو نہ تکذیب، اس قاعدہ سے دو باتیں معلوم ہوئیں، اول یہ کہ جب تک تعریض کلام اللہ کا بیان حدیث نبوی ﷺ میں دستیاب ہو سکے بنی اسرائیل سے نقل نہ کرنا چاہئے، ولقد فتنا سلیمان والقینا علی کرسیه جسداً ثم اناب کا محل جب کہ حدیث نبوی میں انشاء اللہ کے ترک کرنے اور اس پر مواخذہ ہونے کا قصہ پایا جاتا ہے تو کیا ضرورت ہے جو صخرہ کا قصہ ذکر کیا جائے، دوسرے یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ ضروری امر اپنی حد ضرورت تک ہی محدود رہتا ہے اس لئے اقتضائے تعریض کی مقدار کو محفوظ رکھتے ہوئے بیان کرنا چاہئے تا کہ اس کی تصدیق ہم قرآنی شہادت سے کر سکیں اور اس سے زیادہ بیان سے زبان کو روکنا

چاہئے، یہاں پر ایک نہایت لطیف نکتہ بھی ہے، اس کو ضرور سمجھنا چاہئے، وہ یہ ہے قرآن شریف میں کسی مقام پر ایک قصہ کو مجملاً بیان کیا جاتا ہے اور کسی جگہ مفصلاً جیسا کہ اول یہ فرمایا قال تعالی انی اعلم مالاتعلمون اور یہ فرمایا الم اقل لکم انی اعلم غیب السمٰوٰت والارض واعلم ما تبدون وماکنتم تکتمون۔ یہ بیان دراصل وہی سابق بیان ایک قسم کی تفصیل کے ساتھ ہے، اس لئے اس تفصیل سے اجمال سابق کی تفسیر کر سکتے ہیں اور اس اجمال سے تفصیل کا پتہ لگا سکتے ہیں، مثلاً سورۂ مریم میں عیسیٰ علیہ السلام کا قصہ مجملاً ذکر فرمایا گیا (ولنجعلہ اٰیۃ للناس ورحمۃ منا وکان امراً مقضیاً) اور آل عمران میں مفصل طور پر (ورسولاً الی بنی اسرآئیل انی قد جئتکم الایہ) اس مقولہ میں تفصیلی بشارت ہے، اور پہلا بیان بشارت اجمالی اس لیے بندۂ ضعیف نے اس آیت کے یہ معنی لیے ہیں کہ (رسولاً الی بنی اسرآئیل مخبراً بانی قد جئتکم) اور یہ تمام مضمون بشارت کے ذیل میں داخل ہے کسی محذوف کے متعلق نہیں جیسے علامہ سیوطیؒ نے اس طرف عبارت ذیل میں اشارہ کیا ہے، فلما بعثہ اللہ قال انی رسول اللہ الیکم بانی قد جئتکم واللہ اعلم۔

اور اس میں شرح غریب ہے، جس کی بناء یا تو لغت عرب کے تتبع پر ہے اور یا آیت کے سیاق وسباق فہم اور لفظ کی اس مناسبت کے علم پر ہے جو کہ اس کے اپنے جملہ کے اجزاء کے ساتھ حاصل ہے اس لئے اس مقام پر بھی عقل کا دخل اور اختلاف کی گنجائش ہے کیونکہ ایک کلمہ زبان عرب میں متفرق معانی کے لیے آتا ہے اور استعمالات عرب کے تتبع اور سابق ولاحق کی مناسبت کے فہم میں عقول مختلف ہوتی ہیں، ایک منصف مفسر کو شرح غریب کے دو پہلوؤں پر غور کرنا چاہئے، ایک استعمال عرب پر کہ اس کے اعتبار سے کون سی صورت اقویٰ ہے اور دوسرے لاحق وسابق کی مناسبت پر کون سی جہت راجح ہے۔ فقیر نے اصول موضوعہ تفسیر کے انضباط اور مقامات استعمال کی چھان بین اور احادیث کی پوری دیکھ بھال کے بعد شرح غریب کے متعلق ایسے تازہ استنباط کئے ہیں جن کا لطف بجز بے انصاف اور نافہم کے کسی پر مخفی نہیں رہ سکتا، مثلاً: کتب علیکم القصاص فی القتلیٰ کو تکافو قتلیٰ کے معنی اور ایک دوسرے کے حکم میں شرکت پر حمل کیا جائے تاکہ الانثیٰ بالانثیٰ کے معنیٰ سمجھنے میں نسخ کا قائل اور ایسی توجیہات کا مرتکب نہ ہونا پڑے جو

ادنیٰ تامل سے ساقط ہو جاتے ہوں اور مثلاً یسئلونك عن الاهلة کو یسئلونك عن الاشهر کے معنی پر حمل کیا جائے یعنی سوال شہر حج کی نسبت کیا گیا تھا جس کا جواب ہی مواقیت للناس والحج دیا گیا، اور مثلاً هوالذی اخرج الذین کفروا من اهل الکتاب من دیارهم ولاول الحشر کے معنی لاول جمع الجنود اس لیے کئے جاتے ہیں کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے وابعث فی المدائن حاشرین اور وحشر سلیمان جنوده یہ معنی قصہ بنی نضیر کے ساتھ دیکھنے سے زیادہ چسپاں معلوم ہوتے ہیں، اور بیان احساس میں اقویٰ۔

بعض ان میں سے بیان ناسخ و منسوخ ہے، اس مقام پر دو نکتے یاد کرنے کے قابل ہیں۔ ایک یہ کہ صحابہ و تابعین رضوان اللہ علیہم نسخ کا استعمال اصولیوں کی اصطلاح کے علاوہ دوسرے ایسے معنی پر فرماتے تھے جو کہ لغوی معنی (یعنی ازالہ) کے قریب تر ہے بدیں وجہ ان کے نزدیک نسخ کے معنی یہ ہوئے کہ پہلی آیت کے بعض اوصاف کا ازالہ بعد کی آیت سے عام ہے کہ وہ انتہائے عمل ہو یا معنی متبادر کا غیر متبادر کی جانب کلام کا انصراف یا کسی قید کے زائد ہونے کا بیان ہو یا عام کی تخصیص یا اس امر کا اظہار ہو کہ نصوص اور اس میں جو کہ اس پر ظاہراً قیاس کر لیا گیا ہے، بہت فرق ہے وغیرہ وغیرہ یہ ایک وسیع بحث ہے جس میں عقل کے لیے میدان اور اختلاف کو پوری گنجائش ہے اس لیے ان حضرات نے آیات منسوخہ کی تعداد پانچ سو تک بڑھا دی ہے، دوسرا یہ کہ اصطلاح نسخ کے بیان میں اصل یہ ہے کہ نزول آیات کا زمانہ معلوم ہو مگر کبھی سلفِ صالح کے اجماع یا جمہور کے اتفاق کو علامت نسخ قائم کر کے اس کے قائل ہو جاتے ہیں بہت سے فقہاء اس بات کے مرتکب ہوئے حالانکہ ممکن ہے کہ مصداقِ آیت مصداق اجماع کے مخالف ہو، الحاصل وہ آثار جو نسخ سے بنے ہیں بہت مشتبہ ہیں، اور ان میں معاملہ کی تہ کو پہونچنا سخت دشوار ہے، اور محدثین کے پاس ان اقسام کے علاوہ اور چیزیں بھی ہیں جن کو وہ بیان کرتے ہیں مثلاً صحابہ رضی اللہ عنہم کا مناظرہ کسی مسئلہ میں اور اس میں ایک خاص آیت کا استشہاد یا ان کی تمثیل کسی آیت کے ذکر سے یا تلاوت فرمانا آنحضرت کا استشہاد کے طور پر اور کسی ایسی حدیث کی روایت جو آیت کے اصل معنی میں موافق ہو، یا تلفظ کا وہ طریقہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یا صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے منقول ہو۔

فصل دوم

اس باب کے باقی لطائف

منجملہ لطائف کے ایک، مسائل کا استنباط ہے، استنباطِ مسائل کا باب نہایت درجہ وسیع ہے اور آیات کے فحویٰ اور ایماء اور اقتضا اٰتِ علم میں عقل کے لیے میدان وسیع اور اختلاف کی پوری گنجائش حاصل ہے، ان استنباطات کا حصر دس اقسام میں اور ان کی ترتیب اس فقیر کے قلب پر القاء کی گئی ہے جو کہ بہت سے احکامِ مستنبطہ کی جانچ پرتال کے لیے نہایت سچا کانٹا ہے اور منجملہ ان کے ایک توجیہہ ہے اور توجیہہ ایک ایسا فن ہے جس میں بکثرت شاخیں ہیں اور جس کو شارحین متون کی شرح میں استعمال کرتے ہیں اور اس میں ان کی ذکاوت اور جودتِ ذہن کا امتحان ہو جاتا ہے، صحابہ نے حالانکہ ان کے زمانہ میں قوانینِ توجیہہ کی تنقیح نہ ہونے پائی تھی قرآن مجید کی توجیہہ بکثرت فرمائی ہے، توجیہہ کی حقیقت صرف اسقدر کہ اگر مصنف کے کلام میں شارح کو کوئی ایسی دشواری نظر آئے تو وہ اس پر رک جائے، اس صعوبت کو حل کر دے اور چونکہ کتاب کے پڑھنے والوں کے ذہن یکساں نہیں ہوتے اس لیے توجیہہ کے مراتب بھی یکساں نہیں ہیں، مبتدیوں کے لیے توجیہہ اور ہے اور منتہیوں کے لئے اور بسا اوقات کوئی صعوبت منتہی کی سمجھ میں ایسی آتی ہے کہ وہ اس کے حل کا محتاج ہوتا ہے اور مبتدی اس سے غافل ہوتا ہے بلکہ وہ اس کی سمجھ میں بھی نہیں آسکتی، اور میدانِ کلام مبتدی پر دشوار ہوتا ہے نہ کہ منتہی پر مگر چونکہ شارح کا مقصود اذہان کے تمام انواع کا احاطہ ہوتا ہے اس لیے عام پڑھنے والوں کے حال کو اختیار کرتا اور ان کی سمجھ کے موافق کلام کرتا ہے اس لیے آیاتِ مخاصمہ میں عمدہ توجیہہ ان فرقوں کے مذاہب کا بیان اور وجہ الزام کی تنقیح ہے، اور آیات احکام میں صورت مسئلہ کی تصویر کھینچنا، اور قیود کے فوائد احتراز وغیرہ کو بیان کرنا ہے اور آیات تذکیر بآلاء اللہ میں نعماتِ الٰہیہ کی تصویر اور ان کے خاص خاص مواضع کا بیان ہے، اور آیات تذکیر بایام اللہ میں قصوں کی باہمی ترتیب اور اس تعریض کی توضیح کرنا ہے جو کہ قصہ میں مذکور ہوتی ہے، اور موت اور مابعد موت کی تذکیر میں اس وقت کی تصویر اور اس وقت کے

حالات کا بیان ہے ،فنون توجیہہ میں یہ بھی داخل ہے کہ جو امر نا مانوس ہونے کی وجہ سے بعید الفہم ہے اس کو قریب الفہم کیا جائے اور نیز دو دلیلوں یا دو تعریضوں یا معقول ومنقول کے درمیان سے تعارض اٹھایا جائے اور دو مشتبہ چیزوں میں فرق اور دو مختلف باتوں میں تطبیق دی جائے ،اور آیات میں جس وعدہ کی جانب اشارہ ہے اس کی صداقت کا اظہار کیا جائے اور جو امر قرآن شریف میں ہوا ہے اس پر آنحضرت ﷺ کے عمل کی کیفیت کا بیان ہو، الحاصل صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ کی تفسیر میں توجیہہ کا حصہ بہت ہے،اور ایسے مقام صعب کا حق ادا نہیں ہو سکتا، جب تک کہ اول اس دشواری کی وجہ کو تفصیلاً نہ بیان کیا جائے اور اس کے بعد اس دشواری کے حل کو مفصل لکھا جائے اور پھر ان اقوال کی باہمی جانچ کی جاوے اور متشابہات کی تاویل صفاتِ باری تعالیٰ کی حقیقت کے بیان کرنے میں متکلمین جس قدر مبالغہ کرتے ہیں وہ میرا مذہب نہیں ہے ،میرا مذہب وہ ہے جو امام مالکؒ، امام ثوریؒ اور ابن مبارکؒ اور تمام قدماء کا مذہب ہے۔ یہ امر بظاہر متشابہات میں داخل ہے اور اس کی تاویل میں مبالغہ وخوض کرنا متروک اور احکامِ مستنبطہ میں نزاع، اور اپنے اپنے مذہب کا استحکام اور دوسرے مذہب کا ابطال اور قرآن مجید کے دلائل کے دفع کرنے میں حیلہ سازی یہ تمام باتیں میرے نزدیک صحیح نہیں ہیں مجھے خوف ہے کہ یہ تدارء بالقرآن کے قبیلہ سے نہ ہو، عالم کو چاہئے کہ وہ آیات کے مفہوم کو تلاش کرے اور اسی کو اپنا مذہب قرار دے خواہ وہ اس کے مذہب سابق کے موافق ہو یا مخالف لیکن لغتِ قرآنی کو عرب اول کے استعمالات سے لینا چاہئے اور صحابہ وتابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے آثار پر کلی اعتماد کرنا چاہئے اور قرآن شریف کے نحو میں ایک عجیب فساد پیدا ہو گیا ہے، وہ یہ ہے کہ ایک جماعت مفسرین نے مذہب سیبویہؒ اختیار کیا ہے اس لیے کلام اللہ میں جو استعمال ان کو اس کے مذہب کے خلاف ملتا ہے اس کی تاویل کرتے ہیں خواہ تاویل بعید ہی کیوں نہ ہو اور یہ بات میرے نزدیک صحیح نہیں ہے، عالم کو چاہئے کہ وہ اس امر کا اتباع کرے جو سیاق وسباق کے موافق اور زیادہ قوی ہو خواہ سیبویہؒ کا مذہب ہو یا فراء کا اور والمقیمین الصلوۃ والموتون الزکوۃ کی امثال میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ستقیمھا العرب بالسنتھا اور فقیر کے نزدیک کلمہ ہٰذا کی یہ تحقیق ہے کہ مشہور محاورہ کے مخالف محاورہ بھی محاورہ ہی ہوتا ہے،اور عرب اول اپنے خطبات میں بکثرت ایسے محاورات

استعمال کرتے تھے جو کہ مشہور قواعد کے مخالف ہوتے تھے، اور چونکہ کلام اللہ عرب اول کی زبان میں نازل ہوا اس لیے اگر کسی جگہ واؤ کی جگہ یا اور تثنیہ کی جگہ مفرد اور مذکر کی جگہ مؤنث آ جائے تو کوئی تعجب خیز بات نہیں اس لیے جو بات محقق ہے وہ یہ کہ ترجمہ والمقیمین الصلوٰۃ حالتِ رفع کے اعتبار سے کیا جائے، واللہ اعلم۔

علمِ معانی و بیان ایک ایسا علم جو کہ حضراتِ صحابہ اور تابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے زمانہ کے بعد پیدا ہوا ہے، بدیں وجہ اس کے جو مسائل جمہور عرب کے عرف کے موافق سمجھ میں آئیں علی الراس والعین، اور جو ایسے دقیق امور ہیں کہ ان فنون میں گہری معلومات رکھنے والے کے سواء اور کسی کی سمجھ میں نہیں آتے ان کی نسبت ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ وہ کلام اللہ میں بھی مطلوب ہیں اور صوفیائے کرام کے اشارات و اعتبارات درحقیقت علمِ تفسیر کا جزء نہیں ہیں بلکہ قرآن شریف کے سننے کے وقت بعض باتیں سالک کے قلب پر ظاہر ہوتی ہیں جو نظمِ قرآن اور اس حال سے جو سالک پر طاری ہوتا ہے، یا اس معرفت سے جو اس کو حاصل ہوتی ہے، پیکر ہوتی ہیں، اس کی ایسی مثال ہے کہ کوئی عاشق لیلیٰ و مجنوں کا قصہ سنے اور اس کی وجہ سے وہ اپنی محبوبہ کو یاد کرے اور نیز اس کے ان واقعات کی تصویر جو محبوبہ کے ساتھ گزر چکی ہیں اس کی نظروں کے سامنے کھنچ جائے، یہاں ایک مہتم بالشان فائدہ ہے، اسکو جان لینا چاہیے، وہ یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تعبیر رؤیاء کے فن کو معتبر قرار دیا ہے اور اس راہ کو خود چل کر دکھایا ہے تاکہ تعبیر رؤیاء امت کے لیے سنت نبوی بن جائے اور ان پر وہبی علوم میں سے ایک دوسری راہ کا دروازہ کھل جائے مثلاً آیت فاما من أعطي واتقى، مسئلہ تقدیر کی تمثیل میں بیان کیا جاتا ہے اگرچہ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جس شخص نے یہ افعال کئے اس کو جنت کی بے بہا نعمتیں عطا کی جائیں گی اور جو ان کے خلاف کا مرتکب ہوگا اس پر دوزخ اور عذاب کا دروازہ کھولا جائے گا، لیکن فنِ تعبیر کی راہ سے یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ ہر ایک شخص کو ایک ایسی مخصوص حالت کے لیے پیدا فرمایا ہے اور وہ حالت اس پر طاری ہوتی ہے خواہ وہ واقف نہ ہوتا ہو، اس لیے اس آیت کو تقدیر کے مسئلہ سے ربط ہوگیا، علیٰ ہذا آیت و نفسٍ وّ ما سوّاها فالهمها فجورها وتقواها کا مفہوم یہ ہے کہ خداتعالیٰ نے ہر شخص کو نیکی اور بدی پر مطلع فرمایا لیکن نیکی اور بدی کی صورتِ علمیہ کے پیدا کرنے کو نفخ روح کے وقت ان کو اجمالاً

پیدا کرنے کے ساتھ مشابہت ہے اس لیے بذریعہ اعتبار کے اس آیت سے مسئلہ تقدیر میں فصل کر سکتے ہیں واللہ اعلم۔

فصل

غرائب قرآنی جن کو احادیث میں مزید اہتمام اور فضیلت سے خاص کیا گیا ہے، ان کے چند انواع ہیں، تذکیر بآلاء اللہ کے فن میں غریب وہ آیت ہے جس میں حق تعالیٰ شانہ کی صفات کا بڑا مجموعہ ہو جیسے آیۃ الکرسی، سورۂ اخلاص اور سورۂ حشر کی آخری آیتیں اور سورۂ مومن کی اول کی اور تذکیر بایام اللہ میں غریب وہ آیت ہوگی جس میں کوئی قلیل الذکر قصہ بیان کیا جائے یا کسی معلوم قصہ کو ان کی پوری تفصیل سے ذکر کیا جائے یا کسی ایسے بہت مفید واقعہ کو جس میں حصول عبرت کے متعدد پہلو ہوں ذکر کیا جائے، یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خضر علیہ السلام کی ہمراہی کے قصہ میں فرمایا کہ میری آرزو تھی کہ موسیٰ علیہ السلام حضرت خضر علیہ السلام کے ہمراہ اور زیادہ صبر کرتے تاکہ خدا تعالیٰ ہم سے اس قصہ کو اور زیادہ ذکر فرماتا، اور تذکیر بالموت اور مابعد الموت کے فن میں غریب وہ آیت ہے جو کہ حالاتِ قیامت کے لیے جامع ہو، مثلاً رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو شخص قیامت کو کھلی آنکھوں سے دیکھنے کا آرزو مند ہو اس سے کہہ دو کہ وہ سورۂ اذا الشمس کورت کو پڑھے اور فنِ احکام میں غریب ایسی آیت ہے کہ جو حدود کے بیان اور وضع خاص کی تعیین کو شامل ہو مثلاً حدِ زنا میں سو درے کی تعیین اور تین حیض اور تین طہر کی تخصیص مطلقہ کی عدت میں اور میراث کے حصوں کی تعیین اور فنِ مخاصمہ میں غریب وہ آیت ہے جس میں جواب ایسے عجیب و غریب اسلوب پر بیان کیا جائے جو کہ شبہہ کو نہایت کامل طریقہ سے اٹھائے، اور یا کہ اس میں فریق میں مقابل کے حال کو ایک واضح مثال کے ساتھ بیان کیا جائے، کمثل الذی استوقد نارا، علیٰ ہذا بت پرستی کی قباحت اور خالق و مخلوق اور مالک و مملوک کے مراتب کا فرق عجیب امثلہ سے بیان کیا جائے، یا ریاکاروں اور طالبانِ شہرت کے اعمال کی ضبطی کو بلیغ اسلوب کے ساتھ بیان کیا جائے، غرائبِ قرآنی انہیں ابوابِ مذکورہ میں محصور نہیں ہیں بسا اوقات غرائب کلام کی بلاغت اور اسلوب کی شیرینی سے بھی

پیدا ہوتی ہے، مثلاً سورۂ الرحمٰن، یہی وجہ ہے کہ اس کا نام حدیث میں عروس القرآن رکھا گیا ہے اور کبھی غرائب، شقی اور سعید کے باہمی فرق کی تصویر کھینچنے سے پیدا ہوتی ہے، حدیث شریف میں آیا ہے لکل آیۃٍ منہا ظہرٌ وبطنٌ ولکل حد مطلع (۱) قرآن شریف کی ہر ایک آیت کے لیے ایک معنی ظاہری اور ایک باطنی ہیں، اور ہر ایک حد کے لیے جھانکنے کی جگہ ہے) جاننا چاہئے کہ ان علوم پنجگانہ کا ظہر وہ چیز ہے جو کہ کلام کا مدلول اور مفہوم ہے اور باطن علم تذکیر بآلاء اللہ میں یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی نعمتوں میں غور کیا جائے اور صحیح مراقبہ اور علم تذکیر باَیام اللہ میں ان قصوں سے مدح وذم اور عذاب وثواب کے موقوف علیہ کی پہچان ہے، اور نصیحت حاصل کرنا اور فن تذکیر بالجنۃ والنار میں امید وبیم کا ظہور اور ان امور کو چشم دید کیفیت تک پہنچانا اور احکام کی آیتوں میں ان کی فحوی سے باریک وخفی احکام کا استنباط اور گمراہ فرقوں سے مباحثہ میں ان مباحثوں کی اصل کی پہچان اور نیز ان کے ساتھ ان کی دوسری قباحتوں کو شامل کرنا کلام اللہ کے ظاہر کی اطلاع زبانِ عرب اور ان آثار کے علم سے ہوتی ہے جن کا تعلق فن تفسیر سے ہے اور اس کے ذہن کی لطافت اور استقامت اور نورِ باطن اور حالت سکنہ سے ہوتی ہے، واللہ اعلم۔

فصل

علم تفسیر کے ان وہبی علوم میں سے جن کی طرف ہم نے اشارہ کیا، انبیاء علیہم السلام کے قصوں کی تاویل بھی ہے، فقیر نے اس فن کا ایک رسالہ تاویل الاحادیث کے نام سے تالیف کیا ہے اور تاویل سے مراد یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے جس زمانہ میں جو تدبیر چاہی ہے اس کی رو سے ہر ایسے قصہ کے لیے جو اس وقت واقع ہوا ہے ایک مبداء پیغمبر اور اس کی قوم کی استعداد سے ہوتا ہے اور گویا انہی معنی کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے ویعلمك من تاویل الاحادیث دوسرے علوم پنجگانہ کی تنقیح میں درحقیقت کلام اللہ منطوق وہی ہیں مفصل بیان اس رسالہ کے شروع میں گزر چکا ہے اس کی طرف رجوع کرنا چاہئے، اس کے علاوہ کلام اللہ کا فارسی زبان میں

---

(۱) مطلع کل حد الاستعداد الذی بہ تحصل معرفۃ اللسان والآثار ومطافۃ الذہن واستقامۃ الفہم (۱۲ حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۴۵)

ترجمہ اس طریقہ سے کہ وہ مقدار اور تخصیص وتعمیم وغیرہ میں عربی کے مشابہ ہے، یہ کام ہم نے فتح الرحمٰن فی ترجمۃ القرآن میں کیا ہے، اگرچہ بعض مقامات میں ہم نے ناظرین کے عدمِ فہم کے خوف سے بلا کسی تفصیل کے اس شرط کو ترک کردیا ہے، یا ماسوا اس کے خواص قرآنی کا علم ہے، متقدمین نے کلام اللہ کے خواص میں دو طرح پر کلام کیا ہے، ایک تو دعا کے مشابہ اور دوسرے سحر کے مشابہ استغفر اللہ منہ مگر فقیر پر خواص منقول کے علاوہ ایک جدید دروازہ کھولا گیا ہے حضرت حق جل شانہ نے ایک مرتبہ اسماء حسنٰی اور آیات عظمٰی اور ادعیۂ متبرکہ کو میری گود میں رکھ کر فرمایا کہ تصرف عام کے لیے یہ ہمارا عطیہ ہے لیکن ہر ایک آیت اور دعا ایسی شرائط کے ساتھ مشروط ہے جو کسی قاعدہ میں سما نہیں سکتیں بلکہ اسکا قاعدہ اصلی عالم غیب کی طرف سے اشارہ کا انتظار ہوتا ہے جیسا کہ حالتِ استخارہ میں ہوتا ہے حتیٰ کہ عالمِ غیب سے کسی خاص آیت یا اسم کا اشارہ ہو جاتا ہے، اس آیت یا اسم کو اسی طور پر تلاوت کرنا چاہئے جیسا کہ اس فن والوں کے نزدیک مقرر ہے یہ ہیں وہ مضامین جن کے بیان کا اس رسالہ میں ہم نے قصد کیا تھا، والحمد اولاً و آخراً وظاهراً وباطناً

تمت بالخیر

فتح الخبیر

بما لابد من حفظہ فی علم التفسیر

تصنیف

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ

مترجمین

مولانا سید محمد مہدی الحسنی

مولانا حبیب الرحمٰن صدیقی کاندھلوی

ترتیب

مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی

فہرست مضامین

صفحہ	مضمون	نمبرشمار
۳۳۶	سورۂ فاتحہ	۱
۳۳۶	سورۂ بقرہ	۲
۳۴۰	سورۂ آل عمران	۳
۳۴۲	سورۂ نساء	۴
۳۴۵	سورۂ مائدہ	۵
۳۴۷	سورۂ انعام	۶
۳۴۹	سورۂ اعراف	۷
۳۵۱	سورۂ انفال	۸
۳۵۲	سورۂ برأت	۹
۳۵۴	سورۂ یونس	۱۰
۳۵۵	سورۂ ھود	۱۱
۳۵۶	سورۂ یوسف	۱۲
۳۵۸	سورۂ رعد	۱۳
۳۵۹	سورۂ ابراہیم	۱۴

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱۵	سورۂ حجر	۳۵۹
۱۶	سورۂ نحل	۳۶۰
۱۷	سورۂ بنی اسرائیل	۳۶۲
۱۸	سورۂ کہف	۳۶۴
۱۹	سورۂ مریم	۳۶۵
۲۰	سورۂ طٰہ	۳۶۶
۲۱	سورۂ انبیاء	۳۶۷
۲۲	سورۂ حج	۳۶۸
۲۳	سورۂ مومنون	۳۶۹
۲۴	سورۂ نور	۳۷۰
۲۵	سورۂ فرقان	۳۷۱
۲۶	سورۂ شعراء	۳۷۲
۲۷	سورۂ نمل	۳۷۲
۲۸	سورۂ قصص	۳۷۳
۲۹	سورۂ عنکبوت	۳۷۳
۳۰	سورۂ روم	۳۷۳
۳۱	سورۂ لقمان	۳۷۳
۳۲	سورۂ الٓمٓ سجدہ	۳۷۳
۳۳	سورۂ احزاب	۳۷۳
۳۴	سورۂ سبا	۳۷۴
۳۵	سورۂ ملائکہ (فاطر)	۳۷۵
۳۶	سورۂ یٰسٓ	۳۷۵

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۳۷	سورۂ صافات	۳۷۶
۳۸	سورۂ صٓ	۳۷۶
۳۹	سورۂ زمر	۳۷۷
۴۰	سورۂ مومن	۳۷۸
۴۱	سورۂ حم سجدہ	۳۷۸
۴۲	سورۂ شوریٰ	۳۷۸
۴۳	سورۂ زخرف	۳۷۹
۴۴	سورۂ دخان	۳۷۹
۴۵	سورۂ جاثیہ	۳۸۰
۴۶	سورۂ احقاف	۳۸۰
۴۷	سورۂ محمد	۳۸۰
۴۸	سورۂ فتح	۳۸۰
۴۹	سورۂ حجرات	۳۸۱
۵۰	سورۂ قٓ	۳۸۱
۵۱	سورۂ ذاریات	۳۸۲
۵۲	سورۂ طور	۳۸۲
۵۳	سورۂ النجم	۳۸۲
۵۴	سورۂ قمر	۳۸۳
۵۵	سورۂ الرحمٰن	۳۸۳
۵۶	سورۂ واقعہ	۳۸۴
۵۷	سورۂ حدید	۳۸۵
۵۸	سورۂ مجادلہ	۳۸۵

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۵۹	سورۂ حشر	۳۸۶
۶۰	سورۂ ممتحنہ	۳۸۶
۶۱	سورۂ صف	۳۸۶
۶۲	سورۂ جمعہ	۳۸۷
۶۳	سورۂ منافقین	۳۸۷
۶۴	سورۂ تغابن	۳۸۷
۶۵	سورۂ طلاق	۳۸۷
۶۶	سورۂ تحریم	۳۸۸
۶۷	سورۂ ملک	۳۸۸
۶۸	سورۂ ن	۳۸۸
۶۹	سورۂ حاقہ	۳۸۹
۷۰	سورۂ معارج	۳۸۹
۷۱	سورۂ نوح	۳۸۹
۷۲	سورۂ جن	۳۹۰
۷۳	سورۂ مزمل	۳۹۰
۷۴	سورۂ مدثر	۳۹۰
۷۵	سورۂ قیامہ	۳۹۱
۷۶	سورۂ دھر	۳۹۱
۷۷	سورۂ مرسلات	۳۹۱
۷۸	سورۂ نباء	۳۹۱
۷۹	سورۂ نازعات	۳۹۲
۸۰	سورۂ عبس	۳۹۲

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۸۱	سورۂ کوّرت	۳۹۲
۸۲	سورۂ انفطرت	۳۹۳
۸۳	سورۂ مطففین	۳۹۳
۸۴	سورۂ انشقت	۳۹۳
۸۵	سورۂ بروج	۳۹۳
۸۶	سورۂ طارق	۳۹۴
۸۷	سورۂ اعلیٰ	۳۹۴
۸۸	سورۂ غاشیہ	۳۹۴
۸۹	سورۂ فجر	۳۹۴
۹۰	سورۂ بلد	۳۹۴
۹۱	سورۂ شمس	۳۹۵
۹۲	سورۂ لیل	۳۹۵
۹۳	سورۂ ضحیٰ	۳۹۵
۹۴	سورۂ الم نشرح	۳۹۵
۹۵	سورۂ تین	۳۹۵
۹۶	سورۂ قلم	۳۹۵
۹۷	سورۂ قدر	۳۹۵
۹۸	سورۂ لم یکن	۳۹۶
۹۹	سورۂ زلزلت	۳۹۶
۱۰۰	سورۂ عادیات	۳۹۶
۱۰۱	سورۂ قارعہ	۳۹۶
۱۰۲	سورۂ تکاثر	۳۹۶

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱۰۳	سورۂ عصر	۳۹۷
۱۰۴	سورۂ ہمزہ	۳۹۷
۱۰۵	سورۂ فیل	۳۹۷
۱۰۶	سورۂ قریش	۳۹۷
۱۰۷	سورۂ ماعون	۳۹۷
۱۰۸	سورۂ کوثر	۳۹۷
۱۰۹	سورۂ کافرون	۳۹۷
۱۱۰	سورۂ نصر	۳۹۸
۱۱۱	سورۂ تبت	۳۹۸
۱۱۲	سورۂ اخلاص	۳۹۸
۱۱۳	سورۂ فلق	۳۹۸
۱۱۴	سورۂ ناس	۳۹۸

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمام تعریفیں اس ذات کبریا کے لئے خاص ہیں، کہ جس نے قرآن کو مؤمنین کے لئے شفا اور رحمت بنا کر نازل فرمایا اور صحابہ وتابعین اور علمائے دین کو اس امر کا الہام فرمایا کہ قرآن مجید کے غریب الفاظ کی تشریح اور اس کے اسباب نزول بیان کرنیکی جانب توجہ کریں، تاکہ اتمام نعمت اور تکمیل رحمت کا باعث بن سکے اور آثار یقین روشن اور واضح ہو جائیں۔

اما بعد بندہ ضعیف ولی اللہ بن عبد الرحیم بتائید فضل ایزدی کہتا ہے کہ یہ قرآن کے غریب الفاظ کی شرح میں ایک رسالہ ہے جو خیر امت حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنھما سے مروی ہے، میں نے اس رسالہ میں حضرت ابن عباس کی وہ روایات جمع کی ہیں، جو ابن ابی طلحہؒ کے ذریعہ مروی ہیں اور کچھ حصہ وہ ہے جو ضحاک کے ذریعہ ان سے مروی ہے، اور یہ وہی طریقہ کار ہے جو امام جلال الدین سیوطی نے اپنی کتاب اتقان میں اختیار کیا ہے، اللہ تعالیٰ جنت میں ان کا درجہ بلند فرمائے لیکن میں نے ان ہر دو طریق میں بعض غریب الفاظ غیر مفسر پائے تو میں نے نافع بن الازرق کے طریق سے اس کی تکمیل کی اور جس کو امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں بھی ذکر کیا ہے، اس کو بھی میں نے لیا ہے، کیونکہ امام بخاری کی روایت کردہ تفسیر اس باب میں جہات صحیح ہے پھر اس کے بعد ان روایات کو لیا ہے جو ثقات نے اہل نقل سے روایت کی ہیں، اگرچہ وہ ایک محدود تعداد میں ہیں، اور اس کے ساتھ میں نے وہ امور بھی جمع کر دیئے ہیں جن کی ایک مفسر کو احتیاج ہوا کرتی ہے، مثلاً اسباب نزول وغیرہ اور اسباب نزول میں نے محدثین کی صحیح تفاسیر سے جمع کئے ہیں، یعنی امام بخاریؒ، امام ترمذیؒ اور حاکمؒ کی تحریر سے جو انہوں نے اپنی اپنی کتابوں میں نقل فرمائے ہیں، اللہ تعالیٰ جنت میں ان کا مقام بلند فرمائے، اسی طرح اس مضمون پر ایک اچھا خاصا مفید رسالہ تیار ہو گیا، جس کا نام میں نے فتح الخبیر بما لابد من حفظہ فی علم التفسیر رکھا ہے اور اول اور آخر اور ظاہر اور باطن تمام تعریفیں اللہ ہی کے لئے خاص ہیں۔

سورۂ فاتحہ

الحمد لله تمام شکر اللہ ہی کیلئے ہے رب العالمین جو تمام مخلوقات کا مالک ہے الرحمن الرحیم دونام ہیں جو رحمت سے مشتق ہیں مالك يوم الدين جزا کے دن فیصلہ کرنے والا ہے ایاك نعبد ہم آپ ہی کو عبادت کے ساتھ خاص کرتے اور آپ ہی کی ذات کا قصد کرتے ہیں وایاك نستعين اورآپ ہی سے امداد کا سوال کرتے ہیں الصراط المستقيم اس سے مراد کتاب اللہ یا نبی کریم ﷺ اور آپ کے دونوں ساتھی ابوبکرؓ و عمرؓ مراد ہیں صراط الذين انعمت عليهم جن پر آپ نے ہدایت کے ذریعہ انعام فرمایا، اور وہ انبیاء وصلحاء ہیں غير المغضوب عليهم اور وہ موسیٰ اور عیسیٰ کی قومیں ہیں کیونکہ انہوں نے خدا کی نعمتوں میں تغیر کیا نبی کریم نے ارشاد فرمایا کہ مغضوب علیهم سے یہود اور ضلال سے نصاریٰ مراد ہیں۔

سورۂ بقرہ

لاريب فيه اس میں کوئی شک نہیں ختم الله على قلوبهم اللہ نے دلوں پر مہر لگادی يؤمنون تصدیق کرتے ہیں للمتقين مومنین کے لئے جو شرک سے بچتے اور میری طاعت پر عمل کرتے ہیں ويقيمون الصلوٰة رکوع وسجود، تلاوت وخشوع، توجہ الی اللہ اور نماز کی مداومت کو پورے طور پر انجام دیتے ہیں، مرضٌ اس سے مراد نفاق وشک ہے ومن الناس من يقول منافقین کے بارے میں نازل ہوئی، جنہوں نے کفر کے ساتھ ایمان کا اظہار کیا، اللہ تعالیٰ نے اپنے قول وما هم بمؤمنين کے ساتھ ان کے ایمان کی نفی فرمائی يخادعون الله جس طریقے پر وہ ہیں اس طریقے کے خلاف دوسرا طریقہ ظاہر کر کے اللہ کو دھوکا دینا چاہتے ہیں وما يخدعون الا انفسهم کفر کے سبب اور لوگوں کو ایمان سے روکنے کے باعث واذا خلوا جب لوٹ کر جاتے ہیں الى شياطينهم اپنے بڑوں کے پاس عذابٌ اليم دردناک عذاب يكذبون تبدیل وتحریف کرتے ہیں السفهاء جهلاء فى طغيانهم اپنے کفر میں يعمهون حد سے بڑھتے جاتے ہیں، یا مذاق کرتے اور تردد کرتے ہیں وقودها الناس والحجارة گندھک کا پتھر جسے اللہ نے اپنے پاس جیسا چاہا پیدا فرمایا انى جاعلٌ فى

الارض خلیفۃ آدم کی پیدائش سے قبل دو ہزار سال تک زمین پر جنات آباد تھے جب انہوں نے زمین میں فساد پھیلانا شروع کیا تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے لشکر بھیجے جنہوں نے جنات کو مار مار کر بھگا دیا، حتیٰ کہ وہ جزائر کی جانب بھاگ گئے، اسی بنا پر فرشتوں نے کہا تھا اتجعل فیھا من یفسد فیھا جیسا کہ جنات نے کیا تھا ونقدس لك تقدیس کے معنی پاکی بیان کرنا ہے رغدا وسیع وافر تو ابہ متشابھا کہ بعض بعض سے صورتاً مشابہ ہوں گے، لیکن مزے میں مختلف ہوں گے، اور یہ انتہائی تعجب انگیز ہے وخلدون ہمیشہ رہیں گے جس سے کبھی اخراج نہ ہوگا ولا تلبسو اخلط ملط نہ کرو انفسھم یظلمون ضرر پہنچاتے ہیں وقولوا حطۃ بنو اسرائیل سے کہا گیا تھا کہ لفظ حطۃ کہنا لیکن انہوں نے اس کے بجائے حبۃ فی شعرۃٍ کہا یعنی بال میں دانہ چاہیے نہ کہ معافی وفی ذلکم بلاء نعمت مراد ہے الی بارئکم تمہارا خالق وفومھا گیہوں المنّ گوند و السلوی پرندہ خاسئین ذلیل وباؤ الوٹے نکالاً سزا، لمابین یدیھا ان کے بعد والوں کے لئے وما خلفھا جو ان کے ساتھ باقی رہ گئے تھے وموعظۃ تذکرہ لافارضٌ بوڑھی عوانٌ بڑھاپا اور جوانی کا درمیانی حصہ فاقعٌ صاف لا ذلولٌ جسے کسی کام نے نہ تھکایا ہو تثیر الارض کہ زمین میں کھیتی کرے، مسلمۃٌ عیوب سے سالم لا شیۃ جس میں سپیدی نہ ہو فادارأتم تم نے اختلاف کیا بما فتح اللہ علیکم جو تم پر اکرام کیا بروح القدس وہ نام کہ جس کے ساتھ حضرت عیسیٰ مردوں کو زندہ کیا کرتے تھے یستفتحون مدد طلب کرتے تھے علی الذین کفروا یہود خیبر مراد ہیں کہ جو بنو غطفان سے جنگ کرتے، تو شکست کھا جاتے، پھر اس دعا کے ذریعہ کامیاب ہوئے، اللھم انا نسألك بحق محمد النبی الامی الذی وعدتنا ان تخرجہ لنا فی آخر الزمان الا نصرتنا علیھم اس دعا کی برکت سے بنو غطفان کو شکست ہوئی الا مانی بات چیت، قلوبنا غلف پردے میں ہیں بئسما اشتروا بہ انفسھم دنیا کی تھوڑی سی لالچ میں اپنی آخرت کا حصہ فروخت کر ڈالا، یود احدھم لو یعمر عجمیوں کو جب چھینک آتی تو کہتے تو دس ہزار سال تک زندہ رہے، اور نوروز اور مہرجان کے ہزار سال تک کھاتا رہے راعنا، رعونت سے مشتق ہے اور یہود جب کسی کو ذلیل کرنے کا ارادہ کرتے تو راعنا کہہ کر پکارتے ماننسخ ہم تبدیل نہیں کرتے او ننسھا اسے چھوڑ دیتے ہیں کہ اسکی جگہ

کوئی شی تبدیل نہیں کرتے قانتون تابعدار یا اقرار کرنے والے فثم وجه الله سواری پر نفل پڑھنے کے متعلق نازل ہوئی، یا اندھیری رات میں قبلہ نہ معلوم ہونے کی صورت میں نازل ہوئی واذابتلی ابراهیم ربه بکلمات ان کا پاکی کے ساتھ امتحان لیا، جن میں سے پانچ چیزیں سر میں اور پانچ بدن میں ہیں اور وہ فطرت کے خصائل ہیں مثابة لوگ اس کی جانب دوڑ کر آئیں پھر واپس چلے جائیں القواعِدَ بیت اللہ کی بنیادیں حنیفاً متوجہ اور مائل صبغة الله اللہ کا دین اتحاجوننا ہم سے جھگڑتے ہوئے شطرهٔ اس کی جانب، نبی ﷺ نے بیت المقدس کی جانب سولہ یا سترہ ماہ تک نماز پڑھی اور آپ کی خواہش یہ تھی کہ آپ کا قبلہ بیت اللہ ہو، پس قبلہ تبدیل کر دیا گیا، لیکن اس تحویل قبلہ سے قبل جن لوگوں کا انتقال ہو گیا، ان کی نمازوں کی قبولیت اور عدم قبولیت کا سوال پیدا ہوا تو اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی وماکان الله لیضیع ایمانکم لتکونوا شهدآء نبی ﷺ نے فرمایا، نوح، کو بلایا جائیگا اور سوال کیا جائے گا، کیا تو نے میرے احکام پہنچا دیئے، وہ جواب دیں گے ہاں، لیکن قوم کہے گی، ہمارے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تو نوح سے کہا جائیگا تمہارے گواہ کون ہیں جواب دیں گے، کہ محمد ﷺ اور آپ کی امت تو حضور کو اور آپ کی امت کو بلایا جائیگا، تو وہ گواہی دینگے، شعائر، نشانیاں اس کا واحد شعیرہ ہے فلا جناح کوئی حرج نہیں یہ اس لئے فرمایا کہ کچھ لوگ صفا اور مروہ کے مابین سعی کو برا سمجھتے تھے، ورنہ یہ سعی واجب ہے ینظرون تاخیر کرتے ہیں خطوات الشیطن شیطان کا عمل الفینا ہم نے پایا اھل به لغیر الله طاغوت کیلئے ذبح کی جائے، ابن السبیل وہ مہمان جو مسلمانوں کے پاس آیا ہو، ان ترک خیرا اگر مال چھوڑے جنفا ظلم وصیت میں ایک جانب مائل ہونا الباساء فقر الضراء بیماری عفی چھوڑ دیا گیا وعلی الذین یطیقونه یہ منسوخ ہے یا یہ بوڑھے آدمی اور بوڑھی عورت کے لئے خاص ہے، جب رمضان کے روزے نازل ہوئے تو لوگ تمام رمضان عورتوں کے پاس نہ جاتے تھے، بعض نے اپنے نفسوں سے خیانت بھی کی تو یہ آیت نازل ہوئی احل لکم لیلة الصیام الرفث الخیط الابیض من الخیط الاسودِ صبح کی سپیدی رات کی سیاہی سے، اور وہ صبح ہے پو پھوٹتے وقت کچھ آدمیوں نے روزہ کا ارادہ کیا اور اپنے پاؤں سے سفید اور سیاہ دھاگا باندھ لیا، تو اللہ تعالیٰ نے لفظ من الفجر نازل فرمایا، العاکف

مقیم التھلکۃ ،تہلکہ اور ہلاک کے معنی ایک ہی ہیں ،انصار نے ایک دوسرے سے کہا ،کہ ہمارے مال ضائع ہو چکے ہیں اور اب اللہ تعالیٰ نے اسلام کو عزت عطا کی ہے اور اس کے مددگار بھی کافی ہو گئے ہیں ،تو اگر ہم اپنے مالوں میں مقیم رہیں اور ان کی دیکھ بھال کریں اور غزوات میں شرکت ترک کر دیں تو بہتر ہے اس پر یہ آیت نازل ہوئی تو یہاں تہلکہ سے مراد مالوں میں رہنا اور جہاد ترک کر دینا ہے یا یوں کہا جائے کہ یہ مصارف میں فضول خرچی کے متعلق نازل ہوئی ثقفتموھم جہاں بھی تم انہیں پاؤ لا تکون فتنۃ فتنہ سے مراد شرک ہے ،عرب جب جاہلیت میں احرام باندھ لیتے تو گھروں میں پیچھے کی طرف داخل ہوتے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی لیس البر بان تاتوا البیوت ۔فمن کان منکم مریضااو بہ اذیً یہ آیت کعب بن عجرہ کے بارے میں نازل ہوئی ،زمانہ جاہلیت میں عکاظ مجنہ اور ذوالمجاز وغیرہ بازار لگا کرتے ،لیکن اب اہل عرب موسم حج میں تجارت کو گناہ سمجھتے تھے تو یہ آیت نازل ہوئی لیس علیکم جناح ان تبتغوا فضلاً من ربکم قریش اور جولوگ ان کے دین پر تھے ،مزدلفہ میں ٹھہرتے اور بقیہ عرب عرفات میں ،تو یہ آیت نازل ہوئی ثم افیضوا من حیث افاض الناس ،خلاقٍ ، حصہ الد الخصام باطل کے لئے جھگڑنے والا السلم اطاعت کافۃ ،سب قل العفو جسے تمہارے مالوں میں ظاہر نہیں کیا ہے لاعنتکم تمہیں تنگی میں مبتلا کر دیتا ،یہود میں جب کسی عورت کو حیض آتا تو نہ اس کے ساتھ کھاتے اور نہ پیتے ، نبی کریم ﷺ سے اس بارے میں سوال کیا گیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی قل ھو اذیً تو انہیں بجز صحبت کے ہر شئی کی اجازت دی گئی ،حضور اکرمؐ نے ارشاد فرمایا ،تم عورتوں کے پاس آگے سے جاؤ یا پیچھے سے لیکن حیض کے وقت اور پاخانہ کی جگہ سے احتراز کرو اور یہود کہا کرتے کہ اگر عورت سے پیچھے کی جانب سے صحبت کی جائے بچہ بھینگا پیدا ہوتا ہے تو یہ آیت نازل ہوئی نسائکم حرث لکم فاتوا حرثکم ،حدود اللہ اللہ کی اطاعت معقل بن یسارؓ کی بہن کو ان کے خاوند نے طلاق دیدی اور رجوع نہ کیا حتی کہ عدت گزر گئی ،پھر انہیں دوبارہ پیغام نکاح دیا لیکن معقلؓ نے انکار کر دیا ،اس پر یہ آیت نازل ہوئی فلا تعضلوھن لا تواعدوھن سرا سر سے مراد جماع ہے مالم تمسوھن او تفرضولھن فریضۃ چھونے سے مراد جماع ہے ،اور فریضہ سے مہر الصلوٰۃ الوسطی اس سے مراد عصر

ہے، نبی ﷺ کے اس فرمان کے مطابق کہ انہوں نے ہمیں سورج غروب ہونے تک صلوٰۃ وسطیٰ سے روکے رکھا، زید بن ارقمؓ فرماتے ہیں ہم نماز میں پہلے ایک دوسرے سے ضرورت کی باتیں کرتے رہتے تھے حتیٰ کہ یہ آیت نازل ہوئی قوموا لله قانتين ۔الم تر الی الذین خرجوا من دیارھم یہ چار ہزار تھے جو طاعون کی وجہ سے اپنے گھروں سے بھاگ گئے فقال لهم الله موتوا یہ سب کے سب مر گئے تو ان پر ایک نبی کا گزر ہوا انہوں نے اللہ سے انہیں زندہ کرنے کا سوال کیا، تو اللہ نے انہیں زندہ کر دیا فیہ سکینۃ" رحمت، سنۃ اونگھ ولا یؤودہ اسے اس کا بوجھ معلوم نہیں ہوتا اوکا الذی مر علی قریۃ اللہ کے نبی عزیرؑ لم یتسنہ جو سالہا سال تک تبدیل نہ ہو صفوان پتھر صلدا جس پر کوئی شئی نہ ہو صاف ایود احدکم ان تکون له جنۃ" حضرت عمرؓ فرماتے ہیں یہ اس کی مثال ہے جو اللہ کے احکام کے مطابق عمل کرتا ہے، پھر اللہ نے اس کے پاس شیطان بھیجا تو وہ گناہوں میں مبتلا ہو گیا، حتیٰ کہ اس نے اپنے تمام اعمال غرق کر لئے اعصار تخت ہوا، صر سردی فصرھن انہیں ہلالے الحافا بولا جاتا ہے وہ مجھے چمٹ گیا اور گڑگڑایا یمحق الله الربوا سے لیجاتا ہے ولا تیمموا الخبیث ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جو ردی اور بیکار کھجوریں صدقہ کرتے فاذنوا پس جان لو وان تبدوا ما فی انفسکم یہ لا یکلف الله نفسا الا وسعھا کے ساتھ منسوخ ہے غفرانک تیری مغفرت۔

سورۂ آل عمران

آل عمران کا نصف اخیر ایک ہی قصہ کے بارے میں نازل ہوا ہے زیغ شک ابتغاء الفتنۃ شبہات کدأب مثل طریقہ کے بعض نے کہا کہ مثل حالت کے بالقسط عدل والخیل المسوّمۃ نشان زدہ گھوڑے الا ان تتقوا منھم تقۃ یعنی زبان سے تو کفر کا اقرار کریں، لیکن دل ایمان پر مطمئن ہو حصورا جو عورتوں کے پاس نہ جاتا ہو الا رمزا مگر ہاتھ یا سر کے اشارے سے الاکمۃ جو پیدائشی نابینا ہو متوفیک تجھے موت دینے والا ہوں ایھم یکفل مریم جو اپنے پاس رکھے جب یہ آیت ندع ابناء نا وابناءکم آخر تک نازل ہوئی، تو نبی ﷺ نے علیؓ اور حسنؓ وحسینؓ اور فاطمہؓ کو بلایا، اور فرمایا اے اللہ یہ میرے گھر والے ہیں سواءٍ بیننا وبینکم انصاف

اور اعتدال ربانیین ربانی کی جمع ہے، علماء وفقہاء مراد ہیں، اشعث بن قیس فرماتے ہیں، کہ میرے اور ایک یہودی کے مابین ایک مشترکہ زمین تھی، اس یہودی نے اس زمین کے بارے میں مجھ سے جھگڑا کیا میں اسے لے کر حضور کی خدمت میں آیا، آپؐ نے مجھ سے ارشاد فرمایا، کیا تیرے پاس گواہ موجود ہیں۔ میں نے عرض کیا نہیں، آپ نے یہودی سے فرمایا تو قسم کھا میں نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ تو قسم کھا کر میرا تمام مال ہضم کر لے گا، اس پر اللہ تعالیٰ نے آیت نازل فرمائی۔ ان الذین یشترون بعهدالله وایمانهم ثمناً آخر تک لا خلاق حصہ، روایت ہے کہ اسرائیل کو عرق النساء کی بیماری لاحق ہوئی تو وہ بولے اگر اللہ نے اس بیماری سے شفاء عطا کی تو ایسا گوشت نہ کھائیں گے جس میں رگ ہو، اس طرح یہود نے گوشت اپنے اوپر حرام کر لیا، تو یہ آیت کل الطعام کان حلاً آخر تک نازل ہوئی من استطاع الیه سبیلاً عرض کیا گیا یا رسول اللہ سبیل سے کیا مراد ہے فرمایا زادراہ اور سواری شفا حفرةٍ اس کا کنارہ تبوئی المومنین مومنوں کو جگہ بتا رہے تھے اذهمت طائفتان منکم ان تفشلا بنوحارثہ اور بنوسلمہ من فورهم اپنے غضب سے مسومین، مسوم وہ ہے جس پر نشان لگا ہو، روایت ہے کہ نبی ﷺ کا جنگ احد میں چہرہ مبارک زخمی ہوا، اور آپ کے سامنے کا دانت ٹوٹ گیا، آپ نے فرمایا وہ قوم کیسے فلاح پا سکتی ہے جو اپنے نبی کے ساتھ اس قسم کی حرکت کرے اس پر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی لیس لك من الأمر شئٌ ابن عمر نے فرمایا نبی ﷺ نے احد کے روز یہ بددعا فرمائی اے اللہ ابوسفیان پر لعنت نازل فرما، الٰہی! حارث بن ہشام پر لعنت فرما، الٰہی! صفوان بن امیہ پر لعنت کر، تو یہ آیت لیس لك من الامر شئٌ نازل ہوئی ولا تھنوا کمزور نہ پڑ جاؤ القرح زخم اذ تحسنوهم جب تم انکی جڑیں کاٹ رہے تھے یا انہیں قتل کر رہے تھے، غزاً اس کا واحد غازی ہے یعنی مجاہد امنة نعاساً ابوطلحہ فرماتے ہیں جب ہم میدان جنگ میں تھے تو ہمیں اونگھ نے گھیر لیا وماکان لنبی ان یغل یہ آیت ایک چادر کے بارے میں نازل ہوئی جو بدر کے دن گم ہوگئی منافقین نے کہنا شروع کیا شائد حضور نے لی ہو استجابوا انہوں نے جواب دیا فقد فاز کامیاب ہوا اور نجات پائی لا تحسبن الذین یفرحون یہ یہود کے بارے میں نازل ہوئی، حضور نے ان سے کوئی چیز دریافت فرمائی، لیکن انہوں نے اسے چھپا لیا۔

سورۂ نساء

حوباً کبیراً بڑا گناہ، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں ایک شخص کے پاس ایک یتیم لڑکی ہوتی تو وہ اس سے نکاح کر لیتا اور اس لڑکی کے پاس کافی مال ہوتا تو یہ شخص اس لڑکی کو اس کے مال کے باعث طلاق بھی نہ دیتا اور نہ اس سے کوئی تعلق رکھتا، اس پر اللہ نے یہ آیت وان خفتم الا تقسطوا فی الیتامی نازل فرمائی ادنی الا تعولوا یہ لائق ہے اس کے کہ تم انکی جانب مائل نہ ہو نحلة مہر وابتلوا امتحان کرو انستم تم پہچان لو رشداً صلاحیت قیاماً تمہاری معیشت کو قائم کرنے والا ومن کان فقیراً فلیاکل بالمعروف حضرت عائشہ فرماتی ہیں اپنی خبر گیری کے بدلے معروف طریقے پر کلالة جو شخص نہ باپ چھوڑے اور نہ لڑکا، جاہلیت میں جب کوئی شخص مرجاتا تو مرنے والے کی بیوی کے ولی وارث ہوتے تو اس پر یہ آیت لا یحل لکم ان ترثوا النساء کرھا نازل ہوئی، جنگ اوطاس میں کچھ عورتیں ہمارے ساتھ آئیں جن کے خاوند مشرکین میں زندہ موجود تھے، صحابہ نے ان سے صحبت کو برا سمجھا تو یہ آیت والمحصنات من النساء الا ماملکت ایمانکم نازل ہوئی محصنات سے مراد خاوند والی عورت ہے طولاً کشادگی اور فراخی، محصنات غیر مسافحات پاکدامن ہو جو علانیہ یا خفیہ زنا کا ارتکاب نہ کرتی ہو، ولا متخذات اخدان دوست فاذا احصن جب وہ نکاح کر لیں العنت زنا موالی عصبہ یا ورثا مراد ہیں والذین عقدت ایمانکم فاتوھم نصیبھم مدد کرنا، فائدہ پہنچانا اور وصیت کرنا اور میراث منسوخ کر دی گئی ہے، اور اس کے لئے وصیت کی جائے گی، ام سلمہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ مرد جہاد کرتے ہیں اور ہم نہ جہاد کرتی ہیں اور نہ قتال اور نہ شہید ہوتی ہیں اور ہمارے لئے آدھی میراث ہے اللہ نے یہ آیت ولا تتمنوا مافضل الله نازل فرمائی قوامون امیر قانتات فرمانبردار والجار ذی القربیٰ وہ پڑوس جس سے قرابت ہو والجار الجنب جس پڑوس سے کوئی قرابت نہ ہو والصاحب بالجنب رفیق مثقال ذرۃ ایک ذرہ کے برابر نطمس وجوھاً ہم انہیں برابر کردینگے بولا جاتا ہے طمس الکتاب یعنی اسے مٹا دیا صعیداً زمین کی سطح، تیمم کی آیت حضرت عائشہؓ کے ہار کھوئے جانے اور اس کے باعث لوگوں

کے ایسے مقام پر ٹھہرنے کے سبب نازل ہوئی جہاں پانی نہ تھا ابن عباسؓ سے اس آیت واللہ ربنا ماکنا مشرکین اور اس آیت ولا یکتمون اللہ حدیثاً کی تفسیر پوچھی گئی، انہوں نے فرمایا جب قیامت کے روز لوگ یہ دیکھیں گے کہ بجز اہل اسلام کوئی جنت میں داخل نہیں ہوتا تو کہیں گے آؤ ہم بھی (شرک) کا انکار کردیں تو اللہ انکے منھوں پر مہر لگا دیگا، تو انکے ہاتھ اور پیر کلام کریں گے پس اللہ سے کوئی بات نہ چھپا سکیں گے، روایت ہے کہ عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے کھانے اور شراب پر ایک جماعت انصار کی دعوت کی اور یہ شراب کی حرمت سے قبل کا واقعہ ہے، انہوں نے کھانا کھایا اور شراب پی اور سب نشہ میں مدہوش ہوگئے اتنے میں مغرب کی نماز کا وقت آ گیا، ان سے ایک آدمی نماز پڑھانے کیلئے آگے بڑھا اس نے قل یا ایھا الکفرون اعبد ماتعبدون وانتم عبدون مااعبد پڑھا اس پر یہ آیت لا تقربوا الصلوۃ انتم سکاری نازل ہوئی فتیلاً کھجور کی گٹھلی کے درمیان کے خلا میں جو جھلی ہوتی ہے اسے کہتے ہیں واسمع غیر مسمع وہ کہا کرتے کہ سن اور تو نہ سنے، لیّاً بالسنتھم جھوٹی تحریف کرتے ہوئے الجبت شرک اور شیطان نقیر اُوہ نقطہ جو گٹھلی کی پشت میں ہوتا ہے اور اسی سے درخت اگتا ہے اولی الامر اہل فقہ و اہل دین یہ آیت اطیعو االلّٰہ واطیعوا الرّسول واولی الامر عبد اللہ بن حذافہ سہمی کے بارے میں نازل ہوئی اور معنی یہ ہیں کہ اللہ اور رسول کی اطاعت مقدم ہے اذاعوا بہ اسے پھیلا دیا حسیباً کافی، ثبات چھوٹے چھوٹے متفرق لشکر مقیتاً حفاظت کرنے والا یا صاحب قدرت و اقتدار جنگ احد سے کچھ لوگ بغیر جنگ میں شرکت کئے واپس آ گئے جسکی بنا پر لوگوں کی دو جماعتیں ہوگئیں ایک جماعت ان کے قتل کا مشورہ دیتی اور دوسری جماعت اس سے منع کرتی تو یہ آیت نازل ہوئی فمالکم فی المنافقین فئتین واللہ ارکسھم انہیں واقع کیا یا انہیں گرایا، یا انہیں لوٹایا حصرت تنگ ہوا ایک شخص اپنی بکریوں میں مقیم تھا، اتفاق سے وہاں کچھ مسلمان پہنچے، اس نے انہیں سلام کیا، لیکن انہوں نے اسے قتل کر دیا اور بکریاں لوٹ لیں تو یہ آیت ولا تقولوا لمن القیٰ الیکم السلام لست مؤمناً نازل ہوئی اولی الضرر عذر والے جب یہ آیت لا یستوی القاعدون من المؤمنین نازل ہوئی تو حضور نے زید کو بلوایا انہوں نے یہ آیت لکھی اتنے میں ابن ام مکتومؓ آئے جو اپنی مجبوری کی شکایت کرتے تھے اللہ

تعالیٰ نے غیر اولی الضرر نازل فرمائی، روایت کیا گیا ہے کہ کچھ مسلمان مشرکین کے ساتھ رہتے تھے کہ کافروں کی کثرت کا باعث تھے، پھر ان مسلمانوں میں سے کسی کو تیر آ کر لگ جاتا، یا تلوار لگ جاتی، اور وہ قتل ہو جاتا، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی ان الذین توفھم الملائکۃ ظالمی انفسھم، مراغماً مقام ہجرت اور راستہ کہ جس پر چلنے سے اپنی قوم کو ناراض کردے وسعۃ رزق میں ان تقصروا من الصلوۃ حضرت عمرؓ سے قصر کے بارے میں پوچھا گیا، تو انہوں نے فرمایا، یہ تم پر اللہ کا ایک صدقہ ہے، اسے قبول کرو موقوتاً فرض کی ہوئی کہ ان کے لئے وقت معین کیا، روایت کیا گیا ہے، کہ حضور ﷺ ضجنان اور عسفان کے درمیان ٹھہرے مشرکین نے باہم کہا یہ نماز انہیں اپنے باپ اور بیٹوں سے بھی زیادہ محبوب ہے، جب یہ نماز پڑھتے ہوں، تو ان پر کل یک بار حملہ کردو، تو اس وقت صلوٰۃ الخوف نازل ہوئی ان خفتم ان یفتنکم تمہیں عذاب اور تکلیف کے ساتھ مصیبت میں ڈالدیں تالمون تمہیں تکلیف اور درد پہنچتا ہے ولا تکن للخائنین خصیماً بنوابیرق کے بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے قتادہ بن النعمان کے چچا کی زرہ چرالی تھی، پھر اس سے انکار کر گئے الا اناثاً یعنی بیجان پتھر کے ہوں یا مٹی کے ہوں مریداً سرکش فلیبتکن ٹکڑا ٹکڑا کردیا ولیغیرن خلق اللہ اللہ کا دین، جب یہ آیت من یعمل سوءً یجزبہ نازل ہوئی، تو یہ امر مسلمانوں پر بہت شاق گزرا، نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا، درستی کرو اور ایک دوسرے کے قریب ہو جا اور ہر وہ مصیبت جو مسلمان کو پہنچتی ہے وہ اس کے گناہوں کا کفارہ ہوتی ہے، حتیٰ کہ ایک کانٹا بھی اس کے لگے وان امرأۃ خافت من بعلھا نشوزاً یعنی بعض کوئی شخص اپنی زوجہ سے بے پروا ہو اور اس سے مفارقت کرنا چاہتا ہو، وہ عورت اس سے یہ کہدیتی میں نے تجھے اپنے بارے میں آزاد و خود مختار کہا و احضرت الانفس الشح کہ پیدا کئے گئے ہیں بخل پر، کالمعلقۃ کہ نہ وہ بیوہ ہو اور نہ خاوند والی وان تلووا شہادت کے وقت اپنی زبانوں کو او تعرضوا یعنی شہادت سے وقولھم علی مریم بھتاناً عظیماً جب کہ ان لوگوں نے حضرت مریمؑ پر زنا کی تہمت لگائی وان من اھل الکتاب الا لیؤمنن بہ یعنی حضرت عیسیٰ کے نزول کے وقت قبل موتہ کتابی کی موت یا حضرت عیسیٰؑ کی وفات سے قبل۔

سورۂ مائدہ

سورہ مائدہ کے بارے میں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ یہ نزول کے لحاظ سے آخری سورت ہے، تو اس میں جو حلال ہے اسے حلال سمجھو اور جو حرام ہے اسے حرام سمجھو اوفوا بالعقود جو شئی اللہ نے حلال کی یا حرام کی، فرض کی یا قرآن میں اس کی حد بیان کی، سب کو پورا کرو یجرمنکم تمہیں نہ ابھارے شنان عداوت آمین ارادہ کرنے والے اممت اور تیممت ایک ہیں البر جس کے ساتھ حکم کیا گیا والتقوی جس سے روکا گیا المنخنقة جو گلا گھونٹنے سے مرجائے والموقوذة جو لکڑی مارنے سے مرجائے والمتردية جو پہاڑ سے گر کر مرجائے والنطيحة وہ بکری جو دوسری بکری کے سینگ مارنے سے مرجائے وما اکل السبع جسے درندہ لے لے الا ما ذکیتم مگر جسے تم ذبح کرلو اور اسمیں روح موجود ہو النصب پتھر جس پر ذبح کرتے تھے وان تستقسموا، استقسام اسے کہتے ہیں کہ تیروں کو گھمایا جائے اگر اس میں ممانعت نکل آئے تو اس سے رک جائے، اور اگر کرنے کا حکم نکلے تو کرے، الازلام تیر جس سے اپنے امور میں استقسام کرتے تھے غیر متجانف گناہ کی طرف مائل نہ ہونے والا الجوارح کتا، چیتا، شکرا، اوران جیسے جانور مکلبین سدھائے ہوئے وطعام الذین اوتوا الکتاب ان کے ذبیحے اجورھن ان کے مہر لا مستم جنہیں تم نے چھوا ہو، اوران کے ساتھ صحبت کی ہو، افضاء سے مراد نکاح ہے تیمموا تم ارادہ کرو عزرتموھم تم انہیں روکو فافرق جدا کرالو، سیلة حاجت انما جزاء الذین یحاربون اللہ ورسولہٗ عرینہ اور عکل کی ایک جماعت کے بارے میں نازل ہوئی جو مدینہ آکر بیمار ہوگئے تھے، تو حضور کے اونٹوں میں چلے گئے، وہاں ان کا پیشاب اور دودھ پیا، جس سے وہ تندرست ہوگئے، انہوں نے حضور کے چرواہے کو قتل کیا اور اونٹ ہنکا کے لے گئے، ابوقلابہ کہتے ہیں دیکھو نہیں یہ سزا ان کے ارتداد اور اللہ سے جنگ اور کفر کی بنا پر دی گئی ہے، ومن یرد اللہ فتنته' اسکی گمراہی کا سماعون للکذب جھوٹ کو سنتے ہیں اکالون للسحت وہ رشوت ہے بما استحفظوا امانت رکھے گئے وقفينا على آثارهم ہم نے انبیاء کے پیچھے دوسروں کو بھیجا یعنی انبیاء کو مبعوث کیا، ومهيمنا امین اور قرآن تمام پہلی

کتابوں پر امین ہے شرعة و منها جا آراستہ اور سنت اور قول یہ ہے کہ شرعہ سے مراد دین اور منہاج سے مراد طریق ہے فسوف یأتی الله بقوم یحبهم ویحبونه نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا اے ابوموسیٰ یہ تیری قوم ہے اذلةٍ علی المؤمنین رحم دل یدالله مغلولةٌ وہ اس سے یہ مراد لیتے تھے کہ اللہ تعالیٰ بخیل ہے اور جو کچھ اس کے پاس ہے، اسے روک لیا ہے (معاذ اللہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ جب میں گوشت کھاتا ہوں تو میرے جذبات بر انگیختہ ہو جاتے ہیں اس لئے میں نے اپنے اوپر گوشت حرام کرلیا ہے، اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی یا أیها الذین اٰمنوا لاتحرموا طیباتِ ما احل الله لکم حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ دعا فرمائی کہ الٰہی شراب کے بارے میں ہمارے لئے کوئی شافی بیان نازل فرما، تو یہ آیت یسألونك عن الخمر والمیسرِ نازل ہوئی، پھر انہوں نے وہی دعا کی، جس پر آیت لاتقربوا الصلوۃ وانتم سکاری نازل ہوئی، پھر آپ نے وہی دعا کی، تو یہ آیت انما یرید الشیطان آخر تک نازل ہوئی، تو جب شراب کی حرمت اس آیت کے ذریعہ نازل ہوئی تو بعض بولے کہ بہت سے صحابہ اس عالم میں شہید ہوئے کہ شراب ان کے پیٹ میں تھی، اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی لیس علی الذین اٰمنوا وعملوا الصٰلحٰت جناحٌ فیما طعموا جب آیت حج نازل ہوئی، تو صحابہؓ نے کہا یا رسول اللہ کیا ہر سال حج فرض ہے آپ نے فرمایا نہیں اور اگر میں ہاں کہتا تو یہ ہر سال واجب ہو جاتا، تو اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی لاتسألوا عن اشیاء ان تبدلکم تسؤکم یہ بھی کہا گیا، کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ میرا باپ کون ہے، آپ نے فرمایا، تیرا باپ فلاں ہے، تو یہ آیت نازل ہوئی، سعید بن مسیّب فرماتے ہیں بحیرہ وہ ہے جس کا دودھ بتوں کے لئے روک دیا جائے، اور کوئی اس کا دودھ نہ نکالے، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ اونٹنی ہے کہ جب اس کے پانچواں بچہ ہوتا تو یہ دیکھتے کہ آیا یہ نر ہے، تو اگر وہ نر ہوتا، تو اسے ذبح کر لیتے، اور صرف مرد کھاتے نہ کہ عورتیں اور اگر وہ بچہ مادہ ہوتا تو اس کے کان چیر ڈالتے اور سائبہ وہ جانور ہے جو مشرکین مکہ اپنے بتوں کے نام پر چھوڑتے نہ تو اس پر سوار ہوتے نہ اس کا دودھ نکالتے، نہ اس کی اون اتارتے اور نہ اس پر کوئی بوجھ لادتے وصیلہ وہ بکری جو ساتویں بار جنے اگر وہ اس وقت اس کے نر پیدا ہوا ہے تو وہ انکا حصہ سمجھا جاتا اور اگر مادہ ہوتا، تو وہ ان کے

معبودوں کے نام کا ہوتا اور اگر دونوں ایک ساتھ ہوتے تو انہیں زندہ رکھتے اور کہتے اس کے ساتھ اس کا بھائی مل گیا ہے، اس نے اسے ہم پر حرام کر دیا ہے، اور ایک قول یہ ہے کہ وہ اونٹنی ہے جو اول بار نر بچہ دے پھر اس کے بعد پے درپے دو مادہ دے، تو اسے بتوں کے نام کر دیتے، بشرطیکہ ان دونوں مادہ بچوں کے درمیان کوئی نر نہ ہو حــــام وہ اونٹ ہے جس کے بچہ کے بچہ پیدا ہو چکا ہو، تو کہا کرتے تھے، کہ اس کی پشت محفوظ ہوگئی ہے، تو اسپر نہ بوجھ لادتے، نہ اون اتارتے، نہ کسی جگہ چرنے سے روکتے، اور نہ کسی حوض سے پانی پینے سے روکتے، چاہے وہ حوض اس کے مالک کا نہ ہو، اور ایک قول یہ ہے کہ حــام اس اونٹ (سانڈ) کو کہتے ہیں، کہ جس کے متعینہ بچے پورے ہو چکے ہوں، تو اسے وہ بتوں کے نام پر چھوڑ دیتے اور اسپر بوجھ نہ لادتے، اور اسے حامی کہا جاتا، حضور سے اس آیت کے بارے میں پوچھا گیا یـا ایهـاالـذیـن اٰمنوا علیکم انفسکم لایضرکم مـن ضـل اذااهتـدیتـم آپ نے فرمایا بلکہ بھلائی کا حکم کرو، اور برائی سے روکو حتی کہ جب تو یہ دیکھے، کہ بخل وحرص کو اپنا پیشوا بنا لیا گیا، خواہشات کی پیروی کی جانے لگے، اور دنیا کو ترجیح دی جانے لے اور ہر صاحب رائے اپنی رائے پر پھولا ہوا ہو، تو اپنے نفس کو لازم پکڑلو، اور عوام کو ترک کردو یـا یهـا الـذیـن اٰمنوا شهادۃ بینکم تمیم داری اور عدی بن زید کے بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے بدیل کے ترکہ میں سے چاندی کا پیالہ چھپا لیا تھا، انہوں نے حضور کے سامنے حلف اٹھالیا، پھر وہ جام مکہ میں بکتا ہوا پایا گیا، بیچنے والوں نے بتایا کہ ہم نے ان دو شخصوں سے خریدا ہے، بدیل کے ورثاء میں دو اشخاص نے حضور کے سامنے حلف اٹھایا اور کہا شهـادتنا احق من شهادتهما اور جام ان کے آدمی کا ہے۔

سورۂ انعام

یـعدلون اس کے برابر کرتے ہیں تـمترون تم شک کرتے ہو مدرارا کہ بعض بعض کی اتباع کرے ولـلبسـنـا ہم شبہ میں ڈال دیتے ہیں ثـم لـم تـكـن فـتـنتهم حجت ومعذرت اساطیر کہانیاں، قصے اس کا واحد اسطورہ اور اسطارہ ہے وقرا ڈاٹ، وقر کے معنی بوجھ کے ہیں وهم ينهون عـنه وينأون عنه یہ آیت ابو طالب کے بارے میں نازل ہوئی،

کہ وہ مشرکین کو تو حضورؐ کی ایذا سے روکتا تھا اور خود اس سے دور رہتا تھا، ایک روز ابوجہل نے کہا اے محمد! ہم یہ جانتے ہیں کہ تو صلۂ رحمی کا حکم دیتا ہے اور ہمیشہ سچ بولتا ہے، اور ہم تجھے قطعاً نہیں جھٹلاتے بلکہ ہم تو اس شئی کو جھٹلاتے ہیں، جو تو لے کر آیا ہے، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی فانهم لا یکذبونك ولٰکن الظٰلمین بایٰت الله یجحدون نفقاً سرنگ سلماً سیڑھی الباساء باس یا بؤوس سے مشتق ہے شدت فقر کو کہا جاتا ہے الضراء بیماریاں اور درد فلما نسوا انہوں نے چھوڑ دیا مبلسون مایوس یصدفون اس کے برابر قرار دیتے ہیں یا حق سے اعراض کرتے ہیں اوجهرة علانیہ تدعون من دون الله تم عبادت کرتے ہو ماجرحتم جو تم نے گناہ کمائے یفرطون ضائع کرتے ہیں قل هو القادر علیٰ ان یبعث علیکم عذاباً نبی ﷺ نے فرمایا، اور وہ عذاب آنے والا ہے، اور ابھی تک اس کی تاویل نہیں آئی ہے۔ یلبسکم تمہیں مخلوط کرتا ہے شیعاً مختلف خواہشات یا مختلف فرقے لکل نبأ مستقر حقیقت اور ایک قول یہ ہے کہ وقت اور جگہ ان تبسل تو ذلیل ہو یا روک لیا جائے وان تعدل انصاف کرے ابسلوا رسوا ہوئے استهوته اسے گمراہ کیا فلما جن اندھیری چھا گئی افلت جب سورج آسمان کے درمیان سے ڈھل گیا، جب یہ آیت ولم یلبسوا ایمانهم بظلم نازل ہوئی صحابہ نے عرض کیا ہم میں سے کون ہے جس نے ظلم نہیں کیا، تو یہ آیت نازل ہوئی ان الشرك لظلمٌ عظیم حضرت علیؓ فرماتے ہیں یہ آیت ابراہیمؑ اور ان کے صحابہ کے بارے میں نازل ہوئی، اور اس امت میں کوئی نہیں وما قدر والله حق قدره اس کی عظمت کے مطابق اس کی تعظیم نہیں کی باسطوا ایدیهم، بسط کے معنی مارنا ہیں عذاب الهون وہ عذاب جس کے ساتھ سخت ذلت واقع ہو، خولناکم ہم نے تمہیں دیا، فالق الاصباح دن میں سورج کی روشنی اور رات میں چاند کی روشنی حسباناً دن مہینے اور سالوں کا شمار ایک قول یہ ہے کہ شیطانوں کے مارنے کا ذریعہ مستقر پشت میں ومستودع رحم میں قنوانٌ دانیة کھجور کا وہ چھوٹا درخت جس کی شاخیں زمین سے لگی ہوں، ایک قول یہ ہے کہ قنو ایک یا دو کھجور کو کہتے ہیں اور اس کی جمع قنوان ہے، جیسے صنو اور صنوان وینعه اور اس کے پکنے کی طرف وخرقوا له بنین انہوں نے تراش لئے اور گھڑ لئے، کذب و کفر انکار، دَرَسْتَ تو نے تعلیم حاصل کی ہے قبلاً

آ سے سامنے ولتصغی تا کہ تو مائل ہو ولیقترفوا تا کہ وہ کمائیں زخرف القول جو شئے بظاہر اچھی ہو اگر وہ باطل ہے تو اسے زخرف کہا جاتا ہے، چند آدمی نبی کریمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بولے کہ شئے ہم قتل کرتے ہیں اسے تو ہم کھاتے ہیں اور جسے اللہ قتل کرے اسے ہم نہیں کھاتے تو یہ آیت نازل ہوئی فکلوا مما ذکر اسم اللہ علیہ ،میتافاحییناہ گمراہ تھا ہم نے اسے ہدایت کی صغار ذلت ورسوائی علی مکانتکم تمہاری اس حالت پر جس پر تم ہو وحرث حجر حرام۔ حمولۃ ہر وہ جانور جس پر بوجھ لادا جائے مثلاً اونٹ، گھوڑا، خچر، گدھا وفرشا بکری۔معروشات انگور کی چھپر پر چڑھائی ہوئی بیل کل ذی ظفر اونٹ اور شترمرغ وغیرہ مسفوحا بہایا ہوا ماحملت ظہورھما یعنی پشت میں جو چربی ہو،الحوایا، انتڑیاں، املاق، فقر دراستھم ان سے پڑھنے سے،صدف اعراض کیالا ینفع نفساً ایمانھا لم تکن امنت من قبل جب آفتاب مغرب سے طلوع ہوگا۔

سورۂ اعراف

ولقد خلقناکم ثم صورناکم مردوں کی پشتوں میں پیدا کئے گئے اور رحم مادر میں ان کی تصویر بنائی گئی صراطك تیرا راستہ مذؤماً ملامت کیا ہوا، یخصفان پتوں کو لپیٹ رہے تھے سواتھما ان دونوں کی شرمگاہوں سے کنایہ ہے قبیلہ اس کی ذریت جس سے وہ تھا، ریشاً اسے ریاشاً بھی پڑھا گیا ہے بمعنیٰ مال، زمانہ جاہلیت میں عورت ننگی طواف کیا کرتی تھی تو یہ آیت نازل ہوئی قل من حرم زینۃ اللہ آخر آیت تک، حذیفہؓ فرماتے ہیں اصحاب اعراف وہ لوگ ہیں کہ جن کی اچھائیاں انہیں دوزخ سے روک لیں گی، لیکن ان کی برائیاں انہیں جنت میں نہ جانے دیں گی، تو وہ درمیان میں اعراف میں ہونگے، پھر ان پر اللہ تعالیٰ جلوہ گر ہوگا اور فرمائیگا، جاؤ جنت میں چلے جاؤ، میں نے تمہاری مغفرت کی، غواشٍ جس سے اسے ڈھانپ لیں، نکداً تھوڑا حثیثا جلدی اقلت اٹھایا قوماً عمین کفار جن کے دل اندھے ہیں بسطۃ سختی تنحتون الجبال پہاڑوں کو پھاڑتے تھے الرّجفۃ سخت زلزلہ جاثمین مردے لا تبخسوا ظلم نہ کرو وتصدون اور تم پھر جاتے ہو عوجاً ٹیڑھا پن، افتح فیصلہ فرما، کان لم یغنوا،

نہیں ٹھہرے اسی بہت غمگین عفو زیادہ ہوئے ارجہ اس کے کام کو مؤخر کر تلقف نگل جائے گا ویذرك والھتك تیری عبادت کو چھوڑ دیں الطوفان بارش القمل وہ ٹڈی جس کے پر نہ ہوں، جوں، یطیروا ابدقالی لینے لگے الرجز نافرمانی یعرشون بناتے تھے متبر ہلاک ہونے والا ٹوٹے میں پڑنے والا میقات ربه وہ وقت جو اللہ نے مقدر کیا تھا، دکاً پیسا ہوا، خوارٌ آواز سُقط فی ایدیهم ہر وہ شخص جو نادم ہوا اسے بولا جاتا ہے اسفاً غمگین واختار موسی قومه موسیٰ نے اپنی قوم کے لئے دعا کی، تو اللہ نے ان کی دعا کو اس شخص کے لئے کر دیا جو نبی ﷺ پر ایمان لایا اور آپ کی اتباع کی، جیسا کہ فرمایا فسأکتبها للذین یتقون۔ فخذها بقوةٍ کوشش اور احتیاط سے ان هی الا فتنتك یہ نہیں مگر تیرا عذاب هدنا ہم لوٹے اصرهم ان کے عہد و پیمان کا بوجھ وعزروہ ان کی حفاظت اور عزت کرو فانبجست پس پھوٹے یعدون فی السبت اس میں اللہ کی حدود سے تجاوز کرتے تھے نبأ ألذی أیتناہ اتینا وہ بلعم بن باعورا ہے شرعاً پانی پر ظاہر بئیس سخت وبلونهم ہم نے ان سے امتحان لینے والے کا معاملہ کیا نتقنا ہم نے اٹھایا الاسباط بنی اسرائیل کے قبائل واذا أخذ ربك آخر آیت تک اللہ تعالیٰ نے آدم کو پیدا فرمایا پھر ان کی پشت پر ہاتھ پھیرا، تو اس سے ذریت کو نکالا، اور فرمایا یہ لوگ جنت کے لئے پیدا کئے گئے ہیں اور اہل جنت جیسا عمل کریں گے پھر دوبارہ پشت پر ہاتھ پھیرا، اور اس سے ان کی ذریت کو نکالا اور فرمایا یہ دوزخ کیلئے پیدا کئے گئے ہیں اور اہل نار جیسا عمل کریں گے ذرانا، ہم نے پیدا کیا اخلد الی الارض بیٹھ گیا، اور دنیا کی جانب مائل ہوا، سنستدرجهم ہم ان کے پاس ان کی پناہ گاہوں سے آئیں گے ایان مرسها اس کا وقوع وظہور کب ہوگا حفی عنها اس کا جاننے والا اور خوب جاننے والا اخذ العفو زیادتی کو خرچ کرو وامر بالمعروف اس بھلائی کا کہ جس کا حسن ظاہر ہو ینزغنك تجھے برداشت کرے، طائف خیال وسوسہ یمدونهم عمدہ کرتے ہیں لولا جتبیتها تو اسے بنا کر لے یا اسے ڈالے تو وہ بڑھنے لگے، جب حضرت حوا حاملہ ہوئیں، تو ابلیس ان کے پاس آیا، اور حوا کے کوئی بچہ زندہ رہتا تھا، ابلیس بولا کہ اس کا نام عبدالحارث رکھو، تو وہ زندہ نہ رہا، اور یہ وحی شیطانی اور اس کے حکم سے ہوا، اور یہی ہے اللہ کے قول کا مقصد فلما اتاهما صالحاً تضرعاً وخیفة زاری اور خوف کے ساتھ۔

سورۃ انفال

انفال اہل بدر کے بارے میں نازل ہوئی، حضرت سعدؓ فرماتے ہیں، میں نے بدر کے روز ایک تلوار کا سوال کیا، تو یہ آیت نازل ہوئی یسألونك عن الانفال، انفال نافله کی جمع ہے بمعنی عطیہ وجلت گھبرا گیا، ذات الشوكة کانٹے والی مردفين پے در پے ایک فوج دوسری فوج کے بعد كل بستان، جوڑا اور ایک قول یہ ہے کہ انگلیوں کے کنارے شاقوا الله ورسوله ان کی مخالفت کی زحفاً جمع شدہ قریب قریب متحرفاً ہٹتے ہوئے واپسی کے لئے لوٹنے والے او متحيزاً ملے ہوئے جاء كم الفتح مدد لما يحييكم تمہاری اصلاح کرے ليثبتوك تاکہ تجھے باندھ لیں فرقاناً مدد، ابوجہل کہا کرتا تھا کہ ان كان هذا هو الحق من عندك آخر آیت تک تو اس کے قول کی تردید میں یہ آیت نازل ہوئی وماكان الله ليعذبهم وانت فيهم مكاء و تصدية، مكاء کے معنی اپنے منہ میں انگلیاں داخل کرنا، اور تصدیہ کے معنی سیٹی بجانا فيركمه اسے جمع کریگا، يوم الفرقان بدر کے روز کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس روز حق وباطل میں فرق فرمایا اذانتم بالعدوة الدنيا وهم بالعدوة القصوىٰ مدینہ کی جانب وادی ادنیٰ کے کنارے پر تھے، اور دشمن مکہ کی جانب وادی اقصیٰ کے کنارے پر والركب اونٹوں والے یعنی قافلہ تفتشلوا، پس تم بزدل ہو جاؤ و تذهب ريحكم تمہاری حکومت اور غلبہ بطراً سرکشی جارٌ لکم حفاظت کرنے والا انكص على عقبيه پشت پھیر کر لوٹا وذوقوا ملو اور تجربہ کرو، اور یہ ذوق منہ کے مزے کے معنی میں نہیں ہے فشرد بهم من خلفهم منتشر کر دو اور انہیں ایسی سزا دو جو پچھلوں کے لئے قابل عبرت ہو، یعنی ہر ناقض عہد کی جمعیت میں تفریق کر خيانة عہد کو توڑتے ہوئے، وان جنحوا وہ طلب کریں یا مائل ہوں حرض المؤمنين، انہیں ابھار، ان يكن منكم عشرون صابرون يغلبوا مائتين اس آیت کے نزول سے مسلمانوں پر یہ فرض کر دیا گیا کہ ان میں سے ہر شخص دس کے مقابلہ سے نہ بھاگے، پھر یہ آیت نازل ہوئی الئن خفف الله تو یہ فرض کر دیا گیا، کہ سو آدمی دو سو کے مقابلہ سے نہ بھاگیں مااستطعتم من قوةٍ نبی ﷺ نے فرمایا، خبردار قوت تیراندازی ہے مسلمان بدر کے دن مال

غنیمت لوٹنے لگے، حالانکہ یہ ان کے لئے ابھی حلال نہ تھی، تو یہ آیت نازل ہوئی لولا کتاب من اللہ سبق بدر کے دن مسلمان تین حصوں میں منقسم تھے، ایک حصہ جنگ میں مصروف تھا، دوسرا مال غنیمت جمع کرنے اور قیدیوں کے سنبھالنے میں مصروف تھا، اور تیسرا حضور کے خیمہ کی حفاظت کررہا تھا، یہ تینوں فرقے باہم جھگڑنے لگے، تو اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھوں سے غنیمت چھین کر حضور کے ہاتھ میں دے دی حضور نے اسے برابر تقسیم کیا من ولایتھم ان کی میراث سے۔

سورۂ برأت

سورہ برأت پر بسم اللہ نہیں لکھی گئی، حضرت عثمانؓ فرماتے ہیں، مدینہ میں انفال اولاً نازل ہوئی، اور برأت بلحاظ نزول آخر قرآن سے ہے، اور اس کا قصہ اور انفال کا قصہ ایک دوسرے سے مشابہ ہے، میرا خیال ہوا، کہ یہ انفال کا قصہ ایک حصہ ہے، نبی ﷺ کی وفات ہوگئی اور یہ ظاہر نہیں فرمایا، کہ یہ اس کا حصہ ہے، اسی باعث میں نے ان دونوں کو ایک جگہ رکھا اور درمیان میں بسم اللہ تحریر نہیں کی، حضرت علیؓ فرماتے ہیں، بسم اللہ امان ہے، اور یہ سورت برأت ہے، جو تلوار کے ساتھ رفع امن کے لئے نازل کی گئی ہے، اور جب اس کا اول حصہ نازل ہوا، تو نبی ﷺ نے حضرت علیؓ کو بھیجا، جنھوں نے چار باتوں کا اعلان کیا، اللہ اور اس کے رسول کا ذمہ ہر مشرک سے بری ہے، تو زمین میں چار مہینوں تک پھرو، اور اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہ کرے، اور نہ کوئی بیت اللہ کا ننگے ہو کر طواف کرے اور جنت میں بجز مومن کے کوئی داخل نہ ہوگا برأۃ اعلان وندا، فسیحوا چلو پھر کل مرصد راستہ لایرقبوا نہ حفاظت کریں الا ولا ذمۃ الال قرابت، رشتہ داری الذمۃ عہد ولیجۃ دوست اور راز دار سقایۃ الحاج موسم حج میں پانی پلانا عیلۃ فقر یضاھؤون مشابہت کرتے ہیں ذلك الدین القیم کہا جاتا ہے القضاء القیم یعنی ٹھیک اور صحیح فیصلہ، انی یؤفکون وہ کیونکہ جھوٹ بولتے ہیں اور ایک قول یہ ہے کہ وہ وضوح دلیل کے بعد حق سے کیسے پھرتے ہیں ان یطفئوا یہ کہ بجھا دیں کافۃ سب، لیواطئوا موافقت ومشابہت کریں، انفروا نکلو اثاقلتم تم نے ٹھہرنے کو بہتر سمجھا عرض غنیمت الشقۃ چلنا، اور

راہ طے کرنا اور سفر کرنا، فثبطھم انہیں روکا، اور ذلیل کیا خبالاً فساد ولاَ وضعوا چغل خوری میں جلدی کرتے ہیں وقلّبوا لك الامور آپ کے خلاف سازشیں کرتے ہیں اور آپ کے ساتھ مکروفریب کرنے کی کوشش کرچکے ہیں ولا تفتنی مجھے رسوانہ کراورنہ مجھے دھکا، احدی الحسنیین فتح یا شہادت ملجا پہاڑ میں پناہ لینے کی جگہ مغارات غار، کھڈ، مخفی زمین میں چھپنے کی جگہ مدخلاً گھسنے کی جگہ اور ٹھکانا یجمحون جلدی کرتے ہیں یلمزك تجھے عیب لگاتے اور تجھ پر طعن کرتے ہیں والعاملین علیھا زکوۃ وصول کرنے پر مامور، المؤلفة قلوبھم عطیہ کے ساتھ ان کی تالیف کریں ھواذنٌ ہر ایک کی بات سن لیتے ہیں نسوا اللہ فنسیھم انہوں نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت ترک کی، تو اس کے ثواب اور اس کی عزت کو ترک کیا، بخلاقھم اپنی دنیا کا حصہ والمؤتفکاتُ قوم لوط کے گاؤں ائتفکت کہ ان کے ساتھ زمین پلٹ دی گئی عدنٍ خلد، بولتے ہیں عدنت بارض میں اس زمین میں ٹھہرا واغلظ ان سے نرمی کو ترک کرو، جب عبداللہ بن ابی کا انتقال ہوا تو آنحضرت ﷺ اس پر نماز پڑھنے کے لئے کھڑے ہوئے، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت ولا تصل علیٰ احدٍمنھم نازل کی وما نقموا اورنہیں برا سمجھا یلمزون عیب لگاتے، غیبت کرتے اور طعن کرتے ہیں الا جھدھم وہ قلیل شئے جس کے ساتھ زندگی گزرے اذا نصحوا للہ ورسولہ اپنے اعمال کو کھوٹ سے پاک کیا المعذرون عذر والے وصلوات الرسول آپ کا دعائے مغفرت کرنا مردوا علی النفاق اس میں گھس گئے، اور اس کے غیر کا انکار کیا تطھرھم وتزکیھم بھا یہ دونوں مترادف لفظ ہیں، اور ان کی طرح بہت سے الفاظ مترادف ہیں، اور زکوۃ کے معنیٰ پاکی اور خالص کرنا ہے ان صلاتك سکن لھم ان کے لئے رحمت ہے، مرجون لامر اللہ پیچھے کئے ہوئے تاکہ اللہ جو ان میں فیصلہ کرنا چاہے فیصلہ کردے، ضرراً ضرر پہنچاتے ہیں، اس کے ساتھ وارصاداً انتظار شفا جرفٍ گرنے والے کنارے پر شفا اور شفیر ایک معنیٰ میں آتے ہیں جرف وہ حصہ ہے جو سیلابوں سے کٹ جائے ھار گرنے والا بولا جاتا ہے تھورت جب ٹوٹ کر گر جائے وانھارت کے بھی یہی معنیٰ ہیں ریبة شك الا ان تقطع قلوبھم یعنی موت، نبی ﷺ سے سائحین کے معنیٰ پوچھے گئے، فرمایا روزے دار، حضرت علیؓ فرماتے ہیں میں نے ایک آدمی کو سنا، کہ وہ اپنے ماں باپ کے لئے

دعائے مغفرت کررہا تھا، حالانکہ وہ دونوں مشرک تھے تو میں نے اس سے کہا کہ تو مشرک والدین کے لئے دعاء مانگتا ہے اس نے کہا کیا حضرت ابراہیم نے اپنے باپ کے لئے مغفرت کی دعاء نہ کی تھی، حالانکہ وہ بھی مشرک تھا میں نے یہ بات حضور سے ذکر کی، تو یہ آیت نازل ہوئی وماکان استغفار ابراهيم لابيه الا عن موعدةٍ وعدها اياه، جابر نے کہا جب ابوطالب نے وفات پائی، تو حضور ﷺ نے فرمایا میں تمہارے لئے اس وقت تک دعائے مغفرت کروں گا جب تک اللہ مجھے منع نہ کردے، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی ماکان للنبی لاوّاه، مومن اور اللہ کی طرف متوجہ ہونیوالے، ایک قول یہ ہے کہ بہت دعائیں کرنے والے، اور بہت رونے والے اور حبشی زبان میں رحم دل اور شفیق وعلى الثلاثة الذين خلفوا، كعب بن مالك اور ان کے دو ساتھی مخمصه بھوک نصب تھک جاتا ولا يطئون موطناً اور کسی جگہ نہیں ٹھہرتے نيلا قید و قتل طائفة جماعت غلظةٌ شدت، يفتنون مبتلا کئے جاتے ہیں عزیز شدید ما عنتم جو تم پر شاق ہو۔

سورۂ یونس

لهم قدم صدقٍ ذکر خیر کی سعادت کی بھلائی، یا نبی ﷺ، یا اعمال صالحه یا بھلائی دعواهم انکی ندا اور پکار ولا ادركم میں تمہیں نہیں سکھا سکتا واذا اذقنا الناس رحمة بارش اذا لهم مكر "ان کے جھٹلانے کا قول، یعنی جب ان پر فراخی عیش ہوتی ہے، تو اکڑنے لگتے ہیں، حتىٰ اذا كنتم في الفلك وجرين بهم معنی ہیں تمہارے ساتھ احيط بهم ہلاکت سے قریب ہوئے فاختلط به نبات الارض پس پانی سے ہر رنگ کی چیز اگی، زخرفها اس کی زینت و حسن حصيداً جس میں کوئی شئے نہ ہو كان لم تغن بالامس کل کچھ نہ تھا ولا يرهق نہیں ڈھانپتی ہے قتر رنجیدگی کی سیاہی ترهقهم ذلة انہیں ذلت و رسوائی پہنچی ہے عاصمٍ روکنے والا اغشيت پہنایا گیا فزيلنا ہم نے جدا کیا تبلو آزمائش کیجائیگی، تفيضون فيه تم اسے کرتے ہو، وما يعزب غائب ہوتا ہے لهم البشرى نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا، وہ سچا خواب ہے جو مسلمان خود دیکھتے ہے یا کسی کو اس کے حق میں دکھایا جاتا ہے الا

یخرصون کہتے ہیں وہ چیز جو نہیں ہوتی مبصرا روشن کرنے والا، تاکہ تم اپنی حاجتوں میں ہدایت حاصل کرو اجمعوا امرکم ایک کام کا پختہ ارادہ کرلو غمة مخفی جو ظاہر نہ ہو ثم اقضوا الیّ ولا تنظرون میری جانب اٹھو اور تاخیر نہ کرو، یعنی میرے لئے اپنے مکر کر گزرو لتلفتنا ہم کو لوٹا دیں، الکبریاء ملک و عزت اطمس علیٰ اموالھم اسے مٹا دے اور اس کی صورت سے اسے بدل دے واشدد علیٰ قلوبھم اس پر مہر کر دے یہاں تک کہ نرم نہ ہوں وعدوا ظلم ننجیك ہم تجھے بلند زمین پر ڈال دیں گے، آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے، کہ جبریل علیہ السلام فرعون کے منہ میں مٹی ٹھونس رہے تھے، اس خوف سے کہ وہ لاالہ الا اللہ نہ کہہ دے حقت گذر چکا، واجب ہو گیا الرجس عذاب۔

سورۂ ھود

فصلت بیان کیا گیا یثنون پھیرے دیتے ہیں یہ حق میں شک کرنے سے کنایہ ہے یستخفوا منہ اگر طاقت رکھیں، تو اللہ سے چھپائیں یستغشون ثیابھم، اسے چھپاتے اور ڈھانپتے ہیں یعلم مستقرھا اسے رزق دیتے ہیں، جہاں بھی وہ ہو، ومستودعھا جہاں وہ مرے گا، ما یحبسہ جو ہمارے عذاب کو روک دے حاق نازل ہوا اور احاطہ کیا لا جرم کیوں نہیں واخبتوا وہ خائف ہوئے یا اطمینان میں ہوئے یا توبہ کی، اراذلنا ہم میں سے ذلیل اور ناکارہ لوگ، بادی الرای یعنی اول رائے جو ہمارے لئے ظاہر ہوئی، اور ایک قول یہ ہے کہ ظاہر رائے میں آپ کی اتباع کرتے ہیں، اور ان کا باطن اس کے خلاف ہوتا ہے عمیت تمہارے عناد کی بنا پر حق کو مخفی کر دیا گیا انلزمکموھا ہم اس کی معرفت کی جانب تم کو کیا مجبور کریں گے، تزدری حقیر سمجھیں، ان یغویکم یہ کہ تمہیں گمراہ کرے اجرامی اجرمت کا مصدر ہے یعنی میرے جرم کی سزا ایس الفلک کشتی فلا تبتئس غم نہ کر لا تخاطبنی مجھ سے رجوع نہ کرو فارا التنور ابلنے لگا مجریھا اس کے چلنے کی جگہ اور یہ اجریت کا مصدر ہے ومرسھا اس کے ٹھہرنے کی جگہ، ارسیت کا مصدر ہے معزل گوشہ ابلعی تو پی، اقلعی تو روک لے اعتراك عروتہ سے مشتق ہے یعنی تجھے پہنچا اخذ بناصیتھا یعنی اس کے ملک و سلطنت میں عنید

اور عاند اور عنود کا ایک ہی معنی ہے سخت زبردستی اور سرکشی کرنے والا، استعمر کم تم کو آباد کیا اور بسایا غیر تخسیرٍ، تخسیر بمعنی گمراہ کرنا کان لم یغنوا فیھا انہوں نے زندگی نہیں گزاری، گویا کہ وہ تھے ہی نہیں بعجلٍ حنیذٍ پکا ہوا جسے پتھروں پر رکھ کر بھونا جائے نکرھم اور انکرھم اور استنکرھم ایک ہی معنی میں ہیں واوجس چھپایا الروع گھبراہٹ منیب اللہ کی اطاعت کی جانب بڑھنے والا وسیٓء بھم اپنی قوم کے ساتھ برا گمان کیا وضاق بھم اپنے مہمانوں کی وجہ سے ذرعا بیٔ یوم عصیب سخت، یھرعون الیہ جلدی کرتے ہیں، اور اس کی جانب غضب کے ساتھ متوجہ ہوتے ہیں بقطعٍ من اللیل سیاہی و لا یلتفت پیچھے نہ ہٹ یا پیچھے کی جانب نہ دیکھ من سجیل پکی ہوئی مٹی منضود ایک کے پیچھے دوسرا یعنی لگا تار مسومۃ نشان زدہ و لا تعثوا، اور کوشش نہ کرو، و لا یجرمنکم تمہیں برانگیختہ نہ کرے رھطك تیرا قبیلہ وراءکم ظھریاً یعنی اس کی جانب متوجہ نہ ہوئے، اور اسے اپنی پشت کے پیچھے ڈالدیا الورد المورود داخل ہونے کی جگہ الرفد المرفود لعنت کے بعد لعنت یا اچھی طرح مدد کرنا بولتے ہیں رفدتہ میں نے اس کی اعانت کی، تتبیب بلاء، ہلاکت وحسرت زفیر سخت آواز شھیقٌ کمزور آواز غیر مجذوذٍ غیر منقطع و لا ترکنوا اداہنت نہ کرو، یا مائل نہ ہو، وارد ہوا ہے، کہ ایک شخص نے ایک عورت کو ناجائز طور پر پیار کرلیا، وہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور واقعہ عرض کیا، تو یہ آیت نازل ہوئی اقم الصلوۃ طرفی النھار وزلفاً من اللیل یعنی ایک ساعت کے بعد دوسری ساعت میں اترفوا تم ہلاک کئے گئے اولوا بقیۃٍ دین فضل وتمیز۔

سورۂ یوسف

غیابۃ الجب کنویں میں اندھیری جگہ، ایک قول یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو انسان کی نگاہوں سے کسی شئے کو غائب کردے، غیابہ ہے الجب کنواں جس پر منن نہ ہو السیارۃ راستہ چلنے والا سولت مزین کیا رشدہ نقصان میں پڑنے سے قبل وراودتہ اس سے مباشرت کو طلب کیا ھیت لك ادھر آ، قریب آ، لولا ان رای برھان ربہ ان کے لئے حضرت یعقوبؑ کی

صورت سامنے کردی گئی، انہوں نے ان کے سینے پر ہاتھ مارا، تو انکی شہوت ان کے پوروں سے نکل پڑی قدت قمیصه، اسے پھاڑ دیا، شغفها اس پر غالب آگیا متکأ مجلس، اس طعام کو بھی کہا جاتا ہے جو چھری سے کاٹا جائے، ایک قول یہ ہے کہ سنگترہ اکبـــرنـــه، اسے بڑا سمجھا، فاستعصم رک گیا اور باز رہا اصب، مائل ہو جاؤں گا، قضی الامر الذی فیه تستفتیان جو کچھ ان دونوں نے دیکھا تھا اسے بیان کیا اور حضرت یوسف نے تعبیر بیان کی، تو ان میں سے ایک بولا ہم نے کوئی خواب نہیں دیکھا، حضرت یوسفؑ نے فرمایا، فیصلہ تو ہو چکا اضغات احلام جس کی کوئی تعبیر نہ ہو، بعد امة کچھ مدت بعد تحصنون خزانہ کرو گے اور جمع کرو گے یعصرون انگور اور تیل حصحص ظاہر و واضح ہو گیا و نمیر اهلنا ہم ان کی جانب کھانا پہنچائیں گے الا ان یحاط بکم یہ کہ تم سب کے سب مر جاؤ الا حاجة فی نفس یعقوب قضاها یعنی یہ داخل ہونا، حاجت کا پورا ہونا ہے، اور وہ حاجت حضرت یعقوبؑ کا یہ ارادہ تھی، کہ یہ مختلف دروازوں سے داخل ہوں اور یہ اولاد پر شفقت کی بنا پر تھا، اوی الیه اخاه اپنی جانب اسے ملالیا، العیر قافلہ، ساتھی صواع الملك پانی پینے کا پیالہ اور وہ فارسی پیالہ تھا، جس کے دونوں کنارے ملے ہوتے، اور عجمی اس سے پانی پیتے خلصوا نجیا سرگوشی کے لئے علیحدہ ہوئے تفتؤ ہمیشہ رہے، حرضا درد کی شدت سے نزار و ہلاک۔ جسے غم نے پگھلا دیا ہو، لا تثریب، عار دلانا فصلت نکلی، تفندون تم مجھے بیوقوف اور جاہل خیال کرتے رہے مزجاة تھوڑی، غاشیة من عذاب الله عام مزاجو انہیں ڈھانپ لے هذه سبیلی میری سنت میرا طریقہ، میری دعوت حتیٰ اذا استیأس الرسل و ظنوا انهم قد کذبوا حضرت عائشہ فرماتی ہیں یہاں کذبوا تشدید کے ساتھ ہے تخفیف کے ساتھ نہیں، رسول اپنے رب کے ساتھ اس قسم کا گمان نہ کرتے تھے، بلکہ رسولوں کے متبعین پر جب مصائب زیادہ ہوئے، تو انہوں نے یہ گمان کیا کہ انبیاء نے ان سے جھوٹ بولا ہے، ابن عباسؓ فرماتے ہیں یہ تخفیف کے ساتھ ہے اور یہ ایسے ہے جیسے حتیٰ یقول الرسول والذین امنوا معه

سورۂ رعد

نبی ﷺ نے فرمایا رعد ایک فرشتہ ہے جو بادلوں پر متعین ہے، اس کے ساتھ آگ کے کوڑے ہیں، اللہ تعالیٰ جہاں چاہتا ہے، وہ بادلوں کو وہاں لے جاتا ہے وجعل فیھا رواسی پہاڑوں کی میخیں گاڑ دی ہیں قطع متجاورات ملے ہوئے کہ بعض بعض کے قریب ہوں صنوانٌ مجتمع وتفضل بعضها على بعضٍ في الاكل ، نبی ﷺ نے فرمایا، ردی، عمدہ، میٹھی اور کڑوی المثلات سزائیں یا مثالیں اور مشابہ چیزیں ایک قول یہ ہے کہ گزرے ہوئے لوگ جس پر اللہ کا عذاب آیا ھادٍ نبی اور اللہ تعالیٰ کی جانب دعوت دینے والا وما تغیض الارحام مدت حمل کو کم کرتا ہے عالم الغیب والشھادۃ چھپی ہوئی اور ظاہر وسارب بالنھار سارب کے معنیٰ ظاہر جو اپنی راہ پر چل رہا ہو معقبات فرشتے یحفظونه من امر الله تعالی کے حکم سے من وال جو ان کے امر کا والی ہو وینشئ پیدا کرتا ہے شدید المحال، قوت ایک قول یہ ہے، کہ بڑے مکر و دشمنی والا یا سخت عذاب دینے والا بقدرھا اس کی طاقت کے مطابق اور اس مقدار کے مطابق جو اسے بھر دے زبداً جھاگ جو پانی پر آجائے رابیاً بلند، ربی یربو سے بنا ہے فاما الزبد فیذھب جفاء اور وہ وہ شئی ہے، جسے سیلاب پھینک دے، بولا جاتا ہے اجفأت القدر ، جب ہانڈی جوش مارتی ہے تو اس کے اوپر جھاگ آجاتے ہیں، پھر ابال ختم ہو جاتا ہے وہ جھاگ بھی بغیر کسی منفعت کے مرجاتے ہیں، اسی طرح حق باطل سے جدا ہو جاتا ہے المھاد بستر ویدرؤن دفع کرتے ہیں الا متاع تھوڑی، جانے والی شئے، کہ انسان اس سے فائدہ تو اٹھا سکتا ہے، لیکن پھر فنا ہو جاتی ہے طوبیٰ خوشی، آنکھوں کی ٹھنڈک، افلم ییأس جانتا ہے متاب میری توبہ قارعة دہشت زدہ کرنیوالی فأملیتُ انہیں مہلت دی، املاء سے مشتق ہے من واق روکنے والا، بچانے والا یمحو الله مایشاء ویثبت دعاء کے ذریعہ تقدیر میں سے جو چاہتا ہے، مٹا دیتا ہے، اور جسے چاہے برقرار رکھتا ہے ننقصها ، علماء اور فقہاء کی موت کے ساتھ یا مسلمانوں کی فتح کے ساتھ لا معقب بدلنے والا نہیں۔

سورۂ ابراہیم

آنحضرت ﷺ نے فرمایا، مسلمان سے جب قبر میں سوال کیا جاتا ہے اور وہ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں، یہی مطلب ہے اللہ کے اس قول کا یثبت اللہ الذین آمنوا واذ تاذن ربکم تمہیں بتایا لمن خاف مقامی جب کہ اللہ اسے اپنے سامنے کھڑا کریگا من ورائہ اس کے سامنے سے فردوا ایدیھم فی افواھھم جس شے کا انہیں حکم دیا گیا، اس سے رک جانے کی یہ مثال ہے یا اس پر ہاتھ کاٹے گئے صدید پیپ اور خون ولا یکاد یسیغہ اسے حلق میں نہ اتار سکے گا، مگر دیر کے بعد فی یوم عاصف تخت ہوا چلنا، لکم تبعاً اس کے واحد تابع ہے مغنون دفع کرنے والے بمصرخکم تمہیں امداد دینے والا، یہ صراخ سے مشتق ہے، جس کے معنی پناہ چاہنے کے ہیں اجتثت اکھاڑ لیا گیا البوار ہلاک، حضرت علیؓ سے اس آیت کی تفسیر دریافت کی گئی الذین بدلوا نعمۃ اللہ کفراً واحلوا قومھم دار البوار فرمایا یہ قریش کے منافقین تھے ولا خلال دوستی اور قرابت خالتہ خلالا کا مصدر ہے دائبین اللہ کی اطاعت پر قائم رہنے والے مھطعین دیکھنے والے یا ایمان وخشوع کے ساتھ متوجہ ہونے والے، اور بلانے والے کی طرف دوڑنے والے مقنعی رؤسھم اپنے سروں کو آسمان کی طرف اٹھانے والے ھواء خالی مقرنین اپنے شیطانوں سے ملے ہوئے فی الاصفاد بندش، اصفاد لوہے کی زنجیریں اور بیڑیاں سرابیلھم ان کے کرتے من قطران پگھلے ہوئے تانبے کے۔

سورۂ حجر

یلھھم الامل انہیں غافل کردیتی ہے کتاب معلوم موت جس کی طرف یہ پہنچیں گے سکرت ابصارنا یعنی بند کردی گئیں اور ڈھانپ دی گئیں بروجاً سورج اور چاند کی منزلیں، معایش پھل اور دانے، لواقح حاملہ، کیونکہ وہ پانی بادل اور مٹی کو اٹھائے پھرتی ہیں من صلصال وہ مٹی جو ریت میں ملی ہوئی ہو، اور وہ سوکھ کر ٹھیکرے کی طرح بجنے لگے، اور سڑی ہوئی مٹی کو بھی کہا جاتا ہے من حمأ، سیاہ مٹی سڑی ہوئی مٹی حماۃ کی جمع ہے مسنون بجتی

ہوئی، یا جس کی بو بدلی ہوئی ہو ھذا صراط علیّ مستقیم اللہ کی جانب رجوع کرنے والا، یعنی یہ راہ ہے جو اسے میری جانب پہنچادیگی، نصب تھکنا وجلون گھبراتے ہوئے لا توجل نہ ڈر قوم منکرون انہیں لوطؑ نے نہ پہچانا، واتبع ادبارھم اپنی بیٹیوں اور گھر والوں کے پیچھے پیچھے چل تا کہ ان میں سے کوئی پیچھے نہ رہ جائے لعمرك تیرے عیش اور زندگی کی قسم سکرتھم ان کی گمراہی یعمھون بڑھتے جارہے تھے الضیحۃ تباہی مشرقین سورج کے چڑھتے وقت داخل ہونے والے للمتوسمین دیکھنے والوں کے لئے، فراست والے، نظر میں بڑے پختہ، حتی کہ نام ہی سے کسی شئے کی حقیقت کو پہچان لیں وانھا یعنی قوم لوط کا شہر لبسبیل مقیم تیری قوم کے راستے پر شام کی جانب اور دہ وہ راستہ ہے، جو نہ مٹتا ہے نہ مخفی ہوتا ہے لبامام مبین جس کی میں نے اقتدا کی ہے، اور جس کے ساتھ میں نے ہدایت حاصل کی یعنی واضح راستہ الصفح الجمیل بغیر برائی کے کنارہ کشی اتیناك سبعاً من المثانی والقرآن العظیم یعنی سورہ فاتحہ اور وہ سات آیات ہیں، اور ہر نماز میں مکرر پڑھی جاتی ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اس سورت کے ذریعہ اپنے رسول پر احسان کیا ہے، جیسا کہ تمام قرآن کے ساتھ احسان کیا ہے، حضور نے فرمایا ام القرآن وہ سبع مثانی ہے المقتسمین جن لوگوں نے حلف اٹھایا، اور اسی سے لا اقسم ہے جعلوا القرآن عضین وہ اہل کتاب ہیں، کہ انہوں نے اسے ٹکڑے ٹکڑے کیا، پس بعض پر ایمان لائے اور بعض کا انکار کیا، ظاہر کر بما تومر اپنی وحی کا بالجہر اعلان کردے۔

سورۂ نحل

امر اللہ اس کا عذاب بالروح، وحی کیساتھ دفء کپڑے یا وہ کپڑا اور عمارت جس سے گرمی حاصل کیا جائے جمال زینت تریحون بوقت شام ان کے ٹھہرنے کی جگہ انکولوٹاتے ہیں حین تسرحون صبح کو چراگاہ کی جانب انکو نکالدیتے ہیں الا بشق الانفس یعنی مشقت، قصد السبیل بیان اسلام اور سیدھی راہ جو اللہ تعالیٰ کی رضا تک پہنچائے منھا جائر روگردانی کرنے والا، اور مختلف خواہشات کی جانب مائل ہونے والا تسیمون اپنے مویشی چراتے ہو لحماً طریاً مچھلی مواخر پانی کو پھاڑنے والی، ان تمید بکم تمہیں حرکت دے وعلامات یعنی

پہاڑ، اور وہ دن میں راہ کی علامت ہوتے ہیں او یاخذھم فی تقلبھم ان کا سفر اور تجارت کے لئے آنا جانا فما ھم بمعجزین اللہ رب العزت پر غالب آنے والے نہیں ہیں، علی تخوف ان کے اموال کے کم ہونے کا یتفیؤ مائل ہوتے ہیں ولہ الدین طاعت واصبا ہمیشہ تجارون مدو طلب کرنے کے لئے تم اپنی آوازیں بلند کرتے ہو، وھو کظیم مغموم یدسہ اسے چھپادے مفرطون بھلائے ہوئے، چھوڑے ہوئے سائغا ان کے حلقوں سے گزرنے والا، سکر اشراب، سکر ہر وہ شئے ہے جو اللہ تعالیٰ نے پھلوں سے حرام کی ہے ورزقا حسنا جو کچھ اللہ تعالیٰ نے حلال کیا، اور وہ سرکہ اور کشمش اور کھجور ہے واوحی ربک الی النحل اسے الہام کیا، اور اس کے دل میں ڈالا ذللا تابعدار مسخر وحفدۃ پوتا، تھیال مددگار وھو کل، ثقیل، مصیبت تستخفونھا یوم ظعنکم تمہارے سفروں میں تم پر اس کا اٹھانا ہلکا ہو جاتا ہے اثاثا چادر، کپڑے اور بستر، اکنانا، غار اور چھپنے کی جگہ، سرابیل کرتے تقیکم الحر تمہیں گرمی سے بچاتا ہے، اور جو کرتے تمہیں لڑائی سے بچاتے ہیں، اور وہ ہیں جو تمہیں نیزہ، تلوار اور تیر سے بچاتے اور حفاظت کرتے ہیں ولاھم یستعتبون ان سے اس کی جانب رجوع کرنے کو طلب کیا جائیگا جس سے اللہ تعالیٰ راضی ہو الفحشآء زنا یعظکم تمہیں نصیحت کرتا ہے، نقضت غزلھا اسے خراب کردیا، ایک بیوقوف عورت سوت کاتتی، جب اس کا سوت تیار ہو جاتا، تو اسے توڑ دیتی من بعد قوۃ گھمانے اور بٹنے سے سوت کاتنے کی انکاثا ٹکڑے ٹکڑے دخلا بینکم دھوکہ ہر وہ شئے جو صحیح نہ ہو، اسے دخل کہا جاتا ہے اربی من امۃ دوسری قوم سے برتر، زیادہ فتزل قدم بعد ثبوتھا خدا کو پہچاننے کے بعد ایمان سے پھیر گیا، ینفد فنا ہوتا ہے منقطع ہوتا ہے باق ہمیشہ جو منقطع نہ ہو، فاذا قرأت القرآن فاستعذ باللہ، جب تو قرآن پڑھنے کا ارادہ کرے، پس اللہ سے سوال کر کہ وہ تجھے پناہ دے اور یہ مقدم و مؤخر ہے، اور یہ اس باعث کہ استعاذہ قرأت سے قبل ہے، اور اس کے معنی اللہ سے پناہ چاہنا ہے روح القدس جبریل لسان الذی یلحدون الیہ جس کی طرف کلام کو منسوب کرتے ہیں، اور یہ گمان کرتے ہیں کہ آپ کو تعلیم دے رہا ہے۔ اعجمی جو عمدہ طور پر عربی نہ بول سکے کفار کہا کرتے تھے، کہ محمد کو عبد بن الحضرمی تعلیم دیتا ہے جو کتاب جانتا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لسان

الذی یلحدون الخ من بعد مافتنوا عذاب دیئے گئے امۃ قانتاً خیر کی تعلیم دینے والا ،تابعدار واتیناہ فی الدنیا حسنۃ یعنی ذکر ،اور لوگوں میں اچھی تعریف۔

سورۂ بنی اسرائیل

سبحان الذی اس کے لئے ہر برائی سے برأت ہے اسری بعبدہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو لے گیا یہ معراج کے واقعہ کی طرف اشارہ ہے انہ کان عبداً شکوراً سلمان سے روایت ہے کہ نوح علیہ السلام جب کھانا کھاتے اور کپڑے پہنتے ،تو خدا کا شکر کرتے ،اسی بنا پر ان کا نام عبد شکور رکھا گیا ہے وقضینا الیٰ بنی اسرآئیل ان کی جانب ہم نے وحی کی اور انہیں تعلیم دی ولتعلن تم سرکشی کرو گے وعد اولھما یعنی پہلا فساد عباداً لنا جالوت اور اس کی قوم فجاسوا خلال الدیار پس چلے اور اپنے گھروں کے درمیان گھومنے لگے ثم رددنا لکم الکرۃ علیھم ہم نے تمہارے لئے ان پر حکومت جالوت کے قتل کے ساتھ لوٹا دیا اکثر نفیراً بلحاظ عدد تم سے زیادہ ولیتبروا تا کہ جڑیں کاٹ دیں اور تباہ کر دے،اس کی جس پر غالب آئے حصیراً قید خانہ اور جیل عجولا جو برائی کی اتنی جلدی دعا کرتے جتنی بھلائی کی مبصرۃ روشنی کہ اس میں دیکھ سکیں فصلناہ ہم نے اسے بیان کیا امرنا مترفیھا ہم نے رسول کی زبانی اطاعت کا حکم کیا،حد سے سرکشی کرنے والے اور تسلط کرنے والے مترفین اس سے مراد ہیں،ایک قول یہ ہے،کہ ہم نے شریروں کو مسلط کیا فحق پس واجب ہوا، القول عذاب دمرناھا ہم نے اسے ہلاک کر دیا،العاجلۃ دنیا وسعیٰ لھا سعیھا اللہ کے احکام پر عمل کیا من عطاء ربك یعنی دنیا جو نیک و بد میں تقسیم ہے محظوراً دنیا میں مؤمنین اور کافرین سے روکا ہوا وقضی حکم کیا ولا تقل لھما اف یعنی بے کار بات،اور ان کے معاملہ میں سے کسی چیز کو گراں نہ سمجھ واخفض اپنی جانب کو نرم کر للاوابین اللہ کی نافرمانیوں سے بچنے والے ولا تبذر بے کار کام میں مال خرچ نہ کر ابتغاء رحمۃٍ رزق کا انتظار میسوراً نرم،سہل ملوماً تیرا نفس ملامت کرے،اور تو ملامت کیا جائے محسوراً تیرے پاس کچھ نہیں کہا جاتا ہے، حسرت الرجل بالمسئلۃ جب کہ تم مانگ کر اس کا مال ختم کر دو خشیۃ املاقٍ فقر کے

خوف سے، خطاء، گناہ لولیه اس کے وارث کے لئے واحسن تاویلاً انجام ولا تقف اس شئے کے بارے میں کچھ نہ کہہ جسے تو نہیں جانتا مرحاً بڑائی اور فخر کے ساتھ لن تخرق الارض تو اسے پھاڑ نہ دیگا أفاصفاکم تمہیں چنا اور خاص کیا صرفنا ہم نے پھیرا اور ہم نے بیان کیا من کل مثل جو عبرت حاصل کرنے اور ذکر کرنے کا سبب ہو، حجاباً مستوراً، چھپانے والا واذھم نجوی ناجیت کا مصدر ہے، اس کے ساتھ ان کا وصف بیان کیا، مقصد یہ ہے کہ وہ جھٹلانے اور مذاق اڑانے کا مشورہ کرتے ہیں فسینغضون الیك رؤسھم اس قول کے ساتھ کذب اور استہزاء کے طور پر حرکت دیتے ہیں، یا مذاق کرتے ہیں، فتستجیبون بحمدہ اس کی حمد کو قبول کرتے ہیں جب کہ تمہیں حمد نفع نہ دیگی ینزغ فساد کرتا ہے ولا تحویلاً بیماری سے صحت کی جانب، اور فقر سے غنا کی جانب أولئك الذین یدعون کچھ انسانوں نے جنات کے ایک گروہ کو اپنا معبود بنالیا تھا، پھر وہ جنات مسلمان ہو گئے تو انہوں نے ان کا دین اختیار کرلیا، ایھم اقرب اللہ کی رحمت سے کون زیادہ قریب ہے وماجعلنا الرؤیا التی ارینا ک ابن عباسؓ فرماتے ہیں رؤیا سے مراد آنکھ کا دیکھنا ہے جو معراج کی رات میں حضور کو دکھایا گیا والشجرۃ الملعونۃ تھوہر کا درخت لاحتنکن ذریته، میں اغوا کے ساتھ ان کی جڑیں کاٹ دونگا، اور ان پر مسلط ہو جاؤنگا جزاءً موفوراً پورا واستفزز اسے گھبرادے، اکھاڑ دے بصوتك غنا اور باجے واجلب علیھم چیخ پکار کر بخیلك ورجلك سواروں اور پیدل چلنے والوں کے ساتھ یزجی جاری کرتا ہے، چلاتا ہے حاصباً اکھاڑنے والی ہوا قاصفاً من الریح شدید ہوا جو کشتیوں کو الٹ دے یا توڑ دے تبیعاً مددگار فتیلاً کھجور کی گٹھلی میں جو جھلی ہوتی ہے واضل سبیلاً بہت بعید حجت لیفتنونك تجھے پھسلا دیں گے ضعف الحیاۃ وضعف المماۃ دنیا اور آخرت کا عذاب، لیستفزونك تجھے گھبرادیں گے واذاً لا یلبثون خلافك نہیں ٹھیریں گے حتی کہ تیرے پیچھے سے جڑیں کاٹ دیں لدلوك الشمس سورج کے زوال کے وقت الی غسق اللیل اس کی اندھیری آنے کے وقت وقراٰن الفجر صبح کی نماز مشھوداً کہ اس میں رات اور دن کے فرشتے حاضر ہوتے ہیں نافلۃ زیادتی مقاماً محموداً تیرا رب تجھے مقام محمود میں کھڑا کریگا اور وہ قیامت کے روز مقام شفاعت ہوگا وزھق الباطل

شرک مضمحل ہوگیا زھوقاً زائل ہونے والا یزھق الباطل معنی ہیں ہلاک ہوتا ہے ایک قول یہ ہے کہ جانے والا یؤساً ناامید، جواللہ کی رحمت سے ناامید ہو شاکلتہ اپنے طریقے پر یا اپنے کونے پر قل الروح من امر ربی میرے رب کے علم سے ہے یہود نے کہا اے ابوالقاسم! ہم سے روح کی کیفیت بیان کیجئے، تو یہ آیت نازل ہوئی کسفاً ٹکڑے قبیلاً ظاہر خبت بجھ گئی ورفاتاً غبار قتوراً بخیل مثبوراً ملعون، خیر سے رکا ہوا، فرقناہ ہم نے اسے جدا کیا یخرون للاذقان چہروں کے بل ولا تجھر بصلوتك ولا تخافت بھا جہر و اعلان اور آہستگی کے درمیان راہ طلب کر، نہ تو بہت بلند آواز سے نہ اتنا آہستہ کہ تیرے کان بھی نہ سن سکیں آنحضرت ﷺ جب قرآن مجید بلند آواز سے تلاوت فرماتے تو مشرکین آپ کو اور نازل کرنے والے اور لانے والے سب کو گالیاں دیتے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی ولا تجھر آخر آیت تک ولیّ من الذل کسی کو حلیف نہیں بنایا۔

سورۂ کہف

عوجاً خلط ملط کرنا، اور اختلاط کرنا قیماً سیدھا، باخعٌ ہلاک کرنے والا اسفاً ندامت، الکھف پہاڑ میں راہ، غار، الرقیم کتاب، شیشے کی تختی ان کے عامل نے ان کے نام لکھے، پھر اسے خزانے میں ڈال دیا فضربنا علیٰ آذانھم اللہ نے ان کے کانوں پر مارا، پس وہ سو گئے ثم بعثناھم انہیں زندہ کیا امداً انتہاء ربطنا علیٰ قلوبھم انہیں صبر کا الہام کیا شططا زیادتی مرفقاً ہر وہ شئے جس کے ساتھ تم انتفاع حاصل کرو، تزاور مائل ہوتا ہے تقرضھم انہیں کاٹتا ہے فجوۃٍ وسیع بالوصید صحن میں ازکیٰ بہت زیادہ ولا تعدعینك عنھم نہ انہیں ان کے غیر کی جانب لے جا، فرطاً ندامت سرادقھا پردے کی طرح اور وہ حجرہ جو پردوں سے گھرا ہو، کالمھل تیل کی تلچھٹ ولم تظلم نہیں کم کیا وکان له ثمر سونا اور چاندی یحاورہ اس پر فخر کرتا تھا، محاورہ سے مشتق ہے لکنا ھو اللہ ربی لیکن میں، تو میرا رب اللہ ہی ہے، الف کو حذف کر دیا گیا، اور دونوں نون ایک دوسرے میں ادغام کر دیئے گئے حسباناً من السماء آگ کی بجلیاں زلقاً جس میں قدم نہ ٹھہر سکیں ھنالك الولایۃ تولی کا

مصدر ہے عقباً وہ آخرت ہے الباقیات الصالحات اللہ کا ذکر موبقا ہلاکت کی جگہ قبلاً ظاہر قبلا قبیل کی جمع ہے اور قبلاً دونوں کے زیر کے ساتھ سامنے آنے والی شی، آمنا سامنا کرنا لید حضوا تا کہ زائل کردیں، دحض کے معنی پھسلنے کے ہیں موئلاً پناہ کی جگہ حقباً طویل زمانہ سرباً جانے کی جگہ، بولتے ہیں یسرب یعنی چلتا ہے قصصاً دونوں اپنے نشانیوں کو تلاش کرتے ہوئے لوٹے عبداً من عبادنا، خضر علیہ السلام فخشینا ان یرھقھما طغیاناً وکفراً یعنی ان دونوں کو اس کی محبت اس امر پر مجبور کردے کہ اس کے دین کی متابعت کریں واقرب رحماً، رحم سے مشتق ہے، اوراس میں رحمت سے زیادہ مبالغہ ہے، کان تحتہٗ کنزلھما سونا اور چاندی من کل شئي سبباً، علم، عین حمئۃ گرم الصدفین دو پہاڑ فما اسطاعوا ان یظھروہ جس پر چڑھ سکیں جعلہٗ دکاء اسے زلزلے میں ڈالا، لایستطیعون سمعاً نہیں سمجھتے یحسبون انھم یحسنون صنعاً حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ ان میں سے فرقہ حروریہ بھی ہے، حضرت سعدؓ فرماتے ہیں، اس سے مراد فرقہ حرو ریہ نہیں ، بلکہ گرجا والے ہیں، اورحروریہ ایسے لوگ ہیں جنہوں نے کجی اختیار کی، تو اللہ نے ان کے دلوں کو کج کردیا حضرت ابیؓ فرماتے ہیں، لیکن خوارج وہ فاسق ہیں جو اللہ سے عہد کرکے توڑتے ہیں۔

سورۂ مریم

لم نجعل له من قبل سمياً مثل سوياً بغیر گونگے پن کے وحناناً من لدنا ہماری جانب سے رحمت، بشراً سویاً عیسیٰ علیہ السلام جباراً شقیا نافرمان، یہود کہتے تھے کیا تم قرآن میں یہ نہیں پڑھتے یااخت ھارون اورموسیٰ اورعیسیٰ کے درمیان بہت فاصلہ تھا، آنحضرت ﷺ نے جواب دیا، کہ لوگ اپنے انبیاء اور پہلے نیک لوگوں کے نام پر نام رکھتے تھے فاجاء ھا المخاض دردزہ انہیں ایک پناہ کی جگہ لے آیا سریاً چھوٹی نہر رطباً جنیاً تازہ کھجوریں انتبذت جدا ہوئی شیئاً فریاً بری اسمع بھم وابصر اس دن کفار سب سے زیادہ دیکھنے سننے والے ہوں گے وانذرھم یوم الحسرۃ جب ندا کی جائے گی، کہ اے اہل جنت تمہارے لئے ہمیشگی ہے اور موت نہیں اور اے اہل دوزخ تم ہمیشہ رہوگے اور مرنا نہیں

لا رجمنك تجھے میں برا کہوں گا لسان صدقٍ علیاً اچھی ثنا وا ھجرنی مجھ سے دور ہو، حفیاً مہربان و بـکیا باک کی جمع ہے غیا ٹوٹے میں لا یسمعون فیھا لغواً باطل، نبی ﷺ نے جبریلؑ سے فرمایا تجھے ہمارے پاس زیادہ آنے سے کیا چیز روکتی ہے،تو یہ آیت نازل ہوئی ومانتنزل الا بامر ربك، وماکان ربك نسیاً حقیر ھل تعلم لهٗ سمیاً اس کے علاوہ کسی نے رحمان نام نہیں رکھا عتیاً نافرمان صلیاً، صلی یصلی سے مشتق ہے بمعنی داخل ہونا اور جلنا، ان منکم الا واردھا اس پر وارد ہونگے، پھر اپنے اعمال کے مطابق نکلیں گے حتماً مقضیا یقینی احسن ندیا، نادی بمعنی مجلس اثاثا مال ورئیا منظر، یہ بھی کہا گیا ہے ری بمعنی شراب، خباب کہتے ہیں، میں عاص بن وائل کے پاس اپنا حق مانگنے کے لئے گیا جو اس پر تھا، اس نے جواب دیا، میں اس وقت تک نہ دوں گا، وہ جب تک تو محمد کا انکار نہ کرے میں نے جواب دیا میں اس وقت تک اس کا انکار نہ کروں جب تک تو مر کر دوبارہ زندہ نہ ہو، بولا کیا واقعی میں مر کر دوبارہ زندہ ہوں گا، میں نے کہا ہاں کہنے لگا، تو اس وقت بھی میرے پاس مال اور اولاد ہوگی ،تو آیت نازل ہوئی أفرأیت الذی کفر بایاتنا، اداً برا قول تؤزھم ازا انہیں اغوا کریگا یا انہیں گھبرا دے گا نعدلھم عداً ہم ان کے سانسوں کو جو وہ دنیا میں لیتے ہیں شمار کرتے ہیں وردا پیاسا عھداً لا الہ الا اللہ کی شہادت ھداً گرانا، لذا ٹیڑھا پن رکزا آواز یا حس۔

سورۃ طٰہٰ

الواد المقدس مبارک اور اس کا نام طویٰ ہے اکاد اخفیھا میں اسے اپنے علاوہ کسی کو اس پر مطلع نہیں کرتا سیرتھا اس کی حالت واحلل عقدۃً من لسانی، عقدہ سے مراد نہ بولنا حرف کو پورے طور پر ادا نہ کرنا ہے، یا بولتے وقت لکنت ہو ازری میری پشت ان یفرط یہ کہ جلدی کرے یطغی حد سے تجاوز کرتا ہے فاوجس خوف کو چھپایا و فتناك فتوناً تیری مختلف بار آزمائش کی ولا تنیا تم دونوں کمزور نہ پڑو اعطی کل شیئٍ خلقهٗ ہر شئے کے لئے اس کا جوڑا پیدا کیا ثم ھدی اس کے نکاح، کھانے پینے اور رہنے کی، لا یضل خطا نہیں کرتا فی جذوع یہاں فی بمعنی علی ہے النھی بچنے والے، تارۃً حالت فیسحتکم پس تمہیں ہلاک

کرے السلوی ایک پرندہ ہے جو بیٹر کے مشابہ ہوتا ہے، ولا تطغوا تم گمراہ نہ ہو فقد هوی بدبختی اختیار کی بملکنا ہمارے حکم سے ظلت تو ٹھہر گیا، لننسفنهٔ فی الیم ہم اسے دریا میں بہادیں گے سساء براہوا یتخافتون چپکے چپکے بولے قاعاً برابر، چکنا، جس پرسے پانی گزر جائے صفصفاً جس زمین میں گھاس نہ ہو، برابر زمین عوجاً وادی امتاً ٹیلا مکاناً سوًی انکے درمیان میں یبساً خشک علی قدر وعدہ کا وقت ماخطبك تیرا کیا حال ہے مساسَ مسه مساساً کا مصدر ہے، معیشة ضنکاً، ضنك کے معنی ہیں سخت، بعضوں کے نزدیک بدبختی کے معنی میں آتا ہے، نبی ﷺ نے فرمایا وہ قبر کا عذاب ہے، خشعتِ الاصوات خاموش ہوگئیں همساً ہلکی آواز، قدموں کی آواز، آہستہ چلنا، وعنت الوجوهُ جھک گئے فلا یخاف ظلماً یہ کہ ظلم کرے کہ اس کی برائیوں میں زیادتی کی جائے من زینته القوم وہ زیور جو فرعون کی قوم سے مستعار لئے تھے فقذفنا ها ہم نے اسے ڈالدیا القی السامری سامری نے بنایا المثلی، امثل کا مؤنث ہے یعنی وہ تمہارے اچھے دین کو ختم کردیں امثلهم طریقةً ان میں سب سے اچھا هضماً ظلم نہیں کرتا، کہ اس کی نیکیاں ہضم کر جائے خوارٌ چیخ حشرتنی اعمی میری حجت سے کنت بصیراً دنیا میں لاتظمأ پیاسا نہ ہوگا ولا تضحی تجھے گرمی نہ پہنچے گی۔

سورۂ انبیاء

فلما احسوا توقع کی احست سے مشتق ہے خامدین مردے لعلکم تسئلون تم سے پوچھا جائے الویل جہنم میں ایک وادی ولا یستحسرون تھکتے نہیں ارتضی راضی ہوا، فی فلك، دو ر یسبحون جاری رہتے ہیں، گھومتے رہتے ہیں ولا هم منا یصحبون مجاورت نہیں کرتے، قریب نہیں رہتے ننقص من اطرافها اس کی اصل اور اس کی برکت کم کرتے رہتے ہیں التماثیل بت، جذاذاً ٹکڑے ٹکڑے ثم نکسوا الوٹ گئے نفشت نفش کے معنی ہیں رات میں جانور چرانا، صنعة لبوْسٍ لکم زرہیں ان لن نقدرعلیه ہم اسے اس عذاب میں نہیں پکڑیں گے جو اسے پہنچ رہا ہے امتکم امة واحدة تمہارا دین ایک دین ہے

وتقطعوا امرهم انہوں نے اختلاف کیا حدبٍ بلندی، ینسلون سامنے آتے ہیں حصب درخت لکڑی جب یہ آیت نازل ہوئی انکم وماتعبدون من دون الله حصب جهنم انتم لها واردون تو مشرکین نے اعتراض کیا کہ فرشتے عیسیٰ اور عزیرؑ کی بھی اللہ کے علاوہ عبادت کی جاتی ہے تو یہ آیت ان الذین سبقت لهم منا الحسنى نازل ہوئی الحسیس حسیس اور حس ایک معنی میں ہیں یعنی ہلکی آواز السجل صحیفہ کطی السجل للکتب جیسے صحیفے کو کتاب پر لپیٹ لیا جاتا ہے، حضور نے فرمایا اے لوگو! تم اللہ کی جانب ننگے بغیر ختنہ کئے اٹھائے جاؤ گے پھر آپ نے یہ آیت پڑھی کما بدأنا اول خلق۔

سورۂ حج

ان زلزلة الساعة شئیٌ عظیمٌ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا، کہ جس دن اللہ تعالیٰ آدم سے فرمائیگا، اٹھ اور نو سو ننانوے دوزخ میں بھیج دے اور ایک جنت میں تذهل غافل ہو جائیں گی بھیج حسیس ثانی عطفه اپنے دل میں تکبر کرنے والا یصهرُ پگھلایا جائے گا من یعبد الله علی حرف شك یہ بھی کہا گیا ہے کہ جب کوئی آدمی مدینہ آتا ہے، تو اگر اس کے گھر لڑکا پیدا ہوتا، اور اس کا گھوڑا بھی بچہ جنتا تو کہتا یہ دین عمدہ ہے، اگر اس کی بیوی کو بچہ نہ ہوتا، اور نہ اس کی گھوڑی بچہ جنتی، تو کہتا یہ دین برا ہے هذان خصمان اختصموافی ربهم یہ ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی، جو بدر میں اول مقابلے کے لئے نکلے تھے یعنی حمزہؓ، علیؓ اور عبیدہؓ اور کفار میں سے عتبہ، شیبہ اور ولید فلیمدد بسببٍ الى السماء گھر کی چھت کی طرف رسی کے ساتھ وهدوا الى الطیب قرآن کا الہام کئے گئے وهدوا الى صراط الحمید اسلام من کل فج عمیق بعید راستہ البائس الفقیر جو حال کی شدت سے کوئی چیز نہ پائے تفثهم ان کے حج کے واجبات سر منڈانا، کپڑے پہننا اور ناخن کاٹنا وغیرہ بالبیت العتیق آنحضرت ﷺ نے فرمایا اس کا نام بیت العتیق اس لئے ہے کہ اس پر کوئی ظالم غالب نہیں آسکتا منسکا راہ بندگی المخبتین مطمئن قانع سوال نہ کرنے والا، وہ شخص کہ جو کچھ بھی اسے دیا جائے اس پر قناعت کرے المعتر سوال کرنے والا، اذن للذین یقاتلون یہ اول آیت ہے جو قتال کے بارے

میں نازل ہوئی وقصرٍ مشید چونے اور اینٹ کے ساتھ بنا ہوا اذا تمنٰی القی الشیطان فی امنیتہٖ جب وہ بات کرتا ہے تو شیطان اس کی بات میں اپنی بات ڈالدیتا ہے پس اللہ شیطانی باتوں کو باطل کرتا اور اپنی آیات کو محکم کرتا ہے یسطون حد سے بڑھتے ہیں سطوت سے بنا ہے۔

سورۂ مومنون

افلح المؤمنون کامیاب و بامراد ہوئے خاشعون خاموش ڈرتے ہوئے من سلالۃٍ نطفہ سبع طرائق آسمان تنبت بالدھن زیت واترفناھم اور ہم نے انہیں وسعت دی، ھیھات ھیھات دور ہوا غثأً جھاگ جو پانی پر اٹھ آئے، اور وہ شئے جو نفع نہ دے ربوۃٍ بلند مکان، نبی ﷺ نے فرمایا، فردوس جنت کا اعلیٰ اور عمدہ اور افضل حصہ ہے، تترٰی بعض بعض کے پیچھے ذات قرارٍ سرسبز، معینٍ پاک پانی امتکم تمہارا دین وقلوبھم وجلۃ ڈرے ہوئے، حضرت عائشہؓ نے حضور سے دریافت کیا یارسول اللہ اس آیت والذین یوتون ما اٰتوا وقلوبھم وجلۃ میں کیا وہ لوگ مراد ہیں جو شرابیں پیتے اور چوری کرتے ہیں، آپ نے فرمایا اے صدیق کی بیٹی نہیں، بلکہ یہ وہ لوگ ہیں جو روزے رکھتے ہیں اور صدقہ کرتے ہیں، اور اس بات سے ڈرتے ہیں کہ شاید ان کی عبادت قبول نہ ہو اؤلئك یسارعون فی الخیرات وھم لھا سابقون ان کے لئے سعادت پہل کر چکی ہے یجأرون مدد چاہتے ہیں سامراً تھجرون بیت اللہ کے گرد اور بے ہودہ باتیں کہتے ہو تنکصون پیچھے ہٹتے ہو عن الصراط لنا کبون حق سے ہٹنے والے تسحرون تم دھوکہ دیئے جاتے ہو ایک شخص ابن عباسؓ کے پاس آیا، اور کہنے لگا، میرے دل میں قرآن کے بارے میں کچھ شک ہے ایک مقام پر تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وکان اللہ علیٰ کل شئی قدیرًا یہ ایک مقدر شئے تھی جو ہو چکی دوسرے مقام پر فرماتا ہے فلا انساب بینھم یومئذٍ ولا یتساء لون تیسرے مقام پر ارشاد ہے واقبل بعضھم علی بعضٍ یتساء لون ، ابن عباسؓ نے فرمایا یہ آیت وکان اللہ علی کل شئی قدیراً تو وہ ہمیشہ سے تھا اور ہمیشہ رہیگا اور جہاں تک ویتساء لون کا تعلق ہے، تو یہ پہلے نفخہ کے وقت ہوگا، یعنی حشر میں اور جہاں تک یتساء لون کا تعلق ہے، یہ اس وقت ہوگا جب جنت میں

داخل ہو جائیں گے کالحون بگڑے ہوئے چہرے حضورؐ نے فرمایا ھم فیھا کالحون ان میں سے کسی کو آگ لگے گی تو اس کا ہونٹ درمیان سر تک چڑھ جائیگا، اور نچلا ہونٹ ناف تک آ جائے گا۔

سورۂ نور

انا انزلناھا، ہم نے اسے بیان کیا، فرضنھا اس میں مختلف فرائض نازل کئے، مرثد نے کہا یا رسول اللہ میں عناق سے نکاح کرنا چاہتا ہوں اور وہ مکہ کی ایک رنڈی تھی تو یہ آیت نازل ہوئی الزانی لاینکح الا زانیة یرمون المحصنات، آزاد، والذین یرمون ازواجھم ہلال ابن امیہ کے بارے میں نازل ہوئی، جنھوں نے اپنی بیوی پر حضور کے سامنے شریک بن سمحاء کے ساتھ تہمت لگائی، ایک قول یہ ہے کہ یہ آیت عویمر کے بارے میں نازل ہوئی ان الذین جاؤا بالافك حضرت عائشہ کے قصہ میں نازل ہوئی اذتلقونہ جب وہ اس بات کو ایک دوسرے سے نقل کرکے کہہ رہے تھے مازکی نہیں ہدایت پائی ولا یاتل نہ قسم کھائیں وینھھم ان کا حساب تستانسوا تم سے اجازت طلب کریں ولا یبدین زینتھن الا لبعولتھن اپنے پازیب بازوبند، سینہ بال وغیرہ سوائے خاوند کے کسی کے لئے ظاہر نہیں کرتیں، عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں نہ پازیب نہ بالیاں اور نہ ہار، مگر جو شئی ہے خود بخود ظاہر ہو اور وہ کپڑے میں غیر اولی الاربة وہ غافل جسے عورتوں کی شہوت نہ پیدا ہوئی ہو اوالطفل الذین لم یظھروا وہ کچھ بھی نہیں جانتے کیونکہ ان میں بچپن ہے ان علمتم فیھم خیرا اگر تم ان کے لئے سمجھ دیکھو فتیاتکم تمہاری باندیاں البغاء زنا، نور السموات آسمان وزمین والوں کو ہدایت کرنے والا ہے مثل نورہ مومن کے دل میں اس کی ہدایت کی مثال کمشکوٰة، بتی رکھنے کی جگہ، طاق، فی بیوت مسجدیں ان ترفع اکرام کیا جائے ویذکر فیھا اسمہ جن میں اس کی کتاب پڑھی جائے، یسبح نماز پڑھتا ہے بالغدو صبح کی نماز الاصال عصر کی نماز رجال لا تلھیھم تجارة ولا بیع عن ذکر اللہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ وہ لوگ ہیں جو انتہائی تجارت پیشہ اور خرید و فروخت میں مشغول رہتے لیکن پھر بھی ان کی تجارت اور بیع انہیں اللہ کے ذکر سے نہیں روکتی، بقیعة برابر زمین میں سنا برقه اس کی روشنی من خلالہ بادلوں

کے تھوں کے درمیان سے مذعنین اطاعت کرنے والے کے لئے تحیة سلام۔

سورۂ فرقان

تبارک برکت سے تفاعل کے وزن پر تملی پڑھی جاتی ہیں ثبوراً تباہی بوراً ہلاک شدہ عتوا نافرمانی کی هبـاً منثوراً جسے ہوا اڑا لے جائے الذین یحشرون علیٰ وجوههم کہا گیا اے اللہ کے نبی قیامت کے روز کافر اپنے چہرے پر کیسے اٹھائے جائیں گے آپ نے فرمایا، کیا یہ ممکن نہیں ہے، کہ جو دنیا میں ''پیروں پر چلانے پر قادر ہے، وہ اس امر پر بھی قادر ہے کہ اسے منہ کے بل چلائے الرس کان مدالظل طلوع فجر اور طلوع شمس کے درمیان کا حصہ ساکناً ہمیشہ علیہِ دلیلاً کیونکہ اگر سورج نہ ہوتا، تو سایہ، کو نہ پہچانا جاتا، قبضا یسیراً جلدی جعل اللیل والنهار خلفة جس سے رات کا کوئی عمل فوت ہو جائے، تو اسے دن میں پالیتا ہے، اور اگر دن میں فوت ہوتا ہے، تو رات کو پالیتے ہیں، وعباد الرحمن مؤمن، هوناً طاعت، پاکدامنی اور تواضع کے ساتھ غـرامـاً سخت چمٹنے والا جیسے قرض خواہ چمٹ جاتا ہے، یا ہلاکت لا یقتلون النفس التی حرم اللّٰه الا بالحق ، جب یہ آیت نازل ہوئی تو اہل مکہ بولے ہم نے اللہ سے شرک بھی، اور جو جان اللہ نے حرام کی تھی اسے بھی قتل کیا، اور زنا بھی کیا، تو اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی الا من تاب وامن آخر تک اثاماً سزا هب لنا من ازواجنا وذریاتنا قرة اعین اللہ کی اطاعت میں اور جو شئے مومن کی آنکھ کی ٹھنڈک کا باعث ہے، وہ یہ کہ اپنے محبوب کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں دیکھے، ما یعبأ اسے شمار نہیں کرتے لزاماً ہلاکت۔

سورۂ شعراء

کالطود پہاڑ کی طرح ازلفنا ہم نے جمع کیا الشرذمة تھوڑی سی جماعت فکبکبوا جمع کئے گئے ریع بلندی، مصانع ہر بنائی ہوئی شے مصنع ہے لعلکم گویا کہ تم ہمیشہ رہو گے خلق الاولین پہلوں کا دین فارهین ماہرین، اکڑنے والے تعثوا، عثو کے معنی سخت فساد کے ہیں تعبثون تم کھیلتے ہو هضیم بعض بعض سے ملے ہوئے جو چھونے سے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے مسحرین جادو کئے ہوئے الایکة جھاڑی، درخت، الجبلة، عادت، یوم الظلة

عذاب کا سایہ واخفض جناحك اپنے پہلو نرم کر فی کل وادٍ یھیمون ہر لغو کام میں گھسے رہتے ہیں۔

سورۂ نمل

بورك پاک کیا گیا بشھابٍ قبسٍ آگ کا شعلہ جس سے تم آگ حاصل کرتے ہو اوزعنی مجھے کر یخرج الخب، آسمان وزمین میں ہر مخفی شئے کو جانتا ہے، لا قبل لھم ان کے لئے طاقت نہیں الصرح، وہ مکان جو شیشے سے بنا ہو، اس کی جمع صروح آتی ہے، عرش عظیمٌ معزز تخت یاتونی مسلمین مطیع نکروا تبدیل کردو طائرکم تمہارے مصائب ادارك علمھم ان کا علم جا تا رہا ردف، قریب ہے یوزعون روکے جاتے ہیں، یہ بھی کہا گیا ہے، کہ دفع کئے جاتے ہیں یا ان کا اول ان کے آخر پر روکا جاتا ہے، یہاں تک کہ پرندے سو جاتے ہیں داخرین ذلیل جامدۃ قائم اتقن محکم کیا۔

سورۂ قصص

قصیه اس کے پیچھے پیچھے جاء عن جنبٍ دور سے یاتمرون باہم مشورہ کرتے ہیں انستُ میں نے دیکھا جذوۃ لکڑی کا سخت کا ٹکڑا جس میں شعلہ نہ ہو، ردأ مددگار سنشد عضدك ہم تیری مدد کریں گے العضد مددگار کو کہتے ہیں نبی ﷺ نے اپنے چچا سے فرمایا، تو لا الہ الا اللہ کہہ لے، میں تیرے لئے قیامت کے روز اس کی شہادت دوں گا، بولا اگر مجھے اس بات کا خطرہ نہ ہوتا کہ قریش مجھے یہ عیب لگائیں گے، کہ میں نے موت سے گھبرا کر کلمہ پڑھ لیا، تو میں تیری آنکھ ٹھنڈی کر دیتا، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی انك لا تھدی من احببت معمیت علیھم الانباء دلائل سرمداً ہمیشہ کتنوء بھاری ہوتا ہے لرادك الی معادٍ مکہ کی جانب کل شئی ھالك الا وجھه مگر اس کا ملک اور کہا گیا ہے، مگر جس چیز کا اللہ کے لئے ارادہ کیا جائے

سورۂ عنکبوت

تخلقون افکاً تم جھوٹ بولتے ہو اثقالاً بوجھ ام سعد نے سعد سے کہا، کیا اللہ نے نیکی

کا حکم نہیں کیا، خدا کی قسم نہ میں کھاؤں گی، نہ میں پیوں گی حتیٰ کہ میں مر جاؤں یا تو کافر بن جائے تو یہ آیت نازل ہوئی ووصینا الانسان بوالدیہ حسناوان جاھداك علیٰ ان تشرك بی، آخر آیت تک وتاتون فی نادیکم المنکر وہ اہل زمین پر کنکر مارتے، اور ان سے مذاق کرتے تھے۔

سورۂ روم

جس روز یہ آیت نازل ہوئی الٓمٓ غلبت الروم فارس رومیوں پر غالب تھے، اور مسلمان رومیوں کے غلبے کو پسند کرتے تھے، اور قریش فارس کے غلبے کو، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی، اور روم ساتویں سال فارس پر غالب آئے ادنـــیَ الارض شام کا کنارہ اھـــون بہت آسان یصدعون متفرق ہوتے ہیں فلا یربو جو دیتے وقت، فضیلت کا متلاشی ہو، اس کے لئے کوئی اجر نہیں یحبرون انعام کئے جاتے ہیں یمهدون بستر تیار کرتے ہیں الودق بارش، السوئ برائی لا تبدیل لخلق اللہ اللہ کے دین الفطرۃ اسلام۔

سورۂ لقمان

ولا تصعر خدك للناس تکبر نہ کر، کہ تو اللہ کے بندوں کو حقیر سمجھے اور ان سے اعراض کرے، جب وہ تجھ سے بات کریں، تصعر کے معنی ہیں منہ پھیرنا الغرور شیطان ختارٍ، غدار

سورۂ الٓمٓ سجدہ

تتجافی جنوبھم عن المضاجع انتظار نماز کے بارے میں نازل ہوئی نسیناً کم ہم نے تمہیں چھوڑ دیا العذاب الادنی دنیا کی مصیبتیں اور اس کی بیماریاں مھین کمزور اور وہ مرد کا نطفہ ہے الجرز، وہ بادل جس سے اتنی معمولی بارش ہو، کہ وہ کوئی فائدہ نہ پہنچا سکے اولم یھدِ کیا بیان نہیں کیا۔

سورۂ احزاب

لوگ زید بن حارثہ کو زید بن محمد کہہ کر پکارتے تھے حتیٰ کہ یہ آیت نازل ہوئی ادعـــوھـــم

لا بــاثـهـم، ابن عباسؓ فرماتے ہیں، منافقین کہا کرتے تھے، کہ محمد کے دو دل ہیں ایک دل ان کے ساتھ ہے اور ایک دل تمہارے ساتھ ہے پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی مـا جـعـل الـلـه لـرجـل من قلبين ،فمنهم من قضى نحبهٗ اپنی اس عدت کو جوان کے لئے مقرر کی گئی ہے ، نبی ﷺ نے فرمایا، طلحہ وہ شخص ہے، جس نے اپنی مدت پوری کر لی ہے صيـاصيـهـم ان کے محل سلقوكم تمہارا استقبال کیا بـالسنةٍ حدادٍ یعنی طعن کرتے ہیں فيـطـمـع الذى فى قلبه مـــرض فجور اور زنا، ایک عورت نے کہا، میں ہر شئے کو صرف مردوں کے لئے دیکھتی ہوں اور عورتوں کا کسی شئے میں ذکر نہیں دیکھتی، تو یہ آیت نازل ہوئی ان الـمـسـلـمـين والـمـسـلـمـات ، وتــخـــفـــی فـــي نـفسك زینب بنت جحش اور زید بن حارثہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے يصلون دعائے برکت کرتے ہیں ترجی تو مؤخر کرتا ہے آنحضورؐ نے جب زینت سے رخصتی کی ، تو ایک جماعت کو کھانے پر بلایا جب لوگ کھا پی کر چلے گئے، تو دو آدمی بیٹھے باتیں کرتے رہے، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی يـا ايـهـا الـذيـن اٰمنوا لا تدخلوا بيوت النبى آخر تک لـنغرينك بهم ہم تجھے ان پر مسلط کر دیں گے، آنحضور ﷺ نے فرمایا موسیٰ بہت شرمیلے تھے اپنی جلد کا کوئی حصہ ظاہر نہ ہونے دیتے، لوگ کہتے کہ یہ جو اتنا پردہ کرتے ہیں، تو کسی عیب کی بنا پر کرتے ہیں، وہ ایک روز تنہائی میں غسل کرنے گئے، اور اپنے کپڑے پتھر پر رکھ دیئے اور نہانے لگے، پتھر کپڑے لے کر بھاگ نکلا، موسیٰ اس کے پیچھے بھاگے، اور کہتے جاتے اے پتھر! میرے کپڑے حتی کہ بنی اسرائیل کی ایک جماعت پر پہنچے، پس انہوں نے موسیٰ کو ننگا دیکھا، اور بے عیب پایا یہی مطلب ہے اللہ کے اس قول کا فبـرأه الـلّـه مـمـا قالوا سديداً حق بات، انصاف کی بات، الامانة فرائض جهولا اللہ کے حکم میں دھوکا کھایا ہوا۔

سورۂ سبا

آنحضرت ﷺ نے فرمایا، وہ ایک آدمی تھا جس کے دس لڑکے ہوئے، جن میں سے اس نے چھ کو یمن میں آباد کیا اور چار کو شام میں منساتهٗ اس کی لاٹھی سيل العرم سخت، خمط پیلو کا درخت هـل يـجازى سزا دیتا ہے الاثل جھاؤ ایک درخت ہے اوبـى معهٗ تسبیح کرو قدر فى

السرد جوڑ اور حلقے و اسلنا له عين القطر اس کے لئے لوہا نرم کیا، ایک قول یہ ہے کہ تانبا، محاریب محلات سے چھوٹی دیگر تعمیرات و جفانٍ کالجواب اونٹ کے حوضوں کی طرح، جوابي وسیع حوض فزع دور ہوا، الفتاح فیصلہ کرنے والا معاجزين سبقت کرنے والے، غلبہ کرنیوالے معشار دسواں اعظکم بواحدةٍ اللہ کی اطاعت کے ساتھ وبين مايشتهون مال، اولاد اور عمدہ چیزیں باشياعهم انکے مثل کے ساتھ فلا فوت کوئی نجات نہیں انی لهم التناوش تو ان کے لئے کیونکر لوٹنا ہوگا، یعنی آخرت سے دنیا کی جانب۔

سورۂ ملائکہ (فاطر)

الكلم الطيب اللہ کا ذکر والعمل الصالح ادائے فرض قطمير وہ جھلی جو چھوہارے کی گٹھلی پر ہوتی ہے لعوبٍ تھکن جدد راستے، الحرور دن میں، اور ایک قول یہ ہے کہ حرور رات میں ہوتی ہے، اور سموم دن میں سورج کے ساتھ مثقلة بوجھ کے ساتھ غرابيب سودٍ سخت سیاہ ثم اورثنا الكتاب الذين اصطفينا آنحضرت ﷺ نے فرمایا، یہ سب جنت میں ہونگے۔

سورۂ یٰس

بنو سلمہ مدینہ کے کنارے پر آباد تھے، انہوں نے مسجد نبوی کے قریب تبدیلی کا ارادہ کیا، تو یہ آیت نازل ہوئی انا نحن نحي الموتى ونكتب ماقدموا وآثارهم، مقمحون، مقمح کے معنی ہیں اپنی ناک اوپر کرنے والا، یا اپنے سر کو جھکانے والا طائركم تمہاری مصیبتیں احصيناه ہم نے اس کی حفاظت کی فعزز نا هم نے اسے مدد پہنچائی ياحسرة ان کے لئے تباہی اور حسرت ہے رسولوں کا مذاق کرنے کی بناء پر كالعرجون القديم عمدہ کھجور کی جڑ کی طرح المشحون بھرا ہوا، ان تدرك القمر، ان میں سے کوئی دوسرے کی روشنی سے روشنی حاصل نہیں کرتا اور نہ یہ ان دونوں کے لائق ہے ولا الليل سابق النهار یہ دونوں ایک دوسرے کو جلدی طلب کرتے ہیں، نسلخ منه النهار ان میں سے ایک کو دوسرے سے نکالتے ہیں، اور ایک کو دوسرے سے جاری کرتے ہیں من مثله مايركبون، چوپائے، جندٌ

محضرون حساب کے وقت الاجداث قبریں ینسلون نکلیں گے من مرقدنا ہمارے نکلنے کی جگہ سے۔

سورۂ صافات

واصب ہمیشہ لازب چمٹا ہوا یستسخرون مذاق کرتے ہیں فاھدوھم انہیں متوجہ کرو وقفواھم، انہیں روکو انھم مسئولون یہ حساب کئے جائیں گے مالکم و لاتناصرون تم روکتے کیوں نہیں مستسلمون مطیع اور مسخر، غول چکر، ایک قول یہ ہے کہ جس میں دنیا کی شراب کی طرح نہ بو ہوگی، نہ کراہت بیض مکنون چھپے ہوئے موتی سواء الجحیم دوزخ کے درمیان شربا انکا طعام مخلوط ہوگا، اور کھولتے پانی سے تیار ہوگا الفوا انہوں نے پایا و جعلنا ذریتہ ھم الباقین نبی ﷺ نے فرمایا وہ حام، سام اور یافث ہیں و ترکنا علیہ فی الآخرین تمام انبیاء کے لئے اچھی تعریف وان من شیعتہ ان کے دین والا یزفون چلنے میں دوڑتے ہیں، بلغ معہ السعی عمل وتلہ اسے پچھاڑ دیا فی الغابرین باقی رہنے والوں میں الفلک المشحون بھری ہوئی کشتی وھو ملیم گنہگار فنبذناہ بالعراء ہم نے اسے ساحل پر ڈال دیا، یا زمین پر من یقطین بغیر جڑ کے، اور وہ کدو ہے، یا اس کے مانند دوسری بیلیں، بفاتنین گمراہ کرنے والے کنحن الصافون وہ فرشتے ہیں۔

سورۂ صٓ

فی عزۃ نفرت، الملۃ الآخرۃ ملت قریش مراد ہے ولا ت حین مناص اس کے لئے بھاگنے کا وقت نہیں ہے، عجاب تعجب الاختلاق جھوٹ فلیرتقوا فی الاسباب آسمان، آسمان کے کنارے یا اس کے دروازے جند ما ھنالک مھزوم من الاحزاب قریش اولٰئک الاحزاب گزرے ہوئے زمانے فواق لوٹنا اور آنا جانا، قطنا قط کے معنی عذاب اور بدلہ اور حساب نامے کے ہیں و لا تشطط حد سے نہ گزرو عزنی مجھ پر غالب آ گیا الخلطاء شریک الصافنات، صفن الفرس گھوڑے کا ایک پیر اٹھا کر سم کے کنارے کھڑا کرنے کو کہتے ہیں۔ الجیاد تیز رو فطفق مسحا وہ گھوڑے کی گردن اور ٹانگوں پر ہاتھ

پھیرنے لگے جسداً شیطان رخاء پاکیزہ، اس کی مطیع، حیث اصاب جہاں اس نے ارادہ کیا الاصفادِ بیڑیاں، فامنن دے ارکض مار یرکضون دوڑے ہیں ضغثاً جھاڑو، اولی الایدی قوت والابصارِ، دین میں سمجھ اور اللہ تعالیٰ کے حکم میں غور کرنا قاصراتُ الطرف اپنے ازواج کے غیر سے اترابٌ برابر ہم عمر غساقٍ ٹھنڈک من شکلہٖ ازواجٌ رنگ برنگ کے عذاب اتخذناھم سخریاً ہم نے ان کا احاطہ کیا ہے۔

سورۂ زمر

یکوّر اٹھاتا ہے زلفیٰ، قربیٰ کی طرح مصدر ہے کتاباً متشابھاً یہ اشتباہ سے نہیں، لیکن اس کا بعض تصدیق میں بعض کے مشابہ ہے یتقی بوجھہٖ وہ اپنے منہ کے بل آگ میں گھسیٹا جائے گا غیر ذی عوجٍ اختلاط متشاکسونَ شکس تنگ دلی، جو انصاف کے ساتھ راضی نہ ہو رجلاً سلماً خالص یعنی صحیح وسالم والذی جآء بالصدق قرآن وصدقٌ بہ مومن قیامت کے روز آئے گا، اور کہے گا یہ وہ شئے ہے کہ جس کے ساتھ اس نے مجھے نصیحت کی ویخوفونك بالذین من دونہٖ بت اشمازت نفرت کی، ثم اذا خولناہُ ہم نے اسے دیا، وارد ہوا ہے، کہ کچھ مشرکین نے بہت قتل کئے تھے اور بے پناہ زنا بھی کیا تھا، وہ حضور کے پاس آئے، اور بولے، کہ جس چیز کی آپ دعوت دیتے ہیں، وہ عمدہ شئے ہے کاش! کوئی ایسا عمل ہوتا ہے، جو ہمارے گناہوں کا کفارہ بن سکتا تو یہ آیت نازل ہوئی قل یا عبادی الذین اسرفوا علیٰ انفسھم آخر آیت تک وان کنت لمن الساخرین مذاق کرنے والے لو انَّ لی کرۃ لوٹنا، المحسنین ھدایت پائے ہوئے بمفازتھم فوز سے مشتق ہے، والارض جمیعاً قبضتۃٗ آنحضرت ﷺ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ زمین کو قبض کریگا اور آسمان اس کے دائیں ہاتھ میں لپٹے ہوں گے۔ پھر فرمائے گا میں بادشاہ ہوں زمین کے، بادشاہ کہاں ہیں، ونفخ فی الصورِ ایک اعرابی نے کہا یا رسول اللہ صور کیا ہے، فرمایا ایک سینگ ہے جس میں پھونکا جائیگا حافین اپنے جانبوں سے گھرے ہوئے۔

سورۂ مومن

ذی الطول کشادگی اور غناء، فضیلت داب حال، تباب ٹوٹا، ادعونی مجھا کیلئے کی عبادت کرو، آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا، دعا ہی عبادت ہے داخرین خشوع کرنے والے النجاۃِ ایمان، لیس لہٗ دعوۃٌ بت یسجرون ان کے ذریعہ آگ سلگائی جائے گی تمرحون اکڑتے ہو۔

سورۂ حٰم سجدہ

فصلت بیان کی گئی ہے غیر ممنون شمار کیا ہوا وقدر فیھا اقواتھا ان کے رزق أتیاطوعاً اوکرھاً میرے ارادے کے موافق ہو جاؤ، قالتا اتینا طائعین ہم نے موافقت کی فی کل سماءٍ امرھا جس کے ساتھ ہم نے حکم کیا نحساتٍ بدبختیاں فھدیناھم ہم نے انکے لئے بیان کیا، تین آدمی بیت اللہ کے قریب جھگڑنے لگے ایک بولا کہ کیا تم خیال کرتے ہو، کہ اللہ ہماری باتیں سنتا ہے، دوسرا بولا اگر ہم بلند آواز سے بولیں تو سنتا ہے اور اگر آہستہ بولیں تو نہیں سنتا، تیسرا بولا اگر وہ ہماری بلند آواز سنتا ہے تو ہماری خفی آواز کو بھی سنتا ہے، اس پر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی وماکنتم تستترون ان یشھد علیکم سمعکم ولا ابصارکم ولا جلودُ کم ولکن ظننتم آخر تک والغوا فیہ اس میں عیب لگاؤ، آنحضور نے یہ آیت پڑھی ان الذین قالو ربنا اللہ ثم استقاموا پھر فرمایا یہ بات کہی تو بہت لوگوں نے پھر کافر بن گئے، تو جو شخص اسی بات پر مرجائے، تو اس نے استقامت کی ادفع بالتی ھی احسن غصب کے وقت صبر کرنا، اور برائی کے وقت معاف کرنا لا یسامون وہ تھکتے نہیں ولیٌّ حمیمٌ قریبی اعملوا ماشئتم وعید ہے مالھم من محیصٍ، حاص عنہ کے معنی میں اس سے بھاگا، اس سے بچا مریۃ، شک۔

سورۂ شوریٰ

یذرؤکم فیہ نسلاً بعد نسلٍ لا حجۃ کوئی جھگڑا نہیں ہے شرعوا انہوں نے

ایجاد کیا، الا المودة فی القربی سعید بن جبیر کہتے ہیں آل محمد کے قرابتدار، ابن عباسؓ نے فرمایا تو نے یہ بات کہنے میں جلدی کی، قریش کی کوئی شاخ ایسی نہیں جس میں حضور ﷺ کی قرابت نہ ہو، پس فرمایا میرے اور تمہارے درمیان جو قرابت ہے، اسے ملائے رکھو فبما کسبت ایدیکم نبی ﷺ نے فرمایا بندے کو جو تکلیف پہنچتی ہے، چاہے وہ چھوٹی ہو یا بڑی ہو وہ گناہ کی بنا پر پہونچی ہے، اور اللہ تعالیٰ جو معاف فرما دیتا ہے وہ بہت زیادہ ہے فیظللن رواکد علی ظهره پس نہیں حرکت کرتیں اور نہ دریا میں چلتی ہی ہیں یوبقهن انہیں ہلاک کر دیتا ہے من طرفٍ خفي ذلیل عقیماً جس عورت کے اولاد نہ ہو اوحینا الیك روحاً من امرنا قرآن۔

سورۂ زخرف

ام الکتاب اصل کتاب مضی مثل الاولین پہلوں کی سزا، مقرنین طاقت میں رکھنے والے کنٹرول کرنے والے وجعلوا له من عباده جزأ برابر کظیم غم سے بھرا ہوا او من ینشأ فی الحلیة یعنی لڑکیاں لوشاء الرحمن ماعبدنهم بتوں کو مراد لیا کرتے تھے علی امةٍ امام پر ومعارج درجے وزخرفاً سونا ومن یعش اندھا ہو جائے، وانه لذکرلك عزت وشرف اسفونا ہمیں ناراض کیا یصدون روکتے ہیں تحبرون عزت کئے جاتے ہو ملائکة فی الارض یخلفون بعض بعض کے خلیفہ ہوں گے واکوابٍ پیالے، جن کے کنارے نہ ہوں فانا مبرمون اتفاق کئے ہوئے وقیله یارب اس کی تفسیر یہ ہے کہ کیا وہ گمان کرتے ہیں کہ ہم ان کی پوشیدہ باتیں اور ان کی سرگوشیاں نہیں سنتے، اور نہ ہم ان کا کہنا سنتے ہیں۔

سورۂ دخان

رهواً ساکن، خشک یا راہ فاعتلوه اسے دفع کرو، زوجنا هم بحورٍ عینٍ ہم نے ان کا حور عین سے نکاح کیا قوم تبعٍ یمن کے بادشاہ اور ان میں سے ہر ایک کو تبع کہا جاتا ہے فارتقب پس انتظار کر، ابن مسعودؓ فرماتے ہیں، جب قریش نے حضور کی مخالفت کی، آپ نے ان کے لئے یوسف جیسے قحط کی بد دعا کی پس انہیں قحط اور مصیبت پہنچی، حتیٰ کہ انہوں نے ہڈیاں کھالیں، جب ان میں سے کوئی آسمان کی جانب دیکھتا، تو بھوک کے باعث اسے دھواں سا نظر آتا، یہ آیت

اسی بارے میں نازل ہوئی فارتقب یوم تاتی السماءُ بدخان مبین آپ سے عرض کیا گیا، یا رسول اللہ مضر کے لئے بارش کی دعا فرمایئے، آپ نے بارش کی دعاء فرمائی، جب وہ سیراب ہو گئے تو پھر اپنے حال پر لوٹ آئے، جب انہیں راحت پہنچی، تو یہ آیت نازل ہوئی یوم نبطش ،البطشة الکبری انا منتقمون بدر کے روز۔

سورۂ جاثیہ

اضلَّہ اللہ علی علمٍ اپنے گزرے ہوئے علم میں جاثیہ گھٹنے پر گرنے والی نستنسخ، ہم لکھتے ہیں۔

سورۂ احقاف

فیما ان مکّنکم جب تک ہم تمہیں جگہ نہ دیں، اثارۃٍ علم کا بقیہ ماکنت بدعاً من الرسل میں کوئی پہلا رسول نہیں ارایتم کیا تم جانتے ہو عارضاً بادل، ابن مسعودؓ فرماتے ہیں جب آپ مکہ میں تھے، تو ایک رات آپ ہمیں نہ ملے، ہم نے دل میں کہا نہ معلوم ہم سے جدائی کی حالت میں حضور کے ساتھ کیا رویہ ہوا ہو، ہم نے وہ رات بہت بری طرح گزاری حتی کہ ہم نے صبح کے وقت آپ کو حرا کی جانب سے آتے دیکھا، آپ نے فرمایا میرے پاس جنوں کا داعی آیا تھا، میں انکے پاس گیا، اور انہیں قرآن سنایا۔

سورۂ محمد

اٰسنٍ تبدیل ہونے والا، اوزار ھا اس کے گناہ عرفھا اسے بیان کیا، مولی الذین امنوا۔ ان کا دل یستبدل قوماً غیرکم آنحضرت ﷺ نے سلمانؓ کے کندھے پر ہاتھ مارا، پھر فرمایا، وہ یہ ہے اور اس کی قوم ہے عزم الامر کام کی کوشش کی اضغانھم ان کا حسد لن یترکم تمہیں کم نہ کریگا۔

سورۂ فتح

لیغفرلك اللہ ماتقدم آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا، مجھ پر ایک آیت نازل ہوئی ہے

، جو مجھے دنیا کی تمام چیزوں سے زیادہ محبوب ہے، پھر آپ نے یہ آیت تلاوت کی ،صحابہ نے عرض کیا، یارسول اللہ آپ کو مبارک ہو،لیکن ہمارے لئے کیا چیز ہے،تو یہ آیت نازل ہوئی لیدخل المؤمنین والمؤمنات جنات آخرتک دائرۃ السوء عذاب تعزروہ اس کی مدد کرو ،روایت کیا گیا ہے، کہ جبل تنعیم سے صبح کی نماز کے وقت اسی ۸۰ آدمی اترے اور وہ آپ کے قتل کا ارادہ رکھتے تھے ،موٗں نے انہیں پکڑ لیا، آنحضرت ﷺ نے سب کو آزاد فرمادیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی وھو الذی کف ایدیھم عنکم آخرتک کلمۃ التقوی نبی ﷺ نے فرمایا لا الہ الا اللہ سیماھم فی وجوھم تواضع شطأہ اس کی فراخی شطأ السنبل سے مراد ایک دانے سے دس یا آٹھ یا سات دانے اگیں ،اور ایک دوسرے کو وہ تقویت دیں ،اگر ایک ہو،تو وہ سیدھی کھڑی نہ ہو سکے فازرہ اسے تقویت دی فاستغلظ غلیظ ہو گیا علی سوقہ تنہ جو درخت کو کھڑا رکھے۔

سورۂ حجرات

لاتقدموا بین یدی اللہ ورسولہ کتاب اللہ اور سنت کے خلاف نہ کہو، روایت کیا گیا ہے، کہ اقرع بن حابس حضور کی خدمت میں آئے ،تو حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا، یارسول اللہ اسے اس کی قوم کا عامل بنا دیجئے ،حضرت عمرؓ نے عرض کیا یارسول اللہ اسے عامل نہ بنائیے ،دونوں حضورؐ کے سامنے گفتگو کرنے لگے، حتی کہ دونوں کی آوازیں بلند ہو گئیں تو یہ آیت نازل ہوئی یا ایھا الذین امنوا لا ترفعوا اصواتکم ولا تجسسوا ،تجسس یہ ہے کہ مومن کی پوشیدہ باتیں تلاش کی جائیں امتحن اللہ خالص کیا ولا تنابزوا اتم اسلام کے بعد کفر کے ساتھ مت پکارو ایک آدمی کے دو یا تین نام ہوتے اور وہ ان میں سے بعض کے ساتھ بلایا جاتا تو اسے برا سمجھتا اس پر یہ آیت اتری ،الشعوب دور کا نسب اور قبائل اس سے کم۔

سورۂ قٓ

المجید معزز مریج مختلف ،ملتبس اور کہا گیا ہے کہ باطل باسقات بلند لبس شک حبل الورید گردن کی رگ ذلك رجع بعید دور کا رد فروج پھٹن ما تنقص الارض

منهم ان کی ہڈیوں سے حب الحصید گندم قرینة وہ شیطان ہے، جو اس کے ساتھ لگا ہے تبصرۃ دیکھنا فنقبوا بھاگے اور کہا گیا ہے، کہ مارے گئے، القیَ السمع کہ اس کے دل میں بات نہ کرتا ہو، لغوب تھکاوٹ نضیدٍ کلی جو پتیوں میں چھپی ہو جو بعض بعض سے ملی ہو۔

سورۂ ذاریات

والذاریات ہوائیں جو اسے اڑا دیں یا متفرق کر دیں، فالحاملاتِ وقراً بادل ذاتِ الحبك طریقوں اور اچھے بناوٹ والا یا برابر ہونا، حسین ہونا، قتل الخواصون سرکشی کرنے والے ملعون ہیں، فی غمرةٍ ساھون گمراہی میں بڑھتے جاتے ہیں یفتنون عذاب دیئے جاتے ہیں یھجعون سوتے ہیں وفی انفسکم افلا تبصرون ایک جگہ سے کھاتے پیتے ہو، اور نکلتا دوجگہ سے ہے فراغَ إلی اھلہ پس لوٹا صرةٍ چیخ فصکت ماتھے پر ہاتھ مارا برکنہ اپنی قوت کے ساتھ کالرمیم زمین کا سوکھا ہوا اور پامال شدہ گھاس بایدٍ، قوت کے ساتھ انا لموسعون وسعت والے ہیں خلقنا زوجین دوصنف، جیسے مرد اور عورت اور رنگوں کا اختلاف، اور میٹھا اور کڑوا تو یہ باہم زوج ہیں ففروا الی اللہ اس کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس کی طرف وماخلقت الجن والانس الا لیعبدون ہر دو فریق میں سے اہل سعادت کو، مگر یہ کہ وہ خدا کو واحد سمجھیں اتواصو اموافق ہو گئے المتین سخت ذنوباً ڈول۔

سورۂ طور

الطور پہاڑ مسطور لکھا ہو، رقی منشورٍ صحیفه المسجور قید کیا گیا، اور ایک قول یہ ہے، جلایا ہوا یہاں تک جلایا جائے، کہ اس میں پانی کا ایک قطرہ بھی باقی نہ رہے تمور حرکت کرتا ہے اور گھومتا ہے یدغون دفع کئے جاتے ہیں، فاکھین گھمنڈ کرنے والے، ما التناھم ہم نے کم نہیں کیا یتنازعون لیتے دیتے ہیں تاثیم جھوٹ ریب المنون موت المسیطرون مسلط کسفاً ٹکڑے۔

سورۂ النجم

اذا ھوی جب غائب ہو جائے ذومرۃ عمدہ منظر یا اللہ کے حکم میں قوت و شدت والا قاب

قوسین دو کمانوں میں چلنے کے لحاظ سے افتمارونہ کیا تم اس سے جھگڑتے ہو، ابن عباسؓ نے فرمایا، محمد نے اپنے رب کو دیکھا، اوران پر کسی نے اس آیت سے اعتراض کیا لا تدرکہ الابصار انہوں نے فرمایا، تجھ پر افسوس یہ اس وقت ہے جب وہ اپنے اصلی نور کے ساتھ تجلی فرمائے، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں، وہ جبرئیلؑ تھے، انہیں حضور نے اصلی صورت میں دوبار دیکھا ایک مرتبہ سدرہ کے قریب اور ایک بار اجیاد کے قریب جن کے چھ بازو تھے ما زاغ البصر حضور کی نگاہ وماطغی جو کچھ دیکھا اس سے تجاوز نہیں کیا قسمۃ ضیزی ظالمانہ یا ٹیڑھی اکدیٰ اپنے احسان کو جتا کر، اپنی عطا کو ختم کیا الذی وفی جو کچھ اس پر فرض کیا اغنی واقنی دیا اور راضی کیا رب الشعری جو راز کا مرکز ازفت الازفۃ قیامت قریب ہوئی، قیامت کے روز آسمان کی چیخ سامدون کھیلنے والے۔

سورۂ قمر

آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں چاند کے دو ٹکڑے ہوئے، ایک ٹکڑا پہاڑ پر تھا، اور ایک اس کے اوپر نبی ﷺ نے فرمایا، گواہ ہو جاؤ مستمرٌ ہمیشہ عذابٌ مستقرٌ حق، مزدجرٌ روکنے والا وازدُجر زجرت سے مشتق ہے ودسرٌ دسار کی جمع ہے، کشتی کا چپو، کشتی کے کنارے اشرٌ اکڑنے والا الاشرٌ محتضرٌ پانی پر حاضر ہوتے ہیں فتعاطیٰ اپنے ہاتھوں سے اسے دیا، پھر کوچیں کاٹیں المحتظر بکری کے لئے جو باڑہ متعین کیا جاتا ہے، اور ھشیم جلنے والا یسرنا القرآن اس کی قرأت کو آسان کیا افتمارو انہوں نے جھٹلایا سیھزم الجمع ویولون الدبر آنحضرت ﷺ نے بدر کے روز اس کی تلاوت فرمائی، یعنی اس وعدے کا مصداق یہ ہے مشرکین قریش آنحضرت ﷺ کے پاس آئے اور تقدیر کے معاملے میں جھگڑنے لگے، تو یہ آیت نازل فرمائی یوم یسحبون فی النار علیٰ وجوھھم ذوقوامس سقر انا کل شیٍٔ خلقناہ بقدرٍ۔

سورۂ الرحمٰن

النجم جو درخت زمین پر پھیلے، بیل الشجر جو تنہ پر کھڑا ہو، الوزن ترازو کا کانٹا الانام

مخلوق، العصف بھونسہ یا ترکاری، گیہوں کا پتہ الریحانُ کھیتی کی سبزی، کھیتی کا پتہ، وہ دانہ جو کھایا جائے فبای الآءِ ربکما، اللہ کی کون سی نعمتوں کا صلصالِ جو مٹی ریت میں ملی ہو، کالفخار جیسے ٹھیکرا بجتا ہے مارجٍ زرد شعلہ، خالص آگ مرج چلایا برزخٌ پردہ لا یبغیان نہیں ملتے المنشاتِ کشتی کے کھلے ہوئے بادبان ذوالجلالِ عزت و بڑائی والا، سنفرغ لکم یہ اللہ کی جانب سے بندوں کے لئے وعید ہے، اور اللہ کے ساتھ کوئی شغل نہیں ہے، یعنی تمہارا حساب کریگا لا تنفذون میری حکومت سے نہیں نکل سکتے شواظٌ آگ کا شعلہ اور ایک قول یہ ہے، کہ وہ شعلہ جس میں دھواں نہ ہو، نحاسٌ آگ کا دھواں اور کہا گیا ہے، وہ دھواں جس میں آگ نہ ہو اور ایک قول یہ ہے کہ تانبا جوان کے سروں پر انہیں عذاب دینے کے لئے ڈالا جائے گا ولمن خاف مقام ربہٖ جنتانِ معصیت کا ارادہ کرتا ہے، پھر اللہ کو یاد کرتا ہے، اور اسے چھوڑ دیتا ہے، افنانِ شاخیں وجنی الجنتین دانٍ جو قریب ہی پھل والا ہو، قاصرات الطرف اپنے خاوندوں کے علاوہ جو کسی کو نہ دیکھیں لم یطمثھن ان سے قریب نہ ہوگا مدھامتان تروتازگی سے سیاہ نضاختان ابلنے والے مقصوراتٌ، حوریں، جن کی نگاہیں اور نفس صرف اپنے خاوندوں کے لئے مقید ہوں رفرفٍ خضرٍ مجالس۔

سورۂ واقعہ

خافضۃٌ ایک قوم کو جہنم کی طرف جھکانے والی رافعۃٌ اور دوسری کو جنت کی جانب اٹھانے والی رجت ہلائی جانے کی، بست ٹکڑے ٹکڑے کئے گئے ثلۃٌ جماعت موضونۃٌ لگائے ہوئے واکوابٍ کوب وہ برتن ہے، جس میں کنڈا نہ ہوں اور نہ ٹونٹی اباریق کنڈے اور ٹونٹی والے، ولا ینزفون نہ قے کریں گے اور نہ نشہ ہوگا لغواً باطل تاثیماً جھوٹ فی سدرٍ محضودٍ جس میں کانٹے نہ ہوں، جو بوجھ سے لدے ہوئے ہوں، وطلحٍ منضودٍ کیلئے وماءٍ مسکوبٍ جاری مترفین فائدہ اٹھانے والے، نعمت حاصل کرنے والے، یحمومٍ سیاہ دھواں انا انشاناھن انشاءً حضور نے فرمایا منشآت سے وہ عورتیں مراد ہیں، جو دنیا میں بوڑھی اور چوندھی ہوں گی یصرون ہمیشہ رہتے ہیں الحنث العظیم شرک الھیم پیاسا اونٹ ماتمنون جو تم عورتوں

کے رحم میں نطفہ ڈالتے ہو انا لمغرمون تاوان ڈالے گئے تؤرون جلاتے ہو، اور یت میں نے جلایا للمقوین سفر کرنے والے بمواقع النجوم قرآن کے حکم سے مدھنون جھٹلانے والے وتجعلون رزقکم اس کا شکرانکم تکذبون، نبی علیہ السلام نے فرمایا تم کہتے ہو، کہ فلاں فلاں ستارے کے اثر سے بارش برسائے گئے غیر مدینین حساب کرنے والے فروح راحت وجنت نعیم، آرام فسلام لک یعنی تیرے بھائی اصحاب الیمین تجھے سلام کہتے ہیں۔

سورۂ حدید

نحن أنشاھا ہم اسے پیدا کرتے ہیں مستخلفین عمر والے فیہ باس شدید اور ہتھیار مولاکم تمہارے لائق ہے۔

سورۂ مجادلہ

حضرت عائشہ فرماتی ہیں، بابرکت ہے وہ ذات جس کا سننا ہر شئے کو عام ہے، میں خولہ بنت ثعلبہ کی بات سنتی تھی اور مجھ سے کچھ باتیں پوشیدہ رہیں، اور وہ اپنے خاوند کی حضور سے شکایت کر رہی تھی، اور کہہ رہی تھی کہ یارسول اللہ اس نے میری جوانی کو کھالیا، اور اس کے لئے میرا پیٹ پھیلا رہا ہے، جب میری عمر زیادہ ہوگئی، اور اولاد ہونی بند ہوگئی، اس نے مجھ سے ظہار کرلیا، اے اللہ میں تجھ ہی سے شکایت کرتی ہوں، حضرت عائشہ فرماتی ہیں، کہ ابھی کچھ دیر نہ گزری تھی کہ حضرت جبریل یہ آیت لے کر نازل ہوئے قد سمع اللہ قول التی الخ یحادون اللہ اس کی مخالفت کرتے ہیں، کبتوا رسوا کئے گئے، حضرت علی فرماتے ہیں، جب یہ آیت نازل ہوئی یا ایھا الذین اٰمنوا اذا ناجیتم الرسول تو حضور نے فرمایا، کیا ایک دینار مناسب ہے، میں نے عرض کیا، وہ اس کی طاقت نہیں رکھتے، آپ نے فرمایا، آدھا دینار، میں نے کہا اس کی بھی طاقت نہیں رکھیں گے آپ نے فرمایا پھر کتنا میں نے کہا ایک جو سونے کی، فرمایا، تو بہت زاہد ہے، تو یہ آیت اتری ااشفقتم، حضور نے فرمایا اللہ نے میرے ذریعے سے اس امت سے تخفیف فرمائی استحوذ غالب ہوا۔

سورۂ حشر

الجلاء ایک زمین سے دوسری زمین کی طرف نکالنا حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں، یہ آیت بنونضیر کے بارے میں نازل ہوئی، مسلمانوں کو درختوں کے کاٹنے کا حکم دیا گیا تو ان کے دلوں میں کھٹکا پیدا ہوا، انہوں نے باہم کہا، کہ ہم نے بعض درخت کاٹے، اور بعض چھوڑ دیئے، تو آؤ ہم نبی ﷺ سے سوال کریں، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی ما قطعتم من لینةٍ آخر آیت تک، حضرت عائشہ فرماتی ہیں، وہ ایسے قبیلے تھے، کہ کبھی جلاوطن نہ ہوئے تھے لینۃ کھجور کا درخت، عجوہ اور برنیہ کے علاوہ حاجۃ حسد خصاصۃ فاقہ، روایت کیا گیا ہے، کہ انصار کے ایک شخص کے پاس ایک مہمان نے رات گزاری، اور اس انصاری کے پاس بجز اپنے کھانے اور بچوں کے کھانے کے کچھ نہ تھا اس نے اپنی بیوی سے کہا بچوں کو سلادو، چراغ بجھادو، اور جو کچھ تیرے پاس موجود ہے، وہ مہمان کے سامنے رکھ دے تو یہ آیت نازل ہوئی ویوثرون علی انفسھم ولوکان بھم خصاصۃ. المفلحون ہمیشگی کے ساتھ فائز ہونے والے فلاح کے معنی بقا کے ہیں المھیمن شاہد العزیز جو چاہے اس پر قادر الحکیم جو ارادہ کرے اس کا حکم دینے والا۔

سورۂ ممتحنہ

حاطب بن ابی بلتعہؓ نے حضور کی بعض خبروں کی اطلاع کے لئے مشرکین کو ایک خط لکھا، جس پر یہ سورت نازل ہوئی، لا تجعلنا فتنۃ للذین کفروا ہم پر انہیں مسلط نہ کر، کہ وہ ہمیں فتنہ میں مبتلا کردیں، اسماء بنت ابی بکرؓ کی ماں اسماء کے پاس کچھ ہدایا لے کر آئی، لیکن اسماء نے ہدایا لینے سے بھی انکار کیا اور اسے گھر میں بھی داخل نہ ہونے دیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ لا ینھکم اللہ عن الذین لم یقاتلوکم الخ لا یاتین ببھتانٍ یفترینہٗ اپنے ازواج کے ساتھ انکے غیر کی اولاد کو نہ ملاؤ۔

سورۂ صف

عبداللہ بن سلامؓ فرماتے ہیں، ہم صحابہ کی ایک جماعت بیٹھے باہم مذاکرہ کررہے تھے، ہم

نے کہا، اگر ہمیں یہ معلوم ہوتا، کہ اللہ کون سا عمل زیادہ محبوب ہے، تو ہم اس پر عمل کرتے، اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی سبح للہ ما فی السموٰتِ وما فی الارض الخ مرصوصٍ بعض بعض سے ملا ہوا من انصاری الی اللہ کون میری اتباع کرے گا۔

سورۂ جمعہ

واٰخرین منھم لما یلحقوا بھم آپ سے دریافت کیا گیا، یا رسول اللہ وہ کون لوگ ہیں تو آنحضرت ﷺ نے اپنا ہاتھ حضرت سلمانؓ کے کندھے پر رکھ کر فرمایا، اگر ایمان ثریا کے قریب ہو، تو اس قوم کے کچھ آدمی اسے ثریا سے اتار لائیں گے، جمعہ کے روز ایک قافلہ غلہ لے کر آیا، اور صحابہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے، لوگ حضور کو چھوڑ کر قافلے کی جانب چلے گئے، صرف بارہ شخص باقی رہ گئے، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی واذا رأو ا تجارۃ او لھوًا آخر تک۔

سورۂ منافقین

عبداللہ بن ابی کے رد میں نازل ہوئی، جو اس نے حضور کے بارے میں گستاخی کی تھی اور زید بن ارقمؓ کی تصدیق کے لئے قاتلھم اللہ اللہ ان پر لعنت کرے جس جگہ بھی لفظ قتل قرآن میں اللہ کی جانب مضاف ہے اس سے مراد لعنت ہے خشب مسندۃ کھجور کے کھڑے درخت لوّوا رؤسھم سروں کو حضور کا مذاق اڑانے کے لئے حرکت دیتے ہیں، ینفضوا متفرق ہو جائیں۔

سورۂ تغابن

یو م التغابن اہل جنت اہل نار کا غبن کریں گے و من یؤمن باللہ یھد قلبہٗ یہ وہ ہے، کہ جب کوئی مصیبت پہنچے، تو راضی ہو اور جان لے کر یہ اللہ کی جانب سے ہے ان من ازواجکم واولادکم عدوّ لکم ابن عباسؓ فرماتے ہیں، کہ یہ وہ لوگ ہیں، جو مکہ میں اسلام لائے انہوں نے حضور کی خدمت میں آنے کا ارادہ کیا، لیکن ان کی بیویوں اور ان کی اولاد نے انکار کر دیا۔

سورۂ طلاق

انفقوا صدقہ کرو ومن یتق اللہ یجعل لہٗ مخرجاً دنیا و آخرت کی ہر مصیبت سے

اسے نجات دے گا ان ارتبتم اگر تم اسے نہیں جانتے وبال امرھا اس کا بدلہ و اولات الاحمال اس کا مفرد ذات حمل ہے، نبی ﷺ نے بیان فرمایا، اگر حاملہ کو خاوند کی وفات کے فوراً بعد وضع حمل ہو جائے، تو اس کی عدت پوری ہو جائے گی، تو اولات الاحمال کا حکم اس عورت کے لئے مخصوص ہے، جس کے خاوند کا انتقال ہو گیا ہو، عتت عن امر ربھا اس کا انکار کیا۔

سورۂ تحریم

آنحضرت ﷺ حضرت زینب کے پاس شہد پیتے اور کچھ دیر ٹھہرتے، تو آپ کی ازواج نے باہم موافقت کی اور آپ سے کہا، کہ آپ سے مغافیر کی بو آتی ہے، تو یہ سورت نازل ہوئی، اور جن دو عورتوں نے حضور کے خلاف اتفاق کیا تھا، وہ حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ ہیں، ایک روایت یہ ہے، کہ آنحضرت ﷺ کی ایک باندی تھی، جس سے آپ صحبت فرماتے، حفصہ آپ کو اس سے روکتی رہیں حتی کہ آپ نے اسے اپنے اوپر حرام فرمالیا، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی یا ایھا النبی لم تحرم۔ صغت قلوبکما مائل ہوئے ظھیر مددگار قوا انفسکم اھلیکم ناراً، اپنے اہل کو اللہ کے تقوی کی وصیت کرو، اور انہیں ادب سکھاؤ۔

سورۂ ملک

فسحقاً ہلاکت من فطور پھٹن حسیر، کمزور فی غرور باطل میں تفاوت، اختلاف تمیز ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے مناکبھا اسکے کنارے سے تفور، جوش مارتا ہے۔

سورۂ ن

لو تدھن فیدھنون اگر تو انہیں ڈھیل دے، تو وہ بھی ڈھیلے ہو جائیں گے عتل متکبر زنیم حرام زادہ، بہت ظالم کا الصریم جیسے صبح رات سے جدا ہوتی ہے اور رات دن سے، صریم کے معنی ہیں، جانے والا یتخافتون مناجات کرتے ہیں علی حرد فقیروں کو انکار کر دینا، قال اوسطھم ان میں سب سے منصف یوم یکشف عن ساق سخت کام سے کنایہ ہے جو قیامت

کی ہول سے گھبرانے والا ہوگا، ابن مسعودؓ فرماتے ہیں، یہ بے چینی کا دن ہوگا، نبی ﷺ نے فرمایا ، ہمارا رب اپنی پنڈلی کھولے گا، تو ہر مومن اور ہر مومنہ اسے سجدہ کریں گے، اور جو شخص دنیا میں ریا کاری کے لئے سجدہ کرتا تھا، وہ باقی رہ جائے گا وہ سجدہ کرنا چاہے گا، تو اس کی کمر ایک طبق کی طرح ہوجائے گی وھو مکظوم مغموم وھو مذموم ملامت کیا ہوا لیزلقونك تجھے کم کریں گے۔

سورۂ حاقہ

صرصر شدید عاتیۃ سرکشی کرنے والی حسوما پے درپے خاویۃ جس کا اوپر کا حصہ نیچے کے حصہ پر گر گیا ہو طغی الماء بہت زیادہ ہوا واعیۃ حفاظت کرنے والی انی ظننت میں نے یقین کیا دانیۃ قریب کانت القاضیۃ پہلی ہی موت جو مجھے آچکی اس کے بعد میں زندہ نہ ہوتا غسلین دوزخیوں کی پیپ الوتین قلب کی رگیں۔

سورۂ معارج

سأل سائل وہ نضر بن حارث ہے جس نے کہا تھا اللھم ان کان ھذا ھو الحق آخر تک المعارج بلندی اور فضیلت، کالمھل یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی طرح ہے یغاثوا بماء کالمھل نبی ﷺ نے فرمایا، تیل کی تلچھٹ کی طرح، جب وہ اسے اپنے منہ کے قریب لے جائیگا تو اس کے چہرے کی کھال گل کر گر جائے گی فصیلتہ اس کے دودھیال میں سے وہ قریبی شخص جس کی جانب وہ منسوب ہو نزاعۃ للشوی ہاتھ، پیر اور دیگر اعضاء اور سر کی کھال جسے شواۃ کہا جاتا ہے عزین حلقہ، جماعتیں اس کا واحد عزۃ ہے۔

سورۂ نوح

مدرارا بعض بعض کے پیچھے لا ترجون لله وقارا تم اللہ سے اس کے عظیم ہونے کے سبب ڈرتے نہیں سبیلا جماعتیں فجاجا مختلف والکبار کبار سے زیادہ بڑا ردا ولا سواعا آخر آیت تک، ابن عباسؓ فرماتے ہیں یہ قوم نوح کے نیک آدمی تھے، جب وہ مر گئے، تو شیطان نے ان کی قوم کے دلوں میں ڈالا، کہ جہاں وہ بیٹھا کرتے تھے، وہاں ان کے مجسمے رکھو، اور ان

مجسموں کے وہی نام رکھو، انہوں نے یادگار کے طور پر ایسا ہی کیا، ان لوگوں نے تو انکی عبادت نہ کی لیکن انکے مرنے کے بعد انکی اولاد نے انکی عبادت شروع کردی۔

سورۂ جن

آنحضرت ﷺ صحابہ کی ایک جماعت کے ساتھ سوق عکاظ کی جانب تشریف لے چلے، اور شیاطین اور آسمان کی خبروں کے درمیان روک پیدا کردی گئی تھی، اور ان پر شعلے پھینکے جانے لگے، شیاطین نے باہم فیصلہ کیا، کہ مشرق و مغرب میں پھر کر معلوم کرو، کہ کونسا ایسا امر پیش آیا ہے، جس کے باعث ہم آسمان کی خبریں نہیں سن سکتے، ان میں سے کچھ شیاطین سرزمین مکہ کی جانب چلے، اس وقت نبی ﷺ ایک نخلستان میں صحابہ کو صبح کی نماز پڑھا رہے تھے، جب انہوں نے قرآن سنا تو بولے کہ یہی باعث ہے، جو ہم پر آسمان کی خبروں کو روک دیا گیا ہے، تو اسی وقت وہ اپنی قوم کے پاس لوٹ کر گئے اور بولے یا قومنا انا سمعنا کی آیات تک جد ربنا خدا کا فعل وامر اور اس کی عظمت و قدرت فلا یخاف بخسا اس کی اچھائیوں میں کوئی نقص و لا رھقا اس کی برائیوں میں کوئی زیادتی طوائق قددا ہر طریقے سے لبدا دوست۔

سورۂ مزمل

جب یا ایھا المزمل نازل ہوئی، تو صحابہ کرام اتنا قیام کرتے کہ پاؤں ورم کر آتے، تو اللہ نے یہ آیت اتاری فاقرؤا ما تیسر منه، وتبتل خالص کر انکالا قید یں کثیبا مھیلا بہنے والی ریت اخذا و بیلا سخت جس کے لئے کوئی ٹھکانہ نہ ہو منفطر بہ بھاری، قیامت کے خوف سے پھٹنے والے۔

سورۂ مدثر

الرجز بت یوم عسیرٌ سخت صعودا آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا، صعود دوزخ میں ایک پہاڑ ہے، جس پر کافر ستر سال تک چڑھتے رہیں گے پھر اس سے گرائے جائیں گے، اور یہ ہمیشہ ہوتا رہے گا لواحۃٌ جلانے والی اتانا الیقین موت، مستنفرۃٌ نفرت کرنے والی

گھبرانے والی قسورۃ شیر یا لوگوں کی ڈانٹ ڈپٹ اور انکی آوازیں۔

سورۃ قیامہ

لیفجر امامہ کہتا ہے میں عنقریب توبہ کروں گا، لا وزر کوئی پناہ کی جگہ نہیں، آنحضرت ﷺ پر جب وحی نازل ہوتی تو اپنی زبان کو حرکت دیتے، تو یہ آیت نازل ہوئی لا تحرك به لسانك، فاذا قرانه فاتبع قرانه اس پر عمل کر باسرۃ بگڑے ہوئے والتفتِ الساق بالساق دنیا کا سب سے آخر دن اور آخرت کا اول دن شدت سے مل جائیں گے یتمطی اکڑتا ہے اولیٰ لك فاولیٰ تجھے ڈرایا جاتا ہے سدیً مہمل۔

سورۃ دھر

امشاج مختلف رنگوں کے نطفے، اور کہا گیا ہے، کہ مرد اور عورت کے نطفہ کا رحم میں مل جانا، مستطیراً عام تنگ، جس کی مصیبت لمبی ہو، عبوساً قمطریراً جو شخص درد کے باعث اپنا چہرہ سکیڑ لیتا ہو، اور ایک قول یہ ہے، کہ لمبا، اور ایک قول ہے سخت سلسبیلاً تیز جاری شددنا اسرھم ان کے جوڑوں کے تعلق کو ہم نے اعصاب کے ساتھ مضبوط کیا۔

سورۃ مرسلات

کفاتاً اس کے پلے ملے ہونگے رواسی شامخات اونچے پہاڑ فراتاً میٹھا جمالت صفرٌ کشتیوں کی رسیاں اتنی جمع ہو جائیں، جیسے درمیانے قد کے آدمی۔

سورۃ نباء

سراجاً وھاجاً روشن المعصرات بادل جو ایک دوسرے کو نچوڑتا ہو جس سے پانی دونوں بادلوں کے درمیان سے نکلے ثجاجاً بہنے والا الفافاً مجتمع غساقاً آنکھ کا پانی، زخم کا پانی بہنا، جزاءً وفاقاً ان کے اعمال کے موافق لا یرجون حساباً اس سے خوف نہ کریں گے مفازاً جائے پناہ وکواعب حسین، اترابا ہم سن تینتیس سال کی وکاساً دھاقاً بھرا ہوا عطاءً حساباً پورا بدلہ لا یملکون منه خطاباً اس کی اجازت کے بغیر اس سے بات نہ کریں گے

الروح خلقت کے لحاظ سے بڑے فرشتوں میں سے ایک فرشتہ وقال صواباً حق اور کہا گیا ہے، لا الٰہ الا اللہ۔

سورۂ نازعات

الرادفۃ دوسرا نفخۃ واجفۃ ڈرنے والی فی الحافرۃ ہمارے پہلے کام کی طرف یعنی زندگی نخرۃ بوسیدہ، بالساھرۃ زمین کا اوپر کا حصہ متاعاً لکم نفع سمکھا اس کی بناء واغطش تاریک کیا مرسھا اس کی انتہاء۔

سورۂ عبس

عبس وتولی ابن ام مکتوم نابینا کے بارے میں نازل ہوئی، کہ وہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آئے اور عرض کرنے لگے، کہ یا رسول اللہ مجھے ہدایت کیجئے، اور آنحضرتؐ کے پاس اس وقت ایک رئیس مکہ بیٹھا تھا، آپ ابن مکتوم سے منہ پھیر رہے تھے اور دوسرے کی طرف متوجہ ہو رہے تھے، تصدی تو نے اس سے تغافل برتا تلھی تو بے پرواہ ہوا سفرۃ کتبہ لما یقض انسان نے اس شئے کو پورا نہ کیا، جس کا اسے حکم دیا گیا ہے وقضباً تازہ کھجوریں ڈالیں حدائق باغ وفاکھۃ تازہ پھل واباً جسے چوپائے کھاتے ہیں مسفرۃ چمکدار ترھقھا قترہ اسے تختی نے ڈھانٹ لیا ہے۔

سورۂ کوّرت

کوّرت سیاہ کر دیا گیا انکدرت بے نور ہو جائینگے اور ٹوٹ جائیں گے سجرت اس کا پانی جاتا رہا، بعض کے نزدیک مسجور کے معنی بھرے ہوئے کے ہیں واذا النفوس زوجت اپنے ہم جیسوں سے ملا دیا گیا، وہ اہل جنت ہوں یا اہل دوزخ الخنس الجوار الکنس لوٹتے ہیں پھر داخل ہو جاتے ہیں جیسے ہرن داخل ہوتا ہے عسعس پشت پھیری والصبح اذا تنفس دن بلند ہو گیا بضنین بخیل یا متہم۔

سورۂ انفطرت

فجرت بعض بعض میں کھول دیا گیا، بہ گیا، بعثرت پھاڑ دی گئیں فعدلك تجھے خلوت میں معتدل بنایا۔

سورۂ مطففین

مطفف وہ ہے، جو پورا ناپ کر یا تول کر نہ دے، یوم یقوم الناس آنحضرت ﷺ نے فرمایا اپنے پسینہ میں ہر ایک ان میں سے آدھے کانوں تک کھڑا ہوگا بـــــل ران گناہ جم گئے علیین جنت الارائك تخت رحیقٍ شراب ختامہٗ اس کی مٹی من تسنیم اہل جنت کی شراب کے اوپر ہوگا ثوب بدلہ دیا گیا۔

سورۂ انشقت

اذنت سنا اور اطاعت کی القت اس میں جو مردے تھے وہ اس نے نکال پھینکے وتخلت اس سے حساباً یسیراً نبی ﷺ نے فرمایا یہ بغیر مناقشہ کے پیش ہونا ہے لن یحورَ نہیں لوٹے گا، نہیں اٹھے گا وما وسق چوپاؤں کو جمع کیا والقمرِ اذاتسق اتساق کے معنی مجتمع ہونا ہیں لترکبن طبقاً عن طبقٍ ایک حالت کے بعد دوسری حالت اجرٌ غیرُ ممنون بغیر کم کیے۔

سورۂ بروج

اصحاب الاخدود زمین میں گڑھا، ایک لڑکا جسے لوگوں نے جادو سیکھنے کا حکم دیا تھا، ایک راہب کے ہاتھ پر اسلام لے آیا، جب لوگوں کو اس کی خبر ہوئی، تو اسے پکڑ لیا، لیکن اس سے کرامت ظاہر ہوئی اور بہت سے آدمی اس کے ہاتھ پر ایمان لے آئے لوگوں نے اسے قتل کر دیا، اور جو لوگ اس کے ہاتھ پر ایمان لائے، انہیں پکڑ کر گڑھوں میں ڈال کر آگ لگادی فتـــنـــوا عذاب یا الودود دوست۔

سورۂ طارق

التـرائـب عورت کے گلے کی وہ جگہ جہاں ہار رہتا ہے، ذات الـرجع بادل، کہ بارش کیساتھ لوٹتا ہے، والارض ذات الصدع گھانس سے چھٹتی ہے لـقـولٌ فصلٌ، حـق وماھو بالھزل باطل۔

سورۂ اعلیٰ

غثاءً کوڑا احوىٰ متغیر من تزکی شرک سے وذکر اسم ربہ اللہ کی وحدانیت کا اقرار کیا، فصلیّ پانچوں نمازیں۔

سورۂ غاشیہ

غاشیہ، طامہ، صاخہ، حاقہ اور قارعہ قیامت کے نام ہیں عـامـلـةٌ نـاصـبـةٌ وہ نصاریٰ ہیں عین اٰنیةٍ جو اپنے کناروں تک بھرا ہوا، اور اسکا پینا قریب ہو ضـریـعٍ ایک گھانس ہے اور کہا گیا ہے کہ آگ کے درخت لا تسمـع فیھا لا غیةً گالی ونـمارقُ بستر بـمـصـیـطـرٍ جبار مسلط، داروغہ۔

سورۂ فجر

آنحضرت ﷺ شفع اور وتر کے معنی دریافت کئے گئے، فرمایا وہ نمازیں ہیں، ان میں سے بعض وتر ہیں یا وتر سے مراد اللہ ہے ارم ذاتِ العماد بلند محل والا جـابـو الصخر پہاڑوں میں پتھر کاٹ کاٹ کر مکان بنائے سـوط عـذابَ یہ ایک کلمہ ہے جس سے عرب ہر قسم کا عذاب مراد لیتے ہیں لبـالـمـرصـاد سنتا اور دیکھتا ہے، اسی کی جانب لوٹنا ہے ولا تـحـاضـون علیٰ طعامِ المسکین اس کے کھلانے کا حکم نہیں دیتے اکلا لمّا جامع حبًا جما شدید و کثیر انی له اس کے لئے کیونکہ ہوگا المطمئنة مومنہ۔

سورۂ بلد

فـی کبدٍ اعتدال اور استقامت میں مـا لالُبدا کثیر الـنـجدین خیر و شر، ہدایت و گمراہی

فلا اقتحم العقبة دنیا میں گھاٹی کو طے نہیں کیا، پھر اپنے قول کے ساتھ عقبہ کی تفسیر فرمائی وما ادرٰك۔ ذا مسغبۃٍ بھوک، ذا متربۃٍ مٹی میں لوٹنے والا، حاجت اور کوشش والا مؤصدۃ تہ بہ تہ۔

سورۂ شمس

وضحاھا اس کی روشنی طحٰھا اسے تقسیم کیا فالھمھا فجورھا وتقوٰھا اس کے لئے خیر و شر کو بیان کیا بطغوٰھا اس کی نافرمانیوں کے ساتھ اذ انبعث اشقاھا ایک ظالم جس کا نام قدار تھا، اور وہ اپنی جماعت میں صاحب شوکت تھا ولا یخاف عقباھا اپنے انجام کا خوف نہیں کرتا۔

سورۂ لیل

اذا تردّٰی جب مرجائے گا اور دوزخ میں گرے گا، بالحسنٰی حلف کے ساتھ تلظّٰی بھڑکتا ہے۔

سورۂ ضحٰی

سجٰی سیاہ ہوا، ساکن ہوا، گیا ماودّعك ربك وما قلٰی تجھے نہیں چھوڑا، اور نہ مجھ سے بغض کیا ہے، جب ایک بار جبریلؑ کو آنے میں دیر ہوئی، تو مشرکین بولے، کہ اب تو محمد ﷺ کو اس کے رب نے چھوڑ دیا ہے، تو یہ آیت نازل ہوئی، عائلاً عیال والا۔

سورۂ الم نشرح

انقض بھاری کردیا فانصب، دعا میں۔

سورۂ تین

فی احسن تقویم، عمدہ خلقت میں۔

سورۂ قلم

الرجعٰی لوٹنے کی جگہ لنسفعاً ہم ضرور پکڑیں گے ناديۃ اس کے خاندان کو، ابوجہل

نے کہا، کہ اگر میں محمد کو نماز پڑھتے دیکھوں گا، تو اس کی گردن پر پیر رکھ دونگا، حضور نے فرمایا، کہ اگر وہ ایسا کرنے کی کوشش کرتا، تو اسے فرشتے ظاہر ہو کر پکڑ لیتے، ایک روایت میں ہے کہ ابوجہل نے آپ سے کہا، کہ تو جانتا ہے، کہ مجھ سے زیادہ کوئی مجلس والا نہیں، تو اللہ نے یہ آیت اتاری فلیدع نادیہ سندع الزبانیۃ یعنی فرشتے۔

سورۂ قدر

انا انزلناہ فی لیل القدر ،قدر کی ایک رات ایک ہزار مہینے کی رات سے بہتر ہے۔

سورۂ لم یکن

منفکین ،زائل ہونے والے۔

سورۂ زلزلت

تحدث اخبارھا حضور نے فرمایا، اسکی خبر یہ کہ، ہر بندے اور بندی پر اس بات کی شہادت دے، کہ اس نے زمین پر کیا کیا عمل کئے ہیں۔

سورۂ عادیات

فاثرن بہ نقعا اس کے ساتھ غبار اڑاتے ہیں لکنوذ بہت ناشکر، الحب الخیر لشدیذ بخیل، حصل جدا کیا گیا۔

سورۂ قارعہ

کالفراش المبثوث ٹڈی دل کی طرح، کہ بعض بعض پر سوار ہوں، اسی طرح بعض انسان بعض میں گھسے ہوں گے کالعھن اون کے رنگوں کی طرح، اور عبداللہ بن مسعودؓ کی قرأت میں کالصوف ہے۔

سورۂ تکاثر

الھاکم التکاثر ،مال واولاد کی کثرت،

سورۂ عصر

العصر زمانہ، خسر، گمراہی۔

سورۂ ہمزہ

الحطمۃ جہنم کا نام ہے، سقر اور لظی کی طرح

سورۂ فیل

الم تر کیا تو نہیں جانتا طیرا ابابیل پے درپے آنے جانے والے، اپنی چونچ اور پیروں میں پتھر لاتے تھے، تو وہ ان کے سروں پر مارتے تھے، من سجیل یہ لفظ معرب ہے، سنگ گل ہے۔

سورۂ قریش

لایلاف قریش قریش پر میری نعمت کے لئے ایلا فھم انکا لازم ہوتا، وہ سفر کو محبوب رکھتے، سردی اور گرمی میں ان پر کوئی بار نہ گزرتا و امنھم من خوف ان کے دشمن سے۔

سورۂ ماعون

یدع الیتیم اس کے حق سے روکتا ہے ساھون غفلت کرنے والے الماعون، ہر اچھی چیز اور بعض نے کہا ہے، پانی اور کہا گیا ہے، اس کا اعلیٰ حصہ زکوۃ ہے اور ادنی حصہ عاریۃ سامان لینا ہے۔

سورۂ کوثر

آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا، کہ وہ جنت میں ایک نہر ہے شانئك تیرا دشمن۔

سورۂ کافرون

لکم دینکم ولی دین تمہارا دین تمہارے لئے اور میرا دین میرے لئے، یہ قرآن کی وسعت نظری ہے۔ لا اکراہ فی الدین اس کی مزید وضاحت ہے۔

سورۂ نصر

ابن عباسؓ فرماتے ہیں، یہ حضور کی وفات کی طرف اشارہ ہے، کہ اللہ نے خاص کر آپ کو اس کا علم دیا، پھر اس کی تصدیق کی۔

سورۂ تبت

آنحضرت ﷺ صفا پر چڑھے اور آواز دی، یا صباح تمام قریش آپ کے گرد جمع ہو گئے، آپ نے فرمایا، میں تمہیں ایک سخت عذاب سے ڈراتا ہوں، جس پر ابولہب نے کہا تیرے ہاتھ ٹوٹیں، تو نے ہمیں اسی لئے جمع کیا تھا، اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی تبت یدا ابی لھب مسدٍ مونجھ، دوزخ کی زنجیر۔

سورۂ اخلاص

ایک بار مشرکین نے کہا، ہم سے اپنے رب کا نسب بیان کر، تو اللہ نے قل ھو اللہ احدٌ اتاری الصمد جس کا نفع کامل ہو۔

سورۂ فلق

الفلق صبح، جب رات کی سیاہی سے جدا ہو جائے، پیدا کرنا غاسقٍ زیادہ اندھیری رات اذا وقب، جب کہ سورج غروب ہونے کے باعث رات کی سیاہی ہر چیز میں داخل ہو جائے حضور نے چاند کی جانب نظر اٹھائی، اور فرمایا، اے عائشہ اللہ سے اس کے شر سے پناہ مانگ، کیونکہ یہی وہ غاسق ہے، جو تاریک ہو جاتا ہے۔

سورۂ ناس

الوسواس الخناس، جب بچہ پیدا ہوتا ہے، تو اس کے پاس شیطان آتا ہے، اگر اس وقت اللہ کا ذکر کیا جائے تو بھاگ جاتا ہے، اور اگر اللہ کا ذکر نہ کیا جائے تو دل میں جگہ بنالیتا ہے۔

اور یہ آخری چیز ہے، جو ہم نے رسالہ فتح الخبیر میں ذکر کی ہے، والحمد للہ اولا و آخراً وباطناً وظاھراً وصلی اللہ تعالیٰ علی سیدنا محمد واٰلہ وصحبہ اجمعین۔

فیوض الحرمین

تصنیف

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ

ترجمہ

مولانا عابد الرحمٰن صدیقی

ترتیب

مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی

فہرست مضامین

صفحہ	مضمون	نمبر شمار
۴۰۶	(۱) مشہد (یعنی ارباب فکر اور اصحاب ذکر	۱
۴۰۷	(۲) مشہد یعنی تدلی کی حقیقت	۲
۴۰۸	معرفة عظیمة	۳
۴۰۸	تحقیق شریف	۴
۴۰۹	زائد ایضاح یعنی وجدان کی حقیقت	۵
۴۱۲	(۳) مشہد یعنی اللہ تعالیٰ کے شعائر کا نور بلند ہوتا ہے	۶
۴۱۳	(۴) مشہد عظیم اور تحقیق شریف	۷
۴۱۸	(۵) مشہد عظیم یعنی ملکہ دعا حاصل ہونے کے بعد داخلہ ملاء اعلیٰ	۸
۴۲۰	(۶) مشہد یعنی ایک غیبی اشارہ	۹
۴۲۰	(۷) مشہد عظیم اور تحقیق شریف یعنی ایمان لانے کی قسمیں ہیں	۱۰
۴۲۲	(تحقیق شریف اولیاء اللہ کا الہام)	۱۱
۴۲۳	(۸) تحقیق شریف اور مشہد	۱۲

نمبرشمار	مضمون	صفحہ
۱۳	(۹) مشاہد اجمالی، انبیاء کرام اپنی قبروں میں زندہ ہیں	۴۲۵
۱۴	(۱۰) مشہد یعنی شفاعت کا ثبوت	۴۲۶
۱۵	(۱۱) مشہد یعنی آنحضرت ﷺ رحمۃ للعالمین اور خاتم النبیین ہیں	۴۳۰
۱۶	تحقیق شریف یعنی ایک شبہ کا ازالہ	۴۳۳
۱۷	(۱۲) مشاہد اخری آنحضرت ﷺ کو تمام انبیاء کرام پر فوقیت حاصل ہے	۴۳۶
۱۸	(۱۳) مشہد یعنی روضہ اطہر اور منبر مبارک کے انوار اور برکات	۴۳۷
۱۹	(۱۴) مشہد آخر یعنی روح مبارک ﷺ کی عظمت	۴۳۸
۲۰	(۱۵) مشہد آخر	۴۳۸
۲۱	(۱۶) مشہد آخر یعنی حقیقت محمدیہ ﷺ	۴۳۹
۲۲	(۱۷) مشاہد	۴۳۹
۲۳	(۱۸) مشہد آخر	۴۴۰
۲۴	حقیقت طریق	۴۴۱
۲۵	(۱۹) مشہد آخر مذہب حنفی کا بہترین طریقہ	۴۴۳
۲۶	(۲۰) مشہد آخر یعنی روضۂ اطہر کے انوار تمام انوار سے فائق ہیں	۴۴۳
۲۷	(۲۱) مشہد آخر، علماء کرام کا مقام رسول اللہ ﷺ کے نزدیک بہت بلند ہے	۴۴۴
۲۸	(۲۲) مشہد آخر حضرت ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ کو کیوں فضیلت حاصل ہے	۴۴۵
۲۹	(۲۳) مشہد آخر (رسولؐ پر اللہ تعالی کی خصوصی نظر)	۴۴۶
۳۰	(۲۴) انسان محدث بنے یا اس کا طفیلی	۴۴۷
۳۱	(۲۵) مشہد یعنی عارف کے کامل ہونے کے	۴۴۷
۳۲	(۲۶) مشہد یعنی کامل معرفت کو ہمہ قسم کی نعمتیں ملتی ہیں	۴۴۸
۳۳	(۲۷) مشہد آخر۔ وھو القاھر فوق عبادہ کا مطلب	۴۵۱

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۳۴	(۲۸) مشہد، اللہ تعالیٰ مخلوق کی طرف کتاب نازل کرنے کے وقت کیا کرتا ہے	۴۵۲
۳۵	(۲۹) مشہد، قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ کی تفسیر	۴۵۴
۳۶	(۳۰) مشہد، نور عرش	۴۵۵
۳۷	(۳۱) اجمالی مشاہد، فقہ حنفی اکسیر اعظم اور کبریت احمر ہے	۴۵۵
۳۸	(۳۲) مشہد آخر، ائمہ اہل بیت کا عجیب طریقہ	۴۵۶
۳۹	(۳۳) مشاہد اُخری، تفضیل شیخینؓ کا حکم	۴۵۷
۴۰	(۳۴) مشہد۔ نور ارشادیت	۴۵۸
۴۱	(۳۵) مشہد	۴۵۸
۴۲	(۳۶) مشہد	۴۵۸
۴۳	تحقیق شریف	۴۵۹
۴۴	مزید تحقیق شریف	۴۶۰
۴۵	(۳۷) مشہد یعنی ملاء اعلیٰ کے اسرار عارف کی روح میں حلول کرتے ہیں	۴۶۱
۴۶	(۳۸) مشہد، کمال انسانی کس وقت متحقق ہوتا ہے	۴۶۲
۴۷	(تحقیق شریف) حدیث لا یرد القضاء الا الدعاء کا مطلب	۴۶۳
۴۸	تحقیق شریف	۴۶۴
۴۹	تحقیق اور تمثیل	۴۶۷
۵۰	(۳۹) مشہد آخر	۴۶۹
۵۱	(۴۰) مشہد آخر	۴۷۱
۵۲	تحقیق	۴۷۲
۵۳	(۴۱) مشہد آخر و تحقیقات	۴۷۳
۵۴	(۴۲) جنتیوں اور دوزخیوں کا لباس	۴۷۵

صفحہ	مضمون	نمبر شمار
۴۷۶	(۴۳) مشہد، یعنی ولی کو خلعت قطبیت کس وقت پہنایا جاتا ہے	۵۵
۴۷۹	(۴۴) شہر اجمیر میں کفر کی باتوں کا رواج	۵۶
۴۸۰	(۴۵) مشہد آخر یعنی دقائق اور ان کے اثرات	۵۷
۴۸۷	(سید عبد السلام بن بشیش کے قول کی تشریح)	۵۸
۴۸۹	(تحقیق کاملین کیلئے ذات کی طرف وصول بالفعل ثابت ہے)	۵۹
۴۹۰	(تحقیق اللہ تعالیٰ کو علم اشیاء اجمالاً وتفصیلاً حاصل ہے)	۶۰
۴۹۱	(۴۶) مشہد آخر، ہندوستان میں مذہب حنفی کی ضرورت اور اسکی حقانیت	۶۱
۴۹۴	(۴۷) مشہد آخر ذکی ہو یا غبی ہر ایک صراط مستقیم پر کاربند ہوسکتا ہے	۶۲
۴۹۴	تحقیق	۶۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الٰہی میں تیری حمد وثنا کرتا ہوں اور اس بات کا اقرار کرتا ہوں کہ تیری حمد وثناء میں قاصر ہوں اور تیری ہی مغفرت چاہتا ہوں اور تجھ ہی سے مدد کا طلبگار ہوں اور جانتا ہوں کہ تیرے علاوہ کوئی گناہ معاف کرنیوالا اور رنج وراحت میں مدد کرنیوالا نہیں، بس تیری ہی جانب متوجہ ہوتا ہوں اور اپنے کو تیرے ہی سپرد کرتا ہوں میری تمام عبادتیں تیرے لئے ہیں اور میری موت وحیات سب تیرے قبضہ قدرت میں ہے آپ کا شریک وسہیم نہیں، میں اپنے نفس کی شرارتوں اور اعمال کی برائیوں سے پناہ چاہتا ہوں اور کمال عاجزی کیساتھ درخواست کرتا ہوں کہ بہترین اخلاق اور اعمال صالحہ کی ہدایت عطا فرما اور اس بات کا عقیدہ رکھتا ہوں کہ برائیوں سے بچانیوالا اور بھلائیوں کی ہدایت کرنیوالا اس ذات کے علاوہ اور کوئی نہیں کہ جس نے مجھے پیدا کیا اور زمین وآسمان کو بنایا، گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ وحدہ لاشریک ہے اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ بندے اور رسول ہیں، جو سب رسولوں سے افضل اور تمام انبیاء کرام سے اشرف ہیں ان پر اور ان کی آل واصحاب پر یکے بعد دیگرے جب تک کہ رات دن ہیں اور جس وقت تک آسمان سایہ کرے اور زمین اس کا مظہر رہے، اللہ تعالیٰ کا درود نازل ہو۔

اما بعد: بندہ عبد ضعیف ولی اللہ بن عبد الرحیم دہلوی (اللہ تعالیٰ دونوں پر اپنی عنایتیں اور رحمتیں نازل فرمائے) کہتا ہے کہ اللہ کا بڑا انعام ہے کہ اس نے مجھے حج بیت اللہ اور زیارت رسول خدا صلی اللہ علیہ کی ۱۱۴۳ھ یعنی ایک ہزار ایک سو تینتالیس میں توفیق عطا فرمائی اور اس سے اعلیٰ نعمت یہ حاصل ہوئی کہ میرا حج مشاہدہ اور معرفت الٰہی کے ساتھ ہوا کوئی حجاب اور کسی قسم کی رکاوٹ

پیش نہیں آئی اور اسی طرح زیارت بھی زیارت مبصرہ ہوئی، اندھوں والی زیارت نہ ہوئی سو یہ زیارت شریفہ میرے نزدیک تمام نعمتوں سے فائق ہے، اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ ان تمام مشاہد کے اسرار جو کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے القاء فرمائے ہیں لکھ لوں اور اسی طرح جیسا کہ مجھے روحانیت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے فوائد حاصل ہوئے تا کہ یہ چیز میرے لیے باعث تذکیر، میرے بھائیوں کے لیے بصیرت کے فرائض انجام دے، امید ہے کہ اس تالیف سے کچھ شکر ادا ہو جائے اور میں نے اس رسالہ کا نام ''فیوض الحرمین'' رکھا ہے (۱) اللہ تعالیٰ ہمیں کافی ہے اور وہ بڑا کارساز ہے، برائی سے محفوظ رکھتا ہے اور نیکی پر قوت عطا کرنا اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے چنانچہ ان مشاہدوں میں سے مشاہدۂ اول حسب ذیل ہے۔

(۱) مشہد، یعنی ارباب فکر اور اصحاب ذکر

میں نے خواب میں ایک کثیر اہل اللہ کی جماعت دیکھی، ایک جماعت ان میں سے اہل ذکر اور یادداشت کی تھی، ان کے قلوب پر نورانی اثرات اور چہرے تر و تازہ اور صاحب جمال تھے وہ وحدت الوجود کے قائل نہ تھے اور ایک جماعت ان میں سے وحدۃ الوجود کا عقیدہ رکھتی تھی کہ جن کا مشغلۂ فکر سریان وجود تھا ان کے دلوں میں شرمندگی اور خجالت، اس امر حق کی بنا پر تھی کہ عالم تدبیر عموماً اور نفسوں کی خصوصاً حق ہے، ان کے چہرے سیاہ اور منہ سوکھے ہوئے تھے۔ دونوں جماعتیں کامیاب ہیں، اہل اذکار و اوراد بولے، ہمارا نور اور جمال نہیں دیکھتے ہمارا راستہ تم سے بہت زائد ہدایت پر ہے، وحدۃ الوجود والوں نے جواب دیا کیا سب موجودات کی ہستی حق کے وجود کے سامنے امر حق کے مطابق واقع نہیں ہے؟ سو ہمیں وہ راز معلوم ہو گیا کہ جس سے تم ناواقف ہو لہذا ہمیں تم پر فضیلت ہے غرضیکہ جب ان دونوں جماعتوں میں تنازع بڑھ گیا تو انہوں نے مجھے اپنا فیصل بنا لیا اور اپنا جھگڑا میرے سامنے پیش کیا میں ان دونوں میں منصف بنا اور کہا کہ بعض علوم صادقہ ایسے ہیں کہ جن سے نفس مہذب ہوتا ہے اور بعضے ایسے ہیں کہ جن سے نفس تہذیب نہیں پاتا اور یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے نفسوں میں قسم قسم کی استعدادیں پیدا کی ہیں اور علوم حقہ میں سے ہر

---

(۱) یہ حضرت شاہ صاحب کا روحانی سفرنامہ ہے (قاسمی)

ایک نفس کا ایک مشرب ہے کہ جب بھی اس میں مستغرق ہو جائے تو تہذیب پاتا اور سنور جاتا ہے اور جس وقت اس سے انہماک نہ ہو تو صلاحیت اور درستگی پیدا نہیں ہوتی، تو تمہارا یہ مسئلہ اگرچہ علوم حقہ میں سے ہے مگر تمہارا یہ مشرب نہیں، تمہارا مشرب تو حقیقت جامعہ کی جانب ملاء اعلیٰ کے تضرع کے طور پر متوجہ ہونا ہے، بہر حال نور والا فرقہ گو اس مسئلہ سے جاہل رہا مگر اپنے مشرب حق تک پہونچنے میں غلطی نہ کی، نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے نفس مہذب اور درست ہو گئے اور جس کمال کے لیے پیدا ہوئے تھے اس تک پہونچ گئے، اور اصحاب وحدۃ الوجود اگرچہ مسئلہ کو پہنچ گئے لیکن اپنے مشرب حق تک پہونچنے میں غلطی کھا گئے، اس لیے کہ جب انہوں نے اپنا فکر سریان وجود میں صرف کرنا شروع کر دیا تعظیم و محبت ان کے ہاتھوں سے جاتی رہی اور وہ تنزیہہ بھی جس سے ملاء اعلیٰ نے اپنے پروردگار کو پہچانا اور انہیں یہ معرفت بحکم فطرت قوائے افلاک سے حاصل ہوا، سو عالم ان کی معرفت سے لبریز ہو گیا اور جو اس چیز کے وارث نہ ہوئے ان کے نفس مہذب نہ ہوئے اور نہ وہ اس چیز کی حقیقت تک پہونچے کہ جس کے لیے پیدا ہوئے تھے، سوائے وحدۃ الوجود اور سریان وجود فی العام کے قائلوں تمہارے اس راز کو اس جزء نے جس کے لائق یہ علم نہیں ہے، ظاہر کر دیا، لیکن جس جزء کا مشرب یہ علم ہے، وہ تو تم میں گونگا اور مسخ شدہ انسان ہے کہ اس راز کی حقیقت سے وہ واقف نہیں اور تم میں عناصر فلکیہ اور جو اجزاء فاطمہ اس کمال کے ہیں بالکل نہیں، اس سر کے لیے تو وہ شخص زیادہ لائق ہے جس میں یہ جزء بہت ہی خوبی کے ساتھ راسخ ہو اور اسے نشأۃ متروکہ بوسیدہ نہ کر سکے، ظہورات کو گھیر لینے والے دونوں فریق سمجھ گئے اور اس چیز کا یقین کر لیا، اس کے بعد میں نے کہا اللہ تعالیٰ نے مجھے ان اسرار سے خاص فرمایا جس میں تمہارا اختلاف تھا اور میں فیصل بنا والحمد للہ رب العالمین، اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی۔ (۱)

(۲) مشہد یعنی تدلی کی حقیقت

میں نے اپنی روح کی آنکھ سے تدلی کو دیکھا وہ ایک شئ واحد متصل فی ذاتہ تمام عالم میں سرایت کیے ہوئے ہے گویا کہ عالم اس کے اوپر ایک پردہ ہے اور وہ اس کے اندر ہے اس وقت

(۱) اس مشہد میں وحدۃ الوجود کے قائلین اور منکرین کا تمثیلی ذکر ہے۔ (قاسمی)

میں نے یہ بات سمجھی کہ یہ وہ تدلی ہے کہ عارف جب اس کی جانب متوجہ ہوا اور روح کی بصارت سے اسے دیکھے اور اس میں فنا ہو جائے تو اس کے ارشاد کی تاثیر قوی ہو جاتی ہے اور اس کا تصرف حقیقی طور پر خلقت میں جمع ہوتا ہے اور اس تدلی کی دو جہتیں ہیں ایک وجود خارجی کی جانب مائل ہونا سو یہ ایک لون (رنگ) ہے جو الواح نفوس میں نقش ہے اسے نور کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے اور دوسری جہت وجود ذہنی کی طرف متوجہ ہے اور یہ ذات کے ساتھ صادق آتی ہے تو یہی اسم اور تدلی ہے، نقشبندیہ اسی بنا پر کہتے ہیں کہ ہم نے نہایت کو بدایت میں درج کر دیا ہے، جو شخص اس تدلی کے وسیلہ سے ذات کے اصول کا ارادہ رکھتا ہے تو اسے ارادہ اور اختیار کے علاوہ اور کوئی چیز معلوم نہیں ہوتی اور اپنے کو ایک دریائے ناپیدا کنار میں ڈوبا ہوا محسوس کرتا ہے۔

معرفة عظيمة

خدا تعالیٰ کا ادراک اپنے بندوں کی طرف جو اعظم تدلیات کے ساتھ متدلی ہے اگر وہ روح کی آنکھ سے ہے تو یہ کاملوں کا مقام ہے اور اگر روح کے علم سے ہے تو اس میں عوام کو بھی شرکت حاصل ہے، اسی طرح اس کے کلام سننے کے متعلق گفتگو ہے، اگر وہ روح کے کان سے ہے تو بھی کاملوں کا مقام ہے، اور اگر روح کے ذریعہ اس کا علم حاصل ہو تو اس میں عام حضرات بھی شریک ہیں۔

تحقیق شریف

یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ نفس ناطقہ کے لیے ان جوارح محسوسہ کے علاوہ آنکھ اور کان اور زبان ہیں اور اس کی حقیقت بایں طور پر واضح ہوتی ہے کہ اس مقام پر دو لطیفے ہیں ایک تو قیومیۂ الٰہی جو بدن سے وابستہ ہے اور نسمہ سے قطع نظر کرتے ہوئے اس میں حلول کئے ہوئے ہے اور اس کی معرفت اشیاء میں دو جہتیں ہیں ایک تو یہ ہے کہ مبدأ صور سے کوئی صورت مجرد اس پر افاضہ کئے ہوئے ہو تو یہ علم ہے دوسرے یہ کہ اشیاء میں سے کسی شئی کا اضافہ کرے اور اس سے متصل ہو جائے اور یہ اتصال اگر انکشاف بصری سے سمجھا جائے تو اسے بصر بولینگے اور اگر انکشاف سمعی کا اعتبار کیا جائے تو پھر اس کا نام سمع ہے، اور اگر افادہ و استفادہ کے ذریعہ علوم کے انکشاف کا اعتبار کریں تو پھر کلام ہے، سو اسی جہت سے فرد اپنے پروردگار عزوجل کو دیکھتا ہے اور اسی طریقہ سے

الہام ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے باتیں کرتا ہے اور ارواح افلاک اور ملاء اعلیٰ اور جو نیک لوگوں کی روحیں گزر گئیں ہیں ان سے باتیں کر لیتا ہے اور کبھی اس روح سے جو اپنے پرودگار کو دیکھتی ہے، نسمہ پر ایک لون اور رنگ کا اثر نمایاں ہوتا ہے اور نسمہ سے جس بصر پر تو وہ لون ایک ہیئت متصلہ بن جاتا ہے تو اسی وقت فرد کہنے لگتا ہے کہ میں نے اپنی آنکھ سے اپنے پروردگار کو دیکھا وہ اپنے قول میں سچا ہوتا ہے اور اسی قبیل سے وہ چیز ہے جس کا دعویٰ ابن عباسؓ نے کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے پروردگار کو دیکھا ہے اور اسی قبیل سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کلام فرمانا ہے، ایک روز میں روح آفتاب سے متصل ہوا، میں نے اسے دیکھا اور اس سے سنا تو میں بولا بڑا تعجب ہے ان لوگوں پر جو تجھ سے روشنی طلب کرتے ہیں اور فائدہ اٹھاتے ہیں اور تیرا غلبہ اور ظہور طرح طرح سے دیکھتے ہیں اس کے باوجود پھر تیرے منکر ہیں اور تیرا مقابلہ کرتے ہیں اور تو نہ کسی سے انتقام لیتا ہے اور نہ ان پر غصہ کرتا ہے تو اس نے جواب دیا کیا ان کا تکبر اور اپنے نفسوں سے ان کا خوش ہونا کیا میری جان کی خوشی کا شعبہ نہیں ہے میں ان تمام چیزوں کے باوجود تکبر کی صورت کی طرف کچھ توجہ نہیں کرتا میں تو اس شادمانی کی حقیقت کو ملحوظ رکھتا ہوں کیونکہ یہ سب میرے ہی نفس کی خوشی ہے تو پھر کیا کسی کو اپنے نفس کے کمال پر غصہ آیا کرتا ہے اور اپنے نفس سے انتقام لیا کرتا ہے غرضیکہ پھر میں نے سورج پر توجہ کی تو وہ بالطبع اور فطری طور پر فیاض ہے اور اسی طرح تمام افلاک اور اسی طرح میں نے دیکھا کہ ارواح افلاک اپنے علوم اور ہمتوں میں موافق اور ملے جلے ہیں۔

زائد ایضاح یعنی وجدان کی حقیقت

اگر تو اس وجدان کی حقیقت معلوم کرنا چاہے تو جو کچھ کہ میں بیان کروں تو اسے توجہ کے ساتھ سن کہ نفس ناطقہ کا علم جسے نور بسیط سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ قیومیہ کے جسم واحد کے لیے مقید ہوتا ہے اور طبیعت کلیہ کا تنزل وہ خارج میں ایک نقطۂ فعالیہ ہے کسی خاص معلوم کی صورت میں کوئی سا بھی معلوم کیوں نہ ہو وہ ہمارے نزدیک مدرِک اور مدرَک کا ایک ہونے کے ساتھ ہوتا ہے، پھر اس چیز کا ادراک یا تو نشأۃ کلیہ کی بناء پر ہوگا جو کہ نفس کو شامل ہو یا اس کے جسم کو شامل ہو جیسا کہ صورۃ انسانیہ یا حیوانیہ یا زمین اور پانی اور تمام عناصر یا قوت شمسیہ اور قمریہ یا اس کا ادراک کسی ایسی

خاص چیز کی بنا پر ہوگا، جو اس نفس دراکہ کا قسیم ہے جیسا زید کے نفس کا عمرو کے نفس کو ادراک کرنا سو اگر اول ہی مقصود ہے تو ادراک نفس کی صفت اس کی حقیقت یہ ہے کہ اس نقطہ کی طرف یکسوئی کرے جو کہ اس حقیقت شاملہ فی النفس کے مقابل ہے تو یہ چیز اس کے ساتھ باقی رہ جائے گی اور دوسری اشیاء سے فانی ہو جائے گی اس وقت یہ نقطہ خود بخود بیدار ہو جائے گا اور اس حقیقت کے تمام احکام اور یہ تجلی ذوقی حقیقی طور پر روشن ہو جائیگی یہی معنی ہیں ہمارے قول کے کہ مدرِک اور مدرَک اس صورت میں ایک ہو جائیں گے؟ اور اگر امر ثانی ہے تو ادراک نفس کی صفت اس حقیقت قسیمہ لہا کے لیے یہ ہوگی، کہ یہ چیز اس کے ساتھ کسی حضرت میں حضرات طبیعہ کلیہ سے جمع ہو تو غالب ہوگا ایک نفس دوسرے نفس پر یا اسی جزء کی وجہ سے جو اس جزء پر غالب ہے اور اس قوت سے جو دوسری قوتوں سے پیروی طلب کرتا ہے یا اکثر قوتوں کی جہت سے اس شرط کے ساتھ کہ یہ قوت منقطع نہ ہو جائے اس لیے کہ تمام نفسوں کی تاثیر ایک کی دوسرے میں غلبہ اور محبت سے ہوتی ہے، اور ان دونوں چیزوں کی کنہ اور حقیقت یہ ہے کہ نفس میں جو ایک قوت بطور امانت کے موجود ہے غالب ہو یا مغلوب کہ نفس اس کی طرف مائل ہو جائے سو یہ کاملوں کی صفت ہے، یہ قوت غالبہ ہو یہ غیر کاملوں کا درجہ ہے اور اس مقام پر ایک اور نفس ہے جس میں یہ قوت ہے لیکن اس کے احکام کا ظہور پہلے نفس سے یہاں بہت کم اور ضعیف ہوتا ہے لہٰذا موثِر نے موثَر کا اور موثر نے موثِر کا اس قوت حاسہ کے ساتھ ادراک کر لیا اور یہ ایک دوسرے کے ساتھ مل گئیں تو جو احکام نہ تھے وہ ظاہر ہو گئے اور بسا اوقات وہ قوت ہے جو اس نفس میں ہے دوسری قوتوں کی پیروی طلب کرتی ہے اس طور پر کہ ان مین مل کر نیست و نابود ہو جاتی ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ احکام اور آثار سے معزول ہو جاتی اور فقط قوت غالبہ باقی رہ جاتی ہے، اس وقت بولا جاتا ہے کہ اس نفس نے اس نفس میں اثر کیا اور اس کیفیت کا فائدہ پہونچایا اور حقیقی بات یہ ہے کہ اس نفس نے خارج سے کچھ نہیں حاصل کیا بلکہ اپنے ہی جزء کی طرف توجہ کی ہے اور اپنی اس قوت کی طرف جو اس میں امانت ہے اور اس طور پر کہ سب قوتوں اور اجزاء کے احکام پامال ہو گئے لہذا اس وقت غلبہ اور تتبع اس جانب سے ہوا اور محبت و پیروی اس طرف سے تو دونفسوں کا اتحاد مطلقاً نہیں ہوتا بلکہ قوت اور جزء کی جانب سے ہوتا ہے اور کل مقامات پر بھی نہیں بلکہ کلیت طبیعیہ کے مقامات میں سے کسی بھی مقام پر اور ہمارے

قول مدرِک اور مدرَک کے ایک ہو جانے کے اس صورت میں یہی معنی ہیں، غرضیکہ جب تم نے یہ بات بھی سمجھ لی تو یہ بھی سمجھو کہ اس نفس کے واسطے بہ نسبت اس کے حالات اور اوضاع بھی ہیں ایک تو متحد ہونا اور اسی میں مستغرق ہو جانا ہے اور اس کے علاوہ دوسری اشیأ کو بھلا دینا دوسرے یہ کہ ہر نفس اس کے ملاحظۂ فنا کی جانب رجوع کرے درانحالیکہ معنیٰ اتحاد میں مستغرق ہو سو باوجود اس سے مل جانے اور قدرے جدا ہونے کے بعد اس رنگ میں رنگا جائے گا اور اس بات کا شعور ہو کہ یہ کل وجوہ سے نہیں بلکہ کسی بھی وجہ سے ہو اور اس حالت کو رویت کے ساتھ موسوم کرتے ہیں اور تیسرے یہ کہ تمام احکام اس طرح غالب ہو جائیں اور اس طرح غائب ہو جائیں کہ اس قوت کا حکم غائب ہو جائے اور یہ پوشیدہ چیز کی طرح ہو جائے تو اس وقت یہ احکام ضعیف صورت میں بہ نسبت رویت کے ظاہر ہوں گے اور یہ افضاء غالبیت کی جانب سے اور قبول مغلوبیت کی جانب سے ہو جائیگا تو اس وقت بولا جائیگا کہ زید کے نفس نے عمرو کے نفس سے کلام کیا اور اس نے اس کا کلام سنا اور چوتھا یہ ہے کہ اس قوت کے احکام بہت شدت کے ساتھ غائب ہو جائیں کچھ باقی نہ رہے مگر اس قوت کے احکام کی ضدوں میں ایک خفیف سا خیال رہ جائے اور اس سے جدا اس وقت کہا جائے گا جب کہ ذہن میں سے کوئی صورت حاصل ہو جائے اور اس طرح نقش ہو جائے جیسے آئینہ میں صورت نقش ہو جاتی ہے یہ چار احوال ہوئے اور ہر ایک کے لیے علیحدہ حکم ہے، لہٰذا غور وفکر کرنے والوں میں سے ہونا چاہیے اور دوسرا لطیفۂ نسمیہ ہے اس میں حاسہ جمیلہ ہے اس کا خاصہ فعل کے ساتھ متصل ہونا ہے اگر کان یعنی قوت سمع خیال کریں تو اسے سمع بولیں گے، اگر آنکھ کی طرف قیاس کریں تو بصر بولینگے، چکھنے کا قیاس کریں تو ذوق کہا جائیگا اور لمس یعنی چھونے کی جانب توجہ کریں گے تو اسے لمس بولا جائے گا اور شاید اسی کو حس مشترک بولا جاتا ہے اور اسی حس مشترک سے ہر ایک حاسہ کو احتلام ہوتا ہے، تو آنکھ کا احتلام یہ ہے کہ جوالہ نقطہ کو دائرہ سمجھے اور دائرہ خارج میں ہوتا نہیں وہ تو حس مشترک کا احتلام ہی ہوا کرتا ہے اور ذوق کا احتلام یہ ہے کہ کسی مرغوب شیٔ کو دیکھ کر جی للچانے اور رال ٹپکنے لگے اور قوت لامسہ کا احتلام یہ ہے کہ انسان دوسرے انسان سے قریب ہو اور وہ اس سے رغبت رکھتا ہو جب اس کا بدن اس سے ملے تو اس کے نفس میں گدگدی اٹھے اور رہا قوت سمع کا احتلام نغمات گانے اور اشعار کا وزن جاننا ہے لہٰذا نسمہ تو یہ ظاہری

افعال کی جانب بالکل توجہ نہیں دیتا بلکہ حس باصرہ، ذائقہ، سامعہ اور لامسہ سے لذت اٹھاتا ہے اور اگر تحقیق کرنا چاہے تو اس حاسہ سے تمام حواس ظاہرہ اور ادراک پایۂ تکمیل کو پہونچتے ہیں اور جب ارواح اپنے بدن سے جدا ہوتی ہیں تو بسا اوقات یہ حاسہ مستقل ہوتا ہے اور خیال عرش سے اپنے موافق موجودات مثالیہ پیدا کرتے ہیں، جیسا کہ جن اور فرشتے متشکل ہوتے ہیں۔

(۳) مشہد یعنی اللہ تعالیٰ کے شعائر کا نور بلند ہوتا ہے

میں نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ کی ہر ایک شعائر کا نور بلند ہوتا ہے، سو میں نے اس چیز کی حقیقت دریافت کی تو حقیقت نور کی کسی شیء کی روحانیت سے مناسبت کی بنا پر ہے اور اس میں ایک حقیقت راسخہ ہے جو روحانیت کی تاثیر کی وجہ سے ہے کہ اس ہیئت سے انسان روح کے حاسہ سے ادراک انطباعی کا احساس کر لیتا ہے، بایں طور کہ خوش اور منشرح ہو جاتا ہے اور اسے روحانیت کیساتھ مناسبت اور بڑھ جاتی ہے اور لوگ جب اللہ کے شعائر کی جانب متوجہ ہوتے ہیں تو وہ جماعتوں کی شکلیں اختیار کر لیتے ہیں سو ان میں سے بعض اپنی نیت اور عزیمت کی بنا پر نفع حاصل کر لیتے ہیں بایں طور کہ جب بھی کوئی کام اللہ کے لیے کریں تو اس اعتقاد سے کریں کہ یہ کام شعائر اللہ سے ہے اور دوسرا گروہ وہ ہے کہ اس کی روح کی آنکھ کھل جاتی ہے اور وہ نور کے ذریعہ سے اسے معلوم کر لیتا ہے اور اس کی قوت ملکیہ، قوت بہیمیہ پر غالب آ جاتی ہے اور ایک وہ جماعت ہے جو اس نور میں غور و فکر کرے اور اس تدلی کا ادراک کرے کہ جو شعائر اللہ کی اصل ہے جس کی بنا پر وہ متحیر ہو جائے۔

(۴) مشہد عظیم اور تحقیق شریف (یعنی تدلی سے اللہ تعالی کا قرب آسان ہو جاتا ہے)

اللہ تعالی نے مجھے اس تدلی عظیم و جلیل کی حقیقت پر مطلع کیا جو نوع بشر کی جانب متوجہ ہوتی ہے اور مراد یہ ہے کہ اس سے اللہ تعالی کا قرب آسان ہو جاتا ہے اور وہ تدلی ہے جو عالم مثال میں متمثل ہے اور کبھی یہ چیز دوسرے انبیا کے ساتھ عموماً متفسر ہوتی ہے اور ہمارے نبی اکرم محمد ﷺ کے ساتھ خصوصاً اور گاہے آسمانی کتابوں کے ساتھ، عموماً اور قرآن عظیم کے ساتھ خصوصاً متفسر ہوتی

ہے اور ایسے ہی کبھی نماز اور کبھی کعبہ شریف کے ساتھ تب میں نے تدلی وحدانی فی ذاتہ کو پہچان لیا جو کہ ظہورات کثیرہ میں باعتبار معدات خارجیہ کے ظاہر ہے جیسا کہ انسان کی اوضاع اور اس کی عادتیں اور جو ان کے ذہنوں میں مقرر ہیں بایں طور کہ جب برزخ میں جائیں تو اوضاع اور عادتیں اور علوم ان کے ساتھ ہیں جو ان سے جدا نہ ہوں اور حظیرہ قدس میں صورت مثالیہ کے منعقد ہونے کو اس تدلی جلیل کی وجہ سے آمادہ کریں پھر جب اللہ تعالیٰ ارادہ فرمائے تو عالم جسمانی میں نزول فرمائیں اور ان کے لئے عالم باعتبار اوضاع علویہ اور سفلیہ کے مستعد ہو جائے اور اللہ تعالیٰ نے مجھے انفسار کی حکمت پر بھی مطلع فرمایا اور ہر ایک انفسار کے دوسرے انفسار پر متوجہ ہونے پر ان خصوصیات کے ساتھ جو صرف اسی میں معدات کی جانب سے موجود ہیں، اور وہ اسی چیز کے لئے آمادہ ہیں، ہم انشاء اللہ تعالیٰ تجھ سے اس حقیقت وحدانیہ اور کیفیت انفسار کو بیان کریں گے تو سمجھ لو کہ شخص اکبر جس وقت خارج میں ظاہر ہوا اس نے فوری طور پر اپنے رب کو پہچانا اور اس کے ساتھ خشوع کیا، کیونکہ اس کے مدارک میں صورت علمیہ تھی جس کی دو جہتیں ہیں، ایک تو اس جانب متوجہ ہے جو شخص اکبر میں جسم اور جسمانیات، روح اور روحانیت ہیں اور دوسری جہت وجود ذہنی کی طرف مائل ہونا ہے کہ جس سے نفس معلوم ہو جائے اور اس جہت کا اخیر حق جل علی کی تدلیات میں سے ایک تدلی ہے اور یہی شخص اکبر کا اپنے پروردگار کی معرفت کی بنا پر نصیب اور حصہ ہے اور اس کے لئے ایک مقام معلوم ہے، کہ جس سے تجاوز نہیں اور جو کچھ بھی اس کے جوف اور حیز میں ہے، تو صرف اس کے نصیب میں اپنے رب کی معرفت سے تنزل ہے ایک منزل مقید میں اس تدلی کے تنزلات سے لہٰذا اس مقام پر باعتبار متجلی لہ اور فیہ کے تنزل ہوتا ہے اور اس تنزل میں احکام جانبین کی رعایت ہوتی ہے یہ معرفت عظیمہ ہے لہٰذا اسے دانتوں کے ساتھ پکڑ لو، غرضیکہ جب بھی کوئی فلک یا عنصر روح ظاہر یہ یا خفیہ کا حیز ہوا تو سب سے پہلی چیز اس سے یہ ظاہر ہوئی کہ اس نے اپنے رب کو پہچانا، اور اس کے ساتھ خشوع کا معاملہ کیا اور اس میں شخص اکبر سے طبعی اور فطری مدد چاہی اس لئے کہ وہ اس کی اصل اور مبداء وجود ہے اور صرف ذات کی جانب متوجہ ہو گیا جیسا کہ شخص اکبر صرف ذات کی جانب متوجہ ہوتا ہے لیکن شخص اکبر اور اس تدلی نے جو اس میں موجود ہے فیضان صورت خاصہ کے لئے اس کے مدارک میں آمادہ کیا یہ دوسری معرفت ہے اس کے بعد جب

یہ مثالیں متعین ہوئیں جنہیں رب الانواع بولا جاتا ہے تو ہر ایک نوع کے احکام متعین ہو گئے جو کہ دوسری نوع کے احکام سے جدا ہیں اور یہ چیز عالم مثال میں ہے اور اسی سے انسان ہے۔ تو یہ تمام انواع معرفت سے محظوظ ہونے کی بنا پر متمیز ہو گیا اور اسے بیکار نہیں قرار دیا گیا اور اس میں امانت رکھی گئی اس کے بعد اشخاص بشری اس مثال انسانی سے تقسیم انحصاریہ کے طور پر ظاہر ہوئیں جیسا کہ موسیقی والا ساز کے تار سے نغمات تلاش کرتا ہے تو معلوم کر لیتا ہے کہ یہ نغمہ اس طرح ہے نہ اس سے زائد ہے، اور نہ کم، اس کے بعد کہتا ہے کہ اگر ہم اس نغمہ کو اس نغمہ کے ساتھ مرکب کر لیں تو ایسے ایسے ابعاد حاصل ہوں گے، نہ اس سے کم اور نہ زائد، جیسا کہ تقسیم حاصر یہ عقلیہ سے اس کا علم ہوا پھر اسی طرح بعض ابعاد کو بعض کے ساتھ مرکب کرتا چلا جاتا ہے حتی کہ محصور عدد خاص میں لحن مقرر کر لیتا ہے اور اسے محفوظ کر لیتا ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر ایک کا حکم، خاصیت اور وقت معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ راگ آج اس وقت اور اس مجلس کا ہے، اور دوسرا راگ اس روز اور اس وقت کا ہے اسی طرح یہ سلسلہ غیر متناہی ہو جاتا ہے اگر زندگی اس کا ساتھ دیدے تو ابد تک اس کے عجائبات ختم نہ ہوں غرضیکہ اور یہ سب انفسار ہیں جنہیں پہلے ہی قسمت حاصرہ سے معلوم کر چکا ہے پھر جبکہ اشخاص بشری کا عالم جسم میں ظہور ہوا اور ان کی استعدادیں اور قوتیں مختلف تھیں۔ بعضے ذکی اور بعض غبی اور بعضے صاحب نفس قدسیہ جن کی ہمتیں اور نفوس اللہ تعالیٰ کی جانب متوجہ ہوئیں اور خلاصہ بشریت حظیرۂ قدس میں تو اس مقام پر وہ امر واحد کی طرح ہو گئے کہ ان پر اسم واحد کا اطلاق ہو اور مثال واحد کے ساتھ وہ منسوب ہوں اور وہ انسان الٰہی ہے کہ جن کے امور اور مدارک باہم قریب ہیں، تدلی اعظم نے اس مقام پر نزول کیا تو یہ عالم مثال ان کے لئے قدمِ صدق ہو گیا، اور مقام معلوم ان کی نسبت اور ان کے نصیب ان کے رب کی طرف سے قائم ہو گئے تو نفوس انسانی جس وقت عادات حیوانیہ اور ہیئات فاسقہ جسمانیہ کی کثافت سے پاک ہوئے تو حظیرہ قدس کی طرف اٹھائے گئے اس جگہ آ کر برق جلال چمکی کہ جس سے وہ بے خبر ہو گئے اور ایسی حالت ہو گئی کہ انہیں معلوم ہی نہیں رہا کہ وہ کہاں تھے اور کہاں ہیں، اور لوٹنے کی بھی کوئی شکل ہے، یا نہیں اس وقت تدبر حق اس بات کی متقاضی ہوئی کہ یہ تدلی اس کی جانب حرکت کرے اور نزول کرے اور متشخص و منفسر ہو جائے حتی کہ ان کا قرب اس سے آسان ہو جاتا ہے اور اس کے ساتھ رنگے جاتے ہیں،

اس وقت انفسارات معدات کے اعتبار سے ظہور میں آتے ہیں اور ان ہی انفسارات کا ثمرہ نبوت ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جب اشخاص آپس میں ملتے ہیں تو جوان میں بہت کامل اور بڑا عاقل اور واثق ہوتا ہے اور اپنے سے کم مرتبہ والے کو تدبیر منزل اور سیاست مدنی میں مطلع کر دیتا ہے تو یہ چیز طبیعت بشر اور خلق ہو جاتی ہے اور ایک امران کے ذہنوں میں جما ہوا ہے اگر یہ زندہ رہیں تو اسے بھی اپنے سینوں میں بلا تامل پالیں جیسے ارتفاقات اولیہ ضروریہ اور اگر مر جائیں تو اسے اپنے برزخ اور معاد میں ساتھ لے جائیں تو اس وقت یہ امر معد ہو جاتا ہے اس تدلی کے انفسار کی صورت جسمانیہ میں، اور وہ تمام اشخاص پر تقدم شخص انسانی ہے، اور اس کا صدور ان کی رائے سے متحقق ہوتا ہے اور پھر اس صورت جسمانیہ میں روح الٰہی پھونکی جاتی ہے تو اسکے بعد اس کی برکات کا ظہور ہوتا ہے اور یہی رسالت اور نبوت ہے اور اس مقام پر نبوت سے میرا مقصود یہ ہے جو بوجہ ریاست تقدم مجادلت اور تسخیر کے ہو، نہ صرف فیضان علوم کے ہو اگر چہ انقیاد کی ان میں سے بالتبع رغبت کریں اور نہ نبوت جامعہ شہیدیت سے میری غرض ہے جو کہ ہمارے سردار اور نبی اکرم ﷺ کو حاصل ہے اور ان ہی انفسارات میں سے ایک نماز بھی ہے اور یہ اس لئے کہ بشر کے ہر خلق کے لئے کچھ افعال ہیں اور وہی اس کا قالب اور جسم ہے اور محسوس میں اسرار معنوی اپنی ہیئت کے ساتھ منضبط ہوتے ہیں اور اسی کی جانب مدح اور ہجو کے احکام منصرف ہوتے ہیں اور اسی کا تذکرہ ہوتا ہے اور خبر دی جاتی ہے اور اسی کے ساتھ خلق کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے اور یہی طبیعت بشر اور ان کے اجسام ہیں اور ان کے ذہنوں میں بھی یہی چیز پوشیدہ ہے چنانچہ حق تعالیٰ اخلاق بشر میں سے ایک خلق کو اور ہیئات نفوس میں سے ایک ہیئت کو چن لیتا ہے اور اسی طرح ان کی روحوں کے رنگوں میں سے ایک رنگ کو اور یہی صورت حظیرہ قدس میں مقام معلوم کے ساتھ انصباغ کی ہے اور میرا مقصود اس خلق اور ہیئت سی احسان اور اپنے پروردگار کے ساتھ خشوع کرنا اور ہیئت ظلمانیہ فاسدہ سے علیحدگی حاصل کرنا ہے، یہی خلق امتزاج نفس بالحیوانیہ کے حیز میں موجود ہے، لیکن یہ چیز اس مقام معلوم سے جو عالم حظیرہ قدس میں ہے، بہت مشابہ ہے اور اس خلق کو ھُوَ ھُوَ کے طریقہ پر کر دیا ہے جیسا کہ بدن کو نفس کے مانند اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان اقوال اور افعال کو منتخب فرمالیا جو کہ اس خلق کے لئے تفسیر ہیں، اور اس پر منطبق ہوتے ہیں انہیں بھی ہو بہو کے طریقہ

پر کر دیا ہے اور ان ہی انفسارات میں سے کتب آسمانی بھی ہیں اور یہ اس لئے کہ اشخاصِ انسانی کو کتابیں لکھنے کے متعلق الہام ہوا اور رسائل جمع کرنے کا تاکہ زمانہ دراز تک نفع پہونچاتے رہیں اور دور دراز تک ان کا نفع پہونچے اور صاحب کتاب کی نص مضبوطی اور خوشحالی کے ساتھ باقی رہے اور روایت بالمعنی، میں کسی قسم کی غلطی اور نسیان نہ ہو، چنانچہ یہ کتابت ان میں پھیل گئی اس کے بعد یہ تدلی دوسری صورت میں حرکت کر کے اشخاص انسانی کے پاس جو تھا، اس کے مقابل ہو گئی نتیجہ یہ ہوا کہ جو رسول انوار الٰہی سے بہرہ ور ہیں، اور جو بشریت سے حظیرہ قدس کیطرف اٹھائے گئے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے ارادوں کے خادم ہوئے چنانچہ علوم ملاء اعلیٰ منعقد ہوئے اور ان کا مجادلہ فاسق شبہات میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کے ارادہ سے انسان سے شروع ہوا اور اس الہام خیر سے جو کہ ان کے سینوں میں از روئے وحی متلو کے ہے، رسول کے مدارک میں بالآخر کتاب منتظم ہو گئی اور اس طرح کی پہلی کتاب تورات ہے، رہا اس سے پہلے تو وہ تو صرف وہ صحیفے جو کہ ان کے علوم پر جو نبی کے قلب میں فیضان تھے، مشتمل تھے اس کے بعد امت میں جس نے چاہا ان چیزوں کو جمع کر لیا اور ان انفسارات میں سے ایک ملت بھی ہے، اور یہ اس لئے کہ اشخاص کو آپس میں رسمیں منعقد کرنے کا الہام ہوا چنانچہ انہوں نے رسوم مدینہ، رسوم منزلیہ اور رسوم معاشیہ اور معاملہ کو منعقد کر لیا اور یہ چیز ان کے لئے نہایت ضروری امور میں سے ہوئی جو ان کی ضروریات علوم میں داخل ہے تو اللہ تعالیٰ نے نبی کے قلب کو ایسی رسمیں منعقد کرنے کے قابل کیا جس میں شان الٰہی، روح الٰہی اور نور اور برکت ہے سو وہ شرح اور ملت ہے اور ان انفسارات میں سے بیت اللہ بھی ہے اور یہ اس لئے کہ لوگ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے عبادت گاہوں اور کنیسہ بنانے میں مشغول ہو گئے چنانچہ انہوں نے سورج کے نام سے ایک مکان ایسے وقت میں تعمیر کر دیا کہ جس میں روحانیت شمس غلبہ کرتی ہے اور اسی طرح چاند اور تمام ستاروں کے نام پر اور انہوں نے یہ گمان کر لیا کہ جو شخص ان مکانات میں سے جس میں بھی داخل ہوگا، وہ اسی ستارہ سے قریب ہوگا اور یہ چیز ضروریات کے ساتھ لاحق ہو گئی اور تمام تر توجہ امر بسیط کی طرف ہو گئی، جس کے لئے کوئی بھی جہت متعین نہیں اور ایک جگہ امر بعید کی طرح ہو گئی چنانچہ ہمارے سردار حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قلب پر اس کے مقابل جو کہ اس زمانہ میں تھا اس چیز کا نزول ہوا انہوں نے اپنے علم سے ایک جگہ

منتخب کی جو اس امر کے لئے نہایت مناسب تھی کہ وہاں قوائے افلاک اور عناصر بقاء کے مقتضی ہوں اور لوگوں کے دلوں کو اس طرف کھینچنے والے ہوں اور کچھ طریقے اور اوضاع اس کے لئے متعین کئے، تا کہ انسان اس کی تعظیم کریں اور ان پر اس کی تعظیم کے واجب کرنے کے لئے تدلی کی اور یہ بات بھی جان لینی چاہیے کہ شریعت عادات میں جاری ہوا کرتی ہے، اور یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے کہ ان کی مقررہ عادات کی طرف نظر رکھتا ہے لہٰذا جو ان میں سے فاسد ہوتی ہیں ان کے ترک پر آمادہ کر دیتا ہے اور صحیح کو قائم رکھتا ہے اور اسی طرح وحی متلو الفاظ، کلمات اور وہ اسلوب جو ان کے ذہنوں میں پوشیدہ ہوا کرتے ہیں اور جو ان کی جانب وحی کئے گئے ہیں، ثابت ہوا کرتی ہیں اسی بناء پر اللہ تعالیٰ نے عرب والوں کی طرف عربی زبان میں وحی نازل فرمائی اور سریانی زبان والوں کی طرف لغت سریانی میں اور اسی طرح سچے خواب، ان صورتوں اور خیالات میں جو کہ ذہن میں ہیں، ظہور میں آتے ہیں یہی وجہ ہے کہ مادر زاد اندھا خواب میں رنگ اور صورتیں نہیں دیکھتا اس کا خواب تو چھونا، سننا، چکھنا، سونگھنا اور وہم ہے اور مادر زاد گونگا خواب میں کوئی بات نہیں سنتا اس کا خواب دیکھنا اور چھونا وغیرہ ہے۔ اور اگر حقیقت دریافت کرنا چاہے تو کوئی صورت بھی عالم میں افاضہ غیبیہ کے ساتھ متحقق نہیں ہوسکتی، علاوہ ازیں یہ افاضت عادیہ ہو یا غیر عادیہ ہو مگر موافق احکام عالم کے ہو کیونکہ وہ مشخصات جو شرکت اور رنگ اور اشکال کو مانع ہیں وہ اس عالم کے ساتھ خاص ہیں جیسا کہ یہ گھوڑا کہ اس کے کل مشخصات عالم فرسیت میں داخل ہیں تو گویا کہ گھوڑے میں اس بات کا احتمال ہے کہ اس کا طول چار ہاتھ ہو، اس سے زائد اور کم ہو تو یہ چار ہاتھ جو کہ نہ کم ہیں اور نہ زائد وہ اس عالم کے علاوہ اور کہیں نہیں ہو سکتے اور اسی طرح نوع کے ممیّزات جن سے ایک نوع دوسری نوع سے ممیّز اور جدا ہے تو یہ سب کے سب اس عالم جنسیت میں داخل ہیں لہٰذا اس وضع کے ساتھ خصوصیت کے ساتھ ہر ایک فائض کے لئے اس عالم میں ایسا معد ضروری ہے جس نے اسے اس وضع کے ساتھ خاص کیا ہو پس اس جگہ یہ چیز باقی رہ گئی کہ صورتوں کی ایجاد کا معاملہ مکان اور تقدیر پر ہے اور تدلی اور شعائر کا امر مسلمات اور مشہودات پر اور ان امور پر جن سے اطمینان نفوس حاصل ہو، اسی لئے ہر ایک تدلی کے لئے اس کے مسلمات میں سے معدات کی حاجت اور ضرورت ہے کیونکہ تدلیات کا مقصود تو یہ ہے کہ بندے اپنے پروردگار کی عبادت اپنے

دل سے اس طرح کریں کہ اس سے زیادہ اطاعت کی گنجائش ہی باقی نہ رہے اس کے بعد اپنے اعضاء کو اس کے موافق عادی بنائیں لہٰذا جس وقت مقتضیات کا یہ تقاضہ ہو کہ انسان دس گز کا ہو تو ایسا ہی کیا جائے اس لئے کہ یہ چیز ممکن ہے اگرچہ مشہور نہیں ہے کہ اس سے قلوب مطمئن ہو جائیں لیکن شرائع اور تدلیات تو یہ تمام چیزیں مشہور اور مسلمات کے موافق ہیں ہاں اس مقام پر ایسی برکتیں ہیں جو سچ کو جھوٹ سے اور حق کو باطل سے جدا کر دیتی ہیں اور بسا اوقات تیرے دل میں یہ بات کھٹکتی ہوگی کہ ہر ایک تدلی کے لئے خرق عادات ہونا ضروری ہے تو یہ چیز مشہور کے کیسے موافق ہو سکتی ہے تو ہم کہتے ہیں کہ مجمل اور پیچیدہ امر پر ٹھہر نہ جاؤ بلکہ اس کی جستجو اور تلاش کرو کیونکہ شئی کی اصلیت اپنی عادت سے متجاوز نہیں ہو سکتی رسول فرشتہ نہیں ہو سکتا اور نہ کتاب آسمانی، عجمی اور نہ گھر نور کا بن سکتا ہے لیکن اس میں ایسی برکتیں ظاہر ہوتی ہیں کہ جن کا ظہور دوسری اشیاء میں نہیں ہوتا تو خرق عادات برکتوں کی وجہ سے ہوتا ہے اصلیت کی بنا پر نہیں اور کفار قریش اللہ تعالیٰ کی حکمت اور دونوں امروں میں فرق کو نہیں سمجھتے تھے تو وہ اعتراض کرتے تھے کہ رسول فرشتہ ہونا چاہیے اور کہتے تھے کہ یہ کیسا رسول ہے جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں پھرتا ہے اللہ تعالیٰ نے ان کے اس قول کی تردید فرمائی اور ان کے فاسد اعتقادات کی رسوائی کی اور اسی طرح رسول کے غلبہ کی یہ صورت نہیں ہے کہ فرشتہ اس کے ساتھ ہو جو رسالت کی گواہی دے یا آسمان سے کوئی ایسی کتاب نازل ہو جسے وہ اپنی آنکھوں سے دیکھیں جیسا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے سورۂ فرقان وغیرہ میں اس چیز کی تصریح کر دی ہے، بلکہ بادشاہوں کے غلبہ کی صورت جہاد اور لڑائیاں ہیں اور یہ ایسا مضمون ہے کہ جس کا وجدان نے حکم لگایا ہے کہ ہم نے قرآن وحدیث کو اس کا اور اس کی جزئیات کا بیان کرنے والا پایا ہے ایک مسئلہ میں نہیں بلکہ بہت سے مسائل میں، والحمد للہ اولا وآخراً۔

(۵) مشہد عظیم یعنی ملکہ دعا حاصل ہونے کے بعد داخلہ ملاء اعلیٰ

میرے دل میں ملاء اعلیٰ کی طرف سے ایسے اسرار عظیمہ کا القاء ہوا کہ میرا نفس اور روح ان سے لبریز ہو گیا، انہیں میں بالتفصیل بیان کرتا ہوں۔ لہٰذا تو انہیں مضبوطی کے ساتھ محفوظ کر لے جب تو ملاء اعلیٰ میں سے ان پر کمال حاصل کرنا چاہے جو کہ متخاصمین ہیں تو اس کے لئے بجز دعا اور

اللہ تعالیٰ سے عاجزی کرنا اور کمال عزیمت اور صدق کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے سوال کرنے کے اور کوئی چارۂ کار نہیں خصوصاً جس وقت تو اس سے اس چیز کے حاصل ہونے کا سوال کرے جس کا تو مشتاق ہے اور عقل اور طبیعت کے اعتبار سے اور اس میں تیرے لئے اور دوسرے انسانوں کے لئے کمال ہو اور عام اللہ تعالیٰ کی مخلوق پر مہربانی ہو غرضیکہ جب ملکہ دعا تیرے میں راسخ ہو جائے اور تو سمجھ لے کہ صدق ہمت کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے کیسے سوال کیا جاتا ہے تو اس وقت تیرا داخلہ ملاء اعلیٰ کے زمرہ میں ہو گیا اور اسی چیز کی جانب ہمارے سردار اور نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ جس شخص کے لئے دعاء کا دروازہ کھل جاتا ہے تو اس کے لئے جنت کا دروازہ کھل جاتا ہے یا رحمت کاملہ کا، اَوْ کَمَا قَالَ، اور جو شخص کہ ملاء سافل کے مقام کے حصول کا ارادہ رکھے تو اس کے لئے بجز بہت پاکیزہ رہنے اور پرانی مسجدوں میں نمازیں پڑھنے کہ جن میں اولیاء اللہ کی جماعتوں نے نمازیں پڑھی ہیں اور کوئی چارہ کار نہیں اور ایسے ہی کثرت سے نمازیں پڑھنا اور قرآن کریم کی تلاوت کرنے اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کا اس کے اسماء حسنیٰ کے ساتھ ذکر کرنا یا ان چالیس ناموں کے ساتھ جو کہ مشہور ہیں غرضیکہ یہ تمام باتیں مقاصد کے لئے رکن اول ہیں اور رکن ثانی امور مشکل میں استخارہ کرنا بایں طور پر کہ نفس کو کام کے کرنے اور نہ کرنے کی جانب متوجہ کرنے اس کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ سے سوال کرے کہ وہ جس چیز میں مصلحت ہو اسے ظاہر فرما دے کہ باوضو خاطر جمعی کے ساتھ بیٹھا رہے اور اس بات کا انتظار کرتا رہے کہ دونوں جانبوں میں سے کس پہلو پر قلب منشرح ہوتا ہے اور جسے اللہ تعالیٰ نے نماز کے نور کی فہم اور اسی طرح طہارت کے نور کی فہم عطا کی، بایں طور کہ جب وہ نماز نے سے رہ جائے یا بے وضو ہو جائے یا جنابت لاحق ہو جائے یا اس کے حواس ان رنگوں سے بھر جائیں جو کہ نظر آتے ہیں اور ان آوازوں سے جو کہ سننے میں آتی ہیں تو اُسے ایسی کیفیت لاحق ہوتی جسے وہ سمجھ جاتا ہے اور تمیز کر لیتا ہے اور اس سے اذیت پاتا اور کسی بھی حیلہ اور تدبیر کے ذریعہ اس سے نفرت کرتا ہے اس کے بعد جب وہ طہارت اور نماز اور اطمینان کے ساتھ ذکر کرنے میں مشغول ہوتا ہے تو اسے ایک عجیب کیفیت حاصل ہوتی ہے جسے وہ سمجھتا اور تمیز کرتا ہے اور اسے اچھا جانتا اور اس سے خوش ہوتا ہے اور یہ دونوں معلوم حالتیں جنہیں وہ تمیز کرتا ہے اور اس کے نزدیک ان کا مقام محسوسات کے طریقہ پر

ہو جاتا ہے تو یہی شخص ایسا مومن ہے کہ جسے ایمان حقیقی حاصل ہے اور اسی کو احسان سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اس میں کسی قسم کا شک نہیں اور جو شخص کہ دعا اور ذکر کے درمیان کیفیت حضور (قلبی) پائے اگر چہ وہ حضور قلبی کو الفاظ و حروف اور خیال کی بنا پر علیحدہ اور یکسو کرنے پر قادر نہیں مگر پھر بھی اس نے احسان کے باب میں جس چیز کا ارادہ کیا تھا، اسے پالیا۔

(۶) مشہد یعنی ایک غیبی اشارہ

میں نے ماہ صفر کی دسویں تاریخ ۱۱۴۴ھ ایک ہزار ایک سو چوالیس میں مکہ مکرمہ میں خواب دیکھا کہ امام حسنؓ اور حسینؓ میرے گھر تشریف لائے اور حضرت حسنؓ کے ہاتھ میں ایک قلم ہے جس کی نوک ٹوٹی ہوئی ہے، انہوں نے میری طرف ہاتھ بڑھایا تا کہ وہ قلم مجھے عنایت کریں اور فرمایا یہ ہمارے جد اکرم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قلم مبارک ہے، پھر فرمایا ذرا اسے حضرت حسینؓ ٹھیک کر دیں اس لئے کہ یہ ایسا نہیں ہے کہ جیسا حضرت حسینؓ نے سنوارا تھا۔ چنانچہ حضرت حسینؓ نے اس قلم کو لے لیا اور سنوار کر پھر مجھے عنایت کر دیا میں بہت خوش ہوا اس کے بعد دھاریدار چادر لائی گئی جس میں ایک سبز دھاری اور ایک سفید دھاری تھی اور ان دونوں کے سامنے رکھ دی گئی حضرت حسینؓ نے اس چادر کو اٹھایا اور فرمایا یہ میرے جد اکرم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر ہے اس کے بعد وہ مجھے اڑھا دی، میں نے اس چادر کو اپنے سر پر تعظیماً رکھا اور اللہ تعالیٰ کا شکر کیا پھر میری آنکھ کھل گئی۔

(۷) مشہد عظیم اور تحقیق شریف یعنی ایمان لانے کی قسمیں ہیں

یہ بات بخوبی سمجھ لینی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے جو چیز اپنے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمائی ہے، اس پر ایمان لانا دو قسم پر ہے ایک تو آدمی کا اپنے پروردگار کے دلائل پر ایمان لانا اور دوسرے غیب پر ایمان لانا سو جس شخص کا ایمان اپنے پروردگار کے دلائل پر ہو اس کی مثال ایسی ہے جیسا کہ کوئی شخص بادشاہ کے دربار میں حاضر ہو اور وہ بادشاہ اس وقت اپنے وزیر کو خلعت وزارت عطا کرے اور امور مملکت پر اسے قائم کرے اور اسے لوگوں کو ان اشیاء کے متعلق خبر دینے کے لئے

روانہ کرے اور اسے بھیج کر خفا کو دور کر دے اور اس کے ذریعہ سے لوگوں کو مکلف کر دے وہ شخص یہ سب کچھ دیکھ رہا ہے اور سن رہا ہے اس نے اپنی آنکھوں سے خلعت دینے کو دیکھا اور بادشاہ کے اس قول کو کانوں سے سنا اور اس کے قلب نے اس کے مکلف کرنے کو محفوظ رکھا تو یہ شخص اپنے حاضر ہونے کی وجہ سے وزیر نہیں ہوسکتا اور نہ ہی لوگوں کی طرف مبعوث ہوسکتا ہے لیکن ان دلائل کا مکلف اور دیکھنے کے ساتھ مامور ہو گیا اور ایمان بالغیب والے کی مثال اس شخص کے طریقہ پر ہے، جیسا کہ کسی اندھے کو ایک بینا نے آفتاب نکلنے کی خبر دی اس نے اس چیز پر اس طرح یقین کر لیا کہ اس کے دل میں اس کے متعلق کوئی نقیض پیدا نہیں کی اور کوئی ضعیف احتمال تک بھی نہ آیا لیکن اسے یقین ہے کہ آنکھوں والوں نے اس چیز کی حقیقت کی خبر بغیر دوسرے آنکھوں والے کے واسطہ سے دی ہے اور انسانوں میں کامل وہ ہے جسے دونوں قسم کا ایمان حاصل ہوا سے اس کے حق ہونے کا بغیر کسی واسطہ کے پہلے ہی سے یقین ہے چنانچہ اس ارتباط اور یقین سے اس پر وہ تمام علوم مترشح ہوتے ہیں، جو اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کرام پر نازل فرمائے ہیں چنانچہ اس نے ان پر یقین اور اطمینان کیا کیونکہ وہ اپنے پروردگار کی جانب سے دلائل پر قائم تھا تو اس ارتباط کے برابر کوئی ایسا فرمان نہیں جو اس کی حفاظت کرے اور اسے دونوں ہاتھوں سے روکے بجز اسبات کے کہ اسے اللہ تعالیٰ کی حفاظت اور اس کی عصمت اپنے روبرو محفوظ کئے ہوئے ہے چنانچہ وہ اس حفاظت کا احساس کرتا ہے اور جانتا ہے کہ اگر اس سے علیحدگی اختیار کی گئی تو جہنم کے علاوہ اور کوئی ٹھکانہ نہیں چنانچہ وہ اس کی وجہ سے علم الٰہی کا محقق ہے اور اس سے بڑھ کر اس کے لئے مقام تدلی حاصل ہے جو کہ عوام کے مقابل ہے اور جس کو کمال ایمان غیب اور حفاظت کرنے والی شریعت اور بواسطہ خبر کے یقین اور مخبر صادق کا پورا پورا اتقیاد اور اس سے کامل محبت ہو تو یہ دونوں ایمان کی قسمیں فرد انسانی کے لئے محقق ہیں، لیکن جس وقت پہلی قسم کے انوار روشن ہوتے ہیں تو دوسری قسم کے انوار چھپ جاتے ہیں اور میں ایک رات حرم میں تہجد پڑھ رہا تھا تو ایمان علی بینۃ کے انوار غالب آ گئے اور منور ہو گئے میں متحیر ہوا اور سوچا کہ ایمان بالغیب ہے تو اسے نہ پایا پھر غور کیا تو بھی اسے نہ پایا، حتیٰ کہ ایسا محسوس ہونے لگا کہ میں اس پر حسرت اور افسوس کر رہا ہوں اس کے بعد بھی یہ چیز مخفی رہی چنانچہ اس کے بعد ایمان بالبینۃ ظاہر ہوا اور میرا قلب مطمئن ہو گیا۔

(تحقیق شریف اولیاء اللہ کا الہام)

بہت اولیاء اللہ کو اسبات کا الہام ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم سے تکالیف شرعی کو معاف کر دیا اور تمہیں طاعات کے معاملہ میں اختیار ہے اگر چاہو کرو، ورنہ نہ کرو حضرت قبلہ والد محترمؒ نے مجھ سے اپنا واقعہ بیان کیا کہ انہیں بھی اس چیز کا الہام ہوا انھوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ تکلیف شرعی ان پر باقی رہے، اور انہوں نے شرع کے علاوہ اور کسی چیز کو پسند نہ کیا ان کا مسلک کسی سے اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے تکلیف شرعی کے ساقط ہونے کا نہ تھا جب تک کہ وہ عاقل اور بالغ ہو میں نے انہیں دیکھا کہ وہ الہام کو بھی حق سمجھتے تھے، اور اپنے مذہب کو بھی حق اور اس کی تطبیق میں متحیر تھے اور قبلہ عم محترمؒ نے بھی اپنا حال بیان کیا کہ انہیں اس بات کا الہام ہوا ہے کہ ان سے تکالیف شرعی معاف کر دی گئی اور ان سے کہا گیا کہ اگر جہنم کے خوف سے عبادت کرتے ہو تو ہم نے تمہیں نجات دی اور اگر جنت کی خواہش ملحوظ رکھتے ہوئے عبادت کرتے ہو تو ہم تم سے وعدہ کرتے ہیں کہ تمہیں جنت میں داخل کر دیں گے اور اگر ہماری رضامندی اور خوشنودی کے لئے عبادت کرتے ہو تو ہم تم سے راضی ہوگئے اس کے بعد پھر کبھی ناراض نہ ہوں گے انہوں نے عرض کیا اے پروردگار میں تیری عبادت تیری ذات کے علاوہ اور کسی چیز کے لئے نہیں کرتا، اور وہ قدس اللہ سرہ اس بات کی طرف مائل تھے کہ کاملین سے تکلیف معاف ہو جاتی ہے اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ ان پر فرمان شریعت ان کے اختیار کے بغیر قائم کر دیتا ہے اور یہی چیز بہت اولیاء اللہ سے منقول ہے اور میرے نزدیک اس میں یہ راز ہے کہ انسان جب ایمان بالغیب سے ان اصول شریعت کے ذریعہ ایمان علیٰ بینہ کی طرف منتقل ہوتا ہے اور عبادات اور نوامیس کو اپنے دل میں پاتا ہے، جیسا کہ بھوک اور پیاس اور وہ چیزیں کہ جن کے ترک پر قادر نہیں اور اس کے تکلیف کے وابستہ ہونے کے کوئی معنی نہیں اس لئے کہ یہ تو اس کی فطرت ہے کہ جس پر وہ پیدا ہوا ہے، برابر ہے کہ یہ سر اس پر روشن طریقہ پر واضح ہو جائے یا مجمل طریقہ پر کہ اس کے ذریعہ سے اس کے باطن پر اللہ تعالیٰ کا خطاب مترشح ہوتا رہے کہ مقصود اس کا اس سے یہ حالت اجمالیہ اور تفصیلہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے تکلیف کو ساقط کر دیا، اور اس نے اس کے بعد اپنے قصد اور اختیار سے تکلیف شرعیہ کو اختیار کیا اور

میرے نزدیک ان امور کی مثال خواب کی طرح ہے کہ جس کی تعبیر کی حاجت اور ضرورت ہے اور ان الہامات کی تعبیر ان مقامات کا حاصل ہونا ہے جو الہام کا مطلوب ہے اور میرے نزدیک یہ بات حق اور صحیح ہے، کہ تمام الہامات حق ہیں، لیکن بعض ان میں سے زبان خاص اور مطلوب خاص سے فائض ہیں اور بعض ان میں سے حاکم وقت کے حکم سے ہیں پہلے بعض مقامات کی موافقت کے تابع ہیں اور دوسری قسم تابع مطلق ہے، اور بعضے الہام تعبیر کے محتاج ہیں، ان کے لئے کامل معرفت والے شخص کا استنباط ضروری ہے اور بعضے محتاج تعبیر نہیں غرضیکہ ان امور میں غور وفکر سے کام لینا چاہیے۔

(۸) تحقیق شریف اور مشہد یعنی رحمت الٰہی کے بعد نفس پر کیا حالت طاری ہوتی ہے

یہ چیز بخوبی سمجھ لینی چاہیے، کہ ارواح جس وقت اجسام سے جدا ہوتی ہیں تو بہت سی چیزیں قوت بہیمیہ کی مضمحل ہو جاتی ہیں اور قوت ملکیہ قوی ہو جاتی ہے اور جو کمال حاصل کیا تھا، اس کے لئے اس میں استقلال پیدا ہو جاتا ہے اور اس کمال کی کئی شکلیں ہیں ان میں سے ایک اعمال کا نور ہے اور یہ اس وجہ سے کہ قوت ملکیہ جس وقت قوت بہیمیہ کو اعمال صالحہ میں سے کسی عمل کے کرنے کے متعلق الہام کرے تو قوت بہیمیہ اس کی مطیع بالکل اس کے تحت اور تصرف میں آ جاتی ہے تو اسے قوت ملکیہ کو خوشی لاحق ہوتی ہے اور قوت بہیمیہ کو قوت ملکیہ کے مناسب ایک کیفیت حاصل ہو جاتی ہے اور یہی قوت بہیمیہ قوت ملکیہ کا انتہائے کمال ہے اور جس وقت یہ امر یکے بعد دیگرے کئی مرتبہ حاصل ہوتا ہے تو قوت ملکیہ اور بہیمیہ میں یہ کمال حاصل ہو جاتا ہے اور یہ چیز اس نفس کے لئے ایسی عادت اور طبیعت ہو جاتی ہے کہ ابد تک اس سے جدا نہیں ہوتی اور انہیں کمالات میں سے ایک نور رحمت ہے اور یہ اس لئے کہ انسان جس وقت کوئی عمل کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے راضی اور خوش ہوتا اور اس بنا پر اس پر رحمتیں نازل کرتا ہے کہ اس وجہ سے تمام لوگوں کی سختی دور کرتا ہے یا اس بنا پر کہ یہ سبب ہوتا ہے اس چیز کے لئے جو کہ اللہ تعالیٰ نے خلقت پر اپنی تدلی کے پورا کرنے کا ارادہ فرمایا ہے یعنی ہدایت اور اشاعت نور یا اس نفس کے معدودات تدلی شمار ہونے کے

لئے بایں طور کہ نفس التفات کرے اور اپنی ہمت کی کوشش سے تدلی کی طرف مرتفع ہو اور اس میں داخل ہو جائے سو اس وقت یہ تینوں وجہیں جمع ہو جائیں یا ان میں سے ایک تو اس وقت رحمت الٰہی شامل حال ہوتی ہے تو اب آ کر نفس کے لئے انشراح ملکی اور انبساط حاصل ہوتا ہے اور بعض شکلیں ان میں سے یہ ہیں کہ انسان جس وقت اپنے رب کے جلال کو یاد کرتا ہے الفاظ یا باعتبار تخیلات کے جیسا کہ اشغال قلبیہ یا وہم سے جو عالم جبروت کا حال بتانے والا ہے اور یہ وہی چیز ہے جسے اکثر اہل زمانہ یادداشت کہتے ہیں یہ چیز نفس کو حاصل ہوتی ہے تو اس کا ایک ملکہ بسیط دوست ہو جاتا ہے اور ایسے ہی ایک رنگ جبروتی اور بہت حضرات اسے نور یادداشت سے تعبیر کرتے ہیں اور ان ہی میں سے ایک نور احوال ہے اور یہ اس وجہ سے کہ نفس جبکہ ان میں سے ہو جاتا ہے جو کہ تیزی کے ساتھ احوال بدلتے رہتے ہیں جیسا کہ خوف و رجاء، قلق اور شوق، انسیت اور ہیبت اور تعظیم وغیرہ تو اس کے جوہر کی صفائی اور رقت قوام خالص ہو جاتی ہے سو جس وقت وہ جسم سے دور ہو جائے اور ارادات متجددہ اسے گھیرے میں نہ لیں تو اس میں اسمائے الٰہی کے رنگ اور انوار منطبع ہو جاتے ہیں اور اسے کثیر لطافتیں حاصل ہوتی ہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ہر لطافت سے خوش ہوتا ہے اور یہی حالت اکثر روحوں کی ہے اور ان انوار کی بنا پر روح اس آئینہ کی طرح ہو جاتی ہے جو کہ دھوپ میں رکھا ہو کہ روشنی اور شعاعوں سے چمکتا ہو یا اس حوض کی طرح ہو جاتی ہے جو کہ پانی سے لبریز نہ ہو اور جس دن ہو سکون پر ہو، آفتاب کی شعاعیں اس پر پڑتی ہوں اور دوپہر کا وقت ہو اور پانی آفتاب کی روشنی سے چمک رہا ہو جب تو نے ہماری بیان کردہ بات جان لی اور اسے سمجھ لیا تو سمجھ کہ جس وقت میں نے شہدائے بدر کی زیارت کی اور میں ان کے مزاروں کے گرد کھڑا ہوا تو ان کے مزاروں سے یکبارگی میری طرف نور چمکا، جیسا کہ انوار محسوسہ حتی کہ میں تردد میں تھا کہ ان آنکھوں سے میں دیکھتا ہوں یا روح کی آنکھوں سے، اس کے بعد میں نے غور کیا کہ یہ کون سے انوار ہیں تو میں نے انہیں انوار رحمت پایا اور جس وقت میں نے اس مزار کی زیارت کی جو وادی صفراء میں ابوذرؓ کے مزار کے ساتھ مشہور ہے (حقیقت حال) سے اللہ تعالیٰ بخوبی واقف ہے اور ان کے مزار کے قریب بیٹھا اور ان کی روح کی جانب توجہ کی تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ ایک تیسری شب کا چاند ہے میں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ اس نور میں نور اعمال اور نور رحمت دونوں جمع تھے مگر

نو ر رحمت غالب اور بہت ظاہر تھا۔ اور میں اس سے پہلے مکہ معظمہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مولد مبارک میں ولادت کے روز حاضر تھا اور لوگ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیج رہے تھے اور آپ کے ان معجزات کا تذکرہ کر رہے تھے جو ولادت باسعادت کے وقت ظاہر ہوئے اور ان مشاہدات کو بیان کر رہے تھے جو بعثت سے پہلے ظاہر ہوئے تو میں نے دیکھا کہ اچانک بہت سے انوار ظاہر ہوئے میں نہیں کہہ سکتا کہ ان جسمانی آنکھوں سے دیکھا اور میں بیان نہیں کر سکتا کہ صرف روح کی آنکھوں سے اسکا مشاہدہ کیا واللہ اعلم کچھ نہیں بیان کیا جاسکتا کہ ان آنکھوں سے دیکھا یا روح کی آنکھوں سے، میں نے ان انوار کے متعلق بھی غور کیا تو معلوم ہوا کہ یہ نور ان فرشتوں کا ہے جو ایسی مجالس اور مشاہد پر موکل اور مقرر ہیں اور میں نے دیکھا کہ انوار ملائکہ اور انوار رحمت دونوں ملے ہوئے ہیں۔

(۹) مشاہد اجمالی، انبیاء کرام اپنی قبروں میں زندہ ہیں

جس وقت میں مدینہ منورہ حاضر ہوا اور روضۂ اقدس علی صاحبہا الف الف صلوٰۃ والف الف تسلیم کی زیارت سے مشرف ہوا تو میں نے روح مبارک ومقدس ﷺ کو ظاہراً اور عیاناً دیکھا نہ صرف عالم ارواح میں بلکہ عالم مثال میں ان آنکھوں سے قریب تو سمجھ گیا کہ یہ جو عوام میں مشہور ہے کہ حضور اکرم ﷺ نمازوں میں حاضر ہوتے ہیں اور لوگوں کی امامت فرماتے ہیں وغیرہ ذلک کہ یہ سب اسی وقیقہ کی باتیں ہیں اسی طرح اکثر لوگ کوئی بات زبان پر نہیں لاتے مگر جو انکی ارواح پر کسی علم کی وجہ سے مترشح ہوتو یہ چیز حقیقۃ ہو یا اس کی صورت پھر اسے ایک بیان کرتا ہے اور دوسرا اس چیز کو جسے اجمالی طور پر معلوم کیا، قبول کر لیتا ہے اور تیسرا سنتا ہے تو وہ اس کی وجہ سے تائید کرتا ہے اور چوتھا سنتا ہے تو وہ اس کے مناسب ایک اور صورت بیان کر دیتا ہے۔ اور اسی طرح سلسلہ چلتا رہتا ہے یہاں تک کہ لوگوں کی ایک جماعت اس پر متفق ہو جاتی ہے۔ اور ان کا اتفاق ایسے معاملات میں مہمل نہیں ہے لہذا تو ان مشہورات عوام کی تحقیر نہ کر مگر تو اس میں ان اسرار کو سمجھ جنہیں وہ بیان کرتے ہیں۔ اس کے بعد پھر میں روضۂ عالیہ مقدسہ کی طرف چند بار متوجہ ہوا تو رسول خدا ﷺ نے لطافت میں لطافت کے بعد ظہور فرمایا ہے تو بصورت عظمت اور ہیبت کہ افروز

ہوئے اور کبھی جذب ومحبت اور انسیت وانشراح کی شکل میں ظاہر ہوئے اور کبھی سریان کی شکل میں حتی کہ میں نے خیال کیا کہ تمام فضاء نبی اکرم ﷺ کی روح سے لبریز ہے اور روح اقدس ﷺ اس میں تیز ہوا کی طرح موجیں مار رہی ہے حتی کہ دیکھنے والے کو موجیں، ملاحظہ اقدس کی طرف نظر کرنے سے روک رہی تھیں اور میں نے نبی اکرم ﷺ کو آپ کی اصلی صورت کریمہ میں بار بار دیکھا باوجود یہ کہ میری تمنا اور آرزو تھی کہ روحانیت میں دیکھوں، نہ جسمانیت رسول اکرم ﷺ میں تو میری یہ بات سمجھ میں آئی کہ آپ کا خاصہ ہے روح کو صورت جسم ﷺ میں کرنا اور یہی وہ بات ہے کہ جس کی طرف آپ نے اپنے قول مبارک سے اشارہ فرمایا ہے کہ انبیاء کرام ﷺ کو موت نہیں آیا کرتی وہ اپنی قبروں میں نمازیں پڑھا کرتے اور حج کیا کرتے ہیں اور وہ زندہ ہوا کرتے ہیں اور جس وقت بھی میں نے آپ پر سلام بھیجا تو آپ مجھ سے خوش ہوئے اور انشراح فرمایا اور ظہور فرمایا یہ سب باتیں اس لئے ہیں کہ آپ رحمۃ للعالمین ہیں۔(۱)

(۱۰) مشہد یعنی شفاعت کا ثبوت

جب تیسرا روز ہوا تو میں نے آپ ﷺ پر اور آپ کے صاحبین یعنی ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ پر سلام بھیجا اور عرض کیا یا رسول اللہ ہمیں بھی ان علوم میں سے کچھ عنایت ہو جو کہ اللہ تعالی نے آپ کو عطا فرمائے ہیں ہم آپ کی عطاؤں کے شوق اور رغبت میں حاضر ہوئے ہیں اور آپ رحمۃ للعالمین ہیں، تو آپ نے میری جانب کمال التفات فرمایا حتی کہ میں نے خیال کیا کہ آپ کی عنایت کی چادر نے مجھے لپیٹ لیا اور گھیر لیا پھر مجھے خوب گھیر لیا اور مجھ پر اسرار و معارف کا اظہار فرمایا، اور بذات خود ان چیزوں کی معرفت کرائی اور میری ایک بہت بڑی اجمالی مدد فرمائی اور مجھے بتلا دیا کہ کس طرح اپنی حاجتوں میں آپ سے مدد کی درخواست کروں اور کس طرح آپ اس شخص کا جواب دیتے ہیں جو آپ پر درود بھیجے اور جو شخص کہ آپ کی مدح وتعریف میں کوشش اور الحاح کرے، اس سے آپ کس طرح خوش ہوتے ہیں سو میں نے آنحضرت ﷺ کو دیکھا کہ آپ اپنے جوہر روح اور عادات نفس اور حیات وفطرت کے باعث تدلی عظیم کے مظہر ہو گئے اور وہ چیزیں جو

(۱) یہی اہل سنت والجماعت کا مسلک ہے آپ حیات ہیں مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی نے اسی کی تصریح کی ہے (قاسمی)

بشر کے اوپر انبساط کر جاتی ہیں کہ جن میں ظاہر اور مظہر کی تمیز کرنا مشکل ہو جاتی ہے اور یہی وہ تدلی عظیم ہے جسے صوفیائے کرام حقیقت میں محمد یہ بولا کرتے ہیں اور یہی وہ تدلی ہے کہ جسے صوفیاء قطب الاقطاب اور نبی الانبیاء کہتے ہیں اور اس کی حقیقت اس تجلی کا صورت بشریہ میں ظاہر ہونا ہے سو جب کوئی حقیقت مثال میں خلعت کی جانب متوجہ ہو کر منعقد ہوتی ہے تو اس کا نام حقیقت محمدیہ قطب اور نبی رکھا جاتا ہے اور یہ اس شخص کے ساتھ اتحاد کرتی ہے جسے خلق کی طرف بھیجا جائے سو جب بعثت کا امر پایۂ تکمیل کو پہونچ جاتا ہے اور معبود کو اپنے رب کی رحمت کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور خلقت سے پشت پھیرتا ہے اور ہمارے سردار نبی اکرم ﷺ کی اصل بعثت میں یہ بات مندرج تھی کہ آپ قیامت کے دن شہید ہوں اور شفیع ہوں اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں گنہگاروں کے لئے اللہ تعالیٰ کے لطف وکرم سے عذر خواہ ہوں تاکہ نبی اکرم ﷺ سے ایک ہمت عظیمہ کا ظہور ہو جیسا کہ ان پر شمول رحمت مقتضی ہے اور ان کی قوت ملکیہ کو قوت بہیمیہ سے خالص کرنے کو تاکہ آپ کا وجود باجود ان لوگوں پر رحمت الٰہی کے نازل ہونے کا باعث ہو جیسا کہ تناسل کی قوتیں بقائے نوع کے واسطے ہر ایک نوع میں پیدا کی گئی ہیں اور اسی طرح ہر وہ چیز جو واقعات اور حوادثات کے پیش آجانے کے وقت معین ہو، یہی حال ہے کہ برابر نبی اکرم ﷺ خلق کی جانب متوجہ ہیں اور ان کی طرف رخ انور کئے ہوئے ہیں اسی بنا پر آپ اس حقیقت مثالیہ کے پائے جانے کے تمام انبیاء کرام سے زائد حقدار ہیں اور باوجود اسکے آپ کے ساتھ اس طرح متحد ہونے کے کہ ظاہر اور مظہر میں کوئی تمیز باقی نہیں رہی گویا بعینہ وہی ہے کہ حقیقت میں اس کے لئے جدائی ہی نہیں اور اس بیت مشہور کے معانی میں سے ایک معنی یہ بھی ہیں۔ (شعر)

افلت شموس الاولین وشمسنا

ابداً علی افق العلی لاتغرب

پہلے حضرات کے آفتاب چھپ گئے اور ہمارا آفتاب ہمیشہ بلندی آسمان پر تاباں رہیگا اس حقیقت سے آپ کے متحد ہونے کو میں نے اپنی روح کی آنکھ سے دیکھا اور اتحاد کا سبب میں نے اس سے معلوم کیا اور میں نے ہمیشہ نبی اکرم ﷺ کو اسی حالت واحدہ پر قائم دیکھا کہ وہاں سے آپ کو نہ تو کوئی ارادہ متجددہ ہٹا سکتا ہے نہ کوئی اور داعیہ ہاں جس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم مخلوق

کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو نہایت قریب ہو جاتے ہیں کہ انسان اپنی کوشش ہمت سے عرض کرے اور آپ اس کی مصیبت میں فریادرسی کریں یا اس پر ایسی برکتیں افاضہ فرمائیں کہ وہ خیال کرے کہ آپ صاحب ارادات متجددہ ہیں جیسا کہ کوئی شخص مظلومین اور محتاجوں کی فریادرسی میں مصروف ہو اور میں نے غور کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مذاہب اربعہ فقیہ میں کس کی جانب مائل ہیں، کہ میں بھی اسی مذہب کو اختیار کروں تو معلوم ہوا کہ سب مذاہب آپ کے نزدیک برابر ہیں، بایں طور فروع کا علم آپ کی روح مبارک کی عادات میں سے بھی نہیں ہے آپ کو جو ہر روح میں تو علم فروع کی اصلیت داخل ہے، اور نفوس بشر پر حق کی عنایت ہے ان کے اعمال اخلاق اور اصلاح کے اعتبار سے اور یہ ایک ایسی اصل ہے کہ جس کے فروغ اور صورتیں اختلاف زمانہ سے مختلف ہوتی رہتی ہیں لہذا جو روح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ اصلیت داخل ہے، یہی وجہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک سب مذہب برابر ہیں کہ ایک سے دوسرا جدا معلوم نہیں ہوتا اس لئے کہ ہر ایک مذہب ان مہمات اور وصول کو جو کہ دین محمدی صلی اللہ علیہ وسلم میں واجب اور ضروری ہیں حاوی ہوتا ہے اگرچہ مختلف ہوں سو اگر کوئی ایک مذہب کا متبع نہ ہو تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس سے ناراض نہیں ہیں، مگر اس شکل میں جبکہ دین میں اختلاف اور لوگوں میں جنگ وجدال اور باہمی فساد کا موجب ہو تو یہ امر آپ کی بہت سخت خفگی اور ناراضگی کا باعث ہے، اسی طرح میں نے دیکھا کہ تمام صوفیاء کے طریقے، مذاہب کی طرح آپکے نزدیک برابر ہیں اور اس کے ایک اور نکتہ سے آگاہ کرنا ضروری ہے وہ یہ کہ بعض آدمیوں کے یہ بات ذہن میں ہوتی ہے کہ فلاں مذہب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند ہے اور وہی حق اور مطلوب ہے پھر اس میں قصور ہوتا ہے تو اس کے دل میں یہ اعتقاد راسخ ہوتا ہے کہ میں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کا قصور کیا اس کے بعد وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں حاضر ہوتا ہے اور ٹھہرتا ہے تو اپنے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان دروازہ کو ایسا بند پاتا ہے کہ پھر وہ نہیں کھلتا تو کہتا ہے کہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا میری تقصیر پر عتاب ہے اور حقیقت یہ ہے کہ وہ آپ کی خدمت میں اس طرح حاضر ہوا کہ اس کا سینہ مخالفت اور کدورت سے لبریز ہے لہذا فیض کا دروازہ قابلیت کی خامی کی وجہ سے بند ہو گیا اور کبھی انسان خیال کرتا ہے کہ مذاہب مقررہ اور تقلید کو چھوڑنا یہ شرع کی پیروی اور

اللہ تعالیٰ کے حکم کی تابعداری کو چھوڑنا ہے اور اس کے نزدیک تقلید کے علاوہ اور کوئی مضبوط طریقہ نہیں اور اس سے اس کے نزدیک نکلنا انقیاد و شرع سے نکلنے کے برابر ہے، اس بنا پر وہ سمجھتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اس پر عتاب ہے اور اس کے علاوہ اور بہت سے شبہات ہیں جو طالب کو پیش آتے ہیں اور اسکے ساتھ ساتھ اس بات سے بھی آگاہ کر دینا ضروری ہے کہ جب لوگ مدینہ منورہ میں داخل ہوتے ہیں، اور وہاں کے لوگوں کے اعمال اپنے نزدیک برے دیکھتے ہیں یا وہ اعمال نفس الامر میں برے ہوتے ہیں تو ان سے بغض اور کینہ رکھتے ہیں اس کے بعد جب روضۂ اقدس پر حاضر ہوتے ہیں اور اس جانب توجہ کرتے ہیں اور صفائی اور خلوص کا وقت آتا ہے تو اس بغض اور کینہ سے تجلی ٹپکتی ہے تو ان کا حال مکدر ہو جاتا ہے، خبردار! خبردار اس نور اتم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسے امور روکتے ہیں اور میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو عظمتوں اور تشبیہ بالجبروت کا لباس پہنے ہوئے دیکھا اور آپ کی بہت سی لطافتیں ہیں آپ کے کمالات کے شمار اور تعداد کے مطابق اور لوگوں کے آپ کی طرف اپنی استعدادات سے متوجہ ہونے کے موافق اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان مجالس میں میری اجمالی مدد فرمائی کہ جن کی تفصیل مجددیت، وصایت اور قطب ارشادیت ہے اور مجھے قبولیت عطا ہوئی اور مجھے امام بنایا اور میرے طریقہ اور مذہب کو اصل اور فروع کے اعتبار سے درست فرمایا سب انسانوں کے لئے نہیں بلکہ مخصوص مخصوص حضرات کے لئے جن کی فطرت میں تحقیق ہے، مگر اس شرط کے ساتھ کہ یہ چیز اختلاف اور کشت وخون کا باعث نہ ہو اس نکتہ سے اس شخص کو جو کہ اصل اور فروع کے ساتھ ہمارا مذہب اختیار کرے، آگاہ ہونا واجب اور ضروری ہے اور ایسے ہی وہ شخص جو کہ ہمارے طریقۂ سلوک پر ہے اس کے بعد میں نے ارادہ کیا کہ آپ سے مبادی وجود اور مراتب جود اور فنا و بقاء دریافت کروں تو میں نے دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس تدلی مذکور کی طرف کلی طور پر متوجہ ہیں سو جب بھی میں اس بات کا ارادہ کرتا تھا کہ آپ سے کچھ دریافت کروں تو میرا استغراق آپ کیفیت حال کے دریافت کرنے سے روک دیتا ہے، اس کے بعد آپ نے مجھے بتلایا کہ میں آپ کے روبرو بیٹھوں اور اپنے رب سے اپنی اس زبان سے سوال کروں جو ملاء اعلیٰ کی طرف ہے تو مجھے نور نے لپیٹ لیا پھر سوال کیا پھر لپیٹ لیا پھر سوال کیا غرضیکہ اسی طرح اس کے بعد میرا سوال اور آپ کی ہمت علیا مختلط ہوگئی تب جا کر تیر نشانہ

پر پہونچ گیا اور میں نے دیکھا کہ آپ ایک حالت پر صورت کریمہ کے حفظ پر قرار کئے ہوئے ہیں، اور یہ کہ آپ محل راز کثیر الامت اور نگہبان اور تدلی مذکور کے ظرف خلق کی جانب متوجہ ہیں درانحالیکہ آپ عظمتوں کا لباس پہنے ہوئے ہیں اور اس میں قبول اور جذب اور الفت بے شمار ہے کہ جس کی انتہا دریافت نہیں کی جاسکتی، جس وقت کوئی انسان اپنی کوشش ہمت سے متوجہ ہو میری مراد فقط انسان عالی ہمت ہی نہیں ہے بلکہ ہر وہ روح والا شخص جو کسی شئے کا مشتاق اور آپ کی جانب اس شئے کے قصد اور شوق سے متوجہ ہو تو آپ اس کی طرف تدلی کرتے ہیں اور یہی رد سلام اور اجابت درود ہے یعنی اس فعل کی وجہ سے انسان کی ایسی حالت ہوتی ہے جو کہ قصد متجددہ کے شبیہ ہے اور میں تجھے ایک سر عظیم اور بتلادوں وہ یہ کہ اس نسمہ مبارکہ کو تدلی کے ظرف بنانے میں یہ حکمت ہے کہ اللہ تعالیٰ اہل زمین اور جوان سے بھی نیچے ہیں، بہت قریب ہو جائے اور یہ جود کامل نہیں ہوتا، مگر نسمہ کے توسط کے ساتھ اور میں نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا جو آپ پر درود بھیجے اور مدح کرتے تو بہت خوش ہوتے ہیں اور میں نے دیکھا کہ آپ ظاہری طور پر فیض صحبت پہونچانے والے ہیں جیسا کہ مشائخ صوفیہ کی مجالس افاضت میں اور میں آپ کے حضور میں ہوں جو بھی کچھ بیان کیا مشاہد میں سے صرف ایک مشہد ہے اور محمد عاشقؒ کو ایک سرّ عجیب خواب معلوم ہوا میں یقین کرتا ہوں کہ یہ حق کی طرف سے ہے وہ یہ کہ حج اور کمالات میں سے ایک پورا کمال ہے اور اسی وجہ سے حاجیوں کے دل میں بہت خوشی ہوتی ہے اور اس مسئلہ کا سرّ اور راز اللہ تبارک وتعالیٰ تک وصول ہے یہی کمال ہے کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کو قائم کر کے خلق کی طرف تدلی کی اور اسے شعائر اللہ میں سے ایک شعائر فرمایا تو باعتبار مسافت کے کعبہ تک وصول یہ اللہ تعالیٰ تک ہی وصول ہوا اور وصول الی اللہ کے بہت سے طریقے ہیں لیکن وصول بالمسافت وہ حج ہی سے کامل ہوتا ہے واللہ اعلم۔

(۱۱) مشہد یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رحمۃ للعالمین اور خاتم النبیین ہیں

میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس حدیث کا مطلب دریافت کیا کہ آدم علیہ السلام ابھی آب وگل ہی میں تھے اور میں نبی ہو چکا تھا اور میرا یہ سوال زبان کے مقال اور دل کے خطرات

سے نہ تھا بلکہ اس سرّ اور راز کی آرزو اور شوق سے میری روح لبریز تھی اس کے بعد میں آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم سے جس قدر قوت اور طاقت تھی، آپ کی صورت مثالیہ کے قریب ملا سو آپ نے مجھے اپنی وہ صورت کریمہ مثالیہ دکھائی جو پہلے عالم اجسام کے پائی جاتی تھی اس کے بعد مجھے عالم مثال سے اس عالم میں آنے کی کیفیت بتلائیں اور مجھے انبیاء ہعثین کی شکلیں بتلائیں اور کس طرح حضرت تدبیر سے ان پر نبوت کا افاضہ ہوا اس کے مقابلہ میں جو کہ آپ کو عالم مثال میں حضرت تدبیر سے ملا اور مجھے اولیاء اللہ کی صورتیں بتلائیں اور کیونکر انہیں علوم اور معارف حاصل ہوئے اس کے بعد میرے لئے اس چیز کی حقیقت واضح اور روشن ہوگئی اور مجھے صورت مثالیہ سے جو چیز ملی میں اس کے لئے ظرف ہوگیا اور میں نے اس چیز کو سمجھ لیا جو آپ نے اس افاضہ سے ارادہ فرمایا اب میں اپنی سمجھی ہوئی بات کو بیان کرتا ہوں معلوم کر لینا چاہیے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی تدلی عظیم خلق کی جانب متوجہ ہے اسی سے وہ ہدایت پاتے ہیں اور اسی کی طرف التجا کرتے ہیں اور اس تدلی کی ہر ایک دراز زمانہ میں ایک شان ہے جو کہ مخلوق کی طرف یکے بعد دیگرے ظہور کرتی رہتی ہے اور جب بھی کوئی ظہور ظاہر ہوتا ہے تو عالم میں اس ظہور کا ایک عنوان ہوتا ہے اور اس سے مراد وہ رسول ہے جو مخلوق کی طرف اوامر اور نواہی اور شریعت کے ساتھ مبعوث کیا جاتا ہے لہٰذا رسول اور وہ جو احکام لائے ہیں عنوان ہیں اور یہ ظہور حقیقت ہے سو جس وقت لوگوں میں کوئی ظہور ہوتا ہے تو علوم ومعارف اس ظہور کے مناسب ہوتے ہیں اگرچہ لوگ اس بات کو نہ سمجھیں کہ وہ اس ظہور سے فائض اور اس کے مناسب ہیں اور جن حضرات پر یہ علوم اور معارف ظاہر ہوتے ہیں اگر وہ ایسے لوگ ہیں کہ کلام رسول سے اس کا استنباط کر سکتے ہیں تو انہیں احبار اور رہبان کہتے ہیں اور اگر وہ لوگ ایسے نہیں ہیں مگر ان کی ہمتیں اللہ تبارک وتعالیٰ سے علم حاصل کرنے کیلئے ہیں تو انہیں حکمائے محدثین، اہل حکمت رہبانیہ بولتے ہیں۔ غرضیکہ دونوں جماعتیں اس ظہور سے فیضان پاتی ہیں خواہ اسے سمجھیں یا نہ سمجھیں اور یہ ہی بہت بڑا احسان ہے، اخبار رسول کی طرح اس کا حال نہیں ہے، کہ کوئی قوم اسے سنتی ہے اور کوئی قوم نہیں سنتی جس وقت اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کے پیدا کرنے کا ارادہ فرمایا اور یہ کہ وہ نوع بشر کے باپ ہوں تو آدم علیہ السلام کے پیدا کرنے کا ارادہ حقیقت میں نوع بشر کے پیدا کرنے کا ارادہ تھا تو ارواح بشریہ نے اس مثال کی طرف جو کہ اجسام کے

مناسب ہیں حرکت کی تو ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیکر یعنی پیکر مثالی بہت ممکن ہوا، اپنی ذات کی رو سے منطبق ہونے کو اس تدلی کے موافق ظہور کے ظہورات میں سے ہے چنانچہ اس پر یہ چیز باعتبار شبیہہ کے منطبق ہوگئی جیسا کہ کلی کا جزئی پر انطباق ہوا کرتا ہے اور یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی سابق عنایات ہیں آپ پر اور لوگوں پر تاکہ ایسا مددگار پایا جائے جو میدان حشر میں فیضان رحمت الٰہی کا معین ہو اور جب ان کو بہت سخت حاجت ہو تو وہ ان کی شریعت کو منعقد کرنے والا اور ان سے امراض فاسدہ کا دور کرنے والا ہو، سو یہی معنی ہیں، حضرت آدم سے پہلے ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی ہونے کے، اس کے بعد جب اشخاص بشری وجود میں آئے اور ان کے طریقے مختلف ہوئے کوئی افراط کرنے والا اور کوئی تفریط کرنے والا تو تدبیر الٰہی نے چاہا کہ ان کے کام میں اعتدال آجائے تو تدلی ان شخصوں میں سے ایک پر منطبق ہوئی اور وحی کی وہ باتیں ظاہر ہوئیں جس میں ان کی قوم کی صلاح اور درستگی ہو اور اس کی بعثت سے برزات میں سے ایک برزہ نے ظہور کیا تو منطبق اس نبی پر وہ وجود بشری ہی ہے اور وہ مثال میں حکایت کے طور پر تھا تاکہ اس چیز کے لئے مستعد ہو چنانچہ حسب استعداد اس پر اس چیز کا افاضہ کیا جا رہا ہے اور ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسی وقت بالفعل بہت منطبق تھے محض حکایتاً نہ تھے اس کے بعد جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خارج میں ظہور فرمایا تو برزات تدلی میں سے ایک برزہ ظاہر ہوا اور یہ برزہ قوت مثالیہ پر مشتمل تھا اور اس برزہ نے مثال کا لباس پہن کر آفاق کو صحیح اور درست کر دیا اور اس سے پہلے تدلی مثال کے لباس میں ظاہر نہ تھی اگرچہ نفس مثال کا وجود بہت ضروری تھا اور میرا مقصود یہ ہے کہ باعتبار اس تدلی کے ظاہر ہونے کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے اللہ تعالیٰ اور مخلوق کے درمیان کوئی مثال نہ تھی۔ لیکن بعد میں ہیکل مثالی تدلی سے تمام فضا اور آسمان اور زمینیں سب پُر ہوگئیں لہٰذا جس کسی کو بھی علم اور معرفت یا حال الٰہی اور کمال حاصل ہوا تو اس کا ماخذ یہی ہیکل مثالی ہے خواہ کوئی جانے یا نہ جانے چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہوگئے اور آپ کے بعد نبوت ختم ہوگئی اس لئے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقت جس وقت کو آپ مبعوث ہوئے عنوان نبوت کی طرح پر تھی اور یہی برزہ مثالیہ مستطیرہ ہے جب تم نے یہ بات سمجھ لی اور تمہارے سامنے یہ بات بھی ثابت ہوگئی کہ آپ رحمۃ للعالمین اور خاتم النبیین ہیں اور تمام انبیاء کرام کو فیض

اسی حضرۃ تدلی سے ہوا، اگر چہ وہ عالم اجسام میں تھے اور اولیاء کرام فیض اسی برزہ مثالیہ سے حاصل کرتے ہیں جو کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی حقیقت ہے، اور مجھ کو کوئی تمیز نہیں ہوا، کوئی ان اشخاص میں سے اس راز کا، مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کہ ان کی نبوت عالم روح میں انعقاد ضعیف کے ساتھ منعقد ہوئی تھی، یہ نسبت ہمارے نبی اکرم ﷺ کے انعقاد نبوت کے نتیجہ یہ ہوا کہ یہ تدلی بعثت برزہ روح ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ظہور برزہ مثالیہ سے ضعیف طور پر ظاہر ہوئی جو کہ ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت ظہور میں آئی تھی اور اسی وجہ سے آپ کے بعد کوئی کامل نبی اور نہ کوئی محدث پیدا ہوا مگر آپ کی ملت میں، اور نبوت بھی منقطع نہ ہوئی مگر جب ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو برزہ مثالیہ بہت منور طریقہ پر منور ہوا اور نبوت کلی طور پر ختم ہوگئی اور علوم و معارف کامل طور پر فیضان ہوئے اس لئے کہ وہ مثال میں اکثر طور پر منعقد تھے۔

تحقیق شریف یعنی ایک شبہ کا ازالہ

اگر تم دریافت کرو کہ کیا حکمت ہے کہ زمانہ سابق میں حضرت آدم علیہ السلام کے بعد لوگ کند ذہن، سرد طبائع اور بہائم سیرت ہوگئے، قلیل آدمیوں کے علاوہ کسی نے اس وقت ارتفاقات کا استنباط نہ کیا اور نہ علوم محاضرات طبیعہ اور الٰہیہ ان کو حاصل ہوئے مگر شاذ و نادر کو باوجود کہ عمریں بہت زائد پائیں اور غور و فکر بہت کیا پھر ابراہیم علیہ السلام کے بعد یہ چیز تھوڑی تھوڑی بڑھتی گئی، یونان و روم و فارس بنی اسرائیل اور مغرب اور عراق و عرب میں حتی کہ ہمارے سردار نبی صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے، تو پھر علوم کے دریا رواں ہوگئے، اور ان سے علوم حکمیہ کے چشمہ جاری ہوگئے اور فنون ادبیہ اور محاضریہ اور علوم شرعیہ بایں طور پر کہ جن کی نہ ابتدا ہے، اور نہ انتہا تو میں اس شبہ کا ازالہ کئے دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی ایک تدلی عظیم ہے جس سے تمام آسمان اور زمینیں پُر ہیں اور اس کی حقیقت شخص اکبر کو اپنے پروردگار کا پہچاننا ہے اس لئے کہ جب اس نے اپنے رب کو اس کی معرفت کے حق کے ساتھ پہچانا اور اس کے تصور کے حق کے ساتھ اس کا تصور کیا تو اس کے مدرکہ میں ایک صورت عالیہ منقش ہوگئی جو یاد دلائے اللہ تعالیٰ کے اس جلال اور عزت کو جو اس کے شایان ہے اور جب تک شخص اکبر ہے اسی وقت تک یہ شکل بھی قائم ہے اور وہ اللہ تعالیٰ پر منطبق

ہے اور وہ اس کی پورے طور پر یاد دلانے والی اور نفس الامر کے کلی طور پر موافق ہے اس کے بعد جب عناصر اور افلاک طبیعہ کلیہ میں پیدا ہوئے تو یہ طبیعہ کلیہ اسی صورت میں محفوظ تھی۔ جیسا کہ طبیعہ ارضیہ معدن روئیدگی حیوان اور انسان میں محفوظ ہے اور ان کے خواص اور مقتضیات اور قوی بھی اپنی ذات کے انحفاظ کے ساتھ محفوظ ہیں اس کے بعد جب معاون نباتات حیوانات اور انسان پائے گئے اور عناصر اور افلاک کی طبیعتیں محفوظ تھیں اور یہ چیزیں مرایا کے طور پر ہیں، افلاک وحرکات اور عناصر اور ان کی طبیعتوں کے خواص ظاہر ہونے کے لئے اور طبیعت کلیہ مع اپنے قویٰ کے افلاک اور عناصر میں محفوظ تھی چنانچہ ہر فرد انسانی کے اصل قلب اور جوہر نفس اور بنیاد تحقیق میں اپنے پروردگار کی معرفت تھی، مگر بہت سے پردوں اور حجابات میں پوشیدہ تھی، اس لئے کہ لوح نفس انسان سرمایہ ہے امہات اور مولدات کی طبائع میں سے ہر ایک طبیعت کے لئے حکم ظاہر کرنے کے لئے اور ان صورتوں کے بقدر لوح نفس انسانی کی صفائی ناقص ہو جاتی ہے اور اس تدلی کے نقطہ کا حکم پوشیدہ ہو جاتا ہے وہ تدلی جو ایسی ہے کہ جو شخص بھی اسے پکڑے تو اسے اپنے پروردگار کی معرفت حاصل ہو جاتی ہے لہٰذا یہی حجابات ہیں جو کہ ایک دوسرے پر پڑے ہوئے ہیں سو جس شخص کو حقیقت الحقائق پر تنبہ حاصل ہو گیا اور جان لیا اس نے اس تدلی کے اس انفساد کو جو کہ طبیعت کلیہ اور اس کے اجزاء کی طرف ہے تو اس کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے نور کی ایسی مثال ہے جیسا کہ ایک روشن چراغ جو شیشہ کی قندیل میں ہو کہ کل حجابات نور اصل اور اس کی روشنی سے روشن اور منور ہو گئے اور یہ حجابات اسے معرفت الٰہی میں بھی مفید ہوں گے اور جس شخص کو حقیقت الحقائق پر تنبہ حاصل نہ ہوا اور اس نے اس کے انفسارات کو نہ سمجھا تو اس کی سخت تاریکیوں کی مثال ہے جیسے ایک گہرے دریا کی اندھیریاں، موجیں مار رہی ہوں اس کی لہر پر لہر ہو اور اس کے اوپر بادل جب یہ تمہید ختم ہو چکی تو اب جان لینا چاہیے کہ معدات کے شمار کے مطابق یہ نقطہ ظاہر ہوتا ہے اور اس کے آثار نمایاں ہوتے ہیں اور جس قدر اعداد ظاہر کریں گے اسی طور پر ظہور بھی ظاہر اور صریح ہوگا اور معدات میں سے ملاء اعلیٰ بھی ہیں اور میرا مقصود اُن سے صرف فرشتہ نہیں ہیں بلکہ جو نفوس کاملہ جس وقت کہ ان کے بدن پر سے کثیف چادریں اتاری جاتی ہیں تو وہ ان سے زیادہ اعظم اور اشبہ ہیں، لہٰذا جس وقت کاملین میں سے کوئی انتقال کرتا ہے اور عام لوگ خیال کرنے لگتے ہیں کہ

وہ عالم میں سے ضائع ہوگیا تو یہ چیز ہرگز نہیں خدا کی قسم وہ گم نہیں ہوا بلکہ اس نے نجات اور قوت حاصل کی، کیونکہ ملاء اعلیٰ کے ہر سردار کو حجاب متراکمہ قطع کرنے اور اس تدلی تک پہونچنے کی توفیق دی جاتی ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس تدلی کی ایک موج اس نفس کے شرجہ(۱) میں داخل ہوتی ہے جس کی بنا پر نفس اللہ تعالیٰ کی معرفت سے لبریز ہوجاتا ہے پھر وہ موج اس تدلی کی جانب عود کرتی ہے اس کے بعد اس تدلی کی وجہ سے دوسری تدلی ثابت ہوتی ہے اس چیز کی طرف جو کہ قریب ہے ان چیزوں سے جو نفوس بشریہ میں ہیں اور عالم نفوس کو ان معرفت کے افاضہ کے قریب کرنے کے لئے آمادہ کرتا ہے اور اسی طرح ملاء اعلیٰ کے انوار متراکم ہوتے اور ان کے اعداد بڑھتے جاتے ہیں بعض سافل کے اور بعض ان دونوں کے درمیان، بالآخر وہ فضا لبریز ہوجاتی ہے جو ان نفوس کی زمین اور اس معرفت کے آسمان کے درمیان ہے اسی واسطے کاملین کی معرفت اخیر زمانہ میں پہلے سے زائد سریع اور صریح ہوتی ہے اور اسی دقیقہ کی طرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے فرمان سے اشارہ فرمایا ہے کہ جس وقت قیامت کا زمانہ قریب ہوجائے گا تو مومن کے خواب جھوٹے نہ ہوں گے اور اسی طرح طبیعت عرشیہ میں علوم ارتفاقات انسانیت موضوع ہیں بلکہ ہر نوع کے ارتفاقات نہیں بلکہ تمام نفوس اور انواع کے احکام سو جو کوئی بھی استخراج ارتفاقات میں فائق اور کامل ہوا اس نے یہیں سے فیض حاصل کیا اور جب یہ فیض اس کے قلب میں راسخ ہوگیا تو اس نے اپنے منبع کی طرف عود کیا تو اس طبیعت کے لئے اس کے اس کمال کی بنا پر تمام نفوس بشریہ کی طرف تدلی ظاہر ہوگئی اور ان علوم کا منقش ہوجانا اس کے لئے آسان ہوگیا چنانچہ جس وقت وہ کامل انتقال کرتا ہے تو اس کی ذات اور اس کا فضل و کمال ضائع نہیں ہوتا اور نہ یہ شرجہ بلکہ سب بحال خود رہتے ہیں اور نفوس کے بعض افراد بعض کے لئے معد ہوتے ہیں اور اس کی تشخص واحد کے ساتھ نسبت جو طبیعت انسانیہ میں متجسد فی المثال ہے، ایسی ہے جیسا کہ قوی اور خیالی صورتوں کی نسبت اور جیسا کہ مقدمات فکر یہ فیضان نتیجہ کے لئے معد ہوتی ہیں اسی طرح نفوس زکیہ تمام انسانوں کی پاکی اور صفائی کے لئے معد ہوتے ہیں اور یہ معرفت ان معانی میں سے ایک معانی ہے

---

(۱) شرجہ: پانی کی نالی جو میدان کی طرف جاری ہو، وہ گڑھا جس میں کھال بچھا کر اس سے اونٹوں کو پانی پلایا جائے۔ مراد سالک کی ذات!(قاسمی)

جو کہ قصیدہ لامیہ میں مذکور ہیں کہ

شهدت تداويرا لوجود جميعها
تدور كما دار الرحى المتمائل

(۱۲) مشاہد اخری آنحضرت ﷺ کو تمام انبیاء کرام پر فوقیت حاصل ہے

علی الاجمال جب بھی میں روضۂ اطہر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی جانب متوجہ ہوا تو آپ کو حاضر دیکھا یا یہ کہ میری روح کی آنکھ کھل گئی تو میں نے جیسا کہ آپ ہیں اسی طرح دیکھا اور یا میرا نفس اس سے بہت زیادہ متاثر ہوا۔ تو یہ ایک اثر آپ کا حاکی ہے غرضیکہ ایک روز میں آپ کی طرف متوجہ ہوا اور میرا نفس اس چیز کی حقیقت ظاہر ہونے کی وجہ سے جس سے میں خاص ہو، آپ کے شوق سے لبریز تھا۔ یعنی مراتب جود کے معارف اور استنباط معارف شرائع نفوس کی حالت دریافت کرنے کی وجہ سے تو میرا نفس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نفس مبارک سے قریب اور ان کے علوم کی خوشی اور سرور سے لبریز ہو گیا اور ایک روز مجھ پر نظر حق کا افاضہ ہوا اور وہ ایک شئے ہے جس کی بناء پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اور تمام انبیاء سے خصوصیت حاصل ہے اس ہیکل تدلی کی وجہ سے جو کچھ کہ ہم بیان کر چکے ہیں اور اس کا خاص ہونا اور ان کا ناسوت کی طرف اس کے انتقال سے منتقل ہونا غرضیکہ میں بہت شدت کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف متوجہ ہوا تو میرے نفس میں اس نظر کا لون منطبع ہوا تو میں نے پہچانا گویا کہ اس وقت میرے نفس پر اللہ تبارک وتعالیٰ نظر کر رہا ہے اور میں نے یقین کیا کہ اس نظر کے خواص میں سے ہے، کہ ایسا شخص جس مکان میں بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کا ذکر کرے تو تمام آسمان اور زمینیں اس کی پیروی کرتی ہیں خصوصاً اجزاء زمین نیچے تک اور فضا و ہوا کے اجزاء ساتویں آسمان بلکہ عرش تک اور جس وقت اس انسان کو اس پر قرار حاصل ہو تو وہ قطب ہو جاتا ہے اور میں نے افاضہ کے وقت یہ بات سمجھی کہ یہ منطبع ہونا اور انطباعات کے طریقہ پر نہیں بلکہ یہ تو جو ہر روح اور طبیعت نفس میں داخل ہے اور ایک روز میری طرف ایک ایسا نور ظاہر ہوا جیسا ملاء سافل والوں کی صورت ہے اور میں نے دیکھا کہ وہ روضۂ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک چشمہ کی طرح شدت کے ساتھ جوش مار رہا ہے۔

(۱۴) مشہد یعنی روضہ اطہر اور منبر مبارک کے انوار اور برکات

ایک روز میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مصلّٰی میں جو کہ قبر مبارک اور منبر کے درمیان ہے چاشت کی نماز پڑھ رہا تھا، یکا یک اسرار نے مجھ پر تجلی کی جن کی اصلیت کو کعبہ کی حقیقت سے میں نے استفادہ کیا اور یہی ملاء اعلیٰ کا قرب اور تمام عبادتوں کا مغز ہے تو اس وقت میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کا مطلب سمجھا کہ **اما السجود فاجتهدوا فی الدعاء** اور آپ نے جو اپنے بعض اصحاب سے فرمایا **اعنی علی نفسک بکثرۃ السجود** یہ قرب نہیں حاصل ہوتا مگر تضرع اور زاری اور الحاح کے ساتھ دعا کرنے اور مولیٰ کے روبرو سر جھکانے اور اس کے دروازہ پر ناک رگڑنے اور اس کا آستانہ پکڑنے سے اور یہ چیز نہیں حاصل ہوتی تاوقتیکہ سجدے میں پڑ کر کوشش کے ساتھ دعا نہ کرے اس لئے کہ سجدہ اس تقرب کے لئے ایک ذریعہ ہے اور ہر ایک ذریعہ کے لئے اس کی حقیقت کی طرف اس کے جوہر میں سے ایک شارع ہے اور رحمت عامہ جس وقت بشر کی طرف متوجہ ہوتی اور ان پر افاضہ کا ارادہ کرتی ہے تو اس کی خوشبوؤں کا پیش آنا اور اس کے حلول کا متمکن ہونا اور اس کی تحقیق کا آمادہ ہونا مدد ہو جاتا ہے اس رحمت کا اور اس کی مراد پورا ہونے کا سبب ہو جاتا ہے اور کیونکہ سجدہ نفحات رحمت کے پیش آنے کے زیادہ قریب تھا اسی واسطے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کثرت سجود کا خاص طور پر حکم فرمایا ہے اور اسی طرح مجھ پر آپ کے اس فرمان کی حقیقت ظاہر ہوئی کہ آپ نے فرمایا کیا تمہیں چودھویں رات کے چاند دیکھنے میں کوئی تکلف ہوتا ہے، حاضرین نے جواب دیا نہیں آپ نے فرمایا تو پھر اسی طرح تم اپنے پروردگار دیکھو گے، لہٰذا سورج نکلنے سے پہلے کی نماز اور غروب ہونے سے پہلی نماز کو نہ فوت ہونے دو، اور وہ حقیقت یہ ہے کہ قیامت کے دن جو تدلی جلوہ کرے گی وہ وہی ہوگی جو نمازی کے سامنے نماز پڑھنے کے وقت ہوتی ہے اور یہ وہی چیز ہے نماز میں بندہ کی مقاسم اور مجاذب ہوتی ہے لیکن پردۂ بدن انسان کو روح کی آنکھ سے دیکھنے نہیں دیتا اور روح کی آنکھ بدن کی آنکھ پر غالب نہیں آتی، سو جب قیامت کا دن ہوگا اور پردے مرتفع ہو جائیں گے، تو روح کی آنکھ مستقل ہو جائے گی اور جسم کی آنکھ پیچھے رہ جائے گی اور عالم آخرت نشأۃ دنیا کا بقایا ہے، اور کچھ فرق نہیں۔ روح کی آنکھ سے دیکھنے سے جو دنیا میں سب کو حاصل ہو جاتی ہے اور آخرت میں یہ چیز مسلمانوں کے لئے

عام ہو جائے گی، مگر پردہ کی آنکھ اُٹھ جانے سے اس کے بعد میں نے ہر ایک آیت اور حدیث کو اسرار کا ایک دریائے موج دیکھا کہ اگر ان میں سے ایک کی بھی شرح لکھی جائے تو بہت سی جلدوں میں نہ آئے اور میں نے اسرار خفیہ کو دیکھا کہ اشارات قرآن کریم اور حدیث شریف میں محفوظ ہیں تو میں بہت متعجب ہوا اس کے بعد مجھ پر تدلی اعظم جلوہ گر ہوئی، اسے میں نے دیکھا تو اس کی کوئی حد ہی نہیں ہے اور میں نے اپنے نفس کو غیر متناہی دیکھا اور میں نے معلوم کیا کہ ایک غیر متناہی کے مقابل ہے میں وہ سب نگل گیا، اس میں سے ایک ذرہ بھی نہیں چھوڑا اس کے بعد میں نے اپنے نفس کی طرف رجوع کیا اور اس کی عظمت اور بزرگی کی وسعت سے متحیر ہوا پھر وہ تدلی اعظم مجھ سے پوشیدہ ہو گئی اور اس وقت میں نور سے بھرا ہوا تھا جو میرے اوپر اور نیچے اور میرے دائیں اور بائیں سے پڑ رہا ہے، بلکہ میں نے اسے دیکھا کہ میرے قلب اور میری آنکھوں سے میرے ہاتھوں بلکہ میرے تمام اعضاء سے نکل رہا ہے اور یہ اس مشہد کا آخری حصہ ہے۔

(۱۴) مشہد آخر یعنی روح مبارک ﷺ کی عظمت

ہیکل مثالی مجھ سے غائب ہو گئی اور مجھ پر روح مبارک صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقت ظاہر ہوئی جو کہ ان ملبوسہ لباسوں سے مجرد اور پاک تھی حتی کہ بعض اجزاء نسمہ بھی اور میں نے اس وقت اس طرح پایا جیسا کہ پہلے بعض ارواح اولیاء متقدمین کو پایا تھا، اس کے بعد میری روح سے ایک صورت متجردہ اس کی شکل کی پیدا ہوئی اور میں نے انجذاب اور بلندی کا اس قدر مشاہدہ کیا کہ زبان اس کی توصیف پر قادر نہیں۔

(۱۵) مشہد آخر (۱)

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے استفادہ کیا حتی کہ میرا نفس وسیع ہو گیا یہاں تک کہ میں آپ کی اس وراثت کی بنا پر لاحق ہو گیا۔ تدلی اعظم کی برزہ (۲) مثالیہ کو جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے منتقل ہونے کے ساتھ ناسوت کی طرف منتقل ہو گیا اور میں متصل ہوا اور پہونچا اور مل گیا،

(۱) یعنی شاہ ولی اللہ آخری نقاط علم ہیں۔ (قاسمی)

(۲) برزہ: گمان و پوشیدگی کے بعد ظاہر ہونا۔ فضیلت و شجاعت میں اپنے ساتھیوں پر فوقیت حاصل کرنا۔ (قاسمی)

اس برزہ کے ساتھ بایں طور کہ تو مجھے دو حالتوں اور شکلوں میں ایک حالت خیال کرے کہ ایک ان میں سے اتم اور اعم ہے اور قریب ہے حضرت وجود خارجی سے اور دوسری حالت کی پہلی حالت سے ایسی نسبت ہے جیسا کہ مذاہب تخریج کرنے والے کی صاحب مذاہب سے کہ وہ حضرت وجود علمی کے قریب ہے اور اس وقت میرا نام زکی اور آخری نقاط علم رکھا گیا اور اس وقت میں نے معلوم کر لیا کہ جو اس برزہ سے مخلوط ہوا اور اس تک پہونچے جیسا کہ میں مخلوط ہوا اور پہونچا یعنی اس کی جو ہر روح میں داخل ہو گیا تو یہ چیز یادداشت کے داخل ہونے کے طور پر ہے جو ہر نفس میں بایں طور کہ اس سے وہ نقطہ کھل جاتا ہے جہاں نفس آ کر حاصل ہوا ہے سو اس مقام کے شعبوں میں سے مجددیت وصایت، قطبیت اور امامت طریق ہے اور یہ بات اس وقت حاصل ہوتی ہے جبکہ اپنے بعد کلمہ باقیہ کا مصداق ہو، غرضیکہ اسرار عمیق ہیں غور سے کام لینا چاہیے۔

(۱۶) مشہد آخر یعنی حقیقت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم

میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کھڑا ہوا اور آپ کو سلام کیا اور کمال عاجزی سے آپ کے حضور میں ہاتھ پھیلائے اور اپنی روح کو آپ کی جانب متوجہ کیا آپ کی روح مبارک سے انوار چمکے تو میری روح نے بہت اچھے طریقہ پر ایک لحہ یا اس کے قریب میں اس سے ملاقات کی، میں متعجب ہوا کہ کس قدر روح نے جلد ملاقات کی اور اصل اور فرع اور تمام اطراف کو ایک آن بلکہ اس سے بھی کم میں احاطہ کر لیا اور یہ انوار اس جبل ممدود کی تجلی ہے جس سے تمام عالم بندھا ہوا ہے اور میں نے دیکھا کہ یہ تجلی آپ کے جو ہر روح مبارک میں داخل ہے اور اصل اس جبل ممدود کی تدبیر واحد ہے جو کہ اس مبداء سے فائض ہے کہ جس کی تفصیل تمام عالم ہے اور جبل ممدود کی فروع وہ تدبیرات تفصلیہ ہیں کہ جن سے تمام عالم قائم ہے اور میں نے یہ چیز بھی دریافت کر لی کہ یہ جبل ممدود حقیقت محمدیہ کی حقیقت ہے اور اسی سے ہر ایک قطب، محدث اور نبی متکلم کو حصہ ملا ہے، واللہ اعلم۔

(۱۷) مشاہد (۱)

مجھے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سالک بنایا اور آپ نے خود میری تربیت فرمائی لہٰذا

(1) شاہ صاحب کا سالک بننا۔

میں کسی واسطے کے بغیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شاگرد ہوں اور اویسی ہوں اور یہ بات اس بناء پر ہے کہ آپ نے اپنی روح مکرمہ مجھے دکھلائی اور اس سے مجھے عارف بنایا کیونکہ معرفت مفیض کے افاضہ سے پیشتر ہی میرے نزدیک آپ کی روح مبارک اعرف الاشیاء ہے حتی کہ محسوسات میں بھی۔ غرضیکہ سلوک کے ابتدائی مراحل یہ ہیں کہ آپ نے سب سے پہلے مجھ پر تجلیات حق میں سے ایک تجلی کا افاضہ کیا اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود باوجود سے ایک برزہ مثالیہ کا ظاہر ہونا ہے چنانچہ میں نے اس تجلی کو اپنے جو ہر روح سے قبول کیا، اور اس میں مستغرق ہو گیا اور فنا ہو گیا۔ اس کے بعد میں اس سے متحقق ہوا اور مجھے بقا حاصل ہو گئی اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ ایک اور تجلی افاضہ فرمائی کہ وہ اس برزہ مذکورہ کی اصل ہے، اور وہ عالم میں اصل افعال حق کا ایک نقطہ فرد ہے اور اللہ کی تدبیرات کا عالم میں اصل ہے، اس کو بھی میں نے قبول کیا اور اس میں فنا ہوا اور اس سے بقا حاصل ہوئی اس کے بعد تیسری مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر نقطۂ ذات کو افاضہ فرمایا کچھ لون جبروتی کے ساتھ اسے میں نے قبول کیا اور میں فانی اور باقی ہوا پھر چوتھی مرتبہ اس نقطہ کا افاضہ فرمایا جو روحانیت میں منعقد ہے اس سے نہایت کا اندراج ہدایت میں ہوتا ہے چنانچہ اسے بھی میں قبول کر کے فانی اور باقی ہو گیا پھر پانچویں مرتبہ مجھے نقطۂ احوال نسمہ کی معرفت کرائی اور اس نقطہ کی کیفیات اس نقطۂ روحانیہ کے محاذی ہیں گویا کہ یہ وہی شئے ہے، تو میں نے معلوم کیا کہ جو اسے حاصل کرے تو اس کی تاثیر اس کے شاگرد پر قوی ہے، اور یہ عزم اور جرأت کے مشابہ ہے میرا مقصود اس سے کسی شی کا عزم اور کسی چیز پر جرأت نہیں ہے بلکہ نفس عزم اور نفس جرأت میرا مقصود ہے تو اس وقت صعود اور ہبوط سب تام ہو گیا یہ ایک مختصر سا سلوک ہے، جو جذب کے مشابہ ہے اور انبیاء کرام علیہم السلام کے احوال کے بہت مشابہ ہے۔

(۱۸) مشہد آخر

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مجھے بواسطۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے راستہ پر سلوک کا طریقہ عطاء کیا، اور آپ کی روح کریمہ اس عطا کا سبب ہوئی اور مجھے اس شئے کی حقیقت پر بھی مطلع کیا جو مجھے عنایت کی ہے تو میں نے اسے اس کی معرفت کے حقوق کے پیش نظر پہچان لیا اور میں

نے جان لیا کہ یہ اس کے طریق فی السلوک کی ایک شکل ہے اور اس کا عین نہیں اور عنقریب میں تم سے بعض معرفتین بیان کروں گا۔ والحمد للہ رب العالمین۔

حقیقت طریق

بخوبی سمجھ لینا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اپنے برگزیدہ بندوں میں سے جس پر احسان کا ارادہ فرماتا ہے تو اسے سلوک کا راستہ عطا فرماتا ہے اور بہت سے عارف اس نکتہ کو کما حقہ سمجھنے سے عاجز ہیں اور بسا اوقات اللہ تعالیٰ اسے ذکر وفکر پر مطلع کرتا ہے کہ جس سے سالک فنا اور بقاء کو پہونچ جاتا ہے اور کہنے لگتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے سلوک کا راستہ عطا فرمایا اور وہ سالک اس قول میں اپنے گمان کے موافق سچا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ طریقت اس ذکر اور فکر کا نام نہیں بلکہ وہ ایسی حقیقت ہے جو ملاء اعلیٰ میں منعقد ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کا آسمانوں پر سے حکم کرتا ہے تو وہ حکم ملاء اعلیٰ پر نازل ہوتا اور وہاں ٹھہرتا ہے اس کے بعد احکامات عالم ناسوت میں اس کے مطابق نازل ہوتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ کا ملاء اعلیٰ میں ایک داعیہ ہے کہ ہمیشہ ناسوت میں اس کی صورت وحقیقت اور مقام رہتا ہے جب تک کہ وہ موجود ہوتا ہے اور جس وقت طریقہ منسوخ ہوجاتا ہے اور وہ داعیہ ختم ہوجاتا ہے تو انسانوں میں اس کی صورت حقیقت اور مقام کچھ نظر نہیں آتا، سو اگر تمام زمین والے اس بات پر متفق ہوجائیں کہ اس حافظہ کو جسے ہم نے بیان کیا معدوم کردیں اور برابر اس سے اور اس کے محافظین سے مقاتلہ کرتے رہیں تو ایسا ہرگز نہیں کرسکتے جب تک کہ وہ داعیہ موجود ہے اور اسی طرح اگر تمام اہل زمین مل کر اس کجی کو ٹھیک کرنا چاہیں اور اس کے اس فساد کو جو فطرت اور اضمحلال کے وقت واقع ہوا ہے، درست کرنا چاہیں تو اس وقت انہیں اس چیز پر قدرت نہیں حاصل ہوسکتی اور اس کی مثال آسمان کے ستاروں کے طریقہ پر ہے کہ ہمیشہ ان کا عکس حوضوں اور تالابوں میں پڑتا ہے، کسی بشر کی طاقت ہی نہیں کہ پانی کو ان کے عکس پڑنے سے روکے سو وہ داعیہ وہ ایک الہٰی طریقہ ہے جس وقت تک کہ اللہ تعالیٰ کسی بندہ کے لئے اس کا ارادہ فرمائے تو اس کے لئے یہ طریقہ فیصل ہوچکا، اس کے بعد اس حقیقت منعقدہ اور اس کے اجزاء اور ارکان کی تشریح کا بیان ممکن نہیں مگر ذہین اور تیز فہم انسان کے لئے اور میرے پروردگار نے جو باتیں مجھے سمجھائیں ہیں، یہ ہیں کہ

آسمان اول کے ذریعہ نقلیں اور توسطات اور لباس آتے ہیں اور دوسرے آسمان سے قواعد منضبطہ تو وہ لکھی جاتی ہیں اور محفوظ کر لی جاتی اور جانی جاتی ہیں اور بزرگوں کے واسطہ سے نقل ہوتی چلی آتی ہیں اور ان سے سینوں کو عظمت حاصل ہوتی ہے اور صحیفے ان سے پُر ہوتے ہیں، اور تیسرے آسمان سے لون طبعی کہ وہ طبیعت ہو جاتا ہے اور اس کی طرف طبیعتیں مائل ہوتی ہیں اور لوگوں کی حمیت اس سے جوش میں آتی ہے اور وہ اس کی حمایت اور مدد کرتی ہیں اور اس کے اغیار سے جھگڑا کرتی ہیں، اور اسے جان و مال اور اولاد کی طرح محبوب رکھتی ہیں اور چوتھے آسمان سے غلبہ اور قوت اور تسخیر کہ اس سے بڑے اور چھوٹے علماء اور امراء مسخر ہوتے ہیں اور پانچویں آسمان سے مغلوبیت اور شدت کہ جو شخص ان چیزوں کا انکار کرے تو اسے شدائد میں گرفتار کر دیا جاتا ہے اور اس پر بلائیں نازل ہوتی ہیں اور وہ ملعون ہو جاتا ہے اور عذاب میں مبتلا ہو جاتا ہے گویا کہ کوئی غیبی طور پر اس کا مددگار ہے اور چھٹے آسمان سے ہدایت معظمہ نازل ہوتی ہے جو لوگوں کی ہدایت اور کمال حاصل کرنے کا سبب ہوتی ہے اور ساتویں آسمان سے شرف دائمی نازل ہوتا ہے جو پتھر کی لکیر کی طرح ہے اور کبھی نہیں مٹتا تاوقتیکہ وہ پتھر پارہ پارہ اور ریزہ ریزہ نہ ہو جائے تو یہ سات ارکان ہیں جو ملاء اعلیٰ میں آ کر مل جاتے ہیں تو ان کا ایک مستوی جسم بن جاتا ہے پھر اس جسم میں تدلی اعظم سے ایک جذبہ پھونکا جاتا ہے جو کہ بمنزلہ روح کے ہوتا ہے اس جسم میں لہٰذا جو شخص ان اذکار اور افکار سے آراستہ ہو جائے اور اس حالت کو اختیار کرے تو اس کی جانب رحمت الٰہی متوجہ ہوتی ہے اور اس کے اوپر اور نیچے سے جذب آتا ہے اور ایسے ہی دائیں اور بائیں اور ان مقامات سے کہ جہاں سے اس کا گمان نہ ہو تو پھر اس طفل کی، سادات ملاء اعلیٰ تربیت کرتے ہیں اور ملاء سافل اس کی خدمت کرتے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہمیشہ اس کا معاملہ پختہ اور اس کی شان بڑھتی رہتی ہے تاوقتیکہ حکم الٰہی اس کے متعلق نہ آئے، سو یہی طریقت ہے اور اسی پر مذہب کو اصول اور فروع میں قیاس کر لو، اب اس کے بعد جو شخص بھی دعوی کرے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے طریقت اور مذہب عطا کیا اور اسے وہ چیزیں نہ عطا ہوئی ہوں جو کہ ہم نے بیان کیں تو وہ شخص طریقت کی معرفت سے جیسا کہ اس کی حقیقت ہے عاجز ہے، اور پھر ہر ایک شخص کے لئے طریقت کا حکم نہیں ہوتا اور اللہ تعالیٰ کے پاس کسی چیز کے اندر تخمینہ اور اٹکل پچو کی بات نہیں ہوتی بلکہ اللہ تعالیٰ اس شخص کو عطا کرتا ہے جو اپنی

فطرت اور حیات کے اعتبار سے زکی اور مبارک ہے، جس میں افلاک سبعہ ملاء اعلیٰ اور سافل سے امداد ہوتی ہے اور اس کے لئے تدلی اعظم سے ایک رحمت خاص ہے پس کتنے عارف عظیم المعرفت یا فانی باقی شدید الفنا، کامل البقاء ہیں لیکن مبارک اور زکی نہیں تو اس بنا پر یہ چیز انہیں عطا نہیں ہوتی اور اسی طرح نگہبانی طریقت ہر ایک شخص کو نہیں عطا ہوتی ہے بلکہ ہر ایک کام کے لئے ایک انسان پیدا کیا گیا ہے اور اس کی جبلت میں وہ کام آسان کر دیا گیا ہے لیکن اس صورت کے ظہور کا عالم وہ ان عالم متعارفہ کے علاوہ ایک اور عالم ہے کہ اس کی حقیقت اعراض اور افعال میں برکت فائضہ کا ہونا ہے۔

(۱۹) مشہد آخر مذہب حنفی کا بہترین طریقہ

مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلایا کہ مذہب حنفی میں ایک بہترین طریقہ ہے اور وہ بہت موافق ہے اس طریقۂ مسنونہ کے جو کہ مدون اور منقح کیا گیا، بخاریؒ اور ان کے اصحاب کے زمانہ میں وہ یہ کہ مسئلہ میں اقوال ثلاثہ یعنی امام اعظمؒ اور صاحبینؒ میں سے جو (قول) اقرب بالسنۃ ہو اسے اختیار کر لیا جائے اس کے بعد ان فقہائے احناف کی کلی طور پر اتباع کی جائے جو علمائے حدیث میں سے ہیں کیونکہ بہت سی ایسی چیزیں ہیں جو امام صاحبؒ اور صاحبینؒ نے اصول میں نہیں بیان کی ہیں اور نہ ان کی نفی کی ہے اور احادیث ان پر دلالت کرتی ہیں تو ان کا اثبات ضروری ہے اور یہ سب مذہب حنفی ہے۔

(۲۰) مشہد آخر یعنی روضۂ اطہر کے انوار تمام انوار سے فائق ہیں

روضۂ منورہ اور منبر مبارک کے درمیان جنت کے باغیچوں میں سے ایک باغ ہے جیسا کہ احادیث صحیحہ میں آیا ہے سو اس کی انیت تو ہم نے مشاہدہ کیا کہ اس کا نور تمام نوروں سے فائق ہے اور جو اس مقام پر نماز پڑھتا ہے وہ دریائے نور میں مستغرق ہو جاتا ہے اگرچہ وہ التفات نہ کرے اور لمیت یہ ہے کہ انسان جس وقت محبوب ہو جاتا ہے، یعنی اس کے جوہر روح میں یہ برزہ مثالیہ یا نقطۂ تدبیر یہ داخل ہو جاتا ہے، تو وہ اللہ تعالیٰ کا منظور نظر ہو جاتا ہے اور ملاء اعلیٰ کے لئے ایک عروس جمیل بن جاتا ہے۔ سو جس مکان میں بھی جاتا ہے ملاء اعلیٰ اس کے ساتھ منعقد اور ان کی ہمتیں

اس کے ساتھ متعلق ہو جاتی ہیں اور ملائکہ کی فوجیں اور انوار کی موجیں اس کے ساتھ چلی آتی ہیں خصوصاً جس وقت اس کی ہمت اس مکان معظم کے ساتھ متعلق ہو جائے اور جو عارف کامل معرفت اور حال والا ہوتا ہے تو اس کی ہمت میں نظر حق نفوذ کرتی ہے چنانچہ اس کے اہل اور مال اور گھر اور نسل اور نسب اور قرابتداروں اور دوستوں سے متعلق ہو جاتی ہے، اور مال اور آبرو وغیرہ کو شامل ہو جاتی ہے، اور اس کی اصلاح کرتی ہے، اور اسی سے کاملین کی سیرتیں غیر کاملین سے ممتاز ہوتی ہیں۔

(۲۱) مشہد آخر، علماء کرام کا مقام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک بہت بلند ہے

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان اعتراضات کی تردید کرنے کی اجازت چاہی جو علماء حرمین نے بعض صوفیاء پر کیے ہیں، تو مجھے اس چیز کی اجازت نہ ملی، اور میں نے علماء عاملین کو دیکھا، کہ جن کا علم مشتغلین تصفیہ کے موافق ہے اور وہ نشر علم اور دین کرتے ہیں، اور آپ کو عزیز ہیں، اور ان صوفیاء سے آپ کو محبوب ہیں، اگرچہ یہ اہل فنا اور بقاء اور اس جذبہ سے تعلق رکھتے ہوں، جو کہ نفس ناطقہ میں ظہور کرے اور اہل توحید وغیرہ میں سے ہوں، جو صوفیاء کے ہاں اعلیٰ مقامات ہیں، اس اجمال کی تفصیل اس طرح پر ہے، کہ اس مقام پر دو طریقے ہیں ایک طریقہ تو یہ ہے، کہ خلقت کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے ساتھ منتقل ہو، یہ چیز وسائط کے ساتھ ہوتی ہے، اور یہ جوارح کی تہذیب طاعات سے اور قوی نفسانیہ کی ذکر اور تزکیہ اور اللہ تعالیٰ کی محبت اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے کر دیتی ہے، اور لوگوں کی تہذیب نشر علم، امر بالمعروف نہی عن المنکر سے اور عام طور پر لوگوں کو نفع رسانی کی کوشش کرنے سے اور دیگر اشیاء سے جو ان مذکورات کے مناسب ہوں اور دوسرا طریق اللہ تعالیٰ اور اس کے بندہ کے درمیان ہے، کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ایجاد کیا، اسی طرح بندہ نے پایا، اور جو افاضہ کیا، اسے حاصل کیا اور اس میں اصلاً واسطہ نہیں ہے، اور جو شخص کہ اس راستہ پر چلا، تو اس کی شان یہ ہے کہ وہ حقیقت انا سے متنبہ ہوا اور اس تنبہ کے ضمن میں حق سے آگاہ ہوا، اور اس سے فناء اور بقاء اور جذب و توحید

وغیرہ منشعب ہوئیں اور ہماری گفتگو دوسرے طریقہ میں ہے کہ یہ طریقہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک عالی مرغوب اور پسندیدہ نہیں ہے، اس لئے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پہلے طریقہ کے فیضان کے عنوان ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو مخلوق میں اپنی عنایت کے فیضان کے لئے آشیانہ بنایا ہے، اور اس کے ظہور کے لئے آپ کو مظنہ بنایا ہے اور اشیاء آپس میں ایک وجہ سے فضیلت رکھتی ہیں، دوسری وجہ سے نہیں اگر تو اس شئے کا اعتبار کرے جو وجود عام میں ظرف ہے، بایں طور کہ سب جہات کو محیط ہوں کسی کو نہ چھوڑیں، تو ایسی وجوہات حاصل ہوں گی، کہ جن سے تفاضل حاصل ہوگا، اور تفاضل اسی میں دائر ہوگا، اور منافست ان میں منقسم ہوگی، اور اگر تو اسے سبب واحد کی طرف منسوب گمان کرے تو ایک وجہ سے فضل جاتا رہے گا، اور دوسری وجہ سے باقی رہ جائے گا، نتیجہ یہ ہوگا، کہ احد الاشیاء فضل سے کلی طور پر محروم رہ جائے گی، ہاں جس وقت یہ نور ناسوت کی طرف منتقل ہوتا ہے، تو دونوں طریقوں سے سالکین کو نفع پہنچتا ہے، اہل جذب پر تو انفسار تنبیہ اجمالی کا کہ اس نور کی بنا پر اُن پر معارف روشن ہو جاتے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ تم عارفین کو دیکھتے ہو، کہ اپنی معرفتیں کتاب اور سنت سے مطعون رکھتے ہیں اور اہل سلوک تضرع کرتے ہیں، اور اس کی آرزو رکھتے ہیں، اور اس نور میں مندرج ہوتے ہیں، اور اس سے قوام پاتے ہیں، غور سے کام لینا چاہیے، کیونکہ مسئلہ بہت دقیق ہے۔

(۲۲) مشہد آخر حضرت ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ کو کیوں فضیلت حاصل ہے

تمہیں معلوم ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ پر کیوں فضیلت حاصل ہے، باوجودیکہ حضرت علیؓ اس امت میں سب سے پہلے صوفی، پہلے مجذوب اور اول عارف ہیں، اور یہ کمالات دیگر صحابہ کرام میں نہیں ہیں۔ مگر صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل میں قلت اور کمی کے ساتھ موجود ہیں، غرضیکہ یہ مسئلہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں عرض کیا، تو یہ چیز مجھ پر ظاہر ہوئی، کہ فضل کلی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک وہ ہے، جو تمام امر نبوت کی طرف راجع ہو، جیسا کہ اشاعت علم اور دین کے لئے لوگوں کی تسخیر اور جو چیزیں

اس کے مناسب ہوں اور رہا وہ فضل جو ولایت کی طرف راجع ہو، جیسا کہ جذب اور فناء تو یہ تو ایک فضل جزئی ہے اور اس میں ایک وجہ سے ضعف ہے، اور شیخینؓ اول قسم کے ساتھ مخصوص تھے، حتی کہ میں انہیں فوارہ کے طریقہ پر دیکھتا ہوں کہ اس میں سے پانی پھوٹ رہا ہے تو جو عنایات اللہ تعالیٰ کی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوئیں وہی بعینہ حضرت شیخینؓ پر ظاہر ہوئیں، تو آپ دونوں حضرات کمالات کے اعتبار سے ایسے عرض کے مرتبہ میں ہیں جو جوسر کے ساتھ قائم ہے، اور اس کی تحقیق کو پورا کرنے والا ہے، لہٰذا حضرت علی کرم اللہ وجہہ اگرچہ آپ کے بہت قریب ہیں نسب وحیات اور فطرت محبوبہ میں حضرات شیخینؓ سے اور جذب میں بہت قوی اور معرفت میں بہت زائد ہیں، مگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم باعتبار کمال نبوت حضرات شیخینؓ کی طرف بہت زیادہ مائل ہیں، اور اسی بناء پر جو علماء معارف نبوت سے باخبر ہیں، شیخینؓ کو فضیلت دیتے ہیں، اور جو علماء معارف ولایت سے آگاہ ہیں، وہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو فضیلت دیتے ہیں اور اسی بنا پر حضرت شیخینؓ کا مدفن بعینہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مدفن ہے اور اکثر امور عادیہ کا مبداء معنوی ہوا کرتا ہے، اور یہ سر ہے رسول اللہ ﷺ کے قول اللھم لا تجعل قبری وثنا یعبد من دونک کا۔

(۲۳) مشہد آخر (رسولؐ پر اللہ تعالیٰ کی خصوصی نظر)

میں نے دیکھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اللہ تعالیٰ کی ایک خاص نظر ہے، گویا کہ یہی مراد ہے، مثل اس قول کے کہ ایسے رسول اگر تمہیں نہ پیدا کرتا تو ان آسمانوں کو بھی نہ پیدا کرتا سو مجھے اس صورت نظر کا شوق ہوا اور مجھے بہت تعجب ہوا، تو میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاصق ہو گیا، اور آپ کا طفیلی بن گیا، اور میں ایسا ہو گیا جیسا کہ جوہر کے ساتھ عرض اور میں نے اس نظر کے متعلق اصرار کیا، اور اس کی حقیقت دریافت کی اور میں اس کا منظر اور آئینہ ہو گیا، تو وہ ارادہ ظہور تھا، اور یہ اس لئے کہ جس وقت اللہ تعالیٰ نے ظہور شان کا ارادہ کیا، تو اسے محبوب رکھا، اور اس کی طرف نظر کی اور رسول اللہ ﷺ کی شان ایک آدمی کی شان کی طرح نہیں ہے، بلکہ ایک عالم مبتداء جو کہ بشر کی صورتوں پر نشأۃ منبسطہ کے ساتھ موجودات کے اوپر منبسط ہے، تو گویا کہ نبی اکرم ﷺ غایت الغایات اور ظہور کے آخری نقاط ہیں، اور ہر ایک موج کی اس کے منتہی تک حرکت

ہے اور ہر ایک سیل کیلئے اپنے مبلغ تک شوق ہے، غور سے کام لو، راز بہت نازک ہے۔

(۲۴) انسان محدث بنے یا اس کا طفیلی

میں نے دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں شفاعت ہے، اور علماء محدثین کے لئے توسل ہے اور وہ حضرات جوان کے زمرہ میں داخل ہوں، اور علم حدیث اور حفظ حدیث شریف ایک عروہ وثقی اور حبل ممدود ہے۔ جو کبھی نہیں ٹوٹ سکتی لہٰذا واجب اور ضروری ہے، کہ خود محدث ہو، یا محدث کا طفیلی۔ میری رائے میں ان دونوں باتوں کے علاوہ اور کسی چیز میں خیر اور بھلائی نہیں، واللہ اعلم بالصواب۔

(۲۵) مشہد یعنی عارف کے کامل ہونے کے بعد اس کی روح ملاء اعلیٰ سے جا کر مل جاتی ہے

عارف جس وقت کامل ہو جاتا ہے، تو اس کی روح ملا اعلیٰ سے جا کر مل جاتی ہے، اور وہاں ایک عالیشان عظیم المرتبت درگاہ ہے، ان کی ہمتیں اس مقام پر پہنچ جاتی ہیں، اور ان کے جسم وہاں نہیں پہنچتے، اور یہ سب مرد واحد کی ہمت کی طرف راجع ہوتے ہیں، جس کی ہمت تدبیر وحدانی کی طرف راجع ہو، اگر چہ اس ہمت کی تفاصیل میں مختلف ہوں، پھر اس عالی درگاہ میں الٰہ العالمین تدلّی فرماتا ہے، سو انہیں انوار سے جس قدر ڈھانکنا چاہتا ہے ڈھانک لیتا ہے، اور ان کی ہمتیں ان انوار کی چمک میں پوشیدہ ہو جاتی ہیں، حتی کہ ان ہمتوں کی تمیز نہیں ہوتی اور نہ وہ آپس میں ممتاز رہتی ہیں اور اگر میں تیرے سامنے ان کے حال کی مثال بیان کر دوں، تو مجھ پر نشیب و فراز سے خفگی کا اظہار نہ کر اس لئے کہ امثال اشیاء کی ایک جہت سے تفسیر کر دیا کرتی ہیں، دوسری جانب سے نہیں کرتیں، اور یہ بمنزلہ خفیہ ہیولیٰ کے ہوا کرتی ہیں، جو دریافت نہیں ہوتا، مگر احکام و آثار سے جو جاری ہوتے ہیں اس موجود سے جہت مسام ہیولیٰ سے ایسا ہیولیٰ جو ام القابلیات ہے اور وہ نور جس نے انہیں گھیر لیا اور محو کر لیا ہے، وہ بمنزلہ اس صورت کے ہے، جو سب سے پہلے مدرک ہوتی ہے، اور وہ صورت اصل فعلیات ہے، پھر اس درگاہ عالی میں احکام و آثار جاری ہوتے ہیں، جو ملاء اعلیٰ کے علوم سے متولد ہیں، اور ان کی تفصیلیہ ہمتیں ان میں لطیف ہو جاتی ہیں اور بلند ہو جاتی ہیں، اور

ایسے ہی ان کی صفات فرشتوں کو ہمتوں کے ساتھ پھر ان کی ہمتوں کے مسامات سے خطیرۂ قدس میں جاری ہوتا ہے پھر اس سے نور چمکنے لگتا ہے، اور ایسا ہی نہیں رہتا بلکہ اس کو اپنے جوہر کے قریب کر دیتا ہے، چنانچہ احوال مختلف ہوتے رہتے ہیں، حضرت قدس کی رضا مندی، غصہ، ہنسی خوشی اور انقباض اور اعتراض ونزول فی اوقات یا محال اور تردد فی القضاء اور لعن اقوام اور ایجاب وتحریم ونسخ وغیرہ سے، سو جس شخص نے اس درگاہ کا مشاہدہ کیا، اور اس کے اہتزاز اور انشراح اور عزیمت کو معلوم کیا اور ہر ایک روز نئی شان ہونے کو پہچانا تو اس کے نزدیک متشابہات بھی محکمات ہو گئے اور اشکال کے اندر اشکال اور شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی اور جس نے اس درگاہ کا مشاہدہ نہیں کیا، تو اس کے لئے صحت اور صلاحیت کی کوئی سبیل نہیں، مگر یہ کہ ان تمام امور کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرے اور ان تمام متشابہات پر ایمان لائے جب تم نے یہ بات سمجھ لی، تو وہ درگاہ ملا اعلیٰ کی ہمتوں کا قبلہ ہے، اور ان کا مناط توجہ اور معقد نواصی ہے سو جو شخص کہ اس مرتبہ کو پہنچ گیا اور اللہ تعالیٰ نے اپنے سابقہ علم میں مقدر کر دیا تھا، کہ یہ چیز اسے حاصل ہو، تو وہاں فنا اور بقا اکثر اوقات مضمحل ہو جاتا ہے، اور اس مقام پر اس کی روح اس کے جسم کی نگہبانی نہیں کرتی، بلکہ صرف وہی درگاہ اس کی نگہبانی کرتی ہے اور وہی مرشد اور ملہم ہے، اور میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا طفیلی بن گیا، تو اس میں سے مجھے ایک جام سرشار عطا ہوا، بس کیا بیان کروں کہ وہ کیا تھا، والحمد للہ رب العالمین، اور اس درگاہ کے محاذی ایک اور درگاہ ہے، اس سے نیچے جو کہ ملاء سافل کی ہمتوں کا منتہی ہے، اور ان کا مجمع امر اور ان کے الہام کی جگہ اور ان کا محکمہ یقضاء ہے اور ان کی توجہ کا منظر ہے، کہ اس کی شان اس درگاہ مقدسہ کی شان کے مطابق نہیں، اس مقام پر بواسطہ تدلّی کے حق منصف ہے اپنے بندوں کے ساتھ محبت کرنے اور بعض امور میں ان کی خوشنودی ملحوظ رکھنے میں، غرضیکہ دونوں درگاہوں کی معرفتیں بہت دقیق ہیں، اور اس سے بالا ہے، کہ تمام عقلوں کی وہاں تک رسائی ہو سکے، واللہ الموفق۔

(۲۶) مشہد یعنی کامل معرفت کو ہمہ قسم کی نعمتیں ملتی ہیں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے مجھ پر بہت سے علوم منکشف ہو گئے، اور اللہ تعالیٰ کی معرفت کے پورے احوال اور منجملہ اس کے کہ یہ شخص تمام لوگوں سے ممتاز ہے، بایں طور کہ

اجزائے فلکیہ کا اس میں قوی ظہور ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ نافذہ حکم ہے، کہ جس کی بنا پر خدائی رنگ اس وجہ سے قائم ہوتے ہیں، تا کہ تمام معانی اس شے کے مناسب کر دے، جو جناب حق کے قریب ہے اور منجملہ ان امور کے ایک یہ بھی ہے کہ تام المعرفت کے لئے یہ چیز ضروری ہے، کہ تمام تعلقات دنیویہ، اخرویہ، جسمانیہ اور روحانیہ اس سے شدت کے ساتھ دور ہوں، اور اسے سریان الوجود فی الموجودات کا سر بیکار نہ کر دے، اور ایسے ہی مبداء کی توجہ بارادۂ حبیت ان عالموں کی طرف اور میں نے سمجھ لیا، کہ یہ ان اجزاء میں سے ایک معنی ہیں، جو کہ زحل کے مقابل ہیں، سو جب رنگ الٰہی غالب آتا ہے، تو وہ بے تعلقی محبت ذاتی ہو جاتی ہے، جو کہ نقطۂ ذات کی طرف متوجہ ہے، سو جو شخص اس بے تعلقی سے باز رہا، اور اسے حاصل نہ کیا، حالانکہ خلوت کل سے بقایا اللہ ہے اور تصرف بحق خلقت میں اور ارادۂ طلوع حبیت مبداء کا کیا اپنے قوی تشخص کے طریقوں سے تو وہ پورا کامل اور تام نہیں، اور کامل وہ ہے جس نے اس بے تعلقی کو اپنے ظرف میں مضبوطی کے ساتھ رکھا اور اسے مظہر کی محبت نے آلودہ نہ کیا، اگرچہ وہ حق کے ساتھ ہو، بایں طور کہ وہ محبت ذاتی کا عنوان ہو اور اس کے جسم کی روح اور اس کی حقیقت کا مظہر اور جب مظاہر کو لا بنفسہ ہی پر محمول کیا، بلکہ مخلوق کے لئے بالحق ہو، نہ ان کے نفسوں کے لئے بلکہ بالحق بھی ان کے ظرف میں ہو اور ایک چیز یہ ہے کہ جو عارف کامل المعرفت ہوتا ہے وہ اپنے نفس کے علاوہ اور کسی سے کچھ نہیں حاصل کرتا اور آمادگی معدات یہ ہے، کہ وہ فرد جو کہ اس جزو میں موجود ہے، وہ اس سے آگاہ ہو اور اس کے معنی اس پر منکشف ہو جائیں، پھر اس پر وہ چیز ظاہر ہو جائے، جو کہ ظاہر نہیں ہوئی تھی، لہٰذا جو شخص بھی اپنے علاوہ اور کسی سے استفادہ کرے، تو وہ اس وجہ سے کہ وہ کامل المعرفت نہیں، اور ان امور میں سے ایک یہ ہے کہ ہر وہ عارف جو کہ کامل المعرفت ہو جاتا ہے، تو اللہ تبارک وتعالیٰ اور اس کے اسماء اور تدلیات کے علاوہ تمام چیزیں اس کے لئے مسخر ہو جاتی ہیں، یا تو زبردستی سے اور یہ اس صورت میں ہے، کہ حال ادنیٰ اور قوت ناقص ہو، باوجود اس کے کہ عارف کے اس عالم کی جامعیت کے اوپر جو چیز پہنائی گئی ہے، اور معانی کے علاوہ حجاب کر دیا، سو کبھی بہیمیت ملکیت سے مختلط ہو جاتی ہے، قوی قوی سے یا ضعیف ضعیف سے ایسے ہی ضعیف قوی کے ساتھ تو احکام اور آثار دونوں چیزیں مل جاتی ہیں، ایسی شکل میں یہ چیز ان عوام کے لئے وجہ نکارت بن جاتی ہے

جو جامعیت کو چھوڑ کر لباس کی طرف دیکھنے والے ہیں، اور ظاہر پر نظر رکھنے والے ہیں، نہ معانی پر اور یا عارف کامل کے لئے یا مناسبت کی وجہ سے مسخر ہو جاتے ہیں اور یہ اس شکل میں ہوتا ہے جبکہ اس عام لباسیت اور حجابیت سے قوی حال اور کامل تاثیر ہو اور مناسبت کا سر اور راز اس چیز سے ظاہر ہوتا ہے، جو عارف میں ہے، اور اس مراد کے قائم مقام اس کی تسخیر ہو جاتی ہے، اور اس عارف اور اس جز کے درمیان ممتدہ رگیں اور ماساریقا ہیں اور اصل میں ان اسرار کی جہت سے جو اس عالم مشترک میں موجود ہیں سو جس وقت عارف اس جزء کی طرف شدت کے ساتھ متوجہ ہوتا ہے، تو ان خیوط مستترہ میں حرکت ہوتی ہے، جو کہ اس تسخیر سے مقصود ہے، لیکن اسماء اور تدلیات ربوبیت کے انوار چمکنے کی وجہ سے مسخر نہیں ہوتے، ہاں اس مقام پر محبوبیت کے مقابلہ میں حب ہے، سو محبوبیت متحرک ہوتی ہے، اور اس کا مقابلہ حب کرتی ہے، اور پھر تدلی متحرک ہوتی ہے، اور اسم کیونکہ یہ دونوں چیزیں اس حب کے مناسب ہیں، لہٰذا جو شخص اس تسخیر مستطیر کو نہیں پہچانتا اور اپنے نفس میں یہ چیز نہیں دیکھتا تو وہ کامل المعرفت نہیں ہے، اور میں معلوم کیا، کہ یہ تسخیر مستطیر کے ان معانی میں سے ایک معنی اس جزء کے مقابل ہے جو کہ شمس اور سورج کے محاذ میں ہے، تو جس وقت یہ چیز انوار الٰہی سے رنگی جاتی ہے، تو یہ تسخیر ہو جاتی ہے، جس میں یہ مستطیر ہے، اور ان اشیاء میں سے ایک یہ ہے، کہ کامل کی معرفت کی روح میں ہر شئے کے ساتھ تیز نظری اور غور و عنایت ہوتی ہے، طریقت مذہب سلسلۂ نسبت اور قرابت سے اور ہر اس چیز سے جو کہ اس سے قریب ہو اور اس کے ساتھ تعلق رکھے، اور اس کامل معرفت کی عنایت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عنایت شامل ہو جاتی ہے کیونکہ جس وقت اس کا نفس کدورات جسم سے مجرد اور ملاء اعلیٰ کے ساتھ ملحق ہو جاتی ہے تو اس مقام پر اس کے لئے حق کی تجلی ہوتی ہے، اور تجلی اس شخص کی استعداد کے مطابق ہوتی ہے، کہ جس کے لئے تجلی کی گئی ہے، اور یہی وہ نکتہ ہے جسے ہم نے ضرب المثل میں ہیولیٰ اور صورت سے تعبیر کیا ہے، تو اس وقت یہ نفس حق کے لون کے ساتھ رنگا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی ان تدلیات میں سے ایک تدلی ہو جاتا ہے جو کہ مخلوق کی طرف ہیں، اس انصباغ امتزاج اور اختلاط کی وجہ سے جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، تو اس وقت اس کا نفس ان امور کی جانب متوجہ ہوتا ہے، اور جناب قدس کے اپنی جانب منعطف کرنے کے لئے توجہ ہو جاتی ہے، سو جب یہ راز اس کے نفس کے پہلوؤں،

اس کے شعبوں اور رگوں پٹھوں میں سرایت کر جاتا ہے تو نظر الٰہی ان سب سے مختلط ہو جاتی ہے اور وہ شخص اکسیر بن جاتا ہے، کہ جس سے لوگوں کو شفا حاصل ہو، اور میرا مقصود نفس کی رگوں اور پٹھوں سے یہ ہے، کہ نفس اس کی طرف بلا قصد از روئے عادت اور ملکۂ غیر مستقرہ کے متوجہ ہو، اور اس کامل کے لئے ان اسرار کی جہت سے بہت سے احکام اور آثار ہیں، اور میں نے یہ بات سمجھ لی، کہ یہ بات اس جزء کے معانی میں سے ہے جو زحل مختلط یا مشتری کے بوقت الوان الٰہی کے حلول کرنے کے مقابل ہے، اور ایک ان میں سے یہ چیز بھی ہے، کہ کامل معرفت والے کو وہ تمام نعمتیں ملتی ہیں، جو کہ اللہ تعالیٰ نے تمام آسمان اور زمین اور کل کائنات اور جوان میں ہیں، ملائکہ، انبیاء، اولیاء اور بادشاہوں وغیرہ میں سے ان پر نازل کی ہیں، اور یہ چیز اس وجہ سے ہے، کہ اس میں جو بھی اجزاء ہیں، وہ تمام موجودات کے اجزاء کے مقابل ہیں، تو یہ ایک اجمالی نسخہ ہے، جو تمام موجودات کو جامع ہے، اور جب اس کے کسی بھی جزء کی تفصیل کرنا چاہیں، تو وہ عالم میں ظاہر ہو جائے، سو جو بھی نعمت واقع ہوگی، تو اجزاء میں سے کوئی بھی جزء اس کا محل ہوگا، اور وہی ان نعمتوں کے شکر سے مطلوب ہے اور ہمارا کلام کچھ سرسری مسامحت اور تجوز کا حامل نہیں ہے بلکہ وہ ایسی حقیقت ہے کہ نفس الامر سے متجاوز نہیں، ہاں یہ سر اور راز اس وقت حاصل ہوگا، جس وقت کہ اس تشخص کلی کے لئے جو کہ تمام مخلوقات میں منتشر ہے مجرد ہو جائے، اور جب تشخصات جزئیہ کی پستی میں چلا جائے تو یہ سر اور راز اس سے پوشیدہ ہو جائے گا۔

(۲۷) مشہد آخر، وھو القاھر فوق عبادہٖ کا مطلب

میں اس حدیث کی شرح کا منتظر تھا، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا، کہ اللہ تعالیٰ مخلوق کے پیدا کرنے سے پہلے کہاں تھا، الخ چنانچہ مجھ پر اس سر کا افاضہ ہوا، دیکھتا کیا ہوں کہ ایک نور ہے، اعالی بعد ہیولانی میں اور اس نے از روئے تدبیر کے اس بعد کے مجامع کو گھیر لیا ہے، ان خطوط شعاعی سے جو کہ اس نور سے اس کے تمام نواحی میں ممتد ہیں، اور کہا گیا، کہ یہ وہی چیز ہے، جس کا اشارہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس فرمان سے کیا کہ **کان فی عماء** اور یہ بعد ہیولانی بھی عماء ہے (۱)، اور یہ خطوط شعاعیہ کا احاطہ وہی قہر ہے، جس کی طرف اللہ تبارک

(۱) عماء: بلند بادل۔

وتعالیٰ نے اپنے اس فرمان سے اشارہ کیا ہے کہ (ھو القاھر فوق عبادہ) تو جس وقت اس سر کا ظہور ہوا تو میرا کلیجہ ٹھنڈا اور میرا قلب مطمئن ہو گیا، گویا کہ کچھ شبہ ہی باقی نہ رہا اور نہ کوئی سوال جسے دریافت کروں، اس کے بعد میں حیز فکر میں چلا گیا، تو میں نے سمجھا کہ ذات الٰہی ان استعدادات کے ظہور کے لئے مستلزم اور متقاضی ہوئی، جو کہ اس میں مندرج ہیں، تو اس مقام پر از روئے ظہور عقلی کے کنارہ وجوب ظاہر ہوا، اور اس مقام پر اس ظہور سے اعیان ممکنات ظاہر ہو گئیں اور ہر ظہور واجب کی شاخیں ہر عالم میں متمثل ہو گئیں، اور ایسے ہی اس کی تدلی ہر ایک برزہ میں اور ذات الٰہی نے ان ظہورات سے متصف ہونے کا باعتبار عدم مادہ اور خارج کے اقتضاء کیا، تو ان چیزوں کو ظاہر کر دیا، جو کہ گوشۂ اعیان اور اسماء میں مطوی تھے، اور سب سے پہلے نور الٰہی ظاہر ہوا، اس نے مجامع عدم اور مادہ کو اخذ کیا اور اس پر مسلط ہو گیا اور وہ قائم مقام ذات الٰہی کا ہے اور وہ قدیم بالزمان ہے اس لئے کہ زمان مکان اور مادہ ہمارے نزدیک سب ایک ہی چیزیں ہیں اور یہ وہی استعداد ہے، کہ جسے ہم نے عدم اور خارج سے تعبیر کیا ہے، اور اسی میں ارادات متجددہ ہیں، اور یہ پہلی وہ شئے ہے کہ جس کی شان میں زبان شرائع ناطق ہے اور یہ اس لئے کہ لفظ اَیْنَ سے سوال کیا گیا ہے، اور اس کے جواب کی وہی چیز صلاحیت رکھتی ہے، جو کہ خارج میں موجود ہو،

(۲۸) مشہد، اللہ تعالیٰ مخلوق کی طرف کتاب نازل کرنے کے وقت کیا کرتا ہے

مجھ پر جناب اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے بندہ کے متعلق اپنے حیز سے حیز قدس کی طرف ترقی کر جانے کی کیفیت کا افاضہ ہوا تو اس وقت اس کے لئے ہر ایک چیز روشن اور منور ہو جاتی ہے، جیسا کہ اس مشہد کے معراج منامی کے قصہ میں اس کی خبر دی گئی ہے، تو بسا اوقات آدمی کی نظر ان وقائع کی جانب جو کہ پیش آئے ہیں، پیچھے ہٹ جاتی ہے تو ان واقعات کو جان لیتا ہے جو الہام خداوندی طبعی خیالات اور مکر شیطانی سے ہوئے ہیں اور بسا اوقات اسے علم صریح بھی حاصل ہو جاتا ہے، جس کا استعمال ملاء اعلیٰ علوم ناموسیہ اور وقائع کے پیش آنے سے ڈرانے کے لئے کرتے ہیں، اور لوگوں کے تنازعات کے تعلق ان کے مدارک میں نزول کے اعتبار سے اور اس

عقدہ کو کھولنے کے لئے حیلہ اور تدبیر کرنے کے واسطے ان علوم میں سے جو کہ اس عالم کے مناسب ہیں، اور ایسے ہی ملاء اعلیٰ کی ہیات اور ان کے مقامات اور فرشتوں کے مقامات اور اولیاء و انبیاء کرام کی ارواح اور ملاء سافل اور وہ چیزیں جو ان کے مناسب ہوں، غرضیکہ یہ تمام علوم قرآن عظیم کے علوم ہیں، چنانچہ میں نے دیکھا، کہ طبیعت سے پردہ دور کرنے اور الفت اور عادت اور محسوسات سے جدا ہونے میں اور اس درگاہ کے رنگ میں رنگے جانے میں ایک امر عظیم ہے، پھر مجھ سے کہا گیا، کہ یہ درگاہ درگاہ رویت ہے نہ درگاہ کلام اس کے بعد جب اللہ تعالیٰ اس بات کا ارادہ فرماتا ہے کہ مخلوق کی طرف کتاب منزل کے ساتھ تدلی کرے، تو اس مشہد والے کو ایک باریک نورانی لباس پہناتا ہے۔ تو یہ رویت اس کی نسبت کے اعتبار سے کلام ہو جاتی ہے اس کے بعد میں نے اس کے حیز عادت اور طبیعت کی طرف انحدار کی کیفیت دیکھی، تو اس وقت اس کی چشم طبیعت کھل جاتی ہے۔ اور چشم ملاء اعلیٰ بند ہو جاتی ہے، تو اس کے سامنے ایک خیال کی سی کیفیت ہو جاتی ہے، کہ جسے وہ دیکھ رہا ہے اور ایک امر کی سی کہ اس کے غائب ہو جانے کے بعد اسے یاد کر رہا ہے، اور کبھی طالب ملاذ اور اسباب وہ شئے پالیتا ہے، جو اس سے سب ہو چکی ہوتی ہے، یا اس سے منع کر دی گئی تھی، اور اس کی ترقی اور تنزل کے درمیان بہت سے حالات ہیں، کہ جن کا میں نے اس مشہد میں مشاہدہ کیا ہے، بعض ان میں سے وہ ہیں جو اعلیٰ کے بہت قریب ہیں، اور بعض ان میں سے وہ ہیں جو اسفل کے بہت قریب ہیں، پھر ان حالات سے وہ چیزیں پیدا ہوتی ہیں، جو کہ میں تم سے بیان کرتا ہوں، چنانچہ ہاتف، خاطر اور خواب پیدا ہوتے ہیں، اور حق بات یہ ہے، کہ خواب احادیث نفس کی طرح ہیں، کہ جس وقت ذرا کہ ان کی جانب متجرد ہو جاتا ہے تو اسے مرائی اور مسمع کے مقامات پر پاتا ہے۔ تو اس کو صحیح خیالات پیدا ہوتے ہیں، کہ جن سے اس کا دماغ بھر جاتا ہے اور پھر اس سے فراست صادقہ پیدا ہوتی ہے وغیر ذلک اور یہ سب چیزیں حسین حجاب میں ہیں، اس درگاہ کے درمیان کہ جس میں کوئی حجاب نہیں ہے، اور حجاب متاکد من کل وجہ کے درمیان اور میں نے ان میں سے ہر ایک شئے کی میزان اور مقدار کو بھی پایا، اور میں نے ہر ایک مظنہ بھی پایا جو وہاں پایا جاتا ہے، لیکن میں اس مشہد میں ان میزان اور مقداروں کے احاطہ سے فارغ نہیں ہوا، اور صرف ان کے اصول پر اکتفا کرتا ہوں، امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ثانی حال میں ان چیزوں کے

احاطہ کی ہمیں توفیق عطا فرمائے۔

(۲۹) مشہد، قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ کی تفسیر

عارف جس وقت اس چیز میں ہوتا ہے، جو کہ طبیعت سے متصل ہے تو فعل حق کا جیسا مشاہدہ کرنا چاہے ویسا مشاہدہ نہیں کرتا، تو بسا اوقات اس کے سامنے الہامات مشتبہ ہو جاتے ہیں حدیث نفس اور حالت الٰہیہ امر طبیعت کے ساتھ اور ہو جاتا ہے کوئی حادثہ جس کے متعلق نہیں جانتا کہ اس میں اللہ تعالیٰ کا کیا حکم ہے، تو متردد ہو جاتا ہے، اور اس میں ایک زمانہ گزر جاتا ہے، پھر وہ حیز حق کی طرف منجذب ہوتا ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ عبداللہ ہوتا ہے۔ تو اس پر ہر ایک شئے روشن ہو جاتی ہے، اور پھر الٹے پاؤں اس کی نظر ان امور مشتبہ اور شکوک کی جانب پیچھے ہٹتی ہے، تو اس پر ارادۂ حق منکشف ہو جاتا ہے اور اس کا حکم پورا ہو جاتا ہے، گویا کہ اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے، پھر اگر وہ مکلّم ہوتا ہے، تو برابر کلام کیا جاتا ہے، اور اگر فہیم اور سمجھدار ہوتا ہے تو سمجھایا جاتا اور تلقین کی جاتی ہے، اور تجھے سورۂ انفال سے عبرت حاصل کرنی چاہیے۔ کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے انفال کے متعلق دریافت کیا گیا، تو آپ نے نہیں بیان فرمایا کہ حق کا اس میں کیا حکم ہے اور کس طرح یہ چیز تقسیم کی جائے چنانچہ اس حکم کو حق نے ذات شوکت کی طرف روانہ کیا، تاکہ کفر مٹ جائے، اس کے بعد جب سوار اور ذات شوکت سب جمع ہوئے، تو آراء مختلف ہو گئیں، تو الہام حق تو ذات شوکت کی طرف جذب کرتا تھا، اور طبیعتوں کا میلان سواروں کی طرف نتیجہ یہ ہوا کہ ان لوگوں کو حق کی طرف ہدایت کی گئی۔ اور امن و مطرب سب چیزیں نازل ہو گئیں۔ چنانچہ جہاد کی جانب لوگوں کے قلوب حرکت میں آ گئے، معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ اس کا مبداء حق کا ان کے ذریعہ سے مدد کرانا ہے، یا تمام امور طبیعت ہیں، چنانچہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حیز حق کی جانب متوجہ ہوئے تو ان سے ان امور کی حقیقت بیان کی گئی، اب اگر تم دریافت کرو کہ جسے تم حیز حق کہتے ہو، وہ کیا ہے، تو سمجھو کہ وہ ملاء اعلیٰ اور عظماء مومنین کی ہمتیں اور ان کی مطمح نظر ہیں، جو حق کی تجلیات میں سے کسی بھی تجلی میں جمع ہوتی ہیں، اور یہ حظیرہ قدس ہے، اور یہی وہ چیز ہے کہ جس کے متعلق نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ حضرت آدم اور حضرت موسیٰ کی اللہ تعالیٰ کے دربار میں

بحث ہوئی، اور یہی قدم صدق عند ربھم ہے اور جس نے اسے پالیا تو وہ علی بیّنة من ربه ویتلوہ شاھد منه کا مصداق ہو گیا۔ یعنی اس کے نفس میں اس درگاہ سے ایک رنگ داخل ہو جاتا ہے جو کہ مومنین کے قلوب میں حق کا داعیہ بن جاتا ہے، غور سے کام لو مسئلہ دقیق ہے۔

(۳۰) مشہد، نور عرش

اس اثناء میں کہ میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب متوجہ تھا کہ اچانک ایک ایسا بلند نور طلوع ہوا کہ جس سے میرا خیال پر ہو گیا اور میں اس کی چمک سے متحیر رہ گیا، تو میرے باطن سے بطور فراست اور تفطن کے یہ آواز آئی کہ یہ نور عرش ہے، اور اس کا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت میں بہت بڑا دخل ہے، اور ان کی حقیقت کی معرفت کامل نہیں ہو سکتی تاوقتیکہ اس نور کی حقیقت کا علم نہ ہو، پھر میں حیز فکر اور رویت کی جانب منحدر نازل ہوا، تو مجھے وہ روایت یاد آئی جو کتاب درمنثور میں حزقیل کے واقعہ میں رؤیت نور عرش کے منقول ہے، اور ان کی رسالت اس نور کی زبان پر منعقد ہے۔

(۳۱) اجمالی مشاہد، فقہ حنفی اکسیر اعظم اور کبریت احمر ہے

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک روحانی سوال کیا، جیسا کہ میں کئی مرتبہ اس کے متعلق آگاہ کر چکا ہوں، کہ میرے لئے تسبب بہتر ہے، یا ترک تسبب تو مجھے ایک ایسی خوشبو آئی، کہ جس کی وجہ سے میرا دل اسباب اولاد اور گھر سے سرد اور ٹھنڈا ہو گیا، اس کے بعد مجھے کشف ہوا تو میں نے مشاہدہ کیا، کہ میری طبیعت تو اسباب کی طرف مائل ہے اس سے لذت حاصل کرتی اور اسے تلاش کرتی ہے اور میں نے اپنی روح کا مشاہدہ کیا، تو وہ تفویض کی طرف مائل ہے، اور اس کی خواہش رکھتی اور تلاش کرتی ہے، اور میں نے دیکھا کہ دونوں آپس میں جھگڑ رہے ہیں اور رضا مندی الٰہی مراد روح میں ہے، سچ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی خفیہ مہربانیاں عنقریب بے اختیار ظاہر ہوں گی، اس کے بعد ایک اور خوشبو آئی، اور یہ بات ظاہر ہوئی کہ اللہ تعالیٰ اور حق کی یہ مرضی ہے کہ تجھ میں ان چیزوں کو جمع کر دے، جو کہ امت مرحومہ سے چھوٹ گئی ہیں، اور خبردار تو اس چیز سے بچنا جو کہ کہا گیا ہے، کہ صدیق اس وقت تک صدیق نہیں ہوتا، تاوقتیکہ ہزار صدیق اسے زندیق نہ

کہدیں اور خبردار قوم کا فروع میں مخالف نہ ہوتا، اس لئے کہ یہ چیز مراد حق کے مناقض ہوتی ہے، اس کے بعد ایک اور نمونہ کھلا جس سے فقہ حنفیہ یعنی امام اعظمؒ اور صاحبینؒ کے اقوال میں سے کسی کے قول کو اختیار کرنے اور ان کے عمومات کی تخصیص اور اس کے مقاصد پر وقوف اور لفظ حدیث کے معنی پر اکتفا کرنے میں حدیث کی مطابقت اور کیفیت مجھ پر ظاہر ہوئی، اور مجھ پر ان کے عمومات کی تخصیص اور ان کے مقاصد کا وقوف منکشف ہوا اور الفاظ سنت کے مفہوم پر اکتفا کرنا، اور فقہ حنفی میں نہ تو تاویل بعید ہے، اور بعض احادیث کا بعض پر ضرب ہے اور نہ امت میں سے کسی کے قول کے ساتھ حدیث کو چھوڑنا ہے، اس طریقہ کو اگر اللہ تعالیٰ پورا اور کامل کرے تو کبریت احمر اور اکسیر اعظم ہے، اس کے بعد ایک اور خوشبو آئی، اور اس میں میں نے اس سے وصیت کو دریافت کیا، انبیاء کرام کا طریقہ اختیار کرنے اور ان کی طرح سختیوں کو برداشت کرنے کے لئے اور ایسے ہی ان کی خلافت کا منتظر ہونا اور لوگوں پر تعلیم اور ارشاد کی رو سے شفقت کرنا اور ان کے لئے دعا رفاہیت کرنا اور ایسے ہی ان چیزوں کو تلاش کرنا، جس میں ان کی ظاہری اور باطنی اصلاح ہو، اللہ تعالیٰ ہمیں سنت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کی توفیق عطا فرمائے۔

(۳۲) مشہد آخر، ائمہ اہل بیت کا عجیب طریقہ

میں ائمہ بیت رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی قبروں کی جانب متوجہ ہوا، تو میں ان کا خاص قسم کا طریقہ پایا ان کا یہ خاص طریقہ اولیاء کرام کے طریقوں کی اصل ہے، سو میں تم سے وہ طریقہ بیان کرتا ہوں، اور یہ بھی بیان کرتا ہوں کہ اس طریقہ کے ساتھ وہ کیا ہے جو مل گیا حتی کہ وہ اولیاء کرام کا طریقہ ہو گیا، چنانچہ بیان کرتا ہوں کہ ان کا طریقہ یادداشت کی طرف التفات کرتا ہے، یعنی مبداء کی طرف ایک اجمالی تیقظ اگرچہ یہ پردوں کے پرے سے ہو لیکن پھر بھی پردوں سے ذھول ہو، اور اس سے بھی ذھول ہو کہ یہ بیداری جوہر نفس سے ہے، یا علم حصولی سے الغرض تیقظ بسیط ہو، اور التفات اس تیقظ کی جانب کسی بھی نوع سے ہو یہ ان کا طریقہ ہے، اور جبکہ اس نقطہ میں اولیاء کرام سے جوہر نفس فنا ہو گیا، تو اس التفات کے علاوہ ان کے فنا کی اور ہی شکل ہو گئی، پھر انہیں ایسے راستے الہام ہوئے کہ جن سے فنا کی طرف ہدایت پائیں چنانچہ تمام ولایتیں مع طول اور عرض کے ظاہر ہو گئیں۔

(۳۴) مشاہد اُخری، تفضیل شیخینؓ کا حکم

مجھے درگاہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اسباب کا استفادہ ہوا کہ جس کے دل میں علاقات حبیہ کے نقض میں قصور ہو اور ایسے ہی حق تعالیٰ کی محبت کے ثابت کرنے میں اور اس کے ساتھ ساتھ غیر وسوا کی عداوت میں جیسا کہ سیّدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا، اِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّيْ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ اور تحقیقی طریقہ سے اس کی سرگشتگی عشق میں منہ کے بل گرنے میں نہ صرف معرفت سے تو ایسا شخص مغرور ہے اس میں کوئی بھی ہو سب برابر ہیں، عام ازیں کہ اسی حالت سے علاقات طبیعہ یا مشاہدہ سریان وحدت فی الکثرت کے استغراق نے روکا ہو، اس حیثیت سے کہ ہر شئے کو دوست رکھے اس لئے کہ اس میں اس کے محبوب کا سریان ہے یا اس کے علاوہ اور موانع ہوں اور میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسے تین امور کا استفادہ کیا جو کہ میرے عندیہ کے خلاف تھے اور اس کے خلاف کہ جس کی طرف میری طبیعت بہت مائل تھی، سو یہ استفادہ میرے لئے حق تعالیٰ کی طرف سے برہان اور دلیل ہو گئے، ایک تو ان میں سے تسبب کی طرف ترک التفات کی وصیت چنانچہ جب بھی طبیعت کی طرف نزول کرتا تھا، تو مجھ پر عقل معاشی غالب آجاتی تھی، چنانچہ میں اسباب معاش کو دوست رکھتا تھا، اور اپنی فکر کو ان تمہید اسباب میں دوڑاتا تھا، کہ جن سے اولاد اور مال حاصل ہو اور جس وقت بھی میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ملاء اعلیٰ کے ساتھ ملحق ہوا تو اس رذیلت سے جدا ہو گیا اور مجھ سے عہد و پیمان لئے گئے کہ تسبب کو چھوڑ دوں، یہاں تک ان دونوں امور میں تناقض محسوس ہوا، جیسا کہ ظلمت اور نور اور ٹھنڈی ہوا اور گرم ہوائیں اور میرے اکثر امور میں مناقضہ نہ تھا، بلکہ وہ بطریق صواب کے تھا، الحمد للہ کہ طبیعت الہام کے لئے سلامتی طلب تھی، لیکن ہر ایک شئے پر اس امر کا مناقضہ ایک سر عجیب کی وجہ سے باقی تھا، اور دوسرا امر یہ ہے، کہ ان مذاہب اربعہ میں کسی ایک مذہب کے مقلد ہونے کی وصیت کہ میں ان سے نہ نکلوں اور تا بمقدور ان کی موافقت کروں، اور میری سرشت تقلید کا انکار کرتی تھی اور اس سے روگردانی کرتی تھی لیکن ایک شئے مجھے میرے نفس کے خلاف باعتبار تعبد کے طلب کی گئی تھی، اور اس مقام پر ایک نکتہ ہے، کہ جس کے تذکرہ کو میں نے موقوف کر دیا، سو الحمد للہ مجھے اس جلت

اور وصیت کا سر معلوم ہو گیا، اور تیسرا امر حضرت ابوبکر صدیقؓ و عمر فاروقؓ کو فضیلت دینے کی وصیت اس لئے کہ جس وقت میری طبیعت اور فکر کو چھوڑا جاتا، تو وہ دونوں کی دونوں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی فضیلت دیتی تھیں، اور ان سے بہت سخت محبت کرتیں، لیکن یہ چیز بھی خواہش کے برخلاف مجھ سے باعتبار عبادت کے طلب کی گئی، افسوس یہ شدت جامعیت کے مناقضے کہ جنہوں نے مجھے اس میں ڈالا، نہ ہوتے۔

(۳۴) مشہد، نور ارشادیت

میں جس وقت خانہ کعبہ کا طواف کر رہا تھا، تو میں نے اپنی ذات کے لئے ایک نور عظیم دیکھا کہ جس نے شہروں کو گھیر لیا، اور شہر والوں کو روشن کر دیا، سو میں نے سمجھا کہ قطبیت یعنی ارشادیت اسی نور سے ثابت ہوتی ہے جو منور ہے، اور سب پر غالب ہے، کسی سے مغلوب نہیں، اور ہر ایک شئے اس کے پاس آتی ہے، اور یہ کسی کے پاس نہیں جاتا۔

(۳۵) مشہد

اس بیت عتیق اور بنائے بلند، میں نے دیکھا کہ اس میں ملاء اعلیٰ اور ملاء سافل کی ہمتیں اس سے ملحق ہیں، اور اس سے ایسی متعلق ہیں، جیسا کہ نفس بدن سے اور میں نے اس کو ان کی ہمتوں اور ارواح سے بھرا ہوا دیکھا، جیسا کہ گلاب کے پھول میں عرق گلاب اور روئی میں ہوا اور میں نے لوگوں کی خواہشات کو اس بیت عتیق کی طرف برانگیختہ ہوتا ہوا دیکھا، بسبب ان کی ہمتوں کے اس کے ساتھ وابستہ ہونے کے کہ جس میں ملا اعلیٰ اور ملاء سافل ہیں۔

(۳۶) مشہد۔ (۱)

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مجھے اس شئے سے مطلع کیا، جو کہ مجھے کروانے والا ہے، اور وہ جو کہ ظاہری اور باطنی نعمتیں مجھے دینے والا ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ مجھے دنیا اور آخرت کے مواخذہ سے عصمت عطا فرمائی، لہٰذا جو سختیاں بھی مجھ پر گزریں، وہ مقتضیات طبیعت سے ہیں، مواخذہ کی وجہ سے نہیں، اللہ تعالیٰ نے مجھ پر ان چیزوں کا احسان کیا اور مجھے بتلا دیا کہ وہ ایک ایسی شئے ہے،

(۱) شاہ ولی اللہ کو منجانب اللہ ولایت عطا ہونا۔

جو اولیاء کو کم ملتی ہے۔ اور مجھے بہترین زندگانی عطا کی ہے، اور ہر ایک سعادت سے مجھے معتد بہ حصہ ملا، اور مجھے خلافت باطنہ کا خلعت پہنایا چنانچہ یہ راز دفعتہً ظاہر ہوا، اور میں متحیر ہو گیا پھر اس کے بعد یہ چیز مجھ پر ظاہر ہوئی تو میں اس کی کما حقہ حقیقت سمجھ گیا۔

تحقیق شریف

کبھی عارف پر وہ نعمتیں منکشف ہو جاتی ہیں، جو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی ہیں چنانچہ ان امور کے کشف کے اعتبار سے اہل اللہ کے دو گروہ ہو جاتے ہیں، اصحاب کشف الٰہی اس واقعہ کو آئینہ حق میں دیکھتے ہیں یعنی اس بندہ کے ساتھ حق کی نظر کا ملاحظہ کرتے ہیں، اور اس کے ذریعہ سے ملاء اعلیٰ میں منعقد ہونے کے ارادہ کو ایسے اور ایسے ایجاد اور اسی طرح تقریب کے ساتھ پہچان لیتے ہیں، اور ان کی نظر اس واقعہ کی حقیقت پر نہیں پڑتی، سو اسی بنا پر وہ اس واقعہ کی تفاصیل سے مطلع اور باخبر ہونے کی قوت اور طاقت نہیں رکھتے، جیسا کہ صاحب کشف کوئی اس کی خبر دے سکتے ہیں، اور کبھی ان کے لئے ملاء اعلیٰ کی جانب سے ان افاضات کے خزائن اور چشمے منکشف ہو جاتے ہیں، اور یہ ایسا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اور ایسی کوئی شئے نہیں کہ جس کا خزانہ ہمارے پاس نہ ہو، اور ہم اسے مقررہ اندازہ کے ساتھ اُتارتے ہیں، چنانچہ حواس ظاہری اور باطنی پر جو کہ اجزاء بہیمیہ ہیں بعض اوقات میں اسے خزائن اور اس کے چشموں کے وہ انوار جو کہ چمکتے ہیں، غالب آ جاتے ہیں، اور نہیں معلوم ہو سکتا کہ جو نازل ہوگا اس کی مقدار کیا ہے، اور یہ درگاہ بھی عجیب ہے چاہیے اس میں احتیاط سے کام لے تاکہ یہ درگاہ رویت تفکر اور حدیث نفس کے ساتھ مختلط نہ ہو جائے، کہ صغیر کبیر اور حقیر عظیم اس معنی مرأت کی بنا پر نظر آنے لگیں تو بتانے لگے اس مقدار نازل کی بڑائی اور عظمت کو تو پھر جھوٹا بنے، اور یہی اللہ تبارک وتعالیٰ کے فرمانوں میں سے ایک فرمان کا منشا ہے یعنی اے پیغمبر! ہم نے تم سے پہلے نہ تو ایسا کوئی رسول بھیجا، اور نہ نبی کہ جب اس نے کسی بات کی آرزو کی تو شیطان نے اس کی تمناؤں میں وسوسہ ڈالا، اور اصحاب کشف کوئی اس واقعہ پر باعتبار خواب یا ہاتف کے بغیر معرفت خزائن اور مبادی کے مطلع ہوتے ہیں، سو اگر وہ تعبیر کے محتاج نہیں ہوتے، اپنی صورت خیالیہ موافقت کے لئے صورت طبیعہ کلیہ سے اس معنی

مثالی کے لئے جسد ارضی میں خواہ جسم ہو یا جسمانی ہو، تو وہ امر بلا تفاوت ویسا ہی ہوتا ہے، جیسا کہ انہوں نے دیکھا ہے، ورنہ پھر تعبیر کی حاجت پیش آتی ہے اور حقیقت امر پر مطلع ہونا، خاردار درخت پر ہاتھ پھیرنے سے زیادہ مشکل ہے۔

(مزید تحقیق شریف) امت مرحومہ کیلئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفاءؓ کی اتباع ضروری ہے

امت مرحومہ کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ کی اتباع ضروری ہے خصوصیت کے ساتھ اصحاب خلافت ظاہری کے لئے حدود کے جاری کرنے اور اسباب جہاد تیار کرنے اور سرحدوں کی حفاظت کرنے میں اور ایسے ہی وفود کو نافذ کرنے اور صدقات کو وصول کرنے میں اور خراج لینے میں اور اس کو اس کے مستحقین پر صرف کرنے میں اور ایسے ہی قضایا فیصل کرنا اور یتیموں کی نگہبانی اور مسلمانوں کے اوقات اور ان کے راستوں کی خبر گیری اور ان کے مساجد کی نگرانی اور ان کے مشابہ اور امور کی ذمہ داری وغیرہ الغرض جو ان امور میں مشغول ہو، ہم اسے خلیفہ ظاہر کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں ان کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع ہی اسوہ حسنہ ہے اس طریقہ پر جو کہ آپ نے اس باب میں بیان فرما دیا، ان تفاصیل کے ساتھ جو کہ کتب حدیث میں مذکور ہیں۔ اور جو اصحاب خلافت باطنی ہیں، یعنی شرائع تعلیم کرتے ہیں، اور قرآن شریف اور حدیث اور اچھی باتیں بتلاتے اور بری باتوں سے روکتے ہیں۔ اور جن کے کلام سے دین میں نصرت حاصل ہوتی ہے، یا تو باعتبار مناظرہ کے جیسا کہ متکلمین یا نصیحت سے جیسے واعظین یا صحبت اور مجالست سے جیسا کہ مشائخ صوفیاء کرام اور جو نمازیں قائم کرتے ہیں اور حج کرتے ہیں، اور ایسے ہی جو حضرات احسان کا طریقہ حاصل کرنے کے لئے رہنمائی کرتے ہیں اور عبادت اور زہد کی ترغیب دیتے ہیں، اور ان امور کو قائم رکھتے ہیں، ایسے لوگوں کو ہم خلیفہ باطنی کہتے ہیں ان کے لئے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی اتباع میں بہترین نمونہ ہے جو بھی کچھ آپ نے اس باب میں بیان فرما دیا ہے، اس تفصیل کے ساتھ جو کہ کتب احادیث میں مذکور ہے سو اس کلی مقدمہ پر علماء کا اجماع ہے، یہی وجہ ہے کہ تم فقہاء کو دیکھتے ہو، کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کی سنت سے ان مسائل کو اخذ کرتے ہیں اور آپ کی ذات اقدس کو مضبوطی کے ساتھ پکڑتے ہیں۔ اور جب ہم نے اس اصول کو اصل قرار دیا تو ہمارے لئے مناسب ہے، کہ ہم بیعت لینے کے مسائل کو اسی پر متفرع کریں اور ہم نے اس مسئلہ کو کتاب القول الجمیل فی بیان سواء السبیل میں بیان کر دیا ہے، تو اب ہمیں حق حاصل ہے، کہ ہم داعیان اور قاصدوں کے روانہ کرنے کو بھی اسی سے اخذ کریں اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اطراف اور قبائل میں ایسے لوگوں کو روانہ کرتے تھے، جو کہ ایمان باللہ ورسولہ کی دعوت دیں اور انہیں احکام شرعی پہونچائیں، جیسا کہ ابوموسیٰ اشعریؓ کو اشعریین، اور ابوذر غفاریؓ کو قبیلۂ غفار اور اسلم اور عمرو بن مرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو قبیلۂ جہینہ کی طرف اور عامر حضریؓ کو بنی عبدالقیس کی جانب اور مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو مدینہ والوں کی طرف روانہ فرمایا اور انہیں امور خلافت ظاہری میں سے کوئی کام سپرد نہ کیا ان کا کام تو صرف لوگوں کو اسلام کی طرف بلانا اور قرآن کریم اور سنت رسول اللہ کی تعلیم تھی، اور خلیفۂ ظاہر اور باطن کے درمیان یہ فرق ہے، کہ تعدد اہل باطن سے خصومت اور نزاع ظاہر نہیں ہوتا، برخلاف خلیفہ ظاہر کے اور خلیفہ اور داعی اور قاصد کے درمیان فرق یہ ہے، کہ خلیفہ کے لئے ضروری ہے۔ کہ وہ عالم وسیع العلم اور وسیع الاکلام ہو اور داعی کے لئے یہ چیز ضروری ہے کہ اس کے لئے ایک دستور العمل لکھ دیا جائے کہ اس پر عمل کرے، اس کے علاوہ اور کچھ نہ کرے اور جہاں مشکل پیش آ جائے، تو خلیفہ سے رجوع کرے اور اکثر داعی اور قاصدین کے طریقے ان کا قاصدین سے اخذ کئے جاتے ہیں، جو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی قوموں کی طرف ہجرت سے قبل روانہ فرمائے۔

(۳۷) مشہد یعنی ملاء اعلیٰ کے اسرار عارف کی روح میں حلول کرتے ہیں

میں نے اپنی روح کو پایا کہ وہ دو چند اور عظیم فراخ اور وسیع ہو گئی سو میں نے اس وجدان کے تعلق پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ عارف ان اشیاء کو پاتا ہے اور اس کا راز یہ ہے کہ حضرت الٰہیہ کے اسرار جو ملاء اعلیٰ میں منعقد ہیں، وہ عارف کی روح میں حلول کرتے ہیں، اور اولاً اسماء الٰہیہ کی

برکات کا نزول ہوتا ہے جو کہ مدارک جمیلہ میں منعقد ہیں اور منفسر، میں ان آیات کے ساتھ جو کہ قلب رسول مجتبیٰ پر متلو اور منزل ہیں، یا وہ اسمائے مشہورہ کہ جن کو حق کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے، باعتبار ان آثار کے اس سے از روئے سرشت وجبلت اور طبیعت اور لوگوں کی عادات کے موافق ثانیاً لہٰذا ان حضرات اور برکات کا حلول عارف لوگوں کی ارواح میں وسعت اور قوت کو پیدا کرتا ہے، سو تو ان حضرات میں سے کسی کو نہیں دیکھے گا، کہ وہ کسی بھی شخص کی طرف غور سے دیکھیں، مگر یہ کہ وہ شخص اس کے رعب اور عظمت سے مرعوب نہ ہو جائے گا اور اس کی جلالت چہرہ سے اس کی ذات کا کرم ظاہر ہوتا ہے، اور ایسے ہی اس کی فراست اور ہمت میں برکات کا ظہور ہوتا ہے، سو یہ اس وجدان کا سر اور اس کی اصلیت ہے۔

(۳۸) مشہد، کمال انسانی کس وقت متحقق ہوتا ہے

میں نے ایسی درگاہ دیکھی کہ اس کی نسبت طبیعت کلیہ سے ایسی ہے، جیسا کہ نسبت قوت ارادہ اور عزم کو درانحالیکہ کہ مقرون ہوں، حرکت طبیعت سے کسی فرد کے ساتھ افراد انسان میں سے جیسا کہ انسان کے خیال میں نفع حاصل کرنے کی لذت یا ضرر رفع کرنے کی خواہش ہوتی ہے چنانچہ خیال اس صورت کا خلاصہ چھانٹ لیتا ہے، اور اس قوت میں اسے ڈال دیتا ہے تو وہ قوت برانگیختہ ہوتی ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عزم حاصل ہو جاتا ہے، اس کے بعد عضلات کو فعل مطلوب کی طرف حرکت حاصل ہوتی ہے، اسی طرح نفس قوی مجرد کے قریب ہمت ظہور واقعہ کی عالم ناسوت میں متمثل ہوتی ہے، وہ بھی اس صورت مطلوبہ کا خلاصہ منتخب کر لیتی ہے، چنانچہ اپنے رب کی معرفت کے ساتھ اس درگاہ میں اٹھا کر لے جاتی ہے، تو پھر طبیعت کلیہ کے قلب سے فیصلہ برانگیختہ ہوتا ہے، اور عالم مثال میں صورت واقعہ آجاتی ہے، پھر جبکہ عالم ناسوت میں اس واقعہ کے پیدا ہونے کا وقت آتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اسے ایسا پیدا کر دیتا ہے، جیسا کہ عالم مثال میں اسے پیدا کیا تھا۔ اور میں نے سمجھا کہ ہمت کی تاثیر اس طریقہ پر جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے، یہی کمال انسانی ہے، اور یہ اسباب کے لئے معد ہوتی ہے، کہ نفس جوارح حق میں سے عالم برزخ میں جارحہ ہو جائے۔

(تحقیق شریف) حدیث لا یرد القضاء الا الدعاء کا مطلب

کبھی عارف پر یہ بات منکشف ہوتی کہ قضاء فلاں واقعہ کو اس طرح ایجاد کرنے میں ضرور متعلق ہے، اور اس میں تقدیر مبرم ہے، چنانچہ وہ عارف اپنی کوشش ہمت سے دعا کرتا ہے۔ اور دعا میں خوب اصرار اور الحاح کرتا ہے، حتیٰ کہ وہ قضاء دوسرے طریقہ پر ایجاد کرنے میں منقلب ہو جاتی ہے، تو یہ پھر اس چیز کو حسب ارادہ پاتا ہے، اور یہ اسی طرح ہے جیسا کہ سیدی عبدالقادر جیلانیؒ سے ایک تاجر کے بارے میں منقول ہے، جو کہ حماد دباس کے اصحاب میں سے تھا، اور جیسا کہ سیدی والد مرحوم سے مرزا ہدایت اللہ کے واقعہ کے درمیان یہ چیز واقع ہوئی، اور اس میں جو اشکال ہے، وہ مخفی نہیں، اور میرے نزدیک حق بات یہ ہے کہ یہ امر دو طریقہ پر ہوتا ہے، ایک تو ان میں سے یہ ہے، کہ بعض اسباب عالیہ اس امر کے اقتضاء موکد کے ساتھ مقتضی ہوتے ہیں، اور بے شک ہر ایک اقتضاء میں ایک شئے واحد ہے، کہ جس میں اس کی نقیض کا احتمال نہیں، اور اس میں بغیر اس انقباض کے جو اس پر کسی اور سبب سے وارد ہو، صورت واقعہ کامل اور وافر ہے، چنانچہ عارف پر یہ اقتضائے متاکد اپنی صورت اور ہیئت کے ساتھ منکشف ہو جاتا ہے اور قدر مبرم کا منبع اس اقتضا کے سوراخ سے دیکھ لیتا ہے، اور صراحتہً اسے نہیں دیکھتا، تو اسی کو قدر مبرم گمان کر لیتا ہے پھر اس کے بعد اس کی ہمت اسباب میں سے ایک سبب ہو جاتی ہے جو کہ نزول قضاء کے لئے معد ہوتی ہے، تو ان اسباب کی مزاحمت کے وقت اللہ تعالیٰ کی حکمت ان امور میں سے جس پر وہ قبض کر لیتی ہے اور ان ہی امور میں سے ایک امر کو بسط کر دیتی ہے چنانچہ مراد ظاہر ہو جاتی ہے اور دوسری صورت وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ اس واقعہ کی صورت عالم مثال میں اجزائے قوی روحانیہ سے پیدا کر دیتا ہے، قبل اس کے کہ اجزاء جسمانیہ سے اس کی صورت پیدا کرے، پھر اسے دنیا کی طرف نازل کرتا ہے، اور پھر متحد ہو جاتی ہے۔ وہ صورت واقعہ ناسوتیہ سے اور یہی معنی ہیں انعام کے نازل کرنے کے اور انزال میزان اور حدید کے اور بلا کے نازل کرنے کے پھر اس چیز کا دعا معالجہ کرتی ہے، پھر یہ صورت مثالیہ عالم مثال میں محو ہو جاتی ہے، چنانچہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ارشاد

فرمایا: یمحو اللہ ما یشاء ویثبت وعندہ ام الکتاب اور محو وہ چیز ہے کہ جس کا نام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان لا یرد القضاء الا الدعاء میں رد قضاء رکھا گیا ہے، چنانچہ عارف پر اس واقعہ کا وجود منکشف ہو جاتا ہے اور وہ اسے قضاء مبرم کے ساتھ تعبیر کرتا ہے پھر اس کے ساتھ ہمت مصادمت کرتی ہے، تو اسے متن طبیعت سے پھیر دیتی ہے۔

تحقیق شریف

کبھی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کسی اہل اللہ سے وعدہ کرتا ہے پھر اس امر کو اس وعدہ پر ظاہر نہیں کرتا، باوجودیکہ الہام حق ہے، تو اکثر لوگوں پر یہ بات مشکل ہو جاتی ہے، اس اشکال کو دفع کرنے کے لئے مشائخ نے کلام کیا ہے، چنانچہ مشائخ نے بیان کیا کہ اکثر لطف الٰہی اس بندہ پر ہوتا ہے کہ اس سے ایک اچھا وعدہ ہوتا ہے تو اسے رغبت ہو جاتی ہے اور اس کا انتظار کرنے لگتا ہے پھر وہ وعدہ پورا نہیں کیا جاتا چنانچہ وہ نعمت کی محبت سے ترقی کر کے منعم کی محبت کرنے لگتا ہے، اور افعال کی محبت سے اب ذات اور صفات کی محبت کرتا ہے مشائخ نے اس امر سے یہ ارادہ کیا ہے کہ وعدہ کو پورا نہ کرنا کوئی نقص نہیں ہے، بلکہ علی الاطلاق اللہ تعالیٰ کی تنزیہ واجب ہے بلکہ بسا اوقات وعدہ پورا نہ کرنا بخل وغرور اور تدلیس سے ہوتا ہے اور یہ منقصت ہے، اور اللہ رب العزت کی ذات اس قسم کے امور سے منزہ ہے، اور کبھی بندہ پر لطف کرنا مقصود ہوتا ہے، اور اس کی ترقی کا سبب ہوتا ہے اور ترقی کے قریب کا تو یہ چیز صفات کمال میں سے ہوئی، اور اس کی نظیریں ہیں ان میں سے ایک یہ ہے، کہ کسی کلمہ کی اس کے محل سے تقدیم وتاخیر کرنا رعایت فاصلہ کی ضرورت کے لئے اور اسی طرح مجاز کے ساتھ کلام کرنا۔ کہ عذوبت میں اس جیسا حقیقی کلمہ کوئی بھی نہیں پایا جاتا، یا اس کے مثل سوا گر ہم اسے اضطرار اور عدم قدرت پر محمول کریں تو یہ چیز نقصان کی ہے اور اگر ہم یہ بات سمجھیں کہ قرآن کریم لغت قریش میں نازل ہوا، اور ان کی لغت میں فاصلہ کی رعایت کی وجہ سے تقدیم وتاخیر اور عذوبت کی وجہ سے مجاز استعمال کر لیتے ہیں تو ان کی لغت کے موافق یہ نازل کیا گیا ہے، کسی قسم کے اضطرار کی وجہ سے نہیں، بلکہ ان پر لطف اور مہربانی کی وجہ سے کتاب اور قرآن کریم اس کے اس لغت نازل کیا گیا، جسے وہ پہچانتے ہیں، تاکہ وہ کما حقہ تدبر کریں، تو یہ چیز عین صفات

کمال میں سے ہے، بس یہ ان کا قول ہے، اور ان کی توجیہ اور تحریر لیکن ہم کہتے ہیں، کہ یہ وجدان حق ہے جو کہ ان کے لئے ظاہر ہوا اس کے بعد انہوں نے اپنی رویت کی طرف رجوع کر لیا، تو ان کے سامنے ان کے وہ علوم آگئے جو کہ ان کے سینوں نے پوشیدہ کر رکھتے ہیں، کہ جس میں ان کے وجدان کی تاویل روشن ہوگئی اور ان کے قلوب کو وجدان سے اطمینان حاصل ہو گیا، ایسا اطمینان جو کہ اس تراشی ہوئی، تاویل سے ہے، بایں طور کہ ان کو اس چیز کی خبر نہیں، اور ایسا اکثر اتفاق ہوتا ہے، اور یہ بعینہ ہمارے اس مسئلہ کی مثال ہے سو جیسا کہ وعدہ حق ہے اور موعود کبھی ظاہر نہیں ہوتا، اسی طرح تعلیم حق ہے، اور اس میں تاویل تراشیدہ ہے، اور حق صریح یہ ہے کہ الہام بندہ کے لئے علی ماہی علیہ تجلی حقائق کی ایک قسم ہے، اور جس وقت بندہ اور تجلی صراح کے درمیان حجاب چھوڑ دیا جاتا ہے، اور بندہ اور حالت تجلی کے درمیان جو تنگ ہو جاتا ہے مگر بقدر انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کے حلقہ کے تو اس وقت یہ تجلی خطاب الہام اور خاطر و ہاتف ہو جاتی ہے، باعتبار اختلاف استعداد قوی دراکہ اور اسباب حاکمہ فی الوقت کے اور جب یہ امر اس طرح ہوا، تو عدم وقوع موعود کی دو شکلیں ہیں ایک تو ان میں سے یہ ہے کہ بندہ پر مساوات ملاء اعلیٰ میں کسی سردار کا اقتضاء منکشف ہو، بایں طور کہ اگر امر صرف اسی اقتضاء کے ساتھ جمع، تو اللہ تعالیٰ کی حکمت میں یہ چیز ضروری ہے کہ اس کی دعا قبول ہو، اور اس کے لئے اس کا اقتضاء زیادہ کیا جائے لیکن اس مقام پر اسی کی مانند ایک اور اقتضاء ہے جو کہ اس سے زیادہ موکد ہے، تو اللہ تعالیٰ کی حکمت میں یہ چیز واجب ہے کہ جس وقت یہ جمع ہوں اور قوت میں مقابلہ کریں وہ قوت جو کہ طبیعت کلیہ کے قلب میں بمنزلہ قوت ارادہ اور عزم کے ہیں، جو کہ عضلات کی تحریک کے ساتھ وابستہ ہے، تو فیصلہ فرمائے، دوسری طرح اور یہ چیز پائی جائے، دوسری مثال میں سو بسا اوقات یہ بندہ نہیں پہنچ سکتا، اس صمیم قوت عازمہ کو جو طبیعت کلیہ کے قلب میں ہے اور بیشک میں خیال کرتا ہوں کہ یہ مرکز عرش میں ہے اور مرکز اس کے لئے عناصر اور موالید کا ٹھکانا ہو گیا ہے، تا کہ اس کی جانب بلا واسطہ اضافہ ہو، اور اس سے اسی کی طرف مواخذہ کرے، بلکہ خلاصہ سید اور صفاوت ہمت تک پہنچے، اور اس سوراخ سے قوت عازمہ کی طرف دیکھے تا کہ آنکھ میں مرآت اور مرئی کا رنگ مختلط ہو جائے اور اس کا علم احاطہ اسباب اور اس حقیقت کی تہ تک پہنچنے سے قاصر ہو جائے تو وہ بندہ اس اقتضاء اور اس حکم کے علاوہ اور کسی

چیز کو نہ پہچان سکے اس لئے کہ اس سید کی ہمت تمام ان احکام کو جامع ہے اور اس کے احکام متضادہ کے لئے مانع ہے، چنانچہ جمع اور منع اس میں اس حیثیت سے سرایت کرتی ہے، کہ معلوم نہ ہو سکے اس کے بعد پھر یہ انکشاف خطاب سے ان اسباب کی طرف جو کہ ہم نے بیان کئے اور بیان نہیں کیے ہیں منقلب ہو جاتا ہے، اور یہ خبر دینی ظاہری طور پر نہیں ہوتی، کہ ضروری طور پر صادق ہو، اور دوسری بات یہ ہے کہ اس شخص کو ایک امر مجمل منکشف ہو جائے اور پھر یہ انکشاف اجمالی الہام کی جانب محول ہو جائے، چنانچہ پھر اس کے سینہ کی طرف علوم مخزومہ سبقت کریں، اور اس کی اس حیثیت سے شرح کریں کہ معلوم نہ ہو سکے اور جیسا کہ اس کے علوم انکشاف اجمالی کی خواب میں شرح کرتے ہیں اور وہ ایسا خواب ہو جاتا ہے، کہ اس میں تعبیر کی حاجت پیش آتی ہے سو اسی طرح یہ مختلط الہام اجمالی سے تراشیدہ ہے تعبیر کا محتاج ہو جاتا ہے اور اس وقت ٹھنڈک اور اطمینان کا کوئی اعتبار نہیں رہتا، اس لئے یہ فی الحقیقت ایک امر اجمالی سے دل کی تسلی ہے، بایں طور کہ وہ اس شرح میں محفوظ ہے اور کبھی اس کی طرف خطرات نفس متبادر ہوتے ہیں، اور ایسے ہی استعمال طبیعت اور شیطان کا دھوکہ تو انسان کی نظر تمیز سے قاصر ہو جاتی ہے، تو وہ امر اس کے نزدیک غیر مبین رہ جاتا ہے، الغرض جو بھی اس صورت مختلط کو دیکھے وہ یہی کہے گا، کہ وعدہ کیا، مگر موعود نہیں پایا گیا اور جو شخص کہ ہر ایک چیز کو دوسرے سے متمیز دیکھے، تو وہ کہے گا کہ وعدہ اجمالی ہے، اور وہ پورا ہو چکا، اگر چہ ایک عالم کے علاوہ دوسرے عالم میں ہو، اور ایک قالب کے علاوہ کسی اور قالب میں ہو، اور صورت تراشیدہ ہے، یا تو اس شئے کے ساتھ جو کہ اس کی تفسیر ہے اور محتاج تعبیر ہے، اور تعبیر کماحقہ نہیں دی گئی، یا اس چیز کے ساتھ مخلوط ہوگئی، کہ جس سے صدق آلودہ ہوا، اور اپنی صرافت پر باقی نہ رہی، خلاصہ کلام یہ ہے کہ دونوں وجہیں متوسطین کو لاحق ہوتی ہیں، مگر اہل کمال وہ ان سے علیحدہ ہیں، ہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ محتاج تعبیر ہیں، لیکن ان پر ان کے کمال کی بنا پر احکام عالم میں امر پوشیدہ نہیں رہتا۔ واللہ واعلم۔

تحقیق اور تمثیل

یہ بات سمجھ لینی چاہیے، کہ ارادہ صدور خلائق کی علتوں کا مرقی ہے، لیکن ارادہ کے لئے ایک علت ہے، کہ جس سے وہ صادر ہوتا ہے وہ کیا ہے ذات کا اس ارادہ کو مقتضی ہونا اور اس سے مستلزم ہونا بایں طور کہ کوئی اس میں شبہ نہ کرے اس لئے کہ ارادہ بذات خود واجب اور ضروری نہیں، لیکن ذات واجب الوجود کے واجب کرنے سے واجب ہوتا ہے، اس مقام پر ایک بات بہت مشکل باقی رہ گئی وہ یہ کہ کیا ارادہ کا تعلق اسی کے ساتھ ہے، نہ اس کی ضد سے باعتبار اس خصوصیت کے اور ایسے ہی اس کی تعین ذات ارادہ کے لئے واجب ہے، کہ ذات واجبہ کے لئے وجوب مرتفع نہیں ہوتا، یا اس کا وجوب اس جہت سے بھی ذات واجبہ کی طرف مرتفع ہوتا ہے، جیسا کہ نفس ارادہ وجود ذات واجب کی طرف مرتفع ہوتا ہے، غرضیکہ یہ راز اکثر انسانوں سے مخفی ہے، اور حق بات یہ ہے، کہ جو اس کی ذات کے وجوب کا فاقد ہے اور اس کا وجود اس کی ذات ہی سے ہے تو وہ ہر اس کمال کو فوت کرنے والا ہے، جو بعد میں اس کے وجود اور وجوب سے باعتبار ذات کے پیدا ہو، اس چیز کو اس کمال سے وہی آراستہ کرتا ہے، جو شخص کہ اسے وجوب کے ساتھ آراستہ کرتا ہے، لہٰذا استعدادات تاثیریہ میں فراخی کے علاوہ کہ جن کا نام اسما ہے اور کوئی تعلق ارادہ نہیں، اور وہ استعدادات تاثیریہ کہ جن کا نام اعیان ہے باعتبار اقتضائے ذات اور اس کے استلزام کے ساتھ اور ان دونوں استعدادات تاثیریہ کے لئے فراخی کرنے میں اس کے لئے ایک حصر ہے، جو کہ زیادتی کو منع کرتا ہے، اور اس نقصان کو جو ذات سے پیدا ہو، اور ہم اس کے لئے ایک مثال بیان کرتے ہیں کہ یہ بات ثابت نہیں کہ جس وقت محاسب ارادہ واحد کے ساتھ وابستہ ہو تو اس سے ایک پیدا ہوتا ہے، اور ایک دوبارہ نظر کے ساتھ تو دو پیدا ہو جاتے ہیں اور اس سے نکلا ایک اور ایک اور ایک، تیسری نظر سے تو تین پیدا ہو گئے، غرضیکہ جس وقت کہ ارادہ اس کے ایک مشتق کو دوسرے مشتق کے ساتھ ملانے سے متعلق ہو، بقدر اس کی وسعت علمی کے تو مراتب احاد عشرات اور مآت اور الوف پیدا ہو جائیں گے اس کے بعد اگر بعض کو بعض کے ساتھ باعتبار فرض عقل کے جمع کیا جائے تو امور غیر متناہیہ ہو جائیں گے بذات خود واحد کی طرف نسبت کرنے سے محصور ہیں،

کیونکہ وہ اس سے مشتق ہوئی ہیں۔ اس کے علاوہ کسی اور سے نہیں، اور انہیں مراتب بعض سے بطریقہ اشتقاق ممتاز ہیں، تو اس وقت علت ظہور ان صور عددیہ متکثرہ کے تعلق ارادہ کے ساتھ ظاہر ہوگئی کمال محاسب کے ظہور کے ساتھ اور ان مراتب کی تعیین کا منشا ترتیب اور انحصار اور انضباط کے ساتھ ایسے طور پر کہ اس میں نہ زیادتی ہو، اور نہ کمی وہ طبیعت عددیہ ہے جو ارادہ سے پہلے محفوظ ہے، گویا کہ ارادہ اسی کی طبیعت کے لئے حکایت ہے اور اس کے احکام کے ظاہر کرنے کے لئے منصہ ہے سو نسبت جعل اور ایجاد کی ماہیات کے ساتھ ایسی ہے جیسا کہ محاسب کی تاثیر اعداد میں ان کی صورتوں کے ظاہر ہونے کے طریقہ پر بعد اس کے کہ وہ نہ تھیں، اور نسبت ماہیات اور ان کے لوازم کی ان کے مفیض کی طرف جعل سے پہلے مراتب اعداد کی نسبت کی طرح ہے جو کہ واحد کی طرف ہو اور ان میں سے بعض کا بعض سے تقدم اور لزوم ان مراتب کے خواص کا صرف طبیعت عددیہ کی طرف سے ہے سو یہی معنی میں ان کے قول کہ ماہیات جعلی نہیں ہیں، اور جعل و ایجاد وہ ظہور اور فیض مقدس ہے اور ماہیات کا ارتباط اپنے مفیض سے ایسا ہے، جیسا کہ مراتب عددیہ کا ارتباط واحد کے ساتھ اور ماہیات کا تعین اپنے خواص کے ساتھ فرضاً وجوداً پہلے متعین ہونے کے ساتھ پہلے اور یہی وجود اقدس ہے، سو جیسا کہ عدد کے لئے سلسلہ مرتبہ ہے، کہ بعض ان میں بعض کے بعد میں یہ سلسلہ واحد سے لے کر غیر متناہی تک ممتد ہے اور جیسا کہ واحد میں جہت فرض اور تقدیر پوشیدہ ہے بیچ واحد کے جہت فرض سے نہ جہت تقرر بالفعل سے۔

اسی طرح ہے واسطے طبیعت کلیہ کے ساتھ اس شئے کے جو اس کے حیز میں ہے ارکان و موالید سلسلہ مرتبہ بعض بعض کے معلوم الخواص والمراتب چنانچہ اللہ تعالیٰ از روئے حکایت ان حقائق کو بیان فرماتا ہے وما منا الا لہ مقام معلوم کہ منفسر ہے طرف انواع کے انفسار حاصر ایسا کہ نہ زیادہ نہ کم اور نہ ممکن ہو ابد تک پھر منفسر ہوتی ہیں وہ نوعین طرف افراد کے جب ان کو ضرب کریں اتصالات فلکیہ وارضیہ میں اور ملاحظہ کریں وضع سابق کا واسطہ وضع لاحق کے تغیر نہایت ممتد ہے یہ سلسلہ ماہیت الماہیات سے اور حقیقت الحقائق سے طرف لا نہایت کے پنہاں ہے حقیقت الحقائق میں اور ابسط اشیاء ہے باعتبار فرض و امکان کے نہ باعتبار جہت تقریر بالفعل کے پھر مرتبط ہوا ساتھ حقیقت الحقائق خارج کے اور اس میں ظاہر ہوئی صورت حقیقت الحقائق کی اور ارتباط

خارج کا حقیقت الحقائق سے ایسا ہے جیسے ارتباط لوازم کا ساتھ ماہیات کے پس صادر ہوئی اس تجلی بالارادہ والاختیار سے طبیعت کلیہ واحدہ کہ وہ مانند ایک شخص واحد کے۔ ہے کہ جس سے صادر ہوئے اس کے واسطے سے ارکان وعناصر پھر حاصل ہے امتزاج عناصر وارکان سے موالید اور ادراک کیا اس شخص واحد نے اپنے رب کو فرد صمد اپنے خیال میں تو حاصل ہوئی صورت علمیہ کہ وہ کیفیت علمیہ ہے ایک اعتبار سے اور نفس معلوم ہے ایک اعتبار سے اور نفس علم ہے ایک اعتبار سے اور یہ پہلے تجلی ہے طبیعت کلیہ میں پھر نازل ہوئی تدارک عقیدہ تو ہوگئے حضرات ایمن ہی سے خطیرۃ القدس وغیرہ۔

(۳۹) مشہد آخر

اخلاق انسان میں سے ایک خلق ہے اس کا نام سمت صالح ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ وہ حفظ ہی نفس ناطقہ کا اپنے اعمال اور اخلاق کا جو اس میں اور اللہ تعالیٰ میں ہیں یا وہ اعمال واخلاق درمیان اس کے اور لوگوں کے ہیں اور ان کا ہدایت پانا ہے واسطے نظام صالح کے کہ اللہ تعالیٰ راضی ہو اپنے بندہ سے، تو جب اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کی بہتری چاہتا ہے تو اس کو سمجھ دیتا ہے اُن اعمال واخلاق کی اور ہدایت کرتا ہے اس کو ان کے نظام صالح کی وہ سمجھ افاضہ ہوتی ہے۔ درگاہ رحمت سے بے فکر وروبیت کے اس سے اور یہ افاضہ تحقیق ایک برکت ہوتی ہے نفخ کی گئی خلق سمت صالح میں اور یہ معنی ہیں اللہ تعالیٰ کے اس قول کے **واوحینا الیھم فعل الخیرات واقام الصلوٰۃ**۔ اور یہ صورت ہے ایجاد فعل کی اور تابع ہوتا ہے اس ایجاد کے، ایجاد علم ان اعمال واخلاق اور ان کے نظام محبوب کے ساتھ اور اللہ کے بندوں میں سے کوئی کامل نہیں ہوتا مگر ساتھ ان دو ہدایتوں کے، لیکن بہت سے افراد انسان ہیں کہ مستوجب ایجاد مشافہ کے نہیں درگاہ رحمت سے بغیر واسطے کے تو اس وقت بہتری یوں ہوتی ہے کہ رحمت متوجہ ہوتی ہے کسی کامل بشر کی طرف جو استحقاق رکھتا ہو اپنی حیات کے سبب اس امر کا کہ نکل آئے احکام فرد خاص سے اور رہ جائے گروہ مردم میں ان کے مزاج کے موافق اور ان کے مزاج کے موافق اعمال واخلاق کے اور ان کی ترقی کے طبیعت کے لائق جو ان کے واسطے تقدیر کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قربت سے اور نیز مستوجب ہو اس امر کا اپنی فطرت کے سبب کہ جذب کرے خیر طبیعت سے طرف خیز قدس کے اور وہاں منصبغ ہو اس کا

نفس ساتھ لون کئے کیونکہ اور احاطہ کرلے ان دونوں ہدایتوں کا از روئے تحقیق اور تبیین کی پس جس وقت متوجہ ہو رحمت طرف اس کامل کی جس کی یہ صفت ہو وہ رحمت اس سے مل جائے اور اس کو ڈھانک لے تو اس میں منطبع ہوجائے یہ سر مراد اور قالب ہوجائے، یہ سر اجمالی اپنی بقا کی صورت میں ساتھ احکام ان لوگوں کے پس سرایت کرے اس سے درانحالیکہ وہ طرف علم ہے پھر وارد ہو حیز نزول شرائع کی نبیوں پر از روئے وحی اور نزول طریقہ اولیا کے از روئے کشف اور الہام کے، تو محتاج واسطہ کا سنتا ہے اس سے ایسا کلام جو دلالت کرتا ہے، اوپر نظام مراد کے، پس متبادر ہوتی ہے اس کامل کی طرف اس کی فطرت اس سے اور اخذ کرتی ہے خلق سمت صالح اور خلق حکمت اللہ تعالیٰ کی توفیق سے جس قدر کہ اس کے خواص نفس کے مناسب ہے اور چھوڑ دیتا ہے امر عامہ کو پس متمثل ہوجاتا ہے اس کی آنکھوں کے سامنے نظام مراد اور ہوجاتا ہے حکم فیصل سب امور میں تو وہ فائز ہوتا ہے سعادت کو اور ہوجاتا ہے ان میں سے جنھوں نے صراط مستقیم کی ہدایت پائی ہے اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ ان میں سے تھے جن کی عقل مستوجب ہوئی بعد معرفت کے اس سننے کے جو مناسب تھا ان کے خواص نفس کو پہچانیں اکثر چیزیں امت کے حال کی، پس فرمایا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حالت کی آگاہی کے واسطے ان کو، **لقد کان فیمن قبلکم محدثون** الخ اور فرمایا، **لو کان بعدی نبی لکان عمر**، وہ یہ ہے اور بیشک مجھ کو دیا اللہ تعالیٰ نے اس میں سے حصہ پس سمجھا دیئے مجھے لوگوں کے مشرب اللہ کے قرب میں ان کی تو اس درگاہ سے یہ بات بھی ہے کہ انسان نہیں قابل ہوتا اس قربت کے جب تک نہ پہچانے نور طہارت کو اور اس کے فقدان کو اور جب تک نہ پہچانے طبیعت کے پردے پڑے ہوئے کو درمیان اپنے اور اس نور کے اور پہچانے طبیعت کے غلبہ کو اور اس کے علاج کو اور ہیئت نفسانیہ کو جو اعادہ کرتی ہے اس کی طرف وہ شئے جو گم ہوگئی ہے تجربہ کرے اس کو اپنے نفس سے اور احاطہ کرے اپنے نفس کا اس سے از روئے علم کے اور یہاں تک کہ پہچانے لذت مناجات کے سجدے میں اور پہچانے کہ کیونکر اس کی روح کو رقت ہوئی اور صاف ہوئی اس حالت میں اور اٹھ گیا حجاب جو اس روح کے اور اللہ کے درمیان تھا تو ہوگیا مشافہ سبب مناجات کے جیسا آنکھوں سے دیکھا اور پہچانے اس امر کو کہ کیونکر پردہ پڑتا ہے اس کے قلب پر بعد اسکے اور کیونکر دفع ہوجاتا ہے ساتھ التجا کے خشوع سے اور ہیئت بدنی اور نفسانی

پرلاتی ہے اس شئے کو جوگم ہوگئی تھی اور یہاں تک کہ پہچانے یقین کو یعنی جمع خاطری کو اللہ کی طرف اور اعتماد اللہ پر اور پہچانے کہ متضرع ہوتا ہے اس خلت پر تضرع بیچ دعا کے واسطے بہتری دنیا اور آخرت کے اور پناہ مانگنے فتنوں سے اس امر کی معرفت سے کہ اعمال و اخلاق اس کے اور اعمال و اخلاق اس کے سواء کے اور مصائب زبانی کے اس کے ساتھ ہیں نہیں سب اللہ کے ہاتھ ہیں جو خدا چاہتا ہے سو کرتا ہے اور پہچانے کہ یہ خلعت اسے کیا ہدایت کرتی ہے، استخارہ سے ہر شئے سے جو اس پر وارد ہو اور بے قراری سے طرف دعا کے اور پناہ مانگنی مضطرب ہو کہ جہت معرفت سے اور پہچانے کہ کیا اللہ نے اس کے واسطے مہیا کیا ہے دنیا و آخرت میں اس چیز میں جس سے رجوع ہو طرف قربت کے اور جنت بہتر ہے لذات فانیہ جسمانیہ سے اور یہاں تک کہ جان لے حجاب طبیعت کا اور کیونکہ اس پر غالب آجاتا ہے اور کیونکر اس کے نور کو فاسد کر دیتا ہے اور اطمینان کو پھر کیونکر علاج کیا جاوے غلبہ طبیعت کا اور پہچانے حجاب رسم وسوء معرفت کا پس جس شخص نے ان امور کو اپنے نفس سے پہچان لیا اگرچہ بقدر حوصلہ اپنے نفس کے تو وہ شخص مقرب ہے اور اس کے قلب میں ایمان کی بشاشت داخل ہوئی پس اپنے پر لازم سمجھ لے کہ تو اپنے نفس کا طبیب ہو اور خبردار ان علوم کو پس پشت نہ کیجئے۔

(۴۰) مشہد آخر

اطلاع دی مجھے اللہ سبحانہ نے روح کی حقیقت پر کہ بیشک روح وہ شئے ہے کہ اس کے بدن سے جدا ہونے سے انسان مر جاتا ہے اور اسی سے حس و حرکت و حیات ہے اور اس کے طبقے اور لطائف ہیں اقرب بدن میں اس کا جسم ہوا ہے کہ جس کا مقدار قلب میں ہے پھر وہ منتشر ہوتا ہے بدن میں اور اٹھاتا ہے قوت دراکہ اور طبیعت کو پھر ایک حقیقت مثالیہ ہے اور وہ وہ ہے کہ منعقد ہوتی ہے عالم ناسوت میں ظاہر ہونے سے پہلے اور اسی سے لیا گیا ہے میثاق پھر ایک حقیقت روحیہ ہے وہ ایک حصہ ہے صورت انسانیت کا ایسی صورت انسانیہ کہ مکتنف ہے، عوارض مشخصہ سے جو قوائے افلاک عناصر سے مقتضی ہیں واسطے احکام کے پھر صورت انسانیہ ہے قطع نظر مشخصات سے پھر صورت حیوانیہ ہے پھر صورت نامویہ ہے، پھر صورت جسمیہ ہے، پھر حصہ ہے طبیعت کلیہ سے، پھر

انبساط ہے حکم باطن الوجود کا، لوح خارج پر تو جو شخص کہے کہ روح جسم لطیف ہے حلول کئے ہوئے بدن میں جیسا حلول آگ کا کوئلے میں تو وہ سچ کہتا ہے اور جو کہے کہ روح مجرد ہے وہ بھی سچا ہے اور جو شخص کہے کہ روح قدیم ہے وہ بھی صادق ہے اور جو شخص کہے روح حادث ہے وہ بھی صادق ہے۔ لکل وجه هو موليها لیکن یہ امر پوشیدہ تر ہے کہ اقتصار تصور ہے۔

تحقیق

قال النبي صلى الله عليه وسلم لكل نبي دعوة مستجابة فتعجل كل نبي دعوته واني اختبأت دعوى شفاعة لامتي. اگر تم کہو کہ ہر نبی کے واسطے بہت دعائیں مقبول ہیں اور اسی طرح ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے بہت دعائیں مقبول ہیں جیسا کہ واقع ہوئیں استسقاء اور بے شمار موقعوں میں تو کون سی دعا کی طرف اشارہ ہے اس حدیث شریف میں کیونکہ اس کے سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک دعا ہے واسطے ہر نبی کے تو میں بتاؤں تم کو یہ خاص کسی مطلب کے رغب کی دعا نہیں ہے بلکہ جب بھیجا اللہ تعالی نے کوئی نبی اپنے بندوں پر لطف اور رحمت کے واسطے تو بندوں کا حال دو امر سے خالی نہیں یا اس نبی کے مطیع ہوئے تو یہ ان کے حصہ میں افاضہ برکات کا ہوا یا نہ ایمان لائے اس پر تو وہ مہربانی اور رحمت قہر وعذات ہو گیا ان پر اور دونوں صورتوں میں نبی کے دل میں یہ بات ڈالی جاتی ہے، کہ ان کے لئے دعاء خیر کرے یا ان کے لئے بد دعا کرے، سو یہ دعا واحد ہے، جو کہ ہر نبی کے لئے ہے جو اللہ تعالیٰ کے لطف سے پیدا ہوتی ہے جس کے لئے اس نبی کو بھیجا تھا، لیکن ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے نفس سے اس بات کو سمجھ لیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی بعثت سے فقط ان پر دنیا میں لطف کا ارادہ نہیں کیا بلکہ اس کے ساتھ قیامت کے دن عام رحمت کا ارادہ فرمایا اور ہم بیان کر چکے ہیں، کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آخرت میں شہید ہیں اور شہادت آپ کے خواص میں سے ہے، لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب میں یہ بات ڈالی گئی، کہ آپ اس دعاء کو محفوظ کر رکھیں قیامت کے دن کے لئے وہ دعا جو اس لطف سے پیدا ہو گئی۔ جو منشائے نبوت ہے لہٰذا اس راز کو اچھی طرح سے محفوظ کر لو۔

(۴۱) مشہد آخر وتحقیقات (یعنی انسان میں شرافت اور بزرگی موروثی نہیں

میرے دل پر خلق اور ایجاد کے علوم عموماً افاضہ ہوئے اور خلق کے نشأۃ خیالیہ میں خصوصاً اور اجتماع نقیضین اور ضدین کا نفس الامر میں مجتمع ہونا ممکن ہے، مگر یہ کہ احد النقیضین ایک درگاہ میں ہوا، مگر اس میں یہ یقین ہو، کہ یہ امر اسی طرح ہے اور دوسرا امر دوسری درگاہ میں ہو، اور اس میں یہ یقین ہو کہ یہ امر اس طرح نہیں ہے، اور ہم تم سے ان علوم کو بیان کرتے ہیں کہ جس طریقہ پر ان کا بیان کرنا آسان ہے، خلق اجزاء مختلفہ کا جمع کرنا ہے اور اس صورت کا افاضہ ہے، جو ان اجزاء پر مناسب ہو، حتیٰ کہ یہ اجزاء ایک شئے واحد ہو جائیں، اور خلق کبھی ہوتا ہے، عناصر سے تو اس وقت اجزاء عناصر جمع ہو جاتے ہیں، اور تمام اعراض میں صورت عنصریہ کے مناسب ہوتی ہے تو مخلوق انسان ہو جاتی ہے، یا فرس (گھوڑا) اور کبھی صورت خیالیہ سے ہوتی ہے تو تمام وہ خیالات جمع ہو جاتے ہیں جو خیال میں منتشر تھے، یا خیال میں حلول کرنے سے تنگ تھے، صورت واقعہ فی الخیال میں خارج کے توان پر یہ صورت افاضہ ہوتی ہے جو صورت خیالیہ کے تجرد میں ایک وجہ سے مناسب ہے اور مادہ کے ساتھ آلودہ ہونے کے دوسری وجہ میں اور ہر ایک خلق خواہ وہ کسی بھی عالم میں ہو، تو اس عالم میں اس عالم کے خارج سے کوئی شئے داخل نہیں ہوتی، اس لئے کہ یہ چیز محال ہے، عقل اسے ضرورۃً قبول نہیں کرتی، ہاں یہ بات ہے کہ ایک عالم دوسرے عالم کے لئے معد ہو جاتا ہے، اور ایک وجود ایک عالم میں دوسرے عالم میں موجود کے لئے معد ہو جاتا ہے اور یہ یہ سب اس کے تمام انتظام کے طبیعت کلیہ میں ہے، اور اس کی سرایت تمام عالم میں برابر ہے سو مناسب ہے کہ تیری نظر عالم خیالیہ میں مجرد ہو جائے تو اس مقام پر بنانا اور بگاڑنا، زندہ کرنا اور مارنا اور تقریبات ہیں واللہ ھنالک کل یوم ھو فی شان، بسا اوقات ارادہ الٰہیہ شخص خیالی کی تکوین کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے تو اس کے لئے تقریب برانگیختہ ہوتی ہے اور اس کے بعد اجزاء خیالیہ جمع ہوتے ہیں اور عجیب اسرار میں سے ایک خلق نسب ہے کہ اس کا وجود ہی نہ تھا، چنانچہ ایک شخص نفس الامر میں شریف ہوتا ہے اور دوسرا ایک ہی زمانہ میں نفس الامر میں شریف نہیں ہوتا، اور

یہ اس لئے کہ ایک شخص فی الواقع شریف نہیں ہوتا، لیکن وہ ایسے زمانہ میں پیدا ہوتا ہے کہ اتصالات فلکیہ اس وقت اس کی بزرگی کے مقتضی ہیں اور میری رائے میں یہ ایک نوع امتزاج ہے زحل کا شمس اور مشتری کے ساتھ بایں طور کہ زحل آئینہ ہے اور نور شمس اور مشتری اس میں منعکس ہیں تو اس وقت یہ چیز ہو جائے گی، اور اللہ تعالیٰ اس مولود (بچہ) میں بزرگی نسب اور اس کی بنا پر نباھت خوب اچھی طرح جانتا ہے، اور یہ اتصال اس طریقہ پر ہوا کہ اس کی صورت مفاضہ میں اس اتصال کا حکم اس طرح محفوظ ہو، جیسا کہ بچوں میں والدین کے اشکال اور ان کی صورتیں محفوظ ہوتی ہیں اور اس انسان میں شرافت موروثی نہیں، لہٰذا اولاً ملاء اعلیٰ میں اس کے شریف ہونے کا حکم دیا جاتا ہے پھر اس میں ہمیشہ یہ بات بڑھتی رہے جیسا کہ انسان اپنے بچہ کی تربیت کرتا رہتا ہے تو ایسا بڑھ جاتا ہے، کہ اس سے ملاء سافل کی طرف الہامات مترشح ہونے لگتے ہیں اور انہیں اسرار میں کاملین کے علاوہ بنی آدم کی قوتیں ہیں، سو جس وقت انسان اپنی جوانی کو پہنچتا ہے اور وہ اتصال آتا ہے جو اس کے ظہور نسب اور اس کے نباھت امر کو مستدعی ہے، تو اس وقت یہ سرزمین پر نزول کرتا ہے، اور لوگوں کی حفاظت یا بطون اوراق سے ایسی کوئی وجہ نکلتی ہے جو اس کے شریف ہونے پر دلالت کرتی ہے، اگرچہ یہ چیز نفس الامر کے مخالف ہی کیوں نہ ہو، لیکن اس مقام پر شباہت ہوتی ہے۔ تو بنی آدم کے خیالات منقاد ہو جاتے ہیں، تو سب اس کے شریف کہنے پر جمع ہو جاتے ہیں اور شرافت کی بنا پر اس کی عظمت کرنے پر اور جس وقت یہ انسان اہل صلاح سے ہوتا ہے، تو اکثر اوقات وہ خواب دیکھتا ہے کہ وہ شریف ہے، تو اس کے ذریعہ سے اس کا نفس مطمئن ہو جاتا ہے اور جس نے امر اول کی حفاظت کی اور ذکر کیا گیا کہ وہ شریف نہیں ہے، تو اس کا قول قبول نہیں کیا جاتا، بلکہ ملاء سافل کا انکار اس کا احاطہ کر لیتا ہے، اور ایسا ہو جاتا ہے کہ شریف کو برا کہے کہ وہ شریف نہیں ہے، اور یہ سب باتیں خارج میں ایک ہیئت رکھتی ہیں۔ اور تمثال ہیں، اس کے نفس کے رنگے جانے کے لئے شرافت کے نسب سے اور ہر ایک نباھت نسب کے لئے خارج میں ایک نسب ہے، کہ جو اس کی طرف منسوب کیا جاتا ہے بایں طور کہ وہ امام ہے دین میں یا بادشاہ ہے دین میں تو یہ استناد باعتبار وقت کے متعین ہو جاتی ہے، اور امر ایسا ہو جاتا ہے، گویا کہ سرے ہی سے تھا ہی نہیں اور اسی پر شرف جاتے رہنے کو قیاس کر کہ اللہ تعالیٰ ایسی تقریبات عجیبہ کو موجود کرتا ہے کہ اس کی وجہ سے سب

اس انسان کے شرف کو بھول جاتے ہیں، اور اس کی ذات سے شرافت نسب کی رنگت ختم ہو جاتی ہے، اور تمام انسان اس بات پر جمع ہو جاتے ہیں، کہ یہ شریف نہیں ہے، کہ یہ بات ملاء سافل میں لکھ دی جاتی ہے اور جو شخص اسے شریف کہتا ہے، تو اس کا انکار کیا جاتا ہے جیسا کہ کوئی غیر شریف کو شریف کہنے لگے۔ اور ہمارا مقصود اس سے اجتماع نقیضین نہیں ہے بایں طور کہ وہ ایک اعتبار سے شریف ہوا اور دوسری حیثیت سے غیر شریف اس لئے کہ یہ ایک شئے میں تناقض نہیں ہے بلکہ اس مقام پر دو درگاہیں ہیں ایک درگاہ میں تو یہ چیز ہے، کہ یہ من کل وجہ شریف ہے، اور دوسری درگاہ میں یہ بات ہے کہ یہ من کل وجہ شریف نہیں ہے، ان دونوں خبروں کی بناء پر جو ان درگاہوں میں مطابق ہیں، اسی طریقہ سے یہ بات ہے کہ ظالم بادشاہ کی خلافت ایک درگاہ میں خلافت ہے، اور دوسری درگاہ میں نہیں ہے، اور اسی سے تقارب زبان ہے، کہ جس وقت قیامت قریب ہوگی، تو ایک سال ایک ماہ کے برابر اور ایک مہینہ ایک جمعہ کے برابر اور ایک جمعہ ایک دن کے برابر ہو جائے گا، اور یہ ملاء اعلیٰ میں صورت فنا اور عدم کے انعقاد کی بنا پر ہے، تو اس چیز کا رنگ عالم ناسوت میں منافس ہوگا، چنانچہ ان کے خیال میں آئے گا کہ یہ امتداد ہے اور اس مقام پر امتداد وغیرہ کچھ نہ ہوگا، اور قیاسوں میں خلل پیدا ہو جائے گا، کوئی انسان اس بات پر قادر نہ ہوگا، کہ ایک دن میں وہ کام کرے جو پہلے ایک دن میں کرتا تھا۔ اور یہ اس سر مفاض کی تاثیر کی بنا پر ہے، جو ملا اعلیٰ سے بمنزلہ تاثیر کے افاضہ ہوا ہے، وہم انسان کے پیر کی لغزش کھا جانے سے اس درخت کے ٹہنے سے جو دو دیواروں کے درمیان ہے، اور اگر یہ ٹہنہ درخت کا زمین پر رکھا ہوتا تو پھر یہ لغزش نہ صادر ہوتی، اور اجتماع نقیضین کی بہت سی صورتیں ہیں، کہ ہمارا کلام اس وقت ان کا احاطہ نہیں کر سکتا۔

(۴۲) مشہد آخر (جنتیوں اور دوزخیوں کا لباس)

مجھ پر مبداء اور معاد کے اسرار افاضہ ہوئے تو معاد کے اسرار میں سے اہل جہنم کا لباس روغن قطران کے کرتے اور جنتیوں کا لباس سندس اور حریر اور ان کے علاوہ اور فاخرہ لباس اور اسی طرح دوزخیوں کے منہ سیاہ ہونا اور جنتیوں کے چہروں کا منور اور روشن ہونا اور اس کے علاوہ اور شکلیں جو

کہ ہم نے بیان کردیں، اوران چیزوں کا بیان دو مقدموں پر موقوف ہے، ایک تو ان میں سے یہ ہے کہ نفس کے درمیان یعنی جس سے انسان میں حس وحیوۃ کا ہونا، اوراس کے نکل جانے پر انسان کی موت ہے اور بدن کے درمیان بہت مضبوط امتزاج ہے خصوصیت کے ساتھ ان بنی آدم میں کہ جن کی فہم اس بات کی طرف سبقت کرتی ہے، کہ روح بدن کے لئے ایک وصف ہے اور وہی حیاۃ ہے یا روح بدن میں ایسی ہے جیسا کہ کوئلے میں آگ اوراسی موکد امتزاج کی بنا پر اوصاف نفس حالت خواب میں اوصاف بدن کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں اور دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ بعض حضرات عالم ناسوت میں کسی ایسی شے کی صورت کے ساتھ متمثل ہوتے ہیں، جیسا کہ عالم خیال مقید میں ان کا تمثال جیسا کہ سیدنا داؤد علیہ السلام کا واقعہ اور ملائکہ کا جھگڑوں کے متعلق متخاصمین کی شکلوں میں ظاہر ہونا ان کے بعض آدمیوں سے معاملہ کے بارے میں ارواح میں اور ان دونوں مقدموں کی تمہید کے بعد ہم کہتے ہیں، کفر کا رنگ ان کی ذاتوں پر یہی روغن قطران کے لباس کی شکل میں ہے، اور منہ کی سیاہی کی بوجہ لعنت الٰہیہ کے تاثیر کرنے کے اور ایمان کا رنگ ان کے نفوس پر لباس سندس کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے، اوران کے چہروں کا منور ہو جانا بسبب اللہ تعالیٰ کے ان کے ساتھ عنایت کرنے کے اور میں نے یہ چیز باعتبار رویت روحانیہ کے دیکھی، اور مبداء کے اسرار میں سے یہ ہے کہ میں نے وجود منبسط کو حق میں دو طریقہ سے متلاشی دیکھا اس کے ذات الٰہی کی جہت سے صادر ہونے کے طریقہ پر اور تجلی الٰہی کے اس میں ظاہر ہونے کے طریقہ پر بایں طور کہ وہ تمام جامع چیزوں کا احاطہ کرلیتی ہے سو جو اس چیز کا ناطق ہے کہ وجود منبسط وہ اللہ ہے سو یہی اس کی غفلت کی نشانی ہے، لیکن نظر دقیق اس بات کا تقاضہ کرتی ہے، کہ ذات واجبہ سے ایسی شئون صادر ہوتی ہیں جو کہ مبداء اول میں ہیں اور پھر وجود منبسط صادر ہوتا ہے، اور وہ فعلیت اور خارج ہے، پھر خارج میں ایک شان کے بعد دوسری شان ظاہر ہوتی ہے اس ترتیب کے مطابق جو کہ اس میں پوشیدہ ہے۔

(۴۳) مشہد، یعنی ولی کو خلعت قطبیت کس وقت پہنایا جاتا ہے

مجھ پر کرامات کے ظاہر ہونے کے طریقہ پر عجیب اسرار ظاہر ہوئے۔ سمجھ لو کہ کرامت اس

قوت کے علاوہ جو کہ نفس ناطقہ میں ہے، اور کسی چیز سے برانگیختہ نہیں ہوتی، سو جس وقت ملاء اعلیٰ سے تیاری ہوتی ہے اور اس کی ہمت اس قوت کے ساتھ ملحق ہوتی ہے جو کہ شخص اکبر کا ارادہ کرنیوالی ہوتی ہے، تو اس قوت عازمہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ چیز بمنزلہ استحسان کے ہو جاتی ہے، تو اس وقت صورت مطلوبہ اس مقام پر عزم یقینی سے بدل جاتی ہے، اولیاء کرام کی اس مقام پر دو حدیں ہیں ایک تو وہ حد ہے، کہ اس مقام پر ادنیٰ خطرہ اور ادنیٰ استحسان ہو، جو کہ قوت عازمہ کے ساتھ متصل ہے، اور دوسری ان میں سے وہ حد ہے، کہ اس مقام پر وہ ہمت قویہ ہو جو کہ صلب نفس مستمرہ سے اوقات کثیرہ میں نفس پر منبعث ہے جو کہ اس سے متصل ہے، اور دونوں طرفوں کے درمیان بہت سے مراتب ہیں، اور اوقات اور احوال اور اسباب کیلئے خواص ہیں پھر اولیاء کی ان میں سے دو قسمیں ہیں، ایک تو ان میں سے وہ ہیں کہ ان کی ہمت نفس انکے نزدیک متمثل ہے، اور وہ آثار کو اس سے صادر ہوتا ہوا دیکھتے ہیں، اور ایک ان میں سے وہ ہیں، کہ جن کی ہمت غیر متمثل ہوتی ہے، بلکہ مضمحل ہوتی ہے، خاطر یا خیال یا لفظ ہیں، تو وہ اس کے لئے توجہ نہیں پاتے اور کسی وقت تدبیر حق اور اس کی رحمت کے ساتھ یہ چیز مائل ہوتی ہے، تو اس سے آثار کا صدور ہوتا ہے، اور پہلی چیز ہند خراسان اور اس کے قرب میں بہت ہے اور دوسری چیز حجاز اور یمن اور اس کے قرب وجوار میں، بکثرت ہے پھر اولیاء کرام کیلئے اوقات ہیں، بعضے ان میں سے وہ ہیں، کہ ان کا ارادہ صرف استبعاد کے غیر مزاحم ہو، یا اسے اللہ تعالیٰ کی سنت کے مخالف سمجھتا ہو بایں طور کہ وہ مقصود میں تاثیر کرنے میں بہت سریع ہے، سو جس وقت اس کے دل میں خاطر استبعاد یا سنت اللہ کی مخالفت کا خطرہ پیدا ہوتا ہے تو اس کا قلب رک جاتا ہے جیسا کہ حیاء اور شرمندگی کے آجانے پر اور یہی رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کا راز ہے، جو کہ آپ نے ابو رافع سے فرمایا، جس وقت آپ ﷺ نے ان سے تیسری مرتبہ دست طلب کیا تھا، انہوں نے عرض کیا تھا کہ یا رسول اللہ بکری کے دو ہی دست ہوتے ہیں، آپ نے فرمایا تھا، اگر تم خاموش رہتے دست کے بعد دست لا کر دیتے رہتے، اور بعضے ان میں سے وہ ہیں، کہ جن میں مخالفت استبعاد اور انکار قوم زائد نہ ہو، مگر صرف عزیمت میں شدت ہو جیسا کہ تم جنگ وجدال اور معرکوں میں دلیروں، بہادروں اور ہم عمر جنگ جو انسانوں کو دیکھتے ہو۔ پھر اولیاء کے باعتبار انبعاث داعیہ کے دو طبقے ہیں بعضے ان میں سے وہ ہیں، کہ ان

میں داعیہ حق تعالی کے الہام سے منبعث ہو، اور یہ اس بنا پر کہ نظام خیر کا ارادہ اپنی ہمت میں دواعی کو پیدا کرتا ہے، اور یہ کہ اسباب مقتضیہ کے لئے یہ داعیہ حادث ہوتا ہے جیسا کہ خضر علیہ السلام کا واقعہ یا یہ داعیہ مستمرہ ہوتا ہے جیسا کہ امت عوجاء عمیاء کی اقامت کا ہمارے رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے ساتھ ارادہ فرمانا تو یہ ارادہ مستمرہ ہے اور یقیناً قلب مقدس کے ساتھ کوئی بھی گوشہ اس کے گوشوں میں سے متصل رہے گا، تو یہ چیز افاعیل خاصہ کیلئے ارادہ ہو جائے گی اور ان اوضاع جزئیہ کیلئے جو وقت اور مقام کے مناسب ہوں، اور یہی وہ طبقہ علیا ہے جو کہ کمال مطلق کے ساتھ خاص ہے، تو یہی چیز شرافت اور قبولیت دعاء اور تکثیر طعام و آب باعتبار مقتضیات اور معدات کے اسی وقت اور اسی پر علم کے چشمہ کو قیاس کرو، جو ناموس سے جاری ہے، اور ملاء اعلیٰ میں منعقد ہے، اہل زمین کے خیر کے ارادہ سے تو وہ ہمیشہ ان کے قلب مقدس سے متصل ہے، لیکن باعتبار اوقات اوضاع، اور ہیات نفس کے ان کی صورتیں مختلف ہیں چنانچہ یہ چیز کبھی تو الہام قلب کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے، اور کبھی فرشتہ کی شکل میں متشکل ہوتی ہے، اور کبھی افاضہ برکات رویت میں اور کبھی مقام میں اور بعض ان میں سے وہ ہوتے ہیں کہ داعیہ شغلیہ انہیں میں باعث ہوتا ہے، اور یہ مقام کمال نہیں ہے، مگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ چیز جامعیت کے معنیٰ کو پوری کرنے والی ہے، اور اسی کی جانب ان کے مشہور مقالہ میں اشارہ ہے کہ **انا العارف لا همته له**، پھر جب کہ ولی قوت عازمہ کی اس حد کو پہنچتا ہے، تو اسے خلعت قطبیت مشہد سویداء قلب میں شخص اکبر کی طرف سے پہنایا جاتا ہے تو اس وقت وہ لوگوں کی پناہ کا مقام ہو جاتا ہے، اور ان کے متفرقات کو جمع کرنے والا اور میری رائے میں تنہا ایک شخص کیلئے اس مرتبہ کا واجب ہونا ضروری نہیں بلکہ بسا اوقات دو اور تین اور اس سے زائد کے ساتھ یہ چیز متصل ہو جاتی ہے، اور حضرت ان میں سے ہر ایک کیلئے ایسی ہوتی ہے، جیسا کہ وہ اس کے اندر مفرد ہے، اس کی مثال انسان کے طریقہ پر ہے، کہ ہر ایک فرد بشر انسان ہونے میں متفرد ہے، بغیر کسی مزاحمت کے اگرچہ یہ ہزاروں میں اور جس شخص نے اس سے انفراد شخصی کا گمان کیا، تو وہ اس راز کے علاوہ اشارہ کرتا ہے کہ جس کی جانب میں اشارہ کیا، اور وہ اس انفراد کے ساتھ عروج حاصل کرے جس کو میں نے بیان کیا، اور اسے اس کے غیر محمل پر محمول کیا جائے، الحمدللہ کہ ان تمام مقامات سے کہ جن کی جانب میں نے اشارہ کیا ہے مجھے چھلکتا ہوا جام پلایا گیا۔

(۴۴) مشہد آخر، شہر اجمیر میں کفر کی باتوں کا رواج

میں نے اپنے کو خواب میں قائم الزمان دیکھا، میرا مقصود اس سے یہ ہے، کہ اللہ تعالیٰ جب کسی چیز کا نظام خیر سے ارادہ کرتا ہے، تو مجھے اپنی مراد کے اتمام کے لئے اعضاء کے طریقہ پر بنا دے اور میں نے دیکھا کہ کفار کا بادشاہ مسلمانوں پر غالب آگیا، اور ان کے مالوں کو لوٹ لیا، اور ان کی اولاد کو غلام بنالیا، اور شہر اجمیر میں کفر کی باتوں کو رائج کر دیا، اور شعائر اسلام کو مٹا دیا، عیاذ باللہ، نتیجہ یہ ہوا، کہ الہ العالمین زمین والوں پر بہت شدید ناراض ہوا اور میں نے اس غضب کی صورت ملاء اعلیٰ میں متمثل دیکھی، تو پھر یہ غضب میرے جانب مترشح ہوا تو میں بسبب اس درگاہ سے ڈرائے جانے کے بہت غضبناک ہوا، اس بنا پر نہیں کہ وہ اس عالم کی جانب رجوع کر رہا ہے، اور میں اس وقت لوگوں کے جم غفیر میں ہوں، ان میں سے روم، ازبک اور انہیں ہی میں سے عرب ہیں، بعض ان میں سے اونٹوں پر سوا ہیں اور بعض ان میں سے گھوڑوں پر سوار ہیں، اور بعض ان میں سے پیادہ سبقت کر رہے ہیں اور میں نے جو دیکھا تو یہ میدان عرفات میں حاجیوں کے بہت مشابہ محسوس ہوئے اور میں نے دیکھا، کہ وہ سب میرے غضب ناک ہونے کی بنا پر غضبناک ہیں، اور مجھ سے دریافت کر رہے ہیں، کہ اس وقت اللہ تعالیٰ کا کیا حکم ہے، میں نے کہا کہ ہر ایک نظام کے دور کرنے کا انہوں نے عرض کیا، کب تک میں نے جواب دیا، جب تک کہ میرے غصہ کو ٹھنڈا کو نہ دیکھ لو، تو پھر وہ آپس میں قتال کرنے لگے اور اپنے اونٹوں کے چہروں کو مارنے لگے، ان میں سے بہت سے قتل ہوئے اور بہت اونٹوں کے سر پھوٹے اور زخمی ہوئے، پھر میں ایک شہر کی طرف بڑھا، اسے ویران کرنے اور اس شہر والوں کو قتل کرنے کے لئے چنانچہ اس چیز میں بھی انہوں نے میری پیروی کی اور اسی طرح ہم ایک شہر کے بعد دوسرے شہر کو خراب کرتے رہے، یہاں تک کہ اجمیر پہنچ گئے، اور ہم نے وہاں پہنچ کر کفار کا قتال کیا، اور کفار سے اس شہر کو چھوڑ ایا اور کفار کے بادشاہ کو قید کیا، پھر میں نے دیکھا کہ کافروں کا بادشاہ مسلمانوں کے بادشاہ کے ساتھ ان کی جماعت میں جا رہا ہے، تو اس اثناء میں مسلمانوں کے بادشاہ نے اس کے ذبح کر دینے کا حکم دیا تو لوگوں نے اسے پکڑ لیا اور اس کو گرا دیا، پھر چھری سے ذبح کر کر ڈالا، سو جس وقت میں نے خون

کو دیکھا، کہ اس کی رگوں سے فوارہ کی طرح نکل رہا ہے، تو میں نے کہا کہ اس وقت رحمت نازل ہوئی ہے، رحمت اور سکینت کو دیکھا کہ مسلمانوں میں سے انہیں شامل ہوئی، کہ جنہوں نے قتال کیا ، اور یہ مسلمان رحمت کے مظہر ہو گئے تو پھر میری طرف ایک آدمی کھڑا ہوا، اور مجھ سے ان مسلمانوں کے بارے میں دریافت کیا، جنہوں نے آپس میں قتال کیا ہے، سو میں جواب میں توقف کیا، اور انہیں صاف نہ بتلایا اور میں نے یہ منظر شب جمعہ اکیسویں ماہ ذی قعدہ ۱۱۴۴ھ کو دیکھا۔

(۴۵) یعنی دقائق اور ان کے اثرات

اس میں کسی قسم کا کوئی شبہ نہیں، کہ حقیقت الحقائق وحدت ہے، اس میں کثرت نہیں، اور اس کے لئے تنزلات ضرور ہیں تا کہ کثرت ظاہر ہو، اور اس کے خاص اور احکام کے مراتب متعین ہوں، اور اس وحدت کی حرکت اس کی صرافت وحدت سے آخر مراتب تک تدریجیہ ہے اور اس کی کوئی حد نہیں مگر نفس ظہور اس کمال وحدت کے اور اس کی حرکت لنفسہا کے لئے اس کے مراتب کثرت کے وقت جب مقدس اعلیٰ ہے، اس سے کہ جسے ایک قوم، ارادہ اختیار یہ کہتی ہے، اور دوسرے ایجاب طبعی اور یہ اول امر میں حب بسیط ہے، پھر اس کا دائرہ آہستہ آہستہ وسیع ہوتا گیا بمقابلہ اتساع کثرت کے اس لئے کہ ہر مرتبہ خاصہ کیلئے ایک حب خاص ہے، جو سبب ہے اس کے ظاہر ہونے کے لئے اور وہ بساطۃ اولیٰ میں تمام ان محبات سے خالی نہیں ہے، جو کہ بعد میں ظاہر ہوئیں لیکن وہ اس میں مندمج ہیں، پھر ظاہر ہوئیں اور پوشیدہ اور پھر ظاہر ہو گئیں، یہ اصول ہیں، کہ جسے ذرا سی بھی عقل ہو اسے ان میں سے کسی حالت میں بھی شبہ کرنا درست نہیں اور ہمارے لئے اس کے بعد ایک اور مشہد ہے سو ہم نے مشاہدہ کر لیا، کہ تمام مراتب کا اندماج اس بساطت میں ایک حد پر نہیں ہے، بلکہ اس مقام پر ایک حب خاص ہے، جو کہ اس حب بسیط میں مندمج ہے اور وہ بمنزلہ ظاہر بارز موجود بالفعل کی ہے، اور ایک اور حب ہے جو قوت قریبیہ یا بعیدیہ کے طریقہ پر ہے اور حب ظاہر اس سے ایسی حب ہے، جو کہ نشاۃ کلیہ کے اولاً اور بالذات ظاہر ہونے کے ساتھ متعلق ہے، اور اس مقام پر اس نشاۃ کے افراد کا تذکرہ نہیں، پھر جس وقت اس نشاۃ کے افراد کے ظاہر ہونے کا وقت آتا ہے تو ظہور افراد کا حب اپنی تفاصیل کے ساتھ بارز اور ظاہر ہو جاتا ہے

اور اسی سے وہ حب ہے، جو کہ نشاۃ کے ایسے فرد کے ظاہر ہونے کیساتھ متعلق ہے جو کہ مثال میں فرد مشخص ہو، اور فرد منتشر جو کہ عالم ناسوت میں بہت سے افراد پر علی سبیل البدل شامل ہو بایں طور کہ اس مرکز میں ایک شخص قائم ہو، اور اس کے بعد دوسرا شخص اور اسی طرح سلسلہ جاری رہے پھر جب متعلق ظہور فرد کے ساتھ اس معنی کے اعتبار سے یا تو تدبیر الٰہی کے ظاہر ہونے کا قصد کرے گا، جو کہ اس نشاۃ کے ساتھ متعلق ہے یا نہیں اور اسی طرح جب کہ یہ حب ظہور نشاۃ کلیہ کے ساتھ متعلق ہو اور پھر اس سے حب اس کے افراد اور اشخاص کے ظاہر ہونے کا وقت منفسر تو ہو وہ بھی یا تو ظہور تدبیر الٰہی کے قصد کے ساتھ منفسر ہوگی یا مقصود نہ ہوگی، مگر نفس نوع کے وجود کا کمال ہے، یہ ہم نے مشاہدہ کر لیا، اور ہم نے یہ بھی مشاہدہ کیا کہ نشاۃ انسانیہ نشاۃ حیوانیہ کے تابع نہیں ہے، بلکہ اس کے بالمقابل ایک حب خاص ہے، جو اول الامر میں ظاہر ہوگی، اور اسی نشاۃ حیوانیہ کی ناموسیہ کے تابع نہیں ہے، اور ہم نے مشاہدہ کیا ہے، کہ وہ حب جو کہ ظہور فرد کیساتھ متعلق ہو، جبکہ وہ اول الامر میں ہو تو یہی مراد تمام نشاۃ الٰہیہ اور کونیہ کے لئے فرد جامع ہوتی ہے پھر اگر اس تدبیر نشاۃ کا قصد کیا جائے، تو یہی فرد نبی ہے، جیسا کہ حقیقت نبویہ جو کہ عالم مثال میں متمثل ہے، اور وہی نبی بالاصالت ہے، اور برابر عالم ناسوت میں ایک مثال کے بعد دوسری مثال ظاہر ہوتی رہتی ہے، حتی کہ ہمارے سردار حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پائے گئے تو ان کی وجہ سے اس مرتبہ کے احکام پورے ہو گئے اور اگر اس سے تدبیر نشاۃ مقصود نہیں ہوتی بلکہ نفس تحقق اس وجہ کا کمال سے مقصود ہوتا ہے۔ تو وہ ایسا فرد ہوتا ہے، جو کہ نبی نہیں ہے اور جس وقت حب نشاۃ کلیہ کے ساتھ متعلق ہو، اور پھر جب اس کے افراد کے ظاہر ہونے کا وقت آئے، تو حب دوسری مرتبہ ظہور فرد کے ساتھ متعلق ہو جائے پھر اگر اس کے ذریعہ سے اس وقت تدبیر نشاۃ کا قصد کیا جائے تو وہ انبیاء میں سے ایک نبی ہے، اور وہ فرد جامع نہیں ہے، اور اگر اس وقت اس کے ذریعہ سے یہ قصد نہ کیا جائے بلکہ محض ان کمالات کے ظاہر ہونے کا خیال ہو کہ جن میں قوی الٰہیہ، قوی کونیہ پر غالب ہوں، تو وہ ولی فانی اور باقی ہے، اور بسا اوقات حب اول امر میں متعلق نہیں ہوتی اور نہ ظہور افراد کے وقت نشاۃ کلیہ کیلئے ظہور افراد کے ساتھ بلکہ ظہور افراد کے ساتھ بلکہ ظہور افراد کے وقت عالم ناسوت میں متعلق ہوتی ہے، اور اسوقت اگر اس کے ذریعہ سے تدبیر ملت کا قصد کیا جائے، تو وہ وارث الانبیاء ہیں، یا

اس کے علاوہ اور کسی چیز کا تو وارث ملاء اعلیٰ ہیں، یا قصد نہ کیا جائے، مگر صرف اس کا راشد ہونا تو وہ وارث الاولیاء ہے یہ بہت باریک معرفت ہے، مضبوطی کیساتھ اسے محفوظ کرلو، پھر اس کے بعد یہ بات سمجھو کہ فرد کے لئے احکام ہیں، کہ جو ان کے بغیر نہیں پائے جاتے، بعض ان میں سے وہ ہیں کہ ان کے لئے اول ہی سے جب سے نقطۂ حبیہ سے سفر شروع کیا، کوئی قیام گاہ نہیں تاوقتیکہ وہ اس شئے کی طرف عود نہ کرے کہ جس کے لئے سفر کیا اور ہر نشأۃ کیلئے ایک پناہ گاہ ہے اور اس کے درمیان سیر تیر کی رفتار سے زیادہ تیز ہے، جس وقت کہ اسے کمان سے پھینکا جائے حتیٰ کہ اپنے نشانہ پر پہنچ جائے، تو وہ نشأۃ کی کسی بھی گندگی اور نجاست سے آلودہ نہیں ہوتا، بخلاف اس کے غیر کے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت میں ہو کہ نشأۃ متاخرہ نشأۃ متقدمہ سے مدد حاصل کرے از روئے ضرورت کے بعض ان میں سے وہ ہیں کہ انہیں محبت ذاتیہ حاصل ہوئی ہے اور اس کی حقیقت نقطۂ حبیہ ہے جو کہ اس شئے کیجانب عود کرنیوالی ہے کہ جس سے سیر باعتبار علم کے یا حال کے اور نشأت کے حاصل ہوتی ہے اور اس کے غیر کے لئے اس قسم میں کوئی حصہ نہیں ہے اور انہیں امور میں سے ایک چیز یہ بھی ہے کہ سبب حقیقی انتقال فرد کیلئے ایک نشأۃ سے دوسری نشأۃ کی طرف نہیں ہوتا، مگر محبت ذاتیہ کیلئے ایسا ہوتا ہے، چنانچہ تفصیل اس کی یہ ہے کہ فرد جس وقت مستودع میں ورود کرتا ہے، تو ضروری ہے، کہ کسی زمانہ کی طرف التفات کرے اس نشأت کے احکام سے تا کہ اعلیٰ بلندی کو واصل ہو جائے اور اس کے غارب پر ٹھہرا رہے، اور اس سے وہ باتیں ظاہر ہوں، جو کسی اور سے ظاہر نہیں ہوئیں، پھر اس کے بعد یہ چیز ضروری ہے، کہ وہ نشأۃ اسے اپنے میں سے نکال دے۔ جیسا کہ بچہ اپنے ماں کے پیٹ سے نکلتا ہے اور اس سے بچپن کا نشأۃ دور ہو جاتا ہے، سو جس وقت دور ہونے کا وقت آتا ہے، تو نقطۂ حبیہ اس میں یاد آجاتا ہے جو کہ مقر عزت اور حیز بساطت ہے، اور بہت شدت کے ساتھ مشتاق ہو جاتا ہے، تو اس کا جوش اس کی ذات کے لئے یہی محبت ذاتیہ ہے، اور اس کی خاصیتوں میں سے یہ ہے کہ اس کی نشأت کی رگیں منقطع ہو جائیں اور وہ مر جائے اور اس کی روح اس کے جسم کثیف خالی سے رہا ہو جائے اس جس وقت اس کی روح کا نسمہ ہوائیہ سے منفک ہونے کا وقت آتا ہے، تو اس کی جانب وہ محبت کی شدت اور بے تعلقی عود کرتی ہے اور جب اس کی روح کے داخل ہونے کا وقت ہو تب بھی اس کی جانب عود کرے، اور اسی طرح سلسلہ باقی

رہے، تاوقتیکہ نقطہ اپنے حیز اور موضع بساطت کو نہ پہنچ جائے، اور اپنی قرار گاہ عزت کو لیکن نہایت میں نشأۃ جسدیہ کے ٹھہرنا، سو یہ چیز انبیاء میں تو ظاہر ہے اور ان کے علاوہ اور حضرات میں وراثت انبیاء کے مراتب کے اعتبار سے ہے، جیسا کہ مجددیت اور قطبیت اور ان کے آثار اور احکام کا ظاہر ہونا اور ہر علم اور حالت کی حقیقت تک پہنچنا اور واصفون کے درمیان جمع ہر مقام پر ہر ایک انسان کے لئے حاصل ہے، جس وقت سے خلقت پیدا ہوئی ہے اور اس سے رقائق کا ظاہر ہونا، اور ہر رقیقہ کے لئے اس کے مناسبات میں سے متعین کرنا، اور ہر رقیقہ کے آثار کا اس طریقہ پر آنا کہ کوئی شان اس میں کسی شان سے مشغول کرنے والی نہیں، اور نشأۃ نسمیہ کی بلندی پر ٹھہرنا، سو اس سے یہ ہے، کہ یہ معد ہوتی ہے، ان علوم نسمیہ نے وصول کی طرف جو کہ مقید ہیں، اپنے اجساد کے ساتھ تدلی اعظم کی طرف کہ جس سے طبیعت کلیہ پر ہے، اور یہ کہ جارحہ ہو جائے افاضہ صور خارجیہ اور وقائع کونیہ میں اور اگر حق بات معلوم کرنا چاہتے ہو تو فرد کے لئے حال اور مقام اور منصب کچھ بھی نہیں، ہر ایک چیز لسان رقیقہ اور حال تدلی پر ہے، لیکن تمام عالم کو حال اور منصب نہیں، پوشیدہ کر سکتا ہے، احوال اور مناصب تو سب اس میں ہے تو اس وجہ سے مناسب ہے کہ محمول کیا جائے افراد میں سے ہر ایک کے کلام کو ان چیزوں کے ساتھ جو کہ مشعر ہوں اس کے قیام سے تدبیرات عالیہ اور مناصب مشاحہ میں سے اور ہم اس کے جامع کلام اور ملاک امر سے تجھے آگاہ کرتے ہیں، اگر تو سمجھ دار ہے اور اس میں دس رقائق بارزہ ظاہرہ ہیں، اور ہر ایک رقیقہ کیلئے حکم اور اثر خاص ہے، کہ ضروری ہے کہ وہ آثار اس سے ظاہر ہوں اور اس کے لئے یہ بات درست نہیں، کہ وہ اپنے نفس کو اس سے روکے اس لئے وہ وہ ایسی جبلت ہے کہ اس پر رقیقہ قمریہ ظاہر ہوئی ہے، جو کہ مقابل ہے، علوم کسبیہ کے علم حدیث اور برکات طریق سے اور جو مشائخ صوفیہ کیطرف منسوب ہے اور ایک رقیق عطاردیہ ہے، کہ جو ان علوم کسبیہ کے مقابل ہے کہ جن سے تصانیف اور ہر علم میں رائے خاص ہے کہ اس کی نظر اس تک پہنچی، خواہ کوئی علم ہو، معقول ہو یا منقول اور ایک رقیقہ زہریہ ہے جو کہ جمال اور محبت کے مقابل ہے کہ وہ ہر ایک کو دوست رکھتا ہے اور ہر ایک اسے دوست رکھتا ہے اس حیثیت سے کہ دونوں کو معلوم نہیں، اور ایک رقیقہ شمسیہ ہے کہ جس کے مقابل غلبہ اور ظہور ہے تمام چیزوں پر باعتبار معنی اور استحقاق کے اور اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوق کو حکم وحدانی

کے ماتحت جمع کرنے کے لئے اور ایک رقیقہ مرتبخہ یہ ہے، کہ اس کے ہر کمال کے تاصل شدت اور رسوخ مقابل ہے، اگر وہ نہ ہوتا تو ہر ایک چیز بیکار اور بناوٹ کے اعتبار سے کمزور ہوتی ہے، اور ایک رقیقہ مشتریہ ہے کہ جس کے مقابل قطبیب، امانت اور ہدایت ہے اور اس میں لوگوں کا مرجع ہونا کہ جس میں انسان اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کریں، اور ایک رقیقہ زحلیہ ہے کہ جس کے مقابل ہر رقیقہ کی بقاء اور تاصل ہے اور اس کا درازی زمانہ تک نافذ ہونا ہے اور نیز طبیعت کلیہ کی جانب تجرد ہے اور ایک رقیقہ ملاء اعلیٰ کیجانب سے ہے، اس کے مقابل وہ ہمت تام ہے جو کہ ان سے ملی ہوئی چیزوں کا احاطہ کرنے والی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی نظر کا قالب ہے اور اس کی عصمت ہے، اور ایک رقیقۂ ملاء سافل کی طرف سے کہ جس کے مقابل وہ نور ہے کہ جو اس کے ہاتھوں اور پیروں اور اس کی آنکھوں میں اور تمام اس کے اعضاء میں داخل ہے اور ایک تدلی الٰہی کا رقیقہ ہے، جو اللہ تعالیٰ کے بندوں کی جانب متدلی ہے، اس سے دو شعبے منشعب ہوتے ہیں، شعبۂ نور نبوت اور شعبۂ ولایت اور اس کے بعد نفس بالکل نفس قدسیہ پیدا ہوتا ہے، کہ پھر اسے کوئی شان کسی شان سے نہیں روکتی، اور اس پر احوال میں سے کوئی حال بھی نہیں آتا، نقطیہ کلیہ کے تجرد کی جانب مگر وہ اس سے اسوقت باخبر ہے اور آنیوالی شیئے اجمال کی تفصیل اور شرح نقطہ کی اور اس کے دورہ کے ساتھ اور فرد سے کرامات کا صدور اس طرح نہیں ہے، جیسا کہ غیر سے اس کا صدور ہے، اس لئے اس کے غیر سے آثار اور خوارق اس حالت کے غلبہ سے صادر ہوتے ہیں، جو کہ اس میں ہے، جسوقت کہ وہ حالت اس کے طبقات وجود پر حکم کرتی ہے اور مسلط ہو جاتی ہے اور اس کے علاوہ عمدہ اور کوئی نہیں ہوتی، لیکن فرد کا ہر ایک جزء اپنی روشن صورت پر مستقل ہے اور یہ بات اس لئے ہے، کہ تم جان چکے ہو کہ اس میں رقائق کلیہ حملیہ آئے ہیں اور وہ اسماء الٰہیہ کی جانب سے آئے ہیں، اور وہ رقائق ہیں، جو کہ نفوس افلاک اور ان کی طبائع کی جانب سے آئے ہیں، اور وہ رقائق ہیں کہ عناصر کی جانب سے آئے ہیں، اور وہ رقائق ہیں جو طرح طرح کے کمالات سے آئے ہیں، کہ جو ان سے حاصل ہیں، تو ایک جزء دوسرے جزء پر کبھی بھی غلبہ نہیں کرتا، اور نہ بہیمت اپنے اقتضاء سے ملکیت کے تسلط کی بنا پر کبھی معزول ہوتی ہے اور نہ ملکیت اپنے اقتضاء سے کبھی بھی بہیمت کے اس پر تسلط کر جانیکی وجہ سے معزول ہوتی ہے، اور کبھی کسی کمال کی وجہ تجرد نہیں ہوتا، اس طریقہ پر کہ دوسروں

کا کمال اس پر اثر کر جائے، بلکہ اس کے نزدیک ہر ایک شئے اپنی مقدار پر ہے، تو اس سے جو خارق عادت ظاہر ہو، اس کی دو وجہیں ہیں، ایک تو ان میں سے یہ ہے، کہ مدبر حق نے اپنے بندوں کو دنیوی یا اخروی نفع پہنچانے کا ارادہ کیا ہے یا اسی طرح ان سے تکلیف کو دور کرنا چاہتا ہے، یا ان کے فعال پر انہیں عذات دینا چاہتا ہے تو اس فرد کے ہاتھوں پر جاری ہو جاتا ہے، اور خوارق اس کی طرف سے منسوب کرتا ہے، درانحالیکہ باعتبار حقیقت کے وہ غسال کے ہاتھوں میں میت کے طریقہ پر ہوتا ہے، اس میں اس کا کوئی اختیار نہیں ہوتا، اور دوسری وجہ ہے کہ وہ فرد اپنی عقل حکمت اور فراست کی طرف رجوع کرے، پھر جب کہ کوئی ایسی شئے دیکھتا ہے کہ جس میں اس کا نفع یا اس کے غیر کا نفع ہوتا ہے، اس کے رقائق میں سے کوئی رقیقہ اس کی جانب بسط کرتا ہے، ان چیزوں میں سے جو کہ اس شئے کی مناسب ہیں، تو لوگوں میں خارق عادات ظاہر ہوتے ہیں، مثلاً وہ ارادہ کرے کہ آنے والے وقائع کے متعلق لوگوں کو خبر دے تو رقائق میں سے ایک رقیقہ بسط کرتا ہے، اور وہ قمریہ ہے تو وہ علم سے ملاقی ہو، اور ان کی طرف اس نے وہ علم پہنچایا ہے یا کسی قوم کی تسخیر کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے رقائق میں سے ایک رقیقہ بسط کرتا ہے اور وہ شمسیہ ہوتا ہے، چنانچہ تسخیر ہو جاتی ہے اور اسی طرح سلسلہ چلتا رہتا ہے اور دنیاوی زندگی میں فرد کے خواص میں سے یہ چیز ہے، کہ وہ اس بات کی تیاری کرے کہ اپنے پروردگار کی عبادت کرتا رہے، تمام اخلاق اور تمام طبائع کے ساتھ اور یہ اس وجہ سے کہ انسان مجریٰ عادت میں ایسے داعیہ کی وجہ سے افعال شجاعت کرتا ہے جو کہ نفع حاصل کرنے یا دنیاوی ضرر کے دفع کرنے کا باعث ہو، تو جس وقت بندہ فرد ہوتا ہے تو حق کے احکاموں میں سے ملاء اعلیٰ میں حکم نافذ ہوتا ہے تو اس سے نفس کی طرف اثر مترشح ہوتا ہے، اور داعیہ منبعث ہوتا ہے اور کوئی خلق اس کے اخلاق میں سے اس کی خدمت کرتی ہے، تو افعال جاری ہوتے ہیں اور وہ تمام چیزوں میں اپنی مراد سے فانی ہے، مراد حق کے ساتھ باقی ہے، سو یہی معنی ہیں اس کے اخلاق کے ساتھ اس کی عبادت کے اور انسان کے لئے طبیعتیں ہیں، اور ہر ایک طبیعت کے لئے فنا اور بقا ہے اور ایک کمال ہے، جو اسے اس کے پروردگار کی طرف سے دیا گیا ہے، اور افعال سے جاری ہوتے ہیں، اس کو حق میں فنا کرنے کے ساتھ اور تجلیات معنویہ ہیں جو کہ حاصل ہیں، کمال کی طبیعت بشریہ سے ترکیب کے ساتھ باعتبار اس کو کب کے جیسا کہ

طبیعت زہریہ باعتبار نسمیہ کے اس بات کے لئے متقاضی ہے کہ ہر حسن جمال کے ساتھ لذت اٹھائے کہ جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اسے خاص کر دیا ہے اور ہر لذت اور خوشی میں اللہ تعالیٰ کی تابعداری دیکھے اور اس کے سامنے انقیاد کا اظہار کرے تو سب حواس اس کی لذتوں کے ساتھ وابستہ ہو جائیں اور وہ اشیاء کہ جن سے لذت حاصل کی جاتی ہے، سب کی سب اللہ تعالیٰ کی یاد کے لئے گویا ان میں اس سے ایک عجیب حالت حاصل ہوتی ہے، کہ جس میں وہ مستغرق ہو جاتا ہے، اور کچھ دیر کے لئے غشی میں آ جاتا ہے، اور اس پر ہر ایک طبیعت کو قیاس کر لینا چاہئے، اور اگر تو حق چیز کا طالب ہے، تو اس کی عبادت اپنے پروردگار کے لئے اس کے حق میں باعتبار مقتضائے طبیعت کے اس سے اس کا جاری ہونا ہے، اور اللہ تعالیٰ اس کا محافظ ہے اور جس وقت کسی فعل پر تنبیہ آتی ہے تو اس کا سبب اس کی اس امر میں کہ جو لباس اللہ تعالیٰ نے اسے پہنایا ہے، مخالفت کرتا ہے، اور اس فرد کے خواص میں سے برزخ میں یہ ہے، کہ جس وقت اس بدن سے منتقل ہوتا ہے، اور طبیعت عامہ کی طرف ہیمان کرتا ہے، جو کہ ہر موجود کو عام ہے، جیسا کہ نفس ناطقہ کا اس کے بدن کی طرف ہیمان کرتا ہے، مگر نفس ناطقہ کا ہیمان، ہیمان تدبیر ہے، اور اس کا ہیمان، ہیمان عشق ہے تو اس وقت تمام اجزاء عالم میں وہ اپنی ہمت کے ساتھ سرایت کر جاتا ہے، بایں طور کہ وہ حجر میں حجر شجر میں شجر اور فلک میں فلک اور ملک میں ملک ہے، اسے ایک طور دوسرے طور سے ہیئت طبیعہ مطلقہ کے طریقہ پر نہیں روکتا ہے، اور اسوقت بسا اوقات اس فرد سے آثار عجیبہ اور احکام غریبہ صادر ہوتے ہیں، سو بعض ان میں سے یہ ہیں، کہ باعتبار علم حضوری کے یہ جاننا کہ یہ طبیعت اولیٰ کو قائم رکھنے والا ہے، جیسا کہ نفس جانتا ہے کہ وہ قائم ہے، اور وہ قائم نہیں مگر جسد قائم ہے، اور اس علم سے یہ بات نہیں جانتا، کہ وہ فلاں بن فلاں ہے، بلکہ بسا اوقات علم حصولی سے یہ بات جانتا ہے کہ جیسا کہ وہ جانتا ہے کہ فلاں اجنبی بن فلاں ہے، اور انہیں امور میں سے یہ بھی ہے کہ یہ حقیقت بسا اوقات بعض تدبیر کلیہ کے لئے معد ہوتی ہے، کہ بعض مواطن میں ظہور کرتی ہے اور افاضۂ برکات کا سبب ہوتی ہے شعر، یعنی اس کے بعد اس کی صفتیں ظاہر نہیں کی جاتی اور میرے نزدیک اس کا چھپانا بہت خوب اور اچھا ہے۔

تحقیق (سیّد عبد السلام بن بشیش کے قول کی تشریح)

یعنی سید عبد السلام بن بشیش کا قول باعتبار مشرب قوم کے وہ یہ کہ اَللّٰھُمَّ اجْعَلِ الْحِجَابَ حَیَاۃَ رُوْحِی وَرُوْحَہٗ سِرَّ حَقِیْقَتِیْ وَحَقِیْقَتَہٗ جَامِعَ عَوَالِمِیْ بِتَحْقِیْقِ الْحَقِّ الْاَوَّلِ. انتھی، حجاب اعظم سے مراد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس ہے، جیسا کہ اس پر قدس اللہ سرہٗ کا قول سابق والا ہے، وَحِجَابُکَ الْاَعْظَمُ الْقَائِمُ بَیْنَ یَدَیْکَ، اور ذات اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو حجاب اعظم کے ساتھ تعبیر کیا گیا، اس لئے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقت اول مخلوقات اور اعظم میں سے ہے جیسا کہ قوم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم کے اس فرمان کے متعلق بیان کیا ہے، کہ اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰہُ نُوْرِیْ، (سب سے پہلے اللہ نے میرا نور پیدا کیا) اور اسی سے حقائق منشعب ہوئے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقت اللہ تعالیٰ اور حقیقتوں کے درمیان واسطہ ہے اور روح مقدس صلی اللہ علیہ وسلم نبی الانبیاء ہے اس لئے کہ انبیاء کرام کی ارواح نے علوم اور معارف بواسطہ روح اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اخذ کئے ہیں، سو جیسا کہ نبی اپنی قوم میں ترجمان حق ہے، اور اللہ تعالیٰ اور اپنی قوم کے درمیان واسطہ ہے، سو اسی طرح روح اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ارواح میں ترجمان حق ہے اور اللہ تعالیٰ اور تمام روحوں کے درمیان واسطہ ہے، اور اللہ تعالیٰ کے اس فرمان فَکَیْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ کُلِّ اُمَّۃٍ بِشَھِیْدٍ الخ پھر کیا ہوگا، جب کہ ہم ہر امت کے گواہوں کو بلائیں گے اور اے پیغمبر! تم کو بھی ان پر گواہی کے لئے بلائیں گے، اشارہ اس معنی کی جانب ہے بنابریں کہ لفظ ھٰؤُلاءِ کا اشارہ شہداء کی طرف ہے، اور ان کی صورت ناسوت میں ظاہر ہے کہ جن سے معجزات کا ظہور ہوا اور اس کی زبان پر معارف اور احکام کا بیان ہوا، مخلوق اور حق کے واسطہ کی بنا پر اور یہ سبب ہے، مخلوق کے قرب کا حق سے اور ظاہر ہوا، اس سے جو ہم نے بیان کیا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تین عالم کلیہ ہیں، اور تین اصناف ہیں، توسط میں سے باعتبار ان نشأۃ کے، تو اول ان میں سے وہ مرتبہ ہے، کہ جسے جماعت اور قوم حقیقت محمدیہ کہتی ہے اور یہ احکام اسماء کلیہ کے لئے خارج میں تعیین کلی ہے، اور دوسرا ان کے نزدیک روح محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے مرتب ہے، اور تعیین مجازی حقیقت محمدیہ کے لئے انسان کلی کے اپنے مظاہر اور تقیدات کے

انفسار کے وقت اور تیسرا ان میں سے نشاۃ ناسوتیہ ہے، جس سے خلقت میں کسی کی طرف نبی ہونے کے بعد کمالات ظاہریہ متعلق ہیں بعد اس کے کہ عمر مبارک چالیس سال کی ہوگئی، گمراہ امت کو راہ پر لانے، اندھوں کی آنکھیں کھولنے، گونگوں کو کان عطا کرنے اور دلوں کو ہدایت بخشنے کیواسطے تاکہ وہ وحدانیت الٰہی پر گواہی دیں اور تہذیب پائیں اور اللہ تعالیٰ کے ان احکاموں کو جانیں جو افعال مکلفین کے ساتھ متعلق ہیں، اور اس کے علاوہ اور معارف جلیلہ ہیں، اور اکمل الاولیاء وہ شخص ہے، جو کہ ان تینوں نشاۃ میں خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب پر ہے لیکن حقائق جزئیہ جو مستعد ہیں، کمالات محبت اور محبوبیت کو اور جو ان کے مناسب ہیں، انہیں متعین ہوتیں، مگر انسان کلی کے اس کے مقابل میں حیز اختیار کرنے کے بعد سو پہلی تعین اس کی خارج میں مشابہ اور ہم جنس ہے اس تعین روحی کے جو کہ حقائق کلی سے ہے، لہٰذا حقیقت محمدیہ سے مدد حاصل نہیں ہوتی، جو کہ حقائق جزئیہ کی طرف واصل ہیں مگر اس کے تعین کے وقت اور جامعیت کے حقیقت محمدیہ کی میراث ہونے کے بعد اور انعقاد استعدادات اس مقام پر باعتبار وراثت روح محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہے سو مرتبہ عطایا کا ایک ہوا، اور اسرار ان کے وجود کی متعدد جب یہ بات ثابت ہوگئی، تو ہم کہتے ہیں، کہ شیخ قدس اللہ سرہ اللہ تبارک وتعالیٰ سے آہ وزاری کرتا ہے، بزبان اپنی استعداد کے اللہ تعالیٰ اسے سیدنا ومولانا محمد صلی للہ علیہ وسلم کے وارثوں میں سے باعتبار نشاۃ ثلثہ کردے اور ان کے ان کے کمالات مختصہ کے ساتھ جو ہر ایک میں ہیں، پس تعبیر کیا اپنے سوال میراث کو اس کے کمال ناسوتیہ سے اور اپنے اس قول کے ساتھ اَللّٰھُمَّ اجْعَلِ الْحِجَابَ الْاَعْظَمَ حَیٰوۃ روحی مراد اس سے وہ روح ہے، جو بدن میں پھونکی گئی ہے، جو بدن کی مدبر ہے، حس اور حرکت کا ارادہ کرنے والی ہے، اور وہی افراد جزئیہ میں جو مستعد ہیں، ان کمالات جزئیہ کے لئے جن کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے، بمقابل صورت ناسوتیہ کے افراد کلیہ میں جو کہ مستعد میں کمالات جزئیہ کیلئے اور کچھ مخفی نہیں، حسن تشبیہ اس مدد کے ساتھ جو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے واصل ہے، اس مستفید کی روح کی طرف اس حیات کے ساتھ ایسی حیات جو کہ کمال اول ہے اس روح کے لئے، اور تعبیر کیا، اس نے اپنے سوال سے میراث آنحضرت صلی للہ علیہ وسلم کمالات روحیہ سے اپنے قول کے ساتھ کہ وَرُوْحَہٗ سِرَّ حَقِیْقِی اور یہ اس لئے کہ حقائق

جزئیہ تعیین ارواح کلیہ کے مقام سے ظہور کرتی ہیں، اور یہ چیز مخفی نہیں، کہ وہ شئے ایسی تعبیر کی مدد سے ہے، کہ واصل ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس مستفید کی حقیقت کی طرف اس سر کی بنا پر کہ جس سے خفاء سمجھی جاتی ہے، اور مصدریت آثار اور کمال کے لئے اور تعیین استعداد ذات ہمیشہ کے لئے ایک ہی طریقہ پر مستمر ہے، حسن اور براعت سے اور تعبیر کیا، اس سے اس کا سوال اور میراث باعتبار ان کمالات کہ جن کا حقیقت محمدیہ نے وارث بنایا ہے، اگر چہ وہ ظاہر نہ ہوں اس مرتبہ کے علاوہ جو کہ ان کا قول ہے، کہ وَحَقِيقَتُهُ جَامِعُ عَوَالِمِي، اور یہ اس وجہ سے کہ اکملیت اس طریقہ پر بہت سے رقائق کے ظاہر ہونے کے لئے متلازم ہے، نشأۃ خارجیہ کے مقابلہ میں اس لئے کہ ہر رقیقہ اجمال نشأۃ ہے اور ان کے احوال کے لئے معرفت ہے، سو وہ مدد جو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے واصل ہے، اس مرتبہ میں حقیقت مستفید کی طرف، تو اس کی صورت جمع عوالم ہے، اس معنی کے اعتبار سے **اجعل ذالك بتحقيقك** اور تحقیق کسی چیز کا خارج میں متحقق کرنا ہے اور مقصود اس سے فیض مقدس ہے اور مخفی نہیں جو کچھ بھی وضع مظہر سے مکان مضمر میں ہے جو کہ اس بات کے لئے مشعر ہے، کہ تحقیق صادر ہے، اس کے حق ہونے کے اعتبار سے جو کہ متحقق بذاتہ اور محقق لغیرہ ہے، اور اوّل الاشیاء ہے اس لئے کہ وہ وجود موجودات اور ماہیت الماہیات ہے۔

تحقیق (کاملین کیلئے ذات کی طرف وصول بالفعل ثابت ہے)

عارف کیلئے ذات اسماء اور تجلیات تک پہنچنا برابر ہے، جو کچھ بھی ہم نے کہا، کہ وصول الی الذات اسکا علم ہے خواہ اس کا ادراک ہو یا نہ ہو، اور جو ہمارے بیان کے خلاف اس مسئلہ میں محققین کے کلام سے وہم ہوتا ہے، تو اس کے معنی نفی علم اور احاطہ میں نفس وصول نہیں ہیں، اور اس کی تفصیل یہ ہے سالک جس وقت حقیقت کی طرف وصول کرتا ہے، کہ جسے انا کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے، اور وہ حقیقت اپنے ماسواء سے مجرد کر دیتی ہے، تو اس سے التفات واقع ہوتا ہے، تحقیق وتقرر اور وجود کی طرف اور ان تمام چیزوں کی اصلیت وجود مطلق ہے، اور اس کے لئے بہت سے تنزلات اور بکثرت ملابس ہیں، سو اس التفات کے ضمن میں پہچان لیتا ہے، ہر ایک تنزل اور لبسہ

اس تنزل اور لبس کے حاسہ کو تو مثال کا ادراک مثال کے علاوہ اور کسی چیز سے نہیں ہوتا اور نہ روح کا بغیر روح کے اور اسی طرح رجوع کرتا ہے، صعود کرتا ہوا، حتیٰ کہ ادراک کر لیتا ہے اس حقیقت کا کہ اس حقیقت کے بعد اور کوئی حقیقت بعینہا نہیں ہے، پس اس مقام پر وصول ہے، اور انا کے علاوہ اور کوئی علم نہیں اور نہ انا علاوہ اور کوئی ادراک ہے، اور شیخ عارف عفیف الدین تلسانیؒ کا کیا خوب قول ہے، جو اس نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں، شعر ان کو چھوڑ دو جو محبوبہ سے مراد حاصل ہونے کے منکر ہیں، کہ وہ شق ہو جائیں، کیونکہ ان کے دلوں کا شق ہونا، اس چیز کو ثابت کر دے گا، اس کو کیا ہے، جو محبوبہ کے رخسار کا خال ہو گیا، اس کا باپ غیرت کرے یا ہمسایہ آگاہ ہو جائے، پس کاملوں کے لئے ذات کی طرف وصول بالفعل متحقق ہے، اور اسی طرح اصول اسماء اور تجلیات کیلئے فنا بقاء اور متحقق ہے، ان کے لئے اس امر میں حالت منتظر ونا جائز نہیں، ہاں اس کے نشأۃ میں سے ہر ایک نشأۃ کے لئے احکام خاصہ ہیں، کہ استعمال کرتا رہتا ہے، ان میں سے انسان ایک کے بعد دوسرے کا گویا کہ اس نے دونوں وصولوں میں اس کا اجمالاً احاطہ کر لیا ہے، اور تفصیل کے علاوہ اور کوئی چیز باقی نہیں، سو اس معنی سے کاملوں کی ترقیات غیر متناہی ہیں۔

تحقیق (اللہ تعالیٰ کو علم اشیاء اجمالاً وتفصیلاً حاصل ہے)

جاننا چاہئے کہ اللہ جل مجدہ کو دو وجھوں سے علم اشیاء حاصل ہے، ایک تو ان میں سے اجمالی ہے، اور اس کا بیان یہ ہے کہ جب اس نے اپنی ذات کو جانا، تو نظام وجود کے لئے ذات کے اقتضاء کو جانا اس لئے کہ علت تامہ کا علم معلول کے علم کے لئے کافی ہے، اور یہ تمام چیزیں اس مقام پر وجود الٰہی کے ساتھ موجود ہیں، نہ وجود امکانی کے ساتھ اس لئے کہ ہر ایک شئی واجب لہ کے تحقق کے ساتھ متحقق ہوتی ہے، اور ایجاد الواجب کے ساتھ پائی جاتی ہے، لہٰذا ہر ایک شئے کے مقابلہ میں کمال واجب اور اقتضاء ہے اور یہ کمالات ان اشیاء کے صادر ہونے کے لئے مبداء اور ان کے حقائق کی کنہ ہیں تو ہر ایک کمال کسی شئے کا بخصوصہ مقتضی ہے اور ہر ایک شئے کمال کی بخصوصہ محتاج ہے، گویا کہ یہ کمالات اور اشیاء امر واحد ہیں، مگر یہ لوازم واجب میں سے ہیں اور اعتبارات ذاتیہ بمنزلہ علم کے ہیں، اور قدرت اور حیات کے اور یہ تمام معلولات اس سے صادر ہیں اور دوسری وجہ

تفصیلی ہے اور اس کا بیان یہ ہے کہ ہر ایک موجود معلول واجب ہے اور جو معلول نہ ہو سکے، اس کے لئے تحقق ممکن نہیں، اور اللہ تعالیٰ کو ان معلولات کی ایسی حاجت نہیں ہے، جیسا کہ مکان بنانے والے کو مکان کی حاجت بلکہ حاجت معلومات کی اور اصل تقرر اور جوہر اور تحقق اور تقوم کی مستمرہ ہے، جب تک کہ موجود ہیں اور ایجاد واجب کا ہے ان کے لئے اور ان کی تحقیق کرنا وہی ان کے وجود اور تحقق کی کنہ ہے، اور اس کے علاوہ کچھ نہیں، اور منشأ ء امتیاز ماہیات کا کہ بعض کو بعض سے امتیاز حاصل ہے، بعض اقسام ایجاد کا اور تحقیق اور تقویم کا بعض سے سو یہ ارتباط بہت زیادہ قوی ہے، صورت کے ارتباط سے اپنے محل کے ساتھ جو کہ حضور اشیاء کا اپنے فاعل کے لئے تقاضہ کرتی ہیں، تو اولاً اللہ تعالیٰ ان اشیاء کو ان اشیاء کے ساتھ جانتا ہے، ان کی صورت مترسمہ فی الواجب سے اور یہ علم واجب کا ہے اور ان کے ساتھ ان کیلئے وجود امکانی بھی برابر ہے مادیات اور مجردات میں پس حق بات یہ ہے کہ کوئی حاجت نہیں جواہر عقلیہ کے لانے میں کہ مرتسم ہیں، ان میں اشیاء کی صورتیں مگر ان مفروضات میں جو متحقق نہیں ہوتے، مگر فرض کرنیوالے کے عندیہ میں جیسا کہ دیو کے دانت لہٰذا اس کلام میں کما حقہٗ غور کرو۔

(۴۶) مشہد آخر

ہندوستان میں مذہب حنفی کی ضرورت اور اسکی حقانیت

ملتیں اور مذاہب حقیقت کے ساتھ موصوف کی جاتی ہیں، کہا جاتا ہے ملت حقہ ہے اور مذہب حق ہے اور ناظران دونوں میں سے ایک وصف میں نظر کرتا ہے، بایں طور کہ یہ اس واقعہ کے مطابق ہے، سو ہم نے اس واقعہ کی حقیقت کے متعلق تامل کیا،، کہ اگر اس کے موافق کوئی شئے ہو، تو حق ہو جائے ورنہ باطل تو ہم نے دو معنیٰ پائے ان میں سے جلی اور دوسرے دقیق کہ بعد میں ان کا علم ہو سکے سو جلی اور ظاہر تو یہ ہے کہ اگر ہو، ہر ایک مسئلہ اعتقادیات میں سے مطابق اس شئے کے کہ جس پر خارج میں اعتقاد کرنے والا ہے، مثلاً اس بات کا حکم کیا جائے، کہ اللہ تعالیٰ خفگی اور غصہ کا اظہار کرتا ہے، اور امر اسی طرح ہو، اور یہ کہ حشر جسمانی ہونے والا ہے اور وہ بھی اسی طرح ہو، اور ہر وہ مسئلہ کہ جس میں کسی وجوب اور حرمت کا حکم دیا جائے، کہ وہ مطابق ہو اس شئے کے کہ

جس پر امر ملاء اعلیٰ منعقد ہے، مثلاً یہ حکم دیا جائے، کہ نماز واجب ہے اور ملاء اعلیٰ میں نازل مثالی ہو، اس کی ادائے مضمون کی تحسین کے لئے کہ جو شخص اس کے ساتھ متلبس کرے، اور اس کا انسان کی ترقی کے لئے مستلزم ہونا، جو کہ اس کے نسمہ کے دامن کے ساتھ دنیا اور آخرت میں وابستہ ہے، اور تکفیر ہیئات ظلمانیہ کے نسمہ سے وہ ہیئت ظلمانیہ جو کہ احکام بہیمیہ میں استغراق سے حاصل ہوئی ہے، جیسا کہ زنجبیل کا کھانا تسخین بدن کے لئے مستلزم ہے اور انسان سے برودت کے دور کرنے کے لئے تو یہ نازل اس مقام پر حکم کا اپنے وجوب کے ساتھ مطابق ہے اور ہر وہ مسئلہ کہ جس میں توقیت یا تحدید ہے، وہ قواعد ملت کے مطابق ہے، جیسا کہ توقیت صلوٰۃ پانچویں وقتوں کے ساتھ اور تحدید زکوٰۃ دو سو درہم اور حولان حول کے ساتھ اور اس حیثیت سے ہو، کہ اصل اور اشباح کے درمیان وجود تشبیہی ثابت ہو، مدارک ملاء اعلیٰ میں تو یہ وہی ہے، اور وہ یہی ہے اس اعتبار سے تو جب ملت اسی طرح ہو تو کہا جائے گا، کہ یہ ملت حقہ ہے، اور یہی معنی حقیقت مذہب کے ہیں، کہ اس کے احکام مطابق ہوں، ان اشیاء کے جو نفس الامر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائے ہیں اور مطابق ہوں اس کے کہ جس پر وہ قرون کاربند ہیں کہ جن کے لئے خیر کی شہادت دی جا چکی، اور اگر مسئلہ کے متعلق کوئی نص اور کوئی روایت نہ ہو، تو اس کی حقیقت ایسے قرائن کی محتاج ہے، جو کہ غالب ظن کے لئے مورث ہوں، بایں طور کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اگر اس مسئلہ میں کلام فرماتے تو اس قول کے علاوہ اور کچھ نہ فرماتے، اور یہ کہ وجہ استخراج اور استنباط کی ظاہر ہو، کہ اس میں وہ شخص شبہ نہ کرے جو کہ اسالیب کلام کا محیط ہو، اور ایسے ہی مقاصد شارع کا شرعی احکام میں تو یہی معنی ہیں حقیقت مذہب کے اور رہے وہ دقیق اور باریک معنی جو کہ بعد میں معلوم ہوتے ہیں وہ یہ کہ حق اللہ تعالیٰ نے جان لیا، امتوں میں سے کسی امت کے جمع کرنے کو بایں طور کہ اپنے برگزیدہ بندوں میں سے کسی کی طرف الہام کرے، ملتوں میں سے کسی ملت کے قائم کرنے کے ساتھ تو وہ برگزیدہ بندہ ارادۂ حق کا خادم اور اس کی تدبیر کے ظاہر ہونے کا منصہ ہو جاتا ہے اور آشیان ہو جاتا ہے، اس کے مدد غیبی کے فیض کے لئے تو اسی کے متعلق کہا جاتا ہے، کہ جس نے اس بندہ کی اطاعت کی اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی اور جس نے اس کی نافرمانی کی اس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی چنانچہ رضا اس تدبیر کی موافقت میں موقوف ہو جاتی ہے۔ اور ناراضگی اس

کی مخالفت اور منافات میں اور جب یہ امر اس طرح ہو جائے گا۔ تو تمام ملت کے احکام حق ہو جائیں اور اس وقت اس ۔ کے حق کہنے میں ظہور تدبیر الٰہی اس جسم اور قالب میں منظور ہے، اور اس کے علاوہ اور کچھ نہیں، اور اسی طرح مذہب کو بسا اوقات عنایت متوجہ ہوتی ہے، اس ملت حقہ کی حفاظت کی طرف جو کہ متوجہ ہیں، باعتبار معدات کے مذہب خاص کی حفاظت کی طرف بایں طور، کہ مذہب کے محافظ اس روز وہ حضرات ہیں جو ملت سے برائی کے دور کرنے کے لئے قائم ہیں یا ان کا اطراف میں سے کسی طرف میں شعار ہوتا ہے، جو کہ فارق ہے، حق اور باطل کے درمیان تو اس وقت وجود تشبیہی ملاء اعلیٰ یا ملاء سافل میں منعقد ہوتا ہے، بایں طور کہ یہ ملت بھی مذہب ہے، اور اس کے احکام کلیہ ان صور خاصہ کے ساتھ ان کے مدارک میں مقید ہوتے ہیں۔ تو وہ مذہب اس معنی کے لحاظ سے حق ہو جاتا ہے۔ اور یہ وجود تشبیہی مناط حقیقت ہوتا ہے۔ لیکن معنی جلی وہ ہے۔ جہاں تک راسخین فی العلم اپنے علم سے اور اہل استنباط اپنے استنباط سے پہنچتے ہیں، لیکن دقیق معنی سے واقف نہیں ہوتا۔ مگر نور نبوی کے ذریعہ جو ان احکام تدبیر کا کاشف ہے جو قاہر علی البشر ہے اسی لئے ہم نے کہا کہ یہ بعد میں دکھائی دے گا۔ اور جب یہ تمہید ہوگئی تو ہم کہتے ہیں کہ یہی نظر آیا کہ مذہب حنفی میں ایک سر غامض ہے۔ پھر میں اس سر غامض میں غور کرتا رہا یہاں تک کہ میں نے پایا جو میں نے بیان کیا ہے اور میں نے مشاہدہ کیا۔ کہ ہمارے اس زمانے میں اس مذہب کو اس دقیق معنی کے لحاظ سے تمام مذاہب پر ترجیح ہے اگر چہ پہلے معنی کے لحاظ سے ان میں سے بعض کو بعض سے ترجیح ہے۔ اور میں نے مشاہدہ کیا کہ یہی وہ سر ہے۔ جس کو صاحب کشف اکثر ایک نوع کا ادراک کرتے ہیں اسی لئے اس مذہب کو تمام مذاہب پر ترجیح ہے۔ اور بسا اوقات الہام اس میں مضبوط رہنے کا متمثل ہوتا ہے یا ایسے خواب کی شکل میں ہوتا ہے جو اس پر عمل کے لئے ابھارتا ہے لیکن حق صریح وہی ہے جو ہم نے کہا اس لئے اس کو دانتوں سے مضبوط پکڑ اور غور کر۔

(۴۷) مشہد آخر۔

ذکی ہو یا غبی ہر ایک صراط مستقیم پر کاربند ہوسکتا ہے

میں کعبہ مشرفہ میں داخل ہوا، اور اپنے باطن کی طرف وہاں متوجہ ہوا۔ تو مجھ پر صراط مستقیم کی حقیقت متجلی ہوئی جس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح بیان فرمایا کہ ایک خط کھینچا اور اس کے دونوں جانب متعدد خطوط کھینچے، الی آخر الحدیث، تو میں نے اس حقیقت کو احوال نفس کے بیچوں بیچ پایا، کہ اس کا بعض فوق کے قریب ہے، اور بعض اس سے کم میری مراد اس سے یہ ہے کہ ہر طبقہ خواہ زکی ہو یا غبی، اس کے لئے صراط مستقیم ہے، اور صراط مستقیم کسی ایسے مرتبہ کا نام نہیں ہے، جو ذکی کے ساتھ خاص ہو، اور میں نے اس کو موافقت اور انقیاد میں ایک طرح کا رسوخ اور تثبیت پایا۔ اور میں نے پایا کہ گویا مدبر اس کو نفوس پر القا کرتا ہے، تو الہام الٰہی کے زیادہ قبول کرنے والے اس کو قبول کرتے ہیں، اور جو الہام سے دور ہیں، وہ اس کو کم قبول کرتے ہیں، اور اس کی طرف پہنچنا نفوس کے تکلف کسب کے ذریعے نہیں ہے، اور میں نے جہنم کی پیٹھ پر نصب کیے صراط کو اس حقیقت کا تمثال پایا، کہ اللہ تعالی آفاق میں اس کا اس کے مطابق القا کرتا ہے، جو عالم النفس میں القا کیا گیا ہے، اور میں نے اس صراط مستقیم کے ساتھ جوف کعبہ کی خصوصیت پائی، اور میں نے پایا کہ وہ اشیاء جو اس کے اور ان معانی کے درمیان ہیں ان میں اسی طرح ایک مناسبت ہے جو عالم حشر میں متقوم ہے، ان معانی کے ان کی صورتوں کے ساتھ قائم کرنے کے ذریعے اور یہاں منبر اور مسجد نبوی اور اسطوانہ حنانہ کے وجود کا اور رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کا کہ میرے منبر اور میرے گھر کے درمیان جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے۔ یہی راز ہے۔

تحقیق

وہ افعال جو انسان ارادہ اور اختیار سے کرتا ہے۔ اس کے چند اسباب ہیں، جو اس کے صدور کو واجب کرتے ہیں، مثلاً حتم نفس کے ساتھ فعل کا عزم کرنا اور ساتھ ساتھ عضاء کی اطاعت کرنا۔ اور اس کے علاوہ بہت سے امور خفیہ جن کا ان کے غامض ہونے کی وجہ سے بہت کم احاطہ

ہوسکتا ہے۔ پھر عزم اور ان امور میں سے ہر ایک کی کوئی علت ہے۔ جو اس کو واجب کرتا ہے۔ مثلاً ایسے نفس سے ایسی حالت میں اعتقاد جازم یا ظن سے برانگیختہ ہونے والے شوق کا وجود عزم کو واجب کرتا ہے، اور ان اسباب کے لئے بھی اسی طرح علتیں ہیں۔ اور اسی طرح اس کا سلسلہ دراز ہوگا یہاں تک کہ وجوب قاطع تک اس کا سلسلہ ختم ہو جائے گا، پس وہ موجود ہیں اللہ تعالیٰ کی ایجاد سے اور صادر ہیں بندہ کے ارادے سے لیکن اس کے سببوں کے واسطے اس کا ارادہ بھی واجب ہے، پھر جب انسان ارادہ کا مباشر ہو، تو اس کا لصوق جو ہر نفس کے ساتھ اس سے قصداً صدور کی وجہ سے اور اس کی قوتوں میں سے کسی قوت کے انشراح کی وجہ سے واجب ہے، اور واجب ہے کہ نفس کو الم یا ہو خوشی ہو محض اس لاحق کو اس سے مخالفت یا اس کی موافقت سے آگاہ ہونے کی وجہ سے یا کسی تقریبات خارجیہ کی وجہ سے اس طور پر کہ اس کا مثال مقید مثال مطلق کے مشابہ ہو تو مطلق میں تنعم یا تالم کی صورت منعقد ہو، اور ملائکہ اس کے خادم ہوں، جن پر اس دربار سے الہام کیا جاتا ہے، تو اسباب سرور یا الم حاصل ہوں یا بایں طور کہ لوگوں سے بھلائی کا ارادہ اس کے حق میں رحمت یا عذاب ہو، اور یہ سب یا تو دنیا میں ہو، یا آخرت میں ہو، اور ان احتمالات میں سے ہر ایک کے لئے علل موجبہ ہیں، پس وجود میں نہیں ہوتی کوئی چیز مگر جو واجب ہو، اور اسی طرح مبداء سے ظہور شرائع واجب ہے، جبکہ اس دن اس صورت میں خیر کو محصور جانے، پس اعتقاد جازم کا وجود اس کے مطابق ان نفوس صالحہ میں واجب ہے جو شیطنت کی نجاستوں سے آلودہ نہ ہو، جس وقت کہ معجزات ظاہر ہوں، اور عقل صریح اس خبر کے صدق پر دلالت کرے۔

السر المكتوم
فی اسباب تدوین العلوم

تصنیف

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ

ترجمہ

مولانا ابو یحیٰ امام خان

ترتیب

مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی

السر المکتوم فی اسباب تدوین العلوم (۱)

یہ رسالہ مصنف علام کے مسترشدین ملا امان اللہؒ اور ملا شیر محمدؒ دونوں کی تحریک پر سپرد خامہ ہوا، شاہ صاحب بعد بسملہ تحمید فرماتے ہیں:- (۲)

شکر ہے اس خدا کا جو نعمتیں بخشنے والا اور مکروہات سے نجات دلانے والا ہے، دلوں میں حکمت و دانائی کا القا جس کے بس میں ہے، ہم اس کی حمد کرتے ہیں اور اسی کے حضور اپنی بخشش کے خواہش مند ہیں، اس کی ذات سے اپنی ناجائز تمناؤں کے نقصانات سے پناہ مانگتے ہیں اور شہادت دیتے ہیں کہ اس ذات کبریا کے سوا کوئی دوسرا معبود نہیں۔ اور ہم یہ شہادت بھی دیتے ہیں کہ بلاشبہ سیدنا محمدؐ اس کے بندے اور رسول ہیں، جو اخلاق حسنہ کے اکمال کا سبب ہیں، صلی الله عليه و آله و صحبه اهل معالی الهمم.

بعد ازیں عرض گزار ہے کہ عبدہ ضعیف ولی اللہ بن عبدالرحیم، ان دونوں کے ساتھ پروردگار بخشش اور احسان کا معاملہ فرمائے، اس (رسالے) سے امید ہے پڑھنے اور سننے والے فائدہ

---

(۱) شاہ ولی اللہ کا یہ رسالہ عربی میں ہے،

(۲) مترجم کے پیش نظر رسالہ مذکورہ کا وہ نسخہ ہے جس کا عربی متن اردو ترجمے کے ساتھ ۱۳۲۱ھ مطابق ۱۹۰۳ء میں دہلی میں چھپا تھا، اس کے طابع و ناشر سید ظہیرالدین عرف سید احمد ولی اللہی مالک مطبع احمدی متعلق مدرسہ عزیزی دہلی تھے، مدرسہ عزیزی کا محل وقوع دہلی کے موجودہ اردو بازار سے مشرق کی طرف جگت سنیما سے ملحقہ کھڑکی سے لگا ہوا ہے اور ادھر کو چہ چیلان کی طرف جاتے ہوئے یہ احاطہ پہلے مدرسہ شاہ عبدالعزیز سے موسوم تھا، اب اس میں بڑبونجے رہتے ہیں، ان کے علاوہ اب مختلف لوگوں کی رہائش گاہ میں ہیں، اب صرف مدرسہ شاہ عبدالعزیز کا بورڈ لگا ہوا ہے۔ (قاسمی)

حاصل کریں، اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ ان کی دست گیری فرمائے۔

واضح ہو کہ علوم مدونہ چار قسموں پر مشتمل ہیں، عربی، شرعی، فلسفی اور محاضرہ کے متعلق، ہم انشاء اللہ ان علوم کے ناموں اور لوگوں میں یہ جس طرح پھیلے، اس کے اسباب پر نہایت اختصار کے ساتھ گفتگو کریں گے۔

پہلی فصل، علوم عربیہ

علوم عربیہ اس لئے مدون کئے گئے کہ ان کے ذریعہ کلام عرب کی معرفت حاصل ہو، منجملہ ان کے ایک وہ علم ہے، جس میں حروف مفردات سے بحث کی جاتی ہے، اگر ان سے بہ لحاظ مادہ بحث کی جاتی ہے تو یہ علم لغت ہے، اگر زبان سے حروف کو ادا کرنے کی کیفیت پر بحث ہو، تو یہ علم المخارج ہے، الفاظ کی ہیئت سے بحث کو علم صرف سے موسوم کیا جاتا ہے، اور جب الفاظ کو اصل وفرع کے لحاظ سے ایک دوسرے سے منسوب کیا جائے تو یہ علم الاشتقاق ہوا، منجملہ ان کے ایک وہ علم ہے جس میں مرکبات سے بحث کی جاتی ہے اور اس کی بھی کئی شاخیں ہیں، اگر مرکب کلمہ کے آخری احوال سے بحث ہو تو وہ علم الاعراب ہے، صنعت ترکیب کے اعتبار سے بحث کی گئی ہو تو وہ عالم التالیف ہے اور محسنات کلام کے لحاظ سے بحث ہو، تو وہ علم البدیع ہے۔

منجملہ ان کے ایک وہ علم ہے، جس میں شعر کے احوال سے بحث کی جاتی ہے اور اس کی بھی متعدد شاخیں ہیں، وزن کے لحاظ سے شعر پر بحث ہو تو وہ علم العروض ہے، اور اخرابیات کے اعتبار سے بحث ہو تو وہ علم القافیہ ہے اور اس سے متعلق علم الخط ہے، جس میں عربوں کی اصطلاح کے مطابق نقوش کتابت یعنی حروف کی شکل وصورت سے بحث کی جاتی ہے، یہ فنون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پیشتر اس شکل میں نہیں تھے کہ ان کا کوئی خاص مقام ہوتا۔ سب سے پہلے ابوالاسود نے ان کے استنباط کی طرح ڈالی، اس نے دواوین اشعار پر زیر زبر پیش کی، علامتوں کے لئے نقطے لگائے، پھر خلیل بن احمد آئے، اور انھوں نے لغت میں کتاب العین تصنیف کی اور عروض وقافیہ کا استنباط کیا، پھر (امام) سیبویہؒ آئے اور انھوں نے نحو میں اپنی مشہور کتاب (۱) لکھی اور اس میں ایک ضمیمہ شامل کیا، جس میں حروف کے مخارج علم صرف، علم تالیف اور قدرے علم معانی کا

---

(۱) جو فن نحو میں ''الکتاب'' کے نام سے مشہور ہے۔ (قاسمی)

بیان ہے اس کے بعد بادشاہوں کے ندیموں مصاحبوں وغیرہ میں سے جو سخن طراز لوگ تھے، انھوں نے قصے کہانیاں اور بلیغوں کے شعروں کے متعلق باہمی بحثوں کے نکتے جمع کر دیئے، چنانچہ یہ علوم معانی و بیان و بدیع کے استنباط کا ایک اساس بن گیا۔

دوسری فصل، علوم شرعیہ

علوم شرعیہ کی تدوین اس غرض سے ہوئی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب تبارک وتعالیٰ کی طرف سے جن امور کے ساتھ مبعوث ہوئے، ان کی معرفت حاصل ہو، ان علوم کا مرجع ہے، قرآن مجید وسنت اور جو ان سے مستنبط کیا گیا، سلف نے علوم شرعیہ میں چار اصناف کی تصانیف کیں۔ فقہ، جس میں عبادات، خرید وفروخت، میراث، خانہ داری، شہروں کی سیاست، اور آداب بعثت کا ذکر ہے، تفسیر، اس میں قرآن مجید کے نامانوس (غرائب) الفاظ کی شرح، نزول آیات کے اسباب کا بیان، متعارض آیات میں تطابق وتوافق، مشکل مقامات کی وضاحت، ناسخ ومنسوخ کا بیان اور اسی طرح کی چیزیں آتی ہیں، سیر، اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عادات وشمائل، آپ کی آمد ورفت، آپ کے غزوات وشواہد اور اس طرح کی دوسری باتیں بیان کی جاتی ہیں، رقائق، یہ مشتمل ہے مواعظ ونصائح کی تلقین اور جنت ودوزخ، اعمال کے فضائل، صحابہ کے مناقب اور زہد وترک دنیا وغیرہ کے ذکر واذکار پر۔

ان اہل علم میں سے کوئی ایسا تھا، جس نے ایک فن میں کمال حاصل کیا، اور وہ اسی کا ہو گیا۔ بعض دو اور بعض کئی فنون پر جامع تھے۔ چنانچہ ضحاکؒ بن مزاحم مفسر تھے، ابوحنیفہؒ، مالکؒ اور شافعیؒ فقہاء، اور ابن اسحاقؒ اور واقدی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات کے عالم اور واعظین، زھاد اور صوفیہ علم رقائق والے تھے اور ابن عباسؓ بہت سے فنون کے جامع تھے، حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم میں یہی عبداللہ بن عباس امام تفسیر تھے، اور عمر، علی، ابن مسعود اور ابن عباس رضی اللہ عنہم، ائمہ فقہ تھے، ان زمانے کے بعد اور لوگ ان فنون کی تحقیق میں لگ گئے اور ان کی بحث وتمحیص میں انھوں نے گہرے غور وفکر سے کام لیا چونکہ پہلے پہلے صرف قرآن وسنت ہی تھے، اس لئے انھوں نے قرأت کی مختلف وجوہ یعنی لہجوں کے بارے میں تصنیفات کیں اور اس میں سات اور سات سے بھی زیادہ مذاہب ہو گئے ان میں سے بعض روایت پر اور بعض عربوں کے کلام اور علم المخارج پر

محمول ہیں، انھوں نے قرآن کے رسم الخط پر لکھا اور اس میں عثمانی مصاحف کا تتبع کیا، اسی طرح انھوں نے اول اول بغیر کسی سابقہ نمونے کے جمع وتدوین احادیث پر کتابیں لکھیں، پھر انہیں غور وفکر اسی ضمن میں بہت سے فنون کی ترتیب کی طرف لے گیا، ان میں سے ایک حدیث صحیح کو سقیم سے اور مستفیض کو غریب ومعلوم سے متمیز کرنا ہے، جیسے صحیح بخاری، صحیح مسلم، مستدرک حاکم، مسند احمد، جامع ترمذی، سنن ابوداؤد، نسائی، دارقطنی ہیں۔ ان کتابوں میں ایک قسم ہے، جس میں حدیثوں کو مسائل فقہ کے اعتبار سے مرتب کیا گیا۔ مثلاً کتب شافعی، ابن ماجہ، بیہقی اور شرح السنہ وغیرہ نیز احادیث کی ایک تقسیم صحابہ کے لحاظ سے ہے اور یہ کتابیں مسند کے نام سے موسوم ہیں، جیسے مسند ابی یعلی (۱) اور مسند بزار۔

منجملہ ان فنون کے، ایک فن اسماء الرجال (۲) کا ہے، اس میں رجال احادیث پر جرح وتعدیل اور احادیث کے نامانوس غریب الفاظ (۳) کی شرح ہوتی ہے۔ انہی فنون میں سے ایک مختلف کتب میں آمدہ احادیث کی تخریج (۴) ہے جیسے احیاء العلوم کی تخریج اور ایسے ہی کتب صحیحہ کی

(۱) نام مسند نہ صرف صحابہ کی تقسیم کے لحاظ سے ہے، بلکہ شیوخ واساتذہ کے ساتھ بھی مسند ہیں، نواب صدیق حسن خاں نے اتحاف النبلاء میں ایسی تقریباً پچاس مسانید کا ذکر کیا ہے، ان میں سے سب سے زیادہ مشہور مسند امام احمد بن حنبل ہے، مسانید میں ترتیب کے مسائل کا لحاظ نہیں ہوتا، پہلے کسی ایک صحابی کی مرویات آتی ہیں، پھر دوسرے کی، اب ان اخذ مسئلہ کے لئے ان کی تبویب ضروری ہوئی، چنانچہ مسند امام احمدؒ کی بے شمار شروح کے ساتھ اسے بوب بھی کیا گیا۔

(۲) علمائے ہندوپاک میں سے علامہ طاہر پٹنی نے المغنی نام سے رجال پر کتاب لکھی جو مطبع نظامی دہلی میں طبع ہوئی، اور اب نایاب ہے۔

(۳) غریب الحدیث پر بھی علامہ پٹنی نے مجمع البحار کے نام سے کتاب لکھی اردو میں نواب وحید الزماں حیدرآبادی نے نور اللغات نام سے کتاب لکھی، جو دوسری مرتبہ کراچی سے شائع ہوگئی ہے۔

(۴) کسی مصنف کی مؤلفہ کتاب میں جو احادیث آئی ہوں، ان کے راویوں کی جرح وتعدیل تخریج ہے جیسے امام غزالیؒ کی احیاء العلوم پر حافظ زین الدین العراقیؒ (م ۸۰۶ھ) کی کتاب اور ہدایہ پر زیلعی (جمال الدین یوسف م 762ھ) کی تالیف نصب الرایۃ فی تخریج احادیث الہدایہ ہے۔ برصغیر میں علم حدیث کی اس صنف پر زیادہ کام نہیں ہوسکا، شاہ ولی اللہ کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں آوردہ احادیث کی تخریج قاضی محمد مچھلی شہری نے یہ مہم سر کی تھی، کاش! وہ مخطوطہ دستیاب ہوجاتا، لیکن ان کی رحلت کے بعد یہ کتاب طبع نہ ہوسکی۔ تخریجات میں ہندی علماء میں سے نواب صدیق حسن خاں کی کتاب الادراک فی تخریج احادیث الاشراک ''تقویت الایمان'' میں متخرجہ احادیث پر ہے اور نواب وحید الزماں کی تالیف احسن الفوائد فی تخریج احادیث شرح العقائد ہے، اسی فصل میں مولانا سید امیر علی ملیح آبادی کی تالیف تقعیب ہے، جس میں تقریب التہذیب ذہبی میں آمدہ راویوں کے اسماء وکنی کی تصحیح ہے، یہ کتاب تقریب التہذیب کے حاشیے پر نول کشور میں طبع ہوچکی ہے۔

طرز پر تخریج ہے جیسے صحیح ابی عوانہ اور صحیح الاسماعیلی۔

منجملہ ان فنون کے ایک فن مشکل الحدیث کا ضبط، مختلف حدیثوں میں تطبیق دینا اور اصول حدیث ہے، اور ان میں سے ایک کتب حدیث کی متون کی شرح کرنا ہے، جیسے ابن حجرؒ اور نوویؒ نے صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی شرحیں لکھیں، ان کے علاوہ وہ کثیر التعداد شرحیں ہیں جن کا شمار کرنا مشکل ہے، اللہ تعالیٰ کا اس بندے پر بہت بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے اسے اسرار حدیث اجمالاً وتفصیلاً بیان کرنے کی توفیق عطا فرمائی، چنانچہ اس نے اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں انہیں مدون کر دیا ہے۔

بعد ازاں اہل علم ان مذکورہ بالا چار فنون کی تحقیق کی طرف متوجہ ہوئے، اور تفسیر میں ان کا زیادہ انہماک ہوا، چنانچہ ہر صاحب فن نے تفسیر لکھی، صاحب نحو نے نحو کو صاحب لغت نے لغت کو صاحب اخبار نے مناسب قصوں کو صاحب قرأت نے اپنے فن کو، صاحب فقہ نے فقہ کو، صاحب علم معانی نے علم معانی کو، صاحب علم کلام نے علم کلام کو اور صاحب تصوف نے تصوف کو اس میں شامل کیا، غرض بڑی کثرت سے کتابیں لکھی گئیں، اور وہ خوب پھیلیں، اس کے بعد اہل علم نے ان تمام کو جمع کرنے کی کوشش کی، جیسے کہ رازیؒ، بیضاویؒ اور نیشاپوریؒ کی تفسیریں ہیں، پھر فقہ میں تلاش وتفحص انہیں اس طرف لے گیا کہ وہ اصول فقہ، علم جدل اور معرفت خلاف کا استنباط کریں اور چونکہ حوادث وواقعات کسی ایک حد پر نہیں رکتے اور جو کچھ پہلے لکھ گئے ہیں وہ تمام حوادث وواقعات کے لئے کافی نہیں، اس لئے بعد میں آنے والوں نے پہلوں کے نصوص سے مسائل استنباط کرنے کی طرف توجہ کی، انھوں نے فتاویٰ اور واقعات جمع کئے اور اس میں بعض اقوال اور وجوہ کی دوسروں پر ترجیح کو مدنظر رکھا، اس کے بعد وہ اپنے مذاہب فقہ کے علوم کی تدوین اور اقوال اور وجوہ کی روایت کی تحقیق وتائید میں لگ گئے اور انھوں نے ہر مذہب ومسلک کے حق میں منقول اور معقول دلائل فراہم کیں اور اس پر کتابیں لکھیں، اس وقت وہ فقہی مذاہب، جو مدون ومنضبط ہو چکے تھے اور ان میں تخریج وترجیح بکثرت ہو چکی تھی، چار تھے۔

علم رقائق یعنی وعظ ونصیحت میں ایک گروہ نے دو طریقوں سے عملی دلچسپی لی، کبھی تو انھوں نے مواعظ اور دلوں میں رقت پیدا کرنے والی حکایات پر مشتمل کتابیں تصنیف کیں اور منبروں

سے ایسے اسلوب میں جو لوگوں کے دلوں پر اثر کرے، ان چیزوں کا ذکر کیا، اور کبھی انھوں نے راہ آخرت پر چلنے کے بارے میں کتابیں لکھیں، چنانچہ اس کے لئے انھوں نے قواعد بنائے، انہیں تفصیل سے بیان کیا اور ان پر مسائل کی بنیاد رکھی، جیسے کہ کتاب احیاء العلوم ہے اسی طرح بعد میں آنے والے، کتب سیر کی طرف متوجہ ہوئے، اور ان میں تنقیح اور بحث کی اور جو مناسب سمجھا اس کا اضافہ کیا، چنانچہ انھوں نے صحابہ، تابعین، علماء اور زاہدوں کی سیر لکھیں، اور یہ سلسلہ اتنا آگے بڑھا کہ لوگوں نے اپنے مشائخ کی سیرتیں تصنیف کیں اور فرداً فرداً ان کے اقوال منضبط کر دیئے، تصانیف کی اس قسم کو "مقامات" اور "ملفوظات" کا نام دیا گیا۔

یا ایک شیخ کے حالات ضبط کرنے کے بجائے ایک طبقے کے تمام لوگوں کے حالات یکجا کر دیئے جیسے مشائخ چشت یا علمائے حنفیہ یا ایک زمانے، یا ایک ملک یا شہر کے علماء و مشائخ کے حالات اس نوع کی تصنیفات کو طبقات یا طباق کا نام دیا گیا، ان تصنیفات میں کچھ تو تاریخ کا حصہ ہے اور کچھ اسماء الرجال کی کتابوں کا ان کی ترتیب میں ادھر ادھر سے استفادہ کیا گیا، اس باب میں راقم ضعیف نے انفاس العارفین کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں اپنے والد ماجد اور عم محترم کے مقامات اور بعض اہل حرمین کے کچھ حالات جمع کئے ہیں، علی ہذا القیاس ان اہل علم میں سے بعض ایسے تھے، جنھوں نے صوفیہ کے اوراد اور ان کے احوال پر کتابیں لکھیں اور بعض نے صوفیہ کے رموز، جو ان کے احوال کے تغیر کی وجہ سے تھے ان پر تصنیفات کیں، پھر ان لوگوں کے سلوک کے معاملے میں کئی مسلک اور مذہب ہو گئے اور ہر مسلک اور ہر مذہب پر انھوں نے رسالے لکھے۔

ان اہل علم میں سے ایسے بھی تھے، جنھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ و درود بھیجنے کے متعلق تصنیفات کیں، جیسے کہ دلائل الخیرات (۱) ہے اور بعض نے احزاب اور مناجات مرتب کیں۔

جب ملت کے بہت سے فرقے بن گئے اور ان فرقوں نے مختلف جماعتوں کی شکل اختیار کر لی تو یہ ہوا کہ ان میں قیل وقال اور بحث ومناظرہ ہونے لگے، ان فرقوں میں سے معتزلہ تھے، انہی میں سے روافضہ تھے، اہل تفلسف تھے، اور انہی میں سے یہود ونصاریٰ اہل کتاب تھے، بعض

---

(۱) از ابوعبداللہ محمد بن سلیمان بن ابوبکر۔ م ۸۵۴ھ

اوقات دین کی نصرت کے لئے ان مباحثوں (۱) کی ضرورت پڑتی تھی، ان مباحثوں کے لئے انہوں نے مجالس ومحافل قائم کیں، لیکن جب تک ان امور کے لئے مستحکم اصول، الگ الگ فروع، ترتیب وتسلسل افکار اور حسن تحریر وتقریر نہ ہو، یہ مباحثے اتمام کونہیں پہنچ سکتے، اور عادتاً یہ دوسروں کی باتیں سننے، وراثت میں دوسروں سے لینے، تدوین وتصنیف اور تعلیم وتعلم کے بغیر ممکن نہیں، لہٰذا وہ لوگ علم کلام کی تالیف میں لگ گئے۔

اہل اسلام میں سے جنھوں نے سب سے پہلے بحث ومناظر سے عملی دلچسپی لی وہ معتزلہ تھے انھوں نے فلسفہ سے حد (۲)، اسم (۳)، قیاس (۴) اور مقولات (۵) عشر مباحث نیز الٰہیات میں سے امور عامہ (۶) کے مباحث لئے اور ان کے ساتھ شریعت میں جو صفات، بنوات اور معاد کے مباحث تھے، انہیں شامل کرلیا، چنانچہ وہ اصولی فلسفہ جو قواعد اسلامیہ کے خلاف نہ تھے، انہیں تو انہوں (معتزلہ) نے بحالہ رہنے دیا اور جو قواعد اسلامیہ کے خلاف تھے ان پر اعتراض کئے، اور ان کی جگہ انھوں نے دوسرے اصول قائم کردیئے، فلسفہ سے علم کلام کو اخذ کرنے کے یہی معنی ہیں اہل سنت میں سے جنھوں نے سب سے پہلے علم الکلام پر گفتگو کی، اور اسے اختیار کیا، وہ ابوالحسن اشعری تھے، اور ان کا اعتزال سے رجوع کا قصہ تو مشہور ہی ہے، وہ (معتزلی ہونے کے دور میں) جان گئے تھے، کہ ایک اصول کی بنیاد کیسے ڈالی جاتی ہے، اور پھر اس سے مختلف فروع اور شاخیں کس طرح نکلتی ہیں، چنانچہ انھوں نے معتزلہ ہی کے نمونے پر اپنے طریقے کی بنا رکھی، بعد ازاں ابونصر اور ابوعلی وغیرہ آئے اور انھوں نے قواعد اسلامیہ کو فلسفہ پر اس طرح تطبیق دینا شروع کیا کہ

---

(۱) ان میں سب سے زیادہ موثر مناظرہ بشر مریسی معتزلی اور امام عبدالعزیز بن یحیٰی الکناتی المکی کا ہے۔ جو مامون الرشید کی صدارت میں قدم وخلق قرآن پر ہوا۔ اور بعد میں کتاب الجیدہ کے نام سے چھپ گیا۔ اس کا اردو میں ترجمہ ترجمہ فتنۂ خلق قرآن کے نام سے راقم السطور نے ۱۹۳۵ء میں چھپ گیا ہے۔

(۲) حد: تعریف شے بذاتیات، چناں کہ تعریف انسان بہ حیوان ناطق۔

(۳) رسم، قیاس شے بعرضیات چناں کہ تعریف انساں بہ ماشی وضاحک۔

(۴) قیاس، قولیت مرکب بہ دو جملہ کہ لازم آید از وے نتیجہ

(۵) مقولات عشر، یک جوہر ونہ عرض

(۶) الٰہیات کے امور عامہ، در اصطلاح اہل حکمت چیزہا او گویند کہ ذات آنہا عام باشد ومختص یک قسم از اقسام موجودات نباشد، بلکہ شامل باشد۔

فلسفہ میں جو چیز اسلام کے خلاف تھی، اس کی تاویل کرتے گئے، اس کے بعد مسلمانوں کو ان کا علم کلام نقل کرنے اور ان پر ردوقدح کرنے کی ضرورت پڑی، مثال کے طور پر جب شیعہ اپنے مذہب کے حق میں استدلال کرتے تو انہیں ان کا علم کلام نقل کرنے اور اس کی تردید کرنے کی ضرورت پڑتی، اس طرح علم کلام کا یہ سلسلہ آگے بڑھتا گیا، اور وسیع ہوتا گیا، یہاں تک کہ اس کی اہمیت اور وقار ہو گیا، چنانچہ ان کے دلوں میں جو تذبذب ہوتا تھا، اس سے سکون حاصل کرنے کے لئے وہ اس علم کی طرف رجوع کرتے تھے، یہاں تک کہ وہ یہ سمجھنے لگے کہ یہی خالص حق ہے۔

جب اہل حدیث (۱) نے یہ دیکھا تو انھوں نے اہل سنت کے عقیدے پر کتابیں تصنیف کیں، اس ضمن میں انھوں نے وہ احادیث الگ کرلیں، جن سے عقائد کے مسائل مستنبط ہوتے ہیں جہاں تک صوفیہ کا تعلق ہے، پہلے تو وہ ان اشارات ورموز میں مشغول رہے جو صوفیہ کے احوال اور کیفیات کی تعبیر کرتے ہیں، پھر وہ اس مقام سے معارف کی طرف منتقل ہوئے، اس میں سب سے پیش پیش شیخ محی الدین محمد بن عربیؒ اور ان کے تلمیذ شیخ صدرالدینؒ ہیں، جن کی بدولت یہ بھی ایک جداگانہ علم بن گیا، اس علم کی باریک باریک رگوں کی طرح بہت سی شاخیں ہیں، جو علوم اشراقیہ سے سیراب ہونے لگیں، اسی وجہ سے ان کی اصطلاحات میں مثال (۲)، ناسوت (۳) اور لاہوت (۴) مروج ہوئیں، وہ شخص جس نے سب سے پہلے قلم، لوح، امر وخلق کا ان معنوں میں جو صوفیہ کے ہاں مستعمل ہیں، ذکر کیا، وہ میرے نزدیک فارابی تھا، پھر اس کے بعد ان لوگوں کے متبعین جیسے ضرورتیں پیش آتی رہیں، ان امور کے ایک ایک باب کے متعلق کتابیں لکھتے رہے، اور ان میں آپس میں بحثیں اور مناظرے ہوتے رہے، غرض شرعی علوم وفنون اس طرح شاخ در شاخ اور فرع در فرع ہوئے۔

---

(۱) اہل حدیث سے عاملین بالحدیث ترک التقلید نہیں بلکہ ممارسین بالحدیث مفہوم ہے۔

(۲) عالم مثال، عالمے فروتر است از عالم ارواح وآں چہ دریں عالم ظاہر یست مثل آں در عالم مثال است وخواب مے بینند آں را صور عالم مثال گویند۔

(۳) ناسوت۔ عالم اجسام کہ دنیا وایں جہاں باشد وگاہے مجازاً بمعنی شریعت وعبادت ظاہری۔

(۴) لاہوت، دراصل "لاهو الا هو" است

تیسری فصل، علوم حِکمیہ

علوم حکمیہ، سوان کی اصل یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد زمین میں پھیلی، وہ اس کے اطراف و جوانب میں آباد ہوئی اور اس کے گروہ در گروہ ہو گئے، چنانچہ ہر ایک میں لوگوں کی ایک کثیر جماعت جمع ہوگئی اور ذہانت، تجربہ اور ان امور کی معرفت میں مشغول ہونے کی وجہ سے جنھیں احاطۂ تحریر میں لانا مشکل ہے، بہت سے اتفاقات کے باوجود ان میں اختلافات ضروری ہوگیا اب ضرورت پیش آئی کہ تدبیر منزل اور سیاست مدنیہ کے فنون اور اچھے اخلاق کو برے اخلاق سے پہچاننے کے متعلق ان کی روایات اور نکتوں کو نقل کیا جائے اسی طرح طب، دواؤں اور بیماریوں کی معرفت اور ستاروں، کہانت، قیافہ اور حساب کو جاننے نیز بدنی اور نفسیاتی ریاضتوں کے ذریعہ تہذیب نفس کے طریقوں کی معرفت سے متعلق امور نقل ہوں۔

اب ان لوگوں میں جو بھی صنعتیں وجود میں آئیں، وہ ان کے باہم متفق ہونے اور خوب سے خوب تر کی تلاش کی وجہ سے تھیں، چنانچہ لوگوں میں سے کسی قدیم اور جدید گروہ کو تم ایسا نہیں دیکھو گے کہ ان فنون میں سے کسی نہ کسی سے اسے لگاؤ نہ ہو، بلکہ وہ سرزمین جہاں کے باشندے خلافت اور بادشاہت کے وارث ہوئے اور ان میں ان علوم کے حصول اور ان کی معرفت میں مقابلے کی رسم چل پڑی، ان کی ان امور میں معرفت دوسروں سے زیادہ تھی، خلافت اور بادشاہت کا دور دورہ، فریدوں کے زمانے سے ہمارے نبی علیہ السلام کے زمانے تک فارس اور روم میں رہا، اسی لئے وہاں کے حکماء کو ان امور میں بہت زیادہ رغبت تھی۔

اتفاق سے اسکندر سے تین سو سال کے لگ بھگ پہلے اقلیم یونان میں ذہین، طلب علم کی مشقتوں پر صبر کرنے والے اور معرفت امور میں ایک دوسرے سے بڑھ کر رغبت کرنے والے لوگ تھے وہ ان علوم و فنون میں بہت زیادہ گہرے گئے، چنانچہ طب میں انہماک انہیں معدنی، نباتی اور حیوانی دواؤں، ان کے خواص اور ان کے طبیعی افعال کی تلاش و تفحص اور ابدان موالید (۱) کی طبیعت مدبرہ (۲) اور یہ طبیعت مدبرہ جس طرح ابدان میں غذا پہنچانے اور نشو و نما دینے وغیرہ کا

---

(۱) جمادات، نباتات اور حیوانات موالید ثلاثہ کہلاتے ہیں۔

(۲) ان موالید میں تصرف کرنے والی طبیعت کو طبیعت مدبرہ کا نام دیا جاتا ہے۔

کام کرتی ہے، اس کی کیفیت میں بحث ونظر کی طرف لے گیا، اس سے وہ کائنات فضائی ومعدنی وغیرہ کے بہت سے اسباب کی ٹوہ میں لگ گئے اور اس ضمن میں انہیں بہت سی حکایتیں اور نکتے ملے جنھیں ذہین لوگوں نے لے لیا اور جہاں تک بن پڑا انہیں رسالوں میں ضبط کرلیا۔

اسی طرح ستاروں کا علم انہیں سیاروں کی حرکات کی تحقیق کی طرف لے گیا اور چونکہ ہندسی اور حسابی قواعد کے بغیر انہیں دائرہ ضبط میں نہیں لایا جاسکتا تھا، اس لئے انھوں نے یہ قواعد بھی مرتب کیے تاکہ اس طرح وہ ستاروں کی تحقیق کرسکیں غرض ان کے غور وفکر کا سلسلہ برابر جاری رہا، یہاں تک کہ ہیئت ہندسہ اور حساب نے مستقل فنون کی شکل اختیار کرلی۔

اسی طرح نفسانی ریاضتیں جو پیش روانبیا سے ماخوذ تھیں، انہیں ان ریاضتوں کے ثمرات کے ادراک کی طرف لے گئیں اور پھر یہ ادراک باعث بنا، دنیا سے علیحدگی، تجرد اور انسلاخ کا اور یہ انہیں معارف وجدانیہ کی طرف لے گیا، چنانچہ انھوں نے ان سب کے متعلق گفتگو کی اور ان پر رسالے لکھے، جن میں سے اکثر رمزوں اور اشاروں میں ہیں، پھر بعد کے زمانے والوں نے ان فنون میں دلچسپی لی اور ان میں بحثیں کرنے لگے اور یہ مباحثے انہیں تحدید، استدلال، جدل اور کثرت ردّ ومنع کی طرف لے گئے پھر ارسطاطالیس پیدا ہوا، وہ صحیح فکر اور تیز ذہن والا تھا، شور وشغب اور جھگڑے اور جدل کے بجائے انصاف اور تحقیق کو عزیز رکھتا تھا، اس نے دیکھا جب تک حد اور برہان(۱) کے مباحث کی تنقیح اور برہان سے جدل وشعر کی تمیز نہ ہو، علوم میں صائب نظر پیدا نہیں ہوسکتی، چنانچہ اس نے اس بارے میں نہایت صاف ومفید گفتگو کی، جسے عقلوں نے فوراً قبول کرلیا، ارسطاطالیس کا یہ کارنامہ خلیل سے جس نے علم عروض کا استنباط کیا، ملتا ہے، غرض ارسطاطالیس نے علم الطبیعہ سے اوپر کے تین علوم اخذ کئے، اس میں اس جیسی اور چیزیں شامل کیں

---

(۱) شعری مقدمات، وہ مقدمات جن سے طبیعت میں انقباض پیدا ہو۔

برہان باصطلاح منطقیین عبارت است از قیاسے کہ مرکب باشد از مقدمات یقینی وآں دو قسم است۔ یکے لمی، ومی آنست کہ حد اوسط دروں علت حکم بود در ذہن ونفس الامر، چنانچہ کہ گویند، ھذ امتعفن الاخلاط وکل متعفن الاخلاط فہومحموم، فہٰذ المحموم، پس حد اوسط کہ متعفن الاخلاط است علت است برائے حکم کردن محموم بر ہذا در ذہن ونفس الامر، وآں را برہان لمی ازاں گویند کہ دلالت می کند برلم وعلت حکم در نفس الامر، دوم انی۔

اوران سب کو بڑی اچھی طرح سے بیان کیا، اس نے اشرقیین (۱) کے رسالوں میں غیر مربوط کلام دیکھا کہ اس میں سے کہیں کہیں تناقض، تعقید اور اضطراب ہے، جس سے واضح طور پر یہ معلوم ہوا کہ اس میں حد اور برہان کے مباحث کی رعایت نہیں رکھی گئی، گویا ان مسائل میں غور وخوض نہیں کیا گیا، چنانچہ ارسطاطالیس نے اسے بڑے صاف اور مختصر طریقے سے بیان کیا۔

اگر اسکندر نہ ہوتا، تو نہ ارسطاطالیس یہ کتابیں تصنیف کرتا اور نہ لوگ ہی اس کی کتابوں کی طرف اتنا زیادہ رجوع کرتے، باقی رہا بطلیموس، تو وہ علم ہیئت اور نجوم میں بڑا ماہر تھا، اوران فنون میں اس کی بڑی اچھی کتابیں ہیں، اقلیدس وہ تھا جس نے اپنے زمانے کے ایک بادشاہ کے لئے اصول ہندسہ پر کتاب لکھی، بقراط طب میں بڑا ماہر تھا، اوراس موضوع پر اس نے کتاب تصنیف کی اس کے بعد جالینوس آیا، اس نے علم طب کی تنقیح کی اور اسے اتمام کو پہنچایا، دور جاہلیت تو ختم ہوگیا لیکن ان کی یہ کتابیں اور رسالے رہے، لوگ انہیں پڑھتے پڑھاتے تھے اوران کے مصنفوں کی عزت وتکریم کرتے اوران میں ایک دوسرے سے بڑھ کر بحثیں کرتے تھے۔

موسیقی کی نسبت میرا خیال یہ ہے کہ وہ علوم کے بجائے صناعات میں سے تھی، لیکن ایک جماعت نے دیکھا کہ اس کے منتشر مسائل کی وجہ سے اس کی تعلیم ایسی صورت میں آسان ہوسکتی ہے کہ وہ ایک رسالے میں مدون ہو، چنانچہ انہیں اس فن میں کتابوں اور رسالوں کو تصنیف کرنے کی ضرورت پڑی پھر حکماء کی ایک جماعت آئی اوراس نے اس بارے میں بحث کی کہ بعض نغمات سے تو نفس کو لذت ملتی ہے اور بعض سے نہیں، ان کی یہ بحث حکمت کی قبیل سے تھی چنانچہ اس طرح موسیقی کو اصطلاحاً علم حکمیہ میں داخل کیا گیا۔

پھر جب اسلام آیا اور حنین (۲) نے کتب فلسفہ کو یونانی سے عربی میں منتقل کیا، تو مسلمان

---

(۱) بالکسر۔ گروہیئت از حکمائے سلف کہ از باعث اشراق درروشنی باطن قوا ہا کہ از کثرت ریاضت پیدا کردہ بودند، تعلیم تعلم بمکاشفہ ومراقبہ می کردند وحاجت برفتن پیش یک دیگر نداشتند بخلاف حکمائے مشائین کہ ایشاں نزدیک یک دیگر رفتہ، مقدمات وریاضت می ساختند، چنانچہ افلاطون وبقراط وغیرہ از زمرۂ اشراقیین بودند۔

(۲) حنین بن اسحٰق عبادی، یہ اپنے عہد کا بڑا صاحب کمال نصرانی طبیب تھا۔ اس کو یونانی، سریانی اور عربی تینوں زبانوں میں کامل دستگاہ تھی، اس نے یونانی کتابوں کے بکثرت عربی اور سریانی میں تراجم کئے، اس کی تالیفات وتراجم بے شمار ہیں۔

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر......)

ان کے مطالعہ میں لگ گئے۔اس کے بعد بوعلی (۱) آئے،اور وہ بھی اسی نہج پر چلے ان دونوں نے ایسی باتیں بیان کیں جو مشابہ تھیں اس صلح سے جس سے کہ دونوں فریق راضی نہ ہوں، ان میں سے بعض باتیں ایسی تھیں جن کے بارے میں یہ دونوں اس اصل مصلحت کو ہی نہیں سمجھے، جو شارع کے مقصود تھی اور نہ وہ کلام کا جو اصل مقصد تھا، اسے سمجھے پس جو کچھ ان کی سمجھ میں آیا، وہ انھوں نے بیان کردیا، جہاں تک بوعلی کا تعلق ہے اس نے ان لوگوں کے علوم پر کتابیں لکھیں، اور اپنی تصنیف ''کتاب الشفا'' میں ان علوم کو بڑی اچھی طرح مرتب کیا۔اس نے حکمت نظری کی چار قسمیں کیں، ایک منطق، جس میں نو بحثیں ہیں۔کلیات خمس (۲)۔معقولات عشر، قضایا، قیاس، مباحث حدو برہان، خطابت، جدل، شعر اور مغالطہ۔

حکمت نظری کی دوسری قسم طبیعیات ہے، اس کے آٹھ ابواب ہیں:- سماع طبیعی (۳)، کون، فساد کائنات جوی، معادن، نبات، حیوان اور نفس، تیسری قسم ریاضیات ہے، اور اس کے

(پچھلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ)

ملا کاتب چلپی لکھتے ہیں کہ جب خلافت مامون کے پاس آئی تو اس نے اپنے دادا ابوجعفر منصور کے کام کو تکمیل تک پہنچایا، اور علوم وفنون کو ان کے مرکزوں اور معدنوں سے نکالنے کی طرف متوجہ ہوا، سلاطین روم سے فلسفہ کی کتابیں مانگ بھیجیں چنانچہ ان لوگوں نے افلاطون، ارسطو، بقراط، جالینوس، اقلیدس اور بطلیموس وغیرہ کی کتابیں بھیجیں اور مامون نے ماہر مترجمین سے ان کا ترجمہ کرا کے لوگوں کو ان کی تعلیم کی ترغیب دلائی، اور چند دن کے اندر اندر ایک معتدبہ جماعت علوم وفنون سے آراستہ ہوگئی، (تاریخ اسلام حصہ سوم۔مرتبہ شاہ معین الدین احمد ندوی)

مامون رشید نے ۸۳۳ء میں انتقال کیا مگر حنین بن اسحٰق کا سال وفات ۸۷۷ء ہے۔اس کا سن ولادت ۸۰۰ء کے لگ بھگ ہے (نامور مسلم سائنس داں، پروفیسر حمید عسکری)

(۱) بوعلی سینا ۹۸۰ء میں پیدا ہوا۔اس نے ایک سو سے زائد کتب تالیف کیں، جو ہر قسم کے علوم مثلاً فلسفہ، سائنس، طب، فقہ اور ادب پر مشتمل تھیں، لیکن جن کتابوں کے باعث اس کو اسلامی دور کے نامور سائنس دانوں کی صف میں بہت اونچی جگہ تھی، دو ہیں ایک قانون دوسری شفا، شفا میں فلسفہ، طبعیات، کیمیا، ریاضی، موسیقی اور حیاتیات (یعنی بائی آلوجی) پر مضامین ہیں...... دوسری بڑی کتاب ''قانون'' صحیح معنوں میں اس کی سب سے عظیم تصنیف ہے۔یہ علم العلاج کا ایک مکمل انسائیکلو پیڈیا ہے، جس میں اس نے اپنے زمانے تک کی تمام قدیم اور جدید معلومات کو نہایت قابلیت سے یکجا جمع کیا ہے، نامور مسلم دانست داں پروفیسر حمید عسکری۔

(۲) جنس (حیوان) نوع (انسان) فصل (ناطق) خاصہ (ضاحک) عرض (ماشی) یہ کلیات خمس کہلاتے ہیں۔

(۳) وہ حکمت جس میں جسم طبیعی سے بحث کی جائے۔

چار ابواب ہیں، ہیئت، حساب، ہندسہ اور موسیقی، چوتھی قسم الٰہیات ہے، اور اس کے دو باب ہیں، موجودات کے لئے امور عامہ کی معرفت اور باری تعالیٰ اور عقول کی معرفت، بوعلی نے اپنی کتاب کے آخر میں سزا و جزا، امور نبوت اور عبادات کے متعلق جو اسرار شریعت ہیں، انہیں اور خانہ داری وشہریت کی سیاسیات کو بیان کیا ہے اب اگر تم ان امور میں تلاش وتفحص کرو تو دیکھو گے کہ بوعلی جب باری تعالیٰ اس کی صفات اور کلام پر بحث کرتا ہے تو اس میں بہت زیادہ بودا پن ہے، اور ان مباحث میں اس کی گفتگو ظن وتخمین سے مشابہ ہے، طبیعیات میں فلسفیوں کی گفتگو کا مرجع زیادہ تر عناصر اور موالید میں جو حوادث رونما ہوتے ہیں، حواس وقیاس سے ان کے اسباب بیان کرنا ہوتا ہے۔

چوتھی فصل، علوم محاضرہ

اب رہے علوم محاضرہ، یہ عبارت ہیں ان کلی قوانین، مفید صنعتوں اور عجیب وغریب حکایات وغیرہ سے، جو اس لئے مدون کیے گئے کہ لوگوں کو ان کی ضرورت پڑتی ہے، یا لوگوں میں ان کو جاننے کی رسم چلی آتی ہے، یا لوگوں کا ایک طبقہ انہیں یاد رکھنے کا میلان رکھتا ہے، یا اسی قسم کی کوئی اور بات ہوتی ہے، ان علوم کی بھی کئی قسمیں ہیں ایک قبل از وقت معرفت حاصل کرنے کے علوم اور ان کی تدوین کی وجہ یہ ہوئی کہ لوگ اپنے معاملات میں اس کے محتاج ہوتے ہیں کہ وہ فتح، شکست، بارش اور خشک سالی وغیرہ کے واقعات کو ان کے وقوع ہونے سے قبل جانیں اور اس کے لئے ستاروں، فال، کہانت، تعبیر رویاء، رمل اور جفر وغیرہ سے کام لیا جاتا ہے، انہی علوم میں سے مزاج کو اعتدال پر رکھنے اور بیماریوں کو دور کرنے کے علوم ہیں، اور ان کی طرف لوگوں کی احتیاج کسی سے مخفی نہیں، اور یہ ہیں علم طب، تعویذ گنڈوں کا علم، اور ان حیوانات کے علاج ومعالجے کا علم جنھیں پالنے کی رسم چلی آتی ہے، جیسے کہ گھوڑے، اونٹ، گائیں، بکریاں، ہاتھی، کبوتر وغیرہ ہیں۔

ان علوم میں سے یہ عجیب وغریب اور مفید صنعتیں بھی ہیں، جیسے تیر اندازی، خوش خطی، کیمیا، موسیقی، کھانا پکانا اور کاشت کاری، انہی علوم میں سے فنون حکمیہ ہیں اور یہ وہ نکات ہیں جن سے اخلاق فاضلہ، تدبیر منزل اور سیاست مدنیہ کی معرفت حاصل ہوتی ہے، قدیم حکماء کا یہ دستور تھا کہ وہ وحشی جانوروں، پرندوں اور درندوں کی زبان سے واقعی یا فرضی حکایتیں تصنیف کیا کرتے تھے،

ان حکایتوں میں نکتہ طرازی انہیں بہت دور تک لے گئی۔

ان علوم میں سے بادشاہوں اور رہبانوں کی تواریخ، نادر حکایتیں، ملکوں اور شہروں کے احوال وہیئتیں اور پہاڑوں اور درختوں وغیرہ کی ہیئتیں بھی ہیں، انہی علوم میں سے زبانوں کا جاننا جیسے کہ ترکی، عربی، فارسی اور ہندی وغیرہ ہیں اور مختلف خطوں کا جاننا ہے، انہی علوم میں سے لوگوں کی شعر و شاعری، اس کی نشو ونما، اشعار کے نظم کرنے اور رسائل لکھنے کی معرفت ہے اور ان علوم میں سے قوموں کے مذاہب اور ان کی کتابوں کی روایات اور ان کے تراجم کی معرفت ہے۔

ان اوراق میں جو ہم درج کرنا چاہتے تھے، یہاں اس کا اختتام ہوتا ہے۔

رسالۂ
دانش مندی

تصنیف

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ

ترتیب

مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی

رسالہ دانش مندی(۱)

سب تعریف اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے، جو حکمتوں کا الہام کرنے والا اور نعمتوں کا عطا کرنے والا ہے اور درود وسلام ہو ان سب میں افضل پر، جنہیں (اللہ تعالیٰ کی طرف سے) کتاب اور فیصلہ کن بات دی گئی، نیز آپ ؐ کی آل اور آپ ؐ کے صحابہ پر، جنہوں نے احکام دین کی تبلیغ واشاعت کی اور ہمارے لئے انہیں اس طرح بیان کیا کہ اس سے یقین حاصل ہو، اس کے بعد فقیر ولی اللہ بن عبدالرحیم کہتا ہے کہ اس خاکسار نے فنِ دانشمندی اپنے والد سے سیکھا، انہوں نے میر محمد زاہد بن قاضی اسلمؒ سے یہ فن سیکھا، انھوں نے ملا محمد فاضلؒ سے، انھوں نے ملا محمد یوسف قرا باغیؒ سے، انہوں نے مرزا جانؒ سے، انہوں نے ملا محمود شیرازیؒ سے، انہوں نے ملا جمال الدین دوانیؒ سے، انہوں نے اپنے والد اسعد بن عبدالرحیمؒ اور ملا مظہر الدین گازرونیؒ سے، ان دونوں نے ملا سعد الدین تفتازانیؒ اور سید شریف جرجانیؒ سے، انہوں نے قطب الدین رازیؒ سے، انہوں نے اور ملا سعد الدین تفتازانیؒ دونوں نے قاضی عضدؒ سے، انہوں نے ملا زین الدینؒ سے، انہوں نے قاضی بیضاویؒ سے اور ان کی سند کا سلسلہ جو کتب تاریخ میں مشہور ومعروف ہے شیخ ابوالحسن اشعریؒ تک جاتا ہے۔

غرض فقیر نے فن دانشمندی اس سند سے اخذ کیا ہے، اور علم کلام اور اصول (۲) بھی اس فن سے مخلوط ہیں، اس سند کے رجال سب کے سب اہل تصنیف اور اصحاب تحقیق ہیں اور درس

(۱) فن دانشمندی پر شاہ صاحب کا فارسی زبان میں ایک مختصر رسالہ ہے، یہاں اس کا اردو ترجمہ شائع کیا جارہا ہے۔

(۲) اصول سے مراد اصول فقہ ہے۔

وتدریس اور تصنیف، وتالیف میں مصروف رہے ہیں، سوائے فقیر کے والد (شاہ عبدالرحیمؒ) کے، جواشغال قلبی میں مشغول رہنے کی وجہ سے تصنیف وتالیف اوردرس وتدریس کیلئے وقت نہ نکال سکے۔

اس فقیر کے دل میں آیا کہ فن دانشمندی کے قواعد واصول مرتب کرے، اوراپنے زمانے والوں کوان سے متعارف کرائے، اگرتم یہ پوچھو کہ دانشمندی سے میں کیا مراد لیتا ہوں تو دانش مندی سے میری مراد کتاب دانی ہے، اوراس کے تین درجے ہیں، اس کا ایک درجہ تو یہ ہے کہ کتاب کا مطالعہ ہو، اوراس کی حقیقت بدرجہ تحقیق حاصل کی جائے، دوسرا درجہ یہ ہے کہ استاذ کتاب کو پڑھائے اوراس کی حقیقت شاگردوں کو سمجھائے، اوراس کا تیسرا درجہ یہ ہے کہ وہ اس کتاب پرشرح یا حاشیہ لکھےاوراس کی حقیقت کے انکشاف میں مبالغہ کرے۔

اگرتم کہوکہ یہ جومیں نےفن دانشمندی کےاصول وقواعدکومرتب کرنے کا ذکرکیا ہے، اس کا اوران کے حفظ کرنے اوران کی تحقیق کرنے کا کیا فائدہ ہے، تو میں یہ کہتا ہوں کہ اس کے دو فائدے ہیں، ایک تو اس سے طالب علم کےمطالعہ کا طریقہ جان لیتا ہےاوراس طرح اکثر حالات میں یہ مطالعہ قرین صواب ہوتا ہے، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جب طالب علم کوفن دانشمندی کےبعض مقدمات جیسا کہ صرف ونحو ولغت وغیرہ ہیں، یاد ہوں گے، اس کے بعد وہ کسی کتاب کا مطالعہ کرے گا، اس کے پیش نظراس کتاب کی شرح وتفسیر ہوگی اورشفیق استاذ اسے ان قواعد کلیہ سے آگاہ کرے گا، اس کے بعد استاذ اسے ہرمقام پرشارح نے اس سلسلے میں جونکتہ بیان کیا ہوگا اس سے مطلع کرے گا تو اس طرح طالب علم کوکتاب مذکور سمجھنے کا سلیقہ پیدا ہوجائے گا اس میں شک نہیں کہ کلیات کے احکام جاننے کے بعد جزئیات اورجزئیات سےان جیسی جواورچیزیں پیدا ہوتی ہیں، ان کا احاطہ زیادہ آسان ہوجاتا ہے، اوراس کی مثال ایسی ہے کہ جوشخص شعراء کے دواوین پرممارست رکھتا ہے، وہ شعرکہنےلگتا ہے۔

اس کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ ان بزرگوں نے، جن کا اوپرذکرہوا ہے، اوروہ، اوران جیسے دوسرے حضرات نے جودانشمندی میں سند کی حیثیت رکھتے ہیں، فنونِ دانشمندی کوعلم کلام واصول وغیرہ سے مخلوط کردیا ہے، اب اکثر ایسا ہوتا ہے کہ طالب علم ان علوم سےفنون دانشمندی کوالگ تمیز نہیں کرسکتا، اوران سب کے مجموعہ کووہ ایک ہی علم جانتا ہے چنانچہ اس زمانے کے اکثر خام طبعوں

کا یہ حال ہے کہ چونکہ انہیں علم کے مختلف پہلوؤں میں انتشار نظر آتا ہے اس کی وجہ سے وہ اس کا صحیح طرح احاطہ نہیں کر سکتے اور نہ وہ فن دانشمندی پر عمل کر سکتے ہیں، کیونکہ اُدھر ان کا ذہن منتقل ہی نہیں ہوتا، غرض جب اس مجموعی علم سے اس کے فنون الگ اور ممیّز ہو نگے اور طالب علم اس قاعدے کو جان لے گا اور اس طرح اس کے ذہن میں فنون دانشمندی کے بارے میں ایک امر جامع معین ہو جائے گا تو جیسے ہی وہ کسی مقام پر تھوڑی سی توجہ کرے گا وہ اس علم کے مسائل کا الگ الگ ادراک کر لے گا اور ان کے ہر پہلو پر اس کا احاطہ ہو جائے گا، وما اريد الا الاصلاح ما استطعت وما توفيقي الا بالله (میں تو حتی المقدور بس اصلاح چاہتا ہوں اور اللہ تعالیٰ ہی مجھے اس کی توفیق دینے والا ہے)

تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اگر ایک عالم اپنے شاگردوں کو علوم کی کتابوں میں سے کوئی کتاب، درایت و تحقیق کے طریقے پر پڑھانا چاہتا ہے تو اسے لازمی طور پر پندرہ باتوں کا خیال رکھنا چاہئے، اسی طرح اگر کوئی شخص کسی کتاب کی شرح کرنا چاہتا ہے، تو لامحالہ طور، اسے بھی ان باتوں کا خیال رکھنا ہوگا، وہ پندرہ باتیں یہ ہیں:۔

(۱) پہلی:۔ پیش نظر عبارت میں جو مشکل الفاظ ہیں، ان کی نشان دہی یعنی عبارت میں جو اسماء وافعال ہیں اگر ان کی حرکات وسکنات محل اشتباہ ہیں، تو انہیں بیان کر دے، اسی طرح حروف پر جہاں نقطے ہیں، اور جہاں کوئی نقطہ نہیں، وہ بھی بیان کرے تا کہ تصحیف خطی اور تصحیف لفظی (مثلاً ج کی ح، ع کی غ، ت کی ث وغیرہ سے تمیز ہو جائے) ہر دو سے محفوظ ہو جائے۔

(۲) دوسری یہ کہ:۔ عبارت میں جو غریب و نامانوس لفظ آئے، تو اس کی شرح کرے یعنی اگر کوئی لفظ قلیل الاستعمال ہے اور شاگردوں کے لئے اس کے استعمال کا مفہوم واضح نہیں، تو عالم اس کی لغت اور اصطلاح دونوں کی رو سے تشریح کر دے۔

(۳)۔ ان پندرہ باتوں میں سے تیسری بات یہ ہے:۔ عبارت میں جو مغلق جگہ ہو، استاذ اس کی وضاحت کرے، یعنی اگر عبارت میں کوئی مشکل ترکیب یا شکل نحوی وصرفی صیغہ آیا ہے اور شاگردوں کے لئے اسے سمجھنا مشکل ہے، تو عالم اس کو نحو اور صرف کے مطابق حل کر دے۔

(۴) چوتھی یہ کہ:۔ مسئلہ زیر بحث کو مثالیں دے کر یا اس کی مختلف صورتیں پیش کر کے

سمجھائے ،مثلاً کتاب میں ایک قاعدے کا ذکر ہے اور شاگرد اسے نہیں سمجھ پاتے ،تو عالم اسے واضح طور پر بیان کرے اور اس کی مثالیں دے تاکہ شاگردوں کے ذہن میں اصل مقصد آ جائے۔

(۵) پانچویں بات ''تقریب الدلائل'' (دلیلوں کو ذہن کے قریب لانا) ہے، یعنی اگر کتاب میں کسی مسئلے پر کوئی دلیل قائم کی گئی ہے، تو عالم اس کے مخفی (۱) مقدمات کو اس طرح بیان کرے کہ بعض مقدمات کا بعض سے جو التزام ہے، یا بعض جو دوسروں میں مندرج ہیں، ان سے جو نتیجہ مقصود ہے وہ نکل آئے اور اس ضمن میں وہ ایسے مقدمات بدیہہ (۲) کی طرف رجوع کرے کہ جن میں شکل اور شبہ ہداہتاً داخل نہ ہو۔

(۶) اس سلسلے کی چھٹی بات یہ ہے کہ تعریفات کی تحقیق کرتے وقت ان کی جو قیود (۳) ہوں، ان کے فوائد بیان کرے۔ اور اگر کسی تعریف کی قیود میں سے کسی قید کی کمی ہے تو اسے پورا کیا جائے، نیز اسناد تقسیمات (۴) اور ان سے ایسی جامع و مانع (۵) حد (۶) کے انتزاع (۷) کا جس میں کہ کوئی چیز زائد نہ ہو، طریقہ شرح بسط سے بیان کرے۔

(۷) ساتویں بات یہ ہے کہ قواعد کلیہ کی اس طرح وضاحت کرے کہ اس کے ذیل میں تعریف کی قیود کے فوائد، تقسیمات اور مثالوں کا نیز ان سے اس قاعدہ کلی (۸) کے ایسا انتزاع کا

---

(۱) قیاس دو قضیوں سے مرکب ہوتا ہے اور ان سے نتیجہ نکلتا ہے، جیسے عالم متغیر ہے، یہ پہلا قضیہ ہے اور جو چیز متغیر ہو، وہ حادث ہوتی ہے، یہ دوسرا قضیہ ہے، اس سے لازم آیا کہ عالم حادث ہے، یہ نتیجہ ہے، پہلے قضیے کو صغریٰ اور دوسرے کو کبریٰ کہتے ہیں، اگر پہلا قضیہ مذکور اور دوسرا متروک ہو تو یہ قضایا یا مقدمات مخفی ہوں گے۔

(۲) وہ تصور یا تصدیق جس میں غور وفکر کی ضرورت نہ ہو، بدیہی ہوتا ہے، ذہن میں کسی چیز کا آنا تصور ہے اور تصور مع الحکم کو تصدیق کہتے ہیں۔

(۳) انسان کی تعریف ہے حیوان ناطق، حیوان ناطق اس تعریف کی قیود ہیں۔

(۴) تقسیمات (بسط قسمت) مثلاً اس طرح استدلال کرنا کہ یہ چیز یوں یوں ہے، اور یوں یوں نہیں، ایک چیز کے خواص اور عدم خواص کا برابر تفصیل کرتے جانا 'بسط قسمت' کہلاتا ہے۔

(۵) اپنے تمام افراد پر محیط ہونا جامع اور اپنے تمام غیر افراد کی نفی کرنا، مانع ہے۔

(۶) دلیل یا قیاس میں تین حدیں ہوتی ہیں، اصغر، اوسط، اکبر، ''عالم متغیر ہے''، دلیل یا قیاس میں عالم کو حد اصغر کہتے ہیں ہر متغیر حادث ہے، حادث کو حد اکبر کہیں گے اور عالم اور حادث کو ملانے والی حد اوسط ہے۔

(۷) انتزاع، نتیجہ نکالنا۔

(۸) وہ قاعدہ جو بہت سی چیزوں پر صادق آئے، کلی ہے۔

کہ اس میں کوئی چیز زائد نہ ہو، اور وہ جامع و مانع ہو، شرح وبسط سے بیان آ جائے۔

(۸) آٹھویں بات یہ ہے:۔ عالم تقسیمات کو حصر کرنے کی وجہ واضح کرے اور بتائے کہ یہ حصر تقسیمات استقراء (۱) کی بنا پر ہے یا وہ اس کے حق میں عقلی دلیل پیش کرے کہ شئے مطلوب انہی مذکورہ اقسام میں محصور ہے اور اسی طرح عالم فصول وقواعد میں جو تقدیم وتاخیر ہو، اس کی وجہ بیان کرے۔

(۹) نویں بات ہے دو اقتباس رکھنے والی چیزوں میں تفریق، مثلاً اگر بادی النظر میں دو قسمیں مشابہ ہوں یا دو مخالف مذہب ایک دوسرے سے مشابہ دکھائی دیں تو عالم بڑے واضح طور سے ان کے درمیان جو فرق ہے اسے بیان کرے۔

(۱۰) دسویں بات ہے، دو مختلف چیزوں میں تطبیق، اگر مصنف کی عبارت میں دو مختلف جگہوں میں اختلاف پایا جاتا ہے تو عالم اس اختلاف کو حل کرے، خواہ ان دونوں کا اختلاف دلالت (۲) مطابقی کا ہو، یا ایک دلالت مطابقی ہو اور دوسرا تضمنی یا التزامی۔

(۱۱) گیارہویں بات۔ یہ پہلی بات کا تکملہ ہے، ظاہر الورود شبہات کا دور کرنا ہے۔ جیسے کہ مثال کے طور پر تعریفات میں استدراک 'کسی زائد چیز کا ذکر' خفی ترشیٔ سے کسی چیز کی تعریف کرنا اور تعریف کا جامع و مانع نہ ہونا، ممنوع ہے، یا جیسے کہ دلائل میں جزئیہ (۳) کبریٰ ممنوع ہے یا شاگردوں کو مصنف کے کلام میں بادی النظر میں مخالفت نظر آئے یا اس کا استدلال کے موقع ومحل پر ٹھیک نہ بیٹھتا ہو، عالم ان ظاہر الورود شبہات کی طرف توجہ کرے اور انہیں دور کرے۔

---

(۱) اس دلیل کو کہتے ہیں، جن میں جزئیات کی تحقیق کر کے ان کی ماہیت کلی پر حکم لگایا جائے۔

(۲) الفاظ کا اپنے معنی پر دلالت کرنا "دلالت" کہلاتا ہے، یہ دلالت یا تو وضعی ہوتی ہے یا غیر وضعی، لفظ کا اپنے اس معنی پر دلالت کرنا، جس کے لئے وہ وضع کیا گیا ہے، یہ دلالت وضعی ہے، اور اس کا اپنے اس معنی پر دلالت کرنا جس کے لئے وہ وضع نہیں کیا گیا، یہ دلالت غیر وضعی ہے، دلالت وضعی کی تین قسمیں ہیں، مطابقی، تضمنی اور التزامی، انسان کا حیوان ناطق پر دلالت کرنا یہ دلالت مطابقی ہے، انسان کا حیوان یا ناطق میں سے کسی ایک پر دلالت کرنا یہ دلالت تضمنی ہے، اور اگر ان دونوں سے کسی خارج چیز پر وہ دلالت کرے اور وہ خارج چیز انسان کے لئے ذہن میں لازم ہے، تو اسے دلالت التزامی کہتے ہیں مثلاً انسان کا قابل العلم ہونے پر دلالت کرنا۔

(۳) قیاس التزامی کی چار شکلیں ہوتی ہیں، شکل اول میں یہ شرط ہے کہ صغریٰ موجبہ ہو اور کبریٰ کلیہ، اس شکل میں جزئیہ کلیہ آنا ممنوع ہے۔

(۱۲) بارہویں بات، جہاں حوالہ دیا گیا ہے وہاں حوالے کا اور جہاں مصنف نے ''وفیہ نظر'' کہا ہے، وہاں اس سے مصنف کی کیا مراد ہے، اس کا ذکر کیا جائے اور جہاں سوال (۱) مقدر کی طرف اشارہ ہوتا ہے اس کی وضاحت کی جائے۔

اوران پندرہ باتوں میں سے (۱۳) تیرہویں بات یہ ہے کہ اگر شاگردوں کی زبان وہ نہیں، جو کتاب کی ہے، تو کتاب کی عبارت کا شاگردوں کی زبان میں ترجمہ کیا جائے۔

(۱۴) چودہویں بات، مختلف توجیہات کی تنقیح اوران توجیہات میں جو صحیح تر ہو، اس کا تعین مطلب یہ ہے کہ اگر کتاب کے کسی مقام کے متعلق پڑھانے والوں اور شارحوں میں اختلاف ہو، ایک جماعت ایک جہت سے اس کی نئی شرح کرتی ہے، اور دوسری جماعت دوسری جہت سے اس کی شرح کرتی ہے اور اس طرح توجیہات میں نزاع پیدا ہو جاتا ہے، عالم ان توجیہات کی تنقیح کرے اوران میں سے جو بہترین ہو، اس کا تعین کرے، اور اسی پر مشکل الفاظ کا ضبط ونشاندہی اور مشکل ترکیبوں کا حل بھی قیاس کرلو۔

(۱۵) پندرہویں بات یہ ہے کہ عالم کی تقریر سہل ہو، یعنی اوپر جن بارہ باتوں (صنعتوں) کا ذکر ہے، انہیں وہ واضح اور موجز ومختصر عبارت میں اس طرح بیان کرے کہ وہ ذہن سے قریب ہوں، (کم سے کم الفاظ میں مفہوم ادا کرنا کہ اس میں کوئی غیر ضروری چیز نہ آئے، ایجاز واختصار ہے) اوران کا اخذ کرنا آسان ہو، اوران میں سے ایک بات امتزاج بھی ہے اور وہ یہ کہ استاذ مصنف کی عبارت کو اپنی عبارت کے ساتھ اس طرح ملائے کہ دونوں عبارتیں مل کر باہم مربوط وہم آہنگ ہو جائیں۔

جب ایک عالم مذکورہ بالا پندرہ صنعتوں پر عمل کرے گا تو وہ درس وتدریس اور کتاب کی شرح وتفسیر میں کامل ہو جائے گا، شفیق استاذ کو چاہئے کہ اولاً وہ اپنے شاگردوں کو ان امور سے اجمالی طور سے مطلع کرے، ثانیاً جب وہ شرح وبیان کے دوران ان امور سے گزریں، تو وہ انہیں بتائے کہ یہاں شارح کا مطلب یہ ہے، اور وہاں اس کا مطلب یہ تھا، ثالثاً: شفیق استاذ شاگردوں

(۱) کوئی عبارت جو کسی سوال کا جواب معلوم ہوتی ہے لیکن عبارت میں سوال مذکور نہ ہو، اس سوال کو سوال مقدر کہتے ہیں۔

کو بتائے کہ وہ کتاب کے مطالعہ میں ان ان امور کو پیش نظر رکھیں، اور ان ان میدانوں میں اپنی فکر کو جولاں کریں، رابعاً: شاگرد کے مطالعہ کا اپنے مطالعہ سے مقابلہ کرے، اور شاگرد سے غلطی ہو تو اسے اس طرح اس پر متنبہ کرے کہ یہ غلطی اس کے ذہن پر واضح ہو جائے اور وہ آئندہ ایسی غلطی کرنے میں احتیاط برتے۔

خامساً: استاذ شاگرد کو کسی کتاب کی شرح یا اس پر حاشیہ لکھنے کو کہے، اور اس طرح اس کی قابلیت کا امتحان لے تاکہ تربیت کا جو حق ہے، اس کی تکمیل ہو سکے۔

یہ بھی معلوم رہے کہ دانشمندی کے فن کا کتب معقول و منقول اور علوم برہانیہ (۱) اور خطابیہ (۲) اس پر اطلاق ہوتا ہے، اس ضمن میں کتب منقول میں زیادہ تر ان کی عبارتوں کی تحقیق کی ضرورت پڑتی ہے اور کتب معقول میں مسائل کی تحقیق کی، علوم برہانیہ میں ایک یا ایک سے زیادہ واسطوں کے مقدمات بدیہی کو بطریق برہان (۳) کی ضرورت ہوتی ہے اور علوم خطابیہ میں بطریق ظن، میں نے اپنے اساتذہ سے مذکورہ بالا سند کے ساتھ جو فن دانشمندی سیکھا تھا یہ اس کا خلاصہ مطلب ہے، اور یہ یہاں ختم ہوتا ہے۔

والحمد لله اولاً و آخراً و ظاهراً و باطناً

............☆☆☆............

(۱) علوم برہانیہ، وہ علوم جن میں دلیل و برہان ہو، جیسے کہ منطق

(۲) ظن کے علوم کو علوم خطابیہ کہتے ہیں، ان میں ظنی مقدمات پیش کر کے اپنی بات کہی جاتی ہے۔

(۳) وہ تصدیق جو جازم و ثابت اور واقع کے مطابق ہو، یقین ہے اور وہ قیاس جو مقدمات یقینی سے مرکب ہو، برہان ہے۔ یہ مقدمات یقینی یا تو بذاتہ بدیہی ہوتے ہیں یا ان مقدمات یقینی کی طرف ایک واسطے یا ایک سے زیادہ واسطوں سے پہنچا جاتا ہے۔

وصیت نامہ

تصنیف

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ

ترجمہ

پروفیسر محمد سرور مرحوم

ترتیب

مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی

وصیت نامہ

سب تعریف اللہ کے لئے ہے جو حکمتوں کا الہام کرنے والا اور نعمتوں کا عطا کرنے والا ہے اور صلوٰۃ وسلام ہو عرب وعجم کے سردار اور آپ کی آل اور اہل فضل وکرم اصحاب پر، اس کے بعد فقیر ولی اللہ عفی عنہ کہتا ہے، یہ چند کلمات ہیں جن کی میں اپنی اولاد واحباب کو وصیت کرتا ہوں۔ میں اس کا نام ''المقالة الوضية في النصيحة والوصية'' رکھا ہے، ہمارے لئے اللہ کافی ہے، وہی سب سے اچھا کارساز ہے اور وہی راہ راست کی ہدایت دیتا ہے۔

۱۔ اس فقیر کی پہلی وصیت یہ ہے کہ اعتقاد اور عمل دونوں میں کتاب وسنت کو مضبوط پکڑیں اور ہر دو کے اہتمام وتدبیر میں برابر مشغول رہیں، روزانہ ان دونوں میں سے کچھ نہ کچھ پڑھا جائے اور اگر اس کے پڑھنے کی استطاعت نہ ہو تو ان کے ایک صفحے کا ترجمہ سنا جائے، عقائد میں قدمائے اہل سنت کا مذہب اختیار کریں، اس سلسلے میں جن چیزوں کی تفصیل وتفتیش سلف نے نہیں کی، وہ بھی اس کی تفتیش نہ کریں، خام وناپختہ عقل پرستوں سے اعراض کریں اور ان کی تشکیک پیدا کرنے والی باتوں کی طرف ملتفت نہ ہوں، فروعی مسائل میں علمائے کبار محدثین کی، جو کہ فقہ وحدیث دونوں کے جامع ہیں، پیروی کریں اور فقہ کی جزئیات وتفریعات کو ہمیشہ کتاب وسنت کے روبرو پیش کریں، جو ان کے موافق ہو اسے قبول کریں، اور جو نہ ہو اسے مسترد کردیں، امت کے لئے کوئی بھی ایسا زمانہ نہیں، جس میں وہ اجتہادی مسائل کو کتاب وسنت پر پیش کرنے سے مستغنی

التفہیمات الالٰہیہ جز ثانی میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کا ایک وصیت نامہ درج ہے، یہاں اس کا اردو ترجمہ دیا جارہا ہے۔ (مرتب)

ہو سکے، وہ خشک مزاج (متقشفہ) فقہاء کی بات، جنھوں نے کہ ایک مخصوص عالم کی تقلید اختیار کر کے سنت کے تتبع ترک کر دیا ہو، نہ سنیں اور نہ ان کی طرف التفات کریں اور ان سے دور رہ کر خدا تعالیٰ کا قرب چاہیں۔

۲۔ دوسری وصیت یہ ہے کہ امر بالمعروف کی حدود کے متعلق اس فقیر کے دل میں یہ خیال ڈالا گیا ہے کہ فرائض، کبیرہ گناہوں اور شعائر اسلام کے بارے میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے سلسلے میں سختی کرنی چاہئے، جو شخص اس معاملے میں تساہل برتتا ہے، اس کی مجلس میں نہ بیٹھنا چاہئے اور اس کا دشمن بننا چاہئے۔ اس کے علاوہ دوسرے امور میں، خاص کر وہ امور جن میں سلف اور ان کے بعد آنے والوں میں اختلاف رہا ہے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی حد یہاں تک ہے کہ اس بارے میں جو حدیث ہے وہ بتا دی جائے اور اس میں سختی کرنا پسندیدہ نہیں۔

۳۔ تیسری وصیت یہ ہے کہ اس زمانے کے پیروں اور مشائخ کے ہاتھ میں ہرگز اپنا ہاتھ نہ دیں اور نہ ان کی بیعت کریں، ان سے عوام کو جو حد سے زیادہ عقیدت ہوتی ہے، نہ اس سے اور ان سے جو کرامات منسوب کی جاتی ہیں، نہ ان سے دھوکا کھانا چاہئے، اس لئے کہ عوام کی یہ حد سے زیادہ عقیدت اکثر عام رسم ورواج کے تحت ہوتی ہے اور رسمی اور رواجی امور کا حقیقت میں کوئی اعتبار نہیں ہوتا، اس زمانے کے تمام کرامات فروشوں نے سوائے چند مستثنیات کے طلسمات اور نیر نجات کو ہی کرامات سمجھ رکھا ہے، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ سب سے مشہور خارق عادت امر یعنی کرامات دوسروں کے دلوں کے خیالات پر مطلع ہونا (اشراف) اور آنے والے واقعات کا جاننا (انکشاف) ہے، اور اس اشراف اور انکشاف کے بہت سے طریقے ہیں، ان میں سے ایک علوم نجوم ورمل کا باب ضمیر ہے، تم اس گمان میں نہ رہنا کہ علوم نجوم کے فیصلوں کا انحصار خانے بنانے پر ہوتا ہے، رمل کے لئے زائچہ ضروری ہے، ہم نے تجربہ کر کے دیکھا ہے کہ فن نجوم کے ماہر نے جب یہ جان لیا کہ اس وقت دن کی گھڑیوں میں سے کون سی گھڑی ہے تو اس سے اس کا ذہن طالع کی طرف منتقل ہو گیا اور تمام خانے، کواکب کے محل ومواقع اور ان کے احکام اس کے دماغ میں اس طرح صورت پذیر ہو گئے، گویا خانوں کا صفحہ اس کے روبرو پڑا ہے ایسے ہی جب فن رمل کا ماہر اپنے دل میں یہ متعین کرتا ہے کہ میں نے فلاں انگلی کو لحیان قرار دیا ہے اور فلاں انگلی کی فلاں شکل مقرر کی

ہے اور وہ اپنے ذہن میں نقشہ بناتا ہے کہ ان شکلوں سے کیا کیا شکلیں پیدا ہوں گی یہاں تک کہ اس کے سامنے پورا زائچہ آ جاتا ہے، انہی فنون میں سے ایک فن اپنی مختلف انواع کے ساتھ کہانت ہے۔ یہ فن بڑا وسیع ہے، اس میں کبھی جن حاضر کیے جاتے ہیں اور کبھی بغیر ان کے عمل کیا جاتا ہے، انہی فنون میں سے ایک فن طلسم ہے کہ کواکب کی قوتوں کو ایک صورت میں مرکوز کرتے ہیں اور اس سے دوسروں کے دلوں کے خیالات معلوم کیے جاتے ہیں، اس طرح جوگ کے اعمال ہیں کہ ان میں سے بعض میں دوسروں کے دلوں کے حالات معلوم کرنے اور آنے والے واقعات کو جاننے کی خصوصیت ہوتی ہے، جسے اس امر کی مزید تحقیق مطلوب ہو، وہ ان فنون کی کتابوں کی طرف رجوع کرے۔

کسی کام پر ہمت مرکوز کر دینا، ہیبت ناک شکل میں ظاہر ہونا، دل کو دوسرے کے دل سے باندھ دینا اور طالب کی تسخیر کرنا، یہ سب نیرنجات کے فنون میں سے ہیں، نیرنجات والے ان میں سے بعض پر عمل کرتے ہیں اور اس عمل سے مراد بر آ جاتی ہے، ان معاملات میں کسی کی نیکی و بدی، سعادت و بدبختی اور اس کے مقبول یا مردود ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، اسی طرح مجلس میں حاضر لوگوں میں وجد و شوق اور قلق و اضطراب کی کیفیت کے جاری و ساری ہونے کا باعث بہیمیہ کی حدت و تیزی ہوتی ہے، لہٰذا جس شخص کی قوت بہیمیہ قوی تر ہوگی، اس میں وجد و شوق زیادہ ہوگا، بے شک بعض صالحین بھی ان اعمال و احوال کو نیک نیتی سے بجا لاتے ہیں لیکن وہ ان چیزوں کو کرامات میں سے نہیں سمجھتے، اور یہ بات کسی پر پوشیدہ نہیں، میں نے اکثر سادہ لوح افراد کو دیکھا ہے کہ جب وہ ان اعمال کو کسی پیر یا شیخ سے ظاہر ہوتے ہیں تو وہ انہیں حقیقی کرامات سمجھ لیتے ہیں۔

اس کا چارۂ کار یہ ہے کہ آدمی کتب حدیث جیسے صحیح بخاری، مسلم، سنن ابوداؤد اور ترمذی اور کتب فقہ حنفیہ و شافعیہ پڑھے اور ظاہر سنت پر عمل کرے، اگر اللہ سبحانہ تعالیٰ اس کے دل میں شوق صادق کا فیضان فرمائے اور شوق صادق کی راہ کی طلب غالب ہو تو وہ کتاب عوارف المعارف سے نماز، روزہ، ذکر و اذکار اور اوقات کو مصروف رکھنے کے آداب اور رسائل نقشبندیہ سے یادداشت کے حصول کے طریقے کو حاصل کرے، ان بزرگوں نے ان دونوں امور پر اتنا اچھا لکھا ہے کہ اس کے بعد مرشد کی تلقین کی احتیاج نہیں رہتی، جب نور عبادت کی کیفیت اور نسبت یادداشت حاصل

ہو جائے تو وہ اس پر مداومت کرے، اگر اس دوران میں اسے کوئی بزرگ مل جائے جس کی صحبت جذب پیدا کرنے والی ہو اور اس کی تاثیر لوگوں کے اندر سما جاتی ہو تو وہ اس بزرگ کی صحبت اس وقت تک لازم پکڑے، جب تک اس کی نور عبادت کی مطلوبہ کیفیت اور نسبت یادداشت ایک مستقل ملکہ کی حیثیت اختیار نہ کرلے، اس کے بعد وہ الگ تھلگ ہو کر گوشے میں بیٹھ جائے اور اپنے اس مستقل ملکہ سے برابر لو لگائے رکھے، اس زمانے میں کوئی بھی ایسا نہیں، سوائے بعض مستثنیات کے، جو ہر حیثیت میں کمال رکھتا ہو، اگر وہ ایک حیثیت میں کمال رکھتا ہے تو دوسری حیثیت میں کمال سے خالی ہوگا، اس لئے اسے چاہیے کہ جو کمال وہ رکھتا ہے، اسی میں استحکام پیدا کرے دوسری چیزوں کو نظر انداز کردے، اس معاملے میں وہ "خذ ماصفا ودع ماکدر" (جو اچھا ہے وہ لے لو، جو خراب ہے اسے چھوڑ دو) پر عمل کرے، صوفیہ کی نسبتیں بہت بڑی نعمت ہیں، باقی رہیں ان کی رسوم، ان کی کوئی قیمت نہیں، بے شک میری یہ بات بہت سوں کو گراں گزرے گی، لیکن میرے ذمے ایک کام کیا گیا ہے، اسی کے مطابق مجھے کہنا ہے، اور زید وعمر کے کہنے سے سروکار نہیں۔

۴۔ چوتھی وصیت یہ ہے کہ ہمارے اور اس زمانے کے لوگوں کے درمیان اختلاف ہے۔ صوفی منش لوگ کہتے ہیں کہ اصل مقصود فنا و بقا، استہلاک (اپنے آپ کو ذات مطلق میں گم کردینا) اور انسلاخ (تجرد کامل) ہے، باقی یہاں تک معاشی معاملات اور بدنی طاعات کا ادا کرنا ہے، جن کے بارے میں کہ شرعی احکام وارد ہوئے ہیں، تو یہ ان کے لئے ہے، جو اس اصل مقصود کو بجا نہیں لا سکتے، جیسا کہ مثل ہے: "وما لا یدرک کلہ لایترک کلہ" (جس کا پورا ادراک نہ ہوسکے، اسے پورے کا پورا چھوڑنا نہیں چاہیے) متکلمین کہتے ہیں کہ ان امور کے ضمن میں جو کچھ شرع میں وارد ہوا ہے، اس کے علاوہ اور کچھ مطلوب نہیں اور مذکورہ بالا اصل مقصود یعنی فنا و بقا اور استہلاک وانسلاخ کا ذکر شارع نے صرف خواص کے لئے کیا ہے، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ نوع انسانی کی تخلیق ایک لحاظ سے اس طرح ہوتی ہے کہ وہ جامع ہے قوت ملکیہ اور قوت بہیمیہ کی، چنانچہ اس لحاظ سے اس کی سعادت وخوش بختی قوت ملکیہ کی تقویت اور اس کی شقاوت قوت بہیمیہ کی تقویت میں ہے۔

غرض نوع انسانی کی تخلیق ایک لحاظ سے تو اس طرح ہوئی ہے، لیکن ایک لحاظ سے اس طرح بھی ہوتی ہے کہ نفس اعمال واخلاق کے مختلف رنگ قبول کرتا ہے اور یہ رنگ نفس کی جڑوں میں جذب ہو جاتے ہیں چنانچہ جب انسان مرتا ہے تو یہ رنگ وہ اپنے ساتھ لے جاتا ہے، اس کی مثال یہ ہے کہ انسان کا بدن غذا سے پیدا ہونے والی کیفیات کو اخذ کرتا ہے جو اس کے ساتھ مل جاتی ہیں اور انہیں وہ ساتھ لے لیتا ہے، چنانچہ انہی کیفیات کے نتیجے میں وہ بدہضمی، بخار اور دوسری بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

نوع انسانی کی تخلیق ایک لحاظ سے اس طرح بھی ہوئی ہے کہ انسان حظیرۃ القدس سے ملحق ہو کر وہاں سے الہام حاصل کر سکتا ہے۔ اگر (حظیرۃ القدس کے) فرشتوں سے اچھی مناسبت ہے تو الہام کے ذیل میں اسے مسرت وبہجت حاصل ہوتی ہے اور اگر ان سے منافرت ہے تو تنگی اور وحشت کا ارتقا ہوگا۔

غرض انسانوں کی نوع کی اس طرح تخلیق ہوئی ہے کہ اگر انہیں خود ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے تو اکثر انسانوں کو امراض نفسانی دکھ دیں اس کے پیش نظر حق سبحانہ تعالی نے محض اپنے فضل وکرم سے کارسازی فرمائی، انسانوں کے لئے راہ نجات متعین کی اور خود انہی میں سے ان کے لئے ترجمان لسان غیب، کہ جس سے مراد حضرت پیغمبرؑ ہیں، مبعوث فرمایا تاکہ اتمام نعمت ہو اور ربوبیت جس کا مقتضائے اول انسانوں کو عدم سے وجود میں لانا تھا، دوسری باران کی دست گیری کرے، پس انسانوں کی صورت نوعیہ نے زبان حال سے مبدائے فیض سے شرع کی درخواست کی، اس طرح جو شرع نازل ہوئی تو اس کا حکم نوع انسانی کے تمام افراد کے لئے لازمی وضروری ہوا، کیونکہ انسان کی جو صورت نوعیہ ہے، اس کا حکم تمام انسانوں میں جاری وساری ہے اور اس میں افراد کی خصوصیت کو کوئی دخل نہیں ہوتا، اب جہاں تک فنا وبقا واستہلاک اور اس قبیل کے دوسرے مقامات کا تعلق ہے تو ان کا مقصود ومطلوب ہونا افراد کی خصوصیت کی بنا پر ہے، اس لئے کہ بعض افراد کی تخلیق انتہائی بلندی وتجرد پر ہوتی ہے اور خدا تعالی ان کو مذکورہ بالا راہ کی طرف ہدایت کرتا ہے۔ یہ چیز نوامیس فطرت میں سے نہیں، بلکہ ہوتا یہ ہے کہ ایک فرد اپنی اس خصوصیت فردیہ کی حیثیت سے جو اسے حاصل ہوتی ہے، اپنی زبان حال سے مقامات فنا وبقا وغیرہ کا تقاضا کرتا ہے، شارع کا کلام

ان معانی پر ہرگز محمول نہیں ہے، نہ صراحتاً نہ اشارتاً، ہاں ایک جماعت نے ان مطالب کو کلام شارع سے سمجھا، جیسے کوئی لیلیٰ مجنوں کا قصہ سنے اور اس کی ہر بات کو خود اپنی سرگزشت پر محمول کرے، اسے انھوں نے اپنی اصطلاح میں ''اعتبار'' کا نام دیا ہے۔

مختصراً مقامات انسلاخ واستہلاک میں حد سے زیادہ تجاوز کرنا اور ہر کس و ناکس کا اس میں مشغول ہونا، ملت مصطفویہ میں ایک سخت بیماری ہے، خدا اس پر رحم کرے جو اس بیماری کو فرو کرنے کی کوشش کرے، خواہ وہ خود ان مقامات کی تحصیل کے لئے بعض فطری استعداد یں رکھتا ہو، ہر چند یہ بات اس زمانے کے بہت سے صوفیہ پر دشوار گزرے گی، لیکن میرے ذمے جو کام کیا گیا ہے، میں اس کے مطابق اپنی بات کہوں گا، مجھے زید وعمر سے کوئی سروکار نہیں۔

۵۔ پانچویں وصیت یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے حق میں نیک اعتقاد رکھنا چاہے اور زبان پر ان کے مناقب کے سوا اور کوئی ذکر نہیں آنا چاہئے، اس مسئلے میں دو گروہوں نے غلطی کی ہے، ایک گروہ یہ گمان کرتا ہے کہ صحابہ کے سینے آپس میں صاف تھے اور ان کے درمیان جھگڑے نہیں ہوتے، یہ سرتاپا وہم ہے کیونکہ مشہور روایات ان کے باہمی جھگڑوں کی شہادت دیتی ہیں اور ان روایات کا انکار نہیں ہوسکتا، دوسرے گروہ نے جب دیکھا کہ یہ سب چیزیں صحابہ سے منسوب ہیں تو ان کے خلاف انھوں نے اپنی زبان طعن ولعن کھولی اور اس طرح وہ ہلاکت کی وادی میں جا گرے۔

مجھ فقیر کے دل میں یہ بات ڈالی گئی ہے کہ اگرچہ آپؐ کے صحابہ معصوم نہیں تھے اور ہوسکتا ہے کہ ان میں سے بعض عوام صحابہ سے ایسی چیزیں صادر ہوئی ہوں کہ اگر ویسی چیزیں دوسروں سے صادر ہوتیں تو وہ لعن وطعن اور جرح وتنقید کے مستوجب بنتے، لیکن ہمیں ان کی لغزشوں کے بارے میں زبان روکنے کا حکم دیا گیا ہے اور ان کی جرح وطعن سے عبادت کے طور پر منع کیا گیا ہے، اس میں ایک مصلحت ہے اور وہ مصلحت یہ ہے کہ اگر صحابہ کی جرح وطعن کا دروازہ کھول دیا گیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کا سلسلہ منقطع ہو جائے گا اور سلسلہ روایات کے منقطع ہو جانے سے ملت کا شیرازہ درہم برہم ہو جائے گا، چونکہ ہر صحابی سے روایت لی گئی ہے اور اسی بنا پر بہت سی احادیث کے ایک سے زیادہ، کئی کئی راوی ہیں اور اس طرح امت کو جن احکام کا مکلّف

بنایا گیا ہے، ان کی تائید میں حجت قائم ہوئی ہے، اب اگر اس ضمن میں بعض صحابہ پر جرح بھی ہوگی تو اس سے نقل روایت میں خلل واقع نہ ہوگا۔

اس فقیر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روح پر فتوح سے سوال کیا کہ آپ شیعہ کے بارے میں جو اہل بیت کی محبت کے مدعی اور صحابہ کو برا کہتے ہیں، کیا فرماتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے از نوع کلام روحانی یہ القا فرمایا کہ ان کا مذہب باطل ہے اور ان کے مذہب کا باطل ہونا لفظ امام سے واضح ہوتا ہے جب مجھے اس بات سے افاقہ ہوا تو میں نے لفظ امام میں غور و تامل کیا، معلوم ہوا کہ ان کی اصطلاح میں امام معصوم ہوتا ہے، اس کی اطاعت فرض ہے اور خلق کے لئے اس کا تعین ہوتا ہے، وہ امام کے حق میں وحی باطنی بھی تجویز کرتے ہیں، چنانچہ اس طرح وہ درحقیقت ختم نبوت کا انکار کرتے ہیں، گو زبان سے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم الانبیاء ہی کہتے ہیں، مزید برآں جیسے آپؐ کے صحابہ کے حق میں اچھا اعتقاد رکھنا چاہئے، اسی طرح آپؐ کے اہل بیت کا عقیدت مند ہونا چاہئے اور ان میں سے جو صالح تھے، ان کی اور زیادہ تعظیم کرنی چاہئے، بے شک اللہ نے ہر چیز کا ایک اندازہ مقرر کر رکھا ہے۔

اس فقیر کو معلوم ہوا ہے کہ بارہ امام رضی اللہ عنہم نسبتوں میں سے ایک نسبت کے قطب تھے اور تصوف کا رواج ان کے زمانے کے ختم ہونے پر شروع ہوا، جہاں تک عقیدہ و شرع کا تعلق ہے تو وہ حدیث پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کسی چیز سے نہیں لیا جا سکتا، ان ائمہ کی قطبیت ایک باطنی امر ہے، تکلیف شرعی سے اس کا کوئی تعلق نہیں (یعنی قطبیت کسی کو کسی شرعی حکم کا مکلّف نہیں کر سکتی) ان میں سے ہر ایک کا اپنے بعد والوں کے لئے جو نص و اشارہ تھا، وہ اسی قطبیت کی وجہ سے تھا، اور جن امور امامت کے بارے میں انھوں نے گفتگو کی ہے وہ بھی اسی طرف راجع ہیں۔ وہ یوں کہ اپنے بعض مخلص احباب کو انھوں نے اس سے مطلع کیا، پس ایک زمانے کے بعد ایک جماعت نے اس میں غور کیا اور ائمہ کے قول کو دوسرے موقع و محل پر محمول کر دیا، واللہ المستعان۔

۶۔ چھٹی وصیت یہ ہے، تعلیم علم کا طریقہ جو تجربے سے پایۂ تحقیق کو پہنچا ہے، یہ ہے کہ سب سے پہلے صرف و نحو کے مختصر رسائل پڑھائے جائیں، ان میں سے ہر ایک کے تین تین یا چار چار رسالے طالب علم کی ذہنی استعداد کے مطابق، بعد ازاں تاریخ یا حکمت عملی کی کوئی کتاب جو

عربی میں ہو، پڑھائیں، اس دوران میں اسے کتب لغت سے استفادہ کرنے کا طریقہ اور اس کے مشکل الفاظ کے معنی نکالنا سکھائیں، جب عربی زبان پر قدرت حاصل ہو جائے تو اسے یحییٰ بن یحییٰ مصمودی کی روایت کے مطابق موطا امام مالک پڑھائیں، اسے ہرگز نہ چھوڑیں کیونکہ اصل تو علم حدیث ہے اور اسے پڑھنے میں بڑے فوائد ہیں، ہم تک ان کا سلسلۂ سماعت باقاعدہ پہنچتا ہے، اس کے بعد قرآن عظیم کا درس دیں اور یہ درس اس طرح دیں کہ صرف قرآن پڑھائیں بغیر تفسیر کے، ساتھ ساتھ ترجمہ کرتے جائیں اور جہاں کوئی نحو یا شان نزول کا مشکل مسئلہ آجائے تو وہاں ٹھہریں اور اس پر بحث کریں، درس سے فارغ ہونے کے بعد درس میں جتنا قرآن پڑھا گیا ہو، اس کی مقدار کے مطابق جلالین پڑھائیں، اس طرح پڑھنے میں بڑے فائدے ہیں، بعد ازاں ایک وقت میں کتب حدیث میں سے صحیحین اور دوسری کتابیں، نیز کتب فقہ وعقائد وسلوک پڑھائیں، اور ایک ہی وقت میں کتب دانشمندی جیسے شرح ملا، قطبی وغیرہ پڑھائیں، اگر ممکن ہو تو ایک دن مشکوٰۃ اور دوسرے دن اس کی شرح طیبی پڑھائیں، پہلے دن جتنی مشکوٰۃ پڑھی ہو، اسی مقدار میں دوسرے دن اس کی شرح پڑھائیں تو بہت فائدہ مند ہوگا۔

۷۔ ساتویں وصیت، ہم عربی ہیں، ہمارے آبا واجداد ہندوستانی شہروں میں مسافروں کی حیثیت سے آئے، ہمارے لئے ہمارا عربی النسب اور عربی اللسان ہونا باعث فخر ہے، کیونکہ یہ دونوں چیزیں ہمیں سید اوّلین وآخرین، افضل الانبیا والمرسلین، فخر موجودات علیہ وعلیٰ آلہ الصلوٰۃ والتسلیمات سے نزدیک کرتی ہیں، اس عظیم نعمت کا شکر یوں ادا کیا جائے کہ ہم بقدر امکان عربوں کی عادات ورسوم کو، جن میں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے اور آپؐ نے نشو ونما پائی، ہاتھ سے نہ جانے دیں اور عجم کی رسوم اور ہنود کی عادات کو اپنے اندر نہ رہنے دیں۔

بغوی نے ابوعثمان النہدیؒ سے روایت کی ہے کہ ہمارے پاس عمرؓ بن خطاب کی طرف سے ایک خط آیا اور ہم اس وقت عتبہؓ بن مرقد کے ساتھ آذربائیجان میں تھے، (خط کے عربی متن کو نقل کرنے کے بعد شاہ صاحب اس کا فارسی ترجمہ کرتے ہیں) لکھتے ہیں، یعنی جب عرب جہاد کرنے کے لئے سرزمین عجم کی مختلف اطراف میں پھیلے تو حضرت عمرؓ ڈرے کہ عرب کہیں عجمیوں کی رسمیں اختیار نہ کرلیں اور عربوں کی رسمیں نہ چھوڑ دیں، اس لئے انھوں نے اپنے خط میں لکھا کہ وہ تہ بند

باندھیں، چادریں اوڑھیں، جوتے (نعل) پہنیں، موزے ترک کردیں، شلواریں چھوڑ دیں، اپنے دادا اسماعیلؑ کا لباس اپنے لئے لازم کریں، اپنے آپ کو ناز ونعم اور ٹھاٹ باٹھ اور عجمیوں کی طرز رہائش سے دور رکھیں، دھوپ میں بیٹھنا اپنے لئے لازم ٹھہرائیں، بے شک دھوپ عربوں کے لئے حمام ہے۔ بنو معد (۱) کی رسمیں اختیار کریں، سخت لباس پہنیں، مشقت کی زندگی گزاریں، پرانے کپڑے پہننے کی عادت ڈالیں، اونٹوں کو پکڑیں اور انھیں رام کریں، چھلانگ مار کر گھوڑوں پر سوار ہوں اور نشانوں پر تیر اندازی کریں۔

ہنود کی بری عادتوں میں سے ایک عادت یہ ہے کہ جب کسی عورت کا شوہر مرجائے تو وہ اجازت نہیں دیتے کہ وہ عورت کسی اور مرد سے شادی کرے، یہ عادت سرے سے عرب میں نہ تھی، نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے، نہ آپ کے زمانے میں اور نہ آپ کے بعد، خدا تعالیٰ اس شخص پر اپنی رحمت نازل کرے جو اس بری عادت کو ختم کرے، اگر اس کو تمام لوگوں سے دور کرنا ممکن نہ ہو تو خود اپنی جماعت میں نکاح بیوگان کی اس عربوں کی عادت کو رائج کرنا چاہئے، اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو بیوگان کا نکاح نہ کرنے کی اس عادت کو برا سمجھے اور دل سے اس کا مخالف ہو کیونکہ نہی عن المنکر کا سب سے ادنیٰ درجہ یہی ہے۔ (۲)

ہم لوگوں کے ہاں ایک اور بری رقم یہ ہے کہ نکاح میں مہر بہت زیادہ مقرر کرتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جن پر کہ دین ودنیا دونوں میں ہمارا عزوشرف منتہی ہوتا ہے، اپنے اہل بیت کا جو سب سے بہتر تھے، مہر بارہ اوقیہ اور نشّ مقرر فرمایا تھا، یہ سب مل کر پانچ سو درہم ہوتے ہیں، دوسری ہماری بری عادت خوشی کے موقعوں پر فضول خرچی اور اس ضمن میں بہت سی

---

(۱) حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صاحب زادے حضرت اسماعیلؑ کے فرزند عدنان میں سے بعد میں بنو معد کی شاخیں نکلیں، بنو معد جزیرہ نمائے عرب کے شمال میں رہتے تھے، بنو مضر اور بنو ربیعہ، ان ہر دو کے مورث اعلیٰ بنو معد تھے، یہ زیادہ تر بدو قبائل تھے اور بڑی سخت مشقت کی زندگی بسر کرتے تھے۔

(۲) ارشاد نبوی ہے کہ من رأی منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ فان لم یستطع فبلسانہ فان لم یستطع فبقلبہ وذلک اضعف الایمان. رواہ مسلم، (اگر تم میں سے کوئی شخص بری بات دیکھے تو اسے اپنے ہاتھ سے تبدیل کردے اور اگر اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو زبان سے اسے تبدیل کرنے کا کہے اور اگر اس کی بھی استطاعت نہ رکھتا ہو تو دل سے اسے برا سمجھے، اور یہ سب سے کمزور ایمان ہے)۔

رسموں کا جاری کر لینا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خوشی کے موقعوں کے لئے دو چیزیں مقرر فرمائیں ہیں، ولیمہ کی دعوت اور عقیقہ، ان دونوں کو اختیار کرنا چاہئے اور ان کے علاوہ دوسری چیزوں کو ترک کرنا چاہئے یا ان کا زیادہ اہتمام نہ کرنا چاہئے، ہم لوگوں کے ہاں ایک اور بری رسم یہ ہے کہ ماتم کے سلسلے میں سوئم، چہلم، ششماہی اور سالانہ فاتحہ پر بہت اسراف کرتے ہیں، ان سب رسموں کا عرب اولین میں بالکل وجود نہ تھا، صحیح بات یہ ہے کہ تین دن تک میت کے وارثوں کی تعزیت اور انھیں ایک دن ایک رات کھانا دینے کے علاوہ اور کوئی رسم نہ کی جائے، میت ہو جانے کے تین دن بعد خاندان کی عورتیں جمع ہوں اور مرنے والے کے رشتہ دار عورتوں کو خوشبو لگائیں اور اگر اس کی بیوی ہے تو وہ عدت ختم ہو جانے کے بعد سوگ ختم کر دے۔

ہم میں سے خوش قسمت وہ ہے جو عربی زبان کی صرف ونحو اور اس کی کتب ادب سے مناسبت پیدا کرے، حدیث اور قرآن میں سے اسے درک حاصل ہو، فارسی و ہندی کتابوں، علم شعر، معقولات، اس سلسلے کی جو دوسری چیزیں پیدا ہوگئی ہیں، ان میں مشغول ہونا اور تاریخ بادشاہوں کی سرگزشتوں اور صحابہ کے باہمی نزاعات کا مطالعہ کرنا گمراہی در گمراہی ہے، اگر رسم زمانہ ان چیزوں میں مشغول ہونے کی مقتضی ہو تو یہ ضروری بات ہے کہ وہ اسے علم دنیوی سمجھیں، اس سے متنفر رہیں اور توبہ واستغفار اور اظہار ندامت کرتے رہیں، ہمارے لئے یہ لازمی ہے کہ حرمین محترمین جائیں اور ان کے آستان پر اپنی پیشانی رگڑیں، اس میں ہمارے لئے سعادت ہے اور اس سے پہلوتہی کرنے میں ہمارے لئے شقاوت ہے۔

۸۔ آٹھویں وصیت، حدیث شریف میں آیا ہے۔ "من ادرک منکم عیسی بن مریم فلیقرا منی السلام" (۱) (جو تم میں عیسیٰ بن مریم کو پائے تو وہ میرا انھیں سلام دے) اس فقیر کی یہ پوری آرزو ہے کہ اگر اسے حضرت روح اللہ علیہ السلام کا زمانہ ملے تو سب سے پہلے جو انھیں سلام کہے، وہ میں ہوں، اگر میں وہ زمانہ نہ پاؤں تو اس فقیر کی اولاد یا متبعین میں سے جو بھی ان کے مبارک زمانے کو پائے، وہ انھیں سلام پہنچانے کی پوری کوشش کرے تاکہ ہم محمدی لشکروں میں سے آخری لشکر ہوں، پس سلام ہو، اس پر جو ہدایت کی اتباع کرے۔

---

(۱) اس حدیث کو الحاکم نے اپنی مستدرک میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

خوشخبری

مجموعہ

رسائل امام شاہ ولی اللہؒ
حصہ سوم

(تصوف، مکتوبات، فن ترجمہ نگاری اور دیباچہ فتح الرحمن

حضرت امام شاہ ولی اللہ محدثؒ کے نادر و نایاب رسائل و کتب کا گرانقدر مجموعہ)

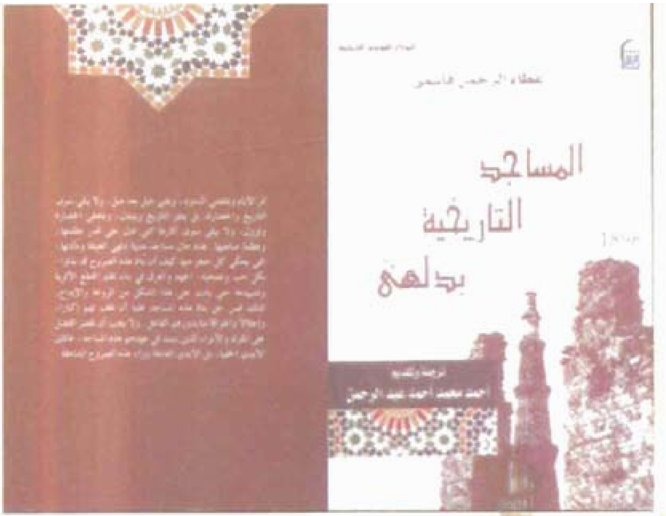
شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی کے زیر اہتمام

جلد ہی منظر عام پر آرہا ہے

شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کی

اہم نئی مطبوعات

دلی کی تاریخی مساجد (حصہ اول)	مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی	200.00
دلی کی تاریخی مساجد (حصہ دوم)	//	100.00
پنجاب وہریانہ کی تاریخی مساجد	//	200.00
امام شاہ ولی اللہ اوران کے افکارونظریات	//	250.00
الواح الصنادید (حصہ اول)	//	150.00
الواح الصنادید (حصہ دوم)	//	100.00
مجموعہ رسائل امام شاہ ولی اللہ (جلد اول)	//	325.00
مجموعہ رسائل امام شاہ ولی اللہ (جلد دوئم)	//	300.00
مولانا عبدالماجد دریابادی، خدمات وآثار	//	200.00
ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کا حصہ		200.00
ہندومندراوراورنگزیب عالمگیر کے فرامین (اردو)	//	20.00
ہندومندراوراورنگزیب عالمگیر کے فرامین (ہندی)	//	20.00
نقوش خاطر (قلمی خاکوں کا مجموعہ)	//	70.00
۱۸۵۷ء اور ہریانہ	//	250.00
مردِ دیدہ ور	//	200.00
مجموعہ رسائل امام شاہ ولی اللہ (جلد سوم)	//	زیر طبع
ضمائر القرآن	مصنفہ ڈاکٹر ابوالنصر محمد خالدی مرتبہ مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی	300.00
الاشباہ والنظائر فی القرآن الکریم	//	350.00
وفیات اعیان الہند	//	300.00
مضامین خالدی	//	300.00
قرآنی تشبیہات واستعارات	//	150.00
نشریات	مولانا جنید احمد بنارسی	100.00
سفر وسیلۂ ظفر	خورشید انوار عارفی	100.00



المساجد التاريخيه بدلهى

عطاء الرحمٰن قاسمى

قام بالنشر

وزارة الثقافة لجمهورية مصر العربية

ISBN 8190164688-1

مجموعۂ

رسائلِ امام شاہ ولی اللہؒ

(سیاسی مکتوبات، تذکرہ، سوانح عمری، آپ بیتی، اصول تفسیر نگاری، اصول ترجمہ نگاری
پر مشتمل ومحیط
امام شاہ ولی اللہ محدثؒ کے نادر ونایاب رسائل وکتب کا گرانقدر مجموعہ)

حصہ سوم

ترتیب وتقدیم:

مولانا مفتی عطاء الرحمن قاسمی

شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی

مجموعۂ

رسائل امام شاہ ولی اللہؒ

حصہ سوم

ترتیب وتقدیم

مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی

شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی

www.KitaboSunnat.com

نام کتاب : مجموعۂ رسائل امام شاہ ولی اللہ جلد سوم

مرتبہ : مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی

قیمت : ۳۰۰

سن اشاعت : یکم جنوری ۲۰۱۴

تعداد : ۵۰۰

کمپوزنگ : ریاض احمد

آئی ایس بی این : 81-901848-6-5

ناشر : شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ، مسجد کاکا نگر، نزد (این، ڈی، ایم، سی پرائمری اسکول) کاکا نگر نئی دہلی۔۱۱۰۰۰۳

بہ تعاون قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

Title : Majmua Rasail-e-Imam Shah Waliullah-III
Editing : Maulana Mufti Ataur Rahman Qasmi
First Edition : 1st Junary 2014
Price : 300
ISBN : 81-901848-6-5
Composing : Riyaz Ahmed

Published by

Shah Waliullah Institute
Masjid Kaka Nagar, Near (N. D. M. C.
Primary School) Kaka Nagar, New Delhi-110 003
Ph. : 011-26953430, Mob.9811740661
website : www.shahwaliullah.com
Email : shahwaliullah_institute@yahoo.in

فہرست کتب

نمبر شمار	کتب		صفحہ
۱۔	مقدمہ	مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی	۵
۲۔	چہل حدیث	امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ	۱۱
۳۔	شاہ ولی اللہؒ کے سیاسی مکتوبات	//	۲۳
۴۔	انفاس العارفین	//	۱۰۹
۵۔	مقدمہ در قوانین ترجمہ	//	۴۸۷
۶۔	دیباچہ فتح الرحمٰن	//	۴۹۹

مقدمہ

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ شیخ الاسلام حضرت امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی تصنیفات وتالیفات کی جدید ترتیب وتدوین کا یہ تیسرا حصہ اصحاب علم ودانش کے سامنے ہے۔ جو ''مجموعۂ رسائل امام شاہ ولی اللہ جلد سوم'' کے نام سے موسوم ہے، بعض دوستوں نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ اس کا نام ''کلیات امام شاہ ولی اللہ'' رکھا جائے، مگر نہ جانے کیوں، میرا ذہن ''کلیات'' سے کوئی علمی وتحقیقی مجموعہ نہیں بلکہ شعری مجموعہ تصور کر بیٹھتا ہے، حالانکہ اب نثر اور نظم پر مشتمل دونوں طرح کی کتابیں ''کلیات'' کی صورت میں شائع ہونے لگی ہیں۔ بعض اہل علم نے کہا کہ حضرت امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی اہم تصنیفات وتالیفات کی ترتیب وتدوین کا کام صد فیصد مفید اور کارآمد ہے، مگر ''مجموعۂ رسائل'' نام رکھنا۔ کچھ ہلکا نام محسوس ہوتا ہے، میں نے کہا کہ مجھے اس سے بھی اتفاق ہے، مگر متبادل نام تو بتائیے انھوں نے ایک اچھا نام بتانے کا وعدہ ضرور کیا تھا۔ مگر اب تک ایفائے وعدہ نہ ہوسکا ہے۔ درآں حالیکہ یہ ''مجموعۂ رسائل امام شاہ ولی اللہ جلد سوم'' بھی اب طباعت کی آخری شکل میں ہے۔

مجھے خوشی ہے کہ علماء اور دانشوروں کا ایک بڑا طبقہ شاہ صاحب کی نادر ونایاب کتابوں کی ترتیب وتدوین کے کام کو پسند کر رہا ہے، ۷رمئی ۲۰۱۳ء کو شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے ایوان غالب میں ''شاہ ولی اللہ اور تصوف'' کے عنوان سے ایک روزہ سیمینار ہوا تھا۔ اور اسی تقریب میں ''مجموعۂ رسائل امام شاہ ولی اللہ جلد اوّل'' کی رونمائی عمل میں آئی تھی، جناب کپل سبل

صاحب مرکزی وزیر مواصلات حکومت ہند نے اس کتاب کی رونمائی کرتے ہوئے کہا کہ میں اس کتاب کی تحقیق واشاعت پر دل کی گہرائی سے مبارکباد دیتا ہوں اور شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کے علمی کارنامے لائق ستائش ہیں اور اس کے مرتب مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی صاحب بھی لائق مبارکباد ہیں، جو ایک معروف عالم دین اور بڑے دانشور ہیں۔

دلّی یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی کے استاذ ڈاکٹر علیم اشرف خان نے مجموعۂ رسائل امام شاہ ولی اللہ جلد اوّل پر اپنا کلیدی مقالہ پیش کیا اور اس کتاب کے مختلف پہلوؤں کا معروضی جائزہ پیش کیا، جسے سامعین نے بے حد پسند کیا اور ان کے پُر مغز مقالہ کو بغور سنا۔ ڈاکٹر صاحب نے میرے کام کی ستائش کی، جس کے لئے میں ان کا شکر گزار ہوں۔ یہ میرے پرانے دوست اور ایک مخلص انسان ہیں، مولانا ڈاکٹر خلیل الرحمٰن راز اور مولانا عقیدت اللہ قاسمی صاحب نے بھی مقالہ تحریر فرمایا تھا لیکن ہم لوگ ان کے مقالوں سے استفادہ نہ کرسکے جس کا افسوس ہے۔

مسجد فتح پوری کے شاہی امام وخطیب اور مشہور عالم دین حضرت مولانا ڈاکٹر مفتی مکرم احمد صاحب نے بھی اپنے خطاب میں غیر معمولی حیرت واستعجاب کا اظہار کیا کہ اس مجموعہ میں حضرت شاہ صاحب کے وہ نادر ونایاب رسائل وکتب شامل ہیں، جن کے نام آج تک سنتے تھے اور ان کے اقتباسات ہی پڑھتے آئے تھے، آج ان کتابوں کو براہِ راست پڑھنے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ حضرت مفتی صاحب نے کتاب کے بارے میں مزید اپنے وقیع خیال کا اظہار فرمایا، جس سے مجھے مزید تحقیقی کام کرنے کا حوصلہ ملا ہے، اللہ ایسی دعاگو شخصیتوں کو صحیح وسلامت رکھے۔

اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے سربراہ پروفیسر اختر الواسع صاحب نے کہا کہ مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی لائق مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اس گرانقدر مجموعۂ رسائل کو بڑے قرینے وسلیقے سے مرتب کیا ہے اور ہمیں مطالعہ کرنے کا موقع فراہم کیا ہے۔ اس کا مختلف زبانوں میں خصوصیت سے انگریزی زبان میں بھی ترجمہ ہونا چاہئے تاکہ شاہ صاحب کے آفاقی فکر کو عام کیا جاسکے۔

دلی یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی کے سابق صدر پروفیسر شریف حسین قاسمی صاحب نے شاہ صاحب کی فارسی خدمات اور اس خانواہ کے قرآنی تراجم کا ذکر اپنے والد مولانا اخلاق حسین قاسمی

مرحوم کے حوالے سے کیا اور اس کی ترتیب واشاعت پر مبارکباد دی۔ اور خاندان ولی اللہی کی فارسی خدمات کا مؤثر ذکر کیا۔

یونانی کونسل کے ڈائریکٹر جنرل پروفیسر سید شاکر جمیل صاحب نے بھی اس مجموعے کی ترتیب واشاعت پر خوشی کا اظہار کیا اور تصوف کی معنویت وافادیت پر روشنی ڈالی، پروفیسر سید شاکر جمیل صاحب نہ صرف فن طبیب کے ماہر ہیں بلکہ تصوف کے رمز شناس بھی ہیں۔

جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی کے استاذ ڈاکٹر اخلاق احمد آہن نے بھی ہمعات، سطعات، لمعات، خیر کثیر اور الطاف القدس کا معروضی جائزہ لیا اور مع عربی وفارسی متون شائع کرنے کا قیمتی مشورہ دیا۔ جس پر آئندہ عمل کیا جائے گا۔

جماعت اسلامی ہند کے سکریٹری مولانا رفیق احمد قاسمی صاحب نے بھی اس کتاب کی تحقیق وتدقیق اور اشاعت کی داد دی اور خوشی کا اظہار کیا، ان کے علاوہ دوسرے اصحاب علم ودانش نے بھی اس تحقیقی کام کو پسند کیا اور سراہا ہے، جو میرے لئے باعث افتخار واعزاز ہے۔

میں ان تمام اصحاب علم اور دانشوران ملت کا شکر گزار ہوں کہ اس مجموعۂ رسائل امام شاہ ولی اللہ جلد اول کی تقریب رونمائی میں میری حوصلہ افزائی کی اور اپنی قیمتی تجویزوں اور مشوروں سے مجھے نوازا ہے۔

اس تقریب میں اکثر اصحاب علم کی رائے تھی کہ حضرت شاہ صاحب کی کتابوں کے اردو تراجم کے ساتھ عربی وفارسی متون بھی شائع کیے جائیں، یہ تجویز بادی النظر میں بہت معقول ومناسب تھی۔

شروع میں میری بھی رائے تھی کہ عربی، فارسی متون بھی شائع کیے جائیں لیکن ضخامت وطوالت کے خوف واندیشہ سے یہ منصوبہ ترک کرنا پڑا تھا۔ جس کا مجھے خود بھی قلق وصدمہ ہے۔ لیکن آئندہ میری کوشش ہوگی کہ شاہ صاحب کی جملہ عربی وفارسی تصنیفات کو صحت املاء، تحقیق وتنقیح، تقدیم اور حواشی کے ساتھ شائع کی جائے اور ان کے علمی فیض کو عام کیا جائے۔ البتہ شاہ صاحب کی کتابوں کو انگریزی اور دوسری زبانوں میں بھی منتقل کرنیکی سخت ضرورت ہے۔ مجھے حلقۂ جامعہ کے مشہور عالم اور مولانا عبید اللہ سندھی کے فیض یافتہ مولانا جمال الدین اعظمی صاحب مرحوم

سابق استاذ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی نے بتایا تھا کہ مولانا عبید اللہ سندھی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام کے دوران اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ارتداد و زندقہ کا سیلاب جو امریکہ اور یوروپ سے آرہا ہے، اس کا انسداد صرف فلسفہ ولی اللہی سے ہی ہوسکتا ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ شریعت کے اسرار و رموز کی تفہیم اور مقاصد شریعت کی تعبیر و تشریح جس جامعیت کے ساتھ حضرت شاہ صاحب کے یہاں ملتی ہے وہ امت کے کسی اور عالم دین کے یہاں نظر نہیں آتی ہے۔ حضرت شاہ صاحب نے نہ صرف قرآن و حدیث اور فقہ اسلامی کے درمیان تطبیق و اعتدال کی راہ نکالی ہے، بلکہ تصوف و سلوک کے بھی مختلف مسالک و مکاتب فکر کے مابین بھی تطبیق و توفیق پیدا کرنے کی سعی بلیغ کی ہے۔ حضرت شاہ صاحب کا اصل تجدیدی کارنامہ یہی ہے کہ انھوں نے امت کے اندر اتحاد و اتفاق اور اعتدال کی راہ ہموار کی ہے اور اختلاف و انتشار اور فرقہ بندی و تخرب پسندی سے دور رہنے کی ترغیب دلائی ہے، جو آپ کا تجدیدی مقام ہے۔

اس ''مجموعۂ رسائل امام شاہ ولی اللہ جلد سوم'' میں حضرت شاہ صاحب کی متعدد رسائل و کتب شامل ہیں۔ حدیث اربعین، مکاتیب، انفاس العارفین، المقدمہ فی قوانین الترجمہ اور دیباچہ فتح الرحمٰن وغیرہ بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

حدیث اربعین یہ ۴۰ حدیثوں کا مجموعہ ہے۔ چہل حدیث کی حدیث میں بڑی فضیلت آئی ہے۔ اسکے پیش نظر ہر محدث اور ہر عالم دین کی خواہش ہوتی ہے کہ چہل حدیث اپنی یادگار چھوڑ جائے۔ چنانچہ حضرت شاہ صاحب نے بھی اربعین (چہل حدیث) مرتب کی ہے، اس کا پہلا اردو ترجمہ ۱۲۵۴ھ مطابق ۱۸۳۸ء میں مطبع احمدی کلکتہ سے شائع ہوا تھا، جس کے مترجم سید عبداللہ مرحوم تھے، جو سید احمد شہیدؒ کے خلیفہ تھے۔ اس کا دوسرا ترجمہ مع حواشی لکھنؤ کے مشہور ناشر محمد مصطفیٰ خان مرحوم نے اپنے مطبع مصطفائی لکھنؤ سے ۱۲۵۸ھ مطابق ۱۸۴۲ء میں شائع کیا تھا۔ پھر اس کا تیسرا ترجمہ ماہنامہ الرحیم (حیدرآباد) پاکستان سے مئی ۱۹۶۷ء کے شمارہ میں شائع ہوا۔ جس کے مترجم و محشی مولانا عبدالحلیم چشتی صاحب تھے۔ مولانا عبدالحلیم چشتی صاحب کے ترجمہ اور حواشی کو سامنے رکھتے ہوئے مفسر قرآن مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم نے نہایت ہی سلیس و شستہ اور بامحاورہ ترجمہ اور حواشی قلمبند کیا تھا۔

صدق جدید بک ایجنسی لکھنؤ نے ۱۳۸۹ھ مطابق ۱۹۶۹ء میں شائع کیا تھا، مولانا عبدالماجد دریابادی کا عمدہ اور لاجواب ترجمہ مع مفید حواشی اس مجموعہ میں شامل کیا جاتا ہے۔

شاہ صاحب کے سیاسی مکتوبات

یہ حضرت شاہ صاحب کے چالیس سے زائد فارسی سیاسی مکتوبات کا اردو زبان میں شاہکار ترجمہ ہے۔ جسے حضرت شاہ صاحب نے امراء وسلاطین اور مشائخ تصوف کے نام لکھا ہے۔ جس کے مترجم وشارح پروفیسر خلیق احمد نظامی صاحب مرحوم ہیں اور اس کے ناشر ندوۃ المصنفین دہلی ہے۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی کے استفسار پر مولانا ابوالکلام آزاد نے ان خطوط کی زبان وبیان اور معیار واسلوب کو دیکھتے ہی فرمایا کہ میرے بھائی: یہ حضرت شاہ صاحب ہی کے خطوط ہیں۔

پروفیسر نظامی نے حضرت شاہ صاحب کے سیاسی مکتوبات کو مولانا آزاد کے نام معنون کیا ہے جو سیاست، ثقافت اور تصوف سے متعلق ہیں اور بڑے ہی اہم ہیں۔

انفاس العارفین: حضرت شاہ صاحب کے مختلف رسائل وکتب کا مجموعہ ہے جس میں دو رسالے بوارق الولایہ اور شوارق المعرفۃ بڑے اہم ہیں، اوّل الذکر میں حضرت شاہ صاحب کے والد بزرگوار حضرت شاہ عبدالرحیم محدث اور آخر الذکر میں چچا شیخ ابوالرضاء محمد کے حالات، ملفوظات اور کشف وکرامات بیان کئے گئے ہیں۔ اسی طرح الامداد فی مآثر الاجداد میں شاہ صاحب کے خاندانی بزرگوں کے حالات زندگی عطیة الصمدیة فی انفاس المحمدیة شیخ محمد پھلتیؒ کے حالات زندگی اور النبذة الابریزیہ میں حضرت شاہ صاحب کے جدامجد شاہ عبدالعزیز شکر بار دہلویؒ کے حالات زندگی اور اوصاف وکمالات بیان ہوئے ہیں۔ علاوہ ازیں دو رسالے اور بھی شامل ہیں ان میں انسان العین فی مشائخ الحرمین اور دوم الجزء اللطیف فی ترجمة العبد الضعیف ہے۔ اول الذکر حضرت شاہ صاحب کے مشائخ حرمین کے مختصر حالات زندگی اور کمالات عمل پر محیط ہے اور آخر الذکر حضرت شاہ صاحب کے خودنوشت حالات زندگی پر مشتمل ہے۔

انفاس العارفین کے فاضل ترجمہ نگار محمد فاروق القادری صاحب ہیں۔ اس کی پہلی اشاعت مطبع احمدی دہلی میں ہوئی تھی اور دوسری مرتبہ مطبع مجتبائی کی اشاعت ۱۳۳۴ میں ہوئی تھی۔ اس کے بعد اس کی طباعت کہاں کہاں ہوئی، اس کی تفصیل نہیں ملتی ہے، مگر اس کے ایک عرصہ بعد

اس کی اشاعت مکتبہ الفلاح دیوبند سے ہوئی ہے جس میں کوئی تاریخ درج نہیں ہے۔ مخمور عثمانی مرحوم نے اس کی اشاعت کا انتظام کیا تھا۔

المقدمہ فی قوانین الترجمہ: حضرت شاہ صاحب کا ایک مختصر فارسی رسالہ ہے جو فن ترجمہ نگاری اور طریقہ ترجمہ نگاری کے موضوع پر ہے۔ اس کا فارسی مخطوطہ خدا بخش لائبریری میں موجود ہے، جس کے پہلے ترجمہ نگار مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی تھے۔ آپ کا کیا ہوا ترجمہ قسط وار ماہنامہ البرہان میں چھپتا رہا ہے۔ اس کے بعد مولانا مشتاق احمد تجاروی صاحب نے اردو ترجمہ کیا۔ یہی ترجمہ شامل مجموعہ ہے۔

دیباچہ فتح الرحمٰن: حضرت شاہ صاحب نے قرآن کریم کا فارسی ترجمہ فتح الرحمٰن کے نام سے کیا ہے۔ فتح الرحمٰن کے شروع میں دیباچہ بھی تحریر فرمایا ہے۔ اس دیباچہ میں ترجمہ کرنے کی تحریکات اور اس کے اسباب پر تفصیلی بحث کے ساتھ اصول ترجمہ نگاری اور اس کے آداب وخصوصیات پر بحث کی ہے اور المقدمہ فی قوانین الترجمہ اور دیباچہ فتح الرحمٰن دونوں میں ترجمہ نگاری کے اصول وضابطہ بیان کیا گیا ہے۔ ان دونوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت شاہ صاحب جدید اسلوب ترجمہ نگاری سے کس قدر باخبر ہیں اور ان کی نزاکتوں اور باریکیوں سے کما حقہ آگاہ ہیں۔ مقدمہ فی قوانین الترجمہ کو ترجمہ نگاری کے باب میں ایک اہم اضافہ تصور کرنا چاہئے۔ اس کو دینی مدارس کے نصاب تعلیم میں شامل کرنا چاہئے تاکہ طلبہ ترجمہ نگاری کے اسلوب وطریقہ سے واقف ہوسکیں۔ اس مجموعہ رسائل امام شاہ ولی اللہ جلد سوم کی اشاعت کے بعد شاہ ولی اللہ کی معرکتہ الآراء کتاب حجتہ اللہ البالغہ کی ترتیب واشاعت زیر غور ہے۔ اللہ نے چاہا تو جلد ہی اس کی چوتھی جلد منظر عام پر آجائے گی اور قارئین اس سے استفادہ کریں گے۔ اخیر میں عزیزی عتیق الرحمٰن سلمہ کے لئے دعا گو ہوں کہ وہ اپنی تمام تر تعلیمی مصروفیات کے باوجود تھوڑا بہت وقت علمی کاموں کے لئے نکال لیتے ہیں اور میری معاونت کرتے ہیں۔ اللہ انکو صحت وعافیت سے رکھیں۔

عطاء الرحمٰن قاسمی

چیرمین

شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ

چہل حدیث

یعنی

امام شاہ ولی اللہؒ کی "اربعین"

ترجمہ

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ

ترتیب

مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شروع اللہ نہایت مہربان، بار بار رحمت کرنے والے کے نام سے

اَمَّا بَعْدَ الْحَمْدِ وَالصَّلٰوةِ فَهٰذِهٖ اَرْبَعُوْنَ حَدِيْثاً مُسْنَدَةً بِالسَّنَدِ الصَّحِيْحِ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُبَانِيْهَا يَسِيْرَةٌ وَمَعَانِيْهَا كَثِيْرَةٌ لِيَدْرِسَهَا رَاغِبُ خَيْرٍ رَجَآءَ اَنْ يُدْخَلَ فِيْ زُمْرَةِ الْعُلَمَاءِ لِقَوْلِهٖ عَلَيْهِ التَّحِيَّةُ وَالثَّنَاءُ مَنْ حَفِظَ عَلٰى اُمَّتِيْ اَرْبَعِيْنَ حَدِيْثاً فِيْ اَمْرِ دِيْنِهَا بَعَثَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى فَقِيْهًا وَكُنْتُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ شَافِعًا وَشَهِيْداً قَالَ الْفَقِيْرُ وَلِيُّ اللّٰهِ عُفِيَ عَنْهُ شَافَهَنِيْ اَبُو الطَّاهِرِ الْمَدَنِيُّ عَنْ اَبِيْهِ الشَّيْخِ اِبْرَاهِيْمَ الْكُرْدِيِّ عَنْ زَيْنِ الْعَابِدِيْنَ عَنْ اَبِيْهِ عَبْدِالْقَادِرِ عَنْ جَدِّهٖ يَحْيٰى عَنْ جَدِّهٖ الْمُحِبِّ عَنْ عَمِّ اَبِيْهِ اَبِيْ اَيْمَنٍ عَنْ اَبِيْهِ شِهَابٍ اَحْمَدَ عَنْ اَبِيْهِ رَضِيِّ الدِّيْنِ عَنْ اَبِي الْقَاسِمِ عَنِ السَّيِّدِ اَبِيْ مُحَمَّدٍ عَنْ وَالِدِهٖ اَبِي الْحَسَنِ عَنْ وَالِدِهٖ اَبِيْ طَالِبٍ عَنْ اَبِيْ عَلِيٍّ عَنْ وَالِدِهٖ مُحَمَّدٍ زَاهِدٍ عَنْ وَالِدِهٖ اَبِيْ عَلِيٍّ عَنْ اَبِي الْقَاسِمِ عَنْ وَالِدِهٖ اَبِيْ مُحَمَّدٍ عَنْ وَالِدِهٖ الْحُسَيْنِ عَنْ وَالِدِهٖ جَعْفَرٍ عَنْ اَبِيْهِ عَبْدِاللّٰهِ عَنْ اَبِيْهِ زَيْنِ الْعَابِدِيْنَ عَنْ اَبِيْهِ الْاِمَامِ الْحُسَيْنِ عَنْ اَبِيْهِ عَلِيِّ بْنِ اَبِيْ طَالِبٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔

حمد الٰہی اور درود مصطفائی کے بعد عرض ہے کہ یہ چالیس حدیثیں ہیں سند صحیح کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف مستند۔ ان کے لفظ تھوڑے ہیں اور معنی بہت (۱) تاکہ انھیں پڑھے خیر کا شائق، اس امید کے ساتھ کہ وہ طبقہ علماء میں شامل کرلیا جائے (۲) نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس قول کے بموجب کہ جس نے یاد رکھیں میری امت کے واسطے چالیس حدیثیں امت کے دین کے بارے میں تو اللہ اسے اٹھائے گا فقیہ کی حیثیت سے اور میں اس کی طرف سے شافع اور گواہ ہوں گا قیامت کے دن (۳)۔ کہتا ہے فقیر ولی اللہ عفی عنہ کہ میرے سامنے روایت کی ابوطاہر مدنی نے اپنے والد شیخ ابراہیم کردیؒ سے اور انھوں نے (۴) زین العابدین سے اور انھوں نے اپنے والد عبدالقادر سے اور انھوں نے اپنے دادا یحییٰ سے اور انھوں نے اپنے دادا محب سے اور انھوں

نے اپنے باپ کے چچا ابی ایمن سے اور انھوں نے اپنے والد شہاب احمد سے اور انھوں نے اپنے والد رضی الدین سے اور انھوں نے ابوالقاسم سے اور انھوں نے سید ابومحمد سے اور انھوں نے اپنے والد ابوالحسن سے اور انھوں نے اپنے والد ابوطالب سے اور انھوں نے ابوعلی سے اور انھوں نے اپنے والد محمد زاہد سے اور انھوں نے اپنے والد ابوعلی سے اور انھوں نے ابوالقاسم سے اور انھوں نے اپنے والد ابومحمد سے اور انھوں نے اپنے باپ حسین سے اور انھوں نے اپنے والد جعفر سے اور انھوں نے اپنے والد عبداللہ سے اور انھوں نے اپنے والد زین العابدین سے اور انھوں نے اپنے والد امام حسینؓ سے اور انھوں نے اپنے والد علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہم سے کہ انھوں نے کہا (۵) کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ

۱۔ لَيْسَ الْخَبَرُ كَالْمُعَايَنَةِ — شنید دید کے برابر نہیں۔ (۶)

۲۔ وَبِهِ الْحَرْبُ خُدْعَةٌ — اور اسی سند سے (۷)۔ جنگ تو دھوکے کا نام ہے۔ (۸)

۳۔ وَبِهِ الْمُسْلِمُ مِرْآةُ الْمُسْلِمِ — ایک مسلم دوسرے مسلم کا آئینہ ہے۔ (۹)

۴۔ وبِهِ الْمُسْتَشَارُ مُؤتَمَنٌ — جس سے مشورہ کیا جائے اُسے امانتداری لازم ہے۔ (۱۰)

۵۔ وَبِهِ الدَّالُ عَلَى الْخَيْرِ كَفَاعِلِه — نیک کام کا بتانے والا بھی اس کے کرنے والے کے برابر ہے۔ (۱۱)

۶۔ وَبِهِ اِسْتَعِينُوْا عَلَى الْحَوَائِجِ بِالْكِتْمَانِ — ضرورتوں میں مدد چاہو چھپا کر۔ (۱۲)

۷۔ وَبِهِ اِتَّقُوْا النَّارَ وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ — دوزخ سے بچو آدھے چھوہارے ہی سے سہی۔ (۱۳)

۸۔ وَبِهِ الدُّنْيَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ وَجَنَّةُ الْكَافِرِ — دنیا قید خانہ ہے مومن کا اور جنت ہے کافر کی۔ (۱۴)

۹۔ وَبِهِ الْحَيَاءُ خَيْرٌ كُلُّهُ — حیا سرتا سر خیر ہی ہے۔ (۱۵)

۱۰۔ وَبِهٖ عِدَةُ الْمُؤْمِنِ كَاَخْذِ الْكَفِّ

مومن کا (زبانی) وعدہ اس کے ہاتھ مارنے کے برابر ہے۔(۱۶)

۱۱۔ وبہ لَا يَحِلُّ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّهْجُرَ اَخَاهُ فَوْقَ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ

جائز نہیں کسی مومن کو کہ وہ چھوڑے اپنے بھائی کو تین دن سے زیادہ۔(۱۷)

۱۲۔ وبہ لَيْسَ مِنَّا مَنْ غَشَّنَا

وہ ہم میں سے نہیں جو ہم سے خیانت کرے۔(۱۸)

۱۳۔ وبہ ما قَلَّ وَكَفٰى خَيْرٌ مِمَّا كَثُرَ وَاَلْهٰى

جو چیز ہو تو تھوڑی، مگر کافی ہو جائے، وہ بہتر ہے اس سے جو ہو تو بہت مگر غفلت میں ڈال دے۔(۱۹)

۱۴۔ وَبِهٖ الرَّاجِعُ فِىْ هِبَتِهٖ كَالرَّاجِعِ فِىْ قَيْئِهٖ

دی ہوئی چیز کا پھیر لینے والا ایسا ہے جیسے اپنی قے کو چاٹ جانے والا۔(۲۰)

۱۵۔ وبہ اَلْبَلَاءُ مُوَكَّلٌ بِالْمَنْطِقِ

مصیبت تو مقرر ہے بولنے ہی پر۔(۲۱)

۱۶۔ وبہ النَّاسُ كَاَسْنَانِ الْمُشْطِ

انسانوں کی مثال کنگھی کے دندانوں کی ہے۔(۲۲)

۱۷۔ وبہ اَلْغِنٰى غِنَى النَّفْسِ

تونگری تو دل کی تونگری ہے۔(۲۳)

۱۸۔ وبہ السَّعِيْدُ مَنْ وُّعِظَ بِغَيْرِهٖ

خوش قسمت وہ ہے جو دوسرے کے حال سے نصیحت حاصل کرے۔(۲۴)

۱۹۔ وبہ اِنَّ مِنَ الشِّعْرِ لَحِكْمَةً وَاِنَّ مِنَ الْبَيَانِ لَسِحْرًا

بعض شعر پُر حکمت ہوتے ہیں اور بعض تقریریں سحر انگیز۔(۲۵)

۲۰۔ وَبِهٖ عَفْوُ الْمُلُوْكِ اِبْقَاءٌ لِلْمُلْكِ

بادشاہوں کے عفو سے ملک کی بقا ہے۔(۲۶)

۲۱۔ وبہ اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّهٗ

آدمی اسی کے ساتھ ہوگا جس کے ساتھ اسے محبت ہے۔(۲۷)

۲۲۔ وَبِهٖ مَا هَلَكَ اُمْرءٌ عَرَّفَ قَدْرَهٗ	جس شخص نے اپنی حقیقت پہچان لی، وہ برباد نہ ہوا۔ (۲۸)
۲۳۔ وَبِهٖ اَلْوَلَدُ لِلْفِرَاشِ وَلِلْعَاهِرِ اَلْحَجَرُ	لڑکا عورت کے لئے اور حرام کار (مرد) کے لئے پتھر۔ (۲۹)
۲۴۔ وَبِهٖ اَلْيَدُ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِنَ الْيَدِ السُّفْلٰى	اوپر کا ہاتھ بہتر ہے نیچے کے ہاتھ سے۔ (۳۰)
۲۵۔ وَبِهٖ لَا يَشْكُرُ اللّٰهَ مَنْ لَّا يَشْكُرُ النَّاسَ	جو بندوں کا شکرگزار نہیں ہوتا وہ اللہ کا بھی شکرگزار نہ ہوگا۔ (۳۱)
۲۶۔ وَبِهٖ حُبُّكَ الشَّيْءَ يُعْمِيْ وَيُصِمُّ	محبت کسی چیز کی تجھے اندھا اور بہرا کردیتی ہے۔ (۳۲)
۲۷۔ وَبِهٖ جُبِلَتِ الْقُلُوْبُ عَلٰى حُبِّ مَنْ اَحْسَنَ اِلَيْهَا وَبُغْضِ مَنْ اَسَآءَ اِلَيْهَا	دلوں کی غفلت ہی ایسی ہوئی ہے کہ بھلائی کرنے والے کے ساتھ انھیں محبت پیدا ہو جاتی ہے اور برائی کرنے والے کے ساتھ دشمنی۔ (۳۳)
۲۸۔ وَبِهٖ اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَهٗ	گناہ سے توبہ کرلینے والا گناہ نہ کرنے والے ہی کے برابر ہے۔ (۳۴)
۲۹۔ وَبِهٖ اَلشَّاهِدُ يَرٰى مَا لَا يَرَاهُ الْغَائِبُ	حاضر دیکھ لیتا ہے اس شے کو جسے غائب نہیں دیکھتا۔ (۳۵)
۳۰۔ وَبِهٖ اِذَا جَاءَكُمْ كَرِيْمُ قَوْمٍ فَاَكْرِمُوْهُ	جب تمہارے پاس کسی جماعت کا سردار آئے تو اس کی تعظیم کرو۔ (۳۶)
۳۱۔ وَبِهٖ اَلْيَمِيْنُ الْفَاجِرَةُ تَدَعُ الدِّيَارَ الْبَلَاقِعَ	جھوٹی قسم ملکوں کو اجاڑ ڈالتی ہے۔ (۳۷)

۳۲۔ وَبِهٖ مَنْ قُتِلَ دُوْنَ مَالِهٖ فَهُوَ شَهِيْدٌ
جو اپنے مال کی حفاظت میں مارا جائے وہ بھی شہید ہے۔ (۳۸)

۳۳۔ وَبِهٖ الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّةِ
اعمال کا دارومدار نیت پر ہے۔ (۳۹)

۳۴۔ وَبِهٖ سَيِّدُ الْقَوْمِ خَادِمُهُمْ
قوم کا سردار تو اس کا خادم ہوتا ہے۔ (۴۰)

۳۵۔ وَبِهٖ خَيْرُ الْاُمُوْرِ اَوْسَطُهَا
عمل میں سب سے بہتر اس کا درجہ درمیانی ہے۔ (۴۱)

۳۶۔ وَبِهٖ اَللّٰهُمَّ بَارِكْ فِيْ اُمَّتِيْ فِيْ بُكُوْرِهَا يَوْمَ الْخَمِيْسِ
الٰہی میری امت کو برکت دے جمعرات کی صبح کے سفر میں۔ (۴۲)

۳۷۔ وَبِهٖ كَادَ الْفَقْرُ اَنْ يَّكُوْنَ كُفْرًا
قریب ہے کہ مفلسی کفر تک پہنچ جائے۔ (۴۳)

۳۸۔ وَبِهٖ السَّفَرُ قِطْعَةٌ مِنَ الْعَذَابِ
سفر بھی مصیبت کی ایک قسم ہے۔ (۴۴)

۳۹۔ وَبِهٖ الْمَجَالِسُ بِالْاَمَانَةِ
مجلسیں قائم رہتی ہیں امانت سے۔ (۴۵)

۴۰۔ وَبِهٖ خَيْرُ الزَّادِ التَّقْوٰى
بہترین توشہ پرہیزگاری ہے۔

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ

اللہ کی رحمت نازل ہو بہترین خلائق محمدؐ پر اور آپ کے آل واصحاب سب پر۔

حواشی

(۱) عربی میں کلام بلیغ کی جو ایک پہچان یہ بتائی گئی ہے کہ خیر الکلام ما قلّ و دلّ۔ بہترین کلام وہ ہے جو لفظاً مختصر ہو اور معناً وسیع۔

وہ شان اس کلام رسول کی پوری پوری ہے اور شاہ صاحب نے جو ۴۰ حدیثیں روایت فرمائی ہیں وہ اس معیار پر سو فی صد پوری اترتی ہیں۔

(۲) یعنی اللہ کے نزدیک اور حشر میں۔

(۳) یہ حدیث نبوی، خود کیسی بشارت دینے والی، ڈھارس بندھانے والی تسلی قلب کا سامان بہم پہنچا دینے والی ہے۔ اللہ اللہ، کتنی پر منفعت اور کتنا ارزاں سودا! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت اور شہادت کی نعمت بے

بہا حاصل ہوئی جا رہی ہے اتنا سادہ ہلکا کام کر دینے کے عوض کہ ۴۰ چھوٹی چھوٹی سی حدیثیں جمع کر کے سنا دیں۔

فقیہہ اسے کہتے ہیں جس کی سمجھ بوجھ دین کے بارے میں سند و مستند ہو۔ ماہر دینیات۔

(۴) روایت مسلسل اسی کو کہتے ہیں اور اس فن کو ہمارے محدثین نے جس کمال پر پہنچا دیا، اس کی نظیر نہ ان سے قبل کسی دور میں ملی ہے اور نہ ان کے بعد کسی دوسرے زمانے میں، مورخین عالم کی بڑی سی بڑی کوششیں اور کاوشیں ہیچ ہیں محدثین کی اس تخصیص کے سامنے۔

لفظ ''اور'' کا اضافہ اردو میں سلسلۂ ربط روایت کے اظہار کے لئے ہے۔ عربی میں حرف ''عن'' (''از'' یا ''سے'') آتا ہے، بغیر کسی حرف عطف کے۔

(۵) یعنی آخری راوی امیر المومنین حضرت علیؓ نے اس چہل حدیث کو ایک مزید شرف یہ بھی حاصل ہے کہ اس کی ساری روایتوں کا سلسلہ جا کر حضرت علیؓ پر ختم ہوتا ہے۔

(۶) مشہور مصرعہ ''شنیدہ کے بود مانند دیدہ'' اسی کا ترجمان ہے حدیث اس حقیقت کا اظہار کر رہی ہے کہ خبر و روایت وزن و تحقیق میں رویت و مشاہدہ کی برابری نہیں کر سکتی، دنیا اگر اس سامنے کی حقیقت کو خیال میں رکھے، تو کتنی الجھنوں سے نجات مل جائے۔

(۷) و بہ سے مراد ہے کہ جس سلسلۂ اسناد سے روایت ماقبل نقل ہوئی ہے اسی سے یہ روایت بھی آئی ہے، محدثین متن حدیث کے ساتھ اس کا دھرانا بھی ہر بار ضروری سمجھتے ہیں۔ ترجمہ میں آئندہ سے اس کا التزام نہ رہے گا۔

(۸) یعنی جنگ کسی معاملہ میں حق و ناحق کا معیار نہیں۔ بلکہ دنیا میں عام طور سے جنگیں جو ہوتی ہیں ان میں مقصود چونکہ بہر صورت فتح و کامیابی ہوتی ہے۔ اس لئے ہر فریق پوری طرح دھوکے دھڑی سے بھی کام لیتا ہے۔ اور دنیا جنگ میں اخلاقی قانون کی پابند نہیں رہتی۔ یہ بیان ''حرف'' (جنگ) ہے جیسی کہ وہ دنیا میں معروف ومتعارف ہے۔ اسے اسلام کے بتائے ہوئے ''قتال'' و جہاد سے کوئی تعلق نہیں، جس کی بنیاد ہی تمام تر حق وحقانیت، صدق و اخلاص پر ہے۔

(۹) یعنی ہر مومن کا دل دوسرے کی طرف سے آئینہ کی طرح صاف و بے غبار ہونا چاہئے۔ اور غایت اخلاص سے یہ چاہئے کہ دوسرے کا عیب اسی کو جتا دیں۔

(۱۰) اس میں تاکید ہے اخلاص کی۔ جو تم سے مشورہ چاہے اسے خلوص دل سے دو، اور اس کے رازوں کو دوسروں پر ظاہر نہ کرو۔

(۱۱) یعنی کسی بھلائی کی ترغیب دینے والا، اس کی طرف شوق و رغبت دلانے والا بھی اللہ کے ہاں اصل

فاعل سے پیچھے رہنے والا نہیں۔ داعی خیر بھی اجر میں فاعل خیر کا شریک و سہیم ہوگا۔ اسلام خیر ہی کا نہیں، خیر اجتماعی کا بھی حریص ہے۔

(۱۲) انسان اپنی ضرورتوں میں دوسروں کی مدد کا محتاج رہتا ہی ہے، چاہئے کہ یہ عمل استعانت چپکے چپکے جاری رکھے، بلاضرورت اس کا چرچا نہ کرتا پھرے، کہ اس سے مخالفوں کو دراندازی کا موقع مل جائے گا۔

(۱۳) نیکی کے ادنیٰ سے ادنیٰ کام کو بھی حقیر نہ سمجھو۔ '' آدھا چھوہارا'' مقدار و تعداد کی تصغیر کے دکھانے کو ہے یعنی ادنیٰ سے ادنیٰ کام سے بھی دریغ نہ کرو، کیا معلوم کہ تمہاری نجات اسی حقیر سے عمل سے ہو جائے۔

(۱۴) مومن کو جو نعمتیں آخرت میں نصیب ہونا ہیں، ان کے مقابلہ میں یہ تنگنائے دنیا اس کے لئے جیل خانہ یا کال کوٹھری ہی ہے۔ کافر جو آخرت کی نعمتوں سے محروم ہے اسے کھو جو جشن منانا ہے یہیں منالے، اس کو اپنی جنت سمجھ لے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ مومن کیلئے دنیا میں طرح طرح کی قیدیں ہیں، پابندیاں ہیں، شریعت کے حدود و قیود ہیں، منکر یہاں جانوروں کی طرح بے کھٹکے ہر طرف چلتا پھرتا، کھاتا پیتا، ڈینگ مارتا پھرتا ہے۔

(۱۵) شرم و غیرت کی خیریت کل اس مختصر ارشاد سے ظاہر ہے۔

(۱۶) مومن کو محض اپنے زبانی وعدہ کا اتنا پاس و لحاظ ہونا چاہئے کہ جیسے اس نے ہاتھ پر ہاتھ مار کر کوئی پکا وعدہ کر لیا ہو۔ مومن کی ہر بات پتھر کی لکیر ہونا چاہئے۔

(۱۷) دنیوی معاملات میں آپس میں رنج پہنچتے رہنا ایک امر طبعی ہے۔ حضورؐ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ یہاں تک تو مضائقہ نہیں کہ ایک مسلمان دوسرے سے منھ پھیر لے، اس سے بول چال، صاحب سلامت ترک کر دے، لیکن اس طبعی اشتعال و ہیجان کی بھی ایک محدود مدت ہوتی ہے، یہ نہ ہو کہ یہ مہینوں، برسوں جاری رہے، بس اسے تین دن میں ختم ہو جانا چاہئے۔ دنیا کے اس دانا ترین انسانؐ اور سب سے بڑے حکیم فطرت نے اس فیصلہ میں کیسی رعایتیں دونوں فریقوں کی رکھ لیں، ناراض ہونے کی بھی اجازت دیدی اور ساتھ ہی اس ناراضی پر قید بھی عائد کر دی۔ حدیث میں فریق ثانی کے لئے لفظ '' بھائی'' (اخ) لانا کس درجہ حکیمانہ ہے۔

(۱۸) اللہ اکبر! امت کی اجتماعی فلاح و بہبود کس درجہ آپؐ کو محبوب تھی اور کیا درجہ تاکید کا آپؐ نے اس کے لئے کر لیا ہے، صاف فرما دیا کہ جو کوئی مسلمان بھائی سے کسی قسم کی خیانت کرے، اسے دھوکا دے۔ اسے فریب میں رکھے، وہ اس قابل نہیں کہ اس کا شمار دائرہ امت کے اندر کیا جائے۔

(۱۹) نعمت مقدار یا تعداد میں کتنی ہی تھوڑی یا چھوٹی ہو لیکن اگر اس سے دل میں سکون اور طبیعت میں قناعت پیدا ہو رہی ہو، تو وہ کہیں بہتر ہے ایسی دولت سے جو دیکھنے میں بڑی خوشنما ہو، لیکن بجائے سکون و قناعت کے وہ حرص و ہوس کو بھڑکانے والی ہو، مشروب وہی اچھا جو پیاس بجھائے، نہ کہ وہ جو اور تشنگی بڑھائے۔

(۲۰) طبعی کراہت کی کیسی سچی اور موثر تصویر کھینچ دی ہے۔

(۲۱) وہ دنیا میں زیادہ تر آفتیں، نتیجہ ہوتی ہیں زیادہ گوئی، غلط گوئی، فضول گوئی کا، انسان اگر اپنی زبان قابو میں رکھنا سیکھ لے، تو کتنی مصیبتوں، فکروں، رنجشوں سے نجات پا سکتا ہے۔

حضرت تھانویؒ ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ بزرگوں نے تین باتیں اہل طریق کے لئے لازمی رکھی ہیں ایک کم کھانا، دوسرے کم سونا، تیسرے کم بولنا۔ لیکن میں نے تجربہ سے پایا ہے کہ اس کے لئے اہم ترین ہدایت کم بولنے کی ہے۔ پہلی دو چیزوں میں سے بے احتیاطی تو لشتم پشتم چل جاتی ہے۔ لیکن زیادہ گوئی کا فتنہ ایسا ہے جو زہر قاتل کا کام دیتا ہے۔

احادیث نبوی زبان کے فتنوں سے بھری پڑی ہیں! اور امام غزالیؒ وغیرہ نے بھی اس پر تفصیل سے لکھا ہے۔

(۲۲) یعنی جس طرح چند دندانوں کے ٹوٹ جانے سے پوری کنگھی ناقص ہو جاتی ہے۔ چند لوگوں کے راہ فساد پر پڑ جانے سے، پورا معاشرۂ انسانی داغ دار ہو جاتا ہے۔

(۲۳) سعدیؒ کا مقولہ "تونگری بہ دل ست نہ بہ مال" شاید اسی حدیث سرتا پا حقیقت کا ترجمہ ہے اور انسانی تجربات کا یہ ایک خلاصہ یا نچوڑ ہے۔

(۲۴) بدنصیب ہے کہ وہ کہ دوسرے اس کی بدانجامی سے سبق حاصل کریں اور خوش نصیب ہے وہ جو خود ہی دوسروں کا انجام دیکھ دیکھ اپنی اصلاح حال کرے۔

(۲۵) اچھے شاعروں کے کلام میں حکمت کے موتی دبے ہوئے ملتے ہیں، جیسا کہ ہر شخص کا تجربہ ہے اور اسی طرح کتنے خطیبوں کی خطابت دلوں کو زیروزبر کر دیتی ہے۔

(۲۶) سلطنت کے قیام واستحکام میں بڑا دخل فرمانروا کے حلم وتحمل، اور درگزر کو ہوتا ہے۔ بادشاہ اگر بات بات پر غصہ کرنے لگے تو رعایا تباہ اور ملک ویران یا باغی ہو کر رہے۔

(۲۷) یہ کتنا اچھا نسخہ ساری امت کو تعلیم کر دیا گیا ہے۔ ابرار وصالحین کے ساتھ اگر رشتہ محبت قائم کر لو، تو ان کی معیت ورفاقت کی دولت خود ہی تمہیں نصیب ہو جائے گی اور ساری مخلوق کی محبت سے اشرف وافضل محبت تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔

(۲۸) اپنی حقیقت پہچان لینا انسان کے لئے بہت بڑی نعمت ہے۔ جو انانیت کے مغالطوں سے نکل آیا اور جس نے اپنی کمزوریاں پہچان لیں، وہ ان شاء اللہ فریب نفس سے محفوظ رہے گا۔ اور عرفان نفس سے عرفان حق کی راہ کھل جائے گی۔ بزرگوں نے اسی لئے تو کہا ہے کہ من عرف نفسه فقد عرف ربه. خودشناسی ذریعہ ہے خداشناسی کا۔

(۲۹) اولاد اگر ناجائز ہے تو اس کی ماں ہی اس کی مالک ہوگی، حرام کار باپ کو اس پر کچھ بھی حق حاصل نہ ہوگا۔

(۳۰) کنایہ ہے اس حقیقت سے کہ دینے والا افضل ہوتا ہے لینے والے (سائل) سے۔ امراء، واغنیاء فرط اخلاص سے جو ہدیئے اہل اللہ کی خدمت میں پیش کرتے رہتے ہیں، وہ یہاں مراد نہیں۔

(۳۱) کتنی کام کی اور کیسی ہدایت آموز حقیقت کا بیان ہے۔ اصل شکر یہ تو ہر حال میں منعم حقیقی ہی کا حصہ ہوتا ہے۔ لیکن بندہ پر لازم ہے کہ احسان منداور شکر گزار اپنے محسن قریب کا بھی ہو۔ یعنی اس بندہ کا بھی، جو واسطہ اور ظاہری ذریعہ اس انعام ونعمت کا ہوا ہے۔ آپسی خوشگوار تعلقات کا کتنا اچھا نسخہ اس ہدایت سے ہاتھ آجاتا ہے۔

(۳۲) جذبہ محبت حقیقت شناسی کے لئے ایک حجاب بن جاتا ہے۔ جہاں کسی چیز کی الفت ومحبت دل پر غالب آگئی، بس پھر اس کا کوئی عیب محسوس نہیں ہوتا۔

(۳۳) محسن کی طرف دل کا کھنچنا اور موذی کی طرف سے دل کا ہٹ جانا انسان کی سرشت و جبلت میں داخل ہے، نفسیاتی حقیقتیں تو حدیث نبوی میں بڑی کثرت سے بیان ہوئی ہیں، انہیں کی ایک مثال یہ حقیقت ہے۔

(۳۴) بیان تائب کے مرتبہ کا ہے، جب کسی گنہگار نے اس گناہ کو چھوڑ دیا، اور دل سے اس پر نادم وپشیمان ہوا، بلکہ اگر اس کا تدارک عملاً ممکن ہوا، تو وہ بھی کر دیا تو اب اس پر الزام کسی قسم کا نہ رہا، اور نہ اللہ کے ہاں اس کے مرتبہ مقبولیت میں فرق آیا۔

(۳۵) حاضر اور غائب میں بڑا فرق ہے، حاضر واقعہ کا شہود براہ راست کرتا ہے۔ غائب کو اس کا علم بالواسطہ ہوسکتا ہے۔

(۳۶) مسلمان کا اکرام تو بہرصورت لازم ہے ہی، یہاں اس کا ذکر نہیں، بلکہ غیروں کا ذکر ہے، کہ اگر ان کے بھی کسی قوم یا قبیلہ کا سردار تمہارے پاس آجائے تو اس کی سرداری بجائے خود اس کا حق رکھتی ہے کہ تم بھی اس کا اکرام کرو۔ عام بشری جذبات کی بھی کتنی رعایتیں ہمارے نبی امیؐ نے رکھ لی ہیں۔

(۳۷) جس قوم میں جھوٹی قسم کا رواج چل پڑتا ہے۔ معاملات میں جھوٹی گواہیاں چلنے لگتی ہیں، اور عدالتوں میں بڑے بڑے فیصلے جھوٹے گواہوں کے بیان پر صادر ہونے لگتے ہیں، اس قوم کا کردار شریفوں کا نہیں رذیلوں کا بن جاتا ہے، اس کی اخلاقی بنیادیں اندر ہی اندر کھوکھلی ہوجاتی ہیں اور آخر کار وہ قوم تباہ ہی ہوکر رہتی ہے۔

(۳۸) جس مال یا جائیداد کا انسان مالک ہے اس کی حفاظت کا اسے ویسا ہی حق ہے، جیسے اپنے وطن وملک کی حفاظت کا، اور شریعت الٰہی نے اس جذبہ فطری کی اس درجہ رعایت رکھی ہے، کہ ایسے مظلوم کو بھی، جو حفاظت

مال میں مارا جائے، ایک درجہ شہادت کا دے دیا ہے۔

(۳۹) یہاں کتنی گہری حقیقت دو لفظوں میں بیان فرمادی ہے، انسان جو کچھ بھی دوسروں کا عمل دیکھتا ہے وہ تو صرف صورت عمل ہوتی ہے، عمل کا صرف ظاہری قلب ہوتا ہے، باقی روح عمل تو دوسروں کی نظر سے ہمیشہ مخفی ہی رہتی ہے، اصل شے تو محرک عمل ہے۔ اور وہ صرف عالم الغیب کے علم میں رہتی ہے۔ اسی کا نام نیت ہے۔

صحیح بخاری کی پہلی حدیث اور اسی کلیہ میں بنیادی حدیث **انما الاعمال بالنیات** ہے۔

(۴۰) کتنے کام کی ہدایت، سرداروں، پیشواؤں، فرماں رواؤں، بادشاہوں کے لئے ہے، حاکم و سردار ہونے کے تو معنی ہی یہ ہیں کہ وہ شخص اپنا نصب العین اپنی قوم کی خدمت بنائے ہوئے ہے، اپنی سرداری اگر قائم رکھنا ہے تو بس قوم کی خدمت میں لگے رہئے۔

(۴۱) یعنی عمل میں اعتدال و میانہ روی، نہ کمی نہ زیادتی نہ افراط نہ تفریط، نہ زیادہ گرمی، نہ زیادہ نرمی۔

(۴۲) ہفتہ میں جمعہ کا دن تو مبارک ہے، رسول کریمؐ نے اسی کے متصل دن جمعرات کے بھی بابرکت ہونے کی دعا اپنی امت کے حق میں فرمادی ہے۔

(۴۳) قناعت و بے طمعی، مسکینی کی تو حدیث میں خود بڑی فضیلت آئی ہے، اور آنحضورؐ نے مسکین ہی کی زندگی اختیار رکھی، لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ آپؐ نے امت کے ہر طبقہ کے لئے ہر حال میں فقر ہی کو پسند کیا ہے، بلکہ ساتھ ہی فطرت بشری کے دوسرے پہلوؤں پر نظر رکھ کر یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ فقر بعض دفعہ بندہ کے لئے ناقابل برداشت ہو کر اسے حد کفر تک پہنچا دیتا ہے، نظام اسلام کے اندر گنجائش مالداری و تمول کی بھی ہے۔

اکابر امت میں، رسول کریمؐ کی آنکھوں کے سامنے، جس طرح ابوذرؓ و ابوہریرہؓ ہوئے ہیں، عثمان غنیؓ اور عبدالرحمٰن بن عوف اور طلحہؓ و زبیرؓ بھی ہوئے ہیں۔

(۴۴) آپؐ کے معاصرین کے زمانے میں سفر کا ایک مصیبت ہونا تو ظاہر ہی تھا۔ اب جب اتنی سہولتیں بہم پہنچ گئی ہیں، سفر پھر بھی حضر کی آسائشوں اور راحتوں کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ اپنے معمولات میں کچھ نہ کچھ فرق آجانا تو بہرحال ناگزیر ہے۔

(۴۵) کسی کا راز افشا نہ ہونے دینا، مجلس کی بات مجلس ہی تک محدود رکھنا، تو پہلا قدم مجلسی، اجتماعی، زندگی کا ہے۔

(۴۶) سفر کے سلسلے میں تو یہ ٹکڑا ایک آیت قرآنی کا ہے۔ رسول اللہؐ نے اسے عام کر کے بتادیا، کہ پرہیزگاری تو ایسی نعمت ہے جو سفر زندگی کے ہر ہر شعبہ میں بہترین زاد راہ کا کام دے سکتی ہے۔

شاہ ولی اللہؒ کے سیاسی مکتوبات

ترجمہ

پروفیسر خلیق احمد نظامی

ترتیب

مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱	مکتوب اوّل	۲۷
۲	مکتوب دوم	۳۰
۳	مکتوب سوم	۴۱
۴	مکتوب چہارم	۴۲
۵	مکتوب پنجم	۴۳
۶	مکتوب ششم	۴۴
۷	مکتوب ہفتم	۴۵
۸	مکتوب ہشتم	۴۶
۹	مکتوب نہم	۴۷
۱۰	مکتوب دہم	۵۰
۱۱	مکتوب یازدہم	۵۱
۱۲	مکتوب دوازدہم	۵۳
۱۳	مکتوب سیزدہم	۵۴
۱۴	مکتوب چہاردہم	۵۵
۱۵	مکتوب پانزدہم	۵۶
۱۶	مکتوب شانزدہم	۵۷
۱۷	مکتوب ہفت دہم	۵۸
۱۸	مکتوب ہشت دہم	۵۹
۱۹	مکتوب نوازدہم	۶۰

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۲۰	مکتوب بستم	۶۱
۲۱	مکتوب بست و یکم	۶۲
۲۲	مکتوب بست و دوم	۶۴
۲۳	مکتوب بست و سوم	۶۵
۲۴	مکتوب بست و چہارم	۶۷
۲۵	مکتوب بست و پنجم	۶۸
۲۶	مکتوب بست و ششم	۶۹
۲۷	مکتوب بست و ہفتم	۷۱
۲۸	مکتوب بست و ہشتم	۷۲
۲۹	مکتوب بست و نہم	۷۴
۳۰	مکتوب سی	۷۵
۳۱	مکتوب سی و یکم	۷۷
۳۲	مکتوب سی و دوم	۷۸
۳۳	مکتوب سی و سوم	۷۹
۳۴	مکتوب سی و چہارم	۸۱
۳۵	مکتوب سی و پنجم	۸۳
۳۶	مکتوب سی و ششم	۸۴
۳۷	مکتوب سی و ہفتم	۸۶
۳۸	مکتوب سی و ہشتم	۸۷
۳۹	مکتوب سی و نہم	۸۹
۴۰	مکتوب چہل	۹۰
۴۱	مکتوب چہل و یکم	۹۱
۴۲	مکتوب چہل و دوم	۹۲

مکتوب اوّل

بجانب

بادشاہ ووزیر واُمراء

بعد حمد وصلوٰۃ: یہ چند کلمات ہیں جن کی تحریر کا باعث بادشاہ اسلام، امراء اور جمہور مسلمین کی خیر خواہی ہوئی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے، ''خیر خواہی دین (۱) ہے''، اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے امید ہے کہ اگر ان کلمات کے بموجب عمل کریں گے تو امورِ سلطنت کی تقویت، حکومت کی بقاء اور عزت کی بلندی ظہور پذیر ہوگی۔

در پسِ آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند
آنچہ اُستاذِ ازل گفت بگوی گویم

(یعنی مجھ کو آئینے کے پیچھے طوطی کی مانند رکھا ہے، جو کچھ ''استاذِ ازل'' نے کہا ہے وہی کہتا ہوں)

کلمۂ اوّل: اصل اصول جس پر حکومت کی بہتری اور ملت بیضا کی رونق موقوف ہے یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ اور اس کے رسول حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی کے لئے یہ بات لازم کرلیں کہ جب فتحیابی نصیب ہو اور مخالف شکست یافتہ ہو تو سب سے پہلی چیز جس کے اجراء کا مضبوط ارادہ کریں، جاٹوں (۲) کے علاقے اور ان کے قلعوں کے فتح کرنے کی جدوجہد ہو، اس کام میں دینی ودنیاوی دونوں فائدے ہیں، منجملہ ان ضروری کاموں کے ''بدمعاشوں کی'' سرزنش کرنا بھی ہے، تاکہ کوئی زمیندار اس قسم کی شوخی اور بے باکی کا خیال بھی نہ لائے۔

کلمۂ دوم: یہ کہ خالصہ (۳) کو کشادہ تر کرنا چاہئے، خصوصاً وہ علاقہ جو دہلی کے اردگرد ہے، آگرہ، حصار اور دریائے گنگ اور حدودِ سہرند تک سب کا سب علاقہ یا اس میں کا اکثر خالصہ ہو، کیونکہ امور سلطنت میں ضعف کا سبب خالصہ کی کمی اور خزانہ کی قلت ہوا کرتی ہے۔

کلمۂ سوم: یہ کہ جاگیر (۴) عطا کرنا، بڑے بڑے امراء کے لئے مخصوص ہو چھوٹے چھوٹے منصب داروں کو نقد دینا چاہئے (جاگیر نہ دی جائے) جیسا کہ عہد شاہجہاں میں قاعدہ تھا، اس لئے کہ چھوٹے منصب دار (۵)، جاگیروں پر قابو نہیں پاتے، اس لئے ٹھیکہ دینے کی احتیاج ہوتی ہے، اسی وجہ سے وہ اکثر اوقات مفلس رہتے ہیں اور اپنے آپ کو کارہائے پادشاہی میں پوری طرح مشغول نہیں کر سکتے۔

کلمۂ چہارم: یہ کہ جو لوگ اس فتنہ میں غنیم کے ساتھی ہوئے ہیں، ضروری ہے کہ ان کو جاگیر و منصب اور خدمت سے بے دخل کر دیں تا کہ ان کے لئے یہ چیز سزا کے قائم مقام ہو جائے اور دوسرے لوگ اس قسم کے مواقع پر "حق نمک (۶)" کی ادائیگی کے راستے سے نہ بھٹکیں۔

کلمۂ پنجم: یہ کہ افواج بادشاہی کی ترتیب عمدہ طریقے پر کرنی چاہئے، اور یہ ترتیب (۷) تین طریقوں سے ہو سکتی ہے۔

(۱) وہ داروغہ مقرر کئے جائیں جو مندرجہ ذیل تین صفتوں سے متصف ہوں۔

الف: نجیب ہوں۔

ب: بہادر ہوں اور اپنے ساتھیوں پر شفیق ہوں۔

ج: تہہ دل سے بادشاہ کے خیر خواہ ہوں۔

(۲) جن لوگوں سے اس فتنہ میں بے غیرتی اور نمک حرامی سرزد ہوئی ہے ان کو معزول کر کے دوسروں کو داخل رسالہ کیا جائے۔

(۳) یہ کہ ملازموں کی تنخواہیں (۸) بغیر تاخیر کے ان کو ملنی چاہئیں، اس لئے کہ تاخیر کی صورت میں وہ لوگ سودی قرض لینے پر مجبور ہوتے ہیں اور ان کا اکثر مال ضائع ہو جاتا ہے۔

کلمۂ ششم: "خالصہ (۹)" سے ٹھیکہ دہندگی کی رسم موقوف کر دی جائے، دین دار، واقف کار امین ہر جگہ مقرر کر دیئے جائیں، ٹھیکہ دینے میں ملک خراب ہوتا ہے اور رعیت پامال و بدحال

ہو جاتی ہے۔

کلمۂ ہفتم: یہ کہ قاضی ومحتسب ایسے لوگوں کو بنایا جائے جن پر رشوت ستانی کی تہمت نہ لگائے گئے ہوں اور مذہب اہل سنت و جماعت رکھتے ہوں۔

کلمۂ ہشتم: ....

کلمۂ نہم: ائمۂ مساجد کو اچھے طریقے پر تنخواہ دی جائے، نماز با جماعت کی حاضری کی تاکید اور ماہِ رمضان کی بے حرمتی کی ممانعت پورے طور پر کی جائے۔

کلمۂ دہم: یہ کہ بادشاہ اسلام اور امرائے عظام ناجائز عیش وعشرت میں مشغول نہ ہوں، گزشتہ گناہوں سے سچے دل سے توبہ کریں، اور آئندہ گناہوں سے بچتے رہیں، بالفعل اگر ان دس کلمات پر عمل کریں گے، مجھے امید ہے کہ بقائے سلطنت، تائید غیبی اور نصرت الٰہی میسر ہوگی، وما توفيقي الا بالله، عليه توكلت واليه أنيب۔ یعنی مجھے توفیق اللہ ہی سے حاصل ہوگی اور اُسی کی ذات پر میرا توکل ہے، اور اسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں۔

مکتوب دوم

بجانب

بعض بادشاہوں کے نام (۱)

بعد حمد وصلوٰۃ کے۔ یہ چند کلمات ہیں جن کے لکھے جانے کا باعث اسلامی حمیت ہے، اللہ تعالیٰ ان کلمات کو گوشِ مبارک تک پہنچادے۔

بادشاہان اسلام کا وجود اللہ تعالیٰ کی ایک زبردست نعمت ہے، جاننا چاہئے کہ ملک ہندوستان ایک وسیع ملک ہے، قدیم اسلامی بادشاہوں نے بڑی مدت میں بڑی جدوجہد کے بعد کئی دفعہ میں جاکر اس ولایت کو فتح کیا ہے، علاوہ دہلی کے جو صاحب اقتدار پادشاہوں کا مستقر رہی ہے، ہر علاقے میں علیحدہ علیحدہ فرمانروا تھے، مثلاً گجرات، احمد آباد کا علاقہ ایک علیحدہ حکمراں سے تعلق رکھتا تھا، ٹھٹہ کا دوسرا بادشاہ تھا، بنگالہ ایک اور حاکم کے زیر حکومت تھا، اودھ جدا ایک شخص کے زیر اقتدار تھا، جس کو سلطان الشرق یعنی پورب کا بادشاہ کہتے تھے، ملک دکھن پانچ حسب ذیل سلطنتوں کا مجموعہ تھا:

(۱) برہان پور۔

(۲) برار۔

(۳) اورنگ آباد۔

(۴) حیدر آباد۔

(۵) بیجاپور۔

ان پانچوں سلطنتوں میں سے ہر سلطنت کا ایک جداگانہ مستقل بادشاہ تھا۔

مالوہ کا بھی حکمراں علیحدہ تھا اور ان تمام مذکورہ علاقہ جات میں سے ہر ایک علاقے کا بادشاہ مستقل طور پر صاحب فوج اور صاحب خزانہ ہوتا تھا۔

ہر ایک بادشاہ نے اپنی اپنی مملکت میں مسجدیں تعمیر کرائیں، مدرسے قائم کیے، عرب وعجم کے مسلمان اپنے اپنے وطنوں سے منتقل ہو کر ان علاقوں میں آگئے اور یہاں اسلام کی ترویج واشاعت کا باعث بنے، اس وقت تک ان لوگوں کی اولاد اسلام کے طور وطریقہ پر قائم ہے، ایک اور ملک بھی ہے جو کبھی کسی بادشاہ اسلام کے قبضہ میں نہیں آیا اور وہ اپنے خالص غیر مسلمانہ طریقہ پر باقی رہا، اتنا ضرور ہوا کہ بادشاہ ان راجاؤں سے جو اُن کے حدود میں تھے خراج لیا کرتے تھے، یہ ملک جس کا تذکرہ ہو رہا ہے راجپوتانہ کا ملک ہے، اس ملک کا طول حدود ٹھٹھہ سے لے کر حدودِ بنگالہ وبہار تک چالیس منزل ہے اور عرض دہلی وآگرہ سے لے کر گجرات واجین کی حد تک بیس منزل ہے، یہی وہ باوسعت ملک ہے جو کبھی ملوک اسلامیہ کی نشست گاہ نہیں بنا۔ قصہ مختصر: بادشاہان مغلیہ نے رفتہ رفتہ اتنا کرلیا کہ اپنی طرف سے ان کو ریاست پر متعین کرتے تھے اور انھوں نے راجپوتوں سے معاہدہ کرلیا اور اس گروہ کو اپنا ماتحت قرار دے کر ان کی مخالفت سے مامون ومحفوظ ہوگئے اور جنگ سے دست کشی اختیار کرلی، واقفان فن تاریخ تفصیلی طور پر ان واقعات کو بیان کریں گے (۲)۔

غیر مسلموں میں ایک قوم مرہٹہ نامی ہے کہ......ان کا ایک سردار ہے، اس قوم نے کچھ عرصہ سے اطراف دکن میں سر اٹھایا ہے اور تمام ملک ہندوستان پر اثر انداز ہے، شاہان مغلیہ میں سے بعد کے بادشاہوں نے عدم دوراندیشی، غفلت اور اختلاف فکر کی بنا پر ملک گجرات (۳) مرہٹوں کو دے دیا پھر اسی سست اندیشی اور غفلت کی وجہ سے ملک مالوہ بھی ان کے سپرد (۴) کردیا اور ان کو وہاں کا صوبہ دار بنادیا، رفتہ رفتہ قوم مرہٹہ قوی تر ہوگئی اور اکثر بلاد اسلام ان کے قبضہ (۵) میں آگئے، مرہٹوں نے مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں سے باج لینا شروع کردیا اور اس کا نام چوتھ (۶) (یعنی آمدنی کا چوتھا حصہ) رکھا۔

دہلی اور نواح دہلی میں مرہٹوں کا تسلط اس وجہ سے نہ ہوسکا کہ دہلی کے رؤسا، پادشاہان

قدیم کی اور یہاں کے وزراء اور اُمراء، امرائے قدیم کی اولاد ہیں، ناچار مرہٹوں نے ان لوگوں سے یک گونہ مروت کا معاملہ رکھتے ہوئے عہد و پیمان کرلیا اور رواداری کا سلسلہ جاری کر کے طرح طرح کی چاپلوسی سے دہلی والوں کو اپنی طرف سے امن وامان دے کر چھوڑ دیا، دکن پر بھی مرہٹوں کا قبضہ اس بنا پر نہ ہو سکا کہ نظام الملک مرحوم کی اولاد نے بڑی بڑی تدبیریں کیں کبھی مرہٹوں کے درمیان میں پھوٹ ڈلوادی، کبھی انگریزوں کو اپنا رفیق بنالیا اور برہان پور، اورنگ آباد، بیجاپور جیسے بڑے بڑے شہروں پر اولاد نظام الملک قابض رہی، البتہ اطراف ونواحی کو مرہٹوں کے لئے چھوڑ دیا، المختصر سوائے دہلی ودکن کے خالص طور پر مرہٹوں کا تسلط ہے، قوم مرہٹہ کا شکست دینا آسان کام ہے، بشرطیکہ غازیان اسلام کمر ہمت باندھ لیں، حقیقت یہ ہے کہ قوم مرہٹہ خود قلیل ہیں، لیکن ایک گروہ کثیر ان کے ساتھ ملا ہوا ہے، اس گروہ میں سے ایک صف کو بھی اگر درہم برہم کر دیا جائے تو یہ قوم منتشر ہو جائے گی اور اصل قوم اسی شکست سے ضعیف ہو جائے گی، چونکہ یہ قوم قوی نہیں ہے، اس لئے اس کا تمام تر سلیقہ ایسی کثیر فوج جمع کرنا ہے جو چیونٹیوں اور ٹڈیوں سے بھی زیادہ ہو، دلاوری اور سامان حرب کی بہتات ان کے یہاں نہیں ہے۔

الغرض قوم مرہٹہ کا فتنہ ہندوستان کے اندر بہت بڑا فتنہ (۷) ہے حق تعالیٰ بھلا کرے اس شخص کا جو اس فتنے کو دبائے۔

غیر مسلموں کی ایک قوم جاٹ ہے جس کی بود و باش دہلی وآگرہ کے درمیان ہے (۸)، یہ دونوں شہر بادشاہوں کے لئے دو حویلیوں کی مانند رہے ہیں، مغل بادشاہ کبھی آگرہ میں رہتے تھے تاکہ ان کا دبدبہ اور رعب راجپوتانہ تک پڑے اور کبھی دہلی میں فروکش ہوتے تھے تاکہ ان کی شوکت وہیبت سہرند اور نواحی سہرند تک اثر ڈالے۔

دہلی وآگرہ کے درمیان کے مواضعات میں قوم جاٹ کاشتکاری کرتے تھے، زمانہ شاہجہان میں اس قوم کو حکم تھا کہ گھوڑوں پر سوار نہ ہوں، بندوق اپنے پاس نہ رکھیں اور اپنے لئے گڑھی نہ بنائیں، بعد کے بادشاہوں نے رفتہ رفتہ ان کے حالات سے غفلت اختیار کرلی اور اس قوم نے فرصت کا غنیمت جان کر بہت سے قلعے تعمیر کر لئے اور اپنے پاس بندوق رکھ کر بٹ ماری کا طریقہ شروع کر دیا، اورنگ زیب اس وقت دکن میں قلعۂ بیجاپور وحیدرآباد کے فتح کرنے میں مشغول

تھا(۹)، دکن ہی سے ایک فوج جاٹوں کی تادیب کے لئے اس نے روانہ کی اور اپنے پوتے کو فوج کا سردار مقرر کیا(۱۰)، رئیسان راجپوتانہ نے اس شہزادے سے مخالفت کر لی(۱۱)، لشکر میں اختلاف واقع ہوا، جاٹوں کی تھوڑی سی عاجزی پر اکتفا کر کے فوج بادشاہی واپس ہوگئی۔

محمد فرخ سیر کے زمانہ میں اس جماعت کی شورش پھر جوش میں آئی قطب الملک وزیر نے زبردست فوجیں ان کی طرف بھیجیں، چورامن جو اس قوم کا سردار تھا بعد جنگ، صلح پر راضی ہوگیا، اس کو بادشاہ کے سامنے لائے اور تقصیرات کی معافی دلوائی، یہ کام بھی خلاف مصلحت عمل میں آیا۔

پھر عہد محمد شاہ میں اس قوم کی سرکشی (۱۲) حد سے تجاوز کر گئی، اور چورامن کا چچازاد بھائی سورج مل اس جماعت کا سردار ہوگیا اور فساد کا راستہ اختیار کیا، چنانچہ شہر بیانہ جو کہ اسلام کا قدیم شہر تھا اور جہاں پر علماء و مشائخ سات سو سال سے اقامت پذیر تھے اس شہر پر قہراً و جبراً قبضہ کر کے مسلمانوں کو ذلت وخواری کے ساتھ وہاں سے نکال دیا، اس کے بعد سے سرکشی برابر بڑھتی رہی، بادشاہوں اور امیروں کے اختلاف وغفلت کی بناء پر کوئی بھی اس جانب متوجہ نہ ہوا، اگر بالفرض ایک امیر اس کی تنبیہ کا قصد کرے تو سورج مل کے کارکن دوسرے امراء کی جانب رجوع کرتے ہیں اور اس طرح بادشاہ کے مشورے کو پلٹ دیتے ہیں، پسر محمد شاہ (۱۳) کے عہد میں صفدر جنگ (۱۴) ایرانی نے خروج کیا اور سورج مل سے سازش کر کے پرانی دہلی پر حملہ کر دیا اور تمام باشندگان شہر کہنہ کو لوٹ (۱۵) لیا۔

پسر محمد شاہ نئے شہر میں دروازے بند کر کے چھپ کر بیٹھ گئے اور مرہٹوں نے توپوں کے ذریعہ جنگ کی، محض خدا کے فضل سے صفدر جنگ اور سورج مل دو تین ماہ کے بعد ناکامیاب واپس ہوئے اور صلح وموافقت کی داغ بیل (۱۶) ڈالی، چونکہ بادشاہ کے آدمی جنگ سے تھک چکے تھے، اس لئے انھوں نے صلح کو غنیمت شمار کیا، اس کے بعد سے سورج مل کی شوکت ترقی پاگئی، دہلی سے دوکوس کے فاصلے سے لے کر آگرہ کے آخر تک طول میں اور میوات کے حدود سے فیروز آباد و شکوہ آباد تک عرض میں سورج مل قابض ہوگیا، کسی کی طاقت نہیں کہ وہاں اذان ونماز جاری کر سکے۔

ایک سال ہوا کہ قلعہ الور جو کہ تمام میوات کی خبر گیری کے لئے ایک جائے بلند تھی، سورج مل اس کو بھی اپنے قبضے میں لے لیا ارکان سلطنت میں سے کسی کی مجال نہ ہوئی کہ وہ اس کام سے

روک دیتا۔

ہندوستان کے محصولات سات آٹھ کروڑ سے کم نہیں ہیں بشرطیکہ غلبہ وشوکت موجود ہو، ورنہ ایک کوڑی بھی ملنی مشکل ہے، جیسا کہ اس وقت دیکھا جارہا ہے، جس علاقہ پر جاٹ قابض ہیں وہ ایک کروڑ روپیہ محصول کی جگہ ہے، راجپوتانہ کا علاقہ اپنی وسعت کے باعث دو کروڑ روپے سے کم آمدنی کا نہیں ہے، بشرطیکہ ہر راجہ پر خراج مقرر کیا جائے، عہد محمد شاہ میں بنگالہ سے ہر سال ایک کروڑ کی آمدنی تھی اور وہاں کا صوبہ دار ہمیشہ بلاتوقف بھیجتا رہتا تھا، اس رقم کی ادائیگی کے باوجود صوبہ دار بنگالہ ہندوستان کے امراء میں انتہائی مالدار امیر تھا، چنانچہ اس وقت بھی بنگالہ میں بے اطمینانی ہے اور وہاں ایک بیوقوف ناواقف کار نوجوان یعنی ناظم قدیم کا پوتا (۱۷) مسلط ہے، پھر وہی نوجوان خزائن بے شمار کا مالک ہے، سعادت خاں ایرانی اور اس کے بعد اس کا داماد صفدر جنگ صوبہ اودھ پر قابض تھے، دو کروڑ اس صوبہ سے وصول کرتے تھے، ایک کروڑ خرچ کرتے تھے اور ایک کروڑ جمع کرتے تھے، اسی مالداری نے صفدر جنگ کے اندر بادشاہ سے مقابلہ کرنے کا حوصلہ پیدا کیا، جاٹ کی شوکت کو درہم برہم کرنا بھی تدبیر کے نزدیک آسان کام ہے، انھوں نے جو علاقے اپنے قبضے میں کر لئے ہیں وہ ان کے نہیں ہیں بلکہ غصب کئے ہوئے ہیں، ان مواضع کے مالک ابھی تک زندہ موجود ہیں، اگر کوئی صاحب شوکت وعدالت بادشاہ مہربانی کا ہاتھ ان مالکوں کے سر پر رکھے تو وہ لوگ سورج مل کے مقابلے کے لئے اٹھ کھڑے ہوں گے، یہ جو کچھ بیان کیا گیا ہندوستان کے غیر مسلموں کا حال تھا، رہا مسلمانوں کا حال وہ یہ ہے کہ نوکران بادشاہ جو کہ ایک لاکھ سے زائد تھے، ان میں پیادہ سوار بھی تھے، اہل نقدی وجاگیر دار بھی تھے، بادشاہوں کی غفلت سے نوبت یہاں تک پہنچی کہ جاگیر دار اپنی جاگیروں پر عمل ودخل نہیں پاتے، کوئی غور نہیں کرتا کہ اس کا باعث بے عملی ہے، جب خزانہ بادشاہ نہیں رہا، نقدی بھی موقوف ہوگئی، آخر کار سب ملازمین تتر بتر ہوگئے اور کاسہ (۱۸) گدائی اپنے ہاتھ میں لے لیا، سلطنت کا بجز نام کے اور کچھ باقی نہ رہا (۱۹)، جب ملازمین بادشاہ کا یہ برا حال ہے تو تمام دیگر اشخاص کے حال کو جو کہ وظیفہ خوار یا سوداگر یا اہل صنعت ہیں، انھیں پر قیاس کر لینا چاہئے کہ کس حد تک خراب ہوگیا ہوگا، طرح طرح کے ظلم اور بیروزگاری میں یہ لوگ گرفتار ہیں، علاوہ اس تنگی اور مفلسی کے جب سورج مل کی قوم نے

اور صفدر جنگ نے مل کر دہلی کے پرانے شہر پر دھاوا بولا (۲۰)، یہ غریب سب کے سب بے خانماں، پریشان اور بے مایہ ہوگئے، پھر متواتر آسمان سے قحط نازل ہوا، غرضیکہ جماعت مسلمین قابل رحم ہے، اس وقت جو عمل ودخل سرکار پادشاہی میں باقی ہے وہ ہنود کے ہاتھ میں ہے، کیونکہ متصدی اور کارکن سوائے ان کے اور کوئی نہیں ہے، ہمہ قسم کی دولت وثروت ان کے گھروں میں جمع ہے، افلاس ومصیبت کا بادل مسلمانوں پر چھا رہا ہے، بات طویل ہوگئی اور اختصار کے حدود سے باہر نکل گئی، حاصل کلام یہ ہے کہ ملک ہندوستان میں غیر مسلموں کے غلبہ کی نوعیت یہ ہے کہ جو معرض بیان میں آئی، اور مسلمانوں کا ضعف اس حد تک پہنچ گیا ہے جو لکھا گیا، اس زمانہ میں ایسا بادشاہ جو صاحب اقتدار وشوکت ہو اور لشکر مخالفین کو شکست دے سکتا ہو، دور اندیش اور جنگ آزما ہو، سوائے آنجناب کے کوئی اور موجود نہیں ہے، یقینی طور پر جناب عالی پر فرض عین ہے، ہندوستان کا قصد کرنا اور مرہٹوں کا تسلط توڑنا اور ضعفائے مسلمین کو غیر مسلموں کے پنجے سے آزاد کرنا، اگر غلبہ کفر معاذ اللہ، اسی انداز پر رہا تو مسلمان اسلام کو فراموش کر دیں گے اور تھوڑا زمانہ نہ گزریگا کہ یہ مسلم قوم ایسی قوم بن جائے گی کہ اسلام اور غیر اسلام میں تمیز نہ ہو سکے گی، یہ بھی ایک بلائے عظیم ہے، اس بلائے عظیم کے دفع کرنے کی قدرت بفضل خداوندی جناب کے علاوہ کسی کو میسر نہیں ہے

ہم بندگان الٰہی، حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو شفیع گردانتے ہیں اور خدائے عزوجل کے نام پر التماس کرتے ہیں کہ ہمت مبارک کو اس جانب متوجہ فرما کر مخالفین سے مقابلہ کریں، تاکہ خدائے تعالیٰ کے یہاں بڑا ثواب جناب کے نامۂ اعمال میں لکھا جائے، اور مجاہدین فی سبیل اللہ کی فہرست میں نام درج ہو جائے، دنیا میں بے حساب غنیمتیں ملیں اور مسلمان دست کفار سے خلاصی پا جائیں، خدا سے پناہ مانگتا ہوں، اس بات سے کہ نادر شاہ کی طرح عمل ہو، کہ وہ مسلمانوں کو زیروزبر کر گیا اور مرہٹہ وجٹ کو سالم وغانم چھوڑ کر چلتا بنا، نادر شاہ کے بعد سے مخالفین قوت پکڑ گئے اور لشکر اسلام کا شیرازہ بکھر گیا، اور سلطنت دہلی بچوں کا کھیل (۲۱) بن گئی، پناہ بخدا اگر قوم کفار اسی حال پر رہے اور مسلمان ضعیف ہو جائیں تو اسلام کا نام بھی کہیں باقی نہ رہے گا۔

خدائے تعالیٰ مجاہدین کی صفت میں فرماتا ہے: مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗ الآیۃ۔ یعنی وہ غیروں پر سخت دل ہیں اور اپنوں پر مہربان ہیں (۲۲)۔

اس جماعت کے وصف میں جو مرتدوں سے مقابلہ کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا (۲۳)!

يَـاَيُّهَـا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِى اللّٰهُ الخ (یعنی خدائے تعالیٰ دوست رکھتا ہے ان کو اور وہ دوست رکھتے ہیں خدائے تعالیٰ کو، وہ مسلمانوں کے سامنے تواضع سے پیش آتے ہیں اور غیروں پر سخت ہیں

اس سے معلوم ہوا کہ فتح اسلام اس جماعت کو نصیب ہوتی ہے، جس کی یہ شان ہو کہ اگر کسی جگہ مسلمان ہوں ان کو وہ اپنے بیٹوں اور سگے بھائیوں کی طرح رکھے اور مخالف کے مقابلہ میں وہ شیر نر کی مانند ہو۔

پس واجب ہے کہ ان مجاہدات میں تقویت اسلام کی نیت کرلی جائے، جب افواج قاہرہ ایسے مقام پر پہنچیں جہاں پر مسلمان اور غیر مسلمان دونوں رہتے ہوں، چاہئے کہ منتظمین خاص طور پر ایسے مقام پر متعین ہوں اور ان کو تاکید کی جائے کہ جو ضعیف مسلمان قریوں میں ساکن ہیں ان کو قصبوں اور شہروں میں لے آئیں پھر کچھ منتظمین قصبوں اور شہروں پر مقرر کئے جائیں جو اس بات کی کڑی نگرانی کریں کہ کسی مسلمان کا مال نہ لوٹا جائے اور کسی مسلمان کی عزت میں فرق نہ آنے پائے۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ ''اللہ کے نزدیک تمام دنیا کا زوال قتل مسلم کے مقابلے میں ہیچ ہے (۲۴)''، حضرت سرور انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم بقصد عمرہ جب حدیبیہ تشریف لے گئے اور کفار قریش مکہ کے داخلہ سے مانع آئے، آخر الامر کفار مکہ سے صلح ہوئی، اگرچہ بعض بڑے صحابہ میں سے ایسے تھے جن کی حمیت دینی جوش میں آئی اور اس صلح پر راضی نہیں ہوتے تھے، لیکن حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے قول پر التفات نہیں فرمایا اور صلح کرلی، جب اس سفر سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم واپس ہوئے تو سورۂ اِنَّا فتحنا نازل ہوئی، اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں صلح کی حکمت اور تاخیر فتح کی وجہ ظاہر فرمائی، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَلَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ وَنِسَآءٌ مُّؤْمِنَاتٌ لَّمْ تَعْلَمُوْهُمْ تا عَذَاباً اَلِيْماً (۲۵)

(اگر نہ ہوتے (مکہ میں) کئی مرد ایمان والے اور کئی عورتیں ایمان والیاں جن کو تم نہیں جانتے اور یہ خطرہ نہ ہوتا کہ تم ان کو پیس ڈالو گے، پس اس کے نتیجہ میں تم کو گناہ

ہوتا بغیر دانست کے (تو تصدیق خواب یا بالفعل ہو جاتی اور جلد فتح میسر ہوتی)
(خدا نے فتح کو موخر کیا) تا کہ داخل کر دے جس کو چاہے اپنی رحمت کے سایہ میں،
اگر ہر دو فریق ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے تو ہم منکروں پر (فی الفور) آفت
ڈال دیتے)

یعنی چونکہ مسلمانوں کو مضرت پہنچ جانے کا اندیشہ تھا، حکمت الٰہی نے تقاضا کیا کہ اس مقصد کو مہلت کے ساتھ انجام دیا جائے تا کہ منکرین کسی نہ کسی طرح قبول اسلام کر لیں اور مسلمان مجاہدین کے غلبہ سے محفوظ رہیں، چنانچہ صلح حدیبیہ کے دو سال بعد مکہ فتح ہوا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بارہ ہزار اشخاص کے ساتھ مکہ کے قریب پہنچے، اور اہل مکہ بہرطور داخل اسلام ہوئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت ہوئے۔

اس واقعہ صلح حدیبیہ و فتح مکہ میں بادشاہان دوراندیش کو حکمت کی عجیب وغریب تعلیم دی گئی ہے اور وہ یہ ہے کہ مسلم وغیر مسلم کے اختلاط کے مقام پر حلم کا معاملہ کرنا چاہئے، پہلے مخالفین اسلام کو جو مسلمانوں پر تسلط جمائے ہوئے متفرق کریں، بعد ازاں مسلمان خود بخود بادشاہ عادل اور دوراندیش کے ہاتھ میں ہاتھ دیدیں گے۔

ترجمہ شعر عربی

(اللہ کی کتنی پوشیدہ پوشیدہ مہربانیاں ہیں، جن کی پوشیدگی سے ایک ذکی وفہیم بھی بے خبر ہے)
جیسا کہ دوائے تلخ ہر چند فائدہ مند ہو لیکن مریض کی طبیعت اس کی طرف رغبت نہیں کرتی،

طبیب حاذق، اس کڑوی دوا کو شہد کے ساتھ ملاتا ہے، اسی طرح پادشاہان عادل کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے دشمنوں کی طرف جس جگہ متوجہ ہوتے ہیں اور وہاں پر جو مسلمان متفرق طور پر ہوتے ہیں اور اپنی جان وآبرو کا خوف کرتے ہیں اور اپنی طبیعت سے اس گیرودار کو نہیں چاہتے، وہاں پر فقیروں، غریبوں اور سادات علماء کو اپنے الطاف خسروانہ اور انعام بادشاہانہ سے اور طرح طرح کے دلاسوں اور تسلیوں سے محفوظ رکھتے ہیں تا کہ ان کی مہربانی کا شہرہ دور ونزدیک شہروں تک پہنچ جائے اور سب کے سب ہاتھ اٹھا اٹھا کر پادشاہ عادل کی فتح ونصرت کی دعائیں کریں اور خدائے عزوجل سے شب وروز یہی درخواست کریں کہ اللہ یہ رحمت کی نشانی بادشاہ عادل ہمارے شہر میں

فروکش ہو۔

سب سے پہلے اہم اس کے بعد بالترتیب اس کے نیچے درجے کے اہم امور انجام دیئے جائیں، جس جگہ کسی مسلمان کی شکست کا احتمال ہو وہاں توقف کرنا چاہئے، جماعتِ منکرین کے گرداگرد جہاد مقدم رکھنا چاہئے تاکہ بغیر احتمال قتل مسلم مدعا حاصل ہو جائے، آخر کلام میں خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت پادشاہانِ اسلام کے حق میں اور خلفائے راشدین کی نصیحتیں حفظ آداب بادشاہی کے باب میں لکھی جاتی ہیں۔

ترجمہ وصایا ونصائح

ارشادات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم:

بخاری نے حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت لکھی ہے کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا، ہر وہ شخص جو خلیفہ بنایا جاتا ہے اس کے دو ولی دوست (باطنی قوت) ہوتے ہیں، ایک ان میں سے اس کو خیر و نیکی کی تلقین کرتا اور اس پر آمادہ کرتا ہے، دوسرا اس کو شر کا حکم کرتا ہے اور اس کی رغبت دلاتا ہے اور محفوظ وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے۔

وصیت صدیق اکبرؓ

امام ابویوسفؒ نے ابن سابط سے روایت کی ہے کہ جبکہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی وفات کا وقت قریب آیا، انھوں نے حضرت عمر فاروقؓ کو بلایا، پھر ان سے فرمایا کہ میں تم کو ایک وصیت کرتا ہوں اگر تم اس کو یاد رکھو گے تو موت سے زیادہ کوئی شے تمہیں محبوب نہیں ہوگی، اور اگر اس وصیت کو تم نے بھلا دیا تو موت سے زیادہ کوئی شے تمہارے نزدیک مبغوض و مکروہ نہیں ہوگی اور تم موت کے پنجے سے نکل نہیں سکتے، وہ وصیت یہ ہے:

> ''اللہ تعالیٰ کا تم پر رات میں ایک حق ہے کہ وہ اس کو دن میں قبول نہیں کرے گا اور ایک دن میں حق ہے جس کو رات کو قبول نہیں کرنے کا (یعنی ہر حق کو ادا کرنے کے لئے ایک وقت مقرر ہے) اللہ تعالیٰ نفل اس وقت تک قبول نہ فرمائے گا جب تک فرض کی ادائیگی نہ ہوگی، جن لوگوں نے دنیا میں باطل کی پیروی کی اور باطل کی پیروی کو معمولی چیز تصور کیا اس کی پاداش میں ان کی میزان ہلکی ہو جائے گی اور

میزان قیامت کا معاملہ یوں ہے کہ وہ ہمیشہ ایسی صورت میں ہلکی پڑتی ہے جبکہ اس میں باطل دھرا ہو، اور جن لوگوں نے دنیا میں حق کا اتباع کیا ہوگا اور اس کو اہم تصور کیا ہوگا ان کی میزان قیامت میں بھاری ہوگی اور میزان میں جب حق ہوگا اس کا پلہ بھاری ہی ہوگا''۔

پس اگر تم نے میری اس وصیت کو یاد کرلیا تو کوئی غائب شے موت کے مقابلہ میں محبوب نہیں ہونے کی، اور موت کا آنا یقینی ہے اور اگر اس وصیت کو ضایع کر دیا (بھول گئے) تو کوئی غائب شے موت سے زیادہ مبغوض نہیں ہوگی اور تم موت کو ہرگز عاجز نہیں کر سکتے (وہ تم پر غالب آکر رہے گی)

وصیت فاروق اعظمؓ

امام ابو یوسفؒ نے زبیدؒ سے روایت کی ہے کہ جبکہ حضرت عمرؓ نے وصیت کی تو فرمایا کہ میں اپنے بعد آنے والے خلیفہ کو وصیت کرتا ہوں خدا سے ڈرنے کی اور وصیت کرتا ہوں مہاجرین اولین کے بارے میں کہ ان کا حق پہچانا جائے اور ان کی کرامت وعظمت ملحوظ رکھی جائے اور وصیت کرتا ہوں کہ انصار کے بارے میں وہ انصار جنھوں نے وار وایمان میں ٹھکانہ پکڑا، ان کی خوبیوں کو قبول کرتے ہوئے ان کی لغزشوں سے درگذر کی جائے اور اولاد انصار کے بارے میں بھی وصیت کرتا ہوں، اس لئے کہ وہ اسلام کی جڑ اور عدو کے غصے کا سبب ہیں کہ ان سے ان کی رضامندی کے بغیر ان کا زائد مال وصول نہ کیا جائے اور اعراب کے بارے میں وصیت کرتا ہوں کہ وہ اعراب جو اصل عرب ہیں اور اسلام کے لئے مرکز طاقت ہیں کہ خلیفہ ان کے اموال کو لے کر ان کے فقراء پر تقسیم کردے، اور میں اللہ اور اس کے رسول کے عہد کی پاسداری کی بھی وصیت کرتا ہوں کہ ذمیوں کے عہد کو پورا کیا جائے اور ان کی حفاظت کے لئے مقاتلہ کیا جائے اور ان کو ان کی طاقت سے زیادہ حکم نہ دیا جائے۔

وصیت حضرت عثمانؓ

امام ابو یوسفؒ نے حضرت عثمانؓ بن عفان کے آزاد شدہ غلام حضرت ہانی کی روایت نقل کی ہے کہ ہانی نے کہا کہ جب کبھی حضرت عثمانؓ کسی قبر کے پاس کھڑے ہوتے تھے تو زار زار روتے

تھے، یہاں تک کہ آپ کی داڑھی تر ہو جاتی تھی، ان سے کہا گیا کہ آپ جنت و دوزخ کا تذکرہ کرتے ہیں اس پر تو روتے نہیں، قبر پر کیوں رویا کرتے ہیں، اس کے جواب میں عثمانؓ نے فرمایا، کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ قبر آخرت کی پہلی منزل ہے، پس جو اس منزل سے نجات پا گیا سمجھ لو کہ اس کے بعد معاملہ آسان ہے اور اگر یہاں سے نجات نہیں ملی تو اس کے بعد کی منزل اس سے زائد سخت ہے۔

وصیت حضرت علیؓ

امام ابو یوسفؒ نے عطاء بن ابی رباح سے نقل کیا ہے کہ عطاء نے کہا، حضرت علیؓ جب کوئی لشکر روانہ کرتے تو اس لشکر کے ایک شخص کو امیر بناتے پھر اس سے یہ وصیت کرتے تھے کہ میں تجھے اس خدا سے ڈرنے کی وصیت کرتا ہوں جس کی ملاقات یقینی ہے، اور اس کے علاوہ تیرا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے، وہ دنیا اور آخرت کا مالک ہے، میں تجھ کو جس کام کے لئے روانہ کر رہا ہوں تیرے اوپر اس کی انجام دہی ضروری ہے اور تیرے اوپر ایسے امور کی پابندی لازم ہے جو باعث قرب خداوندی ہوں، اس لئے کہ خدا کے یہاں دنیا کے ہر کام کا بدلہ ہے۔

یہ کچھ چیزیں بطریق استعجال تحریر ہوئی ہیں اگر ان کلمات کی جانب آنجناب کی توجہ محسوس ہوئی تو بعض مطالب تفصیلاً پہنچیں گے۔

وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ اَوَّلاً اٰخِراً وَظَاھِراً وَبَاطِناً

مکتوب سوم

بجانب
نواب زینت المحل والدہ شاہ عالم عالی گہر

اللہ تعالیٰ مرادوں پر فائز فرمائے اور آپ جیسے برگزیدہ افراد کے مطالب ومقاصد کو پورا فرما کر طرح طرح کے برکات کا دروازہ کھول دے۔

آپ کا خط اچھے وقت پر صادر ہوا، حق بات یہ ہے کہ آپ کے خاندان پر جوظلم ہوا ہے اس کے شرارے ایک طرف سے دوسری طرف تک پہنچے ہیں، امید یہ قوی ہے کہ عدل الٰہی: مَنْ قُتِلَ مَظْلُوماً فَقَدْ جعلنَا لِوَلِيِّهِ سُلْطَاناً فَلاَ يُسْرِف فِي الْقَتْلِ اِنَّهُ كَانَ مَنْصُوْراً

(اور جو کوئی ظلم کے ساتھ ناحق قتل کردیا جائے پس ہم نے اس کے وارث کو (قصاص یا دیت کا) تسلط دیا ہے، پس چاہئے کہ وہ وارث قتل کرنے میں زیادتی نہ کرے، یعنی غیر قاتل کو قتل نہ کرے)

فقیر دعاؤں میں مشغول ہے اور قبولیت کا منتظر ہے، سروش غیب نے حصول مراد کا افادہ فرمایا ہے، بلکہ وہ تدبیر بھی گوش ہوش میں ڈال دی ہے جو صاحب معاملہ کو تین چار سال کی مدت میں کرنا چاہئے اور وہ تدبیر بھی جو سات سال کے بعد کرنا چاہئے۔

انشاء اللہ ان تدبیروں کو بروقت لکھا جائے گا، اس وقت اسی زمین میں رہنا مناسب ہے جہاں اس وقت ہیں، آیت رَفِيعُ الدَّرَجَاتِ ذُوْالعَرْشِ تا قَهَّار بعدنماز فرض گیارہ گیارہ بار پڑھنا اس بارے میں نافع ہوگا۔

مکتوب چہارم

بجانب

نجیب الدولہ

خدائے عزوجل امیر المجاہدین کو نصرت ظاہر اور تائید واضح کے ساتھ مشرف کرے اور اس عمل کو قبولیت کے درجہ میں پہنچا کر بڑی بڑی برکتیں اور رحمتیں اس پر مرتب کرے۔ فقیر ولی اللہ عفی عنہ کی جانب سے بعد سلام محبت مشام کے واضح ہو کہ نصرت مسلمین کے لئے یہاں دعا کی جارہی ہے اور سروشِ غیبی سے آثار قبول محسوس ہوتے ہیں، امید یہ کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ہاتھ پر طریقہ ''جدوجہد'' کو زندہ کر کے اس کے برکات اس دنیا میں اور آخرت میں عطا فرمائے گا۔

اِنَّهٗ قَرِيْبٌ مُجِيْبٌ

مکتوب پنجم

بجانب

نجیب الدولہ

خدائے عزوجل اس امیر الغزاۃ، رئیس المجاہدین کو فتوحات تازہ اور بزرگی بے اندازہ سے معزز وممتاز فرما کر مسلمانوں پر برکتوں اور رحمتوں کے دروازے کھول دے۔ اپنے کمال کرم سے، اِنَّهٗ قَرِيْبٌ مُّجِيْبٌ ۔ اکثر خاص اوقات میں دعائے خیر کا وظیفہ ادا کیا جاتا ہے اور بعض اوقات غلبۂ اسلام کی خوش خبری ہوش کے کان میں پہنچتی ہے اگرچہ یہ حقیقت بعد انتظار اور پس از کوشش حاصل ہوگی، لیکن مایوس نہ ہونا چاہئے، ہر کام کے لئے ایک وقت مقرر ہے، والسلام۔

مکتوب ششم

بجانب

نجیب الدولہ

خدائے عزوجل امیر الغزاۃ، رئیس المجاہدین کو محفوظ اور بنظر عنایت ملحوظ رکھے، بعد سلام کے واضح ہو کہ خط مبارک پہنچا، ذات گرامی کی صحت وسلامتی معلوم کر کے شکر الٰہی بجالایا، ''پردۂ غیب'' میں مرہٹہ اور جٹ کا استیصال مقرر ہو گیا ہے، بس وقت پر موقوف ہے جونہی کہ اللہ کے بندے کمر ہمت باندھیں گے طلسم باطل ٹوٹ جائے گا۔

ایک بات اور کہنی ہے وہ یہ کہ جب افواج شاہیہ کا گزر دہلی میں واقع ہو تو اس وقت اہتمام کلی کرنا چاہئے کہ دہلی سابق کی طرح ظلم سے پامال نہ ہو جائے، دہلی والے کئی مرتبہ اپنے مالوں کی لوٹ اور اپنی عزت کی توہین اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں، اسی وجہ سے کارہائے مطلوبہ کے حصول میں تاخیر ہو رہی ہے۔

آخر مظلومین کی آہ بھی تو اثر رکھتی ہے، اگر اس بار آپ چاہتے ہیں کہ کار بستہ جاری ہو جائے تو پوری پوری تاکید کرنی چاہئے کہ کوئی فوجی دہلی کے مسلمانوں اور غیر مسلموں سے جو ذی کی حیثیت رکھتے ہیں، ہرگز تعارض نہ کرے، والسلام۔

مکتوب ہفتم

بجانب

نجیب الدولہ

خدائے عز و جل آں منبع الحسنات، امیر المجاہدین، رئیس الغزاۃ کو فتوح تازہ اور برکات بے اندازہ سے مشرف و ممتاز کرے۔

فقیر ولی اللہ عفی عنہ کی طرف سے التماس یہ ہے کہ اکثر اوقات مجیب الدعوات کی درگاہ میں دعا کی جاتی ہے کہ وہ مخالفین اسلام کے فرقوں کو "شکست خوردہ" کر دے، فضل باری سے امید یہ ہے کہ یہ بات عنقریب وجود میں آئے گی، ہندوستان میں تین فرقے شدت و صلابت کی صفت سے موصوف ہیں، جب تک ان تینوں کا استیصال نہ ہوگا، نہ کوئی بادشاہ مطمئن ہو کر بیٹھے گا، نہ امراء چین سے بیٹھیں گے اور نہ رعیب خاطر جمعی سے زندگی بسر کر سکے گی۔

دینی و دنیاوی مصلحت اسی میں ہے کہ مرہٹوں سے جنگ جیتنے کے بعد فوراً قلعہ جاتِ جٹ کی جانب متوجہ ہو جائیں اور اس مہم کو بھی برکات غیبیہ کی مدد سے آسانی کے ساتھ سر کر لیں، اس کے بعد نوبت سکھ کی ہے اس جماعت کو بھی شکست دینی چاہئے اور رحمت الٰہی کا منتظر رہنا چاہئے۔

ایک اہم بات یہ ہے کہ مسلمانِ ہندوستان نے خواہ وہ دہلی کے ہوں، خواہ اس کے علاوہ کسی اور جگہ کے، کئی صدمات دیکھے ہیں اور چند بار لوٹ مار کا شکار ہوئے ہیں، "چاقو ہڈی تک پہنچ گیا ہے" رحم کا مقام ہے، خدا کا اور اس کے رسول کا واسطہ دیتا ہوں کہ کسی مسلمان کے مال کے درپے نہ ہوں، اگر اس بات کا خیال رکھا، تو امید یہ ہے کہ فتوحات کے دروازے پے در پے کھلتے چلے جائیں گے اور اس امر سے تغافل برتا گیا تو میں ڈرتا ہوں کہ "آہِ مظلوماں" سدِ راہ مقصود نہ بن جائے۔

مکتوب ہشتم

بجانب

نجیب الدولہ بہادر

خدائے عزوجل آں راس المجاہدین، رئیس الغزاۃ، امیر الامرا بہادر کو فتوحات تازہ اور ترقیات بے اندازہ سے مشرف وممتاز کرے۔

فقیر ولی اللہ عفی عنہ کی جانب سے بعد سلام محبت التزام کے واضح ہو کہ فقیر زادہ نے آنجناب کا ایک زبانی پیغام نواحی دہلی پر جاٹوں کے غلبہ اور ان کی سرکشی کی بابت مجھ کو سنایا اور اس بارے میں مفصل جواب کی درخواست کی، بناء بریں یہ کلمات لکھے جاتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ فقیر نے عالم رویا میں قوم جاٹ کا استیصال اسی قسم کا دیکھا ہے جس طرح قوم مرہٹہ کا استیصال ہوا ہے اور یہ بھی خواب میں دیکھا ہے کہ مسلمان جاٹوں کے دیہات اور قلعہ جات پر مسلط ہو گئے ہیں اور وہ دیہات و قلعے مسلمانوں کی جائے بودوباش بن گئے ہیں، غالب گمان یہ ہے کہ روہیلے جاٹوں کے قلعوں میں اقامت گزیں ہوں گے یہ چیز غیب الغیب میں مصمم ومقرر ہے، فقیر کو اس بارے میں ذرہ برابر شک وشبہ نہیں ہے لیکن ابھی تک عالم ملکوت میں صورت فتح ظاہر نہیں ہوئی ہے، جن خدا کے خاص بندوں کو اس کام پر قائم کیا گیا ہے ان کی توجہ اور دعا کی ضرورت ہے۔

جب یہ بات واضح ہوگئی تو اب فقیر کا مشورہ یہ ہے کہ جناب عالی اعلاء کلمۃ اللہ اور تقویت ملت محمدیہ کی نیت مضبوط طریقے پر کرلیں، اور مخالفین سے مقابلہ شروع کردیں، جس دن ؐھر سے

بقصدِ جنگ کوچ کریں فقیر کو اطلاع دیں تا کہ فقیر اس طور پر کہ جس طور پر خداوند کریم نے اس کو تعلیم دی ہے، متوجہ ہو۔

امید فضل خداوندی سے یہ ہے کہ فتح عجیب رونما ہوگی اور افواج مخالفین درہم برہم ہو جائیں گی، یہ بات ملحوظ رہے کہ جنگ اعداء اتار چڑھاؤ رکھتی ہے کہیں ذرا سی خبر سے بددل نہ ہو جانا، پیدائش حضرت آدم سے لے کر تا ایں دم کونسی ایسی فتح ہوئی ہے جو نشیب وفراز نہیں رکھتی تھی، اس بارے میں مبالغہ کرنا فقیر کی عادت میں داخل نہیں ہے، لیکن ایک نکتہ اور خیال میں رہے وہ یہ کہ بعض مردم ہنود جو بظاہر تمہارے اور تمہاری حکومت کے ملازم ہیں اور باطن میں ان کا میلان مخالفین کی جانب ہے، وہ نہیں چاہتے کہ مخالفین کی جڑ کٹ جائے، وہ ملازمین ہزار جتن اس معاملے میں کھڑے کریں گے اور ہر طریقے سے آں عزیز القدر کی نظر میں صلح کو آراستہ و پیراستہ کر کے دکھلائیں گے۔

دل میں ٹھان لینا کہ اس جماعت کی بات نہ سنوں گا اور انکی باتوں کی طرف میلان طبع ہو گیا تو نصرت میں تاخیر ہوگی۔ فقیر اس چیز کو اس طرح جانتا ہے گویا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر رہا ہے، والسلام۔

مکتوب نہم

بجانب

نجیب الدولہ بہادر

اللہ تعالیٰ راس المجاہدین، رئیس الغزاۃ، امیر الامراء بہادر کو فتوحات تازہ اور ترقیات بے اندازہ کے ساتھ مشرف کرے۔

فقیر ولی اللہ عفی عنہ کی طرف سے بعد سلام محبت التزام کے واضح ہو کہ آپ کا مکتوب گرامی جنگ کی استعداد کے بارے میں اور اس بات کے استفسار کے سلسلہ میں پہنچا کہ مسلمانوں کی ایک جماعت جاٹوں کے ساتھ مل گئی ہے، ان کے ساتھ کیا سلوک ہونا چاہئے۔

میرے عزیز! جاٹوں پر فتح غیب الغیب میں مقرر ہو چکی ہے اس بارے میں کوئی اندیشہ دل میں نہیں لانا چاہئے، انشاء اللہ تعالیٰ مرہٹوں کی طرح جوں ہی کہ مقابلہ ہوگا یہ طلسم ٹوٹ جائے گا، اگر مسلمانوں کی ایک جماعت جاٹوں کے ساتھ ہے تو اس کا کوئی خیال نہ کریں، مجھے امید ہے کہ بجز اس کے کہ ظاہر میں دشمنوں کی کثرت نظر آئے اور کوئی تشویش پیش نہیں آئے گی، اللہ تعالیٰ ان مسلمانوں کے ہاتھوں کو جو (غیروں کے ساتھ ہیں) روک دے گا، وہ جنگ نہ کر سکیں گے، انشاء اللہ تعالیٰ بس یوں سمجھ لو کہ جس طرح شیر بکریوں کے گلے میں آجاتے ہیں اور بکریاں بھاگ جاتی ہیں، اسی طرح مخالفین کو بھاگتے بنے گی، دشمنوں کی کثرت سے اور دشمنوں کے ساتھ مسلمانوں کی رفاقت سے ڈرنا نہ چاہئے، اللہ تعالیٰ کا ارادہ سب پر غالب ہے، اگر مخالفین مکر و حیلہ کے ساتھ صلح

کی گفتگو کریں تو ان کی باتوں پر کان نہ دھرنا، اگر بعض ایسے مسلمان جن کا اعلاءِ دینِ محمدیؐ کے سلسلے میں نیت کمزور ہے، لمبے چوڑے خطرے سامنے لا کر پیش کریں تو ان کی بھی نہ سننا چاہئے۔

اس کام میں بس آپ کی توجہ استعدادِ حرب کے بہم پہنچانے اور شدت کی طرف منعطف ہونی چاہئے، میاں فقیر گل نے مسلمانوں کی بعض باتیں اور غلط اندیشے مفصل بیان کئے، تاکید مزید کے ساتھ لکھا جاتا ہے کہ جس وقت جنگ جاٹ کے لئے نکلیں، فقیر کو اطلاع دیں، انشاء اللہ تعالیٰ روانگی کے وقت سے لے کر فتح کے وقت تک دعائے دلی میں مشغول رہوں گا، والسلام۔

مکتوب دہم

بطرف

نجیب الدولہ

اللہ تعالی آں راس المجاہدین، رئیس الغزاۃ، امیر الامراء کو مسند عزت پر برقرار رکھ کر طرح طرح کی بھلائیاں ظہور میں لائے۔

فقیر ولی اللہ عفی عنہ کی جانب سے بعد سلام محبت التزام کے واضح ہو کہ جو کچھ معلوم ہوتا ہے یہ ہے کہ اس دور میں تائید ملت اسلامیہ وامت مرحومہ آپ (جو مصدر خیر ہیں) کے پردے میں ظہور کر رہی ہے، کسی طرح کا وسوسہ قلب گرامی میں نہ آنے پائے، تمام کام انشاء اللہ تعالی دوستوں کی مراد کے مطابق ہوں گے، اگر تمام دشمن قہر الٰہی سے پامال ہو جائیں گے۔

دوسری بات یہ ہے کہ حافظ جواہر خاں بہت نیک خصلت آدمی ہیں خراش وتراش اور لگانا بجھانا جو کہ بادشاہوں کے مصاحبوں کی بری عادت ہے ان کے اندر نہیں ہے، میں موصوف کو اس وقت سے جانتا ہوں کہ جبکہ وہ جواہر خاں مرحوم کی تربیت میں تھے، آپ کی توجہ جو ان کی ملازمت کے برقرار رکھنے کے لئے ان کے حال پر رہی اور اب بھی ہے، صحیح و درست ہے..... پہلے بھی اس مضمون کی طرف اشارہ کیا گیا تھا، والسلام۔

مکتوب یازدہم

بنام

شیخ محمد عاشق پھلتیؒ

حقائق و معارف آگاہ عزیز القدر سجادہ نشین اسلاف کرام شیخ محمد عاشق سلمہ اللہ تعالیٰ فقیر ولی اللہ عفی عنہ کی جانب سے بعد سلام محبت التیام مطالعہ کریں، اللہ کا شکر ہے کہ اس نے خیر و عافیت دے رکھی ہے، دیگر آنکہ کل میں بعد از نماز جمعہ اپنے مقررہ وقت سے پہلے مجلس سے اٹھ گیا تھا اور آں عزیز کو جلد رخصت کر دیا تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ کہیں ہجوم خلق پریشان نہ کر دے، پادشاہ (۱) اور اس کی والدہ (۲) آئے تھے، پہلے مسجد میں زنانہ کا انتظام کیا گیا، اس صورت سے بادشاہ کے آنے کی غرض یہ تھی کہ بے تکلف ہو کر کچھ دیر ٹھہرے، تقریباً تین چار گھنٹے وہ بیٹھا، کھانا بھی کھایا، اس کی زیادہ تر باتیں مخلوق خدا کی بھلائی کے کاموں میں مدد چاہنے سے متعلق تھیں، وہ اس بات پر افسوس کرتا تھا کہ اس نے اعتکاف کے زمانے میں جن باتوں کو اپنے اوپر لازم کر لیا تھا، وہ آشکارا ہوگئیں اور یہ بھی دریافت کرتا تھا کہ آیا مجھ سے کونسی ایسی لغزش ہوگئی، جس کی وجہ سے صفائی قلب جاتی رہی، اس نے یہ بھی کہا کہ اس سے پہلے میں خواب میں مشاہدۂ جمال مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرف ہوتا تھا، اب ''زیارت'' میسر نہیں ہوتی، درمیان گفتگو میں اپنی تین خوابیں ذکر کیں۔

پہلی خواب

اس نے کہا، جس وقت رفیع الدولہ (۳) کو تخت شاہی پر بٹھایا گیا تھا اس وقت میں نے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ رفیع الدولہ کے بعد کون بادشاہ ہوگا؟ فرمایا کہ روشن اختر (محمد شاہ) میں نے عرض کیا روشن اختر (۴) کے بعد کون ہوگا؟ فرمایا ایک اور ہے جس کا ہونا نہ ہونے کے برابر ہے (۵)۔ میں نے عرض کیا اس کے بعد کون ہوگا؟ فرمایا "تو" (۶)، پھر میں نے یہ دریافت نہیں کیا کہ میری حکومت کب تک چلے گی۔

دوسری خواب

جس وقت نادر شاہ کی طرف سے قتل عام واقع ہوا، میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ گویا ایک حصار کھینچ رہے ہیں اور اشارہ فرما رہے ہیں، میں نے عرض کیا حضورؐ یہ کیا ہے؟ فرمایا کہ ایک زبردست آگ لگی ہے، میں نے حصار کر دیا ہے تاکہ قلعہ محفوظ رہے۔

تیسری خواب

میں نے خواب میں دیکھا، کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک کلغی دست مبارک سے تیار فرما رہے ہیں اور ارشاد ہوتا ہے کہ تیرے واسطے بنا رہا ہوں۔

بادشاہ سے فقیر نے خواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر بیعت ہونے کا طریقہ بیان کیا اور بادشاہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت مبارک کے تصور کے لئے کہا، اس نے کہا کہ رفیع الدولہ اور روشن اختر والے خواب میں جو صورت مبارک دیکھی تھی وہ میرے ذہن میں حاضر ہے، فقیر نے کہا کہ اسی کو اپنے دل کے سامنے رکھو، اس گفتگو کے بعد مسجد میں فقیر کے ساتھ نماز پڑھ کر رخصت ہوا، والسلام۔

مکتوب دوازدہم

بنام

شیخ محمد عاشقؒ

حقائق و معارف آگاہ، عزیز القدر، سجادہ نشین اسلاف کرام شیخ محمد عاشق سلمہ اللہ تعالیٰ، فقیر ولی اللہ عفی عنہ سے بعد از سلام مطالعہ کریں۔

الحمدللہ کہ اس ''حادثۂ عامہ'' میں عافیت نصیب ہوئی اس محلّہ کو معلوم نہیں ہوا کہ مخالف کی فوج آئی تھی یا نہیں، نہ تو لوٹ ڈالنے والوں کی لوٹ سے کوئی اذیت پہنچی اور نہ اس تاوان وجرمانہ (تعزیری ٹیکس) سے جو حویلیوں پر ڈالا گیا تھا کوئی زیر بار ہوا۔

سابق میں عالمگیر ثانی سے جو کچھ کہہ دیا گیا تھا کہ اس فتنہ میں تم کو سلامتی حاصل رہے گی وہ بھی ظہور میں آیا، اکثر کی جائیدادوں کی سندیں، (دستاویزیں) ضبط ہوگئیں، مگر میری سند کہ دستخط کر کے مجھ کو واپس کر دی گئی ہے، اس وقت احمد شاہ درانی جنگ جاٹ کی طرف متوجہ ہے، جو کچھ وقوع میں آئے گا بعد کو لکھا جائے گا، اہل شہر اپنے قتل ہونے سے تو محفوظ رہے، لیکن دولت کا مادۂ فاسدہ جن لوگوں کے مزاجوں میں پیدا ہو گیا تھا اس کا تنقیہ پورے طریقے پر ہو گیا، چنانچہ عبرت کی چیز ہے کہ جو لوگ جاہ وحشمت میں جس قدر زیادہ تھے، قید وضرب اور سزا بھگتنے میں بھی وہی آگے آگے رہے، مگر جس کو اللہ تعالیٰ نے محفوظ رکھنا چاہا وہ محفوظ رہا، والسلام۔

مکتوب سیزدہم

بنام

شیخ محمد عاشق پھلتیؒ

حقائق و معارف آگاہ، عزیز القدر، سجادہ نشین اسلاف کرام شیخ محمد عاشق سلمہ اللہ تعالیٰ، فقیر ولی اللہ عفی عنہ کی جانب سے بعد محبت کے مطالعہ کریں، اللہ کا شکر ہے کہ اس نے خیر و عافیت عطا فرما رکھی ہے آج ایک افواہ سنی گئی ہے، جس نے یک گونہ تشویش خاطر پیدا کردی وہ یہ کہ درانی کی فوجیں بارہہ(۱) کی جانب روانہ ہو رہی ہیں اور یہ بات تشویش کا باعث ہے بھی۔

میرا ظن غالب یہ ہے کہ پھلت اور بوڑھانہ (۲) کی طرف جانے سے ان فوجوں کو کوئی تعلق نہیں ہے، حاصل کلام فضل الٰہی سے امید قوی ہے کہ خدا تم کو اور ہم کو تمام آفات سے محفوظ رکھے گا، اور یہی اطمینان دل میں موجزن ہے، اگرچہ بحسب ظاہر کچھ نہ کچھ تشویش بھی ہوتی ہے اور تدبیر اصلاح کی جاتی ہے، والسلام۔

مکتوب چہاردہم

بنام

یعنی شیخ محمد عاشقؒ

حقائق و معارف آگاہ، عزیز القدر، سجادہ نشین اسلاف کرام شیخ محمد عاشق سلمہ اللہ تعالیٰ، فقیر ولی اللہ عفی عنہ کی جانب سے بعد سلام کے مطالعہ کریں۔

خیر و عافیت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ہے اور اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں اور تمہیں ہمیشہ عافیت سے رکھے، آپ کا مکتوب گرامی پہنچا اور آپ کا موضع پھلت میں سلامتی کے ساتھ آنا معلوم ہوا کہ خیریت سے وہاں پہنچے۔

دستور کے موافق امسال بھی اعتکاف میں داخل ہوا، اس توفیق کے ملنے پر اور مزید احسانات کے دروازے کھلنے پر اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں۔

جو باتیں ''وارداتِ احوال'' کے قبیل سے ہیں ان کا لکھنا چنداں لطف نہ دے گا باقی جو ''معارف'' کے قبیل سے باتیں ہیں وہ انشاء اللہ تعالیٰ بعد فراغت اعتکاف بشرط سہولت لکھی جائیں گی۔

جو کچھ فقیر کو معلوم ہو رہا ہے یہ ہے کہ احمد شاہ ابدالی مخالفین کی سرکوبی کے لئے پھر آئے گا(۱) اور بعد تمام ہونے امر ''وعدہ شدہ'' کے شاید اسی سرزمین میں اپنی ودیعت حیات کو سپرد کر دے گا، گناہوں کی کثرت اور لعنتی کاموں کے ہجوم کے باوجود اب تک جو کام کی نوعیت برقرار ہے، غالباً اسی وجہ سے ہے کہ اللہ تعالیٰ کو طاقت مخالفین کو تہس نہس کرنا ہے، والسلام۔

مکتوب پانزدہم

بنام

شیخ محمد عاشقؒ

حقائق و معارف آگاہ، عزیز القدر، سجادہ نشین اسلاف کرام شیخ محمد عاشق سلمہ اللہ تعالیٰ، فقیر ولی اللہ عفی عنہ کی جانب سے بعد سلام کے مطالعہ کریں۔

اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرتا ہوں اور اس سے دنیا اور آخرت میں عافیت اور عفو مانگتا ہوں۔

گرامی نامہ مشکیں شمامہ پہنچا، حقیقت مرقومہ واضح ہوئی، کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ ''طوائف الملوکی'' ہوگی، فوجیں حرکت میں آئیں گی اور شہر تہہ و بالا ہوں گے۔

اللہ سے یہ دعا ہے کہ اس ''حادثہ'' میں مخالفین اسلام پر ہی مصیبت پڑے اور ''مٹھی بھر'' مسلمان جوان بلاد میں غرباء (۱) کی حیثیت سے پڑے ہوئے ہیں، محفوظ و مامون رہیں، ''اللہ تعالیٰ قریب ہے اور دعاؤں کو قبول کرنے والا ہے'' جو کچھ قضا و قدر میں ہے چاروناچار ضرور ظہور میں آئے گا، اس جماعت کو خوشخبری ہو جو تسلیم و رضا کو اپنا شعار بنائے ہوئے ہے، اپنے مقال سے بھی اور اپنے حال سے بھی، ایسی جماعت کو خوش خبری ہو کہ اس کے شیوۂ تسلیم و رضا اختیار کرنے کے بعد جب کبھی ''ہوائے قدس'' چلے گی، اس کی حافظ و ناصر ہوگی۔

''البتہ میرے کام کا بنانے والا اللہ ہے جس نے قرآن اتارا اور وہ نیکوکاروں کو دوست رکھتا ہے''، والسلام۔

مکتوب شانزدہم

بنام

شیخ محمد عاشقؒ

حقائق و معارف آگاہ عزیز القدر، سجادہ نشین اسلام کرام، فقیر ولی اللہ عفی عنہ کی طرف سے بعد سلام مطالعہ کریں، خیر و عافیت پر شکر خداوندی ادا کرتا ہوں۔

سید فتح اللہ خاں کا خط پہنچا، ان کو "یا حفیظ" ابجد کے حساب سے (۹۹۸) مرتبہ پڑھنے کے لئے لکھا گیا کہ اس کے اوّل آخر چند بار یہ الفاظ درود پڑھا جائے، اللّٰہ صل علی سید القاھرین علی اعداء رب العلمین، یعنی اے اللہ رحمت بھیج اس ذات اقدس پر جو سردار ہے اللہ کے دشمنوں پر قہر کرنے والوں کا۔

چند "تعویذ سلاح" بھی بھیجے گئے اور ان کے خط میں یہ فقرہ بھی تحریر ہوا ہے، فقیر کے دل میں یہ بات آتی ہے کہ اگر یہ مسلمان دریا سے پار ہو کر ایک بار جماعت مرہٹہ پر حملہ کر دیں تو اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک عجیب نشانی مشاہدے میں آئے گی، مخالفین طلسم کی طرح منتشر ہو جائیں گے، والسلام۔

مکتوب ہفت دہم

بنام

شیخ محمد عاشق پھلتیؒ

حقائق و معارف آگاہ، عزیز القدر، سجادہ نشین اسلاف کرام شیخ محمد عاشق سلمہ اللہ تعالیٰ، فقیر ولی اللہ عفی عنہ کی جانب سے بعد از سلام کے مطالعہ کریں۔

عافیت پر اللہ کی حمد ہے اور اللہ سے درخواست ہے کہ وہ ہمیں اور تمہیں ہمیشہ عافیت سے رکھے، نامہ مشکیں شامہ پہنچا، وہ دہشت جو اس طرف مخالفین اسلام کی فوج کے قریب آ جانے سے پھیل گئی ہے، اس کا علم ہوا، رب العزت کی بارگاہ سے التجا ہے کہ قریۃ الصالحین کو جملہ آفات سے محفوظ رکھے۔

مکتوب ہشت دہم

بنام

شیخ محمد عاشق پھلتیؒ

.....لکھا تھا کہ کیا اچھا ہو اگر اعتکاف رمضان میں پھلت آ کر کروں، فقیر یہ بات دل سے چاہتا ہے، لیکن شہر دہلی کے موجودہ ناسازگار حالات کے پیش نظر کہ یہاں روزنت نیا فتنہ کھڑا ہوتا ہے اور لوگوں کے دلوں میں قسم قسم کا خوف لاحق ہوتا رہتا ہے، مناسب نہیں ہے کہ اپنا گھربار اور اپنے متعلقین کو یونہی چھوڑ دیا جائے۔

وہی عربی کا مشہور مصرعہ مناسب حال ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ (کبھی) ہوائیں کشتیوں کی خواہش کے برخلاف چلتی ہیں۔

مکتوب نوازدہم

بنام

شیخ محمد عاشقؒ

حقائق ومعارف آگاہ، عزیز القدر، سجادہ نشین اسلاف کرام شیخ محمد عاشق سلمہ اللہ تعالیٰ فقیر ولی اللہ عفی عنہ کی جانب سے بعد از سلام کے مطالعہ کریں۔

عافیت پر خدا کی حمد ہے اور اس سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اور تمہیں ہمیشہ عافیت سے رکھے، تمہارا خط پہنچا، حقائق مندرجہ سے آگاہی ہوئی، تم نے لکھا تھا کہ اگر دہلی سے جانے کا قصد ہو تو سواری کا انتظام کیا جائے۔

اصل قصہ یہ ہے کہ وقوع فتنہ یقینی ہے، جب افواج ابدالی کی آمد آمد کشمیر(۱) کی طرف سنی گئی تو وہ پوشیدہ خطرہ ظاہر ہو گیا اور اس بارے میں مشورہ کیا گیا، بعد مشاورت یہ طے پایا کہ جب نوبت لاہور تک پہنچے اس وقت خاندان کو پھلت کی طرف روانہ کر دیں اس لئے کہ قبل پیدا ہونے فتنہ کے خواہ مخواہ کہیں کو چل پڑنا کم عقلی ہے اور ہجوم فتنہ کے بعد توقف کرنا، یہ گھمنڈ کی بات ہے، ابھی تک وہی بات دل میں ٹھان لی ہے جس کو اوپر ذکر کیا گیا ہے، معلوم نہیں یہ بات جلد پیش آنے والی ہے، یا کچھ مدت کے بعد" میں نہیں جانتا ہوں آیا ہے قریب وہ جس کا وعدہ تم سے کیا جا رہا ہے یا مقرر کر دی ہے اس کے واسطے میرے رب نے کوئی میعاد"۔

حاصل کلام یہ ہے کہ فی الحال کوئی تشویش بظاہر نہیں ہے کہ یہاں سے کہیں جانے کی باعث ہو جب وہ وقت ظاہر ہوگا ہم وہی کریں گے جس کو ہم نے سوچا ہے، والسلام۔

مکتوب بستم

بنام

شاہ محمد عاشق پھلتیؒ

حقائق و معارف آگاہ، عزیز القدر، سجادہ نشین اسلاف کرام شیخ محمد عاشق سلمہ اللہ تعالیٰ، فقیر ولی اللہ عفی عنہ سے بعد مطالعہ کریں۔

الحمد للہ عافیت سے ہوں، مکتوب بہجت اسلوب پہنچا اور ایام عرس میں نہ آنے کا سبب معلوم ہوا، اللہ تعالیٰ اچھے طریقے سے تلافی مافات کرے۔

کفار ہر طرف سے احاطہ کئے ہوئے ہیں ارباب حل وعقد کو بظاہر کوئی بے طاقتی و بے بسی نہیں ہے مگر روپیہ کی کمی ہے اور جنگ کے دراز ہونے کا خوف لگا ہوا ہے، ہر چند وزیر سے مکرر تاکید کے ساتھ لکھا گیا کہ جماعت مرہٹہ عنقریب عقوبات شدیدہ میں مبتلا ہوں گے اگر اس وقت کمر ہمت باندھ لیں تو کھلی فتح حاصل ہوگی، مگر ابھی تک یہ حال ہے کہ صبح کو ایک رائے قائم کرتے ہیں اور شام کو توڑ دیتے ہیں، یہ بات یقینی ہے کہ مسلمین کو نصرت، بادشاہ و وزیر کو فتح اور جیوش کفر کو شکست نصیب ہوگی۔

آپ کو اس فرشتے کا قصہ تو معلوم ہوگا جو معاملۂ جنگ پر مقرر و متعین ہے۔

صفدر جنگ کی حالت یہ ہوئی کہ آکلہ (کینسر) اس کے پاؤں میں پیدا ہوگیا، ہر چند اس کے پاؤں کے گوشت کو کاٹتے تھے اور خراب ہوتا تھا بالآخر پاؤں کاٹنے پر مجبور ہوئے، یہاں تک کہ برے حال میں گزر گیا۔ بس اسی طرح اس وقت مرہٹہ و جٹ کے حق میں خدا کی ناراضگی متوجہ ہوگی، اور ملکوت میں اس جماعت کی شکست و ہلاکت مصمم ہوگئی ہے۔ واللہ غالب علی امرہ۔

مکتوب بست و یکم

بنام

شیخ محمد عاشقؒ

حقائق ومعارف آگاہ، عزیز القدر، سجادہ نشین اسلاف کرام شیخ محمد عاشق سلمہ اللہ تعالیٰ، فقیر ولی اللہ عفی عنہ کی جانب سے بعد سلام محبت التیام مطالعہ کریں۔

عافیت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں اور اس کے فضل عظیم سے یہی درخواست ہے کہ وہ ہمارے اور تمہارے لئے عافیت کو ہمیشہ قائم رکھے، اس خبر پر مشتمل مکتوب پہنچا کہ وہ ظالم وفاجر لوگ جو انتہائی سرکشی اختیار کر چکے تھے اور ان کے ظلم کے ہاتھوں سے کچھ سختی اور شدت بھی سرزد ہوئی تھی، تائید الٰہی کے بروقت پہنچنے کی وجہ سے ظلم سے باز رہے اور انھوں نے اطاعت وانقیاد کا اظہار کیا، اس خبر کے پہنچنے پر شکر الٰہی ادا کیا گیا دو وجہ سے، ایک تو اس لئے کہ ظالموں کا ظلم موقوف ہوا، دوسرے اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ نے آں عزیز القدر کو استجابت دعاء اور دفع بلا کا مصدر ومرکز بنایا، اس نے تم کو ان لوگوں میں سے کردیا جن کی دعائیں قبول کی جاتی ہیں اور جن کی وجہ سے بلائیں دور کردی جاتی ہیں، اور یہ انعام قرآن مجید کی اس آیت کا مصداق ہے۔

وَيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ وَعَلَىٰ آلِ يَعْقُوبَ كَمَا أَتَمَّهَا عَلَىٰ أَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْحَاقَ

یہ بڑی دولت تم کو مبارک ہو، اللہ تعالیٰ ہر لحظہ اس میں ترقی عطا فرمائے، ہر چند جو کچھ خارج

میں ہوتا ہے یعنی بندے کے ساتھ اللہ کے جو معاملات ہوتے ہیں، اس کے کچھ اسباب ہوتے ہیں، مثلاً ہمت ارواح طیبہ احیاء و اموات، لیکن چونکہ اس ہمت کا سلسلہ جنباں بھی کوئی شخص ہوتا ہے لہٰذا وہ کامیاب صورت حال اسی مبارک شخص کی طرف منسوب ہوگی۔

وَتِلْکَ سُنَّةُ اللّٰهِ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَحْوِيْلاً

والسلام

مکتوب بست و دوم

بجانب

شیخ محمد عاشقؒ

حقائق و معارف آگاہ، عزیز القدر، سجادہ نشین اسلاف کرام شیخ محمد عاشق سلمہ اللہ تعالیٰ، فقیر ولی اللہ عفی عنہ کی جانب سے بعد سلام محبت التیام مطالعہ کریں، عافیت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ہے اور اس کے کرم عظیم سے درخواست ہے کہ وہ مستقبل میں بھی ہم کو اور تم کو عافیت سے رکھے۔

رقیمہ گرامی پہنچا، حقیقت مندرجہ واضح ہوئی، تمام حالات میں سوائے فضل الٰہی پر اعتماد کرنے کے ہم کسی چیز پر بھروسہ نہیں کرتے، عین رفاہیت و امن کے زمانہ میں یہ بات دل میں راسخ رہتی ہے کہ انس و جن میں سے بہت سے ظالم و سرکش موجود ہیں اور ہم نے اپنے اندر اتنی طاقت بھی نہیں پاتے کہ ان ظالموں کے مظالم کا دسواں حصہ بھی دفع کر سکیں، بس محض فضل الٰہی سے دن کو رات اور رات کو دن تک پہنچاتے ہیں، لمحات رفاہیت میں بھی ہر لمحہ یہی حقیقت اپنا نصب العین رہی ہے اور اب بھی جبکہ "امواج فتن" کا تلاطم نظر آ رہا ہے، بغیر ذرہ برابر فرق کے یہی عقیدہ ہے۔

ہم کو پوری امید ہے کہ ہم اور ہمارے رفقاء یہاں (دہلی میں) محفوظ رہیں گے، اور اسی طرح آں عزیز القدر مع جمیع احباء و اعزاء وہاں (پھلت میں) محفوظ رہیں گے، مدبر السموت والارض (اللہ تعالیٰ) کی نظر کرم یہاں اور وہاں یکساں ہے، پھر خواہ مخواہ کہیں منتقل ہو جانے کی تکلیف ہم کیوں اٹھائیں، اور یہ بھی احتمال ہے کہ بعض نفوس کا یہاں رہنا اس جگہ کے (صالح) انقلاب حالات کا سبب بن جائے، لہٰذا تم کو یہاں کے حالات کے بارے میں ہرگز پریشان نہ ہونا چاہئے اب، نہ آئندہ، والسلام والاکرام۔

مکتوب بست وسوم

بجانب

شیخ محمد عاشقؒ

حقائق ومعارف آگاہ، سجادہ نشین اسلاف کرام شیخ محمد عاشق سلمہ اللہ تعالیٰ، فقیر ولی اللہ عفی عنہ کی جانب سے بعداز سلام محبت التیام مطالعہ کریں۔

رقیمۂ گرامی پہنچا، اس میں لکھا تھا کہ "ہنگامۂ افغان" کی خبر گرم ہے، اس وقت مناسب یہ ہے کہ آپ اس طرف (یعنی پھلت) منتقل ہو جائیں، ان دنوں یہ بات بھی تو مشہور ہو رہی ہے کہ کچھ عرصہ سے افغان لاہور میں ٹھہرا ہوا ہے اور جس بات سے لوگ ڈر رہے تھے کہ وہ غارت گری کا بازار گرم کرے گا ایسا نہیں ہوا، بلکہ وہ رعیب کو اور (یہاں کے) سپاہیوں کو تسلی دے رہا ہے، اس مرتبہ اس گروہ افغانان کے پیش نظر ماضی کے برخلاف ملک داری ہے نہ کہ غارت گری، واللہ اعلم بحقیقة الحال

اس کے باوجود دل میں یہ بات بھی آتی ہے کہ اس حادثہ میں جس کا وقوع ضرور ہوگا، بعض نفوس کا وجود ضروری ہے، نظر رحمت الٰہی اس شخص کی طرف متوجہ ہے، حضرت حکیم جل مجدہ کی یہ بھی طاقت ہے کہ عین تلاطم میں خوشی اور کشادگی پیدا فرمادے اور آگ گلزار ہو جائے، جیسا کہ آب نیل، مجوبین کے لئے بلا بن گیا تھا اور محبوبین کے لئے نعمت، میرا دل تو بالکل مطمئن ہے، میں شور وغوغا کو کسی شمار میں نہیں لاتا۔

لطف علی خاں، دیوان خواب بہادر اپنے آقا کا پیغام میرے پاس لائے یعنی اس بلا (ہنگامۂ افغان) کے دفع کرنے کے لئے میں کوئی دعا کروں، میں نے ان کے سامنے یہ دعا کی، ''اے اللہ! امت محمدیہؐ کی اصلاح فرما، اے اللہ! امت محمدیہؐ کے گناہ بخش دے''۔

یہ دعا کر کے میں نے کہا کہ ہماری تو یہ دعا ہے، لطف علی نے کہا کہ میں تو بادشاہ کے لئے افغانوں پر فتح ونصرت کی دعائے خاص چاہتا ہوں، میں نے کہا دعائے زبانی تو زبانی جمع خرچ کے طور پر ہوسکتی ہے مگر تہہ دل سے دعاء داعیۂ الٰہیہ پر موقوف ہے اور وہ داعیہ میں اپنے دل میں نہیں پا رہا ہوں، ہر چند یہ بات ان پر شاق گزری، مگر حقیقت کا اظہار کر دیا گیا۔

سید محمد نعیم، اس فتنہ کے دوران اپنے گھر میں بیٹھنا لازم جانیں، والسلام۔

مکتوب بست و چہارم

بجانب

شیخ محمد عاشقؒ

حقائق و معارف آگاہ، سجادہ نشین اسلاف کرام، شیخ محمد عاشق سلمہ اللہ تعالیٰ۔

فقیر ولی اللہ عفی عنہ کی طرف سے بعد از سلام محبت التیام مطالعہ کریں۔

الحمد للہ علی العافیۃ والسلامۃ، حقیقت حال تمہارے مکاتیب بہجت اسالیب سے واضح ہوئی، اللہ تعالیٰ ہمیشہ محفوظ رکھے اور راحت و اطمینان اور یسر کا معاملہ فرمائے۔ اِنَّهٗ قَرِيْبٌ مُّجِيْبٌ

گسائیوں کے غلبہ سے جو سہارنپور کے نواح میں رونما ہے۔ دل میں تردد تھا، آخر اس کلمہ کی طرف رجوع کرنے سے جو ابھی ذکر کیا گیا (اِنَّهٗ قَرِيْبٌ مُّجِيْبٌ) اس تردد کو رفع کیا، والسلام۔

مکتوب بست وپنجم

بجانب

شیخ محمد عاشقؒ

حقائق ومعارف آگاہ، سجادہ نشین اسلاف کرام شیخ محمد عاشق سلمہ اللہ تعالیٰ فقیر ولی اللہ عفی عنہ کی طرف سے بعد از سلام محبت مشام مطالعہ کریں، عافیت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ہے، ہم اللہ تعالیٰ سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ تم کو جمیع آفات وبلایا سے محفوظ رکھے۔

رقیمۂ کریمہ پہنچا، اور اس کی طرف انتشار فساد گسائیں کے سبب جو پریشانی لاحق ہوگئی ہے وہ بھی معلوم ہوئی۔

امید قوی ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے طریقے سے جس کا لوگ گمان بھی نہ کرسکیں گے اس اضطراب وپریشانی کو اطمینان وامن سے بدل دے گا، "اللہ تعالیٰ پر یہ بات دشوار نہیں ہے"، والسلام۔

مکتوب بست وششم

بنام

شاہ شیخ محمد عاشق پھلتیؒ

جمعرات کے دن بادشاہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ اور دیگر مشائخ کے مزارات کی زیارت کرنے کے لئے سوار ہو کر گیا تھا، مجھے پہلے سے اطلاع دیئے بغیر کابلی دروازے سے سادہ تخت پر سوار ہو کر غریب خانے پر وارد ہوا، فقیر کو کوئی اطلاع ہی نہ تھی، مسجد میں بوریوں پر آ کر بیٹھ گیا، اس قدر توقیر سلطان کرنا لازم ہوئی کہ فقیر جس مصلیٰ پر بیٹھتا ہے اور نماز ادا کرتا ہے اس کو اس طریقے سے بچھا دیا گیا کہ اس کی ایک جانب فقیر بیٹھ گیا اور دوسری جانب بادشاہ، بادشاہ نے اوّل مصافحہ کیا بڑی تعظیم کے ساتھ، بعد ازاں کہا، میں مدت سے آپ کی ملاقات کا مشتاق تھا لیکن آج اس جوان کی رہنمائی میں یہاں پہنچا ہوں، اشارہ وزیر کی طرف کیا، پھر کہا کہ غلبۂ کفر اور رعیت کا تفرق وانتشار اس درجہ پر پہنچ گیا ہے کہ سب کو معلوم ہے، چنانچہ مجھے تو سونا اور کھانا پینا دوبھر اور تلخ ہو گیا ہے، اس بارے میں آپ سے دعا مطلوب ہے، میں نے کہا کہ پہلے بھی میں دعا کرتا تھا اور اب تو انشاءاللہ اور زیادہ دعاء میں مشغول رہوں گا۔

اسی دوران میں وزیر نے مجھ سے کہا کہ حضرت بادشاہ پانچوں وقت کی نماز کا بڑا اہتمام فرماتے ہیں، میں نے کہا، الحمدللہ! یہ وہ بات ہے کہ ایک مدت کے بعد سننے میں آ رہی ہے ورنہ ماضی قریب کے بادشاہوں میں سے کسی میں یہ نماز کی پابندی سننے میں نہیں آئی تھی۔

بادشاہ نے (مجھ سے مخاطب ہوکر) کہا علماء انبیاء کے وارث ہیں، جب تک ایسے کاموں میں دعائے اہل دل شامل نہیں ہوتی، کامیابی نہیں ہوتی، اس لئے کہ پادشاہان دین علماء اور اہل دل ہیں بلکہ صحیح ہے کہ وہ دین ودنیا دونوں کے بادشاہ ہیں، دنیا کا کام بھی ان کی توجہ کے بغیر انجام پذیر نہیں ہوتا ہے، اس گفتگو میں بادشاہ نے بڑی تواضع اور عاجزی ظاہر کی، میں نے کہا کہ ایک فقیر کی جھونپڑی میں اگر کوئی بادشاہ آئے تو اس کی غرض اللہ کے لئے تواضع کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوگی۔

حدیث شریف میں آیا ہے......

''جس نے اللہ کے لئے تواضع اختیار کی اس کو اللہ نے بلند کردیا''۔

آپ کو اس جامع حدیث کے ذریعہ بشارت مند ہونا چاہئے، بعد ازاں فقیر نے (بادشاہ سے) کہا حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت عمر فاروقؓ کو خلیفہ بناتے وقت بطور وصیت یہ الفاظ ارشاد فرمائے تھے۔

''خلیفہ کو بھی عجیب عجیب مشکلات درپیش ہوتی ہیں، اعدائے دین کی طرف سے بھی اور موافقین کی طرف سے بھی، ان تمام مشکلات کا بس یہی ایک علاج ہے کہ مرضیات حق کو اپنا نصب العین بنا کر حق تعالٰی سے ہی مدد طلب کی جائے اور اس کے غیر سے قطع نظر کر لی جائے''۔

اس کے بعد میں نے بادشاہ کو ایک تسبیح دی، اس نے ''تعظیم تمام'' کے ساتھ اس کو لیا پھر میں نے کہا کہ یہ آیت فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِیَ اللّٰهُ الآیة سوسو بار ہر نماز کے بعد پڑھنی چاہئے، آپ کے معاملات میں یہ عمل نافع ہوگا، بادشاہ نے قبول کیا، اس کے بعد اپنا ہاتھ مصافحہ کے لئے دراز کیا، میں نے مصافحہ کیا، پھر وہ کھڑا ہوا اور سوار ہوگیا۔

بالجملہ بادشاہ خوش نیت، سخی اور نماز پنج گانہ کا پابند ہے، کوئی فسق وفجور کی علامت اس پر نمایاں نہیں تھی، اس کی داڑھی مونچھ شریعت کے مطابق تھی، زبان ہندی وفارسی درست ہے، عربی میں کوئی مہارت نہیں رکھتا، عقل وتدبیر میں، اگرچہ عالمگیر اورنگ زیب کی مانند تو نہیں کہا جاسکتا، مگر ہاں بظاہر بہادر شاہ (اوّل) کی مثل تو ہوگا، واللہ اعلم۔

مکتوب بست وہفتم

بنام

مولانا سید احمد

سیادت مرتبت، نقاہت منقبت، خلاصہ دودمان نجابت مولانا السید احمد سلمہ اللہ تعالیٰ و ابقاہ ومتع المسلمین بصحبتہ و لقیاہ.

بعد از سلام مسنون اسلام فقیر ولی اللہ کی طرف سے مطالعہ فرمائیں، عافیت پر اللہ کی حمد ہے اور اس لئے یہ دعا ہے کہ وہ ہم کو اور آپ کو ہمیشہ عافیت سے رکھے، وہ احباء جو وہاں سے اس طرف آئے وہ آنجناب سیادت مآب کے شکریے سے تر زبان تھے کہ آپ نے روہیلوں کے لشکروں کو بادشاہ اسلام کی رفاقت کی طرف رغبت دلائی، نیز مسلمانوں کے جان و مال کی حفاظت کی اور ان کی (حملہ آوروں) کے حملہ و غارت گری سے اس طرح محفوظ رکھا کہ اس سے زیادہ متصور ہی نہیں، فقیر ان سب باتوں کے سننے سے بہت مسرور ہوا اور آپ کے لئے دنیا و آخرت میں بلندی مرتبہ کی دعا بھی کی، آپ بھلا ایسا کیوں نہ کرتے آپ کے تو ضمیر میں جوہر غیرت دینی و حق شناسی ودیعت کیا گیا ہے، فی الواقع اس جماعت اشقیاء نے بغاوت، قطع طریق، دشمنان دین حق سے مدد طلب کرنا، ان کو بلاد مسلمین پر مسلط کرنا اور انتہائی درجہ کا رفض ان سب باتوں کو اپنے اندر جمع کرلیا ہے، اس جماعت کی سزا یہی ہے کہ وہ آپ کے دل سے اتر جائیں اور آپ اپنی پوری توجہ ان کے دفع کرنے میں لگادیں، وہ جماعت جس کے دل میں ابھی حق بات نہیں بیٹھی، مکرر اس کو ترغیب دی جائے، اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے اور ہمارے اور آپ کے امور کا انجام اچھا کرے، نیز آپ کو اس مقام بلند تک پہنچائے جس کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا ہو اور نہ کسی کان نے سنا ہو۔

محمد وفا آپ کے مخلصوں میں سے ہیں، امید کہ زیر عاطفت ہوں گے، والسلام۔

مکتوب بست و ہشتم

بجانب

وزیر الممالک آصف جاہ

الحمدللہ والسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

بعد حمد وصلوٰۃ کے اس فقیر کی طرف سے جناب کو واضح ہو کہ عالم ملکوت میں یہ بات مقرر شدہ ہے کہ مخالفین اسلام ذلیل وخوار ہوں گے، بعد ازاں باغی لوگ رسوا اور خانہ خراب ہوں گے، اگر جناب عالی ان بدمعاشوں کے مقابلہ میں کمر ہمت باندھ کر آجائیں تو یہ تمام کارنامے جناب کی طرف منسوب ہوں گے اور دنیا آپ کی تابعدار ہو جائے گی اور ملت مرحومہ کے رواج اور مسلم حکومت کی استقامت کا باعث جناب عالی کو قرار دیا جائے گا۔

کوشش تھوڑی اور فوائد عظیم الشان مرتب ہوں گے، اگر آنجناب کوشش نہ فرمائیں گے تو یہ تمام مخالف عنصر "آسمانی حادثات" سے ہلاک و مضمحل ہو جائے گا، اس صورت میں جناب عالی کی طرف کوئی نیک نامی کی بات منسوب نہ ہو سکے گی۔

(ترجمہ شعر فارسی) اے محبوب اصل میں تو تیری زلف کا کام مشک افشانی کرنا ہے،
لیکن مصلحت کی بنا پر "آہوئے چین" کی طرف مشک کو منسوب کر دیا گیا ہے۔

چونکہ یہ حقیقت بالکل یقینی ہے اس لئے آں عزیز القدر سے بے اختیار کہی گئی اور لکھی گئی، وقت کو غنیمت جانئے اور مخالفین کے مقابلہ میں جدو جہد کرنے میں ذرہ برابر کوتاہی جائز نہ رکھے

کچھ عرصہ کے بعد کام خود بخود واضح ہو جائے گا۔

(ترجمہ شعر عربی (۱)) ''جس وقت گرد و غبار ہٹے گا تو عنقریب دیکھ لے گا کہ تیری سواری میں گھوڑا تھا، یا گدھا یعنی عنقریب حقیقت حال کھل جائے گی''۔

چونکہ ایک امر حقیقت کا اظہار مطلوب تھا، اور درستی و خیر خواہی مقصود تھی، اس لئے کسی قدر مبالغہ سے بھی احتراز نہیں کیا گیا، اس سے زیادہ کھول کر بات کرنا مشکل ہے۔

گوئے توفیق وکرامت درمیاں افگندہ اند
کس بمیداں در نمی آید سواراں راچہ شد (۲)

یعنی توفیق وکرامت کی گیند میدان میں ڈال دی گئی ہے، سواروں میں سے کوئی بھی میدان میں نہیں آتا، آخر انہیں کیا ہو گیا ہے؟ وہ بات کہ جو اپنے راز داروں سے در پردہ کہا کرتا ہوں اس مقام پر بے پردہ لکھی گئی ہے تاکہ عذر کا موقع باقی نہ رہے، والسلام والاکرام۔

مکتوب بست ونہم

بنام

وزیرالمما لک آصف جاہ

...... بعد حمد وصلوٰۃ فقیر ولی اللہ عفی عنہ کی جانب سے واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے شجر اقبال کے نئے میوے کو مبارک ومسعود کرے اور اس درخت سعادت (آپ) کی پرورش میں بے اندازہ پرورشیں عطا فرمائے، آمین، بقیۃ الکلام یہ ہے کہ حکیم مطلق جل شانہ نے آدمی کو دو چیزوں سے مرکب فرمایا ہے، ایک بدن عنصری جو کہ حسی خواہشوں کا متقاضی ہے، دوسرے روح جو کہ عقائد حقہ اور اعمال نافعہ کی خواہشمند ہے، یقینی طور پر آدمی کی سعادت بھی جسم وروح دونوں سے متعلق ہے، فطرت سلیمہ رکھنے والے حضرات دونوں قسم کی سعادتیں جمع کرتے ہیں، فقط ایک ہی قسم پر اکتفا نہیں کرتے جس طرح غذائے روح ضروری ہے (اسی طرح غذائے جسم بھی ضروری ہے) کیونکہ ان دونوں میں سے کسی ایک کے نہ ہونے سے مزاجِ روح درہم برہم ہو جاتا ہے، مسلمانوں سے مظالم کا دفعیہ کرنا اور دین کی اشاعت کرنا، نیز رسوم نیک جاری کرنا سراپا سعادت در سعادت ہے، والسلام۔

مکتوب ۳۰

بجانب

وزیر الممالک آصف جاہ

خدائے تعالیٰ بے نہایت ترقیات عطا فرمائے اور دونوں جہان کی نعمتوں سے خوش اور دونوں جہاں کی مصیبتوں سے محفوظ رکھے، بعد اس دعاء کے واضح ہو کہ بابا فضل اللہ نے ہم سے بعض باتوں کا استفسار کیا، فقیر کے دل میں یہ آیا کہ ان باتوں کا جواب بزبان قلم واضح کیا جائے۔

یہ تمام سختیاں جو ظاہر ہو رہی ہیں فقیر کے اعتقاد میں اس کا سبب وہ کوتاہی عمل ہے جو جنگ مرہٹہ کے سلسلے میں اختیاری یا اضطراری طور پر واقع ہوئی، جن دنوں فقیر نے آگاہ کیا تھا، اس وقت کام ہوتا تو عجیب عجیب رحمتیں پیش گاہ خداوندی سے (وقت کی سازگاری کی وجہ سے) بارش کی طرح برس جاتیں، اگرچہ محسوس ایسا ہوتا ہے کہ تقدیر، حوادث کو شامل ہے، لیکن کارخانہ حکمت الٰہی میں ہر کام کسی نہ کسی خیر سے وابستہ ہے، خیر جو بات گزر گئی وہ گزر گئی۔

قضیۂ قطب خاں (۱) افغان کے متعلق اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے یہ امید ہے کہ عنقریب ختم ہو جائے گا، ظاہرا ایسا ہوتا ہے کہ یہ شخص سرسبز نہیں ہوگا اور اپنے باطل مدعا کو حاصل نہیں کر سکے گا جو کچھ فقیر کو معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ آں عزیز القدر منصور و مظفر اور محفوظ و محظوظ ہیں۔

بادشاہ کا باہر جانا مناسب نہیں، ان کا یہیں رہنا بہتر ہے، البتہ شاہزادوں میں سے آپ جس کو چاہیں اپنے ہمراہ لے لیں، بقیہ کلام یہ ہے کہ آں عزیز القدر کو خدائے عزوجل نے

ہندوستان پر پورا تسلط بخشا ہے، ہم لوگ بڑی بڑی امیدیں قائم کئے بیٹھے ہیں کہ آپ کے ذریعہ رفع مظالم، تغیر رسوم بد، ترویج دین حق، اقامت امر خیر، اشاعت علم ونماز وروزہ، یہ سب کچھ عمدہ طریقے پر ہوگا اس لئے کہ آپ کے اندر ایک عجیب شان اور سعادت محسوس ہوتی تھی اور آپ کا مزاج بھی صلاحیت، ذکاوت اور رغبت امور خیر لئے ہوئے معلوم ہوتا تھا، شاید مقتضیات زمانہ کی وجہ سے ابھی تک مذکورہ بالا امور خیر میں کسی کا ظہور نہیں ہوسکا، خدا کرے کہ اس کے بعد تلافی مافات ہوجائے، اس قدر البتہ گزارش ہے کہ فی الحال جس قدر طاقت ہو گرانیٔ غلہ دور کرنے میں سعی بلیغ فرمائیں، (۲) اور اطراف عالم میں جو لوٹ مچ رہی ہے اس کو حتی الامکان ختم کرنا بھی ضروری ہے، والسلام۔

مکتوب سی و یکم

بجانب

نواب فیروز جنگ نظام الملک احمد شاہی

قادر بیچون آں عزیز القدر کو ترقیات ظاہر و باطن سے بہرہ مند کرے، وہ مکتوب جو سرونج سے تحریر کیا گیا تھا پہنچا، چونکہ وہ خط صحت مزاج اور درستی احوال کی اطلاع پر مشتمل تھا اس لئے وہ موجب مسرت و فرحت ہوا، حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو یہ وصیت کی تھی کہ جب تم اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو گے تمام عالم تم سے ڈرے گا۔

بزرگوں نے فرمایا ہے کہ دنیا سایہ کی طرح ہے، اگر تو اس سے بھاگے گا تو وہ تیرے پیچھے پیچھے دوڑے گی اور اگر تو دنیا کے پیچھے دوڑے گا تو وہ تجھ سے گریز کرے گی۔

اللہ تعالیٰ نے آں عزیز القدر کو اس زمانے میں اہل سنت و جماعت کا پشت و پناہ بنایا ہے، فرقۂ امراء میں آپ کے علاوہ کوئی حامی اہل سنت نہیں رہا، امید کہ تمام حالات میں ترویج سنت کو منظور نظر رکھیں گے، آپ نصرت اسلام کی طرف پوری پوری توجہ کرنے اور مطالب دنیوی کو دوسرے نمبر پر رکھنے کو بہت ہی نفع مند اور مفید پائیں گے، قرآن مجید میں ہے "اگر تم اللہ کے دین کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا"۔ آج عمل صالح کا سواں حصہ انجام دیا جائے گا اس کو ماضی کے سیکڑوں اور ہزاروں اعمال صالحہ کی برابر سمجھنا چاہئے، والسلام۔

مکتوب سی ودوم

بجانب

نواب مذکور (یعنی نواب فیروز جنگ نظام الملک احمد شاہی)

خدائے تعالیٰ ترقیات ظاہر وباطن عنایت فرمائے، نیز اعلاء کلمۃ اللہ اور نصرت دین اللہ کی توفیق عطا فرمائے۔

فقیر ولی اللہ کی طرف سے بعد سلام واضح ہو کہ ہم آپ کے لئے دعائے خیر کرتے ہیں اور توقع رکھتے ہیں کہ آسانی اور معونت الٰہی آپ کے شامل حال ومآل ہوگی، ہمارے مشائخ قدس اللہ اسرارہم نے فرمایا کہ آفتاب کے نکلنے کے وقت ''یا عزیز'' اکتالیس بار پڑھنا اور اس کے بعد یا اللہ الا لہ الرفیع جلالہ، پندرہ بار پڑھنا زیادت عزت وغلبہ کا موجب ہوتا ہے، چونکہ آسان وظیفہ ہے اس لئے اس کو پڑھنا چاہئے، والسلام۔

مکتوب سی وسوم

بطرف

عمادالملک

(ان کی ایک عرضداشت کے جواب میں)

اللہ تعالیٰ عالی جناب کی ذات گرامی کو اپنی حفاظت میں رکھے اور تمام حالات میں دنیا اور آخرت کی بھلائی کی جانب دلالت فرمائے۔

اس فقیر کی طرف سے بعد سلام محبت التزام واضح ہو کہ آپ کا نامہ مشکیں شمامہ پہنچا جس میں اس بات کی اطلاع دی کہ آپ نے اس سے پہلے کوئی مکتوب بھیجا تھا؟ اور اس کا جواب نہیں ملا (درحقیقت) اس سے پہلے آپ کا کوئی خط (یہاں) نہیں پہنچا ہے ورنہ جواب میں کوتاہی نہ کرتا، شاید وہ خط قاصد کے ہاتھ سے ضائع ہو گیا ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ میں آں عزیز القدر کی دوستی کے حقوق کا معترف ہوں اور یہ شرط آدمیت ہے کہ حقوق دوستی کا اعتراف کیا جائے، باقی رہا الہام محبت، خاص وضع پر کہ اہل اللہ اس وضع کو پہچانتے ہیں نہ کہ دوسرے لوگ، پھر اس محبت کا نکل جانا، پھر اس محبت کا اپنے وقت پر لوٹ آنا، یہ باتیں اس قبیل سے نہیں ہیں کہ بندے کے اختیار کو اس میں کوئی دخل ہو۔

اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی وسعت وطاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔

در پسِ آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند
ہر چہ استاذ ازل گفت بگوی گویم

صاحب من! مجھے صاف صاف بات کہنی چاہئے تا کہ (کامیابی کے) انتظار سے آپ کا دل ملول نہ ہو، (وہ یہ ہے کہ) ابھی آپ کے آزمائش اور ابتلاء کے ایام ختم نہیں ہوئے ہیں، ان ایام میں سوائے اس کے کہ حفاظت جان کی سعی کرلی جائے اور کچھ بس کی بات نہیں ہے اور یہ بات (جان کی حفاظت) بروئے کار آئے گی، اغلب یہ ہے کہ آپ سلامت رہیں گے، اگر چہ شور و غل اور ہنگامے پیش آئیں گے، آزمائش کے ایام گزرنے پر وہ ترقی جو کہ سابق میں رکھتے تھے اس کی توقع ہرگز نہیں کرنی چاہئے وہ ترقی اب کہاں ع

زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز

عقلمندی کا کام یہ ہے کہ اپنے اوقات عزیز کو ایسے امر کے حاصل کرنے کی فکر میں صرف نہ کریں جو متصور اور متوقع نہیں ہے، اور (ترقی سابق کے) فقدان سے رنجیدہ نہ ہوں، یہ امید ہے کہ ایام آزمائش کے ختم ہونے اور سلطنت ہندوستان کی استقامت پر ظاہراً و باطناً پوری پوری کوشش کرنے کے بعد کوئی اچھی ملازمت میسر ہو جائے۔

علاوہ ازیں آپ نے لکھا تھا کہ ایک عزیز کے ذریعے ایسے پیغام ملاقات آرہے ہیں جو قسم کے ساتھ موکد ہیں اس بارے میں کیا مشورہ ہے؟

صاحب من! جس سے مشورہ لیا جاتا ہے وہ امین ہوتا ہے جب آپ نے میری رائے دریافت کی ہے تو مجھے لازم ہے کہ دل میں جو بات آئے اس کو بیان کردوں، اس کے موافق کرنا نہ کرنا آپ کا کام ہے، اس قوم کے قول وقرار کا کوئی اعتبار نہیں ہے، جس عزیز کا آپ نے نام لکھا ہے وہ بھی رئیس کے نزدیک اتنا اعتبار نہیں رکھتا کہ قول وقرار پر اعتماد کیا جائے، ہجوم و غلبہ قوم کے وقت مصلحت یہی ہے کہ غیر حاضر رکھا جائے، یہاں تک کہ اچھے دن آئیں، والسلام۔

مکتوب سی و چہارم

بطرف

تاج محمد خاں بلوچ

رفعت دعوالی مرتبت عزیز القدر نواب تاج محمد خاں محفوظ محظوظ اور بہ نظر عنایت خداوندی ملحوظ رہیں، فقیر ولی اللہ عفی عنہ کی جانب سے بعد سلام محبت التزام کے واضح ہو کہ آپ کا مکتوب گرامی جاٹوں کی سرکشی سے متعلق پہنچا، اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے امید یہ ہے کہ وہ مخالف کو پامال کردے گا، خاطر جمع رکھیں، اندریں حالت ضروری ہے کہ:۔

آں عزیز القدر، موسیٰ خاں اور دیگر جماعت مسلمین کے ساتھ موافقت کریں اور آپس میں دوستی و یک جہتی کو کام میں لائیں اور اپنی طاقت کو دشمنوں کے مقابلہ میں صرف کریں، غالب امید ہے کہ اجتماع مسلمین اور ان کی حسن عزیمت کی برکت سے تازہ فتح نصیب ہوگی، اللہ تعالیٰ قرآن عظیم میں فرماتا ہے اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ، یعنی اگر تم اللہ کے دین کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا۔

اس زمانے میں دشمنان دین کے غالب ہونے اور مسلمانوں کے مغلوب ہونے کا سبب سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ مسلمان اپنے اغراض نفسانی کو درمیان میں لاتے ہیں اور ہنود کو اپنے کاروبار میں دخیل بناتے ہیں، ظاہر ہے کہ ہنود غیر مسلموں کا استیصال گوارا نہ کریں گے، دور اندیشی اور تحمل محمود شے ہے لیکن اتنی نہیں کہ غیر مسلم مسلمانوں کے شہروں پر غالب آتے چلے جائیں

اور ہر روز ایک شہر پر قبضہ کرتے رہیں، یہ وقت تحمل اور مصلحت اندیشی کا نہیں ہے، یہ وقت خدا پر بھروسہ کرنے اور استعداد حرب ظاہر کرنے اور غیرت مسلمانی کو جوش میں لانے کا ہے اگر آپ ایسا کریں گے تو اغلب ہے کہ ''نسیم نصرت'' چلنی شروع ہو جائے گی، فقیر جو کچھ جانتا ہے وہ یہ ہے کہ جنگ جاٹ ایک طلسم ہے کہ اوّل اوّل خوفناک وخطرناک معلوم ہوتی ہے جس وقت اللہ تعالیٰ کی قدرت پر پورا پورا توکل واعتماد کرکے اس جانب توجہ واقع ہوگی تو ظاہر ہوگا کہ سوائے نمائش کے وہاں کچھ نہ تھا، امید کہ اپنے حالات اور استعداد حرب کی کیفیت سے اطلاع دیتے رہا کریں گے، یہ چیز دعائے محافظت ونصرت میں مدد ومعاون اور سلسلۂ جنباں ہوگی، والسلام۔

مکتوب سی و پنجم

بطرف

نواب مجد الدولہ بہادر

خدائے عزوجل محفوظ و محظوظ اور اپنی چشم عنایت میں آپ کو ملحوظ رکھے اس وقت آپ کا والا نامہ پہنچا جس میں روداد لشکر اور ان ضعیف رایوں کی تفصیل تھی جن کو لوگ اپنے دماغوں میں پکارہے ہیں۔

عزیز قدر من! فقیر اس قدر جانتا ہے کہ عالم سکوت میں مرہٹہ و جٹ کا استیصال مصمم ہے اور وہ بعض اشخاص جنگی توجہ کو اس قسم کے امور کے حل و عقد میں عنایت فرمایا گیا ہے، ان مخالفین کے استیصال کی دعا کرنے کے لئے برابر مامور ہیں، اگر یہ بات نہ ہوتی تو دن بدن آپ کے دل میں ن کے استیصال کا جذبہ موجزن نہ ہوتا۔

اگر اس بد بخت کا آنا متحقق ہوا جو کہ سلطنت تیموریہ کی تخریب کے درپے ہے تو قول خداوندی ''اِنَّ کَیْدِیْ مَتِیْنٌ''یعنی میری تدبیر بڑی مضبوط ہے، کا مصداق بھی یقینی طور پر ظاہر ہوگا، اطمینان رکھیں، والسلام۔

مکتوب سی وششم

بجانب

نواب مجدالدولہ کشمیری

فرزند نبیل عزیز القدر مجد الدولہ بہادر، محفوظ ومحظوظ اور چشم عنایت سرمدی میں ملحوظ رہیں، فقیر ولی اللہ عفی عنہ کی طرف سے بعد سلام محبت التیام، واضح ہو کہ ایک مدت سے آپ کا کوئی مکتوب نہیں آیا جس میں آپ کے حالات ہم پڑھتے . غالباً آپ کاموں میں مشغول ہیں، پہلے سے آپ کا یہ قاعدہ ہے کہ پریشانیوں کے وقت اپنے حالات کے اظہار کے لئے آپ فارغ ہوتے ہیں اور جب کبھی کسی نہ کسی درجے میں ''گل مراد'' کھلنے کا وقت آتا ہے تو کاموں میں مشغول ہو جاتے ہیں، رسم جہاں اور اہل جہاں کچھ ہے بھی اسی طرح کی۔

دوسری بات یہ لکھنا ہے کہ حافظ جواہر خاں اور ان کے لے پالک غلام مصطفیٰ کے بارے میں جو کہ فقیر سے اخلاص کا معاملہ رکھتے ہیں، آپ نے جو توجہ مبذول فرمائی یا فرماتے رہتے ہیں، یہ بہت مناسب بات ہے، میں جہاں تک سمجھتا ہوں جواہر خاں نیک نفس آدمی ہے، خراش وتراش ادھر کی اُدھر اور اُدھر کی ادھر لگانا اور چغلی کھانا جو کہ بادشاہوں کے مصاحبوں کی سخت مضرت رساں عادت ہوتی ہے، یہ بات جواہر خاں کے مزاج میں نہیں ہے، اغلب یہ ہے کہ جواہر خاں کے مزاج میں تلون اور رنگ برنگی بھی نہیں ہے کہ ان کا مزاج ہر روز پلٹا کھاتا رہے...... اس زمانہ میں اسی قسم کے اشخاص چاہئیں کہ وہ بادشاہوں کے ہم کلام ہوں، جو شخص لگاؤ بجھاؤ کی عادت اور مزاج نہ

تلون رکھتا ہے، وہ ہر چند اوّل اوّل سبز باغ دکھائے مگر بے مزہ پھل اس سے پیدا ہوں گے، یہ دو تین باتیں جو میں نے لکھی ہیں ان میں اچھی طرح غور کرنا چاہیے، بابا فضل اللہ نے غلام مصطفیٰ کے بارے میں آپ کی توجہ اور ان کے مکان سے ''چوکی'' کے اٹھا لینے کو لکھا، اس سے میری طبیعت کو مسرت حاصل ہوئی، وجہ مسرت یہ ہے کہ غلام مصطفیٰ مجھ سے اخلاص صمیم رکھتے ہیں اور اچھی طبیعت کے انسان ہیں، والسلام۔

www.KitaboSunnat.com

مکتوب سی و ہفتم

بطرف

نواب مجد الدولہ عبد الاحد خاں

فرزند نبیل، رفعت نشان عزیز القدر مجد الدولہ، عین عنایت خداوندی میں ملحوظ اور آفات سے محفوظ رہیں۔

آپ کا گرامی نامہ پہنچا جس کے ذریعہ وہاں کے واقعات کا علم ہوا نیز اہل غرض کا آنا اور مشرک کا طلب کرنے کا حال معلوم ہوا۔

عزیز قدر من! بعض امور ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے اسباب ارضی ضعیف نظر آتے ہیں بلکہ اسباب ملکوت بھی ضعیف ہوتے ہیں، (مگر) اللہ تعالی اپنے کسی بندے کے دل میں اس بات کا القاء فرماتا ہے کہ اس کام کے لئے اپنی ہمت کو مضبوط کرلیں، تاکہ اس مراد حق کے مطابق جو غیب الغیب میں ہے، اور جس کا کوئی اثر و نشان خارج میں اور ملکوت میں محسوس نہیں ہوتا، وہ کام پورے طریقے سے متحقق ہو جائے، یہ آپ کا کام بھی اسی قسم کا ہے، اگر تمام اسباب ارضی خلاصی جت پہ مجتمع ہو جائیں تب بھی سنت اللہ سے امید قوی یہی ہے کہ یہ لوگ خلاصی نہیں پائیں گے مگر یہ بات ضرور ہے کہ وجود مراد کے وقت تک بہت کچھ نشیب و فراز آئیں گے، اطمینان کرنے اور وساوس کو دور کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے، اس سلسلہ میں مبالغہ کرنا کوئی فائدہ نہیں دیتا ہے، ہر شے اپنے وقت کے ساتھ متعلق ہوتی ہے، والسلام۔

مکتوب سی و ہشتم

بجانب

نواب مجد الدولہ کشمیری

فرزند جلیل عزیز القدر مجد اللہ تعالیٰ، محفوظ اور چشم عنایت سرمدی میں ملحوظ رہیں۔

نامہ گرامی ایک مدت کے بعد ملا، مشرک معلوم اور اس کے دخیل کار ہونے کی وجہ سے آپ کو جو ملال خاطر تھا الحمد للہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا تدارک اچھے طریقے سے کر دیا ہے، بالفعل سلطنت اس شخص کے لئے مقرر ہوئی ہے جو مشرک معلوم کے ساتھ اور اس شخص کے ساتھ ہرگز موافقت اور ساز باز نہ کرے گا جو سابق میں سلطنت پر تسلط رکھتا تھا اور مشرک معلوم کی ڈینگیں مارنا اور بڑھ بڑھ کر باتیں اس تسلط والے شخص ہی کے ذریعہ تھیں۔

نیرنگ زمانہ کبھی کچھ دنوں اس (تسلط والے) کو اوپر اٹھاتا ہے اور کبھی سرنگوں کر دیتا ہے۔

متولیہ امور کے اطوار کے بارے میں اور اس کے ناواقف و نادان لوگوں سے باتیں سننے کے سلسلے میں جو آپ کو تشویش ہے (اس کے متعلق یہ لکھا جاتا ہے) کہ یہ تولیت اور برداشت بھی عارضی ہے۔

مکرر مرقوم کیا جاتا ہے کہ زمانہ اپنے اندر بہت کچھ پست و بلند رکھتا ہے، پھر آپ دل کے خواہ مخواہ کیوں پریشان کرتے ہیں؟

الحمد للہ، فقیر کسی سے غبار نہیں رکھتا، آں عزیز القدر سے کہ اخلاص مصمم رکھتے ہیں، کس لئے

غبار رکھے گا۔

نصیحت کی باتیں اس لئے لکھی جاتی ہیں کہ آپ کی تشویش خاطر کا علاج ہو جائے۔

زمانہ اور اہل زمانہ یہی لوگ ہیں، بھروسہ صرف کارساز بندہ نواز کے فضل وکرم پر کرنا چاہئے، اور لوگوں کی طرف سے کوئی ملال دل پر نہیں لانا چاہئے، اپنی خیریت کو اور حالات کو جیسے بھی ہوں مفصل لکھتے رہیں، آپ کی سرگزشتوں کے مطالعہ سے کوئی زحمت نہیں ہوتی بلکہ آپ کے حالات کے نہ معلوم ہونے سے تکلیف ہوتی ہے اور تلخی انتظار برداشت کرنا پڑتی ہے، زیادہ کیا لکھوں، والسلام۔

مکتوب سی ونہم

بطرف

نواب عبید اللہ خاں کشمیری

آپ کو خدائے عز وجل محفوظ مخطوظ اور اپنی چشم عنایت میں ملحوظ رکھے، گرامی نامہ پہنچا، آپ نے علاقہ جات میں اقامت کرنے کے لئے دریافت کیا تھا، عزیز القدر! ایک جماعت کے دل پر بار بار ہر دو گروہ کے استیصال کے لئے دعا کرنے کا جذبہ پیدا ہو رہا ہے، ہرگز ان کے درمیان سکونت پذیر نہ ہونا چاہئے، اگر اس زمانہ میں حج کا ارادہ کریں سب سے بہتر رہے گا، دنیا میں بھی اور آخرت کے لحاظ سے بھی، اگر ممکن ہو سکے تو وہاں سے منتقل ہونا ضروری ہے، اگر حج بیت اللہ کریں گے تو انشاء اللہ تعالیٰ واپسی کے بعد بہت سے فائدے اپنی آنکھوں سے ملاحظہ کریں گے، یہ فتنہ کا زمانہ ہے کیوں دو سال تک خواہ مخواہ خوف وخطر میں اپنے آپ کو رکھا جائے، والسلام۔

مکتوب چہل

بجانب

حافظ جاراللہ (پنجابی)

...... دہلی میں ایک حادثہ عظیم واقع ہوا، قوم جاٹ نے دہلی کے شہر کہنہ کو لوٹا اور حکومت اس فساد وشرارت کو دفع کرنے سے عاجز رہی، انھوں نے مال لوٹے، عزت وناموس کو برباد کیا اور مکانات کو آگ لگائی، اللہ تعالی نے مجھ کو بمع اہل وعیال و مال ومکانات کے ان کے دست ستم سے محفوظ رکھا، اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے، نیز اللہ تعالی نے ہمارے بھائی کی کتابوں کو بھی ہماری کتابوں کے ساتھ محفوظ رکھا، اور یہ لوٹ مار کا حادثہ اوائل رجب ۱۱۶۱ھ میں ہوا، اور آخر شعبان تک باقی رہا(۱)۔

مکتوب چہل و یکم

بجانب

میاں نازگل خاں

خلاصہ دودمان مروت، میاں نیاز گل خاں سلمہ اللہ تعالیٰ۔

فقیر ولی اللہ عفی عنہ کی طرف سے بعد سلام محبت التیام مطالعہ کریں۔

آں عزیز القدر کے خطوط برابر پہنچتے رہتے ہیں، ان خطوط سے آپ کی عافیت وخیریت معلوم ہوتی ہے اور فقیر کا دل باغ باغ ہو جاتا ہے، حمد الٰہی بجالاتا ہوں، اکثر اوقات میرا دل آپ کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور چشم دل آپ کی جان و مال اور آبرو کی حفاظت کی طرف کشادہ رہتی ہے، پروردگار کے فضل سے امید یہ ہے کہ جان و مال اور آبرو کی خیریت کے ساتھ با کمال جمعیت وترقی معاونت کریں گے، نواب نجیب الدولہ کی جانب بھی چشم دل کھلی رہتی ہے، ان شاء اللہ تعالیٰ وہ بھی باکمال عزت وآبرو رہیں گے۔

مکتوب چہل ودوم

بجانب

ملا امان اللہ و ملا شیر محمد

فضائل دستگاہ ملا امان اللہ و ملا شیر محمد، حفظ الٰہی میں رہ کر دونوں جہان کی نعمتوں سے مالا مال رہیں، فقیر ولی اللہ کی طرف سے بعد از سلام محبت التیام مطالعہ کریں۔

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ عافیت سے ہوں اور آپ کی عافیت کا خداوند کریم سے طالب ہوں، عرصہ ہو گیا کہ آپ کے احوال کا ایک ورق بھی پڑھنے میں نہیں آیا، دل خیریت کا منتظر ہے، دیگر (آنکہ) جب بادشاہ (ابدالی) عازم ہندوستان ہوں تو آپ کے واقف کاروں اور مخلصوں میں سے جو شخص لشکر میں ہو، اس کو آپ تاکید کر دیں کہ فلاں شخص (ولی اللہ) شہر (دہلی) میں رہتا ہے، اگر ناگاہ فوج شہر میں داخل ہو تو اس کے متعلقین اور علاقے کی ہر ممکن حفاظتی تدبیر کی جائے، اگر کسی طالب علم کو ہمراہ لشکر کر دیں تاکہ اس مخلص کو بروقت یاد دلا دے تو یہ بہت احتیاط کی بات ہوگی، اور اگر کسی ایسے شخص کی تحریر جس سے بادشاہ اعتقاد رکھتا ہو ہمارے بارے میں لکھوالیں اور اس طالب علم کے ہمراہ کر دیں تو یہ بھی بہتر ہوگا۔

اگرچہ تمام امور وابستہ تقدیر الٰہی ہوتے ہیں لیکن توکل کو سبب کے ساتھ جمع کرنا انبیاء کی سنتوں میں سے ایک سنت ہے۔

ایسے شخص کے انتخاب میں طبیعت متردد تھی جو ان چاروں امور کے سرانجام پانے کا سبب ہو، بالآخر آپ حضرات سے بہتر جس کو لکھا جائے کوئی اور سمجھ میں نہیں آیا، والحکم للہ۔

حواشی

مکتوب اوّل

(۱) ''الدین النصیحة''، حدیث نبوی ہے: ''انما الدین النصح'' ابوالشیخ فی التوبیخ عن ابن عمر، ملاحظہ ہو، جامع الصغیر، سیوطی و مطبع میمنیہ مصر ۱۳۲۱ھ جلد اول ص ۸۹۔

امام بخاری نے اس حدیث کو بطور عنوان اس طرح درج کیا ہے۔

''الدین النصیحة للہ و الرسول و لائمة المسلمین و عامتهم''

بخاری، جلد ۱ ص ۱۳ (مطبع اصح المطابع، دہلی)

(۲) سرجدو ناتھ سرکار کا خیال ہے:۔

''اورنگ زیب کی شمالی ہندوستان سے غیر حاضری کا فائدہ سب سے پہلے جاٹوں نے اٹھایا، انھوں نے سب سے پہلے سلطنت کی فوجوں کا مقابلہ کیا، اور عسکری طرز پر اپنی تنظیم شروع کر دی، ہر جاٹ کسان کو تلوار چلانی سکھائی جاتی تھی اور اس کو بندوقیں وغیرہ دی جاتی تھیں، جاٹوں نے حملہ کرنے کے لئے جواڑے، اور لوٹ مار کا مال جمع کرنے کے لئے جو مرکز بنائے تھے وہ گڑھیاں کہلاتی تھیں، یہ چھوٹے چھوٹے قلعے ہوتے تھے جو گھسان جنگلوں میں بنائے جاتے تھے، مٹی کی دیواروں سے ان کو اتنا مضبوط اور مستحکم کر لیتے تھے کہ توپ خانہ کا مقابلہ کر سکتے تھے''۔

ملاحظہ ہو ''تاریخ اورنگ زیب'' جلد پنجم ص ۲۹۶-۷

(۳) خالصہ سے مراد وہ علاقہ ہے جو براہ راست مرکزی حکومت یعنی بادشاہ کے تحت ہوتا تھا، اس کے محاصل بادشاہ اپنے افسران کے ذریعہ وصول کرتا تھا، اس کے برخلاف جاگیر کا علاقہ ہوتا تھا جس کے محاصل جاگیردار وصول کرتے تھے اور جس کا براہ راست مرکزی حکومت سے کوئی تعلق نہ ہوتا تھا، ملاحظہ ہو۔

R. P. Tripathi, Some Aspects of Muslim Administration, P. 308.

دہلی کے ہر صاحب بصیرت فرمانروا کی یہ کوشش رہی ہے کہ خالصہ کا علاقہ بڑھایا جائے ایسی صورت میں بادشاہ، صوبائی گورنروں اور جاگیرداروں کے رحم وکرم پر نہیں رہتا اور مرکزی دفاتر اور محلات شاہی کے اخراجات کے لئے جس قدر روپے کی ضرورت ہوتی ہے وہ براہ راست بادشاہ کو ملتا رہتا ہے، علاوہ ازیں اگر صوبائی حکومتیں یا جاگیردار بادشاہ کے خلاف بغاوت کریں یا محاصل ادا نہ کریں تو بادشاہ پر فوری اثر نہیں پڑتا۔

ضیاء الدین برنی، مبارک شاہ خلجی کی ایک سیاسی غلطی کا ذکر کرتا ہے۔

"بیستے دیہاوزمین ہا کہ در عہد علائی بخالصہ باز آوردہ بودند در عصر او مردمان یافتند"

(تاریخ فیروز شاہی ص ۳۸۲-۳۸۳)

بابر جب ہندوستان آیا تو اس نے اپنے افسران کو جاگیریں ضرور دیں، لیکن خالصہ کا بڑا خیال رکھا، مثلاً بہار کی جاگیر محمد زماں کو دی، لیکن ایک کروڑ اور ۲۴ لاکھ کے محاصل کا علاقہ خالصہ قرار دے دیا۔

ملاحظہ ہو: Memoirs of Babar, P. 663

شاہ ولی اللہ صاحب کے زمانہ میں خالصہ کی کمی سے بادشاہ کی زندگی پر جو اثر پڑا تھا اس کا حال ایک معاصر مورخ، مصنف عالمگیر ثانی کی زبانی سنئے لکھتا ہے:-

"صوبۂ دہلی کے پرگنے اور چند دیگر صوبوں کے پرگنے جو خالصہ میں شامل تھے اور جن سے بادشاہ کے ذاتی ملازمین کی تنخواہیں ادا ہوتی تھیں، اب ہاتھ سے نکل گئے تھے، سہارنپور جس کے محاصل جاگیرداروں کے حوالے کردیئے گئے تھے، اب نجیب خاں روہیلہ کے قبضہ میں تھا آگرہ کے قریب کے علاقے جاٹوں کے پاس تھے، جے پور کے مادھوسنگھ نے نارنول وغیرہ کے علاقوں پر تسلط کرلیا تھا، نتیجہ یہ تھا کہ ایک محل بھی خالصہ میں نہ تھا، نوبت بایں جا رسید کہ بادشاہ کے دسترخوان کے لئے بھی روپیہ نہ رہا، بیگمات بہت سے اخراجات اپنی جیب خاص سے کرتی تھیں"

(تاریخ عالمگیر ثانی، قلمی نسخہ ص ۲۹، ۲۸، ۲۲)

نیز ملاحظہ ہو: Sarkar, Fall of The Mughal Empire II, P. 35.

نظام الملک نے اس سلسلہ میں بادشاہ کو جو مشورے دیئے تھے ان کا ذکر خافی خان نے اس طرح کیا ہے۔

"......روزی نظام الملک بہادر باظہار خیر خواہی بعرض رسانند کہ اولا نام اجارۂ محال خالصہ کہ باعث خرابی وویرانی ملک گردیدہ برطرف باید نمود، دوم رشوت کہ بنام پیشکش جاری گشتہ از طریقہ وداب بادشاہان بعید وخلاف رائے سلیم است، سوم جزیہ بر کفار بدستور عہد خلد مکان جاری باید نمود، چہارم آنکہ چوں در ایام فتور ہمایوں بادشاہ کہ ملک ہندوستان بتصرف شیر شاہ افغان رفتہ بود از شاہ ایران کومک وخدمت گاری ومہمان پرستی واقعی بعد توجہ ہمایوں

پادشاہ طرف ایران بظہور آمدہ اگر درین وقت برای دفع اذیت افغانان کومک فرماں روای ایران نمائندہ در تواریخ باعث نیک نامی خاندان تیموریہ ثبت خواہد گردید پادشاہ فرمودند کہ کرداریم کہ چنیں مہم ماموری سازیم، فتح جنگ بعرض رساند ہر یکی از بندہای کار طلب حضور کہ بدیں خدمت مامور گردد اطاعت حکم بجا خواہد آورد والا اگر خانہ زاد را بدیں مہم ماذون فرمائید بدل و جان خواہیم کوشید ازیں مقولہ چند کلمہ از راہ خیر اندیشی و خیر خواہی در خدمت پادشاہی عرض نمود بعد کہ پادشاہ برای ایں مصلحت کنگاش با دیگر امرای حضور بیان آورد قسمی از طرف نظام الملک بہادر خاطر نشان پادشاہ نمودند کہ حسن ظن نظام الملک را بسوی ظن مبدل ساختہ درحق چناں وزیر بی نظیر سراپا تدبیر بدمظنہ ساختند، و از آنکہ آداب تسلیمات عنایات و آداب اطاعت پادشاہ موافق رویہ سلطنت بالکل نماندہ بود نظام الملک بہادری خواست کہ در نسق آداب پادشاہی اجرای حکم از سرنو کوشد و ایں معنی باعث خار خار دل مقربان حضوری گردید لہٰذا روز بروز از طرف فتح جنگ آنچہ مرکوز خاطر او اصلاً نبود خاطر نشان پادشاہ نمودہ حقوق جانفشانی او بہ کلمات غرض آمیز حسد انگیز مبدل نمودہ بدمظنہ می ساختند و پادشاہ ناتجربہ کار را بمرتبہٗ درحق نظام الملک بہادر بفکر ہای فاسد انداختند۔

(منتخب اللباب جلد دوم ص ۹۴۸۔۹۴۹)

(۴) جاگیر کا علاقہ بڑھانے سے مرکزی حکومت کے استحکام میں فرق آجاتا ہے، سلطنت کے اجزاء میں نظم و ضبط کا اعلیٰ معیار قائم نہیں رہ سکتا، مرکزی حکومت جاگیرداروں کے رحم و کرم پر ہوتی ہے، فلسفۂ تاریخ کا ایک ناقابل تردید اصول ہے کہ: "The More the Jagirs, The More Unhappy Is the Peasant and Unstable is the Government" یعنی جتنی زیادہ جاگیریں ہوں گی اتنی ہی حکومت کمزور اور کاشت کار پریشان ہوں گے۔

شاہ صاحب کی نگاہ حقیقت بیں تھی، انھوں نے جاگیرداری کو بالکل ختم کرنے کا مشورہ نہیں دیا کہ ایسی صورت میں جاگیردار حکومت کے خلاف متحد ہو جاتے اور سیاسی ابتری اور انتشار میں اضافہ ہو جاتا، شاہ صاحبؒ مشورہ دیتے ہیں کہ چھوٹے منصب داروں کو جاگیریں نہ دی جائیں اور پھر اس کی وجوہات بتاتے ہیں۔

(۵) منصب داری کے مختلف پہلوؤں کے تفصیلی مطالعہ کے لئے ملاحظہ ہو

Abdul Aziz "The Mansabdari System and the Mughal Army" G.S.K. Rao Sahib: Some Notes on Mughal Mansabs, J.I.H XVI P 50-62

(۶) ''حق نمک'' کو قرون وسطیٰ کے سیاسی اور سماجی نظام میں ایک ناقابل تردید اخلاقی اصول کی اہمیت حاصل تھی، نمک حرامی کو بدترین اخلاقی جرم سمجھا جاتا تھا، راحت المحبین میں حضرت نظام الدین اولیاء کا قول نقل کیا گیا ہے۔

''بزرگ حقے است حق نمک   حق آں نگاہ تواند داشت''

قلمی نسخے (ب)

برنی (ص ۵۷۵-۵۸۳) عفیف (ص ۶۶) تاریخ مبارک شاہی ص ۸۶، تاریخ داؤدی (۳۴۳) ایلیٹ وغیرہ سے اس کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے، پروفیسر محمد حبیب نے خزائن الفتوح کے مقدمہ میں اس پر تفصیلی گفتگو کی ہے، ملاحظہ ہو:

The Compapaigns of Sultan Alauddin Khalji, P. XV.

اٹھارہویں صدی میں نمک حرامی کو ایک آرٹ بنالیا گیا تھا، اس صدی کی ساری تاریخ نمک حرامی اور غداری کی ایک طویل داستان ہے، کمزور فرماں روا، ایسے سیاسی اور اخلاقی مجرموں کو سزا نہیں دیتے تھے، اس کے اثرات عوام پر برے پڑتے تھے، شاہ صاحبؒ کے خیال میں سیاسی زندگی کی بہتری کا راز ''نمک حرامی'' کے خاتمہ میں تھا۔

اٹھارہویں صدی میں مغل فوجوں کی حالت انتہائی خراب تھی، نظم وضبط اور فرمانبرداری کے بجائے بدنظمی اور حکم عدولی عام ہوگئی تھی، سر وولز ے ہیگ نے لکھا ہے۔

''سلطنت کے زوال کا ایک بڑا سبب فوجوں کی بدنظمی اور بے قاعدگی بھی تھی، فوج کے اعلیٰ افسران آپس میں لڑتے رہتے تھے، دشمنوں سے پوشیدہ خط وکتابت کرتے تھے، عام بدنظمی نے فوج کو ایک بے ترتیب ہجوم کی صورت دیدی تھی، نہ کوئی عسکری تربیت تھی نہ نظام، غیر حاضری کی سزا بہت دی جاتی تو ایک دن کی تنخواہ کاٹ لی جاتی، فوجی جرائم کے لئے کوئی سزا نہ تھی، افسر کبھی بہت ہی زیادہ غصہ ہوجاتا تو گدھے پر بٹھا کر کیمپ میں گھموا دیتا، اس فوج میں نہ فاتحانہ عزم تھا نہ کوئی سپاہیانہ جذبہ''۔

Cambridge History of India Vol IV P. 374-75.

نیز ملاحظہ ہو: Irvine: The Army of the Indian Mughal, P. 296-299.

(۸) احمد شاہ (۱۷۴۸-۱۷۵۵) کے زمانہ میں تین سال تک فوجیوں کی تنخواہیں ادا نہیں کی گئیں، مجبور ہوکر سپاہیوں نے شورش کی، محلوں کے دروازے روک کر کھڑے ہوگئے، ایک امیر کا جنازہ چار دن تک پڑا رہا اور فوجیوں نے اس وجہ سے دفن نہ ہونے دیا کہ اس نے تنخواہیں ادا نہیں کی تھیں، شاکر خاں پانی پتی نے لکھا ہے کہ احمد شاہ کے زمانہ میں محلات شاہی کے ساز وسامان کی فہرست بنا کر دکانداروں کو دی گئی تھی، تا کہ اس کو فروخت کر کے سپاہیوں کی تنخواہیں ادا کردی جائیں (تذکرہ شاکر خاں (قلمی) ص ۴۴)

نیز ملاحظہ ہو: Fall of the Mughal Empire Vol II P. 346-347.

فوجیوں کے افلاس کا اندازہ مصنف تاریخ عالمگیر ثانی کے اس بیان سے ہوتا ہے:

''فوجیوں نے افلاس سے تنگ آکر اپنے گھوڑے بیچ دیئے تھے، پیدل فوج کے پاس وردیاں نہ رہی تھیں، جانوروں کو چارہ نہ ملتا تھا، اس وجہ سے وہ مرنے لگے تھے، فوجی اپنے گھروں سے باہر نہ نکلتے تھے، اور بعض اوقات شاہی سواری کی ہمراہی میں بھی نہ ہوتے تھے''۔

(تاریخ عالمگیر ثانی (قلمی) ص ۱۵۔۲۳ وغیرہ)

نیز ملاحظہ ہو۔ Fall of the Mughal Empire Vol II P. 37

(۹) مرکزی حکومت کی نااہلی اور بادشاہوں کی سستی اور عدم توجہی کی اس سے بڑھ کر مثال ملنی مشکل ہے کہ انھوں نے خالصہ کے علاقہ میں بھی ٹھیکہ دینے کی رسم جاری کردی تھی، اول تو اس زمانہ میں خالصہ کا علاقہ تھا ہی کتنا، یعنی دہلی سے پالم تک، پھر جب اس کے محاصل وصول کرنے میں بھی بادشاہوں کو دقت ہونے لگی تو قبائے جہانداری کو تارتار کردینا ہی بہتر ہے، بابر کے سیاسی تدبر کا ذکر اس سے پہلے (نوٹ ۳) میں گذر چکا ہے، کہ اس نے بہار میں بھی خالصہ کا علاقہ رکھا، اسی کے جانشین یہ تھے کہ دہلی کے خالصہ کا انتظام کرنے سے معذور تھے۔

مکتوب دوم

(۱) گجرات کا صوبہ جغرافیائی، اقتصادی، تجارتی، عسکری اور سیاسی اعتبار سے نہایت اہم تھا، دکن پر تسلط قائم رکھنے کے لئے اس پر اقتدار ہونا ضروری تھا، شاہان مغلیہ نے اس علاقہ کو اپنے قبضہ سے نکال کر جس سیاسی بصیرت کے فقدان کا ثبوت دیا اس کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔

Irvine, Lateir Mughals Vol II P. 165-215.

(۲) صوبہ مالوہ، جمنا سے نربدا تک پھیلا ہوا تھا، اس کے مغرب میں راجپوتانہ اور مشرق میں بندھیل کھنڈ تھا، سلطنت مغلیہ کے لئے اس کا محل وقوع اور پیداوار کی خاص اہمیت تھی، جنوبی اور شمالی ہندوستان کے درمیان یہ کڑی کی مانند تھا، افیون، گنا، انگور، چھالیہ وغیرہ کی زبردست کاشت یہاں ہوتی تھی، صنعت وحرفت میں گجرات کے بعد اسی کا درجہ تھا، شمالی ہندوستان سے دکن کو جانے والی فوجوں کو مالوہ سے ہی گذرنا پڑتا تھا، مرہٹوں اور شمالی ہندوستان کے درمیان کی اس حیثیت پشتے کی تھی اس کے نکل جانے کے بعد مرہٹوں کا طوفان کف بردہان امنڈنے لگا تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔

Raghubir Sinh, Malwa In Transition P. 107-111.

Irvine, later Mughalls Vol II P.242-245.

(۳) مرہٹوں نے اپنا اقتدار کس طرح بڑھایا، اس کے لئے ملاحظہ ہو

Sarkar: Fall of the Mughal Empire Vol I P. 67-76

سیکشن: "How the Maratha Power Spread Over the Mughal Empire"

مرہٹوں کے اقتدار کا عوام پر اقتصادی اثر کیا پڑا؟ مولانا غلام علی آزاد بلگرامی نے لکھا ہے۔

"ہیچے دارند کہ ہر جا دست یابند وجوہ معاش جمیع خلق خدا بندکردہ بطرف خودی کشند و زمینداری و مقدمی و عمل پٹواری گری باقدمین نگذاشتہ، اساس وارثان کارہائے مذکورہ را از بیخ و بن برکندہ بنیاد دخل و تصرف خود قائم کنند"۔

اس کے بعد ایک زبردست معاشی اور اقتصادی حقیقت کو اس طرح مذہبی انداز میں بیان کیا ہے۔

رازق مطلق تعالی شانہ کوروزی رسان ہندو و مسلمان است برات رزق اضافت خلائق بر متین زمین نوشتہ، تمام این مملکت بر یک قوم چوطور مسلم تواند ماند۔

رازق مطلق اللہ تعالی جو ہندو مسلمان دونوں کا روزی پہنچانے والا ہے، اسی نے ہر ایک کی روزی کا حصہ اسی سرزمین (ہند) میں مقرر فرمایا ہے، یہ سلطنت کسی ایک قوم کے فائدہ کے لئے کس طرح مخصوص کی جا سکتی ہے۔

(۴) چوتھ سے مراد لگان کا وہ چوتھائی حصہ ہے جو مرہٹے جبراً مغلیہ سلطنت کے ان دور افتادہ علاقوں سے وصول کرتے تھے جو ان کے رحم و کرم پر تھے۔

مورخوں نے اس کی نوعیت کے متعلق مختلف رائیں ظاہر کی ہیں، رانا ڈے نے لکھا ہے کہ اس کی ادائی کے بعد وہ علاقے کسی تیسری طاقت کے حملوں سے محفوظ ہو جاتے تھے اور یہ بالکل ولزلی کے Subsidiary System کے مانند تھا۔

سرکار کا خیال ہے کہ اس ٹیکس کے دینے کے بعد صرف مرہٹوں کے حملوں سے نجات مل جاتی تھی۔ مرہٹوں پر دوسری طاقتوں کے حملہ سے بچانے کی کوئی ذمہ داری عائد نہ ہوتی تھی، چوتھ ڈاکوؤں کو خریدنے کا ایک طریقہ تھا، سار دیسائے نے لکھا ہے کہ یہ خراج تھا جو مفتوحہ علاقوں سے لیا جاتا تھا۔

تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو:

Sarkar: Shivaji and His Times P. 407-408.

Sarkar: History of Aurangzeb Vol. IV P. 262-3

Sen: Military System of The Marathas P. 28-53

Sen: Administrative System of The Marathas P. 111.

(۵) سخت ناانصافی ہوگی اگر یہ سمجھا جائے کہ شاہ صاحب غیر مسلم جماعتوں سے تعصب کی بنا پر یہ لکھ رہے

ہیں، اس زمانہ میں مرہٹوں کی ہنگامہ آرائیوں سے ہندو اور مسلمان سب ہی متاثر ہوئے تھے، بنگال کا مشہور شاعر گنگارام، بنگال پر ان کے حملوں کا حال لکھتا ہے:-

"برگیوں نے دیہاتوں کو لوٹنا شروع کر دیا، کچھ لوگوں کے انھوں نے ہاتھ، ناک اور کان کاٹ لئے، کچھ کو مارڈالا، خوبصورت عورتوں کو وہ رسیوں میں باندھ کر لے گئے، جب ایک بارگی زنا کر چکتا تھا تو دوسرا کرتا تھا، عورتیں چیخیں مارتی تھیں، انھوں نے گھروں کو آگ لگادی اور ہر طرف لوٹ مار کرتے ہوئے گھومے"۔

سرجدو ناتھ سرکار نے گنگارام کی یہ عبارت نقل کی ہے اور لکھا ہے کہ مرہٹوں کی زنا کے معاملہ میں بہت بری شہرت تھی، ملاحظہ ہو۔

Fall of the Mughal Empire P 87

پرتگال مصنفوں نے بھی مرہٹوں کی ان حرکتوں پر کانوں میں انگلیاں دی تھیں، ملاحظہ ہو:-

Pissurlencer: Fortuguesese Marathas II P 49

بنگال کے ایک مشہور پنڈت ونیشور ودیا پتی نے ۱۷۴۴ء میں مرہٹوں کے ہنگاموں اور مظالم کا ذکر نہایت دردانگیز لہجے میں کیا ہے، ملاحظہ ہو Fall of the Mughal Empire I P 88 ان سب بیانات کے پیش نظر شاہ صاحب کا یہ جملہ کچھ تعجب خیز نہیں معلوم ہوتا۔

(٦) جمنا کے جنوبی علاقہ میں آگرہ سے دہلی تک جاٹ آباد تھے، ان کی مشرقی سرحد چنبل تھی، اس علاقہ میں ان کی ہنگامہ آرائی کا یہ عالم تھا کہ مرکزی حکومت کا ناک میں دم آ گیا تھا بقول سرکار دہلی اور آگرہ کی سڑک پر ایسا کانا برداشت نہیں کیا جاسکتا تھا، Fall Vol I P 369 دہلی سے آگرہ نقل و حرکت میں بڑی احتیاط برتنی پڑتی تھی، دکن کو جمیر ہوتی ہوئی جو فوجیں جاتی تھیں وہ اسی علاقے سے گزرتی تھیں۔

بہادر شاہ کے زمانہ میں اس سڑک کی مخدوش حالت کا اندازہ دستورالانشاء کے مطالعہ سے ہوتا ہے، ملاحظہ ہو دستورالانشاء از یار محمد ص ۱۳۰

۱۷۱۲ء میں فوج نے ننگے نماندے اس علاقہ سے گزرے تو انھوں نے بھی ان ہنگاموں کو دیکھا:

Later Mughals I P 321

جان سرمن (John Surman) جون ۱۷۱۵ء میں یہاں سے گزرا تھا، اس نے جاٹوں کی امن سوز حرکتوں کا ذکر اپنی ڈائری میں کیا ہے: Orme Collections P 1694

شاہ جہاں کے عہد میں جاٹوں نے ایک مرتبہ زبردست شورش برپا کی تھی ۱۰۴۷ھ۔ ۱۶۳۷ء میں متھرا کا فوجدار مرشد قلی خاں ان سے لڑتا ہوا مارا گیا تھا۔

(۷) سر جدو ناتھ سرکار، تاریخ اورنگ زیب جلد پنجم ص ۲۹۷ پر لکھتے ہیں۔

''اورنگ زیب کی شمالی ہندوستان سے غیر حاضری کا فائدہ دو نئے جاٹ لیڈروں راجہ رام اور رام چہرہ نے اٹھایا، راجہ رام کی قانون شکن حرکتوں کو آگرہ کا گورنر خافی خان بھی نہ روک سکا، جاٹوں نے راستے بند کر دیئے اور بہت سے علاقوں کو لوٹا اور اکبر کے مقبرہ کو لوٹنے کے لئے سکندرہ کا رخ کیا، لیکن میر ابوالفضل نے جو وہاں کا فوجدار تھا بہادری سے مقابلہ کیا اور باغی کو آگے نہ بڑھنے دیا، راجہ رام نے مشہور تورانی افسر اصغر خاں کا سامان لوٹا، اصغر خاں جاٹوں سے لڑتا ہوا مارا گیا''۔

(۸) مئی ۱۶۸۶ء کو اورنگ زیب نے مشہور جنرل خان جہاں کو کلتاش ظفر جنگ کو جاٹوں کے مقابلے کے لئے بھیجا، خان جہاں کو شکست ہوئی تو اورنگ زیب کو خطرہ کی نوعیت کا اندازہ ہوا اور اپنے لڑکے اعظم کو جاٹوں کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا، اعظم ابھی برہان پور ہی پہنچا تھا کہ شہنشاہ نے اس کو واپس بلا لیا اور اعظم کے بڑے بیٹے بیدار بخت کو جو اس وقت ۱۷ سال کا تھا جاٹوں کے مقابلے کے لئے بھیج دیا (دسمبر ۱۶۸۷ء) یہاں شاہ صاحب کا اشارہ بیدار بخت ہی کی جانب ہے۔

(۹) شاید یہاں شاہ صاحبؒ کا اشارہ راجہ بھوشن سنگھ (جے پور) کی جانب ہے۔ لیکن راجہ بھوشن سنگھ نے جاٹوں کے استیصال میں بڑا زبردست کام کیا تھا اور اس وقت بیدار بخت سے اس کی مخالفت کا کوئی واقعہ نظر سے نہیں گزرا، راجہ بھوشن سنگھ نے اورنگ زیب سے تحریری عہد کیا تھا کہ وہ جاٹوں کے مشہور قلعہ ''سنسنی'' کو برباد کر دے گا''۔

(تاریخ اورنگ زیب ج ۵ ص ۳۰۰)

سرکار نے لکھا ہے کہ راجہ بھوشن اپنے باپ اور دادا کی طرح بڑے منصب کی آرزو رکھتا تھا اور اس لئے یہ اہم کام انجام دینے کا وعدہ کیا تھا، سنسنی کا محاصرہ بیدار بخت نے کیا تھا، ممکن ہے راجہ کو شہزادہ سے اسی لئے مخالفت پیدا ہوگئی ہو کہ ایسا اہم کام جس کے لئے اس نے اپنے آپ کو پیش کیا تھا شہزادہ کے سپرد کیوں کر دیا گیا۔

(۱۰) فرخ سیر کے زمانہ میں چورامن کے ہنگاموں کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔

Irvine Later Mughals, Vol. I P 321-27

شاہ صاحبؒ نے جس مہم کی طرف اشارہ کیا ہے اس کے مفصل واقعات ارون نے بیان کئے ہیں، چورامن نے قطب الملک وزیر کو ۲۰ لاکھ روپیہ رشوت دے کر اس بات پر آمادہ کیا وہ فرخ سیر کو صلح کر لینے کا مشورہ دے۔

(ارون جلد اول ص ۳۲۶)

راجہ جے سنگھ (جو چورامن کے خلاف بھیجا گیا تھا) اس مصالحت کے خلاف تھا اس کا خیال تھا کہ چورامن

کی طاقت کے ختم ہونے میں زیادہ عرصہ نہیں لگے گا، اس کے بغیر مشورہ یہ صلح کر لی گئی، فرخ سیر خود اس صلح کے لئے آمادہ نہ تھا لیکن قطب الملک نے مجبوراً صلح کرائی، جب چورامن دہلی آیا تو فرخ سیر نے اس کو صرف ایک مرتبہ دربار میں آنے دیا، دوسری مرتبہ دربار میں حاضری کی اجازت نہ دی۔

Irvine: Later Mughals, I P. 327

قطب الملک کے چال چلن اور سیاسی ہنگاموں کے لئے ملاحظہ ہو:

Sarkar: Fall of the Mughal Empire Vol. P. 10-11.

(۱۱) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو:

Irvine: Later Mughals II P. 120-124.

(۱۲) محمد شاہ (۱۷۱۹ـ۱۷۴۸) کا بیٹا احمد شاہ تھا جو اس کے بعد تخت پر بیٹھا، یہاں شاہ صاحب نے اس کا نام لکھنے کے بجائے پسر محمد شاہ لکھا ہے اور ایسا عمداً کیا ہے، شاہ صاحب احمد شاہ ابدالی کو خط لکھ رہے ہیں اس لئے اس کا نام لکھنا سوءادب خیال کیا۔

(۱۳) صفدر جنگ، سعادت خاں صوبہ دار اودھ کا داماد تھا، ۱۷۳۹ میں سعادت خاں کے انتقال پر اودھ کا صوبہ دار ہو گیا اور اٹھارویں صدی کی سیاست میں کافی حصہ لیا مختصر حالات کے لئے ملاحظہ ہو۔

Fall Vol. I PP. 22-24, 442-448

اس کا تفصیلی ذکر اپنی کتاب Fall Vol I P. 480-8. میں کیا ہے لکھا ہے۔

"وزیر کو خود لڑنے میں تامل تھا، اس لئے سورج مل کو آگے بڑھا دیا اس نے پرانی دہلی کو خوب لوٹا، عام لوگوں پر سخت مصیبت آئی بہت لوگوں نے خودکشی کر لی...... جاٹوں کے اس ہنگامہ کو لوگ جاٹ گردی کے نام سے یاد کرتے تھے"۔

ہرچرن داس مصنف چہار گلزار شجاعی کا بیان ہے کہ جب جاٹوں نے لوٹنا شروع کیا تو دہلی کے باشندے گھبراہٹ اور پریشانی میں گھر سے نکل کر کھڑے ہوئے، وہ دربدر، گلی بہ گلی مارے پھرتے تھے، بالکل اس طرح جیسے کوئی ٹوٹا ہوا جہاز ظالم موجوں کے رحم وکرم پر ہو، پاگلوں کی طرح ہر شخص پریشان حال اور گھبرایا ہوا نظر آتا تھا"۔ (قلمی نسخہ ۴۱۰)

(۱۵) صفدر جنگ کے خلاف بادشاہ کی تفصیلی کارروائی کے لئے ملاحظہ ہو:

Sarkar: Fall of the Mughal Empire Vol. I P. 483-500

(۱۶) سراج الدولہ کی طرف اشارہ ہے جو ۱۷۵۶ء میں علی وردی خاں کے انتقال کے بعد بنگال کا صوبہ دار ہوا تھا۔

(۱۷) گداگری کے دو حسرت ناک واقعات کے لئے ملاحظہ ہو:

Fall of the Mughal Empire Vol P 37

(۱۷۔الف) ملاحظہ سیر المتاخرین ص ۸۷

طباطبائی نے لکھا ہے کہ سلطنت اور شہنشاہ اس وقت سب تمغی الفاظ ہو کر رہ گئے تھے (زے اب ب) ملاحظہ ہو۔

Fall of the Mughal Empire I P 481

(۱۸) نادر شاہ کے حملہ نے مغلیہ سلطنت کی کمزور عمارت کو متزلزل کردیا تھا۔

سرکار نے لکھا ہے کہ نادر شاہ کے حملہ نے دہلی سلطنت کا یک مرکز تباہ کر دیا (Fall Vol. I P VII) شاہان مغلیہ کا سیاسی اقتدار خاک میں مل گیا، کرنال کے میدان میں ان بارہ ہزار سپاہیوں کا خون ہوا، دہلی کے تقریباً ۲۰ ہزار نفوس تہ تیغ ہوئے، ہندوستان کی بعض نئی طاقتوں کا عروج بھی اسی وجہ سے ہوا، دہلی کی سلطنت اتنی کمزور ہوگئی کہ ان نئی طاقتوں کا مقابلہ نہ کر سکی، پروفیسر ہری رام گپتا نے بتایا ہے کہ سکھوں نے اس حملہ سے بے حد فائدہ اٹھایا اور پنجاب میں لوٹ مار کی۔ History of the Sikhs. P 3-4

(۱۹) سورۃ الفتح ۔ ۴۸:۲۹

''محمد رسول اللہ کا ہے، اور جو لوگ کہ ساتھ اس کے ہیں سخت ہیں اوپر کفار کے، رحمدل ہیں درمیان اپنے، دیکھتا ہے تو ان کے رکوع کرنے والے سجدہ کرنے والے''۔

(۲۰) سورۃ المائدہ ۔ ۵:۵۴

''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، جو کوئی پھر جاوے گا تم میں سے دین اپنے سے پس البتہ لاوے گا اللہ ایک قوم کو کہ پیار کرتا ہے ان کو اور پیار کرتے ہیں وہ اس کو، نرمی کرنے والے ہیں اوپر مسلمانوں کے، جہاد کریں گے بیچ راہ اللہ کے اور نہ ڈریں گے ملامت کسی ملامت کرنے والے کی سے''۔

(۲۱) پوری روایت ابن ماجہ (مطبع اصح المطابع دہلی ص ۱۹۱) میں اس طرح ہے: ''عن البراء بن عازب ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لزوال الدنیا اھون علی اللہ من قتل مومن بغیر حق''

(۲۲) سورۃ الفتح ۔ ۴۸:۲۵

''اور اگر نہ ہوتے مرد مسلمان اور عورتیں مسلمان نہیں جانتے تم ان کو یہ کہ کچل ڈالو تم ان کو پس پہنچ جاوے تم کو ان سے ایذا بے خبر، یعنی تو ابھی فتح ہو جاتی کہ داخل کرے اللہ بیچ رحمت اپنی کے جس کو چاہے، اگر جدا ہو جاتے مسلمان کافروں سے البتہ عذاب کرتے ہیں ہم ان لوگوں کو کہ کافر ہوئے ان میں سے عذاب درد دینے والا''۔

(۲۳) "اخرج البخاری عن ابی سعید ..... من عصم الله" یہ روایت مشکوۃ میں بحوالہ بخاری درج ہے۔ مشکوۃ جلد دوم ص ۶۳۔۶۲ (مطبوعہ لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز)

بخاری نے حضرت ابو سعید خدری کی روایت لکھی ہے کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا ہر وہ شخص جو خلیفہ بنایا جاتا ہے اس کے دو دلی دوست (باطنی قوت) ہوتے ہیں، ایک ان میں سے اس کو خیر و نیکی کی تلقین کرتا۔ اور اس پر آمادہ کرتا ہے، دوسرا اس کو شر کا حکم کرتا ہے اور اس کی رغبت دلاتا ہے، و محفوظ ہے جس کو اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے"۔

(۲۴) "واخرج ابویوسف ..... تعجزہ"

ملاحظہ ہو کتاب الخراج ص ۶ (المطبعۃ الامیریہ القاھرہ)

(۲۵) "واخرج ابویوسف عن زبید ..... طاقتھم" ملاحظہ ہو کتاب الخراج ص ۸

(۲۶) "واخرج ابویوسف عن ھانی ..... اشد منه" ملاحظہ ہو کتاب الخراج ص ۹

(۲۷) "واخرج ابویوسف عن عطاء بن ابی رباح ... من الدنیا" ملاحظہ ہو کتاب الخراج ص ۹

مکتوب سوم

(۱) ومن قُتِل مظلوماً فقد جعلنا لولیّه سلطٰنا فلا یُسرِف فی القتل انّه کان منصورا (سورہ بنی اسرائیل ۱۷:۳۳)

"اور جو کوئی مارا جاوے مظلوم، پس تحقیق کیا ہے ہم نے واسطے اس کے غلبہ پس چاہئے کہ نہ زیادتی کرے بیچ قتل کے تحقیق وہ ہے یعنی وارث مقتول کا مدد دیا گیا"۔

(۲) "رفیع الدرجات ذوالعرش" تا "قہار" رَفِیعُ الدّرجات ذُوالعرش، یُلقی الرُّوحَ مِن امرِه علٰی مَن یَّشآءُ مِن عبادِه لِیُنذِر یومَ التّلاقِ، یومَهم بارِزُون لایَخفٰی علی الله منهم شیٌ لمن المُلکُ الیومَ لِلّٰه الواحدِ القهّار، (سورۃ المومن ۱۶۔۱۵:۴۰)

"بلند درجوں والا ہے صاحب عرش کا، ڈالتا ہے، روح کو حکم اپنے سے اوپر جس کے چاہتا ہے بندوں اپنے سے، تو کہ ڈراوے دن ملاقات کے سے جس دن کہ وہ ظاہر ہوں گے نہیں چھپے گا اوپر اللہ کے ان سے کچھ، واسطے کس کے ہے بادشاہی اس دن، واسطے اللہ اکیلے غالب کے"۔

مکتوب چہارم

(۱) انّه قریبٌ مُجیبٌ، سورۃ ہود (۱۱:۶۱) میں ہے، انّه قریبٌ مُجیبٌ

"تحقیق پروردگار میرا نزدیک ہے دعا قبول کرنے والا"۔

مکتوب پنجم

(۱) سورۃ ہود ۱۱:۶۱

(۲) لکل اجل کتاب۔ سورۃ الرعد ۱۳:۳۸ "واسطے ہر ایک وعدے کے ایک لکھت ہے"۔

مکتوب نہم

(۱) صفدر جنگ نے سورج مل جاٹ کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا، ملاحظہ ہو

Fall of the Mughal Empire, Vol. II P 435

مکتوب یازدہم

(۱) یعنی احمد شاہ (۱۷۵۴-۱۷۴۸) جیسا کہ آگے آنے والی عبارت سے ظاہر ہے۔

(۲) احمد شاہ کی والدہ کا نام ادہم بائی تھا، اس نے اپنے زمانہ کی سیاست میں بڑا حصہ لیا تھا، احمد شاہ نے اس کو بائی جیو صاحبہ، نواب قدسیہ صاحب الزمانی، صاحب جیو صاحبہ، اور قبلہ عالم وغیرہ کے خطابات یکے بعد دیگرے دیئے تھے، احمد شاہ کے عہدہ میں سارا انتظام مملکت اسی کے ہاتھ میں پہنچ گیا تھا، بڑے بڑے امراء اور افسران روزانہ اس کی ڈیوڑھی پر حاضر ہوتے تھے، وہ پردے کے پیچھے سے ساری عرضیاں اور احکام لکھواتی تھی۔

(۳) رفیع الدولہ بہادر شاہ بن اورنگ زیب کا منجھلا بیٹا تھا، سادات بارہہ نے ۴/جون ۱۷۱۹ء کو رفیع الدرجات کو تخت سے اتار کر رفیع الدولہ کو تخت پر بٹھا دیا تھا اس نے کل چار مہینے اور ۱۶ دن حکومت کی، ۲۱ ستمبر ۱۷۱۹ء کو درگاہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ میں دفن کیا گیا۔

(۴) روشن اختر، بہادر شاہ بن اورنگ زیب کا چوتھا بیٹا تھا، رفیع الدولہ کے بعد ابوالفتح ناصر الدین محمد شاہ بادشاہ غازی کے لقب سے تخت پر بٹھایا گیا ۱۷۴۸ء تک حکومت کی۔

(۵) یہاں شہزادہ محمد ابراہیم کی طرف اشارہ ہے جس کو عبداللہ خاں (سید بارہہ) نے محمد شاہ کی زندگی میں ۵/اکتوبر ۱۷۲۰ء کو تخت پر بٹھا دیا تھا، تھوڑے ہی دنوں کے بعد محمد شاہ نے اس کو پکڑ بلوایا اور جیل خانہ میں ڈلوا دیا، جہاں ۳۰/جنوری ۱۷۴۶ء کو اس کا انتقال ہو گیا۔

(۶) احمد شاہ، محمد شاہ کے بعد تخت نشین ہوا تھا، اس کے دور حکومت کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو:

Sarkar Fall of the Mughal Empire Vol I Chapter VIII

(۷) نادر شاہ کا قتل عام ۱۱ر مارچ ۱۷۳۹ء (بروز اتوار) ۹ بجے صبح سے شروع ہوا تھا اور ۲ بجے دوپہر تک جاری رہا۔

مکتوب دوازدہم

(۱) احمد شاہ ابدالی نے جب پانچویں بار (۱۷۵۷ء) ہندوستان پر حملہ کیا تو جاٹوں کی طرف خاص توجہ کی، اس حملہ کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔ Fall, Vol II P. 114-125.

مکتوب سیزدہم

(۱) بارہہ ضلع مظفر نگر (یوپی) میں ایک قصبہ ہے، سید برادران جنھوں نے اٹھارہویں صدی کی سیاست میں نمایاں حصہ لیا تھا، اسی جگہ کے باشندے تھے۔

(۲) بوڑھانہ اور کھتولی، ضلع مظفر نگر (یوپی) کے دو قصبات ہیں، کھتولی میں پھلت ایک چھوٹا سا گاؤں ہے، پھلت کو شاہ ولی اللہ کے مولد ہونے کا شرف حاصل ہے۔

مکتوب چہاردہم

(۱) احمد شاہ ابدالی کے حملوں کے لئے ملاحظہ ہو ضمیمہ،

مکتوب پانزدہم

(۱) اس زمانہ میں شاہ صاحب کے قلب وجگر پر ملت کی پریشان حالی کا کچھ ایسا اثر تھا کہ ''غرباء'' ہی کا لفظ ان کی زبان سے نکلتا تھا، وصیت نامہ میں لکھتے ہیں:

''ما مردم غریبیم کہ در دیار ہندوستان آبائے مابغربت افتادہ اند'' (وصیت نامہ ص ۲۰۲)

(۲) سورۃ ہود (۱۱:۶۱)

(۳) ان ولیّ اللہ الّذی نزّل الکتٰب وھو یتولّی الصّٰلحین (سورۃ الاعراف ۷:۱۹۶)

''بتحقیق دوست میرا ہے اللہ جس نے اتاری ہے کتاب اور وہی دوستی کرتا ہے صالحوں سے''۔

مکتوب شانزدہم

(۱) سورۂ فیل۔ ۱۰۵

الَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ، اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِىْ تَضْلِيْلٍ، وَّاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ

طَیرًا اَبابِیل، ترمیھم بحجارۃٍ مِنْ سجّیلٍ، فجعلھُمْ کعصفٍ مأکُول.

’’کیا نہ دیکھا تو نے، کیونکر کیا پروردگار تیرے نے ساتھ ہاتھیوں والوں کے، کیا نہ کر دیا مکر ان کا بیچ گمراہی کے اور بھیجے اوپر ان کے پرند جانور جماعت جماعت، پھینکتے تھے پتھر کنکر کے، پس کر دیا ان کو مانند بھس کھائے ہوئے کے‘‘۔

(۲) شاہ صاحب صرف وظیفہ بتا دینے پر اکتفا نہیں کرتے عمل کی تلقین بھی ساتھ ساتھ کرتے ہیں، یہ ان کا مخصوص انداز ہے، ان کی نظر میں کامیابی کا انحصار ’’دعا‘‘ اور ’’عمل‘‘ دونوں پر تھا۔

مکتوب ہفت دہم

(۱) قریۃ الصالحین سے مراد پھلت ہے شاہ صاحب پھلت ہی میں پیدا ہوئے تھے، اپنی پیدائش گاہ کی سلامتی کا خیال شاہ صاحب کو ہر وقت رہتا تھا، اس سے قبل بھی ایک مکتوب میں اپنی تشویش کا اظہار کیا ہے۔

مکتوب ہشت دہم

(۱) یہ متنبی کا مصرع ہے جس کا صدر یہ ہے۔ ما کل ما یتمنی المرء یدرکہ

مکتوب نوازدہم

(۱) احمد شاہ ابدالی نے ۱۷۵۲ء میں کشمیر پر حملہ کیا تھا، حملہ کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو:

Islamic Culture, Vol XI No 4 P 499-500

(۲) قُلْ اِنْ اَدْرِیْ اَقَرِیْبٌ مَا تُوْعَدُوْنَ اَمْ یَجْعَلُ لَہٗ رَبِّیْ اَمَدًا (سورہ الجن: ۲۵-۲۰ ے)

’’میں نہیں جانتا کیا نزدیک ہے جو کچھ وعدہ دیئے جاتے ہو تم یا کرے واسطے اس کے پروردگار میرا مدت‘‘

مکتوب بستم

(۱) صفدر جنگ کی ٹانگ میں ایک پھوڑا نکلا تھا جو بعد کو کینسر میں تبدیل ہو گیا۔ ۱۷ ذی الحجہ ۱۱۶۷ھ مطابق ۵ اکتوبر ۱۷۵۴ء کو اس کا انتقال ہوا، ملاحظہ ہو:

The First Two Nawabs of Awadh, A. L. Sriwastava PP 238-239

مکتوب بست ویکم

(۱) وَیُتِمُّ نِعْمَتَہٗ عَلَیْکَ وَعَلٰی آلِ یَعْقُوْبَ کَمَا اَتَمَّھَا عَلٰی اَبَوَیْکَ مِنْ قَبْلُ اِبْرَاھِیْمَ

و اسحق (سورہ یوسف:۶:۱۲)

''اور پوری کرے گا نعمت اپنی او پر تیرے اور او پر اولاد یعقوب کے جیسا پورا کیا تھا اس کو او پر دو باپ تیرے کے، پہلے اس سے ابراہیم اور اسحاق کے''۔

(۲) سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ، وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلاً (سورہ الاحزاب۶۲:۳۳)

''عادت خدا کی بیچ ان لوگوں کے کہ گذرے پہلے ان سے اور ہرگز نہ پاوے گا تو واسطے عادت اللہ کے بدل ڈالنا''۔

سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ، وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلاً (سورہ الفتح:۲۳:۴۸)

''عادت اللہ کی جو تحقیق گزری ہے پہلے اس سے اور ہرگز نہ پاوے گا تو واسطے عادت اللہ کے بدلے جاتا''

مکتوب بست و پنجم

(۱) سورۃ الطلاق ۳:۶۵ میں ہے:

وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ''اور رزق دے گا اس کو اس جگہ سے کہ نہیں گمان کرتا''

مکتوب بست و ششم

(۱) فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ، (سورہ التوبہ ۹:۱۲۹ ''پس اگر پھر جاویں پس کہہ کفایت ہے مجھ کو اللہ''۔

مکتوب بست و ہشتم

(۱) حضرت مجدد الف ثانی نے اپنے مکتوبات میں متعدد جگہ اس شعر کو استعمال کیا ہے، یہاں شاہ صاحب بالکل اسی ذہنی کیفیت میں اس کو نقل کرتے ہیں۔

مکتوب سی

(۱) صفدر جنگ کی نظر میں روہیلوں کی طاقت کانٹے کی طرح کھٹکتی تھی، جب وہ برسر اقتدار آیا تو اس نے روہیل کھنڈ کی سند قطب الدین خاں نبیرۂ عظمت اللہ خاں سابق گورنر مراد آباد کے نام دربار شاہی سے جاری کرا دی، قطب الدین سات ہزار فوج اکٹھا کر کے عازم روہیل کھنڈ ہوا، حافظ الملک نے اس قصد سے باز رکھنا چاہا، مجبوراً حافظ الملک نے جنگ کی، رام گنگا کے کنارے جنگ ہوئی اور قطب خاں مارا گیا، شاہ صاحبؒ نے یہ خط آصف جاہ کو اس وقت لکھا ہے جبکہ قطب خاں کا ہنگامہ شروع ہوا تھا، اس میں پیشین گوئی بھی کی ہے کہ ''سرسبز نخواہد

شد"۔ ملاحظہ ہو" گلستان رحمت"۔

Life of Hafizul Mulk, P 28.

Cambridge History of India IV P. 429.

Fall of Mughal Empire P. 337.

(۲) ستمبر اکتوبر ۱۷۵۷ء میں گرانی غلہ کا یہ عالم تھا کہ روپیہ کے ۹ سیر گیہوں ملتے تھے، مونگ کی دال روپیہ کی آدھ سیر، ماش کی دال، روپیہ کی پانچ سیر، دہلی میں دوائیں تک گراں ہو گئی تھیں۔

Fall of the Mughal Empire. II P. 154.

مکتوب سی ویکم

(۱) اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ (سورہ محمد ۷:۴۷)

"اگر مدد کرو تم دین خدا کے کی مدد دے گا تم کو"۔

مکتوب سی وسوم

(۱) لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (سورۃ البقرہ ۲:۲۸۶)

"نہیں تکلیف دیتا اللہ کسی جی کو مگر طاقت اس کی پر"۔

مکتوب سی وچہارم

(۱) سورہ محمد ۷:۴۷

مکتوب سی وپنجم

(۱) اِنَّ كَيْدِىْ مَتِيْنٌ (سورۃ الاعراف۔ ۷:۱۸۳) "تحقیق مکر میرا مضبوط ہے"۔

مکتوب چہلم

(۱) ۱۱۶۱ھ مطابق ۱۷۴۷ء۔

قتل و غارت گری کی یہ انتہا ہے کہ دہلی رجب سے شعبان تک لٹتی رہی اور مغلیہ سلطنت بالکل بے بس رہی، تاریخوں میں اس لوٹ کا تفصیلی حال نہیں ملتا، بہر حال ان حالات میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ مسلمانوں نے حد درجہ مایوسی کی حالت میں "جوہر" کر کے اپنے آپ کو ختم کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔

انفاس العارفین

ترجمہ

سید محمد فاروق قادری

ترتیب

مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱	حصہ اوّل قدوۃ العارفین حضرت شاہ عبدالرحیمؒ کے روحانی تصرفات	
	اور نایاب واقعات کا بیان	۱۳۳
۲	زندۂ جاوید	۱۳۴
۳	میراثِ ولایتؒ	//
۴	آثار سعادت	۱۳۵
۵	شہباز قدس	//
۶	تاثیر فیضان نبوت	۱۳۶
۷	سیر ولایت	//
۸	نفی و اثبات اور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم	۱۳۸
۹	حضرت خواجہ حافظ سید عبداللہ قدس سرہ	۱۳۹
۱۰	مجالس قرآن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری	//
۱۱	شوقِ علم و ہدایت	//
۱۲	طالبانِ حق کے ادنیٰ مجاہدات	۱۴۰
۱۳	عالمِ استغراق	۱۴۱
۱۴	مقامِ مجدد	۱۴۲

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱۵	ولی کی وسعت نظر	۱۴۴
۱۶	نامۂ شیخ	۱۴۵
۱۷	تصفیۂ قلب	۱۴۶
۱۸	کلام ربانی کی تاثیر واعجاز	۱۴۷
۱۹	کشف وکرامت نہیں، جہد واستقامت	//
۲۰	اہل دل سے پردہ	۱۴۸
۲۱	مستقبل بینی	//
۲۲	ہونہار بروا	۱۴۹
۲۳	کرامت مکتب یا فیضان نظر	//
۲۴	نگاہ شیخ	۱۵۱
۲۵	گردن نہ جھکی جس کی شہنشاہ کے آگے	۱۵۲
۲۶	حسد سد راہ ہے	۱۵۳
۲۷	ہمزار خواہی آمد	۱۵۴
۲۸	تذکرہ حضرت خواجہ خوردؒ فرزند خواجہ محمد باقی باللہ(۱)	۱۵۵
۲۹	شیوۂ اہل نظر	//
۳۰	دست بہ کار	۱۵۷
۳۱	نسبت وارادت کا احترام	//
۳۲	ثمرۂ اخلاص	۱۵۸
۳۳	ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللّٰہی	//
۳۴	ولایت کی عقابی نگاہ	۱۵۹
۳۵	فقر کی بے نیازی	//
۳۶	بزرگوں کی خوردی	//
۳۷	طریق نقشبندیہ کی انفرادیت	۱۶۱

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۳۸	کچھ نہیں سب کچھ ہے یارو	۱۶۲
۳۹	طریقۂ نقشبندیہ میں عرس کا اہتمام	//
۴۰	نسبت نبویؐ کا احترام	۱۶۳
۴۱	تذکرہ خلیفہ ابوالقاسم اکبرآبادیؒ	//
۴۲	صوفیا کا ذوق علمی	//
۴۳	احوال خلیفہؒ	۱۶۴
۴۴	سوانح میر ابوالعلیٰؒ	۱۶۵
۴۵	سیر روحانی	۱۶۷
۴۶	مقصود سماع	//
۴۷	تعلق باللہ کی حقیقت	//
۴۸	کشف و کرامت	//
۴۹	برکات اسم ذات	//
۵۰	وصول حق کے طریق	//
۵۱	قوتِ توجہ	۱۶۸
۵۲	تاثیر وجد و رقص	//
۵۳	تاثیرِ کلاہ	//
۵۴	سود کی نحوست	//
۵۵	جانوروں پر توجہ کا اثر	۱۶۹
۵۶	سلسلۂ ابوالعلائیہ کی خصوصیات	//
۵۷	حضرت خلیفہ کی پختگی ارادت اور توکل	۱۷۰
۵۸	ذخیرہ اندوزی سے تنگی رزق	//
۵۹	قرب سلطانی سے استغناء	۱۷۱
۶۰	صوفیا کا تبحر علمی	۱۷۲

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۶۱	خواب فقراء	۱۷۲
۶۲	حج درویشاں	۱۷۳
۶۳	طوفانوں پر تصرف	۱۷۴
۶۴	قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید	//
۶۵	قحط میں خوشحالی	۱۷۵
۶۶	احترام مہمان	//
۶۷	خانقاہی بے تکلفی	۱۷۶
۶۸	فقیر اور دنیوی سکون	//
۶۹	صوفیا اور وقت کی قدر	۱۷۷
۷۰	انداز تربیت	//
۷۱	امانت فقیر	//
۷۲	سوانح شاہ عظمت اللہؒ	۱۷۹
۷۳	فقراء اور مجاذیب کے ساتھ حضرت والد ماجدؒ کی ملاقاتیں	//
۷۴	مسلم معاشرہ میں تقریبات عرس کا سلسلہ	//
۷۵	آئینۂ دل	۱۸۰
۷۶	منوا مجذوب	//
۷۷	مجاہدات سلوک	۱۸۱
۷۸	طعام اغنیاء سے نفرت	//
۷۹	حدیث دل	۱۸۲
۸۰	ولی را ولی می شناسد	۱۸۳
۸۱	آنانکہ خاک رابنظر کیمیا کنند	۱۸۴
۸۲	مگس راہما کنند	۱۸۵
۸۳	بئس الفقیر علی باب الامیر	//

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۸۴	ہستی فریب ہے	۱۸۵
۸۵	استاذ اور شاگرد کے روابط	۱۸۶
۸۶	زوال پذیر اسلامی حکومت کے ارکان کی خدا ترسی	//
۸۷	سوانح میر زاہد ہروی	۱۸۷
۸۸	نکات تصوف اور میر زاہدؒ کا منطقی استدلال	۱۸۸
۸۹	کشف ارواح اور اس قسم کے دوسرے احوال پر حضرت شاہ عبدالرحیمؒ کے وقائع	۱۸۹
۹۰	مرتبہ فنا فی التوحید	//
۹۱	مقام قیومیت	۱۹۰
۹۲	تصرف بالحق فی الخلق	//
۹۳	صوفیاء اور رویت باری	//
۹۴	بے صورت اندر صورت آمد	۱۹۱
۹۵	اسمائے الٰہیہ کے ظہور کی کیفیت	//
۹۶	تصرفات وعلوم صوفیاء	۱۹۲
۹۷	مقامات صوفیاء	//
۹۸	شان عبدیت	//
۹۹	جنت اولیاء	۱۹۳
۱۰۰	علوم اولیاء	//
۱۰۱	بدبختی کی مجلس میں جانے پر تنبیہ	۱۹۴
۱۰۲	جبہ غوث الاعظمؒ	//
۱۰۳	نگاہ ولی	//
۱۰۴	نہ کر تقلید اے جبریل میرے جذب و مستی کی	۱۹۵
۱۰۵	ذکر اسم ذات میں مقام کمال	//
۱۰۶	فضیلت بیعت	//

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱۰۷	شرف اقتداء	۱۹۵
۱۰۸	عطیہ سرکار دو جہاں	۱۹۶
۱۰۹	مشکل میں حضورؐ کی دستگیری	//
۱۱۰	مجلس سرور انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم	۱۹۷
۱۱۱	جمال محمدیؐ	۱۹۸
۱۱۲	ولایت اور نبوت کے مراتب اور ان میں فرق	۱۹۹
۱۱۳	موئے مقدس کی برکات	۲۰۰
۱۱۴	سجدہ غیر اللہ کی ممانعت	۲۰۲
۱۱۵	قرابت رسولؐ کا مقام	//
۱۱۶	حضورؐ کا پسندیدہ درود	//
۱۱۷	حضورؐ کی نیاز کی اشیاء کی بارگاہِ نبوی میں مقبولیت	۲۰۳
۱۱۸	نسبت فقر	//
۱۱۹	اجازت سلسلہ	۲۰۴
۱۲۰	خواجہ اجمیریؒ سے خلافت	//
۱۲۱	سیر روحانی	//
۱۲۲	مقامات اولیاء	۲۰۵
۱۲۳	بشارت فرزند	۲۰۶
۱۲۴	مجالس ارواح اولیاءؒ	۲۰۷
۱۲۵	تصرف اولیاء	//
۱۲۶	مقام مجاذیب	۲۰۸
۱۲۷	دعوت مخدوم الدوریہ	//
۱۲۸	ذکر الٰہی	۲۰۹
۱۲۹	حسن نیت	//

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱۳۰	تاثیر ذکر	۲۱۰
۱۳۱	قصر نماز	۲۱۱
۱۳۲	علوم اولیاء	//
۱۳۳	تاثیر جذب ورقص	۲۱۲
۱۳۴	فیوض اولیاء	//
۱۳۵	موکل وباء	//
۱۳۶	موت اختیاری	۲۱۳
۱۳۷	انجام کفر	//
۱۳۸	اولیاء اللہ کے ساتھ بحث وتکرار	//
۱۳۹	از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است	۲۱۴
۱۴۰	واقف اسرار چڑیا اور موحد کوا	۲۱۵
۱۴۱	صالح جن	۲۱۶
۱۴۲	جن کی ہمدردی	۲۱۷
۱۴۳	ایک متعلم جن کا نظام الاوقات	//
۱۴۴	شاہ عبدالرحیمؒ کے تصرفات، مکاشفات اور دیگر کرامات کا بیان	۲۱۹
۱۴۵	طریق تربیت	//
۱۴۶	مستقبل بینی	//
۱۴۷	نگاہ دوررس	۲۲۰
۱۴۸	جو چاہے سو آپ کرے	//
۱۴۹	ختم خواجگان	۲۲۱
۱۵۰	آداب مجلس اولیاء	//
۱۵۱	فراست مومن	۲۲۲
۱۵۲	دست پیر از غائباں کوتاہ نیست	//

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱۵۳	چراغ فقر ہوا بھی جسے بجھا نہ سکی	۲۲۳
۱۵۴	توجہ و تاثیر	//
۱۵۵	ایک منکر سے بزور نذر وصول کی	//
۱۵۶	ولی اور عامل میں فرق	۲۲۴
۱۵۷	در دل گاؤ خر	۲۲۵
۱۵۸	تاثیر توجہ جانور پر اثر انداز مگر عابد معترض کے لئے بے سود	//
۱۵۹	رافضیت سے توبہ	۲۲۶
۱۶۰	نیست بر لوح دلم جز الف قامت یار	۲۲۷
۱۶۱	باران کرم منتظر دست دعا ہے	۲۲۸
۱۶۲	قوت تاثیر کا کرشمہ	۲۲۹
۱۶۳	روشن ضمیری	//
۱۶۴	......صید نہ چھوڑا زمانے میں	//
۱۶۵	سفر و حضر میں شیخ کی نگاہ الفت	۲۳۰
۱۶۶	ہر کہ با دردکشاں درافتاد برافتاد	//
۱۶۷	از نہیب او بلرزد ماہ و مہر	۲۳۱
۱۶۸	جس نے دیکھے نین متوارے ترے	//
۱۶۹	تقدیر شکن قوت باقی ہے ابھی اس میں	۲۳۲
۱۷۰	حکمت ایمانیاں را ہم بخواں	۲۳۳
۱۷۱	دست پیر از غائباں کوتاہ نیست	//
۱۷۲	تصرف ولی	۲۳۴
۱۷۳	مبین حقیر گدایان عشق الخ	//
۱۷۴	دل راہ بدل رہ	۲۳۵
۱۷۵	امداد اولیاء	۲۳۶

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱۷۶	کیا ہے جواں پہ عیاں نہیں	۲۳۶
۱۷۷	مالِ زکوٰۃ	۲۳۷
۱۷۸	چاہ کن را چاہ درپیش	//
۱۷۹	تسخیرِ جنات	۲۳۸
۱۸۰	آتشیں آدمی اور برکت قرآن	//
۱۸۱	ولی کے خلاف جھوٹی شہادت کا انجام	۲۳۹
۱۸۲	مشائخ کی روحانی امداد	//
۱۸۳	جام جہاں نما است ضمیر منیر دوست	//
۱۸۴	ناز ولایت	۲۴۰
۱۸۵	حضرت شاہ ولی اللہ کی پیدائش کا قصہ	۲۴۱
۱۸۶	قبل از پیدائش شاہ اہل اللہ کی بشارت	//
۱۸۷	انسانی فعل و عمل کی اہمیت	۲۴۲
۱۸۸	مردِ مومن کی موت	//
۱۸۹	جن کی نظر چڑھا تر ارخسار آتشیں	۲۴۳
۱۹۰	ز ملک تا ملکوتش حجاب بردارند	//
۱۹۱	مقامِ صبر	۲۴۴
۱۹۲	مردانِ راہ خدا کا جمال باطنی	//
۱۹۳	تاثیرِ شراب وحدت	۲۴۵
۱۹۴	حضرت والد ماجدؒ کے ملفوظات	۲۴۷
۱۹۵	صوفیاء اور رویت باری	//
۱۹۶	حصول رزق میں نیت کے ثمرات	۲۴۸
۱۹۷	راز درون پردہ ز رندان مست پرس	۲۴۹
۱۹۸	تاج شاہی فقر کے قدموں پر	۲۵۰

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱۹۹	مقبولان بارگاہ ہر زمانے میں موجود ہوتے ہیں	۲۵۱
۲۰۰	فاتحہ خلف الامام میں شاہ عبدالرحیمؒ کا مسلک	۲۵۲
۲۰۱	دائمی حضوری	۲۵۳
۲۰۲	فیوض باطنی کے باوجود ظاہری توسل سنت مشائخ ہے	۲۵۴
۲۰۳	مکتوب شیخ فقیر اللہؒ	۲۵۵
۲۰۴	نسبت آگاہی کے متعلق شاہ عبدالرحیمؒ کی تشریح	۲۵۹
۲۰۵	ذرہ ذرہ جلوہ گاہ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم	۲۶۲
۲۰۶	پختگی نسبت کیسے حاصل ہوتی ہے؟	۲۶۴
۲۰۷	نقشبندی مشائخ کے ایک قول پر اعتراض اور شاہ عبدالرحیمؒ کا جواب	//
۲۰۸	مختلف سلاسل کی نسبتوں کے خصائص	۲۶۵
۲۰۹	ترقی مدارج کی حقیقت	۲۶۷
۲۱۰	سلطان العارفینؒ کے قول کی تشریح	//
۲۱۱	لہو ولعب سے اجتناب صفائی قلب کا ذریعہ ہے	۲۶۸
۲۱۲	والدین کے ساتھ نیکی واحسان کا عجیب نکتہ	//
۲۱۳	کیفیت وحالت کی حفاظت کا طریقہ	۲۶۹
۲۱۴	خودساختہ مشائخ کی عیاریاں	//
۲۱۵	تمباکونوشی اور بارگاہ نبویؐ	//
۲۱۶	تمباکونوشی پر عالم مثال میں تنبیہ	۲۷۰
۲۱۷	شاہ عبدالرحیمؒ کا علمی مقام	۲۷۱
۲۱۸	علم مصالح اور شرائع	۲۷۲
۲۱۹	قال را بگذار مرد حال شو	۲۷۴
۲۲۰	حقیقتِ کیمیا	//
۲۲۱	زندگی گزارنے کا گر	//

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۲۲۲	عدل وانصاف	۲۷۴
۲۲۳	باید کہ ہر جا روی طالب مرد ے شوی	۲۷۵
۲۲۴	شیخ اکبرؒ اور شاہ عبدالرحیمؒ	//
۲۲۵	وھو معکم کی عالمانہ تشریح	۲۷۶
۲۲۶	تجدد امثال	۲۷۷
۲۲۷	صفات باری	//
۲۲۸	حسن ذاتی اور قبح نسبتی	//
۲۲۹	مسمّٰی حقیقت	//
۲۳۰	شاہ عبدالرحیمؒ کا ہندی دوہا	۲۷۸
۲۳۱	لطائف ستہ اور ان کے مقامات	//
۲۳۲	شاہ عبدالرحیمؒ یا ابوالفیض ؟	//
۲۳۳	مباش در پے آزار الخ	۲۷۹
۲۳۴	شاہ عبدالرحیمؒ کے جواہر پارے	//
۲۳۵	سراپائے شاہ عبدالرحیمؒ	۲۸۱
۲۳۶	معمولات شاہ عبدالرحیمؒ	۲۸۳
۲۳۷	صحبت یار آخر شد	۲۸۴
۲۳۸	حصہ دوم	۲۸۵
۲۳۹	در حالات جناب معارف مآب امام طریقت وحقیقت کاشف حقائق مخدومنا شیخ ابوالرضا محمد رضی اللہ عنہ	//
۲۴۰	حضرت شیخؒ کے ابتدائی حالات	۲۸۶
۲۴۱	علی المرتضیٰؓ وسیلہ بیعت ہیں	۲۸۷
۲۴۲	برکات قرب نبویؐ	۲۸۸
۲۴۳	آپ کی پاکیزہ زندگی، تصرفات اور مخفی امور پر مطلع ہونے کا بیان	۲۹۰

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۲۴۴	معمولات شیخ ابوالرضا	۲۹۰
۲۴۵	مبین حقیر گدایان عشق	۲۹۱
۲۴۶	جسے اللہ رکھے	۲۹۲
۲۴۷	بادشاہ حقیقی کا انصاف	//
۲۴۸	عاشقم بر قہر و بر لطفش بجد	۲۹۳
۲۴۹	مدار شریعت ظاہر پر ہے	//
۲۵۰	دست پیر از غائبان کوتاہ نیست	۲۹۴
۲۵۱	قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید	//
۲۵۲	اتباع سنت میں آپ کا مقام	۲۹۵
۲۵۳	برکات نسبت	//
۲۵۴	بارگاہ اولیاء میں حاضری کے آداب	۲۹۶
۲۵۵	شاعر گلشن دہلویؒ کا واقعہ	۲۹۷
۲۵۶	تصرف شیخ	//
۲۵۷	وسعت علوم اولیاء	۲۹۸
۲۵۸	هو يطعمني	//
۲۵۹	غرور علم سے سرشار عالم بارگاہ فقیر میں	//
۲۶۰	کسے خبر کہ جنوں بھی ہے، صاحب ادراک	۲۹۹
۲۶۱	خطرات قلب پر اطلاع	۳۰۰
۲۶۲	علم ظاہر اور علم باطن کا فرق	//
۲۶۳	حضرت شیخ ابوالرضاؒ کے حقیقت و معرفت سے معمور ملفوظات	۳۰۱
۲۶۴	رویت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم	//
۲۶۵	نکتہ شیخ اکبرؒ	//
۲۶۶	بعض دعاؤں کے عجیب اثرات	۳۰۲

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۲۶۷	لوح محفوظ است پیش اولیاء	۳۰۲
۲۶۸	منازل ایمان	//
۲۶۹	مقامات بایزیدؒ اور سید الطائفہؒ	۳۰۳
۲۷۰	مقام فنا فی اللہ	//
۲۷۱	خواب اولیاء	۳۰۴
۲۷۲	اتباع سنت ہی ذریعۂ نجات ہے	//
۲۷۳	علوم صوفیاء	//
۲۷۴	اعتقاد توحید	۳۰۵
۲۷۵	ولایت حقیقیہ	//
۲۷۶	بہترین مجاہدہ توجہ الی الحق	//
۲۷۷	العلم حجاب الاکبر	//
۲۷۸	شیخ یاقوت عرشیؒ کی وجہ تسمیہ	۳۰۶
۲۷۹	مشاہدۂ حق	//
۲۸۰	بشری خصوصیات کی خصوصیات	۳۰۷
۲۸۱	الصوفی ھو اللہ	//
۲۸۲	بصارت اور بصیرت	۳۰۸
۲۸۳	علمائے ظاہر کا نزاع لفظی	//
۲۸۴	اولیاء اور دیدار باری	//
۲۸۵	حقیقت بیعت	۳۰۹
۲۸۶	تجلی ذات کی دولت	//
۲۸۷	تعصب راہ خدا میں بڑی رکاوٹ ہے	//
۲۸۸	لفظوں کے پجاری علماء	۳۱۰
۲۸۹	مسئلۂ توحید خالی کتابوں سے حل نہیں ہوتا	//

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۲۹۰	اولیاء ابوالوقت ہوتے ہیں	۳۱۰
۲۹۱	ذوق مشاہدہ	۳۱۱
۲۹۲	خدا کا دشمن کون ہے	//
۲۹۳	ریاضات صوفیاء	۳۱۲
۲۹۴	عین القضاۃ ہمدانیؒ کے قول کی تشریح	//
۲۹۵	لامحدودیت واجب الوجود	۳۱۳
۲۹۶	شیخ اکبرؒ کے ایک قول کی تشریح	//
۲۹۷	عظمت قرآن	۳۱۴
۲۹۸	مقامات سلوک	۳۱۵
۲۹۹	تشریح شعر عطارؒ	//
۳۰۰	ایک لطیف نکتہ	۳۱۶
۳۰۱	مقام ابن منصورؒ	//
۳۰۲	نظارۂ جمال حقیقی	۳۱۷
۳۰۳	ظلمت عدم سے وجود خارجی تک	//
۳۰۴	احدیت وواحدیت	۳۱۸
۳۰۵	اصلیت شطحیات	۳۱۹
۳۰۶	تجلی برقی	//
۳۰۷	لذت عشق	۳۲۰
۳۰۸	کشف ذات	//
۳۰۹	علوم عارف	۳۲۱
۳۱۰	اقسام حدیث قدسی	//
۳۱۱	استعانة باصحاب القبور	//
۳۱۲	حقیقت دنیا	//

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۳۱۳	حقیقت کذب	۳۲۱
۳۱۴	مشابہت یہود سے ممانعت	۳۲۲
۳۱۵	پردہ ہائے امکان و وجوب	//
۳۱۶	تعریف مشاہدہ	//
۳۱۷	حصول شہود	//
۳۱۸	العلم اوسع من الحال	۳۲۳
۳۱۹	ہمہ اوست	۳۲۴
۳۲۰	صفت علم	۳۲۵
۳۲۱	ایک قول کی تاویل	//
۳۲۲	مقام عارف	//
۳۲۳	سماع سرود	۳۲۶
۳۲۴	ولایت عامہ وخاصہ	//
۳۲۵	حقیقت محمدیہ	//
۳۲۶	فناء نفس	۳۲۷
۳۲۷	توجہ شیخ	//
۳۲۸	حقیقت کشف وخواب	//
۳۲۹	تعبیر رؤیا	۳۲۸
۳۳۰	علم توحید ووصول وشہود	۳۲۹
۳۳۱	بسیار خوری اخلاق ذمیمہ پیدا کرتی ہے	//
۳۳۲	حقیقت خوارق عادات	۳۳۰
۳۳۳	مقصود عارف	//
۳۳۴	تسخیر جنات	//
۳۳۵	خواص فاتحہ	۳۳۱

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۳۳۶	تفسیر فوق کل ذی علم علیم	۳۳۱
۳۳۷	اقوال شیخ جنیدؒ کی تشریح	//
۳۳۸	تحقیق لطائف ستہ	۳۳۲
۳۳۹	علی المرتضیٰ وزیر رسالتمآب میں	//
۳۴۰	مقام علی کرم اللہ وجہہ	//
۳۴۱	علم الیقین، عین الیقین، حق الیقین	۳۳۳
۳۴۲	العارف لا همة له	//
۳۴۳	مقام عارف کامل	//
۳۴۴	حقیقت فنا وبقا	۳۳۴
۳۴۵	مجذوب واصل کشف اور خوارق سے بلند ہوتا ہے	۳۳۵
۳۴۶	تحقیق مسلک محب اللہ الہ آبادیؒ	۳۳۶
۳۴۷	حق اور عالم	۳۳۸
۳۴۸	مبدأ مکاشفہ محبت ذاتیہ ہے	//
۳۴۹	ظہور حق در مظاہر	۳۳۹
۳۵۰	علامت کمال	//
۳۵۱	ایک تسامح اور اس کا ازالہ	۳۴۰
۳۵۲	حقیقت تعوذ	//
۳۵۳	قصہ خالد بن سنانؓ کی تشریح	//
۳۵۴	منتہائے عابد	۳۴۱
۳۵۵	القید کفر	//
۳۵۶	قول پیرؒ ہرات	۳۴۲
۳۵۷	وصل حقیقی	۳۴۳
۳۵۸	تشریح توحید کوچہ تنگ است	//

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۳۵۹	تاویل حقیقة الواجب لایدرکه احد	۳۴۳
۳۶۰	تشریح ان لله سبعین الف حجاب	۳۴۴
۳۶۱	معنی قول خواجہ نقشبندؒ	۳۴۵
۳۶۲	توجیہ خضت بحراً الخ	//
۳۶۳	توحید افعال	۳۴۶
۳۶۴	حدیث ماتقرب الی عبد	//
۳۶۵	راہ سلوک میں حزن واندوہ	۳۴۷
۳۶۶	تشریح والعصر الخ	//
۳۶۷	تشریح ''توحید راہ کی درمیانی منزل'' ہے	۳۴۸
۳۶۸	شیخ اکبرؒ کے قول کی تشریح	۳۴۹
۳۶۹	حضرت شیخ ابوالرضاؒ کے چند مسودات اور مکتوبات	۳۵۱
۳۷۰	مکتوب شیخ عبدالاحدؒ	//
۳۷۱	مکتوب شیخ ابوالرضاؒ	//
۳۷۲	مکتوب شیخ عبدالاحدؒ	۳۵۳
۳۷۳	جواب شیخ ابوالرضاؒ	۳۶۵
۳۷۴	مکتوب شیخ عبدالاحدؒ	۳۷۳
۳۷۵	محاکمہ مؤلف رحمتہ اللہ علیہ	۳۸۸
۳۷۶	نامۂ شیخ عبدالاحدؒ	۳۹۲
۳۷۷	نامۂ شیخ ابوالرضاؒ	۳۹۳
۳۷۸	نامہ شیخ ابوالرضاؒ	۳۹۴
۳۷۹	حکایت محبت ومحنت	۳۹۵
۳۸۰	مکتوب شیخ ابوالرضا	۴۰۱
۳۸۱	مکتوب دیگر	۴۰۳

نمبرشمار	مضمون	صفحہ
۳۸۲	بنائے طریقہ رضائیہ	۴۰۸
۳۸۳	تفسیر فاتحہ	۴۰۹
۳۸۴	فرائض ولایت کبریٰ	۴۱۰
۳۸۵	تربیت سالک	۴۱۱
۳۸۶	شیخ ابوالرضاءؒ کا سفر آخرت	۴۱۴
۳۸۷	شاہ ولی اللہ کے اجداد اور مشائخ کے حالات	۴۱۶
۳۸۸	امام ناصر الدینؒ کی روحانی امداد	۴۱۹
۳۸۹	حالات شیخ معظمؒ	۴۲۱
۳۹۰	شیخ معظمؒ کی اولاد	۴۲۲
۳۹۱	مختصر ذکر شیخ وجیہ الدینؒ	//
۳۹۲	معرکہ ڈہاموتی	۴۲۴
۳۹۳	فیل مست سے مقابلہ	۴۲۶
۳۹۴	شیخ رفیع الدین محمدؒ (۱) کے خاندان کے حالات	۴۳۱
۳۹۵	شیخ طاہرؒ	//
۳۹۶	شیخ حسنؒ	۴۳۲
۳۹۷	شیخ محمد خیالیؒ	۴۳۳
۳۹۸	شیخ عبدالعزیزؒ	۴۳۴
۳۹۹	شیخ قطب العالمؒ	۴۳۶
۴۰۰	شیخ رفیع الدین محمدؒ	۴۳۷
۴۰۱	مقام خواجہ محمد باقی باللہؒ	۴۳۸
۴۰۲	قدوۃ العارفین حضرت شیخ محمد قدس سرہ العزیز کے مختصر حالات زندگی اور کرامات کا بیان	۴۴۲
۴۰۳	شیخ ابوالکرمؒ	۴۴۴

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۴۰۴	حضرت شیخ محمدؒ	۴۴۵
۴۰۵	تاثیرِ صدقہ	۴۴۷
۴۰۶	حیات شہید	۴۴۸
۴۰۷	حیات اولیاء	//
۴۰۸	حضرت شیخ محمدؒ کے تصرفات اور بعض کرامات	۴۴۹
۴۰۹	صورت شیخ کا کرشمہ	//
۴۱۰	سلبِ مرض	۴۵۰
۴۱۱	تصرفِ شیخ	۴۵۱
۴۱۲	تکثیرِ طعام	//
۴۱۳	من عادلی ولیا فاذنته بالحرب	//
۴۱۴	امداد اولیاء	۴۵۲
۴۱۵	قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید	۴۵۳
۴۱۶	ختم خواجگان	//
۴۱۷	تاثیرِ نظر	//
۴۱۸	کشفِ قبور	۴۵۴
۴۱۹	کشفِ غیوب	۴۵۵
۴۲۰	مثال وحدۃ الوجود	//
۴۲۱	نگاہِ ولی	//
۴۲۲	حضرت شاہ ولی اللہ کے اساتذہ ومشائخ حرمین کے مختصر حالات	۴۵۷
۴۲۳	شیخ احمد شناویؒ	//
۴۲۴	شیخ احمد قشاشیؒ	۴۵۹
۴۲۵	سید عبدالرحمٰن ادریسی المحجوبؒ	۴۶۲
۴۲۶	شمس الدین محمد بن العلا بابلیؒ	۴۶۳

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۴۲۷	شیخ عیسیٰ جعفری مغربیؒ	۴۶۵
۴۲۸	محمد بن محمد بن سلیمان مغربیؒ	۴۶۶
۴۲۹	شیخ ابراہیم کردیؒ	۴۶۷
۴۳۰	شیخ حسن عجمیؒ	۴۷۰
۴۳۱	شیخ احمد نخلیؒ	۴۷۳
۴۳۲	شیخ عبداللہ بن سالم البصریؒ	۴۷۴
۴۳۳	شیخ ابو طاہر محمد بن ابراہیم کردی المدنیؒ	۴۷۶
۴۳۴	شیخ تاج الدین قلعی حنفیؒ	۴۸۰
۴۳۵	حضرت شاہ ولی اللہ کے خودنوشت حالات زندگی	۴۸۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین وصلی اللہ علیٰ خیر خلقہ وآلہ واصحابہ اجمعین

حمد وصلوٰۃ کے بعد یہ حقیقت اہل بصیرت سے مخفی نہیں کہ مشائخ کرام کی باتیں گویا طائفہ الٰہی کی باتیں ہیں۔ مشائخ صوفیاء کے احوال واقوال جو ان کی کرامتوں اور استقامتوں پر مشتمل ہوتے ہیں اور جن کی بنیاد ان کے ظاہری وباطنی علوم پر ہوتی ہے۔ نوآموزوں کے لیے اشتیاق وترغیب کا باعث بنتے ہیں اور پختہ کاروں کے لیے نظامِ زندگی اور دستور کی حیثیت رکھتے ہیں۔ خاص طور پر اپنے آباواجداد کے تاریخی آثار سننے سے اولاد واخلاف کے لیے زیادہ سے زیادہ فائدہ کی امید ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے بسا اوقات حدودِ شریعت سے تجاوز کرنے والے اخلاف کی غیرت جاگ اٹھتی ہے اور رگِ غیرت کے جوش سے چونک کر وہ کسی منزل مقصود پر پہنچ سکتے ہیں اور میانہ رو اخلاف ذکر اسلاف کی برکت سے اپنی کوتاہیوں سے آگاہ ہوجاتے ہیں۔ پھر یہ آگاہی ان پر رجوع اور توبہ کے دروازے کھول دیتی ہے۔

ان حقائق کو پیش نظر رکھتے ہوئے فقیر حقیر ولی اللہ (اللہ اس کے گناہوں سے درگزر فرمائے اور اسے سلف صالحین میں شامل کرے) نے ارادہ کیا کہ اپنے والد بزرگوار قدوۃ العارفین زبدۃ الواصلین صاحب کرامت جزیلہ ومقامات جلیلہ سیدنا ومولانا شیخ عبدالرحیم (اللہ ان سے راضی ہو اور انہیں راضی کرے) کے علمی ومجلسی فوائد میں سے کچھ نفیس واقعات وحکایات ونادر کرامات اور تصرفات جو کہ حضرت والد ماجد اور ان کے مشائخ کرام سے ظہور پذیر ہوئیں نیز طریقت وحقیقت کے رموز ونکات جو ان بزرگوں کے سینوں کی زرخیز زمین نے باران الہام سے اخذ وقبول کیے اور سالکان طریقت کی ہدایت کیلئے مجالس صحبت یا گوشہ ہائے خلوت میں جو مقامات وملفوظات ان کی زبان گوہرفشاں سے وقوع پذیر ہوئے اور راقم الحروف کے حافظے نے حسب استطاعت انہیں محفوظ ومنضبط کیا حیطہ تحریر میں لائے۔

علاوہ ازیں اپنے بلند پایہ چچا بزرگوار، اہل ذوق و وجود کے پیشوا، ارباب معرفت وشہود کے امام حلقہ بسلسلہ عارفین رونق چشم کاملین، خدائے بے نیاز کے ساتھ پیوستہ و وابستہ سیدنا و مولانا ابوالرضا محمد قدس سرہ الامجد کے عرفان وحقائق میں سے جو چیزیں نقل صحیح کے ذریعے مجھے معلوم ہوئیں ان کا ترتیب و تالیف میں مشغول ہوا اور ان دو اہم مقاصد سے فراغت کے بعد ان بزرگوں کے مختصر حالات بھی بیان کروں جن کے ساتھ اس فقیر کو قرابت یا تلمذ کا قدرے تعلق رہا ہے، ہوسکتا ہے کہ اہل زمانہ عام طور پر اور اس خاندان کے لوگ خاص طور پر ان فوائد علمی اور مقالات روحانی سے نفع اندوز ہوں اور راقم الحروف کو اپنی نیک دعاؤں میں یاد رکھیں، اس کتاب کو میں نے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے اور اس کا نام انفاس العارفین تجویز کیا ہے۔ پہلے دو حصوں کو میں نے دو علیحدہ رسالوں کی شکل میں مرتب کیا ہے ایک کا نام ''بوارق الولایۃ'' اور دوسرے رسالے کا نام ''شوارق المعرفۃ'' رکھا ہے تیسرا حصہ پانچ مقالات پر مشتمل ہے جن کے عنوانات حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ الامداد فی مآثر الاجداد (خاندان مصنف کے حالات پر مشتمل)

۱۔ عطیۃ الصمدیہ فی انفاس المحمدیہ (مصنف کے نانہالی جد حضرت شیخ محمد پھلتیؒ کے حالات)۔

۳۔ النبذۃ الابریزیہ فی لطیفۃ العزیزیہ (مصنف کے جد اعلیٰ مولانا شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کے حالات میں)

۴۔ انسان العین فی مشائخ الحرمین (مصنف نے حرمین شریفین میں جن مشائخ سے استفادہ کیا ان کا ذکر خیر)

۵۔ الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبدالضعیف (مصنف کی خودنوشت)

فقیر خدا سے دعا کرتا ہے کہ ان مقامات سے اللہ اپنے نیک بندوں کو تسکین حاصل کرنے کی توفیق بخشے۔ بیشک وہ سب سے قریب اور سب کی سننے والا ہے۔ اللہ ہی میرے لیے کافی اور میرا بہترین ساتھی ہے۔ ہر نیکی کی توفیق اور ہر بدی سے دوری اس بلند و بالا ذات ہی کی طرف سے ارزانی ہوتی ہے۔

حصۂ اوّل

جناب کرامت مآب قدوۃ العارفین زبدۃ الواصلین سیدنا و مولانا شیخ عبدالرحیمؒ کے پسندیدہ روحانی تصرفات، نایاب واقعات، اور روح پرور واردات قلبی کے بیان میں

تمام حمد وثناء اس ذات اللہ کے لیے ہے جس نے تجلیات اور واردات کے لطیفوں سے اہل عرفان کے دلوں کو منور کیا اور ان کے سینوں کو باران معرفت سے سیراب فرمایا اور عرفان کے نفیس نکتوں سے اور اسماء وصفات کی باریکیوں سے ان کو وہ مقام عطا فرمایا جو نہ کسی کی چشم تصور میں آسکتا ہے اور نہ ہی دید وشنید میں اور نہ ہی بجز ان پختہ کار مردان احرار کے اس مقام تک کسی کے قلب ونظر کی رسائی ہو سکتی ہے۔ اس لطف وکرم کی بناء پر ان مردانِ خدا کو ہر سمت و ہر جہت اور ہر حیثیت سے گونا گوں انوار وتجلیات اور برکات ایزدی نے گھیر رکھا ہے اور ان مقبولان خدا کی زبانیں وصول حق، سلوک طریقت کے نکات اور حکمت واسرار الٰہی کی باریکیاں کلمات ربانی کے نادر حقائق بول اٹھیں اور ان کے ہاتھوں وہ وہ آثار وکرامات اور خلاف عادت واقعات رونما ہوئے جن کے سبب انہیں عامیوں سے ممتاز گردانا گیا، سو پاک ہے وہ ذات جو جسے چاہے اور جو چاہے عطا کر دے نہ کوئی اس کے حکم کو ٹال سکتا ہے اور نہ ہی اس کی تقدیر پھر سکتی ہے، تحیات اور حمد وثناء اسی کو زیبا ہے اور میں اس بات کی شہادت دیتا ہوں کہ وہی معبود برحق ہے، جس کا کوئی ساجھی نہیں اور میں اس بات کا بھی اقرار کرتا ہوں کہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ اس کے عبد خاص اور رسول ہیں۔ یہی شہادت میری مرگ وزندگی کا سرمایہ ہے۔ ازل سے ابد تک صلوٰۃ وسلام ہوں اس نبی اقدس پر ان کے آل واصحاب پر جو ہدایت کے ستارے ہیں اور بندگان خدا کے قائد، بعد ازیں فقیر ولی اللہ عفی عنہ عرض پرواز ہے کہ یہ چند کلمات حضرت والد بزرگوار قدوۃ العارفین زبدۃ الواصلین صاحب کرامت جزیلہ ومقامات جلیلہ سیدنا ومولانا شیخ عبدالرحیمؒ قدس سرہ العزیز کی کرامات،

وقائع اور احوال واقوال پر مشتمل ہیں جن کا نام میں نے بوارق الولایۃ رکھا ہے۔ اللہ ہی مجھے کافی ہے جو میرا بہترین ساتھی ہے۔ وہی نیکی کی توفیق دیتا ہے اور بدی سے باز رکھتا ہے۔

زندۂ جاوید

میرے والد ماجد شاہ عبدالرحیمؒ فرماتے تھے کہ مجھے آغاز کار میں (اپنے نانا) شیخ رفیع الدین دہلویؒ کے مزار مبارک کے ساتھ موانست و رغبت پیدا ہوگئی تھی چنانچہ میں وہاں جا کر ان کے مزار کو مرکز توجہ بنایا کرتا تھا۔ اکثر و بیشتر غیبت کا ایسا حال طاری ہوتا کہ مجھے سردی و گرمی کے احساس سے بھی بے نیاز کر دیتا تھا۔

میراثِ ولایت

فرماتے تھے کہ شیخ رفیع الدینؒ نے آخری وقت میں ایک دن اپنا تمام اثاث البیت جمع کیا اور وارثوں میں تقسیم کر دیا، اولاد میں سے ہر ایک کو اس کے حسب ضرورت دیا۔ جب سب سے چھوٹی اولاد (یعنی والدہ حضرت شیخ عبدالرحیمؒ) کی باری آئی تو انہیں مشائخ کرام کا شجرہ، خاندانی اوراد اور فوائد طریقت پر مشتمل ایک چھوٹا سا رسالہ عنایت فرمایا۔

شیخ کی رفیقۂ حیات نے کہا کہ "یہ بچی غیر شادی شدہ ہے اسے تو جہیز اور اسباب خانہ چاہیے نہ کہ رسائل تصوف"! فرمایا یہ رسائل ہمیں مشائخ سے میراث میں ملے ہیں اس عفیفہ کے بطن سے اس معنوی میراث کا مستحق ایک بچہ پیدا ہوگا۔ ہم نے یہ روحانی میراث اسی کے لیے دی ہے۔ باقی رہے اسباب خانہ تو وہ خدا میسر کر دے گا ہمیں اس کا غم نہیں، بہت عرصے بعد جب میں (شاہ عبدالرحیمؒ) پیدا ہوا اور ہوش سنبھالا تو اللہ تعالیٰ نے ہماری جدہ محترمہ کے دل میں یہ بات ڈال دی اور انھوں نے وہ رسائل مجھے دیدیئے۔ کچھ دنوں بعد وہ کھو گئے اگر چہ بشارت کا لفظ مشترک تھا لیکن ان رسائل سے نفع اندوزی نے اس بشارت کی تفسیر اور مقصود بشارت کو متعین کر دیا کیونکہ حضرت مخدومی اخوی شیخ ابوالرضاؒ (۱) ان دنوں اس کام کا ذوق نہیں رکھتے تھے اور بھائی عبدالحلیمؒ (۲) ابھی تک متولد نہیں ہوئے تھے۔

---

(۱) حضرت شاہ عبدالرحیمؒ کے بڑے بھائی۔ (۲) حضرت شاہ عبدالرحیمؒ کے چھوٹے بھائی۔

آثار سعادت

فرماتے تھے کہ میرے شیخ عبدالحیؒ نہایت نیک مرد تھے جو دنیا سے روگرداں اور طریق اسلاف پر گامزن تھے وہ اپنی اولاد کی تربیت میں بہت کوشاں رہے مگر اولاد ان سے متاثر نہ ہو سکی جس کے سبب وہ ہمیشہ رنجیدہ رہتے تھے۔ ایک روز اتفاق سے مجھے دیکھا کہ میں نے باوجود کم عمر ہونے کے سر سے پگڑی اتار کر گھٹنے پر رکھی ہوئی تھی اور تمام سنتوں اور نوافل کی رعایت کے ساتھ وضو کر رہا تھا۔ مجھے اس حالت میں دیکھ کر ان کا دل کھل اٹھا اور خدا کا شکر کرنے لگے کہنے لگے کہ جب میں نے اپنی تربیت کا کوئی اثر اولاد میں نہ دیکھا تو ڈرا کہ شاید ہمارے اسلاف کا روحانی سلسلہ ہمارے بعد منقطع ہو جائے مگر ابھی معلوم ہوا کہ اس میراث کا حامل ہمارے خاندان میں موجود ہے جو اگرچہ سلسلہ فرزندان میں سے نہیں مگر یہ کیا کم ہے کہ دختر نیک اختر کے نسب سے تو ہے۔

کاتب الحروف (شاہ ولی اللہ) کہتا ہے کہ ہمارے اسلاف کا روحانی دستور یہ چلا آرہا تھا کہ ہر صدی میں طریقۂ چشتیہ کی نسبت کے حامل رہے ہیں اور اکثر و بیشتر ہر جانے والا آنے والے کی بشارت دیتا رہا ہے اور یہ قصہ اسی طرح چلتا رہا ہے۔

شہباز قدس

فرمایا کہ میں نو یا دس برس کا تھا کہ سلسلۂ نقشبندیہ سے متعلق ایک بزرگ خواجہ ہاشم (۱) نامی بخارا سے تشریف لائے اور ہمارے محلّہ میں قیام پذیر ہوئے۔ وہ مجھ پر اکثر توجہ فرماتے تھے ایک مرتبہ فرمانے لگے کہ میں ایک درود جانتا ہوں جس کے پڑھنے سے آدمی دولت مند ہو جاتا ہے۔ میرا دل اس وقت تمام تعلقات سے بیزار تھا میں نے کہا اللہ تعالیٰ والد ماجد کے ذریعے میری ضروریات پوری کر دیتا ہے، مزید احتیاج نہیں رکھتا۔ یہ سن کر خاموش ہو گئے۔

چند دنوں بعد پھر فرمانے لگے۔ مجھے بزرگوں سے ایک دعا ملی ہے جسے کوڑھی پر دم کیا جائے تو کوڑھ فوراً کافور ہو جاتا ہے۔ میں نے کہا اللہ تعالیٰ نے مجھے اس مرض سے محفوظ رکھا ہے اور اگر

---

(۱) غالباً خواجہ ہاشم سے مراد حضرت شیخ محمد ہاشم کشمیؒ ہیں جو حضرت مجدد صاحبؒ کے خلیفہ تھے۔ آپ نے برکات الاحمدیہ الباقیہ کے نام سے حضرت مجدد ان کے پیر و مرشد اور خلفاء و صاحبزادگان کے حالات پر نہایت جامع اور مستند کتاب لکھی ہے کشم بخارا کے علاقے میں ایک قصبہ کا نام ہے۔

کوئی کوڑھی نظر پڑا تو آپ کی خدمت میں پیش کردوں گا۔ اس پر وہ خاموش ہو گئے۔ کچھ دن بعد فرمایا کہ درد و اور دعا سے ہماری غرض تمھیں شکار کرنا تھا کیونکہ تم اچھی استعداد رکھتے ہو مگر معلوم ہوا کہ تم انتہا درجے کے بلند ہمت ہو۔ دراصل ہم چاہتے ہیں کہ اشغال صوفیاء میں سے کسی شغل کو اپنا مطمح نظر بناؤ۔ جس پر میں نے کہا سر آنکھوں پر! اس پر انھوں نے مجھے شغل ''استکتاب'' کی تلقین فرمائی یعنی اسم ذات (اللہ) کو لگاتار کسی تختی یا کاغذ پر لکھتے رہنا چاہئے تاکہ کثرت نگاہ کے سبب قوت متخیلہ میں جاگزیں اور پیوست ہو جائے۔ یہ مشغلہ میں نے شروع کیا جو مجھ پر حاوی ہو گیا۔ ان دنوں میں شرح عقائد اور حاشیہ خیالی پڑھتا تھا۔ میں نے ارادہ کیا کہ حاشیہ ملا عبدالحکیمؒ لکھوں۔ جب لکھنے لگا تو کم و بیش ایک کاپی کے بقدر اسم ذات لکھتا رہا مگر مجھے کوئی شعور نہ رہا۔

تاثیر فیضان نبوت

حضرت والد ماجد نے فرمایا کہ میں اندازاً بارہ تیرہ برس کا تھا کہ حضرت زکریا علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کو مجسم سامنے دیکھا انھوں نے ذکر اسم ذات کی تلقین فرمائی۔ قوت نبوت کے سبب ان کی اس تلقین نے اس قدر تاثیر دکھائی کہ اس عمر میں تحصیل علم کی مشغولیت اور قلت توجہ کے باوجود برکات ذکر اس انداز میں ظہور پذیر ہوئیں کہ کامل اور قوی الطلب طالبانِ حق سے دیکھنے میں نہیں آئیں۔ اس واقعہ کے بعد حضرت شیخ عبدالعزیز قدس سرہٗ کو خواب میں دیکھا۔ فرمایا اے بیٹے! ارادت کا ہاتھ کسی کے ہاتھ میں نہ دینا۔ یہاں تک کہ حضرت خواجہ تجھے قبول فرمائیں۔ اس کے بعد تجھے اختیار ہے۔ یہ واقعہ میں نے خواجہ خوردؒ کی خدمت میں ذکر کیا اور اس کی تعبیر چاہی اور عرض کی کہ اس شہر کے اہل عرفان میں بجز آپ کے اور کوئی خواجہ کے لقب سے مشہور نہیں۔ فرمانے لگے اس واقعے کی تعبیر یہ ہے کہ تمھیں خواجہ کائنات علیہ افضل الصلوٰۃ وایمن التحیات کی بیعت نصیب ہوگی اور اس فقیر کا مرتبہ اس سے کمتر ہے کہ شیخ عبدالعزیزؒ مجھے خواجہ سے تعبیر کریں۔

فقیر کو اسی طرح یاد ہے۔ بعض احباب شیخ عبدالعزیزؒ کی جگہ خواجہ نقشبندؒ کا ذکر کرتے ہیں واللہ اعلم۔

سیر ولایت

اس کے بعد میں ظہور تعبیر کا منتظر رہا اور اکثر درود پڑھنے میں مشغول رہتا تھا۔ ایک رات

درود پڑھ رہا تھا کہ ایک نورانی شبیہ چاند کی شکل میں ظاہر ہوئی حالانکہ اس رات چاند نمودار نہیں تھا اور آہستہ آہستہ پوری روئے زمین پر پھیلنا شروع ہوئی، اس کے بعد وہ میرے سر اور جسم پر وارد ہوئی جب تک وہ نورانی شبیہ میرے سر سے قدرے پرے تھی تو میں ذوق وشوق سے سرمست ہو رہا تھا۔ جب عین سر پر آئی تو بیہوش ہو گیا اور نظر بہ ظاہر میرا وجود غائب ہو گیا واللہ اعلم، کیونکہ میرے والد نے مجھے بہت ڈھونڈا مگر نہ پایا جس کے سبب ان پر اضطراب اور پریشانی چھا گئی۔ اسی غیاب اور گمشدگی کی حالت میں میں نے آسمان پر آسمان طے کرنا شروع کئے۔ یہاں تک کہ ان سب کو پار کر گیا، حتیٰ کہ بارگاہِ سید الانام علیہ الصلوٰۃ والسلام میں جا پہنچا جہاں انھوں نے مجھے اپنی بیعت میں قبول فرما کر نفی واثبات کی تلقین فرمائی۔ تھوڑی دیر بعد مجھے افاقہ ہوا اور اپنی پہلی حالت میں آ گیا چند دنوں بعد خواجہ خوردؒ کی خدمت میں عرض کی کہ مجھ سے جو وعدہ کیا گیا تھا وہ انجام پذیر ہو چکا ہے اب میری اصلاح وتربیت کا کیا سامان ہوگا؟ فرمانے لگے کہ ظاہراً بھی کسی سے ضرور بیعت کرنی چاہیے۔ عرض کی جی چاہتا ہے کہ آپ سے بیعت کرلوں، فرمانے لگے ''تمہیں بہت ہی دوست رکھتا ہوں۔ نہیں چاہتا کہ تمہیں اپنی بیعت میں لوں''۔ عرض کی میں آپ کا مطلب نہیں سمجھ سکا کہ دوستی، بیعت میں نہ لینے کا سبب کیونکر ہو سکتی ہے؟ فرمایا ''مطلب یہ ہے کہ میں بعض غیر شرعی امور کا مرتکب ہوں اور اتباع سنت میں قدرے غفلت وکاہلی کا روادار، کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھ سے تعلق وربط کی بنا پر تمہارے قدم جادۂ شریعت سے ہٹ جائیں۔ ہاں البتہ صحبت ومجلس میں آتے رہو، فیض وبخشش سے کبھی دریغ نہ کروں گا''۔ عرض کی تو پھر جس سے فرمائیے توسل کرلوں۔ فرمانے لگے اگر شیخ آدم (۱) بنوریؒ قدس سرہٗ کے خلفاء میں سے کوئی مل جائے تو زیادہ مناسب رہے گا! کیونکہ یہ لوگ اتباع شریعت، ترک دنیا اور تہذیب نفس میں ایسا کمال رکھتے ہیں جو دوسروں کو میسر نہیں۔ عرض کی کہ ہمارے پڑوس میں ان کے خلفاء میں سے سید عبداللہؒ قیام پذیر

(۱) سید آدم بنوری حسینیؒ آپ کا اصلی وطن قصبہ موودہ تھا مگر بنور میں سکونت اختیار کر لی تھی، سلوک کی ابتدائی تعلیم حاجی خضر سے حاصل کی بعد ازاں حضرت مجدد صاحب کی خدمت میں آ ئے۔ آپ امی محض تھے لیکن باطنی طریق پر قرآن مجید حفظ کرلیا اور دیگر علوم بھی حاصل کئے۔ آپ کی خانقاہ میں ایک ہزار سے زائد طالبان معرفت ہر وقت جمع رہتے تھے۔ ایک دنیا آپ سے فیضیاب ہوئی۔ ایک سو کے قریب نامور خلفاء ہیں۔ خیر البلاد مدینہ طیبہ میں ۲۳ ؍ شوال ۱۰۵۳ھ میں انتقال فرمایا۔ جنت البقیع میں قبر حضرت عثمانؓ کے قریب مدفون ہیں۔

ہیں۔فرمایا،غنیمت ہیں۔جلد ہی ان سے ربط پیدا کرنا چاہئے۔میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ باوجود اس کے کہ تنہائی،عزلت نشینی اور کم آمیزی ان پر غالب تھی۔پہلی ملاقات میں ہی بیعت میں قبول فرمالیا۔بیعت کے بعد میں حضرت خواجہ خوردؒ اور سید عبداللہؒ دونوں کی خدمت میں حاضر ہوتا اور فیض صحبت حاصل کرتا رہا۔

نفی واثبات اور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت والد ماجد فرمایا کرتے تھے کہ اسم ذات (۱) کا شغل جو میں نے حضرت زکریا علیہ السلام سے حاصل کیا تھا مجھ پر غالب رہتا تھا اور میں اس سے بہت ہی کیف وسرور حاصل کرتا تھا۔ اس کے مقابلے میں شغل نفی واثبات (۲) نہیں کرسکتا تھا۔اگر کبھی کرتا تو اس سے ذرا بھی لذت محسوس نہ ہوتی اور اس پر قادر نہ ہوسکنے کی بناپر میں ہمیشہ شرمندہ رہتا تھا۔حضرت سید عبداللہ قدس سرہ سے اس کوتاہی کا علاج دریافت کیا۔بارہا توجہ فرمائی مگر عقدہ حل نہ ہوا فرمانے لگے کہ جو چیز انبیائے کرام علیہم السلام کے انفاس طیبہ کی توجہ کے سبب استحکام حاصل کرے ہم اس میں تبدیلی نہیں لاسکتے۔حضرت ختمی مرتبت علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف توجہ اور رجوع کیجئے،اس نقص وخامی کا علاج ان کی بارگاہ سے ہوگا۔چنانچہ میں نے آنجناب علیہ الصلوٰۃ والسلام سے اس بارے میں التجا کی جس کے نتیجے میں شغل ونفی واثبات مجھ پر غالب آیا اور بہت ہی آسان ہوگیا۔اس انداز پر کہ میں کمسنی کے باوجود ایک ہی سانس میں دوسو مرتبہ یہ ذکر کرسکتا تھا۔میں نے کسی طالب حق میں اس ذکر کے لیے ایسی جذب وکشش نہیں دیکھی باوجود اس بات کے کہ میں تحصیل علم میں مشغول تھا اور دوسرے موانعات بھی حائل تھے مجھے نفی واثبات میں سرور حاصل ہونے لگا۔

---

(۱) اسم ذات کا شغل یہ ہے کہ اسم ذات (اللہ) کا لطیفہ قلب میں دھیان رکھے جس کا مقام بائیں پستان کے نیچے ہے۔بلالحاظ وقت وطہارت،ہاں طہارت اولیٰ ہے کیونکہ طاہر ومطہر کا ذکر طہارت سے ہونا چاہئے۔

(۲) شغل ونفی واثبات،دم بند کرے اور لا کو لطیفہ نفسی سے لطیفہ سری خفی اخفی تک۔وہاں سے الٰہ لطیفہ روحی تک۔ وہاں سے الا اللہ،اور ہائے اللہ دل پر مارے۔ایک ہی حبس میں اکیس دفعہ دوسری بار محمد رسول اللہ ملائے۔اگر اکیس تک نہ پہنچ سکے تو جہاں تک پہنچ جائے یہی عدد اکیس بار تمام وظیفہ ہے۔

حضرت خواجہ حافظ سید عبداللہ قدس سرہ

شوق علم وہدایت

حضرت والد ماجد فرمایا کرتے تھے کہ حضرت سید عبداللہؒ اصل میں قصبہ کھیڑی کے رہنے والے تھے جو بارہہ کے نواح میں واقع ہے۔ ان کے والد نے کھیڑی کو وطن بنا لیا تھا۔ کمسنی ہی میں ان کے والدین فوت ہو گئے تھے اور ان کے دل میں اسی وقت سے خدا طلبی کا جذبہ پیدا ہوا۔ جگہ جگہ اولیائے کرام کی تلاش کرتے رہے۔ یہاں تک کہ پنجاب کے ایک بزرگ کی خدمت میں پہنچے جو علم قرأت میں یدطولیٰ رکھتے تھے اور صحرائے پنجاب کی ایک مسجد میں اپنا وقت گزار رہے تھے۔ لوگوں کے میل جول اور آمد و رفت سے بالکل فارغ البال اور انتہائی متوکل علی اللہ تھے۔ سید صاحب ان کی خدمت میں رہ کر راہِ حق طلب کرنے لگے، ان بزرگ نے سید صاحب سے فرمایا کہ تمہاری تلقین و ہدایت ایک اور بزرگ سے وابستہ ہے جہاں تم انشاء اللہ ضرور پہنچو گے۔ البتہ ہاں حفظ قرآن کی نعمت مجھ سے حاصل کیجئے۔ چنانچہ سید صاحب اسی جنگل میں مدتوں ٹھہرے رہے اور قرآن حفظ کیا، ان بزرگ کے فیض صحبت سے گوشہ نشینی اور ترک دنیا کے آداب سیکھے اور نفس وشیطان کی کج رویوں سے کنارہ کشی کے انداز حاصل کئے۔

مجالس قرآن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری

حضرت والد ماجد نے فرمایا کہ ایک دن وہ بزرگ اور حضرت سید صاحب دونوں قرآن مجید کا دور کر رہے تھے کہ کچھ لوگ عرب صورت، سبز پوش گروہ در گروہ ظاہر ہوئے۔ ان کا سردار مسجد کے قریب کھڑا ہو کر ان قاریوں کی تلاوت سننے لگا اور کہا بارک اللہ ادیت حق القرآن (اللہ برکت دے تلاوت قرآن کا خوب حق ادا کیا) یہ کہہ کر واپس پلٹے۔ ان بزرگ کی عادت تھی کہ تلاوتِ قرآن کے وقت آنکھوں کو نیند کی سی حالت میں رکھتے تھے اور کسی طرف بھی توجہ نہیں کرتے تھے۔ جب زیر تلاوت سورت کو آخر تک پہنچایا تو سید عبداللہ سے پوچھا کہ یہ کون لوگ تھے؟ جن کی ہیبت سے میرا دل کانپ اٹھا مگر عظمت قرآن کے سبب میں اپنی جگہ سے اُٹھ نہ سکا۔ سید صاحب نے کہا قبلہ! یہ اس موضع کے لوگ تھے جب ان کا سردار پہنچا تو مجھ میں یہ طاقت نہ رہی

کہ میں اپنی جگہ پر بیٹھا رہوں۔ مجبوراً اٹھا اوران کی تعظیم بجالایا۔ یہی باتیں ہورہی تھیں کہ اسی وضع قطع کا ایک اور آدمی آیا اور کہنے لگا کہ حضرت نبی اکرمؐ کل مجمع اصحاب میں بیٹھے ہوئے اس جنگل کے رہنے والے حافظ کی تعریف وصفت فرمارہے تھے اور ساتھ ہی فرمارہے تھے کہ کل علی الصباح ہم اسے دیکھنے جائیں گے اوراس کی قرأت بھی سنیں گے کیا آپ تشریف لائے تھے یا نہیں؟ اگر آئے تھے تو کدھر کو گئے۔ ان دنوں بزرگوں نے جب یہ بات سنی تو دائیں بائیں دوڑے مگر کوئی نشان نہ پایا (اللہ ان دونوں کی قبروں پر رحمت کے پھول برسائے)

راقم الحروف (شاہ ولی اللہؒ) کا گمان ہے کہ حضرت والد نے یہ بھی فرمایا تھا کہ اس واقعہ کے بعد مدتوں اس جنگل سے خوشبو مہکتی رہی جسے لوگ سونگھتے اور محسوس کرتے تھے۔

طالبان حق کے ادنی مجاہدات

جب حفظ قرآن سے فراغت حاصل ہوئی تو اس بزرگ نے رخصت عطا فرمائی کہ جاؤ اور جہاں بھی کوئی صاحب ولایت ملے اس کی خدمت گزاری میں انتہائی کوشش کرو۔ یہ سیر کرتے ہوئے ''سامانہ'' میں شیخ ادریسؒ سامانی کی خدمت میں جاپہنچے۔ یہ بزرگ متوکل تھے اور لوگوں سے ملنا جلنا ترک کرکے انتہائی مشکل حالات میں گزارہ کررہے تھے۔ یہ سلسلۂ قادریہ سے منسلک تھے۔ پہلی مرتبہ جب ان سے مڈبھیڑ ہوئی تو شیخ نے فرمایا کہ فقیر بہت سارے ہیں۔ کسی دوسری جگہ چلے جاؤ۔ میرے پاس تو اس مردے (۱) کے سوا اور کوئی نہیں ٹھہر سکتا جو طعام، لباس اور تعلقات دنیوی سے بالکل کٹ چکا ہو اور حوائج ضروریہ کے بغیر میرے دروازے سے باہر قدم نہ رکھے۔ حضرت حافظ عبداللہؒ نے ان تمام شرائط کو قبول کیا اوران کے سامنے راہ سلوک طے کرنا شروع کیا بلکہ مردانہ وار اس اختیاری موت پر صابر اور رضامند رہے۔ یہ دیکھ کر ان پر حضرت شیخ نے اپنی توجہ بڑھادی۔ اسی اثنا میں شیخ کا بیٹا ان سے قرآن مجید حفظ کرنے لگا جس کی بنا پر شیخ کی توجہ دونی ہوگئی اور انھوں نے بھی شیخ کی خدمت گزاری میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ حضرت حافظ سید

---

(۱) رہبانیت اور ترک دنیا کی نیت سے ایسا کرنا مذموم ہے، مگر نفس کشی اور پوری توجہ ایک نقطے پر جمانے کے لیے یہ عمل محمود ہے جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعثت سے پہلے غار حرا میں قیام فرمایا۔ ذات حقیقی کے عرفان خالص کی خاطر دنیاوی آلائشوں سے یکسوئی ہی کا یہ عمل ہے۔ موتوا قبل ان تموتوا یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ابن عمرؓ کو یہ فرمانا کہ اپنے آپ کو اہل قبور میں سے شمار کر۔ (ترمذی)

عبداللہ فرماتے تھے ان دنوں میں نے اپنی عادت بنالی تھی کہ درویشوں کیلئے استنجے کے ڈھیلے پتھر سے رگڑ کر صاف کیا کرتا تھا۔ ایک روز اسی حقیقت پر غور کرنے سے اپنے اندر کبر ونخوت اور خود پسندی کا سرور پایا۔ شیخ میری اس حالت پر مطلع ہوئے اور فرمایا کہ میرے چہرے اور جسم پر کوئی نشان یا تبدیلی دیکھتے ہو۔ عرض کی ہاں۔ فرمایا ابتدائے سلوک میں ایک بزرگ کی خدمت میں پہنچا تو ان کیلئے استنجوں کے ڈھیلوں کو اپنے چہرے اور بدن سے رگڑ کر صاف کیا کرتا تھا اور اس سے مجھے ایک روحانی لذت ملتی تھی۔ یہ زخموں کے نشانات اسی کی یادگار ہیں۔ نیز حضرت حافظ سید عبداللہؒ نے یہ بھی فرمایا کہ ان دنوں میری عادت تھی کہ حضرت شیخ اور ان کے اہل خانہ کے کپڑے ہر جمعرات کوندی کے کنارے لے جاتا تھا اور اپنے ہاتھوں سے دھوتا تھا تاکہ نماز جمعہ صاف ستھرے کپڑوں سے پڑھ سکیں۔ ایک بار اتفاق سے جمعرات کے دن میں فاقہ سے تھا اور دستور کے مطابق کپڑے سر پر اٹھا کر ندی کے کنارے چلا گیا۔ آدمیوں سے ایک طرف ہوکر کپڑے دھونے میں مشغول ہو گیا۔ جب سورج تیز ہوگیا۔ بھوک اور پیاس کی شدت نے غلبہ پایا تو میں بیہوش ہوکر گر پڑا۔ ناگاہ ایک برقع پوش میرے سر پر پہنچا اور مجھے بیدار کیا۔ برقع میں سے گرم روٹی نکال کر مجھے دی اور کہا۔ کیا تو نے یہ نہیں پڑھا ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ (اپنی جانوں کو ہلاکت میں نہ ڈالو) مجھے خوف لاحق ہوا کہ کہیں شیطان تو نہیں جو مجھے دھوکا دے رہا ہے؟ اس بناء پر میں نے روٹی قبول نہ کی۔ وہ بزرگ میرے اس اندیشے پر مطلع ہوئے اور فرمایا ''اے فلاں: یہ گمان مت کر''۔ یہ لفظ سنتے ہی یہ خیال میرے دل سے دور ہو گیا۔ میں نے روٹی پیٹ بھر کر کھائی۔ دل میں خیال آیا کہ نہر کا پانی گرم ہے۔ کاش یہاں ٹھنڈا پانی ہوتا تاکہ سیر ہوکر پیتا۔ وہ اس کھٹکے پر بھی مطلع ہوگئے اور برقع کے اندر سے مجھے پانی کا آبخورہ نکال کر دیا۔ نہایت ٹھنڈا پانی تھا۔ میں نے جی بھر کر پیا اور پھر کپڑے دھوکر شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ جونہی مجھے دیکھا فرمانے لگے! سید خضر (علیہ السلام) کے ہاتھ سے روٹی لے لی؟ محمد یوں کو خضر (۱) کا احسان ہرگز نہیں اٹھانا چاہیے۔

عالم استغراق

حضرت والد ماجد فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت خواجہ ادریس سامانی حجرے میں یاد

(۱): اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں۔

خدا میں مشغول تھے۔ ان کے اہل خانہ کی عادت تھی کہ ہر سال اسی حجرے میں جانوروں کے لیے گھاس، بھوسا وغیرہ ذخیرہ کیا کرتے تھے۔ اتفاق سے اسی گھڑی اہل خانہ نے حجرے میں گھاس ڈالنا شروع کی۔ انھیں حجرے میں شیخ کی موجودگی کا کوئی علم نہ ہو سکا۔ نیز شیخ بھی اپنی ہستی سے اس قدر بے خبر اور محو تھے کہ انھیں اپنے اوپر گھاس پڑنے کا احساس تک نہ رہا۔ چنانچہ حجرے کو گھاس سے بھر کر دروازہ بند کر دیا گیا۔ کچھ دیر بعد شیخ کی پوچھ کی گئی۔ مسجد میں بھی ڈھونڈا گیا لیکن کہیں نہ ملے۔ آنے جانے والوں سے پوچھا گیا۔ کچھ معلوم نہ ہوا۔ مایوس ہو کر تلاش و تجسس بھی چھوڑ دی چھ ماہ بعد جب چارہ باہر لانے کی ضرورت پڑی تو حجرے کا دروازہ کھلا اور گھاس باہر نکالنے لگے۔ بالآخر ایک دن گھاس اٹھانے والے کا ہاتھ شیخ پر جا پڑا تو وہ چونک اٹھا کہ یہاں کوئی آدمی ہے۔ جب اچھی طرح ٹٹولا تو شیخ کو پہچان لیا، یہ سن کر لوگوں کا ہجوم ہو گیا اور اس وقت شیخ کو بھی حالت سکر سے افاقہ ہوا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ نہ تو انہیں درازیٔ مدت کا احساس رہا اور نہ ہی ان کے جسم و جان پر کچھ نہ کھانے پینے سے کوئی اثر پڑا اور یہ واقعہ عجیب و غریب واقعات میں سے ہے، واللہ اعلم۔

مقام مجددؒ

سننے میں آیا ہے کہ جب شیخ بزرگوار شیخ احمد (۲) سرہندیؒ کے ارشادات و کمالات عام ہوئے تو شیخ ادریسؒ نے ان کی خدمت میں کہلا بھیجا کہ "اگر میں زمین کی طرف دیکھتا ہوں تو زمین

---

(۱) حضرت خضر علیہ السلام کے نسب و خاندان اور دیگر حالات کے بارے میں کوئی مستند معلومات نہیں ملتیں۔ قرآن مجید سے اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اللہ کے ایک برگزیدہ بندے سے ملاقات ہوئی تھی۔ جن کو علم لدنی حاصل تھا اور یہ علم علوم تشریعی سے جداگانہ ہے۔ حضرت خضر کے بارے میں آب حیات کا جو افسانہ لوگوں میں مشہور ہے اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔ رہی یہ بات کہ وہ زندہ ہیں۔ اور مشکل حالات میں مدد کرتے ہیں، اگرچہ یہ بات براہ راست کتاب و سنت سے مستند طور پر ثابت نہیں ہوتی مگر اکثر علماء مشائخ صوفیاء اور اہل معرفت کے نزدیک ان کا زندہ ہونا متفق علیہ ہے، چنانچہ حضرت خضر کی زیارت، ملاقات مشکل معاملات میں ان کی دستگیری کے قصے اس کثرت سے زبان زد خاص و عام ہیں کہ ان کا شمار اور انکار نہیں۔

(۲) حضرت شیخ احمد سرہندیؒ المعروف مجدد الف ثانی ۱۴ شوال ۹۷۱ھ کو سرہند میں پیدا ہوئے آپ کے والد شاہ عبدالاحد فاروقیؒ بھی مشہور عالم بزرگ تھے۔ مجدد الف ثانیؒ نے سترہ سال کی عمر میں تمام علوم و فنون و حفظ قرآن سے فراغت حاصل کر لی۔ آپ نے طریقۂ عالیہ قادریہ میں حضرت شاہ سکندرؒ نبیرۂ شاہ کمال کیتھلی اور طریقہ

(اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

کونہیں پاتا اور اگر آسمان کی طرف نگاہ اٹھاتا ہوں تو آسمان کو معدوم پاتا ہوں اور اسی طرح عرش وکرسی اور بہشت ودوزخ کو بھی موجود نہیں پاتا اور جب کسی کے سامنے جاتا ہوں تو اس کا وجود بھی نہیں پاتا۔ یہاں تک کہ اپنے وجود کو بھی غیر موجود پاتا ہوں اور وجود حق سبحانہ تعالیٰ تو بے پایاں ہے جس کی انتہا کو کوئی نہیں پاسکا۔ تمام مشائخ بھی محض یہی نکتہ کہہ کر رہ گئے ہیں اور اس مقام سے آگے کوئی نہیں جا سکا۔ اگر آپ بھی اسی انتہا کو اپنا کمال سمجھتے ہیں تو کوئی مضائقہ نہیں اور اگر کوئی دوسری بات اس کمال سے ورے معلوم ہوئی ہے تو اس سے ہمیں بھی مطلع کیجئے تاکہ ہم اور ہمارے ایک ایسے دوست جو اس مقام تک پہنچنے کی بہت خواہش رکھتے ہیں، وہاں تک پہنچ سکیں"۔ حضرت شیخ احمد سرہندیؒ نے جواب میں لکھا۔

"میرے مخدوم! یہ اور اس قبیل کے دوسرے حالات تلون قلب (۱) کا نتیجہ ہیں۔ مشاہدہ بتاتا ہے کہ ان حالات کا حامل مقامات قلب میں ایک چوتھائی سے زیادہ طے نہیں کر سکا۔ ابھی اسے تین حصے طے کرنے چاہئیں تاکہ معاملہ قلب کو بتمام وکمال طے کر کے سمجھ سکے۔ مقام قلب سے گزرنے کے بعد مقام روح آتا ہے۔ مقام روح (۲) سے آگے بڑھئے تو مقام سر کا دروازہ کھلتا ہے اور مقام سر کو طے کیجئے تو مقام خفی تک رسائی ہوتی ہے۔ تب جا کر کہیں مقام اخفی کے اسرار ورموز کھلتے ہیں۔ ان چار حصوں کے علاوہ قلب پر کچھ اور اثرات بھی مرتسم

نقشبندیہ میں حضرت خواجہ باقی باللہ سے خلافت واجازت حاصل کی، احیائے سنت کے سلسلے میں آپ نے بے مثال کارنامے انجام دیئے۔ اکبر کے دین الہٰی اور جہانگیر کے غیر اسلامی رسوم کے خلاف یہ مرد خدا علی الاعلان ڈٹ گیا۔ ہمارے دینی لٹریچر میں آپ کے مکتوبات کا بہت اہم مقام ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ کی حیات مبارکہ ہر دور کے مسلمان کے لیے روشنی کا مینار ہے اور آپ کی ذات عالم اسلام کی مایہ ناز شخصیات میں سے ایک۔ آپ کے مرشد حضرت خواجہ باقی باللہ نے آپ کے متعلق فرمایا کہ شیخ احمد وہ آفتاب ہے جس میں ہم جیسے کئی ستارے گم ہو جاتے ہیں۔ آپ نے متقدمین صوفیاء کے نظریۂ وحدۃ الوجود کے مقابلے میں جس میں وحدت الشہود کا نظریہ پیش کیا جو بہت زیادہ مقبولیت حاصل نہ کر سکا، آپ کی وفات ۱۰۳۴ھ میں ہوئی۔ سرہند شریف میں مزار مرجع خلائق ہے۔

(۱) تلوین قلب راہ سلوک میں بالکل ابتدائی منازل کا نام ہے، جہاں ابھی تک سالک صفات کے چکر میں پھنسا ہوا ہوتا ہے اور ذات تک اس کی رسائی نہیں ہوتی ان حالات کے تعدد کی وجہ سے قلب کو قرار حاصل نہیں ہوتا۔ اسی کیفیت کا نام تلوین ہے۔

(۲) مکتوب گرامی میں لطائف ستہ کی طرف اشارہ ہے جو یہ ہیں۔ ۱۔ قلب ۲۔ روح ۳۔ نفس ۴۔ سر ۵۔ خفی ۶۔ اخفی

ہوتے ہیں۔ جن کے احوال و کیفیات جدا جدا ہیں۔ ان تمام کو فرداً فرداً طے کرنے چاہئے۔ (آخر مکتوب تک)

یہ خط پڑھ کر شیخ ادریسؒ نے حضرت شیخ احمد سرہندیؒ کی خدمت میں حاضری دینے اور ان کی عزیمت صحبت سے فیض حاصل کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا تھا۔ مگر بعض موانعات کے سبب ان کی یہ تمنا پوری نہ ہوسکی، یہاں تک کہ شیخ احمد سرہندیؒ کے ایام رشد و ہدایت پورے ہوگئے۔

کچھ بعید نہیں کہ یار دیگر سے مراد سید عبداللہ شاہؒ ہوں۔ فقیر کا خیال ہے کہ حضرت والد ماجد یہ قصہ حضرت شیخ آدم بنوریؒ کے سلسلے میں بیان فرمایا کرتے تھے۔

ولی کی وسعت نظر

حضرت والد ماجد فرمایا کرتے تھے کہ شیخ ادریسؒ نے حضرت شیخ آدم بنوریؒ کی خدمت میں لکھ کر بھیجا کہ "مجھے ہر چیز میں ایک خدا نظر آتا ہے اور ہر در و دیوار کو اس ایک نور کی تجلیات سے بھرپور پاتا ہوں"۔ شیخ آدم نے جواب میں لکھا "کہ بابرکت اور عجیب حالت ہے، لیکن کاملین سلوک کے حالات سے موازنہ کیا جائے تو مجھے یہ کہنا پڑے گا کہ بھائی! کسی کوچۂ تنگ سے گزرنے کا سوال نہیں کہ راہِ سلوک میں اتنے سمٹ کر رہ گئے ہو۔ یہاں تو ایک شاہراہِ عظیم کھلی ہوئی ہے جس پر توسن فکر و خیال کو بڑھا چڑھا کر دوڑایا جاسکتا ہے"۔ یہ پڑھ کر ان پر شیخ آدمؒ کی ملاقات کا شوق غالب آیا مگر قضائے الٰہی کہ وہ انہی دنوں بیمار ہو کر رحمت خداوندی کے سائے میں چلے گئے اور سید عبداللہؒ اسی واقعے کی بنا پر ان کی وفات کے بعد حضرت شیخ آدمؒ کی خدمت میں پہنچے۔ (۱)

حاصل کلام سید عبداللہ شیخ آدم بنوریؒ قدس سرہ کی خدمت میں پہنچے اور ان کی صورت میں ایک عالی مقام منبع شریعت، حامل عرفان باثر شیخ کو پالیا۔ ان کی طرز زندگی اور طریق فقر کو پسند کرتے ہوئے اوہام و شکوک کی قوتوں کو شکست دے کر مدتوں ان کی صحبت میں مستحکم اور مقیم رہے۔

واضح رہے کہ سید عبداللہؒ کے چچا یا چچازاد بھائی جن کا نام نامی سید عبدالرحمٰن تھا نہایت خوشحال تھے۔ اور ان کا شمار بڑے امراء میں ہوتا تھا۔ مگر ساتھ ہی دین داری میں بھی شہرت رکھتے تھے۔ حضرت والد ماجد ان کی دینداری کا بہت ہی ذکر فرمایا کرتے تھے۔ یہ امیر نما درویش بھی شیخ آدم

---

(۱) (نوٹ) معلوم نہیں کہ یہ وہی پہلا قصہ ہے جو سہو و نسیان سے ذرا تبدیل ہوگیا یا کوئی دوسرا واقعہ ہے۔

بنوریؒ کا مرید تھا۔ اسی بنا پر حضرت سید عبداللہ انتقال شیخ کے بعد ہمیشہ سید عبدالرحمٰن کی صحبت میں رہتے تھے اور آپس میں انتہائی محبت وانس رکھتے تھے۔ حضرت سید عبداللہ عفیف و پاکدامن تھے۔ زندگی بھر شادی نہ کی۔ محلّہ ''کوشک نز'' میں حضرت عبداللہ کی اقامت کا سب سے بڑا سبب سید عبدالرحمٰن موصوف کی رفاقت تھی۔ شیخ آدم کے تمام مکتوبات میں جو سید عبداللہ کے نام لکھے جاتے رہے۔ سید عبدالرحمٰن کا ذکر بھی متصلاً ملتا ہے۔ شہادت کے طور پر شیخ آدمؒ کے دو مکتوب بعینہ نقل کئے جاتے ہیں جو حافظ عبداللہ اور سید عبدالرحمٰن کے نام صادر ہوئے

نامہ شیخ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمدللہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ خیر خلقه محمد و آله اجمعین الاکرمین

اللہ تعالیٰ دینی اور دنیوی کاموں میں اپنی رضا کے مطابق جمعیت خاطر اور اطمینان قلب کی توفیق ارزانی کرے اور ہمارے دلوں کو خالص و مخلص رکھے۔

زاں یار دلنوازم شکر یست نے شکایت
گر نکتہ دان عشقی خوش بشنو ایں حکایت

(اگر نکتہ داں عشق ہو تو مجھ سے یہ لطف انگیز بات سنو کہ اس محبوب دلنواز کا ہر حالت میں شکر گزار رہنا چاہئے۔ کسی بھی عالم میں زبان شکایت نہ کھولئے۔

ہمارا یہ فقیرانہ سلام نامہ ان برادران معنوی تک بطریق انتباہ مطالعہ سے گزرے کہ چل چلاؤ کا وقت ہے اور کل کا کام کل ہی کے عمل میں شمار ہوگا۔ اللہ نیکی کی توفیق دینے والا ہے اور اسی سے ہی راہ راست اور رشد وہدایت کی توفیق اس کے حبیب، آل اطہار، اصحاب کبار اور تابعین ذی وقار کے طفیل نصیب ہوتی ہے۔ ان سب پر صلوٰۃ وسلام ہوں۔ یہاں کے تمام احباب کی طرف سے برادرانہ تسلیمات مطالعہ فرمائیے''۔

حضرت شیخ آدم بنوریؒ کا دوسرا مکتوب جو سیادت پناہ سید عمادؒ، حافظ عبداللہؒ اور حافظ عبدالرحمٰنؒ کے نام صادر ہوا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمدللہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ خیر خلقہٖ محمد وآلہٖ اجمعین الاکرمین

''بندگان اخی معنوی سیادت پناہ وتوفیق آثار سید عماد و حافظ عبدالرحمٰن سلام فقیرانہ کے بعد مطالعہ فرمائیں کہ اس طرف کے حالات لائق حمد وشکر ہیں اور آپ بھائیوں کی سلامتی واستقامت اللہ سے مطلوب ہے۔ وہی ذات پاک نخل تمنا کو بارآور کرنے والی ہے۔ خلاصہ کلام یہ کہ آنجناب کا ایک ایک گرامی نامہ جو اخلاص سے پر تھا۔ ''بارہہ'' سے اور دوسرا عنایت نامہ محترم حافظین (حافظ عبداللہ و حافظ عبدالرحمٰن) کا لکھا ہوا اکبرآباد سے موصول ہوا۔ اللہ کا شکر واحسان ہے کہ آپ حضرات صحت وسلامتی سے ہیں اور فقیروں کی یاد سے بھی غافل نہیں۔ بہرحال امیدوار ہوں کہ اس اخلاص کا نتیجہ سعادت دارین کی صورت میں نمودار ہوگا (اللہ کے فضل واحسان سے) اے بھائی! وقت ایک چلتا دھارا ہے، گریہ وزاری اور صدق دل سے دعاؤں میں سعی وکاوش دکھانا ضروری ہے تاکہ حق سبحانہ تعالیٰ بقیہ زندگی اس دارِفانی میں ضائع کرنے سے بچائے''۔

تصفیہ قلب

حضرت والد ماجدؒ فرمایا کرتے تھے کہ سید عبداللہؒ نے فرمایا کہ آغاز کار میں جب میں شیخ آدمؒ کی خدمت میں پہنچا۔ میرا قلب نسبت روحانی سے بالکل خالی ہوگیا اور جمعیت خاطر میں فتور ظاہر ہونے لگا۔ میں پریشان ہوا اور حضرت شیخ کی خدمت میں عرض کی۔ فرمایا ''پہلی نسبت سرکہ کا حکم رکھتی ہے اور جو جمعیت قلب ہماری صحبت میں پاؤ گے۔ اس کی مثال گلاب کی سی ہے اور قاعدہ یہ ہے کہ اگر بوتل میں سرکہ ہو اور اس میں گلاب ڈالنے کا ارادہ کیا جائے تو سب سے پہلے بوتل کو خوب دھوکر صاف کیا جاتا ہے تاکہ سرکے کا ذرہ بھر بھی اثر باقی نہ رہے۔ تب وہ بوتل گلاب کے قابل بنتی ہے۔

کلام ربانی کی تاثیر واعجاز

حضرت والد ماجد صاحب شیخ آدم بنوریؒ کی اولاد میں سے کسی بزرگ سے نقل فرماتے تھے کہ سید عبداللہ صحبت شیخ آدمؒ کے دوران ایک دن کسی درخت کے نیچے پورے اطمینان قلب کے ساتھ آنکھیں بند کئے تلاوت قرآن میں مشغول تھے۔ اسی اثناء میں بہت سی چڑیاں درخت سے گر کر مرتی رہیں اور وہ لوگ جو ماوراء النہر سے حضرت شیخ کی بیعت کے لیے آئے ہوئے تھے۔ ذوق سماع سے وجد میں آگئے۔ کسی نے حضرت شیخ آدمؒ کو اس صورت حال سے مطلع کیا آپ تشریف لائے اور فرمایا کہ حافظ! اب بس کرو۔ حافظ نے آنکھ کھولی، انکساری کے ساتھ کھڑے ہوگئے اور چپ سادھ لی۔

حضرت والد گرامی فرماتے تھے کہ سید صاحب بھی قرآن پڑھتے۔ مسجد میں کوئی شخص ایسا نہ ہوتا جو ان کی قرأت سنکر ذوق سماع سے سر نہ دھن رہا ہو۔ ایک مرتبہ داراشکوہ نے نو قاری ان کے امتحان کے لیے بھیجے۔ ہر ایک مختلف قواعد مثلاً وقف، مد، تفخیم، ترقیق، یرملون وغیرہ میں امتحان لینا چاہتا تھا اور حضرت حافظ سے ان قواعد میں قرأت کی استدعا کر رہا تھا۔ سید صاحب نے فرمایا اگر دو رکوع سننا چاہتے ہو تو ابھی سنائے دیتا ہوں اور اگر تھوڑا سا انتظار کرلو تو نماز چاشت کے بعد دو پارے سنادوں گا۔ چنانچہ یہ حضرات رک گئے مگر ان دو سیپاروں کی قرأت میں کوئی لائق بحث بات نہ پاسکے۔ فراغت کے بعد حضرت حافظ نے فرمایا کہ لوگ سات قرأتوں کو اس طریق پر پڑھتے ہیں کہ ہر لفظ کو مختلف طریق سے تلفظ کرتے ہیں مگر یہ طریقہ میرے نزدیک کچھ وقعت نہیں رکھتا۔ میرے خیال میں بہترین طریقہ یہ ہے کہ ایک بار طریق عاصم کوفی پر تلاوت کی جائے کہ دوسرے کسی کا طریقہ بھی اسی قرأت میں مخلوط نہ ہو اور دوسری بار تمام قرآن کو ابوعمرو کے طریق پر پڑھا جائے اور اس میں دوسروں کے طریق کو نہ ملایا جائے اور اسی طریق پر باقی تمام قرأتوں کی تکمیل کی جائے۔ یہ سن کر ممتحن قاری عاجز آگئے۔

کشف وکرامت نہیں، جہد واستقامت

حضرت والد ماجد نے فرمایا کہ میں نے یہ نکتہ حضرت حافظؒ سے کئی بار سنا کہ "کفش بر سر کشف" (کشف وکرامت کے سر پر جوتے) یعنی صوفیاء کے نزدیک استقامت معتبر ہے نہ کہ

کرامت۔ قبلہ والد صاحب فرماتے تھے کہ حضرت حافظ صاحب کا طریقۂ عزلت وگمنامی تھا۔ لوگوں میں اس طرح گھل مل کر رہتے تھے کہ کوئی انھیں کسی خصوصیت سے الگ نہیں کرسکتا تھا۔ وہ اکثر بوڑھی یا بیوہ عورتوں کے دروازوں پر چکر لگایا کرتے تھے تاکہ انہیں پانی اناج وغیرہ ضروریات خانگی بازار سے لاکر دے سکیں۔ بسا اوقات ضعیف خادمائیں اپنے آقاؤں کا سامان لینے آتیں تو حضرت حافظ صاحب ان کی یہ خدمات اپنے ذمے لے کر منزل مقصود تک پہنچا آتے اور ساتھ ہی کہتے کہ آقاؤں سے مت کہنا تاکہ وہ تمہیں ایذا نہ دے سکیں الغرض باوجود اس گمنامی اور انکساری کے شیخ آدم بنوریؒ کے صحبت یافتگان جیسے شیخ عبداللہ کہاتی جن کا لقب ح.جی بہادر تھا۔ شیخ بایزید اور اس قسم کے دوسرے لوگ حضرت سید کی انتہائی تعظیم کرتے تھے۔

اہل دل سے پردہ

حضرت والد ماجد نے فرمایا کہ سید عبداللہ سنایا کرتے تھے کہ طلب کے ابتدائی ایام میں، میں ایک مجذوب کی خدمت میں پہنچا جو ہمیشہ بازاروں میں ننگا پھرا کرتے تھے۔ جب مجھے دیکھا تو بھاگ کھڑے ہوئے۔ میں بھی انکے پیچھے تیز تیز چلنے لگا۔ جب قصبے سے باہر آئے تو وہاں ایک بڑھیا لکڑیاں جمع کر رہی تھی۔ مجذوب نے اس کا دوپٹہ لے کر تن ڈھانپ لیا اور میری طرف متوجہ ہوکر کہا السلام علیکم۔ پھر کہنے لگے کہ اس وقت میں ننگا تھا اور تم آرہے تھے مگر تم نے میرا تعاقب کیوں کیا؟ عرض کی میں جانتا تھا کہ آپ کی عادت ہی کچھ ایسی ہے۔ فرمانے لگے۔ قصبے والے جانور ہیں اولئک کالانعام بل هم اضل (یہ جانور ہیں بلکہ ان سے بھی بدترین راہ پر چلنے والے) اس لیے ان سے پردہ نہیں کرتا۔ مگر جب کوئی اہل دل پہنچ جاتا ہے تو پابند ہوجاتا ہوں۔ (۱)

مستقبل بینی

والد ماجد نے فرمایا کہ سید عبداللہ فرماتے تھے۔ جن دنوں شیخ آدم بنوری قدس سرہ نے حج بیت اللہ کا عزم مصمم کیا میں نے بھی ان کے ساتھ جانے کا ارادہ کرلیا۔ انھوں نے مجھے جانے سے

(۱) سرمد شہیدؒ کے متعلق مشہور ہے کہ آپ اکثر برہنہ رہا کرتے تھے۔ علماء نے اورنگ زیب عالمگیرؒ پر زور دیا کہ سرمد شہید کو اس حرکت کی سزا دیں۔ جب بادشاہ نے سرمد شہیدؒ سے پوچھا تو انھوں نے فرمایا:

آنکس کہ ترا تاج جہانی داد — مارا ہمہ اسباب پریشانی داد
پوشانید لباس ہر کرا عیبے دید — بے عیباں را لباس عریانی داد

روک دیا۔ روانہ ہونے لگے۔ میں نے عرض کی کہ اہل وعیال والے تو دولت ہمراہی سے مشرف ہو رہے ہیں، فقیر جو غیر شادی شدہ ہے اور کسی کے نان ونفقہ کا متحمل بھی نہیں اسے کیوں محروم کیا جارہا ہے؟ فرمانے لگے کہ تمہارا ٹھہرانا حکمت پر مبنی ہے جو تمہیں بعد میں معلوم ہو جائے گا۔ اب معلوم ہوا کہ وہ حکمت تمہاری تربیت سے عہدہ برآ ہونا تھا۔

ہونہار بروا

حضرت والد ماجد فرمایا کرتے تھے کہ سید عبداللہؒ سنایا کرتے تھے کہ جب تم (شاہ عبدالرحیمؒ) بچپن میں بچوں کے ساتھ کھیلا کرتے تھے۔ تو ہم اپنے دل میں تمہارے لیے کشش محسوس کرتے تھے اور دعا کیا کرتے تھے بارخدا! اس بچے کو زمرۂ اولیاء میں شریک کر اور اس کے کمالات میرے ہاتھوں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ الحمدللہ کہ میری دعاؤں کا اثر ظہور پذیر ہوا۔

کرامت مکتب یا فیضان نظر

والد ماجد فرمایا کرتے تھے کہ حضرت سید عبداللہؒ مجھ سے کوئی خدمت نہیں لیتے تھے۔ اگر میں خدمت کرنا چاہتا تو کسی بہانے باز رکھنے کی کوشش کرتے۔ ان کی اس روش سے ایک رات میرے دل میں وسوسہ پیدا ہوا۔ چنانچہ اس خیال کے اظہار کی خاطر میں ان کے حجرے میں چلا گیا۔ گرمی کا وقت تھا۔ کپڑے بدن سے اتار رکھے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی خوش آمدید کہا اور فرمایا میرے جسم کی میل کھرچ لو۔ میں انتہائی مسرت سے بدن کی میل صاف کرنے لگا، درمیان میں فرمایا پورے ہاتھ کو کیوں تکلیف دیتے ہو۔ یہ کام تو دو انگلیوں سے بھی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ میں نے دو انگلیوں سے میل صاف کرنے پر اکتفا کی۔ پھر فرمایا۔ راہ طریقت میں طالب سے خدمت لینے کی جو شرط تھی وہ میرے ساتھ پیوست ہو کر تم نے پوری کر لی ہے۔ آئندہ کسی بھی ایسے اندیشے کو دل میں راہ مت دو۔ کیونکہ میں نے اپنی طرف سے صحبت ظاہری و باطنی کے تمام حقوق تمھیں معاف کر دیئے ہیں۔

حضرت سید صاحب ایک بزرگ سے جو شیخ آدم بنوریؒ کا صحبت یافتہ تھا (شاہ صاحب کے گمان میں یہ بزرگ سید صاحب کے عم محترم یا ان کے کوئی عم زاد بھائی تھے) روایت کرتے تھے کہ سید علم اللہؒ مجھ سے تعلیم حاصل کیا کرتے تھے۔ اسی دوران انہیں طریقت کا شوق پیدا ہوا اور شیخ آدم

بنوری کی خدمت میں حاضری دینے لگے۔ اکثر اوقات حصول علم میں بھی حرج اور ناغہ ہونے لگا۔ اس بات پر میں نے انہیں بہت ٹوکا۔ اسی اثناء میں میری زبان سے نکلا۔ ''علم سے بے بہرہ حامی فقیروں سے تمہیں کیا فائدہ حاصل ہوگا؟ یہ سن کر سید علم اللہؒ کی حالت تبدیل ہوگئی اور کہنے لگے کہ تم اور تم جیسے لوگ اگر ان کی صحبت میں آئیں تو اپنے آپ کو گونگے اور جاہل مطلق سمجھنے لگیں۔ میں یہ سنکر بہت تلملایا اور بھڑک اٹھا اور علم کلام کا ایک انتہائی مشکل ترین مسئلہ تلاش کر کے انہیں عاجز اور زچ کرنے کی نیت سے ان کے پاس پہنچ گیا۔ بہت عزت و تکریم سے پیش آئے، میں نے اپنا اشکال پیش کیا۔ پہلے تو فرمانے لگے۔ ''یہ مسئلہ خالص علمی ہے اور فقیر عامی ہے، ہاں البتہ تم عالم ہو۔ میں کیا جانوں! یہ تو تم ہی سے حل کرانا چاہئے''۔ اسی طرح ٹال مٹول کرتے رہے۔ یہاں تک کہ میں نے یقین کر لیا کہ انہیں علم لدنی کا کوئی دعویٰ نہیں اور اس مشکل مسئلے پر ان کی بے مائیگی مجھ پر ظاہر ہوگئی۔ میرے دل میں اس خیال کا آنا تھا کہ ایک دم ان کا چہرہ سرخ ہوگیا اور بلند آواز سے فرمانے لگے کہ یہ ایسا مسئلہ ہے کہ اگر مشرق و مغرب کے علماء جمع ہوں تو بھی حل نہ کر سکیں۔ ہاں البتہ ہم اسے حل کریں گے۔ پھر غیر مبہم، شگفتہ اور پر تاثیر تقریر شروع کی۔ جس سے اشکال رفع ہوگیا۔ آپ نے ایسے معارف اور نکات بیان کیے جن تک میرا فہم و شعور نہیں پہنچ سکتا تھا اور اکثر باتیں میری سمجھ سے بالاتر تھیں۔ میں اپنے آپ کو ان کے آگے طفل مکتب سمجھنے لگا۔ جب ان کی مجلس سے اٹھا تو خیال آیا کہ ان کی سچائی ظاہر ہو چکی ہے لہٰذا توبہ کر لینی چاہئے مگر جھوٹی انا اور خواہش نفس نے ایسا جکڑ رکھا تھا کہ دوبارہ علم تفسیر کا ایک مشکل ترین مسئلہ ڈھونڈھ کر ان کے سامنے پیش کیا۔ اس بار بھی روز اول کی طرح تعظیم سے پیش آئے اور شروع میں حد سے زیادہ معذرت کرنے لگے۔ جس سے مجھے شبہ گزرا کہ شاید اس مسئلے کے بیان سے عاجز آگئے ہیں۔ مگر ایک دم پلٹا کھایا اور تقریر دل پذیر شروع کر دی۔ تیسرے دن بھی یہی واقعہ پیش آیا جس سے متاثر ہو کر میں نے دل ہی دل میں کہا کہ یہ راست رو اور منصف مزاج ہیں لیکن میرے اندر کج روی اور خامی ہے۔ چنانچہ میں نے ان کا امتحان اور آزمائش لینے سے توبہ کی اور اپنی خطا و قصور کا معترف ہو کر نیازمندگی و انکساری سے ان کی مجلس میں پہنچا۔ اس بار کوئی توجہ نہ فرمائی۔ جوتیوں میں بیٹھا توبہ وزاری کا اظہار کرتا رہا۔ فرمانے لگے تم تو صاحب علم ہو، سر کے بال کنپٹیوں سے نیچے کیوں

چھوڑ رکھے ہیں، اور تہ بند ٹخنوں سے نیچے کیوں لٹک رہا ہے؟ حجام کو بلوایا، سر منڈوا دیا اور تہ بند ٹخنوں سے اوپر کرایا اور بیعت میں قبول فرمایا۔

سننے میں آیا ہے کہ شیخ ابراہیم مرادآبادیؒ طریقہ چشتیہ کے ایک نامور بزرگ تھے۔ وہ کہتے تھے کہ طلب سلوک کے آغاز میں جب میں شیخ آدم بنوریؒ کی خدمت میں پہنچا تو ان کے دوستوں میں سے ایک بزرگ نے میری سفارش کی کہ حضرت! یہ شخص صحیح معنوں میں طالب خدا ہے۔ اسی وقت مجھ پر شیخ نے ایسی نگاہ ڈالی کہ مجھ پر ایک کیفیت طاری ہوگئی جو اب تک باقی ہے۔ چند روز وہاں ٹھہر کر راہِ سفر لی اور شیخ محمد صادقؒ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوگیا۔ وہاں سے بھی بے انتہا روحانی فوائد حاصل کیے، مگر ریاضت اور تصفیۂ قلب کے بعد معلوم ہوا کہ میری جمعیت خاطر اور للّٰہیت کا اصل سرمایہ شیخ آدمؒ کی وہی نگاہ کرم ہے۔ ریاضات اور مجاہدات نے اس میں رونق وصفا کے علاوہ کوئی اضافہ نہیں کیا۔ سننے میں آیا ہے کہ شیخ بایزید جواللہ گو کے لقب سے مشہور تھے۔ مرد سخی اور بے طمع تھے۔ خلق خدا پر انتہائی شفقت فرماتے تھے اور ان کا یہ وصف شہرہ آفاق تھا۔

نگاہ شیخ

فرمایا کرتے تھے کہ ابتدائے سلوک میں جب میں حضرت شیخ آدمؒ کی بارگاہ میں پہنچا تو دیکھا کہ تمام ارادت مندوں نے شیخ کے گھر کا کاروبار آپس میں بانٹ رکھا ہے اور کوئی خدمت بھی باقی نہیں چھوڑی۔ کچھ مدت میں نے انتظار کیا تو دیکھا کہ جو ارادت مند جنگل سے لکڑیاں وغیرہ لانے پر مقرر ہے بہت ہی کمزور اور لاغر ہے۔ صحیح معنوں میں یہ خدمت سرانجام نہیں دے سکتا۔ میں چونکہ تنومند جوان تھا یہ کام میں نے اپنے ذمے لے لیا۔ ہر روز دو ڈھیر اٹھالاتا تھا مگر ابھی تک یہ شرف حاصل نہ تھا کہ شیخ کی مجلس میں باریاب ہوسکوں۔ کچھ مدت کے بعد شیخ ایک نہر پر غسل کرنے تشریف لے گئے۔ ارادت مند بدن کی میل دور کرنے اور مالش کرنے میں مشغول ہوگئے۔ میں بھی ان کے ساتھ شامل ہوگیا، ان سب کی بہ نسبت میں نے خدمت بہتر طور پر انجام دی جس کی بنا پر شیخ اسی وقت میری طرف متوجہ ہوئے۔ ایک ہی نگاہ نے میرا کام تمام کردیا اور اسی نہر میں بیہوش ہوکر گر پڑا۔ ساتھی مجھے مردے کی طرح وہاں سے خانہ شیخ تک اٹھالائے۔ چھ ماہ بعد پھر اسی نہر پر شیخ کی مالش بدن میں مصروف تھا کہ از راہ کرم پھر مجھ سے دریافت حال فرمایا۔ اس التفات کی

کیفیت سے میں پھر بیہوش ہو گیا۔ میرے پلے جو کچھ بھی ہے یہ اسی نگاہ لطف کا صدقہ ہے جو حضرت شیخ نے دو مرتبہ مجھ پر مبذول فرمائی۔

حضرت فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے شیخ آدمؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر توجہ طلب کی، فرمایا۔ وضو کر کے دو رکعت پڑھ لے۔ یہ سن کر میرے سامنے اس شخص نے منھ بنا کر کہا۔ نماز کا وضو تو حکم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی رو سے گناہوں کا کفارہ ہے پھر تمہاری توجہ کی کیا ضرورت ہے؟ شیخ اس کی بے ادبی سے درگزر فرماتے ہوئے اٹھ کر چلے گئے۔ اسی وقت الہام (۱) ہوا کہ ہم نے تو تمہیں اپنی مخلوق میں اس لیے رکھا ہے کہ ان کی بے ادبیوں سے درگزر کرو اور انہیں راہ ہدایت دکھاؤ۔ تم نے ویدرؤن بالحسنة السية (برائی کے بدلے نیکی کو اختیار کرتے ہیں) پر عمل کیوں نہ کیا؟ اس پر شیخ نے اس آدمی کے پیچھے کسی کو بھیجا تا کہ اسے واپس لے آئے اور آداب مجلس سلوک کے برعکس اس پر خاص توجہ فرمائیں۔ شیخ کا قاصد اسے واپس لانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ شیخ نے قاصد سے فرمایا کہ اس کے دونوں کانوں میں اللہ کا اسم پڑھو۔ چنانچہ لفظ اللہ سنتے ہی وہ بیہوش ہو گیا اور اسے مردے کی طرح اٹھا کر شیخ کی خدمت میں لائے۔

گردن نہ جھکی جس کی شہنشاہ کے آگے

حضرت والد ماجد نے حضرت شیخ آدمؒ کے رفقاء سے نقل کیا کہ جب شیخ کی شہرت عام ہو گئی تو ان کی دھوم شہنشاہ ہند شاہجہان تک بھی جا پہنچی۔ شاہجہان نے اپنے وزیر سعد اللہ خان اور ملا عبد الحکیم سیالکوٹی کو بھیجا تا کہ شیخ سے مل کر حقیقت حال کا پتہ کریں۔ دونوں شیخ کی خدمت میں پہنچے شیخ اس وقت مراقبے میں تھے۔ کافی دیر دروازے پر بیٹھے رہے۔ جب شیخ حالت مراقبہ سے باہر نکلے تو دونوں ان کے حجرے میں داخل ہو گئے۔ شیخ ان کی تعظیم بجا نہ لائے یہ دیکھ کر دونوں بزرگوں کا مزاج بگڑ گیا۔ سعد اللہ خان نے کہا۔ میں تو اہل دنیا ہوں۔ مشائخ کے نزدیک مستحق تعظیم نہیں مگر مولانا عبد الحکیم سیالکوٹی تو عالم دین ہیں۔ ان کی تعظیم ضروری ہے۔ شیخ نے فرمایا حدیث میں آتا ہے۔ العلماء امناء الدین مالم یخالطوا الملوک فاذا خالطوھم فھم اللصوص (علماء محافظ دین ہیں۔ جب تک کہ بادشاہوں سے دور رہیں۔ جب سلاطین کی

---

(۱) الہام کی حقیقت یہ ہے کہ بلا واسطہ کسی نظر و اکتساب کے کوئی حقیقت قلب میں القا ہو جائے۔ مانعین زکوٰۃ کے بارے میں حضرت عمرؓ کا یہ فرمانا کہ ان اللہ شرح صدر ابی بکر۔ الہام ہی کی فہم

بارگاہوں تک جا پہنچیں تو وہ علماء نہیں چوز ہیں) پھر ان دونوں نے پوچھا۔ آپ کا نسب کیا ہے؟ فرمایا سید ہوں مگر چونکہ ہماری مائیں افغان قبائل سے تعلق رکھتی ہیں اس لیے عوام کی زبان پر افغان مشہور ہو گئے۔ پھر پوچھا کہ ہم نے سنا ہے کہ آپ علم لدنی رکھتے ہیں، فرمایا ہاں اور اس نعمت پر اللہ کی حمد وثنا کرتا ہوں۔ یہ سن کر دونوں اٹھ کھڑے ہوئے اور شاہجہان سے جا کر کہا کہ یہ ایک عامی اور متکبر فقیر ہے جو لمبے چوڑے دعوے کرتا ہے۔ اصل میں افغان ہے مگر سید کہلاتا ہے۔ باوجود اس کے پٹھان اس کے بے حد معتقد ہیں۔ لہٰذا اسے چھیڑنے سے خوف ہے کہ کہیں فتنہ نہ کھڑا ہو جائے۔ یہ سن کر شاہجہان بگڑ گیا۔ قاصد کے ہاتھ شیخ کو کہلا بھیجا کہ آپ حج کو چلے جائیں۔ شیخ انتہائی عجلت میں عازم مکہ ہو گئے۔ جب سورت میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ حاکم سورت آپ کا ارادت مند ہے۔ شیخ نے کہا۔ تمہارے ذمے یہ خدمت ہے کہ ہمیں جلد تر جہاز میں سوار کر دو۔ جب سوار ہوئے تو بادشاہ کا حکم پہنچا کہ اس فقیر کو جلد واپس لوٹائیے کیونکہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ اس درویش کا باہر جانا میرے ملک کے لیے زوال کا باعث ہوگا۔ حاکم سورت نے معذرت لکھی کہ شاہی حکم پہنچنے سے پہلے حضرت شیخ جہاز پر سوار ہو گئے۔ بہت ہی جلد بادشاہ قید ہوا۔ ادھر شیخ کی وفات مدینہ منورہ میں واقع ہوئی اور جنت البقیع میں قبہ حضرت عثمانؓ کے قریب مدفون ہوئے۔ (اللہ ان کی قبر پر رحمتوں کے پھول برسائے۔

حسد سدِ راہ ہے

والد ماجد فرمایا کرتے تھے کہ طالب نامی ایک درویش حضرت سید عبداللہ قدس سرہ کی خدمت میں رہتا تھا۔ وہ ہمیشہ روتا اور ہائے ہائے کا نعرہ لگاتا رہتا تھا۔ حضرت سید نے اس سے ہمیشہ روتے رہنے کا سبب پوچھا تو میری طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے کہا کہ یہ عزیز حصول علم میں مشغول رہتا ہے اور میں فارغ البال اور یکسو ہوں مگر پھر بھی اس پر مجھ سے زیادہ روحانی عقدے اور مخفی اسرار آشکارا ہوتے جا رہے ہیں۔ فرمانے لگے اس فکر واندیشے میں مت پڑو۔ یہ عطائے الٰہی ہے۔ ہر ایک کو الگ الگ حوصلہ وہمت تفویض ہوئی ہے۔ مگر وہ پھر بھی روتا رہا۔ حضرت سید نے فرمایا۔ تیری اصلاح یوں ہو سکتی ہے کہ تو سفر میں رہا کر۔ چنانچہ اس نے دائمی سفر اختیار کیا۔ کبھی کبھی مجھے دیکھنے کے لیے آ جایا کرتا تھا اور کہا کرتا کہ حضرت سید صاحب کے منہ سے

جو بات نکل گئی اس کا یہ اثر ہے کہ سفر میں مجھے ہمیشہ جمعیت خاطر اور انبساط حاصل رہتا ہے لیکن ایک جگہ قیام میں تنگی و غمگینی۔ کبھی کبھی وہ مغلوب الحال ہو جاتا۔ ایسی حالت میں ایک مرتبہ کسی کے گھر میں گھس گیا۔ انھوں نے پکڑ کر اسے تکلیف دی اور قید کر ڈالا۔ جس قدر بھی اس کی قید اور تکالیف بڑھتی رہی اس کے گھریلو نقصان میں اضافہ ہوتا رہا اس کا بیٹا مر گیا۔ گھوڑا لنگڑا ہو گیا۔ دوسرا بیٹا بیمار پڑ گیا۔ یہ حالت دیکھ کر وہ سخت نادم ہوا، توبہ کی اور پھر میرے ساتھ نیاز مندانہ سلوک شروع کیا۔

بمزار خواہی آمد

والد ماجد فرمایا کرتے تھے کہ جن دنوں اورنگ زیب اکبر آباد میں تھا، میں میرزا زاہد ہروی محتسب لشکر سے کچھ اسباق پڑھتا تھا۔ اسی تقریب کے بہانے میں اپنے والد کے ہمراہ اکبر آباد آ گیا۔ سید عبداللہؒ بھی سید عبدالرحمٰنؒ کی رفاقت کے سبب وہاں موجود تھے وہاں انہیں ایک عارضہ ہو گیا اور رحمت حق سے واصل ہوئے۔ انھوں نے وصیت کی کہ مجھے مسکینوں کے قبرستان میں دفن کرنا تاکہ کوئی پہچان نہ سکے۔ چنانچہ لوگوں نے ایسا ہی کیا۔ میں بھی اس دن شدید بیمار تھا۔ جنازے کے ساتھ جانے کی سکت نہیں تھی۔ جب میں تندرست ہوا اور چلنے پھرنے کی طاقت پیدا ہوئی تو ایک ایسے ساتھی کے ساتھ جو ان کے جنازہ میں دفن میں موجود تھا۔ زیارت و برکت کے لئے ان کے مزار مبارک کی طرف چل پڑا۔ یہ ان کی آخری وصیت کا کمال تھا کہ میرے ساتھی کافی غور و فکر کے باوجود ان کی قبر نہ پہچان سکے۔ آخر اندازے سے ایک قبر کی طرف اشارہ کیا۔ میں وہاں بیٹھ کر قرآن پڑھنے لگا۔ میری پشت کی طرف سے سید صاحب نے آواز دی کہ فقیر کی قبر ادھر ہے لیکن جو کچھ شروع کر چکے ہو، اسے وہاں ہی تمام کر لو اور اس کا ثواب اسی قبر والے کو بخشو۔ جلدی مت کرو۔ جو کچھ پڑھ رہے ہو اسے انجام تک پہنچاؤ۔ یہ سن کر میں نے ساتھی سے کہا۔ اچھی طرح غور کرو۔ سید صاحب کی قبر وہی ہے جدھر تم نے اشارہ کیا یا میری پیٹھ کے پیچھے ہے۔ تھوڑی دیر سوچ کر کہنے لگا، میں غلطی پر تھا۔ حضرت سیدؒ کی قبر تمہارے پیچھے ہے۔ میں اسی سمت ہو کر بیٹھا اور قرآن پڑھنا شروع کیا۔ اسی اثناء میں دل گرفتہ اور غمگین ہونے کے سبب اکثر مقامات پر قواعد قرأت کی رعایت نہ کر سکا۔ قبر میں سے آواز آئی کہ فلاں فلاں جگہ پر تساہل سے کام لیا ہے۔ قرأت کے معاملے میں حزم و احتیاط کی ضرورت ہے۔

تذکرہ حضرت خواجہ خوردؒ فرزند خواجہ محمد باقی باللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (۱)

شیوۂ اہل نظر

والد ماجد فرماتے تھے کہ رسائل صغار (شرح عقائد سے پہلے کے رسائل) سے لے کر شرح عقائد وحاشیہ خیالی تک جملہ متداول کتب میں نے مخدومی اخوی ابوالرضا محمد سے پڑھیں اور دوسری درسی کتب میرزا زاہد ہروی سے ایک دن شرح عقائد وحاشیہ خیالی کے درس کے دوران میرے دل سے ایک اعتراض اٹھا۔ مخدومی ابوالرضا جواب میں گویا ہوئے۔ اس مناظرے نے طول پکڑا اور معاملہ رنج وغصے تک جا پہنچا۔ میں نے کتاب پڑھنا چھوڑ دی۔ کچھ عرصہ بعد ایک دن ہم دونوں خواجہ خورد (۲) کی خدمت میں پہنچے آپ نے مجھ سے پوچھا کہ خیالی کو کہاں تک پہنچایا ہے؟ عرض کی عرصہ ہوا کہ ترک کر دی ہے فرمایا کیا سبب ہوا۔ عرض کی نماز، روزے کے ضروری احکام معلوم ہو چکے ہیں۔ اس سے زیادہ کچھ میسر نہیں ہو سکتا۔ مگر آپ نے حقیقت معلوم کرنے میں مبالغے سے کام لیا، بالآخر بات ظاہر ہوگئی۔ تاکید سے فرمانے لگے۔ مجھ سے پڑھ لیا کرو۔ صبح سویرے کتاب لے کر خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے درس دینا شروع کیا اور میرے سابقہ اعتراض کو بہت ہی پسند کیا اور قوت استدلال کو سراہا دوسرے اور تیسرے روز بھی سلسلہ یونہی چلتا رہا چوتھے دن فرمایا کہ تمہارے جد بزرگوار شیخ رفیع الدینؒ نے بھی مجھے تین دن سے زیادہ سبق نہیں پڑھایا تھا۔ لہٰذا میں بھی تین اسباق سے زیادہ نہیں پڑھاؤں گا۔ پھر یوں حکایت شروع کر دی کہ آغاز جوانی میں میں حسن پرستی شعار رکھتا تھا۔ شیخ رفیع الدینؒ کا ایک صاحبزادہ بہت ہی خوبصورت

---

(۱) حضرت مجدد الف ثانیؒ کے پیر ومرشد حضرت خواجہ محمد باقی باللہؒ، کابل میں ۹۷۱ھ میں پیدا ہوئے آپ کے والد ماجد قاضی عبدالسلامؒ بھی جلیل القدر عالم اور بزرگ تھے۔ آپ نے اس دور کے مشہور فاضل مولانا حلوائیؒ سے تعلیم حاصل کی۔ یوں تو آپ اویسی المشرب تھے۔ آپ کی باطنی تربیت براہ راست سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اور خواجہ بہاؤ الدینؒ کی روحانیت سے ہوئی لیکن ظاہراً آپ نے ماوراء النہر اور ہندوستان کے سینکڑوں مشائخ سے کسب فیض کیا۔ آخر میں حضرت خواجگی امکنگیؒ سے مجاز طریقت ہوئے۔ آپ شریعت وطریقت کے ماہتاب تھے۔ اکتالیس سال کی عمر میں ۲۵ جمادی الثانی ۱۰۱۳ھ کو وفات پائی۔ مزار مبارک دہلی میں زیارت گاہ خلائق ہے۔

(۲) خواجہ خوردؒ کا اصل نام خواجہ عبداللہؒ ہے۔ آپ حضرت خواجہ محمد باقیؒ کے فرزند ارجمند اور ظاہری وباطنی علوم کے جامع والدگرامی کے نقش قدم پر کاربند تھے۔

تھا۔ اس کو دیکھنے کے ارادے سے گیا اور شرح لمعات بھی ساتھ لیتا گیا تا کہ لوگ سمجھیں کہ مسائل تصوف کی تحقیق کے لیے آیا ہے کیونکہ حضرت شیخ رفیع الدینؒ مشکل مسائل کے حل کرنے کے سلسلے میں شہر کے اندر اپنی مثال آپ تھے۔ جب میں ان کی خدمت میں پہنچا تو ہمارے خواجہ (حضرت باقی باللہؒ) سے توسل کے سبب میرے ساتھ انتہائی مہربانی سے پیش آئے اور تعظیم بجالائے۔ جب میں نے سبق شروع کیا تو سرسری طور پر دو چار چیزیں بیان فرمائیں اور زیادہ تحقیق نہ فرمائی۔ اسی وقت اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنے اسی صاحبزادے کو بلا کر فرمایا کہ خواجہ کی خدمت میں رہو۔ یہ دیکھ کر میں شرمندہ اور نادم ہوا مگر چونکہ ایام شباب تھے۔ دوسرے روز بھی اسی نیت اور ارادے سے جا پہنچا اور پھر بھی وہی سلوک ہوا۔ تیسرے روز مجھ پر انتہائی ندامت غالب ہوئی۔ میں نے توبہ کی اور خلوص نیت کے ساتھ پہنچا۔ اخلاص کی تلقین فرمائی اور پہلے سے بھی زیادہ التفات دکھایا اور اس روز نکاتِ تصوف پر خوب زوردار تحقیقی تقریر فرمائی اور اس لڑکے کی طرف کوئی توجہ نہ کی جب سبق سے فارغ ہوئے تو فرمایا۔ اگر تمہاری غرض اس فن کی تحقیق سے ہے۔ تو مجھے حکم دیجئے کہ ہر روز قیام گاہ پر حاضر ہوتا رہوں، کیونکہ آپ کا یہاں تشریف لانا میرے لئے بے ادبی کے مترادف ہے۔ میں نے عرض کی مجھے آپ آنے کی اجازت نہیں دے رہے۔ آپ کی تکلیف فرمائی کے لیے میں تیار نہیں۔ لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس کام کو موقوف رکھنا چاہتے ہیں۔ مجھ سے اختلاف کرتے ہوئے فرمایا کہ دراصل ایک اور سبب ہے۔ یہ کہہ کر میرا ہاتھ پکڑا اور مسجد فیروز شاہ (۱) میں لے آئے اور ایک متعین مقام پر لے جا کر کہنے لگے کہ تمہیں تصوف کی ہر مشکل کتاب کا مطالعہ اس جگہ بیٹھ کر کرنا چاہئے۔ اگر پھر بھی مسئلہ حل نہ ہو تو میرا ذمہ رہا۔ اس دن کے بعد جب بھی کوئی مشکل مسئلہ پیش آتا تو میں وہاں جا کر مطالعہ کرتا اور وہ حل ہو جاتا۔ اگر ایک بالشت بھی اس جگہ سے ادھر ادھر ہو جاتا تو دوسرے مقامات کی طرح وہاں کوئی خاص فیض حاصل نہ ہوتا۔ جب خواجہ خوردؒ یہ قصہ بیان کر چکے تو میں نے عرض کی کہ تین اسباق پر اکتفا کرنا بھی شاید اسی کرامت سے مقید تھا۔ آپ بھی اگر ایسا ہی تصرف فرمائیں تو کیا ہی بہتر ہو! فرمانے لگے۔ یہی تو عرض کر رہا ہوں کہ اگر تمہیں بھی کوئی علمی مشکل پیش آئے اور اسے حل نہ کر سکو تو مجھے بتاؤ کہ فلاں نالائق نے میرا راستہ روک رکھا ہے! واللہ

---

(۱) مسجد کوٹلہ فیروز شاہ، نئی دہلی۔ (قاسمی)

ماجد فرماتے تھے کہ اس کے بعد مجھے کوئی ایسا مشکل مسئلہ پیش نہیں آیا جو حل نہ کر سکا ہوں۔ اگر چہ میں نے مکمل درس و تحصیل علوم میرزا زاہد سے حاصل کی مگر ان کے پاس پڑھنا بھی گویا تحصیل حاصل تھا۔ اکثر اوقات ایسا ہوتا تھا کہ میں اوّل سے پڑھ رہا ہوں اور آخر سے درس دے رہا ہوں۔

دست بہ کار

حضرت والد ماجدؒ فرمایا کرتے تھے کہ خواجہ خوردؒ اپنے انگوٹھے سے ہمیشہ انگلیوں پر کوئی چیز لکھتے رہتے تھے۔ یہاں تک کہ اسباق اور باتوں کے درمیان بھی ایک دن میں ان سے پوچھ بیٹھا فرمانے لگے۔ یہ ایک عمل ہے جسے میں ہمیشہ کرتا رہتا ہوں۔ مگر تیرے سوا یہ بات آج تک کسی نے نہیں پوچھی۔ آغاز حال میں مجھے شغل استکتاب سے لگاؤ رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب بھی گاہے گاہے یہ عادت پوری کر لیا کرتا ہوں۔

نسبت وارادت کا احترام

فرمایا ایک دن خواجہ خوردؒ اپنے اصحاب و احباب میں بیٹھے ہوئے تھے۔ خود پلنگ پر تشریف فرما تھے۔ باقی لوگ چٹائی پر اس موقع پر میں بھی خدمت میں جا پہنچا۔ حد سے زیادہ تعظیم و تکریم فرمائی۔ خود پلنگ کی پائنتی کو ہو بیٹھے اور مجھے صدر نشین بنایا۔ ہر چند میں نے معذرت چاہی۔ مگر نہ مانے۔ اس معاملے سے اہل مجلس کے چہرے متغیر ہو گئے۔ ان کے فرزند خواجہ رحمت اللہ کھڑے ہو کر عرض کرنے لگے کہ مجلس میں ان سے بھی زیادہ معمر اور لائق تعظیم لوگ بیٹھے ہیں آخر ان میں کیا خصوصیت ہے، جو آپ اس قدر انکساری سے پیش آ رہے ہیں۔ فرمایا میں یہ اس لیے کر رہا ہوں کہ تم سلوک کا مشاہدہ کر سکو اور میری طرح ان سے پیش آتے رہو۔ جب میں ان کے جد مادری حضرت شیخ رفیع الدینؒ کے دولت خانے پر حاضری دیتا تھا تو وہ میرے ساتھ اسی طرح سلوک فرماتے تھے۔ حالانکہ وہ میرے استاذ تھے اور میں نے ان سے فیوض حاصل کیے تھے۔ جب شیخ رفیع الدینؒ ہمارے پیشوا خواجہ محمد باقی قدس سرہ کی خدمت میں آئے تھے تو قریب قریب وہ بھی ان کے ساتھ ہی سلوک کرتے تھے۔ اگر چہ شیخ رفیع الدینؒ حضرت خواجہؒ کے خلفاء میں سے تھے۔ مگر چونکہ ابتدائے سلوک میں حضرت شیخ قطب العالمؒ کی خدمت میں رہ کر کچھ کتابیں پڑھی تھیں اور فوائد علمی حاصل کیے تھے۔ لہٰذا ہمیں بھی یہی سلوک روا رکھنا چاہیے۔

ثمرۂ اخلاص

حضرت والد ماجد فرمایا کرتے تھے کہ ایک دفعہ ہم دونوں بھائی حضرت خواجہ خوردؒ کی خدمت میں حاضر تھے کہ ان پر بھوک کا غلبہ ہوا۔ جس کے سبب وہ درس دینے کے قابل نہ رہے۔ اپنے گھر والوں سے پوچھا۔ کوئی کھانے کی بھی چیز موجود ہے۔ انھوں نے کہا۔ ہاں بچوں میں سے کسی بچے کے لیے تھوڑا سا طعام پکایا ہے، فرمایا اس میں سے تھوڑا سا لے آؤ۔ چنانچہ پیالی میں بہت ہی تھوڑا طعام لایا گیا۔ آپ نے ہاتھ دھوئے اور حاضرین سے کہا۔ آیئے مل کر کھائیں۔ سب کو کافی ہے۔ سب لوگ تعجب میں آ گئے میں دوسرے انداز میں دوبارہ اشارہ کیا۔ ہم چلے گئے اور ہم تینوں نے مل کر کھایا۔ یہاں تک کہ سب سیر ہو گئے اور پیالی میں پھر بھی کچھ بچ رہا! جو بچے کے لیے بھیج دیا گیا۔

ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللّٰہی

حضرت والد ماجدؒ نے فرمایا کہ ایک شخص خواجہ خوردؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ بادشاہ مجھے کسی مہم پر بھیج رہا ہے۔ دشمن کی تعداد زیادہ ہے اور میں اسباب جنگ سے خالی ہوں۔ جانے سے انکار بھی نہیں کر سکتا۔ آپ توجہ فرمایئے کہ یہ مصیبت ٹل جائے۔ خوش طبعی کے طور پر فرمایا۔ کچھ نقدی پیش کرو تا کہ ہمارا دل تمہاری طرف متوجہ ہو جائے۔ اتفاقاً اس وقت اس کے پاس کچھ نہ تھا۔ دوستوں سے بھی اسے کچھ نہ مل سکا، کمر سے لٹکا ہوا خنجر گروی رکھ کر دس روپے حضرت کی خدمت میں پیش کیے۔ آپ نے میعاد مقرر فرما دی اور فرمایا کہ فلاں دن جنگ لڑو۔ دشمن کی کثرت اور دوستوں کی قلت سے خوف مت کھاؤ۔ اپنی جگہ پر مستحکم رہو اور پھر مجھے فرمایا کہ جب مقررہ تاریخ آئے تو مجھے خبر کرنا۔ جب وہ وقت آیا میں نے یاد دہانی کرائی۔ حجرے میں اکیلے بیٹھ گئے اور مجھے دروازے پر بٹھا دیا تا کہ کوئی شخص خلل انداز نہ ہو۔ کچھ دیر بعد خوش ہو کر باہر نکلے اور فرمایا کہ دشمن کی تعداد بہت زیادہ تھی اور دوست بہت ہی کم، پہلے حملے میں دوستوں کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا مگر وہ عزیز شکست سے گھبرایا نہیں اور نہ ہی اپنی جگہ سے اکھڑا۔ ہم بھی اس حالت میں وہاں پہنچ گئے۔ الحمدللہ فتح نصیب ہوئی۔ دشمن کافی تعداد میں قتل ہوئے اور باقی ماندہ لشکر نے شکست کو غنیمت جانا۔ کافی عرصے بعد اس عزیز کا عریضہ پہنچا۔ جس میں یہ قصہ پوری تفصیل کے ساتھ لکھا ہوا تھا۔ بطور نذرانہ اس نے بہت سا مال بھیجا، مگر آپ نے قبول نہ فرمایا۔

ولایت کی عقابی نگاہ

حضرت والد ماجدؒ فرمایا کرتے تھے کہ محلّہ ''کوشک نز'' کے ایک آدمی نے حضرت خواجہ خوردؒ کی خدمت میں التماس کیا کہ توجہ فرمایئے تاکہ حصول علم سے جلد فراغت نصیب ہو۔ فرمایا ہم جواب دیں گے۔ جب گھر واپس آئے تو ایک آدمی کے ہاتھ اس کو رقعہ بھجوایا۔ جس میں لکھا کہ کل انشاءاللہ تمام علوم سے فارغ ہو جاؤ گے یہ مژدہ سنکر وہ متعجب ہوا اور دوسری صبح بغیر کسی ظاہری سبب کے سوتے میں ہی جان جان آفریں کے سپرد کردی۔

کسی نے حضرت والد ماجد سے سوال کیا کہ لوگوں میں یہ افواہ پھیلی ہوئی ہے کہ خواجہ خوردؒ شراب خوری کے مرتکب ہوئے تھے یہ کیا قصہ ہے؟ فرمایا کمسنی میں حضرت خواجہ کو کوئی انتہائی جانکاہ مرض لاحق ہوا۔ طبیبان شہر نے بالاتفاق علاج کے لیے شراب تجویز کی۔ علماء نے بھی نزاکت حال کے پیش نظر جواز کا فتویٰ دیا۔ مگر خواجہ خوردؒ ان تمام رعایتوں کے باوجود شراب کے استعمال پر آمادہ نہ ہوئے۔ پھر خواجہ حسام الدینؒ نے اس بارے میں انتہائی اصرار و مبالغہ سے کام لے کر انہیں بطور دوا شراب پینے پر مجبور کر دیا۔ شراب پینے کا قصہ اس قدر ہے مگر جاہلوں نے خواجہؒ پر تہمتوں کے طومار باندھے اور ان کے اس فعل کو غلط رنگ چڑھا دیا۔ ایسے مواقع پر اباحت کے صحیح مفہوم کو نہ سمجھنے کی وجہ سے انھوں نے اس فعل کو شرعی کوتاہی پر محمول کیا۔

فقر کی بے نیازی

فرمایا۔ ایک دن بہمن یار خاں لباس فاخرہ زیب تن کر کے حضرت خواجہ خوردؒ کی خدمت میں آئے۔ اس وقت حضرت کے گھر میں کوئی فرش نہیں تھا۔ لوگ زمین پر بیٹھے ہوئے تھے۔ بہمن یار خان بھی زمین پر بیٹھ گا۔ حاضرین میں سے کوئی شخص اٹھا اور خواجہ کے کان میں کہا کہ یہ بہمن یار خاں ہے۔ اس کی تعظیم کرنی چاہیئے۔ حضرت خواجہ نے بلند آواز سے فرمایا۔ اگر یار ہے تو محتاج تعظیم نہیں اور اگر غیر ہے تو لائق تعظیم نہیں۔ یہ نکتہ سن کر بہمن یار خاں بہت محظوظ ہوا۔ (یہ قصہ مختصر کیا گیا ہے)

بزرگوں کی خوردی

حضرت والد ماجد فرمایا کرتے تھے کہ ایک دفعہ خواجہ کے خدام میں سے ایک نے شراب پی

رکھی تھی۔ میں اس سے جھگڑ پڑا۔ بات پریشان خاطری تک جا پہنچی۔ میں نے عزم کرلیا کہ دوبارہ ادھر کبھی نہیں جاؤں گا۔ دو تین روز بعد خواجہ خوردؒ بنفس نفیس تشریف لائے اور میرے دروازے پر آ کر کسی بڑھیا سے میرا پتہ معلوم کیا۔ اس نے کہا نیند میں ہے۔ فرمایا۔"جب بیدار ہوں تو انہیں کہہ دینا کہ خورد تمھیں ڈھونڈ رہا ہے اور مسجد حبوط میں سویا ہوا ہے۔ ذرا اس کی بھی خبر رکھ لینا"۔ میں جب بیدار ہوا بڑھیا نے مجھے اطلاع دی۔ جلد ہی اس مسجد میں پہنچا۔ حضرت خواجہ اپنی دستار سر کے نیچے رکھ کر بے تکلف سو رہے تھے۔ جب ظہر کی اذان ہوئی تو بیدار ہوئے اور میرے ساتھ بڑے لطف وکرم سے پیش آئے اور دیر تک خیر و عافیت پوچھتے رہے۔ حضرت والد فرمایا کرتے تھے کہ خواجہ خوردؒ اور خواجہ کلاںؒ (۱) دونوں کمسن تھے کہ حضرت خواجہ محمد باقیؒ وفات پا گئے۔ جب یہ دونوں صاحبزادے سن بلوغ کو پہنچے تو حضرت شیخ احمد سرہندی کے پاس گئے اور بہت دن وہاں مقیم رہے۔ خواجہ کلاںؒ کے حالات تو معلوم نہیں ہو سکے البتہ خواجہ خوردؒ نے حضرت شیخ احمد سرہندی سے طریقۂ نقشبندیہ میں فیض حاصل کیا اور اجازت بیعت بھی پائی۔ وہاں سے آ کر خواجہ حسام الدینؒ اور شیخ اللہ دادؒ (خلفائے خواجہ محمد باقی باللہؒ) سے بھی رشد و ہدایت اور فیوض روحانی میں کمال حاصل کیا۔ واضح ہو کہ خواجہ حسام الدین آغاز عمر میں امراء کے زمرے میں شمار ہوتے تھے اور ان کے والد اپنے وقت کے امیر الامراء تھے۔ جب یہ خواجہ محمد باقی باللہؒ کی صحبت میں پہنچے اور جذب طریقہ نے ان میں تاثیر دکھائی اور انھوں نے سب کچھ ترک کر دیا۔ رضا کارانہ طور پر تمام امور دنیوی سے ہاتھ کھینچ لیا۔ جب ان کے اقرباء نے انہیں فقرانہ وضع میں دیکھنا پسند نہ کیا تو انھوں نے اپنے آپ کو دیوانہ قرار دیدیا اور بر سر عام گندگی کے ڈھیر پر بیٹھ کر اپنے کپڑوں کو اس سے آلودہ کیا۔ یہ دیکھ کر عزیز و اقرباء نے ان سے ہاتھ دھو لئے۔ حضرت خواجہ محمد باقی باللہؒ کی اولاد، ان کے مریدین، ان کے طریق تصوف اور اشغال و اوراد کے بارے میں جس قدر رعایت و کشش ان دو بزرگوں (خواجہ حسام الدین و خواجہ اللہ دادؒ) کے دل میں پائی جاتی تھی، کسی عقیدت مند میں بہت کم دیکھی گئی۔

---

(۱) خواجہ کلاں کا اصل نام حضرت خواجہ عبیداللہ ہے۔ آپ حضرت خواجہ محمد باقی باللہؒ کے بڑے فرزند اور خواجہ خورد خواجہ عبداللہ کے بڑے بھائی ہیں۔ آپ جید عالم، متقی، پرہیزگار اور اپنے اسلاف کے طریق پر گامزن تھے۔

طریق نقشبندیہ[1] کی انفرادیت

والد ماجد فرمایا کرتے تھے کہ ایک بار آغاز جوانی میں حضرت خواجہ خوردؒ دعوتِ اسماء کے شغل میں مشغول تھے کہ جنات نے مزاحمت کی یہاں تک کہ خواجہ کے جسم میں حلول کر گئے۔ جس سے خواجہ بے ہوش ہو کر مردے کی طرح گر پڑے۔ خواجہ حسام الدینؒ اتفاق سے وہاں پہنچے۔ کچھ دیر ان پر توجہ ڈالی۔ خدا کے فضل سے افاقہ ہو گیا۔ شیخ اللہ داد پہلے دوسرے سلاسل سے بہرہ یاب ہوئے اور بہت سے ہم عصر بزرگوں کی خدمت میں پہنچے۔ جب خواجہ محمد باقیؒ کی بارگاہ میں آئے تو پچھلے تمام دفتر معرفت کو بالکل لپیٹ کر رکھ دیا اور خواجہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ خانقاہ کی تمام خدمات اپنے ذمے لے لیں۔ خواہ ظاہری خدمات مثلاً قیام وطعام کا انتظام خواہ باطنی خدمات یعنی طالبان حق کی مزاج پرسی، دریافت حال اور ان پر پوری توجہ دینا ہو۔ بیخودی اور استغراق کی کیفیت جو نسبت نقشبندیہ کا حاصل سمجھی جاتی ہے۔ شیخ اللہ دادؒ میں اس قدر تھی کہ باوجود ان تمام خدمات اور مشاغل کے وہ ہر وقت اس سے پر کیف رہتے تھے۔

واضح ہو کہ حضرت والد ماجد طریقۂ نقشبندیہ کی مختلف شاخوں میں سے حضرت خواجہ محمد باقیؒ کی شاخ کو اس قدر پسند کرتے تھے اور اس کے ساتھ ایسی رغبت رکھتے تھے کہ دوسری شاخوں میں سے کسی کے ساتھ ایسی رغبت نہ تھی۔ آپ کی تمام تعلیم وتربیت اور ارشاد وہدایت اسی شعبے کے ذریعے تکمیل کو پہنچی ہے۔

---

(۱) سلسلۂ عالیہ نقشبندیہ کی اہم خصوصیت نسبت دائمی حضور وآگاہی ہے۔ جس کے ساتھ غیبت کا کوئی تعلق نہیں۔ حضرت خواجہ عبدالخالق غجدوانی نے ان آٹھ اصطلاحات پر طریقہ کی بنیاد قائم کی ہے۔ ۱۔ ہوش در دم یعنی ہر دم ہشیاری اور ہر سانس پر یہ تجسس کہ غافل ہوں یا ذاکر، ۲۔ نظر بر قدم سے یہ مراد ہے کہ چلتے پھرتے ادھر ادھر نہ دیکھے بلکہ نظر کو پریشانی سے بچانے کے لئے قدم پر ہی جمائے رکھے ۳۔ سفر در وطن بشری صفات حسیہ سے ملکوتی صفات فاضلہ کی طرف نقل کرتا رہے۔ ۴۔ خلوت در انجمن، جمیع حالات بشری میں رہ کر بھی اللہ سے مشغول رہے، ۵۔ یاد کرد مرشد نے جو بھی ذکر کی تعلیم دی ہے۔ اس کی تکرار کرتا رہے ۶۔ بازگشت ذکر کے اندر مناجات کرے اور مناجات کے بعد ذکر اس طرح مکرر، سہ کررے۔ نگاہ داشت خطرات نفس اور وساوس خاطر کے دور کرنے کا نام ہے۔ ۸۔ یادداشت ایسی توجہ جو واجب الوجود کی حقیقت پر الفاظ اور تخیلات سے خالی ہو کر کی جائے۔ حضرت خواجہ نقشبندؒ نے یہ تین اصطلاحیں اور زیادہ کی ہیں۔ وقوف زمانی، وقوف قلبی، وقوف عددی۔

شیخ تاج سنبھلیؒ جو خواجہ محمد باقی باللہؒ کے اولین خلفاء میں سے ہیں اور آخر عمر میں مکہ معظمہ میں اقامت اختیار فرما کر وہیں مدفون ہوئے۔ آپ کی رفعت شان کا عالم یہ ہے کہ اس فقیر نے آخری دور کے مشائخ ہند میں سے کوئی شخص ایسا نہیں دیکھا۔ جس کے ساتھ اہل مکہ شیخ سنبھلیؒ سے زیادہ عقیدت رکھتے ہوں اور شیخ تاج سے زیادہ اس کی کرامات وکمالات بیان کرتے ہوں۔ چنانچہ شیخ تاج سنبھلیؒ نے سلسلۂ نقشبندیہ کی اسی محبوب ترین شاخ یعنی شعبۂ باقویہ کے اشغال وعقائد کے بارے میں مستقل ایک رسالہ لکھا جو افراط وتفریط سے پاک اور واضح باتوں پر مشتمل ہے۔ حضرت والد ماجدؒ نے فارسی زبان میں اس کا ترجمہ بھی کیا ہے جسے جا بجا عبارات واقوال سلف سے مزین کیا گیا ہے۔ اس فقیر (ولی اللہ) نے حضرت والد کی خدمت میں یہ دونوں رسالے مطالعہ سے گزارے اور اس پر اللہ کا شکر ہے۔

کچھ نہیں سب کچھ ہے یارو

حضرت والد ماجد فرمایا کرتے تھے کہ خواجہ خوردؒ کی طرز بود و باش گمنامی اور عزلت نشینی سے عبارت تھی۔ ایک بزرگ عالم جن سے ہمارے شہر کے اکثر لوگ استفادہ کیا کرتے تھے اور جن کا نام نامی محمد صالح تھا۔ وہ مسجد فیروز شاہ میں درس دیا کرتے تھے اور حضرت خواجہ خوردؒ سے بیعت ہو گئے تھے۔ خواجہؒ نے تاکید فرمادی تھی کہ میرے ساتھ اپنی نسبت کبھی ظاہر نہ کرنا اور صحبت بھی خلوت میں اختیار کرتے رہنا۔ چنانچہ یہ ہمیشہ بیگانوں کی طرح رہتے تھے۔ جب مولانا محمد صالحؒ نے اپنے وطن پنجاب کو جانے لگے تو عرض کی کہ لوگ اگر پوچھیں کہ طریق فقر کس سے حاصل کیا ہے تو کیا جواب دوں؟ فرمایا اگر مجبوراً بتانا پڑے تو میرا نام لے دینا ورنہ اظہار سے احتراز کرنا۔

طریقۂ نقشبندیہ میں عرس کا اہتمام

حضرت خواجہ خوردؒ کبھی کبھار حضرت خواجہ محمد باقی باللہ کا عرس بھی کیا کرتے تھے۔ حضرت والد ماجد فرمایا کرتے تھے کہ ہم نے بارہا دیکھا کہ کوئی شخص ان کے سامنے آ کر کہتا ہے کہ حضرت چاول میرے ذمے! دوسرا آ کر کہہ رہا ہے حضور! گوشت میرے ذمے۔ ایک اور حاضر ہو کر کہتا کہ فلاں قوال کو میں لا رہا ہوں اور اسی طرح دوسرے انتظامات بھی ہو جاتے۔ حضرت خواجہ خوردؒ اس دوران کوئی تکلف نہیں برتتے تھے۔

نسبت نبوی کا احترام

والد ماجد فرمایا کرتے تھے کہ خواجہ خوردؒ نے آخری عمر میں مجھ سے فرمایا کہ" مجھے حضرت خواجہ محمد باقیؒ کے روضۂ اقدس میں جوتے اتارنے کی جگہ میں دفن کرنا اور حضرت خواجہ بزرگ کی نسبت روحانی براہِ راست ذات نبویؐ سے مستحکم ہونے کی رعایت سے مجھے مقبرے میں دفن نہ کرنا۔ میں مقام نعلین میں دفن ہونے کے لائق ہوں" میں نے عرض کی آپ کی تدفین کا کام تو دوسروں کے سپرد ہوگا۔ مجھے اس پر کیا اختیار؟ فرمایا۔"میری وصیت ان کو پہنچا دینا" حضرت خواجہ خوردؒ کی وفات کے بعد میں نے آپ کی وصیت ورثاء سے بیان کی مگر ان کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔

تذکرۂ خلیفہ ابوالقاسم اکبرآبادی قدس سرہٗ

صوفیا کا ذوق علمی

والد ماجد فرمایا کرتے تھے کہ جب اکبر آباد میں حضرت سید عبداللہؒ، اللہ کو پیارے ہوئے تو میں بہت رنجیدہ اور ملول ہوا اور کسی ایسے بزرگ کی طلب محسوس ہوئی جس کی صحبت سے کچھ فیض پاسکوں۔ اسی نواح میں کسی نے حضرت خلیفہ ابوالقاسمؒ کا اس سلسلے میں ذکر خیر کیا چنانچہ میں اس شخص کی معیت میں حضرت خلیفہؒ کی مجلس گرامی میں پہنچا۔ جب پہلی بار حاضر ہوا تو حضرت خلیفہ اپنے گھر کی تعمیر میں مشغول تھے اور معمار کو ہدایات دے رہے تھے۔ اسی دوران یہ شعر آپ کی زبان مبارک پر آیا۔

ہر کرا ذرۂ وجود بود   پیش ہر ذرہ در سجود بود

(جسے ذوق ووجدان سے ذرہ بھر نعمت بھی حاصل ہے وہ کائنات کے ہر ذرے کو لائق سجدہ سمجھے گا)

میں نے ادنیٰ تصرف کے ساتھ اس شعر کو یوں دہرایا کہ ۔

ہر کرا ذرہ شہود بود   پیش ہر ذرہ در سجود بود

(جسے شہود باری تعالیٰ کی نعمت کا ذرا سا عرفان حاصل ہو۔ وہ ذرات عالم کو مسجود تصور کریگا)

فرمانے لگے۔ میں نے کثرت سے صحیح نسخوں کا مطالعہ کیا ہے۔ جن میں لفظ وجود رقم ہے۔

عرض کی فقیر نے بھی صحیح نسخوں کا مطالعہ کیا ہے۔ان میں لفظ شہود پایا ہے۔فرمانے لگے معلوم ہوتا ہے کہ علم سے بھی بہرہ ور ہو؟ عرض کی اگر راہِ حق میں یہ علم ضرر رساں ہو تو اس سے توبہ کرلوں۔فرمایا علم ہر شخص کے لیے نقصان دہ نہیں اور نہ ہی ہر شخص کے لیے نافع ہے اور پھر یہ شعر پڑھا۔

علم را برتن زنی مارے بود　　　علم را بردل زنی یارے بود

(اگر علم پرورش جسم وتن کے لیے حاصل کیا جائے تو وہ سانپ کی مانند ہے اور اگر حصول تعلیم کا مقصد ارتقائے روح ہو تو وہ رفیق راہ ثابت ہوتا ہے)۔

عرض کی کہ آپ کا ضمیر مصفا ہمارے لیے کسوٹی ہے لہٰذا دریافت طلب امر یہ ہے کہ میرا علم میرے لیے نافع ہے یا نقصان دہ! یہاں پہنچ کر مجلس ختم ہوگئی اور جواب میں کچھ بھی نہ فرمایا۔ دوسرے دن دل میں آیا کہ کل تعمیر مکان میں مشغول تھے۔بات ادھوری رہ گئی اور زیادہ تحقیق بیان نہ کر سکے لہٰذا آج پھر ان کی خدمت میں جانا چاہیے۔جب میں پہنچا تو خندہ پیشانی اور حسن اخلاق کے ساتھ پیش آئے اور فرمایا کل میں تعمیر میں مشغول تھا۔بات نامکمل رہ گئی۔اب کہیے کہ اختلاف نسخہ کی وجہ سے لفظ شہود والے نسخے کی صورت میں آپ اس مصرعہ کا کیا معنی لیں گے۔عرض کی۔

”جس کسی کو بھی پہلے ذرات عالم میں حضرت حق تعالیٰ کا شہود حاصل ہوگا وہ لامحالہ ہر ذرّے کو سجدہ کرے گا“۔

لیکن لفظ وجود کی صورت میں جو عبارت ہے مرتبہ جمع سے۔مشاہدہ کرنے والا ذاتِ باری میں مستغرق ہوگا لہٰذا وہ قید سجود سے فارغ ہوگا۔فرمانے لگے بعض صحیح نسخوں میں لفظ وجود بھی پایا جاتا ہے۔اس صورت میں آپ اس کی کیا تاویل کریں گے؟ عرض کی اس صورت میں مناسب ہوگا کہ لفظ وجود وجدان کے معنوں میں لیا جائے جو کہ شہود کے قریب المعنی ہے اس بات سے انہیں بوئے آشنائی آئی اور طبع مبارک پر شگفتگی چھا گئی۔اس روز کی مجلس بڑی خوشگوار رہی۔اس کے بعد میں مسلسل ان کی خدمت میں جاتا رہا اور وہ مجھ پر التفات فرماتے رہے۔یہاں تک کہ کچھ قدیم لوگ مجھ سے حسد کرنے لگے۔

احوال خلیفہ

واضح ہو کہ خلیفہ ابوالقاسمؒ ملا عمرؒ کے داماد تھے جنھوں نے شرح ملا پر حاشیہ لکھا اور اپنے زمانے

کے معتبر علماء میں شمار ہوتے تھے۔ ملا عمر حضرت میر ابوالعلی (بانی سلسلۂ ابوالعلائیہ) کی خدمت میں بھی رہ چکے تھے۔ نیز ملا ولی محمد کے شاگرد رشید تھے جو اپنے زمانے کے اکابر میں سے تھے اور حضرت میر ابوالعلیؒ کے ممتاز خلفاء میں شمار ہوتے تھے۔ انہیں حضرت میر ابوالعلیؒ کے خلفاء میں وہی مقام حاصل تھا۔ جو شیخ نصیرالدین چراغ دہلوی (۱) کو حضرت شیخ نظام الدین دہلوی (۲) قدس سرہ کے خلفاء میں حاصل ہے۔ ملا ولی محمد بھی اکبرآباد میں مدفون ہیں۔

سوانح میر ابوالعلیؒ

معلوم ہونا چاہیے کہ حضرت میر ابوالعلیؒ اکبرآبادی آبائی سلسلے میں حسینی سید تھے۔ آپ کا سلسلۂ نسب امیر تقی الدین کرمانی تک جا پہنچتا ہے۔ امیر تقی الدینؒ اور خواجہ عبیداللہ احرار کا ایک واقعہ ''رشحات'' میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہے۔ امیر ابوالعلی کے ننہالی مورث اعلیٰ خواجہ محمد فیضی ابن خواجہ ابوالفیض بن خواجہ عبداللہ بن خواجہ عبیداللہ احرارؒ ہیں۔ حضرت میر ابوالعلیؒ کے والد ماجد ابوالوفا خواجہ ابوالفیض مذکور کے نواسے تھے اور میر ابوالعلی کے جد محترم میر عبدالسلام خواجہ عبداللہ بن خواجہ عبیداللہ احرارؒ کے نواسے تھے۔ اسی لحاظ سے میر ابوالعلی کو دو طرف سے نسبت احراری حاصل تھی۔ میر ابوالعلیؒ کے والد بزرگوار اور جد امجد علاقہ سمرقند سے سفر کر کے ہندوستان کے راستے مکہ معظمہ پہنچے اور وہیں واصل بحق ہوئے۔ حضرت امیر ابوالعلی اسی سفر کے دوران متولد ہوئے اور اپنے والد وجد امجد کی وفات کے بعد خواجہ فیضی (مصاحب مان سنگھ صوبیدار پورب (۳)) کے سایۂ عاطفت میں پرورش پا کر جوان ہوئے اور جب خواجہ فیضی وفات پا گئے تو کچھ دن بعد میر ابوالعلی نے بھی

---

(۱) شیخ نصیرالدین محمود چراغ دہلوی سلطان المشائخ شیخ نظام الدین اولیاء قدس سرہ کے مشہور اور ممتاز خلیفہ ہیں شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے آپ کے بارے میں لکھا ہے کہ صاحب اسرار اور احوال شیخ کے وارث تھے۔ ۱۸ر رمضان المبارک ۷۵۷ھ کو انتقال فرمایا۔

(۲) شیخ الشیوخ فریدالدین مسعود گنج شکر کے خلیفہ متاخر چشتیہ مشائخ کے سرخیل ہیں۔ پورا نام محمد بن احمد بن علی بخاریؒ اور لقب سلطان المشائخ ہے۔ بارگاہِ الٰہی میں مقبول ومقرب تھے۔ آپ ۱۱ر ربیع الاول ۷۲۵ھ کو رحمت ایزدی کی آغوش میں چلے گئے۔

(۳) صحیح طور پر معلوم نہیں ہوسکا کہ پورب سے کیا مراد ہے تاہم اندازہ ہے کہ جونپور، الہ آباد اور لکھنؤ وغیرہ کا علاقہ ہے۔

انہی کی روش پر مان سنگھ کے لشکر میں ملازمت اختیار کر لی۔

انہی دنوں ایک رات آپ نے خواب میں دیکھا کہ تین بزرگوں نے آ کر انہیں فرمایا کہ یہ کیا روش اختیار کر رکھی ہے؟ وضع تو یہ ہے کہ جو ہم رکھتے ہیں۔ ہماری وضع قطع اختیار کرو اور اگر معاش کی فکر ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اللہ نور السموات والارض (اللہ زمینوں اور آسمانوں کا نور ہے) یہ کہہ کر ان میں سے ایک آدمی نے استرا پکڑا اور ان کا سر مونڈھ دیا۔ دوسرے نے ایک پیراہن پہنا دیا۔ تیسرے نے دستار بندھا کر نعلین پکڑا دی۔ اس خواب کے بعد حضرت امیر ابوالعلی کے دل میں ایک قسم کا اضطراب اور قلق پیدا ہوا۔ چاہا کہ ملازمت ترک کر دیں مگر مان سنگھ مانع ہوا یہاں تک کہ اذا اراد اللہ شیأ ھیا اسبابہ کے تحت ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ چارو ناچار یہ ملازمت سے فارغ ہو گئے اور تلاش خدا میں یکسو اور یک رو ہو کر لگ گئے۔ اسی اثناء میں حضرت خواجہ معین الدین قدس سرہ کے مزار پر انوار کی طرف متوجہ رہنے لگے اور بارگاہ خواجہ کی عنایات اور فیوض سے بہرہ ور ہوئے۔

مروی ہے کہ میر ابوالعلی کے اہل خانہ نے ان کے فرزند میر ابوالعلی کے عارضہ علالت کے سبب ایک روپیہ اور ایک چادر بطور نیاز مزار خواجہ پر بھجوائی تھی۔ حضرت امیر کو اس کی اطلاع نہیں تھی۔ ایک دن صاحب مزار کی طرف متوجہ تھے کہ مزار سے ندا آئی کہ تمہارے فرزند کی صحت کے لیے تمہارے گھر سے یہ کچھ نیاز آئی ہے اور اہل خانہ نے دوسرے فرزند کے لیے بھی التجا کی ہے۔ نیاز قبول اور التجا مبذول ہے۔ یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ مزار خواجہ سے خطاب ہوا کہ یہ نعمت جو تمہیں عنایت ہوئی ہے بائیس یا ایک سو تیس سال بعد بزرگان خاص میں سے کسی ایک کو عنایت ہوگی (پھر بطور جملہ معترضہ حضرت شاہ عبدالرحیمؒ نے ارشاد فرمایا کہ) ہمارے زمانے میں یہ نعمت ہمیں عنایت ہوئی۔ اس واقعہ کے بعد سید تقی الدین کرمانی مذکور کے پوتے سید جعفر کی قبر کی توجہ سے امیر ابوالعلی کے دل میں اپنے عم بزرگوار امیر عبداللہ کی بیعت کا شوق اور خواہش دامن گیر ہوئی۔

حضرت امیر ابوالعلی ظاہراً اگرچہ نوکری پیشہ تھے۔ مگر حقیقت میں ان کی ذات سے ولایت کے آثار نمایاں تھے اور طریقت میں ان کا رابطہ اپنے خالو خواجہ یحییٰ کے ساتھ تھا۔ جو حضرت خواجہ عبیداللہ احرار کے خلیفہ و فرزند اور اپنے عم بزرگوار خواجہ عبدالحق سے مجاز تھے۔ حضرت امیر ابوالعلی طریق

تصوف میں اسی سلسلے کے مطابق عمل فرماتے تھے۔ مگر حقیقت میں ان کی تربیت اویسیانہ طریق پر تھی۔ امیر ابوالعلی کے ارشادات وکلمات طیبات میں سے چند یہ ہیں۔

سیر روحانی

نسبت روحانی کا ارتقاء بھی سیر کشتی کی مانند ہے۔ کشتی کا سوار ہمیشہ یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ ساکن ہے جب ساحل پہ پہنچتا ہے تو وہ قطع منزل پر مطلع ہوتا ہے۔

مقصود سماع

سماج اور بے خودی سے مقصود بشریت کی عادات مذموم کو ختم کرنا ہوتا ہے نہ کہ ان کے ذریعے محض عقل وہوش کو مغلوب کرنا جیسا کہ غواص کا اصل مقصد موتیوں کا حصول ہوتا ہے نہ کہ منہ اور ناک میں پانی داخل کرنا۔

تعلق باللہ کی حقیقت

مشاغل دنیوی کے دوران حضرت حق سجانہ تعالیٰ سے آگاہی وعرفان کے تعلق کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی شخص مٹکے پر مٹکا سر پر رکھ کر باتوں میں مشغول ہو جائے۔ اسی اثناء میں اس کی باطنی توجہ مٹکے کی آواز سے منقطع نہیں ہوتی۔

کشف وکرامت

اگر کوئی شخص ہماری صحبت ومجلس میں اس صحرانورد کی طرح سکون واطمینان محسوس کرتا ہے جو انتہائی گرمی کے موسم میں اچانک کسی درخت کے سائے میں پہنچ کر اپنے تن بدن کی راحت محسوس کرتا ہے تو اسے ہماری صحبت مبارک ہے۔ ورنہ وہ دوسری جگہ چلا جائے۔ ہمارے ہاں کشف وکرامت کی دنیا نہیں بلکہ عالم خداوندی ہے۔

برکات اسم ذات

میر نور العلی حبس دم کے ساتھ ذکر نفی واثبات کثرت سے کرتے تھے۔ آپ نے انہیں فرمایا جو کچھ تم نے اختیار کیا ہے یہ طریقہ سلف ہے مگر اسم ذات کی ورزش دوسرے اذکار سے زیادہ موثر ہے۔

وصول حق کے طریق

اگر کوئی شخص ان سے وصول حق کی طلب کرتا ہے تو اس سے دریافت کرتے کہ محنت

ومشقت سے حاصل کرنا چاہتے ہو یا مفت میں؟ اگر کوئی شخص پہلا طریقہ پسند کرتا تو اسے طریقہ ذکر لکھ کر دیدیتے اور اگر دوسری خواہش کا اظہار کرتا تو فرماتے صحبت میں آیا کرو۔

قوتِ توجہ

فرماتے تھے کہ جس شخص نے بھی ہمارے سامنے آ کر کچھ فیوض حاصل کر لئے، بالفرض اگر وہ دولت آباد جا کر بھی مرتکب گناہ ہو تو ہمارا فیض اس سے ضائع نہیں جائے گا ہاں البتہ اس کی راہ ترقی مسدود ہو سکتی ہے۔

تاثیرِ وجد ورقص

نقل ہے کہ حضرت امیر عارضۂ فالج میں مبتلا ہو گئے۔ جس کے سبب خاص طور پر طہارت اور وضو کے وقت آپ کو انتہائی تکلیف ہوتی تھی۔ ایک دن یہ شعر پڑھنے لگے۔

دردم از یار است ودرماں نیز ہم　　　دل فدائے اوشد وجاں نیز ہم

(میرا درد بھی تو و درماں بھی تو۔ میرا قلب و جسم و جان بھی تو)

اس شعر کی تاثیر سے آپ پر زبردست وجد طاری ہوا۔ جس کی حرارت سے تمام اعضاء و جوارح میں کشادگی پیدا ہوگئی اور قوت بدن پہلی حالت پر واپس لوٹ آئی۔

تاثیر کلاہ

حضرت امیر نے ایک آدمی کو اپنی ٹوپی عنایت فرمائی جسے اس نے جنگ میں پہنا۔ اتفاق سے کسی سپاہی کا تیر اس ٹوپی کو آ کر لگا۔ اس کا پھل ٹیڑھا ہو گیا اور تیر گر پڑا۔

سود کی نحوست

ایک رات حضرت امیر نے رفیقان مجلس پر بھرپور توجہ ڈالی مگر انھوں نے کچھ اثر قبول نہ کیا۔ آپ متعجب ہوئے۔ اچانک چراغ گل ہو گیا۔ اسی وقت مجلس میں عجیب وغریب آثار نمودار ہونے لگے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ چراغ ایک سودخوار لایا تھا۔ واضح ہو کہ حضرت امیر جذب وکشش کی انتہائی قوت رکھتے تھے۔ جب بھی کسی پر توجہ ڈالتے۔ وہ بیخود ہو کر مردے کی طرح کھنچا چلا آتا تھا۔

جانوروں پر توجہ کا اثر

منقول ہے کہ حضرت امیر کی سواری کے جانوروں میں سے ایک جانور آپ سے اس قدر متاثر تھا کہ وہ ان کی مجلس میں دوسرے طالبان حق کی طرح باادب ہوکر بیٹھتا تھا۔ جب اہل طلب امیر کی خدمت میں پہنچتے اور ان کے رخ انور کو دیکھ کر جوش و مستی میں بے قراری کا مظاہرہ کرتے۔ ان کے گرنے پڑنے سے اگر اس جانور کو کوئی چوٹ، ضرب یا دھول دھپہ لگ جاتا تو وہ اپنے آپ ہی میں مست بیٹھا رہتا۔ انہیں کوئی نقصان نہ پہنچاتا۔ جانوروں کے اس قسم کے بیشمار قصے حضرت امیر سے روایت ہیں۔

سلسلۂ ابوالعلائیہ کی خصوصیات

واضح رہے کہ حضرت امیر ابوالعلی کا طریقہ تصوف شریعت نبویؐ کے اتباع اور طریق محمدیؐ کی پیروی کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا جادۂ طریقت پر انھوں نے کسی چیز کا بھی اضافہ نہیں کیا۔ اور اس جادۂ نبویؐ سے وہ سرمو بھی انحراف نہیں فرماتے تھے۔ نہ قول میں اور نہ ہی فعل میں۔ ان کے ابتدائی صحبت یافتگان مثلاً ملا ولی محمد وغیرہ بھی اسی روش پر کاربند تھے۔ ان کے بعد ع بدنام کنِ مردِ نکونامے چند قسم کے ایسے لوگ آئے جنھوں نے خواہش نفسانی کا اتباع کیا۔ فاسد عقیدوں اور کھوٹے اعمال کو اختیار کیا اور اللہ کے اس فرمان کے مصداق بنے کہ۔ ومن ذریتھما محسن وظالم لنفسہ (۱) (اور ان کی اولاد میں کوئی اچھا کام کرنے والا اور کوئی جان پر صریح ظلم کرنے والا ہے) حالانکہ حضرت امیر کی دستار مقدس اس خس و خاشاک سے پاک تھی اور ان کے طریقۂ عالیہ کا دامن اس گندگی سے آلودہ نہیں تھا۔ ملا لطف اللہؒ جامع مقامات حضرت امیر نے اس بات کو زیادہ واضح طور پر بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:-

> ''حضرت امیرؒ کے حاضرین مجلس پر ہمیشہ بے اختیار وجد طاری ہوتا تھا۔ یوں نہیں کہ کوئی ان کی محفل میں کوئی خلاف شرع ارتکاب کرے اور مزامیر و سرود کی آواز پر رقص کرے۔ آپ مزامیر کو بھی خواجہ بزرگ (خواجہ معین الدینؒ) کے فرمان کہ ''مانہ ایں کار کنیم نہ انکار می کنیم'' کے مطابق کبھی کبھار اتفاق سے سن لیا کرتے تھے''۔

---

(۱) پ ۲۳۔ ص ۳۷۔

حضرت والد ماجدؒ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے نور العلی خلف الصدق میر ابوالعلی سے زیادہ حق گو کسی کو نہیں دیکھا۔ میں نے ایک دن ان سے پوچھا کہ لوگ کہتے ہیں کہ میر ابوالعلی سماع کی طرف حد سے زیادہ راغب تھے۔ فرمانے لگے مجھے یاد نہیں کہ سوائے چند تقریبات کے انھوں نے سماع میں حصہ لیا ہو۔ میں نے کہا لوگ کہتے ہیں کہ میر ابوالعلی جس شخص پر بھی نگاہ فرماتے تھے یا اسے پان چبا کر دیتے تھے وہ بیہوش ہو جاتا تھا۔ فرمانے لگے میں نے ان کا چبایا ہوا پان کئی بار استعمال کیا ہے۔ یہ کوئی کلیہ نہیں تھا۔ واضح ہو کہ حضرت والد ماجد نے میر ابوالعلیؒ کی کافی صحبت اٹھائی اور ان سے کلاہ و خرقہ بھی حاصل کیا تھا۔

حضرت خلیفہؒ کی پختگی ارادت اور توکل

حضرت والد فرماتے تھے کہ خلیفہ ابوالقاسم کو بھی میر ابوالعلی کی صحبت نصیب ہوئی لیکن حصول فیض کا رابطہ اور بیعت کا شرف ملا ولی محمد سے حاصل تھا۔ ایک دن میر ابوالعلی نے حضرت خلیفہ سے فرمایا کہ تم ہم سے بیعت کیوں نہیں کرتے؟ خلیفہ نے عرض کیا کہ ملا ولی محمد کی بارگاہ بھی آپ کی بارگاہ کی مظہر ہے۔ اس عاجز نے جب علم ظاہری ان سے حاصل کیا ہے اور حصول علم کے دوران ان سے بے حد محبت پیدا کی تو رابطہ بیعت بھی ان کے ساتھ بہتر سمجھا۔ حضرت امیر یہ سن کر تبسم اور تحسین فرمانے لگے۔ حضرت والد صاحب نے فرمایا کہ خلیفہ ابوالقاسم پر مشرب گوشہ نشینی غالب تھا۔ کسی سے تعلقات نہیں رکھتے تھے۔ نیز ان کا مشرب توکل کل اور ترک کاروبار تھا اور یہ شعر پڑھا کرتے تھے۔

نشان بود ولی را

چوتھا نشان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بغیر کسی واسطے کے ان کی روزی کا کفیل ہوتا ہے۔ سچ یہ ہے کہ یہ بات حضرت خلیفہ کے حق میں بالکل درست تھی۔ ظاہری سامان نہ رکھتے ہوئے بھی وہ ہمیشہ پر لطف زندگی گزارتے تھے۔

ذخیرہ اندوزی سے تنگی رزق

ایک بار حضرت خلیفہ کے گھر میں گھی ختم ہو گیا اور کئی دن تک کہیں سے گھی میسر نہ آ سکا۔ آپ متعجب ہوئے اور بغیر گھی کے گزارہ کرتے رہے۔ ایک دن کسی سبب سے اچانک مکان کی چھت پر

تشریف لے گئے۔ دیکھا کہ لنگر کے گھی کا ایک مٹکا اہل خانہ میں سے کسی نے چھپا رکھا ہے۔ فرمایا ان ایام میں غیب سے روزی نہ ملنے کا سبب یہی تھا۔ چنانچہ وہ گھی لنگر میں خرچ کیا اور اس کے بعد متواتر لنگر میں گھی آتا رہا۔

قرب سلطانی سے استغناء

حضرت والد ماجد فرمایا کرتے تھے کہ شہنشاہ عالمگیر کے زمانے میں فتاویٰ عالمگیری حکم شاہی سے جب تدوین و ترتیب اور نظر ثانی کے مراحل سے گزر رہا تھا تو کچھ تحریری کام شیخ حامد کے سپرد بھی ہوا جو میرزا محمد زاہد (۱) کے مدرسہ میں ہمارے شریک درس تھے۔ یہ علمی خدمت ملنے پر وہ میرے پاس آئے کہ تم بھی میرے ساتھ اس کام میں تعاون کرو۔ تمہارے نام اتنا روزینہ مقرر ہو جائے گا۔ میں نے قبول نہ کیا۔ والدہ ماجدہ نے یہ قصہ سن کر انتہائی ناگواری کا اظہار کیا اور مجھے اس کام پر آمادہ کرنے کے لیے بہت مبالغے سے کام لیا۔ مجبور ہو کر ایک مقررہ وظیفے پر میں اس کام میں مشغول ہو گیا۔ حضرت خلیفہ جب اس حقیقت سے مطلع ہوئے تو فرمایا کہ یہ ملازمت ترک کر دو۔ عرض کی والدہ ماجدہ ناراض ہوتی ہیں تو فرمایا اذا جاء حق اللہ ذھب حق العباد (جب اللہ کا حق آجاتا ہے تو بندوں کے حقوق ساقط ہو جاتے ہیں) ایک سچی بات ہے۔ عرض کی دعا فرمائیے کہ حق سبحانہ تعالیٰ بغیر کوشش کے یہ ملازمت مجھ سے چھڑا دے تاکہ والدہ کی ناراضگی سے بھی بچ جاؤں۔ آپ نے دعا فرمائی چنانچہ کچھ دنوں میں بادشاہ نے تدوین فتاویٰ کے تمام ملازموں کی فہرست طلب کی اور از سر نو تقرری و برطرفی کے احکام صادر کیے۔ جب میرے نام پر پہنچا تو وظیفہ خواروں سے کاٹ کر لکھا کہ اگر چاہیں تو اتنی زرعی زمین ان کو دی جائے۔ اہلکاروں نے مجھ سے پوچھا۔ میں نے قبول نہ کی اور اس نجات پر شکر بجالایا اور حمد و ثنا پڑھی۔

---

(۱) میرزا زاہد ہروی کے والد قاضی اسلم ہرات سے عہد جہانگیر میں ہندوستان آئے۔ قاضی اسلم ملا فاضل کے اور وہ میرزا جان شیرازی مشہور منطقی عالم کے شاگرد تھے۔ میرزا زاہد بچپن سے بڑے ذہین تھے کل تیرہ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہو گئے۔ عالمگیر کے دور میں مختلف خدمات پر مامور ہوئے۔ علاوہ زواہد ثلاثہ کے ان کا ایک حاشیہ تجرید پر بھی ہے اور اشراقیوں کی کتاب، ہیاکل النور پر بھی ایک شرح لکھی ہے۔ ۱۶۹۰ء میں آپ نے انتقال فرمایا۔

صوفیا کا تبحر علمی

والد ماجد فرمایا کرتے تھے کہ ایک دن فتاویٰ عالمگیری کے مفوضہ حصے پر نظر ثانی کے دوران ایک ایسی عبارت پر میری نظر پڑی جس میں صورت مسئلہ کو گڈمڈ کر کے گنجلک بنا دیا گیا تھا۔ میں نے ان کتابوں کی طرف رجوع کیا جو اس مسئلے کا ماخذ تھیں۔ مطالعہ سے معلوم ہوا کہ یہ مسئلہ دو کتابوں میں مذکور ہے۔ اور ہر کتاب میں مختلف انداز سے بیان ہوا ہے۔ مؤلف فتاویٰ عالمگیری نے دونوں عبارتوں کو یکجا کر دیا ہے چنانچہ اس وجہ سے صورت مسئلہ کچھ سے کچھ ہو کر رہ گئی ہے۔ میں نے اس مقام پر ایک نوٹ دیا جس میں لکھا۔

من لم یفقه فی الدین قد خلط فیه هذا غلط وصوابه کذا. یعنی جو دین کی سمجھ نہیں رکھتا۔ اس نے یہاں گڑبڑ کر دی ہے اور صحیح یوں ہے۔

ان دنوں عالمگیرؒ کو اس کتاب کی ترتیب و تدوین میں حد سے زیادہ اہتمام تھا اور ملا نظامؒ روزانہ ایک دو صفحات بادشاہ کو پڑھ کر سناتے تھے۔ جب میرے اختلافی نوٹ پر پہنچے تو اتفاقاً نوٹ کو متن کے ساتھ ملا کر ایک ہی سانس میں پڑھ ڈالا۔ بادشاہ چونک اٹھا اور کہا یہ عبارت کیسی ہے۔ ملا نظام نے اس نشست میں دفع الوقتی کرتے ہوئے کہا۔ اس مقام کا میں نے مطالعہ نہیں کیا ہے کل تفصیل سے عرض کروں گا۔ جب گھر لوٹے تو ملا حامد پر بگڑے کہ فتاویٰ کا یہ حصہ میں نے تمہارے اعتماد پر چھوڑا ہوا تھا۔ تم نے مجھے بادشاہ سے شرمندہ کیا ہے۔ فرمائیے یہ لفظ کیا ہے؟ ملا حامد اس وقت کچھ نہ بولے۔ بعد میں مجھ سے اظہارِ ملال کیا۔ اس پر وہ کتابیں جو اس مسئلے کا ماخذ تھیں میں نے پیش کر دیں اور مسئلے کا ابہام اور عبارت کا گنجلک پن ان پر اس انداز سے واضح کیا کہ سب کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس دن کے بعد مفتیان کرام کا یہ گروہ مجھ سے حسد کرنے لگا۔ میری برطرفی کا ظاہری سبب یہ واقعہ بنا زیادہ بہتر خدا جانتا ہے۔

خواب فقراء

والد ماجدؒ فرمایا کرتے تھے کہ ایک دن حضرت خلیفہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو وہ تعمیر مکان میں مشغول تھے۔ کاریگر کھڑی کی موٹی دیوار میں میخ نکال رہے تھے۔ میں بھی اسی دوران جا پہنچا۔ مجھے دیکھ کر خوش ہوئے۔ میں نے اپنے کپڑے کس لیے اور چاہا کہ گلِ گارا تیار کروں۔ فرمانے

لگے۔ اس سے پہلے بھی کبھی گارا تیار کیا ہے۔ عرض کی نہیں مگر اندازے اور قیاس سے ضرورت کی ہر چیز بنا سکتا ہوں۔ فرمانے لگے۔ یہ کام اٹکل بچو سے صحیح طور پر نہیں ہو سکتا۔ تمہارے لیے ایک اور کام تجویز کیا ہے۔ ایک آدمی کو اشارہ کیا کہ چارپائی لا کر سایۂ دیوار میں بچھا دو اور مجھے حکم دیا کہ تم دور سے آئے ہو، ذرا آرام کر لو۔ میں تعمیل حکم میں لیٹ گیا مگر نیند کوسوں دور تھی۔ فرمانے لگے درویشوں کی نیند تو اختیاری ہوتی ہے۔ یعنی ماسوی اللہ سے فراغت اور خیال حق میں کھو جانا، اسی اثناء میں ایک دوسرا رفیق سید عبدالرسول نامی آیا۔ فرمانے لگے وقت پر پہنچے ہو۔ وہ کمر کس کر حکم کا انتظار کرنے لگا۔ فرمایا میرا مطلب یہ ہے کہ اس چارپائی پر بیٹھ کر اس درویش کے پاؤں داب دیجئے کیونکہ یہ لمبا سفر طے کر کے آئے ہیں۔ بہرحال اس قسم کے الطاف کریمانہ فرماتے رہے اور ہر روز کرم و احسان میں اضافہ ہوتا رہا۔

حج درویشاں

والد ماجد فرمایا کرتے تھے کہ حضرت خلیفہ کو حج کا خیال آیا۔ بغیر سواری زاد راہ اور بلا رخصت اہل خانہ گھر سے نکل کر حجاز کی راہ لی۔ راستے میں بعض مخلص ان کے ہم سفر ہونے لگے۔ اگر کوئی غیر متاہل ہوتا تو اسے ساتھ لیتے اور عیال دار کو یہ کہہ کر رد کر دیتے کہ ہم نے طویل سفر کا قصد کر رکھا ہے۔ اسی طرح حجاز جا پہنچے اور کافی عرصہ وہاں رہے۔ بہت دنوں بعد گہوارہ امن و بہبود کو واپس لوٹے۔ سفر حجاز میں آپ سے بہت سی کرامات ظاہر ہوئیں۔ مثلاً ان میں سے ایک یہ ہے کہ رفقاء میں مشہور تھا کہ آپ جب گھر سے نکلے تھے تو صرف ایک چونی پاس تھی۔ پورے سفر میں کہیں بھی اسے صرف کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ یہاں تک کہ جب واپس لوٹے تو جیب میں وہی چونی موجود تھی۔ جب ان سے اس کے متعلق استفسار کیا گیا تو فرمایا کہ تا حال کسی نے بھی اس بارے میں سوال نہیں کیا۔ جب میں گھر سے نکلا تو ایک شخص نے یہ چونی بطور نیاز پیش کی اور میں نے جیب میں رکھ لی۔ بعد میں کہیں بھی اس کی ضرورت پیش نہ آئی۔ جب وہ کپڑے اتار کر میں نے نیا لباس پہنا تو ہم سفروں نے وہ چونی کپڑے میں باندھ کر محفوظ کر دی۔ اس کے بعد لباس بدلتا رہا اور وہ چونی باندھ کر محفوظ کی جاتی رہی۔ مجھے پورے سفر میں نہ اترے ہوئے لباس اور نہ اس چونی کی طرف کوئی التفات ہوا۔ جب گھر لوٹے تو وہ کپڑے اور چونی رفقائے سفر نے

پیش کی اور یہ قصہ مشہور ہو گیا۔

طوفانوں پر تصرف

حضرت خلیفہؒ سفر حجاز میں عموماً اپنے رفقائے جہاز کو مقامات اور کرامات اولیاء سنایا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ اولیاء کے پانی پر چلنے اور دور دراز مقامات کو آناً فاناً طے کرنے کی بات چل پڑی تو جہاز کے کپتان نے ان کرامات سے انکار کر دیا اور کہنے لگا کہ ایسے جھوٹ کے طومار بہت سے سننے میں آتے ہیں جن کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔ یہ سن کر آپ کی غیرت ایمانی جاگ اٹھی اور سمندر میں چھلانگ لگا دی۔ یہ دیکھ کر لوگوں نے کپتان کو ملامت کی اور وہ خود بھی اس بات پر نادم ہوا کہ میرے جھگڑے کی وجہ سے فقیر ہلاک ہوا اور رفقائے خلیفہ بھی حضرت کے تصور مہجوری سے غمناک ہونے لگے۔ عین اسی وقت حضرت خلیفہؒ نے بلند آواز سے کہا کہ رنجیدہ نہ ہوں۔ میں خیر وعافیت سے پانی کی سطح پر سیر کر رہا ہوں۔ یہ سن کر تمام اہل جہاز اور کپتان نے آئندہ درویشوں سے گستاخی کرنے سے توبہ کی اور حلقۂ نیاز منداں میں شامل ہو گئے۔ ان کے رجوع وتوبہ کے بعد حضرت خلیفہ صحیح وسالم جہاز پر چڑھ آئے۔

قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید

حرمین شریفین میں ایک ایسا شخص مقیم تھا۔ جسے حضرت غوث الاعظمؒ کی کلاہ مبارک تبرکاً سلسلہ وار اپنے آباء واجداد سے ملی ہوئی تھی۔ جس کی برکت سے وہ شخص حرمین شریفین کے نواح میں عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور شہرت کی بلندیوں پر فائز تھا۔ ایک رات حضرت غوث الاعظمؒ کو (کشف میں) اپنے سامنے موجود پایا جو فرما رہے تھے کہ یہ کلاہ ابوالقاسم اکبر آبادی تک پہنچا دو۔ حضرت غوث الاعظمؒ کا یہ فرمان سن کر اس شخص کے دل میں آیا کہ اس بزرگ کی تخصیص لازماً کوئی سبب رکھتی ہے۔ چنانچہ امتحان کی نیت سے کلاہ مبارک کے ساتھ ایک قیمتی جبہ بھی شامل کر لیا اور پوچھ گچھ کرتے حضرت خلیفہ کی خدمت میں جا پہنچا اور ان سے کہا کہ یہ دونوں تبرک حضرت غوث الاعظمؒ کے ہیں اور انھوں نے مجھے خواب میں حکم دیا ہے کہ یہ تبرکات ابوالقاسم اکبر آبادی کو دیدو۔ یہ کہہ کر تبرکات ان کے سامنے رکھ دیئے۔ خلیفہ ابوالقاسمؒ نے تبرکات قبول فرما کر انتہائی مسرت کا اظہار کیا۔ اس شخص نے کہا۔ یہ تبرک ایک بہت بڑے بزرگ کی

طرف سے عطا ہوئے ہیں۔ لہٰذا اس کے شکریے میں ایک بڑی دعوت کا انتظام کر کے رؤسائے شہر کو مدعو کیجئے۔ حضرت خلیفہ نے فرمایا۔ کل تشریف لانا۔ ہم کافی سارا طعام تیار کرائیں گے۔ آپ جس جس کو چاہیں بلا لیجئے۔ دوسرے روز علی الصباح وہ درویش رؤسائے شہر کے ساتھ آیا۔ دعوت تناول کی اور فاتحہ پڑھی، فراغت کے بعد لوگوں نے پوچھا کہ آپ تو متوکل ہیں ظاہری سامان کچھ بھی نہیں رکھتے۔ اس قدر طعام کہاں سے مہیا فرمایا ہے؟ فرمایا کہ اس قیمتی جبے کو بیچ کر ضروری اشیاء خریدی ہیں۔ یہ سن کر وہ شخص چیخ اٹھا کہ میں نے اس فقیر کو اہل اللہ سمجھا تھا مگر یہ تو مکار ثابت ہوا۔ ایسے تبرکات کی قدر اس نے نہیں پہچانی۔ آپ نے فرمایا چپ رہو۔ جو چیز تبرک تھی۔ وہ میں نے محفوظ کر لی ہے اور سامان امتحان تھا ہم نے اسے بیچ کر دعوت شکرانہ کا انتظام کر ڈالا۔ یہ سن کر وہ شخص متنبہ ہو گیا اور اس نے تمام اہل مجلس پر ساری حقیقت حال کھول دی جس پر سب نے کہا کہ الحمدللہ تبرک اپنے مستحق تک پہنچ گیا۔

قحط میں خوشحالی

حاجی نور محمد جو حضرت سید عبداللہؒ اور خلیفہ ابوالقاسمؒ دونوں کے صحبت یافتہ اور ہمارے یار قدیمی تھے۔ بیان کرتے ہیں کہ جن دنوں حضرت خلیفہ مکہ معظمہ میں مقیم تھے۔ اتفاق سے سخت قحط پڑا۔ قریب تھا کہ لوگ انسانوں کو کھا جاتے۔ انہی ایام میں بارہا ہم حضرت خلیفہ کی خدمت میں پہنچے تو انہیں بریانی وغیرہ ایسے لذیذ طعام تناول کرتے ہوئے پایا جو ہمیں بھی عنایت فرماتے تھے جسے کھا کر ہم لوگ تعجب کرتے تھے۔ ایک روز ہم اس معمہ کے بارے میں پوچھ بیٹھے تو متبسم ہو کر فرمایا کہ جو خدا اکبر آباد میں تھا۔ وہ یہاں بھی ہمارے ساتھ ہے۔

احترام مہمان

والد ماجد فرماتے تھے کہ ایک روز ہم حضرت خلیفہؒ کی خدمت میں پہنچے تو دیکھا کہ حمام کی تیاری کر کے گھر سے باہر آئے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھ کر واپس پلٹے۔ چمچہ، پیالہ، گلاب اور بتاشے میرے سامنے لا کر رکھ دیئے۔ پھر فرمایا جی چاہے تو بتاشے کھا لیجئے ورنہ گلاب میں ڈال کر شربت نوش کیجئے۔ ان کے مریدوں میں سے ایک درویش نے جلدی سے کہا کہ موسم سرد ہے لہٰذا محض بتاشے کھانا مناسب رہیں گے۔ آپ خاموش رہے اور مجھ سے فرمایا کہ آپ کو کیا پسند ہے۔ میں

نے عرض کی شربت۔ فرمایا کیوں عرض کی مختصراً یہ کہ آپ جو چمچہ، پیالہ اور گلاب لائے ہیں اور محض تماشوں پر اکتفا کرلوں تو یہ چیزیں بیکار جائیں گی حالانکہ اولیاء کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی حکمت لازمی ہوتی ہے اور تفصیلاً یہ کہ آپ حمام کو جا رہے ہیں۔ حمام کی تکلیف کو بھی شربت ہی تسکین دے سکتی ہے۔ ادھر فقیر لمبا سفر کر کے آ رہا ہے اور خفقان کا مریض بھی ہے اور شربت خفقان کے لئے مفید ہوتا ہے۔ یہ سن کر آپ اس درویش کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا۔ تم نے بغیر پوچھے کیوں جواب دیا؟ بے ادب ہماری مجلس کے لائق نہیں ہو۔ آپ بہت غصہ ہوئے اور اس سے فرمایا کہ اٹھ کر چلے جاؤ۔ فقیر نے گزارش کی کہ یہ درویش مجھے بددعا دے گا۔ کیونکہ میری وجہ سے وہ آپ کی مجلس سے محروم ہو رہا ہے۔ اس مرتبہ درگزر فرمایئے۔ اگر دوبارہ اس سے کوتاہی سرزد ہو تو آپ کو اختیار ہے۔ بہرحال اسے معاف کر دیا۔ آپ اس طرح لوگوں کو ادب سکھایا کرتے تھے۔

خانقاہی بے تکلفی

حضرت والد ماجدؒ فرمایا کرتے تھے کہ حضرت خلیفہؒ نے جب ارادہ کیا کہ مجھے ارشاد و ہدایت میں اجازت بخشیں تو اپنے ایک انتہائی مخلص کو حکم دیا کہ طعام تیار کرو۔ لوگوں کو دعوت پر بلایا اور فقیر کو بھی طلب کر کے دستار بندھائی اور دم کی مانند پیچھے سے شملہ بھی چھوڑ دیا۔ میں نے عرض کی کہ میں مہتمم بالشان کام کی لیاقت نہیں رکھتا اور ان حقوق کی ادائیگی نہیں کر سکتا۔ فرمانے لگے تمہیں دوسری جگہ سے بھی اجازت حاصل ہے۔ سید عبداللہؒ کے ساتھ تمہارا معاملہ کیسا تھا۔ عرض کی انھوں نے تمام حقوق ارادت مجھے معاف کر رکھے تھے۔ فرمانے لگے ہم نے بھی تمام ظاہری و باطنی حقوق معاف کر دیئے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ بعض فقراء جان بوجھ کر کام کیا کرتے ہیں۔ پھر فرمایا کہ عذبہ (شملہ کے لیے مستعمل لفظ) علاقہ یا تعلق کو کہتے ہیں اور اس کے پس پشت ڈالنے سے مراد یہ ہے کہ تمام حقوق کو پس پشت ڈال دیا گیا ہے۔

فقیر اور دنیوی سکون

حضرت والد نے فرمایا کہ خلیفہ ابوالقاسمؒ فرمایا کرتے تھے کہ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ اپنے آرام کے لیے بھی فقیری اختیار نہیں کرتے یعنی جب طبیعت یکسو ہو اور تمام خطرات و وساوس دور ہو جائیں تو آدمی کو ظاہری حرج کے باوجود بھی کلیتہً آرام و سکون حاصل ہو جاتا ہے۔

صوفیا اور وقت کی قدر

والد ماجد فرمایا کرتے تھے کہ حضرت خلیفہ کے مخلص مریدوں میں سے ایک معمار اکثر و بیشتر یہ شعر پڑھا کرتا تھا ۔

کار عالم درازی دارد
ہر چہ گیرید مختصر گیرید

(کاروبار دنیا کی کوئی حد و نہایت نہیں ۔ جس قدر ممکن ہو کاروباری دنیوی کو مختصر کرو اور فرصت کے لمحات کو غنیمت جانو)

انداز تربیت

حضرت والد ماجدؒ فرمایا کرتے تھے حضرت خلیفہؒ کے مخلص مریدوں میں سے ایک مرد درویش سید عبدالرسولؒ کی ایک صاحبزادی تھی ۔ اس کی شادی کے لیے جب پریشان ہوئے تو ارادہ کیا کہ کچھ مالداروں سے مدد طلب کریں ۔ حضرت خلیفہ کے پاس آئے کہ میں دہلی جا رہا ہوں ۔ خلیفہ نے رخصت فرمایا اور فرمایا سب سے پہلے فلاں آدمی سے ملاقات کرنا اور یہ کہہ کر میرا نام (عبدالرحیمؒ) لیا ۔ اس کے بعد پھر جہاں جی چاہے چلے جانا ۔ چنانچہ وہ سب سے پہلے میرے پاس آئے ۔ میں نے ملتے ہی کہا کہ حضرت خلیفہ کا اصل مقصد آپ کو دولت مندوں کے دروازوں سے باز رکھتا تھا ۔ مگر جب آپ کو پریشان دیکھا تو نہ چاہا کہ اپنی زبان سے منع کریں ۔ یہ سنتے ہی سید صاحب اصل حقیقت تک پہنچ گئے اور اغنیاء کے دروازوں تک جانے کا خیال ترک کر دیا ۔ جب یہ بات حضرت خلیفہ تک پہنچی تو فرمایا واقعی اس (عبدالرحیمؒ) کے پاس بھیجنے سے میری غرض یہی تھی ۔

امانت فقر

حضرت والد ماجد نے فرمایا کہ حضرت خلیفہ مجھے اکثر فرمایا کرتے تھے کہ شہر کے درویشوں کی زیارت کیا کرو لیکن میں پس و پیش کر جاتا تھا ۔ کیونکہ میں اپنے دل میں کلی طور پر بجز ان کے کسی کی کشش نہ پاتا تھا ۔ ایک روز تاکید سے فرمایا اور جب جھجک دیکھی تو خادم سے فرمایا ۔ انہیں سید عظمت اللہ کی خدمت میں لے جاؤ (جو مشائخ چشتیہ کے مشہور بزرگوں میں سے تھے) ۔ انہیں میرا سلام کہہ کر عرض کرنا کہ ایک درویش کو آپ کی ملاقات کے لیے بھیج رہا ہوں ۔ جب ہم ان کے محلے میں پہنچے تو خادم ان کا مکان بھول گیا ۔ اتفاق سے وہاں کچھ بچے کھیل رہے تھے ۔ میری نگاہ

ایک بچے پر پڑی تو میں نے فوراً کہا کہ یہ بچہ تو بزرگ زادہ معلوم ہوتا ہے۔ اس سے پوچھ لیجئے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ سید عظمت اللہ کا بیٹا ہے۔ چنانچہ وہ ہمیں گھر لے گیا اور حضرت خلیفہ کا پیغام جناب سید تک پہنچایا۔ انھوں نے کہلوا بھیجا کہ میں بستر علالت پر پڑا ہوں۔ چلنے پھرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ خاندان کی سب عورتیں گھر میں جمع ہیں۔ پردہ بھی نہیں ہوسکتا مجھے معاف کیجئے۔ یہ یکا یک ایک دوسرے آدمی کو بھیجا کہ حضرت خلیفہ کے درویشوں کو بٹھایئے اور خادموں سے اپنی چار پائی اٹھوا کر دروازے تک پہنچائی اور فرمایا کہ میں معذور تھا مگر پھر خیال آیا کہ حضرت خلیفہ کا بھیجنا حکمت سے خالی نہ ہوگا۔ پھر مجھ سے نام ونسب اور وطن کے بارے میں پوچھنے لگے اور خوب جانچ پڑتال کرتے رہے۔ میں نے اپنے جد بزرگوار شیخ عبدالعزیز شکر بار کی نسبت کو مخفی رکھا۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ سید صاحب کا سلسلہ حضرت شیخ تک پہنچتا ہے اور اس اعتبار سے وہ ایسی تکلیف کے وقت میں بھی تواضع وخدمت سے باز نہ آئیں گے جو ان کے لیے تکلیف دہ ہوگی مگر انھوں نے فراست سے پہچان لیا اور ایک علمی اشکال میرے سامنے پیش کر کے جواب کے طالب ہوئے۔ میں نے عرض کی۔ میں فائدہ حاصل کرنے آیا ہوں نہ کہ فائدہ پہنچانے۔ فرمانے لگے ہم یہ سوال پیش کرنے پر مامور ہیں۔ بہر حال اس وقت جو کچھ ظاہر اور منکشف ہوا میں نے بیان کر دیا جسے سن کر ان کے چہرے پر تازگی اور مسرت پھیل گئی اور اپنے آپ کو چار پائی سے نیچے گرادیا اور فرمایا نادانی میں مجھ سے کوتاہی سرزد ہوگئی۔

دوران گفتگو فرمایا کہ شیخ عبدالعزیز شکر بار قدس سرہ نے میرے دادا صاحب کو وصیت فرمائی تھی کہ اگر میری اولاد میں سے کوئی آپ کے پاس آئے اور اس علمی اشکال کا جواب اس طرح سے پیش کرے تو میری امانت اس تک پہنچا دینا اور وہ امانت میرے بعض تبرکات اور اجازت طریقہ پر مشتمل ہے۔ میرے جد محترم زندگی بھر تلاش کرتے رہے۔ وہ میرے والد کو وصیت فرما گئے۔ والد محترم بھی تلاش وتجسس کے باوجود نہ پاسکے تو نوبت مجھ تک پہنچی میں بھی عمر بھر تلاش کرتا رہا ہوں اور نہیں پاسکا۔ اب دم آخر ہے۔ اس لیاقت کا کوئی فرزند بھی نہیں رکھتا مگر الحمدللہ کہ صاحب امانت خوبی تقدیر سے سامنے آگیا۔ یہ کہہ کر عمامہ میرے سر پر باندھا، اجازت طریقت عنایت فرمائی۔ کافی مقدار میں شیرینی اور کچھ نقد نذرانہ بھی پیش کیا۔ جب میں واپس لوٹا تو حضرت خلیفہ خوش روئی سے

ملے اور فرمایا۔ کامل اور بھرپور ہو کر آئے ہو۔ میں نے وہ سب کچھ ان کی خدمت میں پیش کر دیا۔ فرمانے لگے نقد ظاہری خوشحالی کی طرف اشارہ ہے اور عمامہ سکون قلب اور اجازت طریقت کی طرف اشارہ ہے اور ان دونوں چیزوں میں کوئی کسی کا حصے دار نہیں ہو سکتا۔ بعد میں آپ نے تھوڑی سی چیز قبول فرمائی۔ والد ماجد نے فرمایا کہ اسے قصے سے کئی کرامات کا انکشاف ہوتا ہے۔ خاص طور پر شیخ عبدالعزیزؒ اور حضرت خلیفہ ابوالقاسم (اللہ ان سے راضی ہو) کی کرامات کا اظہار۔

سوانح شاہ عظمت اللہؒ

راقم الحروف (شاہ ولی اللہ) کہتا ہے کہ مفتاح العارفین کی تحقیق کے مطابق جو میر محمد نعمان نقشبندیؒ کے اخلاف کی تصانیف میں سے ہے۔ شاہ عظمت اللہ بن بدرالدین بن سید جلال قادری متوکل اکبرآبادی کے فرزند ارجمند اور حسینی ترمذی سادات میں سے تھے۔ ان کا مولد و مسکن اکبرآباد تھا اور مدفن بھی یہی شہر بنا۔ نایاب شخصیت کے مالک تھے۔ فقراء ہوں یا اغنیا سب سے بے نیاز ہو کر گوشۂ قناعت میں لمحات زندگی بسر فرماتے تھے۔ سلسلہ قادریہ، چشتیہ، سہروردیہ اور شطاریہ میں لوگوں سے بیعت لیتے تھے۔ بہتر برس کے ہو کر ۴ ربیع الاول ۱۰۸۴ھ کو جان جان آفریں کے سپرد کی اور اپنے محلّہ میں مدفون ہوئے۔

فقراء اور مجاذیب کے ساتھ حضرت والد ماجد کی ملاقاتیں

مسلم معاشرہ میں تقریبات عرس کا سلسلہ

حضرت والد ماجد فرمایا کرتے تھے کہ میں نے خواجہ بیرنگ کے ایک ایسے خلیفہ کو دیکھا جو ضعیف العمری کے باوجود تابناک چہرے والے اور انتہائی جلیل القدر بزرگ تھے۔ آپ شیخی کے نام سے مشہور تھے۔ تقریب عرس مناتے تھے۔ چھ سات سال کی عمر میں میں بھی کئی دفعہ ان کے عرس میں شامل ہوا۔ راقم الحروف (ولی اللہ) کہتا ہے کہ اس جلیل القدر مرد بزرگ کا اصل نام شیخ نعمت اللہ تھا اور وہ شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری کی اولاد میں سے تھا مگر عرف عام میں وہ شیخی کے نام سے معروف تھے۔ جب شیخ نعمت اللہ خواجہ بیرنگ کی خدمت میں پہنچے تو انھوں نے ان پر بے حد لطف و کرم فرمایا۔ حضرت شیخی نے ۱۰۶۷ھ میں رحلت فرمائی۔ خواجہ شیخی کے ذکر کے بعد حضرت

والد نے لطیفے کے انداز میں ایک حکایت بیان کی۔فرمانے لگے۔خواجہ شیخی مرد ولایتی تھے۔ بڑی سی پگ سر پر رکھتے اور کشادہ جبہ پہنتے تھے مگر عرس میں تبرک کے لیے انتہائی چھوٹی روٹیاں تقسیم کرتے تھے۔ایک ظریف نے از راہ تمسخر کہا، میاں شیخی! جبہ شاہزار گجی، دستارِ شمار آں و نان شما ایں، (میا شیخی تمہارا جبہ تو وسیع و عریض ہے، دستار وہ ہے مگر روٹی یہ! گویا اونچی دکان اور پھیکا پکوان والا قصہ ہے۔

آئینۂ دل

حضرت والد ماجد فرمایا کرتے تھے کہ ایک رات میں اکبرآباد میں جا رہا تھا کہ مجذوب شکل ایک درویش سامنے آ گیا اور زمانے بھر کے مجذوبوں کے نام لے لے کر کہنے لگا کہ شام میں فلاں مجذوب ہے۔روم میں فلاں مجذوب ہے وغیر ذلک۔میرے دل میں آیا کہ کاش ہندوستان کے مجذوبوں کے نام بھی لیتا۔میرے دل میں اس خیال کے آتے ہی ہندوستان کے مجذوبوں کے نام گننے لگا۔اسی اثناء میں کہنے لگا کہ فلاں مجذوب بہت ہی خوب ہے (راقم الحروف کا خیال ہے کہ رائے بھیکا مجذوب کے بارے میں تھی، اور فلاں آدمی نیم مجذوب ہے۔راقم کا گمان ہے کہ یہ بات اس نے بیرا مجذوب کے متعلق کہی اسی دوران میرے دل میں خیال آیا کہ کاش ہندوستان کے سالکوں کے بارے میں بھی کچھ بیان کرتا۔اس خیال پر فوراً مطلع ہو کر کہنے لگا۔اکبرآباد میں خلیفہ ابوالقاسم کا ثانی کوئی نہیں ہے۔پھر میری طرف متوجہ ہو کر کہا۔تم کیوں کھڑے ہو چلے جاؤ اور میں وہاں سے چل پڑا۔

منوا مجذوب

حضرت والد ماجد فرمایا کرتے تھے کہ ایک مرتبہ میں کسی تقریب کے سلسلے میں سونی پت گیا تو دل میں آیا کہ منوا مجذوب کی زیارت بھی کرلوں۔ان کی جگہ پر گیا تو وہ سوئے ہوئے تھے۔میری آہٹ پاکر گدڑی لپیٹ لی اور سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور اپنا ستر ڈھانپ لیا۔کچھ دیر میں یونہی بیٹھا رہا اور وہ بھی خاموش رہے۔بالآخر میں نے آغاز کلام کیا اور کہا کہ میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں اگر ہوش و آگہی سے جواب دیں تو پوچھوں ورنہ رہنے دوں۔فرمایا حتی الامکان احتیاط برتوں گا۔میں نے پوچھا کہ آخر منزل سلوک میں آپ کو وہ کونسا مقام حاصل ہوا ہے کہ عقل و شعور سے بھی

ہاتھ دھو بیٹھے ہو۔ کچھ دیر سوچ کر کہا کہ اگر کوئی شخص گرمی سے شرابور ہو کر آئے اور اچانک ٹھنڈی ہوا چلنے سے اسے راحت و فرحت نصیب ہو تو اس راحت کو تم کن الفاظ سے تعبیر کرو گے؟ میں نے کہا یہ کچھ اور اس سے بھی بہتر بہت کچھ سالکان طریقت کو حاصل ہوتا ہے مگر باوجود اس کے ان کی عقل برقرار رہتی ہے۔ کہنے لگا یہ فضل اور عطائے الٰہی ہے جس کو جس حال میں چاہے رکھے۔

مجاہدات سلوک

والد ماجد فرمایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ کہ میرے والد ماجد (جد شاہ ولی اللہ) کسی دور دراز سفر سے آئے ہوئے تھے اور ارادہ یہ تھا کہ شہر سے باہر ہی باہر کسی دوسرے سفر پر چلے جائیں۔ مجھے طلب فرمایا۔ میں زیارت کو چل پڑا۔ راستے میں میرا گزر ایک بارونق باغ پر سے ہوا۔ میں اس میں سیر و تفریح کرنے لگا۔ اس میں ایک درخت تھا جس کی شاخیں زمین سے لگی ہوئی تھیں۔ ان شاخوں کی گپھا میں ایک مغلائی صورت مجذوب بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی آواز دی کہ دوست ادھر آؤ۔ کچھ دیر ہمارے ساتھ بھی بیٹھو۔ میں جا کر بیٹھ گیا اس نے اپنے سلوک و مجاہدات کی باتیں شروع کر دیں۔ ان باتوں میں سے ایک یہ بھی بتائی کہ میں آغاز سلوک میں ایک پہر بلکہ اس سے بھی زیادہ حبس دم کرتا تھا۔ یہ مجذوب بظاہر مولانا قاضی قدس سرہ کے سلسلے سے نسبت رکھتا تھا اسی اثنا میں کہنے لگا کہ تمہارے ساتھ فلاں طعام ہے اس میں سے تھوڑا سا میرے لیے منگواؤ میں نے منگوا دیا تو انھوں نے تناول فرمایا۔ پھر کہنے لگے تمہاری جیب میں اس قدر پیسے ہیں۔ مجھے ان میں سے ایک سکے کی ضرورت ہے تاکہ حجام کو دے کر سر اور داڑھی کی اصلاح کرا سکوں۔ میں نے پیسے انکے سامنے رکھے اور اسی وقت چل پڑا۔

طعام اغنیاء سے نفرت

والد ماجد فرماتے تھے کہ مارواڑ کی طرف ایک مجذوب رہتا تھا جو مسجد میں کبھی نہیں آتا تھا کہتا تھا کہ ہم پلید ہیں۔ ہمیں مسجدوں میں آنا مناسب نہیں علاوہ ازیں اس علاقے کے زمینداروں کا کھانا بھی نہیں کھاتا تھا اور اس سلسلے میں ہندی میں کچھ کہا کرتا تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ اس طعام میں گھٹن اور روحانی قبض ہے۔ جب میں اس طرف گیا تو مجھے دیکھتے ہی وہ مسجد میں چلا آیا اور میرے ساتھ طعام بھی تناول کیا۔ لوگوں نے پوچھا یہ کیوں؟ کہنے لگا۔ اس بزرگ کے سبب میں

پاک ہوگیا اور تمہارے طعام کی گھٹن بھی دور ہوگئی۔

حدیث دل

والد ماجد فرمایا کرتے تھے کہ شرح ملا جامی (۱) کی بحث عطف میں ایک ایسی مشکل عبارت پیش آئی جس کو بڑے بڑے فضلاء اور خوش مزاج (دوسروں کو زچ کرنے کے لیے) اپنا موضوع بنائے رکھتے تھے۔ آغاز جوانی میں میں نے ایک رات اس مقام کا مطالعہ کیا اور ایک اعتراض مرتب کر کے شیخ حامد کے سامنے پیش کیا۔ کہنے لگے بعینہ یہی اعتراض مجھے سوجھا ہے توارد ہوگیا ہے۔ دوسری رات میں نے اس کا حل سوچا۔ شیخ حامد نے شرح ملا کا نسخہ منگوا کر دیکھا تو اس مقام پر یہ اعتراض لکھا ہوا تھا اور آخر میں فتامل کا لفظ مرقوم تھا۔ کہنے لگے عبارت میں تامل اور غور وفکر سے یہی حل نکل سکتا ہے۔ تیسری رات میں نے اس حل کو کمزور کر ڈالا اور اعتراض کی تقویت کی۔ بہر حال میں اسی بحث ومباحثے میں مسجد جٹو میں آدھی آدھی رات تک مطالعہ کرتا رہتا۔ اسی دوران ایک رات میں اکیلا تھا کہ ایک کشیدہ قامت خوش رو مجذوب آیا جو فارسی میں کلام کے موتی لٹا تا رہا میرے قریب آ بیٹھا اور خوش طبعی سے کہنے لگا۔ اے استاذ! دستار کا شملہ چھوڑنا مکروہ ہے یا حرام؟ میں ان دنوں شملہ نہیں رکھتا تھا۔ میں نے دستار کے نیچے سے اس قدر کونہ کھینچا کہ شملہ بن گیا۔ پھر میں نے فوراً کہا کہ بعض روایات میں سنت ہے اور بعض میں مستحب۔ یہ حرکت دیکھ کر وہ بہت ہنسا۔ اسی اثناء میں اس نے کہا کہ کس قدر اچھی رات ہے کسی طالب علم کی گردن پر سوار ہو کر اسے اس مسجد میں دوڑانا چاہئے۔ یہاں تک کہ وہ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ میں ڈرا کہ کہیں مجھ پر نہ جھپٹے، خنجر میرے پاس تھا۔ اسے ہاتھ میں مضبوط پکڑ کر میں نے کہا آج رات کتنی اچھی ہے۔ کسی درویش کو ذبح کر کے اس کا گوشت پوست کھانا چاہئے۔ بہت ہنسا اور کہا اے استاذ! یہ کس کتاب میں پڑھا ہے کہ درویشوں کو ذبح کرنا اور ان کا کھانا حلال ہے۔ میں نے کہا کہ اور تم کس کتاب

(۱) آپ کا پورا نام عبدالرحمٰن ہے۔ آپ کے جد امجد مولانا شمس الدینؒ نے پہلے پہل خراسان کے موضع جام میں اقامت اختیار کی۔ آپ کے والد مولانا نظام الدین بھی متبحر عالم اور مشہور درویش تھے۔ مولانا عبدالرحمٰن جامی موضع جام ہی میں پیدا ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو مجموعۂ کمالات و جامع شخصیت بنایا۔ علم نحو میں آپ کی کتاب شرح ملا جامی اپنے موضوع کی بہترین کتاب سمجھی جاتی ہے۔ آپ کا عارفانہ، عاشقانہ اور نعتیہ کلام بے حد مقبول ہے۔ آپ ۱۹ ربیع الثانی ۸۹۶ھ کو واصل بحق ہوئے۔

میں پڑھا ہے کہ طالب علم پر سوار ہو کر اسے بیہوش کرنا مباح ہے۔ کہنے لگا۔ ان الفاظ سے میں مجازی معنی لے رہا تھا یعنی طالب علم کو اپنے تصرف میں لے کر اسے دنیائے آب وگل کی تکالیف سے نجات دلانی چاہئے۔ میں نے کہا میں بھی مجازی معنوں میں کہہ رہا ہوں۔ یعنی درویش کے قلب پاک کو کلی طور پر اپنی طرف متوجہ کر کے اس سے کمالات حاصل کرنے چاہئیں۔ کہنے لگے مجاز کو حقیقی معنوں سے کچھ تعلق ہونا چاہئے۔ میرے مجاز کا تعلق ظاہر سے ہے۔ فرمائیے تمہارے مجاز کا حقیقت سے کیا تعلق ہے۔ میں نے کہا منقول ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے آغاز عمر میں خواب دیکھا کہ حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی ہڈیاں مبارک قبر سے باہر نکال کر انہیں ایک دوسرے سے چھانٹ رہے ہیں۔ آپ اس خواب کی ہیبت وعظمت سے متاثر ہو کر بیدار ہو گئے اور مشہور معبر ابن سیرینؒ کے اصحاب میں سے ایک کے سامنے یہ خواب بیان کی۔ انھوں نے کہا مبارک اور بشارت ہو کہ تم سنت نبوی کو بخوبی پہچانو گے اور صحیح کو غلط سے جدا کر سکو گے یہ تعبیر میرے مجاز کے تعلق پر شاہد ہے۔ دوران گفتگو انہوں نے کہا کہ اگر ان تین راتوں میں ذکر الٰہی کرتے تو اخروی فوائد حاصل ہوتے۔ اگر آرام کرتے تو تن بدن کو راحت نصیب ہوتی مردوں کے جھگڑوں سے تجھے کیا حاصل۔ عرض کی سچ کہتے ہو مگر کیا کروں۔ ایسی علمی تحقیقات سے اس قدر الفت پیدا ہو چکی ہے کہ اس کا ترک ممکن نہیں۔ فرمانے لگے خوش ہو، ان لایعنی امور کے ترک کا زمانہ قریب پہنچ گیا ہے۔ پھر فرمانے لگے۔ مجھ سے ایک شعر لکھ لو۔ عرض کی دوات وقلم ساتھ نہیں۔ فرمانے لگے۔ حافظے پر نقش کر لو۔

کار نساختیم و دمیدن گرفت صبح　　　　اوج چراغ خانہ بافسانہ سوختیم

(زندگی کے سفر میں کوئی کام نہ کر سکے کہ صبح طلوع ہو گئی۔ چراغ خانہ کی بتی یونہی افسانہ گوئی میں جل کر رہ گئی۔

ولی را ولی می شناسد

والد ماجد فرمایا کرتے تھے کہ مذکورہ واقعہ کے بعد مطالعہ کرنے سے دل بجھ گیا اور پھر کبھی طالب علموں کی طرح مطالعے کا اتفاق نہ ہو سکا۔ فرماتے تھے کہ ایک دفعہ راستہ میں جا رہا تھا کہ ایک مجذوبہ سامنے آ گئی۔ بتی کے تیل سے تر کی ہوئی چیتھڑوں کی گدڑی اس نے اپنے اوپر لے رکھی تھی۔ میرا راستہ پکڑ لیا اور بلند آواز سے پکاری کہ یہ شخص لوائے نقشبندیہ کا حامل ہے جسے خواہش

ہوا سے دیکھ لے۔ میں نے کہا اس سے زیادہ مجھے رسوا مت کرو چنانچہ یہ سن کر وہ چلی گئی۔ راقم الحروف کے گمان میں حضرت والدؒ نے اس روز یہ بھی فرمایا کہ مجھے الہام ہوا ہے کہ آج کے دن تجھے جو بھی دیکھے گا وہ بخشا جائے گا اور اسی وجہ سے میں بازار چلا گیا تھا۔

فرمایا کرتے تھے کہ ایک دن میرے دل میں آیا کہ صوفیا کے لباس میں قید رہنا تکلف سے خالی نہیں۔ چنانچہ میں نے یہ لباس اتار دیا۔ سپاہیوں والا عمامہ باندھ کر کمر سے شمشیر لٹکائی اور گھوڑے پر سوار ہو کر چل دیا۔ ایک مجذوب سامنے آ گیا اور کہنے لگا کہ کوئی شخص چاند کو پیالے سے ڈھانپ سکتا ہے؟ تجھے قسم ہے معبود ذوالجلال کی۔ یہ وردی اتار اور لباس صوفیا پہن اس دن کے بعد میں نے اپنے اوپر صوفیانہ لباس لازم قرار دے دیا۔

آنانکہ خاک رابنظر کیمیا کنند

حضرت والد ماجد فرماتے تھے کہ شاہ ارزانی ایک مجذوب بزرگ تھے جو عموماً حاکمانہ وضع میں رہتے تھے۔ میری دعوت قبول کرنے میں خاص دلچسپی رکھتے تھے۔ کبھی کبھی ایسی خلعت فاخرہ میں ملبوس ہو کر باہر نکلتے جو سلاطین کے سوا عموماً کسی کو میسر نہیں آتی تھی۔ پھر تھوڑی دیر بعد لباس اتار کر ننگے ہو جاتے ایک روز ہم مسجد جتو میں بیٹھے تھے کہ میں اُٹھ کر کہیں چلا گیا اور اہل خانہ کو بھی مجذوب کی خدمت اور مہمان نوازی کے بارے میں کچھ کہنا بھول گیا۔ پندرہ دنوں بعد واپس آیا تو انہیں وہیں پایا۔ اس عرصے میں ایک دو بار سے زیادہ انہیں کھانا نہ مل سکا۔ مگر اس کے باوجود ان کے بدن پر نقاہت وغیرہ کے کوئی آثار نہیں تھے۔ برادر گرامی (ابوالرضا محمدؒ) ابتدا میں انتہائی تنگدست تھے۔ انھوں نے اس سلسلے میں انہی مجذوب بزرگ سے رجوع کیا۔ مجذوب نے اکتالیس بار سورۂ مزمل پڑھنے کو کہا۔ اللہ تعالیٰ نے برادر گرامی کو وسعت اور خوشحالی سے بہرہ ور فرمایا ایک دفعہ کسی دوست کے بارے میں ان سے سفارش کی کہ تنگدست اور عیال دار ہے اس پر توجہ فرمائیے۔ چند شرائط کے ساتھ ایک دعا پڑھنے کو فرمایا۔ ان شرائط میں ترک کذب اور ترک قتل حیوان بھی شامل تھا۔ اسی دوران اس نے ایک جوں کو مارا اور ایک لڑکے کو بلا کر کہا آؤ اور لے جاؤ مگر دیا نہیں۔ یہ سن کر مجذوب نے فرمایا۔ اب یہ دعا پڑھنے کی تکلیف نہ اٹھاؤ۔ تمہیں کچھ فائدہ نہیں ہوگا مگر اس نے چلہ پورا کیا اور توبہ و رازی کے ساتھ مجذوب سے رجوع کیا۔ مجذوب نے ایک کورا

برتن طلب کیا۔ اس میں نقش لکھا اور سیماب ڈال کر آگ پر رکھ دیا۔ اس میں سے تھوڑا سا جوڑا بنا اور کچھ ایسے ہی رہ گیا۔ اس کے بعد ان مجذوب کی زبان سے معلوم ہوا کہ یہ شخص اس قابل نہیں تھا ورنہ میں نے جو کچھ چاہا ہے وہ بغیر کسی شرط کے ہوجاتا رہا ہے۔

مگس را ہما کنند

حضرت والد ماجد فرمایا کرتے تھے کہ شیخ لعل کے پاس عجیب قسم کی دعائیں تھیں۔ ایک دن مجھ سے کہا سماع کا ذوق رکھتے ہو؟ میں نے کہا ہاں۔ پھر ایک کنویں کے کنارے کھڑے ہوگئے۔ سنگریزے پر کچھ لکھا اور وہیں ڈال دیا۔ عجیب وغریب سازوں کی آوازیں آنے لگیں۔ کبھی کبھار ایسی دعا پڑھتے کہ بھڑ نکل آتے اور پہلے سے ہاتھ میں پکڑی ہوئی لاٹھی سے انہیں مارتے اور خالص سونا بن جاتا ایک دن میرے پاس آئے کہ زندگی کے آخری لمحات ہیں۔ مجھ سے یہ اعمال (دعوت واوراد) لے لیجئے۔ میں نے کہا۔ مجھے کچھ ضرورت نہیں۔ کہنے لگے اگر تم نہیں لیتے تو دریا میں ڈالتا ہوں کیونکہ دوسرا کوئی اہل نظر نہیں آتا۔ میں نے کہا ڈال دیجئے۔ چنانچہ اعمال واوراد کی وہ تمام کتابیں انھوں نے دریا میں ڈال دیں۔

بئس الفقیر علی باب الامیر

والد ماجد فرمایا کرتے تھے کہ ہمارے شہر میں ایک صالح وفاضل مرد رہتے تھے جو انتہائی بے تعلق رہ کر اپنا وقت گزارتے تھے۔ سعد اللہ خان کے بعض خواجہ سرا ان سے تعلیم حاصل کرنے آتے اور ان کی خدمت بجالاتے۔ سعد اللہ خان انہیں اپنے پاس ہر چند بلانے کی کوشش کی مگر وہ اس کے پاس نہ گئے۔ اتفاقاً ایک دن ان کی خدمت میں جا پہنچا۔ میں ان دنوں کافیہ پڑھتا تھا۔ ایک خواجہ سرا نے منادیٰ کے مباحث میں سے مجھ سے ایک سوال کیا۔ فوری جواب ذہن میں نہ آنے کے سبب میں کچھ محزون ہوا تو وہ بزرگ صالح میری پریشانی خاطر کا سبب معلوم کرکے خوجہ سرا پر غصہ ہوئے اور کہا اس بچہ کو نہیں جانتے کہ کون ہے؟ ایک وقت آئے گا کہ اس کی نعلین تیرے آقا کے سر تک پہنچنا اپنے لئے ننگ وعار سمجھے گی۔

ہستی قریب ہے

والد ماجد فرمایا کرتے تھے کہ حاجی شاہ محمد ایک معمر اور سیاح بزرگ تھے۔ بہت سے بزرگوں

سے مل چکے تھے۔ مزاج میں انتہائی گرمی تھی۔ میں مرض الموت میں ان کی عیادت کو گیا۔ میں نے کہا آپ کا وجود مسعود تو غنیمت ہے فرمانے لگے یہ وجود تو تنور میں ڈالنے کے قابل ہے۔ میں نے کہا ہمارا اعتقاد تو یہ ہے کہ جو وجود تنور کے لائق ہوا سے تنور میں ڈالا جائے۔ آپ کا وجود اللہ کی نعمت ہے۔ جو حق سبحانہ وتعالیٰ نے آپ کو عنایت فرمائی ہے۔ یہ سن کر خاموش ہو گئے۔

استاذ اور شاگرد کے روابط

والد ماجد فرمایا کرتے تھے کہ میں نے شرح مواقف اور کلام واصول کی دیگر کتابیں میرزا زاہد ہروی کوتوال سے پڑھیں۔ ان کی توجہ میری طرف اس حد تک مبذول تھی کہ اگر کبھی میں کہتا کہ آج میں نے مطالعہ نہیں کیا تو فرماتے ایک دو سطریں پڑھ لیجئے تاکہ ناغہ نہ ہو۔ ایک دن بادشاہ وقت نے کسی کے ہاتھوں انہیں بلوا بھیجا۔ یہ فوراً ادھر جانے لگے۔ دروازے سے باہر قدم رکھا ہی تھا کہ میں بھی ان سے جاملا۔ میں نے دروازے کے دونوں تختے مضبوطی سے تھام لیتے اور میرزا زاہد ہروی سے کہنے لگا۔ جب تک آپ فلاں کام پورا نہیں کریں گے میں دروازہ ہرگز نہیں کھولوں گا۔ فرمانے لگے تم بیٹھو تاکہ میں واپس آکر اطمینان سے تمہاری بات سنوں۔ اس وقت دل پریشان ہے۔ میں نے کہا کہ جب تک کام پورا نہیں کریں گے دروازہ نہیں کھولوں گا۔ جب یہ اصرار دیکھا تو رک گئے اور جب تک کام پورا نہ کیا پاؤں باہر نہ رکھا۔ جب لوگوں نے یہ معاملہ دیکھا تعجب کیا۔

زوال پذیر اسلامی حکومت کے ارکان کی خداترسی

والد ماجد فرمایا کرتے تھے کہ میرزا محمد زاہدؒ نے ایک دن رمضان المبارک میں میری دعوت کی۔ میں انہی کے گھر میں تھا کہ مغرب کے وقت ایک کباب فروش نے کبابوں کا خوانچہ ان کے سامنے لاکر رکھا کہ نیاز لایا ہوں۔ مرزا متبسم ہوئے اور کہا اے عزیز میں تمہارا استاذ ہوں نہ پیر! پھر یہ نیاز کیسی! البتہ کوئی ضرورت پیش آئی ہوگی سو بیان کرو۔ کہنے لگا کسی چیز کی ضرورت نہیں، مرزا نے استفسار میں اصرار کیا تو معلوم ہوا کہ اس کی دکان راستے میں ہے اور مرزا کے کارکن چاہتے ہیں کہ اس کو اٹھادیں۔ مرزا کہنے لگے کل کسی منصف کو بھیجوں گا تاکہ بغیر کسی ظلم وزیادتی کے تمہاری حق رسی کر دے اور یہ کہہ کر اسے جانے کا حکم دیا کبابی کہنے لگا۔ یہ اتنے سارے کباب میں نے آپ کے لئے تیار کئے تھے۔ اب تو وقت بھی کافی گزر گیا ہے۔ اس تنگ وقت میں یہ کباب بک

نہیں سکیں گے۔ اس گفتگو میں مرزا کے بچوں کا استاذ بھی موجود تھا۔ اسے کہنے لگے اے فلاں، ان کبابوں کی قیمت لگا کر میرے گھر سے لا دیجئے۔ اس نے اٹھنی لا کر دیدی۔ اس فقیر (شاہ عبدالرحیم) نے مرزا کو آہستہ سے کہا کہ اس سارے معاملے میں آپ کا مقصد رشوت سے بچنا تھا مگر وہ پورا نہ ہو سکا۔ اس لئے کہ ان کبابوں کی قیمت زیادہ ہے مگر اپنی مجبوری کے تحت کباب فروش اس قیمت پر راضی ہو گیا ہے۔ مرزا نے یہ بات سنتے ہی کباب فروش کو بلایا اور اس سے پوچھا سچ بتا! گوشت کتنے میں خریدا تھا، مصالحے وغیرہ کتنے میں! اور تیری مزدوری کتنی ہے؟ حاصل کلام جب حساب کیا تو ان کبابوں کی قیمت تین گنا بڑھ گئی۔ پوری قیمت اس کو دے کر استاذ کو طلب کیا اور اس پر بے حد بگڑے اور کہا کیا تم چاہتے ہو کہ ہم مال حرام سے روزہ افطار کریں۔ یہ کہاں کی عقل اور کہاں کی دوستی ہے۔

سوانح میرزا زاہد ہرویؒ

واضح ہو کہ میرزا محمد زاہد ہرویؒ قاضی اسلم کے فرزند تھے جو جہانگیر کے زمانے میں ہرات سے ہندوستان آئے اور بادشاہ نے انہیں قاضی القضاۃ بنادیا۔ وہ ملا محمد فاضل کے شاگرد تھے۔ ملا محمد فاضل کا وطن مالوف بدخشاں تھا۔ آغاز جوانی میں سب سے پہلے کابل میں ملا صادق حلوائی کی شاگردی اختیار کی پھر توران میں جا کر مشہور علمی مشکلات کے حل کرنے والے اور معقولات کے گرہ کشا ملا میرزا جان شیرازی کی صحبت اختیار کی نیز فنون حکمت کا اکتساب ملا میرزا جان شیرازی کے تلمیذ ارشد اور اپنے وقت کے استاذ العلماء ملا یوسف سے کر کے لاہور میں آ کر قیام پذیر ہوئے اور لاہور ہی میں علم تفسیر واصول ملا جمال لاہوری سے حاصل کیا جو ادب عربی میں یگانہ روزگار تھے۔ اس طرح میرزا محمد زاہد ہروی تیرہ سال کی عمر میں علوم معقول ومنقول سے فارغ ہو گئے تھے۔ وہ جودت طبع اور فہم رسا کے لحاظ سے اپنے زمانے میں بے نظیر مانے جاتے تھے۔ ان کی تصانیف میں سے شرح مواقف، شرح تہذیب اور رسالۂ تصور وتصدیق کے حواشی شہرہ آفاق اور علماء وطلباء میں متداول ہیں۔ علاوہ ازیں مرزا کی اور تصانیف بھی ہیں، مثلاً حاشیہ شرح تجرید اور حاشیہ ہیاکل، معلوم ہوتا ہے کہ حاشیہ شرح مواقف کی مسودہ نگاری کا کام میرزا نے اسی سلسلے میں کیا۔ جب والد گرامی ان سے یہ کتاب پڑھتے تھے اور اس کا مسودہ کابل میں تیار ہوا کیونکہ میرزا

منصب احتساب سے استعفا کے بعد کابل میں جا کر گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ میرزا زاہد صوفیائے صافیہ کے مشرب سے بھی حصہ وافر رکھتے تھے اور انھوں نے مشائخ عظام کی صحبت میں رہ کر طریق تصوف میں کمال حاصل کیا۔ ان کی تصانیف تصوف میں سے دو تین نکتے تو فقیر کے دل میں پیوست ہو کر رہ گئے مثلاً وحدت الوجود کی بحث میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔

نکات تصوف اور میرزا زاہد کا منطقی استدلال

حقیقت یہ ہے کہ لفظ وجود مصدری معنی کے لحاظ سے ایک ایسا امر ہے جو قابل اعتبار اور حقیقت نفس الامری میں ثابت ہے اور حقیقی (وضعی) معنوں کے اعتبار سے وجود کا اطلاق ہر اس چیز پر کیا جائے گا جو موجود بنفسہ ہو بلکہ جس کا وجود اپنی ذات کے لئے واجب اور ضروری ہو اور یہ اس لئے کہ کسی چیز کے قابل اعتیاد (اعتباری) اور نفس الامر میں ثابت ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اس وجود کا موصوف اس حیثیت میں ہو کہ اس پر سلب وجود کا اطلاق بھی صحیح ہو سکے، کسی بھی شئے کے سلب و وجود کے سلسلے میں تین امور کو ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے۔

امر اوّل یہ کہ وجود سے جس چیز کا سلب کیا جا رہا ہے۔ کیا وہ ماہیت وجود ہے؟ (جس حیثیت میں بھی ہو) دوسرا یہ کہ کیا سلب کردہ چیز وجود کا مصدری معنی ہے؟ تحقیق و تدقیق سے جب ان دونوں امور کا جواب نفی میں ملا تو تیسرا امر خود بخود ثابت ہوا کہ منشاء انتزاع وجود کا مابہ الموجودی معنی ہے اور وہ یہ ہے کہ وجود اپنی قوت و حیثیت میں قائم اور اپنی ذات کے لئے واجب ہے اس لئے کہ محض انضمام کی وجہ سے وجود کو قائم بالماھیۃ نہیں کہا جا سکتا اگر کہا جائے تو اس کا اپنے موصوف سے موخر ہونا لازم آتا ہے جو بدیہی طور پر غلط ہے اور نہ ہی وجود سے ہیئت کے انتزاع کی وجہ سے اسے قائم بالماہیۃ کہا جا سکتا ہے۔ اگر ایسا کیا جائے تو وجود مصدری سے انتزاع کے وقت دوسرا انتزاع لازم آ سکتا ہے اور اس طرح انتزاعات کا ایک لا متناہی سلسلہ چل سکتا ہے۔

علم واجب الوجود کی بحث میں ایک نفیس نکتہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

جاننا چاہیے کہ ذات واجب الوجود تعالیٰ شانہ کے لئے علم اجمالی بھی ہے اور علم تفصیلی بھی۔ علم اجمالی سو علم تفصیلی کے لئے مبداء و ماخذ اور صورت ذہنیہ و خارجیہ کیلئے خلاق ہے۔ یہی علم حقیقی ہے اور یہی صفت کمال اور عین ذات ہے۔ اس مسئلہ کی جو تحقیق مجھے میرے پروردگار نے اپنے

فضل وکرم سے الہام فرمائی ہے سو یہ ہے کہ ممکن کے لئے دو جہت ہیں ایک وجود اور فعلیت کی جہت دوسری عدم وجود اور لافعلیت کی جہت اور ممکن جہت ثانی سے متعلق ہونے کی صورت میں یہ صلاحیت نہیں رکھتا کہ علم اس سے متعلق ہو۔ اس لئے وہ جہت ثانی سے متعلق ہونے کی بناپر معلوم محض ہے۔ بس جس جہت کے ساتھ علم متعلق ہوسکتا ہے وہ جہت اولیٰ ہے اور اسی جہت اولیٰ کا مرجع علم ہے کہ وجود ممکن بعینہٖ وجود واجب ہے جیسا کہ اہل تحقیق کا مسلک ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے علم بالممکنات اس کے علم بذاتہ میں سمویا ہوا ہے اس حیثیت سے کہ اس سے ممکنات اور ذات کی کوئی چیز خارج قرار نہیں پائے گی۔ موصوفات کے ساتھ اوصاف انتزاعی کے احوال سے بھی آپ کو اس سلسلے میں مدد ملے گی۔ اوصاف انتزاعی بھی وجود رکھتی ہے جو آثار کے مرتب ہونے پر وجود خارجی کے مقابل پایا جاتا ہے اور یہی منشاء اتصاف ہوتا ہے اور اسی کی بناء پر موصوف اور صفات میں امتیاز قائم کیا جاتا ہے۔ اور علم تفصیلی سو موجودات خارجی اور علوی و سفلی مراتب میں صور ذہنی کے علم حضوری کو کہتے ہیں۔ پس غور وفکر کرو، شاید کہ یہ اہم مسئلہ خالی الذہن ہوکر باریک بینی سے اور زیادہ واضح ہو، ہم نے اس کی کچھ مزید تفصیلی تعلیقات شرح تجرید میں بیان کردی ہے۔

کشف ارواح اور اس قسم کے دوسرے احوال پر حضرت شاہ عبدالرحیمؒ کے وقائع

مرتبہ فنا فی التوحید

والد ماجد فرمایا کرتے تھے کہ میں نے چشم حقیقت سے دیکھا تو ایک جماعت حضرت حق تعالیٰ کو واقعہ میں دیکھنے کا ارادہ کرکے رواروی میں جارہی ہے اور میں بھی اس جماعت میں شامل ہوں۔ ایک صاف قطعہ زمین سامنے آیا اور ادھر وقت عصر ہوگیا۔ ان لوگوں نے مجھے اپنا امام بنالیا۔ جب نماز ختم ہوئی تو میں نے جماعت کی طرف رخ کرکے کہا کہ دوستو! اس قدر سعی وکاوش کسی کی تلاش میں دکھا رہے ہو؟ کہنے لگے حق تعالیٰ کی طلب میں۔ میں نے کہا کہ میں وہی تو ہوں جس کی تلاش میں تم نکلے ہو۔ وہ یکدم اٹھے اور مجھ سے مصافحہ کرنے لگے۔ راقم الحروف (ولی اللہ)

کہتا ہے کہ اس قسم کے واقعات کی حقیقت واصلیت یہ ہے کہ کبھی تو ایسا واقعہ حق تعالیٰ کی اعانت سے تصرف فی الخلق کے مقام حاصل ہونے کی نشاندہی کرتا ہے اور کبھی کبھار ایسا دعویٰ شیخ اس عالم میں کرتا ہے کہ جب وہ فنا فی التوحید ہوتا ہے۔

مقام قیومیت

فرمایا کرتے تھے کہ اوقات تدبر و تفکر میں سے ایک وقت میں حق سبحانہ وتعالیٰ سے میں نے تحقیق واطمینان کی نیت سے ذات بیچوں کا مثالی صورتوں میں ظہور طلب کیا۔ میرے اوپر ایک حالت طاری ہوگئی اور اپنے آپ کو قیوم عالم کی صورت میں ملاحظہ کیا۔ میں نے دیکھا کہ کائنات کے ذرے ذرے کا تعلق اور ربط میری ذات کے ساتھ اس حیثیت سے ہے کہ اگر وہ تعلق منقطع ہو جائے تو پوری کائنات لاشی محض ہو کر رہ جائے۔

تصرف بالحق فی الخلق

والد گرامی فرماتے تھے کہ ایک رات میں نے عیاناً دیکھا گویا حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ میرے گھر میں تشریف لائے ہیں اور میں جگہ کی تنگی سامان خانہ کے بکھرے ہوتے اور اس قسم کی دوسری بے سلیقہ باتوں کے سبب جو بزرگ ہستیوں کی تشریف آوری کے وقت غیر موزوں سمجھی جاتی ہیں، شرمندہ اور خجل ہوں اور باوجود اس کے ادھر سے بے انتہا لطف وکرم مبذول ہو رہا ہے۔ اتفاق سے صبح اٹھتے ہی حافظ عبداللطیفؒ کے گھر گیا۔ انھوں نے مجھے اپنے گھر میں بٹھایا اور میرے جانے پر جگہ کی تنگی وغیرہ سے اظہار ندامت کرنے لگے۔ میں نے کہا آج رات حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ کو میں نے دیکھا اور اسی طور پر عرق ندامت میں غرق رہا مگر ادھر سے اظہار نوازش ہوتا رہا۔

راقم الحروف کہتا ہے کہ یہ واقعہ بھی نصرت حق کے ذریعے تصرف فی الخلق کے مقام کے حصول پر دلالت کرتا ہے۔ اس لئے کہ یہ بات واضح ہے کہ اس واقعہ میں حق پر دلالت کرنے والی ہستی خود صورت حق میں ظہور پذیر نظر آ رہی ہے۔

صوفیاء اور رویت باری

والد ماجد فرمایا کرتے تھے کہ بعض درویشوں کے بارے میں مجھے تردد تھا کہ حضرت حق تعالیٰ کی بارگاہ میں وہ کیا مرتبہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ میں نے چشم مشاہدہ سے ایک تجلی دیکھی گویا

حضرت حق حسین صورت میں متمثل ہو کر برقعہ پوش ہیں۔ میرے اور حضرت حق کے درمیان کچھ فاصلہ ہے۔ جب اس کا جمال پاک مجھ پر ظاہر ہوا تو دل ہاتھ سے چلا اور مجھے اس سے بھی زیادہ قرب کی خواہش پیدا ہوئی۔ وہ میری اس تمنا پر مطلع ہو کر قدرے اور نزدیک ہوا۔ اس پر آتش شوق بھڑک اٹھی اور خواہش قرب میں اور اضافہ ہوا۔ اس پر مطلع ہو کر وہ اور نزدیک آ گیا۔ اس مرحلہ پر میں برقعہ کی موجودگی سے تنگ آ گیا اور اس کے ہٹانے کی آرزو کی۔ فرمایا برقعہ تو بہت باریک ہے جو حسن مستور کو اور نمایاں کر رہا ہے۔ عرض کی پھر بھی حجاب تو ہے۔ بالآخر نقاب اٹھا دی اور پھر فرمایا کہ بعض سالکوں کو پہلا مرتبہ حاصل ہے۔ خاص سالکین کو دوسرا مرتبہ اور اخص الخواص کو مرتبہ ثالث میسر ہے۔ اور فلاں فلاں ان تینوں میں سے کوئی مرتبہ بھی نہیں رکھتے۔

بے صورت اندر صورت آمد

والد ماجد فرمایا کرتے تھے کہ ایک مرتبہ میں انتہائی روحانی گھٹن محسوس کر رہا تھا کہ واقعتاً مجھ پر ایک تجلی وارد ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ ایک حسین وجمیل عورت زیورات اور جاذب نظر لباس سے مزین ہے وہ آہستہ آہستہ میرے قریب آنے لگی اور اس کے قرب سے میرا شعلۂ شوق بھڑکنے لگا۔ بالآخر وہ مجھ سے بغل گیر ہو کر یک تن ہوگئی۔ میرا وجود اسی کی شکل میں متمثل ہو گیا اور وہ تمام زیورات اور لباس میں نے اپنے وجود پر موجود پائے۔ یہ دیکھ کر مجھے انتہائی انبساط وسرور حاصل ہوا اور وہ گھٹن جاتی رہی۔

راقم الحروف کہتا ہے کہ یہ واقعہ بھی مقام توحید کے حصول پر دلالت کرتا ہے اور گزشتہ واقعہ کی ہی ایک شاخ ہے۔

اسمائے الٰہیہ کے ظہور کی کیفیت

والد ماجد فرمایا کرتے تھے کہ ایک دفعہ میں نے بصورت واقعہ (کشفی) دیکھا کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء، حی، علیم، سمیع اور بصیر روشنی بخش دائروں مثلاً سورج اور چاند کی شکل میں میرے لئے صورت پذیر ہو گئے ہیں اور یکے بعد دیگرے طلوع وغروب کر رہے ہیں۔ پھر فرمایا کہ بسیط کے شکل پذیر ہونے کے لئے قریب تر صورت دائرے کی ہے، اسی وجہ سے اسمائے الٰہیہ دائروں کی شکل میں نمودار ہوتے رہے۔

تصرفات وعلوم صوفیاء

والد ماجد فرمایا کرتے تھے کہ ایک دن عصر کے وقت میں مراقبے میں تھا کہ غیبت (۱) کی کیفیت طاری ہوگئی۔ میرے لئے اس وقت کو چالیس ہزار برس کے برابر وسیع کر دیا گیا اور اس مدت میں آغاز آفرینش سے روز قیامت تک پیدا ہونے والی مخلوق کے احوال و آثار کو مجھ پر ظاہر کر دیا گیا۔

راقم الحروف (شاہ ولی اللہ) کا گمان ہے کہ آپ نے یہ کلمات بیان کرتے ہوئے بھی فرمایا کہ لا الٰہ الا اللہ کے حروف کا فاصلہ اتنے ہزار برس کا ہے۔ واللہ اعلم۔

مقامات صوفیاء

والد گرامی فرمایا کرتے تھے کہ مجھے دو آدمی دکھائے گئے۔ ایک ذکر حق میں اس قدر مستغرقؔ تھا کہ ماسوی اللہ کی طرف کوئی توجہ نہیں تھی۔ اور نہ ہی کچھ اپنا ہوش تھا۔ دوسرا اس سے بھی زیادہ کامل! لیکن وہ اس قدر ذکر حق کے باوجود تمام کائنات پر بھی نظر رکھتا تھا اور اپنا شعور بھی رکھتا تھا اور ظاہری و باطنی آداب سے بھی کمال درجہ مزین تھا۔ یہ دیکھ کر میرے دل میں الہام ہوا کہ پہلا ذات حق میں فانی ہے اور دوسرے کے مقام کو آیۂ کریمہ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً (۲) (البتہ ہم ایسے مردان خود آگاہ و حق آگاہ کو پاکیزہ دائمی زندگی عطا فرماتے ہیں) بخوبی بیان کر رہی ہے۔

شان عبدیت

والد گرامی فرماتے تھے کہ اوقات عزیز میں سے ایک وقت فنائے کلی (۳) اور غیبت تامہ میسر ہوئی تو دیکھا کہ حق سبحانہ وتعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا ہے کہ میرے فلاں بندے کو ڈھونڈ لاؤ۔ زمین میں تلاش کیا نہ پایا آسمان چھان مارے نہ ملا۔ بہشت میں تلاش کیا نہ پایا اس پر حق سبحانہ تعالیٰ نے فرشتوں سے خطاب کیا کہ جو بھی مجھ میں فنا ہوا وہ نہ آسمان میں ملے گا نہ زمینوں میں پایا جا سکے گا اور نہ ہی بہشت میں۔

---

(۱) اپنے نفس اور خلق سے غائب اور حق تعالیٰ کے حضور میں حاضر رہنے کو غیبت کہتے ہیں۔
(۲) پ۱۴س۱۶ت۹۷
(۳) فنائیت عدم شعور کو کہتے ہیں۔ ذات احد میں اس درجہ استغراق کہ اپنا بھی ہوش نہ رہے۔

جنت اولیاء

والد ماجد فرمایا کرتے تھے کہ ایک رات میں نے بہشت کو دیکھا گویا عین اس کے درمیان میں کھڑا ہوں اور اس کی حوروں اور محلات کو بخوبی دیکھ رہا ہوں۔ اس وقت دل میں آیا کہ ہم نے تو حور و قصور کے خیال کو دل سے نکال دیا تھا اور یکسو ہو کر حضرت حق تعالیٰ کی طلب میں لگے رہتے تھے۔ یہ کیا ہوا کہ یہاں حور و قصور پیش نظر ہیں مگر مقصود حقیقی نہیں مل رہا۔ اسی وقت مجھ پر وجد اور گریہ طاری ہوا۔ وہاں کے لوگ آ آ کر مجھے اپنی آستینوں اور دامنوں میں چھپانے لگے اور کہنے لگے یہ تو مسرت و شادمانی کی جگہ ہے نہ کہ گریہ و غم کی۔ میں نے ان کے دامن جھٹک دیئے اور منہ پھیر لیا۔ بالآخر انہوں نے کہا کہ تجھے اپنے معبود و مقصود کی قسم ہے۔ بتا کہ تیرے رونے کا سبب کیا ہے۔ ان کی بات سنکر میں پریشان ہوا اور اپنے اسرار و رموز کی کچھ باتیں انہیں پیش کیں۔ اسی اثناء میں مولائے مہربان نے الہام فرمایا کہ کیا تم نے ہماری کتاب میں یہ نہیں پڑھا کانت لھم جنات الفردوس نزلا (۱) (ان بندگان خدا کے لئے فردوس کے باغ بطور مہمانی ہیں) نزل اس چیز کو کہتے ہیں جو بوقت آمد فوری طور پر مہمان کے لئے بچھائی جاتی ہے تا کہ وہ اس پر بیٹھ جائے۔ اس کے بعد اس کی ضیافت کا انتظام کیا جاتا ہے۔ پس تم اس قدر گریہ وزاری کیوں کر رہے ہو؟

علوم اولیاء

اس فقیر نے حضرت والد ماجد (شاہ عبدالرحیمؒ) کے خادم قدیم شیخ فقیر اللہؒ سے (جو حسب ذیل واقعہ کے عینی شاہد اور قاصد رہے ہیں) خود سنا ہے کہ محمد فاضلؒ کے رشتہ داروں میں سے رابعہ نامی ایک عورت کے بچہ نہیں ہوتا تھا۔ اس سلسلے میں اس نے حضرت والا سے رسم ادکی۔ آپ نے توجہء کامل سے دعا فرمائی تو اللہ تعالیٰ نے فرزند عطا فرمایا۔ جب نومولود سات ماہ کا ہوا تو اس پر حالت نزع طاری ہوگئی۔ آپ اس وقت اکبر آباد (آگرہ) میں تھے۔ سبحانہ وتعالیٰ نے ان کے دل پر روشن کیا کہ یہ شخص (نومولود) جو تمہارے متوسلین میں سے تھا قریب المرگ ہے مگر تجھے غمگین نہیں ہونا چاہئے۔ ہم تجھے اس کا اجر جمیل عطا کریں گے۔ اس سانحہ کو دل سے نکال دیجئے۔ اس الہام کے بعد آپ کی حالت درست ہوگئی مگر آپ کو قدرے تامل ہوا کہ یہ متوسل کون ہے۔ اس خیال

---

(۱) پ ۱۶۔ س ۱۸۔ ت ۱۰۷

کے آتے ہی آپ پر منکشف ہوا کہ یہ رابعہ کا بچہ ہے جو فلاں تاریخ اور فلاں وقت میں مر گیا ہے۔ آپ نے شیخ فقیر اللہ کو بھیجا تا کہ محمد فاضل کو اس سارے قصے سے آگاہ کرے اور رسم تعزیت بھی ادا کرے۔ محمد فاضل نے اس واقعہ کو وقت اور تاریخ کے ساتھ ایک کاغذ پر لکھ کر رکھ لیا۔ ایک ہفتہ بعد اس کا خط پہنچا تو مذکورہ واقعہ بے کم و کاست سچ ثابت ہوا۔

بدعتی کی مجلس میں جانے پر تنبیہ

والد ماجد فرمایا کرتے تھے کہ میں نے ایک صاحب کشف آدمی کی تعریف سن رکھی تھی میں نے چاہا کہ اس کی صحبت سے کچھ حاصل کروں تو میرے دماغ میں یہ بات سموئی گئی کہ وہ بدعتی ہے اس کے پاس نہیں جانا چاہیے۔ میں نے اس واہمہ کو دل سے نکال دیا۔ دوبارہ دماغ میں یہ خیال ڈالا گیا۔ پھر میں نے اسے جھٹک دیا اور اٹھا کہ اس کے پاس جاؤں مگر بغیر کسی کیچڑ، سنگ و خشت اور لکڑی کے میرا پاؤں پھسلا۔ شدید چوٹ لگی اور میں گر پڑا دماغ میں یہ بات ڈالی گئی کہ اگر پہلی مرتبہ کے انتباہ پر عمل کرتے تو یہ تکلیف نہ پہنچتی۔

فرمایا کرتے تھے کہ مجھے الہام کیا گیا ہے کہ تیرا سلسلہ قیامت تک باقی رہے گا۔ او کما قال۔

جبہ غوث الاعظمؒ

فرمایا کرتے تھے ایک دن میرے دل میں ایک بات ڈالی گئی جس کا اجمال یہ ہے کہ آج تجھے ایک نعمت ملے گی۔ میں سیر و تفریح کے خیال سے باہر نکل کر شہر کے بعض مقامات سے گزرا تو دل نے یہ گواہی دی کہ تیرا مطلوب یہیں ہے میں نے لوگوں سے پوچھا کہ یہاں کوئی درویش یا فاضل ہے تو جواب ملا کہ ہاں فلاں درویش یہاں رہتا ہے۔ میں اس کی زیارت کو پہنچا تو وہ کہنے لگا کہ حضرت غوث الاعظمؒ کا جبہ تبرکا مجھ تک پہنچا ہے اور آج رات مجھے حکم دیا گیا ہے کہ آج کے دن جو شخص بھی سب سے پہلے میرے سامنے آئے میں یہ جبہ مبارک اسے دیدوں۔ میں نے وہ جبہ اس درویش سے لے لیا اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔

نگاہِ ولی

ایک دن سمت قبلہ کے تعین کی بات چل پڑی تو آپ نے فرمایا کہ اگر ہماری چشم وجدان کے مشاہدہ کے مطابق عمل کیا جائے تو چاہیے کہ اس سمت کو کھڑے ہوں۔ یہ کہہ کر آپ قدرے

دائیں طرف کو مڑ گئے۔

نہ کر تقلید اے جبریل میرے جذب و مستی کی

والد ماجد فرمایا کرتے تھے کہ ذکر اسم ذات کے دوران میں نے بعض فرشتوں کو دیکھا کہ میرے اردگرد بیٹھے ہوئے تسبیح و تقدیس اور تحمید و تکبیر میں مشغول ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ میرے قریب آؤ اور ذکر اسم ذات میں میرا ساتھ دو۔ کہنے لگے ہم تیرے نزدیک آنے اور تیرے ذکر میں شامل ہونے کی طاقت نہیں رکھتے۔

ذکر اسم ذات میں مقام کمال

والد ماجد فرمایا کرتے تھے کہ ابتدائے حال میں بازاری لوگوں کی آوازیں بھی مجھ پر اسم ذات کی صورت میں ظاہر ہوتی تھیں۔ ایک مرتبہ میں نے نیا جوتا پہنا تو چلنے میں اس سے جو آواز نکلتی اس پر بھی میں جل جلالہ کہتا جسے سن کر لوگ تعجب کرتے۔

فضیلت بیعت

فرمایا کرتے تھے۔ ایک بار میں پھلت (۱) میں تھا۔ مجھے ایک درجہ دکھایا گیا کہ یہ درجہ اس شخص کے لئے ہے جو آج کے دن تمہاری بیعت کرے گا۔ اسی روز ایک عورت بیعت کے لئے تیار ہوکر آئی اور رسم کے مطابق شیرینی وغیرہ بھی ساتھ لائی۔ مجھے تعجب ہوا کہ یہ عورت تو اس درجے کے قابل نہیں۔ تھوڑی دیر گزری کہ اسے ایک زنانہ عارضہ لاحق ہوا اور وہ شرف بیعت حاصل نہ کرسکی۔ صالحات میں سے ایک دوسری نیک بخت آئی۔ اس کی شیرینی وغیرہ خرید کر بیعت کر لی۔

شرف اقتداء

والد ماجد فرمایا کرتے تھے کہ ایک مرتبہ نماز عصر کا وقت ہوگیا۔ دل میں یہ بات ڈالی گئی کہ اس نماز میں جو شخص بھی تیری اقتداء کرے گا وہ بخشا جائے گا۔ اس جماعت میں ایک ایسا آدمی تھا جس کے بارے میں میرا دل یہ گواہی دیتا تھا کہ اسے یہ دولت نصیب نہیں ہوگی۔ جب تکبیر کہی گئی

---

(۱) پھلت ضلع مظفر نگر (یوپی) کا ایک گاؤں ہے جو میرٹھ سے شمال کی طرف تقریباً بیس کوس کے فاصلے پر واقع ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ کا مولد اور ننہال بھی پھلت ہے۔ شاہ صاحب کے چھوٹے بھائی شاہ اہل اللہ کا مزار بھی یہیں ہے۔

تو اتفاق اس کا وضو ٹوٹ گیا۔ جب وہ دوبارہ وضو کر کے پہنچا تو ہم نماز سے فارغ ہو چکے تھے۔ ایک اور اجنبی شخص آیا اور اس کی جگہ شریک نماز ہو گیا۔

عطیہ سرکار دو جہاں ﷺ

فرمایا کرتے تھے کہ ابتداء میں میں نے چاہا کہ دائمی روزہ اختیار کروں۔ حضرت ختمی مرتبت علیہ السلام کی بارگاہ میں متوجہ ہوا تو بچشم حقیقت دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے روٹی عطا فرمائی ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خوش طبعی کے طور پر فرمایا الھدایا مشترک ہدیہ مشترک ہوتا ہے۔ میں نے وہ روٹی ان کی خدمت میں پیش کر دی۔ انھوں نے ایک ٹکڑا لے لیا۔ اسی وقت حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ الھدایا مشترک میں نے پھر روٹی انہیں پیش کی۔ انھوں نے بھی ایک ٹکڑا لے لیا۔ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا الھدایا مشترک تو میں نے ان کی بارگاہ میں روٹی پیش کی۔ انھوں نے بھی ایک ٹکڑا لے لیا۔ اسی دوران حضرت عثمانؓ نے فرمایا الھدایا مشترک میں نے عرض کی اگر روٹی اسی طور تقسیم ہوتی رہی تو اس درویش کو کیا حصہ ملے گا؟ آپ نے اپنا ہاتھ روک لیا۔ اسی موقع پر میں بیدار ہو گیا۔ ایک عرصہ تک میں غور وفکر کرتا رہا کہ حضرت ذوالنورینؓ کی باری پر حرف عذر کہنے میں آخر کیا نکتہ پوشیدہ تھا۔ بالآخر معلوم ہوا کہ مثالی صورتوں میں ایسے امور اور وقائع کی مثالوں سے رابطہ مراد ہوتا ہے۔ جیسا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ سے طریقۂ نقشبندیہ کا تعلق ہے۔ حضرت عمرؓ تک ہمارا شجرہ نسب پہنچتا ہے اور حضرت علیؓ کی ذات گرامی کے ساتھ والدہ کی طرف سے ہماری نسب اور اصل کا تعلق ہے اور طریقۂ نقشبندیہ نیز دیگر سلاسل صوفیا بھی انہی کی ذات گرامی تک پہنچتے ہیں اور بعض واقعات میں آنجناب کی ذات گرامی سے ہم نے فیوض بھی حاصل کیے ہیں تو یہ معاملہ ان اصحاب ثلثہ کی ذات گرامی تک محدود رہنا ضروری تھا۔ جبکہ حضرت عثمانؓ کے ساتھ ان وجوہات واسباب میں سے کوئی ایک بھی موجود نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

مشکل میں حضورؐ کی دستگیری

والد ماجد فرمایا کرتے تھے کہ ماہِ رمضان میں ایک دن میری نکسیر پھوٹ پڑی تو مجھ پر ضعف طاری ہو گیا۔ قریب تھا کہ میں کمزوری کی بنا پر روزہ افطار کر لوں کہ صوم رمضان کی فضیلت کے

ضائع ہونے کا غم لاحق ہوا۔ اسی غم میں قدرے غنودگی طاری ہوئی تو حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ آپ نے مجھے تعویذ اور خوشبودار زردہ مرحمت فرمایا ہے۔ پھر انتہائی خوشگوار ٹھنڈا پانی عطا فرمایا جو میں نے سیر ہو کر پیا۔ میں اس عالم غنودگی سے نکلا تو بھوک اور پیاس بالکل ختم ہو چکی تھی اور میرے ہاتھوں میں ابھی تک زردہ کے زعفران کی خوشبو موجود تھی۔ عقیدت مندوں نے احتیاطاً میرے ہاتھ دھو کر پانی محفوظ کر لیا اور تبرکاً اس سے روزہ افطار کیا۔

مجلس سرور انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم

والد ماجد فرمایا کرتے تھے کہ ایک مرتبہ حضرت ختمی مرتبت (علیہ اتم الصلوٰۃ واکمل التحیات) کو بچشم حقیقت اس انداز میں دیکھا کہ آپؐ یاقوت سرخ کی ایک ایسی مسجد میں تشریف فرما ہیں کہ جس کا ظاہر و باطن حسن وخوبی کا مظہر ہے۔ آپؐ بہ شکل مراقبہ تشریف فرما ہیں اور صحابہ کرامؓ واولیائے کاملین بھی مراقبے کی صورت میں صف باندھے ہوئے آپ کے اردگرد بیٹھے ہیں۔ جب مسجد کے دروازے پر پہنچا تو دیکھا کہ یاقوت کے رنگ کا پردہ لٹکا ہوا ہے۔ حضرت غوث الاعظمؒ اور خواجہ نقشبند قدس اللہ اسرارہما اندر سے اٹھ کر میرے پاس آئے اور میرے ہی بارے میں آپس میں مناظرہ کرنے لگے۔ حضرت غوث الاعظمؒ فرمانے لگے کہ اس شخص کے آباء واجداد میرے خلفاء سے توسل رکھتے تھے اس لئے میں اس سے زیادہ قریب ہوں اور حضرت خواجہ نقشبند نے فرمایا اس شخص کے میرے خلفاء سے روحانی تربیت حاصل کی ہے۔ اس لئے مجھے اس پر زیادہ حق حاصل ہے یعنی آپ کی مراد اس سے تھی کہ اس نے شیخ رفیع الدینؒ خلیفہ خواجہ محمد باقی سے روحانی تربیت حاصل کی ہے۔ اس گفتگو نے طول پکڑا یہاں تک کہ مجھے خوف ہوا کہ اس مجلس کے ختم ہونے تک کہیں میں اس فیض سے محروم نہ رہ جاؤں۔ بالآخر حضرت غوث الاعظمؒ نے فرمایا جب کہ آپ کے اور ہمارے طریقے میں کوئی فرق نہیں تو پھر اس قدر مناظرے کی کیا ضرورت ہے۔ خواجہ نقشبندؒ نے فرمایا کہ اگر کچھ فرق نہیں تو پھر یہ سعادت میں کیوں نہ حاصل کروں۔ حضرت غوث الاعظمؒ نے فرمایا کچھ مضائقہ نہیں۔ آپ ہی اسے اندر لے جائیے۔ حقیقت میں یہ شخص میرا عز و شرف ہے اور میں اسے اپنی ہی نسبت سے بہرہ ور کروں گا۔ یہ تمام مناظرہ ایسے ادب و احترام کی فضا میں ہوتا رہا۔ جس سے زیادہ بہتر صورت ناممکن ہے۔ اسی وقت خواجہ نقشبند نے میرا ہاتھ پکڑا اور اس مسجد

میں داخل کیا اور سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اہل صف سے ذرا آگے لا بٹھایا اور آپ میرے ساتھ صفِ برابر میں بیٹھ گئے۔ میرے دل میں یہ خیال گزرا کہ اس صورت میں بجز اس کے اور کیا حکمت ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مراقبے سے سر اٹھائیں تو سب سے پہلے آپ کی نگاہ کرم مجھ پر پڑے اور جب کوئی شخص پوچھے کہ تجھے کون لایا ہے تو خواجہ نقشبند عرض کر سکیں کہ اسے میں نے حاضر کیا ہے۔ خواجہ اس خیال پر مطلع ہوئے اور فرمایا کہ واقعی اس انداز میں بٹھانے کا سبب یہی ہے۔

اتنے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مراقبے سے سر اٹھایا اور بے پایاں لطف و کرم سے مشرف فرمایا۔ کاتب الحروف کا گمان ہے کہ اس واقعے کا تتمہ یہ ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خلوت میں لے گئے اور نفی و اثبات کی عجیب و غریب کیفیات سے تلقین فرمائی۔ واللہ اعلم۔

جمال محمدی

فرمایا کہ انا املح واخی یوسف اصبح والی حدیث کے بارے میں میرے دل میں حیرت پیدا ہوتی تھی کیونکہ ملاحت حسن عاشقوں کے لئے صباحت سے زیادہ بے قراری واضطراب کا موجب بنا کرتی ہے اور یہ بھی نقل کرتے ہیں کہ جب حضرت یوسفؑ لباس فاخرہ پہن کر جلوہ گر ہوتے تھے تو جمال یوسفی کی تاب نہ لا کر بہت سے لوگ دارالبقا کو سدھار جاتے تھے۔ جب کہ اس قسم کی کوئی بات حضرت سید الرسل صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نہیں ہے تو معاملہ برعکس ہونا چاہئے تھا۔

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو میں نے چشم حقیقت سے دیکھا اور اس نکتے کے بارے میں استفسار کیا تو فرمانے لگے کہ خدائے غیور نے میرے جمال حسن کو لوگوں کی آنکھوں سے مستور رکھا ہے۔ اگر میرا حسن ظاہر ہو جاتا تو ہر شخص وہی کچھ کرتا جو یوسف علیہ السلام کو دیکھنے والے کیا کرتے تھے۔ اسی توجیہ سے میں نے جانا کہ حضرت عائشہ یا حضرت فاطمہ علیہما السلام کی یہ روایت کہ ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام عمر میں ایک یا دو بار دیکھا ہے کیا معنی رکھتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ ان معصومات کو قوت اخذ و قبول کے مطابق اس جمال جہاں آراء کے خم خانے سے ان تک ایک آدھ جرعہ پہنچا ہے۔

ولایت اور نبوت کے مراتب اور ان میں فرق

فرمایا کہ حضرت سید الرسل علیہ الصلوٰۃ والسلام کو میں نے صورت واقعی میں دیکھا۔ میری طرف متوجہ ہوئے۔ محض توجہ گرامی سے میں مقامات اولیاء کو عبور کر گیا اور وہ تمام مقامات مجھ پر بخوبی منکشف ہو گئے حتی کہ میں اس مقام تک جا پہنچا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی ولی اس سے آگے جا ہی نہیں سکتا۔ میں نے عرض کی کہ اس فقیر کا عقیدہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس محال (ناممکن) کی طرف متوجہ ہوں وہ امکان کی صورت قبول کر لیتا ہے۔ کچھ مشکل نہیں کہ استعداد نہ ہونے کے باوجود بھی اس مقصود کا چہرہ مجھ پر جلوہ نمائی کرے۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میری روح کو اپنی روح کے سائے میں لے کر مقام صدیقیت سے بھی عبور فرما گئے جو ولایت کا انتہائی مقام ہے۔ وہاں برزخ ہمارے سامنے دیا گویا آگ کا دریا ہے جسے کوئی ولی پار نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد ولایت کے مقامات سابقہ کی مثل ہم پر کچھ مقامات منکشف ہوئے۔ مقام صبر اور مقام توکل سابق مقامات کی طرح ہمیں مشاہدہ کرائے گئے بجز اس فرق کے کہ اب یہ مقامات بطور حقیقت دکھلائے گئے جبکہ سابق مقامات محض مجازی تھے گویا اس مرتبہ یہ مقامات اصولی کی حیثیت رکھتے تھے جب کہ پہلی مرتبہ اشباح وتماثیل کی صورت میں دکھائے گئے

کاتب الحروف نے حضرت والد ماجد کی روح کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارک کے سائے (ضمن) میں لینے کی کیفیت کے بارے میں دریافت کیا تو فرمانے لگے یوں محسوس ہوتا تھا گویا میرا وجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود سے مل کر ایک ہو گیا ہے خارج میں میرے وجود کی کوئی الگ حیثیت نہیں تھی بجز اس کے کہ میرا علم مجھے اپنا شعور دلا رہا تھا۔ کاتب الحروف کے نزدیک واقعہ مذکورہ میں آگ کے دریا کو مثالی صورت میں دیکھنے کے سر مخفی کا سمجھنا اس مقدمے پر موقوف ہے کہ نبوت کے حصول کا سبب ہر مصلحت سے خالی محض عنایت ازلی کی توجہ کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ عنایت ازلی کی توجہ سے نبوت کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے ہر نبی اور اس کی قوم کو دنیا میں ہونے والے عظیم واقعات طوفانوں اور قیامت وغیرہ کے آثار و قرائن سے مطلع کرتا رہتا ہے اس کے برعکس اولیائے کرام کا ہر کمال محض ان کے نفوس قدسی کی استعداد اور ہمت پر منحصر ہوتا ہے گویا کمالات ولایت کے عطا کرنے میں عالم انفس و آفاق کی مصلحتوں اور تدابیر کی بہ نسبت اولیاء کے

نفوس اور ذوات کی مصلحتوں کا بطور خاص لحاظ رکھا جاتا ہے۔ ان کے مقابلے میں انبیائے کرام علیہم السلام کی نبوت عالم انفس اور عالم آفاق میں حکما تدبیر عالم ومصالح کے رموز واسرار پر محتوی و مشتمل ہوتی ہے۔ پہلا حکم یعنی مصلحت تدبیر عالم انفس وجود ذہنی رکھتا ہے اور دوسرا حکم یعنی مصالح تدبیر عالم آفاق وجود خارجی۔ حکم اول کا منشا و حکمت خلق اور حکم ثانی کا منشا حکمت تدبیر ہے۔ مجموعی طور پر پہلے حکم یعنی مصالح تدبیر عالم انفس میں کسب و محنت اور ریاضات کو بھی دخل ہے مگر نبوت کے حکم ثانی یعنی مصلحت تدبیر عالم آفاق میں کسب و محنت نہیں بلکہ موہبت الٰہی اور عنایت ازلی کو دخل ہے گویا حکم اول کے لئے الگ استعداد کی ضرورت ہے اور حکم ثانی کے لئے دوسری استعداد کی حاجت۔

حاصل کلام یہ کہ کمالات نبوت کے حکم ثانی کے ممتنع الحصول یا ناممکن الحصول ہونے کی وجہ سے کمالات اول کی استعداد و اہلیت رکھنے اور روح سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے بغلگیر ہونے کی بنا پر حضرت والد ماجد کے سامنے کمال ثانی یعنی مصالح تدابیر عالم آفاق کو آگ کے دریا کی شکل میں برزخی طور پر پیش کیا گیا۔

موئے مقدس کی برکات

فرمایا کہ ایک بار مجھے بخار نے آلیا اور بیماری نے طول پکڑا یہاں تک کہ زندگی سے ناامید ہوگیا۔ اسی دوران مجھ پر غنودگی طاری ہوئی تو میں نے دیکھا کہ حضرت شیخ عبدالعزیزؒ سامنے موجود ہیں اور فرما رہے ہیں بیٹے! حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم تیری بیمار پرسی کو تشریف لا رہے ہیں اور شاید تیری پائتی کی طرف سے تشریف لائیں۔ اس لئے چارپائی کو اس طرح رکھنا چاہئے کہ حضور کی طرف تمہارے پاؤں نہ ہوں۔ یہ سن کر مجھے کچھ افاقہ ہوا۔ قوت گویائی نہیں تھی۔ حاضرین کے میرے اشارے پر چارپائی کا رخ پھیر دیا۔ اسی وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ سلم تشریف فرما ہوئے اور فرمایا **کیف حالک یا بنی** (اے بیٹے کیسے ہو)

اس کلام کی لذت اس قدر غالب ہوئی کہ مجھ پر آہ و بکا اور وجد و اضطراب کی عجیب و غریب کیفیت طاری ہوگئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اس انداز سے اپنی بغل میں لیا کہ آپ کی داڑھی مبارک میرے سر پر تھی اور آپ کا جبہ مبارک میری آنکھوں سے تر ہوگیا۔ پھر آہستہ آہستہ یہ

وجد و اضطراب کی کیفیت حالت سکون میں بدل گئی۔ اسی وقت میرے دل میں آیا کہ ایک مدت سے موئے مبارک کے حصول کی آرزو رکھتا ہوں۔ کیا ہی کرم ہو کہ اس وقت تبرک عنایت فرمائیں۔ میرے اس خیال سے آپ مطلع ہوئے اور داڑھی مبارک پر ہاتھ پھیر کر دو مقدس بال میرے ہاتھ میں تھما دیئے۔ پھر میرے دل میں خیال آیا کہ یہ دونوں مقدس بال عالم بیداری میں بھی میرے پاس رہیں گے یا نہیں۔ اس کھٹکے پر مطلع ہو کر آپ نے فرمایا۔ یہ دونوں بال عالم ہوش یا بیداری میں بھی باقی رہیں گے۔ اس کے بعد آپ نے صحت کلی اور طویل عمر کی خوشخبری سنائی۔ اسی وقت مرض سے افاقہ ہو گیا۔ میں نے چراغ منگوایا وہ دونوں مقدس بال اپنے ہاتھ میں نہ پائے تو میں غمگین ہو کر بارگاہ عالی کی طرف متوجہ ہوا۔ غیبت واقع ہوئی اور آنحضورؐ مثالی صورت میں جلوہ فرما ہوئے، فرمایا اے بیٹے! عقل و ہوش سے کام لو وہ دونوں بال احتیاطاً تمہارے سرہانے کے نیچے رکھ دیئے تھے۔ وہاں سے لے لو۔ افاقہ ہوتے ہی میں نے وہ مقدس بال وہاں سے اٹھائے تعظیم و تکریم سے ایک جگہ محفوظ کر کے رکھ دیئے۔ اس کے بعد دفعتہً بخار ٹوٹا اور انتہائی ضعف، نقاہت طاری ہوئی۔ عزیزوں نے سمجھا کہ موت آ پہنچی، رونے لگے۔ مجھ میں بات کرنے کی سکت نہیں تھی۔ سر سے اشارہ کرتا رہا۔ کچھ دیر بعد اصل طاقت بحال ہوئی اور صحت کلی نصیب ہوئی۔ اسی سلسلے میں یہ کلمات بھی فرمائے تھے کہ ان دو بالوں کے خواص میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آپس میں گتھے رہتے ہیں مگر جب درود پڑھا جائے تو جدا جدا کھڑے ہو جاتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ایک مرتبہ تاثیر تبرکات کے منکروں میں سے تین آدمیوں نے امتحان لینا چاہا۔ میں اس بے ادبی پر راضی نہ ہوا مگر جب مناظرے نے طول کھینچا تو کچھ عزیز ان مقدس بالوں کو سورج کے سامنے لے گئے۔ اسی وقت بادل کا ٹکڑا ظاہر ہوا۔ حالانکہ سورج بہت گرم تھا اور بادلوں کا موسم بھی نہیں تھا۔

یہ واقعہ دیکھ کر منکروں میں سے ایک نے توبہ کی اور دوسروں نے کہا یہ اتفاقی امر ہے۔ عزیز دوسری مرتبہ لے گئے تو دوبارہ بادل کا ٹکڑا ظاہر ہوا۔ اس پر دوسرے منکر نے بھی توبہ کر لی۔ مگر تیسرے نے کہا یہ تو اتفاقی بات تھی۔ یہ سن کر تیسری بار موئے مقدس کو سورج کے سامنے لے گئے۔ سہ بارہ بادل کا ٹکڑا ظاہر ہوا تو تیسرا منکر بھی توبہ کرنے والوں میں شامل ہو گیا۔

آپ نے یہ بھی فرمایا کہ ایک مرتبہ موئے مبارک زیارت کے لئے باہر لے آیا۔ بہت بڑا

مجمع تھا۔ ہر چند صندوق تبرک کا تالا کھولنے کی کوشش کی گئی لیکن نہ کھلا۔ اپنے دل کی طرف متوجہ ہوا تو معلوم ہوا فلاں آدمی ناپاک ہے۔ جس کی ناپاکی کی شامت کے سبب یہ نعمت میسر نہیں آرہی۔ عیب پوشی کرتے ہوئے میں نے سب کو تجدید طہارت کے لئے حکم دیا۔ وہ ناپاک آدمی بھی مجمع سے چلا گیا اور اسی وقت بڑی آسانی سے تالا کھل گیا اور ہم سب نے زیارت کی۔ حضرت والد ماجد نے آخری عمر میں جب تبرکات تقسیم فرمائے تو ان دونوں بالوں میں سے ایک کاتب الحروف کو عنایت فرمایا جس پر پروردگار عالم کا شکر ہے۔

سجدہ غیر اللہ کی ممانعت

فرمایا ایک مرتبہ حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو بچشم حقیقت دیکھا۔ جب اس مظہر اتم میں صفات الٰہیہ کا کمال ظہور مشاہدہ کیا تو سجدے میں گر گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اظہار تعجب کے طور پر انگلی منھ میں دبالی اور اس شکل سے منع فرمایا۔ بارہا دل میں آیا کہ اس صورت سے منع کرنے میں کیا نکتہ پنہاں تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ انسان کو دو طرح سے سجدہ کیا جاسکتا ہے ایک اس صورت میں کہ اس کے معبود ہونے کا اعتقاد دل میں ہو اور یہ کفر ہے دوسرا اس صورت میں کہ اس میں صفات الٰہیہ کے ظہور کا مشاہدہ کرکے سجدہ کیا جائے اور یہ مشابہت کفر کی وجہ سے ممنوع ہے لہٰذا اس باریک فرق کی بنا پر اس وضع سے آپ نے منع فرمایا۔

قرابت رسول ﷺ کا مقام

فرمایا ایک آدمی کے سید یا غیر سید ہونے کے بارے میں مجھے تردد تھا۔ حضرت پیغمبر علیہ ﷺ کو دیکھا۔ گویا ایک پلنگ پر دراز سو رہے ہیں۔ عنایت سے پیش آئے اور آخر میں فرمایا پلنگ کے نیچے دیکھو میں نے اس شخص کو دیکھا، سو رہا ہے۔ فرمایا اگر سید ہونے کی قرابت نہ رکھتا تو یہاں کیسے پہنچتا

حضور کا پسندیدہ درود

فرمایا کہ ایک دن میں نے حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ حاضرین میں سے ہر شخص اپنے فہم و فراست کے مطابق آپ کی بارگاہ میں درود پیش کر رہا ہے۔ میں نے بھی یہ درود عرض کی اللھم صل علی محمد النبی الامی و آلہ واصحابہ وبارک وسلم۔ جب آپ نے یہ سنا تو آپ کے چہرۂ مبارک سے بشاشت اور تازگی نمودار ہو رہی تھی۔

حضورؐ کی نیاز کی اشیاء کی بارگاہِ نبوی میں مقبولیت

فرمایا کہ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے عرس مبارک کے دنوں میں ایک مرتبہ اتفاقاً خزانۂ غیب سے کچھ میسر نہ آسکا کہ میں کچھ طعام پکا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روح پر فتوح کی نیاز دلوا سکتا۔ لہٰذا تھوڑے سے بھنے ہوئے چنے اور قند پر اکتفا کرتے ہوئے میں نے آپ کی نیاز دلوادی۔ اسی رات بچشم حقیقت دیکھا کہ انواع واقسام کے طعام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں پیش کئے جارہے ہیں۔ اسی دوران وہ قند اور چنے بھی پیش کئے گئے۔ انتہائی خوشی ومسرت سے آپ نے وہ قبول فرمائے اور اپنی طرف لانے کا اشارہ فرمایا اور تھوڑا سا اس میں سے تناول فرما کر باقی اصحاب میں تقسیم فرمادیا۔ کاتب الحروف کہتا ہے کہ اس قسم کا قصہ اگلے بزرگوں سے بھی روایت کیا جاتا ہے مگر یہ قصہ بلاشبہ حضرت والد ماجد کا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ توارد ہو گیا ہو۔

نسبت فقر

فرمایا امر واقعہ میں دیکھا کہ حضرت امام حسن وامام حسین رضی اللہ عنہما کسی راستے میں یاقوت سرخ کی بہلی پر سوار ہیں جو بغیر جانوروں کے محض قدرت الٰہی سے چل رہی ہے۔ میں بھی ان کے ہم رکاب سیر کر رہا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ آؤ اور ہمارے ساتھ بہلی میں بیٹھ جاؤ۔ مگر میں رعایت ادب کی وجہ سے اس بات پر راضی نہیں ہوا بلکہ بات ہلکے مزاح پر جاپہنچی اور بلاکر فرمایا کہ بہلی کے پردے کو نیچے لٹکا دو۔ میں اس کے پائے پر چڑھ کر پردہ لٹکانے ہی والا تھا کہ ایک ہاتھ سے حضرت امام حسنؓ اور دوسرے ہاتھ سے امام حسینؓ نے مضبوط پکڑ لیا اور ہنستے ہوئے فرمایا۔ اب خبر دیجیے کیسے رہے۔ میں نے عرض کی کہ اس شخص کی حالت کا بیان کی جائے جس کے دونوں ہاتھ قرۃ العین حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ سلم کے ہاتھوں میں ہوں۔ بہرحال مجھے بہلی میں بٹھا کر مسرت وشادمانی کے ساتھ اپنے گھر تک لائے جہاں مجھے حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی ملاقات نصیب ہوئی۔ آنجناب کی خدمت میں میں نے التماس کی کہ ہم فقیروں کو کسب وریاض سے جو نسبت فقر حاصل ہوتی ہے۔ کیا وہی نسبت ہے جو حضرت پیغمبرؐ کی بارگاہ سے صحابہ کرام حاصل فرمایا کرتے تھے یا زمانہ دراز گزرنے کے سبب اب کچھ تبدیل ہوگئی ہے۔ فرمانے لگے کچھ دیر اپنی نسبت میں غرق

ہو جاؤ تا آنکہ میں اپنی نسبت روحانی کی طرف متوجہ ہو کر مستغرق ہوا تو تھوڑی دیر بعد آپ نے فرمایا کہ تمہیں بھی بغیر کسی فرق کے وہی نسبت حاصل ہے جو صحابہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل تھی۔

اجازتِ سلسلہ

فرمایا کہ ابتدائے احوال میں مختلف طریق سلوک کے اصحاب طریقت کو میں نے دیکھا اور ان سے امر واقعی میں اجازت حاصل کی۔ منجملہ ان اصحاب طریقت کے حضرت خواجہ نقشبند کو بھی میں نے بچشم حقیقت دیکھا کہ لکڑی کے پیالے میں انھوں نے مجھے پانی دیا میں نے سیر ہو کر پیا پھر انھوں نے مختلف طریق وسلاسل کی باتیں بیان کیں اور آخر میں تلقین طریقہ کی اجازت بھی مرحمت فرمائی۔

خواجہ اجمیری سے خلافت

فرمایا کہ حضرت خواجہ معین الدینؒ کو میں نے دیکھا کہ گھر میں بیٹھے ہوئے ہیں اور ایک چراغ روشن ہے لیکن اس چراغ کی بتی حرکت کی محتاج تھی تا کہ تازہ ہو کر روشنی پھیلا سکے۔ مجھے انھوں نے اس خدمت پر مامور فرمایا چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ اس کے بعد اپنی خاص نسبت مجھے عنایت فرمائی اور اس واقعے کی تعبیر بھی اجازت طریقہ تھی۔

سیر روحانی

فرمایا کہ ایک بار اولیاء اللہ کے سلاسل مجھے اس طرح مشاہدہ کرائے گئے کہ گویا ایک وسیع بازار ہے جس میں خوبصورت پختہ دکانیں ہیں اور ہر دکان میں صاحب سلسلہ بزرگ اپنے اپنے خلفاء اور معتقدین کے ساتھ فروکش ہیں۔ میں سب بزرگوں کی زیارت کرتا ہوا بازار سے گزرتا گیا۔ یہاں تک کہ حضرت غوث اعظمؒ کی دوکان پر پہنچا اور آپ کی مجلس مبارک میں بیٹھ گیا۔ اس وقت الاعیان ما شمت رائحة الوجود پر بحث ہو رہی تھی۔ حاضرین میں سے ہر شخص اپنی فہم وفراست کے مطابق اس کے معانی بیان کر رہا تھا اپنی باری پر میں نے اس کا مفہوم بیان کیا۔ حضرت غوث الاعظمؒ نے میری تشریح پر خوش ہو کر فرمایا غرض آں بے چارہ ہمیں بود (اس بیچارے (مصنف) کی مراد بھی یہی تھی) اس واقعے کو عرصہ گزر گیا۔ لیکن فارسی زبان میں ادا کئے ہوئے

آپ کے یہ کلمات ابھی تک میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔ اس کے بعد آپ اس مجلس سے اٹھے اور میرا ہاتھ پکڑ کر خلوت میں لے گئے اور فرمانے لگے۔ کیا تمہارے دل میں میری طرف سے کوئی کھٹکا ہے؟ میں نے عرض کیا ہاں! تمام صاحب سلسلہ بزرگوں نے مجھے بلاواسطہ اجازت وخلافت عطا فرمائی ہے سوائے آپ کے! آپ نے فرمایا۔ میرے خلفاء سے تم نے اجازت حاصل کر لی ہے۔ گویا بلاواسطہ مجھ سے کسب فیض کر لیا ہے۔ کیونکہ میرے خلفاء اور میں معناً ایک ہیں۔ میں نے عرض کیا۔ یہ درست ہے لیکن بلاواسطہ فیض میں ایک خاص لطف ولذت ہے۔ اس پر ارشاد فرمایا: اچھا میں نے بھی تم کو اجازت دی۔ میرے طریقہ پر لوگوں کو ارشاد وسلوک کی تعلیم دو۔ جب اشغال کی نوبت آئی۔ فرمایا تم نے ابتدائی، درمیانی اور انتہائی تینوں قسم کے اشغال کر رکھے ہیں۔ مزید ضرورت نہیں ہے۔ پھر آپ نے میرے دل پر توجہ ڈالی اور خاص نسبت عنایت فرمائی بعد میں آگے روانہ ہوا اور سلاسل کی سیر کرتا رہا۔ اس دوران میں نے بے شمار عجائب وحقائق دیکھے۔ آخر میں عرش کے زیر سایہ پہنچا۔ میں نے دیکھا کہ ایک سلسلہ عرش کے ساتھ معلق ہے اور حضرت خواجہ نقشبندؒ اس کو تھامے ہوئے حالت استغراق میں ہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ آپ کے استغراق کی وجہ یہ ہے کہ آپ کے خلفاء (زندہ ہوں یا رفتہ) میں مخلوق کی طرف توجہ کی ریاضت ومشقت زیادہ ہے۔ کاتب الحروف (شاہ ولی اللہ) عرض کرتا ہے کہ حضرت خواجہ نقشبند رحمتہ اللہ علیہ کی نسبت کی وسعت لطیفۂ سر میں زیادہ ہے اور حضرت غوث الاعظم رحمتہ اللہ علیہ کی نسبت کی وسعت لطیفۂ روح میں روحانی تربیت اسی اعتبار سے ظہور پذیر ہوتی ہے اسی طرح قدیم صوفیائے کرام کی نسبت لطیفہ نفس میں زیادہ ہے۔ اسی بناء پر قدیم صوفیائے کرام کے ہاں سخت مشکل ریاضتیں پائی جاتی ہیں۔ فتدبر

بظاہر آپ نے بے چارے کا لفظ اسی لئے استعمال فرمایا کہ وہ نفوس قدسیہ کہ جو ارشاد کے بلند مقام پر فائز ہوتے ہیں۔ ان کے نزدیک عجیب وغریب علوم ومعارف کو خاص اہمیت حاصل نہیں ہے۔

مقامات اولیاء

فرمایا کہ ایک بار میں حضرت خواجہ قطب الدینؒ کے مزار مبارک کی زیارت کے لئے گیا۔

یکا یک میرے دل خیال پیدا ہوا کہ میری گنہگار آنکھیں اور وجود اس قابل نہیں کہ اس مقدس بارگاہ میں حاضری دیں۔ اس خیال کے آتے ہی مزار مبارک سے متصل چبوترے پر رک گیا۔ اسی دوران آپ کی روحانیت جلوہ گر ہوئی اور مجھے حکم دیا کہ آگے آؤ! میں دو تین قدم آگے بڑھا۔ اسی اثنا میں میں نے دیکھا کہ آسمان سے چار فرشتے ایک تخت اٹھائے ہوئے آپ کی قبر مبارک کے قریب اترے، معلوم ہوا کہ اس تخت پر حضرت خواجہ نقشبندؒ ہیں قران السعدین ہوا۔ دونوں شیوخ نے خلوت میں راز و نیاز کی باتیں کیں۔ اس کے بعد حسب سابق فرشتے تخت کو اٹھا کر روانہ ہو گئے اور حضرت خواجہ قطب الدین میری طرف متوجہ ہو کر فرمانے لگے کہ نزدیک آؤ میں دو تین قدم اور آگے بڑھا۔ آپ بار بار نزدیک آنے کے متعلق فرماتے رہے اور میں آہستہ آہستہ قریب ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ حضرت کے بہت نزدیک ہو گیا۔ پھر آپ نے پوچھا۔ شعر کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟ میں نے کہا کلام حسنه حسن وقبيحه قبيح (شعر بھی منجملہ دیگر کلام کے ہے۔ اس میں جو بہتر ہے وہ اچھا ہے اور جو مخرب ہے وہ قبیح ہے) اس پر آپ نے فرمایا۔ بارک اللہ

پھر آپ نے دریافت فرمایا۔ خوبصورت آواز کے بارے میں تمہارا نظریہ کیا ہے؟ میں نے عرض کیا ذالک فضل الله يوتيه من يشاء (یہ لطف ایزدی ہے) آپ نے فرمایا بارک اللہ! لیکن جب یہ دونوں باتیں (شعر و آواز) جمع ہو جائیں پھر؟ میں نے کہا۔ نور علیٰ نور يهدى الله لنوره من يشاء۔ آپ نے فرمایا بارک اللہ۔ تم بھی کبھی کبھار ایک دو بیت سن لیا کرو۔ میں نے عرض کیا۔ حضرت خواجہ نقشبندؒ کی موجودگی میں آپ نے یہ بات کیوں نہیں فرمائی؟ خلاف ادب تھا! یا مصلحت نہیں تھی! (ان دو باتوں میں سے آپ نے ایک فرمائی) حضرت والد ماجد نے فرمایا عرصے کی بات ہے۔ صحیح الفاظ یاد نہیں ہے۔

بشارتِ فرزند

فرمایا ایک دفعہ میں انہی (حضرت شیخ قطب الدینؒ) کے مزار مبارک کی زیارت کے لئے گیا۔ آپ کی روح مبارک ظاہر ہوئی اور مجھے فرمایا کہ تمہیں ایک فرزند پیدا ہو گا۔ اس کا نام قطب الدین احمد رکھنا۔ اس وقت میری زوجہ عمر کے اس حصے کو پہنچ چکی تھیں۔ جس میں اولاد کا پیدا ہونا ناممکن ہوتا ہے۔ میں نے سوچا کہ شاید اس سے مراد بیٹے کا فرزند یعنی پوتا ہے۔ میرے اس وہم

پر آپ فوراً مطلع ہو گئے اور فرمایا میرا مقصد یہ نہیں بلکہ یہ فرزند (جس کی بشارت دی گئی ہے) خود تمہاری صلب سے ہوگا۔ کچھ عرصہ بعد دوسرے عقد کا خیال پیدا ہوا اور اسی سے کاتب الحروف فقیر ولی اللہ پیدا ہوا۔ میری پیدائش کے وقت والد ماجد کے ذہن سے یہ واقعہ اتر گیا اس لئے انھوں نے ولی اللہ نام رکھ دیا۔ کچھ عرصہ بعد جب انھیں یہ واقعہ یاد آیا تو انھوں نے میرا دوسرا نام قطب الدین احمد رکھا۔

مجالس ارواح اولیاء

فرمایا ایک دفعہ میں نے شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی قدس سرہ کو خواب میں دیکھا کہ وضو فرما رہے ہیں اور نماز کی تیاری میں مشغول ہیں۔ میں نے پوچھا کہ یہ تو عالم (آخرت) تکلیف (عمل) نہیں ہے۔ یہاں پر وضو اور نماز کی حکمت کیا ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا کہ چونکہ دنیا میں اکثر وقت ان امور کی انجام دہی میں گزرا ہے اس لئے ان میں لذت محسوس ہوتی ہے۔ یہاں پر ان کی ادائیگی کسی فریضے پر نہیں بلکہ لطف ولذت کی خاطر ہے۔ نماز کے بعد ارواح اولیاء جمع ہو گئیں اور ان کے درمیان گفتگو شروع ہوئی حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی نے مجھے ارشاد فرمایا کہ تم بھی ہماری محفل میں شامل ہو جاؤ۔ میں اس مقدس مجلس میں جانے سے گریز کرنے لگا۔ اس پر آپ نے فرمایا ہماری مجلس عام مجالس کی طرح نہیں ہے۔ چنانچہ میں حاضر ہو گیا۔ اس روحانی محفل میں وجد بھی دیکھا گیا۔

تصرف اولیاء

فرمایا کہ اکبر آباد میں میرزا محمد زاہد سے تعلیم کے دوران ایک دفعہ درس سے واپسی پر ایک لمبے کوچے سے گزر ہوا۔ اس وقت میں خوب ذوق میں سعدی شیرازیؒ کے یہ اشعار گنگنا رہا تھا۔

جز یاد دوست ہر چہ کنی عمر ضائع است — جز سر عشق ہر چہ بخوانی بطالت است

سعدی بشوی لوح دل از نقش غیر حق — علمی کہ رہ بحق ننماید جہالت است

اتفاق کی بات چوتھا مصرعہ میرے ذہن سے اتر گیا۔ ہر چند ذہن پر زور دیا لیکن یاد نہ آیا۔ اس تار کے ٹوٹنے سے میرے دل میں سخت اضطراب اور بے ذوقی کی کیفیت پیدا ہوئی کہ اچانک ایک فقیر منش، ملیح چہرہ، دراز زلف، پیر مرد نمودار ہوا اور اس نے مجھے لقمہ دیا۔

علمی کہ رہ بحق ننماید جہالت است

میں نے کہا جزاک اللہ خیر الجزاء۔ آپ نے مجھے کتنی پریشانی سے نجات دلائی ہے۔ اور میں نے ان کی خدمت میں کچھ پان پیش کیے۔ انھوں نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔ یہ بھولا ہوا مصرعہ یاد دلانے کی مزدوری ہے؟ میں نے عرض کیا نہیں یہ تو بطور ہدیہ اور شکریہ پیش کر رہا ہوں۔ اس پر انھوں نے فرمایا میں پان استعمال نہیں کیا کرتا۔ میں نے عرض کیا۔ پان کے استعمال میں کوئی شرعی پابندی ہے یا طریقت کی رکاوٹ! اگر کوئی ایسی بات ہے تو مجھے بتایئے تاکہ میں بھی اس سے احتراز کروں۔ انہوں نے فرمایا۔ ایسی کوئی بات نہیں البتہ میں پان کھایا نہیں کرتا۔ پھر فرمانے لگے مجھے جلدی جانا چاہیے۔ میں نے کہا میں بھی جلدی چلوں گا۔ انھوں نے فرمایا میں جلد تر جانا چاہتا ہوں۔ یہ کہہ کر انھوں نے قدم اٹھایا اور کوچہ کے آخر میں رکھا۔ میں جان لیا کہ کسی اہل اللہ کی روح مبارک انسانی شکل میں جلوہ گر ہے میں نے آواز دی کہ اپنے نام سے تو اطلاع دیتے جایئے تاکہ فاتحہ تو پڑھ لیا کروں! فرمایا فقیر کو سعدیؒ کہتے ہیں۔

مقام مجاذیب

فرمایا میں نے چشم حقیقت سے دیکھا کہ میں آسمان پر گیا ہوں۔ وہاں ایک شخص گدڑی لپیٹے ہوئے محو خرام ہے اور اس سے محبت کے شعلے بھڑک رہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہ شخص حلقۂ مجاذیب کا سرخیل ہے اور ہر مجذوب اس کا خوشہ چین ہے۔ ظاہراً یہ مجذوب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زبان مبارک سے پہلے ہو گزرا ہے۔

کاتب الحروف عرض پرداز ہے کہ ممکن ہے کہ مجاذیب کے لئے یہ مثالی صورت تربیت الٰہی اور عقل و خرد سلب کرنے والی عظیم نسبت کا راز ہو۔

دعوت مخدوم اللہ دیہؒ

اس فقیر (شاہ ولی اللہ) نے ان احباب سے جو خود اس واقعے میں عینی شاہد تھے۔ سنا ہے کہ ایک بار حضرت والد ماجد، مخدوم شیخ اللہ دیہ صاحب کے مزار کی زیارت کے لئے قصبہ ڈاسنہ میں گئے ہوئے تھے۔ یہ رات کا وقت تھا۔ اسی دوران آپ نے فرمایا کہ مخدوم صاحب نے ہماری دعوت کی ہے اور فرمایا ہے کہ کچھ تناول کر کے جائیں۔ آپ نے دعوت کا انتظار فرمایا۔ یہاں تک

کہ رات گزر جانے کی وجہ سے لوگوں کی آمد ورفت بھی ختم ہوگئی۔ احباب ملول ہوئے، اچانک ایک عورت میٹھے طعام کا تھال لئے نمودار ہوئی اور اس نے کہا میں نے منت مانی تھی کہ جس وقت میرا شوہر گھر واپس آئے گا میں اسی وقت طعام پکا کر مخدوم اللہ دیہؒ کی درگاہ میں قیام پذیر فقراء میں تقسیم کروں گی۔ اسی وقت میرا شوہر گھر واپس پہنچا ہے میں نے اپنی منت پوری کی ہے۔ میری خواہش تھی کہ خدا کرے اس وقت رات گئے درگاہ میں کوئی موجود ہوتا کہ طعام تناول کرے۔

ذکر الٰہی

فرمایا ایک دفعہ رات کے وقت میں سیر کرتا ہوا ایک بہت ہی خوبصورت مقبرے میں پہنچا۔ میں تھوڑی دیر وہاں ٹھہرا۔ اسی اثناء میں میرے دل میں خیال آیا کہ اس جگہ اس وقت میرے بغیر کوئی شخص بھی ذکر الٰہی میں مصروف نہیں ہے اس خیال کے آتے ہی اچانک ایک کوزہ پشت معمر شخص ظاہر ہوا۔ اور اس نے پنجابی زبان میں گانا شروع کیا۔ اس کے گیت کا مفہوم یہ تھا۔

دوست کے دیدار کی آرزو مجھ پر غالب آگئی ہے

میں اس کے نغمے سے متاثر ہو کر اس کی طرف بڑھا۔ میں جوں جوں اس سے نزدیک ہو رہا تھا وہ اس قدر مجھ سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔ تمہارا خیال یہ ہے کہ اس مقام پر تمہارے علاوہ اور کوئی ذاکر نہیں ہے۔ میں نے جواب دیا۔ میرا یہ خیال زندوں کے بارے میں تھا۔ اس پر اس نے کہا۔ اس وقت تو تم نے مطلق تصور کیا تھا۔ اب تخصیص کر رہے ہو۔ اس کے بعد وہ غائب ہو گیا۔

حسن نیت

فرمایا۔ شیخ بایزید اللہ گو نے حرمین کی زیارت کا قصد کیا۔ آپ کی معیت میں بہت سے ضعیف العمر، بچے اور عورتیں بھی تیار ہو گئیں حالانکہ زادراہ کا کوئی انتظام نہ تھا۔ برادر گرامی اور میں نے متفق ہو کر ارادہ کیا کہ انہیں واپس لایا جائے۔ جب ہم تغلق آباد پہنچے تو دن بہت گرم ہو چکا تھا۔ ہم لوگ ایک سایہ دار درخت کے نیچے آرام کی غرض سے بیٹھ گئے۔ اس دوران تمام احباب سو گئے اور میں اکیلا ان کے کپڑوں اور سامان کی حفاظت کے لئے جاگتا رہا۔ اپنے آپ کو بیدار رکھنے کے لئے میں نے قرآن مجید کی تلاوت شروع کر دی۔ چند سورتیں تلاوت کر کے میں خاموش ہو گیا۔

اچانک قریبی قبور میں سے ایک صاحب قبر مجھ سے مخاطب ہوا۔ قرآن مجید کے زندگی بخش نغمات سننے کے لئے مدت سے ترس رہا ہوں۔ اگر کچھ وقت اور تلاوت کریں تو احسان مند ہوں گا میں کچھ اور تلاوت کر کے پھر خاموش ہو گیا۔ صاحب قبر نے مزید استدعا کی۔ میں نے پھر پڑھا۔ میرے چپ ہونے پر اس نے تیسری بار درخواست کی۔ میں نے اس دفعہ بھی اس کی درخواست قبول کی اور قرآن مجید کی چند آیات تلاوت کیں۔ اس کے بعد یہ صاحب قبر مخدومی برادر گرامی جو پاس ہی سو رہے تھے کو خواب میں آیا اور کہا۔ میں نے ان کو بار بار تلاوت کے لئے کہا ہے اب مجھے حیا آتی ہے۔ آپ انہیں فرمائیں کہ قرآن مجید کا کچھ حصہ زیادہ تلاوت کر کے میرے لئے روح کی غذا فراہم کریں۔ وہ نیند سے اٹھے اور مجھے صورت حال سے آگاہ کیا۔ میں نے نسبتاً زیادہ تلاوت کی اور اس پر ان اہل قبور میں خوشی و مسرت کی خاص کیفیت میں نے محسوس کی اور انہوں نے مجھے فرمایا جزاک اللہ عنی خیر الجزاء۔

اس کے بعد میں نے ان سے عالم برزخ کے متعلق پوچھا۔ اس نے کہا میں ان قریبی قبروں میں سے کسی کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتا۔ البتہ میں اپنا حال آپ کو سناتا ہوں۔ جب سے میں نے دنیا سے انتقال کیا ہے۔ میں نے کسی قسم کا عذاب یا عتاب نہیں دیکھا۔ اگرچہ بہت زیادہ انعام واکرام بھی نہیں ہے۔ میں نے پوچھا تمہیں معلوم ہے کہ کون سے عمل کی برکت سے تمہیں نجات ملی ہے۔ اس نے کہا۔ میں نے ہمیشہ اس بات کی کوشش کی کہ دنیاوی بکھیڑوں سے خود کو آزاد کروں اور ذکر الٰہی اور عبادات سے غافل کرنے والی چیزوں سے کنارہ کشی کروں۔ اگرچہ اپنے اس ارادے کو مکمل عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ تاہم خدائے تعالیٰ نے میرے حسن نیت کو پسند فرما کر مجھے یہ صلہ عطا فرمایا۔ قیلولہ سے فراغت حاصل کر کے شیخ بایزیدؒ سے صحبت ہوئی اور انہیں واپس لائے۔

تاثیر ذکر

فرمایا ایک دفعہ میں حضرت خواجہ قطب الدینؒ کی درگاہ کے قریب سیر کر رہا تھا۔ اس دوران مجھے ایک ایسی قبر نظر پڑی کہ اس کے ذکر کی وجہ سے زمین سے تحت الثریٰ اور فضا میں عرش اعلیٰ تک ہر چیز ذاکر ہے۔ مجھے تعجب ہوا۔ میں نے فضیلت پناہ شیخ محمدؒ سے جو اس وقت میرے ہمراہ تھے کہا۔ آپ بھی اس قبر پر مراقبہ کر کے اس کا حال معلوم کریں۔ مراقبے کے بعد قریب انھوں

نے بھی وہی کیفیت بیان کی جو میں مشاہدہ کر چکا تھا۔ اس وقت وہاں ہمیں ایک عمر رسیدہ دیہاتی ملا۔ میں نے اس قبر کے متعلق اس سے استفسار کیا۔ اس نے بتایا کہ یہ ایک بزرگ کا مزار ہے۔ اس نے مزید بتایا کہ اس وقت میری عمر ۸۰ سال ہے۔ میرے والد سو برس کے ہو کر فوت ہو گئے اور میرے دادا نے ایک سو بیس سال کی عمر پائی۔ میں نے اپنے والد سے سنا ہے وہ اپنے والد سے بیان کرتے تھے کہ اس مزار پر ہر وقت لوگوں کا میلہ لگا رہتا تھا۔ لوگ نذر و نیاز لایا کرتے تھے۔ حضرت قطب الدینؒ کے مزار کی طرح زائرین دور دراز کے علاقوں سے آ کر یہاں قیام پذیر ہوتے تھے۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ یہ بزرگ گمنامی میں چلے گئے اور لوگ ان سے غافل ہو گئے۔

قصر نماز

فرمایا ایک سفر کے دوران مجھے خیال آیا کہ سفری نماز میں قصر رخصت ہے کبھی کبھار سفر کی حالت میں مکمل نماز بھی پڑھ لینی چاہیے۔ چنانچہ اس دفعہ میں نے قصر نہیں کی۔ رات کو خواب میں نے حضرت امام شافعی کو دیکھا کہ آپ بیحد مسرور اور میری طرف متوجہ ہیں۔

علوم اولیاء

فرمایا کہ میرے والد شہیدؒ شہادت کے بعد کبھی کبھار ظاہری شکل و صورت میں مجسم ہو کر میرے پاس تشریف لایا کرتے تھے اور حال و استقبال کی خبریں سنایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ مخدومی برادر گرامی کی دختر کریمہ بیمار ہو گئی۔ اس کی بیماری نے طول پکڑا۔ انہی ایام میں ایک دن تن تنہا میں اپنے حجرے میں سو رہا تھا کہ اچانک والد شہید تشریف لائے اور فرمانے لگے کہ میں چاہتا ہوں کہ کریمہ کو ایک نظر دیکھ لوں لیکن اس وقت گھر میں بہت سی دوسری مستورات آئی ہوئی ہیں۔ ان کی موجودگی میں وہاں جانا طبیعت پر گراں گزرتا ہے۔ تم ان مستورات کو ایک طرف کر دو تاکہ میں کریمہ کو دیکھ لوں! چونکہ اس وقت ان مستورات کا وہاں سے اٹھانا خلاف مصلحت تھا اس لیے میں نے ان کے اور کریمہ کے درمیان پردہ لٹکا دیا۔ اس کے بعد وہ اس طرح ظاہر ہوئے کہ کریمہ اور میرے علاوہ انہیں اور کوئی نہیں دیکھ رہا تھا۔ کریمہ نے انہیں پہچان لیا اور کہا عجیب بات ہے کہ لوگ تو ان کو شہید کہتے ہیں حالانکہ یہ زندہ ہیں۔ فرمانے لگے۔ بیٹی! اس بات کو چھوڑ دو تم نے بیماری میں

کافی تکلیف برداشت کی ہے۔ انشاءاللہ کل صبح کی اذان کے وقت تمہیں مکمل نجات مل جائے گی۔ یہ بات فرما کر اٹھے اور دروازے کے راستے باہر نکلے۔ میں بھی ان کے پیچھے روانہ ہوا۔ فرمایا تم ٹھہرو! اور پھر غائب ہو گئے۔ دوسرے روز فجر کی اذان کے وقت کریمہ کی روح پرواز کر گئی اور اس نے ہر قسم کی تکلیف سے نجات حاصل کر لی۔

تاثیر جذب ورقص

حضرت والد ماجدؒ ایک دفعہ قصبۂ پھلت میں تھے۔ عرس کے روز ایک بزرگ تشریف لائے۔ قوالوں نے نغمہ چھیڑا۔ تھوڑی دیر کے بعد فرمانے لگے۔ شیخ ابوالفتح قدس سرہ کی روحانیت محفل میں آ کر رقص کر رہی ہے عنقریب ان کے جذب کے اثرات اہل محفل پر طاری ہو جائیں گے تھوڑی دیر گزری کہ مجلس کا رنگ بدل گیا اور ہا، وہو کے مستانہ نعروں سے محفل گونج اٹھی۔

فیوض اولیاء

حضرت والد گرامی جب کبھی مخدومی شیخ محمد قدس سرہ کی قبر مبارک کے پاس بیٹھتے فرماتے کہ ان کی روح نماز میں میری اقتداء کرتی ہے اور مجھ سے معارف کسب کرتی ہے۔ ایک دفعہ اس فقیر (ولی اللہؒ) کی طرف متوجہ ہوئے اور بعض فیوض ومعارف عطا فرمائے۔ پھر فرمایا۔ مخدومی شیخ محمد قدس سرہ کی روح پرفتوح نے مجھے حکم دیا ہے کہ فلاں کو کچھ معارف کی تعلیم دو۔ وہ تمام میں نے تمہارے سامنے بیان کر دیتے ہیں۔

موکل وباء

فرمایا ایک دفعہ میں چند احباب کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا کہ ایک طویل القامت پر ہیبت شخص ہاتھ میں تیر وکمان لئے ہوئے آیا اور مسنون طریق سے مجھے سلام کیا۔ میں نے اس کے سلام کا جواب دیا۔ پھر اس نے بتایا کہ میں وباء پر مقرر کیا ہوا فرشتہ ہوں۔ عرصے سے آپ کی ملاقات کی خواہش تھی۔ آج ہمارے لشکر نے اس علاقے سے گزر کیا ہے۔ میں نے سوچا اچھا اتفاق ہے آپ سے مل لوں۔ آج ہمیں فلاں جگہ سے کوچ اور فلاں مقام پر پہنچنے کا حکم ہے۔ میں آپ کو خوشخبری سناتا ہوں کہ آپ کے احباب اور معتقدین میں سے کوئی شخص بھی اس وبا میں ہلاک نہیں ہوگا۔ اس کے بعد اس نے سلام کیا اور چلا گیا۔ چنانچہ چند دنوں میں وبا بھی اس کے بتائے ہوئے علاقے

میں منتقل ہو گئی اور معتقدین و احباب بھی محفوظ رہے۔

موت اختیاری

فرمایا ایک دن تنہا میں اپنے حجرے میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک شخص آیا اور مجھے کہنے لگا کہ اگر تم چاہو تو ابھی اسی دنیائے دوں سے دار الآخرت کی طرف منتقل ہو سکتے اور اگر چاہو تو کچھ عرصہ بعد میں نے جواب دیا۔ ابھی کچھ کمالات اور منازل حاصل کرنا باقی ہیں۔ اور میں ان کی امید میں ہوں۔ کہنے لگا۔ اچھا تمہاری مرضی کے مطابق تمہاری موت موخر کر دی گئی ہے۔ اس کے بعد وہ شخص واپس ہوا۔ میں نے اس کی پشت پر جڑے ہوئے مرصع جواہرات دیکھے۔ یہ قصہ مختصراً بیان کیا گیا ہے۔

انجام کفر

فرمایا ایک دفعہ میں رہتک کے شہر میں تفریح کے ارادے سے باہر نکلا راستے کی تھکاوٹ اور دن کی گرمی کے باعث تھوڑی دیر ستانے کے لیے ایک مقبرے میں چلا گیا۔ اندر جاتے ہی مجھے احساس ہوا کہ ان قبور میں آگ بھڑک رہی ہے اور اس کی تپش کے اثرات، میں محسوس کرنے لگا۔ میں نے احباب سے کہا کہ اس مقبرے سے جلدی باہر نکلو۔ کیونکہ یہاں آگ بھڑک رہی ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ یہاں کوئی مسلمان مدفون ہے۔ اتفاقاً اس وقت مجلس میں ایک ہندو بھی موجود تھا۔ وہ متعجب ہو کر کہنے لگا۔ آپ نے کس طرح معلوم کر لیا کہ یہ مسلمانوں کی قبریں نہیں ہیں۔ میں نے کہا کشف کے ذریعے! پھر اس ہندو نے اعتراف کیا کہ یہ مسلمانوں کی قبریں نہیں ہیں بلکہ یہاں چند جوگی زندہ درگور ہو گئے تھے۔ بعد میں لوگوں نے مسلمانوں کی طرز پر ان کی قبریں بناڈالیں۔

اولیاء اللہ کے ساتھ بحث و تکرار

فرمایا ایک صاحب کشف بزرگ سے جو بعض کشفی مسائل کے بارے میں اکثر مجھ سے جھگڑتے رہتے تھے۔ میں نے معاہدہ کیا کہ ہم دونوں میں سے جو بھی اس دنیا سے پہلے انتقال کر جائے وہ دوسرے کو ان مسائل کی حقیقت سے مطلع کرے۔ اس بزرگ کی وفات کے بعد میں نے اسے دیکھا کہ وہ فردوس بریں میں بلند مقام پر فائز اور گوناگوں نعمتوں سے بہرہ مند ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس کی بصارت کمزور ہے۔ میں نے بصارت کی کمی کا سبب پوچھا تو کہنے لگا کہ اس

کا باعث وہی عقیدہ ہے کہ جس پر میں تمہارے ساتھ بخششیں کیا کرتا تھا۔

کاتب الحروف (شاہ ولی اللہ) عرض پرداز ہے کہ شیخ عبدالباقی لکھنوی نے وحدت الوجود کے متعلق بہت مطالعہ کیا ہوا تھا لیکن کم فہمی کی بنا پر عبادات اور اسلامی عقائد کے بارے میں سست واقع ہوئے تھے۔ ان کی وفات کے بعد والد گرامی ان کے مزار پر تشریف لے گئے اور کچھ دیر وہاں قیام فرمایا۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ عبادات وعقائد میں کمزوری اور سستی کی وجہ سے ماخوذ تھے لیکن میں نے ان کی شفاعت کر دی ہے۔

از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است

فرمایا ایک دفعہ اکبرآباد میں بارش اور ہواؤں کے موسم میں سوار ہو کر جا رہا تھا، دیکھا کہ راستے میں ایک جگہ کتے کا پلا دلدل میں ڈوب رہا ہے اور خوب زور زور سے چلا رہا ہے یہ دیکھ کر اس کی دردناک آواز سے میرا دل بھر آیا۔ میں نے خادم سے کہا کہ جلدی جاؤ اور اس پلے کو باہر نکالو! اس نے نفرت کا اظہار کرتے ہوئے انکار کیا میں جلدی جلدی گھوڑے سے اترا کپڑے اوپر چڑھائے اور پانی میں اترنے کے لئے آگے بڑھا۔ خادم نے جب یہ صورتحال دیکھی تو چاروناچار وہ خود آگے بڑھا اور پلے کو باہر نکال لایا۔ قریب ہی ایک حمام تھا۔ وہاں سے گرم پانی لے کر میں نے اس کو نہلایا طباخی سے روٹی اور شوربا لے کر اسے خوب کھلایا۔ پھر میں نے کہا یہ کتا اس محلے کا ہے۔ اگر اس محلے والے اس کی خبر گیری کا ذمہ اٹھائیں تو بہتر ورنہ ہم اس کو اپنے محلے میں لے جائیں گے۔ طباخی نے یہ ذمہ داری قبول کر لی۔ چنانچہ یہ کتا اس کے حوالے کر کے میں رخصت ہو گیا۔ کچھ عرصہ بعد میں اسی محلے کے اسی کوچے سے گزر رہا تھا میں نے دیکھا کہ سامنے ایک کتا آ رہا ہے اور اس کوچے میں کچھ کیچڑ بھی ہے۔ میرے دل میں آیا اس جگہ سے جلدی گزر جانا چاہئے تاکہ کتے کے ناپاک چھینٹے کپڑوں پر نہ پڑیں۔ میں تیزی سے بڑھا مگر کتا مجھ سے بھی زیادہ تیزی سے آگے آیا، اسی کیچڑ پر ہم ایک دوسرے کے قریب آ گئے مجھے دیکھ کر وہ کتا ٹھہر گیا اور صاف زبان میں کہنے لگا۔ السلام علیک، میں نے وعلیک السلام کہا۔ پھر اس نے کہا تم نے حدیث قدسی میں پڑھا ہے۔ رب العزت فرماتا ہے **یا عبادی انی حرمت الظلم علی نفسی و جعلتہ علیکم محرما فلا تظالموا** ۔ (میں نے ظلم کو اپنے اوپر حرام کر رکھا ہے۔ اسی طرح تمہارے لئے بھی ظلم

حرام ہے۔ پس ظلم نہ کرو) مجھ پر تم نے کیوں ظلم کیا ہے؟ میں نے کہا مجھے تو کچھ علم نہیں کہ میں نے کون سا ظلم کیا ہے۔ اس نے کہا راستہ اور کوچہ انسان اور حیوان دونوں کی گزرگاہ ہے اصولاً ہمیں حسب عادت نرم رفتار سے آنا چاہئے تھا۔ پھر بھی ہم دونوں اگر اکٹھے ہو جاتے تو اس میں کوئی حرج نہ تھا۔ میں نے کہا انسان پر عبادت الٰہی کی بجا آوری کیلئے جسم اور کپڑوں کی پاکیزگی بھی فرائض میں شامل ہے۔ میں نے سوچا میں جلدی سے گزر جاؤں کیونکہ اگر میرے کپڑے ناپاک ہو گئے تو انہیں پاک کرنے میں وقت لگے گا۔ اس نے کہا اس وقت تمہارے دل میں یہ خیال نہ تھا بلکہ تم نے محض کتے سے کراہت اور نفرت کے سبب جلدی گزر جانا چاہا۔ اب اپنے اس فعل کو صحیح ثابت کرنے کیلئے ایک جائز عذر کا بہانہ بنا رہے ہو اگر تمہارے کپڑے پلید ہو جاتے تو وہ پانی کی معمولی مقدار سے پاک ہو سکتے تھے لیکن انسانی قلب تکبر اور خود بینی کی پلیدی سے ناپاک ہو جائے تو وہ سات دریاؤں کے پانی سے بھی پاک نہیں ہو سکتا۔ میں نے اس بات پر اس کی داد دی اور دل میں شرمسار ہوا۔ اس کے بعد میں دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا اور اسے کہا۔ تم نے مجھے نصیحت کی ہے اب اس راستے سے گزر جاؤ۔ کہنے لگا گزشتہ زمانے کے درویش قربانی و ایثار کا جذبہ رکھتے تھے لیکن اس دور کے فقراء اپنے آپ کو ترجیح دیتے ہیں۔ میں نے کہا ان دو لفظوں کی تشریح تو کرو کہنے لگا پہلے فقراء خسیس اپنے لئے اور نفیس دوسروں کیلئے اختیار کرتے تھے۔ لیکن اس دور کے درویش اچھی چیز اپنے لئے لے لیتے ہیں اور بری دوسروں کیلئے چھوڑ دیتے ہیں۔ صاف راستہ تم نے پسند کر لیا ہے اور کیچڑ والا راستہ میرے لئے چھوڑ دیا ہے۔ یہ سنتے ہی میں خراب راستے کی طرف ہو لیا اور اس کیلئے صاف راستہ چھوڑ دیا۔ پھر کہنے لگا۔ اللہ تعالیٰ پاکیزہ عقل عطا کرے اور عقل کور سے بچائے۔

میں نے پوچھا۔ پاکیزہ عقل کیا ہے اور عقل کور کونسی۔ کہنے لگا پاکیزہ عقل یہ ہے کہ بغیر کہے سنے آدمی صحیح راستہ اختیار کرے اور عقل کور یہ کہ جب تک اسے بتایا نہ جائے وہ بھٹکتا رہے۔ اس کے بعد اس نے سلام کیا اور رخصت ہو گیا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو کچھ نہ تھا۔ میں نے جان لیا کہ پلے کو باہر نکالنے کا عمل مقبول ہو گیا ہے اور اس کے نتیجے میں یوں تعلیم و تربیت دی جا رہی ہے۔

واقف اسرار چڑیا اور موحد کوا

فرمایا۔ رمضان المبارک کے آخری دن (جب کہ عید کے چاند کی توقع ہوتی ہے) میں مسجد

حبوط میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک چڑیا آ کر کہنے لگی۔کل عید ہے۔ میں نے یہ بات حاضرین مجلس سے کہی مگر ہو بیک کہنے لگے۔حیوانات کی باتوں کا کیا اعتبار۔اس پر وہ چڑیا کہنے لگی۔جھوٹ بنی آدم کا وطیرہ ہے۔ہم اس سے آزاد ہیں۔پھر وہ اڑ گئی اور اپنی ایک دوسری ہم جنس کو لائی۔اس نے بھی اس بات کی گواہی دی۔اس کے بعد جلد ہی قاضی شہر کے سامنے شرعی شہادتیں پیش ہو گئیں۔کہ عید کا چاند دیکھا گیا ہے۔

کاتب الحروف (شاہ ولی اللہؒ) نے چڑیوں کی گفتگو کے بارے میں پوچھا۔فرمانے لگے ان کی آواز اور چوں چوں بھی بالکل دوسری چڑیوں کی طرح تھی۔مگر لطف ربانی سے میں نے ان کی چوں چوں سے بامعنی مفہوم اخذ کر لیا۔

شیخ فقیر اللہ بیان کرتے تھے کہ ایک جنگلی کوا دوسرے تیسرے دن حضرت کی خدمت میں آیا کرتا تھا اور توحید کے بارے میں باتیں پوچھا کرتا تھا۔کچھ عرصے بعد آپ نے اسے نہ پایا تو راوی (شیخ فقیر اللہؒ) سے پوچھا کہ اکثر یہاں پر ایک کوا بیٹھا کرتا تھا جسے میں چند دنوں سے نہیں دیکھ رہا۔میں نے عرض کیا، فلاں شخص نے اسے شکار کر کے اپنے شکاری پرندے کو کھلا دیا ہے۔آپ نے بہت افسوس کیا۔رنجیدہ ہوئے اور فرمایا کہ یہ کوا موحد تھا مجھ سے توحید کے بارے میں اکثر سوالات پوچھا کرتا تھا۔

صالح جن

فرمایا ابتدائے حال میں بعض اوقات ساری ساری رات اور بعض دفعہ اکثر شب ذکر الٰہی میں گزرتی تھی۔یہ ذکر کبھی اونچی آواز میں ہوتا کبھی آہستگی سے، ذکر کے وقت ہمارے ساتھ ایک نیک بخت جن بھی انسانی شکل میں شریک ہوا کرتا جب بعض احباب نے اس سے پوچھا کہ تم کون ہو؟ تو اس نے بڑی درشتی سے جواب دیا کہ تم یہ سوال کیوں پوچھتے ہو۔جمعہ کے دن میرے وعظ میں بھی شریک ہوا کرتا تھا۔ایک دفعہ حاضرین میں سے ایک شخص نے پوچھا کہ جنات میں سے ایسے بھی ہوتے ہیں جو نماز اور روزہ ادا کرتے ہوں۔میں نے کہا۔ہاں یہ شخص جو تمہارے درمیان موجود ہے۔جنات کے متقی افراد میں سے ہے وعظ سننے کے لئے آیا کرتا ہے۔یہ سن کر وہ ایسا غائب ہوا کہ پھر نظر نہ آیا۔کاتب الحروف (شاہ ولی اللہؒ) نے اس کی شکل وشباہت کے بارے

میں پوچھا تو آپ نے فرمایا۔ اس کی پیشانی اور آنکھوں سے وحشت ٹپکتی تھی۔

جن کی ہمدردی

فرمایا ایک جن نے مجھ سے بیعت کے اشغال واوراد سیکھے۔ ایک دن میں گھوڑے پر سوار جارہا تھا کہ وہ متشکل ہو کر میرے سامنے آگیا اور صلوٰۃ و تسبیح کے بارے میں پوچھنے لگا۔ میں نے اسے بتایا، جہاں میری بات اسے پوری طرح سمجھ میں نہ آتی۔ وہ دوبارہ پوچھتا۔ یہاں تک کہ اچھی طرح سمجھ گیا۔ ایک دن محمد غوث کی چارپائی، پریاں اٹھا کر لے گئیں اور اسے تکلیف پہنچانے لگیں۔ یہی جن وہاں پہنچ گیا اور اس نے پریوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر محمد غوث کو چھڑایا اور اسے کہا کہ حضرت والا سے سلام کے بعد کہنا کہ یہ پریاں تھیں جو تمہیں ایذا پہنچارہی تھیں۔ میں نے انہیں ڈانٹ کر بھگا دیا ہے۔ ایک بار اور آکر کہنے لگا۔ میرا دکن جانے کا ارادہ ہے۔ معلوم نہیں وہاں سے زندہ واپس آسکوں یا نہ۔ میری نجات کے لئے دعا کیجئے۔ میں نے دعا کی۔ اس کے بعد پھر وہ نظر نہ آیا۔

ایک متعلّم جن کا نظام الاوقات

فرمایا اکبر آباد میں میرزا محمد زاہد کے درس سے واپسی پر سید لطف سون پتی کے دروازے سے میرا گزر ہوا تو دیکھا کہ وہ دروازے پر پریشان کھڑے ہیں۔ میں نے سبب پوچھا تو فرمانے لگے۔ ایک عجیب مصیبت میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ مجھے گھر کے اندر لے گئے۔ ان کی ایک عزیزہ کو جن نے پاگل کر رکھا تھا مجھے دیکھتے ہی وہ تعظیم کے لئے اٹھا اور سلام کیا۔ میں نے کہا تم کون ہو؟ اس نے کہا میرا نام عبداللہ ہے اور میں محمد طاہر کے درس میں انسانی شکل میں پڑھتا ہوں۔ جس روز آپ اکبر آباد میں داخل ہوئے تھے اور محمد طاہر اپنے تلامذہ سمیت آپ کے استقبال کے لئے شہر سے باہر آئے تھے تو میں بھی ان میں موجود تھا۔ میں آپ کو اچھی طرح جانتا ہوں البتہ آپ مجھے نہیں پہچانتے۔ میں نے کہا کیا پڑھتے ہو؟ کہنے لگا کافیہ میں مفعول مطلق کی بحث کا وہ حصہ پڑھ رہا ہوں جہاں سے مصنف لبیک وسعدیک سے بحث کرتے ہیں۔ میں نے کہا ان دونوں لفظوں کی اس طرح نحوی تشریح کرو کہ جسے کوئی طالب علم بیان نہ کر سکتے ہوں۔ اس نے تشریح کی میں نے کہا میں محمد طاہر سے تمہاری سفارش کروں گا تاکہ وہ تمہاری طرف زیادہ توجہ رکھیں۔ اس نے کہا اگر

انہیں پتہ چل گیا کہ میں جن ہوں تو وہ مجھے ہرگز نہیں پڑھائیں گے۔ پھر اس نے کہا میرا طریقہ یہ ہے کہ میں رات کو چار حصوں میں تقسیم کر لیتا ہوں۔ ایک حصے میں نماز پڑھتا ہوں۔ دوسرے میں نفی واثبات کرتا ہوں۔ تیسرے حصے میں کافیہ کا مطالعہ کرتا ہوں اور آخری حصے میں آرام کرتا ہوں اور دن بھر محمد طاہر کے پاس رہتا ہوں۔ ایک اونچی کھڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے کہا میں یہاں رہتا ہوں۔ اس عورت نے اس مقام پر پیشاب کر کے میری جگہ کو ناپاک کر دیا ہے اور میرے نظام الاوقات کو خراب کر دیا ہے۔ اسی لئے میں نے اسے تکلیف دی ہے آپ نے حکم دیا۔ فوراً ہی اس جگہ کو پاک کر کے خوشبو میں بسا دیا گیا۔ چنانچہ اس انتظام سے وہ باغ باغ ہو گیا اور واپس چلا گیا۔ اسی وقت وہ عورت ہوش میں آ گئی اور شرم وحیا کے مارے اپنا چہرہ ڈھانپنے لگی۔

••••••••••••••••••••

شاہ عبدالرحیمؒ کے تصرفات، مکاشفات اور دیگر کرامات کا بیان

طریق تربیت

فرمایا شیخ عبدالاحد سرہندیؒ کی مجلس میں ایک آدمی کہنے لگا کہ اس زمانے میں کوئی صاحب کرامت نہیں ہے۔ انہوں نے شخص مذکور کے غلط عقیدہ کی اصلاح کے لئے اسی کے سامنے سات روپئے میری نذر کے لئے مقرر کردیئے۔ پھر فرمایا پہلے پانچ روپئے پیش کریں گے۔ دیکھیں کیا فرماتے ہیں۔ پھر مجھے کہلا بھیجا کہ آج میں آپ کی ملاقات کے لئے آرہا ہوں۔ میں نے کہا مقدر یہ ہے کہ میں آپ کی ملاقات کے لئے آؤں۔ انھوں نے فرمایا تکلیف نہ کریں۔ میں نے سواری کا انتظام کرلیا ہے۔ میں نے کہا سواری کا ارادہ بے سود ہے ہمارے درمیان جب یہ بات بڑھی تو ہم نے ایک درمیانی جگہ کا انتخاب کرلیا کہ ہم میں سے جو بھی پہلے اس مقام پر پہنچے گا وہ دوسرے کو واپس لے جائے گا۔ میں نے گھوڑے کے لئے بہت کوشش کی لیکن کہیں سے میسر نہ آسکا۔ اسی طرح شیخ عبدالاحدؒ نے پالکی تیار کرائی لیکن انہیں چوتھا کہار نہ مل سکا۔ آخری وقت میں ان سے پہلے اس جگہ پہنچ گیا اور انہیں واپس ان کے دولت کدہ پر لے گیا۔

جب ہم وہاں پہنچے تو انھوں نے پانچ روپے میرے سامنے رکھ دیئے اور فرمانے لگے یہ آپ کی نذر ہیں۔ میں نے کہا میری نذر یہ نہیں۔ میری نذر تو سات روپئے ہے چنانچہ انھوں نے پورے سات روپئے پیش کئے۔ اس کے بعد شیخ عبدالاحدؒ کے ازراہ خوش طبعی فرمایا کہ اس کامیاب امتحان پر آپ کی خدمت میں دو روپے اور بھی پیش کرنے چاہئیں۔ چنانچہ دو روپے مزید مجھے پیش کئے گئے۔ پھر فرمایا یہ سب کچھ اس شخص کی اصلاح کے لئے کیا ہے۔

مستقبل بینی

فرمایا شیخ عبدالاحدؒ رمضان المبارک کے آخری عشرے میں اعتکاف میں تھے۔ میں ان سے ملاقات کے لئے وہاں پہنچا، اثنائے گفتگو میں انہوں نے کہا پرسوں عید ہے۔ پھر ملاقات ہوگی۔ میں نے کہا نہیں بلکہ عید اس کے بعد ہوگی فرمانے لگے۔ جنتری والے یہی کچھ کہتے ہیں۔ میں نے کہا لیکن میرا حساب یوں کہتا ہے۔ چنانچہ جیسے میں نے کہا تھا اسی طرح وقوع پذیر ہوا۔

نگاہ دوررس

فرمایا ایک دفعہ شیخ عبدالاحدؒ پورب یا کسی دوسرے علاقے سے واپس آئے تو میرے لئے ایک تحفہ بھی لیتے آئے مگر فرمانے لگے کہ کشف سے بتلا دیں کہ کیا لایا ہوں تو سمجھوں گا کہ تحفہ قبول ہو گیا۔ میں نے کہا ابھی تو معلوم نہیں، بعد میں بتلا سکوں گا۔ چند دنوں بعد میں جائے آرام واستراحت میں تھا کہ اس ہدیے کی شکل مجھے دکھائی گئی۔ جب دوسری بار ملاقات ہوئی تو میں نے کہا کہ یہ ایک دوہرے رنگ کا کپڑا ہے ایک حصہ سبز پھولدار ہے اور دوسرا حصہ بادامی رنگ کا ہے اور وہ بناوٹ میں ہمارے لباس کی طرح نہیں ہے۔ یہ ایک ایسی چادر ہے کہ اس کی بالائی طرف مدور اور زیریں حصہ مستطیل ہے یہ چادر ایک چہار خانہ کپڑے میں لپٹی ہوئی ہے۔ کہنے لگے اور تو ساری بات درست ہے لیکن وہ چار خانہ کپڑے میں لپٹی ہوئی نہیں ہے۔ کچھ روز بعد انھوں نے یہ کپڑا ایک آدمی کے ہاتھ بھجوایا لیکن اس وقت وہ مذکورہ کپڑے میں لپٹا ہوا تھا۔ انھوں نے اس کے متعلق پتہ کیا تو معلوم ہوا کہ پہلے یہ کپڑا ایک دوسرے کپڑے میں باندھا ہوا تھا۔ جب وہ کپڑا کام آ گیا تو پھر اسے چار خانہ کپڑے میں لپیٹ کر رکھ دیا گیا۔ اس درمیانی تبدیلی کا شاہ عبدالاحدؒ کو علم نہیں ہو سکا تھا۔

جو چاہے سو آپ کرے

فرمایا کہ شیخ عبدالاحدؒ سرہند سے چار حل طلب مسئلے لے کر میرے پاس آئے جب باتیں چلیں تو کہنے لگے ایک تو ان میں سے بہت ہی آسان ہے۔ دو اوسط درجے کے اور چوتھا بمشکل پورا ہونے والا ہے۔ اس پر میں نے کہا کہ جسے تم زیادہ مشکل سمجھ رہے ہو وہ تو بادشاہ سے پہلی ملاقات میں ہی پورا ہو جائے گا اور وہ دو جو اوسط درجے کے ہیں ایک دو تین مہینے بعد اور دوسرا پانچ چھ مہینے میں پورا ہو جائے گا اور جسے تم آسان سمجھ رہے ہو اس کا ہونا نہ ہونا میری زبان پر موقوف ہے۔ جب تک میں نہیں کہوں گا اس کے حل کی کوئی صورت نہیں نکل سکتی! اس گفتگو کے بعد انھوں نے بادشاہ سے ملاقات کی۔ میری ترتیب سے بتایا ہوا پہلا عقدہ اسی وقت حل ہو گیا اور دوسرا تیسرا میری بتائی ہوئی میعاد کے مطابق مگر چوتھا جوں کا توں رہ گیا۔ دوبارہ ملاقات کی اور مجھ سے توجہ کے طالب ہوئے۔ میں نے کہا ایسے نہیں پہلے تمہیں شہر کے ان بزرگوں سے رجوع کرنا چاہئے جو

کشف و کرامت میں شہرت تامہ رکھتے ہیں اور ان سے مشکل حل ہونے کی میعاد مقرر کرنی چاہیے۔ مشائخ میں سے ایک نامور صاحب کشف بزرگ کے پاس گئے۔ انھوں نے تین ہفتے کی میعاد مقرر کی۔ وقت گزر گیا مگر مطلوبہ کام کی خوشبو تک ان کے دماغ تک نہ پہنچی۔ پھر دوسرے بزرگ کی طرف رجوع کیا۔ انھوں نے ایک ماہ کا عرصہ بتلایا۔ وہ بھی گزر گیا مگر کام ہونے کے کچھ آثار نظر نہ آئے۔ پھر میرے پاس لوٹ کے آئے اور توجہ کے طالب ہوئے۔ میں نے کہا کچھ فرصت چاہیے تا کہ خود بخود میری زبان سے عقدہ حل ہونے کی بشارت نکلے۔ انھوں نے اپنا عقدہ کاغذ پر لکھ کر فقیر اللہ کے حوالے کر دیا تا کہ روزانہ اشراق اور نماز عشاء کے بعد وہ مجھے دکھاتا رہے۔ ایک مدت ہوئی اور انتظار کی گھڑیاں حد سے بڑھ گئیں۔ اتفاق سے ایک دن طبیعت کھل اٹھی اور میں نے فوراً کہہ دیا کہ آج بادشاہ کے پاس جائیے کام ہو جائے گا۔ وہ اسی دن دربار میں چلے گئے۔ بادشاہ نے توجہ سے پوچھا کہ کوئی مطلب ہے تو بتلائیے۔ انھوں نے سارا قصہ بیان کیا۔ اسی وقت ان کے حسب منشا کام سرانجام پا گیا۔

ختم خواجگان

فرمایا کہ میں شیخ عبدالاحدؒ کے دولت کدہ پر گیا۔ وہ ختم خواجگان پڑھ رہے تھے۔ مجھے بھی اس میں شریک ہونے کی درخواست کی۔ میں نے کہا ختم پڑھنا بے سود ہے۔ اس سے آپ کا کام نہیں ہوگا۔ کہنے لگے کیا آپ کو معلوم ہے کہ کون سا کام ہے؟ میں نے کہاں۔ فلاں کام ہے اور اس کا حل ایک عورت کے ہاتھ میں ہے جن کی شکل ایسی ہے اور عمر یہ ہے۔ اسی طرح میں ان کی زندگی کا پورا کچا چٹھا بیان کرنے اور ان کے کرتوت ظاہر کرنے لگا تو وہ کہنے لگے خدارا بس کیجیے راز ظاہر ہوتے ہیں۔

آداب مجلس اولیاء

حضرت والد ماجدؒ ایک دفعہ شیخ عبدالقدوسؒ کے گھر گئے تو انہوں نے اپنے بیٹے سے کہا کہ حضرت کی خدمت میں شربت گلاب پیش کرو۔ وہاں دو بوتلیں رکھی تھیں۔ لڑکے نے بڑی بوتل رکھ دی اور چھوٹی لا کر پیش کی۔ حضرت والد ماجد نے ہنستے ہوئے فرمایا کہ بیٹے بڑی بوتل کیوں چھوڑ آئے ہو وہ بھی لے آؤ۔

کاتب الحروف (شاہ ولی اللہ) کہتا ہے کہ شیخ عبدالاحدؒ بیمار ہوئے اور حضرت والد ماجد عیادت کے لئے تشریف لے گئے۔ فقیر بھی ہمراہ تھا۔ شیخ نے صحت کے لئے دعا کی درخواست کی تو حضرت والد چپ ہو گئے۔ ان کے عزیزوں نے دعا کے لئے زور دیا تو پھر بھی خاموش رہے بالآخر شیخ عبدالاحدؒ نے حضرت والد کے دل کی بات سمجھ لی اور اپنے عزیزوں کو دعا کے لئے مجبور کرنے سے منع کر دیا کہ اولیاء کی بارگاہ میں اصرار نہیں کرنا چاہئے۔ حضرت والد ماجد وہاں سے اٹھے تو فقیر سے فرمایا کہ شیخ کی زندگی کے دن پورے ہو گئے ہیں۔ اس وقت دعا سے کچھ فائدہ نہ ہوتا۔ میری خاموشی میں یہی حکمت تھی۔ شیخ چند دنوں بعد آغوش رحمت میں چلے گئے۔

فراست مومن

ایک دن حضرت والد ماجد اس فقیر کو علم و عرفان کے عجیب نکتے تعلیم فرما رہے تھے کہ حدیث نبویؐ اتقوا فراسة المومن فانه ینظر بنور الله کی بحث چل نکلی۔ اس کی تشریح میں آپ نے دو قصے بیان فرمائے ایک قصہ شیخ رفیع الدین کی فراست کا جو اپنی جگہ بیان ہوگا اور دوسرا قصہ اپنی فراست کا کہ ایک مرد فقیرانہ وضع، نقاب پوش حد درجہ دردمند جو ہر لمحے کوئی نہ کوئی عاشقانہ شعر یا پرسوز ہندی دوہے پڑھتا اور گریہ وزاری کرتا رہتا تھا! میرے پاس آیا اور رشد و ہدایت کی طلب کے ساتھ قیام کے لئے حجرہ بھی مانگا۔ میں نے بالکل انکار کر دیا۔ جب وہ چلا گیا تو میں نے کہا یہ کالا سانپ ہے اس سے ڈرنا چاہئے۔ حاضرین نے اس بات کو تسلیم کرنے میں تامل کیا ایک مدت کے بعد وہ فقیر عورتوں کے لباس میں آیا اور عاقل خاں صوبیدار دہلی کے گھر میں خیرات کی تقریب میں عورتوں کے ساتھ چلا گیا۔ باہر آتے وقت ایک دربان نے اس کی رفتار دیکھ کر کہا کہ یہ تو عورتوں کی چال نہیں ہے اور تجسس کے خیال سے اس کے پیچھے چل پڑا۔ حقیقت حال واضح ہو گئی اور اسے قید کر لیا گیا۔ بالآخر معلوم ہوا کہ وہ کسی عورت کو بھگاتے ہوئے پھر رہا تھا۔ اسی لئے اس نے نقاب پوشی اور گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی۔ اس کا فقیرانہ سوز و ساز اور دردمندی محض ایک چال تھی

دست پیر از غائباں کوتاہ نیست

فرمایا عبدالحفیظ تھانیسری نے اپنے وطن جانے کا ارادہ کیا اور میرے پاس رخصت کے لئے آئے۔ ایک دستار اور نصف روپیہ نذرانہ بھی لائے اور چاہا کہ دوسرا نصف روپیہ مخدومی محمد

ابوالرضاء کی خدمت میں پیش کرے۔ میں نے خوشدلی سے کہا کہ تمہیں اعظم آباد کے میدان میں بہت خوفناک مشکل پیش آئے گی۔ بہلی کا ایک پہیہ نکل جائے گا۔ میدان میں اسے ٹھیک کرانا بہت مشکل ہو جائے گا۔ جو شخص بہلی کی سواریوں کی حفاظت کرے گا چوروں اور ڈاکوؤں کی مار دھاڑ سے بچانے اور ساز و سامان کی حفاظت میں کوشش کرے گا۔ مناسب ہے کہ اسے پورا روپیہ دیا جائے۔ اسنے پورا روپیہ مجھے دے دیا اور رخصت ہو گیا۔ ایک مدت کے بعد جب واپس لوٹا تو کہا کہ اس خوفناک وادی میں جہاں ڈاکوؤں کا بہت خطرہ تھا۔ بہلی کا پہیہ جدا ہو گیا اور کچھ دور تک بغیر پہیے کے گاڑی چلتی رہی۔ ہمیں کوئی تکلیف بھی نہ پہنچی اور پھر اس بیابان میں آسانی کے ساتھ ٹھیک ہو گئی۔ یہاں تک کہ ہم ساتھ والے قافلے سے ذرا بھر پیچھے نہ رہے۔

چراغ فقر ہوا بھی جسے بجھا نہ سکی

سننے میں آیا ہے کہ ایک دن مخدومی شیخ ابوالرضا محمد کی مجلس میں توجہ اور تاثیر کی بات چل پڑی۔ رات کا وقت تھا۔ تیز ہوا چل رہی تھی۔ چراغ روشن کرنے کا کوئی امکان ہی نہیں تھا۔ حضرت والد نے فرمایا کہ نگاہیں چراغ پر مرکوز رکھو، قدرت کے عجیب تماشے مشاہدے میں آئیں گے۔ چراغ کو پیالے میں رکھ کر لے آئے۔ حضرت والد چراغ کی طرف متوجہ ہوئے۔ جب حضرت نے پوری دلجمعی کے ساتھ توجہ ڈالی تو پیالہ بھی چراغ سے ہٹا دیا گیا۔ چراغ خوب جل اٹھا اور اس کے شعلے میں آندھی کے اثر کی کوئی لپک نہ تھی۔

توجہ و تاثیر

فرمایا محمد مظفر نے مجھے خط لکھ کر ایک آدمی کے ہاتھ روانہ کیا، جس میں لکھا تھا کہ خط لانے والا تاثیر و توجہ کا منکر ہے۔ اگر اس پر نگاہ عنایت ہو جائے تو اس کے لئے ہدایت کا سبب بن جائے گی۔ خط پڑھتے ہی میں نے اس پر توجہ ڈالی تو وہ بے ہوش ہو کر کلیتاً اپنے آپ سے بے خبر ہو گیا اور انکار تاثیر کے عقیدے سے تائب ہوا۔

ایک منکر سے بزور نذر وصول کی

حضرت والد ماجد نے فرمایا کہ فرہاد بیگ کو ایک مشکل پیش آئی۔ اس نے نذر مانی کہ بار خدایا اگر میری مشکل حل ہو جائے تو اتنی رقم حضرت والد (شاہ عبدالرحیم) کی خدمت میں ہدیہ

پیش کروں گا۔ وہ مشکل حل ہوگئی تو نذر کا خیال دل سے جاتا رہا۔ کچھ دنوں بعد اس کا گھوڑا بیمار ہو کر ہلاکت کے قریب پہنچ گیا۔ مجھے اس بات کی روحانی طور پر اطلاع ہوئی تو ایک نوکر کے ہاتھ کہلا بھیجا کہ یہ بیماری نذر پوری نہ کرنے کے سبب ہے۔ اگر گھوڑا بچانا چاہتے ہو تو جو نذر فلاں موقع پر تم نے مانی تھی وہ بھیج دو۔ یہ سن کر وہ نادم ہوا اور نذر بھجوا دی۔ اسی لمحے اس کا گھوڑا تندرست ہو گیا۔

ولی اور عامل میں فرق

فرمایا ایک مستجاب الدعاء شخص ایران کے راستے روم سے ہندوستان پہنچا۔ اسے عبداللہ چلپی کہتے تھے۔ اس سے بہت سے عجائبات مشاہدے میں آئے۔ ان میں ایک تو یہ دیکھا گیا کہ وہ اپنے حجرے میں چالیس دن تک بغیر روٹی اور پانی کے اعتکاف میں رہا۔ حجرے کا دروازہ بند کر دیا تھا۔ اپنے پورے وجود کے ساتھ بغیر کسی مزاحمت کے وہ باہر نکل آتا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ وہ کمرے کے اندر اندھیرے میں قرآن مجید لکھا کرتا تھا اور بارہا یہ بھی دیکھا گیا کہ وہ زمین کے اندر دھنس جاتا اور جہاں سے چاہتا باہر نکل آتا تھا۔

لوگ کہتے تھے کہ یہ صاحب کرامات اولیاء میں سے ہے۔ میں بھی اسے دیکھنے چلا گیا۔ ان دنوں وہ ایرانیوں میں سے ایک کے گھر بادشاہ سے چھپ کر رہ رہا تھا۔ پہلے پہل جاتے ہی میں رافضیوں میں گھل مل گیا۔ بارہ مسائل میں گفتگو چل پڑی۔ میں نے تمام مسائل میں الزامی جوابات دے کر انہیں خاموش کر دیا، داد دیتے اور میری باتیں قبول کرتے رہے مگر آغاز گفتگو میں میں نے انہیں یہ نہیں بتایا کہ میں سنی ہوں بلکہ یوں کہا کہ میرا مذہب خذ ما صفا دع ما کدر (اچھی چیز لے لو بری چھوڑ دو) ہے۔ اس بناء پر وہ کچھ تعصب سے پیش نہ آئے اور موقع سے فائدہ اٹھا کر میں نے ایک ایک مسئلہ دلائل برہانی، خطابی اور الزامی جوابات کی صورت میں ان کے سامنے بیان کیا۔ وہ قبول کرتے رہے اور انکار کی گنجائش نظر نہ آئی۔ ان سے نمٹ کر میں نے عبداللہ سے ملاقات کی مگر اس کے اندر میں نے طریقہ اولیاء میں سے کوئی بہرہ نہ پایا۔ یہ دیکھ کر میں نے اس کی تعظیم سے منہ پھیر لیا۔ ایرانیوں میں سے ایک نے پوچھا کیا سبب ہے کہ انتہائی شوق سے آئے مگر دیکھنے کے بعد منہ پھیر لیا۔ میں نے کہا ولی سمجھ کر آیا تھا مگر یہ تو دعائیں پڑھنے والا نکلا۔ عبداللہ نے یہ سن کر خوب داد دی۔ اس کے بعد وہ دعائے سیفی پڑھنے میں مشغول ہو گیا۔ جب

ایسے مقام پر پہنچا کہ جہاں قواعد نحویہ کی رو سے دو اعراب پڑھنے کا احتمال تھا مگر ذوق و وجدان کی رو سے ایک اعراب متعین تھا۔ اس نے خلاف ذوق اعراب اختیار کیا۔ میں نے اسے کہا کہ غلط پڑھ رہے ہو۔ کہنے لگا یہ غلط نہیں بلکہ ٹھیک ہے اور اس بارے میں مناظرہ کرنے لگا اور دعائے سیفی کے وہ تمام نسخے منگوا لئے جو اساتذہ سے اسے ملے ہوئے تھے۔ تمام نسخے اسی کے اعراب کی تائید کر رہے تھے یہاں تک کہ تیرھواں نسخہ جو حضرت شیخ احمدؒ جام کے تبرکات میں سے تھا! بعض امراء کے گھر سے منگوایا اس میں اعراب میرے موافق نکل آیا۔ داد دی اور اعتراف کیا۔ پھر ایرانیوں سے کہنے لگا جانتے ہو کہ اتنی بحث میں کیوں کر رہا ہوں۔ میں جب بھی اس مقام پر پہنچتا تھا۔ نور کی بجائے ظلمت نظر آتی تھی۔ بالآخر یہ عبداللہ چلپی طریقۂ قادریہ میں مجھ سے بیعت ہوگا۔

دردل گاؤ خر

فرمایا ایک دفعہ سید لطفؒ کے دولت کدہ پر جانا ہوا تو وہاں ایک ایسے فاضل سے ملاقات ہوئی جو صوفیاء کی بعض باتوں کا منکر تھا۔ اتفاقاً نماز کا وقت ہوگیا۔ اسے مصلیٰ پر کھڑا کر دیا گیا۔ اس وقت چولہے پر دیگچہ رکھا ہوا تھا اور نوکر بازار گیا ہوا تھا۔ منکر صوفیاء امام کے دل میں یہ خیال گزرا کہ کہیں طعام نہ جل جائے اور پوری نماز میں اسے یہ خیال ستاتا رہا۔ میں اس کی اس بات پر روحانی طور پر مطلع ہوا اور اس کی اقتداء چھوڑ کے تنہا نماز شروع کر دی۔ جب وہ نماز ختم کر چکے تو میرے ساتھ رنج سے پیش آئے کہ اکیلے نماز پڑھنے کا کیا سبب تھا؟ میں نے کہا تم تو نماز میں اپنے نوکر کے پیچھے دوڑ رہے تھے اور طعام پکار رہے تھے۔ پھر میں تمہاری اقتداء کیسے کرتا! یہ سن کر اس نے داد کے طور پر اعتراف کیا اور احوال صوفیاء کے انکار سے رجوع کیا۔

تاثیر توجہ جانور پر اثر انداز مگر عابد معترض کے لئے بے سود

حضرت والد ماجد سے اجمالاً اور ان کے بعض احباب تفصیلاً سننے میں آیا ہے کہ سرہند کا ایک شخص طبعی طور پر منکر ولایت تھا۔ پہلے پہل ایک بزرگ سے بیعت کر کے اس سے فیضان حاصل کیا۔ اتفاقاً عید کے دن شیخ بزرگوار شیخ احمد سرہندی کے صاحبزادے شیخ محمد معصومؒ سے مصافحہ کیا تو انھوں نے فرمایا کہ میاں دیر سے آئے ہو کہاں تھے؟ اور اس قسم کے دو تین جملے از راہ تلطف فرمائے تو اس کا دل ان کی طرف پھر گیا اور آنا جانا شروع کر دیا۔ پہلے بزرگ کے ہاں آنے جانے

میں کمی کر دی۔ جب اسے یہ قصہ معلوم ہوا تو وہ توجہ کے ذریعے شیخ محمد معصومؒ کے ہلاک کرنے پر کمر بستہ ہو گیا۔ انھوں نے مدافعت کی۔ یہاں تک کہ اس کا بھیجا ہوا شر اسی پر پلٹا اور وہ ہلاک ہو گیا۔ اس کے بعد وہ مرید اسی طرح ان کی خدمت میں رہتا رہا۔

کافی مدت کے بعد ادھر سے بھی اس کے دل میں شک و اضطراب پیدا ہوا۔ الغرض اسی طرح وہ درویشوں کے ہاں آتا جاتا اور انکار کرتا رہا۔ اور اس سبب سے کوئی نفع حاصل نہ کر سکا۔ ایک دن میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ کوئی شخص بھی صاحب تصرف نہیں ہے۔ یہ سن کر میں نے اس پر توجہ ڈالی تو بے خود ہو گیا اور اسی بے خبری کے عالم میں دیکھا کہ گویا اسے سبز خلعت دی گئی ہے۔ جب اسے افاقہ ہوا تو اس کا دیکھا واقعہ بھی میں نے اسے بیان کر دیا۔ اس نے واقعہ سن کر اعتراف کیا مگر فطرتاً منکر ولایت ہونے کے سبب کوئی نفع حاصل نہ کر سکا۔

کاتب الحروف (شاہ ولی اللہ) کہتا ہے کہ یہ واقعہ طویل ہے۔ مگر مجھے سبز خلعت پہنانے والے جملے تک ہی یاد رہ سکا واللہ اعلم۔ حضرت والد سے اجمالاً اور ان کے بعض دوستوں سے تفصیلاً یہ بھی سنا ہے کہ ایک مرتبہ آپ نے حالت غلبہ میں بکری پر توجہ ڈالی تو اس پر ایک عجیب حالت طاری ہو گئی تھی۔ کئی دن اسے گھاس اور پانی کا شعور تک نہ رہا اور بالآخر مر گئی۔

رافضیت سے توبہ

فرمایا ایک دفعہ میں دوستوں کی محفل میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس وقت مجھے کشفی طور پر ایک آدمی کی صورت دکھائی گئی اور میرے دماغ میں یہ بات ڈالی گئی کہ یہ شخص تیرے ہاتھ پر رافضیت سے توبہ کرے گا۔ یہ واقعہ میں نے یاران مجلس کو سنایا اور اس آدمی کا پورا حلیہ بھی بیان کر دیا۔ اس واقعہ سے تقریباً بیس سال بعد میں محمد فاضل کے گھر گیا تو وہاں ایک مہمان کو بیٹھا ہوا دیکھا۔ اسے پہچانا اور انتہائی لطف و کرم سے پیش آیا۔ دوستوں نے یہ دیکھ کر تعجب کیا کہ ایک ایسے اجنبی کے ساتھ جو رافضیت اور غلط عقائد کی وجہ سے بدنام ہے۔ اتنی مہربانی کا آخر کیا سبب ہے۔ یہ سن کر میں نے ان سے کہا کہ تمہیں وہ واقعہ یاد نہیں رہا۔ معمولی غور کے بعد انھوں نے بھی اسے پہچان لیا۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ اس نے میرے ہاتھ پر توبہ کر لی۔ کچھ دنوں بعد مفسد لوگوں کی صحبت نے اسے پھر شکوک میں مبتلا کر دیا، تو اسے پیٹ کے درد نے آلیا۔ وہ جان گیا کہ درد کا سبب کیا ہے، پھر توبہ

کرلی! کچھ دنوں بعد پھر شک میں گرفتار ہوگیا تو پھر وہ پیٹ کے شدید درد میں مبتلا ہوا۔ تب دوستوں نے اس کے دماغ میں ڈالا کہ جب تک توبہ النصوح نہ کرو گے ہلاک ہوجاؤ گے اور پھر وہ خالص سنی ہوگیا اور رافضیت سے کلی طور پر بیزار ہوگیا اور دور رہا۔ اس نے مجھ سے طریقت کا سبق بھی لیا۔ شروع میں اس نے پوچھا کہ کونسا طریقہ اختیار کروں! میں نے کہا طریقہ قادریہ سب سے بہتر رہے گا۔ یہ اس لئے کہا کہ رافضی حضرت غوث اعظمؒ سے عداوت رکھتے ہیں۔

نیست برلوح دلم جز الف قامت یار

حضرت والد ماجدؒ سے اجمالاً اور بعض احباب سے تفصیلاً میں نے سنا ہے کہ تاشقلہ بیگ ایک ترکستانی تھا جسے حصول طریقت کا ذوق ترکستان سے بخارا لایا وہاں ایک مدت تک وہ حضرت خواجہ نقشبند کے مزار پر ٹھہرا رہا۔ اسی انتظار میں کہ اولیاء اللہ میں سے کسی ولی کا اسے پتہ دیا جائے۔ آخر حضرت خواجہؒ نے اسے کشف میں فرمایا کہ تیرا پیر ہندوستان کے شہر دہلی میں ہے اور حضرت والد ماجد کی شکل وصورت اسے دکھائی گئی۔ مگر اسے خیال آیا کہ دہلی تو بہت بڑا شہر ہے اس بزرگ کا وہاں ڈھونڈنا دشوار ہوجائے گا۔ اس خیال پر مطلع ہوکر حضرت خواجہ نے فرمایا کہ جس دن دہلی میں داخل ہوگے۔ اسی دن وہ بزرگ تمہیں وعظ کہتے ہوئے ملیں گے۔ اس واقعہ کے بعد تاشقلہ بیگ کو شوق بیعت کشاں کشاں دہلی لے آیا۔ پہلے پہل وہ شیخ فرید کے ہوٹل میں اترا۔ اتفاقاً جمعہ کا دن تھا۔ اس نے جامع مسجد کا پتہ پوچھا تو لوگوں نے اسے مسجد فیروزی کا پتہ دیدیا۔ وہاں پہنچا تو حضرت والد ماجد کو خواجہ نقشبند کے بتائے ہوئے حلیے کے مطابق پایا۔ جب نماز کے بعد حضرت والد نے وعظ فرمایا۔ اسے بھی تاشقلہ بیگ نے اپنے موافق پایا۔ فراغت کے بعد آپ کے ساتھ گھر آیا اور اپنے سر سے دستار اتار کر اظہار عقیدت کیا۔ حضرت نے فرمایا یہ شرط ہے کہ کچھ دن ہماری صحبت میں رہو تاکہ ہمیں سمجھ سکو۔ اس نے یہاں تک پہنچنے کا سارا قصہ بیان کردیا۔ حضرت والد نے اسے اپنی بیعت میں لے کر اشغال واعمال کی تلقین فرمائی کہ اس کے بعد وہ دکن چلا گیا۔ تو پھر واپس نہ آیا۔

حضرت والد ماجدؒ سے اجمالاً اور یاران طریقت سے تفصیلاً سنا کہ مرزا علی خوافی قصبہ خواف کا صحیح العقیدہ اور پاکیزہ خیال سنی تھا۔ حضرت امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ کو خواب میں دیکھا کہ

فرمارہے ہیں تیرا پیر دہلی میں ہے اور ساتھ ہی حضرت والد ماجد کی صورت بھی دکھلا دی کافی عرصے بعد وہ کسی تقریب سے دہلی آیا مگر پھر بھی مدتوں ملاقات نہ ہوسکی۔ بعد میں محمد افضل پھلواروی سے حضرت والد کا نام نامی اور کچھ اوصاف سنے تو فوراً ان کی خدمت میں پہنچا اور بیعت وتلقین سے مشرف ہوا۔ بعض اوقات اس پر وجد کی کیفیت طاری ہوتی تو چہرہ سرخ ہو جاتا اور کہتا کہ تم مجھے اس کے بارے میں ملامت کرتے ہو۔

ایک مرتبہ حضرت والد ماجد قصبہ پھلت میں تھے کہ مرزا علی خوافی گرمی شوق سے بغیر زاد راہ اور سواری کے راستہ نہ جاننے کے باوجود ادھر دوڑ پڑا اور وہاں پہنچ کر عشق شور انگیز اور شوق بلا خیز کی تپش بجھائی۔

حضرت والد ماجد سے اجمالاً اور یاران طریقت سے تفصیلاً سنا کہ صوفی نامی سہارنپوں کا ایک آدمی تھا جو جوانی میں ایک صاحب کشف درویش سے فیض حاصل کرتا رہا اور وہ اسے کہتے تھے کہ تیری بیعت ایک ایسے شخص سے متعلق ہے جو اس شکل وصورت اور وضع قطع کے ہیں اور اس نام سے مشہور واعظ ہیں۔ وہ صوفی اس بزرگ کے انتظار میں بوڑھا ہوگا اور مختلف قسم کے صوفیانہ اشغال اور ریاضتیں بھی کرتا رہا۔ آخر عمر میں محمد اسمٰعیل میرٹھی کے بتلانے پر حضرت والد کی خدمت میں پہنچا اور بیعت وتلقین سے مشرف ہوا۔ آغاز میں اپنے اشغال اور ریاضات خوب بیان کرتا تھا۔ حضرت والد نے فرمایا۔ آغاز اچھا ہے۔ انشاءاللہ دروازے کھل جائیں گے بالآخر وہ حضرت والد کی تربیت سے کامل ہوکر نکلا۔

باران کرم منتظر دست دعا ہے

فرمایا ایک مرتبہ علاقے میں بارش نہ ہوئی۔ لوگوں نے میری طرف رجوع کیا اور دعا چاہی۔ میں نے دعا مانگی اور بوندا باندی شروع ہوگئی۔ میں نے کہا کہ موسلا دھار بارش کا نہ ہونا ہماری دیواروں کی کمزور لیپا پوتی کی وجہ سے ہے۔ گویا تدبیر خداوندی ہماری دیواروں کے گرانے سے احتراز کر رہی ہے۔ لوگ جلدی سے گارا بنا کر لائے اور ہماری دیواروں کی لپائی شروع کردی۔ فوراً ہی موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔

قوت تاثیر کا کرشمہ

فرمایا کہ اکبر آباد میں میرزا ابوالعلی کے پیروکاروں میں علی قلی نامی ایک شخص تھا جو اپنی توجہ وتاثیر کی قوتوں کے سبب مشہور اور ان پر نازاں تھا۔ ایک دن شیخ عبداللہ محدث کو میں نے دیکھا کہ اس کے دروازے پر کھڑے ہیں مگر بار نہیں پا رہے۔ میں نے چاہا کہ اسے اس غلط فہمی پر متنبہ کردوں تو میں نے اپنے اور علی قلی کے درمیان ایک بھاری پتھر رکھوا کر کہا کہ قوت تاثیر یہ ہے کہ اس پتھر کو اپنی طرف کھینچا جائے۔ جب پیمائش کی گئی تو وہ پتھر علی قلی کے مقابلے میں چند انگل زیادہ میرے قریب نکلا۔

روشن ضمیری

فرمایا شیخ ایوب مرادآبادیؒ ہمیں دیکھنے کے لئے آئے۔ ان کی آمد کا اصل مقصد ہمارا امتحان تھا۔ اپنے ساتھیوں، سواریوں اور سامان کو دور چھوڑ آئے اور خود اکیلے اجنبی وضع میں آئے۔ میں اسی وقت تیراندازی کر رہا تھا۔ میں نے انہیں دیکھتے ہی تیر کمان رکھ دیئے اور کہا خوب تشریف لائے۔ آیئے آیئے خیر و عافیت ہے؟ وہ متعجب ہو کر کہنے لگے میں اس سے پہلے آپ کی خدمت میں کبھی حاضر نہیں ہوا۔ کیا آپ مجھے پہچانتے ہیں۔ میں نے کہا کیا تمہارا نام ایوب ہے۔ اس نے کہا حضرت والا نے کیسے معلوم کرلیا کہ میرا نام ایوب ہے۔ میں نے کہا کہ تمہاری صورت دیکھتے ہی میرے دل نے گواہی دی۔ تب شیخ ایوب نے کہا میں جان گیا ہوں بلاشبہ یہ آپ کی کرامت ہے لیکن یہ بتایئے کہ جس کام کے لئے میں لشکر کے ساتھ جا رہا ہوں اس میں کامیاب ہوں گا کہ نہیں۔ میں نے کہا کہ نہیں۔ اس کے بعد لشکر میں چلے گئے اور جتنی بھی کوشش کی کچھ فائدہ نہ ہوا۔

......صید نہ چھوڑ از مانے میں

فرمایا کہ محمد فاضلؒ کے گھر کشتی کے لئے اکھاڑہ بنا ہوا تھا اور وہاں ایک پہلوان اس کے بیٹوں کو کشتی لڑنا سکھاتا تھا۔ ایک دفعہ ایک بلند قامت اور انتہائی طاقت ور پہلوان آیا اور خواہش ظاہر کی کہ تربیت دینے والے پہلوان سے کشتی کے دو ہاتھ کرے۔ یہ بات محمد فاضل کے لئے بھی عزت و ذلت کا مسئلہ تھی۔ بظاہر دونوں کا مقابلہ ناممکن تھا۔ اس لئے اس پر غالب آنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے یہ حالت دیکھ کر کہا ہے کہ جب تک میں اجازت نہ دوں کشتی شروع

نہیں کرنا۔ عین اس وقت کہا اکھاڑہ گرم ہوتا ہم نے چپ سادھ لی اور پھر ایک دم اجازت دیدی۔ اس طاقت ور پہلوان نے اسے جب دونوں ہاتھوں پر اٹھالیا۔ تو کمزور پہلوان نے اپنے دونوں پنجے زمین میں مضبوطی سے گاڑ دیئے اور اپنے پاؤں طاقتور پہلوان کی گردن میں جکڑ لئے اور اپنے پاؤں کی طاقت سے اسے اٹھا کر زمین پر دے مارا۔ یہ دیکھ کر تماشائیوں میں ایک شور بلند ہوا۔

سفر وحضر میں شیخ کی نگاہ الفت

فرمایا محمد فاضل نے چاہا کہ اپنے بیٹے کو اجمیر بھیج دے اور راستے کی بدامنی کے پیش نظر خود بھی اس کے ساتھ جانا چاہا۔ جب مجھ سے رخصت ہونے آیا تو میں نے کہا کہ تمہارے جانے کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ بحفاظت واپس آجائے گا ہاں البتہ واپسی پر اجمیر سے دو منزل ادھر ڈاکو قافلے پر حملہ کریں گے مگر اس کی حفاظت ہمارے ذمہ رہی۔ ہاں البتہ اسے سمجھا دیجئے کہ اس وقت اپنی بہلی الگ ایک طرف کھڑی کر دے۔ جب وہ وقت آیا تو حضرت والا ادھر متوجہ ہوئے اور توجہ کے دوران آپ کے بدن پر ملال ظاہر ہوا۔ حاضرین نے سبب پوچھا تو فرمایا کہ کچھ دنوں کے سخت سفر نے تھکا دیا ہے۔ جب وہ لڑکا واپس آیا تو بیان کیا کہ وہاں ڈاکو آئے ہوئے تھے۔ میں نے اپنی بہلی کو ایک طرف کر دیا۔ وہاں حضرت والا مثالی صورت میں موجود تھے۔ ڈاکوؤں نے پورے قافلے کو لوٹا مگر میری بہلی محفوظ رہی۔

ہر کہ با دردکشاں در افتاد بر افتاد

فرمایا کہ بااقتدار امیر نے محمد فاضل کی ہمسائیگی میں حویلی کے لئے قطعہ لیا، قطعہ کی ساخت کچھ ایسی تھی کہ حویلی میں ٹیڑھ آتی تھی۔ اس نے محمد فاضل سے دگنی تگنی قیمت پر قدرے زمین مانگی مگر وہ نہ مانا۔ بالآخر ان کے درمیان رنجش اور جھگڑا ہو گیا۔ اس امیر نے کہا میں صبح جا کر بادشاہ سے کہوں گا کہ یہ زمین محمد فاضل کی ملکیت نہیں بلکہ سرکاری ہے۔ زمین کا یہ ٹکڑا چھوڑوں گا کسی بھی صورت نہیں بلکہ لے لوں گا چاہے ہزاروں روپے خرچ ہو جائیں۔ محمد فاضل رات کو میرے پاس آ کر حد سے زیادہ گڑگڑایا۔ میں نے اسے کہا کہ وہ بادشاہ سے ہرگز نہیں مل سکے گا اور کسی بھی صورت یہ جھگڑا پیدا نہیں ہوگا۔ چنانچہ صبح سویرے جب وہ امیر گھر سے نکل کر دربار شاہی میں جانے لگا تو راستے میں اسے شاہی سواروں نے آلیا اور کہا کہ بادشاہ نے تمہارے لئے حکم دیا ہے کہ

ابھی ابھی فلاں مہم کے لئے روانہ ہو جاؤ۔ امیر نے کہا میری خواہش ہے کہ بادشاہ سے روبرو مل کر کچھ ضروری باتیں عرض کروں۔ کارندوں نے اس کی یہ بات نہ مانی اور فوراً ہی کوچ کرنے پر مجبور کر کے اسے زبردستی اسی وقت شہر سے باہر نکال دیا اور وہ امیر اسی مہم میں مرگیا چنانچہ اسے محمد فاضل سے جھگڑا کرنے کی فرصت ہی نہ ملی۔

از نہیب او بلرزد ماہ و مہر

کاتب الحروف (شاہ ولی اللہ) کہتا ہے کہ یہ بات بھی عجیب اتفاقات میں سے ہے کہ حضرت والدؒ کچھ عرصہ کے لئے سیر کو نکل گئے۔ اس فرصت میں آپ کی طویل صحبتوں اور کرامات کے مشاہدے کے باوجود محمد فاضل فاسقوں کی صحبت میں آکر شراب کا رسیا ہو گیا۔ جب حضرت والا سیر و سیاحت سے واپس آئے اور یہ قصہ سنا تو سخت برافروختہ ہوئے۔ جلال ولایت کی تاثیر سے مجلس شراب سونی پڑ گئی۔ جام و مینا توڑ دیئے گئے۔ صراحیاں اوندھی کر دی گئیں اور محمد فاضل پر کپکپی طاری ہو گئی اور دوبارہ دختر رز سے رشتہ توڑ کر پکی توبہ کر لی اور یوں اولئک قوم لا یشقیٰ جلیسھم کا مفہوم و معنی دلوں پر نقش ہو گیا۔

جس نے دیکھے نین متوارے ترے

فرمایا کہ شروع شروع میں جس پر بھی محبت کی نگاہ ڈالتا وہ میرا دیوانہ ہو جاتا۔ اس وجہ سے میں کسی پر بھی نگاہ التفات نہیں ڈالتا تھا اور اکیلا محمد فاضل کے بالا خانے پر رہتا تھا۔ ادھر ادھر جاتے وقت اپنے چہرے پر چادر ڈال لیا کرتا تھا۔ اتفاقاً ایک دن ہدایت اللہ بیگ رشتہ داری کی تقریب سے محمد فاضل کے گھر آیا۔ جب اس سے میرا سامنا ہوا تو وہ میرا دیوانہ ہو گیا اور مجھ سے بیعت کی خواہش کی۔ میں نے سن رکھا تھا کہ اسے ایک بزرگ متوکل نقشبندی سے ربط و تعلق ہے میں نے اس سے کہا کہ بات ایک ہی ہے۔ فقراء ایک تن کی مثال ہیں۔ اس بزرگ کا حق مقدم ہے۔ اس لئے انہی سے بیعت کیجئے۔ اس نے دوبارہ اصرار کیا اور اس کی محبت حد سے بڑھ گئی۔ بالآخر میں نے اسے بیعت میں قبول کیا اور کہا کہ ان بزرگ سے بھی تعلق نہ توڑیئے گا! کچھ دنوں بعد اس بزرگ کو خبر پہنچی تو غصہ ہوئے اور ہدایت اللہ بیگ کے ہاتھ کہلا بھیجا کہ ابھی جوان ہو تمہیں حصول طریقت کی کوشش کرنی چاہئے نہ کہ بیعت وارشاد۔ میں نے کہا اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے۔ اس کا

انحصار بڑی عمر پر نہیں ہوتا۔ پھر کہلا بھیجا کہ میں تم سے اس زیادتی کا بدلہ لوں گا۔ میں کہا لا یحیق المکر السیئ الا باھلہ (یعنی چاہ کن را چاہ درپیش) جو کچھ چاہو کر کے دیکھ لو۔ اس کی افتاد تم پر ہی پڑے گی۔ اس نے مجھے تکلیف پہنچانے کے لئے اپنا عمل شروع کر دیا میں نے اپنی مدافعت کی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ اس بزرگ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ اس کے سینے میں خنجر چبھو دیا گیا ہے اور موت سر پر آ پہنچی ہے۔ آدھی رات کے وقت ہدایت اللہ بیگ کو بلوایا۔ اللہ تعالیٰ سے گناہوں کی معافی مانگی اور میرے حق میں نیازمندی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مجھے یقین ہے کہ میری جان نہیں بچے گی مگر انہیں چاہئے کہ میرا ایمان چھیننے کا قصد نہ کریں میں نے انہیں کہلا بھیجا کہ اگر تم ایذا رسانی کا آغاز نہ کرتے تو نوبت یہاں تک نہ پہنچتی۔ بحمد اللہ تمہارے ایمان کو ضرر نہیں پہنچے گا۔ وہ بے چارے اسی رات عالم قرار کو سدھار گئے ان پر اللہ کی رحمت ہو۔

تقدیر شکن قوت باقی ہے، ابھی اس میں

فرمایا بادشاہ اورنگ زیبؒ نے کسی بات پر ہدایت اللہ بیگ کو اپنے منصب سے ہٹا دیا۔ وہ اس بات پر بہت غمگین اور شکستہ خاطر ہو کر میرے پاس آیا مالی پریشانیوں اور کثرت عیال کا رونا روتا رہا۔ اس کے گڑگڑانے سے میرا دل اتنا پسیجا کہ پورے طور پر اس کی طرف متوجہ ہوا۔ پہلے پہل مجھ پر ظاہر کیا گیا کہ اس بارے میں تقدیر مبرم ہو چکی ہے۔ میں نے بارگاہ الٰہی میں التجا کی اور اس بارے میں میری توجہ اس حد تک جا پہنچی کہ اگر یہ کام میرے حسب منشا نہ ہوا تو میں صوفیانہ چولا اتار پھینکوں گا اور دوبارہ صوفیانہ وضع قطع کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھوں گا۔ اسی عالم میں حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ نے محض اپنے فضل وکرم سے میری دعا قبول کر لی اور مجھے بتایا گیا کہ اسے معزول کرنے کا مضبوط اور پختہ انتظام کرنے کے باوجود ہم نے اسے اپنے منصب پر بحال کر دیا ہے۔ میں نے دعا کی بار خدایا یہ عہدہ تو اسے پہلے ہی ملا ہوا تھا۔ میری آہ وزاری کا ثمرہ آخر کیا ہے؟ میرے خیال میں ڈالا گیا کہ اچھا یہ کچھ ہم نے اسے ترقی بھی دیدی ہے۔ صبح سویرے اسے میں نے خوشخبری سنائی۔ بادشاہ نے بغیر کسی ظاہری سبب کے اسے یاد کیا اور کہا کہ ہم نے تمہاری خطا معاف کر کے عہدہ بحال کر دیا ہے اور اس قدر اضافہ وترقی بھی دے دی ہے یہ سن کر اس کے دشمنوں نے جتنی بھی کوشش کی کامیاب نہ ہو سکے۔

کاتب الحروف (شاہ ولی اللہ) کہتا ہے کہ اولیاء اللہ کے اس قسم کے واقعات بیشمار روایت کیے گئے ہیں اور ان کیلئے تاویلات موجود ہیں اور اس پر ہم نے فیوض الحرمین میں تفصیل سے لکھا ہے۔

حکمت ایمانیاں راہم بخواں

فرمایا ہدایت اللہ بیگ نے تجارت کے لئے کچھ اونٹ خریدے۔ میں نے اسے کہا کہ ان میں سے ایک ضرور مر جائے گا۔ لیکن مجھے اس بات کا اختیار دیا گیا ہے کہ میں اپنی مرضی کے مطابق کسی ایک اونٹ کو موت کے لئے منتخب کرلوں۔ چنانچہ میں نے ان میں سے ایک کمزور اور لاغر اونٹ کو متعین کر دیا اور یہ شرط لگا دی کہ اسے آخر تک محفوظ رکھا جائے۔ اس نے سارے اونٹ بیچ دیئے اور سب سے آخر میں اس اونٹ کو بھی فروخت کر دیا۔ لیکن خریدار نے واپس لوٹا دیا۔ اور پھر اسی کے ہاتھ مر گیا۔

حضرت والد ماجد بارہہ کے علاقے میں تشریف لائے ہوئے تھے۔ لوگ بیماروں کے قارورے لائے۔ آپ نے سب کے لئے فوراً نسخے تجویز کر دیئے۔ اس مجلس میں ایک ہندو طبیب بھی موجود تھا۔ ایک بیمار کے قارورے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے عرض کیا۔ حضرت اس کی بیماری بھی معلوم کی ہے یا نہیں؟ آپ نے ہنس کر فرمایا۔ یہ ایک عورت کا قارورہ ہے جس کا نام یہ ہے۔ ہاتھ ایسے ہیں۔ کردار یہ ہے اور اس کا بیماری کا سبب یہ ہے۔ آپ نے سبب ایسا بتلایا جسے بیان کرنے میں اس عورت کو شرم مانع تھی۔ گویا آپ کو اس عورت کا پورا کچا چٹھا معلوم تھا۔ اس ہندو نے یہ سب کچھ سن کر عرض کی کہ حضرت! طب میں یہ مسئلہ کہاں ہے؟ فرمایا یہ طب کی بات نہیں۔ یہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروکاروں کی سچی فراست ہے۔

دست پیراز غائباں کوتاہ نیست

فرمایا کہ مجھے کشف میں دکھایا گیا کہ قصبہ پھلت کو آگ نے گھیر لیا ہے۔ میں نے اس وقت باطنی انداز سے کے مطابق اپنے مخلصین کے گھروں کے اردگرد ایک لکیر کھینچ دی اور ان کو بشارت دی کہ فلاں جگہ سے فلاں جگہ تک سارے گھر آگ سے محفوظ رہیں گے۔ کچھ عرصے کے بعد قصبے کو آگ لگ گئی۔ بعض لوگوں کے گھر جل گئے۔ اہل اللہ کے بارے میں نفاق رکھنے والوں نے اس بات کو موضوع بحث بنالیا۔ میں نے کہا ذرا ذہن پر زور دے کر سوچئے کہ جلنے والے گھر میرے

حصار میں داخل تھے یا اس سے باہر۔ جب انھوں نے سوچ بچار کی تو وہ گھر میری بتائی ہوئی حد سے باہر نکلے اور جھک مارنے والوں کے منھ بند ہو گئے۔

تصرف ولی

فرمایا قصبۂ پھلت کے معتقدین کے دشمنوں نے وہاں کے رئیسوں کو برانگیختہ کیا کہ اس جماعت (فقراء شاہ عبدالرحیمؒ) کے قبضے میں فرمان شاہی سے کچھ زیادہ زمین آئی ہوئی ہے۔ چنانچہ رئیسوں نے کچھ لوگوں کو پیمائش کے لئے مقرر کر دیا۔ اس بات سے پھلت والوں کو سخت پریشانی ہوئی اور مجھ سے التجا کی کہ جب ناپ کرنے والا بھی دشمن ہو تو ہماری تدبیر کیسے چل سکے گی؟ میں نے انہیں تسلی دی اور پیمائش کے دن خود پہنچا۔ کچھ توجہ ڈالی اور ان سے کہا کہ اب پیمائش کرو۔ جس کھیت کی پیمائش کرتے وہ اصل حساب سے بھی کم بیٹھتا۔ پھلت والے پھر رونے لگے کہ اگر سبھی کھیت اصل پیمائش سے کم نکلے تو دشمن پٹواری پر شک کریں گے اور جھگڑے کی بنیاد ختم نہ ہوگی۔ چاہئے کہ کچھ کھیت کم نکلیں، کچھ برابر اور کچھ زائد تا کہ سب کھیت مل کر اجتماعی شکل میں برابر ہو جائیں۔ میں نے دوبارہ توجہ ڈالی۔ اگرچہ پٹواری نے مختلف حیلوں، بہانوں سے کام لینا چاہا۔ مگر اسے کامیابی نہ ہوئی اور پھلت والوں کے حسب منشاء کام ہو گیا۔

میں حقیر گدایان عشق الخ

فرمایا کہ رستم اور اسداللہ ظالم قسم کے رئیس تھے جو قصبہ پھلت کے گرد ونواح کے لوگوں کو ہمیشہ تنگ کرتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ پھلت والوں پر ایک لشکر چڑھا لائے۔ قصبے والے یہ دیکھ کر پریشان ہوئے اور مجھے اپنی بپتا سنائی۔ میں نے کہا تمہیں فتح اور ان کے ٹولے کو شکست فاش ہوگی اور کچھ ہی دنوں میں پابہ زنجیر ہو کر اسی طرح مر جائیں گے۔ جب مقابلے کا دن آیا تو آیۃ کریمہ کم من فئة قليلة غلبت فئة كثيرة باذن الله کا نقشہ سامنے آ گیا۔ اس واقعہ سے چند دن بعد یہ لوگ ڈاکہ زنی، شرانگیزی اور دوسرے جرائم میں ملوث ہوئے اور ان کے کچھ قریب ترین دوستوں نے بادشاہ اورنگ زیب کی خدمت میں ان کا کچا چٹھا پہنچا دیا۔ بادشاہ نے ان کی گرفتاری کے احکام صادر کر دیئے۔ حاکم نے انہیں ہوشیاری سے قید کر کے لشکر کے ساتھ بھیج دیا اور قید ہی میں مر گئے۔

دل راہ بہ دلِ رہ

فرمایا میں پھلت میں تھا۔ میں نے ارادہ کیا کہ صبح سویرے دہلی روانہ ہو جاؤں۔ اس وقت مجھے بذریعہ کشف معلوم ہوا کہ میری بیعت کے لئے ایک بزرگ دور سے آ رہا ہے۔ نماز عشاء کے بعد میں مسجد میں ٹھہر گیا۔ اور میری یہ نشست طویل ہوگئی۔ لوگ تنگ ہونے لگے اور طعام ٹھنڈا ہوگیا۔ معارف آگاہ شیخ محمد نے کہا کہ اب آرام کرنا چاہئے۔ اگر وہ بزرگ آئے تو دوبارہ گھر سے باہر آ جانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ میں نے کہا جب تک وہ نہیں آئے گا میں تو یہیں بیٹھا رہوں گا۔ جب آدھی رات گزری تو گھوڑے کے ٹاپ کی آواز آئی۔ میں نے کہا۔ اب وہ شخص پہنچ گیا ہے اس نے آتے ہی بیعت کر لی اور کہا کہ دن کے پچھلے پہر آنے کا ارادہ تھا مگر انتظام نہ ہو سکا۔ جب رات ہونے لگی تو یہ آرزو لے کر جلدی سے چل پڑا کہ اے کاش حضرت والا کو مسجد میں بیٹھا پاؤں۔

اس فقیر (شاہ ولی اللہ) نے حضرت والد ماجد سے اجمالاً اور بعض احباب سے تفصیلاً سنا ہے کہ سید غلام محی الدینؒ اور ان کے والد بیجاپور کی مہم میں بیمار ہو گئے اور وہ اس سخت مرض میں کافی عرصہ مبتلا رہے۔ اسی اثناء میں ایک رات حضرت غوث اعظمؒ کو خواب میں دیکھا کہ انھوں نے فرمایا اپنے شیخ سے رجوع کیوں نہیں کرتے؟ جب بیدار ہوئے تو حضرت والد کے لئے کچھ نیاز مانی اور دل سے التجا کی۔ تین دن کے بعد خواب میں دیکھا کہ حضرت والد ماجد تشریف لائے ہیں اور ان کے قریب بیٹھ کر تندرستی کی بشارت دے رہے ہیں اور فرمایا کہ آج سے ساتویں دن قلعہ بیجاپور مورچہ غازی الدین خاں کی سمت سے فتح ہو جائے گا۔ اگر لشکر خاں جس کے ساتھ تم شریک ہو غازی الدین خاں کے ساتھ رفاقت کرے تو اس فتح کا سہرا اسی کے سر رہے گا۔ اور اس کی پلٹن کے لئے سرمایۂ افتخار ہو جائے گا۔ یہ کہہ کر آپ نے غلام محی الدین کو سفید چادر پہنائی اور چلے گئے۔ صبح سویرے اس کے والد وفات پا گئے اور وہ تندرست ہوگیا۔ لشکر خاں کو صورت حال سے مطلع کر دیا گیا۔ چنانچہ وہ غازی الدین خاں کے ساتھ شامل ہوگیا اور اسی دن فتح ہوگئی جس سے اسے کافی مالی فائدہ پہنچا۔

حضرت والد نے بیماری، تندرستی، وفات، فتح اور غازی الدین خاں کے لشکر کی رفاقت یہ سب کچھ دوستوں کے سامنے یہاں بیان کر دیا تھا، کچھ عرصے بعد ان کا خط پہنچا۔ اس سے معلوم ہوا

کہ آپ کی باتیں پوری ہو کے رہیں۔

امداد اولیاء

فرمایا کہ اسد علی کا اپنے بعض ساتھیوں سے جھگڑا ہو گیا۔ ان سب نے مل کر اسے ہلاک کرنے کی ٹھان لی۔ یہ میرے پاس آ کر بہت گڑگڑایا۔ میں اس کی طرف متوجہ ہوا اور کہا کہ جاؤ مضبوط رہو اور کسی سے مت ڈرو! چنانچہ اس کے دشمن کئی ہزار مددگاروں کے ساتھ اس پر چڑھ دوڑے حالانکہ اس کے ساتھ صرف بیس ساتھی تھے۔ بالآخر لڑائی کے دوران میری شکل دیکھی کہ ثابت قدمی کا حکم کر رہا ہوں، چنانچہ اس نے بندوق داغ دی جو دشمن کے گھوڑے کو جا لگی۔ وہیں ڈھیر ہو گا اور دشمن مرعوب ہو کر بھاگ گئے۔

کیا ہے جو ان پہ عیاں نہیں

فرمایا محمد قلی اورنگ زیب کے لشکر کے ساتھ گیا ہوا تھا۔ اس کے جانے پر کافی مدت گزر گئی اور اس کی طرف سے خیریت کی کوئی خبر نہ پہنچی۔ اس کا بھائی محمد سلطان بہت غمگین ہوا اور مجھ سے التجا کی۔ میں نے پوری قوت سے توجہ کی۔ جنگی لشکر کا خیمہ خیمہ چھان مارا مگر کہیں نہ پایا مردوں میں ڈھونڈا تو بھی نہ دیکھا۔ شاہی لشکر کے آس پاس نظر دوڑائی تو دیکھا کہ بیماری سے صحت یاب ہو کر غسل کیا ہے اور گیروے رنگ کے کپڑے پہن کر کرسی پر بیٹھا ہوا ہے اور آنے کی تیاریوں میں ہے۔ میں نے یہ سب کچھ اس کے بھائی کو بتا دیا۔ چنانچہ دو تین ماہ بعد وہ آیا اور میری تمام باتوں کی تصدیق کر دی۔

کاتب الحروف (شاہ ولی اللہ) کہتا ہے کہ خواجہ محمد سلطانؒ نے ایک گھوڑا لے رکھا تھا جو اس نے حضرت والدؒ کو دکھایا۔ آپ نے اسے تنہائی میں بلایا۔ اس وقت یہ فقیر بھی وہاں موجود تھا اور فرمایا کہ گھوڑا خوب ہے مگر اس کی عمر تھوڑی ہے۔ اس کی ایک بدزبان اور بدعادت بیوی تھی جس سے وہ تنگ آ چکا تھا۔ عرض کی کیا ہی اچھا ہو مگر اس عورت کی زندگی گھوڑے کو مل جائے۔ آپ نے متبسم ہو کر فرمایا ایسا ہی ہو جائے گا۔ تین مہینے نہ گزرے تھے کہ اس کی بیوی مر گئی اور گھوڑے کو بیچ کر خوب نفع کمایا۔

مال زکوٰۃ

فرمایا کہ ایک بار ایک شخص میرے سامنے کچھ روپے لایا کہ یہ آپ کی نذر ہیں وہ روپے دیکھ کر میں نے کہا کہ مجھے اس میں ایک خاص قسم کی ظلمت نظر آتی ہے۔ شاید یہ مال زکوٰۃ ہے بعد میں معلوم ہوا کہ ایسا ہی تھا۔

چاہ کن را چاہ درپیش

فرمایا اکبر آباد میں میرے والد ماجد ایک حویلی میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ کم وبیش ایک ہفتہ برسات ہوتی رہی مریض ہونے کی وجہ سے آپ میں چلنے پھرنے کی سکت نہیں تھی۔ اسی لمحے مجھ پر منکشف ہوا کہ یہ حویلی گرے گی اوراس میں رہنے والوں کا کافی نقصان ہوگا۔ اسی وقت باہر نکل کر میں نے بہت جستجو کی مگر کہیں بھی کرائے کا مکان نہ مل سکا۔ چونکہ بادشاہ کا لشکر اترا ہوا تھا۔ ہر جگہ حویلیاں بھر چکی تھیں۔ کافی تلاش کے بعد ایک غیر آباد خالی قطعہ مل گیا۔ شہر والوں سے اس کے مالک کا پتہ اوراس کی ویرانی کا سبب پوچھا تو کہنے لگے۔ یہ ایک ہندو کی ملکیت ہے اور یہاں ایک جادوگر جوگی رہتا ہے۔ جو بھی یہاں ٹھہرتا ہے یہ جادوگر اسے نقصان پہنچاتا ہے۔ میں نے کہا کوئی بات نہیں اور تھوڑے سے کرائے پر وہ لے لیا۔ گھاس پھونس لا کر اسی حالت میں ایک چھپر کھڑا کر دیا اور اپنا بوریا و بستر وہاں لے آیا۔ اسی دن ہماری متروکہ حویلی میں کوئی دوسرا شخص آ بیٹھا۔ اصطبل کی چھت گری اور سارے گھوڑے ہلاک ہو گئے۔ بعد میں وہ جوگی ظاہر ہوا اوراس نے مجھے کہا کہ یہاں زندہ جوگی دفن ہیں۔ آپ کا یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں بلکہ جوگیوں کے دفن ہونے کی جگہ پوچھی تو اس نے ایک کونے کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے کہا۔ ہم یہاں بیت الخلاء بنائیں گے یہ سن کر وہ چلا گیا اور مجھ پر جادوں کرنے لگا جس کا سارا نقصان اسی پر پلٹا۔ چنانچہ ایک دن والد ماجد کی خدمت میں آ کر کہنے لگا کہ تمہارا بیٹا مجھے تکلیف پہنچا رہا ہے۔ آپ نے مجھے سمجھایا۔ میں نے کہا پہلے آپ اس سے یہ تو پوچھئے کہ میں نے اسے کس قسم کی تکلیف دی ہے۔ گالیاں دی ہیں یا مارا ہے؟ پھر اپنے ہاتھ سے مارا یا کسی کو کہہ کر مروایا۔ والد ماجد نے اس سے پوچھا تو وہ کہنے لگا کہ ایسی کوئی تکلیف بھی نہیں پہنچائی بلکہ ہمارے پیر (یعنی جن) سے ہمیں مروا رہا ہے۔

تسخیر جنات

فرمایا نواح دولت آباد کے ایک سید اپنے معتقدین کی ایک جماعت کے ساتھ سفر میں تھے۔ ایک دن رفع حاجت کے لئے ایک پرانی عمارت میں گئے۔ وہاں پریوں کو مثالی شکل میں دیکھا۔ ان میں سے ایک پری ان پر لٹو ہو کر انہیں چمٹ گئی۔ تھوڑے وقفے کے بعد وہ مثالی شکل میں ان کے سامنے آتی اور وہ حد سے زیادہ تکلیف محسوس کرتے۔ اس کو ہٹانے کے لئے جتنی کوشش کی کچھ فائدہ نہ ہوا۔ بالآخر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر میری طرف روانہ ہوئے۔ اس سفر میں بھی وہ پری روزانہ ان کے پاس آتی رہی۔ جب وہ فرید آباد پہنچے تو پری نے حاضر ہو کر ان سے رخصت چاہی کہ اب میرے لئے تم سے ملنے کا امکان نہیں رہا۔ جب میرے پاس پہنچے تو ان بدن تندرست ہوتے چلے گئے اور انہیں بغیر کسی علاج اور تعویذ کے وہ عارضہ بالکل چھوڑ گیا۔

فرمایا ایک شخص کو جن تکلیف پہنچایا کرتا تھا۔ اس کے گھر والوں نے مجھ سے رجوع کیا۔ میں نے کہا اسے میرا پیغام پہنچا دو کہ فلاں کہہ رہا ہے۔ یہاں سے چلے جاؤ ورنہ اچھا نہیں ہوگا انھوں نے پیغام پہنچایا مگر وہ پھر بھی نہ ٹلا۔ میں نے کہا۔ تم لوگوں نے میرا نام اس انداز اور تفصیل سے اسے نہیں بتایا ہوگا جس سے وہ دوسرے ناموں سے ممتاز ہو سکے۔ دوبارہ جاؤ اور اس انداز سے میرا نام لے کر اسے پیغام دو، چنانچہ وہ گئے اور اسی طریق سے میرا نام لیا، پھر اس جن نے اسے کبھی تکلیف نہ پہنچائی۔ فرمایا محلے والوں نے ایک مرتبہ مجھ پر جادو کر دیا۔ میں رات کے وقت بیت الخلاء گیا تو مجھے ایک جوگی کی شکل نظر آئی۔ میں اس کی طرف متوجہ ہوا اور اسے جوتا دے مارا تو وہ دھواں بن کر اڑ گیا۔

آتشیں آدمی اور برکت قرآن

فرمایا لوگوں نے مجھ پر دوبارہ جادو کیا تو میں نے عالم مثال میں دیکھا کہ ایک شخص آگ کی مثالی صورت لئے ہوئے آگ کے گھوڑے پر سوار آتشیں نیزہ ہاتھ میں لئے مجھ پر حملہ کر رہا ہے۔ میں نے بیدا اٹھایا اور اس پر قرآن مجید کی چند سورتیں دم کر کے اسے مارا۔ وہ آتشیں آدمی اس کا نیزہ اور گھوڑا میری پھونک کے اثر سے مردہ ہو کر گر پڑے اور گرتے وقت وہ کہنے لگا کہ میں تمہارے عمل کے اثر سے نہیں گرا۔ صبح سویرے میں یہ واقعہ مخدومی شیخ ابوالرضاء کی خدمت میں عرض کر رہا تھا کہ

اس وقت میرے سامنے ایک بلی کا بچہ آیا۔ میں نے اس پر ہاتھ پھیرا تو وہ اپنی جگہ سے کودا۔ اس کے منہ سے خون نکلا اور وہ مر گیا۔

فرمایا ان لوگوں نے پھر ایک مرتبہ جادو کیا۔ میں بیمار ہو گیا۔ جس قدر علاج کیا کچھ افاقہ نہ ہوا۔ بزرگوں میں سے ایک کو خواب میں دیکھا۔ کاتب الحروف (شاہ ولی اللہ) کے گمان میں یہ خواجہ قطب الدینؒ تھے کہ فرما رہے ہیں تجھ پر جادو کیا گیا ہے۔ فلاں فلاں آیات پڑھو۔

ولی کے خلاف جھوٹی شہادت کا انجام

فرمایا ایک مرتبہ ان لوگوں نے مجھے کسی جھوٹے مقدمے میں پھنسا کر قاضی کی عدالت میں پیش کرا دیا۔ جب میں عدالت میں حاضر ہوا تو گواہوں کے منہ کالے اور زبانیں سرخ ہو گئیں۔ جسے سب نے دیکھا۔ قاضی نے چاہا کہ اس بات کی تشہیر کرے مگر میں نے کہہ دیا کہ جو کچھ دیکھا ہے اسی پر اکتفا کرو۔

مشائخ کی روحانی امداد

اس فقیر (شاہ ولی اللہ) نے حضرت والد ماجد سے اجمالاً اور یاران طریقت سے تفصیل کے ساتھ سنا ہے کہ جن دنوں اورنگزیب (عالمگیر) حسن ابدال کی طرف روانہ ہوا اور پٹھانوں نے بغاوت کر دی تو پوری کوشش کے باوجود کامیابی کی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ بعض مخلصوں نے حضرت والد ماجد سے اس بارے میں دعا طلب کی، جب متوجہ ہوئے تو فرمایا ایک معمر بزرگ کی شکل سامنے آ کر دعا سے منع کر رہی ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ شیخ بزرگوار حضرت آدم بنوری کے خلفاء میں سے حاجی یار محمد نے پٹھانوں کی مدد پر کمر باندھ رکھی تھی۔

جب اورنگ زیب کی وفات ہوئی اور اس کی اولاد آپس میں لڑنے لگی تو بعض احباب نے پوچھا کہ کون کامیاب ہوگا تو فرمایا اعظم کی طرف تو سات بندوقیں اٹھی ہوئی دیکھ رہا ہوں کیسے بچ جائے گا؟ تھوڑے دنوں کے بعد ایسا ہی ہوا۔

جام جہاں نما است ضمیر منیر دوست

جب معز الدین تخت پر متمکن ہوا اور فرخ سیر نے پورب کی طرف سے اس پر چڑھائی کر دی تو وہ بہت پریشان ہوا اور درویشوں کی خدمت میں جا جا کر دعائے فتح مندی کی درخواست کرنے

لگا۔ کسی نے حضرت والا سے عرض کیا کہ وہ آپ کی خدمت میں بھی آنا چاہتا ہے فرمایا اس کا یہاں آنا مناسب نہیں رہے گا۔ اس لئے وہ سچی بات سے ناخوش ہوگا اور اگر جھوٹ بولوں تو مکر و جھوٹ فقراء کا کام نہیں۔

جب فرخ سیر اور عبداللہ خاں باہم لڑنے لگے تو حضرت والد کی خدمت میں ان کی لڑائی کا کچھ حال بیان کیا گیا۔ آپ نے فرمایا میں نے عالم مثال میں دیکھا ہے کہ گویا فرخ سیر کے تخت کو لوگ الٹ دینا چاہتے ہیں اور میں لوگوں سے کہہ رہا ہوں کہ اسے میری وجہ سے معاف کر دو۔ کیونکہ ابھی ابھی پچھلے دنوں تو خونریزی ہو چکی ہے بہر حال حضرت والد کی وفات سے پچاس دن بعد فرخ سیر قید ہو گیا۔

ناز ولایت

حضرت والد ماجد فرمایا کرتے تھے کہ جب فرزند عزیز صلاح الدین بیمار ہوا اور ہم نے اس کی زندگی سے ہاتھ دھو لئے تو میں نے کفن خریدنے اور قبر کھودنے کے لئے کہہ دیا۔ اچانک میرے دل میں جوش آیا اور ایک کونے میں جا بیٹھا۔ حد سے زیادہ گڑ گڑا کر دعا مانگی۔ فرشتے نے آکر اس کی زندگی اور صحت کی بشارت دی، اسی دم وہ چھینکا اور اس کی زندگی لوٹ آئی۔

حضرت شاہ ولی اللہ کی پیدائش کا قصہ

حضرت والد ماجد جب ساٹھ سال کے ہوئے تو ان پر منکشف ہوا کہ تقدیر کے فیصلے کے مطابق آپ کے ہاں ایک اور فرزند پیدا ہوگا۔ بعض خاص یاران طریقت سے یہ بھی سننے میں آیا کہ آپ کو بشارت دی گئی تھی کہ وہ نو مولود علمی اور روحانی بلند مقامات کو پہنچے گا۔ چنانچہ آپ کے دل میں شادی کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ جب مخدومی شیخ محمد نے یہ ماجرا سنا تو وہ اس کوشش میں رہنے لگے کہ یہ بچہ ان کی لخت جگر سے ہو۔ اس فقیر نے بعض ثقہ لوگوں سے سن رکھا ہے کہ جب اس شادی کی بات پکی ہوگئی تو بعض مخالفین اور منافقین نے کہا کہ اس عمر میں شادی مناسب نہیں رہے گی۔ حضرت والد نے ان کی باتیں سنی اور فرمایا کہ میری عمر کا ابھی کافی حصہ باقی ہے اور لڑکے بھی پیدا ہوں گے۔ چنانچہ آپ اس شادی کے سترہ سال بعد زندہ رہے اور دو بچے بھی پیدا ہوئے۔ فقیر (ولی اللہ) ابھی پیدا نہیں ہوا تھا کہ ایک رات حضرت والد ماجد نماز تہجد پڑھ رہے تھے اور میری والدہ بھی ان کے قریب تہجد میں مشغول تھیں۔ نوافل کے بعد حضرت والدؒ نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے اور والدہ آمین کہتی رہیں۔ اسی اثناء میں دو اور ہاتھ ظاہر ہوئے۔ حضرت والد نے فرمایا۔ یہ دو ہاتھ ہمارے بیٹے کے ہیں جو پیدا ہوگا۔ وہ ہمارے ساتھ دعا مانگ رہا ہے۔ اس کے بعد یہ فقیر پیدا ہوا اور سات سال کی عمر میں نماز تہجد میں والدین کا ساتھی بنا اور اسی خواب والی وضع میں ان دونوں کے درمیان ہاتھ اٹھائے۔ وھذا تاویل رویائی من قبل قد جعلھا ربی حقا

قبل از پیدائش شاہ اہل اللہ کی بشارت

نیز یہ فقیر ابھی ماں کے پیٹ میں تھا کہ اس وقت حضرت والد نے ایک بھکارن کو آدھی روٹی خیرات دی۔ وہ جانے لگی تو پھر اسے واپس بلا کر باقی آدھی بھی دے دی اور فرمایا کہ بچہ جو پیٹ میں ہے کہہ رہا ہے کہ خدا کی راہ میں ساری روٹی دینی چاہئے۔ ایک دن جب کہ یہ فقیر ابھی بہت کمسن تھا۔ حضرت والا نے اہل اللہ کے نام سے کسی کو دوبار آواز دی۔ ایک آدمی نے پوچھا۔ حضرت والا کسے بلا رہے ہیں۔ میری طرف اشارہ کر کے فرمایا اہل اللہ اس کا بھائی ہے جو عنقریب پیدا ہوگا۔ اس کا نام خود بخود میری زبان پر جاری ہوگیا۔ حضرت والد مجلس اور تنہائی میں اکثر اس فقیر کی طرف

متوجہ ہو کر لطف و مہربانی فرمایا کرتے تھے مجھے دیکھ کر باغ باغ ہو جاتے اور فرماتے کہ میرے دل میں بارہا یہ خیال آتا ہے کہ ایک ہی دفعہ تمام علوم و معارف تیرے سینے میں ڈال دوں۔ جوش میں آ کر آپ بار بار یہ بات فرماتے۔ بالآخر آپ کی ان باتوں کا اثر ظاہر ہوا ورنہ اس فقیر نے حصول علم میں کچھ اتنی زیادہ محنت نہیں کی۔

انسانی فعل و عمل کی اہمیت

یہ فقیر (شاہ ولی اللہ) بچپن میں ہم عمر رشتے دار بچوں کے ساتھ باغ میں سیر و تفریح کیلئے چلا گیا۔ جب واپس آیا تو آپ نے فرمایا کہ اے فلاں آج کے دن تم نے کونسی ایسی چیز حاصل کی ہے۔ جو تیرے لئے سرمایہ اور توشہ بنے۔ ابھی ابھی ہم نے اس مختصر وقت میں اتنی مرتبہ درود پاک پڑھ لیا ہے۔ محض یہ بات سنتے ہی فقیر کے دل سے باغات کی سیر کا شوق جاتا رہا اور پھر ایسا خیال کبھی نہ آیا۔

مرد مومن کی موت

حضرت والد ماجدؒ کو شوال میں ایک ایسے مرض سے سابقہ پڑا کہ زندگی سے آس توڑ بیٹھے۔ انہی دنوں میں اس فقیر (شاہ ولی اللہ) کو خلوت میں اس بات کی طرف اشارہ فرمایا کہ اپنے دل کو ہمہ وقت حضرت والا کی طرف متوجہ رکھوں اور یہ بھی فرمایا کہ یہ قید تین مہینے کے لئے ہے۔ اس وقت مجھے تین مہینوں کی تخصیص کا نکتہ سمجھ میں نہ آیا۔ جب شفایاب ہوئے اور غسل صحت فرمایا اور تین ماہ بعد مرض پھر لوٹ آیا۔ اور بارہ صفر کو وفات پائی تو اس وقت یہ نکتہ سمجھ میں آیا۔

حضرت والا اخر میں جب صاحب فراش ہوئے تو اس فقیر کو فرمایا کہ قلم دوات لاؤ میں چاہتا ہوں کہ اپنے خاص نکات معرفت تحریر کردوں، میں نے دو چار مرتبہ قلم دوات پیش کی مگر آپ نے لکھنے اور املا کرانے کی طاقت نہ رہی تھی۔ آپ کی وفات کے بعد میرے دل میں حضرت والا کے حالات لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ تحریر کے دوران اکثر حالات میرے دل میں ایسے پختہ ہو جاتے گویا یہ تمام واقعات میرے سامنے ہوئے ہیں اور انہی دنوں چند مرتبہ خواب میں دیکھا گویا میں اپنی تحریریں حضرت والد کو سنا رہا ہوں اور وہ پورے ذوق کے ساتھ سن رہے ہیں۔ یہاں تک کہ یہ سارے مسودات مکمل طور پر محفوظ ہو گئے۔ میرا غالب گمان ہے کہ آپ جو کچھ لکھوانا چاہتے تھے اس

میں سے کوئی ایسی چیز باقی نہیں رہی جو حیطۂ تحریر میں نہ آ گئی ہو۔

جن کی نظر چڑھا تر ارخسار آتشیں

اپنی زندگی کے آخری ایام میں ایک دن صلاح آ تار محمد عاشقؒ اور میری طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور ان کی دوستی ومحبت میرے لئے مسرت وشادمانی کا سبب ہے۔ اس بات کی حقیقت بعد میں کھلی جب محمد عاشق فقیر کے ساتھ ربط بیعت پیدا کر کے نفع مند ہوا اور امید ہے کہ ہماری یہ دوستی بہت سے فوائد کا باعث بنے گی۔ جو شخص بھی حضرت والا کی صحبت میں خلوص نیت سے آتا تھا اس میں عجیب اثرات نمودار ہوتے تھے۔

محمد قلی سپاہیانہ روایتی، بے توجہی کے باوجود حضرت کی باتیں بیان کرتے وقت اس قدر مغلوب ہو جاتا کہ بیہوش ہو کر گر پڑتا تھا اور جب کبھی زیادہ مغلوب الحال ہو جاتا تو اس کا اثر سواری کے جانور گھوڑے پر بھی پڑتا۔ چنانچہ گھوڑا گر پڑتا اور اس کی زین ادھر ادھر بکھر جاتی۔

ز ملک تا ملکوتش حجاب بردارند

محمد فاضل کی دختر شریفہ خاتون کم سنی کے باوجود حضرت والا کی نورانیت کا عکس قبول کر چکی تھی۔ بہت سے امور اس پر بھی منکشف ہو جاتے تھے۔ ایک رات حضرت والد محمد فاضل کے گھر جا رہے تھے کہ راستے میں آپ کے ہاتھ سے تسبیح گر پڑی شریفہ نے کہا میں دیکھ رہی ہوں کہ تسبیح فلاں جگہ گری ہے۔ شمع لے جا کر دیکھا تو تسبیح وہیں پڑی تھی۔

اپنے گھر میں ایک دن شریفہ کہنے لگی کہ حضرت والا ہمارے گھر تشریف لا رہے ہیں اور فلاں طعام کی خواہش رکھتے ہیں۔ چنانچہ وہ طعام تیار کیا گیا اور حضرت والا سے دریافت کیا گیا تو آپ نے شریفہ کی باتوں کی تصدیق فرمائی۔

ایک دفعہ شریفہ اپنے گھر میں تھی۔ حضرت والا بھی وہیں تھے کہنے لگے فتح محمد ہمارے گھر کا ارادہ کر رہا ہے۔ پھر کہا اب راستہ میں کھڑا کسی سے بات کر رہا ہے۔ وہ خود دھوپ میں اور دوسرا آدمی سائے میں کھڑا ہے۔ پھر کہنے لگی۔ اب اس نے تین نارنگیاں خریدی ہیں دو اپنے دونوں بیٹوں کے لئے اور ایک حضرت والا کے لئے، پھر کہا اب اس کی نیت بدل چکی ہے۔ دو حضرت والا کے لئے اور ایک دونوں بیٹوں کے لئے نامزد کر دی ہیں۔ پھر کہنے لگی اب وہ دروازے پر کھڑا

ہے۔ فتح محمد کے پہنچنے پر شریفہ کی ساری باتوں کی تصدیق ہوگئی۔

اس فقیر (شاہ ولی اللہ) نے شریفہ سے عجیب وغریب قصے سن رکھے ہیں۔ کہنے لگی ایک دفعہ میں نے حضرت والا سے گزارش کی کہ میں آپ کا دل دیکھنا چاہتی ہوں۔ فرمایا میرے سامنے بیٹھ کر میری طرف توجہ کرو۔ جب میں متوجہ ہوئی تو میں اپنے آپ سے بے خبر ہوگئی۔ اسی عالم میں میں نے دیکھا کہ گویا حضرت والا کے حلق میں چلی گئی ہوں۔ میں نے دیکھا کہ حضرت والا کا دل ایک آئینے کی مثل ہے۔ جو طول میں ایک ہاتھ اور عرض میں ایک بالشت ہے۔ اس آئینے میں اسم ذات ایسے رنگ میں ظاہر ہوا۔ جو چراغ کے شعلوں کا عکس آئینے پر پڑنے سے پیدا ہوتا ہے۔ روحانی امور سے شغف کی وجہ سے میں اس شعلے کو منہ میں لے کر نکل گئی۔ اسی وقت حضرت والا بیقرار ہوگئے۔ غش پڑ گیا اور بیہوش ہوگئے۔ جب افاقہ ہوا تو آپ نے فرمایا کہ جب تو نے میرے لطیفۂ دل کو اپنے حلق کے اندر لیا تو میں کمزور ہوگا۔

مقام صبر

شیخ فقیر اللہ نے بتایا کہ حضرت والا کی والدہ جب فوت ہوئیں تو آپ نے بے حد غمگینی کے باوجود اظہار غم اور رونے دھونے سے اپنے آپ کو باز رکھا۔ اسی دوران ایک رات سوئے ہوئے تھے اور میں ان کے پاؤں داب رہا تھا۔ اس وقت میں نے ظاہری آنکھوں سے ایک ایسا نور دیکھا جسے محسوس کیا جا سکتا تھا جو ظاہر ہوا اور حضرت کے جسم کا احاطہ کر لیا۔ خاص طور پر ان کے سینے، چہرے اور منہ کو گھیر لیا۔ جب آپ کی آنکھ کھلی تو میں نے یہ واقعہ عرض کیا فرمایا یہ میرے صبر کا پھل تھا۔

خلیفہ فتح محمد حضرت والا کے قدیمی دوستوں میں سے تھا۔ جب آپ کسی کتاب سے کوئی مسئلہ نکالنا چاہتے اور مقام وصفحہ معلوم نہیں ہوتا تھا تو وہ کتاب ان کے ہاتھ میں تھما دیتے۔ معمولی غور کے بعد وہ کتاب کھولتے تو مطلوبہ جگہ ایک صفحہ آگے یا پیچھے نکل آتی تھی۔

مردان راہ خدا کا جمال باطنی

محمد غوث پھلتیؒ بیان کرتے تھے کہ ایک دفعہ حضرت والا حجرے میں اکیلے سو رہے تھے کہ میں ان کی زیارت کے لئے آیا۔ بعض عقیدت مندوں نے مجھے روکا کہ آپ آرام میں ہیں۔ حجرے

میں مت جاؤ۔ میں دروازے پر ٹھہر گیا۔ اسی اثنا میں حجرے سے رونے کی آواز میرے کان میں پہنچی۔ میں گھبرا کر بغیر اجازت حجرے میں چلا گیا۔ اندر قدم رکھتے ہی بعض مغیبات مجھ پر منکشف ہوئیں مثلاً یہ کہ فرہاد خاں حسین پوری حضرت والا کی زیارت کو آرہا ہے۔ جب حضرت والا کے قریب پہنچا تو آپ نے اپنے پاؤں میری طرف بڑھا دیئے اور میں پاؤں دابنے میں مشغول ہوگیا۔ اسی حالت میں میرے دل میں خیال آیا کہ کہا جاتا ہے کہ اولیاء اللہ کی ایک باطنی شکل وصورت ہوتی ہے جو لوگوں کی نگاہوں سے مستور رہتی ہے۔ وہ باطنی جمال کیسا ہوگا؟ جب آنکھ اوپر اٹھائی تو دیکھا کہ حضرت والا کے مبارک چہرہ سے ایک حجاب آہستہ آہستہ اٹھ رہا ہے۔ گویا بادل کا ٹکڑا چاند سے جدا ہو رہا ہے جب تھوڑی تک پردہ اٹھ گیا تو ایسی شعاعیں چمکیں کہ میں قریب قریب بیہوش ہوگیا۔ تب حضرت والا اٹھے اور وضو فرمایا۔ میں بھی آگے جا بیٹھا تا کہ یہ قصہ عرض کروں، اشارے سے فرمایا کہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں، کچھ دیر بعد فرہاد خاں نے بھی آکر شرف قدم بوسی حاصل کی۔

تاثیر شراب وحدت

حضرت والا ماجد جب جب بھی چاہتے تھے اور جس میں بھی چاہتے ایسی تاثیر پیدا کر دیتے کہ اسے اپنی شدھ بدھ نہیں رہتی تھی اور ایسے قصے اعداد وشمار سے زیادہ ہیں۔ بعض اوقات تو آپ کی توجہ سے جماعتوں کی جماعتیں بیہوش ہوگئیں اور بعض اوقات آپ کی توجہ سے لوگوں پر اس قدر بیہوشی طاری ہو جاتی تھی کہ ان کے انتقال کا خطرہ پیدا ہو جاتا تھا۔

آخر عمر میں آپ نے اس قسم کی توجہ سے ہاتھ روک لیا تھا اور اسے ناپسند فرماتے تھے۔ ایک دن قصبہ پرتاب پور میں مستورات نے جمع ہوکر اس قسم کی تاثیر چاہی۔ آپ نے اس فقیر (شاہ ولی اللہ) کی والدہ کو ان مستورات پر توجہ کا حکم دیا اور یہ حکم دیتے وقت ایسی تاثیر پیدا کر دی کہ اس دن والدہ نے جس کو بھی چاہا عالم بے خودی میں بھی پہنچا دیا، کم وبیش بیس عورتوں پر والدہ نے توجہ ڈالی۔ واللہ اعلم۔

دلوں کے بھید بتانے اور نادیدہ امور منکشف کرنے کے سلسلے میں، حضرت والد ماجد کے اس قسم کے واقعات بیشمار ہیں۔ ان کے معتقدین اور مخلصین میں کوئی بھی ایسا نہیں جو اسی قبیل کی پانچ

چھ کرامات اپنے مشاہدے کی روشنی میں بیان نہ کرتا ہو۔ فقیر (شاہ ولی اللہ) کی غرض حضرت والا کے سلسلے میں صرف اپنی سنی ہوئی روایات محفوظ کرنا ہے۔

ع سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے واسطے

حضرت والد ماجدؒ کے ملفوظات

صوفیاء اور رویت باری

فرمایا کرتے تھے کہ ایک بار مشاہیر میں سے ایک بزرگ کی زیارت کو گیا تو وہ کہنے لگے۔ عرصے سے دو باتوں کی الجھن میرے دل میں پائی جاتی ہے اور اطمینان حاصل نہیں ہو رہا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ جو علماء کہتے ہیں کہ اس دنیا میں حق سبحانہ وتعالیٰ کا ظاہری آنکھوں سے دیکھنا محال ہے۔ حالانکہ ہم اللہ تعالیٰ کو بچشم ظاہر دیکھتے ہیں۔ علماء کے قول کے مطابق کھلی حقیقت کا انکار نہیں کرنا چاہئے اور متقدمین صوفیاء بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ کر چکے ہیں جیسا کہ کہتے ہیں۔

دیده را فائده آنست که دلبر بیند

ورنہ بیند چہ بود فائدہ بینائی را

(آنکھوں سے تو یہی فائدہ ہے کہ محبوب کو دیکھیں اور اگر نہ دیکھ سکیں تو پھر بینائی سے کیا حاصل؟)

میں نے کہا اس شعر کے کہنے والے نے نہ جانے جمال حقیقی مراد لیا ہے یا مجازی، پہلی صورت میں تاویل کا دروازہ کھلا ہے۔ البتہ یہ جو بچشم ظاہر آپ نے اپنے دیکھنے کا ذکر کیا ہے تو یہ بصیرت اور بصر کے اشتباہ کی وجہ سے ہے۔ آپ اپنی آنکھیں میچ لیں۔ انھوں نے آنکھیں بند کر لیں تو میں نے کہا۔ کیا اب بھی بند کرنے کی کیفیت کا ادراک باقی ہے۔ کہنے لگے ہاں باقی ہے۔ میں نے کہا۔ یہی تو اشتباہ کی علامت ہے۔

اس بزرگ نے کہا۔ دوسری الجھن یہ ہے کہ یہ جو نقشبندی کہتے ہیں کہ ہم جب سالک پر توجہ ڈالتے ہیں تو پہلی ہی صحبت میں بے خودی اور اپنے آپ سے کھو جانے کی کیفیت اس پر طاری ہو جاتی ہے۔ یہ بات سچ ہے یا نہیں اور آپ نے ایسی کیفیت اپنی آنکھوں سے بھی دیکھی ہے؟ میں نے کہا ہاں یہ حقیقت ہے اور ایسی بہت سی باتیں میں نے دیکھی ہیں بلکہ ایسی تاثیرات تو مجھ سے بھی کثرت سے وقوع پذیر ہوئی ہیں۔ کہنے لگے تم نے سچ کہا ہے مگر میری تسلی نہیں ہوتی۔ میں نے

اسی وقت ان کے عزیزوں میں سے ایک پر جو میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا نگاہ اٹھا کر توجہ ڈالی تو وہ بیہوش ہو کر گر پڑا۔ وہ پریشان ہوئے کہ اس پر مرگی یا غشی کا دورہ پڑ گیا ہے۔ میں نے کہا کچھ بھی نہیں۔ میری تاثیر کے سبب بیخود ہوا ہے۔ جب وہ آدمی ہوش میں آیا تو اس سے سوال کیا گیا کہ کس وجہ سے بیہوش تھے؟ کہنے لگا میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا کہ محض ان حضرت کی توجہ سے ان میں سے ایک نور نکل کر مجھ میں جذب ہو گیا اور میرا ہوش جاتا رہا۔ یہ سن کر وہ بزرگ کہنے لگے کہ عین الیقین تو حاصل ہوا ہے۔ مگر ابھی حق الیقین نہیں ہوا۔ میں نے کہا کہ چونکہ آپ صاحب ارشاد بزرگ ہیں۔ آپ کو بخوبی علم ہے کہ ہر سلسلہ طریقت میں ایک خاص تاثیر ہوتی ہے۔ سلسلہ نقشبندیہ کی یہ تاثیر بغیر ارتباط آپ کو سمجھانا قرین مصلحت نہیں۔

کاتب الحروف (شاہ ولی اللہ) کہتا ہے کہ مکہ معظمہ میں مسجد الحرام کے اندر میں شیخ آدم بنوری قدس سرہ کے ایک بزرگ خلیفہ کی روحانی مجلس سے محظوظ ہوا۔ جو اس دنیا میں ظاہری آنکھوں سے حق سبحانہ وتعالیٰ کی رویت کے قائل تھے۔ میں نے ایک موقع پر رویت باری سے متعلق انہیں اپنے نظریے سے آگاہ کیا تو انھوں نے اعتراض کیا کہ جب حق سبحانہ وتعالیٰ جہت اور مکان کی قید سے منزہ اور ماوراء ہے تو پھر ہر دیکھنے والے کی آنکھ کی پلکیں حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ اور دیکھنے والے کی آنکھ کے ڈیلے کے درمیان ہرگز روک اور حجاب نہیں بن سکتیں۔ اس لئے ثابت ہوا کہ آنکھیں جھپکنے کے باوجود بقائے مشاہدہ ہر لحظہ قائم رہتا ہے اور بصر وبصیرت میں کوئی فرق وامتیاز ثابت نہیں کیا جا سکتا میں نے کہا۔ حقیقت رویت (کھلی آنکھوں سے دیکھنا) عامی مفہوم یا عرف عام میں ایک کامل واشگاف اور کھلی حقیقت کے دیکھنے کو کہتے ہیں جو آنکھ مچولی اور چکا چوند میں نہیں بلکہ ہمیشہ آنکھیں کھولنے کے بعد کے نظارے کو کہا جاتا ہے۔ ملا جلال نے رویت معادیہ کی بحث میں اسے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ انکشاف جو آنکھیں بند کرنے کے دوران اور کھولنے کے بعد یکساں محسوس ہو، اسے رویت نہیں کہہ سکتے۔ واللہ اعلم

حصول رزق میں نیت کے ثمرات

فرمایا کہ میرے ایک ہم سبق نے مجھ سے سوال کیا کہ حق سبحانہ وتعالیٰ آپ کو بھی اپنے بندوں کے وسیلے سے روزی پہنچاتا ہے اور دوسرے لوگوں کو بھی آپ ہی کی طرح کسی حیلے بہانے

سے دیتا ہے۔ ہم سب کا اس بات پر ایمان ہے کہ رزاق حقیقی خداوند تعالیٰ ہے۔ لیکن آپ کے اور عام لوگوں کے درمیان کیا فرق رہا۔ میں نے کہا کہ تم حصول رزق کے لئے مخلوق کی طرف توجہ رکھتے ہو، لالچ میں ان کے آگے بچھے جاتے ہو۔ مگر ہم رازق حقیقی کی طرف توجہ رکھتے ہیں۔ اسی سے طلب کرتے اور جو کچھ آتا ہے اسی کی عطا سمجھتے ہیں۔ کہنے لگا۔ ابھی فرق واضح نہیں ہوا۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے تصرف سے کام لیا۔ یا بغیر کسی تصرف کے خداوند تعالیٰ نے یہ لطیفہ ظاہر فرمایا کہ اس کے دل میں یہ بات آئی کہ کچھ رقم مجھے نذرانہ پیش کرے۔ اس کی خواہش لمحہ بہ لمحہ بڑھنے لگی۔ یہاں تک کہ وہ بے اختیار ہو گیا۔ ادھر میں نے نذرانہ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

وہ کافی دیر دھوپ میں کھڑا ہو کر گڑگڑاتا اور عاجزی کرتا رہا اور کہنے لگا کہ میں بخوبی جانتا ہوں کہ نذرانہ قبول کرنے میں میری بھلائی اور ٹھکرا دینے میں میری بدبختی ہے۔ میں نے نذرانے کی قبولیت کے لئے کچھ مشکل شرائط پیش کیں تو وہ بھی اس نے ہنسی خوشی پوری کیں۔ اس کے بعد میں نے اسے کہا کہ یہ نذرانہ میرے چوکھٹ پر رکھ دو۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ وہاں سے ایک بھکارن گزر رہی تھی۔ میں نے اشارہ کیا کہ یہ اٹھا لو۔ پھر میں نے اسے کہا کہ اب کچھ معلوم ہوا کہ امیروں سے تیرے حاصل کرنے اور میرے لینے میں کیا فرق ہے؟ کہنے لگا ہاں! اب یہ مسئلہ پوری طرح واضح ہو چکا ہے۔

راز درون پردہ ز رندان مست پرس

فرمایا شہر ۔۔۔ ۔۔ ومشائخ کے اجتماع میں ایک آدمی نے کہا کہ یہ جو خواجہ حافظؒ نے فرمایا ہے۔

امروز چوں جمال تو بے پردہ ظاہر است در حیرتم کہ وعدۂ فردا برائے چیست

(اے محبوب ازل! تیرا جلوۂ حسن تو آج بھی ہم پر بے نقاب ہے۔ میں حیران ہوں کہ پھر یہ وعدۂ فردا آخر کس لئے ہے؟)

اور عقائد کی کتابوں میں لکھا ہے کہ اس دنیا میں حق سبحانہ وتعالیٰ کا دیدار ممتنع ہے۔ ان دونوں باتوں میں کیسے مطابقت پیدا کی جائے گی؟ اس مسئلے نے مناظرے کی صورت اختیار کر لی اور بات کافی بڑھ گئی۔ آخر سب نے تھک ہار کر مجھ سے رجوع کیا فریقین کو خاموش کرا کے میں نے کہا کہ اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ حق تعالیٰ محتجب ہے اور محجوب نہیں یعنی خود ساختہ حجاب کی آڑ میں

ہے۔ کسی کے ڈالے ہوئے حجاب میں مستور نہیں۔ خواجہ حافظؒ نے تقاضائے شوق کے تحت فرمایا کہ جب حق سبحانہ وتعالیٰ قید حجاب میں نہیں اور ہماری نہ دیکھ سکنے والی کمزوری کے علاوہ اور کوئی چیز مانع بھی نہیں اور ان موانعات کا اٹھانا بھی اسی کے ہاتھ میں ہے تو پھر اس دنیا میں جمال جہاں آراء سے کیوں محروم رکھا جا رہا ہے۔ میری اس تشریح کے دونوں نے بغیر کسی تردد کے قبول کرلیا۔

کاتب الحروف (شاہ ولی اللہ) کہتا ہے کہ یہ مناظرہ اس بات پر تھا کہ صوفیاء کے نزدیک حق سبحانہ وتعالیٰ کے بے پردہ ہونے سے مراد ایسا انکشاف ہے جس سے اوپر کوئی انکشاف نہیں اور اولیاء اللہ کو اس دنیا میں انہی معنوں میں رویت باری حاصل ہوتی ہے۔ البتہ عوام کے لئے ایسا دیدار آخرت پر موقوف ہے۔ علماء اسی معنیٰ سے انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ رویت کے لئے کھلی آنکھوں سے دیکھنا ضروری ہے۔

تاج شاہی فقر کے قدموں پر

حضرت والد ماجدؒ کا ایک مخلص، بادشاہ اورنگ زیب کے مقربین میں سے تھا۔ ایک دن بادشاہ نے مراقبہ کیا اور وہ پنکھا جھلنے لگا۔ اس پر بھی شغل غالب آیا اور وہ بیخود ہوگیا۔ پنکھا اس کے ہاتھ سے گر پڑا۔ قریب تھا کہ بادشاہ کو تکلیف پہنچتی، پنکھا گرنے کی آواز سے بادشاہ مراقبے سے چونکا اور پوچھا کہ کیا بات ہے؟ اس نے بادشاہ کو اپنے بیخود ہونے اور حضرت والا سے اپنی نسبت کے بارے میں بتایا۔ چنانچہ بادشاہ کے دل میں حضرت والا سے ملاقات کا شوق پیدا ہوا۔ بادشاہ نے کہا کہ حضرت والا کو میرے پاس لاؤ۔ اس نے کہا۔ وہ بادشاہوں اور دولت مندوں کے ہاں جانا مناسب نہیں سمجھتے۔ بادشاہ نے حضرت والا کے ایک مخلص شیخ پیر کو بلوایا اور اس کے ہاتھ شوق زیارت اور خواہش ملاقات کے بارے میں کہلا بھیجا۔ آپ نے یہ بات قبول نہ کی۔ شیخ پیر کا اصرار بھی بیسود نکلا۔ جب وہ مایوس ہوئے تو کہا کہ کم از کم ایک خط ہی لکھ دیجئے تاکہ آپ کا نہ جانا میری کوتاہی پر محمول نہ کیا جائے۔ وہاں پر کاغذ کے ایک پھٹے پرانے ٹکڑے میں جوتے لپٹے ہوئے تھے۔ آپ نے وہ کاغذ لے لیا اور اس پر لکھا کہ اس بات پر اہل اللہ کا اجماع ہے کہ بئس الفقیر علی باب الامیر۔ (امراء کے دروازوں پر فقراء کا جانا بدتر ہے) اور حق سبحانہ وتعالیٰ فرمایا ہے۔ وما متاع الحیوۃ الدنیا الا قلیل (دنیا کی زندگی ناپائیدار کا سارا ساز و سامان کچھ بھی تو

نہیں) اس قلیل میں سے بہت ہی تھوڑا سا حصہ آپ کو ملا ہے۔ اگر بفرض محال آپ مجھے کچھ دینا بھی چاہیں تو وہ جزء لا یتجزی ہی ہوسکتا ہے۔ (ایسا ذرہ جسے آگے تقسیم نہ کیا جا سکے) اس معمولی مقدار کے لئے میں اپنا نام خدائے برتر کے دفتر سے آخر کیوں کر کٹا دوں۔ مشائخ چشت کے ملفوظات سے ثابت ہے کہ جو شخص بادشاہ کے دفتر میں اپنا نام لکھا دے۔ حق تعالیٰ کے دفتر سے اس کا نام کاٹ دیا جاتا ہے۔ اس خط کی روایت معناً ہے۔ الفاظ محفوظ نہیں رہے۔ بہر حال یہ کچھ لکھ کر آپ نے بھجوا دیا۔ اس روایت کے ناقل نے بیان کیا کہ بادشاہ نے اس رقعہ کو اپنی جیب میں محفوظ رکھا۔ جب نیا لباس زیب تن کرتا تو اس کو جیب میں رکھ لیتا۔ یہاں تک کہ سات دفعہ نئے لباس تبدیل کرنے تک یہ خط محفوظ رہا۔ فرصت کے اوقات میں اسے مطالعہ کر کے روتا تھا۔

کاتب الحروف (شاہ ولی اللہ) کہتا ہے کہ اس قسم کے ایک اور واقعہ بھی ملتا ہے کہ آخری دنوں میں بہادر شاہ کے بیٹے عظیم الشان نے طلب دعا اور عجز و انکساری سے بھرپور عریضہ لکھ کر زیارت کی خواہش کی اور کہا کہ اگر آپ خواجہ معین الدین چشتیؒ کی زیارت کے قصد سے تشریف لائیں اور اس بہانے سے ہماری ملاقات بھی ہو جائے تو اس میں کیا حرج ہے؟ اس پر آپ نے فرمایا کہ **ان اللہ لا ینظر الی صورکم واعمالکم وانما ینظر الی قلوبکم ونیاتکم** میں آپ کی چکنی چپڑی باتوں کے فریب میں نہیں آ سکتا۔

مقبولان بارگاہ ہر زمانے میں موجود ہوتے ہیں

شیخ احمد سرہندیؒ کی اولاد میں سے شیخ نقشبند نامی ایک بزرگ نے ایک دن مجمع میں کہا کہ اس طبقے کے درویش پرانے گھسے پٹے نکات کے سوا معارف جدیدہ کے تازہ بتازہ نکات عرفان سے نابلد ہیں۔ حضرت والا نے فرمایا ایسا نہیں بلکہ اس طبقے کے بعض لوگ تو خاص طور پر ایسے جدید معارف کا سرمایہ رکھتے ہیں کہ اس میں وہ کسی کے مقلد نظر نہیں آتے وہ کہنے لگے اگر ایسا ہے تو پھر ان میں سے کچھ ہمیں بھی سنا دیجئے تا کہ آپ کی اس بات کی حقیقت ہم پر بھی واضح ہو جائے۔ آپ نے فرمایا **کلموا الناس علی قدر عقولھم**۔ حد مقرر ہو چکی ہے اس لئے عام مجلس میں ایسے رموز ظاہر نہیں کرنے چاہئیں۔ اس پر وہ کہنے لگے کہ اس مجلس میں اکثریت اہل سلوک کی ہے۔ آپ نے فرمایا۔ معرفت کے بعض باریک نکتوں کے سلسلے میں بہت سے اہل اللہ بھی عوام کا سا حکم

رکھتے ہیں۔ اس پر بھی جب وہ نہ مانے تو حضرت والا نے فرمایا۔ شیخ بسطامیؒ کا قول ہے کہ نہایۃ الصدیقین بدایۃ الانبیاء (کمال صدیقیت آغاز نبوت ہوتا ہے) اور اکثر اہل استقامت اسی راہ پر گامزن ہیں مگر عرفان کچھ اور تقاضا کرتا ہے۔ جب حضرت والا نے بات یہاں تک پہنچائی تو شیخ نقشبندؒ کی پیشانی پر بل پڑ گئے اور ان کے چہرے پر ناگواری کے اثرات محسوس ہونے لگے۔ حضرت والا نے اس خیال سے کہ شاید شیخ نقشبند اس دوسرے قول کو پسند کرتے ہیں کہ الولایۃ افضل من النبوۃ (ولایت نبوت پر فوقیت رکھتی ہے) فرمانے لگے کہ میرے نزدیک نہایۃ الصدیقین و لایۃ الانبیاء والا مقام ایک برزخی حیثیت رکھتا ہے جسے نبی کے سوا کوئی طے نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد جو کچھ وہ بیان کر چکے تھے۔ اسے اس اسلوب سے دوبارہ بیان فرمایا کہ باقی اہل مجلس نے بھی سمجھ کر قبول کیا اور شیخ نقشبندؒ بھی انتہائی مسرور اور محظوظ ہو کر کہنے لگے کہ بایزید بسطامیؒ والی بات تو روشنائی سے لکھی گئی ہے مگر آپ کا یہ نکتہ معرفت آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔

فاتحہ خلف الامام میں شاہ عبدالرحیمؒ کا مسلک

واضح ہو کہ حضرت والد ماجدؒ اکثر مسائل میں حنفی مذہب کے مطابق عمل کرتے تھے مگر جہاں حنفی مسلک کے مقابلے میں حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم یا وجدان کے تحت دوسرے مسالک قابل ترجیح نظر آتے تو انہیں قبول کر لیتے جیسا کہ آپ امام کے پیچھے اور جنازے (۱) میں سورہ فاتحہ پڑھتے تھے۔ ایک دن اس بارے میں شیخ عبدالاحدؒ نے بحث کی اور اپنے بعض اسلاف سے نقل کیا کہ صحیح بات یہ ہے کہ اگر کوئی جماعت بادشاہ کی بارگاہ میں اپنی ضرورت بیان کرنے کے لئے کھڑی ہو تو تقاضائے ادب یہ ہے کہ سب مل کر اپنا کوئی ایک نمائندہ آگے کریں نہ یہ کہ ہر شخص

(۱) مختلف احادیث سے قرأت اور ترک قرأت کے طرز عمل ثابت ہوتے ہیں۔ دونوں حضرات نے احادیث کو مدار استدلال بنایا ہے۔ ایک گروہ کے نزدیک ایک حدیث اس لئے مدار استدلال ہے کہ وہ صحت کے اعتبار سے قوی تر ہے۔ دوسروں کے نزدیک وہ اس لئے استدلال کے قابل نہیں کہ اس سے معانی متعین کرنے قرآن کے ساتھ تطبیق دی جا سکتی ہو۔ اس لئے وہ ترک قرأت کو ترجیح دیتے ہیں کہ بقول شاہ ولی اللہ امام مالک کا مسلک دونوں کے درمیان تطبیق ہے۔ بعض حضرات کم فہمی کی بناء پر اسلامی عبادات کی اس وسعت اور اجازت کو خواہ مخواہ اختلاف کا نام دے کر مذموم پروپیگنڈہ کرتے ہیں حالانکہ اسلامی نظام کے ایک پہلو کی وسعت اور ہمہ گیری کی زندہ مثال ہے۔

بولنے لگ جائے۔ حضرت والا نے فرمایا کہ یہ قیاس مع الفارق ہے۔ نماز سے حقیقی غرض تو دعا اور خضوع اور خشوع کے ذریعے اصلاح نفس اور خدائے قدوس سے شرف ہم کلامی حاصل کرنا ہے جیسا کہ لاصلوٰۃ لمن لم یقرء بام الکتاب، والی حدیث اس پر دلالت کر رہی ہے اور اللہ تعالیٰ تو ایسا سمیع ہے کہ اگر تمام جہان ایک میدان میں کھڑا ہو جائے اور ہر شخص اپنی اپنی بولی میں کچھ کہے تو کسی ایک کی مناجات اللہ تعالیٰ کو دوسرے کی مناجات سننے میں خلل انداز نہیں ہو سکتی۔ بحث کے دوران ہم اس بات پر آ گئے کہ بعض اوقات مقتدیوں کی قرأت امام کی قرأت میں خلل پیدا کر سکتی ہے لیکن اس زمانے کا حال تو یہ ہے کہ امام کی زبان پر لفظ الحمد ہوتا ہے اور حقیقت میں صلوٰۃ کے معنی کی طرف اسے کچھ توجہ نہیں ہوتی۔ اس لئے امام کی تشویش سے گھبرانا نہیں چاہئے۔

کاتب الحروف (شاہ ولی اللہ) اس ضمن میں عرض کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان و اذا قری القرآن فاستمعوا له و انصتوا لعلكم ترحمون (۱) (جب قرآن پڑھا جائے تو غور سے سنو اور چپ رہو تا کہ تم پر خدا کی رحمت ہو) محض جہری نمازوں پر دلالت کرتا ہے اور اس کی تاویلات تفسیروں میں موجود ہیں۔

دائمی حضوری

ایک دن اولیاء اللہ کی دائمی حضوری پر بات چل نکلی۔ شیخ عبدالاحد نے فرمایا کہ ہمارے نزدیک دائمی حضوری یعنی تعلق مع اللہ کی تعریف یہ ہے کہ ولی جس آن بھی حضوری حق کے لئے اپنے آپ میں توجہ کرے تو بغیر کسی کوشش کے دل میں حضور حق کی یادداشتیں آنا شروع ہو جائیں۔ حضرت والا نے فرمایا۔ یہ تو معمولی کوشش سے میسر آ سکتی ہے۔ میرے نزدیک دوام حضور کی تعریف یہ ہے کہ وہ ولی سے ان معنوں میں کبھی منقطع نہ ہو، جیسے بصیر (دیکھنے والا) سے بصارت (نظر) کسی لمحے جدا نہیں ہو سکتی۔

کاتب الحروف (شاہ ولی اللہ) کہتا ہے کہ دائمی حضور ایسے آدمی کے لئے جو ابھی مقام فنا سے نہیں گزرا ایک قسم کا تکلف ہے۔ اور اس شخص کو جو فانی فی اللہ ہو، اپنے زندۂ جاوید نقطہ وجود یہ کی طرف جو کہ حقیقت عالم وجود ہے۔ ذرا سا التفات کرنے سے بھی حضور حق حاصل ہو جاتا ہے اور

---

(۱) الاعراف ت ۲۰۴۔

فانی کو مطلق حضور حق جو کہ ایک لحاظ سے نقطۂ وجود یہ بھی ہے یا التفات اجمالی ہمیشہ حاصل رہتا ہے۔ جیسا کہ بصر میں بصارت موجود رہتی ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ قوت بصریہ کا یکجا مجتمع ومتحد ہونا اور پتلیوں کی گردش سے اس کا منتشر ہونا۔ آنکھ ان دونوں امور کی جامع اور نقطۂ اتحاد ہے گویا بصارت آناً فاناً آتی بھی رہتی ہے اور جاتی بھی رہتی ہے۔ اس تحقیق سے دونوں مسئلوں کی حقیقت واضح ہوگئی ہے۔

فیوض باطنی کے باوجود ظاہری توسل سنت مشائخ ہے

شیخ عبدالاحدؒ (۱) ایک دن اپنے کچھ بزرگوں کے تصرفات بیان کر رہے تھے۔ جس سے حاضرین نے سمجھا کہ اس قسم کے تصرفات صرف انہی کے بزرگوں کا خاصہ تھے، حضرت والا نے قریب بیٹھے ہوئے دوستوں کو اشارہ کیا کہ فلاں فلاں قصہ بیان کرو۔ انھوں نے حضرت والا کے جو تصرفات اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے، بیان کئے اور شنیدہ کے بود مانند دیدہ کا سماں باندھ دیا۔ اس سے لوگوں کا شک مٹ گیا اور کوئی اشکال باقی نہ رہا۔

شیخ فقیر اللہ جن کا لقب زین العابدینؒ تھا۔ حضرت شیخ احمد سرہندیؒ کے پوتوں اور خواجہ کلاں بن خواجہ محمد باقی باللہؒ کے نواسوں میں سے تھے۔ اپنے خاندان کے بزرگوں سے کافی فیوض و برکات حاصل کرنے کے بعد دہلی میں آگئے تو وہاں ایک مدت تک حضرت خواجہ محمد باقی باللہؒ کے مزار فائض الانوار پر بیٹھ کر فیض حاصل کرتے رہے۔ ایک دن ان کے دل میں آیا کہ یہ نسبت اویسیہؒ جو حضرت خواجہ کی روح مبارک سے حاصل ہو رہی ہے جب تک ظاہری استفادے کی شکل اختیار نہیں کرے گی مضبوط نہیں ہوگی۔ اس خیال کے آتے ہی حضرت خواجہ کی طرف متوجہ ہوکر انھوں نے استخارہ کیا کہ وہ ظاہری طور پر کس بزرگ سے اپنا ربط پیدا کریں؟ حضرت خواجہؒ نے انہیں اشارہ فرمایا کہ اگر ہماری نسبت خاص کے طالب ہو! تو حضرت والا (شاہ عبدالرحیمؒ) کی صحبت میں جاؤ اور ان سے استفادہ کرو۔ شیخ زادے فوراً حضرت والا کی خدمت میں پہنچے اور آپ کی خدمت ہی میں ان پر حضرت خواجہ کا لطف و کرم ظہور پذیر ہوا اور عجیب و غریب فیوض جلوہ گر ہوئے۔ چنانچہ انھوں نے ان حالات و کیفیات کا اظہار اپنے ایک خط میں کیا ہے جو یہ ہے۔

---

(۱) شیخ عبدالاحدؒ المعروف شاہ گل متخلص وحدت حضرت مجدد الف ثانیؒ کے پوتے اور صاحب علم بزرگ تھے۔

مکتوب شیخ فقیر اللہؒ

''حقیر ترین خلق زین العابدین، فیاض زمان، قبلۂ مہربان کی خدمت میں سلام وتحیہ عرض کرتا ہے۔

حقیقت حال یہ ہے کہ آپ کی صحبت سرمایۂ سعادت کا اشتیاق اس قدر ہے کہ قلم سرخ زبان اسے بیان نہیں کرسکتی۔ دیوانگی اور بے تابی سے اکثر دل میں یہ خیال آتا ہے کہ کچھ بھی ہو وہاں جاکر آستاں بوسی کا شرف حاصل کروں مگر کیا کیجئے کہ جسمانی کمزوریاں اور زادراہ میسر نہ ہونے ایسی بشری کمزوریاں، منزل مقصود کیلئے سدراہ ہیں۔ آپ کے جمال مظہر کمال کی خاطر شب وروز دیوانگی میں خداوند قدوس سے سوال کرتا ہوں کہ جلد اور خیروخوبی سے میسر آئے، **انه قریب مجیب**، خدا کا شکر واحسان ہے کہ باوجود اس ظاہری دوری کے یہ ناکارہ آں موصوف کے فیوض وبرکات سے لبریز ہے اور اپنے شب وروز دلی اطمینان کے ساتھ گزار رہا ہے۔ مصیبتیں اور سختیاں، جتنی شدت کے ساتھ حملہ آور ہوتی ہیں اسی قدر ترقی کی راہیں، کثرت کے ساتھ کھلتی ہیں۔ محبوب کی ایذا رسانی جو اپنے اندر کچھ مصلحتیں اور مقاصد رکھتی ہے۔ اہل محبت کی نظر میں خوب اور پسندیدہ ہے بلکہ انہیں تو نعمتوں سے بھی زیادہ لذت اسی میں ملتی ہے۔

ہجرے کہ بود مرادِ محبوب
از وصل ہزار بار خوشتر

(عاشق کی دوری جسے محبوب زیادہ تر پسند کرتے ہیں، حقیقت میں عشاق کے لئے وصل یار سے بھی ہزاروں مرتبہ اچھی ہے)

پہلے بھی یہ حقیقت فقیر پر روشن تھی، مگر آپ کی صحبت کثیر البرکت کی تاثیر سے یہ دولت بتمام وکمال حاصل ہوئی ہے اور اسی طرح دنیا اور اہل دنیا کی بے اعتباری، گھٹیا پن اور ان دونوں سے بے رغبتی بھی ان دنوں زیادہ ہوچکی ہے۔ دنیوی ترقی کی باتوں سے بھی دل کی خوشی نہیں ملتی۔ فقیرانہ وضع، دنیا اور اہل دنیا سے بے تعلقی

اور فقر کی بدولت پیدا ہونے والی بے سروسامانی خوب پسندیدہ و مستحسن نظر آتی ہے۔ جب کہ زوال دولت، اہل دولت کے لئے ناپسندیدہ اور تکلیف دہ ہوتا ہے۔ احقر کو بھی دنیوی وضع قطع کے زوال کا احساس قیام دہلی کے دنوں قدرے باقی تھا مگر آپ کی صحبت بابرکت سے فیوض و برکات کا جو اکتساب کرتا رہا وہ تحریر میں نہیں آسکتا۔ ان دنوں آپ سے نسبت ربط نے بے اختیار مغلوب کیا ہوا ہے۔ اکثر و بیشتر آپ کی شکل مبارک سامنے رہتی ہے۔ جسے دیکھ کر یہ ادنیٰ خادم بے خود اور بیقرار ہو جاتا ہے۔ آستاں بوسی کا شوق دیوانگی اس حد تک جا پہنچا ہے کہ نہ نیند میں چین اور نہ بیداری میں آرام ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ تک کیسے پہنچوں، سخت گرمی اور بارش کے سبب گھر سے نکلنے کی جرأت نہیں پڑتی۔ ایسے موسم میں احقر کا اس طرف آنا باعث ہلاکت ہوسکتا ہے اور دوسری ظاہری رکاوٹیں بھی مانع ہیں۔ برسات گزرنے کے بعد اگر کوئی رکاوٹ پیش نہ آئی تو امید ہے کہ آستاں بوسی کر کے اپنی استعداد کے مطابق فیضیاب ہوں گا۔ اگر آپ کی باطنی عنایات جو فوری طور پر پہنچ کر تسلی کرا دیتی ہیں۔ میسر نہ ہوتیں تو قریب تھا کہ درد عشق کی شدت بے جان ڈھانچہ بنا کر رکھ دیتی ہے مگر چونکہ آپ کا فرمان تھا کہ ہم غائبانہ بھی تمہارے دل پر متوجہ رہیں گے اور یہ بھی فرمایا تھا کہ غائبانہ توجہ سے تمہیں فیوض و برکات حاصل ہوں گی۔ اس فرمان سے ذرا دلی سکون حاصل ہے مگر ساتھ ساتھ شرف صحبت کا ذوق وشوق بھی ہے۔ امید رکھتا ہوں کہ توجہ غائبانہ کی کرامت سے حصول پابوسی کا شرف بھی عنایت فرمائیں گے۔ ہفتہ میں آپ نے توجہ کے لئے جو جمعرات کا دن مقرر فرمایا تھا۔ اس پر پیر کا دن بھی بڑھا دیجئے تاکہ آپ احقر کے حال پر ہفتے میں دو دن توجہ فرما سکیں کیونکہ اس توجہ کے باعث پہلی ریاضات و مجاہدات کے مقابلے میں زیادہ کشائش اور روحانی ترقی حاصل ہوتی ہے۔ امید ہے کہ یہ التجا قبول فرمائیں گے۔ جمعرات کے دن نماز عصر کے بعد فرمان عالی کے مطابق آنجناب کی طرف متوجہ رہتا ہوں۔ ان لمحات میں بعض اوقات تو عجیب وغریب کیفیات نمودار ہوتی

ہیں۔ بالخصوص پندرہ صفر کو حسب دستور آپ کی روحانیت کی طرف متوجہ تھا۔

کہ جذبۂ روحانی کی نسبت شعاعوں کی شکل میں جلوہ گر ہوئی، قریب تھا کہ نسبت باطنی کے غلبے کی وجہ سے مدہوش اور بے خود ہو کر زمین پر گرتا کہ اسی درمیان میں نماز مغرب کی اذان ہوئی اور شغل نماز کی وجہ سے یہ کیفیت قدرے ہلکی ہوگئی۔ اسی طرح اکثر اوقات توجہ باطنی کے دوران مغلوب النسبت ہو جاتا ہوں۔ پہلے کبھی کبھار یہ کیفیت ہوتی تھی۔ اب مستقل اور متواتر ہوگئی ہے۔ طبیعت گوشہ نشینی کو پسند کرتی ہے۔ علمی مشاغل اور تلاش روزگار کتنا ہی ضروری کیوں نہ ہو۔ طبیعت ان سے متنفر ہو چکی ہے۔ دو سطریں پڑھنے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ رخصت کرتے وقت آپ کی زبان گوہر افشاں سے نکلا تھا کہ تمہیں اصل نسبت حاصل ہو چکی ہے۔ مداومت اور پابندی کرنے سے یہ روز بروز زیادہ ہوگی اور اس کے اثرات ظہور پذیر ہوں گے سچ تو یہ ہے کہ آپ کا فرمان پورا ہوتا دیکھ رہا ہوں۔ دن بدن نسبت مضبوط ہو رہی ہے اور اس کے آثار خاصیت جلوہ گر ہو رہے ہیں۔ یہ سب کچھ آپ کے لطف وکرم کا ثمرہ جانتا ہوں

من آں خاکم کہ ابر نو بہاری   کند از لطف برمن قطرۂ باری
اگر بر روید از تن صد زبانم   چوں سوسن لطف شکر کے توانم

(میں وہ ناچیز مٹی ہوں کہ ابر نو بہار اپنے لطف وکرم سے مجھ پر رحمت کا مینہ برسا رہا ہے۔ اس لئے میرے بدن سے اگر سو زبانیں بھی پھوٹیں تو گل سوسن کی طرح اس کے لطف وکرم کا شکر ادا نہیں کر سکتیں)۔

میرے ساتھ نشست و برخاست رکھنے والے بعض احباب میری اس نسبت کی خبر اور کیفیت بتلا دیا کرتے ہیں اور بعض تو خود مغلوب الحال ہو کر اپنے اندر ایک عظیم کیفیت مشاہدہ کرتے ہیں۔ برخوردار درویش احمد تو ان دنوں اس نسبت سے بھرپور ہے مگر تمنا یہ ہے کہ اس بے خودی اور مغلوب الحالی کی کیفیت تمام یاران طریقت میں ظہور پذیر ہو۔ جو ابھی تک دیکھنے میں نہیں آرہی، البتہ آپ کی عنایات

سے امید رکھتا ہوں کہ فقیر کے حسب منشایہ بھی ہو جائے گا۔ علم باطنی کی ترقی کے سلسلے میں احقر امید رکھتا ہے کہ توجہ مبذول فرمائیں گے کیونکہ بعض ضروری امور اسی کے حصول پر موقوف ہیں۔ احقر اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ جمیع امور باطنی کی عقدہ کشائی آپ ہی کی توجہ پر منحصر ہے۔

سالہا در طلب روئے نکو در بدرم　　　روئے بنماو خلاصم کن ازیں در بدری

(مدتوں سے رخ انور کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہوں ذرا سی جھلک دکھا کر مجھے اس کوچہ گردی سے نجات دلا)

ان پر اللہ کی سلامتی ہو جو سیدھی راہ چلتے ہیں۔

ایک اور خط میں حضرت والد ماجد کو لکھا کہ:۔

"قبلہ گاہا! فیوض و برکات آپ کی زیر نگرانی تکمیل کئے ہوئے چلّے میں حاصل ہوئیں۔ ان کی تفصیل کسی بیان میں نہیں سما سکتی۔ مختصراً یہ کہ بہت سی ایسی فتوحات باطنی میں جن کا اہل نہیں تھا۔ آپ کی توجہ عالی کی برکت سے حاصل ہوئیں اور نفس کے پلید وسوسوں سے نجات پا کر نسبت روحانی کے مختلف مقامات پر فائز ہوا۔

گر برتن من زبان شود ہر مو　　　یک شکر تو از ہزار نتوانم گفت

(میرے وجود کا ہر بال اگر زبان بن جائے تو تیرے ہزاروں احسانات میں سے ایک کا بھی شکر ادا نہ کر سکوں)

دوسرے یہ کہ اب تک احقر آپ کے فرمان بموجب آغاز قلب کے جوف سے نکلنے والے نور کے مطالعہ ومشاہدہ میں مستغرق ہے۔ اس مشاہدہ ومطالعہ میں عجیب وغریب امور ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں جیسے بیخودی، حضوری، ربودگی اور بعض امور کونی کا کشف اور اس مطالعہ ومشاہدہ کی مشق کے لئے جن مریدین کو اجازت دی تھی۔ ان کے بقول انوار وتجلیات بھی اس مشاہدہ میں میسر آتے رہتے ہیں۔ اگر حکم ہو تو یہ مطالعہ ہمیشہ جاری رکھا جائے یا پھر کوئی اور چیز مناسب حال ارشاد فرمائی جائے تاکہ اسے معمول بنالیا جائے۔ قبلہ گاہا! عجیب معاملہ ہے جب آپ کا اشتیاق

غالب ہوتا ہے تو گویا آپ کی طرف سے ایک کھڑکی کھل جاتی ہے اور آں موصوف کے فیوض باطنی اور برکات روحانی اس ادنیٰ خادم درگاہ پر موسلا دھار مینہ کی طرح برستی رہتی ہیں۔ جس قدر شوق تیز ہوتا ہے اسی قدر یہ برسات شدت اختیار کرتی ہے۔ احقر کو یقین کامل ہے کہ میری تمام باطنی فتوحات آپ کی توجہ کی محتاج ہیں، جناب والا کی ایک توجہ سو سالہ عبادت اور چلوں سے بہتر ہے ؎

اگر از جانب معشوق نباشد کششے
کوشش عاشق بے چارہ بہ جائے نہ رسد

(اگر حصول وصل میں محبوب کی کشش اور عنایت شامل حال نہ ہو، تو عاشق مسکین کبھی منزل مقصود تک نہ پہنچ پائے گا)

نسبت آگاہی کے متعلق شاہ عبدالرحیمؒ کی تشریح

حضرت والد ماجد کے جوابی مکتوب میں مندرج تھا: کہ ذات الٰہی میں گم ہونے اور عرفان و آگہی میں پوری توجہ صرف کرنے سے قوت مشاہدہ اور حضوری حق میں دوامی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے یہ اور بات ہے کہ کچھ لوگ اس کیفیت سے متاثر ہوتے ہیں اور کچھ متاثر نہیں ہوتے۔ میرے مشفق! جب یہ نسبت دوامی کیفیت حاصل کر لے تو کیفیت اور کمیت کے لحاظ سے لحظہ بہ لحظہ ترقی کرتی رہتی ہے اور تمام ہستی موہوم پس پردہ چلی جاتی ہے۔ طالب کو وجود حقیقی عطا ہوتا ہے اور عالم شہود میں وجود امکانی کے آثار کلی طور پر مٹ جاتے ہیں اور وجود حقانی کے انوار و آثار ظہور پذیر ہوتے ہیں اور سالک قرب نوافل کے مقام سے گزر کر قرب فرائض کے مقام میں جا پہنچتا ہے نوع انسانی تو کیا جانور بھی اس نسبت سے متاثر ہوتے ہیں۔ چنانچہ محمد قلی نامی فقیر کا ایک مخلص جس وقت بھی جذبۂ آگاہی کی نسبت سے متاثر ہوتا تھا تو اس کا گھوڑا چلنے سے رک جاتا تھا، جب وہ اس نسبت سے مغلوب ہو جاتا تھا تو گھوڑا زمین پر گر جاتا تھا، جب اس سے بھی زیادہ مغلوب الحال ہوتا تو گھوڑے پر بھی بیخودی طاری ہو جاتی، بعض اوقات کچھ حیوانات نے اس فقیر کی نسبت سے بھی

متاثر ہوکر دانے پانی سے تین تین دن تک منھ پھیر لیا ہے، بلکہ بعض تو اس روحانی نشے کی تاب نہ لاکر مر بھی گئے۔ بزرگان طریقت کے ایسے قصے اور حیوانات کے متاثر ہونے کی باتیں حد تواتر تک پہنچی ہوئی ہیں اور ایسے مشاہدات کثرت سے واقع ہوئے ہیں مگر بعض اکابر سے آثار تصرف کا ظہور اس وقت ہوتا جب وہ معمور ہوتے تھے۔ بعض فقرا مغلوب النسبت ہوکر ایسے آثار دکھاتے تھے اور بعض کاملین ایسے بھی ہوگزرے ہیں جو جب چاہتے یہ تصرفات دکھا سکتے تھے، یہ عجیب بات بھی قابل ملاحظہ ہے کہ جوانی کے دنوں میں بعض احباب توجہ سے ایسے متاثر ہوئے کہ ان کا جسم ہوا میں اڑا اور پھر زمین پر لوٹا۔ متوقع ہوں کہ کچھ عرصہ اس نسبت کو دوام بخشنے کے سلسلے میں مجاہدات اور کوشش کریں گے تاکہ آپ کو اس میں دوام اور پختگی حاصل ہو اور آپ کے تمام احباب طریقت پر بھی اس کا اثر ظاہر ہو۔

جوابی مکتوب میں یہ بھی لکھا تھا کہ:-

سوموار کے دن بھی میری طرف متوجہ ہوا کرو۔ میرے مخدوم و مشفق! یہ خط لکھ کر جمعرات کے دن بعد نماز عصر آں عزیز کی طرف توجہ ڈالی جائے گی انشاء اللہ آپ پر اس کے نیک اثرات کا ظہور ہوگا۔ نیز امید کرتا ہوں کہ آپ درس وتدریس اور کتابوں کے مطالعے کو سردست موقوف رکھیں گے اور بہترین لمحات توجہ کامل کے ساتھ ہمیشہ نسبت مذکورہ حاصل کرنے میں صرف کریں گے۔

حرف کو کاغذی سیاہ کند دل کہ تیرہ است کے چو ماہ کند

(جو حروف اچھے بھلے کاغذوں کو سیاہ کردیتے ہیں وہ تاریک دل کو کیوں کر روشن چاند کا ہمسر بنا سکیں گے)

حروف اور ان کے لہجوں کو دل میں مت لاؤ بلکہ جاگتے سوتے حصول نسبت پر دھیان رکھو حق تو یہ ہے کہ نیند میں بیداری سے بھی زیادہ نسبت حاصل ہوتی ہے، مطالعہ نسبت کے مقابلہ میں ذکر جہری کا وہی مقام ہے جو ذکر قلبی سے دور رکھنے میں وسوسے کو حاصل ہے۔ اس لئے اس نسبت کے حصول میں حضوری پیدا کرنے کے

لئے ذکر ظاہری سے باز رہنا طریقت کے واجبات اور فرائض میں سے ہے، کیونکہ یہ نسبت یعنی نسبت آگاہی حقیقت ذکر کی حیثیت رکھتی ہے اور جہاں حقیقت حاصل ہو وہاں الفاظ واقوال کے تخیل کا کیا دخل؟

میرے مشفق! یہ فقیر جب بھی پیشوائے عارفاں حضرت خواجہ خورد قدس سرہ کی خدمت میں جاتا تھا۔ یہی نصیحت فرماتے تھے کہ اپنے آپ کو درس وتدریس، غیر ضروری کہانیوں اور کتابوں کے مطالعے سے دور رکھو اور اپنی تمام تر توجہ اس نسبت پر مبذول رکھو جو تمام برگزیدہ بندوں کے لئے ضروری قرار دی گئی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ جب تک ہم درس وتدریس اور کتابوں کے اسیر رہے، اس نسبت کے عجیب وغریب آثار ہم پر ظاہر نہ ہو سکے مگر جونہی ان چیزوں سے ہاتھ اٹھایا جو چاہا وہی پایا اگر اپنے پیش رو بزرگوں کی توجہات اور تصرفات کے قصے لکھوں تو ان کے لئے دفتر چاہئیں۔

میرے مشفق! اس طریقے کے اکثر اکابر نسبت آگاہی اور مشاہدے کو اس لحاظ سے کہ مشاہدہ کرنے والے یا حق آگاہ کا وجود درمیان سے اٹھ جاتا ہے تجلی ذاتی گمان کرتے ہیں، اے کاش: اے کاش: کہ تجلی ذاتی ہم سے ابھی کوسوں دور ہے کہنے والے نے کیا ہی خوب کہا ہے۔

کیف الوصول الیٰ سعاد ودونها
قلل الجبال ودونهن حتوف

ع

منزل عشقت مکانِ دیگر است
مرد ایں رہرو نشان دیگر است

(تیرے عشق کی منزل کا مکان ہی اور ہے راہ عشق کے رہرووں کی علامات ہی دوسری ہیں)

ہاں ہاں نسبت آگاہی تجلی ذات کا آئینہ ہے اور یہ نسبت سطوت محبت اور غلبۂ

شوق کی تاثیر سے پیدا ہوتی ہے اور اس نسبت کا تعین صرف وہی علم کر سکتا ہے جو سالک کو باریک اور نازک تر مقامات تک پہنچا سکے۔

معشوق چوں نقاب ز رخ بر نمی کشد
ہر کسے حکایتے بتصور چرا کند

(محبوب جب اپنے رخ سے پردہ نہیں ہٹا رہا تو پھر ہر شخص اپنے دل میں خیالی تصویریں کیوں سجا رہا ہے)

بلند ہمت ارباب سلوک نے اپنی تمام روحانی قوت اور توجہ اس بات پر مبذول رکھی ہے کہ لطیفہ مدرکہ کو بجز ایک حقیقت کے جسے حق کہتے ہیں اور کچھ معلوم نہ ہو سکے آپ کی دانش و بینش کا تقاضا ہے کہ اپنے لطیفہ مدرکہ کو بھی بجز علم حقیقت حق باقی تمام آلائشوں سے پاکیزہ، خالی بیگانہ اور صاف و شفاف رکھنے کے لئے انتہائی اہتمام کریں تا کہ تمہیں استغراق کامل اور حضوری دائمی حاصل ہو۔ جو تمام مقامات سلوک کی انتہا ہے۔ یہ آیۃ کریمہ **وانّ الی ربک المنتھی** (۱) (اے سالک مسالک حقیقت! تیری انتہا وصال ربی ہے) اسی مقام کی طرف اشارہ کر رہی ہے تا کہ اس حالت عظیم اور سعادت دائمی کے وسیلے سے سالک تجلی ذاتی کے اس بلند مرتبے پر فائز ہو سکے جہاں ظاہر و باطن اور قلب و روح میں بجز حقیقت حق سبحانہ اور کچھ نظر نہیں آتا، نیز **کل شیٔ ھالک الا وجھہ** (۲) کے رموز و اسرار بھی سالک پر روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتے ہیں بحمد اللہ کہ طریقۂ خواجگان قدس اللہ اسرارہم میں بعض برگزیدہ اور مقبول درویشوں کو یہ دولت آغاز سلوک ہی میں بغیر کسی ظاہری وسیلے کے صدق اعتقاد اور خلوص نیت کی بدولت مکمل طور پر حاصل ہو جاتی ہے، بے شک جس نے پانا چاہا پالیا اور گرفتار شک بے نصیب رہا۔ والسلام

ذرّہ ذرّہ جلوہ گاہ مصطفٰی صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت والد ماجدؒ فرماتے تھے کہ ایک بزرگ نے توفیق الٰہی سے دنیوی مشاغل سے کنارہ

(۱) پ:۲۷، س: والنجم، ت:۴۲۔ (۲) پ:۲۰، س: عنکبوت، ت:۸۷۔

کشی کر لی، اور اپنی تمام توجہ حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف متوجہ ہونے اور درود پڑھنے میں صرف کر دی، کچھ دنوں میں اس پر نسبت اویسی ظاہر ہوئی اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے فیض پانے لگا اور اپنے آپ کو کمونی کے لقب سے مشہور کر دیا۔ اس تعلق سے کہ کمون کے معنی پردے کے ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے طریق اویسی کے ذریعے اسرار خفی سے سارے پردے اٹھا دیئے تھے، فرمایا مجھے بھی اس بزرگ سے ملاقات اور دوستی کا شرف تھا، ایک دن اس سے سنا کہ میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خلاؤں میں، دھرتی پر، بیٹھنے اٹھنے، بولنے چالنے اور کھانے پینے الغرض ہر حالت میں دیکھتا ہوں، اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حالت مبارک بھی مجھ سے چھپی نہیں رہتی، اور مجھ ناچیز پر حق سبحانہ وتعالیٰ کا یہ کرم خاص ہے۔ میں نے کہا آپ کی انتہائی محبت کے سبب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت کریمہ آپ کی قوت متخیّلہ میں رچ بس چکی ہے ورنہ آپ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رویت حقیقہ نصیب نہیں، یہ سن کر وہ کہنے لگے اس پر دلیل لائیے تاکہ مجھے تصدیق حاصل ہو۔ میں نے کہا کہ فلاں آیہ کا معنی یا بدر واُحد کا قصہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے استفسار کیجئے۔ اگر ایسا جواب ملے جو علماء کے نزدیک یقینی اور تحقیقی ہے تو ماننا پڑے گا کہ آپ کو رویت حقیقہ حاصل ہے اور اگر کچھ معلوم نہ ہو یا خلاف حقیقت ظاہر تو پھر سمجھ لیجئے کہ آپ کے دماغ میں آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت خیالیہ بس رہی ہے اس پر اس بزرگ نے کچھ آیات واحادیث پڑھیں اور بزعم خویش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بار بار پوچھا مگر کچھ جواب نہ ملا میں نے کہا حقیقت واضح ہوگئی کہ فرط محبت کی وجہ سے آپ کے ذہن وخیال میں صورت خیالیہ کی کیفیت طاری رہتی ہے نہ کہ رویت حقیقہ۔ حضرت والا کے ہم نشینوں میں سے ایک اور بزرگ پر یہی حالت طاری ہوئی تو آپ نے اسے بھی یہی کچھ فرمایا۔

فقیر (شاہ ولی اللہ) اس مقام پر ایک تحقیق پیش کرتا ہے اور وہ یہ کہ کبھی کبھی ایسے حضوری لوگوں کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روح انور سے کامل مناسبت پیدا ہو جاتی ہے تو ایسے عالم میں حالت خواب اور بیداری کی تمیز اٹھ جاتی ہے اور ان حضرات کو بغیر دقت نظر کے کائنات کے ذرے ذرے میں صورت محمدی جلوہ گر نظر آتی ہے اور اگر یہ کیفیت زندگی بھر طاری رہے تو بھی اسے رویت حقیقہ کہا جائے گا اور عالم خواب میں انبیاء وصالحین کے مبشرات اور صوفیا کے اس حال میں

کوئی فرق نہیں۔

مذکورہ بالا واقعہ میں شخص مذکور کا آیات واحادیث کے معانی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت نہ کرسکنا کچھ وجوہات رکھتا ہے مثلاً یہ کہ اس بزرگ کی نسبت اس پایہ کی نہیں تھی کہ براہِ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے علوم واسرار کی گرہ کشائی کرسکے یا صاحب نسبت ابھی خام تھا، یا اس لئے کہ صاحب نسبت نے چند خاص امور میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مناسبت پیدا کی نہ کہ یہ نسبت آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مخفی علوم کے حصول کی نیت سے پیدا کی گئی۔ فقیر (شاہ ولی اللہ) کا گمان یہ ہے کہ مذکورہ بالا صاحب نسبت بزرگ کے ادعائے مناسبت کو حضرت والد ماجد نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رویت حقیقہ کے ناممکن الوقوع ہونے کے سبب نہیں بلکہ کچھ اور وجوہات کی بنا پر مسترد فرمایا تھا۔ ضمناً یہ بات بھی ان وجوہات میں شامل ہوگئی۔ واللہ اعلم۔

پختگی نسبت کیسے حاصل ہوتی ہے؟

حضرت والد ماجدؒ اپنے ایک ہم عصر بزرگ کی ملاقات کو گئے جو نسبت اویسیہ میں مشہور اور حد درجہ خوش طبع تھے۔ طویل گفتگو کے بعد حضرت والا نے انہیں فرمایا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روح شریف سے فیضان حاصل کرنا نسبت کے بغیر ناممکن ہے اور نسبت کا تقاضا یہ ہے کہ صاحب نسبت اور مرکز نسبت کے درمیان تمام احوال واعمال میں موافقت میں، بجا یہ کہ آپ کو ایک قسم کی نسبت حاصل ہے لیکن اگر آپ فضول اور بے ہودہ کلام سے اجتناب کریں اور اپنی زندگی کو سیرت نبوی کا نمونہ بنائیں تو یقیناً آپ کی نسبت مضبوط تر ہو جائے گی اور در فیض بھی کھل جائے گا کس قدر بری بات ہے کہ چند گھٹیا قسم کی رکاوٹیں آپ کو پاکیزہ مقاصد تک پہنچنے سے روکے ہوئے ہیں۔ سننے میں آیا ہے کہ حضرت والا کے یہ کلمات ان کے دل میں پیوستہ ہو گئے اور فضول گوئی سے قدرے رک گئے۔

نقشبندی مشائخ کے ایک قول پر اعتراض اور شاہ عبدالرحیمؒ کا جواب

فرمایا کہ شیخ میرٹھی نے مجھ سے پوچھا کہ یہ جو نقشبندی حضرات کہتے ہیں کہ ہمارا آغاز منتہیوں کا انجام ہے حالانکہ میں خواجہ نقشبند کی باتوں سے بیزار ہوں، ہاں ہاں اسی بہاء الدینؒ کی باتوں سے جس کا کلام اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ بایزید کا انتہائی قدم بھی ان کے اوّلین قدم کو

نہیں چھوسکتا، اور ہر شخص یہ جانتا ہے کہ جو شخص پچاس یا ساٹھ سال تک مجاہدے کرتا رہا ہو، وہ مبتدی امروز کے برابر کیسے ہو جائے گا؟ میں نے کہا تم لوگ یعنی سلسلہ شطاریہ کے پیروکار منازل سلوک کیسے طے کرتے ہو، کہنے لگا پہلے اسم ذات دو ضربی، پھر چار ضربی اور پھر اسی طریق سے شغل نفی واثبات کرتے ہیں۔ میں نے کہا اس کے بعد کیا کرتے ہو؟ کہنے لگا شغل امہات اور اسمائے ملتقہ کا ورد کرتے ہیں۔ میں نے پوچھا پھر؟ کہنے لگے شغلِ تُو بتُو۔ پوچھا اس کے بعد کیا کرتے ہو؟ کہنے لگا شغل بے مثال۔ میں نے پوچھا پھر کیا کرتے ہو؟ کہنے لگا اس کے بعد بائے ہویت میں غرق ہو جاتے ہیں۔ میں نے کہا نقشبندی سب سے پہلے بائے ہویت میں غرق ہوتے ہیں اور شیخ نقشبندؒ کے کلام کا یہی تو مطلب ہے نہ یہ کہ صوفیاء کے تمام احوال و آثار آغاز سلوک ہی میں ان پر طاری ہو جاتے ہیں۔

حضرت والد ماجد کے خاص معتقدین میں سے شیخ امان اللہؒ نے ایک دن سوال کیا کہ جب کوئی سالک کسی طریقۂ صوفیاء کے اشغال و اوراد پورے کر کے جمعیت خاطر حاصل کر لے تو کسی دوسرے طریقے میں داخل ہو کر اس کے اعمال و اشغال میں منہمک ہونا اس کے لئے مفید ہے یا نہیں؟ اگر یہ بات اس کے لئے بہتر ہے تو اسے اس سے کیا فائدہ ملے گا؟ آپ نے فرمایا کہ ایک طریقے میں کمال حاصل کرنے کے بعد دوسرے طریقے سے کسب فیض کرنا مستحسن ہے۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ تو یہ ہے کہ اسے اس طریقے کی نسبت حاصل ہوگی، اور ہر طریقے کی نسبت اور اس کے آثار مختلف ہوتے ہیں۔

مختلف سلاسل کی نسبتوں کے خصائص

واضح ہو کہ آپ کی زبان مبارک سے بارہا خلوت میں سنا گیا کہ مجھے جو نسبت حضرت غوث الاعظمؒ سے ملی ہے وہ بہت ہی صاف اور حد درجہ نازک ہے اور جو نسبت مجھے خواجہ نقشبندؒ سے ملی ہے وہ غالب تر اور حد درجہ موثر ہے۔ جمعیت قلب اور قبول عام اس میں بدرجہ اتم موجود ہے اور جو نسبت خواجہ معین الدینؒ سے پائی ہے وہ عشق کے قریب! تاثیر اسماء اور صفائے دل کی مظہر ہے۔

کاتب الحروف (شاہ ولی اللہ) کو آپ کے الفاظ تو یاد نہیں رہے مگر مطلب تقریباً یہی تھا، واللہ اعلم

نیز آپ کی باتوں اور عمل سے اکثر و بیشتر مترشح ہوتا تھا کہ کسی ایک طریقے کے بزرگ کو

دوسرے طریقے کے بزرگ پر فضیلت یا ترجیح دینے کو خاص طور پر اس انداز سے کہ کسی ایک کی تنقیص مقصود ہو آپ ناپسند فرماتے تھے۔

فقیر (شاہ ولی اللہ) نے صلوٰۃ موسم کے متعلق صوفیاء اور محدثین کے اختلاف پر سوال کیا تو فرمایا کلام صوفیاء سے قطع نظر یہ مطلق نوافل میں داخل ہے پھر کیوں نہ اسے نفل ہی کی نیت سے ادا کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت والا راتوں کو عبادت سے زندہ رکھا کرتے تھے اور نوافل میں تعداد رکعات کی بجائے نشاط روح اور حضور قلب کا زیادہ خیال فرماتے تھے۔

بعض طالبان سلوک کی تربیت کے پیش نظر فرمایا کہ عدم اور غیبت کے وقوع پذیر ہونے کے بارے میں ہمارے زمانے کے ارباب سلوک نے جن باتوں کو قابل اعتماد سمجھا ہے وہ حقیقت کے خلاف ہیں بلکہ ان کے مزعومہ غیبت کی حقیقت یہ ہے کہ جب ان نام نہاد سالکین کے دماغوں پر تبخیر معدہ کے اثرات چڑھتے ہیں تو نیند کی سی ایک کیفیت ان پر طاری ہو جاتی ہے اور وہ اپنے آپ میں کھو جاتے ہیں۔ اگرچہ اس کا آغاز حضرت حق سبحانہ تعالیٰ کی طرف توجہ کرنے سے ہی کیوں نہ ہو، باقی رہا ان کا عدم تو بسیار خوری کی وجہ سے جب ان پر نسیان اور بے خودی کا دورہ پڑتا ہے تو اس کے سبب انہیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ ساری قوت یادداشت ختم ہو چکی ہے اور انہیں اپنے وجود کی کوئی شدھ بدھ نہیں رہی۔

مجھے کچھ کچھ یاد آ رہا ہے کہ حضرت والا کی خدمت میں ایک شخص نے عرض کی کہ ان دنوں میرے دل میں ذکر جاری ہو چکا ہے آپ نے ہنس کر فرمایا کہ اگر واقعی ذکر جاری ہے، تو مبارک ہو! بعد میں اس فقیر سے فرمایا کہ لوگوں پر خفقان کا دورہ پڑتا ہے تو وہ سمجھتے ہیں کہ لطیفہ قلب جاری ہو گیا ہے۔

کاتب الحروف (شاہ ولی اللہ) کہتا ہے کہ ہر انسان کے دل بلکہ تمام اعضا میں ایک متحرک نبض موجود ہوتی ہے اور اس کے حرکت میں آنے یا نہ آنے سے کمال انسانی میں کچھ فرق نہیں پڑتا، ہاں البتہ اگر اس حرکت کو کوئی شخص اسم ذات خیال کرے اور یہ تخیل اس پر غالب آ جائے تو یہ فائدہ ہوگا کہ اسم ذات اس کے دل پر نقش ہو کر رہ جائے گا ایسی حالت میں لائق اعتبار تخیلی ہے نہ کہ حرکت! واللہ اعلم

ترقی مدارج کی حقیقت

فرمایا کہ موت کے بعد ترقی درجات ایک ناقابل انکار حقیقت ہے مگر اس سلسلے میں یہ بات کھٹکتی ہے کہ جب اس عالم میں ایک عام آدمی بھی دس گنا یا سو گنا ترقی حاصل کرتے کرتے ہزاروں علماء ومشائخ کے مقامات طے کر کے انبیاء واولیاء کا ہمسر بن سکے گا، تو کچھ مدت بعد ان اولوالعزم ہستیوں اور اس عامی میں کیا فرق باقی رہ جائے گا؟ یہ خیال آتے ہی کشفی طور پر جواب ملا کہ وہاں ہر شخص کی ترقی اپنے اپنے مقررہ مقام کے اندر ہوگی، کیونکہ اس عالم کا ہر مقام اپنے اندر اتنے پہلو، شاخیں، مراتب اور درجات رکھتا ہے کہ جس کی کوئی حدونہایت نہیں، اسی مقام کے مختلف زینے، مراتب اور درجات طے کرنے کو یہ سمجھنا خلاف حقیقت ہے کہ وہ ایک مقام سے دوسرے مقام پر ترقی کر رہا ہے بلکہ اس کا یہ روحانی سفر اپنے ہی مقام کے آخری حدود تک جاری رہ سکے گا۔

اس سلسلے میں کاتب الحروف (شاہ ولی اللہ) کے نزدیک موت کے بعد ترقی مدارج اس لئے نصیب ہوتی ہے کہ مادی وجود کے تمام اجزاء گھل کر ختم ہو جاتے ہیں۔ اور ملکوتی قوتیں پوری طرح ظہور پذیر ہو جاتی ہیں، نیز اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کو ایک خاص استعداد دے کر پیدا کیا ہے جیسے فرمایا: **ومامنا الا له مقام معلوم** (۱) (ہم میں سے کوئی ایسا نہیں جس کے لئے ایک مقام معلوم مقرر نہ کیا گیا ہو) لہٰذا مرنے کے بعد جب انسان کے اندر چھپی ہوئی بہیمی قوتیں اور مادی وجود کے فانی اجزاء منتشر ہو جانے سے صفائے روح اور رونق نوری پیدا ہوتی ہے تو انسان اپنے اس مقام کو پالیتا ہے جسے مقام معلوم کہا گیا ہے۔

سلطان العارفین کے قول کی تشریح

فرمایا جب زرق برق لباس پہنتا اور پان چباتا تو اپنے آپ میں ایک ترقی محسوس کرتا، کاتب الحروف (شاہ ولی اللہ) کہتا ہے کہ اس قسم کے واقعات سے آپ کی طہارت وپاکیزگی اور نفاست طبع کا اندازہ ہوتا ہے۔

حضرت والد ماجد، سلطان العارفین کے اس قول کا معنی بیان کرتے ہوئے **توبة الناس عن ذنوبهم وتوبتي عن قول لا اله الا الله** فرماتے تھے کہ لا الہ الا اللہ میں نفی واثبات کا

(۱) الصفٰت: ۱۶۴

جھگڑا ہے جب کل شئ ھالک الا وجھه کا پہلو نظر آیا، تو پھر نفی کس کی کریں؟ باوجود اس کے کہ خواص نفی کو حقیقت غیر ثابتہ سمجھتے ہیں مگر کبھی کبھی جب غیر اللہ کی جانب سے اطمینان والتفات اور خوف وخطر کی کیفیات دل میں کھٹکتی ہیں، تو انہیں مٹانے کے لئے نفی واثبات کا شغل اختیار کرنا پڑتا ہے۔

لہو ولعب سے اجتناب صفائی قلب کا ذریعہ ہے

فرمایا کہ طالب علمی کے زمانے میں میرے ہم سبق (۱) لڑکے شطرنج کا سامان اور ایک کتاب لائے، مگر مطالعہ کے باوجود وہ کچھ نہ سمجھ سکے، مجھے دی تو میں نے کہا کہ میں تو مہروں کے نام اور ان کی چالوں سے بھی بے خبر ہوں مجھے انہوں نے اس بارے میں کچھ باتیں بتلائیں، پھر میں نے اس کتاب کا مطالعہ کیا، اس میں کھیل سے متعلق لمبی چوڑی باتیں درج تھیں مگر عبارت میں کچھ غلطیاں اور تبدیلیاں تھیں میں نے ان کی اصلاح کردی اور پھر ہر روز اس کتاب کا ایک آدھ سبق اپنے ہم درسوں کو سمجھاتا جس سے وہ بہت خوش ہوتے اور اسی انداز سے شطرنج کھیلتے، انہی دنوں میں بیمار ہوگیا، دلی سکون جاتا رہا اور سخت پریشان ہوا جب چھپر کے کانوں پر نظر پڑتی تو مجھے شطرنج کے مہرے اور دوستوں کا کھیل یاد آجاتا حضرت حافظ سے بہت التجا کی کہ اس مصیبت سے نجات پاؤں تو فرمایا کہ تم ہر حال میں حضرت خاتمیت علیہ من الصلوٰۃ اتمھا و من التسلیمات ایمنھا سے تربیت لینے کے عادی رہے ہو؟ اس لئے کثرت سے درود پاک پڑھو اور اسی بارگاہ میں التجا کرو میں نے کثرت سے درود پڑھا اور بارگاہ نبوت سے التجا کی تو کافی تکلیف کے بعد اس مصیبت سے جان چھوٹی اور شطرنج کے مہروں کے نام اور کھیل کے طریقے میرے دل سے محو ہوگئے، اس پر اللہ کا شکر کیا۔

والدین کے ساتھ نیکی واحسان کا عجیب نکتہ

فرمایا لوگ سمجھتے ہیں کہ والدین کے ساتھ نیک سلوک کرنا بہت ہی مشکل ہے کیونکہ حقیقت میں ان کے ساتھ جتنی بھی نیکی کی جائے وہ اس سے بھی زیادہ کے مستحق ہیں لیکن میرے نزدیک یہ بہت ہی آسان ہے کیونکہ والدین تو معمولی سی دلجوئی سے بھی انتہائی مسرور ہوجاتے ہیں اور اولاد

---

(۱) اصل نسخے میں عبارت اس طرح ہے "درابتدائے حال ہم درشان ما کتابے درحیل شطرنج آوردند" جس کا کوئی مفہوم نہیں نکلتا ہم نے "ہمدرسان ما" کی صورت میں ترجمہ کیا ہے۔ س۔م۔ف۔ق۔

کے معمولی احسان کو بھی انتہائی پدرانہ شفقت کے سبب بہت بڑا احسان سمجھتے ہیں۔

کیفیت و حالت کی حفاظت کا طریقہ

فرمایا جب حق سبحانہ وتعالیٰ کسی کو حالت اور کیفیت عنایت فرمائے تو اس کی حفاظت کا طریقہ یہ ہے کہ صاحب کیفیت و حالت اپنے آپ کو کسی دوسری چیز میں مشغول نہ کرے اور اسے جس جگہ پر کیفیت حاصل ہوئی ہے وہیں ٹکا رہے اور اگر ممکن ہو تو جس ہیئت میں بیٹھا ہے اس میں بھی تبدیلی پیدا نہ کرے اور جس سخن سے یہ کیفیت طاری ہوئی ہے بجز اس کے اور کوئی بات زبان پر نہ لائے جیسا کہ حافظ شیرازیؒ نے فرمایا ہے۔

ایں جافنون شیخ نیرزد بہ نیم جو
دل را بدست آر ہمیں مشرب است بس

(اس دنیا میں مشائخ کے ہنر کچھ وقعت نہیں رکھتے، کسی دل کو راضی کر دو بس یہی مشرب صوفیا ہے)

خود ساختہ مشائخ کی عیاریاں

فرمایا بعض خود ساختہ مشائخ کی زبانوں سے ایسی باتیں نکل جاتی ہیں، جن پر فراست کشفی و عقلی کا احتمال ہو سکتا ہے اور کچھ چیزوں سے بے رغبتی دکھلا کر یہ باور کراتے ہیں کہ یہ چیزیں انھوں نے حق سبحانہ، وتعالیٰ کی خاطر چھوڑ رکھی ہے حالانکہ وہ چیزیں ان کی ضروریات زندگی سے زائد ہوتی ہیں۔

اور کبھی آپ یوں فرماتے تھے کہ اس شعر میں شیخ سے مراد شیخ حقیقی ہے جسے مقام ارشاد عطا ہوا ہے اور دل سے مراد وہ قلب سلیم ہے جو طلب غیر سے خالی اور محفوظ ہو اور فنون شیخ سے مراد تصرف اور کشف ہے۔

تمباکو نوشی اور بارگاہ نبویؐ

جب کبھی تمباکو نوشی کی بات چل پڑتی تو اس کی قباحتوں پر سوائے قطعی حرمت کے آپ بہت سے دلائل اور شواہد پیش فرماتے تھے، چنانچہ آپ فرمایا کرتے تھے کہ لاہور میں دو عزیز رہتے تھے ان میں سے ایک فاضل درویش اور جامع کمالات ہونے کے باوجود تمباکو نوشی کا عادی تھا اور دوسرا عام قسم کا درویش تھا مگر تمباکو سے پرہیز کرتا تھا، دونوں نے عالم مثال میں ایک ہی رات اور ایک

ہی وضع میں حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی گویا یہ عامی درویش آپ کی مجلس میں بیٹھا ہے مگر اس فاضل کو بیٹھنے کی اجازت نہیں مل رہی۔ عامی فقیر نے اہل مجلس سے فاضل عزیز کو بیٹھنے کی اجازت نہ ملنے کا سبب پوچھا تو جواب ملا کہ یہ شخص تمبا کونوشی کرتا ہے، حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسے ناپسند فرماتے ہیں، صبح اٹھتے ہی بہ تقاضائے نصیحت ارادہ کیا کہ یہ بات اس فاضل تک پہنچائے، جب اس کے گھر میں داخل ہوا تو دیکھا کہ وہ سخت رنج وغم میں مبتلا ہے اور رو رہا ہے سبب پوچھا تو اس نے وہی بارگاہ نبویؐ میں حاضری کی اجازت نہ ملنے کا قصہ کہہ سنایا۔ اس عامی درویش نے کہا تمہیں مبارک ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضگی کا سبب میں نے اہل مجلس سے پوچھ لیا تھا جو تمبا کونوشی ہے اس فاضل نے اسی وقت حقہ اور نے (۱) کو ٹکڑے ٹکڑے کیا اور تمبا کونوشی سے پکی توبہ کرلی۔ دوسری رات دونوں نے ایک ہی وقت اور ایک ہی منظر میں خواب میں دیکھا کہ گویا اس فاضل کو تمام اہل مجلس سے زیادہ قرب حاصل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس پر سب زیادہ عنایات والتفات فرمارہے ہیں۔

فرمایا کہ ہمارے ایک بزرگ دوست خود تمبا کونوشی نہیں کرتے تھے مگر مہمانوں کے لئے گھر میں حقے کا انتظام کر رکھا تھا عالم مثال میں دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کے جھونپڑے میں تشریف لائے ہیں اور اندر آنے کے بعد ناپسندیدگی سے واپس لوٹے یہ شخص آپ کے پیچھے پیچھے دوڑا اور ناپسندیدگی کا سبب پوچھا، آپ نے فرمایا کہ تمہارے گھر میں حقہ، چلم اور نے موجود ہے جنھیں میں پسند نہیں کرتا۔

تمبا کونوشی پر عالم مثال میں تنبیہ

فرمایا ہمارے محلے میں ایک درزی رہتا تھا، ایک دن اسے میں نے بلوا بھیجا۔ بلانے والے نے دیکھا کہ وہ مردہ پڑا ہے اور اس کے ورثاء اس پر رو رہے ہیں، کفن دفن کا انتظام کیا جارہا ہے کچھ دیر بعد میں جامع مسجد کو جارہا تھا کہ اسے بازار میں کھڑا دیکھ کر متعجب ہوا اور اس سے اس کا حال پوچھا اس نے کہا میرا قصہ بھی عجیب ہے میں اس محلے کی گلیوں میں جارہا تھا کہ ایسے میں دو ہیبت ناک مرد غضبناک شکل میں میرے سامنے آئے، ان میں سے ایک نے مجھے تھپڑ مارا تو میں

(۱) نے: حقہ کی وہ نلی جس میں سے دھواں آتا ہے۔ (قاسمی)

بے ہوش ہوکر گر پڑا اور بظاہر مر گیا، مجھے اٹھا کر گھر لائے، کفن کا انتظام کیا اور میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ دونوں آدمی مجھے لے کر ایسی جگہ پہنچے جہاں بہت سے لوگ جمع تھے، جن کی شکلیں انسانوں سے مختلف تھیں، مجھے اپنے سردار کے سامنے لے گئے، اس نے کہا جسے ہم نے بلوایا تھا وہ یہ تو نہیں! اسے جہاں سے لائے ہو وہیں پہنچا آؤ۔ جب وہ مجھے لے کر واپس ہونے لگے تو پیچھے سے آواز آئی کہ اسے ذرا ادھر لانا یہ تمباکو نوشی کرتا ہے، یہ کہہ کر انھوں نے لوہے کا ٹکڑا گرم کر کے میری ران کو داغ دیا میری ران جل گئی اور میں اسی حالت میں بیدار ہوا تو دیکھا کہ عزیز و اقارب مجھے نہلا کر کفن پہنانے کا ارادہ کر رہے ہیں۔

شاہ عبدالرحیمؒ کا علمی مقام

ایک دن حضرت والد ماجد باتوں باتوں میں مجھ سے فرمانے لگے کہ شیخ آدم بنوریؒ کے اکابر خلفاء میں سے سید علیم اللہؒ نے تمباکو نوشی کی حرمت میں ایک رسالہ لکھا، اور آیہ کریمہ تأتی السماء بدخان مبین (۱) اور ایسی آیات و امثال اس میں بطور دلیل پیش کیں اور یہ رسالہ افغان مولویوں کے ہاتھ میں دے کر علمائے دہلی کے پاس بھیجا، یہ دونوں پٹھان مولوی سب سے پہلے میرے پاس آئے، میں نے کہا کہ ان بیہودہ دلیلوں سے کچھ کام نہیں چلے گا، اور یہ اس آیت کی تفسیر میں علمائے حق نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے میں نے وہ بیان کیا اور اس سے متعلق احادیث اور روایات فقہی کا حقیقی مفہوم ان پر واضح کیا، اس سے وہ قدرے ناخوش ہوئے اس کے بعد وہ دونوں شہر کے نامور فاضل ملا یعقوبؒ کے درس میں چلے گئے دیکھا کہ وہ مجلس درس میں تمباکو نوشی کر رہا ہے۔ یہ دونوں معترض ہوئے تو ملا یعقوب نے کہا کہ میں مجلس میں اس لئے تمباکو نوشی کر رہا ہوں کہ لوگوں پر اس کا مباح ہونا واضح ہو۔ اگر کسی کو اس مسئلے میں کوئی شک ہے تو وہ میرے سامنے پیش کرے افغان مولویوں نے اس رسالے میں سے بعض فقہی روایات اور احادیث بیان کیں، تو ملا یعقوب بھڑک اٹھا اور معمولی توجہ سے ان کے دلائل رد کر دیئے۔ دونوں شکستہ دل اور غمگین ہوکر واپس لوٹ آئے اور صورت حال مجھے بتلائی۔ میں نے کہا تم نے تمباکو کی حرمت کا دعویٰ کیا اور دلیلیں یہ پیش کیں تو کام کیسے چلتا۔ اب جاؤ اور اس سے آیہ کریمہ یا ایھا النبی لم تحرم ما

(۱) پ ۲۵، س دخان، آیت ۹

احل اللہ لک (۱) کا شان نزول پوچھو، بس یہی تو کہے گا کہ حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کے گھر میں شہد تناول فرماتے تھے جس سے باقی ازواج مطہرات کو رشک آیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی کہ آپ کے دہن مبارک سے مغافیر کی بو آتی ہے۔ آپ نے فرمایا میں نے مغافیر نہیں، بلکہ شہد کھایا ہے تو سب کہنے لگیں کہ ہوسکتا ہے شہد کی مکھیوں ہی نے مغافیر (۲) کھایا ہو! چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شہد کو اپنے اوپر حرام قرار دے دیا تو یہ آیت نازل ہوئی جب اتنا کہہ چکے تو پھر اس سے پوچھو کہ اس ناپسندیدگی کا سبب کیا تھا تو غالباً یہی کہے گا کہ ناخوشگوار بو، پھر اس سے پوچھنا کہ یہ جو حدیث میں آیا ہے کہ جو شخص ان سبزیوں (پیاز و لہسن) میں سے کھائے وہ ہماری مسجد میں ہرگز نہ آئے اس میں منع کرنے کی اصل وجہ کیا ہے؟ تو وہ کہے گا ان کی خراب بو! پھر اس سے پوچھنا کہ یہ جو حدیث میں آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خوشبو کو پسند اور ناخوشگوار بو سے نفرت فرماتے تھے۔ یہ صحیح ہے یا غلط تو وہ ضرور کہے گا کہ صحیح ہے تب اس سے کہنا کہ تمبا کو میں بدبو ہے کہ نہیں؟ اگر کہے کہ نہیں تو اس سے کہنا کہ جنھوں نے کبھی تمبا کو نوشی نہیں کی ان سے پوچھو کہ اس کی بو ان کے دماغوں کو کس قدر ناخوش لگتی ہے جب یہ ثابت ہو گیا کہ اس میں بدبو ہے تو اہل احتیاط اور صاحبان ورع و تقویٰ کے لئے مناسب ہے کہ اسے ترک کر دیں۔ یہ دونوں پٹھان مولوی گئے اور اسی انداز سے سوالات کئے ملا یعقوب نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور مجلس درس سے چلم ہٹا دی۔

علم مصالح اور شرائع

کاتب الحروف کہتا ہے کہ حضرت شارع علیہ السلام نے ہمیں دو قسم کا علم عطا فرمایا ہے۔ علم مصالح اور علم شرائع۔ مصالح سے ہماری مراد یہ ہے کہ چار خصلتیں یعنی طہارت، خشوع، سخاوت اور عدالت اور وہ تمام امور جو ان سے تعلق رکھتے ہیں نیز کلمہ حق کو بلند کرنے کے لئے ملأ اعلیٰ کا ارادہ واشارہ اور وہ تمام مقامات جو اس راہ سے تعلق رکھتے ہیں رضائے الٰہی کا موجب بنیں اور ان خصائل اربعہ یا ان سے متعلق دیگر امور کے مدمقابل خصائل و عادات غضب الٰہی کا سبب بنیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر قسم کے اخلاق تامہ فاضلہ مثلاً شجاعت وغیرہ کی دعوت دی اور یہ

(۱) پ ۲۸ س تحریم، ت ۱ (۲) مغافیر: جمع مغفار، کھانے کا گوند ایک درخت کا گوند۔ (قاسمی)

تمام امور دراصل عقلیات کے تحت آتے ہیں اور ہم ان کو مصالح کے نام سے یاد کرتے ہیں، شرائع سے ہماری مراد احوال واعمال کے شرعی پیمانے، نظام الاوقات اور وہ امور ہیں جو ان سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ سب کے سب بندگی محض کے ضمن میں آتے ہیں، یعنی عقل اگرچہ ان پیمانوں اور اصولوں کی خوبیوں اور خاصیتوں کو اوران کے نازل ہونے کی وجوہات اور مصالح کو جان سکتی ہے، مگران کے قائم کرنے اوران پرکاربند ہونے کے سلسلے میں انجام اور نتیجے کو کوئی دخل نہیں ہوتا کہ ملأ اعلیٰ میں ان اعمال واحوال میں سے کون سی چیز رضائے الٰہی کا موجب اور کون سی بات ناراضی خدا کا سبب بنے گی اور مصالح شرعی کی یہ بات بھی ہمارے عقل میں نہیں سما سکتی، کہ ملا اعلیٰ کی توجہ عبادت گزاروں کو نفع وفائدہ اور گنہ گاروں کو گزندکیوں کر پہنچا سکتی ہے، مثلاً ہم سمجھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کا یاد کرنا ذریعۂ نجات ہے مگر یہ کہ خدا کو کسی صفت خاص سے اوقات خاص میں یاد کرنے سے فرض تو ادا ہو جائے گا، مگر ملا اعلیٰ میں اس کے ردوقبول کی جو حیثیت ومقام مقرر ہے اس کا ادراک واحاطہ ہماری عقل نہیں کرسکتی، میرا مذہب یہ ہے کہ شرائع حکم شریعت کے بغیر ثابت نہیں ہوسکتی اور مصالح کو ہماری عقل حضرت پیغمبرؐ کی بعثت سے قبل بھی اور اس کے بعد بھی سمجھتی رہی ہے۔ اس لئے قیاس جلی اور نص سے ثابت شدہ حکم کے مقابلے میں ایسے غیر قیاسی احکام کو جن کے متعلق کوئی نص بھی نہ ہو۔ حکم شرعی نہیں کہا جائے گا۔ مصالح شرعی کے ضمن میں رغبت رضائے الٰہی اور خوف غضب حق، اصل چیز ہوتی ہے، ہم جانتے ہیں کہ سونے چاندی کے برتنوں اور ریشمی لباس سے منع کرنے کا سبب ان میں موجود کراہت انسان کی خودغرضی، خود پسندی اور اسراف ہے۔ اس حکم میں قابل توجہ اور اصل چیز دونوں میں موجود ذاتی قباحت ہے خواہ کوئی شخص فضول خرچی اور خود پسندی سے بچنے کی غرض سے اجتناب کرے یا یہ چیزیں پیش نظر نہ ہوں، دونوں حالتوں میں اس کی نہی قائم رہے گی، باقی رہا یاقوت وزمرد اور قیمتی شالوں کا استعمال تو ان میں اگرچہ حریر وطلا سے زیادہ خود پسندی اور عجب کا اظہار کیوں نہ ہو مگر چونکہ ان کے لئے ذاتی قباحت کی طرف شارع علیہ السلام نے کوئی اشارہ نہیں کیا اس لئے اگر کوئی شخص ذاتی مفاد اور خود پسندی کی نیت سے انہیں استعمال کرے تو قباحت اور ضرر پایا جائے گا بصورت دیگران کے استعمال میں کوئی حرج نہیں اس علم وعقیدہ کو قبول کرنا چاہئے۔

قال را بگذار و مرد حال شو

فرمایا خواجہ خوردؒ نے مجھے وصیت کی تھی کہ درس و تدریس اور غیر ضروری کتابوں اور کہانیوں سے اپنے آپ کو دور رکھنا سچ تو یہ ہے کہ جب تک ان چیزوں میں محو رہا اس نسبت روحانی کے عجیب وغریب آثار مجھ پر ظاہر نہ ہوئے۔

کچھ کچھ یاد پڑتا ہے کہ کسی شخص نے حضرت والا سے سوال کیا کہ حضرت شیخ ابوالفتحؒ اور مخدومی شیخ محمد قدس اللہ اسرار ہما کی نسبتوں میں کیا فرق ہے؟ فرمایا شیخ ابوالفتحؒ کو نسبت عشق حاصل تھی اور حضرت مخدوم نسبت شہود رکھتے تھے۔

حقیقت کیمیا

فرمایا شیخ ملک یار پران اہل بیت نبوی کی نسبت سے مناسبت کامل رکھتے تھے، فرمایا کہ ایک شخص نے مخدومی اخوی شیخ ابوالرضا قدس سرہ کی خدمت میں خط لکھا جس میں سلوک راہ اور حقیقت کیمیا کے وجود یا عدم کے بارے میں سوال کیا آپ نے جواب کے لئے خط مجھے دیا، میں نے اسے لکھا:

اذا تزوجت الاجساد وتجسدت الارواح حصل المقصود.

(جب اجزائے مادی یکجان ہو جائیں اور ارواح وجود کی شکل اختیار کر لیں تو مقصود حاصل ہو جائے گا)

زندگی گزارنے کا گر

حضرت والد ماجد کے مخلصین میں سے ایک نے سوال کیا کہ لوگوں میں زندگی کیسے گزارنی چاہئے تو آپ نے فرمایا: کن فی الناس کاحد من الناس (لوگوں میں ان جیسا ہو کر رہ) پھر پوچھا حق سبحانہ وتعالیٰ تک پہنچنے کا راستہ کیا ہے؟ فرمایا رجال لا تلهيهم تجارة ولا بيع عن ذكر الله (۱) (خدا کو پانے والے وہ مردان راہ خدا ہیں، جنھیں کاروبار اور مفادات خدا سے نہیں روکتے)

عدل وانصاف

ایک دفعہ حضرت والد ماجد سفر میں تھے۔ آپ کے ساتھی بہلی پر باری باری سوار ہوتے تھے

(۱) پ ۱۸، س نور، ت ۳۷

دوران سفر بعض دوست اپنی باری سے زیادہ سوار ہوئے تو حضرت والا نے فرمایا بہلی کے سواروں سے پوچھو کہ آیہ کریمہ اعدلوا ھو اقرب للتقوی (۱) کون سے پارے میں ہے؟ یاران جماعت میں سے شیخ بدرالحق نے اشارہ سمجھ لیا اور بہلی سے نیچے اتر کر کہنے لگے حضرت! یہ آیۂ پارہ یعتذرون میں ہے۔

باید کہ ہر جا روی طالب مردے شوی

شیخ امان اللہؒ نے کابل جانے کا قصد کیا اور حضرت والا سے دعا کی خواہش کی آپ نے فرمایا جہاں بھی جاؤ اہل اللہ کی تلاش کرتے رہو، جس سالک یا مجذوب میں بھی معنی حقیقت کی خوشبو پاؤ بلا تاخیر اس کی صحبت اختیار کرو گے یہ گئے اور آپ کے فرمان پر عمل کرتے رہے جب واپس لوٹے تو حضرت والا کے سامنے کھڑے ہو کر یہ شعر پڑھا۔

آفاقہا گردیدہ ام مہر بتاں ورزیدہ ام
بسیار خوباں دیدہ ام اما تو چیزے دیگری

شیخ اکبرؒ اور شاہ عبدالرحیمؒ

حضرت والد ماجد شیخ محی الدین بن عربی کی بہت تعظیم کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ اگر میں چاہوں تو فصوص کو برسر منبر بیان کر کے اس کے تمام مسائل کے اثبات کے لئے آیات و احادیث سے دلائل پیش کروں اور اس انداز سے بیان کروں کہ کسی کا شک باقی نہ رہے مگر اس کے باوجود آپ وحدۃ الوجود کے کھلم کھلا بیان سے احتراز فرماتے تھے، کیونکہ اس دور کے اکثر لوگ اس کے سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتے، اور نا سمجھی کی بنا پر الحاد اور زندقے کے بھنور میں پھنس جاتے ہیں۔ اس احتیاط کے باوجود بھی آپ کی کئی تقریروں میں وحدۃ الوجود کا رنگ جھلکتا تھا۔ اور اس فقیر (شاہ ولی اللہ) کو رسائی وحدۃ الوجود کے مطالعہ کی اکثر رغبت دلایا کرتے تھے، نیز اس فقیر نے لوائح (۲)، شرح رباعیات (۳)، اور مقدمہ لمعات (۴) پورے غور و خوض کے ساتھ حضرت والا سے پڑھی ہیں اور بعض یاران حلقہ نے ''النصوص'' بھی حضرت والا سے پڑھی۔ ان کے ساتھ کبھی کبھار فقیر بھی شامل ہو جاتا تھا۔ آپ ان مسائل کا حل بخوبی فرماتے تھے۔ ربط حادث با قدیم کی تحقیق کرتے

---

(۱) پ ٦، س مائدہ، ت ۸ (۲) مصنفہ جامیؒ۔ (۳) مصنفہ باباطاہرؒ (۴) مصنفہ عراقیؒ۔

ہوئے بارہا حضرت والا سے یہ تمثیل سنی، فرماتے تھے کہ جن معلوم شکلوں کو ہم دیکھتے ہیں خارج میں ان کا ثبوت و وجود کوئی بھی نہیں، محض ہماری قوت علمیہ کے سہارے موجود ہیں اور یہ سب کچھ ہمارا ہی علم ہے جو مختلف رنگوں اور شکلوں میں نمودار ہوتا ہے، بلا شبہ ان صورتوں کو ہم عین علم بھی نہیں کہہ سکتے کیونکہ جب علم تھا تو یہ صورتیں نہیں تھیں اور انہیں علم سے جدا بھی نہیں کر سکتے کیونکہ ان تغیر پذیر صورتوں اور ہیولوں کو خارج میں وجود و شکل دینے والا اور انہیں ایک حقیقت بنانے والا علم ہے علم اگرچہ بے رنگ ہے مگر مختلف رنگ اس کی بے رنگی میں کوئی مزاحمت نہیں کر سکتے۔

آیہ کریمہ وهو معكم (۱) کی تشریح میں فرمایا کرتے تھے کہ یہ معیت محض علم کے سہارے نہیں بلکہ خارج اور حقیقت میں بھی موجود اور ثابت ہے اور اس سے کوئی خلجان پیدا نہیں ہونا چاہئے کیونکہ یہ معیت، معیت کے ان معنوں میں نہیں جو جوہر کو جوہر کے ساتھ عرض کو عرض کے ساتھ یا جوہر کو عرض کے ساتھ حاصل ہوتی ہے بلکہ یہ معیت حادث با قدیم ایک لطیف ترین معنی ہے جسے ان معیتوں سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

وهو معكم کی عالمانہ تشریح

فرمایا ہر شخص نے اپنی استعداد کے مطابق معیت کے مسئلے سے لطف اٹھایا ہے۔ ایک گروہ نے یہ سمجھ لیا کہ حق سبحانہ وتعالیٰ اپنے علم قدرت سمع اور بصر کے ساتھ ہمیں محیط ہے جیسا کہ فرمایا مايكون من نجوىٰ ثلثة (۲) اور ایک گروہ نے بچشم عیاں دیکھ کر کہا کہ ہر فعل اور انفعال اور ہر حرکت اور صفت جو عالم میں ظاہر ہوتی ہے حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ سے ہے جیسا کہ فرمایا قل كل من عندالله (۳) اور وما بكم من نعمة فمن الله (۴) ایک جماعت نے مشاہدہ کیا کہ جو کچھ ہی ہے وہی ہے غیر تو ہے ہی نہیں جیسا کہ فرمایا كل شي هالكٌ الا وجهه (۵) اور هو الاول والآخر والظاهر والباطن (۶) اور کچھ حضرات نے تو حق کو حق میں دیکھا اور اس مقام کی گہرائیاں بیان کرنے سے زبان قلم قاصر ہے۔

---

(۱) پ ۲۷، س حدید، ت ۴، (۲) پ ۲۸، س مجادلہ، ت ۷، (۳) پ ۵، س نساء، ت ۷۸،
(۴) پ ۱۴، س نحل، ت ۵۳، (۵) پ ۲۰، س قصص، ت ۸۸، (۶) پ ۲۷، س حدید، ت ۳۔

تجدد امثال

تجدد امثال کی بات چل نکلی تو آپ نے عجیب تقریر بیان فرمائی مگر چونکہ میں اس وقت بہت کمسن تھا اس لئے اسی اسلوب سے وہ تقریر محفوظ نہیں رہی لیکن حاصل کلام یہ تھا کہ موجِد اور موجَد میں وہی تعلق ہے جو دائم اور اس کے دوام میں ہے کہ جب کوئی چیز عدم سے متعلق ہوتی ہے تو اس کا نام ایجاد رکھتے ہیں اور جب اسے حالت وجود پر قیاس کیا جاتا ہے تو اسے ابقا کا نام دیا جاتا ہے مگر یا متحد الحقیقت ہونیکے باوجود اسماء کا اختلاف، اختلافِ لحاظ کے اعتبار سے ہوتا ہے جیسے سورج سے نکلنے والی روشنی جو ہمیشہ اپنے وجود کو قائم رکھنے کے لئے سورج کے ساتھ تعلق کی محتاج ہوتی ہے، جب ہم ضیائے شمس کی پہلی حالت پر نگاہ کریں تو اسے اشراق اور رفع ظلمت کا نام دیا جائے گا اور دوسری حالت یعنی جب وہ پوری آب وتاب کو پہنچے تو اسے ابقا نور کا نام دیا جاتا ہے اور اسی کو تجدد کہتے ہیں، تجدد امثال کی حقیقت اسی مثال سے سمجھی جاسکتی ہے۔

صفات باری

فرمایا کہ صفات ان معنوں میں عین ذات ہوتی ہیں کہ ذات محض صفات زائدہ قائمہ بالذات سے آثار کے ظاہر ہونے میں کفایت کرتی ہے۔

حسن ذاتی اور قبح نسبتی

فرمایا جو کچھ اس عالم میں ہے حسن ذاتی اور قبح نسبتی رکھتا ہے اس سلسلے میں بہت سی مثالیں پیش فرمایا کرتے تھے، مثلاً تلوار کی تیزی فی نفسہ ایک خوبی ہے جو فولاد کے کمال کا اثر ہے مگر ایک مظلوم شخص کو موت کے گھاٹ اتارنے کی وجہ سے تلوار کی یہ خوبی قبیح نظر آتی ہے اسی طرح اور مثالیں بھی دیا کرتے تھے۔

مسمّٰی حقیقت

فرمایا مخلوق کی مسمی حقیقت میں کوئی دخل نہیں اور کسی شخص کا فہم وعقل اور ادراک واندیشہ وہاں بار نہیں پاسکتا ہاں البتہ مسمّٰی اللہ کی حقیقت میں محض اس قدر دخل ہے کہ وہ اپنے تمام اسماء وصفات کے ساتھ موصوف ہے۔

شاہ عبدالرحیمؒ کا ہندی دوہا

ایک دن اس فقیر نے ہندی کا یہ دوہا۔

جب جیو نہ تھا تب پیو نہ تھا اب پیو ہے جیو ناتھ

رحیم پیاسوں یوں ملے جوں بوند سمندر ناتھ

حضرت والا کے مجموعہ خاص میں ان کے ہاتھ سے لکھا ہوا دیکھا آپ چونکہ ایسی باتیں بہت کم بیان کرتے تھے لہٰذا مجھے تعجب ہوا اور حضرت والا سے پوچھا کہ یہ دوہا حضرت نے نظم فرمایا ہے یا کسی اور نے؟ تو فرمایا کہ یہ شعر میرا ہے اور میرے ہی ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔

لطائف ستہ اور ان کے مقامات

ایک دن یہ ذکر چل نکلا کہ لطائف ستہ (۱) کیا ہیں؟ اور دور آخر کے صوفیا نے ان کے لئے کون کون سی جگہیں معین کی ہیں تو حضرت والا نے فرمایا کہ کاغذ اور قلم دوات لاؤ۔ جب یہ لایا تو آپ نے ایک دائرہ بنا کر فرمایا یہ قلب ہے پھر اس دائرے کے بیچ میں ایک اور دائرہ بنا کر فرمایا یہ روح ہے اس طرح دائرہ کے اندر دائرہ بناتے رہے یہاں تک کہ مقام انا تک پہنچے تو فرمایا کہ لطائف کی صورت میں ہمیں سب سے زیادہ یہ پسند ہے کہ باقی سب مختلف رخ اور اعتبارات میں اور پھر خواجہ نقشبندؒ کے اس قول کو کہ ع

آئینہ ما راشش جہت است

(ہمارے شیشے کے چھ رخ ہیں)

اس مسئلے کے ساتھ خوب مطابقت دی۔

شاہ عبدالرحیمؒ یا ابوالفیضؒ؟

اس فقیر (شاہ ولی اللہ) نے بعض دوستوں سے سنا ہے کہ حضرت والا کا نام نامی عالم ملکوت میں ابوالفیض ہے۔ اس بارے میں میں نے آپ سے خلوت میں پوچھا تو ہنس کر فرمایا کہ ہاں ایسے ہی ہے اور تمہارا نام عالم ملکوت میں ابوالفیاض ہے۔

---

(۱) اصل متن میں ''لطائف ستہ مرقوم ہے۔ میرے پاس تین مختلف نسخے موجود ہیں سب میں اسی طرح ہے میں نے ''لطائف ستہ'' سمجھ کر ترجمہ کیا ہے۔ (م)

مباش در پے آزار الخ

ایک دن حضرت والا نماز ظہر کے بعد اس فقیر کی طرف متوجہ ہوئے اور فی البدیہ رباعی پڑھی

گر تو راہ حق بخواہی اے پسر　　خاطر کس را مرنجاں الحذر
در طریقت رکن اعظم رحمت است　　ایں چنیں فرمود آں خیر البشر

پھر فرمایا کہ قلم دوات لاؤ اور لکھ لو کیونکہ حضرت سبحانہ وتعالیٰ نے یہ شعر اچانک میرے دل پر القا فرمایا ہے تاکہ تجھے ان کے ذریعے وصیت کروں، پھر اشارے سے فرمایا کہ یہ بہت بڑی نعمت ہے جس کا شکر لازم ہے یہ رباعی بھی حضرت کے پاکیزہ خیال کا مرقع ہے۔

اے کہ نعمت ہائے تو از حد فزوں　　شکر نعمتہائے تو از حد بروں
عجز از شکر تو باشد شکر ما　　گر بود فضل تو مارا رہنوں

شاہ عبدالرحیمؒ کے جواہر پارے

اس فقیر کو اپنی مجلس اور صحبت میں معاملات دنیوی کے طریقے اور حکمت عملی خوب سکھلاتے تھے ان میں سے جو کچھ حافظے میں باقی رہ گیا ہے اس میں سے چند جواہر پارے یہ ہیں۔

- فرماتے تھے مجلس میں کسی بھی قوم کی تنقیص مت بیان کرو، یہ نہ کہو کہ پورب والے ایسے ہیں اور پنجابی ایسے، افغان ایسے ہیں اور مغل ایسے ہوسکتا ہے کہ اس مجلس میں اس قوم کا کوئی مرد میدان بیٹھا ہو یا اس علاقے کا کوئی باحمیت آدمی اور وہ اسے برا سمجھے اور اہل مجلس کا مزہ کرکرا ہوکر رہ جائے۔
- عوام کے خلاف ہرگز کوئی بات زبان پر نہیں لانی چاہئے، چاہے کتنی ہی سچی اور صحیح کیوں نہ ہو، ہوسکتا ہے کہ سب پھر جائیں اور مجلس بدمزہ ہوجائے۔
- اگر کسی آدمی سے کوئی کام ہو تو حاجت پیش کرنے سے پہلے بہت ہی خوب صورت تمہید باندھو اور پھر تدریجا اپنی حاجت پیش کرو۔ ایسا نہ ہو کہ اپنی ضرورت کی بات کو اس شخص کے سامنے پتھر کی طرح دے مارو۔
- مجلس عام میں کسی شخص کو بھی کھلم کھلا تردید ہرگز نہ کرو۔
- آدمی کو ایسا لباس اختیار کرنا چاہئے کہ جس سے اس کی صفت کمال کا اظہار رہتا ہو مثلاً

دانشمند کو دانشمندوں کا سا لباس پہننا اور ان جیسی زندگی گزارنی چاہیے اور فقیر کو فقیرانہ لباس پہننا اور طریق فقر اختیار کرنا چاہیے۔

- بزرگوں سے بات کرتے وقت پیچیدہ اور گنجلک الفاظ استعمال کرنا اور بہت ہی آہستگی سے بات کرنا مناسب نہیں۔
- اگر تم سے شجاعت، سخاوت یا جوانمردی کی کوئی خوبی ظہور پذیر ہو تو ایسا اہتمام کرنا چاہیے کہ لوگ تمہارے اس کمال سے باخبر ہو سکیں۔
- بیمار پرسی کا سب سے بڑا مقصد بیمار کی خوشنودی ہے نہ کہ صرف اس کے مزاج کی کیفیت سے اطلاع پانا اسی طرح تعزیت سفارش اور اس قسم کی دوسری باتیں پس جو شخص یہ سب چیزیں بجالاتا ہے اور صاحب معاملہ کو اپنی محنت سے مطلع نہیں کرتا تو سمجھ لیجیے اس کی ساری محنت ضائع گئی۔
- اور ہر وہ کام جس کے کرنے میں کوئی مصلحت یا لوگوں کے درمیان الفت ومحبت پیدا کرنا یا صلح جوئی ہو اسی قبیل میں شمار ہوگا۔
- دوسروں کو رخصت کرتے وقت یا انہیں وصیت کرتے وقت آپ اکثر یہ شعر پڑھا کرتے تھے:

آسائش دو گیتی تفسیر ایں دو حرف است
با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

- اگر تم سے کمتر درجے کے لوگ تمہیں سلام کرنے میں پہل کریں تو اس بات کو انعامات الٰہی میں سے ایک نعمت سمجھو اور شکر بجالاؤ ایسے لوگوں سے خندہ پیشانی سے پیش آؤ اور ان کی خیر وعافیت پوچھو اس بات کا قوی امکان ہے کہ تمہاری معمولی توجہ انہیں بہت بڑی خوبی نظر آئے اور اس پر وہ ایسے مرمٹیں کہ دوبارہ اگر ایسی توجہ نہ پائیں تو دل شکستہ ہو جائیں۔

صد ملک دل بہ نیم نگاہ مے تواں خرید
خوباں دریں معاملہ تقصیر مے کنند

- بعض لوگوں کی یہ حماقت ہے کہ لباس یا کسی خاص عادت کو اپنے لئے ایک علامت بنا لیتے

ہیں، یا کوئی تکیہ کلام مقرر کر لیتے ہیں یا کسی ایک طعام سے مصنوعی نفرت اختیار کر لیتے ہیں اور پھر لوگ ان عادات کی بنا پر انہیں اپنی مزاح وظرافت کا نشانہ بناتے ہیں۔

- بعض دوست تجھ سے ذاتی محبت رکھتے ہیں یعنی اگر تیری محبت آہستہ آہستہ ان کے دل میں بس جائے تو پھر کسی حالت میں بھی ان کے دل سے نہیں نکل سکتی، نہ خوشی ومسرت کے عالم میں اور نہ رنج وغم کے حالات میں ایسے دوست کو غنیمت جان کر اولاد سے بھی زیادہ عزیز رکھنا چاہئے۔ بعض دوستوں کی محبت کا سبب ان پر تیری فضیلت اور تجھ سے ان کی ضروریات کی وابستگی میں پنہاں ہوتا ہے اس لئے ہر دوست کی حیثیت پہچاننی چاہئے اور سب کو ایک مقام نہیں دینا چاہئے اور کسی دوست پر اس کی حیثیت سے زیادہ اعتماد نہیں کرنا چاہئے۔
- اہل عقل اور ارباب حکمت کے نزدیک انسان کو ضروریات زندگی کے استعمال میں صرف لذت اندوزی مقصود نہ ہو بلکہ زندگی کی سب نعمتیں دفع حاجت، حصول فضیلت اور ادائے سنت کے ارادے سے حاصل کرنی چاہئیں۔
- بول چال، سیر وسفر اور نشست وبرخاست میں ضعف ونقاہت کے باوجود مردان اولوالعزم کی سی طرز وعادت کو اختیار کرنا چاہئے، اور اگر سوء اتفاق سے کوئی عیب یا مکروہ فعل یا بخل تجھ سے صادر ہو تو اسے چھپانے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہئے اور اس سے شرمندگی محسوس کرنی چاہئے اور اس عیب کی مد مقابل صفت اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہئے تاکہ وہ عیب یا عادت بد طبیعت میں راسخ نہ ہو جائے۔

جب آداب سفر پر گفتگو ہوتی تو آپ چوروں اور ٹھگوں سے بچنے کی بہت تاکید فرماتے اور اس قسم کے جو واقعات سفر اکبرآباد میں پیش آئے وہ بھی سنایا کرتے تھے۔

سراپائے شاہ عبدالرحیمؒ

حضرت والا شجاعت، فراست، قناعت اور غیرت ایسے اخلاق حسنہ سے پورے طور پر بہرہ ور تھے اور امور آخرت کی سمجھ بوجھ کے ساتھ ساتھ اس دنیا کے معاشی اور اقتصادی امور پر بھی دسترس رکھتے تھے اور ہر کام میں میانہ روی کو پسند فرماتے تھے، نہ اس قدر امور دنیا سے غافل اور زہد

میں مستغرق تھے کہ عبادات کو رہبانیت سے ملا دیں اور نہ اس قدر آداب عبادت اور قیود مذہب سے بیگانہ کہ سستی میں شمار ہو۔ آپ کے لباس اور وضع وقطع سے ہمیشہ بے تکلفی ٹپکتی تھی، موٹا جھوٹا اور نرم وگداز جیسا بھی میسر آتا پہن لیتے تھے یہ اور بات ہے کہ حق سبحانہ وتعالیٰ نے بغیر طلب کئے ہوئے انہیں ہمیشہ اعلیٰ لباس عنایت فرمایا۔

فرمایا کرتے تھے کہ جب سے دنیا پہ لات ماری ہے اب تک اپنے لئے بازار سے کبھی لباس نہیں خریدا، نہ دستار، نہ جامہ اور نہ جوتے، حق سبحانہ وتعالیٰ یہ چیزیں بوقت ضرورت کثرت سے دیتا رہا ہے ایک دن آپ نے قیمتی لباس پہن رکھا تھا۔ ایک خشک صوفی نے اس بارے میں بحث شروع کردی آپ فرمانے لگے میرے لباس کی ہر تار جو شال درشال ہے محبت الٰہی کی کمند یعنی جال ہے کیونکہ یہ میرے سعی وارادے کے بغیر اس کارساز حقیقی نے مجھے عطا فرمایا ہے اور تیرے لباس کی ہر تار اگرچہ موٹے کھدر کے دھاگوں پر مشتمل ہے مگر وہ تیرے لئے اژدھا ہے کیونکہ تو نے اسے اپنی سعی وکوشش سے حاصل کیا ہے۔

حضرت والد ماجد امراء کے گھر نہیں جاتے تھے اور یہ دروازہ اپنے لئے بالکل بند کر رکھا تھا اگر یہ لوگ آپ کی زیارت کے لئے آتے تو آپ بہت ہی اخلاق سے پیش آتے اور سرداران قوم کو خاص اکرام اور اعزاز سے نوازتے تھے، اگر یہ لوگ نصیحت کی درخواست کرتے تو انتہائی مہربانی اور نرمی سے آپ یہ فرض انجام دیتے تھے، امراء آپ کے امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور ایسے مسائل کو جو قیاس ظنی سے ثابت ہیں انتہائی سعادت مندی سے قبول کر لیتے تھے۔ علم اور علماء کی تعظیم اور جہلاء اور جہالت سے نفرت ہمیشہ آپ کا دستور رہا۔ ہر حال میں آثار نبویہ کی پیروی آپ کی زندگی کا مشن تھا، آپ کی مستقل مزاجی کا عالم یہ تھا کہ سوائے عذر شرعی کے اپنی پوری زندگی میں نماز باجماعت کبھی ترک نہیں کی، بزرگوں کا قول ہے الاستقامة فوق الکرامت (سنت نبویؐ پر استقامت کرامت سے بہتر ہے) آپ نے اپنے بچپن اور شباب میں بلکہ زندگی کے کسی مرحلے میں بھی غیر شرعی امور کی طرف رغبت نہیں کی، گویا طریق محمدیؐ کی پیروی آپ کی فطرت میں داخل تھی۔

امور ضروری کے سلسلے میں آپ خرید وفروخت بھی خود کیا کرتے تھے، عمامہ وغیرہ میں نہ تو

برخود غلط فقہا کا نمونہ اختیار کرتے اور نہ رسوم وقیود سے آزاد فقیروں کی طرز، بلکہ مشائخ صوفیا کی طرح لباس استعمال کرتے تھے۔

مجموعی طور پر بے تکلفانہ زندگی بسر کرتے تھے، بجز اشد ضرورت کے قرض لینا ناپسند فرماتے تھے اور ایسے لوگوں سے اظہار ناراضی فرماتے جو مختلف طعاموں اور میوہ جات کھانے کی وجہ سے ہمیشہ مقروض رہتے، آپ انہیں سرزنش فرمایا کرتے تھے۔

معمولات شاہ عبدالرحیمؒ

آپ کو ہر علم میں بہرۂ وافر حاصل تھا، کسی فن کو بھی چھوڑنے پر آپ کی طبع رسا راضی نہیں ہوتی تھی، فن طب میں تو آپ کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ آپ کا وظیفہ تھا کہ نوافل تہجد بلا قید رکعات نشاط ورغبت کے ساتھ جتنی پڑھ پاتے، پڑھتے تھے۔ اشراق اور چاشت کے علاوہ نماز مغرب کے بعد والدین اور بڑے بھائی کی ارواح کو ایصال ثواب کی نیت سے بھی دو رکعت پڑھتے تھے اگر کوئی معذوری نہ ہوتی تو ہمیشہ تلاوت قرآن میں مشغول رہتے تھے۔ آپ قرآن مجید قواعد تجوید کی رعایت اور خوش آہنگی سے پڑھتے تھے۔ روزانہ تلاوت کے علاوہ اکثر وبیشتر دوستوں میں ہر دن ترجمہ وتفسیر کے ساتھ بھی دو تین رکوع پڑھتے تھے۔ ایک ہزار مرتبہ درود پاک اور ایک ہزار مرتبہ ذکر نفی واثبات کبھی نماز فجر سے پہلے جہراً اور کبھی ذکر خفی اور بارہ ہزار مرتبہ اسم ذات ہمیشہ بلا ناغہ پڑھتے تھے۔ باوجود ضعیفی اور بڑھاپے کے یہ وظائف ہمیشہ جاری رہتے تھے بجز ان اوقات کے جن میں آپ پر روحانی بے خودی طاری ہو جاتی اور یہ بیخودی کبھی کبھی بہت طویل ہو جاتی تھی۔

سیدنا مخدومنا شیخ ابوالرضا محمد کی وفات کے بعد بعض احباب کی درخواست پر آپ نے پہلے انداز پر وعظوں کا سلسلہ پھر شروع کر دیا، اکثر مشکوٰۃ شریف، تنبیہ الغافلین اور غنیۃ الطالبین کا درس دیتے تھے اور آخر میں تفسیر قرآن بھی شروع کر دی تھی، جب ان کتابوں کے درس سے فارغ ہوئے تو ضعف غالب آ چکا تھا اور یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔

اس فقیر نے آپ کی زبان سے بارہا سنا کہ ہم نے جو کچھ پایا ہے درود شریف اور مجرد توجہ کی بدولت پایا ہے آپ غنائے ظاہری کے لئے روزانہ گیارہ مرتبہ سورہ مزمل اور گیارہ سو مرتبہ یا مغنی پڑھتے تھے، جس کی بدولت ہر حالت میں بغیر کسی ظاہر سبب کے حق سبحانہ وتعالیٰ لوگوں کو دلی طور پر

ان کی خدمت میں مصروف رکھتا تھا۔ آپ کی آخری عمر میں جب رمضان المبارک کا چاند نظر آیا تو پرانے دستور کے مطابق صیام وقیام میں مشغول ہو گئے حالانکہ پیر فانی ہونے کی وجہ سے روزے کی طاقت نہیں رکھتے تھے اور شرعی طور پر بھی آپ رخصت افطار کے مستحق تھے۔ یہ فقیر اور سارے گھر والے جب آپ سے پوچھتے کہ رخصت شرعی کے باجود اتنی تکلیفیں کیوں برداشت کر رہے ہیں تو فرماتے کہ ضعیفی کے سبب زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ بیہوش ہو جاؤں گا اور بے ہوش ہونے کی عادت میں نے پہلے سے اپنے اندر پیدا کر رکھی ہے، یعنی حالت غیبت!

صحبت یار آخر شد

جو شوال کا چاند نظر آیا تو اشتہا بالکل ختم ہوگئی اور کمزوری بڑھنے لگی جس سے ہیضہ ہوگیا، چنانچہ زندگی کی امید منقطع ہو چکی تھی اور مردوں کی طرح گر پڑے تھے گرتے وقت یہ فقیر بھی حاضر تھا، زبان پر استغفر الله الذی لا اله الا هو الحی القیوم جاری ہوا بعد میں آپ روبصحت ہونے لگے اور مرض کی شدت گھٹتی گئی یہاں تک کہ پھر ماہ صفر کے ابتدائی ایام میں مرض نے دوبارہ حملہ کیا اور صبح صادق سے پہلے موت کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ آپ کا عزم یہ تھا کہ نماز فجر قضا نہ ہو، چند بار حالت ضعف میں پوچھا کہ صبح ہوئی ہے یا نہیں؟ حاضرین نے کہا نہیں، جب موت قریب ہوئی تو جواب دینے والوں کو جھڑک کر کہا کہ، تمہاری نماز کا وقت نہیں ہوا مگر ہماری نماز کا وقت ہو چکا ہے پھر فرمایا مجھے رو بہ قبلہ کرو، اور یوں اشاروں میں نماز ادا کی، حالانکہ وقت نماز میں شک تھا! نماز پڑھ کر زیر لب ذکر اسم ذات کرتے ہوئے زندگی مستعار کی امانت خالق حقیقی کے سپرد کر دی! یہ المناک واقعہ بادشاہ فرخ سیر کے آخر عہد میں بدھ کے روز ۱۲ صفر ۱۱۳۱ھ کو رونما ہوا بادشاہ فرخ سیر حضرت والا کے تقریباً ایک ماہ بیس دن بعد قید ہو گیا، اور سخت واقعات رونما ہوئے۔ اس وقت آپ کی عمر شریف ستہتر سال تھی۔ فتح چتوڑ کا واقعہ اور جامع مسجد شاہجہان آباد کی عمارت انہیں یاد تھی۔

ہم اپنے سردار اور مخدوم شیخ عبدالرحیم قدس سرہ کے مناقب میں سے جو کچھ لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے یہ اس کا حرف آخر ہے اب اس سے متصل ہم سیدنا و مخدومنا الشیخ ابوالرضا محمد قدس سرہ کے مناقب کا ذکر کریں گے۔

حصہ دوم

در حالات جناب معارف مآب امام طریقت وحقیقت کاشف حقائق مخدومنا

شیخ ابوالرضا محمد رضی اللہ عنہ

اگر چہ اصولی طور پر اس حصے کو پہلے پیش کرنا چاہئے تھا، مگر سند اور صحت کے لحاظ سے اس حصے کو دوسرے نمبر پر رکھا گیا ہے۔ اس لئے کہ حصۂ اول کی اکثر روایات ایسی ہیں جو فقیر (شاہ ولی اللہ) نے بغیر کسی واسطے کے سنی اور دیکھی ہیں اور اس دوسرے حصے کی اکثر باتیں فقیر کو ایک یا دو واسطوں سے ملی ہیں۔

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان ورحیم ہے

حمد کامل اس اللہ کی جس نے اپنے بندوں میں سے ایک گروہ کو منتخب کر کے مقام ولایت پر فائز کیا، اور انہیں انوار وبرکات کے لباس حقیقی میں ڈھانپ لیا اور ان پر اپنی نعمتوں کی راہیں کشادہ کر دیں، اور ان کی زبان پر علم وحکمت کے چشمے جاری کر دیئے اور ان کے منتہائے مقصود اقامت دین اور وصول الی الحق بنا دیا، جس کے نتیجے میں وہ ہادی ومہدی اور ارباب تقویٰ کے پیشوا بن گئے، انہی بندگان خاص کو اس نے زمین وآسمان میں تمکن عطا فرمایا، پاک ہے اس کی ذات اقدس جس کے جود وعطا کا یہ عالم ہے اور جس نے اپنی بیکراں نعمتوں اور برکتوں سے ان بندوں کو نوازا ہے، بے شک وہ تنہا معبود برحق ہے۔ جس کا کوئی ہمسر نہیں اور جس کے حکم اور فیصلے سے کوئی منھ نہیں پھیر سکتا۔ اور بلا شک وشبہ سیدنا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے رسول اور عبد ہیں جن کی چمک دمک اور ضیاء ونور تمام انبیاء سے زیادہ کامل اور روشنی بخش ہے اس پر اور اس کے آل واصحاب پر اللہ کی رحمتیں اور برکتیں گردش لیل ونہار تک ہوتی رہیں۔

اس تمہید کے بعد فقیر کثیر التقصیر ولی اللہ بن عبدالرحیم (اللہ ان پر لطف عظیم کے ساتھ پیش آئے) کہتا ہے کہ عم بزرگوار بلند قدر اہل ذوق ووجود کے پیشوا صاحبان معرفت وشہود کے امام، سلسلۂ اہل عرفان کے لئے رابطہ اور اہل کمال کی آنکھ کا تارا، خدا نے بے شمار کے ساتھ لو لگانے والے سیدنا ومولانا شیخ ابوالرضا محمد قدس سرہ الامجد کے علم وعرفان سے اخذ کئے ہوئے یہ چند کلمات

ہیں جن کے مجموعے کا نام شوارق المعرفۃ تجویز کیا گیا۔ حسبنا اللہ ونعم الوکیل.

حضرت شیخؒ کے ابتدائی حالات

حضرت شیخ نے بچپن میں علوم ظاہری حافظ بصیر سے حاصل کئے تھے جو زمانہ شاہجہاں میں ایک بلند مقام رکھتے تھے، ان کے علاوہ خواجہ محمد باقیؒ کے صاحبزادے خواجہ خوردؒ سے بھی تحصیل علم کرتے رہے، حقیقت میں آپ کو تمام علوم وہبی طور پر حاصل تھے۔ ظاہری تحصیل علم سے محض سنت الٰہی کی محافظت مقصود تھی۔ کیونکہ یہ دنیا اسباب وعلل کی دنیا ہے۔ تحصیل علم کے بعد اپنے والد ماجد کے مشورے سے اپنے زمانے کے امراء میں سے ایک کے دربار میں ظاہری نفع اندوزی کے لئے آنا جانا شروع کر دیا۔ آپ کی حقیقی استعداد اچانک پردۂ ظہور پر نمودار ہونے لگی اور آپ نے طریق گوشہ نشینی، کامل تنہائی، مکمل توکل، اتباع سنت اور دیگر احوال صوفیاء کو اس انداز سے اختیار فرمالیا کہ کوئی انسان اس سے زیادہ کا تصور ہی نہیں کر سکتا، صحیح روایات سے معلوم ہوا ہے کہ جب آپ نے تمام تعلقات سے ہاتھ کھینچ لیا تو اپنی رفیقۂ حیات سے فرمایا کہ ہم نے یہ راستہ تکالیف اور مصائب کی کثرت کے باوجود خود پسند کیا ہے، اور کسی طرح بھی اس راہ سے واپس نہیں پھر سکتے، اگر ان تمام مشکلات کو میری طرح پسند کر کے لباس وطعام کے لطف سے اور خویش واقارب کے میل جول کی لذتوں سے قطع نظر کر سکو، تو میری زندگی کی ساتھی ہو، ورنہ تمہیں جدا ہونے کا پورا اختیار ہے، آپ کی رفیقۂ حیات نے ہمت سے کام لے کر معمولی نیلے کپڑے زیب تن کئے، زیورات اور بیش قیمت لباس اتار پھینکے۔ انہی دنوں حضرت شیخ والدین کا گھر چھوڑ کر مسجد فیروز آباد کے قریب ایک حجرہ بنا کر رہائش پذیر ہو گئے۔ ان ایام میں اکثر وبیشتر دو دو تین تین روز متواتر فاقے سے گزر جاتے اور اگر کچھ غذا میسر آتی، تو وہ جو کی روٹی کے چند ٹکڑوں اور دہی پر مشتمل ہوتی جو محمد جان طباخی اور ان جیسے دوسرے نیاز مند لاتے اور یہ طعام تمام فقراء پر برابر تقسیم کر دیا جاتا تھا اور آپ دوسرے روز کے مقررہ وقت تک تھوڑی غذا پر اکتفا فرما لیتے تھے، آپ کے گھر میں نہ کوئی دیگچی تھی نہ چولہا، نہ چکی اور نہ دوسرا سامان یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے خوب برکت دی اور اپنے بندوں کے دلوں کو آپ کی طرف متوجہ کر دیا، اور وسیع حویلی اور بہت بڑا لنگر خانہ عطا فرمایا۔

اپنے ابتدائی حالات کے متعلق آپ فرمایا کرتے تھے کہ تجرید کے انتہائی مقام اور بے اسبابی کی

آخری منزل پر فائز ایک درویش جو حضرت خواجہ محمد باقیؒ کے خلیفہ خاص شیخ تاج سنبھلیؒ (۱) کا صحبت یافتہ تھا۔ خواجہ خوردؒ کے پاس آیا، اس پر نسبت غیبت بہ تمام و کمال غالب تھی، حضرت خواجہؒ اس سے جو کچھ پوچھتے وہ بہت ہی تکلف اور دیر سے جواب دیتے تھے۔ اس موقع پر خواجہ خوردؒ نے فرمایا کہ جو بھی معرفت خدا کا طالب ہو، وہ اس مردِ درویش سے مردانہ وار تعلق قائم کرے، جب میں نے یہ بات سنی تو میرے دل میں اس کی بیعت کی خواہش اور اس سے حصول طریقت کا خیال پیدا ہوا میں نے استخارہ کیا اور حضرت غوث الاعظمؒ کی روح پرفتوح کی طرف متوجہ ہوا تو خواب میں دیکھا کہ گویا آپ کشتی پر سوار ہیں اور دریا کی سیر کر رہے ہیں اور میں دریا کے کنارے ان کی طرف متوجہ ہو کر کھڑا ہوا ہوں، میری طرف متوجہ ہوئے اور ان کے ہر بال بال سے اپنی چمک دمک کے ساتھ سورج ابھرتا ہوا معلوم ہوتا تھا، آپ نے مجھے میرے نام سے بلایا اور اس تمثیلی مشاہدے میں مجھ پر ایسے رموز ظاہر ہوئے کہ اس درویش کی محبت سے دل ٹھنڈا پڑ گیا اور حضرت غوث اعظم کی بارگاہ سے استفادہ کرنے کا دروازہ کھل گیا۔

فرمایا ایک مرتبہ میں نے حضرت غوث الاعظمؒ کو بیداری میں دیکھا۔ اس موقع پر آپ نے مجھے عظیم اسرار و رموز تعلیم فرمائے۔

علی المرتضیٰؓ وسیلۂ بیعت ہیں

فرمایا میں نے بچشم حقیقت دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اولیائے کرام کی صفوں کے درمیان تشریف لائے جو مربع شکل میں بیٹھے ہوئے تھے اور ہر صف میں ایک ہزار ولی تھے، یہ سب سیر روحانی کر رہے تھے۔ اور ہر ایک کے ہاتھ میں مورچھل تھا۔ میں اس جماعت سے باہر ایک کونے میں کھڑا تھا، میرے دل میں خیال گزرا جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مطلع ہوئے اور ان صفوں میں سے ایک صف میں مجھے بھی داخل فرمایا اور اپنے دست اقدس کا مورچھل بھی مجھے

---

(۱) شیخ تاج الدین سنبھلی حضرت خواجہ باقی باللہ کے خلیفۂ اول تھے۔ حضرت کے وصال کے بعد بلاد عرب چلے گئے اور وہاں طریقہ نقشبندیہ پھیلایا۔ انھوں نے عربی زبان میں کئی کتابیں لکھ کر اہل عرب کو سلسلۂ نقشبندیہ سے متعارف کرایا آپ کی ایک جامع تصنیف ''الرسالہ فی سلوک خلافۃ السادات نقشبندیہ'' ہے جس کی علامہ عبدالغنی نابلسی نے مفتاح المعیت فی طریقۃ النقشبندیہ کے نام سے مکمل شرح لکھی ہے آپ نے جامع الفوائد کے علاوہ نفحات الانس جامی اور رشحات واعظ کاشفی کا عربی ترجمہ بھی کیا آپ کی وفات ۱۰۵۰ھ میں ہوئی۔

عنایت فرمایا۔ اس کے بعد مجھے ساتھ لے کر آپ ہوا میں اڑنے لگے۔ باقی لوگ اسی مکان میں ٹھہرے رہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تیسرے آسمان کی مسجد عالی میں نماز عصر ادا فرمائی۔

فرمایا دوسری بار ایک دفعہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بچشم حقیقت دیکھا اور عرض کی یا سیدی! میری خواہش ہے کہ آپ کے طریقۂ عالیہ کے فیض یافتہ کسی مرد حق سے بیعت کروں تا کہ اس سے ان حقائق کی تفصیل پوچھ سکوں جو آپ سے حاصل ہوئی ہیں۔ مجھے کسی ایسے مرد راہ کا پتہ دیجئے جو اس کا اہل ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تیری بیعت امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ سے ہوگی۔ کچھ دنوں بعد دیکھا کہ گویا راستے میں جا رہا ہوں۔ آس پاس کوئی شخص نظر نہیں آ رہا، مگر راستے سے گزرنے والوں کے نقش قدم پائے جاتے ہیں۔ تھوڑی دور بیچ راہ کے ایک مرد کو بیٹھا ہوا دیکھا۔ میں نے اس سے راستہ پوچھا تو اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ ادھر آؤ اس سے مجھے انشراح قلب حاصل ہوا۔ اس نے فرمایا اے سست رفتار! میں علی ہوں، اور مجھے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے بھیجا ہے تا کہ میں تجھے ان کی بارگاہ میں لے چلوں، میں ان کے پیچھے پیچھے چل پڑا یہاں تک بارگاہ رسالت میں پہنچے اور حضرت امیر علیہ السلام نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ کے نیچے رکھا، اور اپنا ہاتھ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں دے کر کہا یا رسول اللہ ھذا ید ابی الرضا محمد (یہ ابوالرضا محمد کا ہاتھ ہے) یہ سن کر حضرت رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت امیر علیہ السلام کی بیعت لی۔ اس موقعہ پر میرے دل میں ایک بات کھٹکی جس پر حضرت امیر علیہ السلام مطلع ہوئے اور فرمایا کہ میں اسی طرح اولیاء اللہ کے حق میں وسیلۂ بیعت رہتا ہوں، ورنہ اصل میں تمام سلاسل کی بیعتوں کا مرکز اور مرجع تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دست حق پرست ہوتا ہے۔ اس کے بعد مجھے اشغال واذکار کی تلقین فرمائی اور علوم واسرار سے نوازا اور مجھ پر ان سب کا حصول آسان ہوگیا۔ اس واقعہ سے پہلے میں ذکر قلبی وہبی میں مشغول تھا۔

برکات قرب نبوی

فرمایا حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو میں نے خواب میں دیکھا جیسے مجھے اپنی ذات مبارک کے ساتھ اس انداز سے قرب واتصال بخشا کہ جیسے ہم متحد الوجود ہو گئے ہیں اور اپنے آپ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عین پایا۔ کسی نے اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی سوال

کیا، تو آپ نے میری طرف اشارہ فرمایا، میں نے اسے وضاحت سے جواب دیا۔ بعد میں آپ مجھ سے جدا ہو گئے۔ اس واقعہ سے پہلے مجھے نیند میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کا بہت شوق رہتا تھا۔ جب اتحاد واتصال کی یہ دولت نصیب ہوئی تو وہ شوق پورا ہو گیا اور وہ بھر پور لذت وکیفیت حاصل ہوئی کہ پھر کوئی حسرت باقی نہ رہی۔

آپ کی پاکیزہ زندگی، تصرفات اور مخفی امور پر مطلع ہونے کا بیان

معمولات شیخ ابوالرضا

آپ کے معتقدین کا ایک گروہ راوی ہے کہ بادشاہ عالمگیر نے حضرت شیخ کی زیارت کے لئے کئی بار خواہش ظاہر کی مگر آپ نے انکار کیا۔ ارباب اقتدار اور سرمایہ داروں کو آپ ہمیشہ ہیچ سمجھتے تھے۔ ان کی پیش کشوں اور ان کی ذات کی طرف کبھی متوجہ نہ ہوئے۔ کبھی کبھار کوئی امیر حد سے زیادہ اصرار کرتا تو نذرانہ قبول کر لیتے تھے۔ ہاں البتہ اگر کوئی غریب اور مفلس کفش دوز، طباخی، کنجڑا وغیرہ چار پانچ پیسے بھی نذرانہ پیش کرتا، تو کشادہ دلی کے ساتھ قبول فرما کر اپنے ہاتھ سے لے لیتے تھے۔ مستند روایات سے معلوم ہوا ہے کہ آپ جید عالم، فصیح اللسان، حد درجہ متقی، ماہر علوم، معرفت براق، نورانی چہرے، دراز قامت، گورے چٹے، چھدری داڑھی والے اور خوش گفتار تھے، نماز جمعہ کے بعد ہمیشہ وعظ کہتے تھے۔ اپنے وعظ میں تین حدیثیں صحت لہجہ اور ترتیل کے ساتھ زبانی پڑھتے تھے۔ اور پڑھتے وقت مجلس وعظ کے تمام گوشوں پر پوری توجہ سے نظر ڈالتے تھے پھر ان احادیث کا فارسی میں ترجمہ کرتے تھے، وہ بھی پوری وضاحت ترتیل اور آہستگی کے ساتھ بیان کرتے تھے، پھر ہندی (اردو کی ابتدائی شکل) میں احادیث اور موضوع کی مناسبت سے تقریر فرمایا کرتے تھے جس میں مبالغہ نام کو نہیں ہوتا تھا۔ شروع شروع میں تو آپ مختلف علوم کا درس دیا کرتے تھے اور لوگ بڑے ذوق وشوق سے آپ کی تقریر سننے کو جمع ہوتے تھے۔ آخر میں آپ کا درس دو اسباق پر مشتمل ہوتا تھا۔ ایک تفسیر بیضاوی اور دوسرے مشکوۃ شریف باقی وقت توجہ الی اللہ یا خواص معتقدین سے معرفت کی باتوں سے گزرتا تھا۔ آپ وحدت الوجود کے قائل تھے اور اس موضوع پر ایک محقق کی حیثیت رکھتے تھے۔ اپنی مجالس میں آپ نے کلام صوفیہ کے بہت سے مشکل مقامات حل فرمائے۔ شیخ معظم پھلتی کہتے ہیں کہ عہد اورنگ زیب کے اوائل میں مملکت کے

ایک حصے پر ستنامی ہندوؤں نے قبضہ کرلیا، بادشاہ نے مقابلے کے لئے مسلمان فوجیں بھیجیں مقابلہ اس قدر طویل ہوگیا کہ ان میں سے کوئی فریق مغلوب نہ ہوا۔ اس وجہ سے بادشاہ اور ارکان سلطنت کے دل پریشان ہونے لگے۔ بعض معتقدین نے اس بارے میں حضرت شیخ سے دعا چاہی جونہی آپ نے دعا کی تو قبول ہوگئی۔ کچھ وقت بعد آپ نے فرمایا کہ مسلمانوں کو فتح ہوگئی ہے اور ہندو پسپا اور ذلیل ہوئے ہیں معتقدین نے اٹھ کر پورے شہر میں یہ خبر پھیلا دی۔ رفتہ رفتہ یہ خبر اورنگ زیب تک پہنچی حیران ہوا کہ ہرکارے ابھی تک خبر نہیں لائے اور یہ افواہ کس نے پھیلائی ہے۔ تحقیق کرنے پر جب صحیح علم ہوا تو اس نے حضرت شیخ کی خدمت میں آدمی بھیجا۔ آپ نے فتح کی پوری تفصیل اور واقعات بتلا دیئے کچھ دنوں بعد اسی تفصیل سے لشکریوں نے بادشاہ کو آکر فتح کا واقعہ بیان کیا۔

مبین حقیر گدایاں عشق

کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ آپ کے دل میں یہ خیال گزرا کہ ایسا موٹا کپڑا پہننا چاہئے جو ایک دو سال تک چل سکے کیونکہ یہ تقوی اور وساوس کو دور کرنے میں بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ ایک کشمیری کو آپ نے ایسا کپڑا لانے کو کہا، وہ انتہائی سخت اور موٹا پشمینہ لایا، آپ نے اسے آٹھ پہر پہنا دوسرے دن نماز چاشت پڑھ کر بیٹھے تھے اور مجلس پر سکوت طاری تھا کہ آپ ہنس پڑے۔ راوی نے تبسم کا سبب پوچھا تو فرمایا کہ حق سبحانہ وتعالیٰ نے الہاماً پیغام بھیجا ہے کہ کیا ہمارے خزانے میں کمی ہوگئی تھی جو یہ کپڑے پہنے ہیں۔ تمہارے سارے مصارف ہمارے ذمے ہیں اور ہم چاہتے ہیں کہ تمہیں ناز ونعمت سے رکھیں۔ یہ پشمینہ اتار دو۔ ہم ابھی ابھی ایک لباس بھیج رہے ہیں، جو تمہارے لائق ہوگا۔ آپ نے وہ پشمینہ اتار دیا اور وعدۂ الہامی کے مطابق انتظار میں بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد ایک بڑھیا دروازے پر آئی اور اندر آنے کی اجازت چاہی۔ راوی کو باہر بھیج کر کہا کہ اگر دوہری بنائی کا اس رنگ کا اور ایسے پھولوں والا کپڑا ہو تو لے لینا اور کہنا کہ قبول ہوگیا ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو لوٹا دینا۔ وہ کپڑا آپ کے فرمان کے مطابق نکلا اسی وقت اسے پہنا اور شکر بجالائے۔ اس واقعے کے بعد آپ بغیر قصد وارادہ کے ہمیشہ اعلیٰ لباس پہنتے رہے۔ شروع شروع میں دو تین روز فاقہ بھی رہا، کھانے کو کچھ میسر نہ ہوا۔ اس وقت ایک مخلص آیا اور عرض کی کہ میرے

گھر میں طعام تیار ہے۔ قدم رنجہ فرمائیے آپ اٹھ کر چل دیئے جب اس مخلص کے گھر پہنچے تو وہ اندر جا کر مستورات کو ایک طرف کرنے لگا، اس آدمی نے دروازے کے ساتھ چار پائی کھڑی کر رکھی تھی جس کے گرنے سے حضرت شیخ کو سخت چوٹ لگی اور بیہوش ہو گئے، افاقہ ہونے کے بعد جلدی اپنے گھر واپس لوٹے اور فرمایا یہ اللہ کی طرف سے مجھے تنبیہ ہے کہ آئندہ حصول رزق کے لئے سعی وتلاش نہیں کرنی چاہئے۔ کفیل حقیقی پر بھروسہ کر کے اس کی نعمتوں کا منتظر رہنا چاہئے۔ اس واقعے کے بعد انتہائی ضرورت کے علاوہ آپ کسی کے گھر بھی دعوت میں نہیں جاتے تھے۔

جسے اللہ رکھے

حضرت شیخ ابتدائی ایام میں ایک دن مراقبہ صبح کے بعد اٹھے اور بھنگ نوشوں کے تکیے میں جا کر گم سم بیٹھ گئے اور چاہا کہ ظہور عصمت حق کی کیفیت کا تماشا دیکھیں، جب بھنگ فروش نے بھرا ہوا پیالہ آپ کی طرف بڑھایا تو اہل مجلس میں سے ایک شخص نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا کہ انہیں مت دو! دو چار مرتبہ یہ صورت حال پیدا ہوئی کہ نماز کا وقت آ گیا تو آپ کے دل میں اضطراب اٹھا، مگر ضبط کر کے بیٹھے رہے اس نواح کی مسجد کا امام بھی وہاں موجود تھا جو خیر سے خود بھی بھنگ نوش تھا فوراً اٹھا اور آپ کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ آپ نے بہت چھڑانا چاہا مگر اس نے نہ چھوڑا اور کشاں کشاں مسجد میں لے گیا اور وضو کرا کے آپ کو امامت کے لئے کھڑا کر دیا۔ اس واقعہ سے آپ کا دل مطمئن ہوا کہ یہ عفت وتقویٰ ایسا امر معلوم ہے کہ کوئی چاہے یا نہ چاہے بغیر اختیار کے اسے کاتب تقدیر اس حالت پر قائم رکھے گا۔

بادشاہ حقیقی کا انصاف

سننے میں آیا ہے کہ رستم اور اسد اللہ نے جب پھلت والوں کو تکلیفیں پہنچانی شروع کیں تو انھوں نے ان کی تباہ کاریوں کی کچھ باتیں حضرت شیخ کی خدمت میں عرض کیں اور چاہا کہ آپ عاقل خاں کو ان کی مدد کے لئے رقعہ لکھ دیں، ایک دن نماز اشراق کے بعد آپ کی حالت بدل گئی اور جوش میں آ کر کہنے لگے۔ کہ تم چاہتے ہو کہ تمہاری تکالیف عاقل خاں تک پہنچاؤں۔ تمہاری حالت بادشاہ حقیقی کی بارگاہ میں کیوں نہ عرض رکھوں! یہ کہہ کر آپ نے توجہ فرمائی اور ان دونوں شخصوں کی ہلاکت کا مژدہ سنایا، راوی دکن میں بادشاہ سے ملا تو ان دونوں کو قید کر کے بادشاہ نے

لشکر کے حوالے کیا ہوا تھا کچھ دنوں بعد وہ دونوں ایک شدید مرض میں مبتلا ہوئے پہلے رستم بیمار ہو کر مرا اور پھر اسد اللہ مبتلائے مرض ہوا۔ لشکر خاں نامی ایک مرد مشہور نے راوی سے کہا کہ فلاں کے حق میں دعا کرو۔ راوی نے کہا مجھے تو دونوں کو دفن کرنے کا حکم ملا ہوا ہے۔ کچھ دنوں بعد دوسرا بھی کیفر کردار کو پہنچا۔

عاشقم بر قہر و بر لطفش بجد

فقیر (شاہ ولی اللہؒ) نے شیخ مظفر رہتکیؒ سے سنا ہے وہ کہتے تھے کہ ایک مرتبہ مجھ پر غم واندوہ کی کیفیت طاری ہوئی۔ میں روتا اور آہیں بھرتا تھا۔ حضرت والا نے فرمایا کہ بابا طالبان خدا دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک طرح کے طالبین کو وہ فرحت وشادمانی کی راہ سے اپنی طرف بلاتا ہے اور ایک گروہ کو غم واندوہ کی منزلوں سے گزار کر قرب بخشتا ہے۔ گویا غم واندوہ ازلی دین ہے۔ حضرت شیخ پر غم واندوہ اور رونے دھونے کی کیفیت کبھی طاری نہیں ہوئی۔ ہمیشہ خوش دل اور باغ وبہار رہتے تھے۔

ان سے یہ بھی سنا کہ حضرت شیخ فرمایا کرتے تھے کہ جب حق سبحانہ وتعالیٰ کسی سالک کے باطن پر اپنی صفات زجر وتوبیخ کی تجلیات کا ظہور فرمائے اور وہ راہ طریقت کے سالک سے معمولی اور بڑے امور میں مواخذہ شروع کردے اور صبر وبرداشت کی قوت اس میں باقی نہ رہے تو اسے چاہئے کہ دنیوی امور اور تلاش معاش میں مشغول ہو جائے۔ اسی طرح اس کے عتاب کی کیفیت ختم ہو جائے گی۔

مدار شریعت ظاہر پر ہے

شیخ مظفر رہتکی نے یہ واقعہ بھی سنایا کہ میں شروع شروع میں جب رہتک سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا تو تحفۃ نبات (۱) بھی آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہے جسے آپ قبول نہیں فرماتے تھے، کہتے تھے کہ دیہاتوں اور قصبات کی خرید وفروخت اور ناپ تول شرعی قانون کے مطابق نہیں ہوتی چنانچہ میں نے یہ تحفہ لانا چھوڑ دیا البتہ آپ کے بچوں کے ہاتھ میں کچھ نہ کچھ تھما دیتا تھا اور تھوڑی سی نبات بھی رسم ہدیہ پوری کرنے کی خاطر ان بچوں کو دیا کرتا تھا۔ آخر میں

(۱) نبات: سبزی، ترترکاری، (قاسمی)

ایک مرتبہ حضرت والا کی خدمت میں حاضر ہوا تو نبات کے دو مرتبان حضرت والا کے بچوں کو دیئے۔ وہ آپ کی خدمت میں لے گئے۔ آپ نے اس میں سے کچھ نکال کر تناول فرمائی۔ اس واقعے کے بعد ایک دن مجھے فرمانے لگے۔ ہم نے تمہاری نباتیں کھائی ہیں۔ ہاتھ اٹھائے اور حسب حکم شرع وسوسہ مٹانے کے لئے اس پر ہلکا سا تھوکا (۱)۔ اس سے آپ کا مطلب یہ تھا کہ ہم اس تورع اور تقوی سے گزر چکے ہیں جو انسانی امکان سے بھی زائد تھا۔ اب ہمیں ظاہر شریعت جو کچھ حکم دے گی اس کے لینے میں عار محسوس نہیں کریں گے۔

دست پیر از غائبان کوتاہ نیست

یہی راوی بیان کرتے ہیں کہ درگ داس کے واقعے سے جب رہتک کا گرد ونواح ویران ہوگیا تو میں کئی خاندانوں کے لے کر دہلی کی طرف چل پڑا۔ ان دنوں تمام دیہاتی لوگ درندے بن چکے تھے۔ میرے قافلے کے بہت سارے خاندانوں، عورتوں اور مال ومتاع کے ساتھ بجز میرے اور کوئی مضبوط آدمی نہیں تھا۔ خلاف توقع ہمارا سارا سفر امن سے گزرا۔ ہاں البتہ ایک مقام پر دیہاتی لٹیروں نے جمع ہوکر ہم پر حملہ کرنا چاہا تو میں نے کمان کا چلہ چڑھا کر ان پر حملہ کردیا، وہ شکست کھا کر اپنے خیموں یا چھپروں کی آڑ میں چھپ گئے۔ جب میں حضرت والا کی خدمت میں پہنچا تو خندہ پیشانی سے ملے اور فرمایا کہ ہم بھی اس سفر میں تمہارے ساتھ تھے تمہاری حفاظت اور مدد کرتے رہے۔ دیکھا نہیں تھا کہ جب دیہاتیوں نے حملہ کرنا چاہا اس وقت تم اکیلے تھے اور ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ میں نے فلاں آفت کو ان کے منھ میں دیا جس سے وہ ہیبت زدہ ہوکر اپنے چھپروں کی آڑ میں چھپ گئے تھے۔

قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید

یہ رہتکی معتقد یہ بھی کہا کرتے تھے کہ اکثر اوقات لوگ آپ سے واضح مسائل کے بارے میں بھی پوچھا کرتے تھے۔ ایسے میں حضرت والا اپنی آنکھیں بند کرکے سوچنے لگ جاتے اور کچھ دیر کے بعد جواب بیان فرماتے کسی ہم مجلس نے اس کا راز پوچھا تو فرمایا کہ جب یہ لوگ سوال کرتے ہیں تو بے حد وحساب جوابات میرے سامنے پیش ہوجاتے ہیں۔ اس وقت میں اسی سوچ

---

(۱) اصل نسخے میں عبارت یوں ہے ''دبراوقف زدند'' میں نے اسے براوتف زدند سمجھ کر ترجمہ کیا ہے۔ سید فاروق

بچار میں لگ جاتا ہوں کہ کونسا جواب سائل کی سمجھ کے مطابق ہوسکتا ہے۔

اتباع سنت میں آپ کا مقام

یہی راوی کہتے ہیں کہ حضرت شیخ جب مسجد میں داخل ہونا چاہتے تھے تو مسجد کے نزدیک کھڑے ہو کر اپنا بایاں قدم مبارک جوتے سے نکال کر اس کے اوپر رکھ دیتے۔ پھر دایاں قدم نکال کر مسجد میں رکھتے۔ کاتب الحروف کہتا ہے کہ اس صورت حال سے مقصود یہ تھا کہ دونوں حدیثوں پر عمل ہو جائے۔ پہلی حدیث یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ الیمنی اولھما تنعل و آخرھما تنزع (۱) دوسری حدیث یہ ہے کہ کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یحب التیامن فی شانہ کلہ (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہر کام میں دائیں طرف سے آغاز کرنے کو پسند فرماتے تھے) حضرت شیخ کا یہ عمل سنت نبوی کی رعایت اور احتیاط کا ایک عجیب منظر پیش کرتا ہے۔

برکات نسبت

یہی راوی بیان کرتے ہیں کہ جب میں آپ کے سلسلۂ عالیہ میں منسلک ہوگیا اور مجھ پر توجہ فرمانے لگے تو مجھ پر اسرار توحید کھلنے لگے انہی ایام میں کم وبیش تین روز میرا علم انا مظہر مقید سے علیحدہ ہو کر بظاہر ہستی مطلق کے ساتھ پیوست ہو گیا۔ حضرت شیخ نے شیخ عبدالحفیظ سے فرمایا کہ مجھے حجرے میں بند رکھ کر میری حالت کی نگرانی کرے، میں ان ایام میں کہا کرتا تھا کہ اگر میں چاہوں تو بارش برسا دوں، چاہوں تو ماردوں، چاہوں تو زندہ کردوں، حضرت شیخ اس عالم میں انتہائی ادب وانکساری کا مظاہرہ فرماتے تھے اور کہتے کہ جن لوگوں پر یہ عالم طاری ہو ان کا یونہی ادب کرنا چاہئے۔ جب اس حالت سے افاقہ ہوا تو حضرت والا نے مثال کے طور پر یہ ہندی دوہا پڑھا۔

کنتھارن موں تیہ کر کھاندا باہ نسنگھ!
بامچہ چہبی ژندا پانانچہ چڑھی کلنلہ

یہی شیخ مظہر رہتکی کہتے ہیں کہ اہل رہتک کا ایک گروہ کسی تقریب سے دہلی آیا تو ایک دن ارادہ کیا کہ جماعت کی صورت میں حضرت شیخ کی زیارت کو جائیں۔ راستے میں ایک شخص نے

---

(۱) بخاری کتاب اللباس ص: ۲۳ ج ۴ مطبوعہ مصر

حضرت کی کراماتوں کا ذکر چھیڑ دیا۔ دوسرے نے کہا کہ ایسی کرامتیں تو بہت سے لوگ سنایا کرتے ہیں، لیکن جب تک آنکھ سے نہ دیکھیں تصدیق نہیں کر سکتے، اور مثال میں یہ ہندی دو ہا پڑھا۔

جب لگ نہ دیکھوں اپنی پنا

تب لگ نہ بچوں کرکے بنیا

اور کہا کہ میں تو جب مانوں کہ آج مجھے نان و حلوہ دیں، جب یہ لوگ پہنچے اور آپ سے ملاقات کی تو آپ حسب عادت ہر ایک سے لطف و مہربانی کے ساتھ پیش آئے اور پھر گھر سے حلوہ روٹی منگوائی اور اس شخص کی طرف اشارہ کر کے فرمایا۔ یہ خاص اسی کا حصہ ہے اور وہی دو ہا زبان پر لائے کہ جب لگ الخ

بارگاہ اولیاء میں حاضری کے آداب

فقیر ولی اللہ نے سید عمر حصاریؒ سے سنا ہے کہ ایک دن آپ خوبصورت سی ملیح رنگ چادر اوڑھے ہوئے ہرن کی خوشنما کھال پر تشریف فرما تھے۔ وہ چادر اور کھال میرے دل میں کھب گئیں ویسی چادر اور کھال کی تلاش و تجسس کا شوق میرے دل میں اٹھا۔ اس خیال کو جس قدر جھٹکتا دور نہ ہوتا۔ حضرت والا جب مجلس سے اٹھے تو مجھے فرمایا کہ بیٹھو تم سے ایک کام ہے۔ اس کھال پر شیرینی کے دھبے لگے ہوئے تھے انہیں اپنے ہاتھ سے دھویا، چادر اور ہرن کی کھال کو تہ کر کے اپنے ہاتھ سے مجھے عنایت فرمائیں اور فرمایا اولیاء کی مجالس میں ایسے خیالات دل میں نہیں لانے چاہئیں۔

یہی راوی کہتے ہیں کہ ایک دن حضرت شیخ، شیخ عبدالاحدؒ کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ اس موقعہ پر شیخ عبدالاحدؒ نے پوچھا کہ فلاں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ فرمانے لگے کہ میں نے اس آدمی کے بارے میں فرشتوں کو جھگڑتے دیکھا ہے۔ ایک فرشتہ کہہ رہا تھا کہ فلاں صاف اور پاکیزہ دل رکھتا ہے اور دوسرے نے کہا کہ وہ شریعت پر کاربند نہیں، ایسا دل کس کام کا، کاتب الحروف کہتا ہے کہ یہ شخص ایک بزرگ تھا۔ جو اپنے زمانے کے بہت سے بزرگوں کا معتقد تھا، مگر اس کی باتوں میں پھکڑ پن زیادہ ہوتا تھا۔

شاعر گلشن(۱) دہلوی کا واقعہ

فقیر (شاہ ولی اللہ) نے اپنے زمانے کے شاعر گلشن سے سنا ہے کہ شورش عشق اور طلب سلوک کے ابتدائی ایام میں ایک دن میں اپنا منھ کالا کر کے کوچہ و بازار میں پھرنے لگا۔ جب محلّہ فیروز آباد میں پہنچا تو دیکھا کہ حضرت شیخ تشریف فرما ہیں۔ ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور جوتیوں میں جا بیٹھا۔ آپ نے حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ اس طرح رسوائی کے خطرات مول لیتے ہیں اور لوگوں کو باور کراتے ہیں کہ ہم یہ سب کچھ خدا کے لئے کر رہے ہیں اور اس پر طرہ یہ کہ اولیاء کی مجلس میں آتے ہوئے اس بات سے نہیں ڈرتے کہ اس گروہ روشن ضمیر پر ان کے سارے بھید آشکارا ہیں، پھر میری طرف متوجہ ہو کر فرمایا سر دست چلے جاؤ۔ یہ سن کر میں بہت شرمندہ ہوا اور اپنے دلی خیالات کی قباحت بھی محسوس کی۔

تصرف شیخ

سننے میں آیا ہے کہ حضرت شیخ کو زمانۂ طفولیت میں جب جھولے میں سلاتے تھے تو بغیر کسی ہلانے والے کے آپ کا جھولا چلتا رہتا تھا، لوگ یہ دیکھ کر تعجب کرتے تھے، یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ عبداللہ نامی ایک جن آپ سے علوم و معارف کی تعلیم حاصل کرتا تھا۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص بھی میرے سامنے آتا ہے۔ اس کے تمام احوال و افعال مجھ پر روشن کر دیے جاتے ہیں، ایک مرتبہ ایک منکر میرے پاس آیا اور مشائخ کا انکار کرنے لگا۔ میں نے اس سے کہا کہ اے کتے! تو انہیں کیا جانے؟ اس نے غصے میں اپنی تلوار نکالی اور مجھ پر حملہ کرنا چاہا میں نے اس پر اپنے قہر وغضب کا تصرف ڈالا تو اسے آگ نظر آئی قریب تھا کہ وہ جل کر راکھ ہو جاتا کہ اس نے توبہ وزاری کی اور میں نے اسے ہلاکت سے بچا لیا۔ یہ بھی سنا ہے کہ مسجد میں نماز کیلئے ایک عورت کا جنازہ لایا

---

(۱) آپ کا پورا نام شیخ سعد اللہ گلشن دہلویؒ ہے۔ برہان پور کے رہنے والے تھے مگر بعد میں دہلی میں مستقل سکونت اختیار کی، خود شاعر اور استاذ الشعراء تھے، آپ شیخ عبدالاحد سرہندی المعروف بہ شاہ گل وحدت کے خلیفہ تھے۔ اپنے مرشد کے عرف شاہ گل کی مناسبت سے اپنا تخلص گلشن رکھا۔ تارک الدنیا بزرگ تھے، آپ کی وفات ۱۷۲۷۔۱۷۲۶ء میں ہوئی مزار دہلی میں ہے نمونۂ کلام یہ ہے۔

بدرش رفتہ سجدہ با کردم — منت پائے ماست بر سر ما
سخت جاناں نیستند از چارہ سازاں کامیاب — مومیائی نفع کے بخشد شکست سنگ را

گیا، تو حضرت شیخ نے فرمایا کہ اس کی روح ابھی بدن سے جدا نہیں ہوئی، ایسی صورت میں اس پر نماز جائز نہیں۔ ورثا نے اصرار کیا کہ یہ مرچکی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں مری، آخرالامر اس کا منہ کھول کر دیکھا گیا تو زندگی کے آثار باقی تھے۔ اسے واپس لے گئے اور وہ دوسرے دن فوت ہوئی۔

وسعت علوم اولیاء

سننے میں آیا ہے کہ آپ کا ایک خادم کسی بری عادت میں مبتلا تھا آپ نے اسے کئی بار اشاروں کنایوں میں تنبیہ فرمائی مگر وہ پھر بھی نہ چونکا اور نہ ہی اس عادت بد سے باز آیا۔ بالآخر حضرت شیخ نے اسے تنہائی میں بلا کر کہا تجھے بارہا اشاروں، کنایوں سے سمجھایا مگر تو نے کوئی پرواہ نہ کی شاید تو سمجھتا ہے کہ ہم تیرے کرتوتوں سے بے خبر ہیں۔ قسم بخدا اگر زمین کے نچلے طبق میں رہنے والی کسی چیونٹی کے دل میں بھی سو خیالات آئیں، تو ان میں سے ننانوے خیالات کو میں جانتا ہوں اور حق سبحانہ وتعالیٰ اس کے سو کے سو خیالات سے باخبر ہے۔ یہ سن کر خادم نے اپنی برائی سے توبہ کی۔

ھو یطعمنی

حضرت شیخ فرمایا کرتے تھے کہ ایک دن میں روزے سے تھا کہ بھوک اور پیاس نے مجھے سخت تنگ کیا۔ اسی حالت میں ذکر کرتے ہوئے مجھ پر غیبت اور استغراق کا عالم طاری ہوا۔ میں نے عالم مثال میں دیکھا کہ ایک آدمی نے مجھے دودھ کا پیالہ دیا، اور میں نے وہ پی لیا جب ہوش آیا تو اپنے منہ سے دودھ کے قطرات ٹپکتے ہوئے محسوس کیے۔ یہ دیکھ کر روزہ ٹوٹنے کا خوف پیدا ہوا تو دل میں الہام ہوا کہ یہ غذا تیرے اختیار کے بغیر محض ارادۂ الٰہی سے ملی تھی، اور یہ عالم شہادت کی نہیں بلکہ عالم مثال سے تعلق رکھتی ہے اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔

غرور علم سے سرشار عالم بارگاہ فقیر میں

حافظ عنایت اللہ نے بیان کیا کہ ایک فارغ التحصیل عالم بحث وتکرار اور مذاکرہ سے انتہائی دلچسپی رکھتا تھا۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگا کہ میں اس شہر کے تمام فاضل علماء کو مغلوب کر چکا ہوں، میں نے کہا کہ کبھی حضرت شیخ ابوالرضا محمد کی مجلس میں حاضر ہو کر ان کی زیارت کا شرف بھی حاصل کیا ہے؟ کہنے لگا سنا ہے کہ وہ عوام کو تفسیر حسینی پڑھ کر سناتے اور اسی سے وعظ کہتے ہیں۔ وہ کوئی

صاحب فضیلت نہیں ہیں۔ میں نے کہا نہیں ایسا مت کہو بلکہ ان کی زیارت کروتا کہ ان کا کمال علم اور سیرت تم پر واضح ہو سکے۔ اگلے جمعہ وہ مجلس وعظ میں آیا اور اس کے دل میں یہ خیال گزرا کہ مناظرہ کرے۔ حضرت شیخ نے اس کے خیالات سے مطلع ہو کر تاثیر کے ذریعے اس کا علم سلب کر لیا۔ یہاں تک کہ اور علوم بجائے خود صرف ونحو کا کوئی قاعدہ بھی اس کے حافظے میں نہ رہا۔ اور آپ کا کلام سمجھنے سے عاجز ہو گیا۔ سمجھ گیا یہ حالت حضرت شیخ کے تصرف سے واقع ہوئی ہے۔ نادم ہوا، توبہ کی اور خلوص دل کے ساتھ حضرت کی خدمت میں گریہ وزاری کی۔ حضرت نے اسے سارا علم واپس کر دیا اور پہلی حالت بحال کر دی۔ اس نے اظہار نیازمندی کیا۔ آپ نے فرمایا کہ میں عالم نہیں صرف تفسیر حسینی سے عوام کو نصیحت کرتا ہوں۔ یہ سن کر وہ اور زیادہ نیازمندی کرنے لگا اور کہا کہ اپنی بات اور عقیدے سے توبہ کرتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ آپ سے بیعت کر لوں حضرت والا نے اسے بیعت میں قبول نہ فرمایا اور فرمایا کہ لکھی ہوئی تختیاں کسی کام نہیں آسکتیں۔

کسے خبر کہ جنوں بھی ہے صاحب ادراک

رحمت اللہ کفش دوز نے بیان کیا کہ ایک موقع پر حضرت شیخ مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے، اور میں ان کے سامنے ایک درخت کے نیچے کھڑا تھا کہ آپ کی خدمت میں ایک شخص نے کہا، کہ حضرت بایزید بسطامیؒ بعض اوقات کسی کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھتے تھے تو قوت جذب اور شیخ کی گرمی نگاہ سے اس کی روح پرواز کر جاتی تھی۔ آج کل ہم مشائخ کا شور سنتے ہیں مگر کسی کی قوت باطنی میں یہ تاثیر نہیں دیکھی۔ یہ سن کر حضرت شیخ نے جوش میں فرمایا کہ بایزید روحیں نکال تو لیتے تھے مگر جسم میں واپس نہیں لوٹا سکتے تھے مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے دل کو اپنے قلب اطہر کے زیر سایہ ایسی تربیت اور وہ قوت عطا فرمائی ہے کہ جب چاہوں کسی کی روح کھینچ لوں اور جب چاہوں اسے واپس لوٹا دوں! عین اسی وقت شیخ نے مجھ پر نظر کر کے میری روح کھینچ لی اور میں زمین پر گر کر مر گیا اور مجھے اس عالم کا کوئی شعور نہیں رہا۔ سوائے اس کے کہ میں نے اپنے آپ کو ایک بہت بڑے دریا میں غرق پایا۔ آپ نے سائل کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ اسے دیکھو مردہ ہے یا زندہ؟ اس نے سوچ کر کہا کہ مردہ ہے۔ فرمایا اگر تو چاہے تو اسے مردہ چھوڑ دوں اور اگر پسند کرے تو اسے زندہ کر دوں! کہنے لگا اگر زندہ ہو جائے تو یہ انتہائی رحمت ہوگی، آپ نے مجھ پر

دوبارہ توجہ ڈالی تو میں زندہ ہوکر اٹھ کھڑا ہوا۔ تمام حاضرین مجلس حضرت شیخ کی قوت حال سے متعجب ہوئے۔

خطرات قلب پر اطلاع

حضرت شیخ کے معتقدین کی ایک جماعت نے بیان کیا ہے کہ آپ کی مجالس اور صحبت میں ہم لوگ تصوف وعرفان کے بارے میں کثرت سے زبان پر سوالات نہیں لاتے تھے! بلکہ اپنے اپنے سوالات دلوں میں لے کر بیٹھ جاتے تھے جب بھی کسی کے دل میں کوئی شبہ، سوال، یا خیال وارد ہوتا تو آپ اس سے مطلع ہوکر فوراً جواب دیتے پھر بھی اگر شک باقی رہتا تو دوبارہ جواب دیتے یہاں تک کہ سائل مطمئن ہو جاتا۔

علم ظاہر اور علم باطن کا فرق

سننے میں آیا ہے کہ محمد عاشق نے ملا یعقوب اور حضرت شیخ دونوں سے استفادہ کیا تھا اور مسئلۂ توحید کے بارے میں وہ مطمئن نہیں تھا۔ اس بارے میں ملا یعقوب کی باتیں آپ تک پہنچاتا اور آپ کی باتیں ملا یعقوب تک، جب اس معاملہ نے طول پکڑا تو ایک دن ملا یعقوب نے کہا کہ میں ابھی جاتا ہوں اور بالمشافہ گفتگو کر کے مسئلۂ توحید کے بارے میں آپ کے نظریات کو باطل ثابت کرتا ہوں۔ جب وہ حضرت شیخ کی مجلس میں پہنچا تو ایسا چپ ہوا کہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ جب مجلس سے اٹھ کر جانے لگا تو لوگوں نے خاموشی کا سبب پوچھا۔ ملا نے کہا کہ جب میں آپ کی مجلس میں پہنچا تو میرے تمام علوم سلب ہو گئے۔ یہاں تک کہ میں ابجد بھی نہیں پڑھ سکتا تھا۔

حضرت شیخ ابوالرضاؒ کے حقیقت و معرفت سے معمور ملفوظات

رویت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

فرمایا کہ میں ایک مرتبہ مجلس ذکر میں بیٹھا ہوا تھا وہاں دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے پہلو میں تشریف فرما ہیں جب میں نے آنکھ کھولی تو کچھ محسوس نہ ہوا۔ آنکھ کھلنے پر کچھ محسوس نہ ہونے کا سبب یہ تھا کہ مجھے یہ مشاہدہ عالم مثال میں کرایا گیا اور ظاہری آنکھوں سے دیکھنا عالم شہادت سے تعلق رکھتا ہے۔

فرمایا کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی کیفیت مختلف حالات میں دیکھنے والوں کے مختلف احوال کے سبب مختلف ہوتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک آئینے کی حیثیت رکھتے ہیں ہر شخص کو اس میں اپنی شکل نظر آتی ہے لہٰذا بدعتی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک مریض کی شکل میں دیکھتا ہے گویا بدعتیوں کو دیکھ کر آپ تکلیف محسوس کرتے ہیں حالانکہ اسی لمحے ایک خالص سنی آپ کو جواں صورت اور انتہائی خوش و خرم شکل میں مشاہدہ کرتا ہے۔ اسی طرح حق سبحانہ وتعالیٰ کا مشاہدہ جو اپنی ذات میں ترقی وتنزلی بلکہ ہر قسم کی قید سے پاک ہے یعنی جیسا تھا ویسا ہی ہے۔ جب بھی کوئی شخص حقیقت یا خواب میں حق سبحانہ وتعالیٰ کو کسی صورت اور ہیئت میں دیکھتا ہے تو گمان کرتا ہے کہ شیشہ شکل وصورت کی قید میں آ گیا ہے، نہیں نہیں شیشہ تو اپنی اصلی حالت میں ہے یہ سب اشکال اور صور کی قیود دیکھنے والے کی خود پیدا کردہ ہیں۔

نکتہ شیخ اکبر

فرمایا کہ شیخ اکبر محی الدین محمد بن عربی قدس سرہ کو ان چار راتوں میں متواتر خواب میں دیکھتا رہا ہوں اور ان کے عجیب مقامات اور پسندیدہ نکات معارف سے مطلع ہوتا رہا۔ ان صحبتوں سے یعنی ان سے سنا کہ حق سبحانہ وتعالیٰ کا اس کی ذات کے رعب داب کے اعتبار سے یعنی اس کے

تصرفات کی وجہ سے ایک اسم ہے اور وہ ہے کہار آپ نے فرمایا میں نے اس واقعے سے پہلے یہ اسم کہیں بھی نہیں سنا تھا۔

کاتب الحروف (شاہ ولی اللہ) کے نزدیک کہر اپنے عربی معنوں میں استعمال کیا گیا ہے اور ایک قرأت میں اما الیتیم فلا تکھر بھی پڑھا جاتا ہے اور حدیث میں آتا ہے فواللہ ما کھرنی ولا ضربنی اور لفظ قہر کا مرجع اور حقیقی منشا اپنی تمام مدد واعانت سے ہاتھ کھینچ لینا اور تباہی کی عمیق غاروں میں کسی کو گرا دینا ہے۔ لہٰذا اس تحقیق کی بنا پر کہر ذات (بکاف عجمی ہی مناسب رہے گا جو ذات حق کے رعب و تصرف کا لازمی خاصہ ہے اور کاف عجمی کے ساتھ اسم کہار کا اطلاق ذات باری پر صحیح ہوگا اور صیغۂ کہارۃ کا استعمال محض اس جہت سے کیا جائے گا کہ اسے لفظ صرافت یعنی تصرف حق پر محمول کیا جائے۔ واللہ اعلم۔

بعض دعاؤں کے عجیب اثرات

فرمایا ایک دفعہ میں دعا میں مشغول تھا، کہ اچانک ایک آدمی کو دیکھا کہ میری طرف پیٹھ کر کے دروازے پر کھڑا ہوا ہے میں یہ دیکھ کر حیران ہوا تو میرے ضمیر میں یہ بات ڈالی گئی کہ یہ فرشتہ ہے جو تیری اس دعا پڑھنے کے نتیجے میں تیری حفاظت کرتا ہے۔ کاتب الحروف (شاہ ولی اللہ) کہتا ہے کہ فرشتے نے آپ کی طرف پیٹھ اس لئے کی ہوئی تھی کہ عالم ملکوت کا دروازہ دوسری طرف ہے اور عالم ناسوت کا دوسری جانب۔

لوح محفوظ است پیش اولیاء

فرمایا میں نے لوح محفوظ میں لکھا ہوا دیکھا کہ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حسنات الابرار سیأت المقربین۔ (طبقۂ ابرار کی نیکیاں مقربین کے نزدیک گناہ کا درجہ رکھتی ہیں) کاتب الحروف شاہ ولی اللہ کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ علمائے محدثین نے اس حدیث کو قول سلف قرار دیا ہے مگر حقیقت میں یہ حدیث صحیح ہے۔

منازل ایمان

فرمایا ایمان کی بھی ایک حد مقرر ہے یعنی مومن جب اس حد تک پہنچتا ہے تو اس کا ایمان ہرگز سلب نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح اعمال کی بھی ایک حد مقرر ہے۔ جب اعمال اس حد تک پہنچتے ہیں تو

وہ مردود قرار نہیں دیئے جاسکتے اور ایمان کی کم سے کم حد یہ ہے کہ مومن اپنے سینے میں نور ایمان کو ظاہراً محسوس کرے۔ پھر فرمایا کہ ایک رات میں نے اپنے سینے میں نور دیکھا جو چراغ کی طرح چمک رہا تھا۔ اسی نور کی روشنی میں میں نے اپنے گھر کا ساز وسامان اور کونے کھدروں کو بخوبی ملاحظہ کیا۔ اسی اثنا میں خداوند تعالیٰ نے الہام کیا، کہ ایمان کا وہ ادنیٰ درجہ جو میرے نزدیک مقبول ہے یہی ہے اسے میں سلب نہیں کرتا اس لئے کہ کفر ونفاق کے بعض دبیز پردے اس نور ایمان سے اٹھ چکے ہوتے ہیں۔

کاتب الحروف (شاہ ولی اللہ) کے نزدیک نور ایمان طہارت کاملہ اور اطاعت حق کے نور سے عبارت ہے جیسا کہ ہم نے اپنے موقع ومحل پر اسے بیان کیا ہے۔

مقامات بایزیدؒ اور سید الطائفہؒ

فرمایا ایک دفعہ میں نے چشم حقیقت سے دیکھا کہ میرا دایاں پاؤں شیخ بایزید بسطامی کے پاؤں سے اور میرا بایاں پاؤں سید الطائفہ جنید بغدادی کے پاؤں سے باندھ دیا گیا ہے اسی عالم میں میں نے شیخ بسطامیؒ کی طرف نگاہ کی تو انہیں غیبت کاملہ کے مقام پر فائز پایا۔ اور شیخ جنیدؒ کی طرف دیکھا تو انہیں بے خودی ومدہوشی سے بے نیاز زمان ومکان پر حکمراں (ابوالوقت) پایا۔ اور میں نے اپنی حالت ان دونوں کے درمیان (غیبت وحضور سے معمور) پائی۔ کاتب الحروف (شاہ ولی اللہ) کے نزدیک یہ واقعہ ہردو بزرگوں کے جذب وسلوک کے منازل پر دلالت کرتا ہے کیونکہ حضرت شیخ بسطامی اہل سکر سے تھے اور شیخ جنید اہل صحو سے سکر کو جذب کے ساتھ اور صحو کو سلوک کے ساتھ قریبی تعلق ہے۔

مقام فنافی اللہ

فرمایا ایک مرتبہ میں اپنے اسماء وصفات کی طرف متوجہ ہوا تو ننانوے ناموں سے بھی زیادہ پائے کچھ اور توجہ کی تو چار ہزار سے زیادہ پائے پھر اور تجسس کیا تو اپنے اسماء وصفات کی کوئی حد وشمار نہ پائی جب اس مقام پر پہنچا تو اس حالت میں اپنی ذات کو دیکھا کہ میں کائنات کو پیدا بھی کر رہا ہوں اور مار بھی رہا ہوں ارباب ولایت کبریٰ پر ایسی حالتیں اکثر طاری رہتی ہیں۔

کاتب الحروف (شاہ ولی اللہ) کے نزدیک اس کا سبب یہ ہے کہ انسان کا وجود تمام

استعدادوں اور قابلیتوں کا جامع ہے جس انسان کے اندر نقطۂ وجود زندہ و بیدار اور تدبیر کلی جو تمام امور کونی پر غور وفکر کرنے والی طبیعت کا مقتضی اور خاصہ ہے موجود ہو اور وہ انسان صاحب دل ہونے کی وجہ سے روئے روح بھی رکھتا ہو تو اس کی زبان سے اس نقطۂ وجود کے معارف اور تدبیر کلی کے انکشافات عیاں ہوتے رہیں گے اور وہ اس حاسۂ خاص سے تمام کائنات کے مخفی گوشوں کو دیکھتا رہے گا۔

خواب اولیاء

فرمایا میں بیس سال سے نہیں سویا، لیٹ جاتا ہوں، چادر اوپر تان لیتا ہوں، لوگ سمجھتے ہیں سو رہا ہوں۔ کاتب الحروف (شاہ ولی اللہ) کے نزدیک اس بات کی تاویل یہ ہے کہ عرف عام میں خواب غفلت اور ذہنی تعطل کو کہتے ہیں اور آپ سے یہ دونوں چیزیں دور کردی گئی تھیں۔

اتباع سنت ہی ذریعہ نجات ہے

فرمایا کہ آدمی کی نجات عقائد میں کمی بیشی کے بغیر انبیاء علیہم السلام کی تقلید میں ہے جیسا کہ متقدمین اہل سنت کا مذہب ہے بجز اس آدمی کے جسے کوئی صاحب کشف بعض عقائد واعمال کی تفصیل وتحقیق سے متنبہ کردے۔

علوم صوفیاء

فرمایا صاحب تحقیق متکلمین (فلاسفہ) حقیقت ممکن اور حقیقت واجب کے درمیان تباین سے ایک ایسا معنی مراد لیتے ہیں جسے قبول کر لینے سے صوفیاء کی تحقیقات پر کوئی زد نہیں پڑتی اور اگر اس پر خوب غور کیا جائے تو صوفیائے کرام اور فلاسفہ کے درمیان بہت ہی معمولی اختلاف ہے۔

فلاسفۂ قدیم کے کلام کو حقائق صوفیاء پر محمول کرنا ممکن العمل ہے۔

کاتب الحروف (شاہ ولی اللہ) کے نزدیک صوفیا کے علوم جمع وفرق کی باریکیوں پر مشتمل ہیں اور متکلمین فلاسفہ کے علوم کا موضوع محض فرق پر اکتفا کرنا ہے اور اس باریک فرق کو ہم اختلاف کا نام نہیں دے سکتے، بلکہ یوں کہہ سکتے ہیں کہ ایک طبقہ نے صرف چند چیزوں پر اکتفا کرلیا ہے اور بعض سے صرف نظر کیا۔

اعتقادِ توحید

فرمایا کہ توحید کے اعتقاد سے جو یقینی وجدان اور قطعی برہان سے ثابت ہے اسیران وہم وگمان کے اختلاف اور شکی الطبع لوگوں کی ناسمجھی و بے غوری کے سبب پھرنا نہیں چاہئے۔

ولایت حقیقیہ

فرمایا عادات بد سے کنارہ کشی اور تہذیب اخلاق اختیار کرنے سے اگرچہ آدمی فرشتہ بن جاتا ہے مگر کمال ولایت کی بہ نسبت یہ کوئی کمال نہیں۔ اللہ تعالیٰ ملائکہ کے ذکر میں فرماتا ہے **وما منا الا له مقام معلوم** (ہم میں سے ہر ایک کے لئے ایک درجہ مقرر ہے) مذکورہ صفات والا آدمی عنایات الٰہی کا مستحق اور خوارق عادات کا مظہر بن سکتا ہے کیونکہ ایسی کرامات عادات بد سے بچنے اور اطاعت الٰہی کے اختیار کرنے سے ظاہر ہوتی ہیں مگر ایسا صاحب کرامت ابھی ولایت حقیقیہ سے بہت دور ہے کیونکہ یہ ابھی اپنے آپ میں مشغول ہے اور ایسا آدمی جو خود بین ہو، سالکان طریقت میں کیسے شمار ہو سکے گا؟

کاتب الحروف (شاہ ولی اللہ) کے نزدیک آیۂ کریمہ **وما منا الا له مقام معلوم** کی رو سے ملائکہ کے مقامات و مدارج محدود اور مقرر ہیں اور صاحب ولایت خاصہ کا مقام جو تجلی ذات کے شرف سے مشرف ہو کر کوئی حد و نہایت نہیں رکھتا۔

بہترین مجاہدہ توجہ الی الحق

فرمایا بہترین مجاہدہ وریاضت کھانے پینے میں حد اعتدال قائم رکھنے کے ساتھ علی الدوام توجہ الی الحق میں پوشیدہ ہے یہاں تک کہ اس عمل کو عادت بنالیں۔

العلم حجاب الاکبر

فرمایا کہ جب حضور قلب حاصل ہو تو لوگوں کے ساتھ ملنے جلنے سے یہ نعمت زائل نہیں ہوتی ہاں البتہ تعلیم و تعلم اور باریک علوم میں مشغول ہو جائے تو حضور قلبی میں کچھ خفیف سا حجاب واقع ہو جاتا ہے۔

فرمایا جسے حضور قلب کا ملکہ بایں طور حاصل ہو جیسے آنکھ میں بصارت تو اسے علوم وفنون کے شغف سے بھی کوئی حجاب واقع نہیں ہوگا۔

شیخ یاقوت عرشی کی وجہ تسمیہ

فرمایا شیخ یاقوت حبشی کے عرشی کہلانے کی وجہ تسمیہ شاید یہ ہے کہ انھوں نے ارض و سموات اور حدوث و امکان سے گزر کر عرش وحدت (مقام وحدت) سے دائمی وابستگی حاصل کر لی تھی، ورنہ دل کا مستقل طور ہی سہی عرش کی طرف متعلق اور متوجہ ہونا کوئی کمال نہیں کیونکہ اہل تصوف کا پہلا قدم ماسوائے حق اور جملہ عرش و مافیہ کے خیالات سے گزر جانا ہے۔

کاتب الحروف (شاہ ولی اللہ) کے نزدیک یہ بھی ممکن ہے کہ شیخ یاقوت کی نسبت عرش کے ساتھ اس سبب سے نہ ہو کہ ان کے علم کا حدود اربعہ ان کی بلند ہمتی کے سبب عرش حق ہے کیونکہ یہ بات بھی ان کے کمال کی نفی کرتی ہے بلکہ یہ نسبت ان معنوں میں ہو کہ تجلی ذات حق کے بعد وہ اور عرش ایک ہو کر رہ گئے۔ اس مناسبت سے کہ عرش حق کی طرح ان کا وجود بھی انوار و تجلیات حق کا مظہر اتم بن گیا۔

آپ اس مشہور شعر کے معنی میں فرمایا کرتے تھے۔

اگر تو پاس داری پاس انفاس
بسلطانی رسانندت ازیں پاس

(اے سالک اگر تو پاس انفاس کی حفاظت کرے تو اس مجاہدہ کی بدولت تجھے سلطنت حقیقی پر فائز کیا جائے گا) یعنی سالک کو چاہئے کہ ہر سانس میں اپنی توجہ جناب احدیت اور بارگاہ وحدیت سے دوسری طرف نہ پھیرے اور یہ مقام اس طرح حاصل ہوگا کہ سالک میدان توحید میں خوب غور وفکر کرے یہاں تک کہ عالم امکان کے حجابات اتار کر حق سبحانہ کی ذات کا وہ قرب حاصل کرے کہ مقام بقا پر فائز ہو کر بادشاہ کہلائے۔ نفی سے مقصود غیریت متوہمہ (ماسوائے حق کی وہ شکلیں جو وہم کی بدولت صورت پذیر ہوتی ہیں) کو دور کرنا ہے اور یہ نعمت سالک کو بحر وحدت میں مستغرق ہونے سے حاصل ہو سکتی ہے۔

مشاہدۂ حق

فرمایا کرتے تھے کہ بعض مشائخ کے نزدیک منزل سلوک میں تمام امور سے اہم یہ امر ہے کہ سالک ہر لمحہ اور ہر حالت میں حق سبحانہ کا مشاہدہ مظاہر کائنات میں کرے یعنی وہ یہ تصور کرے

کہ وجود باری کی حقیقت مختلف اور کثیر صورتوں کے ذریعے قید و اطلاق کی صفات میں مشتمل ہو کر جو دکھائی جا رہی ہے اس کا وجود حقیقی نہیں بلکہ اعتباری ہے کیونکہ قابل اعتنا اور لائق توجہ امر یہ ہے کہ تمام حجابات ختم کر کے سالک احدیت کے سورج کو تعینات کے پہاڑوں میں طلوع ہوتا دیکھ سکے۔ اسی مقام سے سالک پر حقیقت مخفی کے تمام رموز منکشف ہونے لگ جاتے ہیں۔ ہاں اگر اس منزل میں سالک پر مایوسی اور رنج و غم کے آثار ہویدا ہوں تو کوئی بات نہیں البتہ مظاہر میں معیت حق کا مطالعہ اس انداز سے کرتا رہے کہ ایک بسیط نور نظر آ رہا ہے جو ہر چیز سے اول ہے اور مثالی صورتوں اور خیالی ہیولوں سے تجاوز کر کے وہ نور بسیط ایک حقیقت ثابتہ کی شکل میں نظر آ رہا ہے۔

کاتب الحروف (شاہ ولی اللہ) کے نزدیک انا کی اوٹ میں شمس احدیت کا نظارہ دراصل مقامات جذب کی روح اور جان ہے اور مظاہرہ کائنات میں معیت حق کا مشاہدہ مقامات سلوک کی نسبتوں میں سے ایک نسبت۔

بشری خصوصیات کی خصوصیات

فرمایا لڑائی، جھگڑا، صلح پسندی، غصہ اور اس قسم کی تمام بشری خصوصیات مختلف قویٰ کے باہمی امتزاج سے پیدا ہوتی ہیں اور سلوک اور مراتب ولایت بھی انہی قوتوں کے ٹکراؤ سے ظہور پذیر ہوتے ہیں اور انسانی مزاج کی انہی مختلف النوع قوتوں سے کام لینے کے لئے انبیائے کرام علیہم السلام کو بھیج کر انسانوں کو تکالیف شرعی کا پابند بنایا گیا۔ اس کے ثبوت میں کہا جا سکتا ہے کہ عارف بعض اوقات تلخ اور بدبودار چیزوں کو بھی انتہائی لذت اور خوشی سے استعمال کر لیتا ہے اس وجہ سے کہ اس وقت وہ اپنے بعض بشری قویٰ سے دستبردار ہو چکا ہوتا ہے۔

کاتب الحروف (شاہ ولی اللہ) کے نزدیک قویٰ سے مراد مختلف النوع مخلوق اور افراد انسانی کی استعداد اور کارکردگی کی قوتیں ہیں، مثلاً انسان کی صورت نوعی نطق، راست قامتی اور قابل توجہ چہرہ کی مقتضی ہے اور گھوڑوں کی صورت نوعی، ہنہنانے، خمیدہ قامتی اور بال دار چہرے مہرے کی مقتضی تھی۔

الصوفی ھواللہ

فرمایا کہ عالم امکان کے حجابات اور قوت وہمیہ کی انانیت سے چھٹکارا پانا منزل عرفان کا

پہلا قدم ہے اور کہنے والے نے اپنے اس قول میں اسی بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ الصوفی ھو اللہ جب ممکن اپنے وجود سے اپنے امکان سے گردوغبار جھاڑ دے گا تو ذات واجب الوجود کے سوا اس میں باقی کچھ نہیں رہے گا۔

فرمایا وجود حق ہر چیز میں اس کی استعداد کے مطابق جلوہ گر ہوتا ہے اور جو کچھ بھی سمع و بصر اور تمام صفات سے ظاہر ہوتا ہے وہ ان تمام (قویٰ وصفات) کی صلاحیت کی مقدار سے مطابقت رکھتا ہے۔ ایسے مقام پر جب کوئی مبتدی خود کو علیحدہ سمجھتے ہوئے نگاہ ڈالتا ہے تو وحدت میں متردد ہو جاتا ہے اور جوں ہی اسماء وصفات کے سایوں سے خود کو نکال لیتا ہے تو تمام تر اعتراضات وخیالات رفع ہو جاتے ہیں۔ جو خود محجوب نہیں وہ بغیر اعتبار قویٰ کے حقیقت وجود کو پا سکتا ہے۔

بصارت اور بصیرت

فرمایا کہ بصارت (ظاہری بینائی) دراصل بصیرت روح (حقیقی بینائی) ہی کا اثر ہے مگر مخصوص فاصلے اور جہات میں مقید ہے کہ یہ فاصلہ وجہت نہ تو غایت درجہ دور ہے اور نہ قریب یہ اس طرح ہے کہ کسی شخص نے سبز رنگ کا چشمہ لگا رکھا ہو اور اسے تمام ماحول سبز دکھائی دے۔ جب بصیرت کو قوت وادراک حاصل ہو جائے تو یہی بصارت اس کے تابع فرمان ہو کر جہت ومسافت کی تمام قیود سے بری ہو جاتی ہے۔

علمائے ظاہر کا نزاع لفظی

فرمایا کہ معتزلہ اور شیعہ رویت باری کا انکار کرتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ رویت جہت کا تقاضا کرتی ہے جبکہ مکمل انکشاف حجابات کے اٹھنے پر ہی حاصل ہو سکتا ہے، (گویا ظاہری بینائی محدود ومقید ہے اور حدود وقیود کے اٹھنے پر ہی دیدار حق ہو سکتا ہے) اور اہل سنت بغیر کیف وجہت رویت کے قائل ہیں اور اسی کو عین انکشاف گردانتے ہیں، نتیجتاً دونوں گروہوں کے ہاں لفظی نزاع کے علاوہ کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا۔

اولیاء اور دیدارِ باری

فرمایا کہ اہل اللہ کو دنیا میں وہ کچھ حاصل ہوتا ہے جو کہ دوسروں کو قیامت میں عطا ہوگا وہ ذات باری کو واشگاف اور اشکال سے منزہ بالکل روز قیامت میں دیدار حق کی طرح (دنیا ہی میں)

اچکتی ہوئی بجلی کی صورت میں دیکھتے ہیں اوران میں سے بعض اس سے بھی زیادہ اور کچھ تو متواتر دیدارعام کرتے ہیں۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرمایا کرتے تھے کہ لم اعبد ربا لمراره (میں جس خدا کی پرستش کرتا ہوں اسے دیکھتا ہوں)

حقیقت بیعت

فرمایا اولیاء اللہ کے سلسلے میں داخل ہونے سے مراد عمل اور تسلیم کا مظاہرہ کرنا ہے۔ جب تک کوئی ان کی ریاضتوں اور اطوار کو نہ اپنائے، چاہے کوئی کتنا بھی ظاہری ارتباط پیدا کر لے اسے داخل سلسلہ نہیں کہا جا سکتا۔

تجلی ذات کی دولت

فرمایا کہ ہمارے زمانے کے عرفاء کا یہ حال ہے کہ انہیں تجلی ذاتی کی دولت حاصل نہیں، ورنہ وہ کبھی اپنی اور آل اولاد کی اغراض کی خاطر سلاطین وامراء کے آگے ہاتھ نہ پھیلائیں۔

کاتب الحروف (شاہ ولی اللہ) یہ سمجھتا ہے کہ تجلی ذاتی کا اطلاق بعض جگہوں پر اس کے متعلقات وغیرہ پر بھی ہوتا ہے۔ لہٰذا اس جگہ تجلی ذات سے مراد کمال تدبیر کا انکشاف ذات باری کے قہر اور ارضی وسماوی اسباب کی تدبیر کا جان لینا مراد ہے۔ اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ذات باری تعالیٰ جب چاہے اور جس چیز کو جہاں چاہے ظاہر فرما سکتا ہے۔ اس (عارف) کو توکل علی اللہ کی دولت نصیب ہوتی ہے۔

تعصب راہِ خدا میں بڑی رکاوٹ ہے

فرمایا کہ راہ وصول کی سب سے بڑی رکاوٹ تعصب ہے۔ حضرت شیخ صوفیاء کے اس قول کو جب تک توجہ کا مرکز ایک نہ ہو، افادہ واستفادہ کا ظہور نہیں ہوسکتا کا معنی بیان کرتے ہوئے فرماتے تھے کہ توجہ کی یکتائی کا مفہوم یہ ہے کہ ایک جانب سے اخذ کیا جائے اور بغیر اس کے دوسری طرف التفات نہ کرے، چاہے وہ غوث وقطب ہی کیوں نہ ہو اور نہ ہی قیاس آرائی سے اس کی (مرشد) افضلیت سب پر مقدم جانے۔

فرمایا کہ یہ بات عارف کے شایان شان نہیں کہ دوسرے عارف کے مرید کو اپنی طرف

پھیر لے اور اس کی توجہ اس کے اپنے شیخ سے ہٹا دے اور اگر اس موقع پر مرید التجا وزاری کرے تو بھی اسے اس کے شیخ کے حوالے کر دے اگر اس کا شیخ کسی دوسرے شہر چلا جائے یا واصل بحق ہو جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔

فرمایا کہ صحابہ کرام کا انکار یا ان کو برا بھلا کہنا ائمہ اہل بیت سے ثابت نہیں بلکہ یہ ان پر افتراء ہے۔ ابن عبدالبر کے اس قول کی توجیہ میں کہ بعض تابعین کی صحابہ رسول پر فضیلت جائز ہے، فرماتے تھے کہ روحانی صحبت کی فرمانبرداری جسمانی صحبت کی فرمانبرداری سے کہیں بڑھ کر ہوتی ہے۔

کاتب الحروف (شاہ ولی اللہ) کہتا ہے کہ ابن عمامہؓ بھی صحابہ میں سے ہیں۔ اور ان کی صحبت روحانی ہے جو کہ موثر تر ہے۔

لفظوں کے پجاری علماء

فرمایا کہ میں نے عرفا وعلماء کی ایک بہت بڑی محفل میں مسئلہ وحدت الوجود ثابت کر دکھایا، عقائد متکلمین پر مبنی عبارات کے حوالے پیش کئے اور عقل ونقلی دلائل دیئے مگر اس تمام بحث کے دوران ''وحدۃ الوجود'' کی اصطلاح کو لفظاً ذکر نہ کیا۔ انھوں نے یہ تمام دلائل قبول کر لئے، گویا خلاصہ یہ نکلا کہ لفظوں کے پجاری علماء کا اکثر تعصب لفظوں سے ہوتا ہے۔

مسئلہ توحید خالی کتابوں سے حل نہیں ہوتا

فرمایا کہ توحید کے موضوع پر لکھی گئی کتابوں کا مطالعہ ریاضت وانجذاب کے بغیر فائدہ نہیں پہنچاتا کیونکہ کتابوں کا مطالعہ عملی مشق کے بغیر تیر کے سوا تیر چلانے کے مترادف ہے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ان رسائل سے مطلوب کی تائید بھی ہو جاتی ہے۔

اولیاء ابوالوقت ہوتے ہیں۔

فرمایا کہ تمام زمانے میرے نزدیک بحیثیت آن واحد کے ہیں۔

فرمایا کہ ایک روز میں نے وضو کرنا چاہا کہ اسی دوران کچھ غنودگی سی طاری ہوگئی، بعد میں میرے دل میں یہ القا ہوا کہ یہ مدت غنودگی نو سو ہزار برس کے برابر تھی۔ کاتب الحروف کہتا ہے کہ طویل تر زمانوں کو ایک پل کی صورت میں پانا دراصل فنا کے حقیقت میں مل جانے سے پیدا ہوا۔ کیونکہ زمانہ فنا ہے اور حقیقت اس سے ماوراء اور ایک ساعت کو طویل تر زمانوں کی حیثیت میں

پانے سے ان کی مراد یہ ہے کہ زمانہ مقدار حرکت کو کہتے ہیں اور عالم مثال میں کوئی ایک ایسی حرکت موجود ہے جو اس (زمانہ) کی حرکت سے تیز تر ہے۔ اگر چہ یہ حرکت ظاہر نہیں ہوتی مگر بعض اوقات ظاہر بھی ہو جاتی ہے اور حرکات مالوفہ سے تیز تر مقدار طویل زمانوں کے گزرنے سے منکشف ہوتی ہے۔

فرمایا کہ اگر کسی برے کام کے مرتکب کو دیکھو تو جان لو کہ وہ قصداً ارتکاب نہیں کر رہا لہٰذا اسے نصیحت کرو کیونکہ فان الذکری تنفع المومنین (نصیحت مومنین کے لئے نفع بخش ثابت ہوتی ہے) اور مومنین سے مراد وہ لوگ ہیں جنھیں ایمان کا بلند تر مقام حاصل ہوتا ہے۔ شاید کہ نصیحت ان سو میں سے کسی ایک کو نفع پہنچائے جو امر ارادی کے موافق ہو، اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی کی بچی گم ہو جائے اور وہ اس کی تلاش میں ہر کوچہ و بازار میں پکارتا پھرے حالانکہ اس کی بچی کسی خاص مقام میں موجود ہو اور اس کی خبر رکھنے والا ہزاروں میں سے کوئی ایک ہو۔ (جب وہ آواز لگائے گا تو ہزاروں میں سے کوئی ایک جو جانتا ہوگا سامنے آ جائے گا، اسی طرح لوگوں کو نصیحت اور بھلائی کی بات بتانی چاہئے ممکن ہے کوئی ایک اس سے فائدہ اٹھالے)

کاتب الحروف (شاہ ولی اللہ) کہتا ہے کہ دنیا ساری تقدیر کی رسیوں میں جکڑی ہوئی ہے اگر کوئی فاسق ہے تو اس کا فسق اس کے لئے مقدر ہو چکا ہے۔ اگر صالح ہے تو اس کی نیکی اس کی تقدیر تھی، اور واجب بالغیر کے لئے علت تامہ کی ضرورت ہے جبکہ ہدایت مرشد جو کہ علت تامہ کی جزو ہے۔ اکثر نفوس کی اصلاح کا سبب بنتی ہے۔ لہٰذا تدبیر کلی بعثت رسل اور کتب آسمانی کے نزول کا تقاضا کرتی ہے۔ اور تمام اسباب کے وجود کی متقاضی ہوتی ہے۔

ذوق مشاہدہ

فرمایا کہ جب کسی کو ذوق مشاہدہ حاصل ہو جائے تو کوئی معصیت اسے زائل نہیں کر سکتی۔ کیونکہ چاہے صالح ہو یا فاجر دونوں کے نزدیک شیرینی محبوب تر ہے اور گناہوں سے حفاظت محض ذات باری کی عنایت پر مبنی ہے۔

خدا کا دشمن کون ہے

فرمایا کہ بایزید (حضرت شیخ کے ایک ہم عصر بزرگ) نے مجھ سے کہا کہ میں خدا کو ان

آنکھوں سے دیکھتا ہوں۔ میں نے کہا اے شیخ! تم کون ہوا سے دیکھنے والے؟ انھوں نے کہا تو کیا دوست کو دوست سے حذر کرنا چاہئے؟ میں نے کہا تو اس کا دشمن کون ہے؟ اس پر ان کا غصہ فرو ہوگیا کیونکہ منصفانہ طبیعت پائی تھی۔

فرمایا کہ ولی اس دنیا میں بوجہ غلبۂ عناصر روح جلایا جاتا ہے اور تلوار سے قتل کیا جاتا ہے مگر روز قیامت معاملہ اس کے برعکس ہوگا کہ آگ بزبان حال پکارے گی۔ جز یا مومن فان نورک یطفأ لھبی) (اے مومن جلدی گزر جا کہ تیرے نور کی لپٹ میرے شعلے کی بھڑک کو ٹھنڈا کر رہی ہے)۔ مگر یہ مقام ان اہل کمال کا ہے جن کے سامنے سے پردہ ہائے امکان اٹھے ہوئے ہوتے ہیں۔

ریاضات صوفیاء

فرمایا کہ ایک عالم نے عارف سے سوال کیا کہ صوفیا یہ تمام مجاہدات و ریاضات، کاہے کو کرتے ہیں، عارف نے کہا کہ اگر تمھیں کہا جائے کہ اس طرح اس طرح کی مشقت کرو جس کے معاوضے میں تمھیں سلطنت دی جائے گی یا بادشاہ تمہارے تابع فرمان ہوجائے گا تو وہ تمام مشکلات اور مشقتیں تمھیں گوارا ہوں گی کہ نہیں؟ اس نے کہا ہر شخص خوشی سے ایسا کرے گا، عارف نے کہا اسی طرح ریاضات ومجاہدات کے نتیجے میں ذات حق نہاں خانۂ قلب میں اپنی شان الوہیت کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔

کاتب الحروف (شاہ ولی اللہؒ) کہتا ہے کہ یہاں (موخر الذکر عبارت میں) آمدن حق (یعنی قلب عارف میں ذات حق کی جلوہ گری) سے مراد صورت الٰہیہ کی بقا کا حصول ہے اور اس کا اصل اس نقطۂ وجود کی روشنی اور جلوہ گری ہے جو سالک کے نفس ناطقہ کے نقاط میں سے ایک ہے۔

عین القضاۃ ہمدانی کے قول کی تشریح

عین القضاۃ ہمدانی کے ظاہراً غیر شرعی قول کہ:

اے پسر لا الہ الا اللہ	خود زشرک خفی است آئینہ دار
چیست شرک جلی رسول اللہ	خویشتن را ازیں دو شرک برآر

کی تاویل میں فرمایا کہ لا الہ الا اللہ کا مفہوم یہ ہے کہ خدا کے سوا کوئی دوسرا معبود نہیں، اور

معبود کے لئے عابد کا ہونا ضروری ہے اس میں دوئی کا تصور نمایاں ہے جو کہ اصل شرک ہے، اور شرک خفی اس میں یہ ہے کہ عابد عبادت میں مذکور نہیں اور محمد رسول اللہ کا معنی یہ ہے کہ خداوند تعالی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگوں کی طرف بھیجا ہے یہاں اس میں شک نہیں کہ مضاف جو کہ رسول ہے، وہ مضاف الیہ یعنی اللہ کا غیر ہے اور یہ شرک جلی ہے اور جب تو وحدت کی حقیقت کو پالے گا اور تعینات کی غیریت کو اعتباری جانتے ہوئے رسول خدا کو بھیجنے والے کا مظہر دیکھے گا تو ان تمام اقسام شرک سے نجات پالے گا۔

لامحدودیت واجب الوجود

فرمایا کہ وجود عالم عدم واجب کو مستلزم ہے، اس لئے کہ وجود عالم کی صورت میں اگر تو واجب وجود عالم سے خارج ہے تو وہ محدود ہو گیا اور واجب کبھی محدود نہیں ہو سکتا، اور اگر واجب وجود عالم میں داخل ہے تو حلول لازم آتا ہے اور ذات حق حلول سے پاک ہے اور اسی طرح ضروری ہے کہ ہر طرح سے عدم ممکنات کی تردید کی جائے تو ثابت ہو گیا کہ عالم تعینات اعتباری سے عبارت ہے اور حقیقت وجود کو دوسرے لفظوں میں یوں بیان کرتا ہوں کہ وہ معدوم ہے جو کہ اپنی ذات میں خود قائم ہے۔

شیخ اکبرؒ کے ایک قول کی تشریح

فتوحات مکیہ میں شیخ اکبرؒ کے اس قول کہ لا من العالم من اللہ کی تشریح میں فرمایا کرتے تھے کہ وجود عالم بمنزلہ وہم ہے اور وجود باری، وجود حقیقی ہے، ایک عارف نے کہا ہے کہ الوجود في الكل ساری و التعينات امور اعتبارية (وجود حقیقی تمام اشیاء میں جاری و ساری ہے اور تعینات صرف اعتباری امور ہیں) لہٰذا عالم خدائے لم یزل سے دور کی چیز ہے، کیونکہ موجود حقیقی (ذات حق) اور موہوم (عالم) میں باہمی تضاد ہے اور ان کے مابین کوئی ایسی چیز نہیں پائی جاتی جو انہیں جمع کر لے۔ اس کی مثال اس سراب کی سی ہے جو شعلۂ آفتاب کے پرتو سے دریا دکھائی دیتا ہے مگر فی الحقیقت دونوں (سراب و دریا) میں تباین کلی موجود ہے اسی طرح خداوند بزرگ و برتر کی یکتائی کا سورج عالم پر چمک رہا ہے جس کے نتیجے میں عالم وجود میں آیا جسے بجز ذات کے ساتھ ایک مناسبت تو پیدا ہوئی مگر حقیقت یہ ہے کہ خود اپنی ذات میں وہ معدوم محض ہے۔

شیخ اکبر کے اس قول ما فی احد من اللہ شیئا کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ اکابر کے نزدیک یہ بات مسلم ہے کہ حق سبحانہ وتعالیٰ کے علاوہ کوئی چیز موجود نہیں، ؎

کجا غیر کو غیر کو نفس غیر

سوی اللہ واللہ ما فی الوجود

یہاں لفظ فی حلول پر دلالت کرتا ہے ذات حق اور اس کے شئونات کے مظاہر ہیں پس اس کی ذات وصفات کس طرح غیر میں حلول کرتی ہے، یا غیر سے متعلق ہو جاتی ہے اور یہ تو مستلزم اثنینیت ہے، پس معلوم ہوا کہ خدا کے سوا میں خدا نہیں جیسا کہ اس کے سوا کوئی چیز اس میں موجود نہیں، چنانچہ صوفیاء کے اس قول کہ لیس فی ذاته سواه ولا ذاته فی سواه (اس کی ذات میں اس کا غیر موجود نہیں اور نہ وہ خود اپنے غیر میں موجود ہے) معلوم ہوا کہ یہ دونوں عبارتیں وحدت وجود کے بارے میں ایک دوسرے کی نفی نہیں کرتیں۔

عظمت قرآن

فرمایا کہ عارفین میں سے کسی نے کہا ہے کہ قرآن مجید میرے لئے بحر اور آیات قرآنیہ موجوں کی صورت میں ظاہر ہوئیں جب میں ایک آیت پر غور کرنے لگا تو بے انتہا پوشیدہ معانی مجھ پر آشکارا ہوئے اور میرے دل میں یہ آیا کہ یہی ہے وہ قرآن جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا گیا تھا، اس طرح میں نے عظمت قرآن کو جان لیا۔ جب کوئی ولی خداوند تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اس کے حضور بعض آدمیوں کے لئے کوئی چیز طلب کرتا ہے تو اسے حسب مطلوب ایک دو آیات قرآنیہ الہام کی جاتی ہیں۔

فرمایا کہ جب وجود حق صور امکانیہ میں ظاہر ہوا تو صفات واجبیہ پردہ ہائے امکان میں پوشیدہ ہوگئیں جیسا کہ نشہ استعمال نہ کرنے والا کاریگر اچانک نشہ آور چیز استعمال کرنے سے اپنے اوصاف کاریگری سے بے خبر ہو جاتا ہے۔

کاتب الحروف (شاہ ولی اللہؒ) کہتا ہے کہ مظاہر ممکنہ میں وجود جلوہ گر ہوتا ہے تو اس وقت صفات کاملہ ظہور پذیر نہیں ہوتیں۔

مقامات سلوک

ایک صوفی کے اس قول کہ ما بعد المقام الذی و صلناہ مقام (یعنی جس مقام تک ہم پہنچے ہیں اس کے بعد بھی ایک مقام ہے) اور ایک دوسرے عارف کے اس قول کہ فوق کل مقام مقام مالا یتناھی (ہر مقام کے ورے ایک اور مقام ہے اور یہ سلسلہ لا متناہی ہے) کی تشریح میں فرمایا کہ پہلا تو اہل شہود (جو تمام مراتب طے کرنے کے بعد رویت حقیقیہ کی دولت سے شادکام ہوں) کی نسبت درست ہے۔ جیسے شیخ بسطامیؒ نے فرمایا کہ اذ لیس وراء عباد ان قریة والی ربک المنتھی اور دوسرے قول کے قائل کی مراد اگر مظاہر اسماء کی سیر ہے جیسے ملائکہ، عالم مثال وارواح وغیرہ مسلّم ہیں لیکن یہ کمال نہیں کیونکہ معارف ذات حقیقی تک رسائی کے بعد ان (سیر مظاہر اسماء) سے بے نیاز ہو جاتا ہے اور اس وقت ان پر لفظ مقام بھی تسامح کے ساتھ صادق آتا ہے۔ اگر سالک یہ سمجھتا ہے کہ وصول ذات کے بعد بھی مقامات غیر متناہیہ واقعتہً موجود ہوتے ہیں تو اس کی فاش غلطی ہے۔

تشریح شعر عطارؒ

شیخ فریدالدین عطارؒ کے اس شعر ؎

عشق را با کافری خویشی بود
کافری را مغز درویشی بود

کی تشریح میں فرمایا کہ اس میں کفر سے مراد نسبت اور دیگر اضافی چیزوں کا مخفی رکھنا ہے۔

شیخ ابوبکر واسطیؒ اور شیخ ابوسعید خرازؒ کے اس قول کہ اکثر العارفین حتّٰی ابی یزید ماتوا فی الوھم والظن (اکثر عارفین یہاں تک کہ ابو یزید نے بھی وہم وگمان میں یکسانیت روا نہیں رکھی) کے بارے میں فرمایا کہ ولایت کبریٰ جہت دوئی کو مٹانے کا نام ہے شہود اور وصول بالذات بھی اسی سے عبارت ہے۔ اکثر عارفین کہ شیخ ابو یزیدؒ بھی ان میں سے ایک ہیں واقعی اسی مقام پر فائز ہیں مگر اس مقام شہود کے کئی مراتب و مدارج ہیں، بعض اوقات تو یہ (شہود) تجلی صفات وجوبیہ جبکہ امکان بھی ساتھ باقی رہتا ہے اکثر عارفین پر اسی مرتبہ کا غلبہ تھا۔ اور یہ ہمیشہ موجود رہتا ہے بعض اوقات یہ (شہود) خالصتاً تجلی ذات کی صورت میں ہوتا ہے اور امکان بھی نہیں

ہوتا۔ یہ بالکل غلط ہے اور یہی تجلی برقی آتی ہے جو اس جہان میں دائم نہیں رہتی اور اس میں اجزاء متفرق ہو جاتے ہیں، روح بدن سے بچھڑ جاتی ہے جو اس طرح شہود ذات کو نہیں پالیتا وہ درحقیقت اصل توحید سے دور رہتا ہے اور اس پر وحدت کا غلبہ نہیں ہونے پاتا جیسے شہود کے کچھ مراتب بایزید بسطامیؒ پر غالب آ گئے تھے اور امکان میں سے کچھ بقیہ کے سبب یہ نعرہ ان کی زبان زد ہو گیا سبحانی ما اعظم شانی اور یہ الفاظ اس شخص کے لئے مناسب نہیں جو طریقۂ مذکورہ کے مطابق وحدت کی اصل تک پہنچا ہو۔

ایک لطیف نکتہ

واضح رہے کہ ما اعظم صیغۂ تعجب ہے اور اس مقام پر تو کوئی تعجب ہوتا ہی نہیں اور اس طرح کہ حق تعالیٰ کو اپنی عظمت و کبریائی پر کوئی تعجب نہیں اور یہ جو کہتے ہیں کہ ایسا نعرہ لگانے کے بعد شیخ بسطامیؒ نے زنار گلے میں ڈال کر بعد میں اسے کاٹ دیا اور کہا اللھم ان کنت قلت یوما سبحانی ما اعظم شانی فکنت مجوسیا زندیقا وانا اقطع زناری واقول لا الہ الا اللہ (یا اللہ اگر میں نے کبھی سبحانی ما اعظم شانی کہا تھا تو میں مجوسی و زندیق تھا۔ اب میں اپنی زنار اتار پھینک کر کلمہ لا الہ الا اللہ کا اقرار کرتا ہوں حالانکہ قرینہ یہاں یہ ہے کہ ابھی ان کے ہاں امکان میں سے کچھ باقی تھا اور آخر میں اس کی خبر ہوئی۔ اگر بعض صوفیاء یہ کہیں کہ ان کے مندرجہ بالا قول کا مطلب ہدایت وارشاد تھا تو اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ آئندہ اس کی تقلید میں کوئی ایسا نعرہ نہ لگائے۔

مقام ابن منصورؒ

جہاں تک ابن منصورؒ کا تعلق ہے تو ان کے بارے میں ابوسعید خرازؒ نے یہ رائے دی کان اوحد زمانہ لم یکن فی عہدہ من الشرق الی الغرب مثلہ (ابن منصورؒ میدان وحدت میں یگانہ روزگار تھے اور ان کے زمانے میں مشرق سے مغرب تک ان کے پائے کا کوئی آدمی نہیں تھا) اسی وجہ سے ان پر سر توحید کا ایسا غلبہ ہوا کہ وہ پیچھے نہ ہٹے، مگر مناسب بات تو یہ ہے کہ ابن منصورؒ نے خود توحید حقیقی کے راز کو نہیں پایا تھا، کیونکہ وہ اپنے قول انا الحق پر ہمیشہ قائم رہے جبکہ تجلی برقی آن واحد کی طرح ہے۔

اکثر عرفاء، جو شہود کی کسی ایک قسم سے مشرف ہوئے اپنے تئیں یہ سمجھتے رہے کہ انہیں شہود ذاتی حاصل ہو گیا ہے حتی کہ وہ اسی زعم میں چل بسے۔

کاتب الحروف (شاہ ولی اللہؒ) کہتا ہے کہ تجلی، متجلیٰ لہ (جس کو تجلی سے نوازا جائے) کی استعداد کے مطابق ہوتی ہے اور جو چیز محدود کے لئے ہو وہ حدود حساب سے خالی نہیں ہو سکتی۔ لیکن ان نفوس کہ جن پر قویٰ اطلاقیہ غالب آ جائیں اور ان نفوس میں کہ قویٰ تقییدیہ ان پر غلبہ رکھتی ہوں، فرق ہے، لہٰذا نفوس تقییدیہ میں معرفت کی غایت ظہور صفات ہے نہ کہ ذات اور یہ بھی ایک طرح کا امتزاج و اختلاط ہوتا ہے جیسے کہ ہر آئینہ اپنی وسعت کے مطابق اجسام کو ظاہر کرتا ہے۔ چنانچہ زمین و آسمان ایک چھوٹے سے آئینے میں آ جاتے ہیں مگر جب یہی آئینہ سبز یا زرد رنگت کا ہو یا اس کی شکل لمبوتری یا مثلث ہو تو کئی اور تبدیلیاں بھی رونما ہو جاتی ہیں گویا ہر تبدیلی ایک حجاب ہے

نظارۂ جمال حقیقی

فرمایا اگر انا الحق کہنے والا امکان کے پردوں میں پوشیدہ ہے تو وہ جھوٹا ہے اور دائرۂ فرعونیت میں داخل ہو جاتا ہے اور اگر اس کی جہت امکان مغلوب ہو گئی ہے تو وہ معذور ہے۔ اس مقام پر فرمایا کرتے تھے کہ تجلی برقی باطل دعووں اور امکانی جہت سے بے نیاز ہوتی ہے، کیا یہ بات کسی سے مخفی ہے کہ جب ایک شخص کسی حسین و جمیل کا نظارہ کرتا ہے تو خود کو اور اپنی تمام تر صفات کو فراموش کر بیٹھتا ہے بعینہٖ یہی حال خواتین مصر کا رخ یوسف علیہ السلام کو دیکھ کر ہوا تھا، یہاں سے اندازہ کر لینا چاہئے کہ نظارۂ جمال حقیقی سے کیا حال واقع ہوتا ہوگا؟

ظلمت عدم سے وجود خارجی تک

اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے تھے ان اللہ خلق الخلق فی ظلمۃ ثم رش علیھم من نورہ (خداوند بزرگ و برتر نے مخلوقات کو اندھیرے میں پیدا کیا پھر ان پر اپنے نور کی ایک جھلک ڈالی) کہ اس نے خلق کو اعیان ثابتہ کی حیثیت میں اس طرح پیدا کیا کہ وہ ظلمت عدم کا لباس پہنے ہوئے تھے واضح ہو کہ ایسے میں وجود خارجی منتفی تھا اس کے بعد ذات حق نے ان پر وجود خارجی کا نور ڈالا تو وہ تمام اعیان خارجی بن گئے، اور اس موجودیت کے ساتھ انھوں نے ذات حق کو پہچانا۔

فرمایا کہ انسان کا مرتب امکانی کی طرف توجہ کرنا حد ذات میں خود کمال ہے۔ اس رو سے کہ یہ تمام شئون ذات ہیں اور یہ جو مراتب کو غفلت کا نام دیا جاتا ہے وہ اس اعتبار سے کہ بعض اوقات صفات واجبیہ کی طرف توجہ کرنے میں مانع ثابت ہوتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی ذات حق تک پہنچنے سے محروم، اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے اور موت کے بعد (اس کی روح) پریشان، غمزدہ اور اذیت رسیدہ ہو جاتی ہے کیونکہ یہ شخص اپنے کمال کو نہ پا سکا اور اپنے مالوف سے جدا ہو گیا:

فرمایا کہ ذات اپنے اعتبار نفس کے لحاظ سے خود تمام تر منفی و مثبت اعتبارات سے قطع نظر ذات خاص، ذات ساذج، لاتعین، احدیت صرفہ اور وجود مطلق کے ناموں سے موسوم ہے۔ یہ وجود مطلق اس معنی میں کہ نسبت تقیید واطلاق سے خالی ہوتا ہے، نہ یہ کہ اطلاق کی پابندی میں مقید ہو۔ صوفیاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ ذات بحت (خاص) موجود ذہنی اور محض عقلی ہے اس کا خارجی وجود نہیں۔

اور اس گفتگو سے مراد یہ ہے کہ مقید سے مراد یہاں امر ذہنی ہے کیونکہ اعتبارات ذات کے اسماء وصفات ہیں جو کہ ذات کا لازمہ ہیں اور انھیں ذات سے خارجی طور پر جدا نہیں کیا جا سکتا۔ ذات ان کمالات کے روپ میں ازلی و ابدی طور پر ظاہر ہے۔ یہ جو کہا گیا ہے کہ احدیت اپنے بعد آنے والی وحدت اور دیگر تمام قابلیات سے پہلے ہے یہاں پر احدیت سے مراد احدیت ذاتی ہے کہ جہاں کوئی اعتبار نہیں پایا جاتا اور یہ جو کہا گیا ہے کہ احدیت اس وحدت کے بعد ہے اس سے مراد احدیت صفاتیہ ہے اور وہاں ذات کے علاوہ کی نفی مقصود ہے لہٰذا اختلاف باقی نہ رہا، الغرض ذات کے علاوہ جملہ اعتبارات و اضافات وغیرہ کو ذات سے ساقط کر دینے کا نام احدیت ہے اور ذات کے ساتھ جملہ اشیاء کو ثابت سمجھ لینا واحدیت ہے اور یہ واحدیت کمالات وجوبیہ و امکانیہ دونوں کو شامل ہے لفظ واجب کا اطلاق تجلی وجود مطلق کے اعتبار سے صفات واجبیہ موثرہ پر اور لفظ ممکن کا اطلاق باعتبار تجلی صفات امکانیہ متاثرہ ہوتا ہے۔

احدیت و واحدیت

یہاں یہ بات ذہن نشین رہے کہ احدیت و واحدیت میں تقدم و تاخر زمانی نہیں بلکہ رتبے کے لحاظ سے ہے جب کہ کچھ غیر حقیقت پسند لوگوں کے گمان میں یہ تقدم و تاخر زمانی ہے۔ تقدم

رتبی کی مثال یوں ہے کہ ایک ہی وقت میں زید اپنے خارج میں زید بھی ہے اور انسان بھی! عالم بھی ہے اور پارچہ باف بھی! مگر جب اس کی ذات خاص پر نظر ڈالی جائے تو اسے صرف انسان کا نام دیا جاتا ہے اور اگر صفات کی نفی کریں تو صرف انسان کہلائے اور اگر ان تمام صفات کو اس کے ساتھ ملحوظ رکھا جائے تو اسے باصفات انسان کہا جائے گا! پھر اگر فرداً فرداً جملہ صفات کی تفصیل بیان کی جائے تو علم کی صفت کے اعتبار سے وہ انسان عالم ہے اور پارچہ بافی کی صفت کو اس سے جوڑا جائے تو وہ پارچہ باف ہوگا اور زید ان تمام حالات میں واحد ہے کہ خارج میں اس کی جملہ صفات اس سے منفک نہیں ہیں اور بعض اعتبارات کے ناموں کا اختلاف عقلی ہے اور ایک اعتبار کا دوسرے پر تقدم رتبی ہے نہ کہ زمانی، اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ خارج میں ذات بحت موجود ہے تو اس سے اس کی مراد یہ ہے کہ جسے ذات بحت فرض کرتے ہیں وہ بعینہ مظاہر میں بھی موجود ہے اور کج فہموں کے اوہام کو دور کرنے کے لئے یہ کچھ کہا گیا ہے جو ذات فاعل کو ہم سے خارج قرار دیتے ہیں اور نسبت ظاہریت ومظہریت ثابت کرتے ہیں تعالی اللہ عما یقول الظالمون علوا کبیرا۔

اصلیت شطحیات

فرمایا جس نے سبحانی ما اعظم شانی یا انا الحق کہا غالباً غلبہ مثال اور اپنی نظر سے جہت امکان کی نفی کرتے ہوئے کہا ورنہ اسمائے الوہیت کا اطلاق سوائے تمام معلومات کے عالم کی کسی چیز پر روا نہیں، اور یہ علم ان سبحانی اور انا الحق کہنے والوں میں موجود نہ تھا اور درحقیقت یہ علم کسی بھی مظہر میں نہ تو پایا گیا ہے اور نہ ابد تک پایا جائے گا، کہتے ہیں اگر تجلی برقی اپنے خواص کے ساتھ دائم ہو جائے تو یہ الفاظ جمیع معلومات ہوگا مگر تجلی ذاتی کا دوام کیونکر ہو سکتا ہے جبکہ روح بدن کو چھوڑ جاتی ہے اور بدن متفرق و پارہ پارہ ہو جاتا ہے۔

تجلی برقی

فرمایا کہ پردوں کے اٹھنے کے بعد کشف ذات کہ جس کا نام رویت ذات اور تجلی برقی ہے۔ اس جہاں میں تجلی امکانات کے پوری طرح اٹھ جانے کے بعد حاصل ہوتا ہے اور جو یہ کہتا ہے کہ یہ تجلی برقی نہیں ہوتی مگر موت کے بعد ایک اعتبار سے ہوتی ہے تو اس ضمن میں کہا گیا ہے کہ جب

نوعی سے چھٹکارا پالینا موت سے تعلق رکھتا ہے جیسا کہ قول باری تعالیٰ ہے اومن کان میتا فاحییناہ و جعلنا لہ نوراً۔

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا من مات فقد قامت قیامتہ (جو مر گیا تو اس کے لئے قیامت قائم ہوگئی) لہٰذا اہل شہود کے لئے قیامت قائم ہے پس وہ ان حالات کو اسی طرح دیکھتے ہیں جو کہ لوگ قیامت موعود میں دیکھیں گے۔

کاتب الحروف (شاہ ولی اللہ) کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس قول اومن کان میتا الخ سے مراد یہ ہے کہ اومن کان فانیا رفع عنہ الحجب فاحییناہ ای ابقیناہ لایریٰ الا باللہ فلا یسمع الا بہ جعلنا لہ نورا یعنی التجلی البرقی الآنی (جو فانی تھا ہم نے اس کے سامنے سے پردوں کو ہٹا دیا اور اسے بقا عطا کردی اس طرح کہ جب وہ دیکھتا ہے تو اپنے رب کی آنکھوں سے اور جب سنتا ہے تو اسی کی سماعت سے اور ہم نے اس کو نور یعنی تجلی برقی آنی عطا کردی)

لذت عشق

ایک دن حضرت شیخ نے مشاہیر میں سے کسی کا نام لے کر فرمایا کہ وہ مقام معشوقیت پر فائز ہیں اور میں اس مقام پر ہوں کہ عاشقیت و معشوقیت کو وہاں کوئی دخل نہیں۔

فرمایا کہ وہ جو یہ کہتا ہے کہ عاشقیت میں جو لذت ہے وہ دوئی کے اٹھ جانے میں نہیں غلطی پر ہے کیونکہ عاشق دوئی کے سبب آتش عشق میں جلتا رہتا ہے اور ایسے میں وہ شرک خفی کا مرتکب ہوتا ہے اگرچہ یہ مرتبہ حسنات الابرار کا ہے مگر سیئات المقربین میں شمار ہوتا ہے جب کہ صاحب شہود عظمت استغنا اور جلال و جمال سے لذت یاب ہوتا ہے اور اس لذت کا درجہ لذت عاشقیت سے کہیں بلند ہے۔

کشف ذات

حضرت شیخ نے فرمایا کہ جس کے سامنے سے پردے اٹھ گئے تو وہ اپنے پروردگار کو اپنی روح میں دیکھتا ہے اور اسی کو کشف ذات کہتے ہیں اور ایسے میں عارف عدم تناہی ذات کی طرف متوجہ نہیں ہوتا کیونکہ یہ صفات میں سے ہے۔

علوم معارف

کاتب الحروف (شاہ ولی اللہ) کہتا ہے کہ عارف کا علم حضوری انا کے ساتھ حقیقت الحقائق سے متعلق ہے اور انا محدود ہے جبکہ حقیقت الحقائق لامحدود تو ان میں تنافی بایں وجہ نہیں ہے کہ انا کا نفوذ حقیقت الحقائق میں اس طرح ہے کہ ہر طرح کے اعتبارات سے بری ہے اور تناہی اور ناتناہی دونوں اعتبارات میں سے ہیں۔

اقسام حدیث قدسی

فرمایا حدیث قدسی کے دو اقسام ہیں، ایک وہ جسے جبرئیل لاتے تھے اور قرآن میں داخل نہیں کیونکہ یہ کلام معجز نہیں اور اپنی غایت میں محدود و مخصوص ہے جبکہ قرآن مجید عام و خاص تمام کے لئے شفا ہے دوسرے وہ کہ خداوند کریم نے براہ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اتاری۔

استعانة باصحاب القبور

حدیث اذا تحیرتم فی الامور فاستعینوا باصحاب القبور (جب تم دنیوی امور میں غلطاں و پریشاں ہو جاؤ تو اصحاب قبور سے مدد طلب کرو) کی وضاحت میں فرمایا کہ یہاں استعانت میں احتمال یہ ہے کہ اس سے مراد مردوں کے احوال کو یاد کر کے عبرت پکڑنا ہے جو امور دنیوی سے توجہ کو ہٹا دیتا ہے اور پریشانی روزگار کو کم کر دیتا ہے۔

حقیقت دنیا

حدیث ان الدنیا اقبح من جیفة منتنة (دنیا گلی سڑی لاش سے بدتر ہے) کی تشریح میں فرمایا کہ دنیا حق کی طرف توجہ کو روکتی ہے کیونکہ دل کا تعلق اس سے ہو جاتا ہے نہ کہ گلی سڑی لاش سے۔

حقیقت کذب

فرمایا کہ اقوال میں سے جھوٹا قول وہ ہوتا ہے جو خلاف شریعت ہو، اور جھوٹے افعال وہ ہوتے ہیں جو خلاف شریعت ہوں اور جھوٹے احوال یہ ہیں کہ کوئی ایک حال سے دوسرے حال میں بدل جائے جب کہ سچا حال ایک ہی ہے اور وہ شہود ہے۔

کاتب الحروف (شاہ ولی اللہؒ) کہتا ہے کہ تلون سے مراد یہاں سر توحید کا ایک بار ظاہر ہونا

اور دوسری بار پوشیدہ ہونا ہے، یا یہ کہ ایک بار جو چیز ظاہر ہوتی ہے تو دوسری بار اس کے برعکس کوئی اور چیز سامنے آتی ہے۔

مشابہت یہود سے ممانعت

فرمایا لمبی ٹوپی اور ریشمی پٹی کمر سے باندھنا جسے ہندی میں سیلی کہتے ہیں علامات یہود ونصاریٰ میں سے ہے حضرت امیر المومنین عمر رضی اللہ عنہ نے ایسا کرنے والوں پر خفگی کا اظہار فرمایا بعد میں جاہل لوگوں نے اسے پسند کر کے اپنالیا۔

پردہ ہائے امکان ووجوب

فرمایا پردہ ہائے امکان غفلت کی تاریکیوں سے عبارت ہیں جو دوئی کے گڑھے میں پھینک دیتے ہیں، ان کا تعلق کھانے پینے یا سونے سے نہیں جو کہ لوازم زندگی ہیں بلکہ غصہ، حسد، بغض اور تمام اوصاف ذمیمہ سے ہے جو غفلت کو بڑھاتے ہیں اور پردہ ہائے وجوب صفات واجبیہ کو کہتے ہیں سالک جب خدا کے فضل سے ان تمام حجب امکانیہ کو قطع کر لیتا ہے تو ذات حق کو حجب وجوبیہ سے وراء اس طرح دیکھتا ہے جیسے کوئی دیکھنے والا آفتاب کو ہوا، کرّہ آگ، اور آسمانوں کے باوجود جو کہ زیر آفتاب ہوتے ہیں، دیکھتا ہے اور یہ جملہ اشیاء اس کو دیکھنے سے مانع نہیں ہوتیں اسی طرح سالک کے لئے حجب وجوبیہ مشاہدۂ ذات سے مانع نہیں ہوتے اور اس کے بعد اولیاء میں سے مخصوص افراد کے لئے تو حجب وجوبیہ کو بھی ہٹا دیا جاتا ہے۔

تعریف مشاہدہ

فرمایا مشاہدہ سے مراد ایسی توجہ قلب ہے جو کہ حقیقت الحقائق کی طرف مبذول ہو، چاہے ایک ساعت کے لئے ہی کیوں نہ ہو، اور جس نے ذات حق کو نہ پہچانا اور اس کے مظاہر کو نہ جانا وہ مشاہدۂ حق سے بے خبر ہے۔

حصول شہود

فرمایا کہ مشاہدے کو عالم مثال وارواح کے طے کرنے کی حاجت نہیں، اور ایک شہود وہ ہے جو محض جذبۂ الٰہیہ سے حاصل ہو جاتا ہے لیکن اس طرح کے شہود کی بقا کا اعتبار نہیں بخلاف اس شہود کے جو سلوک کے بعد حاصل ہوتا ہے چونکہ یہ عبور کے بعد ہوتا ہے لہٰذا اس کی بقاء کا اعتماد موجود ہوتا

ہے۔

فرمایا عارف کا کمال یہ ہے کہ وہ سراپا عشق ہو جائے کیونکہ عشق معشوق کا مادۂ اشتقاق ہے اور اس جگہ یہ بھی فرمایا کہ صوفیاء کی اصطلاح میں حقیقت الحقائق کو بھی عشق سے موسوم کیا جاتا ہے

اہل سلوک کے اس قول کو "ریاضتوں سے دل پستی سے بلندی پر آ جاتا ہے" کی تشریح میں فرمایا کہ دل کا پستی سے بلندی پر آنے کا مقصد یہ ہے کہ سفلیات سے کنارہ کر کے علویات کی طرف مائل ہو جائے ورنہ دل کے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے سے تو انسان کو تکلیف ہوتی ہے کیونکہ شریانیں دل کے ساتھ جڑی ہوئی ہوتی ہیں۔

العلم اوسع من الحال

شیخ اکبرؒ کے اس قول کہ العلم اوسع من الحال (علم حال سے وسیع تر ہے) اور ابو سعیدؒ کے اس قول الحال اوسع من العلم (حال علم سے وسیع تر ہے) کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ وسعت علم تب ہے جب کہ وہ حال اور اس کے علاوہ کیفیات نفسانیہ کے دائرے میں داخل ہو جائے لیکن حقائق خارجیہ حال کے نزدیک کیفیت مخصوصہ ہے کہ اس کا غیر اس میں نہیں سما سکتا اور وسعت حال اس جہت سے ہے کہ حال اس قدر قوی ہوتا ہے کہ علم کے برعکس اس حال کے سبب عجیب کیفیات اور انوکھے علوم حاصل ہوتے ہیں۔

فرمایا ایک روز میں نے دیکھا کہ ایک جن نے کنکری پھینکی جو ایک جگہ سے دوسری جگہ لڑھکتی جا رہی تھی، یہ جنوں کی خصوصیات میں سے ہے کہ جو چیز وہ پھینکتے ہیں سیدھی جاتی ہے۔

فرمایا شمال کی جانب ایک کونہ ایسا ہے کہ جہاں ارضی فرشتے رہتے ہیں اور ان کے ہاں توالد وتناسل بھی ہے برعکس دوسرے آسمانی و زمینی فرشتوں کے۔

فرمایا جب وجود ماہیات پر قابض ہو جائے تو ماہیات کی استعداد کے مطابق خوشبو، بدبو، لذت، تھکاوٹ، الم، راحت، ٹوٹ پھوٹ اور اجزا کی پراگندگی وغیرہ پیدا ہوتے ہیں ورنہ صرف نوری بسیط تو ان کیفیات سے منزہ ہوتا ہے۔ یہاں مزید فرمایا کہ میل خود اور اس کا مزہ و بو، دونوں کھانے والے اور سونگھنے والے کی قوت ذائقہ و قوت شامہ کے مقابلے میں برا ہے اور خنزیر اور کیڑے مکوڑے کی قوت شامہ و ذائقہ کے مقابلے میں اچھا ہے کیونکہ خنزیر اور کیڑے مکوڑوں کی وہ

استعداد جس کے نتیجے میں قباحت ظاہر ہوتی ہے میل کچیل کی نسبت زیادہ بری ہے اور جہاں تک الم کا تعلق ہے تو وہ مزاج سے ناموافق چیز کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے اور یہ مختلف قسم کا ہوتا ہے، جیسے سانپوں کا زہر سانپ کے کاٹے کے موافق ہے، لہٰذا اس کے لئے نفع بخش اور دوسروں کے لئے ضرر رساں ثابت ہوتا ہے اور اس کے باوجود حضرت وجود تو ہر ذرے میں یکساں طور پر جلوہ گر ہے۔ اگر کوئی شخص بعض ادویات صرف اپنی زبان سے چکھے تو وہ مفید و مضر میں تمیز نہیں کر سکتا، اسی طرح اگر کوئی زمان و مکان کی قیود سے چھٹکارا حاصل کر لے تو کوئی چیز اس کیلئے مشکل نہیں رہتی۔

ہمہ اوست

قدماء میں سے کسی کا شعر ہے، ؎

دق الزجاج ودقت الخمر

(شیشہ و شراب دونوں شفاف اور باریک ہیں)

یعنی مظاہر جو کہ بمنزلہ شیشہ کے ہیں صاف و شفاف ہیں اور محبوب مستور جو کہ بمنزلہ شراب کے ہے وہ بھی غایت درجہ شفاف ہے پس: ؎

فتشابها وتشاکل الامر

(تو دونوں میں ایسی مشابہت پیدا ہوگئی کہ تمیز کرنا مشکل ہوگیا)

اور صفائی و باریکی کے لحاظ سے ایک، دوسرے کے رنگ میں اس طرح ظاہر ہوا کہ لوگوں کی نظروں کے لئے مشکل آن پڑی: ع

فکانّما خمر لا قدح

جیسے شراب ہے شیشہ نہیں، گویا شراب ہے جو منجمد ہے اور پیالے کا وجود نہیں: ع

وکانّما قد ولا خمر

گویا پیمانہ ہے شراب نہیں۔ اور اسی طرح کسی نے کہا ہے: ؎

ان شئت قلت حق لا خلق

وان شئت قلت خلق لا حق

(اگر تو چاہے تو کہے کہ حق ہے خلق نہیں اور اگر چاہے تو کہے کہ خلق ہے حق نہیں)

صفت علم

فرمایا صفات الٰہیہ میں سے سب سے بڑی صفت علم ہے اور حیات صفت علم کے شئون میں سے ہے جبکہ عدم علم عین موت ہے، جو حیات کو صفت الٰہیہ میں سب سے بڑی صفت گردانتے ہیں یہ ان کا ذاتی گمان ہے جبکہ موجود پر غائب کا قیاس باطل ہے۔

کاتب الحروف (شاہ ولی اللہؒ) کہتا ہے کہ علم انا حضوری ہوتا ہے اور تحقق وتقرر کے مشابہ ہوتا ہے اگر زائل ہو جائے تو زندگی زائل ہو جاتی ہے اور زندگی علم کے اعتبارات میں سے ایک اعتبار ہے جبکہ ان امور کی نسبت جو کہ موت وحیات کے قابل ہیں اسی پر قیاس کیا جائے۔

ایک قول کی تاویل

کسی نے حضرت شیخؒ کی خدمت میں بعض متصوفین کا یہ قول نقل کیا کہ اقرب الطرق الی اللہ رویۃ الامارد۔

آپ نے اس قول کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ شاید ان کی مراد یہ ہو کہ کائنات کی تمام محسوس اشیاء میں امارد کی شکل وشباہت بہت متناسب ہوتی ہے اور ان کی جانب نفس کا میلان بھی زیادہ ہوتا ہے اس اعتبار سے امارد میں رویت حق کا مشاہدہ زیادہ آسانی کے ساتھ ہو سکتا ہے، اور جن مشائخ نے اسے برا جانا ہے ان کے پیش نظر یہ خطرہ موجود تھا کہ امارد کو دیکھنے سے سالک عالم شہادت ہی میں محدود ہو کر رہ جاتا ہے اور کئی دیگر آفات کے خدشے کی بنا پر جمال حقیقی سے مشرف نہیں ہو پاتا، یہاں حضرت شیخؒ کچھ مسکرائے اور فرمایا کہ امارد میں خون ہی تو ہوتا ہے جو حسن کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے اگر ان کا خون خارج کر دیا جائے تو کوئی ان کی جانب آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے، اہل شہود کی مثال کتاب دیکھنے والے اس شخص کی سی ہے جو عینک لگا کر اسے پڑھتا ہے اس کی توجہ عینک کی طرف بالکل نہیں ہوتی مگر ساری کتاب کو اس کے وسیلے سے ہی دیکھتا ہے مگر ایسی صورت میں کہ عینک کے آگے کوئی حجاب آ جائے یا کوئی شخص ہاتھ رکھ دے تو اس کی توجہ عینک کی طرف مبذول ہو جاتی ہے۔

مقام عارف

اہل شہود خوب صورت عورتوں، حوروں اور امارد کی طرف التفات نہیں کرتے کیونکہ ان کی

نظران تمام سے وراء مقصود حقیقی جل جلالہ پر ٹکی ہوتی ہے مگر حقیقت ناشناس حسین عورتوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور بدصورت سے پہلوتہی کرتا ہے جب کہ عارف کی نظر میں دونوں برابر ہیں۔

سماع سرود

اسی طرح اہل شہود سماع سرود سے بھی لذت حاصل نہیں کرتے کیونکہ گانے والے کے منہ اور سننے والے کے کان کی درمیانی مسافت زیادہ سے زیادہ ایک یا دو تیروں کی مسافت کے انتہائی فاصلے سے زیادہ نہیں ہوتی، چاہے گانے والے کی آواز تیز بھی کیوں نہ ہو جبکہ اہل شہود ان تمام سے بہت آگے اپنے منتہائے حقیقی تک پہنچے ہوئے ہوتے ہیں۔

ولایت عامہ وخاصہ

فرمایا ولایت عامہ کے مختلف مراتب ہوتے ہیں جیسے تقویٰ، ریاضت اور اس شخص کا وحدت شہود جسے اپنی ذات کا پتہ ہے اور نہ اپنی ذات کے احاطہ مظاہر سے باخبر ہے اور جیسے عاشقیت ومعشوقیت کے یہ ولایت عامہ کے خواص کے مقامات ہیں، ولایت خاصہ واحد بسیط تک پہنچنے کے بغیر ہرگز حاصل نہیں ہوسکتی، شہود انبیاء علیہم السلام تو عاشقیت ومعشوقیت سے بہت بلند ہوتا ہے جیسا کہ بعض احادیث سے ظاہر ہوتا ہے مگر ان احادیث کے الفاظ سے راہ سلوک کے کچھ مبتدیوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام محبّ اور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم محبوبیت کے درجے پر فائز تھے حالانکہ حقیقت تو وہی ہے جس کا ذکر ہو چکا ہے۔

حقیقت محمدیہ

فرمایا کبھی تو تکرار کلمہ لا الہ الا اللہ یا محض جذبے سے ہی توحید شہودی کے تصور کا معنی حاصل ہوجاتا ہے مگر اس کا کوئی اعتبار نہیں، عین القضاۃ ہمدانی کی اس شطح کہ

''آں را کہ شما خدا میدانید نزدیک ما محمد است صلی اللہ علیہ وسلم وآنکہ شما محمد صلی اللہ علیہ وسلم میدانید نزدیک ما خدا است۔

(جسے تم خدا جانتے ہو میرے نزدیک وہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہے اور جسے تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہتے وہ میرے نزدیک خدا تعالی ہے)۔

کے بیان میں فرمایا چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت وجود کا آئینہ اور اس کا مظہر اتم

ہیں اور حقیقت محمدیہ تعین اوّل، وجامع تعینات ومظاہر ہے اور تمام کا ظہور ان کے نور سے ہوا ہے اس اعتبار سے عین القضاۃ ہمدانیؒ نے مذکورہ بات کی، ورنہ حضرت وجود تو ہر ذرّے میں یکساں جلوہ گر ہے اور وحدت معنی کے باوجود تکرار لفظ تو محض تفنن عبارت ہے۔

فناء نفس

فرمایا فنائے نفس یہ نہیں کہ جناب مقدس سے غفلت کے باوجود اسے اپنے نفس کا شعور نہ ہو جیسے ایک قصاب گوشت کاٹنے یا نانبائی روٹیاں پکانے میں مصروف ہوتا ہے تو اسکی توجہ اپنی طرف نہیں ہوتی۔

توجہ شیخ

فرمایا کہ جو جذبہ توجہ شیخ کی قوت سے حاصل ہوتا ہے اس میں کمزور اور مضبوط دل دونوں بالکل برابر ہوتے ہیں اور اس سلسلے میں مزاج کی درستگی یا محنت وریاضت کی ضرورت پیش نہیں آتی

حقیقت کشف وخواب

فرمایا انسانی روح میں ایک قوت پوشیدہ ہے، جسے لوح غیب کہتے ہیں جب نبی اس سے علوم حاصل کرتا ہے تو ایسے میں اسے فرشتہ وحی کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ بعض متکلمین نے بھی اس کی یہی تصریح کی ہے۔ جب ولی اس مقام پر پہنچتا ہے تو اسے بھی فرشتہ الہام کی حاجت نہیں رہتی، اور کبھی تو انسانی روح بحالت نینداس مقام تک پہنچ کر کسی چیز سے باخبر ہوجاتی ہے اب اگر وہ اس معنی کے خیال کو مناسب شکل نہ دے جیسا کہ اس نے دیکھا تو اسے کشف مجرد کہتے ہیں اور اگر کوئی مناسب صورت اس خیال کو مل جائے جیسے اس کا خیال علم میں مشغول ہوا تو یہی خیال کوئی مشروب پینے کی صورت میں آیا، یا اس کی روح ماہ رمضان میں اذان فجر کے خیال میں مشغول ہوگئی تو اس کی صورت اس کے سامنے یوں نمودار ہوئی جیسے تمام لوگوں کے کھانے پینے اور خواہشات کی قوتوں پر مہر لگادی گئی ہے تو یہ کشف تعبیر وتاویل کا محتاج ہے اور اسے کشف مخیل کہتے ہیں، اور کبھی تو سونے والے کی روح اس مخفی قوت کے بغیر عالم خیال میں پہنچ جاتی ہے تو خیالی پیکر دکھائی دیتے ہیں۔ بعض اوقات یہ اشکال برہمی طبع کی وجہ سے بھی ظاہر ہوتی ہیں، جیسے بلغمی مزاج آدمی سونے سے پہلے پانی پی لے تو اسے بخارات دکھائی دیتے ہیں، اسی طرح گرم مزاج آدمی اگر بینگن کھالے تو

اسے خواب میں آگ دکھائی دیتی ہے اور یہ تمام لایعنی قسم کے خواب ہیں جن کی نہ تو کوئی تعبیر کی جا سکتی ہے اور نہ ہی ان کی طرف توجہ دینا چاہئے تعبیر بتانے والے کو چاہئے کہ خواب کے وقت کا لحاظ رکھے جیسے نصف شب یا سحر کے اوقات، اور خواب بیان کرنے کی ساعت اور دیکھنے والے کے حالات کہ کہیں وہ برہمی مزاج کا شکار یا خوف زدہ تو نہیں، کا خاص خیال رکھنا چاہئے۔ بعض اوقات شرائط کے بغیر اس قوت قدسیہ تک رسائی حاصل ہو جاتی ہے جیسے کفار کے لئے احتیاط برتی جاتی ہے۔

تعبیر رؤیا

خوابوں کی تعبیر کا علم قرآن وسنت سے ثابت ہے۔ اس فن میں کئی مستند کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور اس فن میں امام جعفر صادق علیہ السلام اور ابن سیرینؒ ایسے ائمہ کبار ہو گزرے ہیں اگر خواب قوت عاقلہ کی کمزوری اور اژدھام علوم وخیالات جو کہ قوت قدسیہ میں در آتے ہیں کے سبب بھول بھی جائے تو فن تعبیر کے ماہرین اسے بیان کر لیتے ہیں، اسی ضمن میں حضرت شیخ نے یہ بھی فرمایا کہ حالت نیند میں بعض اوقات انسان کی روح غیب کی خبروں کے جاننے کے لئے کچھ عرصے کے لئے جسم سے جدا ہو جاتی ہے تو اس کی واپسی کچھ مشکل ہو جاتی ہے اور خواب دیکھنے والا اضطراب میں مبتلا ہو جاتا ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ اس پر جن بیٹھا ہے۔

فرمایا کہ کبھی تو مراقبے میں اس قدر مستغرق ہو جاتا ہوں کہ اپنی خبر بھی نہیں رہتی، فرمایا کہ درحقیقت ذات حق قرب ومعیت اور احاطے سے بری ہے کیونکہ یہ چیزیں دوئی کا تقاضا کرتی ہیں اور ایک طرح کی مسافت کا اثبات کرتی ہیں مگر خدا تعالی نے مبتدیوں کو سمجھانے کی خاطر جو اسے دور دور تصور کئے ہوئے ہیں، جہت عرش بیان فرمائی انھوں نے یہاں یہ بھی فرمایا کہ قرب معیت اور احاطہ سے مراد وہی کچھ ہے جو برف اور پانی میں موجود ہے یعنی ان صورتوں میں اس کا ظہور ہے۔ صوفیائے کرام کے ایک گروہ کے اس قول کہ النقصان مقتضی استعدادات الماهيات (نقصان استعداد و ماہیات کا تقاضا کرتا ہے) کی تشریح میں فرمایا چونکہ ان ماہیات کا ایک مستقل وجود ہے لہٰذا ان کے لئے اقتضا کا ہونا ضروری ہے اور اگر اقتضا حقیقت حضرت وجود سے ہو تو ان ماہیات سے اقتضا کی نسبت کا کیا معنی فی الواقع کوئی نقصان نہیں ہوتا، یہ صرف لوگوں

کی نظر کا دھوکا ہے۔

علم توحید و وصول و شہود

فرمایا علوم توحید کے مقابلے میں تمام علوم بمنزلہ بھوسی کے ہیں اور علوم توحید بمنزلہ آٹے کے۔ پھر علم توحید اور وصول و شہود کی مثال ایسی ہے جیسے آٹا اور مغز۔ وصول سے قبل علم توحید ہی میں محو ہو کر رہ جانے سے سالک ہرگز لذت یاب نہیں ہوتا، کیا تم نہیں دیکھتے کہ بیاہ رچانے والا بیاہ کے بعد مشاطہ کی باتوں پر کان نہیں دھرتا۔ اقوال صوفیاء کو بغیر تحقیق کئے نقل کرنا یوں ہے جیسے کہ میرے محلے میں ایک قصہ گو رات کو قصے گڑتا اور صبح لوگوں سے بیان کر دیتا ہے۔

فرمایا انکار اولیاء اللہ کے سب سے بڑے اسباب یہ ہیں:

ا۔ شرکت مکان:- وہ یہ کہ ایک ولی کسی ایک محلے یا شہر میں رہتا ہے۔

۲۔ شرکت زمان:- یہ کہ اس کے زمانے میں اس کے معاصرین بھی ہوتے ہیں۔

۳۔ شرکت نسبت:- یہ کہ اس کے بھائی بند بھی ہوتے ہیں۔

اس طرح عوام زیادہ تر اس کے معتقد ہو جاتے ہیں، کیونکہ اس کے پاس کئی خادم ہوتے ہیں اور عبادت زیادہ کرتا ہے چاہے یہ عبادت ریاکاری و دکھلاوا ہی کیوں نہ ہو، جبکہ اصول یہ ہے کہ شیخ کی عبادت کی اصلیت پر نظر کی جائے حدیث میں آتا ہے کہ ایک شخص کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت کی بشارت دی۔ ایک صحابی اس کی ٹوہ میں لگ گیا اور پورے تجسس کے بعد اسے معلوم ہوا کہ بشارت یافتہ شخص کوئی زیادہ نوافل ادا نہیں کرتا تھا اس نے اس سے حقیقت حال دریافت کی تو اس نے جواب دیا: ''اگر زمین سے آسمان تک جواہرات اور درہم و دینار بھر جائیں اور میں اس کا مالک ہو جاؤں پھر وہ تمام دولت تباہ ہو جائے تو اس کا مجھے ذرہ برابر دکھ نہ ہو کیونکہ اس کے ہونے سے مجھے کوئی خوشی بھی نہ تھی مقصود تو دراصل دل سے ماسوا کا نکل جانا ہے، اگر یہ گوہر ہاتھ آ جائے تو تھوڑی سی عبادت بھی انتہائی سودمند ثابت ہوتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ طالب صادق کو شیخ کی ظاہری عبادات پر توجہ نہیں دینی چاہئے''۔

بسیار خوری اخلاق ذمیمہ پیدا کرتی ہے

حدیث قلوب بنی ادم تلین فی الشتاء (انسانوں کے دل موسم سرما میں نرم پڑ جاتے

ہیں) کے بیان میں فرمایا موسم سرما میں انسانوں کے بدن باہر سے ٹھنڈے ہو جاتے ہیں اور ان کے باطن گرم ہوتے ہیں۔ اور موسم گرما میں اس کے برعکس، اور جب اس قلب صنوبری کی چربی پگھل جاتی ہے تو قلب معنوی شفاف ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر فاقہ اور ذکر بالجہر کثرت سے کیا جائے تو بھی اس کی چربی پگھل جاتی ہے۔ سیر ہو کر کھانا، غصہ و شہوت جیسے اوصاف ذمیمہ پیدا کرتا ہے۔

حقیقت خوارق عادات

فرمایا کہ غالباً خوارق عادات کا ظہور فقط نشان راہ ہے کیونکہ عارف کی اصل منزل تو شہود وصول ہی ہے مگر جو اس حالت سے فرو آجائے تو اس سے وہ کچھ ظاہر ہوتا ہے جو خدا تعالیٰ چاہتا ہے۔

مقصود عارف

فرمایا عارف خاتمے پر نظر نہیں رکھتا کیونکہ یہ نقصان کے مترادف ہے اگر ہزار بار بھی وہ یہ آواز سنے کہ ''ہم نے تمہیں شقی بنا دیا'' یا یہ سنے کہ ''تمہارا خاتمہ بالخیر ہوگا'' اس طرح کی تمام باتوں پر وہ توجہ نہیں دیتا اور فوری نفع جو کہ محبوب کے جمال کے دیدار کا نام ہے کہ کبھی دور کی امیدوں کے برابر نہیں سمجھتا۔

فرمایا ملائکہ و جن جس صورت میں چاہیں ظاہر ہو سکتے ہیں لیکن ان کی حقیقت نفس جوں کی توں باقی رہتی ہے مثلاً جبرئیلؑ کہ خود اپنی جگہ پر بھی قائم ہے مگر اس کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں دحیہ کلبی نامی صحابی کی صورت میں حاضر ہوتا ہے۔

تسخیر جنات

اگر عارف کسی جن کو مسخر کرنا چاہے، اس کا طریقہ یہ ہے کہ پورے عزم کے ساتھ اس کی شکل کی طرف متوجہ ہو تو وہ جن اس شکل سے باہر نہیں آسکے گا، مگر صرف اسی صورت میں کہ حیلے بہانے کر کے وہ کسی طرح عارف کی توجہ منتشر کر دے مثلاً جن کتے کی صورت میں ظاہر ہو اور عارف کی توجہ اس کی اسی شکل پر مرکوز ہو تو وہ جن اس صورت سے باہر نہیں جا سکتا، مگر کبھی تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ کتے کی شکل پر بکری کی صورت کا حجاب ڈال لیتا ہے، اگر عارف اس حجاب والی صورت پر توجہ ڈال کر اسے بند بھی کر دے لیکن اگر اس کی توجہ دفعتاً کتے کی طرف مبذول ہو جائے

کہ وہ کہاں گیا تو اس کی توجہ منتشر ہو جائے گی، اور جن کسی دوسرے روپ میں فرار ہو جائے گا۔

خواص فاتحہ

فرمایا عرفا سے منقول ہے کہ سورۂ فاتحہ کو اگر ایک ہفتہ تک ایک ہی سانس میں اکتالیس مرتبہ روزانہ اس طرح پڑھا جائے کہ بسم اللہ کے آخر کو الحمد کے ساتھ ضم کرلے تو مقاصد حل ہو جاتے ہیں

تفسیر فوق کل ذی علم علیم

اللہ تعالی کے فرمان فوق کل ذی علم علیم کے بیان میں فرمایا کہ علیم صیغۂ مبالغہ ہے جس کا معنی بہت زیادہ علم رکھنے والے کے ہیں، اور وہ خدائے لم یزل کی ذات قدس کے علاوہ کوئی اور نہیں، لہٰذا استثنا کو یہاں مقدر کئے بغیر معنی درست ہوا۔

کاتب الحروف (شاہ ولی اللہ) کہتا ہے کہ یہاں ایک شبہ ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ کہتے ہیں کہ شہود وحدت سے بالا کوئی مقام اور علم نہیں جبکہ آیت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ ہر علم سے وراء ایک علم ہے اور یہ سلسلۂ لا متناہی ہے۔ اس شبے کا ازالہ یہ ہے کہ استثناء توحید ذاتی مقدر ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ علیم خدا کا نام ہے اور شہود وحدت سے آگے توحید ذاتی باری ہے اگرچہ بندے کے لئے مزید ترقی ممتنع ہے۔ واللہ اعلم

اقوال شیخ جنیدؒ کی تشریح

شیخ جنیدؒ کے قول طارت العبادات الخ کے ضمن میں فرمایا کہ طارت العبادات سے مراد اعمال ظاہری ہیں اور غنیت الاشارات یعنی وہ جو کہ ظاہر سے متعلق ہیں اور باطن سے خالی ہیں وما ینفعنا نوافل العبادات یعنی مکمل فائدہ ظاہری نوافل کے پڑھنے سے حاصل نہیں ہوتا، الا رکعات خفیفۃ صلینا ھا فی جوف اللیل، یعنی راحت و آرام کو ترک کر کے ہم نے محنت و مشقت اپنالی اور اس طرح ہمیں حق تعالی کا وصال نصیب ہوا، خلاصہ یہ کہ زبانی عبارات وارشادات پر اکتفا نہیں کرنا چاہئے اس لئے ضروری ہے کہ جناب اقدس کی طرف پورے خشوع وخضوع کے ساتھ متوجہ ہو خاص کر ایسے اوقات میں کہ کوئی رکاوٹ مانع نہ ہو۔ اس کے نتیجے میں حضور ومشاہدہ حاصل ہو جاتا ہے۔

کاتب الحروف (شاہ ولی اللہ) کہتا ہے کہ میں اس واقعے کو ظاہر پر محمول کرتا ہوں، اگرچہ

معیت وجذب خود اپنی جگہ بڑا کمال ہے لیکن ثواب و درجات تو طاعات کا ثمرہ ہیں۔

حدیث الروح ملک لہ سبعون الف وجہ (روح ایک فرشتہ ہے کہ جس کے ستر ہزار چہرے ہیں) کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا یہاں یہ احتمال موجود ہے کہ اس سے مراد روح الارواح ہو، کیونکہ وہ جوہر ملکی ہے جسے بعض اوقات ملک سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

کاتب الحروف (شاہ ولی اللہ) کہتا ہے کہ روح الارواح تجلی سے عبارت ہے جو حظیرۃ القدس کی اصل ہے اور ہم ارواح اس کے گرد جسم معنی پر روشنی کی طرح ہیں۔ یا میں سمجھتا ہوں کہ روح الارواح سے مراد مثال نوع انسان ہے کہ تمام روحیں اس سے پھوٹتی ہیں۔

تحقیق لطائف ستہ

لطائف ستہ کی تحقیق میں فرمایا کہ روح کے اختلاف عبارات کی حیثیت سے مختلف اسماء ہیں، لہٰذا ہر اعتبار ایک مستقل لطیفہ کی حیثیت سے ظاہر ہوتا ہے۔

علی المرتضیٰ وزیر رسالتمآب میں

حدیث ثعلبی جو کہ تفسیر میں وارد ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کرم اللہ وجہ کے حق میں دعا کرتے ہوئے فرمایا اللھم اشرح لی صدری ویسرلی امری واجعل لی وزیرا من اھلی (اے میرے رب میرا سینہ کھول دے، میرے معاملے کو آسان فرما اور میرے خاندان میں سے میرے لئے وزیر بنا) کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ اس سے مراد ہے واجعل لی وزیراً خامساً (میرے لئے پانچواں وزیر بنا) کیونکہ شیخین حضرت ابوبکر و حضرت عمر رضی اللہ عنہما اور دو فرشتے جرئیل و میکائیل علیہما السلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلے ہی وزراء تھے۔

مقام علی کرم اللہ وجہہ

حضرت علی کرم اللہ وجہ کے اس اثر مسئل رایت ربک قال ما کنت اعبد ربا لم ارہ فقال السائل کیف رایتہ؟ فقال لم ترہ العیون بمشاھدۃ العیان ولکن راتہ القلوب بحقائق الایقان

(حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کیا آپ نے اپنے رب کو دیکھا ہے؟ فرمایا میں نے کبھی مشاہدے کے بغیر خدا کی عبادت کی ہی نہیں۔ اس پر سائل نے پوچھا آپ نے اسے کس

طرح دیکھا؟ فرمایا اسے کھلے بندوں آنکھوں نے تو نہیں دیکھا لیکن اسے قلوب نے حقائق ایقان کے ساتھ دیکھا ہے)

اس کے بارے میں کاتب الحروف کہتا ہے کہ اس توجیہ کی غرض وغایت یہ ہے کہ یہ کلام دنیا میں رویت کے منافی اس وجہ سے نہیں کہ پہلے ہی سے مقرر ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ آنکھیں جہت والوں کا تقاضا کرتی ہیں، نہ یہ کہ وہ عیون مطلق ہیں۔

فرمایا کہ دنیوی آنکھیں جو کہ جہت، الوان اور اشکال کا تقاضا کرتی ہیں، نے ذات حق کو نہیں دیکھا بلکہ وہ تو حق الیقین کی صورت میں دیکھا گیا ہے۔

علم الیقین، عین الیقین، حق الیقین

فرمایا کہ علم الیقین یہ ہے کہ دھواں دیکھنے کے بعد آگ کے وجود پر استدلال کیا جائے اور عین الیقین یہ ہے کہ خود آگ کو دیکھا جائے، اور حق الیقین یہ ہے کہ خود آگ کا علم بھی جانے، اپنے نفس کا مشاہدہ عین الیقین میں داخل ہے جبکہ حق الیقین میں وصول اور شہود ہوتا ہے، سننے اور کتابیں پڑھنے سے اسرار کا جاننا علم الیقین نہیں، علم الیقین یہ ہے کہ کشف حجاب پر اس طرح غالب آجائے کہ احتمال شک نہ رہے، ہاں یقین عرفی جو اطمینان قلب کا باعث ہوتا ہے وہ اس طرح کے امور سے حاصل ہو جاتا ہے۔

العارف لا ہمۃ لہ

صوفیائے کرام کے اس قول کہ العارف لاھمة له (عارف وہ ہے جس کا کوئی ارادہ نہیں ہوتا) کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ عارف اظہار خوارق کا ارادہ نہیں رکھتا بلکہ وہ قدرت حق عزوجل کے حکم پر نظر رکھتا ہے گویا ظہور خوارق کے لئے عارف کے سامنے سوائے منشائے خداوندی کے کوئی چیز رکاوٹ نہیں بنتی۔

مقام عارف کامل

لیکن عارف کامل (واصل باقی) کو یہ قدرت عطا کی گئی ہے کہ جب چاہے قہر وغضب کا مظاہرہ کر سکتا ہے چنانچہ ایک بادشاہ کسی عارف کامل کے آستانہ میں سوار داخل ہوا تو اسے کہا گیا کہ یہ آداب کے خلاف ہے اس نے بڑے غرور سے جواب دیا میں نے بڑے فقراء دیکھے ہیں کسی میں

کچھ تاثیر نہیں، یہ سن کر عارف کو جلال آیا اور اس کی طرف بہ نظر غضب دیکھا اسی وقت گھوڑے نے سرکشی کی اور پچھلے پاؤں پر کھڑا ہو گیا، بادشاہ دھڑام سے نیچے آرہا اور مر گیا۔ عارف نے کہا میں نے یہ اقدام اس لئے کیا ہے تاکہ لوگ فقراء کو حقیر نہ جانیں، مگر بعض کاملین تو اس طرح کی طاقت رکھنے کے باوجود بھی اس طرف التفات نہیں کرتے، اس ضمن میں شیخ فرید الدین عطارؒ، عین القضاۃؒ اور حسین بن منصورؒ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ تمام حضرات خدائے قدوس کی رضا پر راضی اور اس کی تقدیر پر خوش تھے اور اس میں اپنا تصرف نہیں چاہتے تھے، جیسے شیخ عطارؒ نے اپنے قاتل سے کہا: ''اے ترک زادے! تو جس روپ میں بھی آئے میں تجھے خوب پہنچانتا ہوں'' اور یہ کہہ کر اپنا سر قلم کرانے کے لئے اس کے سامنے جھکا دیا، ایسے حالات سے خوفزدہ ہونا ناقص ہونے کی دلیل ہے کیونکہ تنزل ہی کی حالت میں مظاہر قہر کا مقابلہ کرنا مشکل پڑ جاتا ہے۔

فرمایا تجلی ذاتی میں انوار موجودہ کا وجود خارجی کے ساتھ مشاہدہ کرنا ضروری ہے، نہ کہ علمی، ذہنی اور وہمی طور پر کاتب الحروف (شاہ ولی اللہ) یہاں یہ وضاحت کر دینا چاہتا ہے کہ تجلی ذاتی سے مراد یہاں ظہور کمال ''تدلی ہے جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اتفاق ہوا اور تجلی آگ کی صورت میں ظاہر ہوئی۔

حقیقت فنا و بقا

فرمایا یہ سمجھنا کہ فنا سے مراد غیر کی نفی ہے اور بقا اثبات عینیت کا نام ہے۔ دلیل و کلام کی رو سے فاش غلطی ہے یہ بات اس شخص کی طرح ہے جس کے پانچ بیٹے تھے اور وہ خود تنہا سفر کر رہا تھا کہ دو چور اس کے سر پر آن کھڑے ہوئے اس نے اپنے بیٹوں کو مدد کے لئے پکارا کہ بیٹو! آؤ ان چوروں کو مجھ سے دور کرو۔ یہ اس کا حضور وہمی تھا جو اس کو چوروں سے چھڑا سکتا تھا اور نہ ہی اسے خوف و ڈر سے نجات دے سکتا تھا۔

اگر کوئی شخص پانی کی حقیقت اور اس کے اوصاف یعنی پانی کی ٹھنڈک، بہاؤ، پیاس دور کرنے کی صلاحیت اور کپڑوں کو صاف کر دینے کے وصف کو سمجھ بھی لے تاہم جب تک اسے پانی کا پینا میسر نہ آئے اس کی پیاس نہیں بجھ سکتی۔ اور اگر سب کچھ جانتے ہوئے کسی کو مٹھائی کھانے کی طلب ہو مگر اسے کبھی دیکھا نہ ہو تو ایسے میں وہ میٹھے کی جملہ کیفیات کو چاہے بہت بہتر طور پر جانتا ہو،

تب بھی اسے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوسکتا۔ بالکل اسی طرح جس نے صرف توحید رسمی پر اکتفا کیا اور شرک خفی کا اثر بدستور اس کے دل میں باقی رہا تو اس سے اسے کوئی نفع حاصل نہیں ہوگا، مزید فرمایا کہ مذکور آثار تجلیات وصول رسمی سے نہیں بلکہ وصول شہودی سے حاصل ہوتے ہیں، کہتے ہیں کہ حسین بن منصورؒ کے ہاتھ کاٹ ڈالے گئے مگر وہ مسکراتے رہے اور ان کی ہر انگلی سے انا الحق کی صدا آتی رہی، انہیں دار پر کھینچا گیا تب بھی انا الحق پکارتے رہے جلا دیا گیا تو راکھ کا ہر ذرہ انا الحق کی صدا بن گیا۔ تین دن بعد راکھ کو دریا برد کیا گیا تو وہاں بھی انا الحق کا آواز سنائی دیا۔ یہ سب کچھ اس سے تھا کہ توحید رسمی پر اکتفا کی بجائے وہ توحید حالی سے سرفراز ہوئے تھے۔ یہاں فرمایا کہ توحید حالی کے آثار ہوتے ہیں پہلے یہ کہ توحید ذاتی میں انوار موجودہ کا وجود خارجی کے ساتھ ظہور ہوتا ہے، دوسرے نور ازلی کی رویت تیسرے جو کچھ حسین بن منصورؒ سے ظہور پذیر ہوا۔ چوتھے یہ کہ توحید صفاتی میں خشوع وخضوع اور سرور وانس پایا جاتا ہے، پانچویں یہ کہ توحید افعالی میں توکل اور مدح وذم کا یکساں ہونا پایا جاتا ہے۔

مجذوب واصل کشف اور خوارق سے بلند ہوتا ہے

فرمایا مجذوب واصل سے خوارق عادات اور کشف ظاہر نہیں ہوتے کیونکہ وہ وحدت ذاتیہ میں اس قدر مستغرق ہوتا ہے کہ کائنات کی طرف توجہ نہیں دے سکتا، لیکن سالک کا معاملہ اس سے مختلف ہے اور مجذوب کی مثال اس طرح ہے جیسے کسی شخص کو ہودج میں ڈال کر وادیوں اور راستوں سے گزرتے ہوئے ایک شہر سے دوسرے شہر لے جایا جائے آخر میں اگر اس سے کسی درمیانی بستی کے بارے میں تفصیلات پوچھی جائیں تو وہ کچھ نہیں بتا سکے گا جبکہ اس کے مقابلے میں سالک اس راہ کے تمام مقامات اور ان کی تفصیلات سے پوری طرح باخبر ہوتا ہے، یہاں آپ نے مزید فرمایا کہ اگر مجذوب واصل حقیقت کائنات سے آگہی (کشف) حاصل کرنا چاہے تو اسے سلوک اختیار کرنا چاہئے، اگر کوئی شخص اس مقام کا دعوی کرے تو اس سے ذات وصفات کی معرفت کے بارے میں استفسار کرنا چاہئے تاکہ حقیقت حال واضح ہو ورنہ خانہ زاد مشائخ اپنی دکان چمکانے کے لئے ایسے کلمات بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کرامات تو معمولی چیز ہیں ان کی طرف توجہ نہیں کرنی چاہئے ہاں ہاں یہ بات عرفاء وواصلین کے حق میں تو بالکل صحیح ہے، مگر ان

جاہلوں کو تو ذات وصفات کی معرفت اور توحید حالی کے شئو نات کا ذرہ برابر بھی علم نہیں، اس لئے ان کی اس بات میں کوئی وزن نہیں ہے۔

تحقیق مسلک محبّ اللہ الٰہ آبادی

شیخ محبّ اللہ الٰہ آبادی (۱) صاحب تسویہ کے مشرب کی تحقیق میں فرمایا کہ انھوں نے ذات سے مبداء قائم بذاتہ ومقدم بشوناتہ مراد نہیں لیا بلکہ ان کی مراد ماہیت ہے جو کہ معقولات ثانیہ میں سے ہے۔ اور اسی طرح انھوں نے وجود کا معنی مصدری جو کہ کون وحصول ہے مراد لیا ہے اور ''تسویہ'' میں جو لفظ معقول استعمال ہوا ہے وہ یہاں پر محسوس کے مقابلے میں مستعمل ہوا ہے نہ کہ موجود کے مقابلے میں، چنانچہ شیخ الرئیس نے شفا میں لکھا ہے کہ معقول منافی وجود نہیں اور ملا جلال دوانی نے تہذیب کے حاشیے پر یہی بات نقل کی ہے اور یہ بات بعید نہیں کہ اگر ہم اسے موجود کا مقابل قرار دیں تو اس کا معدوم مطلق ہونا لازم آجائے اور وہ جو لفظ موجود سے متبادر ذات لہ الوجود ہے پس اگر وہ موجود کہ اس کا وجود ذات پر زائد نہیں ہے اس سے لازم نہیں آتا کہ معدوم مطلق ہو، بلکہ اس سے جو بات نتیجے کے طور پر نکلتی وہ موجود بنفسہ لنفسہ ہے اور یہ اپنی جگہ درست ہے اور موجود یہی ہے لہٰذا ثابت ہوا کہ خود ان کی اصطلاح میں لفظ معقول بمقابلہ موجود بنفسہ لنفسہ کے لئے موضوع ہے۔ چنانچہ شیخ اکبر قدس سرہ نے فتوحات مکیہ کے باب سوم میں لفظ معقول استعمال کیا ہے اور انھوں نے اس سے یہی معنی مراد لیا ہے جو اوپر بیان کیا گیا ہے، لفظ معقول اگرچہ ان (صوفیا) کی اصطلاح میں موجود بنفسہ لنفسہ کے لئے وضع کیا گیا ہے تاہم یہ موجود ''من غیر

---

(۱) شیخ محبّ اللہ الٰہ آبادی المتوفی ۱۰۵۸ھ۔ ۱۶۴۸ء مشہور صوفی بزرگ اور جید عالم دین ہو گزرے ہیں آپ نے شیخ ابن عربیؒ کی فصوص الحکم کی شرحیں فارسی اور عربی دونوں زبانوں میں لکھیں، تذکرہ علمائے ہند کے مصنف نے آپ کے بارے میں لکھا ہے۔ ''دانش مند متبحر از مشاہیر علمائے صوفیا اور علوم ظاہر و باطن سرخیل امثال واقران خود بود''۔ ماثر الامراء میں آپ کے بارے میں لکھا ہے، ''عالم است تعلیم ظاہر و باطن''۔ دارا شکوہ آپ کا بہت معتقد تھا۔ آپ نے وحدۃ الوجود پر عالمانہ بحث کی ہے آپ کا رسالہ ''تسویہ'' ایک مشہور تصنیف ہے جس پر علمائے ظاہر نے کافی اعتراضات کئے ہیں۔ چنانچہ بادشاہ عالمگیرؒ نے آپ کے ایک مرید شیخ محمدی کو جب رسالہ شیخ جلا ڈالنے کا مشورہ دیا تو انھوں نے کہا ''جس مقام سے شیخ نے گفتگو کی ہے مجھے وہاں تک رسائی نہیں، اگر رسالہ جلانا ہے تو میرے گھر سے مطبخ شاہی میں زیادہ آگ موجود ہے''۔

مدخلة الغیر" ہے اور حضرت محبّ اللہ قدس سرہ نے تسویہ میں شیخ اکبر کے تتبع میں لفظ معقول استعمال کیا ہے اور یہ عبارت شاہ عنایت اللہ اکبرآبادی کی ہے جو میں نے ازالۂ شبہ کے لئے نقل کی ہے، معقول محض، ماہیہ محضہ اور وجود محض، کما ان ذات زید ھو الحیوان الناطق حیث لاوجود لہ الا فی ضمن الافراد، (معقول محض، ماہیہ محضہ اور وجود محض جیسے کہ ذات زید حیوان ناطق ہے کہ اس کا وجود افراد کے ضمن میں موجود ہے) نیز فرماتے ہیں "افراد الانسان من زید و عمر و بکر و خالد ینتزع منھم ما بہ اشتراکھم وھو الحیوان الناطق الذی ھو من المعقولات الثانیۃ فکذلک ینتزع من الشیونات وجود الحق" (جس طرح افراد انسان یعنی زید، عمرو، بکر اور خالد سے قدر مشترک یعنی حیوان ناطق کو حاصل کیا جاتا ہے جو کہ معقولات ثانیہ میں سے ہے بلکہ اسی طرح شیونات میں سے وجود حق کا اثبات کیا جاتا ہے) اور یہ کفر صریح ہے کیونکہ مظاہر کا وجود تو خود قیوم حقیقی جل شانہ سے منتزع اور اس طرح اس کا محتاج ہے جس طرح شمع سے مصنوعی اشکال وصورتیں اپنے وجود میں شمع کی محتاج ہوتی ہیں اور جو موجود ومشہود ہے وہ تو ذات حق جل شانہ ہے اور خلق کی حیثیت طلسم معقول کی سی ہے کیونکہ یہ عالم تو وجود کے فانی اشکال واطوار کا نام ہے اور حق حضرت وجود کا نام ہے اور یہ ان کے اپنے اس قول کی بنا پر کہ حق معقول محض ہے اگر اس سے مراد یہ ہے کہ عقل کی رسائی اس کہ کنہ ذات تک ہے تو یہ بات غلط ہے کیونکہ کنہ واجب تک کسی عقل کی رسائی ناممکن ہے اور اگر اس سے مراد معقولات ثانیہ ہیں جیسا کہ سیاق وسباق اس پر دلالت کر رہا ہے تو یہ بھی کفر صریح ہے جو کہ دہریوں کے باطل مذہب کی طرف جاتا ہے اور اگر اس سے ان کی مراد وہی ہے جو شیخ اکبرؒ نے فرمائی ہے کہ "ذات بحت، اعتبار لایقین معقول محض ہے اس لئے کہ اس کا کمالات اور اس کے عدم یقین سے خالی ہونا عقلی مفروضے سے زیادہ کچھ حیثیت نہیں رکھتا، اگرچہ مظاہر فانیہ میں موجود بھی حضرت حق ہی ہے لیکن یہ جملہ مظاہر اپنے وجود میں درحقیقت اس کے محتاج ہیں، اور نسبت ذات کی حقیقت اور اس کے اعتبارات ومعانی کے بھی محتاج ہیں، یا اس سے ان کا مطلب یہ ہے کہ ذات حق محجوبین کے احساس سے بلند وبالا ہے، تو یہ بات اپنی جگہ درست ہے لیکن ان کی تصریحات سے خود اس بات کی نفی ہوتی ہے، چنانچہ ان کے خطبے کے ابتدائی جملوں سے ہی احتیاج حق کا مفہوم نکلتا ہے،

فرماتے ہیں: ''الحمدلله لمن وجد بکل ما وجد ''(سب تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جو کائنات کی تمام موجودات میں موجود ہیں) لیکن انھوں نے یوں نہیں کہا الحمد لمن وجد به کل ما وجد (تمام تعریفیں اس ذات باری کے لئے ہیں کہ تمام موجودات کا وجود اسی سے ہے)

حق اور عالم

فرمایا حق حضرت وجود کا نام ہے جو خارج میں موجود اور خود اپنی حقیقت کے ساتھ باقی ہے جیسے پانی برتنوں کی شکلوں اور رنگوں کے مختلف ہونے کے باوجود اپنی اصلیت پر برقرار رہتا ہے اور عالم وجود کے اطوار، شیونات اور فانی اشکال وصورتوں کا نام ہے جو ایک صورت سے دوسری صورت میں بدلتی رہتی ہیں، پس کفر وفسق اور نجاستیں وغیرہ اپنی تعریف ذات کے لحاظ سے کمالات ہیں، لیکن ان کا حضرت وجود سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ اوصاف عالم میں سے ہیں، اگرچہ قیوم کل (خالق حقیقی) حضرت حق ہے، اسلئے کہ اگر وہ کفر وفسق کا قیوم (خالق) نہیں تو ان کا وجود کہاں سے آیا، اسی طرح تولد وتولید بھی اوصاف عالم سے ہیں یعنی یہ بدلنے والی اشکال وصور حضرت وجود کے اوصاف میں سے نہیں، اس میں شبہ نہیں کہ اس کے تعینات واوصاف محض اعتباری امور ہیں، کیونکہ یہ سب ذات کے اعتبارات واضافات ہیں، اور ذات ان تمام میں ظہور کے باوجود منزہ ہے۔

فرمایا کہ رسمی متعرّف کا کلام قلوب پر اثر انداز نہیں ہوتا، بخلاف کلام عارف کے اور عارف ومتعرّف کے نزاع کی مثال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اہل بیت کرام کے کافروں کے ساتھ مباہلے میں موجود ہے، متعرف عارف کے ساتھ گفتگو کرنے اور اس کا سامنا کرنے سے گھبراتا ہے۔

مبدأ مکاشفہ محبت ذاتیہ ہے

فرمایا کہ مکاشفہ حجابات کے اٹھ جانے کا نام ہے اور اس کا مبداء محبت ذاتیہ ہے عارف ایسے میں کائنات کو اس حد تک ترک کر دیتا ہے کہ بادشاہان جہاں اور امرائے دنیا اسے کتے، خنزیر اور شیطان کے بھائی معلوم ہوتے ہیں۔ اس مقام پر خداوند تعالیٰ دل میں محبت ذاتیہ کو جاگزیں فرما دیتا ہے اور خلق سے نفرت خلوت اور شب بیداری فنا کے مبادیات میں سے ہے چنانچہ اس

مقام پر عارف خود فانی ہوکر باقی باللہ کے مرتبے پر فائز ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد کثرت مشاہدہ وحدت سے مزاحم نہیں ہوتی اور جلوت بھی خلوت ہو جاتی ہے، نیند بیداری سے بدل جاتی ہے اور آنکھیں سرمہ عنایت ازلی سے سرگیں ہو جاتی ہیں، جس اندھیروں میں بھٹکی ہوئی عقل کی انتہائی منزل صرف یہی ہے کہ مصنوعات کا صانع کامل کے بغیر کوئی چارہ نہیں، وہ ذات وصفات اور اس کے مظاہر کو کیا جانے۔

ظہور حق در مظاہر

فرمایا جاہل متصوفین عالی مقام صوفیا کی باتوں کا مفہوم نہیں جانتے اور کہتے ہیں کہ مظاہر میں ظہور حق کی مثال ایسے ہے جیسے کائنات میں سورج کا ظہور، یا جیسے زید مختلف آئینوں میں، اس میں کوئی شک نہیں کہ اس طرح ایک جزئی محدود جو کہ مظاہر سے جدا ہے کا تصور پیدا ہوتا ہے اور خدا تعالی اس سے بلند و برتر ہے، ہاں البتہ بعض اسلاف نے راہ سلوک کے مبتدیوں کو سمجھانے کی خاطر کائنات کو عکس ذات یا ظل کی مثالیں دی ہیں، لیکن اس سے مراد مرتبہ ثانیہ میں ظہور شئ ہے، اس سے یہ ہرگز مراد نہیں ہے جیسے دیوار پر درخت کا سایہ (جو اصل میں ایک دوسری چیز ہے) تعالی اللہ عن ذلک۔ مشہور شعر ہے

چوں تو فانی شدی ز ذکر بذکر
ذکر خفیہ کہ گفتہ اند آنست

(جب تو ذکر کے ذریعے ذکر میں فنا ہوگیا تو یہی ذکر خفی ہے) کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا فانی کے لئے پردہ ہائے امکان پوشیدہ ہوتے ہیں چنانچہ وہ ذکر خفی سے کھل جاتے ہیں۔

علامت کمال

فرمایا کہ اہل شہود سانپ، بچھو، شیر اور چوروں سے نہیں ڈرتے اسی بنا پر بعض اکابر صوفیا نے خود کو آزمایا اور کسی ایسی جگہ فروکش ہو گئے جہاں بکثرت درندے پائے جاتے تھے اور آب ودانے کا دور دور تک نام ونشان نہ تھا، وہاں جب انھیں کسی طرح کا خوف وخطر لاحق نہ ہوا تو انہیں یقین ہو گیا کہ وہ کامل ہو گئے ہیں۔

کاتب الحروف (شاہ ولی اللہؒ) کہتا ہے کہ درندوں وغیرہ سے ان عرفا کا نہ ڈرنا اس وقت

ہوتا ہے جب یہ نفوس قدسیہ عالم کثرت سے بے خبر ہو کر ذات واحد کے دیدار کی تجلیات میں مستغرق ہوتے ہیں ورنہ بعض حالات میں یہ لوگ عام بشری خصوصیات سے مستثنیٰ نہیں ہوتے۔

ایک تسامح اوراس کا ازالہ

"غوث اعظم سید عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ کے بارے میں مشہور ہے کہ آپ کی مجلس میں انبیائے کرام اور اولیائے عظام تشریف لایا کرتے تھے" کی تاویل کرتے ہوئے فرمایا کہ حضرت غوث الاعظم حقیقت روح جو کہ تمام کائنات میں جاری وساری ہے سے واصل تھے اس لئے آپ اسی مرکز ومنبع ہدایت سے گفتگو (وعظ وتبلیغ) فرمایا کرتے تھے جہاں سے دوسرے اولیائے کرام یا انبیا علیہم السلام فیضان حاصل کرتے ہیں۔ اسی بات کو تسامح کے ساتھ اس طرح بیان کیا گیا کہ آپ کی مجلس میں انبیائے کرام تشریف لاتے تھے۔

حقیقت تعوذ

فرمان باری واذا قرأت القرآن فاستعذ باللہ من الشیطٰن الرجیم (اور جب تو قرآن کی تلاوت کرے تو خدائے بزرگ و برتر کے حضور شیطان مردود سے پناہ مانگ) کی تفسیر میں فرمایا کہ تو شیطان سے چھٹکارا حاصل کر اور اس کے شر سے دور رہ! اور یہ اس لئے کہ قرأت قرآن کے وقت دل مالک حقیقی کے ساتھ لگا ہوا ہونا چاہئے اور دنیا وآخرت سے بالکل بے نیاز اور درحقیقت یہی تعوذ (پناہ) معتبر ہے اگرچہ بظاہر الفاظ تعوذ استعمال نہ بھی کئے جائیں۔

قصہ خالد بن سنان ؒ کی تشریح

خالد بن سنانؒ کے اس قصے کہ انھوں نے وصیت کی تھی کہ مرنے کے چالیس دن بعد انہیں قبر سے باہر نکالا جائے تاکہ وہ عالم برزخ کے بارے میں بتا سکیں، کے بارے میں آپ نے فرمایا کہ جو مر گیا اور عالم برزخ میں پہنچ گیا اس کا دوبارہ اس بدن ناسوتی میں جو کہ قابل تجزی، تبعیض اور خرق والتیام ہے واپس آنا ممکن نہیں، البتہ اس کا بدن مثالی میں لوٹ آنا اس لئے ممکن ہے کہ بدن مثالی قابل تجزی اور خرق والتیام نہیں، اور یہ روح جسد ارواح، روح اجساد، شخص اعمال واخلاق، ظہور معانی بصور مناسبہ اور اشباح جسمانیہ میں مشاہدہ ذوات مجردہ جیسے حضرت جبرئیل دحیہ کلبیؓ کی شکل میں آتے تھے، آسکتی ہے۔ اسی طرح انبیا علیہم السلام اور اولیاء کی متشکل روحیں اور

مشاہدہ خضر وغیرہ یہ تمام عالم مثال کی نیرنگیاں ہیں جب اس دنیا میں نفوس کاملہ مختلف اشکال میں ظاہر ہوسکتے ہیں تو عالم برزخ میں تو یہ عمل بطریق اولیٰ ہوسکتا ہے کیونکہ عالم برزخ میں بدنی (مادی) حجابات کے اٹھ جانے کی وجہ سے ان کے اندر یہ قوت اور مضبوط ہو جاتی ہے خلاصہ کلام یہ کہ خالد بن سنان والے قصے میں ان کی مراد بدن مثالی میں واپسی ہے نہ کہ بدن عنصری میں۔

کاتب الحروف (شاہ ولی اللہؒ) کہتا ہے کہ قیامت سے پہلے اس دنیا میں روح کا بدن عنصری میں لوٹ آنا وہی رجعت ہے جس کے باطل ہونے پر اہل سنت کا اتفاق ہے، کاتب الحروف (شاہ ولی اللہ) کہتا ہے کہ ممکن ہے کہ یہ کلام اپنے ظاہر پر محمول ہو، عارف تدلیات ارواح کو ان کی مثالی صورتوں میں لانے کے لئے اپنے مقام سے نزول کرسکتا ہے اور ان تدلیات کی مثال ان صور کی طرح ہے جو بحالت نیند متخیلہ میں آجاتی ہیں، چونکہ آنجناب (حضرت غوث الاعظمؒ) کو عالم ارواح میں مکمل تمکن حاصل تھا، اس لئے تدلیات ارواح انبیا و اولیاء اپنے آپ وجود مثالی سے آپ پر نزول فرمایا کرتی تھیں۔

منتہائے عابد

فرمایا کہ بیس سال قبل مجھے یہ الہام کیا گیا کہ اگر تو میری رحمت کی امید پر نماز پڑھتا ہے تو تجھے رحمت سے نواز دیا، اور اگر تو میری رضا چاہتا ہے تو میں تجھ سے راضی ہوگیا، میں نے عرض کیا کہ بار خدایا! میرا مقصود تو بس تعمیل ارشاد ہے، لیکن اب تو معاملہ اور ہے، یہاں آپ نے فرمایا ''الصوفیہ عبدالظواھر واحرار البواطن (یہ گروہ صوفیا احکام ظاہری میں غلام اور جہان باطن کا شہنشاہ ہے)

فرمایا کہ اصحاب شہود کو عبادت کی تکلیف و ریاضت کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن اللہ تعالیٰ ان پر عبودیت قائم رکھتا ہے اور یہ نفوس قدسیہ نفس بلکہ روح سے بھی نجات حاصل کر چکے ہوتے ہیں، اس لئے زنا اور شرب خمر ایسی برائیوں کی طرف ان کی توجہ نہیں ہوتی، اگر شاذ و نادر کوئی ایسی بات پیش آجائے تو اس کا کچھ اعتبار نہیں۔

التقید کفر

صوفیا کے اس قول ''القید کفر ولو کان باللہ'' (قید کفر ہے چاہے خدا کے ساتھ ہی

کیوں نہ ہو) کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا: ''عبودیت اثنینیت کا تقاضا کرتی ہے اور جہاں تک اہل شہود کی عبادت کا تعلق ہے تو ان کے مقام کی بلندی کے لحاظ سے ان کی عبادت کا تعلق براہ راست اقامت حق اور اس کے تصرف سے ہوتا ہے، پس عبادت عبودیت کی قید کفر صریح ہے چنانچہ اسی تاویل کی مثال صوفیا کے اس قول محبة الله راس کل خطیئة (اللہ کی محبت ہر خطا کی جڑ ہے) میں بھی موجود ہے چونکہ محبت محبّ محبوب کا تقاضا کرتی ہے جو کہ دوئی (۱) ہے اور یہی تو غلطی کی بنیاد ہے پس جو ان تمام خطاؤں کی سرحد سے نکل گیا اسے محبت خداوندی عطا ہوئی اور جو اس سے بھی آگے نکل گیا تو وہ مقام شہود پر فائز ٹھہرا، کاتب الحروف (شاہ ولی اللہ) کے نزدیک خلاصہ کلام یہ ہے کہ عبادت تو مبتدی اور عارف دونوں کرتے ہیں، مگر ان کے مراتب اخلاص میں فرق ہے، پہلا مرتبہ حضور، ترک ریا اور ترک شہرت وفخر ہے، اس کے بعد کا مرتبہ یہ ہے کہ خوف دوزخ اور طمع جنت سے بے نیاز ہو کر عبادت خالص محبت ذاتیہ میں ہو، اس کے بعد وہ مقام ہے کہ جہاں عبادت عابد کی قدرت وقوت کے ساتھ نہیں بلکہ حق جل شانہ کی قوت اور قدرت کے ساتھ عمل میں آتی ہے ان تمام کے بعد وہ نازک ترین مرحلہ آتا ہے کہ جہاں عام سمجھ بوجھ کا گزر بھی نہیں ہوسکتا، حضرت شیخ کی مراد عبادت کے مذکورہ مراتب کی طرف اشارہ کرنا ہے ان کی بات سے امور عبادات میں تساہل کا کوئی مفہوم ہی پیدا نہیں ہوتا (معاذ اللہ) اس کی واضح دلیل یہ ہے کہ حضرت شیخ شریعت کے اس قدر پابند تھے کہ آخر عمر تک ان سے کوئی سنت نبوی اور مستحسن ومستحب نہ چھوٹا، اور اس کا دوسرا ثبوت یہ ہے کہ آپ نے فرمایا کہ انبیاء علیہم السلام کی ظاہری اعمال کی ادائیگی ان کے تکلیفات شرعی کی قیود سے ممتاز ہونے کے منافی نہیں، یہ تو فریضہ حق ہے جس کے آگے اقتدا کی جائے، اس سے معلوم ہوا کہ ''خیریت'' سے انھوں نے وہ معنی مراد لیے ہیں جو انبیائے کرام میں بوجہ اتم پائے جاتے ہیں۔

قول پیرؒ ہرات

پیرؒ ہرات کے قول۔

---

(۱) دوئی: وحدت کی ضد، نقیض توحید، شرک، علیحدگی۔

از نفی در اثبات بردن صحرائے است
کیں طائفہ را دراں میاں سودائے است
اے دوست چوں عاشقی در آنجا برسد
نہ نفی نہ اثبات نہ مورا جائیست

(نفی واثبات سے آگے ایک صحرا ہے کہ جس میں یہ گروہ صوفیا سرگرداں ہے، اے دوست! جب عاشق کی رسائی اس مقام تک ہوتی ہے تو نفی واثبات تو کجا ایک بال کی بھی وہاں گنجائش نہیں ہوتی)

کی تشریح میں فرمایا:

وصل حقیقی

اصل شہود یہ ہے کہ ثابت کا ثبوت اس طرح ہو کہ مُثبِت اور مُثبَت ایک ہوں اور اسی طرح عاشق، معشوق اور عشق بھی متحد ہو جائیں۔ یہی وہ مقام ہے کہ جہاں پر وصل کی جگہ نہیں تو ہجر کا کیا کام؟ اور اہل سلوک کے ہاں نفی دراصل تو ہم غیریت سے ہوتی ہے جب یہ وہم اٹھ جائے تو منفی عین ثابت ہو جاتا ہے، اور ''نہ مورا جائے است'' سے بساطت اور صرافت ذات کی طرف اشارہ ہے۔

تشریح توحید کوچۂ تنگ است

حضرت خواجہ نقشبندؒ نے بعض اسلاف کا یہ قول نقل کیا ہے کہ توحید کوچۂ تنگ است (توحید ایک تنگ گلی ہے) اس کی تشریح میں فرمایا جس وقت نظر عارف سے جمع کثیرہ صفاتیہ پوشیدہ ہو جاتی ہیں، اور بجز وحدت ذات کے اسے کچھ دکھائی نہیں دیتا، تو اس دوران کوچۂ توحید ایک تنگ گلی ہو جاتی ہے، لیکن بقا کے بعد جب وحدت میں کثرت اسماء وصفات کا مطالعہ میسر آتا ہے، تو اس مقام پر وہ عظیم وسعت کا مشاہدہ کرتا ہے، خلاصہ کلام یہ کہ صرف وحدت پر اکتفا کر لینا کمال نہیں، بلکہ کمال توحید تو عین وحدت میں کثرت کا نظارہ ہے۔

تاویل حقیقة الواجب لایدرکه احد

بعض صوفیاء کے اس قول کہ حقیقة الواجب اظهر الاشیاء (حقیقت واجب تمام اشیاء میں سب سے زیادہ ظاہر ہے) اسی طرح حقیقة الواجد لایدرکه احد (حقیقت واجب کو کوئی نہیں پا سکتا) کی تصریح کرتے ہوئے فرمایا کہ یہاں حقیقت واجب کا تمام اشیاء سے

زیادہ ظاہر ہونا اس اعتبار سے ہے کہ مظاہر میں جو وجود موجود ہے وہی وجود حق ہے اور حضرت وجود تمام میں جاری وساری ہے اور دیگر تمام امور کا تعین اعتباری ہے اور اس کا عدم ادراک (لا یدرکہ احد) اس اعتبار سے ہے کہ مخلوق مرتبہ مخلوقیت میں ذات حق تک رسائی حاصل نہیں کرسکتی، نبی اپنی نبوت اور ولی اپنی ولایت کے ذریعے اس تک پہنچ سکتا ہے اور نہ زاہد اپنے زہد اور عالم اپنے علم کے بل بوتے پر اسے پا سکتا ہے یہاں تک کہ تمام پردہ ہائے امکان اٹھ جائیں اور ظلمات نفسیہ رفع ہوجائیں۔ ذات باری تعالیٰ کو خود اس کے اپنے نور ہی کی مدد سے پہچانا جاسکتا ہے جیسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا عرفت ربی (میں نے اپنے رب کو پہچان لیا) یعنی لا بنفسی (اپنی ذات کے ذریعے سے نہیں بلکہ اسی کے فضل وعطا سے) یہاں ایک دوسرا مفہوم یہ بھی نکلتا ہے کہ معرفت سے مراد تمام شیونات کے ساتھ واجب کی معرفت ہے اور یہ اس دنیا میں محال ہے کیونکہ ہر مظہر عین واحد ہے، لہٰذا معرفت کل کی طاقت نہیں رکھتا اور تجلی برقی آنی تو ایک پل سے زیادہ ہوتی نہیں، لہٰذا اس وقت شیونات کی تفصیل کی طرف کہاں متوجہ ہوسکتا ہے؟

تشریح ان للہ سبعین الف حجاب

معیت ذاتیہ کی احدیت ان للہ سبعین الف حجاب کے ساتھ موافقت میں فرمایا کہ حضرت وجود کا مظاہر کے ساتھ قرب حقیقی ہے۔ اس کی قریبی مثال کلی کا جزئی کے ساتھ قرب پیش کی جاسکتی ہے اگرچہ حق تعالیٰ کلیۃ وجزئیت سے مبرا ومنزہ ہے اسی اعتبار سے حبل الورید (شہ رگ) سے بھی زیادہ قرب کی مثال دی گئی ہے اور اس کے بعد حجابات وہمیہ کی کثرت سے سبب جو کچھ ہے وہ اعتباری ہے یہاں فرمایا کہ حضرت وجود کو مظاہر کے ساتھ جس طرح کی نسبت ہے اس میں کسی طرح کا حجاب موجود نہیں بلکہ حجاب تو واجب اور ممکن کے درمیان ہے، پس ممکن محجوب جو کہ صفات تاثریہ قاصرہ سے موصوف ہے کا اللہ تبارک وتعالیٰ جو کہ صفات واجبیہ مؤثرہ جیسے خالقیت ورزاقیت اور بقا وقدم سے متصف ہے سے وصول بہت مشکل ہے اور یہ اشکال کثرت منازل کے سبب ہے لیکن مجذوب کے لئے خدا تعالیٰ وصول اس طرح آسان فرما دیتا ہے جیسے بے شمار کثیف اجسام اور حجابات کے حائل ہونے کے باوجود دیکھنے والے کے لئے سورج کا نظارہ آسان اور ہر وقت ممکن بنا دیا ہے اور یہاں پر تو لطیف معنوی حجابات ہیں ورنہ بصورت دیگر اللہ

تعالی کا بھی پردہ ہائے جسمانی وامکانی میں محصور ہونا لازم آئے گا اور تعداد (یعنی ستر ہزار جمالات) سے مراد صرف کثرت ہے تحدید نہیں۔

معنی قول خواجہ نقشبندؒ

حضرت خواجہ نقشبندؒ کے اس قول کہ "پی بسر حقیقت مے تواں بردا ما بسر معرفت وعلم نے تواں رسید" (عارف ستر حقیقت تک تو رسائی حاصل کر سکتا ہے مگر سر معرفت وعلم تک نہیں پہنچ سکتا) کے بیان میں فرمایا کہ جب احدیت کا آفتاب کو وہ عارف سے نمودار ہوتا ہے تو آسمان حقیقت روشن ہو جاتا ہے، لیکن سر علم ومعرفت! تو یہ تمام شیونات کی معرفت کے ساتھ وابستہ ہے جو محال ہے۔

فرمایا کہ لوگوں کو صوفیا کو کافر کہنے کا سبب یہ ہے کہ وہ ان سے یہ سن لیتے ہیں کہ حق تعالی وجود مطلق ہے مگر وہ یہ نہیں جانتے کہ صوفیا کی اصطلاح میں وجود سے مراد موجود ہے اور مطلق سے ان کی مراد یہ ہے کہ ذات میں ذات کی حیثیت سے کوئی اعتبار موجود نہیں، کلیتہ نہ جزئیۃ اور عموماً نہ خصوصاً بلکہ اس میں تو اعتبار اطلاق بھی نہیں ہوتا اور صوفیا کے اس قول کہ کل نبی ولی ولا عکس (ہر نبی ولی تو ہوتا ہے مگر ہر ولی نبی نہیں ہوتا) کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا ولایت اصطلاحیہ شرط نبوت نہیں، یہ ممکن ہے کہ ایک شخص محبت یا محبوبیت کے مقام پر فائز ہو، اور خدا اسے نبوت تبلیغ سے مشرف فرمادے ہاں کامل انبیاء کو ولایت اصطلاحیہ اور نبوت تبلیغ دونوں سے نواز دیتا ہے مثلاً نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور تمام اولوالعزم انبیاء علیہم السلام۔

توجیہ خضت بحرًا الخ

قول بایزید خضت بحرا ووقف الانبیاء بساحلہ (میں نے ایک سمندر میں غوطہ لگایا اور انبیاء اس کے ساحل پر کھڑے تھے) کی وضاحت یوں فرمائی کہ انبیا کی استعداد کامل ترین ہوتی ہے کیونکہ ان کے ہاں وہبیت محضہ ہوتی ہے تکاد زیتھا یضیء ولو لم تمسسہ نار (قریب ہے کہ اس کا روغن آگ کے بغیر روشن ہو جائے) وہ تو یقیناً حقیقی اہل شہود ہیں صرف حکمت ارشاد کے تحت خدا تعالی انھیں مقام مشاہدہ پر لے آتا ہے، چنانچہ بایزید کے قول کا معنی یہ ہے ای وقفوا بعد الخوض (انبیاء غوطہ لگانے کے بعد ساحل پر کھڑے تھے) یہاں بحر سے مراد شہود وحدت اور ساحل سے مراد مشاہدہ ہے۔

توحید افعال

فرمایا توحید افعال کو حاصل کرنے کی علامت یہ ہے کہ سالک تدبیر معیشت کو ترک کر دیتا ہے جس کے نتیجے میں اسے مکمل توکل حاصل ہو جاتا ہے اور وہ ہر تکلیف، ایذا اور انعام کو ذات حقیقی کی طرف منسوب کرتا ہے اور توحید صفات کے حصول کی علامات یہ ہیں کہ سالک پختہ اپنی سماعت و بصارت کی قوتوں کو مالک حقیقی کے سپرد کر دے باوجود اس کے کہ حضرت وجود تعین وتقید میں تعین صفات کی قید کے ساتھ موجود ہوتا ہے جیسے کہ کوئی شخص سمندر کے بہاؤ اور سریان کو نہر یا چھوٹے نالوں میں مشاہدہ کر لے تو اس کے لئے ضروری نہیں کہ وہ سمندر میں موجود لعل و جواہر اور حیوانات کا علم بھی حاصل کر لے، اسی طرح جب وہ دیکھتا ہے کہ سمیع وبصیران مظاہر میں ذات حق ہی ہے تو ضروری نہیں کہ وہ تمام مسموعات اور مبصرات پر مطلع ہو جائے کیونکہ یہ تو واجب الوجود جل شانہ کے خواص میں سے ہے۔

حدیث ما تقرب الی عبد

حدیث ما تقرب الی عبد احب الیّ مما افترضت علیه ولا یزال عبدی یتقرب الی بالنوافل حتی اکون سمعه الخ (کوئی بندہ میرے حضور جو کچھ اس پر فرض کیا گیا ہے سے بڑھ کر عزیز ترین چیز پیش نہیں کر سکتا اور میرا بندہ بدستور نوافل کے ذریعے میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اس کی قوت سامعہ بن جاتا ہوں) کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا توحید میں قرب فرائض یہ ہے کہ استغنائے الوہیت افعال واعمال اور یہ کہ عالم میں سوائے اس کے کوئی موثر وقیوم نہیں شامل ہیں اور جس کا ان پر ایمان نہیں آخرت میں اس سے مواخذہ ہوگا! اور یہ قرب فرض ہے اور توحید میں قرب نوافل یہ ہے کہ بندہ حجابات دور کرنے کی سعی کرے اور یہ قرب نفل ہے اگر بندہ اسے حاصل نہ کرے تو اس پر مواخذہ نہ ہوگا، اس لحاظ سے حدیث کی عبارت کا معنی یہ ہوگا کہ کوئی شخص بھی توحید اجمالی کے فرائض کی ادائیگی سے بڑھ کر حق تعالیٰ کے حضور قرب نہیں پا سکتا کیونکہ اسے ترک کرنے پر مواخذہ ہوتا ہے اور توحید تفصیلی میں بندہ برابر حجابات کو دور کرنے اور سخت ریاضتیں کرنے یا ذات اقدس کی طرف مکمل توجہ کرنے میں کوشاں رہتا ہے یہاں تک کہ خدا تعالیٰ اسے اس کی خودی سے باہر لے آتا ہے اور دوستی کا مفہوم یہی ہے

اور بندہ جب یہ مقام حاصل کر لیتا ہے تو جس طرح اس کی ذات اپنی نفی کر کے ذات حقیقی میں فنا ہو چکی ہوتی ہے اسی طرح اس کی صفات (انسانی) بھی اٹھا لی جاتی ہیں۔ اور جو لوگ یہ گمان رکھتے ہیں کہ اس وقت بندے کی صفات تو اخذ کر لی جاتی ہیں، لیکن اس کی ذات جوں کی توں باقی رہتی ہے وہ غلطی پر ہیں۔ کیونکہ جس وقت تمام پردہ ہائے امکان اٹھ جاتے ہیں اس وقت کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اس کی ذات ہنوز باقی ہے، کاتب الحروف (شاہ ولی اللہ) کہتا ہے کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ذات نہیں صرف صفات ماخوذ ہو جاتی ہیں، ان کی ذات سے مراد وجود عنصری اور روحی ہے جو توحید کے اس مقام کے حصول کے بعد بھی تمام مراحل میں اسی طرح باقی رہتا ہے اور اسی طرح خارج میں دیگر تمام طبقات بھی جو علیٰ حالہ قائم رہتے ہیں، اور اگر کچھ خارق عادات کا ظہور ہو تو یہ بھی تو تبدل صفات کی قسم شمار ہوگی اور جن حضرات نے یہ کہا کہ ذات بھی ماخوذ (فنا) ہو جاتی ہے ان کی مراد ذات میں فنا ہونے کا وہی مفہوم ہے جو صوفیا کے ہاں مسلم و معتبر ہے تو یہ سارا نزاع محض لفظی ٹھہرا۔

راہ سلوک میں حزن واندوہ

فرمایا جسے حضرت حق کا وصال نصیب ہو جاتا ہے اور اس میں کچھ حجابات باقی رہ جاتے ہیں تو اس میں غم اور رونے دھونے کے آثار ظاہر ہوتے ہیں بلکہ کبھی تو وہ عام محجوبین کے مقام پر آ جاتا ہے لیکن وہ صاحب حقیقت کہ جس کی رسائی لطائف حقیقت تک ہو چکی ہوتی ہے۔ غم واندوہ اور اثنینیت کے چکر میں کبھی نہیں پھنستا، کاتب الحروف (شاہ ولی اللہ) کہتا ہے کہ یہ حجاب جو غم و بکا کا سبب بنتا ہے یہ دراصل سالک کے اندر کی وہ درشتی اور شدت بہیمیہ ہے جو خود اس کے نفس کو اس کی معرفت کے سلسلے میں حجاب بنا دیتی ہے اور وصل عرفان نصیب نہیں ہو پاتا البتہ جس کی بہیمیت لطیف اور حقیقی ہے وہ سرور اور اُنس میں محو ہو جاتا ہے۔

تشریح والعصر الخ

والعصر ان الانسان لفی خسر الا الذین الخ کی تفسیر میں فرمایا کہ یہاں قسم دہر سے مراد ذات، بقا، سرمدیت اور ذات حق کا دوام ہے، کیونکہ واصلین کے سوا یہاں غیریت اور اثنینیت کے توہم کا شائبہ ہے، کسی نے حضرت شیخ سے سوال کیا کہ سالکین کی آخری منزل کون سی ہے، فرمایا رفع اثنینیت (دوئی) اور شہود وحدت ہی وہ بلند درجہ ہے جس سے بالا کوئی درجہ نہیں۔

تشریح ''توحید راہ کی درمیانی منزل'' ہے

شیخ عبداللہ کھاتی'' جو اس دور کے مشائخ میں سے تھے نے کہا کہ توحید تو ایک ایسا مقام ہے جو راہِ سلوک کے درمیان پیش آتا ہے اس پر آپ نے فرمایا کہ مجھے ذرا اس سے آگے کی خبر دیجئے! انھوں نے کہا کہ ایک چیز ہے مگر بہت مخفی، آپ نے فرمایا سالک جب وحدت محضہ سے واصل ہو جاتا ہے تو اس کی نظروں سے کثرت غائب ہو جاتی ہے اور اس کے بعد تنزل کرتا ہے تو وحدت کو کثرت میں دیکھتا ہے اور یہ تنزل ہے اسے توحید سے بلند مرتبہ کس طرح قرار دیا جا سکتا ہے؟

لیس وراء عباد ان قریة والی ربک المنتهٰی.

کاتب الحروف (شاہ ولی اللہ) کہتا ہے کہ جن لوگوں نے توحید کو راستے کی ایک منزل قرار دیا ہے انھوں نے کثرت سے رویت جمع وذہول مراد لی ہے اور یہ سکر وغلبہ کی ایک قسم ہے اور جو شہود وحدت محضہ کو آخری منزل سمجھتے ہیں، ان کا مطلب یہ ہے کہ لطیفۂ انا اپنی جگہ اطائف میں سب سے اعلیٰ لطیفہ ہے جب صاحب جمع الجمع (۱) وحدت وکثرت دونوں کو ایک ساتھ دیکھتا ہے تو اس وقت رویت وحدہ محضہ کا اصل منشا لطیفہ انا ہوتا ہے اور روحیت کثرت کا منشا لطائف سافلہ ہوتے ہیں تو معلوم ہوا کہ سب سے اعلیٰ مقام لطیف ترین لطائف کا پالینا ہے۔ واللہ اعلم

رشحات میں بعض عرفا سے یہ جو منقول ہے کہ ''من در ابتدا می گفتم ممکن عین واجب است ودر انتہا ظاہر شد کہ واجب عین ممکن است'' (آغاز کار میں میرا خیال تھا کہ ممکن عین واجب ہے لیکن انجام کار یہ بات مجھ پر ظاہر ہوئی کہ واجب عین ممکن ہے) کے بیان میں فرمایا کہ ہر دو عبارات میں فرق یہ ہے کہ پہلی بات صفات امکانیہ میں حصر واجب کو مستلزم ہے اور دوسری بات کا معنی یہ ہے کہ تعینات امور اعتباری اور اعدام محضہ ہیں جب کہ موجود حقیقی بجز واجب تعالیٰ کے کچھ اور نہیں، فرمایا جب خدا تعالیٰ ہر دورہ میں شیونات کو پیدا کرنا چاہتا ہے تو پہلے افعال کو پیدا کرتا ہے کہ جو کہ باب انواع سے متعلق اور اس کی ذات سے عبارت ہیں اور یہ خلق کا سلسلہ ہر نوع میں

---

(۱) اس حقیقت کا انکشاف کہ خلق حق سے قائم ہے اس مقام پر حق کا جمیع موجودات میں مشاہدہ ہوتا ہے سالک یہاں حق کو خلق سے اور خلق کو حق سے دیکھتا ہے اور حق وخلق کو خلق میں دیکھتا ہے یعنی خلق کو خلق اور حق کو حق دیکھتا ہے اور انہیں ایک دوسرے کا عین پاتا ہے یہ سب سے اعلیٰ مقام ہے سلوک میں اس سے بلند کوئی مقام نہیں۔

جاری ہو جاتا ہے جیسے درخت، پتھر، انسان، گھوڑے وغیرہ پس مثال نوع انسانی اس کے مظاہر میں ظاہر ہوئی۔ اس کے بعد ارواح اور اجسام کو بالترتیب پیدا کیا۔ بعدازاں یہ دورہ یہاں پر ختم ہو گیا، یہاں تک کہ یہ روحیں فنائے خفی کے پردے میں چلی جاتی ہیں اس کے بعد سابقہ دورہ کی ترتیب کے مطابق پھر سے انہیں پیدا فرماتا ہے۔

حق تعالیٰ جل شانہ کے افعال وصفات میں تعطل نہیں ہے حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کا قول نحن اناس سرمديون (ہم سرمدی لوگ ہیں) طول مدت پر محمول ہے یا اس اعتبار سے کہ خدا تعالیٰ سرمدی ہے اس لحاظ سے جس پر بھی ازل وابد کی حقیقت کھل جاتی ہے، وہ اپنے آپ کو سرمدی سمجھتا ہے، کاتب الحروف (شاہ ولی اللہ) کہتا ہے کہ میرے نزدیک اس بات کا مفہوم یہ ہے کہ ظہور مثال سے پہلے حقائق کاملہ کے یقین کی صورت انسان ہے اور یہ یقین اشتقاق صورت صرف کی رو سے حقیقۃ الحقائق ہے اور یہ اس لحاظ سے کہ حیز بساطت اور تنزل مراتب میں یکساں طور پر موجود ہے اور ارادۂ قدیمہ واجبہ سے وہ اشتقاق مراتب کونیہ میں ظہور کی خاطر ہے جیسے کہ وہ ستارے کہ جن کا پانی کے تالاب میں عکس پڑ رہا ہے اگر پانی ہزار بار بھی اپنی شکلیں بدلے تو ستاروں پر اس کا کچھ اثر نہیں پڑتا اور وہ ویسے کے ویسے رہتے ہیں، واللہ اعلم

شیخ اکبرؒ کے قول کی تشریح

شیخ اکبرؒ کے قول العبد عبد وان ترقى والرب رب وان تنزل (بندہ بہر طور بندہ ہی رہتا ہے چاہے کتنی ترقی کر لے اور رب بہر صورت رب ہے چاہے تنزل اختیار کر لے) کی تشریح میں فرمایا بندہ چاہے مراتب اعلیٰ پر پہنچ جائے وہ اپنی مقدار عین سے خارج نہیں ہو سکتا، لہٰذا اسی کے تمام تر کمالات اس کی استعداد عین کے دائرہ کار کے اندر ہوتے ہیں، اور حضرت حق اپنی صرافت اور اطلاق کے ساتھ جلوہ گر ہے اگر چہ اس نے مظاہر میں بھی اپنا ظہور فرمایا ہے اس گفتگو کا فقیر (شاہ ولی اللہ) کے نزدیک مفہوم یہ ہے کہ جب خدا تعالیٰ کسی شخص پر اجمالاً تجلی فرماتا ہے اگر چہ وہ تجلی متجلی لہ (جس میں تجلی کا ظہور ہو رہا ہے) کی استعداد کے مطابق ہوتی ہے تاہم اس میں سطوت، تسخیر اور قہر وجوب نمایاں ہوتے ہیں اور مقام فنا میں ایسے مقام بھی آتے ہیں کہ بندہ کبھی کبھار اعلیٰ مقام تک رسائی حاصل کر لیتا ہے، لیکن یہاں بھی انفعال اور تاثر امکان واضح رہے۔

حضرت شیخ ابوالرضاؒ کے چند مسودات اور مکتوبات

شیخ عبدالاحدؒ جو کہ شیخ احمد سرہندیؒ کے پوتے اور اس دور کے مشائخ میں سے تھے، نے حضرت شیخ کی خدمت میں یہ مکتوب تحریر فرمایا:

مکتوب شیخ عبدالاحدؒ

آپ کے اخلاق کریمانہ سے امید کرتا ہوں کہ آپ مجھے اوقات مخصوصہ میں اپنی نیک دعاؤں میں یاد رکھیں گے، کیونکہ معاملہ دشوار، راستہ مشکل اور خوفناک ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ان امامکم عقبة کؤود (تمہارے سامنے ایک پیچیدہ اور دشوار گزار گھاٹی ہے)۔

کیف الوصول الی سعاد و دونها　　قلل الجبال و دونهن حیوف

الرجل حافیة و مالی مرکب　　والکف صفر و الطریق مخوف

(میں سعاد (محبوبہ) تک کیسے پہنچوں کہ راستے میں بلند پہاڑ اور نشیب و فراز حائل ہیں، میرے پاؤں میں جوتا ہے نہ میرے پاس کوئی سواری، راستہ خوفناک ہے اور میں تہی دست ہوں)

میرے محترم و مشفق! حقیقت الفاظ میں نہیں سما سکتی اور غیر حقیقت شایان بیان نہیں، اس لئے بات ختم کرتا ہوں، والسلام

حضرت شیخ نے اس مکتوب کا جواب یہ تحریر فرمایا:

هو الاحد

مکتوب شیخ ابوالرضاؒ

آپ کا سراپا شفقت، عنایت نامہ موصول ہوا اور اس نے خلوص و یگانگت کے رشتے کو استحکام بخشا اللہ جل شانہ آپ کو اس مہربانی اور عزت بخشی کی جزا عطا فرمائے اور اپنے مقصد تک رسائی بخشے۔

گرامی نامہ میں لکھا ہوا تھا۔

کیف الوصول الی سعاد ودونها　　　قلل الجبال ودونهن خیوف
الرجل حافیة ومالی مرکب　　　والکیف صفر والطریق مخوف

حقیقت یہ ہے کہ ہویت ذاتیہ مطلقہ تک اس کے حقیقی اطلاق سے سیر مستطیل کے ذریعے وصول بہت مشکل ہے بلکہ اس سے پہلے اعتبارات محضہ اور اضافات وہمیہ صرفیہ جو کہ عالم خلق وامر سے متعلق ہیں، ایسی دشوار گزار پہاڑی چوٹیاں بھی موجود ہیں کیونکہ ان سے سالک خود کو خوف زدہ پاتا ہے اور اپنے شعور وادراک کو ان کی تلاش میں سرگرداں کر دیتا ہے اور نہ حق سبحانہ تعالیٰ تو اپنی ذات میں وجود خاص کی بنا پر بندے کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے اس کا راستہ بہتر و پرامن ہے اور نہ خوفناک، اس مقام پر ننگے پاؤں کی کوئی بات ہے اور نہ ہی کسی سواری کی، اور نہ ہی اس جگہ کسی تہی دستی کا کوئی وجود ہے جبکہ وہ اپنی ذات میں قائم ہے مگر لوگوں میں اس کا ظہور نہیں، وہ پاک ذات ہے جو اپنے اشراق نور کا حجاب اوڑھے ہوئے اور اپنے ظہور کے استغراق میں مخفی ہے۔

توهمت قدماء ان لیلیٰ تبرقعت　　　وان لناقی البین ما یمنع اللثماء
فلاحت فلا واللّٰه ما ثم مانع　　　سوی ان عینی کان من حسنها اعمی

(قدماء کا یہ وہم ہے کہ لیلیٰ نے برقعہ اوڑھ رکھا ہے مگر ہمارے لئے تو یہی جدائی ہے جو حجاب بن کر بوسے سے مانع ہے جب محبوبہ نے اپنا چہرہ ظاہر کیا تو اس وقت کوئی چیز اس کے دیدار سے مانع نہیں تھی مگر ہماری آنکھیں ہی اس کا جلوۂ حسن دیکھنے کی تاب نہ لا سکیں)۔

پردہ برخاست تا بدید ستم　　　دوست با دوست کردہ در آغوش
آں شناسد حدیث دل مست　　　کہ ازیں بادہ کردہ باشد نوش

(پردہ اٹھا تو میں نے خود کو اس حالت میں دیکھا کہ دوست نے دوست کو آغوش میں لے رکھا ہے اور دل مست کی بات صرف وہی سمجھ سکتا ہے جس نے یہ شراب پی رکھی ہو)۔

وغنی بی منی قلبی فغنیت کما غنی　　　وکنا حیث ما کانوا حیث ما کنا

؎

روز آں بتو بودم ونمی دانستم　　　شب با تو غنودم ونمی دانستم
ظن بود مرا بمن کہ من جملہ منم　　　من جملہ تو بودم ونمی دانستم

(ہر دن میں نے تیرے ساتھ گزارا مگر مجھے معلوم نہ ہو سکا اسی طرح راتوں کو بھی تیرے ساتھ رہا مگر بے خبر تھا۔ میرا گمان تھا کہ میں ہی میں ہوں حالانکہ میں تو تھا ہی نہیں تو ہی تو تھا لیکن مجھے پتہ نہ چل سکا)

مکتوب میں یہ بھی لکھا ہوا تھا کہ جو سخن حقیقی ہوتا ہے بیان میں نہیں آ سکتا۔

اس سے ظاہراً مراد یہ ہے کہ بیان میں اس وجہ سے نہیں آ سکتا کہ سننے والوں کی سوجھ بوجھ میں کمی ہے ورنہ سخن اگر لفظی ہے تو یہ عین گفت ہے اور اگر نفسی ہے تو **فما من عيان الاوله بيان**۔

دوہرہ

کبیرا کا کہر سلہری جہاں سلسلی سیل
ولث با نو پیل کی سواد کون لادی بیل

والسلام علی اہل اللہ الکرام، جب حضرت شیخ کا مکتوب گرامی پہنچا تو جواباً شیخ عبدالاحدؒ نے انتہائی فصیح و بلیغ مکتوب لکھ بھیجا جس میں صعوبت حصول اور بعد راہ کے مضامین کو اس کے ساتھ بیان فرمایا۔ مکتوب یہ ہے۔

مکتوب شیخ عبدالاحدؒ

"**بسم الله الرحمن الرحيم، الحمد لله وسلام على عباده الذين اصطفىٰ اما بعد**" گرامی نامہ سراپا شفقت وتلطف موصول ہوا۔ مطالعہ سے بہرہ اندوز ہوا یہ مکتوب نکات کا خزینہ اور معارف وحقائق کا گنجینہ تھا۔ اس کی دلکش عبارات پاکیزہ اور لطیف اشارات روح پرور تھے۔

نکتہایش ہمہ ہمرنگ چمن   کردہ بر دفتر گل مشق سخن

(اس کے تمام نکات رنگ چمن سے رنگین تھے گویا پھولوں کے کاغذ پر مشق سخن کی گئی تھی)

خدائے بزرگ و برتر آپ کو بہترین جزا عطا فرمائے اور انتہائی مسرتوں سے مالا مال کرے، خط میں مرقوم تھا کہ "سعادت تک رسائی ایسے ہی مشکل ہے جیسے سیر مستطیل کے ساتھ ہویت ذاتیہ کا حصول، ورنہ حق سبحانہ بندوں کی شہ رگ سے بھی قریب تر

ہے۔آپ نے یہ وجود کے بارے میں کہا مگر جہاں تک وجدان کا تعلق ہے تو ذات سبحانہ، وتعالیٰ وراء الوراء اور وراء الوراء ہے۔ ؎

برگ بیرنگی بساز اے عندلیب بینوا کہ ایں گل ما برنتابد از نزاکت رنگ را

(اے بلبل بے نوا کسی بے رنگ پتی سے ناطہ جوڑ کہ یہ میرا پھول انتہائی نزاکت کی وجہ سے رنگ کو بھی برداشت نہیں کر سکتا)

دوہرہ ؎

پنت نکث سنکم اکم بگر مایہ جیوں جہانہ
چکہ اکیں مکہ ہن رہی ملنہ نہ بہر بہر مانہ

شیخ عطارؒ نے فرمایا ہے: ؎

باایں ہمہ نزدیکی جاناں چہ بسی دوری
در عین وصال تو گشت ایں ہمہ مجبوری

(اس تمام نزدیکی کے باوجود محبوب کس قدر دور ہے۔اے محبوب ازل! تیرے عین وصال میں بھی کتنا ہجر ہے)

آپ نے تحریر فرمایا: ''اس کی طرف کوئی پرامن بہتر اور نہ کوئی خوفناک راستہ جاتا ہے اور اس سے ننگے پاؤں چلا جاتا ہے نہ تہی دست ہو کر''۔ ہاں یہاں کوئی اچھا راستہ نہیں مگر اس سے پہلے پہاڑوں کو چوٹیاں اور ان سے پہلے نشیب و فراز حائل ہیں، وہاں راہ حقیقت واضح اور ثابت ہے اور اس راہ کے راہی اس میں پڑے ہیں سبحان الذی اسریٰ بعبدہ لیلا میں اور انی ذاھب الی ربی میں بھی اسی راہ حقیقت کی طرف اشارہ ہے اور قل ھذا سبیلی ادعوا الی اللہ بھی اسی طرف رہنمائی کر رہی ہے۔اسی طرح ففروا الی اللہ بھی اسی معنی کی طرف مشعر ہے اور وہ دو شعر جو آپ نے نور مطلوب کے ظہور اور طالب کی کم مائیگی کے بارے میں تحریر فرمائے، نے مجھے بہت محظوظ کیا، ہاں معاملہ کچھ یونہی ہے جیسے کہا گیا ہے انت الغمامۃ علی شمسک دع نفسک وتعال (تو خود اپنے آفتاب پر بادل کی طرح چھایا ہوا ہے لہٰذا خود کو چھوڑ اور چلا آ) اور فارسی کے جن اشعار میں یہ کہا گیا کہ مطلوب وہم آغوش پردہ پوش محبوب تھا۔ یہ نہایت دلسوز سینہ

افروز اور عرفان ووصل بے پردہ سے معمور تھے۔ بہر طور یہ سمجھنا چاہئے کہ یہ تمام گلشن تشبیہ کے پھول اور عالم سکر ومستی کے شعبدے ہیں۔ مقام تنزیہ جو کہ حضرت ذات سے قریب تر ہے وہ ان تمام کو برداشت نہیں کر سکتا۔ وہاں تو وہی کچھ ہے جو بیان سے باہر ہے وہاں مجھے تو سوائے حیرانگی، ناشناسی اور حقیقت کے ادراک کی عاجزی کے کچھ بھی ہاتھ نہ آیا۔

عنقا شکار کس نشود دام باز چین
کایں جا ہمیشہ باز بدست ست دام را

ما للتراب ورب الارباب (چہ نسبت خاک را بعالم پاک)۔

تو از خوبی نمی گنجی بعالم
مرا ہرگز کجا آئی در آغوش

(تیرا حسن تو سارے عالم میں نہیں سما تا پھر تو میرے آغوش میں کس طرح سما سکتا ہے)

یہی وہ مقام ہے جہاں مقربان بارگاہ کو ابدی حزن وملال دامن گیر ہو جاتا ہے اور یاس وحرمان سرمدی خاصۂ خاصان درگاہ کے حصے میں آتا ہے۔ حدیث میں آتا ہے، **کان علیہ السلام دائم الحزن متواصل الفکر** (حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ہمیشہ حزیں اور مسلسل فکرمند رہتے تھے)۔

دلہا ہمہ آب گشت وجانہا ہمہ خون
تا چیست حقیقت زپس پردہ برون

(سارے دل حقیقت پس پردہ کو جاننے کی کدو کاوش میں پگھل کر پانی ہو گئے اور ساری جانیں خون ہو گئیں)

جو دو ہرہ اس راہ کی دشواری کے بارے میں تحریر کیا گیا وہ انتہائی دل نشین اور بے ساختہ تھا۔ اس راہ کی مشکلات تو اس سے بھی بڑھ کر ہیں، یہاں تک کہ مخبر صادق علیہ السلام نے بھی ان دشواریوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: ان اماکم عقبة کوؤد یہ بھی ہے مگر۔

گر موج زند عنایت او
موراں بکنند کار پیلاں

(اگر اس کی عنایت کا بحر موج مارے تو چیونٹیاں بھی ہاتھیوں کا کام کریں)

احادیث میں آتا ہے کہ ان اللہ یفعل بالضعیف ما یتحیر فیه القوی (خدا کمزور سے وہ کام کرا لیتا ہے جس سے طاقت ور بھی عاجز ہو جاتا ہے۔

عجائب رہِ عشق اے رفیق بسیار ست
زپیش آہوئے ایں دشت شیر نر برمید

(اے دوست جادۂ عشق کے عجائبات بے شمار ہیں۔ اس جنگل کے آہو سے پہلے شیر نر نکلتا ہے)

دوہرہ:

نیہی گرو رپیم کو بپل جہاں رمنا
دیکھو کا برج بہہ کو چو کچیست ہنجی دہارد

اور یہ رباعی ؎

روز آں بتو بودم ونمی دانستم | شب با تو غنودم ونمی دانستم
ظن بود بمن کہ من جملہ منم | من جملہ تو بودم ونمی دانستم

جو آپ نے تحریر فرمائی ہے وصال اور غلبہ سکر کی کیفیت کی خبر بھی دیتی ہے ورنہ خدا کے ہاں تو نہ شام ہے نہ سحر۔ لم یلد ولم یولد اس کے جلال کا صحیفہ ہے اور ولم یکن له کفوا احد اس کے توقیع کمال کا دیباچہ۔

ابروے دوست کے شود دست کش خیالِ من
کس نزد است زین کمان تیر مراد بر ہدف

(دوست کے ابرو میرے ذہن سے کیسے نکل سکتے ہیں کسی نے اب تک اس کمان سے نشانے پر تیر مراد پھینکا ہی نہیں)

اور جو کہا گیا ہے کہ ؎

وغنی بی متی قلبی فغنیت کما غنی
وکنا حیث ما کانوا وکانوا حیث ما کنا

یہ بھی اسی قبیل میں سے ہے ورنہ وہاں تو قیل، قال، حیث کان، انس اور جان کچھ بھی نہیں۔ کان اللہ ولم یکن معہ شئ والان کما کان، اور "بشر کو یہ طاقت نہیں کہ وحی یا پردے کی اوٹ کے بغیر خدا سے ہم کلام ہو سکے"۔ یہ (آیت) جواہر سالکین کی نقاد ہے اور بلا تضربوا الامثال واللہ یعلم وانتم لا تعلمون، معیار حلیہ عارفین ہے۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ سرخیل محبان (حضرت موسیٰ) نے لن ترانی کا زخم برداشت کیا اور دفتر محبوبان کے سرتاج (سرکار دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم) نے لیس لک من الامر کی نداسنی گویا ایک جانب عنایت ہے تو دوسری جانب بے نیازی۔ تحریر تھا کہ "آپ نے لکھا ہے کہ جو سخن حق ہوتا ہے گفتگو میں نہیں آتا۔ اس سے ظاہراً مراد یہ ہے کہ سننے والوں کے ادراک کی کمزوری کی بنا پر گفتگو میں نہیں آسکتا ورنہ اگر سخن لفظی ہو تو عین گفت ہے اور نفسی ہو تو ہر عیاں چیز کے لئے بیان ہوتا ہے"۔ ایسا ہرگز نہیں بلکہ اس سے مراد خود قصور متکلم ہے یہاں سخن حق سے حقیقت ذات کا بیان ہے اور ذات کی بداہت کرنا طاقت بشریہ سے باہر ہے اور اس سلسلے میں ظن وتخمین سے کام لینا بے ادبی ہے کیونکہ ظن بیان حقیقت کو ذرہ برابر فائدہ نہیں پہنچاتا۔ یہ ظاہر ہے کہ جو کچھ درک ممکن اور احاطۂ متناہی میں آئے گا، لامحالہ وہ ممکن اور متناہی ہوگا اور واجب تعالیٰ کی ذات غیر متناہی تو اس سے بہت بالا ہے۔ خواجہ بزرگ (خدا ان کی لحد پر عطر افشانی کرے) نے فرمایا جو کچھ بھی دیکھا اور سنا جاتا ہے سب غیر حق ہوتا ہے لہٰذا اسے کلمہ کے لفظ لا کی حقیقت سے منفی کر دینا چاہئے۔

بس بیرنگ است یار دلخواہ اے دل
قانع نشوی برنگ ناگاہ اے دل

(اے دل محبوب ازل تو بے رنگ ہے تو کہیں اچانک رنگ پر قانع نہ ہو جانا)

خلاصہ کلام یہ کہ جو اس کو جانتا نہیں وہ بطریق اولیٰ اس کے بارے میں کچھ بیان بھی نہیں کر سکتا اسے فکر، وہم اور نگاہیں نہیں پا سکتیں۔

چساں نشاں دہم آں نشان یکتا را
مگس چہ شرح دہد آشیانِ عنقا را

(اس بے نشان و یکتا کا کیا نشان بتاؤں کہ شہد کی مکھی آشیانہ عنقا کا کیا پتہ دے سکتی ہے)

میرے محترم! جسے اس نے خلعت کلام پہنائی اور انی اصطفیتک بکلامی وبرسلتی کی نوید سنا کر اعزاز بخشا۔ اس نے بھی یہی صدا بلند کی کہ یضیق صدری ولا ینطلق لسانی اور جسے اس نے جوامع الکلم سے نوازا اور تاج ومعراج اور اولیت وخاتمیت سے عزت بخشی۔ اس نے بھی یہ فرمایا: لا احصی ثناء علیک سبحان اللہ رب العرش عما یصفون۔

اے از تو گمان خلق بس دور
جلوائے تو از پر مگس دور

(اے کہ تجھ سے لوگوں کا گمان بہت دور واقع ہے اور تیرا جلوہ تو پر مگس سے بھی لطیف ہے)

ہر کس کہ زکنہ تو سخن گفت
خود گفت و زگفت خود برآشفت

(جس نے بھی تیری حقیقت کے بارے میں کچھ کہا تو خود ہی کہا اور اپنے کہے پر خود ہی پشیمان ہوا)۔

اے برتر ازاں ہمہ کہ گفتند
و آنہا کہ بدید ہم نہفتند

(اے کہ تو اس تمام سے بلند ہے جو تیرے بارے میں کہا گیا ہے اور جنھوں نے دیکھا چھپایا)۔

توحید تو ہر کہ راند در قیل
بر مورچہ زد عماری فیل

(جس نے تیری توحید کو لفظوں میں ڈھالا اس نے گویا چیونٹی پر ہاتھی کی ڈولی رکھ دی)

آپ کا یہ فرمان کہ فما من عیان الا ولہ بیان اور قول خداوندی الرحمن علم القرآن اپنی جگہ صحیح ہیں مگر جو عیاں سے بالا ہے وہ بیان سے خالی ہوتا ہے اور آپ علم کے ذریعے اس کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ محققین میں سے کسی کا قول ہے کہ من عرف اللہ طال لسانہ (جس نے خدا کو پہچان لیا اس کی زبان تیز ہوگئی) اور یہ مرتبہ صفات، شیون اور اعتبارات ہے اور صوفیہ کا

یہ قول من عرف اللہ کل لسانہ (جس نے خدا کو جان لیا اس کی زبان گنگ ہوگئی) مرتبہ ذات کی بنا پر ہے جو اضافات اور اعتبارات سے مبرا ہے اور وہ مطلقاً کیف سے منزہ ہے میں عرض کرتا ہوں کہ پہلی بات یہ ہے کہ الرحمٰن علم القرآن میں قرآن صفات میں سے ایک صفت ہے اس لئے اسم ذات کی بجائے اسم صفت کے ساتھ آغاز کیا گیا۔ دوسری بات یہ ہے کہ فاوحی الی عبدہ ما اوحی میں جو کچھ وحی کیا گیا اسے مبہم رکھا گیا اور بندے کی اضافت ہویۂ ذاتیہ کی طرف کی جیسے پیغمبر علیہ السلام کے اس فرمان میں پوشیدہ ہے: ''ابھموا ما ابھم اللہ'' (جسے خدا نے مخفی رکھا اسے ظاہر مت کرو) اس سے مراد یہ ہے کہ تم ذات کے بارے میں سرے سے بحث ہی نہ کرو کیونکہ تم رخ کبریا سے نقاب اٹھانے کی طاقت ہی نہیں رکھتے کہنے والے نے کیا ہی خوب کہا ہے ؎

ہر چہ گویم عشق را شرح و بیان
چوں بعشق آیم خجل باشم ازاں

(میں عشق کی جو شرح بھی بیان کرتا ہوں جب عشق اختیار کرتا ہوں تو اپنے کہے پر شرمسار ہوتا ہوں)

دوسرے یہ کہ عیاں کے لئے کیا بیان؟

میرے محترم! چونکہ نماز اعمال میں سے مقرب ترین عمل ہے اور مورد تجلیات ومشاہدات ہے اور اس کے بارے میں یہ حدیث کہ الصلوٰۃ معراج المومن اور ایک دوسری معتبر حدیث کہ اقرب ما یکون العبد من الرب تعالی فی السجدۃ نماز کے مقرب ترین عبادت ہونے کی بین دلیلیں ہیں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ سالک کے دل میں ادائے نماز کے دوران مطلوب بے حجاب اور محبوب بے نقاب کی ہم آغوشی کا خیال پیدا ہو جاتا ہے اور فرط عشق وشوق کے مارے مظہر وظاہر اور صورت وحقیقت میں تفریق نہیں کر پاتا۔ اسی وجہ سے نماز کے تمام ارکان میں اس حکیم مطلق نے تکبیرات انتقالات اور تسبیحات کا حکم دیا ہے۔ یعنی اے سالک! جب تیرے دل میں وصال کا کوئی خیال پیدا ہو تو جان لے کہ ذات باری اس سے کہیں برتر واعلیٰ ہے۔ خواجہ حافظ شیرازیؒ نے سالک کے توہم وصول کو جو تجلیات

ومشاہدات کے ورود سے پیدا ہو جاتا ہے اور درحقیقت ایسا نہیں ہوتا اس طرح بیان کیا ہے:۔

عکس روئے تو کہ در آئینہ جام افتاد
عارف از خندہ می در طمع افتاد

(آئینہ جام میں جب تیرے چہرے کا عکس پڑا تو عارف شراب میں مسکراتے عکس کو دیکھ کر غلط فہمی کا شکار ہو گیا)

یعنی عارف کا خون دل جو محبت کا گہوارہ ہے جو کہ نقوش ماسوا کو مٹا کر تجلی ذاتی کا مرکز بن جاتا ہے اور یہ تجلی ذاتی اس کی ذات سے وجہ کنایت ہے اور ایسے میں عارف کا باطن پہلے سے سوگنا بڑھ کر ترقی حاصل کرتا ہے اور بے پایاں شگفتگی ومسرت اسے حاصل ہو جاتی ہے تو ناچار بے پردہ وصول ذات کے لالچ میں پڑ جاتا ہے، مگر اسے معلوم نہیں ہوتا کہ تجلی اسے کہتے ہیں جو شائبہ ظلیت سے خالی نہیں ہوتی کیونکہ تجلی کسی چیز کے مرتبہ ثانیہ یا ثالثہ میں ظاہر ہونے کا نام ہے۔

خلق را روی کے نماید او
در کدام آئینہ در آید او

(لوگوں کو وہ اپنا جمال جہاں آراء کس طرح دکھائے اور وہ کس آئینے میں سمائے)

ایک طرف تو یہ کہا جاتا ہے کہ وصول ذات اصلا ناممکن ہے جبکہ مشائخ کبار سے وصول الی الذات منقول ہے اور ان میں سے کسی نے یہ بھی کہا ہے۔

ذات من نیست جز تجلی ذات
ذات بر من زدہ است راہ صفات

(میری ذات سوائے تجلی ذات کے اور کچھ نہیں، اور ذات نے مجھ پر صفات کی راہ مسدود کر دیے ہیں)

اور اسی طرح کسی اور نے کہا ہے "حق تو یہ ہے کہ میں اسم وصفت سے گزرے بغیر ذات تک پہنچا ہوں اس سلسلے میں مشائخ کے اقوال اس قدر ہیں کہ ان کا انکار نہیں

کیا جا سکتا۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ وصول الی الذات کا مطلقاً انکار تو نہیں کرتے مگر کنہ ذات تک وصول کے قائل نہیں اور اس کی کیفیت کے بطریق حصول پانے کے بھی قائل نہیں اور جو وصول بے کیف اور بلا ادراک ہو وہ ممکن اور یقینی ہے جس کے ثبوت کے لئے دلائل و براہین موجود ہیں اور اسی قبیل سے ایک بات یہ ہے کہ اس وصول کے باوصف نگرانی ابدی دامنگیر ہو جاتی ہے اور دائمی حزن واندوہ دولت وصول کے باوجود پیچھا نہیں چھوڑتے اور اس کا سبب دو امور ہیں، پہلا اس تلون وتلذذ کے فقدان کے نتیجے میں پیش آتا ہے جو اس سے پہلے تجلیات صفاتیہ میں موجود ہوتا ہے اور باطن سے پوری طرح مانوس ہو چکا ہوتا ہے اور دوسرا یہ کہ سالک وسعت ذات اور اپنے شوق وتشنگی کی وجہ سے اس مقام کا احاطہ نہیں کر پاتا اگرچہ وہ خود بسیط تر ہوتا ہے مگر ذات حق تو وسیع تر ہے اور یہ تمام (وصول) بلاکیف ہوتا ہے، یہاں عارف بمنزلہ مستسقی کے ہوتا ہے جو ذات حق سے کبھی سیر نہیں ہوتا اور اس مقام کا کوئی کنارہ ہے نہ نہایت، نہ انجام ہے نہ آغاز۔ ع

بمیر د تشنہ مستسقی و دریا ہم چناں باقی

شیخ عطارؒ فرماتے ہیں: ۔

نمی بینی کہ شاہی چوں پیمبر
ندیدہ فقر کل تو رنج کم بر

یعنی اس مرتبے کے وصول کہ اس سے اوپر کوئی مرتبہ نہ ہو اور خزانہ جبروت میں ایک جوہر ہے جس کی احتیاج ہوتی ہے وہ باقی نہ رہے قطعاً ناممکن ہے وفوق کل ذی علم علیم اگر نہ جاننے اور پہچاننے والے کے بارے میں یہ کہا جائے کہ اس میں طلب کیسے پیدا ہوئی؟ جبکہ اس نے اس کے لئے جگر کو کباب اور آنکھوں کو نمناک کیا ہے تو اس کے جواب میں یہ عرض کرونگا کہ جاننا پہچاننا شرط طلب نہیں، بلکہ حسن محبوب کی دھوم حریف عشق کو بیقرار اور بے چین کر دیتی ہے اور جمال محبوب کی خوشبو وگفتگو دیوانگی عاشق کو جوش دلاتی ہے اس طرح کے گلہائے رنگین اس وادی میں بکثرت

کھلتے ہیں اوراس طرح کی نیرنگیاں اس راہ میں اکثر و بیشتر واقع ہوتی رہتی ہیں۔ یہ آتش عشق میں کودنے والوں کی دیوانگیاں اور جاں گدازوں کی الفتیں ہیں، جو دنیائے عشق میں اس طرح کے عجائب وغرائب پیدا کرتی رہتی ہیں، مولوی عبدالرحمٰن جامیؒ فرماتے ہیں۔

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد
بسا کیں دولت از گفتار خیزد

(آتش عشق صرف دیدار یار سے ہی نہیں بھڑکتی بلکہ اکثر یہ دولت حسن یار کے چرچے سے ہی مل جاتی ہے)۔

آری مقتضائے ادب ایں ست — لائق کبریائے محبوب چنیں است
اے عشق زعاشقاں عجب نیست — معشوق شناسی از ادب نیست

(ہاں تو ادب کا تقاضا یہ ہے اور محبوب کی کبریائی کے شایان یہی ہے کہ عشق کا ظہور عشاق سے کچھ تعجب کی بات نہیں کیونکہ معشوق کو جان لینا ادب سے تعلق نہیں رکھتا)۔

تو یہ جان لینا چاہئے کہ جیسے ذات کو کسی عبارت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اور نہ کسی طرح اس کی جانب اشارہ کیا جا سکتا ہے اسی طرح اس کا وصول بھی نہ تو کسی عبارت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس کی طرف کوئی اشارہ ممکن ہے اس اخروی روایت کی طرح کہ جس پر ہمارا ایمان ہے مگر اس کی کیفیت سے سروکار نہیں رکھتے۔

ع بلا بودی اگر ایں ہم نبودی

اگر یہ کہیں کہ پھر مبتدی اور منتہی میں فرق کیا ہے؟ جبکہ ہر دو سوز و گداز میں ایک ساتھ اور دونوں اسی راز و نیاز کے طالب ہیں۔ اگر تو ان دونوں میں فرق واضح ہو جائے تو یہی مقصود ہے مگر یہاں تو دونوں میں کوئی فرق موجود ہی نہیں اور اگر حزن واندوہ ہے تو وہ بھی دونوں میں یکساں موجود ہے میں اس کے جواب میں عرض کرتا ہوں کہ مبتدی کا عدم وصول حقیقی ہے جبکہ منتہی کا صوری، مبتدی جب گریہ کرتا ہے تو اس کے

لئے کہ سامنے حجابات کی دیواریں ہوتی ہیں مگر منتہی تو عظمت و کبریائی کے مشاہدے سے روپڑتا ہے وہ (مبتدی) ہنوز ستر ہزار پردوں میں ہوتا ہے اور یہ (منتہی) انوار کی چکا چوند میں پہنچا ہوتا ہے وہ بار ہستی کو کاندھوں پر اٹھائے ہوتا ہے جبکہ یہ اس کی عظمت کا بار برداشت کئے ہوتا ہے وہ ابھی تک مادی لباس میں گرفتار ہوتا ہے اور اسے خلعت وجود کے ساتھ عزت بخشی گئی ہوتی ہے وہ سایوں اور خیالوں میں ہوتا ہے کہ یہ واصل ہو چکا ہوتا ہے۔ اس نے ابھی انفس و آفاق کے دام سے پاؤں نہیں چھڑائے ہوتے کہ یہ ان تمام سے نکل کر منزل بالا تک پہنچا ہوتا ہے۔ الغرض یہ کہ بکاء المرید من بکاء الشیخ کے مقام پر فائز اس جان جہان پر اپنی جان کی بازی لگائے اسم اور رسم اور نام و نشان سے بے پرواگزر کر تنزیہ مطلق اور غیب صرف کو اپنی توجہ کا قبلہ بنا دیتا ہے بے شک خدائے بزرگ و برتر بلند عزم لوگوں کو عزیز جانتا ہے کیا خوب کہا ہے۔ ع

آں لقمہ کہ در وہاں نگنجد طلبم

(وہ لقمہ طلب کرتا ہوں جو منہ میں نہ سمائے)

خلاصہ کلام یہ نکلا کہ مقصود وصول ہے نہ کہ حصول اور مطلوب قرب ہے نہ کہ ادراک:

دوھرہ:۔

نانو نجانو کا اور بارک لاکی جانو
جاتی جہاں کیے تہاں نانو نہ کانو نہ تھانو

ے

گرفتم نباید ایں عنقا بدامم — تنید تہائے دامش را غلامم
کسی را گر چہ برگ ایں سفر نیست — بہ از سودائے او چیز دگر نیست

(مجھے تسلیم ہے کہ عنقا میرے دام میں نہیں آنے کا، مگر میں اس کے دام کی رسیوں کا غلام ہوں۔ اگر کسی کے پاس اس سفر کا ساز و سامان نہ ہو تو اس کے لئے سودائے محبوب سے بہتر کوئی زادراہ نہیں)

اب ہم اس مکتوب کو حضرت مجدد الف ثانی قدسنا اللہ سبحانہ، بسرہ الاسنیٰ کے کلام پر ختم کرتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا: تمام تعریفیں اس ذات کے لئے جس نے امکان کو آئینہ وجوب اور عدم کو مظہر وجود بنایا، اور وجوب ووجود اگر چہ دونوں اس کے کمال کی صفات ہیں مگر وہ تو ان دونوں سے وراء اور بلند ہے بلکہ تمام اسماء وصفات اور شیون واعتبارات سے ماوراء ہے اور ہر ظہور بطون، بروز اور کمون سے بالا ہے، اسی طرح تجلیات، ظہورات، مشاہدات اور مکاشفات سے بھی ارفع ہے اور ہر معقول، محسوس، موہوم اور تخیل سے بھی ماروا ء ہے الغرض وہ ذات پاک وراء الوراء اور وراء الوراء ہے۔

چہ گویم با تو از مرغی نشانہ | کہ با عنقا بود ہم آشیانہ
زعنقا ہست نامی پیش مردم | ز مرغ من بود آں نام ہم گم

(میں تمہیں اس طائر قدسی کا کیا نشان بتاؤں کہ جس کا آشیانہ عنقا کے ساتھ ہے لوگوں کی نظر میں عنقا کا بھی ایک نام ہے مگر میرے طائر قدسی کا تو نام بھی مخفی ہے)

پس ذات قدس ہر تعریف کرنے والے کی تعریف سے بے نیاز بلکہ تمام تعریفوں کی منزل اس کی ذات اقدس کے سراپردوں سے پہلے واقع ہے وہ خود ہی وہی ذات ہے جس نے خود اپنی ثنا کی اور اپنی ذات کی خود تعریف کی لہٰذا وہ ذات پاک خود ہی حامد ہے اور خود ہی محمود، کوئی دوسرا اس کی حمد وثنا سے عاجز ہے انتہی کلامہ القدسی۔

ہیہات قلم بو قلمم در کف اندیشہ گداخت
رنگ آخر شد و نیرنگ تو تصویر نہ شد

(ہائے افسوس میری بوقلمونی کا قلم اندیشے کی ہتھیلی میں گل گیا، رنگ ختم ہو گیا لیکن تیری نیرنگی تصویر نہ بنی)

عرفان پناہا! ہماری باہمی بحث کسی مقابلے یا مناظرے کی بنا پر نہیں بلکہ اس کا تعلق نیم خامی اور ترک جوشی سے ہے۔ امید ہے کہ آپ معاف فرمائیں گے کیونکہ العذر عند کرام الناس مقبول اور سلامتی ہو اس پر جو راہ ہدایت پر چلا اور

متابعت مصطفیٰ علیہ وعلی آلہ والصلوٰۃ والتسلیمات لعُلیٰ پر کاربند ہوگیا''۔

حضرت شیخ ابوالرضاؒ نے حضرت شاہ عبدالاحدؒ کے مندرجہ بالا مکتوب کے مطالعہ کے بعد یہ جواب تحریر فرمایا:

جواب شیخ ابوالرضاؒ

''تمام تعریفیں اس ذات اقدس کے لئے ہیں جس نے ہمیں ہر غلطی ونقصان سے نکال کر اپنی طرف مائل کیا تو ہم نے اسے اپنی شہ رگ سے بھی قریب پایا۔ ایسی حالت میں کہ کوئی حیرانگی تھی اور نہ پریشانی، اور ہر عارف وجاہل کی طرف سے درود وسلام ہوں ہمارے نبی اور آقا حضرت محمدؐ اور ان کی آل پر۔ یہاں جاہل سے مراد وہ ہے جو حقیقت تک نہ پہنچنے کی وجہ سے غلطاں وپریشاں ہوتا ہے۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، گرامی نامہ دلکش عبارات لئے ہوئے یہاں پہنچا۔ گویا اس مکتوب میں اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ دعوت وصول غلبۂ حال کے سبب ہوتی ہے تو ایسی حالت میں سخنِ مغلوب کا کیا اعتبار؟ اور اس کی مثالیں رموز واشارات سے اشعار کے روپ میں ظاہر کی گئیں اس کے علاوہ انوکھی تشبیہات، کنایے اور استعارے تھے میں نے ان تمام کو اچھی طرح سمجھا، آپ نے پہلی بات جو تحریر کی وہ یہ تھی کہ۔

کیف الوصول الی سعاد ودونها　　قلل الجبال ودونهن خیوف
الرجل حافیة ومالی مرکب　　والکف صفر والطریق مخوف

یہ اشعار راستے کی مشکلات اور امتناع وصول کے سلسلے میں واضح ہیں اور جو میں نے لکھا تھا کہ ہویت ذاتیہ تک سیر مستطیل جو کہ عالم خلق وامر کے اعتبارات کی پہاڑی چوٹیوں کے عبور پر مبنی ہے کے ذریعے وصول بہت مشکل ہے تو یہ بات مقصد کے لئے راستہ، مشکلات راہ کی وضاحت، وقوع اقدام اور حصول وصول کی دشواریوں کے ممتنع الوصول ہونے کی تاویل کے طور پر تھی اور میں نے اس راستے کی نفی بعض اشخاص کے لئے خاص وجوہات کی بنا پر کی ہے جس پر کسی کو انکار کی گنجائش ہے اور نہ کسی اعتراض کی۔ لہٰذا مطلق طور پر اس کے اثبات اور وقوع اور میری سابقہ نفی میں

کسی قسم کا کوئی تعارض موجود نہیں ہے۔ میں نے یہ لکھا تھا کہ "وگرنہ حق سبحانہ وتعالیٰ تو وجوہات خاص سے بندوں کی شہ رگ سے بھی قریب تر ہے"۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ یہ بات تو وجود کے بارے میں ہے لیکن جہاں تک وجدان کا تعلق ہے تو وہ ذات حق سبحانہ اس سے کہیں ارفع واعلیٰ اور وراء الوراء ہے۔ میں عرض کرتا ہوں کہ آپ کی یہ بات بالکل درست ہے لیکن عامی لوگوں کے بارے میں! لیکن جہاں تک اعتبارات کے بغیر صرف ذات کی طرف متوجہ ہونے والے حضرات کا معاملہ ہے وہ اس سے مختلف ہے پس جس طرح حق سبحانہ وتعالیٰ وجود میں شہ رگ سے زیادہ قریب ہے اسی طرح وجدان اور سریانیت میں بھی!۔

تجدنی فی سواد اللیل عبدی
قریباً منک فاطلبنی تجدنی

(اے میرے بندے تو رات کی تاریکیوں میں جس وقت بھی مجھے آواز دے گا اپنے نزدیک پائے گا)۔

مرا اندر شب تاریک یابی زجانِ خویش ہم نزدیک یابی
مرا نزدیک خود پیوستہ میداں نمی دانی اگر دانی بیابی

(تو مجھے رات کے اندھیروں میں ہی پاسکتا ہے اور دور جانے کی ضرورت نہیں بلکہ اپنی جان سے بھی نزدیک پاسکتا ہے مجھے اپنے ساتھ پیوستہ جان تو ایسا نہیں سمجھتا اگر سمجھے تو مجھے پالے)۔

آپ نے اپنے خط میں یہ دوہرہ بھی لکھا تھا۔ دوہرہ ۔

تیپٹ نکٹ سنگم اکم مگر مانہ جیون جہانہ
جگہ اکیں مکھ میں رہیں طنہ نہ بہر بہریانہ

اس کے پڑھتے ہی دل ناتواں میں یہ آیا۔ دوہرہ ۔

ساجن میرے آیا کل لاکھ بہربانہ
بل مارت بچھرت تس دن کہوں نجانہ

میں نے لکھا تھا:۔

پردہ برخاست تا بدیدستم
دست با دوست کردہ در آغوش

اس پر آپ نے فرمایا کہ "یہ تمام گلشن تشبیہ کے پھول ہیں"۔ میں عرض کرتا ہوں کہ آپ کے ہیں ہم آغوشی کی آرزو کا مفہوم نکلتا تھا جبکہ میری عبارت میں اس کے حصول کی طرف اشارہ ہے۔

عباراتنا شتی وحسنک واحد
وکل الی ذاک الجمال یشیر

(ہمارے انداز بیان مختلف ہیں ورنہ تیرا حسن تو ایک ہی ہے درحقیقت ہمارے بیان کے ہر انداز کا اشارہ تیرے ہی جمال حقیقی کی طرف ہے) والا نامہ میں مرقوم تھا:۔

عنقا شکار کس نشود دام باز چین
کاینجا ہمیشہ باد بدست است دام را

میں سمجھتا ہوں کہ اس سے ادراک اور احاطہ کی بے مائیگی مراد ہے۔

اے کمان وتیرہا بر ساختہ
صید نزدیک و تو دور انداختہ

(اے تیر و کمان اٹھانے والے! شکار تو قریب ہے تو نے تیر دور پھینکا)

آپ نے تحریر فرمایا ما للتراب ورب الارباب میں کہتا ہوں قصہ معراج میں مذکور ہے کہ یہ از راہ ادب کہا گیا۔ ارشاد خداوندی ہے یا محمد انک اخترت العبودیۃ تادبا انا اخترتک لجمیع الکرامات الانسیۃ تفضلا۔ (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ نے تادب کے طور پر بندگی کو اپنا لیا اور میں نے تمہیں تمام انسانی فضائل اور خوبیوں کی وجہ سے تفضلا پسند کر لیا ہے) للہذا پتہ چلا کہ تادب اور چیز ہے اور تفضل دوسری۔

خاک را چوں کار باپاک اوفتاد
پیش آدم عرش برخاک اوفتاد

(خاک کو جب ذات اقدس سے تعلق پیدا ہوگیا تو پھر عرش بھی انسان کے سامنے جھک گیا)

مکتوب گرامی میں لکھا ہوا تھا کہ ''ابدی حزن واندوہ مقربان بارگاہ کو دامن گیر ہوتا ہے''۔ اس سلسلے میں عرض ہے کہ ابدی غم واندوہ تو ہمیشہ کا ایک ایسا عذاب ہے جو دوستوں کے لئے نہیں بلکہ دشمنوں کے لئے ہوتا ہے دوستوں پر تو ہر وقت ناز ونعمت کی بارش اور مقربین کے لئے راحت ہی راحت ہوتی ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے فاما ان کان من المقربین فروح وریحان وجنۃ نعیم (اگر تو وہ بندہ مقربین میں سے ہے تو اس کے لئے خوشی، راحت اور جنت کی نعمتیں ہیں)۔

آسود بکام خویش از وصل حبیب
نے بیم فراق است نہ تشویش رقیب

خط میں مرقوم تھا۔

دلہا ہمہ آب گشت وجانہا ہمہ خون
تاچیست حقیقت ز پس پردہ برون

اس کے بارے میں میرا کہنا یہ ہے کہ ابھی تک پردے کے پیچھے جان ودل باقی ہے اور مشتاق کی حالت بھی یہی ہوتی ہے مگر جب کوئی جان ودل سے ہی گزر جائے تو وہ پردے کے اندر چلا جاتا ہے اور پکار اٹھتا ہے۔

راز درون پردہ ز زندان مست پرس
کیں حال نیست زاہد عالی مقام را

(پس پردہ رموز مست رندوں سے ہی پوچھے کیونکہ بلند مرتبہ زاہد کا تو یہ مقام ہی نہیں)

لکھا تھا۔ دوہرہ۔

سینی کر وریم پل جہاں زیبائی
دیکھو کا رج بنہ کو چوکچٹ پٹمی دہائی

اس دوہرے کے حسن تقابل کے متعلق کیا لکھوں تاہم میرے ناتواں دل میں یہ آیا۔

سات سمندر پم کنی پنت اکم اپار
کپست تھئی یہ کئی بہر لا کی اردار

آپ نے تحریر فرمایا۔ ولا تضربوا للہ الامثال الخ میں عرض کرتا ہوں وللہ المثل الاعلیٰ اور یہ جو شعر ہے کہ۔

وغنی بی منی قلبی فغنیت کما غنی
وکنا حیث ما کانوا و کانوا حیث ما کنا

اس سے وفاق مراد ہے فراق نہیں!

حضرت شیخ احمدؒ جو کہ مکتوب الیہ کے دادا اور بزرگ ہیں کے مضمون عالی میں کوئی تشبیہ اور مثال نہیں دی گئی جیسا کہ ان کے اقتباس سے ظاہر ہے۔

چہ گوئیم با تو از مرغی نشانہ   کہ با عنقا بود ہم آشیانہ
زعنقا ہست نامی پیش مردم   ز مرغی من بود آں نام ہم گم

ان اشعار میں مرغ اور اس کی عنقا کے ساتھ ہم آشیانی سے مراد ذات اقدس کا علو شان ہے فکلامکم منطق الطیران لم یفھم غیر فلا خیر۔

تحریر تھا کہ پیشوائے محبان نے زخم لن ترانی کو برداشت کیا، میرے نزدیک اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ اس دنیا کی زندگی میں دیدار باری تعالیٰ نہیں کر سکتے لیکن اس گروہ کے لئے ایک دوسری زندگی بھی تو ہے، آپ نے لکھا کہ ''دنیائے محبوبیت کے سرتاج نے بھی لیس لک من الامر شیئ کی صدا سنی'' میرے خیال میں اس کا شان نزول ایصال ہے نہ کہ وصال، کیونکہ اس کے بلند مرتبے کی شان تو یہ ہے کہ دنیٰ فتدلیٰ فکان قاب قوسین او ادنیٰ۔

مکتوب گرامی میں آپ نے لکھا کہ ''جسے خلعتِ کلام (موسیٰ علیہ السلام) سے نوازا گیا اس نے یہ صدا بلند کی یضیق صدری ولا ینطلق لسانی'' میرا خیال ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ میں

معانی کے حقائق اور مکشوفات کے اسرار بیان کرنا چاہتا ہوں لیکن میری زبان جو انگارۂ فرعون کی وجہ سے جل کر توتلی ہوگئی ہے میرا ساتھ نہیں دیتی۔ اسی وجہ سے میں تنگ دل ہو جاتا ہوں۔ اسی مفہوم کی دلیل یہ ہے واحلل عقدة من لسانی یفقھوا قولی اور اسی طرح یہ آیت واخی ھارون ھو افصح منی فارسل معی رداء کیونکہ دعوت تبلیغ وارشاد کا فریضہ فصیح و بلیغ آدمی ہی بہتر طور پر انجام دے سکتا ہے۔

مکتوب میں مرقوم تھا کہ ''جسے جوامع الکلم کی دولت عنایت کی گئی اس نے بھی لا احصی ثناء علیک کا نعرہ لگایا۔ میرے نزدیک احصا سے مراد یہاں پر پوری طرح شمار ہے اور معنی یہ ہے کہ تیرے تمام کمالات عیاں میں داخل نہیں اور ثناء و بیان عیاں کے بعد ہوتے ہیں جیسا کہ یہ حدیث دلالت کر رہی ہے جس کا آخری ٹکڑا آپ نے چھوڑ دیا تھا۔

''انت کما اثنیت علی نفسک''میں نے بیان کیا تھا کہ ما من عیان الا وله البیان، اس پر دلیل قرآن مجید کی آیہ کریمہ ہے''الرحمن علم القرآن خلق الانسان علمه البیان ،اس کا مفہوم یہ ہے کہ حق تعالی نے محض اپنی رحمت سے قرآن سکھایا جو تمام ذاتی ،صفاتی، اور افعالی معارف کا مجموعہ ہے اور اس نے انسان کو پیدا کر کے اسے باقی تمام حیوانات سے اس بیان کی خصوصیت کی وجہ سے ممتاز بنایا، جس پر پورا قرآن مجید مشتمل ہے۔ والا نامہ میں مرقوم تھا جو عیان سے بالا ہوگا وہ بیان سے خالی ہوگا۔ میں عرض کرتا ہوں یہ درست ہے لیکن یہ اس قول کے منافی نہیں جس کا مفہوم یہ ہے کہ جو عیان کے ذیل میں آتا ہے وہ بیان میں داخل ہوتا ہے، آپ نے تحریر فرمایا'' کہ دیگر عیاں راچہ بیاں'' اس کے بارے میں عرض ہے کہ صاحب عیان کے لئے بیان کی حاجت نہیں اور جو صاحب عیان نہیں وہ بیان کا محتاج ہے یہ اور ہے وہ اور! اور آپ کا اس قول کہ ''ہم کنہ ذات اور اس کے ادراک کی کیفیت کے حصول کے قائل نہیں ہیں'' کے متعلق میرا نظریہ یہ ہے کہ عطف اور ارجاء کی وجہ سے اثبات کیفیت لازم ہو جاتا ہے چاہے وصول کے لئے ہو یا ذات کے لئے! اور آپ نے یہ جو لکھا ہے کہ ''کسی ایسے مرتبے تک پہنچ جانا کہ اس سے بالا کوئی مرتبہ تصور میں ہی نہ آسکے محال ہے'' بالکل صحیح ہے مگر صفات کی سیر میں، لیکن ذات بلا اعتبارات کے وصول کے بعد تو کوئی مرتبہ متصور ہی نہیں (اور یہاں عرفا پہنچتے ہیں) لیس وراء العباد ان قریة

مکتوب میں لکھا تھا کہ "عشق بازوں کی دیوانگیاں ہیں" میں کہتا ہوں کہ مجھے عشق سے کیا سروکار جبکہ عشق حجاب ہے اور عاشق و معشوق رخ حقیقت کا نقاب! اور اس کے علاوہ یہ کہ عشق قلوب میں ایک ایسی آتش ہے جو محبوب کے علاوہ سب کچھ بھسم کر ڈالتی ہے۔ بس کیا ہی اچھا جنوں ہے اور کیا ہی خوب مجنون! کلام قدسی میں ہے انت عشقی وانا عشیقک یا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)۔

دردِ عشق آمد دوائے ہر دِلے　　　حل نشد بے عشق ہرگز مشکلے

گر عشق ہمیں مونس وہم خانہ ماست　　　غمہا ہمہ یک جرعہ پیمانہ ماست

(ہر درد کی دوا دردِ عشق ہے۔ عشق کے بغیر کوئی مشکل آسان ہی نہیں ہوتی، اگر یہی عشق میرا مونس وہم خانہ ہے تو سارے غم میرے پیانے کا ایک گھونٹ ہیں)

از عقل فرد گزر کہ در عالم عشق　　　او نیز غلام دلِ دیوانہ ماست

(عشق میں عقل سے بے پرواہو کر چل کیونکہ یہ بھی میرے دل دیوانہ کا غلام ہے۔

آپ کا یہ قول کہ یہ (گذشتہ بحث) رویت اخروی کی طرح ہے کہ جس پر ہم ایمان تو رکھتے ہیں لیکن اس کی کیفیت سے سروکار نہیں اور کیفیت رویت کے بارے میں صریح ہے اور وصول کے لئے مثدث کو مستلزم ہے اور یہ دونوں کیف ہیں۔

مکتوب گرامی میں تحریر تھا کہ "اسم ورسم سے گزر کر غیب اور تنزیہ مطلق کو اپنی توجہ کا قبلہ بنانا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ عزائم کی بلندیوں کو پسند فرماتا ہے" آپ کی اس تحریر سے اس طرف اشارہ ہے کہ آپ توحید میں بند ہو کر رہ گئے ہیں جو اس راہ کا وسط ہے اور ایسے میں ہی مغلوب الحال ہو گئے ہیں، گویا آپ نے یہ سمجھ لیا ہے کہ اس سے آگے کچھ نہیں، مزید ترقی کی کوشش کیجئے اور جان لیجئے کہ میرا اور میرے بلند ہمت احباب کا یہی مشرب ہے، اسم ورسم سے بے نیاز گزر کر تنزیہ مطلق کو اپنی توجہ کا قبلہ بنانے کے بارے میں آپ نے جو فرمایا ہے اس کے متعلق میں مزید عرض کرتا ہوں کہ اسم ورسم کے بغیر تو توجہ کا حاصل ہونا ہی محال ہے کیونکہ توجہ کے لئے متوجہ اور متوجہ الیہ کا ہونا ضروری ہے جبکہ متوجہ کی ذات بالا تفاق رسم اور خود لفظ متوجہ اسم ہے تو یہ کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ اسم ورسم کے بغیر توجہ کو مقام تنزیہ پر مرکوز کر دینا چاہئے اور اسی طرح تنزیہ اگرچہ ذات کے قریب ترین مقامات میں سے ہے، مگر در حقیقت تو نہ کوئی مقام ہے اور مقیم، ان اللہ یحب معالی المھم،

آپ کا یہ کہنا کہ مقصود وصول ہے نہ کہ حصول، میرے خیال میں صوفیا کے قول "صعب الحصول" کی طرف اشارہ ہے لیکن میں کہتا ہوں کہ یہ تو وصول کی خبر ہے اور جہاں تک شیخ کبیر قدس سرہ (حضرت مجدد الف ثانیؒ) کے کلام کا تعلق ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ معارف دقیقہ اور حقائق غریبہ پر مشتمل ہے لیکن آپ نے ان کے کلام کے آخر میں جو یہ جملہ لکھا ہے کہ انتھی کلامہ القدسی (ان کا قدسی کلام یہاں ختم ہوا) یہ الفاظ (کلام قدسی) صرف اللہ تعالیٰ کے کلام کے لئے مخصوص ہیں اس کا اطلاق تو اس کے انبیاء و اصفیاء پر بھی نہیں کیا جا سکتا چہ جائیکہ ایک ولی کے کلام کے بارے میں ان کا استعمال کیا جائے۔

میرے دوست! آپ سے یہ حقیقت مخفی نہیں کہ مقربین کے لئے قیود، ابدی حزن و یاس اور حرمان سرمدی کی عبارات کا استعمال جبکہ نصوص بھی اس کے حق میں نہیں، طالبین کے جذبہ طلب کو کمزور کرتا ہے ہمیں تو بندوں کو یہ سمجھانے کا حکم دیا گیا ہے کہ ان کا رب ان سے قریب ہے وہ اس کی طرف میلان کیوں نہیں کرتے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے اذا سالک عبادی عنی فانی قریب اور اسی طرح کلام قدسی میں ہے قربونی الی عبادی ولا تبعدونی (مجھے میرے بندوں سے قریب لاؤ میرے اور ان کے درمیان فاصلے نہ بڑھاؤ)۔

گفتم ملکا! ترا کجا جویم من — در خلعت وصف تو چہا گویم من
گفتا کہ مرا مجو بر عرش و بہشت — نزد دل خود جو کہ بر تو یم من

(میں نے عرض کیا اے بادشاہ! تجھے کہاں تلاش کروں اور تیری خلعت وصف کے متعلق کیا بیان کروں؟ تو جواب ملا کہ مجھے عرش پر تلاش کر اور نہ بہشت میں اپنے دل کے قریب ڈھونڈو کہ میں تمہارے اندر ہوں)

میرے دوست! آپ نے جو کچھ مجھے لکھا وہ محض جذبہ خیر خواہی کا اظہار تھا، اللہ تعالیٰ آپ کو سلامتی کے ساتھ باقی رکھے اور اسی طرح جو کچھ میں نے آپ کی خدمت میں تحریر کیا وہ بھی محض جذبہ محبت، خلوص اور یک جہتی کی بنا پر"۔

کاتب الحروف (شاہ ولی اللہ) کہتا ہے کہ ان کے قول کہ "اس دوہرے ع مینھی کرد الخ کے حسن تقابل کے بارے میں کیا لکھوں" کی وضاحت یہ ہے کہ یہ دوہرہ آپ کے دعویٰ کے

مخالف ہے البتہ ایک خاص صورت میں صرف عشاق کے لئے فائدہ مند ہے ان (حضرت شیخ) کا یہ قول کہ دل ناتواں میں یہ آیا ع سات سمندر الخ یہ دوہرہ پہلے دوہرے کے برعکس فنا و بقا دونوں کی حقیقت کو بیان کرتا ہے، اسی طرح ان کا یہ قول کہ "**علی تقادیر العطف والارجاء یلزم الخ** بھی تشریح طلب ہے اور وہ یہ کہ کیفیت میں ضمیر مجرور تاویل شی کے ذریعے یا وصول کی طرف راجع ہے یا ذات کی طرف یا عطف یا تو وصول پر ہے یا کنہ ذات پر، پس اس جگہ نحوی اعتبار سے چار تقدیریں ہیں، پہلی یہ کیفیت وصول کے ادراک کو مانع ہے، یہ کیفیت ذات کے اثبات پر دلالت کرتی ہے۔ تیسری کیفیت ادراک وصول کے وصول کی نفی کرتی ہے اور پہلی تقدیر کی طرح ہے۔ چوتھی تقدیر کیفیت ذات کے ادراک سے وصول کو روکتی ہے اور دوسری بھی اسی طرح ہے۔

جب یہ مکتوب شیخ عبدالاحدؒ کے پاس پہنچا تو انھوں نے پھر اس کا جواب لکھا جو یہ ہے۔

مکتوب شیخ عبدالاحدؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم: تمام تعریفیں اس ذات کے لئے ہیں جو اپنے باطن میں ظاہر ہوئی اور اپنے ظاہر میں بھی باطن بن کر رہی اور جس نے عدم کے گھٹاٹوپ اندھیروں کو اپنے نور وجود اور وجود نور کے ساتھ منور کیا، اور درود و سلام اس ذات گرامی پر جس کا نور تمام موجودات سے پہلے اور جو تمام حمد کرنے والوں سے بڑھ کر حمد کرنے والے ہیں، اور اسی طرح ان کی آل، اصحاب اور تابعین پر بھی درود و سلام ہوں، جب تک تخلیق آدم اور رکوع و سجود جاری ہیں بلکہ ابدالآباد تک۔

حقائق عرفا اور دقائق علماء پر مشتمل آپ کا مکتوب گرامی وصول ہوا، جس میں قیمتی نکات معرفت، بلند اسرار معرفت کے ساتھ ساتھ کئی طرح کی عنایات اور اعزازات کا اظہار بھی تھا چونکہ آپ کے والا نامہ میں ہمارے خط کے کئی مضامین پر تبصرہ تھا اس لئے ہم اپنی کوتاہیوں اور قصور فہم کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے خط کے لہ و ما علیہ کے متعلق کچھ عرض کرتے ہیں۔ بزرگوں کے ہاں عذر معتبر اور اصلاح و ہدایت ان کا طریقہ ہے۔ سلام و دعا کے بعد ہم کہتے ہیں کہ ہمارا یہ قول کہ "**اما فی الوجد ان فھو سبحانہ وراء الوراء ثم وراء الوراء**" بالکل بے غبار ہے اور ایک نکتہ جو کہ اکابرین میں سے بعض بزرگوں سے صادر ہوا خرازؒ نے بیان کیا، جس کے بارے میں سید الطائفہ نے فرمایا کہ "وہ ایک ایسی انتہا ہے جس سے آگے کچھ نہیں"۔ اور سید الطائفہ وہ بزرگ ہیں

جن کے متعلق شیخ اکبرؒ نے فرمایا کہ وہ حق کی زبان ہیں اور یہ وہ بزرگ ہیں جن کے بارے میں شیخ الشیوخ نے کہا کہ ''شیخ اکبرؒ تو ایک ایسا سمندر ہیں جس کا کنارہ نہیں'' اور وہ نکتہ یہ ہے کہ ''الوجد عند وجود الحق مفقود''۔ باقی آپ کا یہ فرمانا ھذا بالنسبة الی الاکثرین الخ اس کے متعلق عرض ہے کہ یہ بالنسبة الی الاکثرین نہیں بلکہ بالنسبة الی الکل ہے۔ کیونکہ یہاں پر وجدان سے مراد کنہ کا ادراک، احاطہ اور اس کا ذہنی حصول ہے جبکہ وہ وجدان کہ جو اس قید میں مقید نہیں، اس کا بالنسبة الی الاکثرین ہونا جائز اور درست ہے۔

آپ کا یہ کہنا کہ ''آپ کی عبارت میں معانقے کی آرزو کا اظہار ہے جبکہ میرے ہاں اس کے حصول کی طرف اشارہ ہے''۔ تو اس سلسلے میں میں عرض کرتا ہوں کہ جس کی تمنا اور آرزو کی جارہی ہو، اس کا مرتبہ اس سے بلند ہے جو حاصل ہو چکا ہے، اور جب یہ مامول ہی (جس کی آرزو کی جارہی ہے) اس محصول کی طرح آسان ہو گیا تو ہم نے وصول کے لئے محصول پر اکتفا ہی نہیں کیا آپ نے لکھا ہے۔

عبارا تنا شتی وحسنک واحد
وکل الی ذاک الجمال یشیر

کہنے والے نے کیا ہی خوب کہا ہے جیسا کہ علائی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: ۔

ندانم آں گل رعنا چہ رنگ و بو دارد
مرغ ہر چمنی گفتگوئی او وارد

(مجھے معلوم نہیں کہ وہ پھول کیسی رنگت و بو کا ہے کہ ہر چمن کے پرندے کی زبان پر جس کا ذکر ہے)۔

لا کہہ سہیلی ایک پیوجھو دس پی پی ہوئی
نا جانو کس را نوسی کن سہاگن ہوئی

ہمارے اس قول کہ ما للتراب ورب الارباب کے بارے میں آپ کو یہ کہنا کہ ''یہ تادباً تھا اور تفضّل دوسری چیز ہے'' کے متعلق عرض ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام بہتر نمونہ ہیں، ولکم فی رسول اللہ اسوة حسنة۔ ہمارا یہ کہنا کہ ابدی

حزن واندوہ مقربان بارگاہ کا دامن گیراور وصال مطلق سے یاس وحرمان سرمدی خاصۂ خاصان درگاہ ہے''۔اس پرآپ نے یہ فرمایا حزن ابدی چاہے وہ کسی بناپر بھی کیوں نہ ہو مستقل الم اور عذاب ہے اور یہ تو عام مومنین کے لائق شان بھی نہیں چہ جائیکہ مقربین کی بات کی جائے اوراس کے ساتھ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ یہ نظریہ نصوص قطعی کے بھی خلاف ہے، میں عرض کرتا ہوں کہ یہاں کئی مباحث ہیں خیال ہے کہ ان میں سے ضروری باتیں بیان کردی جائیں تاکہ یہ عقدہ پوری طرح کھل جائے۔آپ سے یہ امر مخفی نہیں کہ ابد وسرمد کا اطلاق جس طرح خلود پر ہوتا ہے بالکل اسی طرح مدت زندگی پر بھی ان کا استعمال ہوتا ہے جیسا کہ لغت وعرف اس پر شاہد ہیں، چنانچہ فرمان خداوندی ہے:''و لا تقبل لهم شهادة ابدا''۔

تو خلاصہ کلام یہ کہ محبت کے لئے حزن وغم کا ہونا اور وصال مطلق سے ناامیدی جو کہ عظمت محبوب کے مشاہدے سے پیدا ہوتی ہے مقربین کا خاصہ ہے اور جب تک وہ اس زندگی کی قید میں رہیں ان کی یہ حالت قائم رہتی ہے چاہے وہ تجلیات اور مشاہدات کے اعزاز سے بھی مشرف ہو جائیں اس کے برعکس جس کا وعدہ کیا گیا ہے (حیات اخروی میں) وہ اس موجودہ زندگی سے کہیں بہتر ہے، ارشاد خداوندی والآخرة خير لك من الاولىٰ ۔اوراسی طرح فرمان ربی من كان يرجوا لقاء الله فان اجل الله لآت میں اسی طرح اشارہ ہے، پھر یہ حزن ویاس جو کہ مراتب ظلال سے نکل کر اصول تک پہنچنے کے بعد اور مدارج صفات سے ترقی پاکر حضرت ذات تک رسائی حاصل کر لینے کے بعد حاصل ہوتا ہے ایک ایسا خاصہ ہے جوان مراتب پر فائز اصحاب کے علاوہ کسی اور میں نہیں پایا جاتا۔

فرعون را نہ دادیم اے دوست! دردسر
زیرکہ او نداشت سر درد ہائے ما

(اے دوست! میں نے فرعون کواس لئے دردسر نہیں دیا کیونکہ اس کے سر میں میری محبت کا سوداہی نہیں تھا)

اے عارف باللہ! درحقیقت یہ تو مدح ہے مگر اس میں ذم کا پہلو ہے اور ایسا کمال ہے جو نقص سے مشابہ ہے۔ اللہ تبارک وتعالی کا یہ فرمان اسی قبیل سے ہے **انہ کان ظلوما جھولا**۔ لیکن کتنی عجیب بات ہے کہ آپ نے محض نام کی شراکت کی بنا پر اسے دشمنوں کا حصہ قرار دے دیا، اور دوستوں سے اسے بعید بتایا، پھر آپ نے اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اپنے دعوے کے ثبوت میں قرآنی آیات بھی پیش کیں اور ان میں سے ایک یہ ہے **لا خوف علیکم الیوم ولا انتم تحزنون** اس کے متعلق عرض ہے کہ یہاں آپ کے لئے لفظ الیوم (۱) سے زیادہ فصیح و بلیغ کوئی جواب ہو ہی نہیں سکتا اور اس کے بارے میں پیچھے ہم اشارہ کر آئے ہیں، اسی طرح دوسری آیت یہ ہے **الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون** یہ بھی تفاسیر کے مطابق آخرت سے متعلق ہے اہل حقائق نے بھی اسے منجملہ آخرت کی بشارتوں میں سے قرار دیا ہے یہاں تک کہ ان میں بعض نے تو ولایت سے متعلق ولی کے علم کے جواز کو بھی ممنوع قرار دیا ہے کہ یہ عبودیت سے لازم خوف کو زائل کر دیتا ہے، جیسا کہ تعرف میں موجود ہے اور انہی آیات میں سے ایک یہ ہے **فاما ان کان من المقربین فروح وریحان وجنة نعیم** (۲) لیکن میں عرض کرتا ہوں کہ اس سے تو کسی قسم کا استدلال ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ راحت اور ریحان کا تو عالم اخروی میں ہی مقربین کے لئے ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جس کا انکار کوئی بھی نہیں کرتا اور آپ کی پیش کردہ آیات میں سے ایک یہ ہے **انہ لاییأس من روح اللہ الا القوم الکافرون** اس کے بارے میں عرض ہے کہ اس سے کس طرح استدلال کیا جا سکتا ہے کیونکہ اگر روح سے بحیثیت مجموعی اس کے تمام اقسام مراد ہیں تو اس صورت میں اس کے بعض اقسام سے ناامیدی میں کوئی مضائقہ نہیں اور اگر اس سے مراد سلب کلی کے طور پر ہر ہر فرد ہے تو یہ بالاجماع غلط اور باطل ہے اس لئے کہ روح (رحمت) کی اقسام میں سے تو رسالت، نزول وحی، اور ایسی دوسری

---

(۱) یعنی 'الیوم' سے مراد یوم قیامت اور اخروی زندگی ہے۔ (۲) س: واقعہ ت: ۸۸

باتیں بھی ہیں کہ جن سے یاس ونا امیدی فرض ہے اور ایمان کا حصہ ہے اور اگر اس سے مراد (روح کی) بعض اقسام ہیں، تو یہ دو صورتوں سے خالی نہیں یا تو یہ معین ہیں اور ایسی صورت میں ان کے بیان کی ضرورت نہیں یا پھر غیر معین ہیں تو مطلق قرار پائیں گی اور یہ دونوں صورتیں آپ کے لئے سود مند نہیں۔

اے عارف باللہ! جس طرح امید کے بغیر محض یاس اس آیت میں کفر ثابت ہوئی ہے اسی طرح امن مطلق بھی کفر ہے ارشاد باری ہے لا یامن مکر الله الا القوم الخسرون اور دوسری جگہ ارشاد ہے وخافون ان کنتم مومنین اور اسی لئے کہا گیا ہے الایمان بین الخوف والرجاء اور اس سے پہلے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کی طرف اشارہ کر چکا ہوں کہ ان الله یحب کل قلب حزین اور دوسری جگہ فرمایا من اراد الله به خیرا جعل فی قلبه نائحة اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں حدیث میں آتا ہے انه کان دائم الحزن ومتواصل الفکر، اور آپ کے متعلق یہ بھی ہے کہ نماز میں گریاں رہتے اور اس طرح غمگین واندوہ گیں ہوتے لیکن ترش روئی قریب نہ پھٹکتی۔

حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق روایت ہے کہ ایک دفعہ آپ رو رہے تھے کہ جبریل امین نے نازل ہو کر عرض کیا "رب تعالیٰ نے آپ کو سلام بھجوائے ہیں اور اس گریہ وزاری کا سبب پوچھا ہے (حالانکہ وہ عالم کل ہے) آپ نے فرمایا دوزخ کے خوف سے رو رہا ہوں، تھوڑی دیر بعد جبرئیل امین پھر حاضر ہوئے اور کہا اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے انه لم نجعلها لاولیائ (ہم نے دوزخ اپنے دوستوں کے لئے نہیں بنائی) اس بات سے حضرت داؤد علیہ السلام مطمئن ہو گئے، کچھ وقت گزرا تو وہ پھر گریہ وزاری کرنے لگے۔ حضرت جبرئیل نے حاضر ہو کر رونے کا سبب پوچھا۔ تو انھوں نے فرمایا کہ شوق جنت میں رو رہا ہوں۔ اس پر جبرئیل امین نے کہا اللہ تعالیٰ نے فرمایا انی جعلتها لاحبائی (جنت میں نے اپنے پیاروں کے لئے بنائی ہے) یہ بات سن کر حضرت داؤد کو پھر سکون آ گیا، کچھ دیر بعد انھوں

نے پھر رونا شروع کر دیا، جبریل امینؑ نے آ کر حسب سابق پھر رونے کا سبب پوچھا تو انھوں نے فرمایا: میں ذات باری کے شوق وصال کی تمنا میں رو رہا ہوں، جبرئیل نے کہا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے شوق وصال کی تمنا میں جس وقت تک چاہو گریہ وزاری کرو۔ اس پر کوئی پابندی نہیں۔ زندگی کا جنگل تو طے ہو گیا، لیکن عشق کے دشوار گزار راستے ہیں کہ جن کا کوئی انجام نہیں، نمونے کے طور پر ہم نے مشائخ عظام کے جو اقوال نقل کئے ہیں ان میں سے ایک قول خواجہ عبدالخالق غجدوانی (اللہ ان کے مزار کو معطر رکھے) کا ہے جو یہ ہے "وصیت می کنم ترا ای پسر من بکذا وکذا الی ان قال باید کہ دل تو ہمیشہ اندوہ گین باشد وچشم تو گریاں وعمل تو خالص ودعاء تو بتضرع ولنعم ما قیل۔

اے خدا درد مرا درماں مکن

درد منداں راز بے درداں مکن

(اے بیٹے میں تجھے وصیت کرتا ہوں کہ تیرا دل ہمیشہ اندوہگیں اور آنکھ ہمیشہ تر رہنی چاہئے، تیرا عمل خالص اور تیری دعا میں عاجزی ہونی چاہئے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے اے اللہ میرے درد کا چارہ نہ کر اور دردمندوں کو درد سے محروم نہ کر)

حضرت سری سقطی (۱) (اللہ ان کی قبر کو منور فرمائے) نے فرمایا ہے "میرے لئے دن اور رات دونوں میں کوئی خوشی نہیں اس لئے میں دن کی پروا کرتا ہوں اور نہ رات کی کیونکہ جیسے یہ خوشی شریعت میں کجروی کا باعث بنتی ہے ویسے ہی یہ طریقت میں تنزل کا سبب بنتی ہے۔ یہ بعض ایسے حقائق پر پردہ ڈالنے سے کنایہ ہے جو کہ اور حقائق کا پتہ دیتے ہیں" آپ نے لکھا ہے۔

---

(۱) سری نام، ابوالحسن کنیت، آپ حضرت معروف کرخیؒ کے نامور مرید اور خلیفہ تھے۔ اپنے عہد کے مقتدائے زماں، شیخ وقت، صاحب علم اور امام طریقت تھے۔ خوردہ فروشی کی دکان تھی اس لئے سقطی مشہور ہو گئے۔ سید الطائفہ نے فرمایا کہ عبادت میں سری سقطی سے زیادہ کامل میں نے کسی کو نہیں پایا۔ عراق وعجم کے اکثر مشائخ آپ کے حلقۂ ارادت میں شامل تھے ہر روز ایک ہزار نوافل ادا کرتے تھے۔ آپ کا درجہ پیر پیراں اور شیخ الشیوخ کا ہے۔ آپ نے رمضان ۲۵۰ھ میں وصال فرمایا۔ مزار قبرستان شونیز بغداد میں مرجع خلائق ہے تاریخ وصال قطب الحق ہے (۲۵۰ھ)

سات سمندر پیم کے نپت اگم پار
کچ پت تہی کی بہرلا کی اردار

میں عرض کرتا ہوں کہ یہ جیسے کہ پیچھے گزر چکا ہے ذات باری کے استغنا اور اس کی کبریائی کی بات ہے، اس پر میرے ذہن میں وہ شعر موزوں ہو گئے ان میں سے ایک تو اسی مضمون کا ہے اور دوسرا اس کے جواب میں ہے، عجیب بات یہ ہے کہ اس سے قبل ہندی زبان میں کبھی میں نے کوئی شعر نہیں کہا، دوہرہ۔

سات سمندر پار پیو ہوں اکیانی نار
نہیں نہیں بنا کھوتی کسمس اتروں پار

پیم سمندر رے سکھی تہاہ نہیں جس دھار
پار لگی لے لاکھوں لوگ بیکس اروار

ہم نے کہا تھا لا تضربوا للہ الامثال ، آپ نے فرمایا وللہ المثل الاعلیٰ میں عرض کرتا ہوں کہ یہ آیت اپنی جگہ مکمل اور سابقہ آیت کریمہ کے لئے دلیل ہے۔

آپ نے لکھا ہے کہ لن ترانی سے مراد ان آنکھوں سے اس دنیا میں دیدار کی ممانعت ہے لیکن اس گروہ کے لئے ایک اور جہان بھی تو ہے، میں کہتا ہوں کہ یہ بات درست ہے کہ اس گروہ کا ایک دوسرا عالم بھی ہے جیسے کہ ہمارے والد گرامی نے قول خداوندی بل ھم فی لبس من خلق جدید کی تاویل اس طرح کی ہے یعنی وہ حقائق اور اسرار کے ادراک سے محجوب ہیں اور اس کی وجہ ان کی وہ امیدیں ہیں جو انھیں نئی زندگی، ولادت ثانیہ اور فنا کے بعد وجود ثانی چاہے وہ رذائل سے بھرا ہوا بھی کیوں نہ ہو، کے بارے میں ہیں، لیکن پھر بھی استغنا کی منزل دور ہے۔

تعرف میں کہا گیا ہے کہ اس بات پر اجماع ہے کہ اس دنیا میں نہ تو ان ظاہری آنکھوں سے ذات باری کا دیدار کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اسے قلوب کی حقیقی آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ ابن العربی قدس سرہ نے فرمایا ہے۔ تجلی ذات متجلی لہ کی

صورت ہی میں ظاہر ہوتی ہے پس متجلیٰ لہ نے حق کے آئینے میں جو کچھ دیکھا وہ اس کی اپنی صورت کے علاوہ کچھ نہ تھا، اس نے حق کو دیکھا اور نہ ہی اس کا دیکھنا ممکن ہے ویحذرکم اللہ نفسہ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسی زندگی میں اس نشاۃ کے ثبوت کا اقرار کیا، ہمارے قول ''سر دفتر محبوبان ندا لیس لک من الامر بشنید'' کے بارے میں آپ کا یہ کہنا کہ اس کا شان نزول ایصال ہے وصول نہیں، تو اس بارے میں عرض ہے کہ اصل امر کلمۃ اللہ ہے۔ اللہ تعالی نے فرمایا: ما کنت تدری ما الکتاب وللایمان ولکن جعلناہ نوراً نھدی بہ من نشاء من عبادنا الخ ہمارا یہ قول کہ ''جسے اس نے خلعت کلام سے نوازا وہ بھی پکار اٹھا کہ میرا دم گھٹتا ہے اور میری زبان نہیں کھلتی'' کے متعلق آپ نے یہ تشریح فرمائی کہ میں حقائق معانی اور دقائق معرفت بیان تو کرنا چاہتا ہوں لیکن میری زبان جو انگارۂ فرعون کی وجہ سے جل گئی ہے میرا ساتھ نہیں دیتی، اس کے متعلق میرا خیال ہے کہ یہ ساری باتیں تفسیر سے متعلق ہیں اور کوئی مسلمان اس کا انکار نہیں کرتا، مگر جو ہم نے بیان کیا ہے یہ بات تو راسخین کی ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، لکل حرف ظھر وبطن فمنھم من اکتفی بالظھر فاھتدیٰ ومنھم من نفدت بصیرتہ الی البطن فکان اھدیٰ لکل وجھۃ ھو مولیھا فاستبقوا الخیرات (ہر حرف کے دو پہلو ہوتے ہیں ظاہر اور باطن جس شخص نے ظاہر پر اکتفا کیا اس نے ہدایت حاصل کر لی اور جس کی بصیرت باطن پر مرکوز ہوگئی تو اس نے ہر سمت میں ہدایت کاملہ پالی، پس اچھائیوں کی طرف بڑھو) ہمارے اس قول کہ جسے اس نے جوامع الکلم عنایت کئے اس نے بھی ندائے لا احصی ثناء علیک بلند کی، کے بارے میں آپ نے فرمایا کہ حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ آپ کے تمام کمالات عیاں کے ذیل میں داخل نہیں ہو سکتے، جبکہ ثنائے کامل عیان کے بعد ہی ہوسکتی ہے، میں عرض کرتا ہوں کہ ہمارا مقصود بھی بالکل یہی معنی ہے۔ آپ کا یہ فرمانا کہ نفی بھی قید کی طرف لوٹتی ہے اور وہ یہ ہے کہ انت کما اثنیت علیٰ

نفسک ہم کہتے ہیں کہ یہ بات علی الاطلاق نہیں ہے جیسے کہ انھوں نے قول خداوندی ولاتاکلوا الربا اضعافا مضاعفة میں ذکر کیا اس صورت میں نفی کو قید کی طرف لوٹانا مسلم بات ثابت نہ ہوئی بلکہ یہ خود ایک مختلف فیہ مسئلہ بن گئی جیسا کہ حواشی شرح مطالع وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے اور اگر بالفرض اسے مان بھی لیا جائے تو بھی یہ ہمارے مقصود کے خلاف نہیں بلکہ الٹا اس کی موئید ہے ہمارا یہ کہنا کہ عیان راچہ بیاں اور اس پر آپ کا یہ تبصرہ کہ صاحب عیان کو بیان کی حاجت نہیں ہوتی اور جو صاحب عیاں نہ ہو اس کو بیان کی ضرورت ہوتی ہے۔" یہ اور ہے اور وہ اور" اس بارے میں ہم کہتے ہیں کہ ہمارا یہ قول آیۃ کریمہ ذالک الکتاب لاریب فیه کے قبیل سے ہے ہمارا یہ کہنا کہ کسی ایسے مرتبے تک پہنچنا کہ جس سے اوپر کسی مرتبے کا تصور بھی نہ کیا جا سکے، محال ہے، یہ بات آیت کریمہ قل رب زدنی علما اور حدیث انکم لن تستطیعوا ان تغلبوا هذا الدین سے ماخوذ ہے، پھر اس پر آپ کا یہ فرمانا کہ یہ تو سیر صفات کی بات ہے لیکن حضرت ذات سے وصول کے بعد تو فوق کا تصور یقیناً محال ہے میں عرض کرتا ہوں کہ سیر صفات سے انقطاع کے بعد اجمالی طور پر وصول الیٰ حضرات الذات تو ممکن بلکہ واقع ہے، البتہ اس سے آگے بڑھنا عقلا اور نقلا محال ہے، آخر حق تک رسائی کے بعد آگے بڑھنا گمراہی نہیں تو کون سی خوبی ہے، اسی طرح اس کی کنہ کا احاطہ بھی محال ہے کیونکہ اگر طالب بسیط تر ہے تو اس کی ذات وسیع تر اور غیر متناہی ہے چنانچہ سیر واقع جسے محققین سیر فی اللہ کا نام دیتے ہیں، بھی ذات باری کی طرح غیر متناہی ہے اور اس کا طے کر لینا ناممکن ہے:۔

شربت الحب کاسا بعد کاس

فما نفدت الشراب وما رویت

(میں شراب معرفت کے جام پر جام لنڈھاتا رہا مگر نہ شراب ختم ہونے میں آئی اور نہ میں سیر ہوا) ع

بمیر دتشنہ مستسقی و دریا ہم چناں باقی

صاحب تعرف نے کہا ہے القول بالاصلح اس کی قدرت کے لئے نہایت کو ثابت کرتا ہے اور اس سے اس کے خزانوں کے ختم ہونے اور اس کے عجز کی راہ نکلتی ہے تعالی اللہ عن ذالک اس لئے کہ جب وہ ان میں صلاح (خیر) کی آخری اور انتہائی عافیت پیدا کردے تو اس کے بعد مزید صلاح کے لئے کوئی چیز نہیں ہوگی، اب اگر وہ اصلاح کا ارادہ کرے تو کہاں سے ہوگی، اور اس نے جو کچھ ان کو عطا کر دیا ہے اس کے بعد انہیں مزید عطا کرنے کے لئے کچھ بھی نہیں ہوگا جس کے ذریعے وہ ان میں مزید اضافہ کرے حالانکہ خدا تعالیٰ ایسی باتوں سے بہت بلند و بالا ہے۔

یہ بات ذہن میں رہے کہ ایک مقام میں رہتے ہوئے ترقی کرنا اور چیز ہے جب کہ ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف ترقی کرنا بالکل دوسری چیز ہے اور ہم جس بات میں الجھے ہوئے ہیں وہ یہی وہ صورتیں ہیں، جن میں سے ایک ممنوع اور دوسری واقع ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو واصلین ذات میں باہمی کوئی تفاوت نہ ہو اور قرب ذات میں وہ تمام مساوی ہوں اور سب کے سب ایک ہی مقام میں بند ہوں، حالانکہ یہ ساری باتیں غلط ہیں۔ اگر کہا جائے کہ ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ ان میں اس درجہ سے تفاوت ہے بلکہ یہ تفاوت درجات کسی اور بنا پر ہے تو اس کے متعلق ہم عرض کریں گے کہ مرتبہ فوق مراتب کے ممنوع کے بارے میں آپ کے لئے بھی پھر ہمارا یہی جواب ہے۔

اے عارف باللہ! یہاں ترقی وتفوق برآمدے سے مکان اور مکان سے چھت کی طرف ترقی وتفوق کی طرح نہیں، اور اسی طرح سیر وسلوک سے مراد بھی جسمانی حرکت نہیں بلکہ یہ ایک ایسا غیر بیانی اور وجدانی معاملہ ہے کہ جو اس کوچے سے نہیں گزرا وہ اس کی لطافتوں سے باخبر ہو ہی نہیں سکتا۔ اور اس کی تعریف میں زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ ایک حرکت کیفی ہے اور ایک حقیقت سے دوسری حقیقت کی طرف علمی انتقال ہے لیکن یہ مرتبہ صفات کے اعتبار سے ہے مگر مرتبہ ذات کے لحاظ سے تو یہ معرفت اور انکشاف کے ازدیاد اور بطن البطون تک نظر کی رسائی سے عبارت ہے

جیسا کہ اس پر کشف گواہ ہے اور یہی صحیح بات ہے۔ ہمارا یہ کہنا کہ...... یہ بات رویت اخروی کی طرح ہے کہ جس پر ایمان لانے کے تو ہم پابند ہیں لیکن اس کی کیفیت سے ہمارا کوئی سروکار نہیں! اس پر آپ نے فرمایا کہ یہ تو کیفیت رویت کے بارے میں صریح ہے اور وصول کے لئے مثلیت کو مستلزم ہے جبکہ یہ دونوں بے کیف ہیں۔ میں عرض کرتا ہوں کہ یہ تو عدم کیفیت کی تصریح ہے کیونکہ کیفیت سے سروکار نہ رکھنے کی ممانعت سے اصل مقصود کیفیت کا انتفا ہے عبارات میں اس قسم کے تسامحات اکثر و بیشتر واقع ہوتے رہتے ہیں، جیسا کہ سیاق وسباق خود اس پر دلالت کر رہا ہے! مشائخ کبار میں سے کسی نے کہا کہ ذات باری مجہول الکیفیت ہے یعنی اس کی کوئی کیفیت نہیں، پھر علم بیان کے قاعدے کے مطابق بعض امور میں مشابہت کی وجہ سے مثلیت بھی ثابت نہیں ہوتی۔ یہ تسلیم کرنے کے بعد عرض ہے کہ وہ بے کیف امور کا آپس میں مماثل ہونا کیفیت کو مستلزم نہیں، جیسا کہ اس کی تمام صفات میں ہے۔

ہم نے کہا تھا کہ ''اسم ورسم سے گزر کر تنزیہ مطلق اور غیب صرف کو قبلہ توجہ بنالینا چاہئے'' اس پر آپ نے فرمایا کہ توجہ متوجہ اور متوجہ الیہ کے درمیان ایک نسبت ہے پس لفظ متوجہ اسم ہے اور ذات متوجہ رسم تو توجہ مطلق ممکن ہی نہیں! تو اس کے جواب میں ہم یہی کہیں گے کہ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اے عارف راہ! جب معرفت وولایت کے دروازے بند ہو جاتے ہیں تو وہ فنائے کلی اور ذات حقیقی کے ماسوا کو مٹا دینے کے بغیر ہرگز نہیں کھلتے اور اگر یہ چیز نہ ہوتو معرفت حاصل ہوتی ہے اور نہ ہی حقیقت کاملہ تک رسائی! جیسا کہ صوفیا نے کہا ہے۔ ؎

ہیچ کس را تا نکردہ او فنا
نیست رہ در بارگاہِ کبریا

کہیں صاحب نزہتہ کا یہ قول دھوکے میں نہ ڈال دے۔

گویند عنان خود چہ تابی　　گم شو کہ چو گم شوی بیابی
ایں نکتہ نمود نا صوابم　　چوں گم شوم آنگہی چہ یابم
یابندہ اگر کسی دگرخاست　　از گم شدنم پس اوچہ میخواست

یہ تمام فلسفیوں کی موشگافیاں ہیں جن میں معارف کا شائبہ تک نہیں، اس لئے سالک کو زیب نہیں دیتا کہ وہ ان پرخار وادیوں میں بھٹکتا پھرے۔

چاہے آپ یہ سمجھتے ہوں کہ اسے (بحث گزشتہ) محققین نے کس مفہوم میں لیا اور اس پر وارد شبہات پر کیسے اعتراضات کئے، اور پھر کس طرح مکمل اور مسکت جوابات دیئے، اگر چہ ان کی گفتگو اتنے سارے تکلفات کے باوجود محتاج تاویل ہے تاہم ہم اس تفصیل میں نہیں جانا چاہتے البتہ یہاں پر عارف کامل حضرت خواجہ احرار (اللہ ان کی قبر کو منور فرمائے) کی تحریر کا ایک اقتباس پیش خدمت ہے جو اس بحث میں نہایت ہی مفید اور کارآمد ثابت ہوگا، آپ نے فرمایا۔

سالک کی ذات وصفات کی فنا کے تحقق کے بعد خدا تعالی اسے ترقی دے کر بقا تک پہنچا دیتا ہے۔ اس وقت وہ اسے نور عطا کرتا ہے جس کے ذریعے وہ ذات حق کا مشاہدہ کرتا ہے، پس اس وقت ذات کے علاوہ اس کا کوئی مشاہدہ نہیں ہوتا تو اس سے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ متوجہ ذات کے لئے تمام اضافات اور اعتبارات کا حذف کرنا لازمی ہے جیسا کہ بیان ہو چکا ہے۔ اور آپ نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے تو اسم ورسم اور اس کے اعتبارات نفس کیونکر حذف نہیں ہوں گے۔

آپ نے فرمایا تھا کہ ''تنزیہہ اگر چہ ذات کے قریب ترین مقامات میں سے ایک ہے، تاہم وہ مقام تو ہے جبکہ حقیقت میں کوئی مقام ہے اور نہ مقیم'' اسی کے بارے میں عرض ہے کہ شاید یہاں حقیقت سے مراد مرتبہ ذات بحت ہے ورنہ بصورت دیگر اس سے (مقام ومقیم کی) نفی کرنا بے معنی ہے، پس وہ ہمارے لئے لطف وعنایت اور توجہ ومہربانی ہے، اور آخرت سے متعلق ہمارے قول کی طرف رجوع والتفات ہے بلکہ محققین کے قول کی طرف راجع ہے جو یہ ہے کہ کنہ ذات ادراک سے بری

ہے اور اضافات واعتبارات سے معرا ہے، پس نہ تو اس کی جانب کوئی اشارہ کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اسے کسی عبارت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے ۔

در افگندہ دف ایں آوازہ از دوست
کز و بر دست دف گویاں بود پوست

(دف نے محبوب کی آواز اپنے اندر ڈال رکھی ہے اور اس پر ہاتھ کے پڑنے سے اس کی کھال بول اٹھتی ہے)

نبی صادق علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا لایخالطہ الظنون ولا یصفہ الواصفون (نہ گمان اس تک پہنچ سکتے ہیں اور نہ واصف اس کے اوصاف بیان کر سکتے ہیں) ذوالنون مصریؒ نے کہا ہے: التفکر فی ذات اللہ جھل والاشارۃ الیہ شرک وحقیقۃ المعرفۃ حیرۃ (خدا کی ذات کے بارے میں سوچ بچار جہالت اس کی طرف اشارہ کرنا شرک اور اس کی معرفت کی حقیقت حیرت ہے)۔

آفاق روشن ومہ تاباں پدید نیست — پر شور عالمی ونمکداں پدید نیست
از مہر تا بذرہ واز قطرہ تا محیط — چوں گوئی درترددوچوگاں پدید نیست

(آفاق روشن ہیں، مگر مہ تاباں کا کہیں نشان نہیں اک عالم زخم ہائے نمک پاشیدہ سے مرغ بسمل کی طرح تڑپ رہا ہے مگر نمکدان کا وجود نہیں ذرے سے لے کر آفتاب تک اور قطرے سے محیط تک گیند لڑھکتا پھرتا ہے لیکن اس کو چلانے والے کا کہیں نشان نہیں)

حسین بن منصورؒ نے کہا ہے کہ قبل اس پر سبقت لے جانے بعد اسے طے کرنے "من" اسے ظاہر کرنے "عن" اس کی موافقت کرنے "الی" اس سے قریب ہونے "فی" اس میں رچ جانے "اِن" اس میں مشورہ کرنے "فوق" اسے پناہ میں لینے تحت اسے گھٹانے "ہذا" اس کا مقابل بننے "عند" اس کی مزاحمت کرنے "خلف" اسے پانے "امام" اسے محدود کرنے "قبل" اسے ظاہر کرنے "بعد"

اس کی نفی کرنے ”کل“ اسے جمع کرنے ”کان“ اسے موجود کرنے اور ”لیس“ اسے مفقود کرنے سے قاصر ہے۔ اس کے قدیم ہونے کو حادث ہونے پر اور عدم کو اس کے وجود پر تقدم حاصل ہے۔ اس کی ذات کسی کیفیت کو قبول کرتی ہے اور نہ کسی تکلف کو، اکابرین میں سے کلاباذی نے کہا مخلوقات میں سے خدا کی بہت زیادہ معرفت رکھنے والا اس کے بارے میں سب سے زیادہ حیران ہوتا ہے۔ ابن العربیؒ نے قول خداوندی وان من شیء الا لیسبح بحمدہ کے بارے میں فرمایا کہ بحمدہ میں ہ کی ضمیر کا مرجع شی ہے کیونکہ کسی کی تسبیح جناب قدس کے شایان نہیں ہوسکتی۔ قونوی (۱) قدس سرہ نے فرمایا ”ذات حق کے بارے میں یہ درست نہیں کہ اس پر کسی قسم کا کوئی حکم لگایا جائے یا اسے کسی وصف سے جانا جائے یا اس کی طرف کسی چیز کی اضافت کی جائے۔ مولوی نے فرمایا ہے ۔

حق منزہ است از ہر اسم ونام — تو چہ می چفشی بہر اسم اے غلام
ہرچہ گویم عشق را شرح وبیاں — چوں بعشق آیم خجل باشم ازاں

صاحب گلشن راز نے کہا: ۔

بود اندیشہ اندر ذات باطل
محال محض وآں تحصیل حاصل

حضرت مجدد الف ثانی قدسنا اللہ بسرہ نے فرمایا میں حیطہ شہود میں آنے والے یا خیال ووہم میں سما جانے والے خدا کو ہرگز نہیں پوجتا میں تو اس لقمے کی طلب میں ہوں جو منھ میں نہ سما سکے۔ جس نے اس حقیقت کو پالیا وہی سمجھدار ہے۔ بعض اہل تحقیق نے موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں کہ جب فرعون نے ان سے ماہیت حق کے متعلق سوال کیا کہ وما رب العلمین؟ موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا رب السموٰت والارض وما بینھما کہا کہ یہ حکیم کا اسلوب ہے جبکہ اس سے حق

---

(۱) صدرالدین نام اور کنیت ابوالمعالی ہے۔ علوم ظاہری وباطنی کے جامع تھے۔ فقہ وحدیث میں تو یکتائے زمانہ تھے۔ شیخ صدرالدین حمو اور مولانا روم سے خاص روابط تھے۔ ۶۳۰ھ میں وفات پائی۔

کی ماہیت کے متعلق دریافت کیا گیا جو کہ ناممکن البیان تھی تو انھوں نے ان نشانیوں کا حوالہ دیا جو اس کی ذات پر گواہ ہیں ۔

جانہا ہمہ آب گشت ودلہا ہمہ خون

تا چیست حقیقت ز پس پردہ روں

کیا ہی خوب ہے کہ چیست کہا کیست نہ کہا۔

ہمارے اس قول کہ مقصود وصول ہے نہ کہ حصول، کے بارے میں آپ نے کہا ہے کہ ''شاید یہ میرے قول صعب الحصول سے مراد لیا گیا ہے۔ ہم اس بارے میں یہ کہتے ہیں کہ آپ کے قول سے نہیں بلکہ قول سبحانہ تعالی **ولا یحیطون به علما** سے مراد لیا گیا ہے۔ آپ نے لکھا ہے کہ نبی کے کلام کو بھی کلام قدسی نہیں کہا جا سکتا چہ جائیکہ ولی کے کلام کو ہم عرض کرتے ہیں کہ اگر تو اس بارے میں کوئی حدیث معتبر موجود ہے تو سر آنکھوں پر ورنہ بصورت دیگر کسی چیز کو حرام قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ اشیاء کی اصل ان کا جائز ہونا ہے احادیث میں حدیث غیر قدسی کو قدسی کہنا جائز نہیں کیونکہ حدیث میں تو قدسی وغیر قدسی دو قسمیں بنادی گئی ہیں۔ پس غیر قدسی کو قدسی کہنا اس لئے ناجائز ہے کہ دونوں اقسام میں مشابہت واقع ہو جانے کا خدشہ پیدا ہو جاتا ہے مگر جہاں اشتباہ کا خطرہ ہی نہ ہو وہاں کوئی حرج نہیں ہے مزید یہ کہ جب زمین کو ارض مقدسہ اور شہر کو بلدہ قدسیہ کہا جا سکتا ہے تو نبی وولی کے کلام کو تو بطریق اولی کلام قدسی کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اگر کہا جائے کہ قدس تو اسمائے خداوندی میں سے ہے تو کیا اس کا اطلاق اس کے علاوہ پر کرنا جائز ہے ہمارا جواب یہ ہے کہ قدس تو سرے سے خدا کے مخصوص ناموں میں سے ہے ہی نہیں، اور اگر اسے تسلیم کر لیا جائے تو یہ اسرائیلیات میں شامل ہو جائے گا، الغرض یہاں پر کوئی وجہ عدم جواز کی موجود نہیں ہے۔

اے عارف باللہ! بلا وجہ بحث وتکرار اور کثرت قیل قال سے وحشت پیدا ہوتی ہے جو نفرت کو دعوت دیتی ہے طویل سے قلیل بہتر ہوتا ہے اور کلام میں اختصار، اعجاز

سے قریب تر ہے۔

خموشی فیض دیگر می دہد دیوانۂ مارا
چراغ کشتہ روشن می کند ویرانۂ مارا

(مجھ دیوانے کو خموشی ایک اور طرح کا فیض پہنچاتی ہے اور میرا ویرانہ تو بجھے ہوئے چراغ سے روشن ہوتا ہے)

میں آں جناب سے اوقات مخصوصہ میں نیک دعاؤں کا طلبگار رہوں جبکہ میرے حال کی تصویر یہ ہے۔

ماخود بگرد دامن مردی نمی رسیم
شاید کہ گرد دامن مردی بما رسد

(میں خود تو کسی مرد کامل کے دامن کی گرد کو نہیں پاسکا شاید اس کے دامن کی گرد خود بخود مجھ تک پہنچ جائے)

میں چاہتا تھا کہ اپنے بعض اشعار آپ کے مطالعے کی نذر کرتا مگر یہ ارادہ اس لئے ترک کر دیا کہ کہیں آپ اکتانہ جائیں لہٰذا ان چار شعروں پر ہی اکتفا کرتا ہوں:۔

کجا ہر ذرہ دارد تاب حسن بے بیجابش را — کہ باشد چشمۂ خورشید شبنم آفتابش را
نگنجد نشاء حیرت دریں خم خانۂ کثرت — ازیں نہ شیشہ بیروں یافتم موج شرابش را
در خانۂ ما جلوہ گراں رشک چمن شد — ہر خار وخس وگل خس ما برگ وسمن شد
عمریست کہ در حلقۂ زلف تو اسیریم — مجنونِ ترا خانہ زنجیر وطن شد

سبحان ربک رب العزت عما یصفون وسلام علی المرسلین والحمد للہ رب العالمین۔

محاکمۂ مؤلف رحمتہ اللہ علیہ

جب بات یہاں تک پہنچی ہے تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند کلمات محاکمے کے طور پر کئے جائیں واللہ اعلم۔ اس فقیر (شاہ ولی اللہ) کی نظر میں انبیاء علیہم السلام کا کلام درستگی باطن اور بلند مراتب کے حصول پر مشتمل ہوتا ہے جیسے طہارت، خشوع وخضوع اور ان کی اضداد سے ان کا کلام

میرا ہوتا ہے۔ خدائے بزرگ و برتر نے انبیاء علیہم السلام کو ان پاکیزہ مطالب کی تبلیغ کے لئے بھیجا ہے اوران کی قدر و منزلت اسے کہیں برتر ہے جو وحی کے علاوہ ان سے اشارتاً یا صراحتاً ظاہر ہوتے ہیں بلکہ وہ بسا اوقات مقام احسان (۱) سے فروآ کر عام مومنوں کی صورت میں ظاہر ہوتے ہوئے تبلیغ دین کا کام سرانجام دیتے ہیں تاکہ وہ اس مقام میں لوگوں کے لئے نمونہ ثابت ہوں وذلک تقدیر العزیز العلیم اس لئے صوفیا کا ان کے کلام سے اپنے مضامین یعنی توجہ بذات صرف، فنا، بقا اور توحید وجود وغیرہ پر استدلال کرنا عبارت نص، اشارت وایما اور اقتضا کے اعتبار سے نہیں ہوتا بلکہ وہ وہی کچھ اختیار کرتے ہیں جو ان نصوص کے ذریعے ان کے قلوب پر مترشح ہوتا ہے۔ اکثر ان کا ذہن ایک چیز سے دوسری کی طرف منتقل ہوجاتا ہے اور کسی چیز کے بارے میں کوئی نئی بات کہہ دیتے ہیں لہٰذا اس سلسلے میں مناظرہ واستدلال کرنا مخالف کے لئے فائدہ مند نہیں، اور یہ بھی معلوم رہے کہ مجذوب کہ جس کا جذب مکمل ہو کو جب ذات بحت سے خاص رابطہ حاصل ہوجاتا ہے اور اس پر راہ معرفت کے در وا ہوجاتے ہیں، اور ذات بحت کی معرفت کے بارے میں اس کے ذہن میں کچھ آجاتا ہے کہ اسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا تو اسے خواہ وصول وحصول کہیں یا ادراک کا نام دیں بہرصورت کاملین کا اس پر اتفاق ہے یہی معرفت ہے، اس کے بعد اس میں جو بھی اختلاف ہوگا وہ لفظی ہوگا۔

شیخ عبدالاحد نے کہا کہ ''ہم مطلقاً وصول الی الذات کا انکار نہیں کرتے الخ اور شیخ مجدد قدس سرہ العزیز نے شرح الرباعیتین کی شرح میں بھی یہی موقف اختیار کیا، جاننا چاہئے کہ مرتبہ لاتعین میں اگرچہ شہود تجویز کرتے ہیں جبکہ شہود سے اوپر بھی کئی مراتب ہیں کہ جن میں جو کچھ بھی حاصل ہوتا ہے وہ وصول نہیں بلکہ وصول کی دہلیز کا مشاہدہ ہوتا ہے اور وصول کے مراتب اس سے بلند ہیں، چونکہ ہر کسی کا فہم وہاں تک نہیں پہنچ سکتا اس لئے بعید نہیں کہ وہ اس کا انکار کردیں۔ یہ بھی ذہن نشین رہے کہ شیخ کامل سے محبت ذاتیہ کبھی الگ نہیں ہوتی اور اس کی حقیقت مظہر جیسی ہے کہ حقیقت سے واصل ہوتا ہے اور متبوع سے اس کا تعلق ممنوع ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس کا رابطہ متصرف

---

(۱) سلوک میں احسان وہ مرتبہ ہے جہاں سالک آثار اسماء وصفات کو دیکھتے ہوئے خود کو خدا کے سامنے محسوس کرتا ہے، اس کا فروتر درجہ یہ ہے کہ سالک عبادت کے دوران یہ سمجھے کہ خدا اسے دیکھ رہا ہے۔

فیہ کے ساتھ قائم رہتا ہے اور جہاں تک قلق، حزن اور اندوہ کا تعلق ہے تو وہ کامل کے مزاج کے تابع ہیں، مگر اس کی اصلیت سے خارج اگر کامل کے مزاج میں قوت بہیمیہ زوروں پر ہوگی تو یہی محبت ذاتیہ اس کے لئے قلق، عشق اور اندوہ کی صورت میں ظاہر ہوگی اور اگر قوت بہیمیہ اس کے مزاج میں کمزور ہوگی تو خالی الفت اور انسیت کے روپ میں ظاہر ہوگی۔ اور یہ بھی معلوم رہے کہ تمام اہل کمال کا اس بات پر اتفاق ہے کہ مرتبہ ذاتیہ تک رسائی کے لئے دو راستے ہیں۔ پہلا راستہ وہ ہے جو براہ راست شاہراہ وجود سے نکل کر آگے بڑھتا ہے اور اسی پر چل کر فی الحقیقت اس مرتبہ ذاتیہ تک سالک پہنچتا ہے۔ یہ راستہ صرف اقطاب ہی کے لئے مخصوص ہے جب کہ دوسرا راستہ متوسط سالکین کا ہے اور یہی اکثریت کی گزرگاہ ہے فی الحقیقت یہ راستہ (مرتبہ ذاتیہ تک) نہیں جاتا اگر صوفیا میں سے کسی نے معرفت ذات کا انکار کیا ہے تو اس سے ان کی مراد احاطہ اور ادراک ہے اور اس کا تو کوئی بھی قائل نہیں، تو اس کا مطلب یہ نکلا کہ یہ سارا نزاع لفظی ہے۔ مندرجہ بالا اصولوں کو ذہن نشین کرنے کے بعد کوئی نزاع باقی نہیں رہتا، مگر چند معقول قسم کے مقدمات پھر بھی باقی رہ جاتے ہیں جو کہ باعث نزاع بن سکتے ہیں۔ مگر انھیں بھی معمولی توجہ کے ساتھ رفع کیا جا سکتا ہے والعلم عنداللہ۔

ان تمام مباحث کے بعد یہ بات ذہن میں رہے کہ یہ پانچوں مکاتیب ان کی ابتدائی ملاقات کے زمانے میں لکھے گئے۔ چنانچہ پہلے مکتوب میں سے وہ حصہ جو ان کی ابتدائی ملاقاتوں کی تفصیلات سے متعلق تھا اور جو میں نے چھوڑ دیا ہے اس بات پر دلیل ہے، جب دوسری ملاقات ہوئی اور دونوں شیوخ ایک دوسرے سے قریب آئے اور ایک دوسرے کے مقامات پر مطلع ہوئے تو معاملہ ہی بدل گیا۔ چنانچہ یہ خط جو کہ شیخ عبدالاحدؒ نے حضرت شیخ کی خدمت میں ارسال کیا، اس بات کا بین ثبوت ہے، خط یہ ہے۔

> آپ کا مکتوب، مکتوب رحمانی اور خطاب خطاب منانی تھا جس نے آپ کی طلب کی اس نے واجد کو آپ کے پاس پایا اور جس نے واجد کو پالیا اس نے آپ کو پالیا، اور جس نے خدا سے عشق کیا گویا اس نے آپ سے عشق کیا اور جو آپ سے غافل ہوا وہ اپنے آپ سے بے پروا ہوگیا، ہم آپ کے ہیں، اور اس کے جس نے آپ کو

دوست جاناں میں نے آپ کو احسان سے قریب اور رؤف کا ندیم پایا آپ پر اس نعمت کا شکر ادا کرنا اور اس ثروت و امارت کی زکاۃ ادا کرنا فرض ہے ۔

چوبا حبیب نشینی و بادہ پیمائی
بیاد آر محبان بادہ پیما را

(جب تو محبوب کے پہلو میں بیٹھا شراب معرفت کے جام لنڈھا رہا ہو تو ایسے میں اپنے ہم پیالہ دوستوں کو بھی یاد کر لینا)

اب کوئی عذر باقی نہ رہا کہ تو تجلی حق کو عشاق کے آئینے میں سمودے ۔

آں روز کہ مہ شدی نمی دانستی
کانگشت نمائی عالمی خواہی شد

(کیا تجھے معلوم نہیں کہ جب تو ماہتاب بن جائے گا تو سارا عالم تیری ہی جانب اشارہ کناں ہوگا)

دوسری مرتبہ شیخ عبدالاحدؒ نے یہ دو شعر تحریر کئے :۔

یار از آغوش دل مے جوشد و دورم ہنوز
صد تجلی ساقی بزم است و مخمورم ہنوز

(محبوب آغوش دل میں جوش زن ہے مگر میں پھر بھی دور ہوں۔ ساقی بزم کی سینکڑوں تجلیاں ہیں اور میں ابھی تک مخمور ہوں ۔

لن ترانی گرچہ یک وادی خرابم کردہ است
ی کند کاشانہ رنگین آتش طورم ہنوز

(اگر چہ لن ترانی نے میری ایک ہی وادی کو ویرانہ بنادیا ہے مگر میری آتش طور اب بھی کاشانۂ عالم کو رنگین کر رہی ہے)

حضرت شیخ نے اس مکتوب کا جواب یہ تحریر فرمایا:

میرے مخدوم و مشفق! قلب کا معاملہ ایسا ہے کہ جب تک آغوش دل بھول نہ جائے اور تخلی تجلی کی صورت اختیار نہ کرلے اور نہاں خانۂ دل کا کاشانہ غیرت کی آگ

میں جل نہ جائے مجلہ حقیقت سے دلہن بے رنگ اپنا جلوہ نہ دکھائے اور دوری مخموری کے حجابات درمیان سے اٹھ نہ جائیں دل پر کام کرنا ابھی باقی ہے۔

وسقاکم ربکم دھاقا لایصدعون بعدھا شقاقا ولا تفترقون فراقا۔

برنگیرد جہان عشق دوئی

چہ حدیث ست ایں حدیث توئی

نامہ شیخ عبدالاحدؒ

شیخ عبدالاحدؒ نے ایک اور مرتبہ یہ خط لکھا:

تمام تعریفیں اس ذات کے لئے ہیں جس نے ہمیں بنایا اور پھر ہم نے اسے پایا۔ اس نے ہمیں اندھیروں سے روشنی کی طرف نکالا تو ہم نے اندھیروں کو چھوڑ دیا۔ اس نے ہماری طرف اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بشیر ونذیر بنا کر بھیجا تو ہم نے اس کی اتباع کی۔ اس نے ہمارے لئے کتاب مبین بھیجی تو ہم نے اسے تلاوت کیا۔ اس نے ہمیں اپنے جلال و جمال کی تجلی سے نوازا اور اپنے انعامات ووصال سے مشرف فرمایا۔ اس نے ہمارے وجود کی چوٹی پر برقی تجلی ڈالی تو اسے ریزہ ریزہ کر دیا اور جب عالم قیود میں ظہور فرمایا تو ہمارے لئے کوئی پریشانی باقی نہ رہی۔ اس نے ہمیں اپنی عظمت کا مشاہدہ کرایا تو ہم ایک عرصے تک حیرانی میں پڑ گئے، ہم نے اس کی معرفت کی شراب پی تو وہ ہمیں راس آ گئی۔ مکاشفہ کی آنکھوں سے ہم نے اس کا دیدار کیا تو اس نے ہم سے محبت کی۔ ہم نے چشم بصیرت سے اس کا مشاہدہ کیا تو ہم اس کے قریب ہو گئے۔ اس نے منزل صفات سے ترقی دیکر ہمیں اپنی ذات تک پہنچایا اور اس نے اپنے کلمات اور کمالات کے حسب شان ہم سے برتاؤ کیا اور پھر اس نے ہمارے ساتھ وہ الطاف وعنایات کیں جو کسی اشارے میں آ سکتی ہیں اور نہ ہی کسی عبارت کے ذریعے ان کی تعبیر ہو سکتی ہے۔

ومن بعد ھذا ما تدق صفاتہ

واکتمہ احظی لدیہ واجمل

اور پیاس باقی ہے یہاں تک کہ پنڈلی پنڈلی سے لپٹ نہ جائے، وعدہ مکمل نہ ہوجائے اور چلنا تھم نہ جائے، اس روز فراق ختم ہوجائے گا اور اسی پر ہمارا یقین ہے، پھر ہم نے کچھ پیش کیا اور کہا اس تمام پر آپ کو وسیلہ بناتے ہوئے پروردگار عالم سے بخشش طلب کرتا ہوں۔

حضرت شیخؒ نے ان کے جواب میں یہ تحریر ارسال فرمائی:

نامہ شیخ ابوالرضاؒ

تشنگی کا باقی رہنا تشنہ کے موجود ہونے کی دلیل ہے اور ہجر کا اثر مہجور کے بدستور باقی رہنے کا ثبوت ہے۔ قیود کی نشانیوں کے باوجود فراق کا ہونا تشنگی کی علامت ہے اور تشنگی کا باقی رہنا قائل وجود کے نزدیک وقوف (ترقی کا رک جانا) ہے، پس جیسے معالم قیود پر وقوف میں اطلاق کا تصور نہیں کیا جاسکتا اسی طرح وصال محبوب کے ساتھ فراق کا تصور کرنا محال ہے لہٰذا محدث حمیم کے صفات کے باقی رہتے ہوئے محدث قدیم کی صفات کی طرف ترقی کرنا ناممکن ہے چہ جائیکہ ذات حضرت واجب کی طرف ترقی کرنا، پھر پنڈلیوں کا آپس میں لپٹ جانا اور چلنے وسعی کرنے سے رک جانا کسی کے لئے موعود ہوتا ہے اور کسی کے لئے موجود۔ ارشاد خداوندی ہے کلا یعنی حقیقتاً اذا بلغت التراقی ۔یعنی جب نفس انسانیہ اپنی بلندیوں کی معراج کو پہنچ جائے تو عام امر میں مشاہدۂ جمال الٰہی کے اشتیاق کا یہی نقطۂ عروج ہے اور من راق کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ اس کے باطن سے ندا آئے گی کہ ہے کوئی جو مجھے جھاڑ پھونک کرے اور زہر جدائی اور الم شوق سے مجھے چھٹکارا دے۔

لسعت حیة الھوی کبدی فلا طبیب لھا ولا راق

الا الحبیب الذی شغفت به انه رقیقی وتریاق

(محبت کی ناگن میرے کلیجے کو ڈس گئی ہے اب اس کے لئے نہ کوئی طبیب کام آسکتا ہے اور نہ جھاڑ پھونک والا، بلکہ میرے لئے تو میرا محبوب منتر بھی ہے اور تریاق بھی)

اور قول خداوندی کے اس حصے وظن انه الفراق کا مفہوم یہ ہے کہ بقا بالحبیب کا

پیاسا یہ سمجھے گا کہ جو قلق واضطراب اس پر طاری ہے وہ دراصل محبوب کے علاوہ ہر چیز سے اس کے جدا ہونے کی وجہ سے ہے۔ والتفت الساق بالساق کا مطلب یہ ہے کہ دنیائے ممکنات کی ساق اور عالم رحمان کی ساق دونوں یکجا ہو جائیں گی یعنی وہ ان دونوں کا ایک ہی وقت میں مشاہدہ کرے گا۔ یہی مقام مشاہدہ ہے اور الی ربک یومئذ المساق کا مفہوم یہ ہے کہ اس روز اسے عالم الٰہی کی حقیقت کی طرف لے جایا جائے گا اور اسے ماءِ زلال پلایا جائے گا جس کے بعد تشنگی وصال باقی رہے گی اور نہ کوئی حد پس اس مقام پر عین، اثر، مخبر اور خبر کا وجود ختم ہو جائے گا اسے سعادت سرمدی سے اس طرح نوازا جائے گا کہ ایک مرتبہ دائرہ انتخاب میں آنے کے بعد اسے حضرت الٰہیہ سے کبھی دور نہیں کیا جائے گا۔

آسودہ بکام خویش از وصل حبیب
نہ بیم فراق ست و نہ تشویش فراق

(ایسے میں عاشق وصال یار سے اس طرح شادماں وفرحاں ہوتا ہے کہ نہ اسے جدائی کا غم ہوتا ہے اور نہ تشویش فراق)

ایک بار پھر حضرت شیخ نے شاہ عبدالاحدؒ کے نام یہ مکتوب تحریر فرمایا:

نامہ شیخ ابوالرضاؒ

یا منی الی وجہ حجی ومعتمدی — وحج قوم الی ترب واحجار
لبیک لبیک من قرب ومن بعد — سرا بسر واجهاراً باجهار

(اے کہ تو ہی میرے لئے حج بھی ہے اور زیارت گاہ بھی جبکہ لوگوں کا حج مٹی اور پتھروں سے عبارت ہے میں حاضر ہوں دور سے بھی اور قریب سے بھی پوشیدہ بھی اور ظاہر بھی)

اس ذات جل جلالہ کے حسن و جمال کو کیسے لفظوں کا جامہ پہناؤں، اور اس ذات سبحانہ وتعالیٰ کی عظمت وجلال کے بارے میں کیا لکھوں! ایک کو عنایت ازلی سے نوازتا ہے تو دوسرے کو بے پروائی کا سوز عطا کرتا ہے آہ تفاوت راہ تو دیکھو کہ ایک

ہی لو ہے کے دو ٹکڑے جو ایک ہی جگہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں سے ایک گھوڑوں کا نعل بنتا ہے تو دوسرا بادشاہ کا چہار آئینہ۔

دوہرہ

بہت ابھا کی کلسری جاک رہی لورائی
ایک جو پیو کیوں چاہی سوتی لینہ چکائی

ایک مرتبہ حضرت شیخ نے شیخ عبدالاحدؒ کو یہ حکایت لکھی!

حکایت محبت ومحنت

محبت نے محنت کو لوح محفوظ پر دیکھا تو پوچھا تو کون ہے محنت نے جواب دیا میرا نقش تیرے نقش جیسا ہے اور تیرا نقش میرے نقش کی مانند صرف ایک نقطے کا فرق ہے یہاں محبت اور محنت نے باہم پیمان باندھا اور کہا جہاں تو ہوگی وہاں میں بھی ہوں گی اور جہاں میں ہوں وہاں تو۔

ظن بود مرا بمن کہ من جملہ منم
من جملہ تو بودم ونمی دانستم

کاتب الحروف (شاہ ولی اللہ) کہتا ہے کہ یہ بیت حکایت سے متعلق نہیں بلکہ مقام محبت میں غلطی یا کوئی نقص رہ جانے پر تنبیہ کے لئے اور وحدت کی طرف ترقی حاصل کرنے کی خاطر لکھا گیا ہے۔

ایک مکتوب میں تحریر فرمایا:

معرفت خاصہ اضافت کے ہٹا دینے اور اپنی انا کو پے در پے انت کے نورانی شعلوں کے ذریعے جلا دینے کے بعد حاصل ہوتی ہے۔

طوارق انوار تلوح اذا بدت
فتظھر کتمانا وتخبر عن جمع

(نورانی ستارے جب نمودار ہوتے ہیں تو چمکتے ہیں، وہ چھپ چھپ کر ظاہر ہوتے ہیں اور تمام کی خبر دیتے ہیں)

اور معرفت خاص الخاص یہ ہے کہ اضافت کا بنظر احدیت مشاہدہ کیا جائے۔

فامطر الکاس نارا من ابارقها　　فأتیت الدور فی ارض من الذهب
وسبح القوم لما ان راوا عجبا　　نوراً من الماء فی نار من الغب

محمد مرزا سرہندی نے حضرت شیخ کی خدمت میں اشارتاً لکھا کہ حصول حال کے لئے میں نے جو ہلیلہ استعمال کیا تھا اس نے تا حال کوئی فائدہ نہیں پہنچایا۔

حضرت شیخ نے جواباً تحریر فرمایا کہ:

میری ناقص رائے میں آپ کا مزاج مبارک صفراوی اور حار یابس ہے، جو کہ راہ سلوک پر کامیابی کے ساتھ چلنے کے لئے بہت مفید ہے لیکن بعض رسمی قاعدوں، غلط عقلی تخمینوں اور مخالف طبع سودائی دواؤں کا آپ کے مزاج پر غلبہ ہو گیا ہے جو منزل تک پہنچنے سے باز رکھ دیا ہے۔ حکیم حاذق نہ تھا، اس لئے مرض کی صحیح تشخیص نہ کر سکا، ہلیلہ سیاہ کی بجائے ہلیلہ اصفر دے دیا۔ اس نے صفرا کی حفاظت کی بجائے سودا کو بڑھایا علاج الٹا ہو گیا اور حال مزاج بگڑ گیا۔ جو حاذقان طریقت اور ماہران حقیقت ہیں، وہ نظری اور عملی حکمت کے ساتھ حارۂ یابسہ شربتیں پلا کر خدا کے فضل و کرم سے مزاج کو تبدیل کر دیتے ہیں۔ حق تعالیٰ کس قدر ظاہر ہے کہ کوئی ظاہر اس کے لئے حجاب نہیں، اور وہی باطن ہے اس کے علاوہ باطن میں کوئی چیز ہی نہیں۔ حضور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی مناجات میں فرمایا: **اللھم انت الظاھر لا ظاھر فوقک وانت الباطن لا باطن دونک** (اے اللہ تو ہی وہ ظاہر ہے کہ تجھ سے زیادہ کوئی ظاہر نہیں اور تو ہی وہ باطن ہے کہ تیرے آگے کوئی باطن نہیں)

توھمت قدما ان لیلی وترقعت
وان لنا فی البین ما یمنع اللثما
فلاحت فلا فواللہ ما ثم مانع
سوی ان عینی کان من حسنھا اعمی

ف

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم
چشمۂ آفتاب راچہ گناہ

(اگر کسی کور چشم کو دن کے وقت سورج دکھائی نہیں دیتا تو اس میں آفتاب کا کیا قصور؟)

سرمۂ حقیقت لگانے والے تو سرمۂ عنایت آنکھ میں لگا کر آنسوں کو بینائی بخش دیتے ہیں انسی ابری الاکمہ والابرص ۔ اور یہ لوگ سرمۂ عنایت کا نسخہ صرف بزبان طیور ہی لکھ کر دیتے ہیں، آگے چاہے کوئی سمجھے یا نہ سمجھے میں یہ لکھ رہا ہوں کہ خدا ہدایت کرنے والا ہے۔ سرمۂ عنایت دو چیزوں سے مرکب ہے ایک ترقیق (باریک کرنا) دوسرے تسحیق (پیسنا)، باریک کرنے سے مراد یہ ہے کہ قلم اعلیٰ حروف عالیات سے ٹکراتا ہے اس کے دو حصے ہو جاتے ہیں، ظاہر الوجود اور باطن الوجود، باطن آگے دو راستوں پر چل نکلتا ہے تو امر و خلق ظہور پذیر ہوتے ہیں اور ہر ایک کو اجناس متنوعہ سے نواز دیا۔ ایک کہہ اٹھتا ہے ع

ما در پیالہ عکس رخ یار دیدہ ایم
مطرب بگو کہ کار جہاں شد بکام ما

(میں نے جام شراب میں رخ محبوب کا عکس دیکھا ہے۔ اے مطرب کہہ دو کہ نظام جہاں اب میری مرضی کے مطابق ہے)

تسحیق سے مراد یہ ہے کہ ظرف ہائے وجود کو ان کے کناروں میں اور اس کے نچلے حصوں کو اوپر والے حصوں میں اس طرح مٹا کر نیست کر دیتے ہیں کہ اس کے نتیجے میں جو سرمۂ فنائے وجود حاصل ہوتا ہے اسے آنکھوں میں لگا دیتے ہیں، تو اس سے شہود کی بجلیاں چمک اٹھتی ہیں اور نہاں خانۂ دل نور جمال کی تابناکیوں سے روشن ہو جاتا ہے۔ واشرقت الارض بنور ربھا اور احدیت ذات کی سطوت کی تجلی طالب کی ہستی کو عالم نیستی کی طرف لے آتی ہے اور کل شئ ھالک الا وجھہ کا راز ظہور سے جوڑ دیتی ہے۔ ایسے میں ہر شخص اپنی حقیقت سے باخبر ہو جاتا ہے اور پھر محمد مرزا، مرزا محمد ہو جاتا ہے۔

جز یکی نیست لقد ایں عالم باز بیں وبعالمش مفروش
گل ایں باغ را توئی غنچہ سر ایں گنج را توئی سرپوش
آں شناسد حدیث ایں دل مست کہ ازیں بادۂ کردہ باشد نوش

(اس عالم کا جوہر ایک کے سوا کوئی نہیں پھر دیکھ لے اور اسے عالم کے ہاتھ مت بیچ
اس چمن کے پھول کا غنچہ تو ہی ہے اور اس خزانے کے راز کا نگہبان بھی تو ہی ہے۔
اس دل مست کی کہانی وہی سمجھ سکتا ہے جس نے یہ شراب پی ہو)

کاتب الحروف (شاہ ولی اللہؒ) کہتا ہے کہ ہلیلہ کا سہال سے مراد وہ سخت ریاضتیں ہیں جو اہل سلوک باطن کو رذائل سے پاک کرنے اور دل کو طرح طرح کی محبتوں اور دنیا کے نقوش سے خالی کرنے کے لئے تجویز فرماتے ہیں۔ ان (مرزا محمد) کا یہ قول کہ ''دستِ اسہال حال روئے نداد'' سے یہ مراد ہے کہ ان اعتکافات اور ریاضات کے باوجود رذائل سے چھٹکارا حاصل نہ ہوا بلکہ خود بینی، غرور اور وسوسوں کی کثرت ان رذائل کی مزید مدد و معاون ثابت ہوئیں، ان کے قول صفراوی مزاج کے ذیل میں یہ جاننا چاہئے کہ صفرا کی خاصیت گرمی، خشکی اور تیزی و سرعت ہے لہٰذا عاشق کہ جس کی طلب میں شدت اور سیر میں تیزی ہوتی ہے اور وہ جری القلب ہوتا ہے اور اس کے ارد گرد علائق کا گزر بھی نہیں ہوسکتا۔ اس کی مثال صفراوی مزاج کی طرح ہے جو شکوک و شبہات قطع علائق میں بزدلی برتنے، نفس کی باتوں، وسوسوں اور شیطانی خیالات و خطرات میں مبتلا ہو اس کی مثال سودائی مزاج کی سی ہے جو اس مفہوم میں صفراوی المزاج ٹھہرا اس کی فطرت وصول کی قابلیت اور صلاحیت رکھتی ہے جبکہ مذکورہ مفہوم کے مطابق جو شخص سودائی مزاج کا ہوتا ہے وہ وصول وحدت سے محروم رہتا ہے، بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ اس کی فطرت میں استعداد تو صحیح ہوتی ہے لیکن سودائی مزاج لوگوں کے پاس بیٹھ کر شکوک و شبہات کا شکار ہو جاتا ہے اور خاص کر اہتمام و اعتنائے تام جو کہ انہی شکوک و شبہات کے قبیل میں سے ہیں اور اپنی جگہ کوئی کمال نہیں بلکہ تورع ہے ان کے نفس ناطقہ کا ملکہ بن جاتا ہے یہ

روحانی بیماری ہے جو کہ اعضاء میں بھی ہوتی ہے اور وصول سے رکاوٹ کا سبب بنتی ہے۔ان کا یہ قول کہ بجائے ہلیلہ اسود کے ہلیلہ اصفر دے دیا، کی وضاحت یہ ہے کہ ہلیلۂ اسود مسہل اخلاط سوداویہ ہے اور وسواس جو کہ سواد کا لازمہ ہے اس کو طبیعت میں بٹھا دیتا ہے اور ہلیلۂ اصفر مسہل صفرا ہے، جو گرمی، یبس اور سرعت کو دور کر دیتا ہے، چونکہ سخت ریاضتیں، نشاط کو دور کر دیتی ہیں، لہٰذا یہ بمنزلہ ہلیلۂ اصفر کے ہیں اور انکشاف توحید چونکہ دافع وسواس ہے۔اس لئے وہ ہلیلۂ اسود کے مشابہ ہے۔

ائمہ سلوک کا طریق نشاط، گرمی اور محبت کو باقی رکھنا ہے لیکن یہ تمام ذات کی جستجو میں ہوتے ہیں اور شدید ریاضتوں سے نشاط و گرمی دور ہو جاتی ہے۔

ان کے قول حاذقان طریقت الخ کی توضیح یہ ہے کہ ترتیب سالکین میں صوفیا کے دو مکتب فکر ہیں پہلا مکتب متقدمین کا ہے جس کی تفصیلات امام غزالیؒ (۱) نے یوں فرمائی: ''جب کوئی شخص طبیعت کے تقاضوں سے توبہ کر لے تو اسے خلوت میں بیٹھے، دونوں سے کم آمیزی اور تمام حالات میں مخالفت نفس کو پیش نظر رکھنے کی تلقین کی جاتی ہے اور اسے کہا جاتا ہے کہ خود کو اس طرح بنا ڈالو کہ کوئی مارے یا گالی گلوچ کرے تو تمہارا نفس سر نہ اٹھائے۔لوگوں کی طرف سے تعریف اور برائی دونوں کو یکساں تصور کرے۔نوافل اعمال کی کثرت کرے۔ریا، غرور اور دکھلاوے کے نقصانات کو اچھی طرح سمجھ لے اور ان میں غور و خوض کرے، طعام میں کمال احتیاط برتے اور جہاں اسے معمولی سا شبہ بھی گزرے اسے ترک کر دے اور قیام و قعود، کھانے پینے غرض تمام حالات میں آداب کو ہاتھ سے نہ جانے دے اور ان تمام

(۱) ابوحامد بن حامد غزالی حجۃ الاسلام طوس میں ۴۵۰ میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم یہیں حاصل کی، پھر نیشاپور آ گئے یہاں امام الحرمین ابوالمعالی سے تکمیل کی طویل عرصہ تک تحقیق و بحث اور مطالعۂ فلسفہ میں مشغول رہنے کے بعد ان پر یہ حقیقت منکشف ہو گئی کہ فلسفہ اور دین ایک دوسرے کی ضد ہیں، آپ نے فلاسفہ کا ان کے دلائل سے خوب رد کیا۔اسی وجہ سے آپ حجۃ الاسلام کے لقب سے ملقب ہوئے پھر آپ تصوف کی طرف آئے۔تقریباً ساری اسلامی دنیا کا سفر کیا۔آپ کا شمار اسلام کی مایہ ناز ہستیوں میں ہوتا ہے آپ کی تصانیف میں سے احیاء علوم الدین، کیمیائے سعادت اور تہافۃ الفلاسفہ عالمگیر شہرت کی حامل ہیں۔آپ نے ۵۰۵ھ میں طوس میں انتقال فرمایا

امور میں نفیاً واثباتاً کسی نہ کسی طرح روحانی علاج ضرور اختیار کرے۔ جب ان تمام سے پاک ہو جائے تو محبت الٰہیہ کا راستہ اسے دکھا دیا جاتا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل امام غزالیؒ کی احیاء العلوم اور کیمیائے سعادت میں موجود ہے۔

اس سلسلے کا دوسرا مکتب فکر نقشبندیہ، قادریہ اور چشتیہ سلسلوں سے متعلق ان متاخرین کا ہے جن کے فیض سے کئی دور فیضیاب ہوتے رہے ہیں، مختصر لفظوں میں اس مکتب کا خلاصہ یہ ہے کہ جو شخص ان کے ہاتھ پر توبہ کرلے تو اسے افکار واذکار جو کہ حضور شوق وعشق میں اضافے، توحید، نفی ماسواء، خلق سے قطع تعلق اور طرح طرح کے دیگر علائق سے کنارہ کشی کا سبب بنتے ہیں کے اپنانے کی ہدایت فرماتے ہیں اور فرائض وسنن مؤکدہ کی ادائیگی کے بعد طالب کو ان اذکار کے علاوہ کسی اور چیز میں مشغول کرتے ہیں اور یہ مشغولیت نہ تو تجلیہ (۱) ونوافل کی ہوتی ہے اور نہ کتب احادیث کی ہدایات سے بڑھ کر طعام محتاط اور نہ آداب معاش وغیرہ کی محافظت کی مشغولیت ہوتی ہے۔

جب سالک بفضل خدا گرامی شوق اور محبت ماسوا کی نفی کی دولت حاصل کرلیتا ہے تو تمام عیوب خود بخود دھل جاتے ہیں۔ خواجہ محمدؒ پارسا نے بھی اپنے رسالہ قدسیہ میں اسی مفہوم کی طرف اشارہ کیا ہے اور جو حار و یابس شربتیں ہیں۔ ان سے مراد یہی اذکار ہیں اور حکمت نظری شیخ کی نگاہ التفات ہے جبکہ حکمت عملی سے مراد ذکر میں سعی وکاوش ہے۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ حکمت نظری انکشاف توحید ہے اور حکمت عملی دوام حضور! ان کے قول ترقیق وتسحیق الخ کی تشریح یہ ہے کہ کحل عنایت سے مراد شہود وحدت وکثرت اور وحدت میں شہود کثرت ہے۔ یہ معنی دو طرح سے حاصل ہوسکتا ہے۔ ایک تو مبادی کے صورت کثرات میں ظاہر ہونے کی معرفت کے ذریعے حاصل ہوسکتا ہے اور اس کا نام ترقیق اس لئے رکھا گیا ہے کہ یہ نفس امارہ کو پیسنے اور کثرت میں موجود ظہور کے لوازمات کی قوت کے ختم ہوجانے کی قوت کا پتہ دیتا

---

(۱) تجلیہ: روح کو کدورات جسدیہ سے جو قالب عنصری کی مجاورت سے عارض ہوگئی ہوں منزہ کرنا اور اسے چمکانا اور جلا دینا تجلیہ کہلاتا ہے۔

ہے، دوسرے یہ معنی وحدت میں کثرت کے آجانے کی معرفت سے حاصل ہوتا ہے۔ اسے تحقیق کے نام سے اس لئے موسوم کیا گیا کہ یہ تحصیل اجزاء صرف وجود کے لئے مغائرت ماہیت کے ملاحظہ 'ماہیۃ الماہیات' میں تمام ماہیات کے مندرج ہونے اور وجود الوجودات میں وجودات کے مٹ جانے کی خبر دیتا ہے، واللہ اعلم ان کے اس قول کہ "ہر کسی از مرزائی خود آگاہی یابد" کی تشریح یہ ہے کہ ہر شخص حضرت وجود کی حقیقت کی معرفت حاصل کرے۔ ان کے قول کہ "مرزا محمد گردد" سے مراد یہ ہے کہ حقیقت محمد یہ تمام میں جاری وساری ہے۔ واللہ اعلم۔

محمد مرزا نے دوسری مرتبہ اپنے خط میں یہ شعر نقل کیا ؎

مردم دیدہ تیمّم کردہ از خاک درت

گر چہ در خانۂ خود آب روانی دارد

(مردان دیدہ ور نے تیرے در کی خاک سے تیمّم کو ترجیح دی، حالانکہ ان کے اپنے گھر میں آب رواں موجود تھا)

مکتوب شیخ ابوالرضاؒ

حضرت شیخ نے جواباً تحریر فرمایا:

مخدوم من! تیمّم طہارت مجازی ہے، جبکہ مردان دیدہ ور تو طہارت حقیقی کے طالب ہوتے ہیں اور درگاہ اہل حقیقت تو خاک مجاز سے پاک ہوتی ہے گویا مردان دیدہ ور نہیں مردان کور دیدہ ہیں، جن کے گھر میں پانی تو موجود نہ تھا اور سراب کو پانی سمجھ بیٹھے۔ اگر انھوں نے آنکھوں کو پانی کیا ہوتا تو پانی دیکھا ہوتا ؎

مردم دیدہ آب باید کرد

خانۂ خود خراب باید کرد

(طالبان وصال کو اس کی طلب میں آنکھیں پانی اور اپنا گھر برباد کر دینا چاہئے)

تا کہ احدیت ذات کا آفتاب اپنے سراپردۂ عزت سے جلوہ گر ہو اور جملہ اشیاء اس کے سامنے لاشئ بن جائیں تو راز لمن الملک الیوم للہ الواحد القھار

آشکارا ہو ؎

آں سرکہ از گوش شنیدیم ز خلقی
از علم بعین آمدہ از گوش بآغوش

(وہ راز کہ جیسے میں نے لوگوں سے سنا وہ علم کے ذریعے چشم اور کان کے راستے آغوش میں در آیا)

کاتب الحروف (شاہ ولی اللہؒ) کہتا ہے کہ یہاں یہ اقتباس سوء ادب تھا کیونکہ مردم دیدہ سے مراد روشنی چشم سالک ہے اور مردم دیدہ است یا نادیدہ است سے ان کی مراد یہ ہے کہ کسی انسان کامل کو پہچان کر اس کے کمال کے معتقد ہوئے کہ نہیں، لیکن جو مردان دیدہ ور ہوتے ہیں وہ تو درگاہ رب العزت کو حقیقت محض سمجھتے ہوئے شہود کامل کا فائدہ حاصل کر لیتے ہیں لہٰذا یہ سمجھنا کہ انھوں نے تیمّم کیا یہ بات ان کے بارے میں کہی بھی نہیں جا سکتی کیونکہ تیمّم طہارت مجازی ہے اور اگر مرد کور دیدہ ہے یعنی اس نے کامل معرفت صرف ظاہری احوال ہی معلوم کیے تو بدستور حجاب اور اشتباہ میں مبتلا ہے۔ ''اگر پانی کو دیکھا ہوتا'' یعنی انسان کامل کو پہچان لیا ہوتا تو آنکھوں کی ٹھنڈک اور روشنی دیکھی ہوتی اور اس قدر ناقص الفہم نہ ہوتا، اگرچہ شاعر نے تواضع کی انتہائی صورت یعنی آنکھوں کو خاک در پر رکھ دینے کو اس طرح کا جامہ رنگین پہنایا ہے تاہم ظاہراً اس کا معنی یہ ہوگا کہ کمالات طریقت کو اپنے آبا واجداد سے حاصل کرنے کے باوجود میں یہ چاہتا ہوں کہ جناب شیخ سے بعض فوائد کا استفادہ کرلوں۔ پس یہاں پر خود بینی مکمل فائدے کے حاصل کرنے میں رکاوٹ بن گئی۔ اس مفہوم کا قرینہ حضرت شیخ کے مکتوب کے آخر میں موجود ہے۔

دوہرہ ؎

جو تو جانی ایک کر جو کے ہو بھی نہ سیکھ
دریں کر اپنوں ہو سودا ہی موں مکھ دیکھ

حضرت شیخؒ نے ایک مرتبہ محمد مرزاؒ کے نام یہ والا نامہ صادر فرمایا:

رازہائے درون کو طشت از بام کرنے کی تڑپ نے خزانوں کے بند دروازے کھول دیئے اور خزانوں کو سارے عالم میں لٹا دیا۔ صبح ظہور نے پہلی سانس لی اور نسیم عنایت محو خرام ہوگئی، عاشق سراب آب حیات کی لہروں میں کھو گیا کمر شوق باندھ کر شاہراہ طلب پر قدم صدق دھرا۔ پہلی بار اس کی چشم بصیرت وا ہوئی تو اس کی نگاہیں اچانک جمال محبوب پر پڑیں تو خود کو محبوب کا آئینہ اور محبوب کو اپنا آئینہ پایا۔

عشق مشاطہ ایست رنگ آمیز   کہ حقیقت کند برنگ مجاز

تا بدام آورد دل محمود   بطر ازد بشانہ زلف ایاز

(عشق وہ رنگ آمیز مشاطہ ہے جو حقیقت پر مجاز کا رنگ چڑھا دیتی ہے، اور ایاز کی زلفوں کو اس طرح سنوارتی ہے جو دل محمود کو لوٹ لیں)

مکتوب دیگر

حضرت شیخ نے ایک اور مکتوب میں محمد مرزا کے نام حقیقت جامعہ کی زبان میں تحریر فرمایا:

ہوالحی القیوم!

اے میرے مرزا! اور میرے جلال تو میری وحدانیت کی طلب میں ہے جبکہ تو اپنی انانیت کو میری انانیت کے ساتھ شریک کر رہا ہے یہ تو سراسر شرک جلی ہے خفی بھی نہیں، کیا تو میرے غلبے اور قوت سے نہیں ڈرتا اور میری فردانیت سے تجھے حیا نہیں آتی؟ اے مرحوم تو موہوم ہے اور میں معلوم، میں نور ہوں تو ظہور میں حق اور حقیقت ہوں تو مجاز اور طریقت۔ اگر تو یہ چاہے کہ تو تعظیم کرنے والا اور مطلقاً اس کی ذات کی عبادت کرنے والا بنے تو موہوم کو اٹھا رکھ اور معلوم کو قائم کر۔ اور اپنے قلب سیم اور سر قدیم کے ساتھ پکار کہ کسی عیب وریب کے بغیر ہر زمان ومکان میں وہ نہیں بلکہ میں ہوں، اور میں نہیں صرف وہ ہے، جب دوئی اٹھ گئی تو تم نے عین کو پالیا۔ اگر تو نے اس میں شک کو راہ دی تو تو مریض ہے۔ اگر تو نے تردد کیا تو تو معزول ہے اگر تو نے اپنے ایمان وایقان کے ساتھ قبول کر لیا تو منظور نظر گردانا جائے گا پس تو شک کرنے والوں اور رد کیے گئے لوگوں میں سے نہ بن۔ میں نے تجھے اپنی رحمت

کے پیش نظر جواب دے دیا لیکن تم میری عظمت سے غافل مت ہونا اور تجھ پر یہ لازم ہے کہ جو کچھ میں نے تجھے اتنا کیا اسے دھتکارے ہوئے انسانوں پر ظاہر نہ کرنا کیونکہ جو راندۂ درگاہ ہو اور خالی کھوکھلا ہوتا ہے اور جس پر رحمت کی گئی ہو وہ واصل ہوتا ہے، اگر تو نے میری بات کو سمجھ لیا ہے تو تجھ پر میری رحمت اور سلامتی ہو۔

ایک اور خط میں حضرت شیخؒ نے لکھا:

اس خدائے کردگار کے نام سے شروع کرتا ہوں جو واحد اور احد ہے، مجھ سے حق اور شہنشاہ مطلق نے فرمایا اے میرے فرد! اور میری رضا! مجھے اپنی قوت و غلبے اور حسن و جمال کی قسم کہ میں احد ہوں مجھ سے وراء کچھ بھی نہیں، اور میں ہی وہ ہوں جو پردۂ خلق میں مخفی ہے، میں نے اپنی ذات کے ساتھ اپنی ہی ذات سے اپنے ہی اندر اپنے شیون اور صفات ظاہر کیئے اور مخلوقات کو پیدا کیا، میں ہی حق اور حقیقت ہوں، میں ہی ہر چیز کیلئے ذات اور ہر ذی روح کی حیات ہوں، خلق ساری کی ساری میری قدر ہے اور مخلوق میرا امر، جو میرے ساتھ بقا چاہتا ہے وہ میری جلا (۱) کا طالب بنے اور مجھے میرے ذکر لاہوتی کے ساتھ یاد کرے نہ کہ ذکر جبروتی و ملکوتی کے ساتھ **وھو لاھو الا ھو** جس نے میرے کلام کو سمجھ لیا اس پر رحمت و سلامتی ہو۔

ایک اور مرتبہ حضرت شیخؒ نے تحریر فرمایا:

وہ بے کیف ہے اور تمام کیف اس کی بے کیفی سے ظہور میں آئے ہیں، وہ بے نمون ہے اور تمام نمون اس کی نمونی سے پیدا ہوئے ہیں۔ ان بلند ہمتوں کی غایت اور ان بلند مرتبوں کی نہایت مزاحمت اغیار کے باوجود اسرار و بواطن میں رہتے ہوئے رفیع الشان ذات کی سرمدی احدیت ہے، چونکہ کثرت کو ذات مقدس میں کوئی راہ نہیں اس لئے حضرت احدیت تک رسائی پانا احدیت طریق کے بغیر ممکن نہیں اور احدیت طریق سے مراد کثرت اعیانیہ کا وحدت صراط مستقیم میں ختم کر دینا ہے اور یہی انبیاء و رسل اور کامل اولیاء کا راستہ ہے، اور نماز پڑھنے والے بھی اپنی نماز کی

---

(۱) ذات میں ذات کے لئے ذات کے ظہور کو جلا کہتے ہیں۔

ابتداء میں اھدنا الصراط المستقیم سے یہی راستہ طلب کرتے ہیں۔ سید الطائفہ جنید قدس سرہ فرماتے ہیں، توحید ایک ایسا معنی ہے کہ جس میں رسوم کمزور پڑ جاتے ہیں اور علوم اس میں ضم ہو جاتے ہیں اور خدا تعالیٰ ویسا ہی ہوتا ہے جیسا کہ ازل میں تھا اور بندہ بھی ایسا ہوتا ہے جیسا کہ ہونے سے قبل تھا۔

دیدہ ور شو بحسن لم یزلی　　کوز غیرت بسوز معتزلی
چہرۂ آفتاب خود فاش است　　بے نصیبی نصیب خفاش است

(حسن ابدی کے دیدہ ور بنو اور چشم غیرت کو جلا دو۔ آفتاب کا چہرہ تو خود بے نقاب ہے مگر کیا کیا جائے چمگادڑ کی قسمت ہی میں بے نصیبی رقم ہے)

حضرت شیخ نے شیخ عبدالحفیظؒ جو ان کے خاص دوستوں میں سے تھے، کے نام حسب ذیل مکتوب صادر فرمایا:

یہ سمجھ لیجئے کہ آپ دریائے نور کا ایک بلبلہ ہیں جو جب پھٹتا ہے اور اس سے تو دیکھتا ہے تو خود کو اسی نور کا دریا پاتا ہے اور اسی تصور کو گویا تو دل کی توجہ اور قصد کے ساتھ اپنے اوپر لاگو کرتا ہے، چونکہ قصد و توجہ حالات قلبی کو باقی رکھنے میں کافی موثر ثابت ہوتے ہیں لہٰذا جب قصد ٹوٹ جاتا ہے اور غیر کا خطرہ راہ پالیتا ہے تو فوراً اس خیال کی طرف ذہن منتقل ہو جاتا ہے کہ تعرف الاشیاء باضدادہا اور اس نور میں اسم ذات اسم متکلم کے ساتھ صبح و شام مسلسل و متواتر تنہا و تاریک مقام میں اس حیثیت سے موجود رہتا ہے کہ وہ خود اپنے آپ اور دوسری تمام چیزوں سے بے خبر ہوتا ہے اور اس کے دل کے باب کھل جاتے ہیں تو وہ تمام فرشتوں اور پیغمبروں کو عالم بیداری میں دیکھتا ہے اور ان سے عظیم فوائد کا استفادہ کرتا ہے، یہ فضل خداوندی ہے وہ جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے!

چشم دل چوں باز شد معشوق را درخویش دید
عین دریا گشت چوں بیدار شد چشم حباب

(جب دل کی آنکھ کھلی تو محبوب کو اپنے اندر موجود پایا اور بلبلہ جب پھٹا تو عین دریا ہوگیا)

ایک بار شیخ عبدالحفیظؒ نے حدیث قدسی ''قف یا محمد فان اللہ یصلی جو کہ قصہ معراج میں موجود ہے کے بارے میں استفسار کیا حضرت شیخؒ نے جواباً تحریر فرمایا:

میری ناقص رائے میں یہی آتا ہے کہ جب اس قاف معرفت کے سیمرغ نے عالم خلق (۱) وامر کی فضا میں پرواز کی تو عالم کون و امکان کی آخری سرحد پر جا پہنچا آگے اسے حضرت الٰہی کے عالم کی دل لبھا دینے والی فضا دکھائی دی۔ اپنے عزم کی پوری بلندی اور قوت سے اس نے اس فضا میں پرواز کرنا چاہی کہ اسی لمحے خطاب الٰہی ان کے کانوں میں گونجا، قف یا محمد یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم عالم امر کے اس آخری نقطے پر ٹھہر جایئے یہ مقام عبودیت ہے جس میں مشاہدہ رب ہوتا ہے۔ فان اللہ یصلی یعنی وہ تیرے ذریعے دونوں جہانوں کو نبوت و رسالت کی رحمتوں سے نوازنا چاہتا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ رسول خدا اس برزخ میں ٹھہریں تا کہ بارگاہ الٰہیہ سے معارف و احکام کا استفاضہ کر کے عالم خلق و امر (۲) پر مطلع ہوں، تو نے میری چاہت کی جو پاسداری کی وہ تیری اپنی مراد کی پاسداری سے کہیں بڑھ کر میری رحمت کو تیری طرف متوجہ کرتی ہے۔

اریـد وصـالـه ویرید هجری
فـاتـرک مـا اریـد لما یرید

(میں اس کے وصل کا طلبگار ہوں اور وہ میری جدائی پر آمادہ! اس لئے میں اس کی چاہت پر اپنی چاہت کو قربان کرتا ہوں)

فـانـی فی الوصول عبیدة نفسی
وفـی الهـجـران مـولی للموالی

(۱) عالم خلق وہ عالم جو مادہ سے پیدا کیا گیا ہے۔
(۲) عالم امر وہ عالم جو بلا مدت و مادہ حق تعالیٰ کے حکم سے وجود میں آیا ہو۔

(میں وصال میں اپنے نفس کا بندہ ہوتا ہوں جبکہ ہجر میں سرداروں کا سردار)

حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے بلند مرتبے اور علو شان کے پیش نظر موزوں ترین بات تو یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس برزخ میں عالم الٰہی کی فضا میں پرواز کرنے کے بعد واپس آئے، تو ان سے مذکورہ خطاب کیا گیا اس کے علاوہ اس حدیث کے کئی اور دور از کار معانی بھی بعض متاخر صوفیاء کے مقلدین نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق بیان کیے ہیں۔ یہ بھی لکھا گیا ہے کہ جب وہ شہباز بلند پرواز کثرت اسماء وصفات کی فضا کو طے کر گیا تو مقصورۂ برزخیہ کبریٰ جو مراتب تعینات میں سے پہلا اور حقیقت محمدیہ کے نام سے موسوم ہے پر دم لیا، اس کے بعد اس نے چاہا کہ آگے بڑھ کر حقیقت ذات مجرد کے عالم میں پرواز کرے تو اس سے خطاب کیا گیا کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس برزخیت کبریٰ میں ٹھہر جایئے جو عارفین کے مقامات کی انتہا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ صلوٰۃ پڑھ رہا ہے یعنی وہ اس مرتبہ بلند اور قربتوں کی انتہائی منزلوں میں اپنے کامل بندوں پر رحمت فرما رہا ہے یا ٹھہر جانے کا حکم دے کر ان پر رحمت بھیجتا ہے کیونکہ اس مقام سے ماوراء جانے کا شوق محض تضیع اوقات ہے اور یہ آگے جانے کی طلب ایک ایسی شی کی طلب ہے جس کا حصول ناممکن ہے یا فان اللہ یصلی کا معنی یہ ہے کہ وہ اپنی ذات کی عبادت کر رہا ہے یعنی اپنے کمالات ذاتیہ کی ثنا کر رہا ہے اور ان کی طرف متوجہ اور کائنات سے بے نیاز ہے اس کے حریم ذات اور عزت وجلال کی جانب سعی کرنے کا کوئی مقام ہی نہیں۔

تعالیٰ العشق عن همم الرجال　　ومن وصف التفرق والوصالِ
متی ما جل شی عن خیال　　یجل عن الاحاطة والمثالِ

(عشق لوگوں کے ارادوں سے بالا ہے اور ہجر ووصال سے بھی میرا جب کوئی چیز خیال میں نہ آسکے تو وہ احاطہ ومثال سے بھی آزاد ہوتی ہے)۔

ایک اور مرتبہ شیخ عبدالحفیظؒ نے محققین کے قول شرط الولی ان یکون محفوظاً اور حضرت جنید قدس سرہ سے جو سوال کیا گیا کہ کیا عارف سے زنا سرزد ہو سکتا ہے؟

تو انھوں نے کچھ دیر سر جھکائے رکھا اور پھر فرمایا و کان امر اللہ قدراً مقدوراً

میں موافقت اور مطابقت کے متعلق استفسار کیا تو حضرت شیخ نے یہ جواب لکھا:

دونوں قول، حضرات ثقہ اور اکابر کے صحیح اور متفقہ ہیں ان میں باہم کوئی مخالفت نہیں ہے کیونکہ ولایت تین قسم کی ہوتی ہے ایک ولایت ایمانی، دوسرے ولایت غیر فانی تیسرے ولایت احسانی، دلی ولایت ایمانی و عرفانی کی وجہ سے کبیرہ گناہ سے محفوظ نہیں ہوتا، چہ جائیکہ گناہ صغیرہ سے محفوظ ہو۔ البتہ ولایت احسانی پر پہنچ کر مطلقاً گناہ کبیرہ سے اور دانستہ گناہ صغیرہ سے محفوظ ہو جاتا ہے۔

بنائے طریقہ رضائیہ

آپ کے خط مبارک سے منقول ہے کہ طریقہ قدسیہ رضائیہ کی بنیاد ان دس کلمات پر ہے (۱) تنزیہ مقصود (۲) تفرید ہمت (۳) تجرید توحید (۴) مطالعۂ جمال (بلحاظ انفس و آفاق واطلاق) (۵) فنائے لاہوتی (۶) بقائے ہاہوتی (۷) ذکر اجتماعی (۸) جہر و اخفاء کے درمیان جمع (۹) حد مع الاصفیاء (۱۰) ابتداء و انتہا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود شریف، بعض مسودات میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی تفسیر کے سلسلے میں آپ کے خط مبارک سے منقول کہ با کا تعلق مقدر عام یعنی وجود سے ہے اور اسم سے مراد تجلی ذات ہے، صفات میں سے کسی صفت کے ذریعہ، اور اللہ ذات واجب الوجود کا علم ہے جو بنفسہ موجود ہو اور تمام صفات کمال کی جامع ہو ہر قسم کے نقصان سے پاک ہو۔ الرحمٰن الرحیم دونوں اسم لفظ رحمت سے ماخوذ ہیں تفضل و احسان کے معنی میں ہیں۔ اول یعنی رحمٰن بلحاظ فیض اقدس کے ہے جس کی بدولت صور عظیمہ یعنی حقائق و ماہیات مع اپنی استعداد کے حصول پذیر ہوتی ہیں اور دوسرا یعنی رحیم اس فیض مقدس کے اعتبار سے ہے جس کی بدولت ماہیات خارجیہ معہ اپنے لوازم و توابع کے حاصل ہوتی ہیں اور معنی یہ ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ حقائق و ماہیات کی فیض رسائی، اولاً درجہ علمیہ میں فرماتے ہیں اور پھر اس کے بعد اپنے وجود خارجی کا فیضان فرماتے ہیں، لہٰذا رحمٰن و رحیم دونوں لفظ اسم کی صفتیں ہوئیں یا دونوں اس کا بدل یا عطف بیان ہیں یا ھو مبتدائے مقدر کی یہ دونوں خبریں ہیں جس کا مرجع لفظ اسم ہے اور یا یہ دونوں رحمٰن رحیم لفظ اعنی مقدر کے مفعول ہوں گے جو بیان کا فائدہ دیں گے۔ اور لفظ اللہ کے متعلقات میں یہ دونوں اسم نہیں ہوں گے کیونکہ رحمٰن و رحیم علیحدہ ذات نہیں ہیں اور معنی یہ ہوئے کہ ہر چیز کا وجود

ظہور ذات الوجوب کا طفیل ہے۔

تفسیر فاتحہ

الحمد للہ کی تفسیر کے سلسلہ میں تحریر ہے کہ حامدیت و محمودیت، اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے ساتھ مختص ہیں۔ چنانچہ مرتبۂ جمع الجمع میں اللہ نے اپنے کمالات نفس اپنی ذات پر، مرتبہ غیب و معانی میں تجلی اول وثانی کے ساتھ ظاہر فرمائے۔ اور شئون و اعتبارات اولاً اور حقائق الٰہیہ کونیہ ثانیاً ظاہر فرمائے ہیں اور بہر حال مرتبہ جمع فرق میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اپنے فیض مقدس کے ذریعہ اپنے نور وجود کے فیضان سے حقائق پر ان کی موجودہ استعدادات اور ذیلی کمالات کو ظاہر فرمایا ہے اور بہر حال مرتبہ ''فرق جمع'' میں موجودات روحانیہ، مثالیہ، حسیہ، اللہ تعالیٰ کے کمالات ذات وصفات وافعال کو قولاً فعلاً حالاً ہر طرح ظاہر کرتی ہیں اور بہر حال مرتبہ فرق درفرق میں تمام مظاہر خلقیہ اور مواقع کونیہ بھی اگرچہ قولاً فعلاً حالاً بحسب الظاہر اپنے کمالات ظاہر کرتے ہیں لیکن درحقیقت اللہ تعالیٰ اپنی تعریف فرمارہے ہیں۔ نیز جمال ہانسوی کے کلمات مرقوم ہیں کہ اغیار کی عقلیں، اخیار کے احوال میں گم ہیں۔ فقیر کہتا ہے کہ ابرار کی عقلیں اخیار کے اسرار میں گم ہیں اور اخیار کی عقلیں احرار کے اسرار میں گم ہیں۔

نیز مرقوم ہے کہ وجود کے یہ معنی ہیں کہ حق سبحانہ و تعالیٰ کے اسماء وصفات کا وجدان تمہاری ذات میں متجلی ہو جائے اور تم نیست اور وہ ہست ہو جائے پس بندہ پہلے کی طرح نیست اور حق ہمیشہ کی طرح ہست رہے۔ نیز مرقوم ہے کہ فقیر کہتا ہے توحید تفرید لطیف کا نام ہے جس میں امور نسبیہ اور اضافیہ کی انانیت نہ ہو۔ نیز لکھا ہے کہ محققین فرماتے ہیں کہ عجز نام ہے اہل نہایات کی انتہا کا اور ترقی غایات کی غایت کا کہ کسی کامل کے لئے اس سے زیادہ پستی نہ ہو اور اس کے کسی مکمل کے لئے بلندی نہ ہو اور وہ عجز مذموم نہ ہو جس کی طرف محجوبین کا ذہن جاتا ہے۔ بلکہ وہ ایسے انتہائے کمال کا نام ہے۔ جو مقام حضوری میں ادراک ازلی حاصل ہونے کے بعد ہوتا ہے اور وہ مقام ادنیٰ ہے۔ لیکن اس ادراک کی رسائی کا عجز محقق ہو گیا چنانچہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ ادراک کی نارسائی ادراک ہے نیز مرقوم ہے کہ کمال مطلق ولی کا وہ مقام ہے جس میں اسے حقائق اشیاء تمام وکمال عنایت کی جاتی ہیں لہٰذا وہ آن واحد میں تمام صفات ربوبیت اور اوصاف

عبودیت کے ساتھ متصف رہتا ہے۔ نیز مرقوم ہے کہ فنا لوازم بشریت کے فقدان کو کہتے ہیں خواہ ان کے علم کا ذہول ہو یا ان کے انعدام کا علم ہو یا حال حقیقی ہو اور فنا کے نو مراتب ہیں اول ذہول یعنی اہل حجاب کو ذکر حق میں مستغرق ہونے کے وقت، اور اہل کشف کو انوار جمال کے بروز ہونے پر اپنے نفس کا شعور نہیں رہتا۔ دوسرے ذہاب یعنی افعال حق کے مشاہدہ میں بندہ کے افعال کا اس طرح ختم ہو جانا جیسے قلم کی حرکت ہاتھ میں گم ہو جاتی ہے۔ اس سے ترقی کر کے تیسرا درجہ سلب ہے کہ صفات حق کے سامنے صفات خلق ناپید ہو جائیں چوتھے اصطلام ہے کہ ذات حق کے سامنے بندہ اپنی ذات کو فنا سمجھے۔ پانچویں انعدام یعنی فناء الفناء کا مرتبہ ہے جس میں فنائیت کا احساس بھی نہ رہے، چھٹے مستحق ہے یعنی نفس کی اچھائی ختم کر کے بلا تامل صفات الٰہیہ قبول کر لے جس طرح اپنے نفس کی صفات قبول کر رکھی تھیں۔ تحقق باللہ کا یہ پہلا مقام ہے۔ ساتواں مرتبہ محق ہے جس میں بندہ کی جسمانیت وروحانیت حدوحصر ختم ہو جاتی ہے، آٹھویں طمس ہے یعنی انسانی طبعی اور عادتی تقاضے خواہ ظاہری ہوں یا باطنی سب ختم ہو جائیں کہ انتہائی بھوک اور دائمی بیداری وغیرہ بھی اس کو متاثر نہ کر سکیں۔ نواں درجہ محو ہے یعنی آثار حقیقیہ ظاہر ہو جانے سے تمام آثار خلقیہ مٹ جائیں، ان میں سے پہلے پانچ مراتب اہل فنا کے لئے مخصوص ہیں اور آخری چار اہل بقا کے لئے مختص ہیں اور بقاء وہ صفت الٰہیہ ہے کہ بندے فنائے نفس کے بعد اس سے متصف ہو سکتا ہے۔

فرائض ولایت کبری

حضرت موسیٰ نے رسالہ اصول الولایۃ میں بسلسلۂ تفسیر آیت کریمہ یا ایھا الذین آمنوا اتقوا اللہ وابتغوا الیہ الوسیلۃ تحریر فرمایا ہے کہ ولایت کبری کے فرائض چھ ہیں۔ بالترتیب چار شرائط ہیں۔ اول دلی تصدیق اور زبانی اقرار کے ذریعہ ایمان دوسرے ماموارت کے اکتساب اور ممنوعات کے اجتناب کے ذریعہ تقوی تیسرے شیخ طریقت کی طلب جس کو وسیلہ کہنا چاہئے کہ وصول دوست کی راہ اس سے عیاں ہو جاتی ہے۔ چوتھے جہاد ارشاد، انانیت کے فناء کرنے اور اثبات نبوت کے لئے۔ خود سے رستگاری دور کرو اور بقائے شہود دوست میں گرفتار ہو جاؤ کہ فلاح یہی ہے اور ولایت کبری اسی کو کہتے ہیں۔

تربیت سالک

اسی رسالے میں لکھتے کہ مرید صادق جب خلوت میں جائے تو اول اپنی خودی سے نکل کر غسل کامل کرے۔ اور مصلی اور پاک کپڑا ہونا چاہئے جو پاکیزگی کی خدمت کے لائق ہو اور توجہ الہٰی کے ساتھ دوگانہ توبہ ادا کرے۔ اور خالق ومخلوق کے حقوق کی ادائیگی کو اپنی نجات سمجھے۔ تضرع وزاری کے ساتھ گوشہ نشین ہو جائے، جمعہ و جماعات کا تکبیر تحریمہ کے ساتھ اہتمام رکھے اور نماز سے فراغت کے بعد پھر خلوت گزیں ہو جائے۔ اور میل جول سے پرہیز رکھے۔ اور ادھر ادھر نہ دیکھتا رہے اور مخلوق سے نظر اٹھالے اور لذت نفس سے دامن کش ہو جائے۔ آمد و رفت کے وقت بھی غافل نہ رہے۔ اس شان کی اگر خلوت نہیں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ ذکر و مراقبہ اور ہمیشہ باوضو رہے اور شکستگی کو مضبوط تھام لے اور سستی سے خود کو نوافل وتلاوت، درود واستغفار سے فارغ نہ رہنے دے، اگر کسی وقت کسل ہونے لگے تو تازہ وضو سے تازہ دم ہو جائے اور کسی وقت غلبہ ہونے لگے تو سو جائے تاکہ وسوسہ میں گرفتار ہو کر معصیت میں مبتلا نہ ہو جائے، دن رات کے تہائی حصہ میں سونا چاہئے تاکہ جسم اضطراب سے محفوظ رہے۔ چھ گھنٹے رات میں اور دو گھنٹے دن میں سونا چاہئے اور دن رات کی کمی بیشی کے حساب سے یہ مقدار پوری کر لینی چاہئے سونے کی تہائی مقدار کو آہستہ آہستہ کم کرتا چلا جائے اور غروب آفتاب سے پہلے کامل طہارت کے ساتھ مصلی پر روبقبلہ ذکر و مراقبوں میں رہ کر نماز مغرب کا انتظار کرے۔ اور مغرب وعشاء کے درمیان ذکر، نماز و مراقبہ مسلسل رکھے قلب کی نورانیت کے لئے یہ نہایت موثر ہے صبح ہونے کے بعد یہ چاروں دعائیں پڑھنی چاہئیں تاکہ دنیا میں مستغرق ہونے سے اور نفس وشیطان کے شر سے محفوظ رہ سکے۔

(۱) اللهم یا رب انت الله عالم وانا عبد جاهل اسئلک ان ترزقنی علما نافعا حتی اعبد بعلمک والا هلکت.	اے اللہ اے پروردگار آپ اللہ عالم ہیں اور جاہل بندہ ہوں میں، آپ سے علم نافع کی استدعا کرتا ہوں تاکہ آپ کی عبادت آپ علم کے مطابق کر سکوں ورنہ ہلاک ہو جاؤں گا۔

(۲) یا رب انت الله قوی وانا عبد ضعیف اسئلک ان تحفظنی حتی لا اسأل من سواک کفاف الدنیا والا هلکت۔

اے پروردگار آپ اللہ قوی ہیں اور میں ضعیف بندہ ہوں میں آپ سے اپنی حفاظت کی استدعا کرتا ہوں تا کہ میں آپ کے سوا کسی سے دنیا کی روزی نہ مانگوں ورنہ ہلاک ہو جاؤں گا۔

(۳) یا رب انت الله قوی وانا عبد ضعیف اسئلک ان تعیننی حتی اغلب الشیطان بقوتک الا هلکت۔

اے پروردگار آپ اللہ قوی ہیں میں عاجز بندہ ہوں میں آپ سے مدد کی استدعا کرتا ہوں تا کہ آپ کی طاقت سے شیطان پر غالب آسکوں ورنہ ہلاک ہو جاؤں گا۔

(۴) یا رب انت الله قادر، وانا عبد عاجز اسئالک ان تجعلنی قاهرا علی نفسی حتی اقهرها بقدرتک والا هلکت۔

اے پروردگار آپ اللہ قادر ہیں اور میں عاجز بندہ ہوں آپ سے استدعا کرتا ہوں کہ مجھ کو میرے نفس پر اپنی قدرت سے غالب رکھئے ورنہ میں ہلاک ہو جاؤں گا۔

اس کے بعد دو رکعت سنت الفجر گھر میں پڑھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو شخص سنت اور نماز فجر کے درمیان اکتالیس مرتبہ یا قیوم یا حنان یا منان بدیع السموات والارض یا ذالجلال والاکرام لااله الا انت اسئالک ان تحیی قلبی بنور معرفتک یا الله یا الله یا الله پڑھے گا تو سارے دل بھی اگر مر جائیں تو اس کا دل زندہ رہے گا اور ایمان سلامت رہے گا۔ اور جماعت نماز کی نیت سے جب گھر سے باہر نکلے تو بسم الله وبالله والی الله والتُّکلان علی الله ولا حول ولا قوة الا بالله پڑھے اور جب مسجد کے قریب پہنچے تو پڑھے اللهم عبدک ببابک مذنبک اتی جه الیک ممن سواک یستغفرک ویطلب رضائک ان لم تفتح ابواب فضلک فای باب سؤ أباب۔ الٰہی آپ کا یہ بندہ آپ کے در پر آیا ہے اپنے گناہوں کے ساتھ در پر حاضر ہے سب سے کٹ کر آیا ہے آپ سے استغفار کرتا ہے آپ کی رضا کا طالب ہے، آپ نے اپنے فضل کے

دروازے نہ کھولے تو پھر کونسا دروازہ ہے، داہنا پاؤں مسجد میں رکھتے ہوئے کہے بسم اللہ والحمدللہ والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسول اللہ، اور مسجد میں داخل ہوکر اعوذ باللہ العظیم وبوجھہ الکریم وسلطانہ القدیم من الشیطان الرجیم پڑھے تو شیطان کے شر سے محفوظ رہے گا اور مسجد کے اندر پہنچ کر سلام کرے اور اگر مسجد میں کوئی نہ ہو یا نماز میں مشغول ہوں تو السلام علینا وعلیٰ عباد اللہ الصالحین کہے۔ ادائے نماز کے بعد اپنی جگہ بیٹھ کر رو بہ قبلہ ذکر و مراقبہ میں پوری طرح مشغول ہو جائے ایسے میں سونا نہایت ہی مکروہ ہے اگر نیند کا غلبہ ہو کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر ذکر سے اس کو دفع کر دے۔ جب سورج ایک دو نیزہ بلند ہو جائے تو دوگانہ بہ نیت شکر ادا کرے۔ اس کے بعد مسجد میں یا کسی اور جگہ خلوت میں ذکر و مراقبہ میں مشغول ہو جائے اور چوتھائی دن گزر جائے تو چار رکعت نماز چاشت ادا کرے اور اگر تعلیم و تعلم یا اور کوئی ضروری ہو کام تو بقدر ضرورت اس میں مشغول ہو جائے ورنہ تازہ وضو کر کے ذکر و مراقبہ کرے کھانا اگر موجود ہو تو کھا لے اور کھاتے وقت زبان ذاکر اور دل حاضر رہنا چاہئے، اس کے بعد وضو تازہ کر کے ذکر کے ساتھ قیلولہ کرے اور زوال آفتاب سے پہلے بیداری کو غنیمت سمجھے اور زوال کے وقت طہارت کاملہ کے ساتھ قبلہ رو مصلیٰ پر ذاکر و مراقب ہو جائے اور پھر زوال کے بعد چار رکعت نماز زوال پڑھے اور بعد نماز ظہر اگر کوئی ضروری کام، زیارت یا عبادت یا عیال کی تعلیم و پرسش احوال کا ہو بقدر ضرورت اس میں مشغول ہو جائے اور فوراً فراغت کے بعد استغفار کرے کہ نیکوں کی نیکیاں بھی مقربین کے نزدیک کوتاہیاں شمار ہوتی ہیں تکمیل طہارت کے بعد نماز عصر کی تیاری کرے اور نماز عصر کے بعد ذکر و مراقبہ میں مصروف رہے۔

عمر برف ست آفتاب تموز | اندکے ماندہ خواجہ غرہ ہنوز
عمر برف کی طرح ہے دھوپ اسکو پگھلا رہی ہے | اے خواجہ رات آنے میں تھوڑی دیر رہ گئی ہے
دل گفت مرا علم لدنی ہوس ست | تعلیم کن ار گرت بدیں دسترس ست
مرے دل کو علم لدنی کی ہوس ہے | تعلیم کرو گر تمہیں اس پر دسترس ہے
گفتم کہ الف گفت دگر ہیچ مگو | در خانہ اگر کسے ست یک حرف بس ست
میں نے کہا الف کہنے لگا کہ ذکر کچھ مت کرو | گھر میں اگر کوئی آدمی ہے تو اس کیلئے ایک حرف کافی ہے۔

شیخ ابوالرضاؒ کا سفر آخرت

شیخ محمد مظہر رہتکیؒ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت موصوف اوائل عمر میں اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ہماری عمر پچاس ساٹھ کے درمیان ہوگی آپ کی عمر پچاس سے اوپر ہوگئی تو مجھے ہمیشہ اس کا خطرہ ہونے لگا۔ جب پچپن سال کی عمر ہوئی تو مجھے کسی تقریب کے لئے رہتک جانا پڑ گیا رخصت کے وقت میں نے اس بارہ میں دریافت کیا تو مسکرا کر اس معاملہ سے پہلو تہی کر لی اور فرمایا کہ تمہیں اپنے وطن چلے جانا چاہئے اور اس خطرہ کی فکر نہ کرو۔ بالآخر موصوف کی بات پوری ہو کر رہی گلشن شاعر سے میں نے سنا ہے وہ کہتے تھے کہ حضرت موصوف کی حیات میں ایک روز شیخ عبدالاحدؒ آپ کی زیارت کے لئے تشریف لائے میں بھی شیخ کے ہمراہ تھا شیخ جب اندر داخل ہوئے تو دیکھا کہ خلاف عادت چارپائی پر تشریف فرما ہیں اور اہل مجلس پائنتی حاضر خدمت ہیں شیخ کو جب دیکھا تو مسکرائے اور بشاشت کے ساتھ ملاقات کی اور اپنی چارپائی پر بٹھالیا کچھ دیر صحبت رہی مگر کوئی بات چیت نہیں ہوئی معلوم ہوتا تھا کہ آپ کا دل سب علائق سے یکسو ہو گیا اور کمال وارفتگی میں بات چیت کی طرف دھیان نہیں تھا۔ شیخ وہاں سے اٹھ گئے اور چونکہ حضرت موصوف کے اہل خانہ سے شیخ کی قرابت تھی اس لئے حضرت ان کو اندر لے گئے اور اسی طرح بغیر گفتگو کے ایک گھنٹہ صحبت رہی پھر موذن نے مغرب کی اذان پڑھی تو شیخ فخر العالم صاحبزادہ خوردؒ نے عرض کیا کہ اذان ہوگئی باہر چلنا چاہئے۔ اس پر حضرت موصوف نے یہ نکتہ فرمایا۔ کہ بابا ابھی تک اندر باہر کا فرق باقی ہے اور یہ فرمانا کہ باہر تشریف لے آئے اور مسجد میں نماز ادا کی شیخ عبدالاحدؒ اس صحبت کے بعد فرمانے لگے کہ حضرت موصوف اس ہیئت سے بیٹھنے پر مامور تھے اور گویا وفات قریب آچکی تھی اور رفیق اعلیٰ کی طرف سے بلاوا غالب آ گیا تھا اور کچھ دیر کے بعد حضرت کی رحلت ہوگئی مریدین کی ایک جماعت نے ذکر کیا کہ حضرت موصوف کچھ سست ہو رہے تھے اور دو تین روز سے کھانے کی رغبت نہیں رہی تھی اور دل مبارک میں بے تعلقی ظاہر ہو رہی تھی کسی طرف دھیان نہیں رہا تھا۔ اس کے بعد نماز عصر کے لئے مسجد میں جانا چاہا تو اہل خانہ سے رخصت ہوئے اور نماز عصر کے خواجہ نقشبندؒ کی

مقامات طلب فرما کر کچھ حصہ پڑھا۔ مریدین میں سے کسی نے پان پیش کیا۔ ایک دو مرتبہ اس کو چبایا اور خنداں اور فرحان ہوتے ہوئے پہلو میں تکیہ لگالیا اسی حال میں حضرت موصوف کی روح پرواز کر گئی۔ اس وقت مخدومنا سید حضرت شیخ عبدالرحیم قدس اللہ سرہ العزیز کی طرف اپنے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ مریدین ان کو لانے کے لئے دوڑے اور بعض کو یہ گمان ہوا کہ غشی ہوگئی ہے۔ ان کو اٹھا کر زنان خانہ کے دروازہ کی طرف چلے، اسی حال میں شیخ عبدالرحیمؒ دریافت حال کرنے لگے دیکھا تو روح پرواز کر چکی تھی یہ واقعہ ۱۷ محرم الحرام ۱۱۰۱ھ کو پیش آیا بعض یاران طریقت نے آفتاب حقیقت سے تاریخ نکالی ہے رضی اللہ عنہ وارضاہ وجعل اعلیٰ الفردوس مثواہ جو کچھ ہم نے حضرت مخدومنا وسیدنا الشیخ ابوالرضا محمد کے احوال کرامت مآل کو جمع وتالیف کرنے کا ارادہ کیا تھا وہ اختتام پذیر ہوا والحمد للہ اس کے بعد انشاءاللہ تیسری قسم ہے۔

شاہ ولی اللہؒ کے اجداد اور مشائخ کے حالات

اس فقیر کی نسبت قرابت یا تلمذ کی جن سے ہے وہ پانچ فصل پر مشتمل ہے۔ الحمدلله الذی بنعمته تتم الصالحات وعلی فضله العول فی جمیع الحالات وبسم الله الرحمن الرحیم وصلی الله علی سیدنا محمد وآله وصحبه اجمعین.

امابعد فقیر ولی اللہ بن الشیخ عبدالرحیم کان الله لهما فی الآخرة و الاولی۔ کہتا ہے کہ یہ چند ورق اس فقیر کے اجداد کے بعض احوال کے بیان میں ہیں اور امداد فی مآثر الاجداد کے نام سے موسوم ہیں حسبنا الله ونعم الوکیل مخفی نہ رہے کہ اس فقیر کا سلسلہ نسب امیر المومنین حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے اس تفصیل کے ساتھ فقیر ولی اللہ بن الشیخ عبدالرحیم بن الشہید وجیہ الدین بن معظم......بن منصور بن احمد بن محمود بن قوام الدین عرف قاضی بن قادن بن قاضی قاسم بن قاضی کبیر عرف قاضی بدہ بن عبدالملک بن قطب الدین بن کمال الدین بن شمس الدین مفتی بن شیر ملک بن محمد عطا ملک بن ابوالفتح ملک بن عمر حاکم ملک بن عادل ملک بن فاروق بن جرجیس بن احمد بن محمد شہر یار بن عثمان بن ھامان بن ہمایوں بن قریش بن سلیمان بن عفان بن عبداللہ بن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ وعنہم اجمعین۔ رہتک کے پرانے نسب ناموں میں اور شاہ ارزانی مداونی کے قبیلہ میں بھی جن کا نسب سالار حسام الدین بن شیر ملک تک پہنچتا ہے جو موجود ہیں ان میں بھی ایسے ہی پایا جاتا ہے اور قدیم زمانہ میں لفظ ملک تعظیم کے لئے ایسے ہی استعمال ہوتا تھا جیسے ہمارے زمانے میں خان کا لفظ ہے۔ و الله اعلم بحقیقة الحال.

مخفی نہ رہے کہ رہتک میں ہمارے اجداد میں سب سے پہلے شیخ شمس الدین مفتیؒ نے اقامت اختیار کی۔ اور رہتک ہانسی اور دہلی کے درمیان ایک قصبہ ہے، دلی سے تیس کوس مغربی جانب۔ شروع میں جب ہندوستان فتح ہوا اور سادات وقریش بڑی تعداد میں یہاں آباد ہوئے تو کوئی شہران اطراف میں رہتک سے زیادہ آباد اور بارونق نہیں تھا۔ زمانہ دراز کے بعد آبادی اور رونق میں کمی آنی شروع ہوگئی اور یہ بزرگ عالم وعابد تھے اور اس شہر میں سب سے پہلے قریش نژاد

یہی آئے تھے ان کی بدولت شعائر اسلامیہ ظاہر ہوئے۔ اور کفر کی طغیانی مدھم پڑی۔ منجملہ ان کے عجائب روزگار کے ایک بات بعض یہ ذکر کرتے ہیں۔ واللہ اعلم۔ کہ انھوں نے وصیت کی تھی کہ ان کا جنازہ نماز کے بعد اس مسجد میں رکھا جائے جہاں وہ عبادت واعتکاف کرتے تھے اور کچھ دیر اسے خالی چھوڑ دیا جائے پھر اس کے بعد اگر جنازہ پایا جائے تو اس کو دفن کر دیا جائے ورنہ لوگ واپس آجائیں۔ چنانچہ لوگوں نے ایسا ہی کیا مگر کچھ دیر بعد دیکھا تو جنازہ کا نشان نہیں پایا گیا۔ حضرت والد بزرگوار قدس سرہ اس حکایت کی تائید فرمایا کرتے تھے۔ سلسلۂ چشتیہ کے اس زمانہ کے بعض مشائخ کے احوال کی کتابوں میں میں نے یہ واقعہ دیکھا ہے کہ ہر چند ان بزرگ کا نام وہاں متعین نہیں ہے بعض قرائن سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں کوئی معزز مسلمان اگر ایسے شہر میں پایا جاتا تو شہر کے قضاء، احتساب، افتاء کی سیادت اسی کے حوالہ ہو جاتی تھی بغیر اس کے کہ اس کو قاضی یا محتسب کے نام سے یاد کیا جائے واللہ اعلم۔، پھر ان بزرگ کی وفات کے بعد ان کی اہم ترین اولاد میں سے کمال الدینؒ مفتی ہوئے ہیں اسی طرز پر یہ کام ان کے حوالے ہو گئے، پھر ان کے بعد ان کے صاحبزادے قطب الدینؒ پھر ان کے صاحبزادے عبدالملکؒ اسی طرح مقرر ہو گئے اور ان حضرات کے بعد پھر قاضی مقرر کرنا اس شہر کا دستور ہو گیا۔ عبدالملکؒ کے صاحبزادہ قاضی بدہؒ نے ریاست موروثہ کی حفاظت کے لئے صیغۂ قضاء کو اختیار کیا۔ ان کے دو فرزند ہوئے ایک قاضی قاسمؒ کہ اپنے والد کے جانشین ہوئے ان کی وفات کے بعد اور دوسرے متکن جن کے لڑکے یونس نامی ہوئے اور قاضی کے بعد ان کے دو فرزند ہوئے، ایک قاضی قادنؒ جو اپنے والد کے جانشین ہوئے۔ رئیس شہر تھے بظاہر ان کا نام عبدالقادر یا قوام الدین ہوگا۔ ہندوؤں کے بولنے میں بدل کر قادن ہو گیا۔ واللہ اعلم۔ دوسرے فرزند کمال الدینؒ ہیں ان کے بعد ان کے ایک فرزند نظام الدین نام کے ہوئے۔ اور قاضی قادنؒ کے بعد ان کے دو فرزند ہوئے۔ شیخ محمود اور شیخ آدمؒ جو بھائی خاں سے مشہور تھے۔ ان کی نسل سے شیخ محمود باقیؒ تھے جو کہ اپنے خاندان میں بڑے سمجھے جاتے تھے۔ انھوں نے کسی وجہ سے منصب قضاء اختیار نہیں کیا بلکہ سلطنت کے کام میں مشغول ہو گئے اور زمانہ کے سرد و گرم کو آزمایا۔ ظاہر یہ ہے کہ انکی ننھیال صدیقیان رہتک میں سے تھی ان کی شادی سادات سون پت کی دختر فریدہ سے ہوئی اور ان سے شیخ احمد متولد ہوئے شیخ احمد بچپن

میں رہتک سے نکل گئے اور شیخ عبدالغنیؒ بن شیخ عبدالحکیم کے ساتھ نشو ونما پائی انھوں نے اپنی صاحبزادی سے شادی کر کے مدت تک ان کی تربیت فرمائی اس کے بعد رہتک آ کر بیرون قلعہ مکان تعمیر کیا جس میں اپنے اعوان اور خدمت گاروں کو اپنے ساتھ رکھا۔ شیخ احمد کے بعد ان کی اولاد میں بس دو فرزند رہے ایک شیخ منصورؒ جو شجاعت علم وغیرہ صفات کے جامع تھے۔ انھوں نے پہلی شادی شیخ عبداللہؒ بن شیخ عبدالغنی کی دختر سے کر لی تھی جو ان کے ماموں بھی تھے۔ ان سے دو فرزند شیخ معظمؒ اور شیخ اعظمؒ پیدا ہوئے۔ پھر اسی بیوی کی وفات کے بعد دوسری شادی کی جس سے شیخ عبدالغفورؒ اور شیخ اسماعیلؒ پیدا ہوئے۔ دوسرے شیخ حسین جو خوشحال اور صاحب حیثیت تھے انکے دو فرزند ہوئے محمد سلطان اور محمد مراد، حضرت والد بزرگوار نے محمد مراد کو دیکھا تھا اور ان کی طاقت، قوت کے عجائبات کا مشاہدہ کیا تھا۔ منجملہ ان کے ایک یہ کہ اسی سال کی عمر میں انھوں نے دینار (اشرفی) کو اپنے انگوٹھا اور انگشت شہادت سے مسل کر دوہرا کر دیا تھا۔ وہ جب والد صاحب کو بچپن میں دیکھتے تھے تو کہا کرتے تھے کہ اس لڑکے کو دیکھ کر مجھے ڈر معلوم ہوتا ہے جیسے اس کے دادا شیخ معظم کے دیکھنے سے ہیبت معلوم ہوا کرتی تھی۔

ان اوراق کی علت غائیہ یہ ہے کہ اس سے واقف ہونے والا ضروری نسب پر مطلع رہے جس کا صلۂ رحمی سے تعلق ہو رسول اللہ کا ارشاد ہے۔

وقد قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم	نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نسب
تعلموا من انسابکم ما تصلون بہ	کا وہ حصہ معلوم رکھو جس سے صلۂ رحمی کر سکو
ارحامکم فان صلۃ الرحم محبۃ فی	کیونکہ صلۂ رحمی سے رشتہ داروں میں محبت
الاھل مثراہ فی المال منشاۃ فی	مال میں برکت اور اثرات میں مضبوطی آتی
الاثر	ہے۔

اس فقیر نے شیخ عبدالغنی مذکور کے پوتے سے سنا ہے کہ شیخ عالم ومتقی تھے اکبر بادشاہ ان کی بڑی عزت کرتا تھا اور جب سے بادشاہ الحاد وزندقہ میں مبتلا ہوا تو ان کا باہمی رشتۂ الفت بھی ٹوٹ گیا اور دونوں طرف سے مکمل نفرت ہوگئی ایک مدت بعد بادشاہ کو چتوڑ کی مہم پیش آ گئی مسلسل افواج وہاں بھیجی جاتی رہی مگر فتح نہیں ہوئی۔

امام ناصر الدین کی روحانی امداد

اس ولایت میں امام ناصر الدین شہید بن امام محمد باقر رضی اللہ عنہما کے مزار کے معتکفین میں سے بعض نے بحالت بیداری دیکھا کہ ایک رئیس مع جماعت کے ہتھیار بند ہو کر آ رہے ہیں اور ان کے ساتھ شمع بھی ہے وہ مزار کے قبہ میں داخل ہو گئے۔ خیال ہوا کہ شاید مسافر ہوں گے جو زیارت کے لئے آئے ہوں گے اتنے میں وہ رئیس مزار کے اندر داخل ہو گئے اور جماعت کے افراد بھی۔ کسی نے ان میں سے بعض سے پوچھا کہ یہ رئیس کون ہیں اور یہ جماعت کیسی ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ یہ امام ہیں اور اہل جماعت شہداء ہیں پوچھا کہ کہاں گئے تھے اور کیا کر کے آئے ہیں۔ کہنے لگے کہ فتح چتوڑ کے لئے گئے تھے چنانچہ فلاں وقت، فلاں برج کی طرف سے قلعہ فتح کر لیا۔ شیخ عبدالغنیؒ نے جب اس عجیب واقعہ کی اطلاع پائی فتح کی خوشخبری اور بعینہٖ واقعہ کی تفصیل بادشاہ کو سنا دی کچھ زمانے کے بعد ٹھیک اسی طریقہ پر چتوڑ فتح ہو گیا، بادشاہ نے بارہ گاؤں کا پروانہ مزار امام کے نام کر کے شیخ عبدالغنی کے حوالے کر دیا۔ خواجہ محمد ہاشم کشمی شیخ مجدد حضرت شیخ احمد سرہندی قدس سرہ سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت نے فرمایا کہ میرے والد مدت سے شیخ عبدالغنی کی ملاقات کے خواہاں تھے جو سونی پت کے ایک درویش تھے نہایت معمر اور بزرگ، ان سے ایک راز سننا چاہتے تھے جو انھیں معلوم ہوا تھا اور وہ راز یہ تھا کہ میرے پیر جو میرے نانا بھی ہوتے تھے، وفات کے قریب کہتے تھے کہ مجھے کسی شوریدہ کار درویش کے ساتھ اپنے پاس بلائیں تاکہ وہ مجھے نسبت القاء اور عطا فرمادے جب ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس معاملہ کی حقیقت کا راز زبان سے ظاہر کیا کہ محض اس بات کو سنتے ہی دوسرا درویش اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا اور میں حیران و پریشان وہیں کا وہیں کھڑا رہ گیا۔ حضرت والد شوق سے یہ بات ان سے سننا چاہتے تھے۔ ان کے دربار میں جا کر، کہ اچانک شیخ مذکور کو کسی کام سے سرہند ہو کر جانا پڑا۔ جب وہ سرہند پہنچے اور سرائے میں فروکش ہوئے تو ہمارے والد بھی وہیں پہنچ گئے۔ معانقہ اور مجالست کے بعد خواستگار خلوت ہوئے اور اس سربستہ راز کے افشاء کی خواہش کی۔ شیخ نے اس کو بیان کیا۔ جب ہمارے والد شیخ کی خدمت سے باہر آئے۔ شیخ جمیل الدینؒ کہ فاضل اور صاحب دل تھے ہمارے والد کے خلفاء میں سے تھے انھوں نے والد سے دریافت کیا کہ آپ نے اس بات کو پوچھا تھا، کہا ہاں یہ

معلوم کیا تھا کہ وہ کیا معاملہ تھا تو فرمایا کہ یہی بات جو ہم کہہ رہے ہیں اور جان ہمارا مشرب ہے۔
یعنی یہ جو کچھ نظر آ رہا ہے وہ واحد حقیقی ہے جو کثرت کے عنوان سے نمودار ہوتا ہے لیکن اس درویش
کو سادہ وحی ہوئی اور یہ راز اس کے کان میں پہنچا تو اس سے برداشت نہیں ہوا۔

اور جان کو دے بیٹھا۔ لیکن شیخ عبدالغنیؒ چونکہ عالم اور صاحب تمکین اور آشنا تھے یہ راز خانہ
ظاہر ہونے پر بھی اپنی جگہ سے نہ ہلے۔

حالات شیخ معظمؒ

شیخ معظم انتہاء درجہ شجاعت وغیرہ سے متصف تھے ان کے واقعات عجیبہ اس بارہ میں بے شمار ہیں حضرت والد بزرگوار فرماتے تھے کہ شیخ منصورؒ کی کسی راجہ سے لڑائی ہوگئی لشکر کا میمنہ شیخ معظمؒ کے حوالہ کردیا حالانکہ وہ اس وقت بارہ سال کے تھے، جنگ عظیم ہوئی اور دونوں جانب سے بہت لوگ مارے گئے۔ اس وقت کسی کہنے والے نے شیخ معظمؒ سے کہہ دیا کہ شیخ منصور شہیدؒ ہو گئے اور ان کا لشکر شکست کھا گیا۔ ان کی رگ غیرت حرکت میں آئی انھوں نے کفار کے رئیس کا قصد کیا اور اس بارہ میں جو بھی آڑے آیا اس کو مار ڈالا یا زخمی کر کے بیکار کردیا بڑی جدوجہد کے بعد راجہ کے ہاتھی تک پہنچ گئے ان میں سے کسی سورما نے مقابلہ کرنا چاہا تو اس کے ایک وار میں دو ٹکڑے کر ڈالے اور اس کے اوپر کے دھڑ کو گھوڑے کے سموں سے روند ڈالا کافران پر ٹوٹ پڑے مگر راجہ نے سب کو ڈانٹ کر روک دیا۔ اور کہنے لگا کہ اس قدر کمسنی میں جو اس قدر مردانگی اور بہادری دکھلا رہا ہو وہ تو عجائبات زمانہ میں سے ہے یہ کہہ کر شیخ کے دونوں ہاتھوں کو بوسہ دیا اور بڑا اعزاز کیا اور ان کے اس طرح بھڑ کنے کا سبب دریافت کیا، انھوں نے جواب دیا کہ مجھے اطلاع ملی ہے کہ میرے والد شہید ہو گئے ہیں اس لئے میں نے مقابلہ کرنے اور واپس نہ ہونے کی ٹھان لی تھی تاوقتیکہ کفار کے کمانڈر کو مار ڈالوں یا خود شہید ہو جاؤں۔ راجہ نے کہا کسی نے غلط اطلاع دی ہے تمہارے والد زندہ ہیں اور ان کا نشان فلاں جگہ سے نظر آ رہا۔ اور اسی وقت شیخ منصورؒ کے پاس راجہ نے فرستادہ کو بھیجا کہ ہم اس بچہ کی وجہ سے صلح کرتے ہیں اور جو کچھ مسلمانوں نے مطالبہ رکھا اسے منظور کر کے راجہ واپس ہو گیا۔ نیز حضرت موصوف نے شیخ معظمؒ کے تعلقہ، موضع شکوہ پور کے کسی بوڑھے دہقان سے سنا تھا کہ ایک مرتبہ تقریباً تمیں ڈاکوؤں نے اس گاؤں کے مویشی لوٹ لئے اس وقت شیخ معظم بھی وہاں موجود تھے مگر ان کی اولاد، بھائیوں اور چچازاد بھائیوں میں سے کوئی بھی موجود نہ تھا، انھیں اس حادثے کی اطلاع اس وقت پہنچی جب کہ دسترخوان بچھ چکا تھا۔ شیخ معظم نے کسی بے چینی یا عجلت کا مظاہرہ کئے بغیر حسب عادت کھانا کھایا، فراغت کے بعد ہاتھ

دھوئے اور کہا میرے ہتھیار اور میرا گھوڑا لاؤ۔ جب سوار ہونے لگے تو دیہاتی کسانوں کا ایک مسلح گروہ آ گیا مگر انھوں نے سب کو واپس کر دیا اور کہا کہ میں بہت تیزی سے جاؤں گا تم میرے گھوڑے کی دوڑ کو نہ پہنچ پاؤ گے۔ مگر اس واقعے کے راوی کو جو گھوڑے کی دوڑ کے ساتھ بھاگ سکتا تھا، ساتھ لیا کہ وہ اپنی قوم کو اس جنگ کی تفصیل بتا سکے جو ڈاکوؤں اور ان کے درمیان واقع ہو۔ وہ دوڑے یہاں تک کہ ان ڈاکوؤں کو جا لیا، اس وقت وہ اپنے ٹھکانے پر پہنچ چکے تھے غیرت انگیز کلمات سے جوش دلا کر انہیں میدان میں نکال لائے اور کمال ہنرمندی سے ایک تیر سے دو آدمیوں کو مارنا شروع کیا، جب دو تین ایسے تیر انھوں نے دیکھے تو وہ بہت زیادہ مرعوب ہو گئے اور اپنی زندگی سے مایوس ہو کر انھوں نے فریاد و فغاں شروع کر دی کہ ہم توبہ کرتے ہیں، ہمیں معاف کر دیجیے۔ شیخ معظمؒ نے کہا کہ تمہاری توبہ یہی ہے کہ خود اپنے ہتھیار اتار دو اور تم میں سے ہر ایک دوسرے کے ہاتھ باندھے پھر اپنے ہتھیار اور گھوڑے لے کر اسی گاؤں میں واپس چلو، چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا اور اپنے مذہب کے مطابق قسمیں کھائیں کہ دوبارہ اس قصبے کی طرف بری نظر سے نہیں دیکھیں گے اور شیخ معظم کی منشا کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھائیں گے۔

شیخ معظمؒ کی اولاد

شیخ معظم کے سید نور الجبار سون پتی جو ایک عالی نسب سید تھے اور ان کے بزرگ علم و فضل سے آراستہ و پیراستہ تھے، ان کی صاحبزادی سے تین لڑکے پیدا ہوئے۔

۱۔ شیخ جمالؒ

۲۔ شیخ فیروزؒ

۳۔ شیخ وجیہ الدینؒ

مختصر ذکر شیخ وجیہ الدینؒ

شیخ وجیہ الدین شجاعت و تقویٰ میں درجۂ کمال رکھتے تھے۔ حضرت والد قدس سرہ (شاہ عبدالرحیم) فرمایا کرتے تھے کہ میرے والد رحمۃ اللہ علیہ کا معمول تھا کہ روزانہ قرآن مجید کے دو پارے تلاوت کرتے اور یہاں تک کہ سفر، حضر، غم اور خوشی میں بھی اس معمول کو ترک نہیں کرتے تھے، بڑھاپے میں بینائی کم ہو جانے کے سبب جلی خط میں لکھا ہوا قرآن حکیم اپنے ساتھ رکھتے تھے

جسے وہ سفر میں بھی اپنے سے جدا نہیں کرتے تھے، نیز والد ماجد فرماتے تھے کہ سارے لشکر کے کھیت میں گزرنے کے باوجود وہ اپنا گھوڑا کھیت میں نہیں ڈالتے تھے، اس لئے انہیں بعض اوقات جانے پہچانے راستے سے بھی ہٹ کر چلنا پڑتا تھا، والد گرامی نے فرمایا کہ ایک دفعہ کسی لڑائی میں شیخ وجیہ الدین کا ساز و سامان گم ہو گیا، کھانے پینے کا سامان بھی مہیا نہ تھا۔ ایسے میں ان کے ساتھی تو زبردستی گاؤں کے مویشی لے کر کھا جاتے تھے مگر انھوں نے ایسی پرہیزگاری اختیار کی کہ دو تین فاقے ہو گئے۔ قوت بالکل جاتی رہی تو رازق حقیقی جل شانہ کی رزاقیت نے اس صورت میں ظہور فرمایا کہ وہ اتفاقاً چابک سے زمین کرید رہے تھے جیسے عموماً سوچ بچار کے وقت کیا جاتا ہے تو وہاں سے ان کی خوراک بھر چنے ملے چونکہ گری پڑی چیز کا کوئی مالک نہیں ہوتا اس لئے ان کو دھو کر صاف کیا اور ابال کر کھا لئے۔

والد گرامی فرمایا کرتے تھے کہ میرے والد (شیخ وجیہ الدینؒ) خدام، ملازمین اور گھسیاروں وغیرہ کے ساتھ ایسی شفقت اور انصاف سے پیش آتے تھے کہ اس زمانے کے متقیوں سے بہت کم ایسا برتاؤ دیکھا گیا ہے۔

مزید آپ نے فرمایا کہ ایک سفر میں میرے والد نے کسی ولی کی ولایت کے بعض ایسے شواہد ملاحظہ کئے کہ انھوں نے اس سے بیعت کر لی اور اشغال صوفیا میں مصروف ہو گئے۔ کم گوئی اور کم آمیزی کو اپنا شعار بنایا۔ اور اس سلسلے میں انھوں نے ایسا کمال دکھایا کہ اس زمانے کے صوفیا میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔

کاتب الحروف (شاہ ولی اللہ) کہتا ہے کہ شیخ مظفر رہتکیؒ میرے والد ماجد اور عم بزرگوار کے متعلق ان کے والد شیخ وجیہ الدین کے ارتباط کو بیان کرتے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں ان کے فیوض اشغال صوفیا سے مستفید ہوتے ہوں گے اور یہ دونوں اس چشمۂ شیریں سے سیراب ہوئے ہوں گے۔

حضرت والد ماجد حضرت شیخ وجیہ الدین کی بہادری کی بہت سی حکایتیں بیان کرتے تھے، میں ان سے کچھ واقعات بیان کرتا ہوں تاکہ اہل خاندان کو اخلاق فاضلہ کے اکتساب کی تحریص و ترغیب ہو انما الاعمال بالنیات۔

معرکۂ دہا مونی

والد ماجد نے فرمایا کہ میری عمر چار برس کی تھی کہ میرے والد بزرگوار (شیخ وجیہ الدینؒ) سید حسین کی ہمراہی میں جو اپنے زمانے کا ایک مشہور بہادر شخص تھا اور جس کی بے خوف بہادری کی شہرت اس زمانے میں ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ مالوہ کے علاقے میں قصبۂ دہا مونی کی طرف متوجہ ہوئے اتفاق سے میں بھی اس سفر میں آپ کے ہمرکاب تھا، وہاں ایک کافر جو کہ اپنی بہادری اور شجاعت کی وجہ سے مشہور تھا، نے فساد برپا کر رکھا تھا، بڑی کوشش کے بعد وہ سید حسین کی ملاقات کے لئے آیا، دربان یہ چاہتے تھے کہ وہ ہتھیار لگائے بغیر مجلس میں حاضر ہو، وہ اس پر راضی نہ ہوا، بحث نے طول پکڑا تو اس کافر نے سید حسین کو یہ پیغام بھجوایا کہ آپ سپاہی ہیں اور آپ کے ساتھ ایک لشکر کثیر بھی موجود ہے آپ کو شرم نہیں آتی کہ ایک مکھی کو ہتھیار سمیت اپنی مجلس میں نہیں آنے دیتے۔ سید حسین اس بات سے متاثر ہوئے اور حکم دیا کہ کوئی شخص ان کے اسلحہ کو نہ روکے، فرمایا کہ اس کا ہشاش بشاش چہرہ آج بھی میرے تصور سے نہیں اترتا، وہ پان چباتے ہوئے اور بڑے ناز و انداز سے چل رہا تھا جیسے کسی شادی کی محفل میں آیا ہو، جب میرے والد بزرگوار نے اسے دیکھا تو فرمایا کہ یہ شخص اس مجلس میں ہاتھا پائی کرے گا! انھوں نے جلدی سے اپنے خدمتگار کو طلب کیا اور میری طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے کہا کہ اس بچے کو کسی بلند جگہ پر بٹھا دو تاکہ اس دنگا فساد سے اسے نقصان نہ پہنچے۔ جب وہ سلامی کی جگہ سے آگے بڑھنے لگا تو دربان نے اسے روکا اور کہا یہیں سے سلام کرو آگے مت بڑھو۔ اس نے دربان کی یہ بات سنی ان سنی کر دی اور کہا میں چاہتا ہوں کہ سید صاحب کے پاؤں کو بوسہ دوں تاکہ گناہوں کا کفارہ ہو جائے۔ جب بالکل قریب پہنچا تو اس نے سید حسینؒ پر تلوار کا وار کیا۔ سید حسینؒ بڑی پھرتی سے ایک طرف ہو گئے اور پھر تلوار سید صاحب کے تکئے پر پڑی اور اسے کاٹ ڈالا۔ دوسری بار تلوار اٹھا کر پھر سید حسین پر وار کرنے کا ارادہ کیا اسی لمحے میرے والد گرامی انتہائی عجلت کے ساتھ اس تک پہنچے اور خنجر کے ایک ہی وار سے اسے جہنم رسید کیا۔ اسی سلسلے کا ایک واقعہ یہ ہے کہ فرماتے تھے کہ اسی علاقے میں ایک روز سید حسین کے ساتھ ایک جنگ میں (شیخ وجیہ الدینؒ) حاضر ہوئے، جب دونوں طرف صف آراستہ ہو گئیں تو کفار کے سردار نے تلوار گلے میں حمائل کئے ہوئے گھوڑے پر سوار بآواز بلند کہا میں فلاں ہوں،

اس معرکے میں تنہا کھڑا ہوں چاہو تو مجھے قتل کر سکتے ہو مگر شرط بہادری تو یہ ہے کہ سید حسینؒ اکیلے میرے مقابلے کو نکلیں، سید صاحب کی رگوں میں ہاشمی خون کھول اٹھا، اپنے گھوڑے کو صف سے باہر لے آئے اور اس کے ساتھ مقابلے میں مشغول ہو گئے۔ اس کافر نے چابک دستی کے ساتھ سید صاحب پر وار کر ڈالا جسے انھوں نے ڈھال پر روکا۔ تلوار ڈھال کی ایک طرف کو کاٹ کر دوسرے میں پھنس گئی۔ جب کافر نے اپنی پوری طاقت کے ساتھ اپنی تلوار کو ڈھال میں سے کھینچا تو سید صاحب گھوڑے سے نیچے گر پڑے، کافر کود کر سید صاحب کے سینے پر سوار ہو گیا اور انہیں ذبح کرنے کی کوشش کرنے لگا تو میرے والد بزرگوار اسی وقت ان کے پاس پہنچے اور تلوار کے ایک ہی وار سے اس کافر سردار کو کیفر کردار تک پہنچا دیا۔ جب وہاں سے اٹھے اور ہر ایک اپنی اپنی جگہ گیا تو دشمنوں کی صف میں سے ایک اور سوار ہو بہو پہلے کی قصر پر آگے بڑھا اور بآواز بلند پکارا کہ میں مقتول کا بھائی ہوں۔ آپ کے سامنے اکیلا کھڑا ہوں، جو چاہے قتل کرے مگر شرط شجاعت یہ ہے کہ میرے بھائی کا قاتل میرے مقابلہ کو آئے، میرے والد بزرگوار اس کی طرف بڑھے اور چند واروں کے بعد اسے بھی جہنم رسید کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک تیسرا سوار ویسی ہی شکل وصورت کا سامنے آیا اور اسی طرح دعوت مبارزت دی۔ میرے والد بزرگوار مقابلے کے لئے تیار ہو گئے۔ اس کافر نے ان کے دونوں بازوؤں کو اپنی گرفت میں لے لیا اور ارادہ کیا کہ انہیں زمین پر پٹخ دے یا اپنے گھوڑے پر کھینچ لے۔ انھوں نے مزاحمت کی آخر انہیں معلوم ہو گیا کہ کافر بہت طاقتور ہے تو دھوکہ دیتے ہوئے کہا، اے فلانے، اس سردار کو پیچھے سے وار کرو! حالانکہ پیچھے کوئی بھی نہ تھا، کافر نے منھ پیچھے پھیرا تو اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی، اتنے میں انھوں نے خود کو اس کے ہاتھ سے چھڑا لیا اور خنجر کے ساتھ اسے بھی واصل جہنم کر دیا۔ اس مبارزت کے بعد کفار نے شکست اٹھائی اور لشکر اسلام مظفر ومنصور ہو کر اپنی چھاؤنی میں آ گیا۔ اس واقعے کے تین دن بعد ایک ضعیف العمر عورت پوچھتے پوچھتے حضرت والا کے خیمہ تک پہنچی اور کہنے لگی کہ میں ان تینوں مقتولوں کی ماں ہوں، میں سمجھتی تھی کہ میرے بیٹوں سے بڑھ کر دنیا میں کوئی بہادر اور طاقتور نہیں ہے لیکن خدا کی رحمت تو تجھ پر ہو کہ تو سب سے بڑھ کر بہادر اور قوی ہے اس لئے ان کی بجائے تجھے اپنا بیٹا بناتی ہوں، میری آرزو یہ ہے کہ مجھے اپنی ماں سمجھتے ہوئے میری بستی میں کچھ دن رہ جاؤ تا کہ تجھے جی بھر کے دیکھوں

اور اس طرح مقتولوں کے غم سے تسلی پاؤں۔ آپ نے اپنے خادم سے فرمایا کہ میرے گھوڑے پر زین کس دو۔ آپ کے اقربا میں سے آپ کے بھائی مانع ہوئے اور کہنے لگے عجیب بات ہے کہ آپ جیسا عقلمند آدمی بھی ایسا اقدام کرے۔ حضرت شیخ وجیہ الدینؒ نے ان لوگوں کے روکنے کو کوئی اہمیت نہ دی تو انھوں نے جا کر سید حسینؒ سے اس بات کا اظہار کیا۔ سید حسین فوراً ان کے خیمہ میں آئے اور انہیں انتہائی کوشش اور اصرار کے ساتھ اس بڑھیا کی بستی کی طرف جانے سے روکا۔ جب کوئی چارہ نظر نہ آیا تو اس بڑھیا کو بلوا کر فرمایا: ماں میرے ساتھی مجھے آپ کے ساتھ نہیں جانے دے رہے۔ چند روز بعد میں تیری بستی میں آؤں گا، کچھ دن بعد جب ان کے ساتھی غافل ہوئے تو آپ گھوڑے پر سوار ہو کر اس معمر عورت کے گھر کی طرف چل پڑے۔ وہ عورت اس قدر محبت واخلاص اور تعظیم سے پیش آئی کہ والدہ حقیقی اور اس میں کوئی فرق باقی نہ رہا۔ حضرت والدگرامی (شاہ عبدالرحیم) نے فرمایا کہ میں کئی بار اس کے گھر گیا اور میں اسے دادی جان کہتا تھا۔ اور وہ شفقت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتی تھیں، چونکہ میں نے اپنی حقیقی دادی کو نہیں دیکھا تھا اس لئے مجھے بچپن میں یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ اس معمر عورت کے علاوہ میری دادی کوئی دوسری تھی۔

فیل مست سے مقابلہ

ان کی شجاعت و بہادری کے سلسلے میں ایک حکایت یہ ہے، والدگرامی (شاہ عبدالرحیمؒ) نے فرمایا: جب عالمگیر بادشاہ ہوا تو اس کے بھائی شاہ شجاع نے بنگالہ کی طرف خروج کیا۔ عالمگیرؒ نے اس کے ساتھ جنگ کا ارادہ کیا۔ اور حضرت والد (شیخ وجیہ الدین) بھی عالمگیرؒ کے لشکر میں شامل تھے سخت لڑائی ہوئی اور دونوں لشکر تھک کر چور ہو گئے۔ آخر دو تین مست ہاتھیوں نے شاہ شجاع کی طرف سے عالمگیر کے لشکر پر حملہ کر دیا۔ ہر ہاتھی کے پیچھے زرہ پوشوں کا ایک دستہ تھا۔ صورت حال جب اس طرح ہو گئی تو عالمگیر کے لشکر میں بھگدڑ مچ گئی اور فوجی ہر طرف بھاگنے لگے۔ عالمگیرؒ کے ہاتھی کے اردگرد چند آدمی باقی رہ گئے، اسی وقت میرے والد (شیخ وجیہ الدینؒ) کے دل میں خیال آیا کہ وہ ان ہاتھیوں میں سے کسی ایک پر حملہ کریں۔ انھوں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ یہ جان کی قربانی کا وقت ہے ایسے موقع پر استقامت ہر ایک کا کام نہیں، جو شخص علیحدگی چاہتا ہے اسے میری طرف سے اجازت ہے اس پر سوائے چار آدمیوں کے سب نے باگیں پھیر لیں۔ فرمایا اگر

ہمارے احباب میں سے کوئی ہماری محبت میں شریک ہوگا تو یہی چار ہوں گے۔ ان چاروں نے ان کے شکار بند کو مضبوطی سے تھاما اور آپس میں یہ قول وقرار کیا کہ جہاں وہ (شیخ وجیہ الدینؒ) ہوں گے ہم بھی ان کے ساتھ ہوں گے۔ اس کے بعد انھوں نے سب سے زیادہ سرکش ہاتھی پر حملہ کیا اور انھوں نے اس بات کا انتظار کیا کہ ہاتھی ان کو گھوڑے سے گرانے کے لئے اپنی سونڈ اوپر اٹھائے، جب اس نے سونڈ اٹھائی تو حضرت والا (شیخ وجیہ الدینؒ) نے ایک ہی وار میں اسے کاٹ کر رکھ دیا، ہاتھی بری طرح چنگھاڑتے ہوئے اپنے لشکر کی طرف بھاگا اور الٹا اپنے لشکر کے لئے نقصان کا باعث بنا۔ یہ پہلی فتح تھی۔ عالمگیر نے اس سارے معاملے کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور فتح کے بعد چاہا کہ حضرت والا کا منصب بڑھا دے لیکن انھوں نے استغناء اختیار کرتے ہوئے قبول نہ فرمایا۔

اسی ضمن میں ایک واقعہ یہ ہے، فرمایا کہ ایک بار سید شہاب الدین کو بادشاہ کے سامنے محاسبے کے لئے پیش ہونا پڑا۔ حضرت والا (شیخ وجیہ الدینؒ) ان کے ضامن بن گئے جب انھوں نے رقم کی ادائیگی میں تساہلی کیا تو والد گرامی سے مطالبہ ہوا۔ آپ نے سید شہاب الدین سے رقم کی ادائیگی کے بارے میں بات کی تو انھوں نے کہا میرے پاس تو پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔

تلوار حاضر ہے، مسکرائے اور فرمانے لگے شمشیر پکڑنا تو آسان ہے مگر اس سے عہدہ برآ ہونا مشکل! سید شہاب الدین کی حمیت جاگ اٹھی اور خنجر سے ان پر حملہ کر دیا۔ آپ نے اسے بائیں ہاتھ سے پکڑا اور دائیں ہاتھ سے اسے ایسا تھپڑ رسید کیا کہ الٹا زمین پر آ رہا اور گرتے ہی بیہوش ہوگیا، آپ نے خادم سے فرمایا کہ اسے قید کرلو، اور اس کے اصطبل سے اونٹ اور گھوڑے باہر نکال لو، تھوڑی دیر بعد جب ہوش آیا تو آپ نے اسے فرمایا کہ تیری وہ ڈینگیں کہاں گئیں؟ کہنے لگا میں نے کوئی قصور نہیں کیا ہے میرے ہاتھ سے پہلے آپ کا ہاتھ حرکت میں آیا اور مجھے اس قدر تکلیف ہوئی کہ بیہوش ہوکر گر پڑا، ایسے میں میری کیا تقصیر ہے؟ آپ نے فرمایا درست کہتے ہو۔ خادم کو اشارہ کیا کہ اس کی مشکیں کھول دے اور اس کا خنجر اس کے ہاتھ میں دے دے۔ اس نے خنجر پکڑ کر حملے کا ارادہ کیا کہ اس کے تمام جسم میں لرزہ طاری ہوگیا اور حملہ کرنے کی سکت نہ ہوئی۔ حضرت والا (شاہ عبدالرحیمؒ) نے یہ واقعہ بچشم خود دیکھا تھا۔

منجملہ ان حکایات کے ایک یہ ہے کہ حضرت والد ماجد (شاہ عبدالرحیمؒ) فرمایا کرتے تھے کہ میرے والد (شیخ وجیہ الدینؒ) کی قلبی قوت کا یہ عالم تھا کہ ایک بار ایک معرکۂ جنگ میں سخت خونریز مقابلہ ہوا۔ طرفین میں سے بہت سے لوگ مارے گئے لیکن انجام کار مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی جب لشکر اسلامی کا سپہ سالار رات کے وقت اپنے کیمپ میں واپس آیا تو فوجی افسر اکٹھے ہو گئے اور مقتولین کی تعداد کے بارے میں گفتگو چل پڑی اور یہ بحث خاصا طول پکڑ گئی اس میں ہر شخص اپنی اپنی رائے کا اظہار کرنے لگا۔ آپ (شیخ وجیہ الدینؒ) نے فرمایا میرے خیال میں طرفین کے پانچ کم دو سو یا پانچ اوپر دو سو آدمی ہلاک ہوئے ہیں اور جو لوگ شکست کھا کر بھاگے، میں ان کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا، حاضرین نے اس بات کو تسلیم کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کی ان کے اس تردد پر آپ کے دل میں خیال آیا کہ حقیقت حال کا پتہ لگوایا جائے اور اس مجلس سے اس شخص کی طرح نکلے جو قضائے حاجت کے لئے اٹھتا ہے اور اس بادوباراں کی تاریک رات میں میدان کارزار کو روانہ ہو گئے۔ اسی دوران ان کا ہاتھ ایک ایسے زخمی پر پڑا کہ جس میں ابھی تک زندگی کے آثار باقی تھے۔ اس زخمی نے چیخ ماری، آپ نے اُسے تسلی دی اور اپنا نام اسے یاد دلایا۔ اس کے بعد ان کے دل میں یہ بات آئی کہ کچھ جنگ گاؤں کے وسط میں ہوئی تھی۔ اسے بھی دیکھ لینا چاہئے جہاں انہیں کوئی شک گزرتا اسے اچھی طرح تلاش کر لیتے، اسی اثناء میں آپ کا ہاتھ ایک بوڑھی عورت پر پڑا جو لڑائی کے دوران ایک کونے میں چھپ کر بیٹھ گئی تھی۔ وہ بری طرح چیخی، آپ نے اس کو بھی تسلی دی اور اپنا نام اسے یاد دلایا۔ مقتولین کی تعداد ان کے اندازے کے مطابق نکلی اور پھر آپ لشکر کی طرف واپس ہو گئے تو اس مجلس کو بدستور اسی حالت میں دیکھا، آپ نے جو کچھ کیا اور دیکھا انہیں بتایا تو ان کا تعجب مزید بڑھ گیا اور سپہ سالار نے تقریباً سو آدمی مشعلوں کے ساتھ متعین کئے تاکہ مقتولین کو شمار کریں اور ان دو زخمی آدمیوں کو بھی لے آئیں، یہ لوگ اس پر ہیبت رات میں ایسی خوفناک جگہ پر جانے کے لئے تیار تو نہ تھے ناچار گئے، مقتولین کی گنتی کی اور ان دو زخمیوں کو بھی لے آئے تو گنتی ان کے کہنے کے مطابق تھی اور ان دو زخمیوں نے ان (شیخ وجیہ الدینؒ) کے میدان جنگ آنے کی تصدیق بھی کر دی۔ آپ کے اس قسم کے عجیب وغریب واقعات تو بے شمار ہیں لیکن ہم نے چند ایک پر اسی لئے اکتفا کیا ہے کہ تھوڑا زیادہ کی دلیل اور جو چلو بھر پانی دریا کا پتہ دیتا ہے،

شیخ وجیہ الدینؒ کی شادی شیخ رفیع الدینؒ محمد بن قطب العالمؒ بن شیخ عبدالعزیزؒ کی لڑکی سے ہوئی جس سے آپ کے تین صاحبزادے پیدا ہوئے۔

۱۔ مخدومی شیخ ابوالرضا محمدؒ

۲۔ مخدومی شیخ عبدالرحیمؒ

۳۔ مخدومی شیخ عبدالحکیمؒ

والدگرامی (شاہ عبدالرحیمؒ) فرمایا کرتے تھے کہ ایک رات میرے والد (شیخ وجیہ الدینؒ) تہجد کی نماز ادا کر رہے تھے، ان کو سجدے میں بہت زیادہ دیر ہوگئی۔ میں نے سمجھا کہ شاید ان کی روح پرواز کر گئی ہے۔ انہیں جب اس حالت سے افاقہ ہوا تو میں نے اس لمبے سجدے کے متعلق ان سے دریافت کیا۔ انھوں نے فرمایا کہ مجھے غیبت واقع ہوئی تو میں نے اپنے ان عزیزوں کے حالات جو کہ شہید ہوگئے ہیں ملاحظہ کیے۔ ان کے درجات اور مقامات سے میں بہت خوش ہوا۔ چنانچہ میں نے اللہ تبارک وتعالیٰ سے شہادت کی درخواست کی اور بہت زیادہ گڑ گڑایا۔ یہاں تک کہ میری دعا قبول ہوگئی اور مجھے اشارے سے بتایا گیا کہ تیری شہادت دکن کی طرف ہوگی۔ اس واقعہ کے بعد آپ نے از سرنو سفر کا ارادہ کیا اور سامان سفر فراہم کرنے لگے۔ حالانکہ نوکری چھوڑ چکے تھے اور اس کام سے ایک نفرت سی بھی ہوگئی تھی۔ گھوڑا خریدا اور دکن کو چل دیئے آپ کا خیال تھا کہ شاید یہ مقابلہ سیوا سے ہوگا جو اس وقت کفار کا بادشاہ تھا اور جس سے مسلمانوں کے قاضی کی بہت بے حرمتی ہوئی تھی، جب آپ برہان پور پہنچے تو بذریعہ کشف معلوم ہوا کہ جائے شہادت کے پیچھے چھوڑ آئے ہیں، یہاں سے پھر واپس پلٹے اور راستے میں آپ نے بعض صالح اور متقی تاجروں سے عہد موافقت باندھا اور ارادہ کیا کہ قصبۂ ہنڈیا کے راستے ہندوستان میں داخل ہوں، اسی دوران آپ سے ایک ضعیف العمر شخص ملا جو گرتا پڑتا جا رہا تھا آپ نے اس پر رحم کرتے ہوئے اس کا مقصد ومنزل پوچھی اس نے کہا میرا دہلی جانے کا ارادہ ہے آپ (شیخ وجیہ الدین) نے فرمایا میرے ملازمین سے ہر روز تین پیسے لے لیا کرو، دراصل وہ بوڑھا کافروں کا جاسوس تھا جب یہ قافلہ نونبریا کی سرائے میں پہنچا جو کہ دریائے نربدہ سے دو تین منزل ہندوستان کی طرف ہے تو اس جاسوس نے اپنے ساتھیوں کو اطلاع دے دی، چنانچہ لٹیروں کا ایک بڑا گروہ سرائے میں پہنچ گیا۔

آپ اس وقت قرآن مجید کی تلاوت میں مشغول تھے۔اس گروہ میں سے تین آدمیوں نے آگے بڑھ کر پوچھا کہ وجیہ الدین کون ہے؟ جب انھوں نے آپ کو پہچان لیا تو کہا ہمیں آپ سے کوئی سروکار نہیں، ہمیں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ آپ کے پاس مال و دولت نہیں ہے۔اس کے علاوہ ہمارے گروہ میں سے ایک آدمی پر تمہارا حق نمک بھی ہے لیکن ان تاجروں کے پاس تو اتنا مال ہے ان کو ہم ہرگز نہیں چھوڑیں گے، چونکہ آپ کو اس سفر کے اصلی سبب سے پوری طرح آگاہی حاصل تھی، اس لئے ان تاجروں کی رفاقت چھوڑنے پر راضی نہ ہوئے اور انہیں قتل ولوٹ سے بچانے کے لئے آگے بڑھے، اس مقابلے میں آپ کو بائیس زخم آئے اور ایک زخم سے سرتن سے جدا ہو گیا۔اس کے باوجود تکبیر کہتے ہوئے ایک تیر کی مار تک آپ نے کفار کا تعاقب کیا۔ایک عورت یہ حال دیکھ کر بہت متعجب ہوئی، آپ اسی وقت گر پڑے اور وہیں دفن ہوئے۔

حضرت والا (شاہ عبدالرحیم) فرماتے تھے کہ اسی دن کے آخری حصے میں آپ مثالی جسم میں متمثل ہو کر میرے سامنے تشریف لائے اور زخموں کے نشانات دکھلائے میں نے ایصال ثواب کے لئے کچھ صدقہ دیا، آپ نے فرمایا کہ میرا ارادہ تھا کہ آپ کے جسد کو وہاں سے منتقل کروں، لیکن ایک روز انھوں نے میرے سامنے متمثل ہو کر اس بات سے مجھے منع کر دیا، آپ کے قتل کی خبریں حد سے زیادہ مشہور ہیں۔

شیخ رفیع الدین محمدؒ(۱) کے خاندان کے حالات

تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جو منعم اور وہ نعمتیں بخشنے والا ہے جو حد و شمار سے باہر ہیں اور درود وسلام ہو افضل الانبیاء پر اور اس کی آل و اصحاب پر بھی سلامتی اور رحمت ہو جو کہ ارباب فہم وفراست کے قائد ہیں۔ فقیر ولی اللہ (اللہ اس سے درگزر کرے، کہتا ہے کہ یہ چند کلمات جو کہ النبذة الابريزيه في اللطيفة العزيزيه کے نام سے موسوم ہیں، شیخ عبدالعزیز دہلوی اور ان کے اسلاف واخلاف قدست اسرارہم کے حالات پر مشتمل ہیں جو کہ نسبت مادری سے والد بزرگوار کے جد اعلیٰ ہیں۔

شیخ طاہرؒ

شیخ طاہر کا اصلی اوچ ہے، اور آپ وہاں کے سربرآوردہ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ ابتدائے حال میں سارا وقت سیر وتفریح اور شکار میں گزارا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ یہ مشاغل انہیں تحصیل علم سے بھی باز رکھنے لگے۔ ایک دن آپ کی ہمشیرہ نے آپ سے قرآن مجید کی ایک آیت کا مفہوم دریافت کیا، جس کا جواب آپ سے نہ بن پڑا، یہی واقعہ ان کی غیرت نفس کو برانگیختہ کرنے کا سبب بنا اور قرآن مجید ہاتھ میں لے کر وطن مالوف کو خدا حافظ کہا۔ جہاں بھی جاتے استفادۂ علم کرتے۔ جب تھانیسر پہنچے تو اسی آیت کی تفسیر وتشریح لکھ کر ہمشیرہ کو بھجوا دی۔ اس کے بعد حصول علم کا شوق انہیں بہار لے آیا جو کہ ان دنوں علماء کا مرکز تھا اور اس دوران مناظرہ اور ریاضات کی تحصیل بھی انہیں حاصل ہوئی۔ تحصیل علم کے بعد بہار کے قاضی نے جب ان کے علم وفضل اور وجاہت کو دیکھا تو اپنی دختر نیک اختر ان کے نکاح میں دے دی، اس کے بعد آپ پورب کے کسی علاقے میں قیام پذیر ہو گئے، اس زوجہ سے تین فرزند ہوئے۔ آخری عمر میں شیخ نے اپنے بیٹوں کے ساتھ جون پور میں رہائش اختیار کی اور یہیں رحلت فرمائی۔ آپ کا مزار مبارک اسی شہر میں واقع ہے، جو زیارت گاہ خلائق اور مرکز برکات ہے۔

(۱) حضرت شیخ رفیع الدین محمدؒ جناب شیخ عبدالرحیم والد گرامی شاہ ولی اللہ کے نانا اور شیخ وجیہ الدینؒ کے خسر تھے۔

شیخ حسنؒ

شیخ طاہر کے بڑے صاحبزادے شیخ حسن تھے جنھوں نے ۹ سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کرلیا اور اٹھارہ برس کی عمر میں تمام کتب متداولہ سے فراغت حاصل کر کے درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ بچپن ہی سے آپ میں طلب معرفت اور عقیدت اولیاء کے آثار نمایاں تھے۔ جن دنوں سید حامد راجی شاہ کی عظمت کا شہرہ عام تھا شیخ حسن آزمائش و امتحان کی غرض سے سید صاحب کی ملاقات کو گئے، تو سید صاحب کی پہلی نگاہ ہی نے آپ کو اپنے دائرہ ارادت کی طرف کھینچ لیا۔ سید صاحب اپنے وقت کے مشائخ عظام میں سے تھے اور شیخ حسام الدین مانک پوری کے خلیفہ تھے شیخ حسام الدینؒ جامع شریعت و طریقت اور اکابر مشائخ چشتیہ میں سے تھے۔ آپ شیخ نور قطب العالم کے خلیفہ تھے۔ شیخ نور قطب العالم ہندوستان کے مشہور مشائخ میں سے ہو گزرے ہیں وہ صاحب عشق و محبت، ذوق و شوق، تصرف و کرامات اور ریاضات و مجاہدات تھے، یہ اپنے والد شیخ علاء الحق بن سعد کے خلیفہ تھے جو کہ علوم ظاہر و باطن کے جامع، مرجع عوام و خواص اور پورب و بنگال کے معروف ترین بزرگوں میں سے تھے، شیخ علاء الدین بن سعد شیخ سراج الدین اودھی کے خلیفہ تھے جو کہ شیخ نظام الدین قدس اللہ تعالی اسرارہم کے خلفاء میں سے تھے، کہتے ہیں کہ شارح ہدایہ شیخ ہداد اور دیگر نامور علماء جو شیخ حسنؒ کے ہم درس اور ان کے ہم پیالہ و نوالہ تھے نے سید حامد راجیؒ سے آپ کی بیعت پر حیرانگی و تعجب کا اظہار کیا کیونکہ سید صاحب علوم ظاہری سے پوری طرح بہرہ ور نہ تھے، شیخ حسن نے ان سے کہا کہ اہل علم کی ایک جماعت سید صاحب کی خدمت میں جا کر ان سے ہر قسم کے اشکالات کے بارے میں سوال کرے، اگر صحیح جواب ملے تو عقیدت کے ساتھ ان سے بیعت ہو جائے ورنہ جیسے ان کی مرضی، چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا، ان میں سے بعض کے اشکال تو راستے ہی میں حل ہو گئے اور بعض لوگوں کے اعتراضات سید صاحب کے جمال پرانوار پر نگاہ پڑتے ہی کافور ہو گئے اور باقی حضرات کے مسائل آپ کی حکمت آمیز اور پر اسرار گفتگو سے حل ہو گئے۔ الغرض سب کے سب ان کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئے، کچھ عرصے تک شیخ حسنؒ اس سرزمین میں طالبان معرفت کی تعلیم و ارشاد کا منصب سنبھالے رہے اور اس کے بعد سلطان سکندر جو کہ سلاطین دہلی کے انتہائی انصاف پسند بادشاہوں میں سے تھے کی درخواست

پر دہلی تشریف لائے یہاں آپ نے بجے منڈل کے محل میں رہائش اختیار کی اور یہیں پر ہی جان آفریں کے سپرد کی اور آپ کا مزار بھی اسی جگہ ہے، کہا جاتا فتح خاں پسر سلطان سکندر شیخ کے معتقد تھے اس کے دل میں اچانک بغاوت کا خیال پیدا ہوا اور امرائے مملکت اس سے اس سلسلے میں متفق ہو گئے۔ جب اس نے شیخ سے مشورہ کیا تو انھوں نے اسے اس کام سے منع فرمایا اور امن کی بشارت دی چنانچہ یہی بات سلطان سکندر کی آپ سے عقیدت کا سبب بنی۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جب شیخ دہلی پہنچے تو بادشاہ کو خواب میں ان کے بعض کمالات کا علم ہوا، اس طرح اس کا اعتقاد اور بڑھ گیا۔ آپ نے ۹۰۹ھ میں وجد کی حالت میں رحلت فرمائی۔ اس وقت آپ کی مجلس میں یہ رباعی پڑھی جارہی تھی۔ ع

اے ساقی ازاں مے کہ دل و دیں من است الخ

آپ کی کتاب مفتاح الفیض علوم سلوک میں ان کی یادگار ہے، شیخ کے چار فرزند تھے جن میں سے دو سے آگے نسل چلی۔

۱۔ شیخ محمد خیالیؒ

۲۔ شیخ عبدالعزیزؒ

شیخ محمد خیالیؒ

شیخ محمد خیالیؒ صحیح الحال، پاکیزہ مشرب اور قوی الریاضت تھے۔ آپ اپنے والد گرامی سے بیعت تھے لیکن بعد میں سلسلۂ قادریہ کی نسبت آپ پر غالب ہوگئی آپ نے حرم مدینہ منورہ میں سالہا سال تک عبادات و ریاضات کے مجاہدے کئے، حاجی عبدالوہاب بخاری جب دوسری بار زیارت حرمین کے لئے تشریف لے گئے تو شیخ محمد خیالی کو یہ خوشخبری سنائی۔ مجھے خاتم النبیین علیہ افضل الصلوٰۃ واکمل التحیات نے خواب میں ارشاد فرمایا ہے کہ اس ہندی شیخ زادے نے یہاں کافی وقت دشواری اور مشقت سے گزارا ہے، اب انہیں ہندوستان واپس لے جاؤ۔ انھوں نے کہا جب تک مجھے بذات خود اس بات کا حکم نہیں ہوگا میں یہاں سے ہرگز نہیں ہلوں گا، آخر انھیں بھی حکم دے دیا گیا چنانچہ حاجی عبدالوہاب انہیں ہندوستان لے آئے جہاں ''بجے منڈل'' میں وہ اپنے والد بزرگوار کے پہلو میں آسودۂ خاک ہوئے۔ آپ کے خلفا بے شمار ہیں جو سب کے سب مرتبۂ

کمال کو پہنچے ان میں سے شیخ امان اللہ پانی پتیؒ اور شیخ عبدالرزاق جن جھانی اس علاقے کے مشہور بزرگ ہیں۔

شیخ عبدالعزیزؒ

آپ دو یا تین برس کے تھے کہ والد بزرگوار کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور وہ اپنا باطنی فیض اپنے بیٹے شیخ عبدالعزیزؒ کے لیے (جو ابھی صغیر سن تھے) بطور امانت شیخ قاضی خاں ظفر آبادیؒ کے حوالے کر گئے جو کہ شیخ حسن کے خلیفہ اور استقامت و کرامت زہد و تجرید اور ریاضت و تاثیر صحبت کے حامل بزرگ تھے جب شیخ عبدالعزیز نے شعور سنبھالا تو جناب سید محمد بخاری بن حاجی عبدالوہاب بخاری سے علم حاصل کیا۔ اور حاجی عبدالوہاب سے فصوص کا استفادہ کر کے سلسلہ سہروردیہ کا خرقۂ خلافت زیب تن فرمایا، حاجی عبدالوہاب مذکور نے سید راجو قتال سے خرقۂ خلافت حاصل کیا تھا جو مخدوم جہانیاں رحمتہ اللہ علیہ کے چھوٹے بھائی اور عمر رسیدہ بزرگ تھے اور انہوں نے اپنے برادرم مخدوم جہانیاں اور شیخ رکن الدین ابوالفتح سے بھی خرقہ خلافت حاصل کیا اور ان کا سلسلہ معروف ہے، حاجی عبدالوہابؒ شیخ عبداللہ قریشیؒ کی صحبت میں بھی مدتوں رہے، اس کے بعد شیخ قاضی خاں نے اپنے فرزند شیخ عبداللہ کو شیخ عبدالعزیز کے پاس بھیجا تا کہ وہ انھیں وہ امانت یاد دلائے جو شیخ کے والد ان کے سپرد کر گئے تھے اور یہ بھی کہلا بھیجا کہ میں خود آتا مگر مجبوری یہ ہے کہ اس سلسلے میں طلب شرط ہے شیخ عبدالعزیزؒ یہ خبر سنتے ہی ظفر آباد روانہ ہو گئے۔ جب وہاں پہنچے تو جو کچھ کپڑے، نقدی اور گھوڑے وغیرہ ساتھ تھے سب کے سب راہ خدا میں دے دیئے اور تجرید کے عالم میں مسلسل تین سال تک ریاضات کے دور سے گزر کر ارشاد و تکمیل کے مرتبہ پر فائز ہوئے پھر شیخ قاضی خاں کی اجازت سے واپس دہلی آئے اور قواعد ارشاد کی بنا ڈالی اور اس دوران فرصت کے لمحات میں سید ابراہیم ایرچیؒ سے علوم تصوف کا استفادہ کر کے خرقۂ قادریہ بھی حاصل کیا، سید ابراہیم ایرچی تمام فنون علم میں درجہ کمال رکھتے تھے اور کئی خانوادوں کی برکات کے جامع تھے مگر نسبت قادریہ ان پر غالب تھی اور سلسلۂ قادریہ میں انھیں شیخ بہاءالدین قادریؒ سے خلافت حاصل تھی۔

الغرض شیخ عبدالعزیزؒ کی زندگی مجاہدے اور ریاضت سے عبارت تھی انھوں نے جن چیزوں کو بچپن سے خود پر لازم ٹھہرایا انھیں آخری سانس تک قضا نہ کیا۔ اسلاف کے طور طریقوں کی اتباع

میں کبھی کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا، آپ آداب مشائخ کی حفاظت اور حاجت مندوں کی اعانت کے سلسلے میں بہت سعی فرماتے تھے۔ تواضع، انکسار، شگفتگی طبع، علم، بردباری، صبر، رضا و تسلیم الغرض تمام اخلاق محمودہ میں مشائخ چشت کا مثالی پیکر تھے۔ آپ نے ۶ جمادی الثانی ۹۷۵ھ میں انتقال فرمایا۔ روح پرواز ہوتے وقت زبان پر یہ آیت کریمہ تھی **فسبحان الذی بیدہ الملکوت کل شیء و الیہ ترجعون**

فقیر (شاہ ولی اللہ) نے شیخ یحیٰی جنیدیؒ کے مجموعے میں شیخ عبدالعزیزؒ کے قلم سے سلسلہ قادریہ لکھا ہوا دیکھا جسے تبرکاً من وعن نقل کیا جاتا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سب تعریفیں اس ذات کے لئے ہیں جس نے ہمیں راہ ہدایت دکھائی اور حق کی اتباع پر مامور فرمایا اور درود و سلام ہوں اس کے نبی علیہ السلام اور ان کی صاحب ولایت و ارشاد آل پر اور درود و سلام ہوں ان کے مکرم اور صاحب مجد و کمال اصحاب پر۔

یہ بندہ ناچیز خاکپائے خدام اہل بیت نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام عبدالعزیز بن حسن (اللہ اس کے عیوب کی ستر پوشی کرے اور اس کی آخرت کو دنیا سے بہتر بنائے) عرض کرتا ہے کہ برادر محترم و مکرم، عالم باعمل، فخر فضلاء، و کاملین مایہ اولیاء اور نمونہ اصفیاء شیخ یحیٰی بن شیخ معین الدین خالدی اللہ تعالیٰ اسے بندگان مقبول بارگاہ میں سے بنائے اور اسے نگاہ انتخاب سے نوازے، ان کے خلوص محبت اور کمال معرفت کی بنا پر جب ہم نے ان کے ہاں شرف حضوری اور صحبت پائی، اور جب ہمارے ساتھ ان کا تعلق اور جذبۂ محبت پوری طرح استوار ہوگیا تو ہم نے ان کے ساتھ اخوت دینی کا ناطہ باندھا اور میں نے انہیں خرقۂ مشائخ پہنایا، جبکہ یہ خرقۂ خلافت میں نے بطور ارشاد، ولایت، نیابت اور اجازت اپنے شیخ و مرشد مخدومی و سیدی سید السادات سرچشمۂ برکات سید ابراہیم بن معین بن عبدالقادر بن مرتضی الحسنی القادری سلمہ اللہ تعالیٰ سے اور انھوں نے اپنے شیخ و مرشد ابوالبرکات بہاء الملۃ والدین ابراہیم الانصاری القادری سے اور انھوں نے اپنے شیخ السید قطب عصر ابوالعباس احمد بن حسن الجیلی المغربی الشافعی سے اور انھوں نے اپنے والد بزرگوار سید حسن سے انھوں نے اپنے والد گرامی سید موسیٰ سے انھوں نے اپنے والد بزرگوار سید علی سے انھوں

نے اپنے والد ماجد سید محمد سے اور انھوں نے اپنے والد سید حسن سے اور انھوں نے والد سید محمد صلو احمدؒ سے انھوں نے اپنے والد سید محی الدین ابونصرؒ سے انھوں نے اپنے والد سید ابوصالح سے انھوں نے والد سید عبدالرزاق سے انھوں نے اپنے والد گرامی قطب ربانی غوث صمدانی محی الملة والدین ابومحمد عبدالقادر الحسنی والحسینی الجیلانی سے انھوں نے اپنے شیخ ابوسعید علی المخزومی سے انھوں نے شیخ الاسلام ابوالحسن علی بن محمد بن یوسف القرشی الھنکاری سے انھوں نے اپنے شیخ ابوالفرح یوسف الطرطوسی سے انھوں نے اپنے شیخ عبدالواحد بن عبدالعزیز الیمنی سے انھوں نے ابوبکر شبلی سے انھوں نے اپنے شیخ سید الطائفہ جنید بغدادیؒ سے انھوں نے شیخ سری سقطیؒ سے انھوں نے شیخ معروف کرخی سے انھوں نے ابوسلیمان داؤد بن نصر الطائی سے انھوں نے امام علی بن موسیٰ رضا سے اور انھوں نے اپنے والد امام موسیٰ کاظمؒ سے انھوں نے اپنے والد امام جعفر صادقؒ سے انھوں نے اپنے والد امام محمد باقرؒ سے انھوں نے اپنے والد امام زین العابدینؒ سے انھوں نے اپنے والد امام حسینؓ سے انھوں نے اپنے والد امام علی بن ابی طالب سے (رضی اللہ عنہم اجمعین) اور انھوں نے سید المرسلین خاتم النبیین حبیب رب العالمین محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وصحبہ الطیبین الطاہرین سے حاصل کیا اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ادبنی ربی فاحسن تادیبی میرے رب نے مجھے سکھایا (یعنی اپنی معرفت کی تعلیم) اور کیا ہی خوب سکھایا۔

شیخ قطب العالمؒ

حضرت شیخ عبدالعزیزؒ کے فرزندوں میں شیخ قطب العالم اپنے فضل وکمال، علم ودانش اور جود وسخا کی بنا پر سب سے ممتاز تھے، کہتے ہیں کہ ابتدا میں آپ طریقہ وجد وسماع اور صوفیا کے تمام احوال واطوار کے معترض اور منکر تھے، چنانچہ ایک روز شیخ عبدالعزیز قدس سرہ نے اپنی ایک مجلس میں ان پر توجہ فرمائی تو بے خود ہو گئے، حاضرین نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اب وہ ضرور صوفیا کے معتقد ہو جائیں گے اور انکار واعتراض سے باز آجائیں گے۔ شیخ نے فرمایا کہ ابھی اس کا انکار پوری طرح مستحکم ہے اور ابھی تک اس کی طلب کا وقت نہیں آیا جب شیخ قطب العالم ہوش میں آئے تو حاضرین نے بیہوشی کی کیفیت کے بارے میں پوچھا تو فرمانے لگے، ایک خواب جیسا سماں تھا اس کا کیا اعتبار؟ جب شیخ عبدالعزیز واصل بحق ہوئے تو شیخ نجم الحق جو ان کے سب سے بڑے خلیفہ

تھے اپنے شیخ کے مزار مبارک کی زیارت اور پس ماندگان شیخ سے تعزیت کے لئے آئے جب زیارت سے فارغ ہوئے ارادہ کیا کہ اس جگہ سے باہر نکلیں تو دیکھا کہ شیخ قطب العالم درس دے رہے ہیں، ان کی جانب نظر التفات سے دیکھ کر تصرف کیا اور سوار ہو گئے ابھی ان کی پالکی تھوڑی دور نہیں چلی تھی کہ شیخ قطب العالم پر بے قراری واضطراب کی کیفیت طاری ہوگئی یہ کیفیت لحہ بہ لحہ بڑھنے لگی یہاں تک کہ گرتے پڑتے پیادہ پا شیخ نجم الحق کی طرف چل پڑے اور ان سے بیعت ہو گئے۔ اور خواجہ محمد باقی قدس سرہ کے طریقۂ نقشبندیہ کی تبلیغ میں مشغولیت کے بعد شیخ قطب العالم اکثر ان کی خدمت میں پہنچے اور فیض صحبت جو کہ طریقۂ نقشبندیہ کی بہترین روایت ہے حاصل کرتے، اگرچہ ابتداء میں خواجہ محمد باقیؒ نے شیخ قطب العالم کے آگے زانوئے تلمذتہ کئے اور ان کی خانقاہ میں ایک عرصے تک مجاور بن کر رہے تھے والد گرامی (شاہ عبدالرحیمؒ) فرمایا کرتے تھے کہ جن دنوں خواجہ محمد باقی ان کی خانقاہ میں مقیم تھے تو شیخ (قطب العالمؒ) پر نصف شب کے وقت یہ آشکارا ہوا کہ خواجہ محمد باقیؒ کی تعلیم وتلقین کی تکمیل بخارا میں ہوگی اسی وقت باہر تشریف لائے اور خواجہ محمد باقیؒ سے فرمایا کہ آپ کو مشائخ بخارا بلاتے ہیں آپ کو اسی وقت روانہ ہو جانا چاہئے، اس وقت خرقہ موجود نہ تھا صرف تہ بند تھا وہی عنایت کیا جسے خواجہ محمد باقیؒ نے دستار کے طور پر سر پر باندھ لیا، اور فوراً بخارا کو روانہ ہو پڑے وہاں آپ حضرت خواجہ امکنگی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے فیوض وبرکات کی لازوال نعمت حاصل کی۔

شیخ قطب العالمؒ کے فرزندوں میں سب سے بڑے اور صاحب فضل شیخ رفیع الدین محمدؒ تھے

شیخ رفیع الدین محمدؒ

آپ علوم ظاہری وباطنی کے جامع اور کتب تصوف کے ماہر تھے اور صوفیا کے رموز وکنایات کو بیان کرنے پر کامل دسترس رکھتے تھے۔ پہلے پہل اپنے والد گرامی قدر سے طریقۂ چشتیہ قادریہ میں بیعت کی اور شیخ نجم الحق کی صحبت سے بھی فیض حاصل کرتے رہے، اس کے بعد اپنے والد بزرگوار کی ترغیب پر خواجہ محمد باقی کی صحبت اختیار کی اور حضرت خواجہ ہی کی نسبت ان پر غالب آگئی، حضرت والد ماجد (شاہ عبدالرحیمؒ) فرمایا کرتے تھے کہ شیخ رفیع الدین محمد کے ساتھ خواجہ محمد باقی بے حد مہربان تھے جو کچھ عرض کرتے خواجہ محمدؒ باقی اسے ضرور مان لیتے تھے، اس لئے حضرت خواجہ

کے احباب حضرت شیخ رفیع الدین محمدؒ کو خواجہ کا معشوق کہتے تھے، نیز آپ فرمایا کرتے تھے کہ جب شیخ رفیع الدینؒ کی زوجہ انتقال کر گئیں تو انھوں نے چاہا کہ شیخ محمد عارف بن شیخ غفور اعظم پوری کی دختر سے نکاح کریں، چنانچہ انھوں نے حضرت خواجہ سے مجلس عقد میں تشریف آوری کی درخواست کی، حضرت خواجہ نے ضعف کا عذر ظاہر کیا، شیخ نے کہا کہ اگر حضرت خواجہ اس مجلس میں قدم رنجہ نہیں فرمائیں گے تو میں بھی اس میں نہیں جاؤں گا۔ حضرت خواجہ محمدؒ باقی کو مجبوراً اعظم پور جانا پڑا جب وہاں کے صوفیا نے آپ کی آمد کا سنا تو اطراف وجوانب کے سو فیصد صوفیائے کرام اس مجلس میں حاضر ہوئے اور ایسی عجیب محفل بپا ہوئی کہ ویسی کبھی سنی نہ گئی۔

کاتب الحروف (شاہ ولی اللہ) کہتا ہے کہ حضرت والد بزرگوار (شاہ عبدالرحیمؒ) کی والدہ اسی خاتون کے بطن سے پیدا ہوئیں۔

مقام خواجہ محمد باقی باللہؒ

مزید آپ نے فرمایا کہ شیخ بزرگوار شیخ احمد سرہندیؒ سے حضرت خواجہ محمد باقیؒ کی نسبت ایک ناگوار بات سرزد ہوئی، کہنے والے نے وہ بات جوں کی توں حضرت خواجہؒ کی خدمت میں بیان کر ڈالی یہ سنتے ہی ان کے ماتھے پر بل پڑ گئے اور غصے کے عالم میں ایک قریب پڑی ہوئی ڈور اٹھائی اور قوت کے ساتھ اس میں گرہ لگا دی، شیخ رفیع الدینؒ جو حضرت خواجہ کے مزاج شناس تھے نے اس ڈور کو احتیاط کے ساتھ اٹھا کر اپنے پاس رکھ لیا، چند روز بعد شیخ احمد سرہندیؒ شدید قبض میں مبتلا ہو گئے اور اس کا سبب تلاش کرنے میں پڑ گئے جب اصل حقیقت واضح ہوئی تو دہلی تشریف لائے اور حضرت خواجہ کے احباب سے اس بارے میں سفارش کی درخواست کی، ان میں سے کوئی بھی اس بات پر راضی نہ ہوا اور انھوں نے کہا کہ ہم مرضی خواجہ کے خلاف کسی سفارش کی جرأت نہیں کر سکتے، البتہ حضرت خواجہ کے محبوب جو چاہیں کر سکتے ہیں، یہ سن کر شیخ احمد نے شیخ رفیع الدینؒ کی طرف رجوع کیا، شیخ رفیع الدینؒ نے اس بات کو بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ خلوت میں حضرت خواجہ کی خدمت میں پیش کیا اور کافی لیت ولعل کے بعد ان کی نفرت وغضب کو دور کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ حضرت خواجہ نے فرمایا کیا کروں؟ وہ دھاگہ ہی گم ہو گیا ہے۔ شیخ رفیع الدین نے اسی لمحے وہی دھاگہ پیش خدمت کر دیا، حضرت خواجہ نے اس کی گرہ کھولی تو اسی وقت شیخ احمد کی

قبض بسط سے بدل گئی اور گوہر مقصود دامن میں آپڑا۔

والد ماجد (شاہ عبدالرحیمؒ) فرماتے تھے کہ شیخ فرید بخاریؒ جو اپنے وقت کے بڑے امراء میں سے ہونے کے باوجود جامع شرافت ونجابت اور معتقد صوفیا تھے نے ایک عمارت بنوائی یہ عمارت ان کی مشہور سرائے تھی یا کوئی اور اللہ بہتر جانتا ہے۔ اس عمارت کی تعمیر سے فراغت کے بعد انھوں نے ایک ضیافت کا اہتمام کیا اور شہر کے مشائخ کو دعوت دی، شیخ رفیع الدین محمدؒ بھی اس ضیافت میں موجود تھے جب نغمۂ سرود کی لے چھڑی تو اہل مجلس میں سے ایک شخص کا حال متغیر ہوا، مستی کے عالم میں نعرے لگانے لگا، وہ رقص بھی کر رہا تھا اور اس کے چہرے سے حزن واندوہ بھی ظاہر تھا، تمام حاضرین مجلس آداب سماع کا لحاظ کرتے ہوئے اس کی تواضع کے لئے اٹھے مگر شیخ رفیع الدینؒ اپنی جگہ سے نہ ہلے، بعض لوگوں نے شیخ کے نہ اٹھنے پر اعتراض کی زبان کھولی اور باہم چہ میگوئیاں کرنے لگے کہ شیخ نے آداب طریقت کی خلاف ورزی کی ہے۔ شیخ فرید بخاریؒ نے جب یہ صورت حال دیکھی تو وجد کرنے والے کے سکون کے بعد شیخ رفیع الدینؒ سے پوچھا کہ آپ صاحب وجد کی تعظیم کے لئے کیوں نہیں اٹھے۔ شیخ رفیع الدینؒ نے فرمایا کہ آپ وجد کرنے والے شخص سے اس کے وجد ورقص کا سبب دریافت کریجئے میرے نہ اٹھنے کی حکمت آپ کو خود بخود سمجھ میں آ جائے گی۔ شیخ فریدؒ نے اس شخص کو قریب بلا کر وجد ونعروں کا سبب دریافت کیا۔ اس نے کہا میں اور تو کچھ نہیں جانتا البتہ دو تین روز ہوئے ہیں کہ میری بیوی انتقال کر گئی ہے۔ اس کی جدائی کا غم وحزن میرے دل میں مضمر تھا۔ جب یہ حزنیہ نغمے شروع ہوئے تو غم واندوہ بلا اختیار وجد ورقص کی صورت میں ظاہر ہوا اس پر شیخ رفیع الدینؒ نے فرمایا کہ ایک ایسے شخص کی تعظیم کے لئے اٹھنا جو اپنی بیوی کے غم میں نعرے لگا رہا ہو مشائخ نے کہاں فرمایا ہے؟ یہ سن کر معترض حضرات بہت نادم ہوئے اور اس بحث سے توبہ کی۔

حضرت والد گرامی (شاہ عبدالرحیمؒ) فرمایا کرتے تھے کہ اس دور کے امراء میں سے خان عالم جو شیخ رفیع الدینؒ کے معتقد تھے، ایک دفعہ ان کے گھر سے متصل باغ میں ایک درویش وضع شخص وارد ہوا۔ یہ فقیر بظاہر دنیا اور اہل دنیا سے بالکل بے تعلق نظر آتا تھا، بات بات میں اس کی زبان سے قال اللہ اور قال الرسول نکلتا تھا، خان عالم چند ہی دنوں میں اس کا بہت معتقد ہو گیا۔

اتفاق سے ایک دن شیخ رفیع الدین محمد کا گزر اس باغ سے ہوا، آپ نے اس فقیر کو دیکھا اور خان عالم سے فرمایا کہ یہ تو کالا ناگ ہے۔ اس سے بچ کے رہو، خان عالم نے خیال کیا کہ شیخ نے شاید یہ بات حسد کے طور پر کہی ہے چنانچہ اس نے شیخ کی یہ بات سنی ان سنی کر دی۔ کچھ عرصہ بعد بادشاہ نے خان عالم کو ایران کی سفارت پر مقرر کیا۔ چونکہ اس سفر کے لئے خان عالم کو رقم کی ضرورت تھی جو کہ ان کے پاس موجود نہ تھی چنانچہ خان عالم اس وجہ سے متردد اور پریشان ہوئے۔ فقیر نے ان سے اس پریشان خاطری کا سبب پوچھا، جب اسے پوری بات بتائی گئی تو اس نے تسلی آمیز لہجے میں کہا کہ اس کا علاج میرے پاس موجود ہے میں اکسیر بنانا جانتا ہوں اس پر اتنی رقم خرچ ہوگی خان عالم اس کے دھوکے میں آگئے اور ایک لاکھ روپے سے بھی زیادہ کی خطیر رقم اس کے سامنے ڈال دی تاکہ وہ اس سے اکسیر کے لئے ضروری سامان منگوائے۔ اس فقیر نے عجیب عجیب حیلے شروع کر دیئے اور تمام روپیہ برباد کر کے ایک دن خود بھی روپوش ہوگیا، بہت جستجو کی گئی لیکن اس کا پتہ نہ چل سکا، خان عالم بھی اپنی اس حرکت پر نادم ہو کر چپ ہو رہے، اس سفر سے واپسی کے بعد حافظ محمد حسن نے جو کہ خان عالم کا متبنیٰ تھا ایک برہمن کو دیکھا، جس نے داڑھی، مونچھ منڈائی ہوئی تھی اور سنسکرت زبان میں گفتگو کرتا تھا، اس نے پہچان لیا کہ یہ وہی ٹھگ ہے حافظ محمد حسن نے اسے طرح طرح کی سزائیں دیں تو آخر کار اس نے دھوکہ دہی کا اقرار کر لیا اس سے کچھ مال برآمد ہوا اور باقی ہاتھ نہ آیا۔

حضرت والد گرامی (شاہ عبدالرحیمؒ) فرمایا کرتے تھے کہ خان عالم نے خواب میں ایک بزرگ کی خدمت میں حاضری دی اور ان سے بیعت کی چونکہ خان عالم مصوری بھی جانتے تھے علی الصباح اٹھے ایک صفحے پر اس بزرگ کی تصویر بنا اسے حضرت خواجہ محمد باقی کی خدمت میں ارسال کر دیا اور اس خواب کی تعبیر بھی پوچھی، حضرت خواجہ نے کہلا بھیجا کہ میں اس بزرگ کو اچھی طرح جانتا ہوں اس سے آپ کا بیعت کر لینا مناسب ہے اور شیخ رفیع الدینؒ کی طرف اشارہ فرمایا، شیخ رفیع الدین سے خان عالم کی بیعت اور روحانی تعلق کا سبب ظاہری طور پر یہی واقعہ بنا، سننے میں آیا ہے کہ ایک دفعہ رہزنوں کے ایک گروہ نے شیخ رفیع الدینؒ کے گھر کو لوٹنا چاہا۔ یہ ارادہ کر کے وہ کچھ فاصلے پر کھڑے ہو گئے اور اپنے میں سے ایک کو آگے بھیجا تاکہ آنے جانے کا راستہ

دیکھ لے اور اہل خانہ کی حالت کے بارے میں بھی اطلاع دے جب یہ جاسوس شیخ کے گھر میں داخل ہوا تو اندھا ہو گیا اور ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارنے لگا جس کی وجہ سے اہل خانہ بیدار ہو گئے اور انھوں نے چراغ کی روشنی میں ساری حقیقت حال معلوم کر لی۔ حضرت شیخ نے کمال مہربانی سے اس چور کو کچھ نہ کہا اور صرف یہ فرمایا کہ چلے جاؤ، چور نے جواب دیا کیسے چلوں، بینائی تو ہے نہیں اور نہ ہی چلنے کی طاقت ہے۔ شیخ اس کے قریب آئے اور اپنا عصا اس کے گھٹنوں اور آنکھوں پر لگایا، یہاں تک کہ ان کے عصا کی برکت سے وہ اس مصیبت سے نجات پا کر اپنے گروہ سے آملا اور کہنے لگا کہ تمہارے برعکس یہاں تو معاملہ ہی اور ہے! تمام ڈاکو پشیمان ہو کر واپس چلے گئے۔ اس کے بعد انھوں نے کبھی شیخ کے دولت کدے کا رخ نہ کیا، حالانکہ شیخ کا مکان آبادی شہر سے الگ واقع تھا اور اس کی عمارت بھی پختہ نہ تھی، پھر آپ کی دولت مندی اور امارت کے قصے بھی مشہور تھے اور پہرے کا بھی کوئی انتظام نہ تھا۔

قدوۃ العارفین حضرت شیخ محمد قدس سرہ العزیز کے مختصر حالات زندگی اور کرامات کا بیان

تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس نے اپنے اولیاء کو مختلف نشانیوں کے ذریعے عزت بخشی اور اپنے بندوں میں سے مقربین کو فضائل کے ذریعے منتخب فرمالیا، وصل اللہ علی خیر خلقہ وآلہ وصحبہ اجمعین ،فقیر ولی اللہ بن شیخ عبدالرحیم العمری الدہلوی عرض کرتا ہے کہ یہ چند کلمات کو کہ ''العطیۃ الصمدیۃ فی انفاس المحمدیۃ '' کے نام سے موسوم ہیں۔میرے جد مادری قدوۃ العارفین عمدۃ الواصلین حضرت شیخ محمد پھلتی قدس اللہ تعالی سرہ العزیز کے احوال ومناقب اوران کی کرامات پر مشتمل ہیں،واضح ہو کہ حضرت شیخ محمدؒ کے اجداد پہلے پورب کے ایک شہر سدھور میں مقیم ہوئے اور وہ نسلاً بعد نسل مسند تدریس کو زینت بخشتے رہے۔یہاں تک کہ شیخ احمد بن شیخ یوسف سلطان سکندر کی صحبت میں پہنچے اور وہاں ایک خاص مقام پیدا کیا۔سلطان سکندر نے انہیں معاش کے لئے بارہہ کے علاقے میں چند مواضعات پیش کئے۔اسی بنا پر قصبہ پھلت کو ان کی مستقل قیام گاہ بننے کا شرف حاصل ہوا، کچھ مدت کے بعد ان کی آل اولاد نے بھی وہاں سکونت اختیار کرلی، شیخ احمد مذکور کے برادر شیخ محمود کے فرزندوں میں سے دو، شیخ فرید اور شیخ محمد وہیں رہ گئے ،مجموعی طور پر شیخ فرید اپنے آباواجداد کے طریقے پر کاربند اور علوم کسبی وہبی سے بہرہ ور تھے۔ ان کے تین فرزند ہوئے شیخ فیروز ، شیخ ابوالفتح اور شیخ عبدالرحمٰن ،ان تینوں میں سے شیخ ابوالفتح نے عین جوانی کے عالم میں تحصیل علوم کی طرف توجہ کی انہیں علم سے وافر حصہ ملا اس کے بعد سلوک باطن کی طرف اپنی بلند ہمت کو مبذول کیا اور کافی عرصے تک اس دور کے صوفیا کی صحبت میں رہے۔ایک ثقہ روایت کے مطابق آپ شیخ عبدالعزیز کی خدمت میں پہنچ کر ان سے بھی مستفیض ہوئے بعد ازاں شیخ نظام نارنولی جو کہ مشاہیر مشائخ چشت اور خواجہ خانوی گوالیری کے خلفاء میں سے تھے کی صحبت اختیار کی ، یہ صحبت ان کو غایت درجہ راس آئی ، برسوں ریاضتیں کیں اور بے پایاں

فیوض سے اپنی تشنہ روح کو سیراب کیا۔

جب آپ نے سلوک و ارشاد کی تکمیل کر لی تو اپنے وطن واپس ہوئے۔ سننے میں آیا ہے کہ شیخ نظام خود علوم ظاہری زیادہ نہیں جانتے تھے ان کے گھر میں ان علوم کا فیض شیخ ابوالفتح ہی کے ذریعے پہنچا حضرت شیخ نے اپنے مرشد کی اولاد کی تربیت کا بیڑا اٹھایا اور تھوڑے ہی عرصے میں انہیں پڑھا لکھا کر دانشمند اور نامور بنا دیا۔

مزید یہ سنا گیا ہے کہ ایک صاحب دل بزرگ نے جب شیخ ابوالفتحؒ کو حضرت نظام کی بارگاہ میں دیکھا تو سخت تعجب کے انداز میں کہا آفتاب ستارے کی پناہ لئے ہوئے ہے مزید یہ بھی سنا گیا ہے کہ حضرت شیخ عبدالعزیزؒ کے خلفاء میں سے شیخ ہیبت اللہ انصاری جو کہ پھلت کے باشندے تھے نے سفر آخرت اختیار کرنے سے پہلے یہ وصیت کی کہ ان کا جنازہ شیخ ابوالفتحؒ پڑھائیں جب کہ عین اسی وقت حضرت شیخ ابوالفتحؒ نارنول میں تھے۔ لوگ انتظار میں تھے اور وضو کر رہے تھے کہ اتنے میں شیخ ابوالفتحؒ نہایت تیزی سے پہنچ گئے اور نماز جنازہ کے امام بنے۔ نارنول میں ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا اور وہ فوری طور پر وطن روانہ ہوئے، گویا ان کے وطن پہنچنے کا واقعہ اسی بات سے متعلق تھا۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ دونوں شیوخ شیخ ہیبت اللہ اور شیخ ابوالفتح نے آپس میں یہ عہد کر رکھا تھا کہ ان میں سے جو بھی پہلے رحلت کرے گا، دوسرا اس کی نماز جنازہ پڑھائے گا۔ جب شیخ ہیبت اللہ مرض الموت میں مبتلا تھے اور شیخ ابوالفتح نے نارنول کا عزم کیا تو جاتے وقت شیخ ہیبت اللہ نے انھیں اپنا وعدہ یاد دلایا۔ شیخ ابوالفتحؒ نے کہا کہ اگر ایسی صورت ہوئی تو وہ وعدہ ضرور پورا ہوگا۔ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پھلت پہنچنے کا سبب دراصل یہی وعدہ تھا۔

مزید سننے میں آیا ہے کہ شیخ ابوالفتحؒ کا رشتہ خواجہ طیفور کی عفت مآب صاحبزادی کے ساتھ ہونا قرار پایا۔ مجلس نکاح میں جب گانے کی آواز بلند ہوئی تو شیخ ابوالفتحؒ کی حالت متغیر ہوگئی اور وجد و رقص کی حالت میں اٹھ کھڑے ہوئے، چونکہ خواجہ طیفور کا مشرب انکار سماع تھا، اس لئے اس واقعے کو خواجہ طیفور تک پہنچایا گیا، خواجہ صاحب آئے اور خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تو کہنے لگے کہ اس عزیز کو حقیقی وجد ہوا ہے جس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ اور ایک روایت یہ بھی سنی گئی ہے کہ جب شیخ

ابوالفتح کے انتقال کا وقت قریب آیا تو اپنے بھتیجے شیخ ابوالحسن کو بلوایا اور اشارے سے فرمایا کہ قرآن مجید کی کوئی صورت پڑھو۔ جب وہ تلاوت سے فارغ ہوئے تو شیخ ابوالفتح نے فاتحہ کے لئے ہاتھ اٹھائے اور **سبحان ربک رب العزة عما یصفون** (۱) پڑھتے ہوئے اپنے ہاتھ چہرے پر پھیرے کہ آپ کا طائر روح قفس عنصری سے پرواز کر گیا۔ شیخ ابوالفتح کا اوراد و وظائف پر مشتمل ایک نہایت لطیف رسالہ آپ کی یادگار ہے الغرض جب شیخ ابوالفتح کے ایام زندگی پورے ہوئے تو ان کے بڑے فرزند شیخ ابوالفضل ظاہری و باطنی فیوض عام کرنے کے لئے ان کے جانشین ہوئے۔ آپ نے طویل عمر پائی جو سب کی سب رضائے الٰہی، ترک دنیا واہل دنیا، تدریس علوم دینیہ اور کتب سلوک مثلاً ''احیاء'' اور ''عین العلم'' کی تحقیق وتوضیح اور ان کی اشاعت وعمل میں گزاری۔ آپ آداب طریقت میں نہایت خوش مسلک تھے فقیر (شاہ ولی اللہ) نے عین العلم کا نسخہ جس پر شیخ ابوالفضل نے اپنی قلم سے حواشی لکھے ہیں، دیکھا ہے، اس کتاب کے حواشی کی خوبی ان کی تحقیق وتدقیق پر دلیل ہے۔

سنا گیا ہے کہ ایک روز آپ نے اپنے عزیزوں میں سے ایک شخص کو کوئی چیز لانے کو کہا۔ اس شخص نے اس میں سے کچھ اپنے پاس رکھ لی اور باقی شیخ کی خدمت میں پہنچا دی اسی دوران کہیں بطور نیاز آپ کی خدمت میں حلوہ آ گیا شیخ اسے تقسیم کرنے لگے جب اس شخص کی باری آئی تو اسے سب سے کم دیا اور فرمایا کہ یہ تمہاری اس خیانت کا بدلہ ہے جو تم نے ہمارے ساتھ کی۔

شیخ ابوالکرم

جب شیخ ابوالفضل کی زندگی کے دن پورے ہو گئے تو ان کے بڑے فرزند شیخ ابوالکرم جو کہ پہلے ملازم پیشہ تھے، سجادہ نشینی کے لئے کوشاں ہو گئے، اور اس منصب کی ذمہ داری سنبھالنے کا ارادہ کیا، اعزہ واقارب میں سے ایک گروہ ان کی حمایت میں اٹھ کھڑا ہوا، جب شیخ مبارک جو کہ شیخ ابوالفضل کے خادم تھے نے یہ صورت حال دیکھی تو وہ متفکر ہوئے اور حضرت شیخ کی روحانیت کی طرف متوجہ ہوئے تا کہ شیخ کی طرف سے سجادہ نشینی کے منصب کی وضاحت ہو جائے۔ شیخ ابوالفضل نے خواب میں اپنے خادم شیخ مبارک سے فرمایا کہ میرا سجادہ نشین وہی ہوگا جو کل فلاں

(۱) الصفت: ۱۸۰

درخت کے نیچے کھانا تقسیم کرے گا۔ شیخ مبارک نے یہ سارا واقعہ حاضرین کو بتا دیا۔ صبح سویرے یہ عجیب اتفاق ہوا کہ تقسیم طعام کا کام اسی درخت کے نیچے شیخ محمد عاقل کے ہاتھ میں تھا۔ رفتہ رفتہ شیخ ابولکرم کی جمعیت میں تفریق کے اسباب پیدا ہو گئے اور وہ اس مشکل وقت میں صبر کا مظاہرہ نہ کر سکے جو کہ فقراء کا خاصہ ہے۔ خلاصہ کلام یہ کہ شیخ محمد عاقل طالبان علم اور فقراء کی رعایت فرماتے تھے اور وظائف واوراد پر سختی سے کاربند رہنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرتے تھے۔ آپ جود وسخا اور ترک دنیا میں بہت بلند مقام کے مالک تھے آپ کے سب سے بڑے فرزند مخدوم شیخ محمد تھے

حضرت شیخ محمدؒ

بچپن ہی سے شیخ محمد کی جبین مبارک سے رشد وہدایت کے آثار ہویدا تھے اور اہل دل بزرگ ان کے ساتھ التفات سے پیش آیا کرتے تھے چنانچہ شیخ جلال جو شیخ آدم بنوریؒ کے خلفا میں سے تھے اور اس علاقے میں گوشہ نشینی اختیار کی ہوئی تھی، شیخ محمد عاقلؒ کے ساتھ بہت قلبی لگاؤ رکھتے تھے۔ جب شیخ محمد پیدا ہوئے تو انھوں نے بشارت دی اور بالوضاحت تمام خواص کو یہ خبر دی کہ یہ نومولود بچہ بلند رتبے کا مالک ہے۔ شیخ جلال نے اس بچے کی ولادت پر ایک دینار بطور ہدیہ دیا اور دنیا سے رخصت ہوتے وقت یہ وصیت کی کہ ان کا نسخہ قرآن مجید شیخ محمد کو دیا جائے۔

جب شیخ محمد سن شعور کو پہنچے تو تحصیل علم میں مشغول ہو گئے۔ آپ نے اپنی تعلیم کا کچھ حصہ نارنول میں اور کچھ مخدومی شیخ ابوالرضا محمد کی خدمت میں رہ کر حاصل کیا بعد ازاں قدوۂ ارباب کمال سیدی ووالدی شیخ عبدالرحیم قدس سرہ کی صحبت میں پہنچے جو انہیں حد درجہ موافق آئی، یہاں انھوں نے علوم کی تکمیل کی اسی دوران پردۂ غیب سے انہیں راہ معرفت کی طرف آنے کی دعوت ملی جسے حضرت شیخ نے مردانہ وار لبیک کہا۔ انھوں نے ان تمام سرچشموں سے استفاضہ کرتے ہوئے سالہا سال تک معرفت کی طلب میں پوری مستعدی دکھائی اور صوفیا کے تمام اشغال حاصل کئے یہاں تک کہ۔

کان للہ یودہ درما مضی

تا کان اللہ لہ آمد جزا

(کیا تو ماضی میں اللہ کے لئے تھا کہ اس کے بدلے میں خدا تیرے لئے ہو جائے) کے

مصداق مقامات تکمیل وارشاد سے دامن بھر کر آپ وطن مالوف کی طرف لوٹے، الغرض آپ کی سیرت یہ تھی کہ جود وسخا، تواضع وانکساری، ترک خواہشات نفس اپنے مرشد کے احترام اور ایام طلب وارشاد دونوں حلقوں میں اپنے شیخ کی رضا جوئی، افادۂ ظاہری و باطنی اور تاثیر توجہ میں اپنے تمام خاندان میں صاحب فضیلت تھے۔ اس سلسلے میں آپ کے بلند مقام کا یہ عالم تھا کہ ہمعصروں کے لئے ان کے ساتھ برابری کی کوئی گنجائش نہ تھی۔

حضرت شیخ محمد فرمایا کرتے تھے کہ تحصیل علم کے دوران چونکہ ہمارے شیخ اکثر و بیشتر تجرد میں مستغرق رہتے تھے اور اس بناء پر ہمارے اسباق تھوڑے ہوا کرتے تھے، یہ دیکھ کر میرے دل میں قلق پیدا ہوا انہی دنوں اتفاقاً میرا گزر شہر کے ایک عالم کے درس سے ہوا تو وہاں کی پابندی درس دیکھ کر میں نے پختہ ارادہ کرلیا کہ کچھ ضروری کتابیں اس درس میں پڑھ لینی چاہئیں جب میں واپس حضرت شیخ کی خدمت میں پہنچا تو انھوں نے مجھ پر ایک نگاہ ڈالی اور قلم اٹھا کر ایک کاغذ کے ٹکڑے پر دو تین لفظ لکھے اور اسے وہیں پھینک کر گھر تشریف لے گئے، میں نے کاغذ کا وہ پرچہ اٹھا کر دیکھا تو اس میں لکھا تھا، "آج تم کہاں گئے ہوئے تھے کہ میں تمہارے اندر ایک ظلمت دیکھ رہا ہوں"۔ میں نے توبہ کی اور اپنے ارادے سے باز آیا، پھر اس قسم کا کوئی خیال میرے ذہن میں نہ گزرا۔

ایک روز حضرت شیخ (مرشد شیخ محمدؒ) نے اپنے ایک مرید کو کسی صاحب کے گھر ایک بکری پہنچانے کا حکم دیا، جب اس نے بکری کو ہنکانے اور اٹھانے دونوں صورتوں میں دشواری محسوس کی تو اس نے کسی مزدور کی تلاش شروع کی مگر اسے کوئی مزدور ہاتھ نہ آیا۔ اس لئے اس کام میں تاخیر ہوگئی۔ شیخ محمدؒ کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو وہ فوراً بکری کو کاندھے پر اٹھا کر چل پڑے۔ جب شیخ محمد واپس آئے اور حضرت شیخ کو دونوں کے بارے میں علم ہوگیا تو آپ نے فرمایا کہ شیخ محمد کو اس کی حسن خدمت میں مقربین کے درجے پر پہنچایا۔ اور دوسرے کو اس کے قصور نے اس مرتبے کے حصول سے باز رکھا۔ شیخ محمدؒ نے فرمایا کہ لگ بھگ آدھی رات کا وقت تھا کہ حضرت شیخ مسجد سے اٹھ کر جب اپنے دروازے پر پہنچے تو ایک لمحے کے لئے مراقبے کی صورت میں بیٹھ گئے اور اس وقت مجھ سے فرمانے لگے اگر کوئی طالب راہ سلوک تمہاری طرف رجوع کرے تو جو کچھ تمہیں مجھ

سے پہنچا ہے اسے اس کی تلقین کرنا تمہیں اس کی اجازت ہے۔ میں قدرے توقف میں پڑ گیا اور میرا دل کہ جس میں کبھی اس طرح کا خیال نہیں آیا تھا اس بات سے گھبرا گیا حضرت شیخ میرے اس خدشے پر مطلع ہو کر فرمانے لگے، اس وقت خدا تعالیٰ نے ان تمام لوگوں کے نام مجھے الہاماً بتا دیئے ہیں جو تم سے براہ راست یا بالواسطہ بیعت کریں گے چاہو تو میں ان میں سے کچھ کے نام تمہیں بتا دوں، یہ جان لو کہ جب کوئی امر خدا تعالیٰ کے ہاں مقرر ہو جائے تو پھر وہ محل توقف نہیں ہوتا۔

تاثیر صدقہ

شیخ محمد نے فرمایا کہ ایک امیر کو رکاوٹ پیشاب کا عارضہ لاحق ہو گیا بہت علاج معالجہ کیا مگر افاقہ نہ ہوا۔ اسی دوران شیخ بایزیدؒ اللہ گو درویشوں کی اللہ اللہ پکارنے والی جماعت کے ساتھ وہاں سے گزرے۔ امیر کے متعلقین ان کے پیچھے دوڑے اور عرض کیا کہ ہمارے یہاں ایک بیمار ہے اس کے حال پر توجہ فرمائیں۔ شیخ بایزیدؒ اللہ گو اس گھر میں داخل ہوئے۔ بیمار کی پریشانی دیکھ کر شفقت فرمائی اور خدا کی راہ میں کوئی چیز دینے کے لئے کہا۔ اس نے کہا جس قدر فرمائیں؟ آپ نے فرمایا فی الحال ایک ہزار روپیہ حاضر کرو۔ شیخ دروازے کے باہر کھڑے ہوئے اور اپنا پرایا جو بھی سامنے آیا وہ روپیہ ان میں تقسیم فرماتے گئے یہاں تک کہ رقم ختم ہو گئی تو پوچھا کہ اب مریض کا کیا حال ہے؟ انھوں نے کہا ابھی تو ویسے ہی ہے فرمایا ایک ہزار روپیہ مزید لاؤ۔ وہ لے آئے وہ بھی تقسیم کر دیا اور پوچھا کہ اب کیسا ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ اسی طرح ہے، یہ سن کر آپ نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے اور فرمایا اے خدا اب کے مجھے مانگتے ہوئے شرم آتی ہے اپنے فضل سے اس مریض کو شفا عطا فرما دے۔ اسی وقت مریض کے پیشاب کی رکاوٹ ختم ہو گئی اور وہ شفایاب ہو گیا فرمایا کرتے تھے کہ سترہ سال ہوئے میں خود کو خود میں نہیں پا رہا اور اکثر یہ رباعی پڑھا کرتے تھے۔

اے دوست ترا بہ ہر مکاں می جستم
وز تو خبر ز این و آں می جستم
دیدم بتو خویش را تو خود من بودی
خجلت زدہ ام کز تو نشاں می جستم

(اے محبوب ازل تجھے میں نے ہر جگہ تلاش کیا اور این و آں ہر چیز سے تیری خبریں پوچھیں۔ جب میں نے تیری تلاش میں خود پر نظر کی تو میں نہ تھا تو ہی تھا اس لئے شرمندہ ہوں کہ میں تیرا نشان پانے کی تلاش میں سرگرداں تھا)۔

حضرت شیخ محمد نے فرمایا کہ ایک روز مشاہدات میں حق سبحانہ وتعالیٰ ایک دوست کی صورت میں اس طرح جلوہ گر ہوئے کہ گویا ایک بچے کو انگلی سے پکڑے ہوئے لا رہے ہیں اور مجھے فرمایا کہ یہ بچہ تیرے گھر پیدا کرتا ہوں۔ میں نے عرض کیا بار خدایا تیری مخلوق ہے تو جہاں چاہے پیدا کرے۔ اس واقعے کے تھوڑے عرصے بعد مخدومی شاہ عبید اللہ سلمہ اللہ تعالیٰ جو کہ حضرت شیخ محمد کے سب سے بڑے فرزند تھے، پیدا ہوئے۔

حیات شہید

فرمایا کہ میرے اقارب میں سے محمد سخی نامی ایک شخص جو کہ پورب کے کسی علاقے میں شہید ہو گیا تھا طالب علمی کے دور میں ایک دن مسجد جٹو کے ایک حجرے میں تنہا کواڑ بند کئے بیٹھا تھا کہ اچانک وہ عزیز میرے سامنے ظاہر ہوا اس کے لباس اور ہتھیاروں کی چمک زمین پر پڑ رہی تھی، میں نے کہا کہ کچھ اپنے بارے میں تو بتاؤ، کہنے لگا کہ جب میں زخم کھاتا جاتا تھا تو ایسی لذت محسوس ہوتی تھی کہ جس کی حلاوت اب بھی میرے دل میں باقی ہے اس وقت بادشاہ کو فوج فلاں بت خانے کو توڑنے کی خاطر جا رہی ہے میں بھی ان کی رفاقت میں جا رہا ہوں یہاں سے گزر رہا تو آپ سے ملاقات کا شوق مجھے یہاں لے آیا۔

حیات اولیاء

جب حضرت شیخ محمدؒ اس دنیا سے رخصت ہوئے تو حضرت والد بزرگوار (شاہ عبدالرحیمؒ) نے ان کے مزار پر بیٹھ کر حاضرین کو ذکر بالجہر کا حکم دیا۔ اس مجلس ذکر کے بعد آپ نے فرمایا کہ حضرت شیخ محمد کی روح نے میرے سامنے ظاہر ہو کر کہا ''میں چاہتا تھا کہ اپنے جسم سمیت آپ کے پاس آؤں کیونکہ خدا نے مجھے یہ طاقت عطا کر رکھی ہے مگر یہ بات مصلحت کے خلاف تھی۔

حضرت شیخ محمدؒ کے تصرفات اور بعض کرامات

صورت شیخ کا کرشمہ

آپ کے مرید خاص سید علی بیان کرتے ہیں کہ عنفوان شباب میں شراب نوشی کا مرتکب تھا اور کسی بھی برے فعل سے احتراز نہیں کرتا تھا۔ میں نے اپنے دل میں یہ عہد کر رکھا تھا کہ اگر کسی بزرگ کی زیارت سے میں ان قبیح امور سے باز آ گیا اور تقویٰ و پرہیز گاری میرے دل میں جاگزیں ہوگئی تو میں اس کی صحبت اختیار کروں گا اور اسی سے بیعت کروں گا۔ حضرت شیخ محمدؒ کسی تقریب کے سلسلے میں قریہ سرائے میں تشریف لائے، چونکہ میرے والدان کے معتقد تھے اس لئے میں بھی ان کے ساتھ شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے میری طرف توجہ فرمائی اور فرمایا تم کہاں تھے؟ اور کہاں نوکر ہو؟ یہ دو تین لفظ انھوں نے میرے بارے میں ادا فرمائے ہی تھے کہ میرے دل میں ایک عجیب قسم کی کشش پیدا ہوئی اور تمام برے امور سے ایسی نفرت پیدا ہوئی جو لحظہ بہ لحظہ بڑھتی گئی یہاں تک کہ میں اٹھا شراب کی تمام بوتلیں توڑ ڈالیں، برے افعال کی تمام اسباب ہٹا دیے، غسل کر کے نئے کپڑے پہنے اور توبہ کر کے آپ سے بیعت ہو گیا اور باقاعدگی سے آپ کی صحبت میں شامل ہونے لگا، کچھ عرصہ بعد مجھے سفر کابل کا اتفاق ہوا تو میں نے حضرت شیخ کی خدمت میں عرض کی کہ میرا ارادہ تھا کہ کچھ وقت آپ کی صحبت کی سعادتوں سے بہرہ اندوز ہوتا مگر کیا کروں کہ قسمت کابل کی طرف کھینچے لئے جاتی ہے۔ اس پر آپ نے یہ مشہور شعر پڑھا۔

گر در یمنی چو بامنی پیش منی

در پیش منی چو بے منی در یمنی

(چاہے تم یمن میں بھی رہو لیکن مجھے اپنے ساتھ رکھو تو یہ یوں ہے جیسے میرے سامنے ہو اور اگر میرے ساتھ بھی رہو مگر میرے تصور کے بغیر ہو، تو یہ ایسے ہے، جیسے یمن میں ہو)

اس کے بعد آپ نے مجھے اجازت عطا فرمائی اور میں کابل پہنچ گیا، وہاں ایک دن اتفاق

سے مجھے ایک عورت کے ساتھ تنہائی میسر آ گئی اور بدکاری کی خواہش نے مجھ پر پوری طرح غلبہ پالیا، قریب تھا کہ میری توبہ ٹوٹ جاتی کہ عین اسی وقت حضرت شیخ محمدؒ کی صورت مبارک میری آنکھوں کے سامنے آ موجود ہوئی۔ آپ کی شکل مبارک دیکھتے ہی مجھ پر سوار شہوت کا بھوت یکدم غائب ہو گیا۔ اس کے بعد میں نے کابل میں تین چار سال گزارے لیکن اس دوران عورتوں کا خیال تک میرے دل میں پیدا نہ ہوا۔ اس سے مجھے یہ گمان گزرا کہ میں نامرد ہو گیا ہوں، مگر جب وطن واپس آیا اور اپنی منکوحہ بیوی کے ساتھ صحبت کی تو مجھے معلوم ہوا کہ میں نامرد نہیں تھا بلکہ یہ عظمت حق تھی (جس کے طفیل میں بدکاری سے محفوظ رہا)

عظمت اللہ نامی ایک طالب علم حضرت شیخ محمدؒ کی خانقاہ میں مقیم تھا جو حسین شکل وصورت کا مالک تھا، جب وہ نغمہ کی لے چھیڑتا تو حضرت شیخ بہت خوش ہوتے تھے، ایک رات آپ حد درجہ مسرور تھے کہ عظمت اللہ کو گانے کے لئے فرمایا۔ اس نے تن داری کرتے ہوئے بات سنی ان سنی کر دی، آپ نے اسے دو دو تین بار طلب فرمایا مگر اس نے اسی طرح انکار پر اصرار کیا۔ اس پر آپ غضب ناک ہو گئے اور بنظر غضب اس کی طرف متوجہ ہوئے، تو اس کی حالت میں عجیب وغریب تبدیلی آ گئی۔ چہرہ زرد پڑ گیا، جسم پر لرزہ طاری ہو گیا اور اسے اپنی ہلاکت کا خوف پیدا ہوا، چنانچہ اس نے آپ کے خادم خاص محمد جعفر سے سفارش کی التجا کی جب اس نے حضرت شیخ کے حضور اس کی سفارش کی تو آپ کا غصہ فرو ہو گیا اور آپ نے فرمایا کہ اس کی جس خوش الحانی سے مجھے دلچسپی تھی وہ تو واپس نہیں آئے گی اس کے بعد واقعتاً وہ اس خوش آوازی سے محروم ہو گیا اور تمام لوگوں کی طبیعتیں اس سے اچاٹ ہو گئیں بعد ازاں کئی طرح کی برائیوں اور بدعقیدگیوں کا مرتکب ہو گیا اور کہیں امن وسکون نہ پا سکا (العیاذ باللہ)

سلبِ مرض

ایک بار سید برہان بخاری قولنج کے درد میں مبتلا ہو گئے اور شدید بے چینی محسوس کرنے لگے، آپ کی خدمت میں عرض کی گئی تو آپ ان کے گھر تشریف لے گئے اور ان کے سرہانے بیٹھ کر اس کے مرض کو اس طرح سلب کر لیا کہ اسے فوراً شفائے کاملہ ہو گئی البتہ کبھی کبھی قولنج کا یہ عارضہ حضرت شیخ کو ہو جاتا تھا۔

تصرفِ شیخ

میر عبداللہ کہ آپ کے خاص دوستوں میں سے تھے، بیان کیا کرتے تھے کہ حضرت شیخ ایک دفعہ ایک جگہ تشریف لے گئے میں بھی آپ کے ہمراہ تھا آپ نے جب واپس آنے کا عزم کیا تو مجھے تیز بخار نے آلیا، یہاں تک کہ ملنے کی سکت باقی نہ رہی میرے لئے سواری تلاش کی گئی لیکن نہ مل سکی۔ آخر فرمانے لگے کہ اگر کر سکے تو میرے گھوڑے کے آگے آگے چل، تجھے ایک عجیب واقعہ دکھائی دیگا چنانچہ بہت دقت اور محنت کے ساتھ لوگوں نے مجھے کھڑا کیا اور حضرت شیخ کی نظر کے سامنے لے آئے، میں نے تکلیف کی شدت میں قدرے کمی محسوس کی اور آپ کے گھوڑے کے آگے چلنا شروع کیا۔ بخار کی شدت آہستہ آہستہ کم ہونے لگ گئی، یہاں تک کہ میں پوری طرح صحت یاب ہو گیا اور ساری مسافت پیدل طے کی۔

تکثیر طعام

قصبہ سنوتہ میں ایک دفعہ آپ کے ایک معتقد نے دعوت کا اہتمام کیا، اور صرف پندرہ آدمیوں کا کھانا تیار کرایا۔ ابھی دسترخوان لگا ہی تھا کہ شیخ یعقوب حاکم نلوہہ ایک کثیر جماعت لئے ہوئے آپ کی زیارت کو آیا، میزبان کچھ گھبرا سا گیا، آپ نے فرمایا فکر کی بات نہیں، اس کی ذمہ داری ہمارے اوپر ہے اسی وقت حکم دیا کہ بہت ساری پلیٹیں لائی جائیں، سب کو اچھی طرح پر کیا جائے اور تمام لوگ سیر ہو کر کھانا کھائیں، چنانچہ بالکل اسی طرح ہوا اس پر آپ نے مسکراتے ہوئے فرمایا بعض اوقات فقرا یوں بھی کیا کرتے ہیں۔

من عادلی ولیا فآذنته بالحرب

شیخ اللہ بخش جو آپ کے خاندان کا ایک فرد اور باوقار و معتمد انسان تھا، نے ایک دفعہ آپ کی شان میں کوئی نامعقول بات کہی اور گستاخی کی۔ آپ طیش میں آگئے اور فرمانے لگے خداوندا اس شخص کا منہ پھر مجھے مت دکھانا اور اسی وقت سوار ہو کر کسی جگہ تشریف لے گئے، وہ اسی دم بیمار پڑ گیا یہاں تک کہ اس پر جان کنی کا عالم طاری ہو گیا، تیسرے روز جب آپ واپس تشریف لائے تو وہ دم توڑ چکا تھا چنانچہ آپ نے اس کی نماز جنازہ پڑھی۔

شیخ عبدالوہاب جو حضرت شیخ محمد کا چچازاد بھائی تھا، نے ایک عمارت تعمیر کرائی، اس علاقے

کے ایک رئیس رستم نے شیخ عبدالوہاب کی عدم موجودگی میں اس عمارت کو گرانے کا ارادہ کیا۔لوگوں نے یہ بات حضرت تک پہنچائی تو آپ نے فرمایا کہ بہت نامناسب سی بات ہے کہ رستم شیخ عبدالوہاب کی عمارت گرائے اور ہم بھی موجود ہوں، جنگ وجدل تو فقراء کا شیوہ نہیں البتہ میں ایسا تصرف کرتا ہوں کہ وہ یہاں تک پہنچ ہی نہ سکے گا چنانچہ جب رستم عمارت گرانے کی خاطر لشکر لے کر باہر نکلا تو سید لشکر خاں کے عاملوں میں سے ایک آدمی اس کے ساتھ اس بارے میں متفق نہ ہوا اور اس نے راستے میں ان کے ساتھ تنازعہ شروع کر دیا نتیجہ یہ نکلا کہ اس عامل کا بھائی مارا گیا، رستم اس میں ماخوذ ہوا اور اسی مواخذے میں ہی مر گیا۔

امداد اولیاء

سید محمد وارثؒ کا بیان ہے کہ مجھے ایک سفر کا اتفاق ہوا، میں حضرت شیخؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے توجہ کی درخواست کی۔آپ نے خیر و عافیت کی خوشخبری دی، اتفاقاً سفر میں ایک رات ڈاکوؤں نے حملہ کر دیا اور مجھے اپنی موت کا خوف محسوس ہوا، اس حالت میں حضرت شیخ کی جناب میں متوجہ ہوا، فوراً مجھ پر رعشہ طاری ہو گیا اور خواب میں حضرت شیخؒ کو دیکھا کہ آپ فرمار ہے ہیں فلانے! تمہیں کس لئے روکا ہے؟ اٹھو اور روانہ ہو جاؤ۔اس کے بعد آپ نے مجھے دو لڈو عنایت فرمائے جو میں نے جیب میں رکھ لئے، جب اس غنودگی سے بیدار ہوا تو میں نے دیکھا کہ وہ دونوں لڈو بدستور میری جیب میں موجود ہیں، چنانچہ میں اٹھا اور سوار ہو کر اپنی منزل کو چل دیا۔تمام ڈاکو مجھ سے غافل رہے اور ان میں سے کوئی شخص بھی مجھ سے تعرض نہ کر سکا، وہ لڈو ایک عرصے تک (بطور تبرک) میرے پاس موجود رہے مگر جب حضرت شیخؒ اس دار فانی سے کوچ فرما گئے تو میں نے کھا لئے۔

حضرت شیخؒ کے انتقال کے بعد آپ کے متوسلین میں سے ایک معمر عورت تپ لرزہ میں مبتلا ہو گئی اور انتہائی کمزور پڑ گئی۔رات کے وقت اسے پانی اور لحاف اوپر لینے کی ضرورت محسوس ہوئی خود اسے اٹھنے کی طاقت نہیں تھی اور پاس کوئی تھا نہیں چنانچہ حضرت شیخؒ متمثل ہو کر تشریف لائے، آپ نے اسے پانی پلایا، لحاف اوڑھایا اور پھر غائب ہو گئے۔

قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید

جب شاہ عالم اور اعظم ایک دوسرے کے خلاف صف (۱) آرا ہوئے تو آپ کے ایک مرید نے عریضہ ارسال کر کے آپ سے استفسار کیا کہ ان دونوں میں سے کون فتح مند ہوگا آپ جس کی فتح اور کامیابی کی تصدیق فرمائیں میں اسی کا ساتھ دوں، آپ نے اسے بالوضاحت لکھ بھیجا کہ فتح شاہ عالم کی ہے، چنانچہ ایسے ہی ہوا۔

ختم خواجگان

کفار مانکیان نے اپنا ایک جتھہ بنا رکھا تھا جو اکثر اس علاقے کے شہروں کو لوٹا کرتا تھا، بستی والے بہت پریشان ہوئے اور آپ کے حضور دعا کے لئے درخواست کی آپ نے فرمایا اس سے پہلے تو جس چیز کی طرف چاہتا اپنی قوت تصرف کو متوجہ کر دیا کرتا تھا اب تو ہمت وارادہ بھی باقی نہیں رہا جو کسی چیز سے متعلق ہو، مگر حکم خداوندی کے تحت اس کے اسمائے گرامی سے تمسک ضرور کرنا چاہئے۔ یہ کہہ کر آپ ختم خواجگان میں مشغول ہو گئے اور فراغت کے بعد فرمانے لگے دعا قبول ہوگئی ہے حق سبحانہ وتعالیٰ نے اس قوم کو کفار کی ہماری طرف آنے سے روک دیا ہے، چند روز گزرے ہی تھے کہ ایسے ہی ہوا۔

حضرت شیخ محمدؒ جب کسی کے حق میں بنظر قبول التفات فرماتے تو وہ ایک دم عالم غیبت میں پہنچ جاتا اور عجیب وغریب حالات رونما ہوتے۔

تاثیرِ نظر

ایک دفعہ موضع سنبل ہیڑہ کے باشندوں نے آپ سے توجہ اور تاثیر کی استدعا کی آپ نے ایک ہی نظر ڈالی تو سید نور علی سید ملتانی وغیرہ سترہ کے سترہ (حاضرین مجلس) شخص بیہوش ہو کر گر پڑے۔

ایک مرتبہ قصبہ لاور کے رہنے والے شیخ مانک آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے کہ حضور! میں آپ کی توجہ وتاثیر کو آزمانے کے لئے حاضر ہوا ہوں۔ حضرت شیخ نے اس پر توجہ فرمائی تو وقت اشراق سے لے کر جمعہ تک بے ہوش پڑا رہا۔ جب اسے جھنجھوڑا گیا تو وہ مستانہ

---

(۱) اورنگ زیب عالمگیر کے ان فرزندوں کے درمیان ۱۱۱۹ھ میں اکبرآباد میں جنگ ہوئی۔

حرکتیں کرنے لگا۔تھوڑی دیر بعد جب ہوش میں آیا تو اس سے اس کی حالت کے بارے میں پوچھا گیا اس نے کہا کہ اگر ایک ساعت حضرت شیخ مزید توجہ فرماتے تو میری روح بدن سے پرواز کر جاتی۔

سید عبدالرحیمؒ اور سید ہاشم حضرت شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے بیعت وصحبت کا ناطہ جوڑا آپ کی صحبت کی تاثیر کی وجہ سے دونوں میں عجیب کیفیت پیدا ہوگئی۔

کشف قبور

سید عبدالرحیمؒ کو کشف قلوب اور کشف قبور حاصل ہوا، جس قبر پر جاتے اس کی حقیقت بیان کر دیا کرتے تھے۔ایک بار کھاتولی کے قریب کہنے لگے کہ مجھے ایک شعلہ نظر آتا ہے جو زمین سے نکل کر آسمان تک پہنچ گیا ہے۔ جب ایک قبر کے نزدیک پہنچے تو فرمایا کہ شعلہ اس قبر سے نکل رہا ہے۔ جب تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا کہ وہ صاحب قبر زندگی میں ظلم اور بدکاری میں مبتلا تھا۔

اکثر ایسا ہوتا تھا کہ کوئی شخص سامنے سے گزرا تو سید عبدالرحیمؒ فوراً اس کے دل کا حال بیان کر دیا کرتے تھے رفتہ رفتہ سید عبدالرحیمؒ پر جنون کے آثار ظاہر ہونے لگے۔اور مجذوبوں کی سی حالت ہوگئی۔ان کی والدہ نے حضرت شیخ کی خدمت میں فریاد وزاری کی تو آپ نے فرمایا اسے کچھ عرصے کے لئے میری صحبت میں حاضر رہنا چاہئے، کچھ وقت تک اسے حضرت شیخ کی نگرانی میں رکھا گیا تو ان کی حالت معمول پر آ گئی۔

سید ہاشم کی کیفیت یہ تھی کہ جو آسیب زدہ بھی ان کے سامنے لایا جاتا۔ان کا سامنا کرتے ہی جن بھوت فوراً فرار ہو جاتا۔اس طرح ایک عالم آپ کے کرشمہ نظر کے نتیجے میں آسیب جنات سے چھٹکارا حاصل کرتا تھا رفتہ رفتہ ان پر بھی حالت جذب طاری ہوگئی سارا دن صحرا و بیابان میں گھومتے رہتے تھے۔ کہتے ہیں کہ ایک رات آپ ایک ہندو جوگی کے تکیے پر پہنچے اس نے ایسا جادو کیا کہ تالاب کے کنارے پر سنگریزوں سے خشک کھالوں کی رگڑ کی آواز سنائی دینے لگی آپ نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔اس کے بعد بھینسے کی شکل میں ایک خوفناک دیو ظاہر ہوا جس نے سید ہاشم پر حملہ کر دیا مگر آپ عالم مستی میں حق حق کا نعرہ لگاتے ہوئے جو اس کی طرف پلٹے تو ایک ہی ساعت میں اسے راکھ بنا کر ہوا میں اڑا دیا۔ جب ہندو جوگی نے یہ ماجرا دیکھا تو فوراً مسلمان ہوگیا

ایک دفعہ عبدالسبحان نامی ایک شخص حضرت شیخ محمدؒ کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ نے تصرف فرمایا تو اس پر توحید کی ایک قسم منکشف ہوئی جس کے نتیجے میں وہ دیوانہ وار گلی کوچوں میں گشت کرتا ہوا ہر چیز کو خدا کہنے لگا۔ اور ہر قسم کے شرعی و عرفی آداب سے بے نیاز ہو گیا۔ لوگ اس بات سے تنگ آ گئے اور اس کو دوبارہ حضرت شیخ کی خدمت میں لے آئے۔ آپ نے اس کی اس ساری کیفیت کو سلب فرمالیا اور وہ اپنی سابقہ حالت پر لوٹ آئے۔

کشف غیوب

سید عنایت اللہ ساکن سنس بلیڑہ کو حضرت شیخ کی توجہ سے قلیل مدت میں غیب کی باتوں کا کشف حاصل ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ ایک بار سید صاحب بیمار پڑ گئے اور حضرت شیخ ان کی عیادت کو گئے۔ سید صاحب پر شیخ کے سوار ہونے کے وقت سے لے کر گھر پہنچنے تک کے تمام حالات اس طرح منکشف ہو گئے جیسے چشم ظاہر سے دیکھ رہے ہیں۔ شیخ ادھر سوار ہوئے ادھر انھوں نے کہا کہ اب سوار ہوئے ہیں۔ پھر کہا اب فلاں جگہ پہنچے ہیں، اب شہر میں داخل ہو گئے ہیں۔ دوستو! اٹھو، شیخ کے استقبال کے لئے نکلو۔ پھر کہا، اب میرے دروازے پر تشریف لے آئے ہیں اس لئے مجھے اٹھا کر بٹھا دو۔

مثال وحدۃ الوجود

سید ملتانی آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہیں عجیب وغریب غیبت حاصل ہوئی، لوگوں کے شور وشغب کا کوئی احساس نہیں کرتے تھے کیونکہ ان پر توحید کا غلبہ تھا۔ کسی نے ان سے توحید کی مثال پوچھی کہنے لگے جس طرح ایک مٹکے کو ریت سے بھر کر اس میں پانی ڈال دیا جائے اور وہ پانی اس ریت کے ہر ہر ذرے میں سرایت کر جاتا ہے اسی طرح ذات وحدہ لاشریک کائنات کے ہر ذرے میں سرایت کئے ہوئے ہے۔

نگاہ ولی

محمد محسن حضرت شیخ کی صحبت میں حاضر ہوئے اور چند ہی روز میں آگاہی ذات سے مشرف ہو کر ہمہ اوست کی معرفت کے مرتبے پر فائز ہو گئے۔ حضرت شیخ نے محمد جعفر کو اس پر مقرر کر دیا کہ محمد محسن سے نماز نہ چھوٹ جائے لیکن تھوڑے عرصے بعد محمد محسن کو اس کیفیت سکر سے قدرے افاقہ

ہو گیا، بعدازاں محمد محسن کی توجہ تھوڑی ہی مدت میں یہاں تک پہنچ گئی کہ ایک شخص جو کسی عورت کی محبت میں مبتلا اور دیوانہ وار زار و قطار روتا پھر رہا تھا اس کے بارے میں بعض دوستوں نے آپ سے کہا کہ افسوس ہے کہ ایسا مرد ہاتھ سے جا رہا ہے اس پر محمد محسن نے اس شخص کو اپنے پاس بلایا اور ایک دو لمحے اس پر توجہ ڈالی تو اس عورت کی محبت اس کے دل سے بالکل زائل ہو گئی اور اس کی جگہ محبت الٰہی نے گھر کر لیا۔

عبدالہادی نامی ایک شخص جو کہ سماع اور وجد کا منکر تھا آپ کی خانقاہ میں وارد ہوا۔ اتفاقاً اسی روز آپ ایک مجلس سماع میں مدعو تھے، راستے میں اس سے دل لگی کرتے ہوئے فرمایا کبھی تو نے وجد بھی کیا ہے؟ اس نے کہا نہیں، آپ نے فرمایا کیا تم وجد کرنا چاہتے ہو؟ تو اس نے تعجب کا اظہار کیا سماع کے دوران آپ نے اس پر ایک نگاہ ڈالی اور اس پر اپنا تصرف کیا تو وہ شخص مستانہ حرکتیں کرنے لگا۔ اس کی یہ کیفیت لحظہ بہ لحظہ بڑھتی گئی یہاں تک کہ مسلسل دو روز اسی طرح بیخود رہا۔

جہاں آباد کا رہنے والا نتھو نامی ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا آپ نے اس پر توجہ فرمائی تو وہ ایسا بے خود ہوا کہ جو بھی اس وقت اس پر نظر ڈالتا، اس پر بھی بیخودی کے اثرات ظاہر ہونے لگتے۔ خلاصہ کلام یہ کہ حضرت شیخ محمد پھلتی کے تصرفات اور باطنی توجہات حد و شمار سے باہر ہیں۔ ع

قیاس کن زگلستان من بہار مرا

حضرت شیخ محمد ۸/ جمادی الاولیٰ ۱۲۲۵ھ میں رحلت فرمائے خلد بریں ہوئے رضی اللہ عنہ وارضاہ والحقنابہ۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ کے اساتذہ ومشائخ حرمین کے مختصر حالات

تمام تعریفیں اس ذات کے لئے ہیں جس نے حرمین شریفین کو خیر البلاد بنایا اور ہر دور میں ان میں اپنے منتخب بندوں کو ٹھہرایا اور درود وسلام ہوں ہمارے آقا سید الکونین محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے آل اور اصحاب پر۔

فقیر ولی اللہ کہتا ہے کہ یہ چند کلمات جنھیں انسان العین فی مشائخ الحرمین کے نام سے موسوم کیا گیا ہے حرمین شریفین کے بعض ان مشائخ صوفیا اور علمائے محدثین کے حالات پر مشتمل ہیں جن سے اس فقیر کو سلسلۂ خرقۂ صوفیا اور اسناد حدیث پہنچی ہیں، جزاھم اللہ تعالیٰ عنی خیر الجزاء.

شیخ احمد شناویؒ

آپ علی بن عبدالقدوسؒ بن محمد عباس شناوی کے فرزند ارجمند ہیں۔ آپ کے آبا واجداد گرامی اولیائے کبار میں سے ہوگزرے ہیں۔ شیخ عبدالوہاب شعراوی نے ان کے کچھ حالات لکھے ہیں۔ آپ علوم شریعت وطریقت کے جامع تھے۔ علم حدیث شمس رملی اپنے والد بزرگوار سید غضنفر اور شیخ محمد بن ابی الحسن بکری سے حاصل کیا اور اپنے والد بزرگوار سے خلافت پائی۔ ان کی صحبت کے بعد سید صبغۃ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کے ہاتھوں بھی خرقۂ خلافت پہنا۔ آپ ان کی صحبت سے درجات عالیہ پر پہنچ کر ان کے خلیفہ بنے کہا جاتا ہے کہ تربیت سالکین کے سلسلے میں انھوں نے کہا لو کان الشعراوی حیا ما وسعہ الا اتباعی (یعنی اگر شعراوی زندہ ہوتے تو وہ بھی میرے اتباع کرتے) آپ کا قول ہے کہ عھدنا بحفظ وان لم یحفظ. کاتب الحروف (شاہ ولی اللہ کہتا ہے کہ متاخرین اہل حرمین کی اصطلاح میں قبول بیعت سے مراد اخذ عہد ہے، یعنی جب بھی مشائخ صوفیا کسی کی بیعت قبول کرتے ہیں تو اس سلسلے کے تمام مشائخ چاہے

زندہ ہوں یا گزشتہ کی برکات اس کے شامل حال ہو جاتی ہیں۔

آپ کا قول ہے کہ لایدخل النار من رانی ورای من رانی الی یوم القیامۃ (وہ شخص دوزخ میں داخل نہیں ہوگا جس نے مجھے دیکھا یا جس نے مجھے دیکھنے والے کو دیکھا یہ سلسلہ قیامت کے دن تک رہے گا)

کہتے ہیں کہ ایک روز آپ اپنے حجرے میں لیٹے ہوئے تھے کہ ایک گرگٹ کو دیوار پر جاتے ہوئے دیکھا حکم شرعی کے تحت آپ نے اسے مارنا چاہا مگر شہود وحدت نے آپ کے اس ارادے کو متزلزل کر دیا، ایک بار پھر اس کو مارنے کا ارادہ کیا مگر شہود وحدت مانع رہا۔ غرض ان دو اندیشوں کے درمیان الجھے ہوئے تھے کہ آخر کار حکم شرعی کی تعمیل کا پختہ ارادہ کرتے ہوئے ایک پتھر اسے دے مارا، نشانہ چوک گیا اور گرگٹ بھاگ گیا آپ بہت خوش ہوئے اور کہا شکر ہے اس خدا کا جس نے ہمارے لئے دونوں باتیں جمع کر دیں، شیخ احمد قشاشیؒ نے اس حکایت کے بعد کہا کہ اگر وہاں میں ہوتا تو ہرگز تامل نہ کرتا اور فوراً اس گرگٹ کا سر کچل دیتا۔ کاتب الحروف (شاہ ولی اللہ) کہتا ہے کہ قشاشی کی مراد یہ تھی کہ وحدت فی الحقیقت کثرت میں اس طرح جلوہ گر ہے کہ کثرت اور اس کے احکام کے ساتھ ان کا کوئی تضاد نہیں اگرچہ پانی اور آگ دونوں وجود کے لحاظ سے ایک ہیں لیکن چونکہ ان میں سے ہر ایک فیض خاص کا مظہر اور استعداد مخصوص کا منبع ہے، لہٰذا پانی آگ سے اڑ جاتا ہے اور آگ پانی سے بجھ جاتی ہے، اور حکم شرع اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اس کثرت کے احکام میں نظم و ترتیب قائم رہے اور شہود کامل یہ ہے کہ وحدت، کثرت سے مزاحم نہ ہو اور کثرت وحدت کے راستے میں رکاوٹ نہ بنے۔

چوں کہ بیرنگی اسیر رنگ شد
موسوی با عیسوی در جنگ شد

(چونکہ بے رنگی نے رنگ کا روپ اختیار کر لیا اس لئے موسوی عیسوی کے خلاف میدان جنگ میں کود پڑا)

آپ ۱۰۲۸ھ میں وصال فرما کر جنت البقیع میں مدفون ہوئے۔

شیخ احمد قشاشیؒ

آپ محمد بن یونس القشاشی المعروف عبدالنبی بن شیخ احمد الدجانی کے فرزند ارجمند ہیں۔ ''دجانہ'' (بہ تخفیف جیم) بیت المقدس کے قصبات میں سے ایک قصبہ ہے۔ آپ اسی قصبے کے نہایت بزرگ باشندے تھے۔ شیخ عبدالوہاب نے طبقات میں ان کے حالات زندگی لکھے ہیں۔ شیخ یونس کو عبدالنبی کے نام سے اس لئے پکارا جاتا تھا کہ وہ لوگوں کو اجرت دے کر مسجد میں بٹھاتے تاکہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود وصلوٰۃ پڑھیں۔ آپ کو قشاشی اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو چھپانے کی غرض سے مدینہ منورہ میں قشاشہ فروشی کی دکان کرتے تھے اور قشاشہ پرانے سامان کو کہتے ہیں مثلاً دواتیں، پرانے جوتے اور اسی طرح کی دوسری اشیاء، آپ کے والد بزرگوار محمد مدنیؒ بھی عالم اور مرد صالح تھے۔ شیخ احمد قشاشی علم حقیقت وشریعت کے امام تھے۔ حقائق معرفت کے بارے میں آپ کی گفتگو آیات واحادیث سے مدلل ہوتی تھی، کئی مشائخ کی صحبت میں رہے اور خرقۂ خلافت اپنے والد سے حاصل کیا، مگر انہیں گوہر مقصود شیخ احمد شناویؒ سے حاصل ہوا۔ اسی لئے انھوں نے خود کو ان کی طرف منسوب کیا، کہا جاتا ہے کہ شیخ احمد قشاشیؒ نے مشائخ صوفیا کی تلاش میں سفر اختیار کیا، جب واپسی پر جدہ پہنچے تو حالت کشف میں ان پر یہ ظاہر ہوا کہ شیخ احمد شناوی سامنے کھڑے ہیں اور ان کی شرمگاہ سے مادہ منویہ خارج ہورہا ہے جس کی وجہ سے ان کے پاؤں اور کپڑے آلودہ ہیں۔ جب بیدار ہوئے تو ان کے ذہن میں اس واقعے کی یہ تعبیر آئی کہ شیخ شناوی مرتبۂ تکمیل کو پہنچ گئے ہیں لیکن ان سے اکتساب فیض کرنے والا ابھی تک کوئی نہیں، اس کے فوراً بعد وہ حضرت شناویؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انھوں نے جب انھیں دیکھا تو فرمایا ہم اس شخص کو مرحبا کہتے ہیں جو ہم سے ہمارے علوم کا فیض پانے کے لئے آیا ہے۔

کہتے ہیں کہ ایک رات شیخ احمد قشاشیؒ نے خواب میں دیکھا کہ شیخ محی الدین بن عربی (۱)

---

(۱) شیخ ابوبکر محی الدین بن علی المعروف ابن عربیؒ وشیخ اکبرؒ ۱۷ رمضان ۵۶۰ھ مطابق ۱۱ جولائی ۱۱۶۵ء میں مرسیہ میں پیدا ہوئے جو اندلس کے جنوب مشرق میں واقع ہے آپ کا تعلق مشہور عرب قبیلے ''بنو طے'' سے تھا۔ آپ ۵۶۸ھ میں اشبیلیہ آئے جو اس وقت علم وادب کا مرکز تھا۔ آپ نے تقریباً تیس برس کا طویل عرصہ تعلیم وتعلم اور اسلامی فلسفے کے مطالعے میں گزارا۔ ۳۸ برس کی عمر میں بلاد مشرق کی طرف روانہ ہوگئے اور مصر ومشرق قریب اور ایشیائے کوچک کی سیاحت میں مصروف ہوگئے۔ اس دوران آپ بیت المقدس، (باقی اگلے صفحہ پر)

نے انھیں خرقۂ خلافت پہنا کر اپنی ہمشیرہ ان کے نکاح میں دے دی ہے۔ اس کی تعبیر انھوں نے یہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، بغداد اور حلب گئے بالآخر دمشق میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ شیخ ابن عربیؒ وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اپنے نظریۂ وحدت الوجود کے فلسفہ کی عقلی و شرعی تشریحات کی بنا پر پوری دنیا پر بالعموم اور عالم اسلام پر بالخصوص ہمہ گیر اثرات ڈالے ہیں۔ حقیقت کائناب ذات واجب الوجود، ماہہ الموجودیت امر و خلق، انسان اور خدا ایسے بنیادی اور دقیق مسائل پر جس جامعیت سے انھوں نے قلم اٹھایا ہے اس میں وہ اپنے انداز فکر، قوت استدلال اور حقیقت پسندی کے اعتبار سے ہر مذہب وملت کے مفکرین سے بازی لے گئے ہیں۔ اسلامی تاریخ کے مطابق ہر دور کے مسلمان فلاسفہ، مفکرین اور تمام سلاسل کے صوفیا نے نہ صرف یہ کہ ان کے نظریات کو تسلیم کیا بلکہ خراج عقیدت کے طور پر انہیں شیخ اکبر کے نام سے موسوم کیا ہے، مشائخ صوفیا کے تمام سلاسل میں سے صرف دو بزرگوں شیخ علاء الدین سمنانیؒ اور حضرت مجدد الف ثانیؒ نے وحدۃ الوجود پر ان سے اختلاف کیا جسے زیادہ اہمیت حاصل نہ ہوسکی یہاں تک کہ بعض روایات کے مطابق حضرت مجددؒ خود بھی آخر عمر میں وحدۃ الوجود کی طرف لوٹ آئے تھے۔ اگر یہ روایت صحیح نہ بھی ہو تو بھی تمام سلاسل بشمول سلسلۂ نقشبندیہ کے مشائخ کا وحدۃ الوجود پر اجماع ہے ایسی صورت میں ایک دو بزرگوں کا اختلاف کسی خاص اہمیت کا حامل نہیں پھر حضرت مجددؒ کا نظریۂ وحدت الشہود اس وقت کے بعض سیاسی حالات کا تقاضا بھی تھا کیونکہ اس وقت مسلمانوں کو ایک علیحدہ ملت کا تشخص دینے کی اشد ضرورت تھی لیکن بعد میں برصغیر کے متشدد المسلک حضرات نے اس کی زیادہ ترویج کی، حضرت شاہ ولی اللہ وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود میں تطبیق کی کوشش کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ سارا لفظی نزاع ہے۔ عجیب لطیفے کی بات یہ ہے کہ ہمارے جدید دانشور اور مبصر گزشتہ پچاس سالہ پروپیگنڈے کی بنا پر بغیر سوچے سمجھے چھوٹتے ہی نظریۂ وحدت الوجود پر برس پڑتے ہیں اور قطعاً نہیں سمجھتے کہ سلوک و کشف سے قطع نظر خالص عقلی طور پر بھی وحدۃ الوجود کے مانے بغیر آخر توحید کا اثبات کیسے ہوسکتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ خدا کی ہستی (ہستی اعلیٰ) اور اس کا اقرار وہ ابدی سچائی ہے جو کم وبیش ہر مذہب میں کسی نہ کسی طرح مسلم رہی ہے محض اس بات سے دھوکہ کھانا کہ وحدۃ الوجود کے بعض تصورات ویدانت یا دیگر عجمی افکار سے ملتے ہیں کس قدر لغو اور کمزور دلیل ہے اس سلسلے میں مولانا شبلی نعمانی کی رائے بہت وقیع ہے کہ ''اگرچہ بظاہر وحدت الوجود پر بہت اعتراضات کئے گئے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسے مانے بغیر چارہ نہیں''۔ مولانا جامیؒ نے آپ کی تصانیف پانسو سے بھی زیادہ بتائی ہیں۔ آپ نے ۶۳۲ھ میں خود اپنی کتابوں کی جو فہرست مرتب کی اس میں ۲۵۱ کتابوں کے نام درج ہیں آپ کی تصانیف تفسیر، حدیث، سیرت، ادب، متصوفانہ شاعری، علوم طبیعی، ہیئت اور علوم مخفیہ پر مشتمل ہیں آپ کی مشہور زمانہ تصنیف ''المفتوحات المکیہ فی معرفة الاسرار المالکیه و الملکیه'' سب سے ضخیم اور غالباً آخری تصنیف ہے جو ۶۲۹ھ میں مکہ مکرمہ میں مکمل ہوئی۔ ''فصوص الحکم'' دمشق میں ۶۲۷ھ میں لکھی گئی۔ ''تنزلات'' بھی اسی دور کی یادگار ہے۔ شیخ اکبر نے ۶۳۸ھ۔۱۲۴۷ء میں انتقال فرمایا۔ آپ کا مزار مبارک جبل قاسیون میں زیارت گاہ خلائق ہے اور زبان حال سے یہ پکار رہا ہے۔ ع

زیارت گاہ اہل عزم وہمت ہے لحد میری
کہ خاک راہ کو میں نے بتایا راز الوندی

سمجھی کہ ان کی وحدت الوجود کی معرفت تکمیل کو پہنچ گئی ہے، کیونکہ شیخ ابن عربیؒ کی ہمشیرہ کے ان کے نکاح میں آنے کی تعبیر یہی ہوسکتی ہے۔ سید محمد بن علویؒ نے انھیں لکھا کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی ہے، انھوں نے مجھے فرمایا کہ احمد قشاشی سے میرا اسلام کہو اور اسے میری شفاعت کی بشارت دو اور اس سے اگلے روز دوبارہ سید محمد بن علویؒ نے کہا میں نے دوسری دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی تو انہیں یہ فرماتے سنا احمد قشاشیؒ سے میرا اسلام کہو اور اسے یہ مژدہ سناؤ کہ وہ جنت الفردوس میں میرا جلیس ہوگا۔

کہتے ہیں جب کبھی گفتگو کے دوران مقامات کا ذکر آتا تو شیخ احمدؒ فرماتے ہمارے لئے کوئی مقام نہیں اس لئے کہ ہم اہل یثرب میں سے ہیں اور خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے **یا اهل یثرب لا مقام لکم**، گویا اس سے مقام بے نشان کی طرف اشارہ کر رہے تھے اور یہ کہ وہ حضور ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم پر کاربند تھے۔

شیخ احمد قشاشیؒ کے عجائب روزگار کرامات میں سے ایک یہ ہے کہ انھوں نے مکمل قرآن مجید خواب کی حالت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سنایا۔ شیخ ابراہیمؒ سے منقول ہے کہ ایک روز شیخ قشاشی نے اپنی مجلس میں یہ حدیث بیان کہ **ما علی احدکم ان یکون فی بیته محمد و محمد ان ثلثة** اسی وقت میرے دل میں یہ خیال آیا کہ خدا مجھے تین فرزند عطا کرے گا جس میں ہر ایک کا نام محمد ہوگا۔ اس کے بعد میں اس فکر میں پڑ گیا کہ ایک کو دوسرے سے کیسے متمیز کرسکوں گا۔ شیخ قشاشیؒ میرے خدشے پر مطلع ہوگئے اور فرمایا ان میں سے ایک ابوسعید، دوسرا ابوالحسن، اور تیسرا ابوطاہر کنیت اختیار کرے گا۔ ایک مدت بعد ویسے ہی ہوا جیسا انھوں نے فرمایا تھا۔

شیخ ابراہیمؒ ہی سے منقول ہے کہ ایک روز شیخ قشاشیؒ نے میرے دل کی ایک بات کہہ ڈالی، مجھے خیال آیا کہ کاش یہ بات آج سے پہلے واقع ہوتی تو شیخ نے میری طرف کوئی توجہ نہ دی اور فرمایا کہ اگر اللہ چاہتا تو میں تمہیں یہ بات بتاتا اور نہ سمجھا سکتا۔ شیخ قشاشیؒ کی اس طرح کی کرامات اور تصرفات بے شمار روایت کی گئی ہیں۔

الغرض شیخ قشاشیؒ کی زندگی فقہا کے طرز پر تھی اور نہ ہی خشک مزاج زاہدوں کے انداز پر بلکہ عین سنت کے مطابق، تکلف سے خالی اور اعتدال سے عبارت تھی۔ آپ امراء کے ہاں کبھی نہیں

جاتے تھے۔ اگر وہ خود ان کی زیارت کو آتے تو خوش خلقی اور بشاشت سے ان کے ساتھ ملاقات کرتے اور ہر ایک سے اس کی قدر و منزلت کے موافق سلوک فرماتے۔ قوم کے سردار کی بہت زیادہ عزت فرماتے۔ آپ بڑی نرمی کے ساتھ نیکی کی تلقین فرماتے اور زیارت کرنے والوں کو نصیحت کے بغیر نہ جانے دیتے۔

شیخ عیسیٰ مغربیؒ نے آپ کے بارے میں کہا کہ میں جب بھی شیخ قشاشیؒ کی محفل سے اٹھا تو دنیا میری نظروں میں حقیر ترین اور میرا نفس انتہائی ذلیل ہوتا تھا۔ خواہ میں کتنی بار بھی ان کے پاس حاضر ہوتا میرا یہ تاثر اپنی جگہ قائم رہتا۔ آپ نے ۱۹؍ ذی الحجہ ۱۰۷۱ھ میں انتقال فرمایا رحمتہ اللہ علیہ

سید عبد الرحمٰن ادریسی المحجوبؒ

آپ مغرب کے شہر کمناسہ میں پیدا ہوئے۔ مغرب، مصر، روم اور شام کی سیاحت کے بعد حرمین شریفین تشریف لے آئے اور کئی برس یہاں کی مجاورت کی۔ اس کے بعد زیارت اولیاء کی خاطر یمن تشریف لے گئے کیونکہ انھوں نے یہ مشہور مقولہ سن رکھا تھا کہ یمن میں اولیاء ایسے پیدا ہوتے ہیں جیسے زمین سے گھاس، یہاں کے اولیاء کی مجالس میں ان کو عجیب و غریب قسم کے واقعات اور دلچسپ و رنگین صحبتیں میسر آئیں، پھر جب مکہ واپس آگئے اور یہاں مستقل اقامت اختیار کر لی تو اہل مکہ نے ان سے استفادہ کیا اور کئی لوگوں نے خرقۂ صوفیا بھی حاصل کیا۔ آپ سے بے شمار کرامات روایت کی جاتی ہیں۔

شیخ زین العابدین شافعیؒ مفتی مدینہ سے میں نے سنا انھوں نے اپنے والد جو کہ سید محمدؒ کے خادم تھے اور یہ سید محمدؒ سید عبد الرحمٰنؒ کے معتقد تھے سے نقل کیا کہ شریف مکہ کو کوئی ضرورت پیش آئی سید عبد الرحمٰن مجحوبؒ کی طرف دعا کے لئے رجوع کیا، سید عبد الرحمٰنؒ ایک لمحے تک سر بگریباں رہے، کچھ سوچا اور اس کے بعد فرمایا کہ مکہ کے فلاں محلے میں ایک اس قسم کا گھر ہے بیت المال کے افسر کو چاہئے کہ جس قدر شریف مکہ کو ضرورت ہے اسی قدر اس میں سے مال لے لے اور باقی احتیاط سے وہیں پر چھوڑ دے۔ لوگ اسی وقت وہاں پہنچے اور اس گھر کو ویسے ہی پایا جیسے سید صاحب نے فرمایا تھا۔ وہاں سے انھوں نے بیس ہزار اشرفیاں اٹھا لیں اور صندوقوں کو مقفل کر دیا۔ یہ رقم سید صاحب کے پاس لے آئے آپ نے شریف مکہ کے حوالے کر دی تا کہ وہ اس سے اپنی ضرورت

پوری کر لے۔ دوسری بار شریف مکہ نے چاہا کہ باقی دولت بھی اپنے تصرف میں لے آئے مگر گھر کا پتہ ملا نہ مال۔ لوگ حیران رہ گئے اور سید عبدالرحمٰنؒ سے اس معاملے کا راز پوچھا، آپ نے فرمایا کہ ایران کا ایک شخص اپنے ملک میں فوت ہوگیا، اس کا کوئی وارث نہ تھا، میں نے تصرف کر کے اس کے گھر کو مکہ میں لا کھڑا کیا، وہاں سے جو کچھ تم نے لینا تھا، لے لیا، اور جب ضرورت پوری ہوگئی تو مکان اپنی سابقہ جگہ پر پہنچ گیا۔ کہتے ہیں کہ سید عبدالرحمٰنؒ ایک دفعہ سید احمد بن ملوان کے مزار مبارک کی زیارت کے لئے تشریف لے گئے۔ سید احمد نے اپنے خادم کو خواب میں سید عبدالرحمٰن کے آنے کی خبر دی اور فرمایا کل ان کا استقبال و تعظیم بجالانا، خادم استقبال کی غرض سے شہر سے باہر نکلا بہت تلاش کیا مگر سید صاحب کا کہیں پتہ نہ چلا، ناامید ہوکر واپس لوٹ آیا تو دیکھا کہ سید صاحب مزار کے قبہ میں تشریف فرما ہیں حالانکہ دروازہ بند تھا اور اس کی چابی خادم کے پاس تھی۔

شیخ ابوطاہر کا بیان ہے کہ ایک بار شیخ ابراہیم کو قبض (بندشِ لطائف) لاحق ہوئی۔ مسلسل چھ ماہ روتے رہے، کسی کی سمجھ میں اس کا سبب نہیں آتا تھا۔ جب حج کے ایام آئے اور ان کے بعض شاگرد شام سے قافلہ حج میں آئے تو انھوں نے شیخ ابراہیمؒ کے لئے شیخ قشاشیؒ سے حج پر جانے کی اجازت چاہی۔ شیخ قشاشیؒ نے اجازت دے دی جب شیخ ابراہیم کے بھائی عبدالرحمٰنؒ نے ان کی نشست گاہ سے کتابیں اٹھانا چاہیں تو ان کے نیچے کاغذ کا ایک ٹکڑا پایا جس پر شیخ قشاشیؒ کے قلم سے لکھا ہوا تھا اے ابراہیم! ہم نے تمہارا آدھا حصہ غرق کر دیا ہے۔ اگر تم نے رجوع نہ کیا تو ہم تمہیں سارے کا سارا ڈبو دیں گے۔ اس وقت انھیں پتہ چلا کہ ان کے رونے کا سبب کیا تھا۔ جب حضرت شیخ ابراہیم مکہ پہنچے اور سید عبدالرحمن محجوب کی خدمت میں حاضر ہوئے تو سید صاحب شیخ ابراہیم پر گلاب کا پانی چھڑکنے لگے۔ چونکہ شیخ ابراہیمؒ احرام کی حالت میں تھے اور ان کے لئے خوشبو کا استعمال ممنوع تھا اس لئے گلاب کا پانی چھڑکنے کے ساتھ ہی شیخ ابراہیم کی حالت قبض رفع ہوگئی۔ گویا یہ شیخ قشاشی اور شیخ ابراہیم کے درمیان مصالحت تھی جسے سید ابراہیم نے انجام دیا سید عبدالرحمن جہاں باطنی کمالات سے متصف تھے وہاں کمالات ظاہری میں بھی بلند مقام پر فائز تھے جود و کرم میں اپنی مثال آپ تھے۔ ان کے دستر خوان پر صبح و شام بہت سے لوگ جمع ہوتے اور وہ ان تمام کے ساتھ خوش خلقی سے پیش آتے، آس پاس کے اسلامی شہروں سے ان کی خدمت میں

نذر و نیاز پیش ہوتیں جسے آپ فقرا میں تقسیم فرما دیتے۔تقریباً دو سو غلاموں کو آزاد کیا۔جو بھی ایک دفعہ آپ کی محفل میں بیٹھ جاتا آپ کی شیریں کلامی اور خوش خلقی کی بنا پر اٹھنے کا نام نہ لیتا۔اس قدر زیرک و دانشمند تھے کہ جس سے بھی ایک بار ملاقات کر لیتے چاہے ایام حج میں بھی کیوں نہ ہو، اسے دوبارہ فوراً پہچان لیتے۔جو بھی ان کی زیارت کو آتا، استعداد کے مطابق اسے درود، تلاوت، استغفار اور اوراد، ایسے نیک امور کی تلقین فرماتے، اور اسی طرح جس سے استعداد دیکھتے اسے صوفیا کے کلام اور ان کے معتقدات بالخصوص شیخ اکبر ابن عربی قدس سرہ کے مطالعہ کی ترغیب دلاتے۔ میں نے ان کے لقب محجوب اختیار کرنے کی وجہ ہر چند اہل مکہ سے معلوم کرنے کی کوشش کی مگر پتہ نہ چل سکا قرین قیاس یہ ہے کہ آپ سماع کے دوران چہرے کو ڈھانپ لیا کرتے تھے۔جب گرمی شوق کے آثار ظاہر ہونے لگتے تو چہرے سے نقاب ہٹا دیتے۔اس وقت عجیب انوار و تجلیات کا ظہور ہوتا جس کا اثر اہل مجلس پر بھی پڑتا تھا، شیخ احمد نخلیؒ نے بھی اسی توجیہ کی طرف اشارہ کیا ہے، واللہ اعلم۔

شمس الدین محمد بن العلا بابلیؒ

آپ حافظ حدیث اور اپنے زمانے میں مصر اور حرمین کے استاذ تھے۔نیز پسندیدہ اخلاق مثلاً تواضع، ذکاوت اور اخلاق و محبت سے متصف تھے۔کہتے ہیں کہ انہیں ابتدائے حال میں شب قدر کی نعمت حاصل ہوئی اور اس مبارک رات کے بعض عجیب و غریب آثار مشاہدہ کئے۔اسی وقت آپ نے دعا کی کہ بارخدایا! مجھے حافظ ابن حجر عسقلانی (۱) کی طرح بنا دے۔چنانچہ آپ کی یہ دعا مستجاب ہوگئی۔آپ فرمایا کرتے تھے کہ کوئی شخص جب کسی کتاب کی تالیف کرے تو مندرجہ ذیل سات شرائط کو پیش نظر رکھے، پہلی یہ کہ ایسی چیز تالیف کرے جس کی طرف اس سے پہلے کسی کا ذہن نہ گیا ہو، دوسری یہ کہ کوئی چیز نامکمل ہو جس کی تکمیل مقصود ہو، تیسری کوئی چیز متعلق ہو اور اس

---

(۱) احمد نام، ابوالفضل کنیت، اور ابن حجر کے عرف سے مشہور ہوئے۔آپ کا تعلق عرب کے مشہور قبیلہ بنو کنانہ سے تھا۔نو برس کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا اپنے دور کے مشہور شیوخ سے علوم حاصل کئے۔اکثر اسلامی بلاد کا سفر کیا۔علم حدیث میں آپ نے کمال حاصل کیا۔آپ کی تصانیف ڈیڑھ سو کے لگ بھگ ہیں۔آپ کے حافظہ، ثقاہت، امانت، معرفت اور علوم و فنون میں مہارت کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔آپ کی تصانیف میں سے شرح بخاری، تہذیب التہذیب، لسان المیزان، تعلیق التعلیق نخبۃ الفکر مشہور و معروف کتابیں ہیں۔آپ نے ۸۵۲ھ میں انتقال فرمایا۔قاہرہ کے باہر نماز جنازہ ہوئی اور جامع دیلمی کے قریب مدفون ہوئے۔

کی شرح پیش نظر ہو، چوتھی یہ کہ کوئی چیز طویل ہو اسے مختصر کرنا مقصود ہو مگر اس اختصار میں حل معانی اور تفسیر مطالب کو راہ نہ دے، پانچویں کسی بات میں خلط مبحث ہو جسے صحیح ترتیب میں لانا مقصود ہو چھٹی کوئی ایسی چیز جس میں پہلے مصنف نے غلطی کی ہو اور یہ اس کی تصحیح چاہتا ہو، ساتویں کوئی چیز منتشر ہو جسے جمع کیا جائے، اگر کسی کتاب کی تالیف میں مندرجہ بالا سات وجوہ میں سے کوئی ایک وجہ نہ پائی جائے تو ایسی تصنیف تضیع اوقات کے سوا کچھ نہیں۔

آپ نے صحیح بخاری، موطا اور دیگر تمام کتابیں سالم سنہوری اور دوسرے لوگوں سے روایت کیں۔ موطا، بخاری اور حدیث کی دوسری کتابوں میں آپ کے پاس مسلسل اسناد تھیں۔ آپ نے مسلسل اسناد ہی کے ذریعے ان کتابوں کا سماع کیا تھا۔ شیخ عیسیٰؒ مغربی نے آپ کی تمام اسانید کو ایک رسالہ میں ضبط کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ متاخرین کی اسناد کا اصل یہی اسانید ہیں، جو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کے مصداق ہے نضر اللہ امراء سمع منی الحدیث الخ آپ کی شان وعظمت اور جلالت وبزرگی کا عجیب انداز تھا، بادشاہ، امراء اور وزراء آپ سے توجہ ودعا کے طلبگار رہتے تھے۔ اور آپ کے کسی حکم سے سرمو انحراف نہیں کرتے تھے۔ قرآن مجید کی تلاوت آپ کا دائمی معمول رہا۔ آپ نے ۱۰۷۷ھ میں انتقال فرمایا۔ بابل جس کی طرف وہ منسوب تھے مصر میں ایک گاؤں ہے۔

شیخ عیسیٰؒ جعفری مغربی

آپ کی پیدائش اور نشو ونما مغرب میں ہوئی۔ مروجہ علوم کے کچھ متون بھی آپ نے اسی علاقے میں پڑھے، پھر الجزائر میں آگئے اور نجل ماسی کے پاس دس برس سے زیادہ عرصے تک رہ کر علوم میں تبحر حاصل کیا۔ اس کے علاوہ آپ نے قسطنطنیہ، مصر اور حرمین کے علما سے بھی روایت کی۔ پھر آپ نے مکہ معظمہ کو مستقل وطن بنالیا۔ آپ نے ''مقالید الاسانید'' کے نام سے ایک معجم (۱) بھی تصنیف فرمائی، الغرض وہ ایک متقی عالم جمہور اہل حرمین کے استاذ اور حدیث وقرأت کے امام تھے۔ سید عمر نے ان کے بارے میں کیا خوب رائے پیش کی ہے کہ ''جو چاہے کسی ایسے شخص کو دیکھے

---

(۱) حدیث کی وہ کتاب جس میں احادیث کو بہ ترتیب شیوخ جمع کیا گیا ہو۔ اس کے موجد ابن قانع (۳۵۱ھ) ہیں۔ معاجم کو حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب کرنے کا سہرا طبرانی (۳۶۰ھ کے سر ہے)

جس کی ولایت شک وشبہ سے بالاتر ہوتو وہ شیخ عیسیٰ کی زیارت کرے''اور سید محمد بن علویؒ نے ان کے بارے میں کہا کہ ''وہ اپنے وقت کی ایک باکمال شخصیت تھی''۔ انہیں اعمال حسنہ، پابندی نماز باجماعت، کثرت طواف اور مداومت صیام وقیام جیسی خوبیاں ودیعت کی گئی تھیں۔ آپ تمام امور میں اعتدال پسند تھے۔ننگ وناموس میں نہ مبالغہ سے کام لیتے تھے اور نہ تساہل سے، اگرچہ آپ کا تعلق کئی مشائخ کے ساتھ تھا تاہم سلسلۂ شاذلیہ سے باقاعدہ منسلک تھے اور ان پر تادم آخر اسی سلسلے کی نسبت کا غلبہ رہا۔ آپ نے مسلک امام ابوحنیفہؒ کے مطابق ایک مسند (۱) بھی تالیف فرمائی جس میں متصل عنعنہ کے ساتھ حدیث کی روایت کی ہے۔ اس سے لوگوں کے اس خیال کی تردید ہوتی ہے کہ آج کل سلسلہ حدیث (۲) متصل نہیں رہا۔ آپ ۱۰۸۰ھ میں رحلت فرمائے خلد بریں ہوئے

محمد بن محمد بن سلیمان مغربیؒ

آپ حافظ حدیث تھے اور علم وریاضت اور دین ودنیا دونوں کے فنون کے جامع تھے۔ آپ کو شیخ ابو مدین مغربی سے خرقۂ مدینہ حاصل تھا۔ درحقیقت کتب حدیث کا طریق تصحیح اور نسخۂ نبویہ کا تعارف حرمین میں آپ ہی کے ذریعے ہوا۔ آپ تمام اہل حرمین کے استاذ اور متبحر وثقہ عالم تھے۔ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ اسلامبول تشریف لے گئے وہاں ایک شخص نسخۂ نبویہ فروخت کررہا تھا۔ آپ علم کے اس قدر شائق اور قدرشناس تھے کہ وہ نسخہ تین ہزار رائج الوقت سکے کے عوض خرید لیا۔ اس نسخے سے آپ کو اس قدر محبت تھی کہ ایک بار مسجد حرام میں ایسا سیلاب آگیا کہ وہاں کے لوگوں کو غرق ہونے کا اندیشہ پیدا ہوگیا مگر محمد بن سلیمانؒ نے یہ نسخہ سرپر رکھا اور طواف میں مشغول ہوگئے تاکہ اسے کوئی گزند نہ پہنچے اس فقیر (شاہ ولی اللہ) نے اس نسخے کی زیارت کی ہے اور اس کا مطالعہ بھی کیا ہے، شیخ تاج الدین قلعیؒ کا بیان ہے کہ جس طرح شیخ محمد بن محمد بن سلیمانؒ علم روایت میں

---

(۱) اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں احادیث کو بہ ترتیب صحابہ جمع کیا گیا ہو باعتبار حروف تہجی، بلحاظ سبقت الاسلام باعتبار شرافت نسبی، بعض لوگوں کے نزدیک سب سے پہلی مسند موسیٰ کاظمؒ (۱۸۳ھ) کی ہے اس کے بعد مسند ابوداؤد طیالسی ہے۔

(۲) متصل السند وہ حدیث ہے جس کی سند سے کوئی راوی کسی مقام سے ساقط نہ ہو بلکہ سند کے ہر راوی نے روایت بلاواسطہ غیرا پنے شیخ سے بذات خود سن کر روایت کی ہو۔

کمال رکھتے تھے اسی طرح وہ بہت سے عجیب وغریب علوم وفنون میں بھی ید طولی رکھتے تھے۔ آپ اللہ تعالی کے اس فرمان زادہ بسطة فی العلم و الجسم کے مصداق تھے۔ تدبیر معاش میں انہیں اس قدر کمال حاصل تھا کہ سارے مکۂ معظمہ کا نظام کار آپ کے ہاتھ میں آگیا، اس پر حاسدوں کو موقع مل گیا اور جو کچھ ہونا تھا ہوگا، واللہ اعلم۔ اس فقیر (شاہ ولی اللہ) نے شیخ مذکور کے صاحبزادے محمد وفد اللہؒ سے ان کے والد بزرگوار کی تمام مرویات کی اجازت لی ہے، کیونکہ انھوں نے اپنے والد سے ان تمام مرویات کی قرأت، سماعت اور اجازت حاصل کی تھی۔ اس کے علاوہ میں نے مکمل موطا بروایت یحییٰؒ بن یحییٰ بھی شیخ وفد اللہ کے سامنے پڑھی اور انھوں نے موطا شیخ حسن عجمی اور دیگر مشائخ سے پڑھی تھی۔ والحمد للہ۔

شیخ ابراہیم کردیؒ

آپ عالم وعارف تھے اور فقہ شافعی، حدیث اور عربی ادب میں مہارت کاملہ رکھتے تھے ان تمام علوم میں آپ کی تصانیف موجود ہیں۔ آپ نے اپنے وطن میں علم کی تکمیل فرمائی، پھر حج کے ارادے سے نکلے اور تقریباً دو سال تک بغداد میں مقیم رہے، اس اثنا میں آپ اکثر سیدی شیخ عبدالقادر قدس سرہ کے مزار مبارک کو مرکز توجہ بنایا کرتے تھے اور یہیں سے ہی آپ کو اس راہ (معرفت) کا ذوق وشوق پیدا ہوا۔ اس کے بعد آپ نے شام میں چار سال قیام فرمایا پھر مصر سے ہوتے ہوئے حرمین شریفین تشریف لائے۔ اور شیخ احمد قشاشیؒ سے ملاقات کی اور دونوں کے درمیان عجیب قسم کے روابط وتعلقات پیدا ہوگئے۔ شیخ ابراہیم کردیؒ نے شیخ قشاشیؒ سے حدیث روایت کی، ان سے خرقہ پہنا اور ان کی صحبت کے فیض سے اعلیٰ کمالات پر فائز ہوئے۔ آپ فارسی، کردی، ترکی اور عربی سب زبانیں اچھی طرح جانتے تھے۔ آپ ذہن کی تیزی، تبحر علم، زہد، انکساری، صبر اور حلم وحوصلہ ایسے خصائل حمیدہ سے متصف تھے۔ کہتے ہیں کہ شام میں قیام کے دوران ایک دفعہ آپ نے شیخ محی الدین بن عربیؒ کے مزار مبارک کی طرف اس نیت سے توجہ کی کہ آگے سفر مفید ہے یا نہیں، چنانچہ آپ نے (کشف میں) دیکھا کہ شیخ اکبر ان کے پاپوش سے گرد وغبار جھاڑ رہے ہیں۔ آپ نے سمجھ لیا کہ ابھی اقامت کا حکم ہے، شیخ ابوطاہر کا بیان ہے کہ ایام حج میں مدینہ منورہ میں جب مصری لوگ آئے تو شیخ ابراہیمؒ اپنے احباب ومعتقدین کے ہمراہ اہل مصر

کی ایک جماعت سے ملاقات کے لئے تشریف لے گئے۔ راستے میں وہ ایک ایسی جگہ سے گزرے جہاں کچھ گانے بجانے والی لڑکیاں گانے بجانے اور لہو ولعب میں مشغول تھیں۔ آپ کے شاگردوں میں سے سید محمد برزنجی نے ڈنڈا اٹھا کر انہیں اس فعل قبیح سے روکنا چاہا۔ شیخ نے انہیں ایسا کرنے سے منع کیا، کیونکہ اس طرح ہنگامہ ہو جانے کا خطرہ تھا، سید محمد برزنجی خشک مزاج واقع ہوئے تھے شیخ کے روکنے سے تنگ دل ہوئے، جب شیخ اور ان کے رفقا منزل مقصود پر پہنچے تو گانے والیوں میں سے ایک نے اپنے نغمے کا آغاز اس شعر سے کیا۔

ان شرقوا سادقی وان غربوا ویلی

وان عاشروا غیرنا ویلا علی ویلی

یہ شعر قاعدۂ عروض کے مطابق نہیں تھا مگر متاخر عروضیوں کے قواعد سے موافق تھا۔ جب یہ شعر شیخ ابراہیمؒ نے سنا تو ان کی حالت متغیر ہوگئی اور چہرہ ڈھانپ کر گریہ شروع کر دیا۔ اس مجلس میں جس نے بھی شیخ کی آواز سنی یا ان کی شکل دیکھی وہ رو پڑا حالانکہ ان میں رقیق القلب بھی تھے اور سنگدل بھی! سید محمد برزنجی بھی رو پڑے اور ان کے دل سے سیاہی اعتراض دھل گئی۔

شیخ ابو طاہرؒ کا بیان ہے کہ بادشاہ روم کا استاذ جسے وہاں کے لوگ خوجہ کہتے ہیں، مدینہ منورہ کی زیارت کو آیا اور علماء واحباب کی ایک کثیر جماعت کے ساتھ شیخ ابراہیمؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ملاقات کے دوران اس نے شیخ سے کہا کہ میں نے شام میں ایک کھلم کھلا بدعت دیکھی جس کا قلع قمع کرنے میں میں نے انتہائی کوشش سے کام لیا۔ شیخ نے پوچھا وہ بدعت کیا تھی؟ کہنے لگا مساجد میں ذکر بالجہر۔ شیخ نے یہ آیت پڑھی ومن اظلم ممن منع مساجد الله ان یذکر فیها اسمه وسعی فی خرابها (۱) (اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ کی مسجدوں میں نام خدا لینے سے روکے اور ان کی ویرانی میں کوشش کرے) خوجہ کا رنگ متغیر ہو گیا اور وہ نہایت مشکل میں پڑ گیا فتاوی قاضی خاں وغیرہ سے فقہ کی چند جزئیات جو لکھ کر لایا تھا جیب سے نکالیں اور شیخ کے ہاتھ میں تھما دیں شیخ نے فرمایا اگر تقلید کی بات ہے تو میں کسی کا مقلد ہوں اور آپ کسی اور کے، اس لئے اس صورت میں آپ کے دلائل کو تسلیم کر لینا میرے لئے ضروری نہیں ہوگا۔ اور اگر

---

(۱) البقرہ ت۱۱۴

تحقیق مطلوب ہے تو بندہ مناظرے کے لئے حاضر ہے۔ حضرت شیخ نے بہت جلد اس موضوع پر دلائل سے بھرپور رسالہ تحریر فرمایا اور خوجہ کے شبہات کے مسکت جوابات دیئے، چونکہ حضرت شیخ کے احباب نے خوجہ کے تغیر مزاج کو دیکھ لیا تھا اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ وہ دولت عثمانیہ میں بلند رتبے پر فائز ہے اس لئے انھوں نے حضرت شیخ سے عرض کیا کہ اس قدر تردید مناسب نہیں۔ شیخ نے فرمایا حق بات کہنے سے نہیں ٹلنا چاہئے چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ خوجہ اور اس کے ساتھی اس رسالے کے جواب میں کچھ نہ کہہ سکے وہ مبہوت ہو کر رہ گئے اور یہ حقیقت کھل کر سامنے آ گئی کہ حق ہمیشہ بلند رہتا ہے کبھی پست نہیں ہوتا۔

شیخ ابو طاہرؒ مزید بیان کرتے ہیں کہ شیخ یحییٰ شاذلیؒ حرمین میں آئے ہوئے تھے۔ اس دوران انھوں نے شیخ ابراہیمؒ سے بھی ملاقات کی جب وہ روم واپس چلے گئے تو وزیر روم جو شیخ ابراہیم کا معتقد تھا، نے شیخ یحییٰ سے پوچھا کہ آپ نے ہمارے شیخ ابراہیمؒ کو کیسا پایا، اس نے کہا وہ تو ایک بت ہیں۔ وزیر یہ سن کر بھڑک اٹھا اور شیخ یحییٰ کو بے عزتی کے ساتھ مجلس سے نکال دیا۔ اس واقعہ کے بعد یحییٰ شاذلی کو شیخ ابراہیمؒ کے ساتھ سخت کینہ پیدا ہو گیا اور اس نے شیخ کو ایذا پہنچانے کی نیت سے حرمین آنے کا ارادہ کیا، لوگوں نے یہ بات شیخ ابراہیم کو پہنچائی تو آپ نے فرمایا جو ہاتھیوں کو قابو کر لیتا ہے وہ اسے بھی روک لے گا"۔ جب شیخ یحییٰ طور کے قریب پہنچے تو بیمار پڑ گئے اور اسی جگہ انتقال کیا۔ شیخ ابراہیمؒ کی سیرت یہ تھی کہ وہ خود پسند فقہا اور صوفیا کی طرح بڑے بڑے عمامے، لمبی آستینیں، اور پھٹے پرانے لباس سے بیزار تھے۔ آپ اہل حجاز کی طرح متوسط درجے کا لباس پہنتے تھے جو مختصر سی پگڑی، اون کی دھاری دار عبا اور بڑے رومال پر مشتمل ہوتا۔ آپ کبھی کسی محفل میں نمایاں جگہ بیٹھنے اور گفتگو میں پہل کرنے کے ذریعے اپنی حیثیت کا اظہار نہیں فرماتے۔ آپ کے معتقدین اور مذاکرے آپ سے استفادہ کرتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے "بہر حال یہ ایسے ایسے ہے کیا تمہیں فلاں فلاں بات سے اس کی سمجھ نہیں آتی"۔ اگر کوئی ان سے کسی مسئلے کے بارے میں سوال کرتا تو توقف فرماتے یہاں تک کہ تحقیق وانصاف کے ساتھ اس اشکال کو حل کر دیتے، عبداللہ لیاشی نے ان کے بارے میں کہا کہ آپ کی مجلس نمونۂ جنت تھی۔ جب مسائل حکمت پر گفتگو فرماتے تو اس ضمن میں حقائق صوفیا بھی بیان فرماتے اور کلام صوفیا کو حکما کی تحقیق پر ترجیح دیتے اور

فرماتے کہ یہ فلاسفہ گرتے پڑتے حق کے قریب تو پہنچ گئے، لیکن اس تک ان کی رسائی نہیں ہوئی۔ آپکی تاریخ وفات اس زمانے کے ایک خطیب نے ان الفاظ سے نکالی ہے۔ واللہ انا علیٰ فراقک یا ابراھیم لمحزنون۔ ۱۰۷۱ھ

شیخ حسن عجمیؒ

آپ شیخ الحدیث، جامع علوم وفنون اور فصاحت، یادداشت اور تیزی فہم کے پیکر تھے۔ آپ اکثر وبیشتر شیخ عیسیٰ مغربیؒ کی صحبت میں رہے اور ان سے استفادہ کیا۔ ان کے علاوہ کئی دوسرے شیوخ مثلاً شیخ احمد قشاشیؒ، شیخ محمد بن العلاء بابلیؒ اور امام ومفتی شوافع شیخ زین العابدین بن عبدالقادر طبری کی صحبت میں بھی رہے اور ان سے روایت کی۔ شیخ ابوطاہرؒ کا بیان ہے کہ شیخ حسن عجمیؒ نے شیخ نعمت اللہ قادریؒ اور دوسرے صوفیائے کرام سے بھی ملاقات کی تھی آپ دعوت اسماء کے سلسلے میں بھی مشہور تھے۔ شیخ ابوطاہرؒ ہی کا بیان ہے کہ یوں تو شیخ حسن حنفیؒ تھے مگر سفر کے دوران ظہر وعصر اور مغرب وعشا کی نمازیں اکٹھی پڑھ لیتے تھے اور امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ بھی پڑھتے تھے، آپ ہمیں وصیت فرمایا کرتے تھے کہ اپنی عورتوں کو تنگی میں نہ ڈالا کرو بلکہ انھیں حنفی مسلک کی آسانیوں سے مطلع کر دیا کرو تاکہ وہ نماز پڑھ سکیں جیسے درہم برابر نجاست میں جو اجازت دی گئی ہے اور اسی طرح کے دیگر مسائل کہ جن میں آسانی اور رخصت ہے۔

کاتب الحروف (شاہ ولی اللہ) کہتا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ شیخ حسن عجمیؒ باوجود حنفی ہونے کے، تمام امور میں ایک معین فقہی مسلک کی پیروی ضروری نہیں سمجھتے تھے بلکہ فریقین کے ہاں کسی حقیقت ممتعہ کے ثابت ہونے یا نہ ہونے کی پروا کئے بغیر وہ تمام فقہی مکاتب سے اقوال لے لیا کرتے تھے، واللہ اعلم

شیخ ابوطاہر مزید کہتے ہیں کہ میرے شیخ حسن عجمی خوب صورت نہیں تھے بلکہ ان کی ایک آنکھ میں ایک عیب بھی تھا اس کے باوجود جب حدیث پڑھتے تو ان کے چہرے پر انوار ظاہر ہوتے اور وہ دنیا بھر سے زیادہ حسین دکھائی دیتے تھے۔ یہ اس قول نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا اثر تھا کہ نضر اللہ عبدا (۱) الحدیث، آپ نے اپنی اسانید حدیث کو ایک رسالے کی صورت میں ضبط کیا ہے

---

(۱) نضر اللہ عبدا سمع مقالتی ووعاہ یعنی خدا اس شخص کو شگفتہ رکھے جو میری حدیث کو سن کر یاد کر لے

جس نے علم حدیث میں ان کے تبحر کا بخوبی پتہ چلتا ہے، آپ فرماتے تھے لوگ کہتے ہیں کہ عالم کا فرزند نصف عالم ہوتا ہے۔ تو یہ صحیح ہے کیونکہ ایسا کہنے سے عالم کے دو نصف ہو جاتے ہیں، ایک خود عالم اور دوسرا اس کا فرزند جبکہ یہاں یہ بات واضح ہے کہ والد تو عالم ہے ہی، ایسی صورت میں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ عالم کا فرزند نصف عالم ہے کیونکہ عالم کے دو نصف نہیں کئے جا سکتے، گویا خلاصہ کلام یہ نکلا کہ یہ ضروری نہیں کہ عالم کا بیٹا بھی عالم ہو، آپ ہر سال رجب کے مہینے میں مدینہ منورہ کی زیارت کے لئے تشریف لاتے اور مسجد نبوی میں صحاح ستہ میں سے ایک حدیث کی کتاب بطریق سرد پڑھتے اور اہل مدینہ آپ سے روایت کرتے تھے شیخ ابو طاہرؒ آپ کے قاری ہوتے۔ اگر ان کے علاوہ اور قرأت حدیث کرتا تو خوش نہ ہوتے، یہاں یہ بات واضح رہے کہ علمائے حرمین کے نزدیک کتب حدیث کی تدریس کے تین طریقے رائج ہیں پہلا طریقہ سرد سے جس کے مطابق شیخ سامع ہو یا تلاوت کرے دونوں صورتوں میں لغوی وفقہی مباحث چھیڑے اور نہ ہی اسماء رجال کے بارے میں کوئی بحث وتمحیص کرے۔

دوسرا طریقہ بحث وحل ہے، اس میں ایک حدیث کی تلاوت کے بعد اس میں لفظ غریب، مشکل ترکیب اسمائے اسناد میں سے نادر الوقوع اسم، ظاہری شان نزول اور منصوص علیہ مسائل پر تامل کر کے اسے نہایت اعتدال کے ساتھ حل کر دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد اگلی حدیث تلاوت کر کے اسے بھی اسی طرح حل کیا جاتا ہے علی ہذا القیاس۔

تیسرا طریق امعان وتعمق ہے اس کے مطابق ہر ہر لفظ کا لہ وما علیہ اور اس کے متعلقات کو نہایت توضیح وتشریح کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر کلمہ غریبہ اور کسی مشکل ترکیب کی تشریح میں کلام شعراء سے استشہاد کیا جاتا ہے اور الفاظ کے متعلقات کو اشتقاق ومحال کے پیش نظر پرکھا جاتا ہے اس کے علاوہ اسماء الرجال کی تشریح کرتے ہوئے رجال حدیث کے حالات اور سیرت واخلاق تفصیل سے بیان کئے جاتے ہیں نیز فقہی مسائل کی منصوص علیہا مسائل سے تخریج کرتے ہوئے اس کے ساتھ تھوڑی سی مناسبت رکھنے والے قصے اور عجیب وغریب حکایات بھی بیان کی جاتی ہیں۔ علمائے حرمین شریفین کے ہاں یہی تینوں طریقے مذکورہ تفصیلات کے مطابق رائج ہیں۔ شیخ حسن عجمیؒ، شیخ احمد قطان اور شیخ ابو طاہر کا پسندیدہ طریقہ بھی طریق سرد تھا، مگر یہ طریقہ صاحبان علم

وفضل اور منتہی طلبائے حدیث کیلئے زیادہ موزوں سمجھا گیا ہے تاکہ وہ جلد از جلد اپنے سماع حدیث اور سلسلۂ روایت کو مکمل کرلیں اور دوسرے مباحث شروح کی مدد سے حل کریں کیونکہ آج کل ضبط حدیث کا انحصار شروح پر ہی ہے اور مبتدی و درمیانی درجے کے طلبائے حدیث کیلئے طریقہ بحث و حل ہے تاکہ علم حدیث کے بارے میں ضروری معلومات حاصل کرکے فائدہ اٹھائیں۔ جہاں تک شروح کا تعلق ہے تو وہ انہیں پیش نظر رکھیں تاکہ بحث و تمحیص کے دوران ان کی طرف رجوع کرسکیں۔

تیسرا طریقہ قصاص ہے اس کا مقصد روایت و تحصیل علم نہیں بلکہ علم و فضل اور تحقیق و تدقیق کے اعلیٰ مراتب کا حصول ہے۔ اسی ضمن میں یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ ایک محدث کو رجال اسناد کے حالات، تصحیح اسماء ان کی ثقاہت کی معرفت، خصوصاً صحیحین (بخاری و مسلم) اور صحاح کی دوسری کتابوں میں اور لیس منا من فعل کذا اور فان اللہ قبل وجهه اور اسی طرح کے دوسرے جملوں کی تاویلات فقہی فروعات فقہا کے اختلافات مذاہب، مختلف روایات میں باہمی موافقت پیدا کرنے اور بعض احادیث کی بعض پر ترجیح میں تحقیق و تدقیق اور گہرائی و گیرائی پر حاوی ہونا چاہئے مگر اس امت مرحومہ کے متقدمین علماء ان امور میں دلچسپی نہیں رکھتے تھے ہاں فقہا و متکلمین اس سلسلے میں غور و خوض کرتے ہیں لیکن آج اس کی بھی ضرورت باقی نہیں رہی۔ واللہ اعلم۔

شیخ حسن اپنے مشائخ سے انتہائی تواضع اور انکساری سے پیش آتے اور ہر لحاظ سے ان کا دل رکھنے کی کوشش کرتے۔ شیخ حسن کہتے ہیں کہ میں نے شیخ عیسیٰ سے دریافت کیا کہ اگر کسی کا شیخ موجود ہو تو کیا وہ کسی دوسرے شیخ کی بیعت کرسکتا ہے۔ تو انھوں نے فرمایا باپ تو ایک ہی ہوتا ہے مگر چچا، تایا کئی ہوتے ہیں۔ کاتب الحروف (شاہ ولی اللہ) کہتا ہے کہ آپ کی اس بات کا مفہوم یہ ہے کہ شیخ اول کہ جس کے باعث مزید دائرہ بشریت سے نکلا، یا اس نے ظاہری علوم حاصل کئے، کا مقام تو یہ ہے کہ اس کا مرتبہ حقیقی والدین کا سا ہے جبکہ دوسرے بزرگ کہ جن سے اس نے دائرہ بشریت سے خروج کے علاوہ دیگر خارجی فیوض کا اکتساب کیا ہے، کا معاملہ امام کا ہے لہذا انہیں اس طرح سمجھنا چاہئے۔ شیخ حسن آخری عمر میں مکہ مکرمہ سے ترک سکونت کرکے طائف میں گوشہ نشین ہوگئے تھے۔ آپ کا مقولہ ہے لیس بمکۃ من یقرا الیہ آپ نے طائف ہی میں ۱۱۱۳ھ میں انتقال فرمایا اور حضرت ابن عباسؓ کے مزار کے قریب مدفون ہوئے۔

شیخ احمد نخلیؒ

آپ علوم ظاہری و باطنی دونوں کے جامع تھے، مشائخ طریقت اور علمائے شریعت کی بے شمار صحبتوں سے مستفیض ہوئے۔ سید احمد نخلیؒ سید محمد رومی، سید عبداللہ سقاف اور میر کلاں بن میر محمود بلخی وغیرہ سے خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ آپ نے حدیث کی تعلیم محمد بن العلاء بابلی، شیخ عیسیٰ مغربی اور اسی طبقے کے دوسرے شیوخ سے حاصل کی اور انہیں سے بخاری و موطا کے سماع میں تسلسل حاصل کیا۔ آپ کا مشائخ کے کئی خانوادوں سے تعلق تھا، ابتدا ہی سے علم و علما کی محبت کی طرف مائل ان کی صحبت میں حاضر، صوفیائے کرام سے عقیدت مندی اور ان کے اعمال اور اشغال پر ثابت قدم تھے۔ آپ حرمین شریفین اور باہر سے آنے والے مشائخ کی صحبتوں سے استفادہ کرتے رہے۔ مختصر یہ کہ شیخ احمد نخلیؒ اعیان مکہ معظمہ میں سے وہ عظیم المرتبت بزرگ تھے جن کی برکات کا فیض عام اور دعوات مستجاب تھیں۔ شیخ احمد نخلیؒ کے فرزند شیخ عبدالرحمٰن نخلیؒ بیان کرتے ہیں کہ ان کے دادا کے ہاں نرینہ اولاد زندہ نہیں رہتی تھی جس کی وجہ سے وہ بہت پریشان رہتے تھے۔ جب شیخ احمد پیدا ہوئے تو ان کیلئے اولیاء اللہ سے دعا کی درخواست کی اور ان سے استمداد اور روحانی توجہ کے طالب ہوئے، وہ ہر جمعہ کے دن شیخ احمد نخلیؒ کو شیخ تاج سنبھلی کی خدمت میں بھیجتے تھے۔ ایک روز اتفاق سے شیخ تاج سنبھلی نے قدرے تامل کے بعد شیخ احمد کو لانے والے خادم کے ہاتھ کہلا بھیجا کہ یہ بچہ آپ کی طرح کا نہیں، بلکہ آپ سے بڑھ کر صاحب فضل اور سعادت مند ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کی عمر کم ہے جب خادم اپنے مالک کے پاس پہنچا اور انہیں شیخ تاج سنبھلیؒ کا پیغام دیا تو انھوں نے اسے یہ کہہ کر فوراً واپس بھیجا کہ میری طرف سے حضرت شیخ تاج سنبھلیؒ کی خدمت میں التماس کرو کہ آقائے من! میں نے اپنی عمر اس بچے کو دے دی ہے اور اس بارے میں آپ سے سفارش کا طالب ہوں، جب حضرت شیخ نے یہ پیغام سنا تو فوراً توجہ کی اور چند لمحوں کے بعد اس خادم سے کہا کہ اپنے مالک سے کہہ دو کہ ان کا مدعا پورا ہو گیا ہے اور اپنی طرف سے انہیں (شیخ احمد نخلی کے والد کو) تین ماہ کی مہلت سفر آخرت کی تیاری کے لئے عطا کی۔ چنانچہ شیخ احمد نخلی کے والد اسی مدت میں اس عالم فانی سے رخصت ہو گئے اور شیخ احمد نخلی نے نوے سال کی عمر پائی۔ شیخ عبدالرحمٰن کا مزید بیان ہے کہ تمام دنیاوی معاملات اور لین دین میں میں اپنے والد کا وکیل تھا۔ جب والد بزرگوار (شیخ احمد نخلی) اپنی آخری عمر کو پہنچے اور ان پر ضعیفی غالب آ گئی تو میں نے ایک روز ان کی خدمت میں قرض خواہوں کے

مطالبات کی شکایت کی اور عرض کی کہ مجھے اندیشہ ہے کہ اگر خدانخواستہ آپ کی وفات کا حادثہ پیش آ گیا تو یہ تمام قرضے میرے ذمے پڑ جائیں گے اور میرے عزیز واقارب میری وکالت کا اعتبار نہیں کریں گے، والد بزرگوار نے فرمایا اس خدشے کو اپنے دل میں ہرگز راہ نہ دو مجھے امید کامل ہے کہ میں اس وقت تک نہیں مروں گا جب تک کہ میرے ذمے تمام واجب الادا قرض ادا نہ ہو جائیں اور میرا خیال ہے کہ وہ رات میری زندگی کی آخری رات ہوگی جس میں مجھ پر کسی کا قرض باقی نہیں ہوگا۔ آپ کی وفات سے کچھ عرصہ پہلے ان تمام قرضوں کی ادائیگی جتنی رقم ایسی جگہ سے حاصل ہوگئی جہاں سے توقع بھی نہیں تھی اور آپ کے کہنے کے مطابق آپ کی اس دنیا کی وہ آخری رات آ ہی پہنچی جبکہ آپ کے ذمے کوئی واجب الادا قرض باقی نہیں تھا۔

شیخ احمد نخلیؒ فرماتے ہیں کہ طریقہ خلوتیہ میں میرے شیخ، شیخ عیسٰی بن کنعان خلوتی نے جب مجھے اس طریقے کی اجازت بخشی تو مجھے مکہ معظمہ میں اپنا خلیفہ بنایا تاکہ خلوتیہ طریقہ کے تمام پیروکار میرے سامنے اکٹھے ہو کر نماز تہجد کے بعد جیسا کہ ان کا طریق ہے اوراد وظائف میں مشغول ہو جائیں اس بات سے میرے دل میں غایت درجہ تردد تھا کیونکہ میرا میلان پوری طرح نقشبندیہ سلسلے کی طرف تھا اور شیخ خلوتی کے سامنے مجھے لب کشائی کی جرأت بھی نہیں تھی اسی تردد کے عالم میں میں نے حضور ختم الرسل علیہ الصلوٰات والتسلیمات کی بارگاہ میں رجوع کیا اور اسی سال روضۂ مقدسہ کی زیارت سے مشرف ہوا تو جمعہ کے روز نماز جمعہ سے قبل مجھے خواب میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی، میں نے دیکھا کہ زیارت عثمانیہ میں چاروں خلفاء کے ہمراہ جلوہ افروز ہیں میں آپ کی طرف تیزی سے بڑھا اور دست مبارک چومنے کے بعد بالترتیب خلفائے کرام کے ہاتھوں کو چومنے کی سعادت حاصل کی۔ بعد ازاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے مزار مقدس کے سرہانے صف اوّل کے متوازی بچھے ہوئے ایک نئے سجادے کی طرف لائے اور فرمایا ''یہ شیخ تاج کا سجادہ ہے اس پر بیٹھ جاؤ'' میں سمجھ گیا کہ آپ کا اشارہ طریقۂ نقشبندیہ کی طرف ہے اور آپ نے اس طریقے کی اجازت عطا فرمادی ہے۔

شیخ عبداللہؒ بن سالم البصری

آپ نے بہت ساری حدیث کی نایاب کتابوں کی ترویج واشاعت میں نمایاں کردار انجام

دیا، مثلاً مسند امام احمدؒ جس کے بارے میں یہ خدشہ تھا کہ شاید روئے زمین پر اس کا کوئی مکمل نسخہ ملنا محال ہو جائے۔ آپ نے مصر، عراق، شام اور اطراف واکناف کے قدیم کتب خانوں سے اس کے متفرق اجزا کمال احتیاط سے جمع کر کے ان تمام کو ایک ہی نسخے کی صورت میں ترتیب دیا اور اسے صحت کے ساتھ ایک اصلی نسخے کی صورت میں عام کر دیا۔ اس کے علاوہ صحاح ستہ کی روشنی میں آپ نے کئی اصول وضع کیے اور نسخہ نبویہ اصل کی نسبت زیادہ بہتر انداز میں اپنے قلم سے لکھا۔ آپ نے صحیح بخاری کی شرح ''ضیاء الساری'' کے نام سے لکھنی شروع کی تھی جسے بڑھاپے اور کمزوری کے سبب مکمل نہ کر سکے۔ آپ نے ساری زندگی سرد بحث طریقوں سے روایت حدیث میں گزاری، الغرض آپ واقعتاً اس آخری دور کے حافظ الحدیث تھے۔ اس اجمالی گفتگو کی تفصیل یہ ہے کہ صحت حدیث کے ضبط کے امت مرحومہ میں تین دور رائج رہے ہیں۔ پہلا دور صحابہ وتابعین کا ہے، جس میں احادیث کو زبانی یاد کر لیتے تھے اور اچھی طرح یاد کر لینا ہی ان کے ہاں ضبط حدیث کہلاتا تھا، دوسرا دور تبع تابعین اور ساتویں آٹھویں طبقہ تک کے متقدمین محدثین کا ہے۔ یہ حضرات احادیث کو لکھ لیتے تھے ان کے نزدیک ضبط ان اصولوں پر مبنی تھا۔ صفائی تحریر، حرکات وسکنات اور نقاط میں احتیاط، ہیئت حروف کی حفاظت، احادیث کا اصول صحیحہ سے موازنہ اور کتاب کو ہر قسم کے خارجی اثرات سے محفوظ رکھنا۔ تیسرا دور وہ ہے کہ جس میں حفاظ حدیث نے اسماء رجال اور مشکل وغریب الفاظ کے ضبط میں کتابیں تالیف کیں۔ مفصل شرحیں لکھیں اور پیچیدہ ومشکل مقامات حدیث کی تشریح میں رسائل لکھے۔ آج ضبط حدیث کا یہ عالم ہے کہ کوئی بھی شخص ان تصانیف وشروح کو پیش نظر رکھ کر ان کے مطابق روایت شروع کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب علمائے حدیث ان اصولوں میں تساہل سے کام لینے لگے ہیں جن پر قدما سختی سے کاربند تھے، چونکہ متوسطین نے حفظ حدیث میں سستی برتی اور صرف عبارت پر ہی اکتفا کر لیا، جس کے نتیجے میں طبقات سابقہ کے برعکس ان میں وجادت (۱) اور اجازت مجردہ اور اس کی دوسری چیزیں رائج

---

(۱) کوئی شخص کسی محدث کی لکھی ہوئی تحریر یا کتاب حاصل کرے لیکن اس شخص نے ان روایات کو نہ اصل سے سنا نہ ہی اس کو روایت کی اجازت ہو، ایسی صورت میں راوی ثانی اگر ان احادیث کو روایت کرنا چاہے تو یوں کہے گا، وجدت بخط فلاں، فلاں شخص کی تحریر سے میں نے ایسا پایا قرأت بخط فلاں اسے وجادہ کہتے ہیں۔

ہوگئیں۔ حاصل کلام یہ ہو کہ ضبط حدیث کا یہ طریقہ شیخ عبداللہ کے ہاں بکمال موجود تھا جبکہ اس سلسلے کی بقا کا سبب بھی انہی کی ذات بنی، حضرت شیخ عبداللہ بچپن ہی سے علم وعلما ، اور صلاح وتقوی کو دل وجان سے عزیز جانتے تھے، روزانہ قرآن مجید کے دس پارے تلاوت فرماتے مگر بڑھاپے میں حسب استطاعت تلاوت فرماتے۔ آپ کے وقت کا کوئی حصہ بھی درس وتدریس، تلاوت کلام پاک، نماز یا ضروری گفتگو سے خالی نہ ہوتا تھا۔ میں (شاہ ولی اللہ) نے سنا ہے کہ جب شیخ عبداللہ کے فرزند شیخ سالم نے شریف مکہ کے دربار میں ملازمت اختیار کرلی تو شیخ عبداللہ، شیخ سالم کے کھانے میں شریک ہونا تو درکنار ان کے گھر کے نمک سے بھی احتراز فرماتے تھے۔ آپ نے حجرہ کعبۃ اللہ میں دوبار صحیح بخاری ختم کی، پہلی بار مرمت کعبہ کے وقت اور دوسری دفعہ اس وقت جبکہ کعبہ مکرمہ کا دروازہ درست کیا جارہا تھا اور مسند امام احمد بن حنبل تصحیح وجمع کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مزار مقدس کے سرہانے مسجد نبوی میں چھپن روز میں ختم کی۔ آپ نے طویل عمر پائی جو سب کی سب رضائے الٰہی میں گزری۔ آخر عمر تک سمجھ بوجھ، حافظہ اور حواس درست رہے، البتہ قوت سماعت میں کچھ کمی واقع ہوگئی۔ عمر کے آخری حصے میں شیخ عبداللہ مغربی نے آپ سے کتب صحاح ستہ پڑھیں اور اہل مکہ نے آپ سے سماع حدیث کیا، آپ ۴ رجب ۱۱۲۴ھ میں واصل بحق ہوئے۔

شیخ ابوطاہر محمد بن ابراہیم کردی المدنیؒ

آپ ابتداء ہی سے علم اور علماء کی طرف راغب تھے، خرقۂ خلافت اپنے والد بزرگوار سے حاصل کیا، جنھوں نے آپ کیلئے بے شمار بزرگوں سے خرقہ واجازت حاصل کی تھی، ان بزرگوں میں سے ایک شیخ محمد بن سلیمان مغربیؒ تھے آپ نے کتب عربیہ کی تعلیم سیبویۂ وقت سید احمد ادریس مغربی سے حاصل کی، شیخ ابوطاہر سید احمد ادریس کا ایک واقعہ نقل کرتے ہیں کہ ان کے ایک فاضل شاگرد نے مسجد نبوی کے محراب میں سورۂ تبت تلاوت کی جب وہ نماز سے فارغ ہوکر سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ اس پر برس پڑے اور فرمانے لگے میں یہ ہرگز برداشت نہیں کرسکتا کہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور وہ سورت پڑھو جس میں ان کے چچا (ابولہب) کا نام (اہانت کے ساتھ) مذکور ہے۔ کیونکہ خدا جیسے چاہے اپنے رسول سے خطاب کرے لیکن ہمارا یہ

مقام نہیں! کاتب الحروف (شاہ ولی اللہ) کہتا ہے کہ اگر چہ اس طرح کی باتیں سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ انتہائی محبت کا نتیجہ ہیں تاہم یہ ارباب تقویٰ و تحقیق کا مقام ہے مگر ہمارے لئے تو صحابہ وتابعین کا طرز عمل ہی کسوٹی ہے۔ وہ یوں کیوں نہیں سمجھتے کہ اس سورت میں تو حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی انتہائی مدح ومنقبت کا پہلو نکلتا ہے، کیونکہ یہاں اس سورت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرنے والے آپ کے ایک دشمن پر خدا تعالیٰ نے لعنت کی ہے۔

شیخ ابوطاہر نے فقہ شافعی کی تعلیم شیخ طولونی مصری سے معقولات، روم کے مشہور زمانہ متبحر عالم منجم باشی سے اور علم حدیث اپنے والد بزرگوار سے حاصل کیا۔ اس کے بعد وہ شیخ حسن عجمی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے بہت زیادہ استفادہ کیا۔ انکے بعد شیخ احمد نخلی اور شیخ عبداللہ بصری کی صحبت میں پہنچے اور شیخ عبداللہ بصری سے شمائل النبی صلی اللہ علیہ وسلم پڑھی اور انہی سے مسند امام احمد دو ماہ سے بھی کم عرصے میں سنی۔ ان کے علاوہ آپ نے وقتاً فوقتاً حرمین شریفین میں باہر سے آنے والے علماء ومشائخ سے بھی بہت کچھ حاصل کیا۔ ان میں ایک شیخ عبداللہ لاہوری تھے جن سے آپ نے ملا عبدالحکیم سیالکوٹی (۱) کی کتابیں روایت کیں اور ان کا سلسلہ شیخ عبداللہ لبیب کے ذریعے خود مولانا تک پہنچا ہے۔ اسی طرح شیخ عبدالحق دہلویؒ (۲) کی کتابیں بھی آپ نے اسی واسطے سے پڑھیں۔ مولانا سیالکوٹی نے خود ان سے ان کتابوں کی روایت کی اجازت لی تھی اور ان

---

(۱) ملا عبدالحکیم سیالکوٹی اپنے دور کے یگانہ روزگار فاضل ملا کمال الدین متوفی ۱۶۰۸ء کے شاگرد رشید ہیں، آپ علمی تبحر اور مسلمہ حدیث کی شہرت پوری اسلامی دنیا میں ہے۔ کچھ وقت اکبر آباد کے سرکاری مدرسے میں مدرس رہے۔ آپ کی تصانیف زیادہ تر درسی کتابوں کے حواشی وشروح سے متعلق ہیں۔ حواشی تفسیر بیضاوی، حاشیہ شرح عقائد، حاشیہ شرح شمسیہ، تکملہ حاشیہ عبدالغفور اور حاشیہ خیالی جس کی نسبت کسی نے کہا ہے۔

خیالات خیالی بس عظیم است
رائے حل او عبدالحکیم است

علمی دنیا میں مشہور اور ماخذ کا درجہ رکھتی ہیں۔ شاہان مغلیہ آپ کے علمی مقام ورتبے کو ہمیشہ خراج عقیدت پیش کرتے رہے۔ ۱۶۵۶ء میں آپ کا انتقال ہوا۔ مزار سیالکوٹ میں شہابان روڈ پر ہے۔

(۲) رئیس صوفیا، امام المحدثین، عاشق مصطفیٰ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ عالم اسلام کی وہ مایہ ناز شخصیت ہیں کہ جنھوں نے ایک بار پھر دنیائے اسلام کو اس کا بھولا ہوا سبق یاد دلاتے ہوئے مقام محمدی کی عظمتوں کی طرف بلایا اور اسے حب رسول کا جاں بخش پیغام دیا۔ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

میں سے شیخ سعید کوکنی سے بھی آپ نے بعض عربی کتابیں اور فتح الباری کا چوتھا حصہ پڑھا۔ الغرض آپ سلف صالحین کے تمام اوصاف مثلاً تقویٰ، عبادت، علمی شغف اور بحث وتمحیص میں انصاف پسندی سے متصف تھے۔ جب آپ سے کسی مسئلے کے بارے میں رجوع کیا جاتا تو جب تک پورا غور وفکر اور کتابوں سے اس کی تحقیق نہ کر لیتے، جواب نہ دیتے۔ آپ اس قدر رقیق القلب تھے کہ جب بھی کوئی اس طرح کی حدیث پڑھتے تو آنکھیں پرنم ہو جاتیں، لباس وغیرہ میں کوئی تکلف نہ برتتے۔ اپنے تلامذہ اور خدام سے بھی تواضع سے پیش آتے۔

صحیح بخاری کی قرأت کے دوران جب روایات احادیث اور فقہ کے اختلافات سامنے آتے تو شیخ ابوطاہر فرماتے کہ یہ تمام اختلافات سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی انتہائی جامعیت (جامعیت کبری) کا نتیجہ ہیں جو اپنے اندر کونین کی تمام تر اضداد وموافقات سموئے ہوئے ہیں۔ راقم الحروف (شاہ ولی اللہ) کہتا ہے کہ یہ ایک نہایت گہرا نکتہ ہے جس پر تدبر کی ضرورت ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

آپ ایک مشہور علمی وروحانی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ تعلیم دہلی ہی میں مکمل فرمائی۔ کچھ وقت فتح پور سیکری میں جو دارالحکومت ہونے کی وجہ سے علمی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ تعلیم وتدریس اور تصنیف وتالیف کا شغل اختیار کیا۔ ۱۵۷۷ء میں شیخ موسیٰ گیلانی (المعروف موسیٰ پاک شہیدؒ) سے بیعت کی۔ ۱۵۸۸ء میں زیارت حرمین کے لئے تشریف لے گئے اور وہاں دو تین سالہ قیام کے دوران مشائخ حرمین کے علاوہ براہ راست بارگاہ رسالت سے فیوض حال کئے۔ ہندوستان کے تمام اکابر واعیان کے ساتھ آپ کے تعلقات قائم رہے۔ ۱۵۹۹ء میں خواجہ محمد باقی باللہ سے بیعت کر کے ان سے خلافت حاصل کی۔ آپ کے برادر طریقت شیخ مجدد الف ثانیؒ کے ساتھ اختلافات پیدا ہو گئے۔ آپ نے حضرت مجدد کے بعض مکشوفات کی تردید میں ایک رسالہ بھی لکھا۔ حضرت مجددؒ کے ساتھ آپ کے اختلاف خالص علمی اور احوال صوفیا کے اختلاف تھے جو آخر دم تک قائم رہے لیکن باہمی وقار اور احترام کی فضا میں! اس سلسلے میں حضرت شیخ کے رجوع کا سارا قصہ محض عقیدتمندی کا فسانہ ہے۔ حضرت محدث کا سب سے بڑا کارنامہ مصائب وآلام میں گھری ہوئی امت مسلمہ کو محبت نبوی اور دامن رسالت پناہی سے وابستگی کی دعوت کی تجدید ہے۔ یہی وہ تریاق ہے جو مسلمان قوم کو نئی زندگی بخش سکتا ہے۔ آپ کی تصانیف میں سے لمعات، شرح مشکوٰۃ، مدارج النبوۃ، جذب القلوب، اخبار الاخیار، زاد المتقین زندہ جاوید کتابیں ہیں۔ آپ نے ۱۶۴۲ء میں چورانوے برس کی عمر میں رحلت فرمائی ع

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

ایک دن احوال صوفیا اوران کی باہمی تردید وتنقید جو بعض دفعہ ان کے پیروکاروں میں بھی چل پڑتی ہے پر گفتگو چھڑ گئی تو شیخ ابوطاہر نے فرمایا کہ میں صوفیا کے بارے میں کچھ کہنے سے بہت ڈرتا ہوں۔ اگر چہ میرے بعض اسلاف بعض صوفیا کے بارے میں ناقدانہ رائے رکھتے تھے مگر جہاں تک میرا تعلق ہے میرے دل میں ان کے لئے تردید وتنقید کا معمولی جذبہ بھی موجود نہیں، یہاں آپ نے ایک قصہ سنایا کہ شیخ یحیٰی شاذلی میرے والد سے کچھ اختلافات رکھتے تھے اور یہ بات ان کی طرف سے میرے دل میں کھٹکتی رہی، اسی اثناء میں شیخ یحیٰی شاذلیؒ اس دنیا سے کوچ کر گئے۔ ایک عرصے کے بعد جب انہیں کسی وجہ سے لحد سے باہر نکالا گیا تو اس طرح صحیح وسالم تھے جیسے آج سوئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی پر کسی عارف سے اختلاف کے سبب طعن وتشنیع نہیں کرنی چاہئے، یہاں انھوں نے مزید فرمایا کہ شیخ محی الدین بن عربیؒ نے اس سلسلے میں ایک عجیب وغریب وصیت فرمائی ہے یہ کہہ کر انھوں نے شیخ ابن عربی کے اپنے قلم سے لکھا ہوا فتوحات کا نسخہ نکالا اور اس میں سے باب الوصیت پڑھ کر سنایا۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ شیخ اکبر فرماتے ہیں کہ میں ایک شخص سے اس لئے عداوت رکھتا تھا کہ وہ شیخ ابو مدین مغربی پر طعن وتشنیع کرتا تھا، جبکہ میں شیخ مغربی کی مقبولیت وبزرگی کا معترف تھا۔ ایک دن میں نے حضور سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں فرماتے ہوئے سنا کہ "تمہیں فلاں شخص سے کیوں بغض ہے؟ میں نے عرض کی اس لئے کہ وہ ابو مدین سے عداوت رکھتا ہے جبکہ میں انھیں بزرگ سمجھتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کیا وہ شخص اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت نہیں رکھتا؟ میں نے عرض کیا رکھتا ہے۔ فرمایا گویا تمہیں ابو مدین سے اس کے بغض کی بنا پر تو عداوت ہے، لیکن میرے محبّ ہونے کی حیثیت سے الفت نہیں۔ شیخ اکبر فرماتے ہیں کہ اس کے بعد میں نے اللہ سے اس بغض کی توبہ کی۔ اس شخص کے گھر گیا، اسے معذرت کے ساتھ سارا واقعہ سنایا اور ایک قیمتی کپڑا اس کی نذر کر کے اسے راضی کیا۔ اس کے بعد میں نے اس سے ابو مدینؒ کے بارے میں ناراضگی کا سبب پوچھا۔ اس نے جو وجہ بتائی وہ ایسی نہ تھی کہ اس کی بنا پر ابو مدینؒ سے عداوت رکھی جاتی، تو میں نے اسے حقیقت حال سمجھائی جس پر اس نے خدا تعالیٰ سے توبہ کی اور ابو مدینؒ کے بارے میں طعن وتشنیع سے رجوع کر لیا اور اس طرح سب کے دلوں میں الفت نبیؐ کی برکات جاری وساری ہو گئیں اور اس پر اللہ کا

شکر ہے جس روز میں (شاہ ولی اللہؒ) وطن واپس ہوتے وقت شیخ ابو طاہرؒ کی خدمت میں الوداعی سلام کے لئے حاضر ہوا۔ تو بے اختیار میری زبان پر یہ شعر آ گیا۔

نسیت کل طریق کنت اعرفه

الا طریقا یودینی لربعکم

(میں تیرے گھر کی طرف جانے والے راستے کے علاوہ باقی سارے راستے بھول گئے)

یہ شعر سنتے ہی حضرت شیخ پر گریہ طاری ہو گیا اور بہت متاثر ہوئے۔ آپ رمضان المبارک ۱۱۴۵ھ میں رحلت فرمائے، خلد بریں ہوئے۔

شیخ تاج الدین قلعی حنفیؒ

آپ قاضی عبد المحسن کے فرزند اور مکہ مکرمہ کے مفتی تھے کئی مشائخ حدیث کی صحبتوں میں پہنچ کر ان سے علوم حاصل کئے اور ہر ایک سے اجازت بھی حاصل کی، آپ ابھی کمسن تھے کہ والد بزرگوار نے شیخ عیسیٰ مغربی سے آپ کے لئے اجازت حاصل کی۔ آپ فرماتے تھے کہ شیخ محمد بن سلیمان مغربیؒ کے درس میں سنن نسائی کے ختم کے موقع پر حاضر ہوا، انھوں نے ختم کے بعد تمام حاضرین مجلس کو اجازت دی جن میں میں بھی شامل تھا، آپ نے علم حدیث کا آخر حصہ شیخ عبداللہ بن سالم بصریؒ کی خدمت میں مکمل کیا، فرمایا کرتے تھے کہ یہ ساری کتابیں میں نے بحث و تنقیح کے ساتھ ان سے پڑھیں، صحیحین (بخاری و مسلم) شیخ حسن عجمی سے پڑھیں اور جس قدر روایات ان کی نظر میں صحیح تھیں، ان کی اجازت بھی حاصل کی، اس کے علاوہ شیخ صالح زنجانی کی خدمت میں ایک عرصے تک رہ کر ان سے فقہ میں مکمل استفادہ کیا، آپ نے شیخ احمد نخلیؒ سے بھی اجازت و روایت حاصل کی۔ شیخ احمد قطان بھی آپ کے مشائخ میں سے تھے جن کی صحبت میں سالہا سال رہ کر ان سے درس کا طریقہ سیکھا، شیخ تاج الدینؒ فرمایا کرتے تھے کہ شیخ احمد قطانؒ کی وفات کے بعد میرے تمام مشائخ یعنی شیخ عبداللہ مصریؒ اور شیخ احمد نخلیؒ وغیرہ اس پر مصر ہوئے کہ شیخ احمدؒ کی جگہ حرم کعبہ میں مصلیٰ مالکی پر بیٹھ کر حدیث کا درس دوں، جیسے کہ میرے شیخ کا معمول تھا مگر مجھے ایسے اکابر کی موجودگی میں یہ جرأت نہیں پڑتی تھی اس لئے میں اس پر آمادہ نہ ہوا اس کے باوجود ان کی طرف سے اصرار بڑھتا گیا تو میں نے حسن عجمی جو ان دنوں طائف میں مقیم تھے، کی خدمت میں

ساری صورت حال لکھی بھیجی، انھوں نے بھی مشائخ کا کہنا ماننے لینے کی تاکید کی آخر کار اس معاملے میں ہر طرح استخارہ وغور وفکر کر کے میں اس فریضے کو انجام دینے کے لئے تیار ہو گیا اور مسند شیخ قطان پر بیٹھ کر بخاری کا درس اسی مقام سے شروع کیا جہاں شیخ نے چھوڑا تھا، ختم بخاری کی مجلس میں تمام علماء ومشائخ موجود تھے۔ آپ نے شیخ ابراہیم کردیؒ سے بھی ان تمام علوم کی اجازت حاصل کی حدیث (۱) مسلسل بالاولیت بھی انہی سے حاصل کی۔

کاتب الحروف نے شیخ تاج الدینؒ سے ایک عجیب وغریب حکایت سنی جو یہ ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ ایک دفعہ سخت بیمار ہو گا۔ اس بیماری نے اس قدر طول پکڑا کہ ضعف و ناتوانی کے مارے ہاتھ پاؤں ہلانے کی سکت بھی نہ رہی، اسی حالت میں ایک رات خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ جیسے کوئی آکر کہنے لگا کہ اس مریض کے شفا کے لئے مرغ پکا کر اس پر پورا قرآن مجید دم کیا جائے تاکہ بیمار اسے کھا کر شفایاب ہو، جب میں بیدار ہوا تو خواب کو عملی جامہ پہنانے کا پختہ ارادہ کرلیا، اگلی رات میں نے پھر خواب میں دیکھا کہ گویا امام محمد بخاری میرے غریب خانے پر تشریف لائے ہیں۔ اپنے ہاتھوں سے دیگچہ چڑھا کر آگ جلائی اور اس میں صبح سے لے کر شام تک مرغ پکاتے رہے جب پک کر تیار ہو گیا تو میرے سامنے لاکر رکھ دیا اور کہنے لگے میں نے اس کھانے پر سارا قرآن پڑھا ہے اسے کھاؤ اسے کھاتے ہی مجھے اس قدر افاقہ ہوا کہ اس قدر لطف وکرم سے مجھے جتنی مسرت وشادمانی حاصل ہوئی وہ مرض سے نجات پانے میں بھی نہ ملی۔ کاتب الحروف (شاہ ولی اللہ) شیخ تاج الدین کے درس میں جو ان دنوں بخاری کے درس میں مشغول تھے دو تین روز لگاتار حاضر ہوا۔ اس دوران اسے صحاح ستہ اور موطا امام مالک کے کچھ حصے مسند دارمی، امام محمد کی کتاب الآثار اور موطا سماعت کیں، حضرت شیخ نے ان تمام کتابوں کی اجازت تمام اہل مجلس کو عطا کیں جن میں فقیر بھی شامل تھا اور حدیث مسلسل کے سلسلے میں یہ میری پہلی حدیث تھی جو میں نے زیارت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے واپسی کے بعد شیخ ابراہیمؒ سے سماعت کی۔ ۱۱۴۴ھ۔

---

(۱) حدیث مسلسل سے مراد یہ ہے کہ حدیث کی سند کی روایت کرنے والوں کی روایت کے وقت ایک صفت یا ایک حالت مسلسل قائم رہی ہو خواہ یہ حالت اور صفت سند کے الفاظ میں ہو یا راویوں کے حالات میں، اس کی کئی اقسام ہیں مثلاً مسلسل بسمعت، مسلسل باخذ اللحیہ، مسلسل فان قیل لفلان۔

حضرت شاہ ولی اللہ کے خودنوشت حالات زندگی

بسم اللہ الرحمن الرحیم، الحمد لہ الذی بدا بالنعم قبل استحقاقھا وخص من شاء بمعرفۃ الاسماء واذواقھا والصلوٰۃ والسلام علی سیدنا محمد المتحلیٰ بتیجان الکرامات واطواقھا المکرم بصنوف العطیات واطباقھا وعلی آلہ واصحابہ الذین بھم قیام الملۃ ورواج اسواقھا، اما بعد

فقیر ولی اللہ بن عبدالرحیم (خدا سے اور اس کے والدین کو بخشے اور اسے اور اس کے والدین کو احسان سے نوازے، رقمطراز ہے کہ یہ چند کلمات میں نے اپنے حالات زندگی کے بارے میں ''الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف'' کے نام سے تحریر کئے ہیں۔ میری ولادت بروز بدھ ۴ شوال ۱۱۱۴ھ بوقت طلوع شمس ہوئی۔ بعض ستارہ شناسوں نے علم نجوم کے مطابق یہ کہا کہ میری پیدائش کے وقت حوت کا درجہ دوم طالع میں تھا اور شمس بھی اسی درجہ میں تھا۔ زہرہ آٹھویں، عطارد اکیسویں، زحل دسویں اور حمل ومشتری پندرہویں درجے میں تھے اور وہ سال علوبین کے قران کا سال تھا۔ یہ قران درجہ اوّل میں تھا اور مریخ اس سے دوسرے درجے میں تھا اور راس سرطان تھا، واللہ اعلم بالصواب

بعض احباب نے میری تاریخ پیدائش ''عظیم الدین'' سے نکالی ہے(۱)۔ میرے والدین قدس اللہ تعالیٰ سرہما اور کئی دیگر صلحاء کو میرے بارے میں میری پیدائش سے پہلے اور اس کے بعد بشارتیں ہوئیں۔ چنانچہ ایک قریبی برادر اور مخلص دوست نے یہ ساری تفصیلات دوسرے واقعات کے ساتھ اپنے رسالے ''قول جلی'' میں بیان کی ہیں، اللہ اسے اس کی بہترین جزا عطا فرمائے اور اسے اور اس کے اسلاف واخلاف کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنے اور اس کے دینی ودنیوی

(۱) عظیم الدین سے ابجد کے حساب سے تاریخ ۱۱۱۵ھ نکلتی ہے۔ چونکہ آپ کی ولادت ماہ شوال ۱۱۱۴ھ میں ہوئی جبکہ نئے سال یعنی ۱۱۱۵ھ کے شروع ہونے میں صرف دو ماہ باقی رہ گئے تھے اسی لئے شاید تاریخ نکالنے والوں نے یہ دو ماہ شمار نہیں کئے۔

مقاصد پورے فرمائے پانچ سال کی عمر میں مکتب میں بیٹھا اور سات سال کا تھا کہ والد بزرگوار نے مجھے نماز کے لئے کھڑا کر دیا اور روزہ رکھنے کا حکم دیا، ختنہ بھی اسی سال ہوا، اور مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے قرآن مجید بھی اسی سال ختم کر کے عربی فارسی کتابیں شروع کیں۔ دس برس کا تھا تو شرح ملا پڑھتا تھا، اسی دوران مجھ پر مطالعہ کی راہ کھلی، چودہ برس کی عمر میں میری شادی ہوگئی۔ والد بزرگوار کو میری شادی کے بارے میں بڑی جلدی تھی۔ جب میرے سسرال والوں نے سامان شادی وغیرہ کے مہیا نہ ہونے کا عذر کیا تو والد بزرگوار نے انہیں لکھ بھیجا کہ اس عجلت میں بھی ایک راز ہے اور یہ راز مجھ پر اس وقت کھلا جب میری شادی کے بعد میری ساس، میری اہلیہ کے نانا، شیخ ابوالرضا محمد قدس سرہ کے خلف الرشید شیخ فخر العالم، میرے بڑے بھائی شیخ صلاح الدین کی والدہ اور والد بزرگوار جو ضعیف ہونے کے سبب طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہو گئے تھے یکے بعد دیگرے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ الغرض اس طرح خاندان کے بہت سارے بزرگ اس دار فانی سے کوچ کر گئے اور ہر خاص و عام کو معلوم ہو گیا کہ اگر اس وقت میری شادی نہ ہو جاتی تو پھر برسوں اس کا امکان نہ تھا۔ پندرہ برس کی عمر میں والد بزرگوار سے بیعت کر کے اشغال صوفیا خصوصا مشائخ نقشبند کے اشغال میں مصروف ہو گیا اور ان کی توجہ و تلقین سے بہرہ ور ہوتے ہوئے ان سے آداب طریقت کی تعلیم اور خرقۂ صوفیا حاصل کر کے اپنے روحانی سلسلے کو درست کرلیا، اسی سال بیضاوی شریف کا کچھ حصہ پڑھا تو اس موقع پر والد بزرگوار نے ایک عام دعوت کا اہتمام کیا اور درس کی اجازت عطا فرمائی۔ خلاصہ یہ کہ اس علاقے کے تمام علوم متداولہ سے پندرہ برس کی عمر میں حاصل کر لی۔ میں نے تمام علوم کی کتابیں ذیل کی ترتیب کے مطابق پڑھیں۔ علم حدیث میں کتاب البیع سے کتاب الاداب تک کا حصہ چھوڑ کر باقی مکمل مشکوۃ، صحیح بخاری کتاب الطہارۃ تک، شمائل النبی صلی اللہ علیہ وسلم مکمل (والد بزرگوار سے ان کتابوں کی قرأت بعض ہم درس ساتھیوں نے کی) تفسیر بیضاوی و مدارک کے کچھ حصے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کے عظیم احسانات میں سے مجھ پر ایک احسان یہ ہے کہ چند مرتبہ والد بزرگوار سے مدرسے میں قرآن عظیم کے معانی، شان نزول اور کتب تفاسیر کی طرف رجوع کرتے ہوئے کلام قدسی میں تدبر حاصل کرنے کا موقع ملا جو میرے لیے ایک عظیم فتح تھی اور اس پر خدائے قدوس کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ فقہ میں شرح وقایہ اور ہدایہ کا

اکثر حصہ، اصول فقہ میں حسامی اور توضیح تلویح کا کچھ حصہ منطق میں شرح شمسیہ مکمل اور شرح مطالع کا کچھ حصہ۔ کلام میں شرح عقائد مکمل اور خیالی وشرح مواقف کے کچھ حصے، سلوک میں عوارف المعارف کا کچھ حصہ اور رسائل نقشبندیہ وغیرہ۔ حقائق میں شرح رباعیات مولانا جامی، لوائح، مقدمہ شرح لمعات اور نقد النصوص، خواص اسماء وآیات میں والد بزرگوار کا خاص مجموعہ جس کی انھوں نے چند بار اجازت دی، طب میں موجز القانون، حکمت میں شرح ہدایۃ الحکمت وغیرہ، نحو میں کافیہ اور اس پر شرح ملا، معانی میں مطول کا اکثر حصہ اور مختصر معانی کا وہ حصہ جس پر ملازادہ کا حاشیہ ہے اور ہندسہ وحساب میں بعض مختصر رسائل۔

اس حصول علم کے دوران ہر فن کے کئی قیمتی نکات میرے ذہن میں پیدا ہوتے تھے جو مزید غور وفکر سے کئی اور راہیں سمجھا دیتے، میں اپنی عمر کے سترہویں برس میں تھا کہ والد بزرگوار بیمار پڑ گئے اور اسی علالت میں رحمت خداوندی کی آغوش میں چلے گئے۔ آپ نے مرض الموت کے دوران مجھے بیعت وارشاد کی اجازت عطا فرمائی۔ اور یہ جملہ کہ یدہ کیدی اس (شاہ ولی اللہ) کا ہاتھ میرا ہاتھ ہے) دوبارہ ارشاد فرمایا میرے نزدیک سب سے بڑی نعمت یہ ہے کہ والد بزرگوار ساری زندگی مجھ سے راضی رہے اور اسی عالم میں اس دنیا سے رخصت ہوئے، مجھ پر ان کی اس قدر توجہ تھی کہ کسی باپ کو اپنے بیٹے پر نہیں ہوسکتی۔ میں نے کسی ایسے والد، استاذ یا مرشد کو نہیں دیکھا کہ جو اپنے فرزند، شاگرد اور مرید کے ساتھ ایسی شفقت سے پیش آتا ہو جس شفقت کے ساتھ والد بزرگوار مجھ سے پیش آتے تھے (اے اللہ مجھے اور میرے والدین کو بخش دے، اور ان پر رحم فرما جیسے کہ انھوں نے مجھے بچپن میں پالا اور ان کی ہر شفقت، رحمت کا انھیں ہزار در ہزار گنا اجر عطا فرما بے شک تو قریب اور دعاؤں کا قبول کرنے والا ہے) والد بزرگوار کی وفات کے بعد کم وبیش بارہ برس تک میں دینی اور عقلی کتابوں کی تدریس میں مشغول رہا اور ہر علم میں خاصا درک حاصل ہوا۔ جب میں والد گرامی کے مزار مبارک پر مراقبہ کرتا تو مسائل توحید حل ہو جاتے۔ جذب کا راستہ کھل جاتا سلوک میں سے وافر حصہ میسر آتا اور وجدانی علوم کا ذہن میں ہجوم لگ جاتا، مذاہب اربعہ اور ان کے اصول فقہ کی کتابوں اور ان احادیث جن سے وہ استدلال کرتے ہیں، کے مطالعے کے بعد مجھے نور بصیرت سے معلوم ہوا کہ فقہائے محدثین کی روش ہی اختیار کی جائے۔ اس

بارہ سال کے عرصے کے بعد میرے سر میں حرمین شریفین کی زیارت کا سودا سمایا، ۱۱۴۳ھ کے اواخر میں حج کی سعادت سے مشرف ہوا اور ۱۱۴۴ھ میں مجاورت مکہ مکرمہ، زیارت مدینہ منورہ شیخ ابوطاہر قدس سرہ اور دوسرے مشائخ حرمین سے روایت حدیث کا شرف حاصل کیا۔ اسی دوران حضرت سید البشر علیہ افضل الصلوٰۃ واتم التحیات کے روضۂ اقدس کو مرکز توجہ بنا کر فیوض حاصل کیے، علمائے حرمین اور دیگر لوگوں کے ساتھ دلچسپ صحبتیں رہیں اور شیخ ابوطاہرؒ سے خرقہ جامعہ حاصل کیا جو بلاشبہ تمام سلاسل کے خرقوں کا جامع ہے، اسی سال کے آخر میں فریضہ حج ادا کیا، ۱۱۴۵ھ میں عازم وطن ہوا اور اسی سال بروز جمعہ ۱۴ رجب المرجب صحیح وسالم وطن پہنچ گیا۔ واما بنعمة ربك فحدث (اور اپنے رب کا شکر ادا کرو) اور خاکسار پر اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا انعام یہ ہے کہ اس نے مجھے ''خلعت فاتحیہ'' سے نوازا اور اس آخری دور کا آغاز میرے ہی ہاتھوں کرایا۔ اور مجھے اس طرف رہنمائی کی گئی کہ فقہ میں سے پسندیدہ مسالک کو یکجا کر کے فقہ حدیث کی نئے سرے سے بنیاد رکھوں، اسی طرح اسرار حدیث، مصالح احکام، ترغیبات اور جو کچھ حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرف سے لائے ہیں اور جن کی آپ نے تعلیم دی ہے۔ ان تمام کے اسرار ورموز کا بیان ایک مستقل فن ہے جس کے بارے میں اس فقیر سے زیادہ وقیع بات کسی اور سے نہیں بن آئی ہے اگر کسی کو اس فن کی عظمت و بلندی کے باوجود میرے بیان میں شبہ گزرے تو اسے شیخ عزالدین بن عبدالسلام کی کتاب ''قواعد کبریٰ'' دیکھنی چاہئے جس میں انھوں نے کس قدر زور مارا ہے مگر پھر بھی وہ اس فن کے عشر عشیر تک نہیں پہنچ پائے اور طریقہ سلوک جو کہ خدائے بزرگ و برتر کے نزدیک بہت پسندیدہ ہے اور جسے اس دور میں رائج ہونا ہے۔ اور مجھے الہام کیا گیا، جسے میں نے اپنے دو رسالوں ''لمعات'' اور ''الطاف قدس'' میں قلم بند کر دیا ہے میں نے قدیم علمائے اہل سنت کے عقائد کو دلائل و براہین کی روشنی میں جس طرح ثابت کیا اور جس طرح انہیں معقولیوں کے شکوک وشبہات سے پاک کیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ اب ان پر مزید بحث کی گنجائش ہی نہیں رہی اور مجھے کمالات اربعہ یعنی ''ابداع:: خلق تدبیر اور تدلی جو اس دنیا کے طول وعرض میں موجود ہیں اور نفوس انسانیہ کی استعداد اور ان کے کمال اور انجام کو جاننے کا علم عطا کیا گیا ہے۔ یہ دونوں علوم اس قدر اہم ہیں کہ اس فقیر سے پہلے کوئی ان کی گرد تک نہیں پہنچا اور حکمت عملی

جس کے ذریعے اس دور کی اصلاح کی جاسکتی ہے مجھے پوری طرح ودیعت کی گئی ہے اس کے ساتھ مجھے کتاب وسنت اور آثار صحابہ کے ذریعے اس حکمت عملی کو مستحکم کرنے کی توفیق بھی بخشی گئی ہے۔ اور جو کچھ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام سے منقول ہے یا دین میں جو کچھ اضافے کئے گئے ہیں یا تحریف کی گئی ہے اور جو کچھ سنت ہے یا ہر فرقے نے جو نئی چیزیں دین میں رائج کی ہیں ان تمام کی مجھے پرکھ عطا فرمائی گئی ہے۔ اگر میرا ہر بن مو زبان بن جائے تو بھی میں کما حقہ اس کا شکر نہیں بجالا سکتا اور تمام تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں جو عالمین کا پروردگار ہے۔

مقدمہ در قوانین ترجمہ

تصنیف

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ

ترجمہ

مولانا مشتاق احمد تجاوری

ترتیب

مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی

الحمد لله واهب العطيات، ملهم الحكم والمخبّات، والصلوٰة والسلام الاتمان علی سید البشر، معلم اهل المدر والوبر ،مبین الکتاب بفصل الخطاب وعلیٰ آله واصحابه اجمعین.

اللہ کریم کی رحمت کا محتاج ولی اللہ بن عبدالرحیمؒ کہتا ہے کہ یہ رسالہ ترجمہ نگاری کے اصول وضوابط سے متعلق ہے،اس کا نام ہے المقدمہ درقوانین ترجمہ یہ رسالہ ترجمہ قرآن کی تسوید کے دوران ضبط تحریر میں لایا گیا۔

فصل

مترجمین نے ترجمہ نگاری کے مختلف اسالیب اختیار کیے ہیں:

(۱) بعض لوگ ایک لفظ کے نیچے اس کا ترجمہ پھر دوسرے لفظ کے نیچے دوسرے لفظ کا ترجمہ لکھتے ہیں اور پورے مضمون کا ترجمہ اسی طرح کرتے ہیں۔

اس کو تحت اللفظ ترجمہ کہتے ہیں۔

(۲) بعض لوگوں نے یہ اسلوب اختیار کیا کہ پہلے پورے جملے پر غور وفکر کرتے ہیں اور تقدیم وتاخیر اور مجاز وکنایہ کی رعایت کرتے ہوئے پورے جملے کا مفہوم فارسی میں یا جس زبان میں بھی ترجمہ کر رہے ہوں، بیان کر دیتے ہیں۔

اس کو بیان حاصل المعنیٰ کہتے ہیں۔

ترجمہ کا پہلا طریقہ درست نہیں ہے اس لیے کہ اس طرح بالعموم ترجمہ کا نظم بگڑ جاتا ہے اور جس زبان میں ترجمہ کیا جا رہا ہے اس کے اعتبار سے ترکیب غلط ہو سکتی ہے یا کم از کم اس صورت میں رکاکت الفاظ اور تعقید یا غیر معروف الفاظ کا استعمال لازم آتا ہے اور اس کی وجہ زبانوں کا اختلاف ہے۔

مختلف زبانوں میں مختلف اجزاء کلام کی تقدیم وتاخیر کا اسلوب، الفاظ کی ترکیب، کنایات اور صلات کا استعمال ایک دوسرے سے جدا اور مختلف ہوتا ہے جس کی نظیر دوسری زبان میں نہیں ملتی

جیسے سبحان اللہ اور سقیالک، اسی طرح بعض زبانوں میں لازم سے ملزوم کی طرف منتقل ہونا اور ایک لفظ کی جگہ دوسرے کا استعارہ استعمال کرنا صحیح ہوتا ہے جبکہ دوسری زبان میں وہ صحیح نہیں ہوتا، عربی میں کہتے ہیں ''فلان عظیم الرماد ''اس سے سخاوت مراد لی جاتی ہے اس کا فارسی ترجمہ ہوگا فلاں بزرگ خاکستر است (فلاں بہت بڑا مٹی والا ہے) اس سے فارسی والے وہ معنی اخذ نہیں کر سکتے جو اس کا اصلی مفہوم ہے۔

بسا اوقات عربی زبان میں ایسی خصوصیت ہوتی ہے جس کی نظیر فارسی میں (یا کسی اور زبان میں) ہوتی ہی نہیں، جیسے یہ الفاظ رغاء الابل (اونٹ کا بلبلانا) خوار البقر (گائے کا رنبھانا) صهال الفرس (گھوڑے کا ہنہنانا) نواج الكبش (مینڈھے کی آواز) ویعار المعز (بکری کا ممیانا) نباح الكلب (کتے کا بھونکنا) هدير الحمام (کبوتر کا غٹرغوں کرنا)۔ اسی طرح جرد الكلب (کتے کا پلا) شبل الاسد (شیر کا بچہ) فصيل الابل (اونٹ کا بوتا) حدى البقر (گائے کا بچھڑا) غناق الشاة (بکری کا بچہ) ان الفاظ کا فارسی متبادل بغیر تکلیف کے نہیں مل سکتا، اسی طرح افعال کے صلات میں بھی بڑا اختلاف ہوتا ہے تحت اللفظ ترجمہ میں یہ اور اسی جیسی بہت سی مشکلات ہیں جو باشعور اور اصحاب دانش لوگوں سے مخفی نہیں ہیں۔

ترجمہ کرنے کا دوسرا طریقہ (بیان حاصل المعنی) بھی دشواریوں سے خالی نہیں ہے چونکہ بسا اوقات کلام میں دو یا زیادہ پہلوؤں کی گنجائش ہوتی ہے لیکن مترجم صرف ایک ایسے پہلو کو سمجھ پاتا ہے جو متکلم کی مراد نہیں ہوتی، سابقہ کتب سماویہ میں تحریف کا ایک سبب میں یہ بھی رہا ہے، اس لئے کلام الٰہی کے ترجمہ میں اس کے نظم و ترتیب کا باقی رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے تاکہ اگر مترجم سے کہیں کوئی غلطی سرزد ہوگئی ہو تو بعد کے کوئی صاحب اس کی اصلاح کر سکیں، کیوں کہ بسا اوقات وہ شخص جس تک بات پہنچائی گئی ہے وہ براہ راست سننے والے سے زیادہ اس کو سمجھنے والا ہوتا ہے (فرب بلغ اوعىٰ من سامع)

فصل

مشکل مقامات کی تفسیر اور متشابہات کی تاویل وغیرہ میں بھی علماء کی مختلف آراء ہیں ایسی

بہت سی آراء اگر غور سے دیکھا جائے تو شریعت کا حصہ نہیں ہوتی بلکہ عقلی استدلال کے زور پر شریعت میں موشگافیاں ہوتی ہیں، اگر ہر شخص اپنی فہم کے مطابق نصوص کی اسی طرح تأویل کرتا رہے تو متن کلام کا نظم باقی نہیں رہے گا اور اصل شریعت گم ہو جائے گی۔

قرآن پاک عربی زبان میں نازل ہوا اور رسول اللہ ﷺ کی زبان بھی عربی تھی اس لئے عربی زبان سے واقفیت کے بغیر امت مرحوم کا معاملہ درست نہیں ہوسکتا، اور اسی لئے عربی زبان سے واقفیت ملت پر واجب کفایہ ہے اور ہر فرد کا عربی سے واقف ہونا مسنون و مستحب ہے، جو شخص عربی زبان سے واقف نہیں ہے دین محمدی کی معرفت کے اعتبار سے اس کا شمار زندہ انسانوں میں نہیں کیا جاسکتا بلکہ وہ انسان ہی نہیں وہ تو جمادات کے قبیل سے ہے یا مردوں میں شامل، اس نے اپنے اوپر ایسا عجز طاری کر رکھا ہے جس کی وجہ سے وہ شریعت کی رحمت سے محروم ہے اور ایسی پسماندگی اوڑھ رکھی ہے جس کی وجہ سے شریعت نے اس کو سربلندی نہیں بخشی، اس لئے علماء نے تلاوت قرآن، ذکر الٰہی، اور خطبۂ جمعہ وعیدین) کا فارسی زبان میں ترجمہ کرنا جائز نہیں تھا، حالانکہ ان چیزوں (یعنی تلاوت اور خطبۂ جمعہ وعیدین) کا مقصد وعظ و نصیحت ہے، الفاظ کی تکرار نہیں (اس کے باوجود ان کا عربی کے علاوہ کسی اور زبان میں کہنا جائز نہیں)۔

قرآن پاک کے ترجمہ کا اصل مقصد یہ ہے کہ قاری کو نظم قرآن میں درک حاصل ہو اور قرآن کی عبارتوں میں غور وخوض کا ملکہ حاصل ہو جائے، یہ مقصد بیان حاصل المعنی میں مفقود ہے، بعض لوگوں نے یہ کیا کہ جب دونوں قسموں میں اغلاط دیکھیں تو ترجمۂ تحت اللفظ اور حاصل المعنی دونوں کو جمع کر دیا، تاکہ اگر تحت اللفظ میں رکاکت یا تعقید ہو تو دوسری عبارت کے ذریعے اس کو دور کیا جاسکے اور اگر حاصل المعنی میں کسی ایک پہلو کو اختیار کرنے یا کسی متشابہ کی تاویل کرنے کی وجہ سے خلل واقع ہو رہا ہو تو تحت اللفظ کے ذریعہ اس کی اصلاح کی جاسکے۔

لیکن یہ تیسرا طریقہ بھی اصحاب ذوق سلیم پر گراں ہے، اس طریقے میں مبتدی کو تو تشویش ہوتی ہے اور منتہی حضرات کے لئے یہ طریقہ بے کار ہے چونکہ اس کی وجہ سے بلا ضرورت طوالت آتی ہے اور اس سے کلام کا فطری اسلوب بھی باقی نہیں رہ پاتا، اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس عجز وجہل کی اصل وجہ دونوں زبانوں کے اسلوب کلام سے ناواقفیت ہے۔

فصل

اس فقیر نے جب ان تینوں طریقوں کا مطالعہ کیا اور ان کے نقائص اس پر واضح ہوئے تو اس نے ارادہ کیا کہ ایک چوتھا طریقہ وضع کیا جائے جس میں ان تینوں طریقوں کی خوبیاں تو ہوں لیکن وہ ان کی خرابیوں سے پاک ہو، میں نے ایک طرف تو ترجمہ تحت اللفظ کو اختیار کیا اور اس کے اندر جو خرابیاں ہوسکتی تھیں ان کی اصلاح کی کوشش کی دوسری طرف بیان حاصل المعنی کو بھی پیش نظر رکھا اور مشکل مقامات کو حل کرنے کے کچھ طریقے وضع کیے اس کے بعد پہلے قرآن پاک کے نظم کی ترتیب کے مطابق لفظی ترجمہ کیا، فعل کے صلات میں جو اختلاف ہے اس کو دور کیا جس جگہ اس فارسی ترجمہ میں تعقید یا رکاکت پیدا ہو رہی تھی، یا عربی میں کوئی ایسی ترکیب تھی جو فارسی میں نہیں ہوتی ایسی جگہ عربی زبان کا مترادف لفظ وہاں لکھ دیا اور اس کا ترجمہ کر دیا، مثلاً جب اسم فاعل مستقبل کے لئے آتا ہے تو اس کا مساوی فعل مستقبل معروف ہوتا ہے اور جب اسم مفعول مستقبل کیلئے لایا جاتا ہے تو اس کا مساوی فعل مستقبل مجہول ہوتا ہے جیسے قل یا أیھا الکافرون، قل للذین کفروا، اور قل لمن کفر، یہ تینوں ایک ہی مفہوم کے حامل ہیں، اسی طرح یا ایھا الذین آمنوا، یا ایھا المؤمنون، یا ھولاء المؤمنین، بھی ایک ہی مفہوم کے حامل ہیں، اسی طرح فما لھم من ناصرین اور فمالھم من ناصر دونوں کا ایک ہی مفہوم ہے اس لیے کہ یہاں ناصرین سے مراد عموم جمع نہیں ہے بلکہ عموم افراد مراد ہے۔

اس لئے قرآن پاک کو سات طریقوں سے پڑھنا جائز ہے اور صحابہ کرام بعض الفاظ کی تفسیر اس کے مترادف الفاظ سے کر دیتے تھے۔

میں نے اس ترجمہ میں اس بات کو بھی ملحوظ رکھا ہے کہ جس لفظ کو پہلے آنا چاہئے اس کو پہلے بیان کیا جائے اور جس کو بعد میں آنا چاہئے اس کو بعد میں بیان کیا جائے، محذوف کو ظاہر کیا جائے، مقحم کو ترک کیا جائے اور نحوی تراکیب وغیرہ کا بھی التزام کیا جائے، اور اگر مفہوم پوری واضح نہیں ہوا تو کوشش کی ہے، تقدیم و تاخیر میں ادنیٰ تصرف کر کے یا کوئی حرف بڑھا کر یا محذوف کو ظاہر کر کے یا معطوف پر عامل کا اعادہ کر کے یا مضمر کے اظہار یا اظہار کے مضمر کے ذریعہ اس کو حل کیا

جائے، اگر سیاق کلام میں ایسے تصرف کی گنجائش نہ ہوتو پھر لفظی ترجمہ کے بعد حاصل معنیٰ کو لفظ یعنی یا مراد آنست کے ذریعہ واضح کیا ہے اور اگر کسی قید کا ذکر کلام کا اجمال یا کنایہ کا حل یا تعریض کے کشف یا مبہم کا اظہار ضروری ہوا تو اس کو بھی لفظ یعنی یا مراد آنست کے ذریعہ واضح کیا ہے سعادت مند قاری کو چاہیے کہ جو عبارت یعنی کے تحت آ رہی ہے، اس کے بعد سلسلۂ کلام کو پھر سابق عبارت سے جوڑ لے تا کہ کلام مربوط رہے۔

بالجملہ دوز بانوں میں اختلاف کے مواقع بہت ہیں، انہیں میں سے

(۱) ایک یہ ہے کہ عربی میں یہ رواج ہے کہ پہلے بات کو ایک طرح کے اجمال یا اختصار سے بیان کرتے ہیں پھر اس کی وضاحت کرتے ہیں عربی زبان میں اجمال کے بعد یہ تفصیل دراصل شروع میں ہی تفصیل بیان کر دینے کے مقابلے میں زیادہ لذت رکھتی ہے۔

جیسے کہتے ہیں ضربت زیدًا راسه میں نے زید کے سر میں مارا، حسن زیددارا زید کا گھر اچھا ہے، ان احد استجارک اگر کوئی تجھ سے پناہ چاہے، زیدًا ضربته، میں نے زید کو مارا، ضربت زیدا راسه یا سلبت زیدًا ثوبه جیسے جملوں میں اول ایک حکم زید پر لگایا جاتا ہے جب کہ حقیقت یہ ہوتی ہے کہ وہ حکم زید کے متعلق کے بارے میں ہوتا ہے اس لئے پھر اس متعلق کو بیان کر کے اس تسامح کا تدارک کیا جاتا ہے۔

جیسے حسن زیددارًا میں حسن کا اثبات زید کے لئے کیا گیا جبکہ یہاں مراد یہ ہے کہ زید کا گھر اچھا ہے عربی جملہ میں اس متعلق یعنی گھر کی طرف بعد میں رجوع کیا جاتا ہے۔ اور اس کو بطور تمیز بیان کر کے اس کی وضاحت کی جاتی ہے، اسی لئے کہا گیا ہے کہ تمیز فاعل یا مفعول کی طرف سے نسبت سے تبدیل ہوگئی اور ان احد میں استجارک کو مضمر مانتے ہیں، اور زیدًا میں ضربت کو مضمر مانتے ہیں، بعد ازاں اضمار کی وجہ سے جو خلل واقع ہوا تھا اس کو دور کرنے کے لئے اس کو مقدم مان لیتے ہیں۔

عجمی زبانوں میں اس طرح کی ترکیب مستعمل نہیں ہے۔

(۲) اسی طرح یہ بھی ہے کہ عرب جب کوئی جملہ استعمال کرتے ہیں تو اس کو فطری طریقہ سے تبدیل کر دیتے ہیں، وعداللّٰه، وسبحه اللّٰه، سقاک اللّٰه میں انہوں نے یہ تبدیلی کی کہ

فعل کی جگہ مصدر کو قائم مقام بنایا پھر اسی کو فعل کے معمول چاہے وہ فاعل ہو یا مفعول، یا حرف جر کے واسطہ سے ہو یا یا بلا واسطہ مضاف کر دیتے ہیں جیسے وعداللہ حقا، سبحان اللہ اور سقیا لک ، عجم کی زبان میں اسی طرح کی روایت نہیں ہے۔

(۳)اسی طرح کا ایک تصرف یہ ہے کہ نکرہ کو بطور معرفہ استعمال کرتے ہیں جو لفظ کسی کی طرف مضاف ہو اس کو اضافت کر کے بولتے ہیں اس کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ الفاظ میں تخفیف ہو جائے، ورنہ معنی وہی مراد ہوتے ہیں۔

(۴)اسی طرح کا ایک تصرف یہ ہے کہ ایک مضمون کو سہولت ادا کے ساتھ دو مرتبہ بیان کرتے اس لئے وہ اس مکرر لفظ کو اول کے ساتھ ملا کر کے اس طرح بولتے ہیں، ھو اعلمھم علماً و احلمھم حلماً ،وزید ابوک عطوفا ،تبسم ضاحکا، قام قائما ،الزاریات ذرواً والصافات صفا، وغیرہ عجمی زبان میں یہ طریقہ بھی مستعمل نہیں ہے۔

(۵)اسی طرح کا ایک انداز یہ ہے کہ اہل عرب ایک مکمل جملہ کا ارادہ کرتے ہیں پھر اس میں تبدیلی کر کے فعل یا حرف کو اس پر مقدم کر دیتے ہیں جیسے ما کان زید لیفعل ھذا وانما ضرب زید، وظننت زیدًا قائماً اس کے برخلاف فارسی زبان میں اس عامل کو جملہ پر مقدم نہیں کرتے بلکہ علیحدہ بیان کرتے ہیں جیسے دانستم کہ زید قائم است، یہ نہیں کہتے کہ دانستم زید را استقامت، یا جز ایں نبود کہ زید زد یا ہرگز نیست کہ زید چنیں کند۔

(۶)اسی طرح تعبیر کا ایک انداز یہ ہے کہ عربی میں کہتے ہیں قام زید اور فارسی میں کہتے ہیں زید استاد اگر فارسی میں یوں کہیں کہ استاد زید تو غیر فصیح ہوگا۔

(۷)اسی طرح فارسی میں حکایت حال ماضی کے لئے ماضی پر می بڑھا دیتے ہیں جیسے می کرد، می زد، جبکہ عربی میں کان استعمال کئے بغیر یہ مفہوم حاصل نہیں ہوگا جیسے کان یفعل۔

(۸)ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ عربی میں فعل مضارع جعل اور کاد وغیرہ کی خبر واقع ہو سکتا ہے ،جبکہ فارسی میں ایسا نہیں ہوتا۔

(۹)اسی طرح عربی میں جملہ اسم کی خبر واقع ہو سکتا ہے، کہتے ہیں زید قام ابوہ اور یہ صورت فارسی میں تکلف کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔

الغرض دوزبانوں میں اختلاف کے مواقع بہت ہیں اور مترجم (مفہوم واضح کرنے کے لئے) مجبور ہوجاتا کہ ایک لفظ کی جگہ دوسرا لفظ استعمال کرے مقولہ مشہور ہے الضرورات تبیح المحزورات جوکچھ ہم نے کہا ہے بالکل واضح ہے لیکن یہاں مزید تفصیل کی ضرورت ہے اور تھوڑی سی توجہ اس کی طرف مبذول کرنے سے اس کے درست معنی معلوم ہوسکتے ہیں۔

فصل

لفظ است رابط کی علامت ہے جو جملہ اسمیہ وظرفیہ کے دونوں حصوں میں ربط کو ظاہر کرتا ہے ،جیسے زید قائم است ،زید کجاست ،اسی طرح جملہ فعلیہ میں فعل کی فاعل ساتھ نسبت کو ظاہر کرتا ہے، زید استاد اور بوقت ضرورت استاد زید بھی کہا جاسکتا ہے اور مفعول بہ چاہے نائب فاعل ہو یا نہ ہو کسی حرف کے ساتھ ملا ہوا ہوگا، جیسے زدم زیدرا ،وزدہ شد زیدرا ،اس جملہ کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے زید زدہ شد،اور اگر قرینہ موجود ہوتو اس کا حذف کرنا بھی جائز ہے،اور مفعول مطلق اگر عدد کے لئے ہوتو یکبار کردن ودوبار کردن کہا جاسکتا ہے اور اگر برائے نوع ہوتو یک نوع کردن ویک طور کردن اور اگر غیر مصدر مصدر کی جگہ لایا گیا ہو جیسے کہیں،ضربت سوطا توترجمہ ہوگا زدم یک چابک، اوراگر مفعول فعل کے لفظ سے جدا ہو جیسے قرأت سردًا توترجمہ ہوگا خواندم بطریق پی درپی ،اوراگر محض تاکید کیلئے مفعول کا ذکر ہو یا اس طرح ہو جیسے سبحان اللہ اور وعد اللہ میں تو یہ دونوں زبانوں کے اختلافات کے قبیل سے ہوگا اور بغیر تکلف اور دوسرے حرف کے ملائے صحیح ترجمہ نہیں ہوسکے گا۔

(الف) اگر مفعول لہ غرض کے معنی میں ہوتو اس کا ترجمہ برائے یاتا ہوگا،اور جملہ ضربتہ تادیبا مصدر کا ترجمہ اس طرح ہوگا (زدمش برائے ادب دادن ،یازدمش تاادب دہم)اور اگر مفعول لہ بمعنی حاصل ہوتو اس کا ترجمہ بعلت یا بحکم یا بمقتضا سے کرتے قعدجبنا کا ترجمہ ہوگا (نشست بعلت نامردی)اور اگر احتراز کے معنی میں ہو اس کا ترجمہ برائے احتراز یا برائے احتیاط یا اسی جیسے الفاظ سے کیا جایگا جیسے ضربتہ ان یقول الناس ماضربتہ کا ترجمہ یوں کریں گے زدمش برائے اجتناب ازآنکہ گویند نزدمش۔

مفعول فیہ کا ترجمہ درمکان یا درزمان کیا جائیگا، اور مفعول معہ کا ترجمہ لفظ با سے کیا جائے گا۔ جیسے استو الماء والخشبہ کا ترجمہ ہوگا، برابر شد آب با چوب، اور اگر حال مفرد کلمہ ہوتو اس کا ترجمہ کرنے لئے ایسے لفظ کا استعمال کرنا ہوگا جو حال کے معنی کے لئے وضع کیا گیا ہو جیسے جئت راکبا کا ترجمہ ہوگا سوار آمدم۔

(ب) اگر جملہ معطوفہ ذوالحال ہو یا لفظ کردہ و کناں یا ان جیسے الفاظ کے ساتھ ہو جیسے جاء زید یتبختر فی مشیہ کا ترجمہ ہوگا زید آمد تبختر کناں در رفتار خود، اور اگر جملہ معطوفہ ذوالحال کے فعل کے علاوہ کسی اور چیز پر مشتمل ہو تو لفظ حالانکہ کا اضافہ کرکے اس کا ترجمہ کیا جائے گا اگرچہ فارسی زبان میں یہ لفظ مستعمل نہیں ہے۔

حال عربی زبان میں مختلف معنوں میں استعمال ہوتا ہے کبھی تاکید کے معنی میں آتا ہے۔

(۱) جیسے جاء نی ابوک عطوفا۔

کبھی تھیاء کے معنی آتا ہے، جیسے:

(۲) فادخلوھا خالدین

کبھی قصد وارادہ کے معنی میں آتا ہے۔ جیسے:

(۳) جئت اشکو الیہ.

فارسی میں یہ معنی مستعمل نہیں ہیں۔

(ج) اگر تمیز سے مقصود، عدد یا وزن یا پیمانہ یا مساحت ہوتو فارسی ترجمہ میں یا تمیز کا صیغہ استعمال کریں گے یا اس کو اضافت کے ذریعہ ظاہر کریں گے یا لفظ از کے ذریعہ اس کا اظہار کریں گے جیسے بست مرد، یک رطل گندم یک صاع از جو۔

اگر تمیز اسم اشارہ ہوتو لفظ صفت کے ساتھ اس کا ترجمہ کیا جائے گا جیسے ماذا اراد اللہ بھذا مثلاً کا ترجمہ ہوگا چہ چیز ارادہ کردہ است خدا با این مثل، اور اگر نسبت سے تمیز مطلوب ہوتو فاعل یا مفعول کو تحویل کرکے یا از جہت یا باعتبار کا اضافہ کرکے ترجمہ کیا جائیگا جیسے زید حسن داراً نیک است از روئے خانہ۔

کبھی کبھی فارسی میں تمیز کا ترجمہ اس طرح کرتے ہیں کہ دو کلموں کو ایک کلمہ بنا کر اس کا اصل

مفہوم واضح کرتے ہیں جیسے ضاق قلباً ، کا ترجمہ ہوگا تنگ دل شدہ، ھو قاسی قلباً کا ترجمہ ہوگا، وی سخت دل است۔

کبھی عربی میں مفعول بغیر حرف جر کے واسطے کے ہوتا ہے لیکن فارسی میں حرف جر کا واسطہ ضروری ہوتا ہے۔ جیسے فسیکفیکھم اللہ کا ترجمہ ہوگا، کفایت خواہد کردہ ترا خدا از شر ایشاں یا جیسے قالوا اتخذ اللہ ولدًا کا ترجمہ ہوگا فرزند گرفت خدا، یا جیسے اعطیت زیدًا درھما کا ترجمہ ہوگا، درہم دادم زید را، کان زیدٌ قائماً کا ترجمہ ہوگا، زید قائم بود، اور جعلت زیدا عبدی کا ترجمہ ہوگا، زید را بندہ خود ساختم۔

ان تمام صورتوں میں ترجمہ کے اسلوب کے لحاظ سے تقدیم وتاخیر اختیار کی گئی ہے۔

کبھی کبھی وہ جملہ جس کو تاویل کر کے مصدر بنالیا گیا ہو تو اس کا ترجمہ مصدر اور مفرد ہی استعمال کیا جائے گا مصدر مفرد کی تفسیر اس جملہ سے کی جاتی ہے جس کو ان مصدر یہ کے ذریعے مصدر بنایا گیا ہو۔

اسی موصول کی اپنے صلہ کے ساتھ مفرد کلمہ سے یا اس کے برعکس سے تفسیر کی جاتی ہے وقال الذی آمن کا ترجمہ ہوگا گفت آں مسلمان، والذین آمنوا کا ترجمہ ہوگا مسلمانان، الذین اوتوا الکتاب کا ترجمہ ہوگا اہل کتاب۔

یہ اس صورت میں ہے جب کہ معنی واضح ہوں جیسے قد افلح المؤمنون الذین ھم فی صلوتھم خاشعون کا ترجمہ ہوگا، ہرآئینہ رستگار شدند آں مسلماناں کہ ایشاں در نماز خویش خشوع کنند۔ یعنی اگر موصول کسی اسم کی صفت واقع ہو تو لفظ آں کو اس موصوف پر مقدم کیا جائے گا، اور جب معمول کو مقدم کر کے تخصیص کی علامت مقرر کی جائے تو فارسی میں بھی اس کی تقدیم کی جائے گی۔

کم ،ھم، ھو اور ایاہ بعض مقامات پر ان کا ترجمہ خود کا، فارسی میں کہا جائیگا شمار است گوئید، یا ایشا نندراست گوی، اس کی ضرورت نہیں کہ یہ کیا جائے ایشا نندراست گویاں۔

اگر مضمر کی جگہ ظاہر لفظ استعمال کیا جائے تو ربط باقی رکھنے کے لئے وہاں لفظ آں زیادہ کیا جائے گا۔

فارسی میں قاعدہ ہے کہ علامت جمع کو فعل کے ساتھ ملا دیتے ہیں چاہے فاعل ظاہر ہی کیوں نہ ہو جیسے قام هو لاء ایستادند ایشاں۔

واؤ اور فا بسا اوقات زائد ہوتے ہیں اور بسا اوقات عطف کے ترجمہ کے بغیر جملہ مربوط ہو جاتا ہے اور ترجمہ درست ہوتا ہے، اسی صورت میں اگر ترجمہ میں رکاکت پیدا ہو رہی ہو تو اس واو یا فا کا ترجمہ کرنے کی ضرورت نہیں۔

الغرض فن ترجمہ کی بارکیاں بہت ہیں یہاں مقصود صرف چند مثالوں کا تذکرہ ہے، اس فقیر نے ترجمہ (ترجمۂ قرآن مجید) میں بغیر کسی شخص یا کتاب کی معاونت کے غور و خوض کیا اور تمام دیگر علوم میں مشغولیت کے سبب یہ مختلف اوقات میں لکھا ہے، ممکن ہے کہ بعض مقامات پر ان چیزوں کا التزام نہ رہا ہو، اس لئے اپنے سعادت مند احباب جو ان قواعد کا استحضار رکھتے ہیں، ان سے امید ہے کہ اخوت دینی کی وجہ سے نصیحت کو ملحوظ رکھیں گے اور اس کی اصلاح کی کوشش کریں گے، ولیصلحه من جاد مقولاً وماتو فیقی الا بالله علیه کلت والیه انیب ،حسبنا الله ونعم الوکیل ،ولا حول ولا قوة الا بالله۔

دیباچہ فتح الرحمٰن

تصنیف

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ

ترجمہ

مولانا مشتاق احمد تجاوری

ترتیب

مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی

بے حد وحساب تعریفیں اس خدائے تبارک وتعالیٰ کے لئے ہیں جس نے اپنی رحمت کاملہ سے قرآن پاک کو اپنے بندوں کے لئے نازل فرمایا تاکہ اس کی مرضی کو معلوم کرسکیں اور اس کے ناپسندیدہ امور سے آگاہ ہوسکیں اور نفس کے مکروفریب سے، بداعمالی اور بدکرداری کے اندھیروں سے نجات پاسکیں اور حظیرۃ القدس کے لئے راہ یاب ہوسکیں تاکہ اپنے پروردگار کے نزدیک پسندیدہ قرار پائیں، اگر اللہ تعالیٰ خود مدد نہ فرماتے تو کسی کے لئے ہلاکت کے اس گڑھے سے نجات ممکن نہیں تھی اور اگر وہ خود راہ نہ دکھائے تو اس تہہ بہ تہہ تاریکی سے نجات کا تصور بھی نہیں ہوسکتا تھا، اس پروردگار کے احسانات ہمارے دل وجان کو محیط ہیں اور اس کا وجود ہمارے ظاہر وباطن کو اپنی گرفت میں لئے ہوئے ہیں۔

درود وسلامتی ہو آنحضرت ﷺ پر جنہوں نے ہم کو سعادت دارین سے باخبر کرایا اور دونوں جہاں کے فائدے سے مکمل طور پر آگاہ کرایا، چنانچہ آپؐ کے بیان سے زیادہ واضح کوئی بیان نہیں ہوسکتا اور آپؐ کی رحمت سے بالاتر کوئی رحمت نہیں ہوسکتی، ہم میں سب سے زیادہ خوش بخت وہ ہے جو آپؐ کی سنت کا اتباع کرے اور ہم میں سب سے زیادہ بدبخت وہ ہے جو اس راہ سے انحراف کا رویہ اختیار کرے، واشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ واشھد ان محمداً عبدہ ورسولہ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وسلم ۔امابعد.

ہر علاقے اور ہر زمانے میں مسلمانوں کی نصیحت وخیر خواہی الگ نوعیت کی ہوتی ہے اور اس کے تقاضے بھی مختلف ہوتے ہیں، اس لئے علماء دین اور اکابر اہل ایمان نے تفسیر، احادیث، عقائد، فقہ اور سلوک پر بہت سی متنوع کتابیں لکھیں اور گوناگوں تالیفات رقم کی ہیں، کسی نے تفصیل وشرح وبسط کے ساتھ کلام کیا ہے، کسی نے مختصر نویسی کی راہ اختیار کی ہے، کسی نے عجمی زبانوں میں خامہ فرسائی کی ہے، کسی نے عربی زبان میں، یہ زمانہ جس میں ہم ہیں اور یہ ملک جس میں ہم بود وباش رکھتے ہیں، اس میں مسلمانوں کی خیر خواہی تقاضا کرتی ہے کہ روزمرہ کی متداول اور سلیس فارسی زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ کیا جائے اور اس ترجمہ میں اپنی علمیت کے اظہار اور عبارت آرائی، متعلقہ قصوں اور غیر ضروری توجیہات سے اجتناب کیا جائے تاکہ عوام وخواص یکساں طور

پر اس کو سمجھ سکیں اور چھوٹے بڑے سب قرآن کے معنی سے واقف ہو سکیں، اس اہم کام کا داعیہ فقیر کے دل میں ڈالا گیا اور اس کے لئے مجبور کیا گیا، کچھ عرصہ تک تو دیگر تراجم کا جائزہ لیا تا کہ جو ترجمہ مناسب حال ہو اس کی ترویج و اشاعت کی کوشش کی جائے اور جس طرح ممکن ہو اسے اہل زمانہ کے لئے مرغوب و پسندیدہ بنا کر پیش کیا جائے۔

لیکن میں نے دیکھا کہ بعض ترجموں میں بے کیف تطویل تھی اور بعض ترجمے اتنے مختصر تھے کہ مطلب ہی خبط ہو گیا تھا، کوئی ترجمہ ہمارے میزان پر پورا نہیں اترا، آخر کار ایک نئے ترجمے کی تالیف کا عزم مصمم کیا اور زہراوین (سورہ بقرہ و آل عمران) تک کا ترجمہ لکھ لیا، اس کے بعد اس فقیر کو حرمین شریفین کا سفر درپیش ہوا اور یہ سلسلہ منقطع ہو گیا، اس کے کئی سال بعد ایک عزیز نے قرآن مع ترجمہ مجھ سے پڑھنا شروع کیا، اس کی وجہ سے ترجمہ قرآن کا عزم پھر تازہ ہو گیا اور یہ طے پایا کہ جتنا پڑھنا ہے اتنے حصے کا ترجمہ روزانہ لکھ لیا جائے، تہائی قرآن کا ترجمہ مکمل ہو جانے کے بعد اس عزیز کو ایک سفر درپیش ہو گیا، اس طرح یہ سلسلہ پھر موقوف ہو گیا۔

ایک مدت کے بعد پھر ایک سبیل پیدا ہوئی اور ترجمہ کا پرانا خیال دل میں پھر تازہ ہوا اور دو تہائی قرآن پاک کا ترجمہ مکمل کر لیا، چونکہ اکثر کل کے حکم میں ہوتا ہے اس لئے بعض دوستوں نے کہا کہ اس مسودہ کو بیضہ کر لیا جائے اور اس کو قرآن پاک کے ساتھ لکھا جائے تا کہ نسخہ مکمل ہو جائے، اس نیک بخت دوست نے عید الاضحیٰ کے دن ۱۱۵۰ھ میں اس کی تبیض شروع کی، جب مبیضہ مکمل ہو گیا تو طبیعت نے پھر زور مارا تو پورے قرآن کا ترجمہ کر ڈالا، اس کا مسودہ اوائل شعبان میں مکمل ہوا اور اس کا مبیضہ اوائل رمضان ۱۱۵۱ھ میں مکمل ہوا، اس کے بعد ۱۱۵۶ھ میں برادر عزیز القدر خواجہ محمد امین کے ذریعہ اس کتاب کو رواج دیا گیا، اس کی تعلیم شروع ہوئی، اس کے متعدد نسخے تیار کئے گئے اور اہل زمانہ نے اس کو قبول کیا:

للہ الحمد کہ آں نقش کہ خاطر می بست
آمد آخر زپس پردۂ تقدیر پدید

(اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ جو نقش دل میں تھا وہ تقدیر کے پردہ سے نکل کر ظہور پذیر ہوا)

اصل مقصد کو شروع کرنے سے قبل ایک تمہید ضروری ہے تا کہ اس کتاب کے سمجھنے میں مدد

ملے اور ترجمہ قرآن کے مسائل سے علی وجہ البصیرت آگاہی ہو سکے۔

مقدمہ میں چند مقاصد کا بیان ہے، کتاب کے شروع میں مقدمہ لکھنا قدیم مصنفین کی روایت رہی ہے، یہ کتاب قرآن عظیم کے ترجمہ کے سلسلے میں ہے، یعنی عربی زبان کے مطلب کو فارسی زبان کی عبارت میں لکھنا، اس میں نحو و قواعد، مقدم، مؤخر کی رعایت رکھی گئی ہے، محذوف کو ظاہر کیا گیا ہے اور ترجمہ کی ترتیب حتی المقدور قرآنی عبارت کی ترتیب کے مطابق رکھی گئی ہے، سوائے ان مقامات کے جہاں دونوں زبانوں کے اختلاف کی وجہ سے رکاکت یا تعقید پیدا ہو رہی ہو، جن اسباب نزول کا بیان ضروری تھا ان کا ذکر کیا گیا ہے اور بقدر ضرورت مشکل مقامات کی توجیہہ وجیز اور جلالین جیسی کتابوں سے کی گئی ہے۔ اور وجیز و جلالین کی ہم رنگی پر امام غزالیؒ کی شہادت موجود ہے، فرماتے ہیں کہ وجیز جیسی کتابوں کے پڑھنے والے علم کو تفسیر سے ابتدائی درجہ کی مناسبت حاصل ہو جاتی ہے۔

میں نے اس کتاب کا نام فتح الرحمٰن بترجمۃ القرآن رکھا، اس کے مصنف کا نام احمد بن عبد الرحیم اور لقب ولی اللہ، وطن دہلی، نسب فاروقی ہے، احسن اللہ الیہ والی مشائخہ و والدیہ.

قرآن پاک ناظرہ پڑھنے اور فارسی کے ابتدائی رسائل پڑھنے کے بعد جب فارسی زبان بے تکلف سمجھی جا سکے اس وقت اس کتاب کو پڑھنا چاہئے، خاص طور پر اہل حرفہ اور سپاہیوں کی اولاد جن کو زیادہ علوم حاصل کرنے کا موقع نہیں ملتا ان کو ابتداء سن تمیز میں اس کتاب کی تعلیم دے دینی چاہئے تا کہ پہلی چیز جو ان کے دلوں میں پڑے وہ کتاب اللہ کے معانی ہوں تا کہ اصل انسانی فطرت جس پر اس کو پیدا کیا گیا ہے وہ باقی رہے، ملحدوں اور بے دینوں کی فکری موشگافیاں جو تصوف کا لبادہ اوڑھ کر ایک عالم کو گمراہ کر چکی ہیں وہ اس کو اپنی طرف مائل نہ کر لیں، نیز کم سواد عقلیت پسندوں کی ٹامک ٹوئیاں اور ہندوؤں کے افکار اس کے دل و دماغ پر قبضہ نہ کر لیں۔ وہ لوگ جن کو عمر کی ایک مدت گزارنے کے بعد توبہ کی توفیق ہوتی ہے اور وہ علوم کی تحصیل کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، یہ کتاب ان کو بھی پڑھائی جائے تا کہ وہ بھی تلاوت قرآن پاک کی حلاوت سے مستفید ہوں، ویسے یہ کتاب جمہور مسلمانوں کے حق میں بھی انشاءاللہ مفید ثابت ہوگی۔

بچوں اور مبتدیوں کے لئے اس کی افادیت ظاہر ہے جس کا بیان اوپر آ چکا ہے اور عوام الناس کہ جن کا زیادہ تر وقت تلاش معاش میں گزرتا ہے، ان کو چاہئے کہ فرصت کے اوقات میں حلقہ بنا کر بیٹھیں اور جو شخص فارسی عبارت سے اچھی طرح واقف ہو، ساتھ ہی کچھ تفسیر سے بھی واقفیت رکھتا ہو، یا اس نے یہ ترجمہ کسی جاننے والے سے پڑھ لیا ہو وہ حسب فرصت ایک دو سورت ترتیل وتبین کے ساتھ پڑھے تاکہ سب لوگ سنیں اور اس کے معنی سمجھیں، اس طرح وہ صحابہ کرام کے مشابہ ہو جائیں گے، چونکہ صحابہ بھی اسی طرح حلقہ بنا کر بیٹھا کرتے تھے اور ان میں سے جو قاری ہوتا وہ قرأت کرتا، فرق صرف یہ ہوگا کہ صحابہ کرام خود عربی زبان کے شناور تھے اور یہ لوگ فارسی کے توسط سے اس کے معنی سمجھیں گے، جس طرح لوگ مثنوی مولانا جلال الدین اور گلستان شیخ سعدی، یا منطق الطیر شیخ فرید الدین عطار، یا فصص فارابی یا نفحات الانس جامی یا اس جیسی دیگر کتابوں کی مجلس لگاتے ہیں، اس طرح اس ترجمہ کو بھی اپنے درمیان رواج دیں اور تھوڑی سی توجہ اس کے اوپر غور وفکر میں بھی صرف کریں، چونکہ اگر وہ کلام اولیاء سے شغف ہے تو یہ کلام اللہ سے شغف ہے، وہ اگر حکیموں کے مواعظ ہیں تو یہ احکم الحاکمین کے مواعظ ہیں، وہ اگر باعزت لوگوں کے مکاتیب ہیں تو یہ رب العزت کا مکتوب ہے، ان دونوں کے مرتبوں کے درمیان زمین وآسمان کا فرق ہے۔

اگر بہ نظر انصاف دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ نزول قرآن کا فائدہ اس کے الفاظ سے نصیحت حاصل کرنا اور ہدایت پانا ہے، صرف اس کے الفاظ کی تلاوت مقصود نہیں اگرچہ اس کے الفاظ کا پڑھنا بھی کار ثواب ہے، پس جو مسلمان قرآن کے مدلول کو نہ سمجھے اسے کیا حاصل اور جو کلام اللہ کے معنی کو نہ جانے اسے کیا لذت حاصل ہوگی۔

جو لوگ عربی زبان پر دسترس رکھتے ہیں اور تفسیر کا سبق اساتذہ سے حاصل کر چکے ہیں ان کو اس ترجمہ کے پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے، لیکن خدا کی ذات سے امید ہے کہ اگر وہ بھی اس کو پڑھیں گے تو ان کے سامنے قرآن پاک کا تحت اللفظ ترجمہ مزید واضح ہوگا اور نحوی ترکیب اور مشکل الفاظ کی تشریح وغیرہ جیسی منتخب چیزوں سے واقفیت حاصل ہوگی اور بہت سے ایسے فائدے جو اس کے مطالعہ سے قبل نہ سنے ہوں گے اور نہ دیکھے ہوں گے، وہ بھی ان پر کھلیں گے۔

یہ ترجمہ جمہور خلق اللہ کی محبت میں تالیف کیا گیا ہے، اس میں وجوہ اعراب کا استقصاء، توجیہات کلام کا احاطہ اور قصص کے استیعاب کا اہتمام نہیں ہے، اگر علوم الیہ کے حصول کو ضروری قرار دیا جائے تو معلوم نہیں کہ وہ ہو پائے یا نہ ہو پائے اور ہو جائے تو ہو سکتا ہے کہ انہی علوم میں تعمق کا داعیہ پیدا ہو اور ساری زندگی اسی میں گزر جائے جیسا کہ اکثر علوم الیہ کے ماہرین میں دیکھا گیا ہے۔

اس سے بہتر کچھ نہیں ہے کہ علوم تفسیر ابتداء عمر میں حاصل کر لیا جائے، تاکہ اگر علوم الٰہیہ کے سیکھنے کا موقع مل جائے تو یہ بھی اس میں تو مؤید و معاون ثابت ہوں اور اگر اس کا موقع نہ ملے تو کم از کم مقصد ہاتھ سے نہ جانے پائے ورنہ یہ محض گھاٹے کا سودا ہوگا۔

صنمارہ قلندر سزدار بمن نمائی
کہ دراز و دور دیدم رہ ورسم پارسائی

(اے صنم اگر تو مجھے قلندری کی راہ دکھائے تو یہ زیادہ مناسب ہے چونکہ رہ ورسم پارسائی بہت طویل اور اس راستے سے منزل بہت دور ہے)

اس کتاب کا طریق تصنیف یہ ہے کہ ہر آیت کو جدا لکھا جائے اس کے بعد اس کا ترجمہ لکھا جائے اور ترجمہ میں اس زبان کا متداول اور روزمرہ کی گفتگو کا اسلوب اختیار کیا جائے، اگر ترجمہ تحت اللفظ کے علاوہ ایک دو جملے کا اضافہ ہو تو لفظ یعنی یا مثل کے ذریعہ ان کو ترجمہ سے ممتاز کر دیا جائے اور اگر مستقل کلام ہو تو اس سے قبل مترجم گوید لکھا جائے اور اس کے آخر میں واللہ اعلم لکھا جائے اور جہاں تک ممکن ہو قرآنی قصوں میں ایک دو لفظ پر اکتفا کیا جائے اور شان نزول کے طویل قصوں سے اجتناب کیا جائے۔ حتی الامکان آیات کے سیاق یعنی نظم کی رعایت کی گئی ہے اور جہاں تک ہو سکا، محدثین کی صحیح ترین تفاسیر، جیسے بخاری، ترمذی اور حاکم سے مدد لی گئی ہے اور حتی الامکان ضعیف اور موضوع روایات سے اجتناب کیا گیا ہے، وہ اسرائیلی روایات جو اہل کتاب سے منقول ہیں، حدیث خیر البشر علیہ وعلی الہ الصلوٰۃ والتسلیم نہیں ہیں، ان کو کتاب میں شامل نہیں کیا گیا ہے، سوائے ان مقامات کے جہاں اس کے بغیر معنی واضح نہ ہو رہے ہوں، چونکہ ضرورت کی وجہ سے ممنوع چیزیں بھی مباح ہو جاتی ہیں۔

یہ ترجمہ دیگر تراجم سے چند وجوہ کی بنا پر ممتاز ہے۔

(۱) ایک یہ کہ فارسی ترجمہ میں نظم قرآن کو پوری طرح ملحوظ رکھا گیا ہے اور اس کے ساتھ معنی کی وضاحت، تعبیر الفاظ کی لطافت کا پاس رکھا گیا ہے اور دیگر تراجم میں جو اطناب، عبارت کی رکاکت اور مفہوم کو خبط کر دینے کی بات ہے اس سے حتی الامکان بچنے کی کوشش کی گئی ہے۔

(۲) دوسرا یہ کہ تمام تراجم دو حال سے خالی نہیں ہیں یا تو ان میں قرآن کے متعلقہ قصوں کو ترک کیا گیا ہے یا ان کو مکمل تفصیل کے ساتھ نقل کیا گیا ہے، اس ترجمہ میں درمیانی راستہ اختیار کیا گیا ہے، جن مقامات پر آیت کے معنیٰ کی تفہیم قصہ پر موقوف ہے وہاں دو تین جملوں میں اس کو بیان کر دیا گیا ہے، اور جہاں آیت کے معنی کی تفہیم کسی قصہ کے بیان کرنے پر منحصر نہیں ہے، وہاں اس کو بیان نہیں کیا گیا ہے۔

(۳) تیسری بات یہ کہ مختلف توجیہات میں سے جو توجیہ عربی اسلوب کے اعتبار سے زیادہ قوی، علم حدیث وفقہ کے اعتبار سے زیادہ واضح ہو اور لفظ کے ظاہر معنی سے زیادہ دور نہ ہو اس کو بیان کیا جائے، ''تفسیر وجیز'' اور ''تفسیر جلالین'' جو اس ترجمہ کے لئے اصل کی طرح ہیں جو کوئی ان کا اور دیگر تفاسیر کا مطالعہ کرے گا وہ جان لے گا کہ اس میں کوئی شک نہیں۔

(۴) چوتھی خوبی اس ترجمہ کی یہ ہے کہ جو شخص نحو سے واقف ہو وہ اس ترجمہ کے ذریعے اعراب قرآن محذوف کا تعین، ضمیر کا مرجع اور مقدم و مؤخر سے واقفیت وغیرہ کو جان لے گا اور جو نحو سے واقف نہیں ہے مفہوم اس پر بھی پوری طرح واضح ہو جائے گا۔

(۵) پانچویں خوبی اس ترجمہ کی یہ ہے کہ کوئی بھی ترجمہ دو حال سے خالی نہیں ہوتا یا تو ترجمہ تحت اللفظ ہوگا یا ترجمہ حاصل المعنی ہوگا، دونوں صورتوں میں کئی خرابیاں ہیں، یہ ترجمہ دونوں طریقوں کا جامع ہے، دونوں ترجموں میں جو خرابی واقع ہو سکتی ہے، ہم نے اس کی اصلاح کا علاج مقرر کیا ہے، یہ ایک تفصیلی موضوع ہے، اس کو ہم نے اپنے رسالہ قواعد ترجمہ (مقدمہ در قوانین ترجمہ) میں بیان کیا ہے۔

ہم نے جو یہ بات کہی ہے کہ اس ترجمہ میں وجوہ اعراب کی بھی نشاندہی کی گئی ہے، مثلاً کوئی لفظ مہمل ہے اس کی تفسیر کی ضرورت ہے اس کو سمجھنے کے لئے تھوڑی سی توجہ کی ضرورت ہے، لفظ

است ربط کی علامت ہے جو جملہ اسمیہ وظرفیہ کے دونوں حصوں میں ربط کو ظاہر کرتا ہے، جیسے زید قائم است ،زید کجاست ،اسی طرح جملہ فعلیہ میں فعل کی فاعل ساتھ نسبت کو ظاہر کرتا ہے،زید استاد اور بوقت ضرورت استاد زید بھی کہا جا سکتا ہے اور مفعول بہ چاہے نائب فاعل ہو یا نہ ہو کسی حرف کے ساتھ ملا ہوا ہوگا، جیسے زدم زیدرا،وزدہ شد زیدرا،اس جملہ کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے زید زدہ شد،اور اگر قرینہ موجود ہو تو اس کا حذف کرنا بھی جائز ہے اور مفعول مطلق اگر عدد کے لئے ہو تو یکبار کردن، ودوبار کردن کہا جا سکتا ہے اور اگر برائے نوع ہو تو یک نوع کردن و یک طور کردن اگر غیر مصدر کو مصدر کی جگہ لایا گیا ہو جیسے کہیں ضربت سوطا تو ترجمہ ہوگا زدم یک چابک،اور اگر مفعول فعل کے لفظ سے جدا ہو جیسے قراءت سردًا تو ترجمہ ہوگا خواندم بطریق پی در پی،اور اگر محض تاکید کے لئے مفعول کا ذکر ہو یا اس طرح ہو جیسے سبحان اللہ اور وعد اللہ میں تو یہ دونوں زبانوں کے اختلافات کے قبیل سے ہوگا اور بغیر تکلف اور دوسرے حرف کے ملائے صحیح ترجمہ نہیں ہو سکے گا۔

(الف)اگر مفعول لہ غرض کے معنی میں ہو تو اس کا ترجمہ برائے یا تا ہوگا،اور جملہ ضربتہ تادیبًا میں مصدر کا ترجمہ اس طرح ہوگا (زدمش برائے ادب دادن ،یازدمش تاادب دہم)اور اگر مفعول لہ بمعنی حاصل ہو تو اس کا ترجمہ بعلت یا بحکم یا بمقتضا سے کرتے قعد جنبًا کا ترجمہ ہوگا (نشست بعلت نامردی)اور اگر احتراز کے معنی میں ہو اس کا ترجمہ برائے احتراز یا برائے احتیاط یا اسی جیسے الفاظ سے کیا جائے گا جیسے ضربته ان یقول الناس ماضربته کا ترجمہ یوں کریں گے زدمش برائے اجتناب از آنکہ گویند نزدمش۔

مفعول فیہ کا ترجمہ درمکان یا درزمان کیا جائیگا،اور مفعول معہ کا ترجمہ لفظ با سے کیا جائے گا، جیسے استوالماء والخشبة کا ترجمہ ہوگا، برابر شد آب با چوب،اور اگر حال مفرد کلمہ ہو تو اس کا ترجمہ کرنے کے لئے ایسے لفظ کا استعمال کرنا ہوگا جو حال معنی کے لئے وضع کیا گیا ہو جیسے جئت راکبًا کا ترجمہ ہوگا سوار آمدم۔

(ب)اگر جملہ معطوفہ ذوالحال ہو یا لفظ کردہ و کناں یا ان جیسے الفاظ کے ساتھ ہو جیسے جاء زیدیتبختر فی مشیه کا ترجمہ ہوگا زید آمد تبختر کناں دررفتار خود،اور اگر جملہ معطوفیہ ذوالحال کے

فعل کے علاوہ کسی اور چیز پر مشتمل ہوتو لفظ حالانکہ کا اضافہ کر کے اس کا ترجمہ کیا جائے گا اگر چہ فارسی زبان میں یہ لفظ مستعمل نہیں ہے۔

حال عربی زبان میں مختلف معنوں میں استعمال ہوتا ہے کبھی تاکید کے معنی میں آتا ہے۔

(۱) جیسے جاء نی ابوبکر عطوفا۔

کبھی تهیاء کے معنی آتا ہے، جیسے:

(۲) فاد خلوها خالدین۔

کبھی قصد وارادہ کے معنی میں آتا ہے۔ جیسے:

(۳) جئت اشکوا الیہ۔

فارسی میں یہ معنی مستعمل نہیں ہیں۔

(ج) اگر تمیز سے مقصود، عدد یا وزن یا پیمانہ یا مساحت ہوتو فارسی ترجمہ میں یا تمیز کا صیغہ استعمال کریں گے یا اس کو اضافت کے ذریعہ ظاہر کریں گے، یا لفظ از کے ذریعہ اس کا اظہار کریں جیسے بست مرد، یک رطل گندم یک صاع از جو۔

اگر تمیز اسم اشارہ ہوتو لفظ صفت کے ساتھ اس کا ترجمہ کیا جائے گا جیسے ماذا اراد اللہ بھذا مثلاً کا ترجمہ ہوگا چہ ارادہ کردہ است خدا با این مثل، اور اگر نسبت سے تمیز مطلوب ہوتو فاعل یا مفعول کو تحویل کر کے یا از جہت یا باعتبار کا اضافہ کر کے ترجمہ کیا جائے گا جیسے زید حسن دارا نیک است از روئے خانہ۔

کبھی کبھی فارسی میں تمیز کا ترجمہ اس طرح کرتے ہیں کہ دو کلموں کو ایک کلمہ بنا کر اس کا اصل مفہوم واضح کرتے ہیں جیسے ضاق قلبا، کا ترجمہ ہوگا تنگ دل شدہ، ھو قاسی قلبا کا ترجمہ ہوگا وی سخت دل است۔

کبھی عربی میں مفعول بغیر حرف جر کے واسطے ہوتا ہے لیکن فارسی میں حرف جر کا واسطہ ضروری ہوتا ہے، جیسے فسیکفیکھم اللہ کا ترجمہ ہوگا، کفایت خواہد کردہ ترا خدا از شر ایشاں یا جیسے قالوا اتخذاللہ ولدا کا ترجمہ ہوگا، فرزند گرفت خدا، یا جیسے اعطیت زیدا درھما کا ترجمہ ہوگا، درھم دادم زید را، کان زیداً قائماً کا ترجمہ ہوگا، زید قائم بود، اور جعلت

زیداً عبدی کا ترجمہ ہوگا، زیدرا بندہ خود ساختم۔

ان تمام صورتوں میں ترجمہ کے اسلوب کے لحاظ سے تقدیم وتاخیر اختیار کی گئی ہے۔

کبھی کبھی وہ جملہ جس کو تاویل کر کے مصدر بنالیا گیا ہو تو اس کا ترجمہ مصدر اور مفرد ہی استعمال کیا جائے گا مصدر مفرد کی تفسیر اس جملہ سے کی جاتی ہے جس کو ان مصدر یہ کے ذریعے مصدر بنایا گیا ہو۔

اسی طرح موصول کی اپنے صلہ کے ساتھ مفرد کلمہ سے یا اس کے برعکس تفسیر کی جاتی ہے وقال الذی آمن کا ترجمہ ہوگا گفت آں مسلمان، والذین آمنوا کا ترجمہ ہوگا مسلمانان الذین اوتوا الکتاب کا ترجمہ ہوگا اہل کتاب۔

یہ اس صورت میں ہے جب کہ معنی واضح ہوں جیسے قد افلح المومنون الذین هم فی صلوتهم خاشعون کا ترجمہ ہوگا ہر آئینہ رستگار شدند آں مسلماناں کہ ایشاں در نماز خویش خشوع کنند یعنی اگر موصول کسی اسم کی صفت واقع ہو تو لفظ آں کو اس موصوف پر مقدم کیا جائے گا، اور جب معمول کو مقدم کر کے تخصیص کی علامت مقرر کی جائے تو فارسی میں بھی اس کی تقدیم کی جائے گی۔

کم، هم، هو ایاه بعض مقامات پر ان کا ترجمہ خود ہوگا، فارسی میں کہا جائیگا شما را راست گوئید، یا ایشاندرا ست گوی، اس کی ضرورت نہیں کہ یہ کہا جائے ایشانندراست گویاں۔

اگر مضمر کی جگہ ظاہر لفظ استعمال کیا جائے تو ربط باقی رکھنے کے لئے وہاں لفظ آں زیادہ کیا جائے گا۔

الغرض فن ترجمہ کی باریکیاں بے شمار ہیں یہاں صرف چند بطور نمونہ بیان کی گئیں ہیں، چونکہ اس فقیر نے بغیر کسی کی مدد کے اور بغیر کسی کتاب سے رجوع کئے ہوئے اور دیگر علوم میں مشغولیت کے ساتھ ترجمہ کیا ہے، اس لئے اس کا امکان ہے کہ کہیں کہیں ان ضابطوں کا التزام نہ ہوسکا ہو، سعادت مند احباب جو ان قواعد کو مستحضر رکھتے ہیں ان سے گزارش ہے کہ دینی اخوۃ کے پیش نظر خیر خواہی کو مدنظر رکھیں اور اس کی اصلاح کریں۔

اس ترجمہ کے لکھنے والوں کو فقیر کی وصیت یہ ہے کہ قرآن کی عبارت کو جلی حروف میں لکھیں

اور اعراب اور سرخی کو ترجمہ سے الگ رکھیں اور احتیاط کریں کہ ترجمہ کے الفاظ میں کوئی تبدیلی نہ آنے پائے اور ایسے مقامات جہاں جملہ مکمل ہو رہا ہو، لیکن اشتباہ کا اندیشہ ہو تو سرخ نقطہ لگا کر اس کو مابعد سے الگ کر دیں اور مرکب اضافی اور مرکب توصیفی کو مضاف اور موصوف پر کسرہ لگا کر نمایاں کر دیں تاکہ مبتدیوں کے لئے بات واضح تر ہو جائے۔

اگر ترجمہ میں کوئی ایسا لفظ ہو جو مبتدیوں کے لئے اجنبی ہو یا ایسی گفتگو ہو جو بچوں کی سمجھ میں نہ آتی ہو تو سعادت مند دوستوں سے گزارش ہے کہ اس کے معنی حاشیہ پر لکھ دیں تاکہ کسی فرد کے لئے بھی بات مشکل نہ رہے۔

ان اريد الا الاصلاح ما استطعت وماتوفيقي الا بالله ،عليه توكلت واليه انيب. (میں تو صرف اصلاح چاہتا ہوں جہاں تک ہو سکے، اور میرا رہنما صرف اللہ تعالیٰ ہے، اس پر میں نے بھروسہ کیا اور اسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں)۔

سند درس قرآن

ضعیف بندہ ولی اللہ بن عبدالرحیم عفی عنہ کہتا ہے کہ میں نے پورا قرآن از اول تا آخر بروایت حفص عن عاصم۔

(۱) مرد نیک اور صالح حاجی محمد فاضل سندھی سے ۱۱۵۴ھ میں پڑھا، انہوں نے بتایا کہ انہوں نے پورا قرآن از اول تا آخر بروایت حفص۔

(۲) شیخ عبدالخالق، سے پڑھا جو دلی کے شیخ القراء تھے۔ انہوں نے بتایا کہ میں نے قرأت سبعہ کے قرآن۔

(۳) شیخ بقری سے پڑھا اور انہوں نے

(۴) اپنے عہد کے شیخ القراء شیخ عبدالرحمٰن یمنی سے اور انہوں نے اپنے والد

(۵) شیخ سجادہ یمنی اور شہاب احمد بن عبدالحق السنباطی سے پڑھا اور شیخ سجادہ مذکور اور شیخ سجادہ مذکور نے اس طرح۔

(۶) شیخ ابوالنصر الطبلاوی سے پڑھا اور شیخ ابوالنصر الطبلاوی سے اور الطبلاوی

(۷) شیخ الاسلام زکریا سے پڑھا، اور انہوں نے

(۸) برہان العقلیلی اور رضوان ابونعیم العطبی سے پڑھا، اور ان دونوں نے

(۹) امام القراء والمحدثین محرر الروایات والطرق ابوالخیر محمد بن محمد بن علی بن یوسف الجزری، جو کتاب النشر کے مصنف ہیں، ان سے پڑھا۔ ان کی بہت سی اسناد ہیں جن کا ذکر انہوں نے التیسیر میں کیا ہے، اس میں

التیسیر کے حوالے سے قراء ضابطین کا سلسلہ ہے، ہم یہاں صرف اسی کو ذکر کریں گے، (امام) جزری نے کہا میں نے التیسیر اور اس کے مطابق پورا قرآن مجید اول سے آخر تک اپنے

(۱۰) استاذ امام، صالح، عالم، قاضی المسلمین ابوالعباس احمد بن الشیخ الامام ابوعبداللہ الحسین بن سلیمان بن فزارة الحنفی سے دمشق میں پڑھا، انہوں نے بتایا کہ انہوں نے یہ کتاب اور اس کے مطابق قرآن کریم

(۱۱) اپنے والد سے پڑھا اور انہوں نے بتایا کہ انہوں نے اس کے مطابق تلاوت قرآن

(۱۲) شیخ الامام ابومحمد القاسم بن احمد بن الموفق اللورقی سے پڑھا، انہوں نے فرمایا کہ میں نے اس کو اس کے مطابق قرآن پاک

(۱۳) شیخ الائمۃ المقرئین ابوالعباس احمد بن علی بن یحیٰ بن عون اللہ الحصار اور ابوعبداللہ محمد بن سعید اور ابی عبد اللہ محمد بن سعید بن محمد المرادی، اور ابی عبداللہ محمد بن ایوب بن محمد بن نوح الغافقی الاندلسیین سے پڑھا ان سب نے الگ الگ اپنے استاذ:

(۱۴) الشیخ الامام ابی الحسن علی محمد بن ہذیل البلنی سے پڑھا اور انہوں نے اپنے استاذ

(۱۵) ابی داؤد سلیمان بن نجاح، انہوں نے اس کے مصنف سے پڑھا

(۱۶) الامام ابی عمرو الدانی۔

الجزری کہتے ہیں کہ اس وقت دنیا میں یہی سند سب سے اعلیٰ ہے اور قراۃ، سماع اور تلاوت کے تسلسل کے لئے مخصوص ہے اور اس کے تمام رواۃ ماہر ائمہ ہیں الدانی اپنی کتاب التیسیر میں فرماتے ہیں کہ میں نے پورے قرآن کو حفص کی روایت کے مطابق اپنے استاذ

(۱۷) ابی الحسن علی بن محمد بن صالح الہاشمی الضریر المقری سے بصرۃ میں پڑھا، انہوں نے

(۱۸) ابی العباس احمد بن سہل لاشنانی، سے پڑھا، انہوں نے

(۱۹) ابی محمد عبید بن الصباح سے پڑھا، انہوں نے

(۲۰) حفص، سے پڑھا، انہوں نے

(۲۱) عاصم سے پڑھا،

الدانی کہتے ہیں کہ عاصم نے

(۲۲) ابی عبدالرحمٰن عبیدہ بن حبیب السلمی، وعن زر بن جیش، امام عبدالرحمٰن سے اور انہوں نے

(۲۴) عثمان بن عفان، وعلی بن ابی طالب، وابی بن کعب، وزید بن ثابت، وعبداللہ بن مسعود۔

اور ان سب نے

(۲۵) رسول اللہ ﷺ سے،

زر نے عثمان بن عفان، وابن مسعود، کے واسطے سے رسول اللہ ﷺ سے پڑھا۔

خوشخبری

مجموعۂ

رسائل امام شاہ ولی اللہؒ

حصہ چہارم

مشتمل بر حجۃ اللہ البالغہ

مع ترجمہ اردو

باسم

نعمۃ اللہ السابغہ

مولانا ابو محمد عبد الحق حقانی

شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی کے زیر اہتمام

جلد ہی منظر عام پر آرہا ہے

شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کی اہم مطبوعات

ہ رسائل امام شاہ ولی اللہؒ (جلد اول)	مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی	325.00
ہ رسائل امام شاہ ولی اللہؒ (جلد دوم)	//	300.00
ہ رسائل امام شاہ ولی اللہؒ (جلد سوم)	//	300.00
ہ رسائل امام شاہ ولی اللہؒ (جلد چہارم)	//	زیر طبع
لی تاریخی مساجد (حصہ اول)	//	200.00
لی تاریخی مساجد (حصہ دوم)	//	100.00
ب و ہریانہ کی تاریخی مساجد	//	200.00
شاہ ولی اللہ اور ان کے افکار و نظریات	//	250.00
ح الصنادید (حصہ اول)	//	150.00
ح الصنادید (حصہ دوم)	//	100.00
نا عبدالماجد دریابادی، خدمات و آثار	//	200.00
ستان کی پہلی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کا حصہ	//	200.00
مندر اور اورنگ زیب کے فرامین (اردو)	//	20.00
مندر اور اورنگ زیب کے فرامین (ہندی)	//	20.00
ں خاطر (قلمی چہرے)	//	100.00
۱۸ء اور ہریانہ (ہریانہ کے مجاہدین آزادی کا تذکرہ)	//	250.00
ساجد التاریخیہ بدھلی	//	500.00
رقوم ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی	//	300.00
ومن ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی	//	300.00
لی اللہ خصوصی نمبر (ماہنامہ براہین)	//	195.00
م الدہلوی خصوصی شمارہ (ماہنامہ براہین)	//	195.00
ترمیمی بل ۲۰۱۰ء منظر، پس منظر	//	زیر طبع
القرآن (ضمائر قرآن اور انکے مراجع) ڈاکٹر ابونصر محمد خالدی	مرتبہ مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی	300.00
باہ والنظائر فی القرآن الکریم (قرآن کے مرادف الفاظ اور امثال و نظائر)	//	350.00
ت اعیان الہند (امراء و سلاطین کی تاریخ ہائے وفات اور مختصر حالات)	//	300.00
مین خالدی (اسلامیات، قرآنیات اور دکنیات پر مشتمل مقالات)	//	300.00
ں تشبیہات و استعارات	//	150.00
ت (ریڈیائی تقریروں کا مجموعہ)	مولانا جنید احمد بناری	100.00
سیلہ ظفر	خورشید انوار عارفی	100.00

SHAH WALIULLAH INSTITUTE

Adjacent to Kaka Nagar Masjid, (Near NDMC Primary School),
Kaka Nagar, New Delhi-110003
Ph.: 9811740661, 9811615455, 26953430
E-mail: shahwaliullah_institute@yahoo.in, swiinstitute26gmail.com

مجموعۃ

رسائل امام شاہ ولی اللہؒ

(حجۃ اللہ البالغہ جلد اوّل کے جمیع مباحث و مسائل پر مشتمل)

جلد چہارم

ترتیب و تقدیم:

مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی

SWI

شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی

مجموعۂ

رسائل امام شاہ ولی اللہؒ

حصہ چہارم

(حجۃ اللہ البالغہ حصۂ اوّل

کے

جمیع مباحث ومسائل پر مشتمل)

ترتیب وتقدیم

مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی

شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی

نام کتاب : مجموعۂ رسائل امام شاہ ولی اللہ جلد چہارم

مرتبہ : مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی

قیمت : ۳۰۰

سن اشاعت : جنوری ۲۰۱۴

تعداد : ۵۰۰

کمپوزنگ : ریاض احمد

مطبع : نیو پرنٹ سنٹر، دریا گنج، نئی دہلی

ناشر : شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ، مسجد کاکانگر، نزد (این، ڈی، ایم، سی پرائمری اسکول) کاکانگر نئی دہلی ۔ ۱۱۰۰۰۳

بہ تعاون قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

Title : Majmua Rasail-e-Imam Shah Waliullah-IV
Editing : Maulana Mufti Ataur Rahman Qasmi
First Edition : January 2014
Price : 300
ISBN : 978-93-84153-00-7
Composing : Riyaz Ahmed

Published by

Shah Waliullah Institute
Masjid Kaka Nagar, Near (N. D. M. C.
Primary School) Kaka Nagar, New Delhi-110 003
Ph. : 011-26953430, Mob.9811740661
website : www.shahwaliullah.com
Email : shahwaliullah_institute@yahoo.in

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱	حرفے چند	۱۱
۲	سوانح حیات	۲۳
۳	دیباچہ	۵۹
۴	مقدمہ	۶۵
۵	حصہ اوّل	۸۱
۶	(مبحث اوّل) تکلیف اور جزا وسزا کا بیان	//
۷	پہلا باب۔ ابداع اور پیدا کرنے اور تدبیر کا بیان	//
۸	دوسرا باب۔ عالم مثال کا بیان	۸۴
۹	تیسرا باب۔ ملأ اعلیٰ ومقرب ومعزز فرشتوں کا بیان	۸۹
۱۰	چوتھا باب۔ تبدیل نہ ہونے والی سنت الٰہی کا بیان (جس کا ذکر اس آیت میں "خداوند تعالیٰ کی سنت وطریقہ کو بدلنے والا نہ پاؤ گے)	۹۵
۱۱	پانچواں باب۔ حقیقت روح کا بیان	۹۹
۱۲	چھٹا باب۔ سر تکلیف کا بیان	۱۰۲
۱۳	ساتواں باب۔ تقدیر سے تکلیف پیدا ہونے کا بیان	۱۰۵
۱۴	آٹھواں باب۔ اس بیان میں کہ تکلیف جزا وسزا کا باعث ہے	۱۱۴

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱۵	نواں باب۔ اس بیان میں کہ لوگوں کی جبلات کے اختلاف کی وجہ سے ان کے اخلاق و اعمال اور مراتب کمال میں اختلاف وفرق پایا جاتا ہے	۱۱۹
۱۶	دسواں باب۔ ان خواطر و خیالات کے بیان میں جو اعمال پر اکساتے ہیں	۱۲۴
۱۷	گیارھواں باب۔ انسان کے اعمال کا اس کے نفس پر لگایا اور چپکایا جانا اور اس کے لئے گن کر محفوظ رکھا جانا	۱۲۵
۱۸	بارھواں باب۔ اعمال کا نفسی حالتوں سے وابستہ ہونا	۱۳۰
۱۹	تیرھواں باب۔ جزا و سزا کے اسباب	۱۳۲
۲۰	(مبحث دوم) دنیاوی و اخروی جزا و سزا کی کیفیت	۱۳۶
۲۱	پہلا باب۔ دنیا میں اعمال کی جزا و سزا	//
۲۲	دوسرا باب۔ موت کی حقیقت	۱۴۱
۲۳	تیسرا باب۔ عالم برزخ میں لوگوں کے مختلف احوال	۱۴۵
۲۴	چوتھا باب۔ واقعات حشر کے اسرار و رموز	۱۵۱
۲۵	(مبحث سوم) تدبیراتِ نافعہ کا بیان	۱۵۷
۲۶	پہلا باب۔ تدبیرات نافعہ کے حصول کی کیفیت	//
۲۷	دوسرا باب۔ ارتفاق اوّل کا بیان	۱۶۰
۲۸	تیسرا باب۔ آداب معاش کا بیان	۱۶۲
۲۹	چوتھا باب۔ خانگی تدابیر کا بیان	۱۶۳
۳۰	پانچواں باب۔ معاملات کے فن کا بیان	۱۶۷
۳۱	چھٹا باب۔ شہری سیاست کا بیان	۱۶۹
۳۲	ساتواں باب۔ بادشاہوں کی سیرت کا بیان	۱۷۱
۳۳	آٹھواں باب۔ اعوان و انصار کی سیاست کا بیان	۱۷۳
۳۴	نواں باب۔ ارتفاق رابع کا بیان	۱۷۶

نمبرشمار	مضمون	صفحہ
۳۵	دسواں باب۔اصول ارتفاقات پرلوگوں کے اتفاق کا بیان	۱۷۸
۳۶	گیارھواں باب۔لوگوں کی باہمی رسوم کا بیان	۱۷۹
۳۷	(مبحث چہارم) سعادت کا بیان	۱۸۴
۳۸	پہلا باب۔سعادت کی حقیقت کا بیان	//
۳۹	دوسرا باب۔لوگوں کے سعادت میں مختلف ہونے کا بیان	۱۸۵
۴۰	تیسرا باب۔اس سعادت کے حاصل کرنے کی کیفیت میں لوگوں کے مختلف طورطریقے ہیں	۱۸۶
۴۱	چوتھا باب۔ان اصولوں کا بیان جوطریقۂ ثانیہ کی تحصیل کا مرجع ہیں	۱۸۸
۴۲	پانچواں باب۔ان خصائل کے حاصل کرنے کا اور ناقص کی تکمیل اور رزائل کی تحصیل کا بیان	۱۹۲
۴۳	چھٹا باب۔ان حجابات کا بیان جوفطری امور کے ظاہر ہونے میں مانع ہیں	۱۹۵
۴۴	ساتواں باب۔ان حجابات کے دور کرنے کا بیان	۱۹۷
۴۵	(مبحث پنجم) نیکی اور بدی کا بیان	۱۹۹
۴۶	مقدمہ۔نیکی اور بدی کی حقیقت کا بیان	//
۴۷	پہلا باب۔توحید کا بیان	۲۰۰
۴۸	دوسرا باب۔حقیقت شرک کا بیان	۲۰۳
۴۹	تیسرا باب۔شرک کی اقسام کا بیان	۲۰۶
۵۰	چوتھا باب۔خدا کی صفات پر ایمان لانے کا بیان	۲۰۹
۵۱	پانچواں باب۔تقدیر پر ایمان لانے کا بیان	۲۱۵
۵۲	چھٹا باب۔اس بات پر ایمان لانا کہ خدا کی عبادت بندوں پر اللہ کا حق ہے کیونکہ وہ نعمت اور جزا بالارادہ دیتا ہے	۲۱۹
۵۳	ساتواں باب۔خدا کے نشانات اور شعائر کی تعظیم کا بیان	۲۲۴

نمبرشمار	مضمون	صفحہ
۵۴	آٹھواں باب۔ وضو اور غسل کے اسرار کا بیان	۲۲۷
۵۵	نواں باب۔ نماز کے اسرار کا بیان	۲۳۰
۵۶	دسواں باب۔ زکوٰۃ کے اسرار کا بیان	۲۳۳
۵۷	گیارھواں باب۔ روزہ کے اسرار کا بیان	۲۳۴
۵۸	بارھواں باب۔ حج کے اسرار کا بیان	۲۳۶
۵۹	تیرھواں باب۔ اقسام نیکی کے اسرار کا بیان	۲۳۸
۶۰	چودھواں باب۔ مراتب گناہ کا بیان	۲۴۰
۶۱	پندرھواں باب۔ گناہوں کی خرابیوں کا بیان	۲۴۳
۶۲	سولھواں باب۔ ان گناہوں کا بیان جو بندہ کے نفس سے متعلق ہیں	۲۴۵
۶۳	سترھواں باب۔ ان گناہوں کا بیان جن کا تعلق لوگوں سے ہوتا ہے	۲۴۷
۶۴	(مبحث ششم) سیاست مذہبی کا بیان	۲۵۲
۶۵	پہلا باب۔ مذہبی رہنماؤں اور مذہب کے قائم کرنے والوں کی ضرورت کا بیان	//
۶۶	دوسرا باب۔ نبوت کی حقیقت اور اس کے خواص کا بیان	۲۵۵
۶۷	تیسرا باب۔ اس بیان میں کہ مذہب کی اصل ایک ہی ہے اس کے طریقے اور راستے مختلف ہیں	۲۶۱
۶۸	چوتھا باب۔ خاص خاص شرائع کا ایک قوم اور ایک زمانہ کے ساتھ مخصوص ہونے کے اسباب	۲۶۵
۶۹	پانچواں باب۔ شریعت کے طریقوں پر مؤاخذہ کرنے کے اسباب کا بیان	۲۷۲
۷۰	چھٹا باب۔ حکمتوں اور علتوں کے اسرار کا بیان	۲۷۶
۷۱	ساتواں باب۔ ان مصلحتوں کا بیان جن سے فرائض اور ارکان اور آداب وغیرہ معین کئے گئے ہیں	۲۸۰

نمبرشمار	مضمون	صفحہ
۷۲	آٹھواں باب۔اوقات کے اسرار کا بیان	۲۸۶
۷۳	نواں باب۔اعداد اور مقداروں کے اسرار کا بیان	۲۹۱
۷۴	دسواں باب۔قضا اور رخصت کے اسرار کا بیان	۲۹۷
۷۵	گیارھواں باب۔تدابیر کی اقامت اور رسوم کی اصلاح کا بیان	۳۰۰
۷۶	بارھواں باب۔ان احکام کا بیان جو ایک دوسرے سے پیدا ہوتے ہیں	۳۰۶
۷۷	تیرھواں باب۔مبہم کے انضباط،مشکل کی تمیز اور کلیہ سے حکم نکالنے وغیرہ کا بیان	۳۱۱
۷۸	چودھواں باب۔مذہبی آسانیوں کا بیان	۳۱۷
۷۹	پندرھواں باب۔ترغیب اور ترہیب کے اسرار کا بیان	۳۲۰
۸۰	سولھواں باب۔کمال مطلوب کے حاصل ہونے یا نہ ہونے کے اعتبار سے امت کے درجات کا بیان	۳۲۶
۸۱	سترھواں باب۔اس بیان میں کہ ایک ایسے مذہب کی ضرورت ہے جو اور مذاہب کا ناسخ ہو	۳۳۱
۸۲	اٹھارھواں باب۔دین کو تحریف سے محفوظ اور مضبوط کرنے کا بیان	۳۳۷
۸۳	انیسواں باب۔ہمارے نبی ﷺ کے مذہب اور یہود و نصاریٰ کے مذہب کے مختلف ہونے کے اسباب کا بیان	۳۴۲
۸۴	بیسواں باب۔اسباب نسخ کا بیان	۳۴۵
۸۵	اکیسواں باب۔اس حالت کا بیان جو زمانہ جاہلیت کے لوگوں میں تھی پھر نبی ﷺ نے اس کی اصلاح فرمائی	۳۴۸
۸۶	(مبحث ہفتم)حدیث نبویؐ سے احکام شرعی کے استنباط کا طریقہ	۳۵۸
۸۷	پہلا باب۔علوم نبویؐ کی اقسام کا بیان	//
۸۸	دوسرا باب۔مصلحتوں اور شریعتوں کے مابین فرق کا بیان	۳۶۰

صفحہ	مضمون	نمبر شمار
۳۶۵	تیسرا باب۔امت کا نبی علیہ السلام سے شریعت کو اخذ کرنے کا بیان	۸۹
۳۶۸	چوتھا باب۔کتب حدیث کے طبقات کا بیان	۹۰
۳۷۴	پانچواں باب۔اس بیان میں کہ کلام کا مطلب کیسے سمجھ میں آتا ہے	۹۱
۳۷۷	چھٹا باب۔کتاب وسنت سے احکام شرعیہ کے سمجھنے کے طریقہ کا بیان	۹۲
۳۸۰	ساتواں باب۔مختلف حدیثوں میں فیصلہ کا بیان	۹۳
۳۸۷	تتمہ	۹۴
//	پہلا باب۔فروعات میں صحابہ اور تابعین کے اسباب کا بیان	۹۵
۳۹۶	دوسرا باب۔فقہا کے مذاہب مختلف ہونے کے اسباب کا بیان	۹۶
۴۰۴	تیسرا باب۔اہل حدیث اور اصحاب الرائے کے مابین فرق کا بیان	۹۷
۴۱۵	چوتھا باب۔اس بیان میں کہ چوتھی صدی ہجری سے پہلے اور بعد میں لوگوں کا حال کیا تھا	۹۸
۴۲۰	فصل تقلید اور اختلاف مذاہب وغیرہ کے چند مشکل مسائل کا بیان	۹۹
۴۳۸	حصہ دوم (نبی علیہ السلام سے جو کچھ تفصیلاً صادر ہوا ہے اس کے اسرار کا بیان)	۱۰۰
//	ایمان کی قسموں کا بیان	۱۰۱
۴۵۳	کتاب وسنت کے اتباع کا بیان	۱۰۲
۴۶۲	طہارت (پاکیزگی) کا بیان	۱۰۳
۴۶۴	فضائل وضو کا بیان	۱۰۴
۴۶۵	کیفیت وضو کا بیان	۱۰۵
۴۶۸	موجبات وضو کا بیان	۱۰۶
۴۷۱	موزوں پر مسح کرنے کا بیان	۱۰۷
۴۷۲	کیفیت غسل کا بیان	۱۰۸
۴۷۴	موجبات غسل کا بیان	۱۰۹

نمبرشمار	مضمون	صفحہ
۱۱۰	جنبی اور بے وضو کے لئے مباح اور غیر مباح امور کا بیان	۴۷۶
۱۱۱	تیمّم کا بیان	۴۷۷
۱۱۲	آداب خلا کا بیان	۴۷۹
۱۱۳	خصائل فطری اور ان سے متعلق امور کا بیان	۴۸۲
۱۱۴	پانی کے احکام کا بیان	۴۸۵
۱۱۵	نجاستوں کے پاک کرنے کا بیان	۴۸۸
۱۱۶	نماز کے ابواب کا بیان	۴۹۱
۱۱۷	نماز کی فضیلت کا بیان	۴۹۳
۱۱۸	نماز کے اوقات کا بیان	۴۹۴
۱۱۹	اذان کا بیان	۵۰۱
۱۲۰	مساجد کا بیان	۵۰۴
۱۲۱	نمازی کے کپڑوں کا بیان	۵۰۹

حرفِ چند

الحمد للہ مجموعۂ رسائل امام شاہ ولی اللہ کی چوتھی جلد حجۃ اللہ البالغہ کے حصہ اوّل کے اہم مباحث اور متنوع مسائل پر محیط و مشتمل ہے۔ حجۃ اللہ البالغہ، حکیم الامت، حجۃ اللہ فی الارض حضرت امام شاہ ولی اللہ محدث کی شہرۂ آفاق تصنیف ہے، جو احکام شرعیہ کے رموز و اسرار اور مقاصد دین کی تشریح و تنقیح کے حوالے سے روئے زمین پر بلا شبہ رب کریم کی ایک ابدی و سرمدی نعمت کی حیثیت رکھتی ہے۔

حجۃ اللہ البالغہ کے الہامی اسلوب سے اندازہ ہوتا ہے کہ بہت پہلے حضرت شاہ صاحب کو احساس ہو چکا تھا کہ آئندہ جو دور آنے والا ہے وہ عقلیت پسندی اور مادیت پرستی کا دور ہوگا اور احکام دین متین کے متعلق طرح طرح کے شکوک و شبہات پیش کیے جائیں گے، ایسے پرفتن دور میں اسلام کو دین فطرت کی حیثیت سے پیش کرنے اور اس کے احکام کی حکمت و معنویت بیان کرنے کی ضرورت ہوگی۔ تاکہ لوگ غلط فہمی و شبہ میں مبتلا نہ ہوں۔ حضرت شاہ صاحب نے اسلامی تعلیمات پر عائد الزامات کو دفع کرنے کا فریضہ ادا کیا ہے۔ اور اسلامی احکام کے اسرار و رموز کی نشاندہی کی ہے۔

مجھے براہِ راست ایک ذمہ دار عالم دین نے بتایا کہ مولانا عبیداللہ سندھی جلاوطنی کے بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اپنے قیام کے دوران اپنے رفقا اور حلقۂ درس کے شرکا سے بڑے جوش و خروش اور جذبے کے ساتھ کہا کرتے تھے کہ یورپ سے الحاد و زندقہ کا ایک سیلاب اور طوفان بلاخیز آنے والا ہے جو اسلام پر یلغار کرے گا اور اس کا دفع و مقابلہ کسی چیز سے ہو سکتا ہے تو وہ صرف

فلسفہ ولی اللہی ہے۔ حضرت شاہ صاحب کے افکار ونظریات کی عصری معنویت پر معروضی گفتگو کی ضرورت ہے جو ایک مستقل بحث کا موضوع ہے۔

حضرت شاہ صاحب حجۃ اللہ البالغہ کی تصنیف کے بارے میں لکھتے ہیں:

وبينا أنا جالس ذات يوم بعد صلوٰة العصر متوجّها الى الله اذ ظهرت روح النبي صلى الله عليه وسلم وغشيتني من فوقي بشئ خيل الى أنه ثوب ألقي علي ونفث في روعي في تلك الحالة، أنه اشارة الى نوع بيان للدين ووجدت عند ذلك في صدري نوراً لم يزل ينفسح كل حين. (حجۃ اللہ البالغہ صفحہ ۳۹)

میں ایک دن عصر کی نماز کے بعد مراقبہ میں بیٹھا ہوا تھا کہ یکا یک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارک مجھ کو نظر آئی اور ایک کپڑا سا مجھ پر ڈال دیا گیا۔ اور اسی وقت میرے دل میں اس کے یہ معنی معلوم ہوئے کہ یہ دین کو ایک خاص طرز سے بیان کرنے کی طرف اشارہ ہے اور اسی وقت سے میرے دل میں ایک ایسا نور معلوم ہوا جو کہ ہر وقت ترقی پذیر تھا۔

حضرت شاہ صاحب نے مکہ مکرمہ کے قیام کے دوران یہ ایک خواب بھی دیکھا تھا جس کا ذکر کرتے ہوئے حجۃ اللہ البالغہ ہی میں لکھتے ہیں:

ثم رأيت الامامين الحسن والحسين في منام. رضي الله عنهما وأنا يومئذ بمكة، كأنهما أعطياني قلما وقالا هذا قلم جدنا رسول الله صلى الله عليه وسلم. (حجۃ اللہ البالغہ صفحہ ۴۰)

پھر اس کے بعد خواب میں میں نے حضرت امام حسنؓ وحسینؓ کو مکہ میں اس طرح دیکھا کہ انھوں نے مجھ کو ایک قلم عطا فرمایا اور کہا کہ یہ ہمارے نانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قلم ہے۔

اس طرح حضرت شاہ صاحب کو اس عظیم الشان کتاب کی تصنیف کی طرف ترغیب دلائی گئی ہے اور آپ کی توجہ خاص سے یہ شہرۂ آفاق کتاب معرض وجود میں آئی۔ مگر یہ کتاب کب لکھی گئی

اس کی تصنیف کی ابتدا اور اس کی تکمیل کی تاریخ خود حضرت شاہ صاحب نے نہیں تحریر فرمائی ہے اس لئے کہ اس کی ابتدا اور اس کی تکمیل کی حتمی تاریخ کا تعین خاصا مشکل ہے البتہ بعض لوگوں نے حجۃ اللہ البالغ کا سنہ تصنیف ۱۱۸۳ھ/ ۱۷۶۹ء رقم کیا ہے۔ لیکن یہ قول بداہۃً غلط ہے، کیونکہ حضرت شاہ صاحب کی تاریخ وفات ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۳ء ہے تو اگر اس قول کو تسلیم کرلیا جائے تو اس کا واضح مطلب ہوگا کہ یہ کتاب آپ کی وفات کے بعد میں معرض وجود میں آئی ہے، جو ایک مضحکہ خیز دعویٰ ہے۔

جناب اطہر عباس رضوی صاحب کی تحقیق ہے کہ ۱۱۴۵ھ/ ۱۷۳۲ء اور ۱۱۵۱ھ/ ۱۷۳۹ء کے درمیان کسی وقت اس تصنیف کی تکمیل ہوئی ہے اور مولانا محمد احسن نانوتوی (جو حجۃ اللہ البالغہ کے پہلے مصحح وناشر ہیں) کا خیال ہے کہ حضرت شاہ صاحب نے یہ تصنیف اپنے آخری زمانہ میں مکمل تھی۔ اور وہ اس پر نظر ثانی نہ کر سکے

بعض دانشوروں کی رائے ہے کہ جناب اطہر عباس رضوی کی رائے زیادہ صائب اور مناسب ہے اور یہی خیال کچھ میرا بھی ہے کہ یہ کتاب حضرت شاہ صاحب کے آخری دور کی ہے اور اگرچہ اس کے بعد ہمعات تصنیف کی گئی ہے اور اس میں حجۃ اللہ البالغہ کے مطالعہ کرنے کا مشورہ بھی دیا گیا ہے۔

سردست حجۃ اللہ البالغہ کے مختلف مخطوطات، مطبوعات اور تراجم اور عربی واردو شروح کا اختصار سے تذکرہ کیا جارہا ہے، تاکہ حجۃ اللہ البالغہ کے مخطوطات، مطبوعات اور ان کے تراجم وشروح کا علم ہو سکے اوران کے مترجمین وشارحین کے بارے میں بھی واقفیت ہو سکے۔

حجۃ اللہ البالغہ کے مخطوطات:۔

(۱) نسخہ کراچی: یہ حجۃ اللہ البالغہ کا قدیم ترین وصحیح ترین قلمی نسخہ ہے، جسے حضرت شاہ ولی اللہ محدث کے ایک شاگرد ومعتقد مولانا کریم نے ۱۱۵۹/ ۱۷۴۶ میں تحریر کیا ہے، جو حضرت شاہ عبدالعزیز محدث کی تاریخ پیدائش بھی ہے، اس نسخہ کی اہمیت یہ ہے کہ اس کے کاتب نے حضرت شاہ صاحب کے روبرو درس میں پڑھا بھی ہے۔ حضرت شاہ صاحب کے درس میں اس کی قرأت وخواندگی شعبان ۱۱۶۲ میں پوری ہوئی تھی۔ اس نسخہ کے سرورق پر یہ نوٹ درج ہے:

''پیش حضرت شیخ مصنف بطریق تعلم شروع نمودہ شد، اللہ سبحانہ توفیق اتمام دہد وتحقیق بایں علوم میسر سنازد''

اور اسی نسخہ کے آخری صفحہ پر رقم ہے:

''تم الکتاب حجۃ اللہ البالغہ بید الفقیر الحقیر کریم ہر کہ خواند دعا طمع دارم، زآنکہ من بندہ گنہ گارم در سنہ ۱۱۵۹ھجری المقدس''

اسی صفحہ پر دوسری جگہ تحریر ہے:

تا شعبان ۱۱۶۲ تا آخر پیش حضرت مرشد خواندہ شدہ۔ اللہ تعالی تحقیق میسر کند''۔

یہ نسخہ ۲۷۳ اوراق پر محیط ہے، جس کے ۷۵ اوراق خط نسخ میں ہیں اور باقی حصے خط نستعلیق میں ہیں۔ اور دونوں خط عمدہ ولا جواب ہیں، یہ نسخہ کراچی، پاکستان کے معروف ایڈووکیٹ خالد اسحق صاحب کی ملکیت وتصرف میں رہا ہے۔ اب کیا صورت ہے، اس کا علم نہیں ہے۔

حضرت مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی صاحب لکھتے ہیں:

''نسخہ کراچی کے دیکھنے سے یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ نسخہ حضرت شاہ صاحب کے ابتدائی مسودہ کی نقل ہے چوں کہ اس میں جگہ جگہ عبارتیں قلم زد کی گئی ہیں۔ جن کی خاصی تعداد ہے۔ ایک آدھ سطر سے چار چھ سطروں تک اور بہت سے مقامات پر آدھا صفحہ، پون صفحہ، بلکہ پورا یا ڈیڑھ یا پونے دو صفحے مسلسل قلم زد کئے گئے ہیں، کہیں کہیں عبارتیں بالکل مٹائی گئی ہیں، بیشتر مقامات پر قلم زد عبارت پڑھی جا سکتی ہے۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ ناقل (کریم) نے اپنا نسخہ حضرت مصنف کے ابتدائی مسودہ سے نقل کیا تھا مگر درس کے وقت جب یہ نسخہ حضرت شاہ صاحب کے حضور پڑھا گیا تو حضرت شاہ صاحب نے اس میں کثرت سے ترمیم کرائی، جو عبارتیں غیر ضروری یا زائد تھیں وہ حذف کرا دیں اور چند عبارتوں سے یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ اس سلسلہ میں حضرت مصنف کی رائے میں تبدیلی ہو گئی تھی، اس لئے پرانے نظریہ پر قلم پھیر دیا۔ اسی شان سے پورے نسخہ کی تعلیم وقرأت مکمل ہوئی آخر آخر میں حضرت شاہ صاحب نے جس متن کو باقی رکھا تھا۔ حجۃ اللہ البالغہ کے اور

نسخوں کے نقل کرنے والوں نے اس کو بنیاد بنایا ہے۔
یہ تو بڑی تصحیحات کی کیفیت تھی، اس کے علاوہ کلمات یا فقروں کی تصحیح بھی کثرت سے ہے جو کہیں کہیں متن میں اور کثرت سے حاشیوں پر کی گئی ہے، تصحیحات کی فراوانی کا یہ عالم ہے کہ شاید ہی کوئی صفحہ ان سے خالی ہے''۔

حجۃ اللہ البالغہ ایک تجزیاتی مطالعہ صفحہ ۱۴

مخطوطہ کراچی میری نگاہ سے نہیں گزرا ہے اسی وجہ سے حضرت مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی صاحب کی تحقیق پر انحصار و اعتماد کیا ہے، جو ایک معتبر و مستند محقق اور فکر ولی اللہی کے ماہر ہیں۔

(۲) مخطوطہ خدا بخش لائبریری پٹنہ:۔

یہ حجۃ اللہ البالغہ کا اہم ترین خطی نسخہ ہے، جو نسخہ ۱۲ ربیع الاول ۱۲۴۰/۴ نومبر ۱۸۲۴ کا مکتوبہ ہے، جس کے مجموعی اوراق ۲۵۷ ہیں، یہ نسخہ منشی محمد حسن کے لئے لکھا گیا ہے، جس کے گمنام کاتب و ناقل یہ تصریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''تمت: تمام شد ایں کتاب بموجب فرمائش جناب منشی محمد حسن دام اقبالہ، بتاریخ دوازدہم ماہ ربیع الثانی سنہ ۲۲ بوسی و مطابق هجری ۱۲۴۰ فقط''

منشی محمد حسن کے بارے میں بھی کوئی صراحت نہیں کی گئی ہے۔ یہ کون بزرگ ہیں۔ لیکن ''دام اقبالہ'' کے لفظ سے اندازہ ہوتا ہے کہ کوئی رئیس یا کوئی صاحب علم بزرگ ہوں گے۔

مذکورہ بالا نسخہ نہایت ہی پاکیزہ و خوشنما اور نستعلیق میں تحریر کیا گیا ہے اور حواشی بھی خوشخط لکھے گئے ہیں۔

(۳) نسخہ پیر جھنڈا، حیدرآباد، یہ قلمی نسخہ ۱۱۸۳ھ میں لکھا گیا ہے، جس کے ناقل و کاتب شیخ محمود بن محمد سندھی پلیجو تھے۔ یہ نسخہ عرصہ دراز تک شیخ مولانا محب اللہ (پیر جھنڈا) کے معروف کتب خانہ میں رہا ہے۔ اب اس تاریخی کتب خانہ کا ایک بڑا حصہ نیشنل میوزیم آف پاکستان، کراچی میں منتقل ہو گیا ہے، غالباً یہ نسخہ پیر جھنڈا نیشنل میوزیم میں موجود ہے۔

(۴) نسخہ حضرت شاہ محمد اسحٰق محدثؒ: یہ نسخہ قیمہ خود محدث کبیر حضرت شاہ محمد اسحٰق محدثؒ کے دست مبارک نے لکھا ہوا ہے۔ یہ نسخہ اگرچہ نسخہ پیر جھنڈا کے بعد کا مکتوبہ ہے، لیکن حضرت شاہ محمد

اسحٰق محدثؒ سے نسبت کی وجہ سے نسخہ کراچی، یعنی نسخہ مصنف کے بعد سب سے مستند نسخہ ہے، یہ نسخہ کتب خانہ حرم مکہ میں محفوظ ہے، مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے قیام مکہ کے دوران اس نسخہ سے استفادہ کیا ہے۔

(۵) نسخہ کاکوری: یہ خانقاہ کاظمیہ قلندریہ کاکوری لکھنؤ میں موجود ہے۔ یہ نسخہ ۱۲۶۸/ ۵۲-۱۸۵۱ کا مکتوبہ ہے ایک مستند نسخہ ہے۔

(۶) نسخہ برلن: یہ نسخہ خطی جرمنی کی نیشنل لائبریری برلن میں ہے، جسے نسخہ اسپرنگر بھی کہتے ہیں، اسپرنگر ایک انگریز تھا جسے مخطوطات اور قیمتی کتابوں کو جمع کرنے کا بڑا شوق تھا، ہندوستان سے بہت سارے مخطوطات لے گیا تھا اور بہت سی کتابوں کو نقل بھی کروایا تھا۔ نسخہ برلن صاف ستھرے خط اور خوشنما تحریر میں ہے، لیکن نہ کاتب کا نام درج ہے اور سنہ کتابت رقم ہے، یہ مخطوطہ دو جلدوں میں ہے یہ نسخہ ۵۳۹ اوراق پر مشتمل ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ سفر برلن کے دوران میرے علم میں نہ تھا کہ یہ مخطوطہ برلن میں موجود ہے، ورنہ میں اس کا معائنہ ضرور کرتا۔

(۷) نسخہ دلی: یہ حجۃ اللہ البالغہ کا نسخہ خطی ہے، درگاہ حضرت شاہ ابوالخیر چتلی قبر دلی میں موجود ہے، جس کے وارث و مالک مولوی محمد انس فاروقی صاحب ہیں، اس کے کل ۱۷۵ اوراق ہیں، لیکن کاتب کا نام درج نہیں ہے۔

(۸) نسخہ مدرسہ صولتیہ، یہ نسخہ مکہ مکرمہ کے مشہور مدرسہ صولتیہ میں محفوظ ہے۔ گرچہ یہ مخطوطہ بہت بعد کا مکتوبہ ہے لیکن اس کی اہمیت یہ ہے کہ یہ نسخہ برسوں مولانا عبیداللہ سندھی کے مطالعے میں رہا ہے اور اس پر مولانا سندھی کے دستخط بھی موجود ہے، یعنی عبیداللہ بن الاسلام۔

حجۃ اللہ البالغہ کے مطبوعہ نسخے:۔

طبع اوّل: ''مطبع صدیقی'' بریلی:

حجۃ اللہ البالغہ کی سب سے پہلی طباعت ۱۲۸۶ میں ''مطبع صدیقی'' بریلی سے مولانا محمد احسن نانوتوی کی نگرانی میں ہوئی تھی۔ جس کے محرک مولانا منشی جمال الدین نانوتوی تھے جو ریاست بھوپال میں مدارالمہام کے عظیم منصب پر فائز تھے۔ انھوں نے مطبع صدیقی کے معیار طباعت ونفاست کو دیکھ کر حجۃ اللہ البالغہ اور ازالۃ الخفا کی طباعت واشاعت کی تحریک کی تھی۔

مولانا محمد احسن نانوتوی نے اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود اس کی ذمہ داری قبول کی اور حجۃ اللہ البالغہ کو موجود مخطوطات سے موازنہ وتقابل کے بعد مفید حواشی، ضروری اعراب اور کتابت وحسن طباعت کے ساتھ شائع کیا۔ مشہور عالم دین مولانا محمد منیر نانوتویؒ بھی اس کے اہتمام طباعت میں ان کے شریک کار تھے۔ حجۃ اللہ البالغہ کی تصحیح وتنقیح میں درج ذیل کتب خانوں کے مخطوطات مولانا محمد احسن نانوتویؒ کے پیش نگاہ تھے:-

(۱) مولانا احمد حسن مرادآبادی (متوفی ۱۲۸۸/۱۸۷۱)

(۲) مولانا مفتی سعد اللہ رام پوری (متوفی ۱۲۹۴/ ۱۸۷۷)

(۳) مولانا مفتی ریاض الدین کاکوری (متوفی ۱۲۹۵/ ۱۸۷۸)

(۴) مولانا ارشاد حسین رام پوری مجددی (متوفی ۱۳۱۱/۱۸۹۳)

یہ تمام مخطوطے ناقص اور غیر مکمل تھے اس وجہ سے مولانا محمد احسن نانوتوی نے موجود چاروں خطی نسخوں کو سامنے رکھ کر ایک مستند اور جامع متن تیار کیا اور اس جامع متن میں ان چاروں مخطوطوں کے امتیازات وخصوصیات کو ملحوظ خاطر رکھا۔

حجۃ اللہ البالغہ کی پہلی اشاعت بڑے سائز کے ۳۹۶ صفحات پر مشتمل ہے، جس کے آخری دو صفحات پر مولانا محمد احسن نانوتویؒ کا لکھا ہوا خاتمۃ الطبع بھی ہے، جس میں مخطوطات کی فراہمی کی تفصیل ہے، اور بعض لوگوں کے تعاون وتحریک کا بھی ذکر ہے اور آخر میں چھ عربی اشعار پر مشتمل ایک قطعہ تاریخ بھی ہے۔

طبع دوم: ''مطبع بولاق'' مصر:

ہندوستان میں حجۃ اللہ البالغہ کی اشاعت کے بعد اس کے افادہ عام کے لئے مولانا منشی جمال الدین کتانوی نے مصر میں اس کی طباعت واشاعت کا منصوبہ بنایا اور مولانا محمد حسین فقیر دہلوی کو بطور سفیر مصر بھیجا اور مطبع بولاق میں اس کی طباعت واشاعت کا انتظام کرایا۔ مصری طباعت اور متن کی نئی تدوین اور قلمی نسخوں سے موازنے ومراجعت کا اہتمام نہیں کیا گیا بلکہ ہندوستانی مطبع صدیقی کے مطبوعہ نسخے کو عربی رسم الخط میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ البتہ جہاں جہاں کوئی حدیث آئی ہے، وہاں حاشیہ میں ''ح'' بنادی گئی ہے تاکہ احادیث کی شناخت ہو سکے۔ اس

کے مصحح شیخ ابراہیم عبدالغفار دسوقی (متوفی ۱۳۰۰/۱۸۸۳) تھے، جو مصر و ترکی کے نامور اور دور اندیش مصحح تھے۔ حجۃ اللہ البالغہ کا یہ مصری نسخہ بھی ہندوستانی نسخہ کے طرح دو جلدوں میں ہے۔ یہ مصری نسخہ ۱۲۹۴/۱۸۷۷ کا مطبوعہ ہے۔

طبع سوم: ''مطبع خیریہ'' مصر:

حجۃ اللہ البالغہ کی دوسری طباعت ۲۳-۱۳۲۲ میں مصر میں مطبع خیریہ کے زیر اہتمام ہوئی ہے۔ یہ مطبع بولاق کے مطبوعہ نسخہ کی بعینہٖ دوسری اشاعت ہے۔ حسب سابق دو جلدوں میں چھپی ہے، جلد اوّل ۱۳۲۲ کے اواخر میں اور جلد دوم ۱۳۲۳ میں طبع ہوئی ہے۔

طبع چہارم: ''مطبع منیریہ'' مصر:

حجۃ اللہ البالغہ کی تیسری اشاعت ۱۳۵۲ میں مصر میں ''مطبع منیریہ'' کے زیر اہتمام ہوئی تھی اور اس کی تصحیح و تنقیح میں مولانا عبیداللہ سندھی نے معاونت کی ہے اور اس میں حضرت شاہ محمد اسحٰق محدث کا دستیاب مخطوطہ حرم مکی سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ اور یہی نسخہ منیریہ ہندوستان میں بھی مقبولیت عام کا درجہ حاصل کرلیا ہے۔ تقریباً یہی نسخہ کتب خانہ رشیدیہ دہلی نے شائع کیا ہے علاوہ ازیں دارالسلفیہ لاہور سے بھی تھوڑی بہت تصحیح کے بعد شائع ہوا ہے اور دارالسلفیہ کے مطبوعہ نسخے میں احادیث کی تخریج اور متون احادیث کا اضافہ کیا گیا ہے۔

حجۃ اللہ البالغہ کے اردو تراجم:

حجۃ اللہ البالغہ کے متعدد اردو تراجم مختلف ادوار میں ہوتے رہے ہیں، جن میں سے کچھ بہت ہی معیاری اور کچھ برائے نام ہیں۔

مجھے افسوس ہے کہ سردست حجۃ اللہ البالغہ کے یہ تمام اردو تراجم میرے پاس موجود نہیں ہیں ورنہ میں حجۃ اللہ البالغہ کے ان اردو تراجم کا تقابلی و تجزیاتی جائزہ پیش کرتا جس سے اندازہ ہو جاتا کہ کون سا ترجمہ زیادہ سلیس و شستہ اور بامحاورہ، اور کون ترجمہ تحت اللفظ، مغلق، پیچیدہ اور چیستان اور غیر واضح ہے۔

اب حجۃ اللہ البالغہ کے اردو تراجم کا ایک مختصر تعارف پیش کیا جارہا ہے:

(۱) نعمۃ اللہ البالغہ: یہ اردو ترجمہ مولانا محمد فضل الرحمٰن رئیس اعظم عظیم آباد پٹنہ کی تحریک

وترغیب پر مولانا ابومحمد عبدالحق حقانی (متوفی ۱۲۶۷/ ۱۳۳۵ھ) نے کیا ہے، مولانا ابومحمد عبدالحق حقانی ایک اچھے مترجم وشارح اور مفسر قرآن ہیں، آپ نے ترجمہ وتفسیر قرآن ''تفسیر حقانی'' کے نام سے کیا ہے۔ حجۃ اللہ البالغہ کا یہ ترجمہ دو جلدوں میں ہے اور ۱۳۰۲/ ۱۸۸۵ میں مکمل ہوا ہے۔ اور یہ ترجمہ آپ نے کب شروع کیا ہے۔ اس کی کوئی اطلاع نہیں ملتی ہے، اردو ترجمہ نعمۃ اللہ البالغہ پہلی مرتبہ کس سن میں چھپا تھا اس کی بھی اطلاع نہیں ہو سکی ہے البتہ دوسری مرتبہ اصح المطابع کراچی سے طبع ہوا ہے اور ترجمہ کی زبان میں جزئی ترمیم مولانا عبداللطیف، مولانا معراج احمد فارق صاحب نے کی ہے۔ اصح المطابق کا نسخہ بھی متن کے ساتھ دو جلدوں میں شائع ہوا ہے مگر اس پر تاریخ درج نہیں ہے، حجۃ اللہ البالغہ کے اردو تراجم میں نعمۃ اللہ البالغہ سب سے زیادہ معیاری اور سلیس وشستہ ترجمہ ہے، اور یہی ترجمہ حجۃ اللہ البالغہ مجموعۂ رسائل امام شاہ ولی اللہ کی چوتھی. پانچویں جلد میں شامل ہے۔

(۲) آیات اللہ الکاملہ: یہ اردو ترجمہ حجۃ اللہ البالغہ مولانا خلیل احمد سنبھلی اسرائیلی (متوفی ۱۳۴۰ھ) مقیم علی گڑھ کا کیا ہوا ہے، یہ ترجمہ پہلی مرتبہ ۱۳۱۵/ ۱۸۹۷ میں مطبع اسلامی لاھور سے طبع ہوا ہے۔ اور دوسری مرتبہ ۱۳۲۲ھ/ ۱۹۰۵ء میں حمایت الاسلام پریس لاہور سے شائع ہوا ہے. یہ دونوں تراجم عربی متن سے معری ہیں، اور یہ چھ سو بیس صفحات پر مشتمل ہیں۔

(۳) شموس اللہ البالغہ: مولانا عبدالحق صاحب ہزاروی نے یہ ترجمہ کیا ہے اور ۱۳۵۱ھ میں شیخ الٰہی بخش نے حمایت الاسلام پریس لاہور سے طبع کرایا تھا اور دو جلدوں میں شائع ہوا ہے اور متعدد بار یہ ترجمہ مع عربی متن کے چھپتا رہا ہے، اس ترجمہ کے بارے میں اکثر لوگوں کی رائے اچھی نہیں ہے۔

(۴) نعمۃ اللہ البالغہ: یہ اردو ترجمہ مولانا عماد الدین شیرکوٹی (متوفی ۱۳۸۳ھ/ ۱۹۶۳ء) نے ۱۳۶۰ھ/ ۱۹۴۰ء کے دوران کیا تھا اور کتب خانہ انصار یہ جالندھر کے زیر انتظام دو جلدوں میں طبع ہوا ہے۔

(۵) ترجمہ حجۃ اللہ البالغہ: جس کے مترجم مولانا پروفیسر عبدالرحیم پشاوری (متوفی ۱۳۶۹/ ۱۹۵۰ء) ہیں، یہ اردو ترجمہ ۱۳۶۶ھ/ ۱۹۴۷ء میں مکمل ہوا اور ۱۳۶۷/ ۱۹۴۹ء میں دو جلدوں میں

شائع ہوا تھا اور یہ ترجمہ ۱۴۰۴ھ/۱۹۸۴ء میں قومی کتب خانہ لاہور سے بھی شائع کیا گیا ہے۔

(۶) برہان الٰہی: یہ اردو ترجمہ حجۃ اللہ البالغہ: مولانا ابوالعلاء اسماعیل گودھروی نے مولانا عبیداللہ سندھی اور مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریک پر ۱۳۷۰ھ/۱۹۵۰ء میں مکمل کیا تھا اور شیخ غلام نبی اینڈ سنز لاہور نے دو جلدوں میں شائع کیا تھا۔ اس کی پہلی جلد جون ۱۹۹۹ میں مطبع حاجی حنیف اینڈ سنز لاہور کی جانب سے شائع کی گئی تھی اور اس کی دوسری جلد بھی اسی مطبع سے ۱۹۹۹ ہی میں شائع کی گئی ہے۔

مولانا ابوالعلاء محمد اسماعیل گودھروی لکھتے ہیں:

''۱۹۱۹ء میں قیام رانچی کے زمانے میں مولانا ابوالکلام آزاد صاحب نے سب سے پہلے مجھے اس کتاب کے ترجمہ کی طرف توجہ دلائی تھی، مگر افسوس کہ عرصہ تک اس کا موقع نہ ملا، اور میری ہمت نے بھی ساتھ نہ دیا، ۱۹۳۷ء میں جب میں حج بیت اللہ کے لئے گیا تو مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم نے حرم مکہ میں دوران ملاقات اس کتاب کے ترجمہ کی طرف توجہ دلائی بلکہ کافی اصرار بھی کیا''۔ مقدمہ مترجم صفحہ ۱۷

مولانا ابوالعلاء محمد اسماعیل گودھروی صاحب حجۃ اللہ البالغہ کے دوسرے اردو تراجم پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس کتاب کے اردو ترجمے پہلے ہی ہو چکے ہیں، لیکن ترجمے کیا ہیں۔ ایک چیستاں ہیں۔ جن میں مغلق مقامات کو اور بھی زیادہ مغلق کر دیا گیا ہے۔ اکثر الفاظ مفردہ کا ترجمہ الفاظ مفردہ سے کیا گیا ہے۔ جس سے مطلب کی وضاحت تو درکنار الجھاؤ اور بڑھ گیا ہے، ایسے مقامات اور الفاظ کو جملوں اور سطروں سے واضح کرنے کی ضرورت ہوئی ہے۔ تحت اللفظ یا تحت اللفظ جیسا ترجمہ اس کتاب کی شان کے خلاف ہے بلکہ کتاب کے مطلب کو بگاڑنا ہے''۔ مقدمہ مترجم صفحہ ۱۷

ترجمہ برہان الٰہی ایک عمدہ ترجمہ ہے، دوسرے اردو تراجم (باستثنا نعمۃ اللہ البالغہ) کے مقابلے میں زیادہ آسان اور واضح ہے۔ اور یہ بھی واضح رہے کہ کوئی بھی ترجمہ یا کوئی بھی کام حرف آخر نہیں ہوا کرتا ہے، اس کے بعد بھی کچھ اردو تراجم سامنے آئے ہیں۔ وہ خود بھی مغلق اور غیر واضح ہیں۔

ترجمہ از مولانا منظور الوحیدی: یہ ترجمہ کس نام سے کیا گیا ہے، اس کا علم نہ ہو سکا ہے البتہ یہ ترجمہ ۱۳۹۱ھ/ ۱۹۷۱ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچا ہے۔ جس کے فاضل مترجم مولانا منظور الوحیدی صاحب ہیں، یہ ترجمہ پہلی دفعہ غلام علی اینڈ سنز لاہور سے دو جلدوں میں شائع ہوا ہے اور یہ ترجمہ میری نظر سے نہیں گزرا ہے۔

شروح حجۃ اللہ البالغہ

اردو شرح حجۃ اللہ البالغہ از عبید اللہ سندھیؒ: مولانا عبید اللہ سندھیؒ امام شاہ ولی اللہ محدث کے علوم و افکار کے امین و شارح ہیں، انھوں نے ہی حضرت شاہ صاحب اور ان کے فکر و فلسفہ کو برصغیر میں متعارف کرایا ہے۔

حجۃ اللہ البالغہ کے اردو تراجم کے علاوہ اس کی دو شرحیں بھی لکھی گئی ہیں۔ ایک شرح عربی میں اور دوسری شرح اردو میں ہے۔ یہ دونوں شرحیں دراصل مولانا عبید اللہ سندھی کی درسی تقریریں ہیں، مولانا سندھیؒ مکہ کے قیام کے دوران حجۃ اللہ البالغہ کا درس دیا کرتے تھے، آپ کے درسی افادات کو آپ کے شاگرد مولانا عبداللہ بن نہال نے عربی میں منتقل کر دیا تھا اور جلاوطنی کے بعد جب آپ ہندوستان آ گئے تو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں قیام کیا تھا اور حجۃ اللہ البالغہ کی تدریس شروع کی تو آپ کے ایک شاگرد محمد صدیق سہارنپوری نے آپ کی درسی تقریروں کو جمع کر کے شائع کیا اور افادۂ عام کے لئے وقف کیا۔

مولانا عبید اللہ سندھی کی اردو شرح میرے پیش نظر ہے، اس کے شروع میں حکیم الہند امام شاہ ولی اللہ کے حالات زندگی، ان کی تعلیمات، ان کے آبا و اجداد اور اساتذہ کا تعارف ہے اور اس کے بعد ابداع، خلق اور تدبیر کی تشریح ہے اور اس کے علاوہ دوسرے مسائل بھی زیر بحث آئے ہیں، غرضیکہ ایک اچھی شرح ہے، جو حجۃ اللہ البالغہ کے اہم مسائل کو سمجھنے میں بے حد مددگار ثابت ہوتی ہے۔

رحمۃ اللہ الواسعہ: مولانا سعید احمد پالن پوری صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ کا ترجمہ اور شرح رحمۃ اللہ الواسعہ کے نام سے کیا ہے اور متعدد جلدوں میں کیا ہے، جلد اول ۲۰۰۱ میں مکتبہ حجاز دیوبند سے شائع ہوئی ہے اور اس کی دوسری جلد ۲۰۰۲ء میں مکتبہ حجاز دیوبند سے شائع ہوئی تھی۔

اس مجموعۂ رسائل امام شاہ ولی اللہ جلد چہارم میں مولانا ابومحمد عبدالحق حقانی دہلوی کا ترجمہ نعمۃ اللہ البالغہ کو شامل کیا گیا ہے جو حجۃ اللہ البالغہ کے اردو تراجم میں ایک شاندار و جاندار اور سلیس وشستہ ترجمہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ حضرت شاہ صاحب کے علوم و معارف سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے ایک نایاب تحفہ ثابت ہوگا۔

اس مجموعہ رسائل امام شاہ ولی اللہ کی اشاعت میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے فعال و متحرک اور ہر دلعزیز ڈائریکٹر خواجہ محمد اکرام الدین صاحب کی خصوصی دلچسپی رہی ہے۔ وہ اردو زبان کے مخلص ادیب اور باشعور دانشور ہیں۔ میں ان کا صمیم قلب سے شکر گزار ہوں۔ انھوں نے اس کی اشاعت میں گہری دلچسپی لی۔ اللہ تعالیٰ انہیں مزید ترقیات وفتوحات سے نوازے۔

بڑی ناسپاسی ہوگی اگر برادر عزیز عرفی عبید صاحب کا شکریہ ادا نہ کیا جائے جو ایک علمی خانوادہ کے چشم و چراغ ہیں، جن کے دادا جناب ارشاد الحق صاحب مرحوم جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بانیوں میں تھے اور آپ کے والد جناب عبید الحق صاحب جامعہ ملیہ اسلامیہ کے استاذ تھے۔ اللہ ان حضرات کی مغفرت فرمائے۔ جناب عبید عرفی صاحب جہاں پیشے سے ایک اچھے و تجربہ کار انجینئر اور فن تعمیر کے ماہر ہیں وہاں دینی و ملی حمیت وغیرت میں بالکل منفرد مزاج و ذوق کے مرد میدان بھی ہیں، جنھوں نے اس مجموعہ کی اشاعت میں تعاون کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو باحوصلہ و باہمت رکھے۔ آخر میں برادرم جناب محمد الیاس ملک صاحب کا بھی تہہ دل سے شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ انھوں نے اس مجموعہ کی اشاعت و ترویج میں بھرپور دلچسپی لی ہے، جو ایک سماجی آدمی ہیں، ملی مسائل سے بھی انہیں گہری دلچسپی ہے۔

والسلام

عطاء الرحمٰن قاسمی

چیئرمین

شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی

سوانح حیات

حضرت امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی

از مولانا معراج محمد بارقؒ

نام ونسب:۔

احمد نام، ابوالفیاض کنیت اور ولی اللہ عرف ہے۔ بشارتی نام قطب الدین اور تاریخی نام عظیم الدین مشہور ہے۔ آپ کے والد ماجد شیخ عبدالرحیم ابوالفیض ہیں جو اپنے وقت کے ایک جید عالم اور مشہور بزرگ تھے۔ فتاویٰ عالمگیری کی نظر ثانی واصلاح میں آپ بھی شریک تھے۔

شاہ صاحب کا سلسلۂ نسب والد ماجد کی جانب سے حضرت عمرؓ تک اور والدہ کی طرف سے امام موسیٰ کاظمؒ تک پہنچتا ہے اس لحاظ سے آپ خالص عربی النسل اور نسباً فاروقی ہیں۔

ولادت:۔

آپ بروز چہارشنبہ ۴ شوال ۱۱۱۴ھ/۱۷۰۳ء بوقت طلوع آفتاب دہلی میں تولد ہوئے۔ آپ کی ولادت سے قبل آپ کے والد کو ایک بلند اقبال اور ہونہار لڑکا پیدا ہونے کی بے شمار بشارتیں ہوئیں، شیخ عبدالرحیم کی اہلیہ شباب کے تمام مراحل طے کرکے زمانۂ یاس کو پہنچ چکی تھیں اس لئے ان کو گمان ہوا کہ شاید یہ اشارہ بیٹے کی طرف نہیں، لیکن کچھ عرصہ بعد انھوں نے شیخ محمد کی صاحبزادی سے عقد کیا اور اس خاتون کے بطن سے آپ پیدا ہوئے اور وہ بشارت یوں پوری ہوئی۔ بعض دیگر بزرگوں کو بھی آپ کے متعلق بہت سی بشارتیں ہوئیں غالباً انہی بشارت کی بنا پر

آپ کا نام ولی اللہ مشہور ہوا۔

بچپن:۔

بچپن کے حالات زیادہ معلوم نہیں، لیکن آپ کی طبیعت میں شروع ہی سے سادگی، شرافت اور متانت موجود تھی، نہایت ذہین واقع ہوئے تھے۔ بچپن میں آپ کی تمام حرکات اتنی محبوب و دلفریب تھیں کہ ہر شخص ان کا شیفتہ تھا، عام بچوں کی طرح آپ بیکار کھیل کود میں وقت ضائع نہ کرتے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ آپ چند ہم عمر لڑکوں کے ساتھ کہیں باغ میں کھیل کود کو چلے گئے، جب وہاں سے واپس آئے تو والد بزرگوار نے سر پر دست شفقت پھیر کر فرمایا "جانِ پدر آج تم نے کیا چیز ایسی حاصل کی جو تمہارے ساتھ باقی رہے گی؟ ہم نے تو یہ پڑھا، یہ لکھا اور یہ یہ عبادت کی"۔ والد بزرگوار کی زبان سے یہ الفاظ سننے تھے کہ آپ فرط ندامت سے پسینہ پسینہ ہو گئے اور ان کے یہ جملے گویا دل میں بس گئے۔ اس کے بعد آپ پھر کبھی سیر سپاٹے اور بیکار کھیلوں میں مشغول نہ ہوئے۔ اس سے آپ کی سعادت مندی اور وفا شعاری کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔

تعلیم و تربیت:۔

آپ پانچ برس کے ہوئے تو مکتب میں میں قرآن مجید پڑھنے بٹھائے گئے۔ ساتویں سال قرآن ختم کر لیا اسی سال آپ کے والد بزرگوار نے نماز روزہ شروع کرایا اور فارسی کی درسی کتب پڑھانی شروع کیں، آپ کی "رسم سنت" بھی اسی سال عمل میں آئی۔ ایک ہی سال میں فارسی کی تعلیم مکمل کر لی اور صرف ونحو کی طرف متوجہ ہوئے اور دس برس کی عمر میں علم نحو کی معرکۃ الآرا کتاب "شرح ملا جامی" تک پہنچ گئے۔ اور نہ صرف فارسی کی نوشت وخواند میں مہارت پیدا کر لی بلکہ عربی کی صرف ونحو میر پر بھی عبور حاصل کر لیا اور عربی کتب کے مطالعہ کی استعداد پیدا ہوگئی۔ اس کے بعد معقول کی کتابیں شروع کیں اور تھوڑے ہی عرصہ میں ان سے فراغت پائی۔ پندرہ سال کی عمر میں تمام متداولہ درسی علوم کی تکمیل کر لی۔ اور نہ صرف مروجہ نصاب تعلیم مکمل کیا بلکہ طب، حکمت، ہندسہ، حساب وغیرہ کی بھی بعض کتابیں پڑھیں۔ اور اس طرح چھوٹی سی عمر میں ارباب فضل وکمال کے زمرہ میں شامل ہو گئے۔

شاہ صاحب کی تعلیم اکثر اپنے والد بزرگوار کے پاس ہوئی اور جو کچھ اپنے والد سے اکتساب

کیا اس کے متعلق خود بیان فرماتے ہیں۔ ''علم حدیث میں مشکوۃ شریف تمام وکمال پڑھی لیکن چند روز کی علالت کی وجہ سے کتاب البیع سے کتاب الادب تک کا حصہ نہ پڑھ سکا۔ صحیح بخاری شروع سے کتاب الطہارۃ تک پڑھی اور شمائل ترمذی اوّل سے آخر تک تفسیر میں تفسیر بیضاوی اور تفسیر مدارک کے کچھ حصے باقاعدہ پڑھے اور باقی حصوں کا خود مطالعہ کیا۔ اس کے علاوہ کامل غور وفکر اور مختلف تفاسیر کے مطالعہ کے ساتھ والد ماجد کے درس قرآن میں مجھے حاضری کی توفیق ملی اور اس طرح کئی بار میں نے حضرت سے متن قرآن پڑھا اور یہی میرے حق میں ''فتح عظیم'' کا باعث ہوا (والحمد للّٰہ علی ذلک) علم فقہ میں شرح وقایہ پوری، ہدایہ کی دو جلدیں، صرف تھوڑا سا حصہ چھوڑ دیا گیا۔ اصول فقہ میں حسامی اور توضیح وتلویح کا درس لیا۔ منطق میں شرح شمسیہ کامل اور بعض مختصرات پڑھیں۔ علم کلام میں شرح عقائد کامل، شرح خیالی اور شرح مواقف کے کچھ حصے پڑھے۔ تصوف وسلوک میں عوارف المعارف کا بڑا حصہ اور رسائل نقشبندیہ پڑھے۔ علم الحقائق میں شرح رباعیات، لوائح، مقدمہ شرح لمعات اور مقدمہ نقد النصوص پڑھا۔ خواص اسماو آیات میں والد صاحب کا ترتیب دیا ہوا ایک مجموعہ پڑھا۔ طب میں موجز اور فلسفہ میں شرح ہدایۃ الحکمۃ وغیرہ نحو میں کافیہ اور اس کی شرح از ملا جامی۔ علم معانی میں مطول اور مختصر المعانی اس قدر جتنے پر ملا زادہ کا حاشیہ ہے اور ہیئت وحساب میں بھی بعض رسالے پڑھے۔ اور الحمد للہ کہ اسی تحصیل علم کے زمانے میں ہر فن سے ایک خاص مناسبت پیدا ہوگئی اور ان کے خاص مسائل اور اہم مباحث میرے ذہن کی گرفت میں آگئے۔

عقد نکاح:۔

شاہ صاحب کی عمر جب چودہ سال کی ہوئی تو شادی کی صورت پیدا ہوگئی۔ آپ کے والد صاحب نے اس معاملہ میں انتہائی عجلت سے کام لیا، لیکن سسرال والوں نے سامان شادی تیار نہ ہونے کا عذر کیا تو آپ نے کہلا بھیجا کہ یہ عجلت بے وجہ نہیں، اس کی حکمت ومصلحت بعد میں ظاہر ہوگی۔ چنانچہ شیخ صاحب کے اصرار پر سسرال کے لوگ راضی ہوگئے اور اسی سال آپ کی شادی ہوگئی۔

وہ راز بعد میں اس طرح ظاہر ہوا کہ شادی ہوجانے کے چند ہی روز بعد شاہ صاحب کی

خوش دامن کا انتقال ہوگیا۔ پھر تھوڑے ہی دن بعد خوش دامن کے والد کا وصال ہوگیا۔ کچھ ہی دن گزرے تھے کہ شاہ صاحب کے ماموں شیخ ابوالرضا محمد کے صاحبزادے شیخ فخر عالم رحلت فرما گئے۔ اس کے بعد آپ کی سوتیلی ماں وفات پا گئیں۔ ان صدمات اور مختلف امراض وضعف کی وجہ سے آپ کے والد بھی سخت بیمار پڑ گئے۔

بیعت ودستار بندی:-

شادی کے ایک سال بعد یعنی پندرہ سال کی عمر میں آپ نے والد صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی۔ انھوں نے آپ کو علوم باطنی کی طرف توجہ دلائی۔ اور آپ ان کی زیرنگرانی اشغال صوفیہ میں مشغول ہوئے خصوصاً نقشبندیہ میں کہ تمام طریق صوفیہ میں یہ طریقہ بدعات متاخرین سے پاک وصاف ہے۔ اسی سال آپ نے بیضاوی کا ایک حصہ پڑھ کر گویا مروجہ نصاب تعلیم مکمل کرلیا۔ والد ماجد نے اس تقریب میں بڑے پیمانہ پر خواص وعوام کی ایک شاندار دعوت کی اور دستار بندی کی رسم ادا ہوئی۔

والد ماجد کا انتقال اور بیعت وارشاد کی اجازت:-

دو تین سال کے عرصہ میں آپ نے علوم باطن میں بھی کمال پیدا کرلیا، پھر آپ کی عمر کے سترھویں سال آپ کے والد ماجد سخت بیمار ہوئے اور اسی حالت مرض میں آپ کو بیعت وارشاد کی اجازت دے دی اور ۱۱۳۱ھ/ ۱۷۱۹ء میں درس وارشاد کی مسند اپنے اس بلند اقبال بیٹے کے لئے خالی کردی۔

درس وتدریس اور علمی استغراق:-

اپنے والد کے انتقال کے بعد آپ ۱۱۳۱ھ/ ۱۷۱۹ء میں مستقل طور پر مسند ارشاد پر جلوہ افروز ہوئے اور درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ آپ کے علم وفضل اور کمالات ظاہری وباطنی کا شہرہ دور دور تک پہنچ چکا تھا۔ ہر طرف سے تشنگان علوم ومعارف جوق در جوق آتے اور زانوئے ادب بچھاتے۔ تقریباً بارہ سال تک آپ کتب دینیہ اور معقولات کا درس دینے میں مشغول رہے۔

اس دوران میں آپ کو ہر علم وفن میں غور کرنے کا موقعہ ملا، اسی زمانہ میں آپ نے مذاہب اربعہ کی فقہ اور ان کے اصول فقہ کی کتابوں کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا اور ان احادیث کو بھی بامعان نظر

دیکھا جن سے یہ حضرات ائمہ اپنے اقوال و مذاہب کی سند لاتے ہیں اور اسی وقت سے ''فقہائے محدثین'' کا طریقہ بھی آپ کے دلنشین ہوا۔

آپ کا یہ زمانہ نہایت استغراق اور محویت کا گزرا، آپ نے نہایت تحقیق و کاوش سے کتابوں کا مطالعہ شروع کیا اور رات دن انتہائی، انہماک و استغراق کے ساتھ کتب بینی میں مشغول رہے۔ شاہ صاحب ان دنوں کھانا بھی کم کھاتے اور آرام بھی کم کرتے اور درس و تدریس کے بعد جو وقت ملتا صحبت کتب میں صرف کرتے۔

حج بیت اللہ:۔

یہ شوق علم و تحقیق اس قدر بڑھا کہ آپ کو حرمین جانے کا خیال پیدا ہوا۔ جس قدر علم حدیث کی ضرورت آپ محسوس کرتے تھے وہ دہلی میں حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کی تحصیل و تکمیل کے لئے آپ کو حجاز کا سفر اختیار کرنا ضروری تھا، تاکہ وہاں کامل اساتذہ کی صحبت اور اعلیٰ علمی کتابوں کے مطالعہ سے اپنی بصیرت اور روحانیت میں اضافہ کریں۔

چنانچہ اسی ارادہ کے تحت آپ ۱۱۴۳ھ-۱۷۳۱ء کے اواخر میں حج کے لئے روانہ ہوئے، اس زمانہ میں ذرائع نقل و حمل کی کمی اور راستوں کے غیر محفوظ ہونے کی وجہ سے ایسا سفر کرنا اگرچہ بڑا مشکل اور جان جوکھوں کا کام تھا لیکن اس کے باوجود آپ نے زیارت حرمین کا شوق و ولولہ اور علم و تحقیق کی لگن سے مجبور ہو کر ان مصائب و تکالیف کو سر پر لیا اور نہایت عزم کے ساتھ حجاز روانہ ہوئے۔

وہاں آپ سب سے پہلے مکہ معظّمہ پہنچے اور اسی سال حج سے فارغ ہو کر مدینہ طیبہ تشریف لے گئے۔ کم و بیش ایک سال تک عالم اسلامی کے مختلف علما و مشائخ سے دلچسپ صحبتیں رہیں اور علوم ظاہر و باطن کا اکتساب کیا۔

فیوض حرمین:۔

قیام حرمین کے زمانہ میں شاہ صاحب متعدد علما و مشائخ سے کسب فیض کرتے رہے۔ پہلی مرتبہ شاہ صاحب نے ہندوستان میں شیخ محمد افضل خان المعروف بہ حاجی سیالکوٹی سے حدیث پڑھی تھی، پھر مدینہ منورہ میں شیخ ابو طاہر محمد بن ابراہیم کردی مدنی سے سند حاصل کی۔ شیخ ابو طاہر شاہ

صاحب کے بڑے معتقد تھے، اکثر فرمایا کرتے کہ ''ولی اللہ الفاظ کی سند مجھ سے لیتے ہیں اور میں معنی کی سند ان سے لیتا ہوں''۔

شیخ ابوطاہر کے علاوہ شاہ صاحب نے شیخ وفد اللہ بن شیخ سلیمان مغربی کی درسگاہ میں بھی شرکت کی اور موطا یحییٰ بن یحییٰ (یعنی موطا امام مالک بروایت یحییٰ بن یحییٰ) اول سے آخر تک سنائی اور اس کے بعد شیخ محمد بن محمد سلیمان مغربی کی تمام مرویات کی اجازت لی، شاہ صاحب تاج الدین قلعی حنفی مفتی مکہ کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے اور صحیح بخاری کی سماعت کے علاوہ کتب صحاح ستہ کے بعض مشکل مقامات کی بھی سماعت کی، اس کے علاوہ موطا امام مالک بروایت یحییٰ بن یحییٰ اور موطا امام مالک بروایت امام محمد، کتاب الآثار امام محمد اور مسند دارمی کی بھی سماعت کی۔ شیخ تاج الدین نے خصوصیت کے ساتھ شاہ صاحب کو تحریری اجازت نامہ عنایت کیا۔

شاہ صاحب دیگر بڑے بڑے مشائخ سے بھی مستفید ہوئے، شیخ سناوی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے بیعت کر کے کسب فیض کیا، شیخ احمد قشاشی سے بھی کچھ فیوض حاصل کیے۔ ان کے علاوہ سید عبدالرحمن ادریسی، شمس الدین، محمد بن علا بابلی، شیخ عیسیٰ جعفری، شیخ حسن عجیمی، شیخ احمد علی اور شیخ عبداللہ بن سالم بصری سے بھی اکتساب فیض کیا، شیخ ابوطاہر مدنی فقط علم ظاہر کے حامل نہ تھے بلکہ علوم باطن میں بھی ان کا پایہ بلند تھا، شیخ موصوف نے تمام طرق صوفیہ کا جامع خرقہ بھی اسی بابرکت سفر میں شاہ صاحب کو عنایت کیا۔

حج سے واپسی:۔

الغرض وہاں ایک سال کے قیام میں ان علمی صحبتوں اور عمیق مطالعۂ کتب اور امداد غیبی سے آپ نے حدیث وفقہ میں مجتہدانہ کمال پیدا کر لیا پھر اواخر ۱۱۴۴ھ/۱۷۳۲ء میں آپ نے دوبارہ حج کیا اور ۱۱۴۵ھ/۱۷۳۲ء کے اوائل میں وطن کا رخ کیا، پورے چھ مہینے آپ کو آتے آتے راستہ میں لگ گئے اور بتاریخ ۱۴ رجب ۱۱۴۵ھ/۱۷۳۲ء ٹھیک جمعہ کے دن صحیح سلامت وطن مالوف دہلی پہنچے، شہر کے تمام باشندوں اور نامی گرامی علما وفقہا نے آپ کا خیر مقدم کیا۔

آپ کے زمانہ میں ہندوستان کی عام حالت:۔

اس زمانہ میں ہندوستان کی حالت ہر لحاظ سے ابتر تھی شاہ صاحب کی ولادت اورنگ زیب

کی وفات سے چار سال قبل ہوئی تھی۔ اورنگ زیب کے بعد جو ہند میں طوائف الملوکی پھیلی ہے اس سے کوئی بشر ناواقف نہیں، شاہ صاحب کو تمام عمر میں دس سلاطین دہلی کے دیکھنے کا اتفاق ہوا، یعنی اورنگ زیب عالمگیر، بہادر شاہ اول، معزالدین جہاندار شاہ، فرخ سیر، رفیع الدرجات، رفیع الدولہ، محمد شاہ (رنگیلا)، احمد شاہ، عالمگیر ثانی، شاہ عالم ثانی۔

ان سلاطین کے عہد میں ہندوستان کو جن مہیب اور خونی واقعات اور لرزہ خیز حوادث وانقلابات سے گزرنا پڑا، وہ سب پر عیاں ہیں۔ سادات بارہ کا تسلط (جو بادشاہ گر یعنی ''کنگ میکر'' کے نام سے مشہور ہیں)، فرخ سیر کا ان کے ہاتھوں بصد بیکسی قید میں مرنا پھر تورانی امرائے دربار کے ہاتھوں ان سادات بارہ کا زوال، مرہٹوں کی بغاوت اور ان کا عروج سکھوں کا خونی فتنہ، نادر شاہ کی یلغار اور دہلی میں قتل عام، احمد شاہ ابدالی کی معرکۂ پانی پت میں فتح، روہیلوں کا ہندوستان کی سیاست میں شریک ہونا، ایرانی و تورانی امرا کی باہمی کشمکش، مغربی اقوام کا ملکی سیاست میں بتدریج داخل ہوتے جانا، انگریزوں کا بنگال و بہار وغیرہ پر اقتدار اور عمل دخل تقریباً یہ تمام واقعات شاہ صاحب کی زندگی ہی میں پیش آئے۔

الغرض پورا ملک عجیب بے کلی و بے چینی میں مبتلا تھا، مغلیہ حکومت کا شیرازہ بکھر رہا تھا، مسلمانوں کی سلطنت کا چراغ ٹمٹما رہا تھا، قتل و غارتگری کا طوفان برپا تھا، بدامنی و بدنظمی ہر طرف آشکارا تھی، امرا و سلاطین کبھی رنگ رلیوں میں مبتلا ہوتے اور کبھی فتنوں سے دوچار، زمانہ کی رفتار کچھ سیدھی نہ تھی، ادھر شاہان وقت اپنے اسلاف کی دولت رقص و سرود کی محفلوں اور حسن و جمال کے بازاروں میں لٹا رہے تھے اور اُدھر رعایا بدحال و پریشان، غربت وافلاس کے ہاتھوں برباد، اور ستمگروں کے مظالم سے پامال ہو رہی تھی، گویا پوری قوم کو اگر ایک طرف عشرت ڈبو رہی تھی تو دوسری طرف عسرت کھا رہی تھی۔

عوام کی اخلاقی حالت بھی نہایت درجہ گری ہوئی تھی۔ بدعقیدگی و بدعملی کے تمام جراثیم ان میں پیدا ہو چکے تھے، فسق و معصیت ان کی معاشرت کا جزو بن گئی تھی، تمام بدکاریاں اور منکرات ان کی تہذیب میں داخل تھی، اور کھلم کھلا سر مجلس ان پر فخر کیا کرتے تھے۔ بے ایمانی، دغابازی، جھوٹ، مکر و فریب، زنا و بدکاری، دیوثیت شراب خواری، جوا بازی، دریوزہ گری، ظلم و ناانصافی،

ٹونے ٹوٹکے، فضول خرچی، ریا و نمود، ترک امور دین وغیرہ اس قسم کے بیسیوں عیوب ہیں۔ جو شاہ صاحب نے اپنے نصائح میں ان لوگوں کے متعلق بیان فرمائے ہیں۔

دینی لحاظ سے بھی ان کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ کتاب وسنت سے انہیں کوئی واسطہ نہ تھا۔ اہل ہنود کے تمام مراسم قبیحہ اور ایام جاہلیت کے تمام افعال شنیعہ انھوں نے اپنا لئے تھے۔ بے سروپا عقائد ان میں رواج پا چکے تھے، تفرق و تحزب کا جال وسیع تھا اور قسم با قسم کے اوہام و شکوک کا دروازہ کھلا، محض دنیا پرست، عامی مشرب، تحقیق سے اجنبی، تقلید و جمود میں منہمک علما و صوفیہ کا دور دورہ تھا جنہیں نہ دینی امور سے ذوق تھا، نہ دین کا درد، نہ حق کا خیال نہ احقاق حق سے واسطہ، انھوں نے اپنے علم کو ذریعۂ عزت بنا رکھا تھا۔ بجائے اس کے کہ عوام ان کے طالب ہوتے وہ عوام کے طالب بن چکے تھے۔ جاہ و حشمت کے لئے بادشاہوں کے آستانوں پر سر خم کرنے اور ان کے حاضر باش دربار بننے میں فخر محسوس کرتے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ امت خدا سے دور ہوتی گئی۔ غیر اسلامی بدعات و محدثات کو دین سمجھ کر اپنایا گیا، صحیح دینی تعلیمات سے کوئی واسطہ نہ رہا، فرائض وعبادات سے زیادہ خود ساختہ بدعات کی پابندی کی جانے لگی، شریعت کی کوئی پابندی نہ تھی۔ اس کے بے شمار فرائض اس کے عملاً منسوخ و معطل قرار دے دیئے گئے تھے اور بہت سے مستحبات و سنن حرام و متروک، قرآن کو ایک چیستان سمجھ کر بالائے طاق رکھ دیا گیا تھا۔ اس کو عوام کی سمجھ سے بالاتر قرار دے کر صرف چند خاص مواقع پر ثواب بخشنے یا حلف اٹھانے وغیرہ کے کام میں لیا جاتا تھا۔ اس میں غور کرنا باعث گمراہی متصور ہوتا تھا۔ اسلام کے تمام شعائر و آداب اٹھ چکے تھے ان کی جگہ دیگر رسوم و آداب نے لے لی تھی۔ اس کے علاوہ ہندی ویدانت، ایرانی تصوف، یونانی فلسفہ، حلول، بروز اور وحدۃ الوجود کے عقیدے لوگوں کے دل و دماغ میں رچ بس گئے تھے، عوام وجدان پرستی، پیری مریدی اور خانقاہ پرستی میں پھنسے ہوئے تھے، پیرزادے مذہبی پیشوا بن کر لوگوں کو لوٹ رہے تھے، گدی نشین صوفیہ اور مسند آرا مشائخ سب اسی قسم کی دھڑے بندیوں میں مصروف، اپنے اپنے راگ اپنی اپنی منڈلیوں میں الاپ رہے تھے اور جھوٹے فقرا اپنے بزرگوں کے مزاروں پر چراغ جلائے رہزن بنے بیٹھے تھے۔ متقشف واعظین، خانقاہ نشین اور گمراہ صوفیہ لوگوں کو موضوعات و اباطیل کی طرف دعوت دے کر ان کے مال اور ایمان پر ڈاکہ ڈال رہے تھے۔

اس زمانہ میں مسلمانوں کی علمی و تعلیمی حالت بھی حد درجہ انحطاط پذیر تھی، ان کے مدارس میں ''درس نظامیہ'' کا وہی بے ثمر اور فرسودہ نظام تعلیم جاری تھا۔ جو مدت مدید سے ان کے رگ و پے میں جمود و تعطل کے جراثیم داخل کر رہا تھا۔ وہ ساری عمر صرف ونحو اور معانی میں ضائع کر دیتے اور انہی میں سر کھپاتے رہتے اصل علوم (کتاب وسنت) کی طرف انہیں کبھی توجہ نہ ہوتی۔ درسگاہوں میں صدرا قاضی مبارک، شمس بازغہ اور شرح مطالع کے شروح و حواشی اس کثرت سے رائج تھے کہ گویا اس کے علاوہ ان کا کوئی نصاب تعلیم تھا ہی نہیں۔ دینیات میں فقہ کے سوا کچھ نہ تھا، فقہائے سالفین کی تفریعات میں ڈوب کر اصل علم کو چھوڑ دیا تھا، حدیث میں صرف بطور تبرک مشکوٰۃ اور مشارق الانوار پڑھا دینا کافی سمجھتے تھے۔ قرآن مجید خارج از نصاب تھا۔ انھوں نے اس کی درس وتدریس میں وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہ سمجھی، دراصل انہیں یونانی علوم کی تحصیل سے ہی فرصت نہ تھی جو اس کی طرف توجہ دیتے۔ یہ وہ علوم تھے جن کا اپنے منبع و سرچشمہ یونان میں بھی رواج اٹھ گیا تھا۔ ان فضول اور بے فیض علوم سے ان کی ذہنیتیں مسخ ہوگئی تھیں۔ وہ محض عقائد وغیرہ کے استدلالی مناظرات اور کلامی بحثوں میں الجھ گئے تھے۔

اس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ اس زمانہ میں مسلمانوں کی کیا کیفیت تھی اور کس ماحول میں شاہ صاحب نے اپنی جدوجہد کا آغاز کیا۔

حج سے واپسی پر آپ کے مشاغل:۔

فیوض حرمین سے مالا مال ہوکر جب آپ ۱۱۴۵ھ-۱۷۳۳ء میں دہلی تشریف لائے تو حالات گردوپیش کا جائزہ لیا اور اپنے عزائم و مقاصد کو عملی جامہ پہنانے کے لئے سب سے پہلا قدم یہ اٹھایا کہ پرانی دلّی میں ایک مقام پر (جو مہندیوں کے نام سے مشہور ہے اور جہاں اب ان کے بزرگوں کی قبریں ہیں) اپنے والد کے ایک چھوٹے سے پرانے مکان میں درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا اور وہ مدرسہ رحیمیہ کے نام سے مشہور ہوا۔ جب آپ کے علمی کمال کا شہرہ بڑھا تو چند ہی دنوں میں اطراف واکناف سے طلبہ کھنچ کھنچ کر آنے لگے اور وہ جگہ تنگ ہوگئی۔ بادشاہ وقت سلطان محمد شاہ (رنگیلا) نے یہ کیفیت دیکھ کر شاہ صاحب کو بلایا اور شہر میں ایک عالیشان حویلی دیدی۔ آپ نے یہاں دارالحدیث کا افتتاح فرمایا اور پرانی جگہ غیر آباد ہوگئی۔ یہ نیا مدرسہ بڑا

عالیشان اور خوبصورت تھا۔ اور اب یہ ایک بڑا دارالعلوم سمجھا جانے لگا۔ آپ نے بڑی دلجمعی سے یہاں درس وتدریس کا مشغلہ جاری رکھا۔ دور دور سے طلبا آکر یہاں درس قرآن وحدیث میں شریک ہوئے اور کسب فیض کیا۔ یہ مدرسہ عرصہ تک قائم رہا اور آپ کے بعد آپ کے چاروں صاحبزادوں نے یہی مشغلہ درس وتدریس یہاں جاری رکھا اور ان کے بعد دیگر اہل علم حضرات نے یہ خدمت اپنے ذمہ لی۔ یہ سلسلہ کئی پشت تک اس خاندان میں چلتا رہا۔ بالآخر غدر ۱۲۸۴ھ۔ ۱۸۵۷ء میں یہ مدرسہ تباہ ہوا، لوگ وہاں کے کڑی تختے اتار کر لے گئے اور صرف مدرسہ شاہ عبدالعزیزؒ کا ہی نام رہ گیا۔

حرمین شریفین سے واپسی کے بعد اس تعلیم وتدریس کے زمانہ میں آپ نے اپنے اوقات عزیز کو تین اہم مشاغل میں صرف کرنے کے لئے مخصوص کرلیا تھا (۱) صبح کی عبادات واذوار وظائف وغیرہ سے فارغ ہوکر دوپہر تک حدیث کا درس دیتے۔ (۲) علم حدیث کے اسرار ورموز اور علوم نبوت کے حقائق ومعارف کے علاوہ دین کے دقائق وحقائق اور معرفت وتصوف کے اسرار وغوامض پر بھی تقریر فرما کر سامعین کو مستفیض فرماتے (۳) تیسرا نہایت اہم مشغلہ آپ کا یہ تھا کہ جو وقت ان دونوں مشاغل سے بچتا، اس کا کوئی لمحہ ضائع نہ ہونے دیتے بلکہ کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے۔ اس کے بعد آپ نے ہر فن کے لئے ایک شخص تیار کرلیا تھا جس فن کا جو طالب ہوتا اس کو اسی فن کے استاد کے سپرد فرمادیتے۔ یہ معلم حضرات آپ ہی کے پروردہ اور تربیت یافتہ تھے۔ اب مدرسہ ان ہی کے سپرد تھا، خود آپ حدیث کے معارف بیان کرتے اور لکھنے کا کام کرتے، آپ کی مصروفیت اور استغراق کا یہ عالم تھا کہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں ''آپ اشراق کے بعد جو بیٹھ جاتے تو دوپہر تک نہ زانو بدلتے نہ کھجلاتے اور نہ دہن مبارک سے تھوک پھینکتے''۔

آپ کا طریقۂ تعلیم:۔

اس زمانہ کی تعلیمی حالت پر تبصرہ اوپر گزر چکا ہے۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ وہ طریقہ کس قدر نکما اور بے سود تھا۔ شاہ صاحب نے اس طریقہ کو بالکل ترک کردیا اور وہی طریقہ تعلیم جاری فرمایا جس کی بنیاد آپ کے والد ماجد ڈال گئے تھے۔ اس کا مختصر حال یہ ہے کہ پہلے آپ صرف ونحو کے مختصر تین چار چار رسائل حسب استعداد طالب علم کو حفظ کرادیتے، اس کے بعد حکمت یا تاریخ

کی کوئی عربی کتاب پڑھا دی جاتی اس طرح اس کے علم لغت میں اضافہ ہو جاتا، عربی زبان پر قدرت حاصل ہو جانے کے بعد موطا امام مالک کا درس دیا جاتا، قرآن مجید کا ترجمہ بغیر تفسیر کے پڑھایا جاتا، البتہ جہاں کہیں شان نزول یا قاعدۂ نحویہ کی کوئی مشکل اسے پیش آتی تو اس کو اچھی طرح حل کر کے آگے درس دیا جاتا۔ اس کے بعد تفسیر جلالین بقدر نصاب پڑھائی جاتی۔ اس سے فراغت کے بعد ایک وقت کتب حدیث مثلاً صحیح بخاری، صحیح مسلم وغیرہ اور کتب فقہ عقائد و سلوک وغیرہ اور دوسرے وقت کتب حکمت پڑھائی جاتیں، مثلاً شرح ملا، قطبی وغیرہ۔ یہ طریقہ بڑا مفید اور کامیاب رہا، اس سے طلبا کا ذہنی جمود اور قوائے غور و فکر کا تعطل دور ہو گیا۔ اب وہ اندھے مقلد ہونے کے بجائے محقق اور صحیح معنوں میں ''فقیہ محدث'' بن گئے اور ان میں یہ ملکہ پیدا ہو گیا کہ آیات و احادیث میں غور و تدبر کر کے اس کے مطالب سمجھ سکیں۔

ترجمہ قرآن مجید اور فتنہ علمائے سو:-

شاہ صاحب کے زمانے میں جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، قرآن مجید کی طرف کوئی توجہ نہ دیتا تھا، اس کو عمدہ ریشمی جزدانوں میں محفوظ رکھا جاتا تھا تاکہ بوقت ضرورت فال لینے یا حلف اٹھانے کے کام آئے۔ عملی زندگی میں اس سے کوئی استفادہ نہ کیا جاتا تھا، مراجعت حرمین کے بعد آپ نے یہ صورت حال دیکھ کر ان کی اصلاح کی خاطر قرآن مجید کا وہاں کی مروجہ زبان فارسی میں ترجمہ کرنا شروع کیا، سلسلۂ درس و ارشاد کے ساتھ اس ترجمہ کا آغاز ۱۱۵۰ھ-۱۷۳۷ء میں ہوا اور ۱۱۵۱ھ-۱۷۳۸ء میں اس کی تکمیل ہوئی، پھر ۱۱۵۶ھ-۱۷۴۳ء میں اس کی تدریس کا سلسلہ شروع ہوا۔

شاہ ولی اللہ پہلے بزرگ ہیں جنھوں نے ساڑھے گیارہ سو برس کے بعد سرزمین ہندوستان میں قرآن مجید کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا اور اسی کے بعد ترجمہ قرآن کی بنیاد پڑی، آپ ہی کے تتبع میں آپ کے صاحبزادے حضرت شاہ رفیع الدین نے قرآن مجید کا لفظی ترجمہ اردو میں کیا اور دوسرے فرزند حضرت شاہ عبدالقادر نے بامحاورہ اردو ترجمہ کیا۔ الغرض اس ترجمہ کا باب سب سے پہلے آپ ہی نے کھولا اور اگر غور کیا جائے تو یہ امت مسلمہ پر آپ کا بہت بڑا احسان ہے، ورنہ کچھ عجب نہیں کہ ہم ترجمۃ القرآن سے اب تک محروم رہتے، لیکن اس زمانے کے علمائے سو بجائے

آپ کے ممنون احسان ہونے اور ہمت افزائی کرنے کے آپ کے مخالف بن گئے اور عوام میں آپ کے خلاف شورش برپا کردی کہ "اس طرح یہ شخص لوگوں میں گمراہی پھیلانا چاہتا ہے۔ قرآن کا ترجمہ پڑھ کر لوگ بھٹک جائیں گے اس نے دین اسلام میں ایک زبردست بدعت کی بنا ڈالی ہے۔ سلف صالحین نے کبھی ایسا نہیں کیا، ایسا مجرم اور بدعت سیئہ کا مرتکب واجب القتل ہے وغیرہ وغیرہ"۔ مخالفین نے آپ کے اس فعل حسن کو محض اپنے عناد اور دشمنی کی بنا پر عجب رنگ چڑھایا، بہت سے لوگوں کو آپ کے خلاف ورغلایا اور تمام شہر میں اس کے خلاف پروپیگنڈہ کیا۔ حتیٰ کہ ایک مرتبہ عصر کے وقت جب شاہ صاحب مسجد فتح پوری سے نکل رہے تھے تو ان معاندین نے چند غنڈوں کو ہمراہ لے کر آپ کو گھیر لیا لیکن آپ کسی طرح بچ کر نکل گئے۔ اس کے بعد یہ مخالفت آہستہ آہستہ ٹھنڈی پڑتی گئی اور آج یہ کیفیت ہے کہ ہم اسی کارنمایاں پر آپ کی بدیۂ تحسین پیش کر رہے ہیں، اور ہمارا خیال ہے کہ اگر آپ نے صرف یہی خدمت انجام دی ہوتی تو یہ آپ کا نام زندہ رکھنے کے لئے بہت کافی تھی۔

آپ کے اصلاحی کارنامے:۔

ابھی ہم آپ کے دو شاندار کارناموں کا ذکر کر چکے ہیں، ایک تو اس زمانہ کے طریقۂ تعلیم کو بدلنا اور نئے اسلوب پر درس دینا، اور دوسرے قرآن وحدیث کے تراجم مروجہ زبان میں کرنا۔ اگر غور کیا جائے تو یہ دونوں کام قوم کی اصلاح کے لئے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں، ان ہی کے ذریعہ ایک قوم کے انداز فکر اور زاویۂ نگاہ کو بدلا جا سکتا ہے، خصوصاً ترجمہ قرآن کی بنیاد ڈالا جانا ہم لوگوں کے حق میں آپ کی سب سے بڑی خدمت اسلام ہے۔ اس کے علاوہ جو خدمات جلیلہ آپ نے انجام دیں ان کا مختصر حال حسب ذیل ہے:

آپ نے متعصب فرقہ پرستوں اور مختلف مکتب خیال کے لوگوں کو ایک نقطۂ عدل پر لا کر ان میں ہم آہنگی اور اتفاق پیدا کرنے کی کوشش فرمائی، اس زمانہ میں افتراق وتشتت اپنی انتہا کو پہنچا ہوا تھا، ہر فرقہ دوسرے کو کافر وزندیق گردانتا تھا، کٹر حنفیوں اور متشدد اہل حدیث کے درمیان مدتوں سے جھگڑا چلا آتا تھا ادھر سنی وغالی شیعہ باہم دست بگریباں تھے۔ دوسرے فرقے بھی باہمی چپقلش اور جنگ وجدل سے باز نہ رہتے تھے۔ تفرق وتحزب کی ایک ملک گیر وبا پھیلی ہوئی تھی۔

ان حالات میں آپ نے تحریر و تقریر دونوں طریقوں سے اس کے خلاف کوشش کی، ہر ایک کی افراط و تفریط اور لغزش نمایاں فرمائی۔ اور ان موضوعات پر مختلف کتابیں اور رسالے تصنیف کئے جن سے ہر شخص راہ صواب کا پتہ چلا سکتا ہے۔ امت کی سالمیت اور اس کے اتحاد کو برقرار رکھنے میں یہ آپ کا جلیل القدر کارنامہ ہے۔

اس زمانہ کا دوسرا فتنہ معقولین کی خرابی ہے۔ ان لوگوں کے دماغ یونانی فلسفہ اور عجمی افکار باطلہ سے اس درجہ ماؤف ہو گئے تھے کہ اس کے علاوہ کسی دوسرے علم کی طرف توجہ دینا تو درکنار اس کو ذرا بھی وقعت نہ دیتے تھے۔ ان کی ساری عمر منطق، علوم عقلیہ اور الٰہیات کی لا یعنی بحثوں میں گزر جاتی، تمام وقت وہ لفظی موشگافیوں، بے معنی خرافات اور فرسودہ فلسفہ یونان کی تحصیل میں گزار دیتے جو عملی دنیا میں کسی کام کا نہ تھا۔ آپ نے ان کی یہ کیفیت دیکھ کر ایک طرف تو انہیں ان لفظی گورکھ دھندوں اور بے فیض علوم میں تضیع اوقات سے روکا اور دوسری طرف ایک ایسا نیا فلسفہ پیش کیا جو بجا طور پر فلسفۂ اسلام کہلایا جا سکتا ہے اور جس کا انسان کی عملی زندگی سے گہرا تعلق ہے۔ قرآن مجید و احادیث نبوی کے نصوص وکلیات کے مطابق ایک صحیح فلسفۂ اسلام مدون کرنے کی کامیاب کوشش اب تک صرف آپ ہی نے فرمائی ہے اور یہ آپ کا نہایت قابل قدر کارنامہ ہے۔

ایک اور وبا جو آپ کے وقت میں ملک پر تسلط تھی وہ عجمی تصوف اور اس کی بے سروپا خرافات ہیں۔ اس زمانہ میں متقشف صوفیہ اور گمراہ مشائخ نے اپنے من گھڑت اصول، اجنبی افکار اور مختلف خرافات واباطیل کو ''تصوف'' کا نام دے کر ملک میں رائج کر رکھا تھا۔ آپ نے بزور قلم ان کے طلسم وافسوں کی دھجیاں بکھیر دیں اور ان کے مزعومات باطلہ کی تردید کر کے کتاب وسنت کی روشنی میں ''احسان'' کی واضح اور روشن راہ لوگوں کے سامنے پیش کی اور وقت کے ایک اہم تقاضے کو پورا کیا۔

ایک اور خطرہ جو اس زمانہ میں لاحق تھا وہ فرنگی اقتدار اور مغربی خیالات کی اشاعت کے باعث اسلام کے متعلق شکوک وشبہات پیدا ہونے کا خدشہ تھا۔ اگرچہ بعینہٖ اسی قسم کا دور ارتیاب اس سے قبل بھی آ چکا تھا اور اس زمانہ کے علمائے کرام نے پوری قوت سے مقابلہ کر کے اس کا سد باب کر دیا تھا لیکن اب یہ فتنہ اس سے خطرناک شکل میں آنے والا تھا۔ شاہ صاحب نے اس خطرہ کو

بھانپ کر اس کے تدارک و مدافعت کے لئے مکمل دلائل و براہین کا ایک بے بہا ذخیرہ فراہم کر دیا تا کہ آئندہ نسلیں ان سے مرعوب ہو کر صحیح راہ نہ چھوڑ دیں۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ آپ کے زمانہ میں حدیث و قرآن کا ذوق بالکل فنا ہو گیا تھا۔ ان کی جگہ فقہائے متاخرین کے فتاوے اور تفریعات نے لے لی تھی، ہر طرف انہی کا شور و غلغلہ تھا۔ کتاب و سنت کی طرف کسی کی نظر نہ تھی۔ کتاب و سنت سے تمسک کے بارے میں مجدد الف ثانیؒ اور شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کی تحریصات و ترغیبات کا اثر بالکل زائل ہو چکا تھا۔ اور وہی فضا پیدا ہو گئی تھی جس سے ان دو بزرگوں کو مقابلہ کرنا پڑا تھا۔ شاہ صاحب نے یہ صورت حال دیکھ کر ان کتب کی ''پوجا'' ختم کرائی اور علم کے اصل منبع قرآن و حدیث کی طرف توجہ دلائی اور روح اجتہاد کو زندہ کیا۔ آپ ہی کی انتھک کوشش اور مخلصانہ جدو جہد کا نتیجہ ہے کہ آج کل ہم اس ملک میں علوم قرآن و حدیث کا چرچا دیکھتے ہیں۔ اسی بارے میں مصر کے مشہور علامہ رشید رضا مقدمہ مفتاح کنوز السنہ میں فرماتے ہیں ''اگر ہمارے بھائی ہندوستان کے علما کی توجہ اس زمانہ میں علوم حدیث کی طرف مبذول نہ ہوتی تو اس علم کے زوال اور فنا کا فیصلہ ہو چکا تھا۔

اس زمانہ کے نواب و سلاطین اور عوام کی دینی و اخلاقی حالت کا بیان پیچھے گزر چکا ہے، آپ نے ان کو اس خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لئے معاشرہ کے ہر طبقہ اور ہر گروہ سے مخاطب ہو کر اس کی خامیوں سے مطلع کیا اور اس کے انجام سے ڈرا کر صحیح راستے پر لانے کی نہایت واضح الفاظ میں تلقین کی۔ ان کے تمام عیوب گنا کر ان کا علاج تجویز کیا اور اس ڈھنگ سے تنبیہ فرمائی کہ اگر کوئی زندہ دل اور حوصلہ مند قوم ہوتی تو یک لخت اپنی غلط راہ و روش سے باز آ جاتی۔ آپ کی گراں قدر تصنیف ''تفہیمات'' میں اس قسم کے مسلسل الارم موجود ہیں جو اس زمانہ کی صورت حال کا ایک زندہ مرقع بھی ہیں۔ اور آپ کے مخلصانہ جذبات و عزائم کا ثبوت بھی۔

آپ کی جدو جہد کے نتائج:۔

آپ کے کارنامے تمام تر تحریری و قولی ہیں۔ اس وقت کے حالات کے پیش نظر آپ میدان عمل میں نہ اترے اور نہ جہاد کیا، لیکن محض قلم کے ذریعہ آپ نے وہ خدمت انجام دی جو رہتی دنیا تک یادر ہے گی۔ تعلیمات اسلام میں جو خرافات اور بے سرو پا باتیں شامل کر دی گئی تھیں آپ نے

ان کو الگ کیا اور دین کو ایک منظم و مرتب نظام زندگی کی حیثیت سے پیش کیا، معاندین کے اعتراضات کا کماحقہ رد کیا اور مشتبہ مقامات کی صراحت فرمائی، عقل ونقل دونوں اعتبار سے دین اسلام کو مطابق فطرت ثابت کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ کتاب وسنت کے احکام عوام تک پہنچانے کا انتظام بذریعہ ترجمہ فرمایا۔ دین کے ہر شعبہ کو باطل کی آمیزش سے پاک کیا اور اس کی اصل صورت لوگوں کے سامنے پیش کی۔

دراصل شاہ صاحب کا جہاد شمشیر سے گریز کسی بزدلی یا کاہلی کی بنا پر نہ تھا بلکہ اس زمانے کے حالات قابو سے باہر ہو چکے تھے۔ معاشرہ اپنے انحطاط کی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ جہاد کے لئے معتمد وتربیت یافتہ کارکنوں اور ہمراہیوں کا ہونا ازبس ضروری ہے اور ایسے حالات کا ہونا لازم ہے۔ جس میں جہاد بجائے اصلاح ودرستی کے ایک وجہ فساد نہ بن جائے، اگرچہ ہمیں یہ علم نہیں کہ کن وجوہات کی بنا پر آپ نے جہاد سے گریز فرمایا اور کیا حالات تھے جو آپ کو اس اقدام سے مانع رہے لیکن آپ کی سیرت کے مطالعہ اور تحریر وتقریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ واقعی کوئی ایسی ہی صورت حال ہوگی جو آپ شمشیر زنی اور قتل وقتال سے باز رہے۔ چنانچہ آپ خود ''تفہیمات الٰہیہ'' میں فرماتے ہیں۔

''اگر بالفرض یہ شخص (یعنی خود شاہ صاحب) ایسے زمانے میں پیدا ہوتا کہ اسباب کا اقتضا یہی ہوتا کہ لوگوں کو جنگ وقتال سے درست کیا جائے اور اس کے دل میں ڈالا جاتا کہ تلوار ہی سے دنیا کے نظام کو درست کرے تو یہ شخص پھر یہی کرتا اور الحمدللہ بڑی خوبی سے اس کام کو انجام دیتا اور دنیا دیکھ لیتی کہ رستم واسفندیار بھی اس کے مقابلہ میں ہیچ ہیں بلکہ وہ اس کے طفیل اور شاگرد بننے کے لائق ہیں''۔

یہی وجہ تھی کہ آپ نے حالات کو جہاد کے ناموافق پا کر اس معاشرہ کے ذہین ومفکر لوگوں کو اکٹھا کیا اور ان کو اپنی تعلیمات وارشادات سے بہرہ اندوز کر کے اس قابل بنادیا کہ وہ کسی آئندہ زمانہ میں ان کے مشن کے مطابق ایک انقلاب برپا کرسکیں۔ ان ذی عقل اور صاحب فہم تلامذہ نے آپ سے پورا استفادہ کیا اور کچھ عرصہ بعد آپ ہی کی نسل سے شاہ اسمٰعیل شہید اور سید احمد شہید اٹھے اور شرک وبدعت مٹانے کی خاطر علم جہاد بلند کیا۔

آپ کے کارنامے وقتی نہیں بلکہ ایک مستقل افادی حیثیت کے مالک ہیں۔ آپ کی تصانیف سے خاص و عام اب تک استفادہ کرتے آرہے ہیں، ملک کی دینی وعلمی حالت کا سدھار بہت حد تک آپ ہی کا مرہون منت ہے۔ اگر آپ نے اس وقت علم کی شمع روشن نہ کی ہوتی تو نہ معلوم اس وقت جہالت وظلمت کی کیا کیفیت ہوتی۔ آپ ہی کی نکالی ہوئی نہریں اور روشن کئے ہوئے چراغ ہیں جن سے ہم اب تک مستفید ہو رہے ہیں۔

مقام ومنصب:۔

آپ کی منزلت علمی کے بارے میں کچھ لکھنا گویا سورج کو چراغ دکھانا ہے آپ اسلام کے ان جلیل القدر علما میں سے ہیں جن کی شہرت وعظمت زمان ومکان کے حدود سے آگے بڑھ چکی ہے۔ آپ کا شمار عبقریین ونوابغ میں ہوتا ہے۔ آپ جیسی عالی پایہ شخصیتیں اور یگانہ روزگار ہستیاں بہت کم وجود میں آتی ہیں۔ آپ بقول خود زوال وانحطاط کے زمانہ میں پیدا ہوئے ہیں اور اس کو آپ تخزیج بر تخزیج وتفریع بر تفریع کا دور فرماتے ہیں۔ اس زمانہ کی کچھ کیفیت اوپر بیان ہو چکی ہے اس دور ظلمت وجہالت میں ایسی وسیع النظر، دقیقہ رس اور ژرف نگاہ ہستی کا جنم لینا بجائے خود ایک قابل حیرت امر ہے۔ آپ نے اپنے ماحول سے کوئی اثر نہیں لیا۔ آپ کی ذہنی سطح اور آپ کے علوم ومعارف اپنے ہم عصر علما کی سطح سے بہت بلند ہیں۔ نواب صدیق حسن خاں "اتحاف النبلا" میں صحیح فرماتے ہیں۔ "اگر وجوداو در صدر اول درزمانہ ماضی می بود، امام الائمہ وتاج المجتہدین شمردہ می شد" یعنی "اگر آپ کا وجود گزشتہ زمانہ میں صدر اول میں ہوتا تو تمام مجتہدین کے پیشوا اور مقتدا مانے جاتے بلکہ ان کے سرتاج بنائے جاتے اور امام الائمہ کا گرانقدر خطاب پاتے۔

آپ کے علمی وذہنی کمالات واقعی اسی تعریف وتوصیف کے لائق ہیں۔ اور آج بھی امت مسلمہ آپ کو "حکیم الامت" اور "مجدد ملت" کے القاب سے یاد کرتی ہے، آپ کے خارق عادات علمی کارناموں اور غیر معمولی ذہانت ودینی خدمات جلیلہ کو دیکھ کر آپ کے ہم عصر علماء وفضلا نے بھی بڑی قدر ومنزلت سے آپ کا ذکر کیا ہے۔ مرزا محمد مظہر جان جاناں فرماتے ہیں۔ "حضرت شاہ ولی اللہ محدث رحمہ اللہ طریقۂ جدیدہ بیان نمودہ اند۔ در تحقیق اسرار معارف وغوامض علوم طرز خاص دارند، بایں ہمہ علوم وکمالات، از علمار ربانی اند۔ مثل ایشان در محققان صوفیہ کہ جامع اند در علم ظاہر

وباطن وعلم نو بیان کردہ اند، چند کس گزشتہ باشند''۔ آپ کے ایک اور معاصر مولانا فخر الدین فخر جہاں دہلوی اپنے رسالہ ''فخر الحسن'' میں آپ کو اس طرح یاد کرتے ہیں۔ شیخ صاحب المقامات العالیہ والکرامات الجلیلہ الشیخ ولی اللہ المحدث سلمہ اللہ تعالیٰ وابقاہ''۔

مولانا شاہ محمد عاشق پھلتی جو آپ کے خاص عقیدتمندوں میں سے تھے مقدمہ ''خیر کثیر'' میں آپ کو اس طرح خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔

''ودریں زمان بایں مقام اسنی ذات، مجمع آیات، مطلع فیض وانوار، منبع علوم واسرار، مخزن کنوز کمالات وراثت محمدیہ، معدن نقود رموز وصایت احمدیہ، مجدد قواعد شریعت، مقنن قوانین طریقت، مبین غوامض معرفت، محقق دقائق حقیقت، اعظم المحدثین، ولی العصر، لسان اللہ، قطب الدین احمد، ابوالفیاض شیخ ولی اللہ است مد اللہ ظلال ارضاہ علی العالمین الی یوم الدین، کما ہو ثابت عند اہل المعرفۃ والیقین۔

اس کے علاوہ صاحب ''سیر الاخیار'' نے بھی آپ کا تذکرہ لکھا ہے اور اس میں آپ کے یکتائے روزگار اور مجتہد عصر ہونے کا اعتراف کیا ہے۔

علاوہ ازیں امیر شاہ خان کی زبانی مولانا محمد قاسم نانوتوی (بانی دارالعلوم دیوبند) کا ایک واقعہ منقول ہے جس سے شاہ صاحب کی ہند کے علاوہ دیگر اقطار عرب وعجم میں مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ ''مولانا نانوتوی کا جہاز دوران سفر حج میں یمن کی کسی بندرگاہ پر رک گیا۔ مولانا کو کسی کے ذریعہ معلوم ہوا کہ اس شہر میں کوئی معمر بزرگ بھی رہتے ہیں۔ جب ملاقات کی تو ان کے علم سے بہت متاثر ہوئے اور درخواست کی کہ سند اجازت عطا ہو۔ اس پر محدث صاحب نے پوچھا تو کس کے شاگرد ہو؟ انھوں نے اپنا سلسلۂ تلمذ شاہ عبدالعزیز صاحب (شاگرد فرزند شاہ ولی اللہ) تک بیان کیا تو وہ بزرگ بولے ''ہاں میں ان کو جانتا ہوں۔ میرے نزدیک شاہ ولی اللہ گویا شجر طوبیٰ ہیں، جس طرح جہاں جہاں طوبیٰ کی شاخیں ہیں۔ وہاں جنت ہے اور جہاں اس کی شاخیں نہیں وہاں جنت نہیں ہے۔ اسی طرح جہاں شاہ ولی اللہ کا سلسلہ ہے وہاں جنت ہے اور جہاں ان کا سلسلہ نہیں وہاں جنت نہیں''۔

یہ تو آپ کے حلقہ بگوشوں اور عقیدتمندوں کا اظہار خیال تھا۔ ان کے علاوہ مولانا فضل حق

خیرآبادی نے بھی آپ کی عظمت کا اعتراف کیا ہے جن کے متعلق مشہور ہے کہ وہ بجائے عقیدت ونیاز کے اپنے آپ کو علم کے اس سلسلہ اور خانوادہ کا حریف مقابل سمجھا کرتے تھے، چنانچہ ان کے شاگرد رشید مولانا محسن بہاری اپنی کتاب ''الیانع الجنی'' میں خود اپنی سنی ہوئی شہادت بیان کرتے ہیں جبکہ وہ الور میں مولانا سے درس لیا کرتے تھے۔ فرماتے ہیں۔

''مولانا فضل حق کے ہاتھ ''ازالۃ الخفا'' کا ایک نسخہ کہیں سے لگا۔ مولانا اس کے مطالعہ کے بڑے خواہشمند تھے، جب بھی درس وتدریس یا دوسرے مشاغل سے فرصت ملتی تو بکثرت اسی کتاب کے مطالعہ میں مصروف رہتے۔ جب مولانا اس کتاب کا بیشتر حصہ پڑھ کر فارغ ہوئے تو آپ نے سب کے سامنے جن میں میں بھی شریک تھا یہ فرمایا کہ جس شخص نے یہ کتاب تصنیف کی ہے وہ تو ایک بحر بیکراں ہے، جس کے ساحل کا پتہ نہیں چلتا''۔

خودفہمی:۔

اپنی عظمت ومنصب کا آپ کو خود بھی احساس تھا اور اسی احساس نے آپ کے جذبۂ خود اعتمادی اور بے نیازی کو بڑھا دیا تھا۔ اسی احساس کے تحت آپ نے جو فرمایا نہایت ذمہ داری اور یقین سے فرمایا۔ اپنی عظمت کا اظہار بطور ''تحدیث نعمت'' آپ نے متعدد جگہ فرمایا ہے جن میں سے چند اقتباسات بطور مثال پیش کئے جاتے ہیں۔

(۱) ''اور مجھ پر اللہ تعالیٰ کے خاص احسانات میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے مجھے اس دور آخر کا ''ناطق'' اور ''حکیم'' اور ''قائد وزعیم'' بنا دیا (اور یہ میں فخراً نہیں کہتا)'' (تفہیمات)

(۲) ''میرے ذہن میں ڈالا گیا ہے کہ میں لوگوں تک یہ حقیقت پہنچا دوں کہ ''یہ زمانہ تیرا زمانہ ہے اور یہ وقت تیرا وقت ہے۔ افسوس اس پر جو تیرے جھنڈے کے نیچے نہ ہو''۔ (تفہیمات)

(۳) ''مجھ کو رب نے یہ سمجھایا کہ ہم نے تم کو اس طریقہ کا امام بنا دیا اور حقیقت قرب تک پہنچنے کے تمام راستوں کو بند کرکے صرف ایک راستہ کھلا رکھا ہے اور وہ تمہاری محبت اور اطاعت کا راستہ ہے، جو شخص تمہارا دشمن ہے۔ اس کے لئے آسمان آسمان نہیں اور زمین زمین نہیں۔ پس تمام اہل مشرق ومغرب تمہاری رعیت ہیں۔ اور تم ان کے بادشاہ۔ اس سے غرض نہیں کہ یہ لوگ جانتے ہیں یا نہیں۔ اگر جانتے ہیں تو کامیاب ہوں گے ورنہ نقصان اٹھائیں گے''۔ (تفہیمات)

(۴) ''میں نے خواب میں دیکھا کہ میں ''قائم الزماں'' یعنی اللہ تعالیٰ جب خیر کے کسی نظام کا ارادہ فرماتا ہے تو اپنے اس ارادہ کی تکمیل کے لئے وہ مجھے اوزار یا آلۂ کار کی طرح بنالیتا ہے''(فیوض الحرمین)

(۵) ''خداوند تعالیٰ نے ایک وقت میں میرے قلب میں ''میزان'' پیدا کردی جس کی وجہ سے میں ہر اس اختلاف کا سبب پہچان لیتا ہوں جو امت محمدیہ میں واقع ہوا، اور اس کو بھی پہچان لیتا ہوں جو خدا اور اس کے رسول کے نزدیک حق ہے اور خدا نے مجھ کو یہ بھی قدرت دی ہے کہ امر حق کو دلائل عقلیہ ونقلیہ سے اس طرح ثابت کردوں کہ اس میں کسی قسم کا شبہ اور اشکال باقی نہ رہے''۔ (حجۃ اللہ البالغہ)

ایک جگہ اپنے جلائل اعمال کا بالتفصیل تذکرہ اس طرح کرتے ہیں۔

(۶) ''حق تعالیٰ کا عظیم ترین انعام اس ضعیف بندہ پر یہ ہے کہ اس کو ''خلعت فاتحیہ'' بخشا گیا ہے اور اس آخری دور کا افتتاح اس سے کرایا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں جو کام مجھ سے لئے گئے ہیں وہ یہ ہیں کہ فقہ میں جو ''مرضی'' (پسندیہ نظریات) میں ان کو جمع کردوں اور اس کے لئے فقہ حدیث کی از سرنو بنیاد رکھ کر اس فن کی پوری عمارت تیار کی گئی اور آنحضرت صلعم کے تمام احکام وترغیبات اوران تعلیمات کے اسرار ومصالح کو اس طرح منضبط کیا گیا کہ اس فقیر سے پہلے اس کا کام عشر عشیر بھی نہیں کیا گیا تھا۔ نیز سلوک کا وہ طریقہ جو حق تعالیٰ کو پسند ہے۔ اور جو اس دور میں کامیاب ہوسکتا ہے مجھے اس کا الہام فرمایا گیا اور میں نے اس طریق کو اپنے دو رسالوں ''ہمعات'' اور ''الطاف القدس'' میں قلمبند کردیا ہے۔ ایک کام مجھ سے یہ لیا گیا کہ متقدمین اہل سنت کے عقائد کو میں نے دلائل وبراہین سے ثابت کیا اور معقولیوں کے شکوک وشبہات کے خس وخاشاک سے ان کو قطعی پاک کردیا اور ان کی تقریر بحمد اللہ ایسی کی جس کے بعد کسی بحث کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ علاوہ ازیں کمالات اربعہ ابداع، خلق، تدبیر اور تدلی کی حقیقت اور نفوس انسانیہ کی استعدادات کا علم مجھے عطا فرمایا گیا اور یہ دونوں ایسے علم ہیں کہ اس فقیر سے پہلے کسی نے ان کے کوچہ میں قدم بھی نہیں رکھا۔ اور حکمت عملی مجھے بھرپور دی گئی (یعنی تدبیر معاشیات کے اصول اور سیاست مدن کے ضوابط وغیرہ) اور کتاب وسنت وآثار صحابہ سے اس کی تطبیق وتفصیل کی توفیق بھی

نصیب ہوئی۔ اس کے علاوہ مجھے وہ ملکہ عطا فرمایا گیا جس کے ذریعہ میں یہ تمیز کرسکتا ہوں کہ دین کی اصل تعلیم جو فی الحقیقت رسول اللہ صلعم کی لائی ہوئی ہے وہ کیا ہے اور وہ کون کون سی باتیں ہیں بعد میں جو اس میں ٹھونسی گئی ہیں یا جو کسی بدعت پسند فرقہ کی تحریف کا نتیجہ ہیں۔ اگر میرے بدن کا رواں زبان بن جائے اور ہر وقت حمد الٰہی میں مصروف رہے تو بھی حق تعالیٰ کی حمد کا جو حق مجھ پر ہے وہ ادا نہیں ہوسکتا۔ والحمد للہ رب العالمین'' (الجزء اللطیف)

(۷) جب میرا دورۂ حکمت یعنی علم اسرار دین پورا ہوگیا تو اللہ تعالیٰ نے مجھے خلعت مجددیت پہنائی۔ پس میں نے مسائل اختلافی میں جمع (وتطبیق) کو معلوم کرلیا۔ (تفہیمات)

یہ اور اس قسم کے بیسیوں اقوال آپ کی تصانیف میں ملتے ہیں۔ خصوصاً ''تفہیمات'' میں یہ اشارات بکثرت ہیں، لیکن یہ تصریحات بطور تعلّی اور خودستائی کے نہیں اور نہ فخر وغرور کی بنا پر ہیں بلکہ جیسا کہ بعض مقامات پر خود اشارہ کردیا ہے بطور ''تحدیث نعمت'' اور تحمید الٰہی کے ہیں اور ان کے بیان کا خاص مقصد ہے۔ یہ دعوے ظاہر نظر میں اگرچہ بہت بلند بانگ اور حیران کن نظر آتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر آپ کے غیر معمولی کارناموں اور شاندار علمی خدمات کو بہ نظر غائر دیکھا جائے تو گھٹنے ٹیک دینے پڑتے ہیں اور ان کو تسلیم کئے بغیر چارہ نظر نہیں آتا۔

وفات:۔

آپ کی آخری عمر میں دہلی پر ایک متعصب شیعہ نجف علی خاں کا تسلط ہوگیا تھا۔ یہ مغل دربار کا آخری امیر تھا، اس نے بہت سے علما کو دردناک سزائیں دیں۔ امیر شاہ خاں ''امیر الروایات'' میں بیان فرماتے ہیں کہ ''اس نے شاہ ولی اللہ کے پہنچے اترا کر ہاتھ بیکار کردیے تھے تاکہ وہ کوئی کتاب یا مضمون تحریر نہ کرسکیں'' (۱) جب آپ کی عمر اکسٹھ سال سے کچھ زائد ہوئی تو مرض الموت نے آلیا اور چند روز کی خفیف سی علالت کے بعد آسمان علم کا یہ آفتاب جہاں تاب ۲۹ محرم ۱۱۷۶ھ/ ۱۷۶۳ء کو بوقت ظہر افق دہلی میں ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا اور اپنے پیچھے بے شمار کواکب و نجوم کو دمکتا چھوڑ گیا جو اس کی مستعار روشنی سے اب تک منور ہیں۔ مصرعۂ تاریخ وفات ہے ''او بود امام اعظم دیں''۔

---

(۱) یہ روایت ضعیف ہے۔ (قاسمی)

اولاد:-

شاہ صاحب نے اپنے پیچھے چار بیٹے یادگار چھوڑے۔شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر اور شاہ عبدالغنی۔ پھر شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر کے تو کوئی اولاد نرینہ نہ ہوئی۔لیکن شاہ رفیع الدین کے چار بیٹے ہوئے محمد موسیٰ، محمد عیسیٰ، محمد مخصوص اللہ اور حسن جان اور شاہ عبدالغنی کو اللہ تعالیٰ نے شاہ محمد اسمٰعیل جیسا ہونہار اور لائق فخر فرزند عطا فرمایا۔ان میں سے ہر ایک آسمان علم وفضل کا روشن ستارہ اور درخشاں مہتاب تھا۔نواب صدیق حسن خاں قنوجی اس خاندان کی تعریف ''اتحاف النبلا'' میں کیا خوب فرماتے ہیں۔

''ہر یکے از ایشاں بے نظیر وقت وفرید دہر ووحید عصر در علم وعمل وعقل وفہم وقوت تقریر وفصاحت تحریر وتقویٰ ودیانت وامانت ومراتب ولایت بود، وہم چنیں اولاد اولاد ایں سلسلہ از طلائے ناب است''۔

تلامذہ:-

شاہ صاحب کی بیشتر عمر درس وتدریس اور تصنیف وتالیف میں گزری، آپ کے شاگردوں کا حلقہ بہت وسیع تھا، ملک کے اطراف واکناف سے صدہا طالب علم آتے اور آپ سے مستفید ہوتے، حرمین شریفین سے بھی بامذاق عالم آپ سے علم سیکھنے آتے،اس طرح آپ کے تلامذہ کی بسیط فہرست ملنا مشکل ہے لیکن چند ممتاز شاگردوں میں آپ کے چاروں صاحبزادوں کے علاوہ شاہ محمد عاشق پھلتی، شاہ نور اللہ بڈھانوی، جمال الدین شاہ محمد امین کشمیری اور شاہ ابوسعید کے نام آتے ہیں جو آپ کے خاص رفقا بھی رہے ہیں اور اگر یہ کہا جائے کہ عصر حاضر کے تمام علمائے ہند آپ ہی کے معنوی شاگرد ہیں تو کسی طرح بیجا نہ ہوگا۔

مسلک:-

شاہ صاحب کا مسلک علما کے درمیان عرصہ سے متنازعہ فیہ موضوع رہا ہے۔بعض آپ کو حنفی ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں بعض اہل حدیث،بعض حضرات مقلد بتاتے ہیں تو بعض غیر مقلد بیان کرتے ہیں۔الغرض ہر گروہ آپ کو اپنے زمرہ اور فرقہ میں شمار کرنے کی سعی کرتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ خود آپ کو اس تفرق وتحزب سے سخت نفرت تھی اور آپ تمام عمر اسی لعنت کو مٹانے

کی کوشش فرماتے رہے لیکن تعجب ہے کہ لوگوں نے آپ ہی کی شخصیت کو اس بحث کا موضوع قرار دے دیا۔

دراصل آپ کا طریقہ یہ تھا کہ کسی مسئلہ کو مقلدانہ نظر سے نہ دیکھتے بلکہ کتاب وسنت پر پیش کرتے اور پھر فقہ حنفیہ کے علاوہ دیگر مذاہب میں بھی اس کی تحقیق کرتے، جب ہر طرح اسے ٹھیک پاتے تو قبول فرما لیتے ورنہ متروک قرار دیتے گویا آپ ہر معاملہ پر ایک محقق کی حیثیت سے نظر ڈالتے تھے۔ کسی خاص مذہب کی جانب داری اور دیگر مذاہب سے عناد آپ کا طریقہ نہ تھا۔ جس مذہب کی کسی مسئلہ میں تائید فرماتے تو دلائل کی بنا پر اور مخالفت بھی بربنائے دلیل۔ اس تائید و مخالفت میں کوئی عصبیت اور جانبداری کارفرما نہ ہوتی۔ بہت سے مسائل ہیں جن میں آپ نے مسلک حنفی کی پیروی اختیار کی ہے اور بعض امور ایسے ہیں جن میں دیگر مذاہب کو ترجیح دی ہے اور انہی کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ بعض مقامات پر آپ نے دونوں مذاہب میں جمع کیا ہے لیکن جہاں یہ بات ناممکن نظر آئی وہاں جس کو اقرب الی السنہ اور صحیح تر پایا اسے ہی اختیار کیا اپنے مسلک کی توضیح کرتے ہوئے آپ ایک جگہ فرماتے ہیں۔

''میں مذاہب اربعہ مشہورہ میں بقدر امکان جمع کرتا ہوں اور صوم وصلوٰۃ وضوء غسل و حج کے مسائل اس وضع پر واقع ہیں جسے تمام اہل مذاہب جانتے ہیں۔ جب جمع و تطبیق غیر ممکن ہو جاتی ہے تو میں اس مذہب پر عمل کرتا ہوں جو دلیل کی رو سے زیادہ قوی اور حدیث کی رو سے صحیح ہے۔ کیونکہ خدائے قدوس نے مجھے اس قدر علم عطا فرمایا ہے کہ میں ضعیف وقوی میں اچھی طرح فرق کر سکتا ہوں اور فتویٰ دیتے وقت مستفتی کے حال کی بخوبی رعایت کر سکتا ہوں۔ ہر مقلد مذہب کو اس کے مسلک کے مطابق جواب دیتا ہوں اللہ تعالیٰ نے مجھے مذاہب مشہورہ کی معرفت عنایت فرمائی ہے''

ایک اور جگہ وصیت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''فروعی مسائل میں ان علما محدثین کا اتباع کرنا چاہئے جو فقہ وحدیث کے جامع ہوں۔ تفریعات فقہیہ کو ہمیشہ کتاب وسنت سے منطبق کرتے رہنا چاہئے۔ جو مسائل تفریعی کتاب وسنت کے موافق ہوں قبول کئے جائیں جو خلاف ہوں ان کو بالکل ترک کر دیا جائے۔ امت محمدی کے واسطے اجتہادی مسائل کو کتاب وسنت کی کسوٹی پر پرکھنا نہایت ضروری ہے، کسی حال میں اس سے

مفر نہیں، ایسے خشک دماغ فقہا کی بات کبھی نہ سننی چاہیئے۔ جو کسی ایک عالم کی تقلید کو اپنی دستاویز سمجھ لے اور سنت رسول کو ترک کردے۔ اس قسم کے کوڑھ مغز فقہا کی طرف کبھی بھی التفات نہ کرنا چاہیئے۔ بلکہ خدا کی خوشنودی اور قرب ان لوگوں سے دور رہنے میں ہے''۔

انفاس العارفین میں تحریر فرماتے ہیں: ''مخفی نہ رہے کہ میں بیشتر امور میں مذہب حنفی کے مطابق عمل کرتا ہوں لیکن بعض امور کو حدیث اور وجدان (حکمت وعقل) کے ذریعہ پرکھ کر دیگر مذاہب کے مطابق سرانجام دیتا ہوں۔ مثلاً قرأۃ فاتحہ خلف الامام اور قرأۃ فاتحہ در نماز جنازہ وغیرہ''

عادات وخصائل:-

شاہ صاحب نہایت سادہ طبیعت اور منکسر المزاج تھے۔ ہر شخص سے خواہ وہ کسی درجہ رتبہ یا مذہب کا ہو نہایت خندہ پیشانی سے ملتے۔ خلوت وجلوت میں کبھی کسی کی برائی بیان نہ کرتے اور دشمن کے حق میں بھی سوائے کلمہ خیر کے کچھ نہ کہتے۔ مزاج میں نرمی اور نفاست تھی۔ لیکن ریا ونمود اور ظاہری نمائش وشان وشوکت سے پرہیز فرماتے تھے۔ بازار میں نکلتے تو ہم عصر پیروں اور مشائخ کے برخلاف بالکل معمولی حیثیت سے مریدین کا کوئی بڑا ہجوم ساتھ نہ ہوتا۔ نہایت بلند ہمت، فراخ حوصلہ اور جفاکش تھے۔ بہادری اور شجاعت میں بھی کسی سے کم نہ تھے۔ مسجد فتح پوری کا واقعہ اور جہاد بالسیف کے متعلق آپ کا قول پہلے گزر چکا ہے اسی سے آپ کی دلیری اور مردانگی کا ثبوت ملتا ہے۔ مشکلات ومصائب کے مواقع پر نہایت صبر وسکون سے قائم رہتے اور پایۂ استقلال میں جنبش نہ آتی، اظہار حق کے سلسلہ میں آپ کو مختلف طریقہ سے ستانے کی کوشش کی گئی لیکن آپ نے نہایت مستقل مزاجی کا ثبوت دیا۔

آپ کے زمانہ میں شہر دہلی فتنوں اور خانہ جنگیوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ ایک مرتبہ جب صورت حال بہت خراب ہوگئی تو دہلی کے شرفا نے ہندو رسم کے مطابق ''جوہر'' کا ارادہ کرلیا تاکہ عزت وناموس بچا کر سب آگ میں جل مریں، لیکن شاہ صاحب کو جب ان کے اس ارادہ کا علم ہوا تو کربلا کے واقعات یاد دلا کر صبر وضبط کی تلقین کی جس سے متاثر ہوکر وہ اس قبیح ارادہ سے باز رہے۔

شاہ صاحب معیشت کے لحاظ سے متوسط طبقۂ امرا سے تعلق رکھتے تھے۔ اکثر مسکینوں،

ناداروں اور ضرورتمندوں کی امداد فرماتے تھے۔ طلبہ کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کی معیشت کا بھی خاص خیال رکھتے۔ اور بزرگوں کی مخلصانہ خدمات اور احباب کی مہمان نوازی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے۔ باوجود متمول ہونے کے نہایت سادہ زندگی بسر کرتے، اکثر اوقات آپ کے خوان پر سادہ روٹی اور بعض وقت سبزی ہوتی، شان بے نیازی کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ آپ نے کبھی شاہان وقت کی طرف چشم ارادہ سے نہ دیکھا۔

الغرض اس علم وفضل کے ساتھ آپ محاسن اخلاق، طاعت وزہد اور ورع وتقویٰ میں سلف صالحین کی سی شان رکھتے تھے۔

طرز تحریر وتقریر اور خصوصیات تصنیف:۔

ایک مصنف کی حیثیت سے شاہ صاحب کا درجہ نہایت بلند ہے۔ آپ نے مروجہ طرز نگارش کو جو محض نامانوس اور پرشکوہ الفاظ کے طلسم اور فضول قافیہ پیمائی کے افسوں میں گھرا ہوا تھا وسعت بخشی اور اس قابل کردیا کہ وہ ان لفظی گورکھ دھندوں اور بیجا ثقالت کی پابندیوں سے آزاد ہوکر حکیمانہ خیالات اور علمی مضامین کو بطریق احسن پیش کرسکے۔ زمانہ ماضی میں سب سے پہلے ابن خلدون نے یہ خدمت انجام دی تھی پھر ابن خلدون کے بعد آپ ہی ایک ایسے مصنف ہیں جنھوں نے اس اسلوب کو زندہ کیا۔

باوجود عجمی اور ہندوستانی ہونے کے آپ نے عربی فصاحت وبلاغت کا بےنظیر نمونہ پیش کیا جس کی عظمت وکمال کا اعتراف اہل زبان نے بھی کیا ہے۔ مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی فرماتے ہیں۔ ''شاہ ولی اللہ صاحب پہلے ہندوستانی مصنف ہیں جن کی عربی تصانیف (خصوصاً حجۃ اللہ البالغہ) میں اہل زبان کی سی روانی وقدرت اور عرب کی سی عربیت ہے اور وہ ان بے اعتدالیوں سے پاک ہیں جو عجمی علما کی عربی تحریر میں پائی جاتی ہیں''۔

اس کے علاوہ آپ ایک نئے اسلوب اور جداگانہ طرز کے بانی وموجد تھے، جو جامعیت، زور بیان، تحکم واعتماد اور فصاحت وبلاغت میں نبی صلعم کے طرز تکلم سے مشابہ ہے۔ جناب مولانا مناظر احسن گیلانی اسی کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ ''عربی زبان میں انھوں نے جتنی کتابیں لکھی ہیں ان میں ایک خاص قسم کی انشا کی جوان کا مخصوص اسلوب ہے۔ پوری پابندی کی ہے۔

شاہ صاحب پہلے آدمی ہیں جنھوں نے اپنی عبارتوں میں زیادہ تر ''جوامع الکلم، النبی الخاتم صلعم کے طرز گفتگو کی پیروی کی ہے۔ حتی الوسع وہ اس کی کوشش کرتے ہیں کہ اپنے مدعا کا اظہار انہی لغات اور انہی محاوروں سے کریں جو لسان نبوت اور زبان رسالت سے خاص تعلق رکھتے ہیں''۔

آپ کی یہ کیفیت دراصل مراجعت حرمین کے بعد سے ہوگئی تھی، چنانچہ شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں کہ ''حجاز سے واپس آنے کے بعد والد ماجد کی نسبت باطنی اور علم وتقریر کی حالت کچھ اور ہی ہوگئی تھی۔ جو آپ کے پرانے شاگرد تھے وہ آپ کی حالت حاضرہ کا حالت سابقہ سے مقابلہ کرتے تو ان کو اس کی نوعیت میں نمایاں فرق نظر آتا''۔ یہ دراصل ''ٹوٹے ہوئے قلم'' والے خواب کی تعبیر تھی جو آپ نے حرمین میں دیکھا تھا۔ خواب یہ تھا کہ ایک مکان میں حضرت امام حسنؓ و حسینؓ تشریف لائے، حضرت حسنؓ کے ہاتھ میں ایک قلم ہے جس کی نوک ٹوٹی ہوئی ہے۔ وہ آپ نے شاہ صاحب کو یہ فرماتے ہوئے عطا کرنا چاہا کہ یہ قلم ہمارے جد امجد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے، لیکن یہ کہہ کر ہاتھ روک لیا اور فرمانے لگے ذرا ٹھہرو، حسینؓ اسے درست کر دیں۔ حضرت حسینؓ نے وہ قلم لیا اور درست کرکے شاہ صاحب کو عنایت فرمایا اس خواب کی نہایت واضح تعبیر یہی ہے کہ مسلمانوں کے تصنیفی زوال اور علمی انحطاط کے بعد یہ خدمت آپ کے سپرد کی جائے گی۔ کہ تحریر و تصنیف کی خرابیاں دور فرما کر علم وادب کو بام عروج تک پہنچائیں اور یہ کہ آپ کے اسلوب تحریر کو ''جوامع الکلم'' کی خصوصیات حاصل ہوں۔

علاوہ ازیں آپ کی تحریر میں تحقیق وعلم اور فکر ونظر کے ساتھ ساتھ سوز واخلاص اور دردمندی کے جوہر بھی پائے جاتے ہیں جس کے باعث وہ محض ایک تحقیقی تصنیف ہی نہیں رہتی بلکہ ایک دینی مصلح کا پیغام اور اخلاقی معلم کا درس بن جاتی ہے۔ آپ نے اپنی اکثر کتب نہایت پرفتن و پرآشوب زمانہ میں تصنیف فرمائی ہیں۔ لیکن آپ حالات گردوپیش سے متاثر ہوکر جذبات کی رو میں نہیں بہہ جاتے اور نہ عام مصنفین کی طرح اپنی کتب میں زمانہ کا رونا روتے ہیں۔ بلکہ نہایت توازن واعتدال کے ساتھ قلم کو رواں رکھتے ہیں اور مرکزی نقطۂ خیال سے تجاوز نہیں فرماتے۔ آپ کی اسی خصوصیت کے متعلق علامہ سید سلیمان ندویؒ فرماتے ہیں: ''شاہ صاحب کی تصنیفات کے ہزاروں صفحے پڑھ جائیے آپ کو یہ معلوم بھی نہ ہوگا کہ یہ بارہویں صدی ہجری کے پرآشوب زمانہ

کی پیداوار ہے، جب ہر چیز بے اطمینانی اور بدامنی کی نذر تھی، صرف یہ معلوم ہوگا کہ فضل وعلم کا ایک دریا ہے جو کسی شور وغل کے بغیر سکون وآرام کے ساتھ بہہ رہا ہے جو زمان ومکان کے خس وخاشاک کی گندگی سے پاک وصاف ہے"۔

آپ کی ایک بڑی خصوصیت سبقت واولیت ہے آپ نے ایسے موضوعات پر قلم اٹھایا جو اس سے قبل چھیڑے نہ گئے تھے اور بالکل نئے مضامین بیان کئے۔ چنانچہ اسلام کے نظری، فکری، شرعی، اخلاقی اور اقتصادی نظام کو ایک منظم ومرتب صورت میں پیش کرنے کی کوشش سب سے پہلے آپ ہی نے کی ہے۔ اس کے علاوہ احکام شرعی کے حکم ومصالح بیان کرنا اور پورے نظام شرعی کو بہ دلائل وبراہین عین فطرت کے مطابق ثابت کرنا آپ ہی کا کارنامہ ہے۔ اور اس ضمن میں فلسفہ، تصوف، علم کلام اور فقہ وحدیث کے بارے میں جو متنوع مضامین آ گئے ہیں۔ وہ اس کے علاوہ ہیں، فن اصول تفسیر پر جو کچھ آپ سے قبل لکھا گیا وہ برائے نام ہے۔ اس فن کے اصول وقواعد کو باضابطہ طور پر آپ ہی نے مدون کیا۔ اور قرآن کے طرز بیان بلاغت اور اس کے مقاصد ومطالب، شان نزول، ناسخ، منسوخ اور آیات کی تطبیق وغیرہ بالکل نئے انداز پر بیان کی۔ خلافت اور اسلام کے نظام حکومت کی تشریح اور اختلاف مذاہب پر محققانہ تبصرہ جس طرح آپ نے فرمایا ہے اس کی توفیق آپ سے پیشتر کسی کو نصیب نہ ہوئی۔ قرآن مجید وحدیث کا فارسی ترجمہ بھی آپ کی اولیت کا ثبوت ہے۔

اس فضل تقدم اور شرف اوّلیت کے علاوہ آپ کی تصانیف میں شش جہتی بھی پائی جاتی ہے۔ شاید ہی کوئی فن ہوگا جس پر آپ نے خامہ فرسائی نہ کی ہو اور جس موضوع پر قلم اٹھایا اس پر سیر حاصل اور تشفی بخش گفتگو کی آپ کی تحریر میں ایجاز، وسعت نظر، سلامت فہم، سلاست بیان، قوت انشا اور رفعت خیال ودقت نظر بدرجہ اتم موجود ہے۔ اسی طرح آپ کی تقریر بھی نہایت مؤثر اور دلآویز ہوتی تھی۔ دینی مجالس اور علمی محفلوں میں آپ کی خوش بیانی اور لذت تقریر سامعین پر محویت کا عالم طاری کر دیتی تھی۔ آپ کی فصاحت وبلاغت اور قادر الکلامی کے موافق ومخالف سب معترف تھے۔

شاہ صاحب اگرچہ فطری طور پر شاعر نہ تھے لیکن بعض اوقات جب قلبی واردات اور باطنی

احساسات سے مضطرب ہوتے تو دلی تاثرات وجذبات کسی نہ کسی صورت سے کلام موزوں بن کر دل کی گہرائی سے نوک زبان پر آہی جاتے۔ عربی میں آپ کے نعتیہ قصائد اور فارسی میں کچھ غزلیں اور رباعیاں ملتی ہیں جو تمام تر آپ کے قلبی التہاب اور سوز وگداز کا عکس ہیں، فارسی میں آپ امین تخلص فرماتے تھے۔

ایک غزل کا مطلع ہے۔

دلے دارم ز خود خالی حبابش میتواں گفتن
درو کیفیتے جوش شرابش میتواں گفتن

ایک دوسری غزل کا شعر ہے۔

جہان وجاں فدائے وضع شوخ شہر آشوبت
قیامت می نمائی ودم عیسیٰ ومرہم ، ہم

ایک اور غزل کے دو شعر ملاحظہ ہوں۔

بہ زلف پیچ در پیچ کسے گم کردہ ام خود را
خروش درد دل شبہا نمی کردم چہ می کردم
دلے پر درد، جاں فگار، یار تند خودارم
جہاں را پر زیاریہا نمی کردم چہ می کردم

ایک رباعی ملاحظہ ہو:

در عشق تو از جملہ جہاں بگزشتم
وزہر چہ بجز یاد تو ا زاں بگزشتم
مقصود من بندہ بجز وصل تو نیست
اندر طلبت از دل وجاں بگزشتم

عربی کے نعتیہ قصیدہ ''اطیب النغم'' کا پہلا شعر ہے۔

كأن نجوما أومضت في الغياهب
عيون الأفاعي أو رؤس العقارب

"تاریکیوں میں جو ستارے چمک رہے، مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ گویا ناگوں کی آنکھیں ہیں یا بچھوؤں کے سر ہیں"

تصانیف:۔

آپ کی تصانیف بے شمار ہیں، بعض مورخین دو سو سے زائد بیان کرتے ہیں۔ مصنف "حیات ولی" نے ان کی تعداد اکیاون بتائی ہے۔ لیکن آگے لکھا ہے کہ "آپ کی تالیفات کے سلسلہ میں اور بھی بہت سی کتابیں ہیں، جو قدیم کتب خانوں میں موجود ہیں، مگر ہم نے صرف انہی کتابوں کا ذکر کیا ہے، جو مطبوع ہو کر شرق سے غرب تک نہایت وقعت کے ساتھ مشہور ہو چکی ہیں"۔

یہی نہیں کہ آپ کی تصنیفات کثیر ہیں بلکہ آپ نے ہر فن پر قلم اٹھایا ہے اور اس میں نئے نئے نکات اور نادر مضامین بیان کئے ہیں۔ قرآن، تفسیر، حدیث، فقہ، سیرت، فلسفہ، تصوف، سیاسیات، اقتصادیات وغیرہ تمام موضوعات پر اب بھی آپ کی بہت سی کتابیں ملتی ہیں۔ اور سب سے عجیب بات یہ ہے کہ آپ نے یہ تمام کام جیسا کہ حساب لگانے سے معلوم ہوتا ہے کہ ستائیس اٹھائیس برس سے بھی کم مدت میں انجام دیا ہے۔ اور نہایت پر آشوب اور پر فتن زمانہ میں! آپ کی منزلت علمی اور کمال فن کا یہ ایک واضح ثبوت ہے لیکن آپ کا اصلی مقام و مرتبہ جو آپ کو اسلام کی علمی و تصنیفی تاریخ میں حاصل ہے اسی وقت معلوم ہو سکتا ہے جب آپ کی کتب کا بامعان نظر مطالعہ کیا جائے۔

آپ کی چند مشہور اور متداول تصنیفات حسب ذیل ہیں:

ا۔ فتح الرحمٰن فی ترجمة القرآن:۔

یہ قرآن مجید کا فارسی ترجمہ ہے اور تاریخ اسلام میں سب سے پہلا اور بہترین ترجمہ ہے اتنی مدت گزر جانے کے باوجود اب تک اس کے مقابل کا کوئی ترجمہ نہیں ہو سکا اس کی چند خصوصیات پر شاہ صاحب نے خود مقدمہ فتح الرحمٰن میں روشنی ڈالی ہے۔ ترجمہ کے ساتھ جا بجا "فوائد" بھی ہیں جو نہایت مختصر ہیں لیکن جامعیت اور اشکال کی گرہ کشائی میں بے مثل ہیں۔ یہ ترجمہ ہندوستان میں متعدد بار شائع ہو چکا ہے حال ہی میں "اصح المطابع کراچی" نے شیخ الہند مولانا محمود حسن

دیو بندیؒ کے فارسی ترجمہ(۱) اور مختصر تفسیر عثمانی کے ساتھ شائع کیا ہے۔

۲۔الفوز الکبیر فی اصول التفسیر:۔

فارسی زبان میں اصول تفسیر پر مختصر لیکن جامع رسالہ ہے اس میں شاہ صاحب نے قرآن مجید کے علوم خمسہ، تاویل حروف مقطعات، رموز قصص انبیا اور اصول ناسخ و منسوخ پر نہایت مفید اور بصیرت افروز مقالات لکھے ہیں اور بڑے بڑے پیچیدہ مسائل مختصر الفاظ میں حل کر دیئے ہیں، یہ رسالہ متعدد بار شائع ہو چکا ہے۔اس کے اردو اور عربی میں تراجم بھی ہو چکے ہیں۔

۳۔فتح الخبیر بمالا بد من حفظہ فی علم التفسیر:۔

عربی زبان میں آیات قرآنی کی تمام ماثورہ تفاسیر کا جو آنحضرت صلعم اور صحابہ کرام سے صحیح طریقہ پر منقول ہیں ایک نہایت مختصر اور جامع نمونہ ہے۔ اس میں شرح غریب القرآن اور اسباب نزول پر جا بجا روشنی ڈالی گئی ہے۔الفوز الکبیر کے ساتھ طبع ہو چکی ہے۔

۴۔تاویل الاحادیث فی رموز قصص الانبیا:۔

انبیا علیہم السلام کے مکذبین پر جو عذاب آئے اور رسولوں کے ذریعہ جن معجزات کا ظہور ہوا اس کتاب میں ان کو مطابق فطرت ثابت کیا ہے اور بتایا ہے کہ وہ مخفی اسباب مادیہ کے باعث ظہور پذیر ہوئے ہیں۔ان کا خارق عادت ہونا محض ہماری کوتاہ نظری کی بنا پر ہے اور خدا تعالیٰ کا نظام کائنات ناقابل تغیر ہے۔یہ کتاب عربی زبان میں ہے اور اردو ترجمہ کے ساتھ شائع ہو چکی ہے۔

۵۔المسوّٰی من المؤطا:۔

عربی زبان میں مؤطا امام مالک کی شرح ہے۔ اس میں آپ نے احادیث کو اپنے مذاق کے موافق نئی ترتیب سے مدون کیا ہے اور شرح میں وہ اسلوب اختیار کیا ہے جو طالب علم کے لئے سہل اور دل نشین ہو۔حدیث سے مستنبط مسائل اور امام مالک پر دیگر ائمہ کے مناسب تعقبات بھی نہایت لطیف اشاروں میں بیان کئے ہیں۔ یہ کتاب گویا آپ کے اختیار کردہ طریقہ درس حدیث کا نمونہ ہے۔ ہندوستان میں المصفے کے ساتھ طبع ہو چکی ہے، مکہ سے بھی شائع ہوئی ہے۔

---

(۱) حضرت شیخ الہند کا ترجمہ قرآن اردو زبان میں ہے۔ (قاسمی)

۶۔المصفّٰی شرح مؤطا:۔

مؤطا امام مالک کی فارسی شرح ہے۔اس میں آپ نے احادیث اور آثار کو الگ الگ کر دیا ہے اور اقوال مالک کو مناسب طریقہ سے بیان کیا ہے۔ان کے آگے دیگر فقہا کے اقوال نقل کئے ہیں اور احادیث پر مجتہدانہ طریق پر بحث کی ہے۔

۷۔شرح تراجم ابواب صحیح البخاری:۔

اس رسالہ میں آپ نے امام بخاریؒ کے قائم کردہ عنوانات ابواب کی تشریح اور توجیہ اس طرح بیان کی ہے کہ ان کے ذیل میں دی ہوئی احادیث سے ابواب کی مناسبت صحیح طور پر سمجھ میں آجاتی ہے اور کوئی اغلاق باقی نہیں رہتا۔ یہ رسالہ عربی زبان میں ہے اور ''دائرۃ المعارف حیدرآباد'' سے شائع ہو چکا ہے۔''اصح المطابع'' نے بھی اسے صحیح بخاری کے ساتھ بطور مقدمہ شائع کیا ہے۔

۸۔ حجۃ اللہ البالغہ:۔

یہ کتاب بجا طور پر آپ کا تصنیفی شاہکار کہی جا سکتی ہے۔مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی اس کے متعلق فرماتے ہیں کہ:''شاہ صاحب کی یہ مایہ ناز تصنیف آنحضرت صلعم کے ان معجزات میں سے ہے جو آنحضرت صلعم کی وفات کے بعد آپ کے امتیوں کے ہاتھ پر ظاہر ہوئے۔اور جن سے اپنے وقت میں رسول اللہ صلعم کا اعجاز نمایاں اور اللہ کی حجت تمام ہوئی''۔

یہ کتاب دراصل اسی تعریف کے لائق ہے۔اس میں آپ نے تعلیمات اسلام کو مطابق فطرت اور احکام دینی کو مبنی بر عدل ثابت کیا ہے۔ ہر حکم الٰہی اور امر شریعت کے اسرار و مصالح نہایت بلیغ اور مدلل انداز میں بیان کئے ہیں جس سے ایک طرف تو متشکک اور متردد حضرات کے شکوک وشبہات کا ازالہ ہو جاتا ہے اور دوسری جانب معترضین کے احکام اسلام پر معاندانہ اعتراضات کا منہ توڑ جواب مل جاتا ہے۔شاہ صاحب کو یقین تھا کہ کچھ عرصہ بعد دور ''عقلیت'' شروع ہونے والا ہے جس میں احکام شریعت کے متعلق اوہام وشکوک کی گرم بازاری ہوگی۔اسی خطرہ کا سدباب کرنے کے لئے آپ نے یہ بے نظیر کتاب لکھی۔

اس کتاب میں آپ نے مابعد الطبعی مسائل سے ابتدا کی ہے اور فلسفۂ اسلام کو ایک مرتب

شکل میں پیش کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔قدرت کے قانون مکافات کو فلسفیانہ طرز پر بیان کیا ہے۔اس کے بعد آپ نے ارتفاقات کے زیر عنوان اقتصادیات اور سیاسیات کے مسائل پر بحث کی ہے، پھر اخلاقیات کا موضوع لیا ہے اور انسانی سعادت پر بحث کی ہے، اس کے بعد نظام شریعت اس کے عقائد وارکان پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کے اسرار و حکم بیان فرمائے ہیں اور معاصی و آثام پر تفصیلی بحث کی ہے۔بعد ازاں تاریخ مذاہب پر تبصرہ کیا ہے اور تشریع و قانون سازی کے بارے میں نہایت مفید نکات بیان کیے ہیں۔آخر میں آپ نے حدیث سے استنباط کا صحیح طریقہ بتایا ہے۔اور فقہ سے متعلق بیش بہا معلومات بہم پہنچائی ہیں۔دوسرے حصے میں آپ نے فقہی طرز پر ابواب قائم کر کے شریعت کے جملہ احکام پر مفصل تبصرہ کیا ہے۔اور ہر حکم کی علت اس کی حکمت اور فوائد و مصالح بیان کیے ہیں جس سے پڑھنے والا ان احکام پر علی وجہ البصیرت ایمان لے آتا ہے اور اس کے تمام شکوک و شبہات زائل ہو جاتے ہیں۔اس سلسلہ میں جناب محمد منظور صاحب نعمانی کی اپنی سرگزشت ملاحظہ ہو۔فرماتے ہیں: ''میں اپنی زندگی میں کسی بشر کی کتاب سے اتنا مستفید نہیں ہوا جس قدر کہ اس کتاب سے خدا نے مجھے فائدہ پہنچایا۔میں نے اسلام کو ایک مکمل اور مرتبط الاجزا نظام حیات کی حیثیت سے اس کتاب ہی سے جانا ہے۔دین مقدس کی ایسی بہت سی باتیں جن کو پہلے میں صرف تقلیداً مانتا تھا اس جلیل القدر کتاب کے مطالعہ کے بعد الحمدللہ میں ان پر تحقیقاً اور علی وجہ البصیرت یقین رکھتا ہوں''۔

نواب صدیق حسن خاں۔''اتحاف النبلا میں تحریر فرماتے ہیں:

''ایں کتاب اگر چہ در علم حدیث نیست، اما شرح احادیث بسیار دراں کردہ، و حکم واسرار آں بیان نمودہ، تا آنکہ درفن خود غیر مسبوق علیہ واقع شدہ، و مثل آن دریں دوازدہ صد سال ہجری، ہیچ یکے از علمائے عرب و عجم تصنیفے موجود نیامدہ''۔

یہ کتاب ہند و مصر سے متعدد بار شائع ہو چکی ہے۔اس کے اردو تراجم بھی ہو چکے ہیں۔ایک ترجمہ بعنوان'' آیات اللہ الکاملہ'' از جناب مولوی خلیل احمد صاحب اسرائیلی ۱۳۱۵ھ/۱۸۹۷ء میں لاہور سے بغیر متن طبع ہوا تھا۔اس کے بعد لاہور ہی سے ایک اور ترجمہ از عبدالحق صاحب بزاروی متن عربی کے ساتھ بعنوان ''شموس اللہ البالغہ'' شائع ہوا جو سرتاسر'' آیات اللہ الکاملہ'' کی نقل ہے،

صرف شروع کے چند ابواب کا ترجمہ بدل دیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ ایک دوسرا ترجمہ جناب محمد بشیر صاحب نے کیا اور کچھ تشریحی فوائد بھی شامل کئے۔ لیکن یہ ترجمہ نامکمل ہے اور مبحث دوم پر ختم ہو جاتا ہے۔ یہ چھوٹے سائز پر بغیر متن کے شائع ہوا ہے۔ حال ہی میں لاہور سے مولانا عبدالرحیم صاحب کا ترجمہ بھی بغیر متن عربی شائع ہوا ہے۔ ان سب تراجم سے پہلے جناب ابومحمد عبدالحق حقانی دہلوی مؤلف تفسیر حقانی نے اس بے نظیر کتاب کا ترجمہ عظیم آباد پٹنہ میں جناب مولوی سید محمد فضل الرحمٰن صاحب کے ایماء پر ۱۳۰۲ھ-۱۸۸۵ء میں کیا تھا۔ اور یہ مطبع رحمانی پٹنہ سے مولوی محمد صاحب کے زیر اہتمام ۱۳۱۰ھ-۱۸۹۳ء میں دو ضخیم جلدوں میں بغیر متن عربی کے شائع ہوا۔ یہ ترجمہ "نعمۃ اللہ السابغۃ" کے نام سے موسوم ہے۔ ایک غیر اہم اور غیر علمی مقام سے شائع ہونے کے بعد یہ زیادہ معروف نہ ہو سکا۔ اور علمی حلقوں سے حجاب میں رہا۔ حسن اتفاق سے اس کا ایک نسخہ پیر صاحب جھنڈا (سندھ) کے کتب خانہ عالیہ علمیہ میں موجود تھا۔ "اصح المطابع کراچی" نے اس پر نظر ثانی کرا کر عربی متن کے ساتھ شائع کیا ہے۔

۹۔ البدور البازغہ:۔

اس دقیق کتاب میں فلسفہ اور تصوف کے حقائق و معارف بیان کئے گئے ہیں اور بعض ابواب "حجۃ اللہ البالغۃ" کے مضامین کا خلاصہ ہیں۔ عربی زبان میں ہے اور مجلس علمی "ڈابھیل" کے زیر اہتمام شائع ہو چکی ہے۔

۱۰۔ ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء:۔

"حجۃ اللہ البالغۃ" کے بعد یہ آپ کی دوسری معرکۃ الآرا تصنیف ہے۔ اس میں آپ نے خلفائے راشدین کی خلافت قرآن مجید، احادیث، تفسیر، تاریخ وغیرہ سے دلائل و براہین دے کر حق ثابت کی ہے اور شیعہ سنی کے باہمی اختلافات کو نہایت عدل و انصاف سے حل کیا ہے جس سے جانبین کی غلط فہمیاں اور شدت و تعصب دور ہو جاتا ہے۔ اثبات خلافت راشدہ کے ساتھ ساتھ اس میں سیرت، تاریخ اور سیاست و خلافت کے بارے میں دیگر بیش بہا نکات بھی بیان ہوئے ہیں۔ مثلاً اسلام میں صحابہ کرام کا درجہ و مقام ان کے حقوق و فضائل، خلافت خاصہ کی تعریف اس کے اوصاف اور نبی، خلیفہ، محدث اور صدیق کی تعریف، حضرت عمر فاروق کے شاندار

کارنامے اور قابل قدر خدمات دینی، تاریخ اسلام کے مختلف ادوار اور ان پر ہر پہلو سے تبصرہ، اسلام کا تمدنی و عمرانی نظام اور اصول و سیاست وغیرہ۔ مولانا عبدالحی فرنگی محلی فرماتے ہیں کہ "اس موضوع پر پورے اسلامی لٹریچر میں ایسی کوئی کتاب موجود نہیں"۔ یہ فارسی زبان میں ہے اور "مطبع صدیقی بریلی" سے شائع ہو چکی ہے۔ اس کا اوّل چہارم حصہ مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی نے اپنے ترجمہ کے ساتھ شائع کیا تھا، ایک ترجمہ بغیر متن فارسی لاہور سے بھی شائع ہوا تھا لیکن وہ کثیر الغلط ہے۔

۱۱۔ التفہیمات الالٰہیہ:۔

یہ کتاب بقول جناب محمد منظور صاحب نعمانی "ولی اللہی کشکول" ہے اس میں زیادہ تر تصوف و سلوک سے متعلق مقالات ہیں، اور علوم شریعت کے بارے میں بھی مضامین ملتے ہیں بعض مقامات پر اپنے دور میں پیدا شدہ خرابیوں اور لوگوں کے عیوب و نقائص کی نشاندہی کی ہے اور معاشرہ کے ہر طبقہ کو مخاطب کر کے اصلاح پر ابھارا ہے۔ کچھ باتیں ماوراالطبیعی فلسفہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ بعض مقالات فارسی میں ہیں اور بعض عربی میں۔ پوری کتاب دو جلدوں میں ہے اور "مجلس علمی ڈابھیل" کے زیر اہتمام شائع ہو چکی ہے۔

۱۲۔ الخیر الکثیر:۔

تصوف اور "علم اسرار و حقائق" میں ایک اعلیٰ درجہ کی کتاب ہے۔ یہ بھی "مجلس علمی" نے شائع کی ہے۔ اس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ اصل زبان عربی ہے۔

۱۳۔ فیوض الحرمین:۔

قیام حرمین کے دوران جو فیوض و برکات بصورت خواب یا القا آپ کو حاصل ہوئے یہ ان ہی کا مجموعہ ہے۔ بعض جگہ پیشین گوئیاں بھی ہیں۔ اصل کتاب عربی میں ہے اور اردو ترجمہ کے ساتھ شائع ہو چکی ہے۔

۱۴۔ الانصاف فی بیان سبب الاختلاف:۔

اس رسالہ میں احکام شرعیہ کے متعلق صحابہ، تابعین اور ائمہ مجتہدین کے باہمی اختلافات کے اسباب اور اس کی تاریخ بیان کی ہے۔ اور ہر گروہ کی افراط و تفریط پر تنقید کی ہے۔ بے حد مفید

رسالہ ہے، اردو ترجمہ کے ساتھ متعدد بار شائع ہو چکا ہے۔ مصر میں بھی شائع ہوا ہے۔

۱۵۔ عقد الجید فی بیان احکام الاجتہاد والتقلید :۔

اس عربی رسالہ میں آپ نے اجتہاد اور تقلید کے مسئلہ پر نہایت محققانہ اور منصفانہ بحث کی ہے اردو ترجمہ کے ساتھ شائع ہو چکا ہے۔

۱۶۔ البلاغ المبین :۔

بعض نے اس کو "تحفۃ الموحدین" لکھا ہے۔ یہ رد شرک وبدعت اور دعوت توحید خالص میں فارسی زبان میں ایک مختصر لیکن جامع رسالہ ہے شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی "تقویۃ الایمان" گویا اسی کی شرح ہے، اردو ترجمہ کے ساتھ شائع ہو چکا ہے۔

۱۷۔ قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین :۔

تفضیل شیخین کے متعلق فارسی زبان میں نہایت عمدہ کتاب ہے، طبع ہو چکی ہے۔

۱۸۔ انسان العین فی مشائخ الحرمین :۔

شاہ صاحب نے دوران قیام حرمین میں جن شیوخ واساتذہ سے اکتساب فیض کیا اس رسالہ میں انہی کے حالات ہیں۔

۱۹۔ الدر الثمین فی مبشرات النبی الامین :۔

اس رسالہ میں ان بشارتوں کا بیان ہے جو آپ کو اور آپ کے نسبی یا روحانی بزرگوں کو نبی صلعم سے ہوئیں۔ عربی زبان میں ہے۔

۲۰۔ انفاس العارفین :۔

شاہ صاحب نے اس رسالہ میں اپنے بزرگوں کے حالات درج کیے ہیں۔ فارسی زبان میں ہے۔

۲۱۔ القول الجمیل :۔

تصوف، وظائف واذکار اور طریقت کے چاروں سلاسل کے بیان میں مختصر سی کتاب ہے۔ عربی میں ہے اور ترجمہ کے ساتھ شائع ہو چکی ہے۔

۲۲۔ الطاف القدس:۔

اس رسالہ میں شاہ صاحب نے تصوف کا وہ طریقہ لکھا ہے۔ جو آپ کے خیال میں انسب اور زمانۂ حاضر میں قابل عمل ہے۔ اس کا مضمون عام فہم نہیں، زبان فارسی ہے۔

۲۳۔ ہمعات:۔

یہ بھی تصوف سے متعلق رسالہ ہے اور مضمون ''الطاف القدس'' سے مشابہ ہے۔ دونوں رسالے شائع ہو چکے ہیں۔

۲۴۔ سرور المحزون فی ترجمۃ ''نور العیون'':۔

ابن سید الناسؒ نے سیرت نبوی پر ایک ضخیم کتاب ''عیون الاثر فی فنون المغازی والشمائل والسیر'' تالیف کی، اور پھر اس کا ایک جامع خلاصہ لکھا اور ''نور العیون فی تلخیص سیر الامین والمامون'' کے نام سے موسوم کیا۔ شاہ صاحب نے بعض دوستوں اور بزرگوں کے اصرار پر اس خلاصہ کا فارسی میں ''سرور المحزون'' کے نام سے ترجمہ کیا۔ کافی عرصہ ہوا یہ کانپور سے شائع ہوا تھا۔ حیدر آباد (دکن) سے اس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

۲۵۔ مکتوبات مع مناقب امام بخاریؒ وابن تیمیہؒ:۔

آپ کے چند اہم مکاتیب اور امام بخاریؒ وابن تیمیہؒ کے حالات پر دو مختصر رسائل کا مجموعہ ہے۔ مع اردو ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔

۲۶۔ مکتوب المعارف مع مکاتیب ثلثہ:۔

ایک چھوٹا سا رسالہ ہے جس میں آپ کے بعض خاص مکاتیب شامل ہیں۔

۲۷۔ الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف:۔

ایک مختصر سا فارسی رسالہ ہے جس میں آپ نے اپنی آپ بیتی درج فرمائی ہے اس کے اردو وعربی تراجم بھی شائع ہو چکے ہیں۔

۲۸۔ المقالۃ الوضیہ فی النصیحۃ والوصیہ:۔

فارسی زبان میں ایک مختصر سا وصیت نامہ ہے جس میں آپ نے اپنی اولاد، دوستوں، عقیدتمندوں اور شاگردوں کو آٹھ نصیحتیں فرمائیں ہیں اردو ترجمہ کے ساتھ شائع ہو چکا ہے۔

۲۹۔ چہل حدیث:۔

اس رسالہ میں آپ نے وہ احادیث جمع کردی ہیں جو اسلام کے بنیادی اصول سے متعلق ہیں مع ترجمہ متعدد بار شائع ہو چکا ہے۔

۳۰۔ اطیب النغم:۔

عربی میں آپ کے سوز وگداز سے معمور نعتیہ قصائد کا مجموعہ ہے۔

ان کے علاوہ دیگر رسائل وکتب کے نام حسب ذیل ہیں۔ ان میں سے کچھ تو طبع ہو چکی ہے لیکن بعض کے محض نام ہی نام تذکروں میں ملتے ہیں۔

(۳۱) الزہراوین، (۳۲) شفاء القلوب، (۳۳) الہوامع شرح حزب البحر، (۳۴) لمعات، (۳۵) سطعات، (۳۶) المسلسلات، (۳۷) الذکر المیمون، (۳۸) السر المکتوم، (۳۹) اعراب القرآن، (۴۰) الفضل المبین فی المسلسل من حدیث النبی الامین، (۴۱) العقیدہ والحسنہ، (۴۲) المقدمۃ السنیہ فی انتصار الفرقۃ السنیہ، (۴۳) شرح رباعیتین، (۴۴) العطیۃ الصمدیہ، (۴۵) فتح الودود فی معرفۃ الجنود، (۴۶) الارشاد الی مہمات الاسناد، (۴۷) رسالہ اوائل، (۴۸) تراجم البخاری (شرح تراجم ابواب البخاری) کے علاوہ ایک ورقہ رسالہ ہے) (۴۹) ما یجب حفظہ للناظر (یہ چار مختصر رسالے فن حدیث سے متعلق ہیں اور "مجموعۂ رسائل اربعہ کے نام سے شائع ہو چکے ہیں) (۵۰) آثار الاجداد، (۵۱) رسالہ دانشمندی، (۵۲) الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ، (۵۳) رسائل تفہیمات، (۵۴) النوادر من احادیث سید الاوائل والاواخر۔

آپ کی بیشتر کتب امتداد زمانہ کے باعث ضائع ہو چکی ہیں اور ان کے نام تک نہیں معلوم۔ بہت سی ایسی تصانیف ہیں جو اگرچہ معدوم تو نہیں ہوئیں لیکن اب تک لائبریریوں کی زینت ہیں اور طباعت سے محروم۔ بعض مطبوعہ کتب بھی کمیاب بلکہ نایاب ہیں۔

دیباچہ

سب طرح کی حمد وثنا اس خدا کے لئے ہے، جس نے انسان کی فطرت میں اسلام اور ہدایت رکھی اور ان کے لئے ملت حق وآسان وواضح کو جبلی کیا، پھر از خود وہ جہل اور برائی میں پڑ گئے، لیکن ان پر خدا نے بڑا رحم کیا کہ ان کے لئے انبیا ظلمت سے نور کی طرف لانے اور تنگی سے میدانِ فراخی میں پہنچانے کے واسطے بھیجے، اپنی اطاعت کا ان کی اطاعت پر مدار ٹھہرایا، اس بزرگی اور مرتبہ کا کیا ٹھکانا، پھر اس نے (یہ عنایت کی کہ) انبیا کے بعض متبعین کو ان کے علوم حاصل کرنے اور اسرار شریعت پر مطلع ہونے کی توفیق دی، یہاں تک کہ اس کے فضل وکرم سے بہت سے لوگوں نے ان کے اسرار وانوار کو جمع کرلیا اور انھوں نے اتنا بڑا درجہ حاصل کرلیا کہ ان میں سے ایک ایک شخص ہزار عابد سے (فضیلت میں) زائد ہوگیا اور عالم ملکوت میں وہ بڑے مرتبہ والے کہلائے جانے لگے۔ اور کل مخلوق خدا یہاں تک کہ دریاں کی مچھلیاں بھی ان کے لئے دعا گو ہوئیں۔ خدائے پاک ان پر اور ان کے متبعین پر ہمیشہ رحم فرماتا رہے۔ بالخصوص ہمارے سردار جناب محمد علیہ السلام کو (جنھیں کھلے کھلے معجزات عطا ہوئے ہیں) افضل صلوات اور اکرم تحیات کے ساتھ خاص فرمائے اور ان کی آل واصحاب پر اپنی رحمت کا مینہ برسائے اور انہیں جزائے خیر عطا فرمائے۔

اس کے بعد فقیر الی اللہ الکریم احمد المشہور بہ ولی اللہ بن عبد الرحیم یہ کہتا ہے کہ تمام علوم یقینیہ اور فنون دینیہ سے عمدہ اور ان کا سر علم حدیث ہے جس میں جناب افضل المرسلین علیہ السلام کے قول وفعل اور تقریر کا بیان ہوتا ہے، تو اس طرح وہ (اقوال وافعال) ظلمت کے چراغ اور ہدایت کے راستوں کی عمدہ منار ہیں اور گویا ماہتاب جہانتاب ہیں۔ پس جس نے ان کو یاد کرکے ان پر عمل کیا

تو اس نے ہدایت اور مراد پائی اور جس نے ان سے اعراض کیا اس نے اپنی عمرا کارت گنوائی کیونکہ آنحضرت صلعم نے امر و نہی اور بری بھلی بات سب کچھ بیان فرمائی، وعظ ونصیحت کی اور مثالیں دے دے کر بھی سمجھایا اس لئے وہ احادیث (شمار میں) قرآن کے برابر یا اس سے بھی زائد ہیں اور یہ بھی واضح رہے کہ اس علم کے چند مختلف طبقات اور اہل علم کے باہم متفاوت درجات ہیں اور اس علم کا مغز و پوست اور صدف دور بھی ہے اور اس کے اکثر فنون کو علما نے اپنی کتابوں میں نہایت وضاحت سے بیان کیا ہے جن سے بڑے بڑے دقیق مضامین اور مشکل مسائل کے مطالب بآسانی اخذ کئے جاسکتے ہیں۔

اس علم کا پوست ظاہری وہ علم ہے جس میں حدیث کی صحت وضعف اور استفاضہ وغرابت کا ذکر ہوتا ہے۔ اس فن میں بھی علمائے محدثین اور حفاظ متقدمین نے بہت کچھ لکھا ہے۔ اس کے بعد وہ فن ہے جس میں احادیث غریبہ ومشکلہ کے معانی بیان کئے جاتے ہیں، اس میں بھی علمائے فنون ادبیہ و ماہران علوم عربیہ نے خوب عرق ریزی کی ہے۔ پھر اس کے بعد وہ فن ہے جس میں معانی شرعیہ اور استنباط احکام فرعیہ ومسائل قیاسیہ سے جو کہ منصوص فی العبارۃ سے حاصل ہوتے ہیں، بحث کی جاتی ہے۔ نیز اس فن میں ایما واشارہ سے استدلال کا طریقہ اور منسوخ ومحکم اور مرجوع ومبرم کی پہچان بیان کی جاتی ہے اور یہ فن عام علما کے نزدیک تمام فنون حدیث کا لب لباب اور گوہر ہے، اس میں بھی فقہائے محققین نے بڑی جانفشانی کی ہے۔ یہ سب کچھ سہی مگر میرے نزدیک تمام فنون حدیث میں سب سے زیادہ دقیق اور سب کی جڑ واصل اور سب سے بلند و برتر اور تمام علوم شرعیہ سے بہتر اور منزلت میں اعلیٰ وافضل اور قدر و قیمت میں سب سے بڑھ کر علم اسرار دین ہے جس میں احکام کی حکمت اور ان کی لم اور خواص اعمال کے اسرار ونکات بیان ہوتے ہیں۔

بخدا یہ وہ علم ہے جس کو خدا نصیب کرے وہ فرض عبادات سے فراغ کے بعد اپنے تمام عزیز اوقات اسی میں صرف کرے اور اس کو اپنا توشۂ آخرت بنالے، کیونکہ اس علم کی بدولت آدمی شریعت کے حقائق پر مطلع ہوجاتا ہے اور اس کو ان اخبار شریعت سے وہ مناسبت پیدا ہوجاتی ہے، جو صاحب عروض کو اشعار سے منطقی کو براہین حکماء سے، نحوی کو کلام فصحا سے اور اصولی کو تفریعات فقہا سے ہوتی ہے۔ اسی علم کی وجہ سے انسان حاطب لیل اور غائص سیل ہونے سے محفوظ رہتا

ہے(۱)۔ اور اس کا ماہر تو ندی والی (چندی) اونٹنی کی طرح ٹیڑھا ٹیڑھا نہیں چلتا اور نہ اندھے گھوڑے کو سواری بناتا ہے۔ جس طرح کوئی شخص اپنے طبیب سے سیب کھانے کو سنے لیکن احمق حنظل (اندرائن) کو مشابہت ظاہری سے اس پر قیاس کر کے کھا جائے اور اسی علم کے طفیل مومن کو خدا کی طرف سے بصیرت حاصل ہو جاتی ہے اور وہ بمنزلہ اس شخص کے ہو جاتا ہے جس کو کوئی طبیب حاذق سنکھیا کھانے سے منع کرے کہ وہ قاتل ہے تو وہ شخص اس کی تصدیق کرے اور پھر اپنے قرائن سے یہ دیکھے کہ درحقیقت سنکھیا کی حرارت اور خشکی ایسی غایت درجہ کی ہوتی ہے کہ مزاج انسانی کو فاسد کر دیتی ہے۔ تب اس شخص کو اس حکیم کے قول پر دیکھو کس قدر یقین زیادہ ہو جائے گا اور اس علم کے گو احادیث نبوی نے اصول وفروع بیان کر دیئے ہیں اور آثار صحابہ وتابعین نے اس کا اجمال اور تفصیل سب واضح کر دی ہے اور مجتہدین ہر باب شرعی میں مصالح مرعیہ (ملحوظ) بیان کرتے چلے آئے ہیں اور انہی کے متبع محققین نے نکات جلیلہ اور مدققین نے رموزات جمیلہ بھی بیان کئے ہیں، اسی وجہ سے اب اس علم میں کچھ قیل وقال کرنا اجماع امت کے خلاف یا کوئی نئی بات نہیں سمجھا گیا لیکن بہت ہی کم لوگ ایسے گزرے ہیں جنھوں نے اس فن میں کوئی کتاب تصنیف کی ہو یا اس کی اساس وبنیاد پر غور وخوض کیا ہو یا اس کے اصول وقواعد مقرر کئے ہوں یا ایسا کام کیا ہو جو اس علم میں کماحقہ کافی اور وافی ہو، جس سے پڑھنے والا اچھی طرح مستفیض ہو سکے اور تشنگان علم کی سیرابی ہو۔ مثل مشہور ہے ''جب تو شیر کی سواری کرے گا تو تیرا ردیف، ہمرکاب کون بنے گا'' اور یہ ہو بھی کیونکر سکتا ہے جبکہ یہ وہ فن ہے کہ اس پر وہی مطلع ہو سکتا ہے جس کو تمام علوم شرعیہ اور تمام فنون الہیہ سے مکمل آگاہی ہو اور اس علم کو وہی چھان سکتا ہے جس کا سینہ خدا نے علم لدنی کے لئے کھول دیا ہو اور اس کا دل اسرار وہبی سے بھر دیا ہو اور ساتھ ہی ساتھ اس کی طبیعت میں تیزی اور ذہن میں روانی ہو، تحریر وتقریر میں حاذق اور توجیہ وتزئین کلام میں فائق ہو یہ بھی جانتا ہو کہ اصول مقرر کر کے ان پر فروع کی بنیاد کس طرح قائم کرتے ہیں اور قواعد مقرر کر کے ان

---

(۱) رات کو لکڑیاں جمع کرنے والے کو حاطب لیل کہتے ہیں وہ رات کی تاریکی کی وجہ سے خشک اور گیلی لکڑیوں میں فرق نہیں کر سکتا اسی طرح غائص سیل یعنی پانی میں غوطہ مارنے والا بھی نہیں دیکھ سکتا تو ایسا ہی وہ شخص ہوتا ہے جو اس علم سے بے بہرہ ہو۔

پر عقلی ونقلی دلائل وشواہد کس طرح لاتے ہیں۔ مجھ پر خدا کا بڑا احسان ہے کہ اس نے اس فن میں سے مجھ کو بھی ایک حصہ عطا کیا ہے اور یوں تو مجھے ہمیشہ اپنی تقصیر کا اقرار واعتراف رہا ہے" اور اپنے نفس کو میں پاک نہیں کہتا کیونکہ نفس کو تو بری باتوں پر اصرار ہوتا ہی ہے"۔

میں ایک دن عصر کی نماز کے بعد مراقبہ میں بیٹھا ہوا تھا کہ یکا یک نبی صلعم کی روح مبارک مجھ کو نظر آئی اور ایک کپڑا سا مجھ پر ڈال دیا گیا اور اسی وقت میرے دل میں اس کے یہ معنی معلوم ہوئے کہ یہ دین کو ایک خاص طرز سے بیان کرنے کی طرف اشارہ ہے اور اسی وقت سے میرے دل میں ایک ایسا نور معلوم ہوا جو کہ ہر وقت ترقی پذیر تھا۔ پھر کچھ عرصہ بعد مجھ کو یہ الہام ہوا کہ اس عظیم الشان کام کے لئے کسی نہ کسی دن آمادہ ہونا میری قسمت میں لکھ دیا گیا ہے اور اس وقت ایسا معلوم ہوا جیسے تمام زمین اپنے پروردگار کے نور سے جگمگا اٹھی ہے اور گویا عین غروب کے وقت روشنی نے اپنی شعاعیں زمین پر پھینکی ہیں اور وقت آ گیا ہے کہ شریعت مصطفویہ دلائل و براہین کے مکمل لباس میں ملبوس کر کے میدان میں لائی جائے پھر اس کے بعد خواب میں میں نے حضرت امامین حسنؓ وحسینؓ کو مکہ میں اس طرح دیکھا کہ انھوں نے مجھ کو ایک قلم عطا فرمایا اور کہا کہ یہ ہمارے نانا رسول اللہ صلعم کا قلم ہے اور مدت سے میرے دل میں یہ خیال گزرتا تھا کہ اس فن میں ایک ایسی کتاب تصنیف کروں جس کا فائدہ مبتدی ومنتہی اور حاضر وغائب کو یکساں پہنچے اور اہل مجلس بھی فیض پائیں۔ لیکن میں ان باتوں پر نظر کر کے متردد ہو جاتا اور اپنے ارادہ سے رک جاتا تھا کہ میرے آس پاس کوئی ایسا معتبر عالم نہ تھا جس سے بوقت ضرورت میں اپنے شبہات کو حل کر سکوں اور نہ ہی خود مجھ کو اس قدر علم تھا اور زمانہ کا جہل وتعصب اور ہر شخص کا اپنی رائے ناقص پر اترانا تو مجھ کو اور بھی پست ہمت کئے دیتا تھا، اس کے علاوہ ہمعصری منافرت کی جڑ ہوتی ہی ہے اور مصنف ملامت کے تیروں کا شکار بنایا ہی جاتا ہے۔

الغرض میں اسی شش وپنج میں تھا کہ میرے معظم بھائی اور پیارے دوست میاں محمد سلمہ کو جو عاشق کے نام سے مشہور ہیں اس علم کی فضیلت معلوم ہوئی اور ان کو یہ معلوم ہو گیا کہ بغیر اس علم کے سعادت پوری پوری نصیب نہیں ہوتی اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یہ علم بغیر مجاہدۂ شکوک وشبہات اور بلا مشقت اختلاف ومناقضات کے حاصل نہیں ہو سکتا، اور ایسے شخص کی مدد لئے بغیر جس نے سب

سے پہلے اس علم کا دروازہ کھولا ہو اور ہر طرح کی مشکلات فن اس کے آگے دست بستہ کھڑی ہوں اس فن میں کچھ غور وخوض بھی نہیں ہوسکتا، پھر تو وہ اس کی تلاش میں ہر اس شہر میں جس میں کہ جاسکتے تھے گھومتے پھرے اور جس سے بھی کچھ مطلب حاصل ہوتا دیکھا اس سے گفتگو کی اور ہر ایک کھوٹے کھرے کو پرکھتے پھرے لیکن کہیں ان کا مطلب حل نہ ہوا اور کوئی ایسا نہ ملا جو انہیں اس بارے میں کوئی مفید معلومات بہم پہنچا سکے۔ پھر جب انھوں نے یہ دیکھا تو مجھ سے التجا کر کے چمٹ گئے، میں جب بھی ان سے کچھ عذر کرتا تو وہ مجھ کو حدیث لجام (۱) یاد دلاتے یہاں تک کہ انھوں نے میرا کوئی عذر نہ مانا اور مجھ کو ہر طرف سے گھیر کر مجبور کردیا تب تو میں نے یہ جان لیا کہ جس کا مجھ کو الہام ہوا تھا یہ وہی آئندہ پیش آنے والی صورت ہے اور یہ کہ یہ امر شدنی ہے۔ پس میں نے جناب باری کی طرف توجہ کی اور اس سے استخارہ کیا اور اعانت طلب کی اور اپنی قدرت وطاقت کو بالکلیہ ہٹا دیا اور ایسا ہو گیا جیسے مردہ غسال کے ہاتھوں میں بے اختیار ہوتا ہے اور پھر جس کی انھوں نے مجھ سے التجا کی تھی، اس کو شروع کیا اور خدائے پاک سے نہایت عاجزی کے ساتھ یہ عرض کی کہ میرے دل کو لغو باتوں سے پھیر دے اور ہر چیز کی اصل حقیقت سے مجھ کو آگاہ کردے اور میرے دل کو راستی، زبان کو فصاحت اور ہر بات میں صداقت عطا کر اور میرے دلی ارادوں کے پورا کرنے میں اعانت اور مدد فرما۔ بیشک وہ خدا قریب اور مجیب ہے لیکن میں نے ان حضرت سے اول ہی بار کہہ دیا تھا کہ بھائی میں مجلس بیان میں گونگا اور تیز رو گھوڑوں کے میدان میں لنگڑا ہوں۔ میرے علم کی پونجی کھوٹی ہے اور بجائے بوٹی کے ہڈی پر قناعت ہے اور میرا دل تفکرات میں بیحد پریشان ہے جن سے ذرا بھی فرصت نہیں، لہٰذا اوراق بینی میں غور وفکر کرنا میرے لئے اس وقت آسان نہیں اور نہ مجھ سے لوگوں کے اقوال بدرجۂ کمال منضبط ہوسکتے ہیں کہ ان کو ہر آئے گئے کے گاؤں میں تو جو کرتا ہوں خود کرتا ہوں اپنی مٹی آپ اکٹھی کرتا ہوں، اپنے وقت کا بندہ ہوں، اپنے بخت کا تلمیذ ہوں، جو کچھ مجھ کو سوجھ گیا اس کا پابند ہوں اور جو کچھ دل میں سما گیا اس کو پسند کرتا ہوں پس جس کو اس پر قناعت منظور ہو تو یہ حاضر ہے لیکن جس کو کچھ اور مطلب ہو تو اس کو اختیار ہے

---

(۱) حدیث الجام کا مضمون یہ ہے کہ جس سے بھی کوئی علم کی بات پوچھی جائے اور وہ اس کو چھپائے تو ایسے شخص کو قیامت میں آگ کی لگام دی جائے گی۔

جو چاہے سو کرے اور جبکہ تکلیف، جزا اور شریعت باعث رحمت وہدایت کے اسرار کی طرف اس آیت فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ میں اشارہ ہوا ہے اور یہ کتاب بھی اسی کی ایک شاخ اور اسی افق کا ایک درخشاں چاند ہے تو مناسب معلوم ہوا کہ اس کتاب کا نام ''حجتہ اللہ البالغہ'' رکھا جائے۔ خدا ہی کا آسرا کافی ہے وہی بہترین کارساز ہے اس بلند و برتر کی مدد کے بغیر نہ کوئی طاقت، طاقت ہے اور نہ کوئی قوت، قوت۔

مقدمہ

اکثر یوں خیال کیا جاتا ہے کہ احکام شرعیہ کسی مصلحت پر مبنی نہیں اور نہ اعمال اور ان کی جزا میں کوئی مناسبت ہے، جیسے کوئی آقا اپنے نوکر کو اس کی فرمانبرداری کا امتحان لینے کے لئے یونہی بلا فائدہ کسی پتھر کے اٹھانے یا کسی درخت کو ہاتھ لگانے کا حکم دے پھر اگر وہ اطاعت کرے تو اس کو جزا دے اور اگر نافرمانی کرے تو سزا دے۔ لیکن یہ گمان بالکل غلط ہے اور سنت و اجماع خیر القرون اس کی تردید کرتا ہے اور جو شخص یہ باتیں بھی نہیں جان سکتا (کہ اعمال کا اعتبار نیت پر اور اس کی خوبی کا مدار طبیعت پر ہے جیسا کہ نبی صلعم نے فرمایا ہے "اعمال نیتوں پر موقوف ہیں" اور جیسا کہ خداوند تعالیٰ نے فرمایا اللہ کے پاس نہ تو تمہاری ان قربانیوں کا گوشت پہنچتا ہے اور نہ خون بلکہ تمہارا تقویٰ اس کے پاس پہنچتا ہے، اور نماز، ذکر الٰہی اور اس سے مناجات کرنے کے واسطے مقرر ہوئی۔ جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "ہماری یاد اور ذکر کرنے کے لئے نماز پڑھا کرو" اور نیز اس لئے مقرر ہوئی کہ اس کی وجہ سے آخرت میں اس کے جمال کا مشاہدہ اور دیدار حاصل ہو جیسا کہ نبی صلعم نے فرمایا "تم عنقریب اپنے رب کو اس طرح دیکھو گے جس طرح اس چاند کو دیکھتے ہو اور اس کے دیدار میں کسی قسم کا شک وشبہ نہ کرو گے تو اگر تم ایسا کرسکو کہ نماز فجر اور عصر کے وقت (شیطان سے) مغلوب نہ ہو تو ایسا ہی کیا کرو اور زکوٰۃ اس لئے مقرر ہوئی کہ فقرا کی حاجت برآری ہو اور دل پر بخل نہ طاری ہو جیسا کہ اللہ تعالیٰ مانعین زکوٰۃ کی برائی میں فرماتا ہے "جن کو خدا نے کچھ اپنے فضل سے دیا ہے وہ لوگ بخل کو اپنے لئے بہتر نہ سمجھیں بلکہ وہ ان کے حق میں نہایت برا ہے کیونکہ جس مال میں یہ بخل کرتے ہیں قیامت کے دن اس کا طوق بنا کر ان کے گلے میں پہنایا

جائے گا''۔ اور جیسا کہ نبی صلعم نے (معاذؓ بن جبلؓ سے) فرمایا تھا کہ ''ان (اہل یمن) سے کہہ دینا کہ یہ زکوٰۃ اللہ تعالیٰ نے تم پر اس لئے فرض کی ہے کہ تمہارے امراء سے لیکر تمہارے فقرا کو دی جائے (۱)۔ اور روزہ نفس کے زیر کرنے کے لئے مقرر ہوا ہے، جیسا کہ نبی صلعم نے فرمایا۔ ''روزہ رکھنا شہوت کے حق میں بمنزلہ خصی ہونے کے ہے''۔ اور حج خدا کے مقامات کی تعظیم کے لئے مقرر ہوا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''یقیناً وہ مکان جو سب سے پہلے لوگوں کے واسطے مقرر کیا گیا وہ گھر ہے جو مکہ میں ہے بابرکت ہے اور دنیا کا رہنما ہے، اس میں کھلی نشانیاں ہیں الخ'' اور فرمایا ''صفا و مروہ (کی پہاڑیاں) خدا کی نشانیاں ہیں'' اور قصاص قتل کے بند کرنے کے واسطے مقرر ہوا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''اے عقلمندو! قصاص میں تمہاری زندگی مضمر ہے اور حدود کفارات، معاصی کے روکنے کے واسطے مقرر ہوئے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''تاکہ وہ (چور) اپنے لیے کا مزہ چکھے۔ (اور باز آجائے) اور جہاد خدا کا کلمہ بلند کرنے اور شر انگیزوں کا فتنہ مٹانے کے نئے مقرر ہوا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، ''ان سے لڑتے رہو یہاں تک کہ قدم مٹ جائے اور دین خالص اللہ ہی کا ہو جائے''۔ اور احکام معاملات اور بیاہ شادی کے مسائل سب عدل و انصاف کے لئے مقرر ہوئے ہیں۔

ان کے علاوہ اور بہت سے احکام ہیں جن پر آیات کریمہ اور احادیث نبویہ دلالت کرتی ہیں اور (ہر زمانے میں علما نے ان کو بیان بھی کیا ہے) (پس جس کو ان باتوں کا علم نہیں) تو اس کو علم سے کچھ بھی مس نہیں، اگر ہے تو ایسا ہے جیسے کوئی سوئی کو سمندر میں ڈبو کر نکالے، اور اس کی بات پر تو کیا اعتبار کیا جائے بلکہ اس کو مناسب ہے کہ اپنے حال پر تاسف کرے اور روئے، میں پھر کہتا ہوں کہ خود نبی صلعم نے بعض مواقع پر تعیین اوقات کے اسرار ظاہر فرمائے مثلاً ظہر کی پہلی چار رکعت کی نسبت فرماتے ہیں۔ ''اس وقت آسمانوں کے دروازے کھلتے ہیں لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ میرا عمل صالح اس وقت اوپر جائے'' اور یوم عاشورہ کے روزہ کی نسبت آپ سے یوں مروی ہے کہ اس کے جاری ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس دن موسیٰؑ اور ان کی قوم کو فرعون سے نجات حاصل ہوئی تھی۔ پس اس کا ہمارے لئے مقرر ہونا سنت موسیٰؑ کا اتباع ہے اور بعض احکام کی وجوہات بھی بیان فرمائیں۔

---

(۱) پہلی مثال زکوٰۃ کا مقصد بخل دور کرنا بتاتی ہے اور دوسری فقرا کی حاجت برآری بیان کرتی ہے۔

چنانچہ دیکھئے جو شخص سو کر اٹھے اس کو ہاتھ دھونے کے لئے فرمایا اور وجہ یہ بیان فرمائی کہ "اس کو معلوم نہیں ہوتا کہ رات کو اس کا ہاتھ کہاں پڑا رہا" اور ناک میں پانی ڈالنے اور سنکنے کی نسبت یوں فرمایا کہ "انسان کے نتھنوں پر رات بھر شیطان رہتا ہے" (یعنی رطوبت اور گندگی بہتی ہے) اور نیند سے وضو ٹوٹ جانے کی نسبت یوں فرمایا کہ "سوتے میں انسان کو جوڑ بند ڈھیلے پڑ جاتے ہیں (۱)" اور رمی الجمار کی نسبت فرمایا "اس میں ذکر الٰہی کیا جاتا ہے" اور کسی کے گھر میں نظر نہ ڈالنے کی وجہ یہ فرمائی کہ "اجازت لینے سے یہی تو مقصود ہے کہ اچانک گھر والوں پر نظر نہ پڑ جائے" اور بلی کے پس خوردہ کی نسبت یوں فرمایا کہ "یہ ناپاک نہیں کیونکہ یہ گھر میں پھرنے والے جانوروں میں سے ہے (۲)" اور بعض جگہ احکام کی یہ حکمت بیان فرمائی کہ اس میں دفع مضرت ہے، جیسا کہ ایام رضاعت میں جماع کرنے سے منع فرمایا تھا کیونکہ (یہ معلوم ہوا تھا کہ) اس سے بچہ کو ضرر پہنچتا ہے۔ یا فرقہ کفار سے امتیاز اور مخالفت جیسا کہ طلوع آفتاب کے وقت نماز سے اس لئے منع فرمایا کہ "یہ وقت پرستش کفار کا ہے اور آفتاب شیطان کے سر کے اوپر سے نکلتا ہے (۳)" یا دروازۂ تحریف بند کرنے کی مصلحت ہوتی ہے جیسا کہ حضرت عمرؓ نے اس شخص کی نسبت جس نے نفل کو فرض ملا کر پڑھنا چاہا فرمایا کہ "پہلے لوگ اسی وجہ سے ہلاک ہو گئے" پھر اس کی تائید میں آپ نے فرمایا "ابن خطابؓ خدا تم کو اصابت رائے عطا فرمائے (تم نے ٹھیک کہا)" یا وہ مصلحت دفع حرج کے لئے ہوتی ہے جیسا کہ آپ نے ایک شخص سے فرمایا کہ "کیا (تیری طرح) ہر شخص کے پاس دو دو کپڑے ہوتے ہیں" اور اللہ تعالیٰ نے بھی سحری کی نسبت اسی بنا پر اس آیت میں اجازت دی خدا تعالیٰ کو اس کی خبر تھی کہ تم اپنے دلوں میں خیانت کرتے تھے، پس اب خدا نے تم پر رحمت کی اور معاف کر دیا۔ اب تم اپنی بیویوں سے رمضان کی راتوں میں مل سکتے ہو الخ اور بعض جگہ ترغیب وترہیب کے اسرار بیان فرمائے حتیٰ کہ صحابہؓ نے اپنے شکوک وشبہات جو وہاں پیدا ہوتے تھے آپ سے عرض کئے اور آپ نے حل فرما دیئے۔

چنانچہ آپ نے فرمایا "آدمی کی نمازِ جماعت اس کی اس نماز سے جو وہ تنہا گھر میں یا بازار اور

---

(۱) پس احتمال ہے کہ ریح وغیرہ خارج ہوئی ہو لہٰذا وضو کرنا لازم ہے۔ (۲) اس سے احتیاط مشکل ہے اور ناپاک قرار دینے میں حرج ہے۔ (۳) یعنی جو اس وقت سجدہ کرتا ہے گویا شیطان کو سجدہ کرتا ہے۔

دوکان میں پڑھتا ہے پچیس درجہ (ثواب میں) زیادہ ہے۔ اور یہ اس لئے کہ جب کوئی شخص اچھی طرح وضو کرکے مسجد میں آتا ہے اور صرف نماز ہی کیلئے چلتا ہے تو ہر قدم پر ایک گناہ معاف ہوتا ہے اور ایک نیکی ملتی ہے۔'' الحدیث'' اور ایک جگہ آپ نے فرمایا کہ بیوی کے ساتھ صحبت کرنے میں بھی اجر ہے، صحابہ نے عرض کیا'' یارسول اللہ! یہ تو قضائے شہوت ہے اس میں کیا اجر ہوگا''۔ آپ نے فرمایا'' اچھا اگر اس کو وہ حرام میں صرف کرتا تو کیا اس پر گناہ نہ ہوتا، تو اسی طرح جب اس نے حلال میں صرف کیا تو اس کو اجر ملا، اور پھر ایک جگہ آپ نے فرمایا'' جب دو مسلمان تلوار لیکر باہم مقابل ہوتے ہیں تو قاتل مقتول دونوں دوزخ میں جاتے ہیں، صحابہ نے عرض کیا قاتل تو خیر ٹھیک ہے مگر یہ مقتول کس لئے دوزخ میں گیا۔ آپ نے جواب دیا کہ'' وہ بھی اپنے مقابل کو قتل کا خواہاں تھا''۔ ان کے علاوہ اور بہت سے مقامات ہیں جن کا شمار مشکل ہے اور ابن عباسؓ نے جمعہ کے روز غسل کرنے کی مصلحت بیان کی اور زید بن ثابتؓ نے پھلوں کی فروخت، ان کی پختگی سے پہلے ممنوع ہونے کا سبب بیان کیا، اور ابن عمرؓ نے طواف میں خانہ کعبہ کے صرف دو رکنوں کے بوسہ پر اکتفا کی وجہ بیان فرمائی۔ پھر اس کے بعد تابعین اور ان کے بعد مجتہدین احکام کے علل و مصالح برابر سمجھتے رہے اور ہر حکم صریح کی کوئی نہ کوئی علت خواہ وہ حصول نفع ہو یا دفع مضرت ضرور قرار دیتے رہے جیسا کہ ان کی کتابوں میں مفصل مذکور ہے۔

پھر تو غزالیؒ، خطابیؒ اور ابن عبدالسلامؒ وغیرہم نے عجیب عجیب لطائف و نکات اور عمدہ عمدہ تحقیقات بیان کیں، خدا ان کو ان کی اس سعی کا عوض دے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ قطع نظر ان مصالح اور منافع کے شرع کا ان احکام کو از خود واجب اور حرام بنانا بھی فی نفسہ ایک سبب عظیم ہے کہ اس سے مطیع کا ثواب اور عاصی کو عذاب دیا جائے اور یہ بات نہیں کہ اعمال کا حسن و قبح، ان معنوں میں کہ ان کا فاعل مستحق ثواب یا عذاب ہو محض عقلی ہے، اور نہ شرع کا محض یہی کام ہے کہ وہ اعمال کی صرف خاصیات بیان کردے اور از خود کسی چیز کو حرام یا فرض نہ کرے جس طرح کہ طبیب ادویہ کی خاصیت اور حرارت و برودت بیان کردیتا اور مرض کی اقسام گنا دیتا ہے (دواؤں میں از خود کوئی خاصیت پیدا نہیں کرتا) چنانچہ بعض لوگوں کا شریعت کے بارے میں یہی خیال ہے مگر یہ خیال بالکل غلط ہے، بادی النظر ہی میں زبان اسے دور پھینک دیتی ہے اور یہ کہنا قبول نہیں کرتی اور

آخر ایسا کیوں نہ ہو، دیکھئے نبی صلعم نے تراویح میں شریک نہ ہونے کی یہ وجہ بیان فرمائی کہ ''میں ڈرتا ہوں کہ کہیں یہ تم پر فرض نہ ہو جائے'' اور فرمایا کہ بڑا سخت گنہگار وہ مسلمان ہے کہ پہلے کوئی چیز حرام نہ ہو پھر اس کے سوال کرنے سے وہ حرام ہو جائے (۱) اس کے علاوہ اور بہت سی احادیث ہیں اور اگر وہ خیال صحیح ہوتا تو اس مقیم کو جسے مسافر کی مانند مشقت اور تکالیف لاحق ہوں۔ روزہ افطار کرنا جائز ہوتا کیونکہ جس حرج کی بنا پر رخصت افطار دی گئی ہے وہ دونوں میں برابر پایا جاتا ہے اور خوشحال مسافر کو مقیم کی طرح آرام میں ہونے کی وجہ سے افطار درست نہ ہوتا اور یہی حال باقی سب حدود کا ہے جن کو شرع نے مقرر کیا ہے اور سنت نے یہ بات بھی واجب کر دی ہے کہ جب کوئی حکم صحیح روایت سے ثابت ہو جائے تو اس کی فوراً تعمیل کرنی چاہئے اس کی مصلحت دریافت کرنے پر (تعمیل کو) موقوف نہ رکھے کیونکہ بہت سے لوگوں کی عقلیں احکام کی مصلحتوں کے دریافت کرنے سے قاصر ہیں۔ اور نبی صلعم کی عقل ہماری سب کی عقل سے زیادہ معتبر ہے اور اسی لئے یہ علم نااہلوں کے واسطے قابل تعلیم نہ سمجھا گیا اور اس کے لئے وہ شرائط قرار دی گئیں جو کتاب اللہ کی تفسیر کے لئے ہیں اور اس میں اس رائے محض سے جس میں سنت سے مدد نہ لی گئی ہو، غور و خوض کرنا حرام ہے۔

ہمارے بیان سے یہ خوب ظاہر ہو گیا کہ حق بات یہ ہے کہ احکام شرعیہ پر عمل کرنے کی ایسی مثال ہے جیسے کسی امیر کے چند غلام بیمار ہو جائیں اور وہ کسی خاص آدمی کو ان کے دوا پلانے پر مقرر کرے تو اب اگر وہ (غلام) اس کا کہا مانیں گے تو گویا اپنے اصل آقا کی اطاعت کریں گے۔ اور وہ ان سے خوش ہو کر ان کو بہترین انعام عطا کرے گا اور وہ اس مرض سے بھی نجات پائیں گے اور اگر انھوں نے اس کا کہنا نہ مانا تو گویا اپنے اصل آقا کی نافرمانی کی جس سے وہ ان پر غصہ ہوا اور ان کو بڑی سے بڑی سزا دی اور وہ خود بھی اس مرض سے ہلاک ہو گئے اور نبی صلعم نے جس جگہ اپنے متعلق فرشتوں کے اس قول کو نقل کیا ہے کہ اس شخص (یعنی پیغمبرؐ) کی مثال ایسی ہے جیسے کسی نے ایک مکان بنا کر اس میں طرح طرح کے کھانے چنے اور پھر ایک بلانے والے کو بھیجا کہ لوگوں کو

---

(۱) مطلب یہ ہے کہ بغیر کسی مصلحت یا علت کے محض رسول کے کہنے یا کرنے سے بھی بعض احکام فرض ہو جاتے ہیں، ضروری نہیں کہ ہر حکم کی کوئی لم یا وجہ بیان کی جائے۔

بلائے تو جس کسی نے اس کا کہا مانا تو وہ گھر میں بھی آیا اور اس نے کھانا بھی کھایا۔ لیکن جس نے اس کا کہنا نہ مانا تو نہ تو وہ گھر میں آیا اور نہ ہی اس کو وہ کھانا نصیب ہوا۔ تو اس جگہ اس سے آپ کی بھی وہی مراد ہے جو ہم نے بیان کی۔ اور آپ کے اس قول سے بھی یہی مراد ہے اور جو کچھ خدا نے مجھ کو دیکر بھیجا ہے اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص کسی قوم سے آ کر یہ کہے کہ میں نے اپنی آنکھوں سے (دشمن کا) لشکر دیکھا ہے میں کھلم کھلا ڈرانے والا اور ہوشیار کرنے والا ہوں، تم یہاں سے بھاگ جاؤ تو اس کی قوم کے ایک گروہ نے تو اس کا کہنا مان لیا اور اس لشکر کے آنے سے پہلے ہی تڑکے اٹھ کر چلا آیا اور اس طرح اس لشکر سے بچ گیا لیکن اسی قوم کا ایک گروہ اس کو جھوٹا سمجھ کر صبح تک وہیں پڑا رہا تو صبح کو اس لشکر نے آتے ہی ان لوگوں کو مار ڈالا اور ستیاناس کر دیا۔ نیز آپ نے خدائے پاک سے روایت کی ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ تمہارے ہی اعمال تو ہوں گے جو تم کو واپس کر دیئے جائیں گے۔ اور ہمارے اس بیان سے (کہ اصل بات دو باتوں کے بیچ میں ہے اور اعمال کو اور قضائے الٰہی کا کسی چیز کو حرام وحلال کرنے کو (دونوں کو) کسی کے مستحق ثواب وعذاب ہونے میں خاص دخل ہے) ان دلائل میں جو جاہلیت کے لوگوں کے ثواب وعذاب میں متعارض ہیں تطبیق ہوسکتی ہے(۱)۔

بعض لوگ فقط اس قدر تو جانتے ہیں کہ احکام کے چند مصالح اور علتیں ہوتی ہیں اور اعمال

---

(۱) تفصیل اس کی یہ ہے کہ مصنف نے مذہب متوسط اختیار کیا، نہ تو یہی ہے کہ شرع محض طبیب کی طرح خواص اعمال بیان کر دیتی ہے اس کو حرام وحلال کرنے میں کچھ دخل نہیں اور نہ یہی ہے کہ بلا مناسبت اور بغیر کسی مصلحت کے شرع حرام وحلال کرتی ہے اس میں عقل کو کچھ دخل ہی نہیں بلکہ ایک درمیانی بات ہے وہ یہ کہ اعمال کی علل بھی ہیں اور شرع کو بھی حلال وحرام کرنے میں بڑا اختیار ہے، پس اس مذہب سے ان دلائل میں جو مردمان جاہلیت کے ثواب وعذاب میں متعارض ہیں تطبیق ہوسکتی ہے جن لوگوں کی یہ رائے ہے کہ عقل کو اس بارے میں کچھ دخل ہی نہیں شرع نے حکم دیا یا حرام کا حلال کر دیا تو ان کے نزدیک مردمان جاہلیت کو کچھ عذاب نہیں کیونکہ اس زمانہ میں شرع تو تھی ہی نہیں اور عقل کچھ کام نہیں کرسکتی تھی اور جن کے نزدیک عقل حاکم ہے ان کے نزدیک ان کو بسبب عقل ہونے کے عذاب ہوگا کیونکہ باوجود عقل کے احکام الٰہی پر عمل کیوں نہ کیا لیکن مصنف نے مذہب متوسط اختیار کیا تو اس طرح تو حید وغیرہ امور جن میں عقل کافی ہوتی ہے بسبب شرک کے عذاب ہوگا۔

کی جزا و سزا اس لئے مترتب ہوتی ہے کہ وہ ان نفسانی ہیئتوں (مثلاً شوق وخوف وغیرہ) ہی کی وجہ سے صادر ہوتی ہے جن سے انسان درست ہوتا اور بگڑتا ہے۔ جیسا کہ نبی صلعم نے اپنے اس قول میں اشارہ فرمایا کہ "خبردار انسان کے جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جب تک وہ درست رہتا ہے تمام بدن درست رہتا ہے اور جب وہ بگڑ جاتا ہے تو تمام بدن بگڑ جاتا ہے اور وہ دل ہے" لیکن وہ لوگ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس فن کی تدوین کرنا اور اس کی اصول وفروع مقرر کرنا ممنوع ہے، عقلاً تو اس لئے کہ اس کے مسائل نہایت باریک اور دقیق ہیں اور شرعاً اس لئے کہ سلف (متقدمین نے باوجود اس کے کہ نبی صلعم کے زمانہ سے ان کو نہایت قرب تھا اور خوب علم رکھتے تھے۔ مگر اس فن میں کچھ تصنیف نہ کیا تو گویا اب اس کے ترک پر اتفاق ہو گیا یا کوئی یوں کہے کہ اس کی تدوین میں کچھ معتد بہ فائدہ نہیں کیونکہ شرع پر عمل کرنا کچھ اس کی مصلحت جاننے پر موقوف نہیں، تو یہ گمان بھی غلط ہے۔ کیونکہ اگر ان کے اس کہنے کا کہ "اس کے مسائل نہایت باریک اور دقیق ہیں"۔ یہ مطلب ہے کہ "اس کی تدوین بالکل ممکن ہی نہیں" اس لئے غلط ہے کہ مسائل کے باریک وخفی ہونے سے یہ لازم نہیں آتا، دیکھئے علم توحید کے مسائل کا احاطہ ان سے بھی مشکل اور ان کا ادراک ان سے بھی دقیق تر ہے تاہم ان کی تدوین خداوند تعالیٰ نے جس کے لئے چاہی آسان کر دی اور اسی طرح ہر علم ظاہر میں ایسا دکھائی دیتا ہے کہ اس میں بحث کرنا محال اور اس کا احاطہ کرنا ناممکن ہے لیکن جب اس کے لوازمات ومتعلقات میں کاوش کی جاتی ہے اور اس کے مقدمات بتدریج بتائے جاتے ہیں تو اس میں مہارت حاصل ہو جاتی ہے اور اس کے قواعد کی تمہید اور اس کے متعلقات وفرعات کا استنباط آسان ہو جاتا ہے، اور اگر ان کے کہنے کا یہ مطلب ہے کہ "وہ کس قدر مشکل ہے" تو یہ تسلیم! لیکن اشکال ہی سے تو بعض علما کو بعض پر شرف حاصل ہوتا ہے اور مطالب کو تو انسان محنت اور سختیوں سے ہی پاتا ہے اور علوم کی گردن پر تو آدمی عقل کے کام میں لانے اور فہم کے تیز کرنے سے ہی سوار ہوتا ہے اور جہاں تک ان کے اس کہنے کا تعلق ہے کہ سلف نے اس کو مدون نہیں کیا۔

تو میں کہتا ہوں کہ سلف کا تدوین نہ کرنا کچھ مضر نہیں کیونکہ نبی صلعم نے اس کے اصول وفروع مقرر کر دیئے اور فقہا صحابہ مثلاً امیر المومنین عمرؓ اور علیؓ اور زیدؓ اور ابن عباسؓ اور عائشہؓ وغیرہم

نے آپ کا اتباع کیا اور اس علم میں بحث کی اور اس کی وجوہات بیان فرمائیں، پھر اس کے بعد علما دین اور سالکان راہ یقین ہمیشہ اپنے مقابلوں کے سامنے جب کہ وہ شکوک وشبہات پیدا کرنے کی فتنہ انگیزی کرتے، خدا کے عطا کردہ علم میں سے بقدر ضرورت بیان فرماتے تھے اور اس طرح ان بدعتیوں کے لشکر کو مناظرہ و بحث کی تلوار سونت کر زیر وزبر کرتے تھے اور بے دینوں کے جھمگھٹ کو تتر بتر کرتے تھے اور ہم اب تک یہی بات مناسب سمجھتے ہیں کہ بہ نسبت اقوال متفرقہ کے اس فن کے اصول کا ایک کتاب میں یکجا مجتمع ہونا نہایت مناسب ہے، متقدمین کو اس فن کی تدوین کی اس لئے ضرورت نہ تھی کہ ان کا زمانہ آنحضرتؐ سے نہایت قریب تھا اور آپ کا فیض صحبت ان کو نصیب تھا اور اسی برکت صحبت سے ان میں اختلاف کم تھا اور عقیدے صاف تھے نیز ان کو ہر طرح کا اطمینان حاصل تھا کیونکہ وہ ہر اس بات میں جو آنحضرتؐ سے ثابت ہوتی، زیادہ دریافت وتفتیش نہیں کرتے تھے، اور نہ ہی منقول کو معقول سے تطبیق دینے کا وہاں دستور تھا اس کے علاوہ بہت سے بڑے بڑے گہرے علوم میں وہ معتبر علما سے استفسار کر سکتے تھے (اور وہ اس فن کی تدوین سے بالکل اسی طرح مستغنی تھے) جس طرح کہ (بسبب اس بات کے کہ ان کا زمانہ قرن اول یعنی زمانۂ نبوت سے نہایت قریب تھا اور راویان حدیث سے تو بالکل ملا ہوا تھا ان کی ہر بات دیکھتے اور سنتے تھے اور مشکل مسائل معتبر علما سے پوچھ سکتے تھے۔ اس وقت اختلاف بھی کم تھا اور موضوع احادیث کے روایت ہونے کا خوف بھی کم تھا) تمام فنون حدیث کی تدوین سے مستغنی تھے مثلاً شرح غریب الحدیث، فن اسماء الرجال ومراتب عدالت رواۃ، فن مشکل الحدیث، واصول الحدیث ومختلف الحدیث وفقہ الحدیث، وتمیز الضعیف من الصحیح والموضوع من الثابت (۱)۔

اور یہ تمام فنون مذکورہ ایک مدت دراز کے بعد اس وقت مدون کئے گئے اور ان کے اصول وفروع اس وقت مقرر ہوئے جبکہ مسلمانوں کو ان کی ضرورت پڑی اور اسلام کی خیر خواہی انہی پر موقوف نظر آئی، پھر اس کے بعد فقہا کے درمیان احکام کی علتوں میں اختلاف کرنے کی وجہ سے

(۱) یعنی حدیث کے غیر مانوس الفاظ کی شرح، راویان حدیث کے نام ونسب وسیرت اور ان کی معتبر یا غیر معتبر ہونے کے مدارج، مشتبہ ومشکل احادیث کی شرح وحل حدیث کے اصول وقواعد، احادیث کے اختلاف کی تطبیق، حدیث سے مسائل کا استنباط وتفقہ، کمزور وضعیف احادیث کو صحیح احادیث سے علیحدہ کرنا اور بناوٹی وموضوع احادیث کو ثابت شدہ احادیث سے چننا اور چھانٹنا۔

کافی اختلاف واقع ہوا یہاں تک کہ علل احکام میں اس نظر سے بحث شروع ہوئی کہ ان میں کوئی مصلحت معتبر بھی ہے کہ نہیں اور یہ کہ ان سے وہ مصلحت کیسے حاصل ہوسکتی ہیں جو شرع میں معتبر ہیں اور مباحث دینیہ میں بہت سی جگہ دلائل عقلیہ سے تمسک کرنے لگے اور اعتقادی و عملی مسئلوں میں شکوک کرنے لگے اور پھر یہ بات پیدا ہوگئی منقولات کو دلائل عقلیہ سے مطابق اور مدلل کرنا اور سنی ہوئی باتوں اور سمجھی ہوئی باتوں میں مطابقت پیدا کرنا، دین کی پوری پوری حمایت اور اس کی کامل تائید و امداد سمجھا جانے لگا یہی نہیں بلکہ مسلمانوں کے تفرقہ دور کرنے میں اس کو سعی جمیل اور باعث تقرب الٰہی اور بڑی سے بڑی عبادت سمجھا جانے لگا، ان کا یہ کہنا کہ ''اس کی تدوین میں کچھ فائدہ نہیں''۔ بالکل غلط ہے ہم کہتے ہیں کہ اس میں بڑے بڑے فوائد ہیں۔ ان میں سے چند ایک درج ذیل ہیں۔ اول یہ کہ اس سے آنحضرت صلعم کا ایک بڑا معجزہ ظاہر ہوتا ہے کیونکہ آنحضرت صلعم کو جیسا قرآن مجید عطا ہوا اس زمانہ کے بلغا اس سے عاجز آ گئے اور اس کی جیسی ایک سورت بھی بنا کر نہ لا سکے، پھر جب وہ زمانہ عرب العربا کا گزر چکا اور لوگوں پر اس کی وجوہ اعجاز مخفی ہوتی چلیں تو علما امت ان کے بیان و اظہار کے لئے آمادہ ہوئے تاکہ انھیں ہر ایک سمجھ جائے، اسی طرح آپ کو خدائی شریعت عطا ہوئی جو پہلی تمام شریعتوں سے کامل تھی اور جس میں ایسی ایسی مصلحتیں بھری ہوئی تھیں جن کی رعایت بشر سے محال ہے۔ اس کی خوبی کو آپ کے ہم زمانہ لوگوں نے تو ایک طرح کے نور معرفت سے پہچان لیا، یہاں تک کہ ان کی زبانوں پر اس کا اقرار اور ان کے محاورات اور تقریرات میں اس کا اظہار تھا لیکن اس زمانہ کے بعد یہ امر ضروری ہوا کہ آپ کی شریعت کی خوبیاں ظاہر کی جائیں تاکہ ہر شخص یقین کر لے کہ یہ شریعت آسمانی اور کامل ترین شریعت ہے اور یہ کہ بشر سے اس کا ظاہر ہونا اتنا بڑا اور اتنا مشہور و معروف معجزہ ہے کہ ذکر کا محتاج نہیں۔

دوم یہ کہ اس سے پورا پورا اطمینان حاصل ہو جاتا ہے جیسا کہ ابراہیمؑ نے خداوند تعالیٰ سے عرض کیا تھا کہ ''کیوں نہیں (اے اللہ! میں مردوں کے دوبارہ زندہ ہونے پر ایمان تو رکھتا ہوں) لیکن صرف اس لئے (یہ مردوں کا زندہ ہوتا دیکھنا چاہتا ہوں) کہ کسی طرح میرا دل مطمئن ہو جائے''۔ کیونکہ کثرت دلائل اور یقین دلانے کے مختلف طریقوں کے استعمال کرنے سے دل مضبوط اور اضطراب قلب دور ہو جاتا ہے، سوم یہ کہ طالب خیر جب نیکیوں میں انتہائی کوشش کرتا

ہے اور وہ ان کے مشروع ہونے کی وجہ سے بھی بخوبی جانتا ہے اور ان کے تقاضوں ولوازمات پر پوری طرح نگاہ رکھتا ہے تو وہ تھوڑی عبادت بھی اس کو بہت فائدہ دیتی ہے اور وہ اس کو خوب پکا ہوکر دیکھ بھال کرتا ہے اندھا دھند نہیں چلتا اور اسی لئے امام غزالیؒ نے کتب سلوک میں بڑی توجہ واہتمام کے ساتھ لوگوں کو اسرار عبادات سے روشناس کرایا ہے، چہارم یہ کہ فقہا کا بعض فروعی احکام میں اختلاف اس لئے ہے کہ ان کی علل قیاسیہ میں ان کا اختلاف ہے کہ کونسی علت مناسب اور کونسی نامناسب ہے(۱) پس تحقیق حق بغیر اس بات کے کہ ان کی مصلحتیں جانو، ہو ہی نہیں سکتی، پنجم یہ کہ بدعتی لوگوں نے بہت سے دینی مسائل میں شکوک وشبہات کرنے شروع کئے اور کہنے لگے کہ یہ عقل کے خلاف ہیں اور جو مسائل عقل کے خلاف ہوں ان کو یا تو رد کر دینا چاہئے یا کچھ تاویل کرنی چاہئے، چنانچہ عذاب قبر کی نسبت یہ کہتے ہیں کہ یہ عقل وشعور کے خلاف ہے اور اسی طرح حساب، کتاب اور پل صراط اور ترازوئے اعمال میں کلام کر کے لچر اور دور از کار تاویلیں کرنے لگے اور غبار شکوک کو جہاں میں اڑا دیا، خلق خدا کو اس بلا میں پھنسا دیا کہ ایک فرقہ (اسماعیلیہ) نے تو شکوک وشبہات کا بڑا فتنہ برپا کیا کہنے لگے کہ کیا بات ہے کہ رمضان کے آخری دن کا روزہ تو واجب ہوا لیکن (اسی کے دوسرے دن) شوال کی پہلی تاریخ (عید الفطر) کا روزہ ممنوع وحرام کر دیا گیا؟ اور اسی طرح کی اور باتیں بنائیں اور ثواب وعذاب کی باتوں کا بھی مضحکہ اڑانے لگے کہ یہ محض ترغیب وتحریص (ابھارنے اور اکسانے) کی باتیں ہیں ورنہ درحقیقت کچھ نہیں یہاں تک کہ زمانہ کا ایک بدبخت بیگن کی حدیث بنا کر مسلمانوں پر تعریض کرنے لگا کہ ان کی ہاں برے بھلے کی کچھ تمیز نہیں (۲)۔

اب فرمایئے ان مفاسد کے بند کرنے کے سوائے اس کے کہ ہر چیز کی مصلحت اور کچھ فوائد بیان کئے جائیں اور ان کے اصول قرار دیئے جائیں اور کیا صورت ہے جس طرح کہ یہود ونصاریٰ اور دہریوں وغیرہ کے مقابلہ میں کیا گیا۔ ششم یہ کہ فقہا کی ایک جماعت نے یہ فیصلہ

---

(۱) یعنی بعض مجتہدین بعض چیزوں کو نادرست اس لئے کہتے ہیں کہ وہ اس کی علت نادرستی نکالتے ہیں اور بعض اسی کی ایک خوبی سمجھ کر اس کو درست کہتے ہیں، تو اس کی تحقیق بس اس فن کے بغیر ممکن نہیں۔ (۲) اس میں بدبخت سے مراد ابن راوندی ہے اس نے بیگن کی مدح میں چند جھوٹیں حدیثیں اس لئے بنائی تھیں کہ مسلمانوں کی سادہ لوحی ثابت کرے کہ ان کے ہاں ہر روایت مسلم ہوتی ہے کچھ حقیقت کی طرف نظر نہیں کرتے۔

دے دیا کہ جو حدیث بھی کلی طور پر خلاف قیاس ہو اس کا رد کرنا جائز ہے۔ اس طرح تو بہت سی صحیح حدیثوں میں بھی خلل واقع ہونے کا اندیشہ پیدا ہو گیا جیسے حدیث مصراۃ (۱) اور حدیث قلتین (۲)۔ پھر تو محدثین کو سوائے اس کے کہ ان کی مصلحتیں بیان کریں اور کچھ بن نہ آیا ان کے علاوہ اس فن کے اور بیشمار فائدے ہیں اور آپ دیکھئے گا کہ میں جہاں کہیں میدان بیان اور تمہید قواعد میں رواں ہوں گا تو کچھ حسب مقام ایسی ایسی باتیں کہوں گا جو کسی اہل مناظرہ اور کسی اہل کلام نے نہ کہی ہوں گی جیسے خدائے پاک کا حشر کے میدانوں میں مختلف صورتوں اور شکلوں میں تجلی فرمانا اور یہ کہ عالم عنصری کے علاوہ ایک اور ایسے عالم کا وجود میں ہونا جس میں اعمال اور معانی (مخفی چیزیں) جا کر اپنے مناسب ایک صورت جسمانی پیدا کرتے ہیں اور حوادث زمانہ زمین پر ظاہر ہونے سے پیشتر وہاں پیدا ہوتی ہیں (مراد عالم مثال) اور یہ اعمال کا ہیئت نفسانی (مثلاً شوق امید وخوف وغیرہ) سے ایسا لگاؤ رکھنا کہ درحقیقت یہی ہیئت موت کے بعد اور زندگی میں جزا و سزا کی باعث ہے اور یہ قضا وقدر کے اثر کا لازمی ہونا وغیرہ وغیرہ، اور آپ یہ بھی خیال رکھیں کہ میں ان باتوں کا جب قائل ہوا ہوں جبکہ اول میں نے آیات واحادیث وآثار صحابہ وتابعین کو ان کا مثبت ومؤید پا لیا ہے اور ان کے لئے معین دیکھ لیا ہے اور اہل سنت کے ان خاص لوگوں کو جن کو علم لدنی ملا ہے ان کا قائل پا لیا اور (یہ پایا کہ) انھوں نے اپنے بہت سے اصول وقواعد کی بنیاد انہیں پر رکھی ہے اور سنت

---

(۱) حدیث مصراۃ بخاری، مسلم، موطا امام مالک اور ابن ماجہ نے روایت کی ہے کہ جس کا یہ مطلب ہے کہ جو شیر دار جانور اونٹنی بکری بھینس وغیرہ کو زیادہ دودھ دینے والا دکھانے کے لئے اس کا دودھ تھنو میں روک کر فروخت کرے (تاکہ خریدار دھوکہ میں آکر زیادہ دام دے دے اور پھر خریدار کو دودھ دوہنے کے بعد اس کا حال معلوم ہو جائے) تو خریدار کو (تین روز تک) اختیار ہے کہ وہ اس جانور کو بہ مع ایک صاع تمر (سوا دو سیر چھوارے) یا اتنا اناج (بعوض دودھ) دے کر واپس کر دے، فقہاء (حنفیہ) کہتے ہیں کہ حضرت کی ہر ادا کو راوی حدیث نہیں سمجھا اور نہ دودھ کے معاوضہ میں صاع تمر معنوی وصوری کچھ بھی مناسبت نہیں رکھتا اگر اس کی قیمت جس قدر کہ ہو یا دودھ کے عوض دودھ واپس کرے یہ فرماتے تو ایک بات تھی۔ (اس حدیث کی بحث آگے "باب البیوع الممنوع عنھما" میں آئے گی۔ (۲) حدیث قلتین کو بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی، ابوداؤد، ابن ماجہ، احمد، دارمی اور دار قطنی نے روایت کیا ہے کہ اس کا مضمون یہ ہے کہ جب پانی دو مشکیزہ کی مقدار کا ہو (جس کا اندازہ سات من ہے) تو ناپاک چیز سے ناپاک نہیں ہوتا" اس حدیث کی صحت میں محدثین کو بہت کچھ کلام ہے جس کے ذکر کی یہاں گنجائش نہیں خدا جانے شاہ صاحب نے کیا سمجھ کر اس کو صحیح کہہ دیا۔

دراصل کسی خاص مذہب کا نام نہیں ہے بلکہ بات یہ ہے کہ اہل اسلام باوجود اس بات کے کہ دین کی ضروریات کے سب قائل ہیں، بعض مسائل میں مختلف ہوکر مختلف فرقے ہو گئے اور وہ اختلافی مسائل دو قسم کے ہیں، پہلی قسم کے وہ ہیں جو قرآن کی صریح آیات واحادیث صحیحہ سے ثابت ہیں اور سلف کے لوگ صحابہ وتابعین ان کے قائل ہیں پھر جب یہ زمانہ آیا کہ ہر شخص اپنی ہی رائے کا پابند ہونے لگا اور اپنے ہی خیالات فاسدہ کو پسند کرنے لگا تو ایک قوم نے ظاہر قرآن واحادیث کو نہایت مضبوط پکڑ لیا اور وہ عقائد سلف ہی پر قائم رہی اور قواعد عقلیہ کی موافقت اور مخالفت کی کچھ پرواہ نہ کی اور جہاں کہیں کچھ دلائل عقلیہ بیان کئے بھی تو محض مخالف کے رد اور اپنے اطمینان کامل کے لئے بیان کئے۔ اس لئے کہ ان سے عقائد کا اثبات مقصود ہو، اس گروہ کا نام اہل سنت ہے لیکن ایک قوم نے جہاں کہیں ان کو اپنے عقلی ڈھکوسلوں کے مخالف پایا تو کوئی تاویل لچر سی کر دی اور ظاہری معنی سے انحراف کیا، سوالِ قبر، اوزن اعمال، صراط پر چلنا، دیدار الٰہی اور کرامات اولیا، اسی قبیل کی ہیں یہ سب باتیں کتاب وسنت سے ثابت ہیں اور سلف اسی پر قائم تھے لیکن ایک قوم کی عقل ان کے ادراک سے عاجز آ گئی اور وہ ان کا انکار اور تاویل کرنے لگی اور ایک قوم نے یہ کہا کہ گو ہم ان کی حقیقت نہیں جانتے مگر ان پر ایمان رکھتے ہیں مگر ہم کہتے ہیں کہ ہم ان پر ایمان بھی لائے اور بفضل الٰہی ان کی حقیقت بھی ہم کو معلوم ہے اور دوسری قسم کے وہ مسائل ہیں جو نہ تو قرآن سے ثابت ہیں نہ احادیث سے اور نہ ہی صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس میں کچھ گفتگو کی ہے، بس وہ یونہی نہ کئے ہوئے رکھے رہے پھر اس کے بعد وہ لوگ پیدا ہوئے جنھوں نے ان مسائل میں یا تو دلائل عقلیہ پر نظر کر کے گفتگو کی جیسے ملائکہ پر انبیا علیہم السلام کی فضیلت کا مسئلہ یا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی فضیلت کا مسئلہ، یا اس وجہ سے ان مسائل میں گفتگو کی کہ ان پر جو چیزیں موقوف تھیں جو سنت سے ثابت ہیں جیسے امور عامہ کے مسائل یا کچھ جواہر واعراض کے مباحث کیونکہ مسئلہ حدوث عالم، ابطال ہیولٰی، اور اثبات جز لایتجزیٰ پر موقوف ہے(۱) اور یہ مسئلہ کہ خداوند تعالیٰ نے عالم کو بغیر کسی چیز کے توسط سے پیدا کیا ہے''۔

---

(۱) یہ حل برسبیل مشہور حضرت شاہ صاحب مرحوم نے فرمایا ورنہ مسئلے حدوث عالم بغیر ابطال ہیولٰی واثبات جز لایتجزیٰ بھی ثابت ہے اس پر کچھ موقوف نہیں۔

اس قول حکما کے ابطال پر موقوف ہے کہ ''ایک چیز سے صرف ایک ہی چیز نکلتی، اور صادر ہوتی ہے'' اور ثبوت معجزات ''اسباب ومسببات میں لزوم عقلی کے ابطال پر موقوف ہے اور مسئلہ معاد جسمانی''، امکان اعادہ معدوم پر موقوف ہے، ان کے علاوہ اور بہت سے مسائل ہیں جن سے کتابیں بھری پڑی ہیں، یا ان مسائل میں اس لئے اختلاف ہوا کہ جو چیز قرآن واحادیث سے تو ثابت ہے مگر اس کی تفصیل اور تفسیر میں نزاع واقع ہوا لیکن اس کی اصل میں سب کو اتفاق ہے جیسے خداوند تعالٰی کی صفات سمع (سننا) وبصر (دیکھنا) کے ثبوت میں تو سب متفق ہیں لیکن اس کی تفصیل میں اختلاف ہے۔

چنانچہ ایک قوم نے تو یوں کہا کہ اس سے مسموعات ومبصرات (دیکھنے اور سننے کی چیزوں) کا جاننا مراد ہے (نہ کہ دیکھنا اور سننا) لیکن ایک قوم نے یہ کہا ہے کہ نہیں یہ دونوں صفات جداگانہ ہیں اور اسی طرح اللہ تعالی کے حی (زندہ) علیم (جاننے والا) مرید (ارادہ کرنے والا) قدیر (ہر چیز پر قدرت رکھنے والا) متکلم (کلام کرنے والا) ہونے میں تو سب کا اتفاق ہے لیکن ان کی تفسیر میں اختلاف ہے چنانچہ ایک قوم نے اس کی یہ تفسیر کی کہ (ان سے ان کے ظاہری معنی مراد نہیں بلکہ ان سے ان کے غایات، اثرات اور افعال وغیرہ مراد ہیں اور ان ساتوں (مذکورہ بالا صفات اور رحمت غضب اور جود (سخاوت وبخشش) میں اس لحاظ سے کچھ بھی فرق نہیں ہے اور یہ کہ احادیث سے بھی ان کا یہ فرق ثابت نہیں، لیکن دوسری قوم نے یہ کہا کہ (نہیں بلکہ) یہ امور (خدا کی) ذات واجب میں موجود ہیں اسی طرح استواعلی العرش (تخت پر جلوہ افروز ہونا) وجہ (چہرہ ومنہ) اور ضحک (ہنسی) پر تو مجملاً کسی قدر متفق ہیں لیکن اس کے بعد (ان کی تفسیر) میں اختلاف ہے، چنانچہ ایک قوم نے کہا کہ ان صفات سے وہ معانی، مطالب مراد ہیں جو ان سے خاص مناسبت رکھتے ہوں مثلاً استوا سے اس کا قبضہ، غلبہ وحکومت مراد ہے اور وجہ (منہ) سے اس کی ذات مراد ہے لیکن ایک قوم نے اس کو مطلق چھوڑ دیا اور یہ کہا کہ ہم کو نہیں معلوم کہ ان سے کیا مراد ہے۔

میں اس قسم کے مسائل میں کسی ایک قوم کو دوسری قوم پر اہل سنت وحدیث کے مطابق ہونے میں فوقیت نہیں دے سکتا، کیونکہ اگر خالص سنت پر عمل مطلوب ہو تو سرے سے ان مسائل میں غور وخوض ہی نہیں کرنا چاہئے جیسا کہ سلف نے نہیں کیا، لیکن جب زیادہ بیان کی ضرورت

آ پڑے تو یہ ضروری نہیں کہ جو کچھ انھوں نے کتاب وسنت سے استنباط کیا ہو وہ سب کا سب صحیح اور راجح ہو اور نہ یہ ضروری ہے کہ جس چیز کو انھوں نے موقوف علیہ سمجھا ہو تو وہ موقوف علیہ ہی ہو اور نہ یہ ضروری ہے کہ جس چیز کو انھوں نے غلط اور مردود ٹھہرایا ہو وہ کل کا کل غلط ہی ہو، اور نہ یہ ضروری ہے کہ جس چیز کو انھوں نے مشکل سمجھ کر متروک البحث سمجھا سو وہ درحقیقت مشکل ہی ہو اور نہ یہ ضروری ہے کہ جو کچھ تفصیل وتفسیر انھوں نے بیان کی ہو وہ تمام کے تمام حق اور غیر کی تفصیل وتفسیر سے سراسر درست ہی ہو اور جبکہ ہم یہ ذکر کر چکے ہیں کہ پہلی قسم کے مسائل میں سنی ہونا ضروری ہے نہ کہ دوسری قسم کے مسائل میں چنانچہ آپ قسم دوم کے مسائل میں خود اہل سنت کو ہی باہم بہت سی جگہ مختلف پائیں گے جیسے اشاعرہ اور ماتریدیہ ہیں اور اسی لئے آپ بڑے بڑے ماہر علما کو بھی ہر زمانہ میں دیکھیں گے کہ وہ کسی بھی باریک سے باریک نکتہ اور دقیقہ کے بیان کرنے سے نہیں رُکے اور نہ کسی قسم کا گریز کیا بشرطیکہ وہ مخالف سنت نہ ہو گو متقدمین اس کے قائل ہوں یا نہ ہوں اور جب کہیں لوگوں کے راستے مختلف ہوں گے تو میں صاف روشن اور سیدھی راہ چلوں گا۔ ادھر اُدھر نہ دیکھوں گا اور نہ کناروں کو تاکوں گا بلکہ بیچوں بیچ چلوں گا اور لوگوں کی تفریعات وتخریجات کو بھی نہ لوں گا۔

اور یہ بھی دیکھئے کہ ہر فن کا ایک خاصہ اور ہر مقام کا ایک مقتضیٰ ہوا کرتا ہے، جس طرح فن غریب کے مناسب نہیں کہ وہ فن صحت وضعیف حدیث سے بحث کرے اور نہ حافظ حدیث کو لائق ہے کہ وہ فروعات فقہیہ اور ان میں سے بعض کو بعض پر ترجیح دینے واختیار کرنے سے بحث کرے بالکل اسی طرح حدیث کے اسرار ورموز سے بحث کرنے والے کو بھی زیبا نہیں دیتا کہ وہ ان باتوں میں کلام کرے، اس کی غرض وغایت اور مطمح نظر تو یہی ہے کہ وہ نبی صلعم کے قول کے وہ اسرار ورموز بیان کردے جو خود نبی صلعم نے اس میں ملحوظ رکھے خواہ وہ حکم محکم ہو یا منسوخ یا اس کے لئے کوئی اور دلیل متعارض ہو یا نہ ہو جس کسی وجہ سے فقہا نے اس کو مرجوح سمجھا ہو، ہاں! کسی فن کے مدون کو اس سے بھی چارہ نہیں کہ بعض وہ باتیں جو اس فن سے بہت زیادہ مناسبت رکھتی ہوں ان کو بیان کرے اور فن حدیث کے لئے بھی یہ بات موزوں ہے کہ اس میں وہ باتیں ذکر کی جائیں جو شہروں میں مدون شدہ احادیث اور آثار فقہا کے بعد درج ہوئی ہوں اور متابع علیہ کو متفرد بہ سے اور قوی وکثیر الروایہ کو ان کی کمتر سے ممیز کیا جائے پھر بھی اگر کوئی بات تبعاً ذکر بھی ہوئی ہو تو مسائل

اجتہاد یہ اور حق بات کی تحقیق میں اہل علم کا کلام کرنا نہ کوئی نئی بات ہے اور نہ کسی پر موجب طعن ہے۔ میں تو جہاں تک ہوسکتا ہے اصلاح کرنا چاہتا ہوں، باقی (اس میں) کامیاب ہونا نہ ہونا خدا کی مدد پر (موقوف) ہے میں اسی پر بھروسہ کرتا ہوں اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں یہ بھی یاد رہے کہ جو بات مجھ سے خلاف قرآن وحدیث یا اہل قرن خیر کے مخالف یا جمہور مجتہدین کے خلاف یا مسلمانوں کے سوادِ اعظم (بڑی عام جماعت) کے برخلاف صادر ہو تو میں اس سے بری ہوں تاہم اگر مجھ سے کوئی ایسی بات سرزد ہوگئی ہو تو اس کو بھول چوک سمجھے جو کوئی ہم کو خواب غفلت سے بیدار کرے گا یا کوتاہیوں سے متنبہ کرے گا، خدا تعالیٰ اس کو جزائے خیر دے گا باقی جو لوگ متقدمین کے کلام کو چرا کر کج بحثی کرتے ہیں اور اہل مناظرہ ومجادلہ کے نام سے منسوب ہیں ان کی ہر بات سے اتفاق کرنا یا ان کا اتباع کرنا ہمارے لئے کچھ ضروری نہیں ہے۔ وہ بھی آدمی ہیں ہم بھی آدمی ہیں۔ کبھی انکا پلہ بھاری ہوتا ہے کبھی ہمارا۔

میں نے اس کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے، پہلے حصے میں وہ قواعد کلیہ ہیں جن میں ایسی مصلحتیں مذکور ہیں جو آنحضرت صلعم کے زمانہ کے تمام مذاہب میں مسلم الثبوت اور متفق علیہ تھیں اور کسی کو بھی ان میں اختلاف نہ تھا اور صحابہؓ کو گو ان کے دریافت کرنے کی کچھ ضرورت نہ تھی لیکن آنحضرت صلعم ان کو یہ مصلحتیں بتادیا کرتے تھے بالکل اسی طرح جیسے کوئی فروعات بتاتے وقت ایسے اصولوں کی طرف اشارہ کردے جن سے فروعات حاصل ہوتی ہیں۔ تاکہ بوقت ضرورت سامعین ان سے فروعات حاصل کرسکیں کیونکہ صحابہؓ نے ان نظیروں کو دیکھ لیا تھا جو اس زمانہ کے ملت اسماعیلیہ والے جاہل عرب اور یہود ونصاریٰ اور مجوسیوں میں پائی جاتی تھیں لہٰذا وہ اس فن میں خوب ماہر ہوگئے اور ان کو اس ہنر میں بڑا ملکہ حاصل ہوگیا میں نے یہ دیکھا کہ اگر تمام شرائع کے اسرار ورموز کی تفاصیل پر غور کیا جائے تو وہ دو اصولوں پر مبنی نظر آتی ہیں۔ ایک تو نیکی وبدی کا مبحث۔ دوسرے ملی وقومی سیاسیات کا مبحث، پھر یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ نیکی وبدی کی پوری پوری حقیقت جب ہی معلوم ہوسکتی ہے کہ ان سے پیشتر جزائے اعمال، طریقہ ہائے انتفاع اور سعادت نوعیہ کے مباحث معلوم ہوجائیں۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ مباحث چند ایسے مسائل پر موقوف ہیں جن کو اس علم میں پہلے ہی تسلیم کرلیا گیا ہے اور جن کی حقیقت اس علم میں اس لئے بیان

نہیں ہوتی کہ ان کو ہر شخص خود بخود دیا تو اس لئے تصدیق کرتا ہے کہ ہر مذہب میں وہ مسلم ہیں یہاں تک کہ وہ مشہورات میں شمار کئے گئے ہیں یا اس لئے کہ ان کے معلم کی نسبت حسن ظن ہے یا ان کے دلائل اس سے کسی اور اعلیٰ علم میں بیان ہو چکے ہیں، میں نے بخوف طوالت یہ ضروری نہ جانا کہ میں اپنی اس کتاب میں ''روح و نفس کا ثبوت و بقاء اور اس کا بدن سے الگ ہونے کے بعد رنج وراحت پانا'' ثابت کروں کیونکہ لوگوں کی کتابوں میں ان پر کافی بحث ہو چکی ہے البتہ ان مباحث میں سے میں نے صرف وہ مباحث ضرور ذکر کئے ہیں جن سے یا تو وہ کتابیں بالکل خالی تھیں یا ان کی وہ ترتیب و تفریعات نہیں کی گئی تھیں جن کی مجھ کو توفیق دی گئی اور مسلمات میں سے بھی وہی چیزیں ذکر کی ہیں جن کو (پچھلے) لوگوں نے نہیں لیا، اور دلائل مسموعہ (نقلی دلائل) بھی میں نے ان پر بہت کم بیان کئے ہیں، لہٰذا اس (اوّل) حصہ میں ہم وہی مسائل بیان کریں گے جن کو بلا استفسار طیبت و مصلحت یہاں اس فن میں تسلیم کرنا ضروری ہے۔ پھر زندگی میں اور موت کے بعد جزائے اعمال کی کیفیت۔ پھر انتفاع کے وہ طریقے جو بنی آدم کے لئے جبلی و پیدائشی بنائے گئے ہیں اور کسی نے بھی ان کو اس طرح نہ لیا کہ ان کی عقل میں آسکیں۔ پھر انسان کی باعتبار اس کی نوع کے سعادت و شقاوت اور باعتبار آخرت کے بھلائی، پھر نیکی اور بدی کے وہ اصول جن پر ہر اہل مذہب کو اتفاق ہے پھر جو کچھ امت کی سیاست کے لئے تقرر حدود و شرائع سے واجب سمجھا گیا۔ پھر شرائع کے نبی صلعم کے کلام سے استنباط کرنے کی کیفیت اور دوسرے حصہ میں مندرجہ ذیل ابواب کی احادیث کے اسرار و رموز کی شرح بیان کی ہے۔

ابواب ایمان، ابواب علم، ابواب طہارت، ابواب صلوٰۃ، ابواب زکوٰۃ، ابواب صوم، ابواب حج،، ابواب احسان (نیکی)، ابواب معاملات، ابواب تدبیر منازل (امور خانہ داری و گھریلو انتظامات) ابواب سیاست مدن (ملکی سیاست) ابواب آداب معیشت (رہنا سہنا) اور چند مختلف ابواب (سیرت نبیؐ، فتنے، مناقب کے بارے میں) اب مقصود بیان کرنے کا وقت آپہنچا، سب طرح کی حمد و ثنا اللہ ہی کے لئے ہے، شروع میں بھی اور آخر میں بھی۔

حصۂ اوّل: اس میں وہ قواعد کلیہ ہیں جن سے وہ مصلحتیں سمجھی جاتی ہیں جو کہ احکام شرعیہ میں ملحوظ رکھی گئی ہیں اس میں سات مبحث اور ستر باب ہیں (۱)۔

مبحث اول

تکلیف اور جزا وسزا کے اس باب کے بیان میں

پہلا باب: ـــ ابداع (۲)، اور پیدا کرنے اور تدبیر کے بیان میں۔

واضح ہو کہ خداوند تعالیٰ کی خلق و عالم کے پیدا کرنے میں بالترتیب تین صفات ہیں جو ایک دوسرے پر مترتب ہیں (اوّل) ابداع ہے اور وہ کسی چیز کا بغیر کسی سے پیدا کرنا ہے اس طرح کہ وہ چیز پردۂ عدم سے بغیر کسی مادہ کے ظہور کرے، چنانچہ نبی صلعم سے کسی نے سب سے پہلی مخلوق کے بارے میں دریافت کیا تو فرمایا کہ اللہ ہی تھا اور اس سے پہلے کوئی نہ تھا (۳) (دوم) پیدا کرنا اور وہ کسی چیز کو کسی دوسری چیز سے پیدا کرنا ہے، جیسے آدمؑ کو مٹی سے اور جنوں کو بغیر دھوئیں کی خالص آگ سے پیدا کیا، اور عقل ونقل دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے عالم کو چند انواع اور چند اجناس میں ظاہر فرما کر ہر ایک نوع اور جنس کے لئے ایک خاصہ مقرر فرمایا ہے۔ مثلاً انسان کا خاصہ کلام کرنا، صاف جلد ہونا، سیدھا قد ہونا، اور مخاطب کی بات کو سمجھنا ہے لیکن گھوڑے کی نوع کا خاصہ ہنہنانا، جلد پر بال ہونا، ٹیڑھا قد ہونا اور کلام کا نہ سمجھنا ہے اور زہر کی یہ خاصیت ہے کہ جو اس کو کھاتا ہے ہلاک ہو جاتا ہے اور سونٹھ کی خاصیت گرم خشک ہے، اور کافور کی خاصیت سرد ہے اور

---

(۱) یہاں مصنف نے ستر باب کہے ہیں حالانکہ اصل میں اسی باب ہیں، شاید سہو ہوگیا۔ (۲) ابداع کے معنی کسی چیز کو نئے طرز پر بے نمونہ کے پیدا کرنا یعنی ایجاد کرنا۔ (۳) یہ روایت صحیحین کی ہے جو عالم کے حدوث زمانی پر دلالت نہیں کرتی مگر دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے یہ فرمایا کہ ''اللہ ہی تھا اور اس کے ساتھ کوئی چیز نہ تھی'' یہ روایت حدوث عالم پر دلالت کرتی ہے۔

اسی طرح معدنیات نباتات اورحیوانات کی دیگر تمام اقسام وانواع کا حال ہے اور خداوند تعالیٰ کا قانون اسی طرح رہا ہے کہ کسی چیز کا خاصہ اس سے جدا نہیں ہوتا اور متشخص افراد اپنے خواص کے حق میں اس طرح مخصوص اور متعین ہیں جس طرح ممیّزات انواع، خواص اجناس کے حق میں (۱)، اور اسی طرح ان چیزوں کے معانی واثرات کا حال ہے جو ہر خاص وعام میں مترتب ہوتی رہتی ہیں اور مخصوص طور پر بھی پائے جاتے ہیں اور عام طور پر بھی، مثلاً جسم، نامی، حیوان، اور انسان اور یہ خواص بھی ظاہراً تو باہم ملے جلے نظر آتے ہیں لیکن عقل ان کے درمیان فرق معلوم کر کے ان کی اصل چیز کے ساتھ (ان کا رشتہ) ملا دیتی ہے۔

نبی صلعم نے بہت سی چیزوں کے خواص بیان فرمائے اور ان کے اثرات کی نسبت ورشتہ انہیں سے ملا دیا، چنانچہ آپ نے فرمایا کہ "تلبینہ (حریرہ) (۲) مریض کے دل کو فرحت وقوت بخشتا ہے"۔ اور یہ کہ "کلونجی سوائے موت کے ہر ایک مرض کے لئے شفا ہے" ایک جگہ فرمایا کہ اونٹ کا پیشاب ودودھ بدہضمی ودست کا علاج ہے اور فرمایا کہ "شبرم گرم ہوتا ہے (۳)۔ (سوم) صفت تدبیر عالم موالید (۴) ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ زمانہ کی ہر چیز اس نظام کے موافق ہو جو اس کی حکمت پسند کرتی ہے اور اس مصلحت کے مطابق ہو جو اس کی رحمت چاہتی ہے، جیسے بادل سے پانی برسایا اور اس سے زمین کا سبزہ نکال کر اس کو ایک مدت معینہ تک کے لئے انسانوں اور چوپایوں کی زندگی کا سبب بنایا اور جیسے حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں پھینکوا کر پھر آگ کو ان کے زندہ رکھنے کے لئے مناسب طور پر سرد کر دیا اور جیسے حضرت ایوبؑ کے بدن میں مرض کا مادہ جمع کیا اور پھر ایک ایسا چشمہ بنایا جس سے ان کا مرض دور ہو گیا اور جیسے خدا نے ایک بار اہل زمین پر نظر کی تو ان پر (ان کی بداعمالی کی وجہ سے) بہت غصہ ہوا پھر اپنے ایک نبی کو بذریعہ وحی حکم دیا کہ وہ ان کو ڈانٹے اور (عذاب سے) چوکنا کر دے اور ان سے جہاد کرے (یہ اس لئے کیا) تاکہ وہ اپنی مرضی کے مطابق جسے چاہے تاریکی (کفر) سے نکال کر روشنی (ایمان) میں لے آئے، اور تفصیل اس کی

---

(۱) یعنی جس طرح افراد باہم خصوصیات اور تعینات سے ممتاز ہیں، اسی طرح اجناس، انواع کی وجہ سے ممیّز وممتاز ہیں۔ (۲) یہ حریرہ آٹے یا بھوسی سے بنایا جاتا ہے کبھی شہد بھی ملا لیتے ہیں۔ سفیدی اور ملائمت میں دودھ کی مانند ہوتا ہے۔ (۳) شبرم چنے کی طرح ایک دانہ ہوتا ہے جس کو جوش کر کے اس کا پانی دوا کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔
(۴) موالید آسمان وزمین کے اندر کی مخلوقات، نباتات، حیوانات اور معدنیات وغیرہ کو کہتے ہیں۔

یہ ہے کہ موالید میں ودیعت شدہ قوتیں جوان سے کبھی جدا نہیں ہوتیں جب آپس میں ملتی اور ٹکراتی ہیں تو حکمت الٰہی ان میں سے ایسے مختلف اطوار واثرات پیدا کرتی ہے جن میں سے بعض تو جواہر ہوتے ہیں اور بعض اعراض۔ اور اعراض یا تو ذی نفس چیزوں کے اعمال ہوتے ہیں یا ارادے یا ان دونوں کے علاوہ کوئی اور چیز ہوتے ہیں اور ان اطوار واثرات میں فی نفسہ کوئی شر (قباحت وبرائی) ان معنوں میں نہیں کہ جس چیز کو ان کا سبب چاہتا ہے وہ صادر نہیں ہو رہی یا یہ کہ جس کو ان کا سبب چاہتا ہے اس کے بالکل مخالف صادر ہو رہا ہے (۱) اور (یہ تو ایک عام اصول ہے کہ) اگر کسی چیز کے وجود میں آنے کے اصل سبب ومقصد پر غور کیا جائے تو وہ لامحالہ اچھی اور مفید نظر آئے گی، دیکھئے کسی چیز کا کاٹنا یا مثلاً لوہے کا کاٹنا اس وجہ سے اچھا اور حسن ہے کہ لوہے کے جوہر کا یہی تقاضا ہے گو اس لحاظ سے برا ہے کہ اس سے انسانی معاشرہ ختم ہو جاتا ہے، ہاں ان اشیا میں شر ان معنوں میں ضرور پایا جاتا ہے کہ ان میں ایسی چیز پیدا ہو جو اثرات کے لحاظ سے مصلحت میں پہلی چیز سے کمتر ہو (یعنی خوبتر کی جگہ کم درجہ کی چیز پیدا ہو) یا کوئی ایسی چیز سرے سے پیدا ہی نہ ہو جس کے اثرات عمدہ ہوں (۲) اور جب اس قسم کے شر کے اسباب تیار ہو جاتے ہیں تو خدا کی وسیع رحمت اور لطف عام اور قدرت کاملہ اور علم محیط کا یہ تقاضا ہوتا ہے کہ وہ ان قوتوں اور ان چیزوں میں جو ان قوتوں کی حامل ومالک ہیں، قبض، بسط، احالہ اور الہام کے ذریعہ سے کچھ تصرف کرے تاکہ ان سے ان کا اصل مقصد ومطلوب حاصل ہو جائے، قبض (۳) کی مثال وہ ہے جس کا اس حدیث میں ذکر ہے کہ "دجال مرد مؤمن کو دوبارہ قتل کرنا چاہے گا (۴)۔ لیکن خدا اس کو قتل کی قدرت نہ دے گا باوجود یکہ اسباب وسامان قتل سب اس کے پاس صحیح وسالم موجود ہوگا۔ اور بسط (۵) کی مثال یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے حضرت ایوب علیہ السلام کے لئے فرشتہ کی ٹھوکر سے چشمہ پیدا کر دیا۔

---

(۱) ان کی اصطلاح میں شر کی دو صورتیں ہیں اول یہ کہ جس کو سبب چاہتا ہے وہ نہ ہو جیسے پانی کا تقاضا ٹھنڈک ہے وہ اس سے حاصل نہ ہو دوم یہ کہ جس کو سبب چاہتا ہے اس کے خلاف صادر ہو جیسے پانی سے گرمی پیدا ہو، (۲) یہاں شر کی دو اور صورتیں بیان فرمائیں اول یہ کہ ایک چیز سے جیسا عمدہ اثر پیدا ہوتا تھا ویسا نہ ہو بلکہ کم درجہ کا ہو، دوم یہ کہ اس سے کوئی عمدہ اثر ہی پیدا نہ ہو، یہ دو قسم کا شر تو موالید میں پایا جاتا ہے، لیکن پہلی دو قسم کا نہیں پایا جاتا۔ (۳) قبض سکڑ لینا، سلب کر لینا۔ (۴) یہ مرد مومن وہ شخص ہے جو مدینہ سے دجال کے مناظرہ کے لئے نکلے گا۔ (۵) بسط پھیلا دینا، قوت دینا۔

حالانکہ عام طور پر ایسا نہیں ہوا کرتا کہ محض ٹھوکر مارنے سے چشمہ جاری ہو جایا کرے اور اسی طرح اپنے بعض مخلص بندوں کو جہاد میں ایسے ایسے کاموں کی قدرت دی جن کا ان کے سے بدن والوں بلکہ ان سے دگنے تگنے بدن والوں سے سرانجام پایا عقل میں نہیں آتا (۱) اور جو احالہ (۲) ہے اس کی مثال یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کے لئے آگ کو خوشگوار اور فرحت بخش ہوا بنا دیا تھا۔ اب رہا الہام (۳) تو اس کی مثال حضرت خضرؑ کا قصہ ہے کہ انھوں نے کشتی کو توڑا، دیوار کو سیدھا کیا اور لڑکے کو قتل کیا، نیز کتابوں اور احکام کا انبیا پر نازل ہونا بھی الہام ہے۔ اور الہام کبھی خود اس شخص کو ہوتا ہے جو اس معاملہ میں گرفتار (ضرورتمند) ہوتا ہے اور کبھی اس کے لئے کسی اور کو ہو جاتا ہے اور قرآن مجید نے تدبیر کی اتنی انواع واقسام بیان کی ہیں کہ ان سے زیادہ کوئی بیان ہی نہیں کرسکتا۔

دوسرا باب عالم مثال کے بیان میں

معلوم ہونا چاہئے کہ بہت سی احادیث اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اس عالم عنصری (مادی دنیا) کے علاوہ ایک اور ایسا عالم موجود ہے جس میں معنوی (مخفی) چیزیں (مثلاً صفات انسانی وغیرہ) اپنی صفت کے مناسب جسم میں ظہور میں آتی ہیں اور زمین سے پائے جانے سے پیشتر ہر چیز پہلے وہاں موجود ہوتی ہے پس جب پائی جاتی ہے تب ایک طرح سے یہ وہی ہوتی اور بہت سی ایسی چیزیں ہیں جن کا عام لوگوں کے نزدیک جسم نہیں ہے وہ وہاں آتی جاتی ہیں۔ لیکن لوگوں کو دکھائی نہیں دیتیں، چنانچہ نبی صلعم نے فرمایا کہ ''جب خدا نے رحم (۴) سے (رشتہ مہربانی) کو پیدا کیا تو وہ کھڑا ہو کر یہ کہنے لگا کہ یہاں اس کا ٹھکانا ہے جو قطع رحم کرنے (رشتہ توڑنے) میں تجھ سے ڈرتا اور تیری پناہ مانگتا ہے اور فرمایا کہ ''سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران قیامت کے دن اس طرح سے آئیں گی کہ گویا وہ دو بدلیاں یا دو چھتریاں اور سائے یا صف بستہ پرندوں کے دو غول ہیں اور وہ اپنے پڑھنے والے کی طرف سے ہو کر گفتگو کریں گی''۔

اور فرمایا کہ ''قیامت کے روز سب اعمال آئیں گے، پہلے نماز آئے گی پھر صدقہ پھر

(۱) جیسے حضرت علیؓ کا قلعۂ خیبر کے دروازہ کو اکھیڑ دینا۔ (۲) احالہ ایک چیز کو کچھ سے کچھ کر دینا۔ (۳) الہام، وحی دل میں کسی بات کا القا کرنا۔ (۴) رحم آپس کی محبت اور نرمی یعنی صلۂ رحم۔

روزے الخ اور فرمایا کہ ''نیکی اور بدی وہ مجسم چیزیں بن کر قیامت کے روز کھڑی ہوں گی نیکی تو اپنے کرنے والے کو خوشخبری دے گی اور بدی کہے گی بچو! بچو! لیکن وہ (بدلوگ) اس سے بچ نہ سکیں گے'' اور فرمایا کہ ''قیامت کے روز خداوند تعالیٰ تمام دنوں کو تو ہو بہو لائے گا لیکن جمعہ کے دن کو نہایت چمک دمک سے ظاہر کرے گا''۔ اور فرمایا کہ ''دنیا قیامت کے روز ایک ایسی ادھیڑ عمر بڑھیا کی صورت میں لائی جائے گی جس کے نیلے نیلے دانت ہوں گے اور پھیلا ہوا بدنما منہ ہوگا''۔ اور فرمایا کہ ''(اے لوگو) جس کو میں دیکھتا ہوں کیا وہ تم کو بھی نظر آتا ہے میں تو تمہارے گھروں میں مینہ کی طرح فتنے وفساد برستے دیکھتا ہوں(۱)۔ اور حدیث معراج میں یہ فرمایا کہ ''یکا یک مجھ کو چار نہریں دکھلائی دیں دو باطنی اور دو ظاہری۔ تو میں نے پوچھا کہ اے جبرئیل! یہ کیا ہے؟ تو انھوں نے کہا کہ یہ دو باطنی نہریں جنت میں ہیں اور جو باقی دو ظاہری ہیں وہ نیل اور فرات ہیں''۔ اور سورج گہن کی حدیث میں آپ نے یہ فرمایا کہ ''مجھ کو جنت ودوزخ کی صورت دکھائی گئی''۔ اور ایک روایت میں یوں ہے کہ ''قبلہ کی (یعنی سامنے کی) دیوار اور میرے درمیان (جنت ودوزخ کی صورت دکھائی گئی'' اور اسی حدیث میں یہ بھی ہے کہ ''آپ نے جنت (کے پھولوں) کا ایک خوشہ لینے کے لئے اپنا ہاتھ بڑھایا'' اور یہ بھی ہے کہ ''آپ (دوزخ کی) آگ کی گرمی سے اف اف کرتے ہوئے پیچھے ہٹے اور اس آگ میں حاجیوں کے مال چرانے والے کو دیکھا اور اس عورت کو بھی دیکھا جس نے کسی بلی کو باندھ کر بھوکا پیاسا مارا تھا، اور جنت میں اس رنڈی کو دیکھا جس نے پیاسے کتے کو پانی پلایا تھا، اور یہ ظاہر ہے کہ (آنحضرتؐ اور محراب مسجد کا) وہ (درمیانی) فاصلہ جنت ودوزخ کی اس مقدار کی جو سب کو معلوم ہے کہاں گنجائش رکھ سکتا ہے۔ اور ایک جگہ آپ نے فرمایا کہ ''جنت ایسی تکلیف دہ چیزوں سے گھری ہوئی ہے جو نفس کو ناگوار ہیں اور دوزخ ایسی لذت والی چیزوں سے جن کی نفس کو خواہش ہے(۲)۔

پھر جبرئیل نے کہا کہ لو اب ان کو دیکھو، اور آپ نے یہ بھی فرمایا کہ ''جب بلا نازل ہوتی ہے

---

(۱) یہ آپ نے اہل مدینہ سے فرمایا تھا، چنانچہ آپ کے بعد ایسا ہی ہوا، شہادت حسینؓ اور قتل حراء وغیرہ جیسے سخت سخت مصائب اہل مدینہ پر نازل ہوئے۔ (۲) یعنی جنت میں جانے کے لئے بڑی مشکلات جھیلنی پڑتی ہیں اور دوزخ میں جانے والا اس میں داخل ہونے سے قبل بڑے عیش وآرام اور بغیر کسی تکلیف کے رہ چکا ہوگا۔

تو دعا اس سے لڑتی اور اس کو روکتی ہے"۔ اور فرمایا کہ اللہ نے عقل کو پیدا کر کے یہ کہا کہ سامنے آ، تو وہ آ گئی اور پھر کہا کہ چلی جا تو وہ چلی گئی" اور فرمایا کہ "یہ دو کتابیں پروردگار عالم کی طرف سے (ارسال کردہ) ہیں (۱) اور فرمایا کہ "موت کو ایک مینڈھے کی شکل میں لا کر جنت اور دوزخ کے درمیان ذبح کر دیا جائے گا" اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "ہم نے مریم کے پاس اپنا ایک فرشتہ بھیجا تو وہ ان کو ایک جوان آدمی کی شکل میں دکھائی دیا"۔ اور حدیث سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ جبرئیلؑ آنحضرتؐ کے پاس آتے تھے تو آپ ان کو دیکھتے تھے اور ان سے باتیں بھی کرتے تھے لیکن اور لوگوں کو وہ نظر نہیں آتے تھے اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ "مومن کی قبر ستر در ستر گز کشادہ ہو جاتی ہے اور کافر کی تنگ یہاں تک کہ اس کی پسلیاں الٹ پلٹ کر ادھر کی ادھر نکل جاتی ہیں اور یہ کہ "قبر میں میت کے پاس فرشتے آ کر اس سے سوال کرتے ہیں اور اس کے اعمال اس کو ایک خاص شکل میں نظر آنے لگتے ہیں"۔ اور یہ جانکنی کے وقت فرشتے آتے ہیں تو ان کے ہاتھوں میں یا تو ریشم ہوتا ہے یا ٹاٹ" (۲)۔ اور یہ کہ "قبر میں فرشتے میت کو لوہے کے گرزوں اور ہتھوڑوں سے اس طرح مارتے ہیں کہ اس (کافر) کی چیخ کو مشرق سے مغرب تک (سوائے جن وانس کے) سب سنتے ہیں"۔ اور یہ کہ "ہر کافر پر اس کی قبر میں ننانوے زہریلے اژدھے مسلط کئے جاتے ہیں تا کہ وہ اس کو قیامت کے آنے تک نوچتے اور ڈستے رہیں"۔

اور فرمایا کہ "جب مردہ کو قبر میں رکھا جاتا ہے تو اسے آفتاب غروب ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے تب وہ بیٹھ کر آنکھیں ملنے لگتا ہے اور فرشتوں سے کہتا ہے کہ مجھے چھوڑو تو سہی میں ذرا نماز تو پڑھ لوں"۔ اور حدیث سے یہ بھی ثابت ہے کہ "خداوند تعالیٰ قیامت میں اہل محشر کو مختلف صورتوں میں اپنی تجلی دکھائے گا اور یہ کہ "نبی صلعم خداوند تعالیٰ کے پاس جائیں گے اور وہ اپنی کرسی پر (جلوہ افروز) ہوگا" اور یہ کہ "خداوند تعالیٰ ابن آدم سے دوبدو کلام کرے گا"۔ اس کے علاوہ اور بہت سی احادیث ہیں جن کا شمار نہیں ہو سکتا۔

---

(۱) اس میں شاید اس حدیث کی طرف اشارہ ہے جس میں ذکر ہے کہ آپؐ دو کتابیں لیے ہوئے نکلے اور فرمایا کہ ایک کتاب میں تو جنتیوں کے نام ہیں اور ایک میں دوزخیوں کے۔ (۲) تا کہ مرنے والا اگر مومن صالح ہو تو اس کی روح ریشم میں لے جائیں اور اگر فاسق فاجر کافر ہو تو ٹاٹ میں لے جائیں۔

اب ان احادیث کا دیکھنے والا تین حال سے خالی نہیں یا تو ان کے ظاہری معنی کا مقر ہو کر ایک اور عالم ثابت کرے گا جس کا حال ہم نے ذکر کیا۔ چنانچہ اہل حدیث کا یہی دستور ہے جیسے علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے فرمایا کہ میں تو اسی کا قائل ہوں اور یہی میرا مذہب ہے' یا وہ یوں کہے گا کہ یہ چیزیں محض حسن بصر میں دکھائی دیتی ہیں اور اصل میں ان کا کچھ بھی وجود نہیں۔ عبداللہ بن مسعودؓ نے بھی اس آیت اس روز کا انتظار کرو جس روز آسمان کھلا کھلا دھواں لائے گا" کی تفسیر میں ایسا ہی کہا ہے کہ ان کے زمانہ میں قحط سالی ہوگئی تھی اس وقت جب کوئی آسمان کی طرف دیکھتا تھا تو بھوک کی وجہ سے اس کو دھواں سا نظر آتا تھا۔ اور ابن ماجشون سے منقول ہے کہ جس حدیث میں بھی خداوند تعالیٰ کی نسبت قیامت کے روز نقل وحرکت کرنے یا رویت وتجلی کا ذکر آیا ہے تو اس سے یہ مراد ہے کہ خداوند تعالیٰ اپنے بندوں کی نگاہ بدل دے گا جس سے وہ اس کو آسمان سے اترتا اور تجلی کرتا دیکھیں گے اور یوں سمجھیں گے کہ وہ ان سے کلام کر رہا ہے حالانکہ وہ اپنی اسی عظمت سے ہے نہ اترتا ہے نہ کوئی اور نقل وحرکت کرتا ہے اور یہ سب اس لئے ہے کہ ان کو معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے"۔ یا یوں کہے گا کہ ان احادیث سے کچھ اور معنی مراد ہیں اور ان معنی کو سمجھنے کے لئے یہ مثالیں بیان کی گئی ہیں لیکن میرا یہ خیال ہے کہ یہ تیسرا قول کسی اہل حق کا نہیں۔

امام غزالی نے عذاب قبر کے باب میں ان تینوں مقامات کی صورت (بہت اچھی طرح) بیان کی ہے چنانچہ فرماتے ہیں کہ اس قسم کی احادیث کے ظاہری معنی تو صحیح ہیں لیکن ان کے اسرار وبھید مخفی ہیں اور اہل بصیرت پر یہ سب بالکل واضح ہیں، لہٰذا جس کو ان کے اسرار معلوم نہ ہوں اور اصل حقیقت کا علم نہ ہو تو اسے ان کے ظاہری معنوں کا انکار نہیں کرنا چاہئے بلکہ سچا جان کر تسلیم کر لینا چاہئے کیونکہ یہی ایمان کا ادنیٰ درجہ ہے اگر کوئی یوں کہے کہ ہم نے کافر کی قبر کو بارہا کھول کر دیکھا اور عرصہ تک اس کی لاش کو بھی قبر میں پڑے دیکھا لیکن یہ چیزیں ہم نے کبھی نہیں دیکھیں (۱)۔ پھر خلاف مشاہدہ چیز کی کیسے تصدیق کی جائے تو اس کا جواب یوں ہے کہ انسان کے ہر ایسی باتوں کی تصدیق کرنے میں تین حال ہیں۔ پہلا حال جو کہ سب سے زیادہ واضح، صحیح اور قابل تسلیم ہے وہ یہ ہے کہ یہ سب باتیں اپنی جگہ موجود ہیں، بیشک اس کو سانپ اور اژدھا ڈس رہا ہے لیکن تجھ

---

(۱) یعنی ان پر ثواب وعذاب ہوتے نہیں دیکھا۔

کو ان آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتا کیونکہ ملکوتی امور کے دیکھنے کی ان آنکھوں میں صلاحیت ہی نہیں اور جو چیز بھی آخرت سے تعلق رکھتی ہے وہ ملکوتی ہے، دیکھئے صحابہؓ نزول جبرئیل پر کس طرح سے ایمان رکھتے تھے حالانکہ وہ ان کو دیکھتے نہیں تھے، اور ان کا اس بات پر بھی ایمان تھا کہ آنحضرتؐ جبرئیل کو دیکھا کرتے ہیں، پس اگر تم کو اس بات پر ایمان نہیں تو تمہارا ملائکہ اور وحی پر بھی صحیح طور سے ایمان لانا بڑا مشکل ہے (لہذا پہلے اس کی تجدید وتصحیح ضروری ہے) اور اگر تم کو ایمان ہے اور تمہارے نزدیک ممکن ہے کہ ایک چیز امت کو نظر نہ آئے لیکن آنحضرتؐ کو دکھائی دے تو پھر میت کی بابت اس کے تسلیم کرنے میں تم کو کیوں تردد ہے اور جس طرح فرشتے آدم اور حیوانات کے مشابہ نہیں اسی طرح وہ سانپ اور بچھو جو میت کو ڈستے ہیں ہمارے عالم (عنصری) کے سانپ وبچھوؤں کی طرح نہیں بلکہ وہ کسی اور جنس کے ہیں اور کسی اور قسم کی (قوت) جس سے ادراک (علم) میں آسکتے ہیں، دوسرا حال یہ ہے سونے والے کی حالت تو تم کو یاد ہوگی کہ وہ خواب میں سانپ کو ڈستے دیکھتا ہے اور اس کی تکلیف وایذا بھی اس کو محسوس ہوتی ہے جس طرح کہ جاگتے کو محسوس ہوتی ہے یہاں تک کہ تم اس کو چیختے ہوئے اور ماتھے پر پسینہ آتے ہوئے دیکھتے ہو اور کبھی وہ اپنی جگہ سے اچھل بھی پڑتا ہے یہ سب باتیں وہی دیکھتا اور محسوس کرتا ہے لیکن ظاہر میں تم اس کو وہیں خاموش پڑا دیکھتے ہو نہ اس کے گرد سانپ دکھائی دیتے ہیں نہ بچھو حالانکہ اس کے لحاظ سے سانپ بھی اس کے پاس موجود ہیں اور بچھو بھی اور تکلیف بھی اسے برابر محسوس ہو رہی ہے، لیکن یہ سب باتیں تمہارے لحاظ سے مشاہدہ سے باہر ہیں اور جب سزا وعذاب دراصل ڈسنے کی تکالیف سے ہوتا ہے تو پھر خیالی سانپ ہونے یا حقیقی سانپ ہونے سے (اس میں) کیا فرق پڑ جاتا ہے۔

تیسرا حال یہ ہے کہ تم خوب جانتے ہو کہ سانپ بذات خود کچھ تکلیف وضرر نہیں دیتا بلکہ جس چیز سے تم کو درد وتکلیف پہنچتی ہے وہ اس کا زہر ہے، پھر زہر بھی بذات خود کچھ (باعث) تکلیف نہیں بلکہ اس سے جو اثر حاصل ہوتا ہے دراصل وہی (باعث) تکلیف ہے تو اگر سوائے زہر کے چاہے کسی اور چیز سے یہ اثر حاصل ہو تو وہ بھی ایک قسم کی تکلیف وعذاب ہوگا جو اس سے کسی طرح کم نہ ہوگا لیکن اس عذاب (کی تکلیف) کو بغیر ایسے سبب کی طرف نسبت دیئے بیان نہ کر سکو گے جس سے عام طور پر اسی قسم کی تکلیف محسوس ہوتی ہے جیسے جماع کی لذت اگر انسان کو

بغیر عورت سے صحبت کئے حاصل ہو جائے تو وہ اس کی تعریف مباشرت کی طرف نسبت دیئے بغیر نہیں کر سکتا۔ اور یہ نسبت محض سبب کے اثر کی تعریف کے لئے کرتے ہیں اور اس لئے کہ سبب کا ثمرہ حاصل و معلوم ہو جائے گو سبب کی صورت حاصل نہ ہو اور سبب (بیان کرنے) سے اس کا ثمرہ بتانا مقصود ہوتا ہے بذات خود سبب (بیان کرنا) مقصود نہیں ہوتا اور انسان کی یہ (زندگی کی) خراب عادتیں ہی موت کے وقت اس کو ایذا اور الم دینے کے لئے موجود ہو جاتی ہیں اور ان کا درد والم سانپ کے ڈسنے کے برابر ہوتا ہے۔ گو سانپ وہاں موجود نہ ہوں (۱)، یہاں تک کہ امام غزالیؒ کا کلام تھا جو تمام ہو چکا (۲)۔

تیسرا باب ملأ اعلیٰ (مقرب و معزز فرشتوں) کے بیان میں

خداوند تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''عرش کے اٹھانے والے اور جو اس کے اردگرد (ملائکہ) ہیں اس کی حمد و تعریف کے ساتھ اس کی پاکی و خوبیاں بیان کرتے ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں اور مومنوں کے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب تو نے ہر چیز کو (اپنی) رحمت اور علم سے گھیر لیا ہے (یعنی ہر چیز پر تیری نظر رحمت ہے اور تو ہر چیز کو جانتا ہے) پس تو اپنے ان بندوں کو بخش دے جو تیری طرف رجوع رکھتے ہیں اور تیرے (سیدھے) راستے پر چلتے ہیں اور انہیں دوزخ کے عذاب سے بچا، اے ہمارے خداوند! ان کو اور ان کے باپ داداؤں اور بیبیوں اولاد میں سے جو نیک ہو گیا ہو اس کو ان ہمیشگی کی جنتوں میں داخل فرما جن کا تو نے ان سے وعدہ فرمایا ہے کیونکہ تو ہی زبردست اور حکمت والا ہے اور (اے ہمارے خداوند) ان کو برائیوں سے بھی بچا اور جس کو بھی تو نے اس دن برائیوں سے محفوظ رکھا تو اس پر تو نے (بڑا رحم کیا اور یہی

---

(۱) امام غزالیؒ کے تیسرے حال کا یہ مطلب ہوا کہ سبب سے مقصود اس کا ثمرہ ہوتا ہے اور ثمرہ کبھی بغیر اس سبب کے بھی حاصل ہو جاتا ہے جیسے پانی کا گرم ہونا آگ کے سبب سے ہوتا ہے تو کبھی وہ دھوپ سے بھی گرم ہو جاتا ہے لہٰذا اس صورت میں یوں کہنا کہ آگ کا گرم پانی محض کیفیت کے بیان کے لئے ہے، پس اسی طرح ممکن ہے کہ سانپ کے ڈسنے کی تکلیف اس کی بدعادات و اعمال ہی سے حاصل ہو اور شرع نے سانپ کا ڈسنا محض کیفیت کے بیان اور توضیح کے لئے فرمایا ہو۔ (۲) امام غزالیؒ نے جو یہ تین حال ذکر کئے تو ان سے مقصود یہ ہے کہ یہ تین طریقے مخالف کو جواب دینے کے ہیں ورنہ حق حال اول ہی ہے، ان آیات سے مصنف کا مقصود فرشتوں کی ایک جماعت ثابت کرنا ہے جس کو ملأ اعلیٰ (بڑی کچہری مقرب و معزز فرشتے یا مجلس بالا) کہتے ہیں اور وہ خدا کے نیک بندوں کے حق میں دعائے خیر کرتے رہتے ہیں۔

سب سے بڑی کامیابی اور مراد ہے۔ رسول اللہ صلعمؐ نے فرمایا ہے کہ جب ''خداوند تعالیٰ عرش پر سے کوئی فرمان صادر فرماتا ہے تو ڈر کے مارے فرشتے اپنے بازو اور پر پھڑ پھڑاتے ہیں اور وہ آواز ایسی ہوتی ہے جس طرح گھنٹال یا زنجیر کو صاف چکنے پتھر پر مارنے سے آواز پیدا ہوتی ہے پھر جب ان کے دلوں سے وہ خوف اور اضطراب دور ہو جاتا ہے تو آپس میں پوچھتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ نے کیا ارشاد فرمایا تھا تو کہتے ہیں کہ (فلانی) حق (بات فرمائی) اور وہی بلند اور برتر ہے''۔

اور ایک روایت میں یوں ہے کہ جب خداوند تعالیٰ کچھ حکم دیتا ہے تو عرش کے اٹھانے والے فرشتے اس کی تسبیح (وپاکی بیان کرتے ہیں۔(۱)۔ پھر اس آسمان کے فرشتے جو ان (اوپر والوں) سے متصل ہیں (پھر اس کے بعد ان سے نیچے والے) یہاں تک کہ وہ تسبیح اس نیچ (دنیا) دنیا والے آسمان کے فرشتوں تک پہنچتی ہے، پھر عرش کے نیچے والے عرش کے اٹھانے والوں سے پوچھتے ہیں کہ تمہارے رب نے کیا فرمایا تھا تب وہ ان کو وہ بات بتا دیتے ہیں جو خداوند تعالیٰ نے کہی ہوتی ہے پھر ایک آسمان والے دوسرے آسمان والوں سے پوچھتے ہیں کہ یہاں تک کہ (اس طرح) اس ورلے (دنیا والے) آسمان کے فرشتوں کو بھی وہ خبر پہنچ جاتی ہے اور ایک جگہ آپؐ نے فرمایا کہ میں تہجد کے لئے اٹھا تو وضو کر کے جس قدر خدا نے چاہا نماز پڑھی پھر نماز ہی میں اونگھ آ گئی اور میں سو گیا یہاں تک کہ جب خوب بوجھل ہو گیا اور گہری نیند آ گئی تو (خواب میں) کیا دیکھتا ہوں کہ خداوند تعالیٰ نہایت پاکیزہ شکل میں تجلی فرما ہے، پس اس نے فرمایا کہ اے محمد! میں نے عرض کیا کہ اے پروردگار حاضر ہوں، فرمایا کہ ملأ اعلیٰ (مقرب ومعزز فرشتے) کس بارے میں گفتگو کر رہے ہیں میں نے عرض کیا کہ مجھ کو خبر نہیں، اسی طرح تین بار فرمایا اور میں نے یہی جواب دیا، پھر آپ نے فرمایا کہ میں نے یہ دیکھا کہ اس نے اپنے ہاتھ میرے کندھوں پر رکھ دیئے اس طرح کہ اس کی انگلیوں کے سروں کی ٹھنڈک میری چھاتی تک کو محسوس ہوئی پھر وہ سب باتیں مجھ پر کھل گئیں اور اس طرح اس کا جواب بھی مجھ کو معلوم ہو گیا، پھر خداوند تعالیٰ نے فرمایا کہ اے محمد! میں نے عرض کیا اے پروردگار! حاضر ہوں، پھر فرمایا کہ (اے محمد) ملأ اعلیٰ کس بارے میں گفتگو کر رہے ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ کفارات کے بارے میں (۲) فرمایا کہ وہ کیا ہیں، میں نے عرض کیا

---

(۱) یعنی سبحان اللہ سبحان اللہ کہتے ہیں۔ (۲) یعنی ان چیزوں کے بارے میں جن سے گناہ مٹتے اور معاف ہوتے ہیں۔

جماعت (میں شریک ہونے) کے لئے (مسجد کی طرف) چلنا اور مسجدوں میں نماز کے بعد (عبادت کے لئے) بیٹھنا، اور تکلیف (سرد ہوا) کے وقتوں میں بھی وضو اچھی طرح اور پورا پورا کرنا پھر فرمایا کہ کس بارے میں گفتگو کر رہے ہیں؟ عرض کیا کہ درجات کے بارے میں (۱) فرمایا کہ وہ کیا ہیں عرض کیا کہ (مسکین کو) کھانا کھلانا، نرمی سے بات کرنا اور لوگوں کے سونے کے وقت نماز پڑھنا (یعنی تہجد) اور ایک جگہ آپ نے فرمایا کہ ''خدا جب کسی بندے سے محبت کرتا ہے اور اس کو دوست بناتا ہے تو جبرئیلؑ کو بلا کر فرما دیتا ہے کہ میں فلاں سے محبت کرتا ہوں تو تم بھی اس سے محبت کرو، فرمایا کہ جبرئیلؑ بھی اس سے محبت کرتے ہیں، پھر آسمانوں میں منادی کر دی جاتی ہے کہ فلاں شخص خدا کا محبوب ہے اس سے محبت رکھو۔ پس اس سے آسمان کے باقی تمام لوگ بھی محبت کرنے لگتے ہیں، پھر اس کے لئے زمین میں بھی مقبولیت پھیلا دی جاتی ہے (یعنی اس کی محبت ان کے دلوں میں سما جاتی ہے) اور جب خدا کو کسی سے نفرت ہوتی ہے تو جبرئیل کو بلا کر یہ فرما دیتا ہے کہ مجھے فلاں سے نفرت ہے تم بھی اس سے نفرت کرو، فرمایا کہ پھر جبرئیل بھی نفرت کرنے لگتے ہیں اور پھر آسمان کے تمام لوگوں میں منادی کر دی جاتی ہے کہ فلاں شخص سے خداوند تعالیٰ کو نفرت ہے تم سب بھی اس سے نفرت کرو، پس سب نفرت کرنے لگتے ہیں۔ پھر وہ نفرت زمین پر بھی پھیلتی ہے۔

اور فرمایا کہ ''جب تک تم میں سے کوئی شخص نماز پڑھ کر وہیں اپنی جگہ بیٹھا رہتا ہے تو فرشتے اس کے لئے اس وقت تک دعا کرتے رہتے ہیں جب تک کہ وہ ایذا نہیں دیتا اور جب تک کہ حدث نہیں کرتا (۲) اور یوں کہتے ہیں کہ یا الٰہی! اس پر رحم فرمایا، الٰہی! اس کو بخش دے یا الٰہی اس پر رحمت سے توجہ فرما''۔ اور فرمایا کہ ''ہر صبح کو دو فرشتے اترتے ہیں ان میں سے ایک یہ کہتا ہے کہ یا الٰہی! دینے والے اور خرچ کرنے والے کو اس کے بدلہ میں اور دے (یعنی اس کو مالدار کر) اور دوسرا کہتا ہے کہ یا الٰہی! مال روک رکھنے والے (بخیل) کو ٹوٹا دے اور اس کا مال تباہ کر''۔

---

(۱) یعنی ان چیزوں کے بارے میں جن سے انسان کے درجے بلند ہوتے ہیں۔ (۲) یعنی جب تک اس کا وضو رہتا ہے فرشتے اس کے لئے دعا کرتے رہتے ہیں اور ایذا سے بھی یہی وضو ٹوٹنا مراد ہے کیونکہ روحانیات کو بدبو سے ایذا ہوتی ہے۔

واضح ہو کہ شرع سے یہ بات ثابت ہے کہ خداوند تعالیٰ کے کچھ عمدہ بندے ہیں جو کہ بلند مرتبہ فرشتے اور اس کے دربار کے مقرب لوگ ہیں جو شخص اپنے آپ کو نیک بناتا ہے اور اپنے نفس کو بھی تمام عیبوں سے پاک کر کے نیک و پاکیزہ اخلاق والا بناتا ہے اور لوگوں کی اصلاح و رفاہ عام میں کوشش کرتا رہتا ہے تو وہ فرشتے اس کے لئے ہمیشہ دعائے خیر کرتے رہتے ہیں۔ اور ان کی یہی دعا ان پر رحمت و برکت کے نزول کا سبب بنتی ہے اور یہی فرشتے خدا کے نافرمان اور مفسد لوگوں پر لعنت اور بد دعا کرتے ہیں اور ان کی یہ بد دعا اور لعنت ایسے بدکار لوگوں کے دل میں حسرت اور ندامت کے وجود کا سبب بنتی ہے۔ اور اسی کے سبب سے ملأ سافل (نچلے فرشتوں یعنی زمین و آخری آسمان والوں کے دلوں میں یہ بات الہام ہوتی ہے کہ اس بدکار سے بغض و نفرت رکھیں اور یہ کہ اس کے ساتھ برائی سے پیش آئیں یا تو دنیا میں (اس کے جیتے جی) ورنہ اس وقت جبکہ فطری موت کے سبب اس کے بدن کا ڈھانچہ اس سے جدا ہو جاتا ہے (اور اس کی روح نفس عنصری سے پرواز کر جاتی ہے) اور یہ فرشتے خداوند تعالیٰ اور اس کے بندوں کے درمیان بطور سفیر اور ایلچی کے کام کرتے ہیں اور بنی آدم کے دلوں میں نیک باتیں الہام کرتے رہتے ہیں یعنی وہ یہ کسی نہ کسی طریقہ سے دل کے نیک خیالات واردات کا سبب بن جاتے ہیں اور جس طرح خداوند تعالیٰ چاہتا ہے اور جس جگہ چاہتا ہے ان کو جمع کر کے ان کے اجتماعات قائم فرماتا ہے اور اسی (کیفیت و مقام کے) اعتبار سے ان کو الگ الگ ناموں سے پکارتے ہیں۔

کبھی تو ان کو رفیق اعلیٰ (بلند مرتبہ مصاحب) کہتے ہیں، کبھی ندی اعلیٰ (مجلس بالا) اور کبھی ملأ اعلیٰ (معزز و مقرب فرشتے و سردار) کہتے ہیں، نیک و مقرب لوگوں کی ارواح بھی ان میں شامل ہو کر ان ہی سے جا ملتی ہیں جیسے خداوند تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے روح مطمئن! اپنے پروردگار کی طرف خوشی خوشی چلی آ، اور میرے بندوں میں جا مل اور میری جنت میں آ رہ، اور رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ میں نے جعفر بن ابی طالب کو فرشتہ کی صورت میں دیکھا کہ وہ جنت میں فرشتوں کے ساتھ دو پروں سے اڑ رہے تھے، (اور یہیں) ملأ اعلیٰ میں تمام فیصلے و احکام الٰہی نازل ہوتے ہیں اور وہ امور بھی یہیں متعین ہوتے ہیں جن کا خداوند تعالیٰ نے "اپنے اس قول میں اشارہ کیا ہے"،
"دنیا کے تمام امور جو حکمت اور مصلحت پر مبنی ہیں اسی (مبارک) رات (لیلۃ القدر) کو تصفیہ

پاتے ہیں''۔اور اسی جگہ کسی نہ کسی طور پر تمام شرائع مقرر ہوتی ہیں، یاد رہے کہ ملأ اعلیٰ کی تین قسمیں ہیں۔ایک قسم کے وہ لوگ ہیں جن پر حق سبحانہ نے اپنے نظام خیر موقوف رکھا، لہٰذا (اسی بات کو ملحوظ رکھ کر) اس نے موسیٰ کی آگ کی طرح کے اجسام نوری پیدا کر کے ان میں ارواح پاک ڈالدیں (۱)۔دوسری قسم کے وہ لوگ ہیں جو عناصر کے لطیف وخفیف بخارات میں ایک خاص قسم کے مزاج وآمیزش کے پیدا ہونے سے بنتے ہیں اور ان پر ان نفوس عالیہ کا فیضان ہوتا ہے جو آلائش بہیمیہ سے جلدی الگ ہو جاتے ہیں، تیسری قسم ان نفوس انسانیہ کی ہے جو ملأ اعلیٰ سے بہت ہی قریب ہیں۔

اور وہ ایسے ایسے نیک اعمال کرتے رہتے ہیں جو ان (ملأ اعلیٰ) سے جا ملنے کے لئے ان کے حق میں ممد ثابت ہوتے ہیں اور آخر کار جب لباس بدن ان کی روح سے اتر جاتا ہے تو وہ انہی میں جا شامل ہوتے ہیں اور ان کا شمار بھی انہی میں ہونے لگتا ہے، اور ملأ اعلیٰ کا اصلی کام یہ ہے کہ وہ ہر وقت اپنے پروردگار کی طرف متوجہ رہیں اور کوئی مشغلہ ان کو اس سے روک نہ سکے اور اس قول الٰہی کہ وہ (ملأ اعلیٰ) اپنے پروردگار کی تعریف کرتے ہوئے اس کی پاکی بیان کرتے رہتے ہیں۔ اور اس پر (پورا پورا) ایمان بھی رکھتے ہیں۔کا یہی مطلب ہے اور خدا کی طرف سے ان کے دلوں میں یہ بات بھی ڈالی جاتی ہے کہ وہ نظام صالح (عمدہ انتظام) کو اچھا سمجھیں اور پسند کریں (جس کی کہ انہیں خدمت عطا ہوئی ہے) اور یہ کہ غیر صالح نظام کو (جو کہ خلاف الٰہی ہے) برا جانیں اور اس سے نفرت کریں اور اس کلام الٰہی کہ ''وہ مومنوں کے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں'' (۲)۔کا یہی مطلب ہے اور ملأ اعلیٰ کے جو بلند مرتبہ اور اعلیٰ لوگ ہوتے ہیں ان کے انوار اس روح کے پاس آکر جمع ہوتے اور آپس میں ملتے ہیں جس کا نبی صلعم نے بہت سے منہ اور زبانوں کی صفت سے وصف بیان فرمایا ہے پھر وہ سب مل کر وہاں بمنزلہ ایک چیز کے ہو جاتے ہیں اور اسی کا نام

---

(۱) موسیٰ وہ آگ جس کے واسطے وہ اندھیرے میں چلے تھے اور اس میں خدا نے تجلی کی تھی۔ (۲) یہ دوسری قسم کے اور (صالح مومن) اور اسماء ہیں کہ مرنے کے بعد یہ بھی ملائکہ مقربین کے ساتھ اس دربار اقدس میں جس کا ذکر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، جا ملتے ہیں۔ فی مقعد صدق عند ملیک مقتدر ہے جو لوگ بھی ہیں بہشت کے باغوں اور نہروں میں سچی (عزت کی جگہ) بادشاہ (دوجہاں) قادر مطلق کے مقرب ہوں گے۔

حظیرۃ القدس (پاک ومقدس پارلیمنٹ) ہے اور کبھی حظیرۃ القدس میں اس بات کا مشورہ ہوتا ہے کہ بنی آدم کے دینی اور دنیاوی امور کو سرانجام دینے کے لئے اور ان کی مشکلات کو دور کرنے کے لئے کسی ایسے شخص کی تکمیل اور اس کے حکم کی تعمیل لوگوں میں کرانی چاہئے جو اس زمانہ کے سب لوگوں سے افضل ہو پھر اس مشورہ کی وجہ سے مستعد لوگوں کے دلوں میں یہ الہام ہوتا ہے کہ وہ اس کی فرمانبرداری کر کے ایک ایسی عمدہ قوم بن جائیں جو تمام بنی نوع انسان (کی ہدایت) کے لئے میدان عمل میں نکالے جانے کے قابل ہوں اور اسی مشورہ کی وجہ سے وہ علوم سکھلائے اور تلقین کئے جاتے ہیں جن سے قوم کی اصلاح اور ہدایت ہوتی ہے۔ یہ الہام کبھی وحی کے ذریعہ ہوتے ہیں کبھی خواب کے ذریعہ اور کبھی غیبی آواز کے ذریعہ اور کبھی اس طرح سے کہ حظیرۃ القدس کے لوگ اس شخص سے (یعنی نبی سے) دو بدو کلام کرتے ہیں اور اسی کی وجہ سے اس (نبی) کے احباء ورفقا یعنی اصحاب کی مدد ہوتی ہے اور ان کی بھلائی اور بہتری کے اسباب وامکانات بڑھتے جاتے ہیں اور اس کے مخالف اور اللہ کے راستے سے روکنے والوں پر لعنت ہوتی ہے اور ان کی تکلیف، ناکامی ونامرادی کے اسباب وامکانات بڑھتے جاتے ہیں اور من جملہ دیگر اصول نبوت کے یہ بھی ایک اصل ہے اور ان (فرشتوں) کے مستقل اور دائمی اجماع کو تائید روح القدس کہتے ہیں اور پھر اس مقام پر (اس سے) ایسی ایسی بیشمار برکتیں حاصل ہوتی ہیں جو عادت کے خلاف ہوتی ہیں اور عام طور پر کبھی ظاہر نہیں ہوتیں اور ان کو معجزات کہتے ہیں۔

ان ملأ اعلیٰ سے کم درجہ کے چند اور ایسے نفوس ہوتے ہیں کہ سعادت ازلیہ نے ان کو ملأ اعلیٰ کے درجہ تک تو نہیں پہنچایا ہوتا لیکن ان کے فیضان سے لطیف وخفیف بخارات میں ایک ایسا معتدل سا مزاج ضرور پیدا ہو جاتا ہے جو ان میں یہ کمال پیدا کر دیتا ہے کہ وہ اوپر سے فیوضات کے برسنے کے منتظر رہتے ہیں، چنانچہ جب بھی جو کچھ قابل اور اس کی استعداد اور فاعل کی تاثیر کے موافق، ان پر برستا ہے تو وہ اپنے ذاتی ارادے سب مٹا کے اور اسی کی تعمیل میں جان لڑا کے اس کے سرانجام دینے کے لئے ایسے آمادہ ہو جاتے ہیں جس طرح چرند پرند اپنے فطری تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے آمادہ ہو جاتے ہیں، لہٰذا ان کا یہ کام ہے کہ وہ انسانوں اور جانوروں کے دلوں میں اثر پیدا کر کے ان کے ارادوں اور خیالات کو اس امر کی طرف متوجہ کرتے ہیں جو ان کی مراد

مقصود کے مناسب ہوتا ہے اور بعض طبیعاتی چیزوں کی سرعت حرکات اور تبدلات میں بھی اثر کرتے ہیں۔ جیسے اگر کوئی پتھر حرکت کرتا ہے اور لڑھکتا ہے تو کوئی بزرگ فرشتہ اس کو عادات سے زیادہ تیز کردیتا ہے اور یہ بھی ہوتا ہے کہ جب کوئی شکاری دریا میں جال ڈالتا ہے تو فرشتوں کی ایک جماعت بعض مچھلیوں کے دل میں یہ بات ڈالتی ہے کہ اس میں آپڑو اور بعض کے دل میں یہ بات ڈالتی ہے کہ بھاگ جاؤ، اور بعض فرشتے رسی کو کھینچتے ہیں اور بعض پھیلاتے ہیں ان (مچھلیوں) کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ہم یہ کیوں کررہے ہیں بلکہ وہ الہام کی تابع ہوتی ہیں اور کبھی دو لشکر آپس میں لڑتے ہیں تو فرشتے آکر ان کے دلوں میں شجاعت ثابت قدمی اور غلبہ پانے کی تدبیریں اور اسی قسم کے خیالات جن سے تیراندازی اور گولہ باری کی تدبیریں بن آئیں، لا ڈالتے ہیں اور دوسروں کے دلوں میں اس کے برخلاف خیالات (مثلاً بزدلی، ہراسانی اور بدحواسی) پیدا کرتے ہیں تاکہ مقدر کی بات ظاہر ہوجائے اور کبھی ان کو انسان کو راحت وآرام یا رنج والم پہنچانے کا حکم ہوتا ہے تو وہ اس میں بھی ہر طرح کی کوشش کرتے ہیں اور ان (فرشتوں) کے برخلاف ایک اور جماعت بھی ہوتی ہے جن کے کام میں ہلکاپن، ڈر اور برائی ہوتی ہے وہ (جماعت) سڑے ہوئے تاریک بخارات سے پیدا ہوئی ہے، اور ان کو شیاطین کہتے ہیں (۱)۔ اور یہی وہ شیاطین ہیں جو ہمیشہ ان فرشتوں کی کوشش کے خلاف کوششیں کرتے رہتے ہیں، واللہ اعلم۔

چوتھا باب تبدیل نہ ہونے والی سنت الٰہی کے بیان میں

جس کا ذکر اس آیت میں ہے کہ "تم خداوند تعالیٰ کی سنت وطریقہ کو بدلنے والا نہ پاؤ گے" واضح ہو کہ خداوند تعالیٰ کے بعض افعال ان قوتوں پر جو عالم میں رکھے گئے ہیں کسی نہ کسی طرح سے مترتب ہوتے ہیں، عقل ونقل دونوں اس پر شاہد ہیں، رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ خداوند تعالیٰ نے آدم کو تمام زمین کی مشت خاک سے پیدا کیا ہے، اسی وجہ سے بنی آدم اس مٹی کے موافق، سرخ اور سیاہ اور ان کے بین بین اور نرم (خو) اور سخت (دل) اور برے اور اچھے پیدا ہوئے، ایک دفعہ عبداللہ بن سلامؓ نے آنحضرتؐ سے پوچھا کہ یارسول اللہ! بچہ کس وجہ سے باپ یا ماں کی طرف کھنچ

(۱) یہاں سے معلوم ہوا کہ شیاطین ایک ایسی جماعت کا نام ہے جو مادہ ظلماتی سے پیدا ہوئی ہے اور برائی کرنا ان کا کام ہے نہ یہ کہ شیاطین انسان کی بری قوتوں کا نام ہے جیسا کہ بعض ہمعصر کہتے ہیں۔

آتا ہے یعنی اس کے مشابہ پیدا ہوتا ہے، تو آپ نے جواب میں فرمایا کہ جب باپ کی منی ماں کی منی سے پیش قدمی کرتی ہے تو باپ کے مشابہ ہو جاتا ہے اور جب ماں کی منی پیش قدمی کرتی ہے تو ماں کے مشابہ ہو جاتا ہے اور اس میں تو کسی کو بھی شک نہیں کہ موت تلوار کی ضرب یا زہر کھانے سے واقع ہوا کرتی ہے اور یہ کہ بچہ کی پیدائش اور بناوٹ رحم، اور منی میں آگے آنے سے ہوا کرتی ہے۔ اور یہ کہ اناج اور درخت، تخم ریزی اور آب، پانی کے بعد اگا کرتے ہیں اور اسی استطاعت کی وجہ سے انسان کو (شریعت کا) مکلف بنایا گیا اور اس کو اوامر ونواہی بنا کر اعمال کی جزا وسزا کا مستحق ٹھہرایا گیا ہے اب ان قوتوں کی (جن پر خداوند تعالیٰ کے بعض افعال کسی نہ کسی طرح مترتب ہوتے ہیں، چند اقسام ہیں۔ بعض ان میں سے عناصر کے خواص اور طبائع ہیں (مثلاً گرمی، خشکی، تری وغیرہ) اور بعض ان میں سے وہ احکام ہیں جو خداوند تعالیٰ نے ہر صورت نوعیہ میں رکھے ہیں اور بعض ان میں سے عالم مثال کے احوال اور وہ وجود ہیں جن کا زمین پر پائے جانے سے پیشتر وہاں حکم ہو چکا ہوتا ہے، اور بعض ان میں سے ملأ اعلیٰ کی وہ دعائیں ہیں جو شریف النفس اور مصلح لوگوں کے لئے بڑی جدوجہد سے مانگتے ہیں اور انہیں کی وہ بددعائیں ہیں جو وہ اس کے برخلاف لوگوں (یعنی دوسروں) کے واسطے مانگتے ہیں، اور بعض ان میں سے وہ احکام شریعت ہیں جو بنی آدم پر مقرر ہوئے ہیں اور ان سے واجب وحرام امور کا علم ہوتا ہے پھر انہیں کی وجہ سے مطیع وفرمانبردار شخص کو تو ثواب ملتا ہے اور عاصی ونافرمان کو عذاب اور بعض ان میں سے یہ ہے خداوند تعالیٰ کسی چیز کے ہونے کا حکم دیتا ہے تو پھر اس سے کوئی اور بات بھی پیدا ہو جاتی ہے جو پہلی چیز کے وجود میں لانے کے لئے ضروری ہوتی ہے کیونکہ سنت الٰہی نے ان کو لازم وملزوم بنا دیا ہوتا ہے اور اس وجہ سے کہ خداوند تعالیٰ کو عمدہ نظام (کائنات) کا درہم برہم کرنا منظور نہیں، اس کی سند نبی صلعم کی یہ تحریر ہے کہ "جب خداوند تعالیٰ کو یہ منظور ہوتا ہے کہ فلاں شخص فلاں جگہ مرے تو وہاں اس کے جانے کے لئے کوئی نہ کوئی حاجت پیدا کر دیتا ہے"۔

یہ سب باتیں احادیث اور عقل سے ثابت ہیں(۱)۔ اور یہ بھی معلوم رہے کہ جب وہ

(۱) اس بات کا خلاصہ مطلب یہ ہے کہ خدا کی عادت جس کو سنت اللہ کہتے ہیں یوں جاری ہے کہ وہ عالم کی قوتوں پر اپنا فعل مرتب کرتا ہے، دیکھئے تلوار کی ضرب جو ایک شخص کی قوت یا فعل ہے جب اس سے (بقیہ صفحہ ۹۷ پر)

اسباب جن پر حسب عادت الٰہی قضا و حکم کا جاری ہونا مترتب ہوتا ہے باہم متعارض ہو جائیں اور ان سب کے تقاضے اور مقصد پورے نہ ہوں تو اس وقت حکمت یہی ہے کہ جس میں خیر (بہتری) زیادہ پائی جائے اسی کی رعایت کی جائے (یعنی وہی کام وقوع پذیر ہو) اور جو میزان (ترازو) کے متعلق حدیث میں کہا گیا ہے کہ ترازو خدا کے ہاتھ میں ہے جس پلڑے کو چاہتا ہے اونچا کر دیتا ہے جس کو چاہتا ہے نیچا کر دیتا ہے(۱)۔ اس سے اور جو شان (کام) کے بارے میں اس آیت میں مذکور ہے کہ "وہ (خدا) ہر وقت کسی نہ کسی کام میں (مصروف) رہتا ہے اس سے، دونوں سے یہی مراد ہے۔(۲) اور کبھی ترجیح قوت اسباب کی وجہ سے ہوتی ہے اور کبھی مترتبہ آثار و نتائج کے نفع کے اعتبار سے ہوتی ہے(۳)۔ اور اسی طرح خلق (پیدائش) کو تدبیر و انتظام پر ترجیح دیجاتی ہے اس کے علاوہ (ترجیح کی) اور بہت سی وجوہات ہوتی ہیں، اور ہم کو تعارض اسباب کے وقت اچھی طرح سے یہ نہیں جان سکتے کہ ان میں کونسا حق ہے، لیکن یہ بات قطعاً جانتے ہیں کہ جو چیز پائی گئی اور وجود میں آئی اس کا وجود میں آنا اور پایا جانا ہی بہتر تھا اور اسی میں برکت تھی اور ہماری اس تقریر پر غور کرنے سے بہت سے اشکالات دور ہو سکتے ہیں۔ لیکن جہاں تک کواکب و ستاروں کی ہیئت و کیفیت کا تعلق ہے تو اس کے بعض اثرات تو ضرور ہوتے ہیں جیسے گرمی سردی کا بدلنا اور رات دن

(بقیہ صفحہ ۹۶ سے آگے) سرزد ہوتی ہے تب خداوند تعالیٰ موت کو جو اس کا فعل اس پر مرتب کرتا ہے الغرض سنت اللہ یہ ہے مگر وہ اسباب سے کام کرتا ہے اگر چہ پیاس کو بغیر پانی کے بجھا سکتا ہے اور بچہ کو اس کے باپ کے نطفہ کے بغیر پیدا کر سکتا ہے مگر عادت یوں ہی ہے کہ اس کو پانی سے بجھاتا اور اس کو نطفہ سے وجود میں لاتا ہے۔ ان اسباب کی جو قوائے عالم میں ہیں چند اقسام ہیں جن کو بہ لفظ بعض شمار کیا گیا ہے اول خواص عناصر ہیں (جیسے آگ کی حرارت پانی کی ٹھنڈک) جو کسی چیز کے گرم یا سرد ہونے کے اسباب بن جاتے ہیں اور وہ گرم اور سرد کرنا ان کا فعل نہیں بلکہ خدا کا ہے، دوم صورت نوعیہ کے احکام مثلاً صورت نوعیہ ہونے کا یہ حکم ہے کہ وہ خشک کرتی ہے لہذا یہ خشک کرنا جو بسبب ہوا کے حاصل ہوا خدا کا فعل ہے، اسی طرح ملأ اعلیٰ کی دعا خیر و شر کے لئے اور احکام الٰہی کا کرنا یا نہ کرنا مثلاً چوری کرنا عذاب کا اور صدقہ دینا ثواب کا سبب ہو جاتا ہے البتہ ستاروں کی گردش انسان کی سعادت نحوست یا قحط وارزانی کا سبب نہیں، یہ محض جہلا کے تخیلات میں اسی طرح اور بہت سے جاہلوں کے ڈھکوسلے ہیں۔(۱) یعنی مقدور کے رزق و عمل کو کچھ زیادہ کرنا ہے بعض نے کہا کہ ترازو کے اونچا کرنے سے رزق کا زیادہ کرنا مراد ہے اور نیچا کرنے سے اس کا کم کرنا مراد ہے۔ (۲) یعنی جانب خیر کی رعایت کو ملحوظ رکھنا۔(۳) یعنی کبھی وہ ظاہر ہوتی ہے جس کے اسباب قوی ہوتے ہیں اور کبھی وہ ظاہر ہوتی ہے جو نفع میں زیادہ ہوتی ہے۔

کا بڑا چھوٹا ہونا آفتاب کی مختلف تبدیلیوں کے باعث ہوتا ہے اور جیسے مد و جزر (جوار بھاٹے) کا گھٹتے بڑھتے رہنا، چاند کے گھٹنے بڑھنے کے مطابق ہوتا ہے اور حدیث میں بھی آیا ہے کہ ''جب ثریا (نامی تارہ) طلوع ہوتا ہے تو آفت دور ہو جاتی ہے''۔ یعنی عادت یونہی جاری ہے لیکن تنگدستی وتونگری، ارزانی وقحط اور زندگی کا ستاروں کی خاص خاص حرکات کے باعث وقوع پذیر ہونا شرع سے ثابت نہیں بلکہ نبی صلعم نے اس بارے میں دماغ صرف کرنے تک سے منع فرمایا ہے چنانچہ فرمایا کہ ''جس نے کوئی شعبۂ نجوم کا حاصل کیا تو اس نے گویا ایک شعبہ سحر (جادو) کا حاصل کیا (جو قطعی حرام ہے) اور جہلائے عرب کے اس قول میں تو نہایت ہی تشدد فرمایا ہے کہ ہم پر فلاں فلاں تارے کے نور (۱) (غروب ہونے یا طلوع ہونے) سے بارش ہوئی اور ہم یہ بھی نہیں کہتے کہ شریعت محمدیہ نے اس بات کی تصریح کر دی ہے کہ خداوند تعالیٰ نے ستاروں میں کوئی ایسی خاصیت نہیں رکھی جس سے بواسطہ تغیر ہوا (جو ہر طرف پھیلی ہوئی ہے) کوئی حادثہ پیدا نہیں ہوتا یا کوئی اور اس طرح کی بات ظہور میں نہیں آتی اور آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ نبی صلعم نے کہانت سے منع فرمایا ہے (اور کہانت جنوں سے پوچھ پوچھ کر غیب کی خبریں دینے کو کہتے ہیں) اور کاہن کے پاس جانے والے اور اس کی تصدیق کرنے والے سے بڑی بیزاری ظاہر فرمائی ہے، پھر جب کاہنوں کی حقیقت حال جو پوچھی گئی تو یوں فرمایا کہ ''جو قضائے آسمانی میں بعض فرشتے کچھ باتیں قضا و قدر کی ذکر کرتے ہیں تو شیاطین وہ بات لے بھاگتے ہیں، پھر اس کو کاہنوں سے کہتے ہیں آگے وہ ایک سچ میں سو جھوٹ ملا کر لوگوں سے بیان کرتے پھرتے ہیں''۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ''اے مومنو! ان لوگوں کی طرح مت ہو جانا جنھوں نے کفر کیا اور اپنے ان بھائیوں کے بارے میں جو سفر پر یا لڑائی پر نکلے تھے (اور مارے گئے تھے) یہ کہا کہ اگر (ہمارے) وہ (بھائی) ہمارے ہی پاس رہتے اور باہر نہ نکلتے تو نہ مرتے اور نہ قتل ہوتے'' اور نبی صلعم نے فرمایا ہے کہ تم کو (صرف) تمہارا عمل

---

(۱) نور طلوع و غروب کو کہتے ہیں ایک ستارے کا مغرب میں غروب ہونا اور اسی وقت مشرق میں دوسرے ستارے کا جو اس کے مقابل طلوع ہوا، یہ موقع سال بھر میں اٹھائیس دفعہ ہوتے ہیں زمانہ جاہلیت میں عرب کو یہ خیال تھا کہ ایک ستارے کے طلوع اور دوسرے کے غروب ہوتے وقت بارش یا ہوا کا ہونا ضروری ہے اسی وجہ سے وہ بارش کو اسی تارے کی طرف منسوب کرتے تھے جس کے طلوع کے وقت ہوتی تھی اور مندرجہ بالا قول کہے تھے جس سے حضرت صلعم نے منع فرمایا۔

جنت میں نہیں لے جائے گا (بلکہ خدا کا فضل بھی کوئی چیز ہے اور فرمایا کہ تم تو مہربان ساتھی، (رفیق) ہو، اور طبیب اللہ ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ منع کرنے میں بہت سی مصلحتیں اور بیشمار فوائد ہیں۔ واللہ اعلم۔

پانچواں باب حقیقت روح کے بیان میں

خداوند تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''(اے محمد) لوگ تم سے روح کا حال دریافت کرتے ہیں، تو کہدو کہ روح تو اللہ کے حکم سے ہے اور تم کو (اس کے بارے میں) تھوڑا سا علم دیا گیا۔'' اعمش ؒ نے بروایت ابن مسعودؓ وما اوتیتم کی جگہ وما اوتوا پڑھا ہے (بصیغۂ غائب) جس کے یہ معنی ہوئے کہ ''ان کو تھوڑا سا علم دیا گیا ہے'' پس یہاں سے صاف معلوم ہو گیا کہ یہ کلام ان یہودیوں کے مقابلہ میں ہے۔ جو آپ سے حقیقت روح دریافت کرتے تھے اور اس آیت سے صاف طور پر یہ نہیں معلوم ہوتا کہ امت مرحومہ میں سے کسی کو روح کی حقیقت معلوم ہی نہیں جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے اور یہ بھی ضروری نہیں کہ جس چیز کے بیان سے شارع نے سکوت کیا ہو اس کا علم کسی کو ممکن ہی نہ ہو، بلکہ بسا اوقات بعض چیزوں (کے بیان) سے اس لئے سکوت اختیار کیا گیا کہ وہ دقیق الفہم ہیں ہر شخص ان کو سمجھ نہیں سکتا، چاہے کوئی ان کو سمجھ سکتا ہو۔

آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ سب سے پہلی چیز جو کہ حقیقت روح کی سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ روح ایک ایسی چیز ہے جو جاندار کی زندگی وحیات کا مبدأ اور منبع ہے اس کے (بدن کے) اندر رہنے سے جاندار زندہ اور باہر نکل جانے سے مردہ ہو جاتا ہے پھر ذرا اور غور کیا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ بدن میں کچھ ایسے لطیف وخفیف بخارات ہیں۔ جو خالص اور صالح اخلاط (مرکبات جسمانی مثلاً خون، بلغم، سودا، صفرا) سے قلب میں پیدا ہوتے ہیں اور قوائے حساسہ ومحرکہ ومدبرہ غذا (بدن) کو اٹھائے پھرتے ہیں اور ان میں طب کا حکم چلتا ہے اور تجربہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان بخارات کا رقیق (پتلا) اور غلیظ (گاڑھا) صاف اور مکدر ہونا ان (مذکورہ) قوئی پر اور جو افعال ان اقوی سے پیدا ہوتے ہیں ان پر ایک خاص اثر ڈالتا ہے، اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب کسی عضو پر یا ان بخارات کی پیدائش وبناوٹ پر جو اس عضو سے خاص مناسبت رکھتے ہیں کوئی آفت آجاتی ہے تو وہ ان بخارات میں بگاڑ، اور ان کے افعال میں گڑ بڑ پیدا کردیتی

ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان بخارات کا پیدا ہونا حیات کا اور تحلیل ہونا، موت کا باعث ہوتا ہے، بادی النظر میں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ روح یہی بخارات ہیں لیکن اگر غائر نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ بخارات تو روح کا ادنی طبقہ ہیں اوران کو بدن سے وہ نسبت ہے جو بو کو گل سے یا آگ کو کوئلہ سے ہوتی ہے، پھر جب ذرا اور غور کیا جائے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ بخارات روح نہیں بلکہ روح حقیقی کا مرکب اوراس کے (بدن سے) متعلق ہونے کا مادہ ہے اور دلیل اس پر یہ ہے کہ ہم بار ہا دیکھتے ہیں کہ لڑکا جوان ہوتا ہے پھر بوڑھا ہوتا ہے اس کے اخلاط بدن (جسمانی مرکبات مثلاً خون بلغم وغیرہ) بدلتے جاتے ہیں اور جو روح اور بخارات ان سے پیدا ہوتے ہیں وہ بھی پہلے سے ہزار گنا زیادہ ہو جاتے ہیں پھر وہ لڑکا کبھی چھوٹا ہوتا ہے کبھی بڑا کبھی سیاہ ہوتا ہے۔ کبھی سفید، کبھی عالم ہوتا ہے کبھی جاہل، اس کے علاوہ اور صدہا حالات اس کے بدلتے رہتے ہیں۔ حالانکہ وہ شخص وہی کا وہی رہتا ہے۔ اگر یہاں کوئی (اس کے حالات کے تبدیل ہونے اور نہ ہونے میں حیل و حجت کرے تو ہم یوں کہتے ہیں کہ ہم ان تغیرات کو فرضی طور پر تسلیم کر لیتے ہیں ورنہ اس میں تو کچھ شک ہی نہیں کہ اس کے حالات متغیر ہوتے رہتے ہیں حالانکہ وہ وہی رہتا ہے یا یوں کہیں گے کہ ان احوال کے بحال خود باقی رہنے کا تو ہم کو کسی طرح یقین نہیں لیکن اس لڑکے کے بحال خود باقی رہنے کا یقین کامل ہے۔ جس سے یہ ثابت ہوا کہ یہ حالات اس کے عوارض ہیں وہ خود نہیں (پس) ثابت ہوا کہ جس چیز سے انسان (زندہ) وقائم رہتا ہے وہ یہ روح (یعنی بخارات) نہیں اور نہ ہی یہ بدن ہے اور نہ وہ مشخصات ہیں جو بادی النظر میں دکھلائی دیتے ہیں بلکہ روح حقیقی ایک منفرد اور جداگانہ چیز ہے اور ایک ایسا نکتۂ نورانی ہے جو ان اعراض متغیرہ اور اطوار متبدلہ سے جو بعض جواہر اور بعض اعراض میں بالکل الگ ہے اور یہ روح حقیقی جس طرح چھوٹے (جاندار) میں۔ ہے اسی طرح بڑے میں بھی ہے اور جس طرح سیاہ میں ہے اسی طرح سفید میں بھی ہے اور ایسے ہی دیگر تمام مثال ہائے اضداد میں یہ بلا تفاوت موجود ہوتی ہے اور اس حقیقی روح کا اصلی علاقہ اور تعلق تو بخارات (۱) ہی کے ساتھ ہے اور انہیں کی وجہ سے بدن سے بھی ہے کیونکہ بدن تو نسمہ کا (یعنی بخارات کا جن کو روح ہوائی کہتے ہیں) مرکب ہے، اور یہ روح حقیقی عالم قدس

(۱) جو بادی الرائے میں روح سمجھے جاتے ہیں۔

کی ایک ایسی کھڑکی ہے کہ جن جن چیزوں کی روح ہوائی کو قابلیت واستعداد ہوتی ہے وہ سب اسی راہ سے اس پر اترتی ہیں، اب رہے یہ تغیرات تو یہ سب اسباب ارضیہ کی وجہ سے ہوتے ہیں، دیکھو آفتاب کی دھوپ وگرمی کپڑے کو تو سفید کردیتی ہے لیکن دھوبی کو سیاہ کردیتی ہے اور ہم کو اپنے وجدان صحیح سے یہ بھی معلوم ومحقق ہوگیا ہے کہ بدن میں جب روح ہوائی (کے پیدا ہونے) کی استعداد نہیں رہتی تب روح ہوائی وہاں سے الگ ہوجاتی ہے۔(۱) اور اسی کا نام موت ہے نہ کہ روح ہوائی سے روح حقیقی کا جدا ہونا، اور جب مہلک امراض میں روح ہوائی وبخارات تحلیل ہوجاتے ہیں تو حکمت الٰہی کے بموجب وہ اس قدر تو ضرور باقی رہتے ہیں کہ ان سے روح حقیقی (والٰہی) کا علاقہ وتعلق قائم رہے جس طرح سے کہ آپ کسی شیشی کی ہوا کو منہ سے اتنا کھینچیں کہ اس سے زیادہ نہ کھینچ سکیں یہاں تک کہ شیشی کے ٹوٹنے کا خوف ہو تب بھی اس میں کسی قدر ہوا ضرور باقی رہ جاتی ہے جو پھر متخلل ہوکر اس میں پھیل جاتی ہے سو یہ ہوا کی طبیعت کا سر اور راز یا جوہر ہے، پس اسی طرح نسمہ (یعنی روح ہوائی) میں بھی ایک سر اور راز یا جوہر ہے اور اس کی ایک خاص مقررہ حد اور اندازہ ہے جس سے تجاوز نہیں ہوسکتا اور جب آدمی مرجاتا ہے تو اس کی روح ہوائی کی اور ہی صورت پیدا ہوجاتی ہے، پھر روح حقیقی کی وجہ سے اس کی حس مشترک میں سے جو کچھ باقی تھا اس میں ایک ایسی قوت پیدا ہوتی ہے جو عالم مثال کی مدد سے قوت گویائی وشنوائی وبینائی کا کام دیتی ہے یعنی اس کو ایک ایسی قوت ملتی ہے جو محسوسات ومجردات کے بین بین ہوتی ہے جیسے کہ افلاک میں یکساں قوت رکھی گئی ہے، اور بسا اوقات روح ہوائی کو عالم مثال کے ذریعہ سے لباس نورانی یا ظلماتی کی قابلیت واستعداد پیدا ہوجاتی ہے اور اس کی وجہ سے عالم برزخ کے عجائبات ظاہر ہوتے ہیں پھر جب صور (نرسنگھا) پھونکا جائے گا (یعنی جب باری الصور کی طرف سے وہ فیض عام ہوگا جو شروع میں پیدائش عالم کے وقت ہوا تھا جب کہ اجسام میں ارواح ڈالی گئی تھیں اور اس طرح عالم موالید کی بنیاد مستحکم کی گئی تھی) تو اس وقت روح الٰہی (یعنی حقیقی روح) کے فیضان سے اس کو پھر لباس جسمانی یا ایسا لباس پہنایا جائے گا جو عالم مثال اور جسم کے بین بین ہوگا، پھر وہ سب باتیں جن کی مخبر صادق علیہ السلام نے خبر دی تھی ایک ایک کرکے پیش آئیں گی، اور

(۱) جس کے ساتھ روح حقیقی بھی چلی جاتی ہے۔

جب کہ روح ہوائی جسم ارضی اور روح الٰہی کے بیچ میں ایک برزخ اور واسطہ ہے تو یہ ضروری ہوا کہ اس کو کچھ مناسبت اس طرف ہو اور کچھ اس طرف۔ پس وہ مناسبت جو (عالم) قدس کی طرف ہے اس کو ملکیت (یعنی فرشتہ پن) اور جو مناسبت جسم ارضی کی طرف ہے اس کو بہیمیت (یعنی وحشی پن) کہتے ہیں (۱)۔ علم حقیقت روح کے بارے میں ہم کو اسی قدر مقدمات وجہادیات پر اکتفا کرنا چاہیے تا کہ اس علم میں ان کو تسلیم کرنے کے بعد ان پر تفرادات مرتب کی جائیں اور مختلف مسائل مستنبط کیے جائیں قبل اس کے کہ کسی اعلیٰ وارفع علم میں اس کا حجاب اٹھے۔ واللہ اعلم۔

چھٹا باب سر تکلیف (۲) کے بیان میں

خداوند تعالیٰ فرماتا ہے کہ "ہم نے آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے آگے امانت کو پیش کیا تو وہ اس کے اٹھانے سے انکار کر گئے اور ڈر گئے، لیکن انسان نے اس کو اٹھا لیا کیونکہ وہ جفا کار اور بیوقوف تھا، یہ اس لئے ہوا کہ خدا، منافق مرد اور منافق عورتوں کو اور مشرک مرد اور مشرک عورتوں کو عذاب وسزا دے اور مومن مرد اور مومن عورتوں پر مہربانی فرمائی اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور مہربان ہے"۔ امام غزالیؒ اور بیضاوی وغیرہ نے اس بات کی تصریح کر دی ہے کہ یہاں امانت سے مراد عہدۂ تکلیف ہے جو کہ آسمان وزمین کے آگے پیش کیا گیا اور جس کی وجہ سے (خدا کی) اطاعت

(۱) اس بات کا خلاصہ یہ ہے کہ جب خوب غور کیا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی دو روح ہیں ایک روح ہوائی یعنی بدن کے بخارات لطیفہ جس کو نسمہ بھی کہتے ہیں۔ دوسری روح حقیقی جس کو روح قدسی اور روح الٰہی بھی کہتے ہیں اور روح حقیقی کا مرکب روح ہوائی ہے۔ پس موت یہ ہے کہ انسان کے بدن سے روح بمع روح ہوائی کے جدا ہو جاتی ہے اور روح ہوائی کو عالم برزخ میں اس کی قابلیت کے موافق ایک جسم نورانی یا ظلماتی دیا جاتا ہے اور شنوائی اور گویائی وبینائی کی سب قوتیں اس کو حاصل ہو جاتی ہیں اس طرح پر کہ وہ مرنے کے بعد سنتا، دیکھتا اور کلام کرتا ہے، عالم برزخ میں اسی لباس نورانی یا ظلماتی کی وجہ سے اس پر صد ہا رنج وراحت گزرتے ہیں اور حشر کے دن اس کو پھر جسمانی لباس یا ایسا مناسب لباس جو عالم مثال اور جسم کے بین بین ہو پہنا کر وہاں کے عذاب وثواب دکھائے جائیں گے اور چونکہ اس روح ہوائی میں دو جہت ہیں ایک جسم کی جانب جس کی وجہ سے بہیمیت یعنی کھانا پینا، شہوت وغصہ وغیرہ امور سرزد ہوتے ہیں اور دوسری روح الٰہی کی جانب، اس سے ملکیت یعنی عبادت ومعرفت وغیرہ امور سرزد ہوتے ہیں، الغرض انسان عجوبہ خمیر اور طرفہ معجون مرکب ہے۔ ؎ یارب یہ دل ہے یا کوئی مہمان سرائے ہے ۔ غم رہ گیا کبھی کبھی آرام رہ گیا۔ (۲) تکلیف سے بندے کو اوامر ونواہی ودیگر احکام کا متحمل بنانا مراد ہے یعنی خدا کی اس میں کیا حکمت ہے کہ بندے پر اپنی چند باتیں واجب کیں جیسے نماز، روزہ ودیگر اخلاق واعمال اور چند سے منع فرمایا جیسے چوری وزنا وغیرہ، بندے کو یوں ہی کیوں نہ چھوڑ دیا مثل اور بہائم کے۔

کرنے سے ثواب اور اس کی معصیت و نافرمانی کرنے سے عذاب ملتا ہے اور یہ کہ ان کے آگے پیش کرنے سے ان کی استعداد و قابلیت کا اندازہ لگانا مراد ہے (کہ وہ اس کو سرانجام دے سکتے ہیں یا نہیں) اور ان کے انکار کرنے سے ان کی عدم لیاقتی اور لا استعدادی مراد ہے (یعنی وہ اس کو سرانجام نہیں دے سکتے) اور انسان کے اٹھانے سے اس کی لیاقت اور استعداد مراد ہے (۱)۔

جناب میں کہتا ہوں کہ اس تقدیر پر خداوند تعالیٰ کا یہ قول کہ "اور انسان ظالم و جفا کار اور جاہل و بیوقوف تھا"۔ اس کی استعداد کی علت بیان کر رہا ہے، کیونکہ ظالم وہ ہوتا ہے جو کہ عادل نہ ہو لیکن اس میں عدل کی لیاقت ہو اور اسی طرح جاہل وہ ہوتا ہے جو کہ جانتا نہ ہو لیکن اس میں جاننے کی لیاقت ہو، چنانچہ سوائے انسان کے اور جس قدر مخلوق ہے وہ محض عالم و عادل ہے کہ ظلم و جہل کی وہاں رسائی ہی نہیں جیسے کہ ملائکہ ہیں اور یا وہ محض ظالم و جاہل ہیں کہ ان کو عدل و علم کی لیاقت ہی نہیں جیسے کہ بہائم و چوپائے ہیں، لہٰذا اس (امانت و تکلیف) کا وہی مستحق ہو سکتا ہے جس میں کمال بالقوۃ ہو بالفعل نہ ہو۔ (یعنی کسبی ہو فطری نہ ہو) اور لام اس قول الٰہی (لِيُعَذِّبَ) میں لام عاقبت ہے (۲)۔ یعنی اس امانت کے اٹھانے کا انجام رنج و راحت ہے، اور اگر آپ حقیقت حال کا انکشاف چاہتے ہیں تو یوں خیال کر لیجئے کہ ملائکہ میں قوت بہیمیہ کی نہ تفریط ہے جیسے بھوک پیاس اور خوف و غم اور نہ افراط ہے، جیسے شہوت، غصہ اور تکبر اور نہ ان کو تغذیہ و تنمیہ (خوراک و صحت و تندرستی) اور ان کو متعلقات کی پرواہ ہے وہ ان سب چیزوں سے بے نیاز ہو کر حکم

---

(۱) حاصل مطلب یہ ہوا کہ آسمان و زمین کو سرے سے اوامر و نواہی کے ساتھ مامور ہونے اور مکلّف ہونے کی لیاقت ہی نہیں تھی، اس کی لیاقت تو اس انسان ناعاقبت اندیش کو تھی کہ جس کی وجہ سے اس کو اس کی نیکی اور بدی کی جزا و سزا ملے کسی نے کیا خوب کہا ہے ۔ (۲) یہاں لام کو عاقبت پر محمول کیا گیا ہے کیونکہ اگر اس لام کا تعلق (عَرَضْنَا) یعنی خداوند تعالیٰ کے امانت آگے پیش کرنے سے ہے تو یہ ٹھیک نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کے افعال کسی غرض و حاجت کی وجہ سے پیش نہیں آتے اور اگر اس کا تعلق (حَمَلَهَا الْإِنسَانُ) یعنی انسان کے امانت اٹھانے سے ہے تو یہ صحیح نہیں کیونکہ انسان کی اس بار امانت اٹھاتے وقت یہ غرض و نیت نہیں معلوم ہوتی کہ وہ خدا کا عذاب سہے یا آرام و نعمت حاصل کرے کیونکہ غرض تو وہ ہے جو فاعل کو فعل اختیاری پر مجبور و آمادہ کرے اور اٹھانے سے یہاں مراد قابلیت و استعداد ہے جو کہ اختیاری نہیں تو یہ ثابت ہوا کہ لام سے یہاں لام عاقبت مراد ہے جیسے خداوند تعالیٰ نے فرمایا کہ (لِيَكُونَ لَهُمْ عَدُوًّا وَحَزَنًا) لام عاقبت کے معنی غایت و انجام کے ہوتے ہیں یعنی آخر کار انجام ایسا ہوگا جیسے اس قول میں ہے۔

آسمانی کے انتظار میں رہتے ہیں، پھر جب کوئی حکم کسی مطلوبہ نظام کے قیام کے متعلق یا کسی سے بغض وخوشنودی رکھنے کے بارے میں نازل ہوتا ہے تو وہ ملائکہ اپنی خواہشوں سے یکسو ہو کر بدل وجان اس کی تعمیل میں لگ جاتے ہیں، پھر ان کے بعد بہائم کی حالت پر غور فرمائیے کہ ان کا کیسا برا حال ہوتا ہے اور وہ کیسی کیسی بد خصلتوں میں آلودہ رہتے ہیں کہ سوائے لذات جسمانی کے اور کچھ نہیں جانتے محض اپنے منافع جسمانی شہوت رانی یا غصہ کی طغیانی میں غرق رہتے ہیں۔

اس کے بعد یہ بھی دیکھئے کہ خداوند تعالیٰ نے اپنی حکمت کاملہ سے انسان میں دو قوتیں رکھیں ہیں۔ ایک تو قوت ملکیہ ہے جو اس روح انسانی کا فیضان ہے جو روح طبعی کو (جو سارے بدن میں پھیلی ہوئی ہے) ہر وقت اپنا فیض پہنچاتی رہتی ہے اور اس فیض کو قبول کرنا اس کا خاصہ ہے اور فیض اس پر غالب آتا ہے۔ دوسری قوت بہیمیہ ہے جس کا مبدأ ومنبع وہ نفس حیوانی ہے جو تمام حیوانات میں پایا جاتا ہے اور جس میں وہ تمام قویٰ حاصل وموجود ہوتی ہیں جو روح طبعی میں پائی جاتی ہیں اور وہ (قوت بہیمیہ) خود مختار ہوتی ہے اور روح انسانی اس کا حکم مان لیتی ہے۔ پھر یہ بھی یاد رہے کہ ان دونوں قوتوں میں باہم تخالف وتجاذب (کھینچ تان ہوتی) ہے۔ کبھی یہ (قوت ملکیہ) بلندی کی طرف کھینچتی ہے کبھی وہ (قوت بہیمیہ) پستی کی طرف گھسیٹتی ہے۔ جب بہیمیت غالب اور اس کے آثار ظاہر ہوتے ہیں تو ملکیت پست ومغلوب ہو جاتی ہے اور اسی طرح جب ملکیت غالب ہوتی ہے تو بہیمیت پست ہو جاتی ہے، اور خداوند تعالیٰ تو ہر نظام کو چاہتا ہے (اس طرح کہ وہ ایک خاص انداز سے مناسب مواقع پر وقوع پذیر ہوں) چنانچہ استعداد اصلی (یعنی فطری وذاتی) اور کسبی جس چیز کا تقاضا کرتی ہے خداوند تعالیٰ اس کو وہی عطا فرماتا ہے۔ اگر کوئی عادات بہیمیہ (یعنی وحشیانہ خصلتیں) پیدا کرتا ہے تو خداوند تعالیٰ بھی اس کے سامان مہیا کر دیتا ہے اور جب کوئی عادات ملکیہ (یعنی فرشتہ پن کی عادتیں) حاصل کرتا ہے تو خداوند تعالیٰ بھی اس کو اسی کے مناسب سامان عطا کر دیتا ہے۔ جیسے خداوند تعالیٰ فرماتا ہے کہ "جو کوئی اللہ کی راہ میں (مال وزر) دیتا ہے اور تقویٰ اختیار کرتا ہے اور امر حق کی تصدیق کرتا ہے تو ہم اس کے لئے نیک باتیں آسان کر دیتے ہیں اور جو کوئی بخل کرتا ہے اور خدا سے بے خوف رہتا ہے اور حق کو جھٹلاتا ہے تو ہم اس کے لئے بری باتیں آسان کر دیتے ہیں"۔ اور ایک جگہ فرماتا ہے کہ "(اے محمد! ہم تمہارے رب کی عنایت

وبخشش سے ہر گروہ کی مدد کرتے ہیں اس کی بھی اور اُس کی بھی، کیونکہ تمہارے رب کی یہ (دنیوی) عنایت وبخشش (کسی پر) بند نہیں''۔ اور ہر ایک قوت میں رنج اور راحت ہوتی ہے (یعنی لذت والم ہوتا ہے) لذت تو اپنی طبیعت کے موافق چیزوں کے محسوس کرنے کو کہتے ہیں اور الم اپنی طبیعت کے مخالف چیزوں کے سہنے اور برداشت کرنے کو کہتے ہیں۔ دیکھئے جب آدمی کو کوئی مخدّر (سن کرنے والی) چیز لگائی جاتی ہے (۱) تو پھر اس کو کسی چیز سے تکلیف نہیں ہوتی۔ یہاں تک کہ اگر اس کے عضو کو آگ سے جلائیں بھی تب بھی اس کو کچھ بھی خبر نہ ہوگی اور پھر جب اس (مخدّر چیز) کا اثر جاتا رہتا ہے اور حس دوبارہ لوٹ آتی ہے تو کس قدر تکلیف معلوم ہوتی ہے اور آدمی کا حال گلاب سے بہت ملتا جلتا ہے۔ اطبا نے بیان کیا ہے کہ اس میں تین قوتیں رکھی گئی ہیں۔ ایک تو قوت ارضیہ ہے جو کہ گھسنے اور لگانے سے ظاہر ہوتی ہے۔ دوسری قوت مائیہ ہے جو کہ نچوڑنے اور پینے کے وقت ظاہر ہوتی ہے اور تیسری قوت ہوائیہ ہے جو کہ سونگھنے کے وقت ظاہر ہوتی ہے۔ پس ثابت ہوا کہ یہ تکلیف (جو آدمی پر ڈالی گئی ہے) اس (کی) نوع کا تقاضا ہے۔ اور انسان اپنی زبان استعداد سے یہی خدمت مانگتا رہتا ہے کہ قوت ملکیہ کے مناسب چیزیں اس پر واجب کی جائیں تا کہ اس کو اس کا ثواب ملے اور بہیمیت (۲) میں غرق رہنا اس پر حرام کیا جائے تا کہ وہ عذاب سے بچے۔ واللہ اعلم۔

ساتواں باب تقدیر سے تکلیف پیدا ہونے کے بیان میں

واضح ہو کہ مخلوقات الٰہی میں ایسی بہت سی نشانیاں ہیں جن پر غور کرنے سے یہ بات بخوبی معلوم ہو جاتی ہے کہ خداوند تعالیٰ نے جو اپنے بندوں کو احکام وشرائع کا مکلّف بنایا ہے اور اس میں بڑی مصلحت ہے اور اس کے پاس اس کی قوی دلیل بھی ہے۔ اب ذرا درختوں کے پتے اور پھول پھل اور وہ کیفیات دیکھئے جو دیکھنے چکھنے اور سونگھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ دیکھئے خداوند تعالیٰ نے ہر قسم کے پتے کو ایک خاص شکل وصورت اور ہر نوع کے پھول کو ایک خاص رنگ وبو اور ان کے پھلوں کو ایک خاص مزہ وذائقہ عطا کیا ہے جس سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ پھل یا پھول یا پتہ

---

(۱) جیسے کلوروفارم۔ (۲) یعنی چوپایوں اور حیوانوں کی خصلتیں مثلاً شہوت رانی، ہر وقت کھانا پینا، غصہ کرنا وغیرہ وغیرہ۔

فلاں قسم (کے درخت) کا ہے۔اور یہ سب چیزیں صورت نوعیہ کے ساتھ وابستہ ہیں، جہاں سے اور جیسے صورت نوعیہ آتی ہے وہیں سے اور ویسے ہی یہ بھی آتی ہیں۔ خداوند تعالیٰ کی قضا و قدر نے ہر ایک درخت کا ایک خاص مادہ مقرر کر دیا ہے۔ مثلاً کھجور کے لئے ایک خاص مٹی کو معین کر دیا اور مجملاً فرمادیا کہ یہ مادہ کھجور کی صورت میں نمودار ہونا چاہئے اور تفصیلاً اس طرح ارشاد ہوگا کہ اس کا ایسا پھل ہو اور ایسا شگوفہ اور پتا ہو۔ اور کسی نوع کے بعض خواص کو تو ہر ذی عقل جانتا ہے۔ لیکن کچھ خواص ایسے ہوتے ہیں کہ ان کو کوئی دانا ہی جان سکتا ہے مثال کے طور پر یاقوت کی ایک تاثیر کو لے لو کہ وہ جس کے پاس ہوتا ہے اس کے قلب میں فرحت و شجاعت پیدا کرتا ہے (یہ تاثیر ہر کس و ناکس کو معلوم نہیں ہوتی) پھر انواع کے بعض ایسے خواص ہوتے ہیں جو ان کے ہر ہر فرد میں پائے جاتے ہیں اور بعض ایسے ہوتے ہیں جو صرف چند ایسے افراد میں پائے جاتے ہیں جن کا مادہ صلاحیت رکھتا ہے (اور باقی جن افراد کا مادہ صلاحیت نہیں رکھتا ان میں نہیں پائے جاتے حالانکہ ان کی نوع اور قسم وہی ہے) مثلاً ہلیلہ اسی کے حق میں مسہل (دست آور) ہے جو اسے اپنی مٹھی میں بند رکھے اور آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ کھجور کے پھل ایسے کیوں ہوئے؟ اس لئے کہ یہ سوال بیجا ہے کیونکہ لوازم ماہیت اسی کے ساتھ گرہ بندھ رہتے ہیں اور ان کی لم اور وجہ نہیں پوچھی جاتی۔ پھر اس کے بعد اگر آپ حیوانات کی انواع واقسام کو ملاحظہ فرمائیں گے تو درختوں کی طرح ان کی بھی ہر نوع کی صورت و شکل جدا جدا ہی نظر آئے گی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی نظر آئے گا کہ ان کو چند ایسی حرکات اختیاریہ اور الہامات طبعیہ اور تدبیرات جبلیہ بھی عطا ہوئی ہیں کہ ان سے ہر نوع دوسری سے ممتاز ہو جاتی ہے چنانچہ مویشی (ڈھور ڈنگر مثلاً گائے بکری) گھاس کھاتے اور جگالی کرتے ہیں اور گھوڑے گدھے اور خچر وغیرہ گھاس تو کھاتے ہیں لیکن جگالی نہیں کرتے اور درندے گوشت ہی کھا کر جیتے ہیں۔ پرندے ہوا میں اڑتے ہیں۔ مچھلیاں پانی میں تیرتی ہیں۔ ہر نوع حیوان کی ایک جداگانہ آواز ہے۔ جفتی و مجامعت کرنے کا بھی الگ الگ طریقہ ہے بچے پالنے اور انڈے سینے کے ڈھنگ بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اور اگر اس سے زیادہ تفصیل سے بیان کیا جائے تو کلام طویل ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ پھر ہر نوع کو وہی علوم الہام ہوئے ہیں جو کہ اس کے مزاج کے مطابق اور اس کے حق میں فائدہ مند ہیں۔

یہ سارے الہامات ان کے پروردگار کی طرف سے صورت نوعیہ کے سوراخ سے ہوکر آتے ہیں۔ ان کی مثال ایسی ہے جیسے کہ پھولوں کے وضع، وضع کے نقش ونگار اور پھلوں کے ذائقہ دار مزے اپنی صورت نوعیہ کے پابند ہیں۔ اور احکام انواع میں سے بعض احکام تو ایسے ہوتے ہیں جو ایک نوع کے تمام افراد میں پائے جاتے ہیں اور بعض ایسے ہوتے ہیں جو کہ صرف انھیں افراد میں پائے جاتے ہیں۔ جن میں مادہ صلاحیت رکھتا ہے اور اسباب بھی جمع ہوتے ہیں۔ اگر چہ اصل استعداد سب افراد میں برابر پائی جاتی ہے۔ جیسے شہد کی مکھیوں میں ایک فرد (ان کا سردار) یعسوب (۱) ہوتا ہے اور پرندوں میں سے ایک طوطا ہے جو کہ سکھانے اور مشق کرانے کے بعد لوگوں کی آوازوں کی ہو بہو نقل اتارنا سیکھ جاتا ہے پھر آپ ذرا نوع انسان کو دیکھئے اس میں آپ کو وہ سب باتیں ملیں گی جو نباتات وحیوانات میں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً کھانسنا، جمائی لینا، ڈکار لینا، فضلات کا دفع کرنا اور پیدا ہوتے ہی ماں کی چھاتیوں (سے دودھ) کو چوسنا اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ باتیں بھی ملیں گی جن کی وجہ سے وہ تمام حیوانات سے ممتاز ہے مثلاً گفتگو کرنا، گفتگو سمجھنا مقدمات بدیہیہ (آسان وسہل ابتدائی اصول) کو سمجھ کر، تجربے حاصل کر کے، تلاش وجستجو کر کے اور اپنی دانائی وزیر کی اور گمان واندازے کو کام میں لا کے، کسبی علوم کا حاصل کرنا، اور ان امور کا اہتمام کرنا جن کو صرف اس کی عقل اچھا جانتی ہے گو وہ اس کے وہم اور حس میں نہیں آسکتے جیسے تہذیب وتزکیۂ نفس اور اقالیم وممالک کو اپنے قبضۂ قدرت میں لینا اور یہ باتیں چونکہ نوعی اور پیدائشی ہیں اس لئے تمام قومیں اور سکان زمین یہاں تک کہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر رہنے والے بھی ان باتوں میں مشترک اور یکساں ہیں۔

اور یہ سب باتیں اس کی صورت نوعیہ کے طفیل سے ہیں اور اس کا اصل راز یہ ہے کہ انسان کا مزاج یہ چاہتا ہے کہ اس کی عقل اس کے قلب پر غالب رہے اور قلب نفس پر۔ پھر اس کے بعد خداوند تعالیٰ کی حسن تدبیر اور اس تربیت ولطف وکرم کو دیکھئے جو ہر نوع میں شامل حال ہے۔ دیکھئے کہ نباتات میں چونکہ حس وحرکت کا مادہ نہ تھا، لہٰذا ان کی جڑوں کو ایسی قوت عطا فرمائی کہ وہ اس مادہ کو جو ہوا، پانی اور لطیف وباریک خاک سے جمع ہو جاتا ہے چوس کر اپنی شاخوں میں صورت

---

(۱) بڑے مکھے کو کہتے ہیں جو سارے مہال کا بادشاہ ہوتا ہے۔

نوعیہ کے حکم کے مطابق اور ضرورت کے موافق اپنی شاخوں وغیرہ میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ اور حیوان چونکہ حساس ہے اور مرضی کے موافق حرکت بھی کر سکتا ہے تو اس کو زمین سے غذا و مادہ چوسنے والی رگیں اور جڑیں نہیں دیں بلکہ اس کو یہ الہام کیا کہ وہ اناج اور گھاس اور پانی ان مقامات سے حاصل کرے جہاں کہ وہ ملا کرتے ہیں۔ اور دیگر تمام ضروریات کے مہیا کرنے کا طریقہ الہام کیا۔ اور جو انواع زمین سے کیڑوں کی طرح پیدا نہیں ہوتیں تو ان میں خداوند تعالیٰ نے یہ تدبیر وانتظام کیا کہ ان کو توالد و تناسل کی قوت دی اور مادہ (مؤنث) میں ایک ایسی رطوبت پیدا کی کہ وہ اس کو وہ جنیں (حمل کے بچہ) کی تربیت میں صرف کرتی ہے، پھر اس (رطوبت) کو خالص دودھ بنایا اور بچہ کو الہام کیا وہ چھاتیاں چوسے اور پھر دودھ کو اس کے حلق سے اتارا (اس طرح وہ دودھ پینے کے قابل ہوا) اور مرغی میں ایسی رطوبت رکھی جس کو وہ انڈے بنانے میں صرف کرتی ہے۔ پھر جب انڈے دے چکتی ہے تو اس کے مزاج میں خشکی پیدا ہو جاتی ہے اور پیٹ خالی ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے اس کو ایک ایسا جنون سا پیدا ہو جاتا ہے کہ پھر وہ اپنے ہم جنس سے اختلاط (ملنا جلنا) ترک کر کے ان انڈوں کو اپنے پیٹ کے نیچے سینے کو پسند کرتی ہے تا کہ اپنے پیٹ کے خلا کو پر رکھے۔ اور کبوتر کے جوڑے میں عجیب قسم کی محبت والفت پیدا کی اور کبوتری کے پیٹ کے خلا کو انڈے سینے کا باعث بنایا پھر اس کی زائد رطوبت کو قے میں تبدیل کر کے بچوں پر اس کو رحمت کا باعث بنا دیا تا کہ اس کی وجہ سے وہ اپنے بچوں کو دانہ پانی چگاتی رہے اور اس کے نر کو اس کا گرویدہ بنا دیا جس کے سبب سے وہ (اس بارے میں) اس کی تقلید کرتا ہے۔ اور ان بچوں (چوزوں) کا مزاج مرطوب بنایا پھر اس رطوبت کو پر بنانے میں صرف کر دیا تا کہ وہ ان کے ذریعہ اڑ سکیں۔ اور انسان چونکہ باحس و باحرکت ہونے اور الہامات جبلیہ اور علوم طبعیہ کے قبول کرنے کی وجہ سے عاقل اور علوم کسبیہ کا حاصل کرنے والا تھا تو اس کو کھیتی کرنا، درخت لگانا اور تجارت و معاملات میں الہام فرمایا اور بعض کو بالطبع و بالاتفاق سردار و آقا اور بعض کو اسی طرح سے غلام ومحکوم بنایا اور کسی کو بادشاہ بنایا اور کسی کو اس کی رعیت اور کچھ کو حکیم ودانا بنایا کہ وہ حکمت الٰہیہ اور حکمت طبیعیہ اور ریاضیہ اور عملیہ کے دقائق وحقائق بیان کریں اور کچھ کو ایسا غبی پیدا کیا کہ وہ بغیر تقلید کے ان علوم کو سمجھ ہی نہیں سکتا۔

آپ تمام لوگوں کو چاہیے وہ شہری ہوں یا دیہاتی اسی طرح دیکھیں گے کہ یہ تمام باتیں ان پر پوری طرح منطبق ہوتی ہیں۔ یہ تمام کا تمام بیان ان خواص اور ظاہری تدبیروں کی شرح ہے جو اس (انسان) کے معاش اور قوت بہیمیہ سے متعلق ہیں۔ اب اس کی قوت ملکیہ کی طرف چلئے۔ یہ بھی آپ کو یاد رہے کہ یہ انسان اور حیوانوں کی طرح نہیں ہے بلکہ اس کو دانائی سب حیوانات سے عمدہ دی گئی ہے اور اس کے ان علوم میں سے جن کی (سوائے ان کے جن کا مادہ احکام نوعی میں سرکش ہے) سب کو پیروی کرنی پڑتی ہے یہ ہیں کہ وہ اپنی ایجاد (پیدائش) وتربیت (زندگی) کا سبب دریافت کرتا ہے۔ اور یہ بات بھی ضرور معلوم کر کے رہتا ہے کہ اس تمام عالم کا کوئی نہ کوئی مدبر اور چلانے والا ہے جس نے سب کو بنایا اور رزق عطا فرمایا ہے۔ اور وہ اور اس کے تمام ابنائے جنس ہمیشہ زبان حال سے ہمہ تن اپنے باری و پالنہار اور مدبر کے آگے نہایت عجز وانکساری میں مصروف رہتے ہیں اور اس قول الٰہی سے بھی یہی مراد ہے کہ ''کیا آپ نہیں دیکھتے کہ اہل آسمان واہل زمین اور آفتاب اور ماہتاب اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور چوپائے (سب کے سب) اور بہت سے آدمی بھی اس کو سجدہ کرتے ہیں لیکن بہت سے آدمی ایسے بھی ہیں جن کے حق میں (سجدہ نہ کرنے کی وجہ سے) عذاب لکھ دیا گیا ہے''۔ دیکھئے درخت کا ہر جز اس کی شاخیں اس کے پتے اور اس کے پھول ہر دم اس نفس نباتی کے آگے جو درخت کا مدبر ہے ہاتھ پھیلائے رہتے ہیں (۱)۔ اگر ان چیزوں کو (درخت کی) عقل ہوتی تو وہ نفس نباتی کی بڑی ستائش کرتے اور پہلے سے کہیں زیادہ شکریہ ادا کرتے اور اگر ذرا سمجھ ہوتی تو سوال حالی کی جگہ سوال مقالی کرتے۔ پس یہیں سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ انسان چونکہ بڑا عاقل اور دانا تھا لہٰذا وہ بجائے سوال حالی کے سوال علمی کرتا ہے (۲)۔ اور انسان کی نوع کا یہ بھی خاصہ ہے کہ اس کی نوع میں ایک نہ ایک ایسا شخص ضرور ہوتا ہے جو علوم عقلیہ کے منبع (۳) کی طرف ہمہ تن منہمک ومتوجہ رہتا ہے اور وہ اس (منبع) سے وحی یا حدس (۴) (فراست) کے ذریعہ یا خواب میں علوم سیکھتا ہے پھر اور لوگ اس میں رشد وبرکت کے آثار دیکھ کر اوامر ونواہی میں اس کی پیروی واطاعت کرتے ہیں۔ اور ہر انسان کو غیب

(۱) ہاتھ پھیلانا یعنی سوال کرنا مانگنا سے مراد ٹہنیوں وغیرہ کا لہلہانا۔ (۲) یعنی وہ اس کو ہر وقت حاجت روا جانتا۔ (۳) منبع علوم ذات باری یا عالم قدس کے وہ لوگ جن پر اس کے انوار کی پوری شعاعیں پڑتی ہیں۔ (۴) حدس یعنی ظن۔

کی بات دریافت کرنے کی طاقت دی گئی ہے۔ خواہ وہ اس کو بذریعہ خواب کے جانے یا اپنی رائے وبصیرت سے معلوم کرے یا ہاتف غیب سے سن پائے (۱) یا حدس (فراست) سے معلوم کرے مگر اتنا فرق ضروری ہے کہ بعض اس میں کامل اور بعض ناقص ہوتے ہیں۔ اور جو ناقص ہوتے ہیں تو وہ کاملوں کے محتاج ہوتے ہیں اس کے علاوہ انسان کی اور بہت سی ایسی صفات ہیں جو سب حیوانات میں نہیں پائی جاتیں جیسے خشوع (انکساری) پاکیزگی وصفائی، عدل وانصاف اور سخاوت وفراخ دلی اور جیسے اس کی دعا سے عالم جبروت اور ملکوت کے انوار چمکنا اور اسی طرح اور حالات ہیں جیسے کرامت وغیرہ، الغرض جن باتوں میں انسان تمام حیوانات سے ممتاز ہے بہت سی ہیں لیکن ان سب کا اصل اصول دو خصلتیں ہیں ایک تو قوت عقلیہ کی زیادتی ہے۔ اور اس کی دو شاخیں ہیں ایک شاخ مصلحت نظام بشری اور اس کے دقائق کی طرف جھکتی ہے اور دوسری شاخ ان علوم عینیہ کی طرف گئی ہے جو بطریق وہب (عطا خداوندی) حاصل ہوتی ہیں۔

اور دوسری خصلت قوت عملیہ کا کمال ہے۔ اور اس کی بھی دو شاخیں ہیں ایک تو وہ ہے کہ جس کی وجہ سے انسان اعمال کو اپنے ارادے اور اختیار سے کرتا ہے بخلاف بہائم وحیوانات کے کہ وہ اپنے اختیار وارادے سے کچھ نہیں کرتے اور نہ یہ افعال ان کی ذات میں داخل ہوتے ہیں اور نہ ان افعال کی ارواح سے ان کو کچھ اثر پہنچتا ہے بلکہ ان کا اثر ان قویٰ سے متعلق ہے جو کہ ان کی روح ہوائی سے قائم ہیں۔ اور اس لئے یہ افعال حیوانوں سے بہ سہولت سرزد ہوتے ہیں۔ مگر انسان جب ان افعال کو کرتا ہے تو یہ افعال تو فنا ہو جاتے ہیں لیکن ان کی ارواح باقی رہ جاتی ہیں جن کو نفس نگل جاتا ہے اور وہ اس میں شامل ہو کر اپنے اثرات دکھاتی ہیں، پھر یا تو نفس میں انوار ظاہر ہوتے ہیں یا ظلمات اور شرع کا یہ قول کہ ''افعال میں مواخذہ ہونے کی یہ شرط ہے کہ (انسان) ان کو با اختیار خود (قصداً) کرے'' بمنزلہ اس قول طبیب کے ہے کہ ''زہر سے ضرر پانے اور تریاق سے نفع اٹھانے کی یہ شرط ہے کہ ان کو (انسان) کھا کر شکم تک پہنچائے اور ہمارے اس قول کی کہ ''نفس انسانی افعال کی ارواح کو کھاتا اور نگلتا ہے'' یہ دلیل ہے کہ تمام بنی آدم اس بات پر متفق ہیں کہ

(۱) ہاتف آواز دینے والے کو کہتے ہیں۔ ملائکہ کی ایک جماعت اسی کام پر متعین ہے کہ وہ بھولے بسرے کو آواز دیکر بتا دیتے ہیں اور نظر نہیں آتے۔

ریاضات وعبادات کرنا اچھا ہے کیونکہ ان کو اپنے وجدان سے اس کے انوار معلوم ہو گئے ہیں اور اس کے برخلاف گناہ ومعاصی کے ارتکاب کو برا سمجھتے ہیں کیونکہ اپنے وجدان سے اس کی ظلمت وخرابیاں دیکھ لی ہیں۔ اور ایک شاخ حالات رفیعہ اور مقامات عالیہ ہیں جو کسی جنس بہائم وحیوانات میں نہیں پائے جاتے مثلاً خدا کی محبت اور اس کی ذات پر توکل کرنا۔

واضح ہو کہ انسان کا اعتدال مزاج جو اس کی صورت نوعیہ سے پیدا ہوا جبکہ ان چند چیزوں کے بغیر تمام وکامل نہ ہوتا تھا۔ (اوّل) وہ علوم جو سب انسانوں میں سے اعلیٰ اور عمدہ شخص کو حاصل ہوئے اور پھر دوسرے لوگوں نے اس کی تقلید کی۔ (دوم) شریعت الہیہ جس میں معارف الہیہ اور عمدہ انتظام ومنفعت کی تدابیر ہوں (سوم) وہ قواعد جن میں انسان کے افعال اختیاریہ سے بحث ہو اور ان کی ان اقسام خمسہ، واجب، مستحب، مباح، مکروہ اور حرام کی تصریح ہو۔ (چہارم) وہ مقدمات جن سے احسان وسلوک کی خوبیاں واضح ہوتی ہیں۔ تو خداوند تعالیٰ کی رحمت وحکمت نے عالم غیب قدس میں یہ تجویز کی کہ اس کو وہ قوت عقلیہ دی جائے جس کا مستحق سب سے ذکی شخص ہو جو اس کی طرف منہمک ہو کر یہیں (عالم قدس) سے اس کو حاصل کرے اور باقی سب لوگ اس کی اطاعت کریں جیسے مہال کی مکھیوں میں یعسوب (سردار مہال) سب کا انتظام کرتا ہے۔ اگر اس کو یہ قوت بواسطہ یا بلا واسطہ عطا نہ ہوتی تو یہ کمال پورا نہ ہوتا۔ پس جس طرح کوئی شخص کسی ایسے حیوان کو دیکھے جو [illegible] گھاس کے زندہ نہیں رہ سکتا تو وہ ضرور یہ یقین کرلے گا کہ اس کے لئے خداوند تعالیٰ نے کوئی نہ کوئی [illegible] کا جنگل ضرور بنایا ہوگا۔ پس اسی طرح خداوند تعالیٰ کی صنعتوں میں غور ونظر کرنے والا یہ یقین کرلے گا کہ یہاں خداوند [illegible] نے چند ایسے علوم ضرور عطا کئے ہوں گے جن سے عقل کام لے کر اپنے نقائص دور کر کے کمال حاصل کر سکتی ہے۔ من جملہ ان علوم کے ایک علم توحید وصفات ہے جس کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اتنا واضح اور مشرح ہو کہ اس کو ہر شخص کی عقل از خود جان سکے اور اتنا پیچیدہ اور مغلق نہ ہو کہ اس کو [illegible] ہی سمجھ نہ سکے۔ چنانچہ اس علم کی شرح (خداوند تعالیٰ نے) معرفت کے ذریعہ کر دی جس کا اشارہ اس کے قول میں ہے کہ سبحان اللہ وبحمدہ "اللہ اپنی صفات کے ساتھ پاک ہے" پس اس نے اپنے لئے وہ صفات ثابت کیں جن کو لوگ جانتے ہیں اور ان کو باہم استعمال کرتے رہتے ہیں جیسے حیات، سمع (سننا)، بصر (دیکھنا)،

قدرت، ارادہ، کلام، غضب، سخط (ناراضگی)، رحمت، ملک (مالک ہونا) غنا (بے نیازی) وغیرہ۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ثابت کر دیا کہ کوئی شخص ان صفات میں اس کا ہم پلہ (یا اس جیسا) نہیں۔ لہٰذا اس کی حیات وزندگی ہماری زندگی کی طرح نہیں۔ اس کا دیکھنا ہمارے دیکھنے کی طرح نہیں، اس کی قدرت ہماری قدرت کے مثل نہیں۔ اس کا ارادہ ہمارے ارادہ جیسا نہیں اور اس کا کلام ہمارے کلام کے مانند نہیں اور اسی طرح اور صفات (ہماری صفات سے مختلف نوعیت رکھتی ہیں)۔ پھر اس عدم مماثلت (یعنی بے نظیری) کی تفسیر یہ ہے کہ وہ صفات ہماری جنس میں بالکل مستبعد اور دور معلوم ہوتی ہیں مثلاً یہ کہا جاتا ہے کہ وہ بارش کے قطروں کی تعداد اور ریگستانوں کے ریت کے ذرات کا شمار اور تمام درختوں کے پتوں اور سب جانداروں کے سانسوں کی گنتی جانتا ہے اور اندھیری رات میں بھی چیونٹی تک کی چال کو دیکھتا ہے اور بند کمروں میں لحافوں کے نیچے جو کھڑکھڑاہٹ یا کھسر پھسر ہوتی ہے اس کو بھی سنتا ہے اور اسی طرح کی اور باتیں (۱)۔ اور من جملہ ان علوم عبادت (۲) اور علم طریق انتفاعات ومنافع (۳) اور علم بحث ومخاصمت ہے یعنی (وہ علم جس میں یہ بتایا جاتا ہے کہ) نفوس سفلیہ میں جب ایسے شبہات پیدا ہو جائیں جن سے امر حق میں خلجان واقع ہو تو ان کو کس طرح سے دور کیا جائے اور من جملہ ان کے ایک وہ علم (تذکیر) ہے جس میں خداوند تعالیٰ کی نعمتوں اور سختیوں (۴)، وقائع برزخ اور وقائع محشر کو بیان کر کے ڈر سنایا اور اس کی اس قابلیت واستعداد کو دیکھا جو اس کے ابنائے نوع (یعنی ہم جنسوں) میں میراث کے طور پر نسل درنسل چلی آتی ہے اور نیز اس کی قوت ملکیہ کو اور اس تدبیر کو دیکھا جس کی وہ ان علوم مذکورہ سے تکمیل واصلاح کرتا ہے تو یہ علوم، عالم الغیب (۵) میں محدود طور پر متمثل ہو گئے۔ اور اس تمثل کو اشاعرہ کلام (۶) نفسی کہتے ہیں۔ اور یہ چیز، علم، ارادہ اور قدرت کے علاوہ کوئی دوسری چیز ہے پھر جب ملائکہ کے پیدا کرنے کا وقت آیا تو خداوند تعالیٰ نے یہ جانا کہ افراد انسانی کی مصلحت بغیر ایسے نفوس کریمہ (یعنی ملائکہ) پیدا کیے پوری نہ ہوگی جن کی نسبت وتعلق پوری نوع انسانی سے

---

(۱) چنانچہ اس طرح کا دیکھنا سننا ہماری جنس میں مستبعد ومفقود ہے۔ (۲) یعنی یہ علم کہ خدائی بندگی کس کی، کی جائے۔ (۳) یعنی یہ علم کہ دنیا میں کس طرح زندگی گزاری جائے۔ (۴) یعنی موجودہ اور سابقہ قوموں کے عروج وزوال کے اسباب وواقعات۔ (۵) تجلی اعظم سے اوپر کا درجہ۔ (۶) یعنی کلام قدیم جو اللہ تعالیٰ کی خاص ذات سے متعلق ہے۔

ایسا ہی ہو جیسے قوائے عقلیہ کا ہمارے نفوس سے ہے تب ملائکہ محض افراد انسانی پر نظر رحمت فرما کر کن (ہو جاؤ) کے کہتے ہی پیدا کر دیا۔ پھر ان کے دلوں میں ان علوم کی جھلک ڈالی جو عالم غیب الغیب میں محدود تھے۔ پس وہ (ملائکہ) (۱) روحانی صورت میں جلوہ گر ہوئے۔ اور خداوند تعالیٰ کے اس قول میں انہی کی طرف اشارہ ہے کہ "عرش کے اٹھانے والے اور جو اسکے ارد گرد ہیں الخ۔

پھر جب سلطنتوں اور مذہبوں وملتوں کے تغیر وتبدل کا زمانہ آیا (۲) تو حکمت الٰہی ان علوم کے لئے کسی اور وجود روحانی کی مقتضی ہوئی تب وہ علوم ان زمانوں کی ضروریات کے موافق (۳) اور بھی زیادہ مشروح اور مفصل ہو گئے اور اس قول الٰہی میں اسی کی طرف اشارہ ہے کہ "ہم نے اس (قرآن) کو ایک رات بابرکات (یعنی شب قدر) میں نازل کیا ہے۔ ہم آگاہ کرنے والے تھے (۴)۔ اسی رات ہر حکمت والا معاملہ ہماری پیشی سے حکم ہو کر طے اور تقسیم کیا جاتا ہے"۔ پھر حکمت الٰہی ایک ایسے ذکی وپاک شخص (یعنی نبی) کی منتظر ہوئی جو وحی کی استعداد رکھتا ہو۔ اور اس کے لئے اعلیٰ درجہ اور بلند مرتبہ مقرر کیا گیا۔ یہاں تک کہ جب وہ موجود پایا گیا تو اس کو اپنے لئے منتخب کر لیا اور اپنی مراد ومقصود کے پورا کرنے کا ذریعہ بنا دیا۔ اس پر اپنی کتاب نازل فرمائی اور اس کی اطاعت لوگوں پر فرض ٹھہرائی۔ حضرت موسیٰ سے خداوند تعالیٰ اس قول میں یہی فرماتا ہے کہ "(اے موسیٰ!) میں نے تم کو اپنے لئے منتخب کیا ہے" پس جس کی وجہ سے خداوند تعالیٰ نے ان علوم کو عالم غیب الغیب میں متعین کیا تھا وہ عنایت بالنوع (یعنی نوع انسانی پر نظر رحمت) ہی تو تھی۔ اور جس نے حق تعالیٰ سے نفوس ملأ اعلیٰ کے فیضان (وپیدائش) کا سوال کیا تھا وہ استعداد نوع (یعنی نوع انسانی کی قابلیت) ہی تو تھی۔ اور جو چیز ان تغیر ممالک ومذاہب کے زمانوں (کی ضروریات) کے موافق ایک خاص (مشروح ومفصل) شریعت کی خواستگار وملتجی ہوئی تھی تو وہ احوال نوع (نوع انسانی) کے مختلف حالات ہی تو تھے" لہٰذا (معلوم ہوا کہ) اللہ کی دلیل مضبوط ومحکم اور غالب (۵) ہے" پھر اس کو کوئی یوں کہے کہ انسان پر نماز کہاں سے فرض ہوئی اور اطاعت

(۱) یا وہ علوم۔ (۲) یعنی نظام سماوی میں کچھ ایسے حالات پیدا ہوئے۔ (۳) یعنی اس وقت کے آسمانی حالات کے مطابق۔ (۴) یعنی اس کے نازل کرنے سے ہمارا مقصد لوگوں کو ان کے اعمال کے نتائج سے آگاہ کرنا تھا۔
(۵) یعنی اس کی حجت نوع انسانی پر پوری ہوئی اب اس پر کوئی الزام نہیں آ سکتا۔

رسول کہاں سے واجب ہوئی؟ اور زنا اور چوری کہاں حرام ہوئی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حرام وہاں سے ہوئی جہاں سے کہ بہائم وچو پایوں (۱) پر گھاس کھانا حلال واجب اور گوشت کھانا حرام اور درندوں پر گوشت کھانا واجب اور گھاس حرام ہوئی۔ اور جہاں سے کہ مہال کی مکھیوں پر (سردار مہال) یعسوب کا اتباع واجب ہوا۔ (یعنی جس طرح یہ چیزیں واجب وحرام ہوئیں اسی طرح وہ بھی واجب وحرام ہیں) ہاں اتنا فرق ضرور ہے کہ حیوانوں کو یہ علوم بطور الہام جبلی، یعنی نظری وپیدائشی القا کے ذریعہ عطا ہوئے ہیں لیکن انسان نے ان کو اپنے ذاتی تجربہ وکسب وغور ونظر یا وحی یا تقلید (پیروی) کے ذریعہ حاصل کیا۔

آٹھواں باب اس بیان میں تکلیف جزا وسزا کا باعث ہے

واضح ہو کہ انسان کو اس کے اعمال کے موجب جزا ملے گی۔ اگر اعمال اچھے تو جزا بھی اچھی اور اگر اعمال برے تو جزا بھی بری۔ اس کی چار صورتیں ہیں (اوّل) انسان کی صورت نوعیہ کا تقاضا ہے۔ مثال کے طور پر جب چو پایہ (۲) گھاس اور درندہ گوشت کھائے گا۔ تو ان دونوں کا مزاج صحیح رہے گا اور اگر چو پایہ گوشت اور درندہ گھاس کھائے گا تو ان کا مزاج خراب ہو جائے گا اسی طرح انسان ہے اگر وہ ایسے اعمال کرے گا جن کی ارواح حق تعالی کے آگے عاجزی کرنا اور طہارت وپاکیزگی، سماحت وتقویٰ (۳) اور عدالت وانصاف کرنا ہوتے ہیں تو اس کا مزاج ملکی صحیح رہے گا۔ اور جب ایسے اعمال کرے گا جن کی ارواح ان کے برخلاف ہوتی ہیں تو اس کا مزاج ملکی خراب ہو جائے گا اور جب وہ بدن کے بوجھ سے ہلکا (۴) ہوگا تو ان کی نرمی اور سختی (۵) ایسی محسوس کرے گا جس طرح کہ اب ہم جلنے کی تکلیف محسوس کرتے ہیں۔

(دوم) ملأ اعلیٰ کا اثر ہے۔ جس طرح انسان کے دماغ میں قوائے احساس موجود ہیں (جن کی وجہ سے اس کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کے پاؤں کے نیچے کوئی انگارہ آ گیا ہے یا برف کا ٹکڑا) اسی طرح انسان کی اس نوعی صورت کے لئے جو عالم ملکوت میں متمثل ہے (۶) ملائکہ لوگ خدام

---

(۱) چوپائے، گائے بیل وغیرہ یعنی چرنے والے جانور۔ (۲) چوپایہ، گائے بیل وغیرہ گھاس چرنے والا جانور۔ (۳) یعنی دنیاوی لذتوں میں نہ پھنسنا۔ (۴) یعنی جب مرے گا۔ (۵) یعنی نیک اعمال کی نرمی اور برے برے اعمال کی سختی۔ (۶) امام نوع انسانی یا انسان اکبر کہتے ہیں۔

ہیں۔ان کو حق تعالیٰ نے اس نوع انسانی پر خاص عنایت فرما کر پیدا کیا ہے۔کیونکہ جس طرح ہم میں سے کسی کا کام بغیر قوائے ادراک واحساس کے نہیں چلتا اسی طرح اس نوع انسانی کا کام ان (ملائکہ) کے بغیر نہیں چل سکتا تھا۔چنانچہ افراد انسانی میں سے جب کوئی شخص عمدہ کام کرتا ہے تو ان ملائکہ خدام سے خوشی وشادمانی کی (نورانی) شعاعیں نکلتی ہیں اور جب کوئی برا کام کرتا ہے تو بغض ونفرت کی (ظلماتی) شعاعیں نکلتی ہیں اور پھر وہ شعاعیں تو خوشی وشادمانی پیدا کرتی ہیں۔یا وحشت وپریشانی (۱)۔اور کبھی یہی شعاعیں بعض ملائکہ اور بعض مخصوص لوگوں کے نفوس میں تحلیل ہو جاتی ہیں جس سے ان کو یہ الہام ہوتا ہے کہ وہ اس سے محبت رکھیں اور نیک سلوک کریں یا اس سے نفرت رکھیں اور بدسلوکی سے پیش آئیں (۲)۔(اس کو یوں سمجھ لیجئے کہ) جیسے کسی کا پاؤں آگ کی چنگاری پر پڑ جاتا ہے تو اس کو قوائے احساس وادراک کے ذریعہ جلنے کی تکلیف محسوس ہوتی ہے پھر دماغ سے ایک قسم کی شعاعیں نکل کر قلب میں اثر کرتی ہیں۔جس سے رنج ہوتا ہے اور طبیعت گھلتی ہے۔ان ملائکہ کا ہمارے نفسوں میں اثر پہنچانا بھی بالکل ایسا ہی ہوتا ہے جیسے ہماری قوائے احساس وادراک ہمارے بدن میں اثر پہنچاتے ہیں۔چنانچہ جس طرح ہم میں سے کسی کو رنج وذلت وغیرہ کا اندیشہ ہوتا ہے تو وہ کانپنے لگتا ہے اور اس کا رنگ زرد پڑ جاتا ہے اور بدن نڈھال ہو جاتا ہے اور کبھی تو اس کی شہوت بھی ساقط ہو جاتی ہے اور پیشاب سرخ ہو جاتا ہے اور کبھی اتنا سخت خوف ہوتا ہے کہ اس کا ڈر کے مارے پیشاب یا پاخانہ تک نکل جاتا ہے۔یہ سب باتیں اس لئے پیدا ہوتی ہیں کہ قوائے احساس وادراک انسان کی طبیعت پر اثر انداز ہوتی ہیں۔اور اس کے دماغ میں پیغام پہنچاتی ہیں۔جس سے اس چیز کا تصور غالب آ جاتا ہے۔بالکل اسی طرح ان ملائکہ کا حال ہے جو بنی آدم پر متعین ہیں۔ان کی طرف سے انسانوں پر اور ملائکہ سفلیہ کے نفوس پر الہامات جبلیہ (۳) اور تغیرات طبیعیہ (۴) اترتے رہتے ہیں۔افراد انسانی کو (ملائکہ کی) قوائے طبیعیہ سے وہ نسبت وتعلق ہے جو انسان کو اپنی قوائے ادراک واحساس ہے۔اور جس طرح یہ (نورانی وظلماتی) شعاعیں

(۱) خوشی وسرور نیک کاموں سے اور وحشت وپریشانی برے کاموں سے۔(۲) اگر نیک کام کرے تو محبت ونیک سلوک کریں اور برے کام کرے تو نفرت وبدسلوکی کریں۔ (۳) انسان کی طبیعت پر خفیہ طریقہ سے اثر انداز ہونے والا القا جس کا عقل انسانی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا۔(۴) وہ حالتیں جن سے مزاج انسانی بدلتا رہتا ہے مثلاً رنج وغم کی حالت۔سرور کی کیفیت وغیرہ۔

اوپر (ملائکہ کی طرف) سے نیچے اترتی ہیں اسی طرح نیچے سے حظیرۃ القدس تک وہ شعاعیں اوپر پہنچتی ہیں جن سے ایک قسم کا (نورانی) رنگ پیدا ہوتا ہے اور وہ رنگ (تجلی الٰہی میں) ایک قسم کی ہیئت پیدا کر دیتا ہے جس کو رحمت و رضا اور غضب و لعنت کہتے ہیں (۱) (یہ بالکل اسی طرح ہوتا ہے) جیسے پانی کو آگ کے نزدیک رکھنے کی وجہ سے اس میں گرمی پیدا ہو جاتی ہے اور مقدمات کو ترتیب دینے سے نتیجہ حاصل ہو جاتا ہے اور جس طرح دعا قبولیت و اجابت (دعا) کا باعث بنتی ہے، چنانچہ اس وقت (جبکہ یہ رنگ پیدا ہوتا ہے تو) عالم جبروت میں نئی نئی حالتیں و تبدیلیاں ظہور میں آتی ہیں۔ چنانچہ کبھی تو غضب و غصہ ہوتا ہے پھر اسی کے بعد توبہ ہو جاتی ہے اور کبھی رحمت ہوتی ہے تو اسی کے بعد عذاب و عقاب ہو جاتا ہے (۲)

خود خداوند تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''خدا کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اپنی حالت نہ بدلے (۳)'' اور نبی صلعم نے بھی بہت سی احادیث میں یہ بتایا ہے کہ ''ملائکہ بنی آدم کے اعمال اوپر خداوند تعالیٰ کے پاس لے جاتے ہیں'' اور یہ کہ ''خداوند تعالیٰ ان سے پوچھتا ہے کہ تم نے میرے بندوں کو کس حال میں چھوڑا؟ (یعنی جب تم انہیں چھوڑ کر آرہے تھے تو وہ کیا کر رہے تھے؟)'' اور دن کے اعمال اس کے پاس رات کے اعمال سے پہلے پہنچ جاتے ہیں'' اس سے آپ کی مراد یہ ہے کہ بنی آدم اور اس نور الٰہی کے درمیان جو حظیرۃ القدس کے وسط میں قائم ہے۔ ملائکہ بطور واسطہ کے ہیں (سوم) اس شریعت کا تقاضا ہے جو لوگوں پر فرض قرار دی گئی ہے۔ (اس کی ایسی صورت ہے کہ) جس طرح ایک منجم یہ جانتا ہے کہ کواکب کو جب اپنے تمام مقامات و منازل میں سے کوئی مخصوص مقام حاصل ہوتا ہے تو ان (کواکب) کی قوتوں سے مل کر ایک قسم کی روحانیت و روحانی فضا پیدا ہوتی ہے جو فلک کے کسی حصہ میں مرکوز و متمثل ہو جاتی ہے۔ پھر جب احکام فلکیات کا منتقل کرنے والا یعنی ماہتاب جہان تاب اس روحانیت کو زمین کی طرف لاتا ہے تو

(۱) نیک اعمال کے وقت رحمت و رضا اور بد اعمال کے وقت غضب و لعنت۔ (۲) یعنی مختلف شعاعوں کے چڑھنے کے اعتبار سے عالم جبروت میں مختلف اثرات پیدا ہوتے ہیں کبھی اس پر اس کے اعمال کی وجہ سے غضب وغیرہ ہوتا ہے کبھی اس کے اعمال کی وجہ سے اس کو توبہ نصیب ہوتی ہے پھر کبھی رحمت ہوتی ہے پھر اسی کی بدی کی وجہ سے اس پر ناراضگی ہوتی ہے۔ (۳) یعنی جب تک کوئی قوم برے کام نہیں کرتی خدا اس کے ساتھ برائی سے پیش نہیں آتا اور اسی طرح جب تک وہ اچھے کام نہیں کرتی خدا اس کے ساتھ نیکی سے پیش نہیں آتا۔

لوگوں کے دل اور ان کی توجہات اس روحانیت کی طرف پھر جاتی ہیں (۱)۔ بالکل اسی طرح عارف باللہ (۲) جانتا ہے کہ جب ایک خاص وقت آتا ہے جس کو شرع میں لیلۂ مبارک (برکت والی رات) کہتے ہیں اور جس میں تمام حکمت آمیز امور طے ہوتے اور بٹتے ہیں تو اس وقت عالم ملکوت میں ایک قسم کی روحانیت پیدا ہوتی ہے جو احکام نوع انسانی سے مرتب ہوتی ہے اور ضرورت کے مطابق وقت کی مناسبت سے وہاں سے اس زمانہ کے سب لوگوں میں عمدہ اور اذکی شخص (یعنی نبی) پر الہامات نازل ہوتے ہیں۔ اور اسی کے واسطہ سے ان نفوس ذکیہ پر الہامات ہوتے ہیں جو عمدگی و ذکاوت میں اس کے بعد کا درجہ رکھتے ہیں۔ پھر اس کے بعد باقی تمام لوگوں کو یہ الہام ہوتا ہے کہ وہ ان الہامات کو دل سے قبول کریں اور اچھا جانیں۔ اور پھر ان (الہامات) کے معاون و مددگاروں کی تو تائید و امداد ہوتی ہے اور معاندین و مخالفین کی رسوائی و ذلت اور ملائکہ سفلیہ کو یہ الہام ہوتا ہے کہ وہ ان (الہامات) کے مطیع و فرمانبردار کے ساتھ نیک سلوکی سے پیش آئیں اور ان کے عاصی و نافرمان کے ساتھ بدسلوکی سے۔ پھر اس کے بعد ایک قسم کا (نورانی) رنگ و اثر ملأ اعلیٰ اور حظیرۃ القدس میں پہنچتا ہے اور پھر وہاں سے رضامندی و خوشنودی یا ناراضگی و ناخوشی پیدا ہوتی ہے (۳)۔

(چہارم) نبی کی اطاعت ہے اور وہ اس طرح ہے کہ جب خداوند تعالیٰ کسی نبی کو لوگوں میں (رسول بنا کر) بھیجتا ہے اور اس کی بعثت سے ان پر لطف و مہربانی اور خیر رسائی چاہتا ہے اور اس کی اطاعت ان پر لازم قرار دیتا ہے تو وہ علم جو اس کے پاس بذریعہ وحی پہنچتا ہے متشخص اور متمثل ہو جاتا ہے۔ اور اس نبی کی ہمت و دعا کے ساتھ مل جاتا ہے اور اس وقت اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے کہ اس کی مدد ہو، تاکہ اس کا کام مستحکم اور مضبوط ہو جائے، پہلی دونوں صورتوں میں جزا و سزا (جو تقاضائے

---

(۱) یعنی جب اجرام فلکی میں ایک خاص قسم کی ہیئت پیدا ہو جاتی ہے جیسے چاند پر عکس پڑتا ہے اور چاند سے جس رخ پر عکس پڑتا ہے وہ مہینہ کی چودھویں رات کو دنیا کی طرف نظر آتا ہے تو اس روشنی اور ٹھنڈک سب کی توجہ کا مرکز بن جاتی ہے اور اس سے لوگ فیض اٹھاتے ہیں۔ (۲) یعنی خداشناس جو حکمت الٰہی سے واقف ہوتا ہے۔ (۳) یعنی جس طرح اجرام فلکی کا نظام قائم ہے اسی طرح آسمانی نظام بھی قائم ہے۔ لیلۂ مبارک (شب قدر) اسی نظام کے تحت ایک خاص وقت میں وارد ہوتی ہے اور جیسے چاندنی روشنی و ٹھنڈک سے لوگ مادی فیض حاصل کرتے ہیں اسی طرح اس مبارک رات سے روحانی فیض حاصل کرتے ہیں۔

صورت نوعیہ اور جہت ملأ اعلیٰ ہے وہ) اس فطرت الٰہیہ کا نتیجہ ہے جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے اور جو کبھی تبدیل ہی نہیں ہوتی لیکن یہ نیکی و بدی کے اصول اور کلیات ہی میں جاری ہے فروعات میں نہیں۔ اور یہ فطرت وہ دین ہے جو کہ زمانوں کے بدلنے سے بھی نہیں بدلتا اور تمام انبیا اس پر متفق ہوتے ہیں جیسے خداوند تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''یہ ہے تم سب کا طریقہ جو ایک ہی طریقہ ہے''۔ اور نبی صلعم نے بھی فرمایا ہے کہ ''تمام انبیاء علاتی بھائی ہیں کہ ان کا باپ تو ایک ہی ہے لیکن مائیں مختلف ہیں (۱)۔ اور اس قدر مؤاخذہ (جو دین) فطرت کا تقاضا ہے۔ ہر شخص سے ضرور بالضرور ہوتا ہے چاہے وہ انبیا کی بعثت سے پہلے گزرا ہو، چاہے بعد میں (۲)۔

لیکن جو تیسری قسم کی جزا و سزا (جو شریعت کا تقاضا) ہے تو وہ زبانوں کے بدلنے سے بدلتی رہتی ہے اور اسی کے لئے نبی اور رسول مبعوث ہوا کرتے ہیں چنانچہ نبی صلعم کے اس قول میں اسی طرف اشارہ ہے کہ ''میری اور جو کچھ خدا نے مجھ کو دے کر بھیجا ہے اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے کوئی شخص کسی قوم کے پاس آ کر یہ کہے کہ ''اے قوم! میں نے اپنی آنکھوں سے (دشمن کی) فوج دیکھی ہے اور میں تم کو کھلم کھلا (اس سے) ڈراتا اور چوکنا کرتا ہوں لہٰذا تم بھاگو اور اپنی جان بچاؤ۔ تو اس قوم کے ایک گروہ نے تو اس کی بات مان لی اور اس فوج کے آنے سے پہلے پہلے راتوں رات سویرے سے اٹھ کر آرام کے ساتھ چل دیئے اور بچ گئے۔ لیکن ایک گروہ نے اس کو جھوٹا جانا (اور اس کی بات کو نہ مانا) اور صبح تک وہیں اپنی جگہ پر پڑا رہا۔ تو صبح کو اس (دشمن کی) فوج نے آ کر اس کو مار ڈالا اور اس کا ستیاناس کر دیا تو ایسی ہی اس کی مثال ہے جس نے میری اطاعت کی اور میرا کہا مانا اور جو میں لایا اس کی پیروی کی (کہ وہ نجات پائے گا) اور ایسی ہی اس کی مثال ہے جس نے میری نافرمانی کی اور جو حق بات میں لے کر آیا ہوں اس کو جھٹلایا (کہ وہ ہلاک ہوگا)

''اب رہی چوتھی قسم کی جزا و سزا کی صورت جو بعثت انبیا کی وجہ سے ہوتی ہے) تو وہ اس وقت تک نہیں ہوتی جب تک کہ انبیا مبعوث نہ ہو جائیں اور (لوگوں کے) شکوک وشبہات ورنہ ہو جائیں اور تبلیغ (دین) اچھے طریقہ سے نہ ہو جائے تاکہ جس کو (گمراہ و) ہلاک ہونا ہو وہ (اتمام حجت کے

---

(۱) ایک باپ سے مراد امور فطری میں اتفاق اور چند مختلف ماؤں سے مراد احکام کی جزئیات میں اختلاف ہے۔
(۲) اس لئے کہ ان فطری احکام کے لئے کسی نبی کی ضرورت نہیں عام انسانی عقل اس کے سمجھنے کے لئے کافی ہے۔

بعد) دلائل دیکھ کر (دانستہ) ہلاک ہو اور جس کو (ہدایت یاب و) زندہ ہونا ہو تو وہ بھی دلائل دیکھ کر (علی وجہ البصیرت) زندہ ہو''۔

نواں باب اس بیان میں کہ لوگوں کو جبلت کے اختلاف کی وجہ سے ان کے اخلاق واعمال اور مراتب کمال میں اختلاف وفرق پایا جاتا ہے

اور دلیل اس بارے میں نبی صلعم کی یہ حدیث ہے کہ ''جب تم یہ سنو کہ کوئی پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل گیا تو اس کو تو چاہے سچ جان لو لیکن اگر یہ سنو کہ فلاں شخص کے اخلاق وعادات (جبلی) بدل گئے تو اس کو کبھی سچ نہ جانو کیونکہ وہ شخص پھر اپنی جبلی حالت (واصلیت) پر لوٹ آئے گا''۔ اور ایک جگہ آپ نے فرمایا کہ ''دیکھو! بنی آدم مختلف طور پر پیدا کئے گئے ہیں۔ ان میں سے بعض مومن پیدا ہوتے ہیں لیکن کافر ہو کر مرتے ہیں (۱) الخ پھر آپ نے آگے تک پوری حدیث بیان فرمائی اور غصہ اور حقوق وقرض کے تقاضے میں ان کے مختلف درجات کا ذکر فرمایا (۲) اور ایک جگہ یہ بھی فرمایا کہ ''لوگ سونے اور چاندی کی کانوں کی طرح (نسب وقبول فیضان الٰہی کے لحاظ سے) مختلف طور پر (پیدا ہوئے) ہیں اور خداوند تعالیٰ بھی فرماتا ہے کہ (اے محمد) کہہ دو کہ ہر شخص اپنے ڈھنگ پر کام کرتا ہے۔ یعنی اپنے جبلی و پیدائشی طریقہ پر۔ اور اگر آپ کو یہ منظور ہے کہ ان احادیث کے معانی اور جو کچھ اس بارے میں مجھ پر منکشف ہوا ہے وہ آپ کو بھی معلوم ہو جائے تو ذرا متوجہ ہو کر سنئے کہ قوت ملکیہ لوگوں میں دو قسم کی پیدا کی گئی ہے۔ ان میں سے ایک تو وہ ہے جو ان ملا اعلیٰ کے مناسب وموافق ہوتی ہے۔ جن کا یہ کام اور مشغلہ ہے کہ وہ علوم اسماء وصفات سے رنگین رہتے ہیں۔ عالم جبروت کے دقائق وباریک نکات سے باخبر رہتے ہیں اور (کائنات کے) نظام عمدہ (کے امور) کو خوب اچھی طرح حاصل کرتے رہتے ہیں تاکہ اس کا احاطہ کر لیں اور اس کو وجود میں لانے کے لئے اپنی تمام کوششیں اور ہمتیں اس کی طرف مرکوز ومصروف رکھتے ہیں اور دوسری قسم کی وہ قوت ہے جو ملأ سافل کے مناسب ہے (یعنی ان سے مناسبت رکھتی ہے) ان (ملأ سافل) کا

---

(۱) یہ آگے ہے کہ بعض کافر پیدا ہوتے ہیں اور کافر ہو کر مرتے ہیں اور بعض کافر پیدا ہوتے ہیں لیکن کافر ہی مرتے ہیں اور بعض مومن پیدا ہوتے ہیں اور مومن ہی مرتے ہیں۔ (۲) یعنی یہ فرمایا کہ بعض کو جلد غصہ آتا ہے لیکن جلد ہی فرد ہو جاتا ہے اور بعض کو دیر میں آتا ہے اور دیر میں فرد ہوتا ہے اور بعض کو دیر میں آتا ہے اور جلد فرو ہو جاتا ہے اور بعض کو جلد آتا ہے لیکن دیر میں فرو ہوتا ہے اسی طرح قرض کا معاملہ ہے بعض تقاضے میں سخت ہوتے ہیں۔

کام اور مشغلہ یہ ہے کہ وہ محض حکم بالائی کی تعمیل کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں نہ تو اس کا احاطہ کرتے ہیں اور نہ اس کی طرف اپنی کوششیں اور ہمتیں مصروف و مرکوز کرتے ہیں اور نہ ہی اس سے پوری طرح واقف ہوتے ہیں۔ اور نہ انہیں معرفت اسماء و صفات ہوتی ہے۔ البتہ ان میں نورانیت ضرور ہوتی ہے جو ان کو بہیمی آلودگیوں سے پاک رکھ سکتی ہے (۱)۔ اور اسی طرح قوت بہیمیہ بھی دو قسم کی پیدا کی گئی ہے۔ ان میں سے ایک تو وہ ہے جو نہایت شدید اور سخت بنائی گئی ہے، جیسے اس قوی نر سانڈ ھ کی قوت جو بہت سی (عمدہ عمدہ) غذائیں کھلا کر پالا گیا ہو اور جس کی تربیت و پرورش بڑے اہتمام اور نہایت عمدہ ڈھنگ پر کی گئی ہو۔ تو اس طرح وہ نہایت جسیم، بلند آواز، شہ زور، قوی ہیکل، ہٹ کا پکا، باہمت نڈر، بڑا اکڑفوں، نہایت غصیل، سخت کینہ ور، قوی شہوت والا غلبہ اور فتح کا لالچی اور شیر دل ہوگا (۲)۔

اور دوسری قسم کی قوت بہیمیہ وہ ہے جو نہایت کمزور و ضعیف ہوتی ہے۔ جیسے اس جانور کی قوت جو خصی، لنجا اور پیدائشی کچا ہو اور اس کے علاوہ وہ قحط کا مارا ہو، فاقوں میں پلا ہو اور نامناسب طریقہ پر اس کی پرورش کی گئی ہو۔ تو اس طرح وہ نہایت ضعیف و لاغر بدن، پست آواز، کمزور و ناتواں، بزدل، بے ہمت اور غلبہ و فتح سے بے رغبت ہوگا (۳)۔ ان دونوں قوتوں میں سے ہر ایک کی ایک خاص جبلت ہوتی ہے جو کہ ہر فرد میں مخصوص ہوتی ہے اور اس بات کی تخصیص کر دیتی ہے کہ فلاں کس قسم کی قوت کا مالک ہے (ملکی کا یا بہیمی کا) پھر اس کے بعد کسبی اعمال سے اس کو تائید، قوت اور مدد ملتی رہتی ہے (جس سے اس میں اور ترقی ہو جاتی ہے) اور ان دونوں قوتوں (قوت ملکیہ اور بہیمیہ) کا ان (لوگوں) میں یکجا جمع ہونا بھی دو طور پر ہوتا ہے۔ ایک طور تجاذب (۴) ہے کہ باہمی کھینچا تانی کے بعد وہ دونوں جمع ہو جاتی ہیں جبکہ ہر ایک قوت اپنے مقتضا کے حاصل کرنے میں کوشاں اور اپنی اصلی غایت و مقصد کی طلبگار اور اپنے طبعی طور طریقہ کی

---

(۱) اسی طرح جو انسان اس قسم کی قوت ملکیہ کے مالک ہوں گے وہ از خود تو کوئی عمدہ نظام ذمہ دارانہ طریقے پر نہیں چلا سکتے البتہ ایسے دوسروں کا سہارا لیکر جو ذمہ دار ہوں کچھ کام کر سکتے ہیں۔ (۲) جس انسان میں شدید بہیمیت ہوگی اس میں ایسی ہی صفات پائی جائیں گی۔ (۳) جس کی بہیمیت کمزور ہوگی وہ ایسی صفات کا مالک ہوگا۔ (۴) یعنی مزاحمت، کشاکشی اور کھینچا تانی۔

خواہشمند رہتی ہے تو لامحالہ ان میں کشاکشی پیدا ہوگی۔ اگر ان میں سے کوئی ایک غالب آئے گی تو دوسرے کے آثار کو مٹا دے گی۔ دوسرا طور باہمی صلح و مصالحت اور اتفاق ہے۔ اس صورت میں یہ ہوتا ہے کہ قوت ملکیہ کسی قدر اپنی خالص و اصلی باتوں سے نیچے اتر کر (یعنی ان سے ہٹ کر) اس کے قریب قریب کی باتوں ہی کو اختیار کر لیتی ہے (اور انہی پر اکتفا کرتی ہے) جیسے عقل، سخاوت نفس، عفت طبع، سب کے نفع و بھلائی کو اپنے ذاتی نفع سے مقدم سمجھنا فوری (یعنی دنیاوی) نفع کو چھوڑ کر آئندہ کے (یعنی اخروی) فائدہ کا منتظر رہنا۔ ہر بات میں پاکیزگی و نفاست کو پسند کرنا۔ اسی طرح قوت بہیمیہ بھی کسی قدر اپنی خالص باتوں سے ذرا اونچی ہو جاتی ہے اور اپنا اصلی شیوہ چھوڑ کر وہ باتیں اختیار کر لیتی ہے جو رائے کلی سے بعید اور مخالف نہیں ہوتیں (۱) تو اس طرح یہ دونوں (قوتیں) باہم مصالحت کر لیتی ہیں۔ ان کے اس باہمی ملاپ سے ایک ایسا مزاج واختلاط پیدا ہو جاتا ہے جس میں کسی قسم کی باہمی مخالفت نہیں ہوتی۔ قوت ملکیہ اور قوت بہیمیہ اور اجتماعی قوت (مخلوط جو ان کے باہمی ملاپ سے پیدا ہوتی ہے) ان میں سے ہر قوت کے مدارج کے لحاظ سے دو کنارے اور ایک مرکز (یا وسط) ہوتا ہے (۲)۔

پھر اس کے بعد وہ درجے ہوتے ہیں جو یا تو کنارے سے قرب رکھتے ہیں یا مرکز سے، غرض اس طرح بیشمار اقسام پیدا ہوتی ہیں لیکن بڑی بڑی اقسام (جو اپنے اپنے احکام و خاصیتوں کے لحاظ سے جدا جدا ہیں اور جن کے جاننے سے اور اقسام بھی معلوم ہو جاتی ہیں) کل آٹھ ہیں۔ ان میں سے چار تو وہ ہیں جو ان دونوں قوتوں کے باہمی تجاذب اور کشاکش سے پیدا ہوتی ہے (اوّل) وہ جو ملکیت عالیہ اور بہیمیت شدیدہ سے مل کر پیدا ہوتی ہے۔ (دوم) جو ملکیت عالیہ اور بہیمیت ضعیفہ سے مل کر پیدا ہوتی ہے۔ (سوم) جو ملکیت سافلہ اور بہیمیت شدیدہ سے مل کر پیدا ہوتی ہے۔ (چہارم) جو ملکیت سافلہ اور بہیمیت ضعیفہ سے مل کر پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح ان کے باہمی ملاپ و مصالحت سے بھی انہی جیسی چار اقسام پیدا ہوتی ہیں اور ان میں سے بھی ہر قسم کا حکم و خاصیت جدا ہے جو کسی طرح بھی نہیں بدلتی جس کسی کو بھی اس کے احکام و خاصیات معلوم

(۱) یعنی نہ تو بالکل اپنی باتیں اس سے منواتی ہے اور نہ اس کی ساری باتیں مان لیتی ہے بلکہ اس کے بین بین ہے۔

(۲) یعنی ایک کنارہ اعلیٰ درجہ کا دوسرا ادنیٰ درجہ کا اور ایک درمیانہ درجہ۔

ہو جائیں گی تو وہ بہت سی پریشانیوں اور الجھنوں سے نجات حاصل کر لے گا لیکن ہم یہاں صرف ان باتوں کو بیان کریں گے جن کی ہمیں آئندہ اس کتاب میں ضرورت ہے تو (معلوم ہونا چاہئے کہ) سخت ریاضتوں کا سب سے زیادہ محتاج وضرورتمند وہ شخص ہوگا جس کی قوت بہیمیہ سخت ہوگی۔ خصوصاً وہ جو صاحب تجاذب (۱) ہوگا اور کمالات سے بہرہ مند وہ ہوگا جس کی قوت ملکیہ عالی (غالب) ہوگی۔ لیکن صاحب مصالحت (۲) ادب اور عمل میں ان سب سے بہتر ہوگا اور صاحب تجاذب قوت بہیمیہ سے چھٹکارا پانے کے بعد علم اور معرفت میں ان سب سے بڑھ کر ہوگا مگر عمل کی چنداں پرواہ نہ کرے گا (۳) اور بڑے بھاری کاموں (۴) میں بے رغبتی وہی برتے گا (اور ان سے جی چرائے گا) جس کی قوت بہیمیہ ضعیف ہوگی۔ لیکن صاحب قوت عالیہ (۵) سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر خدا کی طرف متوجہ ہو جائے گا۔ اور صاحب قوت سافلہ کو اگر فرصت ملے گی یا بہیمیت سے چھٹکارا پائے گا تو آخرت کے واسطے سب کاروبار ترک کر دے گا ورنہ سستی اور آرام طلبی کی خاطر اسے ترک کر دے گا اور بڑے بھاری کاموں میں سب سے زیادہ تندہی سے گھسے گا اور مشغول ہوگا جس کی قوت بہیمیہ شدید اور زیادہ ہوگی لیکن صاحب قوت عالیہ (۶) ''امور ریاست، سرداری، ولیڈری جیسے کاموں کی طرف زیادہ متوجہ ہوگا اور وہ سب کام کرے گا جو رائے کلی کے مناسب ہوتے ہیں (۷) اور صاحب قوت سافلہ (۸) جنگ وجدل اور باربرداری جیسے کاموں میں زیادہ مصروف ہوگا اور ہر صاحب تجاذب جب پستی کی طرف گرے گا تو صرف دنیوی امور میں مشغول رہے گا اور جب بلندی کی طرف ترقی کرے گا تو صرف دینی امور، اصلاح نفس اور اس کے تزکیہ ہی میں مصروف رہے گا اور ہر صاحب مصالحت ان دونوں کی طرف برابر توجہ صرف کرے گا اور دونوں کو بیک وقت کرے گا لیکن ان میں سے جس کی قوت عالیہ بہت ہی بلند ہوگی تو وہ دین ودنیا دونوں کی سرداری کے لائق ہوگا اور حق تعالیٰ کے ارادہ کے مطابق اسی پر ہمیشہ

(۱) یعنی وہ شخص جس میں قوت ملکیہ اور بہیمیہ بڑی کھینچا تانی اور تجاذب کے بعد یک جا ہوئی ہے۔ (۲) یعنی وہ شخص جس میں قوت ملکیہ وبہیمیہ باہمی مصالحت وملاپ سے یک جا جمع ہوئی ہوں۔ (۳) کیونکہ اس میں بہیمیت مغلوب ہوگئی ہے جو عمل میں کام آتی ہے۔ (۴) جیسے جہاد وغیرہ۔ (۵) یعنی اعلیٰ قوت ملکیہ والا۔ (۶) یعنی جس کی قوت ملکیہ کمزور اور سافل ہوگی۔ (۷) یعنی جس کی قوت ملکیہ غالب اور عالی اور قوت بہیمیہ کمزور اور ضعیف ہوگی۔ (۸) یعنی جس کی قوت ملکیہ کمزور وسافل ہوگی اور قوت بہیمیہ سخت وغالب ہوگی۔

ڈٹا رہے گا۔ نظام کلی کے اہتمام (جیسے خلافت اور دین وملت کی امامت) میں بمنزلہ اس کے دست راست کے ہوگا یہی لوگ انبیا اور ان کے ورثا اور ستون دین اور سلاطین وقت اور اولوالامر ہوتے ہیں اور جن لوگوں کا دین الٰہی میں اتباع واجب ہوتا ہے وہ لوگ ایسے اہل مصالحت ہوتے ہیں جن کی قوت ملکیہ عالی وغالب ہوتی ہے اور ان لوگوں کے زیادہ مطیع وہ اہل مصالحت ہوتے ہیں جن کی قوت ملکیہ کمزور وسافل ہوتی ہے کیونکہ یہ لوگ نوامیس (یعنی اسرار الٰہی) کو پورا پورا حاصل کرتے ہیں اور ان سے دور تر اہل تجاذب ہوتے ہیں کیونکہ یہ لوگ (اہل تجاذب) یا تو سراسر ظلمات طبیعت میں اس طرح غرق رہتے ہیں کہ سنت راشدہ وراہ راست پر اچھی طرح قائم نہیں رہتے اور جب اس پر غالب آتے ہیں تو اس طرح غالب آتے ہیں کہ اگر اہل علو (بلند خیال) ہوں تو ارواح نوامیس (اسرار الٰہیہ کی ارواح) کے ساتھ چمٹے رہیں گے اور ان کی ظاہری صورتوں کو چھوڑ دیں گے اور ان کی اکثر کوششیں اور ہمتیں عالم جبروت کے دقائق (صفات الٰہیہ کی باریکیاں) معلوم کرنے اور ان کے رنگ میں رنگین ہونے میں مصروف رہیں گے اور اگر اس (علو) سے کم ہوں تو ریاضتوں اور دردوں میں پھنسے رہیں گے اور کشف واشراف (۱) اور قبولیت دعا وغیرہ جیسے انوار ملکیہ سے خوش رہیں گے لیکن خاص نوامیس (یعنی اسرار الٰہیہ) ان کے دل کی تہہ میں نہیں بیٹھیں گی (۲) جب تک کہ طبیعت پر جبر نہ کریں یا انوار کا سہارا نہ لیں (۳) تو یہ ہیں وہ اصول جو میرے پروردگار نے مجھے عطا فرمائے ہیں جو ان کو غور سے سمجھ لے گا تو اہل اللہ کے احوال اس پر روشن ہو جائیں گے ان کے ذاتی کمالات واشارات کی انتہا سے وہ واقف ہو جائے گا اور ان کے سلوک کے مراتب بھی اس کو معلوم ہو جائیں گے۔ یہ (علم) محض خداوند تعالیٰ کے اس فضل کی بدولت (عطا ہوا) ہے جو اس نے ہم پر اور باقی تمام لوگوں پر کیا ہے لیکن اکثر لوگ اس کی ان نعمتوں کا شکر ادا نہیں کرتے۔

---

(۱) اشراف، یعنی کسی کے دل کی بات پر مطلع ہونا۔ (۲) یعنی وہ صرف ان چیزوں کو لے لیتے ہیں جن سے نفس مغلوب ہو باقی احکام کی پابندی عادت کے طور پر کرتے ہیں نہ کہ شوق سے۔ (۳) یعنی ان کا میلان طبع نوامیس کی طرف کم ہوتا ہے اگر ہوتا ہے تو طبیعت پر جبر کرکے عادتاً یا اس کو انوار کا سہارا دیکر۔

دسواں باب ان خواطر (۱) وخیالات کے اسباب کے بیان میں جو اعمال پر اکساتے ہیں

واضح ہو کہ انسان کے ان دلی خواطر وخیالات کا جو اس کو کسی کام پر اکساتے اور رغبت دلاتے ہیں ضرور کوئی نہ کوئی سبب ہو گا کیونکہ تمام حوادث (نو پیدا شدہ چیزوں) میں عادت الٰہی یونہی جاری ہے کہ ان کے وجود میں آنے کا کوئی نہ کوئی سبب ضرور ہوتا ہے۔ مشاہدے، تجربہ اور صحیح غور وفکر سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اس کے بہت سے اسباب ہیں جو یہ ہیں من جملہ ان اسباب کے سب سے بڑا سبب انسان کی وہ جبلت ہے جو اس کی خلقت میں رکھی گئی ہے چنانچہ اس کا ذکر ایک حدیث میں اس سے پیشتر آ چکا ہے (۲) منجملہ ان کے انسان کا مزاج طبعی ہے جو کھانے پینے وغیرہ جیسی ضروری تدابیر وحالات سے بدلتا رہتا ہے چنانچہ بھوکا آدمی کھانا طلب کرتا ہے اور پیاسا پانی مانگتا ہے بالغ اور تیز شہوت والا شخص عورت کی خواہش کرتا ہے بعض اوقات انسان ایسی غذائیں کھاتا ہے جو قوت باہ (شہوت) کو تقویت پہنچاتی ہیں جس سے اس میں عورتوں کی طرف میلان پیدا ہو جاتا ہے اور پھر اس کے دل میں ایسے ایسے خیالات پیدا ہوتے ہیں جن کا تعلق عورتوں سے ہوتا ہے اور پھر یہی خیالات اس کو بہت سے (نا قابل ذکر) افعال کے کرنے پر آمادہ کر دیتے ہیں۔ اور بعض اوقات انسان ایسی سخت غذائیں کھاتا ہے جن سے اس کا دل بھی سخت ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ قتل تک کی جرأت کر بیٹھتا ہے اور بہت سی ان باتوں پر بھی غصہ ہو جاتا ہے جن پر اور لوگ غصہ نہیں ہوتے اور نہ وہ باتیں قابل غصہ ہوتی ہیں۔ پھر یہی دونوں قسم کے اشخاص جب صیام وقیام سے ریاضت نفس کرنے لگتے ہیں یا بہت بوڑھے ہو جاتے ہیں یا سخت بیمار پڑ جاتے ہیں تو ان کی پہلی حالت بہت حد تک بدل جاتی ہے یعنی دل نرم ہو جاتا ہے اور نفس سیدھا ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ بوڑھے اور جوان کے حالات میں بڑا فرق پایا جاتا ہے اور اسی (فرق) کی بنا پر نبی صلعم نے روزہ کی حالت میں بوڑھے کو تو (بیوی کا) بوسہ لینے کی اجازت دے دی لیکن جوان کو نہ دی منجملہ ان کے کسی چیز کی عادت اور الفت ہے۔ کیونکہ جب انسان کسی بات کو

---

(۱) دل کے خیالات یعنی ان خیالات کا جو عمل کی طرف رغبت دلاتے ہیں کیا سبب ہے۔ (۲) یہ وہ حدیث ہے کہ پہاڑ کا ٹل جانا سنو تو چاہے سچ جان لینا لیکن اگر کسی کی عادت کا بدل جانا سنو تو کبھی سچ نہ جاننا۔

کثرت کے ساتھ کرتا ہے اور اس طرح اس کے لوح دل پر اس کی مناسب شکل وصورت منقش ہو جاتی ہے تو دل میں بسا اوقات اسی کے خیال آتے ہیں منجملہ ان کے یہ بات ہے کہ کبھی نفس ناطقہ (۱) قوت بہیمیہ کی قید سے نکل بھاگتا ہے اور مقام ملأ اعلیٰ سے (حظیرۃ القدس) سے حسب توفیق کچھ ہیئت نورانی اڑا لاتا ہے، جو کبھی تو نیک کام سے انس ومحبت اور اطمینان وسکون کا باعث ہوتی ہے اور کبھی کسی اعلیٰ ونیک فعل (کے کرنے) کا عزم پیدا کر دیتی ہے منجملہ ان کے ایک یہ بات بھی ہے کہ بعض نفوس خسیسہ (ادنیٰ نفوس) شیاطین سے متاثر ہو کر ان کے رنگ میں رنگ (مل) جاتے ہیں۔ تو کبھی اسی ہیئت سے دل میں خواطر وخیالات پیدا ہوتے اور برے افعال سرزد ہوتے ہیں اور آپ کو یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ خواب کی باتیں بھی وہی حیثیت رکھتی ہیں جو دل کے خیالات وجذبات رکھتے ہیں (۲) فرق صرف اتنا ہے کہ خواب کی باتوں کے لئے نفس مجرد (اکیلا وتنہا) اور صاف ہو جاتا ہے تب وہ باتیں اس پر کسی خاص شکل وصورت میں ظاہر ہوتی ہیں (۳) محمد بن سیرین (۴) فرماتے ہیں کہ خواب کی تین قسمیں ہیں۔ حدیث نفس (دل کی اندرونی باتیں) تخویف شیاطین (شیطانوں کا ڈراوا) بشارت من اللہ (خدا کی طرف سے خوش خبریاں)

گیارھواں باب انسان کے اعمال کا اس کے نفس پر لگایا اور چپکایا جانا اور اس کے لئے گن کر محفوظ رکھا جانا

خداوند تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے ہر انسان کے عمل کو اس کی گردن میں لٹکا دیا ہے اور اس کو اس کے لئے قیامت کے دن کتاب بنا کر پیش کر دیں گے جس کو وہ کھلا ہوا دیکھ لے گا، (پھر ہم کہیں گے) لے! اپنی کتاب پڑھ آج اپنا حساب لینے کے لئے تو خود کافی ہے۔ نبی صلعم خداوند تعالیٰ سے روایت کرتے ہیں (۵) کہ (وہ قیامت کے روز فرمائے گا کہ) ''یہ تمہارے ہی

---

(۱) یعنی روح انسانی۔ (۲) یعنی یہ دونوں کے پیدا ہونے کے اسباب ایک ہی ہیں۔ (۳) یعنی دونوں ایک ہی اصول کے ماتحت پیدا ہوتے ہیں فرق یہ ہے کہ جاگتے میں خیالات منتشر ہوتے ہیں ایک تخیل پر مرکوز نہیں ہوتے اس لئے وہ خیالات واضح طور پر تصویر کی شکل میں نہیں آتے لیکن سوتے میں خیالات ہر طرف سے ہٹ کر صرف اسی تخیل پر جمع ہو جاتے ہیں اور اس طرح ان کی صاف فلم اور تصویر سامنے آجاتی ہے۔ (۴) آپ تابعی اور علم تعبیر خواب کے امام مانے جاتے ہیں ان کی عجائب تعبیریں مشہور ہیں۔ (۵) یعنی اس آیت کی تفسیر میں۔

اعمال تو ہیں جن کو میں نے تمہارے لئے سینت کر محفوظ رکھا تھا اب میں تم کو انہیں کا بدلہ دیتا ہوں تو جس کو بھلائی ملے وہ خدا کا شکر ادا کرے اور جس کو برائی ملے تو وہ صرف اپنے آپ کو ملامت کرے(۱)'' اور آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ نفس (دل) تمنا اور خواہش کیا کرتا ہے پھر فرج (عضو بدن) اس کو سچا اور جھوٹا کرتا ہے(۲)''

واضح ہو کہ جن اعمال کو انسان قصداً کرتا ہے ان کا اور ان عادات و اخلاق کا جو اس میں راسخ ہوتے ہیں، نفس ناطقہ (روح) مبدأ و منبع ہے(۳) وہ اسی سے نکل کر اسی کی طرف واپس لوٹ آتے ہیں پھر اس کے دامن سے چمٹ جاتے ہیں اور سینت کر اس میں محفوظ کر لئے جاتے ہیں اب رہی یہ بات کہ اس سے پیدا کیوں ہوتے ہیں تو اس کی وجوہات وہ ہیں جو آپ جان چکے ہیں کہ قوت ملکیہ اور بہیمیہ اور ان کے امتزاج (مرکب) کی چند اقسام بن جاتی ہیں جن میں سے ہر ایک کی جدا جدا خاصیت ہوتی ہے اور انسان کے مزاج طبعی کا غلبہ اور ملائکہ یا شیاطین کے رنگ میں رنگین ہونا اور اسی طرح کے دوسرے اسباب (جن کی وجہ سے خواطر ظہور میں آتے ہیں) انسان کی جبلت ہی سے پیدا ہوتے اور اس میں مناسبت پیدا کرتے ہیں (۴) لہٰذا (معلوم ہوا کہ) ان کا مرجع یہی اصل نفس ہی ہے خواہ بواسطہ یا بلا واسطہ (۵) اب دیکھیے (اس کی زندہ مثال) کہ جب مخنث (بچہ) ابتدا میں نازک مزاج پیدا ہوتا ہے تو اسی وقت اس بات سے ماہر نفسیات جان جاتا ہے کہ اگر یہ (بچہ) اپنے اسی مزاج پر جوان ہوگا تو ضرور عورتوں کی سی عادات و صفات اور لباس و زیب و زینت اور انہیں کی سی رسومات و طور طریق اختیار کرے گا اور اسی طرح طبیب یا

---

(۱) خدا کا شکر اس لئے کہ خدا نے اس کی فطرت میں ابتدا ہی میں ایسی استعداد رکھی کہ اس کی وجہ سے وہ اچھے کام کر کے اجر پائے گا اور اپنے آپ کو ملامت اس لئے کہ خدا نے تو اس کی فطرت میں استعداد رکھی تھی لیکن اس نے اسے نہ ترقی دی اور نہ صحیح استعمال کیا۔ (۲) یعنی دل میں گوزنا کی آرزو اور خواہش ہو مگر اس کی تصدیق و تکذیب فرج کے اختیار میں ہے کہ اس میں اس کی مدد کرے یا نہیں اگر اس نے وہ فعل کر لیا تو خواہش سچی ہوگئی اور وہ گناہ ہوگیا ورنہ نہیں۔ (۳) یعنی ان کا مادہ اسی کے اندر موجود ہوتا ہے کہیں باہر سے یہ چیز واقع نہیں ہوتے۔ (۴) یعنی اندرونی استعداد ہی ہے جو بیرونی اسباب کا اثر لے کر عمل کرتی ہے۔ (۵) بواسطہ اس طرح کہ استعداد کی قوت اور مضبوطی کی وجہ سے از خود عمل کرے اور بواسطہ اس طرح کہ کمزور ہونے کی صورت میں بیرونی اثرات سے متاثر ہو کر عمل کرے۔

ڈاکٹر بھی یہ جانتا ہے کہ اگر فلاں بچہ اپنے مزاج کے موافق جوان ہوگا اور (پرورش کے دوران میں) اس کو کوئی ایسی ویسی بات (بیماری وغیرہ) پیش نہ آئے گی تو آیا وہ قوی چست و چالاک وہونہار ہوگا یا کمزور ومرجھایا ہوا اور بزدل (۱) اب رہا یہ سوال کہ وہ اعمال اس کے نفس ناطقہ کی طرف واپس کیوں لوٹ آتے ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب انسان کسی کام کو بکثرت کرتا ہے تو وہ اس کا اس درجہ عادی ہو جاتا ہے کہ اس سے بغیر کسی غور وفکر کے نہایت آسانی کے ساتھ خود بخود ایسے افعال سرزد ہونے لگتے ہیں اب اس بات میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں رہتا کہ اس کے نفس نے اس (فعل) سے متاثر ہو کر اس کا رنگ قبول کر لیا ہے اور یہ یقینی بات ہے کہ اس تاثر میں (جو انسان بے شمار اعمال سے قبول کرتا ہے) ہم جنس اعمال کے ایک ایک عمل کو دخل ہوتا ہے چاہے وہ (تاثیر یا اثر) کتنا ہی باریک یا خفیف کیوں نہ ہو۔

نبی صلعم کی اس حدیث میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے کہ ''گمراہیوں کے خیالات (فتنے) دلوں کو بوریہ کے تنکے کی طرح تہ بہ تہ گھیر لیتے ہیں (۲) پھر جو دل ان کے اثر کو قبول کرتا ہے تو اس میں ایک سیاہ دھبہ پڑ جاتا ہے اور جو دل اس کو قبول نہیں کرتا اس میں سفید نشان ہو جاتا ہے آخر کار (بڑھتے بڑھتے) ان دونوں دلوں کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ سفید نشان والا تو (پورا کا پورا) ایسا صاف شفاف ہو جاتا ہے جیسے سنگ مرمر اور پھر اس کو آئندہ کے لئے کسی قسم کے فتنہ یا بدعملی کی نقصان دہی کا اندیشہ نہیں رہتا اور دوسرا سیاہ دھبہ والا کالا سیاہ غبار آلودہ اور چکنے گھڑے کے مانند ہو جاتا ہے (۳) کہ سوائے اپنی دلی خواہشوں کے نیکی بدی کچھ نہیں جانتا اب رہی یہ بات کہ اعمال نفس کے دامن سے کیوں چمٹ جاتے ہیں؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ نفس ناطقہ شروع شروع میں صاف وسادہ ہیولانی صورت میں پیدا کیا جاتا ہے ہر قسم کے خدوخال اور رنگ واثر سے خالی ہوتا ہے پھر اس کے بعد قوت سے فعل کی طرف دن بدن ترقی کرتا رہتا ہے۔ اور ہر پچھلی

---

(۱) قوی اس صورت میں کہ اس کا مزاج قوی ہو اور کمزور اس صورت میں کہ اس کا مزاج کمزور ہو۔ (۲) مطلب یہ ہے کہ فتنوں کی بھرمار ہوتی ہے ایک اٹھا، ابھی وہ دور ہوا نہیں کہ دوسرا اٹھ جاتا ہے۔ (۳) چکنا یا الٹا گھڑا اس لئے کہا کہ جس طرح اس میں پانی نہیں رہتا اور نہ نیا آتا ہے اسی طرح اس دل کا حال ہو جاتا ہے کہ اس میں کوئی نیک بات نہ آتی ہے اور نہ ٹھہرتی ہے، اس کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ وہ کالا، سفیدی ملا ہو (یعنی راکھ کے رنگ کا) اور جھکے ہوئے آبخورے کی طرح ہو جاتا ہے۔ یہاں اوپر محاورہ کی رعایت رکھی گئی ہے۔

حالت کے لئے پہلی حالت معد (۱) ہوتی ہے اور ان معدات کا سلسلہ ترتیب وار ہوتا ہے کوئی ایک بھی آگے کی پیچھے اور پیچھے کی آگے نہیں ہوسکتی جو نفس ناطقہ آج موجود ہے اس میں معدات سابقہ میں سے ہر معد کا ویسا کا ویسا ہی اثر موجود ہے گو کسی خارجی شغل میں توجہ پلٹنے کی وجہ سے نفس کو اس کا پوری طرح احساس نہ ہو صرف دو صورتوں میں اس اثر کے زائل ہو جانے کا احتمال ہے۔ اول یہ کہ وہ چیز ہی فنا ہو جائے جس میں وہ قوت موجود رہتی ہے جس سے اعمال پیدا ہوتے ہیں جیسے کہ بوڑھے اور مریض کے بارے میں ہم ذکر کر چکے ہیں (۲)۔

دوسرے یہ کہ (حظیرۃ القدس کی) کوئی ہیئت بالائی اس پر غالب آ کر اس کے نظام (سابق) کو اس طرح بدل دے جیسے کہ وہ مذکورہ بالا صورت میں بدل جاتا ہے (۳) چنانچہ اسی کی بابت خداوند تعالیٰ بھی فرماتا ہے کہ ''نیکیاں برائیوں کو مٹا دیتی ہیں''۔ اور یہ بھی فرماتا ہے کہ ''اگر تو شرک (اختیار) کرے گا تو تیرے سب اعمال برباد ہو جائیں گے'' اب رہی یہ بات کہ وہ اعمال اس کے لئے جمع کر کے محفوظ کیوں رکھے جاتے ہیں؟ تو اس کا راز جو کچھ مجھے اپنے ذوق سے معلوم ہوا ہے وہ یہ ہے کہ نظام فوقانی کی عطا کے موافق و مناسب عالم مثال کے بالائی طبقے میں ہر انسان کی ایک صورت ظاہر ہوتی ہے اور میثاق کے قصہ میں جس کا ظہور ہوا وہ اسی کی ایک شاخ تھی (۴) پھر جب وہ شخص عالم وجود میں آتا ہے تو وہ صورت اس پر لگ جاتی ہے اور اس طرح اس کے ساتھ مل کر ایک ہو جاتی ہے پھر جب وہ شخص کوئی (اچھا) عمل کرتا ہے تو وہ صورت اس (عمل) سے بلا اختیار طبعی طور پر خوش ہو جاتی ہے (۵) پھر (مرنے کے بعد) عالم معاد میں کبھی تو یوں ظاہر ہوگا کہ اوپر اس کے اعمال اس کے لئے سینت کر محفوظ رکھ لئے گئے ہیں چنانچہ نامہ اعمال پڑھنے سے یہی

(۱) معد اصطلاح میں اس کو کہتے ہیں جو خود معدوم ہو کر دوسرے کے وجود اور ترقی میں مدد کرے جیسے ایام، یعنی آج کا دن ہو چکے گا تو کل کا دن آئے گا۔ اس طرح ہر آنے والی چیز پچھلی چیز کی استعداد سے پیدا ہوتی ہے۔ (۲) یعنی یہ کہ بوڑھے اور مریض کی استعداد و قوت ختم ہو جاتی ہے اس کے دل میں ایسے خواطر آنے بند ہو جاتے ہیں کیونکہ بیماری اور بڑھاپے کے ساتھ ہی ساتھ اس کا مزاج طبعی بھی بدل جاتا ہے۔ (۳) یعنی بیماری اور بڑھاپے کی صورت میں۔ (۴) یعنی یوم الست کا واقعہ جو روز عہد کہلاتا ہے جبکہ خداوند تعالیٰ نے بنی آدم سے عہد لیا تھا اور الست بربکم فرمایا تھا وہاں انسانوں کی یہ صورتیں موجود ہوئی تھیں۔ سورۂ اعراف ۱۷۲ میں یہ واقعہ ملاحظہ فرمائیں۔ (۵) یا پھیل جاتی ہے۔

مراد ہے اور کبھی یوں ظاہر ہوگا کہ وہ اعمال اس کے اعضاء سے چمٹے ہوئے ہیں چنانچہ ہاتھ پاؤں کے کلام کرنے (اور گواہی دینے) سے یہی مراد ہے پھر (یہ بھی ایک بات ہے کہ) عمل کی صورت وشکل اس کے دنیاوی واخروی ثمرہ ونتیجہ کو اپنے آپ صاف صاف بیان کردیتی ہے(۱)۔ کبھی ملائکہ اس کی (صحیح) صورت وشکل بنانے میں تردد کرتے اور دیر لگاتے ہیں تو خداوند تعالیٰ فرمادیتا ہے کہ عمل کو ہو بہو لکھ لو (زیادہ کد وکاوش نہ کرو)

امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ ''ابتدائے عالم سے لے کر اس کی انتہا تک جس جس چیز کا خداوند تعالیٰ نے اندازہ مقرر کرلیا ہے وہ سب ایک مخلوق چیز میں لکھا ہے۔ اس مخلوق کو بھی خداوند تعالیٰ ہی نے پیدا کیا ہے کبھی تو اسے لوح محفوظ کہتے ہیں، کبھی کتاب مبین اور کبھی امام مبین۔ جیسا کہ قرآن میں وارد ہوا ہے (پس جو کچھ عالم میں ہو چکا ہے اور ہوگا اس لوح پر ایسے نقوش سے لکھا ہوا ہے جو ان آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتے۔ آپ یہ نہ سمجھیں کہ وہ لوح (محفوظ) کسی لکڑی یا لوہے یا ہڈی کی تختی ہے اور وہ کتاب (مبین) کاغذ یا ورقوں کی بنی ہوئی ہے بلکہ آپ قطعی طور پر یہ جان لیجئے کہ جس طرح خداوند تعالیٰ کی ذات وصفات انسانوں کی ذات وصفات کے مشابہ نہیں اسی طرح اس کی تختی اور کتاب ان کی تختیوں اور کتابوں جیسی نہیں۔ اگر آپ اس کو سمجھنے کے لئے کوئی مثال چاہیں تو حافظ قرآن کے دل ودماغ کو لے لیجئے کیونکہ لوح محفوظ میں خداوند تعالیٰ کے مقررہ اندازوں کا ریکارڈ بالکل اسی طرح محفوظ ہے جس طرح حافظ قرآن کے دل ودماغ میں قرآن کے الفاظ محفوظ ہوتے ہیں اور اس کو وہ دل ودماغ پر اس طرح لکھے ہوئے نظر آتے ہیں جیسے کہ وہ پڑھتے وقت ان کو دیکھ رہا ہے مگر جب آپ اس کے دماغ کو چیر کر دیکھیں گے تو اس طرح کا لکھا ہوا کوئی حرف بھی دکھائی نہ دے گا پس لوح محفوظ میں بھی اسی طور پر سب کچھ (جو اللہ تعالیٰ نے مقدر کر رکھا ہے) لکھا ہوا سمجھ لیجئے'' امام غزالیؒ کا قول ختم ہوا۔ پھر یہ بھی ہوتا ہے کہ نفس نے جو کچھ کیا ہوتا ہے برا یا بھلا اس کو وہ اکثر یاد کرتا رہتا ہے اور اس کی جزا وسزا کی امید رکھتا ہے تو یہ بھی اس کے عمل برقرار رکھنے کی ایک اور وجہ بن جاتی ہے باقی اللہ بہتر جانتا ہے۔

(۱) یعنی ان کے دیکھنے سے فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا دنیاوی واخروی نتیجہ کیا ہوگا۔

بارھواں باب اعمال کا نفسی حالتوں سے وابستہ ہونا

واضح ہو کہ اعمال ہیئت نفسانی (۱) کے مظاہر، اس کے شکار کرنے کی گھاٹیاں (۲) اور اس کی شرح ہیں اور عرف عام میں اسی کے ساتھ متحد ہیں یعنی ساری کی ساری دنیا حال دل کسی طبعی وقدرتی سبب کی بنا پر جو صورت نوعیہ کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے، اعمال کے ساتھ تعبیر کرتی ہے (۳) اس کی وجہ یہ ہے کہ جب دلی ارادہ انسان کو کسی کام پر آمادہ کرتا ہے اور نفس اس کو پسند کر لیتا ہے تو وہ کھل کر ہشاش بشاش ہو جاتا ہے اور اگر ناپسند کرتا ہے تو وہ پژمردہ وافسردہ ہو کر مرجھا جاتا ہے اور پھر جب وہ اس کام کو کر چکتا ہے تو اس ارادہ کا مبداومنبع (خواہ قوت ملکیہ ہو یا بہیمیہ) مستقل اور قوی ہو جاتا ہے اور اس کا مخالف (منبع خواہ قوت ملکیہ ہو یا بہیمیہ) غیر مستقل اور کمزور ہو جاتا ہے۔ نبی صلعم کو اس قول سے یہی بات جھلکتی ہے کہ (انسان کا) نفس آرزو اور خواہش کرتا ہے اور فرج اور اس کی شرم گاہ اس خواہش نفسانی کو سچا کرتی ہے یا جھوٹا کرتی ہے، آپ جس خلق وعادات کو دیکھیں گے یہی پائیں گے کہ اس کے لئے چند افعال واعمال اور ہیئات وکیفیات مخصوص ہوتی ہیں جن کے ذریعہ سے اس کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور انہی سے اس کو بیان کرتے ہیں اور اس طرح وہ (اعمال وہیئات) اس خلق وعادت کے اظہار کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ چنانچہ اگر کوئی شخص کسی کو بہادر بتائے اور پھر اس سے اس کی بہادری کے متعلق دریافت کیا جائے تو لامحالہ وہ اس کے سخت سخت حملوں اور مہموں ہی کو بیان کر کے اس کی بہادری وشجاعت کا اظہار کرے گا اور اگر کوئی اس کی سخاوت وفیاضی بیان کرے گا تو (استفسار کے بعد) وہ بھی یہی کہے گا کہ وہ شخص روپیہ پیسہ خوب خرچ کرتا ہے اور اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ شجاعت اور سخاوت کی تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے پھر جائے تو وہ مجبور ہوگا کہ ان شجاعت وسخاوت کے اعمال کا ہی تصور خیال میں لائے ہاں یہ دوسری بات ہے کہ وہ فطرت الٰہی ہی بدل جائے جس پر سب لوگ پیدا ہوئے ہیں (۴)۔

---

(۱) ہیئت نفسانی، نفسی حالت، کیفیت قلبی، حال دل، خلق اور ملکہ سب کا ایک ہی مطلب ہے۔ (۲) یعنی روحانی حالتیں، اعمال ہی کے ذریعہ نفس انسانی میں جمتی ہیں۔ (۳) یعنی جب کسی کی ہیئت نفسانی اور خلق کو بیان کرنا چاہتے ہیں اس کے اعمال بیان کرتے ہیں۔ (۴) یعنی کوئی شخص مافوق الفطرت ہو عام لوگوں کی طرح نہ ہو بلکہ احساس میں اتنا بلند ہو کہ کسی صفت کے مخصوص اعمال وافعال کو خیال میں لائے بغیر ہی اس کا تصور اپنے ذہن میں قائم کر سکے یہ بہت کم واقع ہوتا ہے اس لئے ایسے لوگوں کو نظر انداز کرنا پڑتا ہے۔

اگر کوئی شخص (بہ تکلف) وہ خلق و عادت حاصل کرنا چاہے جو اس میں پہلے سے موجود نہیں ہے تو اس کو اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں کہ اس کے صحیح موقعوں کو تاکتا رہے اور ان اعمال و افعال کو نہایت جانفشانی اور تندہی سے کرے جن کا اس (خلق) سے تعلق ہے اور ان لوگوں کے واقعات یاد کرے جو اس قسم کے کام کر گزرے ہیں پھر یہ اعمال ہی ہوتے ہیں جو قابو میں آسکتے ہیں ان ہی کے (کرنے) لئے اوقات کا تعین ہو سکتا ہے نظر بھی یہی آتے ہیں یہ ہی دکھائے بھی جا سکتے ہیں، بیان بھی کئے جا سکتے ہیں اور اثر انداز بھی ہو سکتے ہیں، نقل و پیروی بھی انہی سے ہو سکتی ہے اور قدرت واختیار میں بھی یہی داخل ہوتے ہیں۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ سب نفوس اعمال اور ملکات (۱) کے محفوظ کرنے میں برابر نہیں ہوتے کیونکہ بعض نفوس تو ایسے قوی ہوتے ہیں جو اعمال سے زیادہ ملکات کو تصور میں لے آتے ہیں تو ان کا اصلی کمال اپنے اندر صرف اخلاق و ملکات پیدا کرنا ہوتا ہے لیکن اعمال بھی ان کے تصور میں متمثل ہو کر آتے ہیں کیونکہ یہ اعمال ان اخلاق و ملکات کے قالب اور تصویر ہوا کرتے ہیں تو اس طرح یہ اعمال محض اسی وجہ سے محفوظ کئے جاتے ہیں مگر ان کی محافظت اخلاق و ملکات کی محافظت سے کم ہوتی ہے یہ تمثل (۲) ایسا ہے جس طرح خواب میں معانی مقصودہ (۳) اعمال کی شکل میں دکھائی دیتے ہیں جیسے موھنوں، شرمگاہوں پر مہر لگانا، دیکھنا (۴)۔ اور بعض نفوس ایسے کمزور ہوتے ہیں جو اپنے اعمال ہی کو اپنا اصلی کمال سمجھتے ہیں کیونکہ ان میں نفسی کیفیات اچھی طرح جمی ہوئی نہیں ہوتیں بلکہ اعمال ہی کے لباس میں نظر آتی ہیں لہٰذا ان میں اعمال کے جوہر محفوظ رہتے ہیں اور اکثریت ایسے ہی لوگوں کی ہوا کرتی ہے انہیں وقت کی پابندی کی بہت ضرورت ہوتی ہے اور اسی لئے شریعت میں معانی اور کیفیات کے مقابلہ میں اعمال کی طرف زیادہ توجہ دلائی گئی ہے اور ان ہی پر زیادہ زور دیا گیا ہے پھر ایک بات یہ بھی

---

(۱) اس کا واحد ہے ملکہ یعنی کسی کام کی مہارت جو اس کو بار بار کرنے سے انسان میں پیدا ہوتی ہے اسے کسی کام کا جوہر اور نتیجہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ (۲) تمثل یعنی کسی صورت میں ظاہر ہونا۔ (۳) یعنی وہ باتیں جو نظر نہیں آتیں۔

(۴) یہ اس خواب کی طرف اشارہ ہے جو کسی نے یوں دیکھا تھا کہ میں لوگوں کے موھنوں اور شرمگاہوں پر مہر لگا رہا ہوں۔ ابن سیرین سے جب اس کی تعبیر پوچھی تو انھوں نے کہا کہ شاید تم موذن ہو گے رمضان میں قبل از وقت اذان دے دیتے ہو گے اور اس طرح لوگوں کا کھانا اور جماع کرنا بند کر دیتے ہو گے۔ چنانچہ اس کے اس فعل کے معنی اس طرح واضح شکل وصورت میں دکھائے گئے۔

ہے کہ بہت سے اعمال ایسے بھی ہوتے ہیں جو قطع نظر اس ہیئت نفسانی کے جس کی وجہ سے عام طور پر یہ ظہور میں آیا کرتے ہیں۔ براہِ راست ملأ اعلیٰ میں مقرر ہو کر پسند یا ناپسند کیے جاتے ہیں تو اس طرح کسی نیک کام کا کرنا گویا ملأ اعلیٰ کے اس الہام کو قبول کرنا ہوتا ہے کہ ''ہمارا تقرب حاصل کر، ہماری مشابہت اختیار کر، ہمارے انوار حاصل کر (۱)۔

اور برا کام کرنے سے اس کے خلاف حالت ہوتی ہے۔ ملأ اعلیٰ میں اعمال کا یہ تقرر چند وجوہات کی بنا پر ہوتا ہے من جملہ ان کے ایک یہ ہے کہ ان کو خداوند تعالیٰ کی طرف سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ نظام بشری اس وقت تک نہیں سدھر سکتا جب تک کہ فلاں فلاں اعمال کو اختیار نہ کیا جائے اور فلاں فلاں اعمال سے اجتناب نہ کیا جائے لہٰذا وہ اعمال ملأ اعلیٰ میں متشکل ہو جاتے ہیں اور بعد ازاں وہاں سے (ہر نبی کی) شریعت میں نازل ہوتے ہیں۔ من جملہ ان کی ایک یہ ہے کہ جب وہ نفوس بشریہ جو ان اعمال (صالحہ) کو لگاتار کرتے رہنے سے ان میں مہارت پیدا کر لیتے ہیں جب (بعد از وفات) ملأ اعلیٰ میں پہنچ جاتے ہیں تو وہاں بھی ان کو پسند یا ناپسند کرنے لگتے ہیں اور اس طرح جب اسی میں ایک زمانہ دراز گزر جاتا ہے تو ان اعمال کی صورتیں وہاں ان کے پاس قرار پکڑ لیتی اور جم جاتی ہیں۔ حاصل کلام یہ ہے کہ اس صورت میں اعمال میں بالکل وہ تاثیر پیدا ہو جاتی ہے جو بزرگوں سے منقولہ اور مجربہ تعویذوں اور منتروں میں ہوتی ہے۔ باقی اللہ بہتر جانتا ہے۔

تیرھواں باب جزا و سزا کے اسباب

واضح ہو کہ جزا و سزا کے اسباب اگرچہ بہت ہیں لیکن وہ سب ان دو باتوں پر مبنی ہیں اوّل یہ کہ نفس انسانی اپنی قوت ملکیہ کے ذریعہ اپنی کسی بدفعلی یا بدخلقی کو نامناسب سمجھتا ہے اس کے اس احساس سے اس میں ایک ندامت، افسوس اور الم دل خراش پیدا ہوتا ہے بسا اوقات اس کی وجہ سے خواب یا بیداری میں ایسے ایسے واقعات تصور میں آتے ہیں جو رنج والم، ذلت و اہانت اور خوف و ڈر کے باعث ہوتے ہیں۔ بہت سے نفوس ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو جس طرح کے اور علوم کے

---

(۱) یعنی ان اعمال کا تعلق دلی کیفیات سے نہیں ہوتا بلکہ وہ براہ راست ملأ اعلیٰ کے الہام سے انجام پذیر ہوتے ہیں۔

الہام کی استعداد ہوتی ہے اسی طرح اس عمل کے نامناسب ہونے کے الہام کی بھی استعداد ہوتی ہے(۱) پس فرشتوں کی زبانی یہ خطاب ہوتا ہے کہ ان کو ظاہر کر کے دکھایا جائے اور بتایا جائے (۲)۔ اور اسی بات کی طرف خداوند تعالیٰ کی اس آیت میں اشارہ ہے کہ ''ہاں! جنھوں نے گناہ کمائے اور ان کے گناہوں نے انہیں گھیر لیا تو وہی جہنمی ہیں ہمیشہ وہیں رہیں گے'' دوم یہ کہ حظیرۃ القدس والے فرشتے بنی آدم کی طرف متوجہ رہتے ہیں (صورت حال یہ ہوتی ہے کہ) ملأ اعلیٰ کے پاس ہیئات نفسانی اور اخلاق و اعمال، اچھے اور برے پسندیدہ اور ناپسندیدہ سب رکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ پس وہ اپنے رب سے یہ دعا و سوال کرتے ہیں کہ ان (نیکوکار) لوگوں کو راحت اور ثواب اور ان (بدکار) لوگوں کو مصیبت اور عذاب ملے۔ چنانچہ ان کی دعا قبول ہوتی ہے اور بنی آدم پر اپنا اثر اس طرح دکھاتی ہے کہ ان پر جس طرح دیگر علوم نازل ہوتے ہیں اسی طرح رحمت ولعنت برستی ہے (۳) جس کی وجہ سے المناک یا راحت کن واقعات ظہور میں آتے ہیں اور اس طرح ملأ اعلیٰ انہیں ڈراتے دھمکاتے ہوئے یا ان سے راضی وخوش نظر آتے ہیں (۴) کبھی ان نفوس پر ملأ اعلیٰ کی ناراضگی کی وجہ سے ایسا اثر پڑتا ہے جس کی وجہ سے ان پر غشی یا مرض کی سی حالت طاری ہو جاتی ہے اور کبھی ان کا وہ قصد وارادہ نازل ہوتا ہے جو (انسان کی) کمزور حالتوں کو مضبوط کرتا ہے جیسے خواطر (کمزور خیالات) وغیرہ، تو اس کی وجہ سے ملائکہ یا بنی آدم کو الہام ہوتا ہے کہ وہ ان (بدکاروں) کے ساتھ برا سلوک اور ان (نیکوکاروں) کے ساتھ نیک سلوک روا رکھیں۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ خود اسکے اعمال اصلاح یا فساد پیدا کر کے اس کی راحت وثواب یا مصیبت وعذاب کا باعث بن جاتے ہیں۔ بلکہ دراصل سچی بات تو یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ کی ازل سے جو انسان پر نظر عنایت ہے، وہ کبھی یہ نہیں چاہتی کہ انسان یونہی بیکار آزاد چھوڑ دیا جائے اور اس کے اعمال کی باز پرس نہ ہو لیکن چونکہ یہ بات ذرا مشکل سے سمجھ میں آتی تھی (کہ خدا کس طرح اچھا برا بدلہ دے گا؟) اس لئے ہم نے اس کو فرشتوں کی دعا اور بددعا کا عنوان دے دیا (کہ ان کی دعا

---

(۱) یعنی جس طرح اور علوم کا الہام ان کو ہوتا ہے اسی طرح اس کا الہام بھی ہوتا ہے۔ (۲) یعنی ان کو ان کی غلطی پر باخبر کر دیا جاتا ہے۔ (۳) رحمت نیک کام کے وقت اور لعنت برے کام کے وقت۔ (۴) نیک عملی کے وقت رضامندی اور راحت کن واقعات اور بدعمل کے وقت دھمکی، ڈراوے اور المناک واقعات ہوتے ہیں۔

وبددعا سے ایسا ہو جاتا ہے) باقی اللہ بہتر جانتا ہے۔ اور اسی دوسری بات کی طرف اس قول الٰہی میں اشارہ ہے کہ "جو لوگ کافر ہوئے اور اسی کفر کی حالت میں مر گئے ان پر خدا کی، فرشتوں کی اور سب آدمیوں کی لعنت ہے۔ وہ ہمیشہ کے لئے اسی حالت میں رہیں گے نہ تو کبھی ان پر عذاب کم ہوگا اور نہ (کسی قسم کی) مہلت ورعایت ملے گی (۱)۔

ان دونوں اسباب کی ترکیب اور باہمی ملاوٹ سے عمل اور نفس انسانی کی استعداد کے مطابق بہت سی عجیب عجیب صورتیں پیدا ہوتی ہیں لیکن پہلی بات ان اعمال واخلاق پر زیادہ اثر انداز ہوتی ہے جن سے یا تو نفس کی اصلاح ہوتی ہے یا بگاڑ ہوتا ہے (۲)۔ اور ذکی اور قوی (ملکیت والے) نفوس اس کو زیادہ قبول کرتے ہیں اور دوسری بات ان اعمال واخلاق پر زیادہ اثر انداز ہوتی ہے جن سے نظام کلی میں فرق پیدا ہوتا ہے یعنی ان پر جو مصالح عامہ اور مفاد کلی کے خلاف اور نظام انسانی کی اصلاح ودرستگی کے منافی ہوتے ہیں (۳) اور اس کو وہ نفوس زیادہ قبول کرتے ہیں جو ضعیف (ملکیت والے) اور بدتر و تنگ ہوتے ہیں۔ جزا وسزا کے ان دونوں اسباب کے بعض موانع بھی ہوا کرتے ہیں جو اس کو ایک خاص مدت تک کے لئے ملتوی کر دیتے ہیں۔ پہلے سبب سے تو یہ چیز مانع ہوتی ہے کہ نفس انسانی میں ملکیت کمزور ہو جاتی ہے اور بہیمیت غالب آجاتی ہے اور یہ حالت بڑھتے بڑھتے اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ نفس سارا کا سارا بہیمی بن جاتا ہے اور پھر اس کو ملکیت کو تکلیف دینے والے افعال واعمال سے ذرا بھی رنج اور تکلیف نہیں ہوتی مگر جب نفس پر جامہ بہیمی الگ ہو جاتا ہے اور بہیمیت سے امداد ملنی بھی ختم ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ ملکیت کے انوار چمکنے لگتے ہیں تو اس وقت اس کو رفتہ رفتہ رنج وعذاب یا راحت وثواب ملنا

---

(۱) مصنف نے جزا وسزا کے دو سبب بیان فرمائے ہیں جو سب کے اصل الاصول ہیں، پہلے کا یہ خلاصہ ہے کہ جزا وسزا کا ایک یہ طریقہ ہے کہ نفوس قدسیہ اپنے افعال واعمال پر حسرت وندامت کریں یا خوش ہوں پس ان کے لئے یہی عذاب وثواب ہے مگر یہ خاص نفوس قدسیہ کی بابت ان افعال میں ہے جو خاص انہیں کے ساتھ متعلق ہیں اور دوسرا طریقہ جزا وسزا کا یہ ہے کہ ملاء اعلیٰ کی دعا یا بددعا سے ایسے واقعات ظہور میں آئیں جن سے رنج وراحت پہنچے۔ لیکن یہ ان افعال کی نسبت ہے جو باہم معاملات سے متعلق ہیں مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ عالم آخرت میں جنت ودوزخ کچھ نہ ہوگی بلکہ یہ ظاہراً دنیاوی جزا وسزا کی طرف اشارہ ہے۔ (۲) یعنی ذاتی وشخصی اعمال میں۔ (۳) یعنی سوسائٹی کے اجتماعی معاملات سے اس کا تعلق ہوتا ہے۔

شروع ہو جاتا ہے(۱) اور دوسرے سبب سے یہ چیز مانع ہوتی ہے(۲) کہ اس کا جو حکم (عذابی) ہے اس کے مخالف اسباب جمع ہو جاتے ہیں (اس لئے وہ جزاوسزا ایک خاص وقت تک کے لئے ملتوی (۳) رہتی ہے) لیکن جب اس کا مقررہ وقت (موت) آ جاتا ہے تو اس وقت اس جزاوسزا کا بند ٹوٹ جاتا ہے اور وہ طوفان وسیلاب کی طرح آ جاتی ہے چنانچہ اس قول الٰہی میں اسی طرف اشارہ ہے کہ "ہر قوم (کے عذاب) کا ایک وقت معین ہے جب وہ وقت آ پہنچتا ہے تو (جزا مل کر رہتی ہے) نہ ایک گھڑی دیر ہوتی ہے نہ سویر"

---

(۱) مثلاً جب آدمی طاقتور ہوتا ہے تو کسی کمزور پر ظلم کرتے ہوئے ذرا سا درد بھی محسوس نہیں کرتا لیکن جب وہ خود کمزور ہو جاتا ہے اور کوئی دوسرا طاقتور اس پر ظلم کرتا ہے تو اس کو اس ظلم کا احساس اور درد ہوتا ہے اسی طرح کی بہت سی مثالیں ہیں مثلاً جوان اور بوڑھا ہونا، دولت مند وغریب ہونا وغیرہ وغیرہ۔(۲) یعنی اس کے اثرات کو روک لیتی ہے۔(۳) یعنی کچھ ایسی باتیں پیش آ جاتی ہیں جن کے مدنظر کچھ عرصہ کے لئے اس حکم عذاب کو ملتوی رکھنا پڑتا ہے۔ جیسے ابھی ان میں صالح ونیکوکار لوگ بھی شامل ہوتے ہیں یا ابھی دعوت وتبلیغ مکمل طریقہ سے نہیں ہوئی ہوتی وغیرہ وغیرہ۔

مبحث دوم

دنیاوی واخروی جزاوسزا کی کیفیت

پہلا باب: دنیا میں اعمال کی جزاوسزا

خداوند تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''تم پر جو کچھ مصیبت پڑتی ہے تو وہ تمہارے اپنے کرتوتوں کا نتیجہ ہے اور بہت سی تو وہ معاف بھی کر دیتا ہے'' اور ایک جگہ فرماتا ہے کہ ''اگر وہ لوگ توریت، انجیل اور جو کچھ ان کے پاس ان کے خدا کی طرف سے آیا تھا اس پر عمل کرتے تو آسمان اور زمین کی نعمتیں کھاتے (یعنی رزق آسمان سے برستا اور زمین سے ابلتا)''۔ اور جو کچھ کنجوس باغ والوں کے قصہ میں خداوند تعالیٰ نے سورۂ نون میں فرمایا ہے وہ تو معلوم ہی ہے(۱) اور نبی صلعم نے اس آیت کی تفسیر میں کہ ''اپنے دل کی بات کو خواہ تم ظاہر کرو خواہ چھپاؤ، خدا تم سے سب کا حساب لے لے گا'' اور اس آیت کی تفسیر میں کہ ''جو کوئی بھی برا کام کرے گا وہ اس کا بدلہ پائے گا'' یوں فرماتے ہیں کہ ''اس بدلہ اور جزا سے خدا کا وہ عتاب مراد ہے جو بندہ پر بخار یا اسی قسم کی کسی اور چھوٹی بڑی مصیبت وسختی کی صورت میں ہوتا ہے یہاں تک کہ جو پریشانی اور گھبراہٹ اس کو جیب میں رکھی ہوئی چیز کے گم ہو جانے سے ہوتی ہے وہ بھی اسی میں شمار ہوتی ہے اور اس طرح انسان مصائب کی صورت میں اپنے صغیرہ گناہوں کا کفارہ ادا کرتے کرتے ان سے اس طرح پاک اور صاف ہو جاتا ہے جس طرح سونا بھٹی میں جلانے سے صاف ہو جاتا ہے۔

(۱) اس میں سورۂ نون کے اس قصہ کی طرف اشارہ ہے کہ تین بھائی ایک باغ کے مالک تھے کھیتی کاٹتے وقت مسکین لوگ خدا واسطے مانگنے آجایا کرتے تھے تو یہ کچھ دے دیا کرتے تھے ایک دفعہ یہ مشورہ ہوا کہ راتوں رات فقیروں کے آنے سے پہلے ہی کاٹ لاؤ، خدا نے ان کی اس بدنیتی کی وجہ سے اس باغ کو جلا دیا جب وہ وہاں پہنچے تو دیکھ کر بڑے پشیمان ہوئے اور دعا کی کہ الٰہی ہمارے اس جرم کو معاف کر کے ہم کو اس کا عوض عنایت فرمادے۔

واضح ہو کہ قوت ملکیہ، قوت بہیمیہ کے ہاتھوں سے مغلوب ہو کر پھر غالب اور دب کر پھر ظاہر ہو جایا کرتی ہے، کبھی یہ بات طبعی موت سے حاصل ہوتی ہے اور کبھی اختیاری موت سے طبعی موت سے اس طرح کہ اس وقت قوت بہیمیہ کو غذائی امداد ملنی بند ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے اس کے مواد رفتہ رفتہ اس طرح تحلیل ہو جاتے ہیں کہ نہ پھر ان کا کوئی بدل ہوتا ہے اور نہ بھوک پیاس غصہ وغیرہ سے نفس میں ہیجان وخواہش پیدا ہوتی ہے تو ان حالات میں اس پر عالم قدس کا رنگ آنے لگتا ہے (اور اس طرح قوت ملکیہ بیدار ہو جاتی ہے) اور اختیاری موت سے اس طرح کہ جب انسان اپنی قوت بہیمیہ کو ریاضت نفس سے توڑتا اور مغلوب کرتا رہتا ہے اور عالم قدس کی طرف متوجہ ہو کر اس کا تصور دل میں جمائے رہتا ہے تو اس پر کسی قدر قوت ملکیہ کے انوار چمکنے لگتے ہیں اور (یہ بھی واضح رہے کہ) ہر چیز اپنی مناسب باتوں سے خوش ہو کر کھلتی اور پھیل جاتی ہے (۱) اور مخالف باتوں سے رنجیدہ خاطر ہو کر پژمردہ اور منقبض ہو جاتی ہے (۲) (یہی حال قوت ملکیہ کا ہے) اور (یہ بھی معلوم رہنا چاہئے کہ) ہر درد و رنج اور لذت و خوشی کی ایک خاص صورت وشکل ہوتی ہے جس میں وہ متشکل ہو کر دکھائی دیتی ہے مثلاً خلط (مزاج) محرق کی شکل، بدن میں خراش اور چبھن ہونا ہے اور حرارت صفرا سے جو ایذا و تکلیف ہوتی ہے تو اس کی شکل کرب و بے چینی اور خواب میں آگ اور شعلے دکھائی دیتا ہے۔ اور بلغم کی ایذا ہی کی شکل سردی کی شدت اور خواب میں پانی اور برف دکھائی دینا ہے اسی طرح جب قوت ملکیہ کا غلبہ ہوتا ہے اور انسان اس سے مناسبت رکھنے والی صفات مثلاً نظافت و پاکیزگی اور خشوع وخضوع وغیرہ اپنے اندر پیدا کر لیتا ہے تو اسے خواب میں یا بیداری میں انس و سرور کی مخصوص صورتیں نظر آنے لگتی ہیں اور اگر اس کے برخلاف عمل کیا جائے تو وہ اعمال غیر معتدل کیفیات اور ایسے واقعات کی صورت میں نظر آئیں گے جن میں اہانت اور تہدید (ڈراوا اور دھمکی) پائی جاتی ہے مثلاً غصہ، کاٹتے نوچتے اور غراتے ہوئے درندہ کی صورت میں ظاہر ہوگا اور بخل ڈستے ہوئے سانپ کی صورت میں نظر آئے گا۔ خارجی (یعنی دنیاوی) جزا و سزا کا قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ وہ اسباب کے فراہم ہونے پر ملتی ہے (۳) پس جو

---

(۱) اس کو انبساط کہتے ہیں۔ (۲) اس کو انقباض کہتے ہیں۔ (۳) یعنی اگر وسائل پیدا ہو جائیں تو ملتی ہے ورنہ نہیں ملتی بلکہ ملتوی رہتی ہے۔

کوئی ان اسباب کو سمجھ لے اور ان اسباب سے جو نظام ظہور میں آتا ہے اس کو مدنظر رکھے تو وہ قطعی طور پر جان لے گا کہ خداوند تعالیٰ کسی گنہگار و نافرمان کو دنیا میں سزا دیئے بغیر نہیں چھوڑتا مگر ساتھ ساتھ اس نظام (کائنات کی مصلحتوں) کو بھی ملحوظ رکھتا ہے(۱) ہوتا یوں ہے کہ جب انسان کو راحت و آرام اور رنج و عذاب دینے کے ظاہری اسباب موقوف ہو جاتے ہیں تو اس کو نیک اعمال ہی کے ذریعہ راحت و آرام دیا جاتا ہے اور بد اعمال ہی کے ذریعہ رنج و عذاب دیا جاتا ہے(۲) اور جب کسی انسان کے لئے تکلیف و رنج کے اسباب جمع ہو جاتے ہیں لیکن درحقیقت وہ شخص ہوتا ہے نیکوکار۔ تو اگر ان اسباب کا بند کرنا اس کی نیکوکاری کے مقابلہ میں کچھ برا بھی نہیں ہوتا تو اس کے نیک اعمال اس بلا و مصیبت کو سرے سے دفع کرنے اور اگر یہ نہیں ہو سکتا تو اس کی سختی قدرے کم کرنے میں صرف کیے جاتے ہیں اور اسی طرح جب کسی کے لئے اسباب تو راحت و آرام کے جمع ہو جاتے ہیں لیکن وہ شخص بدکار ہوتا ہے تو اس کے (بد) اعمال اس نعمت و آرام کے دور کرنے میں صرف ہو جاتے ہیں اور گویا وہ ان اسباب کے عمل میں مانع ہو جاتا ہے اور اگر اس کے اعمال کے موافق اسباب جمع ہو جاتے ہیں تو اس وقت راحت بھی خوب ملتی ہے اور تکالیف و سزا بھی خوب ملتی ہے لیکن کبھی اعمال کے حکم سے نظام کائنات کا حکم زیادہ ضروری ہوتا ہے(۳) تو ایسے موقع پر بدکار کو تو نعمت و آرام دیکر کچھ عرصہ مہلت دے دی جاتی ہے اور نیکوکار کو ظاہری طور پر تنگی و مصیبت میں ڈال دیا جاتا ہے اور یہ تنگی اس کی قوت بہیمیہ کے توڑنے اور مغلوب کرنے میں صرف کی جاتی ہے اور پھر اس کو تنگی کی یہ مصلحت سمجھا دی جاتی ہے تب وہ اس پر اس طرح راضی ہو جاتا ہے جیسے کوئی شخص کڑوی دوا کو اس کے فائدہ کے مدنظر خوشی خوشی پی لیتا ہے۔ نبی صلعم کی اس حدیث کا یہی

---

(۱) یعنی اگر اس مجرم کو دنیاوی سزا دینے میں نظام کائنات میں کچھ خلل پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے تو اس کی سزا کو ملتوی رکھتا ہے کیونکہ یہ دنیا جزا و سزا دینے کا مقام نہیں ہے بلکہ یہاں تو نظام کو درست رکھنا مقصود ہے اس لئے اگر ضمناً سزا مل سکتی ہے تو دے دی جاتی ہے ورنہ ملتوی رکھی جاتی ہے۔ (۲) یعنی نیک اعمال کرنے ہی میں اس کو لطف حاصل ہوتا ہے اور بد اعمال کرنے سے روحانی تکلیف ہوتی ہے یا یہ کہ نیک اعمال کرنے سے اور نیک اعمال کی توفیق دی جاتی ہے اور بد اعمال کرنے سے، بد اعمال کا راستہ کھول دیا جاتا ہے اور اس طرح جزا و سزا دگنی تگنی ہو کر نامۂ اعمال میں جمع ہوتی جاتی ہے۔ (۳) یعنی یہ زیادہ ضروری نہیں ہوتا کہ اعمال کی سزا و جزا اسی وقت دے دی جائے بلکہ یہ زیادہ ضروری ہوتا ہے کہ نظام کائنات موزونیت کے ساتھ چلتا رہے۔

مطلب ہے فرماتے ہیں کہ ''مومن نرم شاخ کے مانند ہوتا ہے۔اس کو ہوا کبھی ادھر جھکا دیتی ہے اور کبھی اُدھر جھکا دیتی ہے کبھی زمین پر گرا دیتی ہے اور کبھی سیدھا کھڑا کر دیتی ہے یہاں تک کہ اس کا آخری وقت آ جاتا ہے(۱)۔

اور منافق چیڑ اور سرو کے سیدھے اور مضبوط درخت کے مانند ہے (ہوا سے) اس کا کچھ نہیں بگڑتا لیکن آخر کار یکبارگی جڑ سے اکھڑ جاتا ہے(۲) اور اس حدیث سے بھی یہی مراد ہے فرماتے ہیں کہ ''جس مسلمان کو بھی مرض یا اس قسم کی دوسری مصیبتیں پہنچتی ہیں تو خداوند تعالیٰ ان سے اس کے گناہ صغیرہ اس طرح جھاڑ دیتا ہے جس طرح درخت کے پتے جھڑ جاتے ہیں'' بہت سے ملک ایسے ہوتے ہیں جہاں شیطان کی اطاعت و بندگی زوروں پر ہوتی ہے وہاں کے لوگ (عیش ونشاط وظلم وغیرہ میں) بہائم اور درندوں کی طرح ہوتے ہیں تو ایسے لوگوں کی جزا بھی ایک خاص مدت تک کے لئے ملتوی کر دی جاتی ہے چنانچہ خداوند تعالیٰ نے اپنے اس قول مبارک میں یہی کچھ فرماتا ہے کہ ''ہم نے جب کسی نبی کو کسی بستی یا شہر میں بھیجا تو یہی کیا کہ وہاں کے لوگوں کو سختی، افلاس اور مصیبت میں ڈال دیا تاکہ وہ ڈھیلے پڑ جائیں اور (خدا کے آگے) عاجزی کریں لیکن جب انھوں نے ایسا نہ کیا تو پھر ہم نے تکلیفوں کے بجائے نعمتیں دے کر انھیں خوب خوش حال کر دیا (جب ان کی یہ حالت ہوئی) تو کہنے لگے کہ (اس سے پہلے) ہمارے آباواجداد کو بھی اسی قسم کی سختیاں اور نرمیاں پہنچتی رہی ہیں۔(ان کا نیک و بدعمل سے کوئی تعلق نہیں ہے) پھر ہم نے بھی ان کو یکایک اس طرح آلیا کہ ان کو خبر بھی نہ ہوئی اور اگر ان بستیوں کے رہنے والے ایمان لے آتے اور ہماری بات مان کر پرہیز گاری اختیار کرتے (برے اعمال سے بچتے اور اچھے اعمال کرتے) تو ان پر ہم آسمان وزمین کی برکتوں کے دہانے کھول دیتے لیکن انھوں نے ہماری بات (نہ مانی بلکہ اس) کو جھٹلایا تو ہم نے بھی ان کے اعمالِ بد کی وجہ سے ان کو (عذاب کے پھندے

---

(۱) یعنی مومن نرم شاخ کی طرح ہوتا ہے جب خدا کا کوئی حکم آتا ہے تو اس کے آگے سر جھکا دیتا ہے اور جب کوئی مصیبت یا ناگوار حالت پیش آتی ہے تو اس کے اجر کا منتظر رہتا ہے اور جب مصیبت ٹل جاتی ہے تو اس کا شکر ادا کرتے ہوئے میانہ روی اختیار کرتا ہے۔ (۲) یعنی منافق کو بہت کم تکلیفیں پہنچتی ہیں لہٰذا اس کی تکلیفیں اس کی برائیوں اور گناہ صغیرہ کے دور کرنے کے لئے کافی نہیں ہوتیں تاوقت موت آرام سے رہتا ہے۔

میں) جکڑ لیا''۔

حاصل کلام یہ ہے کہ یہاں (دنیا) کی جزاوسزا کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی سردار اپنی رعیت کو جزا دینے کے لئے پوری طرح فارغ نہ ہو۔ پھر جب قیامت کا دن آئے گا تو وہ اعمال کی جزا دینے کے لئے سب کاموں سے فارغ ہو جائے گا (کسی اور طرف توجہ نہ دے گا(۱)) اس قول الٰہی میں اسی طرف اشارہ ہے کہ ''اے جن وانس! ہم عنقریب تمہارے (حساب وکتاب) کے لئے فارغ ہونے والے ہیں''۔ دنیاوی جزاوسزا کی کئی صورتیں ہیں کبھی تو وہ اس طرح ہوتی ہے کہ انسان کے دل میں خوشی واطمینان یا رنج وگھبراہٹ پیدا ہو جاتی ہے اور کبھی اس طرح کہ اس کے بدن میں کچھ ہو جاتا ہے جیسے غم اور خوف سے پیدا ہونے والے امراض کا حملہ، نبی صلعم کا زمانہ نبوت سے قبل ستر کھولنے سے بیہوش ہو کر گرنا بھی جزائے بدنی کی ایک مثال ہے(۲) کبھی یہ دنیاوی جزا انسان کے مال وعیال کے ذریعہ دی جاتی ہے۔ کبھی انسانوں، حیوانوں اور فرشتوں کو الہام ہوتا ہے کہ وہ اس (فلاں شخص) سے نیک سلوک کریں یا بدسلوکی سے پیش آئیں اور کبھی خود اس کو ایسے الہام وغیرہ ہوتے ہیں جن کی وجہ سے وہ برائی یا بھلائی کے قریب آجاتا ہے۔ جو شخص ہمارے مذکورہ بالا مضمون کو اچھی طرح سمجھ لے گا اور ہر بات کو اپنے موقع پر رکھے گا تو وہ بہت سے اشکالات سے نجات پالے گا جیسے یہ اشکال کہ باہم ان دونوں قسم کی حدیثوں میں معاوضہ اور اختلاف ہے کہ ایک قسم کی حدیث سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ نیکی سے رزق میں زیادتی اور گناہوں سے اس میں کمی ہوتی ہے لیکن دوسری قسم کی احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بدکار لوگوں کو دنیا میں قبل از وقت جلد بھلائیاں اور نعمتیں دے دیجاتی ہیں اور نیک لوگوں پر بلائیں اور مصیبتیں آتی ہیں جو زیادتی ہیں جو زیادہ نیک اور افضل ہوتے ہیں ان پر زیادہ مصیبتیں، پھر درجہ بدرجہ اسی طرح کی

---

(۱) کیونکہ وہاں صرف یہی کام درپیش ہوگا کوئی دوسری مصلحت مانع نہ ہوگی۔ (۲) بعثت سے قبل جب کعبہ کی تعمیر کی گئی تو آنحضرت اور حضرت عباسؓ پتھر اٹھا اٹھا کر دیتے تھے تو حضرت عباس نے آپ سے کہا کہ اپنی ازار اتار کر اپنے کندھے پر ڈال لو (ان کے اصرار پر آپ نے اپنی ازار اتار لی) مگر فوراً زمین پر گر پڑے اور آسمان کی طرف ٹکٹکی بندھ گئی پھر آپ نے فرمایا کہ میری ازار مجھ کو دے دو اور آپ نے پھر اس کو باندھ لیا (بخاری عن جابرؓ) وجہ یہ ہوئی تھی کہ آپ کے کندھے پتھروں کے اٹھانے اور لادنے سے چھل گئے تھے اور اس زمانہ میں برہنہ ہونا معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا لوگ برہنہ ہو کر کعبہ کا طواف کرنا زیادہ افضل سمجھتے تھے۔

اور بہت سی احادیث ہیں (جن میں اس قسم کا ظاہری اختلاف پایا جاتا ہے) واللہ اعلم۔

دوسرا باب: موت کی حقیقت

واضح ہو کہ صورت معدنی، نباتی، حیوانی اور انسانی ان میں سے ہر ایک صورت کی جدا جدا سواری اور جدا جدا کمالات (۱) ہوتے ہیں۔ گو ظاہر میں یہ بات ذرا مشتبہ معلوم ہوتی ہے۔ پس عناصر (آگ، ہوا، پانی، مٹی) جس وقت نہایت چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اور ریزے ہو کر مختلف مقدار میں (کوئی تھوڑے کوئی زیادہ) باہم ملتے اور ممیّز ہوتے ہیں تو ان سے کئی قسم کے مرکبات پیدا ہوتے ہیں مثلاً مرکب ثنائی (دو عنصر والے مرکب) جیسے بخارات یا بھاپ، غبار، دھواں، گیلی مٹی، جتی ہوئی زمین، انگارہ، لو یا لپٹ اور شعلہ وغیرہ ہوتا ہے۔ مرکب ثلاثی (تین عنصر والے مرکب) جیسے خمیرہ کردہ مٹی یا گارہ اور کائی وغیرہ اور مرکب رباعی اس کی بھی اسی طرح کی مثالیں ہیں ان تمام چیزوں کے جو خواص ہوتے ہیں وہ صرف ان کے اجزا کے خواص ہی سے مرکب ہوتے ہیں۔ اجزائے ترکیبی کے خواص کے علاوہ کوئی دوسری خاصیت باہر سے نہیں آجاتی اور نہ اندر سے پیدا ہوتی ہے اس قسم کی چیزوں کو کائنات الجو (۲) کہتے ہیں (۳)۔ پھر اس ترکیب کے بعد معدنی صورت آتی ہے جو اس مرکب مادہ پر مسلط ہو کر اس کو اپنی سواری بنا لیتی ہے۔ اس کی نوع کے خواص اس کو عطا ہوتے ہیں اور وہ اس مادہ کے مزاج کو محفوظ رکھتی ہے۔ پھر اس کے بعد نباتی صورت آتی ہے اور اب اس مرکب مادہ کے جسم پر (جس کا مزاج محفوظ ہوتا ہے) مسلط ہو جاتی ہے اور اب اس میں اتنی قوت آجاتی ہے کہ وہ مختلف اجزائے عنصری اور کائنات الجو کو بدل کر اپنے مزاج کے موافق بنا لیتی ہے تا کہ ان اجزائے عنصری وغیرہ کو ایک کمال جو متوقع تھا بالفعل حاصل ہو جائے۔ پھر اس کے بعد حیوانی صورت آتی ہے جو روح ہوائی کو (جس میں غذا حاصل کرنے اور بڑھنے کی قوتیں) موجود ہوتی ہیں، اپنی سواری بنا لیتی ہے اور اس میں یہ تصرفات کرتی ہے کہ اس میں قوت حس و ارادہ پیدا کر دیتی ہے جس سے اس میں اتنا احساس و ارادہ آجاتا ہے کہ وہ اپنی

---

(۱) سواری سے مراد وہ مادہ جس میں معدنیت یا حیوانیت وغیرہ پائی جاتی ہے اور کمال سے مراد اس کا عمل اور اثرات وغیرہ (۲) مثلاً بھاپ، پانی اور آگ سے مرکب ہے اور غبار، مٹی اور ہوا سے مرکب ہے علی ہذا القیاس۔ (۳) یعنی آسمان کے نیچے کی مخلوقات، فضائی موجودات۔

مطلوبہ اور مفید چیز کے (حصول کے) لئے آمادہ اور کوشاں ہو جاتی ہے اور مضر چیز سے (بچنے کے لئے) پیچھے ہٹ جاتی ہے۔ پھر اس کے بعد انسانی صورت آتی ہے جو اس نسمہ یعنی روح کو (جو بدن میں تصرف کرتی ہے) اپنی سواری بنا لیتی ہے اور ان اخلاق و ملکات کی طرف جو کسی (اچھے) کام کے کرنے پر آمادہ اور (برے) کام کو کرنے سے روکتے ہیں۔ خاص توجہ دیتی ہے لہٰذا وہ اپنے اس مقصد کے زیر نظر ان ملکات و اخلاقی قوتوں کو اجاگر کرتی اور ان کے نظام میں عمدگی پیدا کر کے ایک ضابطہ میں لے آتی ہے اور انہی کو عالم بالا سے حاصل ہونے والی تمام چیزوں کی جلوہ گاہ بناتی ہے (۱)۔ یہ بات (۲) گو بادی النظر میں کسی قدر مشتبہ معلوم ہوتی ہے لیکن (۳) جب غور کیا جاتا ہے تو ہر اثر اور نتیجہ کو اسی کے اپنے علیحدہ مبدأ و منبع کی طرف منسوب کرنا پڑتا ہے اور ہر صورت کو اس کی اپنی جدا سواری پر بیٹھانا پڑتا ہے (۴) اور یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ ہر صورت کے لئے ایک مادہ کا ہونا نہایت ضروری ہے تاکہ اس کے ساتھ وہ صورت قائم و برقرار رہ سکے اور مادہ بھی ہر صورت کے مناسب ہونا چاہئے۔ صورت کو مادے کی ایسی احتیاج ہوتی ہے جیسے موم کی اس صورت انسانی

---

(۱) مرکبات دو قسم کے ہوتے ہیں ایک تو کیمیاوی دوسرے امتزاجی یا غیر کیمیاوی۔ کیمیاوی مرکبات میں اجزائے ترکیبی کے خواص کے علاوہ دیگر خواص پیدا ہو جاتے ہیں یعنی وہ پیدا شدہ خواص اجزائے ترکیبی میں نہیں پائے جاتے جیسے کوئلہ جلنے سے راکھ پیدا ہو جاتی ہے۔ غیر کیمیاوی مرکبات میں اجزائے ترکیبی کے خواص بدستور باقی رہتے ہیں جیسے نمک اور پانی کے ملنے سے نمکین پانی بن جاتا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ عناصر جب باہم مرکب ہو کر مزاج پیدا کرتے ہیں تو سب سے پہلے اس پر صورت معدنیہ فائض ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ ترکیب جدا نہیں ہونے پاتی بلکہ برقرار رہتی ہے، پھر اس پر صورت نباتیہ فائض ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ عناصر پھل پھول کر اور بڑھ کر اپنا کمال مقدر حاصل کرتے ہیں، پھر اس پر صورت حیوانیہ فائض ہوتی ہے جس سے اس جسم میں قوت حس وحرکت وارادہ وغیرہ پیدا ہوتے ہیں۔ پھر اس پر صورت انسانیہ فائض ہوتی ہے جس سے وہ اپنی ان حس وحرکت ارادہ وغیرہ جیسی قوتوں کو اچھی طرح کام میں لاتی اور اخلاق حمیدہ میں صرف کر کے اس کو اس قابل کر دیتی ہے کہ اس پر عالم بالا کے فیوضات نازل ہو سکیں اور یہ کمال جسم طبعی کا چوتھی مرتبہ میں کمال اعلیٰ ہے جیسا کہ معدنیت کمال اول اور نباتیت کمال دوم اور حیوانیت کمال سوم تھا۔ (۲) یعنی مرکبات اور صورتوں کی یہ ترتیب۔ (۳) کہ انسانیت کے تحت پچھلی سب صورتیں معدنیت، نباتیت اور حیوانیت اپنا اپنا کام کر رہی ہیں۔ (۴) یعنی جسم انسانی میں ہر صورت نوعیہ خواہ معدنیت ونباتیت ہو یا حیوانیت سب اپنی اپنی سواری اور مادہ پر فائض ہو کر اپنا اپنا کام سرانجام دے رہی ہے اسی طرح جسم حیوانی میں معدنیت ونباتیت اپنی اپنی سواری اور مادہ پر فائض اور منہمک ہے۔

کو ہوتی ہے جو موم میں بنادی گئی ہو چنانچہ وہ صورت انسانی بغیر موم کے وجود میں نہیں رہ سکتی لہٰذا جو شخص یہ کہتا ہے کہ ''نفس انسانی (یا نفس ناطقہ) موت کے بعد مادہ سے بالکل علیحدہ ہو جاتا ہے'' وہ غلط کہتا ہے ہاں! یہ بات ضرور ہے کہ نفس انسانی کے دو مادے ہوتے ہیں (جن پر وہ سوار ہوتا ہے) ان میں سے ایک اصلی ہوتا ہے جسے نسمہ یا روح ہوائی کہتے ہیں (اس کا تعلق اس سے براہ راست ہوتا ہے اور دوسرا عارضی ہوتا ہے جسے جسم ارضی (زمینی بدن) کہتے ہیں۔ (اس کا تعلق اس سے بالواسطہ ہوتا ہے) پس جب انسان مرتا ہے تو مادہ ارضی کے چھوٹ جانے سے اس کے نفس ناطقہ کا کچھ نہیں بگڑتا بلکہ وہ نسمہ (یعنی روح ہوائی) کے ساتھ جڑا رہتا ہے اور بالکل اس طرح رہتا ہے جیسے کسی ماہر خوشنویس کے اگر ہاتھ بھی کٹ جائیں تو اس کا ملکۂ کتابت اس میں بدستور باقی رہتا ہے یا کسی تیز رو آدمی کے پاؤں ٹوٹ جائیں یا کوئی دیکھنے سننے والا آدمی اندھا بہرا ہو جائے تو جس طرح ان سب کا ملکہ بغیر اعضائے متعلقہ کے باقی رہتا ہے اسی طرح نفس و روح انسانی کا حال ہے کہ وہ بغیر مادۂ ارضی کے صرف نسمہ سے وابستہ رہتی ہے (۱)۔

واضح ہو کہ انسان کے افعال کی چند قسمیں ہیں، بعض وہ افعال ہوتے ہیں جن کو وہ اپنی خواہش قلبی سے کرتا ہے۔ اگر اس کو اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے تو وہ ضرور ان کو عمل میں لائے گا اور ان کے خلاف کبھی نہیں چلے گا اور بعض وہ افعال ہوتے ہیں جن کو وہ محض ابنائے جنس کی موافقت کی وجہ سے یا کسی اور خارجی وجہ سے کرتا ہے جیسے بھوک پیاس وغیرہ، جب وہ (عارضی) سبب جاتا رہتا ہے تو پھر اس میں ان افعال کی خواہش بھی نہیں رہتی بشرطیکہ ان کا ایسا عادی نہ بن گیا ہو کہ ان کو چھوڑ ہی نہ سکے۔ دیکھئے بہت سے ایسے لوگ ہوتے ہیں جو کسی خاص شخص یا فن شاعری یا کسی اور چیز کے عشق میں گرویدہ ہوتے ہیں لہٰذا ان کو مجبوراً ان لوگوں کا سا طرز لباس و روش اختیار کرنی پڑتی ہے مگر جب ان کو ان کی طبیعت پر چھوڑ دیا جاتا ہے تو ان کو اس روش کے ترک کرنے میں کچھ بھی دریغ نہیں ہوتا لیکن بعض ایسے بھی ہوتے ہیں کہ وہ اس روش ولباس کو دل سے اختیار کرتے ہیں

---

(۱) شاہ صاحب کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی اصل روح (یعنی نفس ناطقہ) کا بدن سے براہ راست تعلق نہیں ہوتا بلکہ وہ نسمہ (یعنی روح ہوائی) پر سواری رہتی ہے اور نسمہ جسم ارضی ختم ہو جاتا ہے تو اس کی اصل روح نسمہ پر بدستور سواری رہتی ہے۔

اگر ان کو اپنی طبیعت پر بھی چھوڑ دیا جائے تب بھی وہ اس کو ترک نہیں کرتے۔ اور بعض لوگ ایسے بیدار طبع ہوتے ہیں کہ وہ بہت سی متفرق باتوں میں سے اصل بات کو ذہن نشین کر لیتے ہیں ان کی نظر معلومات (نتائج) کو چھوڑ کر علت (سبب) کی طرف رہتی ہے وہ ملکہ (مہارت) کے پابند رہتے ہیں اور ان افعال کی طرف دھیان نہیں کرتے جن سے یہ ملکہ پیدا ہوتا ہے۔ اور بعض لوگ ایسے خفتہ طبع کے ہوتے ہیں کہ ایک اصل چیز سے غافل اور بہت سی چیزوں کی طرف متوجہ رہتے ہیں ملکات سے ان کو کوئی غرض نہیں ہوتی صرف افعال کو زیر نظر رکھتے ہیں۔ اور اسی طرح افعال کی روح سے تو بے خبر رہتے ہیں لیکن ان کی ظاہری صورتوں کو خوب ذہن میں رکھتے ہیں۔

واضح ہو کہ جب انسان مر جاتا ہے تو اس کا جسم ارضی گل سڑ کر ختم ہو جاتا ہے لیکن اس کا نفس ناطقہ (روح) نسمہ (یعنی روح ہوائی) کے ساتھ متعلق رہتا ہے اور اس کے اندر جو جو خاصیتیں ہوتی ہیں ان کے لئے وہ فارغ ہو جاتا ہے (تاکہ وہ ظاہر ہوں) اور جس قدر افعال اس سے قلبی خواہش کے بغیر محض دنیاوی زندگی کی ضروریات کی وجہ سے سرزد ہوتے تھے سب علیحدہ ہو جاتے ہیں اور صرف وہ افعال باقی رہ جاتے ہیں جو مقصود بالذات اور خالص اسی کے تھے اور جن کو اس نے اپنے جوہر اصلی میں محفوظ کر رکھا تھا اور اس وقت ملکیت غالب اور بہیمیت مغلوب ہونے لگتی ہے اور پھر جب عالم بالا سے اس کے دل میں حظیرۃ القدس کا اور ان اعمال کا علم و یقین ڈالا جاتا ہے جو وہاں اس کے لئے محفوظ رکھے جاتے تھے تو اس وقت اس کی ملکیت یا تو رنج و درد و تکلیف اٹھاتی ہے یا راحت و آرام حاصل کرتی ہے یہ بھی معلوم رہے کہ جب ملکیت (دنیا میں) بہیمیت کے ساتھ گھلتی ملتی اور اختلاط پیدا کرتی ہے تو اس کا کچھ نہ کچھ اثر اس میں ضرور پہنچتا ہے اور وہ اس کی کچھ نہ کچھ باتیں ضرور مان لیتی ہے لیکن بری سے بری اور سخت نقصان دہ بات یہ ہے کہ ملکیت میں اس کے مقصد و انجام کے مخالف عادات و کیفیات جم کر پیوست ہو جائیں اور سب سے عمدہ اور مفید بات یہ ہے کہ اس میں اس کے مقصد و انجام کے موافق و مناسب عادات و کیفیات جاگزیں ہو جائیں۔ من جملہ مخالف باتوں کے ایک یہ بات ہے کہ اس کا دل مال اور اہل و عیال کی محبت میں یہاں تک گرفتار ہو جائے کہ اس کو سوائے ان دونوں چیزوں کے زندگی کا اور کوئی مقصد نظر نہ آئے اور دوسری بات یہ ہے کہ اس کے دل پر ادنی درجہ کی بری بری عادات و کیفیات منقش

ہو جائیں جو اس کی سماحت وتقوے سے دور کر دیں۔ اور تیسری بات یہ ہے کہ وہ نجاستوں میں ملوث اور خداوند تعالیٰ سے متکبر ہو جائے یہاں تک کہ نہ کبھی اس کو جاننے کی کوشش کرے اور نہ کسی روز اس کے آگے عجز وانکساری کرے۔ الغرض ایسی باتیں پیدا ہوں جو نیکی اور احسان کے برخلاف ہوں اور چوتھی یہ بات ہے کہ اس کا رویہ حق کی اعانت اور تعظیم امر الٰہی اور بعثت انبیا اور پسندیدہ نظام خیر کے قیام میں عالم بالا (یعنی حظیرۃ القدس) کے خلاف ہو جائے (۱) حتی کہ اس پر وہاں سے بغض اور لعنت برسنے لگے۔ اور من جملہ مناسب اور موافق باتوں کے ایک یہ بات ہے کہ وہ ایسے اچھے کام کرنے لگے جن سے طہارت اور خدا کے حضور میں عجز وانکسار حاصل ہوتا ہے اور ملائکہ کے حالات یاد آتے ہیں اور ایسے عقائد کی طرف رہنمائی ہوتی ہے جن کی وجہ سے انسان صرف حیات دنیوی پر مطمئن ہو کر بیٹھا نہیں رہتا اور دوسری یہ بات ہے کہ وہ شخص سماحت اور تقوے کا پتلا بن جائے نرم دل ورحم دل ہو جائے اور تیسری یہ بات کہ (وہ اتنا پاکباز بن جائے کہ) عالم بالا (یعنی ملأ اعلیٰ) کی دعائیں اور ان کی وہ توجہات (یعنی نظر خاص) جو پسندیدہ نظام خیر کے لئے مخصوص ہوتی ہیں ان کو نصیب ہونے لگیں (تا کہ وہ نظام خیر کی طرف متوجہ ہو) باقی اللہ بہتر جانتا ہے۔

تیسرا باب: عالم برزخ میں لوگوں کے مختلف احوال

واضح ہو کہ عالم برزخ میں لوگوں کے مختلف احوال ودرجات ہوتے ہیں ان سب احوال ودرجات کا شمار نہیں ہو سکتا لیکن ان کی بڑی بڑی قسمیں چار ہیں۔ قسم اوّل کے لوگ بیدار طبع ہوتے ہیں ان کو آرام وثواب اور تکلیف وعذاب محض مناسب اور مخالف ہیئات وکیفیات ہی سے دیا جاتا ہے (۲) چنانچہ اس آیت میں اسی قسم کے لوگوں کی طرف اشارہ ہے ارشاد ہے کہ ”(کہیں ایسا نہ ہو) کہ (کل قیامت کو) کوئی شخص یوں کہنے لگے کہ ہائے افسوس میری اس کوتاہی اور تقصیر پر جو

---

(۱) یعنی بجائے اس کے کہ حق کی اعانت کرے اس سے عداوت کرتا ہے اور بجائے اس کے کہ اوامر الٰہی کی تعظیم وتوقیر کرے اور ان کو بجالائے ان کی تحقیر اور مخالفت کرتا ہے، ان کے خلاف عمل کرتا ہے۔ وقس علیہ۔ (۲) یعنی وہ اتنے حساس ہوتے ہیں کہ نیک عمل یا بد عمل کی ظاہری صورت ہی کو تصور میں لانے سے راحت یا تکلیف پاتے ہیں۔

میں نے خدا کے حق میں کی، میں تو (اس کی باتوں کا) مذاق اڑانے ہی میں رہ گیا'' میں نے اولیا اللہ (اللہ والوں) کا ایک ایسا گروہ دیکھا ہے جن کے نفوس (روحیں) ایسے تھے جیسے ساکن پانی سے بھرے ہوئے تالاب :وں ان کا پانی ہوا سے بھی حرکت نہ کرے پھر جب ان پر ٹھیک دوپہر کے وقت آفتاب کی شعاعیں پڑیں تو وہ سراپا نور کے ٹکڑے کی طرح ہو جائیں۔ وہ نور یا تو نیک اعمال کا نور ہو یا یادداشت کا یا رحمت (۱) کا۔ قسم دوم کے لوگ ان ہی کے قریب قریب ہوتے ہیں لیکن یہ طبعی نیند والے ہوتے ہیں اور خواب میں فیضیاب ہوتے ہیں (۲) اور خواب کی حقیقت یہ ہے کہ ہمارے آگے وہ چیزیں حاضر ہو جاتی ہیں جو ہماری حس مشترک میں تو جمع ہوتی ہیں مگر حالت بیداری ان کی طرف خیال کرتے اور توجہ دینے سے مانع ہوتی اور روکتی ہے اور یہی بات دل میں جمائے رکھتی ہے کہ یہ چیزیں محض خیالات ہیں لیکن جب ہم سو جاتے ہیں تو ان کو ہو بہو ہی چیزیں پاتے ہیں جن کی وہ تصویریں ہوتی ہیں۔ مثلاً کبھی صفراوی مزاج والا خواب میں یہ دیکھتا ہے کہ وہ کسی خشک جنگل میں ہے گرمی کا موسم ہے، سخت لو چل رہی ہے اسی اثنا میں (جنگل میں آگ لگ جاتی ہے اور وہ) آگ اس کو ہر طرف سے گھیر لیتی ہے وہ ادھر ادھر بھاگنے لگتا ہے مگر اسے بھاگ نکلنے کی کوئی جگہ نہیں ملتی لہٰذا وہ اس میں جل جاتا ہے اور اس طرح اس کو بہت سخت درد و تکلیف ہوتی ہے۔ اور بلغمی مزاج والا یہ دیکھتا ہے کہ سردی کی رات ہے اور وہ کشتی میں سوار ہے نہر میں نہایت ٹھنڈا پانی بہہ رہا ہے اور سخت سرد ہوا چل رہی ہے اتنے میں دیکھتا ہے کہ موجوں نے اس کی کشتی کو

(۱) نیک اعمال کا نور نیک اعمال کو لگا تار کرتے رہنے سے پیدا ہوتا ہے اور یادداشت کا نور ہمہ وقت خدا کی طرف دھیان لگانے سے پیدا ہوتا ہے۔ اس طرح کہ وہ شخص کوئی بھی کام کرے لیکن خدا کی یاد دل سے نہ جائے ہمیشہ خود اور اس کے احکام کو مدنظر رکھے اگر کوئی یہ کہے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ آدمی دو کام بہ یک وقت کرے کہ دنیاوی امور بھی انجام دے اور ساتھ ہی ساتھ خدا کی یاد بھی دل میں قائم رکھے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بالکل اس طرح ہوتا ہے جیسے سائیکل چلانے والا جب چلتے چلتے کسی سے باتیں کرتا ہے تو وہ باتوں کی طرف بھی پوری پوری توجہ رکھتا اور سائیکل کا توازن قائم رکھنے کی طرف بھی، چنانچہ اسی قسم کی اور دوسری مثالیں ہیں، ان صورتوں میں اگرچہ شروع شروع میں کچھ مشکل پڑتی ہے لیکن بعد میں یہ عادت ثانیہ بن جاتی ہے۔ رحمت کا نور دل میں برائی کا خیال تک نہ لانے سے پیدا ہوتا ہے اس صورت میں ان سے ایسا سلوک ہوتا ہے جیسے ماں باپ اپنے بچوں سے کرتے ہیں۔

(۲) یعنی ان لوگوں کو ملکیت کے احساسات مثلاً راحت و تکلیف بیداری کی حالت میں محسوس نہیں ہوتی بلکہ جب ایک خاص قسم کی خواب کی سی حالت طاری ہو جاتی ہے تب اس کا احساس ہوتا ہے۔

الٹ دیا (اور وہ ڈوبنے لگا) اب وہ وہاں سے نکل بھاگنے کی کوشش کرتا ہے لیکن کامیاب نہیں ہوتا اور غرق ہو جاتا ہے تب اس کو بہت سخت درد و تکلیف ہوتی ہے۔ اگر آپ لوگوں کے حالات کو تلاش کریں گے تو ہر شخص کو ایسا ہی پائیں گے کہ اس نے خواب میں اس قسم کے مختلف پراگندہ خیالات وحوادث کو ضرور آرام یا تکلیف کی ایسی صورتوں میں دیکھا ہوگا جو ان خیالات اور اس شخص کی طبیعت دونوں سے مناسبت رکھتی ہوں۔ پس یہ عالم برزخ میں عذاب وثواب میں مبتلا ہونا گویا خواب میں مبتلا ہونا ہے (۱) فرق صرف اس قدر ہے کہ یہ ایک ایسا خواب ہوتا ہے جس سے انسان حشر (قیامت) تک بیدار نہیں ہوتا۔ خواب دیکھنے والا دوران خواب میں یہ نہیں جانتا کہ یہ چیزیں جو میں دیکھ رہا ہوں ان کا خارج میں وجود نہیں صرف خیال ہی خیال ہے۔ اور نہ یہ کہ اصلی حالت میں اس کو کچھ راحت و تکلیف نہیں ہو رہی بلکہ وہ اس کو حالت اصلی جانتا ہے اور اگر وہ (ہمیشہ خواب میں رہتا اور قیامت کو) بیدار نہ ہوتا تو (حالت اصلی نہ ہونے کا) یہ راز اسے کبھی معلوم نہ ہوتا لہٰذا اس عالم برزخ کو عالم خارجی کہنا عالم خواب کہنے سے زیادہ مناسب اور صحیح ہے۔ پس درندہ خصلت انسان (عالم برزخ میں) اکثر یہ دیکھا کرتا ہے کہ اس کو کوئی درندہ چیر پھاڑ کر ہلاک کر رہا ہے اور بخیل شخص یہ دیکھتا ہے کہ اس کو سانپ بچھو کاٹ رہے ہیں۔ اور (انسان کا) عالم بالا کے علوم سے بے بہرہ ہونا دو فرشتوں (منکر نکیر) کی صورت میں نظر آتا ہے جو اس سے سوال کرتے ہیں کہ ''تیرا رب کون ہے؟ تیرا دین کیا ہے؟ اور تو نبی صلعم کو کیا سمجھتا ہے؟'' قسم سوم کے وہ لوگ ہوتے ہیں جن کی قوت بہیمیہ اور ملکیہ دونوں کمزور اور ضعیف ہوتی ہیں وہ لوگ (مرنے کے بعد عالم برزخ میں) ملائک سافلہ (نچلے درجہ کے فرشتوں) میں جا ملتے ہیں کبھی تو جبلی اور پیدائشی اسباب کی بنا پر اور کبھی کسبی اسباب کی وجہ سے۔ جبلی اسباب یہ ہیں کہ ان کی قوت ملکیہ قوت بہیمیہ میں بہت ہی کم غرق ہوتی تھی نہ تو اس کا حکم مانتی تھی نہ اس سے متاثر ہوتی تھی۔ اور کسبی اسباب یہ ہیں کہ اس شخص نے قلبی خواہش وارادہ سے طہارت و پاکیزگی کا جامہ پہنا اور اسے اچھی طرح اختیار کیا اور (ریاضت وعبادت کر کے) اپنی روح میں الہامات وانوار ملکیہ کو خوب جگہ دی (۲) (یہ سب بالکل اسی طرح

---

(۱) یعنی عذاب قبر ایک طرح کا خواب ہوتا ہے۔ (۲) یعنی یہ لوگ کوئی بڑا کام نہیں کر سکتے تھے اس کی جگہ یہ طہارت۔ ذکر و نوافل کا التزام کرتے رہے اور اس طرح اپنا درجہ بلند کیا۔

ہوتا ہے) جیسے کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بعض اشخاص پیدا تو مردانی صورت میں ہوتے ہیں لیکن ان کے مزاج میں زنانہ پن اور عورتوں کی عادات کی طرف میلان ہوتا ہے اگرچہ لڑکپن میں وہ مرد وعورت کی جدا جدا شہوت میں تمیز نہیں کر سکتے بلکہ ان سے بالکل بے خبر ہوتے ہیں کیونکہ اس عمر میں انسان کو کھانے پینے اور کھیلنے کودنے ہی کی خواہش ہوا کرتی ہے دوسری طرف توجہ بالکل نہیں ہوتی، چنانچہ اس عمر میں جب ان کو مردانہ روش پر چلنے کا حکم دیا جاتا ہے اور زنانہ روش سے باز رکھا جاتا ہے تو وہ جبراً وقہراً اس زنانہ روش کو چھوڑ کر مردانہ روش ہی پر چلتے رہتے ہیں لیکن جب وہ جوان ہو جاتے ہیں اور اپنی بے باک طبیعت پر آ جاتے ہیں تو پھر خوب اچھی طرح جم کر اور مستقل طور پر عورتوں کی روش اور انہیں کی سی وضع قطع اور عادات وخصائل اختیار کر لیتے ہیں اور شہوت اُبنی (یعنی مفعول بننے کی خواہش) ہونے لگتی ہے (۱) اور پھر وہ عورتوں کے سے کام کرتے اور ان ہی کے مانند کلام کرتے ہیں اور ان ہی کے سے اپنے نام رکھتے ہیں (اور اس طرح ایک عرصہ تک زنانہ طریقہ پر زندگی بسر کرنے کے بعد) اب وہ مردوں کے زمرہ سے بالکل نکل جاتے ہیں بالکل اسی طرح انسان کا حال ہے کہ وہ اپنی دنیاوی زندگی میں کھانے پینے اور شہوت نفسانی اور اسی طرح دیگر طبعی تقاضوں کو پورا کرنے اور زندگی کے مختلف مراسم ومعاملات میں مصروف رہتا ہے (۲) لیکن اس کا قریبی تعلق ملائکہ سافل سے ہوتا ہے اور انہی کی جانب اس کو زیادہ میلان اور کشش ہوتی ہے (۳)۔

لہٰذا جب وہ مر جاتا ہے تو اس کے تمام جسمانی علاقے وتعلق ٹوٹ جاتے ہیں اور وہ اپنی اصلی طبیعت کی طرف عود کر آتا ہے اور پھر ملائکہ میں مل کر انہی میں کا ہو جاتا ہے (۴) اور انہی کے سے الہامات اس کو بھی ہونے لگتے ہیں اور ان کے جیسے کام وہ بھی کرنے لگتا ہے (اور اس طرح ان کا دست وبازو بن جاتا ہے) چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ ”میں نے جعفر بن ابی طالب کو ایک فرشتہ

---

(۱) یعنی یہ کہ ان سے کوئی اغلام یا لواطت کرے۔ (۲) جس طرح ایک بچہ کھانے پینے کھیلنے کودنے میں مشغول رہتا ہے۔ (۳) جیسے اس بچہ کو زنانہ پن کی طرف رغبت ہوتی ہے۔ (۴) کیونکہ وہ مجبوراً دنیاوی معاملات میں پھنسا ہوا تھا اصل طبیعت اس کی وہی تھی جو فرشتوں کی ہوتی ہے لہٰذا جب مجبوریاں جاتی رہیں تو وہ ان کو ترک کر کے فرشتوں سے جا ملا جیسے کہ وہ مخنث بچہ جوان ہو کر زنانوں میں مل جاتا ہے۔

کی صورت میں اور فرشتوں کے ساتھ دو بازوؤں اور پروں سے جنت میں اڑتے دیکھا ہے (۱) قسم سوم کی یہ لوگ کبھی اعلاء کلمتہ اللہ اور حزب اللہ (خداوندی گروہ) کی مدد میں مصروف ہو جاتے ہیں (۲) اور کبھی انسان کے دل میں نیکی کے خیال القا کرتے ہیں اور کبھی ان میں سے بعض لوگ اپنے جبلی شوق کی وجہ سے صورت جسمانی کے بہت شائق ہوتے ہیں تو (ان کی اس خواہش کی وجہ سے) عالم مثال کا دروازہ کھل جاتا ہے اور ان کی روح ہوائی (نسمہ) میں ایک قسم کی مثالی قوت مل جل جاتی ہے اور وہ ایک نورانی جسم سا بن جاتا ہے اور کبھی ان میں سے بعض لوگ کھانے وغیرہ کی خواہش کرتے ہیں تو ان کی خواہش پوری کرنے کے واسطے ان کو وہاں سے ایسی ہی چیزیں ملتی ہیں (جن کی وہ خواہش کرتے ہیں) چنانچہ قرآن مجید کی اس آیت میں اسی طرف اشارہ ہے خداوند تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ ''جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے گئے ہیں ان کو مردہ مت خیال کرو بلکہ وہ زندہ ہیں۔ اپنے رب کے پاس سے رزق وروزی پاتے ہیں اور جو کچھ ان کو اللہ نے اپنے فضل سے دے رکھا ہے اس پر خوش ہیں الآیۃ'' اور انہی کے مقابل میں ایک اور قسم کے لوگ ہوتے ہیں جو شیاطین سے بہت مناسبت رکھتے ہیں، یا تو جبلی طور سے یا کسبی طور سے، جبلی طور سے اس طرح کہ ان کا مزاج ہی فاسد ہوتا ہے جس سے وہ ایسی باتیں سوچتے ہیں جو کہ حق کے مخالف، نظام کلی کی رائے کے برخلاف اور مکارم اخلاق سے بعید ہوتی ہیں۔ اور اختیاری و کسبی طور سے اس طرح کہ وہ خسیس وکمینی عادتوں اور فاسد افکار وخیالات کا جامہ پہن لیتے ہیں۔ اور شیطانی خیالات کے تابع ہو جاتے ہیں اور ان کو خدا کی ناراضگی ولعنت گھیر لیتی ہے، چنانچہ جب وہ مر جاتے ہیں تو شیاطین میں جا ملتے ہیں اور ظلمانی لباس پہنا کر ان کو وہ کمینی عادتیں اور بری لذتیں جو وہ اپنی خواہش نفسانی کے پورا کرنے کے لئے کرتے تھے متشکل بنا کے دکھائی جاتی ہیں۔

---

(۱) جنگ موتہ میں لڑتے لڑتے جب آپ کا ایک ہاتھ کٹ گیا تو آپ نے دوسرے ہاتھ سے جھنڈا تھام لیا اور جب وہ بھی کٹ گیا تو اس کو چمٹا لیا اور جہاد میں شریک رہے آخر کار تلواروں اور برچھیوں کے نوے زخم کھانے کے بعد گرے اور شہادت پائی۔ خداوند تعالیٰ نے انہیں دونوں کٹے ہوئے بازوؤں کے بجائے دو پر عطا کر دیئے۔ (۲) چنانچہ جب روم اور روس میں سپاسٹوں کے قلعہ پر لڑائی ہوئی تو بہت سے اہل اللہ نے تہجد کے وقت مسجد نبوی میں آنحضرت صلعم اور صحابہ کرام کو تیر مارتے دیکھا چنانچہ اسی روز صبح کو لشکر اسلام غالب آیا۔

پہلی قسم کے لوگ (۱) دل میں خوشی پیدا ہونے سے ثواب و آرام پاتے ہیں اور دوسری قسم کے لوگ (۲) گھٹنے اور غم و غصہ کھانے سے عذاب و تکلیف پاتے ہیں جیسے کہ مخنث یہ سمجھ کر کہ یہ زنانہ پن انسان کی بدترین حالت ہوتی ہے دل میں گھٹتا اور غم کھاتا ہے۔ لیکن اس سے باز نہیں آسکتا۔ قسم چہارم میں وہ اہل اصطلاح (صاحب مصالحت) (۳) لوگ ہوتے ہیں جن کی قوت بہیمیہ غالب اور قوت ملکیہ مغلوب ہوتی ہے اکثر لوگ اسی قسم کے ہوتے ہیں، ان کے اکثر امور اس صورت حیوانیہ کے تابع رہتے ہیں جو بدن میں تصرف کرنے میں غرق رہتی ہے چنانچہ موت واقع ہو جانے سے ان کی روحوں کا تعلق ان کے جسم سے بالکل ہی منقطع نہیں ہو جاتا بلکہ یہ ہوتا ہے کہ تدبیری تعلق ٹوٹ جاتا ہے اور وہمی و خیالی تعلق باقی رہتا ہے ان کا نفس بغیر کسی شک و شبہ کے قطعی طور پر یہ جانتا اور یقین کرتا ہے کہ وہ عین جسم ہے، حتی کہ اگر جسم کو کچلا جائے یا کاٹا جائے تو ان کا نفس (۴) یہ یقین کرتا ہے کہ یہ معاملہ خود مجھ سے ہو رہا ہے ان لوگوں کی علامت یہ ہے کہ یہ لوگ خالص دل سے اس بات کے قائل ہوتے ہیں کہ ہماری روح خود جسم ہے یا وہ روح ایک عرض (۵) ہے جو جسم پر طاری ہے، گو کسی کی تقلید یا رسم کی وجہ سے زبان قال سے اس کے خلاف کہیں۔

یہ لوگ جب مر جاتے ہیں تو ان پر اس عالم کے ہلکے سے انوار چمکتے ہیں اور اچھتے ہوئے خیالات و تصورات نظر آتے ہیں اور بالکل وہی حالت پیش آتی ہے جو یہاں اہل ریاضت کو پیش آتی ہے اور ان کو سب باتیں کبھی خیالی صورتوں کے پیرائے میں اور کبھی عالم مثال کی دوسری خارجی صورتوں کے پیرائے میں دکھائی جاتی ہیں جیسے کہ اہل ریاضت کو دکھائی جاتی ہیں پس اگر انھوں نے اعمال ملکیہ کیے ہوتے ہیں تو ان کے اعمال کی درستگی کا علم ان کو ایسے فرشتوں کی صورت میں دکھایا جاتا ہے جن کی نہایت حسین شکل و صورت ہوتی ہے اور ان کے ہاتھوں میں ملائم ریشمی کپڑے ہوتے ہیں اور وہ ان سے نہایت نرم لہجہ اور عمدہ طرز سے گفتگو کرتے ہیں اور ان کے لیے

---

(۱) جو فرشتوں سے جا ملتے ہیں۔ (۲) جو شیاطین سے جا ملتے ہیں۔ (۳) اہل اصطلاح یا صاحب مصالحت ان کے معنی پہلے بیان ہو چکے ہیں ملاحظہ ہو عنوان باب کتاب ہذا۔ (۴) روح۔ (۵) عرض اس چیز کو کہتے ہیں جو اپنا الگ وجود نہیں رکھتی بلکہ کسی دوسرے جسم کے ساتھ مل کر پائی جاتی ہو جیسے رنگ وغیرہ۔

جنت کی کھڑکی کھول دی جاتی ہے جس میں سے اس کی خوشبوئیں آنے لگتی ہیں۔ اور اگر انھوں نے برے اعمال کئے ہوتے ہیں (جو ملکیت کے خلاف اور موجب لعنت ہوتے ہیں) تو ان (اعمال کی نادرستگی) کا علم ایسے بدشکل فرشتوں کی صورت میں نظر آتا ہے جن کے سیاہ چہرے ہوتے ہیں اور وہ سخت لہجہ سے ہیبت ناک باتیں کہتے ہیں (۱) (یہ سب اسی طرح دکھایا جاتا ہے) جس طرح غصہ کو درندے کی صورت میں اور بزدلی و نامردی کو خرگوش کی صورت میں دکھایا جاتا ہے اور وہاں (عالم برزخ میں) ایسے فرشتے ہوتے ہیں جن کو ان کی استعداد کے بموجب اسی قسم کے کاموں پر مقرر کیا گیا ہے اور انہیں (وہاں آنے والے) لوگوں کو تکلیف و عذاب دینے یا راحت و ثواب پہنچانے پر بھی مامور کیا گیا ہے۔ پس اہل عذاب ثواب ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں گو وہ اہل دنیا کو ان کی (ناقص) نظروں سے دکھائی نہیں دیتے۔

واضح رہے کہ عالم قبر (یا عالم برزخ کوئی علیحدہ نیا عالم نہیں بلکہ) اسی عالم کا تتمہ اور بقایا حصہ ہے اور اس جگہ پردۂ غیب کے پیچھے سے علوم مترشح ہوتے ہیں اور ہر شخص کے خاص خاص احوال (یعنی انفرادی احکام ظاہر) ہوتے ہیں برخلاف عالم حشر کے حوادث کے کہ وہاں یہ خاص (انفرادی) احکام مٹ جائیں گے اور اس کی جگہ تمام افراد انسانی کے نوعی و اجتماعی احکام ظاہر ہوں گے (۲) باقی اللہ بہتر جانتا ہے۔

چوتھا باب: واقعات حشر کے اسرار و رموز

واضح ہو کہ انسانی روحوں کا (عالم مثال میں) ایک مرجع اور مقام خاص ہے جس کی طرف یہ روحیں اس طرح کھینچتی ہیں جیسے مقناطیس کی طرف لوہا کھینچتا ہے اور وہ مقام ''حظیرۃ القدس'' کہلاتا ہے اس جگہ تمام روحیں بدنوں سے جدا ہو کر اس ''روح اعظم'' سے جا ملتی ہیں جس کی تعریف نبی صلعم نے بہت سے مونہوں اور بہت سی زبانوں اور بہت سی بولیوں کے وصف کے ساتھ بیان کی ہے۔

(۱) یہ اشارہ اس حدیث کے مضمون کی طرف ہے جس میں یوں آیا ہے کہ جب مومن کی روح قبض کی جاتی ہے تو نہایت حسین صورت فرشتے ہاتھوں میں ریشم لئے ہوئے آتے ہیں اور پھر قبر میں اس کو طرح طرح کے عیش و آرام بہم پہنچاتے ہیں جنت کی طرف دریچی کھول دیتے ہیں اور کافر سے اس کے برعکس معاملہ کیا جاتا ہے۔ الحدیث۔

(۲) جو بحیثیت مجموعی تمام انسانوں سے تعلق رکھتے ہیں خاص خاص انسانوں کا حکم وہاں کبھی زیر غور نہ ہوگا یعنی وہ انفرادی درجہ یہیں قبر میں ختم ہو جائے گا اس کے بعد جس قدر ترقی ہوگی وہ اجتماعی ترقی ہوگی۔

اور یہ اجتماع گاہ (روح اعظم) عالم مثال یا عالم ذکر (جو چاہے نام لیجئے اس) میں صورتِ نوع انسانی کی شکل یا تصویر ہوتی ہے یہی وہ مقام ہے جہاں وہ احکام جو انفرادی خصوصیات سے پیدا ہوتے ہیں۔فنا ہو جاتے ہیں۔

اور وہ باتیں جو نوع سے پیدا ہوتی ہیں یا ان میں نوعی حالت غالب ہوتی ہے(۱) باقی رہ جاتی ہیں اور تفصیل اس کی یہ ہے کہ تمام فرد انسانی میں بعض باتیں تو ایسی ہیں جن کی وجہ سے وہ ایک دوسرے سے جدا اور ممتاز نظر آتے ہیں اور بعض باتیں ایسی ہیں جن میں سب شریک ہیں اور وہ سب میں پائی جاتی ہیں۔ظاہر ہے کہ یہ باتیں (جو سب میں پائی جاتی ہیں) ''احکام نوع'' کہلائیں گی (انہیں فطرت بھی کہتے ہیں) اس حدیث میں اسی طرف اشارہ ہے کہ'' ہر بچہ انسانی فطرت (سلیمہ) پہ پیدا ہوتا ہے پھر اس کے بعد اس کے ماں باپ اسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں)'' پھر ہر نوع کے احکام مخصوصہ کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ان میں سے ایک قسم تو ظاہری احکام کی ہوتی ہے جیسے پیدائش و بناوٹ یعنی رنگ، شکل، مقدار اور آواز وغیرہ۔پس نوع کا جو فرد اس ہیئت اور شکل پر پایا جائے گا جس کو اس کی نوع چاہتی ہے تو اس میں یہ تمام ظاہری احکام پوری طرح ضرور پائے جائیں گے بشرطیکہ اس کی ساخت کے مادہ میں کوئی کمی و نقص نہ ہو، چنانچہ نوع انسان کا ہر فرد طویل القامت ناطق اور صاف جلد ہوتا ہے۔اور گھوڑے کی نوع کا ہر فرد کج قامت ہنہنانے والا اور بالدار جلد کا ہوتا ہے ان کے علاوہ بہت سی باتیں اور بھی ہیں جو افراد سے کبھی جدا نہیں ہوتیں بشرطیکہ ان کا مزاج صحیح و سالم رہے۔دوسری قسم باطنی احکام کی ہوتی ہے جیسے قوت ادراک (سمجھنا) معاش کے لئے ہدایات حاصل کرنا اور اپنے مقصد کے حصول اور آنے والی مصیبت سے بچاؤ کے لئے مستعد ہونا، غرض ہر نوع کا ایک جداگانہ طریقہ ہوتا ہے، چنانچہ شہد کی مکھی کو دیکھئے کہ خداوند تعالیٰ نے اس کو کس طرح وحی کی کہ وہ درختوں کو ڈھونڈھ کر ان کے پھل کھائے اور اپنے ہم جنسوں کے لئے ایک گھر بنائے اور پھر اس میں شہد جمع کرے۔اور اسی طرح

---

(۱) اور انفرادی جہات مغلوب ہوتی ہے۔

چڑیا کو یہ وحی کی کہ اس کا نر مادہ کی طرف راغب ہو پھر دونوں مل کر گھونسلا بنائیں، انڈے سئیں اور بچے نکالیں اور جب بچے اڑنے لگیں تب ان کو یہ سکھایا کہ یہاں پانی اور وہاں دانہ ہے اور انہیں ان کا دوست اور دشمن بتلا دیا اور یہ بھی سکھلا دیا کہ بلی اور شکاری وغیرہ دشمن سے بھاگ کر یوں اڑ جانا چاہئے اور اپنے ہم جنس سے حصول منفعت اور دفع مضرت کے لئے یوں لڑنا چاہئے۔ کیا کوئی عقل سلیم والا یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ احکام، نوع کے احکام نہیں ہیں؟

واضح ہو کہ افراد کی سعادت (بہتری) یہی ہے کہ ان میں نوع کے احکام پورے پورے پائے جائیں اور ان کا مادہ ان سے گریز بھی نہ کرے اور نہ کوئی کمی چھوڑے کہ اس کے بعض نوعی خواص ظاہر نہ ہو سکیں اور اسی لئے آپ افراد نوع کو سعادت اور شقاوت میں مختلف الحال پاتے ہیں اور جب تک وہ افراد اپنی نوع کے مقتضا کے موافق رہتے ہیں ان کو تکلیف نہیں پہنچتی، لیکن ان افراد کی فطرت کبھی عارضی اسباب کی وجہ سے متغیر ہو جاتی ہے جیسے ورم وغیرہ، آنحضرتؐ کے اس قول میں اسی طرف اشارہ ہے "پھر اس (بچہ) کی ماں، باپ اسے یہودی، نصرانی، یا مجوسی بنا دیتے ہیں (۱) معلوم ہونا چاہئے کہ انسانی روحیں نوعی حیثیت سے "حظیرۃ القدس" کی طرف کبھی تو بصیرت اور ہمت سے کھینچ کر جاتی ہیں اور کبھی اس وجہ سے کہ ثواب وعذاب دینے کے لئے وہاں اس کے آثار متشکل ہو چکے ہوتے ہیں۔ پہلی قسم کے انجذاب وکشش (جو بصیرت وہمت پر مبنی ہے) اس کا تو یہ حال ہے کہ جہاں کوئی شخص بہیمی نجاست سے پاک وصاف ہو جاتا ہے تو جھٹ وہاں پہنچ جاتا ہے اور وہاں کی کچھ نہ کچھ باتیں اس پر منکشف ہو جاتی ہیں، چنانچہ نبی صلعم کی اس حدیث میں اسی طرف اشارہ ہے کہ "آدم اور موسیٰ اپنے خدا کے ہاں جمع ہوئے" اور آنحضرت سے متعدد طریق سے یہ روایت کیا گیا ہے کہ "صالح لوگوں کی ارواح، روح اعظم کے پاس اکٹھی ہو جاتی ہیں"۔ اور جہاں تک دوسری قسم کے انجذاب وکشش کا تعلق ہے تو اس کی تشریح یوں ہے کہ جسموں کا قیامت کے دن دوبارہ اٹھنا اور پھر ان میں ارواح کا واپس آنا کوئی نئی زندگی نہیں ہے بلکہ یہ پہلی (دنیاوی) زندگی ہی کا تتمہ ہے جیسے بہت زیادہ کھانے کا تتمہ بدہضمی ہے، کیونکہ اگر یوں

---

(۱) یعنی انسان بچپن میں صحیح فطرت پر ہوتا پھر ماحول کے اثر سے وہ بگڑ جاتا ہے گویا وہ پہلے تندرست تھا اب اس کو ورم ہو گیا اور پوری سعادت حاصل نہ کر سکا۔

نہ ہوتا تو پھر وہ لوگ پہلے لوگ نہ ہوتے بلکہ ان کے غیر ہوتے اور اپنے افعال پر ماخوذ نہ ہوتے (۱)۔ واضح ہو کہ بہت سی ایسی چیزیں جو خارج میں پائی جاتی ہیں مناسب معنوی اجسام میں متشکل ہو کر عالم بیداری میں اس طرح پیش ہوتی ہیں جیسے کہ عالم خواب میں پیش ہوا کرتی ہیں، مثلاً حضرت داؤد کے سامنے دو فرشتے مدعی اور مدعیٰ علیہ کی صورت میں ظاہر ہوئے اور ایک جھگڑا فیصل کرانے لائے، پس داؤدؑ نے جان لیا کہ یہ وہ قصور ہے جو مجھ سے اوریا کی بیوی کی بابت سرزد ہوا ہے لہٰذا انھوں نے مغفرت مانگی اور تائب ہوئے (۲)۔ اور جیسے (شب معراج کو) آنحضرت صلعم کے روبرو دو پیالے پیش کئے گئے ایک شراب کا اور ایک دودھ کا، تو آپ نے دودھ کا پیالہ پسند فرمایا۔ اس واقعہ میں فطرت اسلامی اور شہوت نفسانی ان دونوں پیالوں کی صورت میں آکر آپ کی امت کے سامنے ظاہر ہوئی تھیں، اور آپ کا دودھ کو پسند فرمانا اہل رشد و ہدایت کا، فطرت اسلامی کو اختیار کرنا ہے اور جیسے آنحضرت صلعم اور ابوبکرؓ اور عمرؓ کا ایک کنویں کی منڈیر پر مل کر بیٹھنا اور حضرت عثمانؓ کا (جگہ نہ ہونے کی وجہ سے) ان سے علیحدہ ہو کر بیٹھنا اس امر کا تصور تھا کہ قبر میں یہ تینوں صاحب تو مجتمع رہیں گے اور ایک جا دفن ہوں گے لیکن حضرت عثمان ان سے علیحدہ دفن ہوں گے۔ چنانچہ سعد بن مسیب نے بھی اس معاملہ کی یہی تعبیر بیان فرمائی ہے حشر کے واقعات سمجھنے کے لئے یہ مثالیں آپ کو کافی ہیں۔ کیونکہ وہاں اکثر واقعات اسی طرح کے پیش ہوں گے۔

واضح ہو کہ عام لوگوں کے نفوس ناطقہ (روح الٰہی) کا نسمہ (روح حیوانی یا ہوائی) سے بہت ہی گہرا تعلق ہوتا ہے اور وہ (عالم مثال کے) علوم بعیدہ کے سمجھنے میں ایسے ہوتے ہیں جیسے مادرزاد اندھا ہوتا ہے کہ وہ رنگ اور روشنی کا تخیل ہی نہیں کرسکتا اور نہ اس کے تخیل کی خواہش رکھتا ہے۔ البتہ ایک مدت دراز اور طویل زمانہ میں مختلف صورتوں اور مثالوں کو سمجھ کر وہ انکا تخیل قائم کرسکتا ہے (اسی طرح ان عام لوگوں میں بصیرت پیدا کرنے کے لئے حشر میں کچھ واقعات ظہور پذیر

---

(۱) یعنی اخروی زندگی اگر دنیاوی زندگی کا تتمہ اور اسی کا ایک سلسلہ نہ ہوتا تو عذاب دیئے جانے والے لوگ کوئی اور لوگ ہوتے وہ لوگ نہ ہوتے جو دنیا میں پیدا ہوئے تھے۔ (۲) یہ قصہ اگر کسی کے نزدیک غلط ہو تو اس کی مثال دینے سے چنداں حرج واقع نہیں ہوتا۔ شاہ صاحبؒ ذاتی طور پر اس قصہ کے بدنما حصہ کو حذف کر کے ایک حد تک اس کو صحیح مانتے ہیں۔ ملاحظہ ہو "تاویل الاحادیث"۔

ہوں گے(۱) چنانچہ) جب اوّل اوّل نفوس مبعوث ہوں گے تو ان سے آسان حساب یا مشکل حساب لے کر جزا (۲) دی جائے گی اور بعض کو پل صراط پر سے گزارا جائے گا کچھ تو اس پر سے سلامتی کے ساتھ گزر جائیں گے اور کچھ خراشیں اور چوٹیں کھا کر (۳) یا اس طرح ہوگا کہ ہر شخص اپنے مقتدا و امام کے پیچھے جائے گا اور اس کی پیروی میں یا تو ہلاک ہوگا یا نجات پائے گا (۴) یا اس طرح ہوگا کہ اس کے ہاتھ پاؤں کلام کریں گے اور وہ نامۂ اعمال کو پڑھے گا (۵) یا اس طرح ہوگا کہ اس کا بخل ظہور میں آئے گا اور اس کو وہ پیٹھ پر اٹھائے گا یا اس سے اس کو داغ دیا جائے گا (۶)۔ المختصر یہ سب کچھ جو ظہور میں آئے گا تو اس کے اعمال اور ادراکات اپنی اپنی صورت نوعیہ کے موافق متشکل اور مجسم ہوں گے اور ہر وہ انسان جس کا نفس پختہ اور وسیع اور روح ہوائی فراخ ہو گی تو یہ تمثیلات و تشکلات حشریہ اس کے حق میں خوب اور کامل طور پر ہوں گی (۷) اسی لئے نبی صلعم نے فرمایا کہ ''میری امت کو اکثر عذاب قبر ہی میں ہوگا (۸) اور وہاں حشر میں بہت سے ایسے امور بھی متشکل ہوں گے جن کو سب لوگ برابر دیکھیں گے جیسے آنحضرت صلعم کی نبوت عامہ کی ہدایت حوض کوثر کی شکل میں اور نفوس انسانی کی محفوظ شدہ اعمال ترازو کی صورت میں ظاہر ہوں

(۱) اس سے ان کی بہیمیت دور ہوگی اور اپنی حقیقت سمجھنے کا موقع مل جائے گا۔ (۲) اس سے ان کی ہمت، بصیرت اور روحانیت میں خوب ترقی ہوگی۔ (۳) اس سے دنیاوی ظلمات کے پردے ٹوٹ جائیں گے اور جو گمراہ تھا وہ علی وجہ البصیرت تباہ ہوگا اور جو ہدایت یافتہ تھا وہ بھی علی وجہ البصیرت سرخ رو ہوگا۔ (۴) اس سے ان کی بصیرت اور روشن ہو جائے گی اور لوگوں کو اپنے تمام اعمال یاد آ جائیں گے۔ (۵) اس سے اس پر بخل کی حقیقت واضح ہو جائے گی۔ (۶) یعنی جس قدر رجحانات زیادہ ہوں گے ان کو زائل کرنے کے لئے اسی قدر زیادہ کوشش درکار ہوگی۔ (۷) یعنی یہ امت بہ نسبت سابقہ امتوں کے کمزور ہے اس کو تمثیلات حشریہ کی زیادہ ضرورت نہیں ہوگی یہ تھوڑی سی بات سے جلد سمجھ جائیں گے۔ (۸) یہ اس حدیث کی طرف اشارہ ہے جس کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے اس روایت کا مضمون یہ ہے کہ ایک جہنمی شخص یہ عرض کرے گا کہ اے اللہ مجھ کو جہنم کی گرمی اور آگ نے جھلس دیا ہے تو اپنی رحمت سے مجھ کو محروم نہ فرما حکم ہوگا کہ تو کیا چاہتا ہے؟ وہ عرض کرے گا کہ میرا منہ آگ سے پھیر دے اس کے سوا اور کچھ نہیں چاہتا۔ اس پر وہ بہت پکا عہد کرے گا پھر جب اس کا منہ پھر جائے گا تو جنت کے سایہ دار درخت دکھائی دیں گے تب وہ صبر نہ کر سکے گا لاچار عرض کرے گا کہ اے اللہ ان درختوں تک مجھ کو پہنچا دے پھر میں اور کچھ نہیں مانگوں گا تب اس سے خدا عہد لے کر اس کو ان درختوں کے پاس لے جائے گا وہ نہا دھو کر صاف ستھرا ہوگا پھر جنت کے اندر کے عیش و سامان دیکھ کر ہکا بکا ہو جائے گا اور تھوڑی دیر دل تھام کے بیٹھے گا لیکن رہ نہ سکے گا آخر سوال کرے گا: الحدیث۔

گے ان کے علاوہ اور بھی بہت سی چیزیں ہوں گی۔ اور اسی طرح نعمت الٰہی نہایت لذیذ کھانوں شراب طہور، لباس فاخرہ، حور مہ جبیں اور قصور دل نشیں کی صورت میں ظاہر ہوگی اور ظلمات تخلیط سے نجات پا کر نعمت الٰہی کی طرف آنے کے بہت سے عجیب عجیب طرز ہیں۔ چنانچہ نبی صلعم نے اس شخص کا طویل حال بیان فرمایا ہے جو سب سے آخر میں دوزخ سے نکلے گا نفوس کو نوعی تقاضے کے موافق خواہشات اور شہوات ہوں گی اور ان کے موافق نعمت الٰہی متمثل ہوگی اس کے علاوہ اور بھی شہوات ہوں گی جن کی وجہ سے ایک شخص دوسرے سے ممتاز ہوتا ہے، چنانچہ نبی صلعم کی اس حدیث میں اسی طرف اشارہ ہے، فرماتے ہیں کہ "میں جنت میں داخل ہوا تو ایک جوان لڑکی گندم گوں سرخ لب دکھائی دی، میں نے جبرئیل سے پوچھا کہ یہ کون (۱) ہے؟ تو انھوں نے کہا کہ خداوند تعالیٰ نے جعفر بن ابی طالب کی رغبت گندم گوں، سرخ لب لڑکی کی طرف پائی تو اسی کے موافق یہ عورت ان کے لئے پیدا کردی (۲)۔ ایک اور جگہ نبی صلعم فرماتے ہیں کہ "جب تو جنت میں جا کر یہ چاہے گا کہ یاقوت کے سرخ گھوڑے پر سوار ہو کر اسے ہر جگہ اڑاتا پھرے تو اسی وقت یہ بات تجھ کو حاصل ہو جائے گی اور تیری خواہش پوری ہو جائے گی۔ اور ایک جگہ فرمایا ہے کہ "ایک جنتی شخص اپنے رب سے کاشتکاری کی اجازت چاہے گا۔ خداوند تعالیٰ اس سے پوچھے گا کہ کیا تجھ کو تیرے دل کے موافق ہر چیز نہیں دی گئی؟ وہ عرض کرے گا کہ ہاں بیشک دی تو گئی ہے لیکن میں کھیتی سے بہت محبت رکھتا ہوں تب وہ بوئے گا اور جیسے ہی پلٹ کر دیکھے گا تو کھیتی اُگ جائے گی اور پک پکا کر کٹ بھی جائے گی اور پھٹکے ہوئے اناج کے پہاڑوں جیسے ڈھیر لگ جائیں گے تب خداوند تعالیٰ فرمائے گا کہ اے ابن آدم! لے، تیرا پیٹ کسی چیز سے نہیں بھرتا (۳) پھر ان سب چیزوں کے بعد خداوند تعالیٰ کے دیدار کی تجلیات سے مشک کے ٹیلوں پر چڑھ کر فیضیاب ہوں گے اس کے بعد کچھ اور بھی ہوگا جس کو میں رسول اللہ کی اقتدا کرتے ہوئے ذکر نہیں کرتا اور سکوت اختیار کرتا ہوں کیونکہ نبی صلعم نے بھی اس بارے میں سکوت فرمایا ہے۔

---

(۱) آپ کو تعجب اس لئے ہوا کہ عربی مزاج کے لحاظ سے وہ لڑکی خوبصورت نہیں تھی جو خوبصورت نہ ہو اس کا یہاں کیا کام؟ (۲) حبشہ میں اس قسم کی لڑکی کو خوبصورت سمجھا جاتا ہے جعفر بن ابی طالب پہلی ہجرت میں کافی عرصہ تک حبشہ رہ چکے تھے لہٰذا انھوں نے اس قسم کی لڑکی پسند کی۔ (۳) یہ سب خاص خاص خواہشوں کی مثالیں ہیں جو وہاں پوری کی جائیں گی۔

تدبیرات نافعہ کا بیان

پہلا باب: تدابیر نافعہ کے حصول کی کیفیت

واضح ہو کہ ہر انسان کھانے، پینے، نکاح کرنے، گرمی اور بارش میں سایہ حاصل کرنے اور سردی میں گرمی حاصل کرنے اور اسی طرح کی دیگر حاجات میں اپنے ہم جنسوں کے مشابہ ہے اور خداوند تعالیٰ نے اپنی خاص عنایت سے انسان کو اس کی صورت نوعیہ کے موافق اس بات کا طبعی الہام کیا ہے کہ وہ اپنی ان حاجات کو رفع کرنے کیلئے کیا کیا تدابیر اختیار کرے چنانچہ اس صفت میں سب برابر کے شریک ہوتے ہیں لیکن اگر کوئی فطری طور پر ہی ناقص الخلقت ہو اور اس کا مادہ ساتھ نہ دے تو وہ الگ بات۔ دیکھئے مہال کی مکھیوں کو اس نے الہام کیا کہ وہ درختوں کے پھل اس طرح کھائیں اور اپنے ہم جنسوں کے باہم رہنے کے لئے اس طرح گھر بنائیں اور پھر اپنی سردار مکھی (ملکہ) کی اس طرح اطاعت کریں اور پھر اس طرح شہد بنائیں اور اسی طرح پرندوں کو وحی کی کہ وہ اس طرح کہیں سے دانے چن کر لائیں اور پانی اس طرح پئیں اور بلی، شکاری جیسے دشمنوں سے اس طرح بھاگ کر اڑ جائیں اور جو بھی ان کی ضروریات میں مانع ہو اس سے اس طرح جنگ کریں اور بوقت خواہش نر مادہ سے کس طرح جفتی کرے اور پھر وہ دونوں مل کر پہاڑ پر کس طرح گھونسلا بنائیں اور پھر وہ دونوں انڈوں کے سینے میں ایک دوسرے کے اس طرح معاون بنے رہیں اور پھر اس طرح بچے نکالیں اور انھیں چگائیں۔

غرض اس طرح ہر نوع کی ایک جداگانہ شریعت (طور طریق) ہے۔ ہر فرد کے دل میں اس کی صورت نوعیہ کے موافق احکام کا الہام ہوتا رہتا ہے۔ چنانچہ انسان کو بھی اس کی ضروریات کی

بابت الہام ہوا کہ وہ ان کو رفع کرنے کے لئے کیا کیا تدابیر اختیار کرے مگر اس قدر فرق ہے کہ اس کی صورت نوعیہ کے اقتضا کے موافق ان باتوں کے علاوہ اس کو تین اور ایسی باتیں دی گئی ہیں جن سے وہ تمام انواع پر فائق شمار کیا گیا ہے۔ اوّل رائے کلی کے موافق کسی چیز کا ارادہ کرنا چنانچہ چوپایوں کو صرف طبعی خواہش کسی محسوس یا موہوم غرض کو پورا کرنے کے لئے آمادہ کرتی ہے جیسے بھوک، پیاس اور شہوت جماع، برخلاف انسان کے کہ وہ ایسے معقول نفع کے لئے قصد کرتا ہے جو اس کی طبیعت کی طرف سے نہیں ہوتا۔ چنانچہ کبھی تو وہ ملک وشہر میں صالح نظام قائم کرنے کا قصد کرتا ہے اور کبھی اپنے اخلاق کی تکمیل اور نفس کی تہذیب کرتا ہے اور کبھی عذاب آخرت سے رستگاری کی فکر کرتا ہے اور کبھی لوگوں سے وجاہت حاصل کرنے کا قصد کرتا ہے۔

دوم یہ کہ وہ ان حاجات کے پورا کرنے میں عمدگی اور لطافت بھی چاہتا ہے چنانچہ چوپائے صرف اپنی حاجت برآری سے کام رکھتے ہیں لیکن انسان حاجت روائی کے علاوہ اپنے دل کی خوشی اور جی کی لذت بھی چاہتا ہے قدر حاجت پر بس نہیں کرتا چنانچہ وہ حسین بیوی، لذیذ کھانے، عمدہ لباس اور بلند مکان پسند کرتا ہے۔ سوم یہ کہ نوع انسانی میں وہ لوگ بھی ہوتے ہیں جو اپنی عقل اور دانشمندی سے عمدہ عمدہ تدبیرات نافعہ سوچتے اور اختیار کرتے ہیں اور اس میں وہ لوگ بھی ہوتے ہیں جن کے دلوں میں وہی تدبیرات آتی ہیں جو دانشمندوں کے دل میں آتی ہیں لیکن یہ لوگ خود استنباط کر کے ان کو اختیار نہیں کر سکتے۔ چنانچہ یہ سب کسی دانا شخص کو تدبیر واستنباط کرتے ہوئے دیکھتے یا سنتے ہیں تو اس کی تدبیر کو دل سے پسند کرتے ہیں اور اس کو اپنے علم اجمالی کے موافق پا کر اس کے پابند ہو جاتے ہیں۔ بہت سے آدمی آپ کو ایسے ملیں گے جو بھوکے اور پیاسے ہوتے ہیں اور کھانا پانی نہ ملنے کی وجہ سے بہت تکلیف اٹھاتے ہیں لیکن جب ان کو وہ کھانا پانی مل جاتا ہے تو اپنی حاجت رفع کرنے کے لئے اس کے موافق تدبیریں بھی کرتے ہیں مگر اچھی طرح نہیں کر سکتے۔

پھر اتفاق سے جب کسی دانش منداور حکیم کو بھی ایسے حال میں پاتے ہیں تب کھانے کے قابل اناج کی تمیز کرنا اس کی زراعت کرنا، اس میں پانی سینچنا اور پھر اس کو کاٹ کر خرمن کو کوٹ کر ہوا میں صاف کرنا اور آئندہ حاجت کے لئے جمع کر کے رکھنا سیکھتے ہیں۔ اور اسی طرح چشموں اور

نہروں سے بعید زمین کے لئے کنوئیں کھودنا، تالاب، مشکیزے اور رہٹ کے ڈونگے بنانا، ایجاد کرتے ہیں پس اس سے تدبیرات کا ایک دروازہ کھل جاتا ہے، اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ بھوکا پیاسا کچا اناج چباتا ہے جو اس کے معدہ میں ہضم نہیں ہوتا اور کچے پھل کھاتا ہے وہ اس کے پیٹ میں نہیں پچتے تب وہ اس بارے میں کچھ کوشش کرتا ہے۔ مگر کامیاب نہیں ہوتا اسی اثنا میں وہ کسی ایسے حکیم و دانا شخص سے ملتا ہے جس کو پکانا، بھوننا اور روٹی پکانا آتا ہے وہ اس کو دیکھ کر ایک اور راہ اختیار کر لیتا ہے اور اس پر تدبیرات کا دوسرا دروازہ بھی کھل جاتا ہے پس اس پر انسان کی دیگر تمام حاجات کو قیاس کر لینا چاہئے ان وجوہات سے جن کا ہم ابھی ذکر کر چکے ہیں ایک غور کرنے والا شہروں میں ایسی تدابیر کو پاتا ہے جو پہلے نہ تھیں زمانہ گزرتا گیا اور لوگ اسی طرح کرتے رہے حتی کہ ایک مقدار معین ایسے علوم الہامیہ کی جن کو تجربات کی مدد ملتی رہی تھی اور جو لوگوں کے دلوں میں پیوست ہو گئے تھے حاصل ہو گئی اور انہی پر زندگی اور موت کا دارومدار ہے۔

حاصل کلام الہامات ضروریہ مع اپنے تینوں اقسام کے سانس اور نبض کے مانند ہیں کہ دونوں کا اصل وجود نہایت ضروری ہے باوجودیکہ چھوٹے اور بڑے سانس لینے میں اختیار ہے۔

اور جبکہ یہ تینوں باتیں تمام انسانوں میں برابر درجہ کی نہیں پائی جاتیں کیونکہ مزاج اور عقلوں جن سے رائے کلی کا حصول ہوتا ہے لوگوں میں مختلف ہیں، بعض لوگ ذہین ہوتے ہیں ان کے حالات تدابیر کے حاصل کرنے میں غور و فکر اور پیروی کرنے میں یکساں نہیں ہوتے علاوہ بریں بہت سی باتیں وجہ تفاوت بن جاتی ہیں اس لئے تدابیر کی دو حدیں مقرر ہوئیں۔

حد اوّل: یعنی تدابیر کا کم سے کم درجہ جس سے کسی کو مفر نہیں وہ ہے جس میں جنگلوں، پہاڑوں اور مہذب بستیوں سے دور دراز رہنے والے لوگ سب شریک ہیں اس کو ہم اپنی اصطلاح میں ارتفاق اوّل کہتے ہیں۔

حد دوم: یعنی وہ اعلیٰ درجہ جس میں شہروں اور آباد بستیوں کے لوگ شریک ہیں جہاں حکما اور عمدہ اخلاق کے لوگ پیدا ہوتے ہیں کیونکہ ایسی جگہوں میں اکثر لوگوں کا اجتماع رہتا ہے۔ ضروریات اور تجربات سے واسطہ پڑتا ہے اور ایک عمدہ معاشرت پیدا ہو جاتی جس کو ہر شخص دل و جان سے پسند کرتا ہے اس حد کی طرف اعلیٰ وہ ہے جس کو سلاطین عمل میں لاتے ہیں۔ جہاں

پورے سامان تعیش کی وجہ سے اطراف وجوانب کے حکما جمع ہو کر ایک عمدہ طریقۂ معاشرت پیدا کرتے ہیں اس کو ہم ارتفاق دوم کہتے ہیں۔ جب یہ ارتفاق پایۂ تکمیل کو پہنچتا ہے تو ارتفاق سوم پیدا ہو جاتا ہے یہ اس وقت ہوتا ہے جب لوگ بخیل، حاسد اور نادہند ہو جاتے ہیں ان میں اختلافات اور جھگڑے پڑ جاتے ہیں، بری خواہشات سے مغلوب اور دلیری سے لوٹ مار کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں اور ان سب کو عملی صورت دینے کے لئے ایک شخص میں طاقت نہیں ہوتی یا اس کو سہولت نہیں ملتی یا اتنا باہمت نہیں ہوتا تو مجبوراً یہ سب مل کر ایک رئیس مقرر کرتے ہیں جو ان میں عدل وانصاف سے فیصلے کرے جو مجرم اور سرکش لوگوں کو سزا دے جو لوگوں سے محصول و مال گزاری وصول کر کے ضروری مصارف پر خرچ کرے۔ اس تیسرے ارتفاق سے ارتفاق چہارم پیدا ہوتا ہے یہ اس وقت ہوتا ہے جب ہر رئیس اپنے اپنے شہر کا خود مختار ہوتا ہے ہر طرف سے اس کے پاس مال جمع ہونے لگتا ہے اور وہ اس میں حق تلفی کرتا ہے اور آپس میں بخل، حرص اور رنجش پیدا ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے باہم قتال کرنے لگتے ہیں اور ان کو ایک خلیفہ منتخب کرنے کی ضرورت پڑتی ہے یا ایسے شخص کو تسلیم کریں جس کا ان پر تسلط خلافت کبریٰ کی طرح ہمہ گیر ہو اور ہماری مراد خلیفہ سے ایسا شخص ہے جس کو اس درجہ شان و شوکت حاصل ہو کہ کوئی اس سے ملک چھین نہ سکتا ہو۔ اور کثیر جماعتیں اور کثیر اموال کے خرچ کئے بغیر کوئی اس سے تعرض نہ کر سکتا ہو۔ ایسے شخص زمانہ دراز کے بعد کبھی کبھی پیدا ہوتے ہیں اور لوگوں کی اختلاف عادات کی وجہ سے خلیفہ بھی مختلف الحال ہوتا ہے اور جس قوم کی طبیعت میں شدت اور تیزی زیادہ ہوتی ہے وہ بہ نسبت ان لوگوں کے جن میں بخل وعداوت کم ہوتی ہے خلفا اور ملوک کی زیادہ محتاج ہوتی ہے۔ اب ہم چاہتے ہیں کہ ان تدابیر اور معاشرت کے اصول اسی طرح بتلا دیں جس طرح مہذب اور صاحب اخلاق قوموں نے پسند کیا اور طریقہ کار بنایا ہے جن میں چھوٹے بڑے سب شریک ہیں۔ پس جو کچھ آپ کو بتلایا جائے اس کو غور سے سنئے۔

دوسرا باب: ارتفاق (۱) اوّل کا بیان

منجملہ اس کے لغت ہے جس کے ذریعہ انسان دلی امور بیان کرتا ہے۔ اور اس بارے میں اصل افعال، ہیئت اور اجسام ہیں جن کا کسی نہ کسی آواز سے تعلق ہوتا ہے خواہ یہ تعلق قرب کا ہو یا

---

(۱) ارتفاق سے مراد تدابیر اولی ہے۔

سبیت کا ہو یا کسی اور وجہ سے ہو پس ہو بہو اس آواز کو لغت کے ذریعہ نقل کیا جاتا ہے پھر اس لغت سے باعتبار معانی کے مختلف صیغے بنائے جاتے ہیں اور جو امور نظروں میں موثر معلوم ہوتے ہیں یا نفس کی ہیئت وجدانیہ سے پیدا ہوتے ہیں ان سب کو قسم اوّل کے ساتھ تشبیہ دیتے ہیں اور بے تکلف ہو بہو اسی طرح کی آواز بناتے ہیں۔ پھر بہ سبب مجاز کے جس میں مشابہت یا مقاربت کا تعلق ہو یا بذریعہ نقل کے جو کسی علاقہ کی وجہ سے واقع ہو، لغات میں اور بھی وسعت دی جاتی ہے۔ اس بارے میں اور بھی قواعد ہیں جن کو آپ ہماری بعض تقریروں میں پائیں گے من جملہ اس کی کھیتی کرنا، درخت لگانا، کنوئیں کھودنا، کھانا اور سالن پکانا ہے منجملہ اس کے برتن اور مشکیز ے بنانا ہے۔ منجملہ اس کے چوپایوں کو اپنے قابو میں کرنا اور جمع کر کے رکھنا ہے تاکہ ان پر بوجھ لادا جائے اور ان کے گوشت، کھال، بال، اون، دودھ اور بچوں سے نفع حاصل کیا جائے۔ منجملہ اس کے جائے سکونت ہے جو اس کو گرمی، سردی سے محفوظ رکھے خواہ پہاڑ کی کوئی کھو ہو یا پھونس کا جھونپڑا ہو یا کچھ اور ہو۔ منجملہ اس کے لباس ہے جو پروں کے قائم مقام ہے خواہ چوپایوں کے چمڑے کا ہو یا درختوں کے پتوں کا ہو یا ہاتھ سے بنا ہوا ہو۔ من جملہ اس کے کسی عورت سے عقد کرنا ہے جس میں کوئی اور شریک نہ ہو اس سے اپنی شہوت پوری کرے پیدائش نسل کرے اور امور خانہ داری میں، اولاد کی پرورش اور تربیت میں اس سے مدد ملے۔

انسان کے علاوہ دوسرے حیوانات میں زوجیت محض اتفاق کا نام ہے جو نر مادہ میں کسی وجہ سے یا ایک ساتھ پیدا ہونے اور دونوں کا بلوغ تک اکٹھا رہنے سے یا کسی اور بات کی وجہ سے پیدا ہو جاتا ہے۔ منجملہ اس کے ایسے آلات کا حاصل کرنا ہے جن کے بغیر کھیتی کرنا، درخت لگانا، کنواں کھودنا اور چوپایوں کا مسخر کرنا وغیرہ نہیں ہو سکتا، جیسے پھاوڑا، ڈول، ہل، رسیاں اور اس کے علاوہ دوسرے آلات ہیں۔ من جملہ اس کے اشیا کا تبادلہ اور دوسرے معاملات جو بعض امور میں ضروری ہیں سیکھے۔ من جملہ اس کے ان میں سب سے زیادہ سلیم الرائے اور زور آور کا پیدا ہونا ہے جو دوسروں کو مغلوب کر کے ان کا سردار بن جائے اور کسی نہ کسی طرح اپنی سرداری کو باقی رکھے۔ من جملہ اس کے یہ ہے کہ ان میں کوئی ایسا پختہ طریقہ ہو جس کی رو سے ان کے معاملات کے فیصلے کئے جائیں۔ ظالم کو ظلم کی سزا ملے اور جو کوئی جنگ کا ارادہ رکھتا ہو تو اس کو روک دیا جائے۔ اور ہر قوم

میں ایسے شخص کا ہونا بھی ضروری ہے جو مہتمم بالشان امور میں تدابیر کے طریقے وضع کرے جس کے اور لوگ اتباع کریں۔ اور ان میں ایسے بھی ہوتے ہیں جو زینت، عیش و آرام اور سہولت کو پسند کرتے ہیں خواہ وہ کسی طرح سے ہو اور بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنے اخلاق، شجاعت، سخاوت، فصاحت اور دانائی وغیرہ پر فخر کرتے ہیں۔ اور بعض اس بات کو درست رکھتے ہیں کہ ان کے نام کی شہرت ہو اور لوگوں میں عزت ہو، اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر بڑا احسان کیا کہ اس نے اپنی کتاب عظیم میں اس ارتفاق کی تمام شاخوں کا الہام کر دیا کیونکہ اس کو معلوم تھا کہ سب لوگوں کو قرآن پر چلنا پڑے گا اور ارتفاق کی یہ نوع ان سب میں پائی جاتی ہے۔ واللہ اعلم

تیسرا باب: آداب معاش کا فن

آداب معاش اس علم کا نام ہے جس میں حد ثانی پر ان حاجات کی تدبیر سے بحث کی جاتی ہے جو پہلے بیان کی جا چکی ہیں اور اس باب میں قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ ارتفاق اول کو صحیح تجربہ کے موافق کرنا چاہئے پس جو صورتیں ضرر سے بعید اور نفع رساں ہوں ان کو اختیار کرنا چاہئے اور دوسری سب تدابیر کو چھوڑ دینا چاہئے اور اسی طرح ان اخلاق حمیدہ کے موافق کرنا چاہئے جو کامل مزاجوں کی فطرت میں ہیں پس جن کا اخلاق حمیدہ تقاضا کریں۔ ان کو اختیار کرنا چاہئے اور باقی سب کو چھوڑ دینا چاہئے اور اسی طرح حسن صحبت جو لوگوں میں موجود ہے اور باہمی مشارکت اور اس کے مثل وہ مقاصد جو رائے کلی سے پیدا ہوتے ہیں ان سب کے موافق کرنا چاہئے اس فن کے بڑے مسائل یہ ہیں۔ کھانے، پینے، چلنے، بیٹھنے، سونے، سفر کرنے کے آداب، قضائے حاجت، جماع، لباس، مکان، پاکیزگی، زینت اور باہمی بات چیت کے آداب، دوا کرنے، آفات میں جھاڑ منتر کرنے، ہجوم حوادث میں پیش بینی کرنے اور ولادت، نکاح، عید، قدوم مسافر وغیرہ کی خوشی میں ولیموں کے آداب، مصائب کے وقت ماتم کرنے، مریضوں کی عیادت کرنے اور میت کے دفن کرنے کے آداب سے واقف ہونا ہے کیونکہ آباد شہروں میں رہنے والے جس قدر صحیح المزاج اور معتبر لوگ ہیں سب اس پر متفق ہیں کہ برا کھانا نہ کھانا چاہئے۔ جیسے مردار جو اپنی موت سے مرا ہو اور متعفن اور وہ حیوان جس میں اعتدال مزاج اور انتظام اخلاق نہ ہو۔ اور برتن میں کھانا رکھنا اور دسترخوان وغیرہ چیزوں پر رکھ کر کھانا، منہ اور ہاتھوں کا کھاتے وقت صاف کرنا سب کے

نزدیک مستحب ہے اور اس طرح کھانے سے جس میں حماقت اور حرص پائی جائے یا اس طریقہ سے ساتھ والوں کے دلوں میں نفرت پیدا کرے، احتراز واجب ہے۔ اور متعفن پانی کو نہ پیا جائے اور جانوروں کی طرح منہ سے پانی پینے اور گٹ گٹا کر پینے سے بچا جائے اور سب کا اس پر اتفاق ہے کہ بدن، لباس اور مکان دونوں قسم کی نجاستوں سے پاک وصاف رکھنا چاہئے۔

قسم اوّل وہ نجاستیں ہیں جن میں بدبو اور تعفن ہے۔ قسم دوم وہ میل کچیل ہے جو طبعی طور پر پیدا ہوتا ہے۔ جیسے گندہ دہنی جو مسواک سے دور کی جاتی ہے اور جیسے بغل اور زیر ناف کے بال، کپڑوں کا تیل اور گھر کا کوڑہ کرکٹ اور اس بات پر بھی سب کا اتفاق ہے کہ آدمی لوگوں میں پاک وصاف ہے۔ اس کا لباس درست ہو، سر اور داڑھی میں کنگھی کرے اور عورت جب کسی کے نکاح میں ہو تو مہندی اور زیورات وغیرہ سے مزین رہے اور یہ کہ برہنگی عیب اور لباس زینت ہے اور دونوں شرم گاہوں کا کھلا رکھنا بے شرمی ہے اور پورا لباس وہ ہے جس سے تمام بدن چھپا رہے اور شرم گاہ چھپانے کا لباس باقی بدن چھپانے کے لباس سے جدا ہے اور اس پر اتفاق ہے کہ خواب یا نجوم یا شگون یا فال یا کہانت یا رمل وغیرہ سے کسی چیز کا پہلے سے معلوم ہو جانا معیوب ہے۔ اور جو شخص مزاج صحیح اور ذوق سلیم رکھتا ہے وہ اپنے کلام میں ضرور ایسے الفاظ استعمال کرے گا جن میں بے تعلقی اور زبان پر گرانی نہ ہو اور کلام میں ایسی ترکیب اختیار کرے گا جو نہایت درست ہو اور طرز کلام بھی ایسا رکھے گا کہ دل وکان اس کی طرف مائل ہوں۔ پس ایسا شخص فصاحت اور خوش بیانی کی میزان ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ ہر باب میں اجمائی مسائل کو تمام شہریوں نے تسلیم کیا ہے۔ گو وہ ایک دوسرے سے دور دراز ہی کیوں نہ ہوں۔ اس کے بعد آداب معیشت کے قواعد مرتب کرنے میں لوگ مختلف ہیں۔ پس عالم طبیعت قواعد طب کے مستحبات کو پسند کرتا ہے اور نجومی ستاروں کی خاصیت کا لحاظ رکھتا ہے اور الٰہیات کا واقف اخلاص واحسان کی رعایت کرتا ہے جیسا کہ آپ ان کی کتابوں میں مفصل پاتے ہیں اور ہر قوم کی عادت وروش جدا جدا ہے کیونکہ ان کے مزاج وعادات ودیگر امور میں اختلاف ہے۔

چوتھا باب: خانگی تدابیر کا بیان

یہ وہ علم ہے جس میں ارتفاق ثانی پر اس رابطہ اور تعلق کے تحفظ کی کیفیت سے بحث کی جاتی

ہے جو ایک مکان کے رہنے والوں میں ہوا کرتا ہے اور اس کے چار حصے ہیں۔ ازدواج، ولادت، مالک ہونا، اور باہمی صحبت، اس کی اصل یہ ہے کہ حاجت جماع نے مرد اور عورت کے درمیان تعلق اور صحبت کو پیدا کیا پھر بچہ پر شفقت والدین، اس کی پرورش میں ایک دوسرے کے اعانت کی باعث ہوئی پھر جبکہ بالطبع عورت کو اولاد کی پرورش کے اچھے طریقے معلوم تھے وہ عقل میں کم محنت کے کاموں سے جی چرانے والی، زیادہ حیادار، خانہ نشینی کی طرف مائل، ادنی ادنی امور میں خوب کوشش کرنے والی اور فرماں بردار تھی۔ اور مرد بہ نسبت عورتوں کے عقل مند، غیرت مند، باہمت، بامردت، زور آور اور مقابلہ کرنے والا تھا اس لئے عورت کی زندگی بغیر مرد کے ناتمام تھی اور مرد کو عورت کی احتیاج تھی۔ اور عورتوں کے بارے میں مردوں کی مزاحمت اور غیرت اس بات کی باعث ہوئی کہ ان کی اصلاح اسی میں ہے کہ گواہوں کے سامنے اس کی بیوی کا اسی شخص کے لئے خاص ہونا طے ہو جائے اور عورت کی جانب مرد کی رغبت ولی کی نظر میں اس کی عزت اور حمایت اس بات کی باعث ہوئی کہ زوج کی جانب سے مہر اور منگنی اور ولی کی جانب سے کچھ بے پرواہی ہو اگر محارم میں اولیا کی رغبت جائز ہوتی تو عورت کو اس سے بڑا ضرر پہنچ سکتا تھا ولی عورت کو اس شخص سے روکتا جو عورت کی نظر میں مرغوب ہے اور عورت کے لئے کوئی ایسا شخص نہ ہوتا جو اس سے حقوق زوجیت کا مطالبہ کرتا حالانکہ اس کو ان حقوق کی نہایت ضرورت ہے اور سوکنوں کے جھگڑے وغیرہ سے صلہ رحمی میں فرق آجاتا۔ اس کے علاوہ صحت مزاج کا تقاضہ یہ ہے کہ آدمی کو اس عورت کی طرف رغبت نہ ہو جس سے وہ خود پیدا ہوا ہے یا اس سے عورت پیدا ہوئی ہے۔ یا وہ دونوں ایک (۱) درخت کی دو شاخوں کے مانند ہیں اور حاجت جماع کے ذکر کرنے میں حیا کا ہونا اس بات کا باعث ہوا کہ یہ ضمن عروج (۲) میں پوشیدہ طور پر اس طرح ہوا کرے گویا یہی دونوں کا مقصود اصلی تھا اور لطف شہرت اور ملاک منزلی جو عروج شمار کی جاتی ہے، ولیمہ، کی باعث ہوئی جس میں لوگوں کو بلایا جائے اور گانے بجانے کی خوشی ہو، حاصل کلام یہ ہے کہ بہت سی وجوہ ہیں جن میں سے بعض کو ہم نے ذکر کیا اور بعض کو لوگوں کے فہم پر اعتماد کر کے حذف کر دیا۔ نکاح کی یہ حالت کذائی، کہ غیر محارم سے نکاح لوگوں کے مجمع میں ہو، اس سے پہلے مہر اور منگنی ہو، اولیا کی جانب

---

(۱) بھائی بہن۔ (۲) عورت کو اپنی جانب مائل کرنا۔

سے بے اعتنائی اور کفو کی رعایت ہو، ولیمہ کیا جائے، مرد، عورتوں کے سرپرست اوران کی معاش کے کفیل رہیں، عورتیں خانگی خدمات میں مصروف رہیں، اولاد کی پرورش میں اطاعت سے رہیں، تمام لوگوں کی نظر میں لازمی طریقہ اورامر مسلم ہو گیا ہے اورامر فطری ہو گیا ہے جس پرلوگوں کو خدا نے پیدا کیا ہے۔عرب اورعجم میں کوئی اس میں اختلاف نہیں کرتا۔اورجبکہ دونوں کی باہم التفات اورسعی اس طور پر کہ ہرایک دوسرے کے نفع ونقصان کواپنا ہی نفع ونقصان خیال کرے، بغیراس کے ممکن نہ تھی۔کہ ہرایک نکاح کے باقی رہنے کو دل وجان سے قبول کرے اور جب آپس میں ناموافقت ہوتو اس کے لئے کوئی خلاصی کا طریقہ بھی ضروری تھا اگرچہ یہ علیحدگی مباح امور میں سے نہایت ہی مبغوض ہے اس لئے طلاق اورعدت میں قیود کا لحاظ ضروری قرار دیا گیا۔اوراسی طرح خاوند کی وفات میں عدت کا لحاظ رکھا گیا تاکہ نکاح کی تعظیم دلوں میں باقی رہے اورکسی قدر حق دوام اورمعاہدہ مصاحبت کی وفاداری ادا ہو جائے۔اورانساب خلط ملط بھی نہ ہوں اوراولاد کی آبا کی طرف احتیاج اورطبعاً والدین کی شفقت اس بات کی باعث ہوئی کہ وہ اولاد کو وہی باتیں تعلیم فرمائیں جو قانون فطرت کے موافق ان کے کام آئیں۔اورآبا کا تقدم جو اولاد پر ہوتا ہے یہاں کہ اولاد بڑی ہو کر بھی عقل اورتجربہ میں ان کو زیادہ ہی پاتی ہے اورصحت اخلاق جس کا حکم ہے کہ بھلائی کے بدلہ میں بھلائی کی جائے۔اوران کی تربیت میں آبا کی محنتیں برداشت کرنا جو کسی شرح کی محتاج نہیں،ان سب باتوں نے والدین کے ساتھ نیکی کرنے کو طریقہ لازمہ بنادیا اور چونکہ لوگوں کی استعداد میں فرق ہے اس لئے یہ بھی ضروری کہ ان میں ایک شخص بالطبع سردار ہو، دانشمند ہو، امورمعاش میں مستقل ہو، ان میں انتظام اوررفاہ عام کا پیدائشی مادہ ہو۔

اورایک شخص بالطبع غلام، بیوقوف، تابع ، کہنے کے بموجب چلنے والا ہو، ایسے دونوں شخصوں کی معاش بغیرایک دوسرے کے مکمل نہیں ہوسکتی اور ہرایک دوسرے کی راحت وتکلیف میں جب ہی مدد کرے گا کہ دونوں اس تعلق کے قیام ودوام کو دلوں میں ٹھان لیں اوربعض ارتفاقات اس بات کا باعث بنتے ہیں کہ ایک دوسرے کو محکوم بنالیتا ہے یہ حالت اسیری بھی لوگوں میں قابل لحاظ ہے اورعلاقۂ مالکیت اورمملوکیت کا منتظم ہو جاتا ہے سوایک قانون کی ضرورت پڑتی ہے جس کی پابندی مالک اورمملوک میں سے ہرایک کرے اورترک پر قابل ملامت ہو۔اوراسیری سے رہا

ہونے کا طریقہ بھی ضروری ہے خواہ مال کے ذریعہ سے ہو یا بغیر مال کے۔ اور بسا اوقات انسان کو حاجات، مصائب مرض، درماندگی، دوسرے کے حقوق اور ضرورتیں ایسی پیش آتی ہیں کہ بغیر ابنائے جنس کی دستگیری کے اپنی حالت کی اصلاح بدقت ہوتی ہے اور ایسے ایسے عوارض پیش آنے میں سب لوگوں کی حالت یکساں ہے تو لاچار آپس میں الفت ہمیشہ ہمیشہ قائم رکھنے میں محتاج ہوئے۔ اور یہ بھی ضروری ہوا کہ حاجتمند کی اعانت اور مظلوم کی دادرسی کا ایک قاعدہ مقرر ہونا چاہئے جس کا ہر ایک سے مطالبہ کیا جائے اور بصورت ترک ملامت کی جائے اور جبکہ حاجت کی دو حدیں تھیں ایک حد وہ ہے جو اس درجہ پر ہو کہ ہر ایک شخص دوسرے کے نفع ونقصان کو اپنا نفع ونقصان سمجھے اور یہ اس کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا کہ ہر ایک دوسرے کے لئے اپنی پوری طاقت صرف کرے اس کے اخراجات اور وراثت کا ذمہ دار بنے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ ایسی باتیں جانبین سے ہونی چاہئیں، تا کہ جو نقصان برداشت کرے وہی فائدہ بھی حاصل کرے۔ اور لوگوں میں اس حد کے لائق قریبی رشتہ دار ہی ہیں کیونکہ ان کی دوستی اور محبت ایک قدرتی امر ہے اور دوسری حد اس سے کم درجہ پر ہے پس اہل مصائب کی ہمدردی لوگوں کا ایک طریق مسلم ہوگیا ہے اور صلۂ رحمی ان سب سے زیادہ مؤکد اور مضبوط ہے اور اس فن کے بڑے مسائل یہ ہیں۔ ان اسباب کا دریافت کرنا جو نکاح یا طلاق کے مقتضی ہوتے ہیں۔ طریقۂ نکاح اور میاں بیوی کی صفت کو جاننا حسن معاشرت، فحش اور عار سے اس کی آبرو محفوظ رکھنے کے زوج پر کیا کیا حقوق ہیں، اور عفت، اطاعت زوج اور گھر کے کاموں میں طاقت صرف کرنا بیوی پر کس حد تک واجب ہے اور باہم میاں بیوی کی ناراضی کو کس طرح سے دور کیا جائے، اور طلاق کا کیا طریق ہے، خاوند کے مرنے کے بعد سوگ کا کیا طریقہ ہے اور اولاد کی پرورش کا کیا طریق ہے، ماں، باپ کے ساتھ نیک سلوک کس طرح کرتے ہیں، غلاموں اور ماتحتوں کے ساتھ کیا کیا احسان کئے جاتے ہیں، غلام اپنے مالکوں کی کس طرح خدمت گزاری کریں اور ان کو آزاد کرنے کا کیا طریق ہے، رشتہ داروں اور پڑوسیوں کے ساتھ کیا کیا سلوک کرنا چاہئے۔ شہر کے بیکسوں کے ساتھ ہمدردی کا کیا طریقہ ہے اور ان کے مصائب کے دور کرنے میں کیا کیا کوششیں ہونی چاہئیں، رئیس قوم کے کیا کیا آداب ہیں اور اس کو قوم کی نگرانی کس طرح کرنی چاہئے اور

باہم کس طرح تقسیم ترکہ ہونا چاہئے اور انساب واحساب کی کس طرح حفاظت کرنی چاہئے۔ پس لوگوں میں کوئی ایسی قوم آپ کو نہیں ملے گی جو ان اصولوں کی پابندی اور حتی الامکان بجا آوری نہ کرتی ہو حالانکہ ان کے مذاہب میں اختلاف ہے اور ان کے وطن جدا جدا ہیں۔

پانچواں باب: معاملات کے فن کا بیان

یہ وہ علم ہے جس میں ارتفاق ثانی کے طور پر مبادلہ معاونت اور کسب کے احوال سے بحث کی جاتی ہے اور اس باب میں قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ جب انسان کی ضروریات بہت زیادہ ہو گئیں اور ان میں ہر ایک اپنی حاجت کو ایسے عمدہ طور پر پورا کرنا چاہتا تھا کہ جس سے آنکھوں کو تازگی اور دل کو سرور حاصل ہو تو ہر ایک کو تنہا ان کی انجام دہی مشکل ہوگئی کیونکہ بعض کے پاس ضرورت سے زاید کھانا تھا لیکن پانی نہ تھا اور بعض کے پاس ضرورت سے زائد پانی تھا لیکن کھانا نہ تھا تو ہر ایک دوسرے کا محتاج ہو گیا۔ اور سوائے مبادلہ کے کوئی اور صورت نہ بن پڑی پس یہ مبادلہ ان کی رفع حاجت کے لئے اچھا قرار پایا اور ضرورتاً یہ قرار پایا کہ ہر شخص ایک حاجت کے سرانجام کی طرف متوجہ ہو اس کو خوب مستحکم کرے اور اسی کے تمام وسائل مہیا کرنے کی کوشش کرے اور بہ واسطہ مبادلہ اپنی تمام حاجات کا ان کو ذریعہ بنائے۔ پس یہ لوگوں کی نظر میں ایک مسلم قانون بن گیا اور جبکہ بعض لوگ ایسے تھے کہ ان کو ایک چیز پسند تھی جو دوسروں کو ناپسند تھی اور ان کو ایسا شخص نہ ملتا تھا جس سے وہ معاملہ کرتے تو لامحالہ ان کو تقدمہ اور تہیہ کرنا پڑا اور انھوں نے معدنی جوہروں کو جو مدت طویلہ تک باقی رہتے ہیں معاملات میں ثمن قرار دیا اور یہ سب کے نزدیک امر مسلم ہو گیا اور ان جواہرات میں سے سونا اور چاندی زیادہ موزوں تھے کیونکہ انکا حجم چھوٹا، افراد مساوی اور بدن انسانی کے لئے نافع تھے اور ان سے زینت حاصل ہوتی تھی اس لئے یہی دونوں چیزیں قدرتی طور پر نقد قرار پائیں اور ان کے ماسوا دوسری چیزیں مقرر کرنے سے ثمن بن سکتی ہیں۔

اور کسبی پیشوں کے اصول زراعت، چار پایوں کو چرانا اور خشکی وتری سے مباح چیزیں لانا جیسے معدنیات، نباتات اور حیوانات ہیں اور نجاری، آہنگری اور کپڑہ بافی اور دیگر دستکاریاں ہیں جو قدرتی جوہروں کو کارآمد کرسکتی ہیں پھر تجارت بھی ایک پیشہ ہو گیا اور شہر کے مصالح کا سرانجام دینا بھی پیشہ ہو گیا اس کے بعد ہر وہ کام جس کی طرف لوگ محتاج ہوئے پیشہ ہوتا گیا۔ پھر جوں

جوں لوگوں نے ترقی کی اور عیش وعشرت میں غرق ہوتے گئے اسی قدر مکاسب کے متعلقات پھیلتے گئے اور ہر ایک شخص ایک ایک پیشے کے ساتھ مخصوص ہوگیا جس کی دو وجہیں ہیں۔

وجہ اول مناسبت قوی ہے پس بہادر آدمی جنگ کے لئے مناسب ہے زیرک اور قوی الحافظہ حساب وکتاب کے لئے اور نہایت توانا بار برداری اور محنت کے کاموں کے لئے مناسب ہے۔ اور وجہ دوم ارتفاقات ہیں۔ پس لوہار کے بیٹے اور اس کے ہمسایہ کے لئے جس قدر یہ کام آسان ہوگا کسی دوسرے کو نہیں ہوسکتا اور نہ ان کو ہی کوئی دوسرا کام ایسا آسان ہوگا اسی طرح دریا کے ساحل پر بسنے والوں کے لئے مچھلی کا شکار کرنا جتنا آسان ہوسکتا ہے کسی دوسرے کے لئے اتنا سہل نہیں ہے اور نہ ہی اس کے لئے کوئی دوسرا کام اس قدر سہل ہوسکتا ہے۔ باقی رہے وہ لوگ جن کو کوئی اچھا پیشہ نہیں آتا تو انھوں نے شہر کے لئے ضرر رساں پیشے اختیار کئے جیسے چوری، جوا، گداگری، مبادلہ کی مختلف صورتیں ہیں۔ مبادلہ کبھی شئے کا شئے کے ساتھ ہوتا ہے اس کو بیع یعنی خرید وفروخت کہتے ہیں۔ اور کبھی شئے دیکر منفعت حاصل کی جاتی ہے اس کو "اجارہ" یعنی مزدوری کہتے ہیں۔ اور جبکہ شہری انتظام بغیر الفت اور محنت کے نہیں ہوسکتا تھا اور الفت موقوف یا مقتضی تھی کہ ضرورت کی چیزیں بلا معاوضہ دی جائیں تو ہبہ اور عاریت کی صورتیں پیدا ہوگئیں۔ اور یہ ہمدردی فقرا کی حاجت براری کے بغیر ناتمام تھی اس لئے صدقہ دینے کی ضرورت پڑی اور اس باہمی انتظام اور اعانت کی یہ بات بھی مقتضی ہے کہ بعض لوگ احمق بعض کارگزار، بعض مفلس، بعض تونگر، بعض ادنی کاموں سے عار کرنے والے اور بعض عار نہ کرنے والے، بعض پر ضرورتوں کا ہجوم اور بعض فارغ البال ہیں۔ پس ہر شخص کی معیشت دوسرے کی اعانت کے بغیر پوری نہیں ہوسکتی تھی اور معاونت بغیر عقد، شروط اور مصالحت کے نہیں ہوسکتی تھی اس لئے مزارعت، مضاربت، اجارہ، شرکت اور وکالت کی صورتیں پیدا ہوئیں اور حاجات کی وجہ سے قرض کا لین دین اور امانت رکھنے کی ضرورت پیش آئی اور اس میں لوگوں کو خیانت، انکار، اور سستی کا تجربہ ہوا تو شہادت، تحریر، دستاویزات، رہن، کفالت اور حوالہ کی ضرورت پڑی اور جوں جوں لوگ آسودہ حال ہوتے گئے اسی قدر معاونات کے اقسام پھیلتے گئے اور آپ ہر قوم میں ان معاملات پر عمل کرنے والا پائیں گے اور آپ یہ بھی دیکھیں گے کہ ان معاملات میں ہر قوم عدل وظلم کا امتیاز کرتی ہے۔ واللہ اعلم۔

چھٹا باب: شہری سیاست کا بیان

یہ وہ علم ہے جس میں ان تعلقات کے حفظان کی کیفیت بیان کی جاتی ہے جو اہل شہر میں ہوا کرتے ہیں اور شہر سے مراد وہ جماعت ہے جو مساوی الحال ہو جن میں باہم معاملات ہوتے ہوں اور وہ جدا جدا مکانوں میں بود و باش رکھتے ہوں اور اس بارے میں اصل یہ ہے کہ شہر باعتبار اس باہمی ربط کے ایک شخص کے مانند ہے جو چند اجزا اور مجموعی ہیئت سے مرکب ہے اور ہر مرکب چیز میں ممکن ہے کہ اس کے مادہ یا صورت میں نقصان واقع ہو جائے اور اس کو کوئی مرض ہو جائے یعنی اس میں ایسی حالت پیدا ہو جائے کہ اس کی نوع کے لئے کوئی دوسری حالت زیادہ مناسب ہو۔ اور باصحت رہے یعنی ایسی حالت جس سے وہ حسین و جمیل معلوم ہو، اور شہر میں چوں کہ بہت سے لوگ ہوتے ہیں جن کا ایک قانون عادل پر متفق الرائے ہونا مشکل ہے اور بغیر کسی ممتاز منصب کے ایک دوسرے کی روک ٹوک بھی نہیں کرسکتا کیونکہ اس سے جنگ وجدل کا اندیشہ ہوتا ہے۔ پس شہر کا پورا انتظام بغیر ایسے شخص کے ناممکن ہے جس کی اطاعت تمام اہل حل وعقد تسلیم کریں، وہ پر شوکت ہو اور فوج کا مالک ہو اور جو شخص نہایت تنگدل، تیز مزاج خونریزی اور غصہ میں بیباک ہے اس کو سیاست کی ضرورت اوروں سے زیادہ ہے اور خرابیوں میں سے ایک یہ ہے کہ چند شریر جن کو قوت اور شوکت حاصل ہو نفسانی خواہشات کے اتباع پر اور قانون عادلہ کے ترک پر متفق ہو جائیں یا لوگوں کے مال لوٹنے کے لئے جمع ہو جائیں جن کو قطاع الطریق کہتے ہیں یا محض دشمنی، حسد، یا ملک کی طمع سے لوگوں کو ایذا پہنچائیں تو ایسی حالت میں لوگوں کو جمع کرنے اور ان سے جنگ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور من جملہ ان خرابیوں کے ایک یہ ہے کہ کوئی ظالم کسی شخص کو قتل کردے یا زخمی کردے یا زدوکوب کرے یا کسی گھر میں اس کی بیوی کے معاملہ میں مزاحمت کرے یا اس کی بیٹیوں اور بہنوں کی ناحق طمع کرے۔ یا اس کے مال کو زبردستی چھین لے یا چھپکے سے چوری کرے یا اس کی آبروریزی کرے ایسی بات منسوب کر کے جو قابل ملامت ہو یا اس کے ساتھ بدکلامی کرے اور ان خرابیوں میں ایسے اعمال بھی داخل ہیں جو پوشیدہ طریقہ پر شہر کو نقصان پہنچاتے ہیں جیسے سحر، زہرخوانی اور لوگوں کو مفسد باتوں کی تعلیم دینا، رعایا کو بادشاہ سے غلام کو مالک سے اور اہلیہ کو شوہر سے برگشتہ کرنا اور ان خرابیوں میں سے عادات فاسدہ ہیں جن سے

فطری منفعت تلف ہو جاتی ہیں جیسے لواطت، جلق، چار پایوں سے مجامعت کرنا۔ کیونکہ یہ سب امور نکاح سے باز رکھتے ہیں، یا ایسے عادات جو فطرت سلیمہ کے خلاف ہیں جیسے مرد ہو کر زنانہ پن اختیار کرنا اور عورت کو مردانہ روش اختیار کرنا۔ یا ان عادات سے بڑے بڑے نزاع پیدا ہوتے ہیں۔ جیسے چند اشخاص کا باہم مزاحمت کرنا۔ ایسی عورت کے لئے جو ان میں سے کسی کے لئے خاص نہیں ہے اور جیسے ہمیشہ شراب پینا۔ وہ معاملات بھی ہیں جن سے شہری زندگی کو نقصان پہنچتا ہے جیسے قمار بازی، سود در سود کا حصول، رشوت کا لین دین، پیمانہ اور وزن میں کمی کرنا، سامان تجارت میں عیب کو مخفی رکھنا، اونچ نرخ سے بیچنے کے لئے شہر سے باہر ہی تاجروں سے مال خرید لینا، بوقت ضرورت غلہ کو بند کر کے رکھنا اور بغیر ارادۂ خریداری دوسرے کو پھنسانے کے لئے زیادہ دام لگانا اور انہی خرابیوں میں سے مشکل مقدمات ہیں جن میں ہر فریق مشتبہ دلیل پیش کرتا ہے اور اصلیت کا پتہ نہیں چلتا۔

پس ایسی حالت میں شہادت، حلف، دستاویزات، قرائن حال وغیرہ کی ضرورت پڑتی ہے اور ان مقدمات میں کبھی قانون مسلم کی، حق کی وجہ ترجیح ظاہر کرنے کی اور فریقین کے مکاید معلوم کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور ان خرابیوں میں سے یہ ہے کہ شہر کے رہنے والے بادیہ نشینی اختیار کر لیں اور ارتفاق اول پر اکتفا کر لیں یا کسی دوسرے شہر میں جا بسیں یا مکاسب پر اس طرز سے جھک پڑیں جس سے شہر کو ضرر پہنچے مثلاً اکثر لوگ زراعت چھوڑ کر تجارت پیشہ ہو جائیں یا ان کی اکثریت فوجی پیشہ اختیار کر لے۔ اور مناسب یہی ہے کہ زراعت پیشہ لوگ بمنزلہ غذا کے قرار دیئے جائیں اور دستکار، تاجر، محافظین ملک بجائے نمک کے سمجھے جائیں جس سے غذا کی اصلاح ہوتی ہے۔ ان خرابیوں میں سے حملہ آور درندوں اور موذی حشرات الارض کا پھیلنا ہے سو ان کے فنا کرنے کی کوشش ضروری ہے۔ اور شہر کی پوری پوری حفاظت کرنے والے چیزوں میں سے ان عمارتوں کا بنانا ہے جن کے نفع میں سب لوگ برابر کے شریک ہوں مثلاً شہر پناہیں، سرائیں، قلعہ جات، سرحدیں، بازار، پل اور ایسے ہی کنوؤں کا کھدوانا، چشموں کا نکالنا اور کشتیوں کا ساحل دریا پر فراہم کرنا اور تیز سوداگروں کو مانوس و مالوف کر کے اس پر آمادہ کرنا کہ باہر سے اجناس وغیرہ لائیں، شہر والوں کو سمجھا دینا کہ مسافروں سے خوش معاملگی کریں کیونکہ اس کی وجہ سے سوداگروں

کی آمد ورفت زیادہ ہوتی ہے اور زراعت پیشہ لوگوں کو اس پر آمادہ کرنا کہ وہ زمین کو بیکار نہ چھوڑیں۔ دستکاروں کی تاکید کرنا کہ چیزوں کو عمدہ اور مضبوط بنائیں اہل شہر کو عمدہ فضائل حاصل کرنے کی تاکید کرنا کہ وہ لکھنا، حساب، علم تاریخ، وطب اور پیش بینی کے عمدہ عمدہ طریقے سیکھیں اور اسی طرح شہر کے حالات کا علم رکھنا تاکہ اچھے برے کا امتیاز رہے اور تاکہ محتاج کا حال معلوم ہو تو اس کی مدد کی جائے اور کوئی عمدہ دست کار معلوم ہو جائے تاکہ اس سے مدد لیا جائے۔ اور اس زمانہ میں شہروں کی ویرانی کے دو بڑے سبب ہیں ایک سبب تو یہ ہے کہ وہ بیت المال پر بوجھ ہیں، اس طرح کہ غازیوں اور علما نے جن کا بیت المال میں حق ہے، شعرا اور زہاد وغیرہ نے جن کے ساتھ سلاطین سلوک کرتے ہیں۔

بیت المال سے حاصل کرنا پیشہ بنالیا ہے یہ لوگ کوئی خدمت نہیں کرتے اور ان کا گزارہ بیت المال سے ہوتا ہے۔ پس ایسے لوگ یکے بعد دیگرے آتے ہیں ایک دوسرے کی زندگی مکدر کرتے ہیں اور شہر پر ایک بار سا ہو جاتے ہیں۔ دوسری وجہ کاشتکاروں، تاجروں اور اہل حرفت پر بھاری ٹیکس لگا دینا اور پھر ان پر سختی کرنا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فرماں بردار لوگ چلے جاتے ہیں اور ان کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور جن لوگوں کو قوت ہوتی ہے وہ درپے بغاوت ہو جاتے ہیں۔ البتہ شہر کی اصلاح خفیف لگان سے اور بقدر ضرورت محافظین ملک کے قائم کرنے سے ہوتی ہے۔ اہل زمانہ کو اس نکتہ سے واقف رہنا چاہئے۔ واللہ اعلم۔

ساتواں باب: بادشاہوں کی سیرت کا بیان

بادشاہ کے لئے ضروری ہے کہ اس میں پسندیدہ اخلاق ہوں ورنہ وہ شہر پر بار ہو جائے گا اگر وہ شجاع نہیں ہے تو اپنے مخالفوں سے پورا مقابلہ نہ کر سکے گا، رعیت اس کو حقارت کی نگاہ سے دیکھے گی اگر وہ بردبار نہیں ہے تو اپنی سطوت سے لوگوں کو برباد ہی کر ڈالے گا اور اگر صاحب حکمت نہیں ہے تو نفع بخش تدبیر کو عمل میں لانے سے عاجز رہے گا اور بادشاہ کے لئے ضروری ہے کہ عقلمند، بالغ آزاد مرد ہو، صاحب رائے، بینا، شنوا اور گویا ہو۔ لوگ اس کے شرف اور اس کے خاندان کے اعزاز کو تسلیم کرتے ہوں، اس کے اور اس کے آباواجداد کے فضائل کو لوگ دیکھ چکے ہوں اور خوب جانتے ہوں کہ۔ بادشاہ مصالح ملکی کی پاسبانی میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کرتا۔ یہ سب امور عقل کے

ذریعہ سے معلوم ہوتے ہیں اور تمام بنی آدم اس پر متفق ہیں خواہ ان کے شہروں میں کیسا ہی بعد کیوں نہ ہو اور وہ کسی ہی مذہب کے کیوں نہ ہوں۔ کیونکہ وہ خوب جانتے ہیں کہ بادشاہ کے مقرر کرنے سے جو مصلحت مقصود ہے وہ بغیر امور بالا کے مکمل نہیں ہوسکتی اگر بادشاہ ان امور میں فروگزاشت کرے گا تو لوگ اس کو خلاف مقصود جانیں گے اور ان کے دل اس سے بیزار ہو جائیں گے اور اگر خاموش بھی رہیں گے تو درپردہ غصہ میں رہیں گے اور بادشاہ کے لئے ضروری ہے کہ اپنی رعایا کے دلوں میں وقار پیدا کرے اور پھر اس وقار کو محفوظ رکھے اور مناسب تدابیر سے ان امور کا تدارک کرتا رہے جو اس کی شان کے منافی ہوں۔ اور جو بادشاہ اپنے مرتبہ کو قائم رکھنا چاہے تو وہ ان اعلیٰ ترین اخلاق سے اپنے آپ کو پیراستہ کرے جو اس کی ریاست کے شایاں ہوں۔ مثلاً شجاعت وحکمت، فیاضی، ظالم سے (حسب مصلحت) درگزر کرنا اور سب کا بھلا چاہنا۔ اور وہ لوگوں سے ایسا معاملہ کرے جو صیاد، شکار سے برتتا ہے۔

پس جس طرح شکاری جنگل میں جا کر ہرنوں کو دیکھتا ہے اور ان کی طبیعت وعادت کے مناسب صورتوں کو سوچتا ہے پس وہ اس کے لئے تیار ہو جاتا ہے وہ دور سے ظاہر ہوتا ہے ان کی آنکھوں اور کانوں کی طرف سے نگاہ کو نیچی کر لیتا ہے پس ہرنوں کی جانب سے جونہی اس کو کھٹکا معلوم ہوتا ہے تو وہیں بے حس وحرکت پتھر کے مانند کھڑا ہو جاتا ہے اور جب ذرا انہیں غافل پاتا ہے تو آگے کو لپکتا ہے، کبھی ان کو نغمہ سے خوش کرتا ہے اور ان کے سامنے ان کی مرغوب چیز چارہ اس طرح سے ڈالتا ہے گویا یہ شخص اپنی کریمانہ عادت سے یہ سلوک کر رہا ہے اور اس سے شکار کرنا مقصود نہیں ہے۔ اور نعمت سے منعم کی محبت بڑھ جاتی ہے کیونکہ محبت کی زنجیر آہنی زنجیر سے زیادہ مضبوط ہوتی ہے۔ ایسے ہی جو شخص اپنے آپ کو لوگوں کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہے اس کے لئے مناسب یہ ہے کہ ایسا لباس، گفتگو ادب اختیار کرے جو لوگوں کو پسند ہو۔

پھر آہستہ آہستہ ان کے قریب ہوتا جائے اور اخلاص ومحبت کو بغیر لاف وگزاف کے ان پر ظاہر کرے اور کوئی ایسا قرینہ نہ ہو جس سے وہ سمجھ جائیں کہ یہ مہربانیاں صرف ان کے شکار کرنے کو ہیں۔ پھر یہ بات ان کے دلوں میں دل نشین کر دے کہ اس جیسا اس کے حق میں کوئی نہیں ہوسکتا۔ یہاں تک کہ معلوم کر لے کہ لوگوں کے دلوں میں اس کی فضیلت اور بزرگی راسخ ہوگئی، ان کے دل

اس کی محبت اور تعظیم سے پر ہو گئے اور ان کے اعضا میں عاجزی وانکساری سرایت کر گئی۔ پھر بادشاہ کو ان سب امور کی نگرانی چاہئے اس کی طرف سے کوئی امر ایسا پیش نہ آئے جس کی وجہ سے ان کی حالت میں کوئی تبدیلی پیدا ہو اگر کوئی کوتاہی بھی ہو جائے تو لطف واحسان کر کے فوراً اس کا تدارک کر دے اور ظاہر کر دے کہ جو کچھ عمل میں آیا ہے۔ مصلحت اسی کی مقتضی تھی اور یہ ان کے فائدے کے لئے ہوا ہے نہ مضرت کے لئے۔ ان سے باتوں کے باوجود بادشاہ کے لئے ضروری ہے کہ اپنی فرمانبرداری ثابت کرنے کے لئے سرکشوں سے انتقام لے۔ پس جس شخص کے متعلق معلوم ہو کہ اس نے جنگ میں یا خراج وصول کرنے یا کسی اور کام میں سرگرمی کی ہے تو اس کی تنخواہ بڑھا دے اس کی قدردانی کرے اور اس کے حال پر مہربانی کرے اور جس کو خیانت کرتے یا اطاعت سے منحرف ہوتا دیکھے تو اس کی تنخواہ میں کمی کر دے، اس کے مرتبہ کو کم کر دے اور اس سے اعراض کرے اور بادشاہ کو بہ نسبت عام لوگوں کے زیادہ سہولت پہنچانے کی بھی ضرورت ہے۔ اس کے لئے مناسب یہ ہے کہ لوگوں کو تنگ نہ کرے کہ کسی خراب زمین کے آباد کرنے کا حکم دے یا کوئی دور دراز جگہ جا کر بسے، وغیرہ۔ اور بادشاہ کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ جب کسی کو سزا دے تو پہلے ارباب شوریٰ پر ثابت کر دے کہ یہ اسی کا مستحق ہے اور در حقیقت مصلحت اسی میں ہے اور بادشاہ کے لئے ضروری ہے کہ اس میں فراست کا مادہ ہو جس سے وہ لوگوں کے دلی ارادے سمجھ لے اس میں ایسی زیرکی ہو کہ اس کے گمان ایسے درست ہوں جیسا کہ کسی چیز کو دیکھ رہا ہے اور بادشاہ کے لئے ضروری ہے کہ ضروری امر کو کل پر نہ چھوڑے۔ اور جب کسی کو پوشیدہ طور پر عداوت کرتا پائے تو جب تک اس کی طاقت کو پراگندہ اور کمزور نہ کر دے اس کو تسلی نہ ہو۔

آٹھواں باب: اعوان وانصاف کی سیاست کا بیان

جبکہ بادشاہ تنہا تمدن کی تمام مصلحتوں کو سرانجام نہیں دے سکتا تو اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس ہر کام کے معاون ہوں، معاونین کے لئے یہ شرط ہے کہ ان میں امانت کی صفت ہو جو خدمت ان کے متعلق ہے اس کی بجا آوری کی قدرت ہو، بادشاہ کے فرمانبردار اور ظاہر و باطن میں خیر خواہ ہوں اور جس معاون میں یہ صفت نہ ہو وہ معزول کرنے کے لائق ہے اگر بادشاہ نے اس کو معزول کرنے میں سستی کی تو گویا اس نے شہر کے ساتھ بددیانتی کی اور اپنی حالت کو خراب کیا

اور یہ بھی مناسب ہے کہ ایسے لوگوں کو اپنا معاون نہ بنائے جن کا معزول کرنا دشوار ہو اور نہ ایسے لوگوں کو جن کا قرابت وغیرہ کے سبب بادشاہ پر استحقاق ہو جس کی وجہ سے ان کو معزول کرنا نازیبا سمجھا جائے۔ اور بادشاہ اپنے مخلصین کی تمیز رکھے کیونکہ ان میں سے بعض کی دوستی خوف کی وجہ سے اور بعض کی لالچ کی وجہ سے ہوتی ہے ایسے لوگوں کو کسی حیلہ اور ذریعہ سے اپنی طرف مائل رکھنا چاہئے۔ اور بعض بے غرضانہ بادشاہ کے مخلص ہوا کرتے ہیں کہ اس کے نفع کو اپنا نفع اور اس کے نقصان کو اپنا نقصان سمجھتے ہیں البتہ یہ لوگ محب خالص ہیں۔ اور ہر شخص کی ایک پیدائشی حالت ہوتی ہے اور ایک خاص عادت ہوتی ہے جس کا وہ عادی ہوتا ہے۔ اور بادشاہ کے لئے یہ مناسب نہیں کہ کسی سے اس کی حیثیت سے زاید کی طمع رکھے اور معاونین کے چند اقسام ہیں، بعض محافظ ہیں جو شریروں کے شر سے محفوظ رکھتے ہیں۔ یہ بدن انسان کے ان ہاتھوں کے مانند ہیں جو ہتھیار تھامے ہوئے ہوں اور بعض شہر کے مدبر لوگ ہیں۔ جیسے بدن انسان میں مدبر قوتیں اور بعض لوگ مشیر ہیں جس طرح انسان کے لئے عقل وحواس۔ اور بادشاہ کا فرض ہے کہ روزانہ ان کی خبروں کا علم رکھے اور اصلاح وفساد سے خبردار رہے اور جبکہ خود بادشاہ اور اس کے معاونین شہری امور میں مصروف رہتے ہیں تو ان کے اخراجات بھی شہر کے ذمے ہیں اور ضروری ہے کہ عشر اور خراج جمع کرنے میں راہ راست اختیار کیا جائے جس میں لوگوں کو ضرر نہ پہنچے اور حاجت روائی بھی ہو جائے اور یہ مناسب نہیں ہے کہ ٹیکس ہر شخص پر اور ہر مال پر مقرر کیا جائے۔ اور ایک خاص وجہ سے مشرقی اور مغربی قوموں کے سلاطین اس بات پر متفق ہیں کہ محاصل خوشحال لوگوں سے لیا جائے۔ سونا، چاندی اور ترقی پذیر مال جیسے نسل والے چار پائے، زراعت اور تجارت میں سے وصول کیا جائے۔ پس اگر اس سے زیادہ کی ضرورت پڑے تو پیشہ وروں سے وصول کیا جائے اور بادشاہ کا یہ بھی فرض ہے کہ لشکروں کی سیاست اس طرح کرے جیسے ایک ماہر شہسوار گھوڑے کی درستی کرتا ہے۔ پس وہ گھوڑے کی چال پویا، دلکی اور دوڑنے وغیرہ کو، اس کی بری عادات بدرکابی وغیرہ کو خوب جانتا ہے جن پر کبھی ایڑ سے، کبھی چابک سے گھوڑے کی بخوبی تنبیہ کرنے کو ضروری سمجھتا ہے اور ان امور کا خوب لحاظ رکھتا ہے۔ جب کوئی ناپسندیدہ حرکت وہ کرتا ہے یا پسندیدہ حرکت کو ترک کرتا ہے تو اس طرح اس کو تنبیہ کرتا ہے کہ اس کی طبیعت اس کو قبول کرلے اور اس کی تندی جاتی

رہے اور اس تنبیہ میں وہ اس کا لحاظ رکھتا ہے کہ اس کی طبیعت پریشان نہ ہو اور جس وجہ سے اس کو مارا ہے اس کو (پچ) کر سکے اور جس بات کی اس کو تعلیم دینا چاہتا ہے اس کی صورت اس کے سامنے متمثل کر دیتا ہے اور اس کے دل میں خوب بٹھا دیتا ہے کہ اس کی طبیعت میں سزا کا خوف دیتا ہے اور جب وہ مرضی کے موافق کام کرنے لگتا ہے اور ناموافق باتوں سے باز لگتا ہے تو وہ اس کی مشاق کو اس وقت تک ترک نہیں کرتا جب تک یہ نہیں دیکھ لیتا کہ مطلوبہ اس کی طبیعت اور عادت ہوگئی ہیں اور اس کی یہ حالت ہوگئی ہے کہ اگر روک ٹوک نہ کی جائے گی تو بھی خلاف اغراض کی طرف میلان نہ کرے گا پس اسی طرح فوج کے منتظم پر ضروری ہے کہ وہ ان امور کو خوب جان لے جو کہ کرنے کے لائق ہیں۔ اور ان سے بھی واقف ہو جن سے لشکریوں کو تنبیہ کرتے ہیں۔ اور منتظم کو ایسا ہونا چاہئے کہ ان امور کو کبھی ترک نہ کرے اور معاونین کی تعداد محدود نہیں ہے بلکہ شہر کی ضرورتوں پر موقوف ہے کیونکہ کبھی ایک کام کے لئے دو دو معاون کی ضرورت پڑتی ہے اور کبھی دو خدمتوں کے لئے ایک ہی معاون کافی ہوتا ہے لیکن اصل معاون پانچ ہیں۔

اوّل قاضی، پس یہ شخص آزاد، مرد، بالغ، عاقل، کام کے لائق ہو معاملات کے طریقے اور متخاصمین [illegible] یب کو خوب جانتا ہو، طبیعت سخت اور حلیم بھی ہو کہ دونوں باتیں اس میں پائی جائیں، اس کو چاہئے کہ مقدمہ میں دو بات پر نظر کرے۔ اوّل یہ کہ صورت حال دیکھے آیا یہ کوئی معاملہ ہے یا کوئی ظلم وزیادتی ہے یا کوئی آپس کا سابقہ ہے۔ دوم یہ کہ ہر شخص اپنے مقابل سے کیا چاہتا ہے آیا وہ صحیح ہے کہ نہیں، اور وجہ معرفت کو بھی دیکھنا چاہئے کیونکہ ایک کے پاس ایسی صریح حجت ہوتی ہے جس میں لوگوں کو کچھ شک نہیں ہوتا اور وہ صریح [illegible] ینا چاہتی ہے اور دوسرے کے پاس اس سے کم درجہ کی دلیل ہوتی ہے جو اس حکم کے علاوہ حکم دینا چاہتی ہے۔ دوم امیر لشکر کو اس شان کا ہونا چاہئے کہ وہ سامان حرب سے خوب واقف ہو، فوج میں جوانمرد اور دلیر لوگوں کو بھرتی کرے اور ہر شخص کے مبلغ منفعت کو معلوم کرے، فوج کی تربیت، جاسوس [illegible] و مقرر کرنے کی کیفیت اس کو خوب معلوم ہو اور دشمنوں کے داؤں گھات سے بخوبی آگاہ ہو۔ سوم، منتظم شہر (یعنی کوتوال شہر) ایسا شخص ہونا چاہئے جو دلیر ہو شہر کی اصلاح وفساد کی باتوں سے خوب واقف ہو، اس میں سختی اور حلم بھی ہو اور ایسے لوگوں میں سے ہو جو ناپسندیدہ بات کو دیکھ کر خاموش نہ رہ سکتے ہوں اور اس کو چاہئے کہ

ہر قوم کے لئے انہی میں سے ایک سرغنہ مقرر کرلے جو ان کے حالات سے پورا واقف ہو۔ اس کے ذریعہ ان کا انتظام کیا کرے اور ان کے افعال کا اس سے مواخذہ کیا کرے۔ چہارم عامل (یعنی تحصیل دار جو تحصیل مال پر متعین ہو) سو یہ ایسا شخص ہونا چاہئے جو اموال پر محصول لینے اور آمدنی کو مستحقین میں تقسیم کرنے کی کیفیت سے بخوبی واقف ہو، پنجم وکیل جو بادشاہ کے معاشی امور کا متکفل ہو کیونکہ بادشاہ احوال ملکی کی وجہ سے اپنی اصلاح معاش کی طرف توجہ نہیں کرسکتا۔

نواں باب: ارتفاق رابع کا بیان

یہ وہ علم ہے جس میں شہروں کے حکام و سلاطین کی سیاست پر بحث ہوتی ہے اور ان تعلقات کے محفوظ رکھنے کی کیفیت بیان کی جاتی ہے جو مختلف اقالیم کے باشندوں کے مابین ہوتے ہیں اور یہ اس لئے کہ جب ہر رئیس اپنے اپنے شہر کا مستقل مالک ہوجاتا ہے اس کے پاس اموال آنے لگتے ہیں اور دلیر طبع لوگوں کی جماعتیں اس سے آملتی ہیں تو ان میں اختلاف مزاج اور اختلاف استعداد کی وجہ سے جور و ظلم ہونے لگتا ہے قانون عدل کو چھوڑ دیتے ہیں ایک دوسرے کے شہر لینے کی طمع کرتے ہیں، باہم حسد کرتے ہیں اور جزئی رجحانات مثلاً اموال و آراضی کی خواہش، یا حسد و کینہ کی وجہ سے باہم جنگ و جدال کرنے لگتے ہیں۔ جب بادشاہوں میں یہ خرخشے بڑھتے ہیں تو خلیفہ کی ضرورت پڑتی ہے۔ خلیفہ سے ایسا شخص مراد ہے جس کے پاس اتنا لشکر اور سامان ہو کہ دوسرے شخص کا اس سے ملک لینا عادتاً ناممکن ہو کیونکہ ایسے شخص سے ملک لینا نہایت درجہ کوشش اور محنت کے بعد بہت سی جماعتوں کے اتفاق اور کثیر اموال صرف کرنے کے بعد ہی متصور ہوسکتا ہے جس کے اہتمام سے لوگ قاصر ہیں اور عادتاً محال ہے جب خلیفہ مقرر ہوجاتا ہے اور ملک میں اپنی عمدہ سیرت کا عملدرآمد کرتا ہے، سرکش لوگ اس کے فرمانبردار اور بادشاہ اس کے مطیع ہوجاتے ہیں تو خدا کی نعمت کامل ہوجاتی ہے شہر میں سکون اور لوگوں کو اطمینان حاصل ہوجاتا ہے خلیفہ کو ایسے درندہ طبیعت لوگوں سے جنگ کرنے کی ضرورت پڑا کرتی ہے جو لوگوں کے مال لوٹتے ہیں ان کی اولادوں کو اسیر کرتے ہیں ان کے ننگ و ناموس کی پردہ دری کرتے ہیں، تاکہ ان سب مضرتوں کو لوگوں سے دور کردیا جائے۔ اسی ضرورت کی وجہ سے بنی اسرائیل نے اپنے نبی سے کہا تھا (ہمارے لئے ایک بادشاہ کو بھیجو تاکہ ہم خدا راہ میں لڑیں) جب شہوت پرست اور درندہ سیرت

لوگ اپنی عادت خراب کر لیتے ہیں اور ملک میں فساد مچاتے ہیں تو بلا واسطہ یا بالواسطہ انبیا اللہ تعالیٰ الہام فرماتا ہے کہ ایسے لوگوں کا رعب وداب اٹھا دیا جائے اور ان میں جو بالکل قابل اصلاح نہ ہو وہ قتل کر دیا جائے اس قسم کے لوگ نوع انسانی میں اس عضو کے مانند ہیں جو گل کر بیکار ہو جاتا ہے پس خلیفہ سب سے پہلے ان سے جنگ پر آمادہ ہوتا ہے اور یہ وہ حاجت ہے جس کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے (اگر خدا تعالیٰ لوگوں کو بعض لوگوں کے ذریعہ سے دفع نہ کرے تو تمام کلیسا اور عبادت خانے منہدم کر دیئے جائیں) اور اسی لئے خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے (ان سے لڑو یہاں تک کہ کوئی فتنہ نہ رہے) اور خلیفہ بغیر مال اور فوج کے سرکش بادشاہوں سے لڑ کر ان کے رعب داب کو ختم نہیں کر سکتا اور ضروری ہے کہ خلیفہ ان اسباب سے واقف ہو جو جنگ و صلح کے مقتضی ہوتے ہیں اور خراج و جزیہ مقرر کرنے کے مقتضی ہوتے ہیں۔ اس کو پہلے سوچ لینا چاہئے کہ مقابلہ سے کیا مقصود ہے۔ کسی ظلم کا دفع کرنا ہے یا ان ناپاک درندہ طبیعت لوگوں کو ہلاک کرنا جن کی اصلاح کی امید نہیں، یا ان سے کم درجہ کے برے لوگوں کو ان کی شوکت ختم کر کے سرزنش کرنا، یا مفسد لوگوں کے ان کے سرداروں کو قتل کر کے جو ان کو تدبیر بتلاتے ہیں تہدید کرنا، یا ان کو قید کرنا، یا ان کے املاک واموال ضبط کرنا، یا رعیت کا ان سے رُخ پھیر دینا۔

اور خلیفہ کے لئے یہ مناسب نہیں کہ کسی غرض کے حاصل کرنے کے لئے اس سے زیادہ سخت اور مشکل امر میں پھنس جائے۔ پس موافقین کی ایک عمدہ جماعت فنا کر کے اموال جمع کرنے میں لگ جائے۔ خلیفہ کا فرض ہے کہ قوم کی دلجوئی کرے، ہر ایک نفع رسانی کا اندازہ رکھے، ہر شخص کی جو حالت ہے اس سے زیادہ کسی پر اعتماد نہ کرے۔ سرداروں اور دانشمند لوگوں کی عزت کرے، ترغیب اور تخویف سے ان کو جنگ پر آمادہ کرے اور اس کی اول نظر اس بات کی طرف ہو کہ ماتحت بادشاہوں کی جماعت متفرق رہے ان کی طاقت کمزور پڑ جائے اور ان کے دل خائف رہیں حتی کہ وہ اس کے روبرو ایسے لاچار ہو جائیں کہ اپنے لئے کچھ منصوبہ نہ کر سکیں جب ایسا بنانے میں کامیابی ہو جائے ان میں وہ بات جاری کرے جس کا جنگ سے پہلے ارادہ کیا تھا پس اگر ان سے دوبارہ فساد کا خوف ہو تو گراں، گراں خراج اور جزیہ ان پر مقرر کر دے ان کے قلعے گرا کر ایسا کر دے کہ پھر بغاوت نہ کر سکیں۔ چونکہ خلیفہ ایسے مزاج کا محافظ ہوتا ہے جو نہایت مخالف خلطوں سے حاصل ہوا ہے اس

لئے ضروری ہے کہ بیدار مغز ہو ہر طرف جاسوس بھیجے اور اپنی فراست کاملہ سے کام لے۔ اور جب اپنی فوج میں کسی جماعت کے اتفاق کر لینے کو پائے تو فوراً ان کے مقابلہ میں دوسری جماعت متعین کرے جو ان سے موافقت نہ کر سکیں۔ اور جب کسی کو خلافت کا خواہاں دیکھے تو فوراً اس کی شوکت کو زائل کر دے اور اس کی قوت کو کمزور کر دے۔ اور خلیفہ کے لئے ضروری ہے کہ اپنے حکم کے منوانے کی اور خیر خواہی پر متفق رہنے کی لوگوں میں عادت ڈالے اور اس بارے میں محض قبول کرنا کافی نہ سمجھے بلکہ قبول کی کوئی علامت ظاہرہ ہو جس سے رعایا پر دارو گیر کر سکے، مثلاً اس کے لئے دعا کرنا، بڑے بڑے مجمعوں میں اس کی تعظیم کرنا اور لوگوں کا ایک روش اور ہیئت پر جس کا خلیفہ نے حکم دیا ہے پابند رہنا، جیسے ہمارے زمانہ میں اشرفیوں پر خلیفہ کا نام کندہ ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

دسواں باب: اصول ارتفاقات پر لوگوں کے اتفاق کا بیان

واضح ہو کہ اقالیم معمورہ کے ہر شہر اور اخلاق حمیدہ اور معتدل مزاج اقوام میں سے ہر قوم آدم علیہ السلام کے عہد سے لے کر آج تک اصول تدابیر سے خالی نہیں رہی اور یہ اصول ہر زمانہ میں سب کے نزدیک مسلم رہتے آئے ہیں جن کی مخالفت کرنے والوں کو لوگ بہت برا سمجھتے ہیں اور بوجہ شہرت کے ان اصول کو بدیہی سمجھتے ہیں اور بعض فروعات تدابیر اور ان کی بعض صورتوں میں اختلاف ہونے سے آپ ہمارے بیان میں شک نہ کریں۔ مثلاً سب کا اتفاق ہے کہ مردوں کی عفونت دور کی جائے اور ان کا ستر چھپا رہے لیکن اس کی صورتوں میں اختلاف ہے بعض نے زمین میں دفن کرنا پسند کیا اور بعض نے آگ میں جلانا اچھا سمجھا۔ سب اس پر متفق ہیں کہ نکاح کی شہرت کی جائے اور حاضرین کے سامنے اس میں اور زنا میں تمیز ہو جائے لیکن اس کی صورتوں میں لوگوں کا اختلاف ہے۔ بعض نے گواہوں، ایجاب وقبول اور ولیمہ کو بہتر سمجھا اور بعض نے دف، گانا باجہ اور لباس فاخرہ کو جو صرف بڑی بڑی دعوتوں میں ہی پہنا جانا ہے اختیار کر لیا۔ زانی اور چور کو سزا دینے میں سب کا اتفاق ہے لیکن اس کی صورت میں اختلاف ہے پس بعض نے سنگسار اور ہاتھ کاٹنا پسند کیا اور بعض نے سخت مار پیٹ اور بامشقت قید، بھاری جرمانوں کی سزا اختیار کی۔ اور نیز ان اصولوں سے دو فریقوں کی مخالفت ہمارے قول سابق سے آپ کو نہ روکے۔

ایک فریق ان احمق لوگوں کا ہے جن کی حالت چار پایوں سے ملتی جلتی ہے۔ لوگوں کی بڑی

اکثریت، ان کے ناقص العقل اور ناقص المزاج ہونے میں کچھ شبہ نہیں کرتی اور ان کی حماقت کی یہی دلیل ہے کہ وہ اپنے آپ کو ان قیود کا پابند نہیں سمجھتے۔ دوسرا فریق فاسق لوگوں کا ہے اگر ان کے دلوں سے فسق نکال دیا جائے تو وہ ان تدابیر کے معتقد ہو جائیں لیکن ان پر نفسانی خواہشات غالب ہیں جس کی وجہ سے خود کو گنہگار سمجھتے ہوئے نافرمانی کرتے ہیں، لوگوں کی بیٹیوں اور بہنوں سے زنا کرتے ہیں اور اگر کوئی ان کی بیٹیوں اور بہنوں سے زنا کرے تو غصہ سے پھٹ پڑیں اور قطعاً جان لیں کہ لوگوں پر ان برائیوں کا وہی اثر ہوتا ہے جو ان پر ہوا ہے اور ان باتوں سے شہر کے انتظام کو ضرر پہنچتا ہے۔ لیکن خواہش نے ان کو اندھا کر رکھا اور یہی حال چوری اور غصب وغیرہ کا ہے۔ اور کوئی یہ خیال نہ کرے کہ لوگوں نے بلاوجہ ان تدابیر پر اس طرح اتفاق کر لیا جس طرح تمام اہل مشرق و مغرب کا کھانے کی نسبت غذا بنانے میں اتفاق ہو جائے۔ کیا ایسا خیال کرنے سے بڑھ کر کوئی دھوکہ ہو سکتا ہے؟ بلکہ فطرت سلیمہ یہ فیصلہ کرتی ہے کہ تمام لوگ باوجودیکہ ان کے مزاج مختلف، ان کے شہر دور دراز ان کے مذہب جدا جدا ہیں ان اصول پر ضرور کسی مناسبت فطریہ کی وجہ سے متفق ہیں۔ یہ ایسی مناسبت فطریہ ہے جو نوعی صورت کی وجہ سے اور ان حاجات کثیرۃ الوقوع کی وجہ سے جن کو نوع کے افراد نے اختیار کیا ہے اور ان اخلاق کی وجہ سے جن کو صحت نوعی نے افراد کے مزاجوں میں قائم کر دیا ہے پیدا ہوتی ہے۔ اگر کوئی آدمی شہر سے دور دراز جنگل میں پرورش پائے اور کسی کی رسم و عادات سے واقف نہ ہو تو ضرور ہے کہ اس کو بھوک، پیاس اور خواہش نفسانی کی حاجتیں پیش آئیں گی اور بلاشک عورت کی طرف رغبت پیدا ہوگی اور ان دونوں کے صحت مزاج سے اولاد بھی پیدا ہوں گی اور گھر والے باہم مل کر رہنے لگیں گے اور ان میں معاملات پیش آئیں گے پس ارتفاق اوّل منتظم ہوگا اور پھر جب ان کی اور بھی کثرت ہوگی تو پھر ضرور ان میں صاحب اخلاق حمیدہ بھی پیدا ہوں گے اور ان میں وہ معاملات پیش آئیں گے جس سے تمام تدابیر عمل میں لانے کی ضرورت پڑے گی۔ واللہ اعلم۔

گیارھواں باب: لوگوں کی باہمی رسوم کا بیان

واضح ہو کہ رسوم کو تدابیر سے وہی نسبت ہے جو دل کو بدن انسانی سے ہے، مذاہب کا مقصود اوّل یہی ہیں اور شرائع الٰہیہ میں انہی کے مباحث اور اشارات ہیں اور ان رسوم کے چند اسباب

ہیں جن سے یہ پیدا ہوتی ہیں مثلاً حکما کا ان کو مستنبط کرنا اوران لوگوں کے دلوں میں جونور ملکی سے موئید ہیں الہام الٰہی کا ہونا، اور چند اسباب ہیں جن کی وجہ سے یہ رسوم لوگوں میں پھیلتی ہیں جیسے کسی بڑے بادشاہ کے طریقہ کا رسم ہو جانا جس کے لوگ مطیع ہوں، یا ان رسوم کا لوگوں کے دلی خیالات کے مطابق ہونا جن کو لوگ اپنی دلی شہادت سے قبول کر لیتے ہیں اوران کی سخت پابندی کرنے کے یہی اسباب ہوتے ہیں کہ ان کے ترک کرنے میں غیبی سزا ملنے کا یا سستی کرنے میں فساد واقع ہونے کا تجربہ ہوتا ہے۔ یا صاحب رائے سلیم ان کے ترک کرنے پر ملامت کرتے ہیں وغیرہ ذالک۔ اور دانا آدمی ان نظائر سے جن کو ہم نے ذکر کیا، ان رسوم کے بعض شہروں میں جاری اور بعض شہروں میں فوت ہونے سے ہماری بات کی خوب تصدیق کر سکے گا۔ اور رسوم مرجبہ نفس الامر میں صحیح ہیں کیونکہ تدابیر مناسبہ کی یہی محافظ ہیں۔ اور افراد انسانی کوانہی کے ذریعہ سے کمال نظری یا عملی حاصل ہوتا ہے اوران کے نہ ہونے سے اکثر لوگ بہائم طبع ہو جائیں۔ بہت سے آدمی نکاح ودیگر معاملات ٹھیک ٹھیک طریقہ سے کرتے ہیں اور جب ان سے ان قیود کی پابندی کا سبب پوچھا جائے تو موافقت قوم کے سوا کوئی جواب نہ ملے گا۔ زیادہ سے زیادہ ان کوان رسوم کا علم اجمالی ہوتا ہے جس کو صاف طور پر ان کی زبان بیان نہیں کر سکتی چہ جائیکہ ان تدابیر کے فوائد کی تمہید بیان کر سکیں۔

ایسا شخص اگر ان رسوم کی پابندی نہ کرے تو بہائم صفت شمار کیا جائے گا۔ لیکن ان رسوم میں بری رسوم بھی داخل ہو جایا کرتی ہیں جس کی وجہ سے لوگوں کو اپنے اچھے طریقے کی تمیز میں اشتباہ پڑ جاتا ہے اور برے رسوم کے پیدا ہونے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ کبھی وہ لوگ سردار ہو جاتے ہیں جن پر جزئی رائیں غالب ہوتی ہیں اور مصالح کلیہ سے بعید ہوتے ہیں تو وہ درندوں کے سے کام کرنے لگتے ہیں جیسے رہزنی اور غصب وغیرہ۔ یا ان سے شہوت پرستی کے کام سرزد ہوتے ہیں۔ جیسے لواطت اور مردوں کا زنانہ پن، یا ضرر رساں پیشے اختیار کرتے ہیں جیسے سودخوری اور ناپ تول میں کمی۔ یا لباس اور ولیموں میں ایسی عادات اختیار کرتے ہیں جن کا انجام اسراف ہوتا ہے اوران کے مہیا کرنے میں بڑے اہتمام کی ضرورت پڑتی ہے یا تفریح کے لئے اپنے شوق بڑھاتے ہیں جن کے سبب سے امور معاش ومعاد معطل ہو جاتے ہیں جیسے گانا بجانا، شطرنج، شکار، کبوتر بازی وغیرہ یا مسافروں پر پر مشقت محصول مقرر کرتے ہیں اور رعیت سے ایسے خراج وصول کرتے ہیں

جس سے وہ تباہ ہو جاتی ہے یا باہم حرص و بغض زیادہ کر لیتے ہیں پس ان کو یہ اچھا معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں سے ایسا برتاؤ کریں اور اس کو ناپسند کرتے ہیں کہ اور لوگ ان سے ایسا معاملہ کریں۔ ان کی وجاہت اور دبدبہ کی وجہ سے کوئی ان کو برا نہیں کہہ سکتا۔ اس کے بعد فاسق، فاجر لوگ پیدا ہوتے ہیں وہ ان کی پیروی کرتے ہیں اور ان کی مدد کرتے ہیں اور ان اعمال کے پھیلانے میں بڑی کوشش کرتے ہیں۔ اور پھر ایک قوم ایسی آتی ہے جن کے دلوں میں نہ اعمال صالحہ کا قوی میلان ہوتا ہے نہ اعمال فاسدہ کا۔ پس اپنے رؤسا کی حالت دیکھ دیکھ کر ان میں بھی انہی امور کی آمادگی پیدا ہو جاتی ہے اور کبھی ان کو نیک باتوں کا پتہ ہی نہیں چلتا اور ایسے خاندانوں کے آخر میں ایسے لوگ باقی رہا کرتے ہیں جن کی فطرتیں درست ہوتی ہیں وہ ان سے میل جول نہیں رکھتے اور غصہ کی حالت میں خاموش رہتے ہیں پس ان کی خاموشی سے بری رسمیں قائم اور مستحکم ہو جاتی ہیں۔

کامل العقل لوگوں کا فرض ہے کہ حق کے پھیلانے و جاری کرنے میں اور باطل کے نابود کرنے میں پوری کوشش کریں اور بسا اوقات یہ بات بغیر جھگڑے اور لڑائیوں کے ممکن نہیں ہوتی۔ پس یہ لڑائی جھگڑے تمام نیک کاموں میں افضل شمار ہوں گے اور جب دنیا میں نیک روی کا طریقہ قائم ہو جائے پس ہر زمانہ میں لوگ اس کو تسلیم کریں کہ اس پر ان کی زندگی اور موت ہونے لگے اور اسی پر ان کے نفوس اور خیالات جم جائیں اور وہ اس طریقہ کو وجوداً و عدماً اصول کا متلازم سمجھ لیں تو پھر کوئی اس سے باہر نہ ہو سکے گا سوائے اس شخص کے جس کا نفس ناپاک ہو، کم عقل ہو شہوت اس پر غالب ہو اور اس کی گردن پر نفس پرستی سوار ہو۔ پس جب وہ اس طریقہ سے باہر قدم رکھے گا تو اپنے دل میں گنہگار ہونے کی شہادت کو پائے گا۔ مصلحت کلی اور اس کے درمیان ایک پردہ حائل ہو جائے گی۔ اور جب وہ کام بے باکانہ طور پر کرے گا تو اس کے مرض نفسانی کی یہی شرح ہو جائے گا (یعنی اس کے نفسانی مرض کی کیفیت صاف صاف معلوم ہو جائے گی) اور یہ اس کے دین پر دھبہ ہوگا پس یہ طریقہ نیک جب پورا پورا کامل اور مقرر ہو جاتا ہے تو ملأ اعلیٰ سے اس طریقہ کے موافقین کے لئے دعا اور مخالفین کے لئے بددعا صادر ہوتی ہے۔ اور حظیرۃ القدس میں موافق کے لئے رضامندی اور مخالف کے لئے ناراضی ظاہر ہوتی ہے۔ جب ان طریقوں کی یہ حالت ہوتی ہے تو وہ اس فطرت سے شمار کیے جاتے ہیں جن پر خدا نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ واللہ اعلم۔

مبحث چہارم

سعادت کا بیان

پہلا باب: سعادت کی حقیقت کا بیان

واضح ہو کہ انسان کے کچھ کمالات ایسے ہیں جو باقتضائے صورت نوعی ہوتے ہیں اور بعض کمالات ایسے ہیں جو باقتضائے موضوع نوع یعنی جنس قریب وبعید کے اقتضا سے ہوتے ہیں۔ انسانی سعادت جس کے مفقود ہونے سے مضرت ہوتی ہے اور درست عقل کے لوگ اس کا نہایت اہتمام اور قصد کرتے ہیں وہ نوعی کمالات ہیں اس لئے کہ عادۃً کبھی انسان کی مدح ان صفات کی وجہ سے ہوتی ہیں جن میں معدنی اجسام بھی شریک ہیں مثلاً طول اور عظیم القامہ کا ہونا۔ پس اگر اسی کو سعادت قرار دیں تو پہاڑوں کو یہ سعادت بدرجہ اتم حاصل ہے اور کبھی انسان کی مدح ایسی صفات کی وجہ سے جن میں نباتات شریک ہیں۔ مثلاً مناسب نشو ونما عمدہ عمدہ نقش ونگار اور تر وتازہ صورتیں۔ پس اگر یہی سعادت ہے تو گل لالہ اور گلاب کو کامل سعادت حاصل ہے۔ اور کبھی ایسی صفات کی وجہ سے مدح ہوتی ہے جن میں حیوانات شریک ہیں جیسے زور آوری، بلند آوازی، جفتی کی طاقت، زیادہ کھانا پینا، غضب اور کینہ کا زیادہ ہونا، پس اگر اسی کا نام سعادت ہے۔ تو گدھے میں کامل درجہ کی سعادت پائی جاتی ہے اور کبھی ان صفات کی وجہ سے انسان کی مدح کی جاتی ہے جو صرف انسان ہی میں پائی جاتی ہیں جیسے مہذب اخلاق، عمدہ تدابیر، اعلیٰ قسم کی صفتیں، بلندی مرتبہ، پس بادی الرائے میں انہی امور کا نام سعادت انسانی ہے اور اسی لئے ہر قوم جس کو آپ بڑا عاقل اور دانشمند پاتے ہیں انہی اوصاف کے حاصل کرنے کا قصد کرتی ہے اور ان کے سوا دوسری صفات کو صفات مدح ہی نہیں سمجھتی۔ لیکن ابھی تک پوری تنقیح نہیں کیونکہ ان صفات کی اصل ہر ہر حیوان

میں موجود ہے مثلاً شجاعت کی اصل غصہ، انتقام لینا، شدائد میں ثابت قدمی، خطرناک کاموں میں پیش قدمی کرنا ہے اور یہ سب امور بہائم کے نروں میں کثرت سے پائی جاتی ہیں لیکن ان کو شجاعت اسی وقت کہا جاتا ہے کہ وہ نفس ناطقہ کے فیضان سے اس طرح مہذب ہو جائیں کہ مصلحت کلیہ کے مطیع اور عقلی خواہش سے پیدا ہونے والے ہوں اور اسی طرح اور صنعتوں کی اصل بھی حیوانات میں موجود ہے۔ چڑیا اپنے آشیانہ کو بناتی ہے بلکہ بعض صنعتیں ایسی ہیں جن کو حیوانات بالطبع بناتے ہیں اور انسان بہ تکلف بھی ویسی نہیں بنا سکتا۔ پس معلوم ہوا کہ یہ امور حقیقی سعادت نہیں بلکہ بالطبع سعادت شمار کی جاتی ہیں اور سعادت حقیقی یہ ہے کہ قوت بہیمیہ نفس ناطقہ کی مطیع ہو اور خواہش عقل کے تابع ہو اور نفس ناطقہ قوت بہیمیہ پر، اور عقل ہوس پر غالب ہو۔ باقی اور خصوصیات لغو ہیں۔

واضح ہو کہ حقیقی سعادت سے جن امور کا تعلق ہے وہ دو قسم کے ہیں ایک قسم ایسی ہے جس میں پیدائشی طور پر نفس ناطقہ کا فیضان امور معاش میں ہوتا ہے لیکن اس قسم سے مقصد اصلی حاصل ہونا ممکن نہیں بلکہ بسا اوقات ان افعال کی زیبائش ہی میں غرق ہونا پڑتا ہے بالخصوص فکر جزئی کی صورت میں جیسا کہ یہ اس کمال ناقص کی شان ہے جو کمال مطلوب کی ضد ہے جیسے کہ کوئی شخص غصہ پیدا کر کے اور کشتی لڑ کر شجاعت حاصل کرنا چاہے یا عرب کے اشعار اور خطبوں کی واقفیت سے فصیح بننا چاہے۔ اور اخلاق اپنے ہم جنسوں کی مزاحمتوں سے ظاہر ہوتے ہیں اور ضرورتوں کے پیش آنے سے تدابیر حاصل ہوتی ہیں اور آلات و مادہ سے صنعتوں کی تکمیل ہوتی ہے اور یہ سب چیزیں زندگی کے تمام ہوتے ہی ختم ہو جاتی ہیں۔

پس جو شخص ان حالات میں ناقص رہ کر مرا اور ان امور سے کچھ بیزار بھی تھا تو وہ صرف اصلی کمال سے ہی محروم رہے گا۔ اور اگر ان تعلقات کی صورتیں نفس کو لپٹی ہوں گی تو نفع سے زیادہ اس کو مضرت ہوگی اور دوسری قسم وہ ہے جس کا اثر یہ ہے کہ قوت بہیمیہ ملکیہ کی فرمانبردار ہو جائے اس کے حکم بموجب کام کرے اور اس کے رنگ سے رنگین ہو جائے۔ اور قوت ملکی ایسی ہو کہ بہیمیت کے ادنیٰ اثر کو قبول نہ کرے، اس کے کمینہ نقوش اس میں نہ جم سکیں جیسے موم میں انگشتری کے نقوش جم جاتے ہیں۔ اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ جب ملکی طاقت کسی چیز کا تقاضہ کرے اور قوت بہیمیہ کو حکم کر کے اس کا مطالبہ کرے تو بہیمیت اس کی اطاعت کرے کسی قسم کی بغاوت نہ کرے اور اس کی

تعمیل سے باز نہ رہے اور ایسے ہی ملکی طاقت اس کو حکم کرتی ہے اور بہیمیت اس کو قبول کرتی رہے اور اس کا امضا ہوتا رہے حتی کہ وہ اس کی عادی ہو کر مشاق ہو جائے اور یہ امور جن کو قوت ملکیہ چاہے اور بہیمیہ مجبوراً قبول کرے، انہی میں حاصل ہوتی ہے جن میں ملکیت کو خوشی اور بہیمیت کو تنگ دلی حاصل ہو جیسے ملکوت کے ساتھ مشابہ ہونا اور جبروت کا ملاحظہ کرنا کیونکہ یہ حالتیں قوت ملکی کا خاصہ ہیں اور قوت بہیمی کو ان حالات سے نہایت بعد ہے۔ یا یہ بات جب حاصل ہوگی کہ قوت بہیمیہ کی خواہشات، لذائذ اور مرغوبات کو ترک کر دیا جائے، اس حصہ کا نام عبادات اور ریاضت ہے یہ ان مقصود اخلاق کو حاصل کرنے کے ذریعے ہیں جو موجود نہیں ہوتے۔

پس اس مقام کی تحقیق کا مرجع یہ ہوا کہ سعادت حقیقی بغیر عبادات کے حاصل نہیں ہو سکتی اس لئے مصلحت کلی افراد انسان کو صورت نوعیہ کے روشندان سے ندا کرتی ہے اور نہایت تاکیدی حکم کرتی ہے کہ بقدر ضرورت ان صفات کی اصلاح کی جائے جو انسان کے لئے کمال ثانی ہیں اور اپنا مقصد اصلی اور بڑی مہم اس بات کو ٹھہرائے کہ نفس کو مہذب کرے اور ایسی ہیئت سے مزین کرے جن کی وجہ سے وہ ملأ اعلیٰ سے مشابہ ہو جائے اس میں ایسی استعداد پیدا ہو جائے کہ عالم جبروت و ملکوت کے اثر اس میں پیدا ہو سکیں۔ قوت بہیمی، ملکی کے زیر فرمان اور نہایت مطیع رہے اور وہ ملکی احکام کا مظہر بن جائے۔ افراد انسانی میں جب نوعی تندرستی ہوتی ہے اور ان کا مادہ احکام نوع کے پوری طرح ظاہر ہونے کے قابل ہوتا ہے تو وہ اس سعادت کے نہایت مشتاق ہوتے ہیں اور جس طرح لوہا مقناطیس کی طرف کھنچتا ہے اسی طرح یہ سعادت کی طرف کھنچتے ہیں یہ ایک جبلی فطری امر ہے جس پر خدا نے اپنی مخلوق کو پیدا کیا ہے اور اسی لئے جب بنی آدم میں کوئی قوم معتدل مزاج ہوئی تو ان میں وہ عظما بھی ضرور ہوئے جو ان اخلاق حمیدہ کے تکمیل کی کوشش کرتے ہیں اور اس کو اعلیٰ ترین سعادت سمجھتے ہیں۔ سلاطین اور حکما انہی کی طرف دیکھتے ہیں کم درجہ کے لوگ انہی سے فیضیاب ہوتے ہیں ان کو تمام دنیا کی سعادت نصیب ہوتی ہے اور یہ لوگ ملائکہ کی جماعت میں داخل ہوتے ہیں۔ انہی کی جماعت میں منسلک ہوتے ہیں حتی کہ لوگ ان سے برکت حاصل کرتے ہیں اور ان کے ہاتھ پاؤں پر بوسہ دیتے ہیں کیا عرب و عجم باوجود اختلاف عادات و ادیان اور دوری بلدان و اوطان بغیر کسی مناسبت فطریہ کے شئے واحد پر متفق ہو سکتے ہیں اور یہ وحدت

نوعی سب ایک سی حالت کا اقرار کر سکتے ہیں حالانکہ آپ ہر آدمی کی فطرت میں قوت ملکیہ کا موجود ہونا اوران کے افاضل اور عمدہ لوگوں کے مراتب بھی پہچان چکے ہیں؟ نہیں ہرگز نہیں۔ واللہ اعلم۔

دوسرا باب: لوگوں کا سعادت میں مختلف ہونے کا بیان

واضح ہو کہ شجاعت اور تمام اخلاق، جس طرح افراد انسانی ان اوصاف میں مختلف ہیں یعنی بعض ایسے ہیں جن میں وصف شجاعت بالکل مفقود ہے اور کسی ایسی مخالف حالت کی وجہ سے جو ان کے نفس طبیعت میں ہوتی ہے، شجاعت کے حاصل ہونے کی امید ہی نہیں ہوتی جیسے مخنث اور نہایت ضعیف القلب، شجاعت سے محروم ہیں۔ اور بعض ایسے ہیں کہ ان میں شجاعت بالفعل نہیں ہوتی لیکن شجاعت کے مناسب افعال، اقوال اور مناسب ہیتوں کی مشاقی کے بعد شجاع ہونے کی امید ہو سکتی ہے۔ جبکہ شجاع لوگوں سے وہ ان افعال و اقوال کو حاصل کرتے ہیں، پیشوایان شجاعت کے واقعات یاد کرتے ہیں جو سختیوں میں ثابت قدم رہے اور ہلاکت کے موقعوں پر اقدام کیا۔ اور بعض ایسے ہیں جن میں اصل ملکہ پیدا کیا گیا ہے اور ان سے ہمیشہ لغزشیں ہوتی رہتی ہیں پس اگر ان کو اس سے رکنے کا حکم دیا جائے تو ان کی زیست تنگ ہو جائے اور ناگواری سے خاموش رہیں اور اگر ان کی پیدائشی حالت کے مناسب کوئی حکم دیا جائے تو ان کی حالت گندھک کے مانند ہے جس کو آگ لگتے ہی جلنے میں کچھ دیر نہیں ہوتی۔ اور بعض ایسا ہے جس میں یہ ملکہ نہایت وافر اور کامل پیدا کیا گیا ہے وہ اپنے مقتضیات طبع کی طرف خود بخود دوڑتا ہے اگر اس کو بزدلی کی طرف بزور بلائیں تو وہ بالطبع اس کو قبول نہیں کرتا اور بغیر کسی رسم و رواج اور بغیر کسی دوسرے کی خواہش کے اس کو اس ملکہ کے کاموں اور ہیتوں کا کرنا آسان ہوتا ہے ایسا آدمی اس ملکہ کا امام ہوا کرتا ہے اس کو کسی پیش رو او ۔ علم کی ضرورت نہیں ہوتی اور جو لوگ اس ملکہ میں اس سے کم درجہ کے ہوتے ہیں ان کو اس کے طرز کا اختیار کرنا اس کے رسوم کا اختیار کرنا اور بہ تکلف اس کی روش اختیار کرنا اور اس کے واقعات یاد کرنا ضروری ہے تا کہ ان کو وہ کمال جو ان کے حق میں مقدر اور ممکن ہے حاصل ہو جائے۔ اسی طرح لوگ اس حالت پر مختلف ہیں جس پر ان کی سعادت کا مدار ہے پس بعض ایسے ہیں جن میں سعادت کی صلاحیت ہی نہیں جیسے وہ لڑکا جس کو خضر نے مار ڈالا تھا بالطبع کافر تھا اسی طرف اللہ تعالیٰ کے اس قول میں اشارہ ہے (بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں سو یہ اب

رجوع نہ ہوں گے)'' اور بعض ایسے ہیں جو فاقد السعادت تو ہیں لیکن ان میں اصلاح کی امید ہے جبکہ وہ سخت ریاضتیں کریں، اعمال پر مداومت کریں، نفس ان اعمال سے متاثر ہوتا رہے۔ ایسے لوگ انبیا علیہم السلام کی جوش دہندہ دعوت اور ان کے طریقوں کے محتاج ہوتے ہیں اس قسم کے لوگ بکثرت پائے جاتے ہیں۔ بعثت انبیا کے لئے اولا بالذات یہی لوگ مقصود ہیں۔ اور بعض ایسے ہیں جن میں اخلاق اجمالا رکھے گئے ہیں اور ان سے لغزشیں بھی ہوتی ہیں لیکن وہ تفصیلی امور میں اور اس خلق کو مناسب ہیئتوں کے درست کرتے ہیں بسا اوقات رہبر کے محتاج ہوتے ہیں اس آیت میں اسی مرتبہ کی طرف اشارہ ہے'' (قریب ہے کہ اس کا تیل روشن ہو جائے اگرچہ اس کو آگ بھی نہ لگے)'' ان لوگوں کو سباق کہتے ہیں۔ لوگوں میں ایک طبقہ انبیا کا ہے جن کو یہ سعادت کامل نصیب ہوتی ہے اس کے مناسب ہیئتوں کے اختیار کرنے، غیر حاصل کمال کے حاصل کرنے، موجود کو باقی رکھنے اور ناقص کی تعلیم کرنے میں ان کو نہ رہبر کی حاجت ہوتی ہے اور نہ کسی کے کہنے کی ضرورت۔ اور وہ طریقہ جس پر وہ اپنے فطری مقتضیٰ سے عمل کرتے ہیں، لوگوں کی ہدایت کے لئے قانون اور سنن بن جاتا ہے جس کو لوگ یاد رکھتے ہیں اور اپنا دستور العمل کر لیتے ہیں اور جبکہ آہنگری اور نجاری وغیرہ عام لوگوں کو بغیر اپنے بزرگوں کے منقول شدہ طریقوں کی پیروی کے حاصل نہیں ہوتی تو ان اعلیٰ مقاصد کی نسبت تم کیا خیال کر سکتے ہو جو سوائے اہل توفیق کے کسی اور کو نصیب نہیں ہوتے۔ اس مقام سے یہ بات بخوبی معلوم ہوگئی کہ انبیا کی طرف متوجہ ہونے کی شدید ضرورت ہے ان کا اتباع واجب ہے اور ان کی احادیث سے شغل رکھنا نہایت ضروری امر ہے۔ واللہ اعلم۔

تیسرا باب: اس سعادت کے حاصل کرنے کی کیفیت میں لوگوں کے مختلف طور طریقے

واضح ہو کہ یہ سعادت دو طریقہ سے حاصل ہوتی ہے ایک وہ طریقہ ہے جس میں قوت بہیمیہ سے گویا بالکل الگ ہو جانا ہے اور یہ اس طرح سے ہوتا ہے کہ ایسے ذرائع اختیار کئے جائیں جن سے طبیعت کے احکام رک جائیں، اس کی تیزی ختم ہو جائے، اس کے علوم اور حالات کا شعلہ بجھ جائے اور ہمہ تن عالم جبروت کی طرف متوجہ ہو جائے۔ نفس ان علوم کو قبول کرنے لگے جو مکان اور

زمان سے بالکل بری ہیں اوران لذتوں کی خواہش اس میں پیدا ہوجائے جو مالوف لذتوں سے بالکل علیحدہ ہیں یہاں تک کہ لوگوں سے ملنا جلنا ترک کردے، ان کی مرغوب چیزوں میں رغبت نہ کرے، ان کے خوف کرنے کی چیزوں سے بے خوف ہوجائے اور تمام لوگوں سے دور، علیحدگی اختیار کرلے یہ وہ سعادت ہے جس کی حکما اشراقین اور صوفیہ میں مجاذیب طالب رہتے ہیں۔ پس ان میں سے بعض اپنے مقصود کو پہنچ جاتے ہیں اور وہ بہت ہی کم ہیں۔ اور باقی لوگ ہمیشہ اس کے مشتاق اوراس کی طرف آنکھیں لگائے رکھتے ہیں اور بہ تکلف اس کی ہیئات کی نقل کرتے ہیں۔ اور دوسرا طریقہ وہ ہے جس میں بہیمیت کی اصلاح ہوجایا کرتی ہے، اس کی کجی دور کردی جاتی ہے لیکن اس کی اصل حالت باقی رہتی ہے۔ یہ اس طرح پر ہوتا ہے کہ اس بات کی کوشش کی جائے کہ نفس ناطقہ کے افعال، ہیئتیں اوراذکار وغیرہ کی قوت بہیمی ایسی ہی نقل کرتی رہے جیسے گونگا آدمی لوگوں کے اقوال کو اپنے اشاروں سے نقل کرتا ہے اور کوئی مصور نفسانی حالات، خوف اور شرمندگی وغیرہ کی ایسی صورتوں سے نقل کرتا ہے جو ان حالات کے ساتھ ساتھ نظر آیا کرتی ہیں اور جس عورت کا بچہ مرجاتا ہے وہ اس کا غم ایسے کلموں اور دردمندی سے ظاہر کرتی ہے کہ اس کو جو سنتا ہے اس پر غم طاری ہوجاتا ہے اور غم کی صورت اس کے سامنے کھڑی ہوجاتی ہے۔ اور جبکہ تدبیر الٰہی کی بنیاد اس بات پر ٹھہری کہ عالم کی تدابیر میں اقرب سے اقرب اور اسہل سے اسہل کو اختیار کیا جائے اور جملہ افراد کے امور کی اصلاح پر نظر کی جائے نہ یہ کہ شاذ و نادر کی طرف توجہ کی جائے۔ اور مصالح دارین کے قائم کرنے میں انتظام ملحوظ رہے تو یہ لطف الٰہی اور رحمت خدا کا یہ تقاضہ ہوا کہ اولاً و بالذات طریقہ ثانیہ کے قائم کرنے، اس کی طرف دعوت، اور آمادہ کرنے کے لئے رسولوں کو دنیا میں بھیجے اور پہلے طریقہ کی طرف صرف ضروری اشارات اور ضمنی اظہارات سے رہبری کرے، وللہ الحجۃ البالغہ۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ پہلا طریقہ ان لوگوں سے بن پڑتا ہے جن میں لاہوتی کشش زیادہ ہو اور ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں اس طریقہ کے لئے سخت ریاضتوں کی نہایت درجہ فراغ خاطر کی ضرورت ہے۔ اور ایسی مشقتیں جھیلنے والے بہت ہی کم ہیں۔ اس طریقہ کے پیشوا وہ لوگ ہیں جنھوں نے امور معاش کو ترک کردیا اور دنیا میں ان کو دعوت دین کا منصب حاصل نہیں ہے۔ اور

نیز اس طریقہ کی تکمیل بغیر اس کے نہیں ہوتی کہ دوسرے طریقہ کا معقول مجموعہ بھی پیش نظر رکھا جائے اور نیز اس طریقہ سے ایک نہ ایک سعادت سے محرومی ہوگی، یا دنیوی تدابیر کی اصلاح نہ ہوگی یا آخرت کے لئے نفس کی اصلاح نہ ہوگی۔ اگر سب لوگ اسی طریقہ کو اختیار کرلیں تو دنیا ویران ہوجائے گی اور اگر لوگوں کو اس کا حکم دیا جائے تو گویا تکلیف بالمحال ہوگی کیونکہ تدابیر نافعہ ایک فطری شیٔ ہوگئے ہیں اور دوسرے طریقہ کے مقتدا ذوفہم اور صاحب اصلاح لوگ ہوتے ہیں دین ودنیا کی ریاست ان کو حاصل ہوتی ہے انہی کی دعوت مقبول اور انہی کا طریقہ قابل اتباع ہے اور ان کے طریقہ میں صالحین سابقین اور اصحاب الیمین کے کمالات منحصر ہیں اور دنیا میں یہی لوگ بہ کثرت ہیں اور اس طریقہ پر ذکی، غبی، مشغول اور فارغ البال سب چل سکتے ہیں اور اس میں کچھ تنگی بھی نہیں اور بندہ کے لئے یہ طریقہ اس کے نفس کی اصلاح، آراستگی اور ان تکالیف سے بچنے کے لئے جن کا آخرت میں اندیشہ ہے کافی بھی ہے اس لئے کہ ہر شخص کے لئے ملکی افعال مقرر ہیں جنکے ہونے سے اس کو آخرت میں آرام ملے گا اور ان کے نہ ہونے سے اس کو تکلیف ہوگی۔ اب رہے احکام تجرد، تو وہ اس کو عالم قبر میں حاصل ہوجائیں گے گو وہ ان کی جبلت سے بالفعل واقف نہیں اگرچہ وہ ایک زمانہ کے بعد ہوں گے (شعر) تجھ پر زمانۂ عنقریب وہ حالات ظاہر کردے گا جن کی تجھ کو خبر بھی نہ تھی اور تیرے پاس خبروں کو وہ شخص لائے گا جس کے لئے تو نے توشہ تیار نہ کیا تھا۔ اور حاصل کلام یہ ہے کہ خیر وسعادت کے تمام طریقوں کا پورے طور پر احاطہ کرنا اگرلوگوں کے لئے محال سا ہے اور جہل بسیط سے کچھ نقصان بھی نہیں۔ واللہ اعلم۔

چوتھا باب: ان اصول کا بیان جو طریقۂ ثانیہ کی تحصیل کا مرجع ہیں

واضح ہو کہ دوسری قسم کی سعادت حاصل کرنے کے بیشمار طریقے ہیں لیکن خدا نے اپنے فضل سے مجھ کو سمجھایا ہے کہ ان کی انتہا چار خصلتوں پر ہوتی ہے جن کو قوت بہیمیہ قبول کرلیتی ہے جبکہ نفس ناطقہ کا قوت بہیمی پر فیضان ہوتا ہے اور نفس ناطقہ اس کو اپنی مناسب حالتوں پر مجبور کرتا ہے۔ انسان کے تمام حالات میں سے ان اوصاف کو ملأ اعلیٰ سے زیادہ ہمرنگی ہے انہی اوصاف کی وجہ سے انسان ملأ اعلیٰ میں ملنے اور ان کی جماعت میں داخل ہونے کے قابل ہوجاتا ہے۔ خدا نے ہم کو سمجھایا ہے کہ انبیا انہی باتوں کی تعلیم اور ترغیب کے لئے بھیجے گئے تھے اور تمام شریعتیں انہی کی

تفصیل اور انہی کی طرف رجوع کرتی ہیں۔ ان میں سے ایک وصف طہارت ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ جب آدمی کی فطرت سلیم ہوتی ہے اس کا مزاج صحیح ہوتا ہے اس کا دل تمام سفلی مشاغل سے جو تدبیر کے مانع ہوتے ہیں، خالی ہوتا ہے تو ایسی حالت میں جب اس کو پلید چیزوں سے آلودگی ہو جاتی ہے اور اس کو بول و براز کی ضرورت ہوتی ہے اور ان سے فارغ نہیں ہوتا اور وہ مجامعت اور اس کی ودائی کو ابھی ابھی کر چکا ہوتا ہے تو اس کا دل منقبض ہوتا ہے، اس پر تنگی اور غم طاری ہوتا ہے اپنے آپ کو نہایت گھٹن میں پاتا ہے پھر جب دونوں قسم کی نجاستیں دور ہو جاتی ہیں اور اپنے بدن کو ملتا ہے اور غسل کرتا ہے اور اچھے کپڑے پہن کر خوشبو لگاتا ہے تو اس کا انقباض دور ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ دل میں کشادگی سرور اور انبساط پاتا ہے یہ لوگوں کے دکھلانے کے لئے یا ان کی رسموں کی پابندی کی وجہ سے نہیں ہوتا بلکہ محض نفس ناطقہ کے حکم کی وجہ سے ہوتا ہے پس پہلی حالت کو حدث اور دوسری حالت کو طہارت کہتے ہیں اور جو شخص ذکی ہے اس سے احکام نوع کی سلامتی ظاہر ہوتی ہے اور اس کا مادہ صورت نوعیہ کے احکام بجا لانے پر قادر ہے، تو وہ دونوں حالتوں میں تمیز کرے گا ایک کو پسند کرے گا اور دوسرے کو ناپسند اور غبی آدمی جب اس کی قوت بہیمیہ ذرا کمزور ہوتی ہے، یکسوئی اور طہارت کو اختیار کرتا ہے، ان کے پہچاننے کے لئے فرصت پاتا ہے تو وہ بھی ضرور ان دونوں کو پہچانتا ہے اور ایک کو دوسرے سے تمیز کر لیتا ہے اور صفات جسمانیہ میں سے طہارت کو نیچی آلودگیوں سے علیحدہ ہونے میں اور اپنی نورانی کیفیت سے خوش ہونے میں ملأ اعلیٰ سے نہایت مشابہت ہے اور اسی وجہ سے یہ طہارت قوت عملی کے اعتبار سے کمالات حاصل کرنے میں نفس کو خوب مدد دیتی ہے۔

اور حدث جب انسان میں جم جاتا ہے اور ہر طرف سے احاطہ کر لیتا ہے تو آدمی میں شیطانی وسواس قبول کرنے کی شیاطین کو حس مشترک کے سامنے دیکھنے کی، پریشان خوابوں کے دیکھنے کی، نفس ناطقہ کے قرب میں تاریکی کے غلبہ کی اور ملعون و کمینہ حیوانات کی صورتیں نظر آنے کی قابلیت پیدا کرتا ہے۔ اور جب طہارت آدمی میں جگہ پکڑ لیتی ہے اور اس کا احاطہ کر لیتی ہے آدمی اس کا خیال رکھتا ہے اور اس کی طرف میلان کرتا ہے تو اس سے فرشتوں کے الہامات قبول کرنے کی، ان کو دیکھنے کی، عمدہ عمدہ خوابوں کی، انوار ظاہر ہونے کی، اچھی چیزوں کے عمدہ شکل میں نظر آنے کی،

اور بڑی مبارک اور معظم چیزیں دکھائی دینے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ دوسری صفت خدا کے حضور میں عاجزی کرنا ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ جب انسان کو خدا کی آیات اور صفات کے ذریعہ سمجھایا جاتا ہے تو نفس ناطقہ متنبہ ہو جاتا ہے اور حواس و بدن اس کے سامنے عاجزی کرتے ہیں اور وہ حیرت زدہ سا ہو جاتا ہے اور عالم قدس کی جانب اپنا میلان پاتا ہے اور اس کو ایک ایسی حالت پیش آتی ہے جو بازاری لوگوں کو بادشاہوں کے دربار میں اپنی عاجزی ان کی عظمت اور بخشش دیکھ کر پیش آتی ہے۔

انسان کی حالتوں میں سے یہ حالت خدا کی طرف رجوع ہونے میں، اس کے جلال اور تقدس میں سراپا حیرت اور مستغرق ہونے میں ملاأعلیٰ کے ساتھ بہت زیادہ مشابہ ہے۔ اسی لئے علمی کمال حاصل کرنے میں یعنی ذہن میں معرفت خداوندی منقش ہو جانے میں اور اس کی بارگاہ میں اس طرح سے جا ملنے میں جس کو بیان نہیں کر سکتے، یہ حالت انسان کی خوب مدد کرتی ہے، تیسری صفت، سماحت یعنی جوانمردی اور سخاوت ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ نفس ایسا ہو جائے کہ قوت بہیمی کی خواہشوں کی اطاعت نہ کرے اس کے نقش اس میں نہ جم سکیں اور اس کی آلائش اس میں نہ اثر کرے، یہ کیفیت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب نفس امور معاش میں مصروف ہوتا ہے، عورتوں کی اس میں خواہش ہوتی ہے، لذات کا عادی اور اچھے کھانوں کا شوق ہوتا ہے۔ اور ان کے حاصل کرنے میں اتنی کوشش کرتا ہے کہ اچھی طرح حاجت روائی کر لیتا ہے اور اسی طرح جب غصہ ہوتا ہے یا کسی چیز کا لالچ کرتا ہے تو اس حالت میں کسی قدر مستغرق رہتا ہے اور دوسری چیز کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ پھر جب یہ حالت زائل ہو جاتی ہے، پس اگر وہ جواں مرد ہے تو اس حالت سے ایسا الگ ہو جاتا ہے گویا اس میں کبھی تھا ہی نہیں۔ اور اگر اس میں قوت سماحت نہیں ہے تو وہ کیفیتیں اس میں اپنا جال پھیلا دیتی ہیں اور اس طرح جم جاتی ہیں جس طرح مہر کے نقش موم میں جم جاتے ہیں۔ اور وہ کشادہ دل اور صاحب سماعت جب اپنے بدن سے جدا ہوگا اور تمام تاریک اور مجتمع تعلقات سے اس کو سبکدوشی ہوگی اور اپنی اصل حالت کی طرف رجوع کرے گا تو وہاں دنیا کی ان کیفیات میں سے جو ملکی قوت کی مخالف تھیں کچھ بھی نہ پائے گا اسی واسطے اس کو وہاں انس اور فراخ عیش حاصل ہوگا۔

اور حریص طمع شخص میں ان تعلقات کے نقوش جمع رہتے ہیں اس کی مثال ایسی سمجھو جیسے کسی کا کوئی نفیس مال چوری ہو جائے، پس اگر وہ سخی ہے تو کچھ پرواہ نہیں کرتا اور اگر وہ تنگدل ہے تو دیوانہ سا ہو جاتا ہے اور اس مال کی صورت اس کی آنکھوں میں پھرتی رہتی ہے اور سماحت اور اس کی مخالف کیفیت کے ان چیزوں کے لحاظ سے جن میں وہ ہوا کرتی ہیں بہت سے لقب ہیں۔ اگر وہ مال میں ہوں تو سخاوت اور بخل کہتے ہیں۔ اگر شرمگاہ اور شکم کی خواہشوں میں ہوں تو اس کو پارسائی اور حرص کہتے ہیں۔ اور اگر آرام اور مشقتوں سے دور رہنے کی بابت ہو تو اس کو صبر اور ناصبری کہتے ہیں۔ اور اگر ان معاصی کے بارے میں ہے جن کو شرع نے ممنوع قرار دیا ہے تو اس کو تقوی اور بدکاری کہتے ہیں۔ اور جب انسان میں یہ سماحت خوب گھر لیتی ہے تو اس کا نفس دنیوی خواہشوں سے الگ ہو جاتا ہے اور اس میں بلند ترین لذات مجردہ حاصل کرنے کی استعداد ہو جاتی ہے۔ اور سماحت ایک حالت ہے جو کمال مطلوب علمی یا عملی کی مخالف باتوں سے انسان کو روکتی ہے۔

چوتھی صفت عدالت ہے اور وہ ایسا نفسانی ملکہ ہے جس کے افعال کی وجہ سے شہر اور قوم کا انتظام بہ سہولت قائم ہو جاتا ہے اور نفس ان افعال پر گویا مجبور ہو جاتا ہے اس میں راز یہ ہے کہ ملائکہ میں اور ان نفوس میں جو تعلقات جسمانی سے دور ہیں، ارادہ کو خداوندی منقش ہو جاتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ انتظام عالم و اس کی پیدائش وغیرہ امور کی نسبت چاہتا ہے۔ پس ملائکہ اور نفوس بھی انہی باتوں کو پسند کرتے ہیں جو اس انتظام کے مناسب ہیں۔ پس یہ طبیعت روح مجردہ کی ہے جب نفس، جسم سے جدا ہو جاتا ہے اور اس میں اس صفت کا اثر باقی رہتا ہے تو اس کو نہایت درجہ خوشی ہوتی ہے اور وہ اس لذت کی طرف راہ پالیتا ہے جو خسیس لذتوں سے جدا ہے اور اگر بدن سے جدا ہوتے وقت اس صفت کی ضد اس میں ہے تو اس کی حالت نہایت تنگ ہوتی ہے وہ متجسس اور ملول ہوتی ہے پس خدا تعالیٰ جب نبی کو دین قائم کرنے کے لئے اور لوگوں کو تاریکی سے نور کی طرف لانے کے لئے مبعوث فرماتا ہے تاکہ تمام لوگ متصف بہ عدالت ہو جائیں تو جو شخص اس نور کے پھیلانے میں کوشش کرتا ہے اور لوگوں میں اس کی اشاعت کرتا ہے وہ قابل رحمت ہو جاتا ہے اور جو اس کے رد کرنے میں، اس کے معدوم کرنے میں کوشش کرتا ہے وہ قابل ملامت و سنگساری ہو جاتا ہے پس جب انسان میں صفت عدالت متمکن ہو جاتی ہے تو اس میں اور حاملین عرش

ومقربین بارگاہ فرشتوں میں جو جودالٰہی اور برکات کے لئے ذریعہ ہیں، اشتراک پیدا ہو جاتا ہے اور اس میں اور ان فرشتوں میں فیضان کا دروازہ کھل جاتا ہے اور یہ صفت اس پر ان کے رنگ اور اثر نازل کرتے ہیں، مددگار بن جاتی ہے۔ اس طور پر کہ نفس میں الہام ملائکہ سے مستفیض ہونے کی صلاحیت ہو جاتی ہے اور وہ ان کے علوم کے لئے آمادہ رہتا ہے پس اگر ان چاروں اوصاف اور خصائل کی تو حقیقت معلوم کر لے گا اور اس کیفیت کو سمجھ لے گا جس سے کمالات علمی و عملی حاصل ہوتے ہیں اور یہ اوصاف کیونکر آدمی کو فرشتوں میں منسلک کر دیتے ہیں اور یہ بھی بخوبی سمجھ لے گا کہ ان اوصاف سے ہر زمانہ کے موافق شرائع الٰہیہ کا کیونکر استخراج ہوتا ہے تو تجھ کو بڑی خیر اور بھلائی عطا ہو گی اور تو دین کا فقیہ بن جائے گا۔ ان لوگوں میں سے تیرا شمار ہو گا جن کی بہتری خدا کو منظور ہے۔

ان چاروں اوصاف سے جو حالت مرکب ہوتی ہے اس کو فطرت کہتے ہیں۔ فطرت حاصل کرنے کے چند اسباب ہیں، بعض ان میں سے علمی ہیں اور بعض عملی، اور بعض حجابات ایسے ہیں جو انسان کو مقاصد فطری سے روکتے ہیں اور ان حجابات کے زائل کرنے کے واسطے حیلے بھی ہیں ہم چاہتے ہیں کہ تم کو ان سب امور پر مطلع کر دیں اس لئے بتوفیق الٰہی جو ہم کہیں غور سے سنو! واللہ اعلم۔

پانچواں باب: ان خصائل کے حاصل کرنے کا اور ناقص کی تکمیل اور رزائل کی تحصیل کا بیان

واضح ہو کہ ان خصائل کے حاصل کرنے کی دو تدبیریں ہیں، تدبیر علمی اور تدبیر عملی، تدبیر علمی کی اس واسطے ضرورت ہے کہ طبیعت علمی قوتوں کے تابع اور مطیع ہے اس لئے آپ دیکھتے ہیں کہ جب انسان کے دل میں حیا اور خوف پیدا کرنے والی باتیں آتی ہیں تو خواہش نفسانی اور جماع کی رغبت جاتی رہتی ہے۔ پس جب اس کا دل فطرت کے مناسب امور کے علم سے پر ہو جاتا ہے تو یہ ہم ان امور کے نفس میں راسخ ہونے کی طرف کھینچتا ہے اور یہ اس طرح سے ہوتا ہے کہ وہ اس بات کا اعتقاد کرے کہ میرا خدا تمام بشری عیوب سے پاک ہے۔ اس پر آسمان اور زمین کا ایک ذرہ بھی پوشیدہ نہیں۔ جب تین آدمی سرگشی کرتے ہیں تو وہاں وہ چوتھا ہوتا ہے۔ اور جہاں پانچ مل کر پوشیدہ باتیں کرتے ہیں تو چھٹا وہ بھی ہوتا ہے جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جس کا چاہتا ہے حکم کرتا

ہے اس کے حکم کو کوئی نہ روک سکتا ہے نہ پھیر سکتا ہے۔ ہر چیز کو اپنے انعام سے موجود کرنے والا ہے اور اس کے متعلق جسمانی اور نفسانی نعمتیں وہی بخشتا ہے، عمل کے بموجب بندے کو جزا دینا ہے اگر عمل اچھے تو جزا بھی اچھی اور اگر عمل برے، تو جزا بھی بری، خدا تعالیٰ کے اس قول سے یہی مراد ہے (یہ میرا بندہ جس نے گناہ کیا ہے یہ جانتا ہے کہ میرا رب بھی ہے، گناہ پر مواخذہ بھی کرتا ہے اور معاف بھی کر دیتا ہے، اچھا میں نے اس کو معاف کیا)

حاصل کلام یہ ہے کہ وہ ایسا اعتقاد رکھے جو دل میں ہیبت اور نہایت تعظیم پیدا کرے اور اس کے دل میں خدا کے سوا کسی دوسرے کا ذرہ بھر بھی خوف اور عاجزی نہ ہو اور خوب اعتقاد کرے کہ انسان کا اصلی کمال خدا کی طرف متوجہ ہو کر اس کی عبادت کرنے میں ہے اور انسان کی سب سے عمدہ حالت یہ ہے کہ فرشتوں کے مشابہ ہو جائے اور ان سے قرب ہو۔ یہی امور ہیں جن سے قرب ربانی حاصل ہوتا ہے اور انہی امور کو خدا، لوگوں سے پسند کرتا ہے بندہ پر خدا کے یہ حقوق ہیں ان کا پابند اوقات رہنا چاہیے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس بات کا خوب یقین کرے کہ انسانی سعادت ان امور کے کرنے میں ہے اور ان کے ترک کرنے میں اس کی بدبختی ہے اور قوت بہیمیہ کے متنبہ کرنے کے واسطے ایک سخت تازیانہ بھی ضروری ہے جو اس کو خوب متنبہ کر دے اور اس کے برے ارادوں سے بزور روکے۔ انبیا کے طریقے اس علمی اور اعتقادی حالت کے پختہ کرنے کے لئے مختلف رہے ہیں۔ پس سب سے عمدہ بات جو اللہ تعالیٰ نے ابراہیمؑ پر نازل فرمائی یہ تھی کہ لوگوں کو خدا کی واضح نشانیوں سے اس کی برتر صفات اور تمام آفاقی و نفسانی نعمتوں کے ذریعہ سمجھائے یہاں تک کہ بہت عمدہ طور پر یہ بات صحیح اور محقق ہو جائے کہ خدا تعالیٰ اس لائق ہے کہ تمام لذائذ کو اس کے لئے صرف کر دیں اس کے ذکر کو تمام ماسوائے الٰہی پر مقدم رکھیں، نہایت درجہ کی اس سے محبت رکھیں اور انتہائی کوشش سے اس کی عبادت میں مصروف ہوں، موسیٰ علیہ السلام نے ان امور کے ساتھ خدا کے شدائد سے بھی ڈرایا۔ اس طرح سے کرامات واضح کر دی کہ وہ فرمانبرداروں اور نافرمانوں کو دنیا میں سزا و جزا دیتا ہے اور نعمتوں کو تکالیف سے بدل دیتا ہے یہاں تک کہ لوگوں کے دلوں میں گناہوں کا خوف اور اطاعت کی رغبت ذہن نشین ہو گئی اور ان علوم بالا کے ساتھ ہمارے نبی علیہ السلام نے حوادث

قبر و حشر کی خوش خبری سنائی اور خوف دلایا، نیکی اور گناہ کے خواص بیان فرما دیئے۔

ان امور کا محض معلوم کر لینا ہی کافی نہیں بلکہ ہمیشہ ان کی تکرار کا دور اور ملاحظہ بھی ضروری ہے یہ چیزیں آنکھوں کے سامنے رہیں تا کہ قوی علمیہ ان سے پر ہو جائیں پھر تمام اعضا ان کی بجا آوری کریں یہ تینوں علوم (تذکیر بآیات اللہ تذکیر بایام اللہ، وقائع حشریہ وغیرہا) مع دو علوم کے جن میں سے ایک میں حلال و حرام کے احکام کا بیان اور دوسرے میں کفار سے مخاصمہ کا بیان ہے پانچ فنون ہوتے ہیں جو قرآن مجید کے عمدہ علوم میں شمار کئے جاتے ہیں۔ اور تدبیر عملی پس اس میں عمدہ یہ ہے کہ انسان ایسی ہیئت، افعال اور امور اختیار کرے جو نفس کو خصلت مطلوبہ یاد دلائیں (اس میں اوصاف مطلوبہ کی یاد پیدا ہو) وہ نفس کو تنبیہ کرتے رہیں اور ان اوصاف کی طرف برانگیختہ کریں، یا تو اس لئے کہ ان اوصاف اور افعال میں عادۃً تلازم ہے یا اس لئے کہ یہ افعال مناسب فطری کی وجہ سے ان اوصاف کے حاصل ہونے کا گمان غالب پیدا کر دیتے ہیں۔ پس جب انسان یہ چاہتا ہے کہ نفس کو غصہ پر آمادہ کرے اور اپنے سامنے غصہ کی صورت پیش کرے تو وہ ان گالیوں کا خیال کرتا ہے جو اس کے مخالف نے اس کو بکی تھیں اور دشنام سے شرم و عار پیدا ہوتی ہے اس کو سوچتا ہے اور نوحہ کرنے والی جب رونا چاہتی ہے تو مردہ کی خوبیوں کو یاد کرتی ہے اور اپنے خیال کے سوار اور پیادے ان کی طرف دوڑاتی ہے اور جو ہم بستری کا ارادہ کرتا ہے، تو اس کی دواعی کو خیال میں لاتا ہے اور اس بات کی نظریں بکثرت ہیں جو کلام کے ہر پہلو کا احاطہ کرنا چاہے گا وہ اس پر مخفی نہ رہیں گی اسی طرح ان اوصاف کے اسباب ہیں جن کے ذریعہ وہ حاصل کئے جا سکتے ہیں اور ان امور کی معرفت اور پہچان میں ذوق سلیم رکھنے والوں کے ذوق کا اعتبار ہے مثلاً حدث کے اسباب یہ ہیں، سفلی باتوں سے دل کا پر ہو جانا جیسے جماع اور مباشرت کے ذریعہ سے عورتوں سے نفسانی رغبت کو پورا کرنا۔ بری باتوں کا دل میں پوشیدہ رکھنا اور ملأ اعلیٰ کی لعنت کا دل کو گھیر لینا، بول و براز کو روکنا، بول و براز اور ریح سرزد ہو جانا اور یہ تینوں معدہ کے فضلات ہیں، بدن کا میلا ہونا، گندہ دہنی، تھوک اور ناک بہنا، زیر ناف اور بغل کے بالوں کا بڑھنا، کپڑے اور بدن کا ناپاکی سے آلودہ ہونا، خیال میں ایسی صورتوں کا رکھنا جس سے حالت سفلیہ پیدا ہو جائے، مثلاً قارورات اور شرمگاہ کو دیکھنا، حیوانوں کی جفتی اور مجامعت کو خوب غور سے دیکھنا، فرشتوں اور

نیک لوگوں کی شان میں طعن وتشنیع کرنا، لوگوں کو ایذا دینے میں کوشش کرنا، اور طہارت کے اسباب ان چیزوں کو دور کرنا ہے۔ ان کے مخالف کام کرنا ہے، ان چیزوں کا استعمال میں لانا ہے، جو عادتاً پاکیزگی کا باعث ہے، جیسے غسل کرنا، وضو کرنا، اچھے کپڑے پہننا اور خوشبو کا استعمال کرنا، کیونکہ ان چیزوں کے استعمال سے نفس پاکیزگی کی طرف مائل ہوجاتا ہے۔ اور رجوع الی اللہ کا سبب تعظیم کے اعلیٰ حالات کا التزام کرنا ہے، مثلاً اس کے سامنے سرنگوں ہوکر کھڑے رہنا، سجدہ کرنا، ایسے لفظوں کو ادا کرنا، جن سے مناجات عاجزی اور طلب حاجات پائی جائے، کیونکہ یہ وہ امور ہیں جن سے نفس کو عاجزی اور رجوع الی اللہ کی کمال درجہ تنبیہ ہوجاتی ہے اور سماحت کے اسباب سخاوت کا خوگر ہونا، داد ودہش، درگزر کرنا، سختیوں میں صبر اختیار کرنا ہے، وغیر ذالک اور عدالت کے اسباب سنت راشدہ کی اس کی تمام تفصیل کے ساتھ محافظت کرنا ہے۔ واللہ اعلم۔

چھٹا باب: ان حجابات کا بیان جو فطری امور کے ظاہر ہونے میں مانع ہیں

واضح ہو کہ بڑے حجابات تین ہیں، طبیعت کا حجاب، رسم کا حجاب، اس کا سبب یہ ہے کہ انسان کی سرشت میں کھانے پینے اور نکاح کی خواہشیں پیدا کی گئی ہیں اور اس کا دل طبعی حالات کے لئے سواری ہے جیسے خوشی اور رنج وغصہ اور خوف وغیرہ پس وہ ہمیشہ ان میں مصروف رہتا ہے۔ ہر حالت کے حاصل ہونے سے پہلے نفس اس کے اسباب کی طرف متوجہ ہوتا ہے اس کے مناسب امور کے لئے قوی حامیہ کو فرمانبرداری بھی کرنی پڑتی ہے اور نفس اس میں مستغرق رہتا ہے اور اس کے علاوہ تمام سے غافل ہوجاتا ہے۔ پس وہ رات دن انہی باتوں میں مصروف رہ کر کمال سے بے خبر رہتا ہے بہت سے آدمی ایسے ہیں جن کے قدم اس دلدل میں دھنس گئے ہیں اور پھر تمام عمر نکلنا نصیب نہیں ہوتا اور بہت سے آدمیوں پر طبیعت کا حکم غالب ہے۔ وہ تمام رسمی اور عقلی امور کو خیر باد کہہ کر ملامت سے بے خوف ہوجاتے ہیں اسی حجاب کو حجابِ نفس کہتے ہیں۔ لیکن وہ شخص جس میں عقل کامل اور بیداری کافی ہوتی ہے وہ اپنے اوقات میں فرصت تلاش کرتا ہے طبعی حالات میں خاموشی پیدا کرتا ہے وہ اپنے نفس میں ان حالات کے علاوہ اور امور کی گنجائش پیدا کرتا ہے اور مقتضیات طبع کے علاوہ دوسرے علوم کے فیضان کے قابل ہوجاتا ہے اور اپنی عقلی اور عملی قوت کی وجہ سے کمال نوعی کا گرویدہ ہوجاتا ہے۔ پس جب وہ اپنی چشم بصیرت کھولتا ہے تو فوراً وہ اپنی قوم کی

تدابیر، لباس اور فخر ومباحات، فضائل، فصاحت وصناعت کا مطالعہ کرتا ہے۔ اس کے دل پر ان امور کا بڑا اثر پڑتا ہے اور ان کے حاصل کرنے میں عزم کامل اور قوی ہمت صرف کرتا ہے یہ حجاب رسم ہے اور اس کو دنیا کہتے ہیں اور بعض لوگ ہمیشہ اسی میں مستغرق رہتے ہیں یہاں تک کہ ان کو موت آجاتی ہے اور یہ فضائل سب کے سب زائل ہو جاتے ہیں کیونکہ ان خوبیوں کا تعلق بدن اور آلات سے ہے اس لئے مرنے کے بعد نفس ان سے بالکل عاری رہ جاتا ہے اور اس کا حال اس باغ والے کا سا ہو جاتا ہے جس کے باغ کو لو نے جھلس دیا۔ یا جس طرح کہ سخت آندھی راکھ کو اڑا لے گئی۔ اور اگر وہ شخص نہایت بیدار مغز اور زیرک ہے تو کسی دلیل عقلی یا ظنی یا شریعت کی پیروی سے یقین کرتا ہے کہ اس کا کوئی پروردگار ہے تمام بندوں پر غالب، ان کے تمام ساز وسامان کا مدبر، تمام نعمتوں کی بخشش کرنے والا ہے پھر اس کے دل میں خدا کی طرف رغبت ومیلان اور محبت پیدا ہوتی ہے پھر وہ اسی کے قرب کو چاہتا ہے ان حاجتوں کا اس سے طالب ہوتا ہے اور اسی کے آگے گرنا چاہتا ہے بعض اس مراد کو پاتے ہیں بعض محروم رہ جاتے ہیں اور اس محرومی کے دو سبب ہیں۔ ایک یہ کہ خالق میں مخلوق کی صفات خیال کی جائیں۔ دوسری یہ کہ مخلوق میں خالق کی صفات کا اعتقاد کیا جائے۔ اول کو تشبیہ کہتے ہیں۔ اس کا منشا ہوتا ہے غائب کی حالت کا حاضر پر قیاس کرنا اور دوسرے کو شرک کہتے ہیں اس کا منشا ہوتا ہے کہ مخلوق میں خلاف عادت باتیں دیکھ کر ان کی طرف منسوب کرنا اور ان کے ذاتی افعال سمجھنا، اور تم کو تمام افراد انسان کا تجسس کرنا چاہئے۔ تم ہمارے بیان میں کیا کہیں کچھ تفاوت پاتے ہو۔

میں نہیں گمان کرتا کہ تم کو تفاوت معلوم ہو بلکہ ہر انسان کے واسطے خواہ وہ کسی شریعت کا پابند ہو مختلف حالات ضرور ہوں گے ایک وقت ایسا ہوگا کہ وہ حجاب طبع میں مستغرق ہوگا خواہ وہ حجاب کم ہوں یا زیادہ اور یہ کہ وہ ہمیشہ رسمی افعال کا پابند ہوگا اور ایک وقت ایسا ہوگا کہ وہ حجاب رسم میں مستغرق ہوگا۔ اس وقت وہ قصد کرے گا کہ کلام لباس عادت اور معاشرت میں اپنے زمانہ کے عقلا کے ساتھ مشابہت حاصل کرلے اور ایک وقت اس کے لئے ایسا ہوگا کہ عام باتوں کو کان لگا کر سنے گا اور اس کو اس وقت احادیث جبروت اور عالم میں تدبیر غیبی کی طرف خیال بھی نہ ہوگا۔ واللہ اعلم۔

ساتواں باب: ان حجابوں کے دور کرنے کا بیان

واضح ہو کہ حجاب طبع کی دو تدبیریں ہیں ایک یہ کہ اس پر حکم کریں، ترغیب دلائیں، اس میں آمادگی پیدا کی جائے دوسرے ان امور پر زدوکوب کیا جائے وہ چاہے یا نہ چاہے لیکن اس سے مواخذ کیا جائے پس پہلا طریقہ وہ ریاضات شاقہ ہیں جو بہیمی قوت کو کمزور کر دیتی ہیں مثلاً روزہ رکھنا، شب بیداری کرنا، بعض لوگوں نے اس امر میں بڑی زیادتی کی کہ پیدائش الٰہی میں تبدیلی کر دی کسی نے آلات تناسل کاٹ ڈالے، کسی نے عمدہ اعضا مثلاً دست و پا سکھا دیئے، ایسے لوگ جاہل ہیں، درمیانہ حالت بہت عمدہ ہے روزہ اور شب بیداری ایک رسمی علاج کے مانند ہیں اس کو بقدر ضرورت کرنی چاہئے، دوسرا طریقہ ان لوگوں کو ملامت کرنا ہے جنھوں نے طبیعت کا اتباع کر کے صحیح راستہ ترک کر دیا۔ ان کو وہ طریقہ بتلانا چاہئے جس کی وجہ سے وہ غلبہ طبیعت سے چھٹکارا پائیں لیکن لوگوں پر بالکل سختی کرنا بھی مناسب نہیں۔ اور سب حالتوں میں صرف زبانی انکار بھی کافی نہیں بلکہ بعض امور میں خوب مارنا اور سخت جرمانہ کرنا بھی ضروری ہے اور یہ مار پیٹ ایسے امور میں زیادہ مناسب ہے جن کا ضرر متعدی جیسے زنا اور قتل اور حجاب رسمی سے بچنے کی بھی دو تدبیریں ہیں ایک یہ کہ ہر کار میں ذکر الٰہی کی رعایت کی جائے کبھی ان الفاظ سے جن کی محافظت کا حکم ہے اور کبھی ان حدود و قیود کی رعایت سے جو خدا کے ساتھ مخصوص ہیں دوسری یہ کہ ہر قسم کی طاعت کو رسم بنا دیا جائے اور اس کی محافظت کا نہایت اہتمام کیا جائے۔ خواہ دل مانے یا نہ مانے اس کے ترک پر ملامت کی جائے۔ اور اگر کبھی ترک ہو جائے تو اس کے بدلہ میں نفس کو جاہ و منزل وغیرہ سے باز رکھا جائے۔ پس ان تدبیروں سے رسم کی کدورتیں زائل ہو جاتی ہیں اور عبادت الٰہی میں نفس کو بڑی تائید حاصل ہوتی ہے۔ اور وہ ہمہ تن زبان بن کر لوگوں کو حق کی ہدایت کرتا ہے سوا معرفت کی دونوں قسمیں (اشراک اور تشبیہ) دو وجوہ سے پیدا ہوتی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو باوجودیکہ وہ صفات بشری سے پاک اور صاف محدثات و محسوسات سے بری ہے خوب اچھی طرح سے نہ پہچانے۔ اس کی تدبیر یہی ہے کہ لوگوں سے ایسی باتیں نہیں کرنا چاہئیں جو ان کے اذہان میں نہ آسکیں۔

اس کی اصل حقیقت یہ ہے کہ کوئی موجود یا معدوم مجسم یا مجرد ایسا نہیں ہے جن کے ساتھ

انسان کے علم کا تعلق نہ ہو یا تو اس کی صورت کو اپنے سامنے پیش کر کے جان لیتا ہے یا کسی مشابہت اور قیاس سے جان لیتا ہے حتی کہ عدم مطلق اور مجہول مطلق کو بھی جان لیتا ہے۔ پس وہ وجود کے معنی سمجھ کر اور اس بات کا لحاظ کر کے کہ عدم وجود سے موصوف نہیں ہوتا عدم کے معنی کا علم حاصل کر لیتا ہے اور وہ جہل سے مشتق صیغۂ مفعول کے معنی سمجھتا ہے پھر مطلق کا مفہوم سمجھتا ہے، پھر ان امور کو باہم ملا کر ایسی صورت ترکیبی درست کر لیتا ہے جس سے امر بسیط کی حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے جس کا خیال میں لانا مقصود ہے اور نہ وہ خارج میں موجود ہے نہ ذہن میں، جس طرح انسان کسی مفہوم نظری کی طرف توجہ کرتا ہے اور اپنی سمجھ کے موافق اس کی جنس اور فصل کو سوچ کر ترکیب دیتا ہے اور ایسی صورت ترکیبی پیدا کر لیتا ہے جس سے وہ چیز معلوم ہو جاتی ہے جس کا تصور کرنا مقصود، ہم اسی طرح پر لوگوں کو بتانا چاہئے کہ اللہ موجود ہے، زندہ ہے لیکن اس کا وجود اور زندہ ہونا ہمارے وجود اور ہمارا سا زندہ ہونا نہیں ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ کے لئے ایسی صفات کا قصد کرنا چاہئے جو موجود اشیا میں باعث خوبی اور تعریف ہیں اور تین مفہوموں کا لحاظ رکھنا چاہئے جن کو ہم مشاہدات میں دیکھتے ہیں۔ بعض چیزیں ایسی ہیں جن میں صفات مدح موجود ہیں اور صفات کے آثار بھی ان سے سرزد ہوتے ہیں اور بعض چیزوں میں نہ وہ صفات موجود ہیں اور نہ ان کی شان ہے کہ ان میں صفات پیدا ہوں۔ اور بعض چیزوں میں صفات موجود تو نہیں لیکن وہ قابل صفات ہیں جیسے زندہ جماد اور مردہ۔ پس اللہ تعالیٰ کے حق میں صفات کا ثبوت ان کے آثار کے لحاظ سے کیا جاتا ہے اور اس تشبیہ کا تدارک اس طرح کر دیا جاتا ہے کہ وہ ہمارے مانند نہیں۔ دوسری وجہ نافہمی اور سوء معرفت کی ہے کہ محسوس صورتوں کا اپنے حسن ولذائذ کے ساتھ پیش نظر رہنا اور قوی عامیہ کا ان حسی صورتوں سے پر رہنا اور پھر دل کا ان کے تابع ہو جانا اور خدا کی جانب خالص توجہ نہ کرنا اس کی تدبیر یہ ہے کہ ریاضت شاقہ کی جائے اور ایسے اعمال کی پابندی کی جائے جن سے انسان میں تجلیات عالیہ کی استعداد پیدا ہو جائے اگرچہ اس کا ظہور عالم آخرت ہی میں ہو، اعتکاف کیا جائے اور بقدر امکان مشاغل کو دور کیا جائے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تصویر دار پردہ کو پارہ کر دیا تھا اور بیل بوٹے والی چادر کو اتار پھینکا تھا۔ واللہ اعلم۔

مبحث پنجم

نیکی اور بدی کا بیان

(مقدمہ نیکی اور بدی کی حقیقت کا بیان)

جب کہ ہم جزا اور سزا کے دلائل کو بیان کر چکے اور ان ارتفاقات کا ذکر کیا جن پر انسان کی جبلت ہے اور جو آدمیوں میں ہمیشہ پائی جاتی ہیں اور کبھی ان سے جدا نہیں ہوتیں۔ اس کے بعد ہم نے سعادت اور اس کے حاصل کرنے کا طریقہ بیان کیا تو اب ہم نیکی اور بدی کے معنی کی تحقیق میں مشغول ہوتے ہیں پس نیکی وہ عمل ہے جس کو انسان ملأ اعلیٰ کی اطاعت بجالانے کے واسطے اور الہام الٰہی کے قبول کرنے میں ہمہ تن محو ہو کر اور مراد الٰہی میں فانی ہو کر کرتا ہے اور ہر وہ عمل ہے جس پر دنیا یا آخرت میں جزا خیر دی جائے اور ہر وہ عمل ہے جو انسان کی ان تدبیرات مناسبہ کے موافق ہو جن پر اس کا انتظام مبنی ہے اور ہر وہ عمل ہے جو حالت انقیاد پیدا کرے اور حجاب کو دور کرے اور بدی وہ عمل ہے جو شیطان کی تابعداری بجالانے کی وجہ سے اور اس کی مراد براری کی وجہ سے کیا جائے اور ہر وہ عمل ہے جس پر دنیا یا آخرت میں بری جزا دی جائے۔ اور ہر وہ عمل ہے جو تدابیر مناسبہ میں فساد پیدا کرے اور ہر وہ عمل ہے جو اطاعت کے مخالف ہیئت کو پیدا کرے اور حجاب کو مستحکم کرے اور جس طرح اہل عقل نے تدابیر حسیہ کو مستنبط کیا اور پھر لوگوں نے دلی شہادت سے ان کی پیروی کی اور تمام اہل زمین یا جو معتبر ہیں ان پر متفق ہو جائے اسی طرح نیکی کے بھی طریقے ہیں۔ جن کو خدائے تعالیٰ نے ان لوگوں کے دلوں میں الہام کیا جو ملکی نور سے موئید ہیں اور فطری حالت ان پر غالب ہے جیسے شہد کی مکھی کے دل میں ایسے امور کا الہام کیا جو اس کی معاش کی اصلاح کرنے والے ہیں سو وہ ان الہام امور پر چلے۔ ان کو مضبوطی سے پکڑا اور لوگوں کو ان کی

تعلیم فرمائی اور ترغیب دلائی پھر لوگوں نے ان کا اقتدا کیا اور تمام اہل مذاہب فطری مناسبت اور نوعی اقتضا کی وجہ سے ان کے اصول پر متفق ہو گئے۔ حالانکہ ان کے وطنوں میں بعد تھا اور ان کے مذاہب مختلف تھے اور اصول پر اتفاق کر لینے کے بعد ان طریقوں کی صورتوں کا اختلاف اس اتفاق کو مانع نہیں ہوسکتا اور نہ یہ بات مانع ہوسکتی ہے کہ ایک گروہ ان طریقوں پر نہیں چلتا جن کی حالت کو اہل بصیرت غور سے دیکھیں تو اس میں شک نہ کریں کہ اس گروہ کا مادہ صورت نوعیہ کے مخالف ہے اور صورت نوعیہ کے احکام قبول نہیں کرسکتا اور یہ لوگ عضو زائد کے مانند ہیں جس کا نہ رہنا اس کے رہنے سے بہتر اور زینت بخش ہے اور ان طریقوں کے شائع ہونے کے بڑے بڑے اسباب اور پختہ تدابیر ہیں جن کو ان لوگوں نے مستحکم کر دیا جو موئیدین بالوحی ہیں ان پر اللہ تعالیٰ کی رحمتیں ہوں پس انھوں نے لوگوں پر اپنا احسان قائم کر دیا۔ اور ہم چاہتے ہیں کہ آپ کو ان کے وہ اصول بتلائیں جن پر ممالک کی بڑی بڑی صالح جماعتیں اشراقین اور سلاطین اور صاحب الرائے حکما عرب اور عجم، یہود، ہنود اور مجوس سب متفق ہیں اور ہم ان اصول کے پیدا ہونے کی بھی شرح کریں گے جو قوت بہیمیہ کے قوت ملکیہ کی اطاعت کرنے سے پیدا ہوتے ہیں اور چند فوائد بھی بتلائیں گے جن کا بارہا ہم نے ذاتی تجربہ کیا ہے اور عقل سلیم نے بتلایا ہے۔ واللہ اعلم۔

پہلا باب: توحید کا بیان

سب نیکیوں کی اصل اور سب سے عمدہ توحید ہے اور یہ اس لئے کہ اللہ رب العالمین کے لئے عاجزی وانکساری کرنا اسی پر موقوف ہے اور یہ عاجزی ہے سعادت کے تمام اسباب میں ایک بڑی چیز ہے یہ اس تدبیر علمی کی بنیاد ہے۔ جو دونوں تدبیروں میں زیادہ مفید ہے اور اسی کی وجہ سے آدمی کو غیب کی طرف کامل توجہ ہوتی ہے اور اسی کی وجہ سے نفس انسانی وجہ مقدس میں مل جانے کے قابل ہو جاتا ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی عظمت پر تنبیہ کی ہے اور اس کو تمام اقسام نیکی میں بمنزلہ دل کے قرار دیا ہے جب وہ درست ہوتا ہے تو تمام بدن درست ہوتا ہے اور جب وہ فاسد ہو جاتا ہے تو تمام بدن فاسد ہو جاتا ہے چنانچہ آپ نے فرمایا کہ جو شخص خدا کے ساتھ کسی کو بھی شریک نہ سمجھتا ہو اور وہ مر جائے تو خدائے تعالیٰ اس کو جنت میں داخل کرے گا اس پر آگ حرام کر دے گا اور وہ جنت سے دور نہ رہے گا۔ اسی طرح بہت سے الفاظ فرمائے اور آپ نے خدائے

تعالیٰ کی جانب سے فرمایا کہ جو شخص مجھ سے ملے اور روئے زمین کے برابر اس کے گناہ ہوں تو میں اس کی اتنی ہی بخشش کروں گا بشرطیکہ وہ شرک نہ کرتا ہو۔

واضح ہو کہ توحید کے چار مرتبے ہیں پہلا یہ کہ صفت وجوب وجود کو باری تعالیٰ کے ساتھ خاص کر دے اور اس کے سوا کوئی واجب نہ ہو۔ دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ عرش آسمان اور زمین میں تمام جوہروں کا خالق خدا تعالیٰ ہی کو سمجھے۔ یہ دونوں مرتبے ایسے ہیں جن سے کتب الٰہیہ میں بحث نہیں کی گئی اور نہ ہی مشرکین عرب یہود و نصاریٰ نے ان میں مخالفت کی ہے بلکہ قرآن یہ کہتا ہے کہ یہ دونوں مرتبے سب کے نزدیک مسلم ہیں تیسرا مرتبہ یہ ہے کہ زمین اور آسمان اور ان کے درمیان کی سب چیزوں کا مدبر خدا تعالیٰ کو سمجھے۔ چوتھا مرتبہ یہ ہے کہ اس کے سوا کوئی دوسرا عبادت کا مستحق نہیں ان دونوں مرتبوں میں قدرتی تعلق اور ربط ہے۔ اور ایک دوسرے کو لازم ہیں۔

ان دونوں مرتبوں میں لوگوں نے اختلاف کیا ہے ان میں تین فریق بڑے ہیں اوّل نجومی لوگ ہیں وہ کہتے ہیں کہ ستارے عبادت کے مستحق ہیں اور ان کی پرستش سے دنیوی منفعت حاصل ہوتی ہے اور اپنی حاجتوں کو ان کے سامنے پیش کرنا بجا ہے وہ کہتے ہیں کہ ہم نے اس بات کی خوب تحقیق کر لی ہے کہ روزانہ حوادث میں انسان کی سعادت اور بدبختی میں اس کی تندرستی اور مرض میں ستاروں کا بڑا اثر اور دخل ہے ان کے نفوس مجردہ ہیں جو ان کی حرکت پر آمادہ رکھتے ہیں۔ اور وہ اپنے پجاریوں سے بے خبر نہیں پس ان لوگوں نے ان کے نام پر مورتیاں بنا کر پرستش کی دوسرا فرقہ مشرکین کا ہے وہ اہل اسلام سے اس بات میں تو متفق ہیں کہ تمام بڑے کاموں کی تدبیر خدا ہی کرتا ہے اور جو کچھ کرتا ہے وہی کرتا ہے۔ اس میں کسی کو کچھ اختیار نہیں لیکن باقی امور میں مسلمانوں کے مخالف ہیں چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ اچھے لوگ جو خدا کی خوب عبادت کرتے تھے اور بارگاہ الٰہی میں مقرب ہو گئے تھے۔ پس ان کو خدا تعالیٰ نے الوہیت عطا فرمائی جس کی وجہ سے وہ پرستش کے مستحق ہو گئے جیسے کوئی شخص کسی بادشاہ کی نہایت خدمت کرے جس کے صلہ میں بادشاہ اس کو کسی ملک کا خلعت عطا کرے اور اپنے کسی شہر کی حکومت سپرد کر دے پس وہ مستحق ہے کہ اس شہر کے لوگ اس کی خدمت اور اطاعت کریں اور اس کی بات سنیں اور وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ خدا کی عبادت ان کی عبادت شامل کئے بغیر مقبول نہیں ہوتی بلکہ اللہ تعالیٰ کا رتبہ نہایت بلند ہے پس اس کی عبادت

سے تقرب الٰہی حاصل نہیں ہوسکتا بلکہ ان لوگوں کی پرستش ضروری ہے تاکہ قرب الٰہی کے لئے ذریعہ بن جائیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ سنتے اور دیکھتے ہیں اور اپنے پجاریوں کی شفاعت کریں گے ان کے امور کی تدبیر کرتے ہیں۔ ان کی مدد اور نصرت کرتے ہیں۔ پس ان کے ناموں کے پتھر تراش لئے جب وہ ان لوگوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو ان پتھروں کو اپنی توجہ کا قبلہ کرتے ہیں پھر ان مشرکین کے بعد اور لوگ پیدا ہوئے۔ انھوں نے ان پتھروں میں اور ان لوگوں میں جن کے لئے یہ پتھر تراشے گئے کوئی فرق نہیں کیا اور خود انہی پتھروں کو اصلی معبود قرار دے لیا اسی لئے خدا نے مشرکین کی رد میں کبھی اس طرح تنبیہ فرمائی کہ حکومت اور قدرت صرف خدا کا خاصہ ہے۔

اور کبھی بیان فرمایا یہ محض جمادات ہیں کیا ان کے پاؤں ہیں جن سے چلتے ہیں یا ہاتھ ہیں جن سے وہ کچھ پکڑ سکتے ہیں یا انکی آنکھیں ہیں جن سے دیکھ سکیں یا کان ہیں جن سے کچھ سن سکیں۔ تیسرا فرقہ نصاریٰ کا ہے وہ کہتے ہیں کہ مسیح علیہ السلام کو خدا سے خاص تقرب ہے اور تمام مخلوق سے ان کا مرتبہ بلند ہے اس لئے ان کو بندہ کہنا مناسب نہیں اور نہ وہ درجہ میں دوسروں کے برابر ہیں۔ اور یہ بات ان کی شان میں سوء ادبی ہے اور ان کے تقرب الٰہی کے لحاظ کو ترک کردینا ہے پھر بعض نصاریٰ نے اس خصوصیت کے اظہار کے لئے کہ باپ بیٹے پر رحم کرتا ہے اس کی تربیت اپنے سامنے کرتا ہے اور اس کا درجہ بندوں سے زیادہ ہے ان کا نام ابن اللہ رکھا اور بعض نے یہ سمجھ کر ان کا نام خدا نے رکھا تھا کہ خدا تعالیٰ نے ان میں حلول کیا تھا۔ اور اسی لئے ان سے ایسے کام سرزد ہوئے جو آج تک کسی بشر سے سرزد نہ ہوئے مثلاً مردوں کا زندہ کردینا پرندوں کو پیدا کرنا۔ پس عیسیٰ کا کلام بعینہٖ کلام الٰہی اور ان کی عبادت بالکل خدا کی عبادت ہے۔ ان کے بعد اور لوگ پیدا ہوئے جنھوں نے اس نام رکھنے کی وجہ کو نہ سمجھا اور وہ بیٹے کے لفظ سے اس کے حقیقی معنی ہی سمجھنے لگے یا ان کو من جمیع الوجوہ واجب الوجود سمجھنے لگے اسی واسطے خدا تعالیٰ نے ان کے اقوال کو کبھی اس طرح رد کیا کہ خدا تعالیٰ کی بیوی نہیں بیٹا کہاں سے ہوگیا۔ اور کبھی اس طرح تردید فرمائی کہ وہ آسمان و زمین کا پیدا کرنے والا ہے اس کے حکم کے ساتھ ہی ہر چیز موجود ہوجاتی ہے پھر اس کو بیٹا جتانے کی کیا ضرورت ہے ان تینوں فرقوں کے بڑے لمبے چوڑے دعوے ہیں ان میں بکثرت خرافات ہیں جو واقف لوگوں پر مخفی نہیں ہیں ان دونوں مرتبوں کو قرآن عظیم نے خوب بیان کیا ہے

اور کافروں کے شبہات کو خوب اچھی طرح رد کیا ہے۔

دوسرا باب: حقیقت شرک کا بیان

واضح ہو کہ عبادت نہایت درجہ عاجزی کا نام ہے اور کسی سے نہایت درجہ عاجزی کے ظاہر ہونے کی دو صورتیں ہیں۔ یا صوری مثلاً ایک شخص کا کھڑا ہونا۔ ایک کا سجدہ کرنا، یا قصد اور نیت سے ہوتی ہے مثلاً سجدہ سے بندوں کی اپنے مولیٰ کے لئے تعظیم کرنا اور قیام سے رعیت کی بادشاہوں کے لئے۔ شاگردوں کی استاذ کے لئے تعظیم کرنا اور کوئی تیسری صورت تعظیم کی نہیں ہے۔ اور جب ثابت ہو چکا ہے کہ سجدہ سے فرشتوں نے حضرت آدم کی اور حضرت یوسف کے بھائیوں نے حضرت یوسف کی تعظیم کی تھی حالانکہ سجدہ سے زیادہ اور تعظیم نہیں ہے تو ضروری ہوکہ نیت ہی سے فرق کیا جائے لیکن ابھی تک اس کی پوری تنقیح نہیں ہوئی کیونکہ مولیٰ کے لفظ کے کئی معنی مستعمل ہوتے ہیں اور یہاں ضرور معبود کے معنی مراد ہیں پس وہ عبادت کی تعریف میں ماخوذ ہے پس اس کی یوں تنقیح کی جائے گی کہ تذلل یہ چاہتا ہے کہ ذلیل میں ضعف اور قوی میں قوت کا لحاظ کیا جائے۔ ذلیل میں ذلت اور پستی اور دوسرے میں شرف اور رفعت کو ملحوظ رکھا جائے۔ ذلیل میں فرماں برداری اور اطاعت اور دوسرے میں نفاذ حکم اور تسخیر کا لحاظ رکھا جائے اور انسان جب مخلی بالطبع ہوتا ہے تو وہ ضرور یہ بات معلوم کر لیتا ہے کہ قوت، شرف اور تسخیر وغیرہ کے جن کو کمال کہتے ہیں، دو مرتبہ ہیں۔ ایک مرتبہ تو یہ ہے کہ انسان اس کو اپنی ذات میں اور اپنی مشابہ چیزوں میں پاتا ہے اور دوسرا مرتبہ ان چیزوں میں پایا جاتا ہے جو حدوث اور امکان کے داغ سے پاک ہیں یا جن میں ان پاک چیزوں کے بعض مخصوص اوصاف پائے جاتے ہیں پس علم غیب کے بھی دو مرتبے ہیں ایک وہ مرتبہ ہے جو غور و فکر اور مقدمات کے ترتیب دینے سے یا سرعت ذہن سے یا خواب سے یا الہام وغیرہ چیزوں سے جو بالکل اس کے مبائن نہ ہوں، معلوم کیا جائے۔

دوسرا مرتبہ علم ذاتی ہے جو خاص عالم کی ذات کا مقتضی ہے۔ جس کو نہ وہ کسی دوسرے سے حاصل کرتا ہے اور نہ اس کو وہ استدلال سے حاصل کرتا ہے اور اسی طرح تدبیر یا تاثیر یا جس لفظ سے آپ تعبیر کریں، اس کے دو درجہ ہیں۔ ایک یہ ہے کہ ہاتھ، پاؤں و دیگر اعضا و قویٰ کو استعمال میں لایا جائے اور [illegible] کیفیات حرارت و برودت وغیرہ سے اعانت لی جائے یا اس کے مشابہ

ان امور سے کام لیا جائے جن کی استعداد قریب یا بعید اس میں موجود ہے۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ بغیر کیفیت جسمانیہ اور بغیر کسی امر کے استعمال کئے کسی چیز کو پیدا کر دیا جائے۔ اور اس قول الٰہی میں یہی مراد ہے کہ ''جس چیز کو خدا کرنا چاہتا ہے تو کن کہتے ہی کر دیتا ہے۔ اور اسی طرح عظمت، شرف اور قوت کے دو درجے معلوم ہوتے ہیں۔ ایک وہ مرتبہ ہے جیسے بادشاہ کو رعیت پر اختیار کثرت اعوان اور زیادتی مال کے ہوتا ہے یا جیسے طاقت ور اور استاد کو ضعیف شاگرد پر ہوتا ہے۔ الغرض ایک قسم کی مشارکت اصل عظمت میں پائی جاتی ہے اور دوسرا درجہ عظمت کا وہ ہے کہ وہ صرف اس میں ہو جس کی رفعت و شان نہایت اعلیٰ درجہ کی ہو۔ اور آپ اس سرکی تفتیش میں بس نہ کریں جب تک اس بات کا یقین نہ کر لیں کہ جو شخص سلسلۂ ممکنات کو ایسے واجب کی طرف منتہی جانتا ہے جو کسی کا محتاج نہیں تو بالضرور ان صفات کو جن سے مدح کی جاتی ہے دو درجوں میں تقسیم کرتا ہے ایک وہ درجہ جو شان خداوندی کے لائق ہو اور دوسرے وہ جو اپنی حالت اور شان کے مناسب ہے اور جبکہ وہ الفاظ جو دونوں کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں باہم معنی کے لحاظ سے قریب قریب تھے۔

پس بسا اوقات نصوص شرائع الٰہیہ غیر محمل پر محمول کئے جاتے ہیں اور اکثر اوقات انسان اپنے بعض افراد سے یا ملائکہ وغیرہ سے وہ اثر صادر ہوتے دیکھتا ہے جو اس کے ابنائے جنس سے نہایت مستبعد ہے اس لئے اس کی نظر میں اصل حالت مشتبہ ہو جاتی ہے تب اس کے لئے وہ قدسی مرتبہ اور تسخیر الٰہی ثابت کرتا ہے حالانکہ لوگ اس درجہ کے شناخت میں برابر نہیں۔ پس بعض لوگ ایسے ہیں جو اپنے انوار کی قوتوں کا احاطہ کر لیتے ہیں جن کے اثر تمام موالید پر غالب اور محیط ہوتے ہیں اور اس درجہ کو پہچان لیتے ہیں اور بعضوں کو اسے احاطہ کرنے کی طاقت نہیں ہوا کرتی۔ اور ہر انسان کو اس قدر تکلیف دی گئی ہے جتنی اس سے ممکن ہے۔ اس حکایت کے یہی معنی ہیں جس کو نبی علیہ السلام نے بیان فرمایا ہے کہ خدا نے اس شخص کو نجات دی تھی جس نے اپنے اہل کو حکم دیا تھا کہ مجھ کو جلا دینا اور میری راکھ کو ہوا میں اڑا دینا۔ اس کو خوف تھا کہ مبادا خدا مجھ کو پھر زندہ کرے اور مجھ پر قابو پالے۔ اس کو یہ یقین تھا کہ خدا میں بڑی قدرت ہے لیکن اس کو قدرت انہی چیزوں میں ہے جو کہ ممکن ہیں ممتنع چیزوں میں اس کو قدرت نہیں ہے وہ سمجھتا تھا کہ اس راکھ کا جمع کرنا محال

ہے۔جس کا نصف حصہ آدمی دریا میں بہا دے اور نصف ہوا میں اڑا دے۔

پس اس خیال سے خدا کی ذات میں کچھ نقص نہیں ہوا جتنا اس کا علم تھا اتنا ہی ماخوذ ہوا اور کافروں میں اس کا شمار نہ ہوا۔تو تشبیہ اور ستاروں اور نیک بندوں کے ساتھ شرک کرنا جن سے کشف وقبولیت دعا وغیرہ خلاف عادت امور ظاہر ہوتے ہیں لوگوں میں موروثی ہو گیا ہے اور جو نبی اپنی قوم میں بھیجا جاتا ہے اس کا فرض ہے کہ وہ شرک کی حقیقت سمجھائے اور دونوں درجوں کی حقیقت ممیّز کر کے دکھاوے اور مقدس درجہ کو خاص واجب تعالیٰ میں حصر کر دے اگرچہ دونوں درجوں کے الفاظ قریب المعنی ہوں جیسے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک طبیب سے فرمایا تھا کہ تو صرف رفیق ہے طبیب درحقیقت اللہ تعالیٰ ہے اور جیسے آپ نے فرمایا کہ سردار صرف خدا ہی ہے۔ان حدیثوں میں طبیب اور سردار کے خاص معنی لئے ہیں اس کے بعد جب رسول اللہ کے حواری صحابہ اور حاملین دین کا زمانہ ختم ہو گیا اور ناخلف لوگ پیدا ہوئے جنھوں نے نمازوں کو ضائع کر دیا اور خواہشوں کی پیروی کی اور مستعمل اور مشتبہ الفاظ کے بیجا معنی بنا لئے جیسے محبوبیت اور شفاعت کو خدا نے تمام شریعتوں میں بندگان خاص کیلئے ثابت کیا ہے لیکن لوگ اس کے بجا معنی مراد نہیں لیتے اور ایسے ہی خلاف عادت اور مکاشفات سے وہ لوگ یہ مراد لیتے ہیں کہ علم الٰہی اور غلبۂ الٰہی کی حالت اس شخص میں منتقل ہو آئی ہے۔جو ایسے ایسے کام کرتا ہے حالانکہ یہ امور ناسوتی یا روحانی طاقتوں کا فیض ہیں جو تدبیر کے نزول کے لئے انسان کو آمادہ کر دیتی ہے اور درحقیقت ایجاد الٰہی نہیں ہیں اور نہ ہی خدا تعالیٰ کی خاص باتیں ہیں۔اس مرض میں لوگ کئی طرح سے گرفتار ہوتے ہیں۔بعض وہ ہیں جو خدا تعالیٰ کی بزرگی کو بالکل بھول گئے اور صرف شرکا کی ہی عبادت کرتے ہیں۔اور اپنی حاجتوں کو انہی سے مانگتے ہیں اور خدا کی طرف بالکل متوجہ نہیں ہوتے اگرچہ یقینی دلیل سے خوب جانتے ہیں کہ سلسلۂ وجود خدا پر ہی ختم ہوتا ہے اور بعض لوگوں کا اعتقاد ہے کہ سردار اور مدبر تو خدا ہی ہے لیکن اپنے بعض بندوں کو بزرگی اور معبودیت کا خلعت پہنا دیتا ہے اور ان کو بعض امور کا اختیار دیتا ہے اور ان کی پرستش کرنے والوں کے حق میں ان کی سفارش قبول کرتا ہے جیسے کوئی شہنشاہ ہر ملک میں اپنی طرف سے اور بجز بڑے بڑے کاموں کے اس ملک کی پوری تدبیر اس کے سپرد کر دے پس ایسے شخص کے حق میں ان لوگوں کو بندگان خدا کہنے کی جرأت نہیں ہوتی

تا کہ کہیں وہ اوروں کے برابر نہ ہو جائیں۔ پس وہ اس کی بجائے ان کو ابن اللہ اور محبوب الٰہی کہتے ہیں اور اپنے نام میں ان کی عبودیت ظاہر کرتے ہیں۔ جیسے عبد المسیح، عبد العزیٰ۔ اور اس مرض میں یہود و نصاریٰ اور مشرکین عام ہیں۔ اور فی زمانہ اسلام میں بھی بعض ایسے غالی اور منافق موجود ہیں۔ اور جب کہ شریعت کی بنیاد اس پر ہے کہ ظن کی چیز کو بجائے اصل کے سمجھے اس لئے وہ محسوس امور جن میں شرک کا گمان تھا کفر شمار کئے گئے۔ جیسے بتوں کو سجدہ کرنا۔ ان کے لئے قربانی کرنا، اور ان کے نام کی قسم کھانا اور ایسے ہی اور امور۔ اوّل اوّل مجھ پر یہ علم اس طرح منکشف ہوا کہ میرے سامنے ایسی قوم پیش کی گئی جو ایک چھوٹی سی زہریلی مکھی کے لئے سجدہ کرتی تھی جو ہمیشہ اپنی دم اور ہاتھ پاؤں ہلاتی رہتی تھی تو میرے دل میں القا ہوا کہ کیا تو ان میں بھی شرک کی تاریکی پاتا ہے۔ اور ان کو ان کے گناہوں نے بھی اس طرح گھیر رکھا ہے جس طرح بت پرستوں کو؟ میں نے کہا نہیں کیونکہ انھوں نے مکھی کو اپنا قبلہ قرار دیا ہے اور ذلت کے درجہ کو عزت کے درجہ سے نہیں ملایا ہے تو آواز آئی کہ تجھے راز کی رہبری ہوگئی۔ پس اس دن سے میرا دل علم توحید سے بھر گیا اور اس میں مجھ کو بصیرت حاصل ہوگئی۔ اور توحید و شرک اور ان چیزوں کی حقیقت جن کو شرع نے توحید و شرک کا موقع قرار دیا ہے بخوبی مجھ کو معلوم ہوگئی اور تدبیر کے ساتھ عبادت کے تعلق کو میں خوب سمجھ گیا۔ واللہ اعلم۔

تیسرا باب: شرک کے اقسام کا بیان

شرک کی حقیقت یہ ہے کہ بعض بزرگوں کی نسبت کسی کا یہ اعتقاد ہو کہ عجیب عجیب اثر جو ان سے صادر ہوئے ہیں وہ محض ان صفات کی وجہ سے سرزد ہوئے ہیں جو انسان میں نہیں ہو سکتیں بلکہ صرف واجب تعالیٰ ہی میں پائی جاسکتی ہیں۔ دوسرے کسی شخص میں اس کا جب ہی امکان ہے کہ خدا تعالیٰ الوہیت کا خلعت اس کو پہنا دے یا اس کو فنا کر کے اپنی ذات میں ملا لے، یا ایسا ہی بیہودہ گمان کوئی اور ہو جس کا مشرکین اعتقاد کیا کرتے ہیں۔ حدیث میں آیا ہے کہ مشرکین لبیک کہنے میں یہ الفاظ پڑھا کرتے تھے ہم حاضر ہیں ہم حضور میں ہیں تیرا کوئی شریک نہیں ہے۔ ہاں وہ شریک جس کا تو مالک ہے اور جس کی تمام ملکیت کا تو مالک ہے اسی لئے اس شخص معبود کے سامنے نہایت تذلل کیا جائے اور اس سے ویسا ہی معاملہ کیا جائے جیسا کہ بندۂ خدا کے ساتھ کرتے ہیں۔

اور اس قسم کے معاملات کی مختلف صورتیں ہیں، شریعت انہی قوالب اور صورتوں سے بحث کرتی ہے جن کو انسان بہ نیت شرک عمل میں لاتا ہے یہاں تک کہ وہ عادتاً مشرک سمجھا گیا۔ جیسا کہ شریعت تمام علل مثلاً زمہ اصلاح وفساد کو ان اصلاح وفساد کی جگہ قائم رکھتی ہے۔ اور ہم آپ کو وہ امور بتلاتے ہیں جن کو خدا نے شریعت محمدیہ میں علی صاحبہا السلام شرک کے مواقع سمجھ کر ان سے منع کر دیا ہے من جملہ ان کی یہ ہے کہ مشرکین اصنام اور ستاروں کو سجدہ کیا کرتے تھے اسی لئے شریعت نے غیر خدا کے سجدہ کو منع فرمایا اور یہ آیت نازل ہوئی "چاند اور سورج کو سجدہ نہ کرو، بلکہ جس اللہ نے ان کو پیدا کیا اس کو سجدہ کرو" اور سجدہ کرنے میں کسی کو شریک کرنا اس بات کو ضرور چاہتا ہے بلکہ لازم ہے کہ تدبیر الٰہی میں بھی اس کو شریک کرے گا جس کی طرف ہم اشارہ کر چکے ہیں اور متکلمین کا یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ توحید عبادت احکام الٰہیہ میں سے ایک حکم ہے جو مذہبوں کے اختلاف سے مختلف ہو سکتا ہے اس کے لئے دلیل یقینی کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اگر یہی بات ہوتی تو خدا تعالیٰ مشرکین کو الزام نہ دیتا کہ وہ پیدا کرنے اور تدبیر کرنے میں یگانہ ہے خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ "سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہے اور مقبول لوگوں پر سلام ہے، کیا خدا تعالیٰ بہتر ہے" اخیر پانچ آیتوں تک۔ بلکہ حق یہ ہے کہ وہ یہ بات تسلیم کرتے تھے کہ عبادت کا مدار انہیں دونوں باتوں پر ہے جیسا کہ ہم توحید کے معنی میں اس کی طرف اشارہ کر چکے ہیں پس اسی واسطے خدا تعالیٰ نے ان کو الزام دیا۔ وللہ الحجۃ البالغۃ

اور انہی امور شرکیہ میں سے یہ ہے کہ مشرکین اپنے اغراض کے لئے غیر خدا سے امداد طلب کیا کرتے تھے۔ بیماری شفا اور غریبوں کی تونگری کو ان سے طلب کرتے تھے اور ان کے نام کی نذریں مان کر اپنی حاجات اور مقاصد کے حاصل ہونے کے متوقع رہتے تھے اور ان کی برکات کی امید میں ان کے نام جپا کرتے تھے اسی واسطے خدا تعالیٰ نے لوگوں پر واجب کیا کہ یہ پڑھا کریں "ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے یاوری کے خواہاں ہیں"۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا "خدا تعالیٰ کے ساتھ دوسرے کو مت پکارو" اور یہاں دعا کے معنی عبادت کے نہیں ہیں جیسے بعض مفسروں کا قول ہے، بلکہ استعانت کے ہیں۔ خدا تعالیٰ کے اس قول کی وجہ سے کہ "خدا ہی سے مدد طلب کرو تا کہ وہ حاجت پوری ہو جائے جس میں تم مدد کے خواہاں ہو" اور ان ہی امور شرکیہ میں

سے یہ ہے کہ مشرکین بعض شرکا الٰہی کو خدا کی بیٹیاں اور بعض کو بیٹے کہتے تھے پس اس سے سختی کے ساتھ منع کر دیا اور اس کا راز ہم پہلے ہی بیان کر چکے ہیں۔ اور نیز امور شرکیہ میں سے یہ بھی ہے کہ وہ اپنے احبار اور رہبان کو خدا کے سوائے معبود اور مطاع سمجھتے تھے بایں معنی کہ ان کا یہ اعتقاد تھا کہ جس چیز کو یہ حلال کہیں تو حلال ہے نفس الامر میں اس میں کوئی حرج نہیں اور جس کو وہ حرام کہیں وہ حرام ہے جو نفس الامر میں مواخذہ کے قابل ہے اور جب یہ آیت نازل ہوئی ''**اتخذوا احبارهم ورهبانهم الاية**'' (کافروں نے علما اور زاہدوں کو دوسرا خدا بنا رکھا ہے) تو عدی بن حاتمؓ نے نبی علیہ السلام سے اس کا مطلب پوچھا، آپ نے فرمایا کہ وہ لوگ جس چیز کو حلال کہہ دیتے تھے۔ یہ لوگ اس کو حلال سمجھتے تھے اور جس کو حرام کہہ دیتے تھے اس کو حرام جانتے تھے۔ اس کا راز یہ ہے کہ تحلیل اور تحریم کے معنی ملکوت میں ایک حکم نافذ کر دینا ہے کہ فلاں شئے پر مواخذہ ہے اور فلاں پر نہیں اور یہ کہہ دینا ہی مواخذہ اور عدم مواخذہ کا سبب ہوتا ہے اور یہ خدا کی صفات میں سے ہے لیکن وہ تحلیل و تحریم جس کی نسبت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کی جاتی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آنحضرت کا قول اس کی تحلیل و تحریم کے لئے علامت ہے اور اس تحلیل و تحریم کو مجتہدین امت کی طرف منسوب کرنے کے معنی یہ ہیں کہ یہ اشخاص اس حکم کو شارع سے روایت کرتے ہیں یا اس کے کلام سے استنباط کرتے ہیں۔

واضح ہو کہ جب خدا تعالیٰ نے رسول بھیجے اور اس کی رسالت معجزات سے ثابت ہوگئی اور اس کی زبان سے بعض امور کا حلال و حرام ہونا معلوم ہو گیا پھر بعض لوگ یہ سمجھ کر کہ ان کے مذہب میں یہ چیز حرام تھی اس سے باز رہیں اور دل میں کراہت کریں تو یہ توقف دو طرح کا ہوتا ہے اوّل یہ کہ اس شخص کو اس شریعت کے ثبوت ہی میں شک ہو، تو ایسا شخص نبی کا منکر ہے اور کافر ہے۔ دوم یہ کہ اس کو پہلی تحریم کی نسبت یہ اعتقاد ہے کہ وہ منسوخ ہونے کے قابل ہی نہیں ہے کیوں کہ خدا تعالیٰ نے اپنے بندے کو الوہیت کا خلعت پہنا دیا تھا۔ اور وہ شخص فنا فی اللہ اور باقی باللہ ہو گیا پس کسی امر سے اس کا منع کرنا یا کسی امر کو اس کا مکروہ سمجھنا مال اور اہل میں باعث محرومی ہے پس ایسا شخص مشرک ہے وہ غصہ اور ناراض ہونے میں، حلال اور حرام کرنے میں دو مقدس ہستیوں کا اعتقاد کرتا ہے اور نیز امور شرکیہ میں سے یہ بھی ہے کہ وہ لوگ بتوں اور ستاروں سے تقرب، ان

کے لئے قربانیاں کر کے چاہا کرتے تھے، یا تو اس طرح سے کہ ذبح کے وقت ان کا نام لیتے تھے یا اپنے خاص ستاروں پر ذبیحہ کرتے تھے پس ایسا کرنے سے ان کو روکا گیا۔ نیز ان امور شرکیہ میں سے یہ ہے کہ وہ اپنے شرکا کے نام پر سانڈ چھوڑتے تھے۔ پس اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''ما جعل اللہ من بحیرۃ و لا سائبۃ الایۃ '(اللہ تعالیٰ نے نہ کان پھٹے کو مشروع کیا ہے اور نہ سانڈ) نیز انہی امور میں سے یہ ہے کہ وہ بعض لوگوں کے ناموں کو نہایت متبرک جانتے تھے اور یہ بھی عقیدہ رکھتے تھے کہ ان کا نام لے کر جھوٹی قسم کھانے سے جان و مال کا نقصان ہوتا ہے اس لئے وہ اپنے اہم معاملات میں اپنے شرکا کے نام کی قسم کھایا کرتے تھے سو، اس سے ان کو منع کیا گیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے غیر اللہ کے نام کی قسم کھائی اس نے شرک کیا۔

بعض محدثین نے اس کو تہدید اور تغلیظ پر محمول کیا ہے اور میں محدثین کی اس تفسیر کا قائل نہیں ہوں بلکہ میرے نزدیک اس حلف سے مراد یمین منعقدہ اور یمین غموس ہے جو اس اعتقاد کی بنا پر ہو جس کا ہم نے ذکر کیا۔ نیز ان امور شرکیہ میں سے غیر اللہ کی زیارت کرنا ہے اور وہ اس طرح سے ہوتا تھا کہ بعض مواضع کو یہ سمجھتے تھے کہ وہ نہایت متبرک اور شرکا کے ساتھ مخصوص ہیں وہاں جانے سے ان کا تقرب نصیب ہوتا ہے۔ پس شریعت نے ایسا کرنے سے منع کر دیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تین مقامات کے سوا اور کسی جگہ کے لئے سواریاں نہ کسیں۔ نیز ان امور شرکیہ میں سے یہ ہے کہ وہ اپنی اولاد کا نام عبد العزی و عبد الشمس وغیرہ رکھتے تھے سو اللہ تعالیٰ نے فرمایا وہ ذات ایسی ہے جس نے تمہاری تخلیق نفس واحد سے کی اور اس کی جنس سے اس کی زوجہ کی تخلیق فرمائی تا کہ اس کو اس سے آرام ملے۔ فلما تغشٰھا الایہ اور حدیث میں آیا ہے کہ حضرت حوا نے شیطان کے بہکانے پر اپنے بیٹے کا نام عبد الحارث رکھا تھا اور بے شمار احادیث سے ثابت ہے کہ جن لوگوں کے نام عبد العزی اور عبد الشمس وغیرہ تھے آنحضرت نے ان کو بدل کر عبد اللہ و عبد الرحمٰن وغیرہ رکھ دیئے تھے۔ یہ سب مذکورہ بالا امور شرک کے قالب تھے اس واسطے شارع نے ان سب سے لوگوں کو روک دیا۔ واللہ اعلم۔

چوتھا باب: خدا کی صفات پر ایمان لانے کا بیان

واضح ہو کہ نیکی کی تمام قسموں سے سب سے زیادہ پر عظمت قسم خدا تعالیٰ کی صفات پر ایمان

لانا، ان کے ساتھ خدا کے متصف ہونے کا اعتقاد کرنا ہے اس کی وجہ سے بندے اور خدا تعالیٰ میں تعلق کا دروازہ کھل جاتا ہے جس سے وہاں کی بزرگی اور کبریائی کے منکشف ہونے میں مدد ملتی ہے۔

معلوم ہونا چاہئے کہ خدا تعالیٰ کا مرتبہ اس سے بلند ہے کہ کسی عقلی یا حسی چیز پر اس کو قیاس کرسکیں یا اس میں صفات ایسے حلول کریں جیسے اپنے اپنے محل میں اعراض حلول کرتے ہیں، یا عام عقلیں ان کا اندازہ کرسکیں یا معمولی الفاظ ان کو ادا کرسکیں۔ لیکن لوگوں کے واسطے ان کی تعریف بھی ضروری ہے تاکہ حتی الامکان وہ اپنے کمال کو پورا کرسکیں اس لئے ضرور ہے کہ صفات سے نتیجے اور غایتیں مراد لی جائیں نہ کہ ان کی ابتدائی حالتیں، مثلاً رحمت کے معنی نعمتوں کا دینا مراد ہے نہ کہ دل کا میلان اور نرم ہونا۔ اور اسی طرح جمیع موجودات کو خدا تعالیٰ کا مسخر بیان کرنے میں ایسے الفاظ مستعار لئے جائیں جن کے معنی بادشاہ کا شہر کو مسخر کرنا ہے کیونکہ اس غرض کے لئے کوئی اور عبارت زیادہ خوش ادا نہیں ہے اور تشبیہات کا اس طرح استعمال ہو کہ ان کے اصلی معنی مراد نہ ہوں بلکہ ایسے معنی مقصود ہوں جو عرفاً اصلی معنی کے مناسب ہوں مثلاً ہاتھ کی کشائش سے فیاضی مراد ہو۔ اور ان تشبیہات میں یہ بھی ضروری ہے کہ مخاطبین کو بشری آلودگیوں کا خدا کی ذات میں ہونے کا صریح شبہ نہ ہو اور یہ حالت مخاطبین کی فہم پر مختلف ہوتی ہے اس لئے یوں کہنا چاہئے کہ خدا سنتا ہے دیکھتا ہے یہ نہیں کہنا چاہئے کہ وہ چکھتا ہے یا چھوتا ہے۔ اور یہ بھی ضروری ہے کہ چند معانی جن کا ایک ہی اثر ہے، ان کے فیضان کو ایک ہی نام سے تعبیر کریں جیسے کہیں رزاق یا مصور، اور ان اوصاف کی خدا سے نفی کی جائے جو اس کی شان کے شایان نہ ہوں بالخصوص وہ اوصاف جن کو ظالمین نے خدا کے حق میں بیان کیا ہے۔ پس یوں کہیں گے کہ خدا کے کوئی فرزند نہیں اور نہ وہ کسی سے پیدا ہوا ہے۔

تمام آسمانی مذاہب نے اتفاق کیا ہے کہ خدا کی صفات اس طرح بیان کی جائیں اور اس پر متفق ہیں کہ ان عبارات کو اسی طرح استعمال کرنا چاہئے اور معنی مستعمل سے زیادہ ان پر بحث نہیں کرنی چاہئے اور اسی حالت پر وہ قرون گزر گئے جن کے لئے حضرت نے خیر کی شہادت دی تھی (یعنی قرون ثلاثہ) پھر ان کے بعد اہل اسلام میں سے ایک گروہ بغیر نص اور دلیل قطعی کے ان کے

معانی کی تحقیق اور بحث کرنے لگا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مخلوق میں غور کرو خالق میں غور نہ کرو۔ اور آیت (وَاَنَّ اِلٰی رَبِّکَ الْمُنْتَھٰی) کی تفسیر میں آنحضرت نے فرمایا کہ پروردگار کی ذات میں غور نہیں کیا جاسکتا اس کی صفات مخلوق اور نو پیدا نہیں ہیں اور ان میں غور کرنے کے معنی یہی ہیں کہ حق تعالیٰ ان سے کیوں کر متصف ہے۔ پس ان میں غور کرنا خالق میں غور کرنا ہے۔

امام ترمذی نے حدیث ''ید اللہ ملائی'' (خدا کا ہاتھ بھرا ہوا ہے) کے متعلق بیان کیا کہ ائمہ حدیث فرماتے ہیں کہ ہم اس پر اسی طرح سے ایمان رکھتے ہیں جس طرح یہ حدیث وارد ہے بغیر اس بات کے کہ کچھ اس کی تفسیر کریں یا اس میں وہم پیدا کریں، اکثر ائمہ کا یہی قول ہے، ان میں حضرت سفیان ثوریؒ، مالک ابن انس، ابن عیینہ اور عبداللہ بن مبارک ہیں، یہ سب کہتے ہیں کہ یہ امور روایت سے ثابت ہیں، ہمارا ان پر ایمان ہے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ایسا کیونکر ہے اور دوسرے موقع پر ترمذی ہی نے کہا ہے کہ ان صفات کو جیسا کا تیسا رکھنا تشبیہ نہیں ہے البتہ تشبیہ یہ ہے کہ یوں کہاں جائے کہ اس کی سماعت ہماری سماعت کے مانند ہے اور اس کی بینائی ہماری بینائی کے مانند ہے۔

حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اور کسی صحابی سے بہ سند صحیح اس بات کی تصریح منقول نہیں ہے کہ متشابہات میں تاویل کرنا ضروری ہے یا تاویل کرنا بالکل منع ہے۔ اور یہ امر محال ہے کہ خدا تعالیٰ اپنے نبی کو ما انزل الیہ کی تبلیغ کا حکم دے اور یہ آیت الیوم اکملت لکم دینکم نازل فرمائے پھر متشابہات کے باب میں کچھ نہ فرمائے اور اس کی کچھ تمیز نہ ہو کہ خدا تعالیٰ کی جانب کس امر کو منسوب کر سکتے ہیں اور کس کو منسوب نہیں کر سکتے حالانکہ آنحضرت نے تبلیغ کے بارے میں بڑی تاکید فرمائی ہے اور حکم دیا ہے کہ حاضر شخص غائب کو سب خبر دیدے حتی کہ لوگوں نے آپ کے اقوال، افعال اور حالات کو اور ان امور کو جو آپ کے سامنے پیش آئے بخوبی نقل کر دیا۔ پس معلوم ہوا کہ سب مسلمانوں کا اتفاق رہا کہ جو خدا کی ان متشابہات سے مراد ہے اسی پر ایمان رکھنا چاہئے۔ مخلوقات کی مشابہات سے خدا تعالیٰ نے اس طرح تنزیہ ذکر کر دی ہے کہ ''اس کی مثل کوئی نہیں ہے'' جس شخص نے ان کے بعد اس قول کی مخالفت کی تو اس نے ان کے

طریقہ کی مخالفت کی۔ انتہیٰ

میں کہتا ہوں کہ سمع اور بصر، قدرت اور ضحک، کلام اور استوا میں کوئی فرق نہیں کیونکہ اہل زبان کی نظر میں ان تمام اوصاف سے وہی معنی مفہوم ہوتے ہیں جو خدا کی بارگاہ قدس کے لائق نہیں ہیں ضحک کو اسی لئے محال کہتے ہیں کہ اس کے لئے منہ چاہئے۔ اور اسی طرح سے صفت کلام ہے۔ اور بطش اور نزول میں بھی یہی استحالہ ہے کہ وہ ہاتھ اور پاؤں چاہتے ہیں اور اسی طرح سمع اور بصر، کان اور آنکھ چاہتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

ان غور وخوض کرنے والوں نے اہل حدیث پر بڑی زبان درازی کی ہے کہ ان کا نام مشبہ اور مجسمہ رکھا ہے مجھ پر خوب ظاہر ہوگیا ہے کہ ان کی زبان درازی محض بے معنی ہے عقلاً اور نقلاً یہی لوگ غلطی پر ہیں اور ائمہ ہدایت کی نسبت ان کا طعن بیجا ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ متشابہات میں دو مقام ہیں ایک یہ کہ خدا تعالیٰ ان صفات کے ساتھ کس طرح متصف ہے آیا یہ صفات ذات خداوندی پر زاید ہیں یا اس کی عین ذات ہیں۔ اور سمع، بصر اور کلام وغیرہ کی حقیقت کیا ہے۔ بادی الرائے میں جو معنی ان الفاظ سے سمجھے جاتے ہیں وہ خدا کی شان کے مناسب نہیں ہیں اس مقام کے متعلق حق بات یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بارے میں کچھ نہیں فرمایا بلکہ اس میں بحث وگفتگو کرنے سے اپنی امت کو روک دیا ہے اس لئے کسی کی تاب نہیں ہے کہ جس چیز کو آپ نے منع فرمادیا ہے اس کا اقدام کرے اور دوسرا مقام یہ ہے کہ ایسی صفات کونسی ہیں جن سے خدا تعالیٰ کو متصف ماننا شرعاً جائز ہے اور کن کن صفات کا اطلاق خدا کے لئے ناجائز ہے اس کے متعلق حق یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی صفات اور اسماء توفیقی ہیں بایں معنی کہ ہم اگرچہ ان قواعد کو جانتے ہیں جن کو شرع نے صفات الٰہی کے بیان کرنے کے لئے معیار قرار دیا ہے جیسا کہ ہم شروع باب میں لکھ چکے ہیں۔ لیکن بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کو اگر صفاتیہ میں غور وخوض کرنے کی اجازت دے دی جائے تو خود بھی گمراہ ہوجائیں اور لوگوں کو بھی گمراہ کردیں۔ اور بہت سی ایسی صفات ہیں جن کے ساتھ خدا کو موصوف کرنا اصل میں جائز ہے لیکن کفار کے بعض فرقوں نے ان کا بے جا استعمال کیا ہے اور استعمال ہوگیا اس لئے اس فساد کے دور کرنے کو شرع نے ان صفات کے استعمال سے منع کردیا ہے۔ اور بہت سی صفات ایسی ہیں جن کو ظاہری معنی میں استعمال کرنے سے

خلاف مقصود کا وہم ہوتا ہے اس واسطے ان صفات کے استعمال سے بھی احتراز ضروری ہوا پس ان مصلحتوں سے شرع نے اسماوصفات کو توقیفی قرار دیا اور کسی کے لئے اپنی رائے سے ان میں خوض کرنے کو مباح نہ رکھا۔

اور حاصل کلام یہ ہے کہ ضحک، فرحت، شادمانی، غضب اور رضا کا استعمال کرنا خدا کی شان میں جائز ہے اور گریہ، خوف وغیرہ کا استعمال درست نہیں ہے اگرچہ ان دونوں قسموں کا ماخذ قریب قریب ہے۔ اور یہ مسئلہ جس کی ہم نے تحقیق کی عقل اور نقل سے ثابت ہے اس کے آگے اور پیچھے سے باطل کا گزر نہیں ہے لوگوں کے اقوال اور مذاہب کے زیادہ ابطال کا موقع اور ہے۔ اب ہم ان الفاظ متشابہ کی تفسیر اور دوسرے معانی سے کرتے ہیں جو بہ نسبت ان علما کے معنی کے زیادہ قریب الفہم اور مناسب ہیں، تاکہ یہ بات ظاہر ہو جائے کہ جو معنی انھوں نے ذکر کیے ہیں ابھی تک بالکل متعین نہیں ہوئے ہیں اور دلیل عقل میں نظر کرنے والا انہی معنی کی طرف مجبور نہیں ہے اور دوسرے معنی کے لحاظ سے کچھ ان کو ترجیح اور فضیلت بھی نہیں ہے، نہ ان کے لئے یہ حکم ہے کہ یہی اقوال مراد الٰہی کے موافق ہیں نہ ان کے اعتقاد پر اجماع واتفاق ہو گیا ہے۔ یہ بات ابھی بہت دور ہے اس لئے ہم کہتے ہیں، مثلاً تمہارے سامنے تین قسم کی چیزیں ہیں، زندہ، مردہ اور پتھر، زندہ کو خدا کے ساتھ عالم اور موثر ہونے میں بہت مشابہت ہے اس لئے ضروری ہے کہ ہم خدا کا نام حی رکھیں۔ اور جبکہ علم ہمارے نزدیک انکشاف کا نام ہے اور خدا تعالیٰ پر تمام اشیا منکشف ہیں۔ پہلے وہ سب اس کی ذات میں مندرج تھیں اس کے بعد ان کا وجود تفصیلی ہوا تو ضرور ہم اس کو علیم کہہ سکتے ہیں۔ اور جبکہ بینائی اور شنوائی سے نظر آنے والی اور سنی گئی چیزوں کا پورا انکشاف ہوتا ہے اور خدا کو یہ انکشاف نہایت کامل درجہ کا ہے تو ضرور ہم اس کو سمیع اور علیم کہیں گے اور جبکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ فلاں شخص نے ارادہ کیا تو ہم اس کے یہی معنی مراد لیتے ہیں کہ وہ کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا قصد کرنے والا ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے بہت سے افعال کسی شرط کے پیدا ہونے سے، یا عالم میں استعداد کی وجہ سے کرتا ہے۔ پس جو چیزیں پہلے ضروری نہ تھیں، شرط اور استعداد ان کو ضروری کر دیتی ہے اور بعض جگہ میں اس کے اذن اور حکم سے اجماع پایا جاتا ہے حالانکہ پہلے سے وہ اتفاق نہیں ہوا کرتا اس وجہ سے خدا تعالیٰ کو مرید کہا جاتا ہے اور نیز جب اس کا ایک ارادۂ ازلیہ جس

کی تفسیر اقتضا ذات کے ساتھ کرتے ہیں ایک مرتبہ تمام عالم کے ساتھ متعلق ہو چکا اور پھر یوماً بعد یوم نئی نئی چیزیں پیدا ہوتی رہیں تو ہر حادث کی طرف یہ نسبت کرنا صحیح ہو گیا کہ ہر حادث علیحدہ پیدا ہوا ہے اور کہا گیا کہ خدا نے ایسا ارادہ کیا اور ایسا ارادہ کیا۔ اور جب ہم یہ کہتے ہیں کہ فلاں شخص قادر ہے تو ہم اس کے یہی معنی مراد لیتے ہیں کہ اس کے لئے وہ فعل ممکن ہو گیا ہے اور کوئی خارجی سبب اس کو نہیں روک سکتا اور دو مقدور چیزوں میں سے اگر قادر ایک ہی کو اختیار کر لے تو اس سے نفی قدرت نہیں ہو سکتی۔ اور رحمٰن ہر چیز پر قادر ہے وہ محض اپنی عنایت اور اقتضا ذاتی سے بعض افعال کو اختیار کرتا ہے اور ان کے مخالف امروں کو ترک کر دیتا ہے۔ اسی وجہ سے اس کا نام قادر ہے اور جبکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ فلاں شخص نے کلام کیا تو ہم اس کے یہی معنی مراد لیتے ہیں کہ اس نے اپنے معانی مقصودہ ان الفاظ سے ادا کر دیئے جن سے وہ معانی معلوم ہوتے ہیں اور خدا تعالیٰ اپنے بندے کو علمی فیض پہنچاتا ہے اور ان کے ساتھ ہی الفاظ کا بھی افاضہ کرتا ہے جن کی صورت اس بندہ کے خیال میں منعقد ہو جاتی ہے وہی الفاظ ان معانی پر دلالت کرتے ہیں اسی کی وجہ سے تعلیم خوب صاف اور صریح ہوتی ہے اس وجہ سے خدا کو متکلم کہتے ہیں، خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''آدمی کا مرتبہ نہیں ہے کہ خدا اس سے ہم کلام ہو، ہاں وحی ہے یا پردہ کی آڑ میں وہ کلام کرتا ہے یا کسی پیغمبر کو بھیج دیتا ہے وہ خدا کی اجازت سے جو چاہتا ہے وحی کرتا ہے، بیشک خدا بڑا اور حکمت والا ہے''۔ پس وحی دل میں القا ہونے کا نام ہے خواہ خواب میں خواہ اس طرح سے کہ غیب کی طرف توجہ کرنے کے بعد خدا علم بدیہی پیدا کر دے اور پردہ کی آڑ کے معنی یہ ہیں کہ خارج سے کلام منظوم سنائی دے اور اس کا قائل نظر نہ آئے، یا رسول کو بھیجے اور اس کے سامنے فرشتہ متشکل ہو کر نظر آئے اور کبھی توجہ غیب اور ضعف حواس کے وقت ایک آواز جرس کی سی سنائی دیا کرتی ہے جیسا کہ غشی ارض ہوتے وقت سرخ و سیاہ رنگ دکھائی دیا کرتے ہیں۔

اور جبکہ حظیرہ القدس میں یہ مطلوب ہے کہ لوگوں میں نظام قائم کیا جائے اگر ان کی طبائع اس نظام کے موافق ہوتی ہیں تو وہ ملأ اعلیٰ میں شامل ہو کر تاریکیوں سے نور الٰہی میں آجاتے ہیں ان کو نفسانی بشاشت حاصل ہوتی ہے۔ فرشتوں اور لوگوں پر الہام ہوتا ہے کہ ان کے ساتھ نیکی سے پیش آئیں اور اگر ان کی طبائع اس نظام کے مخالف ہوتی ہیں تو ملأ اعلیٰ سے ان کی علیحدگی ہو جاتی

ہے اور ملأ اعلیٰ کی بیزاری سے ان پر مصیبت ہوتی ہے اور جیسا پہلے ذکر ہوا ہے کہ ان کو تکالیف وعذاب ہوتا ہے اس لحاظ سے کہتے ہیں کہ خدا خوشنود ہے شکر کی جزا دیتا ہے یا خدا ناخوش ہوا، اس کی لعنت ہوتی اور ان سب کا مرجع مقتضی مصلحت کے موافق عالم کا چلنا ہے اور جبکہ من جملہ نظام عالم کے اس امر کا پیدا کرنا بھی ہے جس کی بندہ دعا کرتا ہے تو اس لحاظ سے کہتے ہیں کہ خدا نے دعا قبول کرلی اور جبکہ ہمارے استعمال میں رویۃ نظر آنے والی چیز کے پورے طور پر منکشف ہونے کا نام ہے اور لوگ جب آخرت میں ان چیزوں کے پاس پہنچیں گے جن کا وعدہ کیا گیا ہے ان کو تجلی حاصل ہوگی جو عالم مثال کے وسط میں قائم ہے تمام لوگ اس وقت خدا کو آنکھ سے دیکھیں گے پس کہہ سکتے ہیں کہ مومن اس کو اس طرح دیکھیں گے جس طرح چودھویں رات کے چاند کو دیکھتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

پانچواں باب: تقدیر پر ایمان لانے کا بیان

تقدیر پر ایمان لانا بڑی نیکیوں میں سے ایک نیکی ہے اور وہ اس طرح سے کہ مسلمان اس پر ایمان لانے کی وجہ سے اس تدبیر کو نظر میں رکھتا ہے جو تمام عالم کے سمیٹے ہوئے ہے۔ جو شخص اس پر ٹھیک ٹھیک اعتقاد رکھتا ہے تو وہ ان چیزوں پر نظر رکھتا ہے جو خدا کے قبضے میں ہیں اور دنیا و مافیہا کو اس کے عکس کی طرح سمجھتا ہے اور قضا الٰہی کی وجہ سے بندوں کے اختیارات کو ایسا سمجھتا ہے جیسے آئینہ میں صورت کا عکس ہوتا ہے اور اس سے یہاں کی تدبیر وحدانی کے انکشاف میں بڑی مدد پہنچتی ہے اگرچہ کامل انکشاف عالم معاد ہی میں ہوگا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی عظمت پر لوگوں کو تنبیہ فرما دی جبکہ یہ ارشاد فرمایا کہ جو شخص نیکی و بدی کی تقدیر پر ایمان نہ لائے تو میں اس سے جدا ہوں اور نیز آپ نے فرمایا کہ آدمی مومن نہیں ہوتا جب تک کہ نیکی اور برائی کی تقدیر پر ایمان نہیں لاتا اور جب تک کہ اس کا یقین نہیں کرتا کہ جو اس کو پیش آنا ہے وہ ٹلنے والا نہیں اور جو نہیں پیش آنا ہے وہ ہرگز پیش نہیں آنے گا۔

واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ کا علم ازلی ذاتی ہر اس چیز کو محیط ہے جو پیدا ہو چکی یا جو پیدا ہوگی اور یہ محال ہے کہ کسی چیز کی اس کو خبر نہ ہو یا کوئی ایسی چیز پیدا ہو جائے جس کو وہ نہ جانتا ہو۔ اگر ایسا ہو تو وہ جہل ہوگا علم نہ ہوگا یہ مسئلہ شمول علم کا ہے قدر کا مسئلہ نہیں ہے اس میں کسی اسلامی فرقہ نے مخالفت

نہیں کی ہے اور یہ تقدیر جس کا حال احادیث مذکورہ سے معلوم ہوا ہے، جس پر سلف صالحین کا اعتقاد رہا اور جس کے سمجھنے کی محققین ہی کو توفیق عطا ہوئی۔ جس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ وہ مکلّف کرنے کے مخالف ہے اور جب یہ حالت ہے تو عمل کی کیا ضرورت ہے، تقدیر ملزم کہلاتی ہے جو حوادثات کے وجود کو ان کے موجود ہونے سے پہلے ضروری قرار دیتی ہے پس اس کے لازم کرنے کی وجہ سے وہ شئے موجود ہوتی ہے جس سے نہ انسان بھاگ سکتا ہے اور نہ کوئی تدبیر اس کو روک سکتی ہے اور یہ تقدیر پانچ مرتبہ واقع ہوئی ہے۔ اوّل یہ کہ خدا تعالیٰ نے ازل میں ارادہ کرلیا تھا کہ عالم کو عمدہ طور سے پیدا کرے گا جس میں سب مصلحتوں کی رعایت ہوگی اور موجود ہونے کے وقت اضافی خوبیوں میں وہ موثر ہوگا۔ اور اللہ تعالیٰ نے جملہ صورتوں میں سے ہر ایک صورت کو اپنے علم میں اس طرح سے متعین کرلیا تھا کہ کوئی دوسری صورت اس میں شریک نہ ہو سکے پس حوادثات کا سلسلہ اس طرح سے مرتب تھا اور ان کا وجود اس طرح سے یکجا تھا کہ ان کے مصداق میں کثرت نہ تھی۔ پس خدا تعالیٰ کا جس پر کوئی امر پوشیدہ نہیں ہے۔ یہ ارادہ کرنا کہ عالم کو موجود کرے بعینہ عالم کے وجود کی صورت کو نہایت الامر تک خاص کر دیتا ہے۔

دوم یہ کہ اس نے ہر چیز کا اندازہ کیا۔ اور یہ بھی روایت کی جاتی ہے کہ خدا تعالیٰ نے تمام مخلوقات کے مقداروں کو آسمان و زمین کے پیدا ہونے سے پچاس ہزار برس پیشتر لکھ لیا تھا یہ اس طرح ہوا کہ اس نے عرش کے وجود میں عنایت ازلیہ کے موافق تمام مخلوقات کو پیدا کیا پس اس جگہ تمام صورتیں بنائیں جس کو شریعت میں ذکر کہتے ہیں۔ مثلاً اس نے وہاں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت موجود کی۔ وہ مقرر کردیا کہ فلاں وقت میں لوگوں کی طرف مبعوث ہوں گے، لوگوں کو احکام الٰہیہ پر مطلع کریں گے۔ ابولہب ان کا انکار کرے گا دنیا میں خطا اور گناہ اس کے دل کو احاطہ کرے گا اور آخرت میں آتش دوزخ سے اس پر عذاب ہوگا۔ پس یہ صورت ازلیہ یہاں اس کے موافق حوادث پیدا ہونے کا سبب ہے جس طرح ہمارے خیال میں دیواروں پر رکھی ہوئی لکڑی پر سے گرنے کی صورت پاؤں پھسلنے کا سبب ہے اور اگر وہ لکڑی زمین پر ہوتی تو کبھی پاؤں نہ پھسلتا۔

سوم یہ کہ اس نے جب آدم کو اس لئے پیدا کیا کہ ابوالبشر بنائے اور نوع انسانی کو اس سے ظاہر فرمائے تو اس نے ان کی اولاد کی صورتیں عالم مثال میں پیدا کردیں اور ان کی سعادت

شقاوت کو نور یا تاریکی کی شکل میں ظاہر کیا اور ان کو مکلّف ہونے کے قابل بنایا۔ ان میں اپنی عبادت اور معرفت کا مادہ پیدا کیا اور اس عہد کی اصل جو بنی آدم کی فطرت میں مخفی رکھا گیا ہے یہی ہے اسی وجہ سے مواخذہ ہے اگرچہ وہ واقعہ ان کو یاد نہ رہا ہو اس لئے جو نفوس اب زمین پر مخلوق ہیں یہ اس دن کی صور موجودہ کا عکس ہیں۔ پس ان میں وہ چیزیں مخفی ہیں جو اس روز ان میں مخفی رکھی جا چکی ہیں۔

چہارم یہ کہ جن جنین میں روح ڈالی جاتی ہے اور جس طرح سے تخم کو وقت مخصوص پر زمین میں ڈالتے ہیں اور اس کے ساتھ تدابیر مخصوصہ عمل میں لائی جاتی ہے تو جو شخص درخت کے نوع کی خاصیت اور اس زمین پانی اور ہوا کی خاصیت پر مطلع ہے وہ جانتا ہے کہ یہ کیسا عمدہ درخت اُگے گا اور وہ اس کے بعض بعض حالات کا پتہ لگا لیتا ہے تو اسی طرح سے ملائکہ مدبرین کو اس روز اس کی عمر، رزق اور عمل کا حال معلوم ہو جاتا ہے اور یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ ایسے عمل کرے گا جن میں ملکیت کا غلبہ ہوگا یا ایسے عمل کرے گا جن میں بہیمیت کا غلبہ ہوگا اور اس کی سعادت اور شقاوت کے سب ڈھنگ ان کو معلوم ہو جاتے ہیں۔

پنجم یہ کہ کسی حادثہ کے پیدا ہونے سے پہلے حکم حظیرہ قدس سے زمین کی طرف آکر شئے مثالی میں منتقل ہو جاتا ہے۔ پس اس کے احکام زمین میں پھیل جاتے ہیں اور میں نے بار ہا اس کا مشاہدہ کیا ہے [illegible] ان میں سے یہ ہے کہ ایک مرتبہ چند آدمی باہم جھگڑے اور ان میں رنجش پیدا ہو گئی پس میں نے خدا [illegible] طرف رجوع کیا تو مجھ کو ایک نقطہ مثالیہ نورانیہ حظیرۂ قدس سے زمین پر اترتا دکھائی دیا پس وہ آہستہ آہستہ پھیلنے لگا اور جس [illegible] پھیلتا جاتا تھا اسی قدر ان کا رنج و کینہ دور ہوتا جاتا تھا۔ ابھی ہم مجلس ہی میں تھے کہ ہر شخص [illegible] پر مہربانی کرنے لگا اور الفت اور محبت کی طرف آ گیا جیسا پہلے تھا یہ بات میرے نزدیک خدا [illegible] عجیب نشانیوں میں سے تھی۔

ایسے ہی میری بعض اولاد بیمار تھی اور میرا دل اس کی طرف لگا ہوا تھا بس ایک بار میں ظہر کی نماز پڑھ رہا تھا کہ اس کی موت کو میں نے نازل ہوتے ہوئے [illegible] پس اس کا اسی رات میں انتقال ہو گیا۔ اور حدیث نے یہ بات خوب واضح کر دی ہے کہ خدا تعالیٰ حوادث کو زمین پر پیدا ہونے سے پہلے پیدا کرتا ہے اس کے بعد اس عالم میں اسی طرح پیدا ہو کر ظاہر ہوتے ہیں جس

طرح عالم مثال میں پیدا ہو چکے تھے، خدا کا قانون ایسا ہی ہے۔ پھر کبھی ایسا ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ اس وجود کے اعتبار سے جو چیزیں وہاں موجود ہو چکی تھیں وہ مٹ جاتی ہیں۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے ''خدا جس چیز کو چاہتا ہے محو کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ثابت رکھتا ہے اور اس کے پاس ام الکتاب ہے'' مثلاً خدا تعالیٰ کسی بلا کو پیدا کرتا ہے وہ مصیبت زدہ پر نازل ہونے کو ہوتی ہے کہ دعا اوپر کو چڑھتی ہے اور اس کو روک لیتی ہے۔ اس کا راز یہ ہے کہ یہ نازل ہونے والی شئے اسباب عادیہ میں سے ایک ایسا ہی سبب ہے جیسے بقائے زندگی کے لئے کھانا اور پینا اور موت کے لئے زہر کھالینا یا تلوار مارنا۔ اکثر احادیث سے معلوم ہو گیا ہے کہ ایک عالم ایسا ہے جس میں تمام قائم بالغیر چیزیں مجسم ہوتی ہیں اور معانی اس میں منتقل ہوتے ہیں اور زمین پر پیدا ہونے سے پہلے یہاں ہر شئے پیدا ہوتی ہے جیسے رحم کا عرش سے متعلق ہونا اور بارش کے قطروں کی طرح فتنے نازل ہونا، نیل اور فرات کا سدرۃ المنتہیٰ کی جڑ سے نکلنا، پھر ان کا زمین پر اتارنا، لوہے اور انعام کا نازل کرنا، مجموعہ قرآن کا آسمان دنیا کی طرف نازل کرنا، آنحضرت اور دیوار مسجد کے بیچ میں جنت اور دوزخ کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس طرح ہو جانا کہ خوشہ انگور کو توڑ سکیں اور دوزخ کی حرارت کو محسوس کر سکیں۔ بلا اور دعا کا باہم لڑنا ذریت آدم اور عقل کا پیدا کرنا، پھر عقل کا آگے بڑھنا اور پیچھے ہٹنا، سورۂ بقرہ اور آل عمران کا پرندوں کی دو صفوں کی صورت میں ظاہر ہونا، اعمال کا وزن ہونا جنت کا ناگوار چیزوں سے اور دوزخ کا خواہشات سے بھرا ہوا ہونا اور ان کے مثل بہت سی چیزیں ہیں جو ادنیٰ ماہر حدیث پر مخفی نہیں۔

واضح ہو کہ تقدیر عالم اسباب کو مزاحم نہیں (یعنی سبب کی سببیت میں کچھ خلل انداز نہیں) کیونکہ اس کا تعلق اس سلسلہ سے ہے جو مجموعی طور پر ایک ہی مرتبہ مرتب ہو گیا ہے اور آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قول کے یہی معنی ہیں جبکہ کسی شخص نے پوچھا تھا کہ منتر، دوا اور پرہیز کیا قضا الٰہی سے بچا سکتے ہیں؟ تو آپ نے فرمایا یہ چیزیں بھی تقدیر الٰہی سے ہیں اور حضرت عمرؓ کے اس قول کے بھی یہی معنی ہیں جو انھوں نے سرغ (ایک گاؤں کا نام ہے) کے قصہ میں فرمایا تھا'' کیا یہ بات نہیں ہے کہ اگر تم ناقہ کو شاداب جگہ میں چراتے تو تقدیر الٰہی سے ہی چراتے'' بندوں کے اپنے افعال کا اختیار ہے لیکن اس اختیار میں ان کا کچھ اختیار نہیں کہ مطلوب کی صورت اور اس کا نفع دل

میں آنے اور اس کی طرف عزم کرنے سے یہ اختیار پیدا ہوتا ہے جن کی بندہ کو کچھ خبر بھی نہیں ہوتی چہ جائیکہ اختیار ہو۔ آنحضرت کے اس قول میں اسی طرف اشارہ ہے کہ بنی آدم کے دل خدا کی دو انگلیوں میں ہیں جس طرح چاہتا ہے ان کو پھیر دیتا ہے۔ واللہ اعلم۔

چھٹا باب: اس بات پر ایمان لانا کہ خدا کی عبادت کرنا بندوں پر اللہ کا حق ہے کیونکہ وہ ان کو نعمت اور جزا بالارادہ دیتا ہے

واضح ہو کہ نیکیوں کے تمام اقسام میں بڑی نیکیوں میں سے یہ بات بھی ہے کہ انسان خالص دل سے اس طرح یقینی اعتقاد کرے کہ دوسرے کسی خلاف اعتقاد کا اس میں احتمال بھی نہ ہو کہ عبادت کرنا بندوں پر خدا تعالیٰ کا حق ہے اور خدا کی طرف سے ان سے عبادت کے بارے میں اس طرح سے مطالبہ کیا جائے گا جس طرح اور اہل حق اپنے حقداروں سے مطالبہ کرتے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذؓ سے فرمایا تھا کہ اے معاذؓ تم جانتے ہو کہ اللہ کا بندوں پر اور بندوں کا اللہ پر کیا حق؟ حضرت معاذ نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول ہی خوب جانتا ہے، آپ نے فرمایا اللہ کا حق بندوں پر یہ ہے کہ خالص اسی کی عبادت کریں اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور بندوں کا حق خدا پر یہ ہے کہ جو شریک نہ کرتا ہو، اللہ تعالیٰ اس کو عذاب نہ دے، اس لئے کہ جس شخص کا اس امر پر کہ عبادت خدا کا حق ہے، یقینی اعتقاد نہ ہوگا اور یہ خیال کرے گا کہ انسان بیکار اور مہمل ہے اس سے نہ عبادت مطلوب ہے نہ پروردگار مرید ومختار کی طرف سے عبادت کا اس سے کچھ مواخذہ ہے تو وہ شخص دہریہ ہوگا اس کی عبادت دل سے نہ ہوگی گو اعضاء ظاہری سے عبادت بھی کرے اور نہ اس کے لئے خدا تک رسائی کا دروازہ کھلے گا اور اس کی یہ عبادت بھی دیگر عادات کی طرح ہوگی اس میں اصل امر یہ ہے کہ انبیا اور ان کے وارثین کے معارف میں (صلوات اللہ علیہم والتسلیمات) یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ عالم جبروت کے موقعوں میں ایک ایسا موقع ہے جہاں قصد وارادہ قرار پاتا ہے یعنی کسی کام کے کرنے کا فیصلہ ہو جاتا ہے اور اس موقع کے لحاظ سے اس کام کا کرنا یا اس کو ترک کر دینا دونوں صحیح ہوتے ہیں اگرچہ مصلحت فوقانی میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے سوائے اس کے کہ یا اس کا کرنا ضروری ہوگا۔ یا نہ کرنا ضروری ہوگا اس اعتبار سے وہاں کوئی حالت منتظرہ نہیں ہوتی ان لوگوں کا کچھ اعتبار نہیں ہے جن کو حکما کہتے ہیں کہ ارادہ میں کسی شئے کے ہونے یا نہ ہونے

کا فیصلہ ہوا کرتا ہے ایسے لوگوں نے بعض چیزیں محفوظ رکھیں اور بہت سی چیزیں ان کی نظر سے غائب رہیں وہ جبروت کے اس موقع کے مشاہدہ کرنے سے محجوب ہیں اور آفاقی وانفسی دلائل ان پر قائم ہو سکتے ہیں ان کے محجوب ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ان کو اس مقام کی رہبری نہیں ہوئی جو تجلی اعظم اور ملاء اعلیٰ کے بین بین ہے اس مقام کی حالت ایسی ہے جیسے شعاع کی جو جوہر میں قائم ہوتی ہے وللہ المثل الاعلیٰ۔

اس مقام میں کسی امر کے ہونے کی صورت قرار پا جاتی ہے جس کے تقرر کے باعث ملاء اعلیٰ کے علوم اور ان کے حالات ہوتے ہیں۔ لیکن اس شئے کا کرنا یا نہ کرنا امر اختیاری ہوتا ہے۔ اور ان حکما کے مقابلہ میں دلیل اس طرح پر قائم ہو سکتی ہے کہ ہم میں سے ہر شخص بالبداہۃ یہ جانتا ہے کہ وہ مثلاً ہاتھ بڑھا کر قلم لیتا ہے اور وہ شخص ایک شئے کا قصد کرنے والا ہی ہوتا ہے اس قصد کے اعتبار سے اس شئے کا کرنا نہ کرنا یکساں ہوتا ہے اور اس قوت کے لحاظ سے جو اس شخص کے نفس میں ہے۔ فعل یا ترک فعل میں ترجیح نہیں ہوتی اگرچہ مصلحت بالا کے اعتبار سے ہر چیز یا واجب الفعل ہے یا واجب الترک ہے۔ یہی حالت ان سب امور کی سمجھ لینی چاہئے کہ خاص خاص استعدادیں ان کی باعث ہوا کرتی ہیں پس خالق صور کی جانب سے مادوں پر ان صورتوں کا نزول ہوتا ہے جن کے لئے مادے قابل اور مستعد ہوتے ہیں جیسے دعا کے بعد قبولیت مرتب ہوتی ہے کہ اس جدید شئے کے پیدا ہونے میں دعا کو ایک قسم کا دخل ہے شاید آپ یہ کہیں گے کہ یہ (یعنی ایک چیز کو مساوی الطرفین کہنا) بہ لحاظ مصلحت فوقانیہ کے وجوب شئے سے ناواقفیت ہے پس ایسا کہنا صحیح اور حق کیسے ہو سکتا ہے میں کہتا ہوں کہ ماشاء اللہ ایسا نہیں ہے بلکہ یہ عین علم اور اس مقام کا حق پورا کرنا ہے، جہل جب ہوتا کہ یوں کہا جاتا کہ یہ شئے واجب نہیں ہے تمام شرائع الہیہ نے اس جہل کی نفی کی ہے اس لئے کہ انھوں نے ایمان بالقدر کو ثابت کیا ہے اور یہ سنا دیا کہ جو چیز تم کو پہنچی ہے اس میں چوک ہونے والی نہ تھی اور جس چیز میں چوک ہوگئی وہ تم کو پیش آنے والی نہ تھی جب یہ کہا جائے گا کہ اس موقعہ کے لحاظ سے اس شئی کا کرنا یا نہ کرنا برابر ہے تو یہ بھی علم حق ہے۔ یقیناً جب آپ بہائم میں سے کسی نر کو نرینہ کام کرتے ہوئے اور مادین کو مادینہ کام کرتے ہوئے دیکھو گے تو اس وقت اگر یہ حکم کرو گے کہ یہ کام مجبوری سے ایسے ہی ہوتے ہیں جیسے پتھر دوسرے کے

لڑکا نے سے لڑ سکتا ہے، تو تم خلاف واقع حکم کرو گے اور اگر یہ کہو گے کہ بلا سبب یہ کام صادر ہوئے ہیں نہ نر کا مزاج ان کا باعث ہے نہ مادین کا، تب بھی تمہارا حکم خلاف واقع ہوگا۔ اور اگر یہ کہو گے کہ ان کا ارادہ جو ان کی طبیعت میں منقش ہے صرف فوقانی ضرورت کا ناقل ہے اس پر اس کا سہارا ہے خود ان میں کوئی مستقل جوش اور ہیجان کسی امر کا نہیں ہے، اس فوقانی حالت کے علاوہ کوئی اور آماجگاہ نہیں ہے، تب بھی یہ حکم خلاف واقع ہوگا بلکہ امر حق اور یقینی بین بین حالت ہے۔

وہ یہ کہ اختیار ایک امر معلول ہے جو اپنے علل واسباب سے مختلف نہیں کرتا اور فعل مقصود کو علل واجب کرتے ہیں اور علل کے بعد یہ ممکن نہیں کہ فعل نہ پایا جائے۔ لیکن اس اختیار کی شان اور حالت یہ ہے کہ اس کی اپنی حالت کی وجہ سے اس میں بہجت اور سرور حاصل ہو اور اس میں کسی امر فوقانی کا لحاظ نہ ہو۔ اگر آپ اس مقام کا حق ادا کریں اور یہ کہیں کہ میری ذات میں اس کا علم ہے کہ فعل کا کرنا یا نہ کرنا مساوی تھا لیکن میں نے اس کا کرنا اختیار کر لیا پس میرا یہ اختیار ہی اس کام کی علت ہے تو البتہ آپ اپنے قول میں سچے اور نیک ہیں۔ شرائع الٰہیہ نے اسی ارادہ کی خبر دی ہے جو اس مقام میں منقش ہوا کرتا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ ایسے ارادہ کا ثبوت ہے جس کا تعلق وقتاً فوقتاً پیدا ہوتا ہے اور اس کے لحاظ سے دنیا و آخرت میں اعمال پر جزا بھی ثابت اور مرتب ہوتی ہے اور یہ امر بھی ثابت ہوا کہ مدبر عالم نے احکام شریعت کے واجب کرنے سے عالم میں تدابیر کو قائم کیا تاکہ لوگ اس شریعت پر عمل کریں اور نفع اٹھائیں۔ پس شریعت سے لوگوں کو مامور کرنا ایسا ہے جیسے کوئی آقا اپنے غلاموں سے کوئی خدمت لینا چاہتا ہے وہ اپنے ان غلاموں سے خوش ہوتا ہے جو ان کی خدمت کریں اور ان سے وہ ناخوش ہوتا ہے جو خدمت کرنے سے انکار کریں۔ یعنی اسی طرز و انداز پر شریعتوں کا نزول ہوا ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا تھا کہ شرائع صفات الٰہیہ وغیرہا کے بیان میں سب سے زیادہ فصیح اور سب سے زیادہ حق ظاہر کرنے والی عبارت میں نازل ہوئی ہیں۔ شریعت کی تعبیر کبھی حقیقت لغوی کے طور پر ہوتی ہے اور کبھی متعارف مجاز کی صورت میں۔ پھر شریعت الٰہیہ نے اس امر کے دریافت کرنے پر کہ عبادت خداوند عالم کا حق ہے، لوگوں کو تین مقامات کی وجہ سے قدرت دی ہے یہ تینوں اصول سب کے نزدیک مسلم ہیں اور بمنزلہ امور مشہور اور بدیہی کے ان کی نظر میں ہو گئے ہیں۔

اوّل یہ کہ خدا تعالیٰ منعم ہے اور منعم کا شکر ادا کرنا واجب ہے اور عبادت اس کی نعمتوں کا شکریہ ادا کرنا ہے۔ دوم یہ کہ وہ خداوند تعالیٰ سے اعراض کرنے والوں اور دنیا میں عبادت کو ترک کرنے والوں کو سخت سزا دیگا۔ سوم یہ کہ خدا تعالیٰ فرمانبرداروں اور نافرمانوں کو آخرت میں جزا وسزا دے گا پس اس مقام میں ان سے تین اور علوم کا اضافہ ہوا۔ اول انعامات الٰہی کے یاد دلانے کا علم، دوم خدا کے عذابوں سے یاد دلانے کا علم، سوم معاد کی باتوں سے سمجھانے کا علم۔ پس قرآن مجید ان تینوں علوم کی شرح کرنے کے لئے نازل ہوا ہے ان علوم کی تشریح کی طرف عنایت الٰہی اس لئے زیادہ متوجہ ہوئی کہ انسان کی اصل فطرت میں باری تعالیٰ جل جلالہ کی جانب ذاتی میلان پیدا کیا گیا ہے اور یہ میلان ایک امر دقیق ہے اس کی صورت آدمی کی خلقت میں ہی منقش ہے اور وجدان صحیح سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ انسانی خلقت میں یہ مندرج ہے کہ اس پر ایمان لایا جائے کہ عبادت خدا کا بندوں پر حق ہے کیونکہ وہی تمام لوگوں کا منعم ہے، ان کے اعمال کی جزا دیتا ہے۔ پس جو شخص ارادہ کا منکر ہے یا عبادت کا بندوں پر حق الٰہی ہونے کا انکار کرے یا جزا کو نہ مانے تو وہ شخص دہریہ ہے اس کی فطرت سلیم نہیں کیونکہ اس نے اس میلان کو کھو دیا جو فطرۃ اس کی طبیعت میں ودیعت رکھا گیا تھا ایسا ہی شخص دہریہ کا نائب اور خلیفہ ہے جو اس کی جگہ پر ماخوذ ہوگا اور اگر اس میلان کی حقیقت معلوم کرنا چاہتے ہو تو سمجھو کہ روح انسانی میں ایک لطیفہ نورانی ہے جس کو بالطبع خداوند عالم کی جانب ایسی ہی کشش ہے جیسے لوہے کو مقناطیس کی طرف ہوتی ہے اور یہ بات وجدان سے معلوم ہوسکتی ہے پس جو شخص اپنے لطائف نفسانی معلوم کرنے کا نہایت خوض سے متلاشی ہوگا اور ہر لطیفہ کی کیفیت کو معلوم کرے گا تو وہ اس لطیفہ نورانی کی کیفیت بھی معلوم کر سکے گا اور اس کا میلان بالطبع خدا تعالیٰ کی طرف بھی معلوم کر سکے گا۔ اہل وجدان کے نزدیک اس میلان کا نام محبت ذاتی ہے اور اس کا حال تمام وجدانی امور کا سا ہے جو دلائل سے حاصل نہیں ہو سکتے جیسے گرسنہ کی بھوک اور پیاسے کی پیاس۔

جب آدمی لطائف سفلی کے احکام کی وجہ سے پردہ اور تاریکی کی حالت میں ہوتا ہے تو اس کی مثال ایسی ہوتی ہے جیسے اس نے اپنے بدن میں کسی مخدر چیز کا استعمال کیا ہو اور اس کی بالکل حس جاتی رہی ہو، اس پر گرمی اور سردی کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ پس جب انسان کے لطائف سفلی مزاحمت

سے تھک جاتے ہیں یہ خواہ اضطراری موت سے ہو جس سے نسمہ (۱) کے بہت سے اجزا منتشر ہو جاتے ہیں اور نسمہ کی اکثر خاصیتیں گھٹ جایا کرتی ہیں۔ یا اختیاری موت سے ہو کہ نفسانی اور بدنی ریاضتوں کے ذرائع عجیب عجیب اس نے استعمال کیے ہوں تب وہ بہ منزلہ اس شخص کے ہوتا ہے کہ مخدر چیز کا اثر اس میں سے دور ہو گیا ہو اس وقت وہ اپنے ذاتی اثروں کو معلوم کر سکتا ہے جن کی پہلے اس کو خبر بھی نہ تھی۔ پس جب آدمی کی وفات ہوتی ہے اور اس کو خدا کی طرف توجہ نہیں ہوا کرتی اس حالت میں اگر اس کا اعراض محض جہل بسیط اور سادہ لاعلمی سے ہے تو ایسا شخص کمال نوعی کے لحاظ سے شقی ہے اس کو برزخ کے بعض حالات کا انکشاف تو ہوگا لیکن ذاتی استعداد نہ ہونے سے کامل انکشاف نہ ہوگا اس لئے وہ حیران ہکا بکا رہ جائے گا۔ اور اگر اس اعراض کے ساتھ اس کی علمی اور عملی قوتوں میں کوئی مخالف صورت توجہ الی اللہ کی قائم تھی تو اس شخص میں کشاکشی پیدا ہوگی، اس کا نفس ناطقہ جبروت کی طرف اور نسمہ مخالف صورت حاصل کرنے کی وجہ سے عالم سفل کی طرف کھینچے گا۔ پس اس میں حشمت، نفس ناطقہ کے جوہر سے صعود کرے گی اور اس نسمہ کے جوہر پر پھیل جائے گی۔ اور بسا اوقات توحش کے ہمرنگ اس کو واقعات بھی پیش آئیں گے جیسے صفراوی مزاج والے کو خواب میں آگ کے شعلے نظر آیا کرتے ہیں اور معرفت نفس کی حکمت کی اصل توجیہ یہی ہے۔ اور نیز ملأ اعلیٰ کی جانب سے ایسے شخص پر غضب ناک تند نظری بھی ہوگی جس کی وجہ سے ملائکہ وغیرہ ذی اختیار نفوس کے دلوں پر الہامات ہوں گے کہ ایسے لوگوں کو ایذا اور تکلیف پہنچائیں اور وہ ارادے اور خواہشات جو بنی آدم کے دل میں پیدا ہوئے ہیں ان کی معرفت کی اصل یہی توجیہ ہے۔

حاصل یہ ہے کہ کہ جبروت کی طرف میلان اور عمل کو واجب قرار دینا جس سے اس قید سے رہا ہو سکے جو لطائف سفلی کی مزاحمت سے پیدا ہوتی ہے اور اس واجب کردہ عمل کے ترک پر مواخذہ کرنا یہ صورت نوعیہ کے احکام اور اس کی قوتوں اور اثروں میں سے ہے جس کا خالق صور اور وجود کا فیضان عطا کرنے والے کی جانب سے افراد نوعی کے ہر فرد پر مصلحت کل کا لحاظ کر کے فیضان کیا گیا ہے لوگوں کے ذاتی التزام یا رسم و رواج کی پابندی سے نہیں ہے اور یہ تمام اعمال حقیقتاً اس لطیفہ نورانی کا ہی حق ہیں جو خدا تعالیٰ کی طرف کھینچتا ہے ان اعمال سے اسی لطیفہ کی

(۱) نسمہ روح ہوائی کو کہتے ہیں، وہ روح حقیقی کا اصلی مرکب ہے اور موت کے بعد بھی ساتھ رہتا ہے۔

خواہش کا پورا کرنا اور اس کی ہی کمی کا درست کرنا ہے۔ اور چونکہ یہ معنی نہایت دقیق تھے اور اس لطیفہ کو بخوبی سمجھنے والے بہت کم لوگ ہیں اس واسطے اس حق کی نسبت اس لطیفہ کی جانب نہیں کی جاتی ہے بلکہ اس کو ذات خداوندی کی طرف منسوب کرتے ہیں جس کی طرف اس لطیفہ کا میلان اور وہی اس کا قبلہ مقصود ہے گویا کہ یہ نفسانی قوتوں میں سے ایک قوت کو معین کر لینا ہے جس کی وجہ سے یہ میلان کرتا ہے اور گویا کہ یہ ہمارے اس قول کا اختصار ہے کہ اس لطیفہ کا حق اس اعتبار سے ہے کہ اس کا خدا کی طرف میلان ہے پس شرع الہیہ اس راز کو ایسی سہل عبارت میں واضح کرنے کے لئے نازل ہوئی ہیں جس کو بشر اپنے علوم فطریہ کے موافق سمجھ جائے خدا کا یہی طریقہ ہے کہ وہ دقیق معانی کو ان صورتوں کے لباس میں نازل کیا کرتا ہے جو وجود مثالی کی مناسب ہوا کرتی ہیں جیسے کہ ہم کو خواب کے ضمن میں مجرد معانی کسی شئے کی ایسی صورت میں نظر آیا کرتے ہیں جو ان معانی کو عادۃً لازم یا اس کے ہم رنگ اور مشابہ ہوا کرتی ہے اسی واسطے کہا جاتا ہے کہ عبادت بندوں پر خدا تعالیٰ کا حق ہے اور اسی طرح پر قرآن مجید کا حق اور پیغمبر کا حق، آقا کا، والدین کا اور رشتہ داروں کا حق قیاس کر لینا چاہئے۔ پس یہ سب انسان کے نفس کے حقوق اسی کے نفس پر ہیں تا کہ اس کو کمال حاصل ہو جائے اور وہ اپنے اوپر ظلم نہ کرے لیکن یہ حق اس کی طرف منسوب کر دیا گیا جس کی طرف سے یہ معاملہ اور جس کی جانب سے مطالبہ ہے۔ پس تو ان لوگوں میں سے نہ ہو جو ظاہر پر ٹھہر گئے، بلکہ ان میں سے ہو جو ہر بات کی اصل تحقیق کرتے ہیں۔ فقط۔

ساتواں باب: خدا کے نشانات اور شعائر کی تعظیم کا بیان

خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''دلی تقوی میں سے خدا کے نشانات کی تعظیم بھی ہے'' واضح ہو کہ شریعتوں کی بنا شعائر الہی کی تعظیم اور ان کے ذریعہ سے خدا کے حضور میں تقرب حاصل کرنے پر ہے اس کی وجہ وہ ہے جس کی طرف ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ جس طریقہ کو خدا نے مقرر کیا ہے وہ یہی ہے کہ عالم تجرد کے امور کو ان چیزوں کے ساتھ نقل کیا جائے جن کو قوت بہیمیہ آسانی سے حاصل کر سکے اور شعائر سے مراد وہ ظاہر محسوس چیزیں ہیں جن کی وجہ سے خدا کی عبادت کی جائے اور اس کے ساتھ اس طرح سے مخصوص ہوں کہ ان شعائر کی تعظیم خدا کی تعظیم اور ان میں کوتاہی بارگاہ خداوندی میں کوتاہی سمجھی جائے یہ تعظیم لوگوں کے دلوں میں اس طرح سے راسخ ہو جائے کہ ان کے

دلوں سے نہ نکل سکے اگرچہ ان کے دلوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جائیں۔ اور شعائر کا وجود قدرتی طور پر ہو جایا کرتا ہے اور یہ اس طرح ہوتا ہے کہ کوئی عادت یا خصلت لوگوں کے دلوں میں اس طرح بیٹھ جاتی ہے کہ وہ ان میں شک وشبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ پس اس وقت رحمت الٰہی ایسی چیزوں کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے جن کو ان کی طبیعتیں اور مشہور عالم ضروری قرار دیتے ہیں وہ سب ان کو قبول کرتے ہیں اور ان کی حقیقت پر سے پردہ اٹھ جاتا ہے قریب اور بعید دونوں کو برابر دعوت الٰہی پہنچتی ہے پس اس وقت ان پر شعائر کی تعظیم فرض ہو جاتی ہے اور ایسی ہی حالت ہو جاتی ہے جیسے خدا کے نام کی قسم کھانے والا اپنی قسم توڑنے سے خدا کے حق میں گویا کمی اور کوتاہی دل میں رکھتا ہے۔ اسی وجہ سے اسی اندرونی دلی بات پر مواخذہ کیا جاتا ہے پس اسی طرح ان لوگوں میں بہت سی ایسی چیزیں مشہور ہو جاتی ہیں جن کی اطاعت ان کے علوم کرتے ہیں۔ پس ان کے علوم میں ان چیزوں کی پابندی یہ بات واجب کرتی ہے کہ ان لوگوں پر رحمت الٰہی اسی چیز میں ظاہر ہو جس کے وہ مطیع ہوں۔ تدبیر کی بنا اسی پر ہے کہ پہلے سب سے زیادہ آسان امر کیا جائے اس کے بعد اور آسان، اور یہ بھی ضرور ہے کہ اپنے دل میں ان شعائر کی نہایت درجہ تعظیم کریں کیونکہ ان کا کمال ایسی تعظیم کرنا ہے۔ جس میں اہمال اور سستی نہ ہو۔ اور خدا تعالیٰ نے اپنے فائدے کے لئے بندوں پر کوئی چیز واجب نہیں کی، خدا کی شان اس سے برتر ہے بلکہ جو کیا ہے محض بندوں کے فائدے کے لئے کیا ہے اور چونکہ یہ فائدہ بغیر نہایت درجہ کی تعظیم کے حاصل نہ ہو سکتا تھا اس لئے جو امور ان کے نزدیک تعظیمی تھے انہیں کا مواخذہ کیا گیا اور یہ حکم ہوا کہ خدا کی شان میں کوتاہی نہ کریں اور تشریعی امور میں مقصود بالذات جماعت کا حال ہے نہ کہ فرد واحد کا۔ گویا کہ یہ جماعت ہی تمام لوگ ہیں۔ وللہ الحجۃ البالغۃ۔

خدا تعالیٰ کے بڑے شعائر چار ہیں۔ قرآن، کعبہ، نبی، نماز، قرآن کا نشان الٰہی ہونا اس طرح پر ہے کہ لوگوں میں سلاطین کی طرف سے فرامین کا رعایا کی طرف بھیجنا رائج تھا اور بادشاہوں کی تعظیم کے تابع فرامین شاہی کی بھی تعظیم ہوتی ہے اور انبیا کے صحیفے اور لوگوں کی تصانیف بھی شائع اور رائج ہو گئی تھیں۔ لوگوں کا ان کے مذہب کی پیروی کرنا ان کتابوں کی تعظیم اور تلاوت پر موقوف تھا اور عرصہ دراز تک ان کے علوم کا پابند ہونا بغیر ایسی کتاب کے جس کو وہ

پڑھیں یا روایت کریں بادی الرائے میں محال بھی تھا اس واسطے لوگوں کا منشا ہوا کہ ایک کتاب کی صورت میں رحمت الٰہی کا ظہور ہو جو رب العالمین کی طرف سے نازل ہوا اور اس کی تعظیم کی جائے۔ من جملہ تعظیم کے یہ (معنی) ہے کہ مصحف کو بغیر وضو کے ہاتھ نہ لگایا جائے۔ جب اس کتاب کو پڑھا جائے تو سب خاموش ہو کر سنیں، اس کے اوامر کی فوراً تعمیل کریں سجدہ تلاوت کریں، جہاں تسبیح کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہاں تسبیح کریں اور کعبہ کا شعار میں سے ہونا اس لئے قرار پایا کہ حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ میں لوگوں نے آفتاب اور ستاروں کے نام پر بہ کثرت عبادت خانے اور کنیسے بنائے تھے ان کی نظر میں کسی ذات مجرد غیر محسوس کی طرف متوجہ ہونا بغیر اس کے محال تھا کہ اس کے نام کی ہیکل بنائی جائے اور اس میں حلول سمجھا جائے اور اس کی پرستش کرنا باعث تقرب سمجھا جائے، بادی الرائے میں ان کی عقلوں میں اور کوئی بات نہیں آتی تھی کہ اس واسطے اس زمانہ کے لوگوں نے چاہا کہ خدا کی رحمت کا ظہور ایک گھر کے ذریعہ سے ہو، لوگ اس کا طواف کریں، اس کی وجہ سے تقرب الی اللہ حاصل کریں اس لئے خدا نے ان کو خانہ کعبہ کی طرف بلایا اور اس کی تعظیم کا حکم دیا۔ اس کے بعد قرناً بعد قرن یہ علم پیدا ہوتا گیا کہ خانہ کعبہ کی تعظیم خدا کی تعظیم ہے اور اس میں کمی کرنا خدا کی عبادت میں کمی کرنا ہے اس لئے خانہ کعبہ کا حج فرض ہوگیا اور اس کی تعظیم کا اس طرح حکم دیا گیا کہ بغیر صفائی اور طہارت کے اس کا طواف نہ کیا جائے، نماز میں اس کی طرف رخ کریں اور بول و براز کے وقت اس کی طرف منہ کرنا یا پشت کرنا مکروہ سمجھیں۔

اور نبی کا شعائر الٰہیہ میں سے ہونا، پس ان کا نام رسول اس واسطے ہے کہ ان کو بادشاہوں کے ایلچیوں سے مشابہت دی گئی ہے جن کو بادشاہ امر و نہی کی اطلاع دینے کے لئے رعایا کی طرف بھیجا کرتے ہیں اور رسولوں کی تعظیم کرنا بھیجنے والے کی تعظیم قرار دی گئی ہے۔ پیغمبر کی تعظیم یہ ہے کہ اس کی اطاعت کو واجب سمجھیں اور اس پر درود بھیجیں، اس سے بلند آواز سے گفتگو نہ کریں۔ اور نماز کا شعائر سے ہونا اس واسطے ہے کہ اس سے مقصود غلاموں کے حال کے ساتھ تشبیہ دینا ہے کہ جب وہ بادشاہ کے سامنے کھڑے ہو کر درخواست اور عاجزی کرتے ہیں اور اس لئے دعا کرنے سے پہلے حمد و ثنا ضروری ہوئی اور آدمی کو ایسی ایسی ھیئتیں اختیار کرنا ضروری ہوئیں جو مناجات کے وقت بادشاہوں کے سامنے اختیار کی جاتی ہیں یعنی ہاتھ باندھنا اور ادھر ادھر التفات نہ کرنا۔ اور

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول میں اسی طرف اشارہ ہے "جب تم میں سے کوئی نماز پڑھتا ہے تو خدا اس کے سامنے ہوتا ہے"۔ واللہ اعلم۔

آٹھواں باب: وضو اور غسل کے اسرار کا بیان

واضح ہو کہ کبھی کبھی انسان طبعی تاریکیوں سے حظیرہ قدس کی روشنیوں میں لایا جاتا ہے۔ اس پر یہ انوار غالب آتے ہیں۔ اور تھوڑی تھوڑی دیر کے لئے کسی نہ کسی طرح طبیعت کے احکام سے بری ہو جاتا ہے پس یہ ملائکہ کے مسلک میں منسلک ہو جاتا ہے اور باعتبار تجرید نفس کے گویا انہی میں سے ہو جاتا ہے اس کے بعد پھر اس کی وہی اصلی حالت ہو جاتی ہے اس کے بعد پہلی حالت کے مناسب چیزوں کا وہ مشتاق ہوتا ہے تاکہ اس کی عدم موجودگی میں ان امور کو غنیمت جانے اور ان امور کے ذریعہ اس فوت شدہ حالت کو حاصل کرے۔ پس اس وقت بھی اس کو ایک حالت من جملہ احوال کے پیش آتی ہے جس کو سرور اور انشراح کہتے ہیں یہ کیفیت میل کچیل دور کرنے اور مطہرات کے استعمال کرنے سے حاصل ہوتی ہے پس وہ ان امور کا پختگی سے پابند ہوتا ہے اور اس کے بعد اس شخص کا مرتبہ ہے کہ اس نے مخبر صادق کو یہ تعلیم دیتے سنا کہ یہ حالت آدمی کے لئے موجب کمال ہے اور اس کا پروردگار اس سے ایسی حالت کو پسند کرتا ہے اور اس میں بے شمار فوائد ہیں، یہ سنکر اس نے دلی شہادت سے اس کو سچ جانا اور جیسا اس کو حکم دیا تھا ایسے ہی اس نے تعمیل کی۔ جتنا وہ اس پر کاربند ہوتا گیا اتنا ہی اس کی خبروں کو حق پاتا گیا اور اس پر رحمت کے دروازے کھلتے گئے اور فرشتوں کی سی حالت اس کی ہوتی گئی۔ اس کے بعد اس شخص کا رتبہ ہے جو کہ خود اس حالت کو کچھ نہ سمجھ سکتا تھا لیکن انبیا نے اس کو ایسی چیزوں کی طرف زبردستی کھینچا اور مجبور کیا جو معاد میں آدمی کو فرشتوں کے ساتھ ملحق کر دیتی ہیں یہی لوگ وہ ہیں جو جنت کی طرف زنجیروں کے ذریعہ سے کھینچے جاتے ہیں اور وہ ناپاکی جس کا اثر بادی الرائے میں نفس پر محسوس ہوتا ہے اور وہ ناپاکی جس کے انضباط مواقع کے لئے تمام آدمی مخاطب ہو سکتے ہیں اور وہ ناپاکی جو کثیر الوقوع ہے اور اس کی تعلیم میں کمی کرنے سے لوگوں کو بڑا ضرر پہنچ سکتا ہے، تلاش سے دو قسموں میں منحصر ہیں۔

اوّل یہ کہ انسان کے معدہ میں فضلات، پیشاب، پاخانہ، ریح پیدا ہوتے ہیں اور ان سے اس کا دل رک جاتا ہے پس ہر شخص اپنے نفس میں یہ بات پاتا ہے کہ جب اس کے پیٹ میں ریح یا

پیشاب، پاخانہ رکا ہوا ہوتا ہے تو اس کا دل برا ہو جاتا ہے پس وہ زمین کی طرف رجوع کرتا ہے اور حیران و پریشان ہو جاتا ہے۔ اس کے اور بشاشی کے درمیان پردہ حائل ہو جاتا ہے۔ پس جب وہ پیشاب یا پاخانہ اور ریح سے فارغ ہو جاتا ہے اور غسل و وضو وغیرہ کا استعمال کرتا ہے جس سے نفس کی پاکیزگی پر تنبیہ ہوتی ہے تو اس وقت دل میں بشاشت اور سرور پاتا ہے اور ایسا خوش ہوتا ہے کہ گویا کوئی گم شدہ چیز مل گئی۔

دوم شہوت جماع سے نفس کا مشغول ہونا اور اس میں غرق ہو جاتا ہے۔ کیونکہ یہ چیز نفس کو طبیعت بہیمیہ کی طرف بالکل متوجہ کر دیتی ہے جب بہائم کو ریاضت کے ذریعہ مقصود آداب کی مشق کرائی جاتی ہے اور شکاری جانوروں کو بھوکا اور بیدار رکھ کر مطیع بنایا جاتا ہے اور شکار پکڑنا سکھایا جاتا ہے اور پرندوں کو آدمیوں کی بولیاں سکھائی جاتی ہیں حاصل یہ ہے کہ جب ہر جانور کی خواہش اور مقتضائے طبیعت کے کھو دینے کی بخوبی کوشش کی جاتی ہے اور خلاف طبع باتوں کی تعلیم دی جاتی ہے پھر یہ جانور مادئیوں میں رل مل کر اپنی خواہش ان سے پوری کرتا ہے اور چند روز انہیں لذائذ میں ڈوبا رہتا ہے تو سب سیکھے سکھائے امور بھول جاتا ہے اور ویسا ہی جاہل، اندھا اور بے خبر ہو جاتا ہے اور جو ان امور میں غور کرے گا تو اس کو ضرور معلوم ہو جائے گا کہ شہوت، نفس کی آلودگی جس قدر اثر کرتی ہے کوئی دوسری چیز (جو نفس کو بہیمیت کی طرف مائل کرتی ہے جیسے کثرت طعام اور نشہ وغیرہ) اس قدر اثر نہیں کرتی، آدمی کو اس کا تجربہ اپنی نفسانی حالت سے ہی کر لینا چاہئے اور ان تدابیر کو یاد کرنا چاہئے جن کا ذکر اطبا نے تارک دنیا راہبوں کی طبیعتوں کو نفس بہیمی کی طرف پھیر دینے کے لئے کیا ہے اور طہارت جس کا اثر ظاہراً محسوس ہوتا ہے اور جو عام لوگوں کو سمجھائی جا سکتی ہے کیونکہ اس طہارت کا ذریعہ یعنی پانی آباد ملکوں میں بکثرت موجود ہے اور اس کے اوقات منضبط ہیں اور جو نفس بشر میں ہر طہارت سے زیادہ دل نشین ہے اور جو باوجود قدرتی طریقہ ہونے کے تمام لوگوں میں مسلم اور مشہور بھی ہے ایسی طہارت تلاش کرنے سے دو قسموں میں پائی جاتی ہے (۱) طہارت صغریٰ (۲) طہارت کبریٰ۔ طہارت کبریٰ سے یہ مراد ہے کہ تمام بدن دھویا جائے اس لئے کہ پانی خود ایک پاک چیز ہے۔ سب نجاستوں کو دور کر دیتا ہے تمام طبیعتوں نے اس کے اثر کو تسلیم کر لیا ہے یہ نہایت عمدہ ذریعہ ہے کہ اس کی وجہ سے صفت طہارت پر نفس متنبہ کیا جائے اور

اکثر آدمی شراب پیتے ہیں اور نشہ میں چور ہو جاتے ہیں اسی مدہوشی میں وہ ناحق خون کر ڈالتے ہیں یا نہایت نفیس مال کو ضائع کر دیتے ہیں تو دفعتہً ان کا نفس متنبہ ہو جاتا ہے وہ ہوش میں آجاتے ہیں اور ان کا نشہ دور ہو جاتا ہے اور اکثر ناتواں لوگوں کو نشست و برخاست کی طاقت نہیں ہوتی اور وہ کوئی کام نہیں کر سکتے پس اتفاقاً کوئی ایسا واقعہ پیش آتا ہے جس سے نفس متنبہ اور قوی ہو جاتا ہے جیسے غصہ یا حمیت یا رغبت، پس اس وقت وہ بڑے سے بڑا کام کر سکتے ہیں یا کوئی بڑی خونریزی کر بیٹھتے ہیں۔ بہر حال نفس کی حالت بعض امور سے دفعتاً بدل جایا کرتی ہے اور ایک عادت سے دوسری عادت کے لئے بیداری اس میں آجاتی ہے اور نفسانی علاجوں میں اس قسم کی تبدیلیاں مفید اور عمدہ ہیں اس قسم کی بیداری اس چیز سے ہوتی ہے جس کا کامل طہارت ہونا طبیعتوں اور دلوں میں پیوست ہو گیا ہے اور ایسی چیز صرف پانی ہی ہے۔ اور طہارت صغریٰ، صرف ہاتھ، پاؤں اور منہ کے دھونے سے حاصل ہوتی ہے۔ اور یہ اس لئے ہے کہ تمام آباد ملکوں میں یہ معمول جاری ہے کہ یہ اعضا قدرتی طور سے کھلے رہتے ہیں اور لباس بدنی سے باہر رہتے ہیں اور اسی کی طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ آپ نے چادر میں لپٹنے سے منع فرمایا۔ تو ان اعضا کے کھلا رہنے سے ان کے دھونے میں کوئی دقت نہیں ہوتی اور یہ غسل تمام اعضا کا نہیں ہے۔

تمام شہروں والوں کا معمول ہے کہ ان اعضا کو روزانہ دھوتے ہیں اور بادشاہوں اور امرا کے دربار میں جاتے وقت پاک و صاف کرتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ اعضا ظاہر اور کھلے رہتے ہیں، بہت جلد میلے ہو جاتے ہیں اور باہم ملاقات کے وقت بھی یہی اعضا نظر پڑتے ہیں اور نیز تجربہ سے شہادت ملتی ہے کہ ہاتھ، پاؤں کے دھونے سے، منہ اور سر پر پانی چھڑکنے سے نفس پر بڑا اثر ہوتا ہے۔ خواب یا نہایت بیہوشی اس سے دور ہو جاتی ہے اور انسان اس کا تجربہ کر سکتا ہے اس تجربہ اور علم کی تصدیق اطبا کی تجویز سے بھی ہوتی ہے وہ اس شخص کے لئے جس کو غشی ہو یا اس کو زیادہ اسہال آتے ہوں یا کسی کی فصد زیادہ لی گئی ہو، یہی پانی چھڑکنا تجویز کرتے ہیں۔ تدابیر ثانیہ کے ابواب سے جن پر انسانی کمال کا مدار ہے اور لوگوں کے لئے وہ بہ منزلہ فطرت کے ہو گئے ہیں، طہارت بھی ایک باب ہے اور اس کی وجہ سے فرشتوں سے قرب اور شیاطین سے بعد حاصل ہوتا ہے اور عذاب قبر بھی اس سے دور ہو جاتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''پیشاب

سے بچو کیونکہ عام عذاب قبر اس سے ہوتا ہے'' اور طہارت کو اس میں بڑا دخل ہے کہ اس کے ذریعہ سے نفس، احسان کا درجہ حاصل کر سکتا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ کے اس قول میں اسی طرف اشارہ ہے ''پاکیزہ رہنے والوں کو خدا دوست رکھتا ہے''۔ جب طہارت کی کیفیت نفس میں خوب راسخ ہو جاتی ہے تو نور ملکی کا ایک شعبہ اس میں ٹھہر جاتا ہے اور بہیمیت کی تاریکی کا حصہ مغلوب ہو جاتا ہے۔ نیکیوں کے لکھے جانے اور خطاؤں کے دور ہونے کے یہی معنی ہیں۔ اور اگر رسمی طور سے بھی عمل میں لائی جائے تو رسمی بلاؤں میں مفید ثابت ہوتی ہے اور جب کوئی پاک آدمی اس کی ان ہیئتوں کی پابندی کرتا ہے جن کا لوگ سلاطین کے حضور میں لحاظ رکھا کرتے ہیں اور ان کے ساتھ ساتھ اذکار اور نیت کی بھی پابندی کرتا ہے تو سوء معرفت سے نجات پا جاتا ہے اور جب انسان خوب سمجھ جاتا ہے کہ طہارت اس کا کمال ہے تو بغیر کسی داعیہ حسیہ کے اس کے اعضا عقل کے تابع ہو جاتے ہیں اور سب سے زیادہ نفع کی بات یہ ہوتی ہے کہ طبیعت عقل کی مطیع ہو جاتی ہے۔ واللہ اعلم۔

نواں باب: نماز کے اسرار کا بیان

واضح ہو کہ کبھی آدمی حظیرۃ القدس کی سی حالت کو اخذ کر لیتا ہے پس جناب باری سے اس کو نہایت قرب ہو جاتا ہے پھر اس پر وہاں سے مقدس تجلیات کا نزول ہوتا ہے اور یہ شخص اپنے نفس پر غالب آ کر ایسی حالت کا مشاہدہ کرتا ہے جس کو زبان نہیں بیان کر سکتی جہاں تھا وہاں کا وہیں آ جاتا ہے اور وہ بے قرار ہو جاتا ہے لہٰذا اپنے نفس کو ایسی حالت میں تسکین دیتا ہے جو حالات سفلیہ میں سب سے عمدہ ہے۔ یعنی اپنے پروردگار کی معرفت میں مستغرق ہو جاتا ہے۔ پس وہ اسی کو پہلی حالت کے حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھتا ہے اور یہ حالت خدا کی عظمت اور اپنی عاجزی کے اظہار سے اور ان افعال و اقوال کے ذریعہ سے جو خدا کی حضور میں مناجات کرنے کے لئے مقرر ہیں، ہوا کرتی ہے اس کے بعد اس شخص کا درجہ ہے جو کسی مخبر صادق کو اس حالت کی طرف بلاتے اور رغبت دلاتے سنتا ہے پھر دلی شہادت سے اس کی تصدیق کرتا ہے اور اس کے احکام کی تعمیل کرتا ہے اور اس کے تمام وعدوں کو سچا پاتا ہے اور مراد کو پہنچ جاتا ہے۔ اس کے بعد اس کا مرتبہ ہے جس کو انبیا نے نمازوں پر مجبور کیا لیکن اس کو نماز کی خوبیوں کا ذاتی علم نہ تھا اس کی مجبوری ایسی ہی تھی جیسے

باپ اپنے بیٹے کو مفید صنعتوں کی تعلیم دے اور وہ ان کو پسند نہ کرتا ہو۔ کبھی آدمی خدا تعالیٰ سے مصیبت کے دور ہونے یا کسی نعمت کے ملنے کی درخواست کرتا ہے اس وقت زیادہ مناسب یہی ہوتا ہے کہ وہ تعلیمی افعال واقوال میں ہمہ تن مستغرق ہو جائے تا کہ اس کی ہمت کا جو دعا کی روح ہے کچھ اثر پڑ سکے۔ اور اسی وجہ سے نماز استسقا مسنون ہوئی ہے۔ نماز میں اصلی امور تین ہیں (۱) خدا تعالیٰ کی بزرگی اور جلال دیکھ کر نہایت خشوع اور خضوع کرنا (۲) خدا کی بزرگی اور اپنی عاجزی کو خوش بیانی سے ظاہر کرنا (۳) اس عاجزی کی حالت کے موافق اعضا میں آداب کا استعمال (شعر) تیری نعمتوں نے مجھ سے تین چیزیں خدمت میں لیں، میرے ہاتھ اور زبان اور پوشیدہ دل، میں اب ان تینوں سے تیری جناب میں شکر گزاری کرتا ہوں۔

افعال تعظیمی میں سے یہ ہے کہ اس کے روبرو کھڑا ہو کر مناجات کرے اور ہمہ تن اس کی طرف متوجہ ہو اور کھڑے ہونے سے بھی زیادہ تعظیم اس میں ہے کہ اپنی عاجزی اور خدا کی برتری کا خیال کر کے اس کے سامنے سرنگوں ہو جائے کیونکہ تمام بنی آدم اور بہائم میں یہ فطری امر ہے کہ گردن بلند کرنا تکبر اور خود پسندی کی علامت، اور سرنگوں ہونا عاجزی اور تعظیم کی علامت سمجھی جاتی ہے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے ''ان کی گردنیں اس کے سامنے جھک گئیں'' اور اس سے بھی زیادہ تعظیم کی بات یہ ہے کہ اپنے چہرے کو جو تمام اعضا میں زیادہ بزرگ اور حواس انسانی کے جمع ہونے کی جگہ ہے، اس کے سامنے رکھ دے یہی تینوں قسم کی فعل تعظیمیں تمام لوگوں میں رائج ہیں۔ جن کو اپنی نمازوں میں اپنے سلاطین اور امرا کے درباروں میں عمل میں لاتے ہیں اور سب صورتوں میں نماز کی وہ صورت عمدہ ہے جس میں یہ تینوں امر جمع ہوں اور اس کے ساتھ ہی ادنیٰ تعظیمی حالت سے اعلیٰ کی طرف ترقی ہو جو کہ خشوع اور خضوع میں ترقی ہوتی جائے اور جو فائدہ اس ترقی کی حالت میں ہو سکتا ہے وہ تنہا اعلیٰ درجہ کی تعظیم میں یا اعلیٰ حالت سے ادنیٰ کی طرف منتقل ہونے میں معلوم نہیں ہو سکتا۔ نماز میں اعمال مخصوصہ ہی کو اصل قرار دیا گیا ہے عظمت الٰہی میں صرف غور کر لینا یا ہمیشہ خدا کا ذکر کرنا اس میں اصل نہیں ٹھہرائے گئے اس لئے کہ خدا کی عظمت کا صحیح خیال صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کی طبیعتیں اعلیٰ درجہ کی ہیں اور ایسے لوگ بہت ہی کم ہیں اور ایسے لوگوں کے علاوہ اور عام لوگ اگر غور و خوض کرنے لگیں تو کند ذہن ہو جائیں اور فائدہ کے بجائے اصل مال کو

بھی کھو بیٹھیں اور محض ذکر بغیر شرح کے اور بغیر اس کے کہ کوئی عمل تعظیمی بھی اس کے ساتھ لگایا جائے اور جوارح میں آداب کالحاظ رکھا جائے، اکثر لوگوں کے حق میں ایک بیکار دوسری ہے البتہ ''نماز'' سو وہ ایسا معجون ہے جس کی ترکیب میں ایک تو تفکر ہے جو خدا کی عظمت کی طرف ثانوی ارادہ کے ساتھ پھیرا جاتا ہے۔

اور دوسری وہ توجہ ہے جو ہر شخص سے تبعاً پیدا ہوتی ہے اور جس کو گرداب شہود میں خوض کرنے کی استعداد حاصل ہو اس کو بھی کوئی مانع نہیں ہے وہ بخوبی اس میں غور کر سکتا ہے بلکہ نماز اس امر میں اس کے خوب اعانت کرے گی۔ اور نماز میں وہ دعائیں بھی ہیں جو اخلاص عمل پر، اسی طرح متوجہ ہونے پر اور اسی سے مدد مانگنے پر دلالت کرتی ہیں۔ اور تعظیمی افعال رکوع و سجود بھی ہیں جو ایک دوسرے کے معین، مکمل اور تنبیہ کرنے والے ہیں اس لئے نماز ہر خاص و عام کے حق میں نافع اور تریاق قوی الاثر ہوگئی تاکہ ہر انسان اس سے اپنی استعداد کے موافق فائدہ اٹھائے۔

نماز، ایمان والے کے لئے معراج ہے اور اس کو اخروی تجلیات کے لئے تیار کرتی ہے اور آنحضرت علیہ السلام کے اس قول میں اسی طرف اشارہ ہے کہ ''تم عنقریب اپنے پروردگار کو دیکھو گے پس تم فجر اور عصر کی نماز سے غافل نہ ہو جایا کرو، ان کو پڑھا کرو، اور یہ نماز خدا کی محبت اور رحمت کا بڑا سبب ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول میں اسی طرف اشارہ ہے، جنت میں لے جانے کے لئے، کہ میں شفاعت کر کے لے جاؤں گا تو بھی میری اعانت کر کہ اکثر نماز پڑھا کر'' اور خدا تعالیٰ کا اہل جہنم کے اس قول کے نقل کرنے میں بھی اسی طرف اشارہ ہے ''ولم نک من المصلّین'' (ہم نماز نہیں پڑھا کرتے تھے) اور جب نماز کا شوق مومن کے دل میں جم جاتا ہے تو وہ نور الٰہی میں غرق ہو جاتا ہے اور اس کے گناہ دور ہو جاتے ہیں (نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں) معرفت الٰہی کے لئے کوئی چیز نماز سے زیادہ مفید نہیں ہے بالخصوص جب نماز کے تمام افعال و اقوال حضور قلب اور پاک نیت سے ادا کئے جائیں اور اگر کوئی نماز کو رسما ادا کرے گا تو بھی رسمی برائیوں سے بچانے میں اس کا بھی نفع ہوگا۔ اور مسلمانوں کے لئے ایسی علامت قرار دی جائے گی جو کافر سے تمیز کر دے گی چنانچہ آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس قول میں اسی طرف اشارہ ہے کہ اہل اسلام اور کفار کے درمیان نماز عہد ہے پس جس نے نماز

ترک کردی وہ کافر ہو گیا۔ اور اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ نفس کو عقل کے ماتحت رہنے کا اور اس کے احکام پر چلنے کا عادی بنانے میں نماز کے برابر کوئی چیز نہیں۔ واللہ اعلم۔

دسواں باب: زکوۃ کے اسرار کا بیان

واضح ہو کہ جب کسی مسکین کو کوئی حاجت پیش آتی ہے اور وہ زبان حال یا قول سے خدا کے حضور میں گریہ وزاری کرتا ہے تو اس کے لئے خدا کی بخشش کا دروازہ کھلتا ہے اور کبھی مصلحت یہ ہوتی ہے کہ کسی نیک بندے کے دل میں یہ الہام ہوتا ہے کہ مسکین کی حاجت روائی کر دے۔ پس جب اس پر الہام چھا جاتا ہے اور اس کے موافق عمل کرتا ہے تو اس سے خدا خوش ہوتا ہے اور اوپر سے نیچے، دائیں سے بائیں سے اس پر برکتیں نازل ہوتی ہیں اور اللہ کی رحمت ہوتی ہے۔ ایک روز ایک مسکین نے اپنی انتہائی حاجت کے وقت مجھ سے سوال کیا تب میں نے اپنے دل میں الہام کی آہٹ پائی کہ وہ اس کو کچھ دینے کا مجھے حکم کرتا ہے اور وہ دنیا وآخرت میں بڑے اجر کی بشارت دیتا تھا، میں نے اس مسکین کی حاجت براری کرائی اور میں نے اپنے پروردگار کے وعدہ کو سچا دیکھ لیا اس غریب کا جود الٰہی کے دروازہ کو کھٹکھٹانا اور اس کو دینے کے لئے مجھ پر اس روز الہام ہونا اور اجر کا ظاہر ہونا یہ سب امور آنکھ کے سامنے محسوس ہوئے اور کبھی کسی موقع پر خرچ کرنا رحمت الٰہی کا باعث ہوتا ہے مثلاً جب ملأ اعلیٰ کی خواہش کسی مذہب کے مشہور اور معزز کرنے کے لئے طے ہو جاتی ہے تو جو اس کی اعانت کے درپے ہوتا ہے اس پر رحمت ہوتی ہے اور اس روز اس کا اس امر میں صرف کرنا غزوۃ العسرت (۱) کے مانند ہے۔ یا مثلاً جب کوئی قوم ایام قحط میں نہایت محتاج ہو اور خدا کو انہیں زندہ رکھنا منظور ہو۔

حاصل کلام یہ ہے کہ ان وجوہات سے مخبر صادق ایک کلیہ بنا کر یوں فرماتا ہے کہ جو اس طرح کے فقیر کو ایسی حالت میں کچھ دیگا تو اس کا عمل مقبول ہوگا۔ پس ان امور کو کوئی شخص سنتا ہے۔ اس پر عمل کرتا ہے اور وعدہ الٰہی کو حق پاتا ہے۔ اور بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ بعض لوگ مال کی محبت اور حرص زر کو اپنے مقصود اصلی کے لئے سدراہ اور مانع پاتے ہیں اس لئے اس سے ان

---

(۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس جہاد کا نام ہے جو آپ نے سخت گرمی اور تنگدستی کے وقت تبوک کے لئے چڑھائی کی تھی۔

کو تکلیف ہوتی ہے اس تکلیف کو وہ اس طرح دفع کر سکتے ہیں کہ وہ اس مال محبوب اور زر مرغوب کے صرف کرنے پر دل کو عادی کریں اس لئے خرچ کرنا ہی اس کے حق میں سب چیزوں سے زیادہ نافع ہوتا ہے اگر وہ صرف نہ کرے تو محبت اور بخیلی ویسی کی ویسی ہی اس میں باقی رہ جائے اور آخرت میں وہ بخل اور حرص سانپ بن کر نظر آئے یا یہ اموال کسی مضر چیز کی شکل میں ظاہر ہو کر ایذا پہنچائیں اور اس حدیث کا یہی مطلب ہے کہ قیامت کے دن وہ اموال جن کی زکوۃ ادا نہیں کی گئی صاحب مال کو روند دیں گے اور اس کو اس کے رو برو چٹیل میدان میں لٹا دیا جائے گا اور اس آیت میں بھی اسی طرف اشارہ ہے "جو لوگ سونا چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور زکوۃ نہیں دیتے تو اس سے ان کی پیشانی، پہلو اور پشت پر داغ لگائے جائیں گے" اور کبھی انسان کو بلا گھیر لیتی ہے اور اس کی ہلاکت کا عالم مثال میں حکم ہو چکتا ہے اتنے میں وہ عمدہ عمدہ مال صرف کرتا ہے، وہ خود اور اس کے ساتھ اچھے لوگ دعا کرتے ہیں، تو مال کے صرف سے اس کی ہلاکی محو ہو جاتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "قضا کو دعا ہی ہٹا سکتی ہے اور عمر کو سوائے نیکی کے کوئی چیز نہیں زیادہ کرتی"۔ اور آدمی کبھی طبیعت کے غلبہ سے کوئی برا کام کر لیتا ہے پھر اس کی برائی معلوم کر کے نہایت شرمندہ ہوتا ہے لیکن طبیعت پھر غالب آ جاتی ہے اور اسی کام کو پھر کرتا ہے، ایسے نفس کا علاج یہی ہے کہ اپنے فعل کے تاوان کے لئے بہت سا مال صرف کرے تا کہ یہ نقصان اس کے پیش نظر رہے اور پھر آئندہ ایسے قصد سے اس کو باز رکھے۔ اور کبھی حسن خلق اور انتظام خاندانی کا حفظان اس طرح سے ہوتا ہے کہ خوب کھانا کھلایا جائے۔ سلام میں تقدیم کی جائے اور طرح طرح کے سلوک کئے جائیں، ان امور کا حکم دیا جاتا ہے اور یہ امور اس کے لئے صدقہ شمار کئے جاتے ہیں۔ اور زکوۃ سے برکت زیادہ ہوتی ہے اس سے غضب الٰہی بجھ جاتا ہے اور فیضان رحمت ہونے لگتا ہے اور عذاب آخرت کو جو بخل پر مرتب ہوتا ہے، زکوۃ دور کر دیتی ہے اور ان ملأ اعلیٰ کی دعا کو جو زمین میں مصلح اور مدبر ہیں اس بندہ کے حق میں لوٹا لاتی ہے۔ واللہ اعلم۔

گیارھواں باب: روزہ کے اسرار کا بیان

واضح ہو کہ کبھی انسان الہام الٰہی کے ذریعہ یہ بات معلوم کرتا ہے کہ طبیعت بہیمی کا جوش اس کو کمال ذاتی سے باز رکھتا ہے اور وہ کمال قوت ملکیہ کا مطیع ہونا ہے اس لئے وہ بہیمیت کو برا سمجھتا

ہے وہ کوشش کرتا ہے کہ اس کے جوش کو مار دے۔ کوئی چیز اس کو اس کے تدارک کے لئے بجز اس کے نہیں ملتی کہ بھوکا، پیاسا رہے، مجامعت ترک کر دے، اپنی زبان، دل اور اعضا کو روکے رہے، ان امور سے وہ مرض نفس انسانی کا علاج کرتا ہے اس کے بعد اس شخص کا درجہ ہے جس نے سچی خبر دینے والے سے ان تدابیر کو دلی شہادت سے اخذ کیا ہو۔ اس کے بعد وہ شخص ہے جس کو انبیا شفقت اور مہربانی سے اس حالت کی طرف لاتے ہیں اور اس کو ان خوبیوں کا ذاتی علم نہیں ہوتا پس اس کسر شہوت کا فائدہ وہ آخرت میں پائے گا۔ اور کبھی انسان کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ طبیعت کا مطیع عقل ہونا کمال ہے اور اس کی طبیعت باغی ہے کبھی اطاعت کرتی ہے اور کبھی نہیں کرتی تو لامحالہ محنت کی ضرورت پڑتی ہے اس لئے محنت کے کام روزہ جیسے اختیار کرنے پڑتے ہیں وہ اپنی طبیعت کو ایسے کاموں پر مجبور کرتا ہے اور اطاعت کے عہد کو طبیعت سے پورا کرتا ہے وہ اس طرح انہیں امور کے اہتمام میں رہتا ہے حتیٰ کہ اس کا مقصود اصلی حاصل ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی کسی شخص سے گناہ سرزد ہو جاتا ہے تو وہ مدتوں تک روزے رکھے چلا جاتا ہے جن میں بہ نسبت گناہ کے زیادہ محنت ہوتی ہے تاکہ دوبارہ اس سے ایسا کام نہ ہو۔ اور نیز کبھی دل میں عورتوں کی رغبت پیدا ہوتی ہے لیکن نکاح کرنے کی قدرت نہیں ہوتی اس لئے زنا کے خوف سے وہ اپنی رغبت کو روزہ سے مار دیتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "جس شخص کو شادی کرنے کی طاقت نہ ہو تو وہ روزہ رکھے کیونکہ روزہ شہوت کے زور کو ختم کر دیتا ہے" اور روزہ ایک بڑی نیکی ہے اس سے ملکی قوت بڑھتی ہے اور بہیمی طاقت کمزور ہو جاتی ہے روح کی صفائی اور طبیعت کے دبانے کے لئے روزہ سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں۔ اس لئے خدا تعالیٰ فرماتا ہے "روزہ خاص میرے لئے ہے اور میں ہی اس کی جزا دوں گا"۔ روزہ سے بہیمیت کا جوش جس قدر کمزور ہوتا ہے اسی قدر گناہ دور ہوتے ہیں اور اس سے انسان کو فرشتوں کی حالت کے ساتھ مشابہت پیدا ہوتی ہے پس وہ روزہ دار سے محبت کرنے لگتے ہیں یہ محبت کا تعلق بہیمیت کے ضعیف ہونے کا اثر ہوتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "روزہ دار کے منہ کی بدبو خدا تعالیٰ کے نزدیک مشک کی خوشبو سے زیادہ پسندیدہ ہے" اگر روزہ رسمی طور پر ہو، تاہم رسمی امور کے لحاظ سے مفید ہے۔ جب کوئی امت اس کی پابندی

کرتی ہے تو ان کے شیاطین زنجیروں میں جکڑے جاتے ہیں ان کے لئے جنت کے دروازے کھل جاتے ہیں اور دوزخ کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ اور جب کوئی انسان نفس کو مغلوب کرنے کی اور اس کی برائی دور کرنے کی کوشش کرتا ہے تو عالم مثال میں اس کے عمل کی ایک مقدس صورت پیدا ہو جاتی ہے اور بعض اذکیا عارفین اس صورت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو عالم غیب سے ان کو علمی مدد ملتی ہے اور تنزیہ و تقدیس کے ذریعہ سے ذات باری تعالیٰ سے اس شخص کو قرب حاصل ہو جاتا ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کے یہی معنی ہیں "روزہ میرا ہے اور میں ہی اس کی جزا ہوں"۔ بسا اوقات انسان کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ امور معاش میں مصروف ہونا اور خارجی باتوں سے خواہش کا پر ہونا اس کے لئے مضر ہے۔ اور ایک مسجد میں جو عبادت کے لئے ہی ہے یکسو ہو کر عبادت کرنا بہتر اور نافع ہے۔ اور ہمیشہ کے لئے تو علیحدگی نہیں ہو سکتی لیکن اگر تمام کا تمام نہ ہو سکے تو بالکل ترک بھی نہ کرنا چاہئے۔

اس لئے اپنے اوقات میں کسی قدر فرصت نکال کر جتنا میسر ہے اعتکاف میں وقت گزارنا ہے۔ اس کے بعد اس شخص کی حالت ہے جس نے دلی شہادت سے مخبر صادق کے ذریعہ سے اعتکاف کی خوبی کو قبول کر لیا ہو، اس کے بعد وہ شخص ہے جس کو زبردستی اعتکاف کی طرف بلایا جاتا ہے جیسا کہ پہلے بیان ہوا۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص روزہ تو رکھتا ہے لیکن زبان کو بغیر اعتکاف کے پاک وصاف نہیں رکھ سکتا۔ کبھی لیلۃ القدر اور اس میں فرشتوں کی ملاقات کا طالب ہوتا ہے یہ بھی بغیر اعتکاف کے میسر نہیں ہو سکتا۔ لیلۃ القدر کے معنی آپ کو عنقریب معلوم ہوں گے۔ واللہ اعلم

بارھواں باب: حج کے اسرار کا بیان

واضح ہو کہ حج کی حقیقت یہ ہے کہ صالحین کی ایک بڑی جماعت ایک وقت خاص میں جمع ہو کر انبیا اور صدیقین، شہدا اور صالحین کے حالات کو جن پر خدا نے اپنا انعام کیا ہے یاد کرے اور ایسی جگہ میں جمع ہوں جہاں خدا کی ظاہر نشانیاں موجود ہوں۔ ائمہ دین کی بڑی بڑی جماعتیں حج کے لئے گئی ہیں جن کا مقصود خدا کے شعائر کی تعظیم، خاکساری اور رغبت، خدا سے گناہوں کی معافی اور خیر کی امید تھی جب اس کیفیت سے لوگوں کی ہمتیں جمع ہوتی ہیں تو لازمی طور پر خدا کی رحمت اور

مغفرت ان پر نازل ہوتی ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کا یہی مطلب ہے ''کہ شیطان جیسا کہ عرفہ کے روز نہایت ذلیل، صغیر اور حقیر اور غصہ میں نظر آتا ہے ایسا کسی روز نظر نہیں آتا۔ حج کی اصل ہر قوم میں موجود ہے کیونکہ ہر قوم کے لئے ایک ایسی جگہ ضرور ہوتی ہے جس میں خدا کی آیات ظاہرہ دیکھ کر لوگ اس کو تبرک سمجھتے ہیں اور ہر امت میں نذر و قربانی اور ایک ہیئت خاص بھی ہے جو ان کے بزرگوں سے چلی آتی ہے اور وہ اس کا التزام کرتے ہیں کیونکہ یہ ہیئت (احرام و تلبیہ و ہدی وغیرہ) مقربین کو ان کا وہ کام جس میں وہ لگے ہوئے ہیں ہر وقت یاد دلاتی رہتی ہے اور بیت اللہ ہی حج کرنے کے قابل ہے، اس میں آیات بینات ہیں اس کو خدا کے حکم اور وحی سے صاف اور پاک زمین میں حضرت ابراہیمؑ نے بنایا ہے اس کی مدح اکثر اقوام کی زبان پر چلی آتی ہے کیونکہ سوائے اس جگہ کے اور کوئی ایسی جگہ جہاں لوگ جاتے ہیں، شرک سے یا بے اصل من گھڑت چیزوں سے خالی نہیں۔ طہارت نفسانی میں سے یہ بھی ہے کہ ایسی جگہ رہنا اور ٹھیرنا اختیار کیا جائے جس کی صلحا ہمیشہ تعظیم کرتے رہے ہوں ذکر الٰہی سے اس کو معمور رکھا ہو کیونکہ اس مقام پر ملائکہ ارضیہ کی توجہات ہوتی ہیں اور اہل خیر کے حق میں ملأ اعلیٰ کی دعا نازل ہوتی رہتی ہے پس جب کوئی شخص اس جگہ میں ٹھیرتا ہے تو ان کے رنگ اس پر غالب آجاتے ہیں اور میں نے اس کا بارہا مشاہدہ کیا ہے اور ذکر الٰہی کے قسم میں خدا کے نشانات کا دیکھنا اور ان کی تعظیم کرنا بھی داخل ہے پس ان چیزوں کے دیکھنے سے خدا اس طرح یاد آتا ہے جیسے ملزوم کے دیکھنے سے کوئی لازم چیز یاد آتی ہے بالخصوص ایسے وقت پر جبکہ تعظیمی حالتوں اور حدود کی پابندی کی جائے جن سے نفس کو کمال درجہ تنبیہ حاصل ہوتی ہے۔ اور کبھی انسان کو اپنے پروردگار کے دیدار کا شوق ہوتا ہے پس اس شوق کو پورا کرنے والی حج کے سوا اور کوئی چیز نہیں جس طرح پر ہر سلطنت کو ایک مدت کے بعد دربار کرنے کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ سرکش اور فرمانبردار میں تمیز ہو، بادشاہت کی شہرت اور سلطنت کا بول بالا ہو اور اس کو ہر شخص جان جائے ایسے ہی مذہب کو حج کی ضرورت ہے تاکہ موافق اور مخالف میں تمیز ہو جائے اور دین الٰہی میں لوگوں کا گروہ ہو کر داخل ہونا عیاں ہو جائے۔ اور تاکہ ایک دوسرے سے مل کر ان فوائد کو حاصل کرے جو اس کو حاصل نہیں ہیں اس لئے کہ باہمی مقاصد ایک ... کے ملنے ہی سے حاصل ہوتے ہیں اور رسمی حج بھی بہت سے رسمی فوائد کا

اضافہ کرتا ہے۔ائمہ دین کی حالت یاد کرنے اور اس کی پابند ہونے میں حج سے زیادہ کوئی چیز مفید نہیں ہے اور چونکہ حج میں دور دراز سفر کرنا پڑتا ہے وہ نہایت دشوار عمل ہے، جو بغیر مشقت کے پورا نہیں ہوتا ہے اس لئے اس کا ادا کرنا خالص اللہ کی عبادت ہے جس سے خطائیں معاف ہوتی ہیں وہ پچھلے گناہوں کو ایسا دور کرتا ہے جیسا کہ ایمان

تیرھواں باب: اقسام نیکی کے اسرار کا بیان

نیکی کے اقسام میں سے ذکر الٰہی ہے کیونکہ ذکر الٰہی اور خدا کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہے سو معرفت کی اصلاح کے لئے اور خدا کی حضوری حاصل کرنے کے لئے اور دل کی قساوت دور کرنے کے لئے کوئی چیز ذکر سے زیادہ مفید نہیں ہے چنانچہ اس حدیث میں اسی طرف اشارہ ہے'' کیا تم کو سب اعمال میں افضل عمل نہ بتاؤں؟ ''الحدیث'' خصوصاً اس شخص کے لئے جس کی قوت بہیمی فطری طور پر یا عملاً ضعیف ہوتی ہے یا اس شخص کے لئے بھی جو فطرتاً اپنے خیال میں محسوس چیزوں کے احکام مجرد میں خلط ملط کر دیتا ہے۔اور انہیں اقسام میں سے دعا بھی ہے کیونکہ اس سے حضوری کا بڑا دروازہ کھل جاتا ہے اور نہایت درجہ اطاعت اور پروردگار عالم کی طرف احتیاج کو داعی کے سامنے کر دیتی ہے۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث میں اسی طرف اشارہ ہے کہ'' دعا عبادت کا مغز ہے'' یہ دعا مبدا کی جانب متوجہ ہونے کی ظاہری صورت ہے جو درخواست کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے اور اس چیز کے حاصل ہونے کی، جس کے لئے دعا مانگی گئی ہے، روح ہے۔نیز بڑی نیکی تلاوت قرآن اور اس کی نصائح کا سننا ہے جو شخص توجہ سے اس کو سنے گا اور اس کو دل میں جگہ دے گا تو بیم و امید کی حالتیں، خدا کی عظمت میں حیرانی، اس کے احسانات میں استغراق کے اثرات پیدا ہو جائیں گے اور طبیعت کی پژمردگی سے نہایت درجہ نفع محسوس کرے گا اور عالم بالا کے اثرات حاصل کرنے کی استعداد پیدا کر لے گا اور اسی لئے آخرت میں وہ نہایت نافع ہے اور ملائکہ قبر کے اس قول سے یہی مراد ہے'' تو نے نہ حق کو جانا، نہ قرآن کی تلاوت کی'' قرآن کی تلاوت سے نفس کو سفلی کیفیتوں سے پاکی حاصل ہوتی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے'' ہر چیز کے لئے ایک خاص صیقل ہوتی ہے اور دل کی صیقل قرآن کا تلاوت کرنا ہے''۔اور نیز نیکیوں میں سے قرابت والوں اور ہمسایوں کے حقوق ادا

کرنا ہے۔ اہل شہر اور اہل مذہب کے ساتھ سلوک سے پیش آنا ہے اور غلاموں کو آزادی دینا ہے، ان امور سے رحمت اور اطمینان نازل ہوتا ہے، تدابیر دوم اور سوم کے انتظامات ان سے مکمل ہوتے ہیں اور ان ہی امور کی وجہ سے فرشتوں کی نیک دعا لگتی ہے۔ نیز نیکیوں میں سے جہاد ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کسی برے آدمی سے جس کا نہ ہونا مصلحت کلیہ کے موافق ہے اور وہ جمہور کو ضرر پہنچاتا ہے ناراض ہو کر کسی نیک آدمی کے دل میں اس کے قتل کرنے کا الہام کرتا ہے اس کی طبیعت سے محض خدا کے لئے بغیر کسی سبب طبعی کے غصہ پیدا ہوتا ہے وہ اپنے تمام ذاتی امور سے اس کام کے لئے علیحدہ ہو کر خدا کی مرضی میں ہمہ تن مصروف ہو کر خدا کی رحمت اور نور میں غرق ہو جاتا ہے اور اس موذی کو قتل کر کے تمام آدمیوں اور شہروں کو نفع پہنچاتا ہے اسی کے قریب یہ حالت بھی ہے کہ خدا تعالیٰ کو کسی ایسی قوم کا برباد کرنا منظور ہوتا ہے جو ظالم، خدا کی منکر اور نہایت بدکار ہوتی ہے اس لئے کسی نبی کو جہاد کرنے کا حکم دیا جاتا ہے، اس کی قوم کے دل میں جہاد کی خواہش پیدا کی جاتی ہے تاکہ سب قوموں میں اچھی قوم ہو جائے اور ان پر رحمت الٰہی ہو۔ اور کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ رائے کلی سے کسی قوم کو معلوم ہوتا ہے کہ مظلوموں کو درندہ خصلت لوگوں سے بچایا جائے اور نافرمانوں کو سزا دی جائے اور بری باتوں سے منع کیا جائے، ان کوششوں سے لوگوں میں امن واطمینان پیدا ہو جاتا ہے۔

اور خدا اس قوم کو اس خدمت کا بدلہ دیتا ہے اور انہی میں سے تقریبات ہیں جو بلا قصد پیش آجاتے ہیں جیسے مصائب اور امراض، پس یہ امور چند وجوہ سے نیکی میں شمار ہوتے ہیں ان میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ جب رحمت الٰہی انسان کی اصلاح عمل چاہتی ہے اور اسباب عالم کا مقتضی ہوتا ہے کہ اس کی حالت تنگ ہو جائے تو وہی رحمت اس کے تکمیل نفس کی باعث ہو کر اس کی خطاؤں کو مٹاتی ہے اور اس کے لئے حسنات لکھے جاتے ہیں جیسے کہ جب پانی کے جاری ہونے کا راستہ بند کر دیا جاتا ہے اور پانی اس کے اوپر اور نیچے سے بہنے لگتا ہے تو یہ بہنا اس تنگی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اور سر (راز) اس میں خیر نسبی پر محافظت رکھنا ہے اور ان امور میں کبھی اس وجہ سے نیکی آجاتی کہ جب مومن پر ایسی مصیبتیں پڑتی ہیں کہ زمین بھی اس پر تنگ ہو جاتی ہے تو اس وقت میں طبیعت اور رسم کا حجاب اٹھ جاتا ہے اور اس کا دل خدا کے سوا سب سے ہٹ جاتا ہے لیکن

کافر اپنی گم شدہ چیز کو ہمیشہ یاد کرتا رہتا ہے اور اسی زندگی میں ڈوبا رہتا ہے حتیٰ کہ یہ مصیبت پڑنے سے اور بھی خبیث تر ہو جاتا ہے۔ اور کبھی وہ سختیاں نیکی کا باعث اس لئے ہوتی ہیں کہ تمام روکنے والی برائیاں غلیظ اور کثیف قوت طبعی میں جمع ہوتی ہیں پس جب یہ شخص بیمار ہوتا ہے اور کمزور ہو جاتا ہے اور جتنا کہ بدن کو پہنچتا ہے اس سے زیادہ مادہ تحلیل ہو جاتا ہے تو برائیوں کی قوت حاملہ بھی تحلیل ہو جاتی ہے اور بقدر قوت حاملہ کی تحلیل کے گناہ بھی کم ہو جاتے ہیں جیسے ہم دیکھتے ہیں کہ مریض کی خواہش نفسانی، غصہ وغیرہ سب دور ہو جاتے ہیں اس کے اخلاق بدل جاتے ہیں اور وہ پچھلے امور کو ایسا بھول جاتا ہے کہ گویا اس میں وہ موجود ہی نہ تھے اور ایک صورت یہ ہے کہ جب مسلمان کی قوت بہیمی اس کی قوت ملکی سے آزاد ہوتی ہے تو دنیا ہی میں اس کے اکثر گناہوں پر مواخذہ ہوتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ دنیا کی مصیبت مومن کے لئے عذاب ہے۔ واللہ اعلم۔

چودھواں باب: مراتب گناہ کا بیان

واضح ہو کہ جس طرح بہت سے عمل ہیں جو اطاعت کا جسم ہیں اور بہت سے طریقے ہیں جن سے اطاعت حاصل ہوتی ہے، جن سے قوت بہیمی کا قوت ملکی کے تابع ہونا معلوم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ایسے بھی اعمال، مواقع اور طریقے ہیں جن سے نافرمانی کی حالت معلوم ہوتی ہے، انہی امور کو گناہ کہتے ہیں ان گناہوں کے مختلف مرتبے ہیں۔ اول وہ گناہ ہیں جو انسانی کمال اور ترقی کا راستہ بالکل مسدود کریں، ایسے بڑے گناہ دو قسم کے ہیں۔ اول قسم خدا تعالیٰ سے متعلق ہے وہ یہ کہ اپنے رب کو ہی نہ پہچانتا ہو یا اس کا علم تو رکھتا ہو لیکن مخلوقین کے اوصاف اس میں ثابت کرتا ہو یا خدا کی صفات مخلوقین میں ثابت کرتا ہو۔ دوسری صورت تشبیہ کی ہے اور تیسری شرک کی، کیونکہ نفس اس وقت مقدس ہوتا ہے جب تجرد فوقانی کا اور تدبیر عام کا جو تمام عالم کو محیط ہو رہی ہے بصیرت کی آنکھ سے مطالعہ کرتا رہے جب اس قسم کا غور ضائع کر دے گا تو نفس اپنی ہی حالت میں مشغول رہے گا یا اپنی ہی جیسی حالت میں مقید رہے گا اور بیگانگی کا پردہ ذرا سا بھی نہ ہٹا سکے گا بس یہ سب سے بڑی بلا ہے اور دوسری قسم بڑے گناہ کی اس امر کا اعتقاد کرنا ہے کہ بجز اس بدنی زندگی کے اور کوئی زندگی نہیں ہے اور بدن کے لئے اور کوئی کمال دوسرا نہیں ہے جس کا طلب کرنا اس کے لئے ضروری ہو۔ پس جب دل میں یہ برا اعتقاد قائم ہوگا تو کمال کی طرف نظر نہ کرے گا اور جب کہ اس بات کا

ثبوت کہ نفس کے لئے کمال جسمانی کے علاوہ اور بھی کمال ہے، عام لوگوں کے لئے بغیر اس کے ممکن نہ تھا کہ وہ ایک ایسی حالت کا تصور کریں جو حالت موجودہ کے بالکل مخالف ہو کیونکہ اگر ایسی حالت کا تصور نہ کیا جائے گا تو انسان معقول کو چھوڑ کر محسوس ہی میں مشغول ہو جائے گا پس اس لئے ایک یاد دلانے والی چیز مقرر کی گئی اور وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہونے اور روز قیامت کے آنے پر ایمان لانا ہے چنانچہ اس آیت میں یہی مراد ہے اور جو لوگ آخرت کا یقین نہیں کرتے ان کے دل منکر ہیں اور وہ متکبر ہیں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ جب انسان اس درجہ کے گناہ میں رہ کر مر جاتا ہے اور اس کی قوت بہیمی مضمحل ہو جاتی ہے تو نہایت درجہ کی نفرت آسمانی جانب سے اس کو لپٹتی ہے جس سے وہ کبھی چھٹکارا نہیں پا سکتا۔ اور دوسرا مرتبہ گناہ کا یہ ہے کہ قوت بہیمی کے غرور سے آدمی ان فضائل سے تکبر کرتا ہے جو خدا تعالیٰ نے لوگوں کے لئے اپنے کمالات تک پہنچنے کے لئے قرار دیئے ہیں۔ اور ملأ اعلیٰ نہایت اہتمام سے پیغمبروں اور شریعتوں کے ذریعہ سے ان کے شائع کرنے اور ان کی شان بلند کرنے کا قصد کرتے ہیں لیکن ایسا شخص ان امور کا انکار کر کے ان سے دشمنی کرتا ہے اور جب یہ مر جاتا ہے تو ملأ اعلیٰ کی تمام ہیئتیں اس سے نفرت کرتی ہیں اور اس کو عذاب دینے کی طرف مائل ہوتی ہیں اور اس کے گناہ اس کو اس طرح گھیر لیتے ہیں کہ پھر اس کو نکلنے کا موقع نہیں ملتا اور چونکہ وہ اپنے کمال کو نہیں پہنچتا اور اگر پہنچتا بھی ہے تو وہ پہنچنا قابل لحاظ نہیں ہوتا اس واسطے یہ حالت اس سے کبھی جدا نہیں ہوتی۔ یہ مرتبہ آدمی کو تمام مذاہب میں اپنے نبی کے طریقے سے باہر کر دیتا ہے۔

اور تیسرا مرتبہ گناہ کا یہ ہے کہ آدمی نجات کے کاموں کو ترک کر دے اور ایسے ایسے کام کرے جن کے کرنے والے پر لعنت مقرر ہے۔ یا تو ان کاموں کی وجہ سے زمین میں کسی بڑے فساد کا گمان غالب ہوتا ہے یا اس کی صورت تہذیب نفس کے بالکل خلاف ہوتی ہے اس کی چند صورتیں ہیں یا وہ شریعت کے ان احکام کی تعمیل نہ کرے جن سے فرمانبرداری حاصل ہوتی ہے یا فرمانبرداری کی کچھ نہ کچھ اس میں آمادگی پیدا ہوتی ہے شرائع کی تعمیل لوگوں کے لئے جداگانہ اور مختلف طور پر ہے جو لوگ بہیمیت میں ڈوبے ہوئے ہوں اور یہ قوت ان میں کمزور ہو ان کو تو احکام شرعیہ کی کثرت کی ضرورت ہوتی ہے اور جن میں یہ قوت شدید اور غلیظ ہوتی ہے ان کو اعمال شاقہ

کی کثرت کی ضرورت ہوا کرتی ہے ان اعمال میں سے بعض اعمال درندوں کے سے ہوتے ہیں جو بڑی لعنت کے مستحق ہوتے ہیں مثلاً قتل بعض اعمال شہوانی ہیں، بعض ضرر پہنچانے والے پیش رہیں جیسے جوا اور سود اوران تینوں قسم کے گناہوں سے نفس میں بڑا رخنہ پیدا ہوتا ہے کیونکہ ان امور میں راہ راست کے خلاف اقدام ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا اوران گناہوں کے سبب سے ملأ اعلیٰ کی جانب سے ایسی لعنت پڑتی ہے جو انسان کا ہر طرف سے احاطہ کر لیتی ہے اس لئے ان دونوں کے ملنے سے عذاب حاصل ہوتا ہے یہ تیسرا مرتبہ سب گناہوں سے بڑا ہے۔ حظیرۃ القدس میں اس کی حرمت اوراس کے مرتکب پر لعنت قرار پا چکی ہے تمام انبیا ہمیشہ اس کو بیان کرتے آئے ہیں ان میں سے اکثر تمام شرائع میں متفق علیہ ہیں۔

چوتھا مرتبہ ان شرائع اور طریقوں کی نافرمانی کرنا ہے جو زمانہ اور اقوام کے بدلنے سے بدلتے جاتے ہیں اوراس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کی طرف کوئی نبی مبعوث کرتا ہے تاکہ ان کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف لائے، ان کے نقص کی اصلاح کرے اوران میں اچھے طور پر سیاست جاری کرے تو اس کے مبعوث ہونے میں یہ بات داخل ہوتی ہے کہ نہایت اہم امور جن کے بغیر ان کی اصلاح اور سیاست نہیں ہو سکتی واجب قرار پاتے ہیں اس لئے ہر ایک مقصد کے لئے ایک معیار دائی یا اکثری ضرور ہوتی ہے اس کے لحاظ سے ان سے مواخذہ اور خطاب کیا جاتا ہے۔ ہر ایک امر کے لئے اوقات متعین کرنے کے لئے ضروری قاعدے ہوا کرتے ہیں اور بعض امور کسی مصلحت یا فساد کی طرف داعی ہوتے ہیں تو ان کے بموجب حکم کیا جاتا ہے اوران میں سے بعض امور کا مامور بہ اور منہی عنہ ہونا قطعی ہے اور بعض کا قطعی نہیں ہے۔ ان میں سے قلیل کے بارے میں وحی ظاہر نازل ہوئی ہے اوران میں سے اکثر نبی کے اجتہاد سے ثابت ہوئے ہیں۔

پانچواں مرتبہ وہ ہے جس کی نسبت نہ تو شارع نے کچھ تصریح کی اور نہ ملأ اعلیٰ میں اس کا کوئی حکم ثابت ہوا لیکن بندہ جب خدا کی طرف اپنی پوری ہمت سے متوجہ ہوتا ہے تو اس کو قیاس یا تخریج وغیرہ سے کسی چیز کے مامور یا ممنوع ہونے کا گمان ہوتا ہے جس طرح بعض عوام کو ناقص تجربہ سے یا حکیم کے کسی علت پر حکم لگا دینے سے بعض دواؤں کی تاثیر معلوم ہو جاتی ہے۔ حالانکہ نہ ان کو تاثیر

کی وجہ معلوم ہے نہ طبیب نے تصریح فرمائی ہے اس قسم کی چیزوں سے بھی انسان بغیر احتیاط برتے بری الذمہ نہیں ہوسکتا ورنہ اس کے اور خدا تعالیٰ کے درمیان اس کے گمان کی وجہ سے ایک پردہ حائل ہو جائے گا اور وہ اس کی وجہ سے ماخوذ ہوگا۔ اس مرتبہ میں اصل خوشنودی کے قابل یہ ہے کہ ان چیزوں کو چھوڑ دے اور ان کی طرف بالکل توجہ نہ کرے لیکن بعض لوگ ایسی چیزوں کو از خود اپنے اوپر واجب کر لیتے ہیں پھر اس کے بموجب خدا تعالیٰ ان سے مطالبہ کرتا ہے چنانچہ اس بارے میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''میں بندہ کے گمان کے موافق پیش آتا ہوں''۔ اور یہ آیت بھی اسی بارے میں وارد ہے ''رہبانیت جس کو انھوں نے خود ایجاد کر لیا ہے ہم نے ان پر اس کو اس لئے واجب کیا تھا کہ خدا کی رضامندی کی تلاش میں رہیں''۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اپنے اوپر سختی نہ کرو ورنہ خدا تم پر سختی کرے گا۔ اور فرمایا کہ گناہ وہی ہے جو تیرے دل میں برا اثر پیدا کرے، یہی حال اس حکم کی نافرمانی کا ہے جو کسی مجتہد کے اجتہاد سے ثابت ہوا ہو اور اسی مجتہد کا جس نے یہ حکم دیا ہے نافرمانی کرنے والا پیرو اور مقلد ہو۔ واللہ اعلم۔

پندرھواں باب: گناہوں کی خرابیوں کا بیان

واضح ہو کہ گناہ صغیرہ اور کبیرہ کا اطلاق دو لحاظ سے کیا جاتا ہے اوّل نیکی اور گناہ کی حکمت کے لحاظ سے دوم شریعتوں اور طریقوں کے لحاظ سے جو ہر زمانہ کے ساتھ مخصوص ہیں۔ نیکی اور گناہ کی حکمت کی نظر سے گناہ کبیرہ ایسے گناہ کو کہتے ہیں جس کے سبب سے قبر یا قیامت میں عذاب واجب یا ضروری ہو جائے اور تدابیر نافعہ میں بڑی خرابی پیدا کر دے اور فطرت کے بالکل خلاف ہو اور صغیرہ گناہ وہ ہے جس میں امور بالا میں سے کسی امر کے ہونے کا شبہ ہو یا اکثر اوقات ان امور کی طرف مفضی ہو، یا ایک وجہ سے اس میں اس قسم کی کوئی خرابی پیدا ہوتی ہو اور دوسری وجہ سے وہ خرابی نہ پیدا ہوتی ہو، مثلاً کوئی شخص خدا کی راہ میں خرچ کرے اور گھر کے لوگ بھوکے رہ جائیں، تو اس نے بخل کا عیب تو دفع کیا لیکن خانہ داری کی تدبیر کو کھو دیا۔ اور گناہ کبیرہ باعتبار شریعت کے وہ گناہ ہے جس کے حرام ہونے کی شارع نے تصریح کر دی ہو یا اس کے مرتکب کے لئے دوزخی ہونے کی وعید کی گئی ہو یا اس پر کوئی حد مقرر کی ہو، یا اس فعل کی برائی کی شدت بیان کرنے کے لئے س کے مرتکب کو کافر، دائرۂ اسلام سے خارج کہا ہو، کبھی بعض امور نیکی اور گناہ کے لحاظ سے صغیرہ

ہوتے ہیں لیکن شریعت کے لحاظ سے وہی کبیرہ قرار پاتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ زمانہ جاہلیت میں بعض گناہ صغیرہ یہاں تک رواج پا جاتے ہیں کہ وہ رسم ہو کر ان میں پھیل جاتے ہیں، ان کے دلوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں جب بھی وہ ان کے دلوں سے نہیں نکلتے، اس کے بعد زمانہ شریعت میں ان کی ممانعت ہوتی ہے لیکن وہ لوگ اس کام پر اڑ جاتے ہیں اس کے کرنے پر اصرار کرتے ہیں، شرع سے ان کے اصرار پر تہدید اور سختی ہوتی ہے یہاں تک کہ اس کا مرتکب شریعت کا دشمن سمجھا جاتا ہے۔ ایسے فعل کو وہی شخص کرتا ہے جو مردود اور سرکش ہو جس کو خدا سے اور لوگوں سے کسی قسم کی حیا نہ ہو۔

حاصل کلام یہ ہے کہ ہم ان گناہوں کی تفصیل جو شریعت کے لحاظ سے کبیرہ قرار دیئے گئے ہیں۔ اس کتاب کی دوسری قسم میں بیان کریں گے، وہیں ان کے بیان کا موقع ہے لیکن ان گناہوں کی خرابیاں جو بر و اثم کی حکمت سے کبیرہ قرار دی گئی ہیں ہم یہیں بیان کرتے ہیں جیسا کہ ہم نے انواع بر میں اس طور پر کلام کیا تھا۔

لوگوں کا اس میں اختلاف ہے کہ کوئی شخص جو گناہ کبیرہ کا مرتکب ہے بغیر توبہ کے مر جائے تو یہ جائز ہے یا نہیں کہ خدا اس گناہ کو معاف کر دے، ہر فریق نے کتاب وسنت سے اپنے اپنے دلائل بیان کئے ہیں لیکن میرے نزدیک اس اختلاف کا حل یہ ہے کہ خدا کے افعال دو طرح پر ہیں اول وہ افعال جو بعادت استمراری ہوتے رہتے ہیں۔ دوم وہ جو خلاف عادت ظہور پذیر ہوتے ہیں اور جو مسائل لوگوں کے سامنے ذکر کئے جاتے ہیں وہ بھی دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک موافق عادت اور دوسری مطلق۔ اور تناقض کی شرط جہت کا ایک ہونا ہے جیسا کہ منطقیوں نے قضایا موجہ میں ذکر کیا ہے اور کبھی جب جہت کو ذکر نہیں کرتے تو وہاں قرائن کو دیکھنا ضروری ہو جاتا ہے سو جب ہم یہ کہتے ہیں کہ جو زہر کھائے گا مر جائے گا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ عادت کے موافق زہر کا یہ اثر ضرور ہوگا اور جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے کہ جو زہر کھائے وہ مر ہی جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر ایسا ہوگا تو خلاف عادت ہوگا پس ان دونوں قولوں میں جہت واعتبار کے مختلف ہونے کی وجہ سے کوئی تناقض نہیں۔ اور جس طرح خدا تعالیٰ کے افعال دنیا میں عادت کے موافق اور عادت کے خلاف ہیں اسی طرح آخرت میں اس کے افعال عادت کے موافق اور عادت کے خلاف ہیں۔

پس عادت مستمرہ تو یہی ہے کہ وہ اس گنہ گار کو جو بغیر توبہ کے مرجائے ایک مدت دراز تک عذاب میں رکھے اور کبھی خلاف عادت بھی کر گزرتا ہے ایسے ہی حقوق العباد کا حال ہے اور صاحب کبیرہ کا ہمیشہ عذاب میں رہنا صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ بات خدا کی حکمت سے بہت بعید ہے کہ وہ صاحب کبیرہ سے ایسا ہی معاملہ کرے جو کافر کے ساتھ کرے گا یعنی دونوں کو مساوی کردے۔ واللہ اعلم۔

سولھواں باب: ان گناہوں کا بیان جو بندے کے نفس سے متعلق ہیں

واضح ہو کہ انسان کی قوت ملکیہ کا قوت بہیمیہ نے ہر طرف سے احاطہ کر رکھا ہے اس کی حالت اس پرندہ کے مانند ہے جو قفس میں بند ہے اس پرند کی خوش نصیبی اسی میں ہے کہ اس قفس سے نکل کر اپنے اصلی مکان کے چمن میں پہنچ جائے اور وہاں بیٹھ کر اچھے اچھے دانے اور عمدہ عمدہ پھل کھائے اور اپنے ہم جنس پرندوں میں مل کر خوشیاں منائے اسی طرح انسان کی حد درجہ بد نصیبی اس میں ہے کہ وہ دہریہ بن جائے۔ دہریہ کی حقیقت یہی ہے کہ وہ ان علوم فطریہ کا مخالف ہو جائے جو خدا تعالیٰ نے اس میں پیدا کیے ہیں۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ انسان کی اصل فطرت میں مبدأ جل جلالہ کی جانب ذاتی میلان ہے اور نہایت درجہ اس کی تعظیم کرنے کی خواہش ہے، اس آیت میں اسی طرف اشارہ ہے "اور اس وقت کو یاد کرو جبکہ تیرے رب نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی اولاد کو نکالا اور ان کو اپنی جانوں پر گواہ کیا" اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قول میں کہ "سب کی پیدائش فطرت اسلام پر ہوئی ہے" اسی طرف اشارہ ہے۔ اور خدا تعالیٰ کی بے انتہا تعظیم دل میں جب ہی راسخ ہوتی ہے کہ خدا کی نسبت اعتقاد کیا جائے کہ وہ اپنے قصد اور اختیار سے ہر قسم کا تصرف کرتا ہے اعمال کی جزا دیتا ہے ان کے لئے شریعت مقرر کرتا ہے جو شخص اس کا منکر ہو کہ اس کا کوئی پروردگار ہے جس پر تمام ہستی کا سلسلہ ختم ہوتا ہے، یا ایسا اعتقاد کرے کہ خدا تعالیٰ معطل ہے عالم میں کوئی تصرف نہیں کرتا یا تصرف کرتا ہے تو بلا قصد اور مجبوراً نہ کرتا ہے، یا وہ اپنے بندوں کے اچھے برے افعال کی جزا نہیں دیتا، یا وہ خدا تعالیٰ کو دیگر مخلوقات جیسا اعتقاد کرے یا اس کے سے صفات کا مخلوق میں اعتقاد کرے یا یہ اعتقاد کرے کہ خدا بندوں پر کسی نبی کی معرفت شریعت فرض نہیں کرتا پس ایسا ہی شخص دہریہ ہے جس کے دل میں نہ اللہ تعالیٰ کی تعظیم ہے اور نہ اس کے فہم کو حظیرۃ القدس تک رسائی ہے وہ بمنزلہ ایک پرندکے ہے جو اپنے قفس میں بند ہے جس میں سوئی

کے برابر بھی سوراخ نہیں مرنے کے بعد اس پر سب چیزیں ظاہر ہو جائیں گی اور کسی قدر قوت ملکی ظاہر ہوگی اور اس کے فطری میلان میں حرکت پیدا ہوگی لیکن پروردگار کے علم اور حظیرۃ القدس کی رسائی سے عوائق مانع ہوگے اور اس سے اس کے نفس میں نہایت وحشت کا جوش ہوگا اور اس ناپاک حالت پر باری تعالیٰ اور ملأ اعلیٰ کی نظر پڑے گی تو ناخوش اور حقارت کی نگاہ تند سے وہ دیکھا جائے اور ملائکہ کی طرف اس کو عذاب دینے کا الہام ہوگا اور وہ عالم مثال اور عالم خارجی میں عذاب پائے گا۔ اور اس میں بھی انسان کی بڑی بدبختی ہے کہ وہ کافر ہو جائے اور خدا تعالیٰ کی اس شان سے تکبر کرے۔ جس کا اس آیت میں ذکر ہے۔ ''كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ'' اور شان سے مراد یہ ہے کہ عالم کے لئے حکمت الٰہی کے موافق دور اور طریقے معین ہوتے ہیں پس جب کوئی دور شروع ہوتا ہے تو خدا تعالیٰ ہر آسمان میں اس کے احکام جاری کرتا ہے اور ملأ اعلیٰ کو مناسب تدابیر پر لگاتا ہے اور لوگوں کے لئے ایک شریعت اور مصلحت مقرر کرتا ہے۔

پھر خدا تعالیٰ ملأ اعلیٰ کو الہام کرتا ہے کہ عالم میں اس طریقہ کے پھیلانے پر متفق ہو جائیں پس ان کے اتفاق سے لوگوں کے دلوں پر الہام ہوتا ہے یہ مرتبہ شان کا، اسی قدیم مرتبہ کا پرتو ہے جس میں حدوث کا شائبہ بھی نہیں اور یہ بھی اس پہلے مرتبہ کی طرح باری تعالیٰ کے کمالات کو ظاہر کرنے والا ہے سو جو شخص اس شان کے خلاف ہو، اس سے بیزاری ظاہر کی اور لوگوں کو روکا تو اس پر ملأ اعلیٰ سے ایسی لعنت پڑتی ہے جو ہر طرف سے اس کا احاطہ کر لیتی ہے اور اس کی وجہ سے اس کے عمل ضائع ہو جاتے ہیں، دل سخت ہو جاتا ہے اور اچھی باتوں کو جو اس کے لئے نفع بخش ہوں حاصل نہیں کر سکتا۔ چنانچہ اس آیت میں اسی طرف اشارہ ہے ''جو لوگ ہماری کھلی نشانیوں اور ہدایت کو اس کے بعد بھی چھپاتے ہیں کہ ہم نے لوگوں کے لئے کتاب میں صاف صاف بیان کر دیا ہے ان پر خدا اور لعنت کرنے والے لعنت کرتے ہیں''۔ اور اس آیت میں بھی اسی طرف اشارہ ہے ''خدا نے ان کے دلوں اور کانوں میں مہر لگا دی ہے پس یہ شخص اس پرندہ کے مانند ہے جو ایسے قفص میں بند ہے جس میں سوراخ ہیں لیکن اس کے اوپر بڑا غلاف پڑا ہوا ہے۔ اس دہریہ اور کافر سے کم مرتبہ میں وہ شخص ہے جو توحید اور تعظیم الٰہی کا اعتقاد تو ٹھیک رکھتا ہے لیکن نیکی اور گناہ کی حکمت کے لحاظ سے جن احکام کا حکم دیا گیا تھا اس نے ان کی تعمیل نہیں کی، اس کی مثال ایسے

شخص کی سی ہے جو شجاعت کو اور اس کے فائدہ کو تو جانتا ہے لیکن یہ صفت شجاعت اس میں حاصل نہیں ہے کیونکہ شجاعت کا جاننا اور ہے اور صفت شجاعت کا حاصل ہونا اور ہے یہ شخص اس سے اچھا ہے جو شجاعت کے معنی بھی نہیں جانتا۔ اس کی حالت اس پرندہ کی سی ہے جو ایسے قفص میں ہے جس میں سوراخ ہیں وہ سبزہ زار اور میوہ جات کو دیکھتا ہے، مدتوں وہاں رہ چکا تھا لیکن اب آ پھنسا پس اسی کے شوق میں بازو پھڑ پھڑاتا ہے اور سوراخوں میں چونچ ڈال دیتا ہے لیکن باہر نکلنے کا راستہ نہیں پاتا، نیکی اور گناہ کی حکمت کے لحاظ سے کبائر یہی ہیں۔ اور اس شخص سے بھی کمتر درجہ اس شخص کا ہے جس نے تمام احکام کی بجا آوری تو کی لیکن ان شرائط کے ساتھ نہیں کی جو ان کے لئے ضروری ہیں، پس اس کی مثال اس پرندہ کی ہے جو ایک شلتہ قفص میں بند ہے جس میں سے بدقت نکل سکتا ہے جب تک جلد میں خراش نہ ہو اور پر نچ نہ جائیں وہاں سے نکلنا متصور نہیں۔ پس وہ بڑی جدوجہد سے باہر نکل سکتا ہے لیکن چونکہ اس کے پروں میں اور بازو میں نکلتے وقت خراش پہنچی ہے اس لئے اپنا ابنا جنس کے ساتھ نہ باغ کے پھل کھا سکتا ہے نہ ان کے ساتھ مل کر خوشیاں منا سکتا ہے یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اعمال صالحہ کے ساتھ برے اعمال بھی کئے ہیں ان کے لئے عوائق اور مانع وہ گناہ ہیں جو نیکی اور گناہ کی حکمت کے اعتبار سے صغیرہ گناہ ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پل صراط کی حدیث میں ان تین کی طرف اشارہ کیا ہے، آپ نے فرمایا بعض لوگ پل صراط سے گر کر جہنم میں چلے جائیں گے، بعض زخمی ہو کر نجات پالیں گے اور بعض کو آگ کی لپیٹ کے بعد نجات مل جائے گی۔ واللہ اعلم۔

سترھواں باب: ان گناہوں کا بیان جن کا تعلق لوگوں سے ہوتا ہے

واضح ہو کہ حیوانات کی قسمیں مختلف ہیں بعض تو ایسے ہیں جو کیڑوں کی طرح زمین میں پیدا ہوتے ہیں ان کا حق یہ ہے کہ پروردگار صور کی طرف سے یہ الہام ہوتا ہے کہ وہ کیسے اپنی غذا حاصل کریں ان کو تدبیر منزل کا الہام نہیں ہوتا۔ اور بعض حیوانات ایسے ہیں کہ ان میں توالد و تناسل ہوتا ہے بچوں کی پرورش میں نر و مادہ مل کر باہم ایک دوسرے کے معاون ہوتے ہیں ان کے لئے حکمت الٰہی سے تدبیر المنزل کی نسبت بھی الہام ہوتا ہے۔ پس پرندوں کو یہ الہام ہوتا ہے کہ کس طرح سے غذا حاصل کریں، کس طرح سے پرواز کریں اور یہ کہ کیسے وہ جفتی کریں، کیسے اپنا آشیانہ

بنائیں اور اپنے بچوں کو کیسے پرورش کریں۔ان سب حیوانات میں انسان مدنی الطبع ہے وہ اپنی بنی نوع کی دستگیری کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا کیونکہ نہ وہ گھاس کھا سکتا ہے، نہ کچے پھل کھا کر جی سکتا ہے اور نہ پشم سے اپنے اندر گرمی پیدا کر سکتا ہے، اس کے علاوہ اور بہت سے امور ہیں جن کو ہم بیان کر چکے ہیں، انسان کا حق ہے کہ خانہ داری کی تدابیر اور آداب معاش کے ساتھ سیاست مدن کا بھی الہام کیا جائے۔انسان اور حیوانات میں فرق اس قدر ہے کہ اور حیوانات کو ضرورت کے وقت طبعی الہام ہوتا ہے اور انسان پر علوم معیشت کے ایک مختصر حصہ کا الہام ہوتا ہے مثلاً یہ الہام ہوتا ہے کہ دودھ پیتے وقت پستان کو کیسے چوستے ہیں، آواز کی تنگی کے وقت کیسے کی نستے ہیں، دیکھنے کے وقت پلکوں کو کیسے کھولتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا خیال خود ہر ایک چیز کو بنایا اور اہتمام کرتا ہے۔وہ تدبیر منزل اور سیاست مدن کے علوم و رسوم و رواج سے اور ان لوگوں کی پیروی سے حاصل کرتا ہے جن کی ملکی روشنی سے خدا تائید کرتا ہے۔یہ روشنی ان علوم میں ظاہر ہوتی ہے جو وحی کے ذریعہ سے ان کو معلوم ہوتے ہیں۔نیز تجربہ اور تدابیر خفیہ سے وہ ان علوم کو حاصل کرتا ہے۔ نیز وہ خود غور کر کے قیاس اور برہان سے ان کو معلوم کرتا ہے اور اس کی مثال اس امر کے حاصل کرنے میں جس کا فیضان باوجود اختلاف استعداد کے باری الصور کی جانب سے ضروری ہوتا ہے۔خواب کی سی ہے۔جیسے خواب میں انسان کو علوم فوقانی حاصل ہوتے ہیں۔پھر وہ اپنے مناسب چیزوں کی صورتوں میں متشکل ہو کر نظر آتے ہیں۔ان کی صورتیں مفیض کی وجہ سے نہیں بلکہ لوگوں کی حالت کی وجہ سے مختلف ہوتی ہیں۔

ان علوم میں سے جو تمام افراد انسانی کو عطا ہوتے ہیں خواہ وہ عرب ہوں یا عجم، شہری ہوں یا بدوی گو ان کے حاصل ہونے کا طریقہ مختلف ہو، چند خصائل کا حرام ہونا ہے جن کی وجہ سے تمام انتظام بلاد درہم برہم ہو جاتا ہے۔ایسے خصائل تین قسم کے ہیں۔شہوانی اعمال، درندوں کے سے اعمال، باہمی بدمعاملگی۔ان کے حرام ہونے کی دلیل یہ ہے کہ انسان اپنے بنی نوع کے ساتھ شہوت، غیرت اور حرص کے اوصاف میں شریک ہے اور جیسے قوی بہائم کو مادہ کی طرف میلان ہوتا ہے وہ دوسرے کی مداخلت کو اپنے جوڑے میں گوارہ نہیں کرتے، ایسے ہی قوی انسانوں کی طبیعت ہوتی ہے لیکن فرق اتنا ہے کہ نر بہائم باہم لڑنے لگتے ہیں جو زور آور تیز ہوتا ہے وہ کمزور پر غالب

ہو جاتا ہے دوسرا اس کے سامنے سے بھاگ جاتا ہے، یا جفتی کرتے ہوئے نہ دیکھنے کی وجہ سے اس کو مزاحمت کرنے کا خیال ہی نہیں ہوتا۔ اور انسان نہایت زیرک پیدا کیا گیا ہے انکل سے چیزوں کو ایسا معلوم کر لیتا ہے گویا ان کو دیکھ رہا ہے یا سن رہا ہے اور اس کو الہام سے یہ معلوم ہو گیا کہ ایسے امور میں لڑنے جھگڑنے سے شہر ویران ہو جائیں گے کیونکہ شہروں کی آبادگی بغیر باہمی تعاون کے نہیں ہو سکتی اور اس تعاون اور مدد میں بہ نسبت عورتوں کے زیادہ دخل قوی مردوں کو ہے اس لئے یہ الہام الٰہی ان میں یہ خیال پیدا کیا گیا کہ ہر شخص اپنی ہی بیوی سے کام رکھے اور اپنے بھائی کی بیوی سے مزاحمت نہ کرے۔ حرمت زنا کی وجہ یہی ہے۔ اور زوجات کے مخصوص ہونے کی صورت رسوم اور شرائع سے تعلق رکھتی ہے نیز انسانوں میں مرد، نر بہائم سے اس بات میں بھی مشابہ ہیں کہ فطرت سلیمہ کی حالت میں مرد کی رغبت عورت کی جانب رہتی ہے جس طرح بہائم میں سے نر سوائے مادینوں کے کسی سے مانوس نہیں ہوتا البتہ جن لوگوں پر ناپاک خواہش نفسانی غالب ہوتی ہے ان کا مزاج ایسا فاسد ہو جاتا ہے جیسے کسی کو مٹی یا کوئلہ کھانے میں مزا معلوم ہوتا ہے وہ سلامتی فطرت سے بالکل نکل جاتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنی خواہش نفسانی مردوں سے پوری کرتے ہیں اور یہ مغتلم ایسی لذت حاصل کرتا ہے جو سلیم الطبع لوگوں کو حاصل نہیں ہوتی۔

پس ان عادات کی وجہ سے ان کا مزاج بدل جاتا ہے ان کے دل روگی ہو جاتے ہیں اور نیز ان عادات سے نسل انسانی کی بیخ کنی ہوتی ہے کیونکہ جب اس نے اپنی اس حاجت کو جس کو خدا نے نسل پھیلانے کے لئے پیدا کیا ہے مخالف طریقہ سے پورا کیا تو خدائی انتظام میں خلل انداز کی اس لئے ان افعال کا مذموم ہونا لوگوں کے دلوں میں پیوست ہو گیا ہے اسی وجہ سے فاسق، فاجر اس کام کو خاموشی سے کرتے ہیں اور اس میں اپنی شہرت نہیں چاہتے اور اگر ان کی طرف ایسے افعال کی نسبت کی جائے تو شرم کے مارے مر جائیں، ہاں انسانیت سے جب وہ بالکل نکل گئے ہوں تو برملا ایسے افعال عمل میں لاتے ہیں۔ جب یہاں تک نوبت پہنچ جائے تو غضب الٰہی نازل ہونے میں کچھ بھی دیر نہ ہوگی جیسا کہ سیدنا لوط علیہ السلام کے وقت میں ہوا اور یہی وجہ حرمت لواطت کی ہے اور چونکہ لوگوں کی معاش، خانگی تدبیر اور سیاست مدن بغیر عقل اور تمیز کے مکمل نہیں ہو سکتیں اور ہر وقت کی شراب خوری انتظام کے لئے سخت مخل ہے، جنگ وجدل اور کینہ پیدا کرتی

ہے لیکن بعض لوگوں پر بیہودہ خواہش غالب آئیں انھوں نے اس رذالت کو اختیار کیا اور انتظامی تدابیر کو تلف کیا۔ اگر ان کو اس فعل بد سے روکنے کا قانون نہ ہوتا تو سب لوگ ہلاک ہو جاتے یہی وجہ دائم الخمری کے حرام ہونے کی ہے لیکن اس کے کم وزیادہ حرام ہونے کو، پس وہ ہم شرائع کی بحث میں بیان کریں گے۔

اور جس طرح نر بہائم میں اس چیز پر غصہ کرنیکا مادہ ہوتا ہے جو ان کو اپنے مقصود سے باز رکھے یا کوئی نفسانی یا بدنی تکلیف ان کو پہنچائے اسی طرح لوگوں میں بھی اس قسم کا مادہ ہوتا ہے لیکن فرق اتنا ہے کہ بہائم محسوس یا موہوم مقصود کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور انسان محسوس اور معقول دونوں کی جستجو کرتا ہے اور بہ نسبت بہائم کے آدمی میں حرص کا مادہ زیادہ ہے اور بہائم آپس میں لڑتے ہیں جب ان میں سے کوئی بھاگ جاتا ہے تو ان کی طبیعت میں کینہ باقی نہیں رہتا۔ ہاں بعض بہائم ایسے ہیں جن میں کینہ کا اثر بعد کو بھی رہتا ہے۔ جیسے اونٹ، بیل، گھوڑا، لیکن آدمی اپنی عداوت کو نہیں بھولتا پس اگر انسانوں میں باہم جنگ جاری رہے تو تمام شہر برباد ہو جائیں اور تمام امور معاش مختل ہو جائیں۔ اس واسطے قتل اور زدوکوب کے حرام ہونے کا ان کو الہام ہوا ہاں کسی مصلحت عظیمہ کی وجہ سے جائز ہے جیسا کہ قصاص وغیرہ میں ہوتا ہے اور کبھی لوگوں کے دلوں میں قاتلین کی طرح کینہ کا جوش پیدا ہوتا ہے اور قصاص کا ان کو اندیشہ ہوتا ہے پس ایسے لوگ کھانے میں زہر دیکر یا سحر سے مارنے کی فکر کرتے ہیں اس کا حال بھی قتل کا سا ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ ہے قتل تو برملا ہوتا ہے اس سے انسان بچ سکتا ہے لیکن اس سے بچنا مشکل ہے اور کبھی متہم کر کے قتل کروا دینے کی غرض سے بادشاہ کے پاس چغل خوری کی جاتی ہے اور معاش کے طریقے خداتعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے یہی قرار دیئے ہیں کہ مباح زمین میں سے کوئی چیز حاصل کریں اس میں مویشی چرائیں یا زراعت وتجارت وغیرہ سے معاش پیدا کریں۔ شہر اور مذہب کا انتظام کریں جو پیشے ان کے علاوہ ہیں ان کے لئے تمدن میں کوئی جگہ نہیں لیکن بعض لوگ برے پیشے اختیار کر لیتے ہیں جن سے ضرر پہنچتا ہے مثلاً چوری اور غصب، ان سے شہر تباہ ہو جاتے ہیں، اس واسطے خدا نے لوگوں کو اپنے الہام سے ان سب مضر پیشوں کو حرام ہونا تلقین کیا ہے تمام بنی آدم انکی حرمت پر متفق ہیں گو سرکش لوگ ان کے مرتکب ہوتے ہیں لیکن انصاف پسند سلاطین ان کو مٹانے اور دور کرنے

کی کوشش کرتے ہیں اور جب بعض نے یہ سمجھا کہ سلاطین ان کو مٹانے کی کوشش کرتے ہیں تو انھوں نے جھوٹے دعاوی، جھوٹی قسمیں، جھوٹے گواہوں کا پیشہ اختیار کرلیا۔

ناپ تول میں کمی کی، جوا کھیلنا اختیار کیا، دو چند، سہ چند سود کھانے لگے ان سب امور کا حکم بھی انہی مضر پیشوں کا سا ہے اور خراج زیادہ لینا بھی بمنزلہ رہزنی کے ہے بلکہ اس سے بدتر ہے بہرحال انہیں اسباب سے لوگوں کے دلوں میں ایسے امور کی حرمت آ گئی ہے۔ جو لوگ زیادہ عقل مند، سلیم الرائے، مصالح عامہ کے زیادہ واقف ہوتے ہیں وہ ہمیشہ قرناً بعد قرن ان سے منع کرتے آئے ہیں یہاں تک کہ یہ عام رواج ہو کر بدیہیات اولیہ میں بمنزلہ دیگر مشہورات کے شامل ہوگئیں۔ پس اس وقت ان کا اثر ملأ اعلیٰ کی طرف پہنچتا ہے جس طرح سے ملأ اعلیٰ کی طرف سے اولاً یہ الہام ہوا تھا کہ یہ چیزیں حرام ہیں اور یہ نہایت مضر ہیں اس لئے جب کوئی شخص ایسے افعال کا مرتکب ہوتا ہے تو ملأ اعلیٰ کو سخت اذیب ہوتی ہے جس طرح کہ کوئی شخص انگارے پر پاؤں رکھتا ہے تو فوراً اسی لمحہ میں قوائے ادراکیہ تک اس کا اثر منتقل ہو جاتا ہے، اور اس سے تکلیف پاتا ہے۔

پھر ملأ اعلیٰ کے ایذا پانے سے خطوط شعاعیہ پیدا ہوتے ہیں جو اس عاصی کو گھیر لیتے ہیں، اور ملائکہ وغیرہ مستعدین کے دلوں میں یہ الہام ہوتا ہے کہ اس کو ایذا پہنچائیں اور وہ مصلحت جو اس کے حق میں مقرر ہو چکی ہے جس کو شرع میں الہام ملائکہ کہتے ہیں کہ اس قدر اس کا رزق ہے اور اس قدر عمر ہے اور فلاں وقت تک زندگی ہے اور وہ نیک ہے یا برا ہے اور جس کو نجوم میں احکام طالع کہتے ہیں اس کے حق میں وسیع کردی جاتی ہے پس جب مر جاتا ہے اور وہ مصلحت پوری ہو جاتی ہے تو اس کے لئے خدا تعالیٰ فارغ ہوتا ہے جیسا کہ فرماتا ہے ''اے انس و جن! میں تمہارے لئے عنقریب فارغ ہونے والا ہوں''۔ اور اس کو پوری پوری جزا دیتا ہے۔ واللہ اعلم۔

چھٹا مبحث

سیاست مذہبی کا بیان

پہلا باب: مذہبی رہنماؤں اور مذہب کے قائم کرنے والوں کی ضرورت کا بیان

خدا تعالیٰ فرماتا ہے ''بیشک تو ڈرانے والا ہے اور ہر ایک قوم کے لئے کوئی نہ کوئی رہبر ہوا کرتا ہے''۔ واضح ہو کہ وہ طریقے جن سے قوت بہیمیت، قوت ملکی کی مطیع ہو جاتی ہے اور وہ گناہ جو قوت ملکی کے بالکل مخالف ہیں اگرچہ عقل سلیم ان کو جان سکتی ہے اور ان طریقوں کے فوائد اور ان گناہوں کی مضرتوں کو پہچان سکتی ہے لیکن اکثر لوگ ان سے غافل ہیں کیونکہ ان کی سمجھ پر پردے پڑے ہوئے ہیں اس لئے ان کی وجدانی قوت صفراوی آدمی کی طرح بگڑ جاتی ہے پس مقصود حالت اور اس کی منفعت اور اندیشناک حالت اور اس کی مضرت ان کے خیال میں نہیں آتی اس لئے تمام لوگوں کو ایک ایسے واقف کی ضرورت ہے جو رہنمائی کے قوانین کو خوب جانتا ہو، لوگوں کا انتظام کرے ان کو اچھی باتوں کا حکم کردے، ان کو ہدایت کر کے آمادہ کرے اور ان قوانین کی مخالفت سے باز رکھے۔ بعض لوگوں کی رائے ایسی فاسد ہوتی ہے کہ وہ طریقہ مطلوب کے خلاف ہی قصد کرتے ہیں اس لئے وہ خود بھی گمراہ ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں پس قوم کی اصلاح ایسے خیالات کے مٹائے بغیر نہیں ہوتی۔ اور بعض لوگ ایسے ہی کہ ان کی رائے کسی قدر ٹھیک ہوتی ہے، ان کو ہدایت کا بہت مختصر سا حصہ حاصل ہوتا ہے اس لئے چند امور ان کی یاد میں رہتے ہیں اور بہت سے امور ان کی نظر سے چوک جاتے ہیں یا ان کو خیال ہوتا ہے کہ وہ فی نفسہ بڑے کامل ہیں، ان کو کسی مکمل کی حاجت نہیں ہے اس لئے ان کی اصلاح کے واسطے ایسے ایسے شخص کی ضرورت پڑتی ہے ان کو جہل پر مطلع کردے، المختصر لوگوں کو ایسے کامل اور عالم کی ضرورت

ہے جو غلطیوں سے محفوظ ہو اور جب کہ شہر، باوجودیکہ اس کے اکثر باشندے عقل معاش رکھتے ہیں جو تمدن کی اصلاحات اور انتظامات مستقل طور پر معلوم کر سکتے ہیں ایک ایسے شخص کا ضرور تمند ہے جو تمدن کی مصلحتوں سے بخوبی واقف ہو۔ لوگوں کی سیاست شائستگی سے کر سکتا ہو۔ تو پھر جب ایسا فرقہ ہو جن میں مختلف استعدادیں ہوں اور ایسے طریقے کے بارے میں ہو کہ اس کو دلی شہادت سے وہی لوگ قبول کر سکیں جو نہایت زیرک ہوں۔ ان کی فطرت علائق سے صاف ہو، کامل تجربہ ان کو حاصل ہو، اس طریقہ کی رہبری صرف انہی کو ہو سکتی ہے جو انسانی طبقہ میں اعلیٰ درجہ کے ہوتے ہیں، حالانکہ ایسے لوگ بہت ہی کم ہیں۔ تو ایسی حالت میں کیونکر کامل کی حاجت نہ ہوگی اور اسی طرح جبکہ آہنگری اور نجاری وغیرہ پیشے عامل لوگوں کو بغیر سلف کے طریقوں کی پیروی کے اور بغیر اساتذہ کی رہبری کے حاصل نہیں ہو سکتے تو آپ ان عمدہ مطالب کے متعلق کیا گمان کر سکتے ہیں جن کو سوائے اہل توفیق کے اور کوئی نہیں سمجھ سکتا اور جن کی طرف سوائے مخلصین کے اور کوئی رغبت نہیں کرتا۔

پھر ایسے عالم کے لئے ضروری ہے کہ برملا لوگوں کے سامنے یہ ثابت کر دے کہ وہ راہِ راست کا عالم ہے، اپنے اقوال میں خطا اور گمراہی سے معصوم اور محفوظ ہے اور وہ اس سے بھی محفوظ ہے کہ اصلاح کے ایک حصہ کو اختیار کرے اور دوسرے ضروری حصہ کو ترک کر دے، اس کی دو صورتیں ہیں (۱) یہ کہ یہ کسی ایسے شخص سے کلام کو نقل کرے جس پر سلسلۂ کلام کا ختم ہوتا ہے کیونکہ لوگ اس کے کمالات اور عصمت پر متفق ہوتے ہیں اور لوگوں میں اس کی روایت محفوظ ہوتی ہے پس وہ انہی کے اعتقاد کے موافق لوگوں سے مواخذہ کرتا ہے اور ان ہی کی دلیل پیش کر کے ان کو ساکت کر دیتا ہے۔ یہ کہ خود یہ وہ شخص ہو جس پر بات ختم ہو جائے اور وہ سب کا متفق علیہ ہو۔

حاصل کلام یہ ہے کہ لوگوں کے واسطے ایک ایسے شخص کی ضرورت ہے جو معصوم ہو اور اس کی عصمت پر سب کا اتفاق ہو یا اس سے روایت محفوظ ہو۔ اب رہا اس بات کا معلوم کرنا کہ اس شخص کو اطاعت کے علوم حاصل ہیں اور ان سے اچھے طریقے پیدا ہوتے ہیں اور یہ شخص ان طریقوں کی بھلائی، برائی کی وجوہات سے واقف ہے، سو یہ بات نہ تو دلیل سے معلوم ہوتی ہے نہ اس عقل سے جو معاش سے تصرف کرتی ہے اور نہ حس سے بلکہ یہ وہ امور ہیں جن کو خاص وجدان ہی جانتا ہے۔ پس جس طرح بھوک، پیاس اور دوا حار یا بارد کی تاثیر بغیر وجدان کے معلوم نہیں ہوتی اسی

طرح سے کسی شئے کا روح کے موافق یا مخالف ہونا بغیر ذوق سلیم کے دریافت نہیں ہوسکتا اور اس شخص کے خطا سے محفوظ ہونے کی صورت یہ ہے کہ خدا تعالیٰ اس کی ذات میں علم بدیہی پیدا کرتا ہے کہ وہ چیزیں جن کا اس نے ادراک کیا ہے بالکل حق اور واقع کے مطابق ہیں جیسے کہ دیکھنے والوں کو دیکھتے ہی معلوم ہو جاتا ہے۔ اس کو کچھ احتمال نہیں ہوتا کہ میری بینائی میں کچھ فرق ہے، یا خلاف واقع چیزوں کو میں دیکھ رہا ہوں۔ اور جیسے زبان کے موضوع الفاظ کا علم ہوتا ہے مثلاً عربی داں کو اس میں شک نہیں ہوتا کہ 'ماء' (پانی) اس عنصر کے لئے موضوع ہے اور 'ارض' (زمین) کا لفظ اس عنصر کے لئے موضوع ہے حالانکہ اس علم کے لئے نہ کوئی عقلی دلیل ہے اور نہ اس لفظ اور معنی میں کوئی لزوم عقلی ہے تاہم خدا تعالیٰ ان امور کا بدیہی علم طبیعتوں میں پیدا کرتا ہے۔ اور اکثر لوگوں میں یہ علم اس طرح سے پیدا ہوتا ہے کہ ان کے نفوس میں ایک ملکۂ جبلیہ ہوتا ہے جس سے ان کو صحیح صحیح طریقہ پر ہمیشہ علم وجدانی حاصل ہوتا رہتا ہے اور وہ تجربہ سے اپنے وجدان کو صحیح اور سچا پاتے اور عام لوگوں کو اس رہبر کے معصوم ہونے کا اس طرح سے علم ہوتا ہے کہ ان کو بہت سی یقینی یا مشہور دلائل سے خوب ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ شخص جن امور کی طرف ہم کو بلاتا ہے وہ سب حق ہیں اور اس کی عادت حمیدہ سے جھوٹ بولنا بعید ہے۔ اور کبھی اس کے معصوم ہونے کا اس طرح علم ہوتا ہے کہ اس کی ذات میں تقرب کے آثار دیکھتے ہیں، معجزات اس سے صادر ہوتے ہیں، اس کی دعائیں مقبول ہوتی ہیں جن سے ان کو یقین ہو جاتا ہے کہ یہ شخص جن امور کی طرف ہم کو بلاتا ہے وہ سب حق ہیں اور اس کی عادت حمیدہ سے جھوٹ بولنا بعید ہے۔

اور کبھی اس کے معصوم ہونے کا اس طرح علم ہوتا ہے کہ اس کی ذات میں تقرب کے آثار دیکھتے ہیں، معجزات اس سے صادر ہوتے ہیں، اس کی دعائیں مقبول ہوتی ہیں جن سے ان کو یقین ہو جاتا ہے کہ سماوی تدابیر میں اس کا بڑا مرتبہ ہے اور اس کا نفس ان نفوس قدسیہ میں سے ہے جو ملائکہ سے ملحق ہیں، ایسے شخص سے کبھی یہ نہیں ہوسکتا کہ خدا کی طرف جھوٹی بات منسوب کرے اور کسی گناہ کو عمل میں لائے۔ اس کے بعد اس شخص سے ایسے ایسے امور ظاہر ہوتے ہیں جن سے وہ لوگ باہم مجتمع ہو کر اس شخص کو اپنے مال سے، اولاد سے اور سرد پانی سے جس کو پیاس کے وقت دوست رکھتے ہیں، زیادہ محبوب رکھتے ہیں۔ بغیر ایسے شخص کے کسی فرقہ اور قوم میں حالت مقصودہ کا

رنگ نہیں چڑھ سکتا ہے اسی وجہ سے لوگ اس قسم کی عبادت میں مصروف رہا کرتے ہیں اور اپنے تمام امور کی ایسے شخص کی طرف نسبت کرتے ہیں جس میں ایسے امور کے ہونے کا ان کو اعتقاد ہوا کرتا ہے خواہ اس اعتقاد میں وہ صحیح ہوں یا غلط۔ واللہ اعلم۔

دوسرا باب: نبوت کی حقیقت اور اس کے خواص کا بیان

واضح ہو کہ انسانی طبقوں میں سب سے اعلیٰ درجہ کے لوگ اہل فہم ہیں یہ لوگ اہل اصطلاح ہوتے ہیں ان کی ملکی قوت نہایت بلند ہوتی ہے یہ لوگ حقانی خواہش سے انتظام مقصود کے قائم کرنے پر آمادہ ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور ملأ اعلیٰ سے ان پر علوم اور احوال الٰہیہ نازل ہوتے ہیں۔ مفہم کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کے مزاج خلقت اور خلق میں اعتدال اور تناسب ہو نہ اس میں جزئی رایوں کے اعتبار سے بیتابی ہو اور نہ ایسے پرلے درجہ کی ذکاوت ہو کہ کلی سے جزئی کو اور روح سے صورت کو معلوم نہ کر سکے اور نہ ایسا غبی ہو کہ جزئی سے کلی کی طرف اور صورت سے روح کی جانب منتقل نہ ہو سکے۔ اور سب لوگوں میں راہ راست کا زیادہ التزام رکھنے والا ہو، عبادت میں ہمیشہ مصروف ہو، لوگوں کے ساتھ معاملات میں انصاف کو پسند کرتا ہو، منفعت عام میں راغب رہتا ہو، کسی شخص کو ایذا نہ دیتا ہو، ہاں اگر تکلیف اور ایذا پر عام نفع موقوف ہو یا نفع عام کو ایذا لازم ہو تو البتہ اس سے ایذا پہنچ سکتی ہے عالم غیب کی جانب ہمیشہ اس کا میلان رہتا ہو، اس میلان کا اثر اس کی بات میں، چہرہ میں اور ہر کام میں محسوس ہوتا ہو اس کے ہر پہلو سے معلوم ہوتا ہو کہ عالم غیب سے اس کو تائید پہنچتی ہے، ادنیٰ ریاضت سے اس کو ایسا قرب اور تسکین حاصل ہو جو دوسروں کو بڑی ریاضت اور عبادت سے حاصل نہ ہو، مفہمین کی چند قسمیں ہیں اور ان کی استعدادیں مختلف ہیں۔ پس جس کی اکثر یہ حالت ہو کہ خدا کی جانب سے ان علوم کو اخذ کرتا رہے۔ جن سے عبادتوں کے ذریعہ سے نفس میں تہذیب پیدا ہوتی ہے اس کو کامل کہتے ہیں۔ اور جس کا اکثر حال یہ ہو کہ اخلاق حمیدہ اور تدبیر منزل وغیرہ چیزوں کے علوم حاصل کرتا ہو تو وہ حکیم ہے اور جس کے اکثر احوال یہ ہوں کہ وہ سیاست کلیہ کو حاصل کرے پھر اس کو لوگوں میں عدل کرنے اور ظلم کے مٹانے کی توفیق ہو تو وہ خلیفہ ہے اور جس کو ملأ اعلیٰ کی حضوری ہو، یہ فرشتے اس کو تعلیم دیں، اس سے خطاب کریں اور اس کو آنکھوں سے نظر آئیں اور مختلف قسم کی کرامتیں اس سے ظاہر ہوں اس کا نام موئید بروح

القدس ہے۔ اور جس کی زبان اور دل پرنور ہوں، جس کی صحبت اور نصیحت سے لوگ نفع حاصل کریں اور پھر وہی تسلی اور نور اس کے خاص صحابہ اور حواریں میں منتقل ہو، وہ اس کے ذریعہ سے کمال درجات تک پہنچ جائیں، اس کو ان کی ہدایت اور رہبری کی نہایت ہی حرص ہو تو اس کو ہادی مزکی کہتے ہیں۔ اور جس کا بڑا حصہ علمی مذہب کے قواعد اور مصالح ہوں وہ اس کا زیادہ مشتاق ہو کہ ان علوم کو قائم کرے جو محو ہو گئے ہیں تو اس کو امام کہتے ہیں۔ اور جس کے دل میں القا کیا گیا ہو کہ لوگوں کو ان مصائب کا حال بتادے جو دنیا میں ان کے لئے مقدر ہیں، یا کسی قوم کے ملعون ہونے کو معلوم کر کے ان کو اس کی اطلاع دے، یا بعض اوقات تجرید نفس کی حالت میں ان واقعات کو اس نے معلوم کیا جو قبر اور حشر میں لوگوں کو پیش آنے والے ہیں اور یہ اس قسم کے حالات لوگوں کو بتائے تو اس کو منذر کہتے ہیں۔

جب حکمت الٰہی کا اقتضا ہوتا ہے کہ کسی مفہم کو لوگوں کی طرف بھیجے تو خدا تعالیٰ اس شخص کے باعث سے لوگوں کو ظلمتوں سے نور کی طرف نکالتا ہے۔ بندوں پر خدا کا فرض ہوتا ہے کہ اپنی زبانوں اور دلوں سے اس کے آگے سر بہ تسلیم ہوں، ملأ اعلیٰ کو اس کی تاکید ہوتی ہے کہ اس کے فرمانبرداروں سے خوشنود ہو کر ان کے شریک رہیں اور جو اس کی مخالفت کرے اور عداوت سے پیش آئے اس پر لعنت کریں اور اس سے علیحدگی کریں، خدا لوگوں کو اس کی اطلاع کرتا ہے، ان پر اس کی اطاعت واجب کرتا ہے، ایسا شخص نبی ہوتا ہے اور سب میں معظم الشان وہ نبی ہے جس کے لئے بعثت کی کوئی اور نوع بھی ہو اور وہ یہ کہ خدا کو یہ منظور ہو کہ اس کو لوگوں کے لئے ظلمات سے نکل کر نور میں آنے کا سبب بنائے اور اس کی قوم عام لوگوں کے لئے رہبر بنے، اس طرح پر اس نبی کی بعثت میں ایک دوسرے قسم کی بعثت ہوا کرتی ہے، پہلی بعثت کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے۔ ''خدا ہی نے ان پڑھوں میں ان میں سے ایک نبی بھیجا''۔ اور دوسری کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے ''تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لئے پیدا کی گئی ہے''۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ''تم لوگوں میں آسانی کے لئے بھیجے گئے ہو نہ کہ دشواری کے لئے''۔ اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں مفہمین کے جمیع فنون پائے جاتے تھے اور آپ کے لئے دونوں بعثتیں حاصل تھیں اور گزشتہ انبیا میں کسی کو ایک فن کسی کو دو فن حاصل تھے۔

واضح ہو کہ حکمت الٰہیہ انبیا کی بعثت کی اس لئے مقتضی ہوتی ہے کہ لوگوں کی اضافی اور قابل اعتبار بہتری تدابیر بعثت میں ہی منحصر ہوتی ہے اور اس بہتری کی اصلی حقیقت کا علم سوائے علام الغیوب کے اور کوئی نہیں جانتا۔ لیکن ہم اس قدر جانتے ہیں کہ چند ایسے ایسے اسباب ہیں جو بعثت کے لئے ضروری ہیں اور ان سے بعثت جدا نہیں ہو سکتی اور یہ بھی جانتے ہیں کہ طاعت جب ہی فرض ہوتی ہے جب خدا تعالیٰ کسی قوم کی اصلاح اور بہبودی اس بات میں پائے کہ یہ لوگ خدا کی عبادت کریں۔ اور ان لوگوں کے نفوس اس قابل نہیں ہوتے کہ وہ خود علوم الٰہی کو اخذ کریں۔ اور ان کے حال کی درستی اس میں ہوتی ہے کہ وہ نبی کی اطاعت کریں اس لئے خدا حظیرۃ القدس میں مقرر فرماتا ہے کہ نبی کی اطاعت واجب ہے وہاں اس امر کا فیصلہ ہو جاتا ہے کہ ایک قوم کی ترقی اور دوسری قوم کے تنزل کا وقت آ گیا ہے۔ پس اس وقت خدا تعالیٰ اس با اقبال قوم میں نبی پیدا کرتا ہے تا کہ ان کے دین کی اصلاح فرمائے جیسا کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث کیا یا یہ کہ خدا کو منظور ہوتا ہے کہ کسی قوم کو باقی رکھے اور دوسروں پر اس کو فضیلت عطا کرے اس لئے ایسے شخص کو مبعوث کرتا ہے جو ان کی کجی کو درست کر دے اور ان کو کتاب الٰہی کی تعلیم دے جیسے سیدنا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت۔ یا جس قوم کی دولت اور دین کا استمرار مقدر ہوتا ہے اس کے انتظام کے واسطے کسی نبی مجدد کو بھیجتا ہے جیسے داؤد اور سلیمان اور انبیا بنی اسرائیل علیہم السلام کی ایک جماعت کی یہی حالت تھی۔ اور خدا تعالیٰ نے یہ بات مقرر کر دی تھی کہ ہم ان انبیا کو ان کے اعدا پر غالب کریں گے جیسے کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے ''اپنے پیغمبر بندوں کے لئے ہمارا قول پہلے ہی طے ہو چکا تھا کہ وہ ہمیشہ فتح مند رہیں گے اور ہمارا لشکر ہی غالب ہو کر رہے گا''۔ ان انبیا کے علاوہ ایسے لوگ بھی ہوا کرتے ہیں جو اتمام حجت کے لئے پیدا کئے جاتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

اور جب کسی قوم کی طرف نبی بھیجا جائے تو ان پر اس کی پیروی واجب ہو جاتی ہے خواہ وہ راہ راست پر ہی کیوں نہ ہوں کیونکہ ایسے بلند مرتبہ شخص کی مخالفت کرنے سے ملأ اعلیٰ کی لعنت پیدا ہوتی ہے اور مخالف کی ذلت پر اجماع ہو جاتا ہے جس سے تقرب الی اللہ کا راستہ ان پر بند ہو جاتا ہے اور ان کی سعی کچھ کام نہیں آتی، ان کے مرنے کے بعد چاروں طرف سے ان کے دلوں کو لعنت

گھیر لے گی۔ علاوہ اس کے یہ ایک فرضی صورت ہے واقع میں نہیں (۱) تم کو یہود کی حالت سے عبرت حاصل کرنی چاہئے، انھوں نے دین میں کیسی کیسی زیادتیاں اور کتاب الٰہی میں کیسی تحریف کی تھی اس لئے سب لوگوں سے زیادہ ان کے لئے پیغمبر کی بعثت کی ضرورت تھی۔ اور انبیا کی بعثت سے بندوں پر حجت الٰہی اس طرح قائم ہے کہ اکثر لوگوں کی پیدائش اس قابل نہیں ہوتی کہ وہ بغیر کسی کے بتلائے مفید اور مضر امور کو حاصل کر سکیں بلکہ یا تو ان کی استعداد ضعیف ہوتی ہے جو انبیا کے خبر دینے اور بتلانے سے قوی ہو جاتی ہے۔ یا ایسے موانع اور مفاسد ہوتے ہیں جو بغیر جبر اور دلیل کے دفع نہیں ہو سکتے اور ان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ دنیا اور آخرت میں ان کو عذاب دیا جائے تب بعض اسباب علوی اور سفلی کے جمع ہونے کے بعد لطف خداوندی کا اقتضا رہوتا ہے کہ کسی قوم میں ہی نہایت ذکی شخص پر وحی کرے کہ لوگوں کو حق کی جانب رہنمائی کرے اور راہ راست کی جانب ان کو بلائے پس نبی کا حال رہبری کے بارے میں ایسا ہے جیسے کسی سردار کے کئی غلام بیمار ہو جائیں اور وہ کسی اپنے خاص رازداں کو ان کے لئے دوا پلانے پر متعین فرمائے کہ یہ کہنا مانتے ہیں یا نہیں، پس اگر وہ ان کو زبردستی پلائے گا تب بھی حق پر ہوگا لیکن اس کے لطف کامل نے تو یہ کیا کہ اولاً ان کو بتلایا کہ تم بیمار ہو یہ دوا تمہارے لئے نافع ہے، اور اپنے اقوال میں سچا ہونے کے لئے اس نے امور خارق عادت دکھلائے تاکہ ان کے دل مطمئن ہو جائیں۔ اور نیز اس کو مناسبت کہ اس دوا میں کوئی شیریں، جز بھی ملا دے، پس اس وقت وہ اس کے احکام کی بجا آوری اپنی بصیرت اور رغبت سے کریں گے اسی وجہ سے معجزات اور قبولیت دعا وغیرہ امور اصل نبوت سے خارج ہیں (۲)۔ ہاں اکثر حالتوں میں لازم ضرور ہوا کرتے ہیں اور بڑے بڑے معجزات کا ظہور اکثر تین اسباب سے ہوا کرتا ہے۔ (۱) اس نبی کا مفہمین میں سے ہونا، اس وجہ سے بعض حوادث اس پر منکشف ہو جاتے ہیں اور یہ ظہور دعاؤں کی قبولیت، اور ان امور میں موجب برکات ہو جاتا ہے جس کے لئے برکت کی دعا کی جاتی ہے اور برکت کے ہونے کی بھی مختلف صورتیں ہوتی ہیں، کبھی کسی شئے کا نفع زیادہ ہو جاتا ہے مثلاً اعدا کے دلوں میں نبی کی طرف سے یہ خیال جما دیا جائے کہ

---

(۱) کیونکہ راہ راست پر چلنے والے نبی کی مخالفت نہیں کر سکتے۔ (۲) اصل منصب نبوت تو ہدایت خلق ہے باقی معجزات وغیرہ امور محض لوگوں کے اطمینان کے لئے ہیں۔

اس کا لشکر بہت ہے، اس لئے وہ بزدل ہو جاتے ہیں۔ یا طبیعت غذا کو خلط صالح بنا دیتی تب ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے دو چند کھانے کھایا ہے۔ اور کبھی خود اصل شئے ہی بڑھ جاتی ہے اور اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ مادہ ہوائی قوت مثالی کے حلول کرنے کی وجہ سے اس صورت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ان اسباب کے علاوہ اور بھی اسباب ظہور برکات کے ہوتے ہیں جن کا شمار کرنا دشوار ہے۔

دوسرا سبب ظہور معجزات کا یہ ہوتا ہے کہ ملأ اعلیٰ متفق ہو کر نبی کے احکام جاری کرنا چاہیں، اس وجہ سے الہامات، انتقالات اور تقریبات پیش آتے ہیں جو پہلے سے نہ ہوتے تھے پس نبی کے احباب فتح مند اور اعدا خوار و خراب ہوتے ہیں۔ اور حکم الٰہی کا ظہور ہوتا ہے اگرچہ کفار کو ناگوار معلوم ہو۔ تیسرا سبب معجزات کا یہ ہوتا ہے کہ اسباب خارجی کی وجہ سے بہت سے حوادث پیدا ہو جائیں جیسے نافرمانوں کو سزا دی جائے اور جو(۱) میں بڑے بڑے امور کا احداث ہو، پس ان امور کو خدا تعالیٰ کسی نہ کسی وجہ سے معجزہ بنا دیتا ہے یا تو نبی پہلے سے ان پر لوگوں کو مطلع کر دیتا ہے یا اس کی نافرمانی پر لوگوں کو سزا مل جاتی ہے یا جو طریقہ سزا کا نبی نے بتا دیا تھا، وہ حوادث اسی کے موافق ہوتے ہیں، یا اسی قسم کے اور امور ہوا کرتے ہیں۔

انبیا کے معصوم ہونے کے بھی تین اسباب ہیں (۱) یہ کہ خدا تعالیٰ انسان کو شہوات رذیلہ سے پاک اور آزاد پیدا کرے، بالخصوص ان امور میں جو محافظت حدود اور شریعت سے متعلق ہیں (۲) یہ کہ وحی کے ذریعہ نیکی کی بھلائی اور گناہ کی برائی اور اس کا انجام اس کو معلوم ہو جائے (۳) یہ کہ اس کے اور شہوات رذیلہ کے درمیان خود خدا تعالیٰ حائل ہو جائے۔ واضح ہو کہ انبیا علیہم السلام کی سیرت میں سے یہ ہے کہ وہ خدا کی ذات اور صفات میں غور اور فکر کرنے کا حکم نہ کریں کیونکہ عام لوگ اس کی طاقت نہیں رکھتے۔ اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے" خدا کی ذات میں غور نہ کرو بلکہ اس کی مخلوق میں غور کرو"۔ اور اس آیت کی تفسیر میں "تیرے رب کی طرف نہایت ہے" فرمایا کہ خدا کی ذات میں کچھ غور نہ کرنا چاہئے۔ انبیا ہمیشہ خدا تعالیٰ کے نعائم اور عجائب قدرت میں فکر کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ نیز انبیا علیہم السلام کی سیرت میں سے یہ بھی ہے کہ لوگوں سے ان کی عقلوں کے موافق اور ان کے علوم کے مناسب جو ان کے اندر پیدائشی طور پر

(۱) کائنات

پائے جاتے ہیں، کلام کیا کریں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ نوع انسان کے لئے خواہ وہ کہیں ہو، ادراک کی ایک حد متعین ہے جس کا مرتبہ تمام حیوانی ادراک سے زیادہ ہے مگر جس کا مادہ اس قسم کے انسانی ادراک کے قابل نہ ہو تو وہ حیوانات سے زاید نہیں۔ اور اس نوع انسانی کے لئے اس ادراک کے علاوہ اور زاید علوم اور ادارک بھی ہیں جو اس میں عادت مستمرہ کے خلاف حاصل ہوتے ہیں، جیسا کہ انبیا اور اولیا کے قدسی نفوس کو حاصل ہوتے ہیں یا ان ریاضات شاقہ سے حاصل ہوتے ہیں جو نفس میں ان علوم کی صلاحیت بخشتے ہیں، جیسا کہ حساب سے یا ایک مدت تک قواعد حکمت اور کلام اور اصول وفقہ وغیرہا کی ممارست کرنے سے۔ پس انبیا علیہم السلام لوگوں سے اس سادہ ادراک کے موافق کلام کرتے ہیں جو بلحاظ اصلی پیدائش کے لوگوں کے طبائع میں موجود ہوتا ہے اور ان امور کی طرف التفات نہیں کرتے جن کے علوم کے اسباب نادر ہیں اور ان کے موجود ہونے کا کمتر اتفاق ہوتا ہے پس اسی لئے انبیا نے لوگوں سے یہ نہیں فرمایا کہ تم اپنے رب کو تجلیات اور مشاہدات سے پہچانو اور نہ یہ فرمایا کہ براہین اور قیاسات سے جانو اور نہ یہ فرمایا کہ اس کو جمیع جہات سے منزہ سمجھو، کیونکہ اس طرح پر معلوم کرنا ان لوگوں کے لئے محال سا ہے۔ جنھوں نے ایک مدت تک ریاضیات کا شغل نہیں رکھا اور نہ ایک مدت دراز تک معقولیت کے ساتھ صحبت رکھی جو ان کو استنباط اور استدلال کے طریقے بتلائے اور استحسانات کے طریقے اور ان مقدمات کے ذریعہ سے جن کے مأخذ پر وقت (۱) ہیں اشباہ اور نظائر میں فرق کرنا سکھاتے ہیں یا اور دیگر وہ امور سکھاتے جن کی وجہ سے اصحاب الرائے اہل حدیث پر فخر کیا کرتے ہیں۔ اور نیز انبیا کی سیرت میں یہ امر بھی داخل ہے کہ وہ ان امور کی جانب توجہ نہیں رکھتے جو تہذیب نفس اور سیاست امت سے تعلق نہ رکھتے ہوں۔ وہ ان اسباب کو بیان نہیں کرتے جو عالم جو میں پیدا ہوتے ہیں مثلاً بارش کسوف اور ہالہ کے اسباب۔ نباتات اور حیوان کے عجائب، چاند اور سورج کی چال کا اندازہ، روز مرہ حوادث کے اسباب، انبیا سلاطین اور شہروں وغیرہ کے حالات اور قصے۔ ہاں اس میں کچھ مضائقہ نہیں کہ آسان طریقہ پر چند باتیں جن سے ان کے کان آشنا اور دل خوگر ہوں، اس غرض سے بیان کی جائیں کہ ان کے سننے سے خوف اور رغبت پیدا ہو۔ لیکن ان کو بھی طبعاً اور اجمالاً اس

(۱) باریک، و عمیق ہے۔

طرح سے بیان کرنا چاہئے جس میں استعارات اور مجازات کا استعمال کرنا جائز رکھا جائے اور یہی وجہ ہے کہ جب لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے چاند کے کم اور زیادہ ہونے کا سبب پوچھا تو خدا تعالیٰ نے اس سے اعراض فرما کر مہینوں کا فائدہ بیان کر دیا۔ اور فرمادیا تجھ سے لوگ ہلالوں کا حال دریافت کرتے ہیں، ان سے کہہ دو! لوگوں کا اور حج کا وقت معلوم ہوتا ہے۔ اکثر لوگوں کو تم دیکھو گے کہ ان فنون رسمی کی الفت سے یا اور وجوہ سے ان کا ذوق سلیم خراب ہو گیا ہے اس لئے انھوں نے رسول کے کلام کے بے موقع معنی لگا لئے۔ واللہ اعلم۔

تیسرا باب: اس بیان میں کہ مذہب کی اصل ایک ہی ہے اس کے طریقے اور راستے مختلف ہیں

خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے" خدا نے دین کا تم کو وہی راستہ بتایا ہے جس کی نوح کو وصیت کی تھی اور جو وحی ہم نے تم پر نازل کی، ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ کو بھی اسی کی وصیت کی تھی، وہ یہی بات تھی کہ دین حق کو ٹھیک رکھنا اور اس میں تفرقہ نہ ڈالنا"۔

مجاہد اس کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ "اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے تجھ کو اور نوح کو ایک ہی دین کی وصیت کی تھی۔ اور خدا تعالیٰ فرماتا ہے" تم سب کی امت ایک ہی ہے میں ہی تمہارا رب ہوں، مجھ سے ڈرتے رہو، پھر اپنے کام کو انھوں نے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا، اپنی اپنی باتوں پر ہر ایک فریق خوش ہے، یعنی ملت اسلام تم سب کی ایک ملت ہے، پھر مشرکین، یہود، نصاریٰ اس میں مختلف ہو گئے اور خدا تعالیٰ فرماتا ہے" ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لئے ایک ایک طریق اور راستہ مقرر کر دیا" ابن عباسؓ کہتے ہیں، اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر ایک کے لئے ایک دستور اور طریقہ جدا بنا دیا۔ اور نیز خدا تعالیٰ فرماتا ہے، ہر ایک گروہ کے لئے ایک طریقہ ہم نے بنا دیا ہے جس پر وہ عمل کرتے ہیں۔

واضح ہو کہ سب کا دین ایک ہی ہے جس پر انبیا علیہم السلام متفق ہیں محض شریعتوں اور دستوروں کا اختلاف ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ نبیوں کا اس پر اتفاق ہے کہ استعانت اور عبادت میں خدا کا کوئی شریک نہیں اور جو امور اس کی بارگاہ کے مناسب نہیں ان سے پاک ہے اور اس کے اسما میں کجروی کرنا حرام ہے اور بندوں پر خدا کا یہ حق ہے کہ اس کی نہایت درجہ تعظیم کریں جس میں

ذرہ کوتاہی نہ ہو اور اپنے منہ اور دلوں کو اس کے آگے جھکا دیں اور اس کے شعائر کے ذریعہ سے قرب خداوندی حاصل کریں اور یہ بھی متفق علیہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے جمیع حوادث کے پیدا ہونے سے پیشتر ان کا اندازہ کر لیا تھا۔ اور فرشتے خدا کی مخلوق میں سے ہیں، جو خدا کی کسی امر میں نافرمانی نہیں کرتے اور اسی کے حکم کی تعمیل کرتے ہیں۔ اور خدا اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے اپنی کتاب نازل فرما کر اپنی اطاعت کو بندوں پر فرض کر دیتا ہے اور قیامت کا ہونا حق ہے اور مرنے کے بعد جی اٹھنا حق ہے۔ جنت و دوزخ حق ہیں اور اسی طرح سے تمام انبیا نیکی کے تمام اقسام، طہارت، نماز، روزہ، زکوۃ، حج اور عبادات نافلہ دعا، ذکر، کتاب الٰہی کی تلاوت کے ذریعہ سے خدا کی بارگاہ میں تقرب حاصل کرنے پر متفق ہیں۔ اور اسی طرح سے ان امور پر اتفاق ہے کہ نکاح جائز اور زنا حرام ہے، لوگوں میں عدل و انصاف کرنا فرض اور ظلم کرنا حرام ہے، نافرمانوں پر حدود مقرر کرنا اور دشمنان الٰہی سے جہاد کرنا، احکام الٰہی اور دین کی اشاعت میں کوشش کرنا واجب ہے۔ پس یہ امور دین کی بنیاد ہیں اور اسی لئے قرآن عظیم نے ان امور کی لمیت سے بحث نہیں کی مگر شاذ و نادر، اس لئے کہ یہ سب امور ان لوگوں کے نزدیک جن کی زبان میں قرآن نازل ہوا ہے مسلم اور متفق علیہ تھے البتہ ان امور کی صورتوں میں اختلاف ہے پس موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں نماز کے وقت بیت المقدس کی طرف رخ کرنے کا دستور تھا اور ہمارے پیغمبر علیہ السلام کی شریعت کعبہ کی طرف رخ کرنا چاہئے۔ موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں زانی کے لئے فقط رجم کی سزا تھی اور ہماری شریعت میں محصن کے لئے رجم ہے اور غیر محصن کے لئے تازیانہ مارنے کی سزا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں محض قصاص تھا ہماری شریعت میں قصاص اور دیت دونوں ہیں اور ایسے ہی طاعتوں کے اوقات اور ان آداب و ارکان میں اختلاف ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ نیکی اور تدابیر نافعہ کی جو خاص خاص صورتیں مقرر کی گئی ہیں ان کا نام شریعت اور منہاج ہے۔

واضح ہو کہ ہر مذہب اور ملت میں جس عبادت اور طاعت کا اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا ہے وہ انہی اعمال کا نام ہے جن کا اصل منشا اور مبدا انسان کی ایک دلی حالت ہے جو اس کو آخرت میں فائدہ یا نقصان پہنچائے گی۔ اصل طاعت اور عبادت یہ دلی حالت ہی ہے اور اعمال اور افعال اس کی صورت اور شرح ہیں۔ یہی دلی حالت عبادت کے لئے میزان اور مدار علیہ ہے جو اس امر کو

معلوم نہ کرے گا اس کو اعمال کے کرنے میں بصیرت حاصل نہ ہوگی اور اکثر ان اعمال پر اکتفا کرے گا جو غیر کافی ہوں گے بغیر قرأت اور دعا کے ہی نماز پڑھ لیا کرے گا اس لئے نماز کچھ مفید نہ ہوگی پس دین میں ایک ایسے کامل شناسا کی سیاست کی ضرورت ہے جو مخفی اور مشتبہ امور کو صاف صاف قرائن اور نشانات سے منضبط کردے، ان کو بہ منزلہ امر محسوس کے بنادے جن کو ادنیٰ اور اعلیٰ قسم کے لوگ تمیز کر سکیں اور لوگوں پر اعمال کے سمجھنے میں اشتباہ نہ رہے تاکہ خدا تعالیٰ کی جانب سے حجت اور دلیل کے ساتھ مطالبہ کرنا درست ہو جائے۔

اور کبھی گناہ غیر گناہ سے مشابہ ہو جایا کرتا ہے جیسا کہ مشرکین نے کہا تھا کہ بیع بھی ربوا ہی کے مانند ہے، ایسا اشتباہ، یا علم کی کوتاہی سے ہوتا ہے یا دنیوی غرض کی وجہ سے جو اس کو اندھا کردیتی ہے پس اس لئے ایسے نشانات کی ضرورت پڑی جن کی وجہ سے گناہ غیر گناہ سے ممیز ہوسکے۔ اور اگر عبادات کے لئے اوقات معین نہ کئے جاتے تو بہت سے لوگ تھوڑے ہی سے نماز روزہ کو زیادہ خیال کرتے جو کہ ان کے کچھ کام نہ آتا اور ان کی حیلہ بازی اور بہانہ جوئی پر کوئی سرزنش نہ ہوسکتی اور اگر لوگوں کے لئے عبادتوں کے ارکان اور شروط معین نہ ہوتے تو وہ بے بصیرتی سے ہاتھ پاؤں مارتے اور اگر گناہوں پر سزائیں مقرر نہ ہوتیں تو سرکش لوگ کبھی باز نہ آتے۔

حاصل کلام، تمام لوگوں کے حق میں احکام الٰہیہ کی تکالیف جب ہی مکمل ہوسکتی ہے کہ ان کے لئے اوقات ارکان، شروط، سزائیں، احکام کلیہ وغیرہ قرار دے جائیں اور اگر آپ تشریع کا قاعدہ معلوم کرنا چاہئیں تو آپ طبیب حاذق کی حالت پر غور کرلیجئے جب وہ مریضوں کی درستی میں نہایت درجہ کوشش کرتا ہے جن چیزوں کو وہ نہیں جانتے ان کی خبر دیتا ہے، جن امور سے وہ واقف نہیں ہیں ان کا مریضوں کو حکم دیتا ہے، دیکھئے وہ کس طرح امور محسوسہ کو مخفی امور کے قائم مقام قرار دیتا ہے جیسا کہ چہرہ کی سرخی اور مسوڑوں سے خون جاری ہونے کو غلبۂ خون کی علامت قرار دیتا ہے اور کس طرح سے مرض کی قوت، مریض کی عمر، اس کے شہر اور موسم کی حالت میں غور کرتا ہے، دوا کی قوت اور علاج کے تمام متعلقات میں غور کرتا ہے پس اپنے اندازہ سے دوا کی ایک مقدار مخصوص جس کو مریض کی حالت کے مناسب سمجھتا ہے مریض کو اس کے استعمال کا حکم دیتا ہے۔ اور کبھی علامت بجائے سبب مرض کے قرار دے کر اور دوا کی خاص مقدار کو جس کو اپنی فطانت سے مادہ

موذیہ کے ازالہ کی بجائے یا اس مادہ کے ہیئت فاسد کے بدل دینے کے قائم مقام جان کر ایک قاعدہ کلیہ بنالیتا ہے مثلاً وہ کہتا ہے کہ جس کا چہرہ سرخ ہو اس کے مسوڑوں سے خون نکلتا ہو تو اس کو طبی احکام کے لحاظ سے نہار منہ شربت عناب یا ماء العسل (۱) پینا چاہئے اور جو ایسا نہیں کرے گا یا وہ کہتا ہے جو شخص فلاں معجون کو اتنی مقدار میں فلاں مرض کے لئے کھائے گا تو اس کا مرض زائل ہو جائے گا اور اس مرض سے محفوظ رہے گا، پس اس طرح کا کلیہ طب سے اخذ کیا جاتا ہے۔

لوگ اس کے کلیہ پر عمل کرتے جس سے خدا تعالیٰ ان کو بڑا نفع پہنچاتا ہے یا اس تشریع کے قاعدہ کو سمجھنے کے لئے اس بادشاہ کی حالت میں غور کرنا چاہئے جو نہایت حکیم، ملکی اصلاحات اور انتظامات لشکر کا نگراں رہتا ہے، وہ کس طرح سے زمین، اس کی پیداوار، کاشتکاروں کے کام اور مشقت پر نظر رکھتا ہے اور کس طرح سے سپاہیوں، ان کی کارگزاری اور کفایت پر غور کرتا ہے پس اسی کے موافق عشر اور خراج مقرر کرتا ہے وہ کس طرح محسوس صورتوں اور قرائن کو ان اخلاق اور ملکات کے قائم مقام قرار دیتا ہے جن کا معاونین ملک میں پایا جانا ضروری ہے اسی قانون سے وہ ان کی گرفت کرتا ہے، وہ بادشاہ کس طرح سے ضرورتوں پر نظر رکھتا ہے جو ملک کے لئے کافی ہو سکیں، معاونین اور ان کی تعداد پر نظر رکھتا ہے پس ان کو ہر ہر کام پر اس طرح تقسیم کرتا ہے جس سے کار براری ہو جائے اور کسی پر تنگی نہ ہو۔ اور اسی طرح معلم اطفال کا حال اس کے شاگردوں کی نسبت اور مالک کا حال اس کے غلاموں کی نسبت دیکھئے۔ استاد لڑکوں کی تعلیم چاہتا ہے اور مالک، حاجت مقصودہ کو غلاموں کے ہاتھوں پورا کرانا چاہتا ہے حالانکہ شاگرد اور غلام نہ تو مصلحت کی حقیقت سمجھتے ہیں اور نہ اس کی پابندی کو دوست رکھتے ہیں، بلکہ حیلہ اور بہانہ کر کے اس سے الگ ہونا چاہتے ہیں لیکن معلم اور مالک خوب جانتے ہیں کہ اس امر سے یہ رخنہ پیدا ہو گا وہ پہلے ہی سے خلل کو روکتے ہیں اور ان کو اس طرح سے حکم دیتے ہیں کہ رات کو دن اور دن کو رات کہنا پڑتا ہے جس سے نہ ان کو حیلہ میسر ہوتا ہے اور نہ وہ کسی طرح سے عدول حکمی کر سکتے پس اس طرح سے مقصود حاصل ہو جاتا ہے خواہ وہ اس سے واقف ہوں یا نہ ہوں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ جو شخص بہت بڑے گروہ کی اصلاح کا ذمہ دار ہوتا ہے جن کی

(۱) شہد

استعدادیں مختلف ہیں، جن کو نہ بصیرت ہے نہ اصلاح کی طرف رغبت ہے تو وہ مجبوراً ہر چیز کا اندازہ کرتا ہے، وقت معین کرتا ہے، اس کے طریقوں اور صورتوں کو مقرر کرتا ہے جو مطالبہ اور مواخذہ میں نہایت عمدہ قانون سمجھا جاتا ہے۔

واضح ہو کہ جب خدا تعالیٰ نے ارادہ کیا رسول بھیج کر لوگوں کو تاریکی سے روشنی کی طرف نکالے تو اس کام کے لئے ان پر وحی بھیجی، اپنا نور، ان کے دلوں میں ڈالا اور ان میں اصلاح عالم کی رغبت پیدا کی۔ اس زمانہ میں ان لوگوں کے ہدایت یافتہ ہونے کے لئے خاص خاص امور اور مقدمات کی ضرورت تھی۔ اس لئے یہ حکمت الٰہی ضرور ہوا کہ تمام ان مصلح امور کو انبیا کے ارادۂ بعثت میں شامل کر دے۔ اور انبیا کی اطاعت اور فرمانبرداری کی فرضیت میں ان مقدمات اصلاح کی فرضیت بھی شامل ہو اور ہر وہ امر شامل ہو جس کے بغیر اطاعت انبیا عقلاً یا عادۃً مکمل نہیں ہو سکتی۔ پس یہ ایک ایسا مجموعہ ہے جس کا بعض، بعض کے ساتھ وابستہ ہے اور خدا تعالیٰ پر کوئی امر مخفی نہیں ہے، اور دین الٰہی میں بیہودگی نہیں ہے۔ پس کوئی شئے جب واجب کی جاتی ہے اور اس کے نظائر کا وہ حکم نہیں ہوتا تو اس میں حکمتیں اور اسباب ہوتے ہیں جن کو راسخین فی العلم ہی جانتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ان حکمتوں اور اسباب کے ایک عمدہ مجموعہ پر لوگوں کو متنبہ کریں۔ واللہ اعلم!

چوتھا باب: خاص خاص شرائع کا ایک قوم اور ایک زمانہ کے ساتھ مخصوص ہونے کے اسباب

اس کی دلیل خدا تعالیٰ کا یہ قول ہے "بنی اسرائیل کے لئے سب کھانے حلال تھے البتہ توریت کے نازل ہونے سے پہلے جو یعقوبؑ نے اپنے اوپر حرام کر لئے تھے وہ حلال نہ تھے۔ اگر تم سچے ہو تو توریت لاکر پڑھو" اسی آیت کی تفسیر یہ ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام ایک بار سخت بیمار ہوئے پس انھوں نے اپنے دل میں یہ نذر مانی کہ اگر خدا نے مجھ کو تندرست کر دیا تو میں اپنے اوپر سب چیزوں سے زیادہ مرغوب کھانے اور پینے کی چیز حرام کر لوں گا۔ چنانچہ جب تندرست ہوئے تو اونٹ کا گوشت اور دودھ اپنے اوپر حرام کر لیا اور ان کی پیروی کرتے ہوئے ان کی اولاد نے بھی ان چیزوں کو حرام ہی سمجھا، ان امور کی حرمت پر زمانے گزرتے گئے یہاں تک کہ لوگوں کے دلوں میں یہ بات بیٹھ گئی کہ اگر کسی نے ان چیزوں کو کھا کر انبیا کی مخالفت کی تو اس نے ان کی

شان میں بے ادبی کی، پس اس لئے تورات میں ان چیزوں کی حرمت نازل ہوئی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب بیان فرمایا کہ میں ملت ابراہیمؑ پر ہوں تو یہود نے اعتراض کیا کہ آپ تو اونٹ کا گوشت کھاتے ہیں اوران کا دودھ پیتے ہیں آپ کیسے ملت ابراہیمؑ پر ہوسکتے ہیں۔ اس واسطے خدا تعالیٰ نے ان کے قول کورد کیا کہ اصل میں سب کھانے حلال تھے لیکن اونٹ، ایک عارضی وجہ سے جو یہودیوں کو لاحق ہوئی تھی حرام ہوگئے تھے اور جب کہ نبوت اولاد اسمٰعیل میں ظاہر ہوئی اور اس عارضی امر سے وہ بری ہیں تو اس کی رعایت ان پر واجب نہ رہی اور اس امر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول بھی دلیل ہے جو آپ نے نماز تراویح کے بارے میں فرمایا تھا ''یہ تمہارا فعل یعنی تراویح پڑھنا میں ہمیشہ دیکھتا ہوں جس سے مجھے اندیشہ ہے کہ تم پر فرض نہ ہو جائے اگر فرض ہوگئی تو تم سے ادا نہ ہوسکے گی اس لئے اے مسلمانوں اس کو جدا جدا اپنے گھروں میں پڑھ لیا کرو''۔ اس لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو تراویح کے شائع ذائع کرنے سے منع فرمایا۔ تاکہ شعائر دین نہ ہوجائے اور لوگ اس کے ترک کو خدا کی شان میں تقصیر کا اعتقاد نہ کرنے لگیں اور یہی فرضیت کا باعث نہ ہوجائے، اور نیز آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمانوں میں سب سے زیادہ گنہ گار وہ شخص ہے جس نے کسی امر کا سوال کیا پس اس کی پوچھ گچھ ہی سے وہ شئے حرام ہوگئی۔ اور آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرت ابراہیمؑ نے مکہ کو حرم قرار دیا تھا اس کے لئے انھوں نے دعا کی تھی۔ اور جیسے حضرت ابراہیمؑ نے مکہ کو حرم قرار دیا تھا، میں مدینہ کو حرم قرار دیتا ہوں اور اس کی مد (ایک پیمانہ ہے) اور صاع (ایک پیمانہ) میں برکت کی ایسی ہی دعا کرتا ہوں جیسی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کے لئے کی تھی اور ایک شخص نے آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حج کے متعلق سوال کیا کہ کیا حج ہر سال ہونا چاہئے۔ آپ نے فرمایا اگر میں ہاں کہہ دوں تو ہر سال ہی حج کرنا فرض ہوجائے اور پھر ادا نہ ہوسکتا اور جب ادا نہ ہوسکتا تو عذاب الٰہی میں گرفتار ہوجاتے

واضح ہو کہ انبیا علیہم السلام کی شریعتیں چند مصالح اور اسباب کی وجہ سے مختلف ہوگئی ہیں اور یہ اختلاف اس طرح ہوا کہ شعائر خداوندی کا شعار قرار پانا معدات کی وجہ سے اوران کی مقداریں مقرر کرنے میں مکلفین کی عادات اور حالات کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ چنانچہ نوح علیہ السلام کی قوم نہایت قوی المزاج اور شہ زور تھی جیسا کہ خدا تعالیٰ نے اس کی خبر دی ہے، اس لئے وہ اسی قابل تھے کہ ان کو

ہمیشہ کے لئے روزہ رکھنے کا حکم دیا جائے تا کہ ان کی قوت بہیمی کمزور ہو جائے۔ اور چونکہ اس امت کے مزاج ضعیف تھے اس لئے ہمیشہ روزہ رکھنے سے منع کر دیئے گئے۔ اور اسی طرح مال غنیمت کو خدا تعالیٰ نے اگلے لوگوں کے لئے حلال نہیں کیا تھا لیکن ہمارے نبی کی امت کا ضعف دیکھ کر ہمارے لئے اس کو حلال کر دیا اور یہ بھی ضروری ہے کہ انبیا علیہم السلام کا اصل مقصد لوگوں کے کاروبار اور معاملات کی اصلاح کرنا ہے اس لئے وہ امر مالوف سے تجاوز نہیں کرتے تھے، الا ماشاء اللہ اور اصلاح کے طریقے عادات اور زمانوں کے بدلنے سے بدلتے رہتے ہیں اسی بنا پر نسخ کا ہونا صحیح ہے۔ نسخ کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی طبیب اس امر کا قصد کرے کہ سب حالتوں میں مزاج حالت اعتدال پر محفوظ رہے اسی لئے ہر زمانہ میں اور ہر شخص کے لئے اس کے جدا جدا احکام ہیں، وہ جوان کو ایسی باتیں بتائے گا کہ ان سے بوڑھے کو منع کر دے گا۔ وہ گرمی میں باہر سونے کا حکم کرے گا کیونکہ اس میں اعتدال کا احتمال ہے اور سردی میں اندر سونے کا حکم کرے گا، پس جو شخص اصلیت دین سے واقف ہے اور ان اسباب سے واقف ہے جن کی وجہ سے مذہبی طریقے مختلف ہوتے ہیں تو اس کی نظر میں نہ کوئی تغیر ہے اور نہ تبدیلی، اسی وجہ سے شریعتوں کی نسبت ہر قوم کی طرف جدا جدا کی گئی، اور چونکہ وہ قوم اپنی استعدادی حالت کی وجہ سے اس شریعت کی مستحق ہو گئی تھی اور انھوں نے بہ زبان حال نہایت اصرار سے گویا اس کی درخواست کی تھی اس لئے وہی ہدف ملامت ہوئی اور اسی واسطے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی فضیلت ظاہر ہوتی ہے کہ جمعہ کا روز ان کے حق میں معین کیا گیا کیونکہ وہ ناواقف تھے اور تمام علوم کسبی سے بری تھے۔ اور یہود کے لئے ہفتہ کا دن قرار دیا گیا کیونکہ یہود کا اعتقاد تھا کہ ہفتہ ہی کے روز خدا تعالیٰ دنیا کے پیدا کرنے کے کام سے فارغ ہوا تھا اس لئے عبادت کے لئے یہی دن بہت اچھا ہے حالانکہ دونوں دنوں کا تقرر محض امر الٰہی اور وحی سے ہوا ہے۔ اور شریعتوں کی مثال ایسی ہے جیسے کسی امر مامور بہ کی حالت ہوتی ہے جس کا حکم دیا جاتا ہے لیکن اس کے بعد عذر اور حرج پیش آجاتے ہیں اس لئے ان لوگوں کی ذاتی حالت کے لحاظ سے اجازتیں اور خصلتیں مشروع ہو جاتی ہیں، تو اس وجہ سے کہ انھوں نے اپنی ذاتی حالت کی وجہ سے اس امر کے قابل اپنے آپ کو بنالیا تھا کبھی کبھی وہی لوگ قابل ملامت ہوتے ہیں، خدا تعالیٰ فرماتا ہے "جب تک لوگ اپنی ذاتی حالت کو نہ بدلیں، خدا تعالیٰ کسی قوم کو نہیں بدلا کرتا" اور اسی ذاتی اور استعدادی اختلاف کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ

وسلم نے فرمایا ہے "اے عورتو! میں نے تم سے زیادہ کسی ناقص عقل اور ناقص دین کو بڑے دانشمند کی عقل خراب کرنے والا نہیں دیکھا"۔ پھر آپ نے ان کے دین کا نقصان بیان کیا کہ جب عورت حیض سے ہوتی ہے تو نہ نماز پڑھتی ہے نہ روزہ رکھتی ہے۔

واضح ہو کہ مذہب کے ایک صورت خاصہ میں نازل ہونے کے بہت سے اسباب ہیں لیکن وہ دو نوع میں منحصر ہیں، اوّل قسم بہ منزلہ امر طبعی کے ہے جس کی وجہ سے لوگ احکام کے مکلف ہوتے ہیں، پس جس طرح تمام افراد انسانی کے لئے ایک خاص طبیعت اور حالات معین ہیں جو نوع انسانی کی طرف سے سب کو وراثتاً ملے ہیں۔ اور جن کی وجہ سے لوگ احکام کے مکلّف ہوتے ہیں، اور جس طرح مادر زاد اندھے کے خزانہ خیال میں رنگتیں اور صورتیں نہیں ہوتیں بلکہ محض الفاظ اور وہ چیزیں ہوتی ہیں جو چھوئی جاسکتی ہیں اور اسی قسم کی اور چیزیں ہوتی ہیں، پس جب غیب سے اس کو کوئی علم یا واقعہ وغیرہ خواب میں حاصل ہوتا ہے تو صرف انہی چیزوں کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے جو اس کے خزانہ خیال میں جمع ہیں نہ کہ اور چیزوں کی صورت میں، اور جس طرح اس عربی کے لئے جو سوائے زبان عرب کے اور کوئی زبان نہیں جانتا۔ الفاظ کے ذریعہ سے کوئی بات معلوم کرائی جاتی ہے تو محض لغت عرب میں نہ کہ غیر عربی زبان میں۔ اور جس طرح کہ جن شہروں میں ہاتھی وغیرہ حیوانات ہیبت ناک ہوتے ہیں تو ان شہروں کے باشندوں کی نظر میں جنوں کا سامنے آجانا یا بھوتوں اور شیاطین کا ڈرانا انہی حیوانات کی صورت میں ہوتا ہے اور جن ملکوں میں جو چیزیں معظم ہوتی ہیں اور جو عمدہ کھانے اور لباس پائے جاتے ہیں تو ان کو ملائکہ کی خوشی اور نعمتیں انہی چیزوں میں دکھائی دیتی ہیں اور جیسے کوئی عربی شخص جب کسی کام کے کرنے کا قصد کرتا ہے یا کسی سفر کا ارادہ کرتا ہے اور وہ راشد یا نجیع (کامیاب) کے لفظ کو سنتا ہے تو آئندہ حالات کی عمدگی اور کامیابی کی دلیل اس کو قرار دیتا ہے، جو عربی نہیں ہے اس پر ان الفاظ کا کوئی اثر نہیں ہوتا، چنانچہ کسی قدر احادیث میں بھی اس کا ذکر آیا ہے، تو جیسے کہ امور بالا کے اثر، اپنا پرتو حالات پر ڈالتے ہیں ایسے ہی شرائع میں ان علوم کا جو کسی قوم میں مخزون اور جمع ہوتے ہیں اور ان اعتقادات کا جو ان میں مخفی ہوتے ہیں اور ان کی عادات کا جو کلب (۱) بیماری کی طرح انہیں ساری اور جاری ہوتی ہیں، لحاظ

---

(۱) کتے کے کاٹنے سے جو دیوانگی ہو جاتی ہے اس کو کلب کہتے ہیں۔

اور اعتبار رہا کرتا ہے۔

اسی واسطے اونٹوں کا گوشت اور دودھ بنی اسرائیل کے لئے حرام تھا، نہ بنی اسمٰعیل کے لئے اور اسی وجہ سے اچھے اور برے کھانوں کی تمیز عادات عرب پر تفویض کی گئی۔ اور اسی وجہ سے ہمشیرہ زادیاں ہمارے لئے حرام کی گئیں، یہودیوں میں وہ حرام نہ تھیں کیونکہ یہود ان کو ان کے باپ کی قوم سے شمار کرتے تھے، ان سے کسی قسم کا میل جول، ربط وصحبت نہیں رکھتے تھے بلکہ ان کو بہ منزلہ اجنبیہ کے سمجھتے تھے۔ بخلاف عرب کے کہ ان میں یہ رسم نہ تھی۔ اور ایسے ہی گائے کے بچے کا گوشت اس کی ماں کے دودھ میں پکانا یہودیوں میں حرام تھا، ہمارے یہاں حرام نہیں ہے کیونکہ یہودیوں کو معلوم تھا کہ اس سے خدا کی پیدائش اور تدبیر الٰہی کی محافظت ہوتی ہے، جو چیز خدا تعالیٰ نے گائے کے بچہ کی پیدائش اور نشوونما کے لئے پیدا کی ہے اس سے ہی اس صورت میں گویا اس کی بنیاد اکھاڑنا اور اس کے اجزا کو جدا جدا کر دینا ہوگی۔ اور عرب کے لوگ اس قسم کے علم وفہم سے نہایت درجہ دور تھے اگر ان کو اس قسم کے راز سمجھائے جاتے تاہم ان کی سمجھ میں نہ آتے، وہ اس امر کو کبھی معلوم نہ کر سکتے جو حکم دینے کا مناسب مدار علیہ تھا اور یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ نزول شرائع میں صرف انہی علوم، حالات اور ان اعتقادات کا ہی اعتبار نہیں کیا جاتا ہے جو لوگوں کے سینہ میں متمثل ہوتے، بلکہ بڑا لحاظ اور اعتبار ان پیدائشی امور کا ہوتا ہے جن کی طرف ان کی عقلیں مائل ہوتی رہتی ہیں خواہ ان امور کا ان کو علم ہو یا نہ ہو تم اس نکتہ کو ان تعلقات میں دیکھ سکو گے کہ جب ایک شئے کسی دوسری شکل اور پیرایہ میں ظاہر ہوتی ہے جیسے موہنوں پر مہر لگانے کی صورت میں لوگوں کو سحری سے باز رکھنا ظاہر ہوا تھا۔ اس لئے کہ لوگوں کی نظر میں مہر لگانا، ایک شئے کے بند کرنے اور روکنے کی صورت ہوا کرتی ہے خواہ یہ امر لوگوں کے پیش نظر ہو یا نہ ہو۔ اور خدا تعالیٰ کا بندوں پر یہ حق اور فرض ہے کہ غایت درجہ اس کی تعظیم کریں اور کسی طرح مخالفت نہ کریں اور لوگوں کا باہم یہ فرض ہے کہ ہمدردی اور باہمی الفت کی مصلحت کو ہمیشہ قائم رکھیں اور کوئی کسی کو نہ ستائے، ہاں جبکہ رائے کلی وغیرہ اس کا حکم کرے۔ اسی وجہ سے اگر کوئی شخص کسی عورت کو اجنبی خیال کر کے اس سے ہم بستر ہو جائے تو خدا تعالیٰ کے اور اس کے درمیان پردہ حائل ہو جائے گا، خدا تعالیٰ کے مقابلہ میں یہ کام اس کی دلیری کا خیال کیا جائے گا اگرچہ یہ عورت واقع میں اس کی بیوی ہی کیوں

نہ ہو، کیونکہ اس نے حکم الٰہی کی مخالفت پر پیش قدمی کی۔

اور جس شخص نے کسی اجنبی عورت سے اپنی بیوی سمجھ کر ہم بستری کر لی تو بلاشک وہ خدا کے نزدیک معذور سمجھا جائے گا اور جو شخص روزہ کی نذر مانتا ہے وہی اس کے مطالبہ میں ماخوذ ہوتا ہے اور جس نے نذر نہ کی ہو وہ ماخوذ نہیں ہوتا۔ اور جو دین میں اپنے اوپر سختی کرتا ہے اس پر سختی کی جاتی ہے اور یتیم کو ادب سکھانے کے لئے طمانچہ مارنا نیکی ہے، اور ایذا دینے کے لئے مارنا گناہ ہے۔ خطا کار اور بھول چوک کرنے والا بہت سے احکام میں قابل معافی ہے، پس یہ وہ اصل ہے جس کے مطابق لوگوں کے علوم اور عادات ظاہرہ اور پوشیدہ ہیں، پس انہی کے موافق ان کے حق میں شریعتوں کی تعیین ہوتی ہے۔

واضح ہو کہ اکثر عادات اور مخفی علوم ایسے ہیں کہ ان پر تمام عرب وعجم اور تمام معتدل اقالیم کے باشندے اور ایسے لوگ جن کا مزاج عمدہ اور بزرگ ترین اخلاق کے قابل ہے، متفق ہیں جیسے اپنے مردہ پر غم کرنا، اس کے حق میں نرم دلی کو پسند کرنا، حسب ونسب پر فخر کرنا، چوتھائی یا تہائی شب کے گزرنے کے بعد سونا علی الصبح بیدار ہونا ان کے علاوہ اور اکثر امور ہیں جن کی طرف ہم نے ارتفاقات کے بیان میں اشارہ کیا ہے۔ تو اس قسم کے جتنے عادات اور علوم ہیں ان کا سب چیزوں سے زیادہ اعتبار اور لحاظ کیا جاتا ہے، ان کے بعد اکثر عادات اور عقائد ایسے ہوتے ہیں جو صرف انہی لوگوں میں خاص ہوتے ہیں جن میں نبی مبعوث کیا جاتا ہے اس لئے ان عادات کا اعتبار بھی ضروری ہوتا ہے اور خدا تعالیٰ نے ہر چیز کا ایک اندازہ کر رکھا ہے۔

واضح ہو کہ نبوت بسا اوقات ملت کے تابع ہوتی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "ملة ابیکم ابراھیم" اور فرمایا اور نوح کے طریقہ والوں میں سے ابراہیم بھی تھے" اس کا راز یہ ہے کہ سالہائے دراز تک لوگ ایک مذہب کی پابندی کرتے ہیں اور اس دین کے شعائر کی تعظیم کرتے ہیں، اس مذہب کے احکام نہایت مشہور اور شائع بہ منزلہ بدیہیات اولی کے ہو جاتے ہیں جن کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ پھر جب اس مذہب کے نبی کی روایتوں میں اختلاط ہو جاتا ہے تو اس کے بعد ایک دوسری نبوت کا زمانہ آتا ہے تاکہ پہلے مذہب کی کجی بالکل دور ہو جائے، اس کی بگڑی ہوئی باتیں درست ہو جائیں، یہ دوسری نبوت لوگوں میں مشہور اور معتبر احکام کی تفتیش کرتی ہے پس جو

صحیح سیاست مذہبی کے قواعد کے موافق ہوتے ہیں دوسری نبوت ان کونہیں بدلتی بلکہ ان کی لوگوں کو رغبت دلاتی ہے اوران پر عمل کرنے کی تاکید فرماتی ہے اور جو احکام کھوٹے ہوتے ہیں، جن میں تحریف ہوگئی ہے ان میں بقدر ضرورت تبدیلی کردیتی ہے اور جو احکام قابل اضافہ ہوتے ہیں تو ان میں کچھ اضافہ کردیتی ہے اور بسا اوقات یہ نبی آخر ان امور سے جو پہلی شریعت کے باقی رہ جاتے ہیں، اکثر اپنے مطالب اور دعاوی پر استدلال کرتا ہے پس اس وقت یہ کہا جاتا ہے کہ یہ نبی، فلاں نبی کی ملت میں ہے یا اس کے گروہ میں سے ہے اور بسا اوقات یہ نبوتیں اختلاف ملل کے سبب سے مختلف بھی ہوجاتی ہیں۔ مذاہب کے ایک صورت خاصہ میں نازل ہونے کی دوسری قسم بہ منزلہ ایک امر عارضی طاری کے ہے اور یہ اس لئے ہے کہ خدا تعالیٰ گو زمانہ سے بلند و برتر ہے لیکن اس کو کسی نہ کسی وجہ سے زمانہ اور زمانہ کی چیزوں سے ربط اور تعلق ہے چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے کہ ہر ایک صدی کے بعد خدا تعالیٰ حوادثات عظیمہ میں سے ایک نہ ایک حادثہ کو پیدا کرتا ہے اور حضرت آدم علیہ السلام اور دیگر انبیا نے بھی حدیث شفاعت میں کسی قدر اس بارے میں خبر دی ہے کہ ہر ایک نبی قیامت کے روز کہے گا کہ آج کے دن خدا تعالیٰ ایسا غضبناک ہے کہ ایسا کبھی غضبناک نہیں ہوا ہے اور نہ آئندہ کبھی ہوگا پس جب عالم آمادہ اور تیار ہوتا ہے کہ شریعتوں کا اس پر فیضان کیا جائے اور امور دینی کے حدود معین کئے جائیں، اور اللہ تعالیٰ تجلی فرما کر دین کو لوگوں پر نازل کرتا ہے اور اسی کے موافق ملأ اعلیٰ بلند ہمتی سے لبریز ہوجاتے ہیں تو ایسے وقت میں عارضی اسباب میں سے ایک ادنی سبب بھی جود الٰہی کا دروازہ کھٹکھٹانے کے لئے کافی ہوجاتا ہے اور جو کریم کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے تو وہ کھل ہی جاتا ہے، آپ موسم بہار پر ہی نظر ڈالئے کہ اس موسم میں بونے اور تخم ریزی کرنے کے لئے ادنی سبب اثر کرجاتا ہے کہ اور موسم میں اس سے کئی گنا اہتمام بھی اثر نہیں کرتا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ کسی شئے کے لئے اس کا انتظار کرنا اور اس شئے کے لئے اس کا دعا کرنا اور نہایت شوق کے ساتھ اس کو طلب کرنا، اس امر میں احکام کے نازل ہونے کا قوی سبب ہوتا ہے اور جب نبی کی دعا روشن طریقہ کو زندہ کرتی ہے اور دعا کی وجہ سے بڑی بڑی جماعتوں پر غلبہ حاصل ہوجاتا ہے اور اس سے نظر کے سامنے کھانے پینے کی زیادتی ہوجاتی ہے تو اس کی وجہ سے نزول حکم جو روح لطیف ہے اور اس کا تعین محض وجود مثالی میں ہے، کیا بعید

ہے اور اسی قاعدہ پر سمجھ لینا چاہئے کہ اس زمانہ کے وہ بڑے بڑے حوادث جن سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تشویش ہوتی تھی، جیسے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر بہتان کا قصہ، یا جب کوئی سائل ایک امر دریافت کرتا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس میں بار بار پوچھ گچھ کرتا تھا جس کی وجہ سے آپ کو فکر ہو جاتی تھی جیسے ظہار کا قصہ، تو یہ امور نزول احکام کے سبب بن جاتے تھے اور اس سے اصل حال کا انکشاف ہو جاتا تھا۔ اور اسی طرح سے کسی قوم کا طاعت میں سستی کرنا، فرمانبرداری میں پہلوتہی کرنا اور ہمیشہ گناہ میں مصروف رہنا اور ایسے ہی کسی چیز کی نہایت رغبت کرنا اور نہایت اہتمام اور قصد سے اس کی پابندی کرنا اور اس کے ترک کو خدا تعالیٰ کا گناہ سمجھنا بھی ان پر کسی چیز کے فرض اور حرام ہونے کا سبب ہوتا ہے اور باران جود برسوانے میں ان سب کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص صالح، قوی الہمت روحانیت کے منتشر ہونے اور سعادت کی کمالیت کے وقت قصد کر کے خدا کی بارگاہ میں نہایت اہتمام کے ساتھ درخواست کرتا ہے تو اسی وقت وہ مقبول ہو جاتی ہے اور انہی معانی کی طرف خدا تعالیٰ کے اس قول میں اشارہ ہے، مسلمانو! بہت سی چیزوں کا سوال مت کیا کرو اگر وہ تمہارے لئے کھل جائیں گی تو تم کو ناگوار معلوم ہوں گی اگر قرآن کے نازل ہوتے وقت پوچھو گے تو خود بخود تم کو معلوم ہو جائیں گی''۔ خداوند کریم کی اصل مرضی یہی ہے کہ نزول شرائع کے اس قسم کے سوالات کم ہوا کریں کیونکہ اس سے وہ امور نازل ہو جاتے ہیں جن میں مصلحت خاص کا حکم اور اثر غالب ہوتا ہے، پس اکثر اس میں آئندہ نسلوں کے لئے تنگی پیش آجاتی ہے اس لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سوال کرنے کو برا سمجھتے تھے اور فرماتے تھے کہ جو کچھ میں تم کو بتلاؤں اسی پر بس کرو اور مجھ سے نہ پوچھو کیونکہ پہلی امتوں کی ہلاکی کا یہی سبب بنا ہے کہ انھوں نے بہت سوالات کئے اور انبیا کی مخالفت پر کمر باندھی اور فرمایا کہ مسلمانوں میں وہ شخص بڑا گنہگار ہے جس کے سوال کرنے سے کوئی چیز حرام کردی جائے اور حدیث میں یہ بھی آیا ہے کہ بنی اسرائیل جس گائے کو ذبح کرڈالتے وہی کافی ہو جاتی، لیکن انھوں نے سختی کی اس لئے ان پر خدا نے بھی سختی کی۔ واللہ اعلم۔

پانچواں باب: شریعت کے طریقوں پر مواخذہ کرنے کے اسباب کا بیان

ہم اس امر کو بیان کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے جو شرائع اپنے بندوں کے لئے مقرر فرمائی

ہیں ان پر عذاب وثواب ایسے ہی مرتب ہوتا ہے جیسے کہ نیکی اور گناہ کے اصول پر ہوتا ہے یا صرف انہیں امور پر مرتب ہوتا ہے جو نیکی اور گناہ کے مواقع صورت اور قالب قرار دیئے گئے ہیں، مثلاً کسی شخص نے ایک وقت کی نماز ترک کردی لیکن اس کے دل میں خشوع وخضوع ہے تو نماز ترک کرنے پر اس شخص کو عذاب ہوگا یا نہ ہوگا، اور ایک شخص نے نماز تو ادا کی اور اس کے ارکان وشروط اس طرح سے ادا کئے کہ وہ بری الذمہ ہوگیا لیکن نہ اس میں خشوع وخضوع تھا اور نہ حضور قلب تو اس نماز پر اس کو ثواب ملے گا یا نہ ملے گا۔ اس میں کچھ کلام نہیں ہے کہ شریعت کے طریقوں کی نافرمانی کرنے میں فساد عظیم ہے اس جہت سے کہ اس سے سنت راشدہ میں روک ہوتی ہے، معصیت کا دروازہ کھلتا ہے اور جماعت مسلمین میں تکدر آتا ہے، قوم، شہر اور ملک کو ضرر پہنچتا ہے، جیسے شہر کی مصلحت کے لئے سیلاب کی وجہ سے بند باندھا تھا، ایک شخص نے نقب دیکر اس بند کو توڑ دیا، وہ شخص خود تو بچ گیا لیکن اہل شہر کو اس نے ہلاک کردیا گفتگو اس میں ہے کہ گناہ یا نیکیاں خود اس شخص کا احاطہ کرتی ہیں یا نہیں۔

پس تمام اہل مذاہب کا یہ مسلک ہے کہ خود ان شرائع پر ثواب وعذاب ہوتا ہے۔ اور ان میں سے اہل تحقیق راسخین فی العلم اور انبیا علیہم السلام کے حواری لوگ اس کے ساتھ ان کے قوالب ارواح، اشباح اور اصول میں وجہ مناسبت بھی نکالتے ہیں اور جانتے ہیں اور عام عاملان دین اور حافظان شریعت پہلی بات پر اکتفا کرتے ہیں۔

فلاسفۂ اسلام یہ کہتے ہیں کہ ثواب وعذاب صفات نفسانیہ اور ان اخلاق کی وجہ سے ہوتے ہیں جو انسان کی روح کے ساتھ متعلق ہیں ان صفات کے قالبوں اور صورتوں کا شرائع میں مذکور ہونا محض سمجھانے کے لئے اور دقیق معانی کو لوگوں کے ذہنوں سے قریب کرنے کے لئے ہے مذاق قوم کے موافق اس مقام کے متعلق یہ تحریر کیا گیا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ مذہبی محققین کا مذہب حق ہے اس کا بیان یہ ہے کہ شرعی امور کے لئے اسباب اور باعث ہوتے ہیں جن سے بعض شرعی امور کو بعض پر ترجیح ہوتی ہے اور ان کی تشخیص ہوتی ہے۔ خدا تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ بغیر ان شرعی احکام کے لوگ دین پر عمل نہ کرسکیں گے اور یہ بھی خدا تعالیٰ کو معلوم ہے کہ یہی طریقے لوگوں پر واجب کردینے کے قابل ہیں، پس یہ طریقے خدا

کی اس توجہ میں مندرج ہوتے ہیں جو ازل میں لوگوں کے ساتھ تھی، پھر جب یہ عالم اس امر کے لئے مستعد اور تیار ہوگیا کہ اس پر شرعی صورتوں کا فیضان کیا جائے اور اس کے پیکر پیدا کئے جائیں تو اس وقت خدا تعالیٰ نے اس کو پیدا کیا اور شرعی امور پیدا کر کے اپنا فیضان پورا کیا اور ازل سے اس کا تعین ہوگیا اس لئے یہی امور بہ منزلہ اصل کے ہوگئے اس کے بعد جب خدا تعالیٰ نے ملأ اعلیٰ کو اس سے مطلع کر دیا اور ان کو الہام سے بتادیا کہ یہی موقع شرعی اصول کے قائم مقام ہیں اور یہی اصول کی صورتیں اور اشباح ہیں اور ان اشباح اور صورتوں کے بغیر لوگ مکلّف نہیں ہوسکتے تب حظیرۃ القدس میں اس پر اتفاق ہوگیا کہ ان صورتوں کو ایسی ہی نسبت ہے جو لفظ کو اپنے معنی موضوع لہ سے اور صور ذہنیہ کو حقیقت خارجیہ سے ہوا کرتی ہے جو اسی صورت خارجی سے حاصل کی جاتی ہے، یا جو تصویری صورت کو اس شئے سے نسبت ہوتی ہے جس کی یہ تصویر یا جو خطوط کو الفاظ موضوعہ سے ہوتی ہے کیونکہ جب ان سب امور میں دال اور مدلول میں نہایت قوی تعلق اور ان میں باہمی لزوم اور گرفت ثابت ہوگئی تو اپنے موقع پر یہ طے ہوگیا کہ یہ دال ہی مدلول ہے اور دونوں شئے واحد ہی ہیں، اس کے بعد اس علم کا پرتو یا اس علم کی خود حقیقت تمام بنی آدم عرب اور عجم کی عقلوں پر منکشف کر دی گئی اور سب نے اتفاق کرلیا کہ وہ شرائع اور اصول ایک ہی شئے ہیں، تم ایسا کوئی شخص نہ دیکھو گے جس کے دل میں اس علم کا ایک حصہ نہ ہو، اکثر ہم نے اس کا نام وجود شئے للمدلول رکھا ہے اور کبھی اس وجود کے آثار عجیبہ ہوتے ہیں جو غور کرنے والے پر مخفی نہیں ہیں۔ شرع میں اس کے بعض بعض آثار کا لحاظ کیا گیا ہے اسی وجہ سے صدقہ کو صدقہ دینے والوں کا میل کچیل قرار دیا گیا ہے اور اسی وجہ سے کسی کام کی برائی مزدوری میں بھی سرایت کر جاتی ہے۔ اس کے بعد جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی، روح القدس سے آپ کی تقویت کی گئی، آپ کے دل میں قوی اصلاح کا الہام ہوا، اور آپ کی روح کے لئے ایک وسیع راستہ جو شریعت کے نازل ہونے اور صور مثالیہ کے صادر کرنے کی ہمت کی طرف جاتا ہے مفتوح ہوگیا تب آپ نے نہایت درجہ کی اولوالعزمی سے اس اصلاح کا اہتمام فرمایا اور موافقین کے لئے نہایت قصد اور ہمت سے دعائیں کیں، مخالفین پر لعنت کی اور انبیا علیہم السلام کی ہمتیں ساتوں آسمان کے طبقوں کو پھاڑ کر پار ہو جاتی ہیں۔ وہ جب پانی برسنے کی دعا کرتے ہیں اور آسمان پر ابر کا ذرا سا ٹکڑا بھی نہیں ہوتا تو ان کی دعا سے اسی

وقت پہاڑوں جیسے بادل پیدا ہو جاتے ہیں اوران کی دعا سے مردے زندہ ہو جاتے ہیں اس لئے حظیرۃ القدس میں ان کی وجہ سے خوشی اور ناخوشی پختگی سے قرار پا جاتی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول میں یہی مراد ہے کہ ''ابراہیمؑ تیرے نبی اور بندے نے مکہ کے لئے دعا کی تھی اور مدینہ کے لئے میں دعا کرتا ہوں الحدیث۔ پھر جس بندہ کو یہ معلوم ہو جائے کہ خدا نے ایسا ایسا حکم کیا ہے اور یہ بھی معلوم ہو جائے کہ ملأ اعلیٰ تمام اوامر و نواہی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید کرتے ہیں اور اس بات کو خوب جان لے کہ مامور بہ کو ترک کرنا اور یہی عدم کو اقدام کرنا خدا کے مقابلہ میں دلیری اور خدا کی شان میں کوتاہی کرنا ہے پھر جان بوجھ کر قصداً وعمداً کسی کام کو کر بیٹھتا ہے تو اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ وہ حجابات کی گہری تاریکی میں مبتلا ہے اور اس کی ملکی قوت منکسر ہو گئی ہے اور اس فعل سے دل پر گناہ جم جاتا ہے اور وہ جب کوئی پر مشقت کام کرتا ہے جس سے اس کی طبیعت بھاگتی ہے اس کو وہ کسی کی نمائش کے لئے نہیں کرتا بلکہ تقرب الٰہی اور اس کی رضامندی کی حفاظت کے لئے کرتا ہے تو اس کی وجہ سوائے اس کے کچھ نہیں ہو سکتی کہ مرتبہ احسان کی فضیلت میں وہ لپٹا ہوا ہے، اس کی بہیمی قوت اچھی طرح کمزور ہو گئی ہے اور اس سے دل میں ایک نیکی جم جاتی ہے اب جو شخص کسی وقت کی نماز ترک کر دے تو اس سے اس امر کی تفتیش ضروری ہے کہ اس نے نماز کیوں ترک کیا اور کسی امر نے اس کو اس پر آمادہ کیا، پس اگر وہ بھول گیا تھا یا سو گیا تھا یا نماز کی فرضیت سے ناواقف تھا یا کسی ضروری کام نے اس کو روک لیا تھا تو شریعت نے تصریح کر دی کہ ایسا شخص گنہگار نہیں ہے اور اگر اس نے جان بوجھ کر اور یاد رکھتے ہوئے نماز کو ترک کر دیا اور اس کو ادا کرنے کی قدرت تھی تو بلاشک یہ فعل دین میں سستی اور شیطانی حجاب سے ہوا جس نے اس کی بصیرت کو ڈھانک لیا ہے اور اس کا اثر اس کے نفس پر ہی پڑتا ہے۔ اور جس شخص نے نماز پڑھ لی اور وہ اس سے فارغ الذمہ ہو گیا تو ہم کو اس کے حال میں بھی تفتیش کرنی چاہئے اگر اس نے نمائش کے لئے یا لوگوں کی تعریف سننے کے لئے یا قومی عادت کی پابندی کی وجہ سے یا عبث سمجھ کر نماز پڑھی ہے تو شریعت نے تصریح کر دی کہ یہ شخص مطیع نہیں ہے اور اس کی یہ نماز قابل اعتبار نہیں ہے اور اگر اس نے تقرب الی اللہ کی وجہ سے اور ایمان کی وجہ سے اور نیکی سمجھ کر اور خدائی وعدہ کی تصدیق کرتے ہوئے پڑھی ہے اور حضور نیت اور خدا کے دین میں خلوص کے

ساتھ یہ کام کیا ہے تو ضرور اس کے اور خدا کے درمیان ایک راستہ کھل جاتا ہے گو وہ سوئی کے ناکہ کے برابر ہی کیوں نہ ہو، اور یہ جو کہا گیا تھا کہ اس شخص نے بند میں نقب لگانے سے شہر کو ہلاک کر دیا اور اپنے آپ کو بچا لیا اس کو ہم تسلیم نہیں کرتے کہ اس نے خود اپنے آپ کو بچا لیا، یہ کیسے ہو سکتا ہے، کیونکہ خدا تعالیٰ کے ایسے فرشتہ مقرر ہیں جن کی کامل توجہ اس طرف مصروف رہتی ہے کہ جو شخص عالم کی اصلاح کرنے میں کوشش کرتا ہے اس کے لئے دعا کرتے ہیں اور جو فساد پھیلانے میں سعی کرتا ہے اس پر بد دعا کرتے ہیں ان کی دعا کے اثر سے رحمت الٰہی کا دروازہ کھلتا ہے اور کسی نہ کسی طرح پر جزا نازل ہوتی ہے اور لوگوں کی طرف خدا تعالیٰ کی توجہ جزا کے باعث ہوا کرتی ہے اس کا سمجھنا چونکہ مشکل تھا اس لئے فرشتوں کی دعا کو ہم نے اس کا عنوان قرار دیا ہے۔ واللہ اعلم۔

چھٹا باب: حکمتوں اور علتوں کے اسرار کا بیان

واضح ہو کہ بندوں کے بعض افعال ایسے ہیں جن سے پروردگار عالم خوش ہوتا ہے اور بعض افعال ایسے ہیں جن سے ناخوش ہوتا ہے اور بعض افعال ایسے ہوتے ہیں جن سے خوش ہوتا ہے اور بعض افعال ایسے ہوتے ہیں جن سے نہ وہ خوش ہوتا ہے اور نہ ناخوش، اس لئے حکمت بالغہ اور رحمت تامہ کا اقتضا ہوا کہ انبیا علیہم السلام کو مبعوث کرے اور ان کے ذریعہ سے لوگوں کو ان افعال پر مطلع کر دے جن سے اس کی خوشی اور ناخوشی کا تعلق ہوتا ہے اور یہ کہ لوگوں سے قسم اول کا مطالبہ ہے اور دوسری قسم کے افعال ممنوع ہیں اور باقی امور میں ان کو اختیار ہے (تا کہ جو ہلاک ہو تو جان بوجھ کر ہلاک ہو اور جو حیات ابدی حاصل کرے تو جان بوجھ کر حاصل کرے) پس کسی فعل سے خدا تعالیٰ کی رضا یا عدم رضا کا متعلق ہونا یا دونوں افعال سے افعال کا غیر متعلق ہونا اور لوگوں سے کسی فعل کا مطالبہ کرنا اور اس سے روکنا یا اس میں مختار ٹھیرانا جو چاہو سو کہو، اس کو 'حکم' کہتے ہیں۔ اور مطالبہ کبھی موکد ہوتا ہے جس سے فعل مطلوب کرنے پر رضا اور ثواب اور ترک کرنے پر ناراضی اور عذاب ہوتا ہے۔ اور کبھی غیر موکد ہوتا ہے جس کے کرنے پر رضا اور ثواب ہوتا ہے اور نہ کرنے پر ناراضی اور عذاب نہیں ہوتا۔

اور اسی طرح نہیں، کبھی موکد ہوتی ہے جس کی وجہ سے فعل کے نہ کرنے پر رضا اور ثواب ہوتا ہے اور اس کے کرنے سے ناراضی اور عذاب ہوتا ہے۔ اور نہی کبھی غیر موکد ہوتی ہے جس کی وجہ

سے نہ کرنے سے رضا اور ثواب ہوتا ہے اور اس کے کرنے پر ناراضی اور عذاب نہیں ہوتا۔ تم اس کا اندازہ اپنے اور لوگوں کے محاورات کے الفاظ طلب اور منع میں کر سکتے ہو کیونکہ جو بات اولاً کہی جاتی ہے اس کے خلاف میں رضامندی اور ناراضی کے اثر سے ہر قسم کی دو قسمیں تم پاؤ گے اور یہ بہ منزل امر طبعی کے ہے جس سے چارہ نہیں۔ اس وجہ سے احکام کی پانچ قسمیں ہیں۔ وجوب، استحباب اباحت، کراہت، حرمت۔ اور مکلفین کے احوال میں سے ہر فعل کی حالت علیحدہ علیحدہ لوگوں کے سامنے پیش کرنا ناممکن ہے کیونکہ یہ افعال حصر میں نہیں آسکتے اور نہ ہی لوگ پورے طور پر ان کو معلوم کر سکتے ہیں اس واسطے یہ ضروری ہوا کہ جس امر میں لوگوں سے خطاب کیا جائے وہ قواعد کلیہ ہوں جن میں ایک ایسی وحدت ہو جس میں بے شمار چیزیں مندرج ہوں تاکہ لوگ اس کو معلوم کر کے اپنے افعال کی حالت معلوم کر سکیں۔ تم فنون کلیہ ہی میں غور کر لو کہ ان میں خاص خاص امور کے لئے قواعد کلیہ مقرر ہیں، دیکھو نحوی کہتا ہے کہ فاعل مرفوع ہوتا ہے تو سامع اس کا یہ قول محفوظ کر کے ''قام زید'' میں زید کا حال اور ''قعد عمرو'' میں عمرو کا حال معلوم کر سکتا ہے، وعلیٰ ہذا القیاس

اور وہ وحدت جس میں کثرت معتبر ہوتی ہے اس کو علت کہتے ہیں جس پر حکم کا مدار ہوتا ہے اور اس علت کی دو قسمیں ہیں۔ قسم اوّل وہ ہے جس میں اسی حالت کا اعتبار کیا جاتا ہے جو مکلفین میں موجود کا ہوا کرتی ہے اور وہ ہمیشہ نہیں پائی جاتی کیونکہ اگر کسی دائمی حالت کا اعتبار کیا جاتا تو احکام ہمیشہ اور ہمہ وقت ایسے نازل ہو جاتے کہ کبھی جدا نہ ہوتے اور یہ امر مکلفین کے قابو سے باہر ہے ایسی تکلیف صرف ایمان میں ہی ہو سکتی ہے پس اس وجہ سے ضروری ہو گیا کہ ایک ایسی حالت کا اعتبار کیا جائے جو دو شئے سے مرکب ہو، ایک مکلّف کی صفت لازمہ جس سے وہ مخاطب ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے اور دوسرے ایک عارضی ہیئت کے کبھی ہوتی ہے اور کبھی نہیں ہوتی اور یہ قسم اکثر عبادات میں پائی جاتی ہے۔ اور یہ ہیئت یا وقت ہے یا استطاعت میسرہ ہے یا مظنہ حرج ہے یا کسی شئے کا قصد کرنا ہے وغیرہ ذالک، مثلاً شارع کا قول ہے جس عاقل، بالغ شخص کو نماز کا وقت مل جائے تو اس پر نماز پڑھنا فرض ہے اور جو عاقل، بالغ، رمضان کو پالے اور وہ روزہ رکھنے پر قادر بھی ہو تو روزہ رکھنا اس پر فرض ہے۔ اور جو شخص نصاب کا مالک ہو اور اس کے مال پر ایک سال گزر جائے تو ایسے شخص پر اس مال کی زکوٰۃ دینا فرض ہے اور جو شخص حالت سفر میں ہو تو اس کے

لئے نماز میں قصر کرنا اور روزہ افطار کرنا جائز ہے اور جو شخص نماز پڑھنا چاہے اور وہ بے وضو رہے تو اس کو وضو کرنا ضروری ہے۔ اس قسم میں اکثر ان صفات کا لحاظ نہیں کیا جاتا ہے جو اکثر امور میں معتبر ہوتی ہیں اور صرف اس صفت کا اعتبار کیا جاتا ہے جس سے ایک حکم کو دوسرے سے امتیاز ہو گیا ہے اس لئے مسامحۃً اسی کو علت کہہ دیتے ہیں، مثلاً کہتے ہیں کہ نماز کی علت وقت کا آنا ہے۔ اور روزے کی علت ماہ رمضان کا آنا ہے اور کبھی شارع ان اوصاف میں سے بعض کو بالخصوص موثر قرار دیتا ہے جیسے مالک نصاب کے لئے ایک سال یا دو سال کی پیشگی زکوٰۃ دینا جائز قرار دیا ہے اور غیر مالک نصاب کے لئے ایسا کرنا جائز نہیں ہے اسی وجہ سے فقیہ ہر ایک امر کا ٹھیک اندازہ کرتا ہے کسی صفت کو سبب اور کسی کو شرط قرار دیتا ہے۔

اور علت کی دوسری قسم وہ ہے جس میں اس شئے کی حالت کا اعتبار رہوتا ہے جس پر کسی کام کا اثر ہوتا ہے یا کام کا اس سے کچھ تعلق ہوتا ہے اور یہ علت کبھی صفت لازمہ ہوتی ہے جیسے شارع کا قول ہے کہ شراب پینا حرام ہے، خنزیر کھانا حرام ہے اور درندوں اور پرندوں میں سے پنجہ دار جانوروں کا کھانا حرام ہے، ماؤں سے نکاح کرنا حرام ہے۔ اور کبھی کوئی عارضی صفت ہوتی ہے جو اسی شئے کے قائم مقام ہوتی ہے جیسے خدا کا قول ہے ''چور مرد اور عورت کے ہاتھ کاٹ ڈالو''۔ اور جیسے کلام الٰہی ''زنا کرنے والے اور زنا کرنے والی کے سو درے لگاؤ'' اور کبھی وہ شئے جس پر فعل واقع ہوتا ہے اس کے حالات میں سے دو یا زیادہ کا لحاظ کیا جاتا ہے جیسے شارع کا قول ہے، محصن زانی کو سنگسار کرنا چاہئے اور زانی غیر محصن کو درہ لگانا چاہئے۔ اور کبھی مکلّف کا اور جس پر کہ فعل واقع ہوتا ہے دونوں کے احوال کا لحاظ کیا جاتا ہے جیسے شارع کا قول ہے کہ اس امت کے مردوں پر سونا اور حریر حرام ہے لیکن عورتوں پر حرام نہیں ہے۔ دین الٰہی میں کسی قسم کی لغویت نہیں ہے پس ان افعال سے رضا یا عدم رضا کا جو تعلق ہوتا ہے تو اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے اور یہ اس لئے کہ ان افعال کے ایسے امور معینہ ہیں جن سے فی الحقیقت رضا اور ناراضی متعلق ہوتی ہے، یہ امور دو قسم کے ہیں، اوّل نیکی اور گناہ، تدابیر نافع اور ان کا ضائع کرنا اور انہی کی مثل اور امور، دوم وہ امور ہیں جو احکام شریعت اور مذہب سے متعلق ہیں جیسے تحریف کا دروازہ بند کرنا، حیلہ جوئی وغیرہ سے باز رکھنا۔

اوران معین امور کے مواقع اور لوازم ہیں جن سے رضا اور عدم رضا کا بالغرض تعلق ہوتا ہے اوران مواقع اور لوازم کی طرف رضامندی اور ناراضی کو مجازاً منسوب کر دیتے ہیں اس کی ایسی مثال ہے جیسے کہا جاتا ہے کہ دوا کا کھانا آرام پانے کی علت ہے اور درحقیقت شفا کی علت، اخلاط کا نفع یا ان کا اخراج ہے۔ اور یہ نضج اور اخراج عادتاً دوا پینے سے حاصل ہوتا ہے اور یہ خود علت نہیں ہے۔ اور جیسے کہا کرتے ہیں کہ تمازت آفتاب میں بیٹھنا یا محنت کا کام کرنا یا کسی گرم غذا کا کھانا بخار کی علت ہے اور بخار کی اصل علت اخلاط کا گرم ہو جانا ہے اور اخلاط کا گرم ہونا ایک ایسی چیز ہے جس کے بہت سے ذرائع ہیں اور متعدد صورتیں ہیں اور محض اصول پر اکتفا کرنا اور ان کے متفرق وسائل اور مواقع کو ترک کر دینا ان لوگوں کا مذاق ہے جن کی نگاہ کلام نظری میں عمیق ہوا کرتی ہے اور عام لوگوں کی یہ شان نہیں ہے اور شرح عام لوگوں کے موافق نازل ہوئی ہے اور یہ ضروری ہے کہ حکم کی علت ایسی صفت ہونی چاہئے۔ جس کو عام لوگ بھی سمجھ سکیں ان پر اس علت کی حقیقت مخفی نہ رہے اور ہر شخص اس کے وجود اور عدم میں تمیز کرنا ان قاعدوں میں سے کسی نہ کسی قاعدہ سے ملتی جلتی ہو جن سے رضا یا عدم رضا متعلق ہوتی ہے یا اس وجہ سے کہ یہ علت اس قاعدہ کی طرف مخفی ہے یا اس کے قریب قریب ہے یا اس قسم کا کوئی اور علاقہ ہے مثلاً شراب خوری یہ بہت سی خرابیوں کا مظنہ ہے جن سے خدا تعالیٰ کی ناخوشی ہوتی ہے جیسے اچھے کاموں سے اعراض کرنا اور بری باتوں سے رغبت کرنا، تمدن اور خانہ داری کے انتظامات کا برہم ہو جانا اور چونکہ یہ خرابیاں اکثر شراب خوری کو لازم ہوتی ہے اس لئے شراب کی ہر قسم کو روک دینا پڑا اور جب ایک شئے کے چند لوازم اور وسائل ہوں تو ان میں سے خاص اسی کو علت قرار دیا جائے گا جس کا علت ہونا بہ نسبت اوروں کے زیادہ ظاہر ہوگا اور زیادہ منضبط ہوگا یا اصل سے اس کو زیادہ تعلق اور لزوم ہوگا یا اس طرح کی کوئی اور وجہ ہو مثلاً نماز قصر اور افطار روزہ کی رخصت، سفر اور مرض پر رکھی گئی ہے نہ کہ حرج کے دوسرے احتمالات پر اس لئے کہ سخت پیشے جیسے کاشتکاری اور آہنگری، اگرچہ ان میں بھی حرج ہوتا ہے لیکن ان کے اعتبار کرنے سے طاعت میں خلل آتا ہے کیونکہ ان پیشوں کے لوگ ہمیشہ ان میں مصروف رہتے ہیں ان کی معاش انہی پیشوں پر موقوف ہوتی ہے اور گرمی سردی کا ہونا تو ان کا ٹھیک اندازہ نہیں ہوسکتا کیونکہ ان کے مراتب مختلف ہیں جن کی تعداد کا لحاظ کرنا مشکل ہے اور قرائن اور

علامات سے ان کی بخوبی تعیین نہیں ہوسکتی اس لئے وہ احتمالات معتبر کئے جاتے ہیں جو قرن اوّل میں اکثر اور مشہور تھے اور سفر اور مرض ایک ایسا امر ہے جس کا سمجھنا کسی پر مشتبہ نہیں ہوسکتا اگر چہ اس زمانہ میں کسی قدر انہیں اشتباہ اس وجہ سے پیدا ہوگیا ہے کہ عرب اوّل کا زمانہ ختم ہوگیا اور لوگوں نے احتمالات میں زیادہ چھان بین کرنا شروع کی یہاں تک کہ وہ ذوق سلیم جو خالص عرب کو حاصل تھا اب لوگوں میں نہ رہا۔ واللہ اعلم۔

ساتواں باب: ان مصلحتوں کا بیان جن سے فرائض اور ارکان اور آداب وغیرہ معین کئے گئے ہیں

واضح ہو کہ امت کی دوستی اور سیاست کے لئے ضروری ہے کہ ہر ایک قسم کی طاعت کی دو حدیں قرار دی جائیں ایک اعلیٰ اور دوسری ادنی۔ پس اعلیٰ وہ ہے جس سے پوری طرح پر مقصود حاصل ہو جائے اور ادنیٰ کے یہ معنی ہیں کہ اس سے کسی قدر مقصود حاصل ہو کہ اس کے بعد کا درجہ لحاظ کے قابل بھی نہ ہو، یہ دو قسمیں اس واسطے قرار پائی ہیں کہ یہ تو نہیں ہوسکتا کہ لوگوں سے کوئی شئے طلب کی جائے اور ان کے لئے اس شئے کے اجزا اس کی صورت، اس شئے مطلوب کی مقدار نہ بیان کی جائے کیونکہ ایسا ابہام تو موضوع شرع کے خلاف ہے اور یہ بھی نہیں ہوسکتا کہ تمام لوگ اس پر مکلّف کئے جائیں کہ ہر شئے کے آداب اور مہتم اشیا کی وہ تعمیل کریں ان لوگوں کو ایسی تکلیف بہ منزلہ تکلیف بالمحال کے ہے جو کاروبار میں مصروف رہتے ہیں یا تنگ حال رہتے ہیں۔ امت کی سیاست اور انتظام کی بنیاد میانہ روی پر ہے۔ نہایت درجہ پر ہر شئے کی حالت کو پہنچانا اور یہ بھی نہیں ہوسکتا کہ اعلیٰ حالت کو چھوڑ کر ادنیٰ حالت پر ہی اکتفا کیا جائے کیونکہ یہ اعلیٰ حالت سابقین امت کا مشرب اور مخلصین کا حصہ ہے ایسے درجہ کو بالکل ترک کرنا لطف الٰہی کے منافی ہے اس لئے یہ ضروری ہوا کہ ادنیٰ حالت کی بخوبی توضیح کر کے اس کے ساتھ لوگ مکان ترک کرنے کے درپے جائیں اور اس سے زاید اور اعلیٰ امور کی طرف بھی لوگ مائل کئے جائیں لیکن ہر شخص پر ان کو ضروری نہیں قرار دینا چاہئے۔ جن امور سے لوگ مکلّف کئے جاتے ہیں ان کے حصے مختلف ہیں، ایک حصہ تو عبادت کی مخصوص مقدار ہے جیسے پنج وقت نماز، رمضان کے روزے، اور بعض امور اس طاعت کے اجزا ہوتے ہیں جن کے بغیر وہ طاعت قابل اعتبار نہیں ہوتی جیسے تکبیر اور سورۂ فاتحہ کا

پڑھنا نماز کے لئے ،ایسے اجزا کا نام ارکان ہے اور بعض امور اس طاعت سے خارج ہوتے ہیں تین بدون ان امور کے طاعت غیر معتبر ہوتی ہے ان امور کا نام شروط ہے جیسے نماز کے لئے وضو۔

واضح ہو کہ کبھی تو کوئی شئے رکن امر طبعی کی وجہ سے قرار دی جاتی ہے اور کبھی کسی امر عارض کی وجہ سے پہلی صورت میں بغیر اس رکن کے عبادت پوری نہیں ہوتی اور نہ فائدہ مند ہوتی ہے جیسے نماز میں رکوع اور سجدہ اور روزہ میں کھانے پینے اور مجامعت سے باز رہنا، یا ایسے رکن کی وجہ سے کوئی امر مخفی اور مبہم جو نہایت ضروری ہوتا ہے منضبط ہو جاتا ہے جیسے تکبیر سے نیت کا انضباط، اور حضوری حاصل ہوتی ہے اور سورۂ فاتحہ سے دعا کا انضباط ہو جاتا ہے اور سلام کے ذریعہ سے نماز سے باہر آنے کی صورت ایسے عمدہ فعل سے منضبط ہو جاتی ہے جو وقار اور تعظیمی حالت کے منافی نہیں اور جو امر عارضی کی وجہ سے رکن قرار دیا جاتا ہے وہ کسی اور سبب کی وجہ سے واجب ہو جاتا ہے وہ نماز کا رکن اس لئے قرار دیا جاتا ہے کہ اس سے نماز کی تکمیل ہوتی ہے، اور پوری طرح سے نماز کی غرض اس سے حاصل ہو جاتی ہے اور اس سے پابندی وقت بھی نہایت عمدگی سے ظہور میں آتی ہے جیسے کہ اس شخص کے مسلک کے موافق جو کسی سورۂ قرآنی کے پڑھنے کو رکن قرار دیتا ہے تو اس کا رکن ہونا اس لئے ہے کہ قرآن شعائر الٰہی میں سے ہے اس کی تعظیم واجب ہے اور اس سے بے پروائی نہیں کرنی چاہئے اور اس کی پابندی وقت میں اس سے بہتر کوئی بات نہیں کہ اس کی تلاوت کا اس عبادت میں حکم دیا جائے جو سب عبادتوں میں زیادہ مؤکد، کثیر الوجود ہے اور لوگ بہ نسبت دوسری عبادتوں کے اس کے زیادہ مکلف ہیں یا اس کی وجہ سے دو مشتبہ چیزوں میں تمیز ہوتی ہے اس سے مقدمۃ الشئے اور اس شئے مستقل میں جو کسی شئے پر موقوف ہے تفریق ہوتی ہے ایسی شئے کو بھی رکن کر لیتے ہیں اور اس کی بجا آوری کا حکم کیا جاتا ہے جیسے رکوع اور سجود میں قومہ، اس کی وجہ سے سر جھکانے میں جو سجدہ کا مقدمہ ہے اور رکوع میں جو مستقل تعظیم ہے فرق ہو جاتا ہے، اور جیسے نکاح میں ایجاب وقبول اور گواہوں کا حاضر ہونا اور ولی کا موجود ہونا اور عورت کی رضامندی، کیونکہ بغیر ان امور کے نکاح اور زنا میں تمیز نہیں ہو سکتی اور ممکن ہے کہ تعیین ارکان میں دونوں وجہیں ذاتی اور عرضی جمع ہو جائیں اور جو کچھ ہم نے رکن میں گفتگو کی ہے اسی پر شرط کا حال قیاس کر لینا چاہئے اور کبھی کوئی شئے کسی وجہ سے واجب ہوتی ہے پس اس کو کسی شعائر دین کے لئے اس کی عظمت شان

کی وجہ سے شرط بنا دیا جاتا ہے۔ اور جو ہمارے ہی سے اس اطاعت کی کمالیت ہوتی ہے جیسے ہم سب کو جب کہ سب جگہ خانۂ کعبہ شعائر الٰہی میں سے ہے اس لئے اس کی تعظیم واجب ہے اور بڑی تعظیم کی صورت یہ ہے کہ عمدہ حالات اور افضل اوقات میں اس کی جانب اپنا رخ کریں اور نماز میں بھی ایک خاص جانب رخ کرنا شعائر الٰہی میں سے تھا کیونکہ اس سے نمازی کو خدا کی حضوری میں اظہار عاجزی وفرمانبرداری پر آگاہی ہوتی ہے اور اس سے اس کو وہ حالت یاد آتی ہے جو مالکوں کے سامنے غلاموں کے کھڑا رہنے سے ہوتی ہے، اس لئے نماز میں قبلہ کی طرف رخ کرنا شرط قرار دیا گیا۔

اور بسا اوقات ایک شئے بغیر ایک خاص ہیئت کے معتد بہ فائدہ نہیں دیتی پس اس لئے اس کی صحت کے واسطے اس ہیئت کو شرط قرار دیا جاتا ہے جیسے نماز میں نیت کرنا کیونکہ اعمال کا اثر محض اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ وہ دلی حالت کی تصویر اور صورت ہوتے ہیں۔ اور نماز خشوع اور خضوع کی تصویر ہے اور یہ خشوع بغیر نیت کے نہیں ہوسکتا، اور استقبال قبلہ بھی ایک دوسری وجہ سے شرط قرار دیا گیا کیونکہ دل کا باحضور اور متوجہ ہونا ایک مخفی امر تھا، اس لئے بیت اللہ کی طرف رخ کرنا جو کہ خدا تعالیٰ کے شعائر میں سے ہے بجائے حضور دل کے قرار دیا گیا اور مثلاً وضو، ستر ڈھانکنا اور ناپاکی دور کرنا، کیونکہ دلی تعظیم ایک مخفی امر تھا اس لئے وہ حالتیں اس دلی تعظیم کو قائم مقام کی گئیں جن کا بادشاہوں اور امرا کی حضوری میں جاتے وقت انسان لحاظ کیا کرتا ہے اور جن کو لوگ آداب تعظیمی سے شمار کرتے ہیں یہ امور ان کے دل نشیں ہو گئے ہیں اور تمام عرب وعجم ان پر متفق ہیں اور جب کوئی عبادت فرض ہونے کے لئے معین کی جائے تو چند اصول کا لحاظ کرنا ضروری ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ لوگوں کو صرف آسان امر کی تکلیف دینی چاہئے چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول میں یہی مراد ہے کہ "اگر میں اپنی امت پر گراں نہ سمجھتا تو میں ہر نماز کے لئے وضو کی طرح مسواک کرنا فرض کر دیتا"۔

اور ان اصول میں سے ایک یہ ہے کہ جب امت کسی مقدار خاص کے متعلق یہ سمجھ لے کہ اس کے ترک کرنے سے خدا تعالیٰ کی شان میں کوتاہی کرنا ہے اور یہ امر ان کے دلوں میں اس لئے خوب جم جائے کہ وہ شئے انبیا علیہم السلام سے منقول ہوتی چلی آتی ہے اور سلف کا برابر اس پر اتفاق

رہا ہے، یا ایسے ہی امور اور بھی ہوں تو ایسی حالت میں مقتضائے حکمت یہی ہے کہ جیسے لوگوں نے اس کو اپنے ذمہ واجب ٹھہرالیا ہے ان پر وہ شئے واجب ہی کر دی جائے جیسے اونٹوں کا گوشت اور دودھ بنی اسرائیل پر حرام کر دیا گیا تھا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث میں جو آپ نے رمضان میں قیام کی نسبت فرمایا تھا یہی مراد ہے کہ میں اس بات سے ڈر گیا کہ کہیں یہ قیام تم پر فرض نہ ہو جائے۔

اور ان اصول میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جب تک کوئی شئے خوب صاف صاف اور ظاہر اور منضبط نہ ہو لوگوں پر وہ فرض نہ کی جائے یہی وجہ ہے کہ حیا اور تمام اخلاق اسلام کے ارکان نہیں قرار دیئے گئے گو وہ اسلام کے شعبے ہیں، اور ادنیٰ طاعت کی حالت آسائش وسختی کی وجہ سے مختلف ہوتی ہے پس طاقت رکھنے والے کے لئے قیام فرض کیا گیا اور ناتواں کے لئے بیٹھنے کو قیام کا جانشین ٹھہرایا۔ اور ایسے ہی ملائمت حد اعلیٰ میں کمیت اور کیفیت کے لحاظ سے زیادہ ہوتی ہے۔ کمیت کی زیادتی اس طرح ہے کہ نوافل کو بہ منزلہ فرائض کے ادا کرنا، جیسے سنت موکدہ اور نماز تہجد اور ہر ماہ میں تین روزے رکھنا اور نفل صدقہ دینا وغیرہ۔ اور کیفیت کی زیادتی اس طرح ہوتی ہے کہ خاص خاص سنتیں اور اذکار ادا کرنا اور ان امور سے پرہیز کرنا جو عبادت کے نامناسب ہیں پس ان امور کا عبادت میں اس لئے حکم دیا جاتا ہے کہ تکمیل ہو جائے اور ان کی بجا آوری پورے طور سے مقصود تک پہنچا دے جیسے وضو میں ان جوڑوں کا خیال رکھنا جن میں میل جمع ہو جاتا ہے، پس ان کے دھونے کا اس لئے حکم کیا گیا ہے کہ پورے طور پر پاکیزگی حاصل ہو جائے اور جیسے دائیں جانب سے ابتدا کرنے کا اس لئے حکم دیا گیا ہے تاکہ نفس عبادت کی عظمت پر تنبیہ ہو اور اعمال مہمہ میں عبادت کی طرف متوجہ ہو۔

واضح ہو کہ جب کوئی انسان کسی خلق کو حاصل کرنا چاہئے اور قصد کرے کہ یہ قصد اس کی رگ وپے میں سرایت کر جائے اور اس کا ہر طرف سے احاطہ کرے تو اس کے حصول کا ذریعہ یہی ہے کہ اس کے مناسب جو جو افعال ہوں ان سب کو انجام دے اگر چہ وہ تمام لوگوں کی نظر میں ادنیٰ اور ناقابل اعتبار ہی کیوں نہ ہو۔ جیسے شجاعت کی مشق کرنے والا کہ وہ نہ دلدلوں میں چلنے سے جھجکتا ہے نہ آفتاب کی گرمی میں اور شب تاریک میں چلنے سے گھبراتا ہے۔ ایسے ہی جس کو خوف خدا کی

مشق منظور ہو تو ہر حال میں آداب تعظیمی کا التزام کرے، رفع حاجت کے وقت سرنگوں اور باحیا ہو کر بیٹھے اور جب خدا تعالیٰ کا ذکر کرے تو اپنے ہاتھ پاؤں سمیٹ لے، اور جو عدالت کی مشق کرنا چاہے تو وہ ہر چیز کا حق ادا کرے، کھانے اور پاکیزہ چیزوں کے لئے دائیں ہاتھ کو خاص کرے اور نجاست دور کرنے کے لئے بائیں ہاتھ کو کام میں لائے اور یہی راز تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا تھا کہ بڑے کو مسواک دو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خواب میں میں نے دیکھا کہ مسواک کر رہا ہوں اتنے میں دو شخص آئے ان میں سے ایک بڑا تھا میں نے مسواک چھوٹے کو دے دی اس وقت مجھ سے کہا گیا کہ بڑے کو دو، ایسے ہی حویصہ اور محیصہ کے قصہ میں آپ نے فرمایا بڑے کو پہلے گفتگو کرنے دو (جنگ خیبر میں جب ابن سہیل قتل ہو گئے اور کوئی ان کا قاتل معلوم نہ ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس عبدالرحمٰن مقتول کے بھائی اور مسعود کے دونوں بیٹے، حویصہ اور محیصہ آئے عبدالرحمٰن نے گفتگو شروع کر دی لیکن وہ عمر میں چھوٹے تھے اس لئے آپ نے ارشاد فرمایا۔ بڑے کو پہلے گفتگو کرنے دو، پس آداب کے بارے میں یہ بڑا قاعدہ کلیہ ہے۔

• واضح ہو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ شیطان بائیں ہاتھ سے کھاتا ہے اور ایسے ہی اور جگہ بھی شیاطین کی طرف بعض افعال کی نسبت کی گئی ہے اس لئے معنی میرے رب تبارک وتعالیٰ نے مجھ کو یہ سمجھائے ہیں کہ شیاطین کو خدا تعالیٰ نے قدرت دی ہے کہ خواب میں یا بیداری کی حالت میں لوگوں کی نظر کے سامنے ایسی شکلوں میں ظاہر ہوتے ہیں جو ان کے مزاج سے اور ان احوال سے جو ان پر شکل بننے کے وقت طاری ہوتے ہیں، حاصل ہوتی ہیں جن لوگوں کا وجدان سلیم ہوتا ہے وہ بخوبی جانتے ہیں کہ شیاطین کے مزاج کی وجہ سے ایسے افعال سرزد ہوتے ہیں جو نہایت شنیع اور برے ہوتے ہیں اور ان کی مزاجی حالت ناپاکیوں سے قریب کر دیتی ہے، ذکر الٰہی میں اس کی وجہ سے سنگ دلی ہو جاتی ہے، جتنے عمدہ انتظامات ہوتے ہیں ان میں ان کی مزاجی حالت کی وجہ سے ابتری ہو جاتی ہے افعال شنیعہ سے ہماری مراد ایسے افعال ہیں کہ جب انسان ان کا ارتکاب کرے تو لوگوں کے دل اس کی وجہ سے نہایت بیزار ہوں، ان کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں، وہ زبان سے ان افعال پر لعن وطعن کریں۔ اور یہ بنی آدم کا قدرتی طریقہ ہے جو صورت

نوعیہ کے فیضان سے ان میں پیدا ہوا ہے اور اس قدرتی طریقہ کے حصول میں تمام فرقے بلا لحاظ رسم اور قوم اور ملت و مذہب کے مساوی ہیں۔ ایسے افعال شنیعہ مثلاً اپنی شرمگاہ کو ہاتھ میں لینا، کودنا، ناچنا، اپنی دبر میں انگلی داخل کرنا، اپنی داڑھی کو تھوک سے آلودہ کرنا یا ناک، کان کاٹ کر سیاہ رو ہونا، لباس کو الٹا پہننا، قمیص کا اوپر والا حصہ نیچے کر لینا، یا کسی چوپایہ پر سوار ہو کر اس کی دم کی طرف اپنا منہ کر لینا یا ایک پاؤں میں موزہ پہن کر دوسرا برہنہ چھوڑ دینا۔ ایسے ہی اور افعال ہیں جن کو دیکھتے ہی ہر شخص لعنت ملامت کرتا ہے۔

اور میں نے بعض اوقات میں شیاطین کو بعض ایسے افعال کرتے ہوئے دیکھا ہے، اور خفیف کاموں سے میری مراد یہ ہے کہ اپنے کپڑے یا کنکریوں سے کھیلنا یا بدنما طور پر ہاتھ پاؤں ہلانا۔

حاصل کلام یہ ہے کہ خداوند کریم نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ان افعال کو منکشف کیا کہ یہ افعال شیطانی مزاجوں سے پیدا ہوتے ہیں، پس شیاطین جب کسی کو خواب میں یا حالت بیداری میں نظر آئیں گے تو ضرور ان افعال میں سے کوئی نہ کوئی حرکت کرتے ہوئے دکھائی دیں گے، اور خدا تعالیٰ نے اپنے نبی کو یہ بتلایا کہ خدا تعالیٰ مومن کے لئے یہ پسند کرتا ہے کہ حتی الامکان شیاطین اور ان کی حالتوں سے۔ ۔یز کیا جائے پس اس لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان افعال اور صورتوں کو بیان فرما دیا، ان کی کراہت ظاہر فرمائی اور ان سے محترز رہنے کا حکم دیا۔ اور اسی قسم سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہے کہ قضائے حاجت کے موقعوں پر شیاطین آ موجود ہوتے ہیں اور اسی قسم سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہے کہ شیا۔ین بنی آدم کی مقعدوں سے کھیل کرتے ہیں اور جب انسان جمائی لیتے وقت ہاہ ہاہ کرتا ہے تو شیاطین ہنستے ہیں اور ملائکہ کی حالتوں کو جو رغبت لوگوں کو دلائی گئی ہے اس کو بھی اسی پر قیاس کر لو۔ چنانچہ اس باب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہے کہ "تم ایسی صفیں کیوں نہیں باندھتے ہو جیسی ملائکہ صفیں باندھتے ہیں اور یہ حدیث ابواب آداب کے لئے ایک دوسرا قاعدہ ہے۔

واضح ہو کہ جب کوئی شئے پر فرض کفایہ مقرر کی جاتی ہے تو اس کا سبب یہی ہوتا ہے کہ اگر سب لوگ مجتمع ہو کر اس کو کرنے لگیں تو انتظام معاش درہم برہم ہو جائے، ان کی تدابیر نافع معطل

ہو جائیں اور بھی نہیں ہو سکتا ہے کہ بعض لوگ ایک کام کے لئے خاص کر دیئے جائیں اور اوروں سے کوئی دوسرا کام لیا جائے، مثلاً جہاد ہے اگر سب لوگ اس کے لئے جمع ہو جائیں اور زراعت، تجارت اور صناعات کو سب لوگ چھوڑ دیں تو معاش درہم برہم ہو جائیں گی اور یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ بعض کو جہاد کا کام سپرد کر دیا جائے اور بعض کو تجارت کا اور بعض کو زراعت کا اور بعض کو قضا اور تعلیم علوم کی خدمت پر مقرر کر دیا جائے اس لئے کہ کسی کو کسی امر میں آسانی ہوتی ہے جو دوسرے کو نہیں ہوتی، اور جس امر کے لئے جو قابل ہے اس کا علم ناموں اور اقسام سے ہو نہیں سکتا کہ ان کو حکم کا مدار علیہ بنایا جا سکے۔ اور فرض کفایہ کے اسباب میں سے یہ بھی ہے کہ اس امر کفایہ سے ایسی مصلحت مقصود ہو کہ اس سے انتظام باقی رہے اور اس کے ترک سے کوئی نفسانی ابتری اور بہیمیت کا غلبہ نہ ہو مثلاً قاضی ہونا، علوم دین کی تعلیم اور خلافت کا بندوبست کرنا کیونکہ یہ سب امور انتظاماً مقرر ہوئے ہیں، اور یہ امور ایک آدمی کے ذریعہ بھی حاصل ہو سکتے ہیں اور جیسے مریض کی عیادت اور جنازہ کی نماز پڑھنا اس لئے مشروع ہوئے ہیں کہ ان سے مقصود یہ ہے کہ بیماری اور مردہ ضائع نہ ہو جائے اور یہ مقصود بعض لوگوں کے پورا کرنے سے حاصل ہو جاتا ہے۔ واللہ اعلم۔

آٹھواں باب: اوقات کے اسرار کا بیان

امت کی سیاست بغیر اس کے پوری نہیں ہوتی کہ ان کی عبادت کے اوقات مقرر کر دیئے جائیں اور تعیین اوقات میں اصلی امر فراست ہے جس سے مکلفین کی حالت خود معلوم کی جا سکتی ہے اور اس سے وہ چیز اختیار کر لیجاتی ہے جو لوگوں پر گراں نہ ہو اور اصل مقصود کے لئے اسی قدر بات کافی ہے مگر اس کے علاوہ تعین اوقات میں اور بھی حکمتیں اور مصلحتیں ہیں جن کو علم میں کامل اشخاص خوب جانتے ہیں اور ان حکمتوں کا تین قاعدوں پر استنباط ہوتا ہے، اولاً یہ کہ اگرچہ خداوند کریم زمانہ سے برتر ہے لیکن آیات اور احادیث سے یہ امر ثابت ہے کہ بعض اوقات میں خدا تعالیٰ اپنے بندوں سے قریب ہوتا ہے اور بعض اوقات میں لوگوں کے اعمال اس کے سامنے پیش ہوتے ہیں اور بعض اوقات میں بعض بعض حوادث کو دنیا میں مقرر اور مقدر کرتا ہے۔ اور اسی قسم کے بہت سے احوال متجددہ ہیں اگرچہ ان کی اصلی حقیقت خدا تعالیٰ ہی کو معلوم ہے، پیغمبر علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ جب تہائی رات باقی رہ جاتی ہے تو خدا تعالیٰ ہر شب آسمان دنیا کی طرف نزول فرماتا ہے اور

نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ پیر اور جمعرات کے دن لوگوں کے اعمال خدا کے حضور میں پیش ہوتے ہیں، اور آپ کا فرمان ہے کہ خدا تعالیٰ نصف شعبان کی شب اخیر میں جھانکتا ہے اور ایک روایت میں ہے کہ آسمان دنیا کی طرف نزول کرتا ہے، اس باب میں بہت سی حدیثیں وارد ہیں جو سب کو معلوم ہیں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ یہ امر ضروریات دین سے ہے کہ بعض اوقات میں زمین پر روحانیت پھیلتی ہے اور ان اوقات میں مثالی قوت سرایت کرتی ہے۔ قبول طاعت اور قبولیت دعا کے لئے ان اوقات سے عمدہ وقت کوئی نہیں ہوتا ہے، ان اوقات میں ذرا سی کوشش کرنے سے نہایت وسعت کے ساتھ قوت بہیمی ملکی طاقت کے مطیع ہو جاتی ہے اور ملأ اعلیٰ اس روحانیت اور مثالی قوت کے پھیلنے کو دورات (۱) آسمانی کے حساب سے نہیں پہنچانتے بلکہ اپنے ذوق اور وجدان سے اس کو اس طور پر معلوم کر لیتے ہیں کہ ان کے دلوں میں اولاً کوئی شئے مطبع ہوتی ہے اس سے وہ سمجھ جاتے ہیں کہ کوئی روحانیات پھیلنے والی ہے اور کوئی حکم الٰہی نازل ہونے والا ہے، اسی روحانیت کے پھیلنے کو حدیث میں اس بات سے تعبیر کیا ہے کہ یہ گویا رنج کی آواز ہے جو پتھر پر مارنے سے پیدا ہوتی ہے۔

انبیا علیہم السلام کے قلوب میں یہ علوم ملأ اعلیٰ کی جانب سے منطبع ہوتے ہیں پس وہ بھی ان علوم کو وجدان اور ذوق سلیم سے معلوم کرتے ہیں اور آسمانی دورات کا ان کو حساب لگانا نہیں پڑتا، اس کے بعد انبیا اس موقع کے مقرر کرنے میں کوشش کرتے ہیں جہاں اس ساعت کے ہونے کا گمان ہوتا ہے ان کے تعین کے بعد لوگوں کو حکم کرتے ہیں کہ اس ساعت کی محافظت کریں، پس ان ساعتوں میں بعض وہ ساعتیں ہیں جو دورہ سال کے ساتھ دورہ کرتی ہیں چنانچہ اس قول الٰہی میں اسی طرف اشارہ ہے ''ہم نے قرآن کو مبارک شب میں نازل کیا ہے ہم برائیوں سے لوگوں کو ڈرانے والے ہیں ہمارے حکم سے اس شب میں مضبوط کام جدا جدا کئے جاتے ہیں، ہم ہی پیغمبروں کو بھیجا کرتے ہیں''۔ اور اسی ساعت میں اوّل آسمان میں قرآن کی روحانیت معین ہوگئی تھی اور اس پر بھی اتفاق ہے کہ یہ ساعت رمضان میں واقع ہوتی تھی اور ان میں سے بعض وہ

(۱) آسمانی گردش کے حساب وشمار

ساعتیں ہیں جو ہفتہ کے بعد آتی ہیں اور وہ ایک تھوڑا سا وقت ہے جس میں دعا اور عبادت کے قبول ہونے کی بڑی امید ہوتی ہے اور جب لوگ عالم معاد کی طرف رجوع کریں گے تو اسی وقت میں خدا تعالیٰ ان پر تجلی کرے گا اور اسی ساعت میں اللہ تعالیٰ بندوں کے قریب ہوگا۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ وہ ساعت جمعہ کے دن واقع ہوتی ہے اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دلیل بیان فرمائی ہے کہ بڑے بڑے واقعات جمعہ کے دن ہی ہوئے ہیں جیسے آدم علیہ السلام کی پیدائش اسی روز ہوئی، اور نیز بہائم کو ملائکہ سفلی کے ذریعہ سے بسا اوقات اس ساعت کی عظمت معلوم ہو جاتی ہے اس وقت وہ خوف زدہ اور ایسے مرعوب رہتے ہیں جیسے کوئی سخت آواز سے خوف زدہ رہتا ہے۔ جمعہ کے روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو مشاہدہ کیا تھا، ان میں سے بعض ساعتیں ہر روز آتی ہیں اس وقت کی روحانیت اور روحانیتوں کی نسبت کسی قدر ضعیف ہوتی ہے اور اصحاب ذوق سلیم جن کو ملأ اعلیٰ سے علوم حاصل ہوتے ہیں ان کا اتفاق ہے کہ روزانہ ایسے اوقات چار ہیں (۱) آفتاب کے طلوع ہونے سے پیشتر (۲) نصف النہار سے ذرا پہلے (۳) آفتاب کے غروب ہونے کے بعد (۴) نصب شب سے لیکر صبح تک، پس خاص ان اوقات میں اور کسی قدر ان ہی سے پہلے اور بعد تک روحانیت پھیلتی ہے اور برکات ظاہر ہوتے ہیں۔ اور دنیا کے تمام اہل مذاہب جانتے ہیں کہ ان اوقات میں عبادت زیادہ مقبول ہوتی ہے لیکن مجوس نے دین کی تحریف کر لی تھی اور خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر ان اوقات میں سورج کی پوجا کرنے لگے تھے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تحریف کا سد باب کرنے کے لئے ان اوقات کو ایسے وقتوں سے بدل دیا جو ان اوقات سے کچھ دور بھی نہ تھے اور اصل غرض بھی اس تبدیلی سے فوت نہ ہوتی تھی اور نصف شب میں اس لئے نماز فرض نہیں کی کہ اس میں حرج تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت صحیح ثابت ہے آپ نے فرمایا ''شب میں ایک ساعت ایسی ہے کہ اگر وہ مسلمان بندہ کو مل جائے اور اس میں دنیا اور آخرت کی کسی بھلائی کو خدا تعالیٰ سے مانگے تو اس کو خدا قبول فرماتا ہے اور دیتا ہے، اور ہر شب میں یہ ساعت ہوتی ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے ''نصف شب کی نماز سب نمازوں سے افضل ہے لیکن اس کے پڑھنے والے لوگ کم ہیں''۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ کون سے وقت میں دعا زیادہ مقبول ہوتی ہے،

آپ نے فرمایا کہ نصف شب میں۔ اور زوال کی ساعت کی نسبت فرمایا کہ وہ ایسی ساعت ہے جس میں آسمان کے دروازے کھلتے ہیں اس میں پسند کرتا ہوں کہ اس ساعت میں میرے اچھے عمل اوپر جائیں، اور فرمایا کہ دن کے فرشتے رات کے فرشتوں کے آنے سے پہلے آسمان کی طرف جاتے ہیں اور رات کے فرشتے دن کے فرشتوں کے آنے سے پہلے آسمان کی طرف چڑھ جاتے ہیں، ان مضامین کی طرف خدا تعالیٰ نے بھی اپنی محکم کتاب میں اشارہ فرمایا ہے، اس کا ارشاد ہے خدا تعالیٰ کی پاکی ہے جس وقت کہ تم شام کرتے ہو اور جس وقت کہ تم صبح کرتے ہو، اور آسمانوں اور زمین میں خدا کی تعریف ہے شام کے وقت اور جب کہ تمہارا وقت ظہر آتا ہے"۔ اور اس امر میں بہت سی نصوص ہیں جو سب کو معلوم ہیں اور میں نے اس کے متعلق بڑے بڑے مشاہدے کئے ہیں۔

دوسرا قاعدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے کا مناسب وقت وہ ہے کہ انسان تمام طبعی تشویشات سے فارغ ہو مثلاً زیادہ بھوک، زیادہ پیاس، زیادہ سیری، نیند کا غلبہ، سستی کا ظہور اور بول و براز کی حاجت وغیرہ امور نہ ہوں اور خیالی پریشانیوں سے بھی انسان آزاد ہو مثلاً لغو اور بیہودہ گفتگوؤں سے کان بھرے ہوئے نہ ہوں اور مختلف صورتوں و پریشانی کرنے والی رنگتوں سے آنکھ پر نہ ہو اور اسی قسم کی تشویشات سے فراغت ہو، اور یہ فراغت اور آزادی عادات کے مختلف ہونے کی وجہ سے مختلف ہوا کرتی ہے لیکن وہ وقت جو تمام عرب اور عجم، مشرق و مغرب کے لوگوں کے لئے بہ منزلہ طریقۂ طبعی کے ہو گیا ہے اور جو اس قابل ہے کہ نوامیس کلی میں اس کو دستور بنا دیا جائے اور اس کے خلاف وقت کو شاذ و نادر ہی سمجھا جاتا ہے وہ صبح اور شام کا وقت ہے۔ اور انسان کو ایک صیقل کی ضرورت ہے جس سے دل کا زنگ دور ہو جائے جبکہ وہ اپنے نفس پر قادر ہوتا ہے اور یہ وہ وقت ہے جب وہ بستر کی طرف رجوع کرتا ہے اور اس کو سونے کی خواہش ہوتی ہے اور اسی لئے نبی علیہ السلام نے عشا کے بعد قصہ گوئی اور شعر خوانی سے منع فرمایا ہے۔ سیاست امت کے اتمام کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ کچھ کچھ زمانہ کے بعد نفس کو عبادت کے لئے آمادہ رہنے کا حکم دیا جائے تاکہ نماز کا انتظار اور نماز پڑھنے سے پہلے اس کی تیاری اور آمادگی اور نماز پڑھنے کے بعد اس کا بقیہ نور اور رنگ نماز کے حکم میں سمجھا جائے اور اس طرح پر اگر تمام اوقات کا استیعاب نہ ہو سکے تو

اکثر اوقات کا استیعاب ہو جائے۔ اور ہم نے اس کا تجربہ کیا ہے کہ جو شخص نماز تہجد کے قصد سے سوتا ہے وہ کبھی خواب میں غرق نہیں ہوتا۔ اور یہ بھی تجربہ کیا ہے کہ جس کا دل کسی انتظار دنیوی یا محافظت وقت صلوٰۃ یا وظیفہ میں لگا رہتا ہے کہ وہ ناغہ نہ ہو تو اس کو کبھی حالت میں تحویت نہیں ہوتی۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول میں یہی راز ہے ''جو شخص خواب سے بیدار ہو اور پڑھے (لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ لہ الملک ولہ الحمد وھو علی کل شئ قدیر وسبحان اللہ والحمد اللہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر ولا حول ولا قوۃ الا باللہ ''اس کے بعد کہے رب اغفرلی ،تو خدا تعالیٰ اس کی دعا قبول کر لیتا ہے ،اور اگر یہ شخص وضو کر کے نماز پڑھ لے گا تو اس کی نماز بھی قبول ہو گی)اور خدا تعالیٰ کے اس قول میں بھی یہی راز ہے ''وہ ایسے لوگ ہیں جن کو نہ تجارت خدا کی یاد سے غافل کرتی ہے اور نہ خرید وفروخت اور مناسب یہ ہے کہ دو وقتوں کے درمیان چوتھائی دن کا فاصلہ دیا جائے پس اتنے عرصہ میں تین گھنٹہ کی مہلت ہو جاتی ہے اور یہ تین گھنٹہ مقدار مستعمل کی اول حد کثرت ہے جو تمام عرب وعجم کے ہاں شب روز کی تقسیم میں معتبر ہے، حدیث میں آیا ہے، سب سے پہلے نوح علیہ السلام نے دن ورات کے حصے کئے تھے ان کے بعد ان کی اولاد یہی حصے کرتی چلی آئی۔

تیسرا قاعدہ اوقات میں یہ ہے کہ عبادت کا وقت ایسا ہونا چاہئے جو کسی نعمت الٰہی کو یاد دلائے مثلاً یوم عاشورہ کہ اس روز خدا تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو فرعون پر غلبہ عطا فرمایا تھا اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود روزہ رکھا اور روزہ رکھنے کا حکم فرمایا۔ اور جیسے ماہ رمضان، کہ اس ماہ میں قرآن نازل ہوا اور ملت اسلام کے ظہور کی ابتدا اس سے ہوئی ،یا انبیا علیہم السلام کی عبادت اور اس کے مقبول ہونے کو یاد دلائے جیسے عید الاضحیٰ کا دن، کیونکہ یہ روز حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے ذبح اور ان کے فدا ہونے کو یاد دلاتا ہے، یا یہ کہ اس روز عبادت کرنے سے بعض شعائر الٰہی کی تعظیم معلوم ہوتی ہے۔ جیسے عید الفطر کے دن نماز پڑھتے ہیں، صدقہ کرتے ہیں اس سے رمضان کی تعظیم، اور خدا نے روزہ رکھنے کی جو توفیق عطا فرمائی تھی اس کے ادائے شکر کی ایک شان معلوم ہوتی ہے۔ اور جیسے عید الاضحیٰ کا دن، کہ اس میں حجاج کے ساتھ ایک قسم کی مشابہت ہوتی ہے اور جو رحمتیں خدا تعالیٰ نے حجاج کے لئے مقرر کی ہیں ان کو اپنے سامنے پیش کرنا ہوتا ہے یا یہ ہو کہ

ان اوقات میں عبادت کرنا ان صالحین کی سنت ہو جن کو سب لوگ اچھا کہتے ہیں جیسے نماز پنج گانہ کے اوقات حضرت جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا یہ تمہارا وقت ہے اور تم سے پہلے انبیا کا وقت بھی یہی تھا۔ اور جیسے رمضان کے روزوں کے متعلق ارشاد الٰہی ہے ''تم پر روزے ایسے ہی فرض ہوئے جیسے اگلے لوگوں پر فرض ہوئے تھے''۔ اس آیت کی ایک تفسیر یہ بھی ہے اور ہمارے متعلق یوم عاشورہ کے روزہ کا بھی یہی حال ہے۔ اور یہ تیسرا قاعدہ اکثر اوقات میں معتبر ہے، اور دونوں پہلے قاعدے اوقات کے اصل الاصول ہیں۔ واللہ اعلم۔

نواں باب: اعداد اور مقداروں کے اسرار کا بیان

واضح ہو کہ شریعت نے ایک چیز کی مقدار معین کی اور اس کی دوسری نظیر کی مقدار معین نہیں کی تو اس کی حکمتیں اور مصلحتیں خاص ہیں اگرچہ اس امر میں پورا اعتماد انسان کی فراست پر ہے جس سے مکلفین کی حالت اور وہ امور جانے جاتے ہیں جو لوگوں کی سیاست کے لائق ہیں اور یہ مصلحتیں اور حکمتیں چند اصول کی طرف رجوع کرتی ہیں (۱) یہ کہ طاق ایک ایسا مبارک عدد ہے کہ جب تک یہ کافی ہو سکے گا اس کو ترک نہیں کریں گے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان میں یہی مراد ہے ''بیشک خدا طاق ہے اور طاق کو پسند کرتا ہے پس اے قرآن والو! وتر نماز پڑھا کرو''۔ اس میں راز یہ ہے کہ ہر کثرت کی ابتدا وحدت سے ہوتی ہے اور طاق عدد تمام کثرت کے عددوں میں وحدت کے قریب تر ہے کیونکہ عدد کے ہر مرتبہ میں ایک غیر حقیقی وحدت شامل ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ مرتبہ قرار پاتا ہے مثلاً دس کا عدد چند وحدتوں کا مجموعہ ہے جو ایک عدد اعتبار کیا گیا ہے پانچ اور پانچ کے دو عددوں کا نام دس نہیں ہے اسی پر اور عددوں کو بھی قیاس کر لو۔ اور یہ غیر حقیقی وحدت ان مراتب عددی میں حقیقی وحدت کا نمونہ ہے اور اس کی جانشین ہے اور طاق عدد میں ایک تو یہ غیر حقیقی وحدت ہوتی ہے اور اس کے ساتھ اسی قسم کی ایک اور وحدت ہوتی ہے اور وہ یہ کہ اس کی تقسیم دو صحیح عددوں پر مساویانہ نہیں ہو سکتی اس لئے طاق عدد بہ نسبت جفت عدد کے وحدت سے قریب تر ہے اور ہر موجود شئے کا اپنے مبدا سے قریب ہونا خدا تعالیٰ کے قریب ہونے کی طرف رجوع کرتا ہے کیونکہ خدا تعالیٰ تمام مبدوں کا مبدا ہے اور وحدت کاملہ اس میں ہوگی جو خلق الٰہی کا ایک نمونہ ہوگا۔

واضح ہو کہ طاق عدد کے چند مراتب ہیں، بعض طاق عدد جفت کے مشابہ اور قریب ہوتے ہیں جیسے نو اور پانچ کا عدد، کیونکہ اگر ان میں سے ایک ایک ہندسہ کم کر دیا جائے تو ان کی تقسیم صحیح دو دو جفت عدد کی طرف ہو جاتی ہے اور نو کا عدد اگرچہ دو صحیح عدد پر مساوی تقسیم نہیں ہوتا لیکن اس کے برابر برابر تین حصے ہو سکتے ہیں اور اسی طرح جفت کے بھی چند مرتبے ہیں، بعض جفت عدد ایسے ہیں جو طاق عدد سے مشابہ ہوتے ہیں، جیسے بارہ کا عدد کہ وہ تین بار چار چار عدد لینے سے حاصل ہوا ہے اور جیسے چھ کا ہندسہ ہے کہ وہ دو کو تین بار لینے سے بنا ہے اور سب طاق عددوں میں امام، اور جس میں جفت کے ساتھ مشابہت بھی نہیں ہے وہ ایک کا عدد ہے اور اس کے بعد اس کے وارث اور جانشین تین اور سات کے عدد ہیں اور جو عدد ان کے علاوہ ہیں وہ ایک عدد کی قوم اور امت میں سے ہیں اسی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سی مقادیر میں ایک تین اور سات کو اختیار فرمایا اور جہاں بہ مقتضائے حکمت ان اعداد سے زیادہ کسی اور عدد کا حکم دیا گیا ہے تو وہاں وہ عدد اختیار کیا جو ان تینوں میں سے کسی کے بڑھ جانے سے حاصل ہوتا ہے۔ مثلاً ایک کا عدد ہے جو صفر سے دس دو صفر سے سو اور تین صفر سے ہزار ہو جاتا ہے۔ اور اسی طرح سے اس کے ساتھ ایک اور ملانے سے گیارہ کا عدد ہو جاتا ہے اور اسی طرح تین کا عدد ہے اس کے ساتھ صفر ملانے سے تیس اور تین ملانے سے تینتیس اور دو صفر ملانے سے تین سو ہو جاتے ہیں۔ اور اسی طرح سات کا عدد صفر ملانے سے ستر اور دو صفر ملانے سے سات سو تک پہنچتا ہے جو عدد بڑھانے کے بعد حاصل ہوتا ہے وہ گویا بعینہٖ وہی عدد ہوتا ہے جس کو بڑھالیا ہے، اسی واسطے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر نماز کے بعد سو کلموں کا پڑھنا مسنون کر دیا پھر تین مرتبہ تینتیس سے اس کو تقسیم کر دیا اور ایک کو زائد کر کے چونتیس بار کر دیا تاکہ مجموعہ مل کر طاق ہو جائے جو طاق عددوں کے امام یا جانشین کی طرف رجوع کرتا ہو اور اعداد کی طرف ہر ایک مقولہ جوہر اور عرض کے لئے بھی ایک اور جانشین ہوتا ہے مثلاً نقطہ بہ منزل امام کے ہے اور دائرہ اور کرہ اس کے جانشین ہیں اور تمام شکلوں میں اس سے زیادہ قریب ہیں۔

میرے والد قدس سرہ نے مجھ سے بیان فرمایا کہ انھوں نے ایک بڑے واقعہ کا معائنہ کیا جس میں حیات، علم، ارادہ اور تمام صفات الٰہیہ، یا انھوں نے فرمایا حی، علیم، مرید اور کل اسمائے الٰہی (ان دونوں میں مجھ کو یاد نہیں کہ کونسا جملہ فرمایا تھا) روشن دائروں کی شکل میں سامنے آئے اور پھر مجھ

سے یہ بھی فرمایا کہ بسیط شئے عالم اشکال میں وہ صورت قبول کرتی ہے جو نقطہ سے زیادہ قریب ہو اور ایسی شکل سطح میں دائرہ ہے اور جسم میں کرہ ہے، انتہی کلامہ۔

واضح ہو کہ عادت اللہ یہ رہی ہے کہ وحدت کا عالم کثرت میں نازل ہو، عالم مثال کے تعلقات کی وجہ سے ہوتا ہے اور انہی ارتباطات میں واقعات صورت پکڑتے ہیں اور زبان قدم کا ترجمان حتی الامکان انہی ارتباطات کی رعایت رکھتا ہے۔

دوسرا قاعدہ ان اعداد کے راز ظاہر کرنے میں ہے جن کا بیان ترغیب یا ترہیب کے موقع میں آیا ہے۔ معلوم ہو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے نیکی اور برائی کے خصائل پیش کئے جاتے ہیں اور نیکی کے فضائل اور برائی کے عیوب آپ پر منکشف ہو جاتے ہیں۔ پس خدا تعالیٰ نے جس طرح آپ کو بتلا دیا ویسے ہی آپ بیان کر دیتے ہیں اور انکشاف کے وقت جس شئے کا جو حال معلوم ہوا اس کا عدد آپ بتاتے ہیں لیکن اس عدد کے بیان کرنے سے آپ کا قصد حصر کرنا نہیں ہوتا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت کے برے اور بھلے اعمال مجھ کو دکھائے گئے، پس اچھے اعمال میں راستہ سے ایذا کا دور کر دینا بھی تھا، اور برے اعمال میں یہ بھی تھا کہ کوئی شخص مسجد میں لعاب دہن پائے اور بغیر دبائے ویسے ہی چھوڑ دے، اور نیز آپ نے فرمایا کہ میری امت کے اجر میرے سامنے پیش ہوئے حتی کہ جو شخص مسجد سے ناپاکی دور کر دے اس کا بھی اجر تھا۔ اور میری امت کے گناہ بھی مجھ کو دکھائے گئے، ان میں میں نے اس سے زیادہ کوئی گناہ نہیں پایا کہ کسی شخص کو قرآن کی کوئی سورت یا آیت یاد ہو اور اس کو وہ بھلا دے، اسی قاعدہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کو قیاس کرنا چاہئے کہ تین (۱) شخصوں کو دو دو اجر ملیں گے، (اول اہل کتاب جو اپنے پیغمبر پر بھی ایمان لایا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایمان لایا، دوسرے کسی کا غلام خدا کا حق بھی ادا کرے اور اپنے مالک کا بھی، تیسرے وہ شخص جس کے پاس کوئی کنیز ہو وہ اس سے تمتع ہوتا تھا پھر اس کو ادب سکھایا اور اچھی طرح اس کو تعلیم دی اور اس کو آزاد کر کے اس سے نکاح کر لیا اور اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تین شخصوں سے خدا کلام نہ کرے گا (اور نہ ان کو ستھرا کرے گا ایک بوڑھا آدمی زانی، دوسرے جھوٹا بادشاہ، تیسرے متکبر حاکم) اسی طرح آپ نے

---

(۱) تین اور چالیس کے عدد سے کثرت مراد ہے، حصر مقصود نہیں ہے۔

فرمایا کہ چالیس خصلتیں ایسی ہیں کہ جو ان میں سے ایک خصلت کو بھی ثواب کی امید سے اور اس کے وعدہ کی تصدیق کر کے کرے گا۔ خدا اس کو جنت میں داخل کرے گا۔ ان خصلتوں میں سے سب سے اعلیٰ یہ ہے کہ کسی کو بکری دے دے (تاکہ وہ شخص اس کے دودھ اور اون سے فائدہ اٹھائے اور پھر یہ شخص اس کو واپس لے لے) اور کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی عمل کے فضائل یا کسی شئے کے اجمالی حصے منکشف ہو جاتے ہیں پس آپ اس کو منضبط کرنے کی وجہ قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ایسا عدد مقرر کر کے خبر دیتے ہیں کہ جس میں اس کا کثیر الوقوع ہونا، یا عظیم الشان ہونا محصور ہو جائے، پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کو تنہا نماز پڑھنے پر جماعت کی نماز کو ستائیس درجہ فضیلت ہے'' اسی پر قیاس کر لینا چاہئے اس لئے کہ ستائیس کا عدد تین تین کو ضرب دے کر پھر مضروف فیہ کو تین میں ضرب دینے سے حاصل ہوتا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں جماعت کے منافع تین قسم کے تھے، ایک وہ جس کا اثر خود نمازی کے جسم پر ہوتا ہے کہ اس کے نفس کی تہذیب ہو جاتی ہے، قوت ملکی غالب اور بہیمی قوت دب جاتی ہے، دوم، لوگوں میں سنت راشدہ کا اجرا ہوتا ہے نماز پڑھنے میں ان کی رغبت بڑھ جاتی ہے، اس کے ذریعہ ان کے نفس کی تہذیب ہوتی ہے اور سب میں اتفاق پیدا ہوتا ہے، سوم یہ کہ ملت مصطفویہ کو بقا اور تازگی حاصل ہوتی ہے جس میں تحریف اور سستی خلط نہیں ہو سکتی، اور نیز پہلے حصہ میں تین منفعتیں ہیں، اللہ تعالیٰ اور ملأ اعلیٰ سے تقرب، نیکیوں کا لکھا جانا، گناہوں کا معاف ہونا، ایسے ہی دوسرے حصہ میں تین منافع ہیں، قوم اور شہر کا انتظام دنیا میں برکات کا نازل ہونا، ایک کا دوسرے کے لئے قیامت کے دن شفاعت کرنا، اور تیسرے حصہ میں بھی تین منافع ہیں، ملأ اعلیٰ کی اتفاقی کوشش کا جاری ہونا، لوگوں کا خدا تعالیٰ کی دراز رسی کو پکڑنا، ایک دوسرے کے انوار کا باہم پرتو پڑنا۔ اور پھر ان نو امور میں سے ہر ایک کے لئے تین تین منافع، خدا تعالیٰ کی رضامندی، فرشتوں کا ان پر رحمتیں بھیجنا، شیاطین کا ان سے دور ہونا اور ایک روایت میں بجائے ستائیس کے پچیس کا عدد آیا ہے، اس کی وجہ بھی یہ ہے کہ جماعت میں پچیس خوبیاں ہیں، دلوں کا استقلال، جماعت میں باہمی الفت، ملت کی پائیداری، ملائکہ کا نزول، شیاطین کی روپوشی، اور ان پانچ میں سے ہر ایک صورت میں پانچ پانچ منافع ہیں، خدا تعالیٰ کی رضامندی، دنیا میں لوگوں پر برکات کا نازل ہونا، ان کے

لئے نیکیوں کا لکھا جانا، گناہوں کا معاف ہونا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور فرشتوں کی ان کے لئے شفاعت کرنا، اختلاف روایت کا سبب وجوہ انضباط میں اختلاف واقع ہونا ہے۔ واللہ اعلم۔

اور کبھی عدد کو کسی شئے کی بڑائی اور عظمت ظاہر کرنے کے لئے لایا کرتے ہیں پس عدد کو صرف مثالی طور پر بیان کرتے ہیں، اس کی نظیر یہ ہے کہ لوگ کہا کرتے ہیں، فلاں شخص کی محبت میرے دل میں پہاڑ کے برابر ہے یا فلاں شخص کا مرتبہ آسمان تک بلند ہے، پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو اسی معنی پر حمل کرنا چاہئے، آپ نے فرمایا کہ مومن کی قبر میں ستر گز تک کشادگی ہو جاتی ہے، اور فرمایا کہ جہاں تک نگاہ ہوتی ہے وسعت ہو جاتی ہے، اور فرمایا کہ میرے حوض کی وسعت اتنی ہے جس قدر کعبہ اور بیت المقدس میں فاصلہ ہے اور فرمایا کہ میرے حوض کی وسعت اس سے زیادہ ہے جتنی شہر ایلہ سے عدن تک ہے، ایسی صورتوں میں کبھی کوئی مقدار بیان کی جاتی ہے اور کبھی کوئی مقدار لیکن اصلی غرض کے لحاظ سے ان میں کوئی اختلاف نہیں ہوتا۔

تیسرا قاعدہ مقادیر کے اندازہ میں یہ ہے کہ کسی شئے کی مقدار ایسی ظاہر، معلوم مقرر کی جائے جس کو مخاطبین اس حکم کے نظائر میں استعمال بھی کرتے ہوں اور اس کو حکم مدار علیہ اور حکم کی حکمت سے مناسبت ہو اس لئے درہموں کا اوقیوں سے اور خرما کا وسقوں سے اندازہ کرنا مناسب ہے۔ اور ایسی کسر بھی نہ لانی چاہئے جس کو حساب والے ہی غور وخوض سے معلوم کرسکیں جیسے سترہواں حصہ اور انیسواں حصہ اسی واسطے خدا تعالیٰ نے فرائض میں ایسی کسریں ذکر فرمائی ہیں جن کا نصف اور دو چند کرنا اور ان کا مخرج دریافت کرنا نہایت آسان ہے، ان فرائض اور سہام کے خدا تعالیٰ نے دو حصے قرار دیئے ہیں (۱) چھٹا، تہائی، دو تہائیاں، (۲) آٹھواں، چوتھائی، نصف، اور اس کا راز یہ ہے کہ ان میں قابل زیادہ کی زیادتی اور قابل کمی کی کمی ظاہر نظر میں معلوم ہو جاتی ہے، اور مسائل کا سمجھنا ادنیٰ اور اعلیٰ پر آسان ہو جاتا ہے اور جہاں ایسی مقدار مقرر کرنے کی ضرورت پڑے جو ان مقادیر معتبرہ مذکورہ کے علاوہ ہے اور ان میں باہم ضعف کی نسبت بھی نہیں ہے تو یہی مناسب ہے کہ دو مثلث سے تجاوز نہ کریں جو نصف سے زاید اور ایک سے کم ہے، اور ایک ثلث سے تجاوز نہ کریں جو ربع سے زاید اور نصف سے کم ہے، اس لئے کہ اور حصے ان دونوں حصوں کی نسبت زیادہ مخفی ہیں، اور جب کسی شئے کثیر کی مقدار بیان کرنا مقصود ہو تو اس کو تین کے عدد سے بیان کرنا چاہئے

اور اگر اس سے بھی زیادہ اس کی کثرت بیان کرنی ہو تو دس کے عدد سے اس کا اظہار کریں۔

اور جب کوئی شئے کبھی کم ہوتی ہے اور کبھی زیادہ ہوتی ہے تو اس کے لئے مناسب یہ ہے کہ اس کی کم حد اور زیادہ حد جمع کر کے نصف کر لیں۔ زکوٰۃ کے باب میں پانچواں، دسواں، بیسواں اور چالیسواں حصہ معتبر کیا گیا ہے اس لئے کہ زکوٰۃ کے زیادہ ہونے کا مدار کثرت منافع اور قلت مشقت پر ہے اور تمام اہل ولایت کے پیشے چار مراتب سے زیادہ میں منحصر نہ تھے اور ہر مرتبہ میں بین فرق رکھنا مناسب تھا اور وہ فرق یہ ہے کہ ہر مرتبہ دوسرے مرتبہ سے دو چند ہو، آئندہ اس کی تفصیل بیان کی جائے گی۔

جب دولت مندی کا اندازہ کیا جائے تو ان امور کا لحاظ کرنا چاہئے جن کو عرفی دولت مندی میں دخل ہے، اور دولت مندی کے احکام و آثار کو دیکھنا چاہئے اور عرب و عجم اور اہل مشرق و مغرب کے حالات سے ان امور کا اخذ کرنا چاہئے اور مانع نہ ہونے کی صورت میں جو قدرتی طریقہ کے موافق ان کی حالت ہے اس کو دیکھنا چاہئے، پس اگر جمہور کے احوال کے اختلاف کی وجہ سے مجبور کی عادت پر مدار کار نہ ہو تو ان عرب اول کا اختیار کیا جائے گا جن کی زبان میں قرآن نازل ہوا، اور ان کی عادت کے مطابق شریعت متعین ہوئی، اسی لئے شریعت نے دو سو درہم سے کنز کا اندازہ کیا ہے، کیونکہ آباد ملکوں میں ایک چھوٹے سے خاندان کو ایک سال تک کے لئے یہ مقدار کافی ہو سکتی ہے، ہاں اگر قحط سالی ہو یا شہر ہی بہت بڑے بڑے ہوں یا ان کے امراء کو کافی نہیں ہو سکتے۔

اور بکریوں کے چھوٹے ریوڑ کا اندازہ چالیس کے ساتھ اور بڑے کا ایک سو بیس کے ساتھ کیا گیا ہے۔

اور زیادہ کھیتی کا اندازہ پانچ وسقوں سے کیا گیا ہے کیونکہ گھر میں کم از کم میاں، بیوی اور تیسرا کوئی نوکر یا لڑکا ہوتا ہے، اور روزانہ خوراک آدمی کی ایک مد (۱) یا ایک رطل ہوگی اور اس کے ساتھ سالن وغیرہ کی بھی ضرورت ہوگی اور ایک سال کے لئے اتنی مقدار سے کاربراری ہو سکتی ہے۔

اور آب کثیر کا اندازہ قلتین (۲) سے کیا گیا ہے کیونکہ یہ ایک ایسی مقدار ہے جس سے کم

---

(۱) مد کا ایک رطل ہوتا ہے اور ایک رطل آدھ سیر سے کچھ زائد کا ہوتا ہے۔ (۲) قلہ اس مٹکے کو کہتے ہیں جس میں پانچ سو رطل پانی آتا ہے۔

کوئی چشمہ نہیں ہوتا اور عادت عرف میں ظروف میں اتنا پانی نہیں جاسکتا، انہی پر باقی تمام اندازوں کو قیاس کر لینا چاہئے۔ واللہ اعلم۔

دسواں باب: قضا اور رخصت کے اسرار کا بیان

واضح ہو کہ امور سیاست سے یہ بھی ہے کہ جب کسی شئے کا حکم کیا جائے یا کسی شئے سے روکا جائے اور مخاطبین کو اچھی طرح سے اس حکم کی غرض معلوم نہ ہو تو ضروری ہے کہ اس حکم کو اس طرح سمجھیں جس طرح ایک شئے موثر بالخاصیت ہوتی ہے جس کی تاثیر کی تصدیق کی جاتی ہے اور تاثیر کا سبب معلوم نہیں ہوتا، یا جس طرح کسی منتر کی تاثیر معلوم ہوتی ہے مگر اس کی وجہ معلوم نہیں ہوتی اسی لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اکثر جگہ اوامر ونواہی کے صریح طور پر اسرار کے بیان کرنے سے سکوت فرمایا۔ البتہ اپنی امت کے راسخین فی العلم کے لئے ان اسرار کو کسی قدر ذہن نشین کر دیا، اسی لئے حاملین دین یعنی خلفائے راشدین اور ائمہ دین کی توجہ شریعت کی صورت قائم کرنے کی طرف بہ سبب ان کی ارواح قائم کرنے کے زیادہ تر تھی حتی کہ حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ میں نماز کی حالت میں بحرین کا جزیہ شمار کرتا ہوں اور لشکر کشی کی تدابیر سوچا کرتا ہوں، اسی لئے سلف اور خلف میں مفتیوں کا یہ دستور رہا ہے کہ فتویٰ دیتے وقت مسئلہ کی دلیل کی طرف توجہ نہیں کرتے تھے اور یہ بھی ضروری ہے کہ امر مامور پر سخت تاکید کر دی جائے اور اس کے ترک پر سخت باز پرس ظہور میں آئے اور ان کو مامور بہ کی طرف نہایت رغبت اور الفت دلائی جائے حتی کہ حق باتوں کی خواہش ان کے ظاہر اور باطن کو ہر طرف سے احاطہ کر لے اور جب کسی ضروری مانع سے وہ کام ترک ہو جائے تو کوئی بدل اس کے قائم مقام قرار دیا جائے اس لئے کہ ایسی ضرورتوں میں مکلّف کی دو حالتیں ہو سکتی ہیں، یا تو اس شخص سے باوجود مشقت اور دقت کے احکام کی تعمیل کرائی جائے اور یہ شرعی قاعدہ کے خلاف ہے، خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ خدا تعالیٰ تمہارے لئے آسانی کا قصد کرتا ہے، دقت اور دشواری وہ تمہارے لئے نہیں چاہتا''۔

یا ان احکام کی تعمیل بالکل ترک کرادی جائے، اس وقت میں نفس ان کے ترک کا خوگر ہو جائے گا۔ اور مہمل چھوڑ دیا جائے گا اور نفس کو کسی فعل کی مشق کرانا ایسا ہے جیسے کسی تند چارپایہ کو تابع کرنا جس میں امر مطلوبہ کی رغبت اور الفت غنیمت سمجھی جاتی ہے جو لوگ اپنے نفس کی ریاضت

کرتے ہیں، یا لڑکوں کی تعلیم دیتے ہیں یا چارپایوں کو مشق کرواتے ہیں کہ کسی کام پر مداومت کرنے سے رغبت پیدا ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے عمل کرنا سہل ہوجاتا ہے۔ اور ترک کرنے سے رغبت جاتی رہتی ہے اور پھر اس کا کرنا نفس پر گراں معلوم ہوتا ہے اور دل تنگ ہوتا ہے پھر اگر اس کو دوبارہ کرنے کا ارادہ کیا جائے تو از سر نو الفت اور میلان پیدا کرنے کی ضرورت پڑتی ہے، اس واسطے ضرور ہے کہ جب کسی کام کے کرنے کا وقت ہاتھ سے نکل جائے تو اس کے لئے قضا مشروع ہو، اور اس کی تعمیل میں رخصت دی جائے تا کہ بہ آسانی اس امر کو بجالائے، فقہا اور رخصت کے قرار دینے میں عمدہ شئے قوت فراست ہے جس سے مکلفین کی حالت کی شناخت، اس عمل کی غرض اور عمل کے اجزا جو اس غرض کے حاصل کرنے میں ضرور معلوم ہوسکتے ہیں۔

علاوہ فراست کے اس قضا اور رخصت کے قواعد بھی ہیں جن کو راسخین فی العلم جانتے ہیں۔

اول قاعدہ یہ ہے کہ رکن اور شرط میں دو امر ہیں، ایک امر اصلی ہے جو شئے کی حقیقت میں داخل یا اس کو لازم ہے کہ اصل غرض کا لحاظ کرتے ہوئے اس لازم کے بغیر وہ شئے غیر معتبر ہوجائے جیسے دعا یا جھکنا، جس سے تعظیم معلوم ہوتی ہے اور جیسے خصائل طہارت وخصائل خشوع کے لئے نفس کو متنبہ کرنا یہ امور اس قسم کے ہیں جن کو تنگی اور آسانی میں ہر وقت یکساں ادا کرنا چاہئے اس لئے کہ ایسے امور کے ترک کرنے سے عمل بالکل بے اثر ہوجاتا ہے۔

اور دوسرا امر تکمیلی ہے جو اور معنی کے لئے واجب قرار دیا جاتا ہے۔ اور جو پابندی وقت کا محتاج ہوتا ہے اور اس کے لئے اس اطاعت سے بہتر کوئی وقت نہیں اور یا اس لئے واجب قرار دیا جاتا ہے کہ کامل اور عمدہ طرح پر غرض حاصل ہونے کے لئے یہ صحیح آلہ ہے، یہ قسم اس قابل ہے کہ ضرورتوں اور ناگواریوں کی حالت میں اس میں رخصت دی جاسکتی ہے۔ اسی قاعدہ کے موافق تاریکی وغیرہ کی حالت میں استقبال قبلہ کے ترک ہونے کی رخصت اور تحری کا حکم ہے اور جس کو کپڑا میسر نہ ہو وہ ستر عورت کو ترک کرسکتا ہے، اور جس کو پانی نہ ملے وہ وضو ترک کرکے تیمّم کرسکتا ہے اور جو سورۂ فاتحہ نہ پڑھ سکتا ہو وہ اس کی جگہ کسی ذکر کو کرسکتا ہے اور جس میں قیام کی طاقت نہ ہو وہ بیٹھ کر یا لیٹ کر نماز ادا کرسکتا ہے اور جس میں رکوع کرنے یا سجدہ کرنے کی طاقت نہ ہو وہ صرف سر جھکا کر نماز پڑھ سکتا ہے۔

دوم قاعدہ یہ ہے کہ بدل میں کوئی ایسی شئے ضرور باقی رکھنا چاہئے جس سے اصل یاد آئے اور معلوم ہو جائے کہ یہ اس کا نائب اور بدل ہے اور اس میں راز یہ ہے کہ رخصتوں کو مشروع کر کے غرض مطلوب کو ثابت کرنا ہے اور وہ یہ ہے کہ پہلے عمل سے الفت بدستور باقی رہے اور نفس کو پہلے عمل کا انتظار سا باقی رہے، یہی وجہ ہے کہ موزوں پر مسح کرنے کے لئے موزہ پہننے کے وقت طہارت کا ہونا شرط قرار دیا گیا، اور اس کے مسح کی ایک مدت قرار دی گئی جس سے مسح کا اختتام ہو جاتا ہے اور اسی وجہ سے قبلہ میں تحری کو شرط قرار دیا گیا۔

سوم قاعدہ یہ ہے کہ ہر حرج کی صورت میں رخصت نہ دی جائے، اس لئے کہ حرج واقع ہونے کے بہت سے اسباب ہیں، پس اگر ہر ایک میں رخصت دی جائے تو طاعت بالکل متروک ہو جائے، اور رخصتوں میں زیادہ اہتمام کرنے سے محنت اور سختی کی برداشت بالکل مفقود ہو جائے، اور سختی کو برداشت کرنے سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ شریعت کی پیروی ہو رہی ہے اور نفس میں استقامت ہے، اس واسطے حکمت الٰہی کا یہی مقتضی ہوا کہ رخصتوں کا تعلق انہی وجوہ سے ہو جو کثیر الوقوع ہیں اور وہ اکثر پیش آتی ہیں، بالخصوص وہ ان لوگوں کو زیادہ پیش آتی ہیں جن کی زبان میں قرآن نازل ہوا ہے اور جن کی عادات کے موافق شریعت متعین ہوئی ہے اور یہ بھی مناسب نہیں کہ حتی الامکان طاعت کے موثر بالخاصیت ہونے کو لحاظ نہ کیا جائے اسی واسطے سفر میں قصر نماز جائز ہوئی اور مشقت کے کاموں میں کاشتکاروں یا اور کاریگروں کے لئے قصر کرنا جائز نہیں کیا گیا۔ اور خوشحال مسافر کے لئے بھی وہ چیز جائز کر دی گئی جو غیر آسودہ حال مسافر کے لئے جائز ہوئی۔

قضا کے چند اقسام ہیں، بعض قضا بشکل معقول ہوتی ہے اور بعض بشکل غیر معقول، اور جبکہ اصل طاعت خداوندی حکم کے دل سے طاعت کرنا اور نفس میں خداوندی تعظیم قائم کرنا ہے تو جس شخص کا عمل بغیر قصد کے ہوتا ہے یا اس کا قصد کامل نہیں ہوتا اور نہ اچھی طرح تعظیم پر پابند ہو سکتا ہے تو اس کو معذور سمجھنا چاہئے اور اس کو زیادہ تنگی میں نہ ڈالنا چاہئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کو اسی پر محمول کرنا چاہئے۔ آپ نے فرمایا "میری امت میں تین شخص مرفوع القلم ہیں ایک وہ جو نیند میں ہو، دوم وہ جو لڑکا ہو، سوم وہ جو کم عقل ہو، یعنی ان سے مواخذہ نہیں کیا جاتا۔ واللہ اعلم۔

گیارہواں باب: تدابیر کی اقامت اور رسوم کی اصلاح کا بیان

ہم نے پہلے صراحتاً یا اشارۃً ذکر کیا ہے کہ تدابیر ثانی یا ثالث جن پر آدمی مجبول ہے اور جن کی وجہ سے وہ تمام حیوانات سے ممتاز ہے، ان تدابیر کا چھوڑ دینا یا ان میں سستی کرنا لوگوں کے لئے محال ہے، اور لوگ ان تدابیر کے اکثر حصہ کے پورا کرنے میں ایسے حکیم کے محتاج ہوتے ہیں جو انسانی ضرورتوں سے واقف ہو۔ ان تدابیر سے متمتع ہونے کا طریقہ جانتا ہو، مصالح کلیہ کا لحاظ رکھتا ہو، وہ غور وفکر سے ان اصول کو مستنبط کرتا ہو یا اس کے نفس میں پیدائشی طور پر قوت ملکی موجود ہو جس کی وجہ سے اس کا نفس ملأ اعلیٰ کے علوم نازل ہونے کے لئے ہمیشہ تیار رہتا ہو، یہ طریقہ انکشاف کا ان دونوں طریقوں میں سے زیادہ کامل اور قابل اعتماد ہوتا ہے۔

تدابیر کے باب میں رسوم کو ایسا ہی درجہ حاصل ہے جیسے دل کو بدن میں حاصل ہے۔ اور رسموں میں ایسے لوگوں کی سرداری کی وجہ سے خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں جن کو عقل کلی سے کچھ مس نہیں ہوتا اور وہ درندوں کے سے اعمال یا شہوانی اور شیطانی افعال کرتے ہیں اور لوگوں میں ان کو رواج دیتے ہیں اور اکثر لوگ ان کے پیرو ہو جاتے ہیں۔ اور اس کے علاوہ اور وجوہ سے بھی رسوم میں ابتری بڑھ جاتی ہے، بہرحال ان رخنوں کو روکنے کے لئے ایک ایسے شخص کی ضرورت پڑتی ہے جو غیب سے مؤید ہو اور مصلحت کلیہ کا پابند ہو تا کہ ان رسوم کو راہ راست کی جانب ایسی تدابیر کے ذریعہ مائل کر دے جن کی طرف رہبری اکثر ان ہی لوگوں کو ہوا کرتی ہے جو روح القدس سے مؤید ہوتے ہیں۔

پس جب اس قدر آپ کو معلوم ہو چکا تو اب سمجھنا چاہئے کہ انبیا کی بعثت اگرچہ اولاً اور بالذات عبادت کے طریقوں کی تعلیم دینے کے لئے ہوتی ہے لیکن ان کے ساتھ ساتھ یہ ارادہ بھی شامل ہوتا ہے کہ خراب رسوم کو مٹا دیا جائے اور تدابیر کے طریقوں کی رغبت دلائی جائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کا یہی مطلب ہے کہ میں دفوں اور لہوؤں کے مٹانے کے لئے پیدا ہوا ہوں''۔ اور ارشاد فرمایا ہے ''میں مکارم اخلاق کے پورا کرنے کو بھیجا گیا ہوں''۔

واضح ہو کہ نہ تو خدا تعالیٰ کی مرضی اس میں ہے کہ تدابیر دوم وسوم متروک کر دی جائیں اور نہ انبیا میں سے کسی نے ایسا حکم کیا ہے اور معاملہ ایسا نہیں ہے جیسا کہ بعض لوگوں نے سمجھا ہے جو

پہاڑوں کی طرف بھاگ گئے ہیں اور برائی بھلائی میں انھوں نے لوگوں سے میل جول بالکل ترک کر دیا ہے اور وحشیوں کی طرح ہو گئے ہیں، اسی واسطے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کا رد فرمایا جس نے عورتوں سے کنارہ کشی چاہی تھی اور فرمادیا ''میں رہبانیت سکھلانے کے لئے نہیں بھیجا گیا ہوں بلکہ میں تو ایک پاک اور آسان دین کے ساتھ مبعوث ہوا ہوں''۔ البتہ انبیا علیہم السلام تدابیر ومنافع میں میانہ روی کا حکم دیتے تھے کہ نہ تو عیش وآرام میں مستغرق لوگوں کی حالت، سلاطین عجم کی سی، اور نہ یہ کہ لوگوں کی زندگی پہاڑی باشندوں کی سی ہو جو وحشیوں سے ملتی جلتی ہوتی ہے۔

اس موقعہ پر دو قیاس باہم متعارض ہیں ایک یہ کہ آسودگی اور آرام سے بسر کرنا عمدہ بات ہے جس سے مزاج صحیح ہوتا ہے، اخلاق درست ہوتے ہیں اور وہ اوصاف ظاہر ہوتے ہیں جن کی وجہ سے انسان اپنے تمام ابنائے جنس سے ممتاز ہے، غباوت اور عاجزی وغیرہ اوصاف سوءِ تدبیر سے پیدا ہوتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ آسودگی بری چیز ہے، اس سے باہمی نزاع پیدا ہوتا ہے، تکالیف جھیلنی پڑتی ہیں۔ جانب غیب سے اس کی وجہ سے اعراض ہو جاتا ہے، اُخروی تدابیر کو آسودگی کی وجہ سے لوگ ترک کر دیتے ہیں، اسی واسطے پسندیدہ امر اور میانہ حالت ہے اور یہ تدابیر کو باقی رکھیں اور ان کے ساتھ اذکار وآداب کو ملائیں، اور عالم جبروت کی جانب متوجہ ہونے کے لئے فرصت کے متلاشی رہیں۔

اس باب میں تمام انبیا علیہم السلام نے جو خدا کی جانب سے لوگوں کے سامنے پیش کیا ہے وہ یہی ہے کہ لوگوں کی حالت دیکھنی چاہئے، ان کے کھانے پینے کے آداب، لباس، تعمیر اور آرائش کے اسباب کیا ہیں، ان میں نکاح کا طریقہ کیا ہے اور زن وشوہر کس طرح باہم پیش آتے ہیں، وہ باہمی خرید وفروخت کن وجوہ سے کرتے ہیں، جرائم سے باز رکھنے کے لئے کیا کیا تعزیرات ان میں مستعمل ہیں، مقدمات کا فیصلہ وہ کس طرح کرتے ہیں، پس اگر یہ امور رائے کلی کے مطابق اور مناسب ہوں تو ان میں کسی قسم کی تبدیلی بے معنی ہے بلکہ لوگوں کو ان کی پابندی پر اور زیادہ آمادہ کرنا چاہئے اور ان میں ان کی رائے کو درست کہنا اور ان امور کی مصلحتیں بیان کر دینا چاہئے اور اگر وہ امور رائے کلی کے موافق نہ ہوں اور ان امور میں اس وجہ سے تبدیلی کی ضرورت پیش آئے کہ ان کے سبب سے ایک شخص دوسرے کے لئے ایذا رساں ہو سکتا ہو یا دنیوی لذات میں ان کی وجہ سے

زیادہ انہماک ہو یا ان کی وجہ سے آخرت اور اچھی باتوں سے اعراض ہوتا ہو، یا ان کی وجہ سے بے غمی پیدا ہوتی ہو جن سے دنیا و آخرت کی مصلحتیں فوت ہوتی ہوں یا اسی طرح کی کوئی اور بات پیش آتی ہو تو اس وقت ضروری ہے کہ ان امور کی تبدیلی اپنی صورت میں کرنا چاہئے جو لوگوں کے مالوف کے بالکل مخالف نہ ہو بلکہ ایسے نظائر میں ان کو تبدیل کرنا چاہئے جو لوگوں میں شائع ہوں یا ایسے نظائر کی جانب ان کو بدلیں جو ایسے صالحین میں مشہور ہوں جن کی بھلائی کی اوروں کی زبان شہادت دیتی رہی ہو۔

حاصل کلام یہ ہے کہ یہ تبدیل شدہ امور ایسے ہوں کہ اگر وہ ان کے سامنے پیش کئے جائیں تو ان کی عقلیں اوران امور کو رد نہ کریں بلکہ اس پر مطمئن ہو جائیں کہ یہ تبدیلی حق اور صحیح ہے اسی وجہ سے انبیاعلیہم السلام کی شریعتوں میں اختلاف واقع ہوا۔ وہ لوگ جن کا علم راسخ ہے اس امر کو خوب جانتے ہیں کہ شریعت نے ابواب نکاح، طلاق، معاملات، زینت، لباس، فیصلہ جات، حدود، تقسیم میراث میں وہ امور مقرر نہیں کئے ہیں جن سے لوگ ناواقف ہوں، یا ان کے مکلف کرنے سے وہ تردد میں پڑ جائیں، بلکہ شریعت نے ان امور کی کجی کو درست کر دیا ہے اور کمزور حالت کو مضبوط کر دیا ہے۔ اس وقت کے لوگوں میں سودخواری کی کثرت ہوگئی تھی پس اس سے وہ روک دئے گئے۔ اور باغوں کے پھل کارآمد ہونے سے پیشتر فروخت کر دیا کرتے تھے اور جب پھلوں کو صدمہ پہنچتا تھا تو باہم جھگڑا کرتے تھے۔ اس واسطے اس بیع سے بھی روکے گئے۔ عبدالمطلب کے زمانہ میں دیت کے دس اونٹ معین تھے جب انھوں نے دیکھا کہ اب بھی لوگ قتل سے باز نہیں آتے تو سو اونٹ مقرر کر دیئے پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہی سو باقی رکھے اور سب سے پہلے قسامہ (۱) ابوطالب کے حکم سے واقع ہوئی تھی۔ اور سردار قوم کے لئے مال غنیمت میں چہارم حصہ مقرر تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی جگہ ہر غنیمت میں سے خمس مقرر فرمایا اور قباذ اور اس کے بیٹے نوشیرواں نے لوگوں پر خراج اور عشر مقرر کیا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسی کے قریب قریب قرار دیا۔ بنی اسرائیل زانیوں کو سنگسار کرتے تھے اور چوروں کے ہاتھ کاٹتے تھے، جان کے بدلے جان لیتے تھے، پس قرآن میں بھی یہی احکام نازل ہوئے ہیں اس

(۱) قاتل کا حال معلوم نہ ہو تو قسم سے فیصلہ کیا جائے۔

قسم کے احکام بے شمار ہیں جو تتبع کرنے والے پر مخفی نہیں ہیں بلکہ اگر کوئی فہیم ہو، احکام کے اطراف وجوانب پر اس کی نظر محیط ہو تو ضرور اس کو یہ بات معلوم ہو جائے گی کہ انبیا علیہم السلام نے عبادات میں سوائے ان امور کے جو لوگوں میں پائے جاتے تھے۔ یا ان کی نظیر تھے کوئی نیا طریقہ مقرر نہیں کیا ہاں انبیا نے جاہلیت کی تحریفات کو مٹایا اور مبہم احکام کو اوقات وارکان سے منضبط کر دیا اور جو پوشیدہ تھے ان کو لوگوں میں شائع کیا۔

واضح ہو کہ ایران اور روم میں جبکہ سالہا سال سے سلطنت چلی آئی اور وہ دنیوی لذت میں مستغرق ہو گئے اور دار آخرت کو بھول گئے اور شیطان ان پر غالب آ گیا تو وہ معیشت کے اسباب پیدا کرنے میں ہمہ تن مصروف ہو گئے اور ان اسباب پر فخر کرنے لگے۔ اطراف عالم سے حکما کی ان کے پاس آمد ورفت رہی، یہ لوگ معاش کے دقائق اور کارآمد باتیں مستنبط کرتے رہے، پس ہمیشہ وہ ان امور پر عملدرآمد کرتے رہے، ہر ایک شخص دوسرے پر ان امور میں سبقت کرتے اور فخر کرنے کی کوشش کرتا رہا یہاں تک کہ یہ بات مشہور ہوگئی کہ اگر ان کے سرداروں میں سے جو شخص ایسی پیٹی یا تاج نہ رکھتا تھا جس کی قیمت لاکھ درہم سے کم ہوتی تھی یا جس کے پاس بلند محل، آبزن، حمام اور باغ نہ ہوتے تھے اور اس کے پاس عمدہ عمدہ گھوڑے اور خوبصورت غلام نہ ہوتے تھے اور اس کو کھانے پینے میں فراغ دستی نہ ہوتی تھی اور لباسوں میں تجمل نہ ہوتا تھا تو اس پر طعن وتشنیع کرتے تھے، ایسے ہی بہت سے امور تھے جن کا ذکر کرنا طوالت ہے۔ اور اپنے شہروں کے سلاطین کے حالات جو تم خود دیکھ رہے ہو ان کے ہوتے ہوئے ان گزشتہ کے حالات بیان کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ پس یہ تکلفات ان کے اصول معاش میں اس طرح پیوست ہو گئے کہ اگر ان کے دلوں میں ریزہ ریزہ کر دیا جاتا تو یہ باتیں ان سے نکلنے والی نہ تھیں اور اس سے ایک ایسا سخت مرض پیدا ہوا جو شہر کے ایک ایک جز میں سرایت کر گیا اور ایسی آفت برپا ہوئی جس سے نہ دہقانی بچا نہ بازاری اور نہ غریب بچا اور نہ امیر بلکہ یہ عیش وآرام کی آفت ہر ایک پر غالب آ گئی تھی اور ان کے دست بگریباں ہو گئی تھی اور اس نے ہر ایک کو تھکا دیا تھا اور ایسے مصائب اور رنجشوں میں پھنسا دیا تھا جن کی کوئی انتہا نہ رہی، یہ عیش وآرام زیادہ تکالیف کے باعث اس لئے ہو گئے تھے کہ جب تک بہت سامان صرف نہ کیا جائے یہ لطف اصل نہیں ہو سکتے اور مال کی اتنی مقدار حاصل کرنے کے

لئے ضروری ہے کہ نہ سب تاجروں اور پیشہ وروں پر ٹیکس زیادہ کئے جائیں، ان پر سختی کی جائے اور وہ ادا نہ کریں تو حکام ان سے جنگ کریں اور ان کو طرح طرح کی تکلیف دیں اور اگر وہ لوگ ان کے احکام کی تعمیل کرتے رہیں تو ان کو بہ منزلہ گدھے اور بیل کے کر دیں جو آب پاشی، جوتنے اور اناج کی کٹائی میں استعمال کئے جاتے ہیں اور اگر ان کو ذخیرہ کیا جاتا ہے تو محض اپنے کام میں لانے کے لئے، پھر ذرا دیر بھی ان کو مشقت سے آرام نہیں دیا جاتا، یہ امرا ایسے ہی گرفتار ہو کر سعادت اخروی کی طرف سر بھی نہیں اٹھا سکتے اور نہ اس مرتبہ کے قابل رہتے ہیں۔

اور اکثر بڑی سے بڑی مملکت میں ایک شخص بھی ایسا نہیں ہوتا جس کو دین کا اہتمام اور خیال ہو، اور یہ عیش کے سامان بھی ایسے ہی لوگوں کے ذریعہ حاصل ہوتے ہیں جو کھانے، لباس، مکانات وغیرہا کے حاصل کرنے میں مصروف رہتے ہیں اور کاروبار کے ان اصول کو جن پر نظام عالم کا مدار ہے ترک کرتے ہیں اور عموماً جو لوگ ان سے ملتے جلتے ہیں تو وہ ان سب امور میں انہی کی نقل کرتے ہیں ورنہ ان کو ان امرا کی خدمت میں باریابی نہ ہو اور نہ ان کے دلوں میں ان کی کچھ وقعت رہے۔

اور تمام لوگ بادشاہ کے محتاج ہوتے ہیں، اس سے اپنی ضروریات کی کفالت چاہتے ہیں، بعض اس وجہ سے کہ وہ لشکری اور شہر کے منتظم ہیں یہ لوگ ان سرداروں کی روش تو اختیار کر لیتے ہیں لیکن اپنے فرائض ادا کرنے کا کچھ بھی قصد نہیں کرتے صرف اپنے رسوم اور سلف کے طریقہ کو پورا کرتے ہیں اور بعض اس لئے کہ وہ شاعر ہیں جن پر انعام واکرام کرنے کے سلاطین عادی ہوتے ہیں، بعض اس لئے کہ وہ درویش اور پارسا ہیں، اور بادشاہوں کے لئے یہ زیبا نہیں کہ ان کی خبر گیری نہ کریں۔ اس واسطے یہ فرقے ایک دوسرے پر تنگی کرتے ہیں اور ان کے ذرائع معاش اس پر موقوف ہوتے ہیں کہ وہ بادشاہوں کی خدمت میں رہیں، ان سے نرم کلامی اور خوشامد سے پیش آئیں انہیں فنون میں ان کی فکریں ڈوبی رہتی ہیں، اور ان کے اوقات ضائع ہوتے رہتے ہیں، پس جب ان اشغال کی کثرت ہو جاتی ہے تو لوگوں کے دلوں میں ایک خسیس حالت پیدا ہو جاتی ہے اور عمدہ اخلاق سے وہ اعراض کرتے ہیں۔

اگر تم اس مرض کی حقیقت معلوم کرنا چاہو تو ان قوموں کو دیکھو جن میں کوئی سلطنت نہیں اور

نہ لذیذ کھانوں اور عمدہ لباسوں میں انہماک ہے بلاشک تم ان اقوام میں سے ہر شخص کو آزاد پاؤ گے، نہ ان پر بھاری محصول مقرر ہوں گے جن سے ان کی کمر جھک گئی ہو، پس ایسے لوگ دین وملت کے امور میں مصروف ہو سکتے ہیں، پھر انہی لوگوں کی حالت کو اس طرح خیال کرو کہ ان میں سلطنت قائم ہو جائے، سلاطین وامراان کو اپنا مطیع بنا کر ان پر اپنا قبضہ کر لیں۔

جب ایسی مصیبت زیادہ بڑھ گئی اور یہ بیماری سخت ہوگئی تو خدا تعالیٰ اور ملائکہ مقربین نے ان پر غصہ ظاہر فرمایا اور خدا کی مرضی ہوئی کہ اس مرض کو بالکل زائل کردے اس واسطے اس نے ایک نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا جس کا عجم اور روم سے کوئی میل جول نہ تھا، اس نے ان کے رسوم کو بالکل اختیار نہ کیا، اس پیغمبر کو خدا تعالیٰ نے ہدایت کے لئے میزان قرار دیا ہے، جس کے ذریعہ ان طریقوں میں جو خدا کے نزدیک پسندیدہ یا ناپسندیدہ ہیں، تمیز ہو جاتی ہے خدا تعالیٰ نے اس سے عجمیوں کی رسموں کی مذمت بیان کرادی اور دنیوی زندگی میں مطمئن اور مستغرق ہو جانے کی قباحتیں ظاہر کرادیں۔ اس پیغمبر کے دل میں خدا تعالیٰ نے الہام فرمایا کہ وہ بڑے بڑے امور جن کے عجمی خوگر ہو گئے تھے اور ان پر فخر کرتے تھے لوگوں پر حرام ہیں، مثلاً ریشمی لباس، ارغوانی کپڑے پہننا، سنہری اور روپہلی برتن، سونے کے زیور، ایسے کپڑے جن میں تصویریں بنی ہوئی ہوں، مکانوں پر نقش ونگار کرنا وغیرہ، خدا تعالیٰ نے مقدر کردیا کہ اس کی دولت سے ان کی دولتوں کا خاتمہ کردے اور اس کی حکومت سے ان کی حکومتوں کا خاتمہ کردے اس کے وجود سے کسریٰ ہلاک ہوگیا اب اس کے بعد کوئی کسریٰ نہ ہوگا۔ اور ہلاک ہوگیا قیصر، اب کوئی قیصر نہ ہوگا۔

واضح ہو کہ زمانہ جاہلیت میں ایسے ایسے جھگڑے پیدا ہو گئے تھے جن سے تمام لوگ تنگ آگئے تھے اور انکا دفع ہونا جب ہی ممکن تھا کہ ان کو اصل سے ہی ختم کردیا جائے، جیسے مقتولوں کے بدلہ میں خون لینا، ایک شخص دوسرے کو قتل کردیتا تھا پھر مقتول کا ولی قاتل کے بھائی یا بیٹے کو مار ڈالتا تھا پھر اس مقتول کا ولی بھی قاتل کے بھائی یا بیٹے کو قتل کرتا تھا اور اسی طرح سے ہیر پھیر رہتا تھا اس کے رفع کرنے کے لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ’’تمام خون میرے اس پاؤں کے نیچے باطل کردیئے گئے اور سب سے پہلے میں نے ربیعہ کے خون کو معاف کیا‘‘۔

اور اسی طرح سے میراث کے باب میں قوم کے رؤسا مختلف طور پر فیصلے کیا کرتے تھے اور

اس زمانہ کے لوگ غصب اور سود خوری وغیرہ سے باز نہیں آتے تھے اور اسی پر عملدر آمد کرتے تھے۔
پھر اس کے بعد ایک اور زمانہ آیا تھا جس میں لوگ طرح طرح کی دلیلیں پیش کرتے تھے، اس واسطے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سرے سے یہ جھگڑا ہی ختم کر دیا اور فرمایا زمانہ اسلام میں ہر چیز کی تقسیم قرآن کے موافق ہوگی اور جو شئے زمانہ جاہلیت میں تقسیم ہو چکی یا وہ کسی نہ کسی طرح کسی شخص کے قبضہ میں آ گئی تو وہ بدستور اپنے حال پر باقی رہے گی اور وہ اس سے نہ لی جائے گی مثلاً سود، اس زمانہ میں کوئی شخص قرض دیتا تھا اور کسی قدر اس پر بیشی کی شرط کر لیا کرتا تھا اس کے بعد مدیون کو تنگ کرتا تھا اور اصل و شرط کو اصل سرمایہ قرار دیتا تھا اور اس پر اور بیشی کی شرط کر لیا کرتا تھا اسی طرح بڑھتے بڑھتے وہ مال ایک تو ڈھیر ہو جاتا ہے، پس آپ نے سرے سے سود ہی کو مٹا دیا اور اصل سرمایہ ادا کرنے کا حکم فرمایا۔ اور فرمایا نہ کسی پر ظلم کرو اور نہ کسی کا ظلم سہو یہ ان کے علاوہ اور بھی بہت سی خرابیاں تھیں کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود نہ ہوتا تو لوگ ان کو ترک کرنے والے نہ تھے۔

واضح ہو کہ بہت سی رسمیں اس واسطے مشروع ہوئی ہیں کہ لوگوں کی دلی رنجشیں دور ہو جائیں جیسے پانی پلانے میں ابتدا دائیں جانب سے کرنا، اس لئے کہ بعض اوقات مخالف لوگ جمع ہو جاتے ہیں اور ایک دوسرے کی بزرگی تسلیم نہیں کرتے جس سے کہ ابتدا کی جائے تو دفع خصومت کے لئے اسی قسم کا کوئی طریقہ ہو سکتا ہے اور جیسے (امامت جنازہ میں) مالک مکان کا امامت کرنا اور جب دو شخص ایک گھوڑے پر سوار ہونے کا قصد کریں تو گھوڑے کے مالک کا آگے بیٹھنا اور ساتھ والے کا پیچھے بیٹھنا وغیرہ ذلک، واللہ اعلم۔

بارھواں باب: ان احکام کا بیان جو ایک دوسرے سے پیدا ہوتے ہیں

خدا تعالیٰ فرماتا ہے ''ہم نے تجھ سے پہلے انہی لوگوں کو پیغمبر بنایا جن پر وحی بھیجی ہے اگر تم نہیں جانتے ہو تو ذکر والوں سے دریافت کر لو' اور ہم نے تجھ پر قرآن اس واسطے نازل کیا ہے کہ تو لوگوں سے نازل شدہ باتیں بیان کر دے اور امید ہے کہ لوگ غور کریں۔

واضح ہو کہ خدا تعالیٰ نے نبی علیہ السلام کو اس واسطے مبعوث کیا ہے کہ لوگوں کو وہ عبادت کے طریقے بیان فرما دیں جو بذریعہ وحی آپ کو معلوم ہوئے ہیں تا کہ لوگ اس پر عمل کریں اور گناہوں کے ابواب کو بتلا دیں تا کہ لوگ ان سے پرہیز کریں اور عمدہ تدابیر سے آگاہ کریں تا کہ لوگ اس کا

اتباع کریں۔ اسی بیان میں یہ بھی ہے کہ نبی لوگوں کو ان امور کی بھی تعلیم دے جو وحی کے اقتضا یا ایما سے ثابت ہوں۔

اور یہ قواعد کلیہ ہیں جن پر احادیث نبوی کا بہت بڑا حصہ منطبق کیا جاتا ہے ہم یہاں اس میں سے بڑے بڑے قواعد ذکر کرتے ہیں۔ ان قواعد میں سے ایک یہ ہے کہ جب عادت الٰہی اس طور پر جاری ہے کہ اسباب کو مرتب کر کے مسببات کو ان سے پیدا کرتا ہے تا کہ وہ مصلحت حاصل ہو جائے جو خدا تعالیٰ کی حکمت بالغہ اور رحمت کاملہ سے مقصود ہے تو اس انتظامی حالت کا مقتضا یہ ہے کہ مخلوق الٰہی کو بدل دینا شر کی بات ہوگی اور خرابی برپا کرنے کی کوشش ہوگی اور ملأ اعلیٰ سے نفرت نازل ہونے کا سبب بنے گی، پس جبکہ خدا تعالیٰ نے انسان کو اس طرح پیدا کیا کہ اکثر اوقات اس کی پیدائش ایسی نہ ہو جس طرح کیڑے مکوڑے زمین سے پیدا ہو جاتے ہیں، اور حکمت الٰہی کا مقتضا بھی یہ تھا کہ نوع انسانی باقی رہے بلکہ کثرت کے ساتھ دنیا میں پھیلے تو اس نے انسان میں تناسل کے قوی پیدا کیئے اور طلب نسل کی ان کو رغبت دلائی اور خواہش نفسانی کو ان پر غالب کر دیا تا کہ اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اس کام کو پورا کرے جس کو اس کی حکمت بالغہ نے ضروری قرار دیا ہے۔

جب خدا تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس راز پر مطلع کر دیا اور اصلی حالت آپ پر بالکل منکشف ہوگئی تو ضروری ہوا کہ آپ اس راستہ کے بند کرنے کو یا ان قوی کے معطل کر دینے کو یا ان کے بیجا استعمال کو منع فرمائیں، یہی وجہ ہے کہ خصی کرنے سے اور لواطت سے نہایت سختی کے ساتھ منع کر دیا اور عزل کو مکروہ قرار دیا۔

واضح ہو کہ جب لوگوں کا مزاج سلیم ہوتا ہے اور ان کے مادہ میں احکام نوعی کے ظہور کی قوت ہوتی ہے تو اس کی ایک معین صورت اور شکل ہوتی ہے، یعنی قد کا سیدھا ہونا، جلد کا صاف ہونا وغیرہ ذلک، یہ امور لوگوں میں نوع کا حکم، اس کا مقتضا اور اثر ہوتے ہیں، اور عالم بالا کی بھی خواہش ہوتی ہے کہ انواع باقی رہیں اور ان کی صورتیں زمین پر باقی رہیں اسی واسطے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اولاً کتوں کو مار ڈالنے کا حکم کیا تھا لیکن بعد میں اس کو منع فرما دیا اور ارشاد فرمایا کتا بھی گروہوں میں سے ایک گروہ ہے"۔ یعنی یہ ایک نوع ہے جس کو اللہ تعالیٰ موجود رکھنا چاہتا ہے اور اس کا زمین سے مٹا دینا خدا کو پسند نہیں اس قسم کی خواہش کا یہ اثر ہے کہ نوع کے احکام تمام افراد

نوع میں ظہور پذیر ہوں اس واسطے اس خواہش کے خلاف کرنا اور اس کے رد کرنے میں کوشش کرنا قبیح اور مصلحت کلی کے خلاف ہے، اسی قاعدہ سے ان بدنی تصرفات کا حکم نکلتا ہے جن کو نوعی احکام نہیں چاہتے جیسے خصی کرنا، اگلے دانتوں کے بیچ میں کشادگی پیدا کرنا اور چہرے سے بالوں کا چننا وغیرہ ذالک، لیکن آنکھوں میں سرمہ لگانا یا بالوں میں کنگھی کرنا یہ ایسے امور ہیں جن سے احکام مقصودہ کے ظہور کو مدد ملتی ہے اور ان کے موافق ہیں۔

جب خدا تعالیٰ نے بنی آدم کے لئے ایک شریعت مقرر کر دی جس سے ان کے حالات منتظم اور درست ہوں اور عالم بالا میں بھی اس شریعت کے ظہور کا منشا تھا اس لئے شریعت کی حالت بھی انواع کی سی ہوگئی جو زمین میں اپنے افراد کا ظہور چاہتی ہے اور اسی وجہ سے شریعت کے بگاڑنے میں سعی کرنا عالم بالا میں ناراضی کا باعث ہے، ان کے مقتضا کے بالکل خلاف اور ان کی سطح ہمت سے بعید ہے۔ ایسے ہی وہ منافع اور تدابیر بھی بہ منزلہ امر طبعی کے ہوگئے ہیں جن پر لوگوں کے عام فرقوں نے عرب ہوں یا عجم، ادنیٰ ہوں یا اعلیٰ اتفاق کر لیا ہے۔

اور جبکہ اللہ تعالیٰ نے قسموں اور دستاویزوں کو مشروع فرمایا جن سے اصل حال اور واقعہ کا انکشاف ہوتا ہے تو اس سے یہ ضروری ہوگیا کہ جھوٹی گواہی اور جھوٹی قسم خدا اور اس کے ملائکہ کی نظر میں ناخوشی کا باعث ہے۔

ان قواعد میں سے یہ بھی ہے کہ جب خدا تعالیٰ اپنے پیغمبر کو کسی حکم شرعی کی وحی کرتا ہے اور اس کی حکمت اور سبب بھی بتا دیتا ہے تو نبی کو مناسب ہے کہ اس مصلحت کا پابند ہو جائے اور اس کی کوئی علت مقرر کر کے اس حکم کا مدار علیہ اس علت کو ٹھیرائے، یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا قیاس ہے اور امت کا قیاس یہ ہے کہ حکم منصوص کی علت معلوم کر کے جہاں علت پائی جائے وہاں اس حکم کو بھی پہنچا دیں اس کی مثال وہ اذکار ہیں جن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صبح، شام اور سوتے وقت معین فرمائے، اس لئے کہ جب آپ نماز کے مشروع ہونے کی حکمت پر مطلع ہوگئے تو آپ نے یہ بھی اجتہاد سے ثابت کر لیا۔

انہی قواعد میں سے یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی آیت سے سیاق کلام کی وجہ دریافت فرما لیتے تھے اگرچہ اور لوگ دقت کلام یا کثرت احتمالات کے ہونے سے وجہ، نہ سمجھ سکتے

تھے تو آپ نے فہم کے موافق حکم دیتے تھے جیسے خدا تعالیٰ کا قول ہے، ”کوہ صفا اور مروہ خدا کی نشانیوں میں سے ہیں“۔ اس آیت سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سمجھ گئے کہ صفا کو مروہ پر مقدم کرنے سے اس امر کے بیان کی موافقت ہوتی ہے جو لوگوں کے لئے مشروع ہوا ہے جیسے کہ یہ تقدیم کبھی موافقت سوال یا کسی اور وجہ سے ہوتی ہے پس آپ نے فرمادیا جس چیز سے خدا نے ابتدا کی ہے اسی سے تم بھی ابتدا کرو“۔ اور ایسے ہی اجتہاد کی مثال یہ بھی ہے، خدا تعالیٰ فرماتا ہے ”سورج اور چاند کو سجدہ نہ کرو بلکہ ان کے خالق کو سجدہ کرو“۔ اور نیز خدا تعالیٰ کا قول ہے ”جب چاند ڈوب گیا تو ابرہیمؑ نے کہا میں ڈوبنے والے کو پسند نہیں کرتا“ ان دونوں آیتوں کے مضمون سے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سمجھ گئے کہ کسوف اور خسوف کی حالت میں عبادت الٰہی کرنا مستحب ہے اور خدا تعالیٰ کے اس قول سے ”مشرق ومغرب خدا ہی کے لئے ہے“۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سمجھ لیا کہ نماز کی حالت میں استقبال قبلہ فرض ہے اور عذر کی حالت میں اس کی فرضیت ساقط ہو سکتی ہے۔ اسی سے آپ نے اس شخص کا حکم مستنبط کیا جس نے تحری سے شب تاریک میں نماز پڑھی اور سمت قبلہ اس کو ٹھیک معلوم نہ ہوئی اور کسی اور سمت رخ کر کے اس نے نماز پڑھ لی، اور اسی آیت سے آپ نے اس شخص کے متعلق بھی حکم معلوم کر لیا جو شہر سے باہر سواری پر نوافل پڑھتا ہے۔

انہی قواعد میں سے یہ بھی ہے کہ جب خدا کسی شخص کو لوگوں سے معاملہ کرنے کا حکم دیتا ہے تو یہ اس امر کا مقتضی ہے کہ لوگوں کو ان معاملات میں اس کی اطاعت کا حکم دیا جائے، جب قاضیوں کو حدود الٰہی قائم کرنے کا حکم دیا گیا تو سرکشوں کو ان کے احکام کی فرمانبرداری کرنے کا حکم دیا گیا کہ مصدق کو قوم سے زکوٰۃ وصول کرنے کا حکم دیا تو لوگوں کو یہ حکم کیا گیا کہ مصدق جب ان کے پاس سے واپس آئے تو ناخوش نہ آئے، اور جب عورتوں کو پردہ کرنے کا حکم دیا تو مردوں کو حکم دیا کہ اپنی نگاہیں ان سے نیچی رکھیں۔

اور انہی قواعد میں سے یہ ہے کہ جب کسی شئے سے منع کیا جائے تو اس کا اقتضا یہ ہوتا ہے کہ اس کے خلاف کا وجوباً یا استحباباً حکم کیا جائے جیسا موقع کے مناسب ہو، اور جب کسی شئے کے کرنے کا حکم دیا جائے تو اس کی ضد منع کر دی جائے۔ پس جب نماز جمعہ پڑھنے اور اس کی طرف سعی کرنے کا حکم دیا گیا تو ضرور ہے کہ خرید وفروخت اور دیگر مشاغل اس وقت ممنوع قرار دیئے

جائیں''۔ اور انہیں قواعد میں سے یہ بھی ہے کہ جب کسی شئے کے واجب ہونے کا حکم کیا جائے تو مناسب ہے کہ اس کے مقدمات اور دواعی کی ترغیب دیجائے اور جب کسی شئے کو قطعی طور پر منع کیا جائے تو ضروری ہے کہ اس کے داعی اور اسباب کی بندش کردی جائے اور ان کو نابود کردیا جائے اور جبکہ بت پرستی گناہ تھی اور تصویروں و بتوں سے میل ملاپ بت پرستی کی طرف لے جا سکتا تھا جیسا کہ پہلی امتوں میں یہ چیز پیش آچکی ہے اس واسطے ضروری ہوا کہ مصوروں سے مواخذہ کیا جائے، اور جبکہ شراب پینا گناہ تھا اس واسطے ضروری ہوا کہ شراب بنانے والوں سے مواخذہ کیا جائے اور جس دسترخوان پر شراب ہو اس میں حاضر ہونا منع کردیا جائے۔ اور جبکہ فتنہ کے وقت جنگ وجدال گناہ تھا اس واسطے ضروری ہوا کہ ایسے وقت میں ہتھیاروں کی فروخت سے منع کردیا جائے۔

اور سیاست مدن میں اس باب کی نظیر یہ ہے کہ جب حکام کو کھانے پینے میں زہر دیے جانے کا خوف ہوتا ہے تو دوافروشوں سے عہد ہو جاتا ہے کہ زہریلی چیزوں کی بیع نہ کریں مگر اس قدر کہ جس سے پینے والا اکثر ہلاک نہ ہو۔ اور جب کسی قوم کی خیانت کا حال معلوم ہوتا ہے تو ان کو گھوڑوں پر چڑھنے کی اور ہتھیار رکھنے کی ممانعت ہو جاتی ہے۔ اور اسی طرح باب عبادت میں جب نماز تمام نیکی کے ذرائع میں بلند مرتبہ تھی تو ضرور ہوا کہ لوگوں کو جماعت کا شوق دلایا جائے تاکہ نماز کی پابندی میں اس سے مدد ملے، اور یہ بھی ضرور ہوا کہ اذان کی رغبت لوگوں میں پیدا کی جائے تاکہ سب لوگ ایک ہی وقت میں ایک ہی جگہ جمع ہوسکیں اور ایسے ہی لوگوں کو مساجد کی تعمیر اور مساجد کے پاکیزہ اور ستھرا رکھنے پر آمادہ کرنا ضروری ہے، اور جبکہ ابر وغیرہ کی حالت میں ماہ رمضان کی پہلی تاریخ کا معلوم کرنا ماہ شعبان کے دنوں کے شمار کرنے پر موقوف تھا تو ہلال شعبان کا خیال رکھنا مستحب ہوگیا۔

اور سیاست مدنیہ میں اس کی نظیر یہ ہے کہ جب دیکھتے ہیں کہ تیراندازی میں بڑی منفعت ہے تو زیادہ کمانیں بنانے، تیر بنانے اور ان کی تجارت کرنے کا حکم دیا جاتا ہے۔

انہی قواعد میں سے یہ بھی ہے کہ جب کسی کام کے کرنے کا حکم دیا جائے یا کسی شئے کی ممانعت کی جائے تو ضروری ہے کہ فرماں برداروں کی عزوشان ظاہر کی جائے اور نافرمانوں کی تحقیر کی جائے اور جبکہ قرأت قرآن سے اس کی اشاعت اور اس کی تلاوت کا التزام مقصود تھا تو یہ امر

مسنون قرار دیا گیا کہ لوگوں کی امامت وہی شخص کرے جو سب سے عمدہ قرآن پڑھتا ہو اور مجالس میں قرآن پڑھنے والوں کی توقیر کی جائے اور جبکہ زنا کی تہمت لگانا گناہ تھا تو ضروری ہوا کہ تہمت لگانے والے کی شہادت قبول نہ کی جائے اور حدیث میں جو یہ آیا ہے کہ بدعتی اور فاسق سے سلام وکلام کی ابتدا نہیں کرنا چاہئے تو وہ اسی پر محمول ہے، سیاست مدن میں اس کی نظیر یہ ہے کہ تیر اندازوں کو تنخواہ زیادہ دی جاتی ہے، ان کو انعام زیادہ ملتا ہے اور تقرر میں ان کو مقدم رکھا جاتا ہے۔

انہی قواعد میں سے یہ بھی ہے کہ جب کسی شئے کا حکم کیا جائے یا اس سے روکا جائے تو اس کا پورا حق یہ ہے کہ لوگوں کو امر کا حکم کر دیا جائے کہ دلی قصد سے اس پر اقدام کریں اور عزیمت قلبی سے منہی عنہ سے باز رہیں اور ان سے اس امر کا مطالبہ کیا جائے کہ دل میں اس کام کے کرنے کی خواہش رکھیں، اسی واسطے مہر اور قرض میں عدم ادائیگی کے قصد کرنے پر نہایت سخت سرزنش وارد ہوئی ہے، اور انہی قواعد میں سے یہ بھی ہے کہ جس شئے میں خرابی کا احتمال ہو اس کو مکروہ قرار دیا جائے جیسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو شخص سوکر اٹھے وہ اپنا ہاتھ ہرگز برتن میں نہ ڈالے کیونکہ اس کو کیا معلوم کہ رات کو اس کا ہاتھ کس جگہ پر پڑا تھا''۔

حاصل کلام یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو عبادت اور عمدہ تدابیر کے احکام تعلیم فرمادیئے اور اسی طرح سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بیان فرمادیا اور ہر ایک باب کے متعلق بڑے بڑے احکام کو آپ نے مستنبط کیا، اس باب میں اور اس باب میں جو اس کے بعد آتا ہے، جو امور بیان کئے گئے ہیں ان سب کو فقہائے امت نے علوم نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کیا اور ان کے دلوں نے نہایت تدبر سے ان کو یاد رکھا، پس جو کچھ انھوں نے اپنی تصنیفات میں لکھا ہے وہ انہی علوم نبوی سے حاصل ہوا ہے۔ واللہ اعلم۔

تیرھواں باب: مبہم کے انضباط، مشکل کی تمیز اور کلیہ سے حکم نکالنے وغیرہ کا بیان

واضح ہو کہ بہت سی چیزیں جن کا نام لے کر حکم بتائے گئے ہیں تقسیم اور مثال کی وجہ سے تو معلوم ہیں لیکن وہ اشیا باعتبار ایسی تعریف کے غیر معلوم ہیں جو جامع اور مانع ہو اور اس سے ہر ہر فرد کا حال معلوم ہو جائے کہ یہ اس شئے کا فرد ہے یا نہیں، مثلاً سرقہ کی نسبت خدا تعالیٰ فرماتا ہے

''چوری کرنے والے اور چوری کرنے والی کے ہاتھ کاٹ ڈالو''۔ خداتعالیٰ نے حد چور کے نام پہ جاری کی ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ بنی ابیرق، طعیمہ اور مخزومی عورت کے قصہ میں یہی سرقہ واقع ہوا تھا اور یہ بھی معلوم ہے کہ غیر کا مال لینے کے چند اقسام ہیں من جملہ ان کے چوری ہے، رہزنی ہے اچک لینا ہے، بددیانتی ہے، زمین سے پڑی ہوئی چیز اٹھالینا ہے، زبردستی چھین لینا ہے، اور من جملہ ان کے لئے بے پروائی ہے ایسی صورتوں میں بسا اوقات نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہر ہر صورت کے متعلق دریافت کرنے کی ضرورت پڑتی ہے کہ آیا یہ بھی چوری میں داخل ہے۔ ایسا سوال خواہ زبانی ہو یا حالی، اس لئے آپ پر ضروری ہے کہ چوری کی حقیقت اس طرح سے بیان فرمائیں کہ اس کے مشابہ چیزوں سے تمیز ہو جائے اور ہر ہر فرد کا حال واضح ہو جائے۔

اس کا طریقہ یہی ہے کہ ان چیزوں کے ذاتی امور دیکھے جائیں جو چوری میں نہ پائے جاتے ہوں، اور ان کی وجہ سے چوری اور غیر چوری میں امتیاز ہو جائے۔ ایسے ہی سرقہ کی ذاتیات میں نظر کرنا چاہئے جن کو اہل عرف اسی لفظ سرقہ سے سمجھ جاتے ہیں، پھر سرقہ کی تعریف امور معلومہ کے ساتھ بیان کی جائے جن کی وجہ سے چوری ممیز ہو جائے، مثلاً یہ بات علم میں آتی ہے کہ رہزنی اور لڑائی وغیرہ ایسے الفاظ ہیں جن سے مظلوموں کے مقابلہ میں قوت پر اعتماد کرنا پایا جاتا ہے اور ایسی جگہ اور ایسے وقت کو اختیار کرنا پایا جاتا ہے جہاں لوگوں کی جماعت مدد کے لئے نہیں پہنچ سکتی اور لفظ اختلاس بتلاتا ہے کہ لوگوں کی نظروں کے سامنے سے کوئی شئے اُچک لی جائے۔ اور لفظ خیانت سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے کسی قسم کی شرکت یا بے تکلفی یا حفاظت اس کی کی گئی تھی اور لفظ التقاط سے کسی چیز کا بغیر حفاظت پایا جانا ثابت ہوتا ہے، اور لفظ غصب سے معلوم ہوتا ہے کہ مظلوم کی نسبت غاصب میں علانیہ قوت زیادہ تھی، اس کو لڑائی میں غالب آنے پر اعتماد تھا، یا یہ خیال تھا کہ حاکموں تک یہ قصہ نہ پہنچے گا یا ان پر پورا حال منکشف نہ ہوگا، یا رشوت وغیرہ دینے سے وہ سچا فیصلہ نہ کریں گے، اور بے پروائی سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حقیر چیزوں میں اطلاق کی جاتی ہے جن کو عرف میں خرچ کرتے رہتے ہیں اور اس سے ہمدردی کا اظہار کیا جاتا ہے جیسے پانی اور لکڑی اور سرقہ ایسا لفظ ہے جس سے مخفی طور پر لینا ثابت ہوتا ہے اس واسطے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سرقہ کی حد چوتھائی دینار یا تین درہم مقرر کردی تاکہ حقیر چیزوں سے تمیز ہو جائے اور فرمایا کہ خیانت

کرنے والے اور لوٹنے والے اور اوچکے کا ہاتھ نہ کاٹا جائے اور فرمایا کہ اس پھل میں بھی ہاتھ نہ کاٹا جائے جو درخت پر لٹکتا ہو اور نہ ایسی چیز میں جو پہاڑ میں پڑی ہے، ان احادیث سے سرقہ میں حفاظت کا شرط ہونا پایا جاتا ہے اور من جملہ ان چیزوں کے جن کی تمیز جامع و مانع تعریف کے لحاظ سے نہیں ہوسکتی، انتہا درجہ کی عیش پسندی بھی ہے ایسی حالت فساد میں ڈالنے والی ہے۔ جس کی نہ ہی کچھ تعیین ہے اور نہ ہی اس کے پائے جانے کے مواقع ظاہری نشانات سے متمیز ہیں جن کی وجہ سے ہر ایک ادنیٰ اور اعلیٰ کی گرفت کی جاسکے اور اس میں کسی کو شبہ نہ رہے کہ انہی امور میں عیش پسندی پائی جاتی ہے۔

یہ امر معلوم ہے کہ عجمیوں کی عادات عمدہ عمدہ سواریوں، بلند مکانات، بیش قیمت لباس اور زیورات وغیرہ میں نہایت درجہ کی عیش پسندی تک پہنچ گئی ہیں۔ اور یہ بھی معلوم ہے کہ لوگوں کی حالت مختلف ہونے سے ان کی عیش پسندی بھی مختلف ہوتی ہے، پس بعض لوگوں کا سامان عیش دوسروں کی نظر میں تنگی اور سختی ہوتی ہے، اور بہت سی چیزیں جو ایک ملک میں عمدہ سمجھی جاتی ہیں دوسرے ملک میں وہی چیزیں نہایت حقیر خیال کی جاتی ہیں اور یہ بھی معلوم ہے کہ منافع کا حصول عمدہ شئے سے بھی ہوتا ہے اور ناقص شئے سے بھی ہوتا ہے لیکن ردی اور ناقص شئے کا استعمال عیش پسندی نہیں ہے اور بغیر عمدگی کا قصد کئے کسی عمدہ شئے سے متنفع ہونا یا اکثر اوقات میں کسی شخص کا عمدہ اشیا کا پابند نہ ہونا عیش پسندی نہیں ہوسکتا اس واسطے شرع نے ہر صورت میں عیش پسندی کی خرابیوں پر مطلع کیا ہے اور ان اشیا کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کر دیا ہے جن سے لوگ صرف عیش و آرام ہی کے لئے متنفع ہوتے ہیں اور ان سے عیش حاصل کرنا لوگوں کی عام عادت ہے اور شرع نے عجم اور روم کو گویا ان اشیا پر متفق پایا تھا اس واسطے شرع نے کمال عیش اور آرام کے مواقع ان امور کو قرار دے کر ان کو حرام کر دیا اور شاذ و نادر جن اشیا سے نفع اٹھایا جاتا ہے یا اطراف و ممالک میں ان کی عادت ہے ان پر شارع نے کچھ التفات نہیں کیا، پس حریر اور سونے چاندی کے برتنوں کی حرمت اسی قبیل سے ہے۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عیش و آرام کی حقیقت اس کو پایا کہ ہر ایک امور نافع سے عمدہ شئے پسند کی جائے اور ردی سے اعراض کیا جائے اور کامل درجہ کی عیش پسندی یہ پائی کہ ایک جنس کی اشیا میں سے صرف عمدہ ہی کو اختیار کریں اور ردی کو بالکل ترک

کر دیں اور معاملات میں ان معاملات کو بھی موجب عیش قرار دیا جن میں ایک جنس کی اشیا میں سے صرف عمدہ ہی کو اختیار کی جائیں اور ردی بالکل ترک کر دی جائیں، البتہ بعض بعض مادوں میں اس کا لحاظ نہ بھی کیا جاتا ہو لیکن قوانین شرع میں ایسے مادوں کا کچھ اعتبار نہیں، اس واسطے آپ نے ایسے معاملات کو بھی حرام قرار دیا کیونکہ یہ معاملہ عیش پسندی کے لئے بہ منزلہ صورت اور مثال کے ہیں ان کی تحریم بھی بہ مقتضائے طبع ہے کیونکہ مقتضائے طبع کے لحاظ سے عیش پسندی مکروہ امر ہے اور جب اسی مقتضائے طبیعت کی وجہ سے اشیا کے مواقع حرام ہیں تو ان مواقع کی صورتیں اور مثالیں بھی بطریقۂ اولیٰ حرام ہوں گی پس نقد کو نقد کے بدلہ میں اور کھانے کی چیز کو اسی کے جنس کے بدلہ میں بڑھا کر فروخت کرنے کی حرمت اسی قاعدہ سے مستنبط ہے لیکن کسی عمدہ شئے کو زیادہ قیمت پر خریدنا حرام نہیں ہے کیونکہ قیمت اختلاف جنس کے وقت ذات مبیع کی طرف رجوع کرتی ہے نہ کہ اس کے وصف کی طرف، ایسے ہی ایک لونڈی کا دو لونڈیوں کے بدلہ میں اور ایک کپڑے کا دو کپڑوں کے بدلہ میں خریدنا حرام نہیں ہے اس لئے کہ یہ اشیاء ذوات القیم میں سے ہیں اس واسطے قیمت کی زیادتی اس شئے خاص کے خواص کے بدلہ میں قرار دی جائے گی اور اس کا عمدہ پن انہی خواص میں مندرج ہو جائے گا، پس اس عمدہ پن کا بادی الرائے میں کچھ اعتبار نہ ہوگا اور ہماری ان تمہیدات سے بہت سے نکتے جو اس باب سے متعلق ہیں منکشف ہو جاتے ہیں، مثلاً حیوان کے بدلہ حیوان کی بیع کے مکروہ ہونے کی وجہ وغیر ذالک، پس ان میں غور کرنا چاہئے۔

اور کبھی دو شئے آپس میں نہایت مشابہ ہوتی ہیں کہ ان دونوں میں مخفی امور کی وجہ سے فرق ہوتا ہے جن کو سوائے نبی علیہ السلام اور آپ کی امت کے علماً کے اور کوئی نہیں سمجھ سکتا اس واسطے ضرورت پیش آئی کہ ان میں سے ہر ایک کی ظاہر علامت معلوم کی جائے، نیکی اور برائی کا حکم ان دونوں اشیا کی علامات پر لگایا جائے اور ان میں تفریق کے احکام بیان کئے جائیں، مثال اس کی نکاح اور شہوت رانی ہے، پس نکاح کی حقیقت اس مصلحت کو قائم کرنا ہے جس پر زن و شوہر میں باہم ہمدردی سے نسل کی طلب اور شرمگاہ کی حفاظت و دیگر وجوہ سے انتظام عالم موقوف ہے اور یہ تمام امور خدا کے نزدیک پسندیدہ اور مطلوب ہیں اور شہوت رانی کی حقیقت نفس کو گمراہی کی طرف چھوڑنا، نفسانی خواہش کا اتباع کرنا، حیا کی پردہ دری کرنا اور اس سے آزاد ہو جانا، مصلحت کلی اور

انتظام عالم کی راہ کو ترک کرنا ہے اور یہ امور خدا کے نزدیک نہایت ناپسندیدہ اور ممنوع ہیں، لیکن نکاح اور شہوت رانی اکثر امور میں مشابہ ہیں کیونکہ دونوں خواہش نفسانی پورا کرنے میں طبیعت کی شورش کے ازالہ میں عورتوں کی جانب رغبت کرنے میں برابر ہیں، اسی طرح سے دونوں امور میں بھی مشترک ہیں اس واسطے ضرورت ہوئی کہ ظاہری علامت سے ایک کو دوسرے سے بالکل الگ کردیا جائے اور طلب ومنع کا اس پر مدار ہو، پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کی تعیین چند امور کے ساتھ قرار دی، من جملہ ان کے ایک یہ ہے کہ نکاح عورتوں سے کیا جائے نہ مردوں سے کیونکہ نسل کی طلب صرف عورتوں سے ہوسکتی ہے اور یہ کہ نکاح اپنے قصد، مشورہ اور اعلان کے ساتھ ہو اسی لئے گواہوں اور ولی کی موجودگی اور عورت کی رضامندی شرط کی گئی ہے، من جملہ ان امور کے ایک یہ ہے کہ دونوں اپنے نفس کو باہمی تعاون پر آمادہ کریں اور یہ صورت اکثر اوقات جب ہی ہوسکتی ہے کہ نکاح دائمی اور لازمی ہو، اس کی کوئی میعاد معین نہ ہو، اس واسطے نکاح پوشیدگی میں (جو بغیر گواہوں کے ہو) اور متعہ اور لواطت حرام قرار پائے۔

اور کبھی کوئی نیک کام ایسے کام کے مشابہ ہوتا ہے جو دوسرے نیک کام کے مقدمات میں سے ہوتا ہے اس واسطے ان دونوں میں فرق کی ضرورت ہوتی ہے، جیسے 'قومہ' اس لئے مشروع ہوا کہ رکوع اور سرنگوں ہونے میں جو سجدہ کے مقدمات میں سے ہے فرق ظاہر ہوجائے، اور کبھی کوئی شئے ایسی بھی ہوتی ہے جو بہت کارآمد اور اتفاق میں داخل نہیں ہوتی، جیسے دو سجدوں کے درمیان جلسہ کرنا اور کبھی کسی شئے کی شرط یا رکن حقیقت میں ایک امر خفی ہوتا ہے جو قلب سے متعلق ہوتا ہے پس اس کے لئے افعال بدنی میں سے کوئی فعل یا کوئی قول اس امر خفی کے لئے علامت قرار دیا جاتا ہے اور اسی کو رکن بنا دیا جاتا ہے تاکہ امر خفی کا انضباط ہوجائے جیسا کہ نیت اور خدا کے لئے اخلاص سے کوئی کام کرنا امر خفی ہے اس لئے استقبال قبلہ اور تکبیر ان کی علامت مقرر کرکے نماز میں اصل قرار دیئے گئے اور جب نص کسی صیغہ کے ساتھ مذکور ہو یا حال کسی نوع کو کسی حکم کا مدار بنانا چاہے اور پھر بعض مواقع ہیں اشتباہ واقع ہوجائے تو یہی مناسب ہے کہ اس صیغہ کی تفسیر میں یا اس نوع کی جامع ومانع تعریف معلوم کرنے میں عرف عرب کی طرف رجوع کیا جائے جیسے ماہ رمضان کے روزے رکھنے کے لئے نص وارد ہوئی ہے لیکن ابر کے وقت شبہ پڑجاتا ہے اس

واسطے اس کا حکم وہی ہوگا جو عرب کے عرف میں تھا کہ شعبان کے تیس دن پورے کر لئے جائیں اور یہ کہ مہینہ کبھی تیس روز کا ہوتا ہے کبھی انتیس کا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول میں یہی مراد ہے ''ہم ان پڑھ لوگ ہیں نہ لکھنا جانتے ہیں نہ حساب کرنا جانتے ہیں کہ مہینہ اتنے دن کا ہوتا ہے'' الحدیث، ایسے ہی قصر میں سفر کے صیغہ کے ساتھ نص مذکور ہے۔ پھر بعض مواقع میں سفر کے معنی معلوم کرنے میں اشتباہ واقع ہوا اس لئے صحابہ نے حکم کیا کہ سفر گھر سے اتنی دور جانے کو کہتے ہیں کہ جہاں پورے ایک روز اور اس شب کے شروع حصہ میں نہ پہنچ سکے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کی مسافت ایک روز اور دوسرے روز کا کچھ حصہ ہو اس طرح پر سفر کا اندازہ چار بردوں کے ساتھ کیا گیا ہے۔

واضح ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی حکم کے ساتھ مخصوص کرنے میں اور آپ کی امت کے لئے اس حکم کے نہ ہونے میں عمدہ اور اصل یہ ہے کہ اس حکم کا مدار علیہ اس شئے کی حقیقت نہیں ہے بلکہ وہ حکم امر مظنون کی طرف رجوع کرتا ہے چنانچہ حضرت طاؤس نماز عصر کے بعد دو رکعت نماز کے متعلق فرماتے ہیں کہ ان کی ممانعت اس لئے کی گئی ہے کہ لوگ ان کو وسیلہ نہ بنالیں، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم حقیقت سے واقف تھے، پس حقیقت کے معلوم ہو جانے کے بعد آپ کی شان میں امر مظنون کا اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ مثلاً چار عورتوں سے زیادہ سے شادی کرنے میں احتمال تھا کہ بیویوں کے ساتھ عمداً معاشرت نہ ہو اور ان کے حقوق میں کسی قسم کی غفلت ہو جائے اور تمام یہ بات کا شبہ ہو سکتا ہو لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم خوب جانتے تھے کہ عورتوں کے ساتھ معاشرت میں کون سے امور پسندیدہ ہیں اس لئے خاص اپنے لئے جائز رکھا اور احتمالی مواقع کو ناجائز قرار دیا، یا وہ حکم رسم کی طرف رجوع کرتا ہے تہذیب نفس سے اس کا تعلق نہیں، جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع کے ساتھ کسی شرط کے لگانے سے منع فرمایا ہے، پھر آپ نے حضرت جابرؓ سے ایک اونٹ اس شرط پر خریدا کہ مدینہ تک وہ جابر کی سواری میں رہے، یا وہ حکم ایسے شخص کو جو معصوم نہیں ہے کسی اور کام کی طرف لے جاتا ہے چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا روزہ دار کے بوسے لینے کی بابت فرماتی ہیں ''تم میں سے کون شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح خواہش نفس پر غالب ہو سکتا ہے''۔ یا وجہ تخصیص یہ ہوتی ہے کہ آپ کا نفس قدسی کسی خاص نیک امر کا مقتضی ہوتا

ہے اس واسطے آپ پر اس کا کرنا واجب کر دیا جاتا ہے کیونکہ آپ کا نفس قدسی خدا تعالیٰ کی طرف زیادہ متوجہ ہونے کا اور غفلت کی چادر اُتار دینے کا بہت مشتاق تھا جیسے قوی آدمی زیادہ غذا کھانے کا آرزومند ہو جاتا ہے جیسا کہ ایک روایت کے بموجب تہجد اشراق اور چاشت کی نماز کی بابت ہے۔ واللہ اعلم۔

چودھواں باب: مذہبی آسانیوں کا بیان

خدا تعالیٰ فرماتا ہے ''خدا کی رحمت کے ساتھ لوگوں سے نرمی کرو اگر تم سخت دلی سے پیش آؤ گے تو لوگ تمہارے پاس سے منتشر ہو جائیں گے'' اور خدا تعالیٰ فرماتا ہے ''خدا تعالیٰ تمہارے حق میں آسانی کا ارادہ کرتا ہے نہ دشواری کا''۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت ابوموسیٰ اشعری اور حضرت معاذ بن جبل کو یمن کی جانب روانہ کیا تو ان سے فرمایا آسانیاں پیدا کرنا نہ دشواریاں، لوگوں کو خوش کرنا، متنفر نہ کرنا، باہم اتفاق رکھنا، اختلاف نہ کرنا''۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم آسانیاں بڑھانے کو پیدا ہوئے ہو نہ دشواریاں پیدا کرنے کو''۔ اور آسانی چند وجوہات سے حاصل ہوتی ہے من جملہ ان کے یہ ہے کہ کسی دشوار امر کو عبادت کا رکن یا شرط نہ قرار دیا جائے اور اس کی اصل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ہے ''اگر میں امت کے لوگوں پر دشوار نہ سمجھتا تو ان کو ہر نماز کے وقت مسواک کرنے کا حکم دیتا''۔ من جملہ ان کے یہ ہے کہ عبادات میں سے بعض امور کو ایسی رسومات بنا دیا جائے جن سے لوگ خوش ہوتے ہیں اور ان امور میں داخل کر دیا جائے جن کو لوگ اپنی نفسانی رغبتوں سے عمل میں لاتے ہیں مثلاً عیدین اور جمعہ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ''تاکہ یہودی جان لیں کہ ہمارے مذہب میں کیسی وسعت ہے''۔ کیونکہ بڑے بڑے مجمعوں میں اپنے آپ کو مزین کرنا اور فخر کے کاموں میں ایک دوسرے سے سبقت کا طالب ہونا لوگوں کی عادت میں داخل ہے۔ من جملہ ان کے یہ ہے کہ عبادات میں بعض وہ امور مسنون کر دیئے جائیں جو لوگوں کو بالطبع مرغوب ہوں تاکہ جس امر کی عقل خواہاں ہے طبیعت بھی اس کی خواہاں رہے۔ پس دونوں رغبتیں جمع ہو کر ایک دوسرے کی مددگار رہیں اسی وجہ سے مساجد کو پاک اور مزین رکھنا اور جمعہ کے دن غسل کرنا اور خوشبو لگانا مسنون قرار دیا اور قرآن کو خوش الحانی سے پڑھنا اور اذان کا خوش آوازی سے پڑھنا مستحب قرار دیا۔

منجملہ ان کے یہ ہے کہ جس سے لوگوں کو دلی نفرت ہو اور ان کو وہ بوجھ معلوم ہو اس کو دور کر دیا جائے، اسی لئے غلام، اعرابی اور مجہول النسب کی امامت مکروہ قرار دی گئی ہے کیونکہ لوگ ایسے آدمیوں کے پیچھے نماز پڑھتے ہوئے دل گرفتہ ہوتے ہیں۔

منجملہ ان کے یہ ہے کہ لوگوں پر وہ شئے باقی رکھی جائے جس کو اکثر لوگوں کی طبیعت چاہتی ہو یا اس امر کے ترک کرنے سے ان کے دل تنگ ہوتے ہوں، جیسے امامت کے لئے سب سے زیادہ مستحق سلطان اور مالک خانہ قرار دیئے گئے ہیں، اور جو شخص نئی عورت سے شادی کرے تو اس کے پاس سات روز یا تین روز رہ کر پھر ایام کو برابر تقسیم کر دے۔

منجملہ ان کے یہ ہے کہ لوگوں کو علم ونصائح کی ہمیشہ تعلیم دیتا رہے، نیکی کا حکم کرتا ہے اور ممنوعات سے روکتا رہے تاکہ ان امور سے لوگوں کے دل بھر جائیں اور پھر احکام الٰہی کو بہ سہولت قبول کریں اور کلفت پیش نہ آئے اور اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ لوگوں کو نصیحت فرماتے رہا کرتے تھے منجملہ ان کے یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بعض ان امور کو عمل میں لائیں جن کا لوگوں کو حکم کرتے ہوں یا ان کے کرنے میں لوگوں کو اختیار دیتے ہوں تاکہ آپ کے فعل سے لوگوں کو اعتبار حاصل ہو۔

منجملہ ان کے یہ ہے کہ نبی ہمیشہ خدا سے دعا کرتا رہے کہ لوگ مہذب اور کامل بن جائیں، من جملہ ان کے یہ ہے کہ نبی علیہ السلام کے ذریعہ سے ان پر خدا کی جانب سے اطمینان اور تسکین ایسی نازل ہوتی رہے کہ لوگ آپ کے سامنے سر جھکا کر اس طرح بیٹھے رہیں گویا ان کے سر پر پرند ہیں، من جملہ ان کے یہ ہے کہ جو شخص حق سے سرتابی کرے اس کی سرکوبی کر دی جائے اور اس کو محروم کر دیا جائے جیسے قاتل کو مقتول کے ورثہ سے محروم کیا گیا اور زبردستی کی صورت میں طلاق واقع نہیں ہوتی پس ایسا کرنا زبردستی کرنے والوں کو جبر اور اکراہ کرنے سے باز رکھے گا، جبکہ ان کی غرض حاصل نہ ہوگی، منجملہ ان کے یہ ہے کہ جن امور میں مشقت ہو ان کو آہستہ آہستہ شروع کرنا چاہئے چنانچہ حضرت عائشہ کا اسی کے متعلق قول ہے کہ قرآن میں اوّل وہ مفصل سورتیں نازل ہوئیں جن میں صرف جنت اور دوزخ کا ذکر تھا، اور جب اسلام کی طرف لوگ آنے لگے تو حلال وحرام کے احکام نازل ہوئے اگر شروع ہی میں یہ نازل ہوتا کہ شراب مت پیو تو لوگ کہہ دیتے کہ

ہم شراب کبھی ترک نہ کریں گے، اور اگر شروع ہی میں یہ نازل ہوتا کہ زنا نہ کرو تو لوگ کہہ دیتے کہ ہم زنا کبھی ترک نہ کریں گے۔

من جملہ ان کے یہ ہے کہ نبی ایسے فعل کو ترک کر دے جس سے لوگوں کے دلوں میں تشویش پیدا ہو اس لئے بعض امور مستحبہ کو ترک کر دیا گیا ہے چنانچہ آنحضرت علیہ السلام کے اس قول سے جو آپ نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا تھا، یہی مراد ہے ''اگر تیری قوم سے کفر کا زمانہ قریب نہ ہوتا تو میں کعبہ کو منہدم کر کے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بنیاد پر تعمیر کرتا''۔

منجملہ ان کے یہ ہے کہ شارع نے مختلف نیکیوں، وضو، غسل، نماز، زکوۃ، روزہ، حج وغیرہ کا خود حکم دیا اور ان امور کو لوگوں کی رائے پر موقوف نہ رکھا، بلکہ ان سب کے ارکان، شروط و آداب وغیرہا کو منضبط کر دیا، پھر ان ارکان، شروط اور آداب کو زیادہ منضبط نہ کیا بلکہ ان کی تکمیل کو لوگوں کی عقلوں پر چھوڑ دیا کہ وہ ان الفاظ کے معانی اپنی عادات کے موافق خود سمجھ لیں مثلاً شارع نے یہ تو بیان کر دیا کہ بغیر سورۂ فاتحہ کے نماز نہیں ہوئی لیکن حرفوں کے مخارج نہیں بیان کئے جن پر سورۂ فاتحہ کا ٹھیک طور پر پڑھنا موقوف ہے اور نہ ان کی تشدیدات و حرکات و سکنات بیان فرمائے اور نیز شارع نے یہ بیان کر دیا کہ استقبال قبلہ نماز میں شرط ہے لیکن کوئی ایسا قاعدہ نہیں بتایا جس سے استقبال قبلہ معلوم ہو سکے۔ اور اسی طرح یہ بھی بیان کر دیا کہ زکوۃ کا نصاب دوسو درہم ہے لیکن یہ نہیں بیان فرمایا کہ درہم کا وزن کتنا ہو اور جب اس قسم کی کوئی بات آپ سے دریافت کی گئی تو اسی قدر بتایا جس کو وہ سمجھ سکتے تھے اور کوئی ایسی بات نہیں بتلائی جو ان کی عادات میں نہیں تھی، اسی واسطے ماہ رمضان کے چاند کی نسبت فرما دیا اگر ابر ہو تو ماہ شعبان کے تیس روزے پورے کر لو۔ اور اس پانی کی نسبت جو بیابان میں ہوتا ہے درندے اور چہار پائے وہاں آتے جاتے ہیں یہ فرمایا جب پانی بقدر قلتین کے ہو تو ناپاک نہیں ہوتا''۔

اور ایسے امور کی اصل اہل عرب میں موجود تھی جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ سب اشیا کی حقیقتوں کا بیان کرنا انہی اشیا کے ساتھ ممکن ہے جن میں ظہور، خفاء اور عدم انضباط ویسا ہی ہو۔

اور پھر ان کے بیان کی ضرورت پڑے گی اور ایسے ہی ضرورت پڑتی جائے گی اور اس میں

بڑا حرج ہے اس لئے کہ ہر پابندی میں کسی قدر دقت ہوتی ہے، پس جب پابندیاں زیادہ ہو جائیں گی تو دقتیں بھی انتہا کو پہنچ جائیں گی، اور نیز شرعی احکام ادنی اور اعلیٰ سب ہی کے لئے ہیں تو ان تعریفات کو تفصیل وار یاد کرنے میں سخت دقت پڑے گی، اور نیز جب لوگ نیکی کی قیودات کی طرف زیادہ متوجہ ہوں گے تو وہ ان نیکیوں کے فوائد نہ معلوم کر سکیں گے اور نہ ہی نیکیوں کے ارواح کی جانب وہ متوجہ ہو سکیں گے جیسا کہ تم بہت سے قاریوں کو دیکھتے ہو کہ وہ اس وجہ سے کہ ان کی دلی توجہ الفاظ کی طرف رہتی ہے قرآن کے معنی میں غور و فکر نہیں کرتے اس لئے اس سے بہتر کوئی اور مصلحت نہ تھی کہ اصول کو منضبط کر کے باقی امور لوگوں کی رائے پر چھوڑ دیں، واللہ اعلم۔

منجملہ ان کے یہ ہے کہ شارع نے لوگوں سے ان کی عقل کے موافق ہی خطاب کیا ہے جو ان کی اصلی فطرت میں فن حکمت، علم کلام اور علم اصول کے دقائق میں غور کرنے سے پیشتر ہی ودیعت رکھی گئی تھی، اسی واسطے خدا تعالیٰ نے اپنے واسطے جہت کو ثابت کیا اور فرمایا ''خدا تعالیٰ عرش پر بیٹھا ہوا ہے''۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کالے رنگ کی عورت سے پوچھا تھا اللہ تعالیٰ کہاں ہے؟ اس نے آسمان کی طرف اشارہ کیا، تو آپ نے فرمایا یہ عورت مومنہ ہے اور اسی طرح قبلہ کی سمت پہنچانے میں نماز کے اوقات دریافت کرنے میں اور عیدین کے مقرر کرنے میں علم ہیئت اور ہندسہ کے مسائل کو حفظ کرنے کی تکلیف نہیں دی اور مسئلہ کی وجہ کی طرف اپنے اس قول میں اشارہ فرما دیا ''قبلہ، مشرق اور مغرب کے درمیان ہے جب کعبہ کی سمت منہ ہو جائے'' اور فرما دیا ''حج کا دن وہی ہے جس روز تم حج کرتے ہو اور یوم الفطر وہی ہے جس روز تم افطار کرتے ہو''۔ واللہ اعلم۔

پندرھواں باب: ترغیب اور ترہیب کے اسرار کا بیان

خدا تبارک وتعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک بڑی نعمت یہ ہے کہ اس نے وحی کے ذریعہ سے انبیا علیہم السلام کو ثواب اور عذاب بتلا دیا جو اعمال پر مرتب ہوتے ہیں تاکہ وہ لوگوں کو مطلع کر دیں اور لوگوں کے دل خوف اور امید سے پر ہو جائیں اور وہ دلی خواہش اور ارادہ سے شرائع کی پیروی کریں جس طرح وہ باقی اور امور کو عمل لاتے ہیں جن سے کوئی ضرور ہوتا ہے یا ان سے کوئی نفع حاصل ہوتا ہے چنانچہ اس آیت میں یہی مراد ہے ''بے شک نماز ایک بڑی بھاری چیز ہے لیکن نہ

ان خوف کرنے والوں پر جن کو خیال رہتا ہے کہ ہم اپنے پروردگار سے ملیں گے اور اسی کی طرف لوٹ کر جائیں گے۔

پھر ترغیب اور ترہیب سے متعلق قواعد کلی ہیں جن سے ترغیب اور ترہیب کے تمام جزئی امور متفرع ہوتے ہیں، فقہا صحابہ ان کو اجمالا جانتے تھے اگرچہ انھوں نے ان قواعد کو تفصیلا منضبط نہیں کیا تھا اور جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے اس پر دلیل یہ حدیث ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''اپنی بیوی سے مباشرت کرنے میں بھی تمہارے لئے اجر ہے، صحابہ نے عرض کیا کہ کیا کوئی خواہش پوری کرے جب بھی ثواب ملتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر حرام میں خواہش کا استعمال کرتا، کیا اس پر اس کو گناہ نہ ہوتا'' اس لئے صحابہ کا اس مسئلہ میں توقف کرنا اور ان پر اس کی علت کا مشتبہ ہو جانا اسی وجہ سے تھا کہ ان کے نزدیک اعمال اور ان کی اجزا میں جو کچھ مناسبت ہوتی ہے۔ اس کو وہ جانتے تھے اور اس کو خوب جانتے تھے کہ اعمال کے نتائج ایسے قاعدہ پر مبنی ہیں جو معقول المعنی ہے اور اگر ایسا نہ ہوتا تو ان کے سوال کرنے کی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب دینے کی جو آپ نے ایک واضح شئے پر قیاس کر کے دیا ہے، کوئی وجہ نہ ہوتی، اور میرے اس قول کی نظیر یہ بھی ہے کہ جو فقہا نے اس حدیث کے بارے میں کہا ہے، حدیث یہ ہے اگر تیرے باپ پر قرضہ ہوتا تو اس کو ادا کرتا یا نہیں؟ اس نے کہا ہاں، ادا کرتا آپ نے فرمایا پس خدا کا قرضہ زیادہ ادا کرنے کے قابل ہے'' فقہا کہتے ہیں اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ احکام کو قواعد کلیہ سے تعلق ہوتا ہے۔

صحابہ کے سوال کا حاصل یہ ہے کہ نیکیوں سے تہذیب نفس حاصل ہوتی ہے مثلاً تسبیح تہلیل، تکبیر، یا ان سے شہری انتظام میں کوئی مصلحت حاصل ہوتی ہے اور برائیوں سے ان دونوں کے خلاف امور حاصل ہوتے ہیں اور خواہش نفس کے پورا کرنے میں بہیمیت کے غلبہ کی پیروی ہوتی ہے اور اس میں عادت سے زیادہ اور کوئی مصلحت بھی نہیں ہوتی اور قضا شہوت کے پورا کرنے میں بہیمیت کے غلبہ کی پیروی ہوتی ہے اور اس میں عادت کے علاوہ نہ تو کوئی مصلحت سمجھی جاتی ہے اور نہ ہی اس کے مثل کوئی ایسی شئے سمجھی جاتی ہے جو معرفت کلیہ کی طرف رجوع کرتی ہو اور قضا شہوت کے مسئلہ کو معرفت کلیہ کی طرف لوٹانا نہایت ہی عجیب وغریب ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

کے جواب کا حاصل یہ ہے کہ اپنی بیوی سے مباشرت کرنے میں خاوند اور بیوی کی پاکدامنی مستحکم ہوتی ہے اور اس میں بے موقع خواہش نفس پورا کرنے سے نجات ملتی ہے، ترغیب اور ترہیب کے چند طریقے ہیں اور ہر طریقہ کا ایک راز ہے اور ہم تم کو ان میں سے بڑے بڑے طریقے بتلاتے ہیں، ان طریقوں میں سے ایک یہ ہے کہ تہذیب نفس کے بارے میں کسی کام کا جو اثر مرتب ہوتا ہے وہ بیان کر دیا جائے یعنی نفس کی نیک و بد قوتوں میں سے کسی کا کمزور پڑنا یا اس کا غالب آنا، اسی کو زبان شرع میں نیکیوں کا لکھا جانا اور برائیوں کا مٹ جانا کہتے ہیں۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص **لا الہ الا اللہ وحدہ لاشریک لہ لہ الملک و لہ الحمد وھو علی کل شی قدیر** ، روزانہ سو بار پڑھ لیا کرے تو یہ دس غلام آزاد کرنے کے برابر ہے اور اس کے لئے سو نیکیاں لکھی جاتی ہیں اور اس کے سو گناہ مٹا دیئے جاتے ہیں اور اس روز شام تک وہ شیطان سے محفوظ رہتا ہے اور ایسے شخص سے افضل کسی کا عمل نہیں ہوتا مگر اس شخص کا جو اس سے بھی زیادہ عمل کرے، اس حدیث کا راز ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

اور ان طریقوں میں سے ایک یہ ہے کہ شیطان وغیرہ سے محفوظ رہنے کی بابت اس عمل کے اثر کو بیان کیا جائے جیسے آپ نے فرمایا تھا اور شام تک وہ شیطان سے محفوظ رہتا ہے'' اور جیسے آپ کا یہ فرمان ہے ''بدکار لوگ اس کو نہیں کر سکتے'' یا اس عمل کا اثر رزق کی وسعت اور برکت کا ظہور بیان کیا جائے وغیر ذلک۔

ان میں سے بعض میں یہ راز ہے کہ کوئی شخص خدا سے سلامتی کو طلب کرتا ہے اور اس کی یہ طلب قبولیت دعا کا سبب بن جاتی ہے، چنانچہ آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اس حدیث میں جس کو آپ خدا کی جانب سے روایت کرتے ہیں یہی مراد ہے، آپ نے فرمایا ''اگر بندہ مجھ سے پناہ چاہے گا تو میں اس کو پناہ دوں گا اور اگر کسی امر کی مجھ سے درخواست کرے گا تو میں اس کو ضرور دونگا''۔

اور بعض احادیث میں یہ راز ہے کہ ذکر الٰہی میں مستغرق ہونے سے اور عالم جبرت کی طرف متوجہ ہونے سے اور ملکوت سے مدد طلب کرنے سے شیاطین سے مناسبت منقطع ہو جاتی ہے اور تاثیر کا مدار مناسبت پر ہوا کرتا ہے اور بعض احادیث میں یہ راز ہے کہ جس کی ایسی حالت ہوتی

ہے تو ملائکہ اس کے لئے دعا کرتے ہیں اس لئے وہ بہت سی راہوں پر چل پڑتا ہے پس کبھی تو وہ حصول منافع کے راستہ پر ہوتا ہے اور کبھی مضرت کے دفع ہونے کے راستہ پر۔

اور ان ترغیب وترہیب کے طریقوں میں سے یہ ہے کہ اعمال کا وہ اثر جو آخرت میں ظاہر ہوگا بیان کر دیا جائے اور اس کا راز دو مقدموں سے معلوم ہوتا ہے اوّل مقدمہ یہ ہے کہ معاد میں کسی شئے کو ثواب اور عذاب کا سبب قرار نہیں دیا جا سکتا جب تک کہ جزا کے دونوں اسباب میں سے کسی سبب کے ساتھ مناسبت نہ ہو، یا تو اس کو ان چاروں اخلاق میں دخل ہو جن پر سعادت اور تہذیب نفس کا ہونا یا نہ ہونا مبنی ہے، اور وہ چاروں اخلاق یہ ہیں: پاکیزگی حاصل کرنا، رب العالمین کے حضور میں عاجزی کرنا، سخاوت کرنا، لوگوں میں عدل وانصاف قائم کرنے کی کوشش کرنا، یا اس شئے کو ان امور کے اجزا میں نفیاً واثباتاً دخل ہو جس اجرا پر ملاء اعلیٰ کا اتفاق ہے جیسے شرائع کو مستحکم کرنا، انبیا علیہم السلام کی امداد کرنا اور عمل اور سبب جزا میں مناسبت کے معنی یہ ہیں کہ وہ عمل اس معنی سببی کے وجود کا محل سمجھا جاتا ہو یا عادۃً اس معنی سببی کو لازم ہو یا اس کے لئے ذریعہ ہو جیسے دو رکعت نماز کو اس طرح سے ادا کرنا کہ کوئی نفسانی وسوسہ واقع نہ ہو، اس میں خدا کے حضور میں عاجزی، خدا کے جلال کی یاد اور بہیمیت کی پستی سے ایک قسم کی ترقی کا ظہور ہے۔ اور ایسے ہی پورا پورا وضو کرنا اس پاکیزگی کا باعث ہے جو نفس میں اثر کرتی ہے اور ایسے ہی مال کثیر کا خرچ کرنا جس میں عادۃ بخل کیا جاتا ہے اور کسی کے ظلم کو معاف کرنا اور اپنے حقوق میں جھگڑے کو ترک کرنا سخاوت نفس کی دلیل اور اس کو متلازم ہے۔ اور ایسے ہی بھوکے کو کھانا کھلانا پیاسے کو پانی پلانا اور لوگوں میں آتش جنگ کو بجھانے میں سعی کرنا اصلاح عالم کا سبب اور ذریعہ ہے۔ اور اسی طرح عرب سے محبت رکھنا ان کی روش اختیار کرنے کا ذریعہ ہے اور یہ دین الٰہی حاصل کرنے کا آسان طریق ہے کیونکہ شریعت عادات عرب کے ہی موافق معین کی گئی ہے اور نیز اس پسندیدگی میں شریعت مصطفوی کی تعظیم ہے اور اسی طرح روزہ کے افطار کرنے میں عجلت کرتے رہنا، دوسرے مذاہب کے اختلاط اور ان کی تحریفات سے جدا رہنا ہے۔

اور ہمیشہ سے لوگوں کے فرقے یعنی حکما اور ارباب صناعت اور اطبا احکام کو ان کی علتوں پر جاری کرتے آئے ہیں اور عرب بھی ہمیشہ اپنے خطبات اور محاورات میں اسی قانون پر چلتے آئے

ہیں اور کسی قدر اس کو ہم نے ذکر بھی کیا ہے۔

اور یا یہ عمل نہایت شاق ہو یا گم شدہ ہو یا سخت ناگوار طبع ہو جس پر وہی شخص اقدام کر سکے جس میں کامل اخلاص ہو اس لئے ایسا عمل اس کے اخلاص کی شرح ہو جائے گا مثلاً خوب سیر ہو کر زمزم کا پانی پینا اور حضرت علیؓ سے محبت رکھنا اس وجہ سے کہ حضرت علیؓ خدا کے احکام کی تعمیل میں نہایت سخت تھے اور جیسے انصار سے محبت کرنا، کیونکہ معد اور یمن کے عرب باہم ایک دوسرے سے متنفر تھے یہاں تک کہ اسلام نے ان میں الفت پیدا کر دی، اس واسطے ان سے محبت کرنا اس امر کی دلیل ہے کہ دل میں اسلام کی بشاشت اثر کر گئی ہے اور جیسے پہاڑ پر چڑھ کر دیکھنا اور لشکر اسلام کی حفاظت میں جاگنا، پس یہ اس امر کو بتلاتا ہے کہ اس کا ارادہ دین الٰہی کے قائم کرنے میں سچا ہے اور اس کو دین سے محبت ہے۔

دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ جب کوئی شخص مر جاتا ہے اور وہ اپنے نفس اور نفس کی ان حالتوں کی طرف رجوع کرتا ہے جن کی موافقت یا منافرت کا نفس پر رنگ چڑھا تھا تو وہاں کے مناسب تکالیف و آرام کی صورتیں اس پر ضرور ظاہر ہوتی ہیں، ان نفسانی حالات اور تکلیف و آرام میں ملازمت عقلیہ کا کچھ اعتبار نہیں ہے بلکہ یہ ملازمہ ایک دوسری قسم کا ہے جس سے نفس کے بعض امور کی بعض کی طرف کشش ہوتی ہے اور اسی کے موافق خواب میں معانی متشکل ہوتے ہیں جیسے ماہ رمضان میں موذن کا اذان دے کر لوگوں کو مباشرت اور کھانے پینے سے منع کرنا ان کے موہنوں اور شرمگاہوں پر مہر لگا دینے کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، پھر عالم مثال میں اور مناسبات ہیں جن پر احکام مبنی ہیں، پس حضرت جبرئیل علیہ السلام دحیہ کلبیؓ کی صورت میں آنے اور کسی کی صورت میں نہ آئے تو یہ ایک خاص مناسبت کی وجہ سے تھا اور خاص وجہ ہی کے سبب سے موسیٰ علیہ السلام کے سامنے آگ کا ظہور ہوا تھا۔ پس ان مناسبات کا سمجھنے والا ہی خوب جان سکتا ہے کہ اس عمل کی جزا کس صورت میں ہوگی جیسے خواب کی تعبیر دینے والا خوب جانتا ہے کہ جو صورت اس نے خواب میں دیکھی ہے اس صورت میں کون سی شے ظاہر ہوئی ہے۔

اصل کلام یہ ہے کہ اسی طریقہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم جانتے تھے کہ جو شخص علم کو چھپائے اور وقت ضرورت تعلیم سے سکوت کرے تو اس کو آتشی لگام سے عذاب دیا جائے گا یہ تشبیہ اس لئے

دی گئی ہے کہ ایسے سکوت سے نفس کو تکلیف ہوتی ہے اور لگام سکوت کے مشابہ اور اس کی صورت ہے، اور جو شخص مال سے زیادہ محبت کرتا ہے اور ہمیشہ اس کا دل مال سے ہی متعلق رہتا ہے تو اس کی گردن میں گنجے سانپ کا طوق ڈالا جائے گا اور جو شخص دراہم، دنانیر اور مویشیوں کی حفاظت میں مصروف رہتا ہے اور ان کو خدا کی راہ میں خرچ کرنے سے باز رہتا ہے تو اس کو انہی اشیا کے ذریعہ سے عذاب دیا جائے گا جیسے تکلیف دینے کا طریقہ ملاء اعلیٰ کی نظر میں مقرر ہے اور جو شخص کسی ہتھیار یا زہر سے خودکشی کرتا ہے اور اس وجہ سے وہ خدا کے حکم کی مخالفت کرتا ہے تو انہی صورتوں سے اس کو عذاب دیا جائے گا۔ اور جو شخص فقیر کو کپڑے پہنائے گا تو اس کو روز قیامت میں حریر جنت کا لباس پہنایا جائے گا اور جو شخص کسی مسلمان غلام کو آزاد کرے گا اور غلام کی مصیبت سے جو اس کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے آزاد کرے گا تو اس غلام کے ہر عضو کے بدلہ میں اس شخص کا ہر عضو دوزخ سے آزاد کیا جائے گا۔

اور ان ترغیب اور ترہیب کے طریقوں میں سے ایک یہ ہے کہ عمل کو اس چیز سے تشبیہ دی جائے جس کی خوبی یا برائی ذہنوں میں شرع یا عادت کی وجہ سے پائی جاتی ہے اور اس وقت میں ضرور ہے کہ ان دونوں امروں میں کوئی جامع شئے ہو جو کسی وجہ سے دونوں میں مشترک ہو جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو جو صبح کی نماز کے بعد سے طلوع آفتاب تک مسجد میں عبادت کے لئے بیٹھا رہے، صاحب حج وعمرہ کے ساتھ تشبیہ دی ہے اور ہبہ کر کے واپس لینے والے کو اس کتے کے ساتھ تشبیہ دی ہے جو قئے کر کے پھر اس کو چاٹ لیتا ہے اور تشبیہ میں یہ بھی ضرور ہے کہ اس عمل کو محبوب لوگوں یا قابل نفرت لوگوں کی طرف منسوب کیا جائے یا اس عمل کرنے والے کے حق میں دعا یا بددعا کی جائے اور ان امور سے اگرچہ اس عمل کے عمدہ یا قبیح ہونے کی وجہ کا لحاظ بھی نہ کیا جائے، اس عمل کی اجمالی حالت معلوم ہو جاتی ہے جیسے شارع کا قول۔ یہ (۱) منافق کی نماز ہے''۔ اور جیسے آپ نے فرمایا ''جو شخص ایسا کام کرے گا وہ ہم سے نہیں''۔ یا فرمایا ''یہ کام شیطان کا ہے یا یہ کام فرشتوں کا سا ہے اور خدا اس پر رحم کرے جو ایسا کرتا ہے؟ اور اسی کے مثل اور عبادتوں کو قیاس کر لینا چاہئے اور ان ترغیب وترہیب کے طریقوں میں سے ایک یہ ہے کہ فعل کی

---

(۱) جو عصر کی نماز تنگ وقت میں پڑھے۔

حالت ہی خدا کی خوشی یا ناخوشی سے متعلق ہے اور یہ حالت ہی ملائکہ کی دعا یا بددعا کا سبب ہے جیسے شارع کا قول ہے ''خدا ایسے ایسے امور کو پسند کرتا ہے اور ایسے ایسے امور کو ناپسند کرتا ہے''۔ اور جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''خدا تعالیٰ اور فرشتے دائیں جانب کی صفوں پر رحمت بھیجتے ہیں'' اور اس کا راز ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ واللہ اعلم۔

سولھواں باب: کمال مطلوب کے حاصل ہونے یا نہ ہونے کے اعتبار سے امت کے درجات کا بیان

اس باب میں اصل خدا تعالیٰ کا وہ قول ہے جو سورۂ واقعہ میں مذکور ہے ''تم تین تین جوڑے ہو، اصحاب الیمین اور اصحاب الیمین کیا ہیں؟ اور اصحاب المشئمة اور اصحاب المشئمة کیا ہیں اور جو لوگ سب پر سبقت لیجانے والے ہیں وہی مقرب ہیں۔ الی آخر السورۃ۔ اور نیز خدا تعالیٰ کا وہ قول ہے ''پھر ہم نے ان لوگوں کو وارث بنایا جن کو ہم نے اپنے بندوں میں سے برگزیدہ کیا تھا، پس بعض لوگ اپنے نفس پر ظلم کرنے والے ہیں بعض میانہ رو اور بعض نیکیوں میں سب سے آگے بڑھنے والے ہیں، خدا کے حکم سے یہ خدا تعالیٰ کا بہت بڑا فضل ہے۔

تم معلوم کر چکے ہو کہ سب سے اعلیٰ درجہ کے نفوس مفہمین کے ہیں اور ہم ان کا ذکر کر چکے ہیں، مفہمین کے بعد اس گروہ کا درجہ ہے جس کو سابقین کہتے ہیں۔ سابقین کی دو قسمیں ہیں۔ اول قسم اہل علو و اصطلاح کی ہے جن کی استعداد کمالات کے حاصل کرنے میں مفہمین کی سی ہوتی ہے لیکن ان کی سعادت ان کو ان کے مرتبہ تک نہیں پہنچاتی پس ان کی استعداد خوابیدہ آدمی کی سی ہے جو ایک بیدار کرنے والے کا محتاج ہوتا ہے، پس جب ان کو رسولوں کی خبریں بیدار کرتی ہیں تو وہ ان علوم کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں جو ان کی استعداد کے مناسب ہوتے ہیں ایسی مخفی مناسبت کی وجہ سے جو ان کے باطن نفوس میں موجود ہوتی ہے اس لئے یہ لوگ مجتہدین فی المذہب کے مرتبہ کے ہو جاتے ہیں اور ان کے الہام کی حالت یہ ہے کہ وہ اس الہام اجمالی کلی کو حاصل کرتے ہیں جو ان کے نفوس کی طرف متوجہ ہوتا ہے اس استعداد کی وجہ سے جو بارگاہ الٰہی میں ان کو محیط ہوتی ہے اور یہ ایسا امر ہے جو اکثر سابقین میں مشترک ہے اور پیغمبروں نے اس کو بیان کیا ہے۔

دوسری قسم اہل جذب اور علو کی ہے جن کو رہبر توفیق نے ایسی ریاضات اور توجہات کی

طرف چلا کر مشغول رکھا ہے جس سے ان کی بہیمیت مغلوب ہوگئی پس خدا تعالیٰ نے ان کو کمال علمی اور کمال عملی دونوں عطا فرمائے ہیں۔ اور اپنے امور میں ان کو پوری بصیرت حاصل ہوگئی ہے اسی واسطے ان کو خداوندی واقعات، رہنمائی اور اطلاع حاصل ہوتی رہتی ہے جیسے طرق صوفیہ کے اکابر صوفیہ تھے، تمام سابقین میں دو امر ضرور جمع ہوتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ اپنی طاقت خدا کی طرف متوجہ ہونے میں اور قرب حاصل کرنے میں صرف کرتے ہیں اور دوسرا امر یہ ہے کہ ان کی فطرت نہایت قوی ہوتی ہے پس ملکات مقصودہ ہو بہو ان کے سامنے متمثل ہوتے ہیں بغیر اس کے کہ ان کو ملکات کے قالب اور صورتوں کی طرف ضرورت پڑے، ان کو ان قالبوں کی ضرورت صرف ان ملکات کی تشریح کے لئے ہوتی ہے اور اس لئے ہوتی ہے کہ وہ قوالب ان ملکات کے لئے ذرائع ہوتے ہیں، سابقین میں سے ایک قسم مفردین کی ہے جو عالم غیب کی طرف متوجہ رہتے ہیں ذکر الٰہی ان کے بوجھ اور دقتوں کو دور کر دیتا ہے، ایک قسم صدیقین کی ہے جو خدا تعالیٰ کی شدت کے ساتھ فرمانبرداری کرنے کی وجہ سے اور اسی کے لئے خاص ہونے کی وجہ سے تمام لوگوں سے ممتاز ہوتے ہیں۔ اور ایک قسم شہدا کی ہے جو لوگوں کی رہبری کے لئے پیدا کئے گئے ہیں، ان میں عالم بالا کا یہ اثر ہوتا ہے کہ کافروں پر لعنت کرتے ہیں ایمان والوں سے خوش ہوتے ہیں، اور نیک امور کا حکم کرتے ہیں، برے کاموں سے منع کرتے ہیں، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے اسلام کو غالب کرتے ہیں، پس یہ قیامت کے روز کفار سے مخاصمہ کریں گے اور ان کے خلاف شہادت دیں گے اور یہ لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت میں بہ منزلہ اعضا کے ہیں تاکہ بعثت سے جو مقصود ہے وہ ان کے ذریعہ سے تکمیل کو پہنچ جائے، اسی واسطے ان کو اوروں سے افضل جاننا اور ان کی عزت و توقیر کرنا ضروری ہے اور ایک قسم راسخین فی العلم کی ہے جن میں ذکاوت اور ہوشمندی کامل ہوتی ہے اور جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے علم و حکمت کی باتیں سنتے ہیں تو ان میں ایک استعداد پیدا ہو جاتی ہے۔

پس کتاب الٰہی کے ٹھیک ٹھیک معنی سمجھنے میں وہ استعداد ان کے باطن کی مدد کرتی ہے اسی طرف حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اشارہ کیا ہے جبکہ فرمایا ''یا استنباط قرآنی کی طاقت جو مسلمان آدمی کو دی جاتی ہے'' اور ایک قسم عباد کی ہے جو عبادت کے فوائد کو عیاناً دیکھتے ہیں اور اس

کے نفوس اس عبادت کے انوار سے منور ہو جاتے ہیں اور وہ فوائد ان کے صمیم قلب میں داخل ہو جاتے ہیں پس یہ لوگ عبادت الٰہی نہایت بصیرت سے کرتے ہیں اور ایک درجہ سابقین میں سے زہاد کا ہے۔ ان کو عالم معاد اور وہاں کے لذائذ کا کامل یقین ہوتا ہے اور ان لذائذ کے مقابلہ میں ان کو دنیوی لذت نہایت حقیر معلوم ہوتی ہے اور لوگ ان کی نظر میں اونٹ کی مینگنیوں کی مانند بے قدر معلوم ہوتے ہیں، اور سابقین میں سے بعض لوگ انبیا علیہم السلام کی جانشینی کی استعداد رکھتے ہیں جو وصف عدالت کے ساتھ موصوف ہو کر خدا تعالیٰ کی عبادت کرتے رہتے ہیں اور وصف عدالت کو احکام الٰہی میں صرف کرتے ہیں اور سابقین میں سے خوش خلق لوگ ہیں یعنی ان میں سخاوت، تواضع اور عفو کی صفات ہوتی ہیں اور سابقین میں سے ایک جماعت ان لوگوں کی ہے جو فرشتوں کے ساتھ مشابہ ہوتے ہیں اور ان کا فرشتوں کے ساتھ اختلاط رہتا ہے جیسے حدیث میں آیا ہے کہ بعض صحابہ کو فرشتے سلام کیا کرتے تھے۔

ان سابقین کے فرقوں میں سے ہر ایک فرقہ میں ایک تو جبلی اور فطری استعداد ہوتی ہے جو اپنے کمال کا ایسی بیداری کے ذریعہ تقاضا کرتی ہے جو انبیا کی اطاعتوں سے پیدا ہوتی ہے اور ایک استعداد کسبی ہوتی ہے جو احکام کو قبول کرنے کے لئے آمادہ کرتی ہے پس ان دونوں استعدادوں کے ذریعہ سابقین کو کمالیت حاصل ہوتی ہے، مفہمین میں سے لوگ ہدایت کے لئے مبعوث نہیں ہوئے وہ بھی شرائع میں سابقین میں شمار کئے جاتے ہیں۔

سابقین کے بعد اس جماعت کا درجہ ہے جن کو اصحاب الیمین کہتے ہیں، اصحاب الیمین کی بھی چند قسمیں ہیں، ایک قسم ان لوگوں کی ہے جن کے قلوب سابقین کے درجہ سے بہت قریب ہیں لیکن ان کو فطری امور کی تکمیل کی توفیق نہیں ہوئی اس لئے انھوں نے اعمال کی ارواح کو چھوڑ کر صرف اعمال کی صورتوں پر ہی اکتفا کیا لیکن ان کو ان ارواح سے بالکل بیگانگی بھی نہیں ہے اور ایک قسم اصحاب جذب کی ہے ان کے نفوس میں قوت ملکی ضعیف ہوتی ہے اور قوت بہیمی قوی ہوتی ہے اس لئے سخت سخت ریاضتوں کی ان کو توفیق ہوتی ہے اس سے ان کو وہ علوم حاصل ہو جاتے ہیں جو ملاء سافل کے لئے ہوتے ہیں، یا ان کی بہیمی قوت ضعیف ہوتی ہے اور وہ ذکر الٰہی سے تزکیۂ قلب حاصل کرتے ہیں پس ان پر جزئی الہامات، جزئی عبادات اور طہارت کا ترشح ہوتا ہے، اور ایک قسم

اہل اصطلاح کی ہے. جن کی ملکی قوت نہایت ضعیف ہوتی ہے ان لوگوں کی بہیمی طاقت اگر قوی ہے تو سخت سخت ریاضتوں میں مصروف رہتے ہیں اور اگر قوت بہیمی ضعیف ہے تو ہمیشہ وظائف میں لگے رہتے ہیں، پس ان تمام محنتوں سے ان کو کسی قسم کا انکشاف حاصل نہیں ہوتا لیکن یہ اعمال اور صورتیں جو عمدہ ملکات کی تصویر ہیں ان کے نفوس میں راسخ ہو جاتی ہیں، ان میں سے اکثر لوگوں کے عمل میں کامل اخلاص اور طبیعت وعادت کے میلان سے پورے طور پر علیحدگی شرط نہیں ہوتی ایسے لوگ صدقہ دیتے ہیں لیکن تنگ دلی اور ثواب کی امید دونوں ان کی نیت میں داخل ہوتی ہیں وہ نماز اس لئے پڑھتے ہیں کہ ان کے خاندان میں نماز پڑھنے کا طریقہ جاری ہے اور ان کو ثواب کی امید بھی رہتی ہے۔ وہ خدا تعالیٰ کے خوف سے اور لوگوں کے خوف سے زنا اور شراب خوری سے اجتناب کرتے ہیں، یا یہ لوگ مرغوبات حاصل کرنے کے قابل نہیں ہوتے اور لہو ولعب میں مال خرچ نہیں کر سکتے تو ایسے لوگوں سے اعمال قابل قبول ہوں گے بشرطیکہ ان کے قلوب اخلاص خالص کی طاقت نہ رکھتے ہوں اور ان کے نفوس نفس اعمال کے پابند رہیں نہ صرف ان کاموں کے جو کسی قدر ملکات کی شرح ہوتے ہیں، پیشتر زمانہ کی حکمت میں مندرج تھا کہ بعض صورت میں تو حیا خیر ہے اور بعض صورتوں میں حیا عاجزی اور ضعف ہے لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حیا سب صورتوں میں عمدہ شئے ہے پس نبی کا یہ فرمان ہماری مذکورہ بالا تقریر کی تائید کرتا ہے اور ان میں سے اکثر ایسے ہیں جن پر کبھی کبھی قوت ملکی کی تجلی چمک جاتی ہے لیکن ان میں اس کا ملکہ نہیں ہوتا اور نہ ہی ایسی تجلی سے وہ بالکل ناواقف ہوتے ہیں ایسے لوگ وہ ہیں جو خدا سے استغفار کرتے ہیں، برائیوں پر اپنے نفس کو ملامت کرتے ہیں اور وہ ہیں جو تنہائی میں خدا کو یاد کرتے ہیں اور ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں اور ایسے لوگ وہ ہیں جن کا نفس برائی کا پابند نہیں ہو سکتا ان کا دل پرندوں کا سا ہوتا ہے، اس وجہ سے کہ یا تو ان کی فطرت ضعیف ہوتی ہے یا قوت کو زائل کرنے والی کوئی شئے ان کے مزاج میں پیدا ہو جاتی ہے جیسے کسی کو شکم میں بیماری ہو یا مصیبتوں میں گرفتار ہو ایسے لوگوں کے مصائب ان کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتے ہیں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اصحاب الیمین کو سابقین کی دونوں خصلتوں میں سے ایک حاصل ہوتی ہے اور ایک حاصل نہیں ہوتی، اصحاب الیمین کے بعد ان لوگوں کا درجہ ہے جن کو اصحاب الاعراف

کہتے ہیں ان کی بھی دو قسمیں ہیں، ایک قسم کے تو وہ لوگ ہیں جن کے مزاج صحیح اور فطرت پاکیزہ ہے اور ان کو دعوت اسلام کی کچھ خبر نہیں ہوئی ہے یا خبر تو ہوئی ہے لیکن اس طرح سے کہ وہ ان پر حجت نہ بن سکی اور نہ ہی اس سے ان کے دلوں کا شبہ دور ہو سکا اس واسطے ان لوگوں کو خسیس ملکات اور برے اعمال میں نہ تو انہماک ہوتا ہے اور نہ ہی جناب حق کی طرف ان کی توجہ ہوتی ہے نہ اثباتا اور نہ نفیاً، یہ لوگ اپنے اکثر حالات میں دنیوی کاروبار میں مشغول رہتے ہیں پس یہ لوگ جب مریں گے تو ایک کورانہ حالت کی طرف رجوع کریں گے نہ ان کو عذاب ہوگا اور نہ ثواب، یہاں تک کہ ان کی بہیمیت محو ہو جائے اور پھر ملکی قوت کی تجلّیوں میں سے کچھ ان پر چمکیں اور دوسری قسم کے وہ لوگ ہیں جن میں عقلی مادہ کم ہے جیسے اکثر لڑکے، دیوانے، کاشتکار اور غلام، اور اکثر و بیشتر ان کے متعلق لوگوں کا یہ خیال ہوتا ہے کہ ان کو کوئی خوف نہیں اور جب رسوم کی پابندی ان میں نہ ہو تو خود محض بے عقل رہ جاتے ہیں ایسے لوگوں کے مومن ہونے میں اتنا ہی کافی ہے جتنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیاہ لونڈی کے لئے کافی سمجھا تھا، اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دریافت فرمایا، خدا کہاں ہے؟ اس نے آسمان کی جانب اشارہ کیا، ایسے لوگوں سے یہی مقصود ہوتا ہے کہ مسلمانوں سے مشابہ ہیں تاکہ کلمہ کی تفریق نہ ہو، لیکن وہ لوگ جو بری عادتوں میں زندگی بسر کرتے ہیں اور نامناسب طریقہ سے جناب حق کی طرف میلان کرتے ہیں تو ایسے لوگ اصحاب جاہلیت ہیں جن کو مختلف صورتوں سے عذاب دیا جائے گا، اصحاب اعراف کے بعد ایک اور جماعت ہے جن کو منافقین کہتے ہیں ان کا نفاق عملی ہوتا ہے، ان لوگوں کی چند قسمیں ہیں، ان منافقین میں وہ سعادت پیدا نہ ہوئی جس سے کمال مطلوب پورے طور پر حاصل ہو اس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ ان پر طبیعت کے حجاب غالب آ گئے پس وہ برے خصائل میں پڑے رہے جیسے کھانے اور عورتوں کی خواہش ہے اور کینہ ہے، ان کی طاعت نے ان کے گناہوں کو زائل نہیں کیا یا رسم کے حجاب ان پر غالب آ گئے، اس لئے رسوم جاہلیت یا بھائی بندوں یا وطنوں کو ترک کرنے کی جرأت نہ کر سکتے تھے، یا ان پر سوء معرفت اور کج فہمی کا حجاب پڑ گیا جیسے اللہ تعالیٰ کے ساتھ اوروں کو تشبیہ دینے والے یا عبادت اور استعانت میں خدا کے ساتھ اوروں کو شریک کر کے شرک خفی کرنے والے جو اس بات کے قائل ہیں کہ شرک مبغوض اس کے علاوہ کوئی اور ہے، یہ شرک ان امور میں

ہوتا ہے جن کی مذہب میں پوری تصریح نہیں اور نہ ہی ان کو بخوبی واضح اور روشن کیا گیا ان میں سے بعض لوگ ضعیف المزاج، نحیف اور کمزور عقل کے ہوتے ہیں جن کو خدا اور رسول کی محبت نے گناہوں سے باز نہ رکھا، جیسے اس شخص کا قصہ جو خدا اور رسولؐ سے دلی محبت رکھتا تھا اور شراب پیا کرتا تھا چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی محبت کی شہادت دی، اور ایک جماعت ہے جس کو فاسقین کہتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جن پر ملکات رذیلہ کی بہ نسبت برے اعمال غالب ہیں، ان فاسقین میں سے بعض میں بہیمیت بہت زیادہ ہوتی ہے وہ درندوں اور بہائم کی خواہشوں میں منہمک رہتے ہیں اور ان میں سے بعض کے مزاج فاسد ہوتے ہیں اور ان کی رائیں لغو ہوتی ہیں، وہ بہ منزلہ اس مریض کے ہوتے ہیں جو مٹی اور جلی ہوئی روٹی کھانے کو پسند کرتا ہے، پس ایسے لوگوں سے شیطانی امور سرزد ہوتے رہتے ہیں۔ فاسقین کے بعد درجہ کفار کا ہے یہ وہ متمرد اور سرکش لوگ ہیں جنھوں نے باوجود کمال عقل اور صحیح تبلیغ کے لا الہ الا اللہ کہنا بھی گوارا نہ کیا یا شریعت انبیا علیہم السلام کے پھیلانے میں باری تعالیٰ کا جو ارادہ تھا اس کی مخالفت کی پس انھوں نے لوگوں کو خدا کی راہ سے باز رکھا اور دنیوی زندگی پر قناعت کی اور دنیا کے مابعد زندگی کی کچھ پرواہ نہیں کی، ایسے لوگ ابدی لعنت اور دائمی قید میں رہیں گے، ان کفار میں سے اہل جاہلیت ہیں اور ان میں وہ منافق بھی شامل ہے جو صرف زبان سے ایمان کا اظہار کرتا ہے اور اس کا دل کفر خالص پر قائم ہے۔ واللہ اعلم۔

سترھواں باب: اس بیان میں کہ ایک ایسے مذہب کی ضرورت ہے جو اور مذاہب کا ناسخ ہو

تمام مذاہب جو روئے زمین پر موجود ہیں تم ان کی چھان بین کرو، کیا تم کو ان امور میں جن کا ہم نے گزشتہ ابواب میں ذکر کیا ہے کچھ خلاف نظر آتا ہے؟ بخدا ہرگز نہیں، بلکہ تمام مذاہب میں صاحب مذہب کی نسبت اعتقاد، صداقت اور اس کی تعظیم ہوتی ہے، اس کی نسبت یہ اعتقاد ہوتا ہے کہ وہ بڑا کامل اور بے نظیر ہے، اور اس اعتقاد کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ عبادات میں لوگ اس کے استقلال کو دیکھتے ہیں یا اس سے خلاف عادت امور کے ظہور کو دیکھتے ہیں یا اس کی دعاؤں کی مقبولیت کو دیکھتے ہیں، اور نیز مذاہب میں ایک حصہ حدود، شرائع اور تعزیرات کا ہوتا ہے جن کے بغیر مذہب کا انتظام نہیں ہو سکتا، پھر اس کے بعد ہمارے مذکورہ بالا اور ان کے مماثل امور میں سے

کچھ امور ایسے ہوتے ہیں جو عمل میں آسانی کی استطاعت پیدا کرتے ہیں۔

ہر ایک قوم کا ایک طریقہ اور شریعت ہوتی ہے جس میں ان کے بزرگوں کی عادت کا اتباع کیا جاتا ہے اور اس میں ائمہ دین اور حاملین مذہب کی روش کو پسند کیا جاتا ہے پھر اس مذہب کی بنیادوں کو اور ارکان کو نہایت مستحکم کیا جاتا ہے حتی کہ اس مذہب کے پیرو اس کی حمایت میں جنگ کرتے ہیں اور جان و مال اس کے لئے قربان کرتے ہیں، یہ جان بازیاں نہایت مضبوط تدابیر اور پختہ مصلحتوں کی وجہ سے ہوتی ہے جن کو عوام لوگ نہیں سمجھ سکتے اور جب ایک فرقہ کا مذہب جدا قرار پا جاتا ہے اور وہ اپنے طریقے مقرر کر لیتے ہیں اور اس کے مخالف امور کی اپنی زبانوں سے مدافعت کرتے ہیں اور اپنی تلواروں سے اس کے لئے مقاتلہ کرتے ہیں اور پھر ان میں اس وجہ سے بے اعتدالی پیدا ہو جاتی ہے کہ جو شخص ملت کے قیام کی صلاحیت نہیں رکھتا وہ اس کا سربراہ کار ہو جاتا ہے، یا نئے نئے طریقے اس میں خلط ملط ہو جاتے ہیں اور اس میں مل کر پوشیدہ ہو جاتے ہیں، یا حاملین ملت اشاعت مذہب میں سست ہو جاتے ہیں تو ان اسباب سے لوگ مذہب کے اکثر حصہ کو چھوڑ دیتے ہیں اور کچھ نام و نشان باقی رہ جاتا ہے جس سے حالت کا پتہ نہیں چلتا، اور ہر ایک مذہب والا اپنے مخالف مذہب کو برا بھلا کہتا ہے، اس کا انکار کرتا ہے اور اس کے خلاف قتال کرتا ہے اور حق پوشیدہ ہو جاتا ہے تب ایک ایسے کامل رہنما کی ضرورت ہوتی ہے جو تمام مذاہب سے ایسا ہی معاملہ کرے جیسا کہ ہدایت یافتہ خلیفہ ظالم بادشاہوں کے ساتھ کرتا ہے اور تم اس میں غور کرو جس کو کتاب 'الکلیلة و الدمنه' کے مترجم نے جس کا اس نے ہندی سے فارسی میں ترجمہ کیا ہے مذاہب کے خلط ملط ہونے کے متعلق ذکر کیا۔

مترجم نے قصد کیا تھا کہ درست اور صحیح بات ثابت ہو جائے لیکن سوائے قدر قلیل کے وہ اس کو نہ کر سکا، اسی طرح مورخین کے اس بیان میں غور کرو جو زمانۂ جاہلیت کے حالات اور ان کے مذاہب کی ابتری سے متعلق ہے، اس امام کو جو تمام فرقوں کو ایک مذہب پر جمع کرنا چاہتا ہے علاوہ ان اصول امامت کے جو پیشتر مذکور ہو چکے ہیں اور اصول کی بھی ضرورت پڑتی ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ لوگوں کو راہِ راست کی طرف بلائے ان کے نفوس کا تزکیہ کرے اور ان کی حالت کو درست کرے، پھر ان کو بہ منزلہ اپنے اعضا کے بنائے تا کہ ان کے ذریعہ تمام عالم میں جہاد کرے

اوران کو دنیا میں پھیلا دے۔ چنانچہ خدا کے اس قول میں یہی مراد ہے ''تم بہترین امت ہو جو لوگوں کی تکمیل کے لئے پیدا کئے گئے ہو''۔ اور یہ اس لئے ہے کہ یہ امام خود تنہا بے شمار قوموں سے جہاد نہیں کر سکتا اور جب یہ بات ہے تو ضروری ہے کہ اس کی شریعت کا مادہ تمام معتدل اقالیم کے باشندوں کے لئے اور تمام عرب وعجم کے لئے بہ منزلہ طبعی مذہب کے ہو اس کے بعد وہ مادہ شریعت اس کی قوم کے علم و ارتفاقات کے موافق ہو اور اس میں بہ نسبت دوسروں کے اس کی قوم کی حالت کا زیادہ لحاظ رکھا گیا ہو، پھر تمام لوگوں کو اس شریعت کی پیروی کا حکم دیا جائے کیونکہ یہ نہیں کہ ہر ہر قوم کی حالت کو اسی کے سپرد کر دیا جائے یا ہر زمانہ کے اماموں پر اس کو چھوڑ دیں اس لئے کہ اس سے شریعت مقررہ بے سود ہو جاتی ہے اور نہ ہی یہ ممکن ہے کہ ہر ہر قوم کے حالات و عادات دیکھ کر ہر ایک کے لئے جداگانہ شریعت مقرر کی جائے اس لئے کہ ان کی عادات اور ان کے حالات کا احاطہ کرنا باوجود ان کے شہر اور مذاہب کے اختلافات کے محال کے درجہ میں ہے۔

حالانکہ تمام نقل کرنے والوں نے صرف ایک شریعت کے نقل کرنے میں عاجز آ گئے ہیں تو مختلف شرائع کی نسبت تم کیا خیال کر سکتے ہو، اور نیز اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک مدت دراز کے بعد دوسرے لوگ شریعت کے مطیع ہوتے ہیں جس کے لئے نبی کی عمر وفا نہیں کرتی اس وقت کی موجودہ شریعتوں میں ایسا ہی ہوا ہے، یہود، نصاریٰ اور مسلمانوں کے متقدمین میں سے ایک مختصر سی جماعت ہی ایمان لائی تھی پھر اس کے بعد ان کو غلبہ حاصل ہو گیا تھا تو اس سے زیادہ عمدہ اور آسان طریقہ نہیں ہے کہ شرائع، حدود اور تدابیر میں اسی قوم کی عادت واعتبار کیا جائے جس کی طرف رسول مبعوث ہوا ہے۔ اور یہ کہ ان کے بعد دوسرے آنے والوں پر یہ کہ ان کے بعد دوسرے آنے والوں پر یہ امور بالکل تنگی کا باعث نہ ہوں گو کسی قدر ان پر تنگی رہے۔

متقدمین کے لئے تو اس شریعت کو قبول کرنا اپنی دلی شہادت اور اپنی عادات کی وجہ سے آسان ہو جاتا ہے اور متاخرین کے لئے اس شریعت کا اختیار کرنا اس مذہب کے ائمہ اور خلفا کی سیرتوں میں رغبت رکھنے کی وجہ سے سہل ہو جاتا ہے کیونکہ یہ امر ہر قوم کے لئے ہر زمانہ میں خواہ قدیم ہو یا جدید بہ منزلہ امر طبعی کے ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں تمام ممالک جو مزاج معتدل کی تولید کی صلاحیت

رکھتے ہیں دو بڑے بادشاہوں کے ماتحت تھے، ایک ان میں سے کسریٰ جو ملک عراق، یمن، خراسان اوران کے متصل ملکوں کا بادشاہ تھا اور ماوراءالنہر اور ہند کے بادشاہ اس کے محکوم تھے، ہر سال وہ کسریٰ کوخراج بھیجتے تھے اور دوسرا قیصر جوشام، روم اوران کے قرب وجوار کے ملکوں پر مسلط تھا، مصر، مغرب اور افریقہ کے بادشاہ اس کے زیر فرمان اور باج گزار(۱) تھے، اسی وجہ سے ان دونوں شہنشاہوں کی طاقت کومتزلزل کردینا اوران کے ممالک پر قبضہ کر لینا گویا تمام روئے زمین پر قبضہ کر لینا تھا، ان سلاطین کے عادات واطوار پر جوآسائش سے متعلق تھے تمام ان کے ماتحت ملکوں میں پھیل گئے تھے پس ان عادات کوتبدیل کردینا تھا اورایسی حرکات سے ان کو باز رکھنا گویا تمام ملکوں کی عادات پر تنبیہ کردینا تھا اگرچہ بعد میں ان کے امور مختلف ہو گئے۔ اور حضرت عمرؓ نے جب عجم کی لڑائیوں میں ہرمزان سے مشورہ لیا تھا توکسی قدر اس حالت کا اس نے ذکر کیا تھا۔ ان کے علاوہ اطراف دنیا جواعتدال مزاجی سے دور تھے، مصلحت کلی میں قابل اعتبار نہ تھے اسی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ’’جب تک ترک تم سے کنارہ کریں تم بھی ان سے تعرض نہ کرو اوراہل حبش جب تک تم سے نہ لڑیں تم ان سے نہ لڑو‘‘۔

حاصل یہ ہے کہ جب خداوندتعالیٰ نے ارادہ کیا کہ مذہب کی کجی کو دور کردے اور لوگوں کے لئے ایسا گروہ پیدا کردے جولوگوں کونیک امور بتلائے اور برائیوں سے روکے اور لوگوں کی خراب رسموں کو بدل ڈالے تو ایسا انتظام دونوں دولتوں کے زوال پر موقوف تھا اوران دونوں سلطنتوں کے حال پر تعرض کرنے سے بہ سہولت حاصل ہوسکتا تھا، کیونکہ انہی کی حالتیں تمام عمدہ ملکوں میں سرایت کرگئی تھیں یا سرایت کرنے کے قریب تھیں اس واسطے خدا تعالیٰ نے ان دونوں سلطنتوں کا زوال مقدر کردیا۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادیا کہ کسریٰ ہلاک ہوگیا اب کوئی کسریٰ اس کے بعد نہ ہوگا اور قیصر ہلاک ہوگیا اب کوئی قیصر اس کے بعد نہ ہوگا اوراس حق کو نازل کیا جوتمام دنیا کی بیہودگی کو دور کرے اس طور سے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے ذریعہ عرب کی اصلاح کی گئی، اورعرب کے ذریعہ ان دونوں سلطنتوں کی بیہودگی رفع کی جائے اور پھران دونوں کے ذریعہ سے

(۱)اس وقت کی یوروپ کی سلطنتیں جیسے فرانس، انگلینڈ، جرمنی، اٹلی وغیرہ بہت چھوٹی چھوٹی سلطنتیں تھیں اوراکثر قیصر کے ماتحت رہا کرتی تھیں۔

تمام عالم کو دروغ اور ناراسی سے پاک صاف کر دیا جائے۔ اور امام کے لئے جن اصول کی ضرورت پڑتی ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ خلافت عامہ کا بھی انتظام کرتا رہے اور اپنے بعد خلفا اپنے ہی اہل شہر اور قوم میں سے مقرر کرے جن کا نشو ونما انہیں عادات اور طریقوں پر ہوا ہے کیونکہ آنکھیں سیاہ کرنا سرمہ لگانے کے مانند(۱) نہیں، اور لوگوں میں خاندانی حمیت اور غیرت کے ساتھ مذہبی حمیت بھی ہوتی ہے اور ان کی شان اور رتبہ کی بلندی صاحب مذہب کی شان اور اس کے مرتبہ کی بلندی سمجھی جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''امام خاندن قریش سے ہونے چاہئیں'' امام ہمیشہ خلفا کو دین کے قائم کرنے اور شائع کرنے کی ہدایت کرتا رہے، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے۔ تمہارا دین پر باقی رہنا اس وقت تک ہے جب تک تمہارے ائمہ تمہارے ساتھ ٹھیک پیش آتے رہیں۔

اور ان اصولوں میں سے یہ بھی ہے کہ امام اپنے مذہب کو سب مذاہب پر غالب کرے اور کسی شخص کو ایسا نہ چھوڑے جس پر دین غالب نہ ہو جائے خواہ اس میں کسی کی عزت ہو یا ذلت، پس لوگ تین درجہ کے ہو جائیں گے ایک وہ جو ظاہراً و باطناً دین کے فرمان بردار ہوں گے، دوسرے وہ جو مجبوراً ظاہر میں اس کی اطاعت کریں گے اور اس کی مخالفت نہ کر سکیں گے، تیسرے کفار ذلیل، جن کو کھیتی کاٹنے اناج نکالنے اور تمام کاموں میں امام اسی طرح مسخر اور ذلیل بنا کر رکھے گا جیسے چار پائے، کھیتی اور بوجھ لادنے کے کام میں آتے ہیں، اور ایسے لوگوں پر ذلت کی کوئی بات ضرور مقرر کی جائے گی اور ان سے بہ حالت ذلت جزیہ وصول کیا جائے گا۔

دوسرے مذاہب پر ایک دین کے غالب آ جانے کے چند اسباب ہوتے ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ تمام مذاہب کے شعاروں پر اپنے مذہب کے شعار کا اعلان کرے، اور مذہبی شعار ایک امر ظاہری ہوتا ہے جو اس مذہب کے ساتھ خاص ہوتا ہے اسی کی وجہ سے یہ مذہب والا دوسرے مذاہب سے ممتاز ہوتا ہے مثلاً ختنہ، مسجدوں کی تعظیم، اذان، جمعہ اور جماعات اور ان اسباب میں سے ایک یہ ہے کہ صاحب مذہب اور لوگوں کو تمام ادیان کے شعائر عمل میں لانے سے روک دے اور ان اسباب میں سے ایک یہ ہے کہ قصاص، میں دیتوں میں، نکاحوں میں،

---

(۱) یعنی اصل اور نقل میں بڑا فرق ہوا کرتا ہے۔

ریاستوں کے انتظام میں کافروں کو مسلمانوں کے ہمسر نہ کرے تاکہ یہ امور ان کو ایمان پر مجبور کریں۔

اور ان اسباب میں سے ایک یہ ہے کہ لوگوں کو نیکی اور بدی کے اعمال ظاہری کی تکلیف دے اور لوگوں پر ان اعمال کی سخت پابندی کرادے۔ اور ان کی ارواح کی طرف زیادہ اشارہ نہ کرے اور شریعت کی کسی بات میں ان کو خود مختار نہ کرے، شرائع کے علم اسرار کو جو تفصیلی احکام کا ماخذ ہے عام لوگوں سے مخفی رکھے جس کا پتہ راسخ العلم ہی لگا سکے اس واسطے کہ اکثر مکلفین نہ تو ان مصالح کو معلوم کر سکتے ہیں اور نہ ہی ان کی معرفت کی استطاعت ان کو حاصل ہو سکتی ہے جب تک کہ ان مصالح کے قواعد منضبط نہ کر دیئے جائیں اور وہ بہ منزلہ محسوسات کے ہو جائیں کہ ہر حاصل کرنے والا ان کو حاصل کر سکے پس اگر کسی امر کے چھوڑنے کی ان کو اجازت دے دی جائے یا ان کو یہ بتلا دیا جائے کہ مقصود اصلی ان ظاہری اعمال کے سوا کوئی اور امر ہے تو ان کے واسطے غور کرنے کے مواقع وسیع ہو جائیں گے اور وہ نہایت سخت اختلاف میں مبتلا ہو جائیں گے اور لوگوں کے متعلق خدا تعالیٰ کا جو مقصود ہے وہ حاصل نہ ہو سکے گا۔ واللہ اعلم۔

من جملہ ان اسباب کے یہ ہے کہ تلوار کے ذریعہ محض غلبہ پانے سے لوگوں کے دلوں کے شبہات دور نہیں ہو سکتے پس احتمال رہتا ہے کہ کچھ عرصہ بعد پھر وہ کفر کی طرف رجوع کر جائیں۔ اس واسطے امام کے لئے ضروری ہے کہ یقینی اور قطعی دلائل کے ذریعہ یا خطابی امور کے ذریعہ جو عام لوگوں کے اذہان میں مفید ہوں یہ ثابت کر دے کہ اور مذاہب اتباع کے قابل نہیں ہیں اس لئے کہ وہ کسی معصوم شخص سے منقول نہیں ہیں یا وہ قواعد ملت کے مطابق نہیں ہیں یا ان میں تحریف اور تبدیلی واقع ہو گئی ہے، اور بعض امور بے موقع ہیں اور سب لوگوں کے سامنے دین اسلام کی صحت اور اس کے مرجحات کو صاف صاف بیان کر دے کہ یہ دین آسان اور صاف ہے اور اس کے احکام واضح ہیں جن کی خوبیاں عقل معلوم کر سکتی ہے اور اس کی رات بہ منزلہ دن کے ہے(۱)، اور اس کے طریقے اماموں کو زیادہ نافع ہیں اور انبیاء سابقین کی سیرت میں سے جو امور لوگوں میں باقی ہیں ان کے ساتھ یہ دین زیادہ مشابہ ہے اور اسی جیسی تفاصیل امام کو واضح کرنا چاہئے۔ واللہ اعلم۔

---

(۱) یعنی دین اسلام میں مشتبہ امر بھی بالکل واضح ہے۔

اٹھارھواں باب: دین کو تحریف سے محفوظ اور مضبوط کرنے کا بیان

اس شخص کے لئے جو نہایت بڑے انتظام کا مالک ہے خدا کی طرف سے ایسے دین کو لاتا ہے جو تمام مذاہب کا ناسخ ہے، یہ امر ضروری ہے کہ وہ اپنے مذہب کو اس طرح پختہ کرے کہ کسی قسم کی تحریف کا اس تک گزر نہ ہو سکے اور یہ اس لئے کہ یہ شخص متفرق جماعتوں کو شامل کرتا ہے جن کی استعدادیں اور اغراض مختلف ہوا کرتی ہیں، پس بسا اوقات ان کی ہوائے نفسانی یا اس مذہب کی الفت جس میں وہ پہلے رہ چکے ہیں، یا قصور فہم کہ کسی شئے کو وہ سمجھ لیتے ہیں اور اس کی اکثر مصلحتیں ان کو معلوم نہیں ہوتیں یہ امور ان کو آمادہ کرتے ہیں کہ مذہب کے منصوص مسائل میں فروگزاشت کریں، یا جو چیزیں اس مذہب میں شامل نہیں ہیں ان کو مندرج کر دیں اس لئے اس مذہب میں خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں جیسا کہ گزشتہ مذاہب میں ایسا ہی ہوا ہے اور جبکہ خرابیوں کے تمام طریقوں کا ضبط کرنا ناممکن تھا کیونکہ وہ حصر میں نہیں آسکتے اور نہ ہی ان کی تعیین ہو سکتی ہے اور یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ جو بتمامہ حاصل نہ ہو وہ بالکل چھوڑا بھی نہ جائے تو یہ ضروری ہے کہ اجمالی طور پر تحریف کے اسباب سے ان کو خوب متنبہ کر دے اور ان مسائل کو متعین کر دے جن میں ظن اور تخمین سے یہ معلوم ہو گیا ہے کہ ان میں سستی اور تحریف کرنا بنی آدم میں ایک استمراری بیماری ہے، پس ان میں فساد کے راستے کو نہایت اہتمام سے بند کر دے اور ایک ایسی شئے کو مشروع قرار دے جو تمام مذاہب فاسدہ کے مالوف کے خلاف ہو ایسے امر میں جو لوگوں کے نزدیک سب سے زیادہ مشہور ہو جیسا کہ مثلاً نمازیں ہیں۔ من جملہ باب تحریف کے ایک سستی ہے اور اس سستی کی حقیقت یہ ہے کہ حواریوں کے بعد ایسے ناخلف پیدا ہو جاتے ہیں جو نمازوں کو تباہ کرتے ہیں اور اپنی خواہشوں کا اتباع کرتے ہیں، درس و تدریس اور عمل کے ذریعہ اشاعت دین میں کچھ بھی سعی نہیں کرتے نہ وہ لوگوں کو نیکی کی تعلیم کرتے ہیں اور نہ برائی سے ان کو روکتے ہیں اسی واسطے بہت جلد مذہب کے خلاف رسمیں قائم ہو جاتی ہیں اور لوگوں کی طبیعتیں ان امور کی طرف ہو جاتی ہیں جو شرائع کے خلاف ہوتے ہیں، ان کے بعد اور ناخلف پیدا ہوتے ہیں جو سستی میں ان سے بھی بڑھ کر ہوتے ہیں یہاں تک کہ علم مذہب کا بڑا حصہ بھلا دیا جاتا ہے، بزرگان قوم اور روٴسا کی سستی لوگوں کے حق میں زیادہ ضرر رساں اور باعث فساد ہوتی ہے اسی سبب سے حضرت نوح اور حضرت ابراہیم علیہما

السلام کا مذہب نیست و نابود ہوگیا اور اب لوگوں میں سے کوئی بھی ان مذاہب کی اصل حالت کو جاننے والا نہ رہا، اور سستی کے اسباب کے چند امور ہیں۔

از آں جملہ صاحب مذہب سے مذہبی امور کا نقل نہ کرنا اور ان پر عمل نہ کرنا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث میں یہی مراد ہے "ہوشیار رہو جاؤ عنقریب ایسا ہوگا کہ پیٹ بھرا آدمی اپنی مسند پر بیٹھ کر یہ کہے گا۔ اس قرآن کو مضبوطی سے لو پس جو چیزیں تم قرآن میں حلال پاؤ ان کو حلال سمجھو اور جو حرام پاؤ، ان کو حرام سمجھو، حالانکہ جو شئے رسول اللہ نے حرام کی ہے وہ ویسی ہی حرام جیسی خدا تعالیٰ نے حرام کی ہے"۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "خدا تعالیٰ علم کو لوگوں کے دلوں سے بھلا کر دور نہ کرے گا بلکہ علما کو ختم کر کے علم کو چھین لے گا یہاں تک کہ جب کوئی عالم ہی باقی نہ رکھے گا تو لوگ جاہلوں کو سردار بنالیں گے، لوگ ان سے مسائل دریافت کریں گے وہ بغیر علم کے فتویٰ دیں گے اس لئے خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے"۔

اور سستی کے اسباب میں سے ایک سبب اغراض فاسدہ ہیں جن کی خاطر لوگ جھوٹی تاویلیں کرتے ہیں جیسے بادشاہوں کی خوشنودی کی خاطر ان کی خواہش نفسانی پورا کرنے کے لئے لوگ ایسا کرتے ہیں، خدا تعالیٰ فرماتا ہے جو لوگ کتاب الٰہی کے احکام کو جو منزل من اللہ ہیں چھپاتے ہیں اور ان کے عوض کچھ قیمت لے لیتے ہیں وہ اپنے شکموں میں آگ کو کھاتے ہیں"۔ اور ان اسباب میں سے ایک سبب یہ ہے کہ لوگوں میں برائیاں پھیل جاتی ہیں اور علما ان سے لوگوں کو باز نہیں رکھتے اس آیت میں اسی طرف اشارہ ہے "پس تم سے پہلی نسلوں میں سے اہل فضل زمین میں فساد پیدا کرنے سے منع کرنے والے کیوں نہ ہوئے سوائے ان چند لوگوں کے جن کو ان میں سے ہم نے بچالیا اور ظالم اسی چیز کے پیچھے پڑے جس میں ان کو فارغ البالی دی گئی تھی اور وہ مجرم بن گئے"۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "جب بنی اسرائیل گناہوں میں مبتلا ہوگئے تو ان کے علما نے ان کو روکا لیکن وہ باز نہ آئے پس علما بھی ان کی مجلسوں میں شریک ہونے لگے اور ان کے ساتھ کھانے پینے لگے تو خدا نے سب کے دل یکساں کر دیئے اور حضرت داؤد و حضرت عیسیٰ علیہما السلام کی زبان سے ان پر لعنت کی، یہ لعنت ان کی نافرمانی اور حد سے تجاوز کرنے کی وجہ سے ہوئی اور تحریف کے اسباب میں سے ایک سبب تعمق ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ شارع

کسی شئے کا حکم کرتا ہے اور کسی چیز سے ممانعت کرتا ہے پس اس کی امت کا کوئی شخص اس کو سنتا ہے اور اپنے ذہن کے موافق اس کو سمجھتا ہے پس وہ اس حکم کو ان امور میں تجویز کرتا ہے جو کسی وجہ سے اصل شئے کے مشابہ ہوتے ہیں یا ان میں اس حکم شرعی کی علت کے بعض اجزا پائے جاتے ہیں۔ یا شارع کے حکم کو اس شئے کے اجزا میں یا اس کے محتمل مواقع یا اس کے اسباب میں بھی تجویز کرتا ہے اور روایتوں کے تعارض کی وجہ سے جب اس کو کسی امر میں شبہ ہو جاتا ہے تو وہ نہایت اشد کام کی پابندی کرتا ہے اور اس کو واجب قرار دیتا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام افعال کو عبادت پر محمول کرتا ہے حالانکہ حق بات یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سے کام حسب عادت بھی کئے ہیں۔

پس اس کا یہی خیال رہتا ہے کہ امر اور نہی ان امور عادیہ کو بھی شامل ہیں اور وہ بآواز بلند یہ کہنے لگتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے اس کا حکم دیا ہے اور اس شئے سے منع کیا ہے۔ مثلاً شارع نے جب نفس کو مغلوب کرنے کے لئے روزہ کو مقرر کیا اور روزہ کی حالت میں جماع سے روکا تو بعض لوگوں نے سحر کا کھانا خلاف مشروع اور ناجائز سمجھ لیا اس لئے کہ وہ نفس کی مغلوبیت کے خلاف ہے اور روزہ کی حالت میں بیوی کا بوسہ لینا بھی حرام سمجھ لیا اس لئے کہ بوسہ لینا ہم بستری کے اسباب میں سے ہے اور اس لئے کہ نفس کی شہوت پورا کرنے میں بوسہ لینا ہم بستری کے مشابہ ہے۔ پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قول کی خرابی بیان فرمادی اور واضح کر دیا کہ یہ دین میں تحریف ہے۔

اور تحریف کے اسباب میں سے ایک تشدد ہے اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ جن شاق امور کا شارع نے حکم نہیں دیا ہے ان کی پابندی کی جائے مثلاً ہمیشہ روزہ رکھنا تمام رات نماز پڑھنا دنیا سے آزاد رہنا اور شادی نہ کرنا اور واجبات دین کی مانند مستحبات اور سنن کی پابندی کرنا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عثمان بن مظعون کو جبکہ انھوں نے نہایت سخت سخت عبادات کی پابندی کا قصد کیا تھا منع کرتے ہوئے فرمایا جس نے مذہبی امور میں زیادہ تعمق کیا ہے دین اس پر غالب آ گیا ہے اور جب ایسا سخت اور پابند آدمی کسی فرقہ کا معلم اور رئیس ہو جاتا ہے تو لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ یہ شرع کا حکم اور شارع کی مرضی سے ہے۔ یہود و نصاریٰ کے راہبوں میں یہی بیماری تھی۔ تحریف کے اسباب میں سے استحسان بھی ہے اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی

شخص شارع کو ہر حکم کے لئے مناسب موقع تجویز کرتے ہوئے دیکھتا ہے اور امور شرعی کو منضبط کرتے ہوئے پاتا ہے تو امور شرعی کے بعض بعض اسرار جن کو ہم ذکر کر چکے ہیں معلوم کر لیتا ہے اور اپنے نزدیک مصلحت سمجھ کر لوگوں کے لئے احکام جاری کرتا ہے جیسا کہ یہود نے جب دیکھا کہ شارع نے حدود کا اس لئے حکم دیا ہے کہ لوگ گناہوں سے باز رہیں اور ان کی اصلاح ہو جائے اور پھر خیال کیا کہ رجم سے اختلاف اور جنگ وجدال پیدا ہوتا ہے اور اس میں اور زیادہ فساد کا اندیشہ ہے تو انھوں نے زانی کا منہ سیاہ کرنا اور تازیانے مارنا اختیار کر لیا پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادیا کہ یہ مذہب میں تحریف ہے اور توریت کے حکم منصوص کے بالکل مخالف ہے حضرت ابن سیرینؒ سے منقول ہے کہ سب سے پہلے ابلیس نے قیاس کیا ہے اور سورج اور چاند کی عبادت قیاس کی وجہ سے ہوئی ہے اور حضرت حسنؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے یہ آیت پڑھی خلقتنی من نار و خلقته من طین مجھ کو تو نے آگ سے پیدا کیا تھا اور آدم کو مٹی سے اور فرمایا کہ ابلیس نے یہ قیاس کیا تھا اور سب سے پہلے ابلیس نے ہی قیاس کیا تھا۔ اور امام شعبی فرماتے ہیں کہ واللہ اگر تم قیاسوں پر عمل درآمد کرو گے تو حلال کو حرام اور حرام کو حلال کر لو گے اور حضرت معاذ بن جبل سے منقول ہے کہ قرآن لوگوں پر کشادہ ہو جائے گا یہاں تک کہ عورت، بچہ اور آدمی سب اس کو پڑھا کریں گے پس ایک شخص کہے گا کہ میں قرآن پڑھا لیکن لوگ میرے مطیع نہ ہوئے، واللہ میں اس پر خوب عمل کروں گا تاکہ لوگ میرے تابع ہو جائیں پس وہ ان میں رہ کر عمل کرے گا لیکن لوگ اس کے تابع نہ ہوں گے، پس وہ کہے گا میں نے قرآن پڑھا اور لوگ میرے تابع نہ ہوئے میں نے ان میں رہ کر عمل کیا پھر بھی وہ میرے تابع نہ ہوئے اب میں اپنے گھر میں ایک مسجد بناؤں گا تاکہ لوگ تابع ہوں پس وہ مسجد بنا کر بیٹھے گا تب بھی لوگ اس کی پیروی نہ کریں گے پھر وہ کہے گا میں نے قرآن پڑھا لیکن لوگ میرے تابع نہ ہوئے اس پر میں نے عمل کیا تب بھی کسی نے پیروی نہ کی، میں مسجد بنا کے بیٹھا تب بھی کوئی تابع نہ ہو، واللہ اب میں ان کو ایسی حدیث بنا کر سناؤں گا جو نہ قرآن میں ہوگی اور نہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہوگی، اس سے شاید کوئی میرا مطیع ہو جائے، اس کے بعد حضرت معاذ نے فرمایا اے لوگو! تم ایسی باتوں سے بچنا جن کو یہ شخص بیان کرے، یہ چیزیں جن کو وہ بیان کرے گا سرتاپا گمراہی ہوں گی، حضرت عمرؓ سے روایت

ہے کہ عالم کی لغزش، منافق کا کتاب الٰہی کے ساتھ جھگڑنا، گمراہ اماموں کا حکم اسلام کو منہدم کر دیتا ہے، اور سب امور سے وہی مراد ہیں جو کتاب الٰہی اور سنت رسول اللہ سے مستنبط نہ ہوں۔

اور اسباب تحریف میں سے اجماع کی پیروی ہے اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ حاملین دین کا ایک فرقہ جن کی نسبت عام لوگوں کا یہ گمان ہو کہ ان کی رائے اکثر یا ہمیشہ درست ہوتی ہے کسی امر پر اتفاق کر لے اور اس اتفاق سے یہ خیال کیا جائے کہ ثبوت حکم کے لئے یہ اتفاق قطعی دلیل ہے اور یہ اجماع ایسے امر میں ہے جس کی قرآن و حدیث میں کچھ اصل نہیں ہے، یہ اجماع اس اجمال کے علاوہ ہے جس پر امت کا اتفاق ہے کیونکہ سب کے سب لوگ ایسے اجماع پر متفق ہیں جس کی سند قرآن و حدیث میں ہو یا ان دونوں میں سے کسی نہ کسی سے مستنبط ہو اور لوگوں نے ایسے اجماع کو جائز قرار نہیں دیا جس کی سند قرآن و حدیث میں کوئی بھی نہیں، چنانچہ اس قول الٰہی میں اسی طرف اشارہ ہے۔ اور جب کفار سے کہا جاتا ہے کہ ان چیزوں پر ایمان لے آؤ جو خدا تعالیٰ نے نازل کی ہیں تو وہ یہی جواب دیتے ہیں کہ ہم تو ان ہی باتوں کی پیروی کریں گے جن پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے'' الایۃ۔ اور یہودیوں کی دلیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضور علیہ السلام کی نبوت کے انکار کرنے میں یہی تھی کہ ان کے بزرگوں نے حضرت عیسیٰ اور محمدؐ کے حالات کی چھان بین کی لیکن انبیا کے شرائط ان میں نہیں پائے عیسائیوں کے بہت سے احکام توریت و انجیل کے بالکل خلاف ہیں۔ ان کے بزرگوں کا صرف اجماع ہی ان کی دلیل ہے اور اسباب تحریف میں سے غیر معصوم کی تقلید ہے، یعنی نبی جس کی عصمت ثابت ہے اس کے علاوہ کسی اور کی تقلید کی جائے اس تقلید کی حقیقت یہ ہے کہ علما امت میں سے کوئی شخص کسی مسئلہ اجتہاد کرے اور کسی عالم کے پیرو یہ خیال کریں کہ یہ اجتہاد بالکل صحیح ہے اور اس کے مقابلہ میں حدیث صحیح کو بھی رد کر دیں، اس قسم کی تقلید اس تقلید کے مخالف ہے جس پر امت مرحومہ نے اتفاق کیا ہے اس لئے کہ سب کا اتفاق ہے کہ مجتہدین کی تقلید جائز ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی جاننا چاہئے کہ مجتہد سے خطا اور صواب دونوں سرزد ہوتے ہیں اور ہر مسئلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منصوص حکم پر نظر رکھنی چاہئے اور یہ عزم ہونا چاہئے کہ جب امر تقلیدی کے خلاف کوئی حدیث صحیح ظاہر ہو جائے تو تقلید کو ترک کر دیا جائے گا اور حدیث کا اتباع کیا جائے گا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی تفسیر میں

(یہودیوں نے اپنے عالموں اور راہبوں کو بجز خدا کے اپنا رب قرار دیا) فرمایا کہ یہودی ان علما اور راہبوں کی پرستش نہیں کرتے تھے بلکہ ان کے علما جس کو حلال کہتے وہ اس کو حلال سمجھتے اور جس کو حرام کہہ دیتے اس کو حرام جانتے تھے۔

اسباب تحریف میں سے ایک مذہب کو دوسرے میں خلط ملط کر دینا بھی ہے یہاں تک کہ ایک دوسرے میں تمیز باقی نہ رہے اور یہ اختلاط اس طرح ہوتا ہے کہ جب انسان کسی مذہب کا پابند ہوتا ہے تو اس کا دلی تعلق اس مذہب کے علوم سے ہوتا ہے پھر یہ شخص مذہب اسلام میں داخل ہو جاتا ہے لیکن اس کا قلبی میلان انہی امور کی جانب باقی رہتا ہے جن کے ساتھ اس کا پہلا تعلق تھا اس واسطے ان امور کے جواز کے لئے ملت اسلام میں کوئی وجہ تلاش کرتا ہے خواہ ضعیف یا موضوع ہی کیوں نہ ہو، اور بسا اوقات اس وجہ کی خاطر جھوٹی حدیث بناتا ہے اور روایت کرتا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول میں یہی مراد ہے کہ "بنی اسرائیل کا معاملہ درست رہا حتی کہ ان میں مخلوط النسل لوگ اور قیدیوں کی اولاد پیدا ہوئی تب انھوں نے رائے سے کہنا شروع کیا وہ خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا۔

اور من جملہ ان چیزوں کے جو ہمارے دین میں داخل ہو گئی ہیں بنی اسرائیل کے علوم اور زمانہ جاہلیت کے خطبا کے وعظ و پند ہیں، یونانیوں کا فلسفہ اور اہل بابل کے وظائف ہیں، اہل فارس کی تاریخ، علوم نجوم و رمل اور علم کلام ہے اور جناب رسول اللہ کے ناراض ہونے کا سبب یہی تھا جس وقت آپ کے سامنے توریت کا ایک نسخہ پڑھا گیا اور یہی راز تھا حضرت عمرؓ کے مارنے میں اس شخص کو جو حضرت دانیال کی کتابیں تلاش کرتا تھا، واللہ اعلم۔

انیسواں باب: ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مذہب اور یہود و نصاریٰ کے مذہب کے مختلف ہونے کے اسباب کا بیان

واضح ہو کہ جب خدا تعالیٰ کسی قوم میں رسول بھیجتا ہے تو پیغمبر اپنی زبان میں لوگوں کے لئے اس مذہب کو قائم کرتا ہے پس وہ نبی اس میں کسی قسم کی کجی باقی نہیں رکھتا پھر مذہبی روایتیں اس سے منتقل ہوتی ہیں اور اس پیغمبر کے حواری ایک مدت تک مناسب حالت میں ان روایتوں کے حامل ہوتے ہیں پھر ان حواریوں کے بعد ایسے ناخلف لوگ پیدا ہوتے ہیں جو دین میں تحریف اور

سستی کرتے ہیں اس لئے وہ دین حق خالص نہیں رہتا بلکہ اس میں جھوٹ کی آمیزش ہوتی ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اس حدیث میں اسی طرف اشارہ ہے ''خدا تعالیٰ نے جب کبھی کوئی نبی بھیجا ہے تو اس کی امت میں سے حواری اور ایسے لوگ پیدا کئے ہیں جو اس کے طریقے کی پیروی اور اس کے حکم کی فرمانبرداری کرتے ہیں، پھر ان حواریوں کے بعد ایسے ناخواندہ اور ہوتے ہیں جو کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ ہیں اور احکام الہٰی کے خلاف اعمال کے مرتکب ہوتے ہیں'' یہ باطل امور جن کی نذر میں آمیزش ہو جاتی ہے ان میں سے ایک حصہ تو شرک جلی اور صریح تحریف کا ہے جو ہر حالت میں مواخذہ کے قابل ہے۔ اور ایک حصہ شرک خفی اور مخفی تحریف کا ہے جس پر خدا تعالیٰ اس وقت مواخذہ کرتا ہے کہ رسول کو بھیج چکا ہوتا ہے تاکہ وہ رسول ہر شئے کی دلیل قوی ان کے سامنے پیش کر دے اور ہر قسم کا شبہ دور کر دے، اب جو کوئی زندگی چاہے یا ہلاکت اختیار کرے تو دیدہ ودانستہ کرے جب کوئی پیغمبر لوگوں میں مبعوث ہوتا ہے تو ہر شئے کو اس کی اصل حالت کی طرف پھیر لاتا ہے وہ پہلی شریعت کے احکام میں غور و نظر کرتا ہے پس ان میں جو امور شعائر اللہ ہوتے ہیں جن میں شرک کی آمیزش نہیں ہوتی یا عبادات کے طریقے یا انتظامی امور کے طریقے جو مذہبی قوانین کے مطابق ہوتے ہیں ان سب کو وہ باقی رکھتا ہے اور جو نابود ہو جاتے ہیں ان کا مہتم بالشان ہونا بتاتا ہے اور ہر شئے کے ارکان واسباب بیان کرتا ہے اور جو تحریف اور سستی کے امور ہوتے ہیں ان کو دور کرتا ہے اور بتلا دیتا ہے کہ یہ باتیں مذہب میں سے نہیں ہیں اور جو احکام اس زمانہ کی مصلحتوں پر مبنی تھے پھر اختلاف عادات کی وجہ سے وہ مواقع مصلحت بدل گئے تو ان احکام کو نبی بدل دیتا ہے کیونکہ احکام کے مشروع کرنے سے مقصود اصلی مصلحتیں ہی ہیں اور مظان کو ان کے عنوان کے طور پر ذکر کر دیا جاتا ہے اور بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک شئے کسی مصلحت کا مظنہ ہوتی ہے اور بعد میں اس مصلحت کا مظنہ نہیں رہتی، مثلاً اصل میں بخار کا سبب خلطوں کی ہیجان ہے پس طبیعت اس ہیجان کا ایک مظنہ مقرر کرتا ہے جس کی طرف وہ بخار کی نسبت کرتا ہے جیسا کہ دھوپ میں چلنا اور سخت حرکت کرنا اور کسی خاص غذا کا کھا لینا ہیجان کا مظنہ ہیں اور ہو سکتا ہے کہ یہ چیزیں ہیجان کا مظنہ نہ رہیں پس اسی کے لحاظ سے احکام بھی بدل جاتے ہیں اور جو امور ایسے ہیں جن پر ملاء اعلیٰ کا اتفاق اور اجماع ہو گیا ہے جو ان کے اعمال، عادات، علوم اور نفسانی حالت میں

داخل ہیں تو ان امور کو نبی اور زیادہ کر دیتا ہے اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پیشتر کے انبیا چند باتیں زیادہ ہی کر دیا کرتے تھے کچھ کم نہیں کرتے تھے اور بہت ہی کم تبدیلی کرتے تھے پس حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت نوح علیہ السلام کے مذہب پر چند عبادتیں، اعمال فطری اور ختنہ کو بڑھا دیا تھا، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مذہب پر چند امور اور زیادہ کر دیئے جیسے اونٹ کے گوشت کو حرام کر دیا اور ہفتہ کے دن کو ضروری قرار دیا اور زانیوں کے لئے سنگسار کرنا قرار دیا اور اسی طرح کے اور امور تھے، اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے زیادتی بھی کی، کمی بھی کی ہے اور تبدیلی بھی کی ہے، دقائق شریعت میں خوض کرنے والا جب اس زیادتی، کمی اور تبدیلی کی چھان بین کرے گا تو ان کی چند وجوہات پائے گا۔

ان میں سے ایک یہ ہے کہ یہودی مذہب احبار اور راہبوں کے ہاتھ میں رہا پھر انھوں نے ان طریقوں کے ذریعہ تحریفات کیں جن کا پیشتر ذکر ہو چکا ہے، پس جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم آئے تو آپ نے ہر چیز کو اصلی حالت کے موافق کر دیا اس واسطے شریعت محمد یہ اس یہودیت سے مختلف ہوگئی جو یہود کے ہاتھ میں تھی پس اس لئے یہود کہنے لگے کہ اس شریعت میں زیادتی، کمی اور تبدیلی ہے حالانکہ حقیقت میں کوئی تبدیلی نہ تھی۔

اور ان میں سے ایک یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت میں ایک دوسری بعثت شامل تھی ایک بعثت تو یہ ہے کہ آپ بنی اسمٰعیل کی طرف مبعوث ہوئے چنانچہ خدا تعالیٰ کے اس قول میں یہی مراد ہے ”خدا ہی نے امیوں کے لئے ان میں ہی سے ایک شخص کو پیدا کیا“۔ اور خدا تعالیٰ کا ارشاد ہے ”تا کہ تو ان لوگوں کو ڈرائے جن کے آباواجداد نہیں ڈرائے گئے تھے اسی لئے وہ غفلت میں ہیں“۔ اس بعثت کے لئے ضروری ہے کہ شریعت محمدیہ کا مادہ وہی شعائر ہوں، وہی عبادات کے طریقے ہوں اور وہی انتظامی امور ہوں جو بنی اسمٰعیل کے پاس موجود تھے اس لئے کہ شریعت لوگوں کے امور متعارف کی اصلاح کیا کرتی ہے نہ کہ ان کو ایسے امور کا مکلف کرتے جن کو وہ جانتے بھی نہ ہوں، اور اس کی نظیر یہ قول الٰہی ہے ”ہم نے قرآن عربی زبان میں نازل کیا ہے شاید تم اس کو سمجھو“۔ اور یہ قول الٰہی ہے۔ ”اگر ہم قرآن کو عجمی زبان میں نازل کرتے تو لوگ کہتے اس کی آیتیں جدا جدا مفصل کیوں نہ کی گئیں کیا یہ عجمی بھی ہے اور عربی بھی“۔ اور یہ قول الٰہی ہے

''ہم نے جو نبی بھیجا ہے اسی قوم کی زبان والا بھیجا ہے''۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری بعثت یہ ہے کہ آپ تمام اہل زمین کے لئے پیغمبر ہیں اس بعثت میں وہ علوم اور تدابیر مندرج ہیں جو تمدن سے متعلق ہیں اور اسی وجہ سے خدا تعالیٰ نے آپ کے زمانہ میں تمام قوموں پر لعنت کی اور ان کی سلطنت کے زوال کو مقدر کیا جیسا کہ عجم اور روم کے ساتھ ہوا اور حکم کیا کہ انتظام دنیوی کے آئین کا قیام ہو، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو درجہ اور غلبہ کو امر مقصود کے اتمام کا ذریعہ قرار دیا اور ان سلاطین کے خزانوں کی کنجیاں آپ کو عطا کیں پس اس کمالیت کی وجہ سے احکام توریت کے علاوہ اور احکام بھی آپ کو حاصل ہوئے مثلاً خراج، جزیہ مجاہدات، اسباب تحریف سے احتیاط وغیرہ۔

اور ان میں سے ایک یہ ہے کہ آپ ایسے انقطاع وحی کے زمانہ میں پیدا ہوئے جس میں تمام مذاہب حقہ محو ہو گئے تھے اور ان میں تحریف ہو چکی تھی اور تعصب واصرار نے لوگوں کو دبا لیا تھا پس وہ اپنے طریقہ باطل اور عادات جاہلیت کو ترک نہیں کر سکتے تھے تاوقتیکہ ان عادات کی سخت مخالفت نہ کی جاتی، پس یہ چیز بھی کثیر اختلافات کا باعث ہوئی۔

بیسواں باب: اسباب نسخ کا بیان

نسخ کے باب میں اصل خدا تعالیٰ کا یہ فرمان ہے ''ہم کوئی آیت منسوخ نہیں کرتے نہ اس کو بھلاتے ہیں مگر اس کے بدلہ میں اس سے بھی بہتر یا ویسی ہی لاتے ہیں''۔

واضح ہو کہ نسخ کی دو قسمیں ہیں ایک یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم انتظامات یا عبادات کے طریقوں پر غور وفکر کر کے ان کو شریعت کے قوانین کے موافق منضبط کرتے ہیں اور یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اجتہاد ہے لیکن خدا تعالیٰ آپ کو اس اجتہاد پر قائم نہیں رکھتا بلکہ اس مسئلہ میں جو اصلی حکم ہے اس کو آپ پر ظاہر کر دیتا ہے۔ اس حکم کا اظہار یا تو یوں کرتا ہے کہ اس کے موافق قرآن نازل فرماتا ہے یا اس طرح پر کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اجتہاد ہی اس حکم کی طرف تبدیل ہو جاتا ہے اور دوسرا اجتہاد آپ کے ذہن میں قرار پا جاتا ہے، پہلی صورت کی مثال یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز میں بیت المقدس کی طرف منہ کرنے کا حکم دیا تھا پھر قرآن میں اس حکم کی منسوخیت نازل ہوئی اور دوسری صورت کی مثال یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سوائے چھاگل کے ہر برتن میں نبیذ بنانے سے منع کر دیا تھا پھر ہر برتن میں نبیذ بنانا لوگوں کے لئے جائز

کر دیا اور فرمایا کہ "نشہ کی کوئی چیز نہ پیو"۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ نشہ پیدا ہونا ایک مخفی امر ہے اس لئے اس کے ظاہری سبب کو اس کے قائم مقام کر دیا اور وہ ظاہری سبب ایسے برتنوں میں نبیذ بنانا ہے جن میں مسامات نہیں ہیں جیسے وہ ظروف جو مٹی، لکڑی اور کدو سے بنتے ہیں اس لئے کہ ان برتنوں میں وہ چیز بہت جلد مسکر ہو جاتی ہے جن کی نبیذ بنائی جائے، اور چھاگل میں نبیذ بنانے کو آپ نے تین دن تک اس کے نشہ آور نہ ہونے کا سبب قرار دیا، پھر آپ نے اجتہاد میں تبدیلی ہوگئی اور حکم کا مدار سکر کو ٹھیرایا کیونکہ کسی چیز کا نشہ آور ہونا اس کے جوش کرنے اور جھاگ لانے سے معلوم ہو سکتا ہے اور اس چیز کو جو لوازم سکر ہے یا شئے مسکر کے صفات میں سے ہے سکر کا موقع اور مظنہ قرار دینا کسی امر کو اجنبی مظنہ سکر قرار دینے سے بہتر ہے اور اس اجتہاد کے بدل دینے کی ایک اور توجیہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ لوگ نشہ آور چیزوں کی طرف بہت راغب ہیں اگر صرف نشہ آور شئے سے ہی منع کر دیا جائے تو اس کا احتمال تھا کہ کوئی شخص نشہ آور چیز کو پی لے اور یہ عذر کرنے لگے کہ اس کا خیال تھا کہ وہ مسکر نہیں ہے یا اس پر اس کے نشہ آور ہونے کی علامات مشتبہ ہوگئی تھیں یا برتنوں میں شراب لگی ہوئی تھی اور ایسے برتنوں میں نبیذ بنانے سے نشہ جلد پیدا ہو جاتا ہے، پس جب اسلام قوی ہو گیا اور نشہ آور چیزوں کے ترک پر وہ مطمئن ہو گئے اور وہ آلودہ برتن بھی نہ رہے تو آپ نے خاص نشہ آور ہونے کے حکم کا مدار ٹھیرایا اور اس توجیہ کے لحاظ سے یہ مثال اس امر کی ہو جاتی ہے کہ موقعوں کے بدلنے سے حکم بدل جایا کرتا ہے اور نسخ کی اسی قسم کے متعلق آپ نے فرمایا ہے "میرا کلام کلام اللہ کو منسوخ نہیں کر سکتا اور کلام اللہ میرے کلام کو منسوخ کر سکتا ہے اور کلام اللہ کا بعض بعض کو منسوخ کرتا ہے"۔

دوسری قسم نسخ کی یہ ہے کہ ایک شئے میں کوئی مصلحت یا خرابی ہوتی ہے اسی کے موافق اس کا حکم متعین کر دیا جاتا ہے اس کے بعد ایک زمانہ آتا ہے جس میں اس شئے کی وہ حالت نہیں رہتی اس واسطے اس کا حکم بھی بدل جاتا ہے، اس کی مثال یہ ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کی جانب ہجرت فرمائی اور مسلمانوں میں اور ان کے رشتہ داروں میں امداد کا طریقہ منقطع ہو گیا اور اس وقت میں ہمدردی کا ذریعہ صرف وہ بھائی چارہ ہی تھا جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ضروری مصلحت کی وجہ سے لوگوں میں قائم کر دیا تھا اس واسطے قرآن میں نازل ہوا کہ وراثت

کے حقوق اخوت سے متعلق کر دیئے جائیں اور اللہ تعالیٰ نے اس کا فائدہ بھی بیان کر دیا ''اگر ایسا نہ کرو گے تو زمین میں شورش اور بڑا فساد ہو جائے گا''۔ پھر جب اسلام کو قوت حاصل ہوگئی اور مہاجرین کے اقارب بھی مسلمان ہو کر ان سے آ ملے تو وہی طریقہ نسبی وراثت کا مقرر ہو گیا، یا ایسا ہوتا ہے کہ ایسی نبوت کے زمانہ میں جس کے ساتھ خلافت کا مرتبہ شامل نہیں ہوتا ایک شئے میں کوئی مصلحت اور خوبی نہیں ہوتی جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل یا آپ ہی کے عہد میں ہجرت سے قبل اور اس نبوت کے زمانہ میں جس کے ساتھ خلافت ضم ہو جاتی ہے اسی شئے میں مصلحت پیدا ہو جاتی ہے، اس کی مثال یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے ہم سے پیشتر کسی امت کے لئے مال غنیمت کو حلال نہیں کیا تھا لیکن ہمارے لئے اس کو حلال کر دیا، حدیث میں اس حلت کی دو وجہیں بیان کی گئی ہیں، ایک یہ کہ خدا تعالیٰ نے ہماری عاجزی اور کمزوری دیکھ کر مال غنیمت کو ہمارے لئے حلال کر دیا اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اس حلت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت دوسرے انبیا پر اور امت محمدیہ کی فضیلت دوسری امتوں پر ظاہر کرنا مقصود ہے۔

ان دونوں وجھوں کی تحقیق یہ ہے کہ آپ سے پہلے اور انبیا کی بعثت محض اپنی قوم کے لئے ہوئی تھی جن کی تعداد محدود ہوتی تھی، کبھی کبھی سال دو سال میں نوبت جہاد کی آیا کرتی تھی، نیز ان کی امتیں قوی تھیں وہ جہاد بھی کر سکتے تھے اور اس کے ساتھ اسباب دنیوی زراعت وتجارت بھی کر سکتے تھے اس واسطے ان کو اموال غنیمت کی ضرورت نہ تھی پس خدا تعالیٰ نے بھی ارادہ فرمایا کہ ان کے عمل میں کوئی غرض دنیوی نہ ملے تاکہ ان کو ان کے عمل کا پورا پورا اجر ملے۔ اور ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تمام لوگوں کے لئے تھی جو اندازہ اور شمار میں نہیں آ سکتے تھے اور زمانہ جہاد بھی غیر معین تھا اور آپ کی امت اس کی طاقت نہیں رکھتی تھی کہ جہاد بھی کرے اور کاروبار معاش، زراعت وتجارت بھی کرے، اس واسطے ان کو مال غنیمت کے جائز ہونے کی ضرورت پڑی نیز آپ کی امت میں دعوت اسلام کے عام ہونے کی وجہ سے ایسے لوگ بھی شامل ہوتے تھے جن کی نیت وارادے کمزور ہوتے تھے اور انہی کی نسبت وارد ہے کہ خدا تعالیٰ اس دین کی تائید مرد فاسق سے بھی کرا دیتا ہے، اس قسم کے ضعیف الاعتقاد لوگ بغیر فائدہ دنیوی کے جہاد نہیں کر سکتے۔ اور جہاد کے بارے میں خدا تعالیٰ کی رحمت سب کو شامل تھی اور خدا تعالیٰ کا غضب ان کے دشمنوں کی

طرف حد درجہ متوجہ تھا۔

چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں اسی طرف اشارہ ہے کہ ''خدا نے تمام لوگوں کو دیکھا اور عرب وعجم سب سے وہ ناخوش ہوا''۔

اسی ناخوشی کی وجہ سے خدا تعالیٰ نے ضروری قرار دیا کہ ان کے مالوں اور جانوں کی حفاظت بالکل منقطع ہو جائے اور ان کے اموال میں تصرف کر کے خوب ان کے دل جلائے جائیں، جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوجہل کی اونٹنی کو جس کی ناک میں چاندی کی نکیل تھی حرم میں قربانی کے لئے بھیجا تھا تا کہ کفار کو صدمہ پہنچے، اور جیسا کہ آپؐ نے کفار کے نخلستان کے کاٹنے اور جلانے کا حکم دیا تھا تا کہ ان کو پیچ وتاب ہو پس اسی وجہ سے اس امت کے لئے قرآن میں غنائم کی اباحت نازل ہوئی۔

اسی قسم کی دوسری مثال یہ ہے کہ ابتدائے اسلام میں اس امت کے لئے کفار سے جنگ کرنا مناسب نہ تھا کیونکہ اس وقت نہ فوج تھی اور نہ خلافت، پھر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت فرمائی اور مسلمان واپس آ گئے اور خلافت ظاہر ہوگئی اور دشمنان خدا سے جنگ کرنے کی قوت حاصل ہوگئی تو خدا تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی ''ان لوگوں کو لڑنے کی اجازت ہے جن کے ساتھ لڑائی کی جاتی ہے کیونکہ وہ مظلوم ہیں اور بے شک خدا تعالیٰ ان کو مدد پہنچانے پر قادر ہے''۔ اسی قسم کے متعلق خدا تعالیٰ کا یہ قول ہے ''ہم جو آیت منسوخ کرتے ہیں یا کوئی آیت بھلاتے ہیں تو اس سے بہتر یا ویسی ہی اور نازل کرتے ہیں''۔ پس خدا تعالیٰ کے قول 'بخير منها' کا اطلاق ان امور پر ہے جن میں نبوت کے ساتھ خلافت بھی شامل ہے اور خدا تعالیٰ کے قول او مثلها کا اطلاق ان صورتوں میں ہے جن میں اختلاف مواقع کی وجہ سے حکم مختلف ہو جاتا ہے۔ واللہ اعلم۔

اکیسواں باب: اس حالت کا بیان جو زمانہ جاہلیت کے لوگوں میں تھی پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اصلاح فرمائی

اگر تم شریعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حقائق میں غور کرنا چاہو تو اولاً ان ان پڑھ لوگوں کے حالات کی تحقیق کرو جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی، وہی حالات آپ کی شریعت کا مادہ ہیں اس کے بعد ان حالات کے اصلاح کی اس کیفیت کو دریافت کرو جو ایسے

مقاصد کی وجہ سے ہے جو باب تشریع اور تیسیر اور احکام ملت میں مذکور ہیں۔

واضح ہو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ملت حنفیہ اسماعیلیہ کی کجی کو درست کرنے کے لئے تھی، اس کی تحریف کو دور کرنے کے لئے تھی اور اس کی روشنی کو پھیلانے کے لئے تھی۔ اور خدا تعالیٰ کے اس قول میں یہی مراد ہے "اپنے باپ ابراہیم علیہ السلا کا مذہب اختیار کرو"۔

اور جبکہ حالت ایسی ہے تو ضرور ہے کہ ملت ابراہیم کے اصول قابل تسلیم اور اس کا طریقہ مقررہ ہو اس واسطے کہ نبی جب ایسی قوم میں مبعوث ہوتا ہے جن میں عمدہ طریقے باقی ہیں تو ان طریقوں میں تغیر و تبدل بے معنی ہے بلکہ ان کو قائم رکھنا ضروری ہے کیونکہ ان لوگوں کے نفوس ان کو اچھی طرح سے قبول کرتے ہیں اور ان سے ان پر خوب حجت ہو سکتی ہے۔

اور نبی اسمٰعیل اپنے باپ ابراہیمؑ کے طریقے پر برابر چلتے رہے اور وہ اسی شریعت پر ثابت قدم رہے یہاں تک کہ عمرو بن لحی پیدا ہوا اس شخص نے اپنی بیہودہ رائے سے ملت اسمٰعیل میں بہت سی چیزیں داخل کر دیں پس خود بھی گمراہ ہوا اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا اسی نے بت پرستی اولاً شروع کی، سانڈ چھوڑے اور بحیرہ مقرر کئے اس وقت سے دین بالکل خراب ہو گیا اور صحیح چیز غلط کے ساتھ مخلوط ہو گئی اور لوگوں پر جہالت، شرک اور کفر چھا گیا، تب خدا تعالیٰ نے ہمارے سردار محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی کج روی کی درستی کے لئے اور ان کی خرابیوں کی اصلاح کے لئے مبعوث فرمایا پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی اسمٰعیل کی شریعت میں غور کیا اور اس میں جو طریقہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے مسلک کے موافق یا من جملہ شعائر الٰہی کے پایا اس کو باقی رکھا اور جس میں تحریف ہو گئی تھی یا اس میں خرابی پیدا ہو گئی تھی یا اس میں شرک و کفر کی علامات تھیں اس کو مٹا دیا اور اس کا ابطال مستحکم کر دیا۔

اور جو امور عادات وغیرہ کی قسم سے تھے ان کی خوبیاں اور برائیاں اس طرح بیان کر دیں کہ ان میں سے غالی رسموں سے احتراز کیا جا سکے، اور بری رسموں سے آپ نے منع فرما دیا اور عمدہ رسموں کا حکم فرمایا۔

اور جو مسائل اصلی یا عملی زمانہ فترت میں متروک ہو گئے تھے ان کو شاداب و تر و تازہ ویسا ہی کر دیا جیسا کہ وہ تھے اس طرح پر خدا کا انعام مکمل اور اس کا دین مستقیم ہو گیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم

کے عہد میں اہل جاہلیت بعثت انبیا کوتسلیم کرتے تھے اور اعمال کی سزا وجزا کے قائل تھے، اقسام نیکی کے اصول کے معتقد تھے اور جو امور منافع قوم اور تمدن کے متعلق تھے ان پر عمل کرتے تھے۔

ان اہل جاہلیت میں دو فرقے پائے جاتے تھے جو خوب ظاہر اور پھیلے ہوئے تھے اور ایسے لوگوں کا ہونا ہمارے گزشتہ بیان کے منافی نہیں ہے، ان میں ایک فرقہ فاسقین اور زندیقوں کا تھا پس یہ فاسق لوگ بہائم اور درندوں کے سے کام کرتے تھے جو ملت اسمٰعیل کے بالکل خلاف تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان میں خواہشات نفسانی کا غلبہ تھا اور مذہبی امور کا لحاظ کم تھا، یہ لوگ ملت کے دائرہ سے خارج تھے درآں حالیکہ اپنے میں برائی کا اقرار بھی کرتے تھے۔

اور زندیق لوگوں میں پیدائشی طور پر نقص فہم تھا وہ پوری طرح پر اس امر کی تحقیق نہیں کر سکتے تھے جو صاحب ملت کا مقصود تھا اور نہ ہی صاحب ملت کی تقلید کرتے تھے اور نہ اس امر کو تسلیم کرتے تھے جس کی وہ خبر دیتا تھا۔ وہ اپنے شکوک میں سرگرداں رہتے تھے اور اس کے ساتھ ان کو اپنے لوگوں سے اندیشہ رہتا تھا، لوگ ان کو برا جانتے تھے اور ان کو دین سے خارج سمجھتے تھے اور جانتے تھے کہ انھوں نے اپنے آپ کو مذہب کی پابندی سے آزاد کر دیا ہے پس جبکہ حالت یہ تھی کہ لوگ ان کو ناپسندیدہ اور برا جانتے تھے تو ان کا مذہب سے خارج ہونا ضرررساں نہ تھا۔

دوسرا فرقہ جاہل اور غافل لوگوں کا تھا جنھوں نے دین کی جانب کسی قسم کی توجہ اور التفات نہیں کیا تھا، اس قسم کے اشخاص قریش اور ان کے قریب کے لوگوں میں بہت تھے کیونکہ ان کا زمانہ انبیا سے بہت دور ہو گیا تھا خدا تبارک وتعالیٰ کے اس قول میں اسی طرف اشارہ ہے" تاکہ تو ایسے لوگوں کو ڈرائے جن کے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں آیا ہے"۔

لیکن وہ راستہ سے اتنی دور نہیں ہوئے تھے کہ ان کے سامنے دلیل بھی پیش نہ ہو سکے اور ان کو الزام بھی نہ دیا جا سکے اور ان میں خاموشی پیدا نہ کی جا سکے۔

جو اصول اہل جاہلیت میں مسلم تھے ان میں سے ایک یہ تھا کہ آسمان وزمین اور جو جو ہر ان دونوں کے درمیان ہیں ان کے پیدا کرنے میں خدا تعالیٰ کا کوئی شریک نہیں، اور بڑے بڑے امور کی تدبیر کرنے میں اس کا کوئی شریک نہیں، اور ان کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ کوئی اس کے حکم کو رد نہیں کر سکتا اور نہ کوئی اس کی قضا اور فیصلہ کو روک سکتا ہے جبکہ وہ مبرم اور قطعی ہو جائے، اس آیت میں

اسی طرف اشارہ ہے "بیشک اگر تو ان لوگوں سے دریافت کرے کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے تو وہ سب کہیں گے کہ خدا نے پیدا کیا ہے"۔ اور اس کا فرمان ہے "بلکہ تم خدا ہی کو پکارتے ہو"۔ اور خدا تعالیٰ فرماتا ہے "وہ گمراہ ہیں جن کو تم بجز خدا کے پکارتے ہو"۔

لیکن ان کے زندیق ہونے کی ایک بات یہ تھی کہ وہ کہتے تھے کہ فرشتوں میں سے اور ارواح میں سے بعض ایسے ہیں جو علاوہ بڑے بڑے انتظامات کے اہل زمین کے دوسرے امور میں مدبر ہوتے ہیں جیسا کہ اپنے پرستش کرنے والے کی حالت درست کرنا ہے جس کا تعلق خاص اس کی ذات سے ہوتا ہے اور اسکی اولاد اور اموال سے ہوتا ہے، یہ مشرکین ان فرشتوں اور ارواح کو ان بادشاہوں کی حالت سے تشبیہ دیتے ہیں جو ان کے شہنشاہ کے مقابلہ میں ہوتی ہے اور جو حالت شفیعوں اور ندیموں کی ایسے بادشاہ کے سامنے ہوتی ہے جو طاقت کے ساتھ تصرف کرتا ہے، اور اس سوفہمی کا منشا یہ ہوا کہ شریعتوں میں بہت سے امور فرشتوں کی طرف تفویض کئے گئے، اور مقرب لوگوں کی دعا مقبول ہونے کی تصریح ہے اس سے وہ لوگ ان امور کو انہی کے تصرفات سمجھ گئے جیسے چھوٹے چھوٹے بادشاہوں کے ہوتے ہیں اور انھوں نے غائب کو حاضر پر قیاس کر لیا اور یہی شئے فساد کا باعث ہوئی اور اہل جاہلیت کے اصول میں سے ایک یہ تھا کہ وہ خدا تعالیٰ کی ذات کو اس شئے سے پاک سمجھتے تھے جو اس کی شان کے لائق نہیں ہے اور اس کے اسما میں الحاد کو ناجائز جانتے تھے لیکن انھوں نے اپنی گمراہی کی وجہ سے یہ سمجھ لیا تھا کہ فرشتے خدا کی لڑکیاں ہیں اور فرشتے ایک واسطہ قرار دیئے گئے ہیں تاکہ خدا تعالیٰ ان کے ذریعہ سے اس امر کو معلوم کرے جس کا اس کو علم نہیں ہے، انھوں نے خدا تعالیٰ کو بادشاہوں پر قیاس کیا جیسا کہ وہ جاسوسوں کے ذریعہ سے حالات معلوم کیا کرتے ہیں، اور ان کے مسلمہ اصول میں سے ایک یہ تھا کہ خدا تعالیٰ نے پیدا کرنے سے پیشتر تمام حوادث کو مقدر کر دیا تھا۔ امام حسن بصریؒ کا قول ہے کہ اہل جاہلیت اپنے خطبوں اور اشعار میں ہمیشہ تقدیر کا ذکر کیا کرتے تھے پس شرع نے اس کو اور موکد کر دیا ہے۔

اور ان کے مسلمہ اصول میں سے ایک یہ تھا کہ عالم بالا میں ایک مقام معین ہے جہاں بتدریج حوادث پائے جاتے ہیں اور اس جگہ فرشتوں اور اچھے آدمیوں کی دعا میں کچھ نہ کچھ تاثیر ہے، لیکن اس کی صورت ان کے ذہنوں میں ایسی تھی جیسے بادشاہوں کے وزیران کی شفاعت کا اثر

بادشاہوں پر پڑتا ہے۔

ان کے مسلمہ اصول میں سے یہ بھی تھا کہ خدا تعالیٰ نے اپنے بندوں پر احکام مقرر کئے ہیں ان میں سے بعض کو حلال اور بعض کو حرام کیا ہے اور یہ کہ وہ ہر کام کی جزا دیتا ہے اگر اعمال اچھے ہیں تو جزا بھی اچھی ہوتی ہے اور اگر اعمال برے ہیں تو جزا بھی بری ہوتی ہے اور یہ کہ خدا تعالیٰ کے پاک فرشتے ہیں جو اس کی بارگاہ میں مقرب ہیں اور بڑے درجہ والے ہیں خدا کے حکم سے وہ اس عالم کی تدابیر میں مصروف رہتے ہیں، احکام الٰہیہ کی تعمیل سے سرتابی نہیں کرتے اور جو حکم ان کو ملتا ہے اس کی تعمیل کرتے ہیں وہ نہ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں نہ براز کرتے ہیں اور نہ شادی کرتے ہیں اور کبھی کبھی نیک آدمیوں کے پاس حاضر ہوتے ہیں اور ان کو بشارت اور خوف دلاتے ہیں۔

اور ان کو اس پر بھی اعتقاد تھا کہ خدا تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ایسے شخص کو لوگوں کی طرف مبعوث کرتا ہے جس پر وحی نازل کرتا ہے اور اس کے پاس فرشتوں کو بھیجتا ہے اور خدا تعالیٰ اس کی طاعت لوگوں پر فرض کرتا ہے پس لوگوں کو اس کے حکم کی تعمیل اور فرمانبرداری کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا۔

ملاء اعلیٰ اور حاملین عرش کا ذکر اشعار جاہلیت میں بکثرت موجود ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امیہ بن ابی الصلت کے ان دو اشعار کی تصدیق فرمائی ہے اس کا قول ہے (شعر)

رجل وثور تحت رجل یمینہ

والنسر للاخری ولیث مرصد

آدمی اور بیل اس کے دائیں پاؤں کے نیچے ہیں۔

''اور گرگس ایک پائے کا اور شیر دوسرے پائے کا محافظ ہے''

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ شعر سن کر فرمایا امیہ نے سچ کہا اس کے بعد امیہ کا یہ شعر پڑھا (شعر)

والشمس تطلع کل اٰخر لیلۃ

حمراء یصبح لونھا یتورد

تأبى فما تطلع لنا في رسلها

الا معذبة والا يجلد

سورج ہر رات کے ختم ہونے کے بعد صبح کو سرخ اور گلابی رنگ کا نکلتا ہے، وہ خوشی سے ہمارے لئے طلوع نہیں ہوتا بلکہ وہ معذب ہوکراور تازیانہ کھا کر آتا ہے، (یعنی خدا کی قدرت سے مغلوب رہتا ہے)

پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ امیہ نے سچ کہا، اور اس کی تحقیق یہ ہے کہ اہل جاہلیت کا یہ عقیدہ تھا کہ عرش کے اٹھانے والے چار فرشتے ہیں، ایک انسان کا ہم شکل ہے اور وہ خدا کے حضور میں بنی آدم کا شفیع ہے، اور دوسرے کی صورت بیل کی ہے اور وہ چار پایوں کا شفیع ہے، تیسرے کی صورت کرگس کی ہے اور وہ پرندوں کی شفاعت کرتا ہے اور چوتھا شیر کی شکل کا ہے اور وہ درندوں کی شفاعت کرتا ہے۔

پس شرع میں بھی اس کے قریب قریب آیا ہے لیکن شرع نے ان تمام فرشتوں کا نام دعول (بزکوہی) رکھا ہے اس اعتبار سے کہ عالم مثال میں ان فرشتوں کی صورتیں ایسی ہی ظاہر ہوتی ہیں، یہ سب باتیں اہل جاہلیت کو معلوم تھیں اس کے ساتھ ساتھ وہ اس باب میں غائب کو حاضر پر قیاس کرتے تھے اور امور علمی اور یقینی کو اپنے پسندیدہ خیالات کے ساتھ خلط ملط کر دیتے تھے۔ اور اگر تم کو ہمارے مذکورہ بیان میں شبہ ہو تو ان مضامین میں غور کرلو جن کو خدا تعالی نے قرآن عظیم میں بیان فرمایا اور اس باقی علم کے ذریعہ جو ان کے پاس رہ گیا تھا ان پر دلیل قائم کی، اور ان شکوک وشبہات کو جو انھوں نے اپنی معلومات میں داخل کر لئے تھے دور فرمایا بالخصوص اس آیت کو دیکھو۔ جبکہ اہل جاہلیت نے نزول قرآن کا انکار کیا تو خدا تعالی نے فرمایا'' آپ فرمادیجئے کہ بتاؤ وہ کتاب کس نے نازل کی تھی جسے حضرت موسیٰ لائے تھے اور جب ان لوگوں نے کہا یہ'' کیسا رسول ہے کہ کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے تو خدا تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی'' آپ رسولوں میں سے کوئی انوکھے اور عجیب نہیں ہیں'' ایسی ہی اور بہت سی مثالیں ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین اگرچہ راہ راست سے دور ہٹ گئے تھے لیکن جو علمی حصہ ان میں باقی رہ گیا تھا اس کے ذریعہ سے ان پر حجت قائم ہوسکتی تھی اہل جاہلیت میں جو لوگ حکیم ہوئے ہیں ان کے خطبوں کو

دیکھو مثلاً قس بن ساعدہ، زید بن عمرو بن نفیل اور عمرو بن لحی سے پیشتر کے نیک لوگوں کے کلام کو دیکھو تو سب میں یہ بات مفصلاً معلوم ہوگی، بلکہ ان کے کلام میں اگر نہایت غور و خوض کرو گے تو ان کے فضلا اور حکما کو پاؤ گے کہ وہ عالم معاد اور فرشتوں وغیرہ کا اعتقاد رکھتے تھے اور وہ توحید کو ٹھیک طور پر مانتے تھے حتی کہ زید بن عمرو بن نفیل نے اپنے شعر میں یہ کہہ دیا۔ شعر

عبادک یخطئون وانت رب
یکفیک المنایا والمحترم

تو پروردگار ہے سب لوگوں کا بادشاہ ہے
موتیں اور فیصلے تیرے ہی قبضہ میں ہیں

اور اس نے یہ بھی کہا:

اربا واحدا ام الف رب
ادین اذا تقسمت الامر
ترکت اللات والعزی جمیعا
کذلک یفعل الرجل البصیر

میں ایک پروردگار کو مانوں یا ہزار کو
جب کاموں کی تقسیم ہو
میں نے لات وعزیٰ سب کو چھوڑ دیا
سمجھ دار آدمی ایسا ہی کیا کرتا ہے

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امیہ بن ابی الصلت کے حق فرمایا ''اس کے شعر میں ایمان ہے لیکن اس کے دل میں ایمان نہیں ہے'' اور یہ سب باتیں وہ تھیں جو ان میں حضرت اسمٰعیل کے طریقہ سے وراثتاً چلی آئی تھیں اور اہل کتاب سے ان کو حاصل ہوئی تھیں ان کو بخوبی معلوم تھا کہ انسان کا اصل کمال یہی ہے کہ اپنے رب کے سامنے سرنگوں ہو اور انتہائی کوشش سے خدا کی عبادت کرے اور عبادت کے ابواب میں سے ان کے ہاں ایک طہارت بھی تھی اور غسل جنابت تو ان کا یہاں ایک معمول تھا اور اسی طرح ختنہ اور تمام فطری خصائل ان میں تھے، توریت

میں ہے کہ خدا تعالیٰ نے ختنہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام اوران کی اولاد کے لئے ایک نشان قرار دیا تھا اوراس وضو کو مجوس اور یہود وغیرہ سب کیا کرتے تھے اور حکمائے عرب بھی اس کے پابند تھے اوران میں نماز بھی مروج تھی حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہونے سے پیشتر تین سال سے نماز پڑھا کرتے تھے اورقس بن ساعدہ ایاوی بھی نماز پڑھا کرتے تھے، یہود، مجوسی اور بقیہ عرب میں نماز کے تعظیمی افعال مروج تھے خاص کر سجود کے پابند تھے اور دعاوذکر الٰہی سے متعلق اقوال بھی تھے اور وہ لوگ زکوٰۃ بھی دیا کرتے تھے۔اور مہمان کی ضیافت کرنا، مسافر کو کھانا کھلانا، کسی کے اہل وعیال کا نفقہ، مساکین کو صدقہ دینا، اہل قرابت سے صلۂ رحمی کرنا اور مصائب حق میں مدد کرنا اوران کا دستور تھا اور یہ سب زکوٰۃ میں داخل تھے، انہی امور سے ان کی مدح ہوتی تھی اورانہی امور کو انسان کا کمال اوراس کی سعادت سمجھتے تھے۔

چنانچہ حضرت خدیجہؓ نے آپ سے عرض کیا تھ بخدا اللہ تعالیٰ آپ کو پسماندہ نہ کرے گا کیونکہ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، مہمانوں کو کھانا کھلاتے ہیں دوسروں کے عیال اورضعفا کے کفیل ہوتے ہیں، حوادث میں لوگوں کی اعانت کرتے ہیں۔

ایسا ہی ابن دغنہ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی نسبت کہا تھا،اور وہ لوگ صبح صادق سے غروب آفتاب تک روزہ رکھا کرتے تھے اور مسجد میں اعتکاف کیا کرتے تھے۔

اور حضرت عمرؓ نے زمانۂ جاہلیت میں ایک شب کے اعتکاف کی نذر کی تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس میں استفتا کیا تھا۔

اور عاص بن وائل نے وصیت کی تھی کہ میری جانب سے فلاں فلاں غلام آزاد کئے جائیں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اہل جاہلیت مختلف تعظیمات کے ذریعہ خدا کی عبادت کیا کرتے تھے لیکن حج بیت اللہ اوراس کے شعائر کی تعظیم اور بزرگ مہینوں کی عظمت، پس یہ امور تو اہل عرب میں ایسے مشہور تھے جو کسی پر مخفی نہیں تھے ان کے پاس کئی قسم کے منتر اور تعویذات بھی تھے لیکن ان میں شرک کی باتیں داخل کردی تھیں، حلق کا ذبح کرنا اور گردن میں برچھا مارنا ان کا طریقہ تھا نہ وہ ذبیحہ کا گلا گھونٹتے تھے اور نہ پیٹ چاک کرتے تھے وہ بقیہ دین ابراہیم علیہ السلام پر قائم تھے، وہ علم

نجوم کو نہ مانتے تھے اور سوائے بدیہی چیزوں کے علم طبیعات کے دقائق میں غور و خوض نہ کرتے تھے، آئندہ امور کے دریافت کرنے میں ان کے ہاں عمدہ طریقہ خواب تھا اور گزشتہ انبیا کی بشارات تھیں، اس کے بعد کہانت اور تیروں سے آئندہ حالات کا اندازہ لگانا اور بدشگونی کرنا ان میں رواج پایا گیا تھا اور اس بات کو جانتے تھے کہ یہ امور اصل ملت میں داخل نہیں تھے چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت ابراہیم اور اسمٰعیل علیہما السلام کی تصویریں دیکھیں جن کے ہاتھوں میں تیر تھے تو فرمایا یہ لوگ خوب جانتے ہیں کہ انھوں نے تیروں کے ذریعہ کبھی اندازہ نہیں لگایا، بنی اسمٰعیل اپنے جد اسمٰعیل علیہ السلام کے طریقہ پر رہے یہاں تک کہ ان میں عمرو بن لحی پیدا ہو گیا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے تقریباً تین سو برس قبل پیدا ہوا تھا، ان لوگوں کے لئے کھانے میں، پینے میں، لباس میں، دعوتوں میں، عیدوں میں، مردوں کے دفن کرنے میں، نکاح، طلاق، عدت اور سوگ میں اور خرید و فروخت و معاملات میں نہایت مستحکم طریقے معین تھے جن کے ترک کرنے پر لوگوں کو ملامت کی جاتی تھی اور ہمیشہ سے وہ محارم کو جیسے بیٹیاں، مائیں، بہنیں وغیرہ ہیں حرام سمجھتے تھے ظلم اور تعدی کے موقع پر ان کے ہاں سزائیں مقرر تھیں جیسے قصاص، دیت اور قسامت کی سزائیں تھیں، ایسے ہی زنا اور چوری کی سزائیں مقرر تھیں، نیز ایران و روم کی سلطنتوں کے ذریعہ سے ان میں منزلی اور تمدنی تدابیر و علوم بھی آ گئے تھے لیکن ان میں بدکاری کی کثرت ہو گئی تھی، آپس میں ایک دوسرے کو قید کرکے اور لوٹ مار کرکے ظلم کرتے تھے، زنا، فاسد نکاح اور سود خوری خوب پھیل گئی تھی، نماز اور ذکر الٰہی کو بالکل ترک کر دیا تھا اور ان کی طرف کچھ توجہ نہ کرتے تھے، پس ان حالات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے پس آپ نے ان کے تمام امور میں غور و خوض کیا ان میں سے جو حصہ ملت ابراہیمی کا صحیح تھا اس کو باقی رکھا اور اس پر عمل کرنے کی تاکید فرمائی، اور آپ نے اسباب و اوقات، شروط و ارکان آداب و مفسدات، رخصت و عزیمت اور ادا و قضا کی تعلیم کرکے ان کے لئے عبادات کو منضبط کر دیا اور معاصی کو بھی ارکان و شروط بیان کرکے ان کے لئے منضبط کر دیا، اور گناہوں کی روک تھام کے لئے حدود، سزائیں اور کفارات معین فرمائے ترغیب اور ترہیب کے بیان کے ذریعہ دین کو ان کے لئے آسان کر دیا۔ گناہوں کے تمام ذرائع بند کر دیئے اور ان امور پر آمادہ کیا جن سے نیکی کی تکمیل ہوتی ہے اور وہ

تمام باتیں بتلائیں جن کا پہلے ذکر ہو چکا ہے ملت حنیفہ کے پھیلانے میں اور اس کے تمام مذاہب پر غالب کرنے میں نہایت کوشش فرمائی، ان کی تمام تحریفات کو مٹایا اور ان کے مٹانے میں انتہائی کوشش کی اور جو رسوم صحیح تھیں ان کو باقی رکھا اور ان کا حکم فرمایا اور جس قدر ان کی رسوم فاسدہ تھیں ان سے روک دیا اور خلافت کبریٰ کو ان میں قائم کیا اور اپنے ساتھیوں کی مدد سے غیروں سے جہاد کیا یہاں تک کہ امر خداوندی پورا ہو گیا گو، وہ ان پر شاق ہی گزرتا رہا۔

بعض حدیثوں میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''مجھ کو آسان حنفی روشن مذہب دیکر بھیجا گیا ہے'' آسان، سے آپ کی مراد یہ ہے کہ اس میں ایسی سخت عبادتیں نہیں ہیں جن کو راہبوں نے ایجاد کر لیا تھا، بلکہ اس ملت میں ہر ایک عذر کے لئے رخصت ہے جس کی وجہ سے قوی اور ضعیف، کاربند اور بیکار سب عمل کر سکتے ہیں اور حنفی سے مراد ملت ابراہیم ہے جس میں شعائر الٰہی کا قیام اور شرک کے شعار کی برائی ہے اور تحریف و رسوم فاسدہ کا ابطال ہے۔

اور روشن سے مراد یہ ہے کہ اس کی علتیں اور حکمتیں اور وہ مقاصد جن پر شریعت کی بنیاد قائم ہے نہایت صاف ہیں جو شخص ان میں تامل کرے گا اس کو کچھ شبہ باقی نہ رہے گا بشرطیکہ وہ سلیم العقل ہو اور ہٹ دھرمی کرنے والا نہ ہو، واللہ اعلم۔

ساتواں مبحث

حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے احکام شرعی کے استنباط کی کیفیت

پہلا باب: علوم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے اقسام کا بیان

واضح ہو کہ جو کچھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے اور کتب حدیث میں مدون ہے اس کی دو قسمیں ہیں اور وہ امور جن کا ذریعہ تبلیغ رسالت ہے اس سے متعلق خدا تعالی کا یہ قول ہے پیغمبر جو کچھ تم کو بتائے اس کی تعمیل کرو اور جس سے منع کرے اس سے باز آؤ"۔

ایسے امور میں سے ایک حصہ علوم معاد اور عالم ملکوت کے عجیب عجیب حالات کا ہے یہ سب امور بواسطہ وحی کے ہوتے ہیں، اور ایک حصہ احکام شرعی ضبط عبادات اور ارتفاقات کا ہے ان وجوہ ضبط کے ساتھ جن کا ذکر پہلے گزر چکا ہے، ان میں سے بعض وحی کے ذریعہ سے معلوم ہوتے ہیں اور بعض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اجتہاد سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اجتہاد بھی وحی کے ذریعہ میں ہے کیونکہ خدا تعالی نے آپ کو اس سے محفوظ رکھا تھا کہ آپ کی رائے خطا پر جم سکے اور یہ بھی ضروری نہ تھا کہ آپ کا اجتہاد کسی امر منصوص سے مستنبط ہو جیسا کہ بعض لوگ گمان کرتے ہیں بلکہ اکثر یہ حالت تھی کہ خدا تعالی نے آپ کو شرع کے مقاصد بتلا دیئے تھے اور تشریع، تیسیر واحکام کے قانون کی تعلیم کر دی تھی پس اسی قانون کے ذریعہ آپ ان مقاصد کی وضاحت کر دیا کرتے تھے جو بذریعہ وحی آپ کو حاصل ہوتے تھے۔

انہی امور تبلیغ رسالت میں سے ایک حصہ ان حکمتوں اور مصلحتوں کا جو بلا قید رکھی گئی ہیں جن کا نہ وقت معین ہے اور نہ ان کی حدیں بیان کی گئی ہیں، جیسے عمدہ اور ناقص اخلاق کا بیان اور یہ حصہ غالبًا اجتہادی ہے بایں معنی کہ خدا تعالی نے آپ کو قوانین انتظامات تعلیم فرمائے پس ان قوانین

سے حکمتوں کو اخذ کیا اور ان کو کلیہ بنایا۔

اور انہی امور میں سے ایک حصہ فضائل اعمال اور عاملین کے مناقب اور اوصاف کا ہے، میری رائے میں ان میں سے بعض امور وحی الٰہی کے واسطہ سے ہوتے ہیں اور بعض اجتہادی ہوتے ہیں، اور ان قوانین کا بیان پہلے گزر چکا ہے اور اسی حصہ کی تشریح اور ان کے مقاصد کا بیان کرنا ہمیں مقصود ہے۔

دوم وہ امور جو تبلیغ رسالت کے باب سے نہیں ہیں اسی کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "میں ایک انسان ہوں جب میں تم کو کسی مذہبی امر کا حکم کروں تو اس کو لے لو اور جو بات میں تم سے اپنی رائے سے کہوں پس میں بشر ہوں"۔ درخت خرما کے نر و مادہ کے ملانے میں بھی آپ نے یہی فرمایا تھا" یہ میرا ایک گمان تھا پس ظنی بات میں میرا مواخذہ نہ کرو لیکن جب میں خدا کی جانب سے کوئی بات بیان کروں تو اس کو اختیار کرو، اس لئے کہ میں نے خدا پر کبھی جھوٹ نہیں بولا"۔

اسی حصہ میں سے طب کا حصہ ہے اور اسی سے متعلق حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے کہ "گھوڑا نہایت سیاہ جس کی پیشانی پر ہلکی سی سفیدی ہو ضرور رکھو"۔ اور اس بارے میں مستند آپ کا تجربہ تھا۔

اور اسی قبیل سے وہ امور بھی ہیں جن کو آپ عادۃً کیا کرتے تھے اور ان کو بطور عبادت کے نہیں کرتے تھے، یا آپ نے ان کو اتفاقاً کیا تھا، قصداً نہیں کیا تھا اور اسی قبیل سے وہ مذکورات ہیں جن کو آپ اپنی قوم سے کہا کرتے تھے، حدیث ام زرع اور حدیث خرافہ اسی قسم کی احادیث ہیں، اسی کو زید بن ثابت نے فرمایا ہے جبکہ چند آدمی آپؐ کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث ہم سے بیان کیجئے، حضرت زید نے کہا "میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمسایہ میں رہتا تھا جب آپ پر وحی نازل ہوتی تھی تو آپؐ مجھ کو بلا بھیجتے تھے پس میں اس کو لکھ دیا کرتا تھا، آپ کی یہ عادت تھی کہ جب ہم دنیا کا ذکر کرتے تو آپ بھی ہمارے ساتھ دنیا کا ذکر کرتے، اور جب ہم کھانے کا ذکر کرتے تو آپ بھی ہمارے ساتھ کھانے کا ذکر کرتے، پس کیا میں تم سے یہ سب قسم کی حدیث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کروں" اور اسی قبیل سے وہ

امور بھی ہیں جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں جزئی مصلحت مقصود تھی لیکن وہ تمام امت کے لئے ضروری نہ تھے اور ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی بادشاہ فوجوں کی ترتیب کرتا ہے اور کوئی شعار (۱) مقرر کرتا ہے، اسی لئے حضرت عمرؓ نے فرمایا ہے ''ہم کو طواف میں رمل (۲) سے کیا تعلق، ہم ان لوگوں کو یہ حالت دکھاتے تھے جن کو خدا نے اب ہلاک کر دیا ہے''۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ کو اندیشہ ہوا کہ کہیں رمل کا کوئی اور سبب نہ ہو۔ اور بہت سے احکام اسی مصلحت جزئی پر محمول ہیں جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ہے ''جہاد میں جو کوئی کسی کو قتل کرے وہی شخص اس مقتول کا اسباب وسامان لے''۔

اسی حصہ میں سے آپ کے احکام اور خاص فیصلے ہیں اور ان میں آپ گواہ اور قسم کا اعتبار کر لیتے تھے، حضرت علیؓ سے آپ نے فرمایا تھا ''جو کچھ شاہد جانتا ہے غائب نہیں جانتا۔

دوسرا باب: مصلحتوں اور شریعتوں کے مابین فرق کا بیان

واضح ہو کہ شارع نے ہم کو دو قسم کے علمی فائدے پہنچائے ہیں جن کے احکام اور مراتب جدا جدا ہیں، پس ان میں سے ایک قسم مصالح اور مفاسد کا علم ہے یعنی جس میں نفس کو مہذب کرنے کا بیان ہے اس طور پر کہ وہ اخلاق جو دنیا اور آخرت میں نافع ہیں حاصل کئے جائیں اور ان کے مخالف اخلاق کو دور کیا جائے، اور جس میں تدبیر خانہ داری، آداب معاش اور سیاست مدینہ کا بیان ہے جن کی شارع نے نہ مقدار معین کی، نہ کسی مبہم کو حدود کے ساتھ منضبط کیا اور نہ ہی علامات معلومہ کے ساتھ کسی قابل اشکال امر کو ممتاز کیا بلکہ پسندیدہ امور کی ترغیب دی اور رذائل سے کنارہ کش رہنے کی ہدایت فرمادی اور اپنے کلام کو اہل زبان کے فہم پر چھوڑ دیا اور نفس مصالح کو طلب اور باز رہنے کا مدار علیہ قرار دیا، نہ ان کے لئے مواقع مقرر کئے اور نہ علامات جن سے طلب یا باز رہنے کی طرف رہبری ہو سکے، مثلاً آپ نے دانائی اور بہادری کی مدح فرمائی اور امر معیشت میں نرمی، محبت اور میانہ روی کا حکم فرمایا اور دانائی کی کوئی حد نہیں بیان کی جو طلب کا مدار علیہ ہو اور نہ اس کا مظنہ بتلایا جس سے تجاوز کرنے پر لوگوں سے مواخذہ کیا جاتا ہو۔

---

(۱) شعار وہ کلمات مقررہ ہوتے ہیں جن سے رات کو اپنے اور غیر میں تمیز ہو جاتی ہے۔ (۲) طواف کی حالت میں سینہ نکال کر چلنے کو رمل کہتے ہیں۔

جس مصلحت کی شرع نے ہم کو ترغیب دی ہے اور جس خرابی سے باز رکھا ہے اس کی انتہا تین اصولوں میں سے ایک نہ ایک پر ہوتی ہے، ان میں سے اوّل ان چار خصلتوں کے ذریعہ نفس کو مہذب کرنا ہے جو آخرت میں نفع بخش ہوں، یا ان تمام خصائل سے نفس کو مہذب کرنا ہے جو دنیا میں مفید ہوں، دوم، کلمۃ اللہ کا بلند کرنا، شرائع کا مستحکم کرنا اور ان کی اشاعت میں سعی کرنا ہے۔ سوم لوگوں کی حالت کا انتظام کرنا، ان کی تدابیر کو درست کرنا اور ان کی رسوم کو مہذب صورت میں لانا ہے۔

اور مصلحت اور خرابی کی انتہا ان اصول پر ہونے کے معنی یہ ہیں کہ کسی شئے کو ان امور میں اثباتاً یا نفیاً دخل ہوتا ہے۔ بایں طور کہ یہ شئے ان میں سے کسی خصلت کا شعبہ ہو یا ان کے شعبہ ہو یا ان کے شعبہ کی ضد ہو یا ان کے پائے جانے کا محل ہو یا نہ پائے جانے کا محل ہو یا ان سے متلازم ہو یا ان کی ضد سے متلازم ہو، یا ان اصول کے حصول کا ذریعہ ہو یا ان سے اعراض کا ذریعہ ہو، اور خدا کی خوشنودی اصل میں انہی مصلحتوں سے متعلق ہوتی ہے اور اس کی ناراضی انہی مفاسد اور خرابیوں سے متعلق ہوتی ہے، پیغمبروں کی بعثت سے پہلے کا زمانہ اور بعد کا زمانہ اس خوشنودی اور ناراضی میں یکساں ہے، اگر ان دونوں حصوں سے خدا کی رضا اور ناراضی کا تعلق نہ ہوتا تو پیغمبر نہ بھیجے جاتے اس لئے کہ یہ تمام شرائع اور حدود تو انبیا کے پیدا ہونے کے بعد ہوئے ہیں۔ پس ابتداً ان شرائع کا حکم دینا یا ان پر مواخذہ کرنا لطف الٰہی نہیں تھا، لیکن مصالح اور مفاسد نفس کی پاکی یا ناپاکی پر یا لوگوں کے انتظامی یا بدانتظامی امور پر بعثت انبیا سے پہلے ہی موثر تھے اس واسطے لطف الٰہی مقتضی ہوئی کہ لوگوں کو ضرر رساں امور سے خبردار کیا جائے اور جو امور ان کے لئے ضروری ہیں ان کا حکم دیا جائے اور یہ چیز بغیر مقادیر اور شرائع کے پوری نہیں ہوسکتی تھی اس واسطے لطف الٰہی نے ان مقادیر اور شرائع کے تعین کا بالطبع اقتضا کیا، اور یہ قسم ایسی ہے جو عقل میں آتی ہے۔

پس اس قسم میں سے بعض امور ایسے ہیں کہ عام لوگوں کی عقلیں ان کے سمجھنے کی صلاحیت رکھتی ہیں، اور اسی قسم میں سے بعض امور ایسے ہیں جن کو صرف ان اذکیا کی عقلیں ہی سمجھتی ہیں پر انبیا کے قلوب کے انوار کا پرتو پڑا ہے، شریعت نے انہیں متنبہ کیا تو خبردار ہوگئے اور کسی امر کا اشارہ کیا تو فوراً سمجھ گئے۔

اور شخص ان اصول کو جن کا ہم نے ذکر کیا ہے اچھی طرح سے ضبط کرلے تو اس کو ان مصالح

اور مفاسد میں سے کسی میں بھی توقف نہ ہوگا۔ اور ان میں سے دوسری قسم شرائع، حدود اور فرائض کا علم ہے یعنی وہ مقادیر جن کو شارع نے بیان کر کے مصالح کے لئے مظان کو مقرر کر دیا، اور مصالح کے لئے ایسی علامات معین کر دیں جو منضبط اور معلوم ہوں اور ان پر حکم کا مدار رکھا اور لوگوں کو ان کا مکلف بنایا، اور نیکی کے اقسام کو ان کے ارکان، شروط اور آداب متعین کر کے منضبط کیا اور نیکی کے انواع میں سے ہر نوع کی ایک ایسی حد مقرر کی جو لوگوں سے واجباً مطلوب ہے اور ایک ایسی حد مقرر کی جس کو وہ بغیر ایجاب کے مستحباً کرتے ہیں، اور ہر نیکی میں سے ایک مقدار ایسی اختیار کی جس کو لوگوں پر واجب کر دیا اور ایک مقدار ایسی اختیار کی جو ان کے لئے مستحب کر دی، اس واسطے تکلیف شرعی خاص ان مظاہر سے متعلق رہی اور احکام شرعی خاص ان علامات پر مبنی ہوئے اور یہ نوع سیاست ملی کے قوانین کی طرف رجوع کرتی ہے، اور ایسا بھی نہیں ہے کہ مصلحت کے ہر مظنہ کو لوگوں پر واجب کر دیا جائے بلکہ اس کو واجب کیا جاتا ہے جو معلوم اور محسوس ہو یا ایسا وصف ظاہر ہو جس کو ہر خاص و عام جانتا ہو، اور کبھی وجوب اور حرمت کے لئے عارضی اسباب ہوتے ہیں جن کی وجہ سے عالم بالا میں وجوب اور تحریم لکھ دی جاتی ہے پس وہاں ایجاب و تحریم کی صورت متحقق ہو جاتی ہے جیسے کسی سائل کا سوال کرنا اور لوگوں کا اس کی طرف التفات کرنا یا اس سے اعراض کرنا، اور یہ سب ایسے معنی ہیں جن کو عقل نہیں سمجھ سکتی بایں معنی کہ ہم کو اگرچہ اندازہ اور تشریع کے قوانین کا علم ہے لیکن ان کا عالم بالا میں لکھا جانا اور حظیرۃ القدس میں وجوب کی صورت کا متحقق ہونا بغیر نص شارع کے ہم کو معلوم نہیں ہوتا کیونکہ یہ ایسے امور ہیں جن کے ادراک کا سوائے باری تعالیٰ کے اخبار کے کوئی اور ذریعہ نہیں، اس کی مثال برف کی سی ہے، ہم کو یہ تو معلوم ہے کہ اس کا سبب برودت ہے جو پانی کو جما دیتی ہے لیکن ہم یہ نہیں جانتے کہ فلاں برتن کا پانی اس وقت جم گیا ہے یا نہیں ہاں خود مشاہدہ کرنے سے یا ایسے شخص کے خبر دینے سے جس نے مشاہدہ کیا ہے معلوم ہو سکتا ہے۔

پس اسی طرح ہم یہ جانتے ہیں کہ زکوٰۃ کے لئے کوئی نصاب مقرر ہونا چاہئے اور یہ بھی جانتے ہیں کہ دو سو درہم یا پانچ وسق نصاب کے لئے ایک عمدہ مقدار ہے کیونکہ اس مقدار سے معتدبہ غنا حاصل ہو جاتی ہے اور یہ دونوں مقداریں لوگوں کے نزدیک معلوم اور مستعمل ہیں، لیکن

یہ امر کہ شارع نے ہم پر یہ نصاب مقرر کیا ہے اور رضا مندی اور ناراضی کا مدار اس پر رکھا ہے بغیر نص شارع کے معلوم نہیں ہوسکتا اور کیونکر معلوم ہوسکتا ہے جبکہ بہت سے امور ایسے ہیں جن کا علم بغیر باری تعالیٰ کے بتلائے ہو ہی نہیں سکتا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول میں یہی مراد ہے کہ ''سب مسلمانوں میں بڑا گنہگار وہ شخص ہے' الحدیث۔ اور اس قول میں بھی یہی مراد ہے۔ ''مجھ کو خوف تھا کہ تم پر تراویح کہیں فرض نہ ہو جائے''۔

اور معتبر علما اس پر متفق ہیں کہ مقادیر کے باب میں قیاس کو دخل نہیں ہے اور اس پر بھی متفق ہیں کہ قیاس کی حقیقت یہ ہے کہ کسی علت مشترکہ کی وجہ سے اصل کے حکم کو فرع کے لئے ثابت کر دیا جائے نہ یہ کہ مصلحت کے مظنہ کو علت بنا دیا جائے یا کسی مناسب شئے کو رکن یا شرط قرار دے دیا جائے۔

اور اس پر بھی متفق ہیں کہ قیاس مصلحت کو پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا بلکہ وہ ایسی علت پیدا کرتا ہے جس پر حکم کا مدار ہوتا ہے، اسی واسطے اس مقیم کو جس کے ساتھ کوئی حرج لاحق ہو نماز اور روزہ کی رخصت میں مسافر پر قیاس نہیں کیا جاسکتا کیونکہ حرج کا زائل ہونا رخصت دینے کی مصلحت ہوسکتا ہے، قصر اور افطار کی علت نہیں ہوسکتا بلکہ علت وہی سفر ہے۔

پس یہ ایسے مسائل ہیں جن میں اجمالاً علما کا اختلاف نہیں ہے لیکن ان میں سے بہت سے ان مسائل کی تفصیل میں اختلاف کرتے ہیں کیونکہ بسا اوقات مصلحت، علت اور تشریع کے ساتھ مشابہ ہو جایا کرتی ہے اور بعض فقہا نے جبکہ قیاس میں غور و خوض کیا تو متحیر ہو کر بعض مقادیر کو لیا اور اس کو اس کے مناسب چیزوں کے ساتھ بدلنے کو برا سمجھا اور بعض میں تسامح کر کے اور چیزوں کو اس کے قائم مقام کر دیا، اس کی مثال یہ ہے کہ فقہا نے روئی کا نصاب پانچ گھٹے مقرر کئے اور کشتی پر سوار ہونے کو دوران سر کا مظنہ خیال کر کے بیٹھ کر نماز پڑھنے کا حکم دے دیا اور پانی کا دہ دردہ کے ساتھ اندازہ کیا، اور جبکہ شرع نے کسی مقام میں مصلحت کو سمجھایا پھر اسی مصلحت کو ہم نے دوسرے مقام میں پایا تو یہ سمجھ لیا کہ رضا الٰہی خاص اس مصلحت سے متعلق ہے اور خاص اس موضع سے اس کا تعلق نہیں، بخلاف مقادیر کے کہ وہاں نفس مقادیر سے ہے رضا متعلق ہوتی ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ جو شخص ایک وقت کی نماز بھی ترک کرے گا، گناہ گار ہوگا۔ خواہ اس

وقت میں ذکر الٰہی و دیگر تمام عبادات ہی میں کیوں نہ مشغول ہو، اور جو زکوٰۃ ترک کرے گا گناہگار ہوگا خواہ اس سے زیادہ مال خیرات میں صرف کرتا ہو اور اسی طرح وہ شخص بھی گناہگار ہوگا جو ریشم اور سونا خواہ ایسی تنہائی میں پہنے جہاں فقرا کی دل شکنی اور لوگوں کو دنیوی دولت مندی پر برانگیختہ کرنا منظور نہیں ہے اور نہ ہی اس کے ذریعہ ترفہ مقصود ہے، اور اسی طرح سے جو شخص دوا کے ارادے سے شراب پئے گا اور وہاں فساد بھی نہیں ہے اور ترک نماز بھی نہیں ہے تب بھی وہ گناہگار ہوگا کیونکہ ان سب میں رضامندی اور ناراضی خاص ان امور سے متعلق ہے اگرچہ غرض اصلی لوگوں کو مفاسد سے روکنا اور مصالح کی ترغیب دینا ہے لیکن خدا تعالیٰ جانتا ہے کہ اس وقت میں امت کی سیاست ان چیزوں کے واجب اور حرام کئے بغیر ممکن نہیں، اس واسطے اس کی رضامندی اور ناراضی ان چیزوں سے متعلق ہوگئی اور ملاء اعلیٰ میں یہ بات لکھ دی گئی۔

اس کے برخلاف اگر کوئی شخص اعلیٰ پشمینہ پہنتا ہے جو ریشم سے کہیں زیادہ بیش قیمت اور عمدہ ہے اور یاقوت کے برتن استعمال میں لاتا ہے تو وہ شخص محض اس فعل کی وجہ سے گناہگار نہ ہوگا، البتہ اگر اس فعل سے فقرا کی دل شکنی ہو اور لوگ اس سے برانگیختہ ہوتے ہوں یا اپنا ترفہ مقصود ہو تو ان خرابیوں کی وجہ سے وہ رحمت الٰہی سے دور ہو جائے گا اور اگر یہ خرابیاں نہ ہوں تو اس کو رحمت الٰہی سے بعد نہ ہوگا اور جہاں کہیں تم نے صحابہ اور تابعین کو پایا ہے کہ انھوں نے اندازہ سا کیا ہے تو اس سے ان کی غرض محض مصلحت کا بیان کرنا اور اس میں رغبت دلانا ہے یا اس کی خرابی بیان کرنا اور اس سے ڈرانا ہے اور وہ اس صورت کو محض بطور مثل کے بیان کرتے ہیں۔ خاص وہ مثال مقصود نہیں ہوتی بلکہ اس سے ان کا مقصود معانی ہوتے ہیں گو، بادی الرائے میں یہ امر مشتبہ معلوم ہو۔

اور جہاں شرع نے ایک مقدار کو اس کی قیمت سے بدلنا جائز رکھا ہے جیسا کہ ایک قول ہے کہ بنت مخاض (۱) کو اس کی قیمت سے مبادلہ کرنا جائز ہے تو علی تقدیر تسلیم یہ بھی اندازہ کی ایک قسم ہی ہے کیونکہ پورا اندازہ نہیں ہوسکتا اور اس سے تنگی لازم آتی ہے، بلکہ بسا اوقات ایسی شئے کے ذریعہ اندازہ کیا جاتا ہے جو بہت سی چیزوں پر منطبق ہو سکے، مثلاً بنت مخاض ہی کو لیا جائے کہ کبھی ایک بنت مخاض دوسری بنت مخاض سے عمدہ ہوتی ہے اور کبھی قیمت کا اندازہ بھی کسی قدر حد معلوم

---

(۱) اونٹنی کا دو سالہ بچہ۔

سے کیا جاتا ہے جیسے قطع ید کا نصاب ہے کہ اس کا اندازہ ربع دینار تا تین درہم ہیں۔
واضح ہو کہ ایجاب و تحریم بھی ایک قسم کا اندازہ ہے اس واسطے کہ اکثر کسی مصلحت یا مفسدہ کی بہت سی صورتیں ظاہر ہوا کرتی ہیں۔ پس ایجاب یا حرمت کے لئے ایک صورت معین کی جاتی ہے کیونکہ یہ صورت ان امور میں سے ہوتی ہے جن کا انضباط ہوسکتا ہے یا اس کا حال پہلے مذاہب میں معلوم ہو چکا ہوتا ہے یا اس میں لوگوں کی بہت زیادہ رغبت ہوتی ہے اسی واسطے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تراویح کے بارے میں عذر کیا تھا اور فرمایا کہ میں ان کے فرض ہو جانے سے ڈرتا ہوں" اور یہ بھی فرمایا ''اگر میں اپنی امت پر سختی نہ سمجھتا تو ان کو ہر نماز میں مسواک کا حکم دیتا''۔ اور جب حالت یہ ہے کہ جس شئے کا حکم منصوص نہیں ہے اس کو ایسی شئے پر محمول نہیں کیا جاسکتا جس کا حکم منصوص ہے لیکن ندب اور کراہت، پس ان دونوں میں تفصیل ہے، شارع نے جس خاص مندوب کا حکم دیا اور اس کی عظمت بیان فرمائی اور اس کو لوگوں کے لئے مسنون کر دیا تو اس کا حال واجب کا سا ہے، اور شارع نے جس مندوب کی صرف مصلحت بیان کرنے پر اکتفا کیا یا خود اس پر عمل کیا اور نہ اس کو لوگوں کے لئے مسنون کیا اور نہ اس کی عظمت بیان فرمائی تو وہ اپنی اس حالت پر باقی ہے جو تشریع سے پہلے تھی اور اس میں اجر کا درجہ اس مصلحت کی وجہ سے ہے جو اس میں پائی جاتی ہے، خود اس فعل کی وجہ سے اجر نہیں ہے اور اسی طرح کی تفصیل مکروہ کے حال کی ہے۔
جب تم اس کو مقدمہ کی تحقیق ہوگئی تو یہ امر بھی تم پر واضح ہو گیا کہ اکثر قیاسات جن پر لوگ فخر کرتے ہیں اور ان کے ذریعہ جماعت اہل حدیث پر فوقیت ظاہر کرتے ہیں خود انہی کے لئے وبال ہیں جس کی انہیں خبر بھی نہیں۔

تیسرا باب: امت کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے شریعت کو اخذ کرنے کا بیان

واضح ہو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے شریعت حاصل کرنے کے دو طریقے ہیں ان میں سے ایک طریقہ ظاہر قول سے حاصل کرنے کا ہے اور اس کے لئے اقوال نبوی کی نقل ضروری ہے خواہ یہ نقل متواتر ہو یا غیر متواتر اور متواتر کی ایک قسم وہ ہے جس کے الفاظ بھی متواتر ہوتے ہیں جیسے قرآن مجید اور چند احادیث، ان میں سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ہے، روز قیامت تم اپنے رب کو صاف صاف دیکھو گے۔

اور متواتر کی ایک قسم وہ ہے جس کے معنی متواتر ہوتے ہیں، جیسے طہارت، نماز، زکوۃ، روزہ، حج، بیع، نکاح اور غزوات کے بہت سے احکام جن میں اسلامی فرقوں میں سے کسی نے اختلاف نہیں کیا۔

اور غیر متواتر میں سب سے بلند رجہ مستفیض کا ہے، مستفیض اس حدیث کو کہتے ہیں جس کو تین یا زیادہ صحابہ روایت کریں اور پانچویں طبقہ تک برابر اس کے راوی بڑھتے رہیں اور اس قسم کی حدیثیں بہت ہیں اور بڑے بڑے مسائل فقہ کی ان ہی پر بنیاد ہے۔

مستفیض کے بعد اس حدیث کا درجہ ہے جس کی صحت یا حسن کا فیصلہ حفاظ اور اکابر محدثین کے بیان سے ہو گیا ہو، ایسی حدیثوں کے بعد ان احادیث کا مرتبہ ہے جن میں محدثین نے کلام کیا ہے بعض نے ان کو قبول کیا اور بعض نے قبول نہیں کیا، پس ان میں سے جو حدیثیں شواہد یا اکثر اہل علم کے اقوال سے یا عقل صریح سے مؤید ہوں وہ بھی واجب العمل ہیں، اور ان میں سے دوسرا طریقہ احادیث کی دلالت اور رہنمائی سے احکام شریعت اخذ کرنے کا ہے اس کی صورت یہ ہے کہ صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی امر فرماتے ہوئے یا کرتے ہوئے دیکھا اور اس سے کوئی حکم وجوب وغیرہ کا مستنبط کر لیا اور اس حکم کی لوگوں کو خبر کر دی کہ فلاں شئے واجب ہے اور فلاں شئے جائز ہے، پھر تابعین نے صحابہ سے ان احکام کو اسی طرح حاصل کیا پھر تیسرے طبقہ کے لوگوں نے ان کے فتووں اور فیصلوں کو جمع کر لیا اور خوب استحکام کر لیا اور اس طریقہ سے اخذ احکام شریعت کرنے والوں میں بڑے پایہ کے لوگ حضرت عمر، حضرت علی، حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم ہیں، لیکن حضرت عمرؓ کی یہ عادت تھی کہ وہ صحابہ سے ہر مسئلہ میں مشورہ اور مناظرہ کیا کرتے تھے یہاں تک کہ اس امر کا پورا انکشاف ہو جاتا تھا، اور آپ کو یقینی امر معلوم ہو جاتا تھا اس واسطے حضرت عمرؓ کے فیصلوں اور فتووں کا تمام مشارق اور مغارب میں اتباع کیا گیا، چنانچہ ابراہیم فرماتے ہیں جب حضرت عمر فوت ہو گئے تو علم کے دس حصوں میں سے نو حصے مفقود ہو گئے"۔ اور عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ جب عمر کسی راستہ پر چلتے تھے تو ہم اس کو سہل پاتے تھے، اور حضرت علی اکثر اوقات مشورہ نہیں کرتے تھے اور ان کے اکثر فیصلے کوفہ میں واقع ہوئے ہیں اور ان فیصلوں کو بہت کم لوگوں نے لیا ہے اور عبداللہ بن مسعود بھی کوفہ میں رہا کرتے تھے اس

لئے ان کے اکثر فتوے بھی اسی نواح کے لوگوں میں رہے اور حضرت عبداللہ بن عباس نے پہلے لوگوں کے زمانہ کے بعد اجتہاد کیا اور بہت سے احکام میں ان کی مخالفت کی اور اس امر میں ان کے اصحاب نے جو مکہ میں تھے ان کی پیروی کی، اور جس امر میں حضرت عبداللہ بن عباس تنہا ہیں اس کو جمہور اہل اسلام نے اختیار نہیں کیا، ان چاروں کے علاوہ اور لوگ بھی احادیث کی دلالت اور رہبری سے واقف تھے لیکن ان کو رکن اور شرط میں اور آداب وسنن میں فرق معلوم نہ ہوتا تھا اور اختلاف احادیث ودلائل کی حالت میں بہت کم اپنی طرف سے فرماتے تھے، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عائشہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہم اسی درجہ کے لوگ تھے۔

اور اس طریقے سے علم حاصل کرنے والے تابعین میں سب سے بڑے مدینہ کے ساتوں فقیہ تھے بالخصوص مدینہ میں سعید بن مسیب، مکہ میں عطا ابن ابی رباح اور کوفہ میں ابراہیم نخعی اور شریح اور شعبی اور بصرہ میں حسن۔

اور ان دونوں طریقوں میں سے ہر ایک میں خلا ہے جو بغیر ایک دوسرے کے نہیں بھرتا ہے اور ایک طریقہ کو دوسرے کی حاجت ہے۔

پہلا طریقہ یعنی نقل ظاہر میں یہ نقصان ہے کہ روایت بالمعنی میں تغیر وتبدل ہو جاتا ہے اور معنی کے بدل جانے کا خوف ہوتا ہے دوسرا نقصان یہ ہے کہ کسی خاص واقعہ میں کوئی حکم دیا جاتا ہے اور راوی اس کو حکم کلی سمجھ لیتا ہے، اور تیسرا نقصان یہ ہے کہ اس حکم میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکیدی جملہ فرمایا تا کہ لوگ اس کا خوب اہتمام کریں پس راوی نے اس سے اس کا واجب ہونا یا حرام ہونا سمجھ لیا اور واقع میں ایسا نہیں تھا، پس جو شخص فقیہ ہے اور خود اس موقع پر موجود تھا تو وہ قرائن سے حقیقت حال معلوم کرے گا۔ جیسے حضرت زید رضی اللہ عنہ نے مزارعت کے متعلق اور پھل پکنے سے پیشتر پھلوں کی خرید وفروخت کی نسبت کہا ہے کہ یہ نہی بطور مشورہ تھی۔

اور دوسرے طریقہ یعنی اجتہادی حالت میں یہ نقصان ہے کہ اس میں صحابہ اور تابعین کے قیاسات جو کتاب وسنت سے مستنبط ہیں داخل ہو جاتے ہیں اور اجتہاد ہر حالت میں یہ ضروری نہیں ہے کہ درست ہی ہوا کرے اور بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان میں سے کسی کو حدیث نہیں پہنچی یا اس طرح سے پہنچی کہ اس جیسی حدیث قابل حجت نہیں ہوتی اس واسطے اس پر عمل نہیں کیا،

پھراس کے بعد اصل حال دوسرے صحابی کی زبانی معلوم ہوا جیسے تیمم جنابت کے متعلق حضرت عمرؓ اورعبداللہ بن مسعودؓ کا قول ہے۔

اور اکثر اوقات بڑے بڑے صحابہ ایسے امر پر متفق ہوئے ہیں جس کی خوبی عقل سے معلوم ہوئی ہے اسی لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے میرے طریقہ کی اور میرے بعد خلفا راشدین کے طریقہ کی پابندی کرو'' ۔حالانکہ یہ اتفاق اصول شریعت میں سے نہیں ہے، پس جس شخص کو اخبار اور الفاظ حدیث میں کمال حاصل ہے تو اس کو لغزش سے نجات پانے میں آسانی ہوسکتی ہے، اور جب ایسی حالت ہے تو فقہ میں خوض کرنے والے کو ضرور ہے کہ وہ دونوں مشربوں سے سیراب ہو اور دونوں مذہبوں میں کمال رکھتا ہو۔

اور احکام ملت میں عمدہ وہ احکام ہیں جن پر جمہور رواۃ اور علما متفق ہوں اور دونوں طریقے ان میں مطابق ہوں، واللہ اعلم۔

چوتھا باب: کتب حدیث کے طبقات کا بیان

واضح ہو کہ ہمارے پاس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے سوا کوئی ذریعہ شرائع اور احکام کے معلوم کرنے کا نہیں ہے بخلاف مصالح کے کہ ان کو تجربہ، غور کامل اور حدس وغیرہ سے بھی معلوم کرسکتے ہیں، اور ہمارے لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا علم حاصل کرنے کا صرف یہی ذریعہ ہے کہ وہ روایتیں ہم پہنچیں جن کی سند آپ تک پہنچتی ہے خواہ وہ احادیث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ ہوں یا موقوف احادیث ہوں کہ ان کی روایت جماعت صحابہ وتابعین سے بصحت پہنچتی ہو، اس طرح کہ اگر شارع کی جانب سے نص یا اشارہ نہ ہوتا تو وہ اس کے قطعی ہونے پر اقدام نہ کرتے پس اس قسم کی روایت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دلالۃً ماخوذ ہے۔

اور ہمارے زمانہ میں اس قسم کی روایتوں کے حاصل ہونے کا کوئی ذریعہ بجز اس کے نہیں ہے کہ جو کتابیں علم حدیث میں مدون ہیں ان کا تتبع کیا جائے کیونکہ آج کل سوائے کتب مدونہ کے کوئی معتبر روایت نہیں پائی جاتی، کتب حدیث کے درجے اور طبقے مختلف ہیں اس لئے ان طبقات کا معلوم کرنا ضروری ہے۔

پس ہم کہتے ہیں کہ صحت وشہرت کے لحاظ سے کتب حدیث کے چار درجات ہیں، اس کی

وجہ یہ ہے کہ پہلے تم جان چکے ہو کہ حدیث کی قسمیں یہ (تین) ہیں، اول متواتر جس کے قبول کرنے اور عمل کرنے پر امت کا اجماع ہے، اس کے بعد دوسری قسم کی وہ ہیں جو متعدد طریقوں سے حاصل ہوئی ہوں اور کوئی معتد بہ شبہ ان کے ثبوت میں نہ رہا ہو اور ان پر عمل کرنے میں جمہور فقہا بلاد متفق ہوں، یا خصوصا علما حرمین نے اختلاف نہ کیا ہو، اس واسطے کہ قرون اولی میں حرمین خلفا راشدین کے قیام کی جگہ تھی، اور پھر ہر زمانہ میں وہاں علما آتے رہے ہیں سو یہ بعید معلوم ہوتا ہے کہ علما حرمین ظاہری خطا کو تسلیم کر سکیں یا کوئی قول مشہور ہو گیا ہو ملک کے بڑے حصہ میں اس پر عمل کیا گیا ہو اور صحابہ و تابعین کی بڑی جماعت نے اس کی روایت کی ہو۔

اور تیسری قسم کی احادیث وہ ہیں جو صحیح ہوں، ان کی اسناد حسن ہو، علما حدیث نے ان کی شہادت دی ہو اور وہ حدیث ایسا قول متروک نہ ہو جس کی طرف علما امت میں سے کسی نے التفات نہ کیا ہو لیکن جو احادیث ضعیف، موضوع، یا منقطع یا مغلوب السند یا مغلوب المتن ہوں یا مجہول الحال لوگوں سے مروی ہوں یا اس حدیث کے خلاف ہوں جس پر ہر طبقہ میں علما کا اتفاق رہا ہو، پس ایسی حدیثوں کا قائل ہونا ممکن نہیں، کتب حدیث کے صحیح ہونے کے معنی یہ ہیں کہ مولف کتاب نے اپنے اوپر لازم کر لیا ہو کہ وہ انہیں حدیثوں کو روایت کرے گا جو صحیح یا حسن ہوں گی نہ ایسی حدیث کو جو مغلوب ہوں یا شاذ ہوں یا ضعیف ہوں، ہاں اگر ضعیف کو روایت کرے تو ساتھ ہی اس کا حال بھی بیان کر دے کیونکہ ضعیف کا اس طرح روایت کرنا اس کا ضعف بھی بیان کر دیا جائے کتاب میں موجب اعتراض نہیں ہے اور شہرت حدیث کے معنی یہ ہیں کہ جو احادیث کتب میں مذکور ہیں وہ تدوین کتب حدیث سے پہلے اور بعد محدثین کی زبان پر دائر و سائر ہوں اور ائمہ حدیث نے مولف سے پہلے ہی ان حدیثوں کو مختلف طرق سے روایت کیا ہو اور اپنے مسندوں اور مجموعوں میں ان کو بیان کیا ہو اور مؤلف کے بعد کے لوگوں نے اس کی روایت کرنے اور محفوظ رکھنے کی طرف توجہ کی ہو، اس کا اشکال رفع کر دیا ہو، اس کے غریب الفاظ کی شرح کر دی ہو اس کا اعراب بیان کیا ہو، اس کے طرق بیان کئے ہوں، مسئلہ فقہی اس سے مستنبط کیا ہو، اور ہر درجہ اور مرتبے میں ہمارے زمانہ تک اس کے راویوں کے حالات کا سراغ لگایا گیا ہو یہاں تک کہ کوئی چیز جو حدیث سے متعلق ہے ایسی باقی نہ رہے جس میں پورا غور نہ کر لیا ہو، الا ما شاء اللہ، ناقدین حدیث

نے مؤلف سے پہلے اور اس کے بعد اس کے اقوال سے موافقت کی ہو اور ان کی صحت کا حکم دیا ہو اور ان میں مصنف کی رائے پر رضا مند ہو گئے ہوں اور اس کی کتاب کی ثنا خوانی بھی کی ہو اور ائمہ فقہ نے ہمیشہ ان احادیث سے استنباط مسائل کیا ہو اور ان پہ اعتماد کیا ہو اور عام لوگ بھی ان پر اعتقاد رکھتے ہوں اور ان کی تعظیم کرتے ہوں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ جب کسی کتاب میں یہ دونوں اوصاف جمع ہوں تو وہ طبقۂ اولیٰ کی سمجھی جائے گی پھر ان اوصاف کے اعلیٰ درجہ کے لحاظ سے فوقیت ہوتی جائے گی اور جس کتاب میں یہ دونوں اوصاف بالکل مفقود ہوں گے تو اس کتاب کا کچھ بھی اعتبار نہ ہوگا، اور جو کتاب طبقۂ اولیٰ میں اعلیٰ درجہ کی ہو تو وہ تواتر کی حد تک پہنچ جاتی ہے اور اس سے کم درجہ کی مستفیض کے مرتبہ تک پہنچتی ہے، پھر اس کے بعد وہ ہے جو قطعی صحت کے قریب ہو، اور قطعی ہونے سے مراد وہ یقین ہے جو علم حدیث میں معتبر اور مفید عمل ہے، اور دوسرے طبقہ کی احادیث وہ ہیں جو مستفیض کے قریب ہوں یا صحت قطعیہ کے قریب ہوں یا ظنیہ کے قریب ہوں اور اسی طرح ان احادیث کا درجہ کم ہوتا جاتا ہے، پس استقرا اور تلاش سے طبقۂ اولیٰ کی صرف تین کتابیں ہیں، موطا، صحیح بخاری اور صحیح مسلم، امام شافعی فرماتے ہیں کہ کتاب اللہ کے بعد سب کتابوں میں زیادہ صحیح کتاب امام مالک کی مؤطا ہے اور اہل حدیث متفق ہیں کہ امام مالک اور ان کے موافقین کی رائے کے مطابق موطا کی تمام احادیث صحیح ہیں اور دوسرے محدثین کی رائے کے موافق اس میں کوئی مرسل اور منقطع حدیث ایسی نہیں ہے کہ دیگر طرق سے اس کی سند متصل نہ ہوئی ہو پس اس وجہ سے موطا کی تمام احادیث صحیح ہی ہیں امام مالک کے زمانہ میں بہت سی مؤطا تصنیف کی گئیں جن میں موطا مالک کی احادیث کی تخریج کی گئی اور اس کی منقطع احادیث کو متصل کیا گیا جیسے ابن ابی ذئب، ابن عیینہ، ثوری اور معمر وغیرہم جن کے اساتذہ اور امام مالک کے اساتذہ مشترک تھے اور اس کتاب کو امام مالک سے بلا واسطہ ایک ہزار سے زیادہ آدمیوں نے روایت کیا ہے، نہایت دور دراز ملکوں سے لوگ سفر کر کے احادیث موطا کے لئے امام مالک کے پاس حاضر ہوئے جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی پیشین گوئی کی تھی، امام مالک کے شاگردوں میں سے بعض بڑے بڑے فقہا تھے جیسے امام شافعی، محمد بن حسن، ابن وہب اور ابن قاسم، اور ان میں سے بعض بڑے بڑے محدثین تھے جیسے

یحییٰ بن سعید قطان، عبدالرحمٰن بن مہدی اور عبدالرزاق، اور ان کے شاگردوں میں سے بعض امراء اور سلاطین تھے جیسے ہارون رشید اور ان کے دونوں بیٹے، اور مؤطا کی شہرت امام مالک ہی کے زمانہ میں تمام اسلامی ممالک میں پھیل گئی تھی، اس کے بعد جو زمانہ بھی آیا اس میں اسی کتاب کو زیادہ شہرت ہوئی اور اسی کی طرف توجہ زیادہ ہوئی اور شہروں کے فقہا نے اپنے مذاہب کا مبنیٰ بھی اسی کو قرار دیا یہاں تک کہ بعض امور میں اہل عراق نے بھی اسی کو بنیاد ٹھیرایا اور علما برابر اس کی حدیثوں کی تخریج کرتے رہے ہیں اور اس کے شواہد اور توابع کو بیان کرتے رہے ہیں اور اس کے غریب الفاظ کی شرح اور مشکل کا انضباط کرتے رہے ہیں اور ہمیشہ اس کے مسائل میں مباحثہ کرتے رہے ہیں اور اس کے راویوں کی اس حد تک تفتیش کی ہے کہ اس کے بعد غور کا کوئی درجہ باقی نہ رہا اور اگر تم حق صریح چاہتے ہو تو کتاب موطا کا امام محمد کی کتاب الآثار اور امام ابو یوسف کی کتاب امالی سے موازنہ کرلو، موطا میں اور ان دونوں کتابوں میں بعد المشرقین تم کو نظر آئے گا۔

تم نے کسی محدث اور کسی فقیہ کو سنا ہے کہ ان دونوں کی طرف اس نے توجہ کی ہے؟

لیکن صحیح بخاری اور صحیح مسلم، پس محدثین متفق ہیں کہ ان میں تمام کی تمام متصل مرفوع احادیث یقیناً صحیح ہیں اور یہ دونوں کتابیں اپنے مصنفین تک بالتواتر پہنچتی ہیں اور جو ان کی عظمت نہ کرے وہ مبتدع ہے جو مسلمانوں کی راہ کے خلاف چلتا ہے۔

اور اگر تم حق صریح چاہو تو ان دونوں کتابوں کا ابن ابی شیبہ اور طحاوی کی کتابوں اور خوارزمی وغیرہ کی مسندوں سے مقابلہ کرو تم ان میں بعد المشرقین پاؤ گے۔

اور حاکم نے صحیحین کی احادیث پر ان دونوں کی شرط کے موافق دیگر احادیث کا اضافہ کیا ہے جن کو شیخین نے ذکر نہیں کیا تھا، میں نے ان احادیث کا تتبع کیا ہے جن کا حاکم نے اضافہ کیا ہے ان کو ایک وجہ سے میں نے درست پایا اور ایک وجہ سے غیر درست، اس واسطے کہ حاکم نے بہت سی احادیث کو صحت اور اتصال میں اساتذۂ شیخین سے ان دونوں کی شرط کے موافق مروی پایا، پس حاکم کا اس وجہ سے اضافہ کرنا درست ہے لیکن شیخین اس حدیث کو ذکر کرتے ہیں جن میں ان کے اساتذہ نے خوب غور کرلیا تھا اور اس کے بیان کرنے پر اور اس کی صحت پر ان کا اتفاق ہوگیا تھا جیسے امام مسلم نے اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے جبکہ انھوں نے یہ کہا کہ میں یہاں صرف وہی

احادیث بیان کروں گا جن پر سب اساتذہ کا اتفاق ہے اور بڑی سے بڑی احادیث جن کو حاکم نے ذکر کیا ہے وہ ہیں جو صحیحین کے مشائخ کے زمانہ میں مخفی تھیں اگر چہ بعد میں ان کی شہرت ہوگئی تھی یا وہ تھی یا وہ ہیں جن کو راویوں میں محدثین نے اختلاف کیا ہے، پس شیخین اپنے اساتذہ کی طرح حدیثوں کے موصول اور منقطع ہونے میں اتنا غور وخوض کرتے تھے کہ اصلی حالت کا انکشاف ہو جاتا تھا اور حاکم نے اکثر ان قواعد پر اعتماد کیا ہے جو محدثین کے فنون سے حاصل کئے گئے ہیں جیسا کہ حاکم کا قول ہے کہ ثقہ راویوں کی زیادتی مقبول ہے۔

اور جب حدیث کے موصول ومرسل ہونے اور موقوف ومرفوع وغیرہ ہونے میں علما کا اختلاف ہو تو جس نے ایک بات زیادہ یاد رکھی وہ اس پر حجت ہے جس نے اس کو یاد رکھا، اور حق بات یہ ہے کہ بسا اوقات حفاظ میں موقوف اور منقطع کے موصول کرنے میں خلل پڑ جاتا ہے بالخصوص جبکہ حفاظ کو متصل مرفوع کی طرف زیادہ میلان وتوجہ ہوتی ہے اس واسطے شیخین بہت سی ان احادیث کے قائل نہیں ہیں جن کے حاکم قائل ہیں، واللہ اعلم۔

اور یہی تینوں کتابیں وہ ہیں جن کے ضبط مشکلات اور رد تحریفات کا قاضی عیاض نے مشارق الانوار میں اہتمام کیا ہے۔

طبقۂ ثانیہ میں وہ وہ کتابیں ہیں جو مؤطا اور صحیحین کے درجہ تک نہیں پہنچتی ہیں لیکن ان کے قریب قریب ہیں، ان کے مصنف وثوق، عدالت اور حفظ میں مشہور تھے اور فنون حدیث میں تبحر تھے اور انھوں نے اپنی اس درجہ کی تصانیف میں ان شروط میں کوتاہی کرنے کو پسند نہیں کیا جن کو انھوں نے اپنے اوپر لازم کر لیا تھا پس ان کے بعد ہر زمانہ میں محدثین اور فقہا نے ان کتابوں کو قبول کیا اور ان کی طرف توجہ کی اور وہ لوگوں میں مشہور ہوگئیں اور لوگوں نے ان کے غریب کی شرح کی اور ان کے راویوں کی تفتیش کی اور ان کتابوں سے مسائل کا استنباط کیا اور عام علوم کی بنا انھی کتابوں کی احادیث پر ہے اس طبقہ میں سنن ابوداؤد، جامع ترمذی اور نسائی ہیں، اس طبقہ کی اور طبقۂ اولی کی احادیث کو رزین نے تجرید صحاح میں اور ابن اثیرؒ نے جامع الاصول میں جمع کیا ہے اور مسند امام احمد بھی تقریباً اسی طبقہ کی ہے، اس واسطے کہ امام احمد نے اس کتاب کو اصل قرار دیا ہے جس سے صحیح اور سقیم میں فرق ہوتا ہے، اور فرمایا ہے جو حدیث میری کتاب میں نہیں ہے اس کو قبول نہ کرو۔

طبقہ ثالثہ میں وہ مسندیں، جوامع اور تصنیفات داخل ہیں جو بخاری ومسلم سے پہلے یا ان کے زمانہ میں یا ان کے بعد تصنیف ہوئی ہیں اور ان میں صحیح ،حسن ،ضعیف ،معروف ،غریب ،شاذ ، منکر ،خطا وثواب اور ثابت ومقلوب ہر قسم کی حدیثیں شامل ہیں اگرچہ ان سے اجنبیت محض رفع ہوگئی ہے تاہم علما میں ان کی ویسی شہرت نہیں ہے۔

ان احادیث کا جو ان کتابوں میں متفرد ہیں فقہا نے کچھ زیادہ استعمال نہیں کیا اور محدثین نے ان کی صحت وسقم سے زیادہ بحث نہیں کی۔

اوران میں سے بعض کتابیں ایسی ہیں کہ کسی اہل لغت نے ان کی غرابت دور کرنے میں کوئی خدمت نہیں کی اور کسی فقیہ نے سلف کے مذاہب پر ان کو منطبق نہیں کیا اور کسی محدث نے ان کی مشکلات کو بیان نہیں کیا اور کسی مورخ نے ان کے اسماء رجال کو ذکر نہیں کیا، میری مراد ان متاخرین سے نہیں ہے جن کی نظر گہری ہے، میرا کلام ان ائمہ حدیث میں ہے جو زمانہ سلف میں تھے پس یہ کتابیں خفا اور گمنامی حالت میں باقی رہیں، جیسے مسند ابویعلی ،مصنف عبدالرزاق ،مصنف ابوبکر بن ابی شیبہ ،مسند عبد بن حمید ،مسند طیالسی ،بیہقی ،طحاوی اور طبرانی کی تصانیف۔

اوران مصنّفین کی غرض محض احادیث کا جمع کردینا تھا احادیث کا خلاصہ کرنا ،ان کو مہذب بنانا اور عمل کے قابل بنانا مقصود نہ تھا۔

طبقہ رابعہ میں وہ کتابیں ہیں جن کے مصنّفین نے زمانہ دراز کے بعد ان احادیث کو جمع کرنے کا قصد کیا جو طبقہ اولی اور طبقہ ثانیہ کی کتابوں میں نہیں تھیں اور وہ ایسے مجموعوں اور مسندوں میں موجود تھیں جن کی شہرت نہیں ہوئی تھی، ان مصنّفین نے ان احادیث کی وقعت کی اور یہ احادیث ایسے لوگوں کی زبان زد تھیں کہ جن کی حدیث کو محدثین نے اپنی کتابوں میں نہیں لیا تھا جیسے اکثر واعظ مبالغہ آمیز باتیں کیا کرتے ہیں یا وہ حدیثیں کہ اہل ہوا اور ضعیف راویوں سے مروی تھیں، یا وہ صحابہ وتابعین کے آثار تھے یا بنی اسرائیل کے احبار یا حکما وواعظین کے کلام تھے جن کو راویوں نے سہواً یا عمداً نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے خلط ملط کردیا تھا، یا قرآن مجید اور حدیث صحیح کے بعض احتمالات تھے جن کو نیک لوگوں نے جو روایت کے غوامض سے واقف نہیں ہوتے تھے، بالمعنی روایت کردیا اور ان معانی کو احادیث مرفوعہ سمجھ لیا، یا بعض معانی کتاب وسنت

کے اشارات سے مفہوم ہوتے تھے ان کو عمداً مستقل حدیث سمجھ لیا یا چند احادیث میں چند مختلف جملے وارد ہوئے تھے ان کو ترتیب دے کر ایک حدیث بنالیا۔ اوران احادیث کا محل ابن حبان اور کامل ابن عدی کی کتاب الضعفا ہے اور خطیب، ابونعیم، جوزقانی، ابن عساکر، ابن بخار اور دیلمی کی کتب ہیں، اور مسند خوارزمی اسی طبقہ سے معلوم ہوتی ہے اور اس طبقہ میں سب سے زیادہ درست وہ احادیث ہیں جو ضعیف ومحتمل ہیں اور سب سے بدتر وہ ہیں جو موضوع یا مقلوب وحد درجہ منکر ہیں اور ابن جوزی کی کتاب الموضوعات میں اسی طبقہ کی احادیث ہیں۔

اس مقام پر ایک طبقہ خامسہ بھی ہے اس طبقہ سے متعلق وہ احادیث ہیں جو فقہا صوفیہ مورخین وغیرہ کی زبان پر مشہور ہیں اور ان چاروں طبقوں میں ان کی کوئی اصل نہیں اور اسی طبقہ سے متعلق وہ احادیث ہیں جن کو بے دین زبان دانوں نے اختراع کیا اور انھوں نے ایسی اسناد قوی بیان کی جن میں جرح نہیں ہوسکتی اور ایسے کلام بلیغ سے بیان کیا جس کا صدور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بعید معلوم نہیں ہوتا۔ پس ایسے لوگوں نے اسلام میں ایک سخت مصیبت برپا کردی لیکن اہل حدیث کے فضلا ایسی حدیثوں کو متابعات اور شواہد پر مطابق کر کے دیکھتے ہیں اس وقت ان پر پردہ دری ہوتی ہے اور عیب ظاہر ہو جاتا ہے لیکن طبقۂ اولی اور طبقۂ ثانیہ۔ پس ان پر محدثین کا اعتماد کامل ہے انہی سے ان کو ہمیشہ وابستگی رہی ہے لیکن طبقۂ ثالثہ پس اس طبقہ کی حدیثوں پر عمل کرنا اور ان کا قائل ہونا ان متبحرین اور محققین کا کام ہے جو اسماء رجال اور علل احادیث کو محفوظ رکھتے ہیں۔ البتہ اس طبقہ کی حدیثوں سے اکثر متابعات اور شواہد ماخوذ ہوتے ہیں۔ قد جعل الله لكل شيء قدراً لیکن طبقۂ رابعہ، پس اس طبقہ کی احادیث سے شغل رکھنا ان کو جمع کرنا اور ان سے مسائل کا استنباط کرنا، علما متاخرین کی طرف سے ایک طرح کا تعمق ہے۔

اور حق بات یہ ہے کہ متبدعین کے گروہ روافض اور معتزلہ وغیرہ ادنی توجہ سے ان احادیث سے اپنے مذاہب کے شواہد کو ملخص کر سکتے ہیں۔ لیکن علما حدیث کے معرکوں میں اس طبقہ کی احادیث سے استدلال کرنا صحیح نہیں ہے، واللہ اعلم۔

پانچواں باب: اس بیان میں کہ کلام سے مراد کیسے سمجھ میں آتی ہے

واضح ہو کہ متکلم کا دلی مقصود بیان کرنے اور سامع کا اس سے مطلب سمجھنے کے بلحاظ ظہور وخفا

کے بالترتیب کئی درجات ہیں، سب سے اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ ایک شئے خاص کے لئے صریح طور پر حکم ثابت کیا گیا ہو اور اسی کے بتانے اور سمجھانے کو وہ کلام بولا گیا ہو اور اس میں کسی دوسرے معنی کا احتمال نہ ہو، اور اس کے بعد اس کا درجہ ہے جس میں ان تین قیدوں میں سے کوئی قید نہ پائی جائے بلکہ یا اس میں حکم کا ثبوت کسی عنوان کے لئے ہو جو چند افراد کو خواہ بطریق شمول خواہ بطریق بدلیت شامل ہو جیسے الناس اور مسلمون اور قوم ورجال ہے اور اسماء اشارہ جب اس کا صلہ عام ہو اور موصوف جس کی صفت عام ہو اور منفی بلام الجنس ہے اس واسطے کہ اکثر عام معنی کو خصوصیت لاحق ہو جاتی ہے اور یا یہ ہو کہ کلام خاص اس مقصد کے لئے نہ بولا جائے بلکہ اس موقع سے وہ مطلب لازمی طور پر حاصل ہوتا ہو جیسے اس کلام: ''میرے پاس زید فاضل آیا''۔ میں زید کی فضیلت اور ''اے فقیر زید''۔ میں زید کا فقر لزوماً معلوم ہوتا ہے، یا اس لفظ میں کسی دوسرے معنی کا بھی احتمال ہو جیسے لفظ ''مشترک'' اور وہ لفظ جس کے حقیقی معنی استعمال میں آتے ہوں۔ لیکن معنی مجازی زیادہ مشہور ہوں اور وہ لفظ جس کا علم مثال اور تقسیم سے ہوتا ہو اور کسی جامع مانع تعریف سے معلوم نہیں ہوتا جیسا کہ سفر معلوم ہے کہ من جملہ اس کی امثلہ کے مدینہ سے مکہ تک کا قصد کرنے کے نکلنا ہے، اور معلوم ہے کہ بعض حرکات بطور تفریح کے ہوتی ہیں اور بعض حرکات ضرورت کی بنا پر ہوتی ہیں کہ اسی روز وہ اپنے گاؤں کی طرف لوٹ آتا ہے اور بعض حرکات سفر ہوتی ہیں اور ان کی حد معلوم نہیں ہوتی اور جیسا کہ وہ لفظ جو دو شخصوں کے دائر ہو جیسے اسم اشارہ اور ضمیر جبکہ قرائن میں تعارض ہو، یا وہ دونوں ایک صلہ کے مصداق ہو رہے ہوں، پھر اس کلام کے بعد اس کلام کا درجہ ہے جس کے بغیر توسط استعمال لفظ کے مطلب مفہوم ہو جائے، ایسے طریقے بڑے بڑے تین ہیں، ایک نحوی کلام ہے اور وہ یہ ہے کہ کلام کسی ایسے امر کا حال بتلائے جس کا عبارت میں ذکر نہیں، ایسے معنی کے توسط سے جس کی وجہ سے وہ حکم ذکر کیا گیا ہے جیسے ''ماں باپ کو اف بھی نہ کرو'' اس سے ماں باپ کو مارنے کی حرمت بطریق اولی سمجھی جاتی ہے اور جیسے کہا جائے کہ جو شخص رمضان میں دن میں کھائے گا تو اس پر قضا واجب ہو جائے گی اس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ جو روزہ توڑے گا اس پر قضا لازم ہوگی اور صرف کھانے کی صورت اس واسطے ذکر کی گئی کہ یہ صورت ذہن میں جلد آجایا کرتی ہے۔ دوسرا اقتضا ہے اس سے مطلب اس طرح سمجھ میں آتا ہے کہ وہ معنی مستعمل فیہ کو عادتاً یا عقلاً یا

شرعاً لازم ہوتا ہے مثلاً یہ کلام ''میں نے آزاد کیا یا فروخت کیا'' اس امر کا اقتضا کرتا ہے کہ پہلے سے وہ شئے اس کی ملک ہو، اور ''وہ چلا'' تقاضا کرتا ہے کہ اس کے پاؤں سالم تھے، اور اس نے نماز پڑھی، کا مقتضایہ ہے کہ وہ طہارت سے تھا، تیسرا ایما ہے اور وہ ایک مقصود کو عبارات میں مناسب اعتبارات سے ادا کرنا ہے پس بلیغ لوگ اس بات کا قصد کرتے ہیں کہ عبارت اس اعتبار مناسب کے مطابق ہو جو اصل مقصود پر زاید ہے، اس واسطے کلام سے اس کے مناسب اعتبار کو سمجھ لیا جاتا ہے۔ مثلاً کسی شئے کو وصف یا شرط سے مقید کرنا، اس وصف اور شرط سے یہ بات سمجھی جاتی ہے کہ اگر یہ وصف اور شرط نہ پائے جائیں گے تو یہ حکم بھی نہ ہوگا لیکن یہ اس وقت ہے کہ جب اس کلام سے جس میں وصف یا شرط ہے سوال وجواب کی مشابہت مقصود نہ ہو اور نہ اس صورت کا بیان کرنا مقصود ہو جو اذہان کی طرف متبادر ہوتی ہے اور نہ حکم کا فائدہ بیان کرنا مقصود ہو، اور ایسے ہی مفہوم استثنا، غایت اور عدد کا حال ہے، اور ایما کے اعتبار کرنے میں یہ شرط ہے کہ اس ایما کی وجہ سے اہل زبان کے عرف میں کلام میں تناقض سمجھا جائے مثلاً کوئی شخص اس طرح کہے کہ مجھ کو دس دینے ہیں سوائے ایک شئے کے اور پھر یہ کہے کہ مجھ کو ایک دینا ہے پس جمہور اس کے کلام میں تناقض کہیں گے لیکن وہ امور جن کو سوائے علم معانی میں غور وخوض کرنے والوں کے کوئی نہیں سمجھتا ان کا کچھ لحاظ نہیں ہے، اس کے بعد ان مطالب کا درجہ ہے جن کی رہبری مضمون کلام سے ہوتی ہے اس کی بھی تین بڑی قسمیں ہیں، اول عموم میں کسی شئے کو مندرج کرنا مثلاً بھیڑیا کچلیوں والا ہوتا ہے اور ہر کچلی والا جانور حرام ہوتا ہے اور اس کا بیان قیاس اقترانی سے ہوتا ہے چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول میں اسی طرف اشارہ ہے کہ ''گدھوں کے بارے میں سوائے اس تنہا جامع آیت کے مجھ پر اور کچھ نازل نہیں ہوا اور وہ آیت یہ ہے ''جو شخص ذرہ برابر بھی کرے گا وہ اس کی جزا دیکھے گا اور جو شخص ذرہ برابر برائی کرے گا وہ اس کی جزا دیکھے گا''۔ اور اسی قسم سے ہے عبداللہ بن عباس کا استدلال اس آیت سے: **فبھداھم اقتدہ** اور اس آیت سے: **وظن داؤد انما فتناہ فاستغفر ربہ وخر راکعا واناب** '' پھر عبداللہ بن عباس نے فرمایا کہ تمہارے پیغمبر کو ان کی پیروی کا حکم ہوا تھا، اور ایک استدلال ملازمت یا منافات کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔

اس کی مثال یہ ہے کہ وتر اگر واجب ہوتے تو آپ ان کو سواری پر ادا نہ کرتے لیکن آپ ان

کوسواری پر ادا کیا کرتے تھے۔ اور اس استدلال کا بیان قیاس شرط کی صورت میں ہے اور اسی قبیل سے اللہ تعالیٰ کی یہ آیت ''لو كان فيهما آلهة الا الله لفسدتا''۔ اور ایک قیاس ہوتا ہے اور وہ کسی علت مشترکہ کی وجہ سے ایک صورت کو دوسری صورت سے تمثیل دینا ہے جیسے یہ قول: گیہوں کی طرح چنا بھی ربوی ہے (یعنی اس میں بھی ربوٰی ہوتا ہے) ایسا ہی قیاس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول میں ہے ''اگر تیرے باپ پر قرضہ ہوتا اور تو اس کو ادا کرتا تو کیا اس کی طرف سے کافی ہو جاتا؟ اس شخص نے کہا ہاں، ہو جاتا، تب آپ نے فرمایا ''پس تو باپ کی طرف سے حج کر''۔ واللہ اعلم۔

چھٹا باب: کتاب وسنت سے احکام شرعیہ کے سمجھنے کی کیفیت کا بیان

واضح ہو کہ جن الفاظ سے رضا اور ناراضی معلوم ہوتی ہے وہ الفاظ حب وبغض، رحمت ولعنت اور قرب وبعد ہیں اور وہ الفاظ ہیں جن میں فعل کی نسبت محبوب یا مغضوب کی طرف ہوتی ہے جیسے مومنین اور منافقین، ملائکہ اور شیاطین، اہل جنت اور اہل نار، اور وہ الفاظ ہیں جن سے طلب اور منع ہوتی ہے یا اس جزا کا بیان ہوتا ہے جو فعل پر مرتب ہوتی ہے یا عرف کی کسی عمدہ یا مذموم شئے کے ساتھ تشبیہ ہوتی ہے، اور نیز رضا و ناراضی اس سے بھی معلوم ہوتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس امر کے کرنے کا اہتمام فرمائیں یا باوجود دواعی کے اس سے اجتناب کریں، لیکن یہ امر کہ رضا اور ناراضی کے درجات وجوب وندب اور حرمت وکراہت میں باہم تمیز ہو، پس اس میں سب سے زیادہ صورت یہ ہے کہ اس فعل کے مخالف کا حال بیان کیا جائے جیسے یہ حدیث ''جو شخص اپنے مال کی زکوٰۃ ادا نہ کرے گا قیامت کے روز اس کا مال گنجے سانپ کی صورت میں ہوگا'' اور جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ہے ''ومن لا فلا حرج'' اور ان درجات کی تمیز اس سے بھی ہوتی ہے کہ مثلاً کہا جائے فلاں شئے واجب ہے یا فلاں شئے ناجائز ہے یا کوئی شئے اسلام یا کفر کے لئے رکن قرار دی جائے یا اس کی بجا آوری یا ترک پر نہایت شدت کی جائے یا اس کے متعلق ایسا کہہ دیا جائے کہ یہ امر مروت سے بعید ہے یا مناسب نہیں ہے، نیز صحابہ اور تابعین اس بارے میں کوئی حکم معین کریں جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ ''سجدہ تلاوت واجب نہیں ہے'' اور جیسے حضرت علی کا قول ہے کہ ''وتر واجب نہیں ہے''۔ یا مقصد کی حالت دیکھی جائے کہ آیا اس سے کسی

طاعت کی تکمیل ہوتی ہے یا کسی گناہ کا ذریعہ بند ہوتا ہے یا اس عمل میں وقار اور حسن ادب کی شان معلوم ہوتی ہے لیکن کسی فعل کی علت اور رکن اور شرط معلوم کرنا ہو تو ان امور کے لئے سب سے صریح اور صاف یہ ہے کہ وہ نص سے ثابت ہو جیسے ہر نشہ والی چیز حرام ہے، جو شخص نماز میں سورہ فاتحہ نہ پڑے گا اس کی نماز نہ ہوگی، تم میں سے کسی کی نماز بغیر وضو کے قبول نہ ہوگی''۔ اس کے بعد وہ ہے جو اشارہ اور ایما سے ثابت ہو جیسا کہ ایک شخص نے کہا تھا کہ ''رمضان میں میں اپنی بیوی سے ہم بستر ہو گیا، آپ نے فرمایا ایک غلام آزاد کر'' اور جیسا کہ نماز کو قیام، رکوع اور سجود کے نام سے تعبیر کرنا اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ امور نماز کے ارکان ہیں، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان سے: ''ان کو چھوڑ کیونکہ میں نے ان کو طہارت کی حالت میں پہنا ہے''۔ یہ سمجھا جاتا ہے کہ موزے پہننے کے وقت طہارت کا ہونا شرط ہے نیز علت وشرط ورکن کی یہ پہچان ہے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کسی شئے کے پائے جانے کے وقت ایک شئے کے وجود اور اس کے نہ پائے جانے کے وقت اس شئے کے عدم کا حکم کیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ذہن میں اس شئے کا علت ہونا یا شرط ہونا یا رکن ہونا اس طرح جم جاتا ہے جس طرح اہل عرب کی ممارست سے اور قرائن کے موافق الفاظ کو معانی موضوعہ میں استعمال کرنے سے ایک فارسی کے ذہن میں لغات عرب کے معانی کی معرفت متمکن ہو جاتی ہے حالانکہ وہ ان الفاظ کے معنی وضعی نہیں جانتا، اور اس کے جاننے کا مدار انہی مواضع استعمال کی معرفت پر ہے پس اسی طرح جب ہم شارع کو دیکھتے ہیں کہ جب بھی وہ نماز پڑھتا ہے تو رکوع اور سجود کرتا ہے اور اپنے بدن سے ناپاکی دور کرتا ہے اور ہر دفعہ ایسا ہی کرتا ہے تو ہم کو یقین ہو گیا کہ یہ امور مقصود ہیں، اگر تم حق معلوم کرنا چاہتے ہو تو ذاتی صفات معلوم کرنے کا مدار علیہ یہی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ لوگ لکڑیاں جمع کرتے ہیں اور ان سے ایسی چیز بناتے ہیں جو نشست کے قابل ہو اور اس کو تخت کے نام سے موسوم کرتے ہیں تو اس سے ہم کو تخت کے اوصاف ذاتی کا انتزاع ہوتا ہے اس کے بعد وجود مناسبت پر اعتماد کرتے ہوتے یا مشابہت وحذف پر اعتماد کرتے ہوئے مدار علیہ کی تخریج کرنا ہے، لیکن ان مقاصد کا معلوم کرنا ہے جن پر احکام کی بناء ہوتی ہے نہایت دقیق علم ہے اس علم میں وہی شخص خوض کر سکتا ہے جس کا ذہن نہایت لطیف اور فہم نہایت مستقیم ہو، اور فقہائے صحابہ نے طاعتوں اور گناہوں کے اصول کو ان مشہور امور

سے اخذ کرلیا تھا جن پر اس زمانہ کے فرقوں کا اتفاق ہو گیا تھا جیسے مشرکین عرب اور یہود و نصاریٰ، اس واسطے صحابہ کو ان احکام کی وجہ اور ان کے متعلق مباحث کی ضرورت نہ تھی، اور شریعت کے قوانین اور سہولت واستحکام دین کے قوانین کو انھوں نے امر ونہی کے مواقع کا مشاہدہ کر کے حاصل کرلیا تھا جیسے طبیب کہ ہم نشین مدت کی میل جول اور مشاقی سے ان دواؤں کے فوائد و مقاصد معلوم کر لیتے ہیں جن کے استعمال کا وہ طبیب حکم کرتا ہے اور صحابہ ان قوانین کو خوب اچھی طرح سے جانتے تھے اسی واقفیت کی وجہ سے حضرت عمر نے اس شخص کی نسبت جو نفل وفرض ملا کر پڑھتا تھا فرمایا تھا اسی سے وہ لوگ ہلاک ہوئے تھے جو تم سے پہلے تھے اس پر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اے ابن الخطاب تیری رائے کو خدا نے درست کر دیا ہے''۔

اور اسی قبیل سے ابن عباس کا وہ قول ہے کہ جو جمعہ کے غسل کے مسنون ہونے کی وجہ میں کہا تھا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول بھی کہ میں تین باتوں میں اپنے رب کے ساتھ موافق رہا۔

اور زید بن ثابت کا یہ قول بھی اسی قبیل سے ہے جو انھوں نے بیوع ممنوعہ کی وجہ میں فرمایا تھا کہ پھلوں میں مختلف بیماریاں لگنے، گر پڑنے اور سوکھ جانے کی پیدا ہو جایا کرتی تھیں۔

اور اسی قبیل سے حضرت عائشہؓ کا یہ قول ہے کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان امور کو دیکھتے جو عورتوں نے اب ایجاد کر لئے ہیں تو ان کو مساجد میں آنے سے روک دیتے جس طرح بنی اسرائیل کی عورتیں روک دی گئی تھیں، معانی شرعیہ معلوم کرنے کا سب سے واضح طریقہ یہ ہے کہ وہ کتاب وسنت میں مصرح طور پر مذکور ہو۔ اور خدا کا فرمان اے عقلمندو! قصاص میں تمہاری زندگی ہے۔ اور خدا کا فرمان ''خدا نے معلوم کیا کہ تم اپنے نفسوں سے خیانت کرتے ہو اس واسطے خدا تعالیٰ نے تم پر توجہ فرمائی اور تم کو معاف کر دیا''۔ اور خدا تعالیٰ کا فرمان ''اب خدا تعالیٰ نے تمہارے لئے آسانی کر دی اور جان لیا کہ تمہارے اندر ضعف ہے''۔ اور خدا تعالیٰ کا فرمان ''اگر اس کو نہ کرو گے تو زمین میں بڑا فتنہ اور فساد ہوگا''۔ اور خدا تعالیٰ کا فرمان ''اگر ان میں سے کوئی راستہ سے بہک جائے تو ایک دوسرے کو یاد دلائے''۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ''اس کو معلوم نہیں ہے کہ اس کا ہاتھ کہاں پڑا رہا ہے''۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ''جو صبح تک سوتا ہے اس کی ناک پر شیطان شب گزارتا ہے''۔

اس کے بعد ان معانی کا درجہ ہے جو ایما اور اشارہ سے معلوم ہوتے ہیں جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان: ''لعنت کے دنوں (۱) سببوں سے بچو''۔ آپ کا فرمان: ''حدیث کا بندھن (۲) دونوں آنکھیں ہیں''۔ اس کے بعد ان کا درجہ ہے جن کو مجتہد صحابی بیان کرے، اس کے بعد علت حکم کے خارج کرنے کا درجہ ہے، یہ تخریج اس طرح ہو کہ اس کی انتہا ایسے مقصود پر ہوتی ہو جس کا ملحوظ ہونا یا اس کے نظیر کا مسئلہ کی نظر میں ملحوظ ہونا ظاہر ہو، اور مذہبی امور میں سے کسی امر میں لغویت نہیں ہے اس واسطے ضرور ہے کہ مقادیر سے بحث کی جائے کہ خاص خاص مقادیر معین ہوئیں ان کی نظائر معین کیوں نہ ہوئیں اور ضرور ہے کہ مخصصات عموم سے بحث کی جائے کہ ان کو کیوں مستثنیٰ کیا گیا آیا ان میں مقصد فوت تھا یا کوئی مانع موجود تھا جس کو تعارض کے وقت ترجیح دے دی گئی ہے، واللہ اعلم۔

ساتواں باب: مختلف حدیثوں میں فیصلہ کا بیان

بنیادی امر یہ ہے کہ ہر ایک حدیث پر عمل کرنا چاہئے سوائے اس صورت کے کہ کسی تناقض کی وجہ سے تمام احادیث پر عمل نہ ہوسکتا ہو اور واقع میں کوئی اختلاف نہیں ہوتا بلکہ فقط ہماری نظر میں اختلاف معلوم ہوتا ہے جب دو مختلف حدیثیں ظاہر ہوں تو اگر وہ فعل رسول کو بیان کرتی ہیں، پس ایک صحابی نے بیان کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فلاں کام کیا تھا اور دوسرے صحابی نے بیان کیا آپ نے دوسرا کام کیا تھا تو ان حدیثوں میں کوئی تعارض نہیں ہوا، اگر یہ دونوں فعل عادت سے متعلق ہیں اور از قسم عبادت نہیں ہیں تو وہ دونوں مباح ہوں گے یا ایک مستحب اور دوسرا جائز ہوگا بشرطیکہ پہلے میں عبادت کے آثار ہوں اور دوسرے میں نہ ہوں، یا دونوں مستحب یا واجب ہوں گے کہ ایک دوسرے کی جگہ کافی ہو جائے گا اگر وہ دونوں عبادت سے متعلق ہیں، حفاظ صحابہ نے اکثر سنن میں ایسی ہی تصریح کی ہے مثلاً وتر میں گیارہ رکعت بھی ہیں نو اور سات بھی ہیں، اور تہجد میں پکار کر پڑھنا بھی ہے اور آہستہ بھی اور اسی قاعدہ کے موافق رفع یدین میں فیصلہ کرنا چاہئے کہ کانوں تک اٹھائے جائیں یا شانوں تک اور ایسے ہی حضرت عمر، عبداللہ بن مسعود اور عبداللہ بن

---

(۱) [illegible] سایہ دار درخت کے نیچے پاخانہ کرنا دوم عام راستہ پر پاخانہ کرنا۔ (۲) جب تک انسان جاگتا رہتا ہے مضبوط رہتا ہے اور جب سو جاتا ہے تو ہر بند ڈھیلا ہو جاتا ہے اس واسطے سونے سے وضو جاتا رہتا ہے۔

عباس رضی اللہ عنہم کے تشہد میں بھی فیصلہ کرنا چاہئے، اور ایسے ہی وتر میں کہ آیا وہ ایک رکعت ہے یا تین رکعات ہیں، اور ایسے ہی طلب نصرت کی دعاؤں میں اور صبح وشام کی دعاؤں میں اور تمام اسباب واوقات کی دعاؤں میں فیصلہ کرنا چاہئے، یا وہ دونوں حدیثیں کسی تنگی اور حرج کا مخلص ہوں گی اگر ایسی حدیثوں سے پیشتر کوئی ایسا امر ہو گیا ہو جس نے حرج کو واجب کر دیا ہو جیسے کفارہ سے متعلق امور، اور لڑنے والوں کے معاوضے، ایک قول کے موافق۔

یا ان احادیث میں کوئی مخفی علت ہو جو ایک فعل کو ایک وقت میں واجب اور دوسرے فعل کو دوسرے وقت میں مستحسن کر دیتی ہے، یا کسی شئے کو ایک وقت میں واجب اور دوسرے وقت میں اس کے ترک کی رخصت دیتی ہے واسطے ایسی علت کی تفتیش کرنا ضروری ہے، یا ان میں سے ایک فعل کو عزیمت اور دوسرے کو رخصت قرار دیں گے بشرطیکہ اول میں اصالت کا اثر ظاہر ہو اور دوسرے میں حرج اور اگر نسخ کی دلیل ظاہر ہو جائے تو نسخ کا اعتبار ہوگا اور اگر ان دونوں حدیثوں میں سے ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی فعل بیان کیا ہو اور دوسری حدیث میں آپ کے کسی قول کا رفع ہوتا ہو تو اگر اس قول سے تحریم یا وجوب قطعی طور پر معلوم نہ ہوتا ہو، یا وہ قول قطعی الرفع نہ ہو تو دونوں حدیثوں میں کئی وجوہ کا احتمال ہوگا، اور اگر وہ قول تحریم یا وجوب میں قطعی ہے تو دونوں حدیثیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت فعل پر محمول ہوں گی یا ان کو نسخ پر محمول کیا جائے گا پس ان دونوں کے قرائن کی تفتیش کی جائے گی اور اگر وہ دونوں حدیثیں قولی ہیں پس اگر ایک حدیث ایک معنی میں ظاہر ہو اور تاویل کرنے سے دوسرے معنی ہو سکتے ہوں اور تاویل بعید بھی نہ ہو تو یہ قرار دیں گے کہ ایک حدیث دوسری حدیث کے لئے بیان ہے اور اگر تاویل بعید ہے تو یہ معنی تاویلی اسی وقت لئے جائیں گے کہ کوئی قرینہ نہایت قوی ہو یا کسی فقیہ صحابی سے یہ تاویل منقول ہو، مثلاً اس ساعت کے متعلق جس میں قبولیت دعا کی امید ہوتی ہے۔ عبداللہ بن سلام سے مروی ہے کہ وہ آفتاب غروب ہونے سے ذرا پہلے کی ساعت ہے، اس پر ابوہریرہؓ نے اعتراض کیا کہ یہ نماز کا وقت نہیں ہے حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ یہ وہ ساعت ہے جس میں مسلمان کھڑا ہو کر نماز پڑھتا ہوگا، جو مانگے گا ملے گا، اس کے جواب میں عبداللہ بن سلام نے یہ فرمایا کہ نماز کا انتظار کرنے والا ایسا ہی ہے جیسے نماز پڑھنے والا، پس یہ تاویل بعید ہے، اگر ایک

فقیہ صحابی نے اس کو بیان نہ کیا ہوتا تو ایسی تاویلیں قابل قبول نہ ہوتیں۔

اور تاویل کے بعید ہونے کا قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ اگر اس کو عقول سلیمہ پر بغیر قرینہ یا دلیل کے پیش کیا جائے تو عقول اس کو قبول نہ کریں اور جب یہ تاویل کسی ایما ظاہر یا واضح مفہوم یا مورد نص کے مخالف ہوگی تو بالکل جائز نہیں ہوگی، اور تاویل قریب میں سے قصر عام ہے کہ اس طرح کے حکم میں بعض افراد پر حکم کرنے میں عادت جاری ہو، اور اس میں سے ایک لفظ عام کا استعمال کرنا ہے ایسے موضع میں جہاں عادتاً تسامح کیا جاتا ہے جیسے مدح اور ذم اور اس میں سے ایک ایسے لفظ عام کا استعمال کرنا ہے جو اصل حکم کے افادہ کے بعد واضح حکم کی مشروعیت کے لئے لایا گیا ہو پس وہ قضیہ مہملہ کے درجہ میں کیا جائے گا جیسے آنحضرت کا یہ قول: ''جس کو بارانی پانی ملا اس میں عشر ہے''۔ اور جیسے آپ کا یہ قول: ''پانچ وسق سے کم میں زکوٰۃ نہیں'' اور من جملہ تاویلات کے یہ ہے کہ ہر حدیث کو ایک خاص صورت پر محمول کیا جائے بشرطیکہ مناط اور مناسب شاہد ہو، اور تاویلات میں سے یہ بھی ہے کہ ان دونوں کو کراہیت اور بیان جواز پر محمول کیا جائے اگر ممکن ہو اور سختی کو زجر پر محمول کیا جائے بشرطیکہ کوئی خرابی مقدم ہو چکی ہو، لیکن یہ اقوال کہ ''تم پر مردار حرام کیا گیا'' یعنی اس کا کھانا ''اور تم پر تمہاری مائیں حرام کی گئیں'' یعنی ان سے نکاح کرنا، اور جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''نظر کا لگنا حق ہے'' یعنی اس کی تاثیر ثابت ہے۔ اور رسول حق ہے'' یعنی اس کی بعثت خدا کی جانب سے ہوتی ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''میری امت سے خطا اور نسیان کو دور کر دیا گیا'' یعنی وہ گناہ جو اس حالت میں ہو معاف ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''بغیر طہارت کے نماز نہیں ہوتی، بغیر ولی کے نکاح نہیں ہوتا، اعمال نیتوں سے ہوتے ہیں'' یعنی ان امور پر وہ آثار جو شریعت نے ان کے لئے مقرر کئے ہیں مرتب نہیں ہوتے اور ''جب نماز کے لئے کھڑے ہو تو وضو کرو'' یعنی اگر تم کو وضو نہ ہوا کرے۔

پس یہ سب اقوال ظاہر ہیں ان میں کوئی امر تاویلی نہیں ہے اس واسطے کہ عرب ان میں سے ہر لفظ کو ایک محل پر استعمال کرتے تھے اور اس محل کے مناسب معنی مراد لیتے تھے اور یہ ان کی زبان تھی جس کو وہ ظاہر معنی سے عدول کیا ہوا نہیں سمجھتے تھے اور اگر وہ دونوں فعل کسی مسئلہ کا جواب یا کسی واقعہ کے فیصلہ کے متعلق ہوں پس اگر کوئی علت دونوں کو جدا کرنے والی موجود ہو تو اسی کے موافق

فیصلہ کیا جائے گا اس کی مثال یہ ہے کہ ایک جوان شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روزہ میں بوسہ لینے کا مسئلہ پوچھا آپ نے اس کو منع کر دیا اور ایک بوڑھے نے پوچھا تو آپ نے اس کو اجازت دے دی اور ان دونوں میں سے ایک حدیث میں کسی حاجت پر یا سائل کے اصرار پر یا تکمیل امر کی طرف توجہ نہ کرنے پر یا کسی ایسے شخص کی حالت کے رد کرنے پر جس نے اپنی ذات پر نہایت سختی کی ہو سیاق کلام دلالت کرے اور دوسری حدیث میں یہ امور سیاق سے ثابت نہ ہوں تو ایک میں عزیمت اور دوسری میں رخصت کہا جائے گا اور اگر وہ دونوں فعل کسی مبتلا شخص کے لئے مخلص یا گنہگار کے لئے عقوبت یا قسم توڑنے والے کے لئے کفارہ ہوں تو دونوں کی صحت کا حکم کیا جائے گا اور نسخ کا بھی احتمال ہوگا اور اسی قاعدہ کے مطابق استحاضہ والی عورت کا فتویٰ ہے کہ کبھی اس کو ہر دو نمازوں کے لئے غسل کا حکم دیا گیا اور کبھی یہ کہ ایام عادت کو حیض سمجھے یا ان دونوں کو ایام حیض سمجھے جن میں زیادہ خون ظاہر ہو، یہ تقریر اس قول کے موافق ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے استحاضہ والی عورت کو دونوں امر کا اختیار دیا تھا اور یہ کہ عادت اور خون کی رنگت دونوں حیض کا مظنہ ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور اسی طرح اس اختلاف کو دور کیا جائے گا کہ آپ نے اس شخص کے حق میں جو مر گیا اور اس کے ذمہ روزہ باقی ہے اس کی جانب سے روزہ رکھنے کا اور ایک روایت کے بموجب کھانا کھلانے کا فتویٰ دیا تھا اور اسی طرح ایک قول کے موافق اس شخص کے حق میں جس کو نماز میں شک پڑتا ہو یہ حکم دیا تھا کہ وہ اپنے شک کو دونوں باتوں میں سے جس طرح چاہے رفع کرے یا تو رکعتوں کی جانچ کرے یا یقینی رکعتوں کو اختیار کرے اور اسی طرح ایک قول کے موافق نسب کے ثابت کرنے میں بھی کبھی قیافہ اور کبھی قرعہ کے ذریعہ فیصلہ فرمایا اور اگر ان احادیث میں دلیل نسخ ظاہر ہو تو ان میں نسخ کا اعتبار کیا جائے گا اور نسخ کبھی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تصریح سے معلوم ہوتا ہے جیسے آپ نے فرمایا ہے کہ میں نے تم کو زیارت قبور سے منع کر دیا تھا لیکن اب زیارت کیا کرو، اور کبھی نسخ اس درجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں حدیثوں کو جمع نہ کر سکتے ہوں۔

اور ایک حدیث دوسری حدیث کے بعد وارد ہوئی ہو، اور جب شارع نے کسی حکم کو مقرر کیا ہو اور پھر اس کی جگہ دوسرا حکم مشروع کر دیا ہو اور پہلے حکم سے سکوت کیا ہو تو فقہا صحابہ نے اس سے

سمجھا ہے کہ وہ پہلے حکم کے لئے ناسخ ہے، یا نسخ کبھی اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ چند احادیث مختلف ہوں اور کسی صحابی نے فیصلہ کیا ہو کہ ایک حدیث دوسری حدیث کے لئے ناسخ ہے پس یہ صورت نسخ کے لئے ظاہر ہے قطعی نہیں ہے اور فقہا کا ان احادیث کو منسوخ کہہ دینا جو ان کے مشائخ کے عمل کے خلاف ہوں کفایت نہیں کرتا، اور نسخ جن امور میں ہیں کہ وہ ظاہر کرتے ہیں، ایک حکم کو دوسرے حکم کے ساتھ تبدیل کر دینا ہے اور در حقیقت وہ ایک حکم کا ختم ہو جانا ہے یا تو اس وجہ سے کہ علت ختم ہو گئی یا مقصود اصلی کے لئے اس علت کا مظنہ ہونا ختم ہو گیا یا علت کے ظاہر ہونے سے کوئی امر مانع پیش آ گیا یا وحی خداوندی کی وجہ سے یا آپ کے اجتہاد کی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر دوسرے حکم کی ترجیح ظاہر ہو گئی ہو اور اس قسم کی ترجیح اس وقت ہوتی ہے جبکہ پہلا حکم اجتہادی ہو حدیث معراج میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے ''میرے ہاں قول میں تبدیلی نہیں ہوتی''۔

اور جب دونوں حدیثوں کے جمع کرنے کی گنجائش نہ ہو اور نہ ہی تاویل کی گنجائش ہو اور نسخ بھی معلوم نہ ہو تو ان حدیثوں میں تعارض پایا جائے گا پس اگر ان میں سے ایک کی ترجیح ثابت ہو گی تو راجح کو اختیار کیا جائے گا۔ ورنہ دونوں حدیثیں ساقط ہو جائیں گی، اور ترجیح یا تو سند کی وجہ سے ہوتی ہے کہ اس کے راوی زیادہ اور فقیہ ہوں اور وہ حدیث متصل ہو اور اس کے مرفوع ہونے کی تصریح ہو اور راوی سے خود اس حدیث کا تعلق ہو کہ اس نے خود فتویٰ دریافت کیا ہو یا اس سے خطاب کیا گیا ہو یا اس فعل کو جو اس میں مذکور ہے وہ اپنے عمل میں لایا ہو، اور یا ترجیح اس وجہ سے ہوتی ہے کہ نفس حدیث میں کوئی امر موکد و مصرح ہو یا ترجیح حکم اور اس کی علت کی وجہ سے ہوتی ہے کہ وہ حکم احکام شرعیہ کے مناسب ہو اور اس علت کو ان احکام سے اتنا شدید تعلق ہو کہ اس علت کی تاثیر پہچانی جاتی ہو، یا ترجیح کسی خارجی امر کی وجہ سے ہوتی ہے جس کو اکثر اہل علم نے قبول کیا ہو، اور حدیثوں کے ساقط ہونے کی صورت محض فرضی ہے۔ ایسی حدیثیں تقریباً معدوم ہیں اور صحابی کا یہ کہنا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا اور منع کیا اور آپ نے فیصلہ کیا اور آپ نے رخصت دی، اس کے بعد یہ کہنا کہ ہم کو یہ حکم دیا گیا اور ہم کو اس سے منع کیا گیا پھر یہ کہنا کہ یہ امر مسنون ہے اور جس نے ایسا کیا اس نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کی، پھر یہ کہنا کہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے تو اس سے بظاہر مرفوع ہونا معلوم ہوتا ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس نے

علت کو حکم کا مدار علیہ خیال کر کے اپنے اجتہاد کو دخل دیا ہو حکم کی خود تعیین کر دی ہو کہ وہ واجب ہے یا مستحب، عام ہے یا خاص۔

اور صحابی کا یہ کہنا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایسا کیا کرتے تھے، اس سے کسی کام کو چند بار کرنا ظاہر ہوتا ہے اور کسی دوسرے صحابی کا یہ کہنا کہ آپ دوسرا فعل کیا کرتے تھے، اس پہلے فعل کے منافی نہیں ہے۔ اور صحابی کا یہ کہنا کہ میں آپ کی صحبت میں رہا اور میں نے آپ کو منع کرتے نہیں دیکھا، یا یہ کہنا کہ ہم آپ کے عہد میں اس فعل کو کرتے تھے تو اس سے اس حکم کا ثبوت ظاہر ہوتا ہے اور وہ نص نہیں ہو سکتا، اور کبھی روایتوں اور طرق کے اختلاف سے احادیث کے الفاظ میں اختلاف ہو جاتا ہے اور یہ اختلاف حدیث کی نقل بالمعنی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ پس اگر کوئی حدیث ایسی وارد ہو کہ فقاہت کا اس کے الفاظ میں اختلاف نہ ہو تو ظاہراً یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ ہوں گے اور ان الفاظ کی تقدیم و تاخیر سے، واؤ اور فا سے اور ایسے ہی ان معانی سے جو اصل مراد سے زائد ہوں استدلال ہو سکتا ہے اور اگر راویوں نے باہم ایسا اختلاف کیا ہے جن کا احتمال ہو سکتا ہے اور وہ سب فقاہت، حفظ اور کثرت میں ہم مرتبہ ہوں تو اس امر کا ظہور ساقط ہو جائے گا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ ہیں، پس صرف اس معنی سے استدلال ہو سکے گا جس کو بالاتفاق سب نے بیان کیا ہوگا اور عام رواۃ صرف اصل معانی کا اعتبار کیا کرتے تھے حواشی اور زوائد کا لحاظ نہیں کرتے تھے اور اگر راویوں کے مراتب میں اختلاف ہو تو اس قول کو لیا جائے گا جو ثقہ سے منقول ہے۔ یا اکثر سے منقول ہے یا اس شخص سے منقول ہے جو واقعہ سے خوب واقف ہے اور اگر کسی ثقہ کے قول میں کوئی زاید بات نہایت ضبط کے ساتھ منقول ہو تو اس کو لیا جائے گا جیسے راوی کا یہ قول کہ حضرت عائشہ نے ''وثب'' کا لفظ فرمایا اور ''قام'' کا لفظ نہیں کہا اور حضرت عائشہ نے فرمایا کہ آنحضرتؐ نے اپنی جلد پر پانی بہایا اور یہ نہیں کہا کہ آنحضرتؐ نے غسل کیا، اور اگر راویوں نے روایت حدیث میں بہت زیادہ اختلاف کیا ہو اور وہ سب رتبہ میں برابر ہوں اور کوئی مرجح نہ ہو تو وہ خصوصیات جن میں اختلاف ہے ساقط ہو جائیں گی اور اگر حدیث مرسل کے ساتھ کوئی قرینہ شامل ہو گیا ہو مثلاً کسی صحابی کی حدیث موقوف سے اس میں قوت آ گئی ہو یا کسی صحابی کی سند ضعیف یا کسی دوسرے راوی کی مرسل حدیث سے اس کی تائید ہو گئی ہو اور راوی دونوں

کے مختلف ہوں یا اکثر اہل علم کے قول یا قیاس صحیح یا نص کے ایما سے اس کی تائید ہوگئی ہو یا یہ معلوم ہو جائے کہ یہ راوی سوائے ثقہ کے حدیث کو بطریق ارسال بیان نہیں کرتا تو ان سب صورتوں میں اس حدیث مرسل کو قابل حجت سمجھنا صحیح ہوگا لیکن ایسی حدیث مسند سے کم درجہ کی ہوگی اور اگر اس مرسل کی ایسی حالت نہیں ہے تو وہ قابل حجت نہیں ہے، اور اسی طرح وہ حدیث جس کو کوئی قاصر الضبط جو متہم نہ ہو یا مجہول الحال روایت کرے تو مذہب مختار یہ ہے کہ وہ حدیث مقبول ہوگی بشرطیکہ کوئی قرینہ بھی اس کے ساتھ ہو مثلاً قیاس کے موافق ہو یا اکثر اہل علم کا اس پہ اتفاق ہو اور اگر ایسا نہیں ہے تو قابل قبول نہ ہوگی، اور جب کوئی راوی ایسی بات حدیث میں زاید بیان کرے جس پر اور راوی سکوت کر سکتے ہوں تو ایسی زیادتی مقبول ہوگی مثلاً حدیث مرسل کی اسناد بیان کرنا یا اسناد میں کسی راوی کو زیادہ بیان کرنا یا حدیث کا مورد بیان کرنا یا روایت اور درازی کلام کا سبب بیان کرنا اور یا کوئی مستقل جملہ ذکر کرنا جس سے کلام کے معنی میں کوئی تبدیلی نہ ہوتی ہو اور اگر اس کی زیادتی پر دوسرے رواۃ کا سکوت کرنا ممتنع ہو تو وہ زیادتی مقبول نہ ہوگی مثلاً ایسی زیادتی کرنا جو معنی کو بدل دے یا کوئی ایسی نادر شئے زیادہ کرنا جس کا ذکر کرنا عادۃً ترک نہیں ہوتا اور جب کوئی صحابی حدیث کو کسی موقع پر محمول کرے تو اس میں اگر اجتہاد کو دخل ہے تو وہی حمل کرنا ظاہر سمجھا جائے گا یہاں تک کہ اس حمل کے خلاف کوئی دلیل قائم ہو جائے اور اگر اجتہاد کو اس میں دخل نہ ہو تو یہ حمل کرنا قوی ہوگا اور اس کو ایسا قرار دیا جائے گا جیسے کوئی عاقل زبان دان قرائن حالیہ یا قالیہ کی وجہ سے کوئی معنی خاص متعین کرتا ہے اور اگر صحابہ و تابعین کے آثار میں اختلاف واقع ہو جائے تو مذکورہ بالا وجوہ سے اگر ان میں جمع ممکن ہے تو بہتر ہے ورنہ یہ سمجھا جائے گا کہ اس مسئلہ میں دو یا دو سے زیادہ اقوال ہیں اس کے بعد یہ دیکھا جائے گا کہ ان میں سے کون سا زیادہ صحیح ہے اور مذاہب صحابہ کا ماخذ معلوم کرنا ایک مخفی علم ہے اس کے معلوم کرنے میں خوب کوشش کرو اس سے تم کو بڑا فائدہ پہنچے گا، واللہ اعلم۔

تتمہ

پہلا باب: فروعات میں صحابہ اور تابعین کے اختلاف کے اسباب کا بیان

واضح ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد شریف میں نہ تو احکام فقہ جمع ہوئے تھے اور نہ اس وقت مسائل میں ایسی بحثیں ہوتی تھیں جیسی یہ فقہا کرتے ہیں کہ نہایت کوشش سے ارکان وشروط اور ہر شئے کے آداب ایک دوسرے سے جدا جدا مع دلائل کے بیان کرتے ہیں اور صورتیں فرض کر کے ان مفروضہ صورتوں میں گفتگوئیں کرتے ہیں اور جو حد کے قابل ہے اس کی حد بیان کرتے ہیں اور جو حصر کے قابل ہے اس کا حصر کرتے ہیں اور اسی قسم کے بہت سے امور کرتے ہیں لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں، پس آپ وضو کرتے تھے اور صحابہ آپ کے وضو کو دیکھ کر اس پر عمل کرتے تھے بغیر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریح کے کہ یہ رکن ہے اور وہ مستحب ہے۔

اور آپ نماز پڑھتے تھے پس صحابہ جس طرح آپ کو نماز پڑھتا ہوا دیکھتے تھے اسی طرح خود بھی نماز پڑھتے تھے۔

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کیا پس لوگوں نے بھی دیکھ کر ویسے ہی افعال حج ادا کیے جیسے آپؐ نے ادا کیے، پس غالب حال آپ کا یہی تھا، آپؐ نے اس کی تشریح نہیں کی کہ وضوء میں فرائض چھ ہیں یا چار ہیں اور نہ آپؐ نے اس احتمال کو فرض کیا کہ انسان بغیر پے در پے کے وضو کرے تاکہ اس کے صحیح یا فاسد ہونے کا حکم کیا جائے الا ماشاء اللہ اور صحابہ اس قسم کی باتیں آپ سے بہت کم دریافت کرتے تھے، حضرت عبداللہ بن عباس سے مروی ہے کہ میں نے اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہتر کسی قوم کو نہیں دیکھا انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کی وفات تک صرف تیرہ مسئلے دریافت کیے جو سب کے سب قرآن میں موجود ہیں، ان

مسائل میں سے یہ ہے: لوگ آپ سے ماہ حرام میں لڑنے کا حکم دریافت کرتے ہیں آپ فرمادیجئے اس مہینے میں لڑنا بڑی برائی ہے، اور آپ سے حیض کا حال دریافت کرتے ہیں۔

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ صحابہ وہی امور دریافت کرتے تھے جو مفید ہوتے تھے، حضرت عبداللہ بن عمر کا قول ہے کہ وہ امور مت دریافت کرو جو ابھی تک ہوئے نہ ہوں اس واسطے کہ میں نے حضرت عمر بن الخطاب کو اس شخص پر لعنت کرتے سنا ہے جو ایسی باتیں دریافت کرے جو ابھی تک وقوع میں نہ آئی ہوں، قاسم کہتے ہیں کہ تم ایسی باتیں دریافت کرتے ہو جن کو ہم دریافت نہیں کیا کرتے تھے اور ایسی باتوں کی تفتیش کرتے ہو جن کی ہم تفتیش نہیں کیا کرتے تھے، تم وہ امور دریافت کرتے ہو جن کو ہم نہیں جانتے اور اگر ہم ان کو جانتے تو ان کو چھپانا ہم کو جائز نہ تھا، عمر بن اسحٰق سے مروی ہے کہ میں اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں جن سے ملا ہوں، ان کی تعداد ان سے زیادہ تھی جو مجھ سے پہلے گزر چکے تھے، میں نے کسی قوم کو نہیں پایا جن کی روش میں ان سے زیادہ آسانی اور ان سے کم سختی ہو، عبادہ بن بسر کندی سے روایت ہے کہ ان سے کسی نے اس عورت کا حال دریافت کیا جو ایک قوم کے ساتھ مرگئی تھی اور اس کا کوئی ولی نہ رہا تھا پس انھوں نے کہا میں بہت سے لوگوں سے ملا ہوں جو تمہاری طرح سختی نہیں کرتے تھے اور تمہاری طرح مسائل دریافت نہیں کرتے تھے، ان آثار کو دارمی نے روایت کیا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے واقعات کے متعلق لوگ دریافت کیا کرتے تھے تو آپ بتلادیا کرتے تھے اور آپ کے پاس قضایا آتے تھے پس آپ فیصلے کردیا کرتے تھے اور لوگوں کو کوئی اچھا کام کرتے ہوئے دیکھتے تھے تو ان کی تعریف کرتے تھے اور اگر برا کام کرتے ہوئے دیکھتے تھے تو منع کرتے تھے اور جب کبھی آپ نے کسی مستفتی کو فتوی دیا یا کسی قضیہ کا فیصلہ کیا یا کسی کام کرنے والے کو منع کیا تو یہ سب کچھ مجلسوں میں ہوتا تھا اور یہی حالت شیخین حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی تھی، جب ان کو کسی مسئلہ کا علم نہ ہوتا تھا تو لوگوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث دریافت کرتے تھے، حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جدہ کے حصہ کے متعلق کوئی حکم نہیں سنا اور لوگوں سے انھوں نے اس کو دریافت کیا، ظہر کی نماز سے فارغ ہوکر فرمایا تم میں سے کسی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جدہ کے بارے میں کچھ سنا ہے؟ مغیرہ بن شعبہؓ نے کہا میں نے سنا

ہے، حضرت ابوبکر نے فرمایا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا فرمایا تھا، انھوں نے کہا پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے جدہ کو چھٹا حصہ دلوایا تھا، حضرت ابوبکر نے فرمایا تمہارے سوا کوئی اور شخص بھی اس کو جانتا ہے؟ محمد بن سلمہ نے کہا مغیرہ سچ کہتے ہیں، تب ابوبکرؓ نے جدہ کو چھٹا حصہ دلوایا اور ایسے ہی قصہ ہے حضرت عمرؓ کا غلام آزاد کرنے کی بابت لوگوں سے سوال کرنا اور مغیرہؓ کی خبر کی طرف رجوع کرنا اور لوگوں سے وبا کے متعلق دریافت کرنا اور عبدالرحمٰن بن عوف کی خبر کی جانب رجوع کرنا اور ایسے ہی مجوس کے قصہ میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی خبر کی طرف رجوع کرنا اور جب عبداللہ بن مسعود کی رائے سے معقل بن یسار کی خبر مطابق ہوگئی تھی تو عبداللہ بن مسعود کا خوش ہونا اور ایسے ہی ابوموسیٰ کا حضرت عمر کے دروازہ سے واپس چلا جانا اور حضرت عمرؓ کا ان سے حدیث دریافت کرنا اور ابوسعیدؓ کا ان کی تصدیق کرنا اور اسی طرح کے بے شمار قصے معلومہ ہیں جو صحیحین اور سنن میں مروی ہیں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت حمیدہ یہی تھی ہر صحابی نے جس قدر اس کو توفیق الٰہی ہوئی آپ کی عبادت، فتاویٰ اور فیصلوں کو دیکھا پس ان کو خوب حفظ کرلیا اور سمجھ لیا اور قرائن سے ہر ایک کی وجہ بھی معلوم کرلی، اور ان امارات اور قرائن کی وجہ سے جو اس صحابی کو معلوم تھے بعض امور کو اباحت پر اور بعض کو نسخ پر محمول کیا۔

صحابہ کی نظر میں سوائے اطمینان قلب اور یقین کے کوئی پسندیدہ امر نہیں تھا انکو استدلال کے طریقوں کی طرف زیادہ توجہ نہ تھی جیسے تم اعراب کی حالت دیکھتے ہو کہ وہ باہم مقصود کلام کو سمجھتے ہیں اور تصریح یا اشارہ سے ان کو اطمینان قلب حاصل ہو جاتا ہے اور ان کو معلوم بھی نہیں ہوتا کہ ان کو کیسے اطمینان حاصل ہو گیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دور مبارک ختم ہو گیا اور صحابہ اسی حالت پر رہے، آپ کے بعد صحابہ تمام بلاد میں پھیل گئے اور ہر شخص ایک ایک حصہ کا مقتدیٰ اور رہبر ہو گیا پس واقعات زیادہ پیش آتے گئے اور لوگوں نے مسائل دریافت کرنے شروع کئے ہر صحابی نے اپنی یادداشت اور استنباط کے موافق جواب دیا، اور اگر انھوں نے اپنی یادداشت اور استنباط میں کوئی امر جواب کے قابل نہ پایا تو اپنی رائے سے اجتہاد کیا اور اسی علت کو معلوم کیا جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

اپنے مصرح احکام میں مدار علیہ قرار دیا تھا پس انھوں نے جہاں اس علت کو پایا وہیں اس کا حکم متعین کر دیا۔ اور حکم کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی غرض کے موافق کرنے میں کوئی کمی نہ کی پس اس وقت ان کے درمیان اختلاف کے چند پہلو ہو گئے جن میں سے ایک یہ ہے کہ ایک صحابی نے ایک معاملہ میں کوئی حکم یا فتویٰ سن لیا اور دوسرے نے اس کو نہیں سنا اس واسطے اس دوسرے نے اپنی رائے سے اس میں اجتہاد کیا اور اس اجتہاد کے بھی کئی طریقے ہو گئے، اول یہ کہ اس کا اجتہاد اس حدیث کے موافق ہو گیا۔ اس کی مثال وہ حدیث ہے جو نسائی وغیرہ نے روایت کی ہے کہ عبداللہ بن مسعود سے کسی نے مسئلہ دریافت کیا کہ ایک عورت کا خاوند مر گیا اور اس نے اس کے لئے کچھ مہر مقرر نہیں کیا تھا، انھوں نے کہا میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے بارے میں کوئی فتویٰ دیتے نہیں دیکھا ہے لیکن لوگ ایک ماہ تک ان کے پاس آتے جاتے رہے اور اصرار کرتے رہے تب انھوں نے اپنی رائے سے اجتہاد کر کے فیصلہ دیا کہ اس کو اس کے خاندان کی عورتوں کے برابر مہر ملے گا نہ کہ اس سے کم اور نہ اس سے زیادہ اور اس کے لئے عدت ضروری ہے اور اس کو ورثہ ملے گا اس کو سنکر معقل بن یسار نے کھڑے ہو کر شہادت دی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایک عورت کے حق میں ایسا ہی فیصلہ دیا تھا۔ اس سے عبداللہ بن مسعود ایسے خوش ہوئے کہ بعد اسلام کے کبھی اتنے خوش نہیں ہوئے تھے۔

دوم یہ ہے کہ دو صحابیوں میں باہم مناظرہ واقع ہوا اور حدیث اس طرح ظاہر ہو جائے جس کے ہونے کا گمان غالب ہو وہ صحابی اپنے اجتہاد سے اس حدیث مسموع کی جانب رجوع کرے، اس کی مثال وہ حدیث ہے جو ائمہ نے روایت کی ہے کہ حضرت ابو ہریرہ کا مذہب تھا کہ جس نے جنابت کی حالت میں صبح کی ہو اس پر روزہ نہیں ہے یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض ازواج نے ان کے مذہب کے خلاف حدیث بیان کی تب ابو ہریرہؓ نے اپنے مذہب سے رجوع کیا۔

سوم یہ کہ صحابی کو حدیث پہنچی لیکن اس طرح سے ظاہر نہ ہو جس سے اس کے حدیث ہونے کا ظن غالب ہو، اس واسطے وہ صحابی اپنے اجتہاد کو ترک نہ کرے، بلکہ حدیث میں طعنہ کرے، اس کی مثال وہ حدیث ہے جو اصحاب اصول نے روایت کی ہے کہ فاطمہ بنت قیسؓ نے حضرت عمر بن

الخطاب کے پاس حاضر ہو کر شہادت دی کہ اس کو تین طلاقیں خاوند نے دی تھیں۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لئے نفقہ اور مکان نہیں دلایا لیکن حضرت عمرؓ نے اس کی شہادت کو قبول نہیں کیا اور فرمایا کہ میں اس عورت کے قول سے کتاب اللہ کو نہیں چھوڑ سکتا ہوں ہم کو معلوم نہیں ہے کہ یہ عورت سچی ہے یا جھوٹی ہے، بیشک مطلقہ کے لئے نفقہ اور مکان ہے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فاطمہ سے فرمایا کہ تو خدا سے خوف نہیں کرتی، یعنی اپنے قول میں۔ اس کی دوسری مثال وہ ہے جو بخاری اور مسلم نے روایت کی ہے کہ حضرت عمرؓ کا مذہب تھا کہ جس جنبی کو پانی نہ ملے اس کے لئے تیمّم کافی نہیں ہے، تب ان کے سامنے عمار بن یاسر نے کہا کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک سفر میں شریک تھا اور مجھ کو غسل کی ضرورت ہوئی اور پانی نہ ملا پس میں خاک میں لوٹا، اس کے بعد یہ بات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو میں نے بیان کی پس آپ نے فرمایا ''تم کو ایسا کرنا کافی تھا اور آپ نے زمین پر دونوں ہاتھ مار کر اپنے منہ اور ہاتھوں پر مسح کرلیا''۔ لیکن حضرت عمرؓ نے اس حدیث کو تسلیم نہیں کیا اور ایک مخفی اعتراض کی وجہ سے جو حدیث میں ان کو معلوم ہوا انھوں نے اس حدیث کو حجت قرار نہیں دیا لیکن دوسرے طبقہ میں بہت سے طریقوں سے اس حدیث کی شہرت ہوگئی اور معترض کا وہم ضعیف ہوگیا اس واسطے سب نے اس پر عمل کیا۔

چہارم یہ ہے کہ صحابی کو حدیث پہنچی ہی نہیں، اس کی مثال یہ ہے کہ مسلم نے روایت کی ہے کہ عبداللہ بن عمر عورتوں کو غسل کے وقت حکم کرتے تھے کہ سر کے بالوں کو کھول لیا کریں، پس حضرت عائشہؓ نے یہ بات سنی اور فرمایا ابن عمر سے تعجب ہے کہ وہ عورتوں کے سر کھولنے کا حکم دیتے ہیں ان کو سر منڈوانے کا حکم کیوں نہیں دیدیتے، یقیناً میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک برتن سے نہایا کرتے تھے اور میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کرتی تھی کہ اپنے سر پر تین بار پانی بہا دیا کرتی تھی، اس کی دوسری مثال وہ ہے جس کو امام زہریؒ نے روایت کی ہے کہ ہندہ کو مستحاضہ کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے نماز کی رخصت کا علم نہ تھا اس واسطے وہ نماز نہ پڑھنے کی وجہ سے رویا کرتی تھیں۔

اور صحابہ میں اختلاف کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے آنحضرتؐ کو کوئی فعل کرتے ہوئے

دیکھا پس بعض نے عبادت پر اور بعض نے اباحت پر اس کو محمول کیا، اس کی مثال وہ حدیث ہے جو اصحاب رسول نے حج کرنے کے بعد مقام ابطح میں قیام کرنے کے متعلق روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جگہ قیام فرمایا تھا پس ابو ہریرہؓ اور عبداللہ بن عمرؓ نے کہا کہ آپ عبادت کے طور پر وہاں ٹھیرے تھے، اس واسطے انھوں نے سنن حج میں اس کو شمار کیا اور حضرت عائشہؓ اور عبداللہ بن عباسؓ نے کہا کہ یہ ٹھیرنا محض اتفاقی امر تھا اور سنن حج میں داخل نہیں ہے اور دوسری مثال یہ ہے کہ جمہور کا مسلک ہے کہ طواف میں رمل کرنا سنت ہے اور عبداللہ بن عباسؓ کہتے ہیں کہ اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اتفاقی طور پر ایک امر عارض کی وجہ سے کیا تھا اور وہ یہ ہے کہ مشرکین نے کہا تھا کہ مسلمانوں کو مدینہ کے بخار نے کمزور کر دیا ہے اور یہ رمل کرنا سنت نہیں ہے۔

اور صحابہ کے اختلاف کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہم کے اختلاف سے ان میں اختلاف ہو گیا، اس کی مثال یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کیا اور لوگوں نے آپ کو دیکھا پس بعض نے خیال کیا کہ آپ متمتع تھے اور بعض نے خیال کیا آپ قارن تھے اور بعض نے خیال کیا کہ آپ مفرد تھے، اس کی دوسری مثال یہ ہے کہ ابوداؤد نے سعید بن جبیر سے روایت کی ہے وہ کہتے ہیں میں نے عبداللہ بن عباس سے کہا اے ابوالعباس مجھ کو تعجب ہے کہ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے احرام باندھنے میں اختلاف کیا عبداللہ بن عباس نے فرمایا میں اس کی حقیقت کو سب لوگوں پر زیادہ جانتا ہوں، یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے ایک حج تھا پس اس میں لوگوں کا اختلاف ہوا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حج کے لئے باہر نکلے پس جب آپ نے مسجد ذوالحلیفہ میں نماز پڑھی تو اسی جگہ آپ نے احرام باندھا اور جب دونوں رکعات سے فارغ ہوئے تو تلبیہ حج کیا پس اس کو لوگوں نے سنا اور میں نے اس کو محفوظ رکھا، پھر آپ سوار ہوئے پس جب آپ کی ناقہ آپ کو لیکر کھڑی ہوئی تو آپ نے تلبیہ پڑھا اور اس کو بھی لوگوں نے سنا، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ کے پاس لوگوں کے جدا جدا گروہ آتے تھے پس جب آپ کی اونٹنی کھڑی ہوئی تو لوگوں نے آپ کو تلبیہ پڑھتے سنا پس ان لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت تلبیہ پڑھا جب آپ ناقہ پر سوار ہو گئے تھے، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوچ فرمایا پس

جب بیدا کی بلندی پر چڑھے تو آپ نے تلبیہ فرمایا اور اس کو بھی لوگوں نے سنا پس انھوں نے کہا کہ آنحضرتؐ نے تلبیہ بیدا کی بلندی سے شروع کیا، اور قسم ہے اللہ کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نماز کی جگہ سے احرام باندھا تھا اور جب اونٹنی کھڑی ہوئی تو آپ نے تلبیہ کہا تھا اور جب بیدا کی چوٹی پر چڑھے تھے تو بھی آپ نے تلبیہ کہا تھا۔

اور صحابہ میں اختلاف کی ایک وجہ سہو ونسیان بھی ہے مثلاً روایت کی گئی ہے کہ عبداللہ بن عمر کہا کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رجب میں عمرہ کیا تھا پس حضرت عائشہ نے یہ سن کر فرمایا کہ عبداللہ بن عمر بھول گئے۔

اور صحابہ کے اختلاف کی ایک وجہ ضبط کا مختلف ہونا ہے اس کی مثال وہ حدیث ہے جس کو حضرت عبداللہ بن عمر نے یا حضرت عمرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے کہ مردہ کو اس کے اہل وعیال کے رونے سے قبر میں عذاب ہوتا ہے، اس پر حضرت عائشہ نے فرمایا کہ ان کو ٹھیک طور پر حدیث معلوم نہیں ہے، (اصل بات یہ ہے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک یہودیہ کے جنازہ کے پاس سے گزرے اور اس پر اس کے گھر والے رو رہے تھے آپ نے فرمایا "یہ لوگ اس عورت پر رو رہے ہیں اور اس کو قبر میں عذاب ہو رہا ہے"۔ پس عبداللہ بن عمرؓ نے خیال کیا کہ "رونا" عذاب قبر کی علت ہے اور سمجھا کہ یہ حکم ہر میت کے لئے عام ہے۔ اور وجوہ اختلاف میں سے ایک یہ ہے کہ صحابہ کا علت حکم میں اختلاف ہو جائے جیسے جنازہ دیکھ کر کھڑا ہونا، پس بعض نے کہا کہ یہ قیام ملائکہ کی تعظیم کے لئے ہے اس لئے مومن اور کافر دونوں کے جنازہ کو شامل ہے اور بعض نے کہا کہ یہ قیام موت کے خوف کی وجہ سے ہے تب بھی دونوں کو شامل ہے اور حسن بن علیؓ عنہما فرماتے ہیں کہ ایک یہودی کا جنازہ آپ کے پاس سے گزرا آپ اس کو دیکھ کر کھڑے ہو گئے اور آپ کو یہ مکروہ معلوم ہوا کہ وہ آپ کے سر کے اوپر سے گزرے، پس یہ حکم خاص کافر کے لئے ہے۔

اور ان وجوہ اختلاف میں سے ایک وجہ وہ مختلف امور کے جمع کرنے میں صحابہ کا آپس میں اختلاف کرنا ہے، اس کی مثال یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سال خیبر میں متعہ کی اجازت دے دی تھی اس کے بعد سال اوطاس میں اس کی اجازت دی اور سال اوطاس کے بعد منع فرما دیا، پس عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ اجازت ضرورت کی وجہ سے تھی اور ضرورت کے رفع

ہونے پر ممانعت کر دی گئی اور وہی ممانعت کا حکم باقی ہے اور جمہور علما کا قول ہے کہ اجازت اباحت کے لئے تھی اور ممانعت نے اس اباحت کو منسوخ کر دیا، اس کی دوسری مثال یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے استنجا کی حالت میں قبلہ کی جانب رخ کرنے سے منع فرمایا تھا پس ایک جماعت کا مذہب یہ ہے کہ یہ حکم عام ہے منسوخ نہیں ہوا اور حضرت جابرؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے ایک سال قبل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تھا کہ آپ نے قبلہ کی جانب پیشاب کیا تھا پس انھوں نے سمجھا کہ اس سے پہلے ہی منسوخ ہو گئی، اور حضرت عبداللہ بن عمر نے آنحضرت کو قبلہ کی جانب پشت اور شام کی جانب رخ کئے قضائے حاجت فرماتے دیکھا تھا پس اس سے انھوں نے اس جماعت کے قول کو رد کر دیا اور ایک جماعت نے ان دونوں روایتوں کو جمع کیا ہے پس امام شعبیؒ وغیرہ اس طرف گئے ہیں کہ استقبال قبلہ کی ممانعت جنگل کے ساتھ مخصوص ہے پس جب پاخانوں میں ہوں تو نہ استقبال منع ہے اور نہ استدبار، اور ایک جماعت یہ کہتی ہے کہ وہ قول منع فرمانے کا عام اور محکم ہے اور آپ کے فعل میں احتمال ہے کہ وہ آپ کی ذات کے ساتھ خاص ہو اس واسطے وہ نہ ناسخ ہو سکتا اور نہ مخصص ہو سکتا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ ان طریقوں سے صحابہ کے مذاہب مختلف ہو گئے تھے اور ان سے تابعین نے اسی طرح حاصل کیا جس طرح جس کو توفیق ہوئی، جس حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مذاہب صحابہ کو انھوں نے سنا اس کو حفظ کیا اور سمجھا اور جہاں تک ہو سکا مختلف امور کو جمع کیا اور بعض اقوال کو بعض پر ترجیح دی اور بعض کو اپنی نظر میں ضعیف سمجھا اگر چہ وہ کبار صحابہ سے مروی تھے جیسے حضرت عمرؓ اور ابن مسعودؓ کا مذہب کہ وہ جنبی کے لئے تیمّم کو جائز نہیں سمجھتے تھے، جب عمار اور عمران بن حصین وغیرہ کی احادیث مشہور ہوئیں تو ان کو وہ مسلک ضعیف معلوم ہوا، اس طرح تابعین میں سے ہر عالم کا ایک مذہب اس کے خیال کے موافق قائم ہو گیا، پس ہر شہر میں ایک امام قائم ہو گیا جیسے مدینہ میں سعید بن المسیب اور سالم بن عبداللہ ابن عمر ہوئے اور ان کے بعد وہیں مدینہ میں امام زہری، قاضی یحییٰ بن سعید اور ربیعہ بن عبدالرحمٰنؒ ہوئے، اور مکہ میں عطا ابن ابی رباح تھے، کوفہ میں ابراہیم نخعی اور شعبی تھے، بصرہ میں حسن بصری تھے، یمن میں طاؤس بن کیسان تھے اور شام میں مکحول تھے، پس خدا نے بہت سے قلوب کو ان کے علوم کا گرویدہ کر دیا اور لوگوں نے نہایت

رغبت سے ان سے حدیث، صحابہ کے فتوے اور اقوال اور خود ان کے مذاہب اور ان کی تحقیقات کو حاصل کیا اور ان سے مسائل کا استفسار کیا اور مسائل کا خوب ان میں تذکرہ رہا تمام معاملات کے وہ مرجع رہے، سعید بن مسیب اور ابراہیمؒ اور ان کے ہم مرتبہ لوگوں نے تمام ابواب فقہ کو مرتب کر دیا تھا اور ہر باب کے متعلق ان کے پاس اصول وقواعد مرتب تھے جن کو انھوں نے اپنے اسلاف سے حاصل کیا تھا سعید بن مسیّب اور ان کے اصحاب کا یہ مذہب تھا کہ فقہ میں حرمین کے علماء سب سے پختہ اور ان کے مذہب کی بنیاد عبداللہ بن عمر حضرت عائشہؓ اور عبداللہ بن عباس کے فتویٰ اور مدینہ کے قاضیوں کے فیصلے ہیں ان سب علوم کو انھوں نے بقدر استطاعت جمع کیا اور ان میں تفتیش کی نظر سے دیکھا جن مسائل پر علما مدینہ کا اتفاق دیکھا ان کو خوب مستحکم طور سے اختیار کیا اور جو مسائل ان کے نزدیک مختلف فیہ تھے ان میں سے قوی اور راجح کو اختیار کیا ان کے راجح ہونے کی وجہ یا یہ تھی کہ اکثر علما نے اس طرف میلان کیا تھا یا وہ کسی قیاس قوی کے موافق تھے یا کتاب وحدیث سے مصرع طور پر مستنبط ہوئے تھے یا اسی طرح کا کوئی اور امر تھا اور جب انھوں نے اپنے محفوظات میں مسئلہ کا جواب نہ پایا تو اس کو ان کے کلام سے حاصل کیا اور کتاب وسنت کے ایما اور مقتضیٰ کا تتبع کیا اس کی وجہ سے ہر ایک باب میں بکثرت مسائل ان کو حاصل ہوگئے۔ ابراہیم اور ان کے شاگردوں کی رائے یہ تھی کہ حضرت عبداللہ بن مسعود اور ان کے شاگرد فقہ میں سب سے زیادہ قابل اعتماد ہیں جیسے علقمہ نے مسروق سے کہا تھا کہ کوئی فقیہ عبداللہ بن مسعود سے زیادہ قابل وثوق نہیں ہے اور ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ نے امام اوزاعیؒ سے کہا تھا کہ ابراہیم، سالم سے زیادہ فقیہ ہیں اور اگر صحابی ہونے کی فضیلت عبداللہ بن عمر میں نہ ہوتی تو میں کہہ دیتا کہ علقمہ عبداللہ بن عمر سے زیادہ فقیہ ہیں اور عبداللہ بن مسعود تو عبداللہ بن مسعود ہی ہیں اور امام ابوحنیفہ کے مذہب کی اصل عبداللہ بن مسعود کے فتوے حضرت علیؓ کے فیصلے اور قاضی شریح اور دیگر قضاۃ کوفہ کے فتاوے ہیں پس ان میں سے امام ابوحنیفہؒ نے بقدر امکان مسائل فقہ کو جمع کیا اور جیسے اہل مدینہ کے آثار سے مدینہ کے علما نے تخریجات کی تھی ایسے ہی اہل کوفہ کے آثار سے انھوں نے تخریج مسائل کی پس ہر باب کے متعلق مسائل فقہ مرتب ہوگئے۔ اور حضرت سعید بن مسیّب فقہائے مدینہ کی زبان تھے اور ان کو حضرت عمرؓ کے فیصلہ اور حضرت ابوہریرہؓ کی احادیث سب سے زیادہ یاد

تھیں اور ابراہیم فقہائے کوفہ کی زبان تھے پس جب وہ دونوں کوئی بات کہتے اور کسی کی جانب اس کو منسوب نہ کرتے تو وہ اکثر صراحتاً یا کنایتہً یا کسی اور طرح سے سلف میں سے کسی کی طرف منسوب ہوتی تھی پس فقہائے مدینہ اور کوفہ نے ان دونوں پر اتفاق کیا، ان سے علم حاصل کیا اور سمجھا اور اس علم کے ذریعہ دیگر مسائل کی تخریج کی، واللہ اعلم۔

دوسرا باب: فقہا کے مذاہب مختلف ہونے کے اسباب کا بیان

واضح ہو کہ خدا تعالیٰ نے اس پیشین گوئی کو پورا کرنے کے لئے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمائی تھی کہ "بعد والی نسل میں سے عادل لوگ اس علم دین کو حاصل کریں گے"۔ تابعین کے زمانہ کے بعد حاملین علم کی ایک جماعت کو پیدا کیا انھوں نے اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وضو غسل، نماز، حج، نکاح، بیوع اور تمام کثیر الوقوع احکام کو سیکھا اور احادیث نبوی کی روایت کی، انھوں نے مختلف شہروں کے قاضیوں کے فیصلے اور وہاں کے مفتیوں کے فتوے سنے اور مسائل دریافت کرتے رہے اور ان سب امور میں نہایت کوشش کی آخر وہ مسلمانوں کے مقتدا بن گئے اور تمام امور مذہبی کا مرجع بن گئے، پس انھوں نے بھی اپنے مشائخ کے طریق کو اختیار کیا، ایما اور اقتضائے کلام کے معلوم کرنے میں کوئی کوتاہی نہ کی، پس انھوں نے فیصلے کئے، فتوے دیئے احادیث روایت کیں اور لوگوں کو تعلیم دی، اس طبقہ میں علما کا کام یکساں تھا، اور ان سب کے عمل کا حاصل یہ تھا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مسند اور مرسل دونوں سے تمسک کرتے تھے اور صحابہ و تابعین کے اقوال سے استدلال کرتے تھے یہ سمجھ کر کہ یہ اقوال یا تو احادیث ہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں جن کو کم درجہ کی سمجھ کر احادیث موقوف قرار دیا، جیسے ابراہیم نخعیؒ نے کہا تھا جبکہ انھوں نے اس حدیث کو نقل کیا۔ جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع محاقلہ (پکنے سے پہلے کھیت کو فروخت کر دینا) اور بیع مزابنہ (تر چھواروں کو جو درختوں پر ہوں خشک چھواروں سے فروخت کر دینا) سے منع فرمایا ہے، تو لوگوں نے ان سے کہا: کیا آپ کو اس حدیث کے علاوہ کوئی اور حدیث بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یاد ہے؟ انھوں نے جواب میں کہا 'ہاں' یاد ہے لیکن میں یہ بہتر سمجھتا ہوں کہ آنحضرت کا ادباً نام نہ لوں بلکہ یہ کہہ دوں کہ عبداللہ نے ایسا کہا ہے اور علقمہؒ نے ایسا کہا ہے، اور جیسے امام شعبیؒ نے کہا تھا جبکہ ان سے ایک حدیث دریافت

کی گئی اور ان سے کہا گیا کہ اس کی سند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتی ہے، تو انھوں نے کہا میں حدیث کو مرفوع نہیں کرتا میرے نزدیک یہ بہتر ہے کہ کسی اعلیٰ شخص کی طرف حدیث کی نسبت کروں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے درجہ سے پست ہے، پس اگر حدیث میں کوئی کمی یا زیادتی ہوگی تو وہ انہی لوگوں پر ہے کہ جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پست درجہ میں ہیں، یا وہ ان اقوال صحابہ سے استدلال کرتے تھے یہ سمجھ کر کہ ان کو صحابہ وتابعین نے منصوصات سے مستنبط کیا ہے یا اپنی رائے سے اجتہاد کیا ہے، اور وہ ان تمام امور میں آئندہ پیدا ہونے والے لوگوں کی نسبت زیادہ بہتر کام کرنے والے تھے اور ان کی رائے زیادہ درست تھی اور ان کا زمانہ بہت پہلے تھا، ان کے عملی محفوظات زیادہ تھے اس واسطے ان کے اقوال پر عمل کرنا معین ہو گیا سوائے اس صورت کے جبکہ ان میں باہم اختلاف ہو اور حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم ظاہر طور پر ان کے اقوال کے مخالف ہو، اور ان سب کا یہ بھی معمول تھا کہ جب کسی مسئلہ میں احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مختلف وارد ہوئی تھیں تو وہ اقوال صحابہ کی طرف رجوع کرتے تھے، پس اگر وہ ان میں سے کسی کو منسوخ کہتے تھے یا اس کو ظاہر معنی سے ہٹاتے تھے یا نسخ کی تصریح تو نہیں کرتے تھے لیکن اس حدیث کے ترک کرنے اور اس کے مضمون کے قائل نہ ہونے پر متفق ہوتے تھے اس واسطے کہ اس میں کوئی علت ہوتی تھی یا نسخ کا حکم ہوتا تھا یا تاویل کی گنجائش ہوتی تھی تو ان سب امور میں وہ صحابہ کا اتباع کرتے تھے، چنانچہ امام مالکؒ نے اس حدیث کے متعلق جو کتے کے پانی پینے کے متعلق ہے کہا تھا کہ یہ حدیث تو ہے لیکن مجھے اس کی وجہ معلوم نہیں، ابن حاجب نے مختصر الاصول میں اس حدیث کو نقل کر کے کہا ہے کہ میں فقہا کو اس حدیث پر عمل کرتے ہوئے نہیں پاتا ہوں اور جب صحابہ اور تابعین کے اقوال کسی مسئلہ میں مختلف ہوتے تھے تو ہر عالم کے نزدیک اپنے مشائخ کا مذہب پسندیدہ ہوتا تھا کیونکہ ان کے صحیح اور سقیم اقوال کو وہ خوب جان سکتا ہے اور ان اقوال کے مناسب اصول کو خوب یاد رکھ سکتا ہے اور ان کے فضل اور تبحر کی جانب اس کا میلان قلب زیادہ ہوتا ہے اسی واسطے اہل مدینہ کے نزدیک حضرت عمر، حضرت عثمان عبداللہ بن عمر، حضرت عائشہ، عبداللہ بن عباس، زید بن ثابت کا مذہب اور ان کے اصحاب مثل سعید بن مسیب جن کو حضرت عمر کے فیصلے اور ابو ہریرہؓ کی احادیث خوب محفوظ تھیں، اور مثل عروہ، سالم، عطا بن یسار، قاسم، عبید اللہ بن عبداللہ زہری، یحییٰ بن سعید، زید

بن اصم اور ربیعہ کا مذہب اختیار کرنا دوسروں کی بہ نسبت زیادہ بہتر ہے، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے فضائل بیان فرمائے ہیں اور ہر زمانہ میں وہ علما اور فقہا کا مرکز رہا ہے اسی واسطے امام مالک اہل مدینہ کے مسلک کو لازم سمجھتے تھے اور اہل کوفہ کے نزدیک عبداللہ بن مسعود اور ان کے اصحاب کا مذہب حضرت علیؓ، شریح اور شعبیؒ کے فیصلے اور ابراہیم کے فتوے اختیار کرنا دوسروں کی بہ نسبت زیادہ بہتر ہے اسی وجہ سے علقمہ نے مسروق سے کہا تھا جبکہ وہ تشریک (۱) میں زید بن ثابت کے قول کی طرف مائل ہوئے کہ تم میں سے کون شخص عبداللہ بن مسعود سے زیادہ وثوق کے قابل ہے؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ بے شک کوئی نہیں ہے، لیکن میں نے زید بن ثابت اور اہل مدینہ کو تشریک کرتے ہوئے دیکھا ہے پس اگر ایک شہر کے لوگ کسی بات پر متفق ہو جاتے تھے تو نہایت پختگی سے اس کو اختیار کرتے تھے، اسی کے متعلق امام مالک نے کہا ہے: وہ احادیث جن میں ہمارے نزدیک اختلاف نہیں اتنی اور اتنی ہیں، اور اگر کسی مسئلہ میں ان کا اختلاف ہوتا تھا تو سب میں جو قول قوی اور راجح ہوتا تھا اس کو وہ لیتے تھے، اور اس قول کی قوت یا اس وجہ سے ہوتی تھی کہ اس کے قائل زیادہ ہیں یا وہ کسی قوی قیاس کے موافق ہے یا کتاب وسنت سے اس کی تخریج کی گئی ہے، ایسے ہی اقوال کے متعلق امام مالک کہتے ہیں جو اقوال میں نے سنے ہیں، ان سب میں یہ زیادہ بہتر ہے۔

پس جب ان علما کو اپنی یادداشت میں کسی مسئلہ کا جواب نہ ملتا تھا تو ایما اور اقتضا کا تتبع کر کے قدما کے ہی کلام سے مسئلہ کا جواب حاصل کرتے تھے، اسی زمانہ میں علما کو تدوین کا الہام ہوا، پس مدینہ میں امام مالک اور محمد بن عبدالرحمٰن بن ابی ذئب نے تصنیف کرنا شروع کیا اور مکہ میں ابن جریج اور ابن عیینہ نے اور کوفہ میں سفیان ثوری نے اور بصرہ میں ربیع بن صبیح نے، اور سب نے تصنیف میں وہی طرز اختیار کیا جس کا میں نے ذکر کیا ہے، جب منصور عباسی نے حج کیا تو امام مالک سے کہا کہ میرا قصد یہ ہے کہ آپ کی مصنفہ کتاب (مؤطا) کے چند نسخے لکھوا کر اہل اسلام کے شہروں میں سے ہر شہر میں ایک ایک نسخہ بھیج دوں اور لوگوں کو حکم کروں کہ اسی کے مسائل پر عمل کریں اور اس سے تجاوز کر کے اور طرف نہ جائیں، امام مالک نے کہا اے امیر المومنین ایسا نہ کرو

---

(۱) جوتے میں تسمہ باندھنا۔

کیونکہ لوگوں تک پہلے ہی سے اقوال پہنچ چکے ہیں اور وہ احادیث کو سن چکے ہیں اور روایات کو نقل کر چکے ہیں اور ہر قوم نے اس پر عمل درآمد کرلیا ہے جو اس کے پاس پہنچ چکا ہے اور لوگوں میں اختلاف ہو گیا ہے اس واسطے لوگوں کو اس حالت پر رہنے دو جو انھوں نے اپنے لئے پسند کرلیا ہے یہ قصہ ہارون رشید کی طرف بھی منسوب کیا جاتا ہے کہ ہارون رشید نے امام مالک سے مشورہ لیا تھا کہ مؤطا کو خانہ کعبہ میں لٹکا دیا جائے اور لوگوں کو اس پر عمل کرنے کی ترغیب دی جائے، امام مالک نے کہا ایسا نہ کرو کیونکہ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فروعات میں مختلف ہوئے ہیں اور شہروں میں پھیل گئے ہیں اور ہر سنت گزر چکی ہے، تب ہارون رشید نے کہا تم کو خدا توفیق دے اے ابوعبداللہ، سیوطی نے اس حکایت کو نقل کیا ہے۔

علما مدینہ کو جو حدیثیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہنچی تھیں ان سب علما میں امام مالک سب سے زیادہ قابل اعتماد تھے اور ان کی حدیث سب سے زیادہ معتبر ہے، اور حضرت عمر کے فیصلے حضرت عبداللہ بن عمر حضرت عائشہ اور ان کے اصحاب فقہائے سبعہ کے اقوال کو امام مالک سب سے زیادہ یاد رکھنے والے تھے، ان سے اور انہی جیسے علما کی وجہ سے روایت اور فتوی کا علم قائم ہوا ہے، پس جب ان کی طرف تفویض کار ہوئی تو انھوں نے حدیث کا درس اور فتویٰ دینا شروع کیا اور لوگوں کو خوب فائدہ پہنچایا، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول انہی پر صادق آیا ''عنقریب لوگ تحصیل علم کے لئے سفر کریں گے لیکن مدینہ کے عالم سے زیادہ کسی کو واقف نہ پائیں گے''۔

ابن عیینہؒ اور عبدالرزاقؒ نے اس حدیث کا محمل امام مالک ہی کو قرار دیا ہے تمہارے لئے ایسے دو شخصوں کی شہادت کافی ہے، امام مالک کے شاگردوں نے ان کی روایات اور پسندیدہ اقوال کو جمع کیا اور ملخص کر کے لکھا اور ان کی شرح کی اور ان سے مسائل کا اخراج کیا، ان اقوال کے اصول اور دلائل میں گفتگو کی اور ان کے شاگرد مغربی ممالک اور زمین کے اطراف میں پھیل گئے اور ان کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو بہت فائدہ پہنچایا اگر تم ہمارے قول کی تحقیق کرنا چاہو جو ہم نے ان کے اصل مذہب کی نسبت بیان کی ہے، تو تم کتاب مؤطا میں غور کرو جیسا ہم نے ذکر کیا ہے ویسا ہی پاؤ گے، اور امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ، ابراہیم نخعیؒ اور ان کے ہم عصر علما کے مذہب کے زیادہ پابند تھے اور ابراہیم نخعیؒ کے مذہب سے بہت کم تجاوز کرتے تھے اور ان کے

مذہب کے موافق مسائل کی تخریج کرنے میں عظیم الشان تھے، تخریجات کی وجوہ دریافت کرنے میں دقیق النظر تھے اور فروعات کی جانب ان کی نہایت توجہ تھی، اور اگر تم ہمارے قول کی تحقیق کرنا چاہو تو امام محمد رحمۃ اللہ کی کتاب الآثار اور جامع عبدالرزاق اور ابوبکر بن ابی شیبہ کی تصنیف سے ابراہیمؒ اور ان کے معاصرین کے اقوال کو ملخص کرو پھر امام ابوحنیفہؒ کے مذہب سے اس کا اندازہ کرو تو تم ان کے طرز سے بہت ہی کم موقعوں پر مخالف پاؤ گے، اور وہ ان چند مواقع میں بھی فقہا کوفہ کے مذہب کو نہیں چھوڑتے ہیں، امام ابوحنیفہ کے شاگردوں میں سب مشہور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ ہیں، ہارون رشید کے عہد میں قاضی القضاۃ مقرر کئے گئے تھے پس وہ امام ابوحنیفہ کے مذہب کی شہرت کا اور اطراف عراق، خراسان اور ماوراء النہر میں معمول بہ ہونے کا سبب ہوگئے اور آپ کے شاگردوں میں نہایت ذہین اور عمدہ تصنیف کرنے والے امام محمد بن حسن ہیں، اور ان کے حالات میں سے یہ ہے کہ انھوں نے امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف سے علم فقہ حاصل کیا اس کے بعد مدینہ جا کر امام مالک سے مؤطا کو پڑھا، پھر خوب توجہ کی اور اپنے اصحاب کے مذہب کو ہر ہر مسئلہ میں مؤطا کے مطابق کیا، پس اگر موافقت پائی تو فبہا ورنہ اگر صحابہ وتابعین کی کسی جماعت کو اپنے اصحاب کے مذہب پر عمل کرنے والا پایا تو بھی اسی کو لیا، اور اگر فقہا کے عمل میں ضعیف قیاس یا ضعیف تخریج کو پایا جس کے خلاف صحیح حدیث پائی جاتی ہے۔ یا اکثر علما کا عمل اس کے خلاف ہے تو اس وقت جس مذہب کو مذاہب سلف میں سے ارجح پایا اس کو اختیار کر لیا اور یہ دونوں (امام محمدؒ اور امام ابو یوسفؒ) بھی حتی الامکان ابراہیمؒ اور معاصرین ابراہیم کے طریقہ سے کنارہ کش نہیں ہوتے جیسے ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کا معمول ہے، البتہ ان تینوں ائمہ کا اختلاف دو باتوں میں سے کسی ایک میں ہوتا تھا، یا تو ابراہیم کے مذہب کے موافق ان کے شیخ ابوحنیفہ نے کسی مسئلہ کی تخریج کی اور اس تخریج میں ان دونوں شاگردوں نے اپنے شیخ کی مخالفت کی یا یہ کہ ابراہیمؒ اور ان کے ہم مرتبہ علما کے کسی مسئلہ میں مختلف اقوال تھے تو یہ دونوں کسی قول کو دوسرے پر ترجیح دینے میں اپنے استاذ کے مخالف ہو جاتے تھے۔ پس امام محمد نے تصنیفات فرمائیں اور ان میں ان تینوں (۱) کی رایوں کو جمع کیا اور کثیر لوگوں کو نفع پہنچایا، پس اصحاب ابوحنیفہؒ نے ان تصنیفات کی طرف نہایت

---

(۱) ابراہیم نخعی، ابوحنیفہ، اور ابو یوسف۔

توجہ کی، ان کے خلاصہ کیئے ان کے دلائل بیان کیئے، شروح لکھیں، ان سے مسائل کی تخریج کی، ان کے مبانی اور دلائل میں تحقیق کی، پھر ممالک خراسان اور ماوراء النہر میں پھیل گیئے پس اس کو امام ابو حنیفہ کا مذہب کہا جاتا ہے، مذہب مالکی اور حنفی کے ابتدا ظہور اور ان کے اصول وفروغ کے مرتب ہونے کے زمانہ میں امام شافعی کا نشو ونما ہوا جب انھوں نے متقدمین کی روش میں غور کیا تو انھوں نے بہت سے ایسے امور کو پایا جن کی وجہ سے وہ متقدمین کے طریق کی پیروی نہ کر سکے، امام شافعی نے ان امور کو اپنی کتاب الام کے اول میں ذکر کیا ہے۔

من جملہ ان کے یہ امر تھا کہ امام شافعیؒ نے دیکھا کہ متقدمین حدیث مرسل اور منقطع پر عمل کرتے تھے اور ایسی حدیثیں خرابی سے محفوظ نہ تھیں پس جب حدیث کے تمام طرق جمع کیئے جاتے تھے تو یہ بات ظاہر ہو جاتی تھی کہ بہت سی مرسل احادیث بالکل بے اصل ہیں اور بہت سی مرسل احادیث مسند احادیث کے مخالف تھیں اس واسطے امام شافعیؒ نے یہ قرار دیا کہ مرسل حدیث پر عمل جب ہی کیا جائے کہ اس کے شروط بھی موجود ہوں اور وہ تمام شروط کتب اصول میں مذکور ہیں، اور ایک امر یہ تھا کہ متقدمین کے زمانہ میں مختلف احادیث کے درمیان جمع وتوفیق کے قواعد منضبط نہ تھے اس واسطے ان کے اجتہادی مسائل میں خرابیاں رہا کرتی تھیں اس خرابی کو رفع کرنے کے لئے امام شافعیؒ نے اصول مقرر کیئے۔ اور ان کو ایک کتاب میں جمع کر دیا، اصول فقہ میں سب سے پہلی تصنیف یہی کتاب ہے اس کی مثال جو ہمارے علم میں آئی یہ ہے کہ امام شافعی امام محمد بن حسنؒ کے پاس گیئے اس وقت وہ علما مدینہ پر اس امر میں اعتراض کر رہے تھے کہ وہ ایک گواہ اور ایک قسم کے ساتھ فیصلہ کر دیتے ہیں اور وہ کہہ رہے تھے کہ ایسا کرنے سے کتاب اللہ پر زیادتی ہوتی ہے، تب امام شافعیؒ نے کہا کیا تمہارے نزدیک یہ بات ثابت ہے کہ خبر واحد سے کتاب اللہ پر زیادتی جائز نہیں ہے؟ امام محمدؒ نے کہا ہاں، جائز نہیں ہے، امام شافعی نے کہا پھر تم کیسے کہتے ہو کہ وارث کے لئے وصیت جائز نہیں اور اس کی وجہ آنحضرت کا یہ قول بتلاتے ہو۔

''خبردار ہو جاؤ وارث کے لئے وصیت جائز نہیں ہے''۔ حالانکہ خدا تعالٰی فرماتا ہے ''تم پر مقرر کیا گیا کہ موت آنے کے وقت اگر مال چھوڑا ہو تو والدین اور رشتہ داروں کے لئے اس میں وصیت کرنا چاہیے، اسی قسم کے اور چند اعتراضات امام شافعی نے ان پر کیئے اور امام محمد بن حسنؒ

خاموش رہے۔

اور ایک امر یہ تھا کہ بعض احادیث صحیحہ علما تابعین کے مفتیوں کو نہ پہنچیں اس واسطے ان کو اپنی رائے سے اجتہاد کرنا پڑا یا عام الفاظ کا انھوں نے لحاظ کیا یا گزشتہ صحابہ کی انھوں نے پیروی کی اور اسی کے موافق فتویٰ دے دیا لیکن تیسرے طبقہ میں یہ احادیث مشہور ہوگئیں اور انھوں نے ان احادیث پر عمل نہ کیا یہ سمجھ کر کہ یہ احادیث ان کے علما شہر کے عمل کے مخالف ہیں اور اس طریقہ کے خلاف ہیں جس پر وہ سب متفق ہیں اور یہ بات ان احادیث میں طعن کی وجہ بن گئی اور ان احادیث کے غیر معتبر ہونے کی علت ہوگئی، یا وہ احادیث تیسرے طبقہ میں مشہور نہیں ہوئی تھیں بلکہ اس کے بعد ان کی شہرت ہوئی جبکہ محدثین نے احادیث کے تمام طرق روایت میں غور کیا اور اطراف ملک میں سفر کیا اور علمائے حدیث سے ان کی تفتیش کی، پس اکثر احادیث ایسی ظاہر ہوتی گئیں جن کی روایت صحابہ میں سے صرف ایک یا دو اشخاص نے کی تھی اور ان صحابہ سے بھی صرف ایک یا دو راویوں نے ان کی روایت کی تھی وَھَلُمَّ جَرًّا پس بہت سی احادیث فقہا کی نظر میں مخفی رہیں اور ان حفاظ حدیث کے زمانہ میں مشہور ہوئیں جنھوں نے تمام طرق حدیث کو جمع کیا تھا، مثلاً بہت سی احادیث کو اہل بصرہ نے روایت کیا اور باقی حصے ان احادیث سے بے خبر رہے پس امام شافعیؒ نے اس بات کو واضح کر دیا کہ علما صحابہ اور تابعین کی ہمیشہ یہ حالت رہی ہے کہ وہ ہر مسئلہ میں حدیث کے متلاشی رہتے تھے جب کوئی حدیث ان کو نہ ملتی تھی تو وہ کوئی اور استدلال اختیار کرتے تھے لیکن اس کے بعد جب کوئی حدیث ان پر ظاہر ہو جاتی تھی تو وہ حدیث کی طرف رجوع کر لیا کرتے تھے، پس جب ان کی ایسی حالت تھی تو ان کا کسی حدیث پر عمل نہ کرنا اس کے لئے قادح نہیں ہوسکتا ہاں، اس وقت قادح ہوسکتا ہے جب وہ کوئی علت قادحہ بیان کر دیں اس کی مثال حدیث قلتین ہے یہ حدیث صحیح ہے جو بہت سے طریقوں سے مروی ہے ان سب میں بڑا طریق وہ ہے جو ابوالولید بن کثیر پر ختم ہوتا ہے، انھوں نے اس کو محمد بن جعفر بن زبیرؒ سے روایت کیا ہے اور محمد بن جعفر نے عبداللہ یا محمد بن عباد بن جعفر یہ روایت عبید اللہ بن عبداللہ اور ان دونوں نے حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت کی ہے پھر اس کے بعد طرق روایت متعدد ہوگئے اور یہ دونوں راوی اگر چہ ثقہ ہیں لیکن وہ فتویٰ میں لوگوں کے مرجع نہ تھے اور نہ ہی وہ لوگوں کے نزدیک معتمد علیہ تھے

اس واسطے یہ حدیث نہ سعید بن مسیّب کے عہد میں اور نہ ہی امام زہری کے زمانہ میں مشہور ہوئی اور نہ اس پر مالکیہ نے عمل کیا اور نہ ہی حنفیہ نے عمل کیا۔ پس لوگوں نے اس پر عمل نہ کیا اور امام شافعیؒ نے اس پر عمل کرلیا۔

اور ایسے ہی خیار مجلس کی حدیث ہے یہ حدیث صحیح ہے اور بہ کثرت طریقوں سے روایت کی گئی ہے اور صحابہ میں سے ابن عمر اور ابو ہریرہ نے اس حدیث پر عمل کیا تھا اور فقہائے سبعہ اور ان کے معاصرین میں اس حدیث کی شہرت نہیں ہوئی تھی پس وہ اس حدیث کے قائل نہ تھے اس واسطے امام مالکؒ اور امام ابو حنیفہؒ نے اس امر کو حدیث مذکور میں علت قادحہ سمجھ کر اس پر عمل نہ کیا اور امام شافعی نے اس پر عمل کیا۔

اور ایک امر یہ تھا کہ صحابہ کے سب اقوال امام شافعی کے عہد میں جمع کئے گئے، ان اقوال کی کثرت ہوئی اور ان میں اختلافات پائے گئے اور ان میں سے بہت سے اقوال کو امام شافعی نے حدیث صحیح کے مخالف پایا اس وجہ سے کہ وہ حدیث صحابہ کو معلوم نہیں ہوئی تھی اور امام شافعی نے سلف کو دیکھا تھا کہ ایسے امور میں وہ حدیث کی طرف رجوع کیا کرتے تھے اس واسطے امام شافعی نے صحابہ کے اقوال سے استدلال کرنا ترک کر دیا۔ جب تک کہ وہ اقوال سب کے نزدیک متفق علیہ نہ ہوں اور کہا صحابہ بھی آدمی تھے اور ہم بھی آدمی ہیں۔

اور ایک امر یہ تھا کہ امام شافعیؒ نے فقہا کے ایک گروہ کو دیکھا کہ وہ اس قیاس میں جس کو شرع نے ثابت کیا ہے ایسی رائیں مخلوط کر دیتے ہیں جن کو شریعت کوئی وقعت نہیں دیتی، وہ فقہا اس قیاس اور رائے میں کچھ فرق نہیں کرتے اور کبھی کبھی وہ اس رائے کا نام استحسان رکھتے ہیں اور رائے سے مراد یہ ہے کہ کسی حرج یا مصلحت کے مظنہ کو حکم کی علت قرار دیا جائے، اور قیاس کے معنی یہ ہیں کہ حکم منصوص سے کوئی علت نکالی جائے اور وہ علت حکم کا مدار علیہ قرار دی جائے اس رائے کو امام شافعی نے نہایت اہتمام سے باطل کیا اور فرمایا جو استحسان کرتا ہے وہ شارع بننا چاہتا ہے، ابن حاجب نے مختصر الاصول میں اس کو نقل کیا ہے اس کی مثال یہ ہے کہ یتیم کا زمانہ رشد تک پہنچنا ایک مخفی امر ہے اس واسطے فقہا نے مظنہ رشد کو جو پچیس برس ہوتے ہیں رشد کے قائم مقام کر دیا اور یہ کہا کہ جب یتیم پچیس برس کا ہو جائے تو اس کو اس کا مال دے دینا چاہئے اور انھوں نے اس کو

استحسان کہا حالانکہ قیاس کا مقتضایہ ہے کہ اس عمر میں اس کو مال نہیں دینا چاہئے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ جب امام شافعیؒ نے متقدمین میں سے ایسے امور پائے تو از سر نو فقہ کو مرتب کیا، اصول قائم کئے اور فروع کو ان پر متفرع کیا، عمدہ کتابیں تصنیف کیں اور لوگوں کو فائدہ پہنچایا، فقہا ان کی خدمت میں جمع ہوئے، ان کی کتابوں کا اختصار کیا، ان پر شروح لکھیں، دلائل بیان کئے اور مسائل کی تخریج کی اور پھر تمام شہروں میں یہ لوگ پھیل گئے ہیں پس اس طریقہ کا نام مذہب شافعی ہو گیا، واللہ اعلم۔

تیسرا باب: اہل حدیث اور اصحاب الرائے کے مابین فرق کا بیان

واضح ہو کہ سعید بن مسیب، ابراہیمؒ اور زہریؒ کے زمانہ میں اور امام مالک، سفیان ثوری اور ان کے بعد کے عہد میں بھی ایسے علما تھے جو مسائل دین میں رائے سے خوض کرنے کو برا جانتے تھے اور فتویٰ دیتے ہوئے اور استنباط کرتے ہوئے ڈرتے تھے لیکن نہایت ہی ضرورت کے موقع پر جس کے بغیر کوئی چارہ نہ ہوتا تھا تو استنباط کرتے تھے، ان کو بڑا اہتمام اس کا ہوتا تھا کہ حدیث رسول کی روایت کر دیں، ایک مرتبہ عبداللہ بن مسعود سے ایک مسئلہ دریافت کیا گیا تو انھوں نے جواب دیا کہ میں ناپسند کرتا ہوں کہ تیرے لئے اس شئے کو حلال کردوں جس کو خدا نے حرام کیا ہو یا وہ چیز حرام کردوں جس کو اس نے حلال کیا ہو اور معاذ بن جبل نے کہا کہ اے لوگو! بلا کے نازل ہونے سے پہلے جلدی نہ کرو کیونکہ مسلمانوں میں ہمیشہ ایسے لوگ ہوتے رہیں گے کہ جب ان سے کوئی امر دریافت کیا جائے گا تو اس کو مسلسل بیان کرتے چلے جائیں گے۔ اور ایسے ہی حضرت عمر، حضرت علیؓ، ابن عباسؓ اور ابن مسعودؓ سے اس امر میں کلام کرنا جو نازل نہیں ہوا مکروہ سمجھنا منقول ہے اور عبداللہ بن عمر نے جابر بن زید سے کہا تھا کہ تم فقہا بصرہ میں سے ہو پس قرآن ناطق یا سنت ماضیہ سے ہی فتویٰ دینا، اگر تم نے ایسا نہ کیا تو خود بھی ہلاک ہو گے اور لوگوں کو بھی ہلاک کرو گے، ابونصر کہتے ہیں کہ جب ابوسلمہ بصرہ میں آئے تو میں اور حسن بصریؒ ان کی ملاقات کو گئے، انھوں نے حسن بصری سے فرمایا حسن بصری تم ہی ہو بصرہ میں تم سے زیادہ کسی کی ملاقات کا مجھ کو شوق نہ تھا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے سنا ہے کہ تم اپنی رائے سے فتویٰ دیتے ہو پس آئندہ بجز قرآن وحدیث کے اپنی رائے سے فتویٰ نہ دینا۔

اور ابن المنکدر کہتے ہیں کہ عالم خدا اور اس کے بندوں کے درمیان واسطہ ہوا کرتا ہے پس

اس کو اپنے لئے نجات کا کوئی راستہ پیدا کرنا چاہئے، امام شعبیؒ سے دریافت کیا گیا کہ جب تم سے مسائل پوچھے جاتے تھے تو تم کیا کرتے تھے، انھوں نے فرمایا تم نے جاننے والے سے یہ بات دریافت کی جب کسی شخص سے کوئی مسئلہ دریافت کیا جاتا تھا تو وہ اپنے مصاحب سے کہتا تھا کہ تم اس مسئلہ کا جواب دو، پس ایسے ہی یہ بات ایک دوسرے سے کہی جاتی تھی، امام شعبی نے فرمایا یہ علما رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ بیان کریں اس پر عمل کرو اور جو کچھ اپنی رائے سے کہیں اس کو پاخانہ میں پھینک دو ان آثار کو دارمی نے روایت کیا ہے پس حدیث اور اثر کی تدوین قرآن اور اس کے نسخوں کی کتابت بلاد اسلام میں پھیل گئی حتی کہ اہل روایت میں سے ایسے بہت کم تھے جن کے پاس کوئی صحیفہ یا نسخہ نہ ہو یا وہ تدوین نہ کرتے ہوں اور یہ اس لئے کہ ان کو کسی بڑے موقع پر ضرورت پڑتی تھی پس اس وقت کے بلند پایہ علما نے حجاز، شام، عراق، مصر، یمن اور خراسان کا سفر کیا اور کتابیں جمع کیں اور نسخوں میں تتبع کیا، غریب حدیث اور آثار نادرہ میں بہت خوض کیا، پس ان کے اہتمام سے احادیث اور آثار اس قدر مجتمع ہو گئے جو پیشتر کسی سے جمع نہ ہو سکے تھے اور ان کے لئے وہ سامان مہیا ہو گیا جو پہلے کسی کے لئے مہیا نہ ہوا تھا اور بے شمار طرق احادیث خاصۃً انہی کو معلوم ہوئے یہاں تک کہ ان کے پاس ایسی احادیث بہت سی تھیں جو سو اور اس سے بھی زیادہ طرق سے مروی تھیں، پس بعض طرق نے بعض دوسرے نامعلوم طرق کو واضح کر دیا اور علما نے ہر حدیث کا مرتبہ معلوم کر لیا کہ کون سی غریب ہے اور کونسی مستفیض ہے اور حدیث کے متابعات اور اس کے شواہد میں غور کرنے کا ان کو موقع ملا۔ اور بہت سی صحیح احادیث جو پہلے اہل فتویٰ پر ظاہر نہ ہوئی تھیں ان کو معلوم ہو گئیں، امام شافعی نے امام احمد سے کہا تھا کہ تم کو ہم سے زیادہ احادیث صحیحہ کا علم ہے جو حدیث صحیح ہوا کرے وہ مجھ کو بتلا دیا کرو تاکہ میں اس کی طرف رجوع کروں خواہ وہ حدیث کوفی ہو یا بصری ہو یا شامی ہو، اس کو ابن ہمام نے نقل کیا ہے۔

امام شافعی نے امام احمد سے یہ اس واسطے کہا تھا کہ بہت سی احادیث ایسی تھیں جن کو خاص ایک ایک شہر کے لوگ ہی روایت کرتے تھے جیسے وہ احادیث جن کو صرف شامیوں نے روایت کیا یا عراقیوں نے روایت کیا یا صرف ایک ہی خاندان کے لوگوں نے روایت کیا جیسے برید کا نسخہ کہ انھوں نے ابو بردہ سے روایت کیا اور ابو بردہ نے ابو موسیٰ سے روایت کیا اور عمرو بن شعیب کا نسخہ جو

انھوں نے اپنے باپ سے اور ان کے باپ نے اپنے باپ سے روایت کیا، یا بعض صحابی قلیل الروایت اور گوشہ نشین تھے جن سے بہت کم لوگوں نے احادیث روایت کی ہیں پس اس قسم کی احادیث سے اکثر اہل فتویٰ غافل تھے اور ان کے پاس ہر شہر کے فقیہ صحابہ اور تابعین کے آثار کا مجموعہ تھا ان سے پیشتر کے لوگ صرف اپنے شہر اور اپنے اصحاب کی حدیثوں کو جمع کر سکتے تھے اور پیشتر کے علما اسماء رجال اور ان کی عدالت کے مراتب پہنچاننے میں اپنے خالص مشاہدہ اور قرائن کے تتبع پر اعتماد کرتے تھے، لیکن اس طبقہ کے علما نے اس فن میں نہایت غور کیا اور اس کو مدون کر کے اور بحث و تفتیش کر کے ایک مستقل فن کر دیا، اور احادیث کے صحیح اور غیر صحیح قرار دینے میں نہایت نظر کی اس طرح اس تدوین اور مناظرہ سے ان حدیثوں کا حال معلوم ہو گیا جن کا متصل یا منقطع ہونا پہلے مخفی تھا، امام سفیان، وکیع اور ان کے امثال کی یہ حالت تھی کہ وہ نہایت اہتمام سے اجتہاد کرتے تھے لیکن حدیث مرفوع متصل ایک ہزار سے کم ہی ان کو حاصل ہوئی تھیں جیسا کہ ابوداؤد سجستانی نے اس کو اپنے خط میں ذکر کیا ہے جس کو انھوں نے اہل مکہ کو بھیجا تھا اور اس طبقہ کے محدثین تقریباً چالیس ہزار تک احادیث کی روایت کرتے تھے۔

امام بخاری کے متعلق یہ صحیح ہے کہ انھوں نے چھ ہزار احادیث سے صحیح بخاری کو مختصر کیا ہے اور ابوداؤد کی نسبت بھی یہ ثابت ہے کہ انھوں نے پانچ ہزار احادیث سے اپنی سنن کو منتخب کیا ہے، اور امام احمد نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث معلوم کرنے کے لئے اپنی مسند کو میزان قرار دیا ہے، پس جو حدیث اس مسند میں موجود ہے اگرچہ اس کی روایت ایک ہی طریقہ سے ہو اس کی کوئی اصل ہے اور جو اس میں نہ ہو اس کو بے اصل سمجھنا چاہئے اس طبقہ کے بڑے علما یہ ہیں: عبدالرحمٰن بن مہدی، یحییٰ بن سعید قطان، یزید بن ہارون، عبدالرزاق، ابوبکر بن ابی شیبہ، مسدد، ہناد، احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ، فضل بن دکین، علی مدینی اور ان کے ہم مرتبہ محدثین اور یہی طبقہ طبقات محدثین کا پہلا نمونہ ہے۔

پس محققین اہل حدیث فن روایت و معرفت مراتب احادیث کو مکمل کرنے کے بعد فقہ کی طرف مائل ہوئے، پس جبکہ بہت سی احادیث اور آثار کو انھوں نے ان مذاہب میں سے ہر ایک مذہب کے مخالف دیکھا تو متقدمین میں سے کسی خاص امام کی تقلید کرنے پر اتفاق کرنے کو انھوں

نے درست نہ سمجھا، پس وہ خود احادیث نبوی کا صحابہ تابعین اور مجتہدین کے آثار کا ان قواعد کے موافق جو انھوں نے اپنے نزدیک قرار دے رکھے تھے تتبع کرنے لگے اور میں ان قواعد کو تمہارے لئے چند کلمات میں بتلائے دیتا ہوں۔

ان کا مسلک یہ تھا کہ جب کسی مسئلہ میں قرآن ناطق ہو تو کسی دوسری شئے کی طرف توجہ کرنا جائز نہیں ہے اور جب آیت قرآنی میں چند احتمالات ہوں تو اس کا فیصلہ حدیث سے کرنا چاہئے۔

اور جب قرآن میں ان کو کوئی حکم نہ ملتا تھا تو رسول خدا کی حدیث پر عمل کرتے تھے خواہ وہ سنت مستفیض ہو جس پر فقہا کا عمل رہا ہو یا کسی خاص شہر کے علما سے یا کسی خاص خاندان کے علما سے یا کسی خاص طریقہ سے مروی ہے، خواہ صحابہ اور فقہا نے اس پر عمل کیا ہو یا نہ کیا ہو۔

اور جب کسی مسئلہ میں ان کو حدیث مل جاتی تھی تو اس کے خلاف کسی اثر یا کسی اجتہاد کا اتباع نہیں کرتے تھے، اور جب تتبع احادیث میں پوری کوشش کر چکتے تھے اور اس مسئلہ میں ان کو حدیث نہیں ملتی تھی تو جماعت صحابہ و تابعین کے اقوال پر عمل کرتے تھے اور اس میں وہ کسی قوم یا کسی شہر کے پابند نہیں تھے جیسا کہ ان سے پہلے لوگ کرتے تھے، پس اگر کسی مسئلہ میں جمہور خلفا اور فقہا کو متفق پاتے تھے تو اس پر قناعت کرتے تھے اور اگر وہ مسئلہ مختلف فیہ ہوتا تھا تو ان میں سے جو بڑا عالم، پرہیزگار یا ضابط یا زیادہ مشہور ہوتا تھا اس کی حدیث کو لیتے تھے اور اگر وہ کوئی ایسا مسئلہ پاتے تھے جس میں مساوی قوت کے دو قول ہوتے تھے تو وہ مسئلہ ذات القولین (۱) رہتا تھا اور اگر اس سے بھی عاجز آ جاتے تھے تو کتاب و سنت کی عام تعبیرات ان کے اشارات اور اقتضاءات میں غور کیا کرتے تھے اور نظیر مسئلہ کو ان پر حمل کرتے تھے بشرطیکہ دونوں مسئلے بادی الرائے میں ایک سی حالت رکھتے ہوں، اس امر میں وہ قوانین اصول کی پابندی نہیں کرتے تھے، بلکہ اس طریق پر اعتماد کرتے تھے جو صاف صاف سمجھ میں آئے اور دل کو اس سے اطمینان ہو جیسے تواتر کے لئے راویوں کی تعداد میزان نہیں ہے اور نہ ہی ان کا حال میزان ہے بلکہ اس کے لئے میزان وہ یقین ہے جو خبر کے بعد لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو جاتا ہے، صحابہ کے حالات میں ہم اس کو بیان کر چکے ہیں، اور یہ اصول متقدمین کے برتاؤ اور ان کی تصریحات سے مستخرج تھے، میمون بن مہران سے منقول ہے

(۱) یعنی اس میں دونوں وجہیں درست ہیں۔

کہ ابوبکرؓ کے پاس جب کوئی قضیہ پیش ہوتا تھا تو اس کا جواب کتاب اللہ میں تلاش کرتے تھے، پس اگر کتاب اللہ میں ایسا امر معلوم ہوجاتا تھا جس سے لوگوں میں فیصلہ کیا جائے تو اس کے ساتھ فیصلہ کردیتے تھے اور اگر قرآن میں اسکا جواب نہ ملتا تھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث جو اس امر میں آپ کو معلوم ہوتی تھی اس کے مطابق فیصلہ کرتے تھے اور اگر حدیث بھی معلوم نہ ہوتی تو باہر جاکر مسلمانوں سے دریافت کرتے کہ ایسا ایسا مسئلہ میرے سامنے پیش ہوا ہے کیا تم کو معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بارے میں کوئی فیصلہ صادر فرمایا ہے؟ پس کبھی آپ کے پاس بہت سے آدمی جمع ہوجاتے اور کہتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے متعلق یہ فیصلہ کیا تھا، تب ابوبکرؓ فرماتے الحمدللہ خدا نے ہم میں ایسے لوگ پیدا کئے ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال محفوظ رکھتے ہیں۔

اور اگر سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پانے سے بھی عاجز ہوجاتے تھے تو معتمد اور نیک لوگوں کو جمع کرکے ان سے مشورہ لیتے پس جس امر پر سب اتفاق رائے کرتے اس کے موافق آپ فیصلہ کردیتے تھے، قاضی شریح سے مروی ہے کہ حضرت عمرؓ نے ان کو تحریر کیا تھا کہ اگر تمہارے پاس کوئی ایسا مسئلہ پیش ہو جس کا حکم کتاب اللہ میں مذکور ہے تو اس کے موافق فیصلہ کرنا اور ایسا نہ ہو کہ لوگ تم کو اس سے باز رکھیں، اور ایسا مسئلہ پیش ہو جس کا حکم کتاب اللہ میں نہ ملے تو سنت رسول اللہ کو تلاش کرکے اس کے موافق فیصلہ کرنا اور کوئی ایسا مسئلہ پیش ہو جس کا حکم نہ کتاب اللہ میں ہے اور نہ اس کے بارے میں حدیث رسول ہے تو اس قول پر نظر کرنا جس پر لوگوں نے اتفاق کیا ہو اور اس کے موافق فیصلہ کرنا۔

اور اگر کوئی ایسا مسئلہ پیش ہو جس کا حکم نہ کتاب اللہ میں ہے اور نہ اس کے بارے میں حدیث رسول منقول ہے اور نہ تم سے پہلے لوگوں میں سے کسی نے اس میں رائے دی ہے تو دو امروں میں سے جو چاہو اختیار کرنا اگر اپنی رائے سے اجتہاد کرنا چاہو اور پیش قدمی کرنا چاہو تو اجتہاد کرنا اور اگر اجتہاد میں تاخیر کرنا چاہو تو تاخیر کرنا، اور میں تمہارے لئے تاخیر ہی کو بہتر سمجھتا ہوں، عبداللہ بن مسعودؓ سے منقول ہے وہ کہتے تھے ہم پر ایسا زمانہ گزرا ہے کہ ہم کسی مسئلہ میں فتویٰ نہ دیتے تھے اور نہ ہم فتویٰ دینے کے قابل تھے اور خدا نے مقدر کیا تھا کہ ہم کو اس درجہ تک پہنچا دیا

جس کو تم دیکھتے ہو، پس آج کے بعد جس کے پاس کوئی مقدمہ پیش ہو تو اس میں کتاب اللہ کے موافق فیصلہ کرے اور اگر ایسا مقدمہ پیش ہو جس کا حکم کتاب اللہ میں نہیں ہے تو اس میں وہ فیصلہ دے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا ہے، اور اگر ایسا مقدمہ پیش ہو جس کا حکم نہ قرآن میں ہے اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے متعلق کوئی حکم دیا ہے تو جیسا صالحین امت نے فیصلہ کیا ہو اس کے موافق فیصلہ کرے اور اپنی طرف سے یہ نہ کہے کہ میں اس میں خوف کرتا ہوں اور اس کو پسند کرتا ہوں اس واسطے کہ حرام اور حلال صاف اور ظاہر ہیں اور حرام و حلال کے بیچ میں مشتبہ امور ہیں پس شک کی بات کو ترک کرو اور جس پر یقین ہو اس کو لو، اور عبداللہ بن عباس کی یہ حالت تھی کہ جب ان سے کوئی مسئلہ دریافت کیا جاتا تھا پس اگر اس کا حکم قرآن میں ہوتا تھا تو بتلا دیتے تھے اور اگر قرآن میں اس کا حکم نہ ملتا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا حکم ثابت ہوتا تو بتلا دیتے اور اگر حضور سے بھی ثابت نہ ہوتا تو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کا دیا ہوا حکم بیان کر دیتے اور اگر ان سے بھی کوئی حکم محقق نہ ہوتا تو اپنی رائے سے فرماتے، عبداللہ بن عباس سے مروی ہے کہ وہ فرمایا کرتے تھے "کیا تم کو اس کا خوف نہیں ہے کہ خدا تم کو عذاب دے یا زمین میں دھنسا دے یہ کہ تم کہتے ہو کہ رسول خدا نے ایسا کہا تھا اور فلاں شخص نے ایسا کہا تھا، قتادہ سے مروی ہے کہ ابن سیرین نے ایک شخص کے سامنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث بیان کی تو اس نے کہا کہ فلاں شخص تو ایسا ایسا کہتا ہے، تب ابن سیرین نے کہا میں تم سے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کرتا ہوں اور تم یہ کہتے ہو فلاں شخص نے ایسا ایسا کہا ہے، اوزاعی سے روایت ہے کہ عمر بن عبدالعزیز نے یہ حکم لکھوایا تھا کہ کسی کو قرآن میں رائے دینے کا حق نہیں ہے اور ائمہ صرف انہی امور میں رائے دے سکتے ہیں جن کے بارے میں قرآن نازل نہ ہوا ہو اور نہ ان کے بارے میں حدیث رسول منقول ہو، اور جس امر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت موجود ہے اس میں بھی کسی کو رائے دینے کا حق نہیں ہے۔

اعمش سے روایت ہے کہ ابراہیمؒ کہا کرتے تھے کہ مقتدی امام کے بائیں جانب کھڑا ہوا کرے، پس میں نے ان سے حدیث بیان کی کہ سمیع الزیات ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن عباس کو اپنے دائیں جانب کھڑا کیا تھا پس ابراہیم نے اس حدیث

کو قبول کرلیا، شعبی سے مروی ہے کہ ایک شخص ان کے پاس ایک مسئلہ دریافت کرنے آیا تو شعبی نے کہا عبداللہ بن مسعود اس امر میں یہ فرمایا کرتے تھے، اس نے کہا آپ مجھ کو اپنی رائے بتلایئے تب شعبیؒ نے کہا کیا تم اس شخص پر تعجب نہیں کرتے، میں عبداللہ بن مسعود کی طرف سے خبر دے رہا ہوں اور وہ مجھ سے میری رائے دریافت کرتا ہے، اور مجھ کو اس سے زیادہ اپنا دین پسندیدہ ہے، واللہ مجھ کو راگ گانا اچھا معلوم ہوتا ہے اس سے کہ میں اپنی رائے ظاہر کروں، دارمی نے یہ تمام آثار بیان کئے ہیں۔

ترمذی نے ابوالسائب سے روایت کی ہے کہ ہم وکیع کے پاس بیٹھے تھے انھوں نے ایک شخص سے جو رائے کو دخل دیا کرتا تھا کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشعار (۱) کیا، اور ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ اشعار مثلہ (۲) ہے اس شخص نے کہا کہ ابوحنیفہ نے تو ابراہیم نخعیؒ سے روایت کی ہے کہ 'اشعار' مثلہ ہے، ابوسائب کہتے ہیں کہ میں نے وکیع کو دیکھا کہ اس شخص پر انھوں نے بہت غصہ کیا اور کہا میں تجھ سے کہتا ہوں رسول خدا نے ایسا فرمایا ہے اور تو کہتا ہے ابراہیم یہ کہتے ہیں، تو اسی قابل ہے کہ قید کردیا جائے اور جب تک اپنے قول سے باز نہ آئے رہا نہ کیا جائے، عبداللہ بن عباس، عطاء، مجاہد، مالک بن انس رضی اللہ عنہم سے مروی ہے وہ کہا کرتے تھے کہ کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس کے قول کو اختیار اور رد نہ کیا جاسکے بجز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ جب علما نے فقہ کو ان قواعد پر مرتب کیا تو ان مسائل میں سے جن میں قدما نے کلام کیا تھا اور وہ جو ان کے زمانہ میں واقع ہوئے تھے کوئی مسئلہ ایسا نہ تھا جس کے متعلق کوئی حدیث مرفوع متصل یا مرسل یا موقوف، صحیح یا حسن یا قابل اعتبار انھوں نے نہ پائی ہو، یا اس مسئلہ کے متعلق شیخین یا دیگر خلفا وقضاۃ امصار اور فقہائے بلاد کے آثار میں سے کسی اثر کو انھوں نے نہ پایا ہو یا اس مسئلہ کے متعلق انھوں نے عموم، ائمۃ الفقہا کے ذریعہ کسی استنباط کو نہ حاصل کیا ہو، اس طرح پر علما کے لئے خدا نے سنت پر عمل کرنا آسان کردیا۔

اسی زمانہ کے علما میں سے نہایت عظیم الشان، زیادہ روایت کرنے والے اور مراتب حدیث

---

(۱) اونٹ کے کوہان پر زخم کردینا تاکہ قربانی کا معلوم ہو اور کوئی اس سے تعرض نہ کرے۔ (۲) شکل بگاڑنا، اس کی شریعت میں ممانعت ہے۔

سے زیادہ واقف اور فقہ میں سب سے زیادہ غائر النظر امام احمد بن محمد بن حنبل تھے، ان کے بعد اسحٰق بن راہویہ تھے۔

اور فقہ کا اس طرح سے مرتب کرنا بہت سی احادیث اور آثار پر موقوف تھا یہاں تک کہ امام احمد سے دریافت کیا گیا کہ ایک شخص کے لئے ایک لاکھ احادیث کافی ہوسکتی ہیں تا کہ وہ فتویٰ دینے کے قابل ہو سکے، انھوں نے کہا اتنی کافی نہیں ہیں پھر کہا گیا کہ پانچ لاکھ ہوں تو فتویٰ دے سکتا ہے؟ انھوں نے جواب دیا مجھ کو امید ہے کہ اتنی کفایت کر سکیں، غایت المنتہی میں یہ مذکور ہے، امام احمد کی مراد یہی ہے کہ فتویٰ دینے کے لئے اتنی حدیثیں کافی ہیں۔

اس کے بعد خدا تعالیٰ نے ایک دوسرے زمانہ کی پیدائش کی انھوں نے اپنے اصحاب کو دیکھا کہ انھوں نے احادیث کے جمع کرنے اور فقہ مرتب کرنے کی تکلیف خود برداشت کی اس واسطے انھوں نے اور فنون کی جانب توجہ کی، مثلاً ان صحیح احادیث کو ممیز کر دیا جو کبرائے اہل حدیث کے نزدیک متفق علیہ تھیں، جیسے زید بن ہارون یحییٰ بن سعید قطان، احمد، اسحٰق اور ان کے ہم مرتبہ لوگوں نے ان کو صحیح مانا تھا اور مثلاً فقہ کے متعلق ان احادیث کو جمع کیا جن پر فقہا، امصار اور علما بلاد اسلامی نے اپنے اپنے مذاہب کی بنیاد قائم کی تھی، اور مثلاً جو حدیث جس درجہ کی مستحق تھی اس پر وہی حکم لگایا اور مثلاً ان شاذ ونوادر احادیث کو جمع کیا جن کو سابقین نے روایت نہ کیا تھا یا ان کے وہ طریق بیان کئے جن طرق سے متقدمین نے ان کو بیان نہیں کیا تھا، ان میں وہ احادیث بھی ظاہر ہوئی جن میں اتصال یا علو سند کا وصف تھا یا ان کی روایت فقیہ نے فقیہ سے کی تھی یا حافظ حدیث نے حافظ حدیث سے کی تھی یا اس کے علاوہ اور مطالب علمی ان میں مندرج تھے، اس منصب کے محدثین بخاری، مسلم، ابوداؤد، عبد بن حمید، دارمی، ابن ماجہ، ابو یعلی، ترمذی، نسائی، دارقطنی، حاکم، بیہقی، خطیب، دیلمی، ابن عبدالبر اور ان کے ہم مرتبہ لوگ ہیں، اور میرے نزدیک ان سب میں وسیع العلم، سب سے زیادہ نافع مصنف اور مشہور ترین چار شخص ہیں جن کا زمانہ قریب قریب ہے، سب سے اول ابوعبداللہ بخاری ہیں، ان کی غرض یہ تھی کہ جس قدر احادیث صحیح مستفیض اور متصل ہیں، اور احادیث سے جدا کر دی جائیں اور ان احادیث سے فقہ، سیرت اور تفسیر کو مستنبط کیا جائے، اس واسطے انھوں نے اپنا جامع صحیح کو تصنیف کیا اور جو شرط مقرر کی تھی اس کو پورا کیا۔

اور ہمیں یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ ایک نیک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا، آپ نے فرمایا تجھ کو کیا ہوگیا ہے کہ تو محمد بن ادریس کی فقہ میں مشغول ہے اور میری کتاب کو تو نے چھوڑ دیا ہے، اس نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ کی کتاب کون سی ہے؟ آپ نے فرمایا صحیح بخاری، اور مجھ کو اپنی زندگی کی قسم ہے کہ صحیح بخاری کو ایسی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی ہے کہ اس سے زیادہ کا قصد نہیں ہوسکتا۔

اور دوسرے شخص مسلم نیشاپوری ہیں انھوں نے بھی یہی قصد کیا کہ ان احادیث صحیحہ کو جمع کریں جو محدثین کے نزدیک متفق علیہ متصل اور مرفوع ہوں اور ان سے احکام مستنبط ہوسکیں، اور انھوں نے یہ بھی قصد کیا کہ احادیث کو قریب الفہم کردیں اور ان سے مسائل کا استنباط کرنا سہل ہوجائے اس واسطے انھوں نے نہایت عمدہ ترتیب دی اور ایک ہی موقع پر ہر حدیث کے تمام طرق کو جمع کردیا تاکہ نہایت صراحت کے ساتھ اختلاف متون اور تفرق اسانید واضح ہوجائے اور انھوں نے تمام مختلف احادیث کو یکجا کردیا تاکہ عربی زبان کے واقف کو حدیث سے اعراض کرکے اور طرف متوجہ ہونے کے لئے کوئی عذر باقی نہ رہے۔ اور تیسرے شخص ابوداؤد سجستانی ہیں اور ان کا قصد یہی تھا کہ ایسی احادیث یکجا کردیں جن سے فقہا استدلال کرتے ہیں اور جو ان میں مروج ہیں اور جن کو علماء بلاد نے احکام کی بنیاد قرار دیا ہے اس مقصد کے لئے انھوں نے اپنی سنن کو تصنیف کیا اور اس سے صحیح، حسن اور قابل عمل احادیث کو جمع کیا، ابوداؤد کہتے ہیں کہ میں نے اپنی کتاب میں کوئی ایسی حدیث بیان نہیں کی جس کے ترک پر سب کا اتفاق ہو، اور ان میں سے جو حدیث ضعیف تھی اس کا ضعف بیان کردیا اور جس حدیث میں کوئی علت تھی اس کو ایسی وجہ کے ساتھ بیان کردیا جس کو علم حدیث میں خوض کرنے والا خوب سمجھ سکتا ہے اور ہر حدیث میں اس مسئلہ کو بیان کردیا جس کو کسی عالم نے اس حدیث سے مستنبط کیا تھا اور جس کو کسی اہل مذہب نے اختیار کیا تھا اسی لئے غزالی وغیرہ نے تصریح کی ہے کہ ابوداؤد کی یہ کتاب مجتہد کے لئے کافی ہے۔

اور چوتھے شخص ابوعیسیٰ ترمذی ہیں انھوں نے شیخین (۱) کے طریقہ کو جہاں انھوں نے صاف بیان کیا تھا اور جس کو انھوں نے مبہم چھوڑا تھا پسندیدہ صورت میں کردیا اور ہر صاحب

(۱) شیخین سے مراد امام بخاری و مسلم ہیں۔

مسلک کے مذہب کو بیان کر کے ابوداؤد کے طریقہ کو بھی اختیار کیا ہے پس دونوں طریقوں کو جمع کیا اور ان پر صحابہ، تابعین اور فقہا امصار کے مذاہب کے بیان کا اضافہ کیا پس ایک جامع کتاب تصنیف کی اور طرق حدیث کو نہایت بہتر شکل میں مختصر کر دیا ایک طریق کو ذکر کر کے دوسرے طرق کی طرف اشارہ کیا اور ہر حدیث کا حال بیان کر دیا کہ وہ صحیح ہے یا حسن ہے، ضعیف ہے یا منکر ہے، اور ضعف کی وجہ بھی ظاہر کر دی تاکہ طالب حدیث کو پوری بصیرت حاصل ہو جائے اور قابل اعتماد احادیث کو دیگر احادیث سے تمیز کر سکے اور یہ بھی ذکر کر دیا کہ فلاں حدیث شائع یا غریب ہے، مذاہب صحابہ وفقہا بلاد کو بھی نقل کر دیا اور جس شخص کے نام معلوم کرنے کی ضرورت تھی اس کا نام بتا دیا اور جس کی کنیت کی ضرورت تھی اس کی کنیت بتا دی اور اہل علم کے لئے کوئی امر مخفی نہیں رکھا اسی واسطے علما کا قول ہے کہ یہ کتاب مجتہد کو کافی ہے اور مقلد کو بے نیاز کرنے والی ہے، امام مالک اور سفیان ثوری کے زمانہ میں اور ان کے بعد کے زمانہ میں ان محتاط اشخاص کے مقابلہ میں ایسے لوگ بھی تھے جو مسائل کے بیان کرنے میں کوئی برائی محسوس نہیں کرتے تھے اور فتویٰ دینے سے خوف نہیں کرتے تھے وہ کہتے تھے کہ دین کی بنیاد فقہ پر ہی ہے اس واسطے اس کی اشاعت ضرور ہونی چاہئے، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث روایت کرنے میں اور آپ تک سلسلہ روایت پہنچانے میں خوف محسوس کرتے تھے حتی کہ امام شعبیؒ نے فرمایا نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سوا کسی اور کی طرف نسبت کرنا ہمارے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے، اگر حدیث میں کوئی کمی بیشی ہوگی تو اسی شخص پر ہوگی، ابراہیم نخعیؒ کہتے ہیں مجھ کو یہ کہنا اچھا معلوم ہوتا ہے کہ عبداللہ نے کہا اور علقمہ نے کہا، اور عبداللہ بن مسعودؓ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حدیث بیان کرتے تھے تو ان کا چہرہ بدل جایا کرتا تھا اور فرماتے تھے کہ آنحضرت نے ایسا ہی یا اس کے مثل فرمایا ہے، اور جس وقت حضرت عمرؓ نے انصار کی ایک جماعت کو کوفہ روانہ کیا تو ان سے فرمایا تم کوفہ کو جاتے ہو وہاں تم ایسے لوگوں سے ملو گے جو قرآن پڑھتے وقت روتے ہیں پس وہ تمہارے پاس آئیں گے اور کہیں گے محمد رسول اللہ کے صحابہ آئے ہیں وہ تم سے احادیث دریافت کریں گے تم رسول خدا سے احادیث کی روایت بہت کم کرنا۔

ابن عون کا قول ہے. شعبی کے پاس جب کوئی مسئلہ پیش ہوتا تھا تو وہ بہت احتیاط کرتے تھے

اورابراہیم خوب بیان کرتے تھے، ان آثار کو دارمی نے روایت کیا ہے، پس حدیث، فقہ اور مسائل کو دوسرے طرز پر مدون کرنے کی ضرورت واقع ہوئی اور یہ اس واسطے کہ ان کے پاس اتنی احادیث اور آثار نہ تھے جن سے ان اصول کے موافق جن کو اہل حدیث نے پسند کیا ہے استنباط فقہ پر قادر ہوتے اور ان کو یہ پسند نہ تھا کہ علما بلاد کے اقوال میں غور کرتے، ان کو جمع کرتے اور ان سے بحث کرتے بلکہ اس امر میں ان کو متہم سمجھا، اور ان کا اپنے اماموں کے متعلق یہ اعتقاد تھا کہ وہ نہایت درجہ کے محقق ہیں اور ان کے دلوں کا میلان سب سے زیادہ اپنے اصحاب کی طرف ہی تھا، جیسے علقمہ کا قول ہے کہ کوئی صحابی عبداللہ بن مسعود سے زیادہ راسخ العلم نہیں ہے اور ابوحنیفہ نے کہا تھا کہ ابراہیم سالم سے زیادہ فقیہ ہیں اور اگر صحابی ہونے کی فضیلت نہ ہوتی تو میں یہ بھی کہہ دیتا کہ علقمہ عبداللہ بن عمرؓ سے زیادہ فقیہ ہیں لیکن ان لوگوں میں فطانت اور سمجھ اور ایک شئے سے دوسری شئے کی طرف ذہن کا سرعت انتقال اس درجہ تھا کہ وہ اس کے ذریعہ اپنے اصحاب کے اقوال کے مطابق جواب مسائل کی تخریج بخوبی کر سکتے تھے، اور جس شخص کی پیدائش میں جو چیز ہوتی ہے وہ اس کے لئے سہل ہوجایا کرتی ہے (ہر گز وہ اپنے اس طریقہ پر نازاں ہے جو ان کے پاس ہے) اس طرح پر انھوں نے تخریج کے قاعدہ پر فقہ کی ترتیب دی اور وہ یہ کہ ہر ایک اس شخص کی کتاب کو محفوظ رکھتا تھا جو ان کے اصحاب کی زبان اور علما کے اقوال کا زیادہ واقف اور ترجیح میں جس کی نظر سب سے زیادہ صحیح ہوتی تھی، اس واسطے وہ ہر مسئلہ میں حکم کی وجہ میں غور کر سکتا تھا پس جب کسی عالم سے مسئلہ دریافت کیا جاتا یا اس کو کسی امر کی ضرورت پیش آتی تو وہ اپنے اصحاب کی تصریحات میں غور کرتا جو اس کو محفوظ ہوتی تھیں اگر ان میں جواب مل جاتا تو فبہا ورنہ ان کے عموم کلام کو دیکھتا اور اس مسئلہ کو اس عموم پر جاری کرتا یا کلام کے ضمنی اشارہ کو دیکھتا اور اس سے جواب مسئلہ مستنبط کر لیتا، کبھی بعض کلام میں کوئی اشارہ یا اقتضا ہوا کرتا تھا جس سے امر مقصود و مفہوم ہوجایا کرتا تھا، اور کبھی مسئلہ مصرح کی کوئی نظیر ہوتی تھی جس پر اصل مسئلہ کو حمل کر لیا کرتے تھے اور کبھی وہ حکم مصرح کی علت میں بتخریج یا بایسر وحذف غور کرتے تھے، اور کبھی کسی عالم کے دو قول ہوتے تھے کہ اگر ان کو قیاس اقترانی یا شرطی کی ہیئت پر جمع کر لیتے تو جواب مسئلہ کا اس سے حاصل ہوجاتا، اور کبھی ان کے کلام میں بعض امور مثال اور تقسیم سے معلوم ہوتے تھے لیکن ان کی تعریف جامع اور مانع معلوم نہ

تھی اس واسطے وہ فقہا اہل زبان کی طرف رجوع کرتے تھے اور اس شئے کے ذاتیات حاصل کرنے میں، اس کی جامع مانع تعریف مرتب کرنے میں، اس کے مبہم کو ضبط کرنے میں، اور اس کے مشکل کو ممیز کر دینے میں کوشش کرتے تھے، اور کبھی ان کے کلام میں دو وجوہ کا احتمال ہوتا تھا، پس وہ دونوں میں سے ایک کو ترجیح دینے میں غور کرتے تھے، اور کبھی دلائل کی ادائیگی میں خفا ہوتا ہے پس یہ فقہا اس کو صاف صاف بیان کر دیتے ہیں، اور کبھی کبھی بعض اصحاب تخریج نے اپنے ائمہ کے فعل اور ان کے سکوت وغیرہ سے استدلال کیا ہے، پس ان طرق مذکورہ کو تخریج کہا جاتا ہے اور اسی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص نے قول کی اس طرح تخریج کی ہے اور کہا جاتا ہے کہ فلاں مذہب کے موافق یا فلاں شخص کے قاعدہ کے موافق یا فلاں شخص کے قول کے موافق مسئلہ کا جواب اس اس طرح ہے اور ان تخریج کرنے والوں کو مجتہدین فی المذہب کہا جاتا ہے، اور جس نے یہ کہا کہ جس نے مبسوط کو یاد کر لیا وہ مجتہد ہے تو اس سے وہی اجتہاد مراد ہے، جو تخریج سے متعلق ہے اگر چہ ایسے شخص کو روایت کا علم بالکل نہ ہو اور اس کو ایک حدیث بھی معلوم نہ ہو اس طرح ہر ایک مذہب میں تخریج واقع ہوئی اور اس کی کثرت ہو گئی، پس جس مذہب کے لوگ زمانہ میں مشہور ہو گئے اور ان کو عہدہ قضا و استفتا ملا اور ان کی تصانیف لوگوں میں مشہور ہوئیں اور انھوں نے عام طور پر درس دینا شروع کیا تو وہ مذہب اطراف عالم میں پھیل گیا اور ہمیشہ اس کی شہرت ہوتی رہی اور جس مذہب کے لوگ گمنام رہے اور ان کو منصب قضا و افتا نہ ملا اور لوگوں نے ان میں رغبت نہ کی تو وہ چند روز کے بعد نابود ہو گیا۔

چوتھا باب: اس بیان میں کہ چوتھی صدی ہجری سے پہلے اور بعد میں لوگوں کا کیا حال تھا

واضح ہو کہ چوتھی صدی سے پہلے لوگ کسی ایک خاص مذہب کی تقلید پر متفق نہ تھے، ابو طالب مکی نے قوت القلوب میں لکھا ہے کہ کتابیں اور مجموعات، لوگوں کے اقوال بیان کرنا، کسی شخص کے مذہب پر فتویٰ دینا اور اس کا قول اختیار کرنا اور ہر امر میں اس کا قول نقل کرنا اور اس کے مذہب پر فقہ کی بنیاد قائم کرنا یہ سب نئی باتیں ہیں، قرن اول اور دوم میں پہلے لوگ ان باتوں کے قائل نہیں تھے، انتہی۔ میں کہتا ہوں کہ دونوں قرنوں کے بعد کسی قدر تخریج کا طریقہ پیدا ہو گیا لیکن

چوتھی صدی کے لوگ کسی خاص شخص کی تقلید خالص پر متفق نہیں تھے اور نہ کسی خاص شخص کے فقہ کے پابند تھے اور نہ ہر امر میں اسی کے قول کو نقل کرتے تھے جیسا کہ تتبع سے ظاہر ہوتا ہے بلکہ ان میں علما اور عام لوگ تھے، عام لوگوں کی یہ حالت تھی کہ وہ ان متفقہ مسائل میں جن میں اہل اسلام یا جمہور مجتہدین کا اختلاف نہ تھا صاحب شریعت کے سوا کسی اور کی تقلید نہیں کرتے تھے، وضو، غسل، نماز اور زکوٰۃ وغیرہ کا طریقہ وہ اپنے باپ داداؤں یا شہر کے علما سے سیکھ لیا کرتے تھے اور اسی کے موافق عمل کرتے تھے اور جب کوئی نیا واقعہ پیش آتا تھا تو بلا تعین مذہب جو مفتی مل جاتا تھا اس سے مسئلہ دریافت کرلیا کرتے تھے، اور خاص لوگوں کی یہ حالت تھی کہ ان میں سے محدثین حدیث میں مصروف رہتے تھے اس واسطے ان کے پاس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور صحابہ کے آثار اس قدر موجود تھے کہ ان کو کسی مسئلہ میں کسی اور چیز کی حاجت نہیں رہتی تھی اور ان کے پاس بہت سی احادیث مستفیض یا صحیحہ تھیں جن پر بعض فقہا عمل کر چکے تھے اور جن کی وجہ سے تارک عمل کو کوئی عذر باقی نہ رہا، یا ان کے پاس جمہور صحابہ اور تابعین سے ایسے اقوال منقولہ موجود تھے جن کی مخالفت مستحسن معلوم نہیں ہوتی تھی، پس اگر تعارض نقل اور وجہ ترجیح ظاہر نہ ہونے وغیرہ سے کسی مسئلہ میں ان کا دل مطمئن نہیں ہوتا تھا تو گزشتہ فقہا میں سے کسی کے کلام کی طرف رجوع کرلیا کرتے تھے اور اگر اس مسئلہ میں فقہا کے دو قول ان کو ملتے تھے تو ان میں سے جو زیادہ قابل اعتماد ہوتا تھا اس کو اختیار کرتے تھے خواہ وہ قول اہل مدینہ کا ہو یا اہل کوفہ کا ہو۔

اور ان خواص میں سے اہل تخریج کی یہ حالت تھی کہ جس مسئلہ کو وہ مصرح نہیں پاتے تھے اس میں وہ تخریج کرتے تھے اور مذہب میں اجتہاد کرتے تھے اور یہ لوگ اپنے اصحاب کے مذہب کی طرف منسوب ہوا کرتے تھے پس کہا جاتا تھا کہ فلاں شخص شافعی ہے اور فلاں شخص حنفی ہے، اور اہل حدیث بھی کثرت موافقت کی وجہ سے کبھی کبھی کسی خاص مذہب کی طرف منسوب ہوتے تھے جیسے نسائی اور بیہقی امام شافعی کی طرف منسوب ہوتے تھے۔

اور سوائے مجتہد کے کسی کو قضا اور فتوے کی خدمت نہیں ملتی تھی اور صرف مجتہد ہی کو فقیہ کہتے تھے، ان قرنوں کے بعد اور لوگ ہوئے جو دائیں بائیں چلنے لگے اور چند امور ان میں بالکل نئے پیدا ہو گئے۔

از آنجملہ علم فقہ کے متعلق ان میں نزاع اور خلاف پیدا ہو گیا، اس کی تفصیل جیسے کہ امام غزالیؒ نے بیان کی ہے یہ ہے کہ جب خلفائے راشدین مہدیین کا زمانہ گزر گیا تو خلافت ان لوگوں کو مل گئی جو اس کے قابل اور مستحق نہیں تھے اور نہ ہی ان کو فتاوی اور احکام دین کا مستقل علم تھا۔ اس واسطے ان کو فقہا سے مدد حاصل کرنے کی اور ہر حال میں ان کو اپنے ساتھ رکھنے کی ضرورت ہوئی۔ اور علما میں سے کچھ ایسے لوگ باقی رہ گئے تھے جو طرز اوّل پر قائم تھے اور صاف دین کے پابند تھے پس جب وہ امرا ان کو طلب کرتے تھے تو وہ گریز کرتے تھے اور خلفا کی صحبت سے اعراض کرتے تھے تب اس زمانہ کے لوگوں نے دیکھا کہ علما کی بڑی عزت ہے اور باوجود ان کے اعراض کے سلاطین ان پر ٹوٹے پڑتے ہیں تو ان لوگوں نے اعزاز اور مرتبہ حاصل کرنے کی آرزو میں نہایت شوق سے علم کی طلب میں توجہ کی پھر تو فقہا مطلوب ہونے کے بجائے طالب ہو گئے اور سلاطین کی طرف توجہ نہ کرنے کی وجہ سے جس قدر معزز تھے بعد میں ان کی طرف التفات کرنے سے اسی قدر ذلیل ہو گئے مگر جس کو خدا نے توفیق دی وہ اس ذلت سے بچا رہا اور ان لوگوں سے پہلے لوگ علم کلام میں کتابیں تصنیف کر چکے تھے اور اس فن میں بہت قیل وقال کر چکے تھے اور اعتراضات وجوابات اور مقابلہ وجدل کا طریقہ بیان کر چکے تھے پس اس علم نے ان کے دلوں میں اس وقت تک قرار پایا جب تک وزرا اور سلاطین کی طبیعتیں فقہ میں مناظرہ کی جانب اور مذہب شافعی وابوحنیفہ میں اولویت ظاہر ہونے کی طرف مائل نہ ہوئیں، بعد میں لوگوں نے علم کلام اور علمی فنون کو ترک کر دیا اور بالخصوص امام شافعی اور امام ابوحنیفہ کے اختلافی مسائل کی طرف متوجہ ہو گئے اور جو اختلافات امام مالک، سفیان اور احمد بن حنبل وغیرہم کے ساتھ تھے ان میں تساہل کیا اور یہ لوگ سمجھے کہ اس چھان بین سے ان کی غرض شریعت کے دقیق مسائل کا مستنبط کرنا اور مذہب کی علتوں کا بیان کرنا اور اصول فتاوی کی تمہید ہے انھوں نے ان اختلافات میں تصانیف اور استنباطات بکثرت کیں اور کئی قسم کے مجادلوں اور تصانیف کو انھوں نے مرتب کیا اور وہ اب تک اسی میں برابر مصروف ہیں ہم نہیں جانتے کہ آئندہ زمانوں میں خدا تعالیٰ نے کیا مقدر کر رکھا ہے، انتہی حاصلہ۔

از آن جملہ یہ کہ ان تقلید پر پورا اطمینان ہو گیا اور آہستہ آہستہ تقلید ان کے سینوں میں سرایت کرتی گئی اور ان کو خبر بھی نہ ہوئی، اس تقلید کا سبب فقہا کا باہم مجادلہ اور مزاحمت ہے، کیونکہ جب

ان میں فتویٰ دینے میں مزاحمت واقع ہوئی تو جو شخص فتویٰ دیتا تھا فوراً اس کے فتویٰ پر اعتراض کئے جاتے تھے اور اس کا رد کیا جاتا تھا، پس سخن کا سلسلہ اس مسئلہ کے بارے میں متقدمین سے کسی شخص کے مصرح قول پر ختم ہوتا تھا۔

اور نیز تقلید کا ایک سبب قاضیوں کا ظلم تھا کیونکہ جب اکثر قاضیوں کی طبیعت میں ظلم آ گیا اور ان میں امانت نہ رہی تو ان کے فیصلے جب ہی مقبول سمجھے جاتے تھے کہ عام لوگوں کو ان میں اشتباہ باقی نہ رہے اور ان کا پہلے سے کوئی قائل بھی ہو۔

اور نیز ایک سبب یہ تھا کہ حکام جاہل تھے اور لوگ ایسے لوگوں سے فتویٰ لیتے تھے جن کو نہ علم حدیث حاصل تھا اور نہ وہ تخریج کے طریقہ سے واقف تھے جیسا کہ اکثر متاخرین کی ظاہری حالت تم دیکھتے ہو ابن ہمامؒ وغیرہ نے اس پر تنبیہ کی ہے، اس زمانہ میں غیر مجتہد کو بھی فقیہ کہنے لگے تھے۔

ازآں جملہ یہ ہے کہ اکثر لوگ ہر فن کی باریک بینی کی طرف متوجہ ہو گئے پس ان میں سے بعض نے خیال کیا کہ وہ علم اسماء الرجال کی بنیاد مستحکم کر رہے ہیں اور جرح وتعدیل کے مرتبوں کو معلوم کرتے ہیں، اس کے بعد انھوں نے قدیم اور جدید تاریخ کی طرف توجہ کی اور بعض نے نادر اور غریب خبروں میں تفتیش شروع کی خواہ وہ خبریں موضوع کے درجہ کی ہوں اور بعض نے اصول فقہ کے متعلق زیادہ گفتگو کی اور ہر ایک نے اپنے اپنے اصحاب کے لئے مناظرہ کے اصول مستنبط کئے پس ان کو مقابل پر پیش کیا اور نہایت درجہ اعتراضات کئے اور ان کے جوابات دیئے اور نہایت درجہ چھان بین کی، ہر امر کی تعریف وتقسیم کی، پس کبھی طول کلام کیا اور کبھی اختصار کیا، بعض نے اس میں یہ روش اختیار کی کہ مسائل کی ایسی مستبعد صورتیں فرض کیں جو اس قابل تھیں کہ کوئی عاقل ان کے درپے نہ ہو اور مخرجین اور ان سے بھی کمتر لوگوں کے کلام سے ایسے عمومات اور ایجادات کی تفتیش شروع کی جن کا سننا نہ عالم پسند کرتا ہے اور نہ جاہل۔

اس جدل ومخالفت اور تعمق کا ضرر اس فتنۂ اولیٰ کے قریب قریب تھا جب لوگوں نے ملک میں فساد برپا کئے تھے اور ہر شخص نے اپنے اپنے ساتھی کی امداد کی تھی، پس جس طرح اس فتنہ وفساد سے انجام کار ظالم حکومت قائم ہوگئی اور نہایت سخت اور تاریک واقعات پیش آئے اسی طرح اس جدل واختلاف سے جہالت، اختلاط، شکوک اور اوہام پیدا ہو گئے جن سے نجات کی امید نہیں ان

کے بعد صرف تقلید کے زمانے پیدا ہوتے گئے لوگوں کو حق و باطل میں مخاصمت اور استنباط میں کچھ تمیز نہ رہی فقیہ اس زمانہ میں اس شخص کا نام ہو گیا جو بڑا بکواسی اور زبان دراز ہو، جو فقہا کے قوی وضعیف اقوال بغیر امتیاز کے حفظ کرے اور منہ زوری سے ان کو بیان کرتا جائے اور محدث اس شخص کا نام ہو گیا جو صحیح، سقیم حدیثیں شمار کرے اور قصہ گویوں کی طرح زبان زوری سے بیان کرتا جائے، میں یہ بات کلیتاً سب کی نسبت نہیں کہتا ہوں کیونکہ بندگان الٰہی میں سے ایک جماعت ہمیشہ ایسی ہوا کرتی ہے جن کو کوئی رسوا کرنے والا مضرت نہیں پہنچا سکتا اور وہ خدا کی زمین میں اس کی طرف سے حجت ہوتے ہیں اگرچہ ان کی تعداد کم ہی کیوں نہ ہو، اس کے بعد جو زمانہ آتا گیا اس میں فتنہ اور تقلید کی زیادتی ہی ہوتی گئی اور لوگوں کے دلوں سے امانت دور ہوتی گئی حتی کہ امور دین میں خوض کرنا انھوں نے ترک کر دیا اور یہ کہہ کر مطمئن ہو گئے "ہم نے اپنے باپ داداؤں کو ایک جماعت پر متفق پایا ہے ہم انہیں کے نشانوں کے پیرو ہیں، اور خدا تعالیٰ ہی سے شکایت ہے اور اسی سے طلب اعانت ہے، اسی کا سہارا ہے، اور اسی پر اعتماد ہے۔

فصل

اس مقام کے مناسب یہ ہے کہ ان مسائل پر لوگوں کو آگاہ کر دیا جائے کہ جن کے صحراؤں میں افہام بہک گئے، قدم لغزش کھا گئے اور قلموں نے کج روی کی۔

ان میں سے ایک مسئلہ یہ ہے کہ یہ مذاہب اربعہ جو مدون ہو چکے ہیں اور تحریر میں آ چکے ہیں تمام امت یا وہ لوگ جو اس امت میں قابل اعتبار ہیں سب اس زمانہ میں ان کی تقلید کے جائز اور درست ہونے پر متفق ہیں اور اس تقلید میں بہت سی مصلحتیں ہیں جو مخفی نہیں ہیں خاص کر اس زمانہ میں جس میں لوگ نہایت ہی پست ہمت ہو گئے ہیں اور ان کے قلوب خواہش نفسانی سے پر ہو گئے اور ہر شخص اپنی ہی رائے پر ناز کرنے لگا، پس ابن حزمؒ نے جو کہا ہے کہ تقلید حرام ہے اور کسی کے لئے جائز نہیں ہے کہ بجز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بلا دلیل کسی کے قول کو اختیار کرے کیونکہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے ''انہیں امور کا اتباع کرو جو تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کئے گئے ہیں اور خدا کے علاوہ اور مقربین کا اتباع نہ کرو''۔ نیز خدا تعالیٰ فرماتا ہے ''جب مشرکین سے کہا جاتا ہے ان احکام کی پیروی کرو جو خدا تعالیٰ نے نازل فرمائے ہیں تو وہ کہتے ہیں 'نہیں' بلکہ ہم تو انہیں چیزوں کی پیروی کریں گے جن پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو پایا ہے''۔ اور جو لوگ تقلید نہیں کرتے ان کی مدح میں خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے ''میرے ان بندوں کو خوشخبری سنا دو جو بات کو سنتے ہیں اور جو سب سے اچھی ہوتی ہے اس کا اتباع کرتے ہیں ایسے ہی لوگوں کو خدا نے ہدایت کی ہے اور وہی عقل والے ہیں''۔ اور خدا تعالیٰ فرماتا ہے ''اگر تم کسی بات میں نزاع کرو تو اس کو خدا اور رسول کی طرف پھیر دو، اگر تم خدا پر اور روز قیامت پر ایمان رکھتے ہو''۔ پس خدا تعالیٰ نے نزاع کے وقت بجز قرآن و حدیث کے کسی کی طرف متوجہ ہونے کو جائز نہیں کیا ہے اور اس آیت کے ذریعہ تنازع

کے وقت کسی شخص کے قول کی طرف رجوع کرنا حرام کر دیا اس لئے کہ وہ قول قرآن وسنت کے غیر ہے اور تمام صحابہ، تمام تابعین اور تمام تبع تابعین کا اتفاق ہو چکا ہے کہ کسی انسان کے قول کی طرف قصد کرنا خواہ وہ اس کے زمانہ کا ہو یا سابق لوگوں میں سے ہو، اور جن کی ہر بات کو تسلیم کرنا ممنوع ہے پس جو شخص امام ابوحنیفہ یا امام مالک یا امام شافعی یا امام احمد رضی اللہ عنہم کے تمام اقوال کی پیروی کرے اور ان میں سے یا ان کے علاوہ میں سے اپنے مقتدا کے قول کے سوا کسی دوسرے کی بات کی پیروی نہ کرے اور قرآن وسنت کے احکام پر اعتماد نہ کرے جب تک کہ وہ ان کو کسی خاص شخص کے قول کی جانب نہ پھیرے تو ایسا شخص خوب سمجھ لے کہ اس نے یقیناً بلا شبہ اول سے آخر تک تمام امت کی مخالفت کی ہے اور وہ کسی سلف کو اور تینوں مبارک زمانوں میں سے کسی شخص کو اپنے ہمراہ نہ پائے گا، پس تحقیق ایسے شخص نے وہ راستہ اختیار کیا ہے جو مومنین کا نہیں ہے، ہم ایسی حالت سے خدا کی پناہ لیتے ہیں۔

اور نیز ان تمام فقہا نے غیر سلف کی تقلید سے منع کیا ہے پس ایسا شخص جو ان کی تقلید کرتا ہے وہ ان کے بھی خلاف ہے، اور نیز وہ کون شخص ہے جس نے ان لوگوں میں سے کسی کی تقلید کو یا ان کے علاوہ کسی اور کی تقلید کو حضرت عمر بن الخطاب یا حضرت علی بن ابی طالب یا حضرت عبداللہ بن مسعود یا حضرت عبداللہ بن عمر یا حضرت عبداللہ بن عباس یا حضرت عائشہ ام المومنین رضی اللہ عنہم کی تقلید سے اولیٰ قرار دیا ہو، پس اگر تقلید جائز ہوتی تو ان صحابہ میں سے ہر شخص بہ نسبت دوسروں کے مقتدا ہونے کے زیادہ قابل ہے، انتہی۔

ابن حزمؒ کی یہ تقریر اس شخص کے حق میں پوری ہوسکتی ہے جس کو اجتہاد کی کسی قدر قوت حاصل ہو، اگرچہ ایک ہی مسئلہ میں کیوں نہ ہو، اور اس شخص کے حق میں ہوسکتی ہے جو صاف طور پر جانتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فلاں امر کا حکم فرمایا ہے اور فلاں امر سے منع فرمایا ہے اور یہ بھی جانتا ہے یہ حدیث منسوخ نہیں ہے یا تو اس وجہ سے کہ وہ اس مسئلہ میں احادیث کا اور مخالف وموافق اقوال کا تتبع کرتا ہے اور وہ کوئی ناسخ نہیں پاتا اور یا اس وجہ سے کہ وہ متبحر علما کی ایک کثیر جماعت کو اس پر عمل کرتے ہوئے پاتا ہے اور اس کے مخالف کو دیکھتا ہے کہ حدیث کے مقابلہ میں قیاس یا استنباط وغیرہ سے استدلال کرتا ہے پس ایسی حالت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث

کی مخالفت کا سبب بجز نفاق خفی اور حماقت جلی کے اور کچھ نہیں ہوسکتا اور اسی شئے کی طرف شیخ عزالدین بن عبدالسلام نے اشارہ فرمایا ہے، وہ کہتے ہیں نہایت تعجب کی بات ہے کہ فقہا مقلدین میں سے بعض اپنے امام کے ضعف ماخذ سے واقف ہوتا ہے کیونکہ اس کے ضعف کو دفع کرنے والی کوئی شئے نہیں ملتی اس کے باوجود وہ اپنے امام کی تقلید ہی کرتا ہے اور اپنے امام کی تقلید سے وابستگی ہونے کی وجہ سے ان لوگوں کے مذہب کو ترک کردیتا ہے جس پر قرآن وحدیث اور صحیح قیاسات کی شہادت ملتی ہے بلکہ ظاہر قرآن وحدیث کو رد کرنے کے لئے مختلف حیلے کرتا ہے اور اپنے مقتدا کی حمایت میں ان میں بعید و باطل تاویلیں کرتا ہے اور وہ فرماتے ہیں کہ لوگ ہمیشہ سے بغیر کسی قید مذہب کے اور سائلین پر بغیر کسی ملامت کے جس عالم سے بھی ملاقات ہوگئی اس سے مسئلے دریافت کرتے رہے یہاں تک کہ ان مذاہب اور متعصب مقلدین کا ظہور ہوا، پس تحقیق ان میں سے ہر شخص اپنے امام کا مقلد بن کر اس کے قول کی ایسی پیروی کرتا ہے گویا وہ نبی مرسل ہے، باوجود یہ کہ اس کا مذہب دلائل سے بہت بعید ہے، ایسا کرنا حق اور صواب سے دور ہٹنا ہے جس کو کوئی عقلمند پسند نہیں کرتا، امام ابوشامہ فرماتے ہیں کہ جس شخص کا فقہ میں شغل ہو اس کو یہی مناسب ہے کہ کسی ایک امام کے مذہب کا پابند نہ ہو اور ہر مسئلہ میں اسی امر کی صحت پر اعتقاد رکھے جو دلالت کتاب اور سنت محکمہ سے زیادہ قریب ہو، اور اس کے لئے یہ امر سہل ہے جبکہ اس نے سابقہ اہم علوم کو منضبط کرلیا ہو، اور اس کو چاہئے کہ تعصب سے اور متاخرین کے طرق اختلافات میں غور کرنے سے اجتناب کرے کیونکہ یہ امور وقت کو ضائع کرتے ہیں اور صاف طبیعتوں کو مکدر کرتے ہیں، امام شافعیؒ سے یہ روایت صحیح منقول ہے کہ انھوں نے اپنی اور دوسروں کی تقلید سے منع فرمایا ہے امام شافعی کے صاحب امام مزنی اپنے مختصر کے شروع میں فرماتے ہیں: اس کتاب میں میں نے امام شافعیؒ کے علم اور ان کے اقوال کے معانی کو مختصراً بیان کیا ہے تاکہ ان کو اس شخص کے ذہن کے قریب کردوں جو ان کے معلوم کرنے کا قصد کرتا ہو، اور میں اس کو یہ بھی بتادوں کہ امام شافعی نے اپنی تقلید اور دوسروں کی تقلید سے منع فرمایا ہے تاکہ آدمی اپنے دین کے لئے ان کے قول میں غور کرے اور اپنے نفس کیلئے احتیاط کرے، یعنی میں اس شخص کو جو امام شافعی کے علم کو حاصل کرنے کا قصد کرے یہ بتاتا ہوں کہ امام شافعی نے اپنی تقلید اور دوسروں کی تقلید سے منع فرمادیا ہے، انتہی۔

اور نیز ابن حزمؒ کا قول اس شخص کے حق میں درست ہوسکتا ہے جو عامی ہے اور کسی خاص فقیہ کی تقلید یہ سمجھ کر کرتا ہے کہ ایسے شخص سے خطا کا ہونا ناممکن ہے اور جو کچھ اس نے کہا ہے وہ بالکل صحیح ہے اور اپنے دل میں یہ خیال رکھتا ہے کہ اس کے خلاف دلیل ظاہر ہونے پر بھی میں اس کی تقلید کو ترک نہیں کروں گا، اسی کے متعلق امام ترمذی نے عدی بن حاتمؓ سے روایت کی ہے، انھوں نے کہا کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ آیت پڑھتے ہوئے سنا ''یہود اور نصاریٰ نے اپنے علما اور راہبوں کو اللہ تعالیٰ کے علاوہ اپنا رب قرار دے لیا تھا''۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''وہ اپنے علما کی عبادت نہیں کرتے تھے بلکہ جب وہ کسی چیز کو ان کے لئے حلال کہہ دیا کرتے تھے تو وہ اس کو حلال سمجھ لیتے تھے اور جب وہ کسی چیز کو ان کے لئے حرام قرار دے دیا کرتے تو وہ بھی اس کو حرام سمجھ لیتے تھے''۔

اور نیز اس شخص کے حق میں یہ قول درست ہوسکتا ہے جو یہ جائز نہیں سمجھتا کہ کوئی حنفی مثلاً کسی شافعی فقیہ سے فتویٰ دریافت کرے یا اس کے برعکس ہو اور یہ بھی جائز نہیں سمجھتا کہ حنفی مثلاً کسی شافعی امام کی اقتدا کرے کیونکہ ایسا خیال قرون اولیٰ کے اجماع اور صحابہ وتابعینؒ کے بالکل خلاف ہے اور ابن حزم کا قول اس شخص کے متعلق نہیں ہوسکتا ہے جو محض نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کا مطیع ہے اور اسی چیز کو وہ حلال یا حرام سمجھتا ہے جس کو اللہ اور رسولؐ نے حلال یا حرام کیا ہے، لیکن جبکہ اس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا قول معلوم نہیں تھا اور نہ مختلف حدیثوں کے جمع کرنے کا طریق اس کو معلوم تھا اور نہ ہی آپ کے کلام سے وہ کوئی امر مستنبط کرسکتا تھا تو اس نے کسی رہنما عالم کی پیروی کی، یہ سمجھ کر کہ وہ اپنے قول میں درست ہے اور یہ ظاہر سنت رسول کا متبع ہوکر فتویٰ دیتا ہے، پس اگر وہ عالم اس کے اس گمان کے خلاف معلوم ہوا تو اس نے فوراً بغیر اصرار و جدال کے اس کے قول کو ترک کردیا پس ایسے شخص کو کوئی کیسے برا کہہ سکتا ہے باوجودیکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے فتویٰ دینے اور فتویٰ لینے کا سلسلہ مسلمانوں میں برابر رہا ہے اور اس کے بعد کہ اس کا مقصد وہی ہے جو ہم نے ذکر کیا ہے اس میں کچھ فرق نہیں ہے کہ کوئی شخص ہمیشہ ایک ہی سے مسئلے پوچھا کرے یا کبھی اس سے دریافت کرلیا کرے اور کبھی کسی دوسرے سے۔

اور کس طرح کوئی برا کہہ سکتا ہے حالانکہ ہم کسی فقیہ پر یہ ایمان نہیں لائے کہ خدا تعالیٰ نے

فقہ کو بطور وحی اس پر نازل کیا ہے، اور خدا نے اس کی اطاعت ہم پر فرض کر دی ہے اور وہ بالکل معصوم ہے، پس اگر ہم کسی فقیہ کی تقلید کرتے ہیں تو یہی سمجھ کر کرتے ہیں کہ یہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کا عالم ہے اور اس کا قول یا تو قرآن وحدیث کا صریح حکم ہے یا اس نے کسی طریق استنباط سے قرآن وحدیث سے اپنے قول کو مستنبط کیا ہے یا اس نے قرائن سے یہ معلوم کیا ہے کہ شارع نے فلاں صورت میں جو حکم دیا ہے وہ حکم فلاں علت کی وجہ سے ہے اور علت حکم کی معرفت کا اس کو خوب یقین ہو گیا تھا اس واسطے اس نے منصوص پر غیر منصوص کو قیاس کر لیا گویا وہ فقیہ یہ کہتا ہے کہ میرا ظن غالب یہ ہے کہ پیغمبر علیہ السلام یہ فرماتے ہیں کہ جہاں یہ علت پائی جائے گی وہاں یہ حکم پایا جائے گا۔ اور مقیس بھی اس عموم میں داخل ہے اس واسطے یہ قول بھی گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہی منسوب ہے، لیکن اس کے طرق میں امور ظنی شامل ہیں، اور اگر یہ اعتقاد نہ ہوتا تو مومن کسی مجتہد کی پیروی نہ کرتا۔

پس اگر ہم کو رسول معصوم کی حدیث بہ سند صحیح معلوم ہو جائے جن کی اطاعت خدا نے ہم پر فرض کی ہے اور وہ حدیث اس مجتہد کے مذہب کے خلاف ہے اور اس حدیث کو ترک کر کے اس تخمینی بات کا ہم اتباع کریں تو ہم سے زیادہ ظالم کون ہو سکتا ہے اور جس روز رب العالمین کے سامنے لوگ حاضر ہوں گے تو ہمارا کیا عذر ہو سکتا ہے۔

ان مسائل مشکلہ میں سے ایک امر یہ ہے کہ کلام فقہا پر تخریج کرنا اور لفظ حدیث کا تتبع کرنا ان دونوں میں سے ہر ایک کے لئے دین میں مضبوط اصل ہے، ہر زمانہ میں علما محققین ان دونوں پر عمل کرتے رہے ہیں پس ان میں سے بعض تخریج کی جانب زیادہ اور لفظ حدیث کے تتبع کی طرف کم التفات کرتے ہیں، اور بعض تخریج کی طرف کم اور تتبع کی جانب زیادہ اہتمام کرتے ہیں اس واسطے یہ مناسب نہیں ہے کہ ان میں سے کسی کو بھی بالکل ترک کر دیا جائے جیسا کہ فریقین کے عام لوگ کرتے ہیں بلکہ خالص حق یہ ہے کہ ایک کو دوسرے کے ساتھ مطابق کرنا چاہئے اور ایک کی خرابی دوسرے سے دور کرنا چاہئے، اور امام حسن بصریؒ کے اس قول سے یہی مراد ہے "قسم ہے اس خدا کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں تمہارا طریقہ افراط، تفریط کے درمیان ہے، پس جو شخص اہل حدیث سے ہو اس کو مناسب ہے کہ اپنے اختیار کردہ قول اور مذہب کو تابعین میں سے مجتہدین کی

رائے پر پیش کرے اور جو اہل تخریج سے ہو اس کو مناسب ہے کہ وہ ایسا طریقہ اختیار کرے جس سے صریح اور صحیح احادیث کی مخالفت سے بچ سکے، اور جس امر میں حدیث یا کوئی اثر وارد ہو وہاں حتی المقدور اپنی رائے سے نہ کہے، اور محدث کو مناسب نہیں ہے کہ ان قواعد میں زیادہ تعمق کرے جو ارباب حدیث نے مستحکم کیے ہیں اور شارع نے ان کی تصریح نہیں کی ہے تا کہ اس وجہ سے وہ محدث کسی حدیث یا صحیح قیاس کو رد کر دے جیسے ان حدیثوں کو رد کر دے جن میں ارسال یا انقطاع کا ادنیٰ شائبہ ہے جیسے ابن حزم نے کیا ہے، انھوں نے تحریم معازف کی حدیث کو اس وجہ سے رد کر دیا کہ بخاری کی روایت میں انقطاع کا شائبہ تھا حالانکہ وہ حدیث فی نفسہ متصل اور صحیح ہے کیونکہ ایسے امور کی طرف تعارض کے وقت رجوع کیا جاتا ہے اور جیسے محدثین کا قول ہے کہ فلاں شخص فلاں شخص کی حدیث کا زیادہ حافظ ہے اس وجہ سے محدثین اس شخص کی حدیث کو دوسرے کی حدیث پر ترجیح دیتے ہیں گو کہ دوسرے کی حدیث میں ترجیح کی ہزار وجہیں ہوں اور روایت بالمعنی کے وقت اکثر روایت کرنے والے اس کا اہتمام کرتے تھے کہ اصلی معنی ادا ہو جائیں، وہ ان اعتبارات کا کچھ لحاظ نہیں کرتے تھے جن کو عربیت میں غور کرنے والے جانتے ہیں اس واسطے ان کا مثلاً 'فا' یا 'واؤ' سے یا کسی کلمہ کی تقدیم و تاخیر وغیرہ سے استدلال کرنا زیادتی ہے، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ دوسرا راوی اس قصہ کو (جو پہلے راوی نے بیان کیا تھا) دوسری عبارت سے بیان کر دیا کرتا ہے اور ایک حرف کے بجائے دوسرا حرف لے آتا ہے اور حق یہی ہے کہ راوی جو حدیث بیان کرتا ہے بظاہر وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام ہے اس کے بعد اگر کوئی دوسری حدیث یا کوئی دوسری دلیل ظاہر ہوتی ہے تو اس کی طرف رجوع کرنا ضروری ہو جائے گا، اور اہل تخریج کو یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ ایسے قول کی تخریج کرے جو اس کے اصحاب کے نفس کلام سے حاصل نہیں ہوتا اور نہ ہی اہل عرف اور علمائے لغت اس کلام سے اس قول کو سمجھتے ہیں، اور وہ قول یا تو تخریج مناط پر مبنی ہے اور یا مسئلہ کی نظیر کو مسئلہ پر حمل کرتا ہے جس میں اہل وجوہ کا اختلاف ہے اور ان کی رائیں متعارض ہیں اور اگر اس کے اصحاب سے اس مسئلہ کے متعلق پوچھا جائے تو کبھی تو وہ کسی مانع کی وجہ سے نظیر پر حمل کرتے ہوں اور کبھی وہ ایسی علت بیان کرتے ہوں جو اس کے خلاف ہو جس کی اس نے تخریج کی ہے، اور تخریج اس لئے جائز ہے کہ وہ بھی فی الحقیقت مجتہد کی تقلید ہے اور یہ تخریج جب ہی مکمل

ہوتی ہے کہ مجتہد کے کلام سے مفہوم بھی ہوتی ہو، اور صاحب تخریج کو یہ بھی زیبا نہیں ہے کہ کسی قاعدہ سے جس کا اس نے یا اس کے اصحاب نے استخراج کیا ہے کسی حدیث یا اثر کو جس پر قوم متفق ہے رد کر دے جیسے کہ حدیث مصراۃ (۱) کو رد کر دیا ہے اور جیسے کہ ذوی القربی کے حصہ کو ساقط کر دیا ہے اس واسطے کہ اس مستخرج قاعدہ کی رعایت کرنے سے اس حدیث کی رعایت کرنا زیادہ ضروری ہے اور اسی معنی کی طرف امام شافعیؒ نے اشارہ کیا ہے اس لئے کہ انھوں نے فرمایا کہ میں جب کوئی بات کہوں یا کوئی قاعدہ مقرر کروں اور اس کے بعد میرے قول کے خلاف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث معلوم ہو تو صحیح قول وہی ہے جو آنحضرتؐ نے فرمایا۔

اور ان مسائل مشکلہ میں سے یہ بھی ہے کہ احکام شرعیہ معلوم کرنے کے لئے قرآن وحدیث میں تتبع کرنے کے چند مراتب ہیں، سب سے اعلیٰ مرتبہ یہ ہے کہ اس کو بالفعل یا بقوۃ قریبہ من الفعل اس قدر احکام کی معرفت حاصل ہو جس سے اکثر واقعات میں مستفتین کا جواب دے سکے اس طرح سے کہ اس کے جوابات اکثر ہوں ان مسائل سے جن میں کہ وہ توقف کرتا ہے اور اس معرفت کو اجتہاد کہتے ہیں، اور یہ استعداد کبھی تو روایات کے جمع کرنے میں غور وفکر کرنے سے اور روایات شاذہ ونادرہ کا پورا تتبع کرنے سے حاصل ہوتی ہے جیسا کہ احمد بن حنبلؒ نے اس طرف اشارہ کیا ہے اور اس کے ساتھ اس کو مواقع کلام کی معرفت بھی حاصل ہو جو عاقل زبان داں کو ہوتی ہے، اور اس کے ساتھ مختلفات کے جمع کرنے کا طریق اور استدلالات کی ترتیب وغیرہا بھی جانتا ہو جو آثار سلف کے واقف کو ہوا کرتی ہے۔

اور یہ استعداد کبھی اس طرح سے حاصل ہوتی ہے کہ مشائخ فقہ میں سے کسی شیخ کے مذہب کے موافق طرق تخریج کو خوب مستحکم کر لے اور اس کے ساتھ احادیث وآثار کے کافی مجموعہ سے بھی واقف ہو جس سے وہ یہ معلوم کر سکے کہ اس کا قول اجماع کے مخالف نہیں ہے اور یہ طریقہ اصحاب تخریج کا ہے اور اس تتبع کا اوسط درجہ جو انہی دو طریقوں سے حاصل ہوتا ہے یہ ہے کہ قرآن

(۱) حدیث مصراۃ وہ حدیث ہے جس کو ابوہریرہؓ نے روایت کیا ہے کہ جو شخص اپنے جانوروں کا دودھ روک کر فروخت کرے تو خریدار کو اس فریب کی اطلاع ہونے پر اختیار ہے چاہے اس کو رکھ لے اور چاہے ایک صاع چھوہارہ دیکر رد کر دے۔

واحادیث کا اس قدر علم حاصل ہو جائے جس کی وجہ سے وہ بڑے بڑے مسائل فقہ جو متفق علیہا ہیں مع ان کے تفصیلی دلائل کے معلوم کر سکے اور بعض مسائل اجتہادیہ کا ان کے دلائل کے ذریعہ نہایت درجہ علم حاصل ہو جائے اور بعض اقوال کو بعض پر ترجیح دے سکے تخریجات کو پڑھ سکے اور صحیح وغلط کو سمجھ سکے گو اس کو وہ اسباب حاصل نہ ہوں جو مجتہد مطلق کو حاصل ہوتے ہیں، پس ایسے شخص کو دو مذہبوں میں خلط کر دینا جائز ہو جاتا ہے جبکہ ان دونوں کے دلائل کو خوب سمجھ لے اور یہ معلوم کر لے کہ اس کا قول ایسے امر میں نہیں ہے، جس میں مجتہد کا اجتہاد نافذ نہیں ہوتا اور نہ اس میں قاضی کا فیصلہ مقبول ہوتا ہے اور نہ اس میں مفتیوں کا فتویٰ جاری ہوتا ہے، اور ایسے شخص کو یہ بھی مجاز ہوتا ہے کہ بعض ان تخریجات کو ترک کر دے جن کو سابقین نے خارج کیا تھا جب ان کے صحیح نہ ہونے کا علم ہو جائے، اسی وجہ سے وہ علما جو اجتہاد مطلق کے مدعی نہیں تھے ہمیشہ سے تصانیف کرتے رہے، ترتیب دیتے رہے، تخریج کرتے رہے اور ترجیح دیتے رہے اور جبکہ جمہور کے نزدیک اجتہاد متجزی ہوتا ہے اور تخریج متجزی ہوتی ہے اور مسائل میں مقصود گمان غالب کا حاصل کرنا ہے اور اسی گمان غالب پر تکلیف کا مدار ہے تو امور بالا میں سے کسی چیز کو بھی بعید نہیں سمجھا جا سکتا اور جو لوگ اس سے کم تر درجہ کے ہیں ان کا مذہب ان مسائل میں جو کثیر الوقوع ہیں وہ ہے جو انھوں نے اپنے اصحاب، اپنے آبا اور اپنے اہل شہر سے اخذ کیا ہے ان مذاہب میں سے جن کا انھوں نے اتباع کیا ہے اور نادر مسائل میں ان کا مذہب اپنے مفتیوں کے فتوے اور معاملات میں قاضی کے فیصلے ہیں، اور ہم نے متقدمین و متاخرین میں سے ہر مذہب کے علما محققین کو اسی طریق پر پایا ہے اور ائمہ مذاہب نے اسی کی اپنے اصحاب کو وصیت کی ہے، یواقیت و جواہر میں ہے کہ امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ جو شخص میری دلیل کو نہ جانے اس کو مناسب نہیں ہے کہ میرے کلام سے فتویٰ دے اور جب ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فتویٰ دیتے تھے تو وہ یہ کہہ دیا کرتے تھے کہ یہ نعمان بن ثابت کی یعنی میری رائے ہے۔

اور جہاں تک ہم کو قدرت ہوئی اس میں یہ قول بہت اچھا ہے اور جو شخص اس سے عمدہ کوئی اور قول پیش کرے تو وہی زیادہ درست ہے، امام مالک رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ ہر ایک کا کلام اختیار کرنے اور رد کرنے کے قابل ہے۔ حاکم اور بیہقی

نے امام شافعی رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے وہ فرمایا کرتے تھے کہ جب کوئی حدیث صحیح مل جائے تو وہی میرا مذہب ہے اور ایک روایت میں ہے کہ جب تم میرا کلام حدیث کے مخالف دیکھو تو حدیث پر عمل کرنا اور میرے کلام کو دیوار پر مارنا، اور امام شافعیؒ نے ایک روز امام مزنی سے فرمایا'' اے ابراہیم! میری ہر بات میں تقلید نہ کرنا اور اپنے لئے اس میں غور کرنا کیونکہ یہ دین ہے۔

اور امام شافعیؒ فرمایا کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی کا قول حجت نہیں ہوسکتا خواہ لوگ کتنے ہی زیادہ کیوں نہ ہوں اور نہ قیاس حجت ہے اور نہ کوئی شئے اور اس مقام پر اللہ اور اس کے رسول کی طاعت ہی واجب التسلیم ہے۔ اور امام احمد رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ کسی کو خدا اور رسول کے مقابلہ میں گفتگو کی اجازت نہیں، اور نیز امام احمد نے ایک شخص سے کہا کہ ہرگز میری تقلید نہ کرنا اور نہ ہرگز امام مالک کی اور نہ اوزاعی کی اور نہ نخعی کی اور نہ کسی اور کی تقلید کرنا، جہاں کتاب وسنت سے انھوں نے احکام اخذ کئے ہیں وہیں سے اخذ کرنا، اور کسی شخص کو فتویٰ نہیں دینا چاہئے جب تک کہ شرعی فتووں میں وہ علما کے اقوال سے واقف نہ ہو اور ان کے مذاہب کو نہ جانتا ہو، پس اگر اس سے کوئی مسئلہ دریافت کیا جائے اور اس کو یہ معلوم ہو کہ اس پر ان علما کا اتفاق ہے جن کا مذہب قبول کیا جاتا ہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ وہ کہہ دے کہ یہ امر جائز ہے اور یہ ناجائز ہے اور اس کا بیان نقل کے طور پر ہوگا، اور اگر مسئلہ ایسا ہو جس میں علما نے اختلاف کیا ہے تو اس کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ یہ فلاں شخص کے قول کے موافق جائز ہے اور فلاں شخص کے قول کے موافق ناجائز ہے اور اس کو یہ مناسب نہیں ہے کہ خود ایک قول پسند کرکے کسی کے قول کے موافق فتویٰ دے دے جب تک کہ اس کی دلیل کو بہ خوبی نہ سمجھ لے۔

اور امام ابو یوسف وزفر وغیرہ فرماتے ہیں کہ کسی کو جائز نہیں ہے کہ ہمارے قول سے فتویٰ دے جب تک کہ اس کو نہ معلوم ہو جائے کہ ہم نے کہاں سے کہا ہے، عصام بن یوسفؒ سے کہا گیا کہ آپ اکثر امور میں ابوحنیفہؒ کا خلاف کرتے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا: اس واسطے کہ ابوحنیفہ کو وہ فہم عطا ہوا تھا جو ہم کو نہیں عطا ہوا، پس وہ اپنے فہم سے وہ بات معلوم کرتے تھے جو ہماری سمجھ میں نہیں آتی ہم کو یہ جائز نہیں ہے کہ بغیر سمجھے ان کے قول کے موافق فتوی دے دیں۔ محمد بن حسنؒ سے کسی نے دریافت کیا کہ آدمی کو فتویٰ دینا کب جائز ہوتا ہے؟ انھوں نے فرمایا کہ جب خطا سے اس

کا صواب زیادہ ہو، ابوبکر اسکاف بلخیؒ سے مروی ہے کہ کسی نے ان سے پوچھا کہ ایک شہر میں ایک عالم ہے کہ اس سے زیادہ علم والا وہاں اور کوئی نہیں ہے کیا اس کو جائز ہے کہ فتوی نہ دے؟ انھوں نے کہا کہ اگر وہ اہل اجتہاد میں سے ہے تو فتوی نہ دینا اس کے لئے درست نہیں ہے، پھر دریافت کیا گیا کہ صاحب اجتہاد کیونکر ہوتا ہے؟ فرمایا کہ جب مسائل کے دلائل سے واقف ہو اور اپنے ہم عصروں سے مخالفت کے وقت مناظرہ کر سکے، کہا گیا ہے کہ اجتہاد کی شرطوں میں سے ادنی شرط مبسوط کا حفظ کرنا ہے، انتہی۔

بحر الرائق میں ابولیثؒ سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں کہ ابونصر سے ایک مسئلہ کے متعلق دریافت کیا گیا جو ان کے سامنے پیش ہوا تھا تم کیا کہتے ہو خدا تم پر رحمت کرے تمہارے پاس چار کتابیں ہیں، کتاب ابراہیم بن رستمؒ، خصافؒ کی روایت سے کتاب ادب القاضی اور کتاب المجرد اور ہشام کی روایت سے کتاب النوادر، کیا ہم کو ان کتب سے فتویٰ دینا درست ہے یا نہیں، اور یہ سب کتابیں تمہاری نظر میں پسندیدہ ہیں، انھوں نے جواب دیا ہمارے اصحاب سے جو صحیح صحیح منقول ہے پس وہ ایسا علم ہے جو محبوب، پسندیدہ، قابل تسلیم ہے لیکن فتویٰ دینا، سو کسی کا بے سمجھے فتویٰ دینا میری رائے میں جائز نہیں اور وہ لوگوں کا بار نہ اٹھائے لیکن اگر وہ مسائل ایسے ہیں جو ہمارے اصحاب سے مشہور، ظاہر اور واضح ہیں تو ان میں مجھ کو امید ہے کہ ان پر میں اعتماد کروں، نیز بحر الرائق میں ہے کہ اگر کسی نے پچھنے لگائے یا غیبت کی پھر یہ سمجھ کر کہ اس کا روزہ ٹوٹ گیا ہے اس نے کچھ کھا لیا تو اگر اس شخص نے کسی فقیہ سے مسئلہ دریافت نہیں کیا تھا اور نہ اس کو حدیث معلوم ہوئی تھی تب تو اس پر کفارہ واجب ہوگا اس لئے کہ یہ محض جہالت ہے اور وہ دار الاسلام میں کوئی عذر نہیں ہے، اور اگر اس نے کسی فقیہ سے دریافت کیا تھا اور اس نے روزہ توڑنے کا فتویٰ دیا تھا تو اس پر کفارہ واجب نہ ہوگا کیونکہ عامی پر عالم کی تقلید واجب ہے جب اس کے فتوے پر اس کا اعتماد ہوا اس واسطے وہ اپنے فعل میں معذور ہوگا اگرچہ مفتی نے اپنے فتویٰ دینے میں خطا ہی کی ہو، اور اگر اس نے کسی مفتی سے تو دریافت نہیں کیا لیکن اس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث معلوم ہوگئی تھی (پچھنے لگانے والا اور جس کے پچھنے لگائے گئے ہیں دونوں کا روزہ ٹوٹ گیا) اور آپ کا یہ فرمان معلوم ہو گیا تھا (غیبت سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے) اور اس شخص کو حدیث کے منسوخ ہونے کا یا اس

کی تاویل کا کچھ علم نہ تھا تو طرفین کے نزدیک اس پر بھی کفارہ نہیں ہے اس واسطے کہ ظاہر حدیث واجب العمل ہے، لیکن امام ابو یوسف اس کے خلاف ہیں وہ کہتے ہیں کہ عامی کو ظاہر حدیث پر عمل نہیں کرنا چاہئے کیونکہ اس کو ناسخ و منسوخ کا علم نہیں ہے اور اگر کسی شخص نے عورت کو چھو لیا یا شہوت سے اس کا بوسہ لیا یا سرمہ لگایا پھر یہ سمجھ کر کہ یہ چیزیں روزہ کو توڑ دیتی ہیں کچھ کھا، پی لیا تو اس پر کفارہ ہے لیکن اگر اس نے کسی فقیہ سے مسئلہ دریافت کیا تھا اور اس نے روزہ ٹوٹ جانے کا فتویٰ دیا تھا یا اس امر میں اس کو کوئی حدیث معلوم ہوگئی تھی تو کفارہ نہ ہوگا، اگر کسی شخص نے زوال سے پہلے روزہ کی نیت کی تھی پھر اس نے روزہ توڑ دیا تو امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اس پر کفارہ واجب نہیں ہے اور صاحبین کا قول اس کے خلاف ہے، کذا فی المحیط۔

اور اس سے معلوم ہوگیا کہ عامی کا مذہب اس کے مفتی کا فتویٰ ہے، اور نیز محیط کا باب قضا الفوائت میں ہے کہ اگر کسی عام کا کوئی مذہب معین نہیں ہے تو جو مفتی اس کو فتویٰ دے گا وہی اس کا مذہب ہوگا جیسا کہ علما نے اس کی تصریح کردی ہے، پس اگر کسی حنفی نے فتویٰ دیا تو عصر و مغرب کا وہ اعادہ کرے گا اور اگر کسی شافعی نے فتویٰ دیا تو وہ عصر و مغرب کا اعادہ نہ کرے گا اور اس کی رائے کا کچھ اعتبار نہ ہوگا، اور اگر وہ کسی سے فتویٰ نہ لے یا وہ کسی مجتہد کے مذہب پر صحت کو پالے تو یہی اس کو کافی ہوگا اور اعادہ کی ضرورت نہ ہوگی۔ ابن صلاحؒ نے کہا ہے کہ جو کوئی شافعی المذہب کسی حدیث کو اپنے مذہب کے مخالف پائے تو اس کو دیکھنا چاہئے اگر اس شخص کو آلات اجتہاد مطلقاً یا خاص اسی باب یا مسئلہ میں پورے حاصل ہیں تو اس حدیث پر وہ مستقل طور پر عمل کر سکتا ہے اور اگر آلات اجتہاد پورے حاصل نہیں ہیں اور بحث کرنے کے بعد اس کو حدیث کی مخالفت شاق معلوم ہوتی ہے اور مخالفت کے لئے وہ جواب شافی نہیں پاتا تو اس کو اس حدیث پر عمل کرنا درست ہے بشرطیکہ امام شافعی کے علاوہ کسی اور مستقل امام نے اس پر عمل کیا ہو اور اپنے امام کے مذہب ترک کرنے میں یہ بات اس کے لئے عذر معقول شمار ہوگی، امام نووی نے اس کو پسند کیا ہے اور اس کا اثبات کیا ہے۔

اور مسائل مشکلہ میں سے یہ بھی ہے کہ فقہا میں اکثر مختلف فیہ صورتیں بالخصوص وہ مسائل جن میں صحابہ کے اقوال دونوں جانب ظاہر ہوئے ہیں جیسے تکبیرات تشریق و تکبیرات عیدین،

احرام باندھنے والے کا نکاح، عبداللہ بن عباس وعبداللہ بن مسعود کا تشہد، بسم اللہ اور آمین کو اخفا سے پڑھنا اقامت میں دو دو بار اور ایک ایک بار کلموں کا ادا کرنا وغیر ذالک، سو وہ اختلاف دو قولوں میں سے ایک کی ترجیح میں ہے اور ان مسائل کے جواز میں سلف کو کچھ اختلاف نہ تھا ان کا اختلاف محض اولویت میں تھا، اور اس کی نظیر قرا کا طرق قرأت میں مختلف ہونا ہے، اور ان امور میں اکثر یہ دلیل بیان کرتے ہیں کہ صحابہ ان میں مختلف تھے اور وہ سب راہ راست پر تھے اسی واسطے مسائل اجتہادیہ میں علما ہمیشہ مفتیوں کے فتوے کو جائز رکھتے آئے ہیں اور قاضیوں کے فیصلوں کو مانتے آئے ہیں، اور کبھی کبھی اپنے مذہب کے خلاف قول پر بھی انھوں نے عمل کیا ہے، اور ایسے موقعوں میں تم ائمہ مذاہب کو دیکھو گے کہ وہ صاف صاف مخالف قول کو بیان کر دیتے ہیں پس کوئی کہتا ہے اس قول میں زیادہ احتیاط ہے یا یہی قول مختار ہے یا یہ قول مجھ کو زیادہ پسند ہے اور بعض کہتے ہیں ہم کو تو یہی قول معلوم ہوا ہے، کتاب مبسوط، آثار محمد رحمۃ اللہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ کے کلام میں ایسا بہت ہے۔

ان لوگوں کے بعد نا خلف پیدا ہو گئے انھوں نے فقہا کے قول کا اختصار کیا اور خلاف پر زیادہ زور دیا اور اپنے اپنے اماموں کے پسندیدہ اقوال پر جم گئے، اور سلف سے جو یہ مروی ہے کہ وہ اپنے اصحاب کے مذہب کی پابندی پر تاکید کرتے ہیں اور کسی حال میں ان سے نکلنا نہیں چاہتے، تو یہ یا تو فطری امر کی وجہ سے ہے اس واسطے کہ ہر شخص اسی بات کو پسند کرتا ہے جس کو اس کے اصحاب پسند کرتے ہیں حتی کہ لباس اور کھانوں میں بھی اس پسندیدگی کا لحاظ ہوتا ہے، یا یہ بات کسی قوت کی وجہ سے ہے جو کسی دلیل کے ملاحظہ کرنے سے یا کسی اور سبب کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے بعض لوگوں نے اس کو تعصب دینی سمجھا وہ اس سے بالکل بری ہیں۔

صحابہ و تابعین میں اور ان کے بعد کے زمانہ میں بعض ایسے تھے جو نماز میں بسم اللہ پڑھتے تھے اور بعض نہیں پڑھتے تھے، بعض اس کا جہر کرتے تھے اور بعض جہر نہیں کرتے تھے، اور بعض نماز فجر میں دعائے قنوت پڑھتے تھے اور بعض نہیں پڑھتے تھے، بعض پچھنے لگانے، نکسیر اور قے کی وجہ سے وضو کرتے تھے اور بعض وضو نہیں کرتے تھے بعض مس ذکر اور عورتوں کو خواہش نفسانی کے ساتھ ہاتھ لگانے سے وضو کرتے تھے اور بعض نہیں کرتے تھے، بعض لوگ آگ سے پکی ہوئی اشیا کے

تناول سے وضو کرتے تھے اور بعض وضو نہیں کرتے تھے بعض لوگ اونٹ کا گوشت کھانے سے وضو کرتے تھے اور بعض نہیں کرتے تھے۔ باوجود ان سب امور کے ہر ایک شخص دوسرے کے پیچھے نماز پڑھ لیا کرتا تھا، مثلاً امام ابوحنیفہ اور ان کے شاگرد اور امام شافعی وغیرہم رضی اللہ عنہم مدینہ شریف کے مالکی المذہب وغیرہ اماموں کے پیچھے نماز پڑھ لیا کرتے تھے اگر چہ وہ بسم اللہ کو نہ آہستہ پڑھتے تھے اور نہ آواز سے، ہارون رشید نے ایک بار پچھنے لگا کر نماز پڑھائی اور امام ابو یوسف نے ان کے پیچھے نماز پڑھی اور نماز کا اعادہ نہیں کیا، اور امام مالک نے ان کو فتویٰ دیا تھا کہ پچھنے لگانے سے وضو نہیں ٹوٹتا، اور امام احمد بن حنبل کے نزدیک نکسیر اور پچھنے لگانے سے وضو کرنا چاہیے، پس کسی نے ان سے پوچھا اگر امام کے جسم سے خون نکلے اور وہ وضو نہ کرے تو آپ اس کے پیچھے نماز پڑھ لیں گے؟ انھوں نے کہا کہ میں امام مالک اور سعید بن المسیب کے پیچھے کیسے نماز نہیں پڑھوں گا۔

اور روایت ہے کہ امام ابو یوسف اور امام محمد عیدین میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی تکبیریں پڑھا کرتے تھے اس لئے کہ خلیفہ ہارون رشید کو اپنے دادا عبداللہ بن عباس کی تکبیر پسند تھی۔

اور ایک مرتبہ امام شافعیؒ نے امام ابوحنیفہؒ کے مقبرہ کے قریب صبح کی نماز پڑھی تو ان کے ادب کی وجہ سے دعائے قنوت کو نہ پڑھا، اور نیز امام شافعیؒ کا قول ہے کہ ہم کبھی کبھی اہل عراق کے مذہب کی طرف جھک جاتے ہیں اور امام مالک نے منصور اور ہارون رشید سے وہ بات کہی تھی جس کو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، اور فتاویٰ بزازیہ میں امام ثانی یعنی امام ابو یوسف سے منقول ہے کہ انھوں نے ایک مرتبہ حمام میں غسل کر کے جمعہ کی نماز پڑھی اور لوگوں کی امامت کی، لوگ نماز پڑھ کر چلے گئے پھر کسی نے خبر دی کہ حمام کے کنویں میں مرا ہوا چوہا پایا گیا ہے، تب امام صاحب نے فرمایا کہ اب ہم اپنے بھائیوں اہل مدینہ کے قول پر عمل کرتے ہیں کہ جب پانی قلتین کی مقدار کو پہنچ جائے تو ناپاک نہیں ہوتا۔ انتہی۔

امام خجندی رحمہ اللہ سے کسی نے پوچھا کہ ایک شخص شافعی المذہب نے ایک سال یا دو سال کی نماز ترک کر دی، پھر اس نے ابوحنیفہ کا مذہب اختیار کر لیا تو اس پر کس طرح سے قضا واجب ہے آیا امام شافعی کے مذہب کے موافق قضا نماز ادا کرے یا امام ابوحنیفہ کے مذہب کے موافق؟ انھوں نے جواب دیا جس مذہب کے موافق قضا نماز ادا کرے گا نماز جائز ہو جائے گی بشرطیکہ اس

کے جواز کا اعتقاد بھی ہو، انتہی۔

جامع الفتاویٰ میں ہے کہ اگر کسی حنفی نے کہا اگر میں فلاں عورت سے نکاح کروں تو اس پر تین مرتبہ طلاق ہے اس کے بعد اس نے کسی شافعی سے مسئلہ پوچھا اور اس نے جواب دیا کہ اس عورت پر طلاق نہ ہوگی اور اس کی یہ قسم باطل ہے، تو اس مسئلہ میں اس کا امام شافعی کی اقتدا کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے اس لئے کہ بہت سے صحابہ ان کی طرف ہیں، امام محمد نے اپنی امالی میں بیان کیا ہے کہ اگر کسی فقیہ نے اپنی بیوی سے کہا کہ تجھ پر قطعی طلاق ہے اور وہ اس کو تین طلاق سمجھتا ہے اس کے بعد کسی قاضی نے حکم کر دیا کہ یہ طلاق رجعی ہے تو اس کو اس عورت کا پاس رکھنا جائز ہے، اسی طرح ہر ایک مسئلہ میں جس کی تحریم یا تحلیل یا اعتاق یا اخذ مال وغیرہ کے بارے میں فقہا کا اختلاف ہے، اس فقیہ کو جس کے خلاف فیصلہ کیا گیا ہے یہی مناسب ہے کہ قاضی کے فیصلہ کو اختیار کرے اور اپنی رائے کو ترک کر دے اور اپنے نفس کو اسی کا پابند کر لے جو قاضی نے اس پر لازم کر دیا ہے اور اسی کی تعمیل کرے جو اس نے دیا ہے، امام محمد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اسی طرح وہ شخص جو ناواقف ہے کسی حادثہ میں گرفتار ہو جائے اور اس کے متعلق فقہا سے دریافت کرے اور فقہا اس میں حلال یا حرام ہونے کا فتویٰ دیں اور مسلمانوں کا قاضی اس کے خلاف فیصلہ کر دے اور وہ مسئلہ بھی ایسا ہے جس میں فقہا کا اختلاف ہے تو اس شخص کو یہی مناسب ہے کہ قاضی کے فیصلہ کو اختیار کرے اور فقہا کے فتوے کو ترک کر دے، انتہی

اور مسائل مشکلہ میں سے یہ بھی ہے کہ میں نے بعض لوگوں کو یہ گمان کرتے پایا ہے کہ جتنے مسائل ان بڑی بڑی شروح اور فتاوے کی ضخیم کتابوں میں مندرج ہیں وہ تمام امام ابوحنیفہ اور صاحبین کے اقوال ہیں، اور ایسے لوگ ان قولوں میں جو تخریج کئے گئے ہیں اور ان قولوں میں جو حقیقی اور اصلی ہیں کچھ فرق نہیں کرتے اور نہ فقہا کے اس قول کے معنی سمجھتے ہیں کہ کرخی کی تخریج کے موافق مسئلہ کا یہ حکم ہے کہ طحاوی کی تخریج کے موافق یہ حکم ہے اور نہ وہ فقہا کے اس قول میں کہ ابوحنیفہ نے ایسا کہا ہے اور ان کے اس قول میں کہ مسئلہ کا جواب ابوحنیفہ کے مذہب پر یا ابوحنیفہ کے قاعدہ کی بنا پر یہ ہے کہ کوئی فرق کرتے ہیں اور نہ وہ ان اقوال کی طرف نظر کرتے ہیں جو محققین حنفیہ جیسے ابن الہمامؒ اور ابن النجیمؒ نے دہ دردہ مسئلہ میں اور ایسے ہی تیمّم کے بارے میں پانی سے

ایک میل کی دوری شرط کرنے وغیرہا مسائل میں فرمایا ہے کہ یہ سب امور اصحاب حنفیہ کی تخریجات ہیں اور حقیقت میں یہ مذہب نہیں ہے اور بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مذہب کی بنیاد ان محاورات جدلیہ پر ہے جو مبسوط سرخسی، ہدایہ اور تبیین وغیرہ کتب میں مذکور ہیں۔

اور ان کو یہ معلوم نہیں ہے کہ اوّل اوّل ان باتوں کو فقہا میں معتزلہ نے ظاہر کیا تھا اور ان پر ان کے مذہب کی بنیاد نہ تھی، بعد میں متاخرین نے بھی ذہنوں کو روشن کرنے اور تیز کرنے کے لئے اچھا سمجھ لیا اور خواہ کسی اور وجہ سے ان کو پسند کر لیا ہو، واللہ اعلم۔ اور ایسے ایسے شبہات اور شکوک اکثر اس بیان سے حل ہو جاتے ہیں جو ہم نے اس باب میں ذکر کیا ہے۔

اور مسائل مشکلہ میں سے ایک یہ امر ہے کہ میں نے بعض لوگوں کو یہ گمان کرتے پایا ہے کہ امام ابوحنیفہ اور امام شافعی رحمہما اللہ کے درمیان مخالفت کی بنیاد ان اصول پر ہے جو بزدوی وغیرہ میں مذکور ہیں حالانکہ حق بات یہ ہے کہ یہ اصول اکثر ان کے اقوال سے خارج کر لئے گئے ہیں، اور میرے نزدیک یہ مسئلہ کہ خاص طور پر ظاہر ہوتا ہے اور اس کو بیان کی حاجت نہیں ہے اور یہ کہ زیادتی نسخ ہوتی ہے اور یہ کہ عام بھی خاص کی طرح قطعی ہوتا ہے اور یہ کہ کثرت رواۃ سے ترجیح نہیں ہوسکتی اور یہ کہ جب حدیث خلاف قیاس ہو تو ایسے شخص کی روایت واجب العمل نہیں ہے جو فقیہ نہ ہو، اور یہ کہ شرط اور وصف کے مفہوم کا کچھ اعتبار نہیں ہوتا، اور یہ کہ امر کا مقتضی قطعاً وجوب ہے اور ایسے ہی دیگر مسائل ایسے اصول ہیں جو ائمہ کے کلام سے مستخرج اور مستنبط ہیں، اور امام ابوحنیفہ وصاحبین سے وہ منقول نہیں ہیں اور ان اصولوں کی محافظت کرنا اور متقدمین کے امور مستنبط پر وارد ہونے والے اعتراضات کے جواب دینے میں تکلف کرنا جیسا کہ بزدوی وغیرہ نے کیا ہے، ان اصول کے مخالف اصول کی محافظت اور ان پر اعتراضات واردہ کے جواب دینے سے زیادہ مستحق نہیں ہیں، مثلاً انھوں نے یہ قاعدہ مقرر کیا ہے کہ خاص ظاہر ہوتا ہے اور اس کو بیان کی حاجت نہیں ہے اور انھوں نے اس قاعدہ کی تخریج متقدمین کی اس تقریر سے کی ہے جو انھوں نے آیت واسجدوا وارکعوا، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث میں کی ہے کہ کسی شخص کی نماز پوری نہیں ہوگی جب تک کہ وہ اپنی پشت کو رکوع وسجدہ میں درست نہ کرے گا"۔ اس واسطے کہ متقدمین نماز میں فرضیت اطمینان کے قائل نہیں ہوئے ہیں اور انھوں نے حدیث کو آیت کا بیان

قرار نہیں دیا ہے۔ پس ان پر یہ اعتراض وارد ہوا کہ انھوں نے خدا تعالیٰ کے قول ''وامسحوا برؤسکم '' میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیشانی پر مسح کرنے کو بیان قرار دیا اور خدا تعالیٰ کے قول ''الزانیۃ والزانی فاجلدوا '' اور خدا تعالیٰ کے قول ''حتی تنکح زوجا غیرہ '' میں اور جو بیانات بعد میں واقع ہوئے ہیں، پس ان کے جوابات دینے میں انھوں نے تکلف کیا جیسا کہ وہ ان کی کتابوں میں مذکور ہے، اور اسی طرح انھوں نے یہ قاعدہ مقرر کیا کہ عام خاص کی طرح قطعی ہوتا ہے اور انھوں نے متقدمین کے اس عمل سے جو خدا تعالیٰ کے اس قول ''فاقرؤا ما تیسر من القرآن '' اور اس حدیث ''لا صلوۃ الا بفاتحۃ الکتاب '' کے بارے میں رہا ہے، قاعدہ کی تخریج کی ہے کیونکہ انھوں نے اس حدیث کو مذکورہ آیت کے لئے مخصص قرار نہیں دیا ہے اور اس عمل سے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول میں کہ ''جو غلہ چشمہ کے پانی سے پیدا ہو اس میں عشر ہے'' اور آپ کے اس قول میں کہ ''پانچ اوقیہ سے کم غلہ میں صدقہ نہیں ہے'' کیونکہ انھوں نے حدیث ثانی کو حدیث اول سے مخصوص قرار نہیں دیا اور اسی طرح کے دیگر مواقع ہیں۔

اس کے بعد ان پر یہ اعتراض وارد ہوا کہ خدا تعالیٰ کا قول ''فما استیسر من الھدی'' عام ہے اس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان سے خاص کیا اور بکری مراد لی ہے، سو اس اعتراض کے جواب دینے میں ان کو تکلف کرنا پڑا، اور اسی طرح انھوں نے یہ قاعدہ مقرر کرلیا کہ مفہوم شرط اور مفہوم وصف کا کچھ اعتبار نہیں، اور انھوں نے اس قاعدہ کی تخریج متقدمین کے اس عمل سے کی ہے جو ان کا اس آیت کے بارے میں ہے ''فمن لم یستطع منکم طولا '' پھر ان پر متقدمین کے عمل کی وجہ سے بہت سے اعتراضات وارد ہوئے مثلاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے ''چرنے والے اونٹ میں زکوۃ ہے'' پس اس کے جواب میں انھوں نے تکلف کیا ہے اور اسی طرح انھوں نے یہ قاعدہ مقرر کیا کہ سوائے راوی مجتہد کے کسی اور کی حدیث واجب العمل نہ ہوگی جب قیاس اس حدیث کے خلاف ہو اور اس قاعدہ کی تخریج انھوں نے متقدمین کے حدیث مصراۃ کو متروک العمل قرار دینے سے کی ہے۔ اس کے بعد قہقہہ والی حدیث اور بھول میں کھا لینے سے روزہ کے عدم فساد والی حدیث ان کے اس قاعدہ کے خلاف وارد ہوتی تھی سو ان کے جواب میں انھوں نے تکلف کیا، اسی قسم کی بہت سی مثالیں ہیں جو غور وخوض کرنے والے پر مخفی نہیں ہیں، اور جو شخص غور

وخوض نہ کرے اس کے لئے طول کلام بھی کافی نہیں ہوسکتا چہ جائیکہ اشارہ ہوا اور اس امر میں آپ کے لئے بطور دلیل کے محققین کا یہ قول کافی ہے جو اس مسئلہ میں ہے کہ اس شخص کی حدیث واجب العمل نہیں ہے جو ضبط وعدالت میں مشہور ہو اور فقیہ نہ ہو جبکہ وہ حدیث خلاف قیاس ہو جیسے مصراۃ کی حدیث ہے کہ یہ مذہب عیسیٰ بن ابانؒ کا ہے اور متاخرین میں سے کثیر نے اس کو اختیار کیا ہے، امام کرخیؒ اور ان کی اقتدا میں بہت سے علما کا مذہب یہ ہے کہ قیاس پر حدیث کے مقدم ہونے راوی کا مجتہد ہونا شرط نہیں ہے کیونکہ حدیث کا مرتبہ قیاس سے زیادہ ہے، احناف کہتے ہیں کہ یہ شرط ہمارے اصحاب سے منقول نہیں ہے بلکہ ان سے یہ منقول ہے کہ خبر واحد قیاس پر مقدم ہے، کیا تم نہیں دیکھتے کہ انھوں نے ابو ہریرہؓ کی اس حدیث پر عمل کرلیا جو روزہ دار کے بارے میں ہے جب اس نے بھول کر کچھ کھا، پی لیا ہو، اگر چہ یہ حدیث قیاس کے خلاف ہے حتی کہ ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اگر روایت نہ ہوتی تو میں قیاس سے کہتا اور تم کو ان کی بہت سی تخریجات میں اختلاف کرنے سے بھی یہ بات معلوم ہو جائے گی کہ وہ متقدمین کے اقوال سے ان کو حاصل کرتے ہیں اور بعض بعض پر رد کرتا ہے۔

ان مسائل مشکلہ میں سے یہ بھی ہے کہ میں نے بعض لوگوں کو پایا ہے کہ ان کا یہ خیال ہے کہ یہاں دو فریق ہیں، کوئی تیسرا فریق نہیں ہے، ایک اہل الظاہر ہیں اور ایک اہل الرائے ہیں، اور ہر وہ شخص جو قیاس واستنباط کرتا ہے وہ اہل الرائے میں سے ہے۔ واللہ ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ رائے سے مراد نہ تو نفس فہم وعقل ہے اس واسطے کہ یہ ہر عالم میں موجود ہے، اور نہ وہ رائے مراد ہے جس کی سنت پر بالکل بنیاد نہ ہو اس واسطے کہ اس کو تو کوئی مسلمان بھی اپنی طرف منسوب نہ کرے گا اور نہ استنباط وقیاس پر قادر ہونا مراد ہے اس واسطے کہ امام احمد واسحٰق بلکہ امام شافعی بھی بالاتفاق اہل الرائے میں سے نہ تھے حالانکہ وہ استنباط اور قیاس کرتے تھے، بلکہ اہل الرائے سے مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے ان مسائل کے بعد جن پر جمہور مسلمین متفق ہیں متقدمین میں سے کسی کے قول پر تخریج کرنے کی طرف توجہ کی۔

پس ان کا اکثر کام یہ ہے کہ وہ بجائے احادیث وآثار میں تتبع کرنے کے ایک نظیر کو دوسری نظیر پر حمل کرتے ہیں اور اصول میں سے کسی اصل کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

اور ظاہری وہ شخص ہوتا ہے جو نہ قیاس کا قائل ہے اور نہ صحابہ وتابعین کے آثار کا، جیسے داؤد اور ابن حزمؒ ہیں اور ان دونوں فریق کے درمیان محققین اہل سنت ہیں جیسے امام احمد واسحٰق۔

ہم نے اس مقام میں کلام کو خوب طول دیا ہے حتی کہ جس فن میں ہم نے یہ کتاب لکھنا شروع کی تھی اس سے نکل گئے حالانکہ میری یہ عادت نہیں ہے لیکن دو وجہوں سے ایسا ہوا، ان میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک وقت میں میرے قلب میں میزان پیدا کردی جس کی وجہ سے میں ہر اس اختلاف کا سبب پہچان لیتا ہوں جو امت محمدیہ میں واقع ہوا اور اس کو بھی پہچان لیتا ہوں جو خدا اور اس کے رسول کے نزدیک حق ہے، اور خدا نے مجھ کو یہ بھی قدرت دی ہے کہ امر حق کو دلائل عقلیہ ونقلیہ سے اس طرح ثابت کردوں کہ اس میں شبہ اور اشکال باقی نہ رہے پس میں نے ایک کتاب کی تالیف کا ارادہ کیا جس کو میں غایۃ الانصاف فی بیان اسباب الاختلاف کے نام سے موسوم کروں اور اس میں یہ مطالب بیان شافی کے ساتھ ظاہر کروں اور بہت سے شواہد وامثال وتفریعات ذکر کروں اور اس کے ساتھ ساتھ ہر مقام میں افراط وتفریط کے درمیان میانہ روی اختیار کروں اور جوانب کلام اور اصول مقصود ومرام کا احاطہ کروں، اس کے بعد اب تک اس کی تصنیف کی مجھ کو فرصت نہ ملی لیکن جب کلام ماخذ اختلاف تک پہنچا تو مجھ کو میرے دلی منصوبہ نے اس میں سے جتنا بھی میسر ہوا اس کے بیان کرنے پر آمادہ کیا۔

اور اس اطناب کی دوسری وجہ اس زمانہ کے لوگوں کی شورش ہے اور ان کا اختلاف اور بعض ان امور میں جن کو ہم نے ذکر کیا اندھا ہوجانا ہے یہاں تک کہ قریب ہے کہ ان لوگوں سے لڑ پڑیں جو ان کو اللہ تعالیٰ کی آیات پڑھ کر سناتے ہیں، وربنا الرحمن المستعان علی ما تصفون۔

اور حجۃ اللہ البالغہ کی قسم اول میں جس کلام کے بیان کرنے کا ہم نے قصد کیا تھا یہ اس کا آخر ہے اور سب تعریف اوّل وآخر، ظاہر وباطن اللہ ہی کے لئے ہے اس کے بعد ان شاء اللہ قسم ثانی آئے گی جس میں ان چیزوں کے معانی کا بیان ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے تفصیلا صادر ہوئی ہیں۔

حصہ دوم

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ تفصیلاً صادر ہوا ہے اس کے اسرار کا بیان

اس مقام پر ان احادیث کا ایک معتد بہ مجموعہ ذکر کرنا مقصود ہے جو احادیث محدثین کے نزدیک معروف ہیں اور اہل علم کے درمیان مشہور ہیں اور جو صحیح بخاری و صحیح مسلم اور سنن ابوداؤد و ترمذی میں مروی ہیں، ان کے سوا اور کتابوں سے جو حدیث میں بھی لایا ہوں اس کا ذکر بالتبع ہے، اور اسی واسطے میں نے ہر حدیث کی نسبت اس کے راوی کی طرف نہیں کی ہے اور کبھی میں نے حاصل معنی یا حدیث کا ٹکڑہ ہی ذکر کر دیا ہے اس واسطے کہ طالب کے لئے ان کتابوں کا تتبع کرنا اور ان کی طرف رجوع کرنا آسان ہے۔

ایمان کی قسموں کا بیان

واضح ہو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت جب کہ تمام مخلوق کے لئے عام تھی تا کہ تمام ادیان پر آپ کے دین کو غلبہ ہو خواہ اس غلبہ سے کسی معزز کی عزت یا ذلیل کی ذلت ہو اس لئے آپ کے دین میں کئی قسم کے لوگ داخل ہوئے، پس ان میں باہم تمیز کی ضرورت ہوئی کہ کون مسلمان ہیں اور کون نہیں ہیں، پھر ان مسلمانوں میں سے بھی کن لوگوں نے اس ہدایت کو حاصل کیا جس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم لائے تھے اور کون لوگ ایسے ہیں جن کے دلوں میں ایمان کی تازگی نے سرایت نہیں کیا اس واسطے شارع نے ایمان کی دو قسمیں کیں ایک تو وہ جس پر احکام دنیا کا مدار ہے جیسے جان و مال کا محفوظ ہونا اور اس کا انضباط ایسے امور سے کرنا جن میں فرمانبرداری ظاہر ہوتی ہے، اور وہ یہ ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ لوگوں سے جہاد کرنے کا مجھ کو حکم ہوا ہے یہاں تک کہ وہ اس بات کی شہادت دین کہ خدا تعالیٰ کے سوا کوئی عبادت کے قابل نہیں ہے اور محمد

اللہ کے رسول ہیں، اور نماز پڑھیں اور زکوۃ دیں، پس جب وہ یہ کام کریں گے تو بجز حقوق اسلام کے وہ اپنی جان و مال مجھ سے محفوظ کرلیں گے اور (جو کفر و معاصی پوشیدہ کریں گے) خدا ان سے حساب لے گا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" جو ہماری سی نماز پڑھے اور ہمارے قبلہ کو قبلہ سمجھے اور ہمارے ہاتھ کا ذبیحہ کھائے تو یہ وہ مسلمان ہے جس کے لئے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کا معاہدہ ہے پس تم لوگ اللہ تعالیٰ کے معاہدہ میں خیانت نہ کرنا"۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" تین چیزیں ایمان کی بنیاد ہیں، جس شخص نے اپنی زبان سے لا الٰہ الا اللہ کہا ہے نہ تو اس کو کسی گناہ کے سبب کافر قرار دے اور نہ تو اس کو کسی عمل کی وجہ سے اسلام سے خارج کر"۔ الحدیث

اور ایمان کی دوسری قسم وہ ہے جس پر آخرت کا مدار ہے جیسے نجات اور حصول درجات ہے اور وہ تمام عقائد حقہ، اعمال صالحہ اور عمدہ ملکہ پر مشتمل ہے اور اس ایمان میں کمی بیشی ہوسکتی ہے۔ اور شارع کا یہ دستور ہے کہ ان میں سے ہر ایک کو ایمان سے تعبیر کرتا ہے تاکہ ان کے جز ایمان ہونے پر اچھی طرح سے تنبیہ ہو جائے اسی واسطے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے" جس میں امانت نہیں اس کا ایمان نہیں اور جس کو عہد کا پاس نہیں اس کا دین نہیں"۔ اور آپ نے فرمایا "مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان سلامت رہیں" الحدیث۔ اس ایمان کی بہت سی شاخیں ہیں، اور اس کی حالت درخت کی سی ہے کہ تنہ، شاخیں، پتے پھل اور پھول سب کو درخت کہتے ہیں، پس جب اس کی شاخیں کٹ جائیں، پتے جھڑ جائیں اور اس کے پھل توڑ لئے جائیں تو اس کو ناقص درخت کہا جاتا ہے اور جب اس کا تنہ جڑ سے اکھاڑ دیا جائے تو درخت کا نام ہی اس سے جاتا رہتا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کا یہی مطلب ہے" ایمان والے وہ لوگ ہیں کہ جب کوئی اللہ کا ذکر کرے تو ان کے دلوں میں خوف طاری ہو جائے"۔ اور جبکہ یہ سب امور ایک قسم کے نہ تھے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے دو حصے کر دیئے، ان میں سے ایک تو ارکان ہیں جو ان کے سب اجزا میں عمدہ ہیں ان کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے"۔ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے، ایک یہ کہ سوائے اللہ تعالیٰ کے عبادت کے قابل کوئی نہیں اور محمد اس کے بندے اور رسول ہیں، اور نماز کی پابندی کرنا، اور زکوۃ دینا، اور حج کرنا اور رمضان

کے روزے رکھنا اور ان میں سے دوسرے باقی سب شعبے ہیں ان کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے "ایمان کے کچھ اوپر ستر شعبے ہیں ان میں سب سے افضل لا الٰہ الا اللہ کہنا ہے اور سب سے ادنیٰ راستے سے تکلیف دینے والی چیز ہٹا دینا ہے اور حیا بھی ایمان کا ایک شعبہ ہے"۔

ایمان کی پہلی قسم کے مقابل کا نام کفر ہے لیکن ایمان کی دوسری قسم کے مقابل کی دو صورتیں ہیں، پس اگر اس میں تصدیق قلبی نہیں ہے بلکہ تلوار کے زور سے اطاعت کرتا ہے تو وہ خالص نفاق ہے اور اس قسم کے منافق اور کافر کے درمیان آخرت میں کوئی فرق نہیں ہے بلکہ منافق لوگ دوزخ کے سب سے نیچے کے درجہ میں ہوں گے اور اگر تصدیق قلبی ہے لیکن اس کے ساتھ اعمال جوارح نہیں ہیں تو اس کو فاسق کہتے ہیں، یا اگر دل میں خلوص نہیں ہے تو یہ اور طرح کا منافق ہے بعض سلف نے اس نفاق کا نام نفاق عمل رکھا ہے اور یہ اس طرح سے پیدا ہوتا ہے کہ طبیعت یا رسم یا بدعقیدگی کا حجاب اس پر غالب آجاتا ہے پس وہ دنیا، کنبہ اور اولاد کی محبت میں مصروف رہتا ہے جس کی وجہ سے اس کے دل میں جزا و سزا کے بعید سمجھنے اور معاصی پر جرأت کرنے کی ایک نامعلوم حرکت پیدا ہو جاتی ہے اگرچہ باعتبار نظر برہانی کے قابل اعتراف امور کا اقرار کرتا ہو، یا وہ اسلام میں سختیاں دیکھتا ہے پس وہ اس کو ناگوار گزرتی ہیں، یا کفار سے محبت کرتا ہے اور وہ اعلاء کلمۃ اللہ سے مانع ہو جاتی ہے۔

ان دو معنی کے علاوہ ایمان کے دو معنی اور ہیں ایک تو ضروری التصدیق امر کی دل سے تصدیق کرنا اور وہ جبرئیل کے جواب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے "ایمان اس کا نام ہے کہ تو اللہ تعالیٰ اور اس کے ملائکہ پر ایمان لائے"۔ الحدیث

اور معنی ثانی وہ اطمینان اور دلی کیفیت ہے جو مقربین کو حاصل ہوتی ہے، اس کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے "پاکی ایمان کا جزو ہے"۔ اور آپ کا قول ہے "جب کوئی بندہ زنا کرتا ہے تو اس سے ایمان نکل جاتا ہے اور وہ اس کے سر پر مثل سائبان کے ہو جاتا ہے، پس جب وہ اس فعل سے فارغ ہو جاتا ہے تو ایمان پھر اس میں واپس آجاتا ہے" اور حضرت معاذؓ کا قول ہے "آؤ ایک ساعت ہم مومن بن جائیں"۔

پس شرع میں ایمان کے چار معنی مستعمل ہیں، اب اگر تم ان احادیث میں سے جو ایمان کے باب میں متعارض ہیں، ہر ایک حدیث کو اس کے محل پر محمول کرو گے تو تم سے تمام شکوک وشبہات دفع ہو جائیں گے اور معنی اول میں لفظ اسلام ایمان سے زیادہ واضح ہے اور اسی لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "کہہ دو کہ تم ایمان نہیں لائے بلکہ یہ کہو کہ ہم مسلمان ہو گئے؟ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سعد سے کہا تھا (جبکہ انھوں نے کسی شخص کی نسبت کہا تھا کہ میں ان کو ایمان دار جانتا ہوں) بلکہ مسلمان کہو، اور معنی رابع میں احسان کا لفظ ایمان کے لفظ سے زیادہ واضح ہے، اور جبکہ نفاق فی العمل اور اس کا مقابل یعنی اخلاص ایک پوشیدہ امر تھا اس واسطے ہر ایک کی علامات بیان کرنا ضروری ہوا، اور اس کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے "چار خصلتیں ہیں جس میں وہ سب پائی جائیں وہ پکا منافق ہوگا اور جس میں ان میں سے ایک خصلت پائی جائے اس میں نفاق کی ایک خصلت رہے گی جب تک کہ اس کو ترک نہ کردے، جب اس کے پاس کوئی امانت رکھے تو خیانت کرے، اور جب بات کرے تو جھوٹ بولے، اور جب کسی سے عہد کرے تو پورا نہ کرے اور جب کسی سے لڑے تو گالیاں بکے۔ نیز نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے "تین باتیں ہیں جس میں وہ باتیں ہوں گی ان کے سبب سے وہ حلاوت ایمان پائے گا۔ وہ شخص جس کو خدا اور اس کے رسول کی محبت سب سے زیادہ ہو، اور وہ جو خاص اللہ کے لئے کسی سے محبت کرتا ہو، اور وہ جو کفر کی طرف اعادہ کرنا اس قدر ناگوار سمجھے جس قدر آگ میں گرنا ناگوار سمجھتا ہے"۔ اور آپ کا فرمان ہے "جب تم کسی بندہ کو ہر وقت مسجد میں دیکھو تو اس کے لئے ایمان کی شہادت دو"۔ اور اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ہے علیؓ سے محبت کرنا ایمان کی علامت ہے اور علیؓ سے بغض رکھنا نفاق کی علامت ہے"۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ امر الٰہی میں نہایت سخت تھے پس ان کی سختی وہی برداشت کر سکتا ہے جس کی طبیعت قائم ہو اور اس کی عقل خواہش نفسانی پر غالب ہو، اور اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ہے "انصار کی محبت ایمان کی علامت ہے"۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ عرب معدیہ اور یمنیہ میں ہمیشہ سے عداوت چلی آتی تھی حتی کہ ایمان نے ان کو یک جا کر دیا پس جس نے اعلاء کلمۃ اللہ کا عزم کر لیا تو اس کے دل سے نزاع دور ہو گیا اور جس نے ایسا پختہ عزم نہیں کیا تو اس کے دل میں وہی نزاع باقی رہا، اور بلاشک نبی صلی اللہ علیہ وسلم

نے ایک حدیث میں بیان فرمایا ہے کہ ''اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے''۔ اور اسی طرح حدیث ضمام بن ثعلبہ اور حدیث اعرابی ہے جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا تھا کہ مجھ کو ایسا عمل بتلا دیجئے کہ جب میں اس پر عمل کروں تو جنت میں چلا جاؤں آپ نے فرمایا کہ یہ پانچ چیزیں ارکان اسلام ہیں اور جس نے ان کو کرلیا اور ان کے سوا کوئی اور عبادت نہیں کی تو اس نے اپنی گردن کو عذاب سے رہا کرلیا اور جنت کا مستحق ہوگیا، ایسے ہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرما دیا کہ ادنی درجہ نماز کا کیا ہے اور ادنیٰ درجہ وضو کا کیا ہے، اور ان پانچ چیزوں کو اس لئے رکن قرار دیا کہ تمام عبادات بشر میں یہی سب سے زیادہ مشہور ہیں اور تمام ملتوں میں کوئی ایسی ملت نہیں جس میں ان پانچ کا التزام نہ ہو، جیسے یہود و نصاریٰ، مجوس اور بقیہ عرب، باوجودیکہ ہر ایک کا ادا کرنے کا طریقہ جداگانہ ہے، اور اس لئے رکن قرار دیا کہ ان پانچ میں یہ بات ہے کہ یہ اور عبادتوں کے بدلہ میں کافی ہوسکتی ہیں اور ان کے سوا کسی اور عبادت میں یہ بات نہیں ہے کہ وہ ان کے بدلہ کافی ہوسکے، اور یہ ان وجوہ کی بنا پر ہے کہ تمام نیکیوں کی اصل توحید اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق اور شرائع الٰہیہ کو تسلیم کرنا ہے اور جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سب کے لئے عام تھی اور لوگوں کے گروہ کے گروہ دین الٰہی میں داخل ہوتے تھے تو ایک علامت ظاہرہ کا ہونا ضروری تھا جس سے موافق و مخالف میں امتیاز ہوجائے اور اس پر حکم اسلام کا مدار ہو اور لوگوں سے اس پر مواخذہ کیا جائے اور اگر یہ نہ ہوتا تو مدتوں کی ممارست کے بعد بھی بجز ظنی تفریق کے جس کی بنا قرائن پر ہوتی دونوں میں کچھ تمیز نہ ہوتی، اور یہ کہ حکم اسلام میں لوگ مختلف ہوجاتے، اور جیسا کہ ظاہر ہے ایسی حالت میں اسلام کے احکام میں بڑی دقت واقع ہوجاتی ہے دلی اعتقاد و تصدیق کی حقیقت ظاہر کرنے میں اقرار سے زیادہ اور کوئی شئے نہیں ہوسکتی جو اختیار اور خوشی کے ساتھ کیا گیا ہو، اور اس سبب سے جو ہم پہلے بیان کرچکے ہیں کہ انسانی سعادت کا مدار اور اخروی نجات کی اصل چار خصلتوں پر ہے، پس وہ نماز جو طہارت کے ساتھ ہو دو اوصاف تواضع اور پاکیزگی کا مظنہ اور جائے گمان قرار دی گئی اور وہ زکوٰۃ جس کی شرائط پائی جائیں اور وہ اپنے مصارف پر خرچ کی جائے، سخاوت اور عدل کا مظنہ قرار دی گئی۔

اور اس سبب سے جو ہم بیان کرچکے ہیں کہ طبعی حجاب دور کرنے کے لئے ایک ایسی عبادت

کی ضرورت ہے جس کا نفس پر دباؤ رہے اور اس باب میں روزہ سے بہتر کوئی چیز نہیں اور اس سبب سے جو ہم بیان کر چکے ہیں کہ اصول شرائع کی اصل شعائر اللہ کی تعظیم ہے اور شعائر چار ہیں ان میں سے ایک کعبہ بھی ہے اور اس کی تعظیم حج کرنا ہے اور پیشتر ان عبادات کے فوائد جو ذکر کرتے ہیں اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ عبادت خمسہ اور عبادتوں کے بدلہ کافی ہوسکتی''۔ ان کے سوا کوئی اور عبادت ان کے بدلہ کافی نہیں ہوسکتی۔

اور شریعت کے اعتبار سے گناہ دو طرح کے ہوتے ہیں صغائر اور کبائر، کبائر گناہ وہ ہیں جو قوائے بہیمیہ یا سبعہ یا شیطانیہ کا پورے طور پر غلبہ ہو جانے کی وجہ سے صادر ہوتے ہیں اور ان میں حق کے راستہ کا انسداد، شعائر الٰہی کی حرمت کا نقض یا تدابیر ضروریہ کی مخالفت اور لوگوں کا ضرر عظیم پایا جاتا ہے اور ان امور کے ساتھ ساتھ کبائر کا مرتکب شرع کو پس پشت ڈال دیتا ہے کیونکہ شریعت نے ان سے سخت ممانعت کی ہے اور کبائر کے کرنے والے پر بہت شدت سے تہدید کی ہے اور ان کے ارتکاب کو ایسا قرار دیا ہے جیسے دین سے خارج ہونا، اور صغائر وہ گناہ ہیں جو کبائر سے کم درجہ کے ہوں اور دواعی شر اور اس کے اسباب میں سے ہوں، اور شریعت کی قطعی ممانعت بھی ان کی نسبت ظاہر ہو لیکن ان میں کبائر جیسی سختی نہ کی گئی ہو اور حق بات یہ ہے کہ کبائر کا شمار متعین نہیں ہے اور ان کی پہچان یہ ہے کہ یا تو اس کے کرنے والے پر قرآن وحدیث صحیح میں جہنم کی وعید ہو یا اس گناہ پر شرعی حد مقرر ہو اور شارع نے اس کا نام کبیرہ بیان فرمایا ہو اور اس کے ارتکاب کو خروج عن الدین بیان کیا ہو اور جس چیز کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کبیرہ بیان فرمایا ہو کوئی شئے فساد اور خرابی میں اس سے زیادہ یا اس کے برابر ہو اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول کہ ''زنا کرتے وقت زانی مومن نہیں رہتا''۔ الحدیث۔ اس کے یہی معنی ہیں کہ یہ افعال اسی وقت صادر ہوتے ہیں کہ جب قوائے بہیمیہ یا سبعیہ کا پورے طور پر غلبہ ہوتا ہے پس اس وقت قوت ملکیہ کالمعدوم اور ایمان بمنزلہ زائل کے ہو جاتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول سے معلوم ہوگیا کہ یہ کبیرہ ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ''اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمد کی جان ہے اس امت کا کوئی یہودی یا نصرانی جس کو میری خبر پہنچی ہو پھر وہ مرجائے اور جن احکام کو میں لیکر آیا ہوں اس پر وہ ایمان نہ لائے تو وہ جہنم میں جائے گا''۔

میں کہتا ہوں یعنی جس شخص کو دعوت پہنچ چکی اور وہ کفر پر جما رہا حتی کہ اسی پر مر گیا تو وہ دوزخ میں جائے گا۔ کیونکہ اس نے اس تدبیر الٰہی کی مخالفت کی جو اس نے اپنے بندوں کے لئے مقرر کر رکھی تھی اور اپنے نفس کو اللہ تعالیٰ اور ملائکہ مقربین کی لعنت کا مورد بنایا اور نجات کے راستہ کو چھوڑ دیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہوتا جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کے باپ اور بیٹے اور سب لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہوں''۔ اور یہ بھی فرمایا ''جب تک کہ اس کی خواہش ان احکام کے تابع نہ ہو جائے جن کو میں لیکر آیا ہوں''۔

میں کہتا ہوں کہ کمال ایمان یہ ہے کہ عقل طبیعت پر غالب آ جائے اس طرح سے کہ اس کے نزدیک بادی الامر میں مقتضی عقل مقتضی طبعی سے بہتر معلوم ہو، اور محبت رسول صلعم کے بارے میں یہی حال ہے اور میں اپنی جان کی قسم کھاتا ہوں کہ یہ حالت کاملین میں دیکھی جاتی ہے، کسی نے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا یا رسول اللہ مجھے اسلام میں کوئی ایسی بات ارشاد فرمائیے کہ پھر آپ کے بعد کسی سے دریافت نہ کروں، اور ایک روایت میں ہے کہ پھر آپ کے سوا کسی اور سے دریافت نہ کروں، آپ نے اس کے جواب میں فرمایا ''یہ کہہ کہ میں خدا پر ایمان لایا اور پھر اس پر قائم رہا''۔ میں کہتا ہوں کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے سامنے فرمانبرداری اور اسلام کے حالات رکھے پھر جو کام اس کے مناسب ہو اس کو کیا کرے اور جو اس کے خلاف ہو اس کو ترک کر دے، اور یہ ایک ایسا قول کلی ہے جس کی وجہ سے انسان کو علم بالشرائع کی نسبت بصیرت ہو جاتی ہے گو وہ علم بالتفصیل نہ ہوتا ہو لیکن علم اجمالی ضرور حاصل ہو جاتا ہے جو انسان کے لئے سبقت کا باعث ہوتا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو شخص صدق دل سے لا الٰہ الا اللہ وانّ محمدا رسول اللہ کہے گا تو خدا تعالیٰ اس پر دوزخ کی آگ حرام کر دے گا''۔ اور فرمایا ''اگرچہ وہ چوری اور زنا کرتا ہو''۔ اور ایک حدیث میں فرمایا ''خواہ اس کے کیسے ہی عمل ہوں''۔

میں کہتا ہوں کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کو اس سخت آگ پر حرام کر دے گا جو دائی ہے اور کفار کے لئے مقرر کی گئی ہے اگرچہ وہ کبائر کا مرتکب ہوا ہو، اور اس طور سے کلام بیان کرنے میں نکتہ یہ ہے کہ گناہوں کے درجوں میں بہت بڑا فرق ہے اگرچہ گناہ کا نام سب پر بولا جاتا ہے پس کبائر کو جب کفر کے اعتبار سے دیکھا جائے گا تو اس کے سامنے ان کی کچھ ہستی معلوم نہیں ہوتی

اور نہ ان کا کچھ معتد بہ اثر معلوم ہوتا ہے اور نہ دخول نار کے واسطے وہ کوئی ایسے سبب ہو سکتے ہیں جن کو سبب کہا جائے اور اسی طرح کبائر کے مقابلہ میں صغائر ہیں، پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں اچھی طرح سے فرق بیان کر دیا کہ جو بمنزلہ صحت اور مرض کے ہے، پس امراض ظاہرہ کو جیسے زکام اور تکان ہے جب سومزاج متمکن کے ساتھ قیاس کریں جیسے جذام، سل اور استسقا ہے تو ان پر صحت کا حکم دیا جاتا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ ان امراض کا مریض، مریض ہی نہیں اور نہ اس میں کوئی بیماری ہے، اور بعض مصائب ایسے ہوتے ہیں جو دوسری مصیبتوں کو بھلا دیتے ہیں مثلاً کسی کو کانٹا لگ جائے اور پھر اس کے بعد اس کا گھر اور مال لٹ جائے تو ایسا شخص بیان کرتے وقت کہے گا کہ پہلے مجھ پر بالکل کوئی مصیبت نہ تھی، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ''ابلیس اپنا تخت پانی پر بچھاتا ہے اور اپنے لشکر کو لوگوں کو بہکانے کے لئے روانہ کرتا ہے''۔ الحدیث

واضح ہو کہ خدا نے شیاطین کو پیدا کیا اور ان کی جبلت میں یہ بات رکھی کہ لوگوں کو بہکائیں جس طرح کیڑے ہوتے ہیں جو اپنے مزاج کے مقتضی کے موافق کام کرتے رہتے ہیں، جیسے نجاست کا کیڑہ نجاست میں لوٹتا رہتا ہے، اور ان سب شیاطین کا ایک سردار ہے جو اپنا تخت پانی پر بچھاتا ہے اور جس کام کے وہ درپے ہیں اس کی تکمیل کے لئے ان کو بلاتا ہے تاکہ پوری بدبختی اور کامل گمراہی کا مستحق ہو جائے اور ہر نوع اور ہر صنف میں خدا تعالیٰ کا یہی قاعدہ ہے اور اس میں کچھ مجاز نہیں ہے اور میرے نزدیک یہ بات ایسی محقق ہو گئی ہے جیسے کوئی آنکھ سے دیکھ لیتا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ''سب تعریف اللہ تعالیٰ کے لئے ہے، جس نے اس کا کام وسوسہ تک ہی رہنے دیا''۔ اور آپ نے فرمایا ''شیطان اس بات سے ناامید ہو گیا کہ جزیرۃ العرب میں کوئی مسلمان اس کی عبادت کرے، لیکن اس کو باہمی عداوت سے ناامیدی نہیں ہے''۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (جبکہ صحابہ نے عرض کیا تھا کہ ہمارے دل میں ایسی ایسی باتیں آتی ہیں جن کا بیان کرنا ہم کو گراں معلوم ہوتا ہے) ''یہ صریح ایمان ہے''۔

واضح ہو کہ باعتبار اس استعداد کے جو کسی شخص میں وسوسہ کے قبول کرنے کی ہوتی ہے شیطانی وسوسہ کی تاثیر مختلف ہوتی ہے، پس شیطانی وسوسہ کی بڑی سے بڑی تاثیر یہ ہے کہ انسان کافر ہو جائے اور دین سے نکل جائے، پس جب قوت یقینی کی وجہ سے خدا تعالیٰ کسی کو اس بلا سے

محفوظ کرتا ہے تو اس کے وسوسہ کی تاثیر دوسری صورت میں بدل جاتی ہے اور وہ باہمی لڑائی، امور خانہ داری میں بگاڑ ڈالنا اس گھر و شہر والوں میں فساد برپا کرنا ہے، پھر جب خدا تعالیٰ اس سے بھی کسی کو بچالیتا ہے تو اس کے دل میں وسوسہ آتا ہے اور نکل جاتا ہے اور چونکہ اس کی تاثیر کمزور ہوتی ہے اس لئے نفس کو کسی عمل پر برانگیختہ نہیں کرسکتا اور اس وسوسہ سے اس شخص کو کچھ مضرت نہیں پہنچتی بلکہ جب اس وسوسہ کو برا سمجھتا ہے تو یہ اس کے خلوص ایمان کی دلیل ہو جاتی ہے البتہ اصحاب نفوس قدسیہ میں ان باتوں کا ذرا بھی وجود نہیں ہوتا جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ''خدا تعالیٰ نے جن پر میری اعانت کی پس وہ مسلمان ہوگیا ہے اور سوائے بھلائی کے وہ مجھے کچھ نہیں کہتا. اور ان تاثیرات کا حال آفتاب کی شعاع کا سا ہے کہ لوہے اور قلعی دار چیزوں میں جس قدر اثر کرتی ہے، دوسری چیزوں میں نہیں کرتی، علی حسب مراتب، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا شیطان کا بھی ایک اثر ہوتا ہے اور فرشتہ کا بھی ایک اثر ہوتا ہے''۔ الحدیث۔

اس حدیث کا حاصل یہ ہے کہ قلوب کے اندر ملائکہ کی تاثیر کی صورت انس الٰہی اور نیک کاموں میں رغبت پیدا کرنا ہے، اور شیاطین کی تاثیر کی صورت دلوں میں وحشت، اضطراب اور افعال قبیحہ کی رغبت پیدا کرنا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس کے دل میں اس قسم کا وسوسہ پیدا ہو تو اس کو اس وقت یہ کہہ دینا چاہئے کہ مجھ کو خدا اور رسول کا یقین ہے؟ اور آپؐ نے فرمایا ''اس کو چاہئے کہ خدا کی پناہ مانگے اور اپنی بائیں جانب تھوک دے''۔ اس میں راز یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف التجا اور اس کی یاد کرنے سے اور شیاطین کو قبیح و ذلیل سمجھنے سے نفس کی توجہ شیاطین کی طرف سے ہٹ جاتی ہے اور ان کا اثر قبول کرنے سے دل رک جاتا ہے جیسا کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے ''تحقیق جو لوگ ہم سے ڈرتے ہیں جب ان کو شیطانی خیال چھوتا ہے تو وہ اللہ کو یاد کرتے ہیں پس وہ فوراً خبردار ہو جاتے ہیں''۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''حضرت آدمؑ اور حضرت موسیٰؑ نے اپنے رب کے سامنے بحث کی''۔

میں کہتا ہوں رب کے سامنے بحث کرنے کے یہ معنی ہیں کہ حضرت موسیٰ کی روح حظیرۃ القدس کی طرف کھینچ آئی اور اس نے وہاں حضرت آدمؑ سے ملاقات کی، اور اس واقعہ کا اصل راز یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے موسیٰؑ کو آدمؑ کی زبانی ایک علم عطا فرمایا، جس طرح کوئی شخص حالت خواب میں

کسی فرشتہ یا کسی نیک آدمی کو دیکھتا ہے اور اس سے کچھ بات دریافت کرتا ہے اور وہ اس کا جواب دیتا ہے حتیٰ کہ ایک بات جو پہلے سے اس کو معلوم نہ تھی اس شخص سے حاصل ہو جاتی ہے، اور یہاں ایک باریک علم تھا جو موسیٰ پر مخفی تھا حتیٰ کہ خدا تعالیٰ نے اس واقعہ میں موسیٰ علیہ السلام پر اس علم کا انکشاف کر دیا اور وہ یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کے قصہ میں دو وجہیں مجتمع ہیں ان میں سے ایک جو خاص آدم علیہ السلام کی ذات سے متعلق ہے یہ ہے کہ جب تک انھوں نے وہ درخت نہیں کھایا تھا نہ ان کو پیاس لگتی تھی نہ دھوپ اور نہ بھوکے رہتے تھے اور نہ ننگے اور فرشتوں کی طرح رہتے تھے پس جب انھوں نے اس درخت کو کھایا تو بہیمیت کا غلبہ ہوا اور ملکیت پست ہو گئی، پس لامحالہ درخت کا کھانا گناہ شمار ہوا جس سے استغفار کرنا ضروری ہوا۔

اور دوسری وجہ جو تدبیر کلی سے متعلق ہے جس کو خدا تعالیٰ نے مخلوق کے پیدا کرنے میں ملحوظ رکھا اور آدمؑ کو پیدا کرنے سے پیشتر فرشتوں کی طرف اس کی وحی کر دی تھی اور وہ یہ تھی کہ خدا تعالیٰ کو آدم کے پیدا کرنے سے یہ منظور تھا کہ نوع انسان زمین میں خلیفہ ہو، اس سے گناہ صادر ہوں وہ مغفرت چاہے، پھر اس کے گناہ معاف کئے جائیں اور لوگوں کو مکلّف بنایا جائے، ان میں رسولوں کی بعثت ہو، اور ثواب وعذاب اور مراتب کمال وگمراہی ان میں پائی جائیں اور یہ بذات خود ایک بڑی مخلوق ہو، اور اس درخت کا کھانا ارادہ الٰہی اور اس کی حکمت کے موافق تھا جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ''اگر تم گناہ نہ کرتے تو خدا تعالیٰ تم کو فنا کر کے اور لوگ پیدا کرتا جو گناہ کرتے اور اس سے مغفرت مانگتے پھر خدا تعالیٰ ان کو معاف کرتا۔'' اور بہیمیت کا اولاً غلبہ آدم علیہ السلام پر ہوا تھا کہ ان پر دوسری بات کا علم پوشیدہ تھا اور وجہ اول نے ان کا احاطہ کر لیا تھا اور ان پر سخت عتاب کیا گیا پھر اس سے ان کو خلاصی ہوئی اور علم ثانی کی ایک جھلک ان پر پڑی، پھر جب آدمؑ حظیرۃ القدس کی طرف آئے تو خوب اچھی طرح سے حال معلوم ہو گیا جو گمان حضرت آدم کو تھا حضرت موسیٰ بھی اسی گمان میں تھے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ پر علم ثانی کا انکشاف فرمایا۔

اور ہم بیان کر چکے ہیں کہ جس طرح خواب کی تعبیر ہوتی ہے وقائع خارجہ کی بھی تعبیر ہوتی ہے اور امر ونہی میں ظن وتخمین کو دخل نہیں ہوتا بلکہ ان کے لئے استعداد ہوتی ہے جو اس امر ونہی کو واجب کرتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''ہر بچہ فطرت کے موافق پیدا ہوتا ہے پھر

اس کے ماں باپ اس کو یہودی اور نصرانی اور مجوسی بنا لیتے ہیں جس طرح حیوان کا بچہ ہاتھ پاؤں سے درست پیدا ہوتا ہے، بھلا تم اس کا ناک، کان کٹا ہوا دیکھتے ہو۔

میں کہتا ہوں، واضح ہو کہ خدا تعالیٰ نے اپنا ایک طریقہ جاری کر رکھا ہے کہ حیوانات، نباتات اور ان کے سوا ہر نوع کو خاص خاص شکل پر پیدا کیا ہے مثلاً انسان کو اس خاص شکل میں بنایا کہ اس کی جلد صاف ہے، قد سیدھا ہے، ناخن پھیلے ہوئے ہیں، بولنے والا، ہنسنے والا ہے اور انہی خواص سے پہچانا جاتا ہے، کہ وہ انسان ہے کہیں شاذ و نادر جگہ، خلاف عادت ہو جاتا ہے جیسے بعض بچے ایسے پیدا ہوتے ہیں کہ ان کے سونڈ یا کھر ہوتے ہیں۔

اسی طرح اس کی یہ عادت بھی جاری ہے کہ اس نے ہر نوع کو تھوڑا سا علم اور محدود ادراک عطا کیا ہے جو اسی کے واسطے خاص اور اس کے تمام افراد میں برابر پایا جاتا ہے، پس شہد کی مکھیوں کو اس علم کے ساتھ خاص کیا، کہ اپنے مطلب کے درخت معلوم کریں، چھتے بنائیں اور ان میں شہد جمع کیا کریں، پس تم کو ایسی کوئی مکھی نہ دکھائی دے گی جس میں یہ علم نہ ہو، اور کبوتر کو اس علم سے خاص کیا کہ وہ کس طرح آواز کرتا ہے، آشیانہ بناتا ہے اور اپنے بچہ کو جگاتا ہے اور اسی طرح خدا نے انسان کو ادراک زائد اور عقل کامل کے ساتھ خاص کیا اور اس میں اپنے پیدا کرنے والے کی پہچان اور اس کی عبادت کا علم رکھا اور ہر وہ چیز عطا فرمائی جو انسان کی امر معاش میں کام آئے اور اس کا ہی نام فطرت ہے۔ پس اگر کوئی رکاوٹ مانع نہ ہو تو اسی حالت پر انسان بڑی عمر تک رہ سکتے ہیں لیکن عوارض پیش آ جاتے ہیں جیسے ماں، باپ کا گمراہ کر دینا، اس واسطے اس کا علم جہل ہو جاتا ہے، جس طرح راہب لوگ طرح طرح کی تدابیر کر کے عورتوں کی خواہش اور کھانے کی خواہش بالکل زائل کر دیتے ہیں باوجودیکہ فطرت انسانی میں یہ دونوں داخل ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے خدا تعالیٰ نے لوگوں کو اس کے لئے پیدا کیا حالانکہ وہ اس وقت وہ اپنے آبا کی پشتوں میں تھے"۔ اور فرمایا "وہ اپنے آبا سے ہیں"۔ اور فرمایا "جو کچھ وہ کرنے والے تھے خدا کو اس کا پورا علم ہے"۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے طویل خواب میں ذکر فرمایا "ذریت بنی آدم کی تمام ارواح حضرت ابراہیمؑ کے پاس ہوتی ہیں"۔

واضح ہو کہ اکثر بچہ فطرت پر ہی پیدا ہوتا ہے، جیسا کہ بیان کیا گیا لیکن کبھی بچہ ایسا بھی پیدا

ہوتا ہے کہ بغیر کسی عمل کے لعنت کے قابل ہوتا ہے جیسے وہ لڑکا جس کو حضرت خضر نے قتل کیا تھا اس کے دل پر کفر کی مہر لگا دی گئی تھی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو یہ فرمایا ہے کہ وہ اپنے آبا سے ہیں تو یہ احکام دنیا کے متعلق ہے۔

اور شرائع کا کسی امر میں توقف کرنا اس وجہ سے نہیں ہوتا کہ اس کا علم نہیں ہوتا بلکہ کبھی اس لئے توقف کیا جاتا ہے کہ مظنہ ظاہرہ کی وجہ سے احکام منضبط نہیں ہوتے یا اس لئے کہ اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی یا اس لئے کہ اس میں کوئی ایسی باریک بات ہوتی ہے جس کو مخاطب نہیں سمجھ سکتے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ''خدا کے ہاتھ میں میزان ہے جس کو چاہتا ہے پست کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے بلند کرتا ہے''۔

میں کہتا ہوں کہ یہ تدبیر کی طرف اشارہ ہے کیونکہ تدبیر کی بنیاد اس بات پر ہے کہ جو مصلحت کے زیادہ موافق اور مناسب ہے اس کو اختیار فرماتا ہے، پس جس حادثہ میں اسباب متنازعہ جمع ہو جاتے ہیں اس میں خدا تعالیٰ عدل کا حکم دیتا ہے اور وہ خدا تعالیٰ کا قول ہے ''کل یوم هو فی شأن''۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''بنی آدم کے دل خدا تعالیٰ کے دو انگشت میں ہیں''۔ اور فرمایا ''قلب کا حال ایک پر کا سا ہے جو چٹیل میدان میں پڑا ہے جس کو ہوا الٹ پلٹ کرتی ہے''۔

میں کہتا ہوں کہ بندوں کے افعال اختیاری ہیں لیکن اس اختیار میں ان کا کچھ اختیار نہیں ہے، اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص پتھر پھینکنے کا ارادہ کرتا ہے پس اگر یہ قادر، حکیم ہوتا تو اس پتھر میں اس کی اختیاری حرکت کو بھی پیدا کرتا اور اس پر یہ اعتراض وارد نہیں ہوتا کہ جب بندوں کے افعال بھی خدا تعالیٰ ہی کے پیدا کئے ہوئے ہیں اور اسی طرح یہ اختیار بھی اس نے ہی پیدا کیا تو پھر جزا کس بات پر دی جاتی ہے، کیونکہ جزا کے معنی بعض افعال خداوندی کا بعض پر مرتب ہونا ہے بایں معنی کہ خدا تعالیٰ نے یہ حالت بندے میں پیدا کی پھر اس نے اللہ تعالیٰ کی حکمت میں اس بات کا اقتضا کیا کہ اللہ تعالیٰ بندے میں عذاب و نعمت کی دوسری حالت پیدا کرے جیسا کہ خدا تعالیٰ پانی میں حرارت پیدا کرتا ہے پس یہ اس بات کا اقتضا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو ہوا کی صورت دے، اور جزا کے لئے بندے کے کسب اور اختیار کا ہونا بالعرض شرط ہے نہ بالذات۔ اور یہ اس لئے کہ نفس ناطقہ ان اعمال کا رنگ قبول نہیں کرتا جو کسب کی وجہ سے اس کی طرف منسوب نہیں

ہوتے بلکہ اس کے غیر کی طرف مستند ہوتے ہیں، اور نہ ان اعمال کا رنگ قبول کرتا ہے جو اس کے اختیار اور قصد کی طرف منسوب نہیں ہوتے، اور خدا تعالیٰ کی حکمت میں یہ نہیں ہے کہ بندے کو اس عمل کی وجہ سے سزا دے جس کا اثر نفس ناطقہ نے قبول نہیں کیا، پس جب یہ بات ہے تو یہ اختیار غیر مستقل جزا کے لئے شرط ہونے میں کافی ہے جبکہ اس اختیار سے عمل کے رنگ کی قبولیت درست ہو اور یہ کسب غیر مستقل کافی ہے جبکہ اس کسب غیر مستقل سے یہ بات ثابت ہو رہی ہو کہ حالت متاخرہ خاص اسی کا سبب بندہ میں پیدا ہونی چاہئے نہ کہ دوسرے میں پس یہ تحقیق نہایت عمدہ ہے، صحابہ وتابعین کے کلام سے سمجھی جاتی ہے اس کو تم یاد رکھو۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''خدا تعالیٰ نے مخلوق کو تاریکی کی حالت میں پیدا کیا پھر ان پر اپنا نور ڈالا پس جس کو وہ نور پہنچ گیا اس کو ہدایت ہوگئی اور جس پر وہ نور نہیں پڑا وہ گمراہ ہوا''۔ پس اسی وجہ سے میں کہتا ہوں کہ علم الٰہی پر قلم خشک ہوگیا، اس سے مراد یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے لوگوں کے پیدا ہونے سے پہلے اندازہ کرلیا تھا، وہ بذات خود کمالات سے خالی تھے، پس انھوں نے یہ چاہا کہ ان کی طرف رسول بھیجے جائیں اور ان پر کتابیں نازل کی جائیں پس بعض نے ہدایت پائی اور بعض گمراہ رہے، خدا تعالیٰ نے ایک ہی مرتبہ یہ سب اندازہ کرلیا تھا لیکن جو بات کہ ان کو از خود حاصل تھی وہ اس پر مقدم ہے کہ جو رسولوں کے ذریعہ سے حاصل ہوئی جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور روایت اللہ تعالیٰ سے نقل فرمایا ہے ''تم سب بھوکے ہو مگر جس کو میں کھانا کھلا دوں اور تم سب گمراہ ہو لیکن جس کو میں ہدایت کردوں''۔ یا ہم کہتے ہیں یہ بھی ایک ایسے ہی واقعہ کی طرف اشارہ ہے جیسے حضرت آدم علیہ السلام کی ذریت نکالنے کا واقعہ ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جب خدا تعالیٰ کسی خاص زمین میں کسی بندے کے مرنے کا حکم دیتا ہے تو اس کی وہاں کوئی ضرورت پیدا کر دیتا ہے''۔

میں کہتا ہوں اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بعض حوادث اس لئے پائے جاتے ہیں تاکہ اسباب کا سلسلہ منقطع نہ ہوجائے پس اگر کوئی حاجت پیدا نہیں ہوتی تو وہ الہام کے ذریعہ سے معلوم کرلیتا ہے یا کوئی ایسی صورت پیدا کردی جاتی ہے جس سے اس قضا الٰہی کا ظاہر ہونا ضروری ہوجاتا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے سے پچاس

ہزار سال قبل تمام خلائق کے مقادیر کو لکھا تھا اور اس کا عرش پانی پر تھا۔

میں کہتا ہوں کہ خدا تعالیٰ نے عرش اور پانی کو سب مخلوق سے پہلے پیدا کیا پھر جتنی چیزوں کا موجود ہونا اس نے چاہا عرش کے قویٰ میں سے ایک قوت میں جو ہمارے قویٰ میں سے خیال کے مشابہ ہے اور جس کو ذکر سے تعبیر کیا جاتا ہے اس کو پیدا کیا جیسا کہ امام غزالیؒ نے بیان کیا ہے اور اس بیان کو تم سنت کے مخالف نہیں سمجھنا کیونکہ ان لوگوں کے نزدیک جو حدیث سے واقفیت رکھتے ہیں قلم اور لوح کی صورت کے بیان میں جیسا کہ عام لوگ اس کو بیان کرتے ہیں کوئی معتدبہ حدیث وارد نہیں ہوئی اور وہ روایتیں جو لوگ بیان کرتے ہیں وہ بنی اسرائیل کے تراشے ہوئے قصے ہیں احادیث محمدی نہیں ہیں اور متاخرین اہل حدیث کا ایسی چیزوں کا قائل ہونا تکلف ہے اور متقدمین کا اس بارے میں کوئی کلام نہیں ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ وہاں کائنات کے اس تمام سلسلہ کی صورت متحقق ہوگئی تھی اور اس کو کتابت سے ایسا ہی تعبیر کیا ہے جیسا کہ سیاست مدنیہ میں کتابت کا اطلاق تعیین اور ایجاب پر ہوتا ہے، اسی معنی میں خدا تعالیٰ کا یہ قول ہے ''تم پر روزے لکھے گئے''۔ اور خدا تعالیٰ کا قول ہے ''جب تم میں سے کسی کو موت آنے لگے تو تم پر یہ بات لکھی گئی'' الا یہ۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''خدا تعالیٰ نے اپنے بندہ پر زنا کا ایک حصہ لکھ دیا ہے'' الحدیث۔ اور ایک صحابی کا قول ہے کہ میں فلاں غزوہ میں لکھا گیا تھا حالانکہ وہاں کوئی دفتر نہ تھا جیسا کہ کعب بن مالک نے بیان کیا ہے اور اس کی مثال اشعار عرب میں بکثرت ہے اور پچاس ہزار سال کا ذکر کرنا، اس میں احتمال ہے کہ اتنی ہی مدت کی تعیین ہو اور اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ اس سے طول مدت بیان کی ہو، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''خدا تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا پھر اپنا دایاں ہاتھ ان کی پشت پر پھیرا'' الحدیث (۱)۔

میں کہتا ہوں جب خدا تعالیٰ نے آدم کو پیدا کیا تاکہ وہ ابوالبشر ہوں تو ان کے وجود میں ان کی اولاد کے حقائق کو لپیٹ دیا پھر خدا تعالیٰ نے ان کو کسی وقت میں اس شئے کا علم جس کو ان کا وجود قصد الٰہی کے موافق مشتمل تھا عطا فرمایا اور ان سب کا ایک صورت مثالیہ میں مشاہدہ کرا دیا اور ان

---

(۱) پھر ان کی ذریت نکل آئی خدا تعالیٰ نے فرمایا ان کو میں نے جنت کیلئے پیدا کیا ہے اور یہ جنت کے کام کریں گے، پھر ان کی پشت پر ہاتھ پھیرا اور ذریت نکل آئی پس فرمایا یہ جہنم کے لئے ہیں اور یہ جہنم کے کام کریں گے۔

کی سعادت اور شقاوت کو نور اور ظلمت کی صورت میں ظاہر کر دیا اور ان کی جبلت میں تکلیف کی جو استعداد تھی اس کو سوال و جواب اور اپنی جانوں پر لازم کر لینے کی صورت میں ظاہر کیا پس ان سے ان کی اصل استعداد کی وجہ سے مواخذہ کیا جاتا ہے اور ظاہر میں یہ مواخذہ شیخ استعداد کی طرف منسوب ہوتا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''تم میں سے ہر شخص کی خلقت چالیس روز تک ماں کے پیٹ میں جمع ہوتی رہتی ہے''۔ الحدیث ۔

میں کہتا ہوں یہ تغیر آہستہ آہستہ ہوتا رہتا ہے دفعتاً نہیں ہوتا اور ہر حالت اپنی سابق اور لاحق حالت کے مغائر ہوتی ہے اور وہ شئے جو صورت دموی سے پورے طور پر متغیر نہیں ہوتی اس کو نطفہ ہی کہتے ہیں اور جس میں کسی قدر انجماد ہو جاتا ہے تو اس کو علقہ کہتے ہیں اور جس میں اس سے زیادہ انجماد ہو جاتا ہے تو اس کو مضغہ کہتے ہیں، اگر چہ اس میں نرم نرم ہڈیاں بھی بن جائیں ۔

اور جس طرح کھجور کی گٹھلی ایک خاص وقت میں زمین میں ڈالی جائے اور ایک خاص تدبیر اس میں صرف کی جائے تو جو شخص اس کھجور کی نوع ، اس زمین ، اس پانی اور اس وقت کی خاصیت کو جانتا ہے وہ یہ بھی معلوم کر لیتا ہے کہ یہ درخت خوب اُگے گا اور اس کے متعلق اس کو بعض بعض باتیں معلوم ہو جاتی ہیں ۔

پس اسی طرح سے خدا تعالیٰ بچہ کا حال جس پر اس کی پیدائش ہوئی ہے بعض فرشتوں پر کھول دیتا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''تم میں سے ایسا کوئی نہیں جس کی جگہ دوزخ اور جنت میں معین نہ ہو''۔

میں کہتا ہوں کہ لوگوں کی ہر صف کے لئے کمال اور نقصان ہے، عذاب اور ثواب ہے اور اس معنی کا بھی احتمال ہے کہ یا جنت میں اور یا دوزخ میں جگہ مقرر ہے، اور اللہ تعالیٰ کا قول ''اور جب تیرے رب نے بنی آدم کی پشت سے ان کی اولاد کو نکالا'' الآیہ۔ اس حدیث کے مخالف نہیں۔ ''پھر خدا تعالیٰ نے اپنا دایاں ہاتھ آدم کی پشت پر پھیرا اور ان کی اولاد کو نکالا''۔ اس واسطے کہ آدم علیہ السلام سے ان کو اولاد کو نکالا اور ان کی اولاد کی پشت سے اولاد کی اولاد نکالی گئی، روز قیامت تک اس ترتیب پر کہ جس پر وہ موجود ہوتے ہیں، پس قرآن میں اس قصہ کا ایک حصہ مذکور

ہے، حدیث نے اس کا تتمہ بیان کر دیا، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے،'' پس جس نے دیا اور ڈرتا رہا اور اچھی بات کی تصدیق کی (یعنی جو شخص ہمارے علم اور تقدیر میں ان صفات سے متصف ہے تو خارج میں ان اعمال کی بجا آوری) ہم اس کے لئے آسان کر دیتے ہیں''۔

پس اس توجیہ پر حدیث بھی منطبق ہو جاتی ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''قسم ہے جان کی جو اس کو درست کیا پھر اس کی نافرمانی اور پرہیزگاری کا اس کو الہام کیا''۔

میں کہتا ہوں یہاں الہام سے مراد نفس کے اندر فجور کی صورت کا پیدا کرنا ہے جیسا کہ عبداللہ بن مسعود کی حدیث میں گزر چکا ہے، پس الہام اصل میں اس صورت علمیہ کو پیدا کرنا ہے کہ جس سے وہ عالم ہو جاتا ہے، پھر مجازاً اس صورت اجمالیہ کو کہنے لگے جو مبدا آثار ہوتی ہے اگرچہ اس سے علم حاصل نہ ہو، واللہ اعلم۔

کتاب وسنت کے اتباع کا بیان

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو تحریف کے سب راستوں سے ڈرایا اور سخت منع فرمایا اور اس بارے میں اپنی امت سے عہد و پیمان لئے، پس سستی کا سب سے بڑا سبب سنت کو چھوڑ دینا ہے اور اس بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ہے ''مجھ سے پہلے خدا تعالیٰ نے کوئی نبی اس کی امت میں ایسا نہیں بھیجا جس کی امت میں سے اس کے حواری اور ایسے اصحاب نہ ہوں جو اس کی سنت پر عمل کرتے اور اس کے حکم کی فرمانبرداری کرتے ہیں، پھر ان کے بعد نااہل لوگ پیدا ہو جاتے ہیں جو کچھ وہ کہتے ہیں کرتے نہیں ہیں اور جن باتوں کا حکم ان کو نہیں ہوتا وہ کرتے ہیں، پس جو ان سے ہاتھ کے ساتھ جہاد کرے وہ مومن ہے اور جو ان سے زبان سے جہاد کرے وہ مومن ہے اور جو ان سے دل سے جہاد کرے وہ بھی مومن ہے، اور اس کے بعد رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان نہیں ہے''۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''میں تم میں سے کسی کو ایسی حالت میں نہ پاؤں کہ اپنے تخت پر تکیہ لگائے ہوئے ہو اور اس کے پاس میرا کوئی حکم آئے جس کا میں نے امر کیا ہو یا نہی کی ہو تب وہ کہنے لگے میں کچھ نہیں جانتا جو کچھ ہم نے کتاب اللہ میں پایا اس کا ہم نے اتباع کیا'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سنت پر عمل کرنے کی بڑی تاکید فرمائی ہے خاص کر جبکہ لوگ مختلف ہوں، اور تشدد کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث ہے'' اپنی جانوں پر سختی نہ کرو۔ پھر خدا تعالیٰ بھی

تمہارے اوپر سختی کرے گا''۔ اور اسی طرح عبداللہ بن عمرو اور کچھ لوگوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کو کم سمجھ کر عبادات شاقہ کا قصد کیا تھا تو آپ نے ان کو منع فرمایا اور تعمق و تکلف کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''لوگوں کا کیا حال ہو گیا ہے کہ ایک چیز کو میں تو کر لیتا ہوں اور وہ اس سے پرہیز کرتے ہیں، بخدا میں ان سے زیادہ خدا کو جانتا ہوں اور ان سے زیادہ خدا سے ڈرتا ہوں''۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''ہدایت پر ہونے کے بعد کوئی قوم گمراہ نہیں ہوئی بجز اس صورت کے کہ وہ باہمی جھگڑے میں پڑ گئے''۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''تم اپنی دنیا کی باتوں سے خوب واقف ہو، اور خلط (۱) کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ہے جو آپ نے ایک صحابی سے فرمایا تھا جو علم یہود سیکھنا چاہتے تھے۔ ''کیا تم بھٹکتے پھرتے ہو جس طرح یہود ونصاریٰ بھٹکتے پھرتے ہیں، میں تمہارے پاس روشن اور صاف دین لیکر آیا ہوں اگر موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے تو ان کو بھی میری اتباع کے سوا چارہ نہ ہوتا''۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اس شخص کو سب سے زیادہ مبغوض قرار دینا ہے جو اسلام میں جاہلیت کی باتوں کا طالب ہے'' اور استحسان کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ہے ''جو شخص ہمارے اس دین میں ایسی بات پیدا کرے جو اس میں نہیں ہے تو وہ رد ہے''۔ اور ملائکہ کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک ایسے شخص کے ساتھ تشبیہ دینا ہے جس نے ایک مکان بنایا اور اس نے کھانا تیار کیا اور ایک شخص کو لوگوں کے بلانے کے لئے بھیجا (۲)۔

میں کہتا ہوں اس میں لوگوں کو مامور بنانے کی طرف اشارہ ہے اور پورے طور پر سمجھانے کے لئے اس کو بہ منزلہ امر محسوس کے کر دینا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''میری مثال اس شخص کی سی ہے جس نے آگ روشن کی'' الحدیث، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، تیری مثال اور اس چیز کی مثال جس کو خدا نے مجھے دیکر بھیجا ہے، اس شخص جیسی ہے جو ایک قوم کے پاس آئے اور کہے اے قوم! میں نے اپنی آنکھوں سے لشکر کو دیکھا ہے''۔ الحدیث۔ یہ حدیث اس امر پر صریح دلیل ہے کہ بعض اعمال بذات خود بعثت سے قبل عذاب آنے کے مستوجب ہوتے ہیں، اور نبی

---

(۱) یعنی اسلام میں اور مذہب کو ملانا۔ (۲) اس کا اخیر یہ ہے پس جس نے اس داعی کا کہنا مانا وہ گھر میں آیا اور اس نے کھانا بھی کھایا اور جس نے کہنا نہ مانا وہ گھر میں نہ آیا اور نہ اس نے کھانا کھایا۔

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس ہدایت اور علم کے ساتھ خدا تعالیٰ نے مجھ کو بھیجا ہے اس کی مثال اس کثیر بارش کی سی ہے جو زمین پر برسا''۔الحدیث۔اس حدیث میں اس امر کا بیان ہے کہ اہل علم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کو دو طریقوں میں سے کسی ایک طریقہ سے قبول کرلیا، یا صریح روایت کے ذریعہ سے یا دلالت روایت کے ذریعہ سے، بایں طور کہ انھوں نے شریعت پر عمل کیا، پس لوگوں نے ان کی رہبری سے ہدایت پائی، اور اہل جہل نے اس ہدایت کو بالکل قبول نہیں کیا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نصیحت میں جو نہایت تاکید سے لوگوں کو فرمائی تھی اس میں کہا تھا میرے طریقہ کو اور میرے خلفا راشدین مہدیین کے طریقہ کو اپنے اوپر لازم کر لینا''۔

میں کہتا ہوں دین کا انتظام نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے اتباع پر موقوف ہے اور سیاست کبریٰ کا انتظام اس پر موقوف ہے کہ خلفا تدابیر ملکی اور جہاد سے متعلق جن امور کا اپنے اجتہاد سے حکم دیں ان کے حکم اطاعت کی جائے بشرطیکہ ان کا یہ حکم شریعت کے حق میں بدعت نہ ہو اور نہ ہی خلاف نص ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کے سامنے ایک خط کھینچا اور فرمایا یہ خدا تعالیٰ کا راستہ ہے پھر اس خط کے دائیں بائیں اور خطوط کھینچے اور فرمایا یہ بھی راستے ہیں ان میں سے ہر راستہ پر شیطان بیٹھا ہوا ہے جو لوگوں کو اپنی طرف بلاتا ہے، اور آپ نے یہ آیت پڑھی ''تحقیق یہ میرا سیدھا راستہ ہے اسی پر تم چلو دوسرے راستوں پر مت چلو ورنہ خدا تعالیٰ کے راستہ سے بچھڑ جاؤ گے''۔

میں کہتا ہوں کہ فرقہ ناجیہ وہ ہے جو تمام عقائد اور اعمال کے اندر اس پر عمل کرتے ہیں جو کتاب وسنت سے ظاہر ہے اور جس پر جمہور صحابہ وتابعین نے عمل کیا ہے اگر چہ وہ ان باتوں کے اندر مختلف ہوں جن میں کوئی نص مشہور نہیں ہے نہ ان پر صحابہ کا اتفاق ظاہر ہوا ہے اور ان کے بعض اقوال سے استدلال کرتے ہوں اور مجمل کی تفسیر کرتے ہوں۔

اور غیر ناجیہ ہر وہ فرقہ ہے جو سلف کے عقیدہ کے خلاف کوئی عقیدہ رکھے یا ان کے عمل کے خلاف کوئی عمل نکالے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''یہ امت گمراہی پر اتفاق نہ کرے گی، اور فرمایا ''ہر صدی کے بعد خدا تعالیٰ اس امت میں ایسے شخص کو پیدا کرتا رہے گا جو اس امت کے لئے اس کے دین کو نیا کرتا رہے گا'' اور اس حدیث کی تفسیر دوسری حدیث میں ہے ''ہر خلف کے عادل لوگ اس علم کا بار

اٹھائیں گے جو اس سے آمیزش کرنے والوں کی تحریف، جھوٹوں کی کج روی اور جاہلوں کی تاویل کو دور کریں گے۔

واضح ہو کہ لوگوں نے جب دین میں اختلاف اور زمین میں فساد پھیلایا تو اس شئے نے جود الٰہی کے دروازہ کو کھٹکھٹایا پس خدا تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا اور آپ کے ذریعہ سے دین کی کجی کی درستی کا ارادہ فرمایا، پھر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عالم سے وفات پائی تو بعینہٖ یہ عنایت الٰہی اس طرف متوجہ ہوئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علم و رشد کو امت میں محفوظ رکھے، پس اس نے ان میں الہامات اور تقریبات پیدا کر دیں۔ پس قیامت تک ان میں ہدایت برقرار رکھنے کا حظیرۃ القدس میں ایک داعیہ رہتا ہے پس اس وجہ سے ضرور ہوا کہ ان میں ہمیشہ ایک ایسا گروہ رہے جو امر الٰہی پر قائم ہو وہ سب کے سب گمراہی پر اتفاق نہ کریں اور قرآن ان میں محفوظ رہے، اور ان کے اختلاف استعداد کی وجہ سے یہ بات بھی ضروری ہوئی کہ ہدایت پانے کے باوجود لوگوں میں کچھ رد و بدل ہو پس عنایت الٰہی ایسے لوگوں کی منتظر ہوئی جو مستعد ہوں اور ان کو عظمت دی گئی ہو، پس اس عنایت الٰہی نے ان کے دلوں میں ان امور کو پیدا کیا کہ علم میں رغبت کریں اور غالی لوگوں کی تحریف کو دور کریں، اور یہ تخی اور تکلف کی طرف اشارہ ہے، اور جھوٹوں کی کج روی کو دور کریں، اور یہ استحسان کی طرف اور مذہب کے ساتھ دوسرے مذہب کو خلط ملط کرنے کی طرف اشارہ ہے، اور جاہلوں کی تاویل دور کریں، اور یہ سستی کی طرف اور ضعیف تاویل کر کے مامور بہ کے ترک کی طرف اشارہ ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''خدا تعالیٰ جس شخص کی بہتری چاہتا ہے اس کو دین کی سمجھ عطا فرماتا ہے''۔ اور آپ نے فرمایا علما انبیا کے وارث ہیں'' اور آپ نے فرمایا ''عالم کو عابد پر ایسی فضیلت ہے جیسی مجھ کو تم میں سے کسی ادنیٰ شخص پر فضیلت ہے'' اور اسی قسم کی اور حدیثیں فرمائی ہیں۔

واضح ہو کہ جب کسی شخص پر عنایت الٰہی کا ورود ہوتا ہے اور خدا تعالیٰ اس کو تدبیر الٰہی کا اہل بناتا ہے تو ضرور اس پر خدا تعالیٰ کی رحمت ہوتی ہے اور فرشتوں کو اس کی محبت اور تعظیم کا حکم ہوتا ہے جیسا کہ اس حدیث میں ہے جس میں جبرئیل کو محبت رکھنے کا اور زمین میں مقبولیت پھیلانے کا حکم ہونا بیان ہے اور جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی تو وہی عنایت جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم

کے ساتھ خاص تھی آپ کی ملت کی حفاظت کے لحاظ سے علمارواۃ اور اس کی اشاعت کرنے والوں کی طرف متوجہ ہوئی اور ان میں بے شمار فوائد پیدا کر دیئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''خوش رکھے اللہ تعالیٰ اس بندے کو جو میری بات کو سنے اور یاد کرے اور محفوظ رکھے اور پھر جیسا سنا تھا ویسا ہی بیان کر دے۔

میں کہتا ہوں کہ اس فضیلت کا سبب یہ ہے کہ یہ شخص اس قابل معلوم ہوتا ہے کہ ہدایت نبوی کو مخلوق کی طرف پہنچادے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو شخص قصداً مجھ سے جھوٹ بولے وہ دوزخ میں اپنا ٹھکانا بنائے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اخیر زمانہ میں دجال اور کذاب پیدا ہوں گے۔

میں کہتا ہوں کہ جب کہ اخیر زمانوں تک دین کے پہنچنے کا ذریعہ روایت ہی ہے اور جب روایت میں فساد داخل ہو جائے تو پھر اس کا کچھ علاج نہیں اس واسطے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ بولنا گناہ کبیرہ ہوا اور روایت کرنے میں احتیاط واجب ہوئی تاکہ روایت کرنے میں کذب نہ ہو، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''بنی اسرائیل سے روایت کرو اور کچھ مضائقہ نہیں''۔ اور فرمایا ''بنی سرائیل کی نہ تصدیق کرو اور نہ تکذیب''۔

میں کہتا ہوں کہ قابل عبرت امور میں بنی اسرائیل سے روایت کرنا جائز ہے اور جہاں احکام دین اختلاف ہونے سے امن ہو اور اس کے ماسوا میں جائز نہیں۔

اور یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ بہت سے بنی اسرائیل کے قصے جو کتب تفسیر میں بھرے پڑے ہیں، اور اخبار جو علما اہل کتاب سے منقول ہیں وہ اس قابل نہیں ہیں کہ ان پر کسی حکم شرعی یا اعتقاد کو قائم کیا جائے، فتدبر۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس علم سے خدا تعالیٰ کی رضامندی مطلوب ہوتی ہو اس علم کو کوئی شخص متاع دنیا حاصل کرنے کی غرض سے پڑھے تو قیامت کے روز وہ جنت کی خوشبو بھی نہ پائے گا''۔ میں کہتا ہوں کہ دنیوی غرض کے لئے علم دین حاصل کرنا حرام ہے اور جس میں غرض فاسد معلوم ہوتی ہو اس کو سکھلانا بھی چند وجوہ سے حرام ہے۔

ان میں سے ایک یہ ہے کہ ایسا شخص اکثر غرض دنیوی کے واسطے ضعیف تاویل کر کے دین

کے اندر تحریف کر سکتا ہے اس واسطے اس راستہ کو بند کر دینا ضروری ہوا، اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ایسا شخص قرآن وسنت کی حرمت نہ کرے گا اور نہ ان پر عمل کرے گا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس شخص سے کوئی علمی بات جس کو وہ جانتا ہو دریافت کی جائے پھر وہ چھپائے تو قیامت کے روز اس کو آگ کی لگام دی جائے گی''۔

میں کہتا ہوں کہ علم کا چھپانا جس وقت کہ اس کے بیان کرنے کی ضرورت ہو حرام ہے اس واسطے کہ یہی سستی کی اصل ہے اور احکام دینی کے نسیان کا سبب ہے اور آخرت کی جزائیں اعمال کی مناسبت سے ہوتی ہیں، پس جبکہ گناہ بیان مسئلہ سے زبان کا روکنا تھا۔ تو زبان کے بند کرنے کے ہم شکل سزا دی گئی اور وہ ہم شکل شئے آگ کی لگام ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''علم تین ہیں آیت محکمہ، یا سنت قائمہ یا فریضہ عادلہ، اور جو اس کے سوا ہے وہ زیادہ ہے۔

میں کہتا ہوں یہ اس انضباط اور حد کو بیان کرنا ہے جس کا سیکھنا لوگوں پر واجب بالکفایہ ہے، پس قرآن کا لفظاً سیکھنا اور بذریعہ بحث الفاظ غریبہ کی شرح سے اس کے محکم کی معرفت اسباب نزول اور وقت طلب امر کی توجیہ اور ناسخ ومنسوخ کی معرفت ضروری ہے، لیکن متشابہ سو اس کا حکم یا توقف ہے یا محکم کی طرف رجوع کر لینا ہے، اور سنت قائمہ وہ ہے جو عبادات اور معاملات میں ان شرائع اور سنن سے ثابت ہو جن پر علم فقہ مشتمل ہے، اور سنت قائمہ وہ ہے جو نہ منسوخ ہو، نہ متروک ہو اور نہ اس کا کوئی راوی چھوٹا ہو اور جمہور صحابہ وتابعین کا اس پر عمل رہا ہو، ان سب میں اعلیٰ وہ ہے جس پر فقہا مدینہ وکوفہ متفق ہوں اور اس کی علامت یہ ہے کہ اس پر مذاہب اربعہ متفق ہوں، اس کے بعد وہ ہے جس میں جمہور صحابہ کے دو قول یا تین قول ہوں اور ہر قول پر اہل علم کے ایک گروہ نے عمل کیا ہو، اور اس کی شناخت یہ ہے کہ موطا اور جامع عبدالرزاق جیسی کتابوں میں ان کی روایات پائی جاتی ہوں اور اس کے سوا جو کچھ ہے وہ بعض فقہا کا استنباط ہے اور بعض کا نہیں ہے جو تفسیر، تخریج، استدلال اور استنباط کی وجہ سے حاصل ہوا ہے اور وہ سنت قائمہ نہیں ہے۔

اور فریضہ عادلہ، ورثہ کے حصے معلوم کرنا ہے اور اس کے ساتھ وہ ابواب قضا بھی ملحق ہیں جن کے ذریعہ مسلمانوں کے درمیان انصاف کے ساتھ قطع منازعت ہو جائے، پس یہ تین چیزیں ایسی ہیں جن کے واقف سے شہر کا خالی رہنا حرام ہے کیونکہ ان پر دین موقوف ہے اور جو ان کے سوا

ہیں وہ فضل اور زیادتی کے قبیل سے ہیں۔

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مغالطات سے منع فرمایا ہے اور یہ وہ مسائل ہیں جن سے مسئول عنہ غلطی میں پڑتا ہے اور ان سے لوگوں کے اذہان کا امتحان لیا جاتا ہے اور ان سے منع کرنے کی کئی وجوہ ہیں، ایک تو یہ ہے کہ ایسی باتوں میں مسئول عنہ کو ایذا اور ذلت اور پوچھنے والے کو تکبر اور عجب حاصل ہوتا ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اس سے تعمق کا دروازہ کھلتا ہے اور صحیح وہ ہے جس پر صحابہ اور تابعین تھے کہ ظاہر سنت پر مطلع ہونا چاہئے، اور جو ایماء و اقتضا اور فحوائے کلام سے بہ منزلہ ظاہر کے ہے اس پر مطلع ہونا چاہئے اور بہت امعان مناسب نہیں ہے اور نہ ہی اجتہاد میں مشغول ہونا مناسب ہے جب تک کہ اس کی ضرورت نہ پڑے اور حادثہ پیش نہ آئے کیونکہ اس وقت خدا تعالیٰ اپنی عنایت سے جو لوگوں پر صحیح علم عطا کر دیتا ہے اور پہلے سے اس کے لئے جلدی کرنے میں غلطی کا امکان ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو شخص اپنی رائے سے قرآن میں کوئی بات کہے اس کو اپنی جگہ دوزخ میں بنانا چاہئے''۔

میں کہتا ہوں جو شخص اس زبان سے جس میں قرآن نازل ہوا ہے واقف نہ ہو اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم، آپ کے صحابہ اور تابعین سے الفاظ غریبہ کی شرح سبب نزول اور ناسخ و منسوخ کے بارے میں جو منقول ہے اس سے واقف نہ ہو تو اس کے لئے تفسیر میں خوض کرنا حرام ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قرآن میں جھگڑا کرنا کفر ہے''۔

میں کہتا ہوں کہ مجادلہ حرام ہے اور وہ مجادلہ یہ ہے کہ کوئی شخص حکم منصوص کو کسی شبہ سے جو اس کے دل میں واقع ہوا ہے رد کرے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''تم سے پہلے لوگ اسی سبب سے ہلاک ہوئے کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کی کتاب کے بعض کو بعض سے لڑایا''۔

میں کہتا ہوں کہ قرآن کے ساتھ تدافع کرنا حرام ہے اور وہ تدافع یہ ہے کہ ایک شخص کسی آیت سے کوئی مسئلہ ثابت کرے اور دوسرا شخص اپنا مذہب ثابت کرنے کے لئے اور دوسرے کی بات باطل کرنے کے لئے یا بعض ائمہ کے مذہب کو بعض پر غالب کرنے کے لئے دوسری آیت کو پیش کرے اور اس کا پورا پورا قصد اظہار حق نہ ہو، اور اسی طرح سنت کے ساتھ تدافع کرنا حرام

ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" ہر آیت کے لئے ایک ظاہر اور ایک باطن ہے اور ظاہر و باطن کو سمجھنے کے ہر درجہ کے لئے ایک خاص استعداد ہوتی ہے"۔

میں کہتا ہوں کہ زیادہ تر قرآن میں صفات الٰہی کا بیان، اس کی عجائب قدرت، احکام اور قصص، کفار پر احتجاج اور جنت و دوزخ کے ساتھ موعظت کرنا ہے پس قرآن کا ظاہر یہ ہے کہ جس کے لئے کلام لایا گیا ہے اس کا پورا پورا علم حاصل ہو جائے، اور اس کا باطن آیات صفات میں، نعمائے الٰہی میں فکر اور غور کرنا ہے، اور آیات احکام میں ایما اور اشارہ اور فحوی اور اقتضا سے مسائل کا استنباط کرنا ہے، جس طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس آیت "وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا" سے اس بات کا استنباط کیا ہے کہ مدت حمل کی کبھی چھ ماہ بھی ہوتی ہے، کیونکہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے "حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ"۔

اور قصص میں اس کا باطن کا ثواب اور مدح، یا عذاب اور ذم کے مدار کی معرفت ہو، اور موعظت میں اس کا باطن رقت قلب اور خوف ورجا کا ظاہر ہونا، اور اسی قسم کی اور باتیں ہیں اور ہر حد کے مطلع سے مراد وہ استعداد ہے جس سے وہ حد حاصل ہوتی ہے جیسے زبان اور آثار سے واقف ہونا اور جیسے ذہن کی صفائی اور سمجھ کی پختگی کا ہونا، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "اس کتاب میں سے کچھ آیتیں محکم ہیں اور وہ کتاب کی اصل ہیں اور کچھ آیات متشابہات ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ بظاہر محکم وہ ہے جس میں ایک وجہ کے سوا دوسری وجہ کا احتمال نہ ہو جیسے یہ آیت ہے "تم پر تمہاری مائیں، تمہاری بیٹیاں اور تمہاری بہنیں حرام ہیں"۔ اور متشابہ وہ ہیں جس میں چند احتمالات ہوں اور ان میں سے بعض مراد ہو، جیسے خدا تعالیٰ کا قول ہے "ان لوگوں پر جو ایمان لائے اور نیک کام کئے اس شئے کے بارے میں کوئی گناہ نہیں جو انھوں نے کھایا"۔ کج فہموں نے اس آیت کو اس پر محمول کیا کہ جب تک کسی پر ظلم یا زمین میں فساد نہ ہو شراب کا پینا درست ہے، اور صحیح یہ ہے کہ یہ آیت ان لوگوں کے حق میں ہے جو تحریم سے پیشتر شراب پیتے تھے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اعمال کا مدار نیت پر ہے"۔

میں کہتا ہوں کہ نیت، قصد اور ارادہ کو کہتے ہیں، اور یہاں نیت سے مراد علت غائیہ ہے جو انسان کو خیال میں آنے کے بعد کسی کام پر آمادہ کرتی ہے جیسے اللہ تعالیٰ سے ثواب اور رہنما کا

طلب کرنا، اور حدیث کے معنی یہ ہیں کہ نفس کی تہذیب اور اس کی کجی کے دور کرنے میں اعمال کا کچھ اثر نہیں ہوتا جب تک کہ وہ کسی ایسے مقصد کے تصور کرنے سے صادر نہ ہوں جس کو تہذیب نفس سے تعلق ہوتا ہے، اور عادت یا لوگوں کی موافقت یا ریا، اور سمعہ یا اقتضا جبلی کی وجہ سے صادر نہ ہوں جیسے اس بہادر آدمی سے قتال کا سرزد ہونا جو جنگ کے بغیر نہیں رہ سکتا اور اگر کفار سے مقابلہ پیش نہ آتا تو اس شجاعت کو مسلمانوں کے قتال میں صرف کرتا اور ایسے ہی شخص کی نسبت کسی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا تھا کہ ایک شخص دکھاوے کی غرض سے قتال کرتا ہے اور ایک شخص اپنی شجاعت کی وجہ سے پس ان دونوں میں سے کون سا خدا کی راہ میں قتال کرتا ہے، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو شخص اس لئے لڑتا ہے کہ خدا کا بول بالا ہو تو اس کا لڑنا خدا کے لئے ہے''۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ دل کا ارادہ روح ہے اور اعمال اس کی صورت اور جسم ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''حلال بھی ظاہر ہے اور حرام بھی ظاہر ہے اور ان دونوں کے درمیان مشتبہات ہیں، پس جو شخص شبہات سے بچا اس نے اپنا دین اور اپنی عزت کو بچالیا''۔

میں کہتا ہوں کہ کبھی ایک مسئلہ میں چند وجوہ متعارض ہوتی ہیں تو اس وقت میں احتیاط اور اس سے بچنا سنت ہے پس تعارض کی ایک صورت تو یہ ہے کہ صراحتاً روایات مختلف ہوں جیسے مس ذکر سے وضوٹوٹتا ہے یا نہیں، بعض نے اس کو ثابت کیا ہے اور بعض نے اس کی نفی کی ہے اور ہر ایک کے پاس حدیث ہے جس سے وہ شہادت پیش کرتا ہے، اور جیسے محرم کا نکاح ہے اس کو ایک گروہ نے جائز رکھا ہے اور دوسروں نے اس کی نفی کی ہے اور روایتیں مختلف ہیں اور تعارض کی ایک صورت یہ ہے کہ اس باب میں جو لفظ استعمال کیا گیا ہے اس کے معنی منضبط نہیں ہیں، یعنی اس کے معنی تقسیم اور مثال سے معلوم ہوتے ہیں اور ایک جامع مانع تعریف سے اس کے معنی معلوم نہیں ہوتے تو وہاں تین مادے پیدا ہوتے ہیں ایک تو وہ مادہ (۱) ہے جہاں اس لفظ کا یقیناً اطلاق ہوتا ہے اور ایک وہ مادہ ہے جہاں یقیناً اطلاق نہیں ہوتا اور ایک وہ مادہ ہے جہاں اس لفظ کے اطلاق کا صحیح ہونا یا نہ ہونا کچھ معلوم نہیں ہوتا اور تعارض کی ایک صورت یہ ہے کہ حکم کا مدار یقیناً کسی علت پر ہوتا ہے جس میں ایک مقصد کا یقینی گمان ہوتا ہے، اور ایک نوع اس کی ایسی ہوتی ہے کہ وہاں مقصد

---

(۱) مادہ سے مراد موقع ہے۔

نہیں پایا جاتا اور علت پائی جاتی ہے۔ جیسے وہ لونڈی جس کو ایسے شخص سے خریدا جس میں جماع کی قابلیت نہیں ہے تو وہ وہاں استبرا(۱) واجب ہے یا نہیں، پس ایسے ایسے مواقع میں احتیاط کی بڑی تاکید ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''قرآن پانچ وجوہ پر نازل ہوا حلال اور حرام اور محکم اور متشابہ اور مثال''۔

میں کہتا ہوں یہ وجوہ کتاب اللہ کے اقسام ہیں اگرچہ مختلف تقسیمات سے ہوں، پس ان میں حقیقی تضاد نہیں ہے اسی واسطے حکم کبھی حلال ہوتا ہے اور کبھی حرام ہوتا ہے اور دین کے اصول میں سے یہ بات ہے کہ جو آیات قرآنی یا احادیث نبوی متشابہات کے قبیل سے ہیں ان میں عقل سے خوض نہ کرنا چاہئے اور اسی قسم کے بہت سے امور ہیں جہاں معلوم نہیں ہوتا کہ کلام کے حقیقی معنی مراد ہیں یا کوئی معنی مجازی مراد ہیں جو حقیقت کے قریب ہیں اور یہ وہاں ہے جہاں امت کا اجماع نہیں ہے اور اس سے شبہ مرتفع نہیں ہوا ہے، واللہ اعلم۔

طہارت کا بیان

واضح ہو کہ طہارت کی تین قسمیں ہیں ایک تو حدث سے طہارت دوسرے اس نجاست سے طہارت جو بدن یا کپڑے یا جگہ سے متعلق ہے، تیسرے بدن سے پیدا ہونے والے میل کچیل سے طہارت ہے جیسے موئے زیر ناف، ناخن اور میل وغیرہ، لیکن احداث سے طہارت حاصل کرنا، سو وہ ''اصول بر'' سے اخذ کی گئی ہے، ناپاکی اور طہارت کی روح کے پہچاننے میں عمدہ ان لوگوں کا وجدان ہے جن کے دلوں میں انوار ملکیہ کا ظہور ہوتا ہے، پس ان کے نفوس اس حالت سے جس کو حدث کہتے ہیں نفرت محسوس کرتے ہیں، اور اس حالت میں جس کا نام طہارت ہے سرور اور انشراح محسوس کرتے ہیں، اور طہارت کی صورتوں کی تعیین میں اور اس کے موجبات کے بارے میں اس امر کا اعتبار ہے جو ملل سابقہ یقینی یہود، نصاریٰ اور مجوس اور بقایا ملت اسماعیلیہ میں مشہور تھا، پس وہ لوگ ناپاکی کی دو قسمیں اور طہارت کی دو قسمیں کرتے تھے جیسا کہ پہلے ہم بیان کر چکے ہیں اور جنابت سے غسل کرنا تمام عرب میں مروج تھا، پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی طہارت کی دونوں قسموں کو حدث کی دونوں قسموں پر تقسیم فرمایا، پس طہارت کبری یعنی غسل کو حدث اکبر یعنی

---

(۱) وضولد سے رحم کے بری ہونے کو معلوم کرنا۔

جناب کے مقابلہ میں رکھا، اس واسطے کہ حدث اکبر قلیل الوقوع اور کثیر التلوث ہے اور وہ ایسے عمل شاق یعنی غسل سے جس کا آدمی کو بہت کم اتفاق ہوتا ہے نفس کو متنبہ کرنے کا زیادہ ضرورت مند ہے اور طہارت صغریٰ وضو کو حدث اصغر کے مقابلہ میں رکھا اور واسطے کہ وہ کثیر الوقوع اور قلیل التلوث ہے اور اس میں نفس کو کسی قدر متنبہ ہو جانا کافی ہے، وہ امور جن میں حدث کے معنی پائے جاتے ہیں فی الحقیقت بے شمار ہیں جن کو اصحاب ذوق سلیم جانتے ہیں لیکن وہ حدث جس سے تمام لوگوں کو مخاطب کیا جا سکے ان محسوس امور میں منضبط ہے جن کا ظاہر میں نفس کے اندر اثر ہوتا ہے تا کہ ظاہر طور پر لوگوں سے اس کی باز پرس ہو سکے اسی واسطے یہ بات مقرر ہوئی کہ مدار حکم اس اشتغال نفس پر نہ رکھا جائے جو معدہ میں معلوم ہوتا ہے بلکہ حدث کے حکم کا دار سبیلین یعنی پیشاب یا پاخانہ کے راستہ سے کسی چیز کے نکلنے پر رکھا جائے کیونکہ پہلی صورت کا کچھ اندازہ نہیں ہو سکتا اور جب معدہ کے اندر کچھ حرکت پائی بھی جائے تو باہر سے وضو کر لینا اس کو رفع نہیں کر سکتا، اور دوسری بات یعنی سبیلین سے کسی شئے کا خارج ہونا حسا معلوم ہو سکتی ہے اور یہ بھی ہے کہ اس میں انقباض نفس کے معنی کی ایک ظاہری صورت ہے اور اس کا قائم مقام یعنی نجاست سے بدن کا آلودہ ہونا پایا جاتا ہے اور نیز نفس کے اندر وضو کا اثر اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جبکہ نفس کو فراغت ہو جائے اور یہ فراغت کسی چیز کے خارج ہونے سے ہوتی ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس کلام میں (تم میں ۔۔۔ شخص ایسی حالت میں نماز نہ پڑھے جبکہ اس کو پیشاب پاخانہ کی حاجت معلوم ہوتی ہو) تنبیہ فرما دی کہ اس میں صرف مشغول ہو جانا بھی حدث کے ایک معنی ہیں، اور وہ امور جن میں طہارت کے معنی پائے جاتے ہیں بہت سے ہیں ۔۔۔ خوشبو لگانا اور وہ اذکار جس اس خصلت یعنی پاکی کو یاد دلاتے ہیں جیسے آپ کا یہ پڑھنا "۔۔۔ے اللہ مجھ کو توبہ کرنے والوں میں سے کر اور مجھ کو پاکیزہ لوگوں میں سے کر"۔ اور آپ کا یہ فرمانا "اے اللہ مجھ کو گناہوں سے ایسا پاک صاف کر جیسے سفید کپڑہ میل سے صاف ہو جاتا ہے"۔ اور پاکیزہ جگہو ۔۔۔ جانے سے بھی طہارت حاصل ہوتی ہے وغیر ذالک، لیکن وہ طہارت جس سے سب لوگوں کو مخاطب کر سکیں ایسی ہونا چاہئے جو منضبط و معین چیز ہو اور ہر وقت اور ہر جگہ لوگوں کو حاصل ہو سکے اور بظاہر اس کا اثر معلوم ہوتا ہو اور لوگوں میں اس کا دستور رہا ہو، وضو کے اندر اصل اعضا کا دھونا ہے اس واسطے شارع نے منہ اور دونوں

ہاتھوں کا کہنیوں تک دھونا مقرر کیا کیونکہ اس سے کم کا اثر محسوس نہیں ہوتا، اور پیروں کا ٹخنوں تک دھونا مقرر کیا کیونکہ اس سے عضو نا تمام ہے اور سر کے واسطے مسح مقرر کیا کیونکہ اس کے دھونے میں ایک طرح کی دقت ہے اور غسل کے اندر اصل تمام بدن کا دھونا ہے، اور سبب وضو میں اصل وہ شئے ہے جو پیشاب پاخانہ کے راستہ سے نکلے اور جو اس کے علاوہ ہے وہ اسی پر محمول ہے، اور سبب غسل میں اصل جماع اور حیض ہے، اور گویا یہ دونوں امر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پیشتر عرب میں مسلم تھے، اور طہارت کی دوسری دونوں قسمیں تمدنی زندگی سے ماخوذ ہیں کیونکہ یہ دونوں (۱) اصل طبیعت انسانی کی مقتضی ہیں، ان سے کوئی قوم اور کوئی ملت خالی نہیں ہے اور اس بارے میں شارع نے عرب خالص کا اعتبار کیا جن کو اوسط درجہ کی خوش حالی حاصل تھی جس طرح اور باقی تمدنی زندگی درست کرنے میں انہیں کا اعتبار کیا، پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سوائے اس کے کوئی بات زیادہ نہیں کی کہ آداب معین کر دیے، جہاں اشکال تھا اس کو صاف کر دیا اور جہاں ابہام تھا اس کا اندازہ کر دیا۔

وضو کا بیان: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''طہارت نصف ایمان ہے''۔

میں کہتا ہوں یہاں ایمان سے ایک ایسی ہیئت نفسانیہ مراد ہے جو نور طہارت اور خشوع سے مرکب ہے، اور لفظ احسان اس معنی میں ایمان سے زیادہ واضح ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ طہارت اس کا نصف ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس شخص نے وضو کیا اور اچھی طرح سے کیا تو اس کے گناہ اس کے جسم سے نکل جاتے ہیں حتی کہ اس کے ناخونوں کے نیچے سے بھی نکل جاتے ہیں۔

میں کہتا ہوں وہ پاکیزگی جو اصل نفس میں اثر کرتی ہے نفس کو مقدس کر کے ملائکہ کے ساتھ ملحق کر دیتی ہے اور بہت سے ناپاک حالات کو محو کر دیتی ہے پس اس پاکیزگی کی خاصیت ہی وضو کی خاصیت کر دی گئی جو طہارت کی صورت اور اس کا مظنہ اور اس کا عنوان ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت کے روز میری امت کو پکارا جائے گا اور وضو کے آثار سے ان کے چہرے اور ہاتھ پاؤں روشن ہوں گے پس تم میں سے جو کوئی اپنا نور بڑھا سکے وہ بڑھا لے'' نبی صلی اللہ علیہ وسلم

---

(۱) تطیب اور حلول۔

نے فرمایا ''جہاں تک وضو کا پانی پہنچے گا وہیں تک مومن کو جنت کا زیور پہنایا جائے گا''۔

میں کہتا ہوں کہ جبکہ طہارت کی صورت پانچ اعضا کے ساتھ متعلق تھی تو نفس کا طہارت کے ساتھ تنعم حاصل کرنا ان اعضا کے لئے زیور اور روشن ہونے کی صورت میں ظاہر ہوا جس طرح بزدلی خرگوش کی صورت میں اور شجاعت شیر کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''مومن کے سوا وضو پر کوئی مداومت نہیں کرسکتا''۔

میں کہتا ہوں کہ جب وضو پر مداومت ایک دشوار امر تھا جس کو وہی شخص کرسکتا ہے جس کو طہارت کے بارے میں بصیرت حاصل ہو اور اس کے نفع عظیم کا اس کو یقین ہو اس لئے اس کی مداومت کو ایمان کی علامت بنادیا گیا۔

کیفیت وضو کا بیان

وضو کی کیفیت جس طرح حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت عبداللہ بن زید وغیرہم رضی اللہ عنہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کی ہے بلکہ جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بالتواتر ثابت ہے اور امت نے اس پر اتفاق کیا یہ ہے کہ پانی کے برتن میں ہاتھ ڈالنے سے پیشتر اپنے دونوں ہاتھ دھوئے اور کلی کرے اور ناک میں پانی ڈالے اور اس کو صاف کرے اس کے بعد اپنا منہ دھوئے پھر اپنے دونوں ہاتھ کہنیوں تک دھوئے پھر سر کا مسح کرے پھر اپنے دونوں پاؤں ٹخنوں تک دھوئے۔

اور ان لوگوں کے قول کا کوئی اعتبار نہیں جن میں گمراہی سرایت کرگئی اور انھوں نے ظاہر آیت سے استدلال کرکے پاؤں کے دھونے سے انکار کردیا کیونکہ میرے نزدیک جو شخص ایسی بات کہے اور وہ شخص جو جنگ بدر جنگ احد سے جو آفتاب فی رابعۃ النہار کی طرح ثابت ہے منکر ہو دونوں برابر ہیں، ہاں، جو شخص یہ بات کہے کہ احتیاط اس میں ہے کہ پاؤں کے دھونے کے ساتھ ان کا مسح بھی کرے یا یہ کہ ادنیٰ فرض مسح کرنا ہے اگرچہ دھونا بھی ایسا ہے جس کا ترک کرنا سخت قابل ملامت ہے تو یہ ایک ایسی بات ہے کہ علما اس کے اندر جب تک کہ اصل حال منکشف نہ ہو توقف کرسکتے ہیں، اور مجھ کو کوئی ایسی صحیح روایت نہیں ملی جس میں یہ تصریح ہو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بغیر کلی کئے اور بغیر ناک میں پانی ڈالے اور بغیر ترتیب کے وضو کیا، پس یہ وضو میں نہایت موکد امور ہیں، اور یہ دونوں یعنی کلی کرنا اور ناک میں پانی ڈالنا خصال فطرت میں سے دو مستقل

طہارتیں ہیں جو وضو کے ساتھ اس لئے ملادی گئی ہیں کہ وضو کے ساتھ ان کا ایک وقت معین رہے اور اس لئے کہ یہ دونوں جسم کے ان پوشیدہ حصوں میں سے ہیں جو خیال رکھنے کے قابل ہیں اور ان دونوں کا ساتھ ساتھ ہونا بہ نسبت جدا جدا ہونے کے زیادہ مناسبت ہے، اور آداب وضو چند امور میں منحصر ہیں ان میں سے ایک جسم کے ان پوشیدہ حصوں کا خیال رکھنا ہے جن میں بغیر تکلف کے پانی نہیں پہنچتا جیسے کلی کرنا، ناک میں پانی ڈالنا، ہاتھ اور پاؤں کی انگلیوں میں اور داڑھی میں خلال کرنا اور انگوٹھی کو حرکت دینا اور ان میں سے ایک پاکیزگی کو پورا کرنا ہے جیسے تین تین مرتبہ دھونا اور جیسے خوب اوپر تک ہر عضو کا دھونا جو روشنی اور نور کا زیادہ کرنا ہے اور صاف کرنا اور وہ بدن کا ملنا ہے اور سر کے ساتھ دونوں کانوں کا مسح کرنا ہے اور وضو پر وضو کرنا ہے اور ان میں سے ایک امور مہمہ کے اندر ان کی عادت کی موافقت کرنا ہے جیسے دائیں عضو سے شروع کرنا اس لئے کہ دائیں کو بائیں سے قوت اور اولویت ہے پس ان امور میں جو دونوں سے تعلق رکھتے ہیں ابتداء کا حق بھی اسی کو حاصل ہے اور ان امور میں جو استعمال میں کسی ایک کے ساتھ تعلق رکھ سکتے ہیں ان میں سے صرف محاسن اور طیبات کو دائیں کے ساتھ ہی خاص کرنا مناسب ہے، اور ان میں سے ایک دل کی کیفیت کا ان الفاظ کے ساتھ انضباط کرنا ہے جو صراحتاً مقصود پر دلالت کرتے ہیں، اور ذکر قلبی کے ساتھ ذکر لسانی کا ملانا ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس نے خدا کا ذکر نہیں کیا اس کا وضو نہیں ہوا''۔

میں کہتا ہوں کہ واقفین حدیث کا اس کی صحت پر اتفاق نہیں ہے اور اگر صحیح بھی سمجھی جائے تو یہ ان مواضع میں سے ہے جہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھنے کے طریقوں میں اختلاف واقع ہوا ہے، پس اہل اسلام ہمیشہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وضو کو بیان کرتے رہے اور لوگوں کو سکھلاتے رہے اور بسم اللہ کا ذکر بھی نہیں کرتے تھے حتی کہ اہل حدیث کا زمانہ ظاہر ہوا، اور اس حدیث میں اس بات کی نص ہے کہ بسم اللہ یا تو وضو کا رکن ہے یا اس کی شرط ہے، اور دونوں وجہوں میں اس طرح مطابقت ہو سکتی ہے کہ حدیث میں ذکر سے مراد ذکر قلبی ہے کیونکہ بغیر نیت کے اعمال مقبول نہیں ہوتے، اور اس وقت وضو سے نفس کا رنگین ہونا مراد ہے اور وضو اپنے ظاہر معنی میں مراد نہیں ہے ہاں تسمیہ ایک امر مستحب ہے جیسے اور مستحبات ہیں کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو مہتم

بالشان کام خدا کے نام سے شروع نہ کیا جائے تو وہ خراب ہوتا ہے'' اور بہت سے مواضع پر قیاس کرنے سے اس کا آداب میں داخل ہونا ثابت ہوسکتا ہے اور لا وضو کے ایک معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ اس کا وضو کامل نہیں ہوتا، لیکن میں ایسی تاویل کو پسند نہیں کرتا کیونکہ یہ ایک ایسی بعید تاویل ہے جو اصل لفظ کے مخالف ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' کیونکہ اس کو معلوم نہیں ہے کہ اس کا ہاتھ رات بھر کہاں پڑا رہا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہاتھوں کو دھوئے ہوئے بہت دیر ہو جانے اور بہت دیر تک ان سے بے خبر رہنے میں ظن غالب ہے کہ نجاست اور میل کچیل ان تک پہنچا ہو جس کی وجہ سے اس کے ساتھ ہاتھوں کا پانی میں ڈالدینا پانی کو ناپاک کر دینا یا مکدر کر دینا یا اس میں کراہت پیدا کر دینا ہے اور پانی میں پھونک مارنے سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو منع فرمایا ہے اس کی بھی یہی وجہ ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' جو صبح تک سوتا ہے تو شیطان اس کی ناک پر رات کو رہتا ہے''۔

میں کہتا ہوں کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ نتھنوں میں بلغم اور مواد غلیظہ کا جمع ہو جانا کند ذہنی اور فکر میں نقصان کا سبب ہوتا ہے پس وہ شیطان کو وسوسہ ڈالنے کا اور اس شخص کو تدبر اذکار سے روکنے کا موقع دیتا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' تم میں سے جو شخص وضو کرے اور پورا پورا کرے اور پھر اشهد ان لا اله الا الله، اخیر تک پڑھے اور ایک روایت میں ہے کہ یہ دعا پڑھے اللهم اجعلنی من التوابین واجعلنی من المتطهرین، تو اس کے لئے جنت کے آٹھوں دروازے کھل جاتے ہیں جس میں سے چاہے داخل ہو جائے''۔

میں کہتا ہوں کہ طہارت کی روح بغیر اس کے حاصل نہیں ہوتی کہ عالم غیب کی طرف نفس کی توجہ ہو اور اس کی طلب میں پوری پوری کوشش ہو اس واسطے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لئے ذکر مقرر فرمایا اور اس پر اس طہارت کے فائدہ کو مرتب فرمایا جو نفس کے اندر حاصل تھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کے بارے میں جس نے پورے طور پر وضو نہیں کیا تھا فرمایا'' خرابی ہے ایڑیوں کو آگ سے''۔

میں کہتا ہوں کہ اس میں راز یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان اعضا کا دھونا واجب کیا تو اس

ایجاب نے اقتضا کیا کہ دھونے کے معنی پائے جائیں پس اس نے بعض عضو کو دھویا اور پورے اس عضو کو نہیں دھویا تو یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ اس نے عضو کو دھویا اور نیز آپ کے اس فرمانے میں سستی کا دروازہ بند کر دینا ہے اور ایڑیوں میں آگ اس واسطے لگی کہ پے در پے ناپاکی کا ہونا اور اس کے دور نہ کرنے پر اصرار کا پایا جانا ایسی خصلت ہے جس سے دوزخ کی آگ واجب ہوتی ہے اور ناپاکی سے طہارت حاصل کرنا اس آگ سے نجات کا اور گناہوں کے دور کرنے کا سبب ہے، پس جب ایک عضو میں طہارت کے معنی نہ پائے گئے اور اس میں حکم الٰہی کی تعمیل نہ ہوئی تو یہ اس بات کا سبب بن گیا کہ اس خصلت کی وجہ سے جو نفس کے اندر خرابی کا سبب بنی ہے اس عضو کی طرف سے نفس کے لئے تکلیف ظاہر ہو، واللہ اعلم۔

موجبات وضو کا بیان

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اس شخص کی نماز قبول نہیں ہوتی جس کا وضو جاتا رہا یہاں تک کہ وہ وضو کرے'' اور آپ نے فرمایا ''بغیر طہارت کے نماز مقبول نہیں ہوتی'' اور آپ نے فرمایا ''نماز کی کنجی طہارت ہے''۔

میں کہتا ہوں کہ ان سب احادیث میں اس بات کی تصریح ہے کہ نماز کے لئے طہارت شرط ہے اور طہارت ایک مستقل عبادت ہے جو نماز کے ساتھ مقرر کر دی گئی ہے کیونکہ ان دونوں میں سے ہر ایک کا فائدہ دوسرے پر موقوف ہے اور اس میں نماز کی جو من جملہ شعائر الٰہی کے ہے تعظیم پائی جاتی ہے، ہماری شریعت میں وضو کو واجب کرنے والے امور تین قسم کے ہیں، ان میں سے ایک قسم وہ ہے جس پر جمہور صحابہ نے اتفاق کیا ہے اور اس میں روایتیں متفق ہیں اور اس پر برابر عمل جاری ہے اور وہ بول و براز ہے اور ریح اور مذی ہے اور غفلت کی نیند ہے، اور جو ان کے ہم معنی ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''سرین کا بندھن دونوں آنکھیں ہیں'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''پس جب آدمی لیٹ جاتا ہے تو اس کے جوڑ ڈھیلے پڑ جاتے ہیں''۔

میں کہتا ہوں کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ گہری نیند میں جوڑ ڈھیلے ہو جاتے ہیں اور ریح کے خارج ہونے کا گمان غالب ہوتا ہے اور اس کے ساتھ میں ایک سبب اور بھی پاتا ہوں وہ یہ ہے کہ نیند نفس کو سست کرتی ہے اور حدث جیسا کام کرتی ہے، مذی کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا ''اپنے آلہ تناسل کو دھو لے اور وضو کر لے۔

میں کہتا ہوں کہ اس میں شک نہیں کہ ملاعبت کرنے سے جو مذی باہر آتی ہے اس میں شہوت کا پورا کرنا ہے جس کا درجہ شہوت جماع سے کم ہے اس واسطے اس کے لئے مناسب یہ ہے کہ ایسی طہارت واجب کی جائے جو طہارت کبریٰ سے کم درجہ کی ہو، جس شخص کو ریح کے خروج کا شک ہو اس کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جب تک آواز نہ سنے یا بو نہ محسوس کرے مسجد سے باہر نہ جائے''۔

میں کہتا ہوں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک اس کو یقین نہ ہو جائے جبکہ وضو کے حکم کا مدار سبیلین سے کوئی چیز خارج ہونے پر ہے تو اس کا مقتضی یہ ہے کہ اس شئے میں جو حقیقت میں ہے اور اس شئے میں جو مشتبہ ہے اور واقع میں نہیں ہے تمیز کی جائے اور اس سے مقصود تکلف اور شک کا دور کرنا ہے اور موجبات وضو کی دوسری قسم وہ ہے جس میں فقہا صحابہ اور تابعین سلف کا اختلاف ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایات مختلف مروی ہیں جیسے مس ذکر سے وضو کا واجب ہونا اس واسطے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس شخص نے آلہ تناسل کو ہاتھ لگایا اس کو وضو کرنا چاہئے''۔ حضرت عبداللہ بن عمر اور سالم اور عروہ وغیرہم کا یہی قول ہے، اور حضرت علی اور عبداللہ بن مسعود اور فقہا کوفہ نے اس کو رد کر دیا اور ان کے لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول دلیل ہے ''وہ بھی بدن کا ایک ٹکڑا ہے'' اور دونوں حدیثوں میں سے کسی ایک کا منسوخ ہونا یقینی نہیں ہے اور جیسے عورت کو ہاتھ لگانا، حضرت عمر اور ابن مسعود اور ابراہیم عورت کو ہاتھ لگانے سے وضو کے وجوب کے قائل ہیں اس واسطے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے ''یا عورتوں کو تم نے چھوا ہو'' اور کوئی حدیث اس کی شاہد نہیں ہے بلکہ حضرت عائشہ کی حدیث اس کے خلاف شہادت دیتی ہے لیکن اس حدیث میں کلام ہے کیونکہ اس کی سند منقطع ہے اور میرے نزدیک اس قسم کی علت یعنی حدیث کی اسناد کا منقطع ہونا اس وقت معتبر ہے جب ایک حدیث کو دوسری حدیث پر ترجیح دی جائے اور جبکہ دوسری حدیث نہ ہونے سے تعارض نہ ہو تو اس ایک حدیث کو ترک کرنے کے لئے اس علت کا کچھ اعتبار نہ کیا جائے گا، واللہ اعلم۔

حضرت عمر اور حضرت عبداللہ بن مسعود کے نزدیک جنابت میں تیمم کرنا درست نہیں ہے

اس واسطے ان کے نزدیک یہ آیت لمس پر محمول ہے لیکن حضرت عمران اور عمار اور عمرو بن العاص کے نزدیک جنابت میں تیمّم کرنا درست ہے اور اس پر اجماع منعقد ہو چکا ہے، اور حضرت عبداللہ بن عمر احتیاط پر عمل کرتے تھے اور ابراہیم عبداللہ بن مسعودؓ کی پیروی کرتے تھے حتیٰ کہ امام ابوحنیفہ پر اس دلیل کا حال ظاہر ہو گیا جس سے عبداللہ بن مسعودؓ نے تمسک کیا تھا تب ابوحنیفہ نے ان کے قول کو ترک کر دیا باوجودیکہ وہ ابراہیمؒ کے مذہب کا بہت اتباع کرتے تھے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ ان دونوں چیزوں یعنی مس ذکر اور حس میں صحابہ اور تابعین کے بعد فقہا کے تین طبقے ہو گئے ایک طبقہ نے ان کے ظاہر کو لیا اور ایک نے بالکل ہی ترک کر دیا اور ایک نے شہوت اور عدم شہوت سے ہاتھ لگانے کا فرق کیا، اور ابراہیم کے نزدیک بہتے ہوئے خون کے نکلنے اور قئے کثیر سے وضو لازم آتا ہے اور حسن کے نزدیک نماز میں قہقہہ لگانے سے وضو لازم آتا ہے اور دوسرے لوگ اس کے قائل نہیں ہیں اور ان سب کے بارے میں احادیث ہیں جن کی صحت پر علما حدیث نے اتفاق نہیں کیا ہے۔

اور اصح یہ ہے کہ جس نے احتیاط کی اس نے اپنے دین کو اور عزت کو محفوظ رکھا اور جس نے احتیاط نہ کی تو شریعت میں اس پر کوئی جرم نہیں، اور اس میں شبہ نہیں ہے کہ عورت کو ہاتھ لگانے سے ہیجان شہوت ہوتا ہے جو اس شہوت کے پورا کرنے کا مظنہ ہے جو شہوت جماع سے کمتر ہے، اور آلہ تناسل کا چھونا بھی ایک بیہودہ فعل ہے اسی وجہ سے استنجا کے وقت دائیں ہاتھ سے اس کا چھونا منع ہے اور جبکہ وہ آلہ تناسل کو پکڑ لے تو وہ ضرور ایک شیطانی کام ہے اور بہتا ہوا خون اور قئے کثیر بدن کو آلودہ کرنے والی اور نفس کو پلید کرنے والی چیزیں ہیں اور نماز میں قہقہہ لگانا ایک گناہ ہے جس کا کفارہ ہونا چاہئے پس کوئی تعجب کی بات نہیں کہ شارع نے ان چیزوں میں وضو کا حکم دیا ہو اور نہ اس میں تعجب ہے کہ اس نے حکم نہ دیا ہو، اور اس میں بھی تعجب نہیں کہ وضو کی ترغیب دی ہو اور اس کو واجب نہ کیا ہو۔

اور موجبات وضو کی تیسری قسم وہ ہے جس میں حدیث کے لفظ سے شبہۃً وجوب پایا جاتا ہے اور فقہا صحابہ اور تابعین نے اس کے ترک پر اتفاق کیا ہے جیسے آگ کی پکی ہوئی چیز کھانے سے وضو کرنا، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفا اور ابن عباس اور ابوطلحہ وغیرہم کا عمل اس کے خلاف

ثابت ہوگیا ہے اور حضرت جابرؓ نے بیان کیا کہ یہ حدیث منسوخ ہے، اور آگ کی پکی ہوئی چیز کھانے سے وضو کرنے کا سبب یہ تھا کہ یہ وہ ارتفاق کامل ہے جو ملائکہ سے عمل میں نہیں آتا پس یہ ملائکہ کے ساتھ مشابہت کے منقطع ہو جانے کا سبب ہوتا ہے، علاوہ بریں آگ سے پکی ہوئی چیز دوزخ کی آگ کو یاد دلاتی ہے اور اسی لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بلاضرورت داغ دینے سے منع فرمایا، پس اس واسطے انسان کو اپنا دل اس قسم ثالث کے ساتھ مشغول نہ کرنا چاہیئے، لیکن اونٹ کا گوشت کھانے سے وضو کا حکم دینا، پس اس میں دقت ہے، فقہا صحابہ اور تابعین میں سے کوئی اس کا قائل نہیں ہوا اور نہ اس کو منسوخ کہہ سکتے ہیں پس اس لئے جس پر تخریج غالب ہے وہ اس کا قائل نہیں ہوا اور احمد و اسحاق اس کے قائل ہیں اور میرے نزدیک اس میں انسان کو احتیاط کرنا چاہیئے، واللہ اعلم۔

اور جو شخص کہ اونٹ کا گوشت کھانے سے وضو کا قائل ہے اس کے مذہب کے بموجب اس میں راز یہ ہے کہ اونٹ کا گوشت تورات میں حرام کیا گیا تھا اور تمام انبیا بنی اسرائیل اس کی حرمت پر متفق رہے پس جب خدا تعالیٰ نے اس کو ہمارے لئے حلال کر دیا تو دو وجہ سے وضو کرنا مشروع کیا یک تو یہ ہے کہ وضو کرنے میں اس نعمت کا شکر ادا کرنا ہے جو اللہ نے اس کو مباح کر کے ہم پر کی ہے بعد اس کے کہ اللہ تعالیٰ ہم سے پیشتر کے لوگوں پر اس کو حرام کر چکا تھا، دوسری وجہ یہ ہے کہ انبیا بنی اسرائیل پر حرام ہونے کے بعد اس کی اباحت سے شاید کسی کے دل میں کچھ خطرہ سا پیدا ہو تو وضو اس کا علاج ہو جائے کیونکہ حرمت سے ایسی اباحت کی طرف جس سے وضوء واجب ہو جائے انتقال کرنا لوگوں کے اطمینان نفوس کے لئے کسی قدر سہل ہے اور میرے نزدیک یہ بات ہے کہ یہ حکم ابتدا اسلام میں تھا بعد میں منسوخ ہوگیا۔

موزوں پر مسح کرنے کا بیان

جبکہ وضو کا مبنی ان اعضا ظاہرہ کے دھونے پر تھا جو جلدی غبار آلود ہو جاتے ہیں اور پاؤں موزے پہننے کے وقت اعضا باطنہ میں داخل تھے اور موزوں کا پہننا عرب کے نزدیک ایک عادت متعارف تھی اور ہر نماز کے وقت ان کے اتارنے میں دقت تھی اس واسطے ان کے پہننے کے وقت پاؤں کا دھونا فی الجملہ ساقط ہوگیا اور چونکہ ایسی تدبیر اختیار کرنا جس کے ہوتے ہوئے نفس مطلوب

کو آسانی سے نہ چھوڑ دیا کرے تیسیر ہی کی ایک قسم ہے اسی لئے شارع نے یہاں تدبیر کو تین طرح استعمال کیا ان میں سے ایک مسح کی مدت مقیم کے لئے ایک دن رات مقرر کرنا اور مسافر کے لئے تین دن اور تین رات مقرر کرنا ہے کیونکہ ایک دن رات خبر گیری کے لئے ایسی مناسب مقدار ہے جس کو لوگ بہت سے ایسے امور میں جن کی خبر گیری مقصود ہوتی ہے استعمال میں لا تے ہیں، اور تین دن رات کی مدت بھی ایسی ہی ہے پس یہ دونوں مقداریں مقیم اور مسافر پر وقت کے موافق تقسیم کردی گئیں اور ان میں سے دوسری شرط یہ ہے کہ ان کو طہارت کی حالت میں پہنے تا کہ پہننے والے کے سامنے یہ تصور رہے کہ وہ دونوں پاؤں گویا اپنی پہلی طہارت پر باقی ہیں یہ سمجھ کر کہ پوشیدہ اعضا کی طرف گرد وغبار کم پہنچتا ہے اور اس قسم کے خیالات نفس کے تنبیہ کرنے میں موثر ہوتے ہیں۔

اور ان میں سے تیسری چیز یہ ہے کہ پاؤں کے دھونے کے عوض میں موزوں کے اوپر مسح کیا جائے تا کہ یادگار اور نمونہ باقی رہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے "اگر دین میں رائے کو دخل ہوتا تو موزوں کے نیچے کی طرف مسح کرنا اوپر کی جانب مسح کرنے سے بہتر تھا، میں کہتا ہوں کہ جبکہ مسح کرنا پاؤں کے دھونے کا نمونہ تھا اور اس کے سوا اس سے کچھ اور مقصود نہیں ہے اور زمین میں چلتے وقت موزوں کے نیچے کا حصہ ان کے ملوث ہونے کا مظنہ تھا تو اوپر کی جانب مسح کرنا اور نیچے کی جانب نہ کرنا معقول اور رائے کے موافق ہوا، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اسرار شرعی کو سب لوگوں سے زیادہ جانتے تھے جیسا کہ ان کے کلام اور خطبوں سے معلوم ہوتا ہے لیکن انھوں نے رائے کے دخل کو روکنا چاہا تا کہ عام لوگ رائے سے اپنا دین نہ خراب کریں۔

کیفیت غسل کا بیان

غسل کرنے کا طریقہ جیسا کہ حضرت عائشہؓ اور حضرت میمونہؓ نے روایت کیا ہے اور امت کا اس پر اتفاق ہے یہ ہے کہ اپنے دونوں ہاتھوں کو برتن میں ڈالنے سے قبل دھولے پھر اپنے بدن اور شرمگاہ سے نجاست کو دھو ڈالے بعد ازاں وضو کرے جس طرح نماز کے لئے وضو کرتے ہیں پھر اپنے سر میں انگلیوں سے خوب پانی پہنچائے پھر اپنے بدن پر پانی بہائے، صرف ایک بات میں اختلاف ہے کہ پاؤں بعد میں دھوئے یا پہلے دھوئے، اور بعض نے یہ فرق کیا ہے کہ جہاں غسل کا پانی جمع ہوتا ہے وہاں اس جگہ سے الگ ہو کر بعد میں دھوئے ورنہ پہلے دھولے۔

ہاتھوں کو پہلے دھونے کی وجہ تو وضو میں پہلے بیان ہو چکی اور شرمگاہ کو دھونا اس واسطے ہے کہ پانی کے بہانے سے نجاست زیادہ نہ پھیل جائے اور اس کے دھونے میں دقت ہو جائے اور زیادہ پانی کی بھی ضرورت پڑے، اور نیز غسل خالص طہارت حدث کے لئے نہ ہوگا، اور وضو کرنا اس لئے ہے کہ طہارت کبریٰ کے لئے یہ مناسب ہے کہ وہ طہارت صغریٰ اور کچھ زیادہ طہارت پر مشتمل ہوتا کہ طہارت کی خصلت کے لئے نفس زیادہ بیدار رہے، اور نیز غسل کے اندر وضو کو وہ نسبت ہے جو وضو کے اندر جوڑوں کی رعایت رکھنے کو ہے کیونکہ جب سر پر پانی ڈالے گا تو تمام اعضا کو تکلف اور مشقت سے پورا پورا پہنچے گا اور دونوں پاؤں کا بعد میں دھونا اس وجہ سے ہے کہ بلا فائدہ ان کو دوبارہ نہ دھونا پڑے، ہاں اوّل دھو لینا بھی اس وجہ سے مناسب ہے کہ اس میں صورت وضو کی محافظت ہوتی ہے، پھر غسل مستحبات سے کامل ہوتا ہے کہ بدن کو تین مرتبہ دھوئے اور بدن کو ملے اور جہاں پانی بہ تکلف پہنچتا ہے ان کا خیال رکھے اور پردہ کا اہتمام کرے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''خدا تعالیٰ بہت حیا اور پردہ والا ہے''۔ اس کی تفسیر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول سے ہوتی ہے ''وہ حیا اور پردہ کو پسند کرتا ہے'' اور لوگوں سے پردہ کرنا تو واجب ہی ہے اور تنہائی میں بھی اس کو اس طرح سے ہونا کہ اگر کوئی شخص عادۃً اس کے پاس سے گزر جائے تو اس کا ستر نہ دیکھے مستحب ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عورت سے فرمایا ''مشک میں بسا ہوا کپڑا لے اور اس سے پاکی حاصل کر'' یعنی خون کے نشان کو اس کے ذریعہ تلاش کر۔

میں کہتا ہوں: حائضہ کو مشک و خوشبو لگانے کا حکم آپ نے کئی وجوہ سے فرمایا، ان میں سے ایک طہارت کا زیادہ پایا جانا ہے اس لئے کہ خوشبو بھی طہارت کا کام دیتی ہے، اور ہمیشہ خوشبو کا حکم اس واسطے نہیں دیا کہ اس میں لوگوں پر دقت ہے، اور ان میں سے ایک اس بدبو سے بچنا ہے جو حیض کے خون میں ہوتی ہے، اور ان میں سے ایک یہ ہے کہ حیض کا گزرنا اور طہر کا شروع ہونا اولاد کی خواہش کا وقت ہے اور خوشبو اس قوت کو ابھارتی ہے۔

غسل کے لئے پانی کی مقدار ایک صاع سے پانچ مد تک اور وضو کے لئے ایک مد مناسب ہے اس واسطے کہ متوسط جسموں میں یہ مقدار کافی ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہر ہر بال کے نیچے جنابت ہے پس بالوں کو دھوؤ اور جلد کو صاف کرو''۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس

نے جنابت سے ایک بال کی جگہ کو بھی چھوڑ دیا اور اس کو نہ دھویا تو اس جگہ کے ساتھ ایسا ایسا کیا جائے گا۔ میں کہتا ہوں اس میں راز وہی ہے جو ہم نے استیعاب وضو میں بیان کیا کہ ایک ایک بال کی جگہ کو دھونے میں غسل کے معنی کو ثابت کرنا ہے اور جنابت پر باقی رہنا اور اس پر اصرار کرنا دخول نار کا سبب ہے اور جس عضو سے غسل میں خلل واقع ہوا ہے اسی عضو کی طرف سے نفس کو تکلیف ظاہر ہوگی۔

موجبات غسل کا بیان

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جب عورت کے چاروں ہاتھ پاؤں کے درمیان بیٹھ گیا اور پھر اس سے جماع کیا تو غسل واجب ہو گیا اگر چہ اس کو انزال نہ ہو''۔

میں کہتا ہوں اس بات میں روایتیں مختلف ہیں کہ آیا اکسال یعنی جماع بدون انزال کو اس جماع پر محمول کر سکتے ہیں جو قضا شہوت کے معنی میں کامل ہوتا ہے یعنی اس جماع پر جو انزال کے ساتھ ہوتا ہے، پس جو صحیح روایت سے ثابت ہے اور جس پر جمہور فقہا متفق ہیں یہ ہے کہ جس نے عورت سے جماع کیا تو دونوں پر غسل واجب ہو گیا اگر چہ انزال نہ ہو اور لوگوں نے اس حدیث میں اور اس حدیث میں کہ غسل انزال سے لازم آتا ہے، تطبیق دینے میں اختلاف کیا ہے، پس حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ حدیث **انما الماء من الماء** احتلام کے متعلق ہے مگر اس میں کچھ کلام ہے، اور حضرت ابی بن کعب نے فرمایا انزال سے ہی غسل کا لازم آنا یہ رخصت ابتدا اسلام میں تھی پھر یہ رخصت نہیں رہی، اور حضرت عثمان، علی، طلحہ، زبیر، ابی بن کعب اور ابو ایوب رضی اللہ عنہم سے اس شخص کے بارے میں جو اپنی عورت سے جماع کرے اور اس کو انزال نہ ہو، مروی ہے کہ ان سب نے کہا ہے کہ وہ اپنے ذکر کو دھو ڈالے اور جس طرح نماز کے لئے وضو کرتے ہیں اسی طرح وضو کر لے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک یہ مرفوع ہے اور میرے نزدیک یہ بعید نہیں ہے کہ اس حدیث سے مباشرت فاحشہ مراد لی جائے کیونکہ اس پر بھی جماع کا اطلاق ہوتا ہے، کسی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ ایک شخص کو اپنے کپڑے پر تری معلوم ہوا اور اس کو احتلام کا ہونا یاد نہ ہو تو آپ نے جواب میں فرمایا ''وہ غسل کرے'' اور اس شخص کے متعلق دریافت کیا گیا کہ اس کو احتلام کا ہونا یاد ہو مگر تری نہ معلوم ہو تو آپ نے فرمایا ''اس پر غسل نہیں ہے''۔

میں کہتا ہوں حکم کا مدار تری پر رکھا ہے خواب پر نہیں رکھا اس واسطے کہ خواب کبھی خیالی ہوتا ہے اور اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا، اور کبھی خواب قضا شہوت ہوتی ہے اور وہ بغیر تری کے نہیں ہوتی، پس غسل کے حکم کا مدار تری پر ہی ہو سکتا ہے، نیز تری ایک ظاہر شئے ہے جس میں تعیین وانضباط کی صلاحیت ہے، اور خوابوں کو آدمی اکثر بھول جاتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ طہر اور حیض کی مدت کی زیادتی اور کمی مزاج اور غذا وغیرہما کے اختلاف سے مختلف ہوتی ہے اور اس کمی، بیشی کا ایسی شئے کے ساتھ انضباط نہیں ہو سکتا کہ کسی میں اس کے خلاف ہی نہ ہو، پس ضرور اصح یہی ہے کہ عورتوں کی عادت کو دیکھی جائے، پس جب وہ یہ سمجھیں کہ وہ حیض ہے تو وہ حیض ہے اور جب وہ یہ سمجھیں کہ وہ استحاضہ ہے تو وہ استحاضہ ہے، اور اس بارے میں صحابہ اور تابعین کا جو اختلاف ہے تو اس کا باعث ہر ایک کا اندازہ اور تخمین ہے حمنہ بن جحش نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے استحاضہ کے بارے میں مسئلہ دریافت کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو روئی کا ٹکڑا رکھنے اور پٹی باندھنے کا حکم دیا اور دو باتوں میں سے ایک بات کا ان کو اختیار دیا الخ۔

میں کہتا ہوں کہ اصل اس باب میں یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دیکھا کہ استحاضہ امور صحت میں سے نہیں ہے اور ان ایام میں نماز ترک کرنا ایک مدت دراز تک اس کو چھوڑ دینے کا باعث ہے تو آپ نے اس کو اسی پر محمول کرنے کا ارادہ فرمایا جو ان کے نزدیک معروف تھا، پس دو وجہیں ظاہر ہوئیں ایک تو یہ بات ظاہر ہوئی کہ یہ کوئی روگ ہے یعنی کوئی مرض ہے جس کا مقام پوشیدہ ہے اور وہ حیض نہیں ہے وہ نکسیر کے مانند ہے، پس تندرستی کی حالت میں ہر ماہ اس کے حیض وطہر کی جو مقدار ہوتی تھی آپ نے وہی مقرر فرمائی، اور اس وقت حیض کی استحاضہ سے تمیز ضروری ہے، تو ان میں یا تو رنگ سے تمیز ہو سکتی ہے پس گہرا رنگ مثلاً سیاہ، حیض کا ہے یا عورت کے ایام سے جو اس کے نزدیک معروف تھے تمیز ہو سکتی ہے اور دوسری بات یہ ظاہر ہوئی کہ یہ حیض فاسد ہے پس اس کے حیض ہونے کی وجہ سے تو یہ مناسب ہے کہ عورت کو ہر نماز کے وقت غسل کا حکم دیا جائے اور اگر ہر نماز کے لئے غسل کرنے میں دشواری ہو تو دو نمازوں کے لئے ایک غسل تو ضرور کرے اور چونکہ وہ فاسد حیض ہے اس واسطے نماز سے مانع نہیں ہے اور روئی کا ٹکڑا رکھنے اور اس پر پٹی باندھ لینے میں یہ حکمت ہے کہ خون رکھے ہوئے روئی کے ٹکڑے سے لگے اور اس سے تجاوز نہ

کرے، اور تاکہ خون اس کے بدن اور کپڑوں کو آلودہ نہ کرے، جمہور فقہا نے پہلی بات (۱) پر فتویٰ دیا ہے بجز اس حالت کے جبکہ وہ ناممکن ہو۔

ان امور کا بیان جو جنبی اور محدث کے لئے مباح ہیں اور ان امور کا بیان جو ان کیلئے مباح نہیں ہیں

جبکہ شعائر الٰہی کی تعظیم واجب ہے اور من جملہ شعائر کے نماز اور کعبہ اور قرآن ہیں اور بڑی تعظیم یہ ہے کہ بدون طہارت کاملہ کے اور کسی نئے فعل سے نفس کو تنبیہ کئے بغیر آدمی ان چیزوں کے قریب نہ ہو اس لئے یہ امر ضروری ہو گیا کہ سوائے پاک آدمی کوئی ان کے قریب نہ ہو، اور قرآن کی تلاوت کے لئے وضو شرط نہیں کیا گیا کیونکہ ہر وقت قرآن کے پڑھنے کے ساتھ وضو کا لازم کرنا قرآن کے یاد کرنے اور اس کے سیکھنے میں مخل تھا اور اس دروازہ کا کھول دینا اور اس میں رغبت دلانا اور جو شخص قرآن یاد کرنا چاہے اس کے لئے آسانی کا کرنا بہت ضروری تھا اور جنابت کے بارے میں زیادہ تاکید واجب ہوئی پس جنابت کی حالت میں قرآن کا پڑھنا بھی جائز نہیں قرار دیا اور نہ جنبی اور حائض کو مسجد کے اندر جانا جائز ہوا کیونکہ مسجد نماز اور یاد الٰہی کے لئے مقرر کی گئی ہے اور وہ شعائر اسلام سے ہے اور وہ کعبہ کا ایک نمونہ ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھنے میں طہارت شرط نہیں کی گئی کیونکہ ہر شئے کی تعظیم اس کے مناسب ہوتی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک بشر تھے اور لوگوں کی طرح حدث اور جنابت آپ کو بھی عارض ہوتے تھے پس آپ کے پاس بیٹھنے میں طہارت کا شرط کرنا قلب موضوع ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس گھر میں تصویر یا کتا یا جنبی ہوتا ہے وہاں فرشتے نہیں آتے'' میں کہتا ہوں مراد اس سے یہ ہے کہ فرشتے ان چیزوں سے نفرت کرتے ہیں اور صفات تقدس اور بت پرستوں سے نفرت جن سے فرشتے متصف ہیں یہ چیزیں ان کی ضد ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کے بارے میں جس کو رات میں جنابت پیش آئے فرمایا ''وضو کر اور اپنے آلہ تناسل کو دھو پھر سو جا''۔

---

(۱) ایک یہ کہ وہ ہر ماہ میں چھ یا سات دن حیض کے شمار کرے اور باقی ایام میں نماز پڑھے اور دوسرے یہ کہ ظہر میں تاخیر اور عصر میں تعجیل کر کے غسل کرے ....

میں کہتا ہوں کہ چونکہ جنابت فرشتوں کے حالات کے منافی ہے تو مومن کے حق میں پسندیدہ یہ ہے کہ جنابت کے ساتھ اپنی ضروریات مثلاً سونے اور کھانے میں مشغول نہ رہے، اور جبکہ غسل کرنا مشکل تھا تو مناسب نہیں ہے کہ وضو کو بھی ترک کردے کیونکہ دونوں کی حالت طہارت میں ایک برابر ہے صرف فرق یہ ہے کہ شارع نے ان دونوں طہارتوں کو دونوں حدثوں پر تقسیم کردیا ہے۔

تیمّم کا بیان

جبکہ احکام الٰہی میں خدا تعالیٰ کی یہ عادت ہے کہ بندوں پر جو کام مشکل ہوتا ہے وہ اس کو ان کے لئے آسان کردیتا ہے اور آسانی کی سب سے مناسب صورت یہ ہے کہ جس چیز کے کرنے میں دقت ہو اس کو ساقط کر کے اس کا بدل قائم کردیا جائے تاکہ لوگوں کے دل مطمئن ہو جائیں اور جس چیز کا وہ غایت درجہ التزام کر رہے تھے اس کو یک بارگی ترک کرنے سے ان کے دل پریشان نہ ہوں اور نہ ترک طہارت کے عادی ہوں تو اس واسطے خدا تعالیٰ نے مرض اور سفر میں وضوء اور غسل کو ساقط کر کے تیمّم مقرر فرمایا اور جبکہ یہ بات اس طرح تھی تو ملا اعلیٰ میں وضو اور غسل کی جگہ تیمم کو مقرر کرنے کا حکم نازل ہوا، اور تیمّم کے لئے ایک وجود تشبیہی حاصل ہوا کہ وہ بھی جملہ طہارات میں سے ایک طہارت ہے اور یہ حکم بھی ان امور عظام میں سے ہے جن کی وجہ سے ملت مصطفوی تمام ملل سابقہ سے ممتاز ہے اور وہ حکم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے "جب ہم کو پانی نہ ملے تو زمین کی مٹی ہمارے لئے پاک کرنے والی بنادی گئی"۔

میں کہتا ہوں کہ تیمّم کے لئے زمین کو اس لئے خاص کیا کہ وہ کہیں ناپید نہیں ہے پس وہ وقت کے رفع کرنے میں زیادہ مناسب ہے اور زمین کو خاص کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ بعض اشیا میں زمین پاک کرنے والی ہے جیسے موزہ اور تلوار کو پانی کے ساتھ دھونے کی بجائے مٹی میں ملنا بھی کافی ہوتا ہے اور ایک یہ بھی وجہ ہے کہ اس میں عاجزی پائی جاتی ہے جیسے چہرہ کو مٹی میں آلودہ کرلیا اور یہ ذلت کی حالت طلب عفو کے مناسب ہے اور غسل اور وضو کے تیمّم میں کوئی فرق نہیں کیا گیا اور نہ ہی تمام بدن پر خاک کا ملنا مقرر کیا گیا کیونکہ جس شئے کا مقصد بظاہر سمجھ میں نہ آئے اس کو موثر بالخاصیت بنانا ہی مناسب ہے نہ کہ موثر بالمقدار، اس واسطے کہ اسی سے ایسے محل میں اطمینان

قلب حاصل ہوتا ہے، اور کیونکہ تمام بدن کو مٹی میں لوٹ پوٹ کرنے میں بھی کچھ دقت تھی اس واسطے اس کے مقرر کرنے سے پوری دقت رفع نہیں ہوسکتی تھی، اور سخت سردی جس میں وضو کرنے سے مضرت ہو مرض کے حکم میں ہے۔ عمرو بن العاص کی روایت کی ہوئی حدیث اس پر دلیل ہے اور سفر آیت میں قید نہیں ہے بلکہ سفر کو اس لئے ذکر کیا کہ وہ پانی کے نہ ملنے کی ایسی صورت ہے جو جلد ذہن میں آتی ہے، اور تیمّم کے اندر مٹی کے ساتھ پاؤں پر مسح کرنے کا حکم اس لئے نہیں دیا گیا کہ پاؤں تو گرد و غبار سے آلودہ ہی رہتے ہیں، اور حکم ایسی چیز کا دیا جاتا ہے جو پہلے سے حاصل نہ ہوتا کہ اس کے کرنے سے نفس کو تنبیہ حاصل ہو، اور تیمّم کرنے کی ترکیب بھی منجملہ ان چیزوں کے ہے جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے معلوم کرنے کے طریق میں اختلاف ہوا، پس پیشتر اس سے کہ محدثین کا طریقہ مقرر ہوا اکثر فقہا تابعین وغیرہم اس پر متفق تھے کہ تیمّم میں دو ضرب ہیں ایک ضرب منہ کے لئے اور دوسری کہنیوں تک دونوں ہاتھوں کے لئے۔

بہرحال احادیث جو اس باب میں آئی ہیں ان سب میں اصح حدیث وہ ہے جو عمار نے روایت کی ہے کہ ''تجھ کو اس قدر کافی تھا کہ اپنے دونوں ہاتھ زمین پر مارتا پھر ان میں پھونک مارتا پھر دونوں ہاتھ منہ اور ہاتھوں پر پھیر لیتا''۔

اور عبداللہ بن عمر سے حدیث مروی ہے ''تیمّم میں دو ضربیں ہیں ایک ضرب منہ کے لئے اور ایک ضرب کہنیوں تک دونوں ہاتھوں کے لئے''۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کا عمل دونوں طرح منقول ہے اور دونوں حدیثوں میں تطبیق کی وجہ ظاہر ہے جس کی طرف لفظ ''انما یکفیک'' اشارہ کرتا ہے، پس اول یعنی ایک ضرب پر اکتفا کرنا تیمّم کا ادنیٰ درجہ ہے، اور ثانی یعنی تیمّم میں دو ضربیں ہیں ہونا سنت کا درجہ ہے، اور تیمّم کے بارے میں ان کے اختلاف کو اسی معنی پر حمل کرنا ممکن ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل کی یہ بھی تاویل ہوسکتی ہے کہ آپ نے حضرت عمار کو یہ بات تعلیم فرمائی ہو کہ تیمّم کے اندر ضرب کی وجہ سے ہاتھوں کو لگی ہوئی چیز کا بدن پر ملنا مشروع ہے نہ کہ خاک میں بدن کو آلودہ کرنا اور اعضا تیمّم میں سے ممسوح کی مقدار بیان کرنا مقصود نہ ہو اور عدد ضربی کا بیان کرنا بھی مقصود نہ ہو، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ قول جو آپ نے حضرت عمار سے فرمایا تھا اس معنی پر محمول ہو، اور اس کے معنی خاک میں لوٹنے کی بہ نسبت حصر کرنا ہے اور ایسے مسئلہ میں انسان

کو اس قول پر عمل کرنا مناسب ہے جس کی وجہ سے وہ یقیناً بری الذمہ ہو جائے اور حضرت عمر اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما جنابت سے تیمّم کرنا جائز نہیں سمجھتے تھے اور آیت، او لا مستم النساء کو لمس پر محمول کرتے تھے اور لمس کو ناقص وضو جانتے تھے لیکن عمران اور عمار کی حدیث اس کے خلاف پر دلالت کرتی ہے اور میں نے کسی حدیث صحیح میں اس بات کی تصریح نہیں پائی کہ ہر فرض نماز کے لئے جدا تیمّم کرنا فرض ہے اور نہ یہ کہ غلام آبق وغیرہ کے لئے تیمّم جائز نہیں ہے یہ سب محض تخریجات کے قبیل سے ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے زخمی آدمی کے بارے میں فرمایا ''اس کو کافی تھا کہ تیمّم کرتا اور اپنے زخم پر پٹی باندھتا اور اس پر مسح کر لیتا اور باقی جسم کو دھوتا''۔

میں کہتا ہوں، اس میں اشارہ ہے کہ تیمّم جس طرح تمام بدن کا بدل ہے اسی طرح ایک عضو کا بھی بدل ہے کیونکہ وہ ایک موثر بالخصوصیت شئے کی طرح ہے۔ اور اس میں مسح کرنے کا حکم ہے جس کی وجہ ہم مسح علی الخفین میں بیان کر چکے ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''پاک مٹی مسلمان کے لئے وضو ہے اگر چہ اس کو دس برس تک پانی نہ ملے''۔

میں کہتا ہوں کہ اس فرمانے سے وہم وتردد کا دروازہ بند کرنا ہے کیونکہ ایسی باتوں میں وہمی لوگ تردد کرتے ہیں اور رخصت کے بارے میں حکم الٰہی کی مخالفت کرتے ہیں۔

آداب خلا کا بیان

یہ آداب چند امور پر مشتمل ہیں، منجملہ ان کے ایک تعظیم قبلہ ہے اس کی نسبت آنحضرت کا فرمان ہے ''جب تم بیت الخلا میں جاؤ تو قبلہ کی طرف نہ منہ کرو اور نہ پشت'' اور اس میں ایک حکمت اور بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ دل کا تعظیم الٰہی کی طرف متوجہ ہونا چونکہ ایک باطنی امر تھا اس واسطے تعظیم قلبی کے قائم مقام ایک مظنہ ظاہرہ کا پایا جانا ضروری تھا پہلی شریعتوں میں یہ مظنہ ان عبادت خانوں میں داخل ہونا قرار دیا گیا تھا جو خدا تعالیٰ کی عبادت کے لئے بنائے گئے تھے اور جو شعائر الٰہی اور دین الٰہی میں سے ہوتے تھے، ہماری شریعت نے قبلہ کی طرف منہ کرنا اور تکبیر کہنا اس کا مظنہ قرار دیا پس جبکہ خدا تعالیٰ نے کعبہ کی طرف منہ کرنا تعظیم الٰہی کی طرف دل کی توجہ کا اور یاد الٰہی میں دل لگانے کا قائم مقام قرار دیا، اور قائم مقام ہونے کی وجہ یہ ہوئی کہ یہ ہیئت اللہ تعالیٰ کی یاد دلاتی ہے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حکم سے یہ استنباط کر لیا کہ استقبال قبلہ کی ہیئت کو تعظیم

الٰہی کے ساتھ مخصوص رہنا ضروری ہے اور وہ اس طرح کہ جو ہیئت نماز کی ہیئت کے بالکل مبائن اور منافی ہے اس میں استقبال قبلہ نہ کیا جائے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بعض دفعہ قبلہ کی طرف چہرہ مبارک کیئے اور بعض دفعہ پشت مبارک کیئے دیکھا گیا پس اس کی تطبیق اس طرح کی گئی کہ پیشاب پاخانہ کی حالت میں قبلہ کی طرف منہ یا پشت کرنا جنگل ومیدان میں منع ہے اور آبادی میں منع نہیں ہے اور اس طرح بھی تطبیق کی گئی کہ ممانعت سے مراد کراہت ہے اور یہی تطبیق زیادہ ظاہر ہے، منجملہ آداب کے پوری پاکیزگی کا کرنا ہے اس واسطے تین پتھروں سے کم یعنی تین دفعہ سے کم استنجا کرنے سے آپ نے منع فرمایا کیونکہ غالباً تین دفعہ سے کم میں نجاست دور نہیں ہوتی، اور پتھر کے ساتھ پانی سے استنجا کرنا مستحب ہے۔

اور منجملہ آداب کے ان امور سے احتراز کرنا ہے جن سے لوگوں کو تکلیف ہوتی ہے جیسے لوگوں کے سایہ کی جگہ میں یا ان کے راستہ میں یا ان کے بیٹھنے کی جگہ میں یا رُکے ہوئے پانی میں پاخانہ کرنا، اور جیسے ہڈی سے استنجا کرنا کیونکہ وہ جنات کی غذا ہے اور اسی طرح ان تمام چیزوں سے استنجا کرنا ممنوع ہے، جو کارآمد ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول نے کہ ''لاعنین سے بچو'' یہ بات سمجھا دی کہ اس میں حکمت لوگوں کی لعنت اور ان کی ایذا سے پرہیز کرنا ہے یا ان امور سے احتراز کرنا ہے جن سے اپنی ذات کو تکلیف ہوتی ہے جیسے سوراخ میں پیشاب کرنا کیونکہ اکثر وہ سوراخ سانپ یا اس جیسے زہریلے جانوروں کی جگہ ہوتی ہے پس وہ اس میں سے نکل کر کاٹ لیتا ہے اور منجملہ آداب کے اچھی عادات کا اختیار کرنا ہے پس دائیں ہاتھ سے استنجا نہ کرے اور پیشاب کے مقام کو دائیں مقام سے نہ پکڑے اور گوبر سے استنجا نہ کرے اور پتھر لینے میں طاق عدد ملحوظ رکھے، اور منجملہ آداب کے پردہ کا اہتمام کرنا ہے پس مناسب ہے کہ لوگوں سے دور جا کر استنجا کرے تاکہ آواز نہ سنائی دے اور نہ بدبو محسوس ہو اور نہ اس کا ستر دکھائی دے اور جب تک زمین کے قریب نہ ہو جائے اپنا کپڑا نہ ہٹائے اور مجتمع درختوں سے پردہ کردے جو اس کے بدن کے نیچے کے حصہ کو چھپا لیں پس جس کو ایسی آڑ نہ ملے تو ریت کی ایک ڈھیری لگا لے اور اس کی طرف پشت کر کے بیٹھ جائے کیونکہ شیطان انسانوں کے پاخانہ کی جگہ سے مذاق کرتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ شیطان کی جبلت میں افکار فاسدہ اور اعمال شنیعہ داخل ہیں، اور منجملہ آداب کے بدن اور

کپڑے کو نجاست سے بچانا ہے اس کی نسبت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جب تم میں سے کوئی شخص پیشاب کرنا چاہے تو پیشاب کے لئے نرم جگہ تلاش کرے''۔

اور منجملہ آداب کے وسواس کا دور کرنا ہے اس کی نسبت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''پس تم میں سے کوئی شخص اپنے نہانے کی جگہ پیشاب نہ کرے کیونکہ اکثر وسوسے اس سے پیدا ہوتے ہیں''۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے (حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے) فرمایا ''کھڑے ہو کر پیشاب نہ کر''۔

میں کہتا ہوں کہ کھڑے ہو کر پیشاب کرنا اس لئے مکروہ ہے کہ اس سے بدن اور کپڑے پر چھینٹ پڑتی ہے اور یہ سنجیدگی اور عادات حسنہ کے منافی ہے اور اس میں ستر کھل جانے کا احتمال ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پاخانے شیاطین کے موجود رہنے کی جگہ ہیں پس جب کوئی پاخانہ میں آیا کرے تو یہ کہہ لیا کرے 'اعوذ باللہ من الخبث والخبائث'، اور جب پاخانہ سے باہر آئے تو کہے غفرانک۔

میں کہتا ہوں پاخانہ میں جاتے وقت اللھم انی اعوذبک من الخبث والخبائث پڑھنا مستحب ہے اس لئے کہ پاخانے شیاطین کے حاضر ہونے کی جگہ ہیں جہاں وہ آتے ہیں کیونکہ ان کو نجاست پسند ہے اور پاخانہ سے نکلتے وقت غفرانک کہنا مستحب ہے کیونکہ وہ ذکر الٰہی کے ترک کا اور شیاطین سے مخالطت کا وقت تھا، نبی نے فرمایا ''ان میں سے ایک پیشاب سے نہیں بچتا تھا'' الحدیث

میں کہتا ہوں کہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ پیشاب سے پاکی حاصل کرنا واجب ہے اور اس کی صورت یہ ہے کہ پیشاب کر کے کچھ دیر رکا رہے اور پیشاب کے قطرے خارج کر دے یہاں تک کہ اس کو یقین ہو جائے کہ پیشاب کا کوئی قطرہ آلہ تناسل کی نالی میں باقی نہیں رہا اور اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نجاست سے آلودہ رہنا اور ایسا کام کرنا جس سے آپس میں بگاڑ پیدا ہو، عذاب قبر کا باعث ہوتا ہے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک تر شاخ کو چیر کر دونوں قبروں میں سے ہر ایک قبر پر گاڑ دینا، سو اس میں سے راز یہ ہے کہ ایسا کرنا ان کے حق میں شفاعت مقیدہ تھا کیونکہ ان کے کفر کی وجہ سے شفاعت مطلقہ ان کے لئے ناممکن تھی۔

خصال فطرت اوران سے متعلق امور کا بیان

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''دس باتیں فطرت میں سے ہیں، مونچھوں کا ترشوانا اور داڑھی کا بڑھانا اور مسواک کرنا اور ناک میں پانی دینا اور ناخن کتروانا اور انگلیوں کے جوڑوں کا دھونا اور بغل کے بال اکھاڑنا اور موئے زیر ناف کا مونڈنا اور پانی سے استنجا کرنا، راوی کہتا ہے کہ اور دسویں بات مجھ کو یاد نہیں رہی غالباً وہ کلی کرنا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ طہارتیں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے منقول ہیں اور تمام امم حنفیہ میں برابر جاری ہیں اور ان کے دلوں میں پیوست ہیں اور ان کے خالص عقائد میں داخل ہیں اور ہر زمانہ میں انہیں پر ان کی زندگی اور انہیں پر ان کی موت ہے اور اسی وجہ سے ان کا نام فطرت رکھا گیا ہے اور ملت حنیفیہ کے یہ شعائر ہیں اور ہر ملت کے لئے شعائر کا ہونا ضروری ہے جن سے ان کی پہچان ہوتی ہے اور جن پر ان سے مواخذہ ہوتا ہے تاکہ ان کی فرمانبرداری اور نافرمانی بظاہر معلوم ہو جائے، اور شعائر میں اس شئے کا داخل کرنا مناسب ہے جو کثرت سے پائی جائے اور بار بار واقع ہوتی رہے اور ظاہر ہو اور اس میں بہت سے فوائد ہیں جن کو لوگوں کے اذہان خوب طرح سے قبول کرتے ہوں اور ان فوائد کے بارے میں مختصراً یہ ہے کہ انسان کے جسم سے بعض جگہ میں جو بال نکلتے ہیں وہ انقباض قلب میں وہی کام کرتے ہیں جو احداث سے پیدا ہوتا ہے اور اسی طرح سر اور داڑھی کے بالوں کے پراگندہ ہونے سے بھی دل منقبض ہوتا ہے اس باب میں انسان کو اطبا کے اس کلام کی طرف رجوع کرنا چاہتے ہیں جو انھوں نے مرض شری (۱) اور خارش اور ان کے علاوہ امراض جلدیہ کے متعلق بیان کیا ہے کہ ایسے امراض سے دل مغموم رہتا ہے اور خوشی جاتی رہتی ہے اور داڑھی ایسی چیز ہے کہ اس سے بڑے چھوٹے کی تمیز ہوتی ہے اور وہ مردوں کے لئے خوبصورتی اور اس کی ہیئت کو مکمل کرنے والی ہے اس واسطے اس کا بڑھانا ضروری ہے اور اس کا کتروانا مجوسی کا طریقہ ہے اور اس میں خلق الٰہی کا بدل دینا اور سردار و اہل عزت لوگوں کو کمتر لوگوں میں شامل کردینا ہے اور جس کی مونچھیں بڑی ہو جاتی ہیں تو ان میں کھانا پینا، اٹکتا ہے اور ان میں میل جمع ہو جاتا ہے اور یہ مجوس کا طریقہ ہے اور اس کی نسبت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

---

(۱) ایک مرض ہے جس میں بدن پر سرخ دانے نکل آتے ہیں یعنی پِتی۔

''مشرکین کی مخالفت کرو، مونچھیں کترا ؤاور داڑھی بڑھاؤاور کلی کرنے اور ناک میں پانی پہنچانے اور مسواک کرنے سے ناک کی کثافت اور منہ کی بدبو دور ہوتی ہے اور ختنہ کی کھال ایک زاید عضو ہوتا ہے جس میں میل اکٹھا ہو جاتا ہے اور اس کی وجہ سے پیشاب کے قطروں سے پوری طہارت نہیں ہوسکتی اور لذت جماع کو بھی کم کرتا ہے توریت میں مذکور ہے کہ ختنہ کرنا حضرت ابراہیمؑ اور ان کی اولاد پر خدا تعالیٰ کی نشانی ہے، اس کے یہ معنی ہیں کہ بادشاہوں کی عادت اس طرح جاری ہے کہ اپنے خاص خاص جانوروں پر کچھ علامت کر دیتے ہیں تاکہ تمیز رہے اور ان غلاموں پر جن کو آزاد کرنا منظور نہیں ہوتا کوئی نشانی کر دیتے ہیں پس اسی طرح سے ختنہ خدا تعالیٰ کی طرف سے بندوں پر علامت ہے اور دیگر شعائر ایسے ہیں جن میں تبدیلی اور حیلہ کی گنجائش ہے اور ختنہ ایسا شعار ہے جس میں تبدیلی بہت مشکل ہے اور انتقاص الماجو حدیث میں مذکور ہے اس سے مراد استنجا کرنا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''چار چیزیں رسولوں کی سنت میں سے ہیں: حیا کرنا اور ایک روایت میں ختنہ کرنا آیا ہے اور خوشبو لگانا اور مسواک کرنا اور نکاح کرنا''۔

میں کہتا ہوں میرے نزدیک یہ سب باتیں طہارت کے قبیل سے ہیں پس حیا کے معنی بے شرمی، بیہودگی اور برے افعال کا ترک کرنا ہے اور یہ امور نفس کو ملوث اور مکدر کرتے ہیں، اور خوشبو لگانا نفس میں سرور اور فرحت پیدا کرتا ہے اور اس سے طہارت پر بہت بڑی تنبیہ ہوتی ہے اور نکاح کرنا عورتوں سے ملنے کی خواہش سے اور ان خیالات سے جو اس خواہش کے پورا کرنے کی طرف مائل کرتے ہیں باطن کو پاک رکھتا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اگر میں اپنی امت پر دشوار نہ جانتا تو ان کو ہر نماز کے وقت مسواک کرنے کا حکم دیتا''۔

میں کہتا ہوں اس کے معنی یہ ہے کہ اگر حرج کا ڈر نہ ہوتا تو مسواک کرنے کو وضو کی طرح نماز کے لئے شرط کر دیتا، اور اسی طرح کی بہت سی احادیث وارد ہیں جو اس امر پر صاف دلالت کرتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اجتہاد کو حدود شرعیہ میں دخل ہے اور حدود شرعیہ مقاصد پر مبنی ہیں اور امت سے حرج کا رفع کرنا منجملہ ان اصول کے ہے جن پر احکام مبنی ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مسواک کرنے کی کیفیت بیان کرنے میں راوی کہتا ہے کہ آپ

مسواک کرتے وقت اُع اُع کی آواز کرتے تھے جیسے کوئی قئے کرتے وقت کرتا ہے۔

میں کہتا ہوں انسان کو مناسب ہے کہ اچھی طرح منہ کے اندر مسواک کرے اور حلق اور سینہ کا بلغم نکالے اور منہ میں خوب اندر تک مسواک کرنے سے مرض قلاع دور ہو جاتا ہے اور آواز صاف ہو جاتی ہے اور منہ خوشبودار ہو جاتا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''ہر مسلمان پر لازم ہے کہ ہر ہفتہ میں ایک دن نہالیا کرے اور اس میں اپنا جسم اور سر دھولیا کرے''۔

میں کہتا ہوں یہ حدیث اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ ہر ہفتہ میں ایک دن غسل کرنا سنت مستقلہ ہے جو جسم سے میل کچیل دور کرنے کے لئے اور صفت طہارت پر نفس کی تنبیہ کے لئے مقرر کی گئی ہے اور جمعہ کی نماز کے لئے اس کی پابندی اس وجہ سے کی گئی کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے سے مکمل ہو جاتا ہے اور اس میں نماز جمعہ کی تعظیم بھی ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم چار چیزوں سے غسل فرمایا کرتے تھے ایک تو جنابت سے اور ایک جمعہ کے روز اور ایک پچھنے لگوانے کے بعد اور مردے کو نہلانے کے بعد۔

میں کہتا ہوں پچھنے لگوانے کے بعد تو اس لئے کہ خون اکثر جسم پر لگ جاتا ہے اور ہر ہر چھینٹ کا دھونا مشکل ہے اور اس لئے بھی کہ سینگی کے چوسنے سے ہر طرف سے خون کھنچ کر آتا ہے پس اس خاص عضو سے خون کے کم ہونے کا نفع نہیں ہوتا اور غسل خون کے بہنے کو بند کرتا ہے اور اطراف سے اس کے انجذاب کو موقوف کرتا ہے اور غسل میت کے بعد نہانے کی وجہ یہ ہے کہ نہلانے میں جسم پر چھینٹیں پڑ جاتی ہیں اور میں ایک شخص کے پاس جان کنی کے وقت بیٹھا تو میں نے ان ملائکہ کی طرف سے جو ارواح کے قبض کرنے پر متعین ہیں حاضرین کی روحوں میں ایک عجیب قسم کی تکلیف کو دیکھا پس میں سمجھ گیا کہ حالت کا بدلنا ضروری ہے تاکہ نفس کو اس حالت کے مخالف حالت کے لئے تنبیہ حاصل ہو جائے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو جو اسلام لایا تھا پانی اور بیری کے پتوں سے نہانے کا حکم فرمایا اور دوسرے شخص سے فرمایا ''تو اپنے کفر کے بال دور کر''۔

میں کہتا ہوں کہ اس میں راز یہ ہے کہ اک شئے سے یعنی کفر سے باہر ہونا اس کے لئے خوب اچھی طرح متمثل ہو جائے، واللہ اعلم۔

پانی کے احکام کا بیان

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''تم میں سے کوئی شخص اس رکے ہوئے پانی میں جو بہتا نہیں ہے۔ ہرگز پیشاب نہ کرے پھر اس میں غسل بھی کرلے۔

میں کہتا ہوں اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ ممانعت ہر ایک سے ہے یعنی پانی میں پیشاب کرنے سے بھی اور اس میں غسل کرنے سے بھی جیسے اس حدیث میں ہے ''دو شخص پاخانہ کرنے کے لئے نہ جائیں کہ برہنہ ہوکر آپس میں باتیں کریں کیونکہ خدا تعالیٰ اس سے ناخوش ہوتا ہے''۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جو فقط پانی میں پیشاب کرنے کی ممانعت مروی ہے اور دوسری حدیث جو اس پانی میں فقط غسل کی ممانعت میں مروی ہے اسی معنی کو ظاہر کرتی ہے اور اس میں حکمت یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک دو باتوں میں سے ایک بات سے خالی نہیں یا تو اسی وقت پانی میں تغیر آجاتا ہے یا وہ پانی کے تغیر کی طرف مفضی ہوتا ہے کہ لوگ اس کو پیشاب کرتا ہوا یا نہاتا ہوا دیکھیں گے اور وہ بھی ایسا ہی کریں گے اور ان دونوں باتوں میں سے ہر ایک منجملہ انہی صورتوں کے ہے جن کی نسبت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لعنت کرنے والے سے بچو، لیکن جبکہ پانی بہت زیادہ ہو یا بہتا ہوا ہو، اور ہر حال میں ان باتوں سے پرہیز کرنا افضل ہے لیکن مستعمل پانی سو اس کو کوئی جماعت طہارت میں استعمال نہیں کرتی تھی اور وہ مہجور اور متروک سا سمجھا جاتا تھا پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اسی حال پر رکھا جیسا ان کے نزدیک تھا، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ پاک ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب پانی قلتین کو پہنچ جائے تو اپنے اوپر ناپاکی کو نہیں آنے دیتا۔

میں کہتا ہوں اس کا مطلب یہ ہے کہ معنوی ناپاکی کو قبول نہیں کرتا یہ حکم شرع کے اعتبار سے ہے عرف وعادت کے اعتبار سے نہیں ہے اور جب نجاست کی وجہ سے پانی کا کوئی وصف بدل جائے اور کمیت یا کیفیت کے اعتبار سے نجاست کا اس پر غلبہ ہو جائے تو وہ اس حکم سے خارج ہے، اور قلتین کو کثیر اور قلیل پانی میں حد فاصل ایک ضروری امر کی وجہ سے قرار دیا ہے کہ اس کے بغیر چارہ ہی نہیں ہے اور وہ حد تخمینا یا انکل سے مقرر نہیں کی گئی ہے اور ایسا ہی حال تمام مقادیر شرعیہ کا ہے کہ کسی میں انکل کو دخل نہیں ہے اور وہ ضروری امر یہ ہے کہ پانی کے رہنے کی دو جگہ ہیں ایک معدن دوسرے برتن، معدن تو کنوئیں اور چشمے ہیں اور جھیل بھی انہیں میں شامل ہے اور برتن مشک اور

مٹکے اور لگن اور ناند اور مشکیزے ہیں۔

اور معدن ایسی چیز ہے کہ اس کے ناپاک ہونے سے لوگوں کو ضرر ہوتا ہے اور اس کے پانی کو نکالنے میں لوگوں کو بڑی دقت ہوتی ہے اور برتن تو ہر روز پانی سے بھرے جاتے ہیں اور ان کا پانی بہانے میں کچھ دقت نہیں ہوتی اور معادن کے لئے نہ کوئی سر پوش ہے اور نہ ہی ان کو جانوروں کے گوبر اور درندوں کے منہ ڈالنے سے محفوظ رکھ سکتے ہیں البتہ برتنوں کے ڈھانکنے اور ان کی حفاظت رکھنے میں زیادہ دقت نہیں ہے ہاں ان جانوروں سے جو گھروں میں پھرتے رہتے ہیں حفاظت مشکل ہے اور معدن میں پانی کثرت سے ہوتا ہے بہت سی نجاستیں اس میں اثر نہیں کر سکتیں بخلاف برتنوں کے، اس واسطے ضروری ہوا کہ معدن کا حکم اور ہو اور برتنوں کا حکم اور ہو۔ اور معدن میں ان چیزوں کی معافی دی جائے جن کی معافی برتنوں میں نہیں دی جاتی اور سوائے قلتین کے اور کوئی چیز حد فاصل نہیں ہو سکتی اس واسطے کہ کنوئیں اور چشمہ کا پانی کسی طرح بھی قلتین سے کم نہیں ہوتا اور جس جگہ پانی قلتین سے کم ہو اس کو نہ حوض کہتے ہیں اور نہ تالاب کہتے ہیں بلکہ اس کو گڑھا کہتے ہیں اور جب قلتین کی مقدار پانی ہموار زمین میں ہو تو غالباً سات بالشت طویل اور پانچ بالشت عریض جگہ میں آتا ہے اور یہ حوض کا ادنی درجہ ہے اور عرب میں سب برتنوں میں بڑا برتن قلہ تھا اس سے بڑا برتن ان کے ہاں اور کوئی معلوم نہیں ہوتا اور سب قلے بھی ان کے ہاں برابر نہ تھے بعض قلہ ڈیڑھ قلہ کے برابر اور بعض سوا قلہ کے برابر اور بعض پونے دو قلہ کے برابر ہوتا تھا اور ایسا کوئی قلہ نہ تھا جو دو قلہ کے برابر ہو پس دو قلہ کی مقدار کو کوئی برتن نہیں پہنچتا اور کوئی معدن اس سے کم نہیں ہے اس واسطے قلتین کی مقدار پانی کثیر اور پانی قلیل کے درمیان حد فاصل قرار پائی اور جو قلتین کا قائل نہیں ہے جیسے مالکیہ تو وہ بھی پانی کثیر کی حد مقرر کرنے میں قلتین کے قریب مقدار کی طرف مجبور ہوئے ہیں، اور جنگل کے کنوئیں میں اونٹ کی مینگنی وغیرہ گر جانے کو معافی کے حکم میں رکھا ہے پس یہاں سے انسان کو حدود شرعیہ کے امر کو معلوم کرنا چاہئے کہ وہ ایسی ضروری صورتوں میں قائم کی گئی ہیں جن کے بغیر لوگوں کو چارہ نہیں اور جن کے ماسوا کو عقل درست نہیں سمجھتی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''پانی پاک ہے اس کو کوئی چیز ناپاک نہیں کرتی'' اور فرمایا ''پانی ناپاک نہیں ہوتا'' اور فرمایا ''مومن ناپاک نہیں ہوتا'' اور اسی طرح کی دیگر احادیث ہیں جن

میں ہے کہ بدن ناپاک نہیں ہوتا اور زمین ناپاک نہیں ہوتی۔

میں کہتا ہوں کہ ان سب سے مراد نجاست خاصہ کی نفی کرنا ہے جس پر قرائن حالیہ اور مقالیہ دلالت کرتے ہیں پس آپ کا فرمان کہ ''پانی ناپاک نہیں ہوتا'' اس کے معنی یہ ہیں کہ معاون نجاست کے پڑنے سے ناپاک نہیں ہوتے جب نجاست نکال کر پھینک دی جائے اور پانی کا کوئی وصف بھی نہ بدلے اور پانی خراب نہ ہوا ہو اور بدن غسل کرنے سے پاک ہو جاتا ہے اور زمین بارش سے اور دھوپ سے اور لوگوں کے چلنے پھرنے سے پاک ہو جاتی ہے اور بیر بضاعہ کے متعلق کیا کوئی یہ گمان کرسکتا ہے کہ اس میں نجاستیں پڑی رہا کرتی تھیں؟ کیونکہ یہ گمان ہوسکتا ہے حالانکہ بنی آدم کو ایسی چیز سے عادۃً اجتناب ہوتا ہے پس کس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کا پانی پی سکتے تھے بلکہ نجاستیں بغیر اس کے کہ کوئی ان کو ڈالنے کا ارادہ کرے اس میں گر جایا کرتی تھیں جس طرح ہم اپنے زمانہ کے کنوؤں کو دیکھتے ہیں، اور پھر یہ نجاستیں نکال دی جاتی تھیں، پس جب اسلام کا زمانہ آیا تو انھوں نے طہارت شرعیہ کا جو ان کے ہاں کی طہارت سے زاید ہو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تو آپ نے ارشاد فرمایا ''پانی پاک ہوتا ہے اس کو کوئی چیز ناپاک نہیں کرتی''، یعنی اس نجاست کے علاوہ جس کو تم سمجھتے ہو کوئی اور نجاست نہیں ہے اور حضورؐ کے کلام میں نہ یہ کوئی تاویل ہے اور نہ کلام کو ظاہر سے پھیرنا ہے بلکہ وہ محاورہ عرب ہے پس خدا تعالیٰ کا قول ''کہ میرے پاس جو وحی کیا گیا ہے اس میں کھانے والے کے لئے کوئی کھانے کی چیز میں حرام نہیں پاتا'' الا یہ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جن چیزوں میں تم کو اختلاف ہے ان میں کوئی حرام چیز نہیں پاتا، اور جب طبیب سے کسی شئے کے متعلق دریافت کیا جائے اور وہ کہے کہ اس کا استعمال جائز نہیں ہے تو اس سے یہ بات سمجھی جاتی ہے کہ اس کی مراد صحت بدن کے اعتبار سے ناجائز ہونا ہے اور جب فقیہ سے کسی شئے کے متعلق دریافت کیا جائے اور وہ اس کا ناجائز ہونا بیان کرے تو عدم جواز سے اس کی مراد عدم جواز شرعی کا ہونا سمجھا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''تم پر تمہاری مائیں حرام کی گئیں'' اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''تم پر مردار حرام کیا گیا'' پس اول سے مراد حرمت نکاح ہے اور ثانی سے مراد حرمت اکل ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''بدون ولی کے نکاح نہیں ہوتا'' اس سے مراد ہے کہ شرع میں وہ نکاح جائز نہیں ہوتا، یہ مراد نہیں ہے کہ خارج میں وہ پایا ہی نہیں جاتا اور اس

قسم کی بہت سی احادیث ہیں اور ان میں تاویل نہیں ہے لیکن اس پانی مقید سے وضو کرنا جس پر بغیر قید کے پانی کا اطلاق نہیں ہوتا ایک ایسی بات ہے جس کو بادی الرائے میں شرع رد کر دیتی ہے، ہاں ایسی چیز سے ناپاکی کے دور کرنے کا احتمال ہے بلکہ راجح یہی ہے کہ نجاست اس سے دور ہو سکتی ہے اور لوگوں نے کنوئیں میں جانور کے مر جانے کے مسئلہ میں اور دہ دردہ میں اور آب جاری میں بہت سی فروعات نکالی ہیں اور ان سب مسائل میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مروی نہیں ہیں لیکن وہ آثار جو صحابہ اور تابعین سے منقول ہیں جیسے ابن زبیر کا اثر زنگی کے بارے میں اور حضرت علیؓ کا چوہے کے بارے میں اور نخعی اور شعبی کا بلی کے قریب قریب جانوروں میں سو ان میں سے کوئی بھی ایسا اثر نہیں ہے جس کی صحت پر محدثین نے گواہی دی ہو اور نہ ہی قرون اولیٰ کے جمہور کا ان پر اتفاق ہے، اور اگر ان آثار کو صحیح بھی مان لیا جائے تو ممکن ہے کہ یہ دلوں کو مطمئن کرنے کے لئے اور پانی کی پاکیزگی کے لئے ہوں اور وجوب شرعی کے اعتبار سے نہ ہوں جیسا کہ کتب مالکیہ میں مذکور ہے اور اس احتمال کی نفی کرنا بہت مشکل ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اس باب میں کوئی معتبر حدیث نہیں ہے جو واجب العمل ہو، اور بلا شبہ قلتین کی حدیث ان سب سے زیادہ ثابت ہے اور یہ امر محال ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے لئے ان مسائل میں ایسی شئے مقرر فرمائے جو ان تدابیر پر زاید ہو جو ان کے واسطے لازم ہیں اور وہ مسائل کثیر الوقوع ہوں اور ان میں عموم بلوی ہو پھر بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شئے کی صاف صاف تصریح نہ فرمائی ہو اور نہ وہ صحابہ اور ان کے بعد کے لوگوں میں مشہور ہو اور کوئی ایک حدیث بھی اس بارے میں وارد نہ ہو، واللہ اعلم۔

نجاستوں کے پاک کرنے کا بیان

نجاست وہ شئے ہے جس کو سلیم الطبع لوگ ناپاک سمجھیں اور اس سے پرہیز کریں اور جب کپڑوں کو لگ جائے تو ان کو دھوئیں جیسے پاخانہ پیشاب اور خون، لیکن نجاسات سے پاکی حاصل کرنا سو وہ بھی سلیم الطبع لوگوں سے ماخوذ اور ان کے مروجہ طریقہ سے مستنبط ہے اور گوبر ناپاک ہے عبداللہ بن مسعود کی حدیث اس پر دلیل ہے اور جن جانوروں کا گوشت کھایا جاتا ہے ان کے پیشاب کے ناپاک ہونے میں بھی شبہ نہیں، طبائع سلیمہ اس کو ناپاک سمجھتی ہیں، اور اس کے پینے کی

جو اجازت ہے تو وہ طلب شفا کی ضرورت کی وجہ سے ہے اور اس کے پاک ہونے کا یا نجاست خفیفہ ہونے کا جو حکم ہے تو وہ دفع حرج کی وجہ سے ہے، اور شراب کو شارع نے نجاست میں داخل کیا ہے اور اس کی نسبت اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "ناپاکی شیطان کا فعل ہے" اس واسطے کہ خدا تعالیٰ نے شراب کو حرام کیا اور اس کی حرمت کی نہایت تاکید کی۔ پس حکمت کا تقاضہ یہی تھا کہ اس کو پیشاب اور پاخانہ کے مانند کر دیا جائے تاکہ لوگوں کے سامنے اس کی برائی متمثل ہو جائے اور اس وجہ سے ان کے دل اس سے ہٹ جائیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جب تم میں سے کسی کے برتن میں کتا پانی پی جائے تو وہ اس کو سات بار دھوئے" اور ایک روایت میں ہے کہ "اول بار مٹی سے دھوئے"۔

میں کہتا ہوں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کتے کے جھوٹے کو بھی نجاسات میں شامل کر دیا اور نجاستوں میں سے سخت ناپاک قرار دیا کیونکہ کتا ایک ملعون حیوان ہے جس سے ملائکہ نفرت کرتے ہیں اور اس کو بلا ضرورت پالنا اور اس کے ساتھ مخالطت کرنا ہر روز ایک قیراط کی مقدار اجر کم کرتا ہے، اور اس میں راز یہ ہے کہ کتا اپنی جبلت میں شیطان سے مشابہ ہے کیونکہ اس کی عادت میں شیطنت کرنا، غصہ کرنا اور نجاسات میں منہ ڈالنا اور لوگوں کو تکلیف پہنچانا ہے اور شیاطین کی طرف سے الہام کو قبول کرتا ہے پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو دیکھا کہ کتوں سے خلط ملط رکھتے ہیں اور ان کو کچھ پرواہ نہیں ہوتی اور کھیتی اور مویشی اور گھر کی حفاظت اور شکار کے واسطے اس کی ضرورت کی وجہ سے بالکل نہیں کر دینا بھی مناسب نہ تھا اس واسطے آپ نے پوری پوری طہارت شرط کر کے اور اس کے موکد کر کے اور ایسی طہارت کا حکم دیکر جس میں کسی قدر دقت بھی ہے اس سے بچانے کا علاج کر دیا تاکہ اس قدر پاک کرنا روک ٹوک میں کفارہ کے برابر ہو جائے، اور بعض حاملین مذہب نے سات مرتبہ دھونے کو امر تشریعی نہیں سمجھا بلکہ ایک طرح کی تاکید پر محمول کیا ہے اور بعض نے ظاہر حدیث کا لحاظ کیا ہے اور احتیاط ہی افضل ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اس اعرابی کے پیشاب پر ایک ڈول پانی کا بہا دو"۔

میں کہتا ہوں بہت سا پانی بہانا زمین پر سے پیشاب کی ناپاکی کو دور کر دیتا ہے اور یہ اس دستور سے ماخوذ ہے جو تمام لوگوں کے نزدیک طے شدہ ہے کہ بہت سی بارش سے زمین پاک

ہو جاتی ہے اور بہت سے پانی سے بد بو بھی دور ہو جاتی ہے اور پیشاب منتشر ہو کر کالعدم ہو جاتا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''تم عورتوں میں سے کسی عورت کے کپڑے کو جب حیض کا خون لگ جائے تو وہ اس خون کو کھرچ دے پھر اس کو رگڑ کر پانی سے دھوڈالے پھر اس کپڑے سے نماز پڑھ لے''۔

میں کہتا ہوں عین نجاست اور اس کا اثر زائل ہونے سے طہارت حاصل ہو جاتی ہے اور تمام خصوصیات اس صورت کا بیان ہیں جو نجاست اور اس کے اثر کو زائل کرسکتی ہے اور وہ خصوصیات طہارت پر تنبیہ کیلئے ہیں طہارت کے لئے شرط نہیں ہیں لیکن ''منی'' سو ظاہر یہی ہے کہ وہ نجس شئے ہے کیونکہ نجاست کی تعریف میں جو کچھ ہم نے بیان کیا وہ اس میں پایا جاتا ہے اور کھرچ دینا خشک منی سے کپڑے کو پاک کر دیتا ہے جبکہ وہ جسم والی ہو، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''لڑکی کے پیشاب سے کپڑے کو دھونا چاہئے اور لڑکے کے پیشاب سے کپڑے پر پانی بہانا چاہئے''۔

میں کہتا ہوں زمانۂ جاہلیت میں یہی طریقہ مقرر تھا پس اسی کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے باقی رکھا اور یہ فرق چند امور کی وجہ سے ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ لڑکے کا پیشاب پھیل جاتا اور اس کا ازالہ دقت سے ہوتا ہے اس واسطے اس کے لئے تخفیف مناسب ہے اور لڑکی کا پیشاب ایک جگہ مجتمع رہتا ہے اور بآسانی زائل ہوسکتا ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ لڑکی کا پیشاب لڑکے کے پیشاب سے زیادہ غلیظ اور بد بودار ہوتا ہے اور تیسری بات یہ ہے کہ لڑکوں سے لوگوں کو رغبت ہوتی ہے اور لڑکیوں کو کم پسند کرتے ہیں اس حدیث پر اہل مدینہ اور ابراہیم نخعیؒ نے عمل کیا ہے اور امام محمد نے اس بارے میں تفصیل کی ہے پس لوگوں میں جو مشہور ہے اس سے دھوکہ میں نہیں پڑنا چاہئے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''چمڑا جب پکالیا جاتا ہے تو پاک ہو جاتا ہے''۔

میں کہتا ہوں حیوانات کے پکے ہوئے چمڑوں کا استعمال کرنا تمام فرقوں کے نزدیک جاری اور مسلم ہے اور اس میں راز یہ ہے کہ پکا لینے سے بد بو اور کراہت دور ہو جاتی ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جب تم میں سے کسی کے جوتے کو نجاست لگ جائے تو مٹی اس کے لئے پاک کرنے والی ہے''۔

میں کہتا ہوں کہ جوتا اور موزہ اس نجاست سے جو جسم والی ہو رگڑنے سے پاک ہو جاتا ہے

کیونکہ وہ سخت جسم ہے اس میں نجاست سرایت نہیں کرتی اور ظاہر یہ ہے کہ یہ حکم تر اور خشک دونوں نجاستوں میں عام ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بلی کے بارے میں فرمایا ''یہ گھر میں پھرنے والی چیزوں میں سے ہے''۔

میں کہتا ہوں اس کے معنی ایک قول کے موافق یہ ہے کہ اگر چہ وہ نجاستوں میں منہ ڈالتی ہے اور چوہے کا شکار کرتی ہے مگر اس جگہ ضرورت ہے کہ اس کے جھوٹے کی پاکی کا حکم دیا جائے اور حرج کا دفع کرنا اصول شرع میں سے ایک اصل ہے اور دوسرے قول کے موافق اس حدیث میں ترغیب ہے کہ ہر جاندار کے ساتھ احسان کیا جائے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بلی کو سائلین اور سائلات کے ساتھ تشبیہ دی ہے، واللہ اعلم۔

نماز کے ابواب کا بیان

واضح ہو کہ نماز تمام عبادتوں میں سب زیادہ عظیم الشان، سب سے زیادہ یقینی اور لوگوں میں سب عبادتوں سے زیادہ مشہور اور نفس میں سب سے زیادہ نفع بخش عبادت ہے اور اسی وجہ سے شارع علیہ السلام نے اس کی فضیلت، تعیین اوقات اور اس کے شروط وارکان بیان کرنے میں اور اس کے آداب، اس کی رخصتیں اور اس کے نوافل بیان کرنے میں اس قدر زیادہ اہتمام کیا ہے جو کسی اور عبادت میں نہیں کیا اور اس کو دین کے بڑے بڑے شعائر میں سے شمار کیا ہے اور نماز تمام یہود، نصاریٰ مجوسی اور بقایہ ملت اسماعیلیہ میں قابل تسلیم رہی ہے پس ضروری ہوا کہ اس کے اوقات اور اس کے جمیع متعلقات میں انہی امور کو اختیار کرنا چاہیئے جن پر انھوں نے اور ان کے جمہور نے اتفاق کیا ہے اور جن جن باتوں کو انھوں نے اپنی طرف سے بنا رکھا ہے جیسے یہود موزے اور جوتے پہن کر نماز پڑھنا مکروہ سمجھتے تھے اور اسی طرح کی دیگر باتیں تھیں تو یہ امر ضروری ہوا کہ ان کے ترک کی تاکید کی جائے اور مسلمانوں کا طریقہ ان کے طریقہ کے خلاف ہو، اور اسی طرح مجوس نے اپنے دین کو بگاڑا اور آفتاب کی پرستش کرنے لگے اس واسطے ملت اسلام کو ان کی ملت سے بالکل جدا کرنے کی ضرورت ہوئی، اور مسلمانوں کو ان کی نمازوں کے اوقات میں نماز پڑھنے سے بھی منع کر دیا گیا، اور چونکہ نماز کے احکام وسیع ہیں اور جن اصول پر نماز کی بنا ہے بہت ہیں اس واسطے کتاب الصلوٰۃ کے شروع میں ہم نے ان اصول کو ذکر نہیں کیا جیسا کہ تمام کتب کے

اوّل میں ہم ذکر کرتے تھے، بلکہ ہر فصل کے اصول کو اس فصل کے اندر بیان کر دیا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اپنی اولاد کو نماز کا حکم کرو جب وہ سات برس کی عمر کے ہو جائیں اور ان کو نماز کے اوپر مارو، جب وہ دس برس کی عمر کے ہو جائیں اور ان کے سونے کی جگہ الگ کر دو''۔

میں کہتا ہوں لڑکے کے بالغ ہونے کے دو طریق ہیں ایک تو اس حد کو پہنچنا جس میں صحیح اور غیر صحیح ادراک کی صلاحیت ہو جائے اور یہ صرف عقل سے ہوتا ہے اور عقل ظاہر ہونے کی علامت سات برس ہیں۔ پس سات برس کا لڑکا ان امور میں یقیناً ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور عقل کے پورے ہونے کی علامت دس برس ہیں پس دس برس کا لڑکا بشرطیکہ صحیح المزاج ہو پورا عاقل ہوتا ہے، اپنے نفع اور نقصان کو خوب پہچاننے لگتا ہے اور تجارت و دیگر معاملات میں پورا ہوشیار ہو جاتا ہے، اور بلوغ کا دوسرا طریق یہ ہے کہ وہ جہاد، حدود اور سزاؤں کے قابل ہو جائے اور اس کا ان لوگوں میں شمار ہونے لگے جو تکالیف برداشت کرتے ہیں اور مدنی اور مذہبی سیاست میں ان کا اعتبار کیا جاتا ہے اور جو راہ راست پر جب چلائے جاتے ہیں اور اس مرتبہ کا مدار عقل کامل اور جسم تام پر ہے اور یہ حالت اکثر میں پندرہ برس کی عمر میں متحقق ہو جاتی ہے اس بلوغ کی علامتوں میں سے یہ ہے کہ احتلام ہونے لگے اور زیر ناف کے بال نکل آئیں۔

نماز میں دو امر کا لحاظ کیا گیا ہے پس اس لحاظ سے کہ نماز بندے اور اس کے مالک کے درمیان ایک واسطہ ہے اور بندے کو جہنم کے طبقۂ اسفل السافلین میں گرنے سے باز رکھنے والی ہے، بلوغ اول کے وقت نماز کے حکم کر دیا گیا اور اس لحاظ سے کہ نماز اسلام کے شعائر میں سے ہے، اور اس پر مواخذہ کیا جاتا ہے اور اس پر لوگوں کو مجبور کیا جاتا ہے خواہ وہ چاہیں یا نہ چاہیں نماز کا حکم دیگر امور کے حکم کی طرح ہے۔

اور چونکہ دس برس کی عمر بلوغ کے دونوں حدوں کے بیچ میں ایک برزخ کی حالت تھی، بلوغ کی دونوں جہتوں میں مشترک تھی اس واسطے دونوں جہتوں سے حصہ دیا گیا اور دونوں کا حکم دیا گیا اور اس عمر میں الگ سلانے کا حکم اس لئے دیا گیا کہ یہ زمانہ آغاز جوانی کا ہوتا ہے پس کچھ بعید نہیں ہے کہ یکجا سونے سے جماع کی خواہش پیدا ہو جائے اس واسطے ضروری ہوا کہ برائی کا راستہ اس کے واقع ہونے سے پہلے ہی بند کر دیا جائے۔

نماز کی فضیلت کا بیان

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے ''بے شک نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کے لئے فرمایا جس نے گناہ کرنے کے بعد جماعت میں شامل ہو کر نماز پڑھ لی تھی ''خدا تعالیٰ نے تیرے گناہ کو بخش دیا'' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اگر تم میں سے کسی کے دروازہ پر نہر بہتی ہو جس میں وہ دن بھر میں پانچ مرتبہ نہاتا ہے تو کیا اس کے بدن پر میل باقی رہ سکتا ہے؟ لوگوں نے عرض کیا نہیں، آپ نے فرمایا، پس یہی حال پنج وقتہ نمازوں کا ہے کہ ان سے خدا تعالیٰ گناہوں کو دور کر دیتا ہے''۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''پانچوں نمازیں اور ایک جمعہ دوسرے جمعہ تک اور ایک رمضان کو دوسرے رمضان تک اپنے درمیان کے گناہوں کو دور کرنے والے ہیں بشرطیکہ کبائر سے پرہیز کیا جائے۔

میں کہتا ہوں نماز میں پاکیزگی بھی ہے اور عبادت بھی اور وہ نفس کو پاک کر کے عالم ملکوت تک پہنچاتی ہے اور نفس کی یہ خاصیت ہے کہ جب وہ کسی صفت کے ساتھ متصف ہوتا ہے تو اس صفت کی ضد کو ترک کر دیتا ہے اور اس سے الگ ہو جاتا ہے اور وہ صفت اس سے ایسی معدوم ہو جاتی ہے کہ کبھی اس کا نام بھی اس میں نہ تھا، پس جو شخص ان نمازوں کو پورے طور پر ادا کرے اور اچھی طرح پر وضو کرے اور ان کے وقت پر ان کو پڑھے اور ان کے رکوع اور خشوع اور اذکار اور اشکال کو پورے طور پر کرے اور اشباح سے ان کی ارواح اور صورتوں سے ان کے معانی مقصود رکھے تو ضرور وہ رحمت الٰہی کے عظیم الشان دریا میں غوطہ لگاتا ہے اور خدا تعالیٰ اس کے گناہ مٹا دیتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''بندے میں اور اس کے کافر ہونے میں نماز کو ترک کرنے کا فرق ہے''۔

میں کہتا ہوں نماز اسلام کے شعائر اور اس کی علامات میں سب سے زیادہ عظیم الشان ہے جس کے جاتے رہنے سے اسلام کے فقدان کا حکم دیا جا سکتا ہے کیونکہ نماز میں اور اسلام میں بہت زیادہ لگاؤ اور اتحاد ہے نیز نماز ہی اس کے معنی کو یعنی اللہ تعالیٰ کے سامنے سر جھکا دینے کو خوب ثابت کرتی ہے ا، جس کو نماز سے حصہ نہیں ملا تو اس کا اسلام اس قدر باقی رہ گیا جس کا خدا تعالیٰ

کے نزدیک کچھ اعتبار نہیں۔

نماز کے اوقات کا بیان

جبکہ نماز کا فائدہ یعنی دریائے شہود میں غوطہ لگانا اور فرشتوں کی جماعت میں مل جانا بدون نماز پر مداومت کے اور اس کا التزام اور اس کی کثرت کے حاصل نہیں ہوتا حتی کہ لوگوں کے اثقال ان کے اوپر سے ہٹ جائیں اور یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ ان کو ایسا حکم دیا جائے جس سے ضروری خارج ہونا لازم آئے، اس واسطے حکمت الٰہی کا مقتضی ہوا کہ لوگوں کو نماز کی محافظت اور اس کی مداومت کا حکم زمانہ کے ہر ایک حصہ کے بعد دیا جائے تاکہ نماز پڑھنے سے قبل اس کا انتظار کرنا اور اس کے لئے تیار رہنا اور نماز پڑھ لینے کے بعد اسکے رنگ کا بقیہ اور اس کے نور کا اثر نماز کے حکم میں شمار ہو اور غفلت کے اوقات میں بھی نظر ذکر الٰہی کی طرف رہے اور دل اللہ تعالیٰ کی طاعت میں لگا رہے، پس مسلمان کا حال اس گھوڑے کا سا ہوتا ہے جو لمبی رسی سے بندھا ہوتا ہے ایک دو قدم ادھر ادھر چل کر پھر اپنے تھان پر آ رہتا ہے اور نماز کی پابندی سے غفلت اور گناہوں کی تاریکی دلوں کے اندر نہیں بیٹھتی، مداومت حقیقی ممکن نہ ہونے کی صورت میں ایسی مداومت ہوسکتی ہے۔

پس جب نماز کے اوقات کی تعیین کی ضرورت ہوئی تو کوئی وقت ان چاروں وقتوں سے بہتر نہ تھا جن میں روحانیت کا عالم ظہور میں ہوتا ہے اور ملائکہ کا نزول ہوتا ہے اور بندوں کے اعمال خدا تعالیٰ کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں اور بندوں کی دعائیں قبول ہوتی ہیں اور یہ چاروں اوقات ان سب لوگوں کے نزدیک جو عالم بالا سے فیض حاصل کرتے ہیں ایک مسلم امر کے مانند ہیں، لیکن آدھی رات کے وقت سب لوگوں کو نماز پڑھنے کے ساتھ مکلف کرنا ممکن نہیں ہے، جیسا کہ ظاہر ہے اس واسطے فی الحقیقت نماز کے اوقات تین ہوئے، صبح اور شام اور رات کی تاریکی۔

چنانچہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے ''قائم کر نماز کو سورج کے ڈھلنے سے رات کی تاریکی تک اور صبح کو قرآن پڑھا کر کیونکہ صبح کے وقت قرآن کا پڑھنا موجب حضور ملائکہ ہے'' اور ''الی غسق اللیل'' اس واسطے فرمایا کہ فصل نہ پائے جانے کی وجہ سے شام کی نماز حکما شب کی تاریکی سے مل جاتی ہے اور اسی وجہ سے ضرورت کے وقت ظہر وعصر کو اور مغرب وعشا کو ایک ساتھ پڑھنا درست ہے، پس یہ ایک اصل ہے، اور دو نمازوں میں بہت زیادہ فصل کرنا بھی درست نہیں ہے کہ

محافظت کے معنی ہی فوت ہو جائیں اور جو کچھ اس نے اوّل بار نماز سے حاصل کیا تھا جاتا رہے، اور نہ ہی بہت تھوڑا سا فصل رکھنا درست ہے کہ ان کو معاش کے حاصل کرنے کی فرصت ہی نہ ملے، اور اس امر میں ایک ایسی ظاہر و محسوس حد مقرر کرنا ضروری ہے جس کو سب خاص و عام معلوم کر لیا کریں اور وہ کسی قدر زیادہ کر دینا ہے اس جز کا جو اوقات کے اندازہ کرنے میں عرب و عجم کے نزدیک مستعمل ہو اور وہ بہت زیادہ بڑھائی ہوئی نہ ہو، اور اس امر کے لئے چوتھائی دن کی مقدار ہی ہو سکتی ہے کیونکہ چوتھائی دن میں تین ساعتیں ہوتی ہیں اور دن کا اور رات کا بارہ حصوں میں تقسیم کرنا ایک ایسا اہم ہے جس پر تمام اقالیم صالحہ نے اتفاق کیا ہے۔

اور اہل زراعت اور تجارت اور اہل صنعت وغیرہم کی اکثر یہ عادت ہے کہ صبح سے دوپہر تک اپنے کاموں میں مشغول رہتے ہیں کیونکہ کسب معاش کا یہی وقت ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''اور ہم نے دن کو روزگار بنایا'' اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''تاکہ تم اس کے فضل سے طلب کرو'' اور بہت سے اشغال ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے لئے ایک طویل مدت درکار ہوتی ہے اور ایسے کاروبار کے وقت میں سب لوگوں کا نماز کے لئے آمادہ ہونا اور اس کے لئے وقت نکالنا حرج عظیم ہے اور اسی واسطے شارع نے نماز چاشت کو ساقط کر دیا اور بغیر فرض کئے اس کی طرف پوری رغبت دلائی اس وجہ سے یہ بات ضروری ہوئی کہ دن کے نصف اخیر کی نماز کے دو حصے کئے جائیں جن کے درمیان قریباً چوتھائی دن کا فصل ہو اور وہ ظہر اور عصر کی نمازیں ہیں اور رات کی نماز کے بھی دو حصے کر دیئے جائیں جن کے درمیان اسی قدر فصل رہے اور وہ مغرب اور عشا کی نمازیں ہیں اور یہ بات بھی ضروری ہوئی کہ بغیر ایسی ضرورت کے جس سے مفر ہی نہیں ایک وقت کی دونوں نمازوں کو جمع نہ کیا جائے ورنہ وہ مصلحت جس کا تعین اوقات میں لحاظ رکھا گیا ہے ضائع ہو جائے گی اور یہ دوسری اصل ہے۔

اور صالح ملکوں کے تمام باشندے اور معتدل مزاج لوگ جو احکام میں مقصود بالذات ہیں ہمیشہ علی الصبح بیدار ہو کر صبح کی روشنی سے رات کی تاریکی تک اپنے کاروبار میں مصروف رہتے ہیں اور نماز کے ادا کرنے کے لئے ایک تو وہ وقت مناسب ہے جس میں انسان کا نفس معاشی مصروفیات کے ان اثرات سے بری ہو جو یاد الٰہی کو بھلا دیتے ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ کا ذکر ایک فارغ

قلب کو پالے پس اس میں جگہ کر لے اور نفس کے اندر پوری پوری تاثیر کر لے اس کی نسبت اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''اور صبح کو قرآن پڑھا کر کیونکہ صبح کے وقت قرآن کا پڑھنا موجب حضور ملائکہ ہے۔

اور ایک وہ وقت مناسب ہے جس میں آدمی سونے کے قریب ہوتا ہے تاکہ اس وقت کی نماز سارے دن کی کدورتوں کا کفارہ اور دل کے زنگ کو دور کرنے والی ہو جائے. چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ''جس نے عشا کی نماز جماعت سے پڑھی تو وہ شب کے نصف اول میں قیام کے برابر ہے اور جس شخص نے عشا اور فجر کی نماز جماعت سے پڑھی تو وہ پوری رات کے قیام کے برابر ہے''۔

اور ایک وہ وقت مناسب ہے جو لوگوں کے کاروبار کا ہوتا ہے جیسے دن چڑھے کا وقت ہے تاکہ اس وقت کی نماز دنیا کے اندر پورے انہماک کو ہلکا کر دے اور اس کے واسطے تریاق کا کام دے، مگر اس وقت کی نماز کا تمام لوگوں کو حکم نہیں دیا جا سکتا کیونکہ اس وقت لوگوں کی دو حالتیں ہوں گی یا تو وہ اپنے کاروبار کو چھوڑیں گے اور یا ان کو نماز ترک کرنا پڑے گی اور یہ ایک اور اصل ہے، نیز تعیین اوقات کے باب میں اس سے بہتر کوئی بات نہیں کہ اس طریق کو اختیار کیا جائے جو گزشتہ انبیا مقربین سے منقول ہے کیونکہ اس طریق کا اختیار کرنا ادائے طاعت پر نفس کے لئے بہت بڑی تنبیہ کرنے والا ہے اور نفس کے لئے اس امر پر ابھارنے والا ہے کہ لوگ عبادت میں ایک دوسرے پر سبقت کریں اور لوگوں میں صالحین کے ذکر جمیل کا باعث ہے، اس کی نسبت حضرت جبرئیل نے فرمایا تھا ''یہ آپ سے قبل گزرے ہوئے انبیا کا وقت صلوٰۃ ہے''۔

یہ اعتراض نہ کیا جائے کہ نماز عشا کے بارے میں حضرت معاذ کی روایت کردہ حدیث میں اس طرح آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اس عشا کو تم سے پہلے کسی نے نہیں پڑھا'' کیونکہ اس حدیث کو لوگوں نے مختلف طور سے روایت کیا ہے پس بعض نے اس طرح سے کہا کہ لوگوں نے نماز پڑھی اور سو گئے اور بعض نے اس طرح کہا کہ اس نماز کو کوئی نہیں پڑھتا تھا مگر مدینہ میں اور اسی طرح اور اقوال ہیں پس ظاہر یہ ہے کہ یہ روایت بالمعنیٰ کی قسم سے ہے اور یہ ایک اور اصل ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اوقات کے مقرر کرنے میں بہت سے اعتبار سے بڑے بڑے راز

ہیں، پس حضرت جبرئیل علیہ السلام بشکل انسان تشریف لائے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھائی اور آپ کو نماز کے اوقات کی تعلیم فرمائی، اور ہمارے بیان سے جمع بین الصلوتین کے جواز کی وجہ فی الجملہ اور نماز تہجد اور نماز چاشت کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم و دیگر انبیا پر واجب ہونے کا سبب جیسا کہ علما نے بیان کیا ہے اور دیگر لوگوں کے لئے ان کا نفل ہونا اور نمازوں کو ان کے اوقات میں ادا کرنے کی تاکید کا سبب ظاہر ہو گیا، واللہ اعلم۔

اور چونکہ تمام لوگوں کو ایک ہی وقت میں نماز پڑھنے کا حکم کرنے میں نہ اس وقت سے پہلے پڑھیں اور نہ اس کے بعد پڑھیں حرج عظیم تھا اس واسطے اوقات کے اندر کسی قدر توسیع کر دی گئی، اور جبکہ وہی قرائن جو عرب کے نزدیک ظاہر تھے اور کسی ادنی و اعلیٰ پر مخفی نہیں تھے تشریع کی صلاحیت رکھتے تھے تو اوقات کے اوائل اور ان کے اواخر کے لئے منضبط اور محسوس حدیں مقرر کی گئیں اور ان اسباب کے مجتمع ہونے کی وجہ سے نمازوں کے لئے چار قسم کے اوقات حاصل ہوئے ان میں سے ایک وقت اختیار کا ہے اور یہ وہ وقت ہے جس میں نماز بلا کراہت کے ادا ہو جاتی ہے اور اس میں زیادہ معتبر دو حدیثیں ہیں ایک تو حدیث جبرئیل ہے کہ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دو روز تک نماز پڑھائی اور دوسری حدیث بریدہ ہے جس میں یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو جو نماز کے اوقات دریافت کرتا تھا جواب دیا کہ وہ دو روز تک ساتھ نماز پڑھے اور ان دونوں حدیثوں میں سے مفسر کا حکم مبہم پر ناطق ہے اور جس امر میں اختلاف ہو گا اس میں بریدہ کی حدیث پر عمل کیا جائے گا کیونکہ وہ مدنی ہے، متاخر ہے اور پہلی حدیث مکی ہے، متقدم ہے اور اتباع متاخر ہی کا ہوا کرتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مغرب کا آخر وقت شفق غائب ہونے سے پیشتر تک ہے اور کچھ بعید نہیں ہے کہ جبرئیل علیہ السلام نے دوسرے دن مغرب کی نماز تھوڑی ہی سی دیر کر کے پڑھی ہو کیونکہ اس کا وقت کم ہوتا ہے پس راوی نے خطا اجتہادی کی وجہ سے یا غایت قلت کو بیان کرنے کی غرض سے یہ کہہ دیا ہو کہ دونوں روز مغرب کی نماز ایک ہی وقت میں پڑھی، واللہ اعلم۔

اور بہت سی احادیث اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ نماز عصر کا اخیر وقت تغیر آفتاب تک ہے اور اسی پر فقہا کا اتفاق ہے، پھر شاید مثلین اخیر وقت مختار یا وقت مستحب کا بیان ہو، یا ہم یہ کہتے ہیں کہ شاید شرع نے اولاً اس بات کی طرف نظر کی کہ وقت عصر کے دو حصے کرنے سے مقصود یہ ہے

کہ ہر دو نمازوں میں بقدر چوتھائی دن کے فصل ہو اس واسطے اس کا انتہائی اخیر وقت یہ مقرر فرمایا ہو کہ ہر شئے کا سایہ مثلین تک پہنچ جائے، پھر لوگوں کے حوائج اور اشغال سے ظاہر ہوا کہ انتہا وقت کو بڑھانا ضروری ہے، اور نیز اس حد کے معلوم کرنے میں ایک قسم کا غور کرنے اور سایہ اصلی کو یاد رکھنے اور آلات رصد کی ضرورت ہے۔

اور مناسب یہ ہے کہ ایسے امور میں ان چیزوں سے لوگوں کو خطاب کیا جائے جو محسوس اور ظاہر ہوں اس واسطے اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں اس بات کا القا فرمایا کہ انتہائے وقت عصر سورج کے جسم یا اس کی روشنی کے تغیر کو گردانا جائے، واللہ اعلم۔

اور ان چار وقتوں میں سے ایک وقت استحباب کا ہے جس میں نماز کا پڑھنا اولیٰ ہوتا ہے اور وہ وقت سب نمازوں کے لئے اول وقت ہے بجز عشا کی نماز کے کہ اس کا اصل مستحب وقت اس کو دیر سے پڑھنا ہے اس وضع طبعی کی وجہ سے جس کو ہم بیان کر چکے ہیں اور وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ہے "اگر میں اپنی امت پر دشوار نہ سمجھتا تو میں ان کو عشا کی نماز کو دیر کر کے پڑھنے کا حکم دے دیتا۔ اس کے علاوہ عشا کی نماز کو دیر سے پڑھنا خدا کی یاد سے غافل کرنے والے اشغال سے باطن کو خوب صاف کرتا ہے اور عشا کے بعد قصے کہانیوں میں پڑنے کو ختم کرتا ہے، لیکن تاخیر کبھی کبھی جماعت میں کمی کا اور نماز سے لوگوں کی بے رغبتی کا سبب بن جاتی ہے اور ایسی تاخیر میں قلب موضوع ہے، پس اس وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایسا کرتے کہ جب لوگ کثرت سے آجاتے تو جلدی کر کے نماز پڑھاتے اور جب کم ہوتے تو دیر کر کے نماز پڑھاتے اور موسم گرما میں ظہر کی نماز میں تاخیر مستحب ہے اس کی نسبت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جب گرمی کی شدت ہو تو ظہر کو ٹھنڈا کر کے پڑھا کرو کیونکہ گرمی کی شدت جہنم کی بھاپ ہے"۔ میں کہتا ہوں اس کے معنی یہ ہیں کہ اس عالم میں جو کچھ کیفیات مناسبہ اور منافرہ کا فیضان ہوتا ہے ان کا خزانہ جنت اور دوزخ ہیں اور کاسنی وغیرہ کے متعلق جو حدیث آئی ہے اس کی بھی یہی تاویل ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "فجر کی نماز اجالے میں پڑھو کیونکہ اس سے اجر زیادہ ہوتا ہے"۔

میں کہتا ہوں کہ یہ ان لوگوں سے خطاب ہے جن کو جماعت کے بہت کم ہونے کا خوف تھا کہ وہ روشنی ہونے تک انتظار کریں، یا بڑی بڑی مساجد والوں سے خطاب ہے جن میں ضعیف

لوگ اور لڑکے وغیرہ اکٹھے ہوتے ہیں جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ہے ''تم میں سے جو شخص لوگوں کو نماز پڑھائے تو وہ تخفیف کرے کیونکہ جماعت میں ضعیف بھی ہوتے ہیں'' الحدیث۔ یا اس حدیث کے یہ معنی ہیں کہ صبح کی نماز کو اتنا طویل کرو کہ اسفار کے وقت ختم ہوا کرے اور ابو برزہؓ کی حدیث اس پر دلیل ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صبح کی نماز میں اس وقت فارغ ہوتے تھے کہ آدمی اپنے پاس کے آدمی کو پہچان لیتا تھا، اور ساٹھ آیت سے سو آیت تک پڑھتے تھے پس اب اسفار کی حدیث میں اور غلس (۱) کی حدیث میں کوئی منافات نہیں رہی۔ اور ان چار وقتوں میں سے ایک وقت ضرورت کا ہے اور یہ وہ وقت ہے کہ بغیر عذر کے اس وقت تک نماز کو موخر کرنا ممنوع ہے اس کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس نے طلوع آفتاب سے پہلے صبح کی ایک رکعت پالی تو اس نے صبح کی نماز کو پالیا اور جس نے غروب آفتاب سے پہلے عصر کی ایک رکعت پالی تو اس نے عصر کی نماز کو پالیا''۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''ایسے تنگ وقت میں نماز پڑھنا منافق کی نماز ہے جو بیٹھا دیکھا کرتا ہے یہاں تک کہ جب آفتاب زرد ہو جاتا ہے'' الحدیث، اور عبداللہ بن عباسؓ کی حدیث بھی اسی قبیل سے ہے جس سے ظہر و عصر کا جمع کرنا اور مغرب و عشا کا جمع کرنا ثابت ہے اور وہ عذر کی وجہ سے تاخیر جائز ہے سفر، مرض اور بارش وغیرہ ہیں اور عشا کی نماز میں طلوع فجر تک تاخیر کرنا جائز ہے، واللہ اعلم۔

اور ان چار وقتوں میں سے ایک وقت قضا کا ہے جب اس کو نماز یاد آ جائے اور اس کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو شخص کسی وقت کی نماز کو بھول جائے یا سو جائے تو جب اس کو وہ نماز یاد آئے پڑھ لے''۔

میں کہتا ہوں کہ ساری بات اس میں یہ ہے کہ نفس کو ترک کرنے کا عادی نہ ہو جائے، اور جو نماز کا فائدہ اس سے فوت ہو گیا ہے وہ اس کو مل جائے، اور علما نے دانستہ نماز فوت کرنے کو بھی خود فوت ہونے کے ساتھ ملحق کر دیا ہے یہ دیکھ کر کہ اس میں کفارہ ادا کرنا اور بھی زیادہ ضروری ہے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوذرؓ کو وصیت فرمائی تھی جب ان پر ایسے سردار مقرر ہوں جو نماز کو بے جان کر کے پڑھتے ہوں ''تو نماز کے وقت پر نماز پڑھا کرنا پھر اگر ان کے ساتھ بھی تو نماز کو پالے

(۱) غلس تاریکی کو کہتے ہیں، بخاری و مسلم کی حدیث ہے کہ آنحضرت اندھیرے میں نماز پڑھتے تھے۔

تو ان کے ساتھ پڑھ لینا پس وہ تیرے لئے نفل ہو جائے گی''۔

میں کہتا ہوں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز میں دو باتوں کا لحاظ کیا، ایک تو اس کا کہ نماز بندہ اور خدا تعالیٰ کے درمیان وسیلہ ہے اور دوسرے اس کا کہ نماز اسلام کے شعائر میں سے ہے جس کا تارک قابل ملامت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''میری امت ہمیشہ بخیر رہے گی جب تک کہ وہ مغرب کی نماز کو ستاروں کے گنجان ہونے تک دیر تک نہ پڑھیں گے''۔

میں کہتا ہوں اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حدود شرعیہ کے اندر سستی کرنا دین کے اندر تحریف اور بگاڑ کا سبب ہوتا ہے، خدا تعالیٰ کا فرمان ہے ''سب نمازوں کی محافظت کرو خاص کر درمیانی نماز کی''۔ درمیانی نماز سے عصر کی نماز مراد ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس نے دو ٹھنڈک کے وقت کی نمازیں پڑھیں وہ جنت میں داخل ہوا''۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس نے عصر کی نماز ترک کردی اس کا عمل ضائع ہو گیا'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس شخص کی عصر کی نماز جاتی رہی تو گویا اس کی اولاد اور مال غارت ہو گیا''۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''منافقین پر فجر اور عشا سے زیادہ کوئی نماز گراں نہیں ہوتی اور جو کچھ ان نمازوں کے اندر ہے اگر ان کو معلوم ہوتا تو ان نمازوں کے لئے آتے خواہ ان کو گھسٹنا ہی پڑتا''۔

میں کہتا ہوں ترغیب اور ترہیب کے لحاظ سے انہی تین نمازوں کا زیادہ تر اہتمام اس لئے کیا گیا ہے کہ ان نمازوں میں سستی اور غفلت کا مظنہ ہے کیونکہ فجر اور عشا کا وقت لوگوں کے سونے کا وقت ہوتا ہے خدا تعالیٰ کا یقین اور اس کا خوف رکھنے والا ہی اپنی آرام کی نیند اور غنودگی کے وقت اپنے بستر اور گدے سے اللہ تعالیٰ کے واسطے اٹھ سکتا ہے اور عصر کا وقت پس وہ بازاروں کے قیام کا اور خرید و فروخت میں لوگوں کی مشغولیت کا وقت ہوتا ہے اور وہ وقت کسان لوگوں کے لئے نہایت ہی تھک جانے کا وقت ہوتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''گنوار لوگ تمہاری مغرب کی نماز کا نام بدلنے میں تم پر غالب نہ آجائیں'' اور ایک دوسری حدیث میں آیا ہے ''عشا کی نماز کا نام بدلنے میں تم پر غالب نہ آجائیں''۔

میں کہتا ہوں کسی شئے کا نام جو کتاب وسنت میں آیا ہے بدل کر کوئی اور نام رکھنا جو پہلے نام کے متروک ہونے کا سبب بنتا ہو مکروہ ہے کیونکہ ایسا کرنا لوگوں پر ان کے دین کو خلط ملط کرتا ہے

اور کتاب آسمانی کو ان پر دشوار کردیتا ہے۔

اذان کا بیان

جب صحابہ کو یہ بات معلوم ہوئی کہ جماعت ایک مقصود اور موکد چیز ہے اور ایک وقت اور ایک جگہ میں بغیر اعلام اور آگاہ کرنے کے اجتماع نہیں ہوسکتا تو انھوں نے اس شئے کے بارے میں باہم گفتگو کی جس سے اعلام حاصل ہوجائے، پس کسی نے آگ روشن کرنے کا ذکر کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجوس کے ساتھ مشابہت ہونے کی وجہ سے نامنظور فرمایا اور کسی نے نرسنگہ بجانے کو کہا تو آپ نے مشابہت یہود کی وجہ سے اس کو رد کردیا، اور کسی نے ناقوس کے لئے کہا تو اس کو بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مشابہت نصاریٰ کی وجہ سے منظور نہیں کیا پس بغیر کسی بات کو معین کیے سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو واپس ہوگئے، اس اثنا میں عبداللہ بن زید نے اذان اور اقامت کو خواب میں دیکھا اور اس خواب کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کیا آپ نے سن کر فرمایا، خواب سچا ہے، اور یہ قصہ ان امور پر واضح دلیل ہے کہ احکام شرعیہ مصلحتوں کی بنا پر مقرر کیے جاتے ہیں اور اجتہاد کو بھی احکام میں دخل ہے اور آسانی ایک اصل اصیل ہے اور دینی امور میں ان لوگوں کی مخالفت کرنا جو گمراہی میں بہت زیادہ بڑھ گئے ہیں شارع کو مطلوب ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی اور بھی خواب کے ذریعہ یا القافی القلب کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی مراد پر کبھی مطلع ہوجاتا ہے لیکن لوگ اس کے مکلّف نہیں ہوسکتے اور نہ اس میں سے شبہ دور ہوسکتا ہے یہاں تک کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو برقرار رکھا ہو، اور حکمت الٰہی کا مقتضیٰ یہ ہوا کہ اذان میں صرف اعلام اور تنبیہ ہی نہ ہو بلکہ اس کے ساتھ اس کا شعائر دین میں سے ہونا بھی شمار کیا جائے اس طور پر کہ بے خبر لوگوں کے سروں پر اس کے الفاظ کا پکارنا اور تنبیہ کرنا تعظیم دین ہو اور لوگوں کا اس کو قبول کرلینا ان کے دین الٰہی کے تابع ہونے کی نشانی ہو اس واسطے یہ بات ضروری ہوئی کہ اذان ذکر الٰہی سے اور شہادتین سے اور نماز کی طرف بلانے سے مرکب ہو، تاکہ جو چیز اس سے مقصود ہے اس کی وہ تصریح کرنے والی ہو۔

اور اذان کے کئی طریقے مروی ہیں، ان میں سے سب سے صحیح طریقہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا طریقہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں اذان، ہر کلمہ کو دو دو مرتبہ کہنے سے اور

اقامت ایک ایک مرتبہ کہنے سے ہوتی تھی مگر قد قامت الصلوٰۃ کو دوبارہ کہتے تھے، اس کے بعد ابومخدورہ کا طریقہ ہے کہ ان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اذان میں انیس کلمات اور اقامت میں سترہ کلمات سکھلائے، اور میرے اذان کے کلمات ایسے ہیں جیسے قرآن کی قرأتیں کہ سب شافی، کافی ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''پس اگر صبح کی نماز ہے تو تجھے کہنا چاہیے۔ الصلوٰۃ خیر من النوم، الصلوٰۃ خیر من النوم۔

میں کہتا ہوں صبح کا وقت چونکہ سونے اور غفلت کا وقت ہوتا ہے اور اس میں نہایت قوی تنبیہ کی حاجت ہے اس واسطے ان کلموں کا زیادہ کرنا مستحب ہوا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو شخص اذان کہے وہی اقامت بھی کہے''۔

میں کہتا ہوں اس میں وجہ یہ ہے کہ جب ایک شخص نے اذان کی ابتدا کی تو اس کے مسلمان بھائیوں پر ضروری ہوا کہ اس نے مباح منافع سے جو حاصل کرنا چاہے ہے اس میں اس سے مزاحمت نہ کریں، جس طرح نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے ''کوئی شخص اپنے بھائی کی منگنی پر منگنی کا پیغام نہ بھیجے''۔ اور فضائل اذان میں سے یہ امور ہیں کہ وہ شعائر اسلام میں سے ہے اور اس کی وجہ سے ملک دارالاسلام ہو جاتا ہے اسی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اگر کسی جگہ سے اذان کی آواز سن لیتے تھے تو حملہ کرنے سے رک جاتے تھے ورنہ اس کو غارت کردیا کرتے تھے، اور وہ نبوت کے شعبوں میں سے ایک شعبہ ہے کیونکہ اس سے اسلام کے بڑے عظیم الشان رکن پر اور اس عبادت پر جو سب عبادتوں کی اصل ہے ترغیب ہوتی ہے، اور خدا تعالیٰ کی رضامندی اور شیطان کی ناراضی جس قدر اس نیکی میں ہوتی ہے جو دوسروں کی طرف متعدی ہو اور کلمہ حق کے بلند ہونے میں ہوتی ہے کسی اور چیز میں نہیں ہوتی، اسی کی نسبت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ''ایک فقیہ ہزار عابد سے زیادہ شیطان پر سخت ہے''۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جب نماز کے لئے اذان ہوتی ہے تو شیطان پشت پھیر کر بھاگتا ہے اور اس کا گوز (۱) نکل جاتا ہے''۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''موذن سب لوگوں سے زیادہ بلند گردن والے ہوں گے'' اور آپ نے فرمایا جہاں تک موذن کی آواز جاتی ہے اس کی مغفرت کی جاتی ہے اور جن وانس اس

---

(۱) ہوا خارج ہو جاتی ہے۔

کی گواہی دیں گے''۔

میں کہتا ہوں جزا اور سزا کا معاملہ معانی کی صورتوں کے ساتھ مناسبت اور ارواح کے اشباح کے ساتھ تعلق پر مبنی ہے اس واسطے ضروری ہوا کہ موذن کی عظمت وشان اس کی گردن اور آواز کے اعتبار سے ظاہر ہو اور اللہ تعالیٰ کی رحمت اس پر اس قدر پھیلے جس قدر اس کا خدا تعالیٰ کی طرف بلانا لوگوں میں پھیلتا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس شخص نے طلب ثواب کی غرض سے سات سال تک اذان دی تو اس کے لئے آگ سے رہائی لکھ دی گئی''۔ اور یہ اس واسطے کہ اس نے اپنی صحت تصدیق کو ظاہر کیا، خدا تعالیٰ کے لئے سات سال تک اذان دینے کی وہی شخص پابندی کر سکتا ہے جس نے اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کے سپرد کر دیا ہو، اور اس واسطے کہ اس نے اپنے نفس کو اس قابل بنا لیا کہ رحمت الٰہی اس پر پورے طور سے چھا جائے۔ خدا تعالیٰ نے اس چرواہے کے حق میں جو پہاڑ کے ٹیلہ پر بکریاں چراتا تھا فرمایا ''میرے اس بندے کی طرف دیکھو! اذان کہتا ہے اور نماز پڑھتا ہے، وہ مجھ سے ڈرتا ہے میں نے اس کو بخش دیا اور اس کو جنت میں داخل کیا''۔ خدا کا یہ فرمانا ''وہ مجھ سے ڈرتا ہے'' اس بات کی دلیل ہے کہ اعمال کا اعتبار ان کے دواعی پر ہوتا ہے جو ان اعمال پر ابھارتے ہیں اور یہ کہ اعمال اشباح ہیں، اور دواعی ان اعمال کی ارواح ہیں پس خدا تعالیٰ سے اس کا خوف کرنا اور اس کا اخلاص اس کی مغفرت کا سبب ہو گیا، اور چونکہ اذان جو شعائر دین میں سے ہے اس لئے مقرر کی گئی کہ اس کے ذریعہ لوگوں کا ہدایت الٰہیہ کا قبول کر لینا پہچان لیا جائے اس واسطے اذان کے جواب دینے کا لوگوں کو حکم دیا گیا تاکہ جواب دینے سے اس کی تصریح ہو جائے جس کا حصول لوگوں کی جانب سے مقصود ہے پس سننے والا ذکر اور شہادتین کا جواب انہی الفاظ کے ساتھ دے اور دعوت کا جواب ان الفاظ کے ساتھ دے جن میں گناہ سے باز رہنے کی اور نیکی کے کرنے کی طاقت کی طلب خاص خدا سے ہوتا کہ اس عبادت کے کرتے وقت فخر پیدا نہ ہو جو شخص دلی خلوص سے ایسا کرے گا جنت میں داخل ہوگا کیونکہ ایسا کرنا قلبی فرمانبرداری کی صورت ہے اور اپنی جان کو خدا تعالیٰ کے سپرد کر دینا ہے، پھر اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے دعا (۱) کرنے کا حکم دیا گیا تاکہ وہ آپ کے دین کو قبول کرنے کی اور آپ کی محبت اختیار کرنے کی

حقیقت کو کامل کر دے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اذان اور اقامت کے درمیان میں دعا رد نہیں ہوتی۔

میں کہتا ہوں اس وقت میں دعا کا رد نہ ہونا رحمت الٰہیہ کے شمول اور دعا کرنے والے کی طرف سے تابعداری پائے جانے کا سبب ہوتا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''بلال رات میں اذان دیا کرتا ہے پس جب تک ابن ام مکتومؓ اذان نہ دے تم کھاؤ پیو''۔

میں کہتا ہوں امام کے لئے مستحب ہے کہ جب اس کو ضرورت معلوم ہو تو دو مؤذن مقرر کردے جس کی آواز لوگ پہچانتے ہوں اور لوگوں کو یہ بتلا دے کہ ان میں سے فلاں مؤذن رات میں اذان دیتا ہے پس جب تک دوسرا موذن اذان نہ دے تم کھایا پیا کرو تا کہ جو شخص بیدار ہو چکا ہے اور سحری کھا رہا ہے وہ پہلی اذان سے نہ رک جائے اور سونے والا نماز کے لئے اٹھ بیٹھے اور سحری نہ کھائی ہو تو جلدی سے سحری کھالے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جب نماز کی اقامت ہو تو نماز کے لئے دوڑتے ہوئے نہ آؤ بلکہ چلتے ہوئے آؤ''۔

میں کہتا ہوں اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ عبادات میں تکلف نہیں کرنا چاہئے۔

مساجد کا بیان

مسجد بنانے کی اور اس کے التزام کی فضیلت اور مسجد میں نماز کے انتظار کی فضیلت کے اسباب یہ ہیں کہ مسجد شعائر اسلام میں سے ہے، چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جب تم کسی مسجد کو دیکھو یا کسی موذن کو اذان کہتے سنو تو پھر کسی کو قتل نہ کرو''۔

اور وہ نماز کی جگہ ہے، عابدوں کے اعتکاف کی جگہ ہے اور رحمت نازل ہونے کی جگہ ہے اور کسی قدر کعبہ کے مشابہ ہے، چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو شخص اپنے گھر سے پاک ہو کر فرض نماز کے لئے نکلا تو اس کا اجر ایسا ہے جیسے حج کرنے والے کا جو حالت احرام میں ہو، اور جو شخص چاشت کی نماز کے لئے گھر سے نکلا اور اس کا مقصود نماز پڑھنا ہی ہو تو اس کا اجر عمرہ کرنے والے کے اجر کے برابر ہے، اور آپ نے فرمایا ''جب تمہارا جنت کے باغوں میں گزر ہوا کرے تو اس میں چرا کرو، کسی نے پوچھا جنت کے باغ کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا ''مساجد'' اور تمام کاروبار

(۱) یعنی اللھم رب ھذہ الدعوۃ اخیر تک پڑھے۔

اور اہل وعیال سے یکسو ہو کر اوقات نماز میں محض نماز کی خاطر مسجد کی طرف متوجہ ہونا اس شخص کے اخلاص دین اور دل سے اپنے رب کی اطاعت کی دلیل ہے چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جب ایک شخص نے وضو کیا اور اچھے طور پر کیا پھر مسجد کی طرف خاص نماز ہی کے لئے چلا تو اس کی وجہ سے ہر ہر قدم پر اس کا ایک درجہ بلند اور ایک گناہ کم ہوتا چلا جاتا ہے پھر جب وہ نماز پڑھنے لگتا ہے تو جب تک وہ اپنی نماز میں رہتا ہے اس کے لئے ملائکہ دعا کرتے رہتے ہیں کہ اے خدا اس پر فضل کر، اے خدا اس پر رحم کر، اور تم میں سے جب تک کوئی نماز کا انتظار کرتا ہے نماز ہی میں رہتا ہے''۔ اور مسجد کا بنانا اعلاء کلمۃ اللہ کی اعانت کرنا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو شخص صبح کو یا شام کو مسجد میں جاتا ہے اللہ تعالیٰ جنت میں اس کی مہمانی کا سامان کرتا ہے خواہ وہ صبح کو جائے یا شام کو''۔

میں کہتا ہوں اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہر صبح وشام کو جانا بہیمیت کو ملکیت کے تابع کرنا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس شخص نے خدا کے لئے مسجد بنائی خدا اس کے لئے جنت میں ایک گھر بنائے گا''۔

میں کہتا ہوں اس میں راز یہ ہے کہ جزا بصورت عمل ہوتی ہے اور وضو جاتے رہنے سے انتظار کا ثواب اس لئے منقطع ہو جاتا ہے کہ اس وقت میں اس کی نماز کے لئے تیاری باقی نہیں رہتی، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد کو اور مسجد حرام کو زیادہ ثواب ہونے کی فضیلت چند وجوہ سے ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ ان مواضع میں خاص خاص فرشتے مقرر ہیں جو وہاں کے باشندوں کو گھیرے رکھتے ہیں اور جو وہاں آتا ہے اس کے لئے دعا کرتے ہیں۔ اور ان وجوہ میں سے ایک یہ ہے کہ ان مواضع کا آباد کرنا اللہ تعالیٰ کے شعائر کی تعظیم ہے اور کلمتہ اللہ کو بلند کرنا ہے۔

اور ان وجوہ میں سے ایک یہ ہے کہ ان مواضع میں آنا ائمہ دین کے حال کو یاد دلاتا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''سوائے تین مساجد کے کہیں کے لئے نہ جاوے نہ کسو، مسجد حرام اور مسجد اقصیٰ اور میری یہ مسجد''۔

میں کہتا ہوں اہل جاہلیت ان مقامات کو اپنے زعم میں معظم سمجھتے تھے ان کی زیارت کرنے کے لئے اور برکت حاصل کرنے کے لئے سفر کرتے تھے اور اس میں دین کی تحریف اور فساد ہے جو

پوشیدہ نہیں ہے، پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فساد کا دروازہ بند کر دیا تا کہ جو چیزیں شعائر الٰہی نہیں ہیں وہ شعائر میں نہ مل جائیں اور تا کہ یہ غیر اللہ کی عبادت کا ذریعہ نہ ہو جائے، اور میرے نزدیک حق بات یہ ہے کہ قبر اور اولیا اللہ میں سے کسی کی عبادت گاہ اور کوہِ طور سب کے سب ممنوع ہونے میں برابر ہیں، واللہ اعلم۔

مسجد کے آداب کے کئی طریقے ہیں، ان میں سے ایک مسجد کی تعظیم کا لحاظ رکھنا اور اپنے نفس کو اس بات کا پابند کرنا کہ دل میں متفرق خیالات نہ آئیں اور مسجد میں داخل ہونے کے بعد وہ مطلق العنان نہ رہے چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''تم میں سے جب کوئی شخص مسجد میں داخل ہو تو بیٹھنے سے پیشتر دو رکعت پڑھ لے'' اور ان آداب میں سے ایک مسجد کو ان چیزوں سے جو ناپاک اور مکروہ ہیں پاک صاف رکھنا ہے اس کے متعلق راوی کہتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد کے بنانے کا اور اس کو پاک صاف رکھنے کا اور معطر کرنے کا حکم دیا، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''میری امت کے اجر میرے سامنے پیش کئے گئے یہاں تک کہ کوڑے کا اجر بھی جس کو کوئی شخص مسجد سے نکال دیتا ہے دکھایا گیا'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''مسجد میں تھوکنا ایک خطا ہے اور اس کا کفارہ اس کو مٹی سے دبا دینا ہے''۔

اور ان میں سے ایک عبادت کرنے والوں کے دل پراگندہ کرنے سے اور بازار کا سا شور وغل کرنے سے باز رہنا ہے، چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص سے فرمایا تھا ''اس تیر کا پھل اپنے ہاتھ میں رکھ'' اور آپ نے فرمایا ''جو کوئی کسی شخص کو مسجد کے اندر اپنی گم شدہ چیز کے لئے آواز دیتا ہوا سنے تو اس کو یہ کہنا چاہئے۔ خدا تیری طرف اس کو واپس نہ کرے، کیونکہ مسجدیں اس واسطے نہیں بنائی گئی ہیں اور آپ نے فرمایا ہے جب تم مسجد کے اندر کسی شخص کو خرید یا فروخت کرتا دیکھو تو کہہ دو کہ خدا تعالیٰ تیری تجارت میں نفع نہ دے''۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد کے اندر اشعار پڑھنے سے، شکار کرنے سے اور حدود قائم کرنے سے بھی منع فرمایا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ گم شدہ چیز کا تلاش کرنا یعنی اس کی طلب میں آواز بلند کرنا اس لئے ممنوع ہوا کہ وہ شور وغل ہے جس سے نماز پڑھنے والوں اور اعتکاف کرنے والوں کے دل اچاٹ ہوتے ہیں اور اس کے مطلوب کے خلاف بد دعا کرے کہ جس میں کہ اس کی ذلت بھی ہوتی ہے اس کو منع کرنا

مستحب ہے، اور اس کی علت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بیان فرمائی کہ مسجدیں اس لئے نہیں بنائی گئی ہیں، یعنی وہ ذکر الٰہی اور نماز کے لئے بنائی گئی ہیں اور مسجد کے اندر خرید و فروخت کرنا اس لئے ممنوع ہوا کہ مسجد بازار نہ بن جائے کہ لوگ اس میں معاملات کرنے لگیں پس اس کی حرمت جاتی رہے اور نمازیوں اور معتکفوں کو تشویش پیدا ہونے لگے، اور اشعار پڑھنے سے منع کرنے کی وجہ بھی یہی ہے جو ہم نے بیان کی اور یہ وجہ بھی ہے کہ اشعار پڑھنے میں ذکر الٰہی سے اعراض اور دوسروں کو اعراض کی ترغیب دینا پایا جاتا ہے اور مسجد کے اندر شکار اور حدود کی اس لئے ممانعت ہوئی کہ اس میں گندگی رونے اور پیٹنے اور شور وغل کے پیدا ہونے اور عبادت سے نمازیوں کے دل ہٹنے کا احتمال ہے البتہ وہ اشعار مستثنیٰ ہیں جن میں ذکر الٰہی ہو اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح ہو اور کفار کو غم وغصہ میں مبتلا کرنا ہو کیونکہ یہ غرض شرعی ہے، اس لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسانؓ کے لئے دعا کی تھی کہ ''اے اللہ تو روح القدس سے اس کی تائید کر''۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کسی حائض اور جنبی کے لئے میں مسجد کو حلال نہیں رکھتا''۔

میں کہتا ہوں اس ممانعت کا سبب تعظیم مسجد ہے کیونکہ مسجد کی سب سے بڑی تعظیم یہ ہے کہ کوئی انسان بغیر طہارت کے اس میں داخل نہ ہو، اور بے وضو کو مسجد میں داخل ہونے سے منع کرنے میں بڑی دقت تھی اور جنبی اور حائض کو منع کرنے میں کوئی دقت نہیں اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ان دونوں کو بہ نسبت دوسرے لوگوں کے نماز سے زیادہ بعد ہے اور مسجد نماز ہی کے لئے بنائی گئی ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اس بدبودار درخت کو کھا کر کوئی شخص ہماری مسجد میں ہرگز نہ آئے کیونکہ جس چیز سے لوگوں کو ایذا ہوتی ہے اس چیز سے فرشتوں کو بھی ہوتی ہے''۔

میں کہتا ہوں اس بدبودار درخت سے مراد پیاز یا لہسن ہے اور ہر بدبودار چیز اسی حکم میں ہے اور فرشتوں کو ایذا ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ اس سے کراہت کرتے ہیں اور نفرت کرتے ہیں کیونکہ فرشتے پاکیزہ اخلاق اور خوشبودار چیزوں کو پسند کرتے ہیں اور ان کی اضداد چیزوں کو ناپسند کرتے ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جب تم میں سے کوئی مسجد میں داخل ہو تو اس کو یہ کہنا چاہئے اللھم افتح لی ابواب رحمتک، پھر جس مسجد سے نکلے تو یہ کہنا چاہئے: اللھم انی اسألک من فضلک.

میں کہتا ہوں داخل ہونے والے کے لئے طلب رحمت کی تخصیص اور نکلنے والے کے لئے طلب فضل کی تخصیص میں حکمت یہ ہے کہ کتاب اللہ میں رحمت سے نفسانی اور اخروی نعمتیں مراد ہیں، جیسے ولایت اور نبوت، خدا تعالیٰ نے فرمایا ''اور تیرے رب کی رحمت اس خیر سے جس کو وہ جمع کرتے ہیں بہتر ہے اور فضل سے دنیاوی نعمتیں مراد ہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''تم پر کوئی حرج نہیں کہ تم اپنے رب کے فضل کو طلب کرو''۔ اور خدا تعالیٰ نے فرمایا ''پس جب نماز ہو چکے تو زمین میں پھیل جاؤ اور خدا کے فضل کو طلب کرو''۔ اور جو شخص مسجد میں جاتا ہے تو وہ خدا تعالیٰ کا قرب تلاش کرتا ہے اور مسجد سے نکلنے کے بعد روزی تلاش کرنے کا وقت ہوتا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جب تم میں سے کوئی مسجد میں جائے تو وہ بیٹھنے سے پہلے دو رکعت پڑھ لے''۔

میں کہتا ہوں یہ اس وجہ سے مقرر کیا گیا کہ جو مکان نماز کے لئے بنایا گیا ہے اس میں داخل ہونے کے وقت نماز نہ پڑھنا بڑے خسارہ اور حسرت کی بات ہے اور اس میں ایک امر محسوس سے نماز کی طرف رغبت کا بھی انضباط ہو جاتا ہے اور اس میں مسجد کی تعظیم بھی ہوتی ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''تمام زمین نماز کی جگہ ہے بجز مقبرہ اور حمام کے'' اور سات جگہ میں نماز پڑھنے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے: کوڑی خانہ میں اور مقبرہ میں اور مذبح میں اور عام راستہ میں اور حمام میں اور اونٹوں کے بندھنے کی جگہ میں اور خانہ کعبہ کی چھت پر اور بل کی زمین میں نماز پڑھنے سے بھی منع فرمایا ہے کیونکہ اس زمین پر خدا کی لعنت ہو چکی ہے۔

میں کہتا ہوں کوڑی جگہ اور مذبح میں نماز پڑھنے سے منع کرنے میں حکمت یہ ہے کہ وہ دونوں نجاست کے مقام ہیں اور نماز کے لئے طہارت اور پاکیزگی مناسب ہے اور مقبرہ میں نماز پڑھنے سے منع کرنے میں حکمت یہ ہے کہ بتوں کی طرح سے علما اور اولیا کی قبور کی لوگ پرستش شروع نہ کر دیں کیونکہ یہ شرک خفی ہے یا ان مقابر میں نماز پڑھنے کو زیادہ تقرب الی اللہ نہ سمجھنے لگیں اور یہ شرک خفی ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کا یہی مفہوم ہے: یہود و نصاری پر خدا کی لعنت ہو انھوں نے اپنے انبیا کی قبروں کو مساجد بنا لیا''۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا سورج کے طلوع استوا اور غروب کے وقت نماز پڑھنے سے منع فرمانا اسی کی نظیر ہے کیونکہ ان اوقات میں کفار آفتاب کو سجدہ کرتے ہیں، اور حمام میں نماز پڑھنے سے منع کرنے میں حکمت یہ ہے کہ وہ لوگوں کے ستر

برہنہ ہونے کی اور لوگوں کے آتے جاتے رہنے کی جگہ ہے پس یہ باتیں نماز کو حضور قلب کے ساتھ مناجات کرنے سے روک دیں گی۔ اور اونٹوں کے باندھنے کے مواضع میں نماز پڑھنے سے منع کرنے میں حکمت یہ ہے کہ اونٹ عظیم الجثہ ہونے کی وجہ سے اور سختی کے ساتھ پکڑنے کی وجہ سے اور اس کی زیادہ جرأت کی وجہ سے انسان کو ایذا پہنچا سکتا ہے پس اس خیال سے اس جگہ نمازی کو حضور قلب حاصل نہ ہوگا بخلاف ان مواضع کے جہاں بکریاں باندھی جاتی ہیں اور عام راستہ پر نماز پڑھنے سے منع کرنے میں حکمت یہ ہے کہ راہ چلنے والوں کی وجہ سے ان کا دل نماز میں نہ لگے گا اور چلنے والوں پر راستہ بھی تنگ ہو جائے گا اس کے علاوہ وہ درندوں کے گزرنے کا راستہ ہوتا ہے جیسا کہ وہاں اترنے سے صریح نہی وارد ہے، اور بیت اللہ کی چھت پر نماز پڑھنے سے منع کرنے میں حکمت یہ ہے کہ بلاضرورت بیت اللہ کی چھت پر چڑھنا مکروہ ہے اور اس میں خانہ کعبہ کی بے حرمتی ہے اور اس حالت میں استقبال الی القبلہ ہونے میں بھی شک ہے اور اس زمین میں جہاں خسف واقع ہونے یا پتھر برسنے سے لعنت ہو چکی ہے نماز پڑھنے سے منع کرنے میں حکمت یہ ہے کہ اس زمین کو حقیر سمجھنا مقصود ہے، اس کے علاوہ خدا تعالیٰ کا خوف کر کے اس کے مقام غضب سے دور رہنا چاہئے چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اس جگہ روتے ہوئے جاؤ''۔

نماز کے کپڑوں کا بیان

واضح ہو کہ لباس کا پہننا ایسی چیز ہے جس کی وجہ سے انسان کو تمام بہائم سے امتیاز حاصل ہے اور کپڑوں کا پہننا انسان کے عمدہ حالات میں سے ہے اور اس میں ایک طرح کی طہارت پائی جاتی ہے اور اس میں نماز کی تعظیم ہوتی ہے اور اس سے اس مناجات کا جو خدا تعالیٰ کے روبرو ہوتی ہے ادب ثابت ہوتا ہے اور لباس کا پہننا بذات خود ایک واجب چیز ہے اس کو نماز میں اس لئے شرط کر دیا گیا ہے تا کہ اس سے نماز کے معنی کی تکمیل ہو جائے، شارع نے لباس کی دو حدیں مقرر کی ہیں ایک تو وہ حد ہے جو ضروری ہے اور وہ نماز کے صحیح ہونے کے لئے شرط ہے، اور ایک وہ حد ہے جو مستحب ہے، پس پہلی حد مرد کے لئے پیشاب اور پاخانہ کے مقام کا ستر کرنا ہے اور ان دونوں میں پیشاب کے مقام کا ستر زیادہ ضروری ہے اور دونوں رانیں انہی کے ساتھ ملحق ہیں اور عورت کے لئے تمام بدن کا ستر کرنا ہے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''حائض کی نماز بغیر

اوڑھنی کے قبول نہیں ہوتی''۔ حائض سے بالغ عورت مراد ہے اور دونوں رانوں کو شرمگاہ کے ساتھ اس لئے ملحق کیا کہ ران محل شہوت ہے اور اسی طرح عورت کا تمام بدن محل شہوت ہے اور اس واسطے اس کا حکم وہی ہے جو دونوں شرمگاہوں کا حکم ہے اور دوسری حد یعنی لباس مستحب کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ہے ''تم میں سے کوئی شخص ایک کپڑے میں کہ اس میں سے اس کے کاندھے پر کچھ نہ ہو نماز نہ پڑھے'' اور فرمایا ''جب کپڑا بڑا ہو تو اس کے دونوں طرف اِدھر اُدھر ڈال لے'' اور اس میں نکتہ یہ ہے کہ عرب اور عجم اور تمام وہ لوگ جن کے مزاج درست اور انسانیت پر ہیں باوجودیکہ وہ اپنی وضع میں مختلف ہیں کہ کوئی قبا پہنتا ہے، کوئی قمیص پہنتا ہے، کوئی حلہ پہنتا ہے اور کوئی ان کے علاوہ کچھ اور پہنتا ہے ان سب کی پوری ہیئت اور ان سب کا پورا لباس وہی ہوتا ہے جس میں دونوں کاندھے اور پشت کپڑے سے ڈھک جائیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک کپڑے میں نماز پڑھنے کا مسئلہ دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا: کیا ہر ہر شخص کے پاس دو کپڑے ہوتے ہیں؟ پھر حضرت عمرؓ سے دریافت کیا گیا تو انھوں نے فرمایا: جب خداتعالیٰ وسعت دے تو وسعت کرو، جمع کیا ایک شخص نے الخ۔

میں کہتا ہوں بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حد اول کی بابت دریافت کیا گیا تھا، اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول حد ثانی کا بیان ہے اور اس بات کا بھی احتمال ہے کہ آنحضرتؐ سے اس حد ثانی کے بارے میں ہی سوال کیا گیا ہے جو مستحب ہے پس آپ نے دو کپڑوں کا حکم نہیں دیا کیونکہ دو کپڑوں کی شرط کے ساتھ حکم کرنے میں خواہ وہ استحباب کے لئے ہی شرط ہوں ایک طرح کا حرج ہے اور شاید اس وجہ سے دو کپڑوں کا حکم نہیں کیا ہو کہ جس شخص کو دو کپڑے میسر نہ ہوں تو وہ اپنے دل میں کچھ کوتاہی پائے پس اس کوتاہی کی وجہ سے جو وہ اپنے خیال میں محسوس کرتا ہے، اس کی نماز ہی نامکمل رہے، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ جانتے تھے کہ احکام کے مقرر کرنے کا وقت تو گزر گیا اور ان کو یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ نماز میں پورا لباس پہننا مستحب ہے اس واسطے انھوں نے اس کے موافق حکم کردیا، واللہ اعلم۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کے بارے میں جو اس حالت میں نماز پڑھتا تھا کہ اس کے سر کے بال پیچھے کی جانب بندھے ہوئے تھے فرمایا اس شخص کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص

شانے بندھے ہوئے حال میں نماز پڑھتا ہو"۔

میں کہتا ہوں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے یہ بات بتلا دی کہ خوبصورتی اور پورا لباس اور طرز ادب میں کمی کرنا کراہت کا موجب ہوتا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس چادر کے متعلق جس پر نقش ونگار تھے فرمایا "اس نے اب مجھ کو میری نماز سے ہٹا دیا"۔ اور آپ نے حضرت عائشہ سے فرمایا "اس تصویر والے پردے کو اتار ڈال اس واسطے کہ اس کی تصویریں میری نماز میں سامنے آتی رہتی ہیں اور فروج حریر کی نسبت فرمایا: یہ لباس متقین کے لئے مناسب نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں نمازی کے لئے ضروری ہے کہ جو چیز اس کو نماز سے غافل کرے خواہ وہ اس چیز کی خوبصورتی کی وجہ سے غافل ہو یا نفس کے اترانے کی وجہ سے غافل ہو تو اس کو اپنے سے علیحدہ کر دے تا کہ جو نماز سے مقصود ہے وہ پورا پورا حاصل ہو جائے، اور یہودی لوگ اپنے جوتے اور موزوں میں نماز پڑھنے کو مکروہ سمجھتے تھے اس واسطے کہ اس میں ایک طرح کی ترک تعظیم ہے اور کیونکہ لوگ بڑوں کے پاس حاضر ہوتے وقت جوتے اتار دیتے ہیں اور اسی کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ "اپنے موتے اتار دے تو مقدس میدان طویٰ میں ہے"۔ اور جوتے اور موزہ کے اندر ایک وجہ اور بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ موزے اور جوتوں سے انسان کے لباس کی تکمیل ہوتی ہے پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود کی مخالفت کی وجہ سے قیاس اول کو ترک کیا اور قیاس ثانی کو ہمیشہ کے لئے جاری رکھا، چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "یہود کی مخالفت کرو اس لئے کہ وہ جوتے اور موزے پہن کر نماز نہیں پڑھتے"۔ پس صحیح یہ ہے کہ جوتے پہن کر نماز پڑھنا اور ننگے پیروں نماز پڑھنا دونوں برابر ہیں، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کے اندر سدل کرنے سے منع فرمایا ہے پس بعض نے سدل کے معنی یہ بتلائے کہ کپڑا اپنے اوپر لپیٹ لے اور اپنے ہاتھوں کو اس کے اندر داخل کر لے، اور عنقریب اس بات کا بیان آئے گا کہ بدن پر اس طرح کپڑا لپیٹنا کہ ہاتھ اندر رہیں لباس کی سب صورتوں سے بدتر ہے کیونکہ ہاتھوں کا کھلا رکھنا انسان کی اصل طبیعت اور اس کی عادت ہے اور یہ ہیئت اس کے مخالف ہے، نیز اس میں ستر کے کھلنے کا ہر وقت احتمال ہے کیونکہ اکثر اوقات انسان کو کسی چیز کے پکڑنے میں ہاتھ باہر نکالنے کی ضرورت پڑتی ہے اور اس سے ضرور ستر کھل جائے گا۔ بعض نے سدل کے معنی یہ بتلائے کہ اپنے اوپر کپڑا ڈال لے اور اس کے دونوں

جانب نہ ملائے اور اس سے بھی خوبصورتی اور تمام ہیئت میں خلل پیدا ہوتا ہے اور تمام ہیئت سے ہماری مراد وہ لباس ہے جس کے متعلق عرف عادت میں یہ کہا جاسکے کہ اس میں ضروری کپڑوں میں سے کوئی کپڑا کم نہیں ہے، اور لوگوں کے لباس کی وضع جداگانہ ہے لیکن ہر طرح کے لباس میں تمام ہیئت ہوتی ہے جو تلاش کرنے سے معلوم ہوسکتی ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تو عرب کے دستور کے موافق جو اس وقت میں لباس کے متعلق تھا حکم دیا ہے۔

شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کی اہم مطبوعات

مجموعہ رسائل امام شاہ ولی اللہ (جلد اول)	مولانا مفتی عطاء الرحمن قاسمی	325.00
مجموعہ رسائل امام شاہ ولی اللہ (جلد دوم)	//	300.00
مجموعہ رسائل امام شاہ ولی اللہ (جلد سوم)	//	300.00
مجموعہ رسائل امام شاہ ولی اللہ (جلد چہارم)	//	زیر طبع
دلی کی تاریخی مساجد (حصہ اول)	//	200.00
دلی کی تاریخی مساجد (حصہ دوم)	//	100.00
پنجاب وہریانہ کی تاریخی مساجد	//	200.00
امام شاہ ولی اللہ اور ان کے افکار ونظریات	//	250.00
الواح الصنادید (حصہ اول)	//	150.00
الواح الصنادید (حصہ دوم)	//	100.00
مولانا عبدالماجد دریابادی، خدمات وآثار	//	200.00
ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کا حصہ	//	200.00
ہندو مندر اور اورنگ زیب کے فرامین (اردو)	//	20.00
ہندو مندر اور اورنگ زیب کے فرامین (ہندی)	//	20.00
نقوش خاطر (قلمی چہرے)	//	100.00
۱۸۵۷ء اور ہریانہ (ہریانہ کے مجاہدین آزادی کا تذکرہ)	//	250.00
المساجد التاریخیہ بدھلی	//	500.00
معمار قوم ڈاکٹر اخلاق الرحمن قدوائی	//	300.00
مرد مومن ڈاکٹر اخلاق الرحمن قدوائی	//	300.00
شاہ ولی اللہ خصوصی نمبر (ماہنامہ براہین)	//	195.00
الامام الدہلوی خصوصی شمارہ (ماہنامہ براہین)	//	195.00
وقف ترمیمی بل ۲۰۱۰ء منظر، پس منظر	//	زیر طبع
ضمائر القرآن (ضمائر قرآن اور انکے مراجع)	ڈاکٹر ابونصر محمد خالدی — مرتب مولانا مفتی عطاء الرحمن قاسمی	300.00
الاشباہ والنظائر فی القرآن الکریم (قرآن کے مرادف الفاظ اور مثال ونظائر)	//	350.00
وفیات اعیان الہند (امراء وسلاطین کی تاریخ ہائے وفات اور مختصر حالات)	//	300.00
مضامین خالدی (اسلامیات قرآنیات اور دکنیات پر مشتمل مقالات)	//	300.00
قرآنی تشبیہات واستعارات	//	150.00
نشریات (ریڈیائی تقریروں کا مجموعہ)	مولانا جنید احمد بنارسی	100.00
سفر وسیلۂ ظفر	خورشید انوار عارفی	100.00

SHAH WALIULLAH INSTITUTE

Adjacent to Kaka Nagar Masjid, (Near NDMC Primary School),
Kaka Nagar, New Delhi-110003
Ph.: 9811740661, 9811615455, 26953430
Email: shahwaliullah_institute@yahoo.in, swiinstitute26gmail.com

مجموعۂ

رسائل امام شاہ ولی اللہؒ

حجۃ اللہ البالغہ حصہ دوم کے جمیع
دینی، فقہی، معاشی، سیاسی، سماجی مباحث پر مشتمل

جلد پنجم

تحقیق و تعلیق

مولانا مفتی عطاء الرحمن قاسمی

شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی

مجموعۂ

رسائل امام شاہ ولی اللہؒ

حصہ پنجم

(نعمۃ اللہ البالغہ ترجمہ حجۃ اللہ البالغہ حصہ دوم کے
دینی، فقہی، معاشی، سیاسی، سماجی مباحث پر مشتمل)

ترتیب وتقدیم

مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی

شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی

نام کتاب : مجموعۂ رسائل امام شاہ ولی اللہ جلد پنجم
مرتبہ : مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی
قیمت : ۳۰۰
سن اشاعت : جنوری ۲۰۱۵ء
تعداد : ۵۰۰
کمپوزنگ : ریاض احمد
مطبع : نیو پرنٹ سنٹر، دریا گنج، نئی دہلی
ناشر : شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ، مسجد کاکانگر، ڈاکٹر ذاکر حسین مارگ
کاکانگر نئی دہلی۔۱۱۰۰۰۳

بہ تعاون قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

Title : Majmua Rasail-e-Imam Shah Waliullah-V
Editing : Maulana Mufti Ataur Rahman Qasmi
First Edition : January 2015
Price : 300
ISBN : 978-93-84153-01-4
Composing : Riyaz Ahmed

Published by

Shah Waliullah Institute
Masjid Kaka Nagar, Dr. Zakir Husain Marg,
Primary School) Kaka Nagar, New Delhi-110 003
Ph.: 011-26953430, Mob.9811740661
website: www.shahwaliullah.com
Email: shahwaliullah_institute@yahoo.in

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱	حرفے چند	۷
۲	قبلہ کا بیان	۱۵
۳	سترہ کا بیان	۱۷
۴	ان امور کا بیان جو نماز میں ضروری ہیں	۱۸
۵	نماز کے اذکار اور اس کی ہیئات مستحبہ کا بیان	۲۶
۶	ان چیزوں کا بیان جو نماز میں ناجائز ہیں اور سجدہ سہو اور سجدہ تلاوت کا بیان	۳۸
۷	نوافل کا بیان	۴۲
۸	نماز تہجد کے آداب	۴۷
۹	اعمال کے اندر میانہ روی کا بیان	۵۷
۱۰	معذور لوگوں کی نماز کا بیان	۶۰
۱۱	جماعت کا بیان	۶۴
۱۲	جمعہ کا بیان	۷۲
۱۳	عید الفطر اور عید الاضحیٰ کا بیان	۷۷
۱۴	جنازوں کا بیان	۸۱

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱۵	زکوٰۃ سے متعلق امور کا بیان	۹۷
۱۶	سخاوت کی فضیلت اور بخل کی قباحت کا بیان	۱۰۱
۱۷	زکوٰۃ کی مقدار کا بیان	۱۰۶
۱۸	زکوٰۃ کے مصارف کا بیان	۱۱۰
۱۹	زکوٰۃ سے متعلق امور کا بیان	۱۱۶
۲۰	روزہ کی تفصیلات	۱۲۰
۲۱	روزہ کی فضیلت کا بیان	۱۲۳
۲۲	روزہ کے احکام کا بیان	۱۲۷
۲۳	وہ اذکار جن کا پڑھنا افطار کے وقت مسنون ہے	۱۳۰
۲۴	روزہ سے متعلق امور کا بیان	۱۳۳
۲۵	جو شخص شب قدر کو دیکھے اس کو یہ دعا پڑھنی چاہئے	۱۳۷
۲۶	حج کی تفصیلات	۱۳۸
۲۷	مناسک کا بیان	۱۴۲
۲۸	حجۃ الوداع کا بیان	۱۵۰
۲۹	حج کے ساتھ متعلق امور کا بیان	۱۵۸
۳۰	ابواب احسان	۱۶۳
۳۱	اذکار اور ان کے متعلقات کا بیان	۱۷۱
۳۲	بقیہ مباحث احسان کا بیان	۱۹۴
۳۳	مقامات اور احوال کا بیان	۲۰۸
۳۴	طلب رزق کے ابواب کا بیان	۲۴۱
۳۵	بیع کی ان اقسام کا بیان جو ممنوع ہیں	۲۴۸
۳۶	بیع کے احکام	۲۶۱

نمبرشمار	مضمون	صفحہ
۳۷	تبرع اور تعاون کا بیان	۲۶۷
۳۸	فرائض کا بیان	۲۷۴
۳۹	تدبیر منزل کے ابواب کا بیان	۲۸۴
۴۰	پیغام نکاح اور اس کے متعلقات کا بیان	۲۸۵
۴۱	ستر کا بیان	۲۹۱
۴۲	نکاح کا بیان	۲۹۶
۴۳	ان عورتوں کا بیان جن سے نکاح کرنا حرام ہے	۳۰۴
۴۴	آداب مباشرت کا بیان	۳۱۱
۴۵	زوجیت کے حقوق کا بیان	۳۱۴
۴۶	طلاق کا بیان	۳۲۱
۴۷	خلع، ظہار، لعان اور ایلا کا بیان	۳۲۶
۴۸	عدت کا بیان	۳۳۰
۴۹	اولاد اور غلاموں کی پرورش کا بیان	۳۳۳
۵۰	عقیقہ کا بیان	۳۳۶
۵۱	شہروں کی سیاست سے متعلق چند ابواب	۳۴۴
۵۲	خلافت کا بیان	۳۴۷
۵۳	مظالم کا بیان	۳۵۲
۵۴	حدود کا بیان	۳۶۷
۵۵	فیصلہ جات کا بیان	۳۸۵
۵۶	جہاد کا بیان	۳۹۴
۵۷	معیشت سے متعلق چند ابواب	۴۱۴
۵۸	کھانے اور پینے کی چیزوں کا بیان	۴۱۶

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۵۹	کھانے کے آداب کا بیان	۴۲۸
۶۰	مسکرات کا بیان	۴۳۴
۶۱	لباس اور زینت اور ظروف وغیرہ کا بیان	۴۳۸
۶۲	آداب صحبت کا بیان	۴۵۴
۶۳	نذروں اور قسموں کا بیان	۴۶۷
۶۴	مختلف ابواب	۴۷۰
۶۵	نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عادات اور خصائل کا بیان	۴۷۱
۶۶	فتنوں کا بیان	۴۸۵
۶۷	مناقب کا بیان	۴۹۳

حرفِ چند

شیخ الاسلام امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ جہاں قرآن وحدیث کے مستند عالم دین اسرار شریعت کے رمز شناس و معارف آگاہ تھے۔ وہاں اسلامی علوم وفنون کے بھی بڑے ماہر و جانکار تھے۔ آپ نے تفسیر، اصول تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ، علم کلام، تاریخ، تصوف، ادب، شعر وشاعری، ترجمہ نگاری، تذکرہ نگاری اور آپ بیتی وغیرہ متنوع موضوعات پر معرکتہ الآراء کتابیں لکھی ہیں، آپ کی تصنیفات وتالیفات کی تعداد کے بارے میں اہل علم کا اختلاف ہے۔

بعض اہل علم نے آپ کی تصنیفات کی تعداد ۴۶ بتائی ہے جبکہ مشہور عالم دین مولانا محمد ابراہیمؒ سیالکوٹی نے آپ کی تصنیفات کی تعداد دوسو سے زیادہ قرار دے دی ہے اور اس کا ماخذ کیا ہے۔ مجھے اس کا علم نہ ہو سکا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ حضرت شاہ صاحب کے بعض رسائل علیحدہ علیحدہ بھی شائع ہوئے ہیں اور بعض رسائل بعض ضخیم کتابوں میں بطور جز بھی شامل کئے گئے ہیں۔ خود حجۃ اللہ البالغہ میں بعض رسائل بطور ضمیمہ شامل ہیں۔ صاحب ''دعوت وعزیمت'' نے ان کی تصنیفات کی تعداد ۵۳ لکھی ہے۔ میں نے بھی ان کی کتابوں کو شمار کیا تو مجھے بھی اس کے قریب تعداد معلوم ہوئی۔ قطع نظر تعداد سے حضرت شاہ صاحب کی جو بھی کتاب ہے۔ وہ اپنے موضوع پر منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ اور امتداد زمانہ کے باوجود اس کی معنویت اور افادیت آج بھی برقرار ہے اور اہل علم و دانش کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ کتابوں کی تعداد کے سلسلہ میں مجھے صاحب دعوت وعزیمت کی رائے زیادہ صائب و درست نظر آتی ہے۔

شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ نے حضرت امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی کتابوں اور رسالوں کو

مجموعہ رسائل امام شاہ ولی اللہ کے نام سے شائع کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ اور اس منصوبہ کے تحت اب تک شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کے تحت ۴ ضخیم جلدیں شائع ہو چکی ہیں اور ملک کے علمی وادبی حلقوں میں قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھی جارہی ہیں۔ اور اصحاب علم و دانش اب اس کی باقی جلدوں کی اشاعت کے بھی متمنی ہیں اور برابر تقاضے کر رہے ہیں۔

الحمد للہ شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے شائع شدہ مجموعہ رسائل امام شاہ ولی اللہ کی جلد پنجم، آپ کے سامنے ہے، یہ دراصل حجۃ اللہ البالغہ کی دوسری جلد کے مباحث و مسائل پر مشتمل ہے، مجموعہ رسائل امام شاہ ولی اللہ کی چوتھی جلد حجۃ اللہ البالغہ کی پہلی جلد کے مسائل و مباحث پر محیط تھی، حجۃ اللہ البالغہ، حجۃ الاسلام فی الارض حضرت امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی وہ معرکۃ الآراء کتاب ہے، جو احکام شریعت و مقاصد دین کے اسرار و رموز کے باب میں ایک منفرد و لاثانی کتاب رہی ہے۔ اور عرب و عجم اور مشرق و مغرب میں قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھی جاتی رہی ہے۔

حجۃ اللہ البالغہ عربی زبان میں ہے اور اس کے اردو اور انگریزی زبان میں بھی متعدد ترجمے ہوئے ہیں، اردو مترجمین و شارحین کا تفصیلی ذکر مجموعہ رسائل امام شاہ ولی اللہ جلد چہارم کے مقدمہ میں آچکا ہے، جس کے اعادہ کی یہاں قطعی ضرورت نہیں ہے۔

ہندوستان کے ممتاز عالم دین اور دانشور مفکر مولانا عبید اللہ سندھی جو نہ صرف حجۃ اللہ البالغہ کے مترجم و شارح تھے، بلکہ برصغیر میں پہلی دفعہ حضرت امام شاہ ولی اللہ محدث کا تعارف و تذکرہ ان ہی کی زبان گوہر بار اور قلم حق آگاہ کے توسط سے ہوا ہے، حضرت مولانا سندھیؒ اور ان کے تلامذہ کو یقین واذعان تھا کہ ''حجۃ اللہ البالغہ دنیا کے انقلابی ادبیات میں ایک چوٹی کی تصنیف ہے، اللہ نے چاہا تو برعظیم ہند میں انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوگی''۔ (اردو شرح حجۃ اللہ البالغہ از مولانا عبید اللہ سندھی صفحہ ۴۴)

مولانا عبید اللہ سندھیؒ کی زندگی کا یہی واحد مشن تھا، مولانا سندھیؒ سفر و حضر میں اسی مشن پر گامزن رہے اور جہاں بھی گئے اسی کی حدی خوانی کرتے رہے اور عوام و خواص کو اس کی طرف متوجہ کرتے رہے، حضرت الاستاذ مولانا محمد سالم قاسمی صاحب مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند نے

حالیہ سفر دیو بند کے موقع پر شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کے علمی کاموں کو سراہتے ہوئے فرمایا کہ جب حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ ۲۴ سالہ جلاوطنی کے بعد ہندوستان واپس آئے تو دارالعلوم دیو بند بھی آئے اور گھر بھی تشریف لائے اور دوران گفتگو حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب رحمتہ اللہ سے دریافت کیا کہ کیا حجۃ اللہ البالغہ دارالعلوم دیو بند کے نصاب تعلیم میں داخل ہے۔ حضرت قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیو بند نے فرمایا کہ حجۃ اللہ البالغہ دارالعلوم دیو بند کے نصاب تعلیم میں داخل نہیں ہے۔ حضرت مولانا سندھیؒ نے فرمایا کہ یہ کتاب نصاب تعلیم میں داخل ہونی چاہئے پھر مولانا سندھیؒ نے فرمایا کہ حجۃ اللہ البالغہ کا کوئی نسخہ موجود ہے۔ حضرت قاری صاحب نے فرمایا جی ہاں! حجۃ اللہ البالغہ موجود ہے حضرت مولانا سندھیؒ نے فرمایا کہ حجۃ اللہ البالغہ کی عبارت پڑھئے۔ حضرت قاری صاحب نے عبارت پڑھی تو مولانا سندھیؒ نے فرمایا ترجمہ کیجئے حضرت نے اس کا ترجمہ کیا اور پھر جب ترجمہ کرلیا تو فرمایا تشریح کیجئے۔ حضرت نے تشریح بھی کر دی تو حضرت مولانا عبید اللہ سندھی نے مسرت وخوشی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ الحمدللہ علم زندہ ہے۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیو بند نے حجۃ اللہ البالغہ مولانا عبید اللہ سندھی سے پڑھی تھی، جو علوم ولی اللہی کے آمین تھے۔

الحمدللہ میں نے حجۃ اللہ البالغہ حضرت قاری محمد طیب صاحب رحمتہ اللہ علیہ سے پڑھی ہے وہ میرے حجۃ اللہ البالغہ کے مشفق استاذ تھے اور فکر ولی اللہی کے ماہر تھے۔

حجۃ اللہ البالغہ کے حصہ اوّل میں حضرت شاہ صاحب کے مقدمہ میں سبب تصنیف پر بحث کی ہے، اس کے بعد اس کے اہم مباحث میں ابداع، خلق اور تدابیر کے مسائل ہیں، حضرت شاہ صاحب کے حجۃ اللہ البالغہ کے شروع میں چند بنیادی اور اصطلاحی موضوعات پر گفتگو کی ہے۔ ان میں ایک ابداع بھی ہے۔ حضرت شاہ صاحب ابداع کی تعریف وتشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں **الابداع وهو ايجاد شئي لا من شئي** ،اور کسی شئے کو کسی شئے کے بغیر ایجاد کرنے کو ابداع کہتے ہیں، ابداع کی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں **فيخرج الشئي من كتم العدم بغير مادة** ۔اللہ تعالیٰ نے شئے کو پردہ عدم سے عالم وجود میں بلا مادہ اور بلا نمونہ کو لایا ہے، اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آغاز کائنات کے سلسلے میں سوال کیا گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تھے اور ان سے قبل کوئی چیز نہیں تھی۔

اللہ تعالیٰ نے کائنات کی تخلیق کسی مادہ اور نمونہ ومثل کے بغیر کی ہے۔ بدیع السموات والارض، اللہ تعالیٰ آسمان وزمین کے موجد اور صانع ہیں اور اس زمین وآسمان کو بغیر کسی نمونہ ومثال کے پیدا کیا ہے۔ مولانا عبیداللہ سندھی ابداع کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ایک چیز کو بغیر کسی چیز کے پیدا کرنا یعنی پہلے کوئی چیز نہیں تھی، پھر ایک چیز پیدا کردینا، ابداع کہلاتا ہے، گویا ایک چیز کو عدم سے بغیر کسی مادے کے پیدا کرنا (یونانی حکماء جسے جعل بسیط کہتے ہیں۔ افلاطون اس کا قائل ہے) (اردو شرح حجۃ اللہ البالغہ ۱۷)

ابداع اور خلق کے مابین جو فرق ہے، اس کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ خلق کی تعریف یوں کی جاتی ہے۔

الخلق وهو ايجاد الشئى من شئى كما خلق آدم من التراب وخلق الجان من مارج من نار.

خلق: کسی چیز کو کسی چیز کے ذریعہ پیدا کرنا ہے جیسا کہ آدم کی تخلیق شئے سے ہوئی اور جان کی تخلیق آگ کے شعلے سے ہوئی۔ انسان کی تخلیق ہو یا جنات کی تخلیق ہو دونوں میں مادے کا دخل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کائنات کی تخلیق بلا مادہ وبلا نمونہ کی ہے۔ یہی اسلامی عقیدہ اور منصوص حکم ہے۔

الثالث: تدبير عالم المواليد، مرجعه الى تصير حوادثها موافقة للنظام الذى ترتضيه حكمته مفضية الى المصلحة التى اقتضاها جوده.

اور تیری تدبیر عالم موالید ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے زمانہ کی ہر چیز اس انتظام کے موافق ہو جو اس کی حکمت پسند کرتی ہے اور اس مصلحت کے مطابق ہو جو اس کی رحمت چاہتی ہے۔

موالید عالم سے مراد آسمان وزمین کی مخلوقات، نباتات، حیوانات اور معدنیات وغیرہ ہیں، یہ تینوں چیزیں عناصر اربعہ سے پیدا ہوتی ہیں، اس لئے ان کو موالید کہتے ہیں۔ ان تمام چیزوں میں نشوونما سے لیکر آخری مراحل تک کا انتظام وانصرام کرنا اور ان کے اندر ان کی خصوصیات پیدا

کرنا، یہ اللہ تعالیٰ کا ہی عمل اور تدبیر ہے۔

حضرت شاہ صاحب اشیاء کے خواص کے قائل ہیں۔ اور یہ بھی قائل ہیں کہ ان خواص کو ان اشیاء سے جدا اور علیحدہ نہیں کیا جاسکتا ہے لیکن شاہ صاحب ان اشیاء میں خواص پیدا کرنے میں موثر بالذات اللہ تعالیٰ ہی کو مانتے ہیں، اور ان کا ماننا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ چاہے گا ان کے خواص کو سلب کرلے گا اور کیا بھی ہے مثال کے طور پر آگ کی خاصیت جلانا ہے اور پانی کی خاصیت ٹھنڈک اور برودت پہنچانا ہے لیکن وہی آگ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر **کونوا بردا سلاما** کے ذریعہ راحت بخش حد تک ٹھنڈی ہوگئی تھی اور اپنی خاصیت کو کھو چکی تھی۔

حجۃ اللہ البالغہ کے اہم مباحث میں ایک اہم بحث عالم مثال کی بھی ہے، حضرت شاہ صاحب عالم مثال کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اعلم انه دلت احاديث كثيرة على أن في الوجود عالماً غير عنصري، تتمثل فيه اللمعاني باجسام مناسبة لها في الصفة وتحقق هنا لك الاشياء قبل وجودها في الارض.

معلوم ہونا چاہئے بہت سی احادیث اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اس عالم عنصری (مادی دنیا) کے علاوہ ایک اور ایسا عالم موجود ہے جس میں معنوی، مخفی چیزیں مثلاً صفات انسانی وغیرہ اپنی صفت کے مناسب جسم میں ظہور میں آتی ہیں اور زمین کے پائے جانے سے پیشتر ہر چیز پہلے سے وہاں موجود ہوتی ہے۔

عالم کے لغوی معنی ہیں، وہ شئے جس سے کوئی شئے یا کوئی چیز جانی جائے جیسے خاتم وہ چیز جس سے مہر لگائی جائے، عالم سے رب العالمین کی شناخت و پہچان ہوتی ہے اور چونکہ اس عالم آب وگل میں موجود حیوانات، جمادات، اور نباتات ذات باری تعالیٰ کے وجود پر واضح دلیل ہیں، چونکہ مخلوقات خالق پر اور مصنوعات صانع پر دلالت کرتے ہیں۔

عالم کی دو قسمیں ہیں، ایک عالم دنیا اور دوسری عالم آخرت، حضرت شاہ صاحب کے نزدیک عالم کی ایک تیسری قسم بھی ہے وہ عالم مثال ہے اور یہ عالم مثال غیر مادی ہے یعنی اس کی تشکیل میں عناصر اربعہ کا دخل نہیں ہے۔ عالم مثال میں معانی (حقائق) کے لئے اجسام ہوئے

ہیں، اور یہ تمام اجسام مثالی اور تمثیلی ہوتے ہیں، اور موجودہ عالم میں وجود میں آنے سے قبل تمام چیزیں عالم مثال میں موجود ہوتی ہیں اوران کی شکلیں مجسم ہوتی ہیں پھر جب وہ چیزیں اس دنیا میں پائی جاتی ہیں تو وہ ایک ہی ہوتی ہیں۔

ان میں غایت درجہ مماثلت واتحاد ہوتا ہے، حجۃ اللہ البالغہ میں ملاء اعلیٰ کی بحث بھی بڑی اہمیت کی حامل ہے، حضرت شاہ صاحب ملاء اعلیٰ کے بارے میں لکھتے ہیں:

اعلم أنه قد استفاض من الشرع أن الله تعالىٰ عبادا هم أفاضل الملائكة ومقربوا الحضرة لا يزالون يدعون لمن اصلح نفسه وهذبها و سعى في اصلاح الناس، فيكون دعاؤ هم ذالک سبب نزول البركات عليهم ويلعنون من عصى الله وسعى في الفساد فيكون لعنهم سبباً لوجود حسرة وندامة في نفس العامل.

واضح ہو کہ شرع سے یہ بات ثابت ہے کہ خدا تعالیٰ کے کچھ عمدہ بندے ہیں جو کہ بلند مرتبہ فرشتے اوراس کے دربار کے مقرب لوگ ہیں جو شخص اپنے آپ کو نیک بناتا ہےاوراپنے نفس کو بھی تمام عیبوں سے پاک کے نیک و پاکیزہ اخلاق والا بناتا ہےاورلوگوں کی اصلاح و رفاہ عام میں کوشش کرتا رہتا ہےتو وہ فرشتے اس کے لئے ہمیشہ دعائے خیر کرتے رہتے ہیں اوران کی یہی دعا ان پر رحمت و برکت کے نزول کا سبب بنتی ہے۔

ملاء اعلیٰ، مقرب فرشتوں کی جماعت ہے، جس کو موجودہ اصطلاح میں ملائکہ اللہ کی پارلیمنٹ بھی کہہ سکتے ہیں، اسی اجتماع کو عربی زبان میں الرفیق الاعلیٰ اونچے درجے کے رفیق، الندی الاعلیٰ، ایوان بالا، اور الملاء الاعلیٰ، جماعت مقربین اعلیٰ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ تمام فرشتے مقربین، اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل وتنفیذ میں ہمہ وقت اور ہمہ تن مصروف رہتے ہیں۔

زمین پر جونظامہائے حکومت چلتے ہیں ان میں کون سانظام اللہ کو پسند ہے اورکون سانا پسند ہے ان کے بارے میں ملاء اعلیٰ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مطلع کردیا جاتا ہےاوروہ نظام صالح کے لئے دعا کرتے ہیں اورنظام طالع کے لئے بددعا کرتے ہیں۔اوران پر لعنتیں بھیجتے ہیں۔

اسی ضمن میں حظیرۃ القدس کے بارے میں بحث کی ہےاورحظیرۃ القدس کے معنی ہیں پاکیزہ

باڑھ اور اس کو دربار اور بارگاہ عالی بھی کہتے ہیں۔ اور کبھی دربار اور بارگاہ عالی سے اللہ کی ذات بھی مراد لیتے ہیں۔ جس سے فیوض و برکات کا ظہور ہوتا ہے، اس کے بعد روح کی حقیقت، تقدیر، حقیقت موت، ارتفاقات اور تدابیر نافعہ، آداب معاش، خانگی تدابیر، شہری سیاست، بادشاہوں کی سیرت، رسوم ورواج، توحید، شرک کی حقیقت، وضو، غسل، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، اقسام نیکی اور مراتب گناہ کے اہم مباحث ہیں۔

یہ تو حجۃ اللہ البالغہ حصہ اوّل کے مباحث کا اجمالی ذکر ہے، جس کے مترجم مولانا ابو محمد عبد الحق حقانی ہیں جنہوں نے نعمۃ اللہ البالغہ کے نام سے حجۃ اللہ البالغہ کا ترجمہ کیا ہے۔ نعمۃ اللہ البالغہ ترجمہ حجۃ اللہ البالغہ حصہ دوم کے مباحث میں تحویل قبلہ، سترہ، نماز کے اذکار اور اس کے لواحقات، اعمال میں میانہ روی، جماعت، جمعہ، عیدین، جنازہ، زکوٰۃ، انفاق، مقادیر، زکوۃ، مصارف زکوٰۃ، روزہ اور اس کی فضیلت، احکام روزہ، حج، مناسب حج، بیع اور احکام بیع، تبرع وتعاون، فرائض (میراث) پیغام نکاح اور اس کے متعلقات، متر، نکاح، محرمات، آداب مباشرت، حقوق زوجیت، طلاق، خلع، ظہار، لعان اور ایلاء، عدت، اولاد کی پرورش، عقیقہ، ملکی سیاست، مظالم، خلافت، حدود، جہاد، معیشت، مسکرات، اور فتن ومناقب صحابہ وغیرہ اہم مباحث ومسائل ہیں۔

حضرت شاہ صاحب نے جہاں ان دینی، فقہی، معاشی اور سیاسی مسائل اور ان کے متعلقات کے اسرار ورموز بیان کرنے میں اپنے اصولوں اور اختراعی ذہن کو بروئے کار لائے ہیں۔ وہاں قرآن وحدیث کے منصوص احکام، صحابہ کے آثار، تابعین وتبع تابعین اور فقہائے امت کے اقوال وآراء بھی نقل کئے ہیں۔

حضرت امام غزالیؒ، عزالدین بن عبدالسلامؒ، علامہ جلال الدین سیوطیؒ، خطابیؒ، ابن حزم مالکیؒ اور علامہ ابن حجر عسقلانیؒ کے اقوال وارشاد بھی ملتے ہیں، مگر ان کی کتابوں اور ان کے مصادر وماخذ کے حوالے نہیں ملتے ہیں اس کی وجہ غالباً یہ ہوسکتی تھی کہ حضرت شاہ صاحب کے دور میں گاہ بگاہ ان کے ناموں کے درج کرنے کا کوئی باضابطہ معمول نہ تھا اور کچھ یہ بات بھی تھی کہ جو اقوال نقل کئے گئے ہیں وہ محض تائید کے لئے ہوں گے اور تعداد بھی بہت ہی کم ہے۔ میں کوئی اعداد وشمار نہیں کرسکتا ہوں کہ کل کتنے حوالے ہیں، مگر سرسری مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ کوئی زیادہ حوالے

نہیں ہیں بہ مشکل تمام پوری حجۃ اللہ البالغہ میں ۲۰/۲۵ حوالے ملتے ہیں وہ بھی امام غزالی کے حوالے نمایاں طور سے ملتے ہیں اور دوسرے اصحاب علم کے حوالے برائے تائید وتوثیق ہی نظر آئے ہیں۔ جیسا کہ خود شاہ صاحب نے مقدمہ میں رقم فرمایا کہ اس موضوع پر بہت کم لکھا گیا ہے۔

شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ نے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے جملہ رسائل وکتب کو مجموعہ رسائل امام شاہ ولی اللہ کے زیر اہتمام شائع کرنے کا منصوبہ بنایا ہے جس کے تحت اب تک چار جلدیں شائع ہو چکی ہیں اور پانچویں جلد آپ کی خدمت میں پیش ہے۔ اللہ نے چاہا تو اس کی چھٹی جلد بھی آپ کی خدمت میں جلد پیش کی جائے گی۔

آخر میں اہل علم سے درخواست ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے رسائل وکتب میں سے کوئی رسالہ یا کوئی کتاب آپ کے پاس یا آپ کے دوست واحباب کے پاس ہو تو از راہ کرم اس کی اطلاع فرمائیں یا اس کی فوٹو کاپی عنایت فرمائیں یہ آپ کی طرف سے بڑی علمی امداد ہوگی۔

عطاء الرحمٰن قاسمی

چیئرمین

شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی

قبلہ کا بیان

جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لائے تو سولہ یا سترہ مہینے تک بیت المقدس کی سمت نماز پڑھتے رہے پھر آپ کو کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم ہوا اور یہی حکم ثابت اور قائم رہا۔ میں کہتا ہوں اس میں راز یہ ہے کہ جبکہ اللہ تعالیٰ کے شعائر اور اس کے گھروں کی تعظیم واجب تھی بالخصوص اس عبادت میں جو ارکان اسلام کی اصل اور سب عبادتوں کی جز اور شعائر دین میں سب سے زیادہ مشہور شعار ہے اور نماز میں اس چیز کی طرف منہ کرنا جو خدا تعالیٰ کی عبادت کر کے رضا مندی حاصل کرنے میں خدا تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے باعث اجتماع خاطر اور صفت خشوع کا سبب اور حضور قلب کے لئے اقرب تھا، کیونکہ اس صورت میں کلام کرنا بادشاہ کے سامنے عرض و معروض کرنے کے مشابہ ہے اس واسطے حکمت الٰہی کا مقتضیٰ یہ ہوا کہ جمیع مذاہب میں نماز کے اندر کسی نہ کسی قبلہ کی طرف رخ کرنا شرط قرار دیا جائے اور حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام اور جو ان کے دین پر تھے کعبہ کی طرف منہ کیا کرتے تھے اور حضرت اسرائیل علیہ السلام اور ان کی اولاد بیت المقدس کی طرف منہ کرتی تھی، یہ اصل تمام شرائع میں مسلم ہے، پھر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف لائے اور اوس وخزرج کی اور یہود میں سے جو ان کے حلیف تھے ان کی آپ نے تالیف قلوب چاہی اور وہی لوگ آپ کی مدد کے لئے کھڑے ہوئے اور وہی لوگ ایسی امت بنے جو لوگوں کی نفع رسانی کے لئے پیدا ہوئے تھے اور مضر اور ان کے احباب آپ کے بڑے دشمن تھے اور سب لوگوں سے زیادہ ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بعد تھا اس واسطے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اجتہاد سے بیت المقدس کی طرف منہ کرنے کا حکم فرمایا

کیونکہ اصل یہ ہے کہ عبادات میں اس امت کے طریقہ کی رعایت ہونی چاہئے جس میں رسول بھیجا گیا اوراس نے رسول کی مدد کی اور جو لوگوں پر گواہ بنی، اور وہ لوگ اس وقت میں اوس وخزرج ہی تھے اور وہ علوم یہود کے بہت ہی پابند تھے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے اللہ تعالیٰ کے قول: **فاتوا حرثکم انی شئتم** کی تفسیر میں اسی کو بیان کیا ہے جیسا کہ انھوں نے کہا ہے "یہ انصار کا گروہ جو بت پرست تھا یہودی گروہ کا ساتھی تھا جو اہل کتاب تھے تو یہ لوگ یہود کو اپنے اوپر علم میں فضیلت دیتے تھے اور اپنے بہت سے کاموں میں ان کی پیروی کرتے تھے"۔ الحدیث،

اور نیز اصل یہ ہے کہ شرائع کو ملل حقہ کے موافق ہونا چاہئے جب تک کہ ان میں لوگوں کی تحریفات اور ان کے تکلفات نہ داخل ہوں تاکہ اس سے لوگوں پر اقامت حجت پورے پورے طور پر ہو سکے اور نہایت اچھی طرح سے ان کے قلوب کا اطمینان ہو سکے، اور یہود ہی آسمانی کتاب کو برابر بیان کرتے رہتے تھے اور اس پر عمل کرتے تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی آیات کو محکم اور مضبوط کیا اور اپنے نبی کو اولاً اس کے دل میں القا فرما کر اس چیز پر مطلع کر دیا جو اس کی نسبت زیادہ مصلحت کے موافق تھی اور قوانین تشریع کے اعتبار سے زیادہ پائدار تھی اس واسطے آپ اس بات کی تمنا کرتے تھے کہ کعبہ کی طرف منہ کرنے کا حکم ہو جائے اور اس آرزو میں کہ جبرئیل علیہ السلام یہ حکم لے کر نازل ہوتے ہوں گے آپ آسمان کی طرف دیکھا کرتے تھے اور پھر دوبارہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کے اندر نازل فرما کر اس سے مطلع کر دیا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں میں مبعوث ہوئے جو ان پڑھ تھے، ملت اسماعیلیہ کے پابند تھے، اور اللہ تعالیٰ کے علم ازلی میں یہ بات مقدر ہو چکی تھی کہ یہی لوگ اللہ کے دین کے حامی اور مددگار رہوں گے اور رسول کے بعد لوگوں پر اللہ تعالیٰ کے گواہ ہوں گے اور اس کی امت میں اس کے خلیفہ بنیں گے اور یہود میں سے بہت ہی کم اشخاص ایمان لائیں گے۔

نیز عرب کے نزدیک کعبہ شعائر اللہ میں سے ایک شعار ہے جس کا ان کے اعلیٰ اور ادنیٰ کو یقین ہے اور اس کی طرف منہ کرنے میں ان کا ایک عام طریقہ جاری رہا ہے پس اس سے عدول کرنے کی کوئی وجہ نہیں اور چونکہ قبلہ کی طرف منہ کرنا نماز کی تکمیل کے لئے شرط قرار دیا گیا ہے اور ایسی شرط نہیں قرار دیا گیا کہ اس کے بغیر نماز کا اصل فائدہ ہی حاصل نہ ہو سکے اس واسطے نبی صلی

اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کے متعلق جو اندھیری رات میں اٹکل سے قبلہ رخ ہو کر نماز پڑھ لے اور حقیقت میں اس کا منہ قبلہ کی طرف نہ ہو اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان پڑھا ''پس جس طرف تم متوجہ ہو خدا کی ذات وہیں ہے'' جس سے آپ نے اس بات کی طرف اشارہ فرمایا کہ ضرورت کے وقت ان کی اس طرح کی نماز جائز ہے۔

سترہ کا بیان

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو شخص نماز پڑھنے والے کے سامنے سے گزرتا ہے اگر اس کو اس کا وبال معلوم ہو جاتا تو چالیس سال تک ٹھہرا رہنا نمازی کے سامنے سے ہو کر گزرنے سے اس کو بہتر معلوم ہوتا''۔ میں کہتا ہوں اس میں یہ راز ہے کہ نماز شعائر الٰہی میں سے ہے جس کی تعظیم واجب ہے اور چونکہ نماز میں مقصود اس حالت کے ساتھ تشبیہ دینا ہے جو غلام کو اپنے مالک کے سامنے خاموشی کے ساتھ خدمت کے واسطے کھڑا ہوتے وقت ہوتی ہے اس واسطے نماز کی تعظیم میں سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ کوئی گزرنے والا نماز پڑھنے والے کے سامنے سے نہ گزرے کیونکہ آقا اور اس کے غلاموں کے درمیان سے جو دست بستہ اس کے سامنے کھڑے ہوئے ہیں گزرنا بے ادبی ہے اس کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جب تم میں سے کوئی شخص نماز میں کھڑا ہوتا ہے تو وہ اپنے رب سے عرض و معروض کرتا ہے اور اس کا رب اس کے اور قبلہ کے درمیان ہوتا ہے'' الحدیث، اور اس کے ساتھ ایک بات یہ بھی ہے کہ نماز کے سامنے سے گزرنے سے نمازی کے دل میں تشویش پیدا ہوتی ہے اسی واسطے نمازی کو اس کے ہٹانے کا حق حاصل ہے اس کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''پس اس شخص سے لڑنا چاہئے کیونکہ وہ شیطان ہے''۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''عورت، گدھا، اور سیاہ کتا نمازی کی نماز کو توڑ دیتا ہے''۔

میں کہتا ہوں اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ نماز کی صحت کے شروط میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ نماز کی جگہ عورت اور گدھے اور کتے سے خالی ہونی چاہئے اور اس میں راز یہ ہے کہ نماز سے مقصود مناجات اور رب العالمین کے روبرو کھڑا ہونا ہوتا ہے اور عورتوں سے ملنا اور ان کا قریب ہونا اور ان کے ساتھ صحبت رکھنا اس حالت کے خلاف حالت کی طرف متوجہ ہونے کا مظنہ ہے اور کتا شیطان ہے جس کی وجہ ہم بیان کر چکے ہیں بالخصوص سیاہ کتا کیونکہ وہ فساد مزاج اور دیوانہ پن

کی طرف اور کتوں سے زیادہ قریب ہے اور گدھا بھی بہ منزلہ شیطان کے ہے کیونکہ وہ بسا اوقات لوگوں کے سامنے اپنی مادہ سے مشغول ہو جاتا ہے اور اس کے آلہ کو حرکت ہوتی رہتی ہے پس نماز کے اندر اس کا دیکھنا نماز کی مقصودہ حالت کے اندر خلل پیدا کرنے والا ہے لیکن اس حدیث پر حفاظ صحابہ اور فقہاء صحابہ نے عمل نہیں کیا ہے، ان صحابہ میں سے حضرت علیؓ اور حضرت عائشہؓ اور حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابو سعیدؓ وغیرہم ہیں اور انھوں نے اس حدیث کو منسوخ سمجھا ہے اگر چہ ان کے استدلال نسخ میں کلام ہے، اور یہ بھی ان مواضع میں سے ایک ہے جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث لینے کے دونوں طریقے مختلف ہوئے ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جب تم میں سے کوئی اپنے سامنے کجاوے کے پشتہ کے برابر کوئی چیز رکھ لے تو پھر وہ نماز پڑھ لے اور اس شخص کی کچھ پرواہ نہ کرے جو اس سے پرے ہو کر گزرتا ہے''۔

میں کہتا ہوں چونکہ نمازی کے سامنے سے ہو کر بالکل نہ گزرنے میں بڑی بھاری دقت تھی اس واسطے آپ نے سترہ کے کھڑا کرنے کا حکم دیا تاکہ ظاہر میں نماز کی جگہ جدا معلوم ہو اور اس کے پرے سے ہو کر گزرنا ایسا سمجھا جائے جیسے دور سے گزرنا۔

ان امور کا بیان جو نماز کے اندر ضروری ہیں

واضح ہو کہ نماز میں تین چیزیں اصل ہیں ایک یہ کہ دل سے اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکنا، دوسرے زبان سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا، تیسرے جسم سے اللہ تعالیٰ کی غایت درجہ تعظیم کرنا، یہ تین چیزیں ایسی ہیں جن کا اجزاء نماز ہونے میں تمام امتوں کا اتفاق ہے اگر چہ ان کے علاوہ امور میں ان کا اختلاف ہے، اور ان تینوں کے سوا دیگر امور میں بوقت عذر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے رخصت دی ہے، مگر ان تینوں کے اندر کسی وقت بھی معافی نہیں دی، اور وتر کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اگر تجھ میں طاقت نہ ہو تو اشارے سے ادا کر لے'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے چاہا کہ نماز کے اندر ان کے لئے دو حدیں مقرر کی جائیں، ایک تو وہ حد مقرر کی جائے کہ اس میں کمی کرنے سے بری الذمہ نہ ہو سکے اور ایک وہ حد مقرر کی جائے جو نماز کے فائدہ کو پورا اور کامل کرنے والی ہو، اور حد اوّل ان امور پر مشتمل ہے جن کے ترک کرنے سے نماز کا اعادہ واجب ہوتا ہے اور جن کے ترک کرنے سے نماز میں نقصان لازم آتا ہے اور اعادہ واجب نہیں ہوتا اور جن

کے ترک کرنے سے سخت ملامت کی جاتی ہے اگرچہ نماز میں نقص پیدا ہونے کا یقین نہیں ہوتا اور ان تینوں مراتب میں فرق کرنا بہت مشکل ہے اور اس کے بارے میں کوئی نص صریح یا اجماع نہیں ہے مگر کسی میں برائے نام، اور اسی وجہ سے اس امر میں فقہا کے درمیان بہت بڑا اختلاف ہوگیا ہے اور اصل اس میں اس شخص سے متعلق حدیث ہے جس نے برے طور پر نماز پڑھی تھی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا تھا ''لوٹ جا اور نماز پڑھ کیونکہ تو نے نماز نہیں پڑھی'' آپ نے ایسا ہی دو بار یا تین بار فرمایا، پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جب تو نماز کے لئے کھڑا ہو تو پورا پورا وضو کر پھر قبلہ رو کھڑا ہو کر تکبیر کہہ پھر جو کچھ تجھ کو قرآن یاد ہو اس میں سے جو پڑھ سکے تو پڑھ پھر رکوع کر یہاں تک کہ تجھ کو رکوع میں اطمینان حاصل ہو جائے پھر اپنا سر اٹھا یہاں تک کہ سیدھا کھڑا ہو جائے پھر سجدہ کر یہاں تک کہ سجدہ میں اطمینان حاصل ہو جائے پھر سر اٹھا یہاں تک کہ اطمینان کے ساتھ بیٹھ جائے پھر خوب اطمینان کے ساتھ سجدہ کر پھر سر اٹھا یہاں تک کہ اطمینان سے بیٹھ جائے پھر اپنی تمام نماز میں اسی طرح سے کر'' اور ترمذی کی روایت میں اس کے ساتھ یہ بھی ہے ''پس جب تو نے اس طرح سے کیا تو تیری نماز پوری ہوگئی اور اگر تو نے اس میں سے کچھ کم کیا تو تو نے اپنی نماز میں سے کم کیا'' امام ترمذیؒ نے بیان کیا کہ یہ نسبت پہلی روایت کے جس میں یہ زیادتی نہیں ہے اس روایت میں لوگوں کے لئے آسانی ہے کیونکہ جس شخص نے ان امور میں سے کچھ کمی کی تو اس کی نماز نقصان کے ساتھ ہوگئی اور بالکل ضائع نہ ہوئی اور حد اوّل میں بعض وہ چیزیں ہیں جن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے رکنیت کے لفظ کے ساتھ بیان کیا ہے جیسے آپ نے فرمایا ''بغیر فاتحہ الکتاب کے نماز نہیں ہوتی'' اور فرمایا ''آدمی کی نماز پوری نہیں ہوتی یہاں تک کہ رکوع اور سجود میں اپنی پشت سیدھی نہ کرلے'' اور حد اوّل میں بعض وہ چیزیں ہیں جن کے ساتھ شارع نے نماز کو تعبیر فرمایا کیونکہ اس سے ان چیزوں کا نماز کے اندر رکن ہونے پر تنبیہ بلیغ پائی جاتی ہے جیسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا **''من قام رمضان''** اور آپ نے فرمایا **''فلیرکع رکعتین''** اور اللہ تعالیٰ کا فرمان **''واركعوا (۱) مع الراكعين''** اور اس کا فرمان **''وادبار السجود''**

---

(۱) ان آیات میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے رکوع، سجود، اور قیام کے الفاظ ذکر فرمائے ہیں اور ان سے نماز پڑھنا مراد ہے، اس طرح کی تعبیر ان کے ارکان نماز ہونے پر تنبیہ کرتی ہے۔

اور اس کا فرمان "وقران الفجر" اور اس کا فرمان "وقوموا لله قانتين"

اور حد اوّل میں بعض وہ چیزیں ہیں جن کو اس طور سے بیان کیا ہے کہ ان کا ضروری ہونا سمجھا جاتا ہے جیسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "نماز کی تحریم تکبیر ہے اور اس کی تحلیل سلام ہے" اور آپ نے فرمایا "ہر دو رکعت کے بعد تشہد پڑھنا چاہئے" اور تشہد کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جب تو نے اس کو کرلیا تو تیری نماز تمام ہوگئی" اور اسی طرح کی دیگر احادیث ہیں۔

اور حد اوّل میں بعض وہ چیزیں ہیں کہ نماز کے اندر ان کے ضروری ہونے میں مسلمانوں کا اختلاف نہیں ہے اور وہ ان میں برابر جاری رہیں اور ان کے ترک کرنے والے پر ملامت ہوتی رہی۔ الحاصل نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز کے متعلق جو تواتر سے ثابت ہے اور جو امت کو مسلسل حاصل ہوتا رہا ہے یہ ہے کہ پاکی حاصل کرے اور ستر عورت کرے، اس کے بعد کھڑا ہو اور اپنا منہ قبلہ کی طرف کرے اور دل سے خدا تعالیٰ کی طرف توجہ کرے اور خالص اس کے لئے عمل کرے اور زبان سے اللہ اکبر کہے اور فاتحۃ الکتاب پڑھے اور بجز فرض نماز کی تیسری اور چوتھی رکعت کے قرآن کی کوئی اور سورت اس کے ساتھ پڑھے پھر رکوع کرے اور اس قدر جھک جائے کہ انگلیوں کی پوروں سے گھٹنوں کو پکڑ سکے حتی کہ اطمینان سے رکوع کرے پھر رکوع سے سر اٹھائے حتی کہ اطمینان سے کھڑا ہو جائے پھر ساتوں اعضا یعنی دونوں ہاتھ، دونوں پاؤں دونوں گھٹنوں اور منہ کے ساتھ سجدہ کرے، پھر سجدہ سے سر اٹھا کر اطمینان کے ساتھ بیٹھ جائے پھر اسی طرح سے دوبارہ سجدہ کرے پس یہ ایک رکعت ہے، پھر ہر دو رکعت کے بعد بیٹھے اور تشہد پڑھے، اور اگر نماز کی اخیر رکعت ہو تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھے اور جو دعا سب سے زیادہ اس کو پسند ہو پڑھے اور اس کے آس پاس جو فرشتے اور مسلمان ہیں ان کے اوپر سلام کہے پس یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز ہے، کسی فرض نماز میں یہ ثابت نہیں کہ آپ نے قصداً بلا عذر کے ان امور میں سے کسی امر کو ترک کیا ہو، اور یہی صحابہ، تابعین اور ان کے بعد کے ائمہ مسلمین کی نماز ہے، اور سب لوگ انہی افعال کو نماز اور ان کو ضروریات دین میں سے کہتے چلے آئے ہیں، ہاں! فقہا کا ان میں سے چند امور کے اندر اختلاف ہے کہ آیا وہ ارکان نماز ہیں جن کے بغیر نماز کا اعتبار نہیں یا نماز کے واجبات ہیں جن کو ترک کرنے سے نماز میں نقصان آتا ہے یا ایسے اجزا ہیں جن کو ترک کرنے سے ملامت کی جاتی

ہے اور سجدہ سہو سے اس کا نقصان پورا ہو جاتا ہے۔

اور اس امر میں اصل یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے لئے دل میں خضوع کا ہونا اور اس کی طرف تعظیم اور رغبت اور خوف کے ساتھ متوجہ ہونا ایک امر خفی ہے جس کے لئے کسی ضابطہ کا ہونا ضروری ہے اس واسطے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دو چیزوں کے ساتھ اس کا انضباط فرمایا ایک تو یہ کہ اپنا منہ اور بدن قبلہ کی طرف کر کے کھڑا ہو اور دوسرے یہ کہ زبان سے اللہ اکبر کہے اس واسطے کہ انسان کی جبلت میں یہ بات داخل ہے کہ جب اس کے دل میں کوئی بات جم جاتی ہے تو اس کے تمام اعضا اور زبان اسی کے موافق حرکت کرتے ہیں، اسی کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''ابن آدم کے بدن میں ایک ٹکڑا ہے جب وہ درست ہوتا ہے تو تمام بدن درست ہوتا ہے اور جب وہ خراب ہوتا ہے تو تمام بدن خراب ہو جاتا ہے، پس زبان اور دیگر اعضا کا عمل دل کے فعل کا قائم مقام اور اس کا قوی مظنہ ہے اور ایسی ہی چیز سے دل کے فعل کا انضباط ہو سکتا ہے اور چونکہ حق سبحانہ جہت سے پاک تھا اس واسطے اس کے گھر کی طرف اور اس کے بڑے شعار کی طرف توجہ کرنا خدا تعالیٰ کی طرف توجہ کرنے کا قائم مقام کر دیا گیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول سے یہی مراد ہے درانحالیکہ اپنے منہ اور دل سے خدا کی طرف متوجہ ہوں اور چونکہ اظہار تعظیم کے لئے اللہ اکبر کا لفظ دلی انقیاد پر خوب تصریح کرنے والا تھا اس واسطے دلی توجہ کے قائم مقام کرنے کے لئے کوئی لفظ اس سے بہتر نہ ہوا اور اس کے اندر اور وجوہ بھی ہیں، ازاں جملہ یہ ہے کہ بوجہ تعظیم بیت اللہ اس کی طرف منہ کرنا واجب ہے اس کو نماز کے ساتھ اس واسطے موقت کر دیا تا کہ ایک دوسرے کی تکمیل ہو جائے۔

ازاں جملہ یہ ہے کہ قبلہ کی طرف منہ کرنا دین حنفی کی بڑی مشہور پہچان ہے جس کی وجہ سے لوگ دوسروں سے متمیز ہو سکتے ہیں اس واسطے ضروری ہوا کہ ایسی چیز اسلام کے اندر داخل ہونے کی علامت مقرر کی جائے بس اس کا وقت سب سے زیادہ عظمت والی اور سب سے زیادہ مشہور عبادت کے ساتھ مقرر کیا گیا چنانچہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو شخص ہماری سی نماز پڑھے اور ہمارے قبلہ کی طرف منہ کرے اور ہمارا ذبیحہ کھائے تو وہ مسلمان ہے جس کا خدا تعالیٰ اور اس کا رسول ذمہ دار ہے''۔

ازان جملہ یہ ہے کہ قیام بغیر استقبال کے تعظیم نہیں ہوسکتا تھا۔

ازان جملہ یہ ہے کہ ہر حالت کے لئے جو احکام کے اندر باقی حالات سے جدا ہو ایک ابتدا اور ایک انتہا ہونی چاہئے اس کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے ''نماز کی تحریم اللہ اکبر کہنا ہے اور اس کی تحلیل سلام پھیرنا ہے''۔

اب رہا جسم سے تعظیم کرنا سو اس میں اصل تین حالات ہیں ایک تو اس کے سامنے کھڑا ہونا اور ایک رکوع کرنا اور ایک سجدہ کرنا۔

اور عمدہ تعظیم وہ ہے جس میں یہ تینوں ہوں، اور خضوع کے بارے میں ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف بتدریج انتقال کرنا دوسری چیزوں کی بہ نسبت نفس کی زیادہ مناسب طور پر تنبیہ کرنا ہے، اور سجدہ کرنا اعلیٰ درجہ کی تعظیم ہے گویا کہ یہی مقصود بالذات ہے اور باقی قیام اور رکوع وغیرہ اس کی طرف واسطہ میں اس واسطے ضروری ہوا کہ اس کو کما حقہ ادا کیا جائے اور وہ سجدہ کو دوبار کرنے سے ادا ہو جاتا ہے، اب رہا ذکر الٰہی تو اس کے لئے بھی پابندی اوقات ضروری ہے اس واسطے کہ وقت کی پابندی سے لوگوں میں جمعیت رہتی ہے اور لوگوں کے دل اس چیز کو خوب مان لیتے ہیں اور اس بات سے بھی اجتناب ہو جاتا ہے کہ ہر شخص اپنی رائے کے موافق چلے خواہ بھلی ہو یا بری البتہ ان کے سپرد دعائے نافلہ کی گئی ہیں جن سے سابقین مخاطب کئے جاتے ہیں علاوہ بریں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بدون پابندی وقت کے ان کو بھی نہیں چھوڑا ہے اگرچہ وہ پابندی بطور استحباب کے ہے۔

اور جب ذکر اللہ میں تعیین وقت ضروری ہوئی تو اس کے لئے سورہ فاتحہ سے زیادہ مناسب کوئی چیز نہ تھی کیونکہ وہ ایک جامع دعا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی زبان میں اس بات کی تعلیم کے لئے نازل فرمایا ہے کہ کس طرح وہ اللہ تعالیٰ کی حمد کریں اور کس طرح اس کی ثنا بیان کریں اور کس طرح خاص اسی کی عبادت کا اقرار کریں اور خاص اسی سے استعانت کا اقرار کریں اور کس طرح اس راستہ کو مانگیں جو ہر طرح کی خیر کا جامع ہو اور کس طرح اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہیں اور ان لوگوں کی راہ سے جن پر اللہ تعالیٰ ناراض ہے اور جو گمراہ ہیں، اور عمدہ دعا وہ ہے جس میں یہ سب باتیں ہوں اور چونکہ قرآن کی تعظیم اور اس کی تلاوت دین کے اندر واجب ہے اور اس سے بڑھ کر تعظیم کی کوئی صورت نہیں کہ اسلام کے سب سے بڑے رکن اور عبادات کی اصل اور دین کے سب

سے مشہور شعائر میں قرآن کو ملحوظ رکھا جائے اور تلاوت قرآن خود ایک مستقل عبادت ہے جو نماز کو کامل اور تمام کرتی ہے اس وجہ سے قرآن کی کسی سورت کا پڑھنا لوگوں کے لئے ضروری کیا گیا کیونکہ سورت ایک ایسا پورا کلام ہے جس کی بلاغت سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے منکرین نبوت کو عاجز کر دیا اور یہ بات بھی ہے کہ ہر سورت اپنی ابتدا اور انتہاء کی وجہ سے ایک جدا کلام ہے اور ہر ایک کا ایک عمدہ اسلوب ہے اور جب شارع کی جانب سے بعض مرتبہ میں سورت کے ایک ٹکڑا کا پڑھنا ثابت ہے تو علما نے تین چھوٹی آیات یا ایک بڑی آیت کو اسی کے حکم میں داخل کیا، اور جبکہ کھڑے ہونے میں تمام افراد ایک طرح پر نہ تھے کیونکہ کوئی سرنگوں ہو کر کھڑا ہوتا ہے اور کوئی جھک کر کھڑا ہوتا ہے اور یہ سب کھڑے ہونے میں شمار ہوتا ہے اس واسطے اس بات کی ضرورت ہوئی کہ جو جھکنا مقصود ہے وہ قیام سے متمیز ہو جائے پس شرع نے اس کو رکوع کے ساتھ منضبط کر دیا جو اس قدر جھکنے کا نام ہے جس میں ہاتھوں کی انگلیاں گھٹنوں کو لگ جائیں، اور جبکہ رکوع اور سجود سے اللہ تعالیٰ کی تعظیم اسی وقت ہوسکتی ہے کہ اس حالت پر کچھ دیر تک رہے اور پروردگار عالم کے سامنے اپنے آپ کو پست کرے اور اس حالت میں اس کا دل اس تعظیم سے خبردار ہو جائے اس واسطے اس کو ایک رکن لازم قرار دیا گیا۔

اور جبکہ سجدہ کرنا اور پیٹ کے بل لیٹ جانا اور جو حالتیں اس کے قریب ہیں سب کے اندر زمین پر سر رکھنا پایا جاتا ہے حالانکہ تعظیم صرف سجدہ کرنے میں ہے نہ کہ باقی ہیئات میں، اس واسطے اس بات کی ضرورت ہوئی کہ ان میں کوئی مابہ الفرق مقرر کیا جائے پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''مجھ کو سات اعضا سے سجدہ کرنے کا حکم ہوا ہے'' الحدیث،

اور جبکہ آدمی سجدہ کرنا چاہتا ہے تو اس کو سجدہ تک پہنچنے کے لئے جھکنا ضروری ہوتا ہے اور وہ جھکنا رکوع نہیں ہوتا بلکہ سجدہ تک پہنچنے کا ایک ذریعہ ہوتا ہے اس واسطے اس بات کی ضرورت ہوئی کہ رکوع اور سجود کے درمیان ایک ایسے اجنبی فعل کو لاکر تفریق کی جائے جس سے ہر ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جائے تا کہ ہر ایک مستقل عبادت قرار پائے اور نفس اس کا جداگانہ ارادہ کرے تا کہ نفس ہر ایک کے ثمرات جداگانہ حاصل کرنے کے لئے آمادہ رہے اور وہ فعل قومہ ہے، اور جبکہ دو سجدے بغیر اجنبی فعل کے حائل ہو جائے جدا جدا نہیں ہو سکتے تھے اس واسطے ان کے درمیان جلسہ

مشروع ہوا، اور جبکہ سجدہ اور قومہ بدون اطمینان کے ایک طرح کا ہلکا پن اور کھیل تھا جو شان عبادت کے بالکل منافی تھا اس واسطے ان دونوں کو بھی اطمینان کے ساتھ ادا کرنے کا حکم دیا گیا، اور جبکہ طہارت کو زائل کر کے یا اس کے علاوہ کوئی ایسا فعل کر کے جو نماز کو فاسد اور باطل کرنے والا ہو نماز سے باہر آنا قبیح، مکروہ اور تعظیم کے منافی تھا اور ایسے فعل کا ہونا ضروری تھا جس سے نماز کا اختتام ہو جائے اور جو امور نماز کے اندر حرام تھے وہ حلال ہو جائیں اور اگر کسی خاص فعل کو اس میں مقرر نہ کیا جاتا تو ہر شخص اپنی خواہش کی پیروی کرتا اس واسطے ضروری ہوا کہ نماز سے باہر ہونا صرف ایسے کلام کے ساتھ ہو جو لوگوں کے کلام میں بہترین کلام ہو اور وہ سلام ہے اور اس کو واجب کر دیا جائے چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''نماز سے باہر آنا سلام پھیرنا ہے اور صحابہ کو یہ امر مرغوب تھا کہ سلام سے پہلے یہ کہتے تھے'' خدا تعالیٰ کے اوپر اس کے بندوں سے پہلے سلام، جبرئیل کے اوپر سلام، فلاں کے اوپر سلام، پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو التحیات کے ساتھ بدل دیا اور اس بدلنے کا سبب یہ کہہ کر بیان فرما دیا'' یہ مت کہو کہ خدا کے اوپر سلام کیونکہ خدا تعالیٰ تو خود سلام ہے''۔

یعنی سلامتی کی دعا تو اس کے لئے مناسب ہے جس کے لئے بسبب عدم کے اور اس کے لواحق کے سلامتی ذاتی نہ ہو پھر اس کے بعد نبی پر سلام کو مقرر کیا تا کہ نبی کے ذکر کی تعظیم ہو اور اس کی رسالت کا اقرار ہو اور اس کے کچھ حقوق بھی ادا ہو جائیں پھر یہ فرما کر سلام کی تعمیم کر دی ''ہم پر سلام اور خدا تعالیٰ کے نیک بندوں پر سلام ہو، آپ نے فرمایا جب کوئی یہ کہتا ہے تو اس کا سلام ہر نیک بندے کو پہنچتا ہے خواہ وہ آسمان میں ہو یا زمین میں ہو''۔

پھر تشہد کا حکم دیا کیونکہ وہ اعظم الاذکار ہے آپ نے فرمایا'' اس کے بعد جو دعا اس کو پسند ہو اختیار کرے''۔

اور یہ اس واسطے کہ نماز سے فارغ ہونے کا وقت دعا کرنے کا وقت ہے کیونکہ اس وقت رحمت الٰہی اس پر چھا جاتی ہے اور ایسی حالت میں دعا قبول ہوتی ہے، اور دعا کے آداب میں سے یہ ہے کہ پہلے خدا کی ثنا کرے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو وسیلہ بنائے تا کہ دعا قبول ہو پھر اسی پر تعین ہو گیا اور تشہد نماز کے لئے رکن قرار دیا گیا کیونکہ اگر یہ امور نہ ہوتے تو نماز سے آدمی اس طرح

فارغ ہوتا جیسے کوئی اعراض کرنے والا یا نادم آدمی فارغ ہوتا ہے۔

اوراس مقام کے متعلق بہت سے وجوہ ہیں جن میں سے بعض پوشیدہ ہیں اور بعض ظاہر ہیں ہم نے ان کو اس لئے ذکر نہیں کیا کہ پہلے ہم جو کچھ بیان کر چکے ہیں وہ کافی ہے۔

مختصر یہ کہ جو شخص ہمارے مذکورہ کلام میں غور کرے گا اور ان قواعد میں فکر کرے گا جن کو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں تو یقیناً وہ یہ جان لے گا کہ نماز اسی کیفیت کے ساتھ ہونی چاہئے اور عقل اس سے بہتر اور کامل صورت کو تصور نہیں کرسکتی، اور غنیمت حاصل کرنے والے کے لئے یہی غنیمت کبریٰ ہے اور جبکہ تھوڑی سی نماز معتد بہ فائدہ نہیں پہنچا سکتی تھی اور کثیر نماز کا قائم کرنا لوگوں پر گراں تھا اس واسطے حکمت الٰہی کا مقتضیٰ یہ ہوا کہ ان کے لئے دو رکعت سے کم مقرر نہ کی جائے پس دو رکعتیں نماز کا کم سے کم درجہ قرار پایا اسی لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''ہر دو رکعات کے بعد التحیات ہے'' اور یہی ایک دقیق راز ہے اور وہ یہ ہے کہ حیوانات اور نباتات کے اشخاص اور افراد کے پیدا کرنے میں خدا تعالیٰ کی عادت اس طور پر جاری ہے کہ ہر فرد کے دو پہلو ہوتے ہیں اور ایک کو دوسرے کے ساتھ ملا کر دونوں کو شئے واحد کر دیا جاتا ہے اس کے متعلق خدا تعالیٰ کا فرمان ہے، والشفع والوتر، پس حیوان کی دو طرفیں تو معلوم ہیں اور بسا اوقات ایک جانب کو کوئی مرض لاحق ہو جاتا اور دوسری جانب اس سے محفوظ رہتی ہے جیسے فالج کے مرض میں ہوتا ہے، اور نباتات کے اندر گٹھلی اور تخم کی دو طرف ہوتی ہیں اور جب پہلی شاخ پھوٹتی ہے تو اس کے دو ہی پتے اگتے ہیں ہر ایک پتہ دونوں گٹھلی اور تخم کی ایک ایک جانب کی میراث ہوتا ہے پھر اسی طریقہ پر نشو ونما ہوتا رہتا ہے پس خدا تعالیٰ کا یہ طریقہ حظیرۃ القدس میں باب خلق سے باب تشریع کی طرف منتقل ہو گیا کیونکہ تدبیر خلق کی فرع ہے اور حظیرۃ القدس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب کے اندر اس کا فیضان ہوا، پس اصل نماز ایک رکعت ہے اور تمام نمازوں میں دو رکعت سے کم مقدار مقرر نہیں ہوئی اور ہر رکعت دوسری رکعت کے ساتھ مل کر دونوں بہ منزلہ شئے واحد کے ہو گئیں، حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا ''جب اللہ تعالیٰ نے نماز فرض کی تھی تو سفر اور حضر میں دو دو رکعت فرض کی تھی پس سفر کی نماز بدستور رہی اور حضر کی نماز بڑھا دی گئی''۔ اور ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ بجز مغرب کے کیونکہ وہ تین رکعات تھیں۔

میں کہتا ہوں تعداد رکعت میں اصل یہ ہے کہ فرض جو کسی حال میں ساقط نہیں ہوتا وہ گیارہ رکعتیں ہیں اور یہ اس واسطے کہ حکمت الٰہیہ اس بات کی مقتضی ہوئی کہ دن اور رات میں کوئی ایسا مبارک متوسط عدد مقرر رہونا چاہے جو نہ تو بہت زیادہ ہو جس کا ادا کرنا تمام مکلفین پر دشوار ہو جائے اور نہ بہت کم ہو جس سے نماز کا مقصود ہی لوگوں کو حاصل نہ ہو سکے اور سابق میں تم یہ بات جان چکے ہو کہ تمام اعداد میں سے گیارہ کا عدد طاق حقیقی کے ساتھ زیادہ مشابہ ہے۔

پھر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت فرمائی اور اسلام کو استحکام ہو گیا اور اس کو ماننے والے بہت ہو گئے اور عبادت کرنے میں لوگوں کی رغبت بہت بڑھ گئی تو چھ رکعات اور زیادہ کر دی گئیں، اور سفر کی نماز بدستور باقی رہی اور اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی شئے پر زیادتی اس قدر نہیں ہونی چاہئے جو اصل شئے کے برابر ہو یا اس سے بڑھ جائے بلکہ مناسب یہ ہے کہ زیادتی اصل شئے کا نصف ہو لیکن گیارہ کا نصف بدون کسر کے نہیں ہوتا اس واسطے دو عدد ظاہر ہوئے پانچ کا عدد اور چھ کا عدد، اور گیارہ میں پانچ زائد کرنے سے پورا عدد جفت ہو جاتا ہے طاق نہیں رہتا اس لئے چھ کو زیادہ کرنا متعین ہو گیا اب رہا پورے عدد پر رکعات کو تقسیم کرنا تو وہ انبیاء سابقین کے آثار پر مبنی ہے جیسا کہ اخبار میں مذکور ہے، اور نیز چونکہ مغرب کی نماز ایک وجہ سے سب سے اخیر کی نماز ہے اس واسطے کہ عرب کے لوگ راتوں کو دنوں سے پہلے شمار کرتے ہیں، پس ایک کے عدد کا جو پوری رکعات کو طاق کرنے والا ہے اسی میں پایا جانا مناسب ہوا اور مغرب کا وقت چونکہ تنگ ہوتا ہے اس واسطے مغرب کے اندر اس مقدار کا زیادہ کرنا مناسب نہیں ہے جو بعد میں نمازوں میں کی گئی ہے اور فجر کا وقت خواب اور غفلت کا وقت ہے اس واسطے اس کی عدد رکعات میں زیادتی نہیں کی گئی بلکہ جس میں طاقت ہے اس کے لئے طول قرأت کو مستحب کر دیا اسی کے متعلق اللہ تعالیٰ کا قول ہے ''اور فجر میں قرآن کا پڑھنا، بلاشبہ فجر میں قرآن پڑھنا روبرو ہونا ہے'' واللہ اعلم۔

نماز کے اذکار اور اس کی ہیئات مستحبہ کا بیان

واضح ہو کہ اس حد کو جس سے نماز کا پورا فائدہ حاصل ہوتا ہے اس حد پر جو نماز کے اندر ضروری ہے دو وجہ سے زیادتی ہے، بالکیف اور بالکم، کیف سے ہماری مراد اذکار اور ہیئات ہیں اور اپنے نفس کو اس طرح سے پابند کرنا ہے کہ یہ خیال کر کے وہ اللہ تعالیٰ کے لئے نماز پڑھے گویا وہ

اس کو دیکھ رہا ہے، اور نماز کے دوران وسوسوں کو نہ آنے دے، اور مکروہ ہیئتوں سے اور اسی طرح کی اور باتوں سے احتراز کرے۔

اور زیادہ بالکم سے ہماری مراد وہ نمازیں ہیں جن کے ساتھ لوگ نوافل پڑھتے ہیں، اور انشاء اللہ تعالیٰ عنقریب بعد میں نوافل کا ذکر آئے گا۔

اور اذکار کے اندر اصل حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے اور استفتاح یعنی قرآن پڑھنے سے قبل کچھ دعا پڑھنے میں حضرت ابو ہریرہ، حضرت عائشہ، حضرت جبیر بن مطعم اور عبداللہ بن عمر وغیرہم رضی اللہ عنہم کی احادیث اصل ہیں اور باقی مواضع میں حضرت عائشہ، ابن مسعود، ابو ہریرہ، ثوبان اور کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہم کی احادیث ہیں ان کے علاوہ اور احادیث ہیں جن کو آگے تفصیل سے ذکر کریں گے، اور نماز کی ہیئت کے اندر اصل ابو حمید الساعدی کی وہ حدیث ہے جس کو انھوں نے دس صحابہ کے سامنے بیان کیا اور سب نے اس کو تسلیم کیا، اور حضرت عائشہ اور وائل بن حجر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی حدیث بھی فی الجملہ اس میں مروی ہے، اور ابن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث رفع الیدین کے بارے میں مروی ہے اور ان کے علاوہ اور احادیث ہیں جن کو ہم عنقریب ذکر کریں گے۔

ہیئات مستحبہ کا مدار چند باتوں پر ہے ان میں سے ایک خضوع کا پیدا کرنا اور تمام اعضا کو خدا تعالیٰ کے سامنے سکوڑ لینا اور نفس کو ایسی حالت پر متنبہ کرنا جو عام لوگوں کو بادشاہوں کے سامنے عرض و معروض کرتے وقت پیدا ہوتی ہے کہ ان پر ہیبت اور دہشت طاری ہو جاتی ہے مثلاً دونوں قدموں کو برابر رکھنا اور دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر رکھنا اور نظر کو پست کرنا اور ادھر سے ادھر نہ دیکھنا

اور ان میں سے ایک خدا تعالیٰ کا ذکر کرنا اور ماسوا پر اس کے اختیار کر لینے کو دل میں سمجھتے وقت اور زبان سے کہتے وقت اپنی انگلیوں اور اپنے ہاتھ سے ظاہر کرنا مثلاً رفع الیدین کرنا اور انگشت شہادت سے اشارہ کرنا تاکہ ایک دوسرے کا معاون ہو جائے۔

اور ان میں سے ایک وقار اور محاسن آداب کے طریقوں کو عمل میں لانا اور طیش اور ان طریقوں سے پرہیز کرنا جن کو اہل عقل ناپسند کرتے ہیں اور حیوانات کی طرف منسوب کرتے ہیں جیسے مرغ کی طرح ٹھونگیں مارنا اور کتے کی طرح بیٹھنا اور لومڑی کی طرح سجدہ میں سمٹنا اور اونٹ

کی طرح بیٹھنا اور درندوں کی طرح ہاتھ و بازو پھیلا دینا اور ان ہیئات سے پرہیز کرنا جو اہل بلا اور متحیر لوگوں کو عارض ہوتی ہیں جیسے پہلو پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہونا

اور ان میں سے ایک یہ ہے کہ عبادت نہایت اطمینان اور سکون سے ادا کی جائے اور اس میں وقار پایا جائے جیسے دونوں سجدوں کے بعد جلسہ استراحت اور قعدہ اولیٰ میں دائیں پاؤں کا کھڑا رکھنا اور بائیں کا لٹا لینا کیونکہ کھڑا ہونے کے لئے اس میں آسانی ہے، اور قعدہ ثانیہ میں سرین پر بیٹھنا کیونکہ اس میں زیادہ راحت ہے، اور اذکار کا مدار بھی چند باتوں پر ہے ان میں سے ایک نفس کو اس خضوع کے لئے بیدار کرنا ہے جس کے لئے یہ فعل مقرر کیا گیا ہے جیسے رکوع اور سجود کے اذکار، اور ان میں سے ایک ذکر الٰہی کو باآواز بلند کہنا تاکہ لوگوں کو امام کا ایک رکن سے دوسرے رکن کی طرف منتقل ہونا معلوم ہو جائے جیسے ہر دفعہ جھکتے اور اٹھتے وقت اللہ اکبر کہنا۔

اور ان میں سے ایک یہ ہے کہ نماز میں کوئی حالت ذکر سے خالی نہ ہو جیسے تکبیرات اور قومہ اور جلسہ کے اذکار ہیں، پس جب تکبیر کہے تو دونوں ہاتھ اوپر کو اٹھائے اس بات کو ظاہر کرنے کے لئے کہ اس نے خدا تعالیٰ کے سوا سب سے اعراض کر لیا اور حیز مناجات میں داخل ہو گیا اور ان کو کانوں تک یا مونڈھوں تک اٹھائے اور یہ دونوں طریق مسنون ہیں، اس کے بعد دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر رکھے اور دونوں قدم برابر رکھے، اور تعظیم کے لئے اور اس لئے کہ اجتماع خاطر کے ساتھ اجتماع اعضا بھی پایا جائے، نظر کو سجدہ کی جگہ پر جھکائے رکھے اور دعائے استفتاح پڑھے تاکہ حضور قلب پیدا ہو اور دل مناجات کی طرف مائل ہو اور اس بارے میں چند دعائیں صحیح وارد ہیں از ان جملہ یہ ہے: اے اللہ مجھ کو میری خطاؤں سے دور رکھ جس طرح تو نے مشرق کو مغرب سے دور رکھا، اے اللہ مجھ کو گناہوں سے اس طرح پاک کر دے جس طرح کپڑے کو میل سے پاک کیا جاتا ہے: اے اللہ میرے گناہوں کو پانی، برف اور اولوں سے دھو دے۔

میں کہتا ہوں برف اور اولوں کے ساتھ دھونے سے مراد گناہوں کا دور کرنا ہے اور اس کے ساتھ سکون قلب اور اطمینان کا پیدا کرنا ہے، اور اہل عرب کہا کرتے ہیں برد قلبه یعنی اس کا دل مطمئن ہو گیا اور اتاه الثلج یعنی اس کو یقین آ گیا۔

اور از ان جملہ یہ ہے میں اس ذات کی طرف متوجہ ہوا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا،

حق کی طرف متوجہ ہونے والا بن کر اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں، بے شک میری نماز میری عبادت میری زندگی اور میری موت سب اللہ تعالیٰ کے لئے ہے جو ہر ہر عالم کا پروردگار ہے کوئی اس کا شریک نہیں اور مجھ کو اسی کا حکم دیا گیا ہے اور میں مسلمانوں میں سب سے پہلا مسلمان ہوں، اور ایک روایت میں ہے اور ''میں مسلمانوں میں سے ہوں''۔

ازاں جملہ یہ ہے **سبحنک اللھم وبحمدک وتبارک اسمک وتعالیٰ جدک ولا الٰہ غیر اللہ اکبر کبیرا**، تین بار **والحمد للہ کثیرا** تین بار، **سبحان بکرۃ واصیلا** تین بار، اس کے بعد تعوذ پڑھے اس واسطے کہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے ''پس جب تو قرآن پڑھے تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شیطان رجیم سے پناہ مانگ

میں کہتا ہوں اس میں راز یہ ہے کہ شیطان کا سب سے بڑا ضرر یہ ہے کہ کتاب الٰہی کے اندر اس تاویل کا وسوسہ ڈالنا ہے جو خدا کے نزدیک ناپسند ہے یا انسان کو اس کتاب کے اندر فکر کرنے سے باز رکھنا ہے، اور تعوذ کئی طرح سے مروی ہے ازاں جملہ **اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم** ہے، ازاں جملہ **اعوذ باللہ من الشیطان من نفخہ ونفثہ وھمزہ** ہے اس کے بعد آہستہ سے بسم اللہ پڑھے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے قرأت سے پیشتر اپنے نام سے برکت حاصل کرنے کو مقرر فرمایا ہے، اس کے علاوہ بسم اللہ کے پڑھ لینے میں احتیاط بھی ہے کیونکہ اس کے جزء فاتحہ ہونے یا نہ ہونے میں مختلف روایتیں ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح طریقہ سے ثابت ہے کہ آپ نماز کو یعنی قرأت کو الحمد للہ رب العالمین سے شروع کرتے تھے اور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو آواز سے نہیں پڑھتے تھے۔

میں کہتا ہوں یہ کچھ بعید نہیں ہے کہ آپ نے بعض اوقات میں بسم اللہ کو بلند آواز سے پڑھا ہو تا کہ آپ لوگوں کو نماز کی سنت بتلا دیں اور ظاہر یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مخصوص صحابہ کو یہ اذکار تعلیم فرمایا کرتے تھے اور آپ ان اذکار کو یہ درجہ نہیں دیتے تھے کہ عام لوگوں سے ان کا مطالبہ کیا جائے اور ان کے ترک سے وہ قابل ملامت ہوں، امام مالک رحمہ اللہ کے قول کی میرے نزدیک یہی تاویل ہے اور ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قول سے یہی سمجھا جاتا ہے انھوں نے فرمایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تکبیر اور قرأت کے درمیان کسی قدر سکوت فرمایا کرتے تھے، میں نے

عرض کیا میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں قرأت اور تکبیر کے درمیان جو سکوت آپ کرتے ہیں اس میں آپ کیا پڑھا کرتے ہیں؟

اس کے بعد سورہ فاتحہ اور کوئی سورت ترتیل کے ساتھ پڑھے یعنی حروف کو مد کے ساتھ ادا کرے اور آیات کے تمام ہونے پر ٹھیر جائے ظہر اور عصر میں قرأت آہستہ کرے اور فجر کی نماز میں اور مغرب وعشا کی پہلی دو رکعت میں امام قرأت پکار کر کرے اور مقتدی پر واجب ہے کہ خاموش کھڑا رہے اور قرآن سنتا رہے۔ پس اگر امام جہر کرتا ہے تو اس کے سکوت کے اوقات میں پڑھ لیا کرے اور اگر امام آہستہ پڑھ رہا ہے تو مقتدی کو اختیار ہے پس اگر پڑھنا چاہے تو سورۂ فاتحہ کو اس طرح پڑھ لے کہ اس کے پڑھنے سے امام کو تشویش نہ ہو، اور میرے نزدیک یہ سب اقوال سے بہتر ہے اور اس کے ساتھ اس باب کی احادیث میں تطبیق ہو جاتی ہے اور اس میں راز وہی ہے جس کی تصریح کردی گئی ہے کہ امام کے ساتھ قرآن پڑھنا امام کی تشویش کا سبب بنتا ہے اور اس سے قرآن کے اندر تدبر فوت ہو جاتا ہے اور وہ قرآن کی تعظیم کے خلاف ہے اور شارع نے لوگوں پر یہ واجب نہیں کیا کہ امام کے پیچھے سورہ فاتحہ کو آہستہ پڑھا کریں اس واسطے کہ جب تمام اہل جماعت صحیح صحیح حروف ادا کرنے کی کوشش کریں گے تو ان سب کی ایک آواز پیدا ہوگی جو امام کے لئے خلجان کا باعث ہوگی اس واسطے خلجان پیدا کرنے والی شئے سے آپ نے تاکیداً نہی فرمادی اور جو منہی عنہ کی طرف مؤدی ہو اس کا آپ نے لوگوں کو حکم نہیں دیا اور ان کو اختیار دے دیا کہ جس سے ہو سکے وہ کرے اور یہ امت کے لئے بہت بڑی رحمت ہے، ظہر اور عصر کی نماز میں قرآن آہستہ پڑھنے میں یہ راز ہے کہ دن کے وقت بازاروں اور گھروں میں شور وغل ہوتا ہے اور ان دو وقتوں کے سوا اور اوقات میں آوازوں کو سکون ہو جاتا ہے اور جہر کے ساتھ پڑھنے میں لوگوں کو وعظ وتذکیر خوب اچھی طرح ہوتی ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”جس وقت امام آمین کہے تم بھی آمین کہو کیونکہ جس کی آمین ملائکہ کی آمین کے ساتھ مل جاتی ہے اس کے سب پہلے گناہ معاف ہو جاتے ہیں“۔

میں کہتا ہوں مجالس ذکر میں فرشتے مشتاق ہو کر حاضر ہوتے ہیں اور لوگوں کی دعاؤں پر آمین کہتے ہیں کیونکہ ملاء اعلیٰ سے ان کے اوپر القا ہو جاتا ہے اور اس حدیث میں امام کی اقتدا کا

اظہار ہے اور اقتدا کا طریقہ قائم ہوتا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دو سکوت مروی ہیں ایک سکوت تکبیر اور قرأت کے درمیان ہے تاکہ اس عرصہ میں تمام لوگ تکبیر تحریمہ کریں اور قرأت کے سننے پر بالقصد متوجہ ہو جائیں، اور ایک سکوت سورۂ فاتحہ اور دوسری سورت کی قرأت کے درمیان ہے، لوگوں نے اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ بلا تشویش اور بلا ترک سکوت مقتدیوں کو قرأت آسان ہو جائے۔

میں کہتا ہوں اصحاب سنن نے آنحضرت سے جو حدیث روایت کی ہے اس سے صراحتاً وہ سکوت جو مقتدیوں کے پڑھنے کے لئے امام کرتا ہے ثابت نہیں ہوتا کیونکہ ظاہر یہ ہے کہ یہ سکوت آمین کہنے کے لئے ہے ان کے نزدیک جو آہستہ آمین کہتے ہیں یا جو آمین بالجہر کہتے ہیں ان کے نزدیک یہ ایک سکتہ لطیفہ ہے جو سورۂ فاتحہ اور آمین میں تمیز کر دیتا ہے تاکہ مقتدیوں کے آمین کہنے سے قرآن غیر قرآن کے ساتھ مخلوط نہ ہو جائے، یا یہ ہلکا سا سکتہ اس لئے ہے کہ قاری دم لے لے اور اگر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ یہ سکوت قرأت مقتدی کے لئے ہے پھر بھی قرن اول کا اس کو نئی بات سمجھنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ کوئی سنت مستقرہ نہیں ہے اور نہ ان سنن میں سے ہے جن پر جمہور نے عمل کیا ہے، واللہ اعلم۔

اور فجر کی نماز میں ساٹھ آیت سے لیکر سو آیت تک پڑھنا چاہئے تاکہ اس کی کمی رکعات کا بدل طول قرأت سے ہو جائے اور کیونکہ ہنوز اشتغال معاش کی کدورت اس کے دل میں مستحکم نہیں ہے اس واسطے قرآن میں تدبر کرنے کے لئے اس فرصت کو غنیمت جانے اور عشا کی نماز میں **سبح اسم ربک الاعلی، واللیل اذا یغشی** اور ان جیسی سورتیں پڑھنی چاہئیں۔ اور حضرت معاذؓ کا قصہ اور آں حضرت کا لوگوں کو نفرت دلانے سے ناراض ہونا مشہور ہی ہے، اور بعض روایات میں ظہر کی نماز کو فجر پر اور عصر کی نماز کو عشا پر محمول کیا ہے اور بعض روایات میں ظہر کی نماز کو عشا پر اور عصر کی نماز کو مغرب پر محمول کیا ہے اور مغرب کی نماز میں قصار مفصل پڑھنا چاہئے کیونکہ وقت تنگ ہوتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مصلحت وقت کے لحاظ سے کبھی طول قرأت کرتے تھے اور کبھی تخفیف کیا کرتے تھے اور لوگوں کو تخفیف کا حکم اس لئے دیا ہے کہ جماعت میں ضعیف ہوتے ہیں، مریض ہوتے ہیں اور کام والے لوگ ہوتے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

چند فوائد کی وجہ سے بعض نمازوں میں بعض سورتوں کو پسند فرمایا ہے مگر ان نمازوں میں انہی سورتوں کا پڑھنا واجب نہیں کیا اور نہ ان کی تاکید کی پس جو ایسا کرے تو اس نے بہت اچھا کیا اور جو ایسا نہ کرے تو اس پر کچھ حرج نہیں مثلاً آپ عید الاضحیٰ اور عید الفطر میں سورۂ ق اور اقترب الساعۃ کی تلاوت پسند فرماتے تھے کیونکہ ان کا اسلوب بہت ہی انوکھا ہے اور ان میں عام مقاصد قرآن علی سبیل اختصار جمع ہیں، اور لوگوں کے اجتماع کے وقت ایسی ہی چیز کی ضرورت ہے یا آپ سبح اسم اور ھل اتاک پڑھا کرتے تھے اس واسطے کہ آپ تخفیف کا قصد فرماتے تھے اور ان کا اسلوب بھی بہت عمدہ ہے، اور جمعہ کی نماز میں سورۂ جمعہ اور سورۂ منافقون پڑھا کرتے تھے کیونکہ ان سورتوں میں ایک طرح کی مناسبت اور تحذیر پائی جاتی ہے اس واسطے کہ جمعہ کی نماز میں منافقین اور ہر طرح کے لوگ جو جمعہ کے سوا اور دنوں میں نہیں آتے جمع ہو جاتے ہیں، اور جمعہ کے روز نماز فجر میں الم تنزیل اور ھل اتی پڑھا کرتے تھے تاکہ قیامت اور اس کے واقعات لوگوں کو یاد دلائے جائیں اور جمعہ کے روز چوپائے ڈرتے رہتے ہیں کہ اسی روز قیامت واقع ہو جائے پس اسی طرح بنی آدم کو بھی مناسب ہے کہ اس دن سے ڈرتے رہیں اور جب قرآن پڑھنے والا سبح اسم ربک الاعلیٰ پڑھے تو اس کو سبحان ربی الاعلیٰ کہنا چاہئے اور جو شخص الیس اللہ باحکم الحاکمین پڑھے تو اس کو بلیٰ وانا علی ذالک من الشاھدین کہنا چاہئے اور جو شخص الیس ذالک بقادر علی ان یحی الموتی پڑھے تو اس کو بلیٰ کہنا چاہئے اور جو شخص فبای حدیث بعدہ یومنون پڑھے تو اس کو امنا باللہ کہنا چاہئے، اور یہ امر مخفی نہیں ہے کہ اس میں ادب اور مسارعت الی الخیر پائی جاتی ہے، پھر جب رکوع کرنا چاہے تو اپنے دونوں ہاتھ مونڈھوں تک یا کانوں تک اٹھائے اور اسی طرح اس وقت رفع الیدین کرے جب رکوع سے اپنے سر کو اٹھائے اور سجدہ میں ایسا نہ کرے۔

میں کہتا ہوں اس میں راز یہ ہے کہ رفع الیدین ایک تعظیمی فعل ہے جو نفس کو ان اشغال کے ترک کرنے پر جو نماز کے منافی ہیں، اور حیز مناجات میں داخل ہونے پر تنبیہ کرتا ہے پس تعظیمات ثلثہ میں سے ہر فعل کی ابتدا رفع الیدین سے مشروع ہوئی تاکہ از سر نو ہر مرتبہ نفس کو اس فعل کے ثمرہ پر آگاہی ہوتی رہے اور یہ ان ہیئات میں سے ہے جس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کیا ہے اور کبھی

ترک کیا ہے اور دونوں میں سے ہر ایک سنت ہے، ان میں سے ہر ایک کو صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کی ایک جماعت نے اختیار کیا ہے، اور رفع الیدین کا مسئلہ ان مسائل میں سے ایک ہے جن میں دونوں فریق اہل مدینہ اور اہل کوفہ کا اختلاف ہے اور ہر ایک کے پاس قوی دلیل ہے۔

میرے نزدیک ایسے مسائل میں حق یہ ہے کہ سب سنت ہیں اور اس کی نظیر وتر کو ایک رکعت کے ساتھ پڑھنا یا تین رکعت کے ساتھ پڑھنا ہے اور جو شخص رفع الیدین کرتا ہے میرے نزدیک رفع الیدین نہ کرنے والے سے بہتر ہے کیونکہ رفع الیدین والی احادیث اکثر اور خوب ثابت ہیں، مگر ایسی صورتوں میں انسان کو مناسب نہیں ہے کہ اپنے شہر کے عوام کا فتنہ اپنے اوپر لیوے، اسی کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ سے فرمایا ''اگر تیری قوم کو کفر ترک کئے تھوڑا زمانہ نہ ہوا ہوتا تو میں کعبہ کو منہدم کر کے حضرت ابراہیمؑ کی بنیاد کے موافق بناتا''۔ اور کچھ بعید نہیں ہے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے یہ سمجھا ہو کہ اخیر میں سنت متقررہ رفع الیدین کا ترک کرنا ہے کیونکہ انھوں نے خیال کیا کہ نماز کا مدار اعضا کے سکون پر ہے اور ان کو یہ معلوم نہ ہوئی کہ رفع الیدین ایک تعظیمی فعل ہے اور اسی وجہ سے نماز کی ابتدا اس سے کی گئی، یا انھوں نے یہ سمجھا ہو کہ رفع الیدین ایک ایسا فعل ہے جو ترک کو بتلاتا ہے۔ پس اس کا اثنا نماز میں ہونا مناسب نہیں ہے اور وہ یہ بات نہ سمجھے کہ نماز کے ہر فعل مقصود کے وقت بار بار نفس کو ماسوا اللہ کے ترک پر متنبہ کرنا ایک امر مطلوب ہے، واللہ اعلم۔

یہ قول کہ ''سجدہ میں جاتے وقت رفع الیدین نہ کرے''۔

اس کے متعلق میں کہتا ہوں کہ قومہ رکوع اور سجود میں فرق کرنے کے لئے مقرر ہوا ہے پس قومہ کے وقت رفع الیدین کرنا سجدہ کے لئے ہی رفع الیدین کرنا ہے پس اس کو دوبارہ کرنے کے کوئی معنی نہیں، ہر دفعہ جھکتے اور اٹھتے وقت تکبیر کہے تاکہ نفس کو متنبہ مذکور حاصل ہوتا رہے اور تاکہ جماعت کے لوگ تکبیر کو سن کر امام کا ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل ہونا معلوم کرتے رہیں، رکوع کی ہیئات میں سے یہ ہے کہ اپنی دونوں ہتھیلیوں کو دونوں گھٹنوں پر رکھے اور اپنی انگلیوں کو ان سے نیچے رکھے جس طرح کسی چیز کو ہاتھ میں پکڑتے ہیں اور دونوں کہنیوں کو بدن سے دور رکھے اور بدن کو برابر رکھے کہ سر کو نہ اٹھا ہوا رکھے اور نہ نیچے کو جھکا ہوا رکھے۔

اور رکوع کے اذکار میں یہ آیا ہے: سبحانک اللھم ربنا وبحمدک اللھم اغفرلی، اور اس میں اللہ تعالیٰ کے اس قول پر عمل پایا جاتا ہے "تو اپنے پروردگار کی حمد کے ساتھ تسبیح کر اور اس سے بخشش طلب کر۔

اور ان اذکار میں سے یہ ہے "سبوح قدوس ربنا ورب الملائكة والروح" اور یہ ہے "سبحان ربی العظيم، تین بار اور یہ ہے "اللهم لک رکعت وبک آمنت وبک اسلمت خشع لک سمعي و بصری فحي عظمي وعصبي.

اور قومہ کی یہ صورت ہے کہ سیدھا کھڑا ہو جائے اور ہر ہر جوڑ اپنی جگہ پر آ جائے اور اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے، اور قومہ کے اذکار یہ ہیں۔ سمع الله لمن حمده اور اللهم ربنا لک الحمد حمدا كثيراً طيبا مبار كا فيه.

اور ایک روایت میں اس کے ساتھ یہ بھی آیا ہے: ملٔ السموت وملٔ الارض وملٔ ما شئت من شئٍ بعد.

اور ایک روایت میں یہ عبارت زائد ہے۔ اهل الثناء والمجد احق ماقال العبد وكلنا لک عبد اللهم لا مانع لما اعطيت ولا معطي لما منعت ولا ينفع ذا لجد منک الجد اور قومہ کے اذکار میں سے یہ بھی ہے۔ اللهم طهرني بالثلج والبرد والماء البارد، اللهم طهرني من الذنوب والخطايا كما ينقى الثوب الابيض من الدنس.

صبح کی قنوت کے بارے میں احادیث اور صحابہ وتابعین کے اقوال مختلف ہیں اور میرے نزدیک قنوت اور ترک قنوت دونوں سنت ہیں اور جو شخص بڑے حادثہ کے وقت ہی قنوت پڑھے یا قنوت کے چند کلمات رکوع سے پہلے آہستہ سے پڑھ لیا کرے تو ایسا کرنا میرے نزدیک زیادہ بہتر ہے کیونکہ احادیث اس بات پر شاہد ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتداء رعل اور ذکوان پر بددعا کی تھی اور پھر ترک کر دی تھی اور اس سے اگرچہ قنوت کے بالکل منسوخ ہونے پر دلالت نہیں ہوتی لیکن اس بات کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ قنوت سنت مستقرہ نہیں ہے یا ہم کہتے ہیں کہ قنوت ہمیشہ کرنے کی چیز نہیں ہے چنانچہ ایک صحابی نے کہا تھا اے بیٹے یہ ایک نئی بات ہے یعنی ہمیشہ قنوت کرنا، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفاء پر جب کوئی حادثہ پیش آتا تھا تو رکوع کے بعد

یا رکوع سے پہلے مسلمانوں کے لئے دعا اور کفار پر بددعا کرتے تھے اور اس کو کبھی ترک نہیں کیا بایں معنی کہ حادثہ پیش آنے پر آپ اس کو عمل میں نہ لائے ہوں۔

اور سجدہ کرنے کی یہ صورت ہے کہ زمین پر ہاتھ رکھنے سے پیشتر اپنے دونوں گھٹنے ٹکائے اور کتے کی طرح اپنی باہیں زمین پر نہ پھیلائے اور اپنے دونوں بازوؤں کو بدن سے جدا رکھے کہ بغلوں کی سفیدی نظر آسکے اور اپنے دونوں پاؤں کی انگلیوں کی پوروں کو قبلہ کی طرف کو رکھے، اور سجدہ کے اذکار میں سے یہ ہے: سبحان ربی الاعلیٰ تین بار اور ان اذکار میں سے یہ ہے: **سبحانک اللھم ربنا وبحمدک اللھم اغفرلی** اور ان اذکار میں سے یہ ہے **اللھم لک سجدت وبک آمنت ولک اسلمت سجد وجھی للذی خلقہ وصورہ وشق سمعہ وبصرہ فتبارک اللہ احسن الخالقین۔**

اور ان اذکار میں سے یہ ہے: **سبوح قدوس ربنا ورب الملائکۃ والروح،** اور ان اذکار میں سے یہ ہے **اللھم اغفرلی ذنبی کلہ دقہ وجلہ واوّلہ وآخرہ وعلانیتہ وسرہ۔** اور ان اذکار میں سے یہ ہے کہ: **اللھم انی اعوذ برضاک من سخطک وبمعافاتک من عقوبتک واعوذبک منک الا احصی ثناء علیک انت کما اثنیت علی نفسک۔**

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ربعہ بن کعب کو جبکہ انھوں نے جنت میں آپ کے ساتھ ہونے کی درخواست کی تھی جو یہ فرمایا "کثرت سجود سے اپنے نفس پر تو میری مدد کر" تو یہ اس لئے فرمایا تھا کہ سجدہ غایت درجہ کا تعظیمی فعل ہے پس سجدہ مومن کی معراج ہے اور اس کی ملکیت کا بہیمیت کی قید سے آزاد ہونے کا وقت ہے، اور جس نے اپنے اوپر رحمت الٰہی کے نزول کو جگہ دی تو گویا اس نے مفیض الخیر یعنی خدا تعالیٰ کی اعانت کی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "قیامت کے روز میری امت کی پیشانی سجدہ کی وجہ سے اور ان کے دست و پا وضو کی وجہ سے روشن ہوں گے"۔

میں کہتا ہوں عالم مثال کا مبنی ایک مناسبت پر ہے جو ارواح واجسام میں پائی جاتی ہے جس طرح عالم مثال میں روزہ داروں کو کھانا کھانے سے روکنا اور جماع سے روکنا شرم گاہ اور منہ پر مہر لگانے کی صورت میں ظاہر ہوا اور دونوں سجدوں کے درمیان میں بیٹھنے کی صورت یہ ہے کہ اپنے

بائیں پاؤں پر بیٹھے اور دائیں پاؤں کو کھڑا رکھے اور دونوں ہتھیلیاں اپنے دونوں گھٹنوں پر رکھے، اور اس کے اذکار میں سے یہ ہے: اللهم اغفرلي وارحمني واهدني وعافني وارزقني.

اور قعدہ کرنے کی صورت یہ ہے کہ اپنے بائیں پاؤں پر بیٹھے اور دائیں پاؤں کو کھڑا رکھے، اور قعدہ اخیرہ کے اندر ایک روایت یہ بھی ہے کہ اپنے بائیں پاؤں کو باہر نکالے اور دائیں پاؤں کو کھڑا رکھے اور سرین پر بیٹھ جائے اور دونوں ہاتھ دونوں گھٹنوں پر رکھ لے اور یہ بھی آیا ہے کہ بائیں ہاتھ سے گھٹنے کو پکڑ لے اور ترپین کی شکل بنا کر شہادت کی انگلی سے اشارہ کرے اور یہ بھی مروی ہے کہ چھوٹی انگلی اور اس کے پاس والی انگلی کو سمیٹ لے اور درمیان کی انگلی اور انگوٹھے سے حلقہ بنائے اور شہادت کی انگلی سے اشارہ کرے، اور شہادت کی انگلی اٹھانے میں راز یہ ہے کہ توحید کی طرف اشارہ ہوتا کہ قول وفعل میں مطابقت ہوجائے اور توحید کے معنی محسوس اور متشکل ہوجائیں اور جو شخص یہ کہتا ہے کہ ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب انگشت شہادت سے اشارہ نہ کرنا ہے تو وہ شخص خطا پر ہے اور اس کی اس بات پر نہ نقل شاہد ہے اور نہ عقل، یہ قول ابن ہمامؒ کا ہے، یہاں امام محمد رحمہ اللہ نے اس کو اپنی کتاب مبسوط میں ذکر نہیں کیا اور موطا میں اس کو ذکر کیا ہے، اور میں نے بعض ایسے لوگوں کو پایا ہے کہ جن کو ہمارے اس قول میں کہ ظاہر مذہب میں اشارہ نہیں ہے، اور ہمارے اس قول میں کہ ظاہر مذہب اشارہ نہ کرنا ہے، کچھ بھی تمیز نہیں ہے اور جہل وتعصب کی خرابیاں بے شمار ہیں، تشہد کے اندر مختلف روایات وارد ہیں ان میں سے سب سے زیادہ صحیح حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا تشہد ہے اور اس کے بعد عبداللہ بن عباس اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کا تشہد ہے اور وہ سب قرآن کی قرائتوں کی طرح ہیں کہ ہر ایک شافی اور کافی ہے۔

اور درود کے کلمات میں صحیح تر یہ ہے: اللهم صل على محمد وعلى آل محمد كما صليت على ابراهيم وعلى آل ابراهيم انك حميد مجيد. اللهم بارك على محمد وعلى آل محمد كما باركت على ابراهيم وعلى آل ابراهيم انك حميد مجيد، اور اللهم صل على محمد وازواجه وذريته كما صليت على آل ابراهيم وبارك على محمد وازواجه وذريته كما باركت على آل ابراهيم انك حميد مجيد.

اور تشہد کے بعد چند دعائیں مروی ہیں ازاں جملہ اللھم انی اعوذبک من عذاب جھنم واعوذبک من عذاب القبر واعوذبک من شر المسیح الدجال واعوذبک من فتنة المحیا والممات۔

اور یہ دعا بھی وارد ہے: اللھم انی ظلمت نفسی ظلماً کثیرا ولا یغفر الذنوب الا انت فاغفرلی مغفرة من عندک وارحمنی انک انت الغفور الرحیم۔

اور یہ دعا بھی وارد ہے: اللھم اغفرلی ما قدمت وما اخرت وما اسررت وما اعلنت وما اسرفت وما انت اعلم به منی انت المقدم وانت المؤخر لا اله الا انت۔

اور نماز کے بعد کے اذکار یہ ہیں: استغفر الله تین بار اور اللھم انت السلام ومنک السلام تبارکت یا ذا الجلال والاکرام لا اله الا الله وحده لا شریک له له الملک وله الحمد وهو علی کل شئ قدیر۔ اللھم لا مانع لما اعطیت ولا معطی لما منعت ولا ینفع ذا الجد منک الجد لا اله الا الله ولا نعبد الا ایاه وله النعمة وله الفضل وله الثناء الحسن لا اله الا الله مخلصین له الدین ولکره الکافرون۔ اللھم انی اعوذبک من الجبن واعوذبک من البخل واعوذبک من ارذل العمر واعوذبک من فتنة الدنیا وعذاب القبر، پھر تینتیس بار سبحان اللہ اور تینتیس بار الحمدلله اور چونتیس بار الله اکبر پڑھے اور یہ بھی روایت ہے کہ ہر ایک کو تینتیس بار پڑھے اور اس کے بعد سو کو پورا کرنے کو لا اله الا الله وحده لا شریک له، اخیر تک پڑھے اور ہر ایک کا پچیس پچیس بار پڑھنا بھی مروی ہے، تین تو وہ اور چہارم لا الہ الا اللہ اخیر تک اور ایک روایت یہ ہے کہ ہر نماز کے بعد دس بار سبحان اللہ اور دس بار الحمدللہ اور دس بار اللہ اکبر پڑھے اور ہر ایک کا سو مرتبہ پڑھنا بھی مروی ہے اور تمام دعاؤں کا حال قرآن کی قرأت کا سا ہے ان میں سے جس کسی کو کوئی شخص پڑھے گا ثواب موعود پائے گا۔ اور اولی یہ ہے کہ ان اذکار کو نوافل سے قبل پڑھ لیا کرے کیونکہ بعض اذکار میں ایسی چیز آئی ہے جو ان کے قبل از نوافل پڑھنے پر صراحتاً دلالت کرتی ہے جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”جو کوئی نماز پڑھنے سے پیشتر اور نماز

مغرب وصبح کے بعد نشست بدلنے سے پہلے لا الہ الا اللہ اخیر تک پڑھے، اور جیسا کہ راوی نے بیان کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز سے سلام پھیرتے تھے تو با آواز بلند لا الہ الا اللہ اخیر تک پڑھتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عباس نے فرمایا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نماز سے فارغ ہونا تکبیر سے معلوم کرلیتا تھا اور بعض حدیثوں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے جیسا کہ آپ نے فرمایا ''ہر نماز کے بعد'' اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہ فرمانا کہ ''جب حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے سلام پھیرتے تھے تو اس قدر بیٹھتے تھے جس میں صرف اللھم انت السلام پڑھ لیں، کئی وجوہ کا احتمال رکھتا ہے۔

از ان جملہ یہ ہے کہ نماز کی ہیئت پر صرف اسی قدر بیٹھتے تھے لیکن اس کے بعد دائیں یا بائیں طرف پھر جاتے تھے یا لوگوں کی طرف منہ کر لیتے تھے اور اذکار پڑھتے تھے تاکہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ اذکار بھی نماز میں داخل ہیں۔

از آں جملہ یہ ہے کہ آپ گاہے گاہے سوائے ان کلمات کے اور اذکار کو ترک کر دیتے تھے تاکہ لوگوں کو ان کا فرض نہ ہونا بتلا دیں اور کان کا مقتضی اس فعل کا بہت سی بار پایا جانا ہے نہ کہ ایک یا دو بار اور نہ ہی ہمیشہ کرنا اس کا مقتضی ہے۔

اور نوافل میں اصل یہ ہے کہ اپنے گھر میں ادا کیا کرے اور اس میں سارا راز یہ ہے کہ فرض اور نوافل میں کسی ایسی چیز سے جو ان دونوں کی جنس سے نہیں ہے فصل ہو جائے اور وہ فصل بھی قابل اعتبار ہو جو بظاہر معلوم ہو سکے۔

چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس شخص سے جو فرض نماز کے بعد نفل ملا کر پڑھنا چاہتا تھا یہ فرمایا ''بیٹھ جا کیونکہ اہل کتاب اسی وجہ سے ہلاک ہو گئے کہ ان کی نمازوں میں فصل نہیں تھا، پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے ابن خطاب تجھ کو خدا تعالیٰ نے رائے صواب عطا کی، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ''ان کو یعنی نوافل کو اپنے گھروں میں پڑھا کرو''۔ واللہ اعلم۔

ان چیزوں کا بیان جو نماز میں ناجائز ہیں اور سجدہ سہو اور سجدہ تلاوت کا بیان

واضح ہو کہ نماز کی بنیاد خشوع اعضا، حضور قلب اور سوائے ذکر اللہ کے اور چیزوں سے زبان کے روکنے اور قرآن شریف کے پڑھنے پر ہے، پس جو ہیئت خشوع کے خلاف ہے اور جو کلمہ ذکر

الٰہی کے قبیل سے نہیں ہے وہ نماز کے منافی ہے کہ بغیر اس کو ترک کئے اور بغیر اس سے باز رہے نماز پوری نہیں ہوتی، لیکن یہ چیزیں متفاوت ہیں اور ہر نقصان نماز کو بالکل باطل نہیں کرتا اور اس بات کی تمیز کرنا کہ کون سی چیز نماز کو بالکل باطل کر دیتی ہے اور کون سی اس میں فی الجملہ نقصان پیدا کرتی ہے ایک تشریع ہے جو نص شارع کی طرف منقول ہے اور فقہا کے درمیان اس میں بہت کچھ بحث ہے اور احادیث صحیحہ کی ان کے کلام پر تطبیق مشکل ہے اور اس باب میں حدیث کے ساتھ وہ مذہب زیادہ موافق ہے جس میں گنجائش زیادہ ہے۔

اور اس میں شک نہیں کہ جس فعل کثیر سے مجلس بدل جائے اور قول کثیر جو بہت زیادہ ہو نماز میں نقصان پیدا کرتا ہے، قول کثیر کے متعلق یہ حدیث ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اس نماز میں لوگوں کی بول چال میں سے کچھ درست نہیں ہے وہ تو صرف تسبیح وتکبیر اور قرأت قرآن ہے''۔

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام کا جواب نہ دینے کی وجہ یہ بیان فرمائی ''بلاشک نماز میں نمازی کے لئے ایک شغل ہے''۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص سے فرمایا تھا جو اپنے سجدہ کی جگہ سے مٹی کو صاف کرتا تھا کہ ''اگر تو کرتا ہے تو ایک دفعہ کر لے''۔ اور آپ نے خصر سے منع فرمایا اور وہ پہلو پر ہاتھ رکھنا ہے کیونکہ وہ دوزخیوں کی راحت ہے، یعنی یہ ان لوگوں کی ہیئت ہے جو مصیبت میں مبتلا، متحیر، مدہوش ہوتے ہیں۔ اور آپ نے ادھر ادھر دیکھنے سے منع فرمایا کیونکہ وہ اچکنا ہے کہ بندہ کی نماز میں شیطان اچک لیتا ہے یعنی یہ فعل نماز کو ناقص کرتا ہے اور نماز کے کمال کے منافی ہے، اور آپ نے فرمایا ''جب تم میں سے کسی کو نماز میں جمائی آئے تو جہاں تک ہو سکے اس کو روکے اس لئے کہ شیطان اس کے منہ میں داخل ہو جاتا ہے''۔

میں کہتا ہوں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد یہ ہے کہ جمائی لینے میں اس بات کا احتمال ہے کہ مکھی وغیرہ اس کے منہ میں چلی جائے جس سے اس کا دل پریشان ہو جائے اور اصل مقصد سے اس کو روک دے، اور آپ نے فرمایا ''جب تم میں سے کوئی نماز کے لئے کھڑا ہو تو ٹھیکریوں کو صاف نہ کرے کیونکہ رحمت اس کے سامنے ہوتی ہے''۔ اور آپ نے فرمایا ''جب تک بندہ نماز میں کسی اور طرف التفات نہیں کرتا اللہ تعالیٰ اس کی طرف متوجہ رہتا ہے پس جب وہ کسی اور طرف التفات کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی طرف متوجہ نہیں رہتا''۔ اور اسی طرح وہ حدیث ہے جو نماز میں

بندہ کو خدا تعالیٰ کے جواب دینے کے بارے میں وارد ہے۔

میں کہتا ہوں یہ اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بخشش تمام بندوں پہ عام و فائض ہے اور اس کا بندوں میں متفاوت ہونا ان کی استعداد جبلی یا کسبی کے اعتبار سے ہے پس جب کوئی بندہ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اس کے لئے اس کی بخشش کا دروازہ کھل جاتا ہے اور جب بندہ اس سے اعراض کرتا ہے تو اس سے محروم رہ جاتا ہے بلکہ اعراض کی وجہ سے عذاب الٰہی کا مستحق ہوتا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''نماز کے اندر چھینک، اونگھ اور جمائی لینا اور حیض، قئے اور نکسیر شیطان کی طرف سے ہے''۔

میں کہتا ہوں اس سے آپ کی مراد یہ ہے کہ یہ چیزیں نماز کے معنی اور اس کے مبنی کے منافی ہیں لیکن فعل کثیر سو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کے اندر بہت سی چیزیں ان کی مشروعیت بیان کرنے کے واسطے کی ہیں اور بہت سی چیزوں کو جو لوگوں نے نماز کے اندر کی ہیں ثابت رکھا اور منع نہیں کیا پس ان سب افعال سے اور ان سے کم سے نماز باطل نہیں ہوتی، اور تلاش سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تھوڑا سا کلام جیسے میں تجھ پر خدا کی لعنت کرتا ہوں، تین بار اور خدا تجھ پر رحم کرے اور تجھ کو تیری ماں روئے اور تمہارا کیا حال ہے جو تم میری طرف دیکھتے ہو اور تھوڑا سا گرفت کرنا جیسے اپنے بچے کو کندھے سے اتار دینا یا اس پر بٹھا لینا اور پاؤں کا دبانا اور جیسے دروازہ کا کھولنا، اور تھوڑا چلنا جیسے منبر کی سیڑھیوں سے اتر کر اس کے نیچے سجدہ کے لئے آنا اور امام کی جگہ سے ہٹ کر صف میں آنا اور سامنے کے دروازہ کی طرف جا کر اس کو کھول دینا اور خدا کے خوف سے رونا اور اشارہ کرنا جس سے کچھ سمجھا جائے اور سانپ بچھو کا مار ڈالنا اور بغیر گردن موڑنے کے دائیں بائیں دیکھنا، ان میں سے کوئی چیز نماز کو باطل نہیں کرتی۔

اور اسی طرح اس کے بدن یا کپڑے کو ناپاکی لگ جانا جبکہ وہ اس کے فعل سے نہ لگی ہو یا اس کو ناپاکی کا علم نہ ہو نماز کو فاسد نہیں کرتا واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس صورت میں جب کہ انسان اپنی نماز میں کوئی قصور کرے دو سجدے کرنے کا حکم دیا تاکہ اس کی کوتاہی کی تلافی ہو جائے پس اس کو قضا کے ساتھ بھی مناسبت ہے اور کفارہ کے ساتھ بھی مناسبت ہے۔

اور وہ مواضع جن میں نص حدیث سے سجدہ کرنا ثابت ہے چار ہیں، اول یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جب تم میں سے کسی کو نماز میں شک ہو اس کو معلوم نہ ہو کہ کتنی رکعت پڑھی ہیں تین یا چار تو وہ شک کی بات کو دور کرے اور جس مقدار پر یقین ہے اس پر نماز کی بنا کرے پھر سلام پھیرنے سے پیشتر دو سجدے کرے پس اگر اس نے پانچ پڑھی ہیں تو وہ ان دونوں سجدوں سے ان کو شفع کرلے گا اور اگر اس نے پڑھ کر چار کو پورا کیا ہے تو یہ دونوں سجدے شیطان کے لئے سرزنش ہیں''۔یعنی نیکی میں زیادتی ہے، اور رکوع اور سجود میں شک کرنا بھی اسی حکم میں ہے۔

دوم یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر کی پانچ رکعت پڑھی پس آپ نے سلام کے بعد دو سجدے کئے، نماز کے اندر کسی رکن کا بڑھ جانا ایسا ہی ہے جیسے رکعت کا زیادہ ہو جانا۔

سوم یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دو رکعت پڑھ کر سلام پھیر دیا پس کسی صحابی نے اس کے بارے میں آپ سے عرض کیا تو جو رکعات رہ گئی تھیں وہ آپ نے پڑھ لیں پھر دو سجدے کر لئے اور یہ بھی مروی ہے کہ آنحضرت نے سلام پھیر دیا اور آپ کی ایک رکعت باقی تھی پھر اس کی بابت کسی نے عرض کیا تو آپ نے ایسا ہی کیا، اور جس فعل کا عمداً کرنا نماز کو باطل کر دیتا ہے اس کا سہواً کرنا اسی حکم میں ہے۔

چہارم یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم دو رکعت کے بعد بجائے بیٹھنے کے کھڑے ہو گئے حتی کہ جب آپ نماز پوری کر چکے تو سلام پھیرنے سے پہلے آپ نے دو سجدے کر لئے، قعدہ کے اندر تشہد کا نہ پڑھنا بھی اسی حکم میں ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جب امام دو رکعت میں کھڑا ہو جائے پس اگر سیدھا کھڑے ہونے سے پیشتر اس کو یاد آجائے تو بیٹھ جائے اور اگر سیدھا کھڑا ہو جائے تو نہ بیٹھے اور سہو کے دو سجدے کر لے۔

میں کہتا ہوں کہ اس کا سبب یہ ہے کہ جب وہ کھڑا ہو گیا تو قعدہ فوت ہو گیا پس اگر وہ لوٹ آئے تو میں اس کے بطلان نماز کا حکم نہیں دیتا اور حدیث میں اس امر پر دلیل ہے کہ جو سیدھا ہونے کے قریب ہوا اور ہنوز سیدھا کھڑا نہ ہوا ہو تو وہ بیٹھ جائے اور یہ عام فقہا کے خلاف ہے۔

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کے لئے جو ایسی آیت پڑھے جس میں سجدہ کا حکم ہے یا سجدہ کرنے والے کے ثواب اور اس کے منکر کے عذاب کا بیان ہے یہ حکم فرمایا کہ اپنے رب کے

کلام کی تعظیم کے لئے اور خیر کی طرف سرعت کرنے کے لئے سجدہ کرے، اور جن مواضع میں ملائکہ کو حضرت آدم علیہ السلام کے لئے سجدہ کرنے کا حکم ہے وہ ان میں سے نہیں ہے کیونکہ کلام اللہ تعالیٰ کے لئے سجدہ کرنے میں ہے، اور جن آیات میں نص سے سجدہ کرنا ثابت ہے وہ چودہ یا پندرہ آیات ہیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے منبر پر چڑھ کر یہ بیان کیا کہ یہ سجدے مستحب ہیں اور واجب نہیں ہیں پس سامعین میں سے کسی نے اس کا انکار نہیں کیا بلکہ سب نے ان کا قول تسلیم کرلیا۔

اور اس حدیث کی تاویل کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۂ نجم میں سجدہ کیا اور آپ کے ساتھ تمام مسلمان اور مشرکین اور جن اور انس نے سجدہ کیا، میرے نزدیک یہ ہے کہ اس وقت میں حق خوب ظاہر اور روشن ہوگیا تھا پس کسی کو سوائے نیازمندی اور تابعداری کے کچھ چارہ نہ تھا پس جب وہ اپنی اپنی طبیعت کی طرف آئے تو جو کافر تھا وہ کافر ہوگیا اور جو مسلمان تھا وہ مسلمان رہا۔

اور ایک بوڑھے قریشی (۱) نے اس رحمت عامہ کو اس وجہ سے قبول نہیں کیا کہ اس کے دل پر مضبوط مہر لگی ہوئی تھی اور بجائے سجدہ کرنے کے مٹی اٹھا کر پیشانی تک لے گیا پس اس کو جلدی یہ سزا ملی کہ جنگ بدر میں مارا گیا، اور سجدہ تلاوت کے اذکار میں سے یہ ہے: **سجد وجھی للذی خلقه وشق سمعه وبصره بحوله وقوته.**

اور ازاں جملہ یہ ہے: **اللھم اکتب لی بھا عندک اجراً وضع بھا عنی وزرا واجعلھا لی عندک ذخرا وتقبلھا منی کما تقبلتھا من عبدک داؤد.**

نوافل کا بیان

جبکہ اس رحمت کا جس کا شرائع کے اندر لحاظ رکھا گیا ہے مقتضی یہ ہے کہ لوگوں کے لئے ضروری چیزیں بیان کردی جائیں اور وہ چیزیں بھی بتلادی جائیں جن سے طاعت کا پورا پورا فائدہ ان کو حاصل ہوسکے تاکہ ہر شخص اپنا حصہ حاصل کرسکے اور جو شخص دنیوی کاروبار میں مصروف رہتا ہے وہ ضروری باتوں کو اپنے ذمہ لازم کرلے اور جو شخص دنیوی کاروبار سے فارغ ہے اور اپنے نفس کی اصلاح اور آخرت کی اصلاح چاہتا ہے وہ کامل طور سے ان عبادات کو ادا کرے اس واسطے عنایت تشریعیہ اس طرف متوجہ ہوئی کہ ان کے لئے نفل نمازیں اور ان کے اوقات کی پابندی ان

---

(۱) ابوجہل

اسباب اور اوقات کے ساتھ بیان کردی جائے جو ان نمازوں کے مناسب ہے اور لوگوں کو ان پر ابھارا جائے اور ان کی ترغیب دی جائے اور ان کے فوائد بیان کئے جائیں اور اس نفل نماز کی بھی اجمالاً ترغیب دی جائے جس کے لئے کوئی وقت مقرر نہیں، مگر جبکہ کوئی مانع موجود ہو جیسے وہ اوقات جن میں نماز کا پڑھنا منع ہے، پس من جملہ ان نوافل کے وہ نوافل ہیں جو فرائض کے ساتھ پڑھی جاتی ہیں، اور ان میں اصل یہ ہے کہ اشغال دنیویہ چونکہ ذکر الٰہی کو بھلاتے ہیں اور اذکار کے اندر تدبر کرنے سے اور عبادات کا ثمرہ حاصل کرنے سے روکتے ہیں کیونکہ ان اشغال سے ہیئت بہیمیہ کا جماؤ سخت دلی اور ملکیت کے لئے دباؤ پیدا ہوتا ہے لہٰذا ضروری ہوا کہ ان کے لئے کدورت صاف کرنے والی شئے مشروع ہو جس کو فرائض سے پہلے عمل میں لائیں تاکہ فرائض کے اندر ایسے وقت میں شروع پایا جائے جبکہ قلب اشغال سے خالی ہو اور جمع خاطر ہو، اور بسا اوقات انسان نماز پڑھتا ہے اور اس کو پورا فائدہ حاصل نہیں ہوتا چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول میں اسی طرف اشارہ ہے ''بہت سے نمازیوں کو ان کی نماز سے صرف نصف، تہائی، چوتھائی ثواب ملتا ہے''۔ پس ضروری ہوا کہ فرائض کے بعد مقصود کی تکمیل کے لئے اور نماز مقرر کی جائے، اور ان سب سنن میں موکدہ دس یا بارہ رکعات ہیں جو اوقات پنج گانہ پر منقسم ہیں اور یہ اس لئے کہ جس قدر اصلی رکعات ہیں اسی قدر زیادہ کرنا مقصود ہوا اور وہ گیارہ رکعات ہیں لیکن وہ شفع ہیں، پس دو عددوں میں سے ایک عدد اختیار کرلیا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس نے بارہ رکعت رات دن میں پڑھیں اس کے لئے جنت میں گھر بنایا گیا''۔

میں کہتا ہوں اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس نے اپنے لئے رحمت کا ایک بہت بڑا حصہ حاصل کرلیا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''صبح کی دو رکعتیں دنیا و مافیہا سے بہتر ہیں''۔

میں کہتا ہوں کہ دو رکعتوں کے بہتر ہونے کا سبب یہ ہے کہ دنیا فانی ہے اور اس کی نعمتیں رنج و مصیبت کی کدورتوں سے خالی نہیں ہیں اور ان دو رکعتوں کا ثواب ایسا باقی ہے جو مکدر نہیں ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس نے جماعت سے صبح کی نماز پڑھی پھر طلوع آفتاب

تک بیٹھا ذکر الٰہی کرتا رہا پھر دو رکعت پڑھی تو اس کو حج اور عمرہ کے برابر ثواب ملے گا''۔

میں کہتا ہوں یہ وہ اعتکاف ہے جو ہر دن کے لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مسنون فرمایا ہے اور اعتکاف کے فوائد پہلے بیان ہو چکے ہیں، ظہر سے پہلے چار رکعت کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''ان کے لئے آسمان کے دروازے کھولے جاتے ہیں'' اور آپ نے فرمایا ''وہ ایسی ساعت ہے جس میں آسمان کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں پس میں چاہتا ہوں میرے نیک عمل آسمانوں میں چڑھیں'' اور آپ نے فرمایا ''ہر چیز اس وقت تسبیح کرتی ہے''۔

میں کہتا ہوں ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ اس ذات کی قسم جو وقت کی قید سے پاک ہے خاص خاص اوقات میں تجلیات ہوتی ہیں اور بعض اوقات میں تمام عالم میں روحانیت پھیلتی ہے پس اس فصل کی طرف رجوع کیجئے۔

اور جمعہ کے بعد اس شخص کے لئے جو مسجد میں پڑھے چار رکعتیں اور اس شخص کے لئے جو گھر میں پڑھے دو رکعتیں اس لئے مسنون ہیں کہ مجمع عام میں جمعہ کی نماز کے ہی وقت میں اور اس کی جگہ میں جمعہ کی نماز کے مثل کوئی اور نماز نہ پائی جائے کیونکہ اس سے عوام کو جماعت سے اعراض کا گمان اور اسی طرح کے اوہام پیدا ہوتے ہیں اسی لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا کہ کوئی نماز دوسری نماز کے ساتھ نہ ملائی جائے جب تک کہ کلام نہ کر لے یا باہر نہ آ جائے اور عصر سے پہلے چار رکعتیں اور مغرب کے بعد چھ رکعتیں مروی ہیں اور فجر کے بعد کوئی سنت نہیں ہے کیونکہ اس وقت نماز کی جگہ اشراق کی نماز تک بیٹھنا مسنون ہے پس اس سے مقصود حاصل ہو گیا، اور یہ بات بھی ہے کہ اس کے بعد نماز پڑھنے سے مجوس کے ساتھ مشابہت کا دروازہ کھلتا ہے اور اسی مشابہت کی وجہ سے عصر کے بعد بھی کوئی نماز مسنون نہ ہوئی اور از اں جملہ رات کے نوافل ہیں۔

واضح ہو کہ رات کا اخیر وقت ایسا ہوتا ہے جس میں تمام اشغال مشوشہ سے قلب کو صفائی اور دل کو جمعیت ہوتی ہے اور شور وغل سے خموشی ہوتی ہے اور لوگ سوتے ہوتے ہیں اور اس وقت میں ریاکاری اور سمعہ نہیں ہوتا اور نماز کے لئے بہترین وقت وہ ہے جس میں قلب کو فراغت ہو اور دل اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ''رات کو اس وقت نماز پڑھو کہ لوگ سوتے ہوں اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے'' بے شک رات کا اٹھنا نفس بہیمی کو سخت پامال کرتا ہے اور

اس وقت ذکر بھی خوب درست ہوتا ہے بے شک دن کے وقت تمہیں اور بہت سے شغل ہوتے ہیں''۔ اور یہ بھی ہے کہ وہ وقت نزول رحمت کا وقت ہوتا ہے اور اس وقت میں رب کو بندے سے نہایت قرب ہوتا ہے جیسا کہ ہم اس کو پہلے بیان کر چکے ہیں۔

اور یہ بھی ہے کہ اس وقت کی بیداری میں قوت بہیمیہ کے ضعیف کرنے کے لئے ایک عجیب خاصیت ہے اور وہ بہ منزلہ تریاق کے ہے اور اسی لئے تمام لوگوں کا دستور ہے کہ جب وہ درندوں کو تابع کرنا چاہتے ہیں اور ان کو شکار کی تعلیم دینا چاہتے ہیں تو وہ بغیر نیند سے باز رکھے اور بغیر بھوکا رکھے نہیں کر سکتے چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' بے شک اس جاگنے میں مشقت اور گرانی ہے'' الحدیث، اس واسطے تہجد کی نماز کی طرف شارع کو بہت اہتمام ہوا، پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے فضائل بیان فرمائے اور اس کے آداب واذ کار منضبط کر دیئے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' تم میں سے جب کوئی شخص سوتا ہے تو شیطان اس کی گردن پر تین گرہیں لگا دیتا ہے''۔ الحدیث

میں کہتا ہوں شیطان اس کے دل میں نیند کی لذت ڈالتا ہے اور اس کے دل میں یہ وسوسہ ڈالتا ہے کہ ابھی رات بڑی ہے اور اس کا یہ وسوسہ بہت مضبوط ہوتا ہے اور بغیر ایسی تدبیر بلیغ کے جس سے نیند دفع ہو اور جس سے خدا کی طرف توجہ کا دروازہ کھلے وہ وسوسہ دور نہیں ہوتا اس واسطے یہ بات مسنون کی گئی کہ جب خواب سے بیدار ہو اور آنکھیں ملے تو ذکر الٰہی کرے اور اس کے بعد وضو کرے اور مسواک کرے پھر ہلکی سی دو رکعت پڑھے بعد ازاں آداب واذ کار سے جس قدر چاہے پڑھتا رہے، اور میں نے ان تین گرہوں کا تجربہ کیا ہے اور ان گرہوں کے لگنے کو اور ان کی تاثیر کو دیکھا ہے اس کے ساتھ ساتھ میں اس وقت یہ جانتا تھا کہ وہ شیطان کی طرف سے ہے اور اس وقت مجھ کو یہ حدیث بھی یاد تھی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' دنیا میں بہت سی پہننے والیاں یعنی طرح طرح کے لباس پہننے والیاں آخرت میں ننگی ہوں گی''۔ یعنی فضائل نفسانیہ کے خالی ہونے کے سبب سے ان کو پوری جزا ملے گی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جبکہ آپ رات کو تہجد کے لئے بیدار ہوئے'' دیکھو آج کی رات آسمان سے کیسے کیسے خزانے اتارے گئے''۔ الحدیث،

میں کہتا ہوں یہ اس بات پر صریح دلیل ہے کہ معانی متشکل ہوتے ہیں اور اپنے وجود حسی سے پیشتر زمین کی طرف نازل ہوتے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' اللہ تبارک وتعالیٰ

آسمان دنیا کی طرف نازل ہوتا ہے''الحدیث،

علما کہتے ہیں کہ اس حدیث سے یہ مراد ہے کہ آوازوں کے سکون کی وجہ سے جو حضور قلب میں خلل انداز ہوتی ہیں اور مشاغل مشوشہ سے دل کے صاف ہونے اور ریا کا احتمال نہ ہونے کے سبب سے اس وقت نفوس طلب نزول رحمت کے لئے آمادہ ہو جاتے ہیں، اور میرے نزدیک اس کے ساتھ ایک اور چیز کی طرف بھی اشارہ ہے جو قلب کے اندر پیدا ہوتی ہے جس کو نزول کے ساتھ تعبیر کیا جا سکتا ہے اور اس کی طرف کسی قدر ہم نے اشارہ بھی کر دیا ہے انہیں دو اسرار کی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اخیر شب میں اللہ تعالیٰ بندہ سے نہایت ہی قریب ہوتا ہے'' اور آپ نے فرمایا ''بے شک رات میں ایک ایسی ساعت آتی ہے کہ اس وقت بندہ جو کچھ بھلائی اللہ تعالیٰ سے مانگتا ہے وہ اس کو عطا کرتا ہے''۔ اور آپ نے فرمایا ''شب میں اٹھنے کا التزام کرو کیونکہ یہ صالحین کی عادت ہے جو تم سے پہلے تھے اور وہ تمہارے لئے تمہارے رب کی جانب قربت ہے اور وہ تمہاری برائیوں کا دور کرنے والا اور گناہ سے روکنے والا ہے۔

گناہوں کے دور کرنے اور ان سے باز رکھنے وغیرہ کے اسرار ہم بیان کر چکے ہیں وہاں ان کو دیکھنا چاہئے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو شخص اپنے بستر پر باوضو آئے اور ذکر الٰہی کرتے کرتے سو جائے تو رات کی جس ساعت میں کروٹ لیتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے دنیا اور آخرت کی کسی بھلائی کو مانگے گا اللہ تعالیٰ اس کو عطا فرمائے گا''۔

میں کہتا ہوں اس کے یہ معنی ہیں کہ جو شخص احسان کی حالت پر جو تشبہ بالملکوت اور باری تعالیٰ کی کبریائی پر تنبہ کو جامع ہے، سوئے گا تو تمام رات اسی حالت پر رہے گا اور اس کا نفس عباد مقربین کے زمرہ میں ہو کر خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ رہے گا، اور تہجد میں مسنون یہ ہے کہ جب خواب سے بیدار ہو تو وضو کرنے سے پہلے ذکر الٰہی کرے اور وہ ذکر الٰہی کئی طرح سے مروی ہے، ازآن جملہ یہ ہے: اللھم لک الحمد انت قیم السمٰوات والارض ومن فیھن ولک الحمد انت نور السمٰوات والارض ومن فیھن، ولک الحمد انت ملک السمٰوات والارض ومن فیھن ولک الحمد انت الحق ووعدک الحق ولقاؤک حق وقولک حق والجنۃ حق والنار حق والنبیون حق ومحمد حق

والساعة حق اللهم لک اسلمت وبک اٰمنت وعلیک توکلت والیک انبت وبک خاصمت و الیک حاکمت فاغفرلی ما قدمت وما اخرت وما اسررت وما اعلنت وما انت اعلم به منی انت المقدم وانت المؤخر لا اله الا انت ولا اله غیرک۔

اورازآں جملہ یہ ہے کہ الله کبر دس باراور الحمد لله دس بار کہےاور سبحان الله وبحمده دس بار کہےاور سبحان الملک القدوس دس بار کہےاور استغفر الله دس باراور لا اله الا الله دس بار کہےاس کے بعد دس بار یہ پڑھے۔ اللهم انی اعوذبک من ضیق الدنیا وضیق یوم القیٰمة. اورازآں جملہ یہ ہے: لا اله الا انت سبحانک اللهم وبحمدک استغفرک لذنبی واسألک رحمتک اللهم زدنی علما ولا تزغ قلبی بعد هدیتنی وهب لی من لدنک رحمة انک انت الوهاب.

اورازآں جملہ یہ ہے کہ یہ آیت پڑھے: ان فی خلق السمٰوات والارض واختلاف اللیل والنهار لأیات لاولی الالباب، اخیر سورۃ تک اس کے بعد مسواک کرے اور وضو کرےاور وتر سمیت گیارہ یا تیرہ رکعتیں پڑھے۔

نماز تہجد کے آداب

اور نماز تہجد کے آداب میں سے یہ ہے کہ ان اذکار پر مداومت کرے جن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارکان نماز میں مسنون کیا ہے اور دو رکعت پر سلام پھیرے پھر دونوں ہاتھ اٹھا کر یارب یارب کہےاور خوب دعا مانگے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعا میں یہ کہتے تھے: اللهم اجعل فی قلبی نوراً و فی بصری نوراً وفی سمعی نوراً وعن یمینی نوراً وعن یساری نوراً وفوقی نوراً وتحتی نوراً وامامی نوراً وخلفی نوراً واجعل لی نوراً.

اور اس نماز تہجد کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی طریقوں سے پڑھا ہے اور سب طریقے مسنون ہیں، اور اصل یہ ہے کہ شب کی نماز وتر ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کے یہی معنی ہیں۔ ''تحقیق اللہ تعالیٰ نے تمہاری ایک نماز کے ساتھ مدد کی ہے اور وہ وتر ہے پس اس کو عشا سے فجر تک کے درمیان پڑھ لیا کرو'' اور اس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے طاق اس واسطے مقرر کیا ہے

کہ طاق مبارک عدد ہے چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اللہ تعالیٰ طاق ہے طاق کو پسند کرتا ہے اس واسطے اے اہل قرآن تم نماز طاق پڑھا کرو'' لیکن جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ نماز تہجد کے لئے اٹھنے میں مشقت ہوتی ہے اور اس کی برداشت وہی کر سکتا ہے جس کو خدا تعالیٰ نے توفیق عطا کی ہو اس لئے اس کو تمام امت پر لازم نہیں کیا اور اول رات میں وتر پڑھنے کی اجازت دی اور تاخیر سے پڑھنے کی رغبت دلائی، چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس کو یہ خوف ہو کہ اخیر شب میں نہ اٹھ سکے گا تو اوّل شب میں وتر پڑھ لے اور جس کو اخیر شب میں پڑھنے کی امید ہو تو وہ اخیر شب میں وتر پڑھے کیونکہ شب کی نماز پر ملائکہ حاضر ہوتے ہیں اور وہ افضل ہے''۔

اور حق یہ ہے کہ وتر سنت ہیں اور وہ سب سنتوں سے زیادہ موکد ہیں، حضرت علی، ابن عمر اور عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہم نے اس کو بیان کیا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''خدا تعالیٰ نے تم کو ایک ایسی نماز زیادہ دی جو تمہارے لئے سرخ اونٹوں سے بہتر ہے''۔

میں کہتا ہوں یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر نماز کی وہ مقدار فرض کی ہے جس کو وہ ادا کر سکیں پس اولا ان پر گیارہ رکعتیں فرض کیں بعد از اں حضر کے اندر باقی رکعات سے ان کو پورا کر دیا پھر محسنین کے لئے ان کو وتر کے ساتھ اور بڑھا دیا کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس بات کو جانتے تھے کہ جو لوگ احسان کے درجہ کی استعداد رکھتے ہیں وہ زائد مقدار کے حاجت مند ہیں اس واسطے اصل نماز کے برابر گیارہ رکعتیں زیادہ کر دیں اسی وجہ سے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اعرابی سے کہا تھا کہ تیرے لئے اور تیرے ساتھیوں کے لئے یہ نہیں ہیں اور وتر کے اذکار میں سے وہ کلمات ہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حسن بن علی رضی اللہ عنہما کو تعلیم فرمائے پس آپ قنوت وتر میں یہ پڑھا کرتے تھے: اللھم اھدنی فیمن ھدیت وعافنی فیمن عافیت وتولنی فیمن تولیت وبارک لی فیما اعطیت وقنی شر ما قضیت فانک تقضی ولا یقضی علیک انہ لایذل من والیت ولا یعز من عادیت تبارکت ربنا وتعالیت،

اوران اذکار میں سے یہ ہے جس کو آپ آخر میں پڑھتے: اللھم انی اعوذ برضاک من سخطک و اعوذ بمعافاتک من عقوبتک واعوذبک منک لا احصی

ثناءً ا علیک انت کما اثنیت علی نفسک.

اوران اذکار میں سے یہ ہے جس کو آپ سلام پھیرنے کے بعد پڑھتے تھے: سبحان الملک القدوس تین بار، تیسری مرتبہ میں آپ باآواز بلند کہتے تھے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب وتر کی تین رکعت پڑھتے تھے تو پہلی رکعت میں سورہ سبح اسم ربک الاعلیٰ اور دوسری رکعت میں سورہ قل یا ایھا الکفرون اور تیسری رکعت میں سورہ قل ھو اللہ احمد اور سورہ قل اعوذ برب الفلق اور سورہ قل اعوذ برب الناس پڑھتے تھے۔

اوران نوافل میں سے ماہ رمضان میں نماز تراویح کا قیام ہے اور اس کے مشروع ہونے میں یہ راز ہے کہ رمضان سے شارع کا مقصود یہ ہے کہ مسلمان ملائکہ کے ساتھ ملحق ہو جائیں اور اوصاف میں ان کے مشابہ ہو جائیں پس اس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دو درجوں میں کردیا ایک درجہ عوام کا ہے اور وہ رمضان کے روزے رکھنا اور فرائض پر اکتفا کرنا ہے اور دوسرا درجہ محسنین کا ہے اور وہ رمضان کے روزہ رکھنا، راتوں میں عبادت کرنا اور اعتکاف کے ساتھ زبان کو بچانا اور عشرہ اخیرہ میں نہایت آمادگی ظاہر کرنا ہے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم جانتے تھے کہ تمام امت اس درجہ علیا پر قائم نہ ہو سکے گی اور یہ ضروری تھا کہ ہر شخص اپنی طاقت کے موافق عمل کرے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس کام کو تم نے ہمیشہ کیا میں اس کو دیکھتا رہا ہوں یہاں تک کہ مجھ کو خوف ہوا کہ کہیں تم پر فرض نہ ہو جائے اور اگر فرض ہو جاتا تو تم سے نہ ہو سکتا''۔

واضح ہو کہ عبادات کی توقیت بندوں پر اسی قدر ہوتی ہے جس سے ان کے دل مطمئن رہیں اس واسطے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خوف پیدا ہوا کہ کہیں اوائل امت اس کی عادی نہ ہو جائے پس اس سے ان کے دل مطمئن ہو جائیں اور عبادات میں کمی کرنے سے اپنے دل میں طاعت الٰہی میں کوتاہی سمجھیں یا وہ عبادت شعائر دین میں داخل ہو جائے اور ان پر فرض ہو جائے اور اس کے متعلق قرآن نازل ہو جائے پھر خیر امت پر وہ ناقابل برداشت ہو جائے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم خائف نہ ہوئے یہاں تک کہ آپ نے فراست سے یہ معلوم کر لیا کہ رحمت تشریعیہ ان کو ملائکہ کے مشابہ بنانا چاہتی ہے اور یہ کہ کچھ بعید نہیں ہے کہ ان میں ذرا سی تشہیر ہے اور ان کے مطمئن ہو جانے سے اور التزام کرنے سے قرآن نازل ہو جائے اور اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ

وسلم کی فراست کو سچ کر دکھایا کہ آپ کے بعد مومنین کے دلوں میں اس پر التزام کرنے کا الہام کر دیا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس شخص نے ایمان کے ساتھ اور ثواب کی نیت سے رمضان کے اندر قیام کیا تو اس کے سب پہلے گناہ بخشے گئے'' اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے اس درجہ کو حاصل کر کے اپنے نفس کو ان برکات الٰہیہ کا مورد بنالیا جو ظہور ملکیت اور گناہوں کے مٹنے کا باعث ہیں، صحابہ اور تابعین نے قیام رمضان میں تین چیزیں اور زیادہ کی ہیں، اوّل مساجد میں اس قیام کے لئے جمع ہونا تاکہ ہر خاص و عام کو آسان ہو جائے، دوم اوّل شب میں ادا کرنا باوجودیکہ سب لوگ کہتے ہیں کہ اخیر شب کی نماز میں فرشتے حاضر ہوتے ہیں اور وہ افضل ہے جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی آسانی پر جس کی طرف ہم اشارہ کر چکے ہیں متنبہ کیا ہے، سوم بیس رکعت کے ساتھ اس کی تعداد مقرر کرنا، اور اس کی وجہ یہ ہوئی کہ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ نے محسنین کے لئے تمام سال میں گیارہ رکعتیں مقرر کی ہیں پس اس پر انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ رمضان کے اندر مسلمان کا حصہ جبکہ وہ تشبہ بالملکوت کے سمندر میں داخل ہونے کا قصد کرے گیارہ رکعت کے دوچند سے کم نہیں ہونا چاہئے۔

اور ان نوافل میں سے چاشت کی نماز ہے اور اس میں یہ راز ہے کہ حکمت الٰہیہ کا مقتضی ہوا کہ دن کے چاروں حصوں میں سے کوئی حصہ نماز سے خالی نہ ہو جو اس کو وہ ذکر الٰہی جو بھول گیا ہے یاد دلا دے کیونکہ چوتھائی حصہ تین ساعت کا ہے اور یہ تین ساعت اس مقدار کی جو دن کے حصوں میں تمام عرب و عجم کے نزدیک مستعمل ہے پہلی کثرت ہے اور اسی لئے چاشت کی نماز ان صالحین کی سنت ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پیشتر تھے اور نیز دن کا اول حصہ روزی تلاش کرنے کا اور معاش میں سعی کرنے کا ہوتا ہے اس واسطے اس وقت میں ایک نماز مسنون کی تاکہ وہ اس غفلت کے زہر کا تریاق ہو جائے جو اس وقت میں نفس پر طاری ہوئی ہے جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بازار میں جانے والے کے لئے **لا الٰہ الا اللہ وحدہ لاشریک لہ** اخیر تک پڑھنا مسنون کیا۔

چاشت کی نماز کے لئے تین درجے ہیں اس کا اقل درجہ دو رکعتیں ہیں اور اس میں یہ بات

حاصل ہوجاتی ہے کہ یہ نماز ان صدقات کا بدلہ ہوجاتی ہے جو بنی آدم پر ہر ہر عضو کے مقابلہ میں واجب ہے اور یہ اس لئے کہ ہر عضو کا اس کی صحت پر جو اس کے مناسب ہے باقی رکھنا خدا تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے جس کے شکریہ میں اللہ تعالیٰ کے لئے حسنات کرکے حمد کرنا واجب ہے اور نماز تمام نیکیوں سے بڑھ کر عبادت ہے جو تمام اعضاء ظاہرہ اور قوی باطنہ سے ادا ہوتی ہے۔

اس کا دوسرا درجہ چار رکعات ہیں اور اس کے متعلق اللہ تعالیٰ کی طرف سے منقول ہے "اے ابن آدم تو اول دن میں میرے لئے چار رکعت ادا کر میں اخیر دن تک تیرے لئے کافی ہوں گا"۔

میں کہتا ہوں اس سے مراد یہ ہے کہ تہذیب نفس کے لئے یہ ایک کامل نصاب ہے اگرچہ اخیر دن تک اس جیسا کوئی اور عمل نہ کرے۔ اور تیسرا درجہ یہ ہے کہ چار رکعت سے زیادہ پڑھنا مثلاً آٹھ رکعات یا بارہ رکعات، اور چاشت کامل کا وقت وہ ہے کہ جب دن چڑھ جائے اور اونٹنیوں کے بچے گرمی کے سبب سے بیٹھ جائیں۔

ان نوافل میں سے نماز استخارہ ہے، اہل جاہلیت کی یہ عادت تھی کہ جب ان کو کوئی حاجت مثلاً سفر یا نکاح یا بیع کی پیش آتی تھی تو وہ تیر ڈالا کرتے تھے پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا کیونکہ وہ ایک بے اصل اور محض اتفاقی چیز ہے اور نیز اس میں اللہ تعالیٰ پر بہتان باندھنا پایا جاتا ہے کیونکہ وہ کہا کرتے تھے کہ مجھ کو میرے رب نے یہ حکم دیا اور مجھ کو میرے رب نے اس سے منع کیا، پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بجائے استخارہ مقرر فرمایا کیونکہ جب انسان اپنے رب سے کسی شئے کے علم کا فیضان چاہتا ہے اور اس امر میں اللہ تعالیٰ کی مرضی کا انکشاف چاہتا ہے اور اس کا دل اس کے دروازہ پر قیام چاہتا ہے تو بلا تاخیر سر الٰہی کا فیضان ہوجاتا ہے، اور نیز استخارہ کے بڑے فوائد میں سے یہ ہے کہ انسان اپنے نفس کی مراد کو فنا کردیتا ہے اور اس کی بہیمیت ملکیت کے تابع ہوجاتی ہے اور وہ اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کے سپرد کردیتا ہے پس جب وہ ایسا کرتا ہے تو اس کی حالت فرشتوں کی سی ہوجاتی ہے جو اللہ تعالیٰ کے الہام کے منتظر رہتے ہیں پس جب ان کو الہام ہوتا ہے تو وہ اس کام میں ارادہ خداوندی کی وجہ سے سعی کرتے ہیں نہ کہ نفسانی ارادہ کی وجہ سے۔

اور میرے نزدیک امور میں کثرت سے استخارہ کرنا ملائکہ کے ساتھ مشابہت حاصل کرنے کے لئے تریاق مجرب ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے استخارہ کے آداب اور دعا کو منضبط کردیا ہے،

پس اولاً دو رکعت نماز مشروع فرمائی اور یہ دعا تعلیم فرمائی: اللھم انی استخیرک بعلمک واستقدرک بقدرتک واسألک من فضلک العظیم فانک تقدر ولا اقدر وتعلم ولا اعلم وانت علام الغیوب اللھم ان کنت تعلم ان ھذا الامر خیر لی فی دینی ومعاشی وعاقبۃ امری، یا آپ نے یہ فرمایا: فی عاجل امری واٰجلہ فاقدرہ لی ویسرہ لی ثم بارک لی فیہ، وان کنت تعلم ان ھذا الامر شر لی فی دینی ومعاشی وعاقبۃ امری، یا یہ فرمایا: فی عاجل امری واٰجلہ فاصرفہ عنی واصرفنی عنہ واقدر لی الخیر حیث کان ثم ارضنی بہ، اور اپنی حاجت کا نام لے۔

ان نوافل میں سے نماز حاجت ہے اور اس میں اصل یہ ہے کہ لوگوں سے مدد چاہنا اور ان سے اپنی حاجت طلب کرنا اس بات کا مظنہ ہے کہ یہ شخص غیر اللہ سے مدد چاہنے کو جائز سمجھتا ہے پس یہ صورت توحید استعانت میں مخل ہے اس واسطے آپ نے لوگوں کے لئے نماز و دعا شروع کی تا کہ ان سے یہ شر دور ہو اور وقوع حاجت حالت احسان میں اس کی موید ہو جائے پس ان کے لئے مسنون یہ ہے کہ اوّل دو رکعت پڑھیں پھر خدا کی ثنا کریں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھیں پھر کہیں: لا الہ الا اللہ الحلیم الکریم سبحان اللہ رب العرش العظیم والحمد للہ رب العالمین اسألک موجبات رحمتک وعزائم مغفرتک والغنیمۃ من کل بر والسلامۃ من کل اثم لاتدع لی ذنباً الا غفرتہ ولا ھما الا فرجتہ ولا حاجۃ ھی لک رضا الا قضیتھا یا ارحم الراحمین،

اور ان نوافل میں سے نماز توبہ ہے اور اس میں مگر پانچ وقتوں میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے، ان پانچ اوقات میں سے تین اوقات میں باقی دو وقتوں کی بہ نسبت بہت سخت ممانعت ہے اور وہ تین وقت یہ ہیں ایک وہ وقت ہے کہ آفتاب برآمد ہوتی کہ بلند ہو جائے، دوسرا وہ وقت ہے کہ بالکل دوپہر ہوتی کہ سورج ڈھل جائے، تیسرا وہ وقت ہے کہ آفتاب قریب الغروب ہوتی کہ بالکل چھپ جائے کیونکہ یہ اوقات مجوس کی نماز کے ہیں اور وہ ایسی قوم ہے جنھوں نے دین کو بدل ڈالا اور اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر آفتاب کی پرستش کرنے لگے اور ان کے اوپر شیطان کا غلبہ ہو گیا، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کا یہی مطلب ہے ”جب آفتاب طلوع

ہوتا ہے"۔ تو شیطان کے دونوں سینگوں کے درمیان طلوع ہوتا ہے اور اس وقت کفار اس کو سجدہ کرتے ہیں لہٰذا ضروری ہوا کہ عبادتوں میں سب سے بڑی عبادت کے اندر باعتبار وقت کے بھی ملت اسلام ملت کفر سے جدا اور ممتاز ہو، ان تین کے علاوہ دو اوقات یہ ہیں: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "صبح کی نماز کے بعد کوئی نماز نہیں ہے یہاں تک کہ آفتاب روشن ہو جائے اور عصر کی نماز کے بعد کوئی نماز نہیں ہے یہاں تک کہ آفتاب غروب ہو جائے"۔

میں کہتا ہوں ان دونوں وقتوں میں نماز پڑھنے سے اس لئے منع فرمایا کہ ان میں نماز پڑھنے سے ان تینوں اوقات ممنوعہ میں نماز پڑھنے کی راہ نکل آتی ہے اور اسی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں وقتوں میں کبھی کبھی نماز پڑھی ہے کیونکہ آپ ان اوقات میں داخل ہونے سے محفوظ تھے اور جمعہ کے روز نصف النہار میں نماز پڑھنا بعض روایات سے مستثنیٰ معلوم ہوتا ہے اور مسجد حرام کے اندر اوقات ثلثہ میں نماز پڑھنے کا جواز اس حدیث سے مستنبط ہے "اے بنی عبد مناف! تم میں سے جو کوئی شخص لوگوں کے امور میں سے طریقہ کو اس امر میں جوان کو اس مرتبہ میں پیش آتا ہے مقرر کر دیں اور عام مسلمانوں کی صورت میں لذات حسیہ وغیرہ حاصل کرنے سے انبیا علیہم السلام کے پاک ہونے کی یہی وجہ ہے پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے تقرب ایمانی کو بلال کی پیش قدمی کی صورت میں دیکھا اور آپ نے احسان میں اپنی ثابت قدمی کو پہچان لیا۔

اور ان نوافل میں سے صلوٰۃ تسبیح ہے، اس کا راز یہ ہے کہ یہ ایک ایسی نماز ہے جس میں ذکر الٰہی کا ایک بہت بڑا حصہ ہے یہ اس کامل نماز کے درجہ میں ہے جس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مع اذکار محسنین کے لئے مقرر فرمایا، پس اس شخص کے لئے جس نے صلوٰۃ کاملہ سے کوئی حصہ نہ پایا یہ نماز اس کے بجائے کافی ہو جاتی ہے اس واسطے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی فضیلت میں دس خصلتیں ارشاد فرمائی ہیں۔

اور ان نوافل میں سے صلوٰۃ آیات ہے جیسا کہ کسوف، خسوف اور تاریکی کی نماز ہے اور اس میں اصل یہ ہے کہ جب خدا تعالیٰ کی نشانیاں ظاہر ہوتی ہیں تو ان کی وجہ سے نفوس مطیع اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہو جاتے ہیں اور ان کو دنیا سے ایک قسم کی جدائی ہو جاتی ہے پس ایمان والے کے لئے یہ وقت بہت غنیمت ہے اس کو چاہئے کہ ایسے وقت میں دعا نماز اور تمام اعمال صالحہ میں کوشش

کرے، اور نیز اس وقت میں اللہ تعالیٰ عالم مثال میں حوادث مقدر کرتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اہل معرفت کو بے چینی سی معلوم ہوتی ہے اور اسی لئے ایسے اوقات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم گھبرا جاتے تھے اور یہ اوقات زمین میں روحانیت کے نزول کے ہوتے ہیں، پس نیک آدمی کے لئے ان اوقات میں اللہ تعالیٰ کی طرف قربت حاصل کرنا بہت مناسب ہے، چنانچہ نعمان بن بشیرؓ کی حدیث میں کسوف کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''پس جب خدا تعالیٰ کی اپنی مخلوق میں سے کسی چیز پر تجلی ہوتی ہے تو وہ چیز اس کے سامنے جھک جاتی ہے''۔ اور نیز کفار لوگ آفتاب و ماہتاب کو سجدہ کرتے ہیں لہٰذا ایمان دار کو لازم ہے کہ جب وہ کوئی علامت ان کے عدم استحقاق عبادت کی دیکھے تو خدا تعالیٰ کی طرف التجا کرے اور اس کو سجدہ کرے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''نہ سورج کو سجدہ کرو اور نہ چاند کو جس اللہ تعالیٰ نے اس کو پیدا کیا ہے اس کو ہی سجدہ کرو'' تاکہ یہ سجدہ کرنا دین کا شعار بن جائے اور منکرین کے لئے جواب مسکت ہو جائے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح حدیث مروی ہے کہ آپ نے اس نماز میں دو قیام اور دو رکوع ان دونوں کو سجدہ پر قیاس کر کے تضرع کے وقت میں کئے ہیں کیونکہ قیام اور رکوع خضوع کے اندر سجدہ کے مانند ہیں لہٰذا ان کی تکرار بھی مناسب ہے، اور حدیث صحیح میں یہ بھی ہے کہ آپ نے اس نماز کو با جماعت پڑھا ہے اور حکم دیا کہ اس بات کی منادی کی جائے: الصلوٰۃ جامعۃ، اور قرآن کو نماز میں پکار کر پڑھا پس جس نے اتباع کیا تو وہ درجہ احسان کو پہنچا اور جس نے وہ نماز پڑھی جو شرع میں معتبر ہے تو اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول پر عمل کیا ''جب تم ایسا حادثہ دیکھو تو تکبیر کہو اور نماز پڑھو اور صدقہ دو''۔

اور ان نوافل میں سے نماز استسقا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے لئے دعا استسقا کئی بار مختلف طور سے کی ہے لیکن وہ طریقہ جس کو امت کے لئے مقرر فرمایا یہ ہے کہ آپ عیدگاہ کی طرف لوگوں کے ساتھ نہایت عجز اور تواضع اور انکساری کے ساتھ تشریف لے گئے اور وہاں جا کر دو رکعت نماز پڑھائی اور ان دو رکعتوں میں جہر کیا بعد ازاں خطبہ پڑھا اور خطبہ میں قبلہ کی طرف منہ کر کے دعا مانگی اور ہاتھ اٹھائے اور اپنی چادر مبارک کو پھیرا اور یہ اس لئے کہ ایک ہی جگہ ایک ہی چیز کی، اصل یہ ہے کہ خدا کی طرف رجوع کرنا بالخصوص گناہ کے بعد پیشتر اس کے کہ

گناہ کا زنگ دل میں جمے، اس سے گناہ کو مٹانے والا اور دور کرنے والا ہے۔

اور ان نوافل میں سے نماز وضو ہے اس کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے فرمایا ''جنت میں، میں نے اپنے سامنے تیری جوتیوں کی آواز سنی''۔

میں کہتا ہوں کہ اس کا راز یہ ہے کہ طہارت پر مداومت کرنا اور اس کے بعد نماز پڑھنا احسان کے درجہ کے لئے ایک کامل نصاب ہے جو اسی سے ہوسکتا ہے جو بڑا بانصیب ہو، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بلالؓ سے کہا ''کس چیز کی وجہ سے تو مجھ سے پہلے جنت میں گیا؟''۔

میں کہتا ہوں اس کا مطلب یہ ہے کہ اس واقعہ میں سبقت کرنا تقدم فی الاحسان کی صورت ہے اور امام المحسنین پر حضرت بلال کی سبقت کرنے میں یہ راز ہے کہ ہر کامل کو احسان کے شعبوں میں سے ہر کمال کے بدلہ میں ایک تقرب حاصل ہوتا ہے جس پر اس کا حال منکشف ہوتا ہے اور جس سے اس کے قلب پر اس کمال کی معرفت کا ذوق ووجدان میں فیضان ہوتا ہے، اس کی نظیر یہ ہے کہ زید جو شاعر محاسب ہے کبھی اس کے ذہن میں یہ بات حاضر ہوتی ہے پس اس وقت حساب سے وہ بالکل غافل ہو جاتا ہے اور کبھی اس کے ذہن میں یہ بات حاضر ہوتی ہے کہ وہ شاعر ہے اور شاعر کا فلاں درجہ اس کو حاصل ہے کہ وہ حساب داں ہے اور اس کی خوشی میں اس قدر غرق ہو جاتا ہے کہ شعر سے بالکل غافل ہو جاتا ہے اور انبیا علیہم السلام ایک عام انسان کے ایمان کے تقرب کو تمام لوگوں سے زیادہ جانتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کو یہ منظور تھا کہ انبیا کو ذوق سلیم سے اس کی حقیقت معلوم ہو جائے تاکہ وہ لوگوں کے لئے ان کے آرزو میں نہایت اہتمام اور گناہوں کی مغفرت طلب کرنے کے ساتھ اور نیک عمل کرنے کے ساتھ مسلمانوں کے اجتماع کو دعا کے قبول ہونے میں بہت بڑا اثر ہے اور بندہ کی تمام حالتوں میں سے اللہ تعالیٰ سے قریب ترین حالت نماز ہے اور ہاتھوں کو اٹھانا نہایت تضرع اور نہایت عاجزی کی علامت ہے، جس سے نفس کو خضوع اور فرماں برداری پر تنبہ ہوتا ہے اور چادر کو لوٹنا ان کے احوال کے بدلنے کی نقل ہے جیسا کہ مستغیث بادشاہوں کے دربار میں کیا کرتے ہیں۔

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم استسقا میں یہ دعا مانگا کرتے تھے: اللهم اسقی عبادک وبهيمتک وانشر رحمتک واحی بلدک المیت، اور یہ دعا بھی پڑھتے تھے، اللھم

اسقنا غيثا مغيثا مريئا مريعا نافعا غير ضار عاجلا غير اجل،

اوران نوافل میں سے نماز عیدین ہیں اوران کا بیان عنقریب آتا ہے اور نوافل سے مناسب سجدہ شکر ہے جبکہ کوئی خوشی حاصل ہو یا کوئی تکلیف دور ہو یا ان دونوں میں سے کسی کا علم ہو، اس واسطے کہ شکر قلب کا فعل ہے اور ظاہر میں اس کے لئے کوئی صورت ضرور ہونی چاہئے تا کہ اس سے قلب کے فعل کو قوت حاصل ہو، اس کے علاوہ نعمتوں کے حاصل ہونے سے کسی قدر تکبر ہو جاتا ہے پس اس کا علاج منعم کے سامنے ذلیل اور عاجز بن کر کرے پس یہ وہ نمازیں ہیں جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کے لئے جو درجہ احسان میں مستعد ہیں، اور آپ کی امت میں سے سابقین ہیں، فرض نماز پر جس کا کرنا ہر خاص وعام پر ضروری ہے زیادہ کر کے مسنون بنایا، پھر نماز ایسی چیز ہے جو بھلائی کے لئے وضع کی گئی ہے پس جو شخص جس قدر اس کی کثرت کر سکتا ہے اس کو کرنا چاہئے کسی امر کا سردار ہو تو وہ کسی کو اس گھر کے طواف سے منع نہ کرے اور نہ نماز سے روکے، رات ودن میں جس وقت چاہے نماز پڑھے، اور اس تقدیر پر اس میں یہ راز ہے کہ جمعہ شعائر دین کے ظاہر ہونے کا وقت ہے اور مسجد حرام شعائر دین کے ظاہر ہونے کی جگہ ہے اس سبب سے یہ دونوں نماز سے مانع کے معارض ہو گئے۔

اعمال کے اندر میانہ روی کا بیان

واضح ہو کہ عبادت کے اندر سب سے بڑا مرض دل کی تنگی ہے کیونکہ جب دل تنگ ہو جاتا ہے تو اس کو خشوع کی کیفیت معلوم نہیں ہوتی اور وہ مشقت عبادت کے معنی سے خالی رہ جاتی ہے اسی لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''ہر چیز کو ایک حرص ہوتی ہے اور ہر حرص کو کمی ہوتی ہے''۔ اور یہی وجہ ہے کہ کسی عمل صالح کے رواج کے مٹ جانے کے وقت اور اس عمل میں لوگوں کے ست ہو جانے کے وقت اس نیکی کے کرنے کا اجر چند در چند ہو جاتا ہے کیونکہ ایسی حالت میں یہ عمل بغیر سخت تنبہ کے اور بغیر مستحکم ارادہ کے ظہور میں نہیں آ سکتا اور اسی لئے شارع نے عبادات کی مقدار مقرر کی ہے جیسے مریض کے حق میں دوا کی مقدار ہوتی ہے جس میں کمی بیشی نہیں کی جاتی۔

اور نیز مقصود صفت احسان کا اس طرح پر حاصل کرنا ہے جس سے تدابیر ضروریہ کا ترک یا حقوق میں سے کسی حق کا تلف نہ لازم آئے، اور اسی لئے حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا۔ تیری آنکھوں کا تجھ پر حق ہے اور تیری بیوی کا تجھ پر حق ہے پس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تصدیق فرمائی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں، قیام بھی کرتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں پس جس نے میری سنت سے اعراض کیا تو وہ میرا نہیں ہے''۔

اور نیز عبادات سے مقصود نفس کا راستی پر لانا اور اس کی کجی کا دور کرنا ہے نہ کہ تمام عبادات کا احاطہ کرنا کیونکہ تمام لوگوں کے حق میں یہ بات دشواری معلوم ہوتی ہے، چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''استقامت اختیار کرو اور تم ہرگز احاطہ نہ کر سکو گے اور جس قدر اعمال کی طاقت رکھتے ہو

اس قدر کرو"۔ اور استقامت ایک مقدار معین سے حاصل ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے لذات ملکیہ سے لذت حاصل کرنے پر اور بہیمیہ کے خسائس سے رنجیدہ ہونے پر نفس کو تنبہ ہو اور جس کی وجہ سے نفس کو بہیمیت کی ملکیت کے لئے تابع ہو جانے کی کیفیت کا ادراک ہو جائے، پس اگر وہ اس کی کثرت کرے گا تو نفس اس کا عادی ہو جائے گا اور اس عبادت کے ثمرہ پر نفس کو تنبہ نہ ہوگا۔

اور نیز تشریع کے اندر مقاصد جلیلہ میں سے یہ بھی ہے کہ دین میں تعمق کا دروازہ بند کر دیا جائے تا کہ لوگ ایک عمل کو اپنے اوپر خوب لازم نہ کرلیں پھر اس کے بعد ایسے لوگ پیدا ہوں جو اس کو عبادات سماویہ میں سے سمجھیں اور اپنے اوپر فرض جانیں بعد ازاں اور لوگ پیدا ہوں پس ان کے نزدیک یہ ظن یقین بن جائے اور جس عبادت کی فضیلت کا احتمال تھا اب ان لوگوں کو اس کی فرضیت پر اطمینان ہی ہو جائے پس اس طرح دین میں تحریف ہو جائے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "درویشی جو انھوں نے اپنی طرف سے ایجاد کی ہے ہم نے ان پر فرض نہیں کی تھی"۔

اور نیز جو شخص اپنے دل میں یہ گمان کرے اگر چہ زبان سے اس کے خلاف کہتا ہو کہ خدا تعالیٰ عبادات شاقہ کے بغیر راضی نہیں ہوتا اور جو شخص ان میں کمی کرتا ہے تو اس میں اس کے نفس کی تہذیب میں ایک حجاب عظیم حائل ہو جاتا ہے اور خدا تعالیٰ کی جناب میں کوتاہی ہوتی ہے تو اس شخص سے اس کے ظن اور اعتقاد کے موافق مواخذہ کیا جائے گا اور اس کے اعتقاد کے موافق اس سے اس کی زیادتی کا مطالبہ ہوگا پس اگر اس میں کمی کرے گا تو اس کے علوم اس کے حق میں مضر اور موجب ظلمت بن جائیں گے، اور اس سستی کی وجہ سے اس کے اعمال مقبول نہ ہوں گے چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "دین آسان ہے اور جو دین میں تشدد اختیار کرے گا تو دین اس پر غالب آجائے گا" پس ان وجوہات کی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت پر ضروری کر دیا کہ وہ عمل میں میانہ روی اختیار کریں اور اس قدر تجاوز نہ کریں جس سے ملال اور دل میں اشتباہ پیدا ہو یا تدابیر ضروریہ متروک ہو جائیں، اور ان امور کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صراحتاً یا اشارۃً بیان فرما دیا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اللہ تعالیٰ کو اعمال میں سب سے زیادہ وہ اعمال پسند ہیں جو ہمیشہ کئے جائیں اگر چہ اس کی مقدار قلیل ہی ہو"۔

میں کہتا ہوں ان اعمال کا زیادہ پسندیدہ ہونا اس لئے ہے کہ ان کو ہمیشہ عمل میں لانا اور ان پر

مواظبت کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ اس کو ان اعمال میں رغبت ہے اور نیز نفس طاعت کا اثر جب ہی قبول کرتا ہے اور اس کے فائدہ سے مستفیض ہوتا ہے کہ ایک مدت گزر جائے اور اس پر مطمئن ہو کر ہمیشہ اس کو عمل میں لایا جائے اور اس کو ایسے اوقات مل جائیں جن میں نفس کو اس قسم کی فراغت اور تخلیہ حاصل ہو جیسے خواب میں ہوتا ہے جس کے سبب سے عالم بالا سے علوم منقش ہو جاتے ہیں اور اس کی مقدار معلوم نہیں ہے کہ نفس کے لئے کتنی مدت درکار ہے اس واسطے اس کے ہونے کا یہی طریقہ ہے کہ وہ کام ہمیشہ اور بکثرت کیا جائے چنانچہ حضرت لقمان علیہ السلام کا قول ہے ''اپنے نفس کو زیادہ استغفار کرنے کا عادی بنا کیونکہ اللہ تعالیٰ کے پاس ایک ایسا وقت ہے جس میں وہ سائل کی درخواست کو رد نہیں کرتا ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' اعمال میں سے اس قدر اختیار کرو جس کی تم طاقت رکھتے ہو پس تحقیق اللہ تعالیٰ ملول نہیں ہوتا یہاں تک کہ تم تنگدل ہو جاؤ''۔ یعنی اللہ تعالیٰ عمل پر ثواب دینا ترک نہیں کرتا مگر جبکہ لوگ عمل کرنے سے تنگدل ہو جائیں پس ترک ثواب کو مشابہت کی وجہ سے ملال کہہ دیا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' جب تم میں سے کوئی شخص سونے کی حالت میں نماز پڑھتا ہے تو اس کو معلوم نہیں رہتا کہ وہ استغفار کی بجائے اپنے حق میں بددعا کر رہا ہے''۔

میں کہتا ہوں کہ آنحضرت کی مراد یہ ہے کہ اس کو بہ سبب شدت ملال کے عبادت اور غیر عبادت میں تمیز نہیں رہتی پس وہ عبادت کی حقیقت کو کیونکر جان سکتا ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے ''پس تم راہ راست اختیار کرو:: یعنی میانہ روی کا طریقہ اختیار کرو جس کی نگرانی ہو سکے اور اس کو ہمیشہ عمل میں لاسکو، وقاربو ایعنی یہ نہ سمجھو کہ تم خدا تعالیٰ سے اس قدر دور ہو کہ بغیر اعمال شاقہ کے نہیں پہنچ سکتے۔ وابشروا، یعنی امید اور سرور حاصل کرتے رہو اور صبح اور شام اور تھوڑی سی آخری شب کے ساتھ مدد حاصل کرو ان اوقات میں رحمت الٰہی نازل ہوتی ہے اور دل کی لوح نفسانی تذکروں سے پاک وصاف ہوتی ہے اور اس کے متعلق ہم ایک فصل بیان کر چکے ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' جو شخص سونے کے سبب سے اپنا وظیفہ یا اس میں سے کچھ حصہ فوت کر دے پھر وہ اس کو نماز فجر اور ظہر کے درمیان میں پڑھ لے تو اس کے لئے اس کا ثواب ایسا ہی لکھا جاتا ہے کہ گویا اس کو رات میں ہی پڑھا تھا''۔

میں کہتا ہوں قضا کے باب میں دو چیزیں سبب اصلی ہیں، ایک یہ ہے کہ نفس عبادت کے ترک کرنے میں بے پرواہ نہ ہو کہ وہ اس کے ترک کا عادی ہو جائے اور بعد میں اس طاعت کی پابندی کرنا اس پر دشوار ہو جائے، دوسرے یہ کہ نفس اس کو کر کے بری الذمہ ہو جائے اور یہ امر دل میں نہ رکھے کہ اس نے خدا تعالیٰ کی جناب میں کوتاہی کی ہے اور خدا تعالیٰ اس کے علم یا بے علمی کی حالت میں اس سے مواخذہ کرے گا۔

معذور لوگوں کی نماز کا بیان

جبکہ شریعت کی تکمیل کے لئے یہ بات ضروری تھی کہ عذر پیش آنے کے وقت لوگوں کے لئے رخصتیں بیان کی جائیں تا کہ مکلفین جس قدر طاقت رکھتے ہوں عبادت ادا کر سکیں اور ان رخصتوں کا اندازہ شارع پر موقوف ہونا چاہئے تا کہ شارع اس میں اعتدال کا لحاظ کر سکے اور لوگوں پر موقوف ہونا نہیں چاہئے کیونکہ وہ ان میں کبھی زیادتی کریں گے اور کبھی کمی کریں گے اس واسطے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رخصتوں اور عذروں کے انضباط کا اہتمام فرمایا، اور رخصتوں کے اصول میں سے یہ بات ہے کہ اصل طاعت کو اس طرح پر دیکھا جائے جس کا کہ حکمت پر حکم دیتی ہے پس ہر حال میں اس کا التزام کیا جائے اور اس کے ان حدود اور ضوابط کو دیکھا جائے جن کو شارع نے اصل نیکی پر عمل کرنے کی آسانی کے لئے مقرر فرمایا ہے، پس ان حدود میں ضرورت کے موافق بعض کو ساقط اور بعض کو بعض سے مبدل کیا جائے۔

پس عذروں میں سے ایک سفر ہے اور اس میں جو حرج ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے، اس واسطے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں چند رخصتیں مشروع فرمائی ہیں، ان رخصتوں میں سے ایک قصر ہے پس رکعات کی اصل تعداد کو جو گیارہ رکعت ہے باقی رکھا اور اطمینان اور قیام کی شرط کے ساتھ جو زائد تھیں ان کو ساقط کر دیا اور چونکہ گیارہ رکعتوں میں عزیمت کا احتمال تھا اس لئے مناسب نہ تھا کہ بقدر ضرورت اندازہ کیا جائے اور رخصت دینے میں زیادہ تنگی کی جائے پس اسی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا کہ آیت میں خوف کی شرط فائدہ بیان کرنے کے لئے ہے اور اس کا کوئی اصلی مفہوم نہیں ہے پس آپ نے فرمایا ''یہ خدا کا صدقہ ہے جو خدا تعالیٰ نے تم کو دیا ہے پس اس کے صدقہ کو قبول کرو'' اور صدقہ میں اہل مروت تنگی نہیں کرتے اسی لئے رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ نماز بالقصر (۱) ہی پڑھی اگر چہ پوری نماز پڑھنا بھی کسی قدر جائز رکھا۔

پس نماز میں قصر کرنا سنت مؤکدہ ہے اور اس روایت میں کہ نماز میں اتمام جائز ہے، اور اس روایت میں کہ ''سفر میں دو رکعتیں پڑھنا پوری نماز ہے قصر نہیں ہے، کوئی اختلاف نہیں ہے کیونکہ ہوسکتا ہے کہ واجب اصلی وہ صرف دو رکعتیں ہوں اور اس کے باوجود پورا پڑھنا بدرجہ اولی کافی ہو جیسے مریض اور غلام جو جمعہ پڑھتے ہیں ان سے ظہر کی نماز ساقط ہو جاتی ہے، یا جیسے وہ شخص جس پر زکوٰۃ میں بنت مخاض (۲) واجب ہو اور وہ اپنا تمام مال صدقہ کر دے اسی لئے اس کا یہ حق ہے کہ جب تک مکلّف پر اسم مسافر کا اطلاق صحیح ہے اس کے لئے قصر جائز ہے یہاں تک کہ اس سے یہ نام بالکل زائل ہو جائے، قصر میں نہ تو حرج کے پائے جانے کا لحاظ رکھا گیا ہے اور نہ ہی پوری نماز پڑھنے پر قدرت نہ ہونے کا لحاظ رکھا گیا ہے کیونکہ دو رکعت ابتدا ہی سے مسافر کے لئے مقرر ہیں اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے اس قول کا یہی مطلب ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر کی نماز میں دو رکعتیں مقرر فرمائیں ہیں اور وہ دونوں پوری نماز ہیں قصر نہیں۔

واضح ہو کہ سفر اور اقامت اور زنا اور چوری اور وہ تمام امور جن پر شارع نے حکم کا مدار رکھا ہے ایسی چیزیں ہیں جن کو اہل عرف ان کے مواقع میں استعمال کرتے ہیں اور ان کے معانی جانتے ہیں لیکن ان کی جامع مانع تعریف جب ہی حاصل ہوسکتی ہے کہ ان میں ایک قسم کا اجتہاد اور تامل کیا جائے، اور طریق اجتہاد کی معرفت ایک دشوار امر ہے پس ہم اس میں سے نمونہ کے طور پر سفر کے اندر بیان کرتے ہیں۔

پس ہم کہتے ہیں، سفر تقسیم اور مثال سے معلوم ہوسکتا ہے، ہر اہل زبان جانتا ہے کہ مکہ سے مدینہ تک جانا اور مدینہ سے خیبر تک جانا ضرور سفر ہے اور صحابہ کے فعل اور ان کے کلام سے بھی ظاہر ہے کہ مکہ سے جدہ تک جانا اور طائف تک جانا اور عسفان تک جانا اور تمام ان مواضع تک جانا جو اڑتالیس میل کے فاصلہ پر ہیں سفر ہے۔

اور یہ بھی جانتے ہیں کہ وطن سے نکلنا کئی طور سے ہوتا ہے، ایک تو اپنی کھیتی اور باغات تک

---

(۱) چار رکعت والی نماز کو دوران سفر دو رکعت پڑھنا۔

(۲) وہ اونٹ کا بچہ جو ایک سال کی مدت مکمل کر کے دوسرے سال میں داخل ہو چکا ہو۔

آمد ورفت کرنا اور ایک بغیر تعیین مقصد اور سفر کے مارا مارا پھرنا۔

اور یہ بھی جانتے ہیں کہ ان میں سے ایک کا نام دوسرے پر نہیں بولا جاتا، اور اجتہاد کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ان مثالوں کو تلاش کیا جائے جن پر ایک نام کا اطلاق ہوتا ہے اور ان اوصاف کی پڑتال کی جائے جن کی وجہ سے ہر ایک اپنے قسیم سے مبائن اور جدا ہے پس جو عام ہو اس کو جنس کی جگہ اور جو خاص ہو اس کو فصل کی جگہ کر دیا جائے اس سے ہم کو یہ معلوم ہو گیا کہ وطن سے منتقل ہونا سفر کا جز ذاتی ہے اس واسطے کہ جو اپنے محل اقامت ہی میں پھرتا رہے اس کو مسافر نہیں کہتے۔

اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ کسی خاص مقام کی طرف جانا بھی سفر کا جز ذاتی ہے ورنہ وہ جانا بدحواسی کا پھرنا سمجھا جائے گا نہ کہ سفر۔

اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اس جگہ کا اتنی دور ہونا کہ وہاں سے اپنے محل اقامت کو اسی روز یا اس روز کی اوّل شب تک واپس نہ آسکے سفر کا جز ذاتی ہے ورنہ وہ اپنے باغ اور کھیت کی طرف آنا جانا سا سمجھا جائے گا۔

اور سفر کے لوازم میں سے یہ ہے کہ وہ پورے ایک دن کی مسافت ہو اور سالم کا یہی قول ہے لیکن اڑتالیس میل کی مسافت یقیناً سفر ہے اور اس سے کم مسافت کو سفر کہنا مشکوک ہے، اور سفر کا اطلاق شہر پناہ سے نکلنے یا گاؤں کی حد یا اس کے مکانات سے نکلنے اور ایسی جگہ جانے کا ارادہ کرنے سے جو اڑتالیس میل کی مسافت پر واقع ہے صحیح ہوتا ہے(۱)، اور کسی شہر یا گاؤں میں کافی اور معتد بہ مدت تک اقامت کی نیت کرنے سے سفر کا نام زائل ہو جاتا ہے۔

اور ان رخصتوں میں سے ظہر وعصر اور مغرب وعشا کا جمع کرنا ہے اور اس میں اصل یہی ہے جس کی طرف ہم اشارہ کر چکے کہ نماز کے اصل اوقات تین ہیں: فجر، ظہر اور مغرب اور عصر کو ظہر سے نکالا گیا ہے اور عشا کو مغرب سے نکالا گیا ہے(۲) تا کہ دو ذکروں کے درمیان زیادہ مدت کا فصل نہ ہو جائے اور تا کہ نیند غفلت کی حالت پر نہ آئے پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کے لئے تقدیم وتاخیر کا جمع کرنا مشروع کر دیا لیکن اس پر آپ نے مداومت نہیں کی اور نہ اس پر ایسا حکم

(۱) اسی مسافرت پر سفر شرعی کا اطلاق ہوتا ہے۔
(۲) یہ حضرت شاہ صاحب کی نادر تحقیق ہے۔ (قاسمی)

فرمایا جیسا آپ نے قصر نماز میں کیا ہے۔

اوران رخصتوں میں سنتوں کا ترک کرنا ہے چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر اور حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم سوائے فجر کی سنتوں اور وتر کے کچھ نہ پڑھتے تھے، اوران رخصتوں میں سے سواری پر نماز پڑھنا ہے جس طرف کو وہ جارہی ہو اسی طرف کو ہی اشارہ سے نماز پڑھ لے لیکن ایسا کرنا نوافل اور سنت فجر اور وتر میں ہے نہ کہ فرائض میں۔اور منجملہ عذروں کے ایک خوف ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز خوف کئی طریقوں سے پڑھی ہے۔

ازاں جملہ یہ ہے کہ قوم کی دو صفیں مرتب کیں اوران کو نماز پڑھائی پس جب آپ نے سجدہ کیا تو آپ کے ساتھ ایک صف نے دونوں سجدے کئے اور دوسری صف نے نگہبانی کی پس جب صف اولی کھڑی ہوئی تو جس صف نے نگہبانی کی تھی اس نے سجدہ کیا اور آپ کے ساتھ نماز میں شریک ہوگئی اور جس صف نے اولاً حفاظت کی تھی اس نے آپ کے ساتھ دوسری رکعت میں سجدہ کیا اور دوسری صف محافظ رہی پس جب آپ بیٹھے تو جو صف نگہبان تھی اس نے بھی سجدہ کیا اور آپ نے دونوں صفوں کے ساتھ تشہد پڑھ کر سلام پھیر دیا اور یہ طریقہ اس وقت میں ہوسکتا ہے جب دشمن قبلہ کی طرف ہو،اور ازاں جملہ یہ ہے کہ دو مرتبہ نماز پڑھائے ایک بار ایک ٹکڑی کو اور دوسری بار دوسری ٹکڑی کو اور یہ اس حالت میں مناسب ہے جب دشمن جہت قبلہ میں نہ ہو اور دونوں رکعت کی تقسیم سے ان کو تشویش ہوتی ہو اور سب کو کیفیت نماز پر احاطہ نہ ہوسکتا ہو۔

ازاں جملہ یہ ہے کہ ایک ٹکڑی دشمن کے روبرو کھڑی ہوگئی اور دوسری ٹکڑی کو آپ نے نماز پڑھادی پس جب آپ دوسری رکعت کے لئے کھڑے ہوئے تو یہ ٹکڑی آپ سے جدا ہوگئی اور اپنی ایک اور رکعت تمام کر کے دشمن کے سامنے چلی گئی اور جو لوگ دشمن کے سامنے کھڑے تھے، آئے اور آپ کی اقتدا کی پس آپ نے ان کو دوسری رکعت پڑھائی پھر جب آپ تشہد کے لئے بیٹھے تو یہ لوگ کھڑے ہوگئے،اور اپنی دوسری رکعت تمام کر کے آپ کے ساتھ مل گئے اور آپ نے ان کے ساتھ سلام پھیرا، اور یہ حالت اس وقت کے مناسب ہے کہ جب دشمن قبلہ کی جانب نہ ہو اور دونوں رکعتوں کی تقسیم کرنے سے ان کو تشویش نہ ہو۔

ازاں جملہ یہ ہے کہ آپ نے ایک گروہ کو نماز پڑھائی اور ایک گروہ دشمن کے سامنے کھڑا رہا

پس ان کے ساتھ ایک رکعت پڑھی پھر یہ لوگ اس گروہ کی جگہ چلے گئے جنھوں نے ہنوز نماز نہیں پڑھی تھی اور وہ لوگ آئے پس ان کے ساتھ ایک رکعت پڑھی پھر دونوں نے اپنی اپنی نماز پوری کر لی

ازاں جملہ یہ ہے کہ جس شخص کو جس طرح ممکن ہو سوار ہو یا پیدل، قبلہ کی طرف ہو یا غیر قبلہ کی طرف نماز پڑھ لے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اس طریقہ کی روایت کی ہے اور یہ اس وقت مناسب ہے جب خوف زیادہ ہو یا لڑائی گرم ہو، حاصل کلام یہ ہے کہ جو طریق نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے وہ جائز ہے اور آدمی کو وہ طریقہ عمل میں لانا چاہئے جو اس پر آسان ہو اور اس وقت کی مصلحت کے مناسب ہو۔

اور منجملہ اعذار کے ایک مرض ہے اور اس کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''کھڑے ہو کر نماز پڑھ اگر تجھ سے یہ نہ ہو سکے تو بیٹھ کر پڑھ پس اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو کروٹ سے لیٹ کر پڑھ''۔ اور نفل کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو شخص کھڑے ہو کر نماز پڑھے تو یہ افضل ہے اور جو بیٹھ کر پڑھے تو اس کو کھڑے ہونے والے سے نصف اجر ملے گا''۔

میں کہتا ہوں جبکہ نماز اس قابل ہے کہ اس کی کثرت کی جائے اور اصل نماز کھڑے ہو کر اور بیٹھ کر ادا ہو سکتی ہے جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں اور قیام محض تشریع کے وقت واجب ہے اور جو چیز پوری حاصل نہ ہو سکے تو وہ تمام کی تمام متروک بھی نہ ہو اس واسطے رحمت کا یہ مقتضی ہوا کہ لوگوں کے لئے نفل نماز بیٹھ کر جائز کر دی جائے اور دونوں درجوں میں جو فرق ہے وہ ان کے لئے بیان کر دیا گیا، نماز طالب، نماز بارش اور نماز کیچڑ کا بیان حدیث شریف میں آیا ہے اور کبھی کسی صحابی نے ضوابط اور حدود کے اندر کسی ایسی ضرورت کے سبب سے جس سے آدمی مجبور ہو رخصت نہیں مانگی مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو تسلیم فرمایا بشرطیکہ وہ رخصت انکار اور سستی کی بنا پر نہ ہو اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ''جب میں تم کو کوئی حکم دوں تو حتی المقدور اس کو عمل میں لاؤ'' ایک کلمہ جامعہ ہے، واللہ اعلم۔

جماعت کا بیان

واضح ہو کہ رسوم کی خرابی دور کرنے میں اس سے بہتر کوئی چیز نہیں کہ ایک عبادت کو عام رسم بنایا جائے جس کو ہر خبردار اور بے خبر کے سامنے ادا کیا جائے اور تمام شہری اور دیہاتی اس میں برابر

ہوں اور اس عبادت کے اندر فخر اور عزت جتانے کا موقع ہو یہاں تک کہ وہ عبادت ان تدابیر ضروریہ میں داخل ہو جائے جن کو نہ وہ ترک کر سکتے ہیں اور نہ ان میں تاخیر کر سکتے ہیں تا کہ وہ رسم عبادت الٰہی کے لئے مؤید ہو جائے اور زبان ہو جائے جو لوگوں کو حق کی طرف بلائے اور جس سے ان کو ضرر کا خوف تھا وہ ایسی چیز ہو جائے جو ان کو حق کی طرف کھینچ کر لائے، اور تمام عبادتوں میں کوئی عبادت نماز سے زیادہ عظیم الشان اور قوی البرہان نہیں ہے اس واسطے لوگوں میں اس کی اشاعت اور اس کے لئے اجتماع اور اس میں لوگوں کی موافقت ضروری ہوئی اور نیز ہر ملت میں کئی طرح کے لوگ پائے جاتے ہیں علما ہوتے ہیں جن کی پیروی کی جاتی ہے اور ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو نیکی حاصل کرنے میں رغبت کے ساتھ کہنے کے محتاج ہوتے ہیں اور کچھ لوگ ضعیف الفطرت ہوتے ہیں اگر ان کو سب لوگوں کے سامنے عبادت ادا کرنے کا حکم نہ دیا جائے تو وہ عبادت میں سستی کرنے لگیں اس واسطے ان سب کے حق میں کوئی چیز اس سے زیادہ نافع اور زیادہ تر مصلحت کے موافق نہیں ہے کہ ان سب لوگوں کے روبرو عبادت الٰہی کرنے کا حکم دیا جائے تا کہ تمیز ہو جائے کہ کون اس عبادت کو کرتا ہے اور کون نہیں کرتا اور کون اس میں رغبت کرتا ہے اور کون بے رغبتی کرتا ہے اور عالم کی اقتدا کی جائے اور جاہل کو تعلیم دی جائے۔

اور اللہ تعالیٰ کی طاعت لوگوں کے حق میں بہ منزلہ بھٹی کے ہے جس کو لوگوں پر پیش کیا جاتا ہے جس سے برا اور بھلا معلوم ہو جاتا ہے اور کھرا اور کھوٹا پرکھا جاتا ہے، اور نیز مسلمانوں کے اجتماع کو جس میں خدا کی طرف رغبت کرنے والے اور اس سے امید رکھنے والے اور اس سے ڈرنے والے اور اس کے آگے سر جھکانے والے ہوتے ہیں، برکات کے نازل ہونے اور رحمت الٰہی کے جھک پڑنے میں ایک عجیب خاصیت ہے جیسا کہ ہم نے استسقا اور حج میں بیان کیا ہے اور نیز اس امت کے قائم کرنے سے اللہ تعالیٰ کا مقصود یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کا بول بالا ہو اور روئے زمین پر دین اسلام سے اعلیٰ اور کوئی دین نہ پایا جائے اور یہ بات اسی وقت متصور ہو سکتی ہے کہ ان کا یہ دستور ہو کہ اس عبادت کے لئے جو دین کا سب سے بڑا شعار اور عبادات میں سب سے مشہور عبادت ہے، ہر خاص و عام، شہری و دیہاتی اور چھوٹا و بڑا سب مجتمع ہوا کریں، اسی سبب سے عنایت شرعیہ جمعہ اور جماعات کے مقرر کرنے اور ان میں رغبت دلانے اور ان کے ترک سے سخت ممانعت کرنے کی طرف متوجہ ہوئی۔

اور اشاعت دو قسم کی ہے، ایک اشاعت محلہ میں ہوتی ہے اور ایک اشاعت شہر میں ہوتی ہے، محلّہ میں اشاعت ہر وقت کی نماز سے ہو سکتی ہے اور شہر میں اشاعت ایک زمانہ کے گزر جانے کے بغیر نہیں ہو سکتی مثلاً ہفتہ بھر کی مدت، پس پہلی اشاعت تو جماعت ہے اور اسی کی نسبت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ''جماعت کی نماز اکیلے شخص کی نماز سے ستائیس درجہ فضیلت رکھتی ہے''۔ اور ایک روایت میں پچیس درجہ آیا ہے۔

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صراحتاً یا اشارۃً بیان فرمایا ہے کہ ان باتوں سے نماز کو فضیلت حاصل ہوتی ہے کہ جب کسی نے وضو کیا اور اچھی طرح سے کیا پھر مسجد کی طرف محض نماز کے لئے گیا تو اس کا یہ چلنا بھی نماز کے حکم میں ہے اور اس کے قدم اس کے گناہ دور کرنے والے ہیں، اور یہ کہ مسلمانوں کی دعا پیچھے سے ان کا احاطہ کر لیتی ہے اور یہ کہ نمازوں کے انتظار میں رباط اور اعتکاف کے معنی پائے جاتے ہیں وغیر ذالک، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں عددوں میں سے ایک کا نام بغیر کسی نکتہ بلیغہ کے نہیں لیا ہے جو آپ کے نزدیک متمثل تھا اور ہم اس نکتہ کو پہلے بیان کر چکے ہیں اس کو دیکھ لینا چاہئے اور اس دین حق کے اندر جس میں نہ سامنے سے باطل آتا ہے اور نہ پیچھے سے کسی طرح سے انکل کو دخل نہیں ہے اور اسی جماعت کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس گاؤں یا جنگل میں تین آدمی ہوں اور پھر وہاں جماعت نہ ہو تو بلا شک ان پر شیطان نے غلبہ کر لیا ہے''۔

میں کہتا ہوں اس حدیث میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جماعت کے ترک کرنے سے سستی کا دروازہ کھلتا ہے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے میں نے اس بات کا قصد کر لیا تھا کہ میں لکڑیوں کے جمع کرنے کا حکم دوں کہ وہ اکٹھی کی جائیں''۔ (۱) الحدیث۔

میں کہتا ہوں جماعت سنت مؤکدہ ہے اس کے ترک پر ملامت متوجہ ہوتی ہے کیونکہ وہ دین

---

(۱) اس کا اخیر یہ ہے کہ پھر نماز کا حکم دوں کہ اذان دی جائے اور ایک شخص کو امامت کرنے کا حکم دوں پھر میں ان لوگوں کے پاس جاؤں جو نماز جماعت میں حاضر نہیں ہوتے پھر ان کے گھر جلادوں لیکن ان کے بیوی بچوں کا خیال آتا ہے۔

کے شعائر میں سے ہے لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں کے بعض لوگوں میں تاخیر اور ڈھیل پائی اور آپ نے معلوم کرلیا کہ اس کا سبب اسلام میں ان کی نیت کا ضعف ہے اس واسطے ان پر سخت وعید کی اور ان کے دلوں کو ڈرایا، پھر چونکہ جماعت کے اندر حاضر ہونے میں ضعیف اور مریض اور حاجتمند لوگوں کے لئے ایک طرح کی دقت تھی تو حکمت الٰہی کا مقتضیٰ یہ ہوا کہ ان کو ایسے وقت میں ترک جماعت کی رخصت دی جائے تاکہ افراط وتفریط میں اعتدال ہو جائے، پس حرج کی قسموں میں سے یہ ہے کہ رات کا وقت ہو جس میں پالا پڑتا ہو یا بارش ہوتی ہو، اور ایسے وقت میں مؤذن کو یہ کہنا مستحب ہے: اے لوگو خبردار! تم اپنی اپنی جگہ پر نماز پڑھو۔

اور اقسام حرج میں وہ حاجت ہے جس سے رکنا مشکل ہو مثلاً رات کا کھانا جبکہ موجود ہو کیونکہ بسا اوقات دل کھانے کی طرف لگا رہتا ہے اور کبھی یہ خوف ہوتا ہے کہ کھانا ضائع ہو جائے گا اور جیسے پیشاب، پاخانہ کی حاجت رفع کرنا کیونکہ نفس کے مشغول ہو جانے کی وجہ سے نماز کے فائدہ سے محروم رہے گا اور اس حدیث میں کہ ''کھانے کے وقت نماز نہیں'' اور اس حدیث میں کہ ''کھانے کے لئے یا کسی اور چیز کے لئے نماز میں تاخیر نہ کرو'' کچھ اختلاف نہیں ہے کیونکہ ہر حدیث کو ایک صورت خاص یا ایک معنی خاص پر محمول کر سکتے ہیں کیونکہ پہلی حدیث میں یہ مراد ہے کہ حاضر ہونا واجب نہیں تاکہ تکلف کا سد باب ہو اور دوسری حدیث میں عدم تاخیر کا حکم اس کے لئے ہے جو تعمق کی قباحت سے مامون ہے اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے روزہ دار کے لئے افطار اور عدم افطار کا حکم دو وقتوں کے ساتھ متعلق ہے یا تاخیر نماز اس وقت ہے جب کھانے کا بہت زیادہ شوق ہو یا اس کے ضائع ہونے کا خوف ہو اور عدم تاخیر نماز اس وقت میں ہے جب ان میں سے کوئی بات نہ ہو اور علت کے حال سے یہ بات سمجھی جاتی ہے۔

اور اقسام حرج میں سے وہ ہے کہ جب کسی فتنہ کا خوف ہو جیسے کوئی عورت خوشبو لگا کر جائے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول میں کہ ''جب تم میں سے کسی کی بیوی مسجد میں جانے کی اجازت مانگے تو منع نہ کرو'' اور اس میں کہ جمہور صحابہ نے عورتوں کو مسجد میں آنے سے منع کیا ہے، کچھ اختلاف نہیں ہے کیونکہ مسجد میں جانے سے روکنے میں جس غیرت سے منع کیا ہے وہ غیرت ہے جو تکبر سے پیدا ہو نہ کہ فتنہ کے خوف سے اور وہ غیرت جائز ہے جو فتنہ کے خوف کی وجہ سے ہو، اسی لئے نبی صلی

اللہ علیہ وسلم نے فرمایا غیرت دو قسم کی ہے، الحدیث، اور حضرت عائشہ صدیقہ نے فرمایا ''عورتوں نے جو نئی باتیں پیدا کی ہیں اگر ان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم دیکھتے تو اجازت نہ دیتے''۔(۱)

اور اقسام حرج میں سے خوف اور مرض ہیں اور ان دونوں میں حکم ظاہر ہے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کے معنی جو آپ نے ایک نابینا سے فرمایا تھا کیا تو اذان سنتا ہے؟ اس نے عرض کیا ہاں، آپ نے فرمایا اس کی تعمیل کر'' یہ ہیں کہ اس کا سوال عزیمت میں تھا پس آپ نے اس کو اجازت نہ دی، پھر اس بات کے بیان کرنے کی حاجت ہوئی کہ امامت کے لائق تر کون شخص ہے اور اجتماع کی کیا صورت ہے اور اس بات کے بیان کرنے کی حاجت ہوئی کہ امام کو مختصر نماز پڑھانے کی وصیت کی جائے اور مقتدی امام کی اطاعت کریں، اور حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کا قصہ نماز کے طویل کرنے میں مشہور ہے اس واسطے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان امور کو نہایت تاکیدی طور سے بیان فرمایا، چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''لوگوں کی امامت وہ شخص کرے جو ان سب سے زیادہ قرآن کو اچھا پڑھتا ہو پس اگر قرأت میں برابر ہیں تو امامت وہ شخص کرے جو سنت کا زیادہ عالم ہو پس اگر علم سنت میں بھی برابر ہیں تو وہ شخص امامت کرے جو ہجرت میں مقدم ہو پس اگر ہجرت میں بھی برابر ہیں تو وہ امامت کرے جو عمر میں زیادہ ہو اور کوئی شخص دوسرے کی سلطنت میں اس کا امام نہ بنے'' اور زیادہ قاری کو مقدم کرنے کی وجہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے علم کی ایک معلوم حد معین کر دی جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں اور صحابہ میں سب سے پہلی چیز کتاب اللہ کی معرفت تھی کیونکہ وہ تمام علوم کی اصل ہے اور نیز وہ اللہ تعالیٰ کے شعائر میں سے ایک شعار ہے اس واسطے اس کے پڑھنے والے کا مقدم کرنا ضروری ہوا اور اس کی تعظیم واجب ہوئی تاکہ اس سے لوگوں کو کتاب اللہ میں رغبت پیدا ہو اور یہ بات نہیں ہے جیسا کہ بعض نے گمان کیا ہے کہ اس کے مقدم کرنے کی محض یہ وجہ ہے کہ مصلی کو قرآن پڑھنے کی ضرورت ہے بلکہ اصل یہ ہے کہ ان کو قرآن سیکھنے کی ترغیب اور حرص دلانا منظور ہے اور باہم حرص کرنے سے فضائل حاصل ہوتے ہیں اور اس ترغیب میں نماز کے خاص ہونے کا یہ سبب ہے کہ نماز کو قرأت کی ضرورت ہے پس اس میں غور و فکر کرنا چاہئے اس کے بعد معرفت سنت کا درجہ ہے کیونکہ سنت کتاب اللہ کے بعد ہے اور اسی سے دین کا قیام ہے اور امت کے اندر یہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ورثہ ہے، پھر اس کے بعد ہجرت کا

(۱) موجودہ حالات میں فتنہ کے خوف سے ممانعت ہے۔ (قاسمی)

اعتبار کیا کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے امر ہجرت کی تعظیم کی ہے اور اس میں رغبت دلائی اور اس کو عظیم الشان سمجھا اور امامت کے اندر ہجرت کرنے والے کو مقدم کرنا بھی اسی ترغیب اور تعظیم کا تتمہ ہے، اس کے بعد زیادتی عمر کا لحاظ کیا کیونکہ تمام مذاہب میں بڑوں کی تعظیم کا عام دستور ہے علاوہ بریں عمر رسیدہ آدمی زیادہ تجربہ والا اور زیادہ حلم والا ہوتا ہے۔

اور صاحب سلطنت کا اس کی سلطنت میں امام بننے سے جو آپ نے منع فرمایا تو اس کا سبب یہ ہے کہ یہ بات صاحب سلطنت پر شاق گذرے گی اور اس کی سلطنت میں نقصان پیدا ہوگا پس صاحب سلطنت کا سلطنت باقی رکھنے کے واسطے ایسا حکم فرمایا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جب تم میں سے کوئی لوگوں کا امام بنے تو اختصار کرے کیونکہ ان میں بیمار، ضعیف اور بوڑھے ہوتے ہیں اور جب تم میں سے کوئی تنہا نماز پڑھے تو جتنا چاہے نماز کو طویل کرے''۔

میں کہتا ہوں دعوت الی الحق کا فائدہ بغیر آسانی کے پورے طور پر حاصل نہیں ہوتا اور لوگوں کو نفرت دلانا دین کے مقصد کے خلاف ہے اور جس چیز کا سب لوگوں کو حکم دیا جائے اس کے لئے آسانی زیبا ہے جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس قول سے اس بات کی تصریح کردی ''بعض تم میں سے نفرت دلانے والے ہیں'' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''امام اس لئے مقرر کیا گیا ہے کہ اس کی اقتدا کی جائے پس تم اس کے خلاف نہ کرو'' سو جب وہ رکوع کرے تو تم رکوع کرو اور جب وہ **سمع اللہ لمن حمدہ** کہے تو تم **اللھم ربنا لک الحمد** کہو اور جب وہ سجدہ کرے تو تم بھی سجدہ کرو اور جب وہ بیٹھ کر نماز پڑھے تو تم سب بیٹھ کر نماز پڑھو، اور ایک روایت میں ہے ''اور جب وہ **ولا الضالین** کہے تو تم آمین کہو۔

میں کہتا ہوں جماعت کی ابتداء حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے اجتہاد سے ہوئی ہے پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اجتہاد کو برقرار رکھا اور اس کو صحیح بتایا اور انھوں نے یہ اجتہاد اس لئے کیا کہ جماعت کی وجہ سے سب لوگوں کی نماز ایک ہو جاتی ہے اور بدون جماعت کے مسجد میں جمع ہونے سے صرف اتفاق فی المکان ہوتا ہے اور ان سب کی نماز ایک نماز نہیں ہوتی۔

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ''جب امام بیٹھ کر نماز پڑھے تو تم بیٹھ کر نماز پڑھو'' منسوخ ہے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اخیر عمر میں بیٹھ کر نماز پڑھائی اور لوگ آپ کے پیچھے کھڑے ہوئے تھے اور اس کے منسوخ ہونے میں راز یہ ہے کہ امام کا بیٹھا رہنا اور لوگوں کا اس

کے پیچھے کھڑا ہونا عجمیوں کے اس فعل کے ساتھ مشابہ ہے جو وہ اپنے بادشاہوں کی حد سے زیادہ تعظیم کرتے ہیں جیسا کہ حدیث کی بعض روایات میں اس کی تصریح پائی جاتی ہے، پس جب اصول اسلامی مستحکم ہوگئے اور بہت سے احکام میں عجمیوں کی مخالفت ظاہر ہوگئی تو اس پر ایک دوسرے قیاس کو ترجیح دی گئی اور وہ یہ ہے کہ قیام نماز کا رکن ہے پس بغیر عذر کے اس کو ترک نہیں کیا جا سکتا اور اس صورت میں مقتدی کے لئے کوئی عذر نہیں ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم میں سے جو لوگ عقلمند اور سمجھدار ہیں وہ مجھ سے مل کر کھڑے ہوا کریں پھر وہ جو ان سے قریب ہیں (آپ نے تین بار اس کلمہ کو فرمایا) اور بازاروں کی طرح شور وغل سے اجتناب کرو"۔(۱)

میں کہتا ہوں یہ آپ نے اس لئے فرمایا تا کہ ان میں بڑوں کی عظمت پیدا ہو اور شرفا کی عادت اختیار کرنے کی طرف رغبت ہو اور تا کہ اہل عقل پر کم درجہ کے لوگوں کا مقدم ہونا شاق نہ گزرے، اور شور وغل سے منع کرنا ادب سکھانے کے لئے ہے اور تا کہ وہ قرآن کے اندر خوب غور وفکر کر سکیں اور ان لوگوں کے ساتھ مشابہت پیدا کریں جو بادشاہ کے حضور میں کھڑے ہوتے ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس طرح فرشتے خدا تعالیٰ کے سامنے صف باندھ کر کھڑے ہوتے ہیں تم اس طرح کیوں نہیں کھڑے ہوتے"۔

میں کہتا ہوں ہر فرشتہ کے لئے ایک مقام معین ہے اور استعدادوں کے اندر ترتیب عقلی کے موافق وہ پیدا کئے گئے ہیں اس واسطے وہاں خالی جگہ نہیں ہو سکتی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میں شیطان کو دیکھتا ہوں کہ بھیڑ کے سیاہ بچے کی صورت میں صف کی خالی جگہ سے گھس آتا ہے"

میں کہتا ہوں کہ ہم نے اس بات کا تجربہ کیا ہے کہ ذکر کے حلقہ میں مل کر بیٹھنے سے جمع خاطر اور ذکر میں حلاوت پیدا ہوتی ہے اور خطرات بند ہوتے ہیں اور اس کے ترک کرنے سے یہ سب باتیں کم ہو جاتی ہیں، اور جب ان معانی میں سے کچھ کم ہوا تو شیطان داخل ہو جاتا ہے، پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شیطان کو اس صورت میں متشکل دیکھا ہے اور اس صورت میں دیکھنے کی وجہ یہ ہے کہ بھیڑ کے بچہ کا داخل ہونا عادۃً ایسی تنگ جگہوں میں اکثر ہوتا ہے اور سیاہی کی صفت کے ساتھ دیکھنا جو باطن کی قباحت پر دلالت کرتی ہے اسی واسطے شیطان اس صورت میں آپ کے سامنے متمثل ہوا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اپنی صفیں سیدھی کرو ورنہ خدا تعالیٰ تمہارے منہ

(۱) مساجد میں لوگوں کو خاموش رہنا چاہئے اور قرآن میں تدبر و تفکر کرنا چاہئے۔ (قاسمی)

بگاڑ دے گا، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو شخص امام سے پہلے اپنا سر اٹھاتا ہے کیا اس کو اس بات کا خوف نہیں کہ خدا اس کا گدھے کا سا سر بنا دے''(۱)۔

میں کہتا ہوں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو صفیں برابر کرنے کا اور امام کی اتباع کا حکم دیا تھا لیکن انھوں نے اس میں کوتاہی کی اور آپ نے ان کو روکا وہ باز نہ آئے تب آپ نے ان پر سخت تحدید کی اور ان کو خوف دلایا کہ اگر مخالفت پر اصرار کریں گے تو ان پر خدا تعالیٰ لعنت کرے گا کیونکہ متقربات الٰہی سے مخالفت کرنا لعنت کا سبب ہے اور لعنت جب کسی کو محیط ہوتی ہے تو مسخ یا ان میں اختلاف کے واقع ہونے کو پیدا کرتی ہے۔

اور گدھے کی خصوصیت میں نکتہ یہ ہے کہ یہ ایسا جانور ہے جو حماقت اور اہانت میں ضرب المثل ہے اسی طرح اس گناہگار پر جب اس نے سر اٹھانے میں سبقت کی بہیمیت اور حماقت کا غلبہ ہو گیا اور چہروں کے پھرنے کی تخصیص میں یہ راز ہے کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کے لئے چہرہ جھکانے میں بے ادبی کی تھی اس لئے ان کے اسی عضو کو سزا دی گئی جس کے ساتھ ان سے برائی سرزد ہوئی تھی، جس طرح چہروں پر داغ دینے کی سزا یا ظاہر میں انھوں نے آگے پیچھے ہو کر یہ اختلاف کیا تھا اس واسطے ان کو اختلاف معنوی اور باہم مخالفت کے ساتھ یہ سزا دی گئی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جب تم نماز کے لئے آؤ اور ہم سجدہ میں ہوں تو تم سجدہ میں شریک ہو جاؤ اور اس کو حساب میں نہ لگاؤ اور جس کو رکوع مل گیا اس کو نماز مل گئی''۔

میں کہتا ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ رکوع قیام کے ساتھ بہت مشابہ ہے پس جس نے رکوع پالیا تو گویا اس نے قیام کو پالیا، اور نیز سجدہ نماز میں اصل اصول ہے اور قیام و رکوع اس کے لئے تمہید اور واسطہ ہیں، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جب تم دونوں اپنے گھر میں نماز پڑھ چکو پھر تم ایسی مسجد میں آؤ جس میں جماعت ہو رہی ہو تو ان کے ساتھ نماز پڑھ لو کیونکہ وہ تمہارے لئے نفل ہے''۔

میں کہتا ہوں کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ تارک نماز کو اس عذر کا موقع نہ رہے کہ میں نے اپنے گھر میں نماز پڑھ لی ہے پس اس پر کچھ باز پرس نہ ہو سکے، اور دوسری یہ ہے کہ مسلمانوں کی بات میں علیحدگی نہ ہو اگرچہ وہ علیحدگی ظاہر میں ہی کیوں نہ ہو۔

---

(۱) عجلت پسند نمازیوں کو خوف خدا کرنا چاہئے، اور اس وعید کو ملحوظ خاطر رکھنا چاہئے۔

جمعہ کا بیان (۱)

اس میں اصل بات یہ ہے کہ شہر میں ہر روز نماز کی اشاعت اس طرح پر ہونا کہ تمام اہل شہر نماز کے لئے جمع ہوا کریں چونکہ متعذر تھا اس لئے ضروری ہوا کہ اس کے لئے ایک حد مقرر کی جائے جس کا دوران نہ تو اس قدر جلدی ہو کہ لوگوں پر وہ دشوار ہو جائے اور نہ بہت دیر سے ہو جس سے کہ ان سے مقصود ہی فوت ہو جائے اور ہفتہ ایسی مدت ہے جو عرب وعجم اور بہت سے مذاہب میں مستعمل تھا اور اس حد کی صلاحیت رکھتا تھا اس واسطے ضروری ہوا کہ اس کو نماز کا وقت بنایا جائے پھر اہل ملل کا دین کے بارے میں اختلاف ہوا جس کو ایسی عبادت کے لئے مخصوص کیا جائے، پس یہود نے ہفتہ کو اور نصاری نے اتوار کو ان ترجیحات کی بنا پر جو ان پر ظاہر ہوئیں، پسند کیا اور اس امت کو خدا تعالیٰ نے علم عظیم کے ساتھ خاص کیا، اولاً اس کو آپ کے اصحاب کے دلوں میں القا فرمایا حتی کہ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لے آنے سے پیشتر مدینہ میں جمعہ قائم کیا بعد ازاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اس کا انکشاف فرمایا کہ جبرئیل علیہ السلام آپ کے پاس ایک آئینہ لیکر تشریف لائے جس میں ایک سیاہ نقطہ تھا پس اس مثال سے جو مقصود تھا وہ آپ کو بتلایا گیا پس آپ نے اس کو معلوم کر لیا۔

اس علم کا حاصل یہ ہے کہ عبادات ادا کرنے کا بہترین وقت وہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے قریب ہوتا ہے اور جس میں ان کی دعائیں قبول کی جاتی ہیں کیونکہ ایسے وقت میں عبادت کے قبول ہونے میں سرعت ہوتی ہے اور عبادت دل میں اثر کرتی ہے اور بہت سی عبادتوں کا نفع بخشتی ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کا ایک وقت ہے جو ہفتوں کی گردش کے ساتھ گردش کرتا ہے جس

(۱) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ میں تشریف آوری سے قبل ہی قیام جمعہ کے لئے آپ کے اصحاب کو آمادہ کیا جا چکا تھا۔ جیسا کہ حضرت شاہ صاحبؒ کی عبارت سے مترشح ہوتا ہے۔ (قاسمی)

میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے نزدیک ہوتا ہے اور یہ وہ وقت ہے جس میں خدا تعالیٰ جنت کے ٹیلوں پر اپنے بندوں پر تجلی کرے گا اور اس وقت کا زیادہ ترگمان جمعہ کے دن میں ہے کیونکہ اس دن میں بڑے بڑے امور واقع ہوئے ہیں۔

چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' بہترین دنوں کا جس میں آفتاب طلوع ہوتا ہے جمعہ کا دن ہے اس دن میں حضرت آدم علیہ السلام پیدا کیے گئے اور اسی دن جنت میں داخل کیے گئے اور اسی دن جنت سے نکالے گئے اور اسی روز قیامت قائم ہوگی اور اسی روز بہائم گھبرائے ہوئے ہوتے ہیں''۔ یعنی خوف زدہ اور ڈرے ہوئے ہوتے ہیں جس طرح کوئی سخت آواز سن کر ڈرتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ملاء سافل سے ان کے نفوس پر گھبراہٹ کا اثر ہوتا ہے اور ان پر ملاء اعلیٰ سے ترشح ہوتا ہے جس وقت کہ وہ قضا کے نازل ہونے سے اوّل بار ڈرتے ہیں اور اسی کی نسبت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' جیسے سخت پتھر پر ایک زنجیر ماری جاتی ہے تو اس سے آواز پیدا ہوتی ہے یہاں تک کہ ان کے دلوں سے گھبراہٹ دور ہوتی ہے'' الحدیث، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کے حکم کے موافق اس نعمت کا ذکر کیا پس آپ نے فرمایا'' ہم بعد میں پیدا ہونے والے ہیں، قیامت کے دن سابق رہنے والے ہیں (یعنی جنت میں داخل ہونے میں یا حساب کے لئے پیش ہونے میں سابق ہیں) مگر اتنی بات ہے کہ ان کو ہم سے پہلے کتاب دی گئی ہے اور ہمیں ان سے بعد کو عطا ہوئی ہے (یعنی سوائے اس خصلت کے کہ اس میں یہود اور نصاریٰ ہم سے مقدم ہے) پھر یہ ان کا دن ہے جو ان پر فرض کیا گیا ہے (آپ کی مراد اس دن سے فرد منتشر ہے جو ہمارے حق میں جمعہ کے ساتھ پایا جاتا ہے اور ان کے حق میں ہفتہ اور اتوار کے ساتھ پایا جاتا ہے) پھر اس دن میں انھوں نے اختلاف کیا پس اللہ تعالیٰ نے ہم کو اس کی ہدایت کی'' یعنی اس دن کی ہدایت کی جو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے موافق ہے۔

الحاصل وہ ایک ایسی فضیلت ہے جس کے ساتھ خدا تعالیٰ نے اسی امت کو خاص کیا اور شرع میں جو چیز اصل ہونی چاہیے اس سے یہود و نصاریٰ بھی محروم نہیں اور اسی طرح آسمانی شریعتیں قوانین شرعیہ کو نہیں چھوڑتیں اگر چہ بعض کسی فضیلت زائدہ کے ساتھ ممتاز ہوں، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ساعت کا اہتمام فرمایا اور اس کی عظمت شان بیان کی، پس آپ نے فرمایا'' جو

کوئی مسلمان اس گھڑی میں خدا تعالیٰ سے سوال کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو عطا فرمائے گا''۔

پھر اس گھڑی کی تعیین میں مختلف روایتیں وارد ہیں، پس بعض نے کہا یہ ساعت مابین اس کے ہے کہ امام بیٹھے یہاں تک کہ نماز سے فارغ ہو کیونکہ وہ ایسی ساعت ہے جس میں آسمان کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور اس ساعت میں ایمان والے خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں پس اس وقت میں آسمان وزمین کی برکات مجتمع ہو جاتی ہیں۔

اور بعض کہتے ہیں کہ وہ گھڑی عصر کے بعد سے غروب آفتاب تک ہے کیونکہ وہ وقت احکام الٰہی کے نزول کا ہے، اور بعض کتب الٰہیہ میں ہے کہ اس گھڑی میں حضرت آدمؑ پیدا کئے گئے ہیں اور میرے نزدیک یہ سب تخمینی بیان ہے اور ان سے تعیین ثابت نہیں ہوتی، پھر اس بات کی ضرورت ہوئی کہ جمعہ کے وجوب کو اور اس کے بارے میں تاکید کو بیان کیا جائے پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''لوگوں کو ترک جمعہ سے باز آنا چاہئے ورنہ خدا تعالیٰ ان کے دلوں پر مہر لگا دے گا پھر وہ بے خبر ہو جائیں گے''۔ میں کہتا ہوں یہ اس طرف اشارہ ہے کہ اس کے ترک کرنے سے سستی کا دروازہ کھل جاتا ہے اور اس سبب سے شیطان غالب آ جاتا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''بجز عورت اور بچے اور غلام کے ہر مسلمان پر جمعہ واجب ہے''۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو اذان کی آواز سنے اس پر جمعہ واجب ہے''۔

میں کہتا ہوں یہ افراط وتفریط کے درمیان اعتدال کی رعایت معذوروں کے لئے اور ان کے لئے جن کو وہاں تک پہنچنا دشوار ہے یا ان کے وہاں جانے سے فتنہ کا خوف ہے ان کے لئے تخفیف ہے اور اس بات کی بھی ضرورت پڑی کہ ان کے لئے نہانے اور مسواک کرنے اور خوشبو لگانے اور کپڑوں کے پہننے کے ساتھ پاکیزگی مستحب کی جائے کیونکہ یہ چیزیں طہارت کو کامل کرنے والی ہیں پس ان کے سبب سے طہارت کی عادت پر اور زیادہ تنبیہ ہوتی ہے اسی لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اگر میں اپنی امت پر دشوار نہ سمجھتا تو ان کو ہر نماز کے وقت مسواک کرنے کا حکم دیتا'' اور نیز لوگوں کے لئے ایک دن ایسا بھی ہونا ضروری ہے جس میں غسل کریں اور خوشبو لگائیں کیونکہ یہ بنی آدمؑ کی عمدہ عادات میں سے ہے اور چونکہ ہر دن ان چیزوں کا کرنا آسان نہ تھا اس لئے جمعہ کے دن ان کو کرنے کا حکم فرمایا کیونکہ اس پابندی سے اس کی رغبت بھی ہوتی ہے اور نماز بھی کامل

ہوتی ہے، چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''ہر مسلمان پر لازم ہے کہ سات روز میں سے ایک روز غسل کیا کرے جس میں اپنا سر اور بدن دھویا کرے'' اور نیز وہ اپنا کام خود کیا کرتے تھے اور جب جمع ہوتے تھے تو ان میں سے بھیڑوں کی سی بو آتی تھی اس واسطے ان کو نہانے کا حکم دیا گیا تاکہ نفرت کا سبب دور ہو اور ان کا باہم خوب اجتماع ہو حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت عائشہؓ نے اس کو بیان فرمایا ہے اور نیز اس بات کی ضرورت پڑی کہ ان کو خاموش رہنے کا اور امام سے قریب ہونے کا اور لغویات ترک کرنے کا اور جلد آنے کا حکم دیا جائے تاکہ نصیحت سننے کا اور اس میں تدبر کرنے کا زیادہ موقع ملے، اور اس بات کی ضرورت پڑی کہ جمعہ کی نماز کے لئے پیدل آنے کا اور سواری ترک کرنے کا حکم دیا جائے کیونکہ اس میں اپنے رب کے لئے تواضع اور خاکساری زیادہ پائی جاتی ہے اور نیز جمعہ میں تنگدست اور غنی سب جمع ہوتے ہیں اس واسطے یہ احتمال ہے کہ جس کو سواری نہ ملے تو وہ شرم محسوس کرے، پس اس دروازہ کا بند کرنا مناسب ہوا، اور اس بات کی بھی ضرورت ہوئی کہ خطبہ سے پیشتر نماز مستحب کی جائے جس کی وجہ نماز پنج گانہ کی سنتوں میں ہم بیان کر چکے ہیں، پس جب کوئی شخص ایسے وقت میں آئے کہ امام خطبہ پڑھتا ہے تو اس کو دو رکعت مختصر سی پڑھنی چاہئے تاکہ سنت راتبہ اور ادب خطبہ دونوں کی بقدر امکان رعایت ہو جائے اور اس مسئلہ کے بارے میں تمہارے شہر کے لوگ جو شور کرتے ہیں ان کے دھوکہ میں نہ آنا کیونکہ اس کے حق میں حدیث صحیح وارد ہے جس کا اتباع واجب ہے اور نیز اس بات کی ضرورت ہوئی کہ لوگوں کی گردنوں پر سے اور دو شخصوں کو ہٹا کر چلنے سے اور کسی کو اپنی جگہ پر بٹھانے سے (تاکہ وہ اس کی نیابت کرے اور کوئی دوسرا شخص نہ بیٹھے) منع کیا جائے کیونکہ جاہل لوگ اکثر ایسا کرتے ہیں اور اس سے باہم فساد پیدا ہوتا ہے اور وہ کینہ کا بیج ہے، پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کا ثواب بیان فرمایا جس نے جمعہ کو تمام آداب کے ساتھ اچھی طرح سے ادا کیا کہ اس جمعہ سے دوسرے جمعہ تک کے سب گناہ معاف ہو جاتے ہیں اور اس کا سبب یہ ہے کہ نور الٰہی اور مومنین کی دعا اور ان کی صحبت کی برکات اور وعظ اور ذکر الٰہی وغیرہ کی برکت کے دریا میں غرق ہونے کے لئے یہ نماز کافی مقدار ہے، پھر آپ نے اس نماز میں جلد آنے کے درجات اور ان کے اوپر جو ثواب مرتب ہوتا ہے اس کو اونٹ اور گائے اور دنبہ اور مرغی کے ساتھ مثال دے کر بیان

فرمایا، اور یہ ساعتیں وجوب جمعہ کے وقت سے قیام خطبہ تک مختصر اوقات ہیں۔

واضح ہو کہ جس نماز میں ادنیٰ اور اعلیٰ سب جمع ہوتے ہیں وہ ایک ہی شفع (دو رکعت) ہے تا کہ لوگوں پر گراں نہ گزرے اس کے علاوہ ان میں کمزور اور مریض اور صاحب حاجت اشخاص بھی ہوتے ہیں، اور اس نماز میں قرأت جہراً پڑھی جاتی ہے تا کہ وہ قرآن میں غور وفکر کر سکیں اور کتاب اللہ کی عظمت بھی پائی جائے اور ایسی نماز میں خطبہ بھی مقرر کیا گیا ہے تا کہ ناواقف واقف ہو جائے اور غافل کو یاد آ جائے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعہ میں دو خطبے اور ان کے درمیان جلسہ مسنون فرمایا تا کہ مقصد پورا حاصل ہو اور اس کے ساتھ خطیب کو آرام مل جائے اور اس کا اور لوگوں کا نشاط تازہ ہو جائے۔

اور خطبہ پڑھنے کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی حمد کرے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجے اور کلمہ شہادتین پڑھے اور کلمۂ فصل لائے اور وہ کلمہ 'اما بعد' ہے، اور لوگوں کو نصیحت کرے اور تقویٰ کا حکم کرے اور دنیا و آخرت میں عذاب الٰہی سے ڈرائے اور کچھ قرآن پاک پڑھے اور مسلمانوں کے لئے دعا خیر کرے، اور اس کا سبب یہ ہے کہ اس نے نصیحت کے ساتھ خدا تعالیٰ اس کے نبی اور قرآن پاک کو ملایا ہے اس واسطے کہ خطبہ دین کے شعائر میں سے ہے پس اذان کی طرح یہ چیزیں خطبہ میں بھی ضرور ہونی چاہئیں۔

حدیث شریف میں آیا ہے، جس خطبہ میں کلمۂ شہادت نہ ہو تو وہ کٹے ہوئے ہاتھ کی طرح ہے اور معناً نہ کہ لفظاً امت کو یہ بات مسلسل حاصل ہوتی رہی کہ جمعہ میں جماعت اور ایک قسم کی شہریت شرط ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفاء رضی اللہ عنہم اور ائمۂ مجتہدین رحمہم اللہ تعالیٰ جمعہ شہروں ہی میں قائم کرتے تھے اور دیہات کے لوگوں سے کچھ تعرض نہ کرتے تھے بلکہ ان کے عہد میں دیہات میں جمعہ نہ ہوتا تھا پس اس بات سے لوگ قرناً بعد قرن وعصراً بعد عصر یہ سمجھنے لگے کہ جمعہ کے لئے جماعت اور شہریت شرط ہے۔

میں کہتا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ جمعہ کی حقیقت شہر میں دین کی اشاعت ہے اس واسطے شہریت اور جماعت کا اعتبار ضروری ہوا، اور میرے نزدیک صحیح تر قول یہ ہے کہ کم سے کم جس پر قریہ کا اطلاق ہوتا ہو وہ نماز جمعہ کے لئے کافی ہے کیونکہ چند ایسے طرق سے جو بعض بعض کی تائید

کرتے ہیں یہ مروی ہے کہ "پانچ قسم کے لوگوں پر جمعہ نہیں"۔ اوران میں دیہات والوں کو بھی شمار کیا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جمعہ پچاس آدمیوں پر واجب ہے"۔

میں کہتا ہوں پچاس آدمیوں سے قریہ (۱) بن جاتا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم "ہر قریہ پر جمعہ واجب ہے" اور کم سے کم جس پر جماعت کا اطلاق ہوتا ہے وہ جمعہ کے لئے کافی ہے اور حدیث (۲) انفضاض اس پر دلالت کرتی ہے، اور ظاہر یہ ہے کہ وہ لوگ نماز جمعہ سے چلے جانے کے بعد پھر واپس نہیں آئے، واللہ اعلم۔

پس جب جماعت حاصل ہو جائے تو جمعہ واجب ہو جاتا ہے اور جو اس میں شامل نہ ہو تو وہ گنہگار ہے اور چالیس آدمیوں کی تعداد شرط نہیں ہے، اور نیز اس حکم کا دینا بھی ضروری تھا کہ نماز قائم کرنے کے مستحق امرا ہیں، چنانچہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا "امام سمیت چار ہوں، الخ۔ اور امام کا ہونا شرط نہیں ہے، واللہ اعلم۔

عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ کا بیان

اصل ان میں یہ ہے کہ ہر قوم کے لئے ایک دن مقرر ہوتا ہے اس میں تجمل کرتے ہیں اور خوب زینت کے ساتھ اپنے شہروں سے نکلتے ہیں اور یہ ایک ایسی رسم ہے کہ اس سے عرب وعجم کی کوئی قوم خالی نہیں ہے اور جبکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف لائے تو ان کے لئے دو دن مقرر تھے کہ ان میں کھیل کود کرتے تھے، آپ نے فرمایا یہ دو روز کیسے ہیں؟ انھوں نے عرض کیا ان دونوں دنوں میں ایام جاہلیت میں ہم کھیل کود کرتے تھے، آپ نے فرمایا، خدا تعالیٰ نے تم کو ان کے بدلہ میں ان سے بھی بہتر دو روز عطا فرمائے وہ یوم الاضحیٰ اور یوم الفطر ہیں"۔ بعض نے کہا کہ وہ دو روز جن میں وہ کھیلتے تھے نیروز اور مہرجان (۳) تھے، اور ان دونوں کو اس لئے بدلا کہ لوگوں میں کوئی دن خوشی کا نہیں ہوتا مگر اس کے پائے جانے کا سبب شعائر دین کی تعظیم یا ائمہ مذہب کی موافقت یا اسی قسم کی کوئی بات ہوتی ہے، پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کا خوف ہوا کہ اگر آپ نے ان کو اسی عادت پر چھوڑ دیا تو شعائر جاہلیت کی تعظیم یا ان کے اسلاف کے طریقہ کی ترویج پائی

---

(۱) حدیث انفضاض سے اس قصہ کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر قرآن شریف کی ان آیتوں میں ہے۔ وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوًا انْفَضُّوْا اِلَيْهَا وَتَرَكُوْكَ قَائِمًا. (۲) گاؤں (۳) پارسیوں کی عید

جائے گی اس واسطے آپ نے ان کو دو اور دنوں کے ساتھ بدل دیا کہ ان میں ملت حنفیہ کے شعائر کی تعظیم پائی جاتی ہے اور ان دونوں دنوں میں تجمل کے ساتھ ذکر الٰہی اور ابواب بندگی کو بھی ملایا تا کہ مسلمانوں کا اجتماع محض کھیل کود ہی نہ ہو، اور تا کہ ان کا اجتماع اعلاء کلمۃ اللہ سے خالی نہ ہو، ان دونوں دنوں میں سے ایک وہ دن ہے جس میں وہ اپنے روزہ سے فارغ ہوتے ہیں اور ایک قسم کی زکوٰۃ ادا ہوتی ہے اس لئے دو فرحتیں حاصل ہوتی ہیں ایک فرحت طبعی جوان کو روزہ کی عبادت شاقہ سے فراغت پانے سے اور فقیر کو صدقات لینے سے حاصل ہوتی ہے اور ایک فرحت عقلی جو خدا تعالیٰ کیطرف سے عبادت مفروضہ ادا کرنے کی توفیق عطا فرمانے کی وجہ سے اور ان کے اہل وعیال کو دوسرے سال تک سلامت سے رکھنے کا انعام عطا فرمانے کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے، اور دوسرا وہ دن ہے جس میں ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے اسمٰعیل علیہ السلام کو ذبح کیا ہے اور خدا تعالیٰ نے ان کے عوض میں ذبح عظیم عنایت کیا کیونکہ اس میں ملت حنفیہ کے ائمہ کے حالات کی یاد دہانی اور خدا تعالیٰ کی طاعت میں ان کے جان و مال خرچ کرنے اور ان کے بہت زیادہ صبر کرنے کے ساتھ لوگوں کو عبرت دلانا ہے اور اس میں حاجیوں کے ساتھ مشابہت اور ان کی تعظیم ہے اور جس کام میں وہ مشغول ہیں اس کا شوق دلانا ہے اسی وجہ سے تکبیر کا کہنا مسنون ہوا، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''اور خدا تعالیٰ کی بڑائی بیان کرو اور بعوض اس کے کہ اس نے تم کو ہدایت فرمائی'' یعنی اس کے شکر میں کہ اس نے تم کو روزے رکھنے کی توفیق عطا فرمائی اور اسی لئے قربانی اور آواز کے ساتھ تکبیر کہنا ایام منیٰ میں مسنون ہوا اور جو شخص قربانی کا ارادہ کرے اس کے لئے سر نہ منڈانا مستحب ہوا اور نماز اور خطبہ مسنون ہوا تا کہ ان کا کوئی اجتماع اللہ تعالیٰ کے ذکر اور شعائر دین کی عظمت کے بدون نہ پایا جائے اور شارع نے اس کے ساتھ منجملہ مقاصد شرع کے ایک اور مقصد رکھا اور وہ یہ ہے کہ ہر ملت کے لئے ایک دن ضرور ہوتا ہے جس میں تمام شہر والے جمع ہوتے ہیں تا کہ ان کی شوکت ظاہر ہو اور ان کی کثرت معلوم ہو، اسی لئے عید گاہ میں سب کا جانا مستحب ہوا حتی کہ بچوں اور عورتوں اور پردہ والی و حائضہ عورتوں کا نکلنا بھی مستحب ہے لیکن حائضہ عورتیں عید گاہ سے علیحدہ ہو کر بیٹھیں اور مسلمانوں کی دعا میں شریک ہوں اور اسی لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک راستہ سے جاتے تھے اور دوسرے راستہ سے آتے تھے تا کہ دونوں راستوں والے مسلمانوں کی

شوکت دیکھیں، اور چونکہ عید کی اصل زینت ہے اس واسطے اچھا لباس پہننا اور دف بجانا اور راستہ کا بدلنا اور عید گاہ میں جانا مستحب ہوا۔

نماز عیدین کا مسنون طریقہ ہے کہ بغیر اذان واقامت کے نماز شروع کی جائے جس میں قرأت جہر سے کی جائے، جب تخفیف مقصود ہو تو سورۂ **سبح اسم ربک الاعلیٰ** اور سورہ **هل اتاک** پڑھے اور جب طوالت کے ساتھ پڑھنا ہو تو سورہ ق اور سورہ **اقتربت الساعة** پڑھے، پہلی رکعت میں قرأت سے پہلے سات تکبیریں اور دوسری قرأت سے پہلے پانچ تکبیریں کہے اور اہل کوفہ کے نزدیک یہ ہے کہ نماز جنازہ کی تکبیر کی طرح پہلی رکعت میں قرأت سے پہلے چار تکبیریں اور دوسری رکعت میں قرأت کے بعد چار تکبیریں کہے، اور یہ دونوں طریقے مسنون ہیں لیکن جس پر اہل حرمین کا عمل ہے وہ راجح ہے۔

نماز کے بعد خطبہ پڑھے اس میں خدا تعالیٰ سے ڈرنے کا حکم کرے اور وعظ و نصیحت کرے اور عید الفطر میں یہ بات خاص ہے کہ جب تک چند چھوہارے نہ کھا لے نماز کو نہ نکلے اور ان کو طاق عدد میں کھانا چاہئے اور نماز کو جانے سے پہلے ہی صدقہ فطر ادا کر دے تا کہ ایسے دن میں مساکین کو بھی غنا حاصل ہو جائے اور فراغت قلب کے ساتھ وہ نماز میں شریک ہوں اور تا کہ ماہ رمضان کے گزرنے پر جو اس کی تعظیم مراد ہے اس وقت عادت روزہ کے خلاف پایا جائے اور عید الاضحیٰ میں یہ بات خاص ہے کہ جب تک نماز سے فارغ نہ ہو کچھ نہ کھائے پھر اپنی قربانی کا گوشت کھائے کیونکہ اس میں قربانی کی عظمت اور اس کی طرف رغبت کا ہونا اور اس کا متبرک سمجھنا پایا جاتا ہے اور نماز کے بعد قربانی کرے کیونکہ ذبح کرنا محض حجاج کے ساتھ مشابہت ہونے کی وجہ سے عبادت شمار کیا جاتا ہے اور یہ مشابہت نماز کے لئے جمع ہونے سے ان کو حاصل ہو سکتی ہے اور قربانی کے لئے بھیڑ کا ایک برس کا بچہ اور دنبہ کا چھ مہینہ کا بچہ ہر گھر والے کی طرف سے کافی ہے اور قربانی کو ہدی پر قیاس کر کے گائے اور اونٹ کی قربانی کو سات آدمیوں کی طرف سے کافی سمجھا۔

اور چونکہ قربانی اللہ کے لئے مال خرچ کرنے کے قبیل سے ہے اور اس کے متعلق خدا تعالیٰ فرماتا ہے "ان کے گوشت اور خون خدا کے پاس کبھی نہیں پہنچتے۔ لیکن تمہاری پرہیز گاری پہنچتی ہے" اس واسطے قربانی کے جانور کو موٹا کرنا اور اچھے کو پسند کرنا مستحب ہوا کیونکہ اس سے اللہ تعالیٰ کی

طرف صحیح رغبت ہونے پر دلالت پائی جاتی ہے پس اسی وجہ سے چار قسم کی قربانیوں سے منع کیا گیا ہے، ایک لنگڑا جانور جس کا لنگڑا پن ظاہر ہو اور ایک وہ جانور جس کی آنکھ صاف پھوٹی ہوئی ہو اور ایک وہ جانور جس کی بیماری ظاہر ہو اور ایک نہایت دبلا جانور جس کی ہڈیوں کا مغز بھی گھل گیا ہو، اور ایسے جانور کی قربانی کرنا بھی منع ہے جس کا سینگ یا کان نہ ہو اور آنکھ و کان کا دیکھ لینا مستحب ہے اور جس جانور کا کان سامنے سے کٹا ہوا ہو اس کی قربانی نہ کی جائے اور نہ اس جانور کی قربانی کی جائے جس کا کان پیچھے سے کٹا ہوا ہو اور نہ اس جانور کی جس کا کان پھٹا ہوا ہو اور نہ اس جانور کی جس کے کان میں سوراخ ہو، اور نر سینگ والے کی قربانی مسنون ہے جس کی آنکھیں سیاہ ہوں اور پیٹ اور سینہ سیاہ ہو اور پاؤں سیاہ ہوں کیونکہ یہ سب باتیں بکرے کے پورے جوان ہونے کی ہیں، اور قربانی کے وظائف میں سے یہ ہے: **انی وجهت وجهی للذی فطر السمٰوات والارض الخ، اللهم منک والیک و لک من الله والله اکبر.**

جنازوں کا بیان

واضح ہو کہ مریض کی عیادت کرنا اور مبارک دعاؤں سے اس کا تمسک کرنا اور نزع کے وقت نرمی کی باتیں کرنا اور میت کی تکفین وتدفین کرنا اور اس کے ساتھ نیکی کرنا اور اس پر رونا اس کے پس ماندوں سے ماتم پرسی کرنا اور قبروں کی زیارت کرنا یہ ایسے امور ہیں جو عرب کے تمام لوگوں میں مروج ہیں، اور یہ یا ان کی نظیر تمام عجم میں مستعمل ہیں اور یہ ایسی رسوم ہیں جن سے سلیم المزاج لوگ خالی نہیں اور نہ ان کے لئے مناسب ہے کہ وہ ان سے جدا رہیں، پس جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تو آپ نے ان کی عادات کو ملاحظہ فرمایا اور ان کی اصلاح فرمائی اور ان میں جو نقص تھیں ان کی تصحیح فرمائی، اور مصلحت جس کا لحاظ رکھا گیا ہے دنیا کے اعتبار سے یا آخرت کے اعتبار سے یا تو وہ خاص مریض کی طرف راجع ہوتی ہے اور زیادہ انہی دونوں اعتباروں میں سے کسی اعتبار سے اس کے اہل وعیال کی طرف راجع ہوتی ہے یا وہ ملت کی طرف راجع ہوتی ہے۔

اور مریض اپنی دنیوی زندگی میں اس بات کا حاجتمند ہوتا ہے کہ اس کی تکلیف ومصیبت کو تسلی بخش باتوں سے دور کیا جائے اور نرمی برتی جائے اور جس کام کو وہ خود نہ کرسکے اس میں لوگ اس کی اعانت کریں اور وہ امر بغیر اس بات کے ممکن نہیں کہ اس کے بھائی بند اور شہر والوں کو اس کے ہاں آنا سنت لازمہ قرار دیا جائے۔

اور امور آخرت میں اس بات کی طرف حاجت ہے کہ صبر کرے اور تمام سختیاں اس کو ایسی دکھائی دیں جیسے تلخ دوا جس کا ذائقہ اس کو ناگوار لگتا ہے لیکن اس کے نفع کی امید رکھتا ہے تاکہ بیماری حیات دنیا میں غرق ہونے کا اور خدا تعالیٰ سے محجوب اور کنارہ کش ہونے کا سبب نہ ہو جائے

بلکہ اس کی جان کے اجزا تحلیل ہونے کے ساتھ وہ بیماری اس کے گناہوں کی کمی ہونے کا باعث ہو اور یہ بات بغیر اس کے ممکن نہیں کہ صبر کے فوائد اور تکالیف کے منافع پر آگاہ کیا جائے، اور جان نکلنے کا وقت اس کے حق میں دنیا کا اخیر دن اور آخرت کا پہلا دن ہوتا ہے پس اس وقت ضروری ہے کہ اس کو ذکر الٰہی اور توجہ الی اللہ کی طرف رغبت دلائی جائے تا کہ اس کی جان ایمان کے جامہ میں اس دنیا میں مفارقت کرے اور آخرت میں اس کا ثمرہ اس کو حاصل ہو، اور انسان جبکہ وہ سلیم المزاج ہو جس طرح اس کی سرشت میں مال اور اولاد کی محبت داخل ہوتی ہے اسی طرح یہ بات بھی اس کی سرشت میں داخل ہوتی ہے کہ حالت زندگی میں اور اس کے مرنے کے بعد اس کو لوگ بھلائی کے ساتھ یاد کریں اور اس کا کوئی عیب ان پر ظاہر نہ ہو حتی کہ ہر گروہ کے بڑے بڑے صحیح العقل اس بات کو دل سے پسند کرتے ہیں کہ مال کثیر صرف کر کے کوئی بلند عمارت تیار کی جائے جس سے ان کا ذکر باقی رہے اور ہلاکتوں میں گھس پڑتے ہیں تا کہ مرنے کے بعد لوگ ان کو بہادر کہیں، اور کوئی یہ وصیت کرتا ہے کہ اس کی قبر بلند بنائی جائے تا کہ لوگ یہ کہیں کہ وہ اپنی زندگی میں اور مرنے کے بعد بھی بڑا صاحب نصیب ہے اور حتی کہ ان کے حکما نے یہ کہہ دیا کہ جس کا ذکر لوگوں میں موجود ہے وہ مردہ نہیں ہیں۔ اور جبکہ یہ ایسی بات تھی کہ اسی پر لوگ پیدا ہوتے ہیں اور اسی پر مرتے ہیں تو ان کے خیال کی تصدیق اور ان کے وعدہ کا پورا کرنا ان کے مرنے کے بعد ایک طرح کا ان کے ساتھ احسان کرنا ہے۔

اور نیز جب روح جسم سے جدا ہوتی ہے تو وہ بدستور سابق حساس رہتی ہے جو حس مشترک وغیرہ سے ادراک کرتی ہے اور جو علوم اور خیالات دنیوی زندگی میں اس کے ساتھ تھے مرنے کے بعد بھی اس میں باقی رہتے ہیں اور اس پر عالم بالا سے اور زائد معلوم مترشح ہوتے ہیں جن کی وجہ سے اس کو عذاب یا ثواب ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کی ہمتیں حظیرۃ القدس تک پہنچتی ہیں پس جب وہ میت کے لئے نہایت گڑگڑا کر دعا خیر کرتی ہیں یا اس کے لئے کوئی بڑا صدقہ دیتی ہیں تو خدا تعالیٰ کی تدبیر سے وہ میت کے لئے نافع پڑتا ہے اور اس فیض کے ساتھ مل کر جو اس پر حظیرۃ القدس سے نازل ہوتا ہے اس میت کی درستی حالت کا سبب ہو جاتا ہے اور اہل میت کو اس کی موت سے بہت صدمہ اور غم لاحق ہوتا ہے تو دنیوی اعتبار سے ان کے لئے مصلحت اس میں ہے کہ

لوگ ماتم پرسی کے لئے آئیں تا کہ ان کا غم کچھ کم ہو، اور میت کے دفن کرانے میں ان کی اعانت کریں اور ان کے لئے اتنا کھانا تیار کر کے دیں جوان کوایک دن رات سیر کر دے، اور آخرت کے اعتبار سے ان کے لئے بھلائی اس میں ہے کہ ان کو اجر عظیم کی ترغیب دلائی جائے تا کہ ہمہ تن وہ غم میں نہ پڑیں اور توجہ الی اللہ کا دروازہ ان پر کشادہ ہو جائے، اور نوحہ کرنے سے اور گریباں پھاڑنے سے اور تمام ان چیزوں سے منع کیا جائے جو غم اور مصیبت کو یاد دلاتی ہیں اور جو غم اور پریشانی کو زیادہ کرتی ہیں کیونکہ اہل میت اس وقت میں بہ منزلہ مریض کے ہوتا ہے اس کو مرض کے علاج کی ضرورت ہے نہ یہ کہ اس کا مرض اور بڑھایا جائے اور اہل جاہلیت نے بہت سی ایسی رسمیں ایجاد کر رکھی تھیں جو شرک کی طرف داعی تھیں اس واسطے مصلحت شرعی کا یہ مقتضیٰ ہوا کہ یہ دروازہ بھی بند کر دیا جائے جب تم کو یہ سب باتیں معلوم ہوگئیں تو اب ہم تم کو ان احادیث کے معنی بتلاتے ہیں جو اس باب میں وارد ہوئی ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس مسلمان کو کوئی مصیبت مرض وغیرہ کی پہنچتی ہے تو اس کے سبب سے خدا تعالیٰ اس کے گناہ کو کم کر دیتا ہے جس طرح درخت سے اس کے پتے جھڑ جاتے ہیں''۔

میں کہتا ہوں گناہوں کے معاف ہونے کے اسباب کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں، منجملہ ان اسباب کے ایک سبب حجاب نفسانی کا کمزور ہو جانا اور روح بہیمیہ کا جو اخلاق رذیلہ کو اٹھائے پھرتی ہے تحلیل ہو جانا ہے اور اہل مصیبت کا دنیوی زندگی کے اطمینان سے ایک طرح کا بیزار ہو جانا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مومن کی حالت نرم شاخ کی سی ہے اور منافق کی حالت صنوبر کے درخت کی سی ہے''، الحدیث۔

میں کہتا ہوں اس میں یہ بھید ہے کہ انسان کے نفس میں دو قوتیں ہیں ایک قوت بہیمیہ اور دوسری قوت ملکیہ، اور انسان کی یہ خاصیت ہے کہ کبھی اس کی بہیمیت دب جاتی اور ملکیت ظاہر ہو جاتی ہے سو اس وقت وہ ملائکہ میں شمار ہونے لگتا ہے اور کبھی ملکیت دب جاتی ہے اور بہیمیت کا ظہور ہو جاتا ہے سو اس وقت وہ انسان چوپائے کی طرح خدا تعالیٰ کے نزدیک بے قدر ہو جاتا ہے اور جب انسان قوت بہیمیہ سے نکل کر قوت ملکیہ کی سلطنت کی طرف آتا ہے تو اس کو مختلف حالات پیش آتے ہیں جن میں ان دونوں قوتوں کا باہم مقابلہ رہتا ہے کبھی قوت بہیمیہ ملکیہ پر غلبہ کرتی ہے

اور کبھی قوت ملکیہ بہیمیہ پر، اور دنیا میں جزا اور سزا دینے کے یہی مواقع ہوتے ہیں، اور دنیا کے اندر جزا اور سزا کی حقیقت ہم پہلے بیان کر چکے ہیں پس اس کو دیکھ لیجئے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب بندہ بیمار یا مسافر ہوتا ہے تو اس کے لئے اتنا ہی عمل لکھا جاتا ہے جو حالت صحت واقامت میں وہ کرتا تھا''۔

میں کہتا ہوں جب آدمی کسی کام کو کرنے کا پورا قصد کرتا ہے اور بجز مانع خارجی کے اور کوئی چیز نہیں روکتی تو اس نے دل کا کام پورا کرلیا اور تقویٰ خاص دل ہی میں ہوتا ہے اور باقی اعمال تقویٰ کی شرح اور اس کے لئے موکد ہوتے ہیں جن کو بوقت قدرت کیا جاتا ہے اور بوقت عجز ترک کر دیا جاتا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''شہید پانچ لوگ ہیں یا یہ فرمایا کہ سات لوگ ہیں'' الحدیث،

میں کہتا ہوں وہ سخت مصیبت جو بندے کے اختیار سے نہیں ہوتی گناہوں کے دور کرنے میں اور اس شخص پر رحمت الٰہی نازل کرنے میں شہادت کا کام کرتی ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''مسلمان جب اپنے مسلمان بھائی کی عیادت کو جاتا ہے تو واپس آنے تک جنت کے پھل چنتا رہتا ہے''۔

میں کہتا ہوں شہر والوں کی آپس میں محبت بغیر اس کے ممکن نہیں کہ ایک دوسرے کی حاجت کے وقت مدد کریں اور اللہ تعالیٰ کو وہ چیز پسند ہے جس میں ان کے شہر کی بھلائی ہو اور باہم محبت پیدا کرنے کے لئے عیادت کرنا بہت عمدہ سبب ہے، قیامت کے دن اللہ تعالیٰ فرمائے گا'' اے ابن آدم میں بیمار ہوا تو تو نے میری عیادت بھی نہ کی الخ''۔

میں کہتا ہوں اس تجلی کا حال بہ نسبت اس روح اعظم کے جس کا بیان اللہ تعالیٰ کے اس قول میں ہے: الملئکة والروح ،اس صورت کا سا حال ہے جو انسان کو خواب میں بہ نسبت اس انسان کے ظاہر ہوتی ہے پس جس طرح انسان کا اعتقاد اپنے رب کی نسبت یا اس کے حکم اور رضا کی نسبت اس شخص کے حق میں عالم خواب میں رب کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور اسی لئے مومن کامل کی یہ شان ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کو خواب میں نہایت حسین صورت میں دیکھتا ہے جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تھا اور اسی لئے جو شخص خواب میں خدا تعالیٰ کو اپنے دروازہ کی دہلیز میں طمانچہ

مارتے دیکھے تو اس کی یہ تعبیر ہے کہ اس دہلیز میں اس نے خدا تعالیٰ کا کوئی قصور کیا ہے، اسی طرح خدا تعالیٰ کا حق اور اس کا حکم اور اس کی رضا مندی اور اس کی تدبیر اور افراد انسان کے لئے اس کی قیومت اور اس کا ان کے وجود کا مبدا ہونا اور وہ اعتقاد جو افراد انسان کو بوقت صحت مزاج اور استقامت نفوس اپنے رب کی نسبت ہوتا ہے یہ سب امور افراد انسان کے اندر صورت نوعیہ کے عطا کے موافق عالم آخرت میں بہت سی شکلوں کے ساتھ متمثل ہو کر ظاہر ہوں گے جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بیان کیا ہے اور یہ تجلی اس روح اعظم کی تجلی ہے جو افراد انسان کی جامع اور ان کی کثرت کا مبلغ اور دنیا و آخرت میں ان کی ترقی کا منتہی ہے، اس سے میری یہ مراد ہے کہ وہاں پر اللہ تعالیٰ کی باعتبار اس کی قومیت اور اس کے حکم کے ایک شان کلی ہے جس کو آخرت میں اپنے دلوں کی بینائی سے ہمیشہ دیکھتے رہیں گے اور کبھی جب کسی صورت مناسبہ میں وہ شان ظاہر ہوگی تو اپنی آنکھوں سے اس کو دیکھیں گے، الحاصل پس اسی لئے یہ تجلی اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کے حق کے ساتھ صورت نوعیہ کے فیضان کے موافق انسان کے افراد میں ظاہر ہوتی ہے جیسے باہم ان کا مانوس ہونا اور ان کا کمال انسانی کو جو نوع انسان کے ساتھ خاص ہے حاصل کرنا، اور پسندیدہ مصلحت کا اپنے اندر قائم کرنا، اس واسطے جو چیز لوگوں کی حالتوں میں سے ہے اس علاقہ کی وجہ سے اپنی طرف اس کا منسوب کرنا ضروری ہوا، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان منتروں کی اجازت دی ہے جو پورے اور کامل ہیں جن کے اندر خدا تعالیٰ کا ذکر اور اس سے مدد مانگنا مذکور ہے، اس سے آپ کو یہ منظور ہے کہ اللہ کی رحمت ان پر چھا جائے اور ان کے مصائب دور ہو جائیں، اور زمانہ جاہلیت میں لوگ جو اپنے بتوں سے مدد مانگا کرتے تھے اس سے ان کو روکنا مقصود تھا اور اس کے عوض میں عمدہ منتر ان کے لئے مقرر کرنا تھا۔

منجملہ ان منتروں (۱) کے یہ ہے کہ منتر پڑھنے والا اپنا دایاں ہاتھ مریض پر پھیرتا جائے اور یہ پڑھتا جائے۔ **اذھب الباس رب الناس واشف انت الشافی لا شفاء الا شفاؤک شفاء ا لایغادر سقما**، اور از اں جملہ یہ ہے: **بسم اللہ ارقیک من کل شیٔ یؤذیک من شر کل نفس او عین حاسد اللّٰہ یشفیک باسم اللہ ارقیک**، اور از اں جملہ یہ

(۱) ان میں غیر شرعی کلمات نہیں ہیں بلکہ یہ تعویذ کے کلمات ہیں۔ (قاسمی)

ہے:اعیذک بکلمات اللہ التامة من کل شیطان وهامة ومن کل عین لامة ،اور ازاں جملہ یہ ہے کہ سات مرتبہ اس کو پڑھے. اسال اللہ العظیم رب العرش العظیم ان یشفیک، اوراز اں جملہ یہ ہے کہ قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس پڑھ کر دم کرے اور جس جگہ مریض کے جسم پر درد ہو وہاں ہاتھ پھیرے اور تین بار بسم اللہ کہے اور سات بار کہے اعوذ بعزة اللہ وقدرته من شر ما اجد واحاذر ،اوراز اں جملہ یہ ہے کہ پڑھے بسم اللہ الکبیر اعوذ باللہ العظیم من شر کل عرق نعار ومن شر حر النار، اوراز اں جملہ یہ ہے کہ پڑھے، ربنا اللہ الذی فی السماء تقدس اسمک امرک فی السماء والارض کما رحمتک فی السماء فاجعل رحمتک فی الارض اغفرلنا حوبنا وخطایانا انت رب الطیبین انزل رحمة من رحمتک وشفاء من شفائک علی هذا الوجع.

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' تم میں سے کوئی شخص موت کی آرزو نہ کرے'' الحدیث،

میں کہتا ہوں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں منجملہ آداب انسان سے یہ بھی ہے کہ وہ نعمت خداوندی کے زوال کو چاہنے کی جرأت نہ کرے، اور زندگی خدا تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے، کیونکہ وہ نیکی کمانے کا ذریعہ ہے اس واسطے کہ انسان جب مرجاتا ہے تو اس کے اکثر عمل منقطع ہو جاتے ہیں اور سوائے طبعی ترقی کے کچھ ترقی نہیں کرسکتا، اور نیز موت کی آرزو کرنا نہایت بے باکی اور بے اطمینانی ہے اور یہ دونوں بدترین اخلاق میں سے ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' جو شخص خدا تعالیٰ سے ملنے کو پسند کرتا ہے خدا اس سے ملنے کو پسند کرتا ہے اور جو شخص خدا سے ملنے کو ناپسند کرتا ہے خدا اس سے ملنے کو ناپسند کرتا ہے''۔

میں کہتا ہوں خدا تعالیٰ سے ملنے کے یہ معنی ہیں کہ ایمان بالغیب سے ترقی کر کے ایمان عینی وبالمشاہدہ کی طرف منتقل ہو جائے اور اس کی صورت یہ ہے کہ بہیمیت کے بھاری بھاری پردے اس سے دور ہو کر ملکیت کا نور اس پر ظاہر ہو جائے اور عالم قدس سے اس پر یقین مترشح ہونے لگے اور جن چیزوں کا اس سے وعدہ کیا گیا تھا وہ سب اس کو دکھائی اور سنائی دینے لگیں، اور مومن بندہ جو ہمیشہ اپنی بہیمیت کے دفع کرنے میں اور اپنی ملکیت کو قوی کرنے میں کوشش کرتا ہے تو اس حالت

کی طرف ایسا مشتاق ہوتا ہے جیسے ہر عنصر اپنے مکان طبعی کا مشتاق ہوتا ہے اور ہر ذی حس اس چیز کی طرف مشتاق ہوتا ہے جو اس حس کی لذت ہے، اگرچہ باعتبار نظام جسمانی کے اس کو موت اور اس کے اسباب سے نفرت اور تکلیف ہوتی ہے اور نافرمان بندہ جو ہمیشہ بہیمیت کے فربہ کرنے کی کوشش کرتا ہے دنیوی زندگی کا مشتاق اور اس کی طرف مائل رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کی کراہیت جو حدیث میں وارد ہوئی ہے وہ بطور مشاکلہ کے ہے اور اس سے مراد نافع یا مضر چیزوں کو موجود ومہیا کرنا اور اس کی گھات میں لگا رہنا ہے۔

اور چونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر دونوں چیزیں ایک دوسرے کے ساتھ مشتبہ ہوگئی تھیں اس واسطے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محبت کی ظاہر ترین حالت کا جس کا عالم بالا سے فیضان ہوتا ہے اور جو دوسری حالت کے ساتھ مشتبہ نہیں ہوتی اور وہ ملائکہ کے ظاہر ہونے کی حالت ہے ذکر کر کے معنی مراد پر مطلع کر دیا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''تم میں سے کوئی شخص نہ مرے مگر اس حال میں کہ وہ اپنے رب سے حسن ظن رکھتا ہو''۔

واضح ہو کہ کوئی عمل صالح اس چیز کے ادا کرنے کے بعد جس سے نفس راستی پر آتا ہے اور جس سے اس کی کجی دور ہوتی ہے یعنی فرائض کو ادا کرنا اور کبائر سے بچنا، انسان کے لئے اس سے زیادہ نافع نہیں ہے کہ وہ خدا تعالیٰ سے بھلائی کی امید کرے کیونکہ پرامید ہونا اللہ تعالیٰ کی رحمت کے نازل ہونے کا سبب بننے میں بہ منزلہ ایسی دعا کے ہے جس میں کمال رغبت ہو اور بہ منزلہ مضبوط ارادہ کے ہے اور خوف الٰہی تو ایک تلوار ہے جس سے دشمنان خدا سے جو قوت شہوانیہ اور قوت سبعیہ اور وساوس شیطانی کے مستحکم پردے ہیں، مقاتلہ کیا جاتا ہے اور جس طرح کوئی شخص جو لڑائی میں مہارت نہیں رکھتا کبھی تلوار سے حملہ کرتے وقت اپنے ہی لگا لیتا ہے اسی طرح جو آدمی تہذیب نفس میں کامل نہیں ہوتا کبھی کبھی خوف الٰہی کو بے محل استعمال کرتا ہے اور وہ اپنے تمام اعمال حسنہ کو عجب اور ریا اور تمام آفات میں آلودہ سمجھ کر اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کے اجر سے بالکل ناامید ہو جاتا ہے اور اپنے تمام صغیرہ گناہوں اور لغزشوں کے متعلق یہی گمان کرتا ہے کہ ان کا وبال ضرور بالضرور واقع ہوگا، پس جب وہ مر جاتا ہے تو اس کے گناہ متمثل ہو کر اس کے گمان میں اس کو کاٹتے ہیں اور ان خیالی صورتوں میں قوت مثالیہ کے فیضان کا وہ سبب بن جاتا ہے پس وہ ایک قسم کے

عذاب میں مبتلا ہو جاتا ہے اور ان شکوک اور خیالات کی وجہ سے وہ اپنے اعمال صالحہ کا معتد بہ فائدہ نہیں حاصل کرتا چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے نقل کرتے ہوئے فرمایا ''میں اپنے بندہ کے گمان کے موافق پیش آتا ہوں'' اور چونکہ انسان اپنے مرض اور ضعف کی حالت میں بسا اوقات خوف کی تلوار کو اس کے موقع پر نہیں استعمال کر سکتا یا وہ موقع اس پر مشتبہ ہو جاتا ہے اس واسطے اس کے حق میں یہی مسنون کیا گیا کہ بہ نسبت خوف کے اس کی امید زیادہ ہونی چاہیے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''لذتوں کو قطع کرنے والی چیز کا ذکر اکثر کیا کرو''۔

میں کہتا ہوں حجاب نفسانی کے توڑنے میں اور طبیعت کو دنیا کی زندگی کے لذائذ سے باز رکھنے میں ذکر موت سے زیادہ کوئی چیز نافع نہیں کیونکہ موت کی یاد دنیا سے مفارقت کی صورت کو اور اللہ تعالیٰ کے روبرو کھڑے ہونے کی ہیئت کو اس کی آنکھوں کے سامنے متشکل کر دیتی ہے اور اس تصویر کا عجیب اثر ہوتا ہے اور اس کا تھوڑا سا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں وہاں دیکھ لینا چاہیے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس کا آخری کلام لا الٰہ الا اللہ ہو وہ جنت میں داخل ہوگا''۔

میں کہتا ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسی حالت میں جبکہ موت اس کو گھیرے ہوئے ہے اس کا اللہ تعالیٰ کی یاد میں اپنے دل کو لگانا اس کے ایمان کی صحت کی اور دل میں محبت ایمان کے داخل ہونے کی دلیل ہے اور نیز مرتے وقت اس کا اللہ تعالیٰ کو یاد کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ اس کا دل نیکی کے رنگ میں رنگا ہوا ہے پس جو ایسی حالت میں مر گیا تو اس کے لئے جنت واجب ہوگئی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اپنے مردوں کو لا الٰہ الا اللہ کی تلقین کیا کرو، اور آپ نے فرمایا ''اپنے مرنے والوں کے پاس سورہ یٰسین پڑھا کرو''۔

میں کہتا ہوں مرنے والے کے ساتھ باعتبار اس کی آخرت کی درستی کے یہ بہت بڑا احسان ہے اور لا الٰہ الا اللہ کو اس لئے خاص کیا کہ وہ افضل الذکر ہے جو توحید پر اور نفی شرک پر مشتمل ہے اور اذکار اسلام میں سب سے عمدہ ہے اور سورہ یٰسین کو اس لئے خاص کیا کہ وہ قرآن کا دل ہے اور اس کا بیان عنقریب آئے گا، دوسرے یہ کہ وہ نصیحت کے لئے کافی مقدار ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس کسی مسلمان پر کوئی مصیبت پڑے اور پھر وہ حسب حکم الٰہی یہ کہے: **انا للہ انا الیہ راجعون اللھم اجرنی فی مصیبتی و اخلف لی خیرا منھا**، تو اللہ تعالیٰ اس کو اس سے

بہتر معاوضہ دے گا''۔

میں کہتا ہوں یہ حکم اس لئے ہے کہ مصیبت زدہ کو وہ ثواب یاد آجائے جو اللہ تعالیٰ کے ہاں ہے اور وہ یہ سمجھ لے کہ اللہ تعالیٰ اس سے بہتر بدلہ دینے پر قادر ہے تاکہ اس کا رنج کم ہو جائے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جب تم کسی مردہ کے پاس جاؤ تو اس کے لئے خیر کی بات کہو'' جیسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوسلمہؓ کے حق میں کہا تھا: اے اللہ تعالیٰ ابوسلمہ کی مغفرت فرما اور اس کا درجہ بلند کر'' الحدیث،

میں کہتا ہوں زمانۂ جاہلیت میں لوگوں کی یہ عادت تھی کہ وہ اپنے اوپر بد دعا کیا کرتے تھے(۱) اور کبھی وہ قبولیت کی ساعت میں واقع ہوتی تھی پس وہ بد دعا قبول ہو جاتی تھی پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بدل کر ایسے کلمہ کا حکم فرمایا جو میت کے لئے اور لوگوں کے لئے نافع ہے، اور نیز یہ پہلا صدمہ ہوتا ہے پس یہ دعا مسنون ہوئی تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کرنے کا وسیلہ ہو جائے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی صاحبزادی زینب کے لئے عورتوں سے کہا تھا ''اس کو طاق طاق نہلاؤ تین مرتبہ یا پانچ مرتبہ یا سات مرتبہ پانی اور بیری کے پتوں سے، اور اخیر مرتبہ میں کافور لگاؤ اور فرمایا کہ اس کی دائیں طرف سے شروع کرو اور اس کے وضو کے مواضع سے شروع کرو''۔

میں کہتا ہوں مردہ کے نہلانے میں اصل یہ ہے کہ اس کو زندہ کے غسل پر قیاس کیا جائے کیونکہ وہ اپنی زندگی میں ایسا ہی غسل کرتا تھا اور غسل دینے والے اپنے لئے بھی ایسا ہی غسل کرتے ہیں اس واسطے میت کی تعظیم میں اس غسل سے بڑھ کر نہلانے کی اور کوئی صورت نہیں۔

اور بیری کے پتے اور کئی دفعہ دھونے کا اس لئے حکم دیا کہ مرض میں بدن پر میل اور بدبو پیدا ہو جاتی ہے اور اخیر میں کافور لگانے کا اس لئے حکم دیا کہ اس کی تاثیر یہ ہے کہ جس چیز میں اس کو استعمال کیا جاتا ہے وہ جلدی نہیں بگڑتی اور یہ بھی کہتے ہیں کہ اس کے لگانے کا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ موذی جانور اس کے قریب نہیں آتا اور دائیں جانب سے شروع کرنے کا اس لئے حکم دیا تاکہ مردوں کا غسل بہ منزلہ زندوں کے غسل کے ہو جائے اور تاکہ ان اعضا کی تعظیم معلوم ہو۔

اور شہید کے بارے میں غسل نہ دینے کی اور اس کے کپڑوں میں اور اس کے خون میں دفن

---

(۱) آج بھی بعض جہلا بعض اوقات اسی قسم کے کلمات بدخود اپنے ہی حق میں کہہ جاتے ہیں۔(قاسمی)

کرنے کی جو سنت جاری ہے وہ اس لئے کہ اس کے اس فعل کی عظمت ہو اور ظاہر میں اس کے بقا عمل کی صورت متمثل ہو اور اس لئے کہ نفوس بشریہ جب اپنے جسموں کو چھوڑتے ہیں تو وہ حساس ہوتے ہیں اوران کو اپنی جانوں کا علم رہتا ہے اور ان میں سے بعض کو ان چیزوں کا بھی علم رہتا ہے جو ان کے ساتھ کی جاتی ہیں پس جب اس جیسے عمل کا اثر باقی رکھا جائے گا تو اس کو اس عمل کے یاد دلانے میں مدد دیگا اور اس کے سامنے متشکل رہے گا، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول سے یہی مراد ہے ''قیامت کے روز شہیدوں کے زخموں سے خون جاری ہوں گے، رنگ خون کا سا ہوگا اور خوشبو مشک کی سی ہوگی اور محرم (۱) کے حق میں بھی حدیث صحیح وارد ہے ''اس کو دونوں کپڑوں میں کفنادو اور نہ اس کو خوشبو لگاؤ اور نہ اس کا سر ڈھانکو کیونکہ وہ قیامت کے روز تلبیہ کہتا ہوا اٹھے گا پس اس کی طرف رجوع کرنا ضروری ہوا۔

اور اسی نکتہ کی طرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس قول سے اشارہ فرمایا ''قیامت کے روز مردہ اپنے ان کپڑوں میں اٹھے گا جن میں وہ مرا ہے''۔ اور کفن میت میں اصل اس سونے والے کے ساتھ مشابہت کا ہونا ہے جو اپنے کپڑے میں لپٹ کر سوتا ہے، مرد کے حق میں پورا کفن تہبند اور کرتا اور اوپر کی چادر ہے یا حلہ یعنی دو کپڑے ہیں اور عورت کے حق میں پورا کفن ان کپڑوں کے ساتھ کچھ اور بھی ہے کیونکہ اس کے لئے زیادہ ستر مناسب ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''زیادہ قیمتی کفن نہ دو کیونکہ وہ بہت جلد اس سے جدا ہو جائے گا''۔ اس سے افراط وتفریط کے درمیان اعتدال مراد ہے اور یہ کہ زیادہ قیمتی کفن (۲) دینے میں جاہلیت کی عادت نہ اختیار کریں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جنازہ کو جلدی لے جاؤ''۔

میں کہتا ہوں اس کا سبب یہ ہے کہ دیر کرنے میں میت کی لاش کے بگڑ جانے کا اندیشہ ہے اور اس کے قرابت والوں کو بیقراری ہوتی ہے کیونکہ جب وہ میت کو دیکھیں گے تو ان کو بے چینی زیادہ ہوگی اور جب وہ ان کی نظر سے غائب ہو جائے گا تو وہ اور کام میں مشغول ہو جائیں گے اور

---

(۱) اتفاق سے کسی محرم کا حالت احرام میں انتقال ہو جائے۔ (قاسمی)

(۲) حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عائشہ سے فرمایا تھا کہ نئے کپڑوں کا زندے زیادہ مستحق ہیں مجھے پرانے کپڑے ہی میں دفن کیا جائے (قاسمی)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں سببوں کی طرف ایک کلمہ میں اشارہ فرمایا، آپ نے فرمایا ''کسی مسلمان کی لاش کو اس کے گھر والوں کے سامنے رو کے رکھنا مناسب نہیں ہے''۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جو فرمایا کہ ''اگر وہ نیک ہے(۱)'' الخ۔

میں کہتا ہوں ہمارے نزدیک یہ کلام حقیقی معنی پر محمول ہے اور بعض نفوس جب اپنے بدن سے جدا ہوتے ہیں تو جو کچھ ان کے بدن کے ساتھ کیا جاتا ہے اس کو وہ محسوس کرتے ہیں اور روحانی کلام کے ساتھ کلام کرتے ہیں جو نفوس پر مترشح ہونے کی وجہ سے سمجھا جاتا ہے اور کانوں کے ذریعہ نہیں سنا جاتا جو لوگوں کا طریق مالوف ہے، اسی لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے سوائے انسان کے اس کی آواز کو ہر چیز سنتی ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو شخص ایمان وثواب سمجھ کر مسلمان کے جنازے کے پیچھے چلا(۲)'' الخ۔

میں کہتا ہوں جنازہ کے ساتھ چلنے کا حکم دینے میں راز یہ ہے کہ اس میں میت کی تعظیم اور اس کے رشتہ داروں کے دلوں کو تسلی ہوتی ہے اور تا کہ وہ مسلمانوں کے ایک صالح گروہ کا میت کے حق میں دعا کرنے کے واسطے، اس کے دفن کرنے میں اس کے رشتہ داروں کی مدد کرنے کے واسطے اجتماع کا ذریعہ بنے اسی واسطے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جنازہ کے لئے ٹھیرنے میں رغبت دلائی یہاں تک کہ اس کے دفن کرنے سے لوگوں کو فراغت ہو جائے اور جب تک جنازہ اتار کر زمین پر نہ رکھ دیا جائے لوگوں کو بیٹھنے سے منع کیا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''تحقیق موت پریشانی کی چیز ہے پس جب تم کسی جنازہ کو دیکھو تو کھڑے ہو جاؤ'' (۳)۔

میں کہتا ہوں جبکہ لذتوں کے دور کرنے والی شئے کا یاد کرنا اور اپنے بھائیوں کی عمر تمام ہو جانے سے عبرت پکڑنا مقصود تھا اور یہ ایک پوشیدہ بات تھی کہ اس کے کرنے والے اور نہ کرنے والے میں تمیز نہ ہو سکتی تھی اس لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مطلوب کا انضباط قیام کے ساتھ کر دیا لیکن آپ نے ان کو ضروری قرار نہیں دیا اور نہ ہی وہ سنت قائمہ ہے، اور بعض نے اس کو

---

(۱) اور اس کی نماز پڑھی اور دفن سے فارغ ہو کر واپس آیا تو قیراط کے برابر اس کو ثواب ملے گا۔

(۲) اس کا اخیر جملہ یہ ہے کہ نیک ہو تو کہتا ہے مجھے جلدی پہنچاؤ اور اگر بد ہے تو کہتا ہے ہائے ہائے مجھے کہاں لئے جاتے ہو۔

(۳) بعض مواقع پر حضورؐ کا یہودیوں کے جنازے کو دیکھ کر کھڑا ہونا بھی ثابت ہے۔ (قاسمی)

منسوخ کہا ہے اور نسخ کی تقدیر پر اس کے منسوخ ہونے میں حکمت یہ ہے کہ اہل جاہلیت ایسے افعال کیا کرتے تھے جو کھڑے ہونے کے مشابہ تھے پس آپ کو اس بات کا خوف ہوا کہ یہ کھڑا ہونا غیر محل پر محمول کرلیا جائے اور اس طرح ممنوعات کا دروازہ کھل جائے، واللہ اعلم۔

اور نماز جنازہ اس لئے مقرر کی گئی مومنین کے ایک گروہ کا میت کی سفارش کرنے کے واسطے جمع ہونا میت پر رحمت الٰہی نازل ہونے میں بڑا کامل اثر رکھتا ہے اور نماز پڑھنے کا یہ طریقہ ہے کہ امام اس طرح پر کھڑا ہو کہ میت اس کے اور قبلہ کے درمیان ہو اور لوگ اس کے پیچھے صفیں باندھ کر کھڑے ہوں اور امام چار تکبیریں کہے اور ان میں میت کے لئے دعا کرے پھر سلام پھیر دے اور یہ وہ طریقہ ہے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں مقرر ہوا اور اس پر تمام صحابہ اور تابعین نے اجماع کیا اگر چہ اس باب میں متخالف حدیثیں بھی وارد ہیں، اور اس نماز میں سورہ فاتحہ کا پڑھنا بھی مسنون ہے کیونکہ وہ سب دعاؤں میں بہتر اور جامع ہے خدا تعالیٰ نے اپنی کتاب محکم میں بندوں کو اس کی تعلیم فرمائی ہے اور ان دعاؤں میں سے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے میت پر پڑھی ہیں اور محفوظ چلی آئی ہیں یہ ہے: **اللهم اغفر لحينا وميتنا وشاهدنا وغائبنا وصغيرنا وكبيرنا وذكرنا وانثانا اللهم من احييته منا فاحيه على الاسلام ومن توفيته منا فتوفه على الايمان اللهم لاتحرمنا اجره ولا تفتنا بعده،** اور **اللهم ان فلان بن فلان فى ذمتک وحبل جوارک فقه من فتنة القبر وعذاب النار وانت اهل الوفا والحق اللهم اغفرله وارحمه انک انت الغفور الرحيم،** اور **اللهم اغفرله وارحمه وعافه واعف عنه واكرم نزله ووسع مدخله واغسله بالماء والثلج والبرد ونقه من الخطايا كما نقيت الثوب الابيض من الدنس وابدله داراً خيرا من داره واهلا خيراً من اهله وزوجا خيرا من زوجه وادخله الجنة واعذه من عذاب القبر ومن عذاب النار،** اور ایک روایت میں ہے، **وقه فتنة القبر وعذاب النار.**

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''یہ قبریں اہل قبور پر تاریکی سے پر ہوتی ہیں اور خدا تعالیٰ میری نماز سے ان کو پرنور کرتا ہے'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو کوئی مسلمان ایسا مرتا ہے کہ اس کے جنازہ پر ایسے چالیس آدمی جو خدا تعالیٰ کے ساتھ شرک نہیں کرتے کھڑے ہو کر دعا

کرتے ہیں تو خدا تعالیٰ ان کی شفاعت اس میت کے حق میں قبول فرماتا ہے اور ایک روایت میں یہ ہے کہ ''اس کے جنازہ پر سو مسلمانوں کا گروہ نماز پڑھے''۔

میں کہتا ہوں جبکہ اس شخص کی دعا کا پورا اثر ہوتا ہے جو خدا تعالیٰ کے نزدیک معزز ہے تاکہ اس کی دعا حجابوں کو پھاڑ کر رحمت الٰہی نازل کرنے کا باعث ہو جس طرح استسقا میں اس واسطے دو امروں میں سے ایک میں رغبت دلانا ضروری ہوا، یا تو ایک شخص عالی مرتبہ ہو جو ایک جماعت کے برابر ہو یا ایک جماعت کثیر ہو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''تم نے اس میت کی ثنا خیر کی ہے اس کے لئے جنت واجب ہوگئی'' الحدیث۔

میں کہتا ہوں جب اللہ تعالیٰ کسی بندہ سے محبت کرتا ہے تو ملاء اعلیٰ کو بھی اس سے محبت ہوتی ہے پھر اس کی قبولیت ملاء سافل میں نازل ہوتی ہے پھر نیک بندے بھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں اور جب کسی بندے سے ناراض ہوتا ہے تو اسی طرح اس کی ناراضگی درجہ بدرجہ نازل ہوتی ہے، پس جس بندہ کے لئے نیک مسلمانوں کی ایک جماعت خلوص دل سے بلا ریا اور بغیر اتفاق عادت کے نیکی کی گواہی دے تو یہ اس شخص کے ناجی ہونے کی دلیل ہے اور جب وہ کسی کی برائی بیان کریں تو یہ اس کے ہلاک ہونے کی علامت ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ''تم زمین میں اللہ تعالیٰ کے گواہ ہو'' تو اس کے یہ معنی ہیں کہ تم مورد الہام اور ترجمان غیب ہو۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''مردوں کو برا مت کہو کیونکہ وہ اپنے اعمال کی جزا تک پہنچ چکے ہیں''۔

میں کہتا ہوں چونکہ مردوں کو برا کہنا زندوں کی دلسوزی اور ایذا کا سبب ہے اور اس میں کچھ فائدہ نہیں ہے اور نیز بہت سے لوگوں کا حال سوائے خدا کے کوئی نہیں جانتا اس لئے برا کہنے سے لوگوں کو روکا گیا، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سبب کو اہل جاہلیت کے ایک مردہ کو برا کہنے اور حضرت عباسؓ کا اس کی وجہ سے غصہ ہونے کے قصہ میں بیان فرما دیا ہے اب رہی یہ بات کہ جنازہ کے آگے چلنا چاہئے یا پیچھے اور اس کو چار آدمی اٹھائیں یا دو اور قبر میں پاؤں کی طرف سے اتاریں یا قبلہ کی طرف سے، پس اس میں مختار قول یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک کی گنجائش ہے اور ہر امر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث یا کوئی اثر مروی ہے''۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''ہم لوگوں

کے لئے لحد ہے اور ہمارے سوا دوسروں کے لئے شق ہے"۔

میں کہتا ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ لحد میت کی تعظیم کے مناسب ہے اور بلا ضرورت میت کے منہ پر مٹی ڈالنا بے ادبی ہے۔

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خاص اس لئے بھیجا تھا کہ کوئی تصویر مٹائے بغیر نہ چھوڑیں اور جس قبر کو اونچا دیکھیں اس کو گرا کر زمین کے برابر کر دیں اور قبر کو پختہ کرنے سے اور اس پر عمارت بنانے سے اور اس پر بیٹھنے سے منع فرمایا اور آپ نے فرمایا قبروں کی طرف نماز نہ پڑھو کیونکہ یہ اس بات کا ذریعہ ہے کہ لوگ قبروں کی پرستش کرنے لگیں اور لوگ ان قبروں کی اتنی زیادہ تعظیم کرنے لگیں جس کی وہ مستحق نہیں پس لوگ اپنے دین میں تحریف کر ڈالیں جیسا کہ اہل کتاب نے کیا، چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "یہود اور نصاریٰ پر خدا کی لعنت ہو انھوں نے اپنے انبیا کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا اور قبر پر بیٹھنے کے معنی بعض نے یہ بیان کئے ہیں کہ اس سے زیارت کرنے والوں کا قبر پر ٹھیرنا مراد ہے اور بعض نے یہ کہا کہ اس سے قبروں پر پیر رکھنا مراد ہے اور اس تقدیر پر میت کی تعظیم ملحوظ ہے پس حق یہ ہے کہ توسط اختیار کرے نہ تو مردہ کی اس قدر تعظیم کرے جو شرک کے قریب ہو اور نہ اس کی اہانت اور اس کے ساتھ عداوت کرے۔

اور جبکہ میت پر رونا اور اس پر غم کرنا ایک طبعی امر جو لوگوں سے دور نہیں ہو سکتا اس واسطے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کے ترک کی تکلیف دینے کو جائز نہ رکھا اور یہ ہونا بھی نہ چاہئے کیونکہ رونا اور غم کرنا ہم جنس ہونے کی رقت کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے اور یہ رقت قلبی قابل حمد ہے کیونکہ اہل مدینہ کا باہم مالوف و مانوس ہونا اس پر موقوف ہے اور نیز انسان کی سلامت مزاج کا یہ مقتضیٰ ہے چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "خدا تعالیٰ اپنے رحم دل بندوں پر ہی رحم کرتا ہے" نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اللہ تعالیٰ آنکھ کے آنسوؤں اور دل کے غمگین ہونے کی وجہ سے عذاب نہیں دیتا لیکن اس کے سبب سے عذاب دیتا یا رحم کرتا ہے اور آپ نے زبان کی طرف اشارہ فرمایا" اور آپ نے فرمایا "جس نے رخساروں کو پیٹا اور گریبان پھاڑے اور جاہلیت کی طرح چیخا چلایا وہ ہم میں سے نہیں ہے"۔

اس میں راز یہ ہے کہ ان باتوں سے غم بڑھتا ہے اور مصیبت زدہ جس کا کوئی مر گیا ہو وہ بہ

منزلہ مریض کے ہوتا ہے جو قابل علاج ہے تا کہ اس کا مرض کم ہو اور یہ مناسب نہیں ہے کہ اس کے درد کے زیادہ کرنے میں کوشش کی جائے اور اسی طرح وہ مصیبت زدہ اس مصیبت سے فارغ ہو گیا ہے جو اس پر پڑ چکی اور اب مناسب نہیں ہے کہ قصداً اس مصیبت میں پڑا رہے اور نیز اس بات کا بھی امکان ہے کہ بے قراری کا بڑھنا حکم الٰہی پر راضی نہ ہونے کا سبب بن جائے، اور نیز اہل جاہلیت لوگوں کے دکھانے کو رویا کرتے تھے اور یہ عادت خبیث اور ضرر رساں ہے اس واسطے اس سے لوگوں کو منع کیا گیا، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نوحہ کرنے والی عورت کے بارے میں فرمایا ''قیامت کے روز اس کو کھڑا کیا جائے گا اس پر قطران (۱) کا کرتا اور گندھک کی چادر ہوگی''۔

میں کہتا ہوں یہ اس لئے ہوا کہ اس کے گناہ نے ہر طرف سے اس کو گھیر لیا اس واسطے گناہ کی صورت میں اس کو سزا دی گئی کہ بدبو اس کے سارے جسم کو گھیر لے، اور اس کو کھڑا اس لئے کیا جائے گا تا کہ اس کی شہرت ہو یا اس لئے کہ نوحہ کرتے وقت وہ کھڑی ہوئی تھی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''میری امت میں جاہلیت کی چار باتیں ہیں جن کو وہ نہ چھوڑیں گے (۲)'' الحدیث،

میں کہتا ہوں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات کہ وہ ان خصلتوں کو ترک نہ کریں گے اس وجہ سے معلوم ہو گیا کہ یہ باتیں طبیعت بشریہ کے حد سے بڑھ جانے کا مقتضیٰ ہیں جیسا کہ حد سے زیادہ شہوت جماع کا بڑھ جانا کیونکہ نفوس کے اندر ایک طرح کی غیرت ہے جو انساب میں ظاہر ہوتی ہے اور مردوں کے ساتھ ان کو محبت ہے جو رونے پیٹنے پر آمادہ کرتی ہے اور ایک طرح کی اٹکل ہے جو ستاروں سے بارش طلب کرنے کا سبب بنتی ہے اور اسی لئے عرب وعجم سب قوموں میں تم اس طریقہ کو دیکھتے ہو اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان عورتوں کے بارے میں فرمایا جو جنازہ کے پیچھے چلتی تھیں ''لوٹ جاؤ تمہارے لئے گناہ ہے نہ کہ ثواب''۔

میں کہتا ہوں عورتوں کو اس لئے منع کیا گیا کہ ان کے حاضر ہونے سے شور اور رونے پیٹنے اور بے صبری اور بے پردگی کا احتمال ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس مسلمان کے تین بچے مر جائیں تو وہ دوزخ میں نہ

---

(۱) ایک روغنی سیال، وہ جو صنوبر جیسے درخت سے حاصل کیا جاتا ہے۔ (قاسمی)

(۲) وہ چار چیزیں یہ ہیں: احساب میں فخر کرنا، انساب میں طعن کرنا، ستاروں سے بارش چاہنا، اور نوحہ کرنا۔

جائے گا''۔

میں کہتا ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے صبر کر کے اپنے نفس سے جہاد کیا اور دیگر وجوہات ہیں جن کا ذکر ہم کر چکے ہیں پس ان کو وہاں دیکھنا چاہئے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو شخص کسی مصیبت زدہ کی تعزیت کرے گا تو اس کو بھی اس کے برابر ثواب ملے گا''۔

میں کہتا ہوں اس کے دو سبب ہیں ایک یہ ہے کہ آنے والے کو ایسی رقت ہوتی ہے جیسی مصیبت زدہ کو اور دوسرے یہ ہے کہ عالم مثال کا مبنیٰ معانی مناسبہ کے ظاہر ہونے پر ہے پس مصیبت زدہ کی تعزیت کرنے میں مصیبت کی صورت ظاہر ہوتی ہے اس واسطے اس کی جزا کے مشابہ اس کو جزا دی گئی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جعفر کے گھر والوں کے لئے کھانا تیار کرو کیونکہ ان کو ایسا حادثہ پیش آیا ہے جس نے ان کو اور کاموں سے روک دیا ہے''۔

میں کہتا ہوں یہ اہل مصیبت کے ساتھ انتہائی ہمدردی ہے اور بھوک سے مرنے سے ان کی حفاظت کرنا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''میں نے تم کو قبروں کی زیارت کرنے سے منع کر دیا تھا اب تم ان کی زیارت کرو''۔

میں کہتا ہوں آپ نے ان کو قبروں کی زیارت سے اس لئے منع فرمایا تھا کہ اس سے قبر پرستی کا دروازہ کھلتا تھا پس جب اسلامی اصول مستحکم ہو گئے اور غیر اللہ کی عبادت کی حرمت لوگوں کے دلوں میں پیوست ہو گئی تو آپ نے ان کو زیارت کرنے کی اجازت دے دی اور اجازت دینے کی علت بھی بیان فرما دی کہ اس کا بڑا فائدہ ہے اور وہ یہ ہے کہ اس سے موت یاد آتی ہے اور دنیا کے انقلاب پر عبرت حاصل ہونے کا کافی سبب ہے اور زیارت کرنے والا اہل قبور کے لئے یہ دعا پڑھے: السلام علیکم یا اھل الدیار من المؤمنین والمسلمین وانا ان شاء اللہ بکم لاحقون نسال اللہ لنا ولکم العافیة.

اور ایک روایت میں ہے: السلام علیکم یا اھل القبور، یغفر اللہ لنا ولکم وانتم سلفنا ونحن بالاثر، واللہ اعلم.

زکوٰۃ سے متعلق امور کا بیان

واضح ہو کہ زکوٰۃ میں سب زیادہ جس کی رعایت کی گئی ہے وہ دو مصلحتیں ہیں، ان میں سے ایک مصلحت انجام کار تہذیب نفس کرتی ہے اور وہ یہ ہے کہ نفوس کے اندر بخل پایا جاتا ہے اور بخل اخلاق میں سے بدترین عادت ہے جو آخرت کے اندر نہایت ضرر رساں ہے اور جب بخیل شخص مرجاتا ہے تو اس کا دل مال کے ساتھ الجھا رہتا ہے اور اس وجہ سے وہ عذاب میں مبتلا رہتا ہے، اور جو زکوٰۃ کا عادی ہو جاتا ہے اور بخل کو اپنے نفس سے دور کر دیتا ہے تو وہ اس کے لئے نافع ہے اور آخرت میں خدا تعالیٰ کی فرماں برداری کے بعد تمام اخلاق میں سب سے زیادہ نافع دل کی سخاوت ہے پس جس طرح خدا تعالیٰ کی فرمانبرداری نفس کے لئے خدا تعالیٰ کی کبریائی پر مطلع ہونے کی صفت پیدا کر دیتی ہے۔ اسی طرح سخاوت اس کی دنیاوی صفات رذیلہ سے بری کر دیتی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ سخاوت کی اصل یہ ہے کہ ملکیت بہیمیت پر غالب آجائے اور ملکیت اس پر حاکم ہو جائے اور بہیمیت ملکیت کے رنگ میں رنگین ہو کر اس کا حکم قبول کرنے لگے۔

اور ان اوصاف میں سے جن سے نفس کو تنبیہ ہوتی ہے اپنی ضرورت کے باوجود مال کا خرچ کرنا ہے اور ظالم کے ظلم کو معاف کرنا ہے اور حوادث کی سختیوں پر صبر کرنا ہے اس طرح سے کہ آخرت پر یقین رکھنے کی وجہ سے دنیا کی تکلیف اس کو آسان معلوم ہو اس واسطے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب باتوں کا حکم فرمایا اور ان میں سب سے زیادہ جو مشکل امر تھا یعنی مال کا خرچ کرنا ان کو چند حدود کے ساتھ منضبط فرمایا اور اس کا ذکر قرآن میں بہت سی جگہ نماز اور ایمان کے ساتھ آیا ہے، اللہ تعالیٰ نے دوزخیوں کے حال کی حکایت میں فرمایا ہے ''ہم نماز پڑھنے والوں میں سے نہ تھے

اور نہ مسکینوں کو کھانا کھلاتے تھے اور بکنے والوں کے ساتھ بکا کرتے تھے"۔ اور نیز جب کسی مسکین کو کوئی سخت حاجت پیش آتی ہے اور تدبیر الٰہی یہ چاہتی ہے کہ اس کی ضرورت اس طرح پر دور کی جائے کہ کسی شخص کے دل میں اس پر کچھ مال صرف کرنے کا الہام ہو تو وہ یونہی ہوتا ہے کہ اس کا دل الہام کے لئے کشادہ ہو جاتا ہے اور اس کی وجہ سے اس کو ایک روحانی انکشاف ہوتا ہے اور و رحمت الٰہی کے لئے سبب اور اس کے نفس کی تہذیب میں نہایت نافع ہوتا ہے اور وہ الہام جو احکام کے اندر لوگوں کی طرف بالاجمال متوجہ ہوتا ہے فوائد میں الہام تفصیلی سے کم درجہ کا ہوتا ہے اور نیز مزاج سلیم کی سرشت میں جنسی ہمدردی داخل ہوتی ہے اور یہ ایسی خصلت ہے جس پر بہت سے اخلاق جن کا انجام لوگوں کے ساتھ خوش معاملگی ہوتا ہے موقوف ہوتے ہیں پس جس شخص میں یہ خصلت نہیں اس میں ایک عیب ہے جس کا دور کرنا ضروری ہے، اور نیز صدقات سے گناہ معاف ہوتے ہیں اور برکات زیادہ ہوتے ہیں جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں اور دوسری مصلحت شہر سے متعلق ہے اور وہ یہ ہے کہ شہر میں ناتواں اور حاجتمند ضرور ہوتے ہیں اور یہ حوادث صبح ایک پر اور شام کو دوسرے پر ہوتے رہتے ہیں پس اگر فقرا اور حاجتمندوں کے ساتھ ہمدردی کا طریقہ لوگوں میں نہ ہو تو وہ ہلاک ہو جائیں اور بھوکے مر جائیں اور نیز شہر کا انتظام اس پر موقوف ہے کہ ایک مال مجتمع رہے جس سے ان لوگوں کی پرورش کی جائے جو شہر کی حفاظت میں مصروف رہتے ہیں اور اس کی تدبیر اور سیاست میں رہتے ہیں اور چونکہ وہ لوگ جو شہر کے رفاہ عام کے کاموں میں مشغول ہو کر اپنے اکتساب معاش سے باز رہتے ہیں تو ان کی پرورش بھی شہر کے ذمہ ہونی چاہئے اور مشترکہ اخراجات کے بعض تو بسہولت کفیل نہیں ہو سکتے یا بعض ان کو برداشت ہی نہیں کر سکتے اس واسطے ضروری ہوا کہ رعایا کے مال میں کچھ حصہ لینا مقرر کیا جائے۔ اور چونکہ آسان تر اور مصلحت کے زیادہ موافق اس سے بڑھ کر کوئی طریقہ نہ تھا کہ دونوں مصلحتوں میں سے ایک کو دوسرے کے ساتھ ملا دیا جائے اس واسطے شرع نے ایک کو دوسرے کے اندر داخل کر دیا۔

پھر اس بات کی ضرورت ہوئی کہ مقدار زکوٰۃ کو معین کیا جائے کیونکہ اگر کوئی اندازہ مقرر نہ ہوتا تو دینے والا کم کر کے دیتا اور لینے والا زیادتی سے لینا چاہتا، اور یہ بھی ضروری ہے کہ وہ مقدار نہ تو نہایت کم ہو کہ اس کے دینے سے ان کو بار نہ گزرے اور ان کے بخل کی بیخ کنی میں کوئی اثر نہ ہو

اور نہ اس قدر زیادہ ہو جس کا ادا کرنا ان پر مشکل ہو جائے، اور اس بات کی بھی ضرورت پڑی کہ ایک مدت مقرر کی جائے جس میں لوگوں سے زکوٰۃ لی جائے اور نیز یہ بات بھی ضروری تھی کہ وہ مدت نہ تو اس قدر کم ہو کہ اس کا دوران جلد جلد ہونے لگے اور ان میں زکوٰۃ کا ادا کرنا مشکل پڑ جائے اور نہ وہ مدت اس قدر دراز ہو کہ اس میں ادا کرنے سے ان کے بخل میں کوئی اثر نہ ہو اور محتاج اور محافظین کو بہت زیادہ انتظار کے بعد حاصل ہو اور مصلحت کے مناسب یہی ہے کہ زکوٰۃ لینے میں اس قانون کی رعایت کی جائے کہ لوگ عادل بادشاہوں کا اپنی رعایا سے زکوٰۃ وصول کرنے میں اس کے عادی ہوں کیونکہ جس چیز کے تمام عرب وعجم عادی ہیں اور وہ مثل ایک ضروری چیز کے ہے جس سے ان کے دلوں میں کوئی تنگی نہیں ہوتی اور وہ لوگوں کے نزدیک ایسی مسلم ہے جس کی محبت نے ان کی کوفت کو دور کر دیا ہے اس چیز سے لوگوں کو مکلّف کرنا ان کے قبول کرنے کے قریب اور ان پر مہربانی کرنے کے مناسب ہے۔ اور معتدل ملکوں کے صالح بادشاہ جن ابواب کے عادی ہیں اور وہ ان پر گراں بھی نہیں ہیں اور ان کو عقول نے قبول بھی کیا ہے وہ چار باب ہیں۔

اوّل یہ ہے کہ زکوٰۃ اموال نامیہ(۱) میں سے لی جائے کیونکہ انہی اموال کی زیادہ حفاظت کرنی پڑتی ہے اس واسطے کہ اموال کا بڑھنا شہر کے باہر آمد ورفت سے ہی پورا ہوتا ہے، اور نیز ان میں سے زکوٰۃ نکالنا ان پر بھی آسان تر ہے کیونکہ ہر وقت اس مال کو زیادہ ہوتے دیکھتے ہیں پس زکوٰۃ کی ادائیگی زائد مال سے ہو جاتی ہے اور بڑھنے والے اموال کی تین قسمیں ہیں۔

ایک تو جنگل میں چرنے والے مویشی جن کی نسلیں بڑھتی رہتی ہیں، دوسری زراعت، تیسری تجارت۔ اور دوم یہ ہے کہ زکوٰۃ ان لوگوں سے لی جائے جو متمول اور صاحب خزانہ ہیں کیونکہ سب سے زیادہ ان کو چوروں سے اور لٹیروں سے مال کی حفاظت کی ضرورت ہے اور ان پر اور اخراجات بھی پڑتے رہتے ہیں جن میں زکوٰۃ داخل کرنے سے ان پر کوئی بار نہیں پڑتا''۔

اور سوم یہ ہے کہ زکوٰۃ ان اموال نافعہ سے لی جائے جو لوگوں کو بغیر مشقت کے حاصل ہوتے ہیں جیسے زمانہ جاہلیت کے دفینے اور دشمنوں سے ہاتھ لگے ہوئے خزائن کیونکہ وہ بہ منزلہ مفت کے ہوتے ہیں جن میں سے زکوٰۃ کا دینا آسان ہے۔

---

(۱) وہ مال جس میں بڑھنے اور نمو کی صلاحیت ہو۔ (قاسمی)

چہارم یہ ہے کہ کمانے والوں پر کچھ ٹیکس مقرر کیا جائے (۱) کیونکہ وہ مخلوق میں عام اور بہ کثرت ہوتے ہیں اور جب ہر ایک سے تھوڑا تھوڑا وصول کیا جائے گا تو ان کو اس کا ادا کرنا آسان ہوگا اور فی نفسہ وہ کثیر ہوگا اور چونکہ دور کے شہروں سے تجارتوں کا جاری رہنا اور کھیتوں کا کٹنا اور پھلوں کا توڑا جانا سال میں ایک بار ہوتا ہے اور زکوٰۃ کی قسموں میں یہ قسم سب سے بڑی ہے اس واسطے ان چیزوں کے لئے ایک سال کی مدت مقرر کی گئی، اور نیز سال کے اندر ہر قسم کی فصلیں آتی ہیں جن کی طبائع مختلف ہیں اور سال کے اندر ان کے بڑھنے کا بھی احتمال ہوتا ہے اور ایک سال کی مدت اس قسم کے اندازوں کے لئے نہایت موزوں ہے، اور زیادہ سہل اور مصلحت کے موافق یہ صورت ہے کہ زکوٰۃ اموال کی قسم ہی سے لی جائے پس اونٹوں کی قطار میں سے ایک اونٹنی اور گایوں کے گلہ میں سے ایک گائے اور بکریوں کے ریوڑ میں سے ایک بکری لی جائے، پھر یہ ضرور ہے کہ مثال اور تقسیم اور تلاش سے ان اموال میں سے ہر ایک کو معلوم کیا جائے تا کہ وہ ان کی جامع مانع تعریفوں کی پہچان کا ذریعہ بن جائے پس اکثر شہروں میں اونٹ گائے اور بکریوں کو مویشی کہا جاتا ہے اور ان سب کو انعام کہتے ہیں اور گھوڑوں کے گلے اور ان کی نسلیں بہت کم ملکوں میں پائی جاتی ہیں جیسے ترکستان ہے، اور کھیتیاں اور اناجوں کو اور پورے ایک برس تک باقی رہنے والے پھلوں کو کہتے ہیں اور جو ایک برس تک باقی نہ رہ سکیں ان کو ترکاریاں کہتے ہیں، اور تجارت اس کا نام ہے کہ کوئی چیز اس غرض سے خریدی جائے کہ اس میں نفع ہو کیونکہ جو شخص ہبہ یا میراث سے کسی چیز کا مالک ہو جائے اور اتفاقاً اس نے اس کو فروخت کیا اور اس میں اس کو نفع ہوا تو اس کو تاجر نہیں کہتے، اور خزانہ، سونے اور چاندی کی بڑی مقدار کو کہتے ہیں، جو مدت دراز تک محفوظ رہے پس دس درہم یا بیس درہم کو خزانہ نہیں کہتے اگر چہ وہ سالہا سال تک باقی رہیں اور اسی طرح سونے چاندی کے علاوہ تمام اسباب کو بھی خزانہ نہیں کہتے گو وہ کثیر ہی ہو، اور جو چیز صبح اور شام آتی جاتی رہے اور وہ مستقل طور پر نہ ہو تو اس کو بھی خزانہ نہیں کہتے ہیں، پس یہ وہ مقدمات ہیں جو زکوٰۃ کے باب میں مسلمہ اصول کے مرتبہ میں قرار دیئے گئے ہیں، پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارادہ فرمایا کہ ان اشیا میں سے جو مبہم ہیں ان کو ان تعریفوں کے ساتھ منضبط فرمادیں جو عرب میں مشہور تھیں اور ان کے ہاں ہر امر میں مستعمل تھیں۔

---

(۱) یہ ٹیکس کوئی زیادہ بھاری نہ ہو بلکہ مناسب اور متوازن ہو جیسا کہ آپ نے اس کتاب میں دوسری جگہ اس کی تشریح کی ہے اور بھاری ٹیکس لگانے سے منع کیا ہے۔ (قاسمی)

سخاوت کی فضیلت اور بخل کی قباحت کا بیان

امور مذکورہ بالا کے بعد اس کی ضرورت پڑی کہ خرچ کرنے کے فضائل اور اس کی ترغیب بیان کی جائے تاکہ خدا کی راہ میں خرچ کرنا دلی رغبت اور سخاوت سے ہو اور یہی زکوٰۃ کی روح ہے اور اسی سے وہ اصلاح حاصل ہوتی ہے جس پر تہذیب نفس کا مدار ہے اور نیز اس بات کی ضرورت ہوئی کہ بخل کی برائیاں اور اس سے بے رغبتی کا حال بیان کیا جائے کیونکہ بخل ہی زکوٰۃ نہ دینے والے کے لئے ضرر کا مبدا ہے اور یہ ضرر یا تو دنیا میں ہوتا ہے کہ فرشتہ کہتا ہے اے اللہ تعالیٰ خرچ کرنے والے کو اس کا بدلہ عطا کر، اور دوسرا فرشتہ کہتا ہے اے اللہ تعالیٰ بخیل کو برباد کردے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''بخل سے بچو کیونکہ تم سے پہلے لوگوں کو بخل نے تباہ کردیا'' الحدیث، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''صدقہ خدا تعالیٰ کی غضب کو فرو کرتا ہے'' اور آپ نے فرمایا ''صدقہ گناہوں کو اس طرح سے دبا دیتا ہے جس طرح پانی آگ کو بجھا دیتا ہے'' اور آپ نے فرمایا ''پس خدا تعالیٰ صدقہ کو اپنے داہنے ہاتھ میں قبول فرماتا ہے اور پھر صدقہ دینے والے کے لئے اس کی پرورش کرتا ہے'' الحدیث،

میں کہتا ہوں اس ... بھید یہ ہے کہ عالم بالا کی دعا جو نبی آدم کے حال کی اصلاح میں ہوتی ہے اور رحمت جو اصلاح شہر یا تہذیب نفس میں کوشش کرنے والے کے حق میں پائی جاتی ہے اس خرچ کرنے والے کی طرف جھک پڑتی ہے اور ملاء سافل اور بنی آدم کے قلوب میں اس بات کا القا کرتی ہے کہ اس کے ساتھ احسان کریں اور وہ رحمت اس کے گناہوں کی معافی کا سبب ہو جاتی ہے اور خدا تعالیٰ کے اس صدقہ کو قبول فرمانے کے معنی یہ ہیں کہ عالم مثال میں اس عمل کی صورت

صاحب عمل کی طرف منسوب ہو کر پیدا ہو جاتی ہے پس اس جگہ ملاء اعلیٰ کی دعاؤں اور خدا تعالیٰ کی رحمت سے وہ صورت مکمل ہو جاتی ہے اور یا زکوٰۃ نہ دینے والے کے لئے یہ ضرر آخرت میں ہوتا ہے چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو کوئی سونا یا چاندی رکھتا ہے اور اس میں سے اس کا حق ادا نہیں کرتا قیامت کے روز اس کی تختیاں بنا کر اس کو داغ دیا جائے گا'' اور آپ نے فرمایا ''اس کا مال اس کے لئے زہریلا سانپ کی شکل میں ظاہر ہوگا'' اور اونٹ اور گائے اور بکری کے بارے میں بھی آپ نے ایسا ہی ارشاد کیا ہے

میں کہتا ہوں زکوٰۃ نہ دینے والے کو ایسی سزا ملنے کے دو سبب ہیں، ایک تو اصلی سبب ہے اور دوسرا اس کیلئے بہ منزلہ تا کید کے ہے، وہ سبب یہ ہے کہ جس طرح ایک صورت ذہنیہ دوسری صورت کو کشش کر لیتی ہے جیسا کہ نفس کے خیالات کا سلسلہ کہ ایک خیال سے دوسرا خیال پیدا ہوتا چلا جاتا ہے اور جس طرح ذہن کے اندر ایک صورت متضائفہ کا حاضر ہونا دوسری صورت متضائفہ کے حاضر ہونے کا تقاضہ کرتی ہے مثلاً بیٹا ہونا اور باپ ہونا اور جس طرح مٹی کے ظروف کا مٹی سے بھر جانا اور قوائے فکریہ کے اندر اس کے بخارات کا جوش مارنا، خواب میں عورتوں کی صورتیں دیکھنے کی طرف نفس میں تحریک پیدا کرتا ہے اور جس طرح دماغ کا تاریک بخارات سے پر ہو جانا نفس کے اندر ان چیزوں کی صورتیں پیدا کر دیتا ہے جو ایذا دینے والی اور ہولناک ہوتی ہیں مثلاً ہاتھی کی صورت، پس اسی طرح جب نفس پر قوت مثالیہ کا فیضان ہوتا ہے تو ادراکات کی طبیعت اس بات کو چاہتی ہے کہ اس کا بخل مال کی صورت میں اس کے سامنے ظاہر ہو اور اس صورت سے جس مال کے ساتھ بخل کرتا تھا اور جس کی نگرانی میں بہت تکلیف اٹھاتا تھا اور جس سے اس کے قوائے فکریہ پر تھے اس کی صورت بھی ظاہر ہو جس سے وہ اسی طریقہ کے موافق تکلیف اٹھائے جو طریقہ ان چیزوں سے تکلیف پہنچانے کا خدا تعالیٰ نے جاری کیا ہے، پس سونے اور چاندی سے تکلیف پہنچنے کی صورت داغ لگایا جانا ہے اور اونٹ سے تکلیف پہنچنے کی صورت اس کا پیروں تلے دابنا اور کاٹنا ہے وعلیٰ ہذا القیاس۔

اور چونکہ ملاء اعلیٰ کو یہ معلوم تھا اور ان کے نزدیک بندوں پر وجوب زکوٰۃ متعین تھا اور نفوس بشریہ کا ان چیزوں سے ایذا پانا بھی ان کے نزدیک متمثل تھا اس واسطے یہ میدان حشر میں اس

صورت کے فیضان کا سبب ہوگیا اور اس مال کا سانپ اور تختیوں کی صورت میں ظاہر ہونے میں فرق یہ ہے کہ سانپ کی صورت اس شخص کے لئے ظاہر ہوگی جس پر اجمالا مال کی محبت غالب ہے اس واسطے فی نفسہ مال کی صورت ایک چیز کی صورت میں ظاہر ہوگی اور اس مال کا نفس پر طوق کی طرح احاطہ کر لینا اور نفس کا اس سے ایذا پانا نہایت زہریلے سانپ کے ڈسنے کی صورت میں ظاہر ہوگا اور دوسری صورت ایسے شخص کے لئے ظاہر ہوگی جس کو سونے چاندی سے بعینہ محبت ہے اور اس کی حفاظت میں اپنی جان کھوتا ہے اور اس کے قوائے فکر یہ درہم و دینار کی صورتوں سے پُر ہیں پس یہ صورتیں اس کے لئے بڑی بڑی تکلیف دینے والی صورتوں میں ظاہر ہوں گی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''سخی اللہ تعالیٰ سے قریب ہے، جنت سے قریب ہے، لوگوں سے قریب ہے، دوزخ سے دور ہے، اور بخیل اللہ تعالیٰ سے دور ہے، جنت سے دور ہے، لوگوں سے دور ہے اور جہنم سے قریب ہے، اور جاہل سخی خدا تعالیٰ کو عابد بخیل سے پیارا ہے''۔

میں کہتا ہوں اس کا خدا تعالیٰ سے نزدیک ہونا یہ ہے کہ وہ شخص خدا تعالیٰ کی معرفت کے اور حجاب نفسانی کے دور کرنے کے قابل ہو جاتا ہے اور جنت سے نزدیک ہونا یہ ہے کہ وہ شخص صفات رذیلہ کو جو قوت ملکی کے بالکل منافی ہیں ترک کر کے اس بات کے قابل ہو جاتا ہے کہ اس کی قوت بہیمی جو ان صفات کا محل تھی قوت ملکی کے رنگ میں رنگ جائے، اور اس کا لوگوں سے نزدیک ہونا یہ ہے کہ لوگ اس سے محبت کرتے ہیں اور کوئی منازعت سے پیش نہیں آتا کیونکہ لڑائی جھگڑے کی اصل بخل ہی ہے، چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''بخل نے تم سے پہلے لوگوں کو ہلاک کیا اسی نے ان کو باہم خونریزی کرنے پر اور اپنے محارم کو حلال سمجھنے پر آمادہ کیا''۔ اور اللہ تعالیٰ کو جاہل سخی عابد بخیل سے زیادہ محبوب اس وجہ سے ہے کہ طبیعت جب کسی چیز کی سخاوت کرتی ہے تو اس کا اثر بہ نسبت اس کے زیادہ اور پورا ہوتا ہے کہ دباؤ اور مجبور ہو کر کچھ دیا جائے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''بخیل اور سخی کی حالت ان دو شخصوں کی سی ہے جن پر لوہے کی دو ڈھالیں ہوں''، الحدیث۔

میں کہتا ہوں اس حدیث میں سخاوت اور بخل کی حقیقت اور ان کی روح کی طرف اشارہ ہے اور یہ اس لئے کہ جب انسان کو خرچ کرنے کے مقتضیات ہر طرف سے گھیر لیتے ہیں اور وہ خرچ

کرنا چاہتا ہے تو وہ شخص اگر سخی النفس ہے تو اس کو ایک روحانی مسرت اور مال پر ایک طرح کا غلبہ حاصل ہوتا ہے اور اس کے سامنے مال حقیر و ذلیل معلوم ہوتا ہے اور اس کو اس مال کا خرچ کرنا آسان ہوتا ہے بلکہ اس کے خرچ کرنے سے اس کو راحت ہوتی ہے اور نفس کو صفات رذیلہ بہیمیت کے ساتھ جو تعلقات ہوتے ہیں اور جو نفس میں منقش ہوتی ہیں ان سب تعلقات کے ترک کرنے کے لئے یہ خصلت بہت عمدہ ہے، اور اگر وہ شخص بخیل ہے تو اس کا نفس مال کی محبت میں غرق ہو جاتا ہے اور اس کی آنکھوں کے سامنے اس مال کی خوبی متمثل ہو جاتی ہے اور اس کے دل پر قبضہ کر لیتی ہے پس وہ اس سے رہائی نہیں پا سکتا، اور نفس کے اندر صفات رذیلہ جم جانے میں اور نفس کو ان صفات کے ساتھ الجھا دینے میں یہ خصلت بخل نہایت موثر ہے اور اس تحقیق سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کے معنی بھی معلوم ہو جاتے ہیں "جنت میں نہ چغل خور داخل ہوگا اور نہ بخیل اور نہ احسان جتلانے والا" اور نیز اس قول کے بھی "کسی بندہ کے دل میں ایمان اور بخل کبھی جمع نہیں ہوگا"۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جنت کے آٹھ دروازے ہیں پس جو نمازی ہے وہ نماز کے دروازہ سے داخل ہوگا"۔ الحدیث

میں کہتا ہوں واضح ہو کہ جنت کی حقیقت ان امور سے نفس کا راحت پانا ہے جو عالم بالا سے نفس پر مترشح ہوتے ہیں اور وہ امور رضامندی اور موافقت اور اطمینان وغیرہ ہیں چنانچہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے "خدا تعالیٰ کی رحمت میں آ کر وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے" اور اس کے خلاف خدا تعالیٰ کا دوسرا قول ہے "وہی لوگ ہیں جن پر خدا تعالیٰ اور ملائکہ اور انسانوں کی لعنت ہے اور ہمیشہ وہ اس میں رہیں گے" اور بہیمیت کی تاریکیوں سے راحت کی طرف نفس کے نکلنے کا راستہ اسی خلق سے ہو سکتا ہے جس خلق میں ملکیت کے غالب ہونے پر اور بہیمیت کے مغلوب ہونے پر نفس پیدا کیا گیا ہے، پس بعض نفوس خشوع اور طہارت کی صفت میں ملکیت پر پیدا کئے گئے ہیں اور اس کی خاصیت یہ ہے کہ اس کو نماز سے بڑا حصہ ملتا ہے۔ اور بعض نفوس سخاوت کی صفت میں ملکیت پر پیدا کئے گئے ہیں اور اس کی خاصیت یہ ہے کہ اس شخص کا صدقات کے دینے میں اور ظالموں سے درگزر کرنے میں اور مسلمانوں کے ساتھ تواضع کرنے میں باوجود اپنی عزت نفس کے بڑا حصہ ہوتا ہے اور بعض نفوس وصف شجاعت ملکیت پر پیدا کئے گئے ہیں پس بندوں کی اصلاح کے لئے تدبیر الٰہی کا نفوس

میں القا ہوتا ہے پس اس القا کو قبول کرنے والی پہلی چیز جو ہے وہ شجاعت ہے پس اس شخص کو جہاد سے بڑا حصہ ملتا ہے، یا اس کا نفس ان لوگوں کے نفوس میں سے ہوتا ہے جن کے قوائے بہیمیہ اور ملکیہ میں باہم کشمکش رہتی ہے پھر اس کو الہام یا اس کا اپنا تجربہ اس بات کی تعلیم دیتا ہے کہ روزہ رکھنے سے اور اعتکاف کرنے سے قوت بہیمی کو شکست ہوتی ہے اور نفس کی تاریکیاں دور ہوتی ہیں پس وہ اس کو خوب سن کر خلوص دل سے قبول کر کے عمل میں لانے کی کوشش کرتا ہے تب اس کو رب الرّیان سے پورا پورا بدلہ دیا جاتا ہے۔

یہ وہی دروازے ہیں جن کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں تصریح کی ہے اور ممکن ہے کہ انہیں میں علما راسخین کا دروازہ ہو اور مصیبت زدہ اور فقرا کا دروازہ ہو اور اہل انصاف کا دروازہ ہو، چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سات شخصوں میں جن کو خدا تعالیٰ اپنے سایہ میں جگہ دیگا امام عادل کا بھی ذکر فرمایا ہے اور اس کی پہچان یہ ہے کہ لوگوں کے درمیان باہمی اتفاق میں وہ بڑی کوشش کرتا ہے اور ممکن ہے کہ باب التوکل اور بدشگونی پر عمل نہ کرنے کا باب بھی انہیں میں سے ہو اور ان ابواب میں سے ہر باب کے متعلق بہت سی احادیث مشہورہ وارد ہیں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ نفس کے رحمت الٰہی میں داخل ہونے کے یہ بڑے بڑے دروازے ہیں اور حکمت الٰہی کا تقاضا یہ ہے کہ اس جنت کے بھی جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے ان دروازوں کے مقابلہ میں آٹھ دروازے ہوں اور سابقین میں سے جو کاملین ہیں ان پر دو دو تین تین اور چار چار احسان کے دروازے کھولے جاتے ہیں پس قیامت کے روز ان کو ان دروازوں سے بلایا جائے گا اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے اس کا وعدہ کیا گیا ہے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جو فرمایا ہے کہ ''جس نے خدا کی راہ میں جوڑا خرچ کیا اس کو جنت کے دروازوں سے بلایا جائے گا''۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ اس کے بعض دروازوں سے بلایا جائے گا، اس امر کو زیادہ اہتمام کی غرض سے ذکر کے ساتھ خاص کیا ہے۔

زکوٰۃ کی مقدار کا بیان

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''پانچ وسق (۱) سے کم کھجوروں میں صدقہ نہیں ہے اور نہ پانچ اوقیہ (۲) سے کم چاندی میں صدقہ ہے اور نہ پانچ اونٹوں سے کم میں صدقہ (۳) ہے''۔

میں کہتا ہوں غلہ اور کھجوروں میں پانچ وسق کی مقدار اس لئے مقرر فرمائی کہ یہ مقدار ایک چھوٹے سے کنبے کے لئے ایک سال تک کافی ہو سکتی ہے اس واسطے کہ چھوٹے سے کنبے میں خاوند بیوی اور ایک نوکر یا ان کا ایک بچہ ہوتا ہے اور جو اس کے قریب قریب ہو وہ بھی اقل بیوت (۴) سے ہے، اور آدمی کی اکثر و بیشتر خوراک ایک رطل یا ایک مد ہوتی ہے پس جب ان میں سے ہر شخص اس غلہ میں سے اس قدر کھائے گا تو وہ ان کو سال بھر کو کافی ہو سکتا ہے اور کسی قدر دیگر حوائج اور سالن کے لئے باقی رہ سکتا ہے، اور چاندی میں پانچ اوقیہ کی مقدار اس لئے مقرر فرمائی کہ یہ مقدار بھی ایک چھوٹے سے چھوٹے گھر کو پورے سال کے لئے کافی ہو سکتی ہے بشرطیکہ اکثر ملکوں میں غلہ کا نرخ قریب قریب ہو، اور معتدل ملکوں کے لوگوں کی عادات کو تلاش کرنے سے گرانی اور ارزانی میں اس بات کا علم ہو سکتا ہے اور اونٹ کی مقدار پانچ مقرر کی گئی اور اس کی زکوٰۃ ایک بکری قرار دی گئی اگرچہ زکوٰۃ میں اصل یہ ہے کہ زکوٰۃ اسی مال میں سے لی جائے اور نیز زکوٰۃ کا نصاب ایک کثیر مقدار کو مقرر کیا جائے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اونٹ تمام مویشیوں میں عظیم الجثہ اور سب سے زیادہ فائدہ پہنچانے والا جانور ہے اس کو ذبح کر کے بھی کھا سکتے ہیں اور اس کی سواری بھی لے سکتے

---

(۱) وسق عرب میں ایک پیمانہ ہے جس میں ساٹھ صاع اناج آتا ہے اور ایک صاع ساڑھے تین سیر کا ہوتا ہے۔

(۲) ایک اوقیہ چالیس درہم کا ہوتا ہے اور ایک درہم چار آنہ سے کسی قدر کم ہوتا ہے۔ (۳) صدقہ سے مراد زکوٰۃ ہے۔

(۴) گھروں کے کم از کم خرچ۔

ہیں اس کا دودھ بھی پی سکتے ہیں اور اس سے نسل بھی بڑھا سکتے ہیں اور اس کے بال اور کھال سے بھی نفع حاصل کر سکتے اور بعض لوگ صرف تھوڑی سی اونٹنیاں پال لیتے تھے اور وہ ایک پوری دانگ (۱) کو کافی ہو جاتی تھیں اور اس زمانہ میں ایک اونٹ دس بکریوں اور کوئی آٹھ بکریوں اور کوئی بارہ بکریوں کے برابر شمار کیا جاتا تھا جیسا کہ بہت سی احادیث میں وارد ہوا ہے اس واسطے پانچ اونٹ بکریوں کے ادنی نصاب کے برابر مقرر کئے گئے اور ان میں ایک بکری ان کی زکوۃ مقرر کی گئی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''مسلمان پر اس کے غلام اور گھوڑے میں زکوۃ نہیں ہے''۔

میں کہتا ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ نسل بڑھانے کے لئے غلاموں کو جمع کرنے کا دستور نہیں ہے اور اس طرح بہت سے ملکوں میں گھوڑوں کی ایسی کثرت نہیں ہے جس کا مویشیوں کے بڑھنے کے لحاظ سے اعتبار کیا جائے اس واسطے غلام اور گھوڑا اموال نامیہ میں سے نہیں ہیں مگر جبکہ ان کو تجارت کی غرض سے پالا جائے، اور ابوبکر صدیق، عمر بن الخطاب، علی بن ابی طالب، ابن مسعود اور عمرو بن حزم وغیرہم رضی اللہ عنہم کی روایت سے ثابت ہے بلکہ تمام مسلمانوں میں یہ بات متواتر ہے کہ ہر پانچ اونٹ کی زکوۃ ایک بکری ہے پس جب پچیس ہو جائیں تو پینتیس تک ایک بنت مخاض (وہ بچہ جو ایک برس کا ہو کر دوسرے میں لگ جائے) ہے، پس جب چھتیس ہو جائیں تو پینتالیس تک ایک بنت لبون (وہ بچہ جو تیسرے برس میں لگ جائے) ہے، اور جب چھیالیس ہو جائیں تو ساٹھ تک ایک حقہ (وہ بچہ جو چوتھے برس میں ہو) ہے، پس جب اکسٹھ ہو جائیں تو پچھتر تک ایک جذعہ (وہ بچہ جو پانچویں برس میں شروع ہو) ہے، پس جب چھہتر ہو جائیں تو نوے تک دو بنت لبون ہیں، پس جب اکیانوے ہو جائیں تو ایک سو بیس تک دو حقے ہیں، پس جب ایک سو بیس سے زیادہ ہو تو ہر چالیس اونٹوں پر ایک بنت لبون اور ہر پچاس پر ایک حقہ ہے۔

میں کہتا ہوں اس میں اصل یہ ہے کہ جب اونٹنیوں کو اونٹوں کے گلوں پر تقسیم کرنا چاہا تو چھوٹی اونٹنی کو چھوٹے گلہ کے لئے اور بڑی اونٹنی کو بڑے گلہ کے لئے انصاف کی رعایت رکھتے ہوئے مقرر کیا اور یہ بات بھی دیکھی گئی کہ گلہ کا اطلاق ان کے عرف میں بیس سے زیادہ پر ہوتا ہے اس واسطے پچیس سے اس کو منضبط کیا، پھر ہر دس پر ایک برس کی زیادتی کو جو عرب میں نہایت

---

(۱) چھ رتی کا وزن۔ دانگانہ، گھر کا ساز و سامان اور اسباب

مرغوب ہے مقرر کیا اس کے بعد ہر پندرہ میں اس زیادتی کو مقرر کیا۔

اور نیز بکریوں کی زکوٰۃ میں ان کی روایت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جب چالیس ہو جائیں تو ایک سوبیس تک میں ایک بکری ہے پس جب ایک سوبیس سے زیادہ ہو جائیں تو دوسو تک میں دو بکریاں ہیں، پس جو دوسو سے زیادہ ہو جائیں تو تین سوتک میں تین بکریاں ہیں پس جب تین سو سے زیادہ ہو جائیں تو ہر سو پر ایک بکری ہے۔

میں کہتا ہوں اس میں اصل یہ ہے کہ بکریوں کا گلہ بڑا بھی ہوتا ہے اور چھوٹا بھی ہوتا ہے اور اس کے گلوں میں باہم بڑا فرق ہوتا ہے کیونکہ بکریوں کا پالنا آسان ہے اور ہر شخص اپنی گنجائش کے موافق پال سکتا ہے اس واسطے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے چھوٹے گلہ کا اندازہ چالیس بکریوں کے ساتھ کیا اور بڑے گلہ کا اندازہ چالیس کے سہ چند کے ساتھ کیا پھر ہر سو پر ایک بکری مقرر کی تا کہ حساب میں آسانی رہے اور گائے بیل کی زکوٰۃ میں حدیث صحیح مروی ہے کہ ہر تیس میں ایک سال کا بچھڑا یا بچھیہ ہے اور ہر چالیس میں دوسال کا بچھڑا یا بچھیہ ہے اور یہ اس لئے ہے کہ گائے بیل کی جنس اونٹ اور بکری کے درمیان میں ہے اس لئے اس میں دونوں کی مشابہت کا لحاظ رکھا گیا اور احادیث سے یہ بات بھی ثابت ہے کہ چاندی کی زکوٰۃ چالیسواں حصہ ہے پس اگر ایک سونوے درہم چاندی ہے تو اس میں کچھ زکوٰۃ نہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ سونا چاندی نہایت عمدہ مال ہے جس کے اندر مقدار کثیر صرف کرنے سے لوگوں کو ضرر ہوتا ہے اس واسطے اس کی زکوٰۃ سب اموال کی زکوٰۃ سے کم ہونا مناسب ہے اور سونے کو چاندی پر محمول کیا گیا ہے اور اس زمانہ میں ایک دینار دس درہم میں چلتا تھا اس واسطے سونے کا نصاب بیس مثقال (۱) مقرر ہوا، اور جو کھیت بارش یا چشموں سے سیراب ہوں یا وہ زمین عشری ہو تو اس میں دسواں حصہ ہے اور جن کھیتوں میں ہاتھ سے پانی دیا جائے تو ان میں بیسواں حصہ ہے کیونکہ جس میں محنت کم ہے اور پیداوار زیادہ ہے اس میں لگان زیادہ ہونا چاہئے اور جس میں محنت زیادہ ہے اور پیداوار کم ہے تو اس کے لگان میں تخفیف مناسب ہے۔

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انگور اور چھواروں کے تخمینہ کرنے میں فرمایا ''تہائی چھوڑ دو اور اگر تہائی نہ چھوڑ دو تو چوتھائی چھوڑ دو''۔

---

(۱) بیس مثقال ساڑھے چار ماشہ کے برابر ہوتے ہیں۔

میں کہتا ہوں تخمینہ کے جائز کرنے میں یہ راز ہے کہ اس میں کاشتکاروں کے لئے سہولت ہے کیونکہ وہ لوگ کچا پکا سب کھاتے ہیں اور صدقہ لینے والوں کے لئے بھی آسانی ہے کیونکہ وہ کھیتی کی حفاظت کرنے میں بڑی دقت برداشت کرتے ہیں اور چونکہ تخمینہ کرنے میں کمی بیشی کا احتمال ہوتا ہے اور زکوٰۃ میں تخفیف مناسب ہے اس واسطے تہائی یا چوتھائی چھوڑ دینے کا حکم فرمایا، اور جو چیز تجارت کے لئے ہو تو اس کی زکوٰۃ میں قیمت کا اعتبار ہے پس نقد کی زکوٰۃ پر اس کو قیاس کرنا ضروری ہے اور دفینہ میں پانچواں حصہ زکوٰۃ ہے کیونکہ اس کو ایک طرح سے مال غنیمت سے اور ایک طرح سے مفت سے مشابہت ہے اس واسطے اس کی زکوٰہ پانچواں حصہ مقرر کی گئی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں میں سے ہر غلام اور حر(۱) اور مرد اور عورت اور چھوٹے و بڑے پر صدقہ فطر میں ایک صاع چھوارے یا ایک صاع جو فرض کئے ہیں اور ایک روایت میں ایک صاع پنیر یا ایک صاع منقیٰ بھی آیا ہے۔

اور ایک صاع کی مقدار اس لئے مقرر کی کہ یہ ایک گھر کو شکم سیر کر سکتا ہے پس اس مقدار میں فقیر پورے طور پر بے پرواہ ہو سکتا ہے اور غالباً دینے والے کو بھی اس مقدار میں کچھ ضرر نہیں ہوتا، اور بعض روایات میں نصف صاع گیہوں کو ایک صاع جو کے برابر رکھا ہے کیونکہ اس وقت میں گیہوں کی گرانی تھی اس کو مالدار ہی کھا سکتے تھے اور غریب لوگ نہیں کھا سکتے تھے، زید بن ارقمؓ نے سرقہ کے قصہ میں اس کو بیان کیا ہے، پھر حضرت علیؓ نے فرمایا ''جب خدا تعالیٰ نے تمہارے لئے وسعت کرے تو تم بھی وسعت کرو'' اور صدقہ فطر کا وقت عید الفطر میں چند وجوہ سے مقرر کیا، از اں جملہ یہ ہے کہ اس کے سبب سے عید الفطر کے شعائر الٰہی ہونے کی تکمیل ہوتی ہے اور اس میں روزہ داروں کے لئے طہارت اور ان کے روزہ کی تکمیل ہوتی ہے جس طرح فرض نمازوں کی تکمیل سنتوں سے ہو جاتی ہے اور زیورات میں زکوٰۃ ہے یا نہیں اس امر میں مختلف احادیث وارد ہیں اور اس پر کنز کا اطلاق کرنا بعید ہے البتہ اس میں کنز کے معنی پائے جاتے ہیں مگر زیور کی زکوٰۃ ادا کر کے اختلاف سے بچنے میں زیادہ احتیاط ہے۔

---

(۱) آزاد۔

زکوٰۃ کے مصارف کا بیان

مصارف کے اندر اصل یہ ہے کہ شہر دو قسم کے ہوتے ہیں ان میں سے بعض ایسے شہر ہیں جہاں خالص مسلمان رہتے ہیں اور کسی غیر ملت کے لوگ ان کے ساتھ نہیں رہتے ایسے شہروں پر تخفیف کرنا مناسب ہے کیونکہ ایسے شہروں کو فوج جمع کرنے کی اور لڑائی کرنے کی ضرورت نہیں اور بسا اوقات ان شہروں میں ایسے لوگ موجود ہوتے ہیں جو عوام کے نفع کے کام اپنے متعلق کر لیتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے محسنین کے لئے جس اجر کا وعدہ کیا ہے اس کی تصدیق کی وجہ سے وہ رفاہ عام کے کام کرتے ہیں اور ان لوگوں کی معاش اپنے مالوں میں ہوتی ہے کیونکہ مسلمانوں کی بہت سی جماعتیں ایسے لوگوں سے خالی نہیں ہوتیں اور بعض ایسے شہر ہوتے ہیں جن میں ہر مذہب کے لوگ رہتے ہیں پس ایسے شہروں میں سختی کرنا مناسب ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے'' کافروں پر سخت ہیں باہم مہربان ہیں'' اور ایسے شہروں میں بہت سی فوج اور قوی مددگاروں کی ضرورت پڑتی ہے اور نیز اس کی بھی ضرورت ہے کہ ہر نافع کام پر اس کے قابل آدمی کو متعین کیا جائے اور اس کی ضرور یات بیت المال سے پوری کی جائیں پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں قسم کے شہروں میں سے ہر ایک کے لئے ایک طریقہ مقرر فرمایا اور محاصل کو مصارف کے لحاظ سے مقرر فرمایا، دوسری قسم کے مباحث عنقریب کتاب الجہاد میں آتے ہیں، خالص مسلمان آبادی کے شہروں سے جو عمدہ مال حاصل ہوتا ہے اس کی دو قسمیں ہیں جس طرح مصرف کی دو قسمیں ہیں ایک تو وہ مال ہے جو مالک کے قبضہ سے نکل گیا جیسے میت کا ترکہ جس کا کوئی وارث نہیں ہے اور گم شدہ مویشی جن کے مالک کا پتہ نہیں اور وہ گری پڑی چیز جو بیت المال کے لوگوں کو دستیاب ہوئی اور اس کی تشہیر کی گئی اور اس کا

کوئی مالک نہ معلوم ہوااوراسی قسم کے اموال، ان سب اموال کو ایسے کاموں میں خرچ کرنا چاہیے جن کا نفع عام ہواوراس میں کسی کی تملیک نہ پائی جائے جیسے نہروں کا جاری کرنا، پلوں کا بنانا، مساجد کی تعمیر کرنا، چشموں اور کنوؤں کا کھودنا اور اسی قسم کے کام اور دوسری قسم مسلمانوں کے صدقات ہیں جو بیت المال میں جمع کئے جاتے ہیں ایسے اموال کو ان مواقع میں خرچ کرنا چاہیے جس میں کسی کو مالک بنایا جائے اوراس بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ''**انما الصدقات للفقراء والمساکین**'' **الایة**.

اوراس میں مختصر بیان یہ ہے کہ اس نوع کی حوائج اگر چہ بے شمار ہیں لیکن سب سے بڑھ کر ان میں تین ہیں: ایک محتاج لوگ اور ان کو شارع نے فقرا اور مساکین اور مسافروں اور قرضداروں کے اندر منحصر کیا ہے، دوسرے محافظین ہیں اور شارع نے ان کو مجاہدین اور زکوٰۃ وصول کرنے والوں میں منحصر کیا ہے، اور تیسرے یہ ہے کہ وہ مال ان فتنوں کے دور کرنے میں صرف کیا جائے جو مسلمانوں میں واقع ہو گئے ہیں یا غیر مسلموں کی طرف سے ان فتنوں کے واقع کرنے کا خطرہ ہے۔

اور یہ اس طور سے ہوتا ہے کہ کسی ضعیف الاسلام کی معاونت کی جائے جو کفار کے ساتھ میل پیدا کر لیتا ہے یا کوئی کافر جو فریب کا ارادہ رکھتا ہے اس کو مال کے ذریعہ روک دیا جاتا ہے اوران سب کو مولفہ قلوب کا لفظ شامل ہے، یا مسلمانوں کے باہمی جھگڑوں میں اس مال کو صرف کیا جاتا ہے اوروہ لفظ غارم میں آتا ہے جو تاوان دینے والا ہے کسی کے بوجھ میں جس کو اس نے اٹھالیا ہے اوران پر تقسیم کرنے کی صورت کہ کن لوگوں کو پہلے دیا جائے اور کس قدر دیا جائے امام کی رائے پر موقوف ہے۔

اور حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ اپنے مال کی زکوٰۃ سے آزاد کر سکتا ہے اور حج کے لئے دے سکتا ہے اور امام حسنؒ سے بھی ایسا ہی مروی ہے پھر انھوں نے اس آیت کو پڑھا: **انما الصدقات للفقراء**، ان مواضع سے جس میں دے گا، کافی ہو گا، اور ابوالعاصؓ سے مروی ہے کہ نبی علیہ السلام نے ہم کو حج میں زکوٰۃ کے اونٹوں پر سوار کیا، حدیث صحیح میں وارد ہے ''بے شک تم زکوٰۃ طلب کر کے خالد پر ظلم کرتے ہو حالانکہ اس نے اپنی زرہ اور ہتھیار خدا کی راہ میں محبوس

کر دیئے ہیں'' اس حدیث سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں ایک یہ ہے کہ ایک چیز کا بدلہ دوسری چیز کا دینا جبکہ اس میں فقرا کا زیادہ نفع ہو درست ہے، دوسرے یہ کہ راہ خدا میں صرف کر دینا صدقہ کی جگہ کافی ہوسکتا ہے۔

میں کہتا ہوں اس تقدیر پر اس آیت ''انما الصدقات للفقراء'' میں حصر اضافی ہے یعنی بہ نسبت ان مصارف کے حصر ہے جن میں منافقین اپنی خواہش کے موافق صرف کرنے کے لئے مانگتے تھے جیسا کہ سیاق آیت سے معلوم ہوتا ہے اور اس میں راز یہ ہے کہ حاجات بے شمار ہوتی ہیں اور ان شہروں میں جن کے باشندے صرف مسلمان ہی ہیں بیت المال کے اندر سوائے زکوٰۃ کے اور کوئی مال کثیر نہیں ہوتا اس واسطے اس میں وسعت دینا ضروری ہے تا کہ وہ مال شہر کی ضروریات کو کافی ہو سکے، واللہ اعلم۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''یہ صدقات لوگوں کے میل ہوتے ہیں اور وہ نہ محمد کے لئے حلال ہیں اور نہ محمد کی اولاد کے لئے حلال ہیں''۔

میں کہتا ہوں صدقات کے میل ہونے کی یہ وجہ ہے کہ صدقات گناہوں کو دور کرتے ہیں اور بلا کو دفع کرتے ہیں اور بندہ کی طرف سے ان باتوں میں وہ فدیہ بن جاتے ہیں پس ملاء اعلیٰ کی نظروں میں یہ صدقات بالکل میل ہی دکھائی دیتے ہیں جس طرح صورت ذہنیہ ولفظیہ وخطیہ میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ صورتیں اسی شئے خارجی کا وجود ہیں جس کے مقابلہ میں یہ صورتیں ہیں اور اس کو ہم وجود تشبیہی کہتے ہیں، پس بعض نفوس عالیہ کو یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ ان صدقات میں ایک قسم کی تاریکی ہے اور بعض امکنہ سافلہ کی طرف اس امر کا نزول ہوتا ہے اور کبھی بعض اہل مکاشفہ کو بھی یہ تاریکی معلوم ہو جاتی ہے۔

اور میرے والد ماجد (۱) قدس سرہ بھی اس امر میں اپنا مکاشفہ بیان فرماتے تھے جس طرح صالحین کو زنا اور اعضاء خبیثہ کا ذکر ناگوار معلوم ہوتا ہے اور وہ اچھی چیزوں کے ذکر کو محبوب رکھتے ہیں اور اللہ پاک کے نام کی تعظیم کرتے ہیں۔

اور نیز جس مال کو انسان بغیر کسی چیز کے عوض کے یا نفع کے لیتا ہے اور اس دینے میں اس

(۱) حضرت شاہ عبدالرحیم محدثؒ

انسان کی عزت مقصود نہیں ہوتی تو اس مال کے لینے میں اس شخص کو ذلت اور اہانت حاصل ہوتی ہے اور مال دینے والے کو اس پر فضیلت اور احسان ہوتا ہے چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے'' پس اس طرح کا کمانا تمام پیشوں میں بدترین پیشہ ہے اور جو لوگ دین کے بزرگ اور پاک ہیں ان کی شان کے بالکل لائق نہیں، اور اس حکم میں ایک راز ہے اور وہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اگر خود صدقہ لیتے اور اپنے خاص لوگوں کے لئے اور ان لوگوں کے لئے جنکا نفع اپنا ہی نفع ہے اس کے لینے کو جائز فرماتے تو لوگ آپ سے بدگمانی کرتے اور آپ کے حق میں نامناسب باتیں کرتے اس واسطے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دروازہ کو بالکل بند کر دیا اور یہ بات ظاہر کر دی کہ صدقات کے منافع انہیں کے لئے ہیں اور انہیں کے اغنیا سے لیکر انہیں کے فقرا کو دیئے جاتے ہیں تا کہ ان پر رحمت اور شفقت ہو اور ان کو نیکی نصیب ہو اور شر سے امان ہو۔

اور جبکہ سوال کرنے میں بڑی ذلت ہوتی ہے اور سوال کرنے والا حیا سے نکل جاتا ہے اور اس کی مروت میں نقصان آجاتا ہے اس واسطے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بجز ایسی ضرورت کے جس کی وجہ سے آدمی مجبور ہو سوال کرنے میں بڑی سختی فرمائی اور نیز جب لوگوں کو سوال کرنے کی عادت پڑ جائے اور ان کو سوال کرنے میں کچھ غیرت معلوم نہ ہو اور بھیک کے ذریعہ ان کو زیادہ مال حاصل ہو جائے تو اس کی وجہ سے ضروری پیشوں کا متروک ہونا لازم آتا ہے یا ان پیشوں کی قلت ہو جاتی ہے اور مالداروں پر بلا وجہ تنگی لازم آتی ہے پس حکمت شرعیہ کا مقتضی یہ ہوا کہ سوال سے عار کرنے کی صورت ان کے سامنے ظاہر کی جائے تا کہ بلا سخت ضرورت کے کوئی اس پر اقدام نہ کرے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو لوگوں سے اس لئے سوال کرتا ہے کہ مال زیادہ ہو تو اس کا منہ چھلا ہوا ہوگا یا انگارہ ہوگا جس کو وہ جہنم سے کھائے گا''۔

میں کہتا ہوں اس میں یہ راز ہے کہ اس کا رنج جو لوگوں سے سوال کرتے وقت اس کو پہنچتا ہے اس چیز کی صورت میں ظاہر ہوگا جس کے پکڑنے سے تکلیف ہوتی ہے جیسے انگارہ یا اس کے کھانے سے تکلیف ہوتی ہے جیسے آگ میں بریاں کیا ہوا پتھر، اور اس کا لوگوں میں ذلیل ہونا اور اس کی آبرو کا برباد ہونا اس صورت میں ظاہر ہوگا جو منہ پر خراش ہونے کے بہت مشابہ ہے اور اس شخص کے بارے میں جس کو ایسی مصیبت پہنچی جس کی وجہ سے اس کا تمام مال برباد ہو گیا یہ آیا ہے

کہ اس کے لئے سوال کرنا جائز ہے یہاں تک کہ اس کی معاش حاصل ہو جائے اور اس غنا کا اندازہ جس کی وجہ سے سوال کرنا منع ہے ایک اوقیہ یا پچاس درہم حدیث میں آیا ہے، اور نیز ایک حدیث میں اس کا اندازہ اتنے کھانے کے ساتھ آیا ہے جو اس کو صبح کے لئے یا شام کے لئے کافی ہو سکے اور ہمارے نزدیک ان احادیث میں اختلاف نہیں ہے کیونکہ لوگوں کے مختلف درجے ہوتے ہیں اور ہر شخص کا ایک جدا پیشہ ہوتا ہے جس سے جدا ہونا اس کے لئے ناممکن ہے۔ میری مراد امکان سے وہ امکان ہے جو ان علوم میں مستعمل ہوتا ہے جن میں سیاست مدن سے بحث کی جاتی ہے نہ کہ وہ امکان جو علم تہذیب النفس میں بولا جاتا ہے پس جو شخص دستکاری سے کماتا ہے تو جب تک اس کے پاس اس کے حرفہ کے آلات نہ ہوں وہ اس حرفہ سے معذور ہے اور جو شخص تاجر ہے وہ اس وقت تک معذور ہے جب تک اس کے پاس سرمایہ تجارت نہ ہو، اور جو شخص مجاہد ہو کہ صبح وشام غنائم ہی سے کھاتا ہے جیسا کہ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے تو اس کے لئے اس مقدار کا اندازہ ایک اوقیہ یا پچاس درہم ہے اور جو شخص بازار میں بار برداری کر کے یا لکڑیاں فروخت کر کے اوقات بسر کرتا ہے اور اسی قسم کے پیشے کرتا ہے تو اس کے حق میں غنا کا اندازہ یہ ہے کہ صبح یا شام کو شکم سیر ہو جائے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''سوال کرنے میں لپٹا نہ کرو، خدا کی قسم ایسا نہیں ہوتا کہ تم میں سے کوئی شخص مجھ سے کچھ مانگے اور اس کا مانگنا مجھ سے اس کو کچھ دلوادے مگر میں خوش نہ ہوں اور پھر میری دی ہوئی چیز میں اس کے لئے برکت ہو''۔

میں کہتا ہوں اس کا راز یہ ہے کہ جو نفوس ملاء اعلیٰ کے ساتھ ملحق ہیں ان میں کراہیت اور رضامندی کی صورت ذہنیہ بہ منزلہ دعائے مستجاب کے ہوتی ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''یہ مال سبز اور شیریں ہے پس جو اس کو دل کی خوشی سے حاصل کرے گا اس کے لئے اس میں برکت دی جائے گی اور جو اس کو حرص سے لے گا تو اس کے لئے اس میں برکت نہ ہوگی اور اس کا حال اس شخص کا سا ہوگا جو کھاتا ہے اور شکم سیر نہیں ہوتا''۔

میں کہتا ہوں کہ کسی چیز میں برکت ہونے کی چند قسمیں ہیں ادنیٰ قسم یہ ہے کہ اس شئے سے دل مطمئن ہو اور دل کو بیقراری نہ ہو مثلاً دو شخص ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کے پاس بیس بیس درہم

ہیں ان میں سے ایک کو اپنے تنگدست ہونے کا خوف ہے اور دوسرے کا دل خوف سے دور ہے اور اس پر امید کا غلبہ ہے، اس کے بعد زیادتی نفع برکت کی دوسری قسم ہے جیسے دو شخصوں کے پاس مساوی مال ہے ان میں سے ایک نے ضروری اور نافع کام میں اس کو صرف کیا اور اس کے صرف کرنے میں صالح تدبیر کا الہام ہوا اور دوسرے شخص نے اس مال کو ضائع کر دیا اور اس کو تدبیر نصیب نہ ہوئی اور نفس اس برکت کو اس طرح کھینچ لیتا ہے جس طرح دعا کھینچ لے جاتی ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو شخص سوال کرنے سے بچے گا خدا تعالیٰ اس کو محفوظ رکھے گا'' الحدیث۔

میں کہتا ہوں اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان کیفیات نفسانیہ کے حاصل کرنے میں ہمت کے مجتمع ہونے اور ارادہ کے مضبوط ہونے کو بڑا دخل ہے۔

زکوٰۃ سے متعلق امور کا بیان

اس کے بعد لوگوں کو اس بات کی نصیحت کرنے کی ضرورت ہوئی کہ صدقہ وصول کرنے والے کو خوش دلی سے صدقہ ادا کیا کریں اور اس بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جب تمہارے پاس صدقہ وصول کرنے والا آئے تو چاہئے کہ وہ تم سے خوش ہو کر رخصت ہو'' (۱) اور اس میں حکمت یہ ہے کہ وہ اصلاح جو نفس سے متعلق ہے پائی جائے اور آپ نے یہ بھی چاہا کہ زکوٰۃ روکنے میں لوگوں کے اس عذر کا دروازہ بند ہو جائے کہ ان سے یہ جبر وصول کی جاتی ہے چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''پس اگر صدقہ وصول کرنے والے انصاف کریں گے تو اپنے لئے کریں گے اور اگر ظلم کریں گے تو اپنے اوپر کریں گے'' اور اس حدیث میں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول میں کوئی اختلاف نہیں کہ ''جس شخص سے اس سے زیادہ مانگا جائے تو وہ نہ دے'' اس واسطے کہ ظلم کرنے کی دو صورتیں ہیں ایک وہ صورت ہے جس کا حکم نص نے ظاہر کر دیا اور اس کے متعلق یہ ہے کہ نہ دینا چاہئے اور ایک صورت ہے جس میں اجتہاد کی گنجائش ہے اور گمان متعارض ہوتے ہیں ان مواضع میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عذر کے دروازہ کو بند کر دیا، اور صدقہ وصول کرنے والے کو بھی اس بات کی وصیت کرنے کی ضرورت ہوئی کہ صدقہ وصول کرنے میں زیادتی نہ کرے اور ان کے نفیس نفیس مال سے بچے اور خیانت نہ کرے تا کہ انصاف پایا جائے اور بہت سے مقاصد حاصل ہو سکیں، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فرمایا ہے ''پس قسم اس ذات کی

---

(۱) اسی حکم میں مدارس کے محصلین وسفرا بھی شامل ہیں۔ اہل ثروت کو ان کا احترام کرنا چاہئے اور زکوٰۃ کی رقومات کی ادائیگی میں ٹال مٹول کا طریقہ نہیں اپنانا چاہئے۔ اور سفرائے مدارس عربیہ کو بھی ضبط وتحمل سے کام لینا چاہئے۔

جس کے قبضہ میں میری جان ہے اس میں سے وہ کچھ نہ لے گا مگر قیامت کے دن اپنی گردن پر لائے گا اگر وہ اونٹ ہے تو بلبلاتا ہوگا'' اس کا راز ہمارے اس بیان سے خوب ظاہر ہوتا ہے جو ہم نے مانعین زکوۃ کے بارے میں ذکر کیا، اور نیز اس بات کی بھی ضرورت ہوئی کہ مال والوں کے حیلے اور فریب کا دروازہ بند کیا جائے اور اس کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ صدقہ کے ڈر سے متفرق اموال کو مجتمع نہ کیا جائے اور نہ مجتمع اموال کو متفرق کیا جائے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' آدمی کا اپنی زندگی میں ایک درہم صدقہ کرنا مرتے وقت سو درہم صدقہ کرنے سے بہتر ہے'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' ایسے وقت میں دینے والے کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کوئی شخص سیر ہو جائے اور پھر اوروں کو ہدیہ دے''۔

میں کہتا ہوں اس میں راز یہ ہے کہ جس چیز کی اس کو حاجت نہیں ہے اور نہ اس کو اپنے لئے اس کی حاجت کی امید ہے ایسی چیز کا صدقہ کرنا پوری پوری سخاوت پر مبنی نہیں ہے پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان خصلتوں کی تعلیم کا قصد کیا جو بخل کو دور کر دیں یا تہذیب نفس یا باہم الفت ومحبت میں کام آئیں پس ان کو بھی صدقہ کے ذیل سے گردانا تا کہ معلوم ہو جائے کہ ثمرات میں وہ صدقات کے ساتھ شریک ہیں، چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' دو شخصوں میں انصاف کر دینا صدقہ ہے اور اپنی سواری پر بٹھا کر کسی کو مدد کرنا صدقہ ہے اور اچھی بات کہنا صدقہ ہے اور ہر قدم جو نماز کے لئے اٹھتا ہے صدقہ ہے اور لا الہ الا اللہ کہنا اور اللہ اکبر کہنا اور سبحان اللہ کہنا صدقہ ہے اور اسی قسم کی باتیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' جو کوئی مسلمان کسی ننگے بدن مسلمان کو کپڑا پہنائے گا خدا تعالیٰ اس کو جنت کا لباس پہنائے گا''۔ الحدیث۔

میں کہتا ہوں کہ ہم کئی بار یہ ذکر کر چکے ہیں کہ طبیعت مثالیہ یہ چاہتی ہے کہ معانی اپنے مناسب اور مشابہ صورت میں متشکل ہوں اور مثلاً کھانا کھلانے میں کھانے کی صورت پائی جاتی ہے اور خواب اور واقعات میں اور معانی کا جسموں کی صورتوں کے ساتھ متشکل ہونے میں اس بات کا معتبر ہونا تم کو ظاہر ہو سکتا ہے۔

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کی وبا کو جو ایک سیاہ عورت کی صورت میں دیکھا اس کی وجہ

اس مقام سے تم کو معلوم ہو سکتی ہے، پھر بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنے اہل و اقارب کو چھوڑ کر غیروں کو صدقہ دیا کرتے ہیں اور اس کے اندر ان لوگوں کی رعایت کا جن کی رعایت کرنا زیادہ ضروری ہے ترک پایا جاتا ہے اور اس میں سو تدبیر ہے اور قریب لوگوں کے ساتھ الفت اور محبت کو ترک کرنا ہے اس واسطے ضرورت ہوئی کہ اس دروازہ کو بھی بند کر دیا جائے پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''ایک وہ دینار ہے جس کو تو خدا کی راہ میں خرچ کرے اور ایک وہ دینار ہے جس کو تو کسی کی جان چھڑانے میں خرچ کرے اور ایک وہ دینا ہے جو تو کسی مسکین کو دے اور ایک وہ دینار ہے جس کو تو اپنے اہل پر خرچ کرے ان سب میں اس دینار کا اجر زیادہ ہے جس کو تو نے اپنے اہل پر خرچ کیا ہے'' اور اس حدیث میں کہ ''بہتر صدقہ وہ ہے جو حالت غنا میں دیا جائے اور پہلے اس کو دو جو تمہارے اہل و عیال میں سے ہے'' اور اس حدیث میں کہ ''کسی نے آپ سے عرض کیا کہ کون سا صدقہ افضل ہے؟ آپ نے فرمایا تنگدست کا صدقہ کی وجہ سے تکلیف برداشت کرنا، اور اپنے اہل و عیال سے دینا شروع کرو'' کچھ منافات نہیں ہے کیونکہ ہر حدیث ایک معنی اور ایک خاص وجہ پر محمول ہو سکتی ہے، پس غنا سے اصطلاحی غنا مراد نہیں ہے بلکہ غنا نفس یا کنبہ کے لئے رزق کا کافی ہونا مراد ہے یا ہم کہتے ہیں غنی کے صدقہ سے اس کے مال میں برکت ہوتی ہے اور مفلس کا صدقہ اس لئے افضل ہے کہ وہ بخل کو خوب دور کرتا ہے اور وہ قوانین شرعیہ کے زیادہ مناسب ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''خزانچی مسلمان امانت دار جو مالک کے حکم کے موافق پورا پورا دیتا ہے وہ بھی بہ منزلہ صدقہ دینے والے کے ہے''۔

میں کہتا ہوں کسی ایسی چیز کا نکالنا جو اس پر واجب اور طیب خاطر اور خوش دلی کی وجہ سے دینے سے انکار نہ کرنا اس شخص کی سخاوت کی پہچان ہے لہٰذا اصلی متصدق کے بعد یہ شخص بھی متصدق ہے اور ان دونوں حدیثوں میں کچھ اختلاف نہیں ہے، یعنی ''جو عورت اپنے شوہر کی کمائی میں سے اس کی بلا اجازت صدقہ دے گی تو اس کو نصف اجر ملے گا'' اور یہ کہ آپ نے حجۃ الوداع میں فرمایا ''کوئی عورت اپنے خاوند کے گھر میں سے بلا اجازت کچھ خرچ نہ کرے اس پر کسی نے کہا کیا کھانا بھی نہ دے؟ آپ نے فرمایا وہ تو ہمارے مالوں میں سب سے افضل مال ہے'' اور نہ اس حدیث میں کوئی تعارض ہے کہ ''ایک عورت نے آپ سے عرض کیا کہ ہم اپنی اولاد اور اپنے مال

باپ اور اپنے خاوندوں پر بوجھ ہوتے ہیں پس ان کے مالوں میں سے ہم کو کس قدر حلال ہے؟ آپ نے فرمایا تر چیزیں کہ تم ان کو کھا سکتی ہو اور دے سکتی ہو' اور تعارض نہ ہونے کی یہ وجہ ہے کہ اول حدیث اس موقع میں ہے جہاں خاوند نے عموماً یا دلالۃً اجازت دی ہو اور کسی چیز کی صراحت کے ساتھ اور خصوصیت کے ساتھ اجازت نہ دی ہو اور خاوند صدقہ نہ دیتا ہو پس جب عورت نے صدقہ نکالا ہے تو یہ اس سے تسلیم کیا جائے گا اور خاوند کے مال میں اس قدر تصرف درست ہے جس قدر لوگوں میں دستور ہے اور اس میں خاوند کے مال کی اصلاح بھی ہو جیسے ہری چیزیں کہ اگر وہ کسی کو نہ دی جائیں تو خراب ہو کر ضائع ہو جائیں اور ان کے سوا اور چیزوں میں تصرف درست نہیں ہے اگر چہ کھانے کی قسم سے ہو، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''صدقہ دے کر واپس نہ لو کیونکہ جو دے کر پھر لیتا ہے گویا وہ اپنی قئے کو کھاتا ہے''۔

میں کہتا ہوں اس کا سبب یہ ہے کہ صدقہ کرنے والا جب خریدنا چاہتا ہے تو اس کے حق میں رعایت کی جاتی ہے یا وہ خود رعایت چاہتا ہے پس اسی قدر اس صدقہ کے ثواب میں کمی ہو جاتی ہے کیونکہ صدقہ کی روح مال سے قلبی تعلق کا ہٹا لینا ہے اور جب اس کے دل میں یہ خیال رہا کہ وہ چیز اس کو بہ رعایت مل جائے تو اس کو اس چیز سے پوری بے تعلقی نہ ہوئی اور نیز شارع کو عمل کی صورت کا کامل ہونا مطلوب ہے اور اس کے واپس لینے میں نقصان پایا جاتا ہے اور جس زمین سے ہجرت کر جائے پھر اس میں آ کر مرنے کی کراہت کی یہی وجہ ہے، واللہ اعلم۔

روزہ کی تفصیلات

چونکہ قوت بہیمی کی شدت قوت ملکی کے احکام ظاہر ہونے سے مانع تھی اس واسطے اس کا مغلوب کرنا ضروری ہوا اور چونکہ اس کی شدت اور جوش کا باعث کھانا پینا اور لذائذ شہوانیہ میں منہمک ہونا تھا اور اس انہماک کا وہ اثر ہوتا ہے جو شکم سیر کھانے پینے کا بھی نہیں ہوتا اس واسطے ضروری ہوا کہ اس کے مغلوب کرنے کا طریق ان اسباب میں کمی کرنے سے ہو، اسی وجہ سے جو لوگ احکام ملکی کا ظاہر ہونا چاہتے ہیں وہ سب باوجود اختلاف مذاہب کے اور ملکوں کے دور دراز ہونے کے ان اسباب کی تقلیل اور نقص میں متفق ہیں اور یہ بھی مقصود ہے کہ بہیمیت ملکیت کی اس طرح تابع ہو جائے کہ اس کے کہنے پر عمل کرے اور اسی کے رنگ میں رنگین ہو جائے اور یہ بھی مقصود ہے کہ ملکیت اس سے اس طرح علیحدہ رہے کہ اس کے خراب رنگ کو قبول نہ کرے اور اس میں اس کے نقوش رذیلہ منقش نہ ہوں جس طرح مہر کے نقوش موم کے اندر منقش ہو جاتے ہیں اور اس کا سوائے اس کے کوئی طریقہ نہیں ہے کہ قوت ملکی کسی شئے کا تقاضا کرے اور قوت بہیمی کو اس کا القا کرے اور اس کے سامنے پیش کرے پس وہ اس کو تسلیم کر لے اور اس سے سرکشی نہ کرے اور کسی طرح سے انکار نہ کرے اور پھر کسی بات کا تقاضا کرے اور اسی طرح پھر قوت بہیمی اس کو تسلیم کرے اور پھر بار بار یہی امر پیش ہوتی کہ اس کو اطاعت کی عادت ہو جائے اور وہ امور جن کو ملکیت چاہتی ہے اور وہ بہیمیت پر بہت شاق گزرتے ہیں ایسے ہیں جن سے ملکیت کو سرور اور بہیمیت کو انقباض ہوتا ہے جیسے عالم ملکوت سے تشبیہ پیدا کرنا اور خدا تعالیٰ کی کبریائی پر معرفت حاصل کرنا کیونکہ یہ امور ملکیت کا خاصہ ہیں بہیمیت کو ان سے بہت بعد ہے یا ان چیزوں کا ترک کرنا جن کو بہیمیت

چاہتی ہے اور ان سے لذت حاصل کرتی ہے اور ہیجان کی حالت میں ان چیزوں کی بہت مشتاق رہتی ہے اور یہ بات روزہ سے حاصل ہو سکتی ہے اور چونکہ ان امور پر مداومت کرنا باوجود تدابیر ضروریہ اور ازواج و اموال کے ساتھ مشغول ہونے کے سب لوگوں سے ممکن نہ تھا اس واسطے یہ امر ضروری ہوا کہ کچھ زمانہ کے بعد ایک مقدار معین کا التزام کیا جائے جس میں ملکیت کے ظہور کا حال اور اس کے مقتضیات سے خوش ہونا معلوم ہو جایا کرے اس سے پیشتر جو کوتاہی ہو گئی ہے اس کا کفارہ ہو جایا کرے اور اس کا حال اس گھوڑے کا سا ہو جائے جس کا رسہ کسی میخ سے بندھا ہوتا ہے اور وہ دائیں بائیں چکر لگا کر پھر وہیں تھان پر آ کھڑا ہوتا ہے، مداومت حقیقی کے بعد اس مداومت کا درجہ ہے، پھر یہ ضروری ہوا کہ اس کی ایک مقدار مقرر کی جائے تاکہ اس میں کوئی کمی نہ کر سکے اور وہ کمی کرنے والا اس عبادت کو اس قدر عمل میں لائے جو اس کے لئے کافی و نافع نہ ہو، یا افراط کرنے والا اس قدر زیادتی کرے کہ اس کو اتنا عمل میں لائے جس سے اس کے ارکان میں کاہلی پیدا ہو اور اس کا نشاط جاتا رہے اور اپنے نفس کو ہلاک کر کے درگور ہو جائے، روزہ ایک تریاق ہے جو سموم نفسانیہ کے دور کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے حالانکہ اس کے اندر لطیفہ انسانیہ کے مقام اور اس کے جائے ظہور یعنی بدن کو تکلیف اور مشقت بھی پہنچتی ہے اس واسطے بقدر ضرورت اس کا معین کرنا ضروری ہوا، پھر خورد و نوش کم کرنے کے دو طریق ہیں ایک تو یہ کہ بہت ہی کم کھایا جائے دوسرے یہ کہ کھانے پینے میں مقدار معتاد سے زیادہ دیر کرے اور شرع کے اندر تقلیل کا دوسرا طریق معتبر ہے کیونکہ اس کی وجہ سے آدمی کمزور ہوتا ہے اور تھکتا ہے اور اس وقت بھوک و پیاس کی کیفیت محسوس ہو جاتی ہے اور بہیمیت کو اس کی وجہ سے پریشانی اور خوف لاحق ہو جاتا ہے اور ان امور کا طاری ہونا اس کو محسوس ہوتا ہے، اور تقلیل کے پہلے طریق میں ایک طرح کا ضعف برابر ہوتا رہتا ہے اور نفس کو اس کی پرواہ نہیں ہوتی حتی کہ انسان اس سے بالکل تھک جاتا ہے، اور نیز تقلیل کے پہلے طریق کا بغیر مشقت کے سب لوگوں کو حکم نہیں دیا جا سکتا کیونکہ لوگوں کی حالتیں مختلف ہوتی ہیں کسی کی خوراک ایک رطل اور کسی کی خوراک دو رطل ہوتی ہے اور جو خوراک ایک کے لئے پوری ہوتی ہے وہ دوسرے کے لئے باعث ہلاکت ہوتی ہے اور جس قدر مدت کا کھانے میں فصل ہوتا ہے اس پر تمام عرب و عجم اور تمام صحیح المزاج لوگوں کا اتفاق ہے اور وہ سب صبح و شام کھاتے

ہیں یا رات اور دن میں ایک بار کھا رتے ہیں، اور رات تک کھانا نہ کھانے سے بھوک کی کیفیت معلوم ہو جاتی ہے اور یہ نہیں ہو سکتا کہ مکلفین کی رائے پر مقدار قلیل کو چھوڑا جائے اور یہ کہہ دیا جائے کہ ہر ایک اتنا کھا لیا کرے جس سے قوت بہیمی مغلوب رہے کیونکہ یہ قاعدہ شرعیہ کے خلاف ہے۔

مثل مشہور ہے کہ جس نے بھیڑیئے کو بکریوں کا چرواہا بنایا تو اس نے ظلم کیا اور احسانیات میں ایسی باتوں کی گنجائش ہے، پھر یہ بھی ضرور ہے کہ یہ درمیانی مدت مہلک نہ ہو جیسے تین شب و روز کیونکہ یہ بھی مقصود شرعی کے خلاف ہے اور نہ ہی تمام مکلفین اس پر عمل کر سکتے ہیں اور نیز یہ بھی ضروری ہے کہ بھوکا رہنا بار بار ہوتا کہ وہ اس کے عادی ہو جائیں اور ان میں تابعداری کا مادہ پیدا ہو ورنہ ایک مرتبہ بھوکا رہنے میں کچھ فائدہ نہیں ہے خواہ کیسی ہی سخت بھوک ہو، اور یہ بات بھی ضروری تھی کہ نفس کا مغلوب ہونا جو غیر مہلک ہے اس کا انضباط اور اس کی تکرار کا انضباط ان مقداروں سے کیا جائے جو ان میں مستعمل ہیں جن کو ہر ذی عقل اور بے وقوف، شہری اور دیہاتی سب جانتے ہیں اور ان کو یا ان کی نظیر کو لوگوں کی بڑی بڑی جماعتیں استعمال میں لاتی ہیں تاکہ ان کی شہرت اور تسلیم سے ان کی دشواری جاتی رہے ان امور کے اعتبار کرنے سے یہ بات ضروری ہوئی کہ روزہ کا انضباط پورے مہینہ تک ہر روز کھانے اور پینے اور جماع سے نفس کو باز رکھنے کے ساتھ کیا جائے کیونکہ ایک دن سے کم کی مقدار کھانا دیر سے کھانے میں شمار ہے اور رات میں ان امور کا ترک کرنا ایک امر عادی ہے جس کی لوگ کچھ پرواہ نہیں کرتے اور ہفتہ دو ہفتہ ایسی قلیل مقدار ہے جو نفس پر پورا اثر نہیں کرتی، اور دو ماہ کی مقدار ایسی ہے جس میں آنکھیں بیٹھ جاتی ہیں اور نفس تھک جاتا ہے اور ہم نے اس امر کا بے شمار دفعہ مشاہدہ کیا ہے اور ان امور کے اعتبار کرنے سے یہ بات بھی ضروری ہوئی کہ دن کا انضباط صبح صادق کے طلوع سے غروب آفتاب تک کیا جائے کیونکہ عرب کا یہی حساب ہے اور یہی ان کے دن کی مقدار ہے اور عاشورہ کے دن روزہ رکھنے میں ان کے ہاں یہی حساب مشہور ہے، اور مہینہ کا حساب ایک چاند دیکھنے سے دوسرے چاند دیکھنے تک ہے کیونکہ اسی کو عرب مہینہ کہتے ہیں اور شمسی مہینوں سے وہ حساب نہیں کرتے اور جبکہ سب کو مکلّف بنانا اور تمام لوگوں کی اصلاح اور تمام عرب وعجم کی بہبودگی مطلوب تھی تو اس بات کی ضرورت ہوئی کہ لوگوں کو اس مہینہ میں اختیار نہ دیا جائے تاکہ ہر شخص اپنے لئے اس مہینہ کو اختیار

کرلیا کرے جس میں روزہ رکھنا آسان ہو کیونکہ اس میں عذر کرنے کا اور بچ کر نکل جانے کا دروازہ کھلتا ہے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا دروازہ بند ہوتا ہے اور اس میں اسلام کے ایک عظیم الشان عبادت کا گمنام کر دینا ہے اور نیز اہل اسلام کی بڑی بڑی جماعتوں کا ایک زمانہ میں ایک چیز پر اجتماع کرنا اور ایک کا دوسرے کو دیکھنا ان کے لئے اس عبادت کا عمل پر ہمت کے پیدا ہونے کا اور اس کے آسان ہونے کا سبب ہے، اور نیز ان کے اس اجتماع سے ہر خاص و عام پر قوت ملکی کی برکات نازل ہوتی ہیں اور کاملین سے کم درجہ کے لوگوں پر ان کے انوار کا پرتو پڑتا ہے اور پھر ان کی دعائیں سب کو گھیر لیتی ہیں۔

اور جب ایک مہینہ کا مقرر کرنا ضروری ہوا تو اس مہینہ سے کوئی مہینہ بہتر نہیں ہے جس میں قرآن نازل ہوا اور ملت مصطفوی کی تکمیل ہوئی اور شب و روز کے پائے جانے کا بھی اس مہینہ میں قوی احتمال ہے جیسا کہ ہم عنقریب ذکر کریں گے پھر اس مرتبہ کا بیان کرنا بھی ضروری ہے جو ہر غافل و ہوشیار اور ہر فارغ و مشغول کے لئے درکار ہے اور جس نے اس میں کوتاہی کی اس نے اصل حکم میں کوتاہی کی اور مرتبہ کمال کا بیان کرنا بھی ضروری تھا جو نیک لوگوں کا طریقہ اور سابقین کا دستور ہے، پس اول مرتبہ رمضان کا روزہ رکھنا اور پنج گانہ نماز پر اکتفا کرنا ہے اس واسطے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس نے عشا اور صبح کی نماز جماعت سے پڑھی تو گویا اس نے تمام شب عبادت کی اور دوسرا مرتبہ پہلے مرتبہ پر کمیت اور کیفیت میں بڑھا ہوا ہے اور وہ رمضان کی راتوں میں عبادت کرنا اور تمام اعضا اور زبان کو بری باتوں سے روکنا ہے اور ماہ شوال میں چھ روز اور ہر ماہ میں تین روز اور یوم عاشورہ اور یوم عرفہ کا روزہ رکھنا اور رمضان کے اخیر عشرہ میں اعتکاف کرنا ہے پس یہ مقدمات روزہ کے باب میں بہ منزلہ اصول کے ہیں پس جب یہ مقدمات ثابت ہو گئے تو اب ہم ان احادیث کی شرح کرتے ہیں جو روزہ کے باب میں وارد ہیں۔

روزہ کی فضیلت کا بیان

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جب رمضان آتا ہے تو جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور ایک روایت میں ہے کہ رحمت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور جہنم کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں اور شیاطین زنجیروں میں باندھ دیئے جاتے ہیں''۔

میں کہتا ہوں: واضح ہو کہ رمضان کے مہینہ میں یہ فضل صرف جماعت مسلمین کے لئے ہے کیونکہ کفار رمضان کے مہینہ میں بہ نسبت اور مہینوں کے زیادہ اندھے اور گمراہ ہوتے ہیں اس وجہ سے کہ وہ شعائر الٰہی کی ہتک کرنے میں اور بھی زیادہ بڑھ جاتے ہیں لیکن مسلمان جب روزہ رکھتے ہیں اور نمازیں پڑھتے ہیں اور جو ان میں سے کاملین ہیں وہ انوار کے دریا میں غوطہ لگاتے ہیں اور ان کی دعائیں ان کو چاروں طرف سے احاطہ کر لیتی ہیں اور ادنیٰ لوگوں پر ان کے انوار کا پرتو پڑتا ہے اور ان کی برکات تمام جماعت پر چھا جاتی ہیں اور ہر شخص حسب استعداد عبادات سے قریب اور معاصی سے بعید ہوتا ہے تو اس بات کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ ان پر جنت کے دروازے کھل جاتے ہیں اور جہنم کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں کیونکہ جنت کی اصل خدا تعالیٰ کی رحمت اور دوزخ کی اصل خدا تعالیٰ کی لعنت ہے، اور کیونکہ زمین والوں کا ایک صفت پر متفق ہونا اس کے موافق خدا تعالیٰ کے وجود کو متوجہ کر لیتا ہے جیسا کہ ہم نے استقا اور حج میں بیان کیا ہے اور اس بات کی بھی تصدیق ہو جاتی ہے کہ شیاطین قید کر لئے جاتے ہیں اور فرشتے ان میں پھیلا دیئے جاتے ہیں کیونکہ شیطان اسی شخص میں اثر کرتا ہے جو اس کے اثر کو قبول کرنے کی استعداد رکھتا ہے اور یہ استعداد بہیمیت کے غلبہ سے پیدا ہوتی ہے اور وہ روزہ کے سبب سے مغلوب ہو جاتی ہے اور فرشتے بھی اسی کے قریب ہوتے ہیں جس میں ان کے اثر کو قبول کرنے کی استعداد ہوتی ہے اور وہ استعداد قوت ملکی کے ظہور سے ہوتی ہے اور روزہ کے سبب سے قوت ملکی کا ظہور ہو جاتا ہے اور نیز رمضان میں اس رات کے ہونے کا احتمال ہے جس میں خدا تعالیٰ کی طرف سے ہر چیز کی تقسیم ہوتی ہے پس ضرور بالضرور اس وقت میں انوار مثالیہ اور ملکیہ منتشر ہو جاتی ہیں اور ان کی [illegible] جاتی ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو شخص رمضان کے روزے ایمان اور ثواب کے ارادہ سے رکھے اس کے تمام پہلے گناہ بخشے جاتے ہیں''۔

میں کہتا ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ رمضان کے روزے رکھنے میں قوت ملکی کے غالب ہونے اور قوت بہیمی کے مغلوب ہونے کا احتمال ہے اور اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کی رحمت کے دریا میں غوطہ لگانے کے لئے یہ کامل مقدار ہے اس واسطے یہ ضروری ہے کہ وہ نفس کو ایک حال سے دوسرے حال میں بدل دیتا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس شخص نے ایمان اور ثواب کے قصد

سے شب قدر میں عبادت کی اس کے پہلے گناہ بخشے گئے''۔

میں کہتا ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ روحانیت کے انتشار کے وقت اور عالم مثال کے غلبہ کے ظاہر ہوتے وقت جب کوئی عبادت پائی جاتی ہے تو اس وقت میں وہ عبادت نفس میں وہ اثر کرتی ہے جو دوسرے اوقات میں کئی مرتبہ اس عبادت کو کرنے سے بھی اس جیسا اثر نہیں کرتی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''بنی آدم کے ہر نیک عمل کا ثواب دس گنا سے سات سو گنا تک زیادہ دیا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا سوائے روزے کے کیونکہ وہ خاص میرے لئے ہے اور میں ہی اس کی جزا دونگا اور روزہ دار میرے لئے اپنی خواہش اور کھانے کو ترک کردیتا ہے''۔

میں کہتا ہوں نیکی کے بڑھ جانے کی وجہ یہ ہے کہ انسان جب مرجاتا ہے اور قوت بہیمی کی مدد اس سے منقطع ہوجاتی ہے اور جو لذتیں اس کے مناسب تھیں ان سے روگردانی کرلیتا ہے تو قوت ملکی کا ظہور ہوتا ہے اور بالطبع اس کے انوار روشن ہوجاتے ہیں اور اعمال کی جزا اور سزا ملنے کی یہی وجہ ہے کہ پس اگر نیک عمل ہوتا ہے تو تھوڑا عمل بھی ملکیت کے ظہور اور اس عمل کے اس کے مناسب ہونے کی وجہ سے اس وقت بہت ہوجاتا ہے اور روزہ کو مستثنیٰ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اعمال کا صحائف میں لکھا جانا اس طرح پر ہوتا ہے کہ ہر عمل کی صورت عالم مثال کے ایک مقام میں جو اس شخص کے لئے خاص ہے اس طرح متصور ہوتی ہے کہ اس کے سبب سے اس کے عمل کی جزا کی صورت جب وہ شخص جسمانی حجابات سے الگ ہوجاتا ہے ظاہر ہوجاتی ہے اور ہم نے بارہا اس کا مشاہدہ کیا ہے اور نیز اس امر کا مشاہدہ کیا ہے کہ اعمال کی جزا لکھنے والے فرشتے بسا اوقات اس عمل کے جزا کے ظاہر کرنے میں جو شہوات نفسانیہ کے ساتھ مجاہدہ کرنے کے قبیل سے ہے توقف کرتے ہیں کیونکہ اس کے ظاہر کرنے میں اس خلق نفس کی مقدار معلوم کرنے کو دخل ہے، جس سے یہ عمل صادر ہوا ہے اور فرشتے اس ذوق سے اور اس وجہ سے ان سے بھی آگاہ نہیں ہوتے ہیں اور یہ جو حدیث میں آیا ہے کہ فرشتے کفارات اور درجات کے بارے میں باہم نزاع کرتے ہیں اس کی بھی یہی وجہ ہے کہ بس اس وقت خدا تعالیٰ فرشتوں کو وحی کرتا ہے کہ اس عمل کو بعینہ لکھ لو اور اس کی جزا میرے سپرد کردو، اور اللہ تعالیٰ کا یہ قول کہ ''میرا بندہ روزہ دار اپنی خواہش اور کھانا میرے لئے ترک کرتا ہے'' اس طرف اشارہ ہے کہ روزہ ان کفارات میں سے ہے جن کی سختی نفس بہیمیہ کو پہنچتی

ہے اور اس حدیث کے لئے ایک بطن اور ہے جس کی طرف اسرار صوم میں ہم نے اشارہ کر دیا ہے اس کو وہاں دیکھنا چاہئے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''روزہ دار کے لئے دو خوشیاں ہیں ایک افطار کے وقت اور ایک خدا تعالیٰ سے ملنے کے وقت پہلی خوشی تو طبعی ہے کہ جو نفس کو مطلوب کے حاصل ہونے کے وقت ہوتی ہے اور دوسری خوشی الٰہیہ ہے کہ جو روزہ دار کے حجاب جسمانی سے الگ ہونے اور عالم بالا سے علم یقین کا فیضان ہونے کے وقت تقدس کے آثار ظاہر ہونے کے قابل ہونے سے ہوتی ہے جس طرح نماز سے تجلی ثبوتی کے اسرار ظاہر ہوتے ہیں چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''طلوع اور غروب کے پہلے تم کسی نماز پر مغلوب نہ کئے جاؤ گے'' اس مقام پر اور بہت سے اسرار ہیں جن کو ظاہر کرنے کی اس کتاب میں گنجائش نہیں ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''البتہ روزہ دار کے منہ کی بو خدا کے نزدیک مشک کی خوشبو سے بہتر ہے۔

میں کہتا ہوں اس کا راز ہے کہ عبادت کے پسندیدہ ہونے سے اس کا اثر بھی پسندیدہ ہو جاتا ہے اور عالم مثال میں عبادت کی جگہ وہ اثر متمثل ہو جاتا ہے پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے ملائکہ کے خوش ہونے اور خدا تعالیٰ کی رضامندی کو ایک پلہ میں رکھا اور مشک سونگھنے سے بنی آدم کے سرور کو ایک پلہ میں رکھا تا کہ یہ غیبی راز آپ ان پر ظاہر کر دیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''روزے ڈھال ہیں''۔

میں کہتا ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ روزہ شیطان اور نفس کے شر سے بچاتا ہے اور ان کے اثر سے انسان کو دور رکھتا ہے اور ان کی مخالفت پر آمادہ کرتا ہے اس واسطے روزہ کے لئے مناسب یہی ہے کہ آدمی اپنی زبان کو اقوال اور افعال شہوانی سے محفوظ رکھ کر کامل طور پر اس کو ڈھال بنائے اور اسی طرف آپ نے اپنے اس قول میں اشارہ فرمایا ہے ''کہ روزہ دار بری بات نہ کہے''۔ اور بہیمیت کے افعال سے بھی باز رہے اور اس کی طرف آپ نے اس قول میں اشارہ فرمایا ہے کہ ''روزہ دار شور و شغب نہ کرے'' اور اقوال کی طرف اس قول میں اشارہ کیا ہے کہ ''جو کوئی روزہ دار کو گالی دے'' اور افعال کی طرف اس قول میں اشارہ کیا ہے کہ ''جو کوئی اس سے لڑے'' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''پس روزہ دار کو کہنا چاہئے کہ میں روزہ دار ہوں'' بعض کے نزدیک تو اس کو

زبان سے ہی کہہ دینا کافی ہے اور بعض کہتے ہیں کہ دل میں یہ کہہ دے اور بعض کے نزدیک فرض کے روزے اور نفل کے روزے میں فرق ہے اور ہر ایک میں گنجائش کا موقع ہے۔

روزہ کے احکام کا بیان

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''نہ بغیر چاند دیکھے روزہ رکھو اور نہ بغیر چاند دیکھے افطار کرو، پھر اگر ابر ہو جائے تو اندازہ کرلو، اور ایک روایت میں ہے کہ تیس روزے پورے کرلو۔

میں کہتا ہوں چونکہ روزہ کا زمانہ قمری مہینہ کے ساتھ رویت ہلال کے اعتبار سے منضبط تھا اور وہ کبھی تیس دن اور کبھی انتیس دن کا ہوتا ہے اس واسطے اشتباہ کی صورت میں اس اصل کی طرف رجوع کرنا واجب ہوا اور نیز احکام کی بنیاد ان امور پر ہونی چاہئے جن کو ان پڑھ لوگ بھی جانتے ہوں نہ کہ تعمق اور محاسبات نجومیہ پر بلکہ شریعت نے ان چیزوں کو مٹایا ہے، چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ''ہم ان پڑھ لوگ ہیں نہ لکھنا جانتے ہیں اور نہ حساب کرنا'' اور آپ نے فرمایا ''عید کے دونوں مہینے کم نہیں ہوتے رمضان اور ذی الحجہ'' بعض کے نزدیک یہ معنی ہیں کہ دونوں مہینے ایک ساتھ انتیس انتیس کے نہیں ہوتے، اور بعض نے کہا کہ تیس اور انتیس کا اجر برابر ہے اور باہم کچھ فرق نہیں ہے اور یہ اخیر معنی قواعد شرعیہ کے زیادہ مناسب ہیں گویا آپ نے اس بات کو دفع کرنا چاہا کہ کسی کے دل میں یہ خیال نہ گزرے کہ انتیس کا اجر کم ہوتا ہے۔

واضح ہو کہ روزہ کے باب میں تعمق کے اسباب بند کرنا اور جو تکلّفات لوگوں نے پیدا کر لئے ہیں ان کا رد کرنا اہم مقاصد میں سے تھا کیونکہ یہ عبادت یہود اور نصاریٰ اور عرب میں سے ان لوگوں میں جنھوں نے اہل کتاب کا دین پسند کیا تھا شائع اور جاری تھی اور چونکہ انھوں نے اس بات کا خیال کیا کہ روزہ میں اصل نفس کا مغلوب کرنا ہے اس واسطے انھوں نے تعمق کیا اور روزہ کے اندر وہ امور ایجاد کئے جن سے نفس اور زیادہ مغلوب ہوتا ہے اور اس کے اندر دین الٰہی کی تحریف ہوتی ہے اور یہ تحریف یا زیادتی کم ہوتی ہے اور یا زیادتی کیف سے ہوتی ہے، پس کمیت کی زیادتی سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح منع فرمایا کہ ''رمضان سے ایک یا دو روز پہلے کوئی روزہ نہ رکھے مگر جو شخص پہلے سے اس دن روزہ رکھتا ہو سو وہ روزہ رکھ لے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عید کے دن اور شک کے دن روزہ رکھنے سے منع فرمایا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس روزہ میں اور رمضان

میں کوئی فصل نہیں ہے پس شاید وہی لوگ اس کو سنت سمجھ لیں اور پھر متاخرین اس کو ان سے لے لیں اور اسی طرح ان کے بعد کا طبقہ، اور دین میں تحریف ہو جائے، اور حقیقت میں تعمق یہ ہے کہ موضع احتیاط کو لازم بنالیا جائے اور یوم شک اسی میں داخل ہے۔

اور کیف کے اندر زیادتی سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح منع کیا ہے کہ آپ نے لوگوں کو صوم وصال سے منع فرمایا ہے اور سحری کھانے کی رغبت دلائی ہے اور سحری کو دیر سے کھانے کا حکم دیا ہے اور روزہ جلد افطار کرنے کا حکم فرمایا کیونکہ یہ سب باتیں تشدد اور تعمق کی ہیں جو جاہلیت کے افعال میں سے ہیں، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول میں کہ ''جب نصف مہینہ شعبان کا گزر جائے تو اس میں روزہ نہ رکھو، اور ام سلمہؓ کی اس حدیث میں کہ ''میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سوائے شعبان اور رمضان کے کبھی پے در پے دو مہینے کے روزے رکھتے نہیں دیکھا'' کچھ تعارض نہیں ہے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بذات خود ایسے افعال کیا کرتے تھے جن کا اپنی امت کو حکم نہیں دیتے تھے اور اکثر یہ افعال ذرائع بند کرنے اور مظنات کلیہ کے مقرر کرنے کے قبیل سے ہوتے تھے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کسی شئے کو بے محل استعمال کرنے یا جس حد تک ان افعال کو عمل میں لانے کا حکم دیا گیا ہے اس سے بڑھ کر ملال خاطر اور ضعف جسمانی کی طرف پہنچنے سے مامون ومحفوظ تھے اور بجز آپ کے اور کوئی شخص مامون نہیں ہے پس وہ قانون شرعی کے مقرر کرنے اور باب تعمق کے بند کرنے کی طرف محتاج ہیں، اسی واسطے نبی صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو چار بیویوں سے زیادہ رکھنے سے منع کرتے تھے اور آپ کے لئے نو بلکہ اس سے بھی زیادہ حلال کی گئی تھیں کیونکہ منع کرنے کی علت یہ ہے کہ ظلم لازم نہ آئے۔

پھر چاند کا دیکھنا ایک نیک مسلمان یا مستور الحال کی اس شہادت سے ثابت ہو جاتا ہے کہ میں نے چاند دیکھا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے دونوں صورتوں میں چاند کا ہو جانا ثابت ہوتا ہے ''ایک اعرابی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اس نے کہا کہ میں نے چاند دیکھا ہے آپ نے فرمایا کہ کیا تو اس بات کی گواہی دیتا ہے؟ الحدیث (۱)

---

(۱) کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں؟ اس نے کہا ہاں، آپ نے فرمایا اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے پیغمبر ہیں؟ اس نے کہا ہاں۔ آپ نے فرمایا اے بلال لوگوں میں اس بات کا اعلان کر دو کہ کل وہ روزہ رکھیں۔

اور ایک مرتبہ حضرت ابن عمرؓ نے بیان کیا کہ انھوں نے چاند دیکھا ہے تو آپ نے روزہ رکھ لیا، اور جس قدر امور دینیہ ہیں ان سب کا یہی حکم ہے اور ان کا حال مثل روایت حدیث کے ہے،
نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''سحری کھایا کرو کیونکہ سحری کھانے میں برکت ہے''۔

میں کہتا ہوں اس میں دو برکتیں ہیں ان میں سے ایک اصلاح بدن سے تعلق رکھتی ہے کہ وہ خراب نہیں ہوتا اور نہ وہ ضعیف ہوتا ہے کیونکہ ایک پورے دن کا امساک روزہ کی مقدار ہے پس اس میں زیادتی نہیں کرنی چاہئے اور دوسری برکت تدبیر دینی سے تعلق رکھتی ہے کہ دین کے اندر تعمق نہ ہو اور اس میں تحریف اور تغیر داخل نہ ہو، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جب تک لوگ افطار میں جلدی کرتے رہیں گے خیریت سے رہیں گے'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''ہمارے اور اہل کتاب کے روزہ میں فرق سحری کھانے کا ہے'' اور خدا تعالیٰ نے فرمایا ''میرے سب بندوں میں میرے نزدیک وہ زیادہ محبوب ہیں جو جلدی افطار کرتے ہیں''۔

میں کہتا ہوں یہ اس طرف اشارہ ہے کہ اس مسئلہ میں اہل کتاب سے تحریف ہوگئی ہے پس ان کی مخالفت کرنے اور ان کی تحریف رد کرنے میں ملت اسلامی کا قیام ہے اور جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے روزہ پر روزہ رکھنے سے منع فرمایا تو کسی نے عرض کیا کہ آپ تو پے در پے روزہ رکھتے ہیں، آپ نے فرمایا تم میں سے مجھ سا کون ہے مجھ کو اللہ تعالیٰ رات میں کھلاتا اور پلاتا ہے۔

میں کہتا ہوں صوم وصال سے منع کرنے کے دو سبب ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ روزہ جان کی ہلاکت کا سبب نہ ہو جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں اور دوسرا سبب یہ ہے کہ دین کی تحریف نہ ہو اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کی طرف اشارہ فرما دیا ہے کہ آپ ہلاک نہیں ہو سکتے کیونکہ آپ کو قوت ملکیہ نوریہ سے تائید ہوتی رہتی ہے اور آپ ہلاکت سے مامون ہیں، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول میں کہ ''جس نے فجر سے پیشتر روزہ کی نیت نہ کی اس کا روزہ نہیں ہوتا'' اور اس قول میں جس وقت آپ کو کھانا نہیں ملتا تھا کہ ''میں اس وقت روزہ رکھنے والا ہوں'' کوئی تعارض نہیں، کیونکہ اوّل قول فرض روزہ کے بارے میں ہے اور دوسرا نفل روزہ کے بارے میں ہے اور نفی سے مراد نفی کمال ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''تم میں سے کوئی جب اذان سنے اور اس کے ہاتھ میں برتن

ہوتو جب تک اپنی حاجت پوری نہ کرلے برتن نہ رکھے''۔

میں کہتا ہوں اذان سے مراد خاص اذان ہے یعنی (۱) حضرت بلالؓ کی اذان اور یہ حدیث اس حدیث کا اختصار ہے کہ''بلال رات میں اذان دیتا ہے''نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا''تم میں سے کوئی شخص افطار کرے تو چھوارے سے افطار کرے کیونکہ اس سے روزہ کھولنے میں برکت ہے اور اگر چھوارے نہ ملے تو پانی سے افطار کرے کیونکہ وہ پاک چیز ہے''۔

میں کہتا ہوں شیریں چیز کی طرف طبیعت کا میلان ہوتا ہے بالخصوص بھوک لگنے کے بعد اور جگر شیریں چیز کو پسند کرتا ہے اور عرب کے طبائع چھوارے کی طرف مائل ہوتی ہیں اور ایسے امور میں میلان طبع کو ایک اثر ہوتا ہے پس لامحالہ طبیعت اس شئے کو بدن کے ایک محل مناسب میں استعمال کرلیتی ہے، اور یہ ایک قسم کی برکت ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا''جس نے روزہ دار کا روزہ افطار کرایا یا کسی مجاہد کو سامان جنگ دیا تو اس شخص کو بھی صائم اور مجاہد کے برابر اجر ملے گا''۔

میں کہتا ہوں جو شخص روزہ دار کا روزہ یہ سمجھ کر افطار کرائے کہ وہ روزہ دار تعظیم کا مستحق ہے تو اس کا یہ افطار کرانا ایک قسم کا صدقہ اور روزہ کی تعظیم اور اہل طاعت کے ساتھ سلوک کرنا ہے پس جب اس کی صورت نامۂ عمل میں متمثل ہوئی تو کئی طرح پر وہ صورت روزہ کے معنی پر مشتمل تھی تو اس کو بھی روزہ کے ساتھ جزا دی گئی۔

وہ اذکار جن کا پڑھنا افطار کے وقت مسنون ہے

اور روزہ افطار کرتے وقت جن اذکار کا پڑھنا مسنون ہے ان میں سے ایک یہ ہے: ذهب الظمأ وابتلت العروق وثبت الاجر ان شاء الله اور ان کلمات کے اندر ان حالات پر شکر ہے جن کو انسان طبیعت اور عقل دونوں سے پسند کرتا ہے۔

اور ان اذکار میں سے یہ بھی ہے: اللهم لك صمت وعلى رزقك افطرت۔ اس میں اخلاص عمل اور نعمت پر شکر کرنے کی تاکید ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا''تم میں سے کوئی شخص جمعہ کے دن روزہ نہ رکھے مگر وہ شخص جو اس سے پہلے یا اس کے بعد رکھ لیا کرے'' اور آپ

---

(۱) حضرت ام مکتومؓ آخر میں اذان دیتے تھے، جو دراصل آذان فجر تھی۔

نے فرمایا ''جمعہ کی رات کو قیام کے ساتھ خاص نہ کرو'' الحدیث،

میں کہتا ہوں اس میں دو حکمتیں ہیں ایک تو تعمق کا بند کرنا کیونکہ جب شارع نے روز جمعہ کو عبادات کے لئے خاص کیا اور اس کی فضیلت بیان کی تو اس میں یہ احتمال تھا کہ تعمق کرنے والے تعمق کر کے اس دن میں روزہ کو عبادات میں شمار کر لیں، دوسری حکمت عید کے معنی کا ثابت کرنا ہے کیونکہ عید میں سرور اور لذت حاصل کرنے کے معنی پائے جاتے ہیں اور جمعہ کے عید قرار دینے میں یہ حکمت ہے کہ لوگوں کو اس بات کا خیال رہے کہ جمعہ کے اندر اس قسم کا اجتماع ہوتا ہے جس کی طرف اس کے دل بغیر جبر کے راغب ہوتے ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دو دنوں میں روزہ رکھنا جائز نہیں یعنی عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن، اور آپ نے فرمایا ''ایام تشریق کھانے پینے اور ذکر الٰہی کے دن ہیں''۔

میں کہتا ہوں اس کے اندر عید کے معنی کا ثابت کرنا اور خشک عبادت اور دین کے اندر تعمق کرنے سے ان کی طبیعت کو روکنا ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''کسی عورت کو اپنے خاوند کی موجودگی میں بلا اس کی اجازت کے روزہ رکھنا جائز نہیں''۔

میں کہتا ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ عورت کے روزہ رکھنے سے مرد کے بعض حقوق فوت ہوتے ہیں اور اس کی بشاشت اور خوشی میں خلل پڑتا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول میں کہ ''نفل روزہ رکھنے والا اپنے دل کا مختار ہے چاہے روزہ رکھے اور چاہے افطار کرے اور اس قول میں جو حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما سے فرمایا تھا کہ ''اس کی بجائے دوسرے دن تم روزہ قضا کر لینا'' کچھ تعارض نہیں، کیونکہ اول قول کے یہ معنی ہو سکتے ہیں کہ اگر روزہ رکھنے والا چاہے تو اپنے اوپر قضا لازم کر کے روزہ افطار کر لے اور دونوں بیویوں کو بطور استحباب کے قضا کا حکم دیا ہو کیونکہ جس چیز کو لازم کیا اس کے پورا کرنے سے ہی دل خوش ہوتا ہے یا آپ کا امر ان دونوں کے لئے مخصوص تھا جبکہ آپ نے اس سے ان کے دلوں میں حرج محسوس کیا جیسا کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا ''لوگ حج و عمرہ کر کے واپس ہوئے اور میں فقط حج کر کے واپس ہوئی تو آپ نے حضرت عائشہؓ کو مقام تنعیم سے عمرہ کا حکم دیا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس نے روزہ کی حالت میں بھول کر کچھ کھا لیا یا پی لیا تو وہ اپنے روزہ کو پورا کر لے کیونکہ اس کو خدا تعالیٰ نے کھلایا اور پلایا ہے''۔

میں کہتا ہوں صرف روزہ کے اندر اللہ تعالیٰ نے نسیان کی وجہ سے آدمی کو معذور قرار دیا اور کسی عبادت میں وہ معذور قرار نہیں دیا گیا کیونکہ روزہ کے اندر کوئی ایسی ہیئت نہیں ہے جو روزہ یاد دلانے والی ہو بخلاف نماز اور احرام کے کیونکہ ان دونوں کو ہیئت مثلاً استقبال قبلہ اور بے سلا ہوا کپڑے پہننا ہیئت مذکورہ ہے اس واسطے روزہ کی حالت میں معذور رکھنا مناسب ہوا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص سے جس نے روزہ کے دن میں اپنی عورت سے مجامعت کر لی تھی فرمایا ''ایک غلام آزاد کر'' الحدیث۔

میں کہتا ہوں اس نے چونکہ شعائر الٰہی کی حرمت کا ہتک کیا تھا اور اس کا مبدا افراط طبعی تھا اس واسطے اس کے مقابلہ میں نہایت سخت وشاق عبادت جب ہوئی تاکہ اس کے سامنے اس کی صورت پیش رہے اور نفس کی سرکشی سے اس کو باز رکھے، اور اس حدیث میں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم روزہ کی حالت میں مسواک کرتے تھے اور آپ کے اس انسان میں کہ ''روزہ دار کے منہ کی بو خدا تعالیٰ کو مشک کی بو سے زیادہ پسندیدہ ہے'' کچھ تعارض نہیں ہے کیونکہ ایسے کلام سے مبالغہ مقصود ہوتا ہے گویا آپ نے یہ فرمایا کہ وہ خدا تعالیٰ کو ایسا محبوب ہے کہ اگر اسکے منہ کی بو بھی ہوتی تو وہ بھی اس کی محبت کی وجہ سے اچھی معلوم ہوئی۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان میں ''سفر میں روزہ رکھنا اچھا نہیں ہے، جو لوگ روزہ نہیں رکھتے وہ اجر والے ہیں'' اور آپ کے اس فرمان میں ''جس شخص کے پاس سواری ہو جو منزل تک اس کو آرام سے پہنچا سکے تو رمضان کو جس جگہ چاہے روزہ رکھے کچھ تعارض نہیں ہے کیونکہ اوّل قول اس شخص کے حق میں ہے جس کو روزہ رکھنا شاق ہو جس سے ضعف اور غشی تک نوبت پہنچے جیسا کہ راوی کے اس قول سے معلوم ہوتا ہے کہ اس پر سایہ کر دیا گیا تھا یا مسلمانوں کو ایسی ضرورت درپیش ہے جو بغیر افطار کے سرانجام نہیں پا سکتی جیسا کہ راوی کا قول ہے کہ روزہ دار گر پڑے اور بے روزہ کھڑے ہو گئے یا کوئی شخص اپنے دل میں اس رخصت کو مکروہ سمجھتا ہے اور اسی قسم کے دیگر اسباب کی صورت میں یہ حکم ہے اور دوسرا قول اس صورت میں ہے کہ جب سفر میں چنداں مشقت نہ ہو اور اسباب مذکورہ سے خالی ہو اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول میں ''جس شخص کے ذمہ کوئی روزہ ہو اور وہ مر جائے تو اس کی طرف سے اس کا وارث روزہ رکھے'' اور اسی کے بارے میں آپ کے اس قول میں ''پس اس کو چاہئے کہ ہر دن کی جگہ ایک مسکین

کو کھانا کھلائے کیونکہ دونوں باتوں کا کافی ہونا ممکن ہے، اور اس میں دو راز ہیں ایک تو میت کے اعتبار سے ہے کیونکہ بہت سے نفوس جو اپنے جسموں سے مفارقت کرتے ہیں اور اس بات کا ادراک کرتے ہیں کہ عبادت میں سے کوئی سی عبادت جو ان پر واجب تھی اور جس کے ترک کرنے سے ان سے مواخذہ کیا جاتا ہے ان سے فوت ہوگئی ہے پس ان کو رنج والم ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے ان پر وحشت کا دروازہ کھل جاتا ہے ایسی حالت میں ان پر بڑی شفقت یہ ہے کہ لوگوں میں سے جو سب سے زیادہ اس میت کا قریب ہے پس وہ اس کا سا عمل کرے اور اس بات کا قصد کرے کہ وہ یہ عمل اسی کی طرف سے کرتا ہے کیونکہ اس کی ہمت اس امر میں مفید ہوگی جیسا کہ قرابت داروں میں ہوتا ہے یا کوئی دوسرا کام اسی کام کے مثل کرے، اور ایسا ہی حال اس شخص کا ہے جس نے صدقہ کرنے کا ارادہ کیا تھا اور وہ بغیر صدقہ کئے مر گیا تو اس کا وارث اس کی طرف سے صدقہ کرے۔

اور ہم نے نماز جنازہ میں یہ بات بیان کردی ہے کہ جب زندہ لوگ مردوں کی طرف سے صدقہ دیتے ہیں تو ان کو نفع پہنچتا ہے اور دوسرا راز دین کے اعتبار سے ہے اور وہ نہایت درجہ تاکید کرنا ہے تاکہ لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ روزہ کسی حال میں بھی ساقط نہیں ہوتا حتی کہ مرنے سے بھی۔

روزہ سے متعلق امور کا بیان

واضح ہو کہ روزہ کا کمال یہ ہے کہ وہ افعال اور اقوال شہوانیہ وسبعیہ اور شیطانیہ سے محفوظ رکھتا ہے کیونکہ یہ امور نفس کو اخلاق رذیلہ یاد دلاتے ہیں اور اوصاف قبیحہ کے لئے نفس کو برانگیختہ کرتے ہیں اور جو چیزیں روزہ ٹوٹنے کے دواعی اور اسباب ہیں ان سے محفوظ رکھتا ہے پس اول کی نسبت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''پس بیہودہ گفتگو نہ کرے اور شور نہ مچائے اگر کوئی اس کو گالی دے یا اس سے لڑے تو اس کو یہ کہنا چاہئے کہ میں روزہ سے ہوں'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو شخص روزہ میں جھوٹ بات کہنے اور اس پر عمل کرنے سے باز نہ آئے تو خدا تعالیٰ کو اس کے کھانا پینا ترک کرنے کی کوئی حاجت نہیں'' یہاں نفی سے مراد کمال کی نفی کرنا ہے، اور دوسرے امر کے متعلق آپ نے فرمایا'' پچھنے لگانے والا اور لگوانے والا دونوں نے روزہ افطار کرلیا'' کیونکہ پچھنے لگوانے والا تو ضعف کے سبب سے افطار کے لئے آمادہ ہوگیا اور لگانے والا اس سے محفوظ نہیں رہتا کہ

چوسنے سے کوئی چیز اس کے پیٹ میں چلی جائے اور بوسہ لینا اور مباشرت کرنا بھی اسی قبیل سے ہے اور لوگوں نے اس کے اندر زیادہ افراط اور تعمق کر لیا تھا اور اس سے بچنے کو رکن کے درجہ میں سمجھنے لگے تھے اس واسطے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قول وفعل سے اس بات کو بیان کر دیا کہ اس سے نہ روزہ ٹوٹتا ہے اور نہ اس سے روزہ کو کوئی نقصان پہنچتا ہے اور لفظ رخصت سے اس امر کی طرف اشارہ کر دیا کہ آپ کے سوا دوسرے کے لئے یہ ترک اولیٰ ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ بیان شریعت پر مامور تھے اس لئے آپ کے حق میں ان کا کرنا اولیٰ تھا اور یہی حال ان سب چیزوں کا ہے جن میں محسنین کے درجہ سے نزول ہو کر عامہ مومنین کے درجہ کی طرف نوبت پہنچتی ہے، واللہ اعلم۔

روزہ کے اندر انبیا علیہم السلام کے طریقے مختلف رہے ہیں پس نوح علیہ السلام ہمیشہ روزہ رکھتے تھے اور حضرت داؤد علیہ السلام ایک دن روزہ رکھتے تھے اور ایک دن افطار کرتے تھے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک روز روزہ رکھتے تھے اور دو روز یا کئی روز افطار کرتے تھے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم بذات خود کبھی اس قدر روزہ رکھتے تھے کہ یہ کہا جاتا تھا کہ آپ افطار نہیں کریں گے اور کبھی اس قدر افطار کرتے تھے کہ گویا آپ روزہ نہ رکھیں گے اور بجز رمضان کے مہینہ کے آپ پورا مہینہ روزہ نہ رکھتے تھے۔ اور اس کا سبب یہ ہے کہ روزہ تریاق ہے اور تریاق کا استعمال بقدر مرض ہوتا ہے اور حضرت نوح علیہ السلام کی امت بڑی مضبوط تھی حتی کہ ان کے بڑے بڑے حالات مروی ہیں اور حضرت داؤد علیہ السلام نہایت قوی اور مضبوط آدمی تھے چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جب کسی سے بھڑ جاتے تھے تو بھاگتے نہ تھے'' اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام ضعیف البدن فارغ البال تھے نہ ان کا گھر تھا اور نہ مال پس ان میں سے ہر ایک نے جو صورت مناسب حال دیکھی اس کو اختیار کر لیا اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم روزہ رکھنے اور نہ رکھنے کے فوائد سے خوب واقف تھے اور اپنے مزاج اور اس کے مناسب امور سے خوب مطلع تھے پس مصلحت وقت کے موافق جو مناسب سمجھا اس کو اختیار کر لیا اور اپنی امت کے لئے بھی چند روزے پسند فرمائے۔

از آں جملہ عاشورہ کے دن کا روزہ ہے اور اس کی مشروعیت میں یہ حکمت ہے کہ وہ ایسا وقت ہے کہ خدا تعالیٰ نے فرعون اور اس کی قوم کے مقابلہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مدد فرمائی اور

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس دن روزہ رکھ کر خدا تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور یہ روزہ اہل کتاب اور عرب میں مروج تھا پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کو برقرار رکھا۔

از آں جملہ عرفہ کے دن کا روزہ ہے اس میں راز یہ ہے کہ اس روزہ سے حاجیوں کے ساتھ مشابہت اور ان کی طرف شوق اور اس رحمت کی امید ہوتی ہے جو ان پر نازل ہوتی ہے اور عاشورہ کے روزہ پر اس روزہ کی فضیلت حاصل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ عرفہ کا روزہ رکھنا اس رحمت کے دریا میں غوطہ لگانا ہے جو اس روز بندوں پر نازل ہوتی ہے اور عاشورہ کے دن روزہ رکھنے میں اس رحمت کی امید ہوتی ہے جو گزر چکی، پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے رحمت الٰہی کے دریا میں غوطہ لگانے کے ثمرہ کی طرف ملاحظہ کیا اور وہ ثمرہ سابقہ گناہوں کا مٹ جانا اور آئندہ گناہوں سے دور رہنا ہے بایں معنیٰ کہ آدمی کا دل ان کو قبول نہیں کرتا پس یہ ثمرہ آپ نے عرفہ کے روزہ میں مقرر کیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے حج میں عرفہ کا روزہ نہیں رکھا اس کی وجہ وہی ہے جو قربانی اور عید کی نماز میں ہم ذکر کر چکے ہیں کہ ان سب کی بنیاد حجاج کے ساتھ مشابہت پیدا کرنے پر ہے، اور مشابہت وہی لوگ پیدا کر سکتے ہیں جو حجاج نہیں ہیں۔

از آں جملہ ماہ شوال کے چھ روزے ہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس نے رمضان کے روزے رکھے اس کے بعد شوال کے چھ روزے رکھے تو گویا اس نے تمام سال روزے رکھے'' اور ان روزوں کی مشروعیت میں یہ راز ہے کہ یہ روزے ایسے ہیں جیسے فرض نمازوں میں سنتوں کا درجہ ہے جن کی وجہ سے ان لوگوں کے فائدہ کی تکمیل ہو جاتی ہے جو اصل نماز سے پورہ فائدہ حاصل نہیں کرتے اور ان روزوں کی فضیلت میں یہ بات کہ ''وہ پورے سال روزہ رکھنے کے برابر ہے'' اس واسطے مخصوص کی کہ قواعد مقررہ میں سے یہ امر ہے کہ ایک نیکی کا ثواب دس گنا ملتا ہے اور ان چھ روزوں سے یہ حساب پورا ہو جاتا ہے۔

از آں جملہ ہر ماہ میں تین روزوں کا رکھنا ہے کیونکہ وہ بھی ایک نیکی کے دس گنا اجر کے حساب سے سال بھر کے روزوں کے برابر ہیں اور یہ بھی بات ہے کہ کثرت کا ادنیٰ درجہ تین ہے اور ان ایام کے اختیار کرنے میں مختلف روایات وارد ہیں پس ایک روایت میں آیا ہے ''اے ابوذر! جب تو مہینہ میں تین روزے رکھے تو مہینہ کی تیرہویں اور چودھویں اور پندرھویں کو روزہ رکھا کر''

اور ایک روایت میں آیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک مہینہ میں ہفتہ اور اتوار اور پیر کو روزہ رکھتے تھے اور دوسرے مہینہ میں منگل اور بدھ اور جمعرات کے دن روزے رکھا کرتے تھے اور ہر مہینہ کی پہلی تاریخ سے لیکر تین دن تک روزہ رکھنا بھی آیا ہے، اور ایک روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ام سلمہؓ کو تین دن کے روزے رکھنے کا حکم دیا تھا جن کا پہلا دن پیر اور جمعرات تھا اور ہر ایک کی ایک وجہ ہے۔

واضح ہو کہ شب قدر کی دو راتیں ہیں ایک تو وہ رات ہے جس میں تمام امور حکمیہ کی تقسیم ہوتی ہے اور اسی رات میں پورا قرآن شریف ایک بارگی پہلے آسمان پر اترا ہے پھر تھوڑا تھوڑا نازل ہوتا رہا اور یہ سال بھر میں ایک رات ہے، یہ ضروری نہیں ہے کہ رمضان ہی میں ہو ہاں رمضان میں اس کے پائے جانے کا ظن غالب ہے اور اس پر اتفاق ہے کہ جس سال قرآن اترا ہے اس سال یہ رات رمضان کے مہینہ میں واقع ہوئی تھی۔

اور دوسری شب قدر وہ ہے جس میں روحانیت کا ایک قسم کا پھیلاؤ ہوتا ہے اور ملائکہ مقربین زمین کی طرف آتے ہیں پس مسلمان اس شب میں عبادتوں میں مشغول ہوتے ہیں اور باہم ان کے انوار کا سایہ ایک دوسرے پر پڑتا ہے، اور ملائکہ ان کے پاس آتے ہیں اور شیاطین ان سے دور بھاگتے ہیں اور ان کی دعائیں اور عبادتیں قبول ہوتی ہیں اور یہ رات ہر رمضان کے اخیر عشرہ کی طاق راتوں میں آگے پیچھے ہوتی رہتی ہے لیکن عشرہ اخیرہ سے باہر نہیں ہوتی، پس جو شخص شب قدر سے پہلی شب مراد لیتا ہے تو وہ یہ کہتا ہے کہ شب قدر سال بھر میں کبھی نہ کبھی ہوتی ہے اور جو شخص شب قدر سے دوسری شب مراد لیتا ہے تو وہ یہ کہتا ہے کہ وہ رمضان کے اخیر عشرہ میں ہوتی ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''میں تمہارے خواب کو ستائیسویں شب میں متفق پاتا ہوں پس جو اس کو تلاش کرے تو اخیر ہفتہ میں تلاش کرے'' اور آپ نے فرمایا ''مجھے یہ رات دکھائی گئی پھر میں اس کو بھول گیا اور میں نے اپنے آپ کو پانی اور مٹی میں سجدہ کرتے دیکھا''۔

اور یہ بات یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشانی پر پانی اور مٹی کا اثر اکیسویں شب کی صبح کو لوگوں نے دیکھا اور صحابہ کے درمیان شب قدر کے بارے میں اختلاف اس کے دیکھنے کی وجہ سے ہوا ہے۔

جو شخص شب قدر کو دیکھے اس کو یہ دعا پڑھنی چاہیے

اللھم انک عفو تحب العفو فاعف عنی.

اور چونکہ مسجد کے اندر اعتکاف کرنا دلجمعی اور قلب کی صفائی اور عبادت کے لئے فراغت اور ملائکہ کے ساتھ مشابہت پیدا ہونے اور شب قدر پانے کے لئے منتظر رہنے کا سبب تھا اس واسطے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو عشرہ اخیرہ میں پسند فرمایا اور اپنی امت کے محسنین کے لئے اس کو مسنون فرمایا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں، معتکف کے لئے مسنون یہ ہے کہ وہ کسی مریض کی عیادت کو نہ جائے اور نہ کسی کے جنازہ میں شریک ہو اور نہ عورت کو ہاتھ لگائے اور نہ اس سے مباشرت کرے اور نہ بغیر ضرورت کے مسجد سے باہر آئے اور بغیر روزہ کے اعتکاف نہیں ہوتا اور نہ ہی مسجد جامع کے سوا کہیں اعتکاف ہوتا ہے"(۱)۔

میں کہتا ہوں ایسا کرنا اعتکاف کے معنی ثابت کرنے کے لئے ہے اور تا کہ عبادت کی قدر رہو اور نفس پر مشقت ہو اور عادت کی مخالفت پائی جائے، واللہ اعلم۔

---

(۱) یہی شرعی اعتکاف ہے۔ مذکورہ شرائط کے ساتھ ہی اعتکاف ہوتا ہے۔ حضرت شاہ صاحب نے شرعی اعتکاف کی پوری تشریح فرمادی ہے۔ جو لائق عمل ہے۔ (قاسمی)

حج کی تفصیلات

حج کے اندر جن مصلحتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے وہ چند امور ہیں از آں جملہ تعظیم بیت اللہ ہے کیونکہ وہ شعائر الٰہی میں سے ہے اور اس کی تعظیم خدا تعالیٰ کی تعظیم ہے، اور از آں جملہ اجتماع کے معنیٰ کا ثابت کرنا ہے کیونکہ ہر دولت اور ہر ملت کے لئے ایک اجتماع کا دن ہوتا ہے جس میں ادنیٰ اور اعلیٰ سب جمع ہوتے ہیں تاکہ ایک دوسرے کی معرفت حاصل کریں اور دین کے احکام سیکھیں اور اس کے شعائر کی تعظیم کریں، اور حج مسلمانوں کے اجتماع کا اور ان کی عظمت کے ظاہر ہونے کا اور ان کے لشکروں کے جمع ہونے کا اور دین کی تعظیم کا دن ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "اور جبکہ ہم نے اس گھر کو لوگوں کا مرجع اور ان کے لئے امن کی جگہ بنایا" (۱)۔

اور از آں جملہ اس دستور کے ساتھ موافقت کرنا ہے جو حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام سے لوگوں میں چلا آتا ہے کیونکہ وہ دونوں ملت حنیفیہ کے امام اور عرب کے لئے اس کے احکام مقرر کرنے والے ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اسی ملت کو ظاہر کرنے کے لئے اور سب ملتوں پر اس کو غالب کرنے کے لئے بھیجے گئے ہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "تمہارے باپ ابراہیم کی ملت" پس اس کے اماموں سے جو طریقہ چلا آتا ہے اس کی حفاظت کرنا ضروری ہوا جیسے فطرت کے خصائل اور امور حج، چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں "اپنے مشاعر پر قائم رہو کیونکہ تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کے ورثہ میں سے تم کو یہ ورثہ ملا ہے۔

(۱) حرمین۔ حنابلہ کے نقطہ نظر سے حرم اور مقام امن ہیں مگر احناف مکہ مکرمہ کو مقام امن اور حرم قرار دیتے ہیں چونکہ اللہ تعالیٰ نے مکہ کو اور حضورؐ نے مدینہ کو حرم قرار دیا تھا۔

اوراز آں جملہ ایک ایسے امر کا پایا جانا ہے جس میں ہر خاص و عام کے لئے سہولت ہے جیسے منیٰ میں اترنا اور مزدلفہ میں رات کو قیام کرنا، کیونکہ اگر ایسی بات مقرر نہ کی جاتی تو ان کو سخت دشواری پیش آتی اور اگر اس کی تاکید نہ کی جاتی تو باوجود اس کثرت اور انتشار کے سب لوگ ایک بات پر متفق نہ ہوتے۔

اوراز آں جملہ ایسے اعمال ہیں جن سے ان کے کرنے والے کا موحد ہونا اور حق کا تابع ہونا اور ملت حنیفی کا پابند ہونا اور اس ملت کے پیشواؤں پر جو کچھ خدا تعالیٰ نے احسان کیا ہے اس پر خدا تعالیٰ کا شکر گزار ہونا معلوم ہوتا ہے جیسے صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرنا۔

اوراز آں جملہ یہ ہے کہ اہل جاہلیت حج کیا کرتے تھے اور حج ان کے دین کے اصول میں سے تھا لیکن انھوں نے اس کے اندر ایسے اعمال کو جو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے منقول نہیں تھے اور انھوں نے ان کو از خود پیدا کیا تھا، شامل کر لیا تھا اور ان اعمال میں شرک پایا جاتا تھا جیسے اساف و نائلہ کی تعظیم اور منات طاغیہ (۱) کے لئے احرام باندھنا اور جیسے تلبیہ میں ان کا یہ کہنا: لا شریک لک الا شریکا ھو لک ، اور یہ اعمال ایسے تھے جن سے نہایت تاکید کے ساتھ روکنا ضروری تھا، اور بعض اعمال ایسے تھے جن کو وہ بطور فخر اور خود پسندی کے اپنی طرف سے کیا کرتے تھے جیسے قریش کا یہ کہنا کہ ہم خدا تعالیٰ کے ہمسایہ ہیں اس واسطے ہم اللہ تعالیٰ کے حرم سے نہ نکلیں گے اس لئے یہ آیت کریمہ نازل ہوئی ''پھر تم چلو جس راستہ سے لوگ چل دیئے'' اور جیسے ایام منیٰ میں وہ لوگ اپنے آبا و اجداد کی بڑائیاں بیان کیا کرتے تھے اس لئے یہ آیت نازل ہوئی ''خدا تعالیٰ کی یاد ایسی کیا کرو جیسے اپنے باپ دادا کا ذکر کیا کرتے ہو یا اس سے بھی زیادہ'' اور جب انصار کو یہ اصل معلوم ہوئی تو انھوں نے صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرنے سے عذر کیا یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی ''صفا اور مروہ خدا تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہیں''۔

اوراز آں جملہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنی طرف سے قیاسات فاسدہ ایجاد کر رکھے تھے جو دین میں رائے زنی کے قبیل سے تھے اور جن سے لوگوں کی بڑی دقت تھی اور وہ اس قابل تھے کہ ان کو مٹایا جائے اور ترک کیا جائے جیسا کہ ان کا یہ کہنا کہ محرم گھر کے دروازوں سے داخل نہ ہوں

---

(۱) یہ ایام جاہلیت کے بت تھے۔

اور پشت کی طرف سے چڑھ کر گھروں میں آیا کرتے تھے یہ سمجھ کر کہ دروازہ سے مکان کے اندر آنا ایک ایسا ارتفاق ہے جو احرام کی ہیئت کے منافی ہے اس واسطے یہ آیت نازل ہوئی ''پشت کی طرف سے تمہارا گھروں میں آنا کچھ بھلائی کی بات نہیں ہے'' اور جیسا کہ ایام حج میں خرید وفروخت کو برا جاننا اس خیال سے کہ ایام حج میں تجارت کرنا اخلاص عمل کے منافی ہے پس یہ آیت نازل ہوئی ''اپنے پروردگار سے فضل کی تلاش میں تم پر کچھ مضائقہ نہیں'' اور جیسا کہ بغیر سامان کے حج کرنا مستحب سمجھتے تھے اور اپنے آپ کو توکل کرنے والا کہتے تھے اور لوگوں پر تنگی اور زیادتی کرتے تھے پس یہ آیت نازل ہوئی'' اور راستہ کے لئے سامان لے لو البتہ بہتر سامان بچاؤ کرنا ہے'' اور جیسا کہ ان کا یہ کہنا کہ حج کے ایام میں عمرہ کرنا بڑا سخت گناہ ہے اور ان کا یہ کہنا جب صفر کا مہینہ گزر جائے اور اونٹوں کی پشت اچھی ہو جائیں اور سفر کے آثار جاتے رہیں تو عمرہ کرنے والے کے لئے عمرہ کرنا درست ہو گیا اور اس میں دور دراز سے آنے والوں کے لئے بڑی دقت تھی کیونکہ عمرہ کے لئے ان کو دوبارہ سفر کرنے کی ضرورت پڑتی تھی اس واسطے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حجتہ الوداع میں اس بات کا حکم دیا کہ پہلے عمرہ کا احرام باندھیں اس کے بعد حج کریں اور اس امر میں بہت سختی کی اور ان کی عادت پر اور جو چیز ان کے دلوں میں پیوست ہو گئی اس پر نہایت توبیخ کی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اے لوگو! خدا تعالیٰ نے تم پر حج فرض کیا ہے پس تم حج کرو، ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا ہر سال؟ آپ یہ سن کر خاموش ہو گئے یہاں تک کہ اس شخص نے تین مرتبہ یہی سوال کیا پس آپ نے فرمایا کہ اگر میں ہاں کہہ دیتا تو ہر سال کے لئے واجب ہو جاتا اور تم سے ادا نہ ہوتا''۔

میں کہتا ہوں اس میں راز یہ ہے کہ وہ بات جو کسی خاص وقت پر وحی الٰہی نازل ہونے کا تقاضا کرتی ہے وہ لوگوں کا ایک امر پر متوجہ ہونا اور ان کے علوم اور ان کی ہمتوں کا اس امر کو قبول کر لینا اور اس مقدار کا لوگوں میں مشہور اور متداول ہونا پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا قصد کرنا اور خدا تعالیٰ سے اس کا طلب کرنا ہوتا ہے پس جب یہ دونوں باتیں جمع ہو جاتی ہیں تو اس کے موافق وحی کا نازل ہونا ضروری ہو جاتا ہے اور یہ بات تم اس سے معلوم کر سکتے ہو کہ خدا تعالیٰ نے کوئی کتاب ایسی نازل نہیں کی جو اس قوم کی زبان میں نہ ہو(۱) اور جس کو وہ سمجھتے نہ ہوں اور کوئی دلیل اور کوئی

(۱) تاکہ افہام وتفہیم میں سہولت ہو۔ (قاسمی)

حکم ایسا بیان نہیں کیا جو قریب الفہم نہ ہو، اور یہ ہو بھی نہیں سکتا کیونکہ وحی کا مدار خدا تعالیٰ کی عنایت پر ہے اور عنایت اس میں پائی جاتی ہے کہ جس امر کو آسانی سے وہ قبول کر سکیں وہی بات ان کے لئے تجویز کی جائے، اور کسی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا سب اعمال میں کون سا عمل افضل ہے؟ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان لانا، پھر عرض کیا اس کے بعد کون سا عمل افضل ہے؟ آپ نے فرمایا اللہ کے راستے میں جہاد کرنا، پھر سوال کیا اس کے بعد کون سا عمل افضل ہے؟ آپ نے فرمایا حج مبرور'' اور اس حدیث میں اور آپ کے اس قول میں جو آپ نے ذکر کی فضیلت میں فرمایا کہ'' کیا میں تمہارے اعمال میں سے افضل ترین عمل نہ بتلا دوں'' کچھ اختلاف نہیں ہے کیونکہ فضیلت اعتبار کے مختلف ہونے سے مختلف ہو جاتی ہے اور یہاں پر فضیلت کا دین الٰہی کی تعظیم اور شعائر الٰہی کے ظہور کے اعتبار سے بیان کرنا مقصود ہے اور اس اعتبار سے ایمان کے بعد جہاد اور حج جیسا کوئی عمل نہیں ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' جس شخص نے اللہ تعالیٰ کے لئے حج کیا اور لغو باتیں نہ کیں اور فسق کے کام نہ کئے تو حج کرنے سے ایسا ہو گیا جیسے اپنی ماں کے بطن سے آج پیدا ہوا'' اور آپ نے فرمایا'' ایک عمرہ سے دوسرا عمرہ درمیان کے گناہوں کا کفارہ ہے اور حج مبرور کی جزا جنت کے سوا اور کچھ نہیں'' اور آپ نے فرمایا'' حج اور عمرہ ملایا کرو''۔

میں کہتا ہوں اللہ تعالیٰ کے شعائر کی تعظیم اور رحمت الٰہی کے سمندر میں غوطہ لگانا گناہوں کو مٹا دیتا ہے اور دخول جنت کا سبب بنتا ہے اور چونکہ حج مبرور اور حج و عمرہ کا ملانا اور ان کو زیادہ عمل میں لانا رحمت الٰہی کے قابل ہونے کے لئے ایک پورا انصاب تھا اس واسطے اس کو ان دونوں کی طرف منسوب کیا اور لغو باتیں اور فسق کے کام ترک کرنا اس لئے شرط کیا تاکہ یہ غوطہ لگانا پایا جائے کیونکہ جو فسق اور لغو باتیں کرتا ہے اس سے رحمت دور ہو جاتی ہے اور اس کے حق میں پوری نہیں پائی جاتی، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' ماہ رمضان میں عمرہ کرنا ایک حج کرنے کے برابر ہے''۔

میں کہتا ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ حج کو عمرہ پر جو فضیلت ہے تو محض اس لئے ہے کہ حج میں شعائر اللہ کی تعظیم اور لوگوں کا نزول رحمت کے لئے مجتمع ہونا پایا جاتا ہے اور عمرہ میں یہ بات نہیں ہے، رمضان کے مہینہ میں جو عمرہ پایا جاتا ہے وہ حج کا کام دیتا ہے کیونکہ ماہ رمضان محسنین کے

انوار کا پرتو پڑنے کا اور روحانیت کے نازل ہونے کا وقت ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس کے پاس سفر کا سامان اور سواری ہو جو بیت اللہ تک پہنچا سکے اور اس نے حج نہیں کیا تو کچھ عجب نہیں کہ وہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر مرے''(۱)۔

میں کہتا ہوں ارکان اسلام میں سے کسی رکن کا ترک کرنا دین سے خارج ہونے کے مشابہ ہے اور تارک حج کو یہودی اور نصرانی کے ساتھ اور تارک نماز کو مشرک کے ساتھ اس لئے تشبیہ دی گئی کہ یہود و نصاریٰ نماز پڑھتے تھے، حج نہیں کرتے تھے اور مشرکین عرب حج کرتے تھے نماز نہیں پڑھتے تھے، کسی نے آپ سے عرض کیا حج کرنے والا کیسا ہوتا ہے؟ آپ نے فرمایا سر میں خاک، بدن میں بدبو، پھر عرض کیا گیا کون سا حج افضل ہے؟ آپ نے فرمایا باآواز بلند تلبیہ کہنا اور قربانی کرنا، پھر عرض کیا گیا سبیل سے کیا مراد ہے؟ آپ نے فرمایا خرچ راہ اور سواری۔

میں کہتا ہوں حج کرنے والوں کی یہ شان ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے اپنے نفس کو عاجز اور ذلیل بنادے اور حج کے اندر جس مصلحت کا اعتبار کیا گیا ہے وہ اعلاء کلمۃ اللہ اور حضرت ابرہیم کی سنت کی موافقت اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا یاد کرنا ہے اور خرچ راہ اور سواری سے راستہ کی توقیت اس لئے کی گئی کہ ان دونوں چیزوں سے وہ آسانی پائی جاتی ہے جس کی رعایت کرنا حج جیسی عبادت شاقہ میں ضروری اور واجب ہے اور ہم نماز جنازہ میں اور میت کی طرف سے روزہ رکھنے میں وہ بیان ذکر کر چکے ہیں کہ جب اس کو دوسرے شخص کی طرف سے حج کرنے کے متعلق بیان کیا جائے تو ہو سکتا ہے۔

مناسک کا بیان

واضح ہو کہ صحابہ اور تابعین اور تمام مومنین سے جو مناسک ثابت ہیں وہ چار ہیں: حج مفرد، عمرہ مفردہ، حج تمتع اور حج قران، پس مکہ کے رہنے والوں کے لئے حج کی یہ صورت ہے کہ مکہ سے احرام باندھیں اور احرام کی حالت میں جماع اور اس کے دواعی اور سر منڈوانے اور ناخن ترشوانے اور سلا ہوا کپڑا پہننے اور سر ڈھکنے اور خوشبو لگانے اور شکار کرنے سے پرہیز کرے اور ایک قول کے موافق نکاح سے بھی پرہیز کرے پھر عرفات کو جائے اور عرفہ کی شام کو وہاں رہے پھر بعد غروب

(۱) سخت ترین وعید ہے۔ قاسمی

آفتاب وہاں سے واپس ہو اور رات کو مزدلفہ میں رہے اور آفتاب نکلنے سے پیشتر وہاں سے چل کر منیٰ میں آئے اور بڑے منارے پر کنکریاں مارے، اگر قربانی ساتھ ہو تو وہیں اس کو ذبح کرے اور سر منڈوائے یا بال کتروائے، پھر ایام منیٰ میں طواف افاضہ کرے اور صفا، مروہ میں سعی کرے۔

اور دور سے آنے والے کے لئے حج کی صورت یہ ہے کہ میقات سے احرام باندھے اور عرفات میں ٹھیرنے سے پہلے اگر وہ مکہ میں آ گیا تو طواف قدوم کرے اور اس میں اکڑ کر چلے اور صفا و مروہ میں سعی کرے پھر احرام اسی طرح سے قائم رکھے یہاں تک کہ عرفات میں مقیم ہو اور رمی کرے اور سر منڈوائے اور طواف کرے اور اس وقت نہ رمل کرے اور نہ سعی کرے۔

اور عمرہ کی ترکیب مکہ والوں کے لئے یہ ہے کہ حل سے احرام باندھے اور اگر دور سے آنے والا ہے تو اپنے اپنے میقات سے احرام باندھے اس کے بعد طواف کرے اور سعی کرے اور سر منڈوائے یا بال کتروائے۔

اور حج تمتع کی صورت یہ ہے کہ آفاقی حج کے مہینوں میں عمرہ کا احرام باندھے پھر مکہ میں آئے اور اپنا عمرہ پورا کر کے احرام سے باہر آئے اور حج کرنے تک بغیر احرام کے رہے اور جو اس کو میسر ہو اس کی قربانی کرے۔

اور حج قران کی صورت یہ ہے کہ باہر کا آدمی معاً حج و عمرہ کے لئے احرام باندھے پھر مکہ میں آئے اور اپنے احرام کو قائم رکھے یہاں تک کہ افعال حج سے فارغ ہو جائے اور اس کو ایک طواف اور ایک سعی کرنی چاہئے اور ایک قول کے موافق دو طواف اور دو سعی کرنی چاہئے بعد ازاں جو گائے بکری میسر ہو ذبح کرے پھر جب مکہ سے کوچ کرنے کا قصد کرے تو طواف وداع کرے۔

میں کہتا ہوں: واضح ہو کہ حج و عمرہ میں احرام باندھنا ایسا ہے جیسا نماز میں تکبیر کہنا، احرام کے اندر اخلاص و تعظیم کی صورت اور ایک ظاہری فعل کے ساتھ حج کے ارادہ کا انضباط پایا جاتا ہے اور اس میں لذت کی چیزوں کے ترک کرنے کے سبب سے اور عادات مالوفہ اور ہر قسم کی زینت کی باتیں ترک کرنے کے سبب سے نفس خدا تعالیٰ کے سامنے ذلیل اور متواضع بن جاتا ہے اور اس میں مشقت اور پریشانی اور اللہ تعالیٰ کے لئے اپنی حالت کا بدلنا پایا جاتا ہے اور محرم کو ان اشیا کے ترک کرنے کا اس لئے حکم دیا گیا تا کہ ذلت اور ترک زینت اور خراب خستہ ہونا پایا جائے اور خوف

الٰہی اور اس کی تعظیم ظاہر ہونے کا موقع پایا جائے اور نفس کو اپنی خواہشات پورا کرنے میں مطلق العنانی نہ ہو۔

اور شکار کرنا لہو (۱) میں داخل ہے اور ایک قسم کا توسع ہے اسی لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس شخص نے شکار کا پیچھا کیا اس نے لہو کیا'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اور کبائر صحابہ سے شکار کرنا ثابت نہیں ہے اگرچہ آپ نے فی الجملہ اس کی اجازت دی ہے اور جماع کرنا شہوت بہیمیہ میں منہمک ہونا ہے اور جبکہ اس باب کو بالکلیہ بند کرنا درست نہ تھا کیونکہ وہ قانون شرعی کے خلاف تھا اس واسطے کم از کم بعض حالات میں منع کرنا ضروری ہوا جیسے احرام اور اعتکاف اور روزہ کی حالت اور نیز بعض مقامات میں اس سے ممانعت کی گئی جیسے مساجد کے اندر، کسی شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا محرم کو کس قسم کے کپڑے پہننے چاہئیں؟ آپ نے فرمایا ''نہ قمیص پہنو نہ عمامے باندھو اور نہ پائجامہ پہنو اور نہ باراں کوٹ اور نہ موزے'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اعرابی سے فرمایا ''یہ خوشبو جو تیرے لگی ہوئی ہے اس کو تین مرتبہ دھو اور جبہ کو اتار دے'' سلے ہوئے کپڑے میں اور اس جیسے کپڑے میں اور اس کپڑے میں جو سلا ہوا نہ ہو یہ فرق ہے کہ پہلی قسم میں ارتفاق اور تجمل اور زینت ہے اور دوسری قسم میں محض ستر عورت ہے اور پہلے کے ترک کرنے میں اللہ تعالیٰ کے سامنے تواضع پائی جاتی ہے اور دوسرے کے ترک کرنے میں بے ادبی پائی جاتی ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''محرم نہ نکاح کرے اور نہ نکاح کرائے اور نہ نکاح کی بات چیت کرے'' اور یہ بھی مروی ہے کہ آپ نے حالت احرام میں میمونہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا تھا۔ میں کہتا ہوں صحابہ، تابعین اور فقہا میں سے اہل حجاز کے نزدیک محرم کے لئے سنت یہ ہے کہ نکاح نہ کرے اور اہل عراق کے نزدیک محرم کا نکاح کرنا جائز ہے اور تم پر یہ مخفی نہیں ہے کہ احتیاط پر عمل کرنا افضل ہے اور اوّل قول کے موافق اس میں یہ راز ہے کہ نکاح کرنا ارتفاقات مطلوبہ میں داخل ہے اور بہ نسبت شکار کے زیادہ مطلوب چیز ہے اور نکاح کرنے کو نکاح کے باقی رکھنے پر قیاس نہیں کیا جا سکتا کیونکہ خوشی اور سرور ابتدا میں ہوتا ہے اور اسی لئے اس امر میں عروس ضرب المثل ہے اور اس کا باقی رکھنا ضرب المثل نہیں ہے۔

---

(۱) کھیل کود

پھر شکار کے معنی کو بھی منضبط کرنا ضروری تھا کیونکہ انسان کبھی تو اس چیز کو قتل کرتا ہے جس کو کھانا چاہتا ہے اور کبھی ایسی چیز کو قتل کرتا ہے جس کو کھانا مقصود نہیں ہوتا بلکہ صرف شکار کی مشق کرنا منظور ہوتا ہے اور کبھی کسی چیز کو اس غرض سے قتل کر دینا ہے کہ اس کے شر سے خود بچنا چاہتا ہے یا لوگوں کو بچانا چاہتا ہے اور کبھی کسی گائے بکری کو ذبح کرتا ہے پس ان میں سے کس کو شکار کہنا چاہئے لہٰذا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''پانچ چیزیں ایسی ہیں جن کے حرم اور احرام میں مار ڈالنے پر مارنے والے پر کچھ گناہ نہیں ہے چوہا، چیل، کوا، بچھو، اور دیوانہ کتا'' اور ان سب میں علت مشترکہ یہ ہے کہ یہ سب جانور موذی اور انسان یا اس کے متاع پر حملہ کرنے والے ہیں اور اگر عرف سے بھی تلاش کی جائے تو ان کے مارنے کو عرف میں شکار نہیں کہتے، اور اسی طرح گائے، بکری اور مرغی اور ان جیسے جانور جن کو گھروں میں پالنے کا دستور ہے ان کے ذبح کرنے کو بھی شکار نہیں کہتے لیکن دیگر اقسام میں ظاہر یہ ہے کہ ان پر شکار کا اطلاق ہوتا ہے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے میقات کی تعیین اس طرح فرمائی کہ اہل مدینہ کے لئے ذوالحلیفہ اور اہل شام کے لئے جحفہ اور اہل نجد کے لئے قرن المنازل اور اہل یمن کے لئے یلملم ہے، پس جو لوگ ان مواقیت میں رہتے ہیں اور جو لوگ باہر سے ان مواقیت میں آتے ہیں جو حج اور عمرہ کا ارادہ رکھتے ہوں ان سب کے لئے یہ مواقیت ہیں اور جو لوگ ان میقاتوں سے ورے ہیں تو ان کو اپنی جائے سکونت سے احرام باندھنا چاہئے حتی کہ اہل مکہ خاص مکہ سے احرام باندھیں۔

میں کہتا ہوں مواقیت کے اندر اصل یہ ہے کہ جبکہ مکہ میں ایسی حالت میں آنا مطلوب تھا کہ سر میں خاک ہو اور بدن میں بدبو آنے لگی ہو اور نفس ذلت کی حالت میں ہو اور لوگوں کو اس بات کا حکم کرنے میں کہ وہ اپنے اپنے شہروں سے احرام باندھ کر آیا کریں بڑی دقت تھی جو کہ ظاہر ہے کیونکہ ان میں سے بعض شہر مکہ سے ایک ماہ کی مسافت پر اور بعض دو ماہ کی مسافت پر رہتے ہیں اور بعض اس سے بھی زیادہ مسافت پر رہتے ہیں تو ضروری ہوا کہ مکہ کے چاروں طرف چند معلوم مقامات خاص کئے جائیں جہاں سے لوگ احرام باندھا کریں اور ان مقامات کے بعد احرام کو موخر نہ کریں اور ضرور ہے کہ یہ مقامات ظاہر اور مشہور ہوں اور ان کو ہر شخص جانتا ہو اور اہل آفاق وہاں سے گزرتے ہوں پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تحقیق فرما کر ان مقامات کا حکم فرمایا اور اہل مدینہ

کے لئے سب سے دور میقات مقرر کیا کیونکہ وہ شہر وحی نازل ہونے کی جگہ اور ایمان کا مرکز اور دار الہجرت اور پہلی بستی ہے جو خدا اور رسول پر ایمان لائی اس واسطے اس کے رہنے والے اس قابل ہیں کہ اعلاء کلمۃ اللہ میں نہایت درجہ کوشش کریں اور زیادہ عبادت کے ساتھ مخصوص کئے جائیں اور نیز مدینہ تمام ان اطراف سے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایمان لائے تھے اور اپنے ایمان میں مخلص تھے سب سے زیادہ قریب ہے بخلاف جواثی، طائف اور یمامہ وغیرہ کے پس مدینہ والوں کو اس میں کچھ دقت نہیں۔

اور عرفات پر قیام کرنے میں یہ راز ہے کہ ایک زمانہ اور ایک مکان میں مسلمانوں کا اجتماع خدا تعالیٰ کی رحمت کی طرف راغب ہوتے ہوئے اور خشوع و خضوع کے ساتھ اس سے دعا کرتے ہوئے برکات الٰہی کے نازل ہونے اور روحانیت کے انتشار میں بڑا اثر رکھتا ہے اور اس لئے شیطان اس دن سب دنوں سے زیادہ حقیر و ذلیل ہوتا ہے اور نیز اس اجتماع میں مسلمانوں کی شان و شوکت معلوم ہوتی ہے اور اس دن اور اس مقام کی خصوصیت تمام انبیاء علیہم السلام سے ثابت ہوتی چلی آئی ہے جیسا کہ اخبار میں حضرت آدمؑ اور ان کے بعد کے انبیا سے مذکور ہے اور توقیت و تعیین کے باب میں اس طریقہ کی پابندی کرنا جو سلف صالح سے منقول ہے بڑا اصل الاصول ہے۔

اور منیٰ میں اترنے میں یہ راز ہے کہ یہ جگہ جاہلیت کے بازاروں میں سے ایک بڑا بازار تھا جیسا کہ عکاظ اور مجنہ اور ذی المجاز وغیرہ اور انھوں نے اس جگہ کو اس لئے مقرر کیا کہ حج میں دور دور کے بے شمار لوگ جمع ہوتے ہیں اور تجارت کے لئے اس سے زیادہ مناسب اور بہتر کوئی صورت نہیں ہے کہ اس کا موسم اس اجتماع کے وقت مقرر کیا جائے اور نیز اس بے شمار فوج کے لئے مکہ میں گنجائش نہیں پس اگر شہری اور دیہاتی غافل اور ہوشیار کے لئے منیٰ جیسے میدان میں اترنا مقرر نہ کریں تو ان کو بڑی دقت پڑے اور اگر بعض لوگوں کو خاص کر کے منیٰ میں اتارا جائے تو ان کو ملال گزرے اور جب وہاں ٹھیرنے کا دستور عام ہو گیا تو عرب کی عادت اور حمیت کا یہ مقتضیٰ ہوا کہ ہر قبیلہ اپنا فخر اور اپنی کثرت ثابت کرنے میں اور اپنے بزرگوں کی سوانح بیان کرنے میں اور ان کی بہادری اور ان کے انصار کی کثرت ظاہر کرنے میں کوشش کرے تا کہ اس بات کو سب نزدیک و دور کے لوگ دیکھیں اور دور دراز ملکوں میں اس کی شہرت ہو اور اسلام کو بھی ایسے اجتماع کی ضرورت تھی

جس سے مسلمانوں کی شوکت اوران کا سامان اوران کی کثرت ظاہر ہوتا کہ دین الٰہی غالب ہواور دور دور تک اس کی آواز پہنچے اور تمام اطراف میں اس کا غلبہ ہو جائے اس واسطے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اجتماع کو باقی رکھا اور اس پر شوق دلایا اور اس کی طرف متوجہ کیا لیکن تفاخر اور آباواجداد کے حالات ذکر کرنے سے ممانعت فرمائی اور اس کی جگہ ذکر الٰہی کو مقرر فرمایا جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی ضیافتوں اور ولیموں میں سے نکاح کے ولیمہ اور اولاد کے عقیقہ کو باقی رکھا کیونکہ ان میں آپ نے تدبیر منزل کے بارے میں بڑے بڑے فوائد ملاحظہ فرمایا، اور مزدلفہ میں شب میں رہنے میں یہ راز ہے کہ یہ عرب کے اندر قدیم دستور تھا اور شاید انھوں نے اس کو اس لئے مقرر کر رکھا تھا کہ وہاں لوگوں کا اس قدر اجتماع ہوتا ہے کہ پھر کہیں ایسا نہیں ہوتا اور ایسے موقع پر اس بات کا احتمال ہوتا ہے کہ لوگ آپس میں دب نہ جائیں اور وہ مغرب کے بعد عرفات سے لوٹتے ہیں اور تمام دن لوگ مشقت اور تکان میں رہتے ہیں جو دور دور دراز سے وہاں آ کر جمع ہوتے ہیں، پس اگر ایسی حالت میں منیٰ آنے کا قصد کریں تو تھک جائیں اور اہل جاہلیت غروب سے پہلے عرفات سے اتر آتے تھے اور چونکہ یہ اندازہ ظاہر نہ تھا اور نہ قطعاً متعین ہوسکتا تھا اور ایسے اجتماع میں وقت کی ایسی تعیین ضروری تھی جس میں ابہام کا احتمال بھی نہ رہے اس واسطے غروب آفتاب کے ساتھ اس کی تعیین ضروری ہوئی۔

اور مشعر حرام میں ٹھیرنے کا اس لئے حکم دیا گیا کہ اہل جاہلیت باہم تفاخر اور شوکت دکھلانے کے لئے قیام کرتے تھے پس اس کی بجائے کثرت سے ذکر الٰہی کرنے کا حکم دیا گیا تاکہ ان کی عادت کو دور کرے اور اس جگہ میں توحید کی تعظیم ہو اور یہ ایسا ہے جیسا کہ آپس کی حرص ہو یا ان سے یہ کہا گیا کہ تم خدا تعالیٰ کی یاد زیادہ کرتے ہو یا اہل جاہلیت اپنے مفاخر زیادہ بیان کرتے ہیں۔

اور رمی جمار میں وہی راز ہے جو نفس حدیث میں وارد ہے کہ رمی جمار اللہ عزوجل کا ذکر قائم کرنے کے لئے مقرر کیا گیا ہے اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ توقیت ذکر کے اقسام میں احسن اور اکمل اور وعدہ [illegible] کے لئے جامع تر یہ ہے کہ اس کو ایک زمانہ اور مقام کے ساتھ معین کیا جائے اور اس کے ساتھ ایسی چیز قائم کی جائے جو اس کی تعداد کو محفوظ رکھے اور اس کے پائے جانے کو سب کے سامنے ثابت کرے اور کچھ مخفی نہ رہے اور ذکر الٰہی کی دو قسمیں ہیں ایک قسم یہ ہے کہ جس سے خدا

تعالیٰ کے دین کی فرمانبرداری مقصود ہوتی ہے اور اس قسم کے ذکر میں اصل یہ ہے کہ اس کو لوگوں کے مجمع میں اختیار کیا جائے، نفس ذکر کی کثرت ضروری نہیں اور رمی جمار اسی قبیل سے ہے اسی وجہ سے اس میں کثرت سے ذکر کرنے کا حکم نہیں دیا گیا، اور ایک قسم وہ ہے جس سے نفس کو خدا تعالیٰ کی کبریائی کے لئے مطیع کرنا مقصود ہوتا ہے اور اس ذکر میں کثرت کی حاجت ہے اور نیز احادیث میں آیا کہ رمی جمار کرنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے جس وقت آپ نے شیطان کو دفع کیا تھا تو اس پر عمل کیا تھا پس ایسے فعل کی حکایت کرنے میں نفس کو خوب تنبیہ ہوتی ہے۔

اور ہدی میں یہ راز ہے کہ اس میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے اس فعل کے ساتھ مشابہت ہے جو انھوں نے اس جگہ خدا تعالیٰ کی طاعت اور اس کی طرف متوجہ ہونے کے لئے اپنے فرزند کو ذبح کرنے کا قصد کیا تھا اور اس میں اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کی یاددہانی ہوتی ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور لوگوں کے باپ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام پر خدا تعالیٰ نے فرمائی تھی اور اس وقت میں اور اسی زمانہ میں ایسے فعل کے کرنے سے نفس کو نہایت تنبیہ ہوتی ہے اور متمتع اور قارن پر یہ ہدی واجب ہوئی کہ تاکہ خدا تعالیٰ کی اس نعمت کا شکریہ ادا کیا جائے کہ اس نے اس مسئلہ میں جاہلیت کے وبال کو ان سے دور کر دیا، اور سر منڈانے میں یہ راز ہے کہ سر منڈانے سے احرام سے نکلنے کے لئے ایسے فعل کے ساتھ ایک طریقہ کی تعیین ہوتی ہے جو وقار کے منافی نہیں ہے پس اگر ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جاتا تو ہر شخص جدا جدا راہ اختیار کرتا اور نیز اس میں پراگندگی کے ختم ہونے کا پورا ثبوت ہے اور سر منڈانا ایسا ہے کہ جیسا نماز میں سلام اور طواف الافاضہ سے قبل سر منڈانے کا حکم اس لئے دیا گیا ہے تاکہ اس کی حالت اس شخص کی حالت کے مشابہ ہو جائے جو پراگندگی اور غبار دور کر کے سلاطین کے سامنے حاضر ہوتا ہے۔

اور طواف کرنے کی یہ صورت ہے کہ حجر اسود کے پاس آئے اور اس کو بوسہ دے پھر اس کے دائیں طرف سے چل کر سات مرتبہ طواف کرے اور ہر مرتبہ حجر اسود کو بوسہ دے یا لکڑی وغیرہ سے جو اس کے ہاتھ میں ہو اس کی طرف اشارہ کرے اور تکبیر کہے اور رکن یمانی کو بوسہ دے اور طواف کی حالت میں طہارت سے ہو اور ستر کھلا نہ ہو اور سوائے اچھی بات کے زبان سے کچھ نہ کہے پھر مقام ابراہیمؑ میں آئے اور دو رکعت نماز پڑھے لیکن حجر اسود سے شروع کرنا، سو اس کی وجہ یہ ہے کہ

تشریع کے وقت ابتدا کا مقام اور چلنے کی جانب کا معین کرنا ضروری ہے اور حجر اسود بیت اللہ کے تمام مواضع میں سب سے بہتر ہے کیونکہ یہ جنت سے نازل ہوا ہے اور دونوں طریقوں میں دائیں طرف متبرک ہوتی ہے اور طواف قدوم بہ منزلہ تحیۃ المسجد کے ہے یہ خانہ کعبہ کی تعظیم کے لئے مشروع ہوا ہے اور نیز طواف کی جگہ اور اس کے زمانہ میں اس کے تمام اسباب مہیا ہوتے ہوئے اس میں دیر کرنا ایک قسم کی بے ادبی ہے اور بیت اللہ کے پہلے طواف میں اکڑنا اور سینہ نکال کر چلنا ہے اور اس کے بعد صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرنا ہے اور اس کی چند وجوہ ہیں۔

از آں جملہ وہ ہے جو حضرت ابن عباسؓ نے ذکر کیا ہے یعنی مشرکین کے دلوں کو خائف کرنا اور مسلمانوں کے غلبہ کا ظاہر کرنا اور اہل مکہ یہ کہتے تھے کہ یثرب کے بخار نے ان کو ضعیف کر دیا پس یہ فعل جہاد کے افعال میں داخل ہے اور یہ سبب باقی نہیں رہا اور گزر گیا۔

اور از آں جملہ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری میں رغبت کرنے کا اظہار کرنا ہے اور یہ کہ دور دراز کے سفر نے اور رحمت عظیم نے ان میں شوق اور رغبت ہی کو زیادہ کیا جیسا کہ شاعر کہتا ہے۔

اونٹنی چلتے چلتے جبکہ تکان کی شکایت کرتی ہے تو اس کا سوار وصال کی
راحت کا وعدہ کرتا ہے تو اس وعدہ کے سننے سے اس میں جان پڑ جاتی ہے۔

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قصد کیا تھا کہ طواف کے اندر اکڑ کر چلنے کو اور کپڑے کو بغل کے نیچے سے نکالنے کو ترک کر دیں کیونکہ ان دونوں کا سبب باقی نہیں رہا ہے پھر اجمالاً انھوں نے اس بات کو سمجھا کہ ان دونوں کا ایک اور سبب بھی ہے جو باقی رہنے والا ہے اس واسطے انھوں نے ان دونوں کو ترک نہیں کیا اور عمرہ کے اندر عرفات میں ٹھیرنا اس لئے مشروع نہیں ہوا کہ اس کا کوئی وقت معین نہیں ہے کہ اجتماع کے معنی پائے جائیں اس واسطے عمرہ میں قیام کا کوئی فائدہ نہیں ہے اور اگر اس کے لئے کوئی وقت مقرر ہوتا تو وہ حج ہو جاتا اور ایک سال میں دو بار اجتماع میں بڑی دقت تھی جو مخفی نہیں ہے۔

اور عمرہ میں عمدہ بات بیت اللہ کی تعظیم اور اس کی نعمت کا شکر ہے اور صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرنے میں جیسا کہ حدیث شریف میں وارد ہے یہ راز ہے کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی والدہ حضرت ہاجرہ کو جب زیادہ پریشانی ہوئی تو انھوں نے صفا اور مروہ کے درمیان تیز رفتاری

سے چلنا شروع کیا جیسے کوئی مصیبت زدہ دوڑتا پھرتا ہے پس خدا تعالیٰ نے ان کی مشقت کو اس طرح دور کر دیا کہ زمزم برآمد کر دیا اور لوگوں کے اندر اس جنگل میں آباد ہونے کا الہام کر دیا اس واسطے حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد پر اور اس کے متبعین پر اس نعمت کا شکر اور اس نشانی خارق عادت کا یاد کرنا ضروری ہوا تا کہ ان کی قوت بہیمی حیران ہو جائے اور خدا تک ان کی رہنمائی کرے اور اس بارے میں اس سے بہتر کوئی بات نہیں کہ مکہ میں داخل ہوتے ہی اپنے دل کو ان کے ساتھ ایسے فعل کے ذریعہ لگا دے جو ظاہر منضبط اور قوم کی عادت کے خلاف ہے جس میں ان کے لئے ایک قسم کی ذلت ہے اور یہ اس فعل کا نقل کرنا ہے جس میں حضرت ہاجرہؑ کو تکلیف اور مشقت ہوئی تھی اور ایسے امور میں کسی حال کا نقل کرنا زبانی ذکر سے بدرجہا مفید ہوتا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''تم میں سے کوئی شخص اخیر وقت خانہ کعبہ کا طواف کئے بغیر مکہ سے نہ جائے اور حائض کو آپ نے معاف کیا''۔

میں کہتا ہوں کہ اس میں راز یہ ہے کہ اخیر وقت پر خانہ کعبہ کا طواف کرنے میں اس کی تعظیم ہے اس طرح سے کہ ابتدا بھی اسی سے ہوتی تھی اور انتہا بھی اسی پر ہوئی تا کہ ان کے اس سفر سے خانہ کعبہ کا مقصود بالذات ہونا ظاہر ہو جائے اور لوگوں کی اس عادت کے ساتھ موافقت بھی ہو جائے کہ قاصد لوگ رخصت ہوتے وقت اپنے بادشاہوں سے مل کر جاتے ہیں، واللہ اعلم۔

حجۃ الوداع کا بیان

حجۃ الوداع میں حضرت جابر، حضرت عائشہ اور حضرت عبداللہ بن عمر وغیرہم رضی اللہ عنہم کی حدیث اصل ہے۔

واضح ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نو برس تک مدینہ میں تشریف فرما رہے اور اس عرصہ میں آپ نے حج نہیں کیا تھا پھر دسویں سال لوگوں میں اس بات کا اعلان کیا گیا کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم حج کرنے والے ہیں بس مدینہ میں بہت لوگ آ گئے پس آپ مدینہ سے نکل کر ذوالحلیفہ میں تشریف لائے اور وہاں غسل کر کے خوشبو لگائی اور مسجد میں دو رکعت پڑھیں اور ایک تہبند اور ایک چادر پہن کر احرام باندھا اور اس طرح تلبیہ پڑھا: **لبیک اللھم لبیک لبیک لاشریک لک لبیک ان الحمد والنعمة لک والملک لاشریک لک۔**

میں کہتا ہوں اس مقام پر دو باتوں میں اختلاف ہے ایک یہ ہے کہ آپ کا حج حج مفرد تھا یا حج تمتع، اس طرح پر کہ عمرہ سے باہر آ کر حج کے لئے احرام باندھا ہو یا یہ کہ حج کا احرام باندھا پھر حضرت جبرئیل علیہ السلام نے اس کے اندر عمرہ داخل کرنے کا اشارہ کر دیا پس آپ اپنے اسی احرام پر قائم رہے یہاں تک کہ حج سے فارغ ہوئے اور احرام سے باہر نہیں آئے کیونکہ آپ ہدی روانہ کر چکے تھے، دوم یہ ہے کہ آپ نے تلبیہ نماز کے وقت پڑھا تھا یا جس وقت آپ اونٹنی پر سوار ہوئے تھے یا جس وقت آپ ٹیلہ بیداء پر چڑھے تھے اور ابن عباس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس قاصد لوگ آتے تھے پر ہر ایک جس طرح کرتے دیکھتا ویسی ہی خبر دیتا، اور شروع احرام آپ کا اس وقت تھا جبکہ آپ نے دو رکعت نماز پڑھی اور آپ کا غسل کرنا اور دو رکعت نماز پڑھنا اس لئے تھا کہ اس میں شعائر اللہ کی زیادہ تعظیم ہے اور اس لئے تھا کہ اس میں ایسے فعل کے ساتھ نیت کا ضبط کرنا پایا جاتا ہے جو ظاہر ہے، منضبط ہے اور جو خدا تعالیٰ کے ساتھ اخلاص اور اس کی فرمانبرداری کے اہتمام پر دلالت کرتا ہے اور اس لئے کہ اس طرح سے لباس کا بدلنا خدا تعالیٰ کی فرمانبرداری کے لئے نفس کو تنبیہ کرتا ہے اور اس کو بیدار کرتا ہے، اور آپ کو خوشبو لگانے کا سبب یہ ہے کہ احرام کا زمانہ گرد و غبار میں آلودہ رہنے کا وقت ہے اس واسطے احرام سے پہلے کسی قدر اس کا تدارک ضروری ہے، اور تلبیہ میں آپ نے اس وجہ سے ان کلمات کو اختیار کیا کہ ان کے اندر اپنے مولیٰ کی فرمانبرداری میں کھڑے رہنے کا بیان ہے اور ان میں خدا تعالیٰ کی فرمانبرداری کی یاد دہانی ہے اور اہل جاہلیت اپنے بتوں کی تعظیم کیا کرتے تھے اس واسطے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے خیال کو رد کرنے کے لئے اور مسلمانوں کو ان سے ممتاز کرنے کے لئے **لا شریک لک** کے کلمات اس میں داخل کر دیئے اور یہ مستحب ہے کہ خدا تعالیٰ سے اس کی رضا کا اور جنت کا کثرت سے سوال کرے اور اس کی رحمت سے دوزخ سے بچنے کی دعا کرے اور جبرئیل علیہ السلام نے احرام اور تلبیہ کے وقت آوازوں کو بلند کرنے کی طرف اشارہ کیا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''کوئی مسلمان تلبیہ کرنے والا نہیں مگر جو چیز دائیں اور بائیں ہیں، پتھر یا درخت یا ڈھیلہ سب تلبیہ کہتے ہیں یہاں تک کہ زمین ادھر سے اُدھر تک ختم ہو چکتی ہے''۔

میں کہتا ہوں اس میں یہ راز ہے کہ تلبیہ شعائر الٰہی میں سے ہے اور اس میں ذکر الٰہی کی تعظیم

ہے اور اس قسم کے اذکار کو پکار کر کہنا مستحب ہے اس طرح سے کہ ہر غافل اور خبردار کو اس کی خبر ہو اور اس طرح سے کہ وہ داردارالاسلام ہو جائے پس جب ایسا ہوگا تو اس شخص کے نامۂ اعمال میں ان مواضع کی تلبیہ کی صورت لکھی جائے گی۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اونٹنی کے کوہان میں دائیں جانب ایک زخم سا کر دیا اور وہاں سے خون پونچھ دیا اور نعلین اس کی گردن میں لٹکائیں۔

میں کہتا ہوں اس خون بہانے میں یہ راز ہے کہ شعائر اللہ کی تعظیم پائی جائے اور ملت حنیفیہ کا استحکام سب ادنیٰ اور اعلیٰ پر ظاہر ہو جائے اور قلب کا فعل ظاہری فعل سے منضبط ہو جائے اور اسماء بنت عمیسؓ کے ہاں ذوالحلیفہ پہنچنے پر ولادت ہوگئی تو آپ نے ان سے فرمایا ''تو غسل کر لے اور ایک کپڑے کی گدی باندھ لے اور احرام باندھ''۔

میں کہتا ہوں اس کا سبب یہ ہے کہ حتی الامکان احرام کی سنت ادا ہوتی رہے اور جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو مقام سرف میں حیض لاحق ہوا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''یہ ایسی چیز ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے آدم کی بیٹیوں پر مقرر کیا ہے پس جو کچھ حج کرنے والا کرتا ہے تو بھی وہی کر بجز اس کے کہ جب تک تو پاک نہ ہو بیت اللہ کا طواف نہ کیجیو''۔

میں کہتا ہوں آپ نے کلام میں اس بات کی تمہید بیان کی کہ حیض کا آنا کثیر الوقوع ہے پس حکمت شرائع کا مقتضی ہے کہ ایسی شئے سے دقت دفع کر دی جائے اور اس کے لئے ایک ظاہر طریقہ مقرر ہو، پس اس واسطے حائضہ سے طواف قدوم اور طواف وداع ساقط ہو گیا اس کے بعد جب آپ مکہ کے قریب پہنچے تو ذی طویٰ میں نزول فرمایا اور دن کے وقت مکہ میں بالائی طرف سے داخل ہوئے اور پست جانب سے نکلے اور یہ آپ نے اس لئے کیا تا کہ مکہ میں داخل ہونا اطمینان قلب کی حالت میں ہو نہ کہ دقت کی حالت میں تا کہ اللہ تعالیٰ کے جلال اور اس کی عظمت پر آگاہی ہو سکے اور تا کہ سب لوگ آپ کو بیت اللہ کا طواف کرتا ہوا دیکھیں کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ کی طاعت کی زیادہ عظمت ہے، اور نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مناسک کی تعلیم منظور تھی اس لئے آپ نے ان کو یہاں تک مہلت دی کہ سیکھنے کے لئے آمادہ ہو کر کثرت سے آپ کے پاس جمع ہو جائیں اور آمد و رفت میں آپ نے راستہ اس لئے بدلا تا کہ دونوں راستوں میں مسلمانوں کی

شوکت ظاہر ہواور اس کی نظیر عید ہے، پھر جب آپ بیت اللہ کے پاس آئے تو رکن یمانی کو ہاتھ لگایا اور سات طواف کئے، تین طواف میں سینہ نکال کر چلے اور چار طواف میں معمولی رفتار سے چلے اور صرف دونوں رکن یمانی کو ہاتھ لگایا اور ان کے درمیان یہ دعا پڑھی: **ربنا اتنا فی الدنیا حسنة وفی الاخرة حسنة وقنا عذاب النار** پھر مقام ابراہیمؑ کی طرف آگے بڑھے اور یہ آیت پڑھی: **واتخذوا من مقام ابراھیم مصلی** ،اور دو رکعت نماز پڑھی اور مقام ابراہیمؑ کو اپنے کعبہ کے درمیان کر لیا اور آپ نے ان دو رکعتوں میں **قل ھو اللہ احد** اور **قل یا ایھا الکفرون** پڑھیں پھر رکن یمانی کی طرف واپس تشریف لائے اور اس کو ہاتھ سے چھوا۔

میں کہتا ہوں سینہ نکال کر چلنے اور دائیں بغل سے بائیں کاندھے پر چادر ڈالنے کا سبب تو ہم بیان کر چکے ہیں اور بالخصوص دونوں رکن یمانیوں کو چھونے کی وجہ وہی ہے جو حضرت ابن عمرؓ نے بیان کی کہ یہ دونوں رکن حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بنیاد پر باقی ہیں ان کے علاوہ دونوں رکن ایسے نہیں ہیں کیونکہ اہل جاہلیت نے ان کو بدل دیا ہے اور طواف کے اندر نماز کی شرطیں لگانے کا وہی سبب ہے جو حضرت ابن عباسؓ نے ذکر کیا کہ خدا تعالیٰ اور اس کے شعائر کی تعظیم میں طواف نماز کے ساتھ مشابہ ہے اس واسطے طواف کو نماز پر قیاس کیا گیا اور اس کے بعد دو رکعتیں اس لئے مسنون کی گئیں کہ بیت اللہ کی پوری تعظیم پائی جائے کیونکہ اس کی پوری تعظیم یہ ہے کہ نماز میں اس کی طرف منہ کیا جائے اور ان دو رکعتوں کو پڑھنے کے لئے مقام ابراہیمؑ کو اس لئے خاص کیا کہ مسجد میں سب سے اچھی جگہ یہی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ظاہر ہوئی اور ان امور کی یاد دہانی ہی حج کے اندر مقصود ہے، اور دونوں رکنوں کے درمیان یہ دعا مانگنا: **ربنا اتنا فی الدنیا حسنة وفی الاخرة حسنة، الخ**، اس لئے مستحب ہوا کہ یہ ایک جامع دعا ہے جو قرآن پاک میں نازل ہوئی ہے اور اس کے کلمات مختصر ہیں جو اس قلیل فرصت کے مناسب ہیں، پھر دروازہ سے نکل کر کوہ صفا کی طرف آپ تشریف لے گئے پس جب آپ صفا کے قریب پہنچے تو یہ آیت پڑھی، تحقیق صفا اور مروہ اللہ تعالیٰ کے شعائر میں سے ہیں'' اور جس چیز کا خدا تعالیٰ نے پہلے ذکر کیا ہے اسی سے آپ نے ابتدا فرمائی پس صفا سے آپ نے ابتدا کی اور اس پر آپ چڑھے یہاں تک کہ آپ نے بیت اللہ کو اس پر سے دیکھا پس اس کی

طرف منہ کر کے خدا تعالیٰ کی توحید اور اس کی بڑائی بیان کی اور یہ کہا: لا الــه الا اللــه وحـده لاشریک له له الملک وله الحمد وهو علی کل شئ قدیر لا اله الا الله وحده انجز وعده ونصر عبده وهزم الاحزاب وحده، پھر اس کے درمیان میں دعا کر کے تین مرتبہ یہی پڑھا پھر آپ اتر کر مروہ کی طرف چلے یہاں تک کہ آپ کے دونوں پاؤں بطن وادی میں پڑنے لگے تو آپ جلدی جلدی چلنے لگے یہاں تک کہ جب بلندی شروع ہوگئی تو آپ معمول کے موافق چلنے لگے یہاں تک کہ آپ کوہ مروہ پر چڑھ گئے اور جیسا کہ آپ نے کوہ صفا پر توحید اور تکبیر بیان کی تھی ویسا ہی کوہ مروہ پر کیا۔

میں کہتا ہوں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس آیت سے یہ سمجھے کہ خدا تعالیٰ نے مروہ پر صفا کے ذکر کو جو مقدم کیا ہے اس سے مشروع کے ساتھ مذکور کا مطابق کرنا مقصود ہے اور تمام اذکار میں سے ان اذکار کو جن کے اندر خدا تعالیٰ کی توحید اور اس کے ایفا عہد اور دشمنوں پر فتحیاب کرنے کا بیان ہے اس وجہ سے خاص کیا تاکہ خدا تعالیٰ کی نعمت کی یاد دہانی اور بعض معجزات کا اظہار اور شرک کی بیخ کنی ہو اور تاکہ اس بات کا بیان ہو کہ یہ سب چیزیں آپ کے قدموں تلے ہیں اور تاکہ ایسی جگہ میں کلمۃ اللہ کا اور اس کے دین کا اعلان ہو جائے، پھر آپ نے فرمایا ''جو حال مجھ کو بعد میں معلوم ہوا ہے اگر پہلے معلوم ہوتا تو ہدی روانہ نہ کرتا اور حج کو عمرہ کر لیتا پس تم میں سے جس کے پاس ہدی نہیں ہے وہ احرام سے باہر آ جائے اور حج کو عمرہ کر لے، کسی نے کہا'' کیا اسی سال کے لئے یا ہمیشہ کے لئے؟ آپ نے فرمایا نہیں، بلکہ ابد الابد کے لئے'' سب لوگ احرام سے باہر آ گئے اور بال کترا لئے بجز نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اور ان لوگوں کے جن کے ساتھ ہدی تھی۔

میں کہتا ہوں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو چند امور کا انکشاف ہوا، از آں جملہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل لوگ ایام حج میں عمرہ کرنا بڑا ہی گناہ سمجھتے تھے پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کا ارادہ فرمایا کہ ان کی اس تحریف کو پورے طور پر مٹا دیں۔

اور از آں جملہ یہ ہے کہ وہ اپنے دلوں میں اس بات سے تنگی محسوس کرتے تھے کہ حج شروع کرنے سے پہلے جماع کر لیا جائے حتیٰ کہ انھوں نے یہ بات کہی'' کیا ہم عرفہ کو ایسی حالت میں آئیں کہ ہمارے اعضا سے منی ٹپکتی ہو'' اور ان کی یہ بات رائے زنی کے قبیل سے تھی پس نبی صلی

اللہ علیہ وسلم نے اس دروازہ کو بند کرنے کا ارادہ فرمایا اور ازآں جملہ یہ ہے کہ حج کے وقت احرام باندھنے میں خانہ کعبہ کو پوری پوری تعظیم پائی جاتی ہے اور ہدی کا روانہ کرنا احرام سے باہر آنے سے اس لئے مانع ہے کہ ہدی کا روانہ کرنا گویا یہ نذر کر لینا ہے کہ وہ ہدی کے ذبح ہونے تک اسی حالت پر باقی رہے گا اور جس چیز کو انسان اپنے اوپر لازم کر لیتا ہے تو جس وقت وہ دل کا خیال ہوتا ہے یا ارادہ ہوتا ہے جو کسی فعل کے ساتھ منضبط نہیں ہوتا تو ایسی بات کا اعتبار نہیں ہوتا اور جس وقت اس ارادہ کے ساتھ کوئی فعل بھی مل جاتا ہے اور اس کا انضباط ہو جاتا ہے تو اس ارادہ کی رعایت واجب ہو جاتی ہے اور انضباط مختلف طرح سے ہوتا ہے پس اس کا ادنیٰ درجہ زبان سے کہہ دینا ہے اور اس کا اعلیٰ درجہ قول کے ساتھ کسی ایسے فعل ظاہر کا ملانا ہے جو اعلانیہ ہو اس حالت کے ساتھ مخصوص ہو جس کا اس نے ارادہ کیا ہے جیسے ہدی کا روانہ کرنا، پھر جب ترویہ کا دن ہوا تو سب لوگ منیٰ کو چلے اور حج کا احرام باندھا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سواری پر سوار ہوئے اور منیٰ میں ظہر اور عصر اور مغرب اور عشا اور فجر کی نماز پڑھی پھر تھوڑی سی دیر ٹھیرے یہاں تک کہ آفتاب نکل آیا تب آپ چلے حتیٰ کہ آپ نے نمرہ میں نزول فرمایا۔

میں کہتا ہوں ترویہ کے دن منیٰ کا اس لئے قصد فرمایا تاکہ آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو آسانی رہے کیونکہ اس روز لوگ کثیر تعداد میں مجتمع ہوتے ہیں اور ان میں ضعیف اور مریض بھی ہوتے ہیں پس آپ نے ان کے ساتھ آسانی کرنے کو مناسب سمجھا اور وقت سے پیشتر عرفات میں اس لئے نہیں گئے کہ لوگ اس کو سنت نہ سمجھنے لگیں اور بے وقت جانے کو بھی عبادت سمجھنے لگیں، پھر نمرہ میں سورج خوب روشن ہو گیا تو آپ نے ناقہ قصواء کو طلب کیا پس وہ کسی گئی اور آپ سوار ہو کر بطن وادی میں آئے اور لوگوں کو خطبہ سنایا اور آپ کے اس دن کے خطبہ میں سے یہ جملہ یاد رہ گیا ہے ''تمہارے خون تمہارے اوپر حرام ہیں'' پھر بلالؓ نے اذان دی اس کے بعد اقامت کہی پس آپ نے نماز ظہر ادا کی پھر بلالؓ نے اقامت کہی اور آپ نے نماز عصر پڑھی اور ان کے درمیان کچھ اور نماز نہ پڑھی۔

میں کہتا ہوں اس روز آپ نے خطبہ کے اندر وہ احکام بیان فرمائے جن کی لوگوں کو حاجت تھی اور جن کا جاننا ضروری تھا کیونکہ وہ دن لوگوں کے جمع ہونے کا دن ہوتا ہے اور ایسی فرصت کو

ایسے احکام کے لئے غنیمت سمجھا جاتا ہے جن کی تبلیغ تمام مخلوق کے لئے مقصود ہوتی ہے اور ظہر وعصر اور عشاء ومغرب کو اس لئے ملا کر پڑھا کہ اس روز لوگوں کا ایسا اجتماع ہوتا ہے جو بجز اس مقام کے کہیں نہیں ہوتا اور شارع کو ایک جماعت کا ہونا مطلوب ہے اور ایسے اجتماع میں ایک جماعت کا قائم کرنا ضروری ہے تا کہ سب لوگ اس کو دیکھیں اور دو وقتوں میں سب کا مجتمع ہونا مشکل تھا اور نیز اس روز لوگ ذکر اور دعا میں مشغول ہوتے ہیں اور وہ اسی روز کا وظیفہ ہیں اور اوقات کی پابندی تمام سال کا وظیفہ ہے اور ایسے وقت میں بدیع ونادر شئے کو ترجیح دی جاتی ہے پھر آپ وہاں سے سوار ہو کر موقف میں تشریف لائے اور قبلہ کی طرف متوجہ ہوئے پس آپ وہیں کھڑے رہے یہاں تک کہ آفتاب غروب ہوا اور زردی کم ہوگئی پھر وہاں سے علیحدہ ہوئے۔

میں کہتا ہوں غروب کے بعد وہاں سے اس لئے علیحدہ ہوئے تا کہ جاہلیت کی تحریف مٹ جائے کیونکہ وہ لوگ غروب سے پہلے ہی ہٹ جاتے تھے اور نیز غروب سے پہلے کا وقت غیر معین ہے اور بعد غروب معین ہے، اور ایسے دن میں امر منضبط کا حکم دینا چاہئے، پھر وہاں سے چل کر مزدلفہ میں تشریف لائے اور وہاں مغرب وعشا کی نماز ایک اذان اور دو اقامت سے پڑھی اور ان کے درمیان کوئی نفل نماز نہیں پڑھی پھر سو گئے یہاں تک کہ صبح صادق ہوگئی پھر جب صبح خوب روشن ہوگئی تو فجر کی نماز ایک اذان اور ایک اقامت سے پڑھی پھر قصواء پر سوار ہوئے حتیٰ کہ مشعر الحرام میں تشریف لائے اور قبلہ کی طرف منہ کر کے خدا تعالیٰ سے دعا مانگی اور تکبیر وتہلیل اور توحید بیان کی اور برابر کھڑے ہوگئے یہاں تک کہ خوب سویرا ہوگیا پھر آفتاب طلوع ہونے سے پیشتر چل پڑے حتیٰ کہ بطن محسر میں تشریف لائے اور سواری کو تھوڑا تیز کر دیا۔

میں کہتا ہوں مزدلفہ کی رات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تہجد کی نماز اس لئے نہیں پڑھی کہ آپ جم غفیر کے اندر بہت سے مستحبات کو ترک کر دیا کرتے تھے تا کہ لوگ ان کو سنت نہ سمجھنے لگیں اور مشعر حرام میں قیام کا راز ہم بیان کر چکے ہیں اور بطن محسر میں اس لئے سواری کو تیز کیا کہ وہ جگہ اصحاب فیل کے ہلاک ہونے کا مقام ہے پس جس شخص کی شان یہ ہے کہ خدا تعالیٰ اور اس کی طاقت سے ڈرتا ہے اس کو اس مقام میں خوف معلوم ہوتا ہے اور غضب الٰہی سے ڈر کر بھاگتا ہے اور چونکہ اس خوف کا معلوم کرنا ایک امر خفی تھا اس واسطے اس کا انضباط ایسے ظاہری فعل سے کیا جو

خوف کو یاد دلانے والا ہو اور اس خوف پر نفس پر تنبیہ کرنے والا ہو، پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم جمرۃ العقبہ میں تشریف لائے اور اس کی طرف سات کنکریاں پھینکیں اور ہر کنکری کے ساتھ تکبیر کہتے تھے اور بطن وادی سے انگلیوں سے کنکریاں پھینکیں۔

میں کہتا ہوں اول دن میں رمی الجمار صبح کے وقت اور باقی دنوں میں شام کے وقت ہونے کی یہ وجہ ہے کہ اول دن میں قربانی اور سر منڈانا اور طواف افاضہ کرنا ہوتا ہے اور یہ سب کام بعد رمی کے ہوتے ہیں اس واسطے صبح کے وقت رمی جمار کرنے میں دوسرے کاموں کی وسعت ہے اور باقی ایام تجارت اور بازار قائم کرنے کے ہوتے ہیں اس واسطے ضروریات سے فراغت پانے کے بعد رمی الجمار میں سہولت ہے اور فراغت اکثر اخیر دن میں ہوتی ہے اور رمی الجمار میں طاق عدد کا مقرر ہونا اور صفا و مردہ کے درمیان سعی کے اعداد کا طاق ہونا اسی وجہ سے ہے جو ہم نے ذکر کیا کہ طاق عدد خدا تعالیٰ کو پسند ہے اور واحد حقیقی کا قائم مقام تین یا سات کا عدد ہے پس سات سے تجاوز نہیں کرنا چاہئے اگر اس میں کفایت ہو سکے اور انگلیوں سے کنکریوں کو اس لئے پھینکا کہ اس سے کم میں وہ محسوس نہیں ہوتیں اور اس سے زیادہ میں ایسے موقع پر ایذا پہنچنے کا احتمال ہے پھر آپ قربانی کرنے کی جگہ میں تشریف لائے پس آپ نے تریسٹھ بدنے اپنے ہاتھ سے ذبح کئے پھر حضرت علیؓ کو چھری عطا فرمائی تا کہ باقی کو ذبح کریں اور اپنی قربانی میں حضرت علی کو شریک کیا پھر حکم دیا کہ ہر بدنہ میں سے ایک ایک ٹکڑا لیکر سب کو ایک ہانڈی میں پکایا جائے پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اس گوشت میں سے کچھ کھایا اور کچھ شوربا پیا۔

میں کہتا ہوں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ سے اس قدر قربانیاں اس لئے کیں تا کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں کہ اس نے آپ کی عمر کے ہر سال کے عوض ایک بدنہ عطا فرمایا، اور اس میں سے اس لئے کھایا اور پیا تا کہ ہدی کی تعظیم پائی جائے اور اللہ تعالیٰ کی چیز سے تبرک حاصل کریں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں نے اس جگہ قربانی کی ہے اور منی سب کی سب قربانی کی جگہ ہے پس تم لوگ اپنے اپنے مقام پر قربانی کرو اور میں یہاں پر ٹھیرا اور عرفات میں سب جگہ ٹھیرنے کی ہے اور میں یہاں پر ٹھیرا اور جمع یعنی مزدلفہ سب کی سب ٹھیرنے کی جگہ ہے اور ایک روایت میں یہ بھی زائد ہے "مکہ کی ہر گلی، راستہ قربانی کی جگہ ہے"۔

میں کہتا ہوں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس امر میں جس کو تشریعا کیا تھا اور اس امر میں جس کو بحسب اتفاق یا کسی ایسی مصلحت کے اعتبار سے جو اس دن کے ساتھ خاص تھی یا اچھے امر کے اختیار کرنے کے طور پر کیا تھا، فرق کر دیا، پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سوار ہوئے اور مکہ کی طرف چلے پس مکہ میں ظہر کی نماز پڑھی اور طواف کیا اور زمزم سے پانی پیا۔

میں کہتا ہوں آپ نے بیت اللہ کی طرف اس لئے جلدی کی تا کہ اول وقت میں عبادت ہو اور دوسرے یہ کہ ہر وقت انسان کو کوئی مانع پیش آ سکتا ہے اور زمزم سے پانی اس لئے آپ نے پیا تا کہ شعائر اللہ کی تعظیم ہو اور خدا تعالیٰ نے اپنی رحمت سے جو ایک چیز ظاہر کی ہے اس سے برکت حاصل ہو پھر جب منیٰ کے دن پورے ہو چکے تو آپ ابطح میں ٹھیرے اور طواف وداع کر کے تشریف لے گئے۔

میں کہتا ہوں ابطح میں نزول فرمانے کے اندر اختلاف ہے کہ وہ عبادت کے طور پر تھا یا عادت کے طور پر، پس حضرت عائشہ نے فرمایا ابطح کے اندر اترنا سنت نہیں ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس جگہ اس لئے ٹھیرے تھے کہ وہاں سے کوچ کرنا آسان تھا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول سے کہ ''ہم کل انشاء اللہ اس جگہ ٹھیریں گے جہاں لوگوں نے کفر پر قسم کھائی تھی'' اس بات کو اخذ کیا کہ آپ نے وہاں پر ٹھیرنے سے دین کی شوکت کا قصد فرمایا تھا اور پہلی بات زیادہ صحیح ہے۔

حج کے ساتھ متعلق امور کا بیان

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''حجر اسود جنت سے اتارا گیا ہے اور وہ دودھ سے زیادہ سفید تھا پس بنی آدم کے گناہوں نے اس کو سیاہ کر دیا'' اور آپ نے اس کے بارے میں فرمایا ''اللہ کی قسم اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے دن ایسی حالت میں اٹھائے گا کہ اس کی دو آنکھیں ہوں گی جن سے وہ دیکھے گا اور زبان ہوگی جس سے وہ بولے گا اور جس نے اس کو اللہ کے لئے بوسہ دیا ہے اس کی شہادت بیان کرے گا'' اور فرمایا ''رکن یمانی اور مقام دو یاقوت ہیں''۔

میں کہتا ہوں اس بات کا احتمال ہے کہ وہ دونوں جنت سے لائے گئے ہوں پس جب وہ زمین پر نصب کئے گئے تو حکمت کا یہ مقتضی ہوا کہ ان میں زمین کے مزاج کی رعایت کی جائے اس واسطے ان کا نور سلب کر دیا گیا اور یہ مراد بھی ہو سکتی ہے کہ ان دونوں کی عظمت کی طرف ملائکہ کی توجہ

اور ملاءاعلیٰ اور بنی آدم میں صالحین کی ہمتوں کے تعلق کے سبب سے ان دونوں کے ساتھ ایک قوت مثالیہ کا اختلاط ہوا حتی کہ ان میں قوت ملکیہ پیدا ہوگئی، اور حضرت ابن عباسؓ کے اس قول میں اور محمد بن حنفیہؒ کے اس قول میں کہ ''زمین کے پتھروں میں سے وہ ایک پتھر ہے'' تطبیق کی یہی صورت ہے اور ہم نے آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کیا ہے کہ خانہ کعبہ قوت ملکیہ سے گویا پر ہے، اس واسطے ضروری ہوا کہ عالم مثال میں حجر اسود کو آنکھیں اور زبان دی جائے جو جاندار چیزوں کی خاصیت ہے، اور چونکہ خانۂ کعبہ مومنین کے ایمان اور خدا تعالیٰ کی تعظیم کرنے والوں کی تعظیم کو بتلانے والا تھا اس واسطے ضروری ہوا کہ زبان میں شہادت کی صورت کا ظہور ہو جیسا کہ ہم نے پاؤں اور ہاتھ کے گویا ہونے کے راز میں بیان کیا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس شخص نے اس گھر کا سات مرتبہ شمار کر کے طواف کیا اور دو رکعت نماز پڑھی تو یہ ایک غلام آزاد کرنے کے برابر ہوا اور جو شخص ایک قدم رکھتا یا اٹھاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے بدلہ میں اس کے لئے ایک نیکی لکھتا ہے اور ایک گناہ دور کرتا ہے اور ایک درجہ بلند کرتا ہے''۔

میں کہتا ہوں اس فضیلت میں دو چیزیں ہیں ایک تو یہ کہ طواف کرنا جبکہ رحمت الٰہی میں غوطہ لگانے کے اور عالم بالا کی دعاؤں کے متوجہ ہونے کے مشابہ تھا اور اس کا مظنہ تھا تو اس کی خاصیت قریبہ کو بیان کر دیا اور دوسرے یہ کہ جب انسان خدا تعالیٰ پر یقین رکھ کر اور اس کے وعدہ کو سچا سمجھ کر کسی کام کو کرتا ہے تو یہ کام اس کے ایمان کی شرح اور بیان ہو جاتا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''عرفہ کے دن سے زیادہ کوئی دن ایسا نہیں ہوتا جس میں اللہ تعالیٰ بندہ کو دوزخ سے نجات دے اور اس دن لوگوں سے نہایت قریب ہوتا ہے پھر ان کے ساتھ فرشتوں سے فخر بیان کرتا ہے''

میں کہتا ہوں اس کا سبب یہ ہے کہ جب سب لوگ مل کر خدا تعالیٰ سے عاجزی کرتے ہیں تو ان پر رحمت کے نازل ہونے میں اور ان کے اندر روحانیت کے پھیلنے میں کچھ دیر نہیں لگتی، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''سب دعاؤں سے بہتر عرفہ کے دن کی دعا ہے اور بہتر بات جو میں نے اور مجھ سے پہلے انبیا نے کہی ہے ''لا الہ الا اللہ وحدہ لاشریک لہ الخ ہے، اور اس کا سبب یہ ہے کہ یہ کلمہ ذکر کے بہت سے اقسام کو جامع ہے اور اسی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اور سبحان اللہ اور الحمدللہ کی بہت سے مقامات اور اوقات میں بہت ترغیب دی ہے جیسا کہ

دعاؤں کے باب میں اس کا ذکر آتا ہے،اور ہدی کا بھیجنا مسنون ہے اگر چہ حج کو نہ جائے تا کہ حتی الامکان اعلاء کلمتہ اللہ کی اقامت ہو اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بال منڈانے والوں کے لئے تین بار اور بال ترشوانے والوں کے لئے ایک بار دعا کی تا کہ سر منڈانے کی فضیلت ظاہر ہو جائے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ سر منڈانے سے گرد وغبار زیادہ دور ہوتا ہے جو بادشاہوں کے پاس جانے والوں کی ہیئت کے مناسب ہے اور اس میں عبادت کا اثر زیادہ باقی رہتا ہے اور یہ اثر سر منڈانے سے دکھائی دیتا ہے تا کہ عبادت الٰہی پر تنبیہ ہو، اور آپ نے عورت کو سر منڈانے سے اس لئے منع فرمایا کیونکہ وہ اس کے حق میں مثلہ ہے اور مردوں کے ساتھ مشابہت کا پایا جانا ہے اور جس شخص نے ذبح سے پیشتر سر منڈایا یا رمی سے پیشتر قربانی کی یا شام ہونے کے بعد رمی کی یا سر منڈانے سے پہلے طواف کیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لئے یہ فتویٰ دیا کہ اس میں کچھ حرج نہیں ہے اور کفارہ کا حکم نہیں دیا اور ضرورت کے وقت سکوت کرنا بیان ہے اور کاش میں یہ جانتا کہ استحباب کے بیان میں لاحرج کے لفظ سے زیادہ صریح کوئی اور لفظ ہے اور تشریع اس کے بغیر تمام نہیں ہوتی کہ شدائد کے وقت رخصتوں کو بیان کیا جائے، پس منجملہ ان شدائد کے وہ تکلیف ہے جس کی وجہ سے احرام کی حرام چیزوں سے اجتناب نہ کر سکے اور اس امر میں اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے ''پس تم میں سے جو شخص بیمار ہو یا اس کے سر میں کچھ تکلیف ہو تو روزوں سے یا صدقہ سے یا قربانی سے اس کا فدیہ دے'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول بھی ہے جو کعب بن عجرہ ؓ سے فرمایا تھا کہ ''اپنے سر کو منڈا لے اور ایک فرق (۱) چھوارے مساکین کو کھلا دے'' الخ۔ اور ہم بیان کر چکے ہیں کہ رخصت کے اقسام میں سے سب سے بہتر وہ ہے جس کے ساتھ کوئی ایسی چیز مقرر کر دی جائے جو اصل عبادت کو یاد دلاتی رہے اور جس نے اصل عبادت کا قصد کر رکھا تھا اس عبادت کے ترک کرتے وقت اس کی دلجمعی کرے اور وجوب کفارہ میں جو زیاتی کی گئی ہے وہ بطریق اولی اس پر محمول ہے، اور من جملہ ان شدائد کے ایک احصار ہے اور اس امر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ طریقہ مقرر کیا کہ جب کفار قریش نے بیت اللہ جانے سے روکا تو آپ نے اپنی ہدایا کی قربانی کی اور سر منڈایا اور احرام سے باہر ہو گئے اور مکہ اور مدینہ کے حرم میں یہ راز ہے کہ ہر چیز کے لئے ایک خاص تعظیم

---

(۱) ایک وزن کا نام ہے۔

ہوتی ہے اور مقامات کی تعظیم یہ ہے کہ ان کے اندر کی چیزوں میں سے کسی برائی کے ساتھ تعرض نہ کیا جائے اور اس تعظیم کی اصل بادشاہوں کی حد اور ان کی شہر پناہوں سے ماخوذ ہے کیونکہ قوم کا ان کے سامنے مطیع ہونا اور ان کی تعظیم کرنا یہ ہے کہ وہ اپنے اوپر اس بات کو مقرر کر لیتی ہے کہ ان حدود کے اندر جو درخت وچوپائے وغیرہ ہیں ان سے وہ کچھ تعرض نہ کریں گے اور حدیث شریف میں وارد ہے کہ "ہر بادشاہ کا ایک حرم ہے اور خدا تعالیٰ کا حرم اس کی حرام کی ہوئی چیزیں ہیں" پس یہ بات ان میں مشہور ہوگئی تھی اور ان کے دلوں میں پیوست ہوگئی تھی اور حرم کا ادب ایک یہ ہے کہ جو چیز غیر حرم میں واجب ہے جیسے عدل کا قائم کرنا، یا جو چیز حرام ہے حرم کے اندر اس کے وجوب کی اور اس کی تحریم کی نہایت تاکید کی جائے چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "حرم کے اندر غلہ کا بند کرنا اس میں الحاد کرنا ہے"۔

اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "اے ایمان والو احرام کی حالت میں شکار نہ کرو" الآیہ۔

میں کہتا ہوں چونکہ حرم اور احرام کے اندر شکار کرنا اور احرام کی حالت میں جماع کرنا ایک طرح کی افراط ہے جو شہوت نفس کے توغل (۱) کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے تو ضروری ہوا کہ کفارہ کے ساتھ اسے روکا جائے اور شکار کی جزا میں اختلاف ہے کہ مثلیت کا اعتبار صورت کے اندر ہے یا قیمت کے اندر ہے اور حق یہ ہے کہ دو عادل شخصوں سے یہ بات دریافت کی جائے پس اگر وہ اس بارے میں سلف کے مانند رائے دیں تو اس پر عمل کرنا چاہئے اور اگر قیمت تجویز کریں تو قیمت دینی چاہئے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میری امت میں سے جو شخص مدینہ کی مصیبتوں پر صبر کرے گا میں قیامت میں اس کے لئے شفیع ہوں گا"۔

میں کہتا ہوں اس فضیلت کا راز یہ ہے کہ مدینہ کا آباد کرنا دین کے شعائر کا بلند کرنا ہے پس یہ ایسا فائدہ ہے جو دین کی طرف رجوع کرتا ہے اور ایسے مواضع میں جانا اور مسجد نبوی میں داخل ہونا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات کو یاد دلاتا ہے اور یہ ایسا فائدہ ہے جو مکلّف کی ذات کی طرف رجوع کرتا ہے۔

---

(۱) ہمہ تن مشغول ہونا۔ غلوئے نفس۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کو عزت دی اور اس کو حرم بنادیا اور میں نے مدینہ کو حرم بنایا''۔

میں کہتا ہوں اس میں اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دل سے دعا اور آپ کے پختہ ارادہ کو توقیتات کے نزول میں بہت بڑا دخل ہے، واللہ اعلم۔

ابواب احسان

واضح ہو کہ ایجاب یا تحریم کی وجہ سے شارع نے بندوں کو بالذات جن امور کی تکلیف دی ہے وہ اعمال ہیں اس اعتبار سے کہ وہ اعمال ان ہیئات نفسانیہ سے پیدا ہوتے ہیں جو آخرت میں نفوس کو نفع یا نقصان پہنچائے گی اور یہ اعمال ان ہیئات نفسانیہ کو بڑھاتے ہیں اور ان ہیئات کا بیان ہیں اور یہ اعمال ان کی اشباح اور صور ہوتے ہیں اور ان اعمال سے دو طرح پر بحث کی جاتی ہے اور یہ ہے کہ تمام لوگوں کو اس کی پابندی پر مجبور کیا جائے اور اس امر میں عمدہ یہ ہے کہ ان ہیئات کے مظان یعنی اعمال کو اختیار کیا جائے اور اس طریق ظاہر کو اختیار کیا جائے جو ہر شخص پر ظاہر ہو اور جو سب لوگوں کے سامنے ہوں پس وہ لوگ حیلہ و بہانہ نہ کر سکیں اور یہ بھی ضروری ہے کہ اس کی بنیاد میانہ روی پر ہو اور امور منضبطہ پر ہو، اور دوسری قسم یہ ہے کہ ان اعمال سے نفوس کی تہذیب اور ان ہیئات کی طرف پہنچانا مقصود ہو جو ان اعمال سے مطلوب ہیں اور اس امر میں عمدہ ان ہیئات کی معرفت ہے اور اعمال کی معرفت ہے اس جہت سے کہ وہ اعمال ان ہیئات کی طرف پہنچادیں اور ان کا مبنی وجدان اور مکلّف کے اختیار میں دے دینے پر ہے پس جس علم میں ان اعمال سے پہلی جہت سے بحث ہوتی ہے وہ علم الشرائع ہے اور جس علم میں دوسری جہت سے بحث ہوتی ہے اور وہ علم علم الاحسان ہے۔

پس مباحث احسان میں نظر کرنے والے کو دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے ایک تو اعمال کی طرف اس طرح پر نظر کرنا کہ وہ ہیئات نفسانیہ کی طرف پہنچادیں کیونکہ کبھی کبھی عمل ریا اور سمعہ یا عادت کے طور پر ادا کیا جاتا ہے یا اس کے ساتھ خود پسندی اور احسان جتانا اور ایذا رسانی پائی جاتی

ہے پس ایسے عمل سے وہ چیز حاصل نہیں ہوتی جو اس سے مقصود ہوتی ہے اور کبھی اس فعل کو اس طرح پر ادا کیا جاتا ہے کہ نفس کو اس عمل کی روح پر وہ تنبہ حاصل نہیں ہوتا ہے جو محسنین کو حاصل ہونا چاہئے اگرچہ بعض ایسے نفوس ہوتے ہیں جو اس کے مثل پر متنبہ ہو جاتے ہیں جیسے وہ شخص جو اصل فرائض پر اکتفا کرتا ہے نہ کمیت میں زیادتی کرتا ہے اور نہ اس کی کیفیت میں زیادتی کرتا ہے اور ایسا شخص ذکی نہیں ہوتا اور دوسرے ان ہیئات نفسانیہ کی طرف نظر کرنا تاکہ ان کی پوری معرفت ہو اور ایسی بصیرت کے ساتھ ان کو عمل میں لائے جو ان سے مقصود ہے پس وہ اپنے نفس کو طبیب بن کر اس پر ایسی حکومت کرے جیسے طبیب طبیعت پر حکومت کرتا ہے کیونکہ جو شخص اس چیز کو نہیں جانتا جو آلات سے مقصود ہے تو وہ جب ان آلات کو برتتا ہے تو اندھی اونٹنی کی طرح بدحواس ہو جاتا ہے اور اس کی حالت اس شخص جیسی ہو جاتی ہے جو رات کے وقت لکڑیاں چنتا پھرتا ہے اور جن اخلاق سے اس فن میں بحث کی جاتی ہے ان کے چار اصول ہیں جیسا کہ ہم پہلے بتلا چکے ہیں ایک تو طہارت ہے جس سے ملکوت کے ساتھ مشابہت حاصل ہوتی ہے اور دوسرے خدا تعالیٰ کے لئے عاجزی اور فرمانبرداری کرنا ہے جو جبروت پر اطلاع کا سبب بنتا ہے پہلے کے لئے وضو اور غسل اور دوسرے کے لئے نماز، اذکار اور تلاوت مقرر کئے گئے، اور جب دونوں جمع ہو جاتے ہیں تو ہم اس کو سکینہ اور وسیلہ کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں۔

چنانچہ حذیفہؓ کا قول جو عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کے بارے میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے محفوظ لوگ اس بات کو جانتے ہیں کہ وہ یعنی عبداللہ بن مسعودؓ سب سے زیادہ وسیلہ کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے مقرب ہیں، اور شارع نے طہارت کو اپنے اس قول میں ایمان فرمایا ہے ''پاکی نصف ایمان ہے'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے طہارت کے حال کو اس طرح بیان فرمایا ''خدا تعالیٰ پاک ہے پاکی کو پسند کرتا ہے'' اور دوسرے کی طرف اس قول سے اشارہ فرمایا ''احسان اس کو کہتے ہیں کہ تو اللہ تعالیٰ کی اس طرح پر عبادت کر گویا تو اس کو دیکھ رہا ہے پس تو اس کو اگر نہیں دیکھتا ہے تو وہ تجھ کو دیکھ رہا ہے'' پس طہارت کے حاصل کرنے میں عمدہ ان عبادات کا اختیار کرنا جو انبیاء علیہم السلام سے منقول ہیں اور ان کی ارواح اور ان کے انوار کا لحاظ کرنا اور کثرت سے ان کو عمل میں لانا اور ان کی ہیئات اور اذکار کا خیال رکھنا ہے، پس طہارت کی روح

باطن کا منور ہونا اور انس وسرور کی حالت کا پیدا ہونا اور پریشان افکار کا دور ہونا اور پراگندگی اور پریشانی اور حیرانی اور گھبراہٹ کا رک جانا ہے اور نماز کی روح خدا تعالیٰ کے ساتھ حضور اور جبروت پر مطلع ہونا اور خدا تعالیٰ کی کبریائی کا یاد کرنا اور اس کے ساتھ تعظیم کا ہونا ہے جس میں محبت اور طمانیت پائی جائے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس قول میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے ''**الاحسان ان تعبدالله** '' الخ۔ اور آپ نے نفس کو نماز کے عادی ہونے کی کیفیت پر اس قول سے اشارہ کیا ہے ''اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں نے نماز کو اپنے اور بندہ کے درمیان نصف نصف تقسیم کر لیا ہے اور میرے بندہ کے لئے وہ چیز ہے جو وہ مانگے پس جب بندہ '**الحمدلله رب العالمين**' کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ بندہ نے میری حمد کی اور جب '**الرحمن الرحيم**' کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ بندہ نے میری ثنا کی، اور جب بندہ **مالك يوم الدين** کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ بندہ نے میری بزرگی بیان کی اور جب بندہ **اياك نعبد واياك نستعين** کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ میرے اور میرے بندہ کے درمیان ہے اور میرے بندہ کے لئے وہ ہے جو وہ مانگتا ہے اور جب بندہ کہتا ہے **اهدنا الصراط المستقيم صراط الذين انعمت عليهم غير المغضوب عليهم ولا الضالين**، تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ خاص میرے بندہ کے لئے ہے اور جو کچھ وہ مانتا ہے وہ اس کے لئے ہے''۔

پس یہ حدیث اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ ہر کلمہ میں جواب کا لحاظ ہے کیونکہ اس سے حضور قلبی پر نفس کو تنبیہ بلیغ ہوتی ہے اور وہ دعائیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کے اندر مسنون فرمائی ہیں اور وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ وغیرہ کی حدیث میں مذکور ہیں ان میں بھی اسی کیفیت کی طرف اشارہ ہے اور تلاوت قرآن کی روح یہ ہے کہ نہایت شوق اور تعظیم سے خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو کر اس کے مواعظ میں غور کرے اور اس کے احکام میں اطاعت کا شعور حاصل کرے اور قرآن کی امثال اور قصص سے عبرت حاصل کرتا جائے اور جب اللہ تعالیٰ کی کسی آیت، صفات اور اس کی نشانیوں پر سے گزرے تو سبحان اللہ کہے اور جب جنت اور رحمت کی آیت پڑھے تو اس کے فضل کو مانگے اور جب دوزخ اور غضب کی آیت پر سے گزرے تو اس کی پناہ طلب کرے پس یہ وہ امر ہے جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نفس کو نصیحت حاصل کرنے کا خوگر

ہونے کے لئے مسنون فرمایا ہے، اور ذکر کی روح حضور اور جبروت کی طرف متوجہ ہونے میں غرق ہو جاتا ہے اور اس کا خوگر اس طرح ہوتا ہے کہ کہے لا الله الا الله و الله اکبر، پھر خدا تعالیٰ سے اس کے جواب میں اس کا یہ قول سنئے، لا الـه الا انا وانا اکبر، پھر کہے لا الـه الا وحده لاشریک له، پھر اللہ تعالیٰ سے اس کے جواب میں یہ سنے لا الله الا انا وحدی لاشریک لـی، اور اسی طرح کیا کرے حتی کہ حجاب رفع ہو اور استغراق حاصل ہو جائے۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے اور دعا کی روح یہ ہے کہ یہ سمجھے کہ ہر چیز سے روکنا اور ہر چیز کی قدرت دینا خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے اور اس طرح ہو جائے جس طرح نہلانے والے کے ہاتھ میں مردہ ہوتا ہے یا جس طرح حرکت دینے والے کے ہاتھ میں مورت ہوتی ہے اور مناجات کی لذت حاصل کرے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تہجد کی نماز کے بعد اس کے شفعوں کے درمیان میں ایک بڑی دعا مسنون فرمائی ہے کہ اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا کرے اور یا رب یا رب کہہ کر دنیا اور آخرت کی بھلائی مانگے اور مصائب سے پناہ مانگے اور نہایت تضرع اور نیازمندی سے مانگے، اور اس میں شرط یہ ہے کہ اس کا دل امور دنیوی سے فارغ ہو اور بول و براز کی حاجت نہ ہو اور نہ بھوکا ہو اور نہ غضب ناک ہو، پس جب انسان حضوری کی حالت معلوم کر لے اور پھر وہ حضور اس سے مفقود ہو جائے تو اس حضور کے جاتے رہنے کا سبب اس کو سوچنا چاہئے پس اگر قوت جسمانی اس کا باعث ہے تو اس کو روزہ رکھنا چاہئے کیونکہ روزہ اس کے لئے قاطع ہے اور اکثر دو مہینہ کے پے در پے روزہ رکھنے سے یہ بات حاصل ہو سکتی ہے اور اگر جماع کی خواہش ہے اور کھانے پینے سے فارغ ہونے کی حاجت ہے یا اس کا سرور جاتا رہا ہے اور اس کا اعادہ چاہتا ہے تو کسی عورت سے نکاح کر کے حاجت جماع کو رفع کرے لیکن لذائذ اور اختلاط میں منہمک نہ ہو اور اس کو دوا کے طور پر سمجھے کہ اس سے نفع اٹھائے اور اس کی مضرت سے بچے اور اگر کاروبار اور لوگوں کی صحبت میں مشغول رہتا ہو تو ان کے ساتھ عبادات کو شامل کر کے علاج کرے اور اگر دماغ میں خیالات مشوشہ اور افکار ناقصہ بھرے ہوئے ہوں تو لوگوں سے کنارہ کش ہو کر گھر یا مسجد میں گوشہ نشینی اختیار کرے اور اپنی زبان کو بجز ذکر الٰہی کے اور اپنے قلب کو بجز اس فکر کے جس کے وہ در پے ہے روکے اور بیدار ہوتے وقت ذکر الٰہی کی عادت ڈالے تاکہ سب سے پہلے اس کے دل میں ذکر

الٰہی داخل ہو اور سوتے وقت بھی ایسا کرے تاکہ تمام اشغال سے دل کو فراغت ہو۔

اور تیسرا اصول سماحت نفس ہے اور سماحت نفس یہ ہے کہ قوت ملکی قوت بہیمی کے دواعی کی مطیع نہ ہو جائے کہ لذت طلب کرے اور انتقام لینے کی خواہش کرے اور غصہ کو اور بخل کو پسند کرے اور مال و جاہ کی حرص کرے کیونکہ جب انسان ان امور کو عمل میں لانے کا مرتکب ہوتا ہے تو کسی وقت میں نفس کے اندر ان کے الوان لگ جاتے ہیں پس اگر نفس میں سماحت ہوتی ہے تو ان ہیئات رذیلہ کا ترک کرنا اس پر آسان ہوتا ہے اور نفس ایسا ہو جاتا ہے گویا اس میں اس قسم کی بات کبھی نہ تھی اور نفس خالص ہو کر رحمت الٰہی میں داخل ہو جاتا ہے اور ان انوار کے دریا میں مستغرق ہو جاتا ہے جن کی نفوس کی جبلت مقتضی ہوتی ہے بشرطیکہ موانع نہ ہوں اور اگر نفس میں صفت سماحت نہیں ہے تو ان اعمال کے الوان نفس کے اندر اس طرح پیوست ہو جاتے ہیں جس طرح موم کے اندر مہر کے نقوش منقش ہو جاتے ہیں اور دنیوی زندگی کا میل اس میں جم جاتا ہے اور ان کا ترک کرنا نفس کے لئے آسان نہیں ہوتا پھر جب ایسا نفس جسم سے جدا ہوتا ہے تو وہ برے اعمال سامنے اور پیچھے سے اور دائیں اور بائیں سے اس کا احاطہ کر لیتے ہیں اور نفس اور ان انوار کے درمیان جن کا جبلت نفوس تقاضا کرتی ہے بہت سے غلیظ پردے پڑ جاتے ہیں اور اس سبب سے نفس کو ایذا و تکلیف پہنچتی رہتی ہے اور اس سماعت کو جب خواہش شکم اور خواہش فرج کے داعیہ کے ساتھ اعتبار کیا جائے تو اس کو عفت کہتے ہیں اور جب آرام و آرائش کے داعیہ کے ساتھ اعتبار کیا جائے تو اس کو اجتہاد کہتے ہیں اور جب بیقراری اور اضطراب کے داعیہ کے ساتھ اعتبار کیا جائے تو اس کو صبر کہتے ہیں اور جب انتقام کے داعیہ کے ساتھ اعتبار کیا جائے تو اس کو عفو کہتے ہیں اور جب حب مال کے داعیہ کے ساتھ اعتبار کیا جائے تو اس کو سخاوت اور قناعت کہتے ہیں اور جب مخالفت شرع کے داعیہ کے ساتھ اعتبار کیا جائے تو اس کو تقویٰ کہتے ہیں۔

اور یہ سب باتیں ایک میں جمع ہو جاتی ہیں اور وہ یہ ہے کہ سماحت کی اصل نفس کا خواہشات نفسانیہ کی نافرمانی کرنا ہے اور صوفیہ اس کو تعلقات دنیویہ کے قطع کرنے یا خسائس بشریہ کے فنا کرنے یا حریت کے نام سے موسوم کرتے ہیں پس اس خصلت کو مختلف ناموں سے تعبیر کرتے ہیں اور اس صفت کے حاصل کرنے میں زیادہ ضروری یہ ہے کہ ان افعال کو اختیار نہ کرے جن سے ان

چیزوں میں گرفتار ہونے کا گمان ہواور دل کو ذکر الٰہی میں لگائے رکھے اور نفس کو عالم تجرد کی طرف متوجہ کرے چنانچہ زیدؓ بن حارثہ کا قول ہے ''میرے نزدیک پتھر اور ڈھیلا سب برابر تھے حتیٰ کہ مجھ کو مکاشفہ سے خبر دی گئی''۔

چوتھا اصول عدالت ہے اور وہ ایک ملکہ اور صفت کا نام ہے جس سے بہ سہولت وہ نظام عادل جو تدبیر منزل اور سیاست مدنیہ وغیرہ کے لئے مصلح ہے سرزد ہوتا ہے اور اس کی اصل جبلت نفسانیہ ہے جس سے افکار کلیہ اور ایسی سیاستیں پیدا ہوتی ہیں جو اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتوں کے موافق ہوتی ہیں اور اس کا سبب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کو منظور ہے کہ عالم میں انتظام قائم رہے اور ایک دوسرے کی اعانت کرے اور کوئی کسی پر ظلم نہ کرے اور باہم الفت اور محبت سے رہیں اور اس طرح مل کر رہیں جس طرح ایک بدن کے اعضا ہوتے ہیں کہ جب اس کے ایک عضو میں درد ہوتا ہے تو بخار اور بیخوابی میں باقی تمام اعضا اس کے شریک حال ہو جاتے ہیں، اور لوگوں کی نسل پھیلے، ان میں سے نافرمانوں کی توبیخ کی جائے اور عادل لوگوں کی تعظیم کی جائے اور ان میں رسوم فاسدہ کو مٹا دیا جائے اور لوگوں کے اندر بھلائی اور شرائع حقہ کو پھیلایا جائے پس اس کے پیدا کرنے میں اللہ سبحانہ کی ایک قضا اجمالی ہے اور یہ سب کچھ اس کی شرح اور تفصیل ہے اور اس کے ملائکہ مقربین نے اس کو معلوم کر لیا ہے اور جو شخص لوگوں کی اصلاح کرنے میں سعی کرتا ہے اس کے لئے وہ دعا کرتے ہیں، ور جو ان کے فساد میں سعی کرتا ہے تو اس پر وہ لعنت کرتے ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''جو لوگ تم میں سے ایمان لائے ہیں اور اچھے عمل کئے ہیں خدا تعالیٰ نے ان سے اس بات کا وعدہ کر لیا ہے کہ ان کو زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح ان لوگوں کو اس نے خلیفہ بنایا ہے جو ان سے پہلے تھے اور جس دین کو ان کے لئے پسند کیا ہے اس پر ان کو قدرت دے گا اور ان کے خوف کے بعد ان کو بدلہ میں امن دے گا، وہ میری عبادت کرتے ہیں کسی کو میرا شریک نہیں کرتے اور جنھوں نے اس کے بعد کفر کیا وہی لوگ نافرمان ہیں'' اور فرماتا ہے ''جو لوگ خدا کے عہد کو پورا کرتے ہیں اور عہد کو نہیں توڑتے اور جس چیز کے جوڑنے کا حکم خدا نے دیا ہے اس کو جوڑتے ہیں'' الا یہ۔

اور فرماتا ہے ''جو لوگ اللہ تعالیٰ کے عہد کو پختہ کرنے کے بعد توڑتے ہیں اور خدا تعالیٰ نے جس چیز کے جوڑنے کا حکم دیا ہے اس کو قطع کرتے ہیں'' پس جو شخص ان اعمال صالحہ کو عمل میں

لاتے ہیں تو خدا تعالیٰ کی رحمت اور فرشتوں کی دعا اس کو شامل ہو جاتی ہے خواہ اس شخص کو اس کا علم ہو یا نہ ہو، اور مہربانیاں اس کو اس طرح محیط ہو جاتی ہیں جس طرح چاند اور سورج کی شعائیں انسان کا احاطہ کر لیتی ہیں اس کے سبب سے بنی آدم اور ملائکہ کے قلوب میں اس شخص کے ساتھ بھلائی کرنے کا الہام ہوتا ہے اور وہ آسمان اور زمین میں مقبول ہو جاتا ہے اور جب وہ عالم تجرد کی طرف جاتا ہے تو یہ مہربانیاں جو اس کے ساتھ متصل تھیں ان کو محسوس کرتا ہے اور لذت حاصل کرتا ہے اور ایک قسم کی کشادگی اور قبولیت پاتا ہے اور اس کے اور فرشتوں کے درمیان ایک دروازہ کھل جاتا ہے، اور جو شخص برے اعمال کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کا غضب اور فرشتوں کی لعنت اس کو گھیر لیتی ہے اور ہر طرف سے تاریکیاں اس کو گھیر لیتی ہیں جو غضب سے پیدا ہوتی ہیں، پس اس کے سبب سے ملائکہ اور لوگوں کے دلوں میں اس کے ساتھ برائی سے پیش آنے کا القا ہوتا ہے اور آسمان اور زمین میں وہ شخص قابل نفرت ٹھیرتا ہے، اور جب وہ عالم تجرد کی طرف جاتا ہے تو ایسی تاریک شعاعوں کو پاتا ہے جو اس کو کاٹتی ہیں اور اس سے اس کے نفس کو تکلیف ہوتی ہے اور ایک قسم کی تنگی اور نفرت کو پاتا ہے اور وہ ان سے ہر جانب سے گھر جاتا ہے پس باوجود کشادگی کے زمین اس پر تنگ ہو جاتی ہے اور عدالت کی صفت کا جب انسان کے ان اوضاع کے ساتھ لحاظ کیا جاتا ہے جو اس کے قیام وقعود خواب و بیداری، چلنے، کلام کرنے اس کے لباس اور اس کے شعار سے متعلق ہیں تو اس کو ادب کہتے ہیں اور جب مال کے ساتھ اور اس کے جمع کرنے اور صرف کرنے کے ساتھ اعتبار کیا جاتا ہے تو اس کو کفایت کہتے ہیں اور جب تدبیر منزل کے ساتھ اعتبار کیا جاتا ہے تو اس کو حریت کہتے ہیں اور جب تدبیر شہر کے ساتھ اعتبار کیا جاتا ہے تو اس کو سیاست کہتے ہیں اور جب عزیزوں کی الفت رکھنے کے ساتھ اعتبار کیا جاتا ہے تو اس کو حسن محاضرہ اور حسن معاشرہ کہتے ہیں، اور عدالت کے حاصل کرنے میں زیادہ ضروری چیز رحمت اور محبت اور نرم دلی اور قساوت قلب کا نہ ہونا اور اس کے ساتھ افکار کلیہ کے تابع ہونا اور انجام کار پر نظر رکھنا ہے۔

اور ان دونوں خصلتوں یعنی سماحت اور عدالت میں ایک قسم کا تنافر اور مخالفت ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ تجرد کی طرف قلب کا میلان اور رحمت اور مودت کے لئے اس کا مطیع ہونا اکثر لوگوں کے حق میں یہ دونوں وصف جمع نہیں ہوتے خصوصا ان لوگوں کے اندر جن کی قوت بہیمی وملکی میں

کشاکشی رہتی ہے اسی وجہ سے تم بہت سے اہل اللہ کو دیکھتے ہو کہ انھوں نے لوگوں سے قطع تعلق کرلیا اور اہل وعیال سے جدا ہو گئے اور لوگوں سے دور دور رہنے لگے اور عام لوگوں کو تم اہل وعیال کے ساتھ اتنا مشغول دیکھتے ہو کہ وہ اللہ کے ذکر کو بھی بھول گئے ہیں اور انبیاعلیہم السلام دونوں مصلحتوں کی رعایت کا حکم دیتے ہیں اسی لئے ان دونوں وصفوں کے اندر مبہم کے ضبط اور مشکل کے تمیز کی ان کو زیادہ ضرورت پڑی، سو یہ وہ اخلاق ہیں جو شرائع میں معتبر ہیں اور بعض افعال اور ہیئات ایسے بھی ہیں جو ان اخلاق کا اور ان اخلاق کے اضداد کا کام دیتے ہیں اس جہت سے کہ ان افعال وغیرہ سے ملائکہ کا مزاج یا شیاطین کا مزاج پیدا ہوتا ہے یا ملائکہ اور شیاطین کے دونوں قبیلوں میں سے ایک کی طرف نفس کے میلان سے یہ افعال وغیرہ پیدا ہوتے ہیں اس واسطے ان کا بھی انہیں اخلاق کے ساتھ حکم دیا جاتا ہے اور ان میں سے بعض کو ہم نے ذکر کر دیا ہے۔

اور اسی باب سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ہے ''شیطان بائیں ہاتھ سے کھاتا ہے اور بائیں ہاتھ سے پیتا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''مقطوع الاعضا شیطان ہے'' اور آپ نے فرمایا ''جس طرح فرشتے صف باندھتے ہیں تم اس طرح صف بندی کیوں نہیں کرتے؟ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان افعال کا بھی حکم دیا ہے جن میں ان اخلاق کے پائے جانے کا گمان ہے پس ایسے اذکار کا آپ نے حکم دیا ہے جن سے ہر وقت فرمانبرداری اور تضرع کی کیفیت حاصل ہوتی ہے اور صبر کرنے اور خدا کی راہ میں صرف کرنے کا حکم دیا اور موت اور آخرت کی یاد کرنے کی رغبت دلائی اور دنیا کو ان کی آنکھوں میں حقیر ظاہر کیا اور خدا تعالیٰ کے جلال اور اس کی عظیم الشان قدرت میں فکر کرنے کا ان کو شوق دلایا تاکہ ان کے اندر صفت سماحت حاصل ہو اور مریض کی عیادت اور نیکی اور صلہ رحمی اور سلام کو رائج کرنے اور حدود کو قائم کرنے اور اچھی باتوں کی نصیحت کرنے اور بری باتوں سے منع کرنے کا ان کو حکم دیا تاکہ صفت عدالت ان کے اندر پیدا ہو اور ان افعال اور ہیئات کو نہایت عمدہ طور سے بیان کر دیا، خدا تعالیٰ اس نبی کریم کو ہماری طرف سے اور تمام مسلمانوں کی طرف سے ایسی جزا خیر دے جس کے وہ لائق ہے۔

جب تم کو یہ اصول معلوم ہو گئے تو اب ہم کسی قدر تفصیل کرتے ہیں، واللہ اعلم۔

اذکار اور ان کے متعلقات کا بیان

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جب کوئی قوم ذکر الٰہی کے لئے بیٹھتی ہے تو ان کو فرشتے گھیر لیتے ہیں اور ان پر رحمت چھا جاتی ہے''۔

میں کہتا ہوں اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف رغبت اور اس کے ذکر کے ساتھ مسلمانوں کا اجتماع رحمت اور سکینہ کو کھینچ لاتا ہے اور ملائکہ سے قریب کر دیتا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''مفرد لوگ سبقت کر گئے''۔

میں کہتا ہوں سابقین میں سے ایک گروہ مفردین کا ہے ان کو مفردین اس لئے کہتے ہیں کہ ذکر الٰہی نے ان کے بوجھ کو ہلکا کر دیا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اللہ پاک فرماتا ہے میں اپنے بندہ کے اس گمان کے ساتھ ہوں جو اس کو میرے ساتھ ہے اور جب وہ مجھ کو یاد کرتا ہے تو میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں پس اگر وہ مجھ کو دل میں یاد کرتا ہے تو میں بھی اس کو دل میں یاد کرتا ہوں اور اگر وہ مجھ کو مجلس میں یاد کرتا ہے تو میں اس کو اس سے بہتر مجلس میں یاد کرتا ہوں''۔

میں کہتا ہوں بندہ کی سرشت جس سے اس کے اخلاق اور علوم پیدا ہوتے ہیں اور وہ ہیئت جس کو اس کا نفس حاصل کرتا ہے اس رحمت کے نزول کے لئے مخصص ہے جو اس بندہ کے لئے خاص ہے پس بہت سے بندے جن میں سماحت کی صفت ہوتی ہے خدا تعالیٰ سے یہ گمان رکھتے ہیں کہ وہ ان کے گناہوں سے درگزر کرے گا اور ذرا ذرا سی بات پر نہ پکڑے گا اور ان کے ساتھ سماحت کا برتاؤ کرے گا پس ان کی یہ امید ان کے گناہ دور ہو جانے کا سبب ہو جاتی ہے اور بہت سے بخیل آدمی اپنے رب سے اس بات کا گمان رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو ذرا ذرا سی بات پر

پکڑے گا اور ان کے ساتھ سخت لوگوں کا سا معاملہ کرے گا اور ان کے گناہوں سے تجاوز نہ کرے گا پس یہ بات دنیوی ہیئات کے اعتبار سے دل میں خوب جم جاتی ہے جو اس کو موت کے بعد گھیر لے گی اور یہ فرق صرف ان امور کے اندر ہے جن کی نسبت حظیرۃ القدس میں تاکیدی حکم نہیں ہوا لیکن کبائر اور ان کے قریب قریب گناہوں کے اندر صرف بالا جمال اس کا ظہور ہوتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ ''میں بندہ کے ساتھ ہوتا ہوں'' معیت قبول کی طرف اور حظیرۃ القدس میں ایک شان کے ساتھ ہونے کی طرف اشارہ ہے پس اگر وہ اللہ تعالیٰ کا ذکر اپنے دل میں کرے گا اور اس کے انعامات میں غور کرنا شروع کرے گا تو اس کے بدلہ میں اس کے اس راستہ سے حجاب دور کردے گا یہاں تک کہ اس تجلی تک پہنچ جائے گا جو حظیرۃ القدس میں قائم ہے اور اگر خدا تعالیٰ کا مجلس میں ذکر کرے گا اور اس کا قصد اشاعت دین اللہ اور اعلاء کلمۃ اللہ بھی ہوگا تو خدا تعالیٰ اس کے بدلہ میں اس کی محبت عالم بالا کے دلوں میں القا کرے گا کہ وہ اس کے لئے دعا کریں اور برکت کے طالب ہوں پھر زمین میں وہ مقبول ٹھیرایا جاتا ہے اور بہت سے عارف باللہ ایسے ہیں جن کو معرفت کا درجہ حاصل ہے لیکن نہ تو زمین میں وہ مقبول ہیں اور نہ ملاء اعلیٰ میں ان کا تذکرہ ہے اور بہت سے ایسے ناصر دین ہیں جو بڑے مقبول اور متبرک ہیں مگر ان کے حجاب دور نہیں ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جو ایک نیکی کرے گا اس کو دس گنا ثواب ملے گا یا اس سے بھی زائد میں کروں گا اور جو کوئی برائی کرے گا تو اس کے برابر بدلہ پائے گا یا میں بخش دوں گا، اور جو کوئی میری طرف ایک بالشت آئے گا میں اس کی طرف گز بھر آؤں گا اور جو میری طرف گز بھر آئے گا تو میں اس کی طرف دونوں ہاتھوں کے پھیلاؤ کے برابر آؤں گا اور جو میری طرف چل کر آئے گا تو میں اس کی طرف دوڑ کر آؤں گا اور جو مجھ سے زمین کے برابر گناہ لے کر ملے گا بشرطیکہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیراتا ہو تو میں اس سے اسی قدر مغفرت کے ساتھ ملوں گا''۔

میں کہتا ہوں انسان جب مرجاتا اور دنیا کو چھوڑ دیتا ہے اور اس کی بہیمیت کی تیزی کمزور ہوجاتی ہے اور اس کی ملکیت کے انوار چمکنے لگتے ہیں تو اس کی تھوڑی نیکی بھی بہت ہوجاتی ہے اور عارضی چیز ذاتی چیز سے ضعیف رہتی ہے اور تدبیر الٰہی کی بنیاد بھلائی پہنچانے پر ہے اور خیر وجود سے نہایت قریب اور شر اس سے بہت بعید ہے، چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے ''خدا تعالیٰ کی رحمت

کے سوحصے ہیں جن میں سے ایک حصہ زمین کی طرف اتار رکھا ہے" پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رحمت کو بالشت اور گز اور باع اور چلنے اور دوڑنے کے ساتھ بیان کیا ہے اور آخرت میں جبروت تک پہنچنے اور اس کی طرف توجہ کرنے سے بہتر کوئی چیز نہیں ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ کے اس قول میں "**من لقيني بقراب الارض خطيئة لايشرک بی شيئا لقيته بمثلها مغفرة** "یہی مراد ہے اور اللہ تعالیٰ کے اس قول میں بھی یہی معنی مراد ہے" میرا بندہ اس بات کو جانتا ہے کہ اس کا کوئی رب ہے جو گناہ بخشتا ہے اور اس پر مواخذہ بھی کرتا ہے" اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جو شخص کسی میرے دوست سے عداوت کرتا ہے میں اس کو اعلان جنگ دیتا ہوں اور بندہ کو مجھ سے کسی چیز سے وہ تقرب حاصل نہیں ہوتا جو فریضہ ادا کرنے سے ہوتا ہے اور بندہ مجھ سے بسبب نوافل کے جب ہمیشہ تقرب چاہتا ہے تو میں بھی اس سے محبت کرنے لگتا ہوں اور جب مجھ کو کسی بندہ سے محبت ہو جاتی ہے تو میں اس کا کان ہو جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور ہاتھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کا پیر ہو جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے اور جو مجھ سے مانگتا ہے اس کو ضرور دیتا ہوں اور اگر میری پناہ مانگتا ہے تو میں اس کو اپنی پناہ میں ضرور لے لیتا ہوں اور مجھ کو کسی چیز میں جس کے کرنے کا میں نے ارادہ کیا ہے اتنا تردد نہیں ہوتا جتنا مومن کے نفس سے تردد ہوتا ہے وہ موت مکروہ سمجھتا ہے اور مجھے اس کی تکلیف گوارا نہیں ہوتی۔

میں کہتا ہوں جب اللہ تعالیٰ کسی بندہ سے محبت کرتا ہے اور اس کی محبت عالم بالا میں نازل ہوتی ہے پھر وہ زمین میں بھی مقبول ہو جاتا ہے پس کوئی شخص اس نظام الٰہی کی مخالفت کرتا ہے اور اس بندہ سے عداوت کرتا ہے اور اس کے کام کے رد کرنے میں اور اس کے بگڑنے میں سعی کرتا ہے تو وہ رحمت الٰہی جو اس محبوب کے لئے ہے اس کے دشمن کے حق میں لعنت بن جاتی ہے اور جو رضا اس کے لئے ہوتی ہے وہ اس کے دشمن کے حق میں غضب الٰہی بن جاتی ہے اور جب خدا تعالیٰ شریعت کے ظاہر کرنے اور اقامت دین کی وجہ سے اپنے بندوں کے قریب ہوتا ہے اور حظیرۃ القدس میں ان سنن اور شرائع کو تحریر فرماتا ہے تو یہ سنن اور عبادات سب چیزوں سے زیادہ رحمت الٰہی کو کھینچنے والی اور اس کی رضامندی کے زیادہ موافق ہو جاتی ہیں اور یہ تھوڑی سی چیزیں بھی بہت ہوتی ہیں اور جب بندہ فرائض ادا کرنے کے بعد نوافل زیادہ کر کے خدا تعالیٰ سے برابر قربت

حاصل کرتا رہتا ہے تو خدا تعالیٰ کو اس سے محبت ہو جاتی ہے اور اس کی رحمت اس کو محیط ہو جاتی ہے اور اس وقت میں اس کے اعضا کو نور الٰہی سے تائید ہوتی ہے اور اس کی ذات اور اس کے اہل و عیال اور اس کے مال میں برکت دی جاتی ہے اور اس کی دعا قبول کی جاتی ہے اور اس کو شر سے بچایا جاتا ہے اور اس کی اعانت کی جاتی ہے اور ہمارے نزدیک اس قرب کا نام قربت الاعمال ہے اور اس حدیث میں جو تردد کا لفظ آیا ہے اس سے عنایت الٰہی کا تعارض مراد ہے کیونکہ خدا تعالیٰ کو ہر نظام نوعی اور شخصی کے ساتھ ایک توجہ خاص ہے اور اللہ تعالیٰ کی وہ توجہ جو بدن انسانی سے متعلق ہے اس بات کو مقتضی ہے کہ اس کی موت و بیماری اور تکلیف کا حکم دیا جائے اور اللہ تعالیٰ کی وہ توجہ جو اس کے محبوب کے ساتھ متعلق ہے اس کا یہ تقاضا ہے کہ ہر طرف سے اس کے لئے راحت و آرام مہیا کرے، اور ہر برائی سے بچائے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''کیا میں تم کو ایسا عمل نہ بتلاؤں جو تمہارے سب اعمال میں بہتر ہو اور تمہارے بادشاہ کے نزدیک سب سے زیادہ پاکیزہ ہو اور سب اعمال سے زیادہ تمہارے درجات بلند کرنے والا ہو اور تمہارے حق میں سونا اور چاندی خرچ کرنے سے بہتر ہو اور تمہارے لئے اس بات سے بہتر ہو کہ تم اپنے دشمن سے مقابلہ کرو اور تم ان کی گردنیں مارو اور وہ تمہاری گردنیں ماریں؟ صحابہ نے عرض کیا 'ہاں' آپ نے فرمایا کہ وہ خدا کا ذکر ہے''۔

میں کہتا ہوں افضلیت مختلف اعتبار سے ہوتی ہے اور اس اعتبار سے کہ نفس کو جبروت تک پہنچنا ہے ذکر الٰہی سے زیادہ کوئی عمل افضل نہیں ہے خاص کر ان نفوس ذکیہ میں جن کو ریاضت کی حاجت نہیں ہوتی بلکہ صرف توجہ کی ضرورت ہوتی ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو کوئی کسی مجلس میں بیٹھ کر ذکر الٰہی نہ کرے تو اس کے حق میں خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک خسارہ ہے اور جو کسی جگہ لیٹے اور ذکر الٰہی نہ کرے تو اس پر خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک خسارہ ہے' اور آپ نے فرمایا ''جو کوئی قوم کسی مجلس سے کھڑی ہو جس میں یاد الٰہی نہ کیا ہو تو گویا وہ مردار گدھے کو کھا کر اٹھے ہیں اور وہ مجلس ان پر ایک حسرت ہوگی'' اور آپ نے فرمایا ''بجز ذکر خداوندی کے کوئی کلام کثرت سے مت کرو کیونکہ بجز ذکر الٰہی کے کثرت کلام سخت دلی پیدا کر دیتا ہے اور سب لوگوں میں سے خدا تعالیٰ سے دور قاسی القلب ہے''۔

میں کہتا ہوں جس نے ذکر الٰہی کی حلاوت پائی اور ذکر الٰہی سے اطمینان حاصل ہونے کی

کیفیت معلوم کر لی اور یہ بات جان لی کہ کس طرح دل سے حجاب دور ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ وہ شخص ایسا ہو جاتا ہے کہ گویا خدا تعالیٰ کو عیاناً دیکھ رہا ہے تو اس میں کچھ شک نہیں کہ جب وہ شخص دنیا کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اہل وعیال اور مال و اسباب میں دل لگاتا ہے تو ان کیفیات میں سے بہت کچھ بھول جاتا ہے اور ایسا ہو جاتا ہے کہ گویا اس نے اس چیز کو جو اس کو حاصل ہوئی تھی کم کر دیا ہے اور اس شخص کے اور اس چیز کے درمیان جس کو یہ اپنی آنکھوں سے دیکھتا تھا ایک پردہ پڑ جاتا ہے اور یہ خصلت دوزخ اور ہر برائی کی طرف انسان کو بلاتی ہے اور ان سب باتوں میں بڑا نقصان ہے اور جب ایسے نقصانات جمع ہو جاتے ہیں تو نجات کا کوئی طریقہ نہیں رہتا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان نقصانات کا پورا پورا علاج بتلایا ہے اس طرح پر کہ ہر وقت کے لئے اس وقت کے مناسب ایک ذکر مقرر فرمایا ہے تا کہ وہ غفلت کے زہر کو دور کرنے والا تریاق ہو پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان اذکار کا فائدہ اور ان سے غافل رہنے کے نقصانات ظاہر فرما دیئے۔

واضح ہو کہ اس کی بھی ضرورت تھی کہ ذکر کے الفاظ کا انضباط کیا جائے تا کہ کوئی تصرف کرنے والا اپنی ناقص عقل سے اس میں تصرف کر کے خدا تعالیٰ کے اسما میں کجروی نہ کرے یا جو مقام جس ذکر کے مناسب ہے اس کو ادا نہ کرے اور اذکار کے باب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو مسنون کیا ہے ان میں عمدہ اور بہتر دس اذکار ہیں جن میں سے ہر ایک میں وہ راز ہے جو دوسرے میں نہیں ہے اسی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر موقع پر ان میں سے کئی کئی ذکر کے جمع کرنے کا حکم دیا ہے اور یہ بات بھی ہے کہ صرف ایک ذکر پر موقوف کرنا عامہ مکلفین کے حق میں اس ذکر کو صرف زبانی حرکت کر دینا ہے اور بعض اذکار سے بعض کی طرف انتقال کرنے سے نفس کو تنبیہ اور غافل کو بیداری حاصل ہوتی ہے۔

از آں جملہ سبحان اللہ ہے اور اس کی حقیقت خدا تعالیٰ کو تمام ادناس (۱) اور عیوب اور نقائص سے پاک سمجھنا ہے اور ان میں سے ایک الحمد للہ ہے اور اس کی حقیقت خدا تعالیٰ کے لئے کمالات اور اوصاف کاملہ کا ثابت کرنا ہے پس جب یہ دونوں باتیں ایک کلمہ میں جمع ہو گئیں تو انسان کو اپنے پروردگار کی جو معرفت حاصل ہو سکتی ہے وہ کلمہ اس کا پورا پورا بیان ہے کیونکہ انسان خدا تعالیٰ کو بغیر اس

(۱) ج دنس۔ گندگی، میل۔

کے نہیں پہچان سکتا کہ ایک ذات ایسی ثابت کرے جو ان تمام نقائص سے پاک ہو جن کا ہم اپنے اندر مشاہدہ کرتے ہیں اور جس قدر کمالات کمال ہونے کی جہت سے ہم اپنے اندر دیکھتے ہیں وہ سب اس ذات کے لئے ثابت ہوں پس جب اس ذکر کی صورت صفحہ خیال میں جم جاتی ہے تو یہ معرفت پوری پوری ظاہر ہو جاتی ہے جس کا کامل ہونے کا حکم دیا جاتا ہے اور قرب الٰہی کا ایک بڑا دروازہ اس کے سبب سے کھل جاتا ہے اور اسی معنی کی طرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں اشارہ کیا ہے ''سبحان اللہ نصف میزان ہے اور الحمد للہ اس کو پر کر دیتا ہے'' اسی لئے سبحان اللہ وبحمدہ کا کلمہ زبان پر آسان اور وزن میں بہت ہے اور خدا تعالیٰ کو پیارا ہے اور اس کے پڑھنے والے کے لئے ایک درخت بویا جاتا ہے جو شخص اس کو سو مرتبہ پڑھے اس کے حق میں وارد ہے کہ اس کے تمام گناہ دور ہو جاتے ہیں اگرچہ سمندر کے جھاگ کے برابر ہوں، اور قیامت کے روز کوئی شخص ان کلمات کے پڑھنے والے سے افضل نہ آئے گا مگر جو اس کلمہ کو اس قدر پڑھے یا اس سے بھی زیادہ کرلے اور یہ افضل الکلام ہے اس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ملائکہ کے لئے ممتاز کر لیا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو یہ فرمایا ہے ''سب سے پہلے جنت میں وہ لوگ بلائے جائیں گے جو مصیبت اور آرام کے وقت اللہ تعالیٰ کی حمد کرتے ہیں'' اس میں یہ راز ہے کہ ان لوگوں کا عمل ثبوتی ہے قوی ثبوتیہ سے پیدا ہوا ہے اور جنت کی نعمتوں میں سے سب لوگوں سے زیادہ ان قوی والوں کا حصہ ہے اور یہ جو فرمایا کہ بہترین دعا الحمد للہ ہے، اس میں یہ راز ہے کہ دعا کی دو قسمیں ہیں جیسا کہ ہم عنقریب ذکر کریں گے اور الحمد للہ میں دونوں قسمیں موجود ہیں کیونکہ شکر سے نعمت میں زیادتی ہوتی ہے اور وہ معرفت ثبوتی ہے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کا راز کہ ''الحمد للہ شکر کی اصل ہے'' یہ ہے کہ شکر زبان، دل اور ہاتھ، پاؤں سے ادا ہوتا ہے اور زبان ان دونوں سے زیادہ شکر پر دلالت کرتی ہے۔

اور ان اذکار میں سے ایک ذکر لا الٰہ الا اللہ ہے اور اس کے کئی بطون ہیں بطن اول شرک جلی کا دور کرنا ہے اور بطن دوم شرک خفی کا دور کرنا ہے اور بطن سوم ان حجابات کا دور کرنا ہے جو معرفت الٰہی تک پہنچنے سے روکتے ہیں، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول میں اسی طرف اشارہ ہے ''لا الٰہ الا اللہ کے لئے خدا سے ڈرے کوئی پردہ نہیں یہاں تک کہ تو اس کے پاس پہنچ جاتا ہے'' اور موسیٰ علیہ السلام اس کے بطون میں سے پہلے دو بطنوں کو جانتے تھے اس واسطے نبی صلی اللہ علیہ وسلم

نے اس بات کو بعید سمجھا کہ آپ کے لئے جو ذکر خاص کیا گیا ہے وہ یہی ہے پس خدا تعالیٰ نے بذریعہ وحی کے اس کا حال ظاہر کر دیا اور آپ پر یہ بات روشن کر دی کہ یہ کلمہ خدا تعالیٰ کے سوا ہر چیز کے اختیار کرنے اور آنکھوں کے سامنے متمثل ہونے سے روکتا ہے اور یہ کہ اگر اس کے سوا تمام کلمات ایک پلہ میں رکھے جائیں اور یہ کلمہ دوسرے پلہ میں رکھا جائے تو ان سب کو جھکا دے کیونکہ اس کے مقابلہ میں سب کلمے کم درجہ کے اور حقیر ہیں، اور تہلیل جس میں نفی اور اثبات کی کسی قدر تفصیل ہے یہ ہے: لاالٰه الا اللّٰه وحده لاشريك له له الملك وله الحمد وهو على كل شئ قدير۔

اور اس کلمہ کو سو مرتبہ کہنے والے کی فضیلت میں یہ آیا ہے کہ اس کو دس غلام آزاد کرنے کے برابر ثواب ملتا ہے الخ، کیونکہ اس میں معرفت ثبوتیہ اور سلبیہ دونوں ہیں اور سلبیہ کو گناہوں کے مٹانے میں نہایت مناسبت ہے اور ثبوتیہ کو حسنات کے پائے جانے میں اور جزا کے متمثل ہونے میں بڑا دخل ہے۔

اور ان اذکار میں سے ایک اللہ اکبر ہے اور اس کلمہ میں اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اس کی قدرت اور اس کی سلطنت کا ملاحظہ ہے اور اس میں معرفت ثبوتیہ کی طرف اشارہ ہے اور اسی لئے اس کی فضیلت میں یہ وارد ہے کہ یہ کلمہ آسمان اور زمین کی فضا کو بھر دیتا ہے اور یہ چاروں کلمات سب کلاموں سے افضل اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب ہیں اور جنت میں بولے جاتے ہیں اور حضرت جویریہؓ والی حدیث جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''میں نے تیرے بعد چار کلمے تین بار کہے ہیں ان کے مقابلہ میں جو کچھ تو نے آج تک کہا ہے اگر وزن کیا جائے تو یہی کلمات غالب رہیں اور وہ یہ کلمات ہیں: سبحان الله وبحمده عدد خلقه ورضاء نفسه وزنة عرشه ومداد كلماته، اس میں یہ راز ہے کہ عمل کی صورت جب نامۂ اعمال میں ثابت ہوتی ہے تو جزا کے وقت اس صورت کا پھیلاؤ اور اس کی وسعت ان کلمات کے معنی کے موافق ہوتی ہے پس اگر اس میں ایسا کلمہ ہے جیسے عدد خلقه تو اس کا پھیلاؤ بھی اسی قدر ہے۔

واضح ہو کہ جس شخص کا زیادہ میلان اس طرف ہو کہ نفس معنی ذکر کی کیفیت سے رنگین ہو تو اس کے لئے یہی مناسب ہے کہ کثرت سے ذکر کرے اور جس شخص کا زیادہ میلان اس طرف ہو

کہ عمل کی صورت نامہ اعمال میں محفوظ رہے اور اس کا ظہور جزا کے دن ہو تو اس کے حق میں ایسے ذکر کا اختیار کرنا زیادہ نافع ہے جو کیفیت میں سب اذکار پر فوقیت رکھتا ہو، اور کسی کو یہ کہنے کی گنجائش نہیں ہے کہ جب ان کلمات کا تین مرتبہ کہنا تمام اذکار سے افضل ہوا تو اذکار کی کثرت اور ان میں تمام اوقات کا لگانا بے فائدہ ہوا اس لئے کہ فضیلت ایک اعتبار سے ہے دوسرے اعتبار سے نہیں ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جویریہؓ کو اقرب اعمال کی طرف رہنمائی کی تھی اور اس میں بڑی رغبت دلائی تھی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ذکر کے اندر تہلیل کے ساتھ اللہ اکبر اور باقی کلمات ملانا جو مسنون فرمایا ہے اس میں یہ راز ہے کہ نفس کو ذکر پر تنبیہ ہوتی رہے اور محض زبانی حرکت نہ رہے اور ان اذکار میں سے ایسے امور کا سوال کرنا ہے جو اس کے بدن یا اس کے نفس کے لئے پیدائش کے اعتبار سے یا حصول اطمینان کے اعتبار سے نافع ہو، یا تدبیر منزل اور اس کے مال و جاہ کے اعتبار سے فائدہ بخشے۔ اور ان امور سے پناہ مانگنا ہے جو اس کے لئے ان اعتبارات سے مضر ہوں اور اس کے اندر راز اللہ تعالیٰ کی تاثیر کا عالم میں مشاہدہ کرنا اور بجز اللہ تعالیٰ کے سب کی قدرت اور طاقت کی نفی کرنا ہے۔

اس باب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دعائیں مقرر فرمائی ہیں ان میں سے یہ دعائیں زیادہ جامع ہیں: **اللھم اصلح لی دینی التی ھو عصمة امری، واصلح لی دنیای التی فیھا معاشی، واصلح لی اخرتی التی فیھا معادی، واجعل الحیاة زیادة لی فی کل خیر، واجعل الموت راحةً لی من کل شر، اللھم انی اسالک الھدی والتقی والعفاف والغنا، اللھم اھدنی وسددنی،**

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لفظ ہدی کے ساتھ **ھدایتک الطریق** اور لفظ سداد کے ساتھ **سداد السھم** ذکر کرو:

اللھم اغفرلی وارحمنی واھدنی وعافنی وارزقنی اللھم ربنا اتنا فی الدنیا حسنة وفی الأخرة حسنة وقنا عذاب النار، رب اعنی ولا تعن علی وانصرنی ولا تنصر علیّ وامکرلی ولا تمکر علی واھدنی ویسر الھدی لی وانصرنی علی من بغی علی، رب اجعلنی لک شاکراً لک ذاکراً لک راھبا لک مطواعاً

لک مخبتا علیک اوّاھا منیبا، رب تقبل توبتی واغسل حوبتی واجب دعوتی وثبت حجتی وسدد لسانی واھد قلبی واسلل سخیمة صدری، اللھم ارزقنی حبک وحب من ینفعنی حبه عندک اللھم ما رزقتنی مما احب فاجعله قوۃ لی فیما تحب اللھم مازویت عنی مما احب فاجعله فراغاً لی فیما تحب اللھم اقسم لنا من خشیتک ما تحول به بیننا وبین معاصیک ومن طاعتک ما تبلغنا به جنتک ومن الیقین ماتھون به علینا مصیبات الدنیا ومتعنا باسماعنا وابصارنا وقوتنا ما احییتنا واجعله الوارث منا واجعل ثارنا علی من ظلمنا وانصرنا علی من عادانا ولا تجعل مصیبتنا فی دیننا ولا تجعل الدنیا اکبر ھمنا ولا مبلغ علمنا ولا تسلط علینا من لا یرحمنا. اور پناہ مانگنے کے بارے میں جو دعائیں آپ نے مقرر فرمائی ہیں ان میں سے یہ دعائیں زیادہ جامع ہیں:

اعوذ باللہ من جھد البلاء ودرک الشقاء وسوء القضاء وشماتة الاعداء، اللھم انی اعوذبک من الھم والحزن و العجز والکسل والجبن والبخل وضلع الدین وغلبة الرجال، اللھم انی اعوذ بک من الکسل والھرم والمغرم والماثم، اللھم انی اعوذبک من عذاب النار وفتنة النار وفتنة القبر وعذاب القبر ومن شر فتنة الغنی ومن شر فتنة الفقر ومن شر فتنة المسیح الدجال، اللھم اغسل خطایای بماء الثلج والبرد ونق قلبی کما ینقی الثوب الابیض من الدنس وباعد بینی وبین خطایای کما باعدت بین المشرق والمغرب، اللھم اٰت نفسی تقواھا وزکّھا انت خیر من زکاھا انت ولیھا و مولاھا، اللھم انی اعوذبک من علم لاینفع ومن قلب لا یخشع ومن نفس لا تشبع ومن دعوۃ لا یستجاب لھا، اللھم انی اعوذبک من زوال نعمتک وتحول عافیتک وفجاۃ نقمتک وجمیع سخطک اللھم انی اعوذبک من الفقر والقلة والذلة واعوذبک من ان اظلم او اظلم.

ازآں جملہ خضوع اور فرمانبرداری کا بیان کرتا ہے جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ہے

''میرے منہ نے اس ذات کو سجدہ کیا جس نے اس کو پیدا کیا'' الخ۔

واضح ہو کہ وہ دعائیں جن کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو حکم دیا ہے دو قسم کی ہیں، ایک تو وہ دعائیں ہیں جن سے مقصود یہ ہے کہ قوی فکریہ جلال الٰہی اور اس کی عظمت کے ملاحظہ سے پر ہو جائیں یا خضوع اور فرمانبرداری کی حالت حاصل ہو کیونکہ زبان سے اس چیز کو جو اس حالت کے مناسب ہے زبان سے بیان کرنے میں نفس کو متوجہ کرنے کے لئے بڑا اثر ہے، اور دوسری قسم کی وہ دعائیں ہیں جن میں دنیا وآخرت کی بھلائی کی طرف رغبت مقصود ہوتی ہے اور ان کی برائی سے پناہ مانگی جاتی ہے کیونکہ نفس کا ارادہ اور بہت کوشش سے اس کا کسی چیز کو طلب کرنا اللہ تعالیٰ کے جود کے دروازہ کو کھڑکھڑاتا ہے جس طرح دلیل کے مقدمات نتیجہ کے فیضان کا سبب ہوتے ہیں اور نیز اس کے دل کو تکلیف دینے والی حاجت اس کو مناجات کی طرف متوجہ کر دیتی ہے اور اللہ پاک کی عظمت کو اس کے روبرو پیش کر دیتی ہے اور ایسے وقت میں آدمی کی ہمت خدا تعالیٰ کی طرف مائل ہو جاتی ہے پس یہ حالت نیک آدمی کے لئے بہت غنیمت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''دعا عبادت ہی ہے''۔

میں کہتا ہوں اس کا یہ سبب ہے کہ اصل عبادت تعظیم کی صفت کے ساتھ حضور کے اندر مستغرق ہو جانا ہے اور دعا اپنی دونوں قسموں کے ساتھ اس کا کامل نصاب ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''بہترین عبادت کشادگی کا انتظار کرنا ہے''۔

میں کہتا ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ نزول رحمت کے طلب کرنے میں رغبت کے ساتھ امید کرنا جس قدر موثر ہے اس قدر عبادت کرنا بھی مؤثر نہیں ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو شخص اللہ تعالیٰ سے کچھ مانگتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو عطا فرماتا ہے یا اس کے برابر مصیبت کی برائی اس سے روک لیتا ہے''۔

میں کہتا ہوں اشیا کے لئے عالم مثال سے زمین پر ظاہر ہونے کا ایک تو طبعی طریق ہے اگر کوئی خارجی مانع نہ ہو، اور ایک غیر طبعی طریق ہے اگر اسباب میں مزاحمت پائی جائے پس غیر طبعی کی ایک صورت یہ ہے کہ کسی مصیبت کے دفع کرنے کی طرف یا اس کی وحشت کے دور کرنے کی طرف اور اس کے دل میں خوشی القا کرنے کی طرف یا اس حادثہ کو اس کی جان سے ٹال کر اس کے

مال کی طرف مائل کرنے کے لئے رحمت الٰہی متوجہ ہوتی ہے اور اسی قسم کی اور صورتیں بھی ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جب تم میں سے کوئی شخص دعا کرے تو یہ نہ کہے کہ اے اللہ اگر تو چاہے تو مجھ کو بخش دے اور اگر تو چاہے تو مجھ پر رحم کر اور اگر تو چاہے تو مجھ کو رزق دے بلکہ کوشش کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے سوال کیا کرے کیونکہ اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے اس پر کسی کا دباؤ نہیں ہے''۔

میں کہتا ہوں دعا کی روح اور اس کا بھید نفس کا کسی چیز میں رغبت کرنا ہے جس کے ساتھ تشبہ بالملائکہ اور جبروت پر اطلاع یابی کی صفت پائی جاتی ہو اور شک کے ساتھ طلب کرنا ارادہ کے اندر پراگندگی پیدا کرتا ہے اور بہیمیت کو سست کرتا ہے اور مصلحت کلیہ کے ساتھ موافقت حاصل ہوتی ہے کیونکہ کوئی سبب مصلحت کلیہ کی رعایت کرنے سے خدا تعالیٰ کو نہیں روکتا چنانچہ نبی نے فرمایا ہے ''وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور اس کو کوئی مجبور کرنے والا نہیں ہے'' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''بجز دعا کے کوئی چیز قضا الٰہی کو نہیں ٹالتی''۔

میں کہتا ہوں قضا سے مراد یہاں وہ صورت ہے جو عالم مثال میں پیدا کی جاتی ہے اور جو عالم کون میں اس حادثہ کے پیدا ہونے کا سبب ہوتی ہے اور وہ صورت تمام مخلوق کی طرح محو واثبات کو قبول کرتی ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''دعا اس چیز سے جو نازل ہوئی اور اس چیز سے جو نازل نہیں ہوئی نفع دیتی ہے''۔

میں کہتا ہوں دعا جب اس حادثہ کا علاج کرتی ہے جو نازل نہیں ہوا ہے تو وہ مضمحل ہو جاتا ہے اور کسی چیز کو زمین پر اس حادثہ کے موجود ہونے کا سبب نہیں ہونے دیتی اور اگر دعا نازل شدہ بلا کے علاج میں واقع ہوتی ہے تو وہاں رحمت الٰہی اس کے رنج کی تخفیف کی صورت میں ظاہر ہو جاتی ہے اور اس کی وحشت دفع کرنے کے لئے نازل ہو جاتی ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو شخص یہ چاہتا ہے کہ خدا سختی کے وقت اس کی دعا قبول کیا کرے تو اس کو لازم ہے کہ آرام کی حالت میں بھی دعا مانگا کرے''۔

میں کہتا ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ دعا اس شخص کی قبول ہوتی ہے جس کی رغبت قوی اور ارادہ مصمم ہوتا ہے اور اس مصیبت کے نازل ہونے سے پیشتر اس کو دعا کی عادت بھی ہو اور ہاتھوں کا اٹھانا اور منہ پر ہاتھ پھیرنا اس رغبت کی صورت اور ہیئت نفسانیہ اور اس کے مناسب ہیئت بدنیہ میں

مطابقت اور نفس کو اس حالت پر متنبہ کرنا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس شخص کے لئے دعا کا دروازہ کھولا گیا اس کے لئے رحمت کے سب دروازے کھولے گئے''۔

میں کہتا ہوں جو شخص دلی رغبت سے دعا کرنے کی کیفیت جانتا ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ کس صورت میں قبولیت ظاہر ہوتی ہے اور وہ صفت حضور کا عادی بھی ہے تو اس کے لئے دنیا میں رحمت کا دروازہ کھول دیا جاتا ہے اور ہر مصیبت میں اس کی مدد کی جاتی ہے اور جب وہ مرجاتا ہے اور اس کے گناہ اس کو گھیر لیتے ہیں اور ہیئت دنیوی کا پردہ اس کو ڈھانکتا ہے تو وہ شخص جس طرح عادی تھا اسی طرح رغبت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے پس اس کی دعا مقبول ہو جاتی ہے اور گناہوں میں سے ایسا صاف اور پاک نکل جاتا ہے جس طرح آٹے میں سے بال نکل جاتا ہے۔

واضح ہو کہ دعاؤں میں سے زیادہ قریب بقبولیت وہ دعا ہوتی ہے جو ایسی حالت میں پائی جائے جس میں نزول رحمت کا موقع ہوتا ہے یا تو اس لئے کہ اس حالت میں نفس انسانی کو کمال کا مرتبہ حاصل ہوتا ہے جیسا کہ نمازوں کے بعد دعا کرنا یا افطار کے وقت روزہ دار کا دعا کرنا یا اس لئے کہ وہ حالت اللہ تعالیٰ کی بخشش کے طلب نزول کا سبب ہوتی ہے جیسا کہ عرفہ کے دن دعا مانگنا، یا اس لئے کہ وہ حالت نظام عالم میں عنایت الٰہی کی موافقت کا سبب ہوتی ہے جیسا کہ مظلوم کا دعا مانگنا کیونکہ خدا تعالیٰ کو ظالم سے بدلہ لینے کی طرف نہایت توجہ ہوتی ہے اور یہ دعا مانگنا اس سے اس توجہ کی موافقت کرنا ہے اور مظلوم کے باب میں آیا ہے کہ اس کی دعا اور اللہ کے درمیان کوئی حجاب نہیں رہتا، یا وہ حالت اس سے راحت دنیا کے انقلاب کا سبب ہوتی ہے پس اس وقت اس کے حق میں رحمت الٰہی دوسری صورت میں ہو کر متوجہ ہوتی ہے جیسا کہ بیمار یا مصیبت زدہ کا دعا کرنا، یا وہ حالت دعا کے اخلاص کا سبب ہوتی ہے جیسا کہ غائب کا اپنے بھائی کے لئے دعا کرنا یا والد کا بیٹے لئے دعا کرنا، یا وہ دعا ایسے وقت میں ہو جس میں روحانیت کا انتشار ہوتا ہے اور رحمت الٰہی کا قرب ہوتا ہے جیسا کہ شب قدر یا وہ ساعت مرجوہ جو جمعہ کے دن ہوتی ہے، یا دعا مانگنا ایسے مکان میں ہو جہاں فرشتے حاضر ہوتے ہیں جیسا کہ مکہ کے مقامات، یا ان مقامات میں جانے سے نفس کو حضور وخضوع کی حالت پر تنبہ ہوتا ہو جیسا کہ انبیاء علیہم السلام کے نشانات، اور جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے اس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کا راز بھی معلوم ہو جاتا ہے ''بندہ کی دعا قبول ہوتی ہے

جب تک گناہ یا قطع رحم کی دعا نہ کرے بشرطیکہ جلدی نہ کرے"۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ہر نبی کی ایک دعا مستجاب ہوتی ہے سو ہر نبی نے اپنی دعا میں جلدی کی اور میں نے اپنی دعا روز قیامت میں امت کی شفاعت کے لئے پوشیدہ کر رکھی ہے پس یہ دعا انشاءاللہ میری امت میں سے اس شخص کو پہنچے گی جو اس حالت میں مر گیا کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرتا ہوگا"۔

میں کہتا ہوں انبیا علیہم السلام کے لئے بہت سی مقبول دعائیں ہوتی ہیں اور اسی طرح ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعائیں بہت مقامات میں مستجاب ہوئی ہیں لیکن ہر نبی کے لئے ایک خاص دعا ہوتی ہے جو اس رحمت کا اثر ہوتی ہے جو اس کی نبوت کا مبداء ہے۔ پھر وہ لوگ ایمان لاتے ہیں تو وہ دعا ان کے حق میں برکات ہو جاتی ہے اور اس نبی کے دل میں ان کے لئے دعا کرنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے، اور اگر وہ لوگ اس کی اطاعت سے اعراض کرتے ہیں تو وہ دعا ان کے حق میں عذاب بن جاتی ہے اور نبی کے دل میں ان پر بددعا کرنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات معلوم ہوگئی کہ آپ کی بعثت سے عظیم مقصد یہ ہے کہ آپ لوگوں کے شفیع ہوں اور روز محشر میں رحمت خاصہ کے نزول کا واسطہ ہو جائیں اس واسطے آپ نے اس بڑی دعا کو جو آپ کی اصل نبوت سے پیدا ہوئی ہے اس دن کے لئے پوشیدہ رکھا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اے اللہ میں نے تجھ سے ایک عہد لے رکھا ہے" الخ،

میں کہتا ہوں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی امت پر جو رحم و کرم ہے اس کا مقتضی یہ ہوا کہ آپ پہلے سے خدا تعالیٰ سے ایک عہد کر لیں اور حظیرۃ القدس میں آپ کی ہمت متمثل ہو جائے جس سے اس کے احکام برابر سرزد ہوتے رہیں اور وہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ آپ کی امت کے بارے میں آپ کی اس ہمت کا اعتبار کرے جو باطنی اور پوشیدہ ہے نہ کہ اس ارادہ کا جو ظاہر ہے اور یہ اس لئے کہ قول یا فعل کے ساتھ مسلمانوں کی تعزیر فرمانے میں آپ کا مقصد ان کے درمیان اس دین کا قائم کرنا تھا جن کو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے پسند فرمایا ہے اور آپ کا یہ مقصود تھا کہ وہ راستی پر آ جائیں اور ان سے کجی دور ہو جائے اور جن لوگوں پر کفر کا حکم ہوا ان پر سختی کرنے سے آپ کا مقصود اس غضب الٰہی کے ساتھ موافقت کرنا تھا جو ان لوگوں سے متعلق ہے پس دونوں طریقے مختلف ہیں

اگر چہ صورت ایک ہے، اوران میں سے ایک توکل ہے اوراس کی روح خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا ہے اس اعتقاد سے کہ اعتماد اسی پر ہے اوراسی کی طرف سے تدبیر کو دیکھنا ہے اورسب لوگوں کو اس کی تدبیر میں مقہور سمجھنا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کا مشہد(۱) ہے''وہی خدا تعالیٰ اپنے بندوں پر غالب ہے اورتم پر محافظین کو بھیجتا ہے اوراس امر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سے اذکار مسنون فرمائے ہیں۔

ازآں جملہ یہ قول ہے''**لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم**''اوراس کی فضیلت میں آیا ہے کہ یہ جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے اوراس کی وجہ یہ ہے کہ یہ کلمات نفس کو معرفت جلیلہ کے قابل بنادیتے ہیں۔

ازآں جملہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ہے''**بک اصول وبک احول**''اورجواذ کار اس اسلوب پروارد ہیں، اورایک آپ کا یہ قول'**توکلت علی اللہ**''اورآپ کا یہ قول''**اعلم ان اللہ علی کل شیٔ قدیر وان اللہ قد احاط بکل شیٔ علما**'' اوراس کے امثال،

اوران میں سے ایک استغفار ہے اوراس کی روح یہ ہے کہ اپنے ان گناہوں کا ملاحظہ کرے جونفس کو گھیرے ہوئے ہیں اوراس کے ساتھ یہ بھی خیال کرے اورنفس سے مدد روحانی اورفیض ملکی کے ذریعہ ان کا دور کرنا ہے اوراس کے کئی اسباب ہیں۔

ازآں جملہ اللہ کی رحمت کا کسی ایسے عمل سے اس کو شامل ہوجانا جو عالم بالا کی دعاؤں کو اس کی طرف متوجہ کرے یا اس عمل میں تدبیر الٰہی کی کوئی شاخ ہو جس سے جمہور کو نفع ہوتا ہے یا کسی محتاج کی حاجت روائی ہوتی ہے یا اس قسم کی کوئی اور بات ہوتی ہے اورازآں جملہ فرشتوں کے ساتھ ان کی ہیئات میں اورملکی انوار کے روشن ہونے میں اور بہیمیت کے اجزا کے ضعیف ہوجانے اوراس کے ہیجان کے ٹوٹ جانے کے سبب سے بہیمیت کی برائیوں کے فروہونے میں مشابہت پیدا کرنا ہے۔

اورازآں جملہ جبروت تک پہنچنا اورخدا تعالیٰ کی معرفت اوراس کا یقین کرنا ہے چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کیا میرا بندہ یہ جانتا ہے کہ اس کا کوئی رب ہے جو گناہ بخشتا ہے اوراس پر مواخذہ کرتا ہے میں نے اپنے بندہ کو بخش دیا''پس جب بندہ اس اعانت

(۱) صوفیہ کی اصطلاح میں مشہد اس کو کہتے ہیں جو آیت کے معانی میں تامل اورفکر کرنے سے فائض ہو۔

روحانی کو اپنے نفس سے گناہ دور ہونے میں استعمال کرتا ہے تو وہ گناہ اس سے دور ہو جاتے ہیں۔

استغفار کے سب اذکار میں سب سے زیادہ جامع یہ ہیں: **اللھم اغفرلی خطیئتی وجھلی واسرافی فی امری وما انت اعلم به منی، اللھم اغفرلی جدی وھزلی و خطئی وعمدی وکل ذالک عندی، اللھم اغفرلی ما قدمت وما اخرت وما اسررت وما اعلنت وما انت اعلم به منی انت المقدم وانت الموخر وانت علی کل شئ قدیر**، اور سید الاستغفار یہ ہے: **اللھم انت ربی لا اله الا انت خلقتنی وانا عبدک وانا علی عھدک ووعدک مااستطعت اعوذ بک من شر ما صنعت ابوء لک بنعمتک علی وابوء بذنبی فاغفرلی فانه لا یغفر الذنوب الا انت**۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''میرے دل پر بھی ابر سا آ جاتا ہے اور میں خدا سے دن میں سو بار استغفار کرتا ہوں''۔

میں کہتا ہوں اس ابر کی حقیقت یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا تھا کہ آپ اپنے نفس کو عامۃ المومنین کے ساتھ اس ہیئت میں رکھیں جو ملکیت اور بہیمیت سے مرکب ہے تا کہ جو امور لوگوں کے لئے مقرر فرمائیں ان میں لوگوں کی رہنمائی ذوق اور وجدان کے طور پر کریں نہ کہ صرف قیاس وتخمین کے طور پر، اور اس ہیئت پر رہنے میں ابر اور کدورت کا عارض ہونا لازم ہے، واللہ اعلم۔

از آں جملہ اللہ تعالیٰ کے نام سے تبرک حاصل کرنا ہے اور اس میں راز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے ہر عالم میں ایک قرب ہے اور عالم حروف میں اس کا قرب اسماء الٰہیہ ہیں جو اہل لسان کی زبانوں پر جاری اور ملاء اعلیٰ میں مروج ہیں پس جب بندہ اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو رحمت الٰہی کو قریب پاتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں جو ان کو یاد کر لے گا جنت میں داخل ہوگا''۔

میں کہتا ہوں اس فضیلت کی وجہ یہ ہے کہ یہ اسماء اللہ تعالیٰ کی صفات ثبوتیہ اور سلبیہ کی معرفت کے لئے کافی مقدار ہیں اور ان کے لئے حظیرۃ القدس میں عزت اور برکت ہے اور ان اسما کی صورت جب صحیفہ عمل مندرج ہو جاتی ہے تو اس صورت کی وسعت ضرور رحمت عظیمہ ہوتی ہے۔

واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ کا وہ اسم اعظم جس کے ساتھ مانگا جائے تو ملتا ہے اور جس کے ساتھ دعا

کی جائے تو قبول ہوتی ہے وہ اسم ہے جو تقربات باری تعالیٰ میں سے نہایت جامع تقرب پر دلالت کرتا ہے اور جس نام کو ملاء اعلیٰ میں کثرت سے ذکر کیا جاتا ہے اور جو ہر زمانہ میں اہل لسان کی زبانوں پر جاری ہے اور ہم اس بات کا ذکر کر چکے ہیں کہ زید شاعر اور کاتب ہے اس میں اس کی ایک صورت شاعر ہونے کی ہے اور ایک کاتب ہونے کی ہے اور اسی طرح حق تعالیٰ کے لئے عالم مثال کے ہر مقام میں تقربات ہوتے ہیں اور یہ معنی اس پر صادق آتے ہیں: **انت الله لا اله الا انت الاحد الصمد الذی لم یلد ولم یولد ولم یکن له کفوا احد** ، اور اس پر صادق آتے ہیں: **لک الحمد لا اله الا انت الحنان المنان بدیع السموات والارض یاذالجلال والاکرام یا حی یا قیوم**، اور اسی قسم کے دیگر اسما پر یہ معنی صادق آتے ہیں۔

از آں جملہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو شخص مجھ پر ایک بار درود بھیجتا ہے خدا تعالیٰ اس پر دس بار رحمت کرتا ہے'' اور آپ نے فرمایا ''قیامت کے دن سب سے زیادہ نزدیک میرے وہ شخص ہوگا جو کثرت سے مجھ پر درود بھیجتا ہے''۔

میں کہتا ہوں اس میں راز یہ ہے کہ نفوس بشریہ کے لئے ضروری ہے کہ حالات الٰہی کی طرف متوجہ ہوں اور متوجہ ہونے میں اس سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہے کہ تقربات کے انوار اور اللہ تعالیٰ کے شعائر جو زمین پر پائے جاتے ہیں ان کی طرف توجہ کی جائے اور ان کے سامنے ہاتھ پھیلائے جائیں اور ان میں غور کیا جائے اور ان پر وقوف کیا جائے بالخصوص ان مقربین کی ارواح کی طرف جو ملاء اعلیٰ میں بزرگ ترین ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی بخشش جو زمین والوں پر ہوتی ہے اس کا وسیلہ ہیں جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا تعظیم سے ذکر کرنا اور آپ کے حق میں خدا تعالیٰ سے خیر طلب کرنا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف متوجہ ہونے کا ایک عمدہ سبب ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ اس سے تحریف کا دروازہ بند ہوتا ہے، کیونکہ اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے صرف رحمت خداوندی کی طلب کے قصد سے آپ کا ذکر کیا ہے اور کاملین کی روحیں جب اپنے جسموں سے جدا ہوتی ہیں تو ان کی حالت رکی ہوئی موج کی طرح ہو جاتی ہے کہ ان کو نیا ارادہ یا کوئی عارضی سبب حرکت نہیں دے سکتا لیکن وہ نفوس جو ان سے کم درجہ کے ہوتے ہیں قصد کر کے ان کے ساتھ مل جاتے ہیں اور نور اور ہیئت جو ان کے مناسب ہوتی ہے ان ارواح سے حاصل

کر لیتے ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث میں یہی مراد ہے ''جو شخص مجھ پر سلام کرتا ہے تو خدا تعالیٰ میری روح کو مجھ پر اعادہ کرتا ہے حتی کہ میں اس کو سلام کا جواب دیتا ہوں'' ۱۱۴۴ھ میں جب میں مدینہ منورہ کا مجاور (۱) تھا تو بیشمار مرتبہ میں نے اس بات کا مشاہدہ کیا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''میری قبر کی زیارت کو عید نہ بناؤ''۔

میں کہتا ہوں اس میں تحریف کا راستہ بند کرنے کی طرف اشارہ ہے جیسے یہود و نصاری نے اپنے انبیا کی قبروں کے ساتھ کیا اور ان کی زیارت کو حج کی طرح عید اور موسم مقرر کر لیا تھا۔

واضح ہو کہ اذکار کے اوقات معین کرنے کی ضرورت ہے اگر چہ ان کی تعیین شرائع کی توقیت سے کم درجہ کی ہے کیونکہ اگر اذکار کی توقیت نہ کی جائے تو سست لوگ کاہلی کر سکتے ہیں اور یہ پابندی اوقات سے یا اسباب سے ہوتی ہے اور ہم نے صراحتاً یا اشارۃً اس بات کا ذکر کر دیا ہے کہ بعض اوقات کو خاص کرنے کی وجہ یا تو ان اوقات میں روحانیت کا ظہور ہے جیسے صبح و شام کے اوقات یا نفس کا ہیئت رذیلہ سے خالی ہونا ہے جیسے خواب سے بیدار ہونے کا وقت یا وہ وقت کاروبار اور دنیا کے قصوں سے فارغ ہونے کا وقت ہے تاکہ اس وقت میں ذکر کرنا بہ منزلہ صیقل کے ہو جائے جیسے سونے کا ارادہ کرتے وقت، اور سببیت کے لئے مخصص وہ شئے ہو سکتی ہے جو ذکر الٰہی سے بھلانے اور جناب باری کی طرف توجہ سے نفس کو غافل کرنے کا سبب ہو پس ایسے وقت میں ذکر الٰہی سے علاج کرنا ضروری ہے تاکہ اس غفلت کے زہر کے لئے تریاق اور اس کے نقصان کا تدارک کرنے والا ہو، یا وہ مخصص کوئی عبادت ہوتی ہے جس کا پورا نفع اور کامل فائدہ بغیر ذکر ملائے نہیں ہوتا جیسے وہ اذکار جو نمازوں کے بعد مسنون ہیں، یا وہ مخصص کوئی ایسی حالت ہوتی ہے جو نفس کو خوف الٰہی اور اس کے عظیم الشان غلبہ کے ملاحظہ کرنے پر متنبہ کرتی ہے، کیونکہ یہ حالت اس کو اعمال حسنہ کی طرف رہنمائی کرتی ہے خواہ اس کو علم ہو یا نہ ہو جیسے آیات الٰہی مثلاً آندھی اور تاریکی اور کسوف کے وقت کا اذکار، یا وہ ایسی حالت ہوتی ہے جس میں نقصان پہنچنے کا خوف ہوتا ہے پس اس حالت کے شروع میں خدا تعالیٰ کے فضل کا طلب کرنا اور اس کی پناہ مانگنا ضروری ہے جیسے سفر کرتے اور سوار ہوتے وقت، یا وہ ایسی حالت ہوتی ہے کہ اس میں اہل جاہلیت ایسے اعتقادات رکھتے تھے جو

(۱) جب مدینۃ الرسول میں مقیم و معتکف تھے۔

اشراک باللہ یا بدشگونی یا اس کے مثل ہوتا تھا جیسے وہ جنون سے پناہ مانگتے تھے اور رویت ہلال کا وقت، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں سے بعض اذکار کے فضائل اور دنیا و آخرت میں ان کے آثار بیان کئے ہیں تا کہ لوگوں کو پورا فائدہ پہنچے اور ان میں کامل ترغیب پیدا ہو اور اس باب میں عمدہ چند امور ہیں۔

از آں جملہ ذکر کا تہذیب نفس کے لئے مظنہ اور اس کی علامت ہونا ہے پس جو امر تہذیب پر مرتب ہوتا ہے آپ نے اس کو ذکر پر دائر کیا ہے جیسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول جس نے ان کلمات کو کہا اور پھر وہ مر گیا تو فطرت اسلامی پر مرے گا، یا یہ فرمایا کہ جنت میں داخل ہوگا یا یہ فرمایا کہ اس کے گناہ بخشے جائیں گے اور اسی قسم کے الفاظ آئے ہیں۔

اور از آں جملہ اس بات کا بیان کہ اس ذکر کرنے والے کو کوئی شئے ضرر نہیں پہنچاتی یا وہ ہر برائی سے محفوظ رہتا ہے اور اس کا یہ سبب ہوتا ہے کہ رحمت الٰہی اس شخص کے شامل حال ہو جاتی ہے اور فرشتوں کی دعائیں اس کا احاطہ کر لیتی ہیں۔

اور از آں جملہ اس بات کا بیان کہ اس کے گناہ دور ہو جاتے ہیں اور نیکیاں لکھی جاتی ہیں اور اس کی وجہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے سے اور رحمت الٰہی کے محیط ہونے سے گناہ زائل ہو جاتے ہیں اور قوت ملکی زیادہ ہو جاتی ہے اور از اں جملہ شیاطین کا اس شخص سے دور ہو جانا ہے اس کا سر بھی بعینہ وہی ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تین اوقات میں ذکر مسنون فرمایا ہے۔ صبح اور شام اور خواب کے وقت، اور اکثر اذکار میں جاگنے کا وقت مقرر نہیں فرمایا کیونکہ غالباً وہی وقت صبح کے طلوع ہونے یا اس کے روشن ہونے کا ہوتا ہے پس صبح اور شام کے اذکار میں سے بعض اذکار یہ ہیں: اللھم عالم الغیب و الشھادۃ فاطر السمٰوات و الارض رب کل شئ و ملیکہ اشھد ان لا الہ الا انت اعوذبک من شر نفسی و من شر الشیطان و شرکہ امسینا و امسی الملک للہ و الحمدللہ و لا الہ الا اللہ وحدہ لاشریک لہ لہ الملک و لہ الحمد وھو علی کل شئ قدیر، اللھم انی اسالک من خیر ھذہ اللیلۃ وخیر ما فیھا و اعوذ بک من شرھا وشر ما فیھا، اللھم انی اعوذبک من الکسل و الھرم وسوء الکبر وفتنۃ الدنیا وعذاب القبر،

اور صبح کے وظیفہ میں بجائے امسینا کے اصبحنا اور بجائے امسی کے اصبح اور بجائے هذه الليلة کے هذا اليوم بدل دینا چاہئے، بک اصبحنا وبک امسینا وبک نحیا وبک نموت والیک المصیر، اور شام کے وقت اس کی بجائے بک امسینا وبک اصبحنا وبک نحیا وبک نموت والیک النشور پڑھنا چاہئے، باسم الله الذی لایضر مع اسمه شئ فی الارض ولا فی السماء وهو السمیع العلیم تین مرتبہ پڑھے، سبحان الله وبحمده ولا قوة الا بالله ما شاء الله کان ومالم یشاء لم یکن اعلم ان الله علی کل شئ قدیر وان الله قد احاط بکل شئ علما، فسبحان الله حین تمسون وحین تصبحون وله الحمد فی السموت والارض وعشیا وحین تظهرون تخرجون تک پڑھے، اور اللهم انی اسألک العافیة فی الدنیا والأخرة، اللهم انی اسالک العفو والعافیة فی دینی و دنیاوی واهلی ومالی، اللهم استر عوراتی وامن روعاتی، اللهم احفظنی من بین یدی ومن خلفی وعن یمینی وعن شمالی ومن فوقی واعوذ بعظمتک ان اغتال من تحتی، رضیت بالله ربّا وبالاسلام دینا وبمحمد صلی الله علیه وسلم نبیّا تین مرتبہ، اعوذ بکلمات الله التامات من شر ماخلق، اللهم ما اصبح بی من نعمة او باحد من خلقک فمنک وحدک لاشریک لک فلک الحمد ولک الشکر، اور سید الاستغفار جو مذکور ہو چکا ہے پڑھے اور جب آدمی سونے کے لئے اپنے بستر پر جائے تو اس وقت کے وظائف میں سے یہ ہے۔ باسمک ربی وضعت جنبی وبک ارفعه ان امسکت نفسی فارحمها وان ارسلتها فاحفظها بما تحفظ به عبادک الصالحین، اور اللهم اسلمت نفسی الیک و وجهت وجهی الیک وفوضت امری الیک والجات ظهری الیک رغبة ورهبة الیک لاملجا ولا منجا منک الا الیک امنت بکتابک الذی انزلت ونبیک الذی ارسلت الحمد لله الذی اطعمنا وسقانا وکفانا واوانا فکم ممن لا کافی له ولا مؤوی له، اور سبحان الله اور الحمدلله ہر ایک تینتیس بار اور الله اکبر چونتیس بار اور اللهم قنی عذابک یوم تبعث عبادک

تین بار، اعوذ بوجهک الکریم وکلماتک التامات من شر ما انت أخذ بناصیته، اللھم انت تکشف المغرم والماثم، اللھم لایھزم جندک ولا یخلف وعدک ولا ینفع ذا الجد منک الجد سبحانک وبحمدک اللھم رب السمٰوات والارض ورب کل شئ فالق الحب والنوی منزل التوراۃ والانجیل والقرآن اعوذبک من شر کل ذی شر انت آخذ بناصیته انت الاول فلیس قبلک شئ وانت الآخر فلیس بعدک شئ وانت الظاهر فلیس فوقک شئ وانت الباطن فلیس دونک شئ اقض عنی الدین واغننی من الفقر باسم اللہ وضعت جنبی، اللھم اغفرلی ذنبی واخسا شیطانی وفک رھانی واجعلنی فی الندی الاعلٰی، الحمد للہ الذی کفانی وآوانی واطعمنی و سقانی والذی من علی فافضل والذی اعطانی فاجزل الحمد للہ علی کل حال، اللھم رب کل شئ وملیکه والٰه کل شئ اعوذ بک من النار، پھر دونوں ہاتھ ملائے اور سورہ قل ھو اللہ احد اور قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس پڑھ کران میں دم کرے اور دونوں ہاتھوں کو اپنے جسم پر جہاں تک ہوسکے پھیرے اور آیت الکرسی پڑھے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کے لئے جو کسی عورت سے نکاح کرے یا کوئی خادم خریدے یہ پڑھنا مسنون فرمایا ہے: اللھم انی اسالک خیرھا وخیر ما جبلتھا علیه واعوذبک من شرھا وشر ما جبلتھا علیه.

اور جب کسی کو نکاح کی مبارک بادی دے تو یہ کہے: بارک اللہ لک وبارک علیکما وجمع بینکما فی خیر ،اور جب بیوی کے پاس آنے کا ارادہ کرے تو یہ کہے: بسم اللہ اللھم جنبنا الشیطان وجنب الشیطان مارزقتنا، اور جو بیت الخلا میں جائے تو یہ کہے: اعوذ باللہ من الخبث والخبائث اور جب باہر آئے تو غفرانک کہے، اور جب کسی کو کوئی تکلیف ہو جائے تو یہ کہے: لا الٰه الا اللہ الحلیم العظیم لا الٰه الا اللہ رب العرش العظیم لا الٰه اللہ رب العالمین السموات ورب الارض ورب العرش الکریم اور غصہ کے وقت یہ کہے: اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم اور مرغ کی آواز سنتے وقت فضل الٰہی

کا سوال کرے، اور گدھے کی آواز سنے تو اعوذ باللہ پڑھے اور جب سوار ہو تو تین بار تکبیر کہہ کر یہ پڑھے سبحان الذی سخرلنا هذا وما كنا له مقرنين وانا الى ربنا لمنقلبون، تین بار الحمد لله کہے الله اكبر تین بار کہے اور یہ پڑھے، سبحانک اللهم ظلمت نفسی فاغفرلی انه لايغفر الذنوب الا انت، اور جب سفر کو جائے تو یہ کہے: اللهم انا نسالک في سفرنا هذا البر والتقوى ومن العمل ما ترضى، اللهم هوّن علينا سفرنا هذا واطولنا بعده، اللهم انت الصاحب في السفر والخليفة في الاهل، اللهم انی اعوذبک من وعثاء السفر وكابة المنقلب وسوء المنظر في المال والاهل اور جب کسی منزل پر ٹھیرے تو یہ کہے، اعوذ بكلمات الله التامات من شر ما خلق یا ارض ربی وربک الله اعوذ بالله من شرک ومن شر مافیک و من شر ما خلق فیک ومن شر مایدب علیک واعوذ بالله من اسد واسود ومن الحية والعقرب ومن شر ساكن البلد ومن والد و ماولد، اور جب سفر کی حالت میں صبح ہو تو یہ کہے: سمع سامع بحمد الله وحسن بلائه علينا ربنا صاحبنا وافضل علينا عائذا بالله من النار اور جب سفر سے واپس آئے تو ہر بلندی پر تین تکبیریں کہے اس کے بعد کہے: لا اله الا الله وحده لاشريك له له الملک وله الحمد وهو على كل شئ قدير، ائبون تائبون عابدون ساجدون لربنا حامدون صدق الله وعده ونصر عبده وهزم الاحزاب وحده اور جب کافروں پر بددعا کرے تو یہ کہے: اللهم منزل الكتاب سريع الحساب، اللهم اهزم الاحزاب اللهم احزمهم وزلزلهم، اللهم انا نجعلک في نحورهم ونعوذبک من شرورهم اللهم انت عضدی ونصيري بک اصول وبک احول وبک اقاتل، اور جب کسی قوم کا مہمان ہو تو یہ کہے: اللهم بارک لهم فيما رزقتهم واغفرلهم وارحمهم، اور جب چاند دیکھے تو یہ کہے: اللهم اهله علینا بالامن والايمان والسلامة والاسلام ربی وربک الله، اور جب کسی مصیبت زدہ کو دیکھے تو یہ کہے: الحمد لله الذي عافاني مما ابتلاک به وفضلنی على كثير ممن خلق تفضيلا۔

اور جب کسی بڑے بازار میں جائے تو یہ کہے: لا اله الا الله وحده لاشريک له له

الملک وله الحمد یحیی ویمیت وهو حی لایموت بیده الخیر وهو علی کل شیء قدیر ،اور جب کسی ایسی مجلس سے اٹھے جس میں شوروغل زیادہ ہو تو یہ کہے: سبحانک اللهم وبحمدک اشهد ان لا اله الا انت استغفرک واتوب الیک ،اور جب کسی کو رخصت کرے تو یہ کہے:استودع الله دینک وامانتک وآخر عملک وزودک الله التقوی وغفر ذنبک ویسر لک الخیر حیثما کنت، اللهم اطوله البعد وهون علیه السفر ،اور جب گھر سے نکلے تو یہ کہے:بسم الله توکلت علی الله اللهم انا نعوذبک من ان نزل او نضل او نظلم او یجهل علینا باسم الله توکلت علی الله لاحول ولا قوة الا بالله. اور جب گھر میں جائے تو یہ کہے اللهم انی اسالک خیر المولج وخیر المخرج باسم الله ولجنا وباسم الله خرجنا وعلی الله ربنا توکلنا ،اور جب کسی پر قرض کا بوجھ ہو اور افکار لاحق ہو تو صبح وشام یہ پڑھے. اللهم انی اعوذبک من الهم والحزن واعوذبک من العجز والکسل واعوذبک من البخل والجبن واعوذبک من غلبة الدین وقهر الرجال ،اور یہ پڑھے اللهم اکفنی بحلالک عن حرامک واغننی بفضلک عمن سواک اور جب نیا کپڑا پہنے تو یہ کہے:اللهم لک الحمد انت کسوتنی هذا ،اور اس کپڑے کا نام لے، اسالک خیره وخیر ما صنع له واعوذبک من شره وشر ما صنع له الحمد لله الذی کسانی مااواری به عورتی واتجمل به فی حیاتی اور جب کوئی چیز کھائے یا پیئے تو کہے' الحمد لله الذی اطعمنا وسقانا وجعلنا من المسلمین، الحمد لله الذی اطعمنی هذا الطعام من غیر حول منی ولاقوة الحمد لله الذی اطعم وسغی وسوّغه وجعل له مخرجا ،اور جب دسترخوان سے ہاتھ اٹھائے تو یہ کہے، الحمد لله حمداً کثیراً طیباً مبارکا فیه غیر مکفی ولا مودع ولا مستغنی عنه ربنا ،اور جب مسجد کی طرف چلے تو کہے: اللهم اجعل فی قلبی نوراً الخ ،اور جب مسجد میں داخل ہونے کا ارادہ کرے تو کہے: اعوذ بالله العظیم وبوجه الکریم وسلطانه القدیم من الشیطان الرجیم، اللهم افتح لی ابواب رحمتک ،اور جب مسجد سے نکلے تو کہے: اللهم انی اسالک من

فضلک، اور جب بادل کی گرج اور بجلی کی کڑک سنے تو کہے اللھم لاتقتلنا بغضبک و لا تھلکنا بعذابک وعافنا قبل ذالک، اللھم انی اعوذبک من شرھا اور جب سخت ہوا چلے تو کہے۔ اللھم انی اسالک خیرھا وخیر ما فیھا وخیر ما ارسلت بہ واعوذبک من شرھا وشر مافیھا وشر ما ارسلت بہ، اور جب چھینک آئے تو کہے، الحمد للہ حمداً کثیراً طیباً مبارکا، اور اس کے پاس والا کہے: یرحمک اللہ اور چھینکنے والے کے جواب میں کہے یھدیکم اللہ ویصلح بالکم اور جب سوئے تو کہے: اللھم باسمک اموت واحیی، اور جب بیدار ہو تو کہے: الحمدللہ الذی احیانا بعد ما اماتنا والیہ النشور۔

اور اذان کے وقت پانچ چیزیں مسنون ہیں: ایک یہ کہ جو کچھ مؤذن کہے اس کے جواب میں وہی خود کہے مگر حی علی الصلوٰۃ اور حی علی الفلاح کے بجائے لاحول ولاقوۃ الا باللہ کہے، دوسرے یہ کہ رضیت باللہ ربا وبالاسلام دینا وبمحمد رسولا کہے، تیسرے یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجے، چوتھے یہ کہ یہ دعا پڑھے: اللھم رب ھذہ الدعوۃ التامۃ والصلاۃ القائمۃ ات محمداالوسیلۃ والفضیلۃ والدرجۃ الرفیعۃ وابعثہ مقاماً محمودا الذی وعدتہ انک لاتخلف المعیاد، پانچویں خدا تعالیٰ سے دنیا وآخرت کی فلاح مانگے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عشرہ ذی الحجہ میں کثرت سے ذکر الٰہی کرنے کا حکم فرمایا اور صحابہ اور تابعین ائمہ مجتہدین سے عرفہ کے دن اور ایام تشریق میں مختلف طور تکبیر ثابت ہوئی ہے جن میں سے سب سے بہتر یہ تکبیر ہے کہ عرفہ کے دن فجر سے لیکر امام تشریق کے آخر دن کی عصر تک ہر نماز کے بعد ایک بار یہ کہے: اللہ اکبر اللہ اکبر لاالٰہ الا اللہ واللہ اکبر اللہ اکبر وللہ الحمد اور نماز وغیرہ کی دعائیں پہلے مذکور ہو چکی ہیں ان کو وہاں دیکھنا چاہیے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ جو شخص اپنے نفس کو ان اذکار کا پابند کرے اور ان اوقات میں ان پر مداومت رکھے اور ان میں تدبر کرے تو اس شخص کے حق میں یہ اذکار ہر وقت ذکر کرنے کے برابر ہیں اور وہ شخص اللہ تعالیٰ کے اس قول کا مصداق ہو جاتا ہے "والذاکرین اللہ کثیراً والذاکرات" واللہ اعلم۔

بقیہ مباحث احسان کا بیان

واضح ہو کہ ان چار اخلاق کے چند اسباب ہیں جن سے یہ اخلاق حاصل ہوتے ہیں اور کچھ موانع ہیں جو ان اخلاق سے روکتے ہیں اور علامات بھی ہیں جن سے ان اخلاق کا تحقق معلوم ہوتا ہے، پس خدا تعالیٰ کے سامنے عاجزی کرنا اور اس کی کبریائی کی طرف متوجہ ہونا اور عالم بالا کے رنگ سے رنگین ہونا اور رذائل بشریہ سے پاک ہونا اور دنیاوی زندگی کے نقوش سے نفس کے اندر منقش نہ ہونا اور دنیاوی زندگی پر مطمئن نہ ہونا ان سب امور کے پیدا کرنے میں فکر کرنے سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہے چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''ایک گھڑی فکر کرنا ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے اور فکر کرنے کی چند قسمیں ہیں۔

ازآں جملہ ذات الٰہی میں فکر کرنا اور انبیا علیہم السلام نے اس سے منع کیا ہے کیونکہ عوام اس فکر کی طاقت نہیں رکھتے اور اس کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے ''اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں فکر کرو، اس کی ذات میں فکر مت کرو'' اور یہ بھی مروی ہے ''ہر شئے میں فکر کرو لیکن خدا کی ذات میں فکر نہ کرو'' اور ازآں جملہ اللہ تعالیٰ کی صفات مثلاً علم اور قدرت اور رحمت اور احاطہ میں فکر کرنا ہے اور اہل سلوک اس فکر کرنے کو مراقبہ کہتے ہیں اور اس میں اصل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ہے ''احسان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اس طرح عبادت کر گویا تو اس کو دیکھ رہا ہے پس اگر یہ نہیں ہوسکتا تو یہ خیال کر کہ وہ تجھ کو دیکھ رہا ہے'' اور آپ کا یہ قول ہے ''خدا تعالیٰ کو یاد رکھ تو اس کو اپنے سامنے پائے گا'' اور اس فکر کرنے کا طریقہ اس شخص کے لئے جو طاقت رکھتا ہے یہ ہے کہ یہ آیت پڑھے: **وھو معکم اینما کنتم** (جہاں تم ہو وہ تمہارے ساتھ ہے) یا یہ آیت پڑھے: **وما**

تکون فی شان وماتتلو منه من قراٰن ولا تعملون من عمل الا کنا علیکم شھوداً اذ تفیضون فیه وما یعزب عن ربک من مثقال ذرة فی الارض ولا فی السماء ولا اصغر من ذلک ولا اکبر الا فی کتاب مبین (اورتو کسی حال میں نہیں ہوتا اور نہ قرآن میں سے کچھ تلاوت کرتا ہے اور نہ تم لوگ کوئی عمل کرتے ہو مگر ہم تمہارے اوپر موجود ہوتے ہیں جب تم اس کام میں گھستے ہو اور تیرے رب سے ذرہ برابر زمین میں اور نہ آسمان میں چھپا ہوا نہیں ہے اور نہ اس سے چھوٹا اور نہ بڑا مگر ظاہر کرنے والی کتاب میں موجود ہے) اور یا یہ آیت پڑھے: الم تر ان اللہ یعلم ما فی السمٰوات وما فی الارض ما یکون من نجوی ثلاثة الا ھو رابعھم ولا خمسة الا ھو سادسھم ولا ادنی من ذالک ولا اکثر الا ھو معھم اینما کانوا، (بلاشبہ خدا تعالیٰ جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے جانتا ہے کہیں تین شخصوں کا مشورہ نہیں مگر وہ ان کا چوتھا ہوتا ہے اور نہ پانچ کا مشورہ ہوتا ہے مگر وہ ان کا چھٹا ہوتا ہے اور نہ اس سے کم اور نہ زیادہ مگر وہ ان کے ساتھ ہوتا ہے جہاں وہ ہو) یا یہ آیت پڑھے: ونحن اقرب الیه من حبل الورید، (اور رگ گردن سے زیادہ ہم اس سے قریب ہیں) یا یہ آیت پڑھے: وعنده مفاتیح الغیب لا یعلمھا الا ھو ویعلم ما فی البر والبحر وما تسقط من ورقة الا یعلمھا ولا حبة فی ظلمات الارض ولا رطب ولا یابس الا فی کتاب مبین، (اور اسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جن کو ان کے سوا کوئی نہیں جانتا اور جو کچھ جنگل اور دریا میں ہے اس کو اس کا علم ہے اور کوئی پتا نہیں جھڑتا جس کو وہ نہ جانتا ہو اور زمین کی تاریکیوں میں کوئی دانہ ہرا اور سوکھا ایسا نہیں ہے جو ظاہر کرنے والی کتاب میں موجود نہ ہو) یا یہ آیت پڑھے: واللہ بکل شئ محیط (اور خدا ہر چیز کو گھیر رہا ہے) یا یہ آیت پڑھے: وھو القاھر فوق عبادہ ،(اور وہی غالب ہے اپنے بندوں پر) یا یہ آیت پڑھے: وھو علی کل شئ قدیر ،(اور وہ ہر چیز پر قادر ہے) یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کو پڑھے ''اس بات کو جان لے کہ تمام دنیا اگر اس بات پر متفق ہو کہ تجھ کو کچھ نفع دیں تو کچھ نفع نہ دے سکیں گے مگر اسی قدر جو تیرے لئے خدا نے لکھ رکھا ہے اور اگر تمام لوگ اس بات پر متفق ہو جائیں کہ تجھ کو کچھ ضرر پہنچائیں تو تجھ کو کچھ ضرر نہ دے سکیں گے مگر اسی قدر جو تیرے لئے خدا تعالیٰ نے لکھ رکھا ہے، قلم

اٹھا لئے گئے اور کاغذ خشک ہو گئے'' یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کو پڑھے'' خدا تعالیٰ کی سو رحمتیں ہیں جن میں سے اس نے زمین پر ایک نازل فرمائی ہے'' الحدیث۔ پھر ان آیات کے معانی کا بغیر تشبیہ و جہت کے تصور کرے بلکہ ان اوصاف کے ساتھ خدا تعالیٰ کے صرف متصف ہونے کو خیال میں رکھے پس جب ان کے تصور کرنے سے تھک جائے تو آیت کا اعادہ کرے اور اس کا تصور بھی کرے اور اس امر کے لئے ایک ایسا وقت مقرر کرے جس میں نہ پیشاب کی حاجت ہو نہ پائخانہ کی حاجت ہو اور نہ بھوک ہو نہ غصہ ہو اور نہ نیند ہو، حاصل کلام یہ ہے کہ دل تشویش سے فارغ ہو۔

اور از آں جملہ خدا تعالیٰ کے افعال عظیم میں فکر کرنا ہے اور اس کی اصل یہ آیت ہے'' جو لوگ آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں فکر کرتے ہیں، اے ہمارے پروردگار تو نے اس کو بیکار نہیں پیدا کیا'' اور اس کی صورت یہ ہے کہ بارش برسانے اور نباتات کے اگانے اور اسی قسم کی چیزوں کا تصور کرے اور احسان الٰہی میں مستغرق ہو جائے۔

اور از آں جملہ ایام اللہ میں تفکر کرتا ہے اور وہ کسی قوم کے بلند ہونے کو اور کسی قوم کے پست ہونے کو یاد کرنا ہے اور اس بارے میں اصل اللہ تعالیٰ کی یہ آیت ہے کہ خدا تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا تھا'' پس ان کو خدا تعالیٰ کے دن یاد دلا'' کیونکہ یہ تفکر نفس کو دنیا سے مجرد کر دیتا ہے۔

اور از آں جملہ موت اور اس کے بعد کے حالات میں تفکر کرنا ہے اور اس بارے میں اصل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ہے'' لذتوں کے منقطع کرنے والی شئے کو یاد کرو'' اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ اس بات کا تصور کرے کہ اس کا نفس دنیا سے الگ ہو گیا اور نیکی و بدی جو اس نے کی ہے اور ان کی جزا و سزا جو اس کو ملنے والی ہے اس کے روبرو ہے، اور تفکر کی یہ دونوں قسمیں نفس کے نقوش دنیا قبول نہ کرنے میں سب سے زیادہ نافع ہیں کیونکہ جب انسان اشغال دنیا سے فراغت پا کر ان اشیا میں خوب فکر کرتا ہے اور ان کو اپنی آنکھوں کے سامنے پیش کرتا ہے تو اس کی بہیمیت مغلوب اور اس کی ملکیت غالب ہو جاتی ہے اور چونکہ عوام کے لئے سب اشغال سے فارغ ہو کر ان امور میں فکر کرنا اور ان کو اپنی آنکھوں کے سامنے حاضر کرنا آسان نہ تھا اس واسطے ضروری ہوا کہ اس ذکر اور

فکر کے واسطے اشباہ وصور مقرر کئے جائیں اور ان میں فکر کے اقسام مرتب کئے جائیں اور ان میں فکر کی روح ڈالی جائے تا کہ عام لوگ بھی اس کا قصد کرسکیں اور ان کو سن سکیں اور اپنی تقدیر کے موافق اس سے فائدہ حاصل کرسکیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک قرآن دیا گیا ہے جو ان تمام اقسام کو جامع ہے اور اس کے ساتھ اس کے مثل یعنی حدیث بھی عطا کی گئی، اور میرے خیال میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ان دونوں قرآن وحدیث میں وہ سب کچھ جمع کردیا گیا جو امم سابقہ میں تھا، واللہ اعلم۔

پھر حکمت کا یہ مقتضی ہوا کہ تلاوت قرآن کی ترغیب دلائی جائے اور اس کی فضیلت اور اس کی سور وآیات کی فضیلت بیان کی جائے اس واسطے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت سے جو معنوی فائدہ حاصل ہونے والا ہے اس کو ایک ایسے محسوس فائدہ کے ساتھ تشبیہ دی جو عرب کے نزدیک سب سے زیادہ عزیز تھا اور وہ بڑی کوہان والی اونٹنی اور فربہ اور حاملہ اونٹنی ہے تا کہ اس معنوی فائدہ کی تمثیل اور تصویر پائی جائے اور آپ نے تلاوت کرنے والے کو فرشتوں کے ساتھ تشبیہ دی اور قرآن کے ہر حرف کا اجر بیان کیا اور لوگوں کے درجات ترنج اور خرما اور اندرائن کے پھل اور ریحان کے ساتھ تشبیہ دیکر بیان کئے اور بیان فرمایا کہ قرآن کی سورتیں قیامت کے روز اجسام میں متشکل ہوکر نظر آئیں گی اور ہاتھوں سے محسوس ہوسکیں گی اور اپنے پڑھنے والوں کی طرف سے حجت کریں گی اور اس میں عذاب اور نجات کے اسباب کا تعارض اور تلاوت قرآن کا دوسرے اسباب پر رجحان ظاہر کرنا ہے اور آپ نے یہ بھی بیان فرمایا کہ بعض سورتوں کو بعض پر فضیلت ہے۔

میں کہتا ہوں یہ فضیلت چند وجوہ سے ہوتی ہے۔ از آں جملہ یہ ہے کہ اس سورت سے صفات الٰہی میں تفکر کرنا حاصل ہوتا ہے اور اس میں صفات جمع ہوتی ہیں مثلاً آیت الکرسی اور سورۂ حشر کے اخیر کے آیات اور قل ہو اللہ احد، کیونکہ اس کا جملہ اسما میں اسم اعظم کا سا درجہ ہے۔

اور از آں جملہ اس کا نزول بندوں کی زبانوں کے موافق ہونا ہے تا کہ ان کو معلوم ہوجائے کہ رب کی طرف تقرب حاصل کرنے کا طریقہ کیا ہے جیسے سورۂ فاتحہ اور اس کا درجہ اور سورتوں میں ایسا ہے جیسے فرائض کا تمام عبادات میں ہے اور از آں جملہ یہ ہے کہ وہ سورت تمام سورتوں میں جامع ہو جیسے سورۂ بقرہ اور آل عمران، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۂ یٰسین کے بارے میں فرمایا

''وہ قرآن کا دل ہے'اس کی وجہ یہ ہے کہ دل سے درمیان میں ہونے کی طرف اشارہ ہوتا ہے اور سورۂ یٰسین ان سورتوں سے جو دو سو آیات یا ان سے زیادہ کی ہیں، کم ہے اور سور مفصلات سے زیادہ ہے اور اس میں توکل اور تفویض اور توحید کی آیات ہیں جو انطا کیہ کے نو مسلم کی زبان سے سرزد ہوئیں یعنی اس آیت میں ''اور مجھے کیا ہوا ہے جو اپنے پیدا کرنے والے کی پرستش نہ کروں'' الآیات۔ اور اس میں مقاصد مذکورہ پورے اور کامل طور پر موجود ہیں، اور 'تبارک الذی' کی فضیلت کے بارے میں آپ نے فرمایا کہ اس نے ایک شخص کی شفاعت کی حتی کہ خدا تعالیٰ نے اس کو بخش دیا اور اس شخص کے قصہ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعض مکاشفات میں دیکھا تھا، اور نیز حکمت شرعی کا یہ مقتضی کہ قرآن کے یاد کرنے کی طرف اور اس میں مشغول رہنے کی طرف رغبت دلائی جائے اور اس کے بھول جانے کی مثال اونٹ کے فرار ہونے کے ساتھ دی جائے اور نیز قرآن کو ترتیل کے ساتھ پڑھنے اور دلجمعی اور جمع خاطر اور زیادہ شوق کے ساتھ تلاوت کرنے کی رغبت دلائی جائے، تاکہ اچھی طرح تدبر ہو اور خوش الحانی سے پڑھا جائے اور پڑھتے وقت گریہ وزاری کی جائے تاکہ وہ مراد جو تفکر کرنا ہے حاصل ہو اور اس کا بھلا دینا حرام کر دیا جائے اور تین دن سے کم میں قرآن ختم کرنے کی ممانعت کی جائے کیونکہ اس وقت میں وہ قرآن کے معنی نہ سمجھ سکے گا اور لغات عرب میں قرآن پڑھنے کی اجازت دی گئی ہے تاکہ ان پر سہولت ہو کیونکہ امت میں ان پڑھ اور بوڑھے اور بچے ہوتے ہیں اور وہ چیز جو اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کے علاوہ عطا فرمائی ہے از آں جملہ یہ ہے ''اے میرے بندو! ظلم کو میں نے اپنے اوپر حرام کر لیا ہے اور تمہارے اندر بھی اس کو حرام کیا ہے اس لئے تم باہم ظلم نہ کرو، اے میرے بندو! تم میں سے ہر ایک گمراہ ہے مگر جس کو میں ہدایت دوں' الحدیث، ''بنی اسرائیل میں سے ایک ایسا شخص تھا جس نے ننانوے آدمیوں کا خون کیا تھا'' الحدیث، خدا تعالیٰ کو اپنے بندہ کی توبہ سے نہایت خوشی ہوتی۔ الحدیث، میرا بندہ جب گناہ کرتا ہے۔ الحدیث، خدا کی رحمت کے سو حصے ہیں ان میں سے ایک زمین کی طرف اتارا، الحدیث، جب بندہ اسلام لائے اور اپنے اسلام کو بہتر بنائے، الحدیث، اور وہ احادیث جن میں دنیا کو اس پانی کے ساتھ تشبیہ دی ہے جو دریا میں سے انگلی کو لگ جاتا ہے اور اس بھیڑ کے بچہ کے ساتھ جو کان کٹا اور مرا پڑا تھا تشبیہ دی ہے۔

واضح ہو کہ نیت روح ہے اور عبادت جسم ہے اور بغیر روح کے جسم کی زندگی نہیں ہوتی اور مفارقت بدن کے بعد بھی روح کو ایک قسم کی حیات رہتی ہے البتہ بغیر بدن کے اس کی حیات کے آثار پورے طور پر ظاہر نہیں ہوتے اس لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''ان کے گوشت اور ان کے خون اللہ تعالیٰ کے پاس نہیں پہنچیں گے لیکن تمہاری پرہیزگاری اس کے پاس پہنچتی ہے'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''البتہ اعمال نیتوں کے ساتھ ہوتے ہیں'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سے مواضع میں اس شخص کو جس کی نیت صادق اور کسی مانع کی وجہ سے عمل نہ کر سکا اس کے ساتھ تشبیہ دی ہے جس نے یہ عمل کیا ہے جیسے مسافر اور مریض جو اپنے دائمی وظیفہ پر قدرت نہیں رکھتے تو وہ اعمال ان کے لئے لکھے جاتے ہیں اور جیسے وہ شخص جو خدا کی راہ میں خرچ کرنے کی صادق نیت رکھتا ہو لیکن بسبب افلاس کے وہ خرچ نہیں کر سکتا تو اس کے لئے خرچ کرنے والے کے برابر اجر لکھا جاتا ہے اور نیت سے مراد وہ معنی ہیں جو عمل پر برانگیختہ کرتے ہیں یعنی اطاعت کرنے والے کے ثواب اور نافرمان کے عذاب کی تصدیق کرنا جس کی اللہ تعالیٰ نے رسولوں کی معرفت خبر دی ہے یا اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی میں اللہ تعالیٰ کے حکم کو بجالانے سے خوش ہونا، اسی لئے شارع کو ریا اور دکھلاوے سے منع کرنا اور ان کی برائیوں کا صاف طور سے بیان کرنا ضروری ہوا اسی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''قیامت کے روز سب سے پہلے جن سے حساب لیا جائے گا وہ تین شخص ہوں گے، ایک وہ شخص جو جہاد میں اس لئے لڑ کر مر گیا کہ اس کو لوگ جوانمرد کہیں، دوسرا وہ شخص جس نے اس لئے علم پڑھا پڑھایا کہ اس کو عالم کہیں، تیسرا وہ شخص جس نے ہر امر خیر میں اس لئے خرچ کیا کہ اس کو لوگ سخی کہیں، پس حکم ہوگا کہ ان کو منہ کے بل گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے، (۱) اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے نقل کرتے ہوئے فرمایا ''میں شرکا کے شرک سے بری ہوں جس نے کوئی ایسا عمل کیا جس میں میرے سوا کسی اور کو بھی شریک کیا میں نے اس کے عمل کو بھی اور اس کے شریک کو بھی چھوڑ دیا'' لیکن وہ حدیث جو ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ کسی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا یا رسول اللہ آپ اس شخص کے بارے میں کیا فرماتے ہیں جو کوئی نیک کام کرتا ہے اور لوگ اس کی تعریف کرتے ہیں، آپ نے فرمایا ''مؤمن کی

---

(۱) اللہ ریا کاری سے محفوظ رکھے۔

خوشیوں میں سے جو اس کو پیش آئیں گی یہ پہلی خوشی ہے'' سو اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ شخص خالص اللہ تعالیٰ کے لئے وہ عمل کرتا ہے پس اس کی قبولیت زمین کی طرف نازل ہوتی ہے اس واسطے اس سے لوگ بھی محبت کرتے ہیں، اور وہ حدیث جو حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ ''میں نے کہا یا رسول اللہ! میں اپنے گھر میں نماز پڑھ رہا تھا کہ اس اثنا ایک شخص میرے پاس آیا پس اس نے جو مجھ کو اس حالت میں دیکھا تو مجھ کو اپنی یہ حالت تو اچھی معلوم ہوئی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تجھ پر اللہ تعالیٰ رحم کرے، تیرے لئے دو اجر ہیں، ایک اجر پوشیدہ کرنے کا اور دوسرا ظاہر کرنے کا، تو اس کے یہ معنی ہیں کہ اعجاب نفسانی مغلوب ہونا چاہئے اور صرف وہ عمل کا باعث نہ ہو اور اجر سر سے اخلاص کا اجر مراد ہے جو پوشیدگی میں پایا جاتا ہے اور ظاہر کرنے کا اجر دین الٰہی کے بلند کرنے اور سنت راشدہ کی اشاعت کرنے سے ہوتا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''تم میں سے بہترین وہ شخص ہے جس کے اخلاق اچھے ہوں''۔

میں کہتا ہوں چونکہ سماحت اور عدالت میں ایک قسم کا تعارض ہے جس پر ہم متنبہ کر چکے ہیں اور انبیا علیہم السلام کی بنا دونوں مصلحتوں کی رعایت کرنے پر اور نظام دارین کے قائم کرنے پر اور حتی الامکان مصالح کے جمع کرنے پر ہے، اس واسطے ضروری ہوا کہ شرائع میں سماحت کے لئے خاص وہی صورتیں معین کی جائیں جن کے ساتھ عدالت بھی ہو اور جن سے اس کی تائید اور اس پر تنبیہ بھی ہو اس واسطے حسن اخلاق کا حکم دیا گیا اور وہ امور سماحت اور امور عدالت کے ایک مجموعہ کا نام ہے کیونکہ حسن اخلاق، جود اور ظلم کرنے والے سے عفو اور تواضع اور ترک حسد و کینہ وغضب کو شامل ہے اور یہ سب باتیں سماحت کے قبیل سے ہیں اور لوگوں سے محبت اور صلہ رحمی اور لوگوں کے ساتھ حسن صحبت سے پیش آنے اور محتاجوں کی مدد کرنے کو بھی شامل ہے اور یہ سب باتیں عدالت کے قبیل سے ہیں اور پہلی قسم دوسری قسم پر موقوف ہے اور دوسری قسم پہلی قسم کے بغیر ناتمام ہے اور یہ ان رحمتوں میں سے ہے جن کا شرائع الٰہیہ میں اعتبار کیا گیا ہے اور چونکہ انسان کے تمام اعضا میں زبان خیر و شر کی طرف زیادہ پیش قدمی کرنے والی ہے اس واسطے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اور لوگوں کو کوئی چیز نتھنوں کے بل اوندھا نہ کرے گی مگر جو ان کی زبانوں نے کاٹا ہے'' اور نیز زبان کی آفات اخبات اور سماعت اور عدالت سب میں خلل انداز ہوتے ہیں کیونکہ کثرت سے

کلام کرنا ذکر اللہ سے غافل کرتا ہے اور غیبت اور فحش باتیں اور ان کے مثل باہم فساد ڈالتی ہیں اور زبان سے جو کلام نکلتا ہے دل پر اس کا رنگ چڑھ جاتا ہے پس جب کوئی غصہ کا کلمہ کہتا ہے تو دل کے اندر ایک جوش پیدا ہو جاتا ہے، وعلیٰ ہذا القیاس۔

اور دل کا رنگین ہونا عالم مثال میں متشکل ہونے کا سبب ہوتا ہے اس واسطے ضروری ہوا کہ شرع میں بہ نسبت اور اعضا کی آفات کے زبان کی آفات سے زیادہ بحث کی جائے اور آفات لسانی کے بہت سے اقسام ہیں از آں جملہ یہ ہے کہ ہر امر میں خوض کرے پس اس کے سبب سے ان چیزوں کی صورتیں آدمی کی حس مشترک میں جمع ہو جاتی ہیں اور جب خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو نہ حلاوت ذکر پاتا ہے اور نہ اذکار میں تدبر کر سکتا ہے اسی وجہ سے لایعنی باتوں سے شریعت نے ممانعت کی ہے اور از آں جملہ یہ ہے کہ وہ لوگوں میں فتنہ پیدا کرتی ہے جیسے غیبت اور لڑائی جھگڑا اور لوگوں کو بہکانا، اور از آں جملہ یہ ہے کہ وہ کلام ایسا ہو جس سے قوت سبعیہ یا قوت شہوت کے اثر سے نفس متاثر ہوتا ہے جیسے گالیاں بکنا اور عورتوں کی خوبصورتیوں کا ذکر کرنا، اور از آں جملہ یہ ہے کہ وہ کلام خدا کے جلال اور کبریائی کے فراموش کرنے کا باعث ہوتا ہے جیسے بادشاہ کو شہنشاہ کہنا اور از آں جملہ یہ ہے کہ وہ کلام مصالح دینی کے خلاف پڑتا ہے بایں طور کہ دین میں جس چیز کے ترک کرنے کا حکم ہے اس کلام سے اس کی ترغیب لازم آتی ہے جیسے شراب کی تعریف کرنا اور انگور کا نام کرم رکھنا یا کتاب اللہ کو عجمی بنانا لازم آتا ہے جیسے مغرب کا نام عشا رکھنا اور عشا کو عتمہ کہنا، اور از آں جملہ یہ ہے کہ وہ کلام مثلاً بیہودہ ہے جیسے افعال شنیعہ جو شیاطین کی طرف منسوب ہوتے ہیں جیسے فحش باتیں اور جماع اور اعضا مستورہ کا صاف صاف الفاظ میں ذکر کرنا اور جیسے اس لفظ کا ذکر کرنا جس سے بدفالی لی جاتی ہے جیسے یہ کہنا کہ گھر میں کامیابی نہیں ہے اور برکت نہیں ہے پھر اس چیزوں کا بیان کرنا بھی ضروری ہے جہاں ساحت بکثرت پائی جاتی ہے اور اخلاق معتبرہ عند الشرائع اور غیر معتبرہ میں تمیز کرنا بھی ضروری ہے، پس از آں جملہ زہد ہے کیونکہ بسا اوقات نفس کو کھانے اور لباس اور عورت کی حرص کی طرف بڑی رغبت ہوتی ہے حتیٰ کہ اس سے ایک فاسد رنگ پیدا ہو جاتا ہے جو نفس کے جوہر میں اثر کرتا جاتا ہے پس جب انسان اس کو اپنے نفس سے دور کر دیتا ہے تو وہ دنیا میں زہد کہلاتا ہے اور خاص ان چیزوں کا ترک مقصود بالذات نہیں

ہے بلکہ ان کے ترک سے اس خصلت کا حاصل کرنا مطلوب ہے اور اسی لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''دنیا کا زہد نہ حلال کے حرام کر لینے سے ہے اور نہ مال کے ضائع کرنے سے بلکہ دنیا کا زہد یہ ہے کہ جو چیز تیرے قبضہ میں ہے اس پر اس چیز سے زیادہ تجھ کو اعتماد نہ ہو جو خدا تعالیٰ کے قبضہ میں ہے اور جب تجھ کو کوئی مصیبت پہنچے تو اس مصیبت کے ثواب کی رغبت میں اس مصیبت کا باقی رہنا تجھ کو پسند ہو'' اور آپ نے فرمایا ''ابن آدم کا سوائے ان تین چیزوں کے اور میں حق نہیں ہے، ایک گھر جس میں سکونت کرے اور کپڑا جس سے تن ڈھانک سکے اور کسی قدر روٹی اور پانی'' اور آپ نے فرمایا ''ابن آدم کو چند لقمے جن سے پشت کو سیدھا کر سکے کافی ہیں''۔

اور آپ نے فرمایا دو شخصوں کا کھانا تین کو اور تین کا کھانا چار کو کافی ہے'' یعنی وہ کھانا جس سے دو آدمی خوب اچھی طرح شکم سیر ہو سکتے ہیں جب اس کو تین آدمی کھائیں گے تو اوسط درجہ میں ان کو کافی ہو جائے گا اس سے آپ کا مقصد حاجت براری کی ترغیب اور شکم پری کی حرص کو مکروہ سمجھنا ہے، اور از آں جملہ قناعت ہے اور وہ یہ ہے کہ بسا اوقات انسان کے نفس پر مال کی حرص غالب ہو جاتی ہے یہاں تک کہ اس کے جوہر میں داخل ہو جاتی ہے پس جب اس حرص کو اپنے دل سے دور کر دیتا ہے اور اس کا ترک اس پر آسان ہو جاتا ہے تو اس کو قناعت کہتے ہیں اور قناعت اس کو نہیں کہتے کہ خدا تعالیٰ نے انسان کو جو کچھ عطا فرمایا ہے بے رغبتی سے اس کو ترک کر دے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''غنی'' کثرت مال واسباب سے نہیں ہوتا بلکہ غنی دل کا غنی ہوتا ہے'' اور فرمایا ''اے حکیم یہ مال سبز اور شیریں ہے پس جو اس کو نفس کی سخاوت کے ساتھ لیتا ہے تو اس میں برکت ہوتی ہے اور جو حرص کے ساتھ اس کو لیتا ہے تو اس میں اس کے لئے برکت نہیں ہوتی اور وہ اس شخص کے مثل ہو جاتا ہے جو کھائے چلا جاتا ہے اور سیر نہیں ہوتا اور اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جب تیرے پاس اس مال میں سے کچھ آئے اور تو نہ اس کا حریص ہے اور نہ سائل تو تو اس کو لیکر آسودہ ہو ورنہ اپنے نفس کو اس کے پیچھے نہ لگا''۔

اور از آں جملہ اس کا بیان یہ ہے کہ مال کی محبت اور اس کے جمع کرنے کی محبت بسا اوقات دل پر غالب آ کر اس کا احاطہ کر لیتی ہے اور جب آدمی اس کے خرچ کرنے پر قادر رہتا ہے اور کچھ پرواہ نہیں کرتا تو اس کو جود کہتے ہیں اور جود مال کا ضائع کر دینا نہیں ہے اور نہ مال خود کوئی مبغوض

چیز ہے بلکہ یہ ایک بڑی نعمت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''بخل سے بچتے رہو کیونکہ بخل نے تم سے پہلے لوگوں کو ہلاک کر دیا اسی نے ان کو لوگوں کے قتل کرنے اور محارم کے حلال کرنے پر آمادہ کیا تھا'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''دو شخصوں کے سوا کوئی حسد کے قابل نہیں'' الحدیث، اور کسی نے آپ سے دریافت کیا کیا خیر سے شر پیدا ہوتا ہے؟ تو آپ نے جواب دیا البتہ خیر سے شر پیدا نہیں ہوتا اور ربیع میں بعض چیزیں ایسی پیدا ہوتی ہیں جو تخمہ پیدا کر کے ہلاک کر دیتی ہیں یا ہلاکت کے قریب کر دیتی ہیں'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس شخص کے پاس زائد سواری ہو تو جس کے پاس سواری نہیں ہے اس کو وہ سواری دے دے اور جس کے پاس زائد کھانا ہو تو جس کے پاس کھانا نہیں ہے اس کو دے دے، پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مال کی بہت سے اقسام ذکر کئے یہاں تک کہ ہم کو یہ گمان ہوا کہ زائد چیز میں ہمارا کوئی حق نہیں ہے اور اس امر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قدر رغبت اس لئے دلائی کہ لوگ جہاد میں مصروف تھے اور مسلمان ضرورتمند تھے اور اس میں سماحت اور نظام ملت کا قیام اور مسلمانوں کی جان کا باقی رکھنا بھی پایا جاتا ہے، اور از آں جملہ آرزو کا کوتاہ کرنا ہے اس لئے کہ انسان پر زندگی کی محبت اس قدر غالب ہوتی ہے کہ وہ موت کے نام لینے کو بھی مکروہ سمجھتا ہے اور اس قدر زندہ رہنے کی امید رکھتا ہے کہ اس حد تک وہ زندہ نہیں رہ سکتا پس اگر ایسی حالت میں وہ مر جاتا ہے تو جس چیز کا اس کو اشتیاق تھا اس کے حاصل نہ ہونے سے اس کو تکلیف ہوتی رہتی ہے اور زندگی فی نفسہ کوئی بری چیز نہیں ہے بلکہ بڑی نعمت ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''دنیا میں اس طرح رہ گویا تو مسافر یا راہ چلنے والا ہے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مربع خط کھینچا اور پھر اس کے وسط میں ایک خط کھینچا جو اس کے باہر تک تھا اور پھر اس بیچ والے خط کے ساتھ ملے ہوئے چھوٹے چھوٹے خط کھینچے مگر اسی مقدار کے ساتھ جتنا وہ مربع کے اندر اندر تھا پھر آپ نے فرمایا کہ یہ بیچ کا خط انسان ہے اور یہ مربع اس کی اجل ہے جو اس کو گھیرے ہوئے ہے اور یہ جو باہر کو نکلا ہوا ہے یہ اس کی امید ہے اور یہ چھوٹے چھوٹے خطوط دنیا کے عوارضات ہیں پس اگر ایک خطا کر گیا تو دوسرا اس کو کاٹتا ہے اور اگر اس سے بچ گیا تو کوئی اور اس کو ڈستا ہے''۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے طول آرزو کی بیماری کا علاج موت کے ذکر اور زیارت قبور اور

ساتھیوں کی موت سے عبرت حاصل کرنے کے ساتھ بیان فرمایا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''تم میں سے کوئی شخص موت کی آرزو نہ کرے اور نہ موت آنے سے پہلے اس کی دعا کرے کیونکہ جب آدمی مرجاتا ہے تو اس کے اعمال منقطع ہو جاتے ہیں اور از آں جملہ تواضع ہے اور اس کے یہ معنی ہیں کہ نفس کو تکبر اور خود پسندی کے دواعی کے تابع نہ کرے جس سے آدمی لوگوں کو حقیر جانے کیونکہ یہ چیز اس کے نفس کو فاسد کرتی ہے اور لوگوں پر ظلم کرنے اور ان کو ذلیل سمجھنے پر برانگیختہ کرتی ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس کے دل میں ذرہ کے برابر تکبر ہے وہ جنت میں نہ جائے گا، ایک شخص نے عرض کیا کہ آدمی چاہتا ہے کہ اس کا کپڑا اچھا ہو اور اس کے پاس اچھا جوتا ہو تو آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ جمیل ہے جمال کو پسند کرتا ہے، تکبر حق کے نہ ماننے اور لوگوں کو ذلیل سمجھنے کا نام ہے'' اور آپ نے فرمایا ''کیا میں تم کو اہل دوزخ کی خبر نہ دوں وہ سب لوگ جھگڑالو اور متکبر ہیں'' اور آپ نے فرمایا ''ایک شخص حلہ پہنے ہوئے خود پسندی کے ساتھ اتراتا ہوا جارہا تھا کہ خدا تعالیٰ نے اس کو دھنسا دیا اور وہ قیامت تک زمین میں دھنستا چلا جائے گا'' اور از اں جملہ حلم اور سہولت اور نرم دلی ہے اور ان کا حاصل یہ ہے کہ وہ غصہ کے اسباب کی پیروی نہ کرے یہاں تک کہ ان میں فکر نہ کر لے اور مصلحت نہ دیکھ لے، اور تمام حالات میں غضب کی صفت مذموم نہیں ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو شخص نرمی سے محروم رہا وہ ہر نیکی سے محروم رہا'' اور ایک شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ مجھ کو کچھ وصیت کیجئے آپ نے اس سے فرمایا غصہ مت کر، اس نے کئی بار یہی عرض کیا ہر بار آپ نے یہی جواب دیا کہ تو غصہ نہ کر'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''کیا میں تم کو وہ لوگ نہ بتلاؤں جو آتش دوزخ پر حرام ہیں وہ قریب بردبار، نرم مزاج اور سہولیت والا ہے'' اور آپ نے فرمایا ''زور آور وہ شخص نہیں ہے جو کشتی مارتا ہے زور آور تو وہ شخص ہے جو غصہ کے وقت اپنے نفس کو قابو میں رکھتا ہے''۔

اور از اں جملہ صبر ہے اور وہ آرام اور پریشانی اور خواہش نفسانی اور تکبر اور اظہار راز اور قطع محبت وغیرہ کے اسباب کا تابع نہ ہونا ہے اور ان اسباب کے اعتبار سے اس کے مختلف نام رکھے جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''صابر لوگوں کو ان کا ثواب بے حساب دیا جائے گا'' اور نبی صلی اللہ علیہ

وسلم نے فرمایا ''کسی شخص کو کوئی عطا زیادہ افضل اور زیادہ کشادہ صبر سے زیادہ نہیں دیا گیا'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عدالت کی علامات کے ساتھ حکم دیا ہے اور اس کے ابواب میں شئے عظیم الشان باب پر تنبیہ کی ہے اور خلق خدا پر مہربانی کرنے کی خوبیاں بیان فرمائیں اور لوگوں کو اس کی ترغیب دلائی اور اس کے اقسام یعنی گھر والوں کا الفت سے رہنا اور اہل محلّہ کے ساتھ برتاؤ اور شہر والوں کی معاشرت اور بزرگان دین کی توقیر اور ہر ایک کے مرتبہ کا لحاظ رکھنا بیان فرمایا اور اس کے متعلق بطور نمونہ ہم ہر بات کے لئے کچھ احادیث نقل کرتے ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''ظلم سے بچو کیونکہ ظلم قیامت کے روز تاریکیاں بن جائے گا'' خدا تعالیٰ نے تمہارے خون اور مال تم پر اس طرح حرام کر دیئے جس طرح آج کے دن کی حرمت اس شہر میں ہے'' مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان سلامت رہیں'' خدا کی قسم تم میں سے جو کوئی شخص کسی چیز کو بغیر حق کے لے گا تو قیامت کے روز اس کو اٹھائے ہوئے خدا تعالیٰ کے سامنے آئے گا پس ایسا نہ ہو کہ میں کسی کو اس حال میں دیکھوں کہ وہ خدا تعالیٰ کے پاس اونٹ اٹھائے ہوئے آئے اور وہ بلبلاتا ہو یا گائے کو اپنے اوپر سوار کئے ہوئے آئے کہ وہ ڈکراتی ہو، یا بکری کو سوار کئے ہو کہ وہ ممیاتی ہو'' اور آپ نے فرمایا ''جو شخص بالشت بھر زمین ظلم سے لے گا ساتوں زمین طوق بنا کر اس کی گردن میں ڈالی جائے گی'' (اور اس کی حکمت ہم زکوٰۃ کے باب میں بیان کر چکے ہیں) اور مومن مومن کے لئے بنیاد کی طرح ہے کہ اس کے اجزا ایک دوسرے کے لئے مضبوطی کا باعث ہوتے ہیں'' مومنین کی مثال آپس کی محبت اور ہمدردی اور مہربانی میں ایسی ہے جیسے بدن جب اس میں سے کوئی عضو مریض ہو جاتا ہے تو تمام بدن کو بے خوابی اور بخار لاحق ہو جاتا ہے'' جو لوگوں پر رحم نہیں کرتا اللہ تعالیٰ اس پر رحم نہیں کرتا'' ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے نہ اس پر زیادتی کرے نہ اس کو ہلاکت میں ڈالے'' جو شخص اپنے بھائی کی حاجت میں پڑتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی حاجت میں ہوتا ہے'' جس شخص نے مسلمان کی کوئی مصیبت دور کی خدا تعالیٰ روز قیامت کی مصائب میں سے اس کی کوئی مصیبت اس کے سبب سے دور فرمائے گا اور کسی کی پردہ پوشی کرے خدا تعالیٰ قیامت کے دن اس کی پردہ پوشی کرے گا، سفارش کیا کرو ماجور ہو گے اور خدا تعالیٰ جو چاہتا ہے اپنے نبی کی زبان پر جاری کرتا ہے'' اور آپ نے فرمایا ''دو شخصوں میں تو جو انصاف کرے تو یہ صدقہ ہے اور کسی

کوسواری میں مدد دی کہ اس کو سوار کرادے یا اس کے اسباب کو اٹھا کر رکھ دے تو یہ صدقہ ہے اور اچھی بات کہنا صدقہ ہے" اور ضعیف مہاجرین کے بارے میں آپ نے فرمایا "اگر تو نے ان کو ناخوش کیا تو تو نے خدا کو ناخوش کیا اور آپ نے فرمایا" یتیم کا بوجھ اٹھانے والا اور میں جنت میں اس طرح ہوں گے اور یہ فرما کر انگشت شہادت اور درمیانی انگلی سے آپ نے اشارہ کیا یعنی جس طرح یہ دونوں انگلیاں پاس پاس ہیں" اپاہج اور مسکین کا کام کرنے والا خدا کی راہ میں جہاد کرنے والے کے برابر ہے" جو شخص ان لڑکیوں کی طرف سے کچھ مشقت میں مبتلا ہوا اور ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے تو وہ اس کے لئے آگ کی روک ہو جائے گی، عورتوں کے بارے میں میری وصیت قبول کرو کیونکہ عورت پسلی سے پیدا ہوئی اور پسلی میں زیادہ ترکجی اوپر کے حصہ میں ہے پس اگر تو اس کو سیدھا کرنا چاہے گا تو اس کو توڑ دیگا"۔

اور بیوی کے حق میں آپ نے فرمایا "تو کھانا کھائے تو اس کو بھی کھلا اور تو کپڑے پہنے تو اس کو بھی پہنا اور منہ پر مت مار اور اس کی صورت بگڑنے کی دعا مت کر اور بجز خواب گاہ کے اس سے علیحدہ مت ہو" جب خاوند اپنی بیوی کو اپنے بستر کی طرف بلائے اور وہ اس کے پاس نہ آئے اور خاوند اس پر غصہ کی حالت میں سو رہے تو فرشتے صبح تک اس پر لعنت کرتے رہتے ہیں" خاوند کی موجودگی میں کسی عورت کو روزہ رکھنا درست نہیں ہے جب تک وہ اجازت نہ دے اور خاوند کی بغیر اجازت کسی کو اس کے گھر میں نہ آنے دے اور اگر میں کسی کو کسی لئے سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو میں عورت کو حکم کرتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے" جو عورت مر جائے اور اس کا خاوند اس سے خوش ہو جنت میں داخل ہوگی" ایک وہ دینار ہے جس کو تو نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کیا اور ایک وہ دینا ہے جو کسی جان کے چھڑانے میں تو نے خرچ کیا اور ایک وہ دینار ہے جو کسی مسکین پر تو نے خرچ کیا اور ایک وہ دینار ہے جو تو نے اپنی بیوی پر خرچ کیا ان سب کے اندر ثواب میں زیادہ وہ دینار ہے جو تو نے اپنی بیوی پر خرچ کیا" جو شخص طلب ثواب کی غرض سے اپنی بیوی کو نفقہ دے تو وہ اس شخص کے لئے صدقہ ہے، پڑوسی کے بارے میں جبرئیل علیہ السلام مجھ کو ہمیشہ وصیت کیا کرتے تھے یہاں تک کہ مجھ کو یہ گمان ہوا کہ وہ عنقریب اس کو وارث بنادیں گے" اے ابوذر جب تو شوربا پکائے تو اس کا پانی بڑھا دیا کر اور اپنے پڑوسیوں کا خیال رکھ" جو شخص خدا تعالیٰ اور قیامت کے دن

پر یقین رکھتا ہے اس کو چاہئے کہ اپنے پڑوسی کو نہ ستائے'' خدا کی قسم جس شخص کا پڑوسی اس کی ایذاؤں سے امن میں نہیں ہے وہ مومن نہیں ہے'' اللہ تعالیٰ نے رحم سے فرمایا '' کیا تو اس سے راضی نہیں ہے کہ جو تجھ سے ملے میں بھی اس سے ملوں اور جو تجھ کو قطع کرے میں بھی اس سے قطع کروں'' جو شخص چاہے کہ اس کے رزق میں فراخی ہو اور عمر میں درازی ہو تو اس کو صلہ رحمی کرنا چاہئے'' ماں باپ کی نافرمانی کبائر میں سے ہے'' آدمی کو اپنے ماں باپ کو گالی دینا کبائر میں سے ہے'' کسی شخص کے باپ کو کوئی گالی دیتا ہے تو وہ اپنے باپ کو گالی دیتا ہے اور جب کسی کی ماں کو گالی دیتا ہے تو وہ اپنی ماں کو گالی دیتا ہے'' کسی نے پوچھا کہ ماں باپ کے مرنے کے بعد بھی کوئی نیکی ان کے ساتھ ہو سکتی ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں، ان پر رحمت کی دعا کرنا اور ان کے لئے استغفار کرنا اور ان کے بعد ان کے عہدوں کا پورا کرنا اور اس قرابت کا جو ماں باپ کے رشتہ سے ہے جوڑنا اور ان کے دوستوں کی تعظیم کرنا'' خدا تعالیٰ کی تعظیم میں سے بوڑھے مسلمان اور حامل قرآن کی جو قرآن کی قرأت میں مبالغہ نہیں کرتا اور نہ نافرمانی کرتا ہے تعظیم اور صاحب سلطنت کی تعظیم ہے جو عادل ہو'' جس نے ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کیا اور ہمارے بزرگی کو نہ جانا وہ ہم میں سے نہیں ہے'' لوگوں کو ان کے مرتبہ پر رکھو، جس نے مریض کی عیادت کی یا فی سبیل اللہ اپنے کسی بھائی کی زیارت کی تو اس کو منادی یہ آواز دیتا ہے کہ تو نے اچھا کیا اور تیرا راستہ بھی اچھا ہوا اور تو نے اپنے لئے جنت میں جگہ بنالی، پس یہ احادیث اور جو ان کے مثل ہیں سب خلق عدالت اور حسن مشارکت پر تنبیہ کرتی ہیں۔

مقامات اور احوال کا بیان

واضح ہو کہ احسان کے لئے بہت سے ثمرات ہیں جو اس کے حاصل ہونے کے بعد حاصل ہوتے ہیں اور ان کو مقامات اور احوال کہتے ہیں اور اس باب کے ساتھ جو احادیث متعلق ہیں ان کی شرح دو مقدموں کی تمہید پر موقوف ہے پہلا مقدمہ عقل اور قلب اور نفس کے اثبات اور ان کے حقائق کے بیان میں ہے اور دوسرا مقدمہ مقامات اور احوال کے پیدا ہونے کی کیفیت کے بیان میں ہے۔

مقدمہ اولیٰ: واضح ہو کہ انسان میں لطائف ہیں جن کو عقل اور قلب اور نفس کہتے ہیں ان کے وجود پر نقل اور عقل اور تجربہ اور عاقل لوگوں کا اتفاق دلالت کرتا ہے لیکن نقل کا دلالت کرنا سو وہ قرآن مجید میں وارد ہوا ہے "عقلمندوں کے لئے اس میں بلاشبہ نشانیاں ہیں" اور اللہ تعالیٰ نے اہل نار سے حکایت فرمایا ہے "اگر ہم سنتے یا عقل رکھتے ہوتے تو اصحاب جہنم میں سے نہ ہوتے" اور حدیث شریف میں آیا ہے "خدا تعالیٰ نے سب سے پہلے عقل کو پیدا کیا پھر اس سے کہا سامنے آ پس وہ سامنے آئی پھر اس سے فرمایا پیچھے لوٹ جا پس وہ پیچھے لوٹ گئی، پھر فرمایا تیرے ہی سبب سے میں مواخذہ کروں گا" اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "آدمی کا دین اس کی عقل ہے اور جس کو عقل نہیں اس کا دین نہیں" اور آپ نے فرمایا "جس کو عقل ملی وہ کامیاب ہوا" اگرچہ ان احادیث کے ثبوت میں محدثین کو کلام ہے لیکن ان کی ایسی اسانید ہیں جو بعض بعض کی تائید کرتی ہیں، اور قرآن عظیم میں آیا ہے "جان لو کہ خدا تعالیٰ آدمی اور اس کے قلب کے درمیان حائل ہو جاتا ہے" اور یہ بھی آیا ہے "اس قرآن میں بلاشبہ نصیحت ہے اس شخص کے لئے جس کا قلب ہو یا کان لگائے

اور وہ حاضر القلب ہو' اور حدیث شریف میں آیا ہے ''خبردار ہو جاؤ کہ بدن کے اندر ایک گوشت کا ٹکڑا جب وہ درست ہوتا ہے تو بدن درست رہتا ہے اور جب وہ بگڑ جاتا ہے تو بدن بگڑ جاتا ہے، خبردار ہو جاؤ کہ وہ قلب ہے'' اور یہ بھی آیا ہے ''دل کی مثال ایک پر کی ہے جو میدان میں پڑا ہے جس کو ہوائیں لوٹ پوٹ کرتی رہتی ہیں'' اور حدیث میں آیا ہے ''نفس آرزو و خواہش کرتا ہے اور پیشاب گاہ اس کی تصدیق یا تکذیب کر دیتی ہے'' اور مواضع استعمال میں تلاش کرنے سے ہی بات معلوم ہوتی ہے کہ عقل اس چیز کا نام ہے جس سے انسان ان چیزوں کا ادراک کرتا ہے جو حواس سے معلوم نہیں ہوتیں اور قلب اس چیز کا نام ہے جس سے انسان محبت یا بغض رکھتا ہے یا کسی چیز کو پسند کرتا ہے اور ارادہ کرتا ہے، اور نفس اس چیز کا نام ہے جس سے انسان لذائذ یعنی کھانے اور پینے اور جماع کرنے کی خواہش کرتا ہے اور عقل کا ان تینوں چیزوں کے وجود پر دلالت کرنا سوا اپنے موقع پر یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ انسان کے بدن میں تین اعضا رئیسہ ہیں جن سے وہ قویٰ اور افعال جو انسان کی صورت نوعیہ کے مقتضی ہیں پورے ہوتے ہیں پس قوائے ادراکیہ یعنی تخیل اور توہم اور پھر ان متخیلات اور متوہمات کے اندر تصرف اور بوجہ من الوجوہ مجردات سے حکایت کرنے کا محل دماغ ہے اور غضب اور جرأت اور جود اور بخل اور خوشی اور ناخوشی اور اسی قسم کی چیزوں کا محل قلب ہے، اور اس چیز کے طلب کرنے کا محل جس پر یا اس کے جنس پر بدن کا قوام موقوف ہے، جگر ہے۔

اور جب ان تین اعضا میں سے کسی خاص عضو میں کوئی نقصان آ جاتا ہے تو ایک خاص قوت میں فتور پیدا ہو جاتا ہے جس سے اس قوت کا اختصاص اس عضو کے ساتھ ثابت ہوتا ہے پھر ان تینوں میں سے ہر ایک کا فعل بغیر باقی دو کی مدد کے تمام نہیں ہو سکتا پس اگر بری بات کی برائی اور اچھی بات بھلائی کا ادراک اور نفع اور ضرر کا توہم نہ ہو تو غصہ و محبت کا ہیجان نہیں ہوتا، اور جب تک قلب میں متانت نہ ہو تو کسی متصور چیز کی تصدیق نہیں ہوتی اور اگر کھانے اور جماع کرنے کی معرفت نہ ہو اور اس کے فائدے متوہم نہ ہوں تو طبیعت ان کی طرف کبھی مائل نہ ہو اور اگر اطراف بدن میں قلب اپنا حکم نافذ نہ کرے تو انسان اپنے لذائذ حاصل کرنے میں کوشش نہ کرے اور اگر حواس عقل کی خدمت نہ کریں تو ہم کو کسی چیز کا ادراک نہ ہو کیونکہ کسبیات بدیہیات کی فرع ہیں بدیہیات محسوسات کی فرع ہیں اور اعضا میں سے اس عضو کی صحت جس پر قلب اور دماغ کی

صحت موقوف ہے نہ پائی جائے تو قلب اور دماغ کو کبھی صحت نصیب نہ ہو اور نہ ان کا کوئی فعل پورا ہو لیکن ان میں سے ہر ایک بہ منزلہ ایک بادشاہ کے ہے جس نے کسی امر عظیم مثلاً کسی مستحکم قلعہ کی فتح کا قصد کر رکھا ہے اور وہ بادشاہ اپنے دوستوں سے ڈھالوں اور توپوں کی مدد طلب کرتا ہے مگر قلعہ کے فتح کرنے میں وہ خود ہی مدبر ہے اور اسی کا حکم چلتا ہے اور اسی کی رائے سے کام ہوتا ہے اور وہ سب خادم ہیں جو اس کی رائے پر چلتے ہیں پس جو حوادث پیدا ہوتے ہیں ان کی صورت ان صفات کے مطابق ظاہر ہوتی ہے جو اس بادشاہ میں غالب ہوتے ہیں یعنی اس کی دلیری اور بزدلی اور سخاوت اور بخل اور عدالت اور ظلم کے اعتبار سے ان کا ظہور ہوتا ہے پس جس طرح بادشاہ اور ان کی رائے اور ان کی صفات کے اختلاف سے حالات مختلف ہوتے ہیں اگر چہ لشکر اور ہتھیار ایک ہی سے ہوں اسی طرح ان رؤساء ثلثہ میں سے ہر رئیس کا حکم بدن انسان کی مملکت میں مختلف ہوتا ہے۔

اور حاصل کلام یہ ہے کہ وہ افعال جو ان اعضا ثلثہ میں سے ہر ایک سے صادر ہوتے ہیں وہ باہم یا تو یکساں ہوتے ہیں یا افراط وتفریط کی طرف مائل یا ان دونوں کے مابین ہوتے ہیں پس جب ہم ان تینوں ہیکلوں کو ان کے افعال مساویہ کے ساتھ اور ان کے امزجہ کے ساتھ جن کو یہ افعال متقاربہ ہمیشہ مقتضی ہیں اعتبار کرتے ہیں تو ان کو لطائف ثلثہ کہتے ہیں جن سے بحث کی جاتی ہے خود وہ قوئ بغیر ان کے ساتھ کسی چیز کے اعتبار کئے لطائف نہیں ہیں پس قلب کی صفات اور اس کے افعال یہ ہیں، غصہ، دلیری، محبت، بزدلی، خوشی، ناخوشی، قدیمی دوستی کی وفاداری، کبھی ایک شخص سے محبت اور کبھی عداوت، حب جاہ، جود، بخل، رجا اور خوف۔

عقل کی صفات اور افعال یہ ہیں: یقین، شک، تو ہم ہر حادثہ کے لئے اسباب کی تلاش، منافع کے حاصل کرنے اور نقصانات کے دفع کرنے کے طریقوں میں فکر کرنا، اور نفس کی صفات کا منتہی لذیذ کھانے اور پینے میں حرص کرنا اور عورتوں سے محبت رکھنا وغیر ذالک۔

اور تجربہ کا ان تینوں چیزوں کے وجود پر دلالت کرنا سو جو شخص افراد انسانی کا تتبع کرے تو وہ ضرور جان لیتا ہے لوگ اپنی جبلت کے موافق ان امور میں مختلف ہیں ان میں سے بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کا قلب نفس کے اوپر حاکم ہوتا ہے اور بعض ایسے ہوتے ہیں جن کا نفس قلب پر غالب ہوتا ہے پہلی قسم کے انسان کو جب غصہ آتا ہے یا اس کے قلب میں بلند درجہ کی خواہش پیدا

ہوتی ہے تو اس کے مقابلہ میں بڑی بڑی لذتوں کو حقیر سمجھتا ہے اور اس کے چھوڑنے پر صبر کرتا ہے اور ان کے چھوڑنے میں وہ شخص اپنے نفس کے ساتھ مجاہدہ عظیم کرتا ہے اور دوسری قسم کے انسان کو جب کسی لذت کی خواہش ہوتی ہے تو اس میں وہ گھس جاتا ہے اگر چہ اس جگہ ہزار طرح سے عار ہو اور اس کو مناصب عالیہ کی طرف رغبت دلائی جائے یا ذلت وخواری کا خوف دلایا جائے تو اس کی کچھ پرواہ نہیں کرتا۔

اور بسا اوقات غیرت مند آدمی کو حسین عورت کی طرف رغبت پیدا ہوتی ہے اور اس کا نفس اس کی طرف بہت بلاتا ہے لیکن اس کے قلب میں غیرت کے سبب سے ایک خیال پیدا ہوتا ہے جس کے سبب سے وہ اس کی طرف دیکھتا بھی نہیں، اور بسا اوقات بھوکے اور ننگے ہونے پر صبر کرتا ہے لیکن اپنی جبلی غیرت کی وجہ سے کسی سے سوال نہیں کرتا، اور بسا اوقات حریص آدمی کو حسین عورت اور عمدہ کھانے کی طرف رغبت ہوتی ہے حالانکہ وہ شخص اس میں خواہ طب کے اعتبار سے یا کسی حکمت عملی کی وجہ سے یا کسی شخص کی سطوت کی وجہ سے اپنا ضرر عظیم جانتا ہے جس سے وہ ڈر جاتا ہے اور کانپنے لگتا ہے اور اس برائی سے بچ جاتا ہے لیکن پھر اس کو خواہش اندھا کر دیتی ہے اور باوجود علم کے اس ہلاکت میں گر پڑتا ہے اور بسا اوقات آدمی کو دونوں جہت مخالف کی طرف اپنے نفس کا میلان معلوم ہوتا ہے پھر ان دونوں میں سے ایک داعیہ دوسرے پر غالب آجاتا ہے اور اس طور پر اس سے افعال متشابہ بار بار سرزد ہوتے ہیں یہاں تک کہ وہ شخص خواہش کی تابعداری اور بے احتیاطی یا خواہش کے روکنے اور نفس کو قابو میں رکھنے کے ساتھ ضرب المثل ہو جاتا ہے اور تیسرا شخص ایسا ہوتا ہے کہ اس کی عقل نفس اور قلب دونوں پر غالب ہو جاتی ہے جیسا کہ سچا اور کامل مومن کہ اس کی محبت اور بغض اور شہوت امر شرع اور اس چیز کے تابع ہو جاتا ہے جس کا شرع سے جواز بلکہ استحباب ثابت ہے پس وہ شخص امر شرع سے کبھی روگردانی نہیں کرتا اور چوتھا شخص ایسا ہوتا ہے جس پر رسم اور طلب جاہ کا غلبہ ہوتا ہے اور اپنے نفس سے عار کو ہٹانا چاہتا ہے ایسا شخص غصہ کو ضبط کرتا ہے اور باوجود سخت غضب ناک ہونے کے اور نہایت دلیر ہونے کے دوسرے کے برا کہنے کی تلخی پر صبر کرتا ہے تاکہ اس کے حق میں کوئی ایسی بات نہ کہے جو اس کو ناپسند ہے اور تاکہ وہ کسی برائی کی طرف منسوب نہ ہو، یا رفعت جاہ جو اس کو مطلوب ہے اس کو مل جائے پس پہلا شخص

درندوں کے مانند ہےاور دوسرا بہائم کے مانند ہےاور تیسرا فرشتوں کے مانند ہےاور چوتھے شخص کو صاحب مروت اور عالی ہمت کہتے ہیں، پھر تتبع کرنے سے انسان کے بعض افراد ایسے بھی ملتے ہیں کہ ان کی دو قوتیں معاً تیسرے پر غالب ہوتی ہیں اور ان دونوں کا حال باہم مشابہ رہتا ہے کہ کبھی یہ اس کے تابع اور کبھی وہ اس کے تابع پس جب صاحب بصیرت ان کے حال کا انضباط چاہے اور ان کے بیان کرنے کا ارادہ کرے تو لامحالہ لطائف ثلثہ کے ثابت کرنے کی ضرورت پڑے گی اور عقلا کے اتفاق سے ان تینوں کا وجود اس طرح ثابت ہوتا ہے۔

واضح ہو کہ تمام اہل ملت اور اہل ادیان جنھوں نے تہذیب نفس کا قصد کیا ہے ان تینوں کے اثبات پر یا ان مقامات واحوال کے بیان کرنے پر جو ان تینوں سے متعلق ہیں متفق ہیں پس فیلسوف اپنی حکمت عملیہ میں ان تینوں کو نفس ملکی اور نفس سبعی اور نفس بہیمی کہتا ہے گو اس نام کے رکھنے میں کسی قدر تساہل ہے پس اس نے عقل کا نام نفس ملکیہ رکھا ہے کیونکہ اس کے افراد میں سے افضل ترین فرد کا یہ نام ہے اور قلب کا نام نفس سبعی رکھا ہے کیونکہ اس کے اوصاف میں سے یہ وصف مشہور ہے اور صوفیہ کے گروہ نے ان لطائف کو ذکر کیا اور ان میں سے ہر ایک کی تہذیب کے درپے ہوئے مگر اتنا فرق ہے کہ انھوں نے دو اور لطیفے ثابت کئے ہیں اور ان کے لئے بڑا ہی اہتمام کیا ہے اور وہ دونوں روح اور سر ہیں ان کی حقیقت یہ ہے کہ قلب کے دو جانب ہیں ایک جانب کا میلان بدن اور اعضا کی طرف ہے اور ایک جانب کا میلان تجرد محض کی طرف ہے اور اسی طرح عقل کی دو جانب ہیں ایک جانب بدن اور حواس کی طرف مائل ہے اور ایک جانب تجرد محض کی طرف مائل ہے پس جو اسفل کی طرف مائل ہے اس کو قلب اور عقل کہتے ہیں اور جس کو جانب فوق سے اتصال ہے اس کو روح اور سر کہتے ہیں پس قلب کی صفت شوق اور وجد ہے جس سے آدمی بیتاب ہو جاتا ہے اور روح کی صفت انس اور انجذاب ہے اور عقل کی صفت اس چیز پر یقین کرنا ہے جس کا ماخذ علوم عادیہ کے مآخذ کے قریب ہے جیسے ایمان بالغیب اور توحید افعالی، اور سر کی صفت اس چیز کا مشاہدہ کرنا ہے جو علوم عادیہ سے برتر ہے بلکہ وہ اس مجرد محض سے حکایت ہے جو نہ کسی زمان میں ہے اور نہ مکان میں اور نہ کسی وصف سے موصوف ہو سکتا ہے اور نہ اس کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے، اور چونکہ شرع صورت انسانی کے میزان پر نازل ہوئی ہے خصوصیات فردیہ کے

اعتبار سے نہیں اس واسطے شرع نے اس تفصیل سے زیادہ بحث نہیں کی اور اس کے مباحث کو اجمال کے خزانہ میں چھوڑ دیا ہے اور تمام اہل ملل ونحل کے نزدیک بھی اس کے متعلق کچھ بیان ہے جو تتبع کے ساتھ ایک قسم کے تفطن اور فہم سے پہچانا جاتا ہے۔

مقدمہ ثانیہ: واضح ہو کہ قوی العقل اور قوی الجسم آدمی جس کے مادہ میں اس کے نوع کے احکام ظاہر ہونے کی پوری اور کامل قابلیت ہے اور وہ شخص افراد انسان کا بالطبع رئیس اور وہ قانون ہے جس کی وجہ سے تمام افراد کا اعلیٰ درجہ کی حد سے قرب و بعد معلوم ہوتا ہے وہ شخص ایسا ہے کہ باوجود قوت قلب کے اور پورے پورے قوی ہونے کے اس کی عقل اس کے قلب پر غالب ہے اور باوجود شدت نفس کے اور کثرت خواہشات کے اس کا قلب اس کے نفس پر غالب ہے پس ایسا شخص وہ ہوسکتا ہے جس کے اخلاق تام اور اس کی فطرت قوی ہے اور اس سے نیچے بہت سی مختلف قسمیں ہیں جو تامل صحیح سے معلوم ہوتی ہیں اور جانوروں میں بھی یہ تینوں قوتیں پائی جاتی ہیں لیکن ان کی عقل قلب اور نفس کے نیچے نہایت درجہ مغلوب ہوتی ہے اس واسطے وہ مکلّف ہونے کی قابلیت نہیں رکھتے اور نہ عالم بالا میں مل جانے کے قابل ہوتے ہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''البتہ ہم نے آدمیوں کو بزرگی دی اور جنگل ودریا میں ان کو سوار کیا اور ہم نے ان کو پاک چیزیں دی اور ہم نے اپنی اکثر مخلوق پر ان کو فضیلت دی''۔

اور یہ قوی العقل آدمی اگر اس کی عقل ان عقائد حقہ کی فرمانبردار ہے جو صادقین کو ملاء اعلیٰ سے حاصل ہوئی ہیں صلوات اللہ علیہم تو وہ فی الحقیقت مومن ہے اور اگر اس کے باوجود ملاء اعلیٰ تک رسائی بھی ہے کہ ان سے بلاواسطہ فیضان حاصل کرتا ہے تو اس شخص میں نبوت کا ایک شعبہ اور اس کی میراث ہے چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اچھا خواب نبوت کے چھیالیس حصوں میں سے ایک حصہ ہے، اور اگر ان کی عقل ان عقائد باطلہ کے تابع ہے جو مضلین ومبطلین سے ماخوذ ہیں تو وہ شخص ملحد اور گمراہ ہے اور اگر اس کی عقل اپنی قوم کے رسوم اور ان چیزوں کے تابع ہے جو اس کو تجربہ اور حکمت عملیہ سے معلوم ہوئے ہیں تو وہ دین الٰہی سے حاصل ہے اور جبکہ لوگ مختلف الاحوال تھے تو حکمت الٰہی میں ضروری ہوا کہ ایک کتاب ایسے شخص پر نازل کرے جو اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوق میں پاکیزہ اور سب سے زیادہ قوی العقل اور عالم بالا کے ساتھ سب سے زیادہ مشابہت

رکھنے والا ہو پھر لوگوں کی رائیں اس کے ساتھ متفق ہو جائیں حتی کہ اس کے احکام مشہورات سے شمار ہونے لگیں تا کہ جو ہلاک ہو تو جان کر ہلاک ہو اور جو نجات پائے تو جان کر نجات پائے اور یہ بات ضروری ہوئی کہ یہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام لوگوں کو احسان کے طریقے اور مقامات جو اس کے ثمرات ہیں خوب اچھی طرح بیان کرے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ انسان جب کتاب الٰہی پر اور اس چیز پر جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان سے ثابت ہے اس طرح سے ایمان لاتا ہے کہ اس کے جمیع قوائے قلبیہ ونفسیہ سیر ہو جاتے ہیں پھر وہ شخص پورے طور پر ذکر لسانی اور فکر قلبی کے ساتھ عبادت میں مشغول ہو جاتا ہے اور اعضا کو ادب دیتا رہتا ہے اور ایک مدت دراز تک اس کی مداومت بھی رکھتا ہے تو ان لطائف ثلثہ میں سے ہر ایک اس عبادت سے حصہ لے لیتا ہے اور اس کی مثال ایک ایسی خشک درخت کی جس کو بکثرت پانی دیا جائے اور اس کی ہر ہر شاخ اور ہر ہر پتی میں تازگی پہنچ جائے پھر اس سے پھل و پھول پیدا ہوں پس اسی طرح ان لطائف ثلثہ میں عبادت داخل ہو کر ان کی صفات طبیعہ خسیسہ کو صفات ملکیہ فاضلہ سے بدل دیتی ہے پس یہ صفات اگر ملکات راسخہ ہیں جن سے افعال ہمیشہ ایک طرح پر یا قریب قریب صادر ہوتے ہیں تو ان کو مقامات کہتے ہیں، اور اگر وہ صفات ایسے ہیں کہ مثل بجلی کے کبھی ظاہر ہو جاتے ہیں اور کبھی پوشیدہ ہو جاتے ہیں اور ہنوز ان کو قرار نہیں ہے، یا وہ صفات اس قسم کے امور ہیں جن کی شان سے قرار نہیں ہے جیسے رویا اور ہواتف اور غلبہ تو ان کو احوال واوقات کہتے ہیں اور چونکہ طبیعت بشری کے غلبہ کی حالت میں عقل کا مقتضی ان امور کی تصدیق کرنا تھا جو طبیعت بشریہ کے مناسب عقل کو پیش آتے ہیں اس واسطے تہذیب کے بعد عقل کا یہ مقتضی ہے کہ جو امور شرع سے ثابت ہیں اس کی اس طرح تصدیق کرے گویا کہ عیاناً وہ ان کا مشاہدہ کر رہی ہے جیسا کہ زید بن حارثہؓ نے بیان کیا جبکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا تھا ''ہر شئے کی ایک حقیقت ہے پس تیرے ایمان کی کیا حقیقت ہے؟ انھوں نے عرض کیا گویا کہ میں خدا تعالیٰ کے عرش کو سامنے دیکھتا ہوں''۔

اور چونکہ عقل کا مقتضی ہر نعمت ومصیبت کے اسباب کو پہچاننا ہے اس واسطے اس کا مقتضی تہذیب کے بعد توکل اور شکر اور رضامندی اور توحید ہے اور چونکہ قلب کا مقتضی اصل طبیعت کے

اعتبار سے منعم اور مربی کے ساتھ محبت کرنا اور دشمن ومخالف کے ساتھ بغض رکھنا اور ایذا پہنچانے والی چیزوں سے خوف کرنا اور نفع پہنچانے والی چیزوں سے امید رکھنا ہے اس واسطے تہذیب کے بعد اس کا مقتضی خدا تعالیٰ سے محبت اور اس کے عذاب سے خوف اور اس کے ثواب کی امید ہے اور چونکہ طبیعت کے ہیجان کے وقت نفس کا مقتضی لذائذ اور آرام میں غرق ہونا تھا اس واسطے تہذیب کے بعد اس کی صفت توبہ اور زہد اور مجاہدہ ہے اور یہ کلام ہم نے بطور مثال کے بیان کیا ہے ورنہ جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے اس کے اندر مقامات منحصر نہیں ہیں لہٰذا غیر مذکور کو مذکور پر قیاس کر لیجئے اور احوال کو مثل سکر اور غلبہ اور مدت مدیدہ تک کھانے پینے سے اعراض اور مثل رویا و ہاتف کو مقامات پر قیاس کر لیجئے۔

اور جب ہم ان امور سے فارغ ہو گئے جن پر اس باب کی احادیث کی شرح موقوف ہے تو اب ہم اصل مقصود شروع کرتے ہیں پس ہم کہتے ہیں ان مقامات اور احوال کی اصل جو قلب سے متعلق ہیں یقین ہے اور یقین کی شاخیں توحید اور اخلاص اور توکل اور شکر اور انس اور ہیبت اور تفرید اور صدیقیت اور محدثیت اور اس کے علاوہ امور ہیں جن کا شمار کرنا طوالت ہے۔

عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا یقین بالکل ایمان ہے اور ایک روایت میں یہ قول نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا میں فرمایا کہ ''اے اللہ ہم کو وہ یقین عطا کر جس کے سبب سے دنیا کے مصائب ہم پر سہل ہو جائیں''۔

میں کہتا ہوں یقین کے معنی یہ ہیں کہ ہر ہر مسئلہ پر جو کہ شرع سے ثابت ہے مومن ایمان لائے جیسے مسئلہ قدر و مسئلہ معاد اور اس کی عقل پر ایمان یہاں تک غالب ہو جائے کہ اس کی عقل ایمان سے پر ہو جائے اور پھر اس کی عقل سے اس کے قلب اور نفس پر اس یقین کا ترشح ہوتی کہ وہ یقینی چیز بمنزلہ محسوس اور معائن کے ہو جائے، اور یقین کے ایمان ہونے کی وجہ یہ ہے کہ عقل کے مہذب کرنے میں یقین کو پورا پورا دخل ہے اور تہذیب عقل، قلب اور نفس کی تہذیب کا سبب ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جب قلب پر یقین کا غلبہ ہوتا ہے تو اس سے بہت سی شاخیں پیدا ہوتی ہیں اور وہ شخص ان چیزوں سے خوف نہیں کرتا جن چیزوں سے عادت کے طور پر لوگ ڈرتے ہیں کیونکہ یہ شخص یہ سمجھ لیتا ہے کہ اس کو جو پیش آنے والا ہے وہ اس سے ٹلتا نہیں اور جو پیش آنے والا نہیں ہے

وہ ہرگز پیش نہیں آئے گا اور اس شخص پر دنیا کے مصائب سہل ہو جاتے ہیں کیونکہ جن کا آخرت میں وعدہ کیا گیا ہے اس کو ان چیزوں کے ملنے پر پورا اطمینان ہوتا ہے اور اس کا نفس بہت سے اسباب کو حقیر سمجھتا ہے یہ سمجھ کر کہ عالم میں جو کچھ موثر ہے وہ اس کی قدرت و جو بیہ ہے جو اختیار اور ارادہ سے اثر کرتی ہے اور اس کو اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ یہ اسباب عادیہ ہیں اس واسطے اس کی کوشش ان امور کے حاصل کرنے میں سست ہو جاتی ہے جن کے حاصل کرنے میں لوگ بے حد کوشش کرتے ہیں اور جان لڑا دیتے ہیں پس اس کے نزدیک دنیا کا سونا اور پتھر یکساں معلوم ہوتا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ جب یقین کامل اور پائیدار ہو جاتا ہے اور ہمیشہ رہتا ہے حتی کہ کوئی چیز اس کو نہیں بدل سکتی نہ فقر نہ دولت اور نہ عزت اور نہ ذلت تو اس سے بہت سے شعبے پیدا ہو جاتے ہیں جن میں سے ایک شکر ہے، اور شکر کے معنی یہ ہیں کہ اس کے اوپر جس قدر نعمتیں ہیں خواہ ظاہری ہوں یا باطنی ہوں ان سب کو اپنے اللہ کی طرف سے سمجھے اور ہر نعمت کے مقابل میں ایک محبت اپنے باری کے لئے پیدا کرے اور اس کا شکر ادا کرنے سے اپنے آپ کو قاصر سمجھے پس وہ اس میں مضمحل اور بھٹکتا پھرے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''سب سے پہلے جنت میں حمد کرنے والے بلائے جائیں گے جو نرمی اور سختی میں خدا تعالیٰ کی حمد کرتے ہیں''۔

میں کہتا ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی حمد کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ اس کی عقل اور اس کا قلب اس یقین کے تابع ہے جو اس کو خدا تعالیٰ کے ساتھ ہے اور اس لئے کہ نعمتوں کی معرفت اور منعم حقیقی کی طرف سے ان کا فیضان سمجھنا ان میں ایسی قوت پیدا کرتا ہے جو عالم مثال میں موثر ہوتی ہے جس سے قوائے مثالیہ اور اشکال اخرویہ اثر قبول کرتے ہیں پس نعمتوں کی تفاصیل کو جاننا اور ان کے فیضان کو منعم حقیقی جل مجدہ کی طرف سے سمجھنا جود الٰہی کے دروازہ کو کھٹکھٹانے میں دعائے مستجاب سے کم درجہ نہیں رکھتا اور شکر کامل اس وقت ہوتا ہے جبکہ آدمی کو خدا تعالیٰ کے اس عجیب برتاؤ پر تنبہ ہوتا ہے جو اس کے ساتھ گزشتہ عمر میں کیا گیا ہے جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب وہ اپنے اخیر حج سے واپس ہوئے تو انھوں نے یہ پڑھا ''سب تعریف خدا کے لئے ہے اور خدا تعالیٰ کے سوا کوئی اور معبود نہیں جس کو جو چاہتا ہے عنایت کرتا ہے اس سے پیش تر میں اسی جنگل ضجنان میں اپنے باپ خطاب کے اونٹ چرایا کرتا تھا اور وہ بڑا سنگدل

اور سخت آدمی تھا جب میں کام کرتا تھا تو مجھ کو تھکا دیتا تھا اور جب میں کام میں کوتاہی کرتا تھا تو مجھ کو مارتا تھا، اور میں اب صبح وشام ایسی حالت میں کرتا ہوں کہ میرے اور خدا تعالیٰ کے درمیان کوئی ایسا شخص نہیں جس سے میں ڈرتا ہوں۔

اور از آں جملہ توکل ہے اور اس کے معنی یہ ہیں کہ اس پر یقین کا غلبہ اس قدر ہو کہ اسباب کی طرف سے منافع کے حاصل کرنے اور نقصانات کے دور کرنے میں اس کی کوشش کم ہو لیکن وہ شخص کسب کے ان طریقوں پر چلتا رہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے مقرر کئے ہیں، اور ان اسباب پر اعتماد نہ کرے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''میری امت میں سے ستر ہزار آدمی بغیر حساب کے جنت میں داخل ہوں گے یہ وہ لوگ ہوں گے جو نہ منتر کو مانتے ہیں اور نہ فال کو مانتے ہیں اور نہ داغ لگواتے ہیں اور اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں''۔

میں کہتا ہوں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کے یہ اوصاف اس لئے بیان فرمائے تاکہ معلوم ہو جائے کہ توکل کا اثر ان اسباب کو ترک کرنا ہے جن سے شارع نے ممانعت کی ہے نہ ان اسباب کا ترک کرنا جن کو خدا تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے مقرر فرمایا ہے اور وہ لوگ جنت میں بغیر حساب اس لئے داخل ہوں گے کہ جب ان کے دلوں میں توکل کے معنی ثابت ہو گئے تو اس کے سبب سے ان کے دلوں میں ایسے معنی پیدا ہوئے جس سے ان اعمال کی سبیت جو ان کے نفوس کو ایذا پہنچاتی ہے ان سے دور ہو جاتی ہے اس وجہ سے کہ انھوں نے یقین کر لیا کہ سوائے قدرت وجوبیہ کے عالم میں کوئی موثر نہیں، اور از آں جملہ ہیبت ہے اور اس کے یہ معنی ہیں کہ خدا تعالیٰ کی عظمت جلال کا یقین کرے یہاں تک کہ اس کے سامنے گھبراتا رہے جیسا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا تھا کہ جبکہ ایک پرند کو درخت پر بیٹھا دیکھا تو فرمانے لگے ''خوشنودی ہو تیرے لئے اے پرند! خدا کی قسم میں پسند کرتا ہوں کہ میں تجھ جیسا ہوتا، تو کسی درخت پر بیٹھتا ہے اور اس کے پھل کھاتا ہے اور وہاں سے اڑ جاتا ہے نہ تجھ پر حساب ہے اور نہ عذاب ہے خدا کی قسم میں اس کو پسند کرتا ہوں کہ کسی راستہ پر ایک درخت ہوتا اور کسی اونٹ کا مجھ پر گزر ہوتا اور وہ مجھ کو اپنے منہ میں رکھ لیتا اور چبا کر نگل جاتا پھر مینگنی کر کے پیٹ کے راستہ سے نکال دیتا اور میں بشر نہ ہوتا''۔

اور از اں جملہ حسن ظن ہے اور اس کو صوفیہ کی اصطلاح میں انس کہتے ہیں اور یہ انس خدا

تعالیٰ کے انعامات اور الطاف میں غور کرنے سے پیدا ہوتا ہے جس طرح ہیبت عذاب الٰہی اور اس کی حکومت میں غور کرنے سے پیدا ہوتی ہے اور مومن اگر چہ اپنی نظر اعتقادی کی وجہ سے خوف اور امید دونوں کو دل میں رکھتا ہے لیکن اس کے حال اور مقام کے سبب سے کبھی اس پر ہیبت غالب ہو جاتی ہے اور کبھی حسن ظن غالب ہو جاتا ہے جیسے کوئی شخص بڑے گہرے کنوئیں کے کنارے کھڑا ہو تو اس کے ہاتھ پاؤں کانپنے لگتے ہیں اگر چہ اس کی عقل خوف کی مقتضی نہیں ہے اور جیسے خوشگوار نعمتوں کو نفس کا یاد کرنا انسان کو خوش کرتا ہے اگر چہ اس کی عقل اس کی مقتضی نہیں ہے لیکن ان دونوں حالتوں میں وہم، خوف اور فرحت پیدا کر دیتا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''خدا تعالیٰ کے ساتھ نیک گمان رکھنا حسن عبادت سے ہے'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے نقل کرتے ہوئے فرمایا ''میں اپنے بندہ کے گمان کے موافق پیش آتا ہوں جو اس کو میرے ساتھ ہے''۔

میں کہتا ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ حسن ظن اس کے نفس کو اس قابل بنا دیتا ہے کہ اس کے پیدا کرنے والے کی طرف سے الطاف کا فیضان ہو، اور از اں جملہ تفرید ہے، تفرید کے معنی یہ ہیں کہ اس کے قوائے ادراکیہ پر ذکر کا غلبہ ہو جائے یہاں تک کہ ایسا ہو جائے کہ گویا خدا تعالیٰ کو ظاہر میں دیکھ رہا ہے پس اس کے دل کی باتیں مٹ جائیں اور ان کا اکثر جوش بجھ جائے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''چلو مفردون سبقت کر گئے یہ وہ لوگ ہیں جن کے بوجھ کو ذکر نے دور کر دیا''۔

میں کہتا ہوں جبکہ ذکر کا نور عقلوں کی طرف خالص ہو جاتا ہے اور ان کے نفوس میں جبروت کی طرف مطلع ہونے کا نقش لگ جاتا ہے تو قوت بہیمی دب جاتی ہے اور اس کا شعلہ بجھ جاتا ہے اور اس کا بوجھ دور ہو جاتا ہے، اور از اں جملہ اخلاص ہے اور اس کے یہ معنی ہیں کہ بہ سبب قریب ہونے اس کے نفس کے حق تعالیٰ کے ساتھ اس کی عقل میں عبادت الٰہی کا نفع متمثل ہو جائے جیسا کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے ''بلا شک خدا تعالیٰ کی رحمت محسنین کے قریب ہے'' یا بسبب تصدیق کے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کی زبان پر آخرت کے ثواب کا وعدہ فرمایا ہے، پس ایک نہایت داعیہ کے ساتھ اس سے ایسے اعمال صادر ہوتے ہیں جن میں نہ ریا، وسمعہ کو دخل ہے اور نہ موافقت عادت کو اور یہ حال اس کے جمیع اعمال میں سرایت کر جاتا ہے حتی کہ اعمال مباح عادیہ میں بھی سرایت

کر جاتا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''اور ان کو اسی کا حکم دیا گیا تھا کہ اس کے لئے دین کو خالص کر کے اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اعمال نیت سے ہیں''۔

اور از آں جملہ توحید ہے اور اس کے تین مرتبے ہیں، ایک توحید عبادت ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ شیاطین کی پرستش نہ کرے بلکہ ان کی عبادت کرنے سے ایسی نفرت کرے جیسا کہ وہ آگ میں گرنے سے نفرت کرتا ہے، اور دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ تمام طاقت اور قوت خدا تعالیٰ کی طرف سے سمجھے اور یقین کرے کہ بلا واسطہ سوائے قدرت وجوبیہ کے اور کوئی چیز عالم میں موثر نہیں ہے اور اسباب کو عادی سمجھے اور یہ یقین کرے کہ مسببات ان کی طرف سے مجازاً منسوب ہوتے ہیں اور حکم الٰہی کو مخلوق کے ارادہ پر غالب سمجھے، اور تیسرا مرتبہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کو مخلوق کی مشابہت سے بالکل پاک سمجھے اور اس کے اوصاف کو مخلوق کے اوصاف سے غیر مماثل جانے اور ان باتوں کا سننا اس کے لئے بہ منزلہ مشاہدہ کے ہو اور اس کا قلب خود مطمئن ہو جائے کہ اس کے مثل کوئی شئے نہیں اور اس امر میں شرع کے اخبار کو اپنے رب کی طرف سے دلیل اور سند سمجھے جو اسی کی ذات سے پیدا ہوتے ہیں اور اسی کی ذات سے قائم ہیں، اور از اں جملہ صدیقیت اور محدثیت ہے اور ان دونوں کی حقیقت یہ ہے کہ امت میں سے بعض اشخاص ایسے ہوتے ہیں جن کی اصل فطرت میں انبیا کے ساتھ مشابہت ہوتی ہے جیسے ذہین شاگرد کو کسی محقق استاد کے ساتھ نسبت ہوتی ہے پس اگر اس شخص کے قوائے عقلیہ کے اعتبار سے تشبہ ہو تو وہ صدیق یا محدث ہے اور اگر اس کو قوائے عملیہ کے اعتبار سے مشابہت ہے تو وہ شہید اور حواری ہے اور انہی دونوں گروہوں کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے ''اور جو لوگ خدا تعالیٰ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے وہی صدیقین اور شہداء ہیں'' اور صدیق اور محدث میں یہ فرق ہے کہ صدیق کے نفس میں نبی سے اثر قبول کرنے کی نہایت درجہ صلاحیت ہوتی ہے جیسے گندھک کو آگ کے ساتھ نسبت قریبہ ہے پس وہ شخص جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی خبر سنتا ہے تو اس کے نفس میں اس بات کی نہایت وقعت ہوتی ہے اور اس کو دلی شہادت سے قبول کر لیتا ہے یہاں تک کہ یہ خبر ایک ایسا علم ہو جاتا ہے جو بلا تقلید اس کے دل میں حاصل ہے اور اس معنی کی طرف اشارہ ہے اس حدیث میں جو وارد ہوئی ہے کہ جب حضرت جبرئیل علیہ السلام آپ پر وحی لاتے تھے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ان کی آواز کی گنگناہٹ سنتے

تھے اور صدیق کے دل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت جہاں تک ممکن ہے ضرور پیدا ہوتی ہے جس کی وجہ سے ہر حال میں وہ جان و مال سے سلوک کرتا ہے، یہاں تک کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کے حال سے خبر دیتے ہیں کہ وہ آپ پر اپنی جان و مال سے سب سے زیادہ احسان کرنے والا ہے اور یہاں تک کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کے لئے گواہی دیتے ہیں کہ لوگوں میں اگر خلیل بنانے کے قابل ہے تو وہ صدیق ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نفس کی طرف سے صدیق کے نفس کی طرف انوار وحی کا نزول پے در پے ہوتا ہے پس جس قدر تاثیر اور تاثر اور فعل وانفعال مکرر ہوتا ہے اس کو فنا اور فدا کا رتبہ حاصل ہوتا ہے اور جبکہ اس صدیق کا کمال جو اس کا غایت مقصود ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہنے اور آپ کے کلام کے سننے سے حاصل ہوتا ہے تو وہ شخص آپ کی خدمت میں اور صحابہ کی بہ نسبت زیادہ رہتا ہے، اور صدیق کی علامت یہ ہے کہ وہ سب لوگوں سے زیادہ خواب کی تعبیر دے سکتا ہو کیونکہ اس کی سرشت میں یہ بات داخل ہوتی ہے کہ وہ اوّل سبب سے امور غیبیہ کو حاصل کرتا ہے اور اسی سبب سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اکثر واقعات میں حضرت ابوبکر صدیق سے تعبیر لیا کرتے تھے اور صدیق کی علامات میں سے یہ بھی ہے کہ وہ سب سے پہلے ایمان لانے والا ہو اور بغیر معجزہ دیکھے ایمان لائے اور محدث کے نفس کو علم کے ان بعض خزائن کی طرف بہت جلد رسائی ہو جاتی ہے جو عالم ملکوت میں ہیں پس جس قدر خدا نے مخلوق کے لئے مہیا کیا ہے وہاں سے حاصل کرتا ہے تا کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے شریعت ہو اور تا کہ بنی آدم کے نظام کے لئے اصلاح ہو اگرچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ہنوز وحی نہ نازل ہوئی ہو جیسے کوئی شخص اپنے خواب میں بہت سے وہ امور دیکھتا ہے جن کی ایجاد پر عالم ملکوت میں اجماع ہو چکا ہے۔

اور محدث کے خواص سے یہ بات ہے کہ بہت سے حوادث میں اس کی رائے کے موافق قرآن نازل ہوتا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خواب میں یہ دیکھتے ہیں کہ خود سیر ہونے کے بعد اپنا دودھ اس کو دیا ہے اور صدیق سب لوگوں سے زیادہ خلافت کی صلاحیت رکھتا ہے کیونکہ صدیق کا نفس اس عنایت الٰہی کا اور اس نصرت اور تائید کا جو نبی کے لئے ہوتی ہے آشیانہ ہوتا ہے یہاں تک کہ وہ ایسا ہو جاتا ہے گویا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی روح صدیق کی زبان سے کلام کرتی ہے

چنانچہ حضرت عمرؓ نے لوگوں کو جب ابو بکر صدیقؓ کی بیعت کے لئے بلایا تو یہ کہا کہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہو گیا ہے تو تحقیق اللہ تعالیٰ نے تم میں ایک ایسا نور پیدا کر دیا ہے جس سے تم رہبری حاصل کر سکتے ہو، خدا تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کی اور ابو بکر، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحب اور غار کے رفیق ہیں اور تمہارے امور کے لئے سب سے بہتر ہیں لہٰذا ان سے بیعت کرو، صدیق کے بعد سب سے زیادہ خلافت کے قابل محدث ہوتا ہے اسی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''پیروی کر دان دو شخصوں کی جو میرے بعد ہوں گے ابو بکر اور عمر'' اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''اور جو شخص کہ سچ کو لایا اور اس کی تصدیق کی یہی لوگ ہیں متقی'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''تم میں سے محدث لوگ ہوا کرتے تھے پس میری امت میں اگر کوئی ہے تو عمر ہے''۔

عقل کے ساتھ جو احوال متعلق ہیں ان میں سے ایک تجلی ہے، سہل فرماتے ہیں کہ تجلی کی تین حالتیں ہیں ایک تجلی ذات ہے اور وہ مکاشفہ ہے اور ایک تجلی صفات الذات ہے اور وہ نور کے مواضع ہیں، اور ایک تجلی حکم الذات ہے اور وہ آخرت اور وہاں کی چیزیں ہیں، اور مکاشفہ کے معنی یقین کا غالب ہونا ہے یہاں تک کہ اس کی یہ حالت ہو جائے کہ گویا وہ خدا تعالیٰ کو دیکھتا ہے اور ماسوا سے اس کو غفلت ہو جائے جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ''احسان یہ ہے کہ تو خدا تعالیٰ کی عبادت اس طرح کر گویا کہ تو اس کو دیکھ رہا ہے'' لیکن آنکھوں سے مشاہدہ کرنا آخر میں ہی ہو گا دنیا میں ممکن نہیں ہے اور یہ جو کہا ہے کہ 'صفات الذات کی تجلی' تو اس میں دو احتمال ہے ایک یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے ان افعال میں غور کرے جو مخلوق میں پائے جاتے ہیں اور اس کی صفات کو پیش نظر کرے جس کی وجہ سے قدرت الٰہی کا یقین اس پر غالب ہو جاتا ہے اور اسباب سے غفلت ہو جاتی ہے اور خوف اور تسبب اس سے ساقط ہو جاتا ہے اور اس پر یہ بات غالب ہو جاتی ہے کہ خدا تعالیٰ اس کو جانتا ہے پس یہ شخص نہایت خضوع کی حالت میں مدہوش اور مرعوب رہتا ہے جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اگر یہ تصور نہ ہو کہ تو اس کو دیکھتا ہے تو یہ سمجھ کہ وہ تجھ کو دیکھتا ہے'' اور یہ نور کے مواضع اس معنی کر کے ہیں کہ نفس انوار متعددہ سے منور ہو کر ایک نور سے دوسرے نور کی طرف اور ایک مراقبہ سے دوسرے مراقبہ کی طرف منقلب ہوتا ہے بخلاف تجلی ذات کے کہ وہاں پر نہ تعدد ہے اور نہ تغیر، اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ صفت ذات کا اس طرح خیال کر کے کہ

بلا رابطہ اسباب خارجیہ کے محض امر کن سے ذات واجبی سے تمام افعال اور تمام مخلوقات پیدا ہوتی ہیں اور مواضع نور وہ اشباہ مثالیہ نوریہ ہیں جو عارف کو دنیا سے بہ وقت غیبت حواس دکھائی دیتے ہیں، اور تجلی آخرت کے یہ معنی ہیں کہ دنیا وآخرت میں جزا وسزا کا بصیرت قلبی سے معائنہ کرے اور اس کو اپنے دل میں اس طرح پائے جس طرح بھوکے کو بھوک کی اور پیاسے کو پیاس کی تکلیف کا احساس ہوتا ہے پس اول کی مثال یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ طواف کر رہے تھے کہ ایک شخص نے ان کو سلام کیا تو آپ نے اس کے سلام کا جواب نہیں دیا پس اس شخص نے ان کے بعض اصحاب سے شکایت کی تو حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا ہم اس جگہ خدا تعالیٰ کا معائنہ کر رہے تھے اور یہ حالت ایک قسم کی غیبت اور ایک قسم کی فنا ہے کیونکہ لطائف ثلثہ میں سے ہر لطیفہ کے لئے ایک غیبت اور فنا ہوتی ہے پس عقل کی غیبت اور فنا یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ مشغول ہونے کے سبب سے تمام چیزوں کی معرفت ساقط ہو جائے اور قلب کی غیبت اور فنا یہ ہے کہ نہ غیر سے محبت رہے اور نہ خوف، اور نفس کی غیبت اور فنا یہ ہے کہ شہوات نفسانیہ ساقط ہو جائیں اور لذت حاصل کرنے سے باز رہے، اور دوسرے کی مثال یہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور جلیل القدر صحابہ نے فرمایا ہے طبیب نے مجھ کو مریض کر دیا، اور تیسرے کی مثال یہ ہے کہ انصاری صحابی نے ایک سائبان دیکھا جس میں مشعلوں کی صورتیں تھیں اور وہ جو مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے دو صحابی شب تاریک میں چلے اور ان کے ساتھ دو چراغ سے آگے آگے چلتے تھے پس جب وہ علیحدہ ہوئے تو ہر ایک ساتھ ایک ایک چراغ ہو گیا یہاں تک کہ وہ اپنے گھر تک پہنچ گئے اور وہ جو حدیث میں آیا ہے کہ نجاشی کے قبر کے پاس ایک نور دکھائی دیتا تھا۔

اور چوتھے کی مثال حنظلہ اسیدیؓ کا وہ قول ہے جو انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا تھا کہ آپ ہم کو جنت ونار سے ڈراتے ہیں، حنظلہ ربیع الاسیدیؓ سے مروی ہے انھوں نے کہا کہ ایک دفعہ حضرت ابوبکرؓ مجھ کو ملے انھوں نے فرمایا اے حنظلہ! کیا حال ہے؟ میں نے کہا حنظلہ تو منافق ہو گیا، حضرت ابوبکر نے فرمایا سبحان اللہ تم کیا کہتے ہو، میں نے عرض کیا ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھتے ہیں وہ ہم کو جنت ونار کا حال بیان فرماتے ہیں تو گویا ہم ان کو آنکھوں سے دیکھنے لگتے ہیں، پھر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے چلے جاتے ہیں تو

بیوی، بچوں اور مال واسباب میں مصروف ہو جاتے ہیں اور بہت سی باتیں بھول جاتے ہیں، حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا خدا کی قسم ایسا حال ہمارا بھی ہوتا ہے پس میں اور حضرت ابوبکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف چلے یہاں تک کہ آپ کے پاس پہنچے تب میں نے عرض کیا یا رسول اللہؐ حنظلہ تو منافق ہوگیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ کیا بات ہے؟ میں نے کہا یا رسول اللہ ہم آپ کے پاس ہوتے ہیں اور جنت ونار کا حال آپ ہم کو سناتے ہیں تو گویا ہم اس کو آنکھوں سے دیکھتے ہیں پھر جب آپ کے پاس سے چلے جاتے ہیں تو اہل وعیال اور مال واسباب میں مشغول ہو جاتے ہیں اور بہت سی باتیں بھول جاتے ہیں، تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر تم ہمیشہ اسی حالت پر رہو جو تمہاری میرے پاس ہوتی ہے اور ذکر کرتے وقت ہوتی ہے تو تمہارے بستروں پر اور راستوں میں تم سے فرشتے مصافحہ کیا کریں لیکن اے حنظلہ! یہ بات کبھی کبھی ہوتی ہے آپ نے یہ تین مرتبہ فرمایا، پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کی طرف اشارہ فرمادیا کہ احوال قائم اور دائم نہیں رہتے، اور اس کی ایک مثال وہ بھی ہے جو حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے خواب میں جنت ودوزخ کا معائنہ کیا تھا، اور ازاں جملہ فراست صادقہ اور گمان مطابق واقع ہے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا جب میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کسی بارے میں یہ سنا کہ میرا اس کی نسبت یہ گمان ہے تو وہ بات ان کے گمان کے مطابق ہی ہوتی تھی، اور ازاں جملہ خواب صالح ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سالکین کے خواب کی تعبیر دینے میں اہتمام فرمایا کرتے تھے یہاں تک کہ روایت ہے آپ نماز صبح کے بعد بیٹھ جاتے تھے اور پوچھا کرتے تھے تم میں سے کسی نے خواب دیکھا ہے پس اگر کوئی بیان کرتا تو جو خدا کو منظور ہوتا آپ تعبیر دیتے، اور صالح خواب سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھنا ہے یا جنت ونار کو دیکھنا ہے یا صالحین اور انبیا علیہم السلام کو دیکھنا ہے یا متبرک مقامات کو دیکھنا ہے جیسے خانہ کعبہ یا آئندہ آنے والے حوادث کو دیکھنا ہے کہ جس طرح وہ ان کو دیکھتا ہے اسی طرح وہ واقع ہوتے ہیں یا امور ماضیہ کو اسی طرح دیکھنا جس طرح ان کا وقوع ہوا ہے یا اس چیز کو دیکھنا ہے جو اس کی تقصیر وکوتاہی پر متنبہ کرتی ہے جیسے اپنے غصہ کو کتے کی شکل میں دیکھنا کہ اس کو کاٹتا ہے یا انوار اور اچھے کھانے پینے کو دیکھنا جیسے دودھ اور شہد اور گھی کا پینا یا ملائکہ کو دیکھنا ہے، واللہ اعلم۔

اور ازاں جملہ مناجات کی حلاوت کا پانا اور وساوس نفسانی کا منقطع ہونا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”جس نے دو رکعت نماز اس طرح پڑھی کہ اس کے نفس میں وسوسہ نہ پیدا ہوا تو اس کے سب پہلے گناہ بخشے گئے“ اور ازاں جملہ محاسبہ ہے اور وہ عقل منور ہنوز ایمان اور اس ارادہ کے مابین سے پیدا ہوتا ہے جو قلب کا پہلا مقام ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دانشمند وہ شخص ہے جو اپنے نفس کو مطیع کرے اور موت کے بعد کے لئے عمل کرے“ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے خطبہ میں فرمایا اس سے پہلے کہ تم سے حساب لیا جائے اپنے نفسوں سے حساب لے لو اور پہلے اس سے کہ وزن کیا جائے تم ان کا وزن کر لو اور خدا تعالیٰ کے سامنے جو بڑی پیشی ہونے والی ہے اس کے لئے آراستہ ہو جاؤ جس روز کہ تم پیش کئے جاؤ گے تمہاری کوئی بات اس پر مخفی نہ رہے گی، اور ازاں جملہ حیا ہے اور یہ حیا اس حیا کا غیر ہے جو نفس کے مقامات سے ہے اور خدا تعالیٰ کی عزت وجلال دیکھنے سے مع اس بات کے ملاحظہ کے کہ میں ادائے شکر سے عاجز ہوں اور ادناس بشریہ میں گرفتار ہوں پیدا ہوتی ہے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ میں خدا سے حیا کرنے کی وجہ سے تاریک مکان میں غسل کرتا ہوں اور کپڑا لپیٹ لیتا ہوں، اور جو مقامات قلب سے متعلق ہیں ان میں پہلا مقام جمع ہے اور اس کے معنی یہ ہیں کہ امر آخرت ہی اس کے نزدیک مقصود اور مہتم بالشان ہو اور دنیا کے معاملات اس کی نظر میں ذلیل ہوں ان کا نہ قصد کرتا ہو اور نہ ان کی طرف التفات ہو مگر بجز اس صورت کے کہ جس کے درپے ہے یہ معاملات اس تک ذریعہ ہوں اور جمع اسی مقام کا نام ہے جس کو صوفیہ ارادہ کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”جو شخص اپنی فکر کو ایک فکر کر لے یعنی آخرت کی فکر کرے تو خدا تعالیٰ اس کی فکر کے لئے کافی ہو جاتا ہے اور جس کو مختلف افکار ہوتے ہیں تو خدا تعالیٰ اس کی پرواہ نہیں کرتا کہ کس جنگل میں وہ ہلاک ہوا“۔

میں کہتا ہوں انسان کے ارادہ کو جود الٰہی کے دروازہ کو حرکت دینے میں دعا کی سی خاصیت ہے بلکہ وہ دعا کا مغز اور اس کا خلاصہ ہے پس جب انسان کی ہمت مرضیات حق کے لئے خالص ہو جاتی ہے تو خدا تعالیٰ ہر بات میں اس کے لئے کافی ہو جاتا ہے پس جب اس کی ہمت پختہ ہو جاتی ہے اور وہ ظاہر میں اور باطن میں عبودیت پر مداومت کرتا ہے تو اس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ اس کے دل میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی محبت ہو جاتی ہے اور اس محبت سے صرف اس بات کے

یقین میں ہی زیادتی نہیں ہوتی کہ خدا تعالیٰ مالک الملک ہے اور اس کا رسول سچا ہے اور وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے مخلوق کی طرف مبعوث ہے بلکہ وہ محبت ایسی حالت ہے جیسے پیاسے کو پانی کے ساتھ اور بھوکے کو کھانے کے ساتھ ایک نسبت ہوتی ہے اور یہ محبت ذکر الٰہی سے عقل کے پر ہونے سے اور اس کے جلال میں فکر کرنے سے اور عقل سے قلب کی طرف نور ایمان کے مترشح ہونے سے اور قلب کے اس نور کو بذریعہ اس قوت کے جو قلب کے اندر پیدا کی گئی ہے قبول کرنے سے پیدا ہوتی ہے چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس شخص کے اندر یہ تین خصلتیں ہوتی ہیں وہ ایمان کی لذت پاتا ہے وہ شخص جس کو خدا اور اس کا رسول سب سے زیادہ پیارا ہو'' الحدیث، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعا میں کہا تھا ''اے اللہ تعالیٰ تو اپنی محبت کو میرے دل میں میری جان اور سمع اور بصر اور میرے مال اور میرے اہل اور سرد پانی سے زیادہ عزیز کر دے'' اور آپ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا ''جب تک میں تجھ کو تیری جان سے زیادہ محبوب نہ ہوں تو مومن نہیں ہے، حضرت عمرؓ نے عرض کیا قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ پر کتاب نازل کی آپ میری اس جان سے زیادہ عزیز ہیں جو میری دونوں پہلوؤں میں ہے، تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے عمر! اب تمہارا ایمان کامل ہوا'' اور حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے ''تم میں سے کوئی شخص ایمان والا نہیں ہوسکتا جب تک کہ میں اس کو اس کی اولاد اور اس کے باپ اور سب لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہوں''۔

میں کہتا ہوں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کی طرف اشارہ فرمایا کہ محبت کی حقیقت لذت یقین کا عقل پر اور پھر قلب اور نفس پر غالب ہونے کا نام ہے یہاں تک کہ وہ قلب کی ان خواہشوں کے قائم مقام ہو جاتی ہے جو قلب کو عادۃ مرغوب ہوتی ہیں جیسے اولاد اور بیوی اور مال کی محبت اور یہاں تک کہ وہ نفس کی خواہشات کے قائم مقام ہو جاتی ہے جیسے پیاسے کو پانی کی خواہش، پس جب ایسی حالت ہو جاتی ہے تو یہ وہ محبت خاص ہوتی ہے جو مقامات قلب سے شمار کی جاتی ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو شخص خدا تعالیٰ سے ملنا چاہتا ہے تو خدا تعالیٰ اس سے ملنا چاہتا ہے''۔

میں کہتا ہوں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی طرف مومن کے میلان کو اور حجاب بدنی سے تجرد کے مقام کی طرف اس کے اشتیاق کو اور طبیعت کی قید سے فضائل قدس کی طرف رہائی کے

طالب ہونے کو جہاں وہ ایسی چیزوں سے متصل ہوتا ہے جو بیان میں نہیں آسکتیں اپنے رب کے ساتھ صدق اور محبت کی علامت گردانا ہے، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ خالص محبت کا مزہ چکھ لیتا ہے تو وہ محبت طلب دنیا سے اس کو روکتی ہے اور تمام لوگوں سے اس کو نفرت دلاتی ہے۔

میں کہتا ہوں حضرت ابوبکرؓ کا یہ قول آثار محبت کا نہایت درجہ بیان ہے پس جب مومن کو اپنے رب سے پوری محبت ہو جاتی ہے تو خدا تعالیٰ کو اس سے محبت ہو جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی محبت جو بندہ سے ہوتی ہے اس کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ اللہ تعالیٰ بندہ سے متاثر ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس سے بہت بلند و بالا ہے بلکہ اس محبت کی حقیقت اللہ تعالیٰ کا اس بندہ کے ساتھ وہ برتاؤ کرنا ہے جس کی وہ قابلیت رکھتا ہے پس جس طرح آفتاب کی تاثیر یہ ہے کہ وہ شفاف جسم کو بہ نسبت اور اجسام کے زیادہ گرم کرتا ہے حالانکہ آفتاب کا فعل حرارت برابر ہے لیکن اجسام کی استعداد کے مختلف ہونے کی وجہ سے اس کا فعل بھی مختلف ہو جاتا ہے اسی طرح خدا تعالیٰ کو اپنے بندوں پر ان کے افعال اور صفات کی وجہ سے ایک عنایت اور توجہ ہے پس جو شخص ان صفات رذیلہ سے متصف ہے جن سے انسان بہائم میں داخل ہو جاتا ہے تو آفتاب احدیت کی روشنی اس کی استعداد کے مناسب اس میں عمل کرتی ہے اور جو شخص ان صفات حمیدہ سے موصوف ہے جو انسان کو ملاء اعلیٰ میں داخل کر دیتے ہیں تو آفتاب احدیت کی روشنی اس میں وہ نور اور ضیا پیدا کر دیتی ہے جس سے وہ منجملہ جواہر حظیرۃ القدس کے ایک جوہر ہو جاتا ہے اور اس پر ملاء اعلیٰ کے احکام جاری ہوتے ہیں پس اس وقت کہا جاتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے اس سے محبت کی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس سے وہ برتاؤ کیا جو محب اپنے حبیب سے کرتا ہے اور اس وقت اس بندہ کو ولی کہا جاتا ہے۔ پھر خدا تعالیٰ کی محبت اس بندہ میں چند حالات پیدا کرتی ہے جن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خوب بیان فرمایا ہے۔ ازاں جملہ یہ ہے کہ وہ شخص ملاء اعلیٰ میں پھر زمین میں مقبول ہو جاتا ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جب اللہ تعالیٰ کسی بندہ سے محبت کرتا ہے تو جبرئیل علیہ السلام کو ندا فرماتا ہے کہ میں فلاں بندہ کو دوست رکھتا ہوں تم بھی اس کو دوست رکھو پھر جبرئیلؑ بھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں پھر تمام آسمانوں پر جبرئیل ندا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فلاں شخص کو دوست رکھتا ہے پس تم بھی اس کو دوست رکھو پس تمام آسمان

والے اس کو دوست رکھتے ہیں پھر اس کی قبولیت زمین میں ہو جاتی ہے''۔

میں کہتا ہوں جب عنایت الٰہی اس بندہ کی طرف متوجہ ہوتی ہے تو ملاء اعلیٰ کی طرف اس کی محبت منعکس ہوتی ہے جس طرح آفتاب کی شعاعیں شفاف آئینوں میں منعکس ہوتی ہیں پھر ملاء سافل کو اس کی محبت کا الہام ہوتا ہے پھر زمین والوں میں سے جس میں اس بات کی قابلیت ہوتی ہے اس کے دل میں اس کی محبت کا القا ہوتا ہے جس طرح نرم زمین پانی کے حوض سے تری کو چوستی ہے اور ازاں جملہ اس کے دشمنوں کا رسوا ہونا ہے چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے نقل کرتے ہوئے فرمایا ''جس نے میرے ولی سے عداوت کی پس میں اس کو اعلان جنگ کر دیتا ہوں''۔

میں کہتا ہوں جب بندہ کی محبت عالم بالا کے نفوس میں جو بمنزلہ آئینوں کے ہیں منعکس ہوتی ہے پھر اہل زمین میں سے کوئی شخص اس کی مخالفت کرتا ہے تو ملاء اعلیٰ اس مخالفت کو محسوس کر لیتے ہیں جس طرح ہم میں سے کوئی شخص اس انگارے کی حرارت محسوس کر لیتا ہے جبکہ اس کا قدم اس پر پڑ جاتا ہے پس ان کے نفوس سے ایک شعاع از قبیل نصرت و عداوت نکل کر اس مخالف کو گھیر لیتی ہے اس وقت میں وہ شخص ذلیل و خوار ہو جاتا ہے اور زندگی اس پر تنگ ہو جاتی ہے اور ملاء سافل اور اہل زمین کے دلوں میں اس بات کا القا ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ بری طرح پیش آئیں پس اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی لڑائی کے یہی معنی ہیں۔ اور ازاں جملہ یہ ہے کہ اس شخص کی دعا قبول کی جاتی ہے اور جس سے وہ پناہ مانگتا ہے اس سے اس کو پناہ دی جاتی ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے نقل کرتے ہوئے فرمایا ''اگر میرا بندہ مجھ سے مانگتا ہے تو میں اس کو ضرور دیتا ہوں اور اگر پناہ مانگتا ہے تو میں اس کو ضرور پناہ دیتا ہوں''۔

میں کہتا ہوں کہ اس کی وجہ اس شخص کا حظیرۃ القدس میں داخل ہو جانا ہے جہاں سے حوادث کا حکم دیا جاتا ہے پس اس شخص کی دعا اور پناہ کی درخواست حظیرۃ القدس کی طرف چڑھتی ہے اور قضاء الٰہی کے نازل ہونے کا سبب ہوتی ہے، صحابہ کے آثار میں استجابت دعا کے باب میں بہت کچھ منقول ہے ازاں جملہ یہ ہے کہ ایک دفعہ حضرت سعدؓ نے ابو سعدہ پر یہ بددعا کی اے اللہ تعالیٰ اگر تیرا یہ بندہ جھوٹا ہے، ریا اور سمعہ کے لئے کھڑا ہوا ہے تو اس کی عمر دراز کر اور اس کی غربت کو زیادہ کر اور اس پر فتنے ڈال دے، پس جیسا انھوں نے فرمایا تھا ویسا ہی ہوا، اور ایک دفعہ حضرت

سعید نے اروی بنت اوس پر یہ بد دعا کی کہ اے اللہ تعالیٰ اگر یہ جھوٹی ہے تو اس کی آنکھیں اندھی کر دے اور اسی کی زمین میں اس کو موت دے، پس جیسا انھوں نے کہا تھا ویسا ہی ہوا اور از ان جملہ نفس سے فانی ہونا اور حق کے ساتھ رہنا ہے اور اسی کو صوفیہ غلبہ وجود حق پر وجود عبد کہتے ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ سے نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں ''میرا بندہ نوافل کے ذریعہ میرا تقرب حاصل کرتا جاتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں پس جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو میں اس کی وہ شنوائی ہو جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی وہ بینائی ہو جاتا ہے جس سے وہ دیکھتا ہے اور وہ ہاتھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے''۔

میں کہتا ہوں جب بندہ کو بہ سبب اس کی قوت عملیہ کے جو اس کے بدن میں ہے نور الٰہی ڈھانک لیتا ہے تو اس نور کا ایک شعبہ اس تمام قوی میں داخل ہو جاتا ہے پھر ان قوی میں ایسی برکات پیدا ہو جاتی ہے جو عادۃً نہیں ہوتیں ایسے وقت میں وہ فعل ایک خاص نسبت کے ساتھ خدا تعالیٰ کی طرف منسوب ہوتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''پس تم نے ان کو قتل نہیں کیا لیکن خدا تعالیٰ نے ان کو قتل کیا اور تو نے جب پھینکا تو وہ تو نے نہیں پھینکا لیکن اللہ تعالیٰ نے پھینکا، اور از ان جملہ یہ بات ہے کہ بعض آداب کے ترک پر مواخذہ کر کے اور ادب کی طرف بندہ کے رجوع کو قبول فرما کر اس کو متنبہ کر دیتا ہے جیسا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو پیش آیا جبکہ انھوں نے اپنے مہمانوں کو ناخوش کر دیا پھر ان کو معلوم ہوا کہ یہ فعل شیطان کی طرف سے ہے تب انھوں نے امر معروف کی طرف رجوع کیا پس ان کے کھانے میں برکت دی گئی۔

اور منجملہ مقامات قلب کے دو مقام اور ہیں یہ مقام ان نفوس کے ساتھ خاص ہوتے ہیں جو انبیا علیہم السلام کے ساتھ مشابہ ہوتے ہیں ان دونوں مقاموں کا عکس ان نفوس پر اس طرح پڑتا ہے جس طرح آفتاب کا عکس کسی آئینہ پر پڑتا ہے جو ایک کھلے ہوئے طاق میں رکھا ہوا ہے اور پھر اس آئینہ کا عکس دیواروں پر، چھت پر اور زمین پر پڑتا ہے اور یہ دو مقام بھی بہ منزلہ صدیقیت اور محدثیت کے ہیں مگر اتنا فرق ہے کہ صدیقیت اور محدثیت کا محل ان کے نفوس کی قوت عقلیہ ہوتی ہے اور ان کا محل قوت عملیہ ہوتی ہے جو قلب سے پیدا ہوتی ہے اور وہ دونوں شہید اور حواری کے مقام ہیں اور دونوں میں فرق یہ ہے کہ شہید کا نفس غصہ اور کفار پر شدت اور دین الٰہی کی مدد کو منکوت

کے مقامات میں سے کسی مقام سے قبول کر لینا ہے جس میں خدا تعالیٰ نے نافرمانوں سے انتقام لینے کا ارادہ کر رکھا ہے اور وہاں سے رسول پر اس ارادہ کا نزول ہوتا ہے تاکہ وہ رسول اس انتقام میں خدا تعالیٰ کے اسباب میں سے ایک سبب ہو پس ان لوگوں کے نفوس ایسے مقام سے اس ارادہ کو قبول کر لیتے ہیں جیسا کہ محدثیت میں ہم نے ذکر کیا ہے، اور حواری وہ شخص ہے جس کو رسول سے خالص محبت ہو اور مدت دراز تک رسول کی صحبت میں رہا ہو یا رسول کے ساتھ اس کی قرابت قریبہ ہو پس خدا تعالیٰ نبی کے دل سے اس کے دل پر نصرت دین کا انعکاس کرتا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "اے ایمان والو خدا کے مددگار ہو جاؤ جس طرح عیسیٰ بن مریمؑ نے حواریوں سے کہا اللہ تعالیٰ کی طرف میرے مددگار کون ہیں، حواری بولے ہم خدا کے مددگار ہیں پس ایک گروہ ایمان لایا" الآیہ، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو حواری ہونے کی بشارت دی ہے، اور شہید اور حواری کی چند قسمیں اور شعبے ہیں ایک ان میں سے امین ہے اور ایک رفیق ہے اور ایک نجیب ہے اور نیک نقیب ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کے فضائل میں ان امور میں سے بہت کچھ ذکر فرمایا ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "ہر نبی کے لئے سات نجیب اور رقیب ہوئے ہیں اور مجھ کو چودہ دیئے گئے ہیں ہم نے عرض کیا وہ کون ہیں تو حضرت علی نے فرمایا میں اور میرے دو بیٹے اور جعفر اور حمزہ اور ابو بکر اور عمر اور مصعب بن عمیر اور بلال اور سلمان اور عمار اور عبداللہ بن مسعود اور ابوذر اور مقداد (رضی اللہ عنہم" اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "تاکہ رسول تم لوگوں پر گواہ ہو" اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اے اُحد ٹھیر جا کیونکہ تیرے اوپر ایک نبی یا صدیق یا شہید ہے"۔

اور من جملہ احوال قلب کے ایک سکر ہے اور وہ یہ ہے کہ نور ایمان عقل میں پھر قلب میں متشکل ہو جائے، حتی کہ وہ کاروبار دنیا سے جاتا رہے اور ان چیزوں کو پسند کرنے لگے جن کو انسان مجرائے طبیعت کے اعتبار سے ناپسند کرتا ہے پس وہ شخص اس شخص کے مشابہ ہوتا ہے جو نشہ کی حالت میں عقل و عادت کے طریقوں سے بدلا ہوا ہوتا ہے۔ جیسا کہ حضرت ابوالدرداءؓ نے کہا تھا کہ میں موت کو خدا تعالیٰ کے شوق ملاقات کی وجہ سے محبوب رکھتا ہوں اور مرض کو اس لئے محبوب رکھتا ہوں کہ میرے گناہوں کا کفارہ ہو جائے اور مفلسی کو اس لئے پسند کرتا ہوں کہ اس سے خدا

تعالیٰ کے سامنے انکساری ہوتی ہے اور حضرت ابوذرؓ کی نسبت مروی ہے کہ وہ اپنی طبیعت سے مال اور ثروت اور دولت کو ایسا ناپسند اور مکروہ جانتے تھے جس طرح کسی کو ناپاک چیزوں سے نفرت ہوتی ہے اور بشر کی طبیعت میں یہ بات نہیں ہے کہ ایسی چیزوں کو پسند کرے، اور ایسی چیزوں سے نفرت کرے لیکن ان دونوں اصحاب پر یقین اس درجہ غالب آ گیا تھا جس نے ان کو مجرائے عادت سے باہر کر دیا تھا۔

اور من جملہ احوال قلب کے ایک غلبہ ہے اور اس کی دو قسمیں ہیں ایک غلبہ داعیہ ہے جو قلب مومن میں اس وقت پیدا ہوتا ہے جب اس میں نور ایمان مخلوط ہوتا ہے اور اس سے وہ جھاگ سے اٹھتے ہیں جو اس نور اور جبلت قلبی کے ملنے سے پیدا ہوتے ہیں پس یہ ایک ایسا داعیہ اور قصد ہو جاتے ہیں جن کے مقتضی سے انسان رک نہیں سکتا خواہ یہ دعا مقصود شرع کے موافق ہو یا نہ ہو اور اس کی وجہ یہ ہے کہ شرع بہت سے ایسے مقاصد کو محیط ہے جن کو قلب مومن محیط نہیں۔ پس کبھی اس کا قلب رحم پر مجبور ہوتا ہے۔ حالانکہ بعض مواضع میں شرع سے رحم ممنوع ہوتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''اور تم کو نہ پکڑے ان دونوں کے ساتھ خدا تعالیٰ کے دین میں نرمی'' اور بسا اوقات اس کا دل بغض پر مجبور ہوتا ہے۔ حالانکہ شرع کو وہاں مہربانی کرنا مقصود ہوتی ہے جیسا کہ کفار اہل ذمہ پر۔ اور اس غلبہ کی مثال وہ ہے جو حدیث میں ابولبابہ بن منذرؓ سے وارد ہے کہ جب سعد بن معاذؓ کے حکم سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی قریظہ کو اتارنا چاہا تو بنو قریظہ نے ابولبابہؓ سے مشورہ کیا۔ ابولبابہؓ نے اپنے ہاتھ سے حلقوم پر اشارہ کیا جس سے ذبح ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ پھر وہ اس بات سے نادم ہونے اور ان کو یقین ہو گیا کہ میں نے خدا تعالیٰ اور اس کے رسول کی خیانت کی ہے۔ پھر وہ اسی حال میں چلے حتیٰ کہ انھوں نے اپنے آپ کو مسجد نبوی کے ایک ستون سے باندھ دیا۔ اور یہ کہا کہ میں اپنی اس جگہ سے اس وقت تک نہ ہٹوں گا جب تک خدا تعالیٰ اس کے بارے میں میری توبہ قبول نہ کرے گا۔ اور حضرت عمرؓ سے مروی ہے کہ ان پر حمیت اسلام اتنی غالب آئی کہ جبکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کے سال مشرکین سے مصالحت کرنی چاہی تو اس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض کر بیٹھے اور بگھر پڑے، یہاں تک کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس تشریف لا کر کہنے لگے، کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے رسول نہیں ہیں انھوں نے فرمایا ہاں

ہیں، پھر حضرت عمرؓ نے کہا کہ کیا ہم مسلمان نہیں ہیں انھوں نے فرمایا ہاں ہیں، پھر انھوں نے کہا کہ کیا وہ مشرک نہیں ہیں انھوں نے فرمایا، ہاں۔ انھوں نے کہا۔ پس کس واسطے ہم اپنے دین میں ذلت اختیار کریں۔ تب ابوبکرؓ نے فرمایا۔ اے عمر! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمانبرداری اپنے اوپر لازم پکڑ میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ اللہ کے رسول ہیں۔ پھر حضرت عمرؓ پر وہ حالت غالب رہی یہاں تک کہ رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہو کر وہی عرض کیا جو حضرت ابوبکر صدیقؓ سے عرض کیا تھا۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ کو وہی جواب دیا جو حضرت ابوبکرؓ نے دیا تھا۔ یہاں تک کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہنا پڑا کہ میں اللہ تعالیٰ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔ میں اس کے حکم کی کبھی مخالفت نہیں کروں گا۔ اور وہ مجھ کو ہرگز ضائع نہیں کرے گا۔

راوی کہتا ہے کہ حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے کہ میں اس روز کے کلام اور جوش سے ڈر کر ہمیشہ اس کے کفارہ میں روزے رکھتا رہا، صدقہ کرتا رہا آزاد کرتا رہا اور نماز پڑھتا رہا حتی کہ مجھے خیر کی امید ہوئی۔ اور ابوطیبہ جراحؓ سے مروی ہے کہ جب انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پچھنے لگائے تو آپ کا خون مبارک انھوں نے پی لیا۔ حالانکہ شرعاً خون کا پینا ممنوع ہے لیکن ان سے یہ غلبہ کی حالت میں ہوگا۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انکا رعذر قبول فرمایا اور ارشاد فرمایا تو نے آگ سے بہت بچاؤ اور روک کر لیا اور ایک غلبہ اور ہے جو اس غلبہ سے زیادہ جلیل القدر اور زیادہ کامل ہے اور وہ خواہش الٰہی کا غلبہ ہے جو مومن کے قلب پر نازل ہوتی ہے۔ پس اس کے مقتضی سے اپنے آپ کو روکنا ممکن نہیں ہے اور اس غلبہ کی حقیقت بعض مقامات قدسیہ سے اس کی قوت عملیہ پر علم الٰہی کا فیضان ہوتا ہے۔ نہ قوت عقلیہ پر اس کی تفصیل یہ ہے کہ جو نفس انبیا علیہم السلام کے نفوس سے مشابہت رکھتا ہے جب اس میں علم الٰہی کے فیضان کی استعداد ہوتی ہے تو اگر اس کی قوت عقلیہ کو قوت عملیہ پر سبقت ہوتی ہے تو وہ علم جو اس پر فائض ہوتا ہے فراست اور الہام ہوتا ہے۔ اور اگر اس کی قوت عملیہ کی قوت عقلیہ پر سبقت ہوتی ہے تو وہ علم جو اس پر فائض ہوتا ہے تو وہ علم ارادہ واقبال یا نفرت ہوتا ہے۔ اس کی مثال وہ ہے جو بدر کے قصہ میں مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا میں نہایت مبالغہ کیا یہاں تک کہ یہ کہا ''اے اللہ! میں تجھ کو تیرا عہد اور وعدہ یاد دلاتا ہوں الٰہی: اگر تو چاہے تو تیری عبادت نہ کی جائے'' تب ابوبکرؓ نے آپ کا ہاتھ تھام کر یہ کہا کہ بس

کیجئے یارسول اللہ! پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ آیت پڑھتے ہوئے خیمہ سے باہر نکلے عنقریب کفار کی جماعت کو شکست دیدی جائے گی اور وہ پیٹھ پھر دیں گے'' اس کے معنی یہ ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دل میں خدا کی طرف سے خواہش پیدا ہوئی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو الحاح سے روکیں اور اس سے باز رہنے کی رغبت دلائیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی فراست سے اس بات کو معلوم کر لیا کہ یہ خواہش خدا کی ہے، تب خدا تعالیٰ کی مدد سے فتح کے طالب ہو کر اس آیت کو پڑھتے ہوئے باہر نکلے۔ اور اس کی مثال وہ بھی ہے جو عبداللہ بن ابی کی موت کے بارے میں مروی ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جنازہ کی نماز پڑھنے کا ارادہ کیا۔ تو حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں لوٹ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا اور عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ اس کی نماز پڑھتے ہیں حالانکہ اس نے اس دن ایسا کہا تھا اور اس دن ایسا کہا تھا حتی کہ آپ نے فرمایا۔ اے عمر! میرے پاس سے ہٹ جاؤ مجھے اختیار دیا گیا ہے۔ پس میں نے اس بات کو اختیار کر لیا۔ اور آپ نے اس کی نماز پڑھی اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی'' ان میں سے کوئی مر جائے تو کبھی اس کی نماز نہ پڑھ'' حضرت عمرؓ کہتے ہیں مجھے اپنے اوپر اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اتنی جرأت کرنے سے تعجب ہوتا ہے۔ حالانکہ رسول اللہؐ سب سے زیادہ واقف تھے اور حضرت عمرؓ نے ان دونوں غلبوں کے درمیان فرق کو خوب اچھی طرح سے بیان کر دیا ہے پس غلبۂ اولی میں فرمایا پس میں روزے رکھتا رہا، صدقہ دیتا رہا، اور آزاد کرتا رہا الخ اور غلبہ ثانیہ میں فرمایا کہ مجھے اپنے حال اور اپنی جرأت پر تعجب ہوا۔ پس ان دونوں کلمات میں جو فرق ہے اس کو دیکھنا چاہئے۔ اور از اں جملہ خدا تعالیٰ کی طاعت کا ماسوا پر اختیار کرنا اور اس کے موانع کا دور کرنا اور جو چیزیں اس کو طاعت الٰہی سے روکتی ہیں ان سے بیزار ہونا ہے جیسا کہ ابوطلحہ انصاریؓ اپنے باغ میں نماز پڑھ رہے تھے کہ اچانک ایک جنگلی کبوتر اڑا اور باغ میں ادھر ادھر اس نے اڑنا شروع کیا۔ اور درختوں کی ٹہنیاں اور پتے گنجان ہونے کی وجہ سے اس کو باہر جانے کا راستہ نہیں ملتا تھا یہ بات ان کو بہت بھلی معلوم ہوئی اور اس خیال میں ان کو رکعتوں کی تعداد یاد نہیں رہی تو انھوں نے اس باغ کو صدقہ کر دیا۔

اور از اں جملہ غلبہ خوف ہے جس کے سبب سے آدمی کو رونا آئے اور اس کا بدن کانپنے لگے،

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب رات میں نماز پڑھتے تھے تو آپ کے سینہ سے بہ سبب گریہ کے ہانڈی کے جوش کی طرح آواز محسوس ہوتی تھی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سات اشخاص کے بارے میں فرمایا جن کو خدا تعالیٰ اس روز اپنے سایہ میں رکھے گا جس روز اس کے سایہ کے سوا کوئی اور سایہ نہ ہوگا'' اور وہ شخص جس نے اللہ تعالیٰ کو تنہائی میں یاد کیا اور اس کی آنکھیں بھر آئیں'' اور آپ نے فرمایا'' جو شخص خوف الٰہی سے رویا ہے وہ آگ میں نہیں جائے گا جب تک کہ دودھ پستان میں لوٹ کر نہ آئے'' اور حضرت ابوبکر صدیقؓ بہت رونے والے شخص تھے قرآن شریف پڑھتے تھے ان کی آنکھیں ان کے اختیار میں نہیں رہتی تھیں، جبیر بن مطعم کہتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ آیت پڑھتے سنا'' **ام خلقوا من غير شئ ام هو الخالقون** ''اس کے سنتے ہی میرا دل ڈر گیا۔

اور وہ مقامات جو نفس کو نور ایمان کے اس پر غالب ہونے اور اس کے صفات خسیسہ کو صفات فاضلہ کے بدلنے کے اعتبار سے حاصل ہوتے ہیں ان میں سے پہلا مقام یہ ہے کہ نور ایمان اس عقل سے جو عقائد حقہ سے منور ہے نازل ہو کر قلب پر آئے اور جبلت قلبی کے ساتھ اتصال پیدا کرے تب ان سے ایک زاجر پیدا ہو جو نفس کو مغلوب کرے اور اس کو مخالفات سے روکے پھر ان سے ایک ندامت پیدا ہو جو نفس کو مقہور کرے اور اس کو اپنے قابو میں کرے اور اس کی باگیں پکڑے، پھر ان سے زمانہ آئندہ میں گناہ ترک کرنے کا عزم پیدا ہوا اور وہ نفس پر غالب ہو کر شرع کے اوامر ونواہی سے اس کو مطمئن کر دے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے'' اور لیکن جس شخص نے اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف کیا اور نفس کو خواہش سے روکا پس بلاشبہ اس کا ٹھکانا جنت میں ہوگیا''۔

میں کہتا ہوں اللہ تعالیٰ کا یہ قول'' من خاف'' عقل کے نور ایمان کے ساتھ منور ہونے کا اور اس سے قلب کی طرف اس نور کے نازل ہونے کا بیان ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ خوف کے لئے ایک ابتداء ہے اور ایک انتہا ہے پس اس کی ابتدا خدا تعالیٰ کا خوف اور اس کے غلبہ کا معلوم کرنا ہے اور اس کا محل عقل ہے اور اس کی انتہا پریشانی اور اضطراب اور دہشت ہے اور اس کا محل قلب ہے اور اللہ تعالیٰ کا قول'' **ونهى النفس** '' اس بات کا بیان ہے کہ یہ نور جو قوت قلب سے مخلوط ہے نفس

کی طرف نازل ہوتا ہے اور اس پر غالب ہوتا ہے اور اس کو روکتا ہے پھر یہ نفس اس کا فرمانبردار اور مطیع ہو جاتا ہے پھر عقل سے نور ایمان دوسری مرتبہ قلب کی طرف نازل ہوتا ہے اور جبلت قلبی کے ساتھ اتصال پیدا کرتا ہے پھر ان دونوں سے خدا تعالیٰ کی طرف التجا پیدا ہوتی ہے اور وہ استغفار اور توجہ کا سبب بنتی ہے اور استغفار سے دل کے زنگ کی صفائی ہوتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''مومن جب گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر سیاہ نقطہ ہو جاتا ہے پس اگر وہ توبہ اور استغفار کرتا ہے تو اس کا دل صاف ہو جاتا ہے اور اگر وہ اور گناہ کرتا ہے تو وہ سیاہی زیادہ ہو جاتی ہے یہاں تک کہ تمام دل پر غالب آ جاتی ہے پس یہ وہ میل ہے جس کا اللہ تعالیٰ اس میں ذکر فرماتا ہے ''کلا بل ران علی قلوبهم ما كانوا يكسبون ''(ان کے دلوں پر ان کے اعمال بد کا زنگ چڑھ گیا ہے۔

میں کہتا ہوں پس سیاہ نقطہ بہیمیت کی ظلمتوں میں سے ایک ظلمت کا ظاہر ہونا اور انوار ملکیہ میں سے ایک نور کا پوشیدہ ہونا ہے اور اس نقطہ کا صاف ہونا ایک روشنی ہے جو نور ایمانی سے نفس پر فائز ہوتی ہے اور اس میل سے مراد بہیمیت کا غالب ہونا اور ملکیت کا بالکل پوشیدہ ہو جانا ہے پھر نور ایمانی کا بار بار نزول ہوتا ہے اور خواہشات نفسانی بار بار دفع ہوتے رہے ہیں پس جب نفس میں کسی گناہ کا وسوسہ پیدا ہوتا ہے تو اس کے مقابلے میں نور نازل ہو کر اس باطل کو مٹا دیتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے ایک مثال بیان فرمائی کہ ایک سیدھا راستہ ہے اور اس راستہ کے دونوں جانب دو دیواریں ہیں جن میں کھلے ہوئے دروازے ہیں اور ان دروازوں پر پردہ لٹکے ہوئے ہیں اور اس راستہ کے سرے پر ایک پکارنے والا یہ کہہ رہا ہے ''راستہ پر سیدھے چلے چلو ادھر اُدھر نہ پھرو اور اس پکارنے والے کے اوپر ایک اور پکارنے والا ہے کہ جب کوئی بندہ ان دروازوں میں سے کسی دروازہ کو کھولنے کا قصد کرتا ہے تو وہ پکار کر کہتا ہے تجھ پر افسوس ہے تو اس دروازہ کو مت کھول اگر تو اس کو کھولے گا تو اس میں جا پڑے گا، پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مثال کی تفسیر بیان کی اور بتلایا کہ وہ راستہ اسلام ہے اور وہ کھلے ہوئے دروازے اللہ تعالیٰ کے محارم ہیں اور وہ پڑے ہوئے پردے اللہ تعالیٰ کی حدود ہیں اور راستہ کے سرے پر پکارنے والا قرآن کریم ہے اور اس کے آگے جو اور پکارنے والا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف کا واعظ ہے جو ہر مومن

کے دل میں موجود ہے۔

میں کہتا ہوں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا کہ یہاں دو پکارنے والے ہیں ایک تو راستہ کے سرے پر پکارنے والا ہے اور وہ قرآن اور شریعت ہے جو ہمیشہ ایک طرز پر بندہ کو راہ راست کی طرف پکارتے ہیں اور ایک پکارنے والا چلنے والے کے سر پر ہے جو ہر وقت اس کی نگہبانی کرتا ہے جب وہ کسی گناہ کا قصد کرتا ہے تو وہ پکارنے والا اس پر چیختا ہے اور وہ خاطر ہے جو قلب سے اٹھتا ہے اور جبلت قلب اور اس نور سے پیدا ہوتا ہے جو عقل منور بنور قرآنی کی جانب سے قلب پر فائض ہوتا ہے اور اس کا حال اس پتنگے کا سا ہے جو بار بار کسی پتھر سے چمکتا ہے اور کبھی کبھی خدا تعالیٰ کی طرف سے بعض بندوں پر یہ مہربانی ہوتی ہے کہ وہ لطیفہ غیبی پیدا کر دیتا ہے جو اس شخص کے اور اس کے گناہ کے درمیان حائل ہو جاتا ہے اور یہ وہ برہان ہے جس کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے "اور البتہ اس عورت نے یوسفؑ کا قصد کیا اور یوسفؑ اس عورت کا قصد کرتے اگر اپنے رب کی برہان نہ دیکھتے" اور یہ سب مقام توبہ ہے اور جب مقام توبہ کامل ہو جاتا ہے اور نفس کے اندر وہ ایک ملکہ راسخ ہو جاتا ہے تو اس سے خدا تعالیٰ کی عظمت پیش نظر رکھنے کے وقت ایسا اضمحلال پیدا ہوتا ہے جس کو کوئی تبدیل کرنے والی چیز بدل نہیں سکتی اور اس کا نام حیا ہے اور لغت میں حیا کے معنی نفس کا ان چیزوں سے باز رہنا ہے جن کو لوگ عادۃً معیوب سمجھتے ہیں پس شریعت نے لغت سے نقل کر کے حیا اس ملکہ کا نام رکھا ہے جو نفس کے اندر راسخ ہوتا ہے جس کی وجہ سے انسان خدا تعالیٰ کے سامنے اس طرح گھلتا ہے جس طرح نمک پانی میں گھلتا ہے اور اس کی وجہ سے انسان ان خواطر کا پابند نہیں ہوتا جو مخالف شرع چیزوں کی طرف مائل ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "حیا جزء ایمان ہے" پھر حیا کی تفسیر کی اور فرمایا "جو شخص اللہ تعالیٰ سے کامل حیا کرتا ہے تو اس کو لازم ہے کہ اپنے سر کو اور جو چیزیں سر کے اندر ہیں ان کی حفاظت کرے اور اپنے شکم کی اور ان چیزوں کی جو اس کے اندر ہیں حفاظت کرے اور موت کو اور بوسیدہ ہونے کو یاد کرے اور جو آخرت کا ارادہ کرے وہ زینت دنیا کو ترک کرے پس جس شخص نے ایسا کیا اس نے خدا تعالیٰ سے پوری حیا کی"۔

میں کہتا ہوں عرف میں کبھی اس شخص کو جو اپنی ضعف جبلی کی وجہ سے بعض افعال سے باز رہتا

ہے حیادار کہہ دیتے ہیں اور کبھی صاحب مروت آدمی کو جو ایسی باتوں سے بچتا ہے جن سے لوگوں میں اس کا چرچا ہو حیادار کہہ دیتے ہیں حالانکہ ان دونوں شخصوں کا اس حیا سے جو مقامات میں شمار کی جاتی ہے کچھ حصہ نہیں ہے پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے معنی مقصود کو ان افعال کی تعیین سے جو حیا سے پیدا ہوتے ہیں اور اس کے سبب سے جس سے وہ پیدا ہوتا ہے اور اس کے مجاور سے جو عادۃً اس کو لازم ہوتا ہے بیان فرمادیا پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ''پس وہ اپنے سر کو بچائے'' الخ۔ ان افعال کا بیان ہے جو اس حیا کے ملکہ سے پیدا ہوتے ہیں جو مخالف چیزوں کے ترک کرنے کے قبیل سے ہے اور آپ کا یہ فرمان ''اور وہ موت کو یاد کرے'' نفس کے اندر حیاء کے استقرار کے سبب کو بیان کرنا ہے اور آپ کا یہ فرمانا ''جو آخرت کا ارادہ کرے'' حیا کے اس مجاور کو بیان کرنا ہے جس کو زہد کہتے ہیں کیونکہ حیا زہد سے خالی نہیں ہوتی پس جب حیا انسان کے اندر جگہ پکڑ جاتی ہے تو نور ایمان بھی عقل سے قلب پر نازل ہوتا ہے اور جبلت قلبی کے ساتھ مخلوط ہو جاتا ہے پھر نفس کی طرف اتر کر اس کو شبہات سے روک دیتا ہے اور اسی کو ورع کہتے ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' حلال بھی ظاہر ہے اور حرام بھی ظاہر ہے اور ان کے درمیان مشتبہ امور ہیں جن کو بہت سے لوگ نہیں جانتے پس جو شخص شبہات سے بچ گیا اس نے اپنی آبرو اور دین کو بچالیا اور جو مشتبہات میں پڑا وہ حرام میں پڑ گیا'' اور آپ نے فرمایا'' شک والی چیز کو چھوڑ کر غیر شک والی چیز کو اختیار کر کیونکہ صدق اطمینان ہے اور کذب شک ہے'' اور آپ نے فرمایا'' بندہ متقین کے درجہ کو نہیں پہنچتا جب تک کہ ان چیزوں کو جن میں کوئی مضائقہ نہیں ان چیزوں کے خوف سے جن میں مضائقہ ہے نہ چھوڑ دے''۔

میں کہتا ہوں کبھی ایک مسئلہ میں دو وجہ متعارض ہو جاتی ہے ایک وجہ اباحت کی ہوتی ہے اور ایک وجہ تحریم کی، یا تو یہ تعارض شریعت کی طرف سے اس مسئلہ کے اصل ماخذ میں ہوتا ہے جیسے دو حدیثیں متعارض یا دو قیاس مخالف ہوتے ہیں یا یہ تعارض حادثہ کی صورت کے اس اباحت وتحریم کے حکم کے ساتھ جو شریعت میں مقرر ہے مطابق کرنے میں ہوتا ہے پس ایسے وقت میں خدا تعالی اور بندہ میں بغیر اس چیز کے ترک کرنے کے اور جس میں اشتباہ نہیں اس کے اختیار کرنے کے صفائی نہیں ہوتی، پس جب ورع پایا جاتا ہے تو نور ایمان بھی نازل ہوتا ہے اور جبلت قلبی اس کو

مخلوط ہو جاتی ہے پھر جو چیز حاجت سے زائد ہیں ان میں مشغول ہونے کی قباحت اس پر منکشف ہو جاتی ہے کیونکہ وہ چیزیں اس کو مقصود اصلی سے روکتی ہیں پھر وہ نور نفس کی طرف نازل ہوتا ہے اور ایسی چیزوں کی طلب سے نفس کو باز رکھتا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آدمی کے اسلام کی خوبی اس میں ہے کہ بے فائدہ چیزوں کو چھوڑ دے''۔

میں کہتا ہوں خدا تعالیٰ کے علاوہ ہر شغل نفس کے آئینہ پر سیاہ دھبہ ہے بجز ان اشغال کے جو زندگی میں ضروری ہیں جبکہ اس نیت سے ان میں مشغول ہو کہ وہ منزل مقصود تک پہنچانے والی ہیں تو ان کے لئے معافی ہے اور ان کے علاوہ جتنی چیزیں ہیں تو اللہ تعالیٰ کا واعظ جو مومن کے قلب میں ہوتا ہے ان سے منع کرتا ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' دنیا کا زہد حلال کو حرام کرنے میں اور مال کو ضائع کرنے میں نہیں ہے بلکہ دنیا کا زہد یہ ہے کہ جو چیز تیرے ہاتھ میں ہے اس کا تجھ کو اس چیز سے زیادہ بھروسہ نہ ہو جو خدا تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اور یہ کہ جب تجھ کو کوئی مصیبت پہنچے تو اس مصیبت کے ثواب میں اگر وہ مصیبت تیرے لئے باقی رکھی جائے تو تجھ کو زیادہ رغبت ہو''۔

میں کہتا ہوں زاہد کو کبھی دنیا میں ایک ایسا غلبہ حاصل ہوتا ہے جس سے وہ ان عقائد و افعال پر آمادہ ہوتا ہے جو شریعت میں محمود ہیں اور ان عقائد و افعال کو ترک کرتا ہے جو محمود نہیں ہیں پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے زہد کا موقع بیان کر دیا کہ یہ شریعت میں محمود ہے اور یہ غیر محمود ہے پس جب کسی شخص پر حاجت سے زیادہ چیزوں میں مشغول ہونے کی قباحت منکشف ہو جاتی ہے اور وہ ان چیزوں کو ایسا برا سمجھتا ہے جیسے اپنے مقتضیٰ طبع کے اعتبار سے ضرر پہنچانے والی اشیا کو برا سمجھتا ہے تو بسا اوقات وہ شخص ان چیزوں میں تعمق کرنے لگتا ہے اور اس کو اس بات کا اعتقاد ہو جاتا ہے کہ ظاہر شرع کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ اس سے مواخذہ کرے گا حالانکہ یہ عقیدہ باطل ہے کیونکہ شرع طبائع بشری کے دستور کے موافق نازل ہوئی ہے اور زہد ایک قسم کی طبیعت بشری سے الگ ہونا ہے اور وہ خاص اس کے نفس کے لئے بہ نظر اس کے مقام کی تکمیل کے حکم الٰہی ہے اور وہ تکلیف شرعی نہیں ہے اور کبھی کبھی وہ مال کے ضائع کرنے پر آمادہ کر دیتا ہے اور وہ دریاؤں اور پہاڑوں میں اس مال کو پھینک دیتا ہے اور یہ ایسا غلبہ ہے جس کو شریعت صحیح نہیں کہتی اور نہ ہی شرع نے اس غلبہ کو احکام زہد کے ظاہر ہونے کا مقام گردانا ہے، بلکہ شرع نے جس کو احکام زہد کے ظاہر ہونے کا مقام گردانا ہے

وہ دو چیزیں ہیں ایک تو یہ کہ جو چیز حاجت سے زیادہ ہے اور اس شخص کو ہنوز حاصل نہیں ہوئی ہے تو وہ شخص اس کے طلب کرنے کی تکلیف نہ اٹھائے بلکہ اس وعدہ الٰہی پر اعتماد کرے کہ دنیا میں جو تکلیف پہنچے گی آخرت میں اس کا ثواب ملے گا، دوسری یہ ہے کہ جو چیز اس کے ہاتھ سے جاتی رہے تو اپنے دل کو اس کے پیچھے نہ لگائے اور نہ اس پر افسوس کرے بلکہ اس وعدہ الٰہی پر یقین کرے جو صابرین اور فقرا کے لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

واضح ہو کہ نفس کی یہ جبلی بات ہے کہ وہ خواہشات کی پیروی کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ نور ایمانی اس میں ظاہر ہو جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام فرماتے ہیں ''میں اپنے نفس کو بری نہیں کرتا ہوں بیشک نفس برائی کا حکم دیتا ہے مگر جو میرا رب رحم کرے'' پس مومن تمام عمر نور الٰہی کا نزول طلب کرنے میں نفس سے مجاہدہ کرتا رہتا ہے پس جو کوئی نفسانی خواہش جوش میں آتی ہے تو خدا کی طرف رجوع کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے جلال اور اس کی عظمت کو اور فرمانبرداروں کے لئے ثواب اور نافرمانوں کے لئے جو عذاب مقرر کیا ہے اس کو یاد کرتا ہے پس اس کے قلب اور عقل سے ایک خیال حق پیدا ہوتا ہے جو باطل خیال کو مٹا دیتا ہے اور وہ باطل خیال کان لم یکن اور معدوم ہو جاتا ہے۔ مگر یہ کہ عارف میں اور نئے سرے سے توبہ کرنے والے میں بڑا فرق ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں خطروں کی باہم مدافعت اور خیال حق کا خیال باطل پر غلبہ اور نفس کا حق کے لئے فرمانبردار ہونا جبکہ نفس مطمئنہ ہو اور اس عقل کے آداب کے ساتھ مؤدب ہو جو نور ایمانی سے منور ہو رہی ہے اور نفس کا حق سے بغاوت کرنا اور اس سے سرکشی کرنا جبکہ نفس عاصی اور منکر ہو بخل اور جود کے مسئلہ میں لوہے کی دو زرہوں کی مثال دیکر کہ ان میں سے ایک ٹھیک ٹھیک اور دوسری تنگ ہے بیان فرمایا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بخیل اور صدقہ دینے والے کی مثال ان دو شخصوں کی سی ہے جو لوہے کی زرہیں پہنے ہوئے ہیں اور ان دونوں کے ہاتھ سینے اور گلے کی طرف جکڑے ہوئے ہیں پس صدقہ کرنے والا جب کچھ صدقہ کرتا ہے تو وہ زرہ پھیل جاتی ہے اور بخیل جب صدقہ کرنے کا قصد کرتا ہے تو وہ زرہ تنگ ہو جاتی ہے اور ہر کڑی اپنی جگہ پکڑ لیتی ہے۔

میں کہتا ہوں جس شخص کا نفس جبلی طور سے یا کسی طور سے مطمئن ہو جاتا ہے تو خاطر حق ظاہر ہوتے ہی اس کے نفس کا مالک ہو جاتا ہے اور اس پر غالب ہو جاتا ہے اور جس شخص کا نفس عاصی

اور منکر ہوتا ہے تو خاطر حق اس میں اثر نہیں کرتا بلکہ اس سے دور ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے قرآن عظیم میں عقل کا نور ایمانی سے منور ہونے اور پھر اس کے نور کا نفس پر فیضان ہونے کو بیان کیا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''متقی لوگوں کو جب شیطان کی طرف سے پھرنے والا چھو جاتا ہے تو وہ ہوشیار ہو جاتے ہیں پھر ناگاہ ان کو سوجھ ہو جاتی ہے''۔

میں کہتا ہوں شہوت نفس کے روزن سے شیطان انسان کے باطن پر جھانکتا ہے اور اس کے دل میں معصیت کی خواہش پیدا کر دیتا ہے پھر اگر بندہ جلال الٰہی کو یاد کر کے ڈر جاتا ہے تو اس سے عقل میں نور پیدا ہوتا ہے اور یہی ابصار ہے پھر وہ نور قلب اور نفس کی طرف اترتا ہے پس اس خواہش کو دور کر دیتا ہے اور شیطان کو دفع کر دیتا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''اور صبر کرنے والوں کو خدا کی خوشنودی کی بشارت سنادو، ان لوگوں پر جب کوئی مصیبت واقع ہوتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم خدا ہی کا مال ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں، یہی لوگ ہیں جن پر ان کے پروردگار کی مہربانی اور رحمت ہے اور یہی سیدھے راستے پر ہیں''۔

میں کہتا ہوں اللہ تعالیٰ کا قول ''انا للہ'' خاطر حق کے نزول کی طرف اشارہ ہے اور اللہ تعالیٰ کا قول ''صلوات من ربهم ورحمة'' ان برکات کی طرف اشارہ ہے جن کو صبر نفس کی نورانیت سے اور نفس کے ملکوت کے ساتھ مشابہ ہونے سے پیدا کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''اور کوئی مصیبت نہیں پہنچتی مگر خدا تعالیٰ کے حکم سے اور جو شخص خدا تعالیٰ پر ایمان لاتا ہے خدا تعالیٰ اس کے دل کو ہدایت دیتا ہے'' الآیہ،

میں کہتا ہوں اللہ تعالیٰ کا قول ''باذن اللہ'' تقدیر کی معرفت کی طرف اشارہ ہے، اللہ تعالیٰ کا قول ''ومن یومن باللہ'' عقل سے قلب اور نفس کی طرف خاطر حق کے نازل ہونے کی طرف اشارہ ہے اور من جملہ احوال نفس کے غیبت ہے اور اس کے یہ معنی ہیں کہ نفس اپنی خواہشات سے غائب ہو جائے جیسا کہ عامر بن عبداللہ کہتے ہیں ''مجھے کچھ توجہ نہیں ہوتی کہ میں نے عورت کو دیکھا یا دیوار کو'' اور امام اوزاعیؒ سے کسی نے کہا کہ ہم نے تمہاری باندی زرقا کو بازار میں دیکھا، انھوں نے فرمایا کیا وہ زرقا تھی؟ اور من جملہ احوال نفس کے محق ہے اور وہ حالت یہ ہے کہ آدمی ایک مدت تک جس میں عادۃً کھانے پینے سے آدمی بے خبر نہیں رہ سکتا اس وجہ سے غافل رہے کہ اس کا نفس

عقل کی جانب متوجہ ہوگیا ہے اور اس کی عقل نورالٰہی سے لبریز ہوگئی ہے اور اس سے بڑھ کر اور کامل یہ ہے کہ نورالٰہی نفس کی طرف نازل ہوکر کھانے اور پینے کے قائم مقام ہو جائے چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''میرا حال تمہارا سا نہیں ہے میں اپنے پروردگار کے پاس شب بسر کرتا ہوں وہ مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے'' واضح ہو کہ قلب، عقل اور نفس کے مابین ہے پس کبھی تسامح کے طور پر جمیع مقامات یا اکثر مقامات کو قلب کی طرف منسوب کر دیا جاتا ہے اور اس استعمال پر آیات اور بہت سی احادیث وارد ہیں پس اس نکتہ سے غافل نہیں ہونا چاہئے۔

اور واضح ہو کہ نفس بہیمی اور قلب سبعی کی خواہشوں میں سے ہر قسم کی خواہش کے لئے نور ایمانی کی جو مدافعت ہوتی ہے اس کا نام جدا ہوتا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان اقسام میں سے ہر ایک کے نام اور اس کے وصف پر مطلع فرمایا ہے پس جب عقل کو خواطر حقہ کے روشن ہونے میں ملکہ اور نفس کو ان خواطر کے قبول کرنے میں ملکہ حاصل ہو جاتا ہے تو اس کو ایک مقام کہا جاتا ہے پس پریشانی کے دفع کرنے کے ملکہ کا نام مصیبت پر صبر ہے اور اس کی جگہ قلب ہے اور آرام اور فراغت کے مدافعت کے ملکہ کا نام اجتہاد ہے اور صبر پر طاعت ہے اور حدود شرعی کی مخالفت کی خواہش کو دفع کرنے کے ملکہ کا نام تقویٰ ہے خواہ وہ مخالفت بطور کاہلی کے ہو یا ان حدود کے اضداد کی طرف میلان کے اعتبار سے ہو، اور کبھی تقوی کا اطلاق لطائف ثلاثہ کے تمام مقامات پر بلکہ ان اعمال پر بھی ہوتا ہے جو ان مقامات سے پیدا ہوتے ہیں اور اسی اخیر استعمال کے بموجب اللہ تعالیٰ کی یہ آیت: ھدی للمتقین الذین یؤمنون بالغیب، اور حرص کی خواہش کو دفع کرنے کے ملکہ کا نام قناعت ہے اور جلد بازی کی خواہش کو دفع کرنے کے لئے ملکہ کا نام تانی ہے اور غصہ کی خواہش کو دفع کرنے سے ملکہ کا نام حلم ہے اور اس کا مقام قلب ہے اور شہوت فرج کی خواہش کو دفع کرنے کے ملکہ کا نام عفت ہے اور زبان زوری اور بیہودہ کلام کی خواہش کو دفع کرنے کے ملکہ کا نام صمت اور سکوت ہے اور غلبہ کی خواہش کو دفع کرنے کے ملکہ کا نام خمول ہے اور محبت وعداوت وغیرہ میں تلون کی خواہش کو دفع کرنے کے ملکہ کا نام استقامت ہے اور ان کے علاوہ بہت سی خواہشات ہیں اور ان کی مدافعتوں کے جدا جدا نام ہیں انشاءاللہ تعالیٰ ان سب کی بحث اس کتاب کے فن اخلاق میں آئے گی۔

طلب رزق کے ابواب کا بیان

واضح ہو کہ جب اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا کیا اور ان کی روزی زمین میں مقرر کی اور زمین کی چیزوں سے ان کے لئے نفع حاصل کرنا مباح کیا تو ان میں حرص اور نزاع واقع ہوا اس وقت اللہ تعالیٰ کا یہ حکم ہوا کہ کسی شخص کو دوسرے شخص سے اس چیز میں مزاحم ہونا جو اس کے لئے خاص ہو گئی ہے حرام ہے خواہ وہ اختصاص اس لئے ہو کہ دوسروں سے پیشتر اس شخص نے یا اس کے مورث نے اس چیز پر قبضہ کیا ہے یا کسی دوسری وجہ سے ہو جس کا لوگوں میں اعتبار ہے بجز تبادلہ یا باہمی رضامندی کے جس کی خبر ہو اور اس میں کوئی مکر وفریب نہ ہو اور چونکہ انسان مدنی الطبع ہے کہ ان کی روزی بغیر باہمی تعاون کے قائم نہیں ہوتی اس واسطے اللہ تعالیٰ کی طرف سے تعاون کے واجب ہونے کا حکم نازل ہوا اور نیز یہ حکم نازل ہوا کہ ان میں سے کوئی شخص اس چیز سے جس کو تمدن میں دخل ہے بغیر حاجت ضروری کے خالی نہ رہے اور نیز اصل ذریعہ اموال مباحہ کو قبضہ میں کرنا یا اموال مباحہ کی مدد سے اپنی مخصوص چیز سے نفع حاصل کرنا ہے جیسے چرا کر مویشی کی نسل کو بڑھانا اور زمین کی اصلاح کر کے اور پانی دیکر کھیتی کرنا اور اس میں یہ شرط ہے کہ کوئی شخص کسی پر تنگی نہ کرے جس سے تمدن میں فساد لازم آئے پھر لوگوں کے اموال کا معاش میں مدد کر کے زیادہ کرنا ایسی چیز ہے جس کے بغیر شہر کی حالت کا قائم رہنا یا تو ناممکن ہے یا دشوار ہے مثلاً ایک شخص مال تجارت ایک شہر سے دوسرے شہر میں لے جاتا ہے اور ایک مدت معلوم تک اس لے جانے کی محافظت کی مشقت جھیلتا ہے یا ایک شخص اپنی کوشش اور عمل سے دلالی کرتا ہے یا مال کے اندر ایک عمدہ صفت پیدا کر کے لوگوں کے مال کی اصلاح کرتا ہے اور ایسی ہی امثال، پس اگر مال میں زیادتی چاہنا

ایسے کام کے ذریعہ ہے جس کو لوگوں کی معاونت میں دخل نہیں ہے جیسے قمار بازی یا باہمی ایسی رضامندی سے ہے جو زبردستی کے معنی کے ساتھ مشابہ ہے جیسے سود کیونکہ تنگدست آدمی مجبور ہو کر ایسی چیز کو اپنے اوپر لازم کر لیتا ہے جس کا ایفا نہیں کر سکتا اور اس کی رضامندی حقیقت میں رضامندی نہیں ہوتی پس یہ عقود پسندیدہ عقود اور اسباب صالحہ میں داخل نہیں ہیں بلکہ اصل حکمت مدنیہ کے اعتبار سے ایسے عقود باطل اور حرام ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس نے بے آباد زمین کو آباد کیا پس وہ اسی کی ہے''۔

میں کہتا ہوں اس میں اصل وہ بات ہے جس کی طرف ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ سب اللہ تعالیٰ کا مال ہے اور درحقیقت اس میں کسی کا حق نہیں لیکن جب اللہ تعالیٰ نے زمین اور زمین کی چیزوں سے نفع حاصل کرنے کو مباح کیا تو باہم جھگڑا پیدا ہوا پس اس وقت یہ حکم ہوا کہ جس نے کسی کو بلا ضرر پہنچائے کسی چیز پر قبضہ کر لیا ہے اس چیز میں کوئی اس سے تعرض نہ کرے پس بنجر زمین جو نہ شہر میں ہے اور نہ شہر کے آس پاس ہے پس جب کوئی شخص اس کو آباد کرے گا تو بغیر کسی کو ضرر پہنچانے کے سب سے پیشتر وہ اس پر قابض ہوا پس اس کا حکم یہ ہے کہ کوئی شخص اس سے اس زمین کو نہ چھینے اور تمام زمین درحقیقت بہ منزلہ مسجد یا سرائے کے ہے جو مسافروں کے لئے وقف ہے اور وہ سب اس میں شریک ہیں پس جو پہلے ہے وہی زیادہ حقدار ہے اور آدمی کے حق میں ملک کے معنی یہ ہیں کہ دوسرے کی بہ نسبت وہ نفع حاصل کرنے کا زیادہ حقدار ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''قدیم زمین اللہ اور اس کے رسول کی ہے پھر وہ میری طرف سے تمہارے لئے ہے''

واضح ہو کہ عادی زمین اس زمین کو کہتے ہیں جس کے باشندے ہلاک ہو گئے ہوں اور اب کوئی مدعی اور مخاصم نہ ہو کہ اپنے مورث کے پیشتر قبضہ کے ساتھ دعویٰ کرنے والا باقی نہ رہا ہو پس جو زمین ایسی ہیں ان سے بنی آدم کی ملکیت ختم ہو گئی اور وہ خالص اللہ تعالیٰ کی ملک ہو گئیں اور ان کا حکم اس وجہ سے جو ملک کے معنی میں ہم بیان کر چکے ہیں اس زمین کا سا ہے جو کبھی آباد ہی نہیں ہوئی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''بجز اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے چراگاہ کسی کی نہیں''۔

میں کہتا ہوں چونکہ گھاس کے رکھانے میں لوگوں پر تنگی اور ان پر ظلم اور ضرر رسانی ہے اس

لئے آپ نے اس سے منع فرمایا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس لئے مستثنیٰ کیے گئے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو میزان عدل عطا فرمائی تھی اور اس بات سے آپ کو محفوظ کیا تھا کہ کوئی ناجائز بات آپ سے صادر ہو اور ہم بیان کر چکے ہیں کہ جن امور کا مبنی گمان غالب پر ہے ان سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم مستثنیٰ ہیں اور جن امور کا مبنی تہذیب نفس اور اس کے مشابہ امور پر ہے وہ امور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسروں پر برابر برابر لازم ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مہزور کے نالہ میں یہ حکم دیا تھا کہ اس کو روک لیا جائے یہاں تک کہ ٹخنوں تک کھیت بھر جائے پھر اوپر والا نیچے والے کے لئے چھوڑ دے اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی مخاصمت کے قصہ میں یہ فیصلہ فرمایا "اے زبیر تو پانی دے پھر اس کو روک یہاں تک کہ پانی دیواروں کی جڑ تک پہنچ جائے پھر اپنے پڑوسی کی طرف پانی کو چھوڑ دے"۔

میں کہتا ہوں اس میں اصل یہ ہے کہ جب ایک مباح چیز میں لوگوں کے حقوق یکے بعد دیگرے متعلق ہوئے تو یہ ضروری ہوا کہ ہر شخص کے لئے کم از کم معتدبہ فائدہ حاصل ہونے کی مقدار میں بھی ترتیب کی رعایت کی جائے کیونکہ اگر قریب کو مقدم نہ کیا جائے گا تو یہ اس کے حق میں زبردستی اور ضرر رسانی ہوگی اور اگر درجہ بدرجہ ہر شخص پورا فائدہ حاصل نہ کرے گا تو اس کا حق حاصل نہیں ہوگا پس اس قاعدہ کے موافق آپ نے پانی کو روکنے کا حکم دیا یہاں تک کہ وہ ٹخنوں تک پہنچ جائے اور یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کے قریب ہے کہ پانی دیوار کی جڑ تک پہنچ جائے کیونکہ وہ دیوار تک پہنچنے کی شروع حد ہے اور ٹخنوں تک پہنچنے سے پہلے پہلے اس کو زمین جذب کرسکتی ہے اور پانی دیواروں تک نہیں پہنچ سکتا اور ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابیض بن حمال ماربی کو نمک جو مارب میں تھا دیدیا پس کسی نے آپ سے عرض کیا کہ آپ نے تو اس کو ایک چشمہ جاری دیدیا، راوی کہتا ہے کہ پھر آپ نے اس سے واپس لے لیا۔

میں کہتا ہوں اس میں شک نہیں کہ جس کھلی ہوئی کان میں زیادہ مشقت نہ ہو اس کو مسلمانوں میں سے کسی ایک کو عطا کردینا دیگر مسلمانوں کو ضرر پہنچانا اور ان پر تنگی کرنا ہے، کسی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے گری ہوئی چیز کے بارے میں دریافت کیا آپ نے فرمایا "اس کے ظرف اور اس کے دہانہ بند کو شناخت کر پھر ایک برس تک اس کو لوگوں میں مشہور کر پس اگر اس کا مالک

آ جائے تو بہتر ہے ورنہ پھر اپنے کام میں لا، سائل نے عرض کیا کہ گم شدہ بکری کا کیا حکم ہے، آپ نے فرمایا، وہ تیرے لئے ہے یا تیرے بھائی مسلمان کیلئے ہے یا بھیڑیئے کے لئے ہے پھر اس نے عرض کیا کہ گم شدہ اونٹ کا کیا حکم ہے، آپ نے فرمایا تجھ کو اس سے کیا کام ہے اس کے ساتھ اس کی مشک اور اس کے قدم ہیں پانی پیئے گا اور گھاس کھائے گا یہاں تک کہ اس کا مالک اس کو پالے گا، اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہم کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ کی لکڑی اور کوڑے اور رسی اور ان کے مثل چیزوں کی اجازت دی ہے کہ کوئی شخص ان کو اٹھا کر نفع حاصل کر سکتا ہے۔

میں کہتا ہوں واضح ہو کہ پڑی ہوئی چیز کا حکم اسی قاعدہ کلیہ سے مستنبط ہے جس کو ہم ذکر کر چکے ہیں پس جن چیزوں سے ان کا مالک مستغنی ہو اور ان کے گم ہونے کے بعد وہ لوٹ کر نہ آئے یعنی حقیر چیز ہو تو اس کا مالک بننا جائز ہے بشرطیکہ یہ گمان ہو کہ اس کا مالک وہاں موجود نہیں ہے اور وہ لوٹ کر وہاں واپس نہیں آ سکتا کیونکہ وہ چیز خدا تعالیٰ کا مال ہو کر مباح ہو گئی اور جو چیز کسی قدر قیمتی ہے جس کو انسان ڈھونڈتا ہے اور غائب اس کی تلاش میں واپس آتا ہے تو ایسی چیز کا اعلان کرنا جس قدر مدت تک ایسی چیز کے اعلان کرنے کا دستور ہے واجب ہے یہاں تک کہ اس کے مالک کے واپس نہ آنے کا گمان غالب ہو جائے اور بکری جیسی چیزوں کا پکڑ لینا مستحب ہے کیونکہ اگر اس نے اس کو نہ پکڑا تو وہ ضائع ہو جائے گی اور اونٹ جیسی چیز کو پکڑنا مکروہ ہے۔

واضح ہو کہ ہر مبادلہ میں چند چیزوں کا ہونا ضروری ہے ایک تو عاقدین اور عوضین اور اس چیز کا ہونا جس میں عاقدین کے مبادلہ کرنے سے رضامندی کا گمان غالب ہوتا ہے اور اس چیز کا ہونا بھی ضروری ہے جو ان کی منازعت کو قطع کرنے والی اور عاقدین پر عقد کو لازم کرنے والی ہوتی ہے اور عاقدین میں یہ شرط ہے کہ وہ دونوں آزاد ہوں، عاقل ہوں، نفع نقصان کو پہچانتے ہوں اور اس عقد کو سمجھ بوجھ کے ساتھ اور ثبات کے ساتھ عمل میں لانے والے ہوں، اور عوضین میں شرط یہ ہے کہ وہ دونوں مال قابل نفع اور قابل رغبت ہوں اور وہ مال ان چیزوں سے نہ ہوں جو ہر شخص کے لئے مباح ہیں اور نہ ان چیزوں سے ہوں جن میں لوگوں کو قابل اعتبار فائدہ نہیں ہوتا ورنہ وہ عقد اس قبیل سے نہ ہوگا۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کے لئے مقرر فرمایا ہے اور وہ عقد عبث ہو جائے گا اور نہ اس عقد کے ضمنی فائدہ کی رعایت ہو (مثلاً سود) جس کو ظاہر میں ذکر نہیں کیا جاتا

اور یہ من جملہ مفاسد کے ایک فساد ہے کیونکہ اس عقد کا کرنے والا اس خیال میں ہوتا ہے کہ جس چیز کا اس نے ارادہ کیا ہے وہ اس کو نہ ملے گی پس وہ ناامیدی کے ساتھ سکوت کرتا ہے یا بغیر کسی حق کے جولوگوں کے ساتھ متعلق ہوا ہو وہ شخص جھگڑا کرتا ہے اور جس چیز سے عاقدین کی رضامندی پائی جاتی ہے اس میں یہ شرط ہے کہ وہ واضح امر ہو جس سے لوگوں کے سامنے مواخذہ کیا جا سکے اور وہ شخص بلا دلیل قائم کئے ظلم نہ کر سکے اور اس باب میں سب سے زیادہ واضح چیز زبان سے صاف بیان کرنا ہے اور پھر اس طرح سے لین دین کرنا جس میں شک باقی نہ رہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''بائع اور مشتری میں سے ہر ایک کو دوسرے پر اختیار ہے جب تک وہ دونوں جدا نہ ہوں سوائے بیع خیار کی۔

میں کہتا ہوں واضح ہو کہ ایک ایسے امر کا ہونا ضروری ہے جو ایک کے حق کو دوسرے کے حق سے جدا کرے اور بیع کے رد کرنے میں ان دونوں کے اختیار کو دور کر دے کیونکہ ایسا امر قاطع نہ پایا جائے گا تو ایک دوسرے کو نقصان پہنچا سکتا ہے اور اپنے قبضہ میں آئی ہوئی چیز میں تصرف کرنے سے ہر شخص متردد رہے گا اس خوف سے کہ اس بیع کو دوسرا شخص فسخ نہ کر دے اور اس جگہ ایک اور امر ہے بعض وہ لفظ بھی ضروری ہے جس سے عاقدین کی اس عقد سے رضامندی اور ان کے قصد کا بیان ہو اور یہ درست نہیں ہے کہ اسی لفظ کو قاطع قرار دیا جائے کیونکہ ایسے الفاظ ترغیب دلانے اور نرخ کرنے کے وقت مستعمل ہوتے ہیں اس لئے کہ جب تک ایک مقدار کے ساتھ یقین نہ ظاہر کیا جائے ان دونوں کا راضی ہونا ناممکن ہے اور نیز لوگوں کی زبان ایسے وقت میں دلی رغبت کی تصویر ہوتی ہے اور لفظ کے درمیان باہم فرق کرنے میں بڑا حرج ہے اور ایسے ہی جانبین سے لین دین کرنا ہے کیونکہ ہر ایک کے لئے ضروری ہے کہ جس چیز کو وہ طلب کرتا ہے اس طور سے لیوے کہ اس کو خریدتا ہے تا کہ اس میں نظر و تامل کرے اور ایک لینے کو دوسرے لینے سے فرق کرنا آسان نہیں ہے اور یہ بھی جائز نہیں کہ وہ قاطع پوشیدہ شئے ہو اور نہ یہ درست ہے کہ قاطع ایک مدت ہو جو ایک روز یا اس سے زیادہ ہو کیونکہ بہت سی چیزیں اس لئے مطلوب ہوتی ہیں کہ ان سے اسی دن میں نفع حاصل کیا جائے لہذا ضروری ہوا کہ وہ قاطع مجلس عقد سے جدا ہونا قرار دیا جائے کیونکہ دستور ایسا جاری ہے کہ عاقدین عقد کے لئے جمع ہوتے ہیں اور اس کے تمام ہونے کے بعد جدا

ہو جاتے ہیں اور اگر عرب وعجم کے ہر قسم کے لوگوں کا تتبع کرو گے تو تم کو یہ بات معلوم ہو جائے گی کہ ان میں اکثر لوگ جدا ہو جانے کے بعد بیع کے رد کرنے کو جور وظلم سمجھتے ہیں اور جدا ہونے سے قبل یہ خیال نہیں کرتے سوائے چند لوگوں کے جنھوں نے اپنی فطرت ہی بدل ڈالی ہو اور شرائع الٰہیہ انہیں احکام کے ساتھ نازل ہوتے ہیں جن کو عام لوگ اول ہی بار تسلیم کر لیں اور چونکہ بعض لوگ عقد کے بعد اس خیال سے کہ ان کو اس عقد میں نفع ہوا ہے پوشیدہ طور پر چل دیتے ہیں اور دوسرے شخص سے اس بیع کے فسخ کو ناگوار سمجھتے ہیں اور اسمیں قلب موضوع لازم آتا ہے اس واسطے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے نہی فرمائی اور آپ نے فرمایا ''اس کے لئے جائز نہیں ہے کہ فسخ کے خوف سے اپنے ساتھی کو چھوڑ کر چلا جائے پس ان دونوں کے لئے لازم ہے کہ وہ دونوں اپنے حال پر قائم رہیں اور ان میں سے ہر ایک اپنے ساتھی کے سامنے جدا ہو''۔

واضح ہو کہ جب کسی شہر میں مثلاً دس ہزار آدمی ہوں گے تو سیاست مدنیہ کو ان کے پیشوں سے بحث کرنا پڑے گی کیونکہ اگر ان میں سے اکثر صنعت اور سیاست شہری میں مشغول ہو کر کسب کریں اور ان میں سے تھوڑے لوگ مویشیوں کے چرانے اور زراعت کے پیشہ میں مشغول ہوں تو دنیا میں ان کی حالت خراب ہو جائے گی اور اگر شراب کشی اور بت تراشی کا پیشہ اختیار کریں تو اس سے لوگوں کو اس طور پر ان کے استعمال کرنے کی ترغیب ہوگی جو ان کے درمیان مروج ہے پس اس سے دین میں ان کی ہلاکت ہے اور اگر پیشہ وروں پر پیشوں کی اس دستور کے موافق تقسیم کی جائے جو حکمت کا مقتضی ہے اور برے پیشہ کرنے والوں کو ان برے پیشوں سے روکا جائے تو لوگوں کی حالت درست ہوگی اور اسی طرح شہروں کی خرابیوں میں سے یہ بھی ہے کہ بڑے بڑے لوگوں کو زیورات اور لباس اور کھانوں کے دقائق کی طرف اور عورتوں کے حسن کی طرف اور انہی کے مثل اور چیزوں کی طرف اس ضرورت سے زیادہ رغبت دلائی جائے جس کی تدابیر ضرور یہ اقتضا کرتی ہیں اور جو لوگوں کے لئے ضروری ہیں اور جن پر عرب وعجم کا اتفاق ہے اور لوگ امور طبیعہ میں تصرف کر کے ایسے پیشے اختیار کریں جن سے رؤسا کی خواہشات پوری ہوں پس ایک قوم لڑکیوں کو ناچنا گانا اور حرکات متناسبہ لذیذہ کے سکھانے کی طرف متوجہ ہو اور کچھ لوگ کپڑوں کے اندر قسم قسم کے خوش رنگ اور طرح طرح کے حیوانات اور درختوں کی صورتیں اور عجیب عجیب نقش

ونگار بنانے کی طرف متوجہ ہوں اور کچھ لوگ سونے اور قیمتی جواہرات میں عجیب وغریب صنعتیں نکالنے کی طرف متوجہ ہوں اور کچھ لوگ بلند بلند مکان بنانے اور ان کے نقش ونگار کرنے کا پیشہ اختیار کریں پس جب لوگوں کی ایک جماعت کثیر ان پیشوں کی طرف متوجہ ہوگی تو ضرور ہے کہ اسی قدر زراعت وتجارت لوگوں سے متروک ہوجائے گی اور جب شہر کے امرا ان چیزوں میں روپیہ صرف کریں گے تو اسی قدر شہر کی دیگر مصلحتوں میں کوتاہی ہوجائے گی اور اس سے یہ بات پیدا ہوگی کہ جو لوگ ضروری پیشے کرتے ہیں مثلاً کاشتکار، تجار اور اہل صنعت پر تنگی ہوگی اور ان پر زیادہ ٹیکس لگایا جائے گا اور اس میں شہر کے لئے بڑا ضرر ہے جو اس کے ایک حصہ سے دوسرے تک پہنچ کر تمام شہر کو گھیر لے گا اور اس میں اس طرح پھیل جائے گا جس طرح دیوانے کتے کے کاٹے کا اثر اس شخص کے تمام جسم میں پھیل جاتا ہے جس کو اس نے کاٹ لیا ہے۔

یہ جو کچھ بیان ہوا ہے ان کے دنیاوی ضرر کا بیان ہے اور کمال اخروی کی طرف پہنچنے میں جو ضرر ان کو پہنچتا ہے وہ بیان کا محتاج نہیں ہے اور یہ مرض عجم کے شہروں میں پورے طور پر پھیل چکا تھا پس اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں اس بات کا القا کیا کہ اس مرض کے مادہ کو قطع کر کے اس کا علاج کیا جائے پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان اشیا کے مظان غالبیہ کی طرف نظر فرمائی جیسے مزین چیزیں اور ریشم اور قسی اور سونے کی بیع زیادہ سونے کے عوض میں لہٰذا آپ نے ان تمام چیزوں سے منع فرمایا۔

بیع کی ان اقسام کا بیان جو ممنوع ہیں

واضح ہو کہ جو حرام اور باطل ہے کیونکہ وہ لوگوں سے ان کے اموال کا چھین لینا ہے جس کا مدار اتباع جہل وحرص اور باطل آرزو اور فریب پر ہے جو اس کو شرط پر آمادہ کرتی ہیں اور اس کو تمدن اور تعاون میں کچھ دخل نہیں ہے اور خسارہ پانے والا اگر سکوت کرتا ہے تو غصہ اور نا امیدی کی حالت میں کرتا ہے اور اگر جھگڑا کرتا ہے تو وہ ایسی چیز میں جھگڑا کرتا ہے جس کو اس نے خود کو اپنے اوپر لازم کیا ہے اور قصداً اس میں پڑا ہے اور جیتنے والے کو لذت حاصل ہوتی ہے اور تھوڑے سے بہت کی طرف اس کی خواہش پیدا ہوتی ہے اور اس کی حرص اس عیب سے اس کو علیحدہ نہیں ہونے دیتی اور چند روز کے بعد اس کو بھی خسارہ ہوتا ہے اور جوئے کی عادت ڈالنے میں اموال کا برباد کرنا اور بڑے بڑے جھگڑوں کا پیدا کرنا اور تدابیر مطلوبہ کا ترک کرنا اور اس تعاون سے اعراض کرنا جس پر تمدن مبنی ہے ثابت ہوتا ہے اور معائنہ کرنے کے بعد ہمارے بیان کرنے کی کچھ حاجت نہیں ہے تم نے جس قمار باز کو دیکھا ہوگا اس کو ایسا ہی پایا ہوگا جیسا کہ ہم نے بیان کیا اور اسی طرح سود ہے اور سود ایک قرض ہے کہ جتنا مقروض نے لیا ہے اس سے زیادہ یا اس سے افضل ادا کرے اور یہ بھی حرام اور باطل ہے کیونکہ اس طرح سے اکثر قرض لینے والے مفلس لوگ ہوتے ہیں جو لاچاری کی وجہ سے لے لیتے ہیں اور بسا اوقات وقت پر ادا نہیں کر سکتے ہیں پس وہ دو چند سہ چند ہوتا چلا جاتا ہے جس سے خلاصی کبھی ممکن نہیں ہوتی اور وہ بڑے بڑے جھگڑوں اور سخت دشمنیوں کا مظنہ ہے، اور جبکہ مال کے بڑھانے کا اس طرح سے طریقہ ورسم ہو جائے گا تو اس کی وجہ سے کھیتیاں اور وہ صنعتیں جو تمام پیشوں کی جڑ ہیں متروک ہو جائیں گی اور تمام عقود میں کوئی ایسا عقد نہیں جو دشمنی

پیدا کرنے میں اور ذرا سی چیز پر بھی بخل کرنے میں سود سے زیادہ ہو اور یہ دونوں پیشے بہ منزلہ نشہ کے ہیں کہ جو کمانے کے طریقے خدا تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے مشروع فرمائے ہیں ان کی اصل کو یہ قطع کرنے والے ہیں اور ان دونوں میں سخت قباحت اور باہمی نزاع ہے اور ایسے امور میں شارع کو اختیار ہے یا تو ان کے لئے کوئی حد مقرر فرمائے کہ اس سے کم مقدار میں رخصت عطا فرمائے اور اس سے زیادہ میں سخت ممانعت فرمائے یا بالکل ہی منع فرمادے اور جوا اور سود عرب میں بہت مروج تھا اور ان کی وجہ سے ایسے جھگڑے اور قصے پیدا ہو گئے تھے جن کی انتہا نہ تھی اور ان دونوں میں تھوڑے سے بہت کی طرف نوبت پہنچتی تھی پس اس سے زیادہ مناسب اور بہتر صورت اور کوئی نہ تھی کہ ان میں برائی اور فساد کے حکم کی پوری رعایت کرتے ہوئے ان دونوں سے بالکل منع کر دیا جائے۔

اور واضح ہو کہ سود کی دو قسمیں ہیں ایک تو سود حقیقی ہے اور دوسرا وہ ہے جو حقیقی پر محمول ہے پس سود حقیقی قرضوں میں پایا جاتا ہے، اور ہم اس بات کو بیان کر چکے ہیں کہ اس میں معاملات کے موضوع کا بدلنا ہے اور زمانہ جاہلیت میں لوگ اس کے اندر نہایت گرفتار تھے اور اس کی وجہ سے بڑے بڑے جھگڑے پھیل گئے تھے اور تھوڑا سا سود بہت کی خواہش پیدا کرتا تھا، اس واسطے ضروری ہوا کہ اس کا دروازہ بالکل بند کر دیا جائے اسی واسطے قرآن کریم میں اس کے بارے میں نازل ہوا جو کچھ نازل ہوا، اور دوسری قسم ربوا فضل ہے اور اس میں اصل ایک حدیث مشہور ہے کہ ''سونا سونے کے ساتھ اور چاندی چاندی کے ساتھ اور گیہوں گیہوں کے ساتھ اور جو جو کے ساتھ اور چھوارہ چھوارہ کے ساتھ اور نمک نمک کے ساتھ مثل کو مثل کے ساتھ برابر دست بدست فروخت کرو پس جب یہ اجناس مختلف ہوں تو جیسے چاہو فروخت کرو بشرطیکہ دست بدست ہو'' اور اس کو ربوا تہدیداً کہتے ہیں اور اس لئے کہتے ہیں کہ وہ سود حقیقی کے ساتھ مشابہ ہے جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں منجم کو کاہن فرمایا ہے اور اسی سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کے معنی بھی مفہوم ہو سکتے ہیں ''نہیں ہے سود مگر قرض میں'' پھر شرع کے اندر کثرت سے سود کا استعمال اس معنی میں آیا ہے حتیٰ کہ اس معنی میں بھی حقیقت شرعیہ ہو گیا، واللہ اعلم۔

اور اس کے حرام ہونے میں یہ راز ہے کہ خدا تعالیٰ کو نہایت درجہ کی عیش پسندی ناپسند ہے جیسے ریشم پہننا اور وہ ارتفاقات بھی ناپسند ہیں جن میں طلب دنیا کے اندر منہمک ہونے کی حاجت

پڑتی ہے جیسے سونے چاندی کے برتن استعمال کرنا اور ایسے زیورات پہننا جو گھڑ کر بنائے جاتے ہیں جیسے کنگن اور پازیب اور ہنسلی اور کھانے پینے میں زیادہ تکلف کرنا بھی ناپسند ہے کیونکہ یہ امور لوگوں کو اسفل السافلین میں گرانے والے اور ان کے افکار کو تاریک رنگوں کی طرف پھیر دینے والے ہوتے ہیں اور عیش پسندی کی حقیقت ہر چیز میں سے عمدہ چیز کی آرزو کرنا اور ناقص چیز سے اعراض کرنا ہے، اور نہایت درجہ کی عیش پسندی یہ ہے کہ ایک ہی جنس میں اچھی اور بری کا لحاظ کیا جائے اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ انسان کو زندگی بسر کرنے میں کسی نہ کسی کھانے اور کسی قدر نقد کی ضرورت پڑتی ہے اور سب کھانوں کی طرف اور سب نقدوں کی طرف ایک ہی حاجت ہے اور دونوں میں سے ایک کا دوسرے سے مبادلہ کرنا ان ارتفاقات کے اصول میں سے ہے جن کے بغیر چارہ نہیں ہے، اور کسی چیز کو کسی چیز کے ساتھ جو اس کی جگہ کافی ہو سکے مبادلہ کی ضرورت نہیں ہے لیکن اس کے باوجود لوگوں کے مزاج اور عادات کا اختلاف اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ تعیش میں ان کے درجے متفاوت ہوں جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''ہم نے ان میں ان کی معیشت کو دنیا کی زندگی میں تقسیم کر دیا اور ایک کے دوسرے پر درجے بلند کیے تا کہ ایک دوسرے سے خدمت لے'' پس ان میں سے بعض گیہوں اور چاول کھاتے ہیں اور ان میں سے بعض جو اور جوار کھاتے ہیں اور بعض چاندی کے زیور پہنتے ہیں۔

اور لوگوں کا باہم چاول اور گیہوں کے قسموں میں ممیز ہونا اور بعض کی بعض پر فضیلت کا اعتبار کرنا اور اسی طرح سونے میں باریک باریک صنعتوں کا اعتبار کرنا اور اس کی عمدگی کے درجات کا اعتبار کرنا مسرفین اور عجمی لوگوں کی عادات سے ہے اور ان امور میں غور وفکر کرنا دنیا میں غرق ہونا ہے پس مصلحت شرعی کا یہی حکم ہے کہ اس دروازہ کو بند کر دیا جائے اور فقہا نے سمجھ لیا کہ علاوہ ان چھ چیزوں کے جن کی حدیث میں تصریح ہے اور چیزوں میں بھی سود جو حرام ہے جاری ہوتا ہے اور ان سے اور چیزوں کی طرف جو ان سے ملحق ہیں حکم متعدی ہوتا ہے پھر اس کی علت دریافت کرنے میں فقہا کا باہم اختلاف ہے۔

اور قوانین شرعیہ کے ساتھ زیادہ تر موافق یہ ہے کہ سونے چاندی میں اس کی علت ثمنیت ہو اور انہی دونوں کے ساتھ مخصوص ہو اور باقی چاروں میں قوت اور ذخیرہ ہونا اس کی علت ہو، اور

نمک پر دوا اور مصلحات کو قیاس نہیں کر سکتے کیونکہ کھانے کو جس قدر نمک کی طرف حاجت ہے وہ حاجت کسی چیز کی طرف نہیں ہے بلکہ اس حاجت کا دسواں حصہ بھی نہیں ہے پس نمک قوت کا جز اور بہ منزلہ قوت کے ہے نہ کہ اور چیزیں، اور ہم اس علت کی طرف اس لئے گئے ہیں کہ شریعت نے بہت سے احکام میں ثمنیت کا اعتبار کیا ہے جیسے مجلس عقد میں تقابض البدلین کا ضروری ہونا، اور اس لئے کہ حدیث میں طعام کا لفظ وارد ہوا ہے اور عرف میں طعام کے دو معنی ہیں ایک تو طعام گیہوں کا نام ہے سو وہ اس جگہ مراد نہیں ہے اور دوسرے طعام اس کو کہا جاتا ہے جو قوت کے لئے ذخیرہ کیا جائے یہی وجہ ہے کہ طعام کا لفظ میوہ جات اور مصلحات کے مقابل بولا جاتا ہے اور مجلس عقد میں قبضہ کے واجب کرنے کے دو سبب ہیں ایک تو یہ ہے کہ طعام اور نقد کی طرف سب چیزوں سے زیادہ حاجت ہوتی ہے اور ان دونوں سے نفع بغیر ان کو معدوم اور ملک سے خارج کئے حاصل نہیں ہو سکتا اور بسا اوقات قبضہ کرتے وقت جھگڑا ہو جاتا ہے اور بدل فنا ہو چکا ہوتا ہے اور یہ سب جھگڑوں سے زیادہ برا ہوتا ہے اس لئے ضروری ہوا کہ اس دروازہ کو اس طور سے بند کیا جائے کہ عاقدین بغیر قبضہ کئے جدا نہ ہوں اور ان دونوں میں کوئی قصہ باقی نہ رہے اور شریعت نے قبضہ کرنے سے پیشتر طعام کی بیع کی ممانعت میں اسی علت کا اعتبار کیا ہے اور چاندی کو سونے سے بدلنے میں جو یہ فرمایا ''تم دونوں اس وقت تک جدا نہ ہو جب تک تم میں کوئی بات باقی ہے'' اس کا سبب بھی یہی ہے اور دوسرا سبب یہ ہے کہ جب نقد ایک طرف ہو اور غلہ وغیرہ دوسری طرف ہو تو نقد اس چیز کے طلب کرنے کا ذریعہ ہوتا ہے جیسا کہ وہ نقد ہونے کا مقتضی ہے۔ پس مناسب ہے کہ اس چیز کے لینے سے پہلے اس کو خرچ کیا جائے اور جب دونوں جانب نقد یا طعام ہو تو ایک کو پہلے دینے کا حکم تحکم قرار پائے گا اور اگر طرفین سے دینے کا حکم نہ ہو تو وہ قرض کی قرض کے ساتھ بیع ہوگی اور بسا اوقات بائع اور مشتری میں سے ہر ایک پہلے دینے میں بخل کرتا ہے اس واسطے عدل کا مقتضی یہی ہوا کہ باہمی جھگڑا دور کر دیا جائے اور دونوں کو یہ حکم دیا جائے کہ بغیر قبضہ کئے جدا نہ ہوں اور غلہ اور نقد کو اس لئے خاص کیا کہ یہ سب اموال کی اصل ہیں اور سب سے زیادہ ان کا لین دین رہتا ہے اور ان دونوں کے معدوم کرنے کے بعد ہی نفع حاصل ہوتا ہے، پس اسی لئے ان دونوں کے لین دین میں قبضہ کرنے سے پیشتر جدا ہونے میں زیادہ حرج ہے اور شدید نزاع پیدا

ہوتا ہے اور دونوں میں اس بات کے منع کرنے سے معاملہ کی دقت پورے طور پر دور ہو جاتی ہے۔

واضح ہو کہ ایسا حکم دینے سے یہ مقصود ہوتا ہے کہ لوگوں میں یہ رسم جاری نہ ہو اور لوگ اس کے عادی نہ ہوں نہ یہ کہ بالکل اس قسم کے معاملہ کا وقوع نہ ہو اور اسی لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلالؓ سے فرمایا ''دوسری بیع کے ساتھ چھواروں کو فروخت کر پھر تو اس کو خرید لے''۔

اور واضح ہو کہ بیع کی بعض اقسام ایسی ہیں جن میں قمار کے معنی پائے جاتے ہیں اور اہل جاہلیت آپس میں ایسی بیع کیا کرتے تھے سو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بیع سے منع فرمایا، از اں جملہ بیع مزابنہ ہے کہ کوئی شخص مثلاً درخت پر لگے ہوئے پھل چھوارے کے سو فرق (۱) کے ساتھ بیع کرے، اور از اں جملہ بیع محاقلہ ہے کہ مثلاً ایک شخص کھیتی کو گیہوں کے سو بوروں کے ساتھ بیع کرے، اور عرایا (۲) میں آپ نے چھواروں کے ساتھ اندازہ کر کے بیع کرنے کی رخصت دی بشرطیکہ وہ پھل پانچ وسق سے کم ہوں کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم تھا کہ اتنی مقدار میں لوگ قمار کا قصد نہیں کرتے بلکہ تر کھجوریں کھانا چاہتے ہیں اور پانچ وسق زکوٰۃ کا نصاب ہیں اور یہ ایسی مقدار ہے جس کو ایک کنبہ کھا سکتا ہے اور از آں جملہ کھجوروں کا ایک انبار جن کا وزن معلوم نہیں ہے ان کی ان چھواروں کے ساتھ بیع کرنا جن کا وزن معلوم ہے اور از اں جملہ بیع ملامسہ ہے کہ ایک شخص دوسرے کا کپڑا چھو لے تو بیع ثابت ہو جائے، اور از آں جملہ بیع منابذہ ہے کہ بغیر دیکھے بھالے ایک شخص اپنا کپڑا پھینک دے تو بیع ثابت ہو جائے، اور از اں جملہ بیع الحصاۃ ہے کہ کنکریاں ڈال دینے سے بیع قرار دے دی جائے پس بیع کے ان سب اقسام میں قمار کے معنی پائے جاتے ہیں اور ان میں معاملہ کا بدلنا لازم آتا ہے اور وہ دیکھ بھال کر استقلال سے اپنی ضرورت کا پورا کرنا ہے اور بیع عربان سے بھی آپ نے منع فرمایا اور وہ یہ ہے کہ خریدار فروخت کرنے والے کو کسی قدر پیشگی رقم دے دے پس اگر اس نے خرید لیا تو قیمت میں سے منہا کر دی گئی ورنہ وہ اس کے لئے بغیر عوض کے ہو گئی اور اس میں قمار کے معنی پائے جاتے ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے تازہ چھواروں کو خشک چھواروں سے بیع کرنے کی نسبت دریافت کیا پس آپ

---

(۱) سولہ رطل کا ایک فرق ہوتا ہے۔ (۲) عرایا ان درختوں کو کہتے ہیں جو کسی کو ہبہ کر دئے جاتے تھے پس باغ میں اس موہوب لہ کا آنا جانا مالک کو ناگوار گزرتا تھا اس لئے ان کی بیع کو جائز قرار دیا۔

نے فرمایا کیا خشک ہوکر تر کھجوریں کچھ کم ہو جاتی ہیں؟ لوگوں نے عرض کیا ہاں، تب اس قسم کی بیع سے آپ نے منع فرمایا۔

میں کہتا ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں بھی ایک قسم کا قمار پایا جاتا ہے اور اس میں سود حکمی کا احتمال ہے کیونکہ شئے کے پورے حال کا اعتبار ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس ہار میں سونا اور کوڑیاں ہوں اس کی بیع نہ کی جائے جب تک ان کو جدا نہ کرلیا جائے۔

میں کہتا ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں بھی ایک قسم کا قمار ہے اور ان میں سے ایک کے نقصان کا مظنہ ہے اگر سکوت کرے گا تو غصہ کی حالت میں کرے گا اور اگر جھگڑا کرے گا تو غیر حق میں کرے گا۔

واضح ہو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایسے وقت عرب میں پیدا ہوئے تھے کہ ان کے اندر معاملات اور خرید وفروخت پائی جاتی تھی پس خدا تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بعض بیوع کے جواز اور بعض کی کراہت کی وحی نازل فرمائی اور کراہت کا مدار چند چیزوں پر ہے از آں جملہ یہ ہے کہ وہ اس قسم کی چیز ہو کہ اس کی عادت ڈالنے سے معصیت پیدا ہوتی ہو یا وہ نفع جو اس سے مقصود ہے کہ وہ لوگوں کے نزدیک ایک قسم کی معصیت ہو جیسے شراب اور بت اور طنبور(۱) پس ان چیزوں کی بیع کا دستور جاری کرنے میں اور ان کے بنانے میں ان معاصی کی عظمت اور لوگوں کو ان پر آمادہ کرنا ہے اور ان چیزوں کی خرید وفروخت کو اور گھروں میں رکھنے کو حرام کرنے میں معاصی کا دور کرنا اور لوگوں کو اس بات کی طرف متوجہ کرنا ہے کہ وہ ان چیزوں سے اجتناب کریں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''خدا تعالیٰ اور اس کے رسول نے شراب اور مردار اور سور اور بتوں کی خرید وفروخت کو حرام کیا ہے'' اور نیز نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''خدا تعالیٰ جب کسی چیز کو حرام کرتا ہے تو اس کی قیمت کو بھی حرام کردیتا ہے'' یعنی جب کسی شئے سے نفع حاصل کرنے کی وجہ متعین ہو جیسے شراب پینے کے لئے بنائی جاتی ہے اور بت پرستش کے لئے بنائے جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے اس چیز کو حرام کیا اور اس کی وجہ سے حکمت الٰہی کا مقتضی ہوا کہ ان کی بیع بھی حرام کردی جائے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''زنا کی اجرت خبیث ہے'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کاہن کو اجرت دینے

---

(۱) ایک مشہور باجہ ہے۔

سے منع فرمایا، اور آپ نے گانے کے کسب سے منع فرمایا۔

میں کہتا ہوں جو مال معصیت کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے اس سے نفع حاصل کرنا دو سبب سے ممنوع ہے ایک سبب یہ ہے کہ اس مال کے حرام کرنے اور اس سے نفع نہ حاصل کرنے میں معصیت سے روکنا ہے اور ان کے معاملہ کے دستور جاری کرنے میں فساد پیدا کرنا اور لوگوں کو ان گناہوں پر آمادہ کرنا ہے، دوسرا سبب یہ ہے کہ لوگوں کے خیال اور ان کے اعتقاد میں قیمت مبیع سے پیدا ہوتی ہے پس عالم بالا کے نزدیک قیمت کا وجود تشبیہی یہ ہے کہ وہ خود مبیع ہے اور اجرت کا وجود تشبیہی یہ ہے کہ وہ خود عمل ہے پس ان کے علوم میں اس مبیع اور اس عمل کی خباثت اس قیمت اور اس اجرت کی طرف پہنچ گئی پس لوگوں کے نفوس میں اس صورت علمیہ کا بڑا اثر ہوتا ہے، اور شراب کے باب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بنانے والے پر اور اس کے بنوانے والے پر اور اس کے پینے والے پر اور اس کے اٹھانے والے پر جس کے پاس وہ شراب جائے اس پر لعنت کی ہے۔

میں کہتا ہوں گناہ میں اعانت کرنا اور اس کا پھیلانا اور لوگوں کو اس کی طرف متوجہ کرنا بھی معصیت ہے اور زمین میں فساد برپا کرنا ہے، اور ازاں جملہ نجاست کے ساتھ اختلاط کرنا ہے جیسے مردار اور خون اور گوبر اور پاخانہ وغیرہ گو ان میں نہایت قباحت اور خدا تعالیٰ کی ناخوشی ہے اور ان چیزوں سے شیاطین کے ساتھ مشابہت پیدا ہوتی ہے اور پاکیزگی حاصل کرنا اور ناپاکی سے دور رہنا ان اصولوں میں سے ہے جن کے قائم کرنے کے لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا گیا تھا اور اس پاکیزگی سے ملائکہ کے ساتھ مشابہت پیدا ہوتی ہے اور پاکیزہ لوگوں کو خدا تعالیٰ پسند فرماتا ہے اور جبکہ کسی قدر مخالطت سے چارہ نہ تھا کیونکہ اس دروازہ کو بالکل بند کرنے میں لوگوں پر دقت تھی اس واسطے ضروری ہوا کہ ان ناپاک چیزوں کے اختلاط کے ساتھ پیشہ اختیار کرنے اور ان کی تجارت کرنے سے منع کیا جائے اور نجاست کے معنی میں وہ بیہودہ کام بھی داخل ہے جس سے حیا کی جاتی ہے، جیسے نر کو مادہ پر چھوڑنا اور اسی لئے مردار کی بیع کو حرام کیا اور پچھنے لگانے کے پیشے سے منع فرمایا اور بوقت ضرورت آپ نے فرمایا: اس کو اپنے اونٹ کو کھلا دے اور نر کو مادہ پر چھوڑنے کی اجرت سے منع فرمایا اور ایک روایت میں اونٹ کے گابن کرنے کا لفظ آیا ہے اور کرامت کی صورت میں

رخصت دی ہے اور وہ یہ ہے کہ بلا شرط کئے اس کو کچھ دے دیا جائے جس کے پاس گابن کرنے والا جانور ہے۔

اور من جملہ اسباب کراہت کے یہ ہے کہ عاقدین کے درمیان عوضین میں ابہام ہونے کی وجہ سے منازعت ختم نہ ہو یا وہ عقد دو بیع کے درمیان ایک بیع ہو یا رضا کا پایا جانا بغیر مبیع کو دیکھے ممکن نہ ہو اور اس نے اس کو ہنوز نہ دیکھا ہو یا بیع میں ایسی شرط ہو جس سے بعد میں نزاع ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مضامین اور ملاقیح کی بیع سے منع فرمایا ہے، مضامین سے مراد وہ نطفہ ہے جو نروں کی پشتوں میں ہے اور ملاقیح وہ بچے ہیں جو ہنوز مادہ کے پیٹ میں ہیں، اور بچے کے بچے کی بیع سے اور قرض کے ساتھ بیع کرنے سے اور ایک بیع میں دو بیع کرنے سے منع فرمایا مثلاً اس طرح فروخت کرے کہ اگر نقد ہے تو ایک ہزار اور قرض ہے تو دو ہزار کیونکہ عقد کے وقت ان دو امروں میں سے ایک امر کی تعیین نہیں پائی جاتی، اور بعض نے یہ بیان کیا ہے کہ اس کی یہ صورت ہے کہ ایک شخص اس طرح کہے کہ تو یہ چیز میرے ہاتھ ہزار میں بیچ دے بشرطیکہ فلاں چیز کو اتنی قیمت سے فروخت کرے اور یہ ایسی شرط ہے جس پر بعد میں شرط کرنے والا حجت پکڑ سکتا ہے اور جھگڑا کر سکتا ہے، اور از آں جملہ یہ صورت ہے کہ بیچنے والا خریدنے والے سے یہ شرط کر لے کہ اگر تو اس چیز کو فروخت کرے تو میں ہی اس کا زیادہ حقدار ہوں اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایسی بیع میں فرمایا کہ یہ تیرے لئے حلال نہیں ہے کیونکہ اس میں ایک کے لئے شرط ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مبیع میں سے کسی چیز کے مستثنیٰ کرنے سے جب تک معلوم نہ ہو نہی فرمائی ہے مثلاً کوئی شخص کسی چیز کے دس ٹوکرے فروخت کرے اور بلا تعیین اس میں سے کچھ مستثنیٰ کر لے، کیونکہ اس کے اندر جہالت پائی جاتی ہے جس سے جھگڑا قائم ہو سکتا ہے اور ہر جہالت سے بیع فاسد نہیں ہوتی کیونکہ بہت سی چیزوں کا بیع میں ذکر نہیں ہوتا اور اگر تمام امور کی تفصیل کی جائے تو اس میں بڑا ضرر ہے بلکہ بیع کو فاسد کرنے والی وہ جہالت ہے جس سے جھگڑا برپا ہوتا ہو اور از آں جملہ یہ ہے کہ اس بیع سے کوئی دوسرا معاملہ مقصود ہو جس کا وہ ضمناً یا اس بیع کے ساتھ امیدوار ہے کیونکہ اگر مطلوب فوت ہو جائے گا تو وہ نہ اس کا مطالبہ کر سکتا ہے اور نہ سکوت کر سکتا ہے اور ایسی بات خواہ مخواہ بغیر کسی حق کے خصومت کا سبب ہوتی ہے اور اس میں پورا پورا کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''بیع اور قرض درست نہیں اور نہ ایک بیع میں دو شرطیں حلال ہیں، مثلاً یہ کہے کہ میں نے تجھ سے اس شرط پر بیع کی کہ تو مجھے اس قدر قرض دے اور دو شرطوں کے معنی یہ ہیں کہ حقوق بیع کو اور اس کے ساتھ کسی خارج چیز کو شرط کرے مثلاً یہ شرط لگائے کہ مجھ کو فلاں چیز ہبہ کردے یا کسی سے میری سفارش کردے یا اگر تجھ کو فروخت کرنے کی ضرورت ہو تو میرے ہی ہاتھ فروخت کرنا وعلی ہذا القیاس، پس ان سب صورتوں میں ایک بیع میں دو شرطیں پائی گئیں۔

اور از آں جملہ اسباب کراہت کے یہ ہے کہ عاقد کے ہاتھ سے تسلیم نہ پائی جائے مثلاً مبیع ایسی چیز ہے جو بائع کے ہاتھ میں نہیں ہے بلکہ وہ ایک حق ہے جو کسی غیر پر ہے یا وہ ایسی چیز ہے کہ جب تک وہ اپنے مقدمہ کو قاضی کے پاس پیش نہ کرے یا گواہ قائم نہ کرے یا اس کے حاصل کرنے میں کوشش نہ کرے یا اس پر قبضہ نہ کرلے اور اس کی ناپ تول نہ کرالے وہ اس چیز کو حاصل نہیں کرسکتا کیونکہ اس میں ایک قضیہ کے اندر دوسرے قضیہ کے پیدا ہونے کا احتمال ہے یا دھوکہ کے پائے جانے کا اور اس چیز کے حاصل نہ ہونے کا احتمال ہے اور اسی طرح ہر اس چیز کی بیع ہے جو تیرے پاس موجود نہیں ہے پس تو اس کو بغیر کوشش کے حاصل نہیں کرسکتا اور بسا اوقات خریدار بیچنے والے سے اس شئے کے قبضہ کا مطالبہ کرتا ہے پس وہ اس کے پاس نہیں ہوتی سو یہ اس سے مطالبہ کرتا ہے جس پر اس کا حق ہے یا جنگل میں شکار کرنے جاتا ہے یا بازار سے خریدنے کا قصد کرتا ہے یا اپنے کسی دوست سے ہبہ کے طور پر لینا چاہتا ہے اور یہ بڑے بڑے جھگڑوں کا پیدا کرنا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو چیز تیرے پاس نہیں ہے اس کی بیع نہ کر'' اور بیع غرر سے آپ نے منع فرمایا اور وہ یہ ہے کہ مبیع کے موجود ہونے یا نہ ہونے اور اس کے ملنے یا نہ ملنے کا یقین نہ ہو، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو شخص اناج خریدے تو قبضہ کرنے سے پیشتر اس کو فروخت نہ کرے'' بعض نے کہا ہے کہ یہ حکم اناج کے ساتھ ہی مخصوص ہے کیونکہ زیادہ تر غلہ کا لین دین رہتا ہے اور اس کی زیادہ حاجت پڑتی ہے اور جب تک اس کو صرف نہ کیا جائے آدمی اس سے منتفع نہیں ہوسکتا اور جب تک خریدار نے اس پر قبضہ نہیں کیا ہے تو اکثر بیچنے والے کا اس اناج میں تصرف کرنے اور جھگڑے میں جھگڑا پیدا ہونے کا احتمال ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ حکم تمام

منقولات میں جاری ہے کیونکہ ان میں تغیر اور نقصان کے پیدا ہونے کا احتمال ہے پس اس سے خصومت پیدا ہوتی ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں ہر چیز کو مثل اناج کے سمجھتا ہوں اور ہم نے علت ذکر کی ہے اس کے اعتبار سے یہی زیادہ قیاس کے موافق ہے، اور از اں جملہ کرامت کے وہ چیزیں ہیں جن میں منازعت کا زیادہ گمان ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں واقع ہوئے اور آپ نے معلوم کرلیا کہ ان میں جھگڑے پیدا ہوتے ہیں جیسے زید بن ثابتؓ نے بیان کیا کہ اہل جاہلیت ان آفات پر جو پھلوں کو عارض ہوتی تھیں جھگڑا کیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے پھل گل گئے اور گر پڑے لہٰذا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پھلوں کی خرید و فروخت سے جب تک ان کا کار آمد ہونا ظاہر نہ ہو جائے منع فرمایا مگر اس صورت میں جبکہ فی الحال پھلوں کو توڑنا شرط کرلیا جائے تو جائز ہے اور اناج کی بالوں سے جب تک سفید نہ ہو جائیں اور آفت سے محفوظ نہ ہو جائیں بیع کرنے سے منع فرمایا ہے اور آپ نے فرمایا "دیکھو! خدا جب کسی کے پھلوں کو خراب کر دے تو پھر وہ کس چیز کے عوض میں اپنے بھائی کا مال لیتا ہے" یعنی اس میں دھوکہ ہے کیونکہ ایسی صورت میں مبیع کے ہلاک ہونے کا خطرہ ہے پس خریدار کو مبیع حاصل نہ ہو سکے گا اور قیمت اس کے ذمہ لازم ہو چکی ہے اور اسی طرح سالہا سال کے لئے بیع کرنا منع ہے، اور از اں جملہ اسباب کراہت کے یہ ہے کہ وہ شہر کی بدانتظامی کا باعث ہو اور بعض کو بعض سے ضرر پہنچتا ہو پس ایسی بیوع سے منع کرنا اور لوگوں کو ان سے دور رکھنا واجب ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "بیع کے لئے بنجاروں سے باہر جا کر نہ ملا کرو اور نہ ایک شخص دوسرے کی بیع پر بیع کرے اور نہ کوئی شخص اپنے بھائی کے سودا کرتے وقت سودا کرے اور نہ تم آپس میں ایک دوسرے پر نرخ بڑھاؤ اور نہ کوئی شہر والا باہر والے کے لئے بیع کرے"۔

میں کہتا ہوں بنجاروں سے ملنا یہ ہے کہ جب سوداگر لوگ باہر سے مال بھر کر لاتے ہیں تو ان کے شہر میں داخل ہونے سے پیشتر بعض لوگ ان سے مل کر نرخ معلوم کر لیتے ہیں پس ان سے شہر کے نرخ سے ارزاں خرید و فروخت کرتے ہیں اور اس میں فروخت کرنے والے کا نقصان ہے کیونکہ اگر وہ بازار میں آ کر فروخت کرتا تو اس کو زیادہ قیمت ملتی اور اس لئے بائع کو جبکہ اس کو نقصان کا علم ہو جائے اس بیع کے رد کرنے کا اختیار ہے اور اس میں عام لوگوں کا بھی ضرر ہے

کیونکہ اس تجارت میں تمام اہل شہر کا حق ہے اور مصلحت شہر کا مقتضی یہ ہے کہ ہر حاجت مند درجہ بدرجہ مقدم کیا جائے پس اگر حاجت میں سب برابر ہو تو ان میں برابری کی جائے یا ان میں قرعہ ڈالا جائے پس قافلہ سے پہلے مل کر ایک شخص کا اس کو حاصل کر لینا ایک قسم کا ظلم ہے اور شہر والوں کو اس بیع کے رد کرنے کا اختیار نہیں ہے کیونکہ اس شخص نے ان لوگوں کے مال کا کچھ نقصان نہیں کیا بلکہ جس چیز کی ان کو امید تھی وہ چیز اس نے ان سے روک لی، اور بیع پر بیع کرنا اپنے ساتھ کے تاجروں پر تنگی کرنا ہے اور ان کے ساتھ بد معاملگی ہے اور بائع اول کا حق متوجہ ہو چکا ہے اور اس کے رزق کی صورت ظاہر ہو چکی ہے، پس اس کو بگاڑنا اور اس کے معاملہ میں دخل دینا ایک قسم کا ظلم ہے اور اسی طرح اپنے بھائی کی قیمت پر قیمت لگانا خریداروں پر تنگی کرنا ہے اور ان کے ساتھ برائی کرنا ہے اور بہت سی عداوتیں اور جھگڑے ان دونوں سے پیدا ہو جاتے ہیں، اور نجش اس کو کہتے ہیں کہ مبیع کی خریداری کا قصد کئے بغیر خریداروں کو فریب میں ڈالنے کے لئے قیمت زیادہ لگانا اور اس میں جس قدر ضرر ہے وہ پوشیدہ نہیں ہے اور شہری کا باہر والے کے لئے بیع کرنا یہ ہے کہ باہر والا اپنا اسباب لاد کر شہر میں اس ارادہ سے لائے کہ اس کو اس روز کے نرخ سے فروخت کرے پس کوئی شہر والا اس کے پاس آئے اور یہ کہے تو اپنا اسباب میرے پاس چھوڑ دے تاکہ کچھ عرصہ بعد زیادہ نرخ پر فروخت کروں اور اگر باہر والا خود اس کو فروخت کرتا تو ارزاں فروخت کرتا اور اس میں اہل شہر کا نفع ہے اور خود اس کا بھی نفع ہے کیونکہ سوداگروں کو دو طرح سے نفع ہوتا ہے ایک یہ ہے کہ کچھ عرصہ روک کر اس مال کو نہایت حاجتمند کے ہاتھ گراں قیمت پر فروخت کریں پس حاجتمند جو کچھ دیتا ہے اس حاجت کے مقابلہ میں کم محسوس کرتا ہے اور دوسری صورت نفع کی یہ ہے کہ کم نفع پر اس مال کو فروخت کریں اور پھر جلدی سے تجارت کا اور مال لاکر اس میں بھی نفع اٹھائیں اور یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہے اور اس طرح نفع حاصل کرنا مصلحت شہر کے زیادہ مناسب اور زیادہ برکت والا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو تجارت کے مال کو روکے وہ گنہگار ہے'' اور آپ نے فرمایا ''باہر سے غلہ لانے والا مرزوق ہے اور روکنے والا ملعون ہے''۔

میں کہتا ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ باوجود اہل شہر کی احتیاج کے اپنے کسی قدر نفع کی توقع پر سامان کو روکنا اہل شہر کو ضرر پہنچاتا ہے اور وہ شہر کی بدنظمی کا سبب ہے، اور از اں جملہ وہ بیع ہے جس

میں خریدار کو فریب دینا ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اونٹنی اور بکری کو اس کا دودھ روک کر بیع نہ کرو پس جوان کو خریدے تو دودھ نکالنے کے بعد دونوں باتوں میں سے ہر ایک کا اس کو اختیار ہے اگر وہ جانور پسند ہو تو اس کو رکھ لے اور اگر ناپسند ہو تو وہ جانور اور اس کے ساتھ دودھ کے عوض میں ایک صاع چھوارے واپس کردے اور ایک روایت میں گیہوں کے علاوہ ایک صاع اناج کا لفظ آیا ہے''۔

میں کہتا ہوں تصریہ کے معنی تھنوں میں دودھ جمع کرنے کے ہیں تاکہ خریدار زیادہ دودھ سمجھ کر دھوکہ میں آجائے اور جبکہ اس کو خیار مجلس یا خیار شرط کے ساتھ زیادہ مشابہت تھی کیونکہ عقد بیع گویا کثرت دودھ کے ساتھ مشروط ہے اس واسطے اس کو ضمان بالخراج کے باب سے نہیں کیا گیا اور جبکہ دودھ کا وزن اور اس کی قیمت کا اندازہ کرنا اس کے ہلاک اور تلف کرنے کے بعد بہت مشکل تھا بالخصوص شریکوں کے باہمی نزاع کے وقت اور جنگل میں اس واسطے ضروری ہوا کہ اس کے لئے کوئی ایسا اندازہ معتدل جو کثیر الوجود ہو مقرر کردیا جائے جس سے نزاع منقطع ہو جائے اور اونٹنیوں کے دودھ میں ایک طرح کی ہیک ہوتی ہے اور ارزاں ملتا ہے اور بکریوں کا دودھ اچھا ہوتا ہے اور گراں ملتا ہے اس واسطے دونوں کا حکم ایک ہوا پس یہ بات متعین ہوئی کہ ایک صاع اس غلہ میں سے مقرر کیا جائے جو عام کھانے میں آتا ہے جیسے حجاز میں چھوارے اور ہمارے ملک میں جو اور جوار نہ گیہوں اور چاول کیونکہ یہ قوت کے اعتبار سے نہایت گراں اور اعلیٰ درجہ کے ہیں اور بعض نے جن کو اس حدیث پر عمل کرنے کی توفیق نہیں ہوئی انھوں نے اپنی طرف سے ایک قاعدہ مقرر کرلیا اور عذر پیش کیا کہ جس حدیث کو راوی غیر فقیہ روایت کرے جب اس سے قیاس کا دروازہ بند ہوتا ہو تو اس حدیث پر عمل نہیں کیا جائے گا اور یہ قاعدہ اس کے باوجود کہ اس میں ضعف ہے ہماری اس صورت مسئلہ پر منطبق نہیں ہوتا کیونکہ اس حدیث کو بخاری نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت کیا ہے اور وہ بڑے فقیہ تھے اور کیونکہ وہ بہ منزلہ ان مقادیر شرعیہ کے ہے جس کے اندازہ کی خوبی کو عقل جان سکتی ہے لیکن اس اندازہ خاص کی حکمت کو جاننے میں عقل مستقل نہیں ہے شاید وہ لوگ جانتے ہوں جو راسخین فی العلم ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اناج کے اس ڈھیر کی بابت جس کے اندر نمی تھی یہ فرمایا ''تو نے اس کو اناج کے اوپر کیوں نہیں کیا تاکہ ہر شخص اس کو دیکھتا،

جو شخص دھوکہ دے وہ مجھ سے نہیں ہے'' اور از آں جملہ ان چیزوں کی بیع ہے جو مباح الاصل ہیں جیسے وہ پانی جو کثیر اور جاری ہو اور کوئی ظالم شخص اس پر قبضہ کر کے اس کو فروخت کرے کیونکہ اس میں خدا کے مال میں بغیر حق کے تصرف کرنا ہے اور لوگوں کو ضرر پہنچانا ہے اسی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ضرورت سے زائد پانی کی بیع سے منع فرمایا کہ اس کے سبب سے جنگل کی گھانس کا فروخت کرنا لازم آئے۔

میں کہتا ہوں اس کی صورت یہ ہے کہ کوئی شخص کسی چشمہ یا ندی پر قبضہ کر لے اور کسی شخص کے مویشی کو بغیر اجرت لئے پانی نہ پینے دے پس اس میں گھانس کا جو مباح شئے ہے فروخت کرنا لازم آتا ہے یعنی ایسے وقت میں مویشی کا چرنا قیمت دینے پر ہو سکے گا اور یہ باطل ہے اس لئے کہ پانی اور گھانس دونوں مباح ہیں، چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول میں اسی طرف اشارہ ہے ''پس خدا تعالیٰ فرمائے گا آج میں تجھ سے اپنے فضل کو روکتا ہوں جس طرح تو نے اس چیز کے فضل سے روکا تھا جو تیرے ہاتھ کی کمائی نہ تھی'' اور بعض نے کہا ضرورت سے زائد پانی کا اس شخص کے ہاتھ فروخت کرنا جو خود پینا چاہتا ہو یا مویشی کو پلانا چاہتا ہو حرام ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''تین چیزوں میں سب مسلمان شریک ہیں، پانی اور گھانس اور آگ میں''۔

میں کہتا ہوں جبکہ یہ چیزیں کسی کی ملک ہوں تب بھی ان چیزوں میں ہمدردی نہایت مستحب ہے اور اگر کسی کی ملک نہیں ہیں تب تو ان کا حال شرکت میں ظاہر ہے۔

بیع کے احکام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اللہ تعالیٰ سہولت والے آدمی پر رحم کرے جب وہ فروخت کرے اور جب وہ خریدے اور جب وہ تقاضا کرے۔

میں کہتا ہوں سماحت ان اصول اخلاق میں سے ہے جس سے نفس مہذب ہو کر گناہوں کے احاطہ سے نجات پاتا ہے اور نیز سماحت میں شہر کا انتظام بھی ہوتا ہے اور اس پر باہمی امداد کا دارومدار ہے اور بیع وشرا وتقاضا ایسے معاملات ہیں جن میں سماحت کے خلاف امور کا گمان ہوتا ہے اس لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے مستحب ہونے کی تاکید فرمائی اور آپ نے فرمایا ''قسم کھا کر سودا بیچنے سے البتہ جلدی اسباب فروخت ہوتا ہے لیکن برکت نہیں رہتی''۔

میں کہتا ہوں بیع کے اندر زیادہ قسمیں کھانا دو وجہ سے برا ہے ایک تو یہ ہے کہ یہ اہل معاملہ کو دھوکہ میں ڈالنے کا محل ہے دوسرے دل سے اسم الٰہی کی تعظیم کے زائل ہونے کا سبب ہے اور جھوٹی قسم کھانے سے اسباب خوب فروخت ہوتا ہے کیونکہ فروخت کی بنیاد خریدار کو فریب دینے پر ہے لیکن اس سے برکت جاتی رہتی ہے کیونکہ برکت کا مدار فرشتوں کی دعا خیر پر ہے اور معصیت کے سبب سے ان کی دعا کو بعد ہو جاتا ہے بلکہ فرشتے ایسے وقت میں اس شخص پر بددعا کرتے ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اے گروہ تجار بیع کے اندر لغو باتیں اور قسم داخل ہو جاتی ہیں اس لئے تم اس کے ساتھ صدقہ ملا لیا کرو''

میں کہتا ہوں اس میں گناہوں کا کفارہ اور نفس کے غلبہ کے سبب جو اس شخص سے کچھ قصور ہو جاتا ہے اس کا تدارک ہو جاتا ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کے بارے میں جس نے

دنانیر سے کسی چیز کو فروخت کرکے ان کے عوض میں درہم لئے تھے فرمایا ''اگر اسی روز کی قیمت پر دراہم کو لے لے تو کچھ مضائقہ نہیں ہے بشرطیکہ تم دونوں کو جدا ہونے سے پیشتر معاملہ تمام ہوگیا ہو''۔

میں کہتا ہوں کیونکہ اگر وہ دونوں معاملہ تمام کئے بغیر علیحدہ ہوجائیں مثلاً وہ دونوں دنانیر کے دراہم سے بدلنے کی پختگی کو صرافوں کے بیان کرتے یا وزن کش کے وزن کرنے پر موقوف رکھیں یا اسی طرح کسی اور چیز پر موقوف رکھیں تو اس میں حجت اور نزاع کرنے والے کے لئے حجت اور نزاع کرنے کی گنجائش ہے اور معاملہ صاف نہیں ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو شخص چھوارے کے درخت کو گابہ لگنے کے بعد خریدے تو اس درخت کا پھل بیچنے والے کے لئے ہے مگر جس صورت میں خریدار شرط کرے تو اس کے لئے ہے''۔

میں کہتا ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ گابہ لگانا اصل درخت سے زائد ایک فعل ہے اور اس کی ملک میں پھل ظاہر ہوچکا ہے پس اس کا حال اس شئے کا سا ہے جو ایک مکان میں رکھی ہوئی ہو اس واسطے ضروری ہے کہ اس کا حق اس کو دلایا جائے مگر جس صورت میں اس کے خلاف کی تصریح ہوجائے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو شرط کتاب اللہ میں نہیں ہے وہ باطل ہے''۔

میں کہتا ہوں اس سے وہ شرط مراد ہے جس کی مخالفت ظاہر ہوگئی ہے اور حکم الٰہی میں اس کی نفی مذکور ہے یہ مطلب نہیں ہے کہ اس شرط کا بالکل ذکر ہی نہ ہو، اور نبی علیہ السلام نے ولا کی بیع اور اس کے ہبہ کرنے سے منع فرمایا کیونکہ ولا کوئی حاضر اور معین مال نہیں ہے بلکہ وہ ایک حق ہے جو نسب کے تابع ہے پس جس طرح نسب کی بیع نہیں ہوتی اسی طرح ولا کی بھی بیع نہیں ہونی چاہئے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''منافع تاوان کے ساتھ ہیں'' (یعنی جو تاوان دے گا وہی نفع لے گا۔

میں کہتا ہوں نزاع ختم کرنے کی یہی صورت ہے کہ منافع کا مدار مشقت پر رکھا جائے پس جو شخص مبیع کو کسی عیب کے سبب سے رد کردے اور اس سے مبیع کے منافع طلب کئے جائیں تو آمدنی کی مقدار کے ثابت کرنے میں حرج عظیم ہے پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حکم سے منازعت کو ختم کردیا جس طرح قضا میراث کے بارے میں آپ نے منازعت کو اس طرح ختم کیا کہ جاہلیت

کی میراث اسی حالت پر رکھی جائے جس حالت پر تقسیم کی گئی ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''خریدار اور بائع کا جب اختلاف ہو اور مبیع موجود ہو اور کسی کے پاس بینہ نہ ہو تو بائع کا قول معتبر ہے یا ہر دونوں بیع کو رد کر دیں گے''۔

میں کہتا ہوں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے قطع منازعت اس لئے کی کہ اصل بات یہ ہے کہ کوئی شئے بغیر عقد صحیح کے اور باہمی رضامندی کے کسی کی ملک سے خارج نہ ہو پس جب منازعت واقع ہوئی تو اصل کی طرف رد کرنا واجب ہوا اور مبیع قطعی طور پر بائع کا مال ہے اور وہی اس وقت اس پر قابض ہے یا قبل اس عقد کے جس کی صحت ثابت نہیں ہوئی اور معتبر قول صاحب مال کا قول ہے لیکن خریدار کو اختیار ہے کیونکہ بیع کا دارومدار رضامندی پر ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''شفعہ اس چیز میں ہے جو تقسیم نہ کی گئی ہو لیکن جب اس میں حدیں پڑ جائیں اور راستے ہو جائیں تب اس میں شفعہ نہیں، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''ہمسایہ اپنے قریب ہونے کی وجہ زیادہ حقدار ہے''۔

میں کہتا ہوں شفعہ میں اصل ہمسایوں اور شریکوں سے ضرر کا دور کرنا ہے اور میرے نزدیک شفعہ کی دو قسمیں ہیں ایک تو وہ شفعہ ہے جس کی نسبت مالک کو واجب ہے کہ عند اللہ شفیع کو اس شفعہ کی اطلاع دے اور غیر کے مقابلہ میں اس کو ترجیح دے لیکن عدالت کے نزدیک مالک کو اس کے پیش کرنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا اس قسم کا شفعہ اس ہمسایہ کے لئے ہے جو شریک نہیں ہے اور ایک وہ شفعہ ہے جس پر مالک عدالت میں مجبور کیا جاسکتا ہے اور یہ شفعہ صرف اس ہمسایہ کے لئے ہے جو شریک ہے اور احادیث جو اس بات میں وارد ہوئی ہیں ان کی تطبیق کی یہی صورت ہے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس نے اپنے مسلمان بھائی کی بیع کو اس کی ناپسندی کی وجہ سے واپس کیا تو اللہ تعالیٰ نے قیامت کے روز اس کے گناہوں سے درگزر کرے گا''۔

میں کہتا ہوں جس شخص کو عقد کرنے کے بعد افسوس ہو تو اس سے رفع ضرر کے لئے اس بیع کا واپس کرنا مستحب ہے اور واجب نہیں ہے کیونکہ انسان اپنے اقرار کے ساتھ ماخوذ ہوتا ہے اور جس کا التزام کر لیتا ہے وہ بات اس پر لازم ہو جاتی ہے، حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ میں نے اپنا اونٹ فروخت کیا مگر یہ مستثنیٰ کر لیا کہ میں اپنے گھر تک اس پر سوار ہو کر جاؤں گا۔

میں کہتا ہوں اس سے ان چیزوں کے اندر استثنا کا جواز ثابت ہوتا ہے جن میں مناقشہ کا موقع نہ ہو اور دونوں عاقدین باہم سلوک کرنے والے اور فراخ دل ہوں کیونکہ استثنا کرنے کی ممانعت اس وجہ سے ہے کہ اس میں مناقشہ کا احتمال ہوتا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس شخص نے ماں اور اس کے بیٹے میں جدائی ڈالی تو خدا تعالیٰ اس میں اور اس کے دوستوں میں قیامت کے روز جدائی ڈالے گا'' اور ایک مرتبہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے دو غلاموں میں سے جو بھائی بھائی تھے ایک کو فروخت کر دیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ واپس کر لو۔

میں کہتا ہوں ماں اور بچے میں جدائی ان کو وحشت اور رونے پر آمادہ کرتی ہے اور ایسا ہی حال دو بھائیوں میں ہے اس واسطے ضروری ہے کہ تفریق ڈالنے سے انسان کو پرہیز کرنا چاہئے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''جب جمعہ کے نماز کے لئے پکارا جائے تو خدا تعالیٰ کی یاد کی طرف جلدی کرو اور خرید و فروخت چھوڑ دو''۔

میں کہتا ہوں یہ حکم اذان کے ساتھ متعلق ہے جو امام کے خطبہ کے لئے نکلتے وقت ہوتی ہے اور چونکہ بیع وغیرہ میں مشغول ہونا بسا اوقات نماز ترک کرنے اور خطبہ سے غافل ہونے کا باعث ہوتا ہے اس واسطے اس سے نہی فرمائی گئی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے عرض کیا کہ کیا نرخ گراں ہو گیا ہے اس لئے آپ ہمارے لئے نرخ مقرر فرما دیجئے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''نرخ مقرر کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے وہی قابض باسط اور رازق ہے میں یہ چاہتا ہوں کہ خدا تعالیٰ کے پاس اس حال میں جاؤں کہ کوئی مجھ سے اپنے حق کا طالب نہ ہو،

میں کہتا ہوں جبکہ خریداروں اور فروخت کرنے والوں کو عدل کا حکم جس سے کسی کو ضرر نہ پہنچے یا دونوں کو برابر ضرر پہنچے نہایت دشوار تھا اس لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے احتیاط برتی تاکہ آپ کے بعد حکام لوگ دستور و طریقہ نہ مقرر کر لیں لیکن اس کے باوجود اگر تاجروں کی طرف سے علانیہ ظلم معلوم ہو جس میں لوگوں کو شک نہ ہو تو اس کو بدلنا جائز ہے کیونکہ اس میں ملک کی بربادی ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''اے ایمان والو جب تم ایک وقت مقرر تک قرض کا لین دین کرو تو اس کو لکھ لو'' الآیہ۔

واضح ہو کہ قرض مناقشہ کے اعتبار سے تمام معاملات میں بڑھ کر ہے اور لڑائی کے اعتبار سے

سب معاملات میں زیادہ ہے اور بوقت حاجت اس سے چارہ بھی نہیں ہے پس اس وجہ سے اللہ تعالی ۔ نے لکھ لینے اور گواہ کرنے کی تاکید فرمائی اور رہن اور کفالت کو مشروع کیا اور گواہی کے چھپانے کے گناہ کو بیان فرمایا اور لکھ لینے اور گواہی دینے کے کافی ہونے کو واجب کیا اور وہ عقود ضروریہ سے ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو لوگ پھلوں میں ایک برس اور دو برس اور تین برس کی بیع سلم (۱) کرتے تھے تب آپ نے فرمایا ''جو کوئی بیع السلم کرے تو کیل معلوم اور وزن معلوم کے ساتھ ایک مقرر وقت تک کرے۔

میں کہتا ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے مناقشہ کا ارتفاق ہو جائے اور فقہا نے ان تینوں پر ان اوصاف کو بھی قیاس کیا ہے جن سے بغیر وقت کے شئے بیان ہو سکتی ہے اور قرض کا دارومدار ابتدا میں تبرع پر ہوتا ہے اور اس میں رعایت کے معنی بھی پائے جاتے ہیں پس اسی وجہ سے اس میں دیر کرنا جائز ہوا اور زیادہ لینا حرام ہوا، اور رہن کا مبنی مضبوطی پر ہوتا ہے اور وہ مضبوطی قبضہ کرنے سے ثابت ہوتی ہے اس واسطے اس میں قبضہ کرنا شرط کیا گیا، اور میرے نزدیک ان دونوں حدیثوں میں کوئی تعارض نہیں، پہلی حدیث تو یہ ہے: رہن کرنا اس شئے کو جس کو رہن کیا ہے اس کے مالک کے ہاتھ سے نہیں روکتا جو کچھ اس سے منافع ہیں وہ سب اس کے لئے ہیں اور جو کچھ اس کا خسارہ ہے وہ بھی اسی پر ہے، اور دوسری حدیث یہ ہے: سواری کا خرچ اٹھانے کی وجہ سے اس کی سواری کی جاسکتی ہے جس وقت کہ وہ مرہون ہے اور دودھ دیتے جانور کا دودھ اس کا خرچ اٹھانے کے سبب سے پیا جاسکتا ہے جس وقت کہ وہ مرہون ہے اور سوار ہونے والے اور دودھ پینے والے کو اس کا خرچ برداشت کرنا پڑے گا'' اور تعارض نہ ہونے کا سبب یہ ہے کہ پہلی حدیث کا حکم دستور کے موافق ہے لیکن جب راہن اس کا خرچ نہ دے اور اس چیز کے ہلاک ہونے کا خوف ہو اور مرتہن اس کا خرچ اٹھائے تو اس وقت جس قدر لوگ انصاف سمجھتے ہوں اس سے مرتہن نفع حاصل کر سکتا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ناپنے والوں اور وزن کرنے والوں سے فرمایا ہے ''تم کو ایسی دو چیزیں سپرد کی گئی ہیں جن میں تم سے قبل امم سابقہ ہلاک ہو چکی ہیں''۔

---

(۱) اس بیع کو کہتے ہیں جس میں یہ کہا جائے کہ اب کی فصل میں جو فلاں اناج پیدا ہوگا ہم نے اتنی مدت پر اس حساب سے خریدا، اس کو عرف میں بدلا کہتے ہیں۔

میں کہتا ہوں کم تولنا حرام ہے کیونکہ اس میں خیانت اور بد معاملگی ہے، اور حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کا حال جو کچھ ہو چکا ہے خدا تعالیٰ نے اپنی کتاب قرآن مجید میں اس کا ذکر فرمایا ہے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو کوئی شخص مفلس ہو جائے پھر کوئی شخص اس مفلس کے پاس بعینہٖ اپنے مال کو پائے تو وہی اس کا مستحق ہے''۔

میں کہتا ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ دراصل اسی کا مال تھا اور اس میں کوئی اس کا شریک نہ تھا پھر اس نے اس کو بیچ دیا اور وہ اس کو بیچ کر اپنے قبضہ سے نکالنے پر بغیر قیمت کے راضی نہ تھا پس بیع قیمت ادا کرنے کے ساتھ مشروط تھی پس جب اس نے قیمت ادا نہ کی تو بائع کو اس کے فسخ کا اختیار ہے جب تک کہ مبیع بعینہٖ موجود ہے لیکن جب مبیع ضائع ہو جائے تو مشتری کے لئے مبیع کا لوٹا ممکن نہیں رہا، پس دوسرے قرضوں کی طرح اس کا ایک قرض ہو جائے گا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو شخص یہ پسند کرے کہ خدا تعالیٰ اس کو روز قیامت میں سختیوں سے نجات دے تو اس کو چاہئے کہ وہ تنگدست کو مہلت دے یا اس کو معاف کر دے''۔

میں کہتا ہوں یہ اس نرمی کی طرف ترغیب ہے جو ان چیزوں کے اصول میں سے ہے جو دنیا وآخرت میں نفع دیتی ہیں اور ہم ان کا ذکر کر چکے ہیں، اور نبی علیہ السلام نے فرمایا ''مالدار کا قرض ادا کرنے میں دیر کرنا ظلم ہے اور جب تم میں سے کسی کا قرض کسی مالدار کے سپرد کر دیا جائے تو وہ اس کو منظور کر لے''۔

میں کہتا ہوں یہ امر استحباب ہے کیونکہ اس میں مناقشہ کا انقطاع ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''مالدار آدمی کا نادہند ہونا اس کی آبرو اور عقوبت کو حلال کرتا ہے۔

میں کہتا ہوں آبرو اور عقوبت کا حلال ہونا یہ ہے کہ اس کے ساتھ سخت کلامی کی جاتی ہے اور اس کو قید کیا جاتا ہے اور بیع پر مجبور کیا جاتا ہے جبکہ اس کے پاس اس کے سوا اور کوئی مال نہیں ہوتا، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''دو مسلمانوں میں صلح جائز ہے مگر وہ صلح جائز نہیں جو حلال کو حرام کر دے یا حرام کو حلال کر دے، اور سب مسلمان اپنی شرطوں پر قائم رہیں سوائے اس شرط کے جو حلال کو حرام کر دے یا حرام کو حلال کرے''، پس من جملہ اس صلح کے کسی قدر قرض کا معاف کر دینا ہے جیسا کہ ابن ابی حدرد کے قصہ میں ہوا، اور یہ حدیث معاملات کے باب میں من جملہ دیگر اصول کے ایک اصول ہے۔

تبرع اور تعاون کا بیان

تبرع کی چند قسمیں ہیں ایک تو صدقہ ہے جبکہ اس سے خدا تعالیٰ کی خوشنودی مراد ہو اور اس کے مستحق وہ لوگ ہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ذکر فرمایا ہے: **انما الصدقات للفقراء،** الآیۃ، اور دوسرے ہدیہ ہے جبکہ اس کے ساتھ اس شخص کو خوش کرنا مقصود ہو جس کو وہ شئے دی گئی ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس کو کوئی چیز عطا کی جائے اور اس کے پاس کوئی چیز موجود ہو تو وہ اس کا بدلہ دے اور جس کے پاس کچھ نہ ہو تو ہو اس کی مدح کرے پس اگر اس نے اس کی مدح کی تو اس نے اس کا شکر ادا کیا اور جس نے اس کو پوشیدہ رکھا تو اس نے ناشکری کی اور جس نے ایسی چیز کو ظاہر کیا جو اس کی حاصل نہیں ہے تو وہ شخص ایسا ہے جیسے جھوٹ کے دو کپڑے پہننے والا''۔

واضح ہو کہ تحفہ دینے سے لوگوں میں محبت پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے اور یہ مقصود اس کے بغیر تمام نہیں ہوتا کہ اسی جیسی چیز دینے والے کو بھی ملنی چاہئے اس واسطے کہ تحفہ دینے سے صرف اس محبت کا اظہار ہوتا ہے جو تحفہ دینے والے کو مہدی لہ سے ہے اور اس سے جانب آخر کی محبت ظاہر نہیں ہوتی اور نیز یہ بات بھی ہے کہ دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ سے بہتر ہے اور جو کوئی کسی کو کچھ دے تو یہ بھی کچھ دے پس اگر نہ دے سکتا ہو تو اس کا شکریہ ادا کرے اور اس کی دی ہوئی چیز کا اظہار کرے کیونکہ اس کی مدح کرنا اس کی نعمت کو اول مرتبہ میں شمار کرنا اور اس کی محبت کو دل میں رکھنا ہے اور مدح کرنا محبت پیدا کرنے میں وہی کام انجام دیتا ہے جو ہدیہ دینے سے ہوتا ہے اور جس نے نعمت کو چھپایا تو اس نے اس چیز کی مخالفت کی جس کا دینے والے نے ارادہ کیا تھا اور اس نے الفت کی مصلحت کا نقض کیا اور اس کی حق تلفی کی اور جس نے اس چیز کا اظہار کیا جو حقیقت میں

اس کے پاس نہیں ہے تو یہ ایک جھوٹ ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا قول کہ ''وہ شخص ایسا ہے جیسے جھوٹ کے دو کپڑے پہننے والا'' تو اس کے یہ معنی ہیں کہ اس کا حال اس شخص کا سا ہے جس نے فریب کی چادر اوڑھی اور فریب کی لنگی باندھی اور اپنے تمام بدن کو فریب سے ڈھانکا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس کے ساتھ کوئی بھلائی کی جائے اور وہ بھلائی کرنے والے کے لئے جزاک اللہ خیرا کہہ دے تو اس نے پورے طور سے اس کی تعریف کر دی''۔

میں کہتا ہوں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لفظ کو اس لئے معین فرمایا کہ ایسے مقام میں اس سے زیادہ کہنا مبالغہ اور الحاح ہے اور اس سے کم کرنا احسان کا کتمان اور اس کو حقیر سمجھنا ہے اور بعض مسلمان بعض کو جو ہدیہ پیش کرے ان سب میں بہتر وہ چیز ہے جو آخرت کو یاد دلائے اور تمام امور کو خدا تعالیٰ کے سپرد کرے اور یہ لفظ اس تمام کے لئے جو ہم نے ذکر کیا کافی مقدار ہے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''باہم تحفے دیا کرو کیونکہ تحفے رنجشیں دور کرتے ہیں اور ایک روایت میں ہے کہ ''ان سے دل کا غصہ جاتا رہتا ہے''۔

میں کہتا ہوں ہدیہ خواہ کم ہی کیوں نہ ہو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ بھیجنے والے کے دل میں مہدی لہ کی تعظیم اور اس کی عظمت ہے اور اس سے محبت کرتا ہے اور اس کی جانب میلان ورغبت رکھتا ہے اور اس حدیث میں اسی طرف اشارہ ہے ''کوئی پڑوسن اپنی پڑوسن کو حقیر نہ سمجھے اگرچہ بکری کے کھر کے ساتھ ہو پس اس واسطے رنجش دور کرنے کا عمدہ طریقہ قرار پایا اور کسی شہر یا قبیلہ میں پوری پوری الفت پیدا ہونے سے رنجش دور ہو سکتی ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' جو کوئی کسی کو خوشبو دے تو اس کو رد نہ کرے کیونکہ یہ ہلکی چیز اور خود خوشبودار شئے ہے''۔

میں کہتا ہوں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خوشبو وغیرہ رد کرنے کو اس لئے ناپسند فرمایا کہ اس کے قبول کر لینے میں زیادہ بار نہیں ہوتا اور لوگوں میں اس کے ہدیہ دینے کا رواج بھی ہے اس واسطے اس کے قبول کر لینے میں لینے والے کو زیادہ عار نہیں ہوتی اور نہ اس کے ہدیہ دینے میں زیادہ حرج ہوتا ہے اور اس کو باہم رواج دینے میں آپس کی الفت ہوتی ہے اور اس کے واپس کرنے میں باہمی فساد اور رنجش کا دل میں ہونا ظاہر ہوتا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اپنی ہبہ کی ہوئی چیز کو واپس لینے والا اس کتے کے مانند ہے جو اپنی قے کو پھر کھا جاتا ہے ایسی بری مثال ہمارے

مناسب نہیں ہے''۔

میں کہتا ہوں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہبہ کی ہوئی چیز کے واپس لینے کو اس واسطے ناپسند فرمایا کہ اس کے واپس لینے کا منشا جس کو وہ اپنے مال سے علیحدہ کر چکا تھا اور اس سے قطع تعلق کر لیا تھا یا تو اس دی ہوئی چیز کے ساتھ حرص کا پیدا ہونا یا اس شخص سے ناخوشی یا اس کی ضرر رسانی ہے اور یہ سب اخلاق مذمومہ میں داخل ہیں اور نیز ہبہ کے پورا کر دینے اور مضبوط کر دینے کے بعد اس کے واپس لینے میں عداوت اور رنجش کا پیدا کرنا ہے بخلاف اس کے کہ پہلے ہی سے کچھ نہ دیا ہوتا اس واسطے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس چیز کے واپس لینے کو جس کو وہ اپنی ملک سے علیحدہ کر چکا تھا کتے کا قئے کر کے کھا لینے کے ساتھ تشبیہ دی تا کہ لوگوں کے لئے ظاہر میں اس کے معنی متمثل ہو جائیں اور لوگوں کے لئے اس حال کی قباحت کو خوب اچھی طرح سے بیان کر دیا مگر جب ان دونوں کے درمیان کوئی ایسا واسطہ ہو جو باہم مناقشہ دور کر دے تو وہاں واپس لینے میں کوئی حرج نہیں ہے جیسے باپ بیٹے سے واپس لے لے، چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''بجز باپ کے جو اپنے بیٹے سے واپس لے لے'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کے بارے میں جس نے اپنی بعض اولاد کو کچھ دیا تھا اور بعض کو نہیں دیا تھا فرمایا ''کیا تو پسند کرتا ہے کہ وہ سب تیرے ساتھ بھلائی کرنے میں برابر ہوں؟ اس نے عرض کیا ہاں، آپ نے فرمایا کہ بس اب نہیں''۔

میں کہتا ہوں ہبہ کے اندر بعض اولاد کو بعض پر فضیلت دینے کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لئے ناپسند فرمایا کہ اس سے ان کے درمیان عداوت پیدا ہوتی ہے اور باپ کی نسبت رنجش پیدا ہوتی ہے، پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرف اشارہ کیا کہ بعض کو بعض پر فضیلت دینے سے اس اولاد کے دل میں رنج پیدا ہوگا جس کے ساتھ کوتاہی کی گئی ہے اور وہ صلہ رحمی کرنے میں کوتاہی کرے گا اور اس میں گھر کی تباہی ہے۔

اور من جملہ تبرع کے وصیت ہے اگر وہ وصیت موت کے وقت سے قریب ہوتی ہے اور وصیت کا دستور اس لئے جاری ہوا کہ بنی آدم میں ملک منازعت کی وجہ سے عارض ہوتی ہے پس جب موت کی وجہ سے اس کا مال سے مستغنی ہونا قریب ہو جاتا ہے تو بہتر یہ ہے کہ جو کچھ اس سے اس میں کوتاہی ہوئی ہے اس کا تدارک ہو جائے اور جن کے حقوق اس پر واجب ہیں ان کے ساتھ

ایسے وقت میں نیک سلوک کرے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''تہائی مال کی وصیت کر اور تہائی مال بہت ہے''۔

واضح ہو کہ تمام عرب اور عجم کی قوموں میں بیشمار مصلحتوں کی وجہ سے میت کا مال اس کے وارثوں کی طرف منتقل ہوتا ہے اور یہ چیز ان کے مابین ایک جبلی اور ضروری بات ہوگئی ہے پس جب وہ مریض ہوتا ہے اور مرنے کے قریب ہو جاتا ہے تو ان وارثوں کے لئے مالک ہونے کی راہ نکل آتی ہے پس ان کو توقعات سے ان کو ناامید کرنا ان کے حق کا تلف کرنا اور ان کے حق میں کوتاہی کرنا ہے، اور نیز حکمت کی بات یہ ہے کہ اس کے مرنے کے بعد اس کے مال کو وہ شخص لے جو سب لوگوں سے زیادہ اس کا دوست اور مددگار اور سب سے زیادہ اس کے ساتھ نیک سلوک کرنے والا ہے اور اس مرتبہ میں ماں، باپ، اولاد اور جتنے ذوی الارحام ہیں ان سے زیادہ کوئی نہیں ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''اور ذوی الارحام میں سے بعض لوگ بعض کے ساتھ اولیٰ ہیں اللہ تعالیٰ کی کتاب میں'' اور اس کے باوجود بسا اوقات ایسے امور پیش آتے ہیں جن سے دوسروں کے ساتھ سلوک کرنا پڑتا ہے اور بسا اوقات خاص خاص حالات ہیں اس بات کو ضروری کر دیتے ہیں کہ ان کے علاوہ دوسروں کو اختیار کیا جائے اس واسطے ایک حد کا مقرر کرنا جس سے لوگ تجاوز نہ کریں ضروری ہوا اور وہ حد ثلث ہے کیونکہ وارثوں کو ترجیح دینا ضروری ہے اور وہ اس طرح ہوسکتی ہے کہ ان کو نصف سے زیادہ دیا جائے اس واسطے ان کے لئے دو تہائی اور ان کے علاوہ دوسروں کے لئے ایک تہائی مقرر کیا گیا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''تحقیق اللہ تعالیٰ نے حق دار کو اس کا حق عطا فرمایا ہے لہٰذا کسی وارث کے لئے وصیت نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں جبکہ وصیت کے اندر ایام جاہلیت میں لوگ ضرر رسانی کرتے تھے اور وصیت کرنے میں حکمت واجبہ کا اتباع نہیں کرتے تھے اور بعض لوگ حق کو چھوڑ کر اور اس شخص کو ترک کر کے جس کے ساتھ سلوک کرنا واجب تر ہے اپنی ناقص رائے سے بعید تر لوگوں کو اختیار کرتے تھے اس واسطے ضروری ہوا کہ اس دروازہ کو بند کر دیا جائے اور یہ بات واجب ہوئی کہ ایسی حالت میں قرابتوں کے اعتبار سے قواعد کلیہ کا لحاظ کیا جائے اور اشخاص کے اعتبار سے خصوصیات کا لحاظ نہ کیا جائے پس جب ان کی منازعت کو ختم کرنے کے لئے اور ان کی دل کی رنجشوں کو دور کرنے کے

لئے وراثت کے احکام مقرر ہوئے تو یہ حکم بھی ضروری ہوا کہ کسی وارث کے لئے وصیت جائز نہ ہو کیونکہ اس کے جائز کرنے میں اس حد مقرر کو توڑنا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''کسی مسلمان شخص کے لئے درست نہیں ہے کہ اس کے پاس وصیت کرنے کے لئے کوئی چیز موجود ہو اور وہ اس حال میں رات بسر کرے کہ اس کے پاس اس کی وصیت لکھی ہوئی نہ ہو''۔

میں کہتا ہوں وصیت میں جلدی کرنا بہتر ہے تاکہ وہ اس بات سے بچ جائے کہ اچانک اس کو موت آگھیرے یا فوری طور پر کوئی حادثہ پیش آجائے پس اس سے وہ مصلحت فوت ہو جائے جس کا قائم کرنا اس کے نزدیک ضروری تھا اور اس وقت وہ حسرت کرنے لگے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس شخص کو کوئی مکان عمر بھر رہنے کو دیا گیا'' الحدیث،

میں کہتا ہوں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بہت سے ایسے جھگڑے تھے جو منقطع نہ ہو سکتے تھے لہٰذا ان کا قطع کرنا من جملہ ان مصلحتوں کے ہوا جن کے قائم کرنے کے لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے، مثلاً سود اور قتل وغیرہ، اور کچھ لوگ دوسروں کو عمر بھر رہنے کے لئے مکان دیدیا کرتے تھے پھر یہ دونوں مر جاتے اور ان کے بعد دوسرا قرن پیدا ہوتا تو ان پر حال مشتبہ ہو جاتا اور باہم جھگڑا شروع ہو جاتا، پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا کہ اگر ہبہ کرنے والے نے تصریح کر دی ہے کہ وہ تیرے لئے ہے اور تیرے بعد والوں کے لئے ہے تو یہ ہبہ ہے کیونکہ اس نے وہ بات بیان کر دی جو خالص ہبہ کے لوازم میں سے ہے اور اگر اس نے یہ بات کہی کہ جب تک تو زندہ ہے وہ تیرے لئے ہے تو وہ اس کی مدت حیات تک اعارہ ہے کیونکہ اس نے ایسی قید کے ساتھ مقید کیا ہے جو ہبہ کے منافی ہے۔

اور من جملہ تبرعات کے وقف ہے اور اہل جاہلیت اس سے واقف نہ تھے پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان مصلحتوں کی وجہ سے جو اور صدقات میں نہیں پائی جاتیں وقف کا استنباط کیا کیونکہ انسان بسا اوقات اللہ تعالیٰ کی راہ میں بہت سا مال خرچ کر دیتا ہے پھر وہ مال فنا ہو جاتا ہے اور ان فقرا کو دوبارہ ضرورت پڑتی ہے اور دیگر فقرا جو آتے ہیں تو وہ بھی محروم ہی رہتے ہیں پس عوام کے لئے اس سے بہتر اور نافع کوئی بات نہیں ہے کہ ایک شئے فقرا اور مسافروں کے لئے روک لی جائے جس کے منافع ان پر صرف ہوا کریں اور اصل مال وقف کرنے والے کی ملک میں باقی رہا

کرے چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا ''اگر تو چاہے تو اس کی اصل کو روک لے اور اس کے ساتھ صدقہ دیا کرے'' پس حضرت عمرؓ نے اس طرح اس کا صدقہ کیا کہ اس کی اصل کو نہ بیچا جائے اور نہ اس کو ہبہ کیا جائے اور نہ کسی کو ورثہ میں دی جائے اور اس کو فقرا میں اور اہل قرابت میں اور غلاموں کے آزاد کرانے میں اور جہاد میں اور مسافروں کے لئے اور مہمانوں کے لئے صدقہ کر دیا اور جو شخص اس کا متولی ہو اس کے حسب دستور کھانے میں اور غیر متمول لوگوں کو کھلانے میں کوئی گناہ نہیں ہے۔

اور معاونت کی بھی چند قسمیں ہیں، از آں جملہ مضاربت ہے اور وہ یہ ہے کہ تجارت کرنے میں ایک شخص کا مال ہو اور دوسرے کی محنت ہو اور نفع جس طرح وہ اس کو مقرر کریں ان کے درمیان مشترک ہو، اور ایک مفاوضت ہے اور وہ یہ ہے کہ دو شخص برابر برابر مال سے تجارت کریں اور وہ دونوں تمام خرید وفروخت میں شریک ہوں اور باہم نفع تقسیم کر لیا کریں اور ہر ایک دوسرے کا کفیل اور وکیل ہو، اور ایک عنان ہے اور وہ یہ ہے کہ اسی طرح مال معین میں شریک ہو کر تجارت کریں اور ہر ایک اس میں دوسرے کا وکیل ہوتا ہے نہ کہ کفیل کہ اس سے دوسرے کے قرضہ کا مطالبہ کیا جائے، اور شرکۃ الصنائع ہے جیسے دو درزی یا دو رنگریز اس طرح پر شرکت کریں کہ ہر ایک محنت کرے اور اجرت دونوں میں تقسیم ہو جائے، اور ایک شرکۃ الوجوہ ہے اور وہ یہ ہے کہ ایسے دو شخص جن کے پاس مال نہیں ہے اس طرح پر شریک ہو جائیں کہ اپنے اعتبار پر خرید وفرخت کریں اور نفع باہم تقسیم ہو جائے اور ایک وکالت ہے کہ ہر ایک اپنے ساتھی کے لئے خرید وفروخت کرے اور ایک مساقات ہے کہ اصل درخت تو ایک شخص کے ہوں اور دوسرا ان کی خبر گیری کرے اور پھل دونوں باہم تقسیم کر لیں، اور ایک مزارعت ہے کہ زمین اور بیج ایک شخص کے ہوں اور محنت اور بیل دوسرے کی جانب سے ہوں اور ایک مخابرت ہے کہ زمین تو ایک شخص کی ہو اور بیج اور بیل اور محنت دوسرے کی جانب سے ہو، اور ایک صورت اور ہے کہ ایک کی صرف محنت ہو اور باقی سب دوسرے کی طرف سے ہو، اور ایک اجارہ ہے اور اس میں مبادلہ اور معاونت کے معنی پائے جاتے ہیں پس اگر صرف منفعت مطلوب ہے تب تو مبادلہ کے معنی غالب ہیں اور اگر کام کرنے والے کی خصوصیت مطلوب ہے تو معاونت کے معنی غالب ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل لوگ ان عقود کو عمل میں لایا کرتے تھے پس ان میں سے جس میں منا قشہ غالب نہیں ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے نہی نہیں فرمائی ہے تو وہ عقد اپنی اباحت پر باقی ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول میں داخل ہے ''مسلمان اپنی شروط پر ہیں۔

اور رافع بن خدیجؓ کی حدیث میں راویوں کا سخت اختلاف ہے اور بڑے بڑے تابعین شرکت مزارعت کیا کرتے تھے اور اس کے جواز پر اہل خیبر کے معاملہ کی حدیث دلالت کرتی ہے اور جن احادیث میں اس سے نہی پائی جاتی ہے وہ احادیث نہروں کے اوپر پیداوار یا کسی خاص قطعہ کے بدلہ کرایہ دینے پر محمول ہے اور رافع رضی اللہ عنہ کا یہی قول ہے، یا وہ نہی تنزیہ اور ارشاد پر محمول ہے اور ابن عباس رضی اللہ عنہ کا یہی قول ہے یا اس وقت اس معاملہ میں مناقشات کی کثرت کی وجہ سے اس وقت کی مصلحت خاصہ پر محمول ہے اور حضرت زید رضی اللہ عنہ کا یہی قول ہے، واللہ اعلم۔

فرائض کا بیان

واضح ہو کہ حکمت الٰہی نے لوگوں کے درمیان اس طریقہ کو ضروری قرار دیا کہ اہل قبیلہ باہم ایک دوسرے کی مدد اور حمایت اور غم خواری کریں اور ہر شخص دوسرے کے نفع ونقصان کو اپنا نفع ونقصان سمجھے اور یہ طریقہ بغیر اس کے قائم نہیں رہ سکتا کہ ان کی جبلت میں یہ بات داخل ہو اور اسباب عارضہ اس کی تائید کریں اور ان کا قدیمی طریقہ بھی اس کو مضبوط کرے پس جبلت تو وہ محبت ہے جو ماں باپ اور اولاد اور بھائی وغیرہ میں پائی جاتی ہے اور اسباب عارضہ وہ لوگوں کی آپس میں الفت وملاقات اور تحفہ وتحائف دینا اور غم خواری کرنا ہے کیونکہ ان میں سے ہر بات ایک دوسرے کا دوست بنا دیتی ہے اور مصائب کے وقت مدد اور معاونت پر ہمت دلاتی ہے اور قدیمی طریقہ وہ ہے جس کو تمام شرائع نے بیان کیا یعنی صلہ رحمی کا حکم اور اس کے ترک پر ملامت کرنا، پھر جبکہ بعض لوگ ایسے تھے جو اپنی ناقص فکر کی پیروی کرتے تھے اور کما حقہ صلہ رحمی نہیں کرتے تھے اور غیر ضروری چیزوں کو زیادہ اہمیت دیتے تھے اس واسطے ان پر ان میں سے بعض چیزوں کے واجب کرنے کی حاجت پڑی خواہ وہ اس کو چاہیں یا نہ چاہیں جیسے مریض کی عیادت اور قیدی کا رہا کرانا اور دیت کا لینا، اور جو شخص اپنے ذی رحم کا مالک ہو اس کو آزاد کرنا وغیر ذالک، اور ان سب سے زیادہ بہتر وہ قسم ہے جس سے بہ سبب قرب موت کے مالک کو استغنا حاصل ہو جائے کیونکہ ایسے وقت میں ضروری ہے کہ اس کا مال اس کے سامنے ایسی چیز میں صرف کیا جائے جو معاونات خانگی میں نافع ہو یا اس کے بعد اس کے اقارب میں خرچ کیا جائے۔

واضح ہو کہ فرائض میں اصل یہ بات ہے کہ عرب اور عجم کے سب لوگوں کا اس پر اتفاق ہے

کہ میت کے مال کے حق دار سب لوگوں سے زیادہ اس کے اقارب اور ذوی الارحام ہیں پھر اس اصل قرارداد کے بعد اس کی تفصیل میں ان کا بڑا اختلاف ہے اہل جاہلیت تو صرف مردوں کو ہی ورثہ دیا کرتے تھے نہ عورتوں کو، وہ سمجھتے تھے کہ مرد ہی اصل ہیں اور وہی مصیبت کے وقت کام آتے ہیں اس واسطے جو چیز بہ منزلہ مفت کے ہے اس کے وہی مستحق ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اول بار جو نازل ہوا ہے وہ بلا تعیین وتوقیت اقارب کے لئے ضرور بالضرور وصیت کرنا نازل ہوا ہے کیونکہ لوگوں کے مختلف حالات ہیں پس ان میں سے بعض ایسے ہیں کہ کسی کا ایک بھائی ناصر و مددگار ہوتا ہے اور دوسرا نہیں ہوتا اور بعض ایسے ہیں کہ ان میں سے باپ اولاد کے کام آتا ہے اور اولاد کام نہیں آتی او علی ہذا القیاس، پس مصلحت اس میں تھی کہ اس بات کا اختیار لوگوں کے سپرد کیا جائے تاکہ ہر شخص جو مصلحت مناسب سمجھے اسی کے موافق وصیت کا حکم کرے پھر جو موصی سے کوئی ظلم اور زیادتی ظاہر ہو تو قاضیوں کو اختیار تھا کہ اس کی وصیت کی اصلاح کریں اور اس کو بدل دیں پس ایک مدت تک یہی حکم رہا پھر جب خلافت کبریٰ کے احکام ظاہر ہونے لگے اور مشرق سے مغرب تک کی زمین نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں دی گئی اور بعثت عامہ کے انوار چمکنے لگے تو مصلحت کا مقتضی ہوا کہ ان کے اس بات کا اختیار نہ ان کے سپرد کیا جائے اور نہ ان کے بعد قاضیوں کے ہاتھ میں دیا جائے بلکہ اس کا مدار ان مظان غالبہ پر رکھا جائے جو عرب و عجم وغیرہ کے عادات کے متعلق علم الٰہی میں ہے اور جو بہ منزلہ امر طبعی کے ہے اور جو شخص اس کے خلاف ہے وہ بہ منزلہ شاذ ونادر کے ہے اور اس جانور کے مانند ہے جو عادت مستمرہ کے خلاف بغیر ناک کان کے یا لنگڑا پیدا ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''تم نہیں جانتے کہ ان میں سے تمہارے لئے نفع میں کون زیادہ تر قریب ہے''۔

اور میراث کے مسائل چند اصول پر مبنی ہیں، از آں جملہ یہ ہے کہ اس باب میں مصاحبت طبیعہ اور باہمی ہمدردی اور محبت کا اعتبار ہے جو بہ منزلہ مذہب جبلی کے ہے امور عارضیہ کا اعتبار نہیں ہے کیونکہ وہ غیر منضبط ہیں اور ان پر شرائع کلیہ مبنی نہیں ہو سکتے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''اور رشتہ دار آپس میں کتاب اللہ کی رو سے ایک دوسرے کے ترکہ کے زیادہ حق دار ہیں'' اسی واسطے اولوالارحام کے علاوہ بجز زوجین کے کسی کے لئے میراث مقرر نہیں کی گئی کیونکہ وہ اولوالارحام کے

ساتھ ملحق ہیں اور چند وجوہ سے اولوالارحام میں داخل ہیں۔

ازآں جملہ خانگی معاملات میں ایک دوسرے کی مدد کرنے کی تاکید اور اس بات کی ترغیب دلانا کہ ہر شخص دوسرے کے نفع ونقصان کو اپنا نفع ونقصان سمجھے۔

اور ازاں جملہ یہ ہے کہ خاوند عورت کا خرچ اٹھاتا ہے اور اپنا مال اس کے سپرد کرتا ہے اور اپنی چیزوں کو اس کے پاس امانت رکھتا ہے یہاں تک کہ اس کا یہ خیال ہو جاتا ہے کہ عورت کا کل مال متروکہ یا بعض مال اس کا حق ہے اور یہ خصومت منقطع نہ ہوسکتی تھی پس شریعت نے اس مرض کا اس طور پر علاج کیا کہ عورت کے مال متروکہ میں سے چوتھائی یا نصف خاوند کے لئے مقرر کر دیا تاکہ اس کے دل کو تسکین رہے اور خصومت کی شدت نہ بڑھے، اور ازآں جملہ یہ ہے کہ بسا اوقات عورت کی اپنے خاوند سے اولاد ہوتی ہے جو لامحالہ خاوند کی قوم اور اس کے نسب اور مرتبہ کے ہوتی ہے اور انسان کا اتصال اپنی ماں سے کبھی منقطع نہیں ہوتا پس اس لحاظ سے بیوی بھی ان لوگوں میں شمار ہو جاتی ہے جو خاوند کی قوم سے جدا نہیں ہوتے اور وہ بہ منزلہ ذوی الارحام کے ہو جاتی ہے، اور ازاں جملہ یہ ہے کہ عورت کو خاوند کے مرنے کے بعد اس کے گھر میں ان مصالح کی بنا پر جو مخفی نہیں ہیں عدت گزارنا واجب ہے اور خاوند کی قوم میں سے کوئی اس کی معاش کا کفیل نہیں ہوتا اس واسطے ضروری ہے کہ اس کی معاش کا تقرر خاوند کے مال میں سے کیا جائے اور اس کی کوئی خاص مقدار مقرر کرنا ناممکن تھا کیونکہ یہ معلوم نہیں ہوسکتا کہ خاوند کس قدر مال چھوڑے گا پس ایک عام حصہ مقرر کرنا ضروری ہوا جو ہر جگہ جاری ہوسکتا ہے مثلاً آٹھواں حصہ اور چوتھائی حصہ، اور ازآں جملہ یہ ہے کہ قرابت کی دو قسمیں ہیں ایک تو وہ قرابت ہے جو حسب اور منصب میں مشارکت کو چاہتی ہے اور اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ وہ دونوں ایک ہی قوم اور ایک ہی مرتبہ کے ہوں، اور دوسری وہ قرابت ہے جو حسب ونسب اور مرتبہ میں مشارکت کو نہیں چاہتی لیکن اس میں محبت وشفقت پائی جاتی ہے اور اگر مال تقسیم کرنے کا اختیار میت کو ہوتا تو وہ اس قرابت سے تجاوز نہ کرتا اور یہ بات ضروری ہوئی کہ قسم اوّل کو دوسری قسم پر فضیلت دی جائے کیونکہ عرب وعجم کے تمام لوگ اس بات کو ظلم سمجھتے ہیں کہ کسی شخص کا منصب اور مال اس کی قوم سے باہر دوسرے شخص کو دیا جائے اور اس کو ناپسند کرتے ہیں اور جب کسی شخص کا مال اور منصب اس شخص کو دیا جائے جو اس کی قوم میں اس کا

قائم مقام ہے تو اس کو عدل سمجھتے ہیں اور اس کو پسند کرتے ہیں اور یہ بات بہ منزلہ اس جبلت کے ہوگئی ہے جو ان کے دلوں کو ٹکڑے ٹکڑے کیے بغیر باہر نہیں نکل سکتی ہاں! مگر ہمارے اس زمانہ میں لوگوں کے نسب ضائع ہوگئے ہیں اور ان کے نسب کی وجہ سے باہم معاونت باقی نہیں ہے اور یہ بھی درست نہیں ہے کہ دوسری قسم کا حق پہلی قسم کے بعد چھوڑ دیا جائے اور اسی سبب سے ماں کا حصہ بیٹی اور بہن کے حصہ سے کم ہے باوجودیکہ اس کے ساتھ نہایت درجہ بھلائی کرنا اور صلہ رحمی کرنا زیادہ ضروری اور زیادہ موکد ہے اور اس کے کم ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ماں نہ تو بیٹے کی قوم سے ہوتی ہے اور نہ اس کے حسب اور اس کے مرتبہ اور شرافت میں شریک ہوتی ہے اور نہ ان لوگوں میں سے ہوتی ہے جو اس کے قائم مقام ہوتے ہیں، دیکھو! بیٹا کبھی ہاشمی ہوتا ہے اور ماں حبشیہ ہوتی ہے اور بیٹا قریشی ہوتا ہے اور ماں عجمی ہوتی ہے اور بیٹا خاندان خلافت سے ہوتا ہے اور ماں بدکاری اور رذالت کے ساتھ ملوث ہوتی ہے لیکن بیٹی اور بہن آدمی کی قوم اور اس کے منصب سے ہوتے ہیں اور اسی طرح ماں کی اولاد جب وہ وارث ہوتی ہے تو کسی حال میں ان کو تہائی مال سے زیادہ نہیں ملتا دیکھو! آدمی کبھی قریشی ہوتا ہے اور اس کا اخیافی (۱) بھائی تمیمی ہوتا ہے اور کبھی دونوں قبیلوں میں دشمنی ہوتی ہے پس ہر شخص دوسرے کی قوم کے مقابلہ میں اپنی قوم کی مدد کرتا ہے اور لوگ اس کو اس کے بھائی کے قائم مقام ہونا عدل نہیں سمجھتے اور اسی طرح زوجہ جو ذوی الارحام کے ساتھ ملحق ہوکر ان کے شمار میں داخل ہے سب سے کم حصہ پاتی ہے اور جب ایک شخص کی کئی بیویاں ہوتی ہیں تو اسی حصہ میں سب شریک ہوتی ہیں اور باقی ورثہ ہرگز کمی نہیں کرسکتیں، دیکھو! بیوی خاوند کے مرنے کے بعد دوسرے شخص سے نکاح کر لیتی ہے پس پہلے خاوند سے اس کا کوئی تعلق نہیں رہتا۔

الحاصل توارث کا مدار تین امور پر ہے ایک یہ کہ میت کے شرف اور مرتبہ میں اور جو باتیں اسی قبیل سے ہیں ان میں اس کا قائم مقام ہونا کیونکہ انسان اس بات کی نہایت کوشش کرتا ہے کہ اس کے بعد اس کا کوئی قائم مقام ہو، دوسرے خدمت اور غمخواری اور شفقت اور نرمی اور دیگر امور جو اسی قسم سے ہیں، اور تیسرے قرابت ہے جس میں یہ دونوں امر بھی پائے جاتے ہیں اور تینوں میں زیادہ اعتبار اسی تیسرے کا ہے اور پورے طور پر ان سب کا محل وہی لوگ ہیں جو سلسلہ نسب میں

---

(۱) جو بھائی ماں کی طرف سے ہو۔

داخل ہیں جیسے باپ اور دادا اور بیٹا اور پوتا یہ لوگ سب سے زیادہ ورثہ کے حق دار ہیں مگر باپ کی جگہ بیٹے کا قائم ہونا وہ وضع طبعی ہے جس پر قرناً بعد قرنٍ عالم کی بنیاد ہے اور اسی کی لوگوں کو امید اور آرزو ہوتی ہے اور اسی کی خاطر بیٹے اور پوتے پیدا ہونے کی کوشش کرتے ہیں لیکن بیٹے کے بعد اس کے باپ کا قائم مقام ہونا وضع طبعی نہیں ہے اور نہ لوگ اس کے طالب اور آرزومند ہوتے ہیں اور اگر کسی شخص کو اس کے مال میں اختیار دیا جائے تو اس کے دل پر اولاد کے ساتھ سلوک کرنا باپ کے ساتھ سلوک کرنے پر غالب ہوگا پس اسی واسطے سب لوگوں کا عام دستور ہے کہ اولاد کو باپ پر مقدم سمجھتے ہیں اور ان کے بعد جن کو ہم نے ذکر کیا قائم مقامی کا مرتبہ بیٹے کے بھائیوں کو ہے اور جوان کے مانند بہ منزلہ قوت بازو کے ہیں اور اس کی قوم کے اور اس کے نسب اور مرتبہ کے ہیں لیکن خدمت اور شفقت، تو اس کا محل قرابت قریبہ پس اس کی سب سے زیادہ مستحق ماں اور بیٹی اور جوان کے مانند ہیں اور سلسلہ نسب میں داخل ہیں اور بیٹی کسی قدر باپ کے قائم مقام ہوتی ہے پھر پھوپھی ہے اور اس کے بعد وہ ہے جس کے ساتھ زوجیت کا علاقہ ہے، پھر اخیافی بھائی بہن ہیں اور عورتوں کے اندر حمایت اور قائم مقامی کے معنی نہیں پائے جاتے کیونکہ عورتیں بسا اوقات غیر قوم میں نکاح کر لیتی ہیں اور اسی قوم میں داخل ہو جاتی ہیں ہاں! کسی قدر بیٹی اور بہن میں یہ معنی پائے جاتے ہیں اور عورتوں کے اندر شفقت اور محبت کے معنی کامل اور وافر پائے جاتے ہیں اور اس کا مظنہ بہت ہی قریب کی قرابت ہے جیسے ماں اور بیٹی اس کے بعد بہن نہ کہ بعید کی جیسے پھوپھی اور باپ کی پھوپھی اور باب اول باپ اور بیٹے میں کامل پایا جاتا ہے اور ان کے بعد بھائی اور چچا میں، اور دوسرے معنی سب سے زیادہ باپ میں اور اس کے بعد بیٹے میں پھر عینی بھائی یا اخیافی بھائی میں پائے جاتے ہیں اور قرابت قریبہ کا مظنہ ہے نہ بعیدہ کا اسی لئے جو چچا کے لئے حکم ہے وہ پھوپھی کے لئے نہیں ہے کیونکہ جس طرح چچا اس کی حمایت کرتا ہے وہ نہیں کر سکتی اور پھوپھی قرابت میں بہن کے برابر بھی نہیں ہے۔

از آں جملہ یہ ہے کہ مرد کو عورت پر فضیلت دی جاتی ہے جبکہ دونوں ایک ہی درجہ کے ہوں کیونکہ مرد ہی حمایت اور مدد کرنے کے ساتھ خاص ہیں اور دوسری وجہ یہ ہے کہ مردوں پر بڑے مصارف پڑتے ہیں پس یہی اس چیز کے زیادہ مستحق ہیں جو بہ منزل مفت کے ہے بخلاف عورتوں

کے کہ وہ خود اپنے خاوندوں یا باپوں یا بھائیوں پر بوجھ ہوتی ہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''مرد عورتوں پر حاکم ہیں بہ سبب اس بات کے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض کو بعض پر فضیلت بخشی ہے اور اس سبب سے کہ انھوں نے خرچ کیا ہے'' اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے ثلث باقی کے مسئلہ میں فرمایا اللہ تعالیٰ نے مجھے ماں کو باپ پر فضیلت دینے کا سبب اس کے سوا کچھ نہیں سمجھایا کہ جب ایک مرتبہ باپ کی فضیلت کا اعتبار کیا گیا کہ اس کو عصوبت اور فرض میں جمع کیا تو دوبارہ اس کا حصہ زیادہ کرنے کے لئے اس کی فضیلت کا اعتبار نہیں کیا گیا کیونکہ اس میں اور ورثا کی حق تلفی ہے اور ماں کی اولاد میں سے ذکور کی اس شخص کے لئے حمایت اور مدد نہیں ہوتی کیونکہ یہ اولاد دوسری قوم کی ہوتی ہے اس واسطے ان کو انثیٰ پر فضیلت نہیں دی گئی اور نیز ان کی قرابت ماں کی قرابت سے پیدا ہوتی ہے اس واسطے وہ تمام اولاد گویا اُناث ہیں۔

اور از اں جملہ یہ ہے کہ جب وارثوں کی ایک جماعت پائی جائے پس اگر وہ ایک مرتبہ کے ہوں تو ان سب پر برابر تقسیم کرنا ضروری ہے کیونکہ ایک کو دوسری پر تقدم نہیں ہے اور اگر وہ مختلف مراتب کے ہیں تو اس کی دو صورتیں ہیں یا تو وہ سب ایک نام اور ایک جہت میں شریک ہیں اور اس میں قاعدہ یہ ہے کہ قریب بعید کو بالکل محروم کر دیتا ہے کیونکہ وراثت اس لئے مشروع ہوئی ہے کہ لوگ اعانت کرنے پر آمادہ رہیں اور قرابت اور تعاون ہر ایک میں پایا جاتا ہے مثلاً شفقت ان سب میں پائی جاتی ہے جن میں ماں کا نام شامل ہے، اور جن میں بیٹے کا نام شامل ہے ان میں قائم مقامی پائی جاتی ہے، اور جن میں عصبہ کا نام شامل ہے ان میں حمایت کے معنی پائے جاتے ہیں اور یہ مصلحت بغیر اس کے متحقق نہیں ہوتی کہ ایک شخص متعین ہو جائے جو ان باتوں کا التزام کرے اور ان کے ترک پر اس کو ملامت کی جائے اور سب لوگوں میں وہ شخص مال کے ملنے کے ساتھ متمیز ہو لیکن کسی کے حصہ کا کسی سے زیادہ ہونا پس اس کی ان کو چنداں پرواہ نہیں ہوتی یا ان کے نام اور ان کی جہات مختلف ہوں اور اس میں قاعدہ یہ ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے نزدیک مظان غالبیہ میں اقرب اور زیادہ کام آنے والا ہے بعید کے لئے حاجب ہو کر اس کے حصہ کو کم کر دیتا ہے۔

اور از اں جملہ یہ ہے کہ ''سہام'' جن سے حصہ متعین ہوتے ہیں ضروری ہے کہ ان کے اجزا ظاہر ہوں کہ محاسب اور غیر محاسب ظاہر میں ان کی تمیز کر سکیں، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے

اس فرمان میں کہ ''ہم امی لوگ ہیں نہ لکھتے ہیں نہ حساب کرتے ہیں'' اس بات کی طرف اشارہ کر دیا ہے کہ جس بات سے تمام مکلفین کو خطاب کیا جائے وہ ایسی ہونی چاہئے کہ حساب کرنے میں دقت پیش نہ آئے ، اور نیز وہ ایسی ہو کہ اس میں کمی بیشی کی ترتیب ظاہر نظر میں معلوم ہو جائے پس شریعت نے سہام کو دو طریق سے لیا ایک تو دو تہائی ، ایک تہائی اور چھٹا حصہ اور دوسرے نصف اور چوتھا حصہ اور آٹھواں حصہ کیونکہ ان دونوں کا مخرج اصلی اول مرتبہ میں اعداد ہیں اور ان دونوں میں تین مرتبے پائے جاتے ہیں جن میں سے ہر ایک کو زیادتی کے اعتبار سے دوسرے سے دو چند کرنے میں اور کمی کے اعتبار سے نصف کرنے میں ایک نسبت ہے اور اس سے زیادتی اور کمی خوب طرح سے محسوس ہو جاتی ہے پھر جب ایک زیادتی کا دوسری زیادتی کے ساتھ اعتبار کیا جائے تو اور نسبتیں پیدا ہو جاتی ہیں جو وراثت کے باب میں ضروری ہیں مثلاً نصف پر کچھ زیادہ کیا جائے اور وہ پورا ہونے تک نہ پہنچے اور وہ دو تہائی ہیں اور جو چیز کہ نصف سے کم کی جائے اور ربع کو نہ پہنچے اور وہ ثلث ہے اور خمس اور سبع کا اعتبار نہیں کیا گیا کیونکہ ان کے مخرج کا نکالنا مشکل ہے اور ان میں کم کرنا اور زیادہ کرنا حساب میں تعمق کرنے کا محتاج ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''اللہ تعالیٰ تم کو تمہاری اولاد کے بارے میں بتلاتا ہے کہ مرد کے لئے دو عورتوں کے برابر حصہ ہے پس اگر عورتیں دو سے زیادہ ہیں تو ان کے لئے میت کے ترکہ کا دو ثلث ہے اور اگر عورت ایک ہے تو اس کے لئے ترکہ کا نصف ہے''۔

میں کہتا ہوں مرد کے حصہ کا عورت کے حصہ سے دو چند ہونا اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے ثابت ہوتا ہے ''مرد عورتوں پر حاکم ہیں اس لئے کہ خدا نے بعض کو بعض سے افضل بنایا ہے'' اور اکیلی بیٹی کے لئے نصف ترکہ ہے کیونکہ اگر اکیلا بیٹا ہوتا ہے تو تمام مال لیتا ہے پس اکیلی بیٹی نصف کی مستحق ہے تاکہ دو چند کا حکم پورا ہو اور دو بیٹیوں کا حکم بالاجماع تین کا ہے اور دو بیٹیوں کو دو ثلث اس واسطے دیا گیا کہ اگر بیٹی کے ساتھ بیٹا ہو تو اس بیٹی کو ثلث ملتا ہے اس واسطے دوسری بیٹی کا حصہ بطریق اولیٰ ثلث سے کم نہیں ہونا چاہئے اور عصبہ کے لئے ثلث زیادہ کیا گیا کیونکہ بیٹیوں سے بھی معاونت ہوتی ہے اور عصبات سے بھی معاونت ہوتی ہے پس ایک دوسرے کو ساقط نہیں کر سکتا لیکن حکمت کی بات یہ ہے کہ جو سلسلہ نسب میں داخل ہے اس کو ان لوگوں پر فضیلت دی جائے جو

سلسلہ نسب سے ادھر ادھر ہیں اور وہ دوثلث کی نسبت ایک ثلث سے ہے، اور ایسے ہی بیٹوں اور بیٹیوں کے ساتھ والدین کا حال ہے، اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''اور اس کے والدین کے لئے دونوں میں سے ہر ایک کے لئے اس کے ترکہ میں سے چھٹا حصہ ہے اگر اس کے اولاد ہو پس اگر اس کے اولاد نہیں ہے اور اس کے ماں باپ اس کے وارث ہوتے ہیں تو اس کی ماں کے لئے ثلث ہے پس اگر اس کے بھائی ہیں تو اس کی ماں کے لئے چھٹا حصہ ہے'' الایہ۔

میں کہتا ہوں تم کو یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ والدین سے زیادہ اولاد وراثت کی مستحق ہے اور اس کی صورت یہ ہے کہ اولاد کے لئے دوثلث اور والدین کے لئے ایک ثلث ہو اور باپ کا حصہ ماں کے حصہ سے اس وجہ زیادہ نہیں مقرر کیا گیا کیونکہ باپ کی فضیلت کا ایک مرتبہ اعتبار کیا گیا ہے کہ اس کو بیٹے کے قائم مقام اور مددگار قرار دیکر عصبہ بنایا تھا اس واسطے بعینہ یہ فضیلت تضعیف کے بارے میں معتبر نہ ہوگی اور جب بیٹے کے اولاد نہ ہوگی تو والدین سے زیادہ کوئی حق دار نہیں ہے اس واسطے تمام ترکہ انہی کو ملے گا اور باپ کو ماں پر فضیلت دی جائے گی اور تم جان چکے ہو کہ اکثر ان مسائل میں جس فضیلت کا اعتبار ہے وہ دو چند کرنے کی فضیلت ہے، پھر اگر وارث ماں اور بھائی ہیں اور بھائی ایک سے زیادہ ہیں تو ضروری ہے کہ ماں کا حصہ کم کر کے اس کو چھٹا حصہ دیا جائے کیونکہ اگر بھائی عصبہ نہ ہوں اور عصبات اس سے بعید ہوں تو عصوبت اور شفقت اور محبت برابر ہے پس نصف ان کو ملے گا اور نصف ان کو اور وہ نصف ماں اور اس کی اولاد میں تقسیم ہوگا تو ماں کو بلاشک چھٹا حصہ ملے گا اور اس سے کم نہ ہوگا اور باقی ان سب کے لئے ہوگا اور اگر بھائی عصبات ہیں تو ان میں قرابت قریبہ اور حمایت دونوں پائی جاتی ہیں اور اکثر ان کے ساتھ اور وارث بھی ہوتے ہیں مثلاً بیٹی اور بیٹے اور خاوند، پس اگر ماں کے لئے چھٹا حصہ مقرر نہ ہو تو اور وارثوں پر تنگی ہو جائے۔

اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''اور تمہارے لئے تمہاری بیویوں کے ترکہ کا نصف ہے اگر ان کے اولاد نہ ہو پس اگر ان بیویوں کی اولاد ہو تو تمہارے لئے ان کے ترکہ میں سے ربع ہے بعد وصیت کے جس کی انھوں نے وصیت کی ہو یا بعد قرض کے، اور بیویوں کے لئے تمہارے ترکہ میں سے ربع ہے اگر تمہاری اولاد نہیں ہے، پس اگر تمہاری اولاد ہے تو ان بیویوں کے لئے تمہارے ترکہ

میں سے آٹھواں حصہ ہے بعد وصیت کے جس کی تم نے وصیت کی ہو یا بعد قرض کے۔

میں کہتا ہوں خاوند کو ورثہ اس لئے ملتا ہے کہ وہ بیوی اور اس کے مال پر قابض ہوتا ہے پس اس کے قبضہ سے مال نکالنا اس کو ضرر پہنچانا ہے اور نیز یہ کہ خاوند اپنا مال بیوی کے پاس رکھتا ہے اور اپنے مال میں اس کو امین جانتا ہے یہاں تک کہ اس کو یہ خیال ہو جاتا ہے کہ جو کچھ بیوی کے قبضہ میں ہے اس میں اس کا بڑا حق ہے اور بیوی خاوند سے اپنی خدمت اور ہمدردی اور محبت کا حق لیتی ہے اس واسطے خاوند کو بیوی پر فضیلت ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''الرجال قوامون علی النساء'' پھر اس بات کا بھی لحاظ کیا گیا ہے کہ وہ دونوں زیادہ حصہ لیکر اولاد پر تنگی نہ کریں اور یہ بات بھی تم کو معلوم ہو چکی ہے کہ اکثر مسائل میں جو فضیلت معتبر ہے وہ فضیلت حصہ کا دو چند کر دینا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، اور اگر ایسے مرد یا عورت کی میراث ہو جس کے نہ باپ ہو نہ بیٹا مگر اس کے بھائی یا بہن ہو تو ان میں سے ہر ایک کا چھٹا حصہ اور اگر ایک سے زیادہ ہوں تو سب ایک تہائی میں شریک ہوں گے''۔

میں کہتا ہوں یہ آیت بالا جماع ماں کی اولاد کے بارے میں وارد ہے اور چونکہ اس شخص کا نہ باپ ہے اور نہ اولاد ہے اس واسطے اگر ان میں ماں ہے تو شفقت کی وجہ سے ان کو نصف ملے گا اور نصف معاونت اور حمایت کی وجہ سے ملے گا اور اگر ماں نہیں ہے تو دو ثلث ان کا ہے اور ایک ثلث ان کا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''اے پیغمبر! لوگ تم سے فتویٰ طلب کرتے ہیں کہہ دو کہ خدا تم کو کلالہ کے بارے میں بیان کرتا ہے: اگر کوئی مرد مر جائے جس کی اولاد نہ ہو اور اس کی بہن ہو تو اس کے لئے اس مرد کے ترکہ کا نصف ہے اور وہ مرد اس کا وارث ہوگا اگر اس کے اولاد نہیں ہے پس اگر دو بہنیں ہیں تو ان دونوں کے لئے اس کے ترکہ میں سے دو ثلث ہے اور اگر اس کے بھائی اور بہنیں ہوں تو مرد کے لئے عورت سے دو چند ہے'' الآیۃ،

میں کہتا ہوں یہ آیت بالا جماع باپ کی اولاد کے بارے میں ہے خواہ وہ بنی الاعیان ہوں یا بنی العلات ہوں، اور کلالہ اس کو کہتے ہیں جس کا نہ باپ ہو اور نہ اولاد ہو، اور اللہ تعالیٰ کا یہ قول ''لیس له ولد'' کلالہ کی بعض حقیقت کو ظاہر کرتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب کوئی ایسا شخص نہ ہو جو سلسلہ نسب میں داخل ہے تو وہ لوگ جو سب سے زیادہ قریب اور اولاد کے مشابہ ہیں وہ اس کی اولاد پر ہی محمول ہوں گے اور وہ بھائی اور بہن ہیں،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''تمام حصے ان کے حق داروں کو دو اور جو کچھ بچ رہے تو وہ اس مرد ذکر کا ہے جو مرنے والے کا سب سے زیادہ قریب ہے''۔

میں کہتا ہوں تم کو یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ توارث کے اندر اصل دو چیزیں ہیں جن کو ہم بیان کر چکے ہیں اور یہ کہ محبت اور شفقت کا صرف اس قرابت میں لحاظ کیا جاتا ہے جو بہت ہی قریب ہے جیسے ماں اور بھائی نہ ان کے علاوہ دوسروں میں، پس جب یہ نہ ہوں تو اب توریث میت کے قائم مقام ہونے اور اس کی معاونت کرنے کے اعتبار سے معین ہوگی اور وہ میت کی قوم اور اس کے نسب اور اس کے درجہ کے لوگ ہیں پس ان میں درجہ بدرجہ قریب کا لحاظ ہوگا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کوئی مسلمان کافر کا اور کوئی کافر مسلمان کا وارث نہیں ہوتا''۔

میں کہتا ہوں یہ حکم اس لئے دیا گیا ہے کہ کافر و مسلمان میں باہمی محبت منقطع ہو جائے کیونکہ کافر کے ساتھ مسلمان کا میل جول رکھنا اس کے دین کے فساد کا باعث ہوگا چنانچہ اللہ تعالیٰ نکاح کے حکم میں فرماتا ہے ''وہ دوزخ کی طرف بلاتے ہیں''۔

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''قاتل کو ورثہ نہیں پہنچتا''۔

میں کہتا ہوں یہ حکم اس لئے دیا گیا ہے کہ بہت سے حوادث ایسے واقع ہوتے ہیں کہ وارث سارا مال لینے کی خاطر اپنے مورث کو قتل کر دیتا ہے خاص کر چچازاد بھائی وغیرہ، پس لوگوں کے اندر ایسے دستور کا مقرر کرنا ضروری ہے کہ جو شخص ایسے فعل کا ارتکاب کرے اس کو اس کی مراد سے ناامید کیا جائے تاکہ لوگوں سے یہ مفسدہ رفع ہو، اور یہ بھی دستور چلا آتا ہے کہ نہ غلام کسی کا وارث ہوتا ہے اور نہ اس کا کوئی وارث ہوتا ہے کیونکہ غلام کا سارا مال مولیٰ کا ہوتا ہے اور مولیٰ اجنبی شخص ہوتا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''بیشک ماں کی اولاد میں سے عینی بھائی وارث ہوتے ہیں نہ علاتی''۔

میں کہتا ہوں اس کا سبب وہی ہے جو ہم بیان کر چکے ہیں کہ میت کی قائم مقامی خصوصیت پر مبنی ہے اور قریب بعید کے لئے حاجب بن کر اس کو محروم کر دیتا ہے اور اس بات پر صحابہ کا اجماع ہے کہ خاوند اور ماں باپ اور بیوی اور ماں باپ کی صورت میں ماں کو باقی کا تہائی ملتا ہے۔

اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس کو خوب واضح کر کے بیان کر دیا جبکہ یہ فرمایا ''خدا تعالیٰ نے مجھ کو یہ نہیں بتلایا کہ میں ماں کو باپ پر فضیلت دوں''۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بیٹی اور ایک پوتی اور ایک عینی بہن کی صورت میں فیصلہ فرمایا کہ بیٹی کو نصف اور پوتی کو چھٹا حصہ اور جو کچھ باقی رہے وہ بہن کو دیا جائے۔

میں کہتا ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ بعید قریب کے اس حصہ میں جو اس کو ملتا ہے مزاحم نہیں ہوتا ہے پس جو باقی بچے بعید اس کا حق دار ہے تاکہ خدا تعالیٰ نے جو کچھ اس صنف کے لئے مقرر کیا ہے وہ اس کو پالے پس بیٹی پورا نصف لے گی اور پوتی بیٹیوں کے حکم میں ہے پس وہ حقیقی بیٹی کے مزاحم نہیں ہوسکتی اور بیٹیوں کے حصہ میں سے جو باقی رہ گیا ہے وہ اس کو مل جائے گا پھر بہن عصبہ ہوتی ہے کیونکہ اس میں بیٹی کے قائم مقام ہونے کے معنی پائے جاتے ہیں اور وہ مورث کے مرتبہ کی ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خاوند اور ماں اور حقیقی بھائیوں اور اخیافی بھائیوں کے بارے میں فرمایا کہ باپ نے محض ان کی قرابت ہی کو زیادہ کیا ہے اور حضرت عبداللہ بن مسعود اور زید اور شریح رضی اللہ عنہم اور بہت سے اشخاص نے اسی حکم پر اتفاق کیا ہے اور یہ قول قوانین شرع کے ساتھ زیادہ موافق ہے اور ماں کے نہ ہونے کی صورت میں دادی کو اس کے قائم مقام کر کے چھٹے حصہ کا حکم دیا اور حضرت ابوبکر اور حضرت عثمان اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم دادا کو باپ کا حکم دیتے تھے اور میرے نزدیک یہ قول سب سے بہتر ہے۔

لیکن ولاء پس اس میں حکمت معاونت اور حمایت کا پایا جانا ہے پس اس امر میں زیادہ مستحق مولیٰ نعمت ہے پھر اس کے اس کی قوم میں ہے مردرجہ بدرجہ ہیں، واللہ اعلم۔

تدبیر منزل کے ابواب کا بیان

واضح ہو کہ فن تدبیر منازل کے اصول تمام عرب و عجم میں مسلم ہیں لیکن ان کی اشباح اور صورتوں میں اختلاف ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم عرب میں پیدا ہوئے اور حکمت الٰہی کا یہ مقتضی ہوا کہ تمام دنیا میں کلمۃ اللہ کا اس طریق پر ظہور ہو کہ عرب کا تمام ادیان پر غلبہ ہو جائے اور تمام دنیا کی عادات عرب کی عادات سے منسوخ ہو جائیں اور عرب کی ریاست سے ان کی ریاستیں زیر ہو جائیں پس اس نے یہ بات ضروری کر دی کہ تدبیر المنازل عرب کی عادات میں ہی متعین کی جائیں اور خاص ان ہی اشباح اور صورتوں کا اعتبار کیا جائے اور جن باتوں کا ذکر کرنا ضروری ہے ان میں سے اکثر کو مقدمۃ الباب میں ارتفاقات وغیرہ کے اندر بیان کر دیا ہے پس وہاں دیکھنا چاہیے۔

پیغام نکاح اور اس کے متعلقات کا بیان

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اے جوانوں کے گروہ! تم میں سے جو شخص نکاح کرنے کی طاقت رکھے تو اس کو نکاح کرنا چاہئے کیونکہ وہ نگاہ کو پست کرتا ہے اور ستر کو محفوظ رکھتا ہے اور جو نکاح کرنے کی طاقت نہ رکھے تو اس کو روزے رکھنا چاہئے کیونکہ روزہ سے شہوت کم ہو جاتی ہے''۔

واضح ہو کہ جب بدن کے اندر منی کی پیدائش زیادہ ہوتی ہے تو اس کے بخارات دماغ کی طرف چڑھتے ہیں تب اس کو خوبصورت عورت کی طرف دیکھنا اچھا معلوم ہوتا ہے اور اس کی محبت اس کے دل میں بھر جاتی ہے اور اس منی کا ایک حصہ پیشاب گاہ کی طرف اترتا ہے جس سے انتشار پیدا ہوتا ہے اور شدت کے ساتھ جماع کی خواہش ہوتی ہے اور اکثر یہ بات جوانی کے وقت میں عارض ہوتی ہے اور یہ طبیعت کے حجابوں میں سے ایک حجاب ہے جو اس کو احسان میں غور کرنے سے مانع ہوتا ہے اور اس کو زنا کی طرف برانگیختہ کرتا ہے اور اس کے اخلاق کو خراب کرتا ہے اور اس کو باہمی فساد کی بڑی بڑی ہلاکتوں میں ڈالتا ہے لہٰذا اس حجاب کا دور کرنا ضروری ہوا پس جو شخص نکاح کی استطاعت رکھتا ہو اور اس پر قادر ہو اس طور سے کہ مقتضی حکمت کے موافق کوئی عورت اس کو میسر آئے اور اس کے نان و نفقہ پر قادر ہو تو اس کے لئے نکاح سے بہتر کوئی صورت نہیں ہے کیونکہ نکاح کرنے سے نگاہ پست ہو جاتی ہے اور آدمی کی شرمگاہ محفوظ رہتی ہے کیونکہ اس کے سبب سے منی کثرت سے خارج ہوتی رہتی ہے اور جو شخص نکاح کرنے کی قدرت نہ رکھتا ہو تو اس کو روزہ رکھنا چاہئے کیونکہ پے در پے روزہ رکھنے سے طبیعت کی تیزی کے رفع کرنے میں اور اس کے جوش

سے باز رکھنے میں بڑا دخل ہے کیونکہ اس میں منی کے مادہ کو کم کرنا ہے پس تمام اخلاق فاسدہ جو کثرت اخلاط سے پیدا ہو گئے ہیں وہ روزہ کے سبب سے بدل جاتے ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان بن مظعونؓ کو تبتل (۱) سے منع فرمایا پس آپ نے فرمایا'' خدا کی قسم میں تم سب سے زیادہ خدا تعالیٰ سے ڈرتا ہوں اور تم سب سے زیادہ میں اللہ تعالیٰ سے خوف کرتا ہوں لیکن میں روزہ رکھتا ہوں اور نہیں بھی رکھتا ہوں اور نماز پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں پس جو شخص میری سنت سے اعراض کرتا ہے وہ مجھ سے نہیں ہے۔

واضح ہو کہ مانویہ اور نصاریٰ میں سے راہبین نکاح ترک کر کے قربت الٰہی طلب کرتے تھے اور ان کا یہ خیال غلط تھا کیونکہ انبیا علیہم السلام کا طریقہ جس کو خدا تعالیٰ نے لوگوں کے لئے پسند فرمایا ہے وہ طبیعت کی اصلاح اور اس کی کجی کا دور کرنا ہے نہ کہ اس کو اس کی تمام مقتضایات سے روکنا اور ہم اس کو خوب طریقہ سے بیان کر چکے ہیں پس اس مقام کو دیکھنا چاہئے پھر ایسی عورت کی طرف رہنمائی ضروری ہے جس سے نکاح کرنا حکمت کے موافق ہو اور خانہ داری کی تمام مصلحتیں وہ پورے طور پر انجام دے سکے کیونکہ میاں بیوی میں صحبت لازمی شئے ہے اور دونوں جانب سے حاجتیں ضروری ہیں پس اگر عورت بد طینت ہے اور اس کی عادت میں سختی ہے اور اس کی زبان میں اغویت داخل ہے تو اس شخص پر زمین باوجود اپنی فراخی کے تنگ ہو جائے گی اور وہ مصلحت فساد کی طرف منقلب ہو جائے گی اور اگر وہ عورت نیک ہے تو امور خانہ داری کی خوب اچھی طرح سے اصلاح ہو سکتی ہے اور اس کے لئے ہر طرف سے اسباب خیر دستیاب ہو جائیں گے چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' دنیا ایک پونجی ہے اور دنیا کی سب سے بہتر پونجی نیک بیوی ہے'' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' چار باتوں کی وجہ سے عورت سے نکاح کیا جاتا ہے۔ اس کے مال کی وجہ سے اور اس کے حسب کی وجہ سے اور اس کی خوبصورتی کی وجہ سے اور اس کے دین کی وجہ سے پس دیندار کو حاصل کرو، خاک میں مل جائیں تیرے دونوں ہاتھ''۔ (۲)

واضح ہو کہ وہ مقاصد جو بیوی پسند کرنے میں مقصود ہوتے ہیں وہ غالباً چار خصلتیں ہیں:
ایک یہ ہے کہ نکاح مال کی وجہ سے کیا جاتا ہے کہ اس شخص کو اس کے مال میں رغبت ہوتی ہے اور

---

(۱) نامرد ہو جانا۔ (۲) یہ عربی محاورہ ہے، جس کا ترجمہ کیا گیا ہے۔

اس کو امید ہوتی ہے کہ وہ عورت اپنے مال سے اس کی مدد کرے گی اور اس کی اولاد ماں کی مالدار ہونے کی وجہ سے غنی ہو جائے گی کیونکہ ماں کے ترکہ میں ان کو یہ مال ملے گا، اور ایک یہ کہ نکاح عورت کے حسب کی وجہ سے کیا جاتا ہے یعنی اس عورت کے باپ دادا کے خاندانی ہونے کی وجہ سے کیونکہ شریفوں میں نکاح کرنا عزت کی بات ہے اور ایک یہ ہے کہ عورت کی خوبصورتی کی وجہ سے نکاح کیا جاتا ہے کیونکہ طبیعت بشری کو جمال کی طرف میلان ہوتا ہے اور بہت سے لوگ طبیعت کے تابع ہوتے ہیں، اور ایک اس کے دین کی وجہ سے نکاح کیا جاتا ہے یعنی اس وجہ سے کہ وہ عورت عفیف ہے اور صاحب ایمان ہے اور عبادات کے ذریعہ اپنے خالق کے نزدیک مقرب ہے پس مال اور عزت ان لوگوں کا مقصد ہوتا ہے جن پر رسم دنیا کا حجاب غالب ہے، اور جمال اور جوانی ان لوگوں کا مقصد ہوتا ہے جن پر حجاب طبیعت غالب ہے اور دینداری ان لوگوں کا مقصد ہوتا ہے جو فطرت کے اعتبار سے مہذب ہو گئے ہیں اور اس بات کو چاہتے ہیں کہ ان کی بیوی دین میں ان کی معاونت کرے اور اہل خیر کے ساتھ صحبت رکھنے کی رغبت دلائے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''ان عورتوں میں جو اونٹ پر چڑھتی ہیں سب میں بہتر قریش کی عورتیں ہیں جو اپنے بچوں پر نہایت مہربانی اور خاوند کے مال کی بڑی پاسبانی کرتی ہیں''۔

میں کہتا ہوں مستحب یہ ہے کہ عورت اس قوم قبیلہ سے ہو جن کی عورتوں کی عادت نیک ہو کیونکہ سونے اور چاندی کے کانوں کی طرح آدمیوں کی بھی کانیں ہیں اور ہر آدمی پر اس کی قوم کی رسوم اور عادات اس پر اس قدر غالب ہوتی ہیں گویا وہ اس کی سرشت میں داخل ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو بیان فرمادیا کہ سب عورتوں سے بہتر قریش کی عورتیں ہیں اس وجہ سے کہ وہ اپنے بچوں پر بڑی مہربان اور خاوند کے مال اور اس کے غلام وغیرہ کی بڑی محافظ ہوتی ہیں اور یہ دونوں خصلتیں نکاح کے مقاصد میں سب سے بڑھ کر ہیں اور انہیں سے خانہ داری کا انتظام ہوتا ہے اور اگر تم اس زمانہ میں ہمارے ملک اور ماوراء النہر وغیرہ ملکوں کے لوگوں کا حال معلوم کرو گے تو اخلاق حمیدہ میں سب سے زیادہ ثابت قدم اور ان باتوں میں مستقل قریش کی عورتوں کو پاؤ گے۔

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''تم ایسی عورتوں سے نکاح کرو جو زیادہ جننے والی اور زیادہ محبت کرنے والی ہوں کیونکہ میں تمہاری وجہ سے اور امتوں سے کثرت میں ہوں گا''۔

میں کہتا ہوں میاں بیوی کی باہمی محبت کی وجہ سے خانہ داری کی مصلحت پورے طور سے قائم رہتی ہے اور کثرت نسل سے مصلحت مدنیہ اور ملیہ کی تکمیل ہوتی ہے اور بیوی کا اپنے خاوند سے محبت کرنا اس کے صحت مزاج اور قوت طبیعت کی دلیل ہے اور اس کو اس سے باز رکھتا ہے کہ وہ عورت کسی اور کی طرف آنکھ اٹھائے اور عورت کو کنگھی وغیرہ سے سنگھار کرنے پر آمادہ کرتا ہے اور اس میں خاوند کی پاکدامنی اور اس کی نظر کی حفاظت ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جب تمہارے پاس کوئی ایسا شخص شادی کا پیغام لائے جس کی دینداری اور عادت سے تم واقف ہو تو اس کے ساتھ شادی کر دو اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو زمین میں فتنہ اور بڑا فساد پیدا ہوگا''۔

میں کہتا ہوں اس حدیث سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ نکاح کے اندر کفو کا اعتبار نہیں ہے اور ایسا کیسے ہوسکتا ہے حالانکہ ہر قسم کے لوگوں کی سرشت میں کفو کا ہونا داخل ہے اور کبھی کفو میں عیب لگانا قتل سے زیادہ ہوتا ہے اور لوگ مختلف مرتبوں کے ہوتے ہیں اور شریعت اس قسم کی باتوں کو نظر انداز نہیں کرتی اسی وجہ سے حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا میں عورتوں کو ان کے کفو کے لوگوں کے سوا سب سے منع کروں گا'' بلکہ اس حدیث سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد یہ ہے کہ کوئی شخص اس کی دینداری اور خلق پسند کرنے کے بعد اس کی کمتر باتوں کو نہ دیکھے کہ مثلاً وہ قلیل المال اور پریشان حال ہے اور وہ بدصورت ہے یا باندی کا لڑکا ہے اور اسی قسم کے دیگر اسباب، کیونکہ تدبیر منزل کا سب سے بڑا مقصد خوش خلقی میں موافقت اور اس کے سبب سے دین کی اصلاح کا ہونا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''نحوست عورت اور گھوڑے اور گھر میں ہوتی ہے''۔

میں کہتا ہوں اس کی صحیح تفسیر جس کو حدیث کا مورد چاہتا ہے یہ ہے کہ ان چیزوں میں اسباب خفیہ غالب ہوتے ہیں جو اکثر اس کے حق میں پائے جاتے ہیں جو خالی از خیر اور غیر مبارک طور پر مثلاً عورت سے نکاح کرتا ہے اور جب کسی عورت کی نحوست پر کوئی تجربہ پایا جائے تو مرد کے لئے بہتر ہے کہ اس عورت سے ترک نکاح کر کے اپنے نفس کو سکون و آرام دے خواہ وہ خوبصورت اور دولتمند ہی ہو اور حکمت کا مقتضی ہے کہ باکرہ سے نکاح کرے بشرطیکہ وہ عاقلہ اور بالغہ ہو کیونکہ اس کے اندر فریب کے معنی کم ہونے کی وجہ سے وہ ادنیٰ درجہ کی چیز سے راضی ہو جاتی ہے اور قوت

جوانی کی وجہ سے اولاد پیدا کرنے کے زیادہ قابل ہوتی ہے اور حکمت کی باتوں کو جلدی قبول کرتی ہے اور ان پر پابند رہتی ہے اور اپنی شرمگاہ اور نظر کو زیادہ محفوظ رکھنے والی ہے بخلاف بیوہ عورتوں کے کہ وہ کیونکہ چالاکی سے خوب واقف ہوتی ہیں اور بداخلاق اور قلیل الاولاد ہوتی ہیں اور وہ مثل الواح منقوشہ کے ہوتی ہیں، جن میں تادیب بہت کم اثر کرتی ہے البتہ جب تدبیر خانہ داری بغیر تجربہ کار عورت کے انجام نہ پاتی ہو تو کوئی مضائقہ نہیں جیسا کہ جابر بن عبداللہؓ نے ذکر کیا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جب تم میں سے کوئی کسی عورت کے لئے نکاح کا پیغام بھیجے تو اگر وہ شخص اس چیز کو جو اس عورت کے ساتھ نکاح کرنے کا باعث ہو دیکھ سکے تو دیکھ لے'' اور آپ نے فرمایا '' کیونکہ یہ بات تم دونوں میں الفت قائم رہنے کے لئے انسب ہے'' اور آپ نے ایک صحابی سے فرمایا تھا '' کیا تو نے اس عورت کو دیکھ لیا ہے کیونکہ انصار کی آنکھوں میں کچھ عیب ہوتا ہے''۔

میں کہتا ہوں مخطوبہ کو دیکھ لینا اس لئے مستحب ہے کہ نکاح دیکھنے کے بعد کیا جائے اور اس ندامت سے بچ جائے جو بلا دیکھے بھالے نکاح کر لینے اور طبیعت کے موافق نہ ہونے اور اس کے رد نہ کرنے سے پیدا ہوتی ہے اور اگر دیکھنے کے بعد رد کرے تو اس کی تلافی آسان ہوتی ہے اور دیکھنے کے بعد اگر نکاح اس کی طبیعت کے موافق ہے تو اس عورت کے ساتھ شادی کرنا شوق اور نشاط کے ساتھ ہو، اور عقلمند آدمی جب تک کسی چیز کی بھلائی اور برائی کو پہلے ہی نہیں دیکھ لیتا اس کا اقدام نہیں کرتا، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''عورت شیطان کی صورت میں آتی ہے اور شیطان کی صورت میں جاتی ہے جب تم میں سے کسی کو کوئی عورت اچھی معلوم ہو اور اس کے دل میں وسوسہ پیدا ہو تو اس کو چاہئے کہ اپنی بیوی کی طرف قصد کرے اور اس سے مجامعت کرے کیونکہ اس سے اس کے دل کا وسوسہ دور ہو جائے گا۔

واضح ہو کہ فرج کی خواہش خواہشات میں سب سے بڑی خواہش ہے اور سب سے زیادہ قلب پر اس کا غلبہ ہوتا ہے جو انسان کو بڑی بڑی ہلاکتوں میں ڈالتی ہے اور عورتوں کی طرف دیکھنا اس خواہش کو پیدا کرتا ہے اور اس حدیث سے یہی مراد ہے ''عورت شیطان کی صورت میں آتی ہے'' الخ، پس جو شخص کسی عورت کو دیکھے اور وہ اس کے دل میں واقع ہو جائے اور اس کی طرف شوق پیدا ہو اور وہ اس کے لئے جوش مارے تو حکمت کی بات یہ ہے کہ اس شوق کو اس کی حالت پر

نہ چھوڑا جائے کیونکہ وہ دم بدم اس کے دل میں زیادہ ہوتا جائے گا یہاں تک کہ اس کے دل میں غالب آجائے گا اور اس میں متصرف ہو جائے گا اور ہر چیز کے لئے مدد ہوتی ہے جس سے اس کو قوت حاصل ہوتی ہے اور ایک تدبیر ایسی ہوتی ہے جس سے وہ کم ہو جاتی ہے پس عورت کی طرف رغبت کی مدد منی کے ظروف کا پر ہو جانا اور اس کے بخارات کا دماغ کی طرف چڑھنا ہے اور اس کے کم کرنے کی تدبیر ان ظروف کا منی سے خالی کر دینا ہے اور نیز اس کا دل جماع کی طرف مشغول ہو جائے گا اور وہ وسوسہ اس کے دل سے نکل جائے گا اور جس چیز کی طرف اس کی توجہ ہے جماع کرنا اس توجہ سے اس کے دل کو ہٹا دے گا اور جب ایک چیز کے استحکام سے پہلے اس کا علاج کر لیا جائے تو ادنیٰ کوشش سے وہ چیز رفع ہو جاتی ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''کوئی شخص اپنے بھائی کے پیغام نکاح پر پیغام نہ بھیجے یہاں تک کہ وہ نکاح کر لے یا ترک کر دے''۔

میں کہتا ہوں اس کا سبب یہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی عورت کی طرف نکاح کا پیغام بھیجتا ہے اور عورت کو بھی اس کی طرف میلان ہوتا ہے تو اس شخص کے گھر کے آباد ہونے کی صورت پیدا ہو جاتی ہے پس اب اس کو اس شئے سے ناامید کرنا جس کے وہ درپے ہے اور اس کی مراد سے محروم کرنا اس کے ساتھ برائی اور ظلم کرنا اور اس کو تنگ کرنا ہے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''کوئی عورت اپنی مسلمان بہن کی طلاق کی خواہش نہ کرے کہ اس کے برتن کو خالی کر کے اپنا نکاح اس شخص سے کرے کیونکہ اس کے لئے وہی ہے جو اس کے مقدر میں ہے''۔

میں کہتا ہوں اس میں یہ راز ہے کہ اس کی طلاق کا چاہنا اس پر ظلم کرنا اور اس کی روزی کے برباد کرنے میں کوشش کرنا ہے اور شہر کی بربادی کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ ایک دوسرے کے روزگار کو برباد کرے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ یہ ہے کہ ہر شخص اپنی روزی اس طریقہ سے حاصل کرے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے آسان کیا ہے نہ یہ کہ دوسرے کی روزی کے زائل کرنے میں کوشش کرے۔

ستر کا بیان

واضح ہو کہ جب عورتوں کی طرف دیکھنے سے مردوں کو ان کا عشق اور ان کے ساتھ محبت پیدا ہوتی ہے اور اسی طرح عورتوں کو بھی مردوں کے دیکھنے سے عشق ومحبت پیدا ہوتی ہے اور بسا اوقات یہ بات اس کا سبب ہو جاتی ہے کہ بغیر طریقہ راشدہ کے ان سے قضا شہوت کی جائے مثلاً اس عورت کی پیچھا کرنا جو دوسرے کی عصمت میں ہے یا بغیر نکاح کے یا بغیر کفو کے اعتبار کئے اس کو تصرف میں لانا اور اس باب میں جو کچھ مشاہدہ میں آیا ہے وہ اس بیان سے مستغنی کرتا ہے جو دفتروں میں مذکور ہے اس واسطے حکمت کا مقتضی یہ ہوا کہ یہ دروازہ بند کیا جائے اور چونکہ انسانوں کی حاجتیں مختلف ہیں جن میں باہم مخالطت کی ضرورت پڑتی ہے اس واسطے ضروری ہوا کہ حاجات کے اعتبار سے ممانعت نظر کے کئی مراتب مقرر کئے جائیں پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی طریقے مشروع فرمائے ان میں سے ایک یہ ہے کہ عورت بغیر ایسی ضرورت کے جس کے بغیر چارہ ہی نہ ہو اپنے گھر سے باہر نہ نکلے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''عورت ستر کی چیز ہے پس جب گھر سے نکلتی ہے تو شیطان اس پر نگاہ ڈالتا ہے''۔

میں کہتا ہوں اس کے معنی یہ ہیں کہ شیطان کا گروہ اس پر نگاہ ڈالتا ہے یا اس سے فتنہ کے اسباب کا مہیا ہونا مراد ہے، اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''اور اپنے گھروں میں رہو'' اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو چونکہ اسرار دین کا علم عطا ہوا تھا اس واسطے وہ ہمیشہ اسی آرزو میں رہتے تھے کہ پردہ کا حکم نازل ہو حتی کہ انھوں نے ایک روز حضرت سودہ رضی اللہ عنہا سے پکار کر کہا کہ تم ہم سے پوشیدہ نہیں ہو، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دیکھا کہ اس باب کے بالکل بند کر دینے میں حرج عظیم ہے اس

واسطے آپ نے گھر میں رہنا ان کے لئے مستحب کیا، واجب نہیں کیا اور فرمادیا ''تم کو اپنی ضروریات کے لئے باہر نکلنے کی اجازت ہے'' دوسرے یہ ہے کہ عورت اپنے اوپر چادر ڈالے رہے اور سوائے خاوند اور ذی رحم محرم کے کسی کے سامنے زینت کے مواضع نہ ظاہر ہونے دے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، ''آپ مومنین سے کہہ دیجئے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہ کی حفاظت کریں یہ ان کے لئے زیادہ پاکیزہ ہے بے شک خدا تعالیٰ ان کے اعمال سے باخبر ہے اور آپ مومن عورتوں سے کہہ دیجئے کہ اپنی آنکھیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور اپنی آرائش کو بجز اس کے جو اس میں سے کھلا رہتا ہو ظاہر نہ ہونے دیا کریں اور اپنے سینوں پر اوڑھنیاں اوڑھا کریں اور اپنی زینت کو بجز اپنے خاوند کے اور باپ کے اور خسر کے اور اپنے بیٹوں کے اور اپنے خاوند کے بیٹوں کے اور اپنے بھائیوں کے کسی پر ظاہر نہ ہونے دیں'' الایہ

پس خدا تعالیٰ نے ان اعضا کے کھولنے کی رخصت دی ہے جن سے شناخت ہوسکتی ہے یعنی منہ، اور جن اعضا سے اکثر چیزیں لی اور دی جاتی ہیں اور وہ دونوں ہاتھ میں اور ان کے علاوہ تمام اعضا کا چھپانا واجب کیا مگر خاوند اور ذی رحم محرم اور اپنے غلاموں کے سوا اور جو عورتیں گھروں میں بیٹھنے والی یعنی عمر رسیدہ ہیں ان کو اپنے کپڑے اتارنے کی اجازت ہے، تیسرے یہ ہے کہ کوئی مرد کسی عورت کے ساتھ تنہائی میں نہ رہے جب تک کوئی تیسرا شخص وہاں ایسا موجود نہ ہو جس سے دونوں کو خوف ہو، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''خبردار کوئی مرد کسی خاوند رسیدہ عورت کے پاس رات بسر نہ کرے بجز اس کے خاوند کے یا محرم کے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''کوئی مرد کسی عورت کے ساتھ تنہائی میں نہ رہے کیونکہ تیسرا ان میں شیطان ہوتا ہے'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''ان عورتوں کے پاس نہ جاؤ جن کے خاوند گھر پر نہیں ہیں کیونکہ انسان کے بدن میں خون کے مانند شیطان پھرتا ہے'' چوتھے یہ ہے کہ کوئی شخص خواہ عورت ہو یا مرد دوسرے کے ستر کو نہ دیکھے عام ہے کہ وہ عورت ہو یا مرد بجز میاں بیوی کے''۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''نہ کوئی مرد مرد کا ستر دیکھے نہ کوئی عورت عورت کا ستر دیکھے''۔

میں کہتا ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ ستر دیکھنے سے شہوت جوش میں آتی ہے اور عورتوں میں باہم عشق ہوجاتا ہے، اور اسی طرح مردوں میں بھی، اور ستر کے نہ دیکھنے میں کوئی دقت بھی نہیں ہے

اور نیز شرمگاہ کا ستر ارتفاقات کے ان اصولوں میں سے ہے جو نہایت ضروری ہیں، پانچویں یہ ہے کہ ایک کپڑا میں کوئی کسی کو ساتھ لپٹ کر نہ سوئے اور اسی حکم میں دو کا مثلاً ایک پلنگ پر سونا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''کوئی مرد دوسرے کے ساتھ ایک کپڑے میں نہ لیٹے اور نہ عورت عورت کے ساتھ ایک کپڑے میں لیٹے''، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''کوئی عورت کسی عورت کے ساتھ برہنہ ہو کر نہ سوئے کہ پھر وہ اپنے خاوند سے اس کا حال اس طرح بیان کرے کہ گویا وہ اس کو دیکھ رہا ہے''۔

میں کہتا ہوں اس کا سبب یہ ہے کہ ایک ساتھ سونے سے شہوت اور رغبت پورے جوش میں آتی ہے جس سے ان میں چپٹی اور لواطت کی خواہش پیدا ہوتی ہے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ ''گویا وہ اس کی طرف دیکھ رہا ہے'' اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک عورت کا دوسری عورت کے ساتھ برہنہ ہو کر لیٹنا بسا اوقات اس کی محبت کو دل میں پوشیدہ رکھنے کا باعث ہو جاتا ہے پس وہ اپنے شوہر یا قرابت دار کے سامنے اس لذت کو بیان کر دیتی ہے جو اس کو حاصل ہوئی تھی جس کی وجہ سے ان لوگوں کو اس عورت کا اشتیاق ہو جاتا ہے اور سب سے بڑھ کر فساد یہ ہے کہ کسی مرد کے سامنے اس عورت کے اوصاف بیان کیے جائیں جس کا خاوند نہیں ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ہیت نامی مخنث کو ازواج مطہرات کے گھروں سے نکالنے کا یہی سبب تھا۔

واضح ہو کہ ستر عورت یعنی وہ اعضا جن کے کھلنے سے لوگوں میں عادات متوسطہ کے اعتبار سے عار آتی ہے جیسا کہ اس زمانہ میں مثلاً قریش میں تھا، ان ارتفاقات کے اصولوں میں سے ہے جن کو ان تمام لوگوں نے تسلیم کر لیا ہے جو بشر کہلائے جاتے ہیں اور اسی کے سبب سے انسان تمام حیوانات سے ممتاز ہے پس اسی وجہ سے شارع نے ان اعضا کے ستر کو واجب کیا اور دونوں عضو خاص اور خصیتین اور پیڑو اور جو اعضا ان کے قریب ہیں یعنی دونوں رانوں کا اوپر کا حصہ ان سب اعضا کا ستر ہونا دین کے روشن بدیہیات میں سے ہے جس پر دلیل پیش کرنے کی کوئی حاجت نہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول سے ''جب تم میں سے کوئی شخص اپنے غلام کا نکاح اپنی باندی سے کر دے تو پھر اس کے ستر کو نہ دیکھے'' اور ایک روایت میں ہے کہ ''ناف سے نیچے اور گھٹنے سے اوپر نہ دیکھے'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول سے ''کیا تو نہیں جانتا کہ ران ستر ہے'' یہ بات

ثابت ہوئی کہ دونوں رانیں ستر ہیں اور اس مسئلہ میں احادیث متعارض ہیں لیکن اس پر عمل کرنے میں زیادہ احتیاط ہے اور وہ قوانین شرع سے قریب تر ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''برہنہ ہونے سے پرہیز کرو کیونکہ تمہارے ساتھ وہ فرشتے ہیں جو تم سے جدا نہیں ہوتے بجز بیت الخلا کے وقت یا اس وقت جب مرد اپنی بیوی سے صحبت کے لئے جاتا ہے پس تم ان سے حیا کرو اور ان کی عزت کرو'' اور آپ نے فرمایا ''اللہ تعالیٰ اس بات کا زیادہ مستحق ہے کہ اس سے حیا کی جائے''۔

میں کہتا ہوں برہنہ ہونا اگرچہ تنہائی میں ہی ہو بغیر ایسی ضرورت کے جس کے بغیر چارہ نہ ہو جائز نہیں ہے کیونکہ بسا اوقات انسان اس پر اقدام کرتا ہے اور اعمال کا اعتبار ان اخلاق کے ساتھ ہوتا ہے جن سے یہ اعمال پیدا ہوتے ہیں اور ستر کا منشا حیا ہے اور نفس پر تحفظ اور تقید کی کیفیت کا غالب کرنا ہے اور بے حیائی کو ترک کر دینا ہے اور اس کا عادی نہ ہونا ہے، اور جب شارع کسی کو ایک شئے کا حکم دیتا ہے تو اس کا مقتضی یہ ہوتا ہے کہ دوسرے کو اس بات کا حکم دیا جائے کہ اس حکم کے موافق اس شخص کے ساتھ معاملہ کرے پس جب عورتوں کو پردہ کا حکم دیا گیا تو مردوں کے لئے نگاہوں کو نیچی رکھنا واجب ہوا اور نیز مردوں کے نفوس کی تہذیب جب ہی ہوسکتی ہے کہ وہ اپنی نگاہوں کو پست کریں اور اپنے نفوس کو اس پر مجبور کریں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''پہلی نظر تیرے لئے جائز ہے دوسری جائز نہیں ہے''۔

میں کہتا ہوں اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ حالت بقایہ منزلہ حالت انشا کے ہے، اور ایک مرتبہ جس وقت ایک نابینا شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں حاضر ہوئے اور حضرت ام سلمہ اور حضرت میمونہ رضی اللہ عنہما کو پردہ کرنے کا حکم دیا گیا اور انھوں نے عرض کیا ''کیا وہ اندھا نہیں ہے جو ہم کو نہیں دیکھ سکتا؟ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تم بھی نابینا ہو جو اس کو نہیں دیکھ سکتیں''۔

میں کہتا ہوں اس میں راز یہ ہے کہ عورتوں کو بھی مردوں میں رغبت ہوتی ہے جس طرح مردوں کو عورتوں میں رغبت ہوتی ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تھا ''تجھ پر کوئی حرج کی بات نہیں اس وقت تیرا باپ اور تیرا غلام ہے''۔

میں کہتا ہوں غلام کو محارم کا درجہ اس لئے دیا گیا کہ اس کو اپنی سیدہ کی طرف اس لئے رغبت

نہیں ہوتی کہ وہ اس کی نظر میں معزز ہوتی ہے اور نہ سیدہ کو غلام کی طرف رغبت ہوتی ہے کیونکہ وہ اس کی نگاہ میں حقیر ہوتا ہے اور ان کے درمیان پردہ کا حکم مشکل ہے اور یہ سب صفات محارم کے اندر معتبر ہیں کیونکہ قرابت قریبہ محرمہ رغبت کے کم ہونے کا باعث ہے اور نا امیدی طمع کے منقطع ہونے کے اسباب میں سے ایک سبب ہے اور طویل مدت تک ساتھ رہنا قلت نشاط کا اور پردہ کے دشوار ہونے کا اور عدم التفات کا سبب ہے پس اس واسطے یہ دستور جاری ہوا کہ محارم سے جو پردہ ہو وہ غیر لوگوں کی بہ نسبت کم درجہ کا ہو۔

نکاح کا بیان

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''ولی کے بغیر نکاح نہیں ہوتا، واضح ہو کہ نکاح کے بارے میں تنہا عورتوں کو مختار بنانا درست نہیں ہے کیونکہ ان کی عقلیں ناقص ہوتی ہیں اور ان کی فکر بھی کمزور ہوتا ہے پس بسا اوقات ان کو مصلحت معلوم نہیں ہوتی اور اکثر ان کو شرافت کا لحاظ نہیں ہوتا پس بسا اوقات ان کو غیر کفو میں رغبت ہو جاتی ہے اور اس میں ان کی قوم کو عار ہوتی ہے اس واسطے ضروری ہوا کہ اس باب میں اولیا کو بھی کچھ دخل ہوتا کہ یہ فساد بند ہو اور نیز ضرورت جبلیہ کے اعتبار سے لوگوں میں عام طریقہ ہے کہ مردوں کو عورتوں پر اختیار ہوتا ہے اور ہر امر کا بندوبست انہیں کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور ان کے تمام اخراجات مردوں ہی کے ذمہ ہوتے ہیں اور عورتیں ان کی مقید ہوتی ہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''مرد عورتوں پر حاکم ہیں اس سبب سے کہ خدا نے بعض کو بعض سے افضل بنایا ہے'' اور نیز نکاح کے اندر ولی کی شرط لگانے میں مردوں کی عظمت ہے اور عورتوں کا نکاح میں خود مختار ہونا بے حیائی ہے جس کا مدار قلت حیا پر ہے اور اولیا کی مخالفت اور ان کی بے قدری پر ہے، اور نیز یہ بات ضروری ہے کہ بہ سبب شہرت کے نکاح زنا سے ممیز ہو جائے اور شہرت کی عمدہ صورت یہ ہے کہ عورت کے اولیا نکاح میں موجود ہوں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''شوہر رسیدہ عورت کا نکاح اس کے مشورہ کے بغیر اور باکرہ کا نکاح اس کی اجازت کے بغیر نہ کیا جائے اور اس کی اجازت اس کا چپ ہو جانا ہے'' اور ایک روایت میں ہے کہ ''باکرہ سے اس کا والد اجازت لے''۔

میں کہتا ہوں صرف اولیا کو مختار بنانا بھی جائز نہیں ہے کیونکہ عورت اپنا نفع ونقصان جس قدر

جانتی ہے وہ نہیں جانتے اور نیز نکاح کا نفع ونقصان خاص اسی کی طرف رجوع کرتا ہے اور استئمار سے مراد عورت کے حکم کا صراحتاً طلب کرنا ہے اور استیذان سے مراد اس سے اجازت طلب کرنا اور اس کا منع نہ کرنا ہے اور اس کا ادنیٰ مرتبہ سکوت ہے اور حدیث شریف میں مراد باکرہ بالغہ سے استیذان ہے نہ صغیرہ سے کیونکہ وہ ناسمجھ ہوتی ہے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت عائشہ صدیقہؓ کا چھ سال کی عمر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح کر دیا تھا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" جو غلام اپنے مولیٰ کی اجازت کے بغیر نکاح کرتا ہے تو وہ حرام کار ہے"۔

میں کہتا ہوں چونکہ غلام اپنے مولیٰ کی خدمت میں مشغول رہتا ہے اور نکاح اور اس کے فروعات یعنی عورت کے ساتھ سلوک کرنا اور خلوت میں اس کے پاس رہنا ایسی چیزیں ہیں جو بسا اوقات مولیٰ کی خدمت گزاری میں نقصان پہنچاتی ہیں اس واسطے ضروری ہے کہ یہ دستور قرار دیا جائے کہ غلام کا نکاح مولیٰ کی اجازت پر موقوف رہے اور باندی کا نکاح بطریق اولیٰ مولیٰ کی اجازت پر موقوف ہونا چاہئے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے" پس ان کے ساتھ مولیٰ کی اجازت لے کر نکاح کرلو" حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو حاجت یعنی نکاح وغیرہ کے وقت یہ تشہد پڑھنا تعلیم فرمایا ہے: **الحمد لله ونستعينه ونستغفره ونعوذ بالله من شرور انفسنا من يهدالله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادى له واشهد ان لا اله الا الله واشهد ان محمداً عبده ورسوله**، اور اس کے بعد یہ تین آیتیں پڑھے: **يايها الذين آمنوا اتقوا الله حق تقاته ولاتموتن الا وانتم مسلمون، واتقوا الله الذى تسائلون به والارحام ان الله كان عليكم رقيباً، يا ايها الذين امنوا اتقوا الله وقولوا قولا سديداً يصلح لكم اعمالكم ويغفرلكم ذنوبكم ومن يطع الله ورسوله فقد فاز فوزاً عظيماً**. میں کہتا ہوں اہل جاہلیت نکاح سے قبل خطبہ میں اپنی قوم کے مفاخر وغیرہ وہ امور بیان کیا کرتے تھے جن کو ذکر مقصود کا وسیلہ بناتے تھے اور اس کی تعظیم کا ذریعہ سمجھتے تھے اور اس رسم کے جاری ہونے میں مصلحت تھی کیونکہ خطبہ کی بنیاد شہرت اور ایک چیز کو سب کے سامنے کر دینے پر ہے اور تشہیر نکاح میں مقصود ہے تا کہ حرام سے تمیز ہو جائے۔

اور نیز خطبہ بڑے بڑے امور میں پڑھا جاتا ہے اور نکاح کا اہتمام کرنا اور اس کو عظیم الشان

بنانا اعظم مقاصد سے ہے اور واسطے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ کی اصل کو باقی رکھا اور اس کی صورت میں تبدیلی فرمادی اس طرح سے کہ ان مصالح کے ساتھ مصلحت کلیہ کو شامل کر دیا اور وہ یہ ہے کہ ہر کام میں اس کے مناسب ذکر کو ملایا جائے اور ہر جگہ پر شعائر الٰہی کی تعظیم کی جائے تا کہ دین حق کے نشانات پھیل جائیں اور اس کے شعائر اور امارات ظاہر ہو جائیں پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں چند اقسام کے ذکر مسنون فرمائے جیسے حمد اور استعانت اور استغفار اور تعوذ اور توکل اور تشہد اور قرآن شریف کی چند آیات اور اس مصلحت کی طرف اپنے اس قول سے اشارہ کر دیا ''جس خطبہ میں تشہد نہ ہو وہ کٹے ہوئے ہاتھ کے مانند ہے'' اور اپنے اس قول سے اشارہ فرمادیا ''جس کلام کی ابتدا میں اللہ تعالیٰ کی حمد نہ ہو تو وہ ناتمام ہے'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''حلال اور حرام میں فرق یہی ہے کہ نکاح میں آواز اور دف ہوتی ہے'' اور آپ نے فرمایا'' نکاح کا اعلان کرو اور نکاح کو مسجدوں میں کرو اور اس پر دف بجادیا کرو''۔

میں کہتا ہوں اہل عرب نکاح میں دف اور آواز کا استعمال کرتے تھے اور یہ عادت ان میں بہت جاری تھی جس کو وہ اس نکاح صحیح میں ترک نہیں کیا کرتے تھے جس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان چار قسم کے نکاحوں میں سے باقی رکھا ہے جن کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا ہے اور اس میں ایک مصلحت یہ ہے کہ نکاح اور زنا دونوں قضا شہوت اور مرد و عورت کی رضامندی میں متفق ہیں اس واسطے ایسی شئے کا حکم دینا ضروری ہوا جس سے ان دونوں کے درمیان بادی الرائے میں ایسا فرق معلوم ہو جائے کہ کسی کو اس میں کلام یا خفا باقی نہ رہے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے چند روز کے لئے متعہ کی اجازت دے دی تھی پھر اس سے منع فرمادیا، لیکن اولاً رخصت دینا ایک حاجت کے سبب سے تھا جو اس کے جواز کی داعی تھی جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے اس شخص کے بارے میں ذکر کیا ہے جو ایسے شہر میں جاتا تھا جہاں اس کا گھر بار نہ ہوتا تھا اور حضرت ابن عباسؓ نے اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا کہ اس زمانہ میں صرف جماع کے لئے اجرت نہیں دیتے تھے بلکہ تدبیر خانہ سے متعلق دیگر ضروریات کے ضمن میں جماع بھی داخل ہوتا تھا، اور ایسا ہو بھی نہیں سکتا کیونکہ محض جماع پر اجرت دینا طبیعت انسانی سے بالکل باہر ہو جانا ہے اور بڑی بے حیائی ہے جس کو قلب سلیم دفع کرتا ہے اور متعہ سے منع کرنے کا سبب یہ ہوا کہ اکثر اوقات میں یہ حاجت رفع

ہو گئی اور نیز متعہ کی رسم کے جاری رکھنے میں انساب کا اختلاط ہوتا ہے کیونکہ اس مدت کے گزرتے ہی وہ عورت خاوند کے قبضہ سے باہر ہو جاتی ہے اور اس کو اپنے نفس کا اختیار ہوتا ہے پس کچھ معلوم نہیں کہ وہ کیا کرے گی اور عدت کا انضباط اس نکاح صحیح میں جس کی بنا دوام پر ہوتی ہے نہایت مشکل سے ہوتا ہے چہ جائیکہ متعہ میں اور متعہ کے جاری رکھنے میں نکاح صحیح کو جو شرع میں معتبر ہے برباد کرنا ہے کیونکہ اکثر نکاح کرنے والوں کی بیشتر غرض شہوت فرج کا پورا کرنا ہوتا ہے، اور نیز من جملہ ان امور کے جن سے نکاح اور زنا میں امتیاز ہوتا ہے دائمی اعانت کا قائم رکھنا ہے اگرچہ اصل اس میں لوگوں کے سامنے منازعت کا قطع کرنا ہوتا ہے اور اہل عرب بغیر مہر کے نکاح نہیں کرتے تھے ان چند امور کی وجہ سے جوان کو اس پر آمادہ کرتے تھے اور اس میں چند مصلحتیں بھی تھیں۔

از اں جملہ یہ ہے کہ نکاح کا فائدہ بغیر اس بات کے تمام نہیں ہوتا کہ ہر شخص معاونت دائمی پر اپنے آپ کو قائم رکھے اور عورت کی جانب سے اس کی صورت یہ ہے کہ اس کو اپنا اختیار نہ رہے اور یہ بات درست نہ تھی کہ مرد کے قبضہ سے بھی اس کا اختیار لے لیا جاتا ورنہ طلاق کا دروازہ بند ہو جاتا اور وہ عورت کے ہاتھ میں مقید ہو جاتا جس طرح عورت مرد کے ہاتھ میں مقید ہے اور اصل بات یہ تھی کہ مرد عورتوں پر حاکم رہیں اور یہ بھی درست نہیں تھا کہ ان دونوں کا اختیار قاضیوں کے سپرد کیا جاتا کیونکہ ان کی طرف مقدمہ لے جانے میں لوگوں کو بڑی دقت ہوتی اور ہر شخص اپنی خاص بات کو جس قدر جانتا ہے قاضی نہیں جانتے پس یہ بات متعین ہوئی کہ خاوند کو مال کا نقصان نظر آئے اگر وہ اس نظام کو توڑنا چاہے تا کہ وہ بغیر ایسی ضرورت کے جس کے بغیر اس کو چارہ نہ ہو جرأت نہ کر سکے پس مہر کے مقرر کرنے میں ایک قسم کا اطمینان ہے اور نیز نکاح کی عظمت بغیر مال کے ظاہر نہیں ہوتی جو بضع کے عوض میں مقرر کیا جائے کیونکہ لوگ جس قدر مال میں بخل کرتے ہیں کسی اور چیز میں نہیں کرتے لہٰذا اسی کے صرف کرنے سے نکاح کا مہتم بالشان ہونا معلوم ہو سکتا ہے اور اس کے مہتم بالشان ہونے سے اولیا کی آنکھیں جبکہ وہ اس شخص کو اپنے جگر گوشہ کا مالک ہوتے ہوئے دیکھیں ٹھنڈی ہو سکتی ہیں اور اس کے سبب سے نکاح اور زنا کے درمیان تمیز ہوتی ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''یہ کہ تم اپنے مالوں کے عوض تلاش کرو حفاظت کرنے والی نہ مستی نکالنے والی'' پس اسی لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وجوب مہر کو بدستور باقی رکھا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی

کوئی ایسی حد جس میں کمی وبیشی نہ ہو سکے مقرر نہیں فرمائی کیونکہ اظہار اہتمام میں لوگوں کی عادات مختلف ہیں اور رغبتوں کے درجات متفاوت ہیں اور مال کی حرص میں ان کے جدا جدا طبقات ہیں پس ان پر اس کی حد معین کرنا ناممکن ہے جس طرح اشیا مرغوبہ کی قیمت ایک حد معین کے ساتھ منضبط کرنا ناممکن ہے اسی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص سے فرمایا ''تلاش کر اگرچہ لوہے کی انگوٹھی ہو'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس شخص نے اپنی بیوی کے مہر میں مٹھی بھر ستو یا چھوہارے دیدیئے تو اس نے حلال کرلیا'' مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ازواج اور اپنی صاحبزادیوں کے مہر میں ساڑھے بارہ اوقیہ مقرر کر رکھے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ''تم عورتوں کے مہر زیادہ مقرر نہ کرو کیونکہ اگر زیادہ مہر مقرر کرنا دنیا میں عزت یا عند اللہ پرہیز گاری کی بات ہوتی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم تم سب میں بدرجہ اولیٰ اس بات کا لحاظ فرماتے'' الحدیث۔

میں کہتا ہوں اس دستور میں کہ مہر اس قدر ہونا چاہئے جو دل پر گراں ہو اور اس کی فکر ہو راز یہ ہے کہ مہر کے اندر مناسب یہ ہے کہ اس کی اتنی مقدار نہیں ہونی چاہئے کہ عادۃً اس کی قوم کے اعتبار سے اس کا ادا کرنا مشکل ہو جائے اور یہ مقدار یعنی ساڑھے بارہ اوقیہ اس حالت کے اعتبار سے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں لوگوں کی تھی اور اسی طرح آپ کے بعد بھی اکثر لوگوں کی حالت کے اعتبار سے پوری اور کافی مقدار ہے مگر وہ لوگ جن کے غنی بہ منزلہ بادشاہوں کے ہیں مستثنیٰ ہیں اور اہل جاہلیت مہر کے بارے میں تاخیر کرکے یا کم کرکے عورتوں پر ظلم کیا کرتے تھے پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی ''اور عورتوں کو ان کے مہر بے مانگے دیدو'' اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''تم پر کچھ حرج نہیں اگر تم عورتوں کو بدوں ہاتھ لگائے یا بدوں کچھ مقرر کئے طلاق دیدو''۔

میں کہتا ہوں اصل اس میں یہ ہے کہ نکاح ملک کا سبب ہے اور عورتوں سے صحبت کرنا اس کا اثر ہے اور ہر شئے سے مقصود اس کا اثر ہوتا ہے اور حکم اس کے سبب پر ہی مرتب ہوتا ہے پس اسی واسطے وہ دونوں اس بات کے مستحق ہیں کہ مہر ان دونوں پر تقسیم کیا جائے اور مرنے کی وجہ سے نکاح کا امر ثابت اور متحقق ہو جاتا ہے کیونکہ اس نے موت تک نکاح کو رد نہیں کیا اور اس نے روگردانی نہیں کی حتی کہ اس کے اور نکاح کے درمیان موت حائل ہوگئی اور طلاق کے ساتھ نکاح مرتفع ہو جاتا ہے اور فسخ ہو جاتا ہے اور وہ رد اور اقالہ کے مشابہ ہے پس جب یہ تمہید ہو چکی تو ہم کہتے ہیں

کہ جاہلیت کے زمانہ میں مہر کی بابت بڑے جھگڑے پیدا ہوتے تھے اور مال میں لوگ بخل کیا کرتے تھے اور بہت سے امور سے حجت قائم کیا کرتے تھے پس خدا تعالیٰ نے اس بارے میں حکمت اور انصاف سے اس قاعدہ کے بموجب فیصلہ کردیا پس اگر عورت کے لئے کچھ مقرر کیا ہے اور عورت سے جماع بھی کیا ہے تو عورت کو پورا مہر دینا پڑے گا خواہ وہ مرجائے یا طلاق دیدے کیونکہ اس کے لئے ملک کا سبب اور اس کا اثر پورا پورا پایا گیا اور خاوند نے اس سے مجامعت کرلی، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''اور البتہ تم میں سے بعض بعض کی طرف پہنچ گیا ہے اور ان عورتوں نے تم سے نہایت پختہ عہد لے لیا ہے'' اور اگر اس کا مہر معین ہو چکا ہے اور مرد بغیر مجامعت کئے مرگیا تب بھی عورت کو کامل مہر ملے گا کیونکہ مرنے سے نکاح ثابت ہو چکا اور ایسی حالت میں صحبت نہ کرنا کچھ مضر نہیں ہے کیونکہ موت آسمانی حکم سے پیش آئی ہے اور اگر قبل از دخول اس نے طلاق دی ہے تو عورت کو اس آیت کے موافق نصف مہر ملے گا کیونکہ اس صورت میں دو باتوں میں سے ایک پائی جاتی ہے دوسری نہیں پائی جاتی پس اس میں دو مشابہتیں پائی جاتی ہیں ایک تو منگنی کے ساتھ جو قبل نکاح ہوتی ہے اور دوسری نکاح تام کے ساتھ، اور اگر اس عورت کے لئے کچھ مہر مقرر نہیں کیا ہے اور اس کے ساتھ صحبت کی ہے تو اس کو اس کے کنبہ کی عورتوں کے موافق مہر ملے گا نہ اس سے کم اور نہ اس سے زیادہ اور اس پر عدت واجب ہوگی اور اس کو میراث ملے گی کیونکہ اس کے حق میں عقد اپنے سبب اور اثر کے ساتھ پورا ہو چکا اس واسطے اس کے لئے مہر کا ہونا ضروری ہوا اور ہر شئے کا اندازہ اس کی نظیر اور مثل سے ہوتا ہے اور اس کے کنبہ کی عورتوں کا مہر اس اندازہ کے لئے نہایت مناسب ہے، اور اگر نہ اس کا مہر مقرر کیا اور نہ اس سے صحبت کی تو اس عورت کو متعہ یعنی جوڑہ وغیرہ دینا پڑے گا کیونکہ عقد نکاح بغیر مال کے ہونا ممنوع ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''ان تبتغوا باموالکم '' اور اس میں مہر واجب کرنے کی کوئی صورت نہیں تھی، کیونکہ نہ ملک پائی گئی اور نہ مہر کی تعیین ہے پس مہر سے کم متعہ کے ساتھ اس کا اندازہ کیا گیا اور ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی چند سورتوں کو مہر مقرر کیا تھا کیونکہ ان کا سکھانا بھی ایک ذی شان کام ہے جس میں رغبت اور طلب ہوتی ہے جس طرح اموال مطلوب اور مرغوب ہوتے ہیں پس اس کا مال کے قائم مقام ہونا جائز ہوا، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں لوگوں کا یہ دستور تھا کہ صحبت سے پیشتر ولیمہ کیا

کرتے تھے اور اس میں بہت سی مصلحتیں ہیں، از اں جملہ یہ ہے کہ اس میں نہایت خوبی کے ساتھ نکاح کی اشاعت ہوتی ہے اور یہ کہ وہ بیوی سے دخول کرنا چاہتا ہے کیونکہ یہ اشاعت ضروری ہے تا کہ نسب میں کسی کو وہم کرنے کی بھی گنجائش نہ رہے اور بادی الرائے میں نکاح اور زنا میں فرق ہو جائے اور اس عورت کی خصوصیت اس مرد کے ساتھ سب لوگوں کے سامنے ثابت ہو جائے اور از اں جملہ یہ ہے کہ اس میں خدا تعالیٰ کی نعمت کا شکر ادا کرنا ہے کہ اس نے تدبیر منزل کے انتظام میں وہ چیز عطا کی جو کار آمد اور نافع ہے۔

اور از اں جملہ یہ ہے کہ اس میں بیوی اور اس کے کنبے کے ساتھ نیکی کرنا ہے کیونکہ اس کے لئے مال کا خرچ کرنا اور اس کے باب میں لوگوں کو جمع کرنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ خاوند کے نزدیک بیوی کی عزت اور حرمت ہے اور میاں بیوی کے مابین الفت قائم کرنے میں اس قسم کے امور ضروری ہیں خاص کر ان کے اول اجتماع میں، اور از اں جملہ ایک جدید نعمت کا مالک ہونا ہے یعنی وہ ایک ایسی چیز کا مالک ہوا جو اس کے ملک میں نہ تھی اور جو سرور اور خوشی کا سبب ہے اور مال کے خرچ کرنے پر آدمی کو آمادہ کرتا ہے اور اس خواہش کے پورا کرنے میں سخاوت کا عادی ہونا اور خواہش بخل سے بری ہونا ہے اور اس کے علاوہ بہت سے فوائد اور مصالح ہیں پس جبکہ اس کے اندر سیاست مدنیہ اور منزلیہ اور تہذیب نفس اور احسان کے متعلق بہت سے فوائد پائے جاتے تھے اس واسطے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اس کو باقی رکھنا اور اس کی طرف رغبت اور حرص دلانا اور خود بھی اس کو عمل میں لانا ضروری ہوا، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا بھی اسی وجہ سے انضباط نہیں فرمایا جس کو ہم مہر میں ذکر کر چکے ہیں اور درمیانی حد ایک بکری کا ذبح کرنا ہے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صفیہؓ کے ولیمہ میں لوگوں کو ملیدہ کھلایا تھا اور آپ نے بعض بیویوں کا ولیمہ دو مد جو سے کیا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''تم میں سے جب کوئی شخص ولیمہ کے لئے بلایا جائے تو اس کو جانا چاہئے'' اور ایک روایت میں آیا ہے ''پس اگر چاہے تو کھائے اور اگر چاہے تو نہ کھائے''۔

میں کہتا ہوں جب اصول شرعیہ میں سے یہ بات ہے کہ جب کسی شخص کو کسی مصلحت سے لوگوں کے ساتھ سلوک کرنے کا حکم دیا گیا تو یہ بات ضروری ہو جاتی ہے کہ لوگوں کو بھی اس کی اطاعت اور فرمانبرداری اور بجا آوری کرنے کی طرف رغبت دلائی جائے ورنہ وہ مصلحت جو اس حکم

سے مقصود ہے نہیں پائی جائے گی پس جب خاوند کو اس بات کا حکم دیا گیا کہ نکاح کی تشہیر لوگوں کو کھانا کھلا کر کرے تو ان لوگوں کے لئے اس حکم کا دینا ضروری ہوا کہ اس کی دعوت کو قبول کریں پس اگر روزہ دار ہے اور کھانا نہ کھائے اور کچھ مضائقہ نہیں ہے کیونکہ اشاعت جو مقصود تھی وہ حاصل ہوگئی اور نیز صلہ رحمی کا تقاضا یہ ہے کہ جب ایک مسلمان کو دوسرا مسلمان بلائے تو اس کو ضرور قبول کرے اور اس دستور کے جاری رہنے میں شہر اور قبیلہ کا انتظام ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''میرے لئے (یا یہ فرمایا کہ کسی نبی کیلئے) یہ درست نہیں ہے کہ کسی منقش گھر میں داخل ہو''۔

میں کہتا ہوں چونکہ صورتوں کا بنانا اور اس کپڑے کا استعمال کرنا جس میں تصویریں بنی ہوئی ہوں استعمال کرنا حرام ہے تو اس کا مقتضی یہ ہے کہ جس گھر میں تصویریں ہوں اس گھر کو چھوڑ دینا چاہئے اور اس بارے میں ملامت کرنا چاہئے خاص کر انبیا علیہم السلام کے لئے کیونکہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے ہی بھیجے گئے ہیں اور نیز نہایت درجہ تجمل کو اچھا سمجھنا دنیا کی طلب میں نہایت درجہ غرق ہونے کا سبب ہے اور عجمیوں کو یہی چیز پیش آئی یہاں تک کہ وہ ذکر آخرت بھی اس کی وجہ سے بھول گئے لہٰذا یہ بات ضروری ہوئی کہ شرع میں اس سے منع کیا جائے اور اس سے نفرت کا اظہار کیا جائے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فخر کرنے والوں کا کھانا کھانے سے منع فرمایا۔ میں کہتا ہوں کہ اہل جاہلیت باہم فخر کیا کرتے تھے اور ہر ایک دوسرے پر غالب ہونا چاہتا تھا پس ہر ایک اسی غرض سے مال کو خرچ کیا کرتا تھا اور کوئی دوسری نیت اس میں نہیں ہوتی تھی اور اس میں رنجش اور باہمی فساد اور بغیر کسی مصلحت دینی یا مدنی کے مال کا ضائع کرنا پایا جاتا ہے اور وہ محض خواہش نفسانی کی پیروی ہے پس اس واسطے ضروری ہوا کہ ایسے کام کو ترک کیا جائے اور اس کی اہانت کی جائے اور اس دروازہ کو بند کر دیا جائے اور اس سے روکنے کی عمدہ صورت یہ ہے کہ اس کا کھانا نہ کھایا جائے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جب دو دعوت کرنے والے ساتھ ساتھ دعوت کریں تو جس کا گھر قریب ہے اس کی دعوت قبول کر اور اگر ان دونوں میں سے ایک پہلے آئے تو جو پہلے آیا ہے اس کی دعوت قبول کر''۔

میں کہتا ہوں جب دونوں کا تعارض ہوا تو ترجیح کی ضرورت ہوئی اور وہ ترجیح دعوت میں سبقت کرنے سے یا گھر کے قریب ہونے سے ہوتی ہے۔

ان عورتوں کا بیان جن سے نکاح کرنا حرام ہے

اصل اس میں اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: ''اور ان عورتوں سے نکاح نہ کرو جن سے تمہارے آبا نے نکاح کیا ہے'' اللہ تعالیٰ کے قول ''واللہ غفور رحیم'' تک، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ہے ''چار کو رہنے دے اور باقی کو چھوڑ دے'' اور آپ کا یہ قول ہے ''کسی عورت سے اس کی پھوپھی پر نکاح نہ کیا جائے'' الحدیث، اور اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے ''زانیہ زانیہ ہی سے نکاح کرے'' الآیۃ

واضح ہو کہ جو محرمات ان آیات میں مذکور ہیں ان کی حرمت اہل جاہلیت میں مشہور اور مسلم تھی جس کو وہ ترک نہیں کر سکتے تھے مگر تھوڑی سی باتیں جن کو انھوں نے سرکشی اور فسق کی وجہ سے از خود پیدا کر لیا تھا مثلاً باپ کی منکوحہ سے نکاح کرنا اور دو بہنوں کو جمع کرنا، اور ان محرمات کی تحریم ان میں پشت در پشت برابر چلی آتی تھی یہاں تک کہ ان کے دلوں میں ایسی پیوست ہوگئی تھی جس کا نکلنا ناممکن تھا اور ان کی تحریم میں بڑی بڑی مصلحتیں بھی تھیں پس اللہ تعالیٰ نے محرمات کا حکم اسی طرح باقی رکھا اور جن باتوں میں وہ سستی کرتے تھے ان کی تاکید فرما دی، اور تحریم کے اندر چند امور اصل ہیں، از آں جملہ باہم ارتباط اور صحبت کی عادت کا جاری ہونا اور ان کے درمیان پردہ کا التزام ناممکن ہونا اور دونوں جانب سے طبعی طور سے حاجات کا ارتباط نہ مصنوعی طور سے، پس اگر ان عورتوں سے طمع کے قطع کرنے کا اور ان میں رغبت سے اعراض کرنے کا طریقہ جاری نہ ہوتا تو بے شمار خرابیاں پیدا ہو جاتیں، اور تم دیکھتے ہو کہ جب کسی شخص کی نگاہ اجنبی عورت کی خوبیوں پر پڑتی ہے تو وہ اس پر فریفتہ ہو جاتا ہے اور اس کی وجہ سے اپنی جان کو ہلاکت میں ڈال دیتا ہے پس اس شخص کے بارے میں تم کیا کچھ اندازہ لگا سکتے ہو جو تنہائی میں اس کے ساتھ رہتا ہے اور رات دن

اس کی خوبیاں دیکھتا رہتا ہے اور نیز اگر ان عورتوں کی طرف رغبت کا دروازہ کھول دیا جائے اور اس کو بند نہ کیا جائے اور اس امر میں مردوں پر کوئی ملامت نہ کی جائے تو اس سے عورتوں کو ضرر عظیم پیش آتا ہے کیونکہ وہ اس بات کا سبب ہو جاتا ہے کہ وہ لوگ ان عورتوں کو اپنے پاس رکھ کر ان لوگوں سے مانع ہوں گے جن سے نکاح کرنے کی ان عورتوں کو رغبت ہے کیونکہ ان کا اور ان کے نکاح کا اختیار ان ہی لوگوں کے ہاتھ میں ہے اور نیز اگر وہ ان عورتوں سے نکاح کر لیں تو کوئی شخص ان عورتوں کے واسطے نہیں ہوگا جو ان کی جانب سے حقوق زوجیت کا ان اقارب سے مطالبہ کر سکے باوجودیکہ عورتوں کو اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ کوئی شخص ان کی طرف سے حقوق زوجیت کا ان کے خاوندوں سے مطالبہ کرنے والا ہو اور اس کی نظیر وہ ہے جو یتیم لڑکیوں میں پیش آئی کہ اولیا یتیم لڑکیوں کے جمال اور مال میں رغبت کر کے خود نکاح کر لیا کرتے تھے اور حقوق زوجیت کو پورا ادا نہیں کرتے تھے تب خدا تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی ''اگر تم کو یتیموں میں انصاف نہ کرنے کا اندیشہ ہو تو عورتوں میں جو تم کو پسند آئیں ان سے نکاح کر لو'' الآیہ، اس کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا اور یہ ارتباط طبعی طور پر مردوں کے درمیان اور ان کی ماؤں اور ان کی بیٹیوں اور بہنوں اور پھوپھیوں اور خالوں اور بھتیجیوں اور بھانجیوں کے درمیان واقع ہوتا ہے۔

اور از اں جملہ رضاعت ہے کیونکہ جو عورت دودھ پلاتی ہے وہ بہ منزلہ ماں کے ہو جاتی ہے کیونکہ اس کے اخلاط بدن کے اجتماع کا اور اس کی صورت اور جسم کے قائم ہونے کا وہ عورت ہی سبب ہے صرف فرق یہ ہے کہ ماں نے اپنے شکم میں اس کی پیدائش کو جمع کیا ہے اور اس نے پیدا ہوتے ہی اس کو دودھ پلا کر پالا ہے پس درحقیقت ماں کے بعد وہ ماں ہے اور دودھ پلانے والی کی اولاد بہن بھائیوں کے بعد بہن بھائی ہیں اور اس نے اس کی پرورش میں بہت کچھ تکلیف اٹھائی ہے اور بچہ کے ذمہ جو حقوق اس عورت کے ثابت ہوئے ہیں اور اس کے بچپن میں جو جو باتیں اس بچہ کی طرف سے اس کو پیش آئی ہیں وہ ظاہر ہیں پس اس کا مالک ہو جانا اور اس کے ساتھ جماع کرنا ایسی چیز ہے جس سے فطرت سلیمہ نفرت کرتی ہے اور بہت سے جانور بھی ایسے ہیں جو اپنی ماں کی طرف اور جن کا دودھ پیتے ہیں ان کی طرف اس قدر التفات نہیں کرتے جس قدر اجنبی مادہ کی طرف ان کی توجہ ہوتی ہے پس آدمیوں کا تو ذکر ہی کیا ہے، اور نیز عرب کے لوگ اپنی اولاد کو اور

قبائل میں دودھ پلوانے کے لئے بھیج دیا کرتے تھے پس وہ بچہ ان میں پرورش پاکر جوان ہوجاتا تھا اور ان کے ساتھ اس طرح اختلاط رکھتا تھا جس طرح اپنے محارم میں رہتا ہے، اور عرب کے نزدیک نسب کے علاقہ کے مانند شیر خواری کا بھی علاقہ ہے پس نسب پر اس کا محمول کرنا ضروری ہے چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو حرمت ولادت سے ہوتی ہے وہی حرمت دودھ کے ذریعہ سے بھی ہوتی ہے'' اور جبکہ رضاعت اس کی حرمت کا باعث تھی کہ اس میں ماں کے ساتھ مولود کی بنیاد قائم ہونے اور اس کی صورت کی ترکیب کے ہونے میں مشابہت پائی جاتی ہے اس واسطے ارضاع میں دو چیزوں کا اعتبار کرنا ضروری ہوا ایک تو وہ اندازہ جس سے تحریم کے معنی ثابت ہوتے ہیں پس قرآن شریف کے اندر اول بار یہ نازل ہوا کہ دس گھونٹ معلوم سے حرمت ثابت ہوتی ہے پھر پانچ گھونٹ معلوم سے وہ منسوخ ہوگئے پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک قرآن میں ان کی تلاوت ہوتی تھی لیکن اندازہ کا ہونا سو اس کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ یہ معنی حرمت کے کثیر میں پائے جاتے ہیں نہ قلیل میں اس واسطے اس حکم کے مقرر کرتے وقت ان دونوں کے درمیان ایک حد کا بیان کرنا بھی ضروری ہوا جس کی طرف بوقت اشتباہ رجوع کیا جائے اور دس کے ساتھ اندازہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ عدد میں احاد سے تجاوز کرنے کی وہ پہلی حد ہے اور دودھ پلانے والی عشرات کے اعتبار سے ہی دودھ پلاتی ہے اور نیز وہ جمع کثرت کی حد اوّل ہے اور جمع قلت کا اس میں استعمال نہیں ہوتا پس کثرت معتد بہا کے انضباط کے لئے جو بدن انسانی میں موثر ہے یہ کافی مقدار ہے اور پانچ کے ساتھ منسوخ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں احتیاط ہے کیونکہ جب بچے کو پانچ بڑے بڑے گھونٹ پلائے جاتے ہیں تو اس کے چہرہ اور بدن پر رونق اور تازگی ظاہر ہوجاتی ہے اور جب ان گھونٹوں میں دودھ کم ہوکر بچہ کو ملتا ہے اور دودھ پلانے والی کے دودھ کم ہوتا ہے تو بچہ کے بدن پر خشکی اور کمزوری ظاہر ہونے لگتی ہے پس اس سے ثابت ہوا کہ پانچ گھونٹ اس کے نشو ونما کا سبب ہوسکتے ہیں اور اس سے اس کا بدن قائم رہ سکتا ہے اور اس سے کم میں نمو اور بدن کا قیام نہیں ہوسکتا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''نہ ایک گھونٹ اور دو گھونٹ حرام کرتے ہیں اور نہ ایک چسکی اور دو چسکیاں حرام کرتی ہیں اور نہ ایک دھار اور دو دھاریں حرام کرتی ہیں''۔

اور جو شخص یہ کہتا ہے کہ کثیر اور قلیل دونوں سے حرمت ثابت ہوتی ہے تو اس کا سبب امر

رضاع کی تعظیم اور اس کو بالخاصہ موثر گردانتا ہے جس طرح خدا تعالیٰ کی عادت ان چیزوں میں جاری ہے جن کے حکم کا مدار معلوم نہیں ہوتا، دوسرے یہ ہے کہ رضاعت بچہ کی شکل وصورت کے قائم ہونے کی ابتدائی حالت میں پائی جائے ورنہ وہ دودھ دیگر غذاؤں کے مانند ہوگا جو صورت اور شکل قائم ہونے کے بعد کھائی جاتی ہے جیسے جوان آدمی روٹی کھاتا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''تحقیق رضاعت بوقت شیرخواری ہے'' اور آپ نے فرمایا ''وہی رضاعت حرمت ثابت کرتی ہے جو پستان میں سے نکل کر آنتوں کو پر کرے اور دودھ چھڑانے سے پہلے ہو''۔

اور از آں جملہ اقارب میں قطع رحم ہونے سے بچنا ہے کیونکہ وہ سوکنوں میں باہم حسد ہوتا ہے اور ان کا باہمی بغض ان کے اقارب تک پہنچ جاتا ہے اور اقارب میں حسد کا ہونا نہایت قبیح اور برا ہے اور اسی وجہ سے سلف کی چند جماعتوں نے دو چچازاد بہنوں سے ایک وقت میں نکاح کرنا ناپسند کیا ہے چہ جائیکہ ان دو عورتوں کے ساتھ نکاح کیا جائے کہ اگر ان میں سے ایک کو مرد فرض کیا جائے تو دوسری اس پر حرام ہو جیسے دو بہنیں اور بھتیجی اور پھوپھی اور بھانجی اور خالہ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیٹی اور دوسرے کی بیٹی کے جمع کرنے کو جو حرام فرمایا ہے تو اس میں اسی اصل کا اعتبار کیا ہے کیونکہ سوکن کا حسد اور شوہر کا اس کو پسند کرنا بسا اوقات سوکن اور اس کے اقارب سے بغض کرنے کا سبب ہو جاتا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بغض رکھنا اگر چہ معاشی امور کے اعتبار سے ہو، مفضی الی الکفر ہے۔

اور اصل اس امر میں دو بہنوں کا جمع کرنا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وجہ مسئلہ پر اپنے اس فرمان سے تنبیہ فرمادی کہ ''بھتیجی اور اس کی پھوپھی کو جمع نہ کیا جائے'' الحدیث۔

اور از آں جملہ مصاہرت ہے پس اگر لوگوں میں یہ دستور ہوتا کہ ماں کو اپنی بیٹی کے خاوند کے ساتھ اور مردوں کو اپنی بیٹوں کی بیویوں اور اپنی بیویوں کی بیٹیوں کے ساتھ رغبت ہوتی تو اس سے یہ بات لازم آتی کہ اس تعلق کو توڑنے میں کوشش کی جاتی یا اس شخص کے قتل کرنے میں کوشش کی جاتی جس کی طرف سے خواہش پائی جاتی ہے اور اگر تو ایران کے قدما کے قصے سنے یا اپنے زمانہ کے ان لوگوں کا حال معلوم کرے جو اس سنت راشدہ کے پابند نہیں ہیں تو تو بڑی بڑی باتیں اور بے شمار جور وظلم دیکھے گا اور نیز اس قرابت میں مصاحبت لازم ہے اور پردہ کرنا دشوار ہے اور

باہم حسد کرنا ایک قبیح امر ہے اور دونوں جانب سے حاجات پیش آتی رہتی ہیں پس ان عورتوں کو بھی بہ منزلہ ماں اور بیٹی کے یا بہ منزلہ دو بہنوں کے سمجھا گیا۔

اور از اں جملہ وہ عدد ہے کہ اس کے ساتھ معاملہ زوجیت میں حسن سلوک نہیں ہوسکتا کیونکہ بسا اوقات لوگوں کو عورتوں کے حسن سے رغبت ہوتی ہے اور بہت سی عورتوں سے نکاح کر لیتے ہیں پھر ان میں سے جو زیادہ پسندیدہ ہوتی ہے اس کو اختیار کرتے ہیں اور باقی کو ادھر(۱) میں چھوڑ دیتے ہیں پس نہ تو وہ پورے طور سے بیوی ہے کہ اس کو اطمینان حاصل ہو اور نہ وہ بیوہ ہے، جس کو اپنا اختیار حاصل ہو اور اس امر میں یہ بالکل تنگی بھی نہیں ہونی چاہئے کیونکہ بعض ایسے لوگ ہیں جو ایک بیوی سے سیر نہیں ہوسکتے، اور نکاح کی غایت مقصود تناسل ہے اور ایک مرد بہت سی عورتوں سے اولاد پیدا کرا سکتا ہے، اور نیز زیادہ بیویاں کرنا مردوں کی خصلت ہے اور بسا اوقات اس کی وجہ سے فخر بھی حاصل ہوتا ہے اس واسطے شریعت نے چار کے ساتھ اندازہ کیا کیونکہ چار ایسا عدد ہے کہ تین راتوں کے بعد پھر ہر ایک کی طرف وہ رجوع کر سکتا ہے اور ایک رات سے کم میں کسی طرح کا فائدہ حاصل نہیں ہوتا اور اس صورت میں یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس نے کسی کے پاس رات گزاری، اور تین کثرت کی پہلی حد ہے اور تین سے اوپر کثرت کی زیادتی ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اختیار تھا کہ جس قدر عورتوں سے چاہیں نکاح کریں کیونکہ اس حد کا مقرر کرنا اس فساد کے دفع کرنے کے لئے ہے جو اکثر واقع ہوتا ہے اور جس کا مدار احتمال غالب پر ہے فساد حقیقی کے دفع کرنے کے لئے نہیں ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم حقیقت سے واقف تھے پس آپ کو مظنہ کی حاجت نہیں تھی اور اللہ تعالیٰ کی طاعت اور اس کے حکم کی تعمیل میں آپ معصوم تھے نہ کہ باقی لوگ۔

اور از اں جملہ اختلاف دین ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''مشرکین سے نکاح نہ کرو جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں'' الآیہ، اور اس آیت میں یہ بیان کر دیا کہ اس حکم میں جو مصلحت پیش نظر ہے وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کا کفار سے صحبت رکھنا اور ان کے اور مسلمانوں کے مابین میل جول ہونا بالخصوص بیاہ شادی کرنا دین کی بربادی کا باعث اور دل میں کفر کی طرف حرکت کے پیدا ہونے کا سبب ہے خواہ اس کو اس کا شعور ہو یا نہ ہو اور یہود و نصاریٰ آسمانی شریعت کے پابند اور قوانین

(۱) معلقہ یعنی وہ عورت جو شوہر کی بے اعتنائی کی وجہ سے لٹکی رہتی ہے۔

تشریع کے اصول اوراس کی کلیات کے قائل ہیں بخلاف مجوس اور مشرکین کے پس ان کی صحبت کا مفسدہ بہ نسبت اوروں کے خفیف ہے کیونکہ خاوند بیوی پر غالب ہوتا ہے اوراس کا سرپرست ہوتا ہے، اور بیویاں خاوندوں کی قید میں ہوتی ہیں پس جب کوئی مسلمان اہل کتاب سے نکاح کرے گا تو اس میں فساد کا خطرہ کم ظاہر ہوگا اس واسطے اس امر میں رخصت دینا مناسب ہے اور دیگر مسائل کی طرح اس میں سختی نہیں کرنا چاہیے۔

ازآں جملہ عورت کا دوسرے کی باندی ہونا ہے کیونکہ اس کا اپنے آقا سے اپنی شرمگاہ کو محفوظ رکھنا ناممکن ہے اور آقا کی باندی کے ساتھ یہی خصوصیت ہے کہ اسی کے دین اوراسی کی امانت کی طرف تفویض ہوتی ہے اور یہ مناسب نہیں ہے کہ مالک کو باندی سے خدمت لینے اوراس کے ساتھ تخلیہ کرنے سے روکا جائے کیونکہ اس میں ضعیف ملک کو قوی ملک پر ترجیح دینا ہے کیونکہ یہاں دو ملک ہیں: ملک رقبہ ملک بضعہ اور پہلی ملک قوی ہے جو دوسرے کو بھی شامل ہے اور دوسری ملک ضعیف اور پہلی میں مندرج ہے اور اولیٰ کو اعلیٰ پر غالب کرنے میں قلب موضوع ہے اور عورت کے ساتھ خصوصیت کا نہ ہونا اور جو شخص اس سے طمع رکھے اس کی مدافعت کا ممکن نہ ہونا زنا کی اصل ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اصل کا اعتبار کیا ہے ان نکاحوں میں جن کو اہل جاہلیت باہم کیا کرتے تھے مثلاً استبضاع وغیرہ جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا ہے پس جب ایک باندی اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتی ہو اور پارسا ہو اوراس کے ساتھ نکاح کرنے کی ضرورت پڑے کیونکہ زنا کا خوف ہے اور آزاد عورت سے نکاح کرنے کی قدرت نہیں ہے تو فساد کم ہے اور ضرورت ہے اور ضرورتوں کی وجہ سے ممنوع چیزیں جائز ہو جاتی ہیں۔

اور ازاں جملہ کسی عورت کا کسی مسلمان یا کافر کے نکاح میں پابند ہونا ہے کیونکہ زنا کی اصل یہ ہے کہ کئی آدمی ایک عورت پر بلاخصوصیت کے جمع ہوں اور ایک دوسرے کی طمع کو اس عورت سے دور نہ کر سکے اور اسی لئے زہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ اس طرح رجوع کرتا ہے کہ خدا نے زنا کو حرام کیا اور کچھ جنگ کی قیدی عورتیں صحابہ کے ہاتھ لگیں اور چونکہ ان کے شوہر مشرکین موجود تھے اس واسطے ان کے ساتھ صحبت کرنے سے صحابہ نے حرج سمجھا پس خدا تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی ''اور عورتوں سے جو خاوند والیاں ہیں وہ حرام ہیں مگر جو تمہارے ہاتھ میں مملوک ہیں'' یعنی یہ

مملوک عورتیں حلال ہیں کیونکہ قید سے غیر کی طمع منقطع ہو جاتی ہے اور اختلاف دارین اس عورت پر کئی شخصوں کے ازدہام سے مانع ہے اور اس عورت کا ایک مسلمان کے حصہ میں آنا اس کے ساتھ خصوصیت پیدا کرتا ہے، اور از اں جملہ عورت کا زانیہ ہونا اور زنا کا پیشہ کرنا ہے پس جب تک وہ اس فعل سے باز نہ آئے اور توبہ نہ کرے اس وقت تک اس سے نکاح درست نہیں ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "زانی عورت سے وہی نکاح کرتا ہے جو زانی یا مشرک ہے" اور اس میں حکمت یہ ہے کہ زانی عورت کا شوہر کی عصمت اور قبضہ میں آ کر پھر وہی زنا کاری کرنا دیوثی اور فطرت سلیمہ سے دور ہونا ہے اور نیز اس میں اختلاف نسب کا اندیشہ اور چونکہ محرمات کے حرام کرنے کی مصلحت بغیر اس کے تمام نہیں ہوتی تھی کہ اس تحریم کو امر لازم اور عادت جبلہ کے بہ منزلہ ان اشیا کے گردانا جائے جن سے لوگ طبعاً باز رہتے ہیں اس واسطے ضروری ہوا کہ اس کی شہرت اور شیوع کی تاکید کی جائے اور لوگ اس کو اس طرح پر قبول کر لیں کہ اگر محرمات کی تحریم میں کوئی شخص اعراض کرے تو اس پر سخت ملامت کی جائے اور اس کا طریقہ یہ ہونا چاہئے کہ جو شخص اپنے محرم سے صحبت کرے خواہ نکاح سے ہو یا بغیر نکاح کے وہ شخص قتل کر دیا جائے اور اسی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کو اس شخص کا سر لانے کے لئے بھیجا تھا جس نے اپنے باپ کی منکوحہ سے نکاح کیا تھا۔

آداب مباشرت کا بیان

واضح ہو کہ جب اللہ تعالیٰ نے انسان کو مدنی الطبع پیدا کیا اور تناسل سے اس کی نوع کا باقی رکھنا چاہا تو ضروری ہوا کہ شرع میں نہایت رغبت دلائی جائے اور قطع نسل اور ان اسباب سے جو اس کی طرف مفضی ہوں سخت ممانعت کی جائے اور نسل کا سب سے بڑا سبب اور جو کثرت سے پایا جاتا ہے اور جو نسل کی طرف سب سے زیادہ مفضی ہے اور جو نسل پر برانگیختہ کرتا ہے وہ شرمگاہ کی شہوت ہے کیونکہ وہ ایسی چیز ہے کہ گویا وہ انہیں میں سے ان پر مسلط ہے جو ان کو نسل لینے پر مجبور کرتی ہے خواہ وہ چاہیں یا نہ چاہیں، اور لڑکوں سے اغلام کرنے اور عورتوں سے دبر میں صحبت کرنے کا طریقہ جاری رکھنے میں خلق اللہ کی تبدیلی لازم آتی ہے اس واسطے کہ یہ طریقہ اس شہوت سے جو انسان پر مسلط کی گئی ہے مقصود حاصل ہونے کا مانع ہے اور ان دونوں میں زیادہ برا لڑکوں سے اغلام کرنا ہے کیونکہ اس میں دونوں جانب سے خلق اللہ کی تبدیلی ہے اور مردوں کا زنانہ بن جانا بدترین خصائل میں سے ہے، اور اسی طرح اعضا تناسل کے قطع کرنے کا طریق جاری ہونا اور ان دواؤں کا استعمال کرنا جو باہ کو قطع کرتی ہیں اور ترک دنیا وغیرہ امور خلق اللہ عزوجل کا بدلنا اور طلب نسل کو ترک کرنا ہے اس واسطے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں سے ہر ایک سے ممانعت فرمائی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''عورتوں سے ان کی دبر میں جماع نہ کرو جو شخص اپنی عورت کی دبر میں جماع کرے وہ ملعون ہے'' اور اسی طرح خصی بننے سے اور بیکار ہونے سے بہت سی احادیث میں نہی فرمائی، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''تمہاری بیویاں تمہاری کھیتیاں ہیں پس جیسے چاہو اپنی کھیتوں پر آؤ''۔

میں کہتا ہوں مباشرت کی ہیئت میں یہود بغیر کسی آسمانی حکم کے تنگی کرتے تھے اور انصار اور

ان کے ساتھی انہیں کے طریق کو اختیار کرتے تھے اور کہا کرتے تھے جب کوئی اپنی بیوی کی فرج میں پیچھے کی جانب سے جماع کرتا ہے تو بچہ احول پیدا ہوتا ہے پس یہ آیت نازل ہوئی یعنی جب ایک ہی مقام یعنی فرج میں مباشرت ہو تو اختیار ہے آگے سے کرے یا پیچھے سے کرے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ایک ایسی چیز ہے جس سے نہ مصلحت مدنیہ متعلق ہے اور نہ مصلحت ملیہ اور ہر شخص اپنی ذات کی مصلحت خود خوب جانتا ہے اور یہ بات صرف یہود کے تکلفات میں سے تھی اس واسطے اس کا منسوخ ہونا مناسب تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی شخص نے عزل یعنی عورت کی فرج سے آلہ باہر نکال کر انزال کرنے کے متعلق پوچھا آپ نے فرمایا ''اگر تم نہ کرو تو تم کو کوئی نقصان نہیں ہے کیونکہ جو روح قیامت تک آنے والی ہے وہ آکر ہی رہے گی''۔

میں کہتا ہوں اس حدیث میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ عزل مکروہ ہے اور حرام نہیں ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ مصالح مختلف ہوتے ہیں پس باندی کے بارے میں مثلاً مصلحت خاصہ اپنی ذات کے اعتبار سے یہ ہوتی ہے کہ عزل کرے اور مصلحت نوعیہ یہ ہوتی کہ عزل نہ کرے تا کہ کثرت سے اولاد ہو اور نسل قائم رہے اور مصلحت نوعیہ کا لحاظ کرنا خدا تعالیٰ کے عام احکام تشریعیہ اور تکوینیہ میں مصلحت شخصیہ کے لحاظ کرنے کی بہ نسبت زیادہ راجح ہے اس کے علاوہ عزل میں خلق اللہ کا تغیر اور اعراض نسل جو دبر سے جماع کرنے میں پایا جاتا ہے نہیں پایا جاتا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس قول میں ''اگر تم نہ کرو تو کوئی مضائقہ نہیں'' اس بات پر تنبیہ کردی کہ حوادثات اپنے پائے جانے سے پہلے مقدر ہو چکے ہیں اور جب کوئی چیز مقدر ہو چکتی ہے اور زمین پر اس کا سبب ضعیف پایا جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی عادت اس طور پر جاری ہے کہ وہ اس سبب ضعیف کو پھیلاتا ہے یہاں تک کہ وہ پورا فائدہ دیتا ہے پس جب انسان انزال کے قریب ہوتا ہے اور اپنے عضو کو باہر نکالنا چاہتا ہے تو بسا اوقات چند قطرے اس کے عضو کے سوراخ سے نکل پڑتے ہیں جو بچہ کے مادہ کو کافی ہو جاتے ہیں اور اس شخص کو اس کا علم بھی نہیں ہوتا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فرمان کا یہی راز ہے جو انھوں نے بچہ کو اس شخص کے ساتھ ملحق کرتے ہوئے جس نے اس عورت کے ساتھ مس کرنے کا اقرار کیا تھا فرمایا تھا عزل اس سے مانع نہیں ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''البتہ میں نے قصد کیا تھا کہ دودھ پلانے والی کے ساتھ جماع کرنے سے منع

کردوں پھر میں نے روم اور فارس میں نظر کی کہ وہ دودھ پلانے والی عورتوں کے ساتھ اس حالت میں جماع کرتے ہیں اور ان کی اولاد کو کچھ ضرر نہیں ہوتا'' اور آپ نے فرمایا ''خفیہ طور پر اپنی اولاد کو قتل نہیں کرو کیونکہ صحبت کی ہوئی عورت کا دودھ گھوڑے سوار کو مل جائے تو گھوڑا اس کو گرادیتا ہے۔

میں کہتا ہوں یہ غیلہ کی کراہت کی طرف اشارہ اور وہ حرام نہیں ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ دودھ پلانے والی عورت سے جماع کرنے سے دودھ بگڑ جاتا ہے اور اس سے بچہ کمزور ہو جاتا ہے اور اوّل نمو میں ضعف ہونا اس کے اصل مزاج میں داخل ہو جاتا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو بیان فرمادیا کہ آپ کا ارادہ نقصان کے احتمال کے غالب ہونے سے اس کے حرام کرنے کا تھا مگر پھر جب آپ نے تتبع فرمایا تو آپ کو معلوم ہوا کہ یہ ضرر ہر جگہ نہیں پایا جاتا اور اس میں احتمال غالب ہونے کی بھی صلاحیت نہیں ہے تاکہ اس پر حرمت کا حکم دائر کیا جائے اور یہ حدیث من جملہ ان احادیث کے ہے جن سے ہم نے یہ ثابت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اجتہاد کیا کرتے تھے اور آپ کا اجتہاد مصالح اور مظنات کو معلوم کر کے حرمت اور کراہت کا ان پر دائر کرنا ہوتا تھا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''خدا تعالیٰ کے نزدیک سب سے بدتر اس شخص کا درجہ ہے جو اپنی بیوی کے پاس جاتا ہے اور وہ اس کے پاس آتی ہے پھر وہ شخص اس کا راز کھولتا ہے''۔

میں کہتا ہوں چونکہ ستر واجب ہے اور جس چیز کا ستر کیا گیا ہے اس کا ظاہر کرنا پردہ کے مقصود کا بدل دینا اور اس کی مخالفت کرنا ہے اس واسطے کہ اظہار سے نہی ضروری ہوئی اور نیز ایسی باتوں کا اظہار کرنا بیہودگی اور بے حیائی ہے اور ایسی خواہشوں کے اتباع سے نفس میں تاریکیوں کے متمثل ہونے کی قابلیت پیدا ہوتی ہے اور حائض کے معاملہ میں مذاہب مختلف تھے پس جو بہت زیادہ متعمق تھے جیسے یہود تو وہ اس کے ساتھ کھانے اور ایک جگہ سونے سے بھی منع کرتے تھے اور جو سستی برتتے تھے جیسے مجوس تو وہ اس کے ساتھ جماع وغیرہ جائز سمجھتے تھے اور حیض کی کچھ پرواہ نہیں کرتے تھے اور ان سب میں افراط و تفریط ہے پس ملت مصطفویہؐ نے توسط کی رعایت کی اور یہ فرمایا کہ ''سوائے جماع کے سب کچھ کیا کرو'' اور اس کی کئی وجوہات ہیں، ایک تو یہ ہے کہ حائضہ سے جماع کرنا خاص جب حیض کی ترقی ہو نہایت مضر ہے تمام اطبا کا اس پر اتفاق ہے۔

اور دوسرے یہ ہے کہ نجاست میں آلودہ ہونا مذموم صفت ہے جس سے طبیعت سلیمہ نفرت

کرتی ہے اور یہ فعل شیاطین کے قریب کرتا ہے اور استنجاوغیرہ میں یہ بات ہے کہ وہ ایک ضروری چیز ہے اور استنجا میں نجاست کا دور کرنا مقصود ہوتا ہے اور حائض سے جماع کرنا نجاست میں ڈوبنا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''آپ فرما دیجئے وہ ناپاکی ہے پس حیض کی حالت میں عورتوں سے بچتے رہو'' اور جماع کے علاوہ میں روایتیں مختلف ہیں بعض یہ کہتے ہیں کہ خون آلودہ بالوں سے بچے اور بعض یہ کہتے ہیں کہ جو کچھ ماتحت الازار ہے اس سے بچے اور دونوں صورتوں میں دواعی جماع کا بند کرنا مقصود ہے اور جو شخص خدا تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی کر کے حائضہ سے جماع کرے تو اس کے لئے یہ حکم ہے کہ ایک دینار یا نصف دینار صدقہ کرے اور یہ مسئلہ متفق علیہ نہیں ہے اور کفارہ کی حکمت وہی ہے جو ہم کئی مرتبہ بیان کر چکے ہیں۔

زوجیت کے حقوق کا بیان

واضح ہو کہ وہ ارتباط جو میاں بیوی کے درمیان واقع ہے خانہ داری کے تمام تعلقات سے بڑھ کر ہے اور سب سے زیادہ نافع ہے اور سب سے زیادہ اس کی طرف ضرورت ہوتی ہے اس واسطے کہ تمام عرب وعجم کے قبائل کا یہ دستور ہے کہ عورت تمام کاروبار میں مرد کی مددگار رہوتی ہے اور اس کے لئے کھانا پینا اور لباس کی تیاری میں اس کی متکفل ہوتی ہے اور اس کے مال کی حفاظت اور اس کی اولاد کی پرورش کرتی ہے اور جب وہ کہیں جاتا ہے تو گھر میں اس کی قائم مقامی کرتی ہے اور ان کے علاوہ بہت سے امور ہیں جن کی شرح اور بیان کی ہم کو حاجت نہیں اور اسی لئے اکثر توجہ شرائع کی اسی طرف ہوئی کہ حتی الامکان اس کا باقی رکھنا اور اس کے مقاصد کا پورا کرنا اور اس کے مکدر کرنے اور باطل کرنے سے بیزاری چاہنا ہے اور کسی ارتباط کے مقاصد کا پورا کرنا بغیر الفت کے ممکن نہیں ہوسکتا اور الفت بغیر اس خصلت کے جس پر وہ خاوند اور بیوی اپنے آپ کو مجبور نہ کریں نہیں حاصل ہوسکتی۔ جیسے غم خواری کرنا اور بے ادبی وغیرہ کو معاف کرنا اور رنجش اور دلسوزی کی باتوں سے پرہیز کرنا اور خوش خلقی اور خندہ پیشانی سے پیش آنا وغیر ذلک، اس واسطے حکمت کا یہ مقتضی ہوا کہ ان خصائل کی ترغیب وتوجہ دلائی جائے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''عورتوں کے حق میں بھلائی کی وصیت قبول کرو کیونکہ وہ پسلی سے پیدا کی گئی ہیں اگر تو اس کو سیدھا کرنے کا قصد کرے گا تو اس کو توڑ دے گا اور اگر تو اس کو اسی حالت پر چھوڑ دے گا تو ٹیڑھی کی ٹیڑھی رہے گی''۔

میں کہتا ہوں اس کے یہ معنی ہیں کہ میری وصیت کو قبول کرو اور عورتوں کے معاملہ میں اس پر عمل کرو اور ان کی پیدائش میں کجی اور برائی ہے اور وہ مثل امر لازم کے ہو کر بہ منزلہ اس چیز کے ہے جو اس کے مادہ سے حاصل ہوتی ہے اور جب انسان خانہ داری کے تمام مقاصد اس سے حاصل کرنا چاہے تو ضروری ہے کہ ادنی ادنی باتوں سے درگزر کرے اور جو بات اپنی مرضی کے خلاف پائے تو اس کو معاف کرے مگر جو غیرت محمودہ کے قبیل سے ہو یا ظلم وغیرہ امور کا بدلہ لینا ہو تو اس سے درگزر نہ کرے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''کسی مسلمان مرد کو کسی مسلمان عورت سے بغض رکھنا نہیں چاہئے اگر اس کی ایک عادت سے ناراض ہے تو اس کی دوسری عادت سے خوش بھی ہے''۔

میں کہتا ہوں جب انسان کو بیوی کی کوئی عادت ناپسند آئے تو اس کو مناسب ہے کہ طلاق دینے میں جلدی نہ کرے کیونکہ بسا اوقات اس میں ایسی خوبیاں ہوتی ہیں جن سے وہ خوش ہوتا ہے اور ان کی وجہ سے اس کی بدخلقی سے تحمل کیا جاتا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''عورتوں کے بارے میں خدا تعالیٰ سے ڈرو کیونکہ خدا کی امان پر تم نے ان کو اپنے قبضہ میں لیا ہے اور حکم الٰہی کی وجہ سے تم نے ان کی شرمگاہوں کو حلال کیا ہے اور تمہارا ان پر یہ حق ہے کہ وہ تمہارے بستر پر کسی ایسے شخص کو نہ آنے دیں جس کو تم ناپسند کرتے ہو پھر اگر وہ ایسا کریں تو ان کی ہلکی مار مارو اور تم پر ان کا کھانا اور پہننا حسب دستور ہے''۔

واضح ہو کہ واجب اصلی وہ حسب دستور گزران کرنا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''وعاشروھن بالمعروف ''پس اس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانا کھلانے اور لباس دینے اور اچھا برتاؤ کرنے کے ساتھ بیان فرمایا ہے اور ان شریعتوں میں جو وحی کی طرف مستند ہیں یہ ممکن نہیں کہ کھانے کی جنس اور اس کی مقدار مثلاً مقدر کردی جائے کیونکہ یہ بات ناممکن ہے کہ تمام زمین پر رہنے والے ایک شئے پر اتفاق کرلیں اس لئے مطلق حکم کیا گیا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جب کوئی شخص اپنی عورت کو اپنے بستر کی طرف بلائے پھر وہ آنے سے انکار کرے پھر وہ شخص غصہ کی حالت میں سو جائے تو صبح تک ملائکہ اس عورت کو لعنت کرتے رہتے ہیں''۔

میں کہتا ہوں چونکہ جس مصلحت کی نکاح میں رعایت کی گئی ہے وہ شرمگاہ کی حفاظت ہے اس

واسطے اس مصلحت کا پایا جانا ضروری ہوا کیونکہ شرائع کے اصول میں سے یہ بات ہے کہ جب وہ کسی شئے کو کسی شئے کا مظنہ قرار دیتی ہے تو وہ اس چیز کی تاکید کرتی ہے جو اس مظنہ کے وقت اس مصلحت کے وجود کو ثابت کرے اور اس کا یہ طریقہ ہے کہ عورت کو مرد کی فرمانبرداری کا حکم دیا جائے جس وقت کہ وہ اس عورت سے ان بات کا قصد کرے اور اگر ایسا نہ ہوا تو اس کی شرمگاہ کی حفاظت نہیں پائی گئی پس اگر اس عورت نے انکار کیا تو اس نے اس مصلحت کے رد کرنے میں کوشش کی جس کو خدا تعالیٰ نے اپنے بندوں کے اندر قائم کیا تھا پس اس کی طرف فرشتوں کی وہ لعنت متوجہ ہوئی جو ہر اس شخص پر ہوتی ہے جو اس مصلحت کے فاسد کرنے میں کوشش کرتا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''بعض غیرت ایسی ہے جو خدا تعالیٰ کو پسند ہے اور بعض غیرت ایسی ہے جس سے خدا تعالیٰ کو نفرت ہے پس وہ غیرت جو خدا تعالیٰ کو پسند ہے وہ زنا کے اندر غیرت ہے اور وہ غیرت جو خدا تعالیٰ کو ناپسند ہے وہ غیر زنا کے اندر غیرت ہے''۔

میں کہتا ہوں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مصلحت اور سیاست کے قائم کرنے میں جس کے بغیر چارہ نہیں ہے اور بدخلقی اور ظلم اور بغیر سبب تنگ کرنے میں فرق کر دیا، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

الرجال قوامون علی النساء بما فضل اللہ سے ان اللہ کان علیما خبیرا تک۔

میں کہتا ہوں یہ بات ضروری ہے کہ جبلی طور سے خاوند کو اپنی بیوی پر حاکم بنایا جائے اور اس کا عورت پر دباؤ ہو کیونکہ خاوند عقل میں کامل اور سیاست میں پورا اور حمایت کرنے میں اور عار کے دفع کرنے میں خوب مضبوط ہوتا ہے اور مال کی وجہ سے بھی اس کو حاکم بنایا جائے کیونکہ وہ اس کے روٹی کپڑے کا خرچ اٹھاتا ہے اور مرد کے ہاتھ میں انتظام کا ہونا اس بات کا مقتضی ہے کہ جب عورت سرکشی کرے تو خاوند اس کی تعزیر و تادیب کرے اور تادیب کے طریقہ کو بتدریج اختیار کرے پس اول از بان سے نصیحت کرے اس کے بعد اس کے پاس لیٹنا ترک کر دے مگر اس کو گھر سے نہ نکالے پھر اگر نہ مانے تو ہلکی مار لگائے پس اگر مخالفت بڑھتی جائے اور ہر ایک دوسرے کی نافرمانی اور ظلم کرنے پر اتر آئے تو قطع منازعت کی یہ صورت ہے کہ وہ حکم (۱) مقرر کئے جائیں ایک خاوند کے کنبہ میں سے ہو اور ایک بیوی کے کنبہ میں سے ہو اور وہ دونوں نفقہ وغیرہ کے متعلق

---

(۱) جج۔

خاوند بیوی کے امور میں بینہ قائم کرنا ناممکن ہے پس اس سے زیادہ مناسب کوئی صورت نہیں ہے کہ یہ فیصلہ ان لوگوں کے سپرد ہو جو ان کے قریب ترین اور ان کے حال پر سب سے زیادہ مہربان ہوں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو شخص بیوی کو خاوند سے برگشتہ کرے یا غلام کو مولیٰ سے بگاڑے وہ ہم میں سے نہیں ہے''۔

میں کہتا ہوں خانہ داری میں فساد ڈالنے کے جہاں اور اسباب ہیں ایک سبب یہ بھی ہے کہ کوئی شخص بیوی کو خاوند سے اور غلام کو مولیٰ سے برگشتہ کر دے اور یہ اس انتظام کے توڑنے اور اس کے بگاڑنے میں کوشش کرنا اور اس مصلحت کی مخالفت کرنا ہے جس کا قائم کرنا ضروری ہے۔

واضح ہو کہ خانہ داری کے بگاڑنے کی بہت سی خصلتیں ہیں جو لوگوں میں پائی جاتی ہیں اور بہت سے لوگ ان میں مبتلا ہیں اس واسطے شرع کو اس کا ذکر کرنا اور اس سے بحث کرنا ضروری ہوا، از آں جملہ یہ ہے کہ ایک مرد کے پاس کئی عورتیں ہیں پس وہ شب باشی وغیرہ امور میں ان میں سے ایک کو ترجیح دیتا ہے اور دوسروں پر ظلم کرتا ہے اور ان کو معلق چھوڑ دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''اور تم ہرگز عورتوں میں برابری نہیں کر سکتے اگرچہ تم اس کی تمنا کرو پس تم بالکل جھک نہ پڑو کہ اس کو ایسا چھوڑ دو جیسے بیچ ادھر میں اور اگر بھلائی کرو اور خدا تعالیٰ سے ڈرو تو بیشک خدا تعالیٰ معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جب ایک شخص کے پاس دو بیویاں ہوں اور وہ ان میں انصاف نہ کرتا ہو تو قیامت کے روز اس حالت میں آئے گا کہ اس کی ایک طرف جھکی ہوئی ہوگی''۔

میں کہتا ہوں یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ قیامت کے روز جزا اور سزا عمل کی صورت میں ظاہر ہوگی پس اب ہم اس کا اعادہ نہیں کرتے، اور از اں جملہ یہ ہے کہ عورتوں کے اولیا ان کو ان مردوں کے ساتھ نکاح کرنے سے روکیں جو ان کے کفو کے ہیں اور جن کی طرف ان کو رغبت ہے اور اس کا منشا کوئی مصلحت نہ ہو بلکہ خواہش نفسانی مثلاً حسد اور بغض وغیرہ کا اتباع ہو اور اس میں ایسی خرابیاں ہیں جو ظاہر ہیں پس یہ آیت نازل ہوئی ''اور جب تم عورتوں کو طلاق دو اور وہ اپنی مدت کو پورا کر لیں تو ان کو اپنے خاوندوں کے ساتھ نکاح کرنے سے مت روکو'' اور از آں جملہ یہ ہے کہ کوئی شخص یتیم لڑکیوں سے جو اس کی پرورش میں ہیں ان کے مال اور جمال کی وجہ سے نکاح

کرلے اوران کے اس طرح سے حقوق ادانہ کرے جیسے باپ والی عورتوں کے ادا کئے جاتے ہیں اوراگروہ یتیم لڑکیاں ایسی نہیں ہیں تو ان سے نکاح نہ کرے، پس اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''اوراگرتم کو خوف ہو کہ یتیم لڑکیوں میں انصاف نہ کروگے تو عورتوں میں سے ان کے ساتھ نکاح کروجوتم کو پسند ہوں دودوتین تین اور چار چار، پس اگرتم کو خوف ہو کہ تم برابری نہ کروگے تو ایک سے یا جس پر تمہارے ہاتھوں نے قبضہ کیا ہے'' پس اگر ظلم کا ڈر ہو تو انسان کے لئے منع ہے کہ وہ یتیم لڑکیوں سے یا ایک سے زیادہ عورتوں سے نکاح کرے اور جب کوئی شخص ایک بیوی موجود ہونے پر کسی کنواری عورت سے نکاح کرے تو مسنون طریقہ یہ ہے کہ سات دن تک اس کے پاس رہے پھر باری باری رہا کرے اوراگر شوہر رسیدہ سے نکاح کرے تو تین روز اس کے پاس رہے پھر باری باری رہا کرے۔

میں کہتا ہوں اس میں یہ راز ہے کہ اس امر میں زیادہ تنگی نہ کی جائے کیونکہ انسان کے اکثر افراد اس پر قابو نہیں رکھتے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''اورتم خواہ کتنا ہی چاہو عورتوں میں ہرگز برابری نہیں کرسکو گے'' اس میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ جب خالص عدل قائم کرنا ناممکن تھا تو ضروری ہوا کہ حکم کا مدار صریح ظلم کے ترک پر رکھا جائے پس جب کسی مرد کو کسی عورت کی طرف رغبت ہو اوراس کا حسن اس کو پسند آئے اوراس کے حسن پر اس کا دل فریفتہ ہوجائے اوراس کی طرف کثرت سے اس کو اشتیاق ہو تو یہ ناممکن ہے کہ اس کو اس سے بالکل روک دیا جائے کیونکہ یہ بہ منزلہ تکلیف بالمحال کے ہے اس واسطے اس کے ترجیح دینے کی ایک مقدار مقرر کردی تاکہ وہ اس سے آگے نہ بڑھے اور جور وظلم نہ کرے اور نیز شریعت نے اس مصلحت کا اعتبار کیا ہے کہ نئی عورت کے قلب کی تالیف ہو اوراس کی عزت کی جائے اور یہ بات اسی طرح پر حاصل ہوسکتی ہے کہ اس کو ترجیح دی جائے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول میں اسی طرف اشارہ ہے جو آپ نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تھا ''تو اپنے خاوند کے نزدیک بے قدر نہیں ہے اگر تیری مرضی ہو تو میں سات سات روز رہا کروں'' الحدیث،

اور پہلی بیوی کے دل شکستہ ہونے کا آپ نے اس طرح علاج کیا کہ جدید کے لئے چند روز زیادہ کرنے کا دستور مقرر کردیا کیونکہ جب کسی بات کا دستور مقرر ہوجاتا ہے اوراس سے کسی ایذا یا

خصوصیت مقصود نہیں ہوتی تو اس سے چنداں رنج نہیں ہوتا اور اللہ کے اس قول میں اسی طرف اشارہ ہے ''اس میں امید ہے کہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور غم نہ کریں اور جو تو نے ان کو دیا ہے اس سے وہ سب کی سب راضی ہو جائیں'' یعنی ان کے حق میں اختیار کے ساتھ قرآن کا نازل ہونا اس بات کا سبب ہے کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ناخوش نہیں ہوگی اور کنواری عورت کی طرف مرد کو زیادہ رغبت ہوتی ہے اور نیز اس کو تالیف قلب کی زیادہ ضرورت ہے اس لئے اس کے واسطے سات روز کی مقدار مقرر کی اور شوہر رسیدہ کے لئے تین روز کی مقدار مقرر کی، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم ازواج مطہرات کے پاس باری باری سے رہا کرتے تھے اور جب آپ سفر کا قصد فرماتے تھے تو ان میں قرعہ ڈال کر ایک کو ساتھ لے جاتے تھے۔

میں کہتا ہوں اس کی وجہ یہ تھی کہ کسی کو رنجش نہ ہو اور ظاہر یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہ بطور تبرع اور احسان کے ہوتا تھا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر باری واجب نہیں تھی، کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''ان میں سے جس کو تو چاہے موخر کرے اور جس کو ان میں سے چاہے اپنے پاس جگہ دے، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا دوسروں میں تامل اور اجتہاد کا موقع ہے مگر جمہور فقہا نے باری مقرر کرنے کو واجب کیا ہے اور قرعہ اندازی میں ان کا اختلاف ہے''۔

میں کہتا ہوں اس میں یہ بات ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ''فلم یعدل'' مجمل ہے اور نہیں معلوم کہ اس سے کون سا عدل مراد ہے، اور یہ آیت ''فتذروھا کالمعلقة'' اس بات کو بیان کرتی ہے کہ صریح ظلم کرنا اور بالکل اس سے کنارہ کشی کر لینا اور بداخلاقی کے ساتھ اس سے برتاؤ کرنا ممنوع ہے اور بریرہؓ جس وقت آزاد کی گئی اس وقت اس کا خاوند غلام تھا، پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اختیار دیا چاہے اس کے نکاح میں رہے چاہے نہ رہے، تو اس نے غلام کے نکاح میں رہنا پسند نہیں کیا اور اپنا اختیار لے لیا۔

میں کہتا ہوں اس کا سبب یہ ہے کہ حرہ کا غلام کے نیچے رہنا اس کے لئے باعث عار ہے پس اس سے اس عار کا دفع کرنا ضروری ہے ہاں! اگر وہ راضی ہو جائے تو کوئی مضائقہ نہیں، اور نیز باندی اپنے مالک کے قبضہ میں ہوتی ہے اس کی رضامندی فی الحقیقت رضامندی نہیں ہوتی اور نکاح رضامندی سے ہوتا ہے پس جب آزاد ہونے کی وجہ سے اس کو اپنی جان کا اختیار ہوا تو اس کی

رضامندی کا اعتبار ضروری ہوا اور ایک روایت میں یہ بھی آیا ہے ''اگر وہ تجھ سے صحبت کر لے تو پھر تجھ کو اختیار نہیں ہے'' اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک ایسی حد کا مقرر کرنا ضروری ہے کہ اس کے بعد کچھ اختیار باقی نہ رہے ورنہ اس کو تمام عمر اختیار رہے گا اور یہ بات امر نکاح کے خلاف ہے اور اس کے اختیار کی حد کلام نہیں ہوسکتا کیونکہ بسا اوقات وہ اپنے کنبہ سے مشورہ کرتی ہے اور کبھی خود اپنے متعلق فکر کرتی ہے اور بسا اوقات ایسے موقع پر اختیار کے کلمات بولے جاتے ہیں مگر ان میں پختگی نہیں ہوتی اور اس کو اس بات کی تاکید کرنے میں کہ وہ زبان سے ایسی بات نہ نکالے جو اس کے لئے باعث دقت ہے پس حد مقرر کرنے کے لئے صحبت سے زیادہ کوئی چیز مناسب نہیں ہے کیونکہ صحبت کرنا ہی ملک کا فائدہ ہے اور ملک سے صحبت کرنا ہی مقصود ہے اور اسی سے امر پورا ہو جاتا ہے، واللہ اعلم۔

طلاق کا بیان

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''عورت بغیر کسی ضرورت شدیدہ کے اپنے خاوند سے طلاق چاہے تو اس پر جنت کی بو حرام ہے'' اور آپ نے فرمایا ''خدا تعالیٰ کو حلال چیزوں میں سب زیادہ ناپسند طلاق ہے''۔

واضح ہو: طلاق کی کثرت میں اور بے پروائی کے ساتھ طلاق کا طریقہ جاری ہونے میں بڑی خرابیاں ہیں اور اس کا سبب یہ ہے کہ بہت سے لوگ شہوت نفس کے پابند ہوتے ہیں اور ان کو امور خانہ داری کا قائم کرنا مقصود نہیں ہوتا اور نہ ہی ارتفاقات ضروریہ میں تعاون مقصود ہوتا ہے اور نہ ان کا مقصود شرمگاہ کی حفاظت ہوتی ہے بلکہ ان کا مطمع نظر عورتوں سے لذت حاصل کرنا اور ہر عورت کا مزہ چکھنا ہوتا ہے پس یہ بات کثرت سے نکاح کرنے اور طلاق دینے پر ان کو آمادہ کرتی ہے پس ان میں اور زنا کرنے والوں میں اس امر میں جو ان کے دلوں کی طرف عود کرتا ہے کوئی فرق نہیں ہے اگرچہ سنت نکاح کے قائم کرنے اور سیاست مدنیہ کی موافقت میں زنا کرنے والوں سے علیحدہ معلوم ہوتے ہیں چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''مزہ چکھنے والوں اور مزہ چکھنے والیوں پر خدا کی لعنت ہے'' اور نیز اس رسم کے جاری ہونے میں معاونت دائمی یا قریب دائمی پر نفس کے پابند کرنے کو ترک کرنا ہے اور ہوسکتا ہے کہ اگر اس باب میں وسعت دی جائے تو خاوند یا بیوی کا دل ادنیٰ ادنیٰ باتوں میں تنگ آکر ایک دوسرے سے جدائی کا قصد کرے اور اس بات کو صحبت کا بوجھ اٹھانے اور ہمیشہ کے لئے خانگی انتظام پر دل لگانے سے کیا نسبت ہے اور نیز عورتوں کا ان باتوں کے ساتھ عادی ہو جانا اور مردوں کا ان باتوں کی پرواہ نہ کرنا اور ان پر کچھ افسوس نہ

کرنا بے حیائی کے دروازہ کو کھولتا ہے اور نیز ان میں سے ہر ایک دوسرے کے ضرر کو اپنا ضرر نہیں سمجھے گا اور جدائی کا خیال کر کے اپنے لئے تیاری میں مصروف ہو جائے گا، دوسری بڑی بڑی قباحتیں ہیں جو ظاہر ہیں لیکن اس کے باوجود اس باب کا بالکل بند کرنا اور اس میں تنگی کرنا بھی ممکن نہیں ہے کیونکہ کبھی خاوند بیوی میں مخالفت پیدا ہو جاتی ہے جو یا تو ان دونوں کی بدخلقی سے یا ان دونوں میں سے کسی ایک کا اجنبی انسان کے حسن کی طرف رغبت کرنے سے یا رزق کی تنگی کی وجہ سے یا دونوں میں سے کسی کی حماقت اور اسی قسم کے دیگر اسباب کی وجہ سے ہو جاتی ہے پس ان قباحتوں کے ساتھ ساتھ اس جوڑے کے نظم کا ہمیشہ باقی رکھنا بلائے عظیم اور حرج ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''تین اشخاص سے قلم اٹھالیا ہے، سونے والے سے جب تک بیدار ہو، لڑکے سے جب تک بالغ ہو اور ناقص العقل سے جب تک عاقل ہو''۔

میں کہتا ہوں اس میں راز یہ ہے کہ طلاق کا جواز بلکہ تمام معاملات کی بنیاد ان مصالح پر ہے جو ان کا تقاضا کرتے ہیں اور سونے والا لڑکا اور بے عقل ان مصالح کے جاننے سے بالکل عاری ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''طلاق اور عتاق اغلاق میں نہیں ہوتا یعنی حالت اکراہ میں نہیں ہوگا۔

واضح ہو کہ حالت اکراہ کی طلاق کے باطل ہونے کی دو وجہ ہیں ایک یہ ہے کہ وہ اس طلاق سے راضی نہیں ہے اور اس نے کسی مصلحت منزلیہ کا ارادہ نہیں کیا بلکہ لاچاری کی حالت میں یہ امر واقع ہوا ہے پس اس کی حالت سونے والے کی سی ہے، دوسرے یہ ہے کہ اگر اس کی طلاق کا اعتبار کر لیا جائے تو اس سے اکراہ کا دروازہ کھلتا ہے پس ہوسکتا ہے کہ زبردست آدمی کمزور لوگوں سے خفیہ طور پر پکڑ کر لے جائے اور اس کی تلوار سے ڈرا کر طلاق پر مجبور کر دے، جس وقت کہ اس کو اس کی بیوی کی طرف رغبت ہو، پس اگر ہم اس کی امید کو منقطع کر دیں اور اس کی مراد کو اس پر واپس کر دیں تو وہ لوگوں کے درمیان بذریعہ اکراہ باہم ظلم کے ترک کا سبب ہو جائے گا اور اس کی نظیر وہ ہے جو ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول میں بیان کر چکے ہیں: ''قاتل وارث نہیں ہوتا'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس کا انسان مالک نہیں اس میں طلاق نہیں ہوسکتی'' اور آپ نے فرمایا ''نکاح سے قبل طلاق نہیں ہوتی''۔

میں کہتا ہوں یہ قول بظاہر طلاق منجز اور معلق جو نکاح کے ساتھ معلق ہو یا کسی اور چیز کے ساتھ معلق ہو دونوں کو شامل ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ طلاق مصلحت کی وجہ سے جائز کی گئی ہے اور اس شخص کو اس عورت کا مالک بننے سے پہلے اور اس کی سیرت دیکھنے سے پہلے مصلحت معلوم نہیں ہوسکتی پس مالک بننے سے پہلے اس کو طلاق دینا ایسا ہے جیسے کوئی مسافر کسی جنگل میں اقامت کی نیت کرے یا کوئی مجاہد دارالحرب میں کہ قرائن حالیہ خود ان کی تکذیب کر رہے ہیں، اور اہل جاہلیت جس قدر چاہتے تھے طلاقیں دیکر رجوع کرلیا کرتے تھے اور ظاہر ہے کہ اس میں عورت پر بہت بڑا ظلم تھا پس اللہ تعالیٰ کا یہ قول نازل ہوا "طلاق دو مرتبہ ہے" الا یہ، اس کے معنی یہ ہیں کہ طلاقیں جن کے بعد رجعت ہوسکتی ہے دو ہیں پس اگر وہ اس عورت کو تیسری طلاق دیدے تو وہ عورت اس کے لئے حلال نہیں ہوتی یہاں تک کہ وہ کسی اور خاوند سے نکاح کرے اور سنت نے اس چیز کو زیادہ کیا کہ تنہا نکاح کافی نہیں ہے بلکہ شوہر جدید کا جماع کرنا بھی شرط ہے اور تین کے اندر طلاق کے محدود ہونے میں کہ اس پر زیادتی نہیں ہے یہ راز ہے کہ وہ کثرت کی شرعی حد ہے اور نیز اس میں غور وفکر بھی ضروری ہے اور بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کو کچھ مصلحت معلوم نہیں ہوتی حتی کہ وہ قبضہ سے عورت کے نکلنے کا مزہ چکھ لیتے ہیں اور تجربہ کے واسطے اصل ایک مرتبہ ایک چیز کو عمل میں لانا ہے اور دوسے تجربہ کی تکمیل ہو جاتی ہے اور تیسری طلاق کے بعد نکاح کا شرط ہونا اس وجہ سے ہے کہ تحدید اور انتہا کے معنی ثابت ہو جائیں کیونکہ اگر بغیر دوسرے نکاح کے اس عورت کا خاوند کی طرف لوٹنا درست قرار دیا جاتا تو وہ بہ منزلہ رجعت کے ہوتا اس واسطے کہ مطلقہ سے نکاح کرنا بھی ایک قسم کی رجعت ہے اور عورت جب تک اپنے خاوند کے گھر میں اور اس کے قبضہ میں اور اس کے اقارب کے سامنے رہتی ہے تو ممکن ہے کہ خاوند عورت کی رائے پر غالب آجائے اور لاچار ہو کر اس چیز کو پسند کرے جس کو وہ لوگ اس عورت کے سامنے بیان کرتے ہیں لیکن جب وہاں سے جدا ہو کر گرمی سردی کا مزہ چکھتی ہے پھر اس کے بعد اس شخص سے راضی ہوتی ہے تو وہ حقیقی رضامندی ہے اور نیز اس میں جدائی کا مزہ چکھانا اور بغیر کسی ضروری مصلحت کے سوچے سمجھے خواہش نفسانی کی پیروی کرنے کی سزا دینا ہے اور نیز اس میں تین طلاق دی ہوئی عورتوں کا لوگوں کی نظروں میں عزت دینا ہے اور اس بات کا جتلانا ہے کہ تین طلاقوں کی طرف وہی شخص جرأت

کر سکتا ہے جو ذلت اور حد سے زیادہ بے عزتی کے بعد اپنے نفس کو اس کے بارے میں ترک طمع پر قائم کرنے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے رفاعہؓ کی بیوی سے فرمایا تھا جس وقت کہ رفاعہؓ نے اس کو طلاق دے دی تھی اور اس کو طلاق مغلظہ کر دیا تھا اور اس نے دوسرے شخص سے نکاح کر لیا تھا'' کیا تو رفاعہؓ کے پاس پھر آنا چاہتی ہے تو اس نے عرض کیا کہ 'ہاں' آپ نے فرمایا 'نہیں'، یہاں تک کہ تو اس کا (اور وہ تیرا) مزہ چکھ لے''۔

میں کہتا ہوں نکاح کے تمام ہونے کے لئے لذت حاصل کرنے کو اس لئے آپ نے شرط کیا تا کہ اس تحدید کے معنی جس کو خدا تعالیٰ نے ان کے لئے مقرر کیا ہے متحقق ہو جائیں کیونکہ اگر یہ نہ ہو تو کوئی شخص یہ حیلہ کر سکتا ہے کہ زبانی نکاح کرا کر اسی مجلس میں دوسرے خاوند سے طلاق دلوائے اور یہ تحدید کے فائدہ کو منافی ہے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حلالہ کرنے والے پر اور اس شخص پر جس کے لئے وہ حلالہ کرتا ہے لعنت کی ہے''۔

میں کہتا ہوں چونکہ بہت سے لوگ محض حلالہ کی غرض سے نکاح کرتے ہیں اور اس نکاح سے ان کی غرض معیشت میں معاونت کرنا نہیں ہوتا اور اس سے وہ مصلحت پوری نہیں ہوتی جو نکاح سے مقصود ہے اور نیز اس میں بے حیائی اور بے غیرتی ہے اور بلا اس بات کے کہ معاونت میں کچھ زیادتی ہو ایک عورت پر کئی مردوں کے جمع ہونے کو جائز رکھنا ہے اس واسطے آپ نے اس سے منع فرمایا، اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی کو حالت حیض میں طلاق دی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا تو آپ بہت ناراض ہوئے اور فرمایا تو اس سے رجوع کر پھر اس کو رکھ یہاں تک کہ وہ پاک ہو جائے پھر اس کو حیض آئے اور پھر وہ پاک ہو پس اگر اس کو طلاق دینا مناسب سمجھے تو ہاتھ لگانے سے پیشتر پاکی کی حالت میں طلاق دے۔

میں کہتا ہوں اس میں راز یہ ہے کہ آدمی کو کبھی اپنی عورت سے طبعی طور پر نفرت ہو جاتی ہے اور ایسی نفرت ماننے کے قابل نہیں ہوتی جیسے اس کا حائضہ ہونا اور گرد و غبار میں آلودہ رہنا اور کبھی اس مصلحت کے سبب سے اپنی عورت سے نفرت کرتا ہے جس کے قائم کرنے کا عقل سلیم حکم کرتی ہے، باوجودیکہ وہاں رغبت طبعی ہوتی ہے اور یہ نفرت ماننے کے قابل ہے اور اکثر پہلی صورت میں ندامت ہوتی ہے اور اس میں رجوع کرنے کا اتفاق ہوتا ہے اور یہ ایسی خواہش ہے جس کے ترک

کرنے پر تہذیب نفس موقوف ہے اور کبھی یہ دونوں قسم کی نفرتیں بہت سے لوگوں پر مشتبہ ہو جاتی ہیں اس واسطے ایسی حد کا مقرر کرنا ضروری ہوا جس سے فرق ثابت ہو جائے پس طہر کو رغبت طبعی کا مظنہ اور حیض کو نفرت طبعی کا مظنہ اور باوجود رغبت طبعی کے طلاق پر اقدام کرنا مصلحت عقلیہ کا مظنہ اور مدت دراز تک دل میں یہی خیال باقی رہنا باوجودیکہ اس کے حالت بدلتے رہے ہیں کہ وہ کبھی حیض سے پاک ہوئی اور آراستہ ہوئی اور انقباض سے انبساط کی طرف ہوئی عقل صریح اور تدبیر خالص کا مظنہ ہے اس واسطے حیض میں طلاق دینا مکروہ ہوا، اور مراجعت اور حیض جدید کے درمیان میں آنے کے انتظار کا حکم ہوا۔ اور نیز اگر وہ عورت کو حیض میں طلاق دے پس اگر یہ حیض بھی عدت میں شمار کیا جائے تو عدت کی مدت کم ہوتی ہے اور اگر شمار نہ کیا جائے تو عدت کے زیادہ ہونے کی وجہ سے عورت کو ضرر پہنچتا ہے خواہ قرء سے طہر مراد لی جائے یا حیض پس ہر صورت میں وہ حد ٹوٹتی ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب محکم میں تین قرء کے ساتھ معین کیا ہے۔

اور طہر کے اندر جماع کرنے سے قبل طلاق دینے کا حکم دو وجہ سے ہوا ایک تو یہ ہے کہ اس میں رغبت طبیعہ کا باقی رکھنا ہے کیونکہ جماع کرنے سے رغبت کا غلبہ کم ہو جاتا ہے دوسرے یہ ہے کہ اس صورت میں انساب میں اشتباہ نہیں رہتا، اور اللہ تعالیٰ نے طلاق پر دو گواہ قائم کرنے کا حکم دو سبب سے دیا ایک تو معاملہ صحبت داری میں اہتمام کرنا ہے تاکہ تدبیر منزل کا قائم ہونا اور اس کا منقطع ہونا لوگوں کے سامنے پایا جائے اور دوسرے یہ ہے کہ انساب میں اشتباہ باقی نہ رہے اور طلاق دینے کے بعد خاوند بیوی یا باہم نہ ملیں اور طلاق کی پرواہ نہ کریں، واللہ اعلم۔

اور ایک طہر میں تین طلاق دینا بھی مکروہ کیا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں اس حکمت کا ترک لازم آتا ہے جس کی رعایت بار بار طلاق دینے میں کی گئی ہے کیونکہ طلاقوں کی تفریق اس لئے مقرر کی گئی ہے کہ اگر کسی سے کوتاہی ہو جائے تو اس درمیان میں وہ اس کا تدارک کر لے، اور نیز جمع کرنے میں اپنے نفس پر تنگی کرنا اور ندامت لینا ہے، اور تین طہروں میں تین طلاقیں دینا بھی تنگی اور ندامت کا محل ہے مگر پہلی صورت سے کم ہے اس وجہ سے کہ اس میں غور کرنے کا موقع اور اتنا عرصہ مل جاتا ہے جس میں حالتیں بدلتی رہتی ہیں اور بہت سے لوگوں کی مصلحت حرمت مغلظہ کے ثابت کرنے میں ہوا کرتی ہے۔

خلع، ظہار، لعان اور ایلاء کا بیان

واضح ہو کہ خلع کے اندر کسی قدر قباحت پائی جاتی ہے کیونکہ خاوند نے بیوی کو جو مال دیا ہے وہ جماع کے بدلہ میں ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''اور تم دیا ہوا مال کیسے واپس لے سکتے ہو جبکہ تم ایک دوسرے کے ساتھ صحبت کر چکے ہو اور وہ تم سے عہد واثق بھی لے چکی ہیں'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لعان کے اندر اسی معنی کا اعتبار کر کے فرمایا ''اگر تو نے کچھ دیا ہے تو یہ اس کے عوض میں ہے جو تو نے اس کی شرمگاہ کو حلال کیا ہے'' اور اس کے باوجود خلع کی حاجت پڑتی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''پس ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں اگر عورت خاوند سے رہائی پانے کے بدلہ میں کچھ دے ڈالے''۔

اور اہل جاہلیت اپنی بیویوں کو حرام کر لیا کرتے تھے اور ان کو بہ منزلہ اپنی ماں کے پشت کے قرار دے لیا کرتے تھے پس اس کے بعد پھر کبھی ان کے پاس نہیں جاتے تھے اور اس میں جس قدر خرابی تھی وہ ظاہر ہے کیونکہ وہ عورت نہ تو مرغوب ہوتی تھی کہ خاوند سے نفع اٹھائے جس طرح اور عورتیں اپنے خاوندوں سے نفع اٹھاتی ہیں اور نہ وہ بیوہ ہوتی تھی کہ اس کو اپنی جان کا اختیار حاصل ہو پس جب ایسا واقعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں پیش آیا اور اس کے بارے میں آپ سے دریافت کیا گیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی ''بلاشک اللہ تعالیٰ نے اس عورت کی گفتگو سن لی جو اپنے خاوند کے بارے میں تجھ سے جھگڑا کرتی ہے ''عذاب الیم'' تک اور اس میں راز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس قول کو بالکل لغو بھی نہیں ٹھیرایا کیونکہ وہ ایک امر ہے جس کو خاوند نے اپنے نفس پر لازم کیا ہے اور اس میں ایسی پختہ بات منہ سے نکالی ہے جو اور قسموں میں ہوا کرتی ہے

اور اس کو ہمیشہ کے لئے بھی نہیں کیا جس طرح اہل جاہلیت کیا کرتے تھے تاکہ وہ جرم دفع ہو جائے جس میں وہ گرفتار تھے اور کفارہ تک اس کو موقت رکھا کیونکہ کفارہ گناہوں کے دور کرنے کے لئے اور اس چیز سے روکنے کے لئے جو مکلّف کے دل میں پیدا ہوتی ہے مقرر کیا گیا ہے لیکن اس قول کا جھوٹ ہونا سو اس کی وجہ یہ ہے کہ بیوی نہ تو فی الحقیقت ماں ہوتی ہے اور نہ ان دونوں میں مشابہت یا مجاورت ہوتی ہے جس کی وجہ سے ایک کا اطلاق دوسرے پر صحیح ہو یہ اس تقدیر پر ہے کہ اگر اس کو خبر کہا جائے اور وہ عقد مضر اور مصلحت کے ناموافق ہے اور نہ خدا تعالیٰ نے اپنی شریعتوں میں اس کو وحی کے ذریعہ بیان فرمایا ہے اور نہ روئے زمین کے دانشمندوں نے اس کو مستنبط کیا ہے اگر اس کو انشائے قبیل سے کہا جائے لیکن اس کا منکر اور بری بات ہونا سو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک طرح کا ظلم اور جور اور جس کے ساتھ احسان کرنے کا حکم ہے اس پر تنگی کرنا ہے، اور ظہار کا کفارہ ایک غلام کا آزاد کرنا یا ساٹھ مساکین کو کھانا کھلانا یا پے در پے دو مہینوں کے روزے رکھنا اس لئے مقرر کیا گیا ہے کہ کفارہ سے غرض یہ ہے کہ مکلّف کے سامنے ایک ایسی چیز ہونی چاہئے جو اس فعل کے ارتکاب سے اس کو باز رکھے اور ارتکاب کی صورت میں اس چیز کے لازم ہونے کا اس کو خوف ہو اور یہ بات بغیر اس کے ممکن نہیں کہ وہ کفارہ کوئی سخت عبادت ہو جو نفس کو مغلوب کرے یا تو اس وجہ سے کہ اس میں اس قدر مال صرف کرنا پڑتا ہو جو نفس پر بہت شاق ہو یا اس میں بھوک و پیاس کی تکلیف بہت زیادہ اٹھانی پڑتی ہو، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''جو لوگ اپنی بیویوں سے ایلاء کرتے ہیں ان کو چار ماہ رکنا ہے''۔

واضح ہو کہ اہل جاہلیت قسم کھا لیا کرتے تھے کہ اپنی بیوی سے ہمیشہ یا مدت دراز تک صحبت نہیں کریں گے اور اس میں عورتوں پر ظلم اور ضرر تھا پس اللہ تعالیٰ نے چار مہینہ تک رکنے کا حکم دیا ''پھر اگر وہ رجوع کریں تو اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے'' اور رجوع کرنے میں علما کا اختلاف ہے بعض نے کہا ہے ایلاء کرنے والے کو چار ماہ گزرنے کے بعد روک دیا جائے پھر اس پر جبر کیا جائے کہ یا تو بھلائی کے ساتھ اس کو چھوڑ دے یا حسب دستور اس کو نکاح میں رکھ لے، اور بعض نے کہا ہے کہ چار ماہ گزرتے ہی اس پر طلاق پڑ جائے گی اور اس کو روکا نہیں جائے گا اور اس مدت کے معین کرنے میں یہ راز ہے کہ اتنی مدت میں ضرور نفس کو جماع کرنے کی خواہش ہوتی ہے اور ترک

جماع سے ضرر ہوتا ہے جبکہ وہ بیمار نہ ہواور نیز یہ مدت سال کا ایک تہائی حصہ ہے اور نصف سے کم کا انضباط ایک تہائی سے ہوتا ہے اور نصف زیادہ مدت شمار کی جاتی ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے'' جو لوگ اپنی بیویوں کی طرف زنا کی نسبت کرتے ہیں اور ان کے لئے گواہ نہیں ہوتے'' الآیۃ ، اور اس امر میں حضرت عویمر عجلانیؓ اور ہلال بن امیہؓ کی حدیث مشہور ہے۔

واضح ہو کہ اہل جاہلیت میں سے جب کوئی مرد اپنی بیوی کو کسی کی طرف منسوب کرتا تھا اور ان دونوں کے درمیان اس امر میں تنازع ہوتا تھا تو وہ کاہنوں کی طرف رجوع کیا کرتے تھے جیسا کہ ہند بنت عتبہ کے قصہ میں ہوا تھا پس جب اسلام آیا تو ان کا کاہنوں کی طرف جانا ممنوع قرار دیا کیونکہ ملت حنیفیہ کی بنیاد ان چیزوں کے ترک کرنے اور ان کے دور کرنے پر ہے اور نیز کاہنوں کی طرف جانے میں بلا اس کے کہ وہ نہ ان کے صدق کو جانتے ہیں اور نہ ان کے کذب کو، ضرر عظیم ہے اور یہ بات ناممکن تھی کہ خاوند کو چار گواہ لانے کی تکلیف دی جائے ورنہ حد لگانے کا حکم دیا جائے کیونکہ زنا تنہائی میں ہوتا ہے اور خاوند گھر کی بات خوب جانتا ہے اور اس کو جو جو قرائن معلوم ہوتے ہیں وہ غیر کو معلوم نہیں ہو سکتے اور یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ خاوند ان لوگوں کے مانند قرار دیا جائے جن پر گواہ نہ لانے میں حد قذف ماری جاتی ہے کیونکہ خاوند شرعاً اور عقلاً اپنے ننگ و ناموس کی حفاظت کرنے پر مامور ہے اور اس کی جبلت میں اس بات پر غیرت کرنا داخل ہے کہ جو چیز اس کی حفاظت میں ہے اس میں دوسرا مداخلت کرے اور نیز خاوند شک کے رفع کرنے اور عورت کی شرمگاہ کے محفوظ رکھنے میں سب سے زیادہ مناسب تر اور اولیٰ ہے پس اگر خاوند عورت کے ساتھ کسی امر کا مواخذہ کرنے میں غیر لوگوں کے برابر رکھا جائے تو امن جاتا رہتا ہے اور مصلحت فساد میں بدل جاتی ہے، اور جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہ حادثہ پیش آیا تو آپ متردد تھے کبھی تو ان معارضات کی وجہ سے کچھ حکم نہیں دیتے تھے اور کبھی اس کا حکم ان قواعد کلیہ سے مستنبط کرتے تھے جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائے ہیں اور ہلال بن امیہ سے کہتے تھے'' تو گواہ لا ورنہ تیری پشت پر حد ماری جائے گی'' یہاں تک کہ اس نے کہا اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے میں بے شک سچا ہوں اور یقیناً خدا تعالیٰ ایسا کوئی حکم نازل فرمائے گا جس کی وجہ سے میری پشت حد سے بری ہو جائے گی اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے آیت لعان نازل فرمائی۔

اوراس میں اصل یہ ہے کہ مؤکد قسم کے سبب سے خاوند حد قذف سے بری ہو جاتا ہے اور عورت پر دھبہ لگ جاتا ہے وہ قید میں رکھی جاتی ہے اور اس پر تنگی کی جاتی ہے اور اگر خاوند قسم کھانے سے انکار کرے تو اس پر حد قذف لگائی جائے گی اور ایک قسم موکد عورت کی طرف سے اس کو بری کر دیتی ہے پس اگر عورت قسم کھانے سے انکار کرے تو اس پر حد لگائی جائے گی۔

الحاصل جس امر میں بینہ نہ ہو اور نہ وہ ایسا ہو کہ وہ لغو اور غیر مسموع ہو اس میں موکد قسم سے زیادہ مناسب اور کوئی چیز نہیں ہے اور یہ طریقہ جاری ہوا کہ عورت اس کو بیان کرے تا کہ قسم سے جو مقصود ہے وہ حاصل ہو، اور یہ بھی طریقہ جاری ہوا کہ وہ عورت پھر کبھی اس خاوند کی طرف عود نہ کرے کیونکہ ان دونوں میں جب ایسا جھگڑا ہو چکا اور ان دونوں کے دلوں میں آتش عداوت شعلہ زن ہو چکی اور خاوند نے اس کو بدکار مشہور کر دیا تو غالباً نہ ان دونوں میں موافقت ہو سکتی ہے اور نہ محبت ہو سکتی ہے اور نکاح ان مصلحتوں کے لئے وضع کیا گیا ہے جو محبت اور موافقت پر مبنی ہیں اور نیز اس میں ان دونوں کو ایسے معاملہ پر اقدام کرنے سے سخت تنبیہ کرنا ہے۔

عدت کا بیان

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''مطلقہ عورتیں تین قروء تک اپنی جانوں کو روکیں'' اخیر آیت تک۔

واضح ہو کہ عدت ان امور میں سے ہے جو زمانہ جاہلیت میں مشہور اور مسلم تھے اور جس کو وہ ترک نہیں کر سکتے تھے اور اس میں بہت سے مصالح ہیں، از آں جملہ مرد کے پانی سے رحم عورت کے پاک وصاف ہونے کی معرفت ہے تا کہ نسبوں میں اختلاط نہ ہونے پائے کیونکہ نسب ایک چیز ہے جس کی لوگوں کو خواہش ہوتی ہے اور عاقل لوگ اس کے طالب ہوتے ہیں اور نسب نوع انسانی کے خواص میں سے ہے اور اسی سے انسان تمام حیوانات سے ممتاز ہے اور استبرا کے باب میں اسی مصلحت کی رعایت کی گئی ہے، از آں جملہ عدت سے امر نکاح کی عظمت پر لوگوں کو متنبہ کرنا ہے اس طور پر کہ نکاح ایسا امر نہیں ہے جو بغیر لوگوں کے اجتماع کے قائم ہو سکتا ہو اور بغیر انتظار دراز کے وہ منقطع نہیں ہو سکتا اگر ایسا نہ ہوتا تو نکاح بچوں کے کھیل کی طرح ہوتا کہ گھڑی میں قائم ہوتا اور گھڑی میں منقطع ہو جاتا۔

اور از آں جملہ یہ ہے کہ نکاح کی مصلحتیں بغیر اس کے پوری نہیں ہوتیں کہ وہ دونوں بظاہر اپنے نفس کو اس عقد پر ہمیشہ قائم رکھنے پر پابند کریں پھر اگر کوئی حادثہ پیدا ہو جائے جس کی وجہ سے اس عقد کا انقطاع ضروری ہو تو فی الجملہ اس دوام کی صورت کا باقی رکھنا جب بھی ضروری ہے اس طور پر کہ عورت کچھ مدت کے لئے اپنے آپ کو روکے رہے کہ اس کو اپنے رکنے کی وجہ سے کسی قدر تکلیف اور دقت معلوم ہو، اور طلاق دی ہوئی عورت کی مدت تین قروء ہیں پس بعض کے نزدیک قروء سے اطہار مراد ہیں اور بعض کے نزدیک حیض اور اگر اس سے طہر مراد ہے تو اس میں یہ راز

ہے کہ طہر رغبت کا زمانہ ہوتا ہے جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں پس اس کی تکرار عدت لازمہ مقرر کی گئی تا کہ غور وفکر کرنے والا اس عرصہ میں غور وفکر کر لے چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے طلاق کے بیان میں فرمایا ہے۔ پس یہ وہ عدت ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے طلاق دینے کا حکم فرمایا ہے'' اور اگر اس سے حیض مراد ہے تو اس میں راز یہ ہے کہ حیض حمل نہ ہونے کی شناخت میں اصل ہے پس اگر بچپن یا بڑھاپے کی وجہ سے عورت کو حیض نہ آتا ہو تو اس کے لئے تین مہینے تین حیض کے قائم مقام ہیں کیونکہ تین ماہ تین حیض کا مظنہ ہیں اور نیز تین ماہ میں رحم کا خالی ہونا ظاہر طور پر معلوم ہوسکتا ہے اور تمام مصلحتیں اسی مدت میں ثابت ہوسکتی ہیں اور حاملہ کی عدت وضع حمل ہے کیونکہ اس سے رحم کا بری ہونا معلوم ہو جاتا ہے اور جس عورت کا خاوند مر جائے اس کی عدت چار ماہ اور دس دن ہیں اور اس مدت میں اس کو سوگ کرنا واجب ہے اور اس کی کئی وجوہ ہیں۔

ایک یہ ہے کہ جب اس عورت پر یہ بات واجب ہوئی کہ اپنے آپ کو اس مدت تک روکے رہے اور نہ وہ نکاح کرے اور نہ پیغام نکاح بھیجے تا کہ مرنے والے کا نسب محفوظ رہے تو حکمت سیاست کے نزدیک اس چیز نے اس بات کا تقاضا کیا کہ اس کو ترک زینت کا حکم دیا جائے کیونکہ زینت کی وجہ سے جانبین سے شہوت کا غلبہ ہوتا ہے اور ایسی حالت میں شہوت کے غلبہ میں بڑی خرابی ہے اور نیز عورت کی وفاداری میں سے یہ بات ہے کہ خاوند کے مرنے پر غم کرے اور خوشبو نہ لگائے اور زینت نہ کرے اور اس پر سوگ کرے کیونکہ اس سے وفاداری ظاہر ہوتی ہے اور بہ ظاہر یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اس کی نظر اسی پر تھی اور مطلقہ کو سوگ کرنے کا حکم نہیں دیا گیا کیونکہ اس کو زینت کرنے کی ضرورت ہے تا کہ اس کا شوہر اس کی طرف رغبت کرے اور ان کے اتحاد میں جو جدائی واقع ہوگئی ہے اس کے جمع ہونے کا پھر وہ سبب بن جائے اسی وجہ سے مطلقہ ثلث میں علما کا اختلاف ہے کہ وہ زینت کرے یا نہ کرے پس بعض نے اصل حکمت کی طرف غور کیا اور بعض نے لفظ مطلقہ کے عموم کا خیال کیا۔

اور شارع نے بیوہ کی عدت چار ماہ دس روز اس لئے مقرر کی کہ چار مہینے کے تین چلے ہوتے ہیں اور یہ تین چلے ایسی مدت ہے کہ اس میں بچہ کے اندر جان پڑ جاتی ہے اور غالباً بچہ اس مدت کے اندر حرکت کرنے لگتا ہے اور دس روز اس پر اور زیادہ کیئے گئے تا کہ بچہ کا حرکت کرنا پورے طور

پر معلوم ہو جائے، اور نیز یہ مدت حمل معتاد کی نصف مدت ہے اور اس مدت میں حمل پورے طور پر ظاہر ہو جاتا ہے کہ ہر شخص اس کو دیکھ کر پہچان سکتا ہے اور شارع نے مطلقہ کی عدت تین حیض اور جس عورت کا خاوند مر جائے اس کی عدت چار ماہ دس روز اس لئے مقرر کی کہ مطلقہ میں صاحب حق یعنی خاوند اپنے اختیار پر قائم ہوتا ہے جو نسب کی مصلحت کو دیکھتا ہے، علامات اور قرائن کو جانتا ہے پس درست ہے کہ عورت کو اس چیز کا حکم دیا جائے جو اس کے ساتھ خاص ہے اور خاوند پر وہ امین سمجھی جائے اور لوگوں کے لئے ممکن نہیں کہ اس عورت کا حال معلوم کر سکیں جب تک کہ وہ خود بیان نہ کرے اور بیوہ کے اندر صاحب حق یعنی خاوند موجود نہیں ہوتا اور دوسرا شخص اس کے باطن کا حال اور اس کا فریب نہیں پہچان سکتا جس طرح خاوند پہچان سکتا ہے اس واسطے ضروری ہوا کہ اس کی عدت ایسا ظاہری امر مقرر کیا جائے جس کے معلوم کرنے میں سب قریب و بعید برابر ہوں اور حیض کو بھی وہ ثابت کر دے کیونکہ غالباً یا دائماً طہر اس قدر بڑا نہیں ہوتا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حاملہ عورت سے جماع نہ کیا جائے یہاں تک کہ بچہ ہو جائے اور نہ غیر حاملہ سے جماع کیا جائے یہاں تک کہ اس کو حیض آ جائے" اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" حالانکہ وہ حاملہ عورت اس کے لئے حلال نہیں ہے پھر کس طرح وہ اس سے خدمت لیتا ہے یا کس طرح اس کو وارث بنا سکتا ہے جبکہ وہ اس کے لئے حلال نہیں ہے"۔

میں کہتا ہوں استبراء کے اندر یہ راز ہے کہ اس سے رحم کا پاک ہونا معلوم ہو جائے اور انساب میں اختلاط نہ ہونے پائے پس جب عورت حاملہ ہو تو تجربہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ایسی صورت میں بچہ کے اندر دو مشابہتیں ہوتی ہیں ایک تو اس شخص کے ساتھ مشابہت ہوتی ہے جس کے نطفہ سے وہ بچہ پیدا ہوا ہے اور ایک اس کے ساتھ مشابہت ہوتی ہے جس نے ایام حمل میں اس کی ماں سے جماع کیا ہے، حضرت عمرؓ کے قول سے یہ بات معلوم ہوئی اور یہی بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول سے سمجھی جاتی ہے" جو شخص اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتا ہے اس کے لئے یہ حلال نہیں کہ اپنے پانی سے کسی اور کی کھیتی کو سیراب کرے" اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول "کیف یستخدمه" الخ تو اس کے یہ معنی ہیں کہ حاملہ کے ساتھ جماع کرنے کے بعد جو بچہ پیدا ہوتا ہے اس میں دو شخصوں کے ساتھ مشابہت ہوتی ہے اور ہر مشابہت کا حکم دوسری مشابہت کے

خلاف ہوتا ہے پس پہلے شخص کی مشابہت بچہ کو غلام بناتی ہے اور دوسرے کی مشابہت چاہتی ہے کہ وہ اس کا بیٹا ہو، اور پہلی مشابہت کا حکم غلام ہوتا اور مولی کی خدمت کا اس پر واجب ہونا ہے اور دوسری مشابہت کا حکم حریت اور میراث کا مستحق ہونا ہے، پس چونکہ بچہ کے اندر جماع کے سبب سے احکام شرعیہ کا التباس لازم آتا ہے اس واسطے جماع کرنے سے ممانعت کی گئی، واللہ اعلم۔

اولاد اور غلاموں کی پرورش کا بیان

واضح ہو کہ نسب من جملہ ان امور کے ہے جن کی محافظت آدمی کی سرشت میں داخل ہے پس صالح ملکوں میں سے کسی ملک کے اندر جہاں لوگ پیدا ہوتے ہیں تم کسی انسان کو کبھی نہ دیکھو گے مگر اس کو اپنے باپ دادا کی طرف منسوب ہونا محبوب ہوگا اور وہ اس بات کو ناپسند کرے گا کہ ان کی طرف اس کو منسوب کرنے میں کوئی عیب لگایا جائے ہاں نسب کی رذالت یا ضرر کے دفع کرنے کی غرض سے یا نفع وغیرہ حاصل کرنے کی غرض سے نہ ہو تو اور بات ہے اور نیز ہر شخص یہ بھی چاہتا ہے کہ اس کے اولاد ہو جو اسی کی طرف منسوب ہو اور اس کے بعد اس کے قائم مقام ہو پس بسا اوقات اولاد کے طلب کرنے میں لوگ بڑی کوشش کرتے ہیں اور اپنی تمام طاقت خرچ کرتے ہیں پس تمام لوگوں کا اتفاق اس خصلت پر ان کی جبلت کے سبب سے ہے اور احکام الٰہی کی بنیاد ان مقاصد کے باقی رکھنے پر ہے جو لوگوں کی جبلت میں داخل ہیں اور جن کے اندر نزاع اور حرص پیدا ہوتا ہے اور ان مقاصد پر صاحب حق کو اس کا حق دلایا جاتا ہے اور ان مقاصد میں باہم ظلم کرنے سے منع کیا جاتا ہے پس اس واسطے ضروری ہوا کہ شارع نسب سے بحث کرے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''لڑکا عورت کے لئے ہے اور زانی کے لئے پتھر ہے'' پس بعض نے اس سے سنگسار کرنا مراد لیا ہے اور بعض نے نقصان مراد لیا ہے''۔

میں کہتا ہوں اہل جاہلیت بہت سے طریقوں سے اولاد حاصل کیا کرتے تھے جن کو قوانین شرع صحیح نہیں جانتے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان میں سے بعض طریقوں کو بیان فرمایا ہے پس جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو آپ نے اس دروازہ کو بند کر دیا اور زانی کو نامراد ٹھیرایا اور اسی لئے ان مصالح ضروریہ میں سے جن کے بغیر نوع انسان باقی نہیں رہ سکتی، مرد کا اپنی عورت کے ساتھ مخصوص ہونا ہے تا کہ ایک عورت پر کئی مردوں کے جمع ہونے کا باب بالکل بند

ہو جائے اور یہ اس کا مقتضی ہے کہ جو شخص اس سنت راشدہ کی نافرمانی کرے اور بغیر اس خصوصیت کے اولاد حاصل کرنا چاہے اس کو محروم کیا جائے تا کہ اس کی ذلت ہو اور اس کا کوئی اختیار نہ رہے اور آئندہ کبھی ایسا قصد نہ کرے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول میں کہ ''زانی کے لئے پتھر ہے'' اسی طرف اشارہ ہے اگر پتھر سے نقصان مراد لیا جائے جیسا کہ بولا کرتے ہیں کہ اس شخص کے ہاتھ میں خاک ہے اور اس کے ہاتھ میں پتھر ہے، اور نیز جب حقوق مزاحم ہوں اور ہر ایک شخص اپنے لئے اس کے حقدار ہونے کا دعویٰ کرے تو ضروری ہے کہ اس شخص کو ترجیح دی جائے جو ایسی حجت ظاہرہ پیش کرے جو تمام لوگوں کے نزدیک قابل سماعت ہو اور جس کے پاس ایسی حجت ہو جو اس پر ملامت زیادہ کرے اور اس کے سبب سے حد کے مارنے کا دروازہ مفتوح ہوتا ہو یا وہ اس بات کا اقرار کرے کہ اس نے خدا کی نافرمانی کی ہے اور باوجود اس کے وہ ایسا پوشیدہ امر ہو جو صرف اس کے اقرار کرنے سے معلوم ہوتا ہے تو اس صورت میں مناسب یہ ہے کہ اس شخص پر تہدید و توبیخ ہونی چاہئے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے ہی معنی کا اعتبار فرما کر لعان کے قصہ میں فرمایا ہے ''اگر تو اس پر جھوٹ بولتا ہے تو مہر کا میری طرف کرنا تجھ سے بہت دور ہے'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول میں کہ ''زانی کے لئے پتھر ہے'' اسی کی طرف اشارہ ہے اگر پتھر سے سنگسار کرنا مراد لیا جائے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو شخص اپنے باپ کے سوا کسی اور کی طرف اپنی نسبت کرے اور وہ یہ بات جانتا ہو کہ وہ اس کا باپ نہیں ہے تو ایسے شخص پر جنت حرام ہے''۔

میں کہتا ہوں بعض لوگ گھٹیا مقاصد کی وجہ سے اپنے باپ سے اعراض کر کے دوسرے شخص کی طرف اپنی نسبت کر دیتے ہیں اور یہ بڑا ظلم اور نافرمانی ہے کیونکہ اس میں اپنے باپ کی امید کو قطع کرنا ہے اس واسطے کہ اس نے اپنی نسل کی بقا کو جو اس کی طرف منسوب ہے اور اس سے پیدا ہوئی ہے چاہا ہے، اور اس میں باپ کی نعمت کی ناشکری اور اس کے ساتھ برائی کرنا بھی ہے اور نیز باہمی نصرت اور انتظام شہر اور قبیلہ کے انتظام کے لئے ضروری چیز ہے اور اگر باپ سے نسبت کی نفی کا دروازہ مفتوح کر دیا جائے تو یہ مصلحت متروک ہو جائے اور تمام قبائل کے نسب مخلوط ہو جائیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس عورت نے کسی قوم میں اس شخص کو ملایا کہ وہ اس

میں نہیں ہے تو خدا تعالیٰ کے ہاں اس کا کچھ حصہ نہیں اور نہ کبھی خدا تعالیٰ اس کو جنت میں داخل کرے گا اور جو شخص اپنے بیٹے کا انکار کرے حالانکہ وہ اس کی طرف دیکھ رہا ہے تو اس کو خدا تعالیٰ اپنے دیدار سے محروم کرے گا اور تمام لوگوں کے روبرو اس کو رسوا کرے گا''۔

میں کہتا ہوں جبکہ عورت عدت وغیرہ میں امین تھی اور اس کو یہ حکم تھا کہ انساب کو مخلوط نہ کرے تو یہ بات ضروری ہوئی کہ اس کو اس امر میں ڈرایا جائے اور اس کو اس امر میں عذاب اس وجہ سے دیا گیا کہ اس فعل میں مصلحت عالم کے برباد کرنے میں کوشش اور جبلت نوع کے ساتھ مناقضت ہے اور یہ ملاء اعلیٰ کے بغض کو کھینچتا ہے کیونکہ وہ اصلاح نوع کے دعا کرنے پر مامور ہیں اور اس کے علاوہ اس میں اس کے لڑکے کے لئے نامرادی اور تنگی ہے اور دوسروں پر اپنی اولاد کا بوجھ ڈالنا ہے اور جب کوئی شخص اپنی اولاد کا انکار کرتا ہے تو ہمیشہ کے لئے ان کو ذلیل کرتا ہے اور بے انتہا عار میں گرفتار کرتا ہے کیونکہ اس نے اس کا نسب نہیں رکھا اور اس کی جان کو ضائع کیا کیونکہ کوئی اس پر خرچ کرنے والا نہیں رہا اور یہ فعل ایک طرح سے اولاد کے قتل کر دینے کے مشابہ ہے اور اس کی ماں کو بھی ہمیشہ کی ذلت اور ایسی عار میں ڈال دیا جو تمام عمر باقی رہنے والی ہے۔

عقیقہ کا بیان

واضح ہو کہ عرب اپنی اولاد کا عقیقہ کیا کرتے تھے اور ان کے نزدیک عقیقہ ایک امر لازم اور سنت مؤکدہ تھا اور اس میں بہت سی مصلحتیں تھیں جن کا رجوع مصلحت ملیہ اور مدنیہ اور نفسیہ کی طرف تھا پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دستور کو باقی رکھا اور خود اس پر عمل کیا اور لوگوں کو اس کی رغبت دلائی، پس منجملہ مصلحتوں کے ایک یہ ہے کہ عقیقہ میں نہایت خوبی کے ساتھ اولاد کے نسب کی اشاعت ہے کیونکہ اشاعت نسب ایک ضروری امر ہے تاکہ کوئی شخص اس کے حق میں کوئی ناپسندیدہ بات نہ کہہ سکے اور یہ بات نامناسب تھی کہ اس کا باپ گلیوں میں پکارتا پھرے کہ میرے ہاں بچہ پیدا ہوا ہے پس اشاعت کے لئے یہی طریقہ بہت مناسب ہوا۔

اور از آں جملہ عقیقہ کے اندر سخاوت کے معنی کا اتباع اور بخل کی صفت کی نافرمانی کرنا پایا جاتا ہے اور از آں جملہ یہ ہے کہ نصاریٰ کے ہاں جب کوئی بچہ پیدا ہوتا تھا تو اس کو زرد پانی سے رنگا کرتے تھے اور اس کا نام معمودیہ رکھتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ اس فعل سے وہ بچہ نصرانی ہو جاتا ہے اور اسی نام کی مشاکلت میں اللہ تعالیٰ کا یہ قول نازل ہوا ''صبغة الله ومن احسن من الله صبغة'' پس مستحب ہوا کہ اہل اسلام کے لئے بھی ان کے اس فعل کے مقابلہ میں کوئی ایسا فعل پایا جائے جس سے لڑکے کا اسلامی اور ملت ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام کا تابع ہونا معلوم ہو جائے اور جس قدر افعال حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہم السلام کے ساتھ مختص تھے جو ان کی اولاد میں چلے آتے ہیں ان میں سے سب سے زیادہ مشہور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنے فرزند کو ذبح کرنے پر آمادہ ہونا پھر ان پر اللہ تعالیٰ کا انعام کہ اس کے عوض ایک بڑی قربانی بھیجنا ہے اور ان

دونوں کی شرائع میں زیادہ مشہور حج ہے جس کے اندر سر منڈانا اور ذبح کرنا ہوتا ہے پس ان امور میں ان کے ساتھ مشابہت پیدا کرنا ملت حنفی کی تعظیم کرنا اور اس بات پر آگاہ کرنا ہے کہ اس فرزند کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا گیا ہے جو اس ملت کے اعمال میں سے ہے۔

اور از آں جملہ یہ ہے کہ ابتداء ولادت میں اس فعل کے کرنے سے اس کے خیال میں یہ بات پیدا ہوتی ہے کہ اس شخص نے اپنے فرزند کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں دیدیا ہے جیسے ابراہیم علیہ السلام نے کیا تھا اور اس میں سلسلہ احسان اور فرمانبرداری کو حرکت دینا ہے جیسا کہ صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرنے میں ہم نے بیان کیا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''لڑکے کے ساتھ عقیقہ ہے پس اس کی طرف سے خون بہاؤ اور اس کے بال منڈاؤ'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''لڑکا اپنے عقیقہ کے عوض میں مرہون ہے، ساتویں روز اس کی طرف سے قربانی کی جائے اور اس کا نام رکھا جائے اور اس کا سر منڈایا جائے''۔

میں کہتا ہوں عقیقہ کے حکم دینے کی وجہ وہی ہے جو ہم ذکر کر چکے ہیں لیکن ساتویں دن کی تخصیص تو اس کی وجہ یہ ہے کہ پیدائش اور عقیقہ میں کسی قدر فاصلہ ہونا ضروری ہے کیونکہ گھر کے تمام آدمی فرزند اور اس کی ماں کی خبر گیری میں اوّل اوّل مصروف رہتے ہیں پس ایسے وقت میں ان کو عقیقہ کا حکم دے کر ان کے شغل کو اور زیادہ نہیں کرنا چاہئے اور نیز بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کو بہت کوشش سے بکری دستیاب ہوتی ہے پس اگر عقیقہ پہلے ہی دن مسنون کیا جاتا تو لوگوں کو دقت ہوتی اور سات روز کا فاصلہ ایک کافی اور معتد بہ مدت ہے جو زیادہ بھی نہیں ہے، لیکن سر منڈانا سو وہ حجاج کے ساتھ مشابہت پیدا کرنے کی وجہ سے ہے اور اس کو ہم بیان کر چکے ہیں اور نام رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ اس سے پہلے لڑکے کے نام رکھنے کی حاجت نہیں ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت امام حسنؓ کی طرف سے ایک بکری عقیقہ میں ذبح کی اور فرمایا ''اے فاطمہؓ ان کے سر کو منڈوا دو اور ان کے بالوں کے ہم وزن چاندی خیرات کر دو''۔

میں کہتا ہوں کہ چاندی خیرات کرنے کا سبب یہ ہے کہ بچہ کا جنین کی حالت سے منتقل ہو کر طفلیت کی طرف آنا خدا تعالیٰ کی نعمت ہے جس پر شکر واجب ہے اور شکر ادا کرنے میں بہتر چیز وہ ہے جس سے عوض میں ہونا سمجھا جائے پس جبکہ لڑکے کے بال حالت جنینیت کی نشانی ہے اور ان کا

مونڈنا حالت طفلیت میں استقلال پانے کی علامت ہے تو ضروری ہوا کہ بالوں کو چاندی کے ساتھ وزن کرنے کا حکم دیا جائے، اور چاندی کو اس وجہ سے خاص کیا کہ سونا گراں ہوتا ہے اور دولتمند کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہوتا اور چاندی کے علاوہ باقی چیزیں ایسی نہیں ہیں جن سے بچے کے بالوں کو وزن کیا جا سکے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسن بن علیؓ کے کان میں جب حضرت فاطمہؓ نے ان کو جنا تھا آذان پڑھی تھی۔

میں کہتا ہوں اس میں وہی راز ہے جو ہم نے عقیقہ میں مصلحت ملیہ ذکر کی ہے کیونکہ اذان شعائر اسلام اور دین محمدی کی علامات سے ہے پھر اس اذان کے ساتھ مولود کو مخصوص کرنا چاہئے اور یہ خصوصیت اس کے بغیر نہیں ہو سکتی کہ اذان اس کے کان میں پڑھی جائے اور نیز تم جان چکے ہو کہ اذان میں یہ خاصیت ہے کہ شیطان اس سے بھاگتا ہے اور شیطان ابتدا ولادت میں لڑکے کو ایذا دیتا ہے حتی کہ حدیث میں آیا ہے کہ ''مولود کا چلانا اسی سبب سے ہوتا ہے''۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''لڑکے کی طرف سے وہ بکریاں اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری ہے''۔

میں کہتا ہوں جس شخص کو مقدور ہو اس کے لئے مستحب یہ ہے کہ لڑکے کی طرف سے دو بکریاں ذبح کرے کیونکہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بہ نسبت لڑکیوں کے لڑکے زیادہ نافع ہیں اس واسطے زیادہ شکر اور اس کی زیادہ عظمت مناسب ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ نام عبداللہ اور عبدالرحمٰن ہیں''۔

واضح ہو کہ مقاصد شرعیہ میں سب سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ تمام ضروری معاملات میں ذکر الٰہی داخل رہے تا کہ ہر ایک زبان بن کر حق کی طرف بلائے، اور مولود کے ایسا نام رکھنے میں توحید کی طرف اشارہ ہے، اور نیز عرب وغیرہ اپنی اولاد کا نام اپنے معبودوں کے نام پر رکھتے تھے اور چونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم توحید کے قائم کرنے کے لئے مبعوث کئے گئے تھے اس واسطے یہ بات واجب ہوئی کہ نام رکھنے میں بھی اس کے مثل دستور جاری کیا جائے اور یہی دونوں نام ان تمام ناموں میں سے جن میں لفظ عبد کسی اسم الٰہی کی طرف مضاف ہوتا ہے اس لئے محبوب ہے کہ یہ دونوں نام خدا تعالیٰ کے ناموں میں بہت مشہور ہیں اور یہ دونوں نام سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کسی پر

نہیں بولے جاتے بخلاف اور ناموں کے، اور ہمارے اس بیان سے تم لڑکے کا نام محمد اور احمد رکھنے کے استحباب کی حکمت کو معلوم کر سکتے ہو کیونکہ تمام لوگ اس بات کی بڑی حرص رکھتے ہیں کہ اپنی اولاد کا نام اپنے بزرگوں کے نام پر رکھیں اور اس میں دین پر آگاہ کرنا اور گویا اس بات کا اقرار کرنا ہے کہ وہ اس دین میں داخل ہے۔

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے نزدیک بدترین نام کا وہ شخص ہوگا جس کا نام شہنشاہ ہو''۔

میں کہتا ہوں اس کا سبب یہ ہے کہ اصول دین کی اصل تعظیم الٰہی ہے اور یہ ہے کہ اس کے ساتھ کسی کو برابر نہ کیا جائے اور کسی شئے کی تعظیم کرنا اس کے نام کی تعظیم کرنے کے برابر ہے اس واسطے واجب ہوا کہ خدا کے نام پر کسی کا نام نہ رکھا جائے خاص یہ نام جو بڑی تعظیم اور عظمت پر دلالت کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''اور مائیں اپنی اولاد کو پورے دو برس دودھ پلائیں''۔

میں کہتا ہوں جب خدا تعالیٰ کا ارادہ تناسل کے ذریعہ نوع انسان کے باقی رکھنے کی طرف متوجہ ہوا اور اس کا حکم بقا کے اندر جاری ہوا اور بچہ عادۃً جب تک اس کے ماں باپ اس کی زندگی کے اسباب میں معاونت نہ کریں زندہ نہیں رہ سکتا، اور یہ ایک جبلی امر ہے جو سب لوگوں کی خلقت میں داخل ہے یہاں تک کہ اس کی مخالفت کرنا خدا کی خلق میں تغیر کرنا اور اس چیز کے بگاڑنے میں کوشش کرنا ہے جس کو حکمت الٰہی نے واجب کیا ہے اس واسطے ضروری ہوا کہ شرع اس سے بحث کرے اور ان دونوں خاوند بیوی پر ان چیزوں کو تقسیم کرے جو ان دونوں سے بہ سہولت ادا ہو سکیں پس ماں کے لئے یہ آسان ہے کہ بچہ کو دودھ پلائے اور اس کی پرورش کرے پس اس پر یہی واجب کیا گیا اور باپ کے لئے لڑکے پر صرف کرنا اور اس کی ماں پر صرف کرنا اور اپنی استطاعت کے موافق کھانا کپڑا دینا آسان ہے کیونکہ خاوند نے اس کو تمام مشاغل اور مکاسب سے روک کر اپنا بچہ اس کی پرورش میں دیا ہے اور وہ اس کی پرورش میں محنت کرتی ہے پس انصاف اس بات کو چاہتا ہے کہ عورت کے اخراجات بھی اسی پر ہوں اور چونکہ بعض لوگ جلدی سے دودھ چھڑا دیتے ہیں اور بسا اوقات اس میں بچہ کو ضرر پہنچتا ہے اس واسطے اللہ تعالیٰ نے اس کی ایک ایسی حد مقرر کر دی جس

کے بعد دودھ چھڑانے سے بچہ غالباً صحیح وسالم رہتا ہے اور وہ مدت پورے دو سال ہیں اور اس سے کم میں بھی دودھ چھڑانے کی اجازت دی ہے بشرطیکہ وہ دونوں اس میں مصلحت سمجھ کر اس بات کو تجویز کریں کیونکہ بسا اوقات اس مدت سے پہلے بچہ کھانے پینے کے قابل ہو جاتا ہے مگر یہ بات اجتہاد اور فکر کی محتاج ہے اور اس امر میں ماں باپ ہی سب سے زیادہ مناسب ہیں اور اس بچہ کی خصلت سے وہ دونوں ہی خوب واقف ہیں، پھر خدا تعالیٰ نے جانبین سے ضرر رسانی کو بھی حرام کر دیا اس واسطے کہ اس میں وقت تھی جس سے تعاون میں نقصان آتا ہے پس اگر ان کو ماں کے ضعف یا مرض یا باہمی جدائی اور نا اتفاقی وغیرہ سے اور عورت سے دودھ پلوانے کی ضرورت پڑے تو اس میں کچھ مضائقہ نہیں اور ایسے وقت میں دونوں جانب سے حق کا ادا کرنا ضروری ہے کسی نے عرض کیا یا رسول اللہ کس چیز سے مذمت رضاعت (۱) میری جانب سے دور ہو سکتی ہے، آپ نے فرمایا ایک غلام یا ایک باندی سے۔

واضح ہو کہ دایہ حقیقی ماں کے بعد ماں ہوتی ہے اور ماں کے ساتھ سلوک کرنے کے بعد اس کے ساتھ سلوک کرنا واجب ہے یہاں تک کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دایہ کے لئے ان کی تعظیم کے سبب اپنی چادر مبارک بچھادی اور بسا اوقات دودھ پلانے والی اس چیز سے راضی نہیں ہوتی جو اس کو دی جائے اگر چہ وہ بہت ہی ہو اور اکثر اوقات دودھ پلانے والا تھوڑی چیز جس کو وہ دیتا ہے بہت سمجھ سکتا ہے اور اس میں اشتباہ واقع ہوتا ہے پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی حد مقرر کرنے کا سوال کیا گیا پس آپ نے ایک غلام یا باندی کے ساتھ اس کی حد مقرر فرمائی، اور اس کا سبب یہ ہے کہ دودھ پلانے والی نے اس پر اپنا ایک حق قائم کر دیا ہے اس وجہ سے کہ اس نے اس کی بنیاد قائم کی اور اس کو کامل انسان بنایا اور اس کی پرورش کی اور اس کی مشقت برداشت کی پس اس کو پوری جزا یہ ہے کہ دودھ پلوانے والا اس کو کوئی آدمی دے جو اس کے لئے تدابیر ضروریہ کے ارادہ کرنے میں بہ منزلہ اعضا کے ہو اور دودھ پلانے والی عورت کے کام کاج کا بار اٹھائے اور یہ ایک حد استحبابی ہے ضروری نہیں ہے، ہندہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ''ابوسفیان ایک بخیل آدمی ہے وہ مجھ کو کچھ نہیں دیتا مگر یہ کہ میں خود بغیر اس کی اجازت کے لے لوں، تو نبی صلی اللہ علیہ

(۱) دودھ پلانے کی اتنی اجرت، جس سے دایہ کی دلجوئی ہو سکے۔

وسلم نے فرمایا جس قدر تجھ کو اور تیرے بچہ کو حسب دستور کافی ہو سکے اس قدر لے لیا کرو''۔

میں کہتا ہوں بچہ اور بیوی کے نفقہ کی حد مقرر کرنا چونکہ دشوار تھا اس واسطے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو عورت کی رائے پر چھوڑ دیا اور اس کے لینے میں دستور کی قید لگا دی اور اس امر کو قاضیوں کی طرف رجوع نہیں کیا کیونکہ ایسے وقت میں اس میں دقت تھی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جب تمہاری اولاد سات برس کی ہو جائے تو ان کو نماز پڑھنے کا حکم کرو'' الحدیث، اور اس کے اسرار پہلے بیان ہو چکے ہیں، اور جب میاں بیوی میں بچہ کی پرورش کی بابت نزاع ہوا ہے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف حکم دیئے ہیں کیونکہ آپ نے اس بات کا لحاظ کیا جو بچہ اور اس کے ماں باپ کے لئے مناسب ہے، اور آپ نے اس کی طرف نظر نہیں فرمائی جو مضرت کا ارادہ کرے اور مصلحت کا قصد نہ کرے کیونکہ حسد اور ضرر رسائی اتباع کے قابل نہیں ہوتی چنانچہ ایک عورت آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اس نے عرض کیا یا رسول اللہ میرا یہ بیٹا میرے پیٹ میں رہا ہے اور میرے پستان کا اس نے دودھ پیا ہے اور میری گود میں اس نے پرورش پائی ہے اور اس کے باپ نے مجھے طلاق دیدی ہے اب وہ اس بچہ کو مجھ سے چھیننا چاہتا ہے تو آپ نے اس سے فرمایا تو ہی اس کی مستحق ہے جب تک تو نکاح نہ کرے۔

میں کہتا ہوں اس کا سبب یہ ہے کہ پرورش کے طریقے ماں ہی خوب جانتی ہے اور اس کو بچہ پر نہایت شفقت ہوتی ہے پس جب وہ نکاح کر لیتی ہے تو وہ دوسرے کے ہاتھ میں بہ منزلہ باندی کی سی ہو جاتی ہے اور وہ شخص اس بچہ کے حق میں محض اجنبی ہے اور بھلائی کرنے کی اس سے امید نہیں، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لڑکے کو اختیار دیا کہ وہ خواہ باپ کے پاس رہے یا ماں کے پاس اور یہ اس وقت ہے جبکہ وہ برائی بھلائی کی تمیز کرنے لگے۔

واضح ہو کہ انسان مدنی الطبع پیدا کیا گیا ہے اور اس کی زندگی باہمی معاونت کے بغیر قائم نہیں ہو سکتی اور معاونت بغیر باہمی الفت اور شفقت کے نہیں ہو سکتی اور الفت غم خواری اور جانبین سے خاطرداری کے بغیر نہیں پیدا ہوتی اور معاونت کو ایک مرتبہ مقرر نہیں بلکہ اس کے مختلف مراتب ہیں جن کے اختلاف سے صلہ رحمی اور بھلائی بھی مختلف ہوتی ہے پس ان مراتب میں ادنی مرتبہ مسلمانوں کے اندر ارتباط ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے اندر باہم سلوک

کرنے کو پانچ چیزوں میں محدود کیا اور فرمایا کہ ''ہر مسلمان کے دوسرے مسلمان پر پانچ حق ہیں: سلام کا جواب دینا، بیمار کی عیادت کرنا، جنازہ کے پیچھے چلنا، جو کوئی بلائے تو اس کو قبول کرنا اور چھینکنے والے کو جواب دینا'' اور ایک روایت میں چھ ہیں اور چھٹا یہ ہے کہ ''جب کوئی تجھ سے نصیحت طلب کرے تو اس کو نصیحت کرنا'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''بھوکے کو کھانا کھلاؤ اور قیدی کے چھڑانے میں کوشش کرو'' اور اس میں راز یہ ہے کہ ان پانچ چھ چیزوں میں دقت بہت کم ہے اور ان سے محبت پیدا ہوتی ہے اور اس ارتباط کے بعد وہ ارتباط ہے جو اہل محلہ اور ہمسایہ اور اقارب کے اندر پایا جاتا ہے پس وہ ارتباط ان کے درمیان ان چیزوں سے مستحکم ہوتا ہے اور تعزیت اور تہنیت اور آمد و رفت اور باہمی تحفہ و تحائف بھی اس کو مستحکم کرتے ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے چند امور کو واجب کیا جن کے وہ پابند ہیں خواہ وہ چاہیں یا نہ چاہیں جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو شخص اپنے ذی رحم محرم کا مالک ہو جائے تو وہ آزاد ہے'' اور جیسا کہ دیتوں میں ہے، اس کے بعد وہ ارتباط ہے جو گھر والوں میں پایا جاتا ہے جیسا کہ بیوی اور غلام باندی وغیرہ، لیکن بیوی کے ساتھ نیک سلوک کرنا سو ہم اس کے بیان کر چکے ہیں لیکن غلام اور باندی سو ان کے ساتھ بھلائی کرنے کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دو مرتبے مقرر فرمائے ہیں ایک واجب ہے جس کی پابندی ضروری ہے خواہ وہ چاہیں یا نہ چاہیں اور دوسرا مستحب ہے اور آپ نے اس کی ترغیب دلائی ہے واجب نہیں کیا ہے پس پہلے مرتبہ کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''غلام کے لئے اس کا کھانا اور کپڑا ہے اور اس کی طاقت سے زیادہ اس سے کام نہ لیا جائے'' اور اس کا کپڑا اور کھانا اس وجہ سے ہے کہ وہ مالک کی خدمت کے سبب سے اپنے لئے کسب نہیں کر سکتا اس واسطے ضروری ہوا کہ اس کی ضروریات مالک کے ذمہ ہوں، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس نے اپنے غلام پر تہمت لگائی حالانکہ وہ اس قول سے بری ہے تو قیامت کے روز اس کے کوڑے لگائے جائیں گے'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو شخص اپنے غلام کے ناک و کان کاٹے تو اس پر وہ غلام آزاد ہے''۔

میں کہتا ہوں اس میں یہ بات ہے کہ اس کے اوپر ملکیت جاتے رہنے سے مالک کے اس فعل پر جو اس نے کیا ہے اس کو سزا دینا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''دس کوڑوں سے زیادہ

اس کو کوڑے نہ لگائے جائیں بجز اللہ تعالیٰ کی حدود میں سے کسی حد میں''۔

میں کہتا ہوں اس میں ظلم کا دروازہ بند کرنا اور تعزیر میں مبالغہ کرنے سے باز رکھنا ہے کہ حد سے زیادہ نہ ہو، یا اس سے مراد یہ ہے کہ اپنی ذات سے متعلق امر میں دس کوڑوں سے زیادہ سزا دینے سے منع فرمایا ہے جیسا کہ اس کام کو ترک کرنا جس کا اس کو حکم کیا گیا ہے اور اسی جیسی باتیں اور مراد حد سے وہ گناہ ہے جس کی شریعت کے حق میں ممانعت آئی ہے اور جیسا کہ کسی قائل کا یہ قول ہے کہ تو حد کو پہنچ گیا اور میرے نزدیک یہ توجیہ صواب کے قریب ہے کیونکہ خلفاء راشدین حقوق شرع کے اندر دس سے زیادہ تعزیر کیا کرتے تھے اور دوسرا درجہ بھلائی کا وہ ہے جس کی بابت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے''جب تم میں سے کسی کا خادم کھانا پکائے پھر وہ اس کے پاس کھانا ایسی حالت میں لائے کہ اس کو دھواں اور گرمی لگی ہے پس اس کو مناسب ہے کہ اس کو اپنے پاس بٹھالے اور اس کے ساتھ کھانا کھائے اور اگر کھانا کم ہو تو اس میں سے ایک یا دو لقمہ اس کے ہاتھ پر رکھ دے'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا''جو شخص اپنے غلام کو حد مارے کہ وہ اس کا مرتکب نہیں تھا یا اس کے طمانچہ لگائے تو اس کا یہ کفارہ ہے کہ اس کو آزاد کردے'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا''جب تم میں سے کوئی شخص اپنے خادم کو مارے اور وہ خدا تعالیٰ کی دہائی دے تو وہ رک جائے'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا''جو شخص کسی مسلمان باندی غلام کو آزاد کرے تو خدا تعالیٰ اس کے ہر عضو کے عوض میں اس کے عضو کو آزاد کردے گا''۔

میں کہتا ہوں آزاد کرنے میں مسلمانوں کا اتفاق اور ان کے قیدیوں کو قید سے چھڑانا ہے پس اس کو اس کی پوری جزا دی جائے گی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا''جو شخص ایک غلام کے اندر اپنے حصہ کو آزاد کردے تو وہ سب آزاد ہو جائے گا اگر اس کے پاس مال ہے''۔

میں کہتا ہوں اس کا سبب وہی ہے جس کی نفس حدیث میں تصریح واقع ہوئی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ''خدا تعالیٰ کا کوئی شریک نہیں ہے'' اس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ مراد ہے کہ یہ آزاد کرنا خدا تعالیٰ کے لئے ہوا ہے اور یہ خلاف ادب ہے کہ خدا کے ساتھ اس میں کسی اور کی بھی ملک باقی رہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا''جو شخص کسی ذی رحم محرم کا مالک ہو تو وہ آزاد ہے''۔

میں کہتا ہوں اس کا سبب صلہ رحمی ہے، پس خدا تعالیٰ نے اس کی ایک قسم ان پر واجب کر دی خواہ وہ چاہیں یا نہ چاہیں اور واجب کرنے کے لئے اس قسم کی صلہ رحمی کو اس لئے خاص کیا کہ اپنے قریب کا مالک ہو جانا اور اس پر تصرف کرنا اور غلاموں کی سی اس سے خدمت لینا اس پر بڑا ظلم ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جب کسی کی باندی کی اسی شخص سے اولاد پیدا ہو تو وہ اس کے مرنے کے بعد آزاد ہو جائے گی''۔

میں کہتا ہوں اس میں راز یہ ہے کہ بچہ پر احسان کرنا ہے تا کہ اس کی ماں کا کوئی اور شخص مالک نہ ہو جائے جس کے سبب سے اس کو عار لاحق ہو اور شارع نے غلام پر مولیٰ کی خدمت واجب کی اور بھاگنا اس پر حرام کیا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو غلام بھاگ گیا پس تحقیق وہ اسلام کے ذمہ سے باہر ہو گیا یہاں تک کہ لوٹ آئے'' اور آزاد شدہ غلام پر حرام کر دیا کہ اپنے مولیٰ کے سوا کسی اور سے موالات کرے اور صلہ رحمی میں سب سے بڑھ کر حقوق والدین کی حرمت ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، سب سے بڑھ کر گناہ ماں باپ کی نافرمانی ہے'' اور والدین کے ساتھ سلوک کرنا چند امور سے پورا ہوتا ہے ان کو کھانا کھلانا اور لباس دینا اور اگر ان کو خدمت کی ضرورت ہو تو خدمت کرنا اور جب وہ بلائیں تو ان کو جواب دینا اور جب وہ کسی بات کا حکم دیں تو اس کو بجالانا بشرطیکہ وہ معصیت کے قبیل سے نہ ہو اور بکثرت ان کے پاس آمد و رفت رکھنا اور نرم کلامی کے ساتھ ان سے بات کرنا اور ان کو اُف تک نہ کہنا اور نام لیکر ان کو نہ پکارنا اور ان کے پیچھے پیچھے چلنا اور جو ان کی برائی کرے یا تکلیف پہنچائیں تو اس کی ان سے مدافعت کرنا اور نشست و برخاست میں ان کی عزت کرنا اور ان کے حق میں مغفرت کی دعا کرنا، واللہ اعلم۔

شہروں کی سیاست سے متعلق چند ابواب

واضح ہو کہ مسلمانوں کی جماعت کے اندر چند مصالح کی وجہ سے ایک خلیفہ کا ہونا ضروری ہے کیونکہ وہ مصالح بغیر اس کے پورے نہیں ہو سکتے اگر چہ وہ مصلحتیں بے شمار ہیں لیکن وہ دو قسموں میں منحصر ہیں ان میں سے ایک وہ مصالح ہیں جو سیاست شہر سے متعلق ہیں یعنی ان لشکروں سے مدافعت کرنا جو ان کو مغلوب اور مقہور کرنے آتے ہیں اور ظالم کو مظلوم سے روکنا اور مقدمات کا فیصلہ کرنا وغیر ذالک اور ان حوائج کی ہم پہلے تشریح کر چکے ہیں اور دوسری قسم وہ مصالح ہیں جو ملت

کی اصلاح سے متعلق ہیں اوراس کا بیان یہ ہے کہ دین اسلام کا تمام ادیان پر غالب ہونا اس کے بغیر متصور نہیں ہوسکتا کہ مسلمان کے اندر کوئی خلیفہ ہو جو اس شخص کو سختی سے روکے جو ملت سے نکلے اور اس چیز کا ارتکاب کرے جس کی حرمت پر نص وارد ہے یا اس چیز کو ترک کرے جس کی فرضیت نص سے ثابت ہے اور وہ باقی تمام ادیان کے لوگوں کو مطیع کرے اور ان سے جزیہ وصول کرے اس حال میں کہ ان سب پر دباؤ ہو ورنہ وہ مرتبہ میں مساوی معلوم ہوں گے، اور ایک فریق کا دوسرے پر غلبہ ظاہر نہ ہوگا اور کوئی شخص ان کو ان کی سرکشی سے روکنے والا نہ ہوگا، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام ان حوائج کو چار باب کے اندر جمع کر دیا ہے: باب مظالم، باب حدود، باب قضا، باب جہاد، پھر اس بات کی ضرورت ہوئی کہ ان ابواب کے کلیات کا انضباط کیا جائے اور ان کی جزئیات کو خلفا کی رائے پر چھوڑ دیا جائے اور ان کو مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ بھلائی کرنے کی نصیحت کی جائے اور اس کے کئی اسباب ہیں، از آں جملہ یہ ہے کہ بسا اوقات جو شخص خلیفہ بنتا ہے وہ جابر اور ظالم اور اپنی خواہش نفسانی کا تابع ہوتا ہے اور اتباع حق نہیں کرتا پس وہ لوگوں کے اندر فساد ڈالتا ہے اور اس کا یہ فساد اس مصلحت سے بدرجہا بڑھ کر ہوتا ہے جس کی اس سے امید کی جاتی ہے اور وہ خلیفہ اپنے افعال میں یہ حجت پیش کرتا ہے کہ وہ حق کی اتباع کر رہا ہے اور اس نے اس بات میں مصلحت سمجھی ہے پس اس واسطے ایسے کلیات کا ہونا ضروری ہے کہ جو شخص ان کی مخالفت کرے اس کو روکا جائے اور ان کلیات کے ذریعہ اس سے مواخذہ کیا جائے اور اس کے خلاف ان کا احتجاج ان کلیات کی طرف رجوع کرے۔

اور از آں جملہ یہ ہے کہ خلیفہ کے لئے ضروری ہے کہ لوگوں کے سامنے ظالم کے ظلم کو ثابت کرے اور نیز یہ سزا حاجت سے زیادہ نہیں ہے اور قضایا کے فیصلوں میں یہ ثابت کرے کہ اس نے انصاف سے فیصلہ کیا ہے اگر یہ بات نہ ہوگی تو لوگ اس کی خلافت میں اختلاف کریں گے اور جس کو ضرر پہنچا ہے اس کے اور اس کے اقارب کے دل میں خلیفہ کی طرف سے غصہ اور جوش پیدا ہوگا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ غدر کے منتظر رہیں گے اور ان کے دلوں میں خلیفہ کی طرف سے بغض پیدا ہو جائے گا اور اپنے آپ کو حق پر سمجھیں گے اور یہ بڑا فساد ہے، اور از اں جملہ یہ ہے کہ بہت سے لوگوں کو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ سیاست مدنیہ میں حق کیا ہوتا ہے پس وہ اجتہاد کرتے ہیں اور غلطی

کر کے حق کے راستہ سے دائیں بائیں پھر جاتے ہیں پس بعض آدمی ایسا سخت اور شدید ہوتا ہے کہ بڑی سخت سزا کو بھی ہلکا سمجھتا ہے اور بعض آدمی ایسا نرم دل ہوتا ہے کہ تھوڑی سزا کو بھی بہت سمجھتا ہے اور بعض ایسے کانوں کے کچے ہوتے ہیں کہ مدعی نے جو کچھ کہہ دیا اسی کو حق سمجھتے ہیں اور بعض ایسے سخت اور ضدی ہوتے ہیں کہ خواہ مخواہ لوگوں کی نسبت بدگمانی کرتے ہیں، اور ہر بات کا احاطہ کرنا ممکن نہیں ہے کیونکہ یہ بہ منزلہ تکلیف بالمحال کے ہے اس واسطے ضروری ہوا کہ اصول کا انضباط کیا جائے کیونکہ لوگوں کا فروع میں اختلاف کرنا اصول میں اختلاف کرنے سے سہل تر ہے۔

اور از آں جملہ یہ ہے کہ قوانین جبکہ شرع سے پیدا ہوتے ہیں تو تقرب الٰہی کے پیدا کرنے میں اور زبان بن کر قوم کے اندر ذکر حق کرنے میں وہ بہ منزلہ نماز اور روزہ کے ہوتے ہیں، حاصل کلام یہ ہے کہ جو لوگ قوت شہوانیہ یا سبعیہ کے تابع ہوتے ہیں تمام اختیارات ان کے سپرد کر دینا ناممکن ہوتا ہے اور خلفا کے اندر عصمت اور ظلم کو معلوم کرنا بھی ناممکن ہے اور تشریع اور ضبط مقادیر میں جن مصلحتوں کا ہم نے ذکر کیا ہے وہ تمام یہاں موجود ہیں، واللہ اعلم۔

خلافت کا بیان

واضح ہو کہ خلیفہ کے اندر عاقل بالغ آزاد مرد شجاع، صاحب رائے، سننے والا اور دیکھنے والا اور گویا ہونا شرط ہے اور اس کا ایسا شخص ہونا شرط ہے کہ لوگ اس کی اور اس کے نسب کی شرافت کو تسلیم کرتے ہوں اور اس کی فرمانبرداری سے عار نہ کرتے ہوں اور اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ وہ سیاست مدنیہ میں حق کا اتباع کریگا یہ سب باتیں ایسی ہیں جن پر عقل دلالت کرتی ہے اور باوجود ملکوں کے اور دنیوی کے اختلاف کے تمام بنی آدم کا خلیفہ کے اندران تمام باتوں کی شرط ہونے کا اتفاق ہے اس لئے کہ سب لوگ اس بات کو جانتے ہیں کہ خلیفہ کے مقرر کرنے سے جو مصلحت مقصود ہے وہ بغیر ان امور کے تمام نہیں ہوسکتی اور ان امور میں سے جب کبھی کوئی امر رہ گیا ہے تو انھوں نے اس کو نامناسب خیال کیا ہے اور اس کا خلیفہ ہونا ان کے دلوں کو ناگوار گزرا ہے اور غصہ کی حالت میں بظاہر سکوت کیا ہے، چنانچہ جب اہل فارس نے ایک عورت کو اپنا بادشاہ بنایا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس قوم نے عورت کو اپنے اوپر حاکم بنایا اس کو ہرگز فلاح نہ ہوگی'' اور ملت مصطفویہ نے نبی کے خلیفہ ہونے میں ان امور کے علاوہ اور باتیں بھی معتبر ہیں۔

ازاں جملہ اسلام اور علم اور عدالت ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ دینی مصالح بغیر ان امور کے تمام نہیں ہوتے اور اس پر مسلمانوں کا اجتماع ہے اور اس امر میں اصل اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: ''تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کئے ان سے خدا تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو زمین میں حاکم بنادے گا جیسا کہ ان سے پہلے لوگوں کو حاکم بنایا تھا'' الی قولہ تعالیٰ ''فاولئک هم الفاسقون''۔

اور ازاں جملہ یہ ہے کہ وہ قریشی ہو، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''امام قریش میں سے ہونا چاہئے اور اس کا سبب یہ ہے کہ حق جس کو اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر ظاہر کیا ہے وہ قریش کی زبان میں اور ان کی عادت کے موافق نازل ہوا ہے اور مقادیر اور حدود میں سے اکثر کی تعیین ان ہی چیزوں کے ساتھ کی گئی ہے جو ان میں موجود تھیں اور بہت سے احکام انہیں ہی کے معاملات کے متعلق نازل ہوئے ہیں پس سب سے زیادہ وہی ان احکام کو قائم کرنے والے اور ان سے دلیل پکڑنے والے ہیں اور نیز قریش نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم اور آپ کا گروہ ہیں اور ان کا فخر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کے بلند ہونے کے سوا اور کسی چیز میں نہیں ہے اور ان میں غیرت دینی اور غیرت نسبی دونوں پائی جاتی ہیں پس وہی لوگ شرائع کے قائم کرنے اور ان سے استدلال کرنے کے قابل ہیں اور نیز خلیفہ ایسا شخص ہونا چاہئے کہ اس کی جلالت نسب اور حسب کی وجہ سے اس کی فرمانبرداری سے لوگ عار نہ کریں کیونکہ جس شخص کا نسب عمدہ نہیں ہوتا تو لوگ اس کو ذلیل و حقیر سمجھتے ہیں اور نیز خلیفہ ان لوگوں میں سے ہونا چاہئے جن میں ریاست اور شرافت ہو اور اس کی قوم لوگوں کے مجمع اور جنگ کے میدان دیکھے ہوئے ہو اور نیز اس کی قوم کے لوگ قوی ہوں جو اس کی حمایت اور مدد کر سکیں اور اس کی خاطر جان دے سکیں، اور یہ سب امور بجز قریش کے کسی قوم کے اندر مجتمع نہیں تھے خاص کر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے اور آپ کی وجہ سے قریش کی عزت اور شوکت زیادہ ہو گئی اور اسی بات کی طرف حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اشارہ کیا تھا اور فرمایا تھا ''خلافت کا امر سوائے قریش کے ہرگز کسی کے لئے نہیں معلوم ہوتا وہ تمام عرب میں باعتبار وطن کے اوسط ہیں''۔

اور خلیفہ کا ہاشمی ہونا دو وجہ سے شرط نہیں کیا گیا ایک تو یہ کہ لوگوں کو اس سے شک واقع نہ ہو اور وہ یہ نہ کہہ سکیں کہ نبی کو اپنے گھرانے کی بادشاہت مقصود ہے جس طرح کہ اور بادشاہوں کو ہوتی ہے اور یہ بات ان کی ارتداد کا سبب بن جائے اور اسی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباس بن عبدالمطلب ؓ کو خانہ کعبہ کی کنجی عطا نہیں فرمائی۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ خلافت کے اندر نہایت ضروری امر خلیفہ سے لوگوں کا راضی ہونا اور اس پر ان کا متفق ہونا اور خلیفہ کے ساتھ ان کا توقیر سے پیش آنا اور خلیفہ کا حدود قائم کرنا اور ملت کے لئے قتال کرنا اور احکام نافذ کرنا ہے اور ان سب امور کا جمع ہونا کسی کسی شخص میں ہوتا ہے اور اس بات کے شرط کرنے میں کہ خلیفہ خاص

قبیلہ کا ہو لوگوں کے لئے باعث دقت اور حرج ہے کیونکہ بسا اوقات اس قبیلہ میں ایسا شخص نہیں ہوتا جس کے اندر یہ تمام شرائط مجتمع ہوں بلکہ دوسرے قبیلہ میں ایسا شخص موجود ہوتا ہے اور اسی وجہ سے فقہا نے کہا ہے کہ مسلم فیہ کا چھوٹی بستی سے ہونے کو شرط ٹھیرانا درست نہیں ہے بلکہ انھوں نے اس کا بڑی بستی سے ہونا جائز قرار دیا ہے۔

اور خلافت چند طرح سے منعقد ہوتی ہے ایک تو ان لوگوں کے بیعت کر لینے سے جو حل وعقد کے مالک ہیں جیسے علما اور رؤسا اور وہ امراء لشکر جو صاحب الرائے اور قوم کے خیر خواہ ہوں جس طرح حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت منعقد ہوئی تھی اور ایک صورت یہ ہے کہ خود خلیفہ وصیت کرے کہ فلاں شخص کو خلیفہ بناؤ۔ جس طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت منعقد ہوئی تھی اور ایک صورت یہ ہے کہ کسی خاص شخص کے لئے قوم کے اندر مشورہ ہو جس طرح حضرت عثمان بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہما کی خلافت کا انعقاد ہوا، اور ایک صورت یہ ہے کہ کوئی شخص جس میں یہ شرائط پائی جائیں لوگوں پر قادر اور مسلط ہو جائے جس طرح خلافت نبوت کے بعد اور خلفا کی خلافت ہے۔

پھر اگر کوئی ایسا شخص جو ان اوصاف کا جامع نہ ہو لوگوں پر غلبہ حاصل کر لے تو اس کی مخالفت پر فوراً کمر بستہ نہیں ہونا چاہئے کیونکہ اس کو معزول کرنا غالباً لڑائیوں اور جھگڑوں کے بغیر ممکن نہیں ہے اور اس میں جس قدر فساد ہے اس مصلحت سے بڑھ کر ہے جو خلافت سے مقصود ہوتی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے عرض کیا، کیا ہم ایسے برے بادشاہوں سے نہ لڑیں؟ تو آپ نے فرمایا ''نہیں، جب تک وہ تمہارے اندر نماز کو قائم رکھیں'' اور فرمایا ''مگر جب کہ تم ان سے کفر ظاہر دیکھو کہ جس پر تمہارے پاس خدا کی طرف سے کوئی برہان ہو''۔

اور حاصل کلام یہ ہے کہ خلیفہ جب ضروریات دین میں سے کسی ضروری حکم کا منکر ہو کر کافر ہو جائے تو اس کے ساتھ قتال کرنا درست بلکہ واجب ہے ورنہ نہیں، کیونکہ بوقت کفر وہ مصلحت جو اس کے خلیفہ بنانے سے مقصود تھی وہ فوت ہو گئی بلکہ لوگوں کے اندر اس کے فساد پھیلانے کا اندیشہ ہے پس اس کے ساتھ قتال کرنا خدا تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''ماننا اور اس کی اطاعت کرنا ہر مسلمان پر واجب ہے خواہ وہ بات اس کو بری لگے یا بھلی جب تک کہ خلیفہ گناہ کا حکم نہ دے پس جب وہ گناہ کا حکم دے تو اس وقت نہ ماننا ہے اور نہ طاعت کرنا ہے''

میں کہتا ہوں جبکہ امام دونوں قسم کی مصلحتوں کے لئے جن سے دین اور ملک کا انتظام ہوتا ہے مقرر کیا گیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی انہیں دونوں مصلحتوں کے لئے مبعوث ہوئے تھے اور امام آپ کا نائب اور آپ کے حکم کو نافذ کرنے والا ہے تو اس کی فرمانبرداری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمانبرداری اور اس کی نافرمانی آپ کی نافرمانی ہے مگر جب امام گناہ کا حکم دے تو اس وقت یہ معلوم ہوگا کہ اس کی فرمانبرداری اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری نہیں ہے اور وہ شخص آپ کا نائب نہیں ہے اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس نے امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس نے امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی'' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''امام ایک سپر ہے جس کی پناہ لیکر قتال کیا جاتا ہے اور جس کے سبب سے لوگوں کو بچاؤ ہوتا ہے پھر اگر امام خدا تعالیٰ کے خوف و ہدایت کا حکم کرے تو اس کے لئے اس کا اجر ہے اور اگر اس کے علاوہ کچھ اور کہے تو اس کا وبال اسی پر ہوگا''۔

میں کہتا ہوں امام کو بہ منزلہ سپر کے اس لئے فرمایا کہ امام کے سبب سے سب مسلمان ایک زبان ہو جاتے ہیں اور ان پر کوئی مصیبت نہیں آسکتی، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو شخص اپنے امیر سے کوئی ناپسند بات دیکھے تو اس کو صبر کرنا چاہئے کیونکہ جو شخص جماعت سے بالشت بھر بھی جدا ہو کر مرا تو وہ جاہلیت کی موت مرے گا''۔

میں کہتا ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کو جاہلیت سے جو امتیاز ہے تو انہیں دونوں مصلحتوں کے قائم کرنے کے سبب سے ہے اور ان دونوں مصلحتوں کے قائم کرنے میں خلیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نائب ہے پس جب کسی شخص نے ان مصلحتوں کے نافذ کرنے والے اور ان کے قائم کرنے والے سے مخالفت کی تو وہ جاہلیت کے مشابہ ہوگیا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس بندہ کو اللہ تعالیٰ نے کسی رعیت کا مالک بنائے اور خیر خواہی کے ساتھ وہ اس کی حفاظت نہ کرے تو وہ جنت کی بو بھی نہ پائے گا''۔

میں کہتا ہوں چونکہ خلیفہ کا مقرر کرنا مصلحتوں کے قائم کرنے کے لئے تھا اس واسطے ضروری ہوا کہ خلیفہ کو ان مصالح کے قائم کرنے کا حکم بتاکید دیا جائے جس طرح لوگوں کو اس کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے تاکہ جانبین سے مصلحتیں پوری ہو جائیں، پھر چونکہ امام تنہا صدقات اور عشور کو

وصول نہیں کر سکتا اور نہ تمام اطراف کے مقدمات فیصل کر سکتا ہے اس واسطے عمال اور قاضیوں کا مقرر کرنا ضروری ہوا اور چونکہ وہ سب کام ترک کر کے مصالح عامہ میں سے ایک کام میں مشغول ہو گئے اس واسطے بیت المال میں ان کے مصارف کا مقرر کرنا ضروری ہوا چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جب خلیفہ ہوئے تو آپ نے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ''تحقیق میری قوم جانتی ہے کہ میری تجارت میرے گھر والوں کے لئے کچھ کم نہ تھی اور اب میں مسلمانوں کے کام میں مشغول ہوں پس ابوبکر کا کنبہ بیت المال سے کھائے گا اور وہ مسلمانوں کے لئے محنت کرے گا،

پھر ضروری ہوا کہ عامل کو نرمی کرنے کا حکم دیا جائے اور خیانت اور رشوت سے اس کو منع کیا جائے اور لوگوں کو اس کی اطاعت کا حکم دیا جائے تا کہ مصلحت مقصودہ پوری پوری پائی جائے چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''بعض لوگ خدا تعالیٰ کے مال میں بغیر حق کے تصرف کرتے ہیں پس قیامت کے روز ان کے لئے آگ ہے'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس کو ہم کسی کام پر مقرر کریں اور اس کو تنخواہ بھی دیں پھر اس کے بعد جو کچھ لے گا تو وہ خیانت ہے'' اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رشوت دینے والے اور لینے والے پر لعنت کی ہے اور اس میں راز یہ ہے کہ رشوت کا لینا اور دینا مصلحت مقصودہ کے منافی ہے اور اس سے فساد کا دروازہ کھلتا ہے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''ہم اس شخص کو عامل مقرر نہ کریں گے جو خود عامل بننا چاہے''۔

میں کہتا ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ عامل بننے کی طلب اکثر خواہش نفسانی سے خالی نہیں ہوتی، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جب تمہارے پاس کوئی عامل آئے تو مناسب ہے کہ وہ تم سے خوش ہو کر واپس جائے'' پھر یہ ضروری ہوا کہ عمال کو ان کے عمل کے بدلہ میں جو کچھ دیا جائے اس کا اندازہ معین کیا جائے تا کہ امام کمی و زیادتی نہ کرے اور نہ خود عامل اس میں کچھ زیادتی کر سکے پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو شخص ہمارا عامل ہو تو اس کو چاہئے کہ اگر بیوی نہیں ہے تو بیوی کر لے پھر اگر اس کے پاس خادم نہ ہو تو خادم بھی مقرر کر لے اور اگر گھر نہ ہو تو گھر بھی لے لے''۔

پس جب امام عامل کو سال بھر کے صدقات وصول کرنے کو بھیجے تو اس کو چاہئے کہ اس کیلئے اس قدر مقرر کر دے جو اس کے اخراجات کو کافی ہو کر دیگر حوائج ضروریہ کیلئے بھی بچ رہے کیونکہ زیادہ کوئی حد نہیں ہے اور بغیر کسی قدر زائد کے عامل مشقت کو گوارا نہ کرے گا اور نہ اس کی طرف توجہ کریگا۔

مظالم کا بیان

واضح ہو کہ جن مقاصد کے لئے انبیا علیہم السلام بھیجے گئے ہیں ان میں سے سب سے بڑا مقصد لوگوں کے باہمی جور وظلم کا دور کرنا ہے کیونکہ ان کا باہم ایک دوسرے پر ظلم کرنا ان کی حالت کو خراب کرتا ہے اور ان پر بڑی تنگی پیدا کرتا ہے جس کی تشریح کی ضرورت نہیں اور مظالم کی تین قسمیں ہیں ایک جان پر تعدی کرنا دوسرے لوگوں کو اعضا پر تعدی کرنا تیسرے لوگوں کے مالوں پر تعدی کرنا، پس حکمت الٰہی کا مقتضی ہوا کہ ان اقسام میں سے ہر قسم کو ایسی سخت سزاؤں سے بند کیا جائے جو لوگوں کو دوبارہ ان کے ارتکاب سے باز رکھیں اور یہ مناسب نہیں تھا کہ سب سزائیں ایک ہی مرتبہ کی ہوں اس لئے کہ قتل کرنا ہاتھ پاؤں کاٹنے کے برابر نہیں ہوسکتا اور نہ ہاتھ پاؤں کاٹنا تلف مال کے برابر ہوسکتا ہے اور یہ کہ جن خواہشات سے یہ مظالم سرزد ہوتے ہیں ان کے مراتب بھی مختلف ہوں اس واسطے کہ یہ بدیہی بات ہے کہ عمداً قتل کرنا ایسا نہیں ہے جیسے تساہل جو خطا کا سبب ہوتا ہے پس سب سے بڑا ظلم قتل ہے اور وہ سب گناہوں میں بڑھ کر گناہ ہے تمام اہل مذاہب کا اس پر اتفاق ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے اندر خواہش غضب میں نفس کی اطاعت کرنا ہے اور وہ لوگوں میں فساد پھیلانے کی سب سے بڑھ کر صورت ہے اور اس میں مخلوق الٰہی کا تغیر اور بنیاد الٰہی کا منہدم کرنا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے جو نوع انسانی کا پھیلانا چاہا ہے اس کے بھی یہ برخلاف ہے اور قتل کی تین قسمیں ہیں: عمد اور خطا اور مشابہ عمد، پس قتل عمد اس قتل کا نام ہے جس میں کسی وزنی و زخمی کرنے والے آلہ سے روح کا نکالنا مقصود ہو، اور قتل خطا اس قتل کا نام ہے جس میں انسان کا مارنا مقصود نہیں ہوتا مگر وہ اس کو لگ جائے اور اس کو قتل کردے مثلاً کوئی

شخص کسی پر گر پڑے اور وہ مر جائے یا کسی درخت کی طرف تیر چلائے اور کسی آدمی کے لگ جائے اور وہ مر جائے اور مشابہ عمد کی صورت یہ ہے کہ کسی شخص کو ایسی چیز سے مارے جو غالباً ہلاک نہیں کرتی مگر وہ شخص اس سے ہلاک ہو جائے جیسے کوئی شخص کسی کو کوڑے یا لکڑی سے مارے اور وہ مر جائے اور قتل کی تین قسمیں اس لئے قرار پائیں کہ ہم پیشتر اشارہ کر چکے ہیں کہ سزا اسی قدر ہونی چاہئے جو داعیہ نفس اور مفسدہ کے مقابل ہو اور داعیہ اور مفسدہ کے چند مراتب ہیں پس چونکہ قتل عمد میں بڑا فساد اور سخت داعیہ تھا اس واسطے اس میں سخت سزا دینا ضروری ہوا تا کہ پورے طور پر اس کا ارتکاب سے رد کے، اور چونکہ قتل خطا میں کم فساد اور کم داعیہ تھا اس واسطے اس کی سزا میں بھی تخفیف ضروری ہوئی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قتل عمد اور قتل خطا کے درمیان ایک اور مرتبہ کا استنباط کیا ہے کیونکہ اس کو دونوں سے مناسبت ہے اور ان دونوں کے درمیان واسطہ ہے پس ان دونوں میں سے کسی میں اس کا داخل ہونا مناسب نہیں ہے پس قتل عمد کے باب میں یہ آیت نازل ہوئی ہے "جو کوئی کسی مومن کو عمداً قتل کر ڈالے تو اس کی جزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس پر خدا تعالیٰ کا غضب اور اس کی لعنت ہوگی اور اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے"۔ اس آیت کا ظاہر یہ ہے کہ اس قاتل کی کبھی مغفرت نہ ہوگی اور حضرت ابن عباسؓ کا یہی مذہب ہے لیکن جمہور اور ظاہر سنت اس طرف ہیں کہ یہ گناہ بھی اور گناہوں جیسا ہے اور یہ تشدیدات زجر کے طور پر ہیں اور جہنم میں اس کے مدت دراز تک رہنے کو خلود کے ساتھ مشابہت ہے اور اس کے کفارہ میں اختلاف ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قتل عمد کے مسئلہ کفارہ کی تصریح نہیں فرمائی، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "اے ایمان والو! مقتولین کے بارے میں تم پر قصاص لکھا گیا ہے حر کے بدلہ میں حر غلام کے بدلہ میں غلام اور عورت کے بدلہ میں عورت" الایہ۔

یہ آیت عرب کے قبائل میں سے دو قبیلوں کے باب میں نازل ہوئی ہے کہ ان میں سے ایک بہ نسبت دوسرے کے زیادہ شریف تھا پس کم مرتبہ قبیلہ کے لوگوں نے اشرف قبیلہ کے کچھ لوگوں کو مار ڈالا تو اشرف قبیلہ نے کہا کہ ہم غلام کے عوض میں حر کو اور عورت کے عوض میں مرد کو قتل کریں گے اور اپنے زخمیوں کے بدلہ میں دو چند زخمی کریں گے اور آیت کے معنی اللہ تعالیٰ ہی خوب جانتا ہے، یہ ہیں کہ مقتولین کے اندر صفات خاصہ مثلاً عقل، جمال، صغر اور کبر اور اس کا شریف یا

مالدار ہونے کا کچھ اعتبار نہیں ہے بلکہ نام اور مظان کلیہ کا اعتبار ہے پس ہر عورت دوسری عورت کے برابر ہے اور اسی لئے سب عورتوں کی دیت برابر ہے اگرچہ اوصاف مختلف ہوں اور اسی طرح ہر حر دوسرے حر کا مثل اور ہر غلام دوسرے غلام کا مثل ہے پس قصاص کے معنی برابری اور اس بات کے ہیں کہ دو شخص ایک درجہ کے حکم میں سمجھے جائیں اور کسی کو دوسرے پر فضیلت نہ دی جائے نہ کہ قتل اس جگہ ضروری ہو، پھر سنت سے یہ بات ثابت ہوئی کہ مسلمان کافر کے بدلہ نہ قتل کیا جائے اور حر غلام کے بدلہ نہ قتل کیا جائے اور مرد عورت کے بدلہ قتل کیا جائے گا کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک باندی کے بدلہ ایک یہودی کو قتل کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس خط میں جو ہمدان کے حکام کے نائبوں کو روانہ کیا تھا اس میں یہ بھی تھا کہ عورت کے بدلہ مرد قتل کیا جائے۔

اور اس کا راز یہ ہے کہ اس امر میں قیاس مختلف ہے پس مردوں کو عورتوں پر فضیلت اور ان پر حاکم ہونے کا تو یہ مقتضی ہے کہ عورتوں کے بدلہ مردوں سے قصاص نہ لیا جائے اور دونوں کی جنس ایک ہی ہے اور جو کچھ فرق ہے وہ صغیر و کبیر اور قوی الجثہ اور ضعیف ہونے میں ہے اور ان کی رعایت کرنا نہایت مشکل ہے، اور بہت سی عورتیں خوبیوں میں مردوں سے زیادہ ہوتی ہیں ان امور کا مقتضیٰ یہ ہے کہ عورتوں کے بدلہ ان سے قصاص لیا جائے پس ضروری ہوا کہ دونوں قیاسوں پر عمل کیا جائے اور ان دونوں پر عمل کرنے کی صورت یہ ہے کہ قتل میں قصاص کا اعتبار کیا جائے اور دیت میں نہ کیا جائے اور یہ اس لئے کیا گیا کہ عمداً قتل کرنے والے نے اس کی جان کا قصد کیا اور اس پر ظلم کا ارادہ کیا اور جو شخص قصداً ظلم کرنے والا ہو تو جہاں تک ممکن ہو اس کو خوب دفع کیا جائے کیونکہ عورت صاحب شوکت نہیں ہوتی اور نہ اس کے قتل کرنے میں کوئی دقت پیش آتی ہے بخلاف مردوں کے قتل کرنے میں، کیونکہ ایک مرد دوسرے کا مقابلہ کرتا ہے اس واسطے یہ صورت قصاص واجب کرنے کے لئے زیادہ مناسب ہوئی تاکہ وہ اس کو دوبارہ ایسی حرکت کرنے سے روکے اور باز رکھے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" کافر (۱) کے بدلہ مسلمان نہ قتل کیا جائے گا"

میں کہتا ہوں اس میں حکمت یہ ہے کہ شریعت میں مقصود اعظم ملت حنفیہ کی تعظیم ہے اور وہ اس کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی کہ مسلمان کو کافر پر فضیلت دی جائے اور ان میں باہم برابری نہ کی

---

(۱) کافر سے مراد حربی ہے نہ کہ ذمی کیونکہ اہل ذمہ تمام دنیاوی حقوق میں مسلمانوں کے برابر ہیں۔

جائے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''بیٹے کے عوض میں باپ کو نہ قتل کیا جائے''۔

میں کہتا ہوں اس کا سبب یہ ہے کہ والد کی شفقت اور محبت اولاد پر بہت زیادہ ہوتی ہے پس والد کے قتل پر اقدام کرنے میں اس بات کا ظن غالب ہے کہ اس نے قتل کرنے کا قصد نہیں کیا اگر چہ قصد کرنے کی علامات پائی جائیں یا وہ قتل ایسے سبب سے ہوا ہے جس نے قتل کو مباح کر دیا اور جس طرح ایسے ہتھیار کا استعمال جو غالباً قتل نہیں کرتا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ قاتل نے جان سے مار ڈالنے کا قصد نہیں کیا تھا والد کا قتل کرنا بھی اس بات پر اس سے کم دلالت نہیں کرتا، اور قتل مشابہ عمد کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو شخص کسی فساد میں مارا جائے جس میں پتھر پھینکے جائیں یا کوڑے بازی ہو یا لٹھ چلیں تو وہ قتل خطا ہے اور اس کی دیت وہی ہے جو قتل خطا میں ہوتی ہے''۔

میں کہتا ہوں اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ خطا کے مشابہ ہے اور وہ قتل عمد نہیں ہے اور اس کی دیت اصل میں خطا کی دیت کے برابر ہے اور فرق صرف صفت کے اعتبار سے ہے یا یہ معنی ہیں کہ قتل خطا اور اس میں سونا و چاندی کے اعتبار سے کچھ فرق نہیں اور دیت مغلظہ میں روایتیں مختلف ہیں پس عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول یہ ہے کہ دیت مغلظہ میں چار قسم کے اونٹ دیئے جائیں پچیس اونٹ کے ایک سالہ بچے اور پچیس دو سالہ اور پچیس سہ سالہ اور پچیس چہار سالہ، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے ''اس قتل عمد خطا میں جو کوڑے یا لاٹھی سے واقع ہو جائے سو اونٹ دیت ہیں جن میں سے چالیس حاملہ اونٹنیاں ہیں'' اور ایک روایت میں یہ ہے کہ تیس دو سالہ اور تیس سہ سالہ اور چالیس حاملہ اونٹنیاں دی جائیں اور جس کمی و بیشی پر وہ مصالحت کر لیں وہ ان کو ملنا چاہئے'' لیکن قتل خطا کی دیت میں تخفیف ہے اور اس میں پانچ قسم کے اونٹ دینے کے لئے آئے، بیس بنت مخاض، بیس ابن مخاض، بیس بنت لبون، بیس حقہ اور بیس جذعہ، اور ان دونوں قسموں میں عاقلہ یعنی محلہ والوں پر تین سال کے اندر اندر دیت کا ادا کرنا واجب ہے اور چونکہ ان اقسام کے مراتب مختلف تھے اس واسطے کئی وجہ سے تخفیف اور تغلیظ کا قتل کے اندر لحاظ رکھا گیا۔

ازاں جملہ یہ ہے کہ قاتل کو مار ڈالنے کا حکم صرف قتل عمد میں دیا گیا اور باقی دو قسموں میں دیت کا حکم دیا گیا اور یہود کی شریعت میں سوائے قصاص کے کوئی اور حکم نہ تھا پس خدا تعالیٰ نے اس

امت پر تخفیف کی اور قتل عمد کی سزا دو باتوں میں سے ایک مقرر کی قتل یا مال، کیونکہ بسا اوقات مقتول کے ورثا کو انتقام لینے سے مال میں زیادہ فائدہ ہوتا ہے اور نیز اس میں ایک مسلمان کی جان بچتی ہے۔ اور از آں جملہ یہ ہے کہ قتل عمد میں قاتل سے دیت لی جاتی ہے اور اس کے علاوہ دونوں قسموں میں عاقلہ (۱) سے دیت لی جاتی ہے تا کہ اس میں سخت ممانعت پائی جائے اور قاتل کو پوری سرزنش ہو جس سے خوب اس کے مال کو صدمہ پہنچے۔

اور قتل غیر عمد میں عاقلہ یعنی محلّہ والوں سے اس لئے دیت لی جاتی ہے کہ کسی کا خون کرنا نہایت فساد عظیم ہے اور مصیبت زدوں کے قلوب کی تسلی شریعت کو مقصود ہے اور ایسی بڑی بات میں قاتل سے تساہل کرنا گناہ عظیم ہے جس پر اس سے مواخذہ ہونا ضروری ہے پھر جبکہ اہل قرابت پر صلہ رحمی واجب تھی تو حکمت کا مقتضی یہ ہوا کہ اس میں سے کچھ ان پر بھی واجب کیا جائے خواہ وہ خوش ہو کر دیں یا ناخوش ہو کر، اور یہ بات دو وجہ سے متعین ہوئی ایک تو یہ کہ خطا اگر چہ تساہل کی وجہ سے قابل مواخذہ ہے لیکن اس میں انتہا درجہ کا مبالغہ بھی نہ کرنا چاہئے پس لوگوں پر ان کے ذی رحم کی طرف سے جو چیز واجب کی جائے وہ ایسی چیز ہونی چاہئے جس میں اس پر تخفیف ضروری ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ عرب کے لوگ تنگی کے وقت جان و مال سے اپنے آدمی کی مدد کیا کرتے تھے اور اس کو وہ صلہ واجب اور حق موکد سمجھتے تھے اور اسکے ترک کو بڑی نافرمانی اور قطع رحم خیال کرتے تھے پس ان کی اس عادت کا یہ مقتضی ہوا کہ یہ امر ان کے لئے مقرر کیا جائے۔

اور از اں جملہ یہ ہے کہ قتل عمد کی دیت کو معجّل قرار دیا کہ ایک سال میں ادا کیا جائے اور غیر عمد کی دیت میں مہلت دی کہ تین برس میں ادا کرے تا کہ اس میں ایک قسم کی تخفیف پائی جائے جس کو ہم بیان کر چکے ہیں اور دیت میں اصل یہ ہے کہ اس میں بہت سا مال واجب ہونا چاہئے جو لوگوں پر گراں ہو اور ان کے مال میں کمی ڈالے اور لوگوں کے نزدیک اس کی قدر ہو اور وہ مال اتنا ہو کہ محنت برداشت کر کے اس کو ادا کر سکیں تا کہ زجر کے معنی حاصل ہوں اور یہ مقدار ہر شخص کے اعتبار سے جداگانہ ہے۔

---

(۱) جس علاقہ میں مقتول ملا ہے، اس علاقے کے لوگوں سے بھی دیت لی جائے گی، تا کہ آئندہ سے چوکنا رہیں اور اس قسم کا حادثہ پیش نہ آئے۔

اور اہل جاہلیت نے دیت کے اندازہ میں دس اونٹ مقرر کئے تھے پس جب عبدالمطلب نے یہ دیکھا کہ لوگ اتنا مال ادا کرنے پر بھی قتل سے باز نہیں آتے تو انھوں نے دیت میں سو اونٹ مقرر کر دیئے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کو برقرار رکھا کیونکہ اس زمانہ میں اہل عرب کے پاس اونٹ ہی تھے لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ معلوم تھا کہ آپ کی شریعت تمام عرب اور عجم بلکہ تمام دنیا پر لازم ہوگی اور سب کے پاس اونٹ نہیں ہوتے اس واسطے آپ نے سونے سے ہزار دینار اور چاندی سے بارہ ہزار درہم دیت میں مقرر فرمائے اور گائے بیل میں سے دو سو اور بکریوں میں سے دو ہزار دیت میں مقرر فرمائے اور اس کا سبب یہ ہے کہ تین سال کے اندر سو مردوں پر اگر ہزار دینار تقسیم کئے جائیں تو ایک سال میں فی آدمی تین دینار سے کچھ زیادہ ہوتے ہیں اور دراہم سے تیس درہم اور کچھ زائد ہوتا ہے اور یہ اتنی مقدار ہے کہ اس سے کم کے ادا کرنے میں لوگوں کو کچھ پرواہ نہیں ہوتی اور قبائل مختلف ہوتے ہیں کوئی قبیلہ بڑا ہوتا ہے اور کوئی چھوٹا ہوتا ہے اور چھوٹے کا اندازہ پچاس آدمیوں سے کیا گیا ہے کیونکہ کم از کم اتنے آدمیوں سے گاؤں آباد ہوتا ہے اور اسی لئے قسامت میں پچاس قسمیں مقرر ہوئیں جو پچاس شخصوں سے لی جاتی ہیں اور بڑے قبیلہ میں ان سے دو چند ہوتے ہیں اس واسطے دیت میں سو اونٹ مقرر کئے گئے تا کہ ہر آدمی ایک اونٹ یا دو اونٹ یا ایک سے کچھ زیادہ اکثر قبائل میں اگر وہ مساوی الحال ہوں ادا کریں اور جو احادیث اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ جب اونٹ گراں ہوتے تھے تو آپ دیت میں کمی فرماتے تھے اور اگر وہ سستے ہوتے تھے تو آپ دیت میں زیادتی کرتے تھے۔

میرے نزدیک اس کے یہ معنی ہیں کہ آپ کا یہ ارشاد انہیں لوگوں کے ساتھ خاص تھا جہاں اونٹوں کی پیداوار ہوتی تھی اور اگر تم اکثر شہروں کی تحقیق کرو گے تو لوگوں کی قسموں میں بعض کو سوداگر اور مالدار پاؤ گے اور یہ لوگ شہری ہوتے ہیں، اور بعض کو مویشی چرانے والے پاؤ گے اور وہ دیہاتی ہوتے ہیں اور اکثر لوگوں کا حال اس سے خالی نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''جو شخص خطا مومن کو قتل کر ڈالے تو اس کو ایک غلام مومن آزاد کرنا چاہئے'' الآیہ۔

میں کہتا ہوں کفارہ میں مسلمان غلام آزاد کرنا یا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا اس لئے واجب ہوا تا کہ قاتل کا وہ گناہ جو اس کے اور خدا کے درمیان ہے مٹ جائے کیونکہ دیت ایک سزا ہے جس

میں لوگوں کو ندامت ہوتی ہے اس طور سے کہ اس پر لوگوں کو تنگی ہوتی ہے اور کفارہ سے بندہ اور خدا تعالیٰ کے مابین گناہ دور ہو جاتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو مسلمان شخص اس بات کی گواہی دیتا ہو کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اس کا رسول ہوں تو اس کا خون کرنا بغیر ان تین باتوں میں سے ایک کے حلال نہیں ہے یا وہ کسی کو قتل کرے یا نکاح کرنے کے بعد پھر کسی سے زنا کرے یا دین سے برگشتہ ہو کر جماعت اسلام کو ترک کرے۔

میں کہتا ہوں تمام مذاہب میں یہ قاعدہ متفق علیہ ہے کہ قتل اسی مصلحت کلیہ کے سبب سے جائز ہوتا ہے جو بدون قتل کے حاصل نہیں ہوتی اور اس مصلحت کا ترک کرنا قتل سے بھی زیادہ فساد کا سبب ہوتا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''فتنہ قتل سے بڑھ کر ہے'' اور جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم احکام اور حدود قائم کرنے کے لئے آمادہ ہوئے تو ضروری ہوا کہ اس مصلحت کلیہ کا جو قتل کو جائز کردیتی ہے انضباط کریں اور اگر مصلحت کلیہ کا انضباط نہ کیا جاتا اور اس کو ایسے ہی چھوڑ دیا جاتا تو قتل کرنے والا ایسے شخص کو مصلحت کلیہ سمجھ کر قتل کردیتا جس کے قتل میں مصلحت کلیہ نہ ہوتی پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تین چیزوں سے اس کا انضباط فرمایا، ایک تو قصاص ہے کیونکہ اس میں سزا اور بے شمار مصلحتیں ہیں جن کی طرف اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول میں اشارہ فرمایا ہے ''اے عقلمندو! تمہارے لئے قصاص کے اندر زندگی ہے''۔

دوسرے نکاح کرنے کے بعد زنا کرنا ہے کیونکہ تمام مذاہب میں زنا سب سے بڑا گناہ ہے اور وہ جبلت انسانی کا اصلی مقتضیٰ ہے کیونکہ انسان جبکہ اس کا مزاج سالم ہو اس کی خلقت میں اس بات کی غیرت ہوتی ہے کہ کوئی شخص اس کی بیوی پر مداخلت کرے جیسا کہ تمام بہائم میں ہوتا ہے مگر فرق یہ ہے کہ انسان کو ان چیزوں کا جاننا ضروری تھا جن سے ان کے درمیان باہمی انتظام درست ہو سکے اس واسطے ان پر یہ بات واجب کی گئی تیسرے مرتد ہے جس نے خدا تعالیٰ اور دین کی بے ادبی کی اور اس مصلحت کی مخالفت کی جو دین کے قائم کرنے اور رسولوں کے بھیجنے میں ملحوظ تھی، اور ان تینوں کے علاوہ وہ ہے جس کی امت قائل ہے جیسے حملہ آور کا قتل کرنا اور اس محارب کا قتل کرنا جس نے ہنوز کسی کو قتل نہیں کیا ان کے نزدیک جو محارب کی سزا میں اختیار کے قائل ہیں

پس ان کا بھی انہیں اصول کی طرف رجوع کرنا ممکن ہے۔

واضح ہو کہ اہل جاہلیت بھی قسامت کے ساتھ حکم کرتے تھے اور سب سے پہلے ابوطالب نے قسامت کا حکم دیا ہے جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے اور اس میں بڑی مصلحت تھی اس لئے کہ قتل بسا اوقات ایسے پوشیدہ مقامات اور تاریک راتوں میں ہوتا ہے جہاں اس پر بینہ قائم نہیں ہوسکتا پس اگر ایسے قتل پر باز پرس نہ کی جائے تو لوگ قتل پر جرأت کیا کریں اور عام فساد پھیل جائے گا اور اگر مقتول کے ورثا کا دعویٰ بلا دلیل قبول کرلیا جائے تو لوگ اپنے تمام دشمنوں کا نام لے لیا کریں اس واسطے ضروری ہوا کہ گاؤں کی ایک بڑی جماعت سے قسم لی جائے اور وہ پچاس آدمی ہوں پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا حکم کیا اور اس کو برقرار رکھا، اور فقہا کا اس علت میں جس پر قسامت کا مدار ہے اختلاف ہے پس بعض کہتے ہیں کہ کسی مقتول کا جس میں ضرب یا زخم یا گلا گھونٹے کا اثر ہو کسی ایسے مقام میں پایا جانا جو کسی قوم کی حفاظت میں ہو جیسے محلہ اور مسجد اور مکان، اور یہ علت عبداللہ بن سہل کے قصہ سے ماخوذ ہے کہ انھوں نے ایک مقتول کو خیبر میں خون آلودہ پایا تھا اور بعض کہتے ہیں کہ اس کی علت ایک مقتول کا پایا جانا اور کسی پر قتل کے شبہ کا قائم ہونا خواہ مقتول کے بیان کرنے سے یا کسی ناقص شہادت وغیرہ سے اور یہ اس قسامت کے قصہ سے ماخوذ ہے جس کا ابوطالب نے حکم دیا تھا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' کافر کا خوں بہا مسلمان کے خوں بہا سے نصف ہے''۔

میں کہتا ہوں اس کا سبب وہی ہے جس کو ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ ملت اسلامیہ کی عظمت اور مسلمان کی کافر پر فضیلت ضروری ہے اور نیز کافر کے قتل کرنے سے مسلمانوں کے اندر کم فساد ہوتا ہے اور اس کا گناہ بھی کم تر ہے اس لئے کہ کافر مباح الاصل ہے اور اس کو قتل کرنے سے کفر بھی کچھ کم ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود اس کا قتل کرنا گناہ اور خطا اور زمین میں فساد پھیلانا ہے پس مناسب ہوا کہ دیت مقرر ہو اور اس میں تخفیف ہو، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کے حمل گروانے کی صورت میں ایک غلام یا باندی کے آزاد کرنے کا حکم دیا تھا۔

واضح ہو کہ جنین میں دو وجہیں پائی جاتی ہیں ایک یہ کہ وہ انسانی نفوس میں سے ایک نفس ہے اور اس کا مقتضیٰ ہے کہ اس کے عوض میں بھی ایک نفس واجب ہو اور دوسرے یہ کہ وہ اپنی ماں کا

ایک حصہ اور عضو ہے جو بغیر ماں کے قائم نہیں رہ سکتا اور اس کا مقتضیٰ یہ ہے کہ مال کا حکم دینے میں اس کا حال اور زخموں کا سا ہو پس دونوں وجھوں کا لحاظ رکھا گیا اور اس کی دیت ایک مال جو آدمی ہے گردانی گئی اور یہ نہایت انصاف ہے، لیکن انسان کے اعضا پر تعدی کرنا سو اس کا حکم کئی اصول پر مبنی ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس میں سے جو عمداً ہو تو اس میں برابر بدلہ لیا جائے مگر جس صورت میں برابر بدلہ لینے سے ہلاکت کا اندیشہ ہو تو وہ برابر بدلہ لینے سے مانع ہوگا اور اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی یہ آیت ہے'' جان کے بدلہ جان اور آنکھ کے بدلہ آنکھ اور کان کے بدلہ کان اور ناک کے بدلہ ناک اور دانت کے بدلہ دانت اور زخم برابر ہیں'' پس آنکھ کے بدلہ میں آنکھ گرم آئینہ سے زائل کرنی چاہئے اور دانت کے بدلہ دانت ریتی سے تراشنا چاہئے اور اس کو اکھاڑنا نہیں چاہئے کیونکہ اکھاڑنے میں زیادہ ایذا کا خوف ہے اور زخموں میں جبکہ وہ گہرا زخم ہو بدلہ ہے، زخم کی گہرائی کے بقدر ناپ کر اس کے بدن سے اسی جگہ پر چھری سے زخم کریں اور اگر ہڈی ٹوٹ جائے تو اس میں قصاص نہیں ہے (بلکہ دیت ہے) کیونکہ اس کا بدلہ لینے میں ہلاکت کا خوف ہے،

اور بعض تابعین سے منقول ہے کہ طمانچہ کے بدلہ میں طمانچہ مارا جائے اور چٹکی کے بدلہ میں چٹکی لی جائے اور دوسرے یہ کہ جس چیز میں انسان کے کسی نفع پہنچانے والی قوت کا ازالہ ہو جیسے پکڑنا اور چلنا اور دیکھنا اور سننا اور سمجھنا اور جماع کرنا اور جس کی وجہ سے انسان لوگوں پر بار ہو جائے اور اپنی معاش پر بغیر دوسرے کی مدد کے قادر نہ ہو اور اس کی وجہ سے لوگوں میں اس کو عار لاحق ہوتی ہو اور مثلہ کرنا ہو جس سے اللہ تعالیٰ کی بناوٹ میں تبدیلی لازم آتی ہے اور تمام عمر تک اس کا اثر جسم پر باقی رہے تو اس میں پوری دیت واجب ہوتی ہے کیونکہ اس میں بڑا ظلم اور اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی صورت کو بگاڑنا اور مثلہ کرنا اور اس کے ساتھ عار کا لاحق کرنا ہوتا ہے اور لوگ ان امور میں مظلوم کی مدد اس طرح سے نہ کرتے تھے جس طرح قتل کے بارے میں اس کی مدد کرتے تھے بلکہ ایسی باتوں کو خود ظالم اور حاکم اور ظالم کی قوم اور مظلوم کی قوم کوئی بڑا امر نہیں سمجھتے تھے اس واسطے ضروری ہوا کہ شارع اس میں تاکید کرے اور اس کی سزا انتہا درجہ کی مقرر کرے اور اس میں اصل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے جو اہل یمن کو نامہ مبارک میں لکھا تھا'' ناک جب جڑ سے کاٹ لی جائے تو اس کے بدلہ میں دیت ہے اور دانتوں میں دیت ہے اور لبوں میں دیت ہے اور بیضوں

میں دیت ہے اور ذکر میں دیت ہے اور پشت میں اور آنکھوں میں دیت ہے'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''عقل میں دیت ہے'' پھر جب ان منفعتوں میں سے کوئی منفعت نصف فوت ہو جائے گی تو نصف دیت آئے گی اور ایک پیر میں نصف دیت ہے اور ایک ہاتھ میں نصف دیت ہے اور جس میں اس منفعت کے دسویں حصہ کا فوت ہونا پایا جائے جیسے ہاتھ یا پاؤں کی ایک انگلی کا کاٹ ڈالنا ہو تو اس میں دیت کا دسواں حصہ ہے اور ہر دانت کے عوض دیت کا بیسواں حصہ ہے اس لئے کہ دانت اٹھائیس یا چھبیس ہوتے ہیں اور وہ کسر جو ایک کے مقابلہ میں اس عدد کے اعتبار سے ہوتی ہے ایک پوشیدہ امر ہے جس میں حساب کرنے میں تعمق کی ضرورت ہے اس واسطے ہم نے بیس کا عدد مقرر کر لیا اور ہر دانت کے عوض میں دیت کا بیسواں حصہ واجب کر دیا۔

اور تیسرے یہ کہ وہ زخم جن سے کسی مستقل قوت کا ابطال نہ ہوا اور نہ اس کے نصف کا ہوا اور نہ اس میں مثلہ کرنا ہو بلکہ وہ صرف زخم ہو جو چند دن میں بھر جاتا ہو اور اچھا ہو جاتا ہو تو اس زخم کو بہ منزلہ نفس کے گردانا مناسب نہیں ہے اور نہ یہ مناسب ہے کہ اس کے بہ منزلہ ہاتھ پاؤں کے برابر شمار کر کے نصف دیت کا حکم دیا جائے اور یہ بھی مناسب نہیں ہے کہ اس کو ایسے ہی چھوڑ دیا جائے اور اس کے عوض میں کچھ مقرر نہ کیا جائے، پس زخم کا کم سے کم مرتبہ موضحہ ہے کیونکہ اس سے کم کو زخم نہیں کہتے بلکہ اس کو چھلنا اور خراش کہتے ہیں، اور موضحہ اس زخم کو کہتے ہیں جس میں ہڈی نظر آنے لگے پس اس میں دیت کا بیسواں حصہ ہے اس لئے کہ بیسواں حصہ کم سے کم حصہ ہے جو حساب میں بلاغور کئے معلوم ہو جاتا ہے اور احکام میں ان حصوں پر شریعت کا معاملہ مبنی ہے جس کی مقدار محاسب اور غیر محاسب سب جانتے ہیں اور جو زخم ایسا ہو، جس میں ہڈی ٹوٹ کر اپنے مقام سے ہٹ جائے تو اس کی دیت پندرہ اونٹ ہیں اس لئے کہ زخم میں ہڈی تک پہنچنا اور اس کا ٹوٹنا اور اپنی جگہ سے ہٹ جانا پایا جاتا ہے پس وہ زخم بہ منزلہ تین کھلے زخموں کے ہے اور جائفہ اور آمہ یعنی وہ زخم جو پیٹ کے اندر تک پہنچ جائے یا وہ زخم دماغ کی جھلی تک پہنچ جائے تو یہ دونوں زخم سب زخموں میں بڑے زخم ہیں پس ان کے بارے میں مناسب یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک میں تہائی دیت دلائی جائے کیونکہ نصف سے کم کا اندازہ ثلث سے ہو سکتا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''یہ اور یہ یعنی چھوٹی انگلی اور انگوٹھا برابر ہیں'' اور فرمایا ''اگلا دانت اور ڈاڑھ دونوں برابر ہیں''۔

میں کہتا ہوں اس کا سبب یہ ہے کہ ان منافع کا انضباط کرنا جو ہر ہر عضو کے ساتھ مخصوص ہیں چونکہ مشکل ہے اس واسطے ان کے ناموں اور نوع پر حکم کا مدار کرنا ضروری ہوا۔

واضح ہو کہ بعض قتل اور زخم ایسے ہیں جن کا کچھ معاوضہ نہیں ہے اور اس کی دو صورتیں ہیں یا تو وہ قتل اور زخم کسی شر کے دفع کرنے کی وجہ سے ہو جو انسان کو لاحق ہوتا ہو اور اس میں اصل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ہے کہ ایک شخص نے آپ سے یہ عرض کیا ''یارسول اللہؐ اگر کوئی شخص میرا مال چھیننے کے ارادہ سے آئے تو آپ اس میں کیا فرماتے ہیں؟ آپ نے فرمایا تو اس کو اپنا مال نہ دے، پھر اس نے عرض کیا اگر وہ مجھ سے لڑنے لگے تو آپ کیا فرماتے ہیں؟ آپ نے فرمایا تو اس سے مقاتلہ کر، پھر اس نے عرض کیا کہ اگر وہ مجھ کو قتل کر ڈالے تو آپ کیا فرماتے ہیں؟ آپ نے فرمایا پس تو شہید ہے، اس نے عرض کیا اگر میں اس کو قتل کر ڈالوں تو آپ کیا فرماتے ہیں؟ آپ نے فرمایا وہ دوزخ میں جائے گا''۔

اور ایک شخص نے ایک شخص کو کاٹا پس جس کو کاٹا تھا اس نے کاٹنے والے کے منہ سے جلدی سے اپنا ہاتھ کھینچا تو اس کا ایک دانت بھی اس کے ساتھ کھینچ لیا پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا کوئی عوض نہیں دلایا۔

حاصل کلام یہ ہے کہ جو کوئی شخص کسی انسان کی جان یا اس کے اعضا یا اس کے مال پر حملہ کرے تو حتی الامکان اس کا دفع کرنا جائز ہے پس اگر حملہ آور کو قتل کرنے تک بھی نوبت پہنچے تو کچھ گناہ نہیں اس لئے کہ درندہ خصلت لوگ بسا اوقات زمین میں غلبہ حاصل کر لیا کرتے ہیں پس اگر ان کو دفع نہ کیا جائے تو لوگوں کی حالت بہت تنگ ہو جائے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اگر کوئی شخص تیرے گھر میں جھانکے اور تو نے اس کو اجازت نہ دی ہو پس تو اس کو کنکری مارے اور اس سے اس کی آنکھ پھوٹ جائے تو تجھ پر کوئی گناہ نہیں ہے، اور ایک صورت قصاص نہ لینے کی یہ ہے کہ وہ قتل اور زخم ایسے سبب سے ہو جس میں کسی پر طرفین سے تعدی نہ پائی جاتی ہو اور وہ بہ منزلہ آفت سماوی کے ہو اور اس میں اصل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ہے کہ ''چوپایہ کے نقصان میں کچھ نہیں اور کان میں گر پڑنے سے کچھ نہیں اور کنوئیں میں گر پڑنے سے کچھ نہیں''۔

میں کہتا ہوں اس کا سبب یہ ہے کہ چوپائے جنگل میں چرنے کے لئے چھوڑ دیئے جاتے

ہیں پس اگر وہ کسی کو تکلیف پہنچائیں تو وہ ان کے مالک کے فعل سے نہیں ہوا ہے اور اسی طرح جب کوئی کوئیں میں گر پڑے یا کان کے نیچے دب جائے اس میں بھی اس کے مالک کا فعل نہیں ہے لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس امر میں احتیاط کرنے کی لوگوں کو بڑی تاکید کردی تاکہ خطا سے کسی کو کوئی ضرر نہ پہنچے کیونکہ مرض کے قریب ہونے سے جان کے تلف ہونے کا خطرہ ہے اور اسی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کنکریاں پھینکنے سے منع کیا اور آپ نے فرمایا ''نہ اس سے شکار مرتا ہے اور نہ اس سے دشمن زخمی ہوتا ہے ہاں اس سے دانت ٹوٹ جاتا ہے اور آنکھ پھوٹ جاتی ہے''، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جب کوئی شخص ہماری مسجد یا بازار میں تیر لیکر گزرے تو اس کو چاہئے کہ اس کے نوکدار حصہ کو تھامے تاکہ مسلمان میں سے کسی کو اس سے ضرر نہ پہنچے'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''تم میں سے کوئی شخص اپنے بھائی کی طرف ہتھیار سے اشارہ نہ کرے کیونکہ وہ نہیں جانتا کہ شاید شیطان اس کے ہاتھ سے گرادے پس وہ جہنم کے کسی گڑھے میں جا پڑے'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس نے ہم پر ہتھیار اٹھایا وہ ہم میں سے نہیں'' اور آپ نے ننگی تلوار دینے سے منع فرمایا اور دو انگلیوں سے لہسن کو پکڑ کر کاٹنے سے منع فرمایا۔

لیکن انسان کے مال پر تعدی کرنا سو اس کی چند قسمیں ہیں: غصب کرنا اور ہلاک کرنا اور چوری کرنا اور لوٹنا، پس چوری اور لوٹ کے معنی تو عنقریب تم کو معلوم ہو جائیں گے لیکن غصب، پس وہ غیر کے مال پر کسی واہی شبہ پر اعتماد کر کے جس کا شریعت میں اعتبار نہ ہو یا اس بھروسہ پر کہ حکام کو حقیقت حال ظاہر نہ ہوگی یا اسی طرح کسی اور بھروسہ پر قبضہ کر لینا ہے، پس غصب اس قابل ہے کہ اس کو معاملات میں شمار کیا جائے اور اس پر حدود مبنی نہ کی جائیں اور اسی وجہ سے ہزار درہم کے غصب کرنے سے ہاتھ کاٹنا واجب نہیں ہوتا اور تین درہم کی چوری سے ہاتھ کاٹنا واجب ہو جاتا ہے، لیکن مال کا تلف کرنا سو وہ کبھی عمداً اور کبھی شبہ عمد سے اور کبھی خطا سے ہوتا ہے مگر چونکہ اموال کا درجہ جان سے کم ہے اس واسطے تمام اموال کے لئے ایک حکم نہیں دیا گیا اور سب کی سزا میں تاوان دلانا کافی سمجھا گیا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو شخص ظلم سے ایک بالشت برابر کسی کی زمین لے گا تو خدا تعالیٰ قیامت کے روز سات زمین کا طوق بنا کر اس کو پہنائے گا''۔

میں کہتا ہوں کئی بار تم کو یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ جو فعل مصلحت شہر کے خلاف ہو اور اس

میں ایذا اور ظلم پایا جائے وہ فعل ملاء اعلیٰ کی لعنت کا سبب ہوتا ہے اور عذاب عمل کی صورت میں یا اس کے قریب قریب صورت میں متمثل ہوتا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو ہاتھ کوئی چیز لے تو اس کا واپس کرنا ضروری ہے''۔

میں کہتا ہوں غصب اور عاریت کے باب میں یہ حدیث اصل ہے بعینہ اس چیز کا واپس کرنا واجب ہے اگر بعینہ اس کا واپس کرنا مشکل ہو تو اس کے مثل کا دینا واجب ہوتا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ٹوٹی ہوئی رکابی کے عوض میں رکابی واپس کی اور ٹوٹی ہوئی رکابی کو اپنے پاس رہنے دیا۔

میں کہتا ہوں تلف کرنے کے باب میں یہ حدیث اصل ہے اور ظاہر سنت سے معلوم ہوتا ہے کہ منقولات میں تاوان لینا جس کو عام وخاص کہہ دیں کہ یہ اس کے مثل ہے جائز ہے جیسے رکابی کے بدلہ رکابی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے صحابہ کے سامنے مغرور (۱) کی نسبت یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ اپنی اولاد کے مثل غلاموں کی قیمت ادا کرے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس شخص کو اپنا بعینہ مال کسی کے پاس مل جائے تو وہی اس کا مستحق ہے اور خریدنے والا بائع سے دام وصول کرلے''۔

میں کہتا ہوں اس حکم کا سبب اور مقتضیٰ یہ ہے کہ جب یہ صورت واقع ہو تو دونوں جانب میں جور وظلم کا احتمال ہے پس جب اس کا اسباب کسی کے پاس برآمد ہو، اور ایسی حالت میں اگر یہ قاعدہ مقرر کیا جاتا کہ جب تک وہ بائع کو نہ پالے یہ شخص اس مال کو نہ لے گا تو اس میں صاحب اسباب یعنی اصل مالک کا ضرر عظیم ہے کیونکہ غاصب یا چور کی جب خیانت معلوم ہوتی تو بسا اوقات وہ یہ حجت پیش کرسکتا تھا کہ اس نے فلاں شخص سے وہ مال خریدا ہے تا کہ اپنی جان بچائے اور بسا اوقات غاصب اور چور اس مال کے فروخت کرنے پر کسی کو وکیل بنادیتا تا کہ خود ماخوذ نہ ہوں اور نہ بائع ماخوذ ہو پس اس میں لوگوں کی حق تلفی کے باب کو کھولنا تھا اور اکثر اوقات بائع اس وقت ملتا جبکہ وہ مشتری موجود نہیں ہوتا پس وہ مالک اس کو پکڑتا اور اس کے پاس کچھ نہیں پاتا پس خسارہ پاکر سکوت کرنا پڑتا اور اگر یہ قاعدہ مقرر کیا جاتا کہ اسی وقت اپنی چیز پر قبضہ کرلے تو اس میں مشتری کا ضرر تھا کیونکہ بسا اوقات خریدنے والا بازار میں سے کوئی چیز خریدتا ہے اور نہ وہ بیچنے والے کو جانتا

---

(۱) مغرور اس شخص کو کہتے ہیں جس کو کوئی عورت یہ دھوکہ دیکر کہ میں حرہ ہوں اس سے نکاح کرلے اور حقیقت میں وہ کسی کی باندی ہو

ہے اور نہ اس کا گھر اس کو معلوم ہوتا ہے پھر یہ مال کسی اور کا نکل آتا ہے اور بائع کو اس کا پتہ نہیں لگتا تو خسارہ کی حالت میں اس کو سکوت کرنا پڑتا ہے اور بسا اوقات اس کو کسی چیز کی حاجت ہوتی ہے اور حق دار کے اس پر قبضہ کرنے میں اور بیچنے والے پر اس کے حوالہ کرنے میں اس کی حاجت فوت ہوتی ہے پس جبکہ دونوں طرف کا ضرر تھا اور ان دونوں میں سے ایک کا ضرر ضروری تھا تو یہ امر ضروری ہوا کہ ایسی ظاہر بات کی جائے جس کو بلاشبہ لوگوں کی عقل قبول کر لے اور وہ اس جگہ یہ ہے کہ حق اس شئے خاص کے ساتھ متعلق ہوا ہے اور عین اس عین کے معاوضہ میں جس کے ساتھ حق متعلق ہے روک لیا جائے جبکہ بینہ قائم ہو اور اشکال مرتفع ہو جائے اور اسی قیاس پر قضایا کا اعتبار کرنا مناسب ہے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے باغ والوں کو حکم دیا کہ وہ دن میں باغوں کی نگہبانی کریں اور رات میں جو مویشی نقصان کر جائیں تو اس کا معاوضہ مویشی والوں پر ہے''۔

میں کہتا ہوں اس فیصلہ کا سبب اور باعث یہ ہے کہ جب مویشی نے لوگوں کے باغ کا کچھ نقصان کیا تو ظلم اور عذر دونوں کے ساتھ ہے پس مویشی والا تو یہ عذر کر سکتا ہے کہ مویشی کو جنگل میں چرنے کے لئے چھوڑنا اس کو ضروری ہے ورنہ وہ بھوک سے مر جائے گا اور ہر مویشی کے پیچھے پیچھے رہنا اور اس کی نگہبانی کرنا تدابیر ضروریہ میں خرابی پیدا کرتا ہے اور مویشی نے جو نقصان کیا ہے اس کا اس میں کوئی بس نہیں ہے بلکہ باغ والے نے خود اپنے مال کی حفاظت میں کوتاہی کی اور اس کو غیر محفوظ چھوڑ دیا، اور باغ والا یہ حجت کر سکتا ہے کہ باغ شہر سے باہر ہوتا ہے پس اس کی حفاظت کرنا اور اس میں کسی کو آنے سے روکنا اور اس پر پہرا دینا اس کی حالت کو خراب کر دینے کا سبب ہے اور مویشی کے مالک نے یا تو خود اس میں مویشی کو چھوڑا ہے یا خود اس کی نگرانی میں کوتاہی کی ہے پس جب یہ امر دونوں میں دائر ہوا اور ہر ایک کی طرف سے ظلم اور عذر ممکن ہوا تو ضرور ہوا کہ اس عادت مالوفہ کی طرف نظر کی جائے جو ہمیشہ سے ان میں جاری ہے پس اس عادت سے تجاوز کرنے پر جور کی بنا قائم کی جائے، اور عادت یہ ہے کہ ہر باغ میں دن میں وہ لوگ رہتے ہیں جو اس میں کام کرتے ہیں اور اس کی درستی اور اس کی حفاظت کرتے ہیں اور رات کو اسے چھوڑ کر اپنے گھروں میں گاؤں یا شہر میں آ کر سوتے ہیں اور یہ کہ مویشیوں کے مالک رات کے وقت ان کو اپنے گھروں میں جمع کر لیتے ہیں اور پھر دن کو چرنے کے لئے چھوڑ دیتے ہیں پس لوگوں کی اس

عام عادت سے تجاوز کرنا ظلم سمجھا گیا، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے درختوں میں لگے ہوئے پھلوں کی نسبت سوال کیا تو آپ نے فرمایا ''جو کوئی محتاج شخص اس کو منہ سے کھالے اور جھولی نہ بھرے تو اس پر کچھ گناہ نہیں''۔

واضح ہو کہ لوگوں میں باہمی ظلم دور کرنے کی یہی صورت ہے کہ جو کوئی کسی کو ضرر پہنچائے اور ظلم کرے اس کا ہاتھ پکڑا جائے نہ یہ کہ ان کے لالچ اور طمع نفسانی کی پیروی کی جائے پس اس پھل کے کھانے میں جو معلق غیر محفوظ کثیر ہے جس سے محتاج آدمی کے پیٹ بھر کر کھانے سے مالک کو ملال بھی نہیں گزرتا جبکہ کھانے والا حد سے تجاوز نہ کرے اور نہ جھولی بھرے اور نہ درختوں پر پتھر پھینکے تو اس صورت میں عرف درگزر کرنے کا تقاضا کرتا ہے پس ایسی حالت میں جو شخص اس حاجتمند پر دعویٰ کرتا ہے تو وہ اپنی طمع نفسانی کا اتباع کرتا ہے اور ضرر پہنچانا چاہتا ہے پس اس کا دعویٰ مسموع نہ ہوگا البتہ جس صورت میں تھوڑے پھل ہوں یا وہ جھولی بھرے یا پتھر پھینکے یا کسی اور طرح سے ضرر پہنچانے میں حد سے تجاوز کرے تو اس میں تعزیر اور تاوان آتا ہے اور مویشی کا دودھ دوہنے میں قیاسات متعارض ہیں اور ان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان کر دیا ہے پس کبھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اس مال پر قیاس کیا جو گھر میں حفاظت سے رکھا ہوا ہے پس اس کے دوہنے سے منع فرمایا اور کبھی درختوں کے پھلوں اور غیر محفوظ چیزوں پر اس کو قیاس فرما کر اس شخص کے لئے جس کو مویشی کا مالک نہ ملے تاکہ اس سے اجازت لے بقدر ضرورت دودھ لینے کو مباح فرمایا اور جن احادیث میں اختلاف ہے اور ان کی علتیں ظاہر ہوگئی ہیں ان میں قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ ان علتوں کے اعتبار سے ان کو جمع کیا جائے پس جہاں ایسی چیزوں کے صرف کرنے کی عادت ہو اور وہاں لوگوں کو بخل اور تنگی نہ ہو اور حاجت بھی ہو تو اس کا لینا جائز ہے اور اگر ایسی بات نہ ہو تو جائز نہیں ہے اور اسی پر بیوی کا خاوند کے مال میں اور غلام کا آقا کے مال میں تصرف کرنے کو قیاس کر لینا چاہئے۔

حدود کا بیان

واضح ہو کہ بعض معاصی ایسے ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے حد مقرر فرمائی ہے اور وہ ایسے معاصی ہیں جن میں فساد کی بہت سی صورتیں ہیں کہ ان سے زمین میں فساد ہوتا ہے اور مسلمانوں کے امن و اطمینان کو ختم کرنا ہوتا ہے اور ان کے لئے بنی آدم کے نفوس کے اندر داعیہ ہوتا ہے جو ہمیشہ ان کے اندر جوش مارتا رہتا ہے اور ان کی عادت ہو جاتی ہے کہ جب وہ معاصی دل میں پیوست ہو جاتے ہیں تو لوگ ان سے باز نہیں آسکتے اور ان میں ضرر عظیم ہوتا ہے جن کو اکثر اوقات مظلوم اپنے نفس سے دفع کرنے کی طاقت نہیں رکھتا اور یہ بات لوگوں کے درمیان اکثر واقع ہوتی رہتی ہے پس ایسے گناہوں میں عذاب آخرت سے ڈرانا کافی نہیں بلکہ اس قسم کے معاصی پر نہایت درجہ ملامت اور تکلیف کا پہنچانا ضروری ہے تاکہ ہر وقت وہ لوگوں کی آنکھیں کے سامنے رہے اور جس گناہ کا وہ ارادہ کرتے تھے اس سے وہ باز رہیں جیسے زنا ہے، کیونکہ شہوت اور عورتوں کے جمال میں رغبت کرنے کی خواہش سے زنا کا جوش پیدا ہوتا ہے اور اس کا مزہ پڑ جاتا ہے اور زنا کرنے میں عورت کی اہل کے لئے نہایت درجہ کی عار ہے اور ایک عورت پر کئی آدمیوں کے جمع ہونے سے جبلت انسانیہ کی تغیر ہے اور اس کے سبب سے لوگوں کے درمیان لڑائیوں اور کشت و خون کا اکثر احتمال رہتا ہے اور زنا اکثر زانیہ اور زانی کی رضامندی سے ہوا کرتا ہے اور تنہائی میں اس طور پر ہوتا ہے کہ اس پر بعض لوگ ہی مطلع ہو سکتے ہیں پس اگر اس میں سخت سزا مقرر نہ کی جاتی تو روک ٹوک کیونکر حاصل ہو سکتی تھی اور جیسے چوری ہے اس واسطے کہ انسان بسا اوقات اچھا پیشہ نہیں پاتا ہے پس وہ چوری کی طرف مائل ہو جاتا ہے اور ان کی نفسوں کے اندر اس کی عادت پڑ جاتی ہے اور چوری

بھی خفیہ طور پر اس طرح عمل میں آتی ہے کہ لوگ اس کو نہ دیکھ سکیں بخلاف غصب کے کہ اس میں ایک ایسی دلیل اور شبہ ہوتا ہے جس کو شرع ثابت نہیں کرتی اور وہ باہمی معاملات میں اور لوگوں کے روبرو عمل میں آتا ہے اس واسطے اس کو منجملہ معاملات کے ایک معاملہ شمار کیا گیا، اور جیسے رہزنی ہے اس واسطے کے مظلوم اس کو اپنی جان اور مال سے دور نہیں کر سکتا اور رہزنی مسلمانوں کے ملک اور ان کی حکومت میں نہیں ہو سکتی اور اگر ہو تو وہ اس کی مدافعت کرتے ہیں پس ایسے افعال کی جزا اور سزا زیادہ مقرر کرنا ضروری ہے اور جیسے شراب کا پینا ہے کیونکہ اس کی بھی بڑی حرص ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے ملک میں فساد پھیلتا ہے اور لوگوں کی عقلیں زائل ہوتی ہیں جن کے سبب ان کے معاد اور معاش کی اصلاح ہوتی ہے، اور جیسے کسی کو زنا کی تہمت لگانا ہے اس واسطے کہ جس کو تہمت لگائی جاتی ہے اس کو سخت ایذا ہوتی ہے اور وہ قتل وغیرہ سے اس کی مدافعت بھی نہیں کر سکتا ہے کیونکہ وہ اس کو اگر قتل کرتا ہے تو خود بھی اس کے سبب سے مارا جاتا ہے اور اگر اس کو پیٹتا ہے تو اس کی وجہ سے خود بھی پٹتا ہے اس واسطے ایسے جرم میں کوئی سخت سزا کا ہونا ضروری ہے پھر حد یا تو قتل ہے اور وہ ایسی سزا ہے کہ اس سے زیادہ اور کوئی سزا نہیں اور یا کسی عضو کا کاٹ ڈالنا ہے اور اس میں نہایت درجہ کی تکلیف پہنچانا اور ایسی قوت کا زائل کر دینا ہے کہ جس کے بغیر ساری عمر خود معاش حاصل کرنے کے قابل نہیں رہتا اور بدشکل کرنا اور عار ہے جس کا اثر سب لوگوں کے روبرو دکھائی دیتا ہے جو زائل نہیں ہوتا اس واسطے کہ نفس دو سبب سے متاثر ہوتا ہے جو نفس کہ بہیمیت میں غرق ہوتا ہے اس کو تکلیف دینا بری چیز سے باز رکھتا ہے جیسے بیل اور اونٹ، اور جس نفس میں حب جاہ غالب ہوتی ہے اس کو دائمی عار تکلیف جسمانی سے بھی زیادہ ایک کام سے روک دیتی ہے اس واسطے ان دونوں وجہوں کا حدود کے اندر جمع کرنا ضروری ہوا اور قطع سے کم ایک حد مار پیٹ کے ساتھ تکلیف پہنچانا ہے جس میں عار ہو اور اس کا اثر ظاہر ہو جیسے جلاوطن کرنا اور شہادت کا قبول نہ کرنا اور گوشمالی کرنا۔

اور واضح ہو کہ سابقہ شریعتوں میں قتل کی سزا میں قصاص اور زنا کی سزا میں سنگسار کرنا اور چوری کی سزا میں ہاتھ کاٹنا تھا پس یہ تینوں سزائیں آسمانی شریعتوں میں ہمیشہ سے چلی آتی تھیں اور تمام انبیا اور ان کی امتیں اس پر متفق تھیں اور یہ ایسی چیزیں ہیں جن کو نہایت مضبوطی سے پکڑنا ضروری

ہے اور کبھی ان کو ترک نہیں کرنا چاہئے لیکن شریعت مصطفویہؐ نے اس میں ایک اور قسم کا تصرف کیا ہے پس ہر ایک کی سزا کے دو درجہ مقرر کئے ایک تو بڑی بھاری سزا ہے کہ اس سے بڑھ متصور نہیں اور یہ سزا نہایت بھاری گناہ میں دینی چاہئے اور دوسری سزا اس سے کم ہے اور یہ ان معاصی میں ہونی چاہئے جو پہلے معاصی سے کم درجہ کے ہوں پس قتل کی سزا میں قصاص اور دیت ہے اور اس میں اصل اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے ''اس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے تخفیف ہے''۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل میں قتل کی سزا صرف قصاص تھی اور دیت نہیں تھی اور زنا میں کوڑے مارنا ہے، اور یہودیوں کی جب شوکت جاتی رہی اور وہ سنگسار کرنے پر قادر نہ رہے تو انھوں نے خود ایک سزا کو ایجاد کیا اور وہ یہ کہ زانی اور زانیہ کو گدھے پر چڑھا کر منہ کالا کر کے لوگوں کے سامنے پھراتے تھے پس وہ ان کی شریعت میں تحریف ہوئی پس ہمارے لئے دونوں شریعتوں کو جمع کیا گیا شرائع سماویہ وابتداعیہ کو اور اس میں ہماری طرف اللہ تعالیٰ کی بڑی رحمت ہے اور چوری میں عذاب دینا اور اس سے دو چند تاوان لینا ہے جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے، اور نیز یہ تصرف کیا کہ ظلم کی بہت سی قسموں کو جیسے قذف اور شرب خمر ہے انہی معاصی پر حمل کیا اور ان کے لئے بھی حد مقرر کی کیونکہ یہ بھی بہ منزلہ انہی معاصی کے ہیں اور رہزنی کی سزا زیادہ مقرر کی۔ اور واضح ہو کہ لوگوں کے دو درجے ہیں اور ہر درجہ کی سیاست کا ایک خاص طریقہ ہے ایک لوگوں کا وہ طبقہ ہے جو بذات خود مستقل اور مختار ہیں ان کی سیاست کا یہ طریقہ ہے کہ ان کو پکڑ کر سب کو روبرو سزا دیجائے اور ان کو سخت عار دلائی جائے اور ان کی توہین کی جائے اور ذلیل کیا جائے، اور ایک لوگوں کا وہ طبقہ ہے جو دوسروں کے قبضہ میں بہ منزلہ قیدیوں کے ہیں اور ان کی سیاست کا یہ طریقہ ہے کہ ان کے مالکوں کو حکم کیا جائے کہ بری باتوں سے ان کو محفوظ رکھیں کیونکہ وہی ایسا طریقہ جان سکتے ہیں جو ان کو ان کے فعل سے باز رکھ سکتا ہو چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''تمہاری جب کوئی باندی زنا کرے تو اس کو مارنا چاہئے'' الحدیث، اور آپ نے فرمایا ''جب تمہارا غلام چوری کرے تو اس کو فروخت کر ڈالو اگرچہ نصف قیمت حاصل ہو'' پس یہ دونوں درجے کے لوگ ایک ظاہری وصف سے منضبط کئے گئے پس پہلے درجہ کے لوگ آزاد اور دوسرے درجہ کے لوگ غلام ہیں، پھر بعض سردار ایسے تھے جو اپنے غلاموں پر ظلم کرتے تھے اور اس پر یہ دلیل پیش

کرتے تھے کہ اس نے زنا یا چوری وغیرہ کی ہے اس واسطے ایسے امور میں ضروری ہوا کہ غلاموں کی سزا آزاد لوگوں سے کم مقرر کی جائے تا کہ اس قسم کا احتمال منقطع ہو جائے اور نیز یہ بات بھی ضروری ہوئی کہ ان کو قتل کرنے اور ہاتھ کاٹنے کا اختیار نہ دیا جائے اور اس سے کم سزا کا اختیار ان کو دیا جائے، اور حد دو وجہ سے گناہ کا کفارہ ہوتی ہے کیونکہ گناہ کا مرتکب یا حکم الٰہی کا مطیع اور اس کا فرمانبردار ہو گیا ہے پس اس کے حق میں کفارہ بڑی توبہ ہے اور اس پر دلیل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے کہ آپ نے ماعز بن مالک کے حق میں فرمایا ''اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر تمام امت محمدیہ تقسیم کی جائے تو ان سب کو کافی ہو جائے''۔

اور یا اس حد میں گناہ کے مرتکب کو تکلیف پہنچانا اور اس گناہ سے روکنا مقصود ہوتا ہے اور اس میں راز یہ ہے کہ عمل حکمت الٰہی میں اس بات کا مقتضیٰ ہے کہ اس کی جان یا اس کے مال میں اس عمل کی سزا دی جائے پس حد کا قائم کرنے والا سزا دینے میں اللہ تعالیٰ کا نائب ہو گیا، فتدبر، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''زانیہ اور زانی ان میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو''۔

اور حضرت عمرؓ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حق دے کر بھیجا اور ان پر کتاب نازل فرمائی اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا اس میں آیت رجم بھی تھی چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنگسار کیا اور آپ کے بعد ہم نے بھی سنگسار کیا اور جب کوئی مرد ہو یا عورت نکاح کرنے کے بعد زنا کرے کتاب اللہ میں اس پر رجم کرنا حق ہے۔

میں کہتا ہوں محصن کی حد سنگسار کرنا اور غیر محصن کی حد درّے لگانا اس لئے مقرر کیا گیا کہ مکلّف ہونا جس طرح پندرہ برس کی عمر وغیرہ سے تمام ہوتا ہے اور بغیر اس کے نہ عقل کامل ہوتی ہے اور نہ جثہ پورا ہوتا ہے اور نہ پوری مردمی پائی جاتی ہے پس اسی طرح اس عقوبت کو بھی متفاوت ہونا چاہئے جو کمال عقل اور اس کے مرد کامل ہونے اور خود مختاری اور استقلال سمجھ کی وجہ سے مکلّف ہونے پر مرتب ہوتی ہے اور اس لئے کہ محصن کامل ہے اور غیر محصن ناقص ہے پس غیر محصن احرار کاملین اور غلاموں کے مابین واسطہ ہوا اور صرف سنگسار ہونے میں اس واسطہ کا اعتبار کیا گیا کیونکہ وہ سزاؤں میں سب سے زیادہ سخت سزا ہے جو حق اللہ میں مشروع ہوئی ہے اور قصاص چونکہ حق العباد میں سے ہے اور لوگوں کو اپنے حقوق کے لینے کی حاجت ہے اس واسطے ان کے حقوق ضائع

نہیں کیئے جاتے اور حد سرقہ وغیرہ بہ منزلہ سنگساری کے نہیں ہے اور نیز اس شخص سے گناہ کا صادر ہونا جس پر اللہ تعالیٰ نے انعام کیا ہے اور اس کو اپنی بہت سی مخلوق پر فضیلت دی ہے از حد برا ہے کیونکہ وہ نہایت درجہ کی نافرمانی ہے پس اس میں سزا کا بڑھانا مناسب ہوا اور کنوارے اور کنواری کی حد سو درے اس لئے مقرر کیئے گئے کہ سو کا عدد کثیر اور منضبط ہے جس سے زجر اور تکلیف بخوبی حاصل ہو سکتی ہے اور جلا وطنی کی سزا اس لئے دی گئی کہ سزا دو طرح پر موثر ہوتی ہے ایک تو بدن کو تکلیف پہنچانا اور ایک حیا و شرمندگی اور عار کا لاحق کرنا اور محبوب چیز کا علیحدہ کرنا، پہلی سزا جسمانی ہے اور دوسری سزا نفسانی ہے اور پوری پوری سزا وہی ہوتی ہے جس میں یہ دونوں جمع کی جائیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''جب احصان کے بعد ان سے فحش ظاہر ہو تو ان کو محصنات سے نصف عذاب دیا جائے گا''۔

میں کہتا ہوں غلاموں پر نصف سزا مقرر کرنے کی یہ وجہ ہے کہ غلاموں کا حکم ان کے مالکوں کے سپرد کیا جاتا ہے پس اگر ان کے لئے کامل درجہ کی سزا مقرر کی جائے تو اس سے ظلم کا دروازہ کھلتا ہے اس طور پر کہ مالک اپنے غلام کو قتل کر ڈالے اور یہ کہہ دے کہ یہ زانی تھا اور پھر مالک سے مواخذہ کرنے کی کوئی سبیل نہ رہے پس ان کی حد کم کی گئی اور اتنی مقرر کی گئی جس سے ہلاکت کی نوبت نہیں آتی اور محصن اور غیر محصن کا فرق جو ہم نے بیان کیا ہے وہ یہاں بھی پایا جاتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''مجھ سے سیکھو مجھ سے سیکھو، اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے لئے ایک راہ نکالی ہے کنوارہ کنواری کے ساتھ زنا کرے تو اس کی سزا سو درے ہیں اور سال بھر کے لئے جلا وطن کرنا ہے، اور شادی شدہ مرد شادی شدہ عورت کے ساتھ زنا کرے تو اس کی سزا سو دورے مارنا اور سنگسار کرنا ہے'' اور اس حدیث پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عمل کیا ہے۔

میں کہتا ہوں یہ حدیث لوگوں پر مشتبہ ہو گئی اور اس حدیث کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے شادی شدہ کو سنگسار کرنے اور اس کے درے نہ لگانے کے ساتھ مخالف سمجھا اور میرے نزدیک یہ حدیث آپ کے فعل کے مخالف نہیں ہے اور آیت عام ہے لیکن جب دونوں یعنی رجم اور سو درے مارنا واجب ہوں تو امام کو رجم پر اقتصار کرنا مسنون ہے اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے سفر میں قصر کرنا پس اگر کوئی شخص پوری نماز پڑھے تو بھی جائز ہے مگر قصر کرنا سنت ہے اور یہ اس واسطے مقرر کیا گیا

کہ رجم بڑی سخت سزا ہے اور اس سے جو کم سزا ہے وہ اس میں آجاتی ہے اور اس بیان میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول میں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عمل میں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل میں اور آپ کے اکثر خلفا کے عمل میں تطبیق ہو سکتی ہے کہ انھوں نے رجم پر اکتفا کیا ہے اور حضرت جابرؓ کی حدیث کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے درے لگانے کا حکم دیا پھر کسی نے آپ کو بتلایا کہ وہ محصن ہے تو آپ نے اس کو سنگسار کرنے کا حکم دیا پس اس کو سنگسار کر دیا گیا، اسی بات پر دلالت کرتی ہے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے درے لگانے کا حکم دینے پر اقدام جب ہی کیا جبکہ آپ ہر زانی کے لئے یہی سزا سمجھتے تھے، اور میرے نزدیک جلاوطن کرنے میں معافی کا احتمال ہے جبکہ ماعز بن مالکؓ نے کہا کہ میں نے زنا کیا ہے مجھ کو پاک کر دیجئے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا شاید تو نے بوسہ لیا ہوگا یا ہاتھ سے اس کو پکڑا ہوگا یا اس کی طرف دیکھا ہوگا تو ماعزؓ نے عرض کیا نہیں یا رسول اللہ، تب آپ نے پوچھا کیا تو نے اس کے ساتھ دخول کیا ہے؟ تو ماعزؓ نے جواب دیا ہاں، پس اس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ماعز کو سنگسار کرنے کا حکم دیا۔

میں کہتا ہوں حد مارنے میں احتیاط کا مقام ہے، اور کبھی زنا کا اطلاق شرمگاہ کے سوا پر بھی ہوتا ہے جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''زبان کا زنا یہ ہے اور پاؤں کا زنا یہ ہے'' اس واسطے ایسی صورت میں اس کا ثابت کرنا اور اس کی تحقیق کرنا ضروری ہوا۔

اور واضح ہو کہ جو شخص خود زنا کا اقرار کرتا ہے اور حد قائم کرنے کے لئے اپنے نفس کو سپرد کرتا ہے تو وہ توبہ کرنے والا ہے اور توبہ کرنے والا بہ منزلہ اس شخص کے ہے جس نے گناہ نہیں کیا پس ایسے شخص کو حد نہیں مارنا چاہئے لیکن یہاں اس پر حد قائم کرنے کے لئے کئی اسباب مقتضی ہیں۔

اور از آں جملہ یہ ہے کہ اگر اظہار توبہ اور اس کے اقرار سے حد ساقط ہو جاتی تو ہر زنا کرنے والا امام کے مواخذہ کی خبر پا کر امام کے روبرو اقرار کر کے حیلہ کرتا اور حد سے چھوٹ جاتا اور اس میں مصلحت کی مخالفت ہے از اں جملہ یہ ہے کہ توبہ بغیر ایسے سخت فعل کے تمام نہیں ہوتی جس فعل سے توبہ کو قوت پہنچے اور جو مخلص کے سوا کسی سے عمل میں نہ آسکے اور اسی واسطے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ماعزؓ کے بارے میں جبکہ وہ رجم کے لئے آمادہ ہوئے تھے یہ فرمایا تھا ''البتہ اس نے ایسی توبہ کی کہ اگر محمد کی امت پر تقسیم کی جائے تو ان کو کافی ہوتی'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ غامد کی

عورت کی نسبت فرمایا ''اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر تاجروں سے بظلم محصول لینے والا بھی یہ توبہ کرتا تو بخشا جاتا'' لیکن اس کے باوجود گناہ کا چھپانا مناسب ہے چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہزال (۱) سے فرمایا تھا ''اگر تو اس کو اپنے کپڑے کے ساتھ چھپاتا تو تیرے لئے بہتر ہوتا'' اور نیز یہ بات مناسب ہے کہ اس کو فیما بینہ وبین اللہ توبہ کرنے کا اور حد کے دفع کرنے کے لئے حیلہ کرنے کا حکم دیا جائے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''تم میں سے جب کسی کی باندی زنا کرے اور اس کا زنا ظاہر ہو جائے تو وہ باندی پر حد میں درے مارے اور توبیخ نہ کرے پھر اگر وہ زنا کرے تو پھر اس پر درے مارے اور توبیخ نہ کرے''۔

میں کہتا ہوں اس میں راز یہ ہے کہ انسان کو شرعاً اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے حرم سے معاصی کو دور کرے اور یہ بات انسان کی سرشت میں داخل ہے اور اگر امام ہی کے سامنے حد مقرر ہوتی تو بہت سی صورتوں میں مالک حد کو قائم نہ کر سکتا اور اہل وحرم کی حفاظت نہ ہو سکتی اور اگر حد کی کوئی مقدار مقرر نہ ہوتی تو زیادتی کرنے والا ہلاکت کی حد تک پہنچا سکتا تھا یا حد سے زیادہ تکلیف دے سکتا تھا پس اسی واسطے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''توبیخ نہ کرے''۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''ذی عزت لوگوں سے حدود کے سوا اور لغزشوں کو معاف کرو''۔

میں کہتا ہوں ذی عزت لوگوں سے مراد اہل مروت ہیں یا تو اس طور سے کہ کوئی شخص متقی دیندار ہو جس سے خلاف عادت کسی امر میں کوتاہی ہو جائے پھر وہ اس پر نادم ہو تو ایسے شخص سے درگزر کرنا چاہیئے یا وہ شخص لوگوں میں خاندانی معزز اور سردار ہو پس اگر ہر چھوٹے بڑے گناہ میں اس کو سزا دی جائے تو اس میں امام سے عداوت اور اختلاف اور اس سے بغاوت کا دروازہ کھولنا ہے کیونکہ نفوس اکثر ان باتوں کے متحمل نہیں ہوتے لیکن حدود سو یہ مناسبت نہیں ہے کہ ان کو ترک کر دیا جائے بجز اس صورت کے کہ کوئی سبب شرعی جس سے حد ساقط ہوتی ہے پایا جائے کیونکہ اگر حدود کو چھوڑ دیا جائے تو وہ مصلحت کے خلاف ہے اور حدود کا فائدہ فوت ہوتا ہے۔

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کے بارے میں جو پیدائشی کمزور ہو اور زنا کرے فرمایا

---

(۱) یہ وہ شخص ہے جس کی باندی سے ماعز نے زنا کیا تھا اور جس نے ماعز کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو زنا کے اظہار پر آمادہ کیا تھا۔

ہے ''اس کے لئے ایک بڑی ڈالی لو جس میں سو شاخیں ہوں پس اس سے اس کو ایک بار مارو''۔

اور واضح ہو کہ جو شخص اپنی پیدائشی کمزوری کی وجہ سے اتنی طاقت نہیں رکھتا کہ اس پر حد قائم کی جائے پس اگر اس شخص کو بالکل چھوڑ دیا جائے تو یہ حدود کے استحکام کے خلاف ہوتا ہے کیونکہ شرائع لازمی جن کو اللہ تعالیٰ نے بہ منزلہ خلقی امور کے مقرر کیا ہے ان کی شان سے یہ بات ہے کہ وہ موثر بالخاصیت کی طرح سمجھی جائیں اور لوگ نہایت مضبوطی سے ان کو تسلیم کریں اور نیز جس چیز میں تھوڑی سی تکلیف اور آسانی ہے اس کے چھوڑنے کی ضرورت نہیں ہے، لواطت کی حد میں اختلاف ہے پس بعض نے کہا کہ وہ زنا کی قسم ہے اور بعض نے کہا کہ اس کو قتل کیا جائے گا اس لئے کہ حدیث شریف میں آیا ہے ''جس کسی کو تم قوم لوط کا کام کرتے پاؤ تو فاعل اور مفعول دونوں کو قتل کردو'' اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''اور جو لوگ پرہیزگار عورتوں کو بدکاری کا الزام لگائیں اور اس پر چار گواہ نہ لائیں تو ان کو اسی درے مارو اور کبھی ان کی شہادت قبول نہ کرو اور یہی بدکار ہیں ہاں جو اس کے بعد توبہ کرلیں اور اپنی حالت سنوار لیں تو خدا بھی بخشنے والا اور مہربان ہے'' اور اس پر اجماع ہے کہ محصن مرد محصن عورتوں کے حکم میں ہیں، اور محصن اس کو کہتے ہیں کہ جو حر ہو اور مکلّف اور مسلمان ہو اور ایسے جماع سے پاک ہو جس پر حد قائم کی جاتی ہے۔

واضح ہو کہ یہاں دو باتیں متعارض پائی جاتی ہیں اور وہ یہ ہے کہ زنا گناہ کبیرہ ہے اس کا مٹانا اور اس پر حد قائم کرنا اور اسی پر مواخذہ کرنا ضروری ہے اور اسی طرح زنا کی تہمت لگانا بھی بڑا گناہ ہے اور اس میں ایک بڑی عار کا لاحق کرنا ہوتا ہے جس پر حد کا قائم کرنا ضروری ہے اور زنا کی تہمت لگانے کو زنا پر شہادت دینے کے ساتھ مشابہت ہے پس اگر ہم کسی قاذف کو حد مارنے کے لئے گرفتار کریں تو وہ کہہ سکتا ہے کہ میں زنا کا گواہ ہوں اور اس میں حد قذف باطل ہوتی ہے اور جو زنا پر گواہ ہے مشہود علیہ یہ کہہ کر اپنے آپ کو بچا سکتا ہے کہ وہ زنا کی تہمت لگاتا ہے اور وہ خود حد کا مستحق ہے، پس جب سیاست امت کے وقت اس امر میں ان دونوں حدوں میں تعارض ہوا تو ایک ظاہری امر سے ان دونوں میں تمیز ضروری ہوئی اور وہ امر خبر دینے والوں کی کثرت ہے کیونکہ جب خبر دینے والے کثیر تعداد میں ہوئے تو گواہی اور راست گوئی کا گمان قوی ہوا اور تہمت کا گمان ضعیف ہو گیا اس واسطے کہ تہمت میں دو باتوں کا اجتماع ہوتا ہے ایک دین کے اندر ضعف اور

دوسرے مقذوف کے ساتھ عداوت کا ہونا اوران دونوں صفتوں کا مسلمانوں کی جماعت میں جمع ہونا بعید ہے اور شاہدین کی عدالت کے ساتھ اکتفا نہیں کیا گیا کیونکہ عدالت تمام حقوق میں معتبر ہے پس اس تعارض کا کوئی اثر ظاہر نہ ہوگا اور اس کثرت کا نصاب شہادت کی دو چند تعداد کے ساتھ کیا گیا ہے اور حد قذف اسی درے اس لئے مقرر کئے گئے کہ اس کی معصیت بہرحال زنا سے کم ہے کیونکہ ایک گناہ کا مشہور کرنا اس کو عمل میں لانے کے برابر نہیں ہے اور اس کمی کو ایک مقدار ظاہر سے منضبط کیا گیا اور وہ بیس کا عدد ہے کیونکہ وہ عدد سو کا پانچواں حصہ ہے اور اس حد کا تتمہ گواہی قبول نہ کرنا اس لئے مقرر کیا گیا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ تکلیف کی دو قسمیں ہیں ایک جسمانی اور دوسری نفسانی اور شریعت نے تمام حدود میں ان دونوں کا اعتبار کیا ہے لیکن حد زنا میں جلاوطنی کو شامل کیا گیا کیونکہ حکام کی سیاست اور اولیا کی غیرت کے وقت میں زنا اسی وقت متصور ہوسکتا ہے کہ ان دونوں میں باہم میل جول اور اتحاد اور الفت ہو پس اس کے مناسب یہی سزا ہے کہ اس فتنہ کے مقام سے زانی کو نکال دیا جائے۔

اور حد قذف میں عدم قبول شہادت کو شامل کیا گیا کیونکہ قذف میں خبر دینا ہوتا ہے اور شہادت میں بھی خبر دینا ہوتا ہے پس قاذف کو اسی عار کے ساتھ سزا دی گئی جو اس کی معصیت کی جنس سے ہے کیونکہ قاذف سے شہادت کا قبول نہ کرنا اس کے لئے ایک سزا ہے اور دوسرے گنہگاروں کی شہادت کا قبول نہ کرنا عدالت اور رضا کے فوت ہونے کے سبب سے ہے، اور نیز ہم ذکر کر چکے ہیں کہ قاذف یہ کہہ سکتا ہے کہ میں شہادت دینے والا ہوں پس اس باب کا بند کرنا اس طرح ہوسکتا ہے کہ جس چیز سے اس نے حجت کی تھی اسی چیز سے اس کو سزا دی جائے اور حد خمر میں توبیخ بھی شامل ہے اور اللہ تعالیٰ کے قول ''الا الذین'' میں اختلاف ہے کہ استثنا عدم قبول شہادت کی طرف راجع ہے یا نہیں، اور جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جب فسق کی انتہا ہو جائے تو اس کا اثر اور اس کی سزا بھی ختم ہو جانی چاہئے اور خلفا نے غلاموں پر حد زنا کے لئے سزا کے نصف کرنے میں اس کا اعتبار کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''چرانے والا اور چرانے والی کا ہاتھ کاٹ دو یہی جزا ہے ان کے کئے کی عذاب خدا تعالیٰ کی طرف سے اور اللہ تعالیٰ غالب اور حکمت والا ہے''۔

واضح ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس چیز کے بیان کرنے کے لئے مبعوث ہوئے تھے جو کچھ کہ آپ پر نازل ہوا جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''تا کہ آپ اس کو لوگوں کے لئے بیان کریں'' اور غیر کا مال لینے کی چند صورتیں ہیں ازاں جملہ چوری ہے اور رہزنی ہے اور اچکنا ہے اور خیانت کرنا ہے اور کسی کی پڑی ہوئی چیز کا اٹھالینا ہے اور غصب کرنا ہے اور ایک وہ ہے جس کو لا پرواہی اور بے احتیاطی کہتے ہیں پس ضرور ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم چوری کی حقیقت اس طرح بیان فرمادیں کہ وہ ان سب امور سے ممتاز ہو جائے، اور تمیز کا طریقہ یہ ہے کہ ان تمام چیزوں کی ان ذاتیات کی طرف نظر کی جائے جو چوری میں نہیں پائی جاتیں اور لوگوں کے عرف میں ان کی وجہ سے فرق واقع ہوتا ہے، پھر چوری کو چند امور مضبوط معلومہ سے منضبط کیا جائے جن کے سبب سے اس کو یہ سب سے تمیز ہو جائے پس رہزنی اور غارت گری اور جنگ جوئی ایسے امور ہیں جو بہ نسبت مظلوم کے ظالم کو اپنی قوت پر اعتماد اور ایسے مکان یا زمانہ کے اختیار کرنے کی خبر دیتے ہیں جہاں مسلمانوں کی جماعت سے فریاد اور ان کی مدد نہیں پہنچ سکتی اور اچک لینا لوگوں کے روبرو اور ان کے دیکھتے اور سنتے کسی چیز کے لے جانے کی خبر دیتا ہے اور خیانت میں پہلے سے کوئی شرکت یا معاملہ اور اس میں تصرف کا اذن وغیرہ پایا جاتا ہے اور گری پڑی چیز کے اٹھالینے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی کی حفاظت میں نہ تھی، اور غصب میں مظلوم پر ظالم کا ایسا غلبہ معلوم ہوتا ہے جو بھاگنے یا لڑنے پر موقوف نہیں ہوتا لیکن زبان زوری اور اس بات کے گمان پر اس کا مدار ہوتا ہے کہ یہ مقدمہ حکام تک نہیں پہنچے گا اور نہ ان پر حال منکشف ہوگا اور لا پرواہی اور بے احتیاطی کا اطلاق ان ادنیٰ ادنیٰ چیزوں میں ہوتا ہے جن کے صرف کرنے اور ان کے ساتھ باہمی معاونت کرنے کا لوگوں میں دستور جاری ہے جیسے پانی اور ایندھن، پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب کی ذاتیات سے امتیاز کا انضباط فرمایا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''چور کا ہاتھ نہ کاٹا جائے مگر ربع دینار میں'' اور ایک روایت میں ہے ''جس چیز کی قیمت ڈھال کی قیمت کے برابر ہو اس کو چرانے سے چور کا ہاتھ کاٹا جائے'' اور مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ڈھال کی چوری میں جس کی قیمت تین درہم تھی چور کا ہاتھ قطع کیا، اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک اترج کی چوری میں جس کی

قیمت تین درہم تھی ہاتھ قطع کر دیا تھا۔

اور حاصل یہ ہے کہ یہ تینوں مقداریں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک ہی چیز پر منطبق تھیں پھر آپ کے بعد اختلاف ہوا اور ڈھال کی قیمت چونکہ منضبط نہیں ہے اس لئے وہ قابل اعتبار نہیں، پس باقی دونوں حدیثوں میں امت مسلمہ کا اختلاف ہوا بعض ربع دینار کے قائل اور بعض تین درہم کے اور بعض نے کہا کہ ان دونوں مقداروں میں سے کسی مقدار تک مال پہنچ جائے اور میرے نزدیک یہی زیادہ ظاہر ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ادنیٰ واعلیٰ چیز میں فرق کرنے کے لئے اس مقدار کو مقرر فرمایا کیونکہ کوئی خاص جنس اس اندازہ کی صلاحیت نہیں رکھتی کیونکہ مختلف شہروں میں ایک چیز کا نرخ مختلف رہتا ہے اور نیز شہروں کے اختلاف کے لحاظ سے نفاست اور خساست میں چیزیں مختلف ہوتی ہیں پس جو چیز ایک قوم کے نزدیک مباح وادنی چیز ہوتی ہے وہی دوسری قوم کے نزدیک ایک قابل قدر مال ہوتا ہے پس اندازہ کا اعتبار کرنا قیمت کے اندر ضروری ہوا اور بعض نے کہا دونوں کے اندر اندازہ کا اعتبار کرنا چاہئے۔

اور لکڑی میں چور کا ہاتھ نہیں کاٹا جاتا اگرچہ اس کی قیمت دس درہم ہو، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''لٹکے ہوئے پھل میں قطع نہیں ہے اور نہ ان مویشی میں جو پہاڑ کے اندر رہتے ہیں، پس جب مویشی باڑ میں آجائیں اور پھلوں کا ڈھیر لگا دیا جائے تو ان میں قطع ہے جبکہ ان کی قیمت ڈھال کی قیمت کے برابر ہو، اور کسی شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے لٹکے ہوئے پھلوں کے متعلق پوچھا تو آپ نے فرمایا ''جس نے ڈھیر لگ جانے کے بعد اس میں سے کچھ چرایا تو اس میں قطع ید ہے جبکہ اس کی قیمت ڈھال کی قیمت کے برابر ہو''۔

میں کہتا ہوں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو سمجھا دیا کہ حفاظت قطع ید میں شرط ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ جو چیز غیر محفوظ ہے اس کے لینے کو اٹھالینا کہتے ہیں (چوری نہیں کہتے) پس اس سے بچنا بھی ضروری ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''خائن پر اور لوٹنے والے پر اور اچکنے والے پر قطع ید نہیں ہے''۔

میں کہتا ہوں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو سمجھا دیا کہ چوری کے اندر مال کا پوشیدہ طور پر لینا شرط ہے ورنہ اس کو لوٹ لینا یا اچک لینا کہا جائے گا اور نیز یہ شرط ہے کہ پہلے سے اس میں

شرکت اور کسی کا حق نہ ہو ورنہ اس لینے کو خیانت یا استیفا حق کہا جائے گا۔

اور اس غلام کے بارے میں جو اپنے مالک کا مال چوری کرے احادیث میں یہ آیا ہے کہ وہ تیرا ہی مال ہے جو بعض بعض کے اندر مخلوط ہو گیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چور کے متعلق فرمایا ''اس کا ہاتھ کاٹ دو پھر اس کو تیل میں داغ دیدو''۔

میں کہتا ہوں داغ دینے کا حکم اس لئے ہے کہ قطع سرایت نہ کرے اور وہ ہلاک نہ ہو کیونکہ داغ دینے سے زخم سرایت نہیں کرتا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا کہ چور کا ہاتھ کاٹ کر اس کی گردن میں لٹکا دیا جائے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

میں کہتا ہوں یہ شہرت دینے کے لئے کیا گیا تا کہ لوگ اس کا چور چور ہونا معلوم کر لیں اور اس بات میں فرق ہو جائے کہ اس کا ہاتھ ظلم سے نہیں کاٹا گیا بلکہ حد میں کاٹا گیا ہے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس چوری میں جو نصاب سے کم ہو فرمایا کہ ''اس کو تکلیف دی جائے اور دو چند تاوان لیا جائے''۔

میں کہتا ہوں آپ نے دو چند تاوان لینے کا حکم اس لئے فرمایا کہ چور کو اس کے اس فعل سے باز رکھنا اور اس کو مالی اور بدنی سزا دینا ضروری ہے اس واسطے کہ انسان بسا اوقات جسمانی تکلیف کی بہ نسبت مالی تکلیف کی وجہ سے زیادہ تر باز رہتا ہے اور بسا اوقات اس کے برعکس ہوتا ہے اس واسطے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں تکلیفوں کو جمع کر دیا پھر مال مسروقہ کے برابر تاوان کا حکم کرنا ایسا ہے گویا اس نے چوری ہی نہیں کی اور نہ اس میں کچھ سزا ہے اس وجہ سے دوسرا تاوان اور زیادہ کر دیا گیا تا کہ وہ تاوان آئندہ چوری کا قصد کرنے سے اس کو باز رکھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک چور گرفتار ہو کر آیا جس نے چوری کا اقرار کیا لیکن اس کے پاس مال برآمد نہیں ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا میرے خیال میں تو نے چوری نہیں کی۔ اس نے کہا ہاں چوری کی ہے تو آپ نے دو مرتبہ یا تین مرتبہ اس کے سامنے اسی کلام کا اعادہ فرمایا تب آپ نے اس کا ہاتھ کاٹ دینے کا حکم فرمایا اور ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک مجرم کو لایا گیا تو آپ نے اس سے فرمایا تو کہہ کہ میں خدا تعالیٰ سے مغفرت چاہتا ہوں اور اس کی طرف توبہ کرتا ہوں، اس نے کہا میں خدا سے مغفرت چاہتا ہوں اور اس کی طرف توبہ کرتا ہوں، آپ نے

تین مرتبہ فرمایا اے اللہ تعالیٰ تو اس کی توبہ قبول کر۔

میں کہتا ہوں اس کا سبب یہ ہے کہ جب گنہگار اپنے گناہ کا اقرار کرتا ہے اور اس پر نادم ہوتا ہے تو مناسب ہے کہ کسی حیلہ سے حد اس سے دور کر دی جائے اور ہم اس کا حال پہلے بیان کر چکے ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: انما جزاء الذین یحاربون اللہ ورسولہ'' الآیہ: میں کہتا ہوں محاربہ کرنا بغیر جماعت مظلومہ کے جنگ گئے واقع نہیں ہوتا اور چوری کی حد سے اس حد کو زیادہ مقرر کرنے کا سبب یہ ہے کہ بنی آدم کے اجتماع میں کچھ ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کے نفوس خصلت سبعیہ کے غلبہ سے خالی نہیں ہوتے اور ان لوگوں میں سخت جرأت اور قتال اور اجتماع کا مادہ ہوتا ہے پس وہ قتل کرنے اور لوٹنے میں کچھ پرواہ نہیں کرتے اور اس کا فساد چوری کے فساد سے زیادہ ہے کیونکہ لوگ چوروں سے مال محفوظ رکھ سکتے ہیں لیکن مسافر لوگ رہزنوں سے نہیں بچ سکتے اور حکام لوگ اور جماعت مسلمین اس جگہ اور اس وقت میں ان کی مدد بہ سہولت نہیں کر سکتے اور نیز رہزنوں کا ارادہ جو اس فعل پر آمادہ کرتا ہے زیادہ تر سخت اور مضبوط ہوتا ہے کیونکہ رہزن وہی شخص ہوتا ہے جو بڑا دلیر اور قوی الجثہ شخص ہو اور ان میں باہم اجتماع اور اتفاق بھی ہوتا ہے بخلاف چوروں کے اس واسطے ضروری ہے کہ رہزنی کی سزا چوری کی سزا سے زیادہ سخت مقرر کی جائے اور اکثر علما اس پر متفق ہیں کہ سزا آیت کی ترتیب کے موافق ہے اور وہ قول نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کے موافق ہے کہ ''مومن بغیر ان تین میں سے کسی ایک کے قتل نہ کیا جائے'' الحدیث۔

اور بعض علما کہتے ہیں کہ امام کو سزا میں اختیار ہے اور یہ قول لفظ 'او' کے موافق ہے اور میرے نزدیک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ''جماعت سے باہر ہونے والا'' اس بات کا احتمال رکھتا ہے کہ آپ نے اس میں دو علتوں کو جمع کیا ہے اور مراد یہ ہے کہ ان دونوں علتوں میں سے ہر علت مفید حکم ہے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں دو علتوں کو جمع کیا ہے پس آپ نے فرمایا ''دو شخص پاخانہ کے لئے اس حالت میں باہر نہ جائیں کہ اپنا ستر کھولے ہوئے ہوں باتیں کرتے ہوں'' پس برہنہ ہونا لعنت کا سبب ہے اور ایسی حالت میں باتیں کرنا بھی لعنت کا سبب ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''اے ایمان والو! شراب اور جوا اور بت اور تیر یہ سب ناپاک چیزیں

ہیں شیطان کے اعمال سے ہیں پس ان سے پرہیز کرو تا کہ نجات پاؤ، شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوا کے سبب تمہارے آپس میں دشمنی اور رنجش ڈلوادے اور تم کو خدا کی یاد سے اور نماز سے روک دے پس کیا تم باز رہنے والے ہو''۔

میں کہتا ہوں اللہ تعالیٰ نے اس بات کو بیان فرمادیا کہ شراب کے اندر دو قسم کی برائی ہے ایک تو لوگوں کے لئے برائی ہے کہ شراب کا پینے والا لوگوں سے لڑتا جھگڑتا ہے اور ان کو ستاتا ہے۔

اور ایک برائی کا انجام اس کی تہذیب نفس کی طرف رجوع کرنا ہے کیونکہ شراب کا پینے والا حالت بہیمیت میں غرق ہوجاتا ہے اور اس کی وہ عقل جس پر نیکی کا مدار ہے زائل ہوجاتی ہے اور چونکہ تھوڑی شراب پینے سے زیادہ شراب پینے کی خواہش ہوتی ہے اس واسطے سیاست امت کے لحاظ سے ضرور ہوا کہ تحریم کا مدار اس کے نشہ آور ہونے پر کیا جائے اور فی الحال نشہ کے موجود ہونے پر نہ کیا جائے پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا کہ شراب کی حقیقت کیا ہے، پس آپ نے فرمایا ''ہر نشہ آور چیز شراب ہے اور ہر نشہ آور چیز حرام ہے'' اور آپ نے فرمایا ''شراب ان درختوں سے ہوتی ہے چھوارہ اور انگور'' اور ان دونوں درختوں کو خاص طور پر اس لئے ذکر کیا کہ اس زمانہ میں عرب انہیں سے شراب بناتے تھے اور کسی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مزر (۱) اور بتع کی بابت دریافت کیا تو آپ نے فرمایا ''ہر نشہ آور چیز حرام ہے'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس کے زیادہ استعمال کرنے سے نشہ ہو وہ تھوڑی سی بھی حرام ہے''۔

میں کہتا ہوں یہ سب احادیث مستفیضہ ہیں اور میں اس بات کو نہیں جانتا کہ انگوری شراب اور غیر انگوری شراب میں کوئی فرق ہے کیونکہ شراب کی حرمت صرف ان خرابیوں کی وجہ سے نازل ہوئی جن کی قرآن میں تصریح ہے اور وہ سب خرابیاں انگوری وغیر انگوری سب قسم کی شرابوں میں ایک برابر پائی جاتی ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس نے دنیا میں شراب پی اور اس کا عادی ہوا اور بغیر توبہ کئے مر گیا تو وہ آخرت میں شراب نہیں پیئے گا'' (۲)۔

میں کہتا ہوں اس کا سبب یہ ہے کہ حالت بہیمیت میں غرق ہونے والے اور صفت احسان

---

(۱) مزر اہل یمن کی شراب ہے جو جوار سے بنتی ہے اور بتع ان کی وہ شراب ہے جو نبیذ عسل سے تیار کی جاتی ہے۔

(۲) شراب طہور

سے پشت پھیرنے والے کے لئے جنت کی لذائذ میں کوئی حصہ نہیں ہے پس شراب کے پینے کو اور اس کے عادی ہونے کو اور اس سے تائب نہ ہونے کو حالت بہیمیت میں غرق ہونے کا قوی سبب قرار دے کر اس پر حکم وائر کر دیا گیا اور جنت کے لذائذ میں سے شراب کو مخصوص کیا گیا تاکہ ظاہر میں دونوں لذتوں کا فرق معلوم ہو جائے۔

اور نیز جب کسی فعل کے ضمن میں نفس لذت بہیمیہ میں منہمک ہو جاتا ہے تو اس کو وہ فعل اس لذت کی صورت میں نظر آتا ہے جس کے یاد کرنے سے لذت یاد آجاتی ہے پس وہ شخص اس بات کا مستحق نہیں ہے کہ احسان کی لذت اس کی صورت میں ظاہر ہو اور نیز فعل کی سزا اس کی مناسبت سے ہوتی ہے پس جس شخص نے ایک چیز پر اقدام کیا ہے اس کی سزا یہ ہے کہ اس کی خواہش اور شوق کے وقت اس لذت کے معدوم کرنے سے اس کو تکلیف دی جائے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اللہ تعالیٰ نے اس بات کا عہد کیا ہے کہ جو شخص نشہ آور چیز پیئے گا اس کو اللہ تعالیٰ طینۃ الخبال پلائے گا اور طینۃ الخبال دوزخیوں کا خون اور پیپ ہے''۔

میں کہتا ہوں اس میں راز یہ ہے کہ پیپ اور خون سیال چیزوں میں ہمارے نزدیک نہایت قبیح اور طبائع سلیمہ کے اعتبار سے نہایت حقیر اور نہایت قابل نفرت شے ہیں اور شراب بھی ایک سیال چیز ہے پس مناسب ہوا کہ سزا طینۃ الخبال کی صورت میں مکروہ حالت کے ساتھ متمثل ہو اور یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ علما نے منکر ونکیر کے باب میں فرمایا ہے کہ وہ نیلگوں آنکھوں میں ظاہر ہوتے ہیں کیونکہ عرب نیلگوں آنکھ ناپسند کرتے ہیں اور ہم بیان کر چکے ہیں کہ اس امر میں بعض خارجی حوادث بہ منزلہ خواب کے ہوتے ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص نے شراب پی اللہ تعالیٰ اس کی چالیس روز کی نماز قبول نہیں کرے گا پس اگر وہ توبہ کر لے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کر لے گا''۔

میں کہتا ہوں اس کی نماز قبول نہ ہونے میں یہ راز ہے کہ صفت بہیمیت کا ظاہر ہونا اور کسی گناہ پر اقدام کرنے کی وجہ سے صفت ملکیت پر اس کو غالب کرنا اللہ تعالیٰ پر جرأت کرنا اور اپنے نفس کو ایسی رذیل حالت میں غرق کرنا ہے جو احسان کے منافی اور اس کے مخالف ہے اور اس بات کا سبب ہے کہ نماز سے جو اس کے نفس میں احسان کا نفع ہوتا تھا اور اس کا نفس حالت احسان کا

تابع ہوتا تھا وہ اس کے حق میں معدوم ہو جائے اور جب کوئی شراب پینے والا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیا جاتا تھا تو آپ اس کو مارنے کا حکم فرماتے تھے پس لوگ اس کو جوتوں سے اور چادر کے کوڑوں سے اور ہاتھ سے مارتے تھے یہاں تک کہ چالیس ضربہ اس کو لگتے تھے پھر آپ فرماتے تھے کہ اس کو ڈانٹ بتاؤ تو لوگ اس کی طرف متوجہ ہوتے تھے اور کہتے تھے تو نے اللہ تعالیٰ کا خوف نہیں کیا تو اللہ سے نڈر ہو گیا تو نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ حیا نہ کی اور یہ بھی مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے زمین سے مٹی اٹھا کر اس کے منہ پر پھینک دی۔

میں کہتا ہوں بہ نسبت اور حدود کے اس حد کے کم ہونے میں یہ راز ہے کہ اور معاصی میں ان کے ارتکاب کے ساتھ ہی فساد موجود ہو جاتا ہے مثلاً کسی کا مال چرانا یا رہزنی کرنا یا زنا کرنا یا زنا کی تہمت لگانا، لیکن شراب پینا اس میں فساد کا احتمال ہے اور فوراً فساد موجود نہیں ہوتا اس واسطے سے کم شراب کی حد مقرر کی گئی، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم چالیس درے اس واسطے لگواتے تھے کہ اس میں قذف کا احتمال ہے اور جو کسی چیز کا مظنہ ہوتا ہے اس کا اصل شئے سے نصف کے برابر کم ہونا مناسب ہے پھر جب فساد زیادہ پھیل گیا تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے اسی درے شراب کی حد مقرر کی یا تو اس واسطے کہ کتاب الٰہی میں جس قدر حدود مذکور ہیں اسی کی مقدار ان سب میں ادنیٰ درجہ کی ہے پس جس حد کی قرآن میں تصریح نہیں ہے وہ کمتر حد سے زیادہ نہیں ہونی چاہئے، یا اس واسطے کہ شراب پینے والا اکثر دوسروں کو زنا کی تہمت لگاتا ہے اگرچہ خود اس نے زنا یا قتل نہیں کیا ہے اور جو چیز غالب ہے اس کا حکم یقینی چیز کا حکم ہوتا ہے اور توبیخ کرنے کی حکمت ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''تم سے پیشتر لوگ اسی واسطے ہلاک ہو گئے کہ جب ان میں سے کوئی معزز شخص چوری کرتا تھا تو اس کو چھوڑ دیتے تھے اور اگر ناتواں آدمی چوری کرتا تھا تو اس پر حد قائم کرتے تھے اور خدا کی قسم اگر فاطمہ بنت محمد چوری کرتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹتا''۔

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس نے سفارش کر کے حدود الٰہی میں سے کسی حد کو قائم نہ ہونے دیا تو اس نے اللہ تعالیٰ سے مخالفت کی''۔

میں کہتا ہوں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ معلوم تھا کہ شرفا کی عزت کا محفوظ رکھنا اور ان کے ساتھ درگزر کرنا اور ان کے معاملہ میں سفارش کرنا ایک ایسا امر ہے جو ہمیشہ سے امتوں میں چلا آتا

ہے اور سب اولین اور آخرین اس بات کے پیرو ہیں اس واسطے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس امر میں تاکید فرمائی اور اہتمام کیا کیونکہ شرفا کے حق میں سفارش کرنا اور ان سے درگزر کرنا ان حدود کی مخالفت کرنا ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمایا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محدود پر لعنت کرنے اور اس کے پیچھے پڑنے سے منع کیا تاکہ وہ لوگوں کو حد قائم کرنے سے باز رکھنے کا باعث نہ ہو جائے اور اس واسطے کہ حد گناہ کا کفارہ ہے اور جب ایک شئے کا کفارہ سے تدارک ہو گیا تو وہ شئے کالعدم ہو گئی، چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے وہ (یعنی ماعز) جنت کی نہروں میں غوطے مار رہا ہے''۔

اور حدود کے ساتھ دو قسم کی زجر اور ملحق کی گئی ہیں ایک تو دین کی ہتک حرمت کی سزا اور ایک امامت کی حفاظت، پہلے کی دلیل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ہے ''جو شخص اپنا دین بدلے اس کو قتل کرو'' اور اس کی وجہ یہ ہے کہ دین سے خارج ہونے پر کسی سخت سزا کا قائم کرنا ضروری ہے ورنہ دین کی ہتک کا دروازہ کھلتا ہے اور خدا تعالیٰ کو منظور یہ ہے کہ ملت آسمانی بہ منزلہ جبلی امر کے قرار پا جائے جو جدا نہیں ہو سکتا، اور ارتداد اس قول سے ثابت ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ یا رسولوں کی نفی یا کسی رسول کی تکذیب پر دلالت کرے یا وہ ایسا فعل ہو جس سے دین کے ساتھ صراحتاً ہنسی مقصود ہو اور اسی طرح ضروریات دین کے انکار سے بھی ارتداد ثابت ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''اور انھوں نے دین کے اندر عیب نکالا''۔ اور ایک یہودی عورت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو برا کہا کرتی تھی پس ایک شخص نے اس کا گلا دبا دیا حتی کہ وہ مرگئی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے خون کو باطل کر دیا کیونکہ دین اسلام میں طعن کرنے سے اور عیب جوئی کرنے سے اور ظاہری ایذا رسانی سے ذمی کا عہد منقطع ہو جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''میں ہر اس مسلمان سے بری ہوں جو مشرکین میں ملا جلا رہے وہ دونوں ایک دوسرے کی آگ نہ دیکھنے پائیں''۔

میں کہتا ہوں اس کا سبب یہ ہے کہ کفار کے ساتھ اختلاط کرنا اور ان کے گروہ کو بڑھانا ایک طرح سے ان کی مدد کرنا ہے پھر اس نے کفار کی بستیوں سے دور رہنے کو اس طرح منضبط کیا کہ ان سے اتنے فاصلہ پر رہے کہ اگر ان کے شہر یا منزل میں سے اونچی جگہ پر روشنی کی جائے تو دوسرے کو دکھائی نہ دے اور دوسرے کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے ''پس اگر ایک فریق دوسرے پر زیادتی

کرے تو زیادتی کرنے والے سے لڑوں یہاں تک کہ وہ خدا کے حکم کی طرف لوٹ آئے'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث ہے ''جب دو خلیفہ کی بیعت کی جائے تو ان میں سے دوسرے کو مار ڈالو''۔

میں کہتا ہوں اس کا سبب یہ ہے کہ امامت ایسی شئے ہے جس میں طبعی طور پر انسان کو رغبت ہوتی ہے اور مختلف ملکوں میں لوگوں کا اتفاق ایسے شخص پر ضرور ہوتا ہے جس کو امامت کی خاطر قتال پر جرأت ہوتی ہے اور لوگ اس کی مدد کے لئے متفق ہوتے ہیں پس اگر مقابل کو چھوڑ دیا جائے اور اس کو قتل نہ کیا جائے تو وہ ضرور خلیفہ کو قتل کر دے گا پھر کوئی اور اس سے قتال کرے گا اور وہ اس کو قتل کر دے گا اور پھر اسی طرح سلسلہ جاری رہے گا اور اس میں مسلمانوں کے لئے بڑی خرابی ہے پس اس فساد کے بند کرنے کی یہی صورت ہے کہ مسلمانوں کے اندر ایک طریقہ مقرر کیا جائے کہ جب ایک خلیفہ کی خلافت منعقد ہو جائے پھر جو کوئی اس میں جھگڑا کرنے کے لئے آمادہ ہو تو اس کو قتل کرنا جائز ہو اور اس کے مقابل میں خلیفہ کی مدد کرنا مسلمانوں پر واجب ہو اس کے بعد وہ شخص ہے جو اپنی ذات یا خاندان سے کسی تکلیف کے دفع کرنے کے ارادہ سے کسی تاویل سے خلیفہ کے خلاف کھڑا ہو یا خلیفہ کے اندر کوئی نقص ثابت کرے اور ایسی دلیل شرعی سے اس پر حجت کرے جو جمہور مسلمین کے نزدیک مسلم نہ ہو اور نہ وہ خدا کی طرف سے ایسا حکم ہو جو لوگوں کے نزدیک قطعی دلیل ہو جس کا وہ انکار نہ کر سکیں پس ایسے شخص کا حال اس شخص سے کم درجہ کا ہے جو ملک میں فساد پھیلانے کی غرض سے کھڑا ہو اور شریعت کو ترک کر کے تلوار کو حاکم قرار دے پس ان دونوں شخصوں کو ایک درجہ میں نہیں رکھنا چاہئے اس واسطے مناسب یہ ہے کہ امام ان کی طرف کسی دانا ناصح عالم کو بھیجے جو ان کے شبہ کو دور کرے یا ان کی تکلیف کو ان سے دور کرے جس طرح امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عبداللہ بن عباسؓ کو حروریہ کی طرف بھیجا تھا پس اگر وہ جماعت مسلمین کی طرف رجوع کریں تو فبہا ورنہ امام کو ان سے قتال کرنا چاہئے لیکن ان میں سے جو شخص بھاگ جائے یا قید ہو جائے تو ان کو قتل نہیں کرنا چاہئے اور نہ ان کے زخمی کو ہلاک کرنا چاہئے کیونکہ مقصود ان کے شر کو دفع کرنا اور ان کی جماعت کو پراگندہ کرنا ہے اور وہ حاصل ہو گیا، لیکن دوسرا شخص سو وہ محاربین میں سے ہے اور اس کا حکم محارب کا حکم ہے۔

فیصلہ جات کا بیان

واضح ہو کہ جو حاجات کثیر الوقوع ہیں اور جن کا فساد سخت ہے وہ لوگوں کے باہمی جھگڑے ہیں کیونکہ وہی باہمی عداوت اور بغض اور فساد کا باعث ہوتے ہیں اور وہی حق تلفی اور ردلیل نہ مان کر کجروی کی رغبت دلاتے ہیں، پس ضروری ہوا کہ ہر طرف ایسے لوگ بھیجے جائیں جو انصاف سے ان کے مقدمات کا فیصلہ کریں اور اس فیصلہ پر عمل کرنے پر خواہ مخواہ ان کو مجبور کریں اور اسی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم قاضیوں کے بھیجنے کا سخت اہتمام فرماتے تھے پھر آپ کے بعد مسلمان ایسا ہی کرتے رہے پھر چونکہ لوگوں کے فیصلہ کرنے میں ظلم اور زیادتی کا احتمال ہے اس واسطے ضروری ہوا کہ فیصلہ کے اندر ظلم وزیادتی کرنے سے لوگوں کو ڈرایا جائے اور ایسے کلیات منضبط کئے جائیں جن کی طرف احکام کا رجوع ہو، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو شخص لوگوں کے اندر قاضی مقرر کیا گیا بلاشبہ وہ بغیر چھری کے ذبح کیا گیا''۔

اس حدیث سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ قضا بڑا بھاری بوجھ ہے اور اس پر اقدام کرنے میں ہلاک ہونے کا خطرہ ہے ہاں لیکن جس کو خدا تعالیٰ بچانا چاہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو شخص قضا کے عہدے کا طالب ہو اور اس کی درخواست کرے تو اس کو اس کے نفس پر چھوڑ دیا جاتا ہے اور جس کو زبردستی قاضی بنایا جائے تو خدا تعالیٰ اس پر ایک فرشتہ نازل کرتا ہے جو اس کی رہنمائی کرتا ہے''۔

میں کہتا ہوں اس میں راز یہ ہے کہ جو شخص عہدہ کا طالب ہوتا ہے تو اکثر اس کے دل میں ایک خواہش نفسانی مال یا جاہ کی ہوتی ہے یا کسی دشمن سے بدلہ لینے کی قدرت وغیرہ کا حاصل کرنا

ہوتا ہے پس خلوص نیت جو نزول برکات کا سبب ہے اس کی جانب سے نہیں پائی جاتی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''قاضی تین قسم کے ہیں ایک جنتی اور دو دوزخی ہیں، پس جنتی وہ قاضی ہے جو حق کو پہچانے اور اسی کے موافق فیصلہ دے اور جو قاضی حق کو پہچانے لیکن لیکن فیصلہ دینے میں ظلم کرے تو وہ دوزخی ہے اور جو قاضی جاہل ہو اور لوگوں کا فیصلہ کرے تو وہ بھی دوزخی ہے''۔

میں کہتا ہوں اس حدیث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ قاضی ہونے کے قابل وہ شخص ہے جو عادل ہو اور ظلم سے اور کسی طرف مائل ہونے سے بری ہو اور اس کی یہ بات لوگوں میں مشہور ہو اور عالم ہو جو احکام حقہ خاص کر قضا کے مسائل سے واقف ہو اور اس کا سبب ظاہر ہے کیونکہ قاضی بنانے سے جو مصلحت مقصود ہے بغیر ان باتوں کے متصور نہیں ہو سکتی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''کوئی حکم غصہ کی حالت میں دو شخصوں کے درمیان ہرگز فیصلہ نہ کرے''۔

میں کہتا ہوں اس کا سبب یہ ہے کہ جب ایک شخص کا دل غصہ سے بھرا ہوا ہے تو وہ شخص دلائل اور قرائن میں غور کر کے حق کو معلوم نہ کر سکے گا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جب کوئی حاکم اجتہاد کر کے فیصلہ کرے اور اس میں وہ درست ہو تو اس کے لئے دو اجر ہیں اور جب اجتہاد کر کے فیصلہ کرے اور اس میں وہ چوک جائے تو اس کے لئے ایک اجر ہے، اور اجتہاد کے معنی دلیل کے تلاش کرنے میں طاقت کا صرف کرنا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ تکلیف بقدر وسعت کے ہے اور انسان کی وسعت میں صرف یہ ہے کہ کوشش کرے اور اس کے بس میں یہ نہیں ہے کہ ضرور بالضرور حق کو پہنچ جائے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا ''جب دو شخص تیرے پاس کوئی مقدمہ لائیں تو جب تک تو دوسرے کی بات نہ سن لے پہلے کے حق میں فیصلہ نہ کر کیونکہ دونوں کی بات سننے سے فیصلہ اچھی طرح ظاہر ہو سکتا ہے''۔

میں کہتا ہوں یہ اس واسطے آپ نے فرمایا کہ دونوں کی دلیل کو ملاحظہ کرنے سے ترجیح ظاہر ہو جاتی ہے۔

اور واضح ہو کہ قضا کے دو درجے ہیں ایک تو یہ ہے کہ جس امر میں دونوں شخصوں کا جھگڑا ہے اس کی اصل حقیقت معلوم کرنا اور دوسرے اس مقدمہ میں انصاف سے حکم دینا ہے، اور قاضی کو کبھی ان دونوں کی ضرورت ہوتی ہے اور کبھی صرف ایک کی ضرورت ہوتی ہے پس جب دونوں شخصوں

میں سے ہر ایک اس بات کا دعویٰ کرے کہ یہ جانور مثلاً اس کی ملک ہے اور اس کی ملک میں پیدا ہوا ہے یا اس پتھر کو وہ پہاڑ سے اٹھا کر لایا ہے تو حقیقت حال معلوم ہونے کی وجہ سے یہاں کوئی اشکال نہیں ہے اور حضرت علیؓ اور زید اور جعفر رضی اللہ عنہم کے درمیان حضرت حمزہؓ کی لڑکی کی پرورش کے باب میں جو مقدمہ پیش تھا وہاں اصل حال تو معلوم تھا صرف حکم دینا مطلوب تھا، اور جب ایک شخص دوسرے پر غصب کا دعوی کرے اور مال کی حالت متغیر ہو اور دوسرا اس کا انکار کرے تو اولاً حقیقت حال معلوم کرنے کی ضرورت ہوگی کہ دراصل غصب ہوا بھی ہے کہ نہیں، اس کے بعد حکم دینے کی ضرورت ہوگی کہ اس اصل مغصوب کو واپس کرنے کا حکم دیا جائے یا اس کی قیمت دینے کا حکم دیا جائے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قضا کے دونوں مقاموں کو قواعد کلیہ سے منضبط فرما دیا ہے پس مقام اوّل میں شہادت اور قسم سے زیادہ مناسب کوئی چیز نہیں ہے کیونکہ حقیقت حال کی معرفت بجز اس صورت کے ممکن نہیں کہ جو شخص اس واقعہ میں موجود تھا اس کی خبر دے یا خود مقدمہ والا ایسی تاکید سے اس کو بیان کرے کہ جس کے ساتھ کذب کا گمان نہ رہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اگر لوگوں کو صرف ان کے دعویٰ کرنے کی وجہ سے دلایا جاتا تو لوگ خون اور اپنے مال کے دعوے سے غلط قائم کرتے لیکن مدعی پر گواہ اور مدعا علیہ پر قسم لازم ہے، پس مدعی وہ شخص ہے جو ظاہر کے خلاف دعوے کر کے کسی زیادت کو ثابت کرے اور مدعا علیہ وہ شخص ہے جو اصل کا پابند ہو اور ظاہر سے دلیل پکڑے، پس ایسی صورت میں اس سے بہتر عدل نہیں کہ مدعی کے حق میں گواہ اور اس شخص کے حق میں جو ظاہر سے دلیل پکڑتا ہے اور اپنے نفس کو بچاتا ہے قسم کا اعتبار کیا جائے جبکہ مدعی گواہ قائم نہ کر سکے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قاعدہ کے مقرر ہونے کے سبب کی طرف اپنے اس قول میں اشارہ کر دیا ہے ''اگر لوگوں کو ان کے دعوے کے موافق دیا جاتا'' الخ

یعنی وہ باہمی ظلم کا سبب ہے پس ایسی صورت میں دلیل کا ہونا ضروری ہے پھر گواہ کے اندر اس صفت کا ہونا معتبر ہے کہ لوگوں کے نزدیک وہ پسندیدہ ہو چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''گواہوں میں سے جس کو تم پسند کرو'' اور یہ صفت عقل اور بلوغ اور اس معاملہ کے ضبط اور گویائی اور اسلام اور عدالت اور مروت اور عدم تہمت سے حاصل ہوتی ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''خیانت کرنے والے مرد اور خیانت کرنے والی عورت کی شہادت درست نہیں اور نہ زانی اور زانیہ کی اور نہ

اس شخص کی جو اپنے بھائی سے دشمنی رکھتا ہو اور گھر والوں کے خادم کی شہادت رد کی جائے گی''۔ اور تہمت کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''اور کبھی ان کی شہادت قبول نہ کرو اور یہی بدکردار ہیں ہاں جو اس کے بعد توبہ کرلیں'' الآیہ، اور دیگر کبائر بھی قذف اور زنا کے حکم میں ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ خبر فی نفسہٖ صدق اور کذب دونوں کا احتمال رکھتی ہے اور ان دونوں میں سے ایک کو کسی قرینہ سے ترجیح ہوتی ہے اور وہ قرینہ یا تو مخبر میں ہوتا ہے یا اس میں جس سے خبر دی جاتی ہے یا کسی اور میں اور ان میں سے کوئی چیز ایسی منضبط نہیں ہے جس پر حکم شرعی دائر کیا جائے البتہ مخبر کی وہ صفات جن کو ہم نے ذکر کیا سوائے ظاہر حال اور استصحاب (۱) کے اس قابل ہیں اور ایک مرتبہ ان کا اعتبار کیا گیا ہے جبکہ آپ نے فرمایا مدعی کے لئے بینہ ہے اور مدعا علیہ کے لئے قسم ہے، پھر گواہوں کی تعداد ان اطوار مختلفہ کے اعتبار سے مقرر کی گئی ہے جن کو شارع نے مختلف حقوق کے اندر رکھا ہے پس زنا کے ثبوت میں چار گواہ ضروری ہیں اور اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے ''اور جو لوگ پرہیزگار عورتوں پر بدکاری کا الزام لگائیں اور اس پر چار گواہ نہ لائیں'' الایۃ۔

اور ہم پیشتر اس کی مشروعیت کا سبب بیان کر چکے ہیں اور قصاص اور حدود میں صرف دو آدمیوں کی شہادت کا اعتبار کیا گیا ہے اور اس کی دلیل زہری رحمۃ اللہ کا یہ قول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے برابر یہ دستور جاری ہے کہ حدود میں عورتوں کی گواہی قبول نہیں کی جاتی اور حقوق مالیہ میں ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی معتبر ہے اور اس میں اصل اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے ''پس اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں گواہی دیں'' اور اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے بارے میں کثرت کی وجہ اپنے اس قول میں بیان فرمادی ''ان دونوں میں سے ایک چوک جائے تو ان میں سے ایک دوسرے کو یاد دلادے'' یعنی عورتیں ناقص العقل ہیں پس عدد کی زیادتی سے اس کمی کو پورا کرنا ضروری ہوا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ ایک گواہ اور ایک قسم سے فیصلہ دے دیا تھا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ شاہد عدل کے ساتھ جب قسم مل جائے تو امر شہادت پختہ ہو جاتا ہے اور شہادت کے باب میں وسعت ضروری ہے اور یہ سنت جاری ہے کہ جب گواہوں میں کوئی شک پیدا ہو تو ان کے چال چلن کو دریافت کرلیا جائے اس واسطے کہ ان کی گواہی کا اعتبار ان کی صفات کی

(۱) کسی شے کو اس کی حالت پر باقی رکھنا۔

وجہ سے ہے جو ان کی راست گوئی کو کذب پر ترجیح دینے کا باعث ہیں پس ان کے صفات کا ظاہر ہونا ضروری ہے، اور یہ سنت بھی جاری ہے کہ جب کوئی شبہ ہو تو زمان اور مکان اور لفظ سے قسم کو خوب مضبوط کیا جائے اس واسطے کہ قسم صدق خبر پر دلیل اس قرینہ کی وجہ سے ہوتی ہے، جو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ خبر دینے والا کذب پر اقدام نہیں کر سکتا پس مناسب ہوا کہ جب شبہ زیادہ ہو تو قرائن کو قوی کیا جائے پس لفظ کے اعتبار سے مضبوط کرنا یہ ہے کہ اسما اور صفات زیادہ بیان کئے جائیں اور اس کی دلیل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ہے ''تو اس اللہ تعالیٰ کی قسم کھا جس کے سوا کوئی معبود نہیں اور جو پوشیدہ اور ظاہر بات کو جانتا ہے'' اور زمانہ کے اعتبار سے مضبوط کرنا یہ ہے کہ عصر کے بعد قسم لی جائے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''اگر تم ان گواہوں کی نسبت کچھ شک ہو تو ان کو عصر کی نماز کے بعد کھڑا کرو'' اور جگہ کے اعتبار سے مضبوط کرنا یہ ہے کہ اگر مکہ معظمہ میں ہو تو رکن اور مقام کے درمیان کھڑا کر کے قسم لی جائے اور اگر مدینہ منورہ میں ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر کے پاس کھڑا کر کے اس سے گواہی لیں اور دیگر شہروں میں مساجد کے منبر کے پاس کھڑا کریں کیونکہ ان مقامات کی فضیلت شرع سے ثابت ہے اور ان مقامات میں جھوٹ بولنا نہایت گناہ سمجھا جاتا ہے پھر یہ ضرورت پیش آئی کہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے ان احکام کی مخالفت کرنے سے جن کو اللہ تعالیٰ نے ان کے مقدمات کے فیصل کرنے اور حقیقت حال کے معلوم ہونے کے لئے مقرر فرمایا ہے نہایت خوف دلایا جائے، اور ان ترہیبات میں اصل تین چیزیں ہیں ایک یہ ہے کہ جس فعل سے اللہ تعالیٰ نے ممانعت فرمائی ہے اس پر اور تحریم جنت وغیرہ کے ثابت کیا گیا، دوسرے یہ کہ وہ ظلم کے اندر کوشش کرنا ہے اور اس کا حال ایسا ہے جیسے چوری کرنا اور رہزنی کرنا یا وہ ایسا ہے جیسے چور کو مال بتلانا تاکہ وہ چوری کرے یا رہزن کو رہزنی پر آمادہ کرنا، پس اللہ تعالیٰ اور ملائکہ اور لوگوں کی لعنت جو زمین میں فساد کرنے والوں پر ہوتی ہے اس گناہ کرنے والے کی طرف متوجہ ہوتی ہے پس وہ نار کا مستحق ہو جاتا ہے اور تیسرے یہ کہ اس میں اس حکم کی مخالفت کرنا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے مقرر فرمایا ہے اور جو اللہ تعالیٰ کو اپنی شرائع میں مقصود ہے اس کے مطابق حکم کے جاری نہ ہونے میں کوشش کرنا ہے کیونکہ قسم حق کی معرفت کے لئے اور گواہی حقیقت حال بیان کرنے کے لئے مشروع ہوئی ہے پس اگر جھوٹی گواہی اور جھوٹی قسموں کا

طریقہ جاری ہو جائے تو مصلحت مقصودہ کا دروازہ بند ہو جائے پس من جملہ ان کے گواہی کا چھپانا ہے اس کی نسبت اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "اور جو شخص اس کو چھپائے تو اس کا دل گنہگار ہے"۔

اور من جملہ ان کے جھوٹی گواہی ہے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جھوٹی گواہی کو کبائر میں شمار کیا ہے، اور من جملہ ان کے جھوٹی قسم ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو شخص قسم کھائے کہ اس سے حق لازم کرے اور وہ اس میں جھوٹا ہو اور اس کا مقصود اس سے کسی مسلمان کا مال تلف کرنا ہو تو وہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ سے ایسے حال میں ملے گا کہ اللہ تعالیٰ اس پر غضبناک ہوگا"۔

اور من جملہ ان کے جھوٹا دعویٰ ہے اس کی نسبت نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں "جس نے ایسی چیز کا دعویٰ کیا جو اس کی نہیں ہے تو وہ شخص ہم میں سے نہیں ہے اور اس کو چاہئے کہ وہ اپنی جگہ دوزخ میں بنائے"۔

اور من جملہ ان کے بغیر حق کے حکم قاضی کی وجہ سے کسی چیز کا لے لینا ہے، اس کی نسبت نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں "میں بھی تمہاری مانند بشر ہوں اور تم میرے پاس جھگڑا پیش کیا کرتے ہو" الحدیث (۱)

اور من جملہ ان کے مقدمہ بازی اور عدالت میں دعاوی دائر کرنے کی عادت ڈال لینا ہے کیونکہ وہ بھی باہم فساد ڈالنے سے خالی نہیں ہے اس کی نسبت نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں "لوگوں میں سے سب زیادہ مبغوض اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ شخص ہے جو بڑا جھگڑالو ہے" اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حق و باطل دونوں میں ترک مخاصمت کی ترغیب دی ہے کیونکہ اس میں صفت سماعت کی اتباع ہے اور نیز بسا اوقات ایک شخص کا حق نہیں ہوتا اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ حق اس کا ہے پس یقینی طور پر ذمہ داری سے جب ہی بری ہو سکتا ہے کہ وہ حق و ناحق دونوں میں ترک مخاصمت کا عادی ہو جائے اور حدیث میں وارد ہے کہ "دو شخصوں نے ایک چوپایہ پر دعویٰ کیا پس ان میں سے ہر ایک نے اس بات پر شہادت قائم کر دی کہ وہ چوپایہ اسی کے یہاں پیدا ہوا ہے پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ چوپایہ اسی کو دلایا جس کے قبضہ میں تھا"۔

---

(۱) پس جو شخص چرب زبانی سے غالب آ جائے اور میں اس کے لئے حکم دوں تو یہ جان لے کہ میں نے آگ کا ٹکڑا کاٹ کر اس کو دیا ہے وہ ہرگز نہ لے۔

میں کہتا ہوں اس میں یہ راز ہے کہ جب دونوں حجتوں میں تعارض ہوا تو دونوں ساقط اور بے اعتبار ہوگئیں پس جس کا قبضہ ہے اس کے ہاتھ میں وہ شے باقی رہی کیونکہ اس کے رد کرنے کا کوئی سبب نہیں پایا گیا، یا ہم یہ کہتے ہیں کہ دونوں دلیلوں میں سے ایک دلیل کو قرینہ ظاہری یعنی قبضہ سے تائید حاصل ہوگئی اور اس واسطے اس کو ترجیح دی گئی لیکن قضا کا مقام ثانی ہے اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے چند اصول بیان کئے ہیں جن کی طرف رجوع کیا جاتا ہے اور اجمالاً اس کا بیان یہ ہے کہ جب حقیقت حال معلوم ہوا تو اب نزاع ایسی شے میں ہوگا جو مباح الاصل ہے اور ہر شخص اس کو طلب کرتا ہے اور اس کا حکم یہ ہے کہ ترجیح ظاہر ہو یا تو وہ ترجیح کسی ایسی صفت سے ہو جس میں مسلمانوں کو اور اس شے کو نفع ہو یا ترجیح کی یہ صورت ہو کہ ان دونوں میں سے ایک کا قبضہ بہ نسبت دوسرے کے پیشتر ہو یا قرعہ سے وہ ترجیح حاصل ہو اس کی مثال وہ قضیہ ہے جو زید اور علی اور جعفر رضی اللہ عنہم کے درمیان حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی کی پرورش کے بارے میں ہوا تھا پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ لڑکی حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کو دلائی اور فرمایا 'خالہ بھی ماں ہوتی ہے'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اذان کے بارے میں فرمایا تھا ''اگر لوگوں کو اذان اور صف اول کی فضیلت معلوم ہو جائے تو بغیر قرعہ ڈالے چارہ نہ ہو'' اور نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب سفر کا ارادہ فرماتے تھے تو ازواج مطہرات میں قرعہ اندازی کرتے تھے اور یا ترجیح کی یہ صورت ہو کہ کوئی سابقہ عقد یا غصب چلا آتا ہو اور ہر شخص یہ دعویٰ کرتا ہو کہ وہ اس کا حقدار ہے اور اس میں ہر ایک کے لئے شبہ ہو پس اس کا حکم یہ ہے کہ لوگوں میں جو دستور و عرف جاری ہے اس کا اتباع کیا جائے اقرارات اور عقود کے الفاظ کی تفسیر انہی معنی سے کی جائے جو جمہور کے نزدیک ان کے معنی ہیں اور ضرر رسانی امور کو بھی انہی کے دستور سے معلوم کیا جائے اس کی مثال براء بن عازبؓ کا قضیہ ہے کہ ان کی اونٹنی ایک باغ میں چلی گئی اور اس نے باغ کا کچھ نقصان کر دیا اور فریقین میں سے ہر ایک نے یہ دعویٰ کیا کہ میں معذور ہوں پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی عادت معروفہ کے موافق فیصلہ کیا اور عادت معروفہ یہ ہے کہ باغ والے دن کو اپنے باغ کی نگہبانی کیا کرتے ہیں اور مویشی پالنے والے رات میں اپنے مویشیوں کو حفاظت میں رکھا کرتے تھے۔ اور من جملہ ان قواعد کے جن پر بہت سے احکام مبنی ہیں ایک یہ قاعدہ ہے کہ نفع تاوان کے ساتھ ہوتا ہے اور اس کی اصل

وہ ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ آمدنی تاوان کے ساتھ ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ منافع کا انضباط دشوار ہے اور یہ کہ جاہلیت کی قسمیں اور خون اور جو کچھ اس وقت میں ہوا اس سے تعرض نہ کیا جائے گا اور جاہلیت کے بعد ہر امر نئے سرے سے معتبر ہوگا۔ اور یہ کہ قبضہ بغیر کسی دلیل کے توڑا نہ جائے گا اور استصحاب کی اصل یہی ہے، اور یہ کہ اگر تفتیش کا دروازہ بند ہو جائے تو حکم وہ ہوگا جو مال والا چاہے گا یا اس معاملہ کو دونوں واپس لے لیں گے اور اس کی اصل یہ حدیث ہے کہ "جب بائع اور مشتری اختلاف کریں اور مال موجود ہو تو بائع کا قول معتبر ہوگا یا وہ دونوں بیع کو فسخ کر دیں" اور یہ کہ ہر عقد میں اصل یہ ہے کہ ہر ایک کے لئے پورا پورا حق دلایا جائے اور عقد سے جو شخص جس چیز کا التزام کرے وہ اس پر لازم ہے بجز اس عقد کے جس سے شارع نے منع فرمایا ہے چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "مسلمانوں کو اپنی شروط کا پابند ہونا ضروری ہے بجز اس شرط کے جو اللہ تعالیٰ کی حرام کی ہوئی چیز کو حلال کرے یا حلال کی ہوئی چیز کو حرام کرے" پس یہ کسی قدر ان احکام کا بیان ہے جن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مقام ثانی کے بارے میں بیان فرمایا ہے۔

اور من جملہ ان فیصلوں کے جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احکام صادر کئے ہیں وہ فیصلہ ہے جو حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی کی پرورش کے باب میں واقع ہوا چنانچہ حضرت علیؓ نے فرمایا وہ میرے چچا کی بیٹی ہے اور میں نے اس کو لیا ہے، اور حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے فرمایا وہ میرے چچا کی بیٹی ہے اور اس کی خالہ میری بیوی ہے، اور حضرت زید رضی اللہ عنہ نے فرمایا وہ میرے بھائی کی بیٹی ہے، پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا فیصلہ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کے حق میں فرمایا اور یہ فرمایا کہ "خالہ بہ منزلہ ماں کے ہوتی ہے" اور ایک فیصلہ زمعہ کی باندی کے بچہ کا ہے جو دعویٰ نسب میں ہوا تھا چنانچہ سعد نے کہا کہ میرے بھائی نے اس کے بارے میں مجھ سے یہ عہد کیا ہے، اور عبد بن زمعہ نے کہا کہ وہ میرے باپ کی باندی ولیدہ کا بیٹا ہے جو اس کے بستر پر پیدا ہوا ہے تب نبی صلی اللہ علیہ سلم نے فرمایا "اے عبد بن زمعہ یہ بچہ تیرے لئے ہے بچہ ماں کا ہے اور زانی کے لئے پتھر ہے، اور ایک فیصلہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اور ایک انصاری کا ہے جو باغ میں پانی دینے کی بابت ہوا پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا حکم دیا تھا جس میں دونوں کے لئے آسانی تھی کہ "اے زبیر تو پانی دے لے پھر نالہ کو انصاری کے لئے چھوڑ دے، پس انصاری اس فیصلہ

سے ناخوش ہوا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زبیرؓ کو پورا حق دلایا اور فرمایا کہ اے زبیر تو اتنا پانی لے کہ باغ کی دیواروں کو جڑ تک پہنچ جائے" اور ایک فیصلہ براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی اونٹنی کا ہے جو ایک انصاری کے باغ میں داخل ہوگئی اور اس کا نقصان کیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فیصلہ کیا کہ مال والے دن میں اپنے مال کی حفاظت کریں اور مویشیوں کے مالک رات میں اپنے مویشیوں کی حفاظت کریں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس زمین میں جو تقسیم نہیں ہوئی تھی شفعہ کا حکم فرمایا پس جب حدیں پڑ جائیں اور راستے علیحدہ علیحدہ ہو جائیں تو اس میں شفعہ نہیں، اور ان قضایا کے وجوہات پہلے ہم بیان کر چکے ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جب راستہ کے بارے میں تمہارا اختلاف ہو تو اس کی چوڑائی سات گز کی جائے" میں کہتا ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ جب لوگ مباح زمین کو آباد کرنا چاہتے ہیں اور شہر بسانا چاہتے ہیں اور راستہ کے بارے میں ان کا اختلاف ہوتا ہے پس بعض یہ چاہتے کہ راستہ کو تنگ کریں اور اس میں اپنے مکانات بنائیں اور بعض اس بات سے مانع ہوتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ لوگوں کے لئے کشادہ راستہ کا ہونا ضروری ہے تو ایسے موقع پر یہ فیصلہ ہوا کہ راستہ کا عرض سات گز کا ہونا چاہئے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اونٹ کی دو قطاروں کا گزرنا ضروری ہے اس طور سے کہ ایک ایک جانب سے گزر سکے اور دوسری دوسری جانب سے گزر سکے پس جب ایک قطار اس طرح سے آجائے اور دوسری قطار اس طرف سے آجائے تو ایسی صورت میں ان کے واسطے ضرور اتنا راستہ ہونا چاہئے کہ وہ بہ آسانی گزر سکیں ورنہ دقت پیش آئے گی اور اس کی مقدار سات گز ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو شخص کسی کی زمین میں بلا اس کی اجازت کے کھیتی کرے گا تو اس کو اس کھیتی میں سے کچھ نہیں ملے گا البتہ اس کو کام کی اجرت ملے گی"۔

میں کہتا ہوں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بہ منزلہ محنت کرنے والے کے گردانا کہ مالک زمین کے لئے اس نے نفع بخش کام کیا، واللہ اعلم۔

جہاد کا بیان

واضح ہو کہ تمام شریعتوں میں سب سے زیادہ تمام اور کامل وہ شریعت ہے جس میں جہاد کا حکم پایا جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں کا اوامر ونواہی کے ساتھ مکلّف کرنا ایسا ہے کہ جیسے کسی شخص کے غلام مریض ہو جائیں تب وہ اپنے کسی خاص آدمی کو اس بات کا حکم دے کہ وہ ان کو کوئی دوا پلا دے پس اگر وہ شخص دوا پلانے میں ان پر سختی کرے اور اس کو ان کے منہ میں ڈالے تو ایسا کرنا درست ہوگا مگر رحمت کا مقتضیٰ ہے کہ ان کے سامنے دوا کے فوائد بیان کر دے تا کہ خوشی کے ساتھ اس دوا کو پی لیں اور نیز اس دوا میں شہد شامل کر دے تا کہ رغبت عقلیہ کے ساتھ رغبت طبیعہ بھی پائی جائے، پھر اکثر لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ ان پر ریاستوں کی محبت میں شہوات دنیہ اور اخلاق سبعیہ اور شیطانی وسوسے سے غالب ہوتے ہیں اور ان کے دلوں میں ان کے آبا کے رسوم از حد پیوست ہوتے ہیں پس وہ ان فوائد کو نہیں سنتے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر یقین نہیں کرتے اور اس کی خوبی میں غور نہیں کرتے تو ان کے حق میں یہ رحمت نہیں ہے کہ ان پر اثبات حجت میں ہی اکتفا کیا جائے بلکہ ان کے حق میں رحمت یہی ہے کہ ان پر جبر کیا جائے تا کہ خواہ مخواہ ان کے دلوں میں ایمان اس طرح سے داخل کیا جائے جس طرح زبردستی سے تلخ دوا پلائی جاتی ہے اور یہ جبر اور سختی بغیر اس کے ممکن نہیں کہ جو مقابلہ میں قوت شدیدہ اور سامان قوی رکھتا ہے اس کو قتل کیا جائے یا ان کی قوت وشوکت کو توڑ دیا جائے اور ان کے مال واسباب کو ضبط کر لیا جائے یہاں تک کہ وہ بالکل بے بس ہو جائیں پس اس وقت ان کے پیرو اور ان کی اولاد خوشی اور رغبت سے اسلام کو قبول کر سکتی ہے اور اسی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قیصر روم کو لکھا تھا ''تجھ پر تمام رعایا کا وبال

ہوگا'' اور بسا اوقات ان کو قید کرنا اور ان کو مغلوب کرنا ان کے ایمان لانے کا سبب ہو جاتا ہے اور اسی طرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس قول میں اشارہ فرمایا ہے ''اللہ تعالیٰ کو وہ لوگ اچھے معلوم ہوں گے جو زنجیروں سے بندھے ہوئے جنت میں داخل ہوں گے''۔ اور نیز بشر کی رحمت تامہ کاملہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو نیکی کی طرف رہنمائی کرے اور ان کو ظالموں کے ظلم سے چھڑائے اور ان کے کاروبار اور تدبیر منزل اور سیاست مدنیہ کی اصلاح کرے پس ان کے فاسد شہر جن پر نفوس سبعیہ کا غلبہ ہے اور ان کو نہایت درجہ کی قوت حاصل ہے وہ بہ منزلہ مرض اکلہ (۱) کے ہے جو جسم انسان میں ہوتا ہے جس کو قطع کئے بغیر انسان کا بدن درست نہیں رہ سکتا اور جو شخص اس کے مزاج کی اصلاح اور اس کی طبیعت کے قائم کرنے کی طرف متوجہ ہوگا تو اس کے لئے اس کو قطع کرنا ضروری ہوگا اور جب تھوڑی سی برائی سے خیر کثیر حاصل ہو تو اس برائی کا کرنا ضروری ہے اور تم کو عرب میں قریش اور ان کے اطراف کے لوگوں کی حالت پر غور کرنا چاہئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سب سے زیادہ نیکی سے دور تھے اور ناتوانوں پر نہایت ظلم کرتے تھے اور ان کے مابین شدید مقاتلے ہوتے تھے اور ان میں سے بعض بعض کو قید کر لیا کرتے تھے اور ان میں سے اکثر ایسے تھے جو حجت میں تامل اور دلیل میں نظر نہیں کرتے تھے پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے جہاد کیا اور ان کے سرکشوں کو جو نہایت مضبوط اور شریر تھے قتل کیا حتیٰ کہ امر الٰہی ظاہر ہو گیا اور لوگ آپ کے فرمانبردار ہو گئے اور بعد ازاں وہ نیک راہ پر لگ گئے اور ان کے تمام کام درست ہو گئے پس اگر شریعت میں ان لوگوں پر جہاد نہ ہوتا تو یہ رحمت ان کے حق میں حاصل نہ ہوتی، اور نیز اللہ تعالیٰ عرب و عجم سے ناخوش ہوا اور اس نے ان کے ملک اور دولت کو برباد کرنے کا حکم فرمایا پس اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب میں اور آپ کے واسطہ سے صحابہ رضی اللہ عنہم کے قلوب میں یہ القا فرمایا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں لڑیں تا کہ امر مطلوب حاصل ہو پس وہ اس بات میں بہ منزلہ ملائکہ کے ہیں جو امر الٰہی کے پورا کرنے میں سعی کرتے ہیں صرف فرق اتنا ہے کہ ملائکہ بغیر کسی قاعدہ کلیہ مقرر کئے سعی کرتے ہیں اور مسلمان ایک قاعدہ کلیہ کی وجہ سے جو اللہ تعالیٰ نے ان کو تعلیم فرمایا ہے لڑتے ہیں اور ان کا یہ عمل تمام اعمال سے بڑھ کر ہے اور یہ لڑائی ان کی طرف مطلوب نہیں

(۱) ایک بیماری جس میں عضو سڑ جاتا ہے۔

ہوتی بلکہ حکم کرنے والے کی طرف منسوب ہوتی ہے جس طرح مجرم کے قتل کرنے کی نسبت امیر کی طرف ہوتی ہے نہ جلاد کی طرف۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''پس تم نے ان کو قتل نہیں کیا لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو قتل کیا'' اور اسی راز کی طرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ کیا، چنانچہ آپ نے فرمایا ''اللہ تعالیٰ عرب وعجم سے ناخوش ہوا'' الحدیث، اور آپ نے فرمایا ''نہ کسریٰ ہوگا اور نہ قیصر'' یعنی وہ لوگ جو جاہلیت کا دین رکھتے ہیں۔

اور جہاد کے فضائل کا مرجع چند اصول کی طرف ہے از آں جملہ جہاد میں تدبیر الٰہی اور اس کے الہام کے ساتھ موافقت ہے پس اس کے تمام کرنے میں سعی کرنا شمول رحمت کا سبب ہے اور اس کے ابطال میں سعی کرنا شمول لعنت کا سبب ہے اور اس جیسے زمانہ میں جہاد ترک کر کے بیٹھ رہنا خیر کثیر کا فوت کرنا ہے اور از آں جملہ یہ ہے کہ جہاد ایک شاق عمل جس میں سخت مشقت ہے اور جان و مال صرف کرنا پڑتا ہے اور وطن اور مقاصد کو ترک کرنا پڑتا ہے پس ایسے سخت عمل پر وہی پیش قدمی کرتا ہے جس نے اپنے دین کو خالص اللہ تعالیٰ کے لئے قبول کیا اور دنیا کے مقابلہ میں آخرت کو اختیار کیا اور اللہ تعالیٰ پر ٹھیک ٹھیک بھروسہ کیا اور از آں جملہ یہ ہے کہ ایسے خیال کا دل میں قائم ہونا اسی وقت ہوسکتا ہے کہ اس شخص کو ملائکہ کے ساتھ مشابہت حاصل ہو اور اس کمال سے خوب بہرہ یاب ہو اور شرور بہیمیہ سے اس کو بعد ہو اور اس کے دل میں رسوخ دین کا پورا پورا میلان ہو پس وہ جہاد اس کی سلامتی قلب کی دلیل ہوتا ہے اور یہ سب کچھ اس وقت ہے کہ جہاد اپنی شرائط کے ساتھ پایا جائے اور وہ شرائط وہ ہیں جن کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ ''کوئی شخص بہادری دکھانے کے لئے لڑتا ہے اور کوئی شخص حمیت کی وجہ سے مقاتلہ کرتا ہے پس ان میں سے کونسا اللہ تعالیٰ کی راہ میں قتال کرنے والا ہے؟ تو آپ نے فرمایا جو شخص اس لئے لڑتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا بول بالا ہو پس وہی شخص اللہ کی راہ میں قتال کرنے والا ہے، اور از اں جملہ یہ ہے کہ قیامت کے روز جزا عمل کی صورت میں ظاہر ہوگی جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو شخص اللہ تعالیٰ کی راہ میں زخمی ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ کون اس کی راہ میں زخمی ہوتا ہے تو قیامت کے روز وہ اس حالت میں آئے گا کہ خون اس کے زخم سے جاری ہوگا جس کا رنگ خون کا سا ہوگا

اوراس کی بومشک کی بو ہوگی، اورازآں جملہ یہ ہے کہ جہاد چونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ امر ہےاوروہ عادتاً بغیر خرچ کرنے اور گھوڑوں کے جمع کرنے اور تیراندازی وغیرہ سیکھنے کے پورا نہیں ہوتااس واسطے ضروری ہوا کہ ان اشیا کو بھی اس لئے پسند کیا جائے کہ ان سے مطلوب حاصل ہوتا ہےاورازآں جملہ یہ ہے کہ جہاد سے ملت کی تکمیل اوراس کی عزت کرنا ہےاوراس کولوگوں میں بہ منزلہ امر لازم کے قرار دینا ہے پس جب تم ان اصولوں کو یاد کرلو گے تو ان احادیث کی حقیقت جو فضائل جہاد میں وارد ہیں تم کو معلوم ہوجائے گی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جنت کے اندر سو درجہ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کے لئے تیار کیا ہے'' الحدیث،

میں کہتا ہوں اس میں راز یہ ہے کہ دارالجزا میں مکان کا بلند ہونا اللہ تعالیٰ کے نزدیک بلندی مرتبہ کی صورت مثالیہ ہے اس واسطے کہ جبروتیت پر اطلاع یابی وغیرہ امور سے نفس کو سعادت حاصل ہوتی ہے اور نیز اس کی یہ وجہ ہے کہ جہاد شعائر الٰہی اوراس کے دین کی شہرت کا اور تمام ان چیزوں کا جن کی شہرت سے اللہ تعالیٰ راضی ہوتا ہے سبب ہےاوراسی لئے وہ اعمال جو ان دونوں صفتوں کا مظنہ ہیں ان کی جزا جنت میں درجات کا حاصل ہونا ہے، چنانچہ قرآن کی تلاوت کرنے والے کے حق میں وارد ہوا ہے کہ اس سے یہ کہا جائے گا ''قرآن پڑھتا جا اور چڑھتا جا جس طرح تو دنیا میں پڑھتا تھا'' اور جہاد کے بارے میں وارد ہوا ہے کہ وہ درجات کے بلند ہونے کا سبب ہے کیونکہ اس کو عمل میں لانے سے دین میں بلندی حاصل ہوتی ہے پس اس کی جزا بھی عمل کے موافق ہوگی، پھر درجہ کا بلند ہونا چند وجوہ سے ہوتا ہے پس جنت میں ہر وجہ درجہ کی شکل میں ظاہر ہوگی اور ہر درجہ میں آسمان اور زمین کے برابر فرق ہے کیونکہ علوم بشریہ میں یہ انتہا درجہ کا بعد فوقانی ہے تو جیسا کہ ان کے علوم میں یہ ممکن تھا ویسا ہی دارالجزاء میں وہ متشکل ہوگا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے والا ایسا ہے جیسے شب بیداری کرنے والا روزہ دار''۔

میں کہتا ہوں اس میں راز یہ ہے کہ شب بیدار روزہ دار کو اپنے غیر پر اس وجہ سے فضیلت ہے کہ اس نے اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے بڑا شاق عمل کیا اور وہ شخص بہ منزلہ ملائکہ کے اوران کے مشابہ ہوگیا اور مجاہد جبکہ شرع کے موافق جہاد کرتا ہے تو وہ ہر بات میں شب بیدار صائم کے ساتھ مشابہ ہوجاتا ہے صرف اتنا فرق ہے کہ اور عبادات میں کوشش کرنے کی فضیلت کو سب لوگ تسلیم

کرتے ہیں اوراس کو خاص لوگ ہی سمجھتے ہیں اس واسطے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو شب بیدار صائم کے ساتھ تشبیہ دی تا کہ اس کا حال منکشف ہو جائے پھر اس کی ضرورت پڑی کہ ان مقدمات جہاد کی ترغیب دلائی جائے جن کے بغیر عادتاً جہاد ہو نہیں سکتا جیسے گھوڑوں کا تیار کرنا اور تیر چلانا وغیرہ کیونکہ اللہ تعالیٰ جب کسی چیز کا حکم دیتا ہے اوراس کو پسند کرتا ہے اور یہ جانتا ہے کہ وہ شے ان مقدمات کے بغیر پوری نہیں ہوسکتی تو اس کا مقتضیٰ یہ ہے کہ ان مقدمات کا بھی حکم دے اور ان کو پسند کرے، گھوڑوں کی تیاری کے باب میں وارد ہے کہ ''وہ دنیا و مافیہا سے بہتر ہے'' اور نیز ''وہ ایک ماہ کے روزے اوراس کے قیام سے بھی بہتر ہے اور اگر وہ مر جائے تو جو عمل کرتے ہوئے وہ مرا ہے اس کا وہ عمل اس پر بدستور جاری رہے گا اور اس پر اس کا رزق جاری رہے گا اور منکر ونکیر سے امن میں رہے گا''۔

میں کہتا ہوں دنیا و مافیہا سے بہتر ہونے کی وجہ یہ ہے کہ جہاد کا ثمرہ ایسا ہے جو آخرت میں باقی رہنے والا ہے اور دنیا کی جس قدر نعمتیں ہیں وہ سب کی سب زائل ہونے والی ہیں اور ایک مہینہ کے روزے اور شب بیداری سے بہتر ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک ایسا شاق عمل ہے جو قوت بہیمیت پر نہایت گراں ہوتا ہے اور وہ عمل صرف اللہ تعالیٰ کے لئے اور اس کی راہ میں ہوتا ہے جیسا کہ روزہ رکھنا اور شب بیداری کا عمل شاق گزرتا ہے اور جہاد کے عمل کا بدستور جاری رہنے میں یہ راز ہے کہ جہاد کا بعض جز بعض جز پر اس طرح مبنی ہے جس طرح عمارت ہوتی ہے کہ اس کی دیوار بنیاد پر قائم ہوتی ہے اور چھت دیوار پر قائم ہوتی ہے اس واسطے کہ مہاجرین اور انصار میں سے اولین قریش اور ان کے آس پاس والوں کے اسلام میں داخل ہونے کا سبب بنے پھر اللہ تعالیٰ نے قریش کے ہاتھ پر عراق اور شام کو فتح کیا پھر ان کے ہاتھ پر فارس اور روم کو پھر فارس اور روم کے ہاتھ پر ہند اور ترکستان اور سوڈان کو فتح کیا، پس وہ نفع جو جہاد پر مرتب ہوتا ہے وقتاً فوقتاً زیادہ ہوتا رہتا ہے اور اس کا حال اوقاف اور سرائیں اور صدقات جاریہ کا سا ہوتا ہے اور فتان یعنی منکر ونکیر سے مامون ہونے کی وجہ یہ ہے کہ منکر ونکیر سے اسی شخص کو ہلاکت پہنچتی ہے جس کا قلب دین محمدی پر مطمئن نہیں ہے اور نہ وہ آپ کے دین کی مدد کے لئے کھڑا ہوا ہے اور جو شخص جہاد کے شرائط کے ساتھ سپرد دینے کا التزام کرتا ہے تو وہ شخص دل سے دین کی تصدیق کرتا ہے اور نور الہی

کے پھیلانے میں کوشش کرتا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس نے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے کو سامان دیا تو اس نے جہاد کے برابر ثواب حاصل کیا اور جس نے مجاہد کے پیچھے اس کے گھر کی خبر گیری کی تو اس نے بھی جہاد کیا''۔

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سب سے بہتر صدقہ اللہ کی راہ میں سایہ کے لئے خیمہ دینا ہے'' ومثل ذلک۔

میں کہتا ہوں اس میں راز یہ ہے کہ یہ عمل مسلمانوں کے نفع کا ہے جس کو ان کی مدد پہنچتی ہے اور جہاد یا صدقہ میں مسلمانوں کو نفع پہنچانا ہی مراد ہوتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسل نے فرمایا ''جو شخص اللہ کی راہ میں زخمی ہوتا ہے اور اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ اس کی راہ میں کون زخمی ہوتا ہے وہ شخص قیامت کے روز اس حال میں آئے گا کہ اس کے زخم سے خون بہتا ہوگا جس کا رنگ خون کا سا ہوگا اور اس کی خوشبو مشک کی سی ہوگی''۔

میں کہتا ہوں عمل اپنی ہیئت اور صورت کے ساتھ نفس کے ساتھ متصل ہوتا ہے اور اس عمل کے اعتبار سے زیادتی کے معنی نفس میں پیدا ہو جاتے ہیں اور جزا و سزا کا مبنی نعمت و راحت کا عمل کی مشابہ صورت میں متشکل ہونے پر ہے پس قیامت کے دن جب شہید پیش ہوگا تو اس کا عمل اس پر ظاہر ہوگا اور عمل کی صورت کے ساتھ اس پر انعام کیا جائے گا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی تفسیر میں ''جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کئے گئے ان کو مردے مت سمجھو بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے پاس رزق حاصل کرتے رہتے ہیں'' الایہ، فرمایا ہے ''ان کی روحیں سبز پرندوں کے قالب میں ہیں جن کے لئے عرش میں قندیلیں لٹکی ہوئی ہیں جہاں چاہتے ہیں جنت میں کھاتے پیتے ہیں پھر ان قندیلوں میں واپس آجاتے ہیں''۔

میں کہتا ہوں جو شخص اللہ تعالیٰ کی راہ میں مارا جاتا ہے اس میں دو باتیں جمع ہوتی ہیں ایک یہ کہ اس کی روح کامل اور وافر باقی رہتی ہے اور اس کے وہ علوم جن کے اندر اس کی روح حیات دنیوی میں مستغرق رہتی ہے ان میں کسی قسم کی کمی نہیں آتی بلکہ اس شخص کا حال ایسا ہوتا ہے جیسے کوئی شخص اپنے معاش کے کام میں مشغول ہو اور سو جائے بخلاف اس میت کے جو شدید امراض میں مبتلا رہا جس سے اس کا مزاج بدل گیا اور بہت سی باتوں کو بھول گیا، دوسری یہ کہ وہ رحمت الٰہی جو

نظام عالم کی طرف متوجہ ہوتی ہے اور جس سے حظیرۃ القدس اور ملاء اعلیٰ کے قلوب پر ہیں اس شخص کو شامل ہو جاتی ہے پس جب اس شخص کی روح نکلتی ہے اور وہ دین الٰہی کے قائم کرنے کی سعی اور کوشش سے پر ہوتی ہے تو ایک نہایت وسیع راستہ اس شخص میں اور حظیرۃ القدس میں کھل جاتا ہے اور وہاں سے انس اور نعمت اور راحت اس پر نازل ہوتی رہتی ہے اور حظیرۃ القدس کو اس کی طرف ایک توجہ مثالی ہوتی ہے اور اس کے عمل کے موافق اس کی جزا متمثل ہو جاتی ہے پس ان دونوں خصلتوں کے اجتماع سے عجیب عجیب امور پیدا ہوتے ہیں۔

ازاں جملہ یہ ہے کہ اس کا نفس کسی وجہ سے عرش میں معلق ہو کر متمثل ہوتا ہے کیونکہ وہ شخص حاملین عرش میں داخل ہو جاتا ہے اور اس کی ہمت اسی طرف متوجہ رہتی ہے۔

اور ازاں جملہ یہ ہے کہ اس کا جسم سبز پرندہ کی صورت میں متمثل ہو جاتا ہے پس اس کا پرندہ ہونا اس وجہ سے ہے کہ اس کو ملائکہ کے ساتھ وہ نسبت ہے جو اجمالاً احکام جنس کے ظاہر ہونے میں پرندوں کو زمین پر چلنے والوں کے ساتھ ہے اور سبز ہونے کی وجہ یہ ہے کہ سبزی دیکھنے میں خوشنما معلوم ہوتی ہے، اور ازاں جملہ یہ ہے کہ اس کی نعمت اور راحت رزق کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے جس طرح دنیا میں نعمت میوہ جات اور بھنے ہوئے گوشت کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے پھر اس بات کی ضرورت ہوئی کہ جو چیز تہذیب نفس کا فائدہ دیتی ہے اس کو غیر مفید شئے سے الگ کر دیا جائے اور وہ اس کے ساتھ مشابہ ہے کیونکہ شرع کے اندر دو چیزیں ہیں ایک تو قوم و شہر اور مذہب کا انتظام اور دوسرے نفوس کی تکمیل، کسی شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا بعض آدمی غنیمت کی خاطر اور بعض آدمی اظہار شجاعت کی خاطر اور بعض شہرت کی خاطر لڑتا ہے پس ان میں سے اللہ کی راہ میں کون شخص لڑتا ہے؟ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو شخص اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لئے لڑتا ہے پس وہ اس کی راہ میں لڑتا ہے''۔

میں کہتا ہوں اس کا سبب وہی ہے جو ہم پہلے بیان کر چکے کہ اعمال اجساد ہیں اور ان کی روح نیت ہے اور اعمال کا مدار نیت پر ہے اور جسم کا بغیر روح کے کچھ اعتبار نہیں ہوتا اور بسا اوقات صرف نیت ہی عمل کا فائدہ دی جاتی ہے اگرچہ اس کے ساتھ عمل کا اتصال نہ ہو جبکہ اس عمل کا فوت ہونا اس کی کوتاہی سے نہ ہو بلکہ کسی آسمانی عارضہ کے سبب سے ہو، چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

''مدینہ میں ایسے لوگ بھی ہیں کہ تم کسی جگہ پر نہ چلے اور تم نے کوئی جنگل قطع نہیں کیا مگر وہ تمہارے ساتھ تھے یہ وہ لوگ ہیں جن کو عذر نے روک دیا'' اور اگر وہ عمل اس شخص کی کوتاہی سے فوت ہوا ہو تو اس کی نیت ہی ناتمام رہی جس پر اجر مرتب ہوتا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''برکت گھوڑوں کی پیشانی میں ہے'' اور آپ نے فرمایا ''گھوڑوں کی پیشانی میں بھلائی بندھی ہوئی ہے قیامت تک اجر اور غنیمت ہے''۔

واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خلافت عامہ کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے اور آپ کے دین کا دیگر ادیان پر غلبہ جہاد اور اس کا سامان تیار کیے بغیر ممکن نہیں ہے پس جب لوگ جہاد ترک کر کے بیلوں کی دموں کے پیچھے ہو لیں گے تو ان پر ذلت محیط ہو جائے گی اور دیگر اہل مذاہب کا ان پر غلبہ ہو جائے گا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص نے اللہ تعالیٰ پر یقین رکھ کر اور اس کے وعدہ کو سچا سمجھ کر اللہ کی راہ میں گھوڑا باندھا تو اس کا شکم سیر کرنا اور اس کو پانی پلانا اور اس کی لید اور اس کے پیشاب کی تکلیف برداشت کرنا قیامت کے روز اس کے میزان عمل میں تلے گا''۔

میں کہتا ہوں اس کا سبب یہ ہے کہ وہ شخص اس کو چارہ دینے میں اور اس کو پانی پلانے میں اور اس کی لید اور اس کا پیشاب دور کرنے میں تکلیف برداشت کرتا ہے پس اس کا یہ عمل اس چیز کی صورت میں متشکل ہوگا جس کی اس نے تکلیف گوارا کی ہے پس قیامت کے روز یہ سب چیزیں اپنی صورت و ہیئت میں ظاہر ہوں گی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اللہ تعالیٰ ایک تیر کی وجہ سے تین شخصوں کو جنت میں داخل کرے گا ایک اس کا بنانے والا جس نے ثواب کی نیت سے اس کو بنایا ہے، دوسرا اس کو چلانے والا، تیسرا اس کو اٹھا کر دینے والا'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو شخص اللہ کی راہ میں ایک تیر چلائے گا تو وہ غلام کے آزاد کرنے کے برابر ہوگا''۔

میں کہتا ہوں چونکہ اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ کفار کا مغلوب ہونا بغیر ان چیزوں کے پورا نہیں ہوسکتا اس واسطے اللہ تعالیٰ کی رضامندی کفر اور ظلم کے دور کرنے میں ان چیزوں کی طرف بھی منتقل ہوئی، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ''نہ تو نابینا پر کچھ گناہ ہے اور نہ لنگڑے پر اور نہ بیمار پر'' اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ''نہ تو ضعیفوں پر کچھ گناہ ہے اور نہ بیماروں پر اور نہ ان پر جن کے پاس خرچ موجود نہیں کہ شریک جہاد نہ ہوں، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص سے فرمایا ''کیا تیرے ماں باپ

ہیں؟اس نے جواب دیا ہاں تو آپ نے فرمایا پس تو ان میں جہاد کر''۔

میں کہتا ہوں چونکہ سب لوگوں کا جہاد میں شریک ہونا ان کے کاروبار اور تدابیر ضروریہ کے فساد کا سبب تھا اس واسطے ضروری ہوا کہ سب لوگ جہاد پر نہ جائیں بلکہ بعض لوگ اس کو قائم کریں اور وہ بعض وہ لوگ ہیں جن میں یہ علتیں نہیں پائی جاتیں کیونکہ جن میں یہ علتیں پائی جاتی ہیں ان پر جہاد کرنے میں دقت ہے اور نہ اسلام کو ان کے جہاد کرنے سے قابل اعتبار نفع ہے بلکہ بعض اوقات ان سے نقصان کا اندیشہ ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے''اب اللہ تعالیٰ نے تم پر سے بوجھ ہلکا کر دیا۔ اور معلوم کرلیا کہ ابھی تم میں کسی قدر کمزوری ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اعلا کلمۃ اللہ اس کے بغیر نہیں پایا جاتا کہ مسلمان لوگ اپنے دلوں میں ثبات اور دلیری اور جنگ کی سختیوں پر صبر کرنے کو جگہ دیں، اور اگر یہ دستور جاری ہوتا کہ اگر مشقت معلوم ہو تو بھاگ جائیں تو مقصد حاصل نہ ہوتا بلکہ بعض اوقات ذلت تک نوبت پہنچتی۔

اور نیز بھاگنا بزدلی اور کمزوری کی علامت ہے اور یہ بدترین اخلاق میں سے ہے، پھر ضروری ہوا کہ اس کی کوئی حد بیان کی جائے جس سے واجب اور غیر واجب میں فرق ہو جائے اور دلیری اور شجاعت اسی وقت پائی جاتی ہے جب شکست کے اسباب غلبہ کے اسباب سے زیادہ ہوں پس اولاً دس مثل سے اس کا اندازہ کیا گیا کیونکہ اس وقت کفر اسلام سے زیادہ تھا اور مسلمان بہت ہی کم تھے پس اگر ان کو بھاگنے کی اجازت دیجاتی تو جہاد کبھی نہ پایا جاتا پھر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر دو مثل تخفیف کی کیونکہ دلیری اور ثبات اس سے کم میں نہیں پایا جاتا، پھر چونکہ جہاد اعلاء کلمۃ اللہ کے واسطے واجب ہوا ہے اس واسطے وہ چیز بھی واجب ہوئی جس کے بغیر اعلاء کلمۃ اللہ نہ ہو سکے اور اسی وجہ سے سرحدوں کا بند کرنا اور جنگ کے لئے تیار رہنا اور تمام اطراف اور ناکوں پر افسروں کا مقرر کرنا ضروری ہوا اور ایک متوارث دستور قرار پایا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفا رضی اللہ عنہم نے اس بات میں بہت سے طریقے مقرر فرمائے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی شخص کو کسی بڑے یا چھوٹے لشکر کا امیر مقرر کرتے تھے تو خاص اس کے لئے اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کی اور اس کے ساتھی مسلمانوں کو بھلائی کرنے کی نصیحت فرماتے تھے اور فرماتے تھے''اللہ کی راہ میں اللہ تعالیٰ کے نام سے جہاد کرو اور جو اللہ کا انکار کرے اس سے قتال کرو اور جہاد

کرو اور خیانت نہ کرو' الحدیث،

خیانت سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لئے منع فرمایا کہ خیانت کرنے سے مسلمانوں کی دل شکنی ہوگی اور ان میں اختلاف پیدا ہو جائے گا اور وہ قتال کو چھوڑ کر لوٹنے میں لگ جائیں گے اور ایسی باتوں سے بسا اوقات شکست ہو جاتی ہے، اور عہد شکنی سے اس لئے منع فرمایا تا کہ امن وامان ان کے عہد اور ذمہ سے مرتفع نہ ہو اور اگر امن جاتا رہے تو سب سے بڑی اور اقرب فتح یعنی ذمہ ان کے ہاتھ سے جاتا رہا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مقتول کی صورت بگاڑنے سے منع فرمایا کیونکہ اس میں اللہ کی پیدائش کا متغیر کر دینا ہے اور بچوں کے قتل سے بھی منع کیونکہ اس میں مسلمانوں پر تنگی اور ان کو ضرر پہنچانا ہے کیونکہ اگر وہ بچہ زندہ رہتا تو وہ ان کا غلام بنتا اور اسلام کا فرماں بردار ہوتا۔

اور نیز بچہ نہ اپنے دشمن کو ضرر پہنچا سکتا ہے اور نہ اپنے گروہ کی مدد کر سکتا ہے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مخالفین کو تین باتوں کی طرف ترتیب وار بلانے کا حکم فرمایا ہے ان میں سے پہلی بات یہ ہے کہ اسلام لا کر ہجرت اور جہاد کرے اور اس وقت اس شخص کے لئے غنیمت اور خراج کے مال میں سے مجاہدین کے برابر حصہ ہے، دوسرے یہ کہ بغیر ہجرت اور جہاد کے اسلام لائے بجز اس صورت کے جہاں نفیر عام اور جنگ عام ہو، اور اس وقت غنیمت اور خراج میں اس شخص کا حصہ نہیں ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ بیت المال ضروری امور میں صرف ہوتا ہے اور عادت اس بات کا حکم کرتی ہے کہ بیت المال میں اس قدر گنجائش نہیں ہوتی کہ مجاہدین کے علاوہ شہروں کے رہنے والوں کا خرچ بھی برداشت کیا جائے، پس اس میں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس قول میں کچھ مخالفت نہیں کہ اگر میں زندہ رہا تو بلاشبہ ایک چرواہے کو بھی جو حمیر کے کسی ٹیلہ پر رہتا ہے اور اس کی پیشانی پر اس غنیمت کے حاصل کرنے میں پسینہ تک نہ آیا ہو غنیمت کے مال میں سے حصہ ملے گا، یعنی جب بادشاہوں کے خزانے فتح کئے جائیں گے اور کثرت سے خراج آئے گا تو مقاتلین وغیرہم کے ۔۔۔ کے بعد ان کے لئے بھی باقی رہ جائے گا، تیسرے یہ کہ وہ لوگ اہل ذمہ ہوں اور دب کر اپنے ہاتھ سے جزیہ ادا کریں، پس پہلی بات میں دو مصلحتیں حاصل ہوتی ہیں ایک تو ملک کا انتظام اور باہمی ظلم کو رفع کرنا اور دوسرے تہذیب نفس کہ وہ دوزخ سے نجات حاصل کریں اور حکم

الٰہی کی پیروی میں کوشش کریں، اور دوسری بات میں صرف دوزخ سے نجات پانا ہے بغیر اس کے کہ ان کو مجاہدین کے درجات حاصل ہوں، اور تیسری بات میں کفار کی شوکت کا زائل ہونا اور مسلمانوں کی شوکت کا ظاہر ہونا ہے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم انہیں مصلحتوں کے قائم کرنے کے لئے مبعوث ہوئے ہیں، اور امام پر واجب ہے کہ مسلمانوں کی شوکت ظاہر ہونے کے اور کفار کے زیر کرنے کے اسباب میں غور کرے اور ان میں کوشش اور تامل کرے پس جو اس کے اجتہاد میں آئے اس پر عمل کرے بشرطیکہ وہ یا اس کی نظیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا آپ کے خلفا سے ثابت ہو اس واسطے کہ امام مصلحتوں کے قائم کرنے کے لئے مقرر کیا گیا ہے اور یہ مصلحتیں بغیر اس کے تمام نہیں ہوتیں، اور اصل اس باب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ہے۔

اور ہم اس باب کی احادیث کا حاصل بیان کرتے ہیں، پس ہم کہتے ہیں کہ امام کے لئے ضروری ہے کہ وہ مسلمانوں کی سرحدوں کو اس قدر فوج سے جو ان کے آس پاس کے دشمنوں کے لئے کافی ہو سکے محفوظ رکھے اور ان لشکروں کا سپہ سالار ایسے شخص کو مقرر کرے جو دلیر صاحب رائے اور مسلمانوں کا خیر خواہ ہو، اور اگر خندق کے کھودنے یا قلعہ کے بنانے کی ضرورت پڑے تو وہ اس کو کرے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوم خندق میں کیا تھا اور جب کسی دستہ کو بھیجے تو ان پر ایسے شخص کو سپہ سالار بنائے جو ان سب میں افضل ہو اور مسلمانوں کے لئے سب سے زیادہ نفع رساں ہو اور اس کو اس کے حق میں اور مسلمانوں کی جماعت کے حق میں بھلائی کرنے کی نصیحت کرے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے اور جب جہاد کے لئے جانے کا ارادہ کرے تو اپنے لشکر کا جائزہ لے اور سوار و پیادوں کو دیکھے پس پندرہ سال سے کم عمر والے کو فوج میں نہ لے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور تھا اور نہ اس شخص کو فوج میں لے جو مخزل ہو یعنی اس شخص کو جو اوروں کو بھی جہاد سے باز رکھے اور نہ اس شخص کو فوج میں لے جو مرجف ہو یعنی وہ جو کفار کی قوت وشوکت بیان کر کے لشکر اسلام میں رعب وخوف پیدا کرے اور اس میں دلیل اللہ کا یہ قول ہے ''اللہ تعالیٰ نے ان کا اٹھنا اور نکلنا پسند نہ کیا پس ان کو ہلنے جلنے ہی نہ دیا اور ان سے کہہ دیا گیا کہ جہاں معذور بیٹھے ہیں تم بھی ان کے ساتھ بیٹھے رہو اگر وہ تم میں شامل ہو کر نکل بھی کھڑے ہوتے تو تمہارے حق میں شرارت کرتے'' اور نہ مشرک کو فوج میں لے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا ''ہم بلا شبہ کسی مشرک سے مدد نہیں چاہتے ہاں جس وقت کہ ضرورت ہو اور اس پر اعتماد ہو، اور نہ جوان عورت کو جس سے فتنہ کا خوف ہو فوج میں لے ہاں عمر رسیدہ عورت کے لئے اجازت ہے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ام سلیم اور انصار کی چند عورتوں کے ساتھ جہاد کیا کرتے تھے جو فوجیوں کو پانی پلاتی تھیں اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں اور امام کو چاہئے کہ لشکر کے دو حصہ میمنہ اور میسرہ مقرر کرے اور ہر گروہ کا ایک جھنڈا اور ہر طائفہ کے لئے ایک سردار اور لڑانے والا مقرر کرے جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دن کیا تھا کیونکہ اس میں دشمنوں پر بھی زیادہ خوف ہوتا ہے اور فوج پر بھی قابو رہتا ہے، اور نیز ان کے لئے شناخت مقرر کرے کہ شب خوں کرتے وقت باہم اس کو بولا کریں تاکہ آپس میں ایک دوسرے کو قتل نہ کردے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے اور جمعرات یا پیر کے روز جہاد کے لئے کوچ کرے کیونکہ یہ دونوں ایسے دن ہیں جن میں اعمال پیش کئے جاتے ہیں اور ہم اس کو پہلے بیان کر چکے ہیں اور ان کو اس قدر راستہ چلائے کہ کمزور لوگ بھی اس کی طاقت رکھتے ہوں بجز ضرورت کے وقت کے اور وہ ان کے لئے ایسی جگہ تجویز کرے جو سب میں عمدہ ہو اور وہاں پانی کی کثرت ہو، اور جب دشمن کا خوف ہو تو پہرہ دار مقرر کرے اور بلند جگہ پر کچھ لوگوں کو مقرر کرے جو دشمن کو دور سے دیکھتے رہیں اور جس قدر ہو سکے اپنے حالات پوشیدہ رکھے مگر صاحب رائے اور خیر خواہ سے پوشیدہ نہ رکھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جہاد میں ہاتھ نہ کاٹے جائیں'' یعنی حد میں اور اس میں وہی راز ہے جو حضرت عمرؓ نے بیان فرمایا ہے کہ اس شخص کو غیرت شیطانی نہ لاحق ہو جائے پس وہ کفار کے ساتھ جا ملے اور نیز اس سے لوگوں میں بسا اوقات اختلاف پیدا ہو جاتا ہے اور اس سے لوگوں کی مصلحت میں خلل پڑ جاتا ہے اور امام اہل کتاب اور مجوس سے مقاتلہ کرے یہاں تک کہ وہ اسلام لے آئیں یا عاجز بن کر جزیہ دینا قبول کریں اور کسی بچہ کو یا عورت کو یا بہت بوڑھے آدمی کو قتل نہ کرے، مگر ضرورت کے وقت جیسا کہ شب خوں میں، اور نہ درخت کاٹے اور نہ ان کو جلائے اور نہ مویشیوں کو ہلاک کرے، ہاں جبکہ اس میں مصلحت ہو تو کچھ مضائقہ نہیں جیسا کہ بنی نضیر کے گاؤں بویرہ میں کیا گیا، اور نہ نقض عہد کرے اور نہ سفیر کو قید کرے کیونکہ اس سے باہمی خط و کتابت منقطع ہو جاتی ہے اور لڑائی میں دھوکا دیا کرے کیونکہ لڑائی داؤں گھات کا نام ہے اور غفلت کی

حالت میں ان پر چھاپہ مارے اور ان پر گولہ باری کرے اور ان کا محاصرہ کرے اور ان کو تنگ کرے، یہ سب باتیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں اور اس لئے کہ قتال ان امور کے بغیر نہیں ہوتا جس کی شرح کی ضرورت نہیں اور جس شخص کو اپنے نفس پر بھروسہ ہو اس کو امام کی اجازت سے لڑنا جائز ہے جیسا کہ حضرت علی اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہما نے کیا اور مسلمانوں کو چارہ اور اناج جو مخالفین سے حاصل ہو بلا خمس نکالے تصرف کرنا جائز ہے اس لئے کہ اگر اس کی اجازت نہ دی جائے تو لوگوں کو دقت ہو اور جب مخالفین قید ہو کر آئیں تو امام کو چار باتوں میں سے ہر بات کا اختیار ہے چاہے قتل کرے چاہے فدیہ لے، چاہے احسان رکھ کر چھوڑ دے اور چاہے غلام بنالے ان میں سے جو زیادہ نافع ہو عمل میں لائے اور امام کے لئے جائز ہے کہ ان سب کو یا ان میں سے بعض کو امن دیدے اور اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے ''اگر مشرکین میں سے کوئی پناہ مانگے تو اس کو پناہ دے'' اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا اسلام میں داخل ہونا مسلمانوں کے ساتھ میل جول کرنے اور ان کے دلائل کو سننے اور ان کی سیرت کو معلوم کرنے کے بغیر ممکن نہیں ہے اور نیز بسا اوقات تجار وغیرہ کی آمد ورفت کی ضرورت ہوتی ہے اور امام کو اختیار ہے کہ مال لیکر یا بغیر مال لئے ان سے صلح کرلے کیونکہ بسا اوقات مسلمانوں کو کفار سے مقاتلہ کی طاقت نہیں ہوتی پس ان کو صلح کی ضرورت پڑتی ہے اور بسا اوقات مسلمانوں کو مال کی ضرورت ہوتی ہے کہ اس کے ذریعہ قوت حاصل کریں یا ایک قوم کے شر سے بچ کر دوسری قوم سے قتال کی ضرورت پڑتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''قیامت کے دن تم میں سے کسی کو ایسا نہ پاؤں کہ اس کی گردن پر اونٹ ہو اور بخ بخ کرتا ہو اور وہ شخص کہتا ہو یا رسول اللہ میری مدد کیجئے تو میں اس سے کہوں مجھے تیرے لئے کسی بات کا اختیار نہیں ہے میں تجھ کو احکام سنا چکا تھا'' اور اسی کے مثل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ہے کہ ''اس کی گردن پر گھوڑا اہنہناتا ہو اور بکری ممیاتی ہو اور کوئی شخص گردن پر سوار ہو اور وہ چیختا ہو اور اس کی گردن پر کپڑے ہوں کہ حرکت کرتے ہوں''۔

میں کہتا ہوں اس میں اصل یہ ہے کہ گناہ جس چیز میں واقع ہوا ہے اسی کی صورت میں وہ متمثل ہوگا اور اس کا اٹھانا اس لئے ہوگا کہ اس سے تکلیف اور ایذا پہنچے اور ان چیزوں کی آواز اس لئے ہوگی کہ اس کا وہ گناہ لوگوں کے سامنے ظاہر اور مشہور ہو جائے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

''جب تم کسی شخص کو پاؤ کہ اس نے مال غنیمت میں خیانت کی ہے تو اس کا سب اسباب جلا دو اور اس کو مارو'' حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما نے اس پر عمل کیا ہے۔

میں کہتا ہوں اس میں راز خائن کو سرزنش کرنا اور لوگوں کو ایسے فعل سے باز رکھنا ہے۔

واضح ہو کہ جو مال کفار سے لئے جاتے ہیں اس کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ مال ہے جو گھوڑوں اور اونٹوں کے دوڑانے اور قتال کی مشقت برداشت کرنے سے حاصل ہوتا ہے ایسے مال کو غنیمت کہتے ہیں اور ایک وہ مال ہے جو بغیر قتال کے کفار سے حاصل ہوتا ہے جیسے جزیہ، خراج اور عشور جو ان کے تجار سے لئے جاتے ہیں اور وہ مال جو صلح میں کفار دیتے ہیں یا پریشان ہو کر اس کو چھوڑ بھاگتے ہیں۔ پس غنیمت کے پانچ حصے کئے جائیں گے اور پانچواں حصہ ان مواضع میں خرچ کیا جائے گا جن کا اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ذکر فرمایا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''اور جان لو جو چیز تم کفار سے لوٹ کر لاؤ اس میں سے پانچواں حصہ اللہ تعالیٰ کا اور اس کے رسول کا اور اہل قرابت کا اور یتیموں کا اور محتاجوں کا اور مسافروں کا ہے'' پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حصہ آپ کے بعد مسلمانوں کے اہم امور میں بالترتیب خرچ کرنا چاہئے، اور اہل قرابت کا حصہ بنی ہاشم اور بنی مطلب میں ان کے فقیر اور امیر اور مرد اور عورت پر خرچ کرنا چاہئے اور میرے نزدیک مقداروں کے معین کرنے میں امام کو اختیار ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ آل رسول کے حصہ میں بیت المال سے زیادہ کر دیتے تھے اور ان میں سے جو لوگ مقروض نکاح کرنے والے اور حاجت مند ہوتے تھے ان کی اعانت کیا کرتے تھے اور یتیموں کا حصہ چھوٹے چھوٹے محتاج بچوں کو جن کا باپ نہ ہو دیا جائے، اور فقرا اور مساکین کا حصہ ان کو دیا جائے ان سب باتوں کا امام کو اختیار ہے کہ وہ حصہ کے بارے میں اور اہم کو مقدم کرنے میں اجتہاد کرے اور اجتہاد سے جو اس کو معلوم ہو اس پر عمل کرے اور غنیمت کے پانچ حصوں میں سے باقی چار حصے مجاہدین میں تقسیم کرے امام سب سے پہلے لشکر کے حال میں غور کرے پس جس کو زیادہ دینا مسلمانوں کی مصلحت کے موافق ہو تو اس کو زیادہ دے اور اس کی تین صورتیں ہیں ایک یہ ہے کہ امام دارالحرب میں داخل ہو کر مثلاً ایک چھوٹی سی جماعت کو کسی گاؤں پر دھاوا کرنے کے لئے روانہ کرے پس خمس کے بعد چہارم یا تہائی ان کے لئے مقرر کر دے پس یہ جماعت وہاں سے جو کچھ لائے اس میں سے خمس نکال کر باقی

کا ربع یا ثلث اس جماعت کو دیدے اور اس کے بعد جو باقی رہے وہ غنیمت میں شامل کر دے، دوسری صورت یہ ہے کہ امام اس شخص کے لئے کسی ایسے کام پر جس میں مسلمانوں کا بھلا ہو کوئی انعام مقرر کر دے مثلاً امام کہہ دے کہ جو شخص اس قلعہ پر چڑھے گا اس کو اس قدر مال ملے گا یا جو کسی کو قید کر کے لائے گا تو اس کو یہ انعام ملے گا یا جو کسی کو مارے گا اس کو اس کا سامان دیا جائے گا، پس اگر مسلمانوں کے مال میں سے دینا شرط کیا ہے تب تو اس میں سے دے اور اگر غنیمت میں سے دینا شرط کیا ہے تو پانچواں حصہ نکالنے کے بعد جو باقی رہا ہے اس میں دے، اور تیسری صورت یہ ہے کہ امام بعض مجاہدین کو اس کی مشقت اور عرق ریزی کی وجہ سے کسی شئے کے ساتھ مخصوص کر دے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ ذی قرد میں سلمہ بن الاکوع کو سوار و پیدل کا حصہ عطا فرمایا کیونکہ ان کی ذات سے مسلمانوں کو بہت نفع پہنچا تھا، اور میرے نزدیک صحیح تر یہ ہے کہ مقتول کے سامان کا قاتل مستحق ہے خواہ قتل سے قبل امام کے مقرر کرنے سے یا قتل کے بعد نفل کے طور پر دینے سے، اور امام کو چاہئے کہ حصہ سے کم کسی قدر مال ان عورتوں کے لئے علیحدہ کر لے جو مریضوں کی دوا دارو کرتی ہیں اور ان کا کھانا پکاتی ہیں اور مجاہدین کا کام کرتی ہیں، اور غلاموں اور بچوں اور اہل ذمہ کو بھی دے جن کو امام نے اجازت دی تھی، بشرطیکہ ان سے مجاہدین کو نفع پہنچا ہو اور اگر امام کو یہ معلوم ہو کہ مال غنیمت میں سے کچھ مال کسی مسلمان کا ہے جس کو کفار چھین کر لے گئے تھے تو بغیر کچھ لئے وہ مال اس مسلمان کو واپس کر دے پھر باقی مال کو ان لوگوں میں جو لڑائی میں شریک تھے اس طرح تقسیم کر دے کہ سوار کو تین حصے اور پیدل کو ایک حصہ۔

اور میری رائے میں یہ درست ہے کہ اگر امام مناسب سمجھے کہ شتر سواروں کو یا تیر اندازوں کو کچھ زیادہ حصہ دے یا گھوڑے کے سوار کو خچر کے سوار سے کسی قدر مال جو حصہ سے کم ہو زیادہ دے تو وہ ایسا کر سکتا ہے بعد اس کے کہ اس نے اہل الرائے سے اس کے بارے میں مشورہ کر لیا ہو اور وہ ایسا امر ہو جس کی وجہ سے کوئی شخص امام سے اختلاف نہ کرے اور اسی قول سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کی سیرت میں جو اس باب میں اختلاف ہے اس میں تطبیق ہو سکتی ہے، اور جس شخص کو امام لشکر کی مصلحت سے روانہ کرے جیسے قاصد یا طلیعہ یا جاسوس تو امام اس کو بھی حصہ دے اگر چہ وہ لڑائی میں موجود نہ تھا جیسا کہ جنگ بدر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمانؓ کو

غنیمت میں حصہ دیا۔

اور مال فیئ (۱) کا مصرف وہ مواضع ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بیان فرمایا ہے ''جو مال اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو دیہات والوں سے دلوایا ہے وہ اللہ اور پیغمبر اور پیغمبر کے قرابت والوں اور یتیموں اور حاجتمندوں اور مسافروں کے لئے ہے الی قولہ ''روف الرحیم'' اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب یہ آیت پڑھی تو کہا اس نے تمام مسلمانوں کا احاطہ کرلیا ہے پس امام جہاں زیادہ ضرورت دیکھے اس کو صرف کرے اور اس میں مسلمانوں کی عام مصلحتوں کی طرف غور کرے نہ کہ اپنی کسی خاص مصلحت کی طرف۔

اور فیئ کی تقسیم کرنے کی کیفیت میں احادیث مختلف ہیں پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جس روز مال فیئ آتا آپ اسی روز اس کو تقسیم کردیتے پس شادی شدہ کو دو حصہ اور غیر شادی شدہ کو ایک حصہ دیتے تھے، اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حر اور غلام میں بقدر حاجت تقسیم کرتے تھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دفتر (۲) مقرر کیا تھا جس میں سابقین اور حاجتمندوں کی رعایت کی جاتی تھی پس آدمی کی قدامت اسلام اور اس کی مصیبت اور عیال داری اور اس کی ضرورت کا لحاظ کیا جاتا تھا اور ایسے اختلافات میں اصل یہ ہے کہ یہ اس بات پر محمول ہیں کہ ہر ایک نے اپنے اجتہاد کے موافق کیا اور اپنے وقت میں جیسی مصلحت مناسب سمجھی اس پر عمل کیا اور جن اراضی پر مسلمانوں کا غلبہ ہوگیا ان میں امام کو اختیار ہے چاہے مجاہدین میں تقسیم کردے اور چاہے ان اراضی کو غازیوں پر وقف کردے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر میں کیا تھا کہ نصف زمین کو تقسیم کردیا تھا اور نصف کو وقف کردیا تھا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ارض سواد (۳) کو وقف کیا تھا اور اگر امام چاہے تو مسلمانوں کی رعیت بنا کر کفار کو وہاں رہنے دے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ رضی اللہ عنہ کو یہ حکم دیا تھا کہ ہر بالغ سے ایک دینار یا اس کے برابر یمنی کپڑا اخذ کریں، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مالداروں پر اڑتالیس درہم اور متوسط لوگوں پر چوبیس درہم اور غریب پر جو مزدوری کرتا ہو بارہ درہم مقرر کئے تھے۔

اور یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس امر میں اندازہ امام کی رائے پر موقوف ہے جیسی مصلحت

---

(۱) وہ مال جو بلا جنگ کئے حاصل ہوجائے۔ (۲) دیوان۔ (۳) بمقام خیبر

دیکھے عمل میں لائے اور اسی لئے اس امر میں ان کے عمل مختلف پائے گئے ہیں اور میرے نزدیک یہی حکم مقادیر خراج اور ان سب امور میں ہے جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفا رضی اللہ عنہم کی عادات مختلف پائی گئی ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے غنیمت اور فئے کو اسی وجہ سے مباح کیا ہے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا کہ "ہم سے پیشتر کسی کے لئے غنیمت حلال نہ تھی اس واسطے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ہمارے اندر ضعف اور عجز دیکھا تو غنائم کو ہمارے لئے حلال کر دیا۔

اور آپ نے فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ نے میری امت کو تمام امتوں پر فضیلت دی اور ہمارے لئے غنائم کو حلال کر دیا"۔

اور قسم اول میں ہم اس کی شرح کر چکے ہیں پس اب ہم اس کا اعادہ نہیں کرتے اور مصارف میں اصل یہ ہے کہ اصول مقاصد کے چند امور ہیں از آں جملہ ان لوگوں کا باقی رکھنا جو کسی چیز پر قادر نہیں ہیں خواہ اپاہج ہونے کی وجہ سے یا تنگدست ہونے کی وجہ سے یا اس وجہ سے کہ وہ اپنے مال سے بعید ہو گئے ہیں۔

اور ازاں جملہ شہر کی سرحدیں مضبوط کر کے اور لشکر اور ہتھیاروں اور گھوڑوں کا خرچ برداشت کر کے کفار کے شر سے محفوظ رکھنا ہے۔

اور ازاں جملہ شہر کا انتظام کرنا اور نگہبان اور قاضی اور محاسبین مقرر کر کے اور سرحدین قائم کر کے شہر کا بندوبست کرنا ہے اور ازاں جملہ خطیب اور واعظین اور ائمہ اور مدرسین مقرر کر کے دین کی حفاظت کرنا ہے اور ازاں جملہ منافع مشترکہ میں مثلاً نہروں کا کھدوانا اور پل تعمیر کرانا وغیرہ۔

دوسرے یہ کہ شہر دو قسم کے ہیں ایک تو وہ شہر ہیں جن میں صرف اہل اسلام رہتے ہیں جیسے زمین حجاز یا وہاں دوسری قوموں کے مقابلہ میں اہل اسلام کی کثرت ہے، دوسرے وہ شہر ہیں جن کے باشندے اکثر کفار ہیں اور تلوار کی طاقت سے یا صلح کر کے مسلمانوں نے ان شہروں کو فتح کر لیا ہے دوسری قسم کے شہروں کے لئے فوج رکھنے کی اور ہتھیاروں کے جمع کرنے کی اور قاضی اور پولیس اور عمال مقرر کرنے کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے اور پہلی قسم کے شہروں کو ان چیزوں کی بہت

زیادہ ضرورت نہیں ہوتی اور شرع یہ چاہتی ہے کہ بیت المال میں جو کچھ جمع ہے وہ ان شہروں پر مناسب طریقہ پر اور حسب حاجت تقسیم کیا جائے پس زکوٰۃ اور عشر کا مصرف وہ مقرر کیا گیا جس میں دوسروں کی بہ نسبت محتاجوں کی کفایت زیادہ ہے اور غنیمت اور فیئے کا مصرف وہ قرار دیا گیا جس میں لشکر اسلام کی تنخواہ اور دین کی حفاظت اور شہر کا انتظام زیادہ تر ہے اسی وجہ سے غنیمت اور فیئے میں سے یتیم، مسکین اور فقیر کا حصہ بہ نسبت ان کے صدقات کے حصہ کے کم مقرر کیا گیا اور مجاہدین کا حصہ بہ نسبت صدقات کے حصہ کے غنیمت اور فیئے میں سے زیادہ مقرر کیا گیا، پھر چونکہ غنیمت بغیر مشقت برداشت کئے اور بغیر گھوڑے دوڑائے اور فوج کو لڑائے حاصل نہیں ہوتی اس واسطے ان کے دل بغیر اس کے خوش نہیں ہو سکتے کہ غنیمت میں سے ان کو حصہ دیا جائے، اور شرائع کلیہ میں جو سب لوگوں پر مقرر کی گئی ہیں یہ بات ضروری ہے کہ عامۃ الناس کے حال پر نظر کی جائے اور رغبت عقلیہ کے ساتھ رغبت طبیعہ کو بھی ملایا جائے اور ان کی رغبت طبعی اس میں ہوتی ہے کہ ان کو قتال کے عوض کچھ مال ملے، پس اسی وجہ سے مال غنیمت کے پانچ حصوں میں سے چار حصے غازیوں کے لئے مقرر ہوئے اور فیئے بغیر جنگ کئے صرف رعب سے حاصل ہوتی ہے پس مخصوص لوگوں پر اس کا صرف کرنا ضروری نہیں ہے اس واسطے اس میں مناسب یہ ہے کہ اہم امور کو مقدم کیا جائے اور خمس میں اصل یہ ہے کہ ایام جاہلیت میں چوتھائی حصہ لینے کا قدیمی دستور تھا جس کو رئیس القوم اور اس کی جماعت لیتی تھی پس یہ بات ان کے دلوں میں جگہ پکڑ گئی تھی اور وہ اس سے اپنے دلوں میں کوئی تنگی بھی نہیں پاتے تھے اور اسی کے بیان میں ایک شاعر کہتا ہے، شعر (۱)

ہر لوٹ میں ہمارا چہارم حصہ ہے
خواہ وہ نجد میں ہو خواہ تہائم کی زمین میں ہو

پس اللہ تعالیٰ نے شہر اور دین کی ضروریات کے لئے ان کی عادت کے قریب قریب خمس کو مقرر فرمایا جس طرح اللہ تعالیٰ نے انبیا علیہم السلام پر ان کی عادت شائعہ ذائعہ کے قریب قریب آیات کو نازل فرمایا، اور وہ چوتھائی حصہ قوم کے سردار اور اس کی جماعت کو ان کی عظمت ثابت

---

(۱) وان لنا المرباع من کل غارۃ
تکون بنجد او بارض التہائم

کرنے کے لئے ملا کرتا تھا اور نیز اس وجہ سے ملتا تھا کہ وہ عام لوگوں کے امور میں مصروف رہتے تھے اور ان کو بہت سے اخراجات کی ضرورت رہتی تھی پس اللہ تعالیٰ نے وہ پانچواں حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مقرر فرمایا کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگوں کے کاموں میں مشغول ہونے کی وجہ سے اتنی فراغت حاصل نہ ہوتی تھی کہ اپنے اہل وعیال کے لئے کسب کرتے اس واسطے ضروری ہوا کہ آپ کا نفقہ مسلمانوں کے مال میں مقرر ہو، اور نیز فتح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا اور آپ کے رعب کی وجہ سے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمایا تھا حاصل ہوتی تھی پس آپ کا حال ایسا ہوا جیسے کہ آپ ہر جنگ میں موجود رہے اور وہ پانچواں حصہ آپ کے اقارب کے لئے بھی ہے کیونکہ سب لوگوں سے زیادہ اس میں اسلام کی حمیت ہے اس واسطے کہ ان میں حمیت دینی کے ساتھ حمیت نسبی بھی موجود ہے کیونکہ ان کا سارا فخر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کے بلند ہونے میں ہے اور نیز اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت کی تعظیم پائی جاتی ہے اور یہ ایسی مصلحت ہے جو دین سے متعلق ہے اور جب علما اور قرا کی توقیر میں دین کی تعظیم ہے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اقارب کی تعظیم میں بدرجہ اولیٰ دین کی تعظیم ہے اور وہ پانچواں حصہ محتاجوں کے لئے بھی ہے اور اللہ تعالیٰ نے محتاجوں کا انضباط مساکین اور فقرا اور یتامی کے ساتھ فرمایا اور یہ بھی ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پانچواں حصہ میں سے مؤلفۃ القلوب (۱) وغیرہم کو بھی دیا ہے، اس تقدیر پر ان پانچ مصارف کا خاص طور پر قرآن کے اندر ذکر کرنا ان کے اہتمام شان کی وجہ سے اور اس بات کی تائید کرنے کے لئے ہے کہ خمس اور فئے کو یکے بعد دیگرے مالدار لوگ محتاجوں کی پرواہ نہ کر کے نہ لے لیا کریں اور تاکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اقارب کی نسبت بدگمانی کا باب بند ہو جائے اور انعامات اور بخشش اس واسطے مقرر کی گئی کہ بسا اوقات انسان بغیر طمع کے ہلاکت کی جگہ میں اپنے آپ کو نہیں ڈالتا ہے اور یہ ایسی خصلت اور لوگوں میں طبعی شئے ہے جس کی رعایت ضروری ہے اور گھوڑے سوار کے لئے تین حصے اور پیدل کے لئے ایک حصہ اس لئے مقرر کیا گیا کہ سوار مسلمانوں کی طرف سے بہت کام آتا ہے اور اس کو زیادہ مشقت جھیلنی پڑتی ہے اور اگر تم لشکروں کا

---

(۱) یہ وہ لوگ ہیں جو دین میں سست ہیں ان کی تالیف قلوب اس لئے کی جاتی ہے کہ دین پر قائم اور مستحکم ہو جائیں یہ حکم آج بھی موجود ہے۔ قاسمی

حال دیکھوتو تم کواس بات میں کچھ شک نہ ہوگا کہ اگر سوار کو پیدل کے حصہ سے سہ چند نہ دیا جائے اور کچھ کمی کی جائے تو اس کا دل خوش نہ ہوگا اوراس کی مشقت کے اعتبار سے وہ ناکافی ہوگا، تمام عرب وعجم باوجود اختلاف احوال وعادات کے اس بات پر متفق ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اگر میں انشاء اللہ زندہ رہا تو جزیرہ عرب سے یہود ونصاریٰ کونکال دوں گا اور مشرکین کو وہاں سے نکال دینے کی میں وصیت کرتا ہوں''۔

میں کہتا ہوں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ معلوم تھا کہ زمانہ کا حال یکساں نہیں رہتا پس ایک وقت ایسا آئے گا کہ اسلام میں ضعف آجائے گا اوراس کی جمعیت منتشر ہوجائے گی پس ایسے وقت میں دشمن کا اسلام کے مرکز میں اوراس کے گھر میں اگر قیام رہا تو وہ حرمات الٰہی کی ہتک اور ان کی قطع کا باعث ہوگا اس واسطے آپ نے دارالعلم کے حوالی اور محل بیت اللہ سے نکالنے کا حکم دیا، اور نیز کفار کے ساتھ مخالطت سے دین کی خرابی اور نفس میں تغیر ہوتا ہے اور چونکہ تمام ملکوں میں اختلاط ضروری تھا اس واسطے صرف حرمین شریفین کوان سے پاک کرنے کا حکم فرمایا، اور نیز اخیر زمانہ میں دین کا جو حال ہونے والا تھا آپ پر وہ ظاہر ہوگیا چنانچہ آپ نے فرمایا ''دین مدینہ کی طرف سمٹ کر آئے گا'' الحدیث، اور یہ بات بغیراس کے پوری نہیں ہوسکتی کہ مدینہ میں دیگر مذاہب کا کوئی آدمی نہ رہے(۱)، واللہ اعلم۔

---

(۱) مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ دونوں حرم ہیں، مکہ مکرمہ کواللہ تعالیٰ اور مدینہ منورہ کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حرم قرار دیا تھا۔ ان دونوں مقام پر مشرکین وکفار کا داخلہ ممنوع ہے۔ (قاسمی)

معیشت سے متعلق چند ابواب

واضح ہو کہ تمام اقالیم صالحہ کے باشندے اپنے کھانے پینے اور پہننے اور قیام ونشست اور دیگر ہیئات واحوال میں آداب کے ملحوظ رکھنے میں متفق ہیں اور یہ ایک ایسا امر ہے کہ بوقت سلامت مزاج اور ظہور مقتضیات نوع بوقت اجتماع افراد اور ایک دوسرے کے دیکھا دیکھی کے لحاظ سے گویا انسان کی فطرت میں داخل ہے، اور ان آداب کے ملحوظ رکھنے میں لوگوں کے طریقے مختلف ہیں، پس ان میں سے بعض ایسے ہیں جو حکمت طبیعہ کے قواعد کے موافق ان آداب کو ملحوظ رکھتے ہیں پس تمام احوال وافعال میں ان آداب کو اختیار کرتے ہیں کہ طب اور تجربہ کے اعتبار سے ان میں نفع کی امید ہوتی ہے اور ضرر کا خوف نہیں ہوتا اور بعض احسان کے قوانین کے موافق جس طرح ان کا مذہب ان کو حکم کرتا ہے آداب کو عمل میں لاتے ہیں اور بعض کو اپنے بادشاہوں اور حکما اور درویشوں کے آداب کی نقل مقصود ہوتی ہے اور بعض دیگر طریقوں سے ان آداب کو عمل میں لاتے ہیں، اور ان میں سے بعض آداب میں منافع ہیں جن پر آگاہ کرنا اور ان منافع کے لحاظ سے ان کا حکم دینا ضروری ہے اور بعض آداب میں مفاسد ہوتے ہیں جن کی وجہ سے ان سے منع کرنا اور ان پر آگاہ کرنا ضروری ہے اور بعض آداب میں دونوں باتوں میں سے ایک بات بھی نہیں پائی جاتی اس واسطے ان کو مباح رکھنا اور ان میں اجازت دینا ضروری ہے پس ان آداب سے بحث کرنا اور ان کی تفتیش کرنا من جملہ ان مصلحتوں کے ایک مصلحت ہے جن کے لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے ہیں اور اس کے اندر اصل چند امور ہیں، از آں جملہ یہ ہے کہ ان اشغال میں مصروف ہونے سے ذکر الٰہی سے نسیان ہوتا ہے اور دل کی صفائی میں کدورت پیدا ہوتی ہے پس

ضروری ہے کہ اس زہر کا علاج کسی تریاق سے کیا جائے اور وہ تریاق یہ ہے کہ ان اشغال سے پہلے اور ان کے بعد اوران کے ساتھ ایسے اذکار مسنون کیے جائیں جو قلب کو ان اشغال میں منہمک ہونے سے باز رکھیں اس طور پر کہ ان اذکار میں وہ باتیں ہوں جو منعم حقیقی کو یاد دلائیں اور جانب قدس کی طرف فکر کو متوجہ کریں۔

اور از آں جملہ یہ ہے کہ بعض افعال وہیئات شیاطین کے مزاجوں کے ساتھ مناسبت رکھتے ہیں اس طور پر کہ وہ شیاطین کسی شخص کے خواب یا بیداری کی حالت میں نظر آئیں تو ان افعال میں سے بعض کے ضرور مرتکب ہوں پس انسان کا ایسے افعال کے ساتھ متلبس ہونا شیاطین سے قرب کا اور شیاطین کے اوصاف قبیحہ کا لوگوں کے دلوں میں منقش ہونے کا سبب ہے پس ضروری ہے کہ ان افعال سے منع کیا جائے خواہ نہی بطور کراہت ہو یا بطور تحریم جس طرح مصلحت کا مقتضی ہو اور وہ افعال یہ ہیں مثلاً ایک جوتا پہن کر چلنا اور بائیں ہاتھ سے کھانا، اور اسی طرح بعض افعال ایسے ہوتے ہیں جن کی وجہ سے شیاطین دور ہوتے ہیں اور ملائکہ سے قرب ہوتا ہے مثلاً گھر میں داخل ہوتے وقت اور نکلتے وقت اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا، پس ایسے افعال پر رغبت دلانا ضروری ہے اور از آں جملہ ان ہیئات سے اجتناب کرنا ہے جن میں تجربہ سے لوگوں کو ایذا پہنچتی ہے جیسے بغیر پردہ کے چھت کے اوپر سونا اور سوتے وقت چراغ گل نہ کرنا چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ''چوہا بتی کو لے جاتا ہے اور گھر کو آگ لگا دیتا ہے، اور از آں جملہ عجمیوں کے ساتھ ان امور میں مخالفت کرنا ہے جن کے وہ عادی ہو گئے ہیں جیسے حد سے زیادہ تکلف کرنا اور دنیاوی زندگی پر نہایت درجہ مطمئن ہونا جو لوگوں کو ذکر الٰہی سے غافل کردے اور طلب دنیا کی از حد حرص پیدا کردے اور لذات کو ان کے نفوس پر منقش کردے پس ضروری ہے کہ لوگوں کے تکلفات میں جو سب سے بڑھ کر ہیں ان کو خاص طور پر حرام قرار دیا جائے جیسے حریر اور قسی اور میاثر (۱) اور ارجوان اور وہ کپڑے جن میں تصاویر بنی ہوں اور سونے چاندی کے برتن اور زعفران کے رنگے ہوئے کپڑے اور غازہ وغیرہ ذالک اور ان کی دیگر عادات کو عام طور پر مکروہ قرار دیا جائے اور عیش کی اکثر چیزوں کے ترک کرنے کو مستحب قرار دیا جائے۔

---

(۱) ریشمی کپڑوں کی قسمیں ہیں۔ جن کے استعمال میں تعیش پیدا ہوتے ہیں۔

اور از آں جملہ ان ہیئات سے بچنا ہے جو وقار کے منافی ہیں اور انسان کو دیہاتیوں میں لاحق کر دیتی ہیں ان لوگوں میں سے جو احکام نوع کے لئے فارغ نہیں ہوئے ہیں تاکہ افراط اور تفریط میں میانہ روی حاصل ہو۔

کھانے اور پینے کی چیزوں کا بیان

واضح ہو کہ جب انسان کی سعادت ان اخلاق اربعہ کے اندر ہے جن کو ہم نے ذکر کیا ہے اور اس کی شقاوت ان کے اضداد کے اندر ہے تو حفظ صحت نفسانیہ اور دفع امراض نفسانیہ نے یہ واجب کر دیا کہ ان اسباب کو تلاش کیا جائے جن سے اس کا مزاج دونوں جہتوں میں سے ایک کی طرف متغیر ہوتا ہے پس منجملہ ان کے وہ افعال ہیں جن کے ساتھ نفس متصف ہوتا ہے، اور وہ افعال نفس کی ذات میں پیوست ہو جاتے ہیں اور اس باب کی کافی مقدار سے ہم بحث کر چکے ہیں۔

اور ان میں سے ایک وہ امور ہیں جو نفس کے اندر ہیئات دنّیہ پیدا کرتے ہیں جو شیاطین کے ساتھ مشابہت اور ملائکہ سے بعد پیدا ہونے کا سبب ہوتے ہیں اور اخلاق حمیدہ کے خلاف صفات پیدا کرتے ہیں خواہ ان کو اس بات کا شعور ہو یا نہ ہو، پس وہ نفوس ملاء اعلیٰ سے ملحق ہیں اور الواث بہیمیہ سے دور ہیں ملاء اعلیٰ کی جانب سے ان امور کی کراہت کا ادراک اس طرح کرتے ہیں جس طرح طبیعت تلخ اور کسیلی چیز کی کراہت کا ادراک کرتی ہے اور اللہ تعالیٰ کا لطف اور اس کی رحمت جو لوگوں کے ساتھ متعلق ہے اس کا مقتضیٰ یہ ہے کہ ان امور کے اصول سے لوگوں کو مکلّف کیا جائے جو ان میں سے منضبط ہیں اور ان کا اثر ظاہر ہے کسی پر مخفی نہیں ہے اور چونکہ بدن کے تغیر اور اخلاق کے تغیر کے اسباب میں سے زیادہ تر قوی سبب غذا ہے اس واسطے ضروری ہوا کہ وہ اصول غذا کے لحاظ سے ہوں پس ان میں سب سے زیادہ موثر ایسے جانور کا کھانا ہے جس کی صورت میں کوئی قوم مسخ کی گئی ہے اس واسطے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی انسان پر لعنت کرتا ہے اور اس پر ناراض ہوتا ہے تو اس کے غضب اور لعنت سے انسان کے اندر ایسا مزاج پیدا ہوتا ہے جو سلامت مزاج انسانی سے نہایت دور اور بعید ہوتا ہے یہاں تک کہ وہ شخص انسان کی صورت نوعیہ سے بالکل خارج ہو جاتا ہے پس وہ بدن انسان کو عذاب دینے کی صورتوں میں سے ایک صورت ہے اور ایسے وقت میں اس کا مزاج انسانی صورت سے نکل کر کسی خبیث جانور کے مشابہ ہو جاتا ہے جس سے

طبیعت سلیمہ نفرت کرتی ہے پس ایسے حال میں اس کے لئے یہ کہا جاتا ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ نے بندر اور سور کی صورت میں مسخ کر دیا اور حظیرۃ القدس میں یہ علم متمثل ہوتا ہے کہ حیوان کی اس نوع میں اور انسان کے مغضوب علیہ اور بعید از رحمت ہو جانے میں مناسبت خفیفہ ہے اور اس میں اور اس طبیعت سلیمہ میں جو اپنی فطرت پر باقی ہے نہایت درجہ بعید ہے پس ضرور ایسے جانور کو کھانا اور اس کو اپنے جسم کا جز بنانا نجاستوں کے ساتھ آلودہ ہونے سے اور غضب الٰہی کو بھڑکانے والے افعال سے زیادہ برا ہے۔

اس وجہ سے حظیرۃ القدس کے ترجمان حضرت نوحؑ اور ان کے بعد تمام انبیا علیہم السلام خنزیر کو حرام کرتے آئے ہیں اور اس سے دور رہنے کی تاکید کرتے رہے ہیں حتیٰ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہوگا اور وہ اس کو قتل ہی کر ڈالیں گے اور غالباً خنزیر کو کوئی قوم کھاتی تھی پس شرائع نے اس سے منع کیا اور اس کے ترک کا شدت کے ساتھ حکم دیا گیا اور بندر اور چوہا ایسے جانور ہیں کہ کبھی ان کو کسی قوم نے نہیں کھایا اس واسطے ان سے نہی کرنے میں تاکید شدید کی حاجت نہ ہوئی۔(۱) اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے گوہ کے بارے میں فرمایا ''اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل کے کسی قبیلہ پر ناراض ہوا پس ان کو ان جانوروں کی صورت میں مسخ کر دیا جو زمین پر چلتے ہیں پس مجھے معلوم نہیں کہ گوہ بھی شاید انہیں میں سے ہو'' اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''ان میں سے کر دیا بندر اور خنزیر اور شیطان کی پرستش کرنے والے'' اور اسی کے مثل وہ ہے جو وارد ہوا ہے کہ جس زمین میں خسف (۲) یا عذاب نازل ہوا ہے اس زمین میں ٹھیرنا مکروہ ہے اور اسی طرح اس قوم کی صورت بنانا بھی مکروہ ہے جن میں غضب الٰہی ہوا کیونکہ ان اشیا کے ساتھ اختلاط کرنا نجاسات کے ساتھ اختلاط کرنے سے کم نہیں ہے اور نہ ان اشیا کے ساتھ تلبس کا اثر ان ہیئات کے اثر سے کم ہے جن کا مزاج شیطانی تقاضا کرتا ہے، اور ان کے بعد ان جانوروں کا کھانا ہے جن کی فطرت میں ایسے اخلاق پائے جاتے ہیں جو ان اخلاق کے برخلاف ہیں جو انسان سے مطلوب ہیں حتیٰ کہ ان کی طرف سے کسی ضرورت سے متوجہ ہوتے ہیں اور وہ ضرب المثل ہیں اور طبائع سلیمہ ان کو خبیث جانتی ہیں اور ان کے کھانے سے اعراض کرتی ہیں ہاں مگر وہ لوگ جو کسی شمار میں نہیں ہیں۔

---

(۱) چینی لوگ انہیں کھاتے ہیں۔(قاسمی) (۲) زمین میں دھنسانا۔

اور وہ جانور جس میں یہ معنی پورے پائے جاتے ہیں اور اس میں اس کا ظہور بین ہے اور تمام عرب وعجم نے اس کو مان لیا وہ چند ہیں۔

ازآں جملہ وہ درندے جانور ہیں جن کی جبلت میں پھاڑنا، زخمی کرنا حملہ کرنا اور سخت دلی ہے اسی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''کیا اس کو بھی کوئی کھاتا ہے'' اور ازآں جملہ وہ حیوانات ہیں جن کی جبلت میں آدمیوں کو ایذا دینا اور ان سے کسی چیز کا اچک لینا اور حملہ کرنے کے لئے فرصت کا منتظر رہنا ہے اور اس میں الہام شیطانی کا قبول کرنا ہے جیسے کوا اور چیل اور چھپکلی اور مکھی اور سانپ اور بچھو وغیرہ۔

اور ازآں جملہ وہ حیوانات ہیں جن کی جبلت میں رذالت اور ذلت اور سوراخوں میں چھپنا ہے جیسے چوہا اور حشرات الارض۔

اور ازآں جملہ وہ حیوانات ہیں جو نجاستوں اور ناپاکیوں پر اپنی زندگی بسر کرتے ہیں اور اسی میں ملوث رہتے ہیں اور اسی کو کھاتے ہیں یہاں تک کہ ان کے جسم گندگی کے ساتھ بھرے رہتے ہیں۔

اور ازآں جملہ گدھا ہے کہ جس کے ساتھ حماقت اور ذلت میں مثال دی جاتی ہے اور بہت سے عرب کے لوگ جن کی طبائع سلیمہ تھیں اس کو حرام جانتے تھے اور شیاطین کے ساتھ اس کو مشابہت دیتے تھے، چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جب تم گدھے کا چیخنا سنو تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شیطان سے پناہ مانگو کیونکہ اس نے شیطان کو دیکھا ہے۔

اور نیز تمام اطبا کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ سب جانور بلاشبہ مزاج نوع انسان کے مخالف ہیں لہٰذا طب کے اعتبار سے بھی ان کو نہیں کھانا چاہئے۔

واضح ہو کہ اس جگہ چند مبہم امور ہیں جن کی حدود کے ضبط کرنے کی اور مشکل کے تمیز کرنے کی ضرورت ہے، ازآں جملہ یہ ہے کہ مشرکین اپنے معبودوں کی عبادت کیلئے ذبح کیا کرتے تھے تاکہ ان کی طرف تقرب حاصل کریں اور یہ شرک کی ایک قسم ہے پس حکمت الہیہ کا مقتضیٰ ہوا کہ اس شرک سے منع کیا جائے پھر اس تحریم کی اس طرح تاکید کی جائے کہ بتوں کے لئے جو جانور ذبح کیا جائے اس کے کھانے سے لوگوں کو منع کیا جائے تاکہ اس فعل سے رک جائیں، اور نیز ذبح

کرنے کی قباحت مذبوح میں اثر کر جاتی ہے جس کی وجہ ہم صدقہ میں بیان کر چکے ہیں، پھر بتوں کے لئے ذبیحہ چونکہ ایک امر مبہم تھا اس واسطے ''مَا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِه '' کے ساتھ اور ''مَاذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ'' کے ساتھ اور اس ذبیحہ کے ساتھ جس کو ایسا شخص ذبح کرے جو ان لوگوں کے دین میں نہیں ہے جو غیر اللہ کے نام کے ساتھ ذبح کرنے کا حرام سمجھتے ہیں اس کو منضبط فرمایا اور وہ مسلمان اور اہل کتاب ہیں اور اس سے یہ بات لازم ہوئی کہ ذبح کرتے وقت اللہ تعالیٰ کے نام کا ذکر کرنا واجب ہو کیونکہ بظاہر حلال وحرام میں اس کے بغیر تمیز نہیں ہوتی اور نیز جب حکمت الٰہیہ نے ان حیوانات کو جو زندگی میں انسان کے برابر تھے اس کے لئے مباح کر دیا اور ان حیوانات پر اس کو قدرت عطا فرمائی اس واسطے واجب ہوا کہ ان کی روح نکالتے وقت اس نعمت سے غافل نہ ہوں اور غافل نہ ہونے کی صورت یہ ہے کہ ذبح کرتے وقت اللہ تعالیٰ کا نام ذکر کریں چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے'' تاکہ اللہ تعالیٰ کا نام ذکر کریں ان مویشیوں پر جو اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا فرمائے ہیں''۔

اور ازآں جملہ یہ ہے کہ تمام مذاہب حقہ اور مذاہب باطلہ میں مردار جانور حرام ہے پس مذاہب حقہ کا اس کے حرام ہونے پر اس وجہ سے اتفاق ہے کہ ان مذاہب والوں کو حظیرۃ القدس سے یہ بات حاصل ہوئی کہ یہ چیزیں ناپاک ہیں اور مذاہب باطلہ کے ماننے والوں کا اس وجہ سے اتفاق ہے کہ انھوں نے یہ معلوم کر لیا کہ اکثر مردار چیزوں میں زہر کا اثر ہوتا ہے کیونکہ مرتے وقت ایسے اخلاط سمیہ اس میں پھیل جاتے ہیں جو انسان کے مزاج کے منافی ہیں، پھر مردار کو غیر مردار سے تمیز دینا ضروری ہے پس اس کا انضباط اس طور سے کیا گیا کہ وہ جانور حلال ہے جس کی روح کھانے کی غرض سے نکالی جائے پس اس سے یہ بات ضروری ہوگئی کہ وہ جانور حرام ہے جو سینگ لگ کر یا گر کر مر جائے اور وہ جانور حرام ہے جس کو کسی درندہ نے پھاڑ کھایا ہو کیونکہ یہ سب ناپاک موذی چیزیں ہیں۔

اور ازآں جملہ یہ ہے کہ عرب اور یہود ذبح اور نحر کیا کرتے تھے اور مجوس گلا گھونٹتے اور پیٹ پھاڑ ڈالتے تھے اور ذبح اور نحر انبیا علیہم السلام کی سنت ہے جو ابتدا سے چلی آرہی ہے اور اس میں بہت سی مصلحتیں ہیں، منجملہ یہ ہے کہ اس میں ذبیحہ کو نسبتاً آرام پہنچتا ہے کیونکہ روح نکالنے کا سب

سے آسان طریقہ یہی ہے چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''پس اپنے ذبیحہ کو آرام دینا چاہئے اور ناقص ذبح کر کے چھوڑ دینے سے جو آپ نے منع فرمایا اس میں یہی راز ہے، اور منجملہ یہ ہے کہ خون نجاستوں میں سے ایک نجاست ہے کہ جب وہ کپڑے کو لگ جاتی ہے تو لوگ اس کو دھوتے ہیں اور اس سے بچتے ہیں اور ذبح کرنا ذبیحہ کو اس سے پاک کرنا ہے اور گلا گھونٹنا اور پیٹ پھاڑنا ذبیحہ کو خون کے ساتھ نجس کر دینا ہے اور من جملہ یہ ہے کہ ذبح کرنا ملت حنفیہ کا شعائر میں سے ایک ہے جس کی وجہ سے حنفی غیر حنفی سے ممتاز ہو جاتا ہے پس ذبح کرنا، ختنہ اور دیگر خصال فطرت کے مانند ہے، پھر چونکہ اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ملت حنفیہ کے قیام کے لئے مبعوث فرمایا تھا اس واسطے اس کی حفاظت آپ پر ضروری ہوگئی، پھر گلا گھونٹنا اور پیٹ پھاڑنے سے تمیز ضروری ہوئی اور اس کی یہی صورت ہے کہ کسی تیز چیز سے کاٹنا اور حلق اور اس کی رگیں کاٹنا ضروری قرار دیا جائے پس یہ وہ چیزیں ہیں جن سے ممانعت صحت نفسانیہ کی حفاظت کی وجہ سے اور مصلحت ملیہ کی وجہ سے ہے اور وہ چیزیں جن سے صحت بدنی کی وجہ سے منع کیا ہے جیسے زہر اور سست کرنے والی چیزیں سو ان کا حال ظاہر ہے۔(۱)

اور جب ان اصول کی تمہید ہو چکی تو اب ہم تفصیل سے بیان کرتے ہیں پس ہم کہتے ہیں جن چیزوں کے کھانے سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا اس کی دو قسمیں ایک تو وہ قسم ہے جس سے منع کرنے کی وجہ کوئی ایسی چیز ہے جو حیوان کی اس قسم میں پائی جاتی ہے اور ایک وہ قسم ہے جس سے منع کرنے کی وجہ ذبح کی شرط کا معدوم ہونا ہے پس حیوانات کی چند اقسام ہیں ایک تو گھریلو جانور ہیں ان میں سے اونٹ، گائے اور بکری مباح ہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے'' **احلت لکم بھیمة الانعام** ''اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ جانور پاک معتدل المزاج اور نوع انسانی کے موافق ہیں اور جنگ خیبر کے دن گھوڑے کے کھانے کی اجازت دی گئی اور گدھے کے کھانے سے ممانعت کی گئی اس لئے کہ تمام عرب اور عجم گھوڑے کو پاکیزہ سمجھتے ہیں اور تمام حیوانات میں گھوڑے کو فضیلت دیتے ہیں اور وہ انسان کے مشابہ ہے اور گدھا اپنی حماقت اور ذلت میں ضرب المثل ہے اور وہ شیطان کو دیکھ کر رینگتا ہے اور عرب کے اندر جو لوگ فطرتاً ذکی اور پاکیزہ نفس تھے وہ بھی اس کو حرام

(۱) موجودہ دور میں انجکشن کے ذریعہ سے سن کرنا بھی اسی حکم میں شامل ہے۔

سمجھتے تھے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مرغی کا گوشت کھایا ہے اور مرغابی اور بطخ اسی کے مثل ہے کیونکہ یہ بھی پاکیزہ چیزیں ہیں اور مرغ فرشتہ کو دیکھ کر بانگ کہتا ہے اور کتا اور بلی حرام ہیں کیونکہ وہ درندے ہیں اور مردار کھاتے ہیں اور کتا شیطان ہے اور دوسری قسم وحشی یعنی جنگلی جانور ہیں ان میں سے وہ جانور حلال ہیں جو نام اور وصف میں ڈنگروں سے مشابہ ہیں جیسے ہرن اور نیل گائے اور شتر مرغ اور کسی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو گورخر کا گوشت ہدیہ میں بھیجا تو آپ نے اس کو کھالیا اور کسی نے خرگوش کا گوشت آپ کو بھیجا تو آپ نے اس کو قبول فرمایا اور ایک مرتبہ آپ کے دستر خوان پر گوہ کا گوشت کھایا گیا کیونکہ کہ عرب لوگ ان چیزوں کو پاکیزہ جانتے تھے اور ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے گوہ کے نہ کھانے کی نسبت یہ عذر پیش کیا کہ ''یہ میرے ملک میں نہیں ہوتا اس واسطے مجھے اس سے کراہت معلوم ہوتی ہے'' اور ایک مرتبہ احتمال مسخ کے ساتھ معذرت فرمائی اور ایک دفعہ اس کے کھانے سے منع کیا اور میرے نزدیک ان میں کچھ تناقض نہیں ہے کیونکہ اس میں دو وجہ تھیں جن میں سے ہر ایک عذر کے لئے کافی تھی لیکن جس چیز میں احتمال ہو اس کا ترک کرنا پرہیزگاری ہے نہ کہ اس کو حرام قرار دینا اور نہی سے آپ کی مراد کراہت تنزیہی ہے، اور آپ نے تمام درندوں کے کھانے سے ممانعت فرمائی ہے کیونکہ ان کی طبیعت اعتدال سے خارج اور ان کی عادات بد اور ان کے دل سخت ہوتے ہیں اور پرندوں میں سے کبوتر اور چڑیا کو مباح کیا کیونکہ وہ پاکیزہ سمجھے جاتے ہیں اور ہر شکار کرنے والے پرندہ کے کھانے سے آپ نے نہی فرمائی اور ان میں سے بعض کا نام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فاسق رکھا ہے پس ان کو کھانا بھی ناجائز ہے اور جو پرند مردار اور نجاست کھاتا ہے اور ہر وہ پرند جس کو عرب لوگ خبیث جانتے ہیں اس کا کھانا مکروہ ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''ان پر خبیث چیزیں حرام کی گئی ہیں''۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ٹڈی کو کھایا جاتا تھا کیونکہ عرب اس کو پاکیزہ سمجھتے تھے۔

اور ایک قسم دریائی جانور ہیں ان میں سے جس کو عرب کے لوگ پاکیزہ سمجھتے تھے اس کا کھانا مباح کیا گیا ہے جیسے مچھلی اور عنبر، اور جس کو وہ ناپاک سمجھتے ہیں اور حرام جانور کے نام کے ساتھ اس کا نام لیتے ہیں جیسے خنزیر پس اس میں دلائل متعارض ہیں اور اس سے بچنا افضل ہے اور ایک دفعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے گھی کے متعلق جس میں چوہا مر گیا تھا سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا

''چوہے اور اس کے آس پاس کی گھی کو نکال ڈالو اور باقی کو کھالو'' اور ایک روایت میں ہے'' گھی کے اندر جب چوہا مر جائے تو اگر وہ گھی جما ہوا ہے تو چوہے اور اس کے آس پاس کے گھی کو نکال دو اور اگر وہ گھی پگھلا ہوا ہے تو اس کو استعمال نہ کرو''۔

میں کہتا ہوں مردار اور وہ چیز جس میں اس کا اثر ہو جائے تمام امتوں اور ملتوں میں ناپاک ہے پس جب وہ ناپاک چیز پاک چیز سے جدا ہو سکے تو ناپاک کو پھینک دیا جائے اور پاک کھالیا جائے اور اگر الگ نہ ہو سکے تو وہ سب حرام ہے اور حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر نجاست اور ہر وہ چیز جس میں نجاست پڑی ہو حرام ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر اس جانور کے کھانے اور اس کا دودھ پینے سے منع فرمایا ہے جو نجاست کھاتا ہے۔

میں کہتا ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ جب اس کے اعضا میں نجاست پیوست ہوگئی اور اس کے تمام اعضا میں پھیل گئی تو اس کا حکم نجاستوں کے حکم میں ہوگیا یا اس جانور کے حکم میں ہوگیا جو نجاست کھا کر زندگی گزارتا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' ہمارے لئے دو مردار اور دو خون حلال کئے گئے ہیں، لیکن دو مردار، تو مچھلی اور ٹڈی ہیں اور دو خون جگر، تلی ہیں''۔

میں کہتا ہوں جگر اور تلی بدن حیوان کے اعضا میں سے دو عضو ہیں لیکن وہ دونوں خون کے ساتھ مشابہ ہیں پس ان کے اندر شبہ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دور کر دیا اور مچھلی اور ٹڈی میں بہتا ہوا خون نہیں ہے پس اس لئے اس میں ذبح کرنا مقرر نہ ہوا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے گرگٹ کے مار ڈالنے کا حکم فرمایا اور اس کو فاسق کہا ہے، اور آپ نے فرمایا'' وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آگ پر پھونک مارتا تھا'' اور آپ نے فرمایا'' جو پہلے ہی ضرب میں گرگٹ کو مار دے تو اس کے لئے اتنا اتنا ثواب لکھا جائے گا اور جو دوسری ضرب میں مارے تو اس سے کم اور جو تیسری ضرب میں مارے تو اس کو اس سے بھی کم ثواب ملے گا''۔

میں کہتا ہوں بعض حیوانوں کی جبلت ایسی ہوتی ہے ان سے شیطانی افعال اور سیئات صادر ہوتے ہیں اور وہ سب حیوانات میں شیطان کے ساتھ مشابہت میں زیادہ قریب ہوتے ہیں اور اس کے وسوسہ کو ماننے والے ہوتے ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کا علم تھا کہ گرگٹ بھی انہیں حیوانات میں سے ہے اور اس بات پر آپ نے تنبیہ فرمائی کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی

آگ کو پھونکتا تھا کیونکہ باعتبار طبیعت کے وہ شیطانی وسوسہ کا تابع تھا اگرچہ اس کا آگ پر پھونک مارنا کچھ موثر نہ تھا اور اس کو قتل کرنے میں آپ نے دو وجہ سے رغبت دلائی ایک تو یہ کہ اس کے قتل کرنے میں نوع انسانی کی ایذا رسانی کو دفع کرنا ہے پس اس کی مثال ایسی ہے جیسے شہروں سے زہریلے درختوں کا قطع کرنا ہے اور اسی طرح کے ایسے امور جن اہل شہر میں جمعیت رہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اس کے قتل کرنے میں شیطانی لشکر کا توڑنا اور اس کے وسوسہ کے مقام کو اجاڑ دینا ہے اور یہ بات اللہ تعالیٰ اور ملائکہ مقربین کے نزدیک پسندیدہ ہے اور پہلی ضرب میں اس کا مار ڈالنا دوسری ضرب میں مار ڈالنے سے افضل اس لئے ہے کہ اس میں حذاقت اور نیکی کی طرف سرعت پائی جاتی ہے، واللہ اعلم۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''تم پر مرا ہوا جانور اور بہتا لہو اور سور کا گوشت اور جس چیز پر اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کا نام پکارا جائے اور جو جانور گلا گھٹ کر مر جائے اور جو چوٹ لگ کر مر جائے اور جو گر کر مر جائے اور جو سینگ لگ کر مر جائے یہ سب حرام ہیں اور وہ جانور بھی جس کو درندے پھاڑ کر کھائیں مگر جس کو تم مرنے سے پہلے ذبح کر لو اور وہ جانور بھی جو تھان پر ذبح کیا جائے اور یہ بھی کہ پاسوں سے قسمت معلوم کرو یہ سب گناہ کے کام ہیں''۔

میں کہتا ہوں مردار اور خون اس لئے حرام ہوئے کہ وہ دونوں نجس ہیں اور خنزیر اس لئے حرام ہوا کہ یہ ایسا جانور ہے کہ اس کی صورت میں ایک قوم مسخ ہو چکی ہے اور جن پر غیر اللہ کا نام لیا گیا اور جو بتوں کے نام پر ذبح کئے جاتے ہیں اس لئے حرام ہوئے تاکہ شرک کی جڑ کٹ جائے اور اس لئے کہ فعل کی برائی مفعول بہ میں سرایت کر جاتی ہے اور منخنقہ یعنی وہ جانور جس کو گلا گھونٹ کر مارا جائے اور متردیہ یعنی وہ جانور جو اوپر سے نیچے کی طرف گر جائے اور نطیحہ یعنی وہ جانور جو سینگ کھا کر مر جائے اور وہ جانور جس کو درندے پھاڑ کر کھائیں اور اس میں سے کچھ باقی رہ جائے، یہ سب کے سب اس لئے حرام ہوئے کہ پاک مذبوح کا انحصار اس میں ہو گیا ہے کہ جس کے حلق یا گردن پر دھاردار چیز کا استعمال جان نکالنے کے قصد سے کیا جائے پس اس سے یہ بات لازم ہوئی کہ یہ سب چیزیں حرام کی جائیں۔

اور دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ ان سب میں بہتا ہوا خون تمام بدن کے اندر پھیل جاتا ہے اور

اس کا گوشت ناپاک ہو جاتا ہے مَـاذَكَّيْتُمْ یعنی ان چیزوں میں سے جو کوئی جانور تم کو ایسا ملے کہ اس میں جان باقی ہو اور تم اس کو اس طرح ذبح کر لو کہ اس کی جان کا نکالنا ذبح کی وجہ سے ہو تو وہ حلال ہے۔ (وان تستقسموا بالازلام) یعنی تمہاری قسمت میں جو بھلائی اور برائی ہے تیروں کے ذریعہ تم اس کو معلوم کرنا چاہو جس کا زمانہ جاہلیت میں اس طرح رواج تھا کہ ایک تیر پر 'افعل' یعنی کر اور دوسرے پر 'لاتفعل' یعنی نہ کر اور تیسرے پر 'غفل' یعنی خالی لکھ کر ان کو پھراتے تھے پس ہر کام کے کرنے نہ کرنے پر انہیں کی حرکات کے مطابق بھلائی اور برائی سمجھتے تھے پس یہ اللہ تعالیٰ پر افتراء اور اپنے جہل پر اعتماد کرنا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے کہ جانور کو باندھ کر تیر مارے جائیں یہاں تک کہ مر جائے اور ایسے جانور کا گوشت کھانے سے بھی منع فرمایا۔

میں کہتا ہوں اہل جاہلیت جانوروں کو باندھ کر ان پر تیر مارا کرتے تھے اور اس میں بلاضرورت جانور کو تکلیف دینا تھا اور نیز اس میں نہ تقرب الٰہی تھا اور نہ اس کی نعمت کا شکریہ، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کے ساتھ بھلائی کرنے کا حکم فرمایا ہے پس جب تم قتل کرو تو اچھی طرح سے قتل کرو اور جب تم ذبح کرو تو اچھی طرح سے ذبح کرو اور اپنی چھری کو تیز کر لیا کرو اور اپنے ذبیحہ کو آرام پہنچاؤ''۔

میں کہتا ہوں آسان طور پر روح نکالنے کے طریقہ کو اختیار کرنے میں داعیہ رحمت کا اتباع ہے اور یہ وہ خصلت ہے جس سے پروردگار عالم خوش ہوتا ہے اور جس پر اکثر مصالح منزلیہ اور مدنیہ موقوف ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس زندہ جانور کا کوئی عضو کاٹ لیا جائے تو وہ عضو مردار ہے۔

میں کہتا ہوں اہل جاہلیت اونٹوں کے کوہان اور دنبوں کی چکتیاں کاٹ لیا کرتے تھے اور اس میں عذاب دینا تھا اور اس طریقہ کے خلاف تھا جو اللہ تعالیٰ نے مقرر کیا تھا اس واسطے آپ نے اس سے منع فرمایا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو شخص چڑیا یا اس سے بڑے جانور کو ناحق قتل کرے گا تو اللہ عزوجل اس سے اس کے قتل کے متعلق باز پرس کرے گا، آپ سے عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کا حق سے قتل کرنا کیا ہے آپ نے فرمایا کہ اس کو ذبح کر کے کھالے اور یہ نہ کرے کہ اس کا سر کاٹ کر اس کو پھینک دے''۔

میں کہتا ہوں اس جگہ دو چیزیں باہم مشابہ ہیں ان میں فرق کرنا ضروری ہے ایک تو یہ ہے کہ ذبح کرنا حاجت کی وجہ سے ہو اور اس داعیہ کا اتباع ہو جو مصلحت نوع انسان کے متعلق ہے اور دوسرا یہ ہے کہ زمین میں نوع حیوان کے فاسد کرنے میں سعی ہو اور سخت دلی کے داعیہ کا اتباع ہو۔

واضح ہو کہ شکار کرنا عرب کی عادت اور ان کی عام خصلت تھی یہاں تک کہ وہ ان کے ان پیشوں میں سے ایک تھا جن پر ان کی زندگی اور معاش موقوف تھی پس اس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جائز قرار دیا اور اس کے اندر از حد مصروف ہونے میں جو برائی تھی اس کو اپنے اس قول کے ساتھ ظاہر کر دیا ''جو شکار کے پیچھے پڑا وہ لہو میں پڑا'' اور شکار کے احکام اس بات پر مبنی ہیں کہ وہ تمام شروط میں ذبح کرنے پر محمول ہے بجز اس شرط کے جس کی پابندی دشوار ہے، اور اس شرط کے لگانے میں اکثر کوشش شکار کرنے میں بیکار جاتی ہے اس واسطے شکاری جانور چھوڑتے وقت یا تیر پھینکتے وقت اللہ کا نام لینا شرط کیا گیا اور شکاری کا ذبح کا اہل ہونا بھی شرط کیا گیا، اور ذبح کرنا اور حلق اور گردن کا کاٹنا شرط نہیں کیا گیا، اور ایک اس بات پر مبنی ہیں کہ شکار کرنے کی ذاتیات اس میں پائی جائیں مثلاً سکھائے ہوئے جانور کا قصداً شکار پر چھوڑنا اور اگر یہ بات نہ ہوئی تو اتفاق سے اس شکار کا دبا لینا ہوگا اور شکار کرنا نہ ہوگا، اور یہ بھی شرط ہے کہ وہ شکاری جانور کچھ نہ کھائے اور اگر اس نے کچھ کھا لیا ہے تو اب اگر وہ شکار زندہ رہا اور ذبح کر لیا گیا تب تو وہ حلال ہے ورنہ حرام ہے اور یہ اس لئے کہ سکھلائے ہوئے کے معنی پائے جائیں اور اس کے اور درندوں کے کھائے ہوئے میں فرق ہو جائے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے شکار اور ذبائح کے احکام دریافت کئے گئے تو آپ نے انہی قواعد سے مسائل کا استنباط کر کے جواب ارشاد فرمائے کسی نے عرض کیا ہم اہل کتاب کے ملک میں رہتے ہیں کیا ہم اس کے برتنوں میں کھا لیا کریں؟ اور ہم شکار کی جگہ رہتے ہیں اپنی کمان اور اپنے سکھلائے ہوئے کتے اور غیر سکھلائے ہوئے کتے سے شکار کرتے ہیں پس ان میں سے کون سی بات ہمارے لئے درست ہے؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا اہل کتاب کے برتنوں کا جو تم نے ذکر کیا پس اگر تم کو ان کے سوا اور برتن میسر ہوں تو ان کے برتنوں میں نہ کھاؤ اور اگر تم کو اور برتن میسر نہ ہوں تو ان کے برتنوں کو دھو لو اور ان میں کھا لو اور جس شکار کو تم نے کمان سے مارا ہے اور اللہ کا نام بھی لیا ہے تو اسے کھا لو اور سدھائے ہوئے کتے سے جو تم شکار کرو اور اس

پرتم نے اللہ کا نام بھی لے لیا ہے تو اس کو کھالیا کرو اور جو بغیر سدھائے کتے سے شکار کرو اور اس شکار کو زندہ پالو تو اس کو ذبح کر کے کھالو" نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جو فرمایا کہ "اگر تم کو ان کے علاوہ اور برتن مل سکیں تو ان میں مت کھاؤ"۔

میں کہتا ہوں اس میں پسندیدہ بات کا قصد کرنا اور دل کو وسواس سے راحت دینا ہے اور کسی نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم سدھائے ہوئے کتے چھوڑا کرتے ہیں تو آپ نے فرمایا کہ "جب تم اپنا کتا چھوڑو تو اللہ کا نام لے لیا کرو پس اگر اس نے تمہارے لئے شکار کو پکڑ رکھا ہے اور تم نے اس کو زندہ پایا ہے تو اس کو ذبح کر لو اور اگر تم نے اس کو مردہ پایا ہے اور اس میں سے اس نے کچھ نہیں کھایا تو تم اس کو کھالیا کرو اور اگر اس نے کچھ کھالیا ہے تو نہ کھاؤ کیونکہ اس نے وہ شکار اپنے لئے پکڑا تھا اور اگر تم اپنے کتے کے ساتھ کوئی اور کتا بھی دیکھو اور شکار مر چکا ہو تو اس کو مت کھاؤ کیونکہ تم کو معلوم نہیں کہ ان دونوں میں سے کس نے اس کو مارا ہے" کسی نے عرض کیا یا رسول اللہؐ میں شکار کی طرف تیر پھینکتا ہوں اور دوسرے دن اس جانور میں اپنا تیر لگا پاتا ہوں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اگر تم کو یقین ہے کہ تمہارے تیر سے وہ مرا ہے اور اس میں تم نے درندہ کا کوئی اثر نہیں پایا تو تم اس کو کھالو" اور ایک روایت میں یہ آیا ہے کہ "جب تم اپنے تیر کو پھینکو تو اللہ کا نام لے لیا کرو پھر اگر ایک دن تک وہ شکار تم کو نہ ملے اور دوسرے روز تم کو سوائے تیر کے اثر کے اور کچھ نہ معلوم ہو تو اگر تم چاہو تو اس کو کھالو اور اگر تم شکار کو پانی میں ڈوبا ہوا دیکھو تو اس کو مت کھاؤ" کسی نے عرض کیا ہم بغیر بھال اور پر کا تیر پھینکتے ہیں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اگر وہ زخمی ہو گیا ہے تو کھالے اور اگر وہ جانور تیر کی چوڑائی سے چوٹ کھا کر مرا ہے تو نہ کھا کیونکہ وہ جانور موقوذہ (۱) ہے" کسی نے عرض کیا یا رسول اللہ یہاں ایسے لوگ ہیں جنھوں نے ابھی شرک کو چھوڑا ہے وہ ہمارے پاس گوشت لاتے ہیں اور ہم کو نہیں معلوم کہ اس پر وہ اللہ کا نام ذکر کرتے ہیں کہ نہیں؟ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تم خود اللہ کا نام لیکر اس کو کھالیا کرو"۔

میں کہتا ہوں اس کی اصل یہ ہے کہ حکم ظاہر پر ہوتا ہے اور کسی نے آپ سے عرض کیا کہ کل ہم دشمن سے مقابلہ کرنے والے ہیں اور ہمارے پاس چھری نہیں ہے کیا ہم بانس سے ذبح کر لیا

---

(۱) یعنی بغیر دھار والی چیز سے مارا گیا ہے۔

کریں؟ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو چیز خون کو بہا دے اور اس پر اللہ کا نام لیا جائے اس کو کھائے مگر دانت اور ناخن نہ ہو اور ابھی میں تجھ کو اس کا حال بتلاتا ہوں پس دانت تو ایک ہڈی ہے اور ان حبشیوں کی چھری ہے'' اور ایک مرتبہ ایک اونٹ بھاگ چلا تھا تو ایک شخص نے اس کو تیر مارا جس سے وہ ٹھیر گیا تب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''ان اونٹوں میں بھی وحشی جانوروں کی طرح آدمیوں سے نفرت ہوتی ہے پس جب کوئی اونٹ تم کو مغلوب کر دے تو تم اس کے ساتھ ایسا ہی کرو''۔

میں کہتا ہوں کیونکہ وہ وحشی ہو گیا تو اس کا حکم مثل حکم شکار کے ہو گیا، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک بکری کے متعلق سوال کیا گیا جس کو ایک باندی نے دیکھا کہ اس پر موت کے آثار طاری ہو رہے ہیں تو اس نے ایک پتھر توڑ کر اس کی کتل سے اس کو ذبح کیا پس آپ نے اس کے کھانے کا حکم دیا، کسی نے عرض کیا بعض کھانے ایسے ہیں جن سے مجھ کو حرج معلوم ہوتا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ ''دل میں کوئی خلجان نہ پیدا کر اس میں تو نے نصرانیت کی مشابہت کی ہے'' کسی نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم اونٹنی کو نحر کرتے ہیں اور گائے اور بکری کو ذبح کرتے ہیں، پس ان کے پیٹوں میں ہم بچہ پاتے ہیں آیا ہم اس کو پھینک دیں یا کھالیں، تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اگر تمہارا دل چاہے تو تم اس کو کھالو کیونکہ اس کی ماں کا ذبح کرنا اس کا ذبح کرنا ہے''۔

کھانے کے آداب کا بیان

واضح ہو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانے کے آداب سکھائے ہیں جن کی کھانے میں رعایت کرنا امت پر لازم ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''کھانے کی برکت یہ ہے کہ کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد ہاتھ دھوئے'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اپنے غلہ کو ناپ لیا کرو تمہارے لئے برکت دی جائے گی'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''تم میں سے جب جو کوئی کھانا کھائے تو رکابی کے اوپر سے نہ کھائے بلکہ اس کے نیچے سے کھائے کیونکہ برکت اس کے اوپر سے نازل ہوتی ہے''۔

میں کہتا ہوں من جملہ برکت کے یہ ہے کہ نفس سیر ہو جائے اور آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں اور دل کو تسلی حاصل ہو اور وہ زیادہ حریص نہ ہو جیسے کوئی کھاتا ہے اور سیر نہیں ہوتا، اس کی تفصیل یہ ہے کہ کبھی دو شخص ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کے پاس سو سو درہم ہوتے ہیں ان میں سے ایک تنگدستی سے ڈرتا ہے اور لوگوں کے مال میں طمع کرتا ہے اور اپنے مال کو کسی ایسے کام میں صرف کرنا نہیں جانتا جس سے اس کو دنیا یا دین کا نفع حاصل ہو اور دوسرا ایک محتاط آدمی ہے اور جاہل آدمی اس کو غنی سمجھتا ہے اور وہ میانہ روی سے زندگی بسر کرتا ہے اور اس کا دل مطمئن رہتا ہے، پس دوسرا شخص ایسا ہے جس کے مال میں برکت دی گئی اور پہلے کے مال میں برکت نہ دی گئی، اور من جملہ برکت کے یہ ہے کہ شئے کو ضرورت میں صرف کرے اور وہ اس کی امثال سے کفایت کرے اس کی تفصیل یہ ہے کہ کبھی دو شخص ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک ایک رطل کھانا کھاتا ہے ایک کی طبیعت تو اس کو غذاء بدن بناتی ہے اور دوسرے کے معدہ میں آفت پیدا کرتی ہے پس جو

کچھ اس نے کھایا وہ نفع نہیں دیتا بلکہ بسا اوقات ضرر پہنچاتا ہے اور کبھی دو شخصوں کے پاس مال ہوتا ہے پس ان میں سے ایک شخص اس مال کو ایسے اسباب میں صرف کرتا ہے جس سے بڑا نفع ہوتا ہے اور امور معاش میں ہر بات کا لحاظ رکھتا ہے اور دوسرا شخص اپنے مال کو بے فائدہ صرف کرتا ہے پس اس کی حاجت میں وہ مال کام نہیں آتا، اور نیز ہیئات نفسانیہ اور عقائد نفسانیہ کو بھی برکت کے ظاہر ہونے میں دخل ہے چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو شخص اس مال کو حرص نفسانی کے ساتھ لے گا تو اس میں اس کو برکت نہ دی جائے گی اور وہ ایسا ہوگا جیسے کوئی کھاتا ہے اور سیر نہیں ہوتا اور اسی لئے جو شخص کسی لکڑی معلق پر چڑھتا ہے اس کا قدم پھسل جاتا ہے اور جو زمین پر چلتا ہے وہ نہیں پھسلتا پس جب کوئی شخص کسی چیز کا قصد کرتا ہے اور اس کے ساتھ اس بات کا ارادہ کرتا ہے کہ وہ اس کی ضرورت کو کافی ہو جائے اور اپنے نفس کو اس میں مطمئن کر لیتا ہے تو وہ اس کے سرور اور اطمینان خاطر اور قناعت کا سبب ہو جاتا ہے اور کبھی یہ امر طبیعت کی طرف سرایت کر جاتا ہے اور وہ طبیعت اس کو ضروری کاموں میں صرف کرتی ہے پس جب کوئی شخص کھانے سے پہلے ہاتھ دھوتا ہے اور جوتیاں اتارتا ہے اور اطمینان سے کھانے کے لئے بیٹھتا ہے اور اس کی عادت ڈالتا ہے اور اللہ کا نام بھی لیتا ہے تو اس پر برکت نازل ہوتی ہے، اور جب کوئی شخص اناج کو ناپ لیتا ہے اور اس کی مقدار کو معلوم کر لیتا ہے اور اس کے خرچ کرنے میں میانہ روی اختیار کرتا ہے اور اس کو سمجھ کر خرچ کرتا ہے تو اس کو کم از کم اس قدر غلہ کافی ہو سکتا ہے جو دوسروں کے لئے کافی نہیں ہو سکتا، اور جب کوئی شخص غلہ کو برے طور سے رکھتا ہے جس کو دل برا سمجھتا ہے اور اس کے سبب سے وہ ایک بے قدر چیز ہو جاتا ہے تو کم از کم غلہ جو دوسروں کے لئے کافی سے زیادہ ہوتا ہے اس کو کافی نہیں ہو سکتا، اور میں گمان نہیں کرتا کہ کسی پر یہ بات مخفی ہے کہ انسان بسا اوقات روٹی اس طرح کھاتا ہے جیسے میوا کھاتے ہیں یا چلتے پھرتے باتیں کرتے اسکو کھایا جاتا ہے۔ پس اس کو کھانے کا پتہ بھی نہیں چلتا اور نہ اس کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے کھانا کھایا ہے اور نہ اس کھانے سے اس کا دل سیر ہوتا ہے اگر چہ معدہ پر ہو جاتا ہے، اور بسا اوقات ایک رطل کی مقدار کو خفیف سمجھتا ہے پس اس سے زائد کا ہونا اور نہ ہونا یکساں ہوتا ہے اور وہ کسی کام میں نہیں آتا اور ایک عرصہ کے بعد جب اس غلہ کو دیکھتا ہے تو اس میں کمی معلوم ہوتی ہے۔

اور حاصل کلام یہ ہے کہ برکت کے پائے جانے اور نہ پائے جانے میں اسباب طبعی ہیں

جن کے ضمن میں کوئی فرشتہ بزرگ یا شیطان مردود مدد کرتا رہتا ہے اور ان اسباب کی شکل میں روح ملکی یا شیطانی پھونک دی جاتی ہے، واللہ اعلم۔

اور کھانے سے پیشتر ہاتھ دھونے کا سبب یہ ہے کہ اس میں میل دور ہو جاتا ہے اور کھانے کے بعد ہاتھ دھونے سے کھانے کی بو دور ہو جاتی ہے اور اس بات کا اندیشہ دور ہو جاتا ہے کہ ہاتھوں سے اس کے کپڑے خراب ہوں یا کوئی درندہ اس کے ہاتھ کو چاٹ لے یا کوئی زہریلا جانور کاٹ لے، چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو شخص کھانا کھا کر ہاتھ نہ دھوئے اور سو جائے اور پھر اس کو کوئی تکلیف پہنچے تو اس کو چاہئے کہ اپنی ہی ذات کو ملامت کرے'' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''تم میں سے جب کوئی کھائے تو داہنے ہاتھ سے کھائے اور جب پئے تو داہنے ہاتھ سے پئے'' اور آپ نے فرمایا ''تم میں سے کوئی شخص نہ بائیں ہاتھ سے کھائے اور نہ بائیں ہاتھ سے پئے کیونکہ شیطان بائیں ہاتھ سے کھاتا ہے اور بائیں ہاتھ سے پیتا ہے'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''کھانے پر اللہ تعالیٰ کا نام نہ لینے سے شیطان اس کو حلال کر لیتا ہے'' اور آپ نے فرمایا ''جب کوئی شخص کھانا کھاتے وقت اللہ تعالیٰ کا نام لینا بھول جائے تو اس کو یہ کہنا چاہئے'' بسم اللہ اولہ وآخرہ'' اور جس شخص نے ایسا کیا تھا اس کے بارے میں آپ نے فرمایا'' شیطان برابر اس کے ساتھ کھاتا رہا'' پس جب اس نے اللہ کا نام لیا تو جو کچھ اس کے پیٹ میں تھا قے کر دیا'' اور آپ نے فرمایا'' تم میں سے ہر ایک کے ساتھ اس کے تمام کاموں میں شیطان ساتھ رہتا ہے یہاں تک کہ جب کوئی کھانے بیٹھتا ہے تو اس کے پاس آ موجود ہوتا ہے پس جب تمہارے ہاتھ سے کوئی لقمہ گر جائے تو چاہئے کہ اس کی مٹی دور کر کے کھا جائے اور شیطان کے لئے نہ چھوڑ دے''۔

میں کہتا ہوں من جملہ اس علم کے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو عطا فرمایا ملائکہ اور شیاطین کا حال اور ان کے زمین میں پھیلنے کا علم بھی اسی میں سے ہے فرشتے ملا اعلیٰ سے عمدہ الہامات حاصل کر لیتے ہیں پھر اس کو بنی آدم کے قلوب میں ڈال دیتے ہیں اور شیاطین کے مزاج سے فاسد رائیں پیدا ہوتی ہیں جو عمدہ نظام کے بگاڑنے کی طرف اور حلم وقار کی مخالفت اور اس چیز کی مخالفت کی طرف متوجہ کرتی ہیں جو طبیعت سلیمہ کا مقتضی ہے پس شیاطین اس کو حاصل کرتے ہیں اور بنی آدم میں سے اپنے دوستوں کے دلوں میں ان کو ڈالتے ہیں، پس من جملہ شیاطین کے حالات کے یہ

بھی ہے کہ خواب یا بیداری میں جب وہ دکھائی دیتے ہیں تو ایسی بری ہیئت میں ظاہر ہوتے ہیں جس سے طبیعت سلیمہ نفرت کرتی ہے مثلاً بائیں ہاتھ سے کھانا اور جیسے نکٹے کی صورت میں ظاہر ہونا وغیرہ۔

اور من جملہ ان حالات کے یہ ہے کہ انسان کے نفوس میں صفات دنیہ منقش ہوتی ہیں جو بنی آدم کے دل میں بہیمیت کی وجہ سے ہوتی ہے جیسے بھوک اور جماع کی خواہش، پس جب یہ صفات ان کے اندر پیدا ہوتی ہیں تو وہ بنی آدم کی حاجات کے ساتھ اختلاط اور تلبس کرتے ہیں اور اس وقت میں انسان جو کچھ کرتا ہے اس کی وہ نقل کرتے ہیں اور انسان کی قضائے شہوت کے وقت میں وہ خیال کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنی شہوت پوری کرلی ہے پس جو اولاد ایسے جماع سے پیدا ہوتی ہے جس میں شیاطین کی شرکت ہوتی ہے اور شیاطین نے اس وقت میں قضائے شہوت بھی کی ہے وہ قلیل البرکت ہوتی ہے اور شیطنت کی طرف مائل ہوتی ہے اور اسی طرح وہ کھانا جس میں شیاطین نے شرکت کی ہے اور اس کے ساتھ اپنی حاجت پوری کی ہے قلیل البرکت ہوتا ہے جس سے لوگوں کو نفع حاصل نہیں ہوتا بلکہ بسا اوقات وہ کھانا لوگوں کو نقصان پہنچاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے نام کا ذکر کرنا اور اللہ کی پناہ مانگنا بالطبع ان کی مخالفت کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ جو شخص اللہ کو یاد کرے اور اس کی پناہ مانگے شیاطین اس سے ہٹ جاتے ہیں''۔

اور ہمیں ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ ہماری ملاقات کے لئے ہمارا ایک دوست آیا اور کچھ کھانا ہم نے اس کے سامنے پیش کیا پس اس اثنا میں کہ وہ کھا رہا تھا ایک ٹکڑا اس کے ہاتھ سے گر پڑا اور زمین میں لڑھکنے لگا پس وہ شخص اس کو لینے کے لئے چلا اور وہ ٹکڑا اس سے دور ہوتا جاتا تھا یہاں تک کہ حاضرین کو کسی قدر تعجب ہوا اور وہ شخص اس کے اٹھانے میں کسی قدر تھک گیا لیکن اس نے اس کو پکڑ لیا اور کھالیا پھر چند روز کے بعد ایک پر شخص شیطان مسلط ہو گیا اور وہ اس کی زبان سے کلام کرنے لگا کلام کے دوران میں اس نے یہ بھی بیان کیا کہ فلاں شخص پر میرا گزر ہوا اور وہ کھانا کھا رہا تھا پس مجھ کو وہ کھانا پسند آیا مگر اس نے مجھ کو کچھ نہیں کھلایا پس میں نے اس کے ہاتھ سے اچک لیا تو اس نے مجھ سے منازعت کی حتیٰ کہ مجھ سے اس نے چھین لیا اور ایک مرتبہ ہمارے گھر کے آدمی گاجر کھا رہے تھے کہ اچانک گاجر کا ٹکڑا گر کر لڑھکنے لگا پس ایک شخص اس پر جھپٹ پڑا

اور اس کو اٹھا کر کھا گیا پس اس کے سینہ اور معدہ میں درد شروع ہو گیا پھر اس پر شیطان مسلط ہو کر اس کی زبان سے یہ بیان کرنے لگا کہ اس نے وہ لڑکتا ہوا گاجر کا ٹکڑا اٹھا لیا تھا اور اس قسم کی بہت سی باتیں ہمارے کان میں پڑی ہیں جن سے ہم کو یقین کامل ہو گیا کہ ان احادیث کے معنی مجازی مراد نہیں بلکہ ان کے حقیقی معنی مراد ہیں، واللہ اعلم۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جب تم میں سے کسی کے برتن میں مکھی گر پڑے تو تمام مکھی کو ڈبو کر پھر اس کو پھینک دے کیونکہ اس کے ایک پر میں شفا اور دوسرے میں بیماری ہے'' اور ایک روایت میں یہ آیا ہے کہ ''وہ مکھی اپنے آپ کو اس پر کے ذریعہ بچاتی ہے جس میں بیماری ہے''۔

واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ نے حیوان کے اندر طبیعت کو پیدا کیا ہے جو مدبر بدن ہے پس بسا اوقات وہ طبیعت موادموذیہ کو جو جز بدن ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتے اعماق بدن سے اطراف بدن کی طرف پھینک دیتی ہے یہی وجہ ہے کہ اطبا نے جانوروں کی دم کھانے سے منع کیا ہے اور مکھی اکثر وہ فاسد غذائیں کھاتی ہے جو جز بدن ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتیں اور اس کی طبیعت ان فاسد غذاؤں کو اس کے عضو خسیس یعنی پر کی طرف دفع کر دیتی ہے پھر یہ عضو جس میں وہ سمیہ ہوتا ہے کھجلی محسوس کرتا ہے اور تنگیوں میں کشمکش کے وقت اس کے اعضا میں سے یہی عضو مقدم ترین ہوتا ہے۔

اور اللہ تعالیٰ کی حکمت یہ ہے کہ جس چیز میں زہر رکھا ہے اس میں مادہ تریاقیہ بھی رکھا ہے تاکہ اس کی وجہ سے حیوان کا وجود محفوظ رہے اور اگر ہم اس طبعی بحث کو بیان کریں تو کلام طویل ہو جائے گا۔

اور حاصل کلام یہ ہے کہ مکھی کے کاٹنے کا زہر بعض زمانوں میں اور بعض غذا کھانے کے وقت محسوس اور معلوم ہوتا ہے اور جس عضو کی طرف مادہ لذاعہ گرتا ہے اس کا حرکت کرنا معلوم ہوتا ہے اور طبیعت جس کے اندر ایسے موادموذیہ کی مدافعت کی طاقت ہوتی ہے وہ بھی معلوم ہے تو اب کون سی چیز ہے جو اس مبحث سے مستبعد ہے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ کبھی دسترخوان پر کھایا اور نہ پیالہ میں کھایا اور نہ پتلی چپاتی آپ کے لئے پکائی گئی اور نہ کبھی آپ نے سالم بکری بھنی ہوئی دیکھی اور نہ آپ نے تکیہ لگا کر کھایا اور نہ آپ نے چھلنی کو دیکھا آپ بغیر چھنے جو کھایا کرتے تھے۔

واضح ہو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم عرب میں مبعوث ہوئے اور ان کی عادات درمیانی عادات تھیں اور وہ لوگ عجمیوں کی طرح تکلفات نہیں کرتے تھے اور ایسی عادات کا پابند ہونا اچھا ہے اور اس کے زیادہ قریب ہے کہ دنیا میں تعمق نہ کریں اور ذکر الٰہی سے اعراض نہ کریں اور اصحاب ملت و مذہب کو ہر چھوٹی اور بڑی بات میں اپنے امام کی سیرت کی اتباع کرنی چاہئے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''مومن ایک آنت میں اور کافر سات آنتوں میں کھاتا ہے''۔

میں کہتا ہوں اس کے معنی یہ ہیں کہ کافر کا قصد پیٹ بھرنا ہے اور مومن کا قصد اس کی آخرت ہے اور مومن کو چاہئے کہ کھانے میں کمی کرے اور مومن کا کم کھانا ایمان کی خصلتوں میں سے ایک خصلت ہے اور کھانے میں زیادہ حرص کرنا کفر کی خصلتوں میں سے ایک خصلت ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دو چھوارے ملا کر کھانے سے منع فرمایا ہے۔

میں کہتا ہوں دو چھوارے ملا کر کھانے سے منع کرنے کی کئی وجوہات ہیں، از آں جملہ یہ ہے کہ دو چھوارے اچھی طرح سے چبائے نہیں جاسکتے اور اس بات کا زیادہ احتمال ہے کہ دو گٹھلیوں کے قابو میں نہ آنے کی وہ اس کو تکلیف دیں گی بخلاف ایک گٹھلی کے اور از آں جملہ یہ ہے کہ یہ ہیئت حرص اور ہوکے کی ہے اور از آں جملہ یہ ہے کہ اس میں اپنے دوستوں پر اپنے آپ کو ترجیح دینا ہے اور اس بات کا غالب احتمال ہے کہ اس کے دوست اس کو برا سمجھیں البتہ اجازت لینے کے بعد کوئی مضائقہ نہیں ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جن کے پاس چھوارے ہوں گے ان کے گھر والے بھوکے نہ رہیں گے'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس گھر میں چھوارے نہیں اس گھر کے لوگ بھوکے رہیں گے'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''سرکہ عمدہ سالن ہے''۔

میں کہتا ہوں من جملہ اصول خانہ داری کے یہ ہے کہ کوئی چیز ہلکی اور جس کو وہ بازار میں ارزاں پائے اپنے گھر میں جمع کر لے جیسے مدینہ میں چھوارے اور ہمارے ملک کے بازاروں میں گاجریں وغیرہ پس اگر خواہش کے موافق کھانا مل جائے تو بہتر ہے ورنہ جو چیز اس کے پاس ہے اس سے حاجت روائی ہو جائے گی اور ستر ہو جائے گا پس اگر وہ ایسا نہ کریں گے تو بھوک کا خوف رہے گا اور یہی حال سالن کا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو شخص لہسن یا پیاز کھائے تو وہ ہم سے الگ رہے'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک ہانڈی آئی جس میں ایسی ترکاریاں پکی

ہوئی تھیں جن میں بو آتی تھی تو آپ نے ایک صحابی سے فرمایا کہ "تو کھالے کیونکہ میں اس سے بات کرتا ہوں جس سے تو نہیں کرتا"۔

میں کہتا ہوں فرشتوں کو بنی آدم سے پاکیزگی اور خوشبواور وہ چیز جو پاکیزگی کی عادت پیدا کرے پسند ہے اور ان کے اضداد سے نفرت کرتے ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مابین محسنین کی شریعت کے جن میں ملکیت کے انوار چمکتے ہیں اور مابین ان کے غیر کے فرق کردیا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اللہ تعالیٰ اس بندہ سے خوش ہوتا ہے کہ جولقمہ وہ کھائے اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے اور جو گھونٹ وہ پیئے اس پر اس کا شکر بجالائے اس کا راز سابقاً گزر چکا ہے، اور حمد کے باب میں کئی طریقے وارد ہوئے ہیں ان میں سے جس کو عمل میں لایا اس نے سنت کو ادا کردیا، از آں جملہ یہ ہے: **الحمدلله حمداً كثيرا مباركاً فيه غير مكفي ولا مودع ولا مستغني عنه ربنا**، اور از آں جملہ یہ ہے: **الحمد لله الذى اطعمنا وسقانا وجعلنا المسلمين** اور از آں جملہ یہ ہے: **الحمد لله الذى اطعم وسقى وسوغه وجعل له مخرجا**۔

اور چونکہ ضیافت سخاوت کے ابواب میں سے ایک باب ہے اور شہر اور ملت کے امور کے اتفاق کا باعث ہے اور وہ لوگوں کے مابین دوستی پیدا کرتی ہے اور مسافروں کو اس سے فائدہ پہنچتا ہے تو اس کو زکوٰۃ کے باب میں شمار کرنا اور اس میں رغبت دلانا اور لوگوں کو اس پر آمادہ کرنا ضروری ہوا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو شخص اللہ اور روز آخرت پر ایمان لایا اس کو چاہئے کہ اپنے مہمان کی عزت کرے" پھر اس بات کی حاجت ہوئی کہ مہمان نوازی کی مدت مقرر کی جائے تاکہ مہمان اہل خانہ کو تنگی میں نہ ڈالے یا تھوڑی سی ضیافت بہت نہ سمجھی جائے اس واسطے اس کے اکرام کی مدت ایک دن رات مقرر کی گئی اور وہ تحفہ اور صلہ ہے اور ضیافت کی انتہائی مدت تین روز مقرر کئے گئے پھر اس کے بعد صدقہ ہے۔

مسکرات کا بیان

واضح ہو کہ نشہ آور چیز کھا کر عقل کا زائل کرنا عقل کے نزدیک قطعی قبیح فعل ہے اس لئے کہ اس میں نفس کو وطیرہ بہیمیہ میں ڈال دینا اور ملکیت سے نہایت درجہ بعید ہو جانا ہے اور خلق الٰہی کو بدلنا ہے اس لئے کہ اس شخص نے اپنی اس عقل کو جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے نوع انسان کو مخصوص

کیا ہے اور اس کے ساتھ ان پر احسان کیا ہے، بگاڑ دیا اور اس میں مصلحت منزلیہ اور مدنیہ کا فاسد کرنا اور مال کا ضائع کرنا اور ہیئات قبیحہ کا اپنے اوپر طاری کرنا ہے جس سے وہ مضحکۂ اطفال بن جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان سب باتوں کو صراحۃً یا اشارۃً اس آیت میں جمع کر دیا ہے: انما یرید الشیطان ان یوقع بینکم العداوۃ، الایۃ : یہی وجہ ہے کہ تمام اہل مذاہب اور اہل عقل کا اس کے قبیح ہونے پر اتفاق ہے اور بعض بصیرت نہ رکھنے والے جو یہ گمان کرتے ہیں کہ حکمت عملیہ کے اعتبار سے وہ ایک عمدہ چیز ہے کیونکہ اس میں طبیعت کو تقویت ہوتی ہے سو وہ غلط ہے کیونکہ ان کا یہ گمان حکمت طبیہ کی حکمت عملیہ کے ساتھ اشتباہ کے قبیل سے ہے اور حق یہ ہے کہ وہ دونوں متغائر ہیں اور بسا اوقات ان دونوں میں کشمکش اور تنازع واقع ہوتا ہے جیسے قتال کرنا کہ طب اس سے منع کرتی ہے کیونکہ اس میں انسان کی بنیاد جس کی حفاظت طب میں واجب ہے قطع ہوتی ہے اور بسا اوقات یہ قتال حکمت عملیہ کے اعتبار سے واجب اور ضروری ہوتا ہے کیونکہ اس میں شہر کی اصلاح اور عار شدید کی مدافعت ہوتی ہے اور اسی طرح جماع ہے کہ غلبہ شہوت اور اس کے ترک کرنے سے ضرر کے خوف کے وقت طب اس کو واجب کرتی ہے اور بسا اوقات اس میں عار کے پائے جانے کے وقت یا سنت راشدہ کے خلاف ہونے کی وجہ سے حکمت عملیہ اس کو حرام قرار دیتی ہے اور ہر امت اور ہر زمانہ کے دانشمند لوگ طب پر مصلحت کو ترجیح دیتے رہے ہیں اور وہ عقلمند لوگ اس شخص کو جو مصلحت سے نفع نہ حاصل کرے اور صحت جسمانی کی طرف مائل ہو کر اس کا پابند نہ رہے فاسق وفاجر بدکردار اور برا سمجھتے ہیں اور اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہوتا، اور اللہ تعالیٰ نے ہم کو اس آیت میں اس بات کی تعلیم فرمادی ہے ''ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لئے منافع ہیں اور ان کا گناہ ان کے منافع سے زیادہ بڑا ہے'' البتہ نشہ آور چیز کے کھانے میں جبکہ وہ حد سکر کو نہ پہنچے اور اس پر یہ خرابیاں مرتب نہ ہوں عقلاء کا اختلاف ہے اور شریعت محکمہ محمدیہ جو سیاست امت میں اور فسادات کے بند کرنے میں اور احتمال تحریف کے قطع کرنے میں کامل ہے اس نے اس بات کا لحاظ کیا کہ تھوڑی شراب زیادہ شراب کا مرتکب بناتی ہے اور ان مفاسد سے منع کرنا بغیر اس کے کہ نفس شراب سے منع کیا جائے کچھ موثر نہیں ہے اور اس پر مجوس وغیرہ کا حال کافی شاہد ہے اور نیز اگر تھوڑی شراب کی اجازت کا دروازہ کھل جائے تو سیاست ملیہ کا انتظام بالکل نہیں ہوسکتا اس

واسطے مطلق شراب کے ساتھ حرمت متعلق ہوئی خواہ وہ تھوڑی ہو یا بہت۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اللہ تعالیٰ نے شراب پر اور اس کے پینے والے پر اور اس کے پلانے والے پر اور اس کے بیچنے والے پر اور اس کے خریدنے والے پر اور اس کے نچوڑنے والے پر اور جس کے لئے نچوڑی جائے اس پر اور اس کے اٹھانے والے پر اور جس کے پاس اٹھا کر پہنچائی جائے اس پر لعنت کی ہے''۔

میں کہتا ہوں کہ جب ایک چیز کے حرام کرنے میں اور اس کے مٹانے میں مصلحت قرار پا گئی اور اس کے بارے میں حکم الٰہی نازل ہو گیا تو ضروری ہوا کہ ان تمام چیزوں سے منع کیا جائے جن سے اس کی قدر اور لوگوں میں رواج اور اس کی رغبت پائی جائے کیونکہ یہ چیزیں مصلحت کے خلاف اور شرع کے مخالف ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ سے بہت سی احادیث بے شمار طرق اور مختلف عبارتوں سے منقول ہیں چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''شراب ان دو درختوں سے ہوتی ہے، چھوارے کا درخت اور انگور کا درخت'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص سے جو نے بتع اور مزر وغیرہ کی بابت دریافت کیا تھا فرمایا ''جو پینے کی چیز نشہ آور ہو وہ حرام ہے'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''ہر نشہ آور چیز شراب ہے اور ہر نشہ آور چیز حرام ہے اور جو چیز بہت ساری نشہ لائے وہ تھوڑی سی بھی حرام ہے اور جس کا ایک پیالہ نشہ لائے اس کا ایک چلو بھی حرام ہے'' اور جن لوگوں نے نزول آیت کا مشاہدہ کیا ہے کہا کہ جب شراب کی حرمت نازل ہوئی اس وقت میں شراب پانچ چیزوں سے بنا کرتی تھی انگور، چھوارہ، گیہوں، جو، شہد اور شراب ہر وہ چیز ہے جو عقل کو زائل کر دے اور ان لوگوں کا قول ہے کہ جب شراب حرام کی گئی تو ہمارے پاس انگور کی شراب بہت ہی کم تھی اور عام شراب تر اور خشک چھواروں کی ہوا کرتی تھی اور جب آیت کا نزول ہوا ہے تو لوگوں نے ان مٹکوں کو توڑ ڈالا جن میں وہ شراب بنایا کرتے تھے اور قوانین شرع کا یہی مقتضیٰ ہے کہ مطلق شراب حرام ہو کیونکہ انگوری شراب کے خاص ہونے کے کوئی معنی نہیں اور اس کی حرمت کا سبب اس کا عقل کو زائل کرنے والا ہونا ہے جس کا تھوڑا بہت کی طرف داعی ہوتا ہے اس واسطے مطلق شراب کی حرمت کا قائل ہونا ضروری ہوا اس زمانہ میں کسی شخص کو یہ جائز نہیں کہ جو شراب انگور سے نہ بنائی جائے یا جو حد سکر سے کم استعمال کی جائے اس کے حلال ہونے کا قائل ہو

البتہ صحابہ اور تابعین میں سے کچھ لوگ ایسے تھے جن کو شروع شروع میں یہ حدیث نہیں پہنچی تھی اس واسطے وہ معذور تھے اور جب یہ حدیث سب میں مشہور ہوگئی اور آفتاب نیم روز کے مانند یہ بات ظاہر ہوگئی اور یہ حدیث بھی ثابت ہوگئی کہ ''میری امت کے کچھ لوگ شراب پیا کریں گے اور شراب کے علاوہ اور کچھ اس کا نام رکھیں گے تو اب کچھ عذر باقی نہیں رہا، اللہ تعالیٰ ہم کو اور مسلمانوں کو اس سے بچائے، اور کسی شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے شراب سے سرکہ بنانے کے متعلق دریافت کیا تو آپ نے اس کو منع فرمایا اور کسی نے عرض کیا کہ میں اس کو دوا کے لئے بناتا ہوں تو آپ نے فرمایا وہ دوا نہیں ہے بلکہ بیماری ہے''۔

میں کہتا ہوں چونکہ لوگ شراب کے بڑے حریص تھے اور اس کے پینے کے لئے حیلے کیا کرتے تھے اس واسطے مصلحت اس کے بغیر تمام نہ ہوتی تھی کہ ہر حال میں اس سے منع کیا جائے تاکہ کسی کو کوئی حیلہ اور عذر باقی نہ رہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تر اور خشک چھواروں کے ملانے سے اور منقی اور چھواروں کے ملانے سے اور مائل بہ سرخی چھوارے اور ترشی لئے چھواروں کے ملانے سے منع فرمایا۔

میں کہتا ہوں اس میں راز یہ ہے کہ مزہ بدلنے سے پیشتر ملانے کی وجہ سے ان چیزوں میں جلدی نشہ پیدا ہوجاتا ہے، پس پینے والا تو یہ سمجھتا ہے کہ وہ نشہ آور نہیں ہے حالانکہ اس میں نشہ ہوتا ہے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم تین سانسوں میں پیا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ ''اس سے خوب سیرابی ہوتی ہے اور زیادہ تکلیف سے بچتا ہے اور طبیعت کو خوب موافق ہوتا ہے''۔

میں کہتا ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ جب معدہ کی طرف تھوڑا تھوڑا پانی پہنچتا ہے تو طبیعت جہاں اس کو ضروری سمجھتی ہے اچھی طرح صرف کرتی ہے اور بہت سا پانی معدہ میں ایک دم آپڑتا ہے تو اس کے صرف کرنے میں طبیعت حیران ہوجاتی ہے اور سرد مزاج والے آدمی کے معدہ میں جب ایک دم بہت سا پانی پہنچتا ہے تو زیادہ پانی کی مدافعت سے اس کی قوت ضعیف ہوجاتی ہے اور اس کو زیادہ برودت لاحق ہوجاتی ہے بخلاف اس صورت کے کہ جب بتدریج پانی پہنچے اور گرم مزاج والا آدمی کے معدہ میں جب دفعتہً پانی پہنچتا ہے تو ان دونوں میں مدافعت واقع ہوتی ہے اور پورے طور پر برودت حاصل نہیں ہوتی اور جب بتدریج پانی معدہ میں پڑتا ہے تو شروع میں

مزاحمت ہوتی ہے پھر برودت غالب آجاتی ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی کے برتن کو منہ لگا کر پانی پینے سے اور مشک کے دہانے سے پانی پینے سے منع فرمایا ہے۔

میں کہتا ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ جب مشکیزہ کا دہانہ الٹ کر کوئی شخص پانی پیتا ہے تو پانی اس میں سے اچھل کر دفعتہً اس کے حلق میں پہنچ جاتا ہے اور اس سے جگر میں درد پیدا ہو جاتا ہے اور معدہ کو ضرر پہنچتا ہے اور پانی کے ایک دم منہ میں گرنے سے اس کے تنکے وغیرہ کا پتہ نہیں چلتا۔

اور منقول ہے کہ ایک شخص نے مشکیزہ کے دہانے سے پانی پیا تو پانی کے ساتھ اس کے پیٹ میں سانپ اتر گیا، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر پانی پینے سے منع فرمایا ہے اور ایک روایت میں آیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر پانی پیا۔

میں کہتا ہوں یہ نہی ارشاد اور تادیب کے طور پر ہے کیونکہ بیٹھ کر پینا ایک عمدہ حالت ہے اور اس سے سیرابی اور دل کو سیری خوب حاصل ہوتی ہے اور طبیعت اس پانی کو اس کے محل میں اچھی طرح صرف کر سکتی ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کھڑے ہو کر پینا بیان جواز کے لئے تھا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''داہنی طرف کا پس داہنی طرف کا ہے''۔ یعنی الایمن فالایمن

میں کہتا ہوں اس سے آپ کی مراد قطع منازعت ہے کیونکہ اگر یہ دستور رہوتا کہ افضل کو مقدم کیا جائے تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص کی فضیلت کو سب لوگ نہیں مانتے اور بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک کو مقدم کرنے سے دوسروں کے دلوں میں ملال ہوتا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے برتن میں سانس لینے سے یا اس میں پھونک مارنے سے منع فرمایا ہے۔

میں کہتا ہوں یہ ممانعت آپ نے اس وجہ سے فرمائی کہ اس کے منہ یا ناک سے کوئی ناگوار خاطر چیز پانی میں نہ گر جائے پس اس کے سبب سے ایک ہیئت قبیحہ پیدا ہو جائے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جب تم پینا شروع کرو تو بسم اللہ کہو اور جب پی چکو تو اللہ تعالیٰ کی حمد کرو'' اس کا راز ہم بیان کر چکے ہیں۔

لباس اور زینت اور ظروف وغیرہ کا بیان

واضح ہو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عجم کی عادات کی طرف اور دنیاوی لذات پر مطمئن ہونے میں ان کے تکلفات کی طرف نظر ڈالی پس ان میں سے جو سب کی جڑ اور سب کی اصل تھی

اس کوحرام قرار دیا اور اس سے کم درجہ کے تکلفات کو مکروہ ٹھیرایا کیونکہ آپ کو معلوم تھا کہ یہ چیزیں دار آخرت کو بھلانے والی اور طلب دنیا کی کثرت کی طرف رغبت دلانے والی ہیں پس من جملہ ان اصول کے لباس فاخرہ ہے کیونکہ اسی کا وہ سب سے زیادہ اہتمام کرتے ہیں اور اسی پر ان کو سب سے زیادہ فخر ہوتا ہے اور اس سے کئی طرح پر بحث کی گئی ہے اور از آں جملہ قمیص اور ازار کا بہت نیچا کرنا ہے کیونکہ اس سے ستر اور زیبائش جو لباس میں مقصود اصلی ہیں ان کو مطلوب نہیں ہوتے بلکہ فخر اور اپنی دولت مندی وغیرہ دکھانا مقصود ہوتا ہے اور زیبائش صرف اسی مقدار میں ہے جو بدن کے برابر ہو، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''روز قیامت کو اللہ تعالیٰ اس شخص کی طرف نظر نہ کرے گا جو فخر سے اپنی ازار کو زمین پر کھینچتا چلے'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''مومن کی ازار نصف پنڈلی تک ہوتی ہے نصف پنڈلی سے لیکر ٹخنوں تک نیچا کرنے میں کچھ گناہ نہیں اور جو ٹخنوں سے نیچی ہے وہ آگ میں ہے''۔

اور از آں جملہ نہایت عمدہ اور نرم قسم کے کپڑے ہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس نے دنیا میں ریشمی کپڑا پہن لیا تو وہ قیامت کے دن اس کو نہ پہنے گا''۔

اور اس میں حکمت وہی ہے، جو ہم شراب کے بارے میں بیان کر چکے ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ریشم اور دیبا کے پہننے اور قسی اور میاثر اور ارجوان کے پہننے سے منع فرمایا ہے اور بقدر دو انگشت یا تین کے اجازت دی ہے کیونکہ اتنی مقدار لباس میں داخل نہیں ہے اور اکثر اتنی مقدار کی طرف ضرورت پڑتی ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زبیرؓ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کو کھجلی کے عارضہ میں ریشم کے پہننے کی اجازت فرمائی کیونکہ اس وقت میں اس سے ترفہ مقصود نہیں تھا بلکہ شفا حاصل کرنا مقصود تھا۔

اور از آں جملہ وہ کپڑا ہے جو کسی ایسے رنگ سے رنگا ہوا ہو جس سے فخر اور نمائش حاصل ہوتی ہے اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسم اور زعفران سے رنگے ہوئے کپڑے سے نہی فرمائی اور آپ نے فرمایا ''یہ دوزخیوں کے کپڑے ہیں'' اور نیز آپ نے فرمایا ''خبردار ہو جاؤ مردوں کی خوشبو وہ عطر ہے جس میں رنگ نہ ہو اور عورتوں کی خوشبو وہ رنگ ہے جس میں خوشبو نہ ہو'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول میں کہ ''سادگی ایمان کی خصلت ہے'' اور آپ کے اس قول

میں ''جس نے شہرت کے لئے دنیا میں کپڑا پہنا قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اس کو ذلت کا کپڑا پہنائے گا'' اور آپ کے اس قول میں ''جس نے تواضع کی خاطر زینت کا لباس ترک کیا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کو عزت کا جوڑا پہنائے گا اور آپ کی اس حدیث میں کوئی مخالفت نہیں ہے کہ ''اللہ تعالیٰ کو یہ بات پسند ہے کہ وہ بندہ سے اپنی نعمت کا اثر دیکھے'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو پراگندہ سر دیکھا اور فرمایا ''اس کو ایسی چیز نہیں ملتی جس سے بالوں کو درست کرلے'' اور ایک شخص کو میلے کپڑے پہنے ہوئے دیکھا تو آپ نے فرمایا ''اس کو ایسی چیز نہیں ملتی جس سے اپنے کپڑے کو دھولے'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جب اللہ تعالیٰ تجھ کو مال دے تو چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت اور کرامت کا اثر تجھ پر ظاہر ہو'' ان احادیث میں اختلاف نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس مقام پر دو امر ہیں جو حقیقت میں مختلف ہیں اور بظاہر ایک دوسرے کے مشابہ ہیں ان میں سے ایک شارع کو مطلوب ہے اور دوسرا مذموم ہے پس مطلوب تو بخل کا ترک کرنا ہے اور لوگوں کے درجات مختلف ہونے کی وجہ سے اس میں بھی اختلاف ہوتا ہے پس جو چیز بادشاہوں کے اعتبار سے بخل میں شمار ہوتی ہے وہ بسا اوقات فقرا کے اعتبار سے اسراف میں داخل ہوتی ہے اور نیز شارع کو ان لوگوں کی عادات کا ترک کرنا مقصود ہے جو جنگلی اور بہائم میں شمار ہوتے ہیں اور پاکیزگی اور پسندیدہ اخلاق کا اختیار کرنا مطلوب ہے اور مذموم تکلفات میں تعمق کرنا اور دکھاوے کیلئے کپڑے پہننا اور کپڑوں کے ذریعہ باہم فخر کرنا اور فقراء کی دل شکنی کرنا وغیرہ امور ہیں اور الفاظ حدیث میں ان معانی کی طرف اشارات بھی ہیں جیسا کہ متامل پر پوشیدہ نہیں ہے اور اجر کا مدار داعیہ تکبر اور فخر کے اتباع سے نفس کے باز رکھنے پر ہے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب کوئی نیا کپڑا پہنتے تھے تو اس کا نام عمامہ یا کرتا یا چادر لیتے تھے پھر یہ فرماتے تھے ''اللهم لک الحمد كما كسوتنيه اسألک خيره و خير ما صنع له واعوذبک من شره وشر ما صنع له'' اور اس کی وجہ پہلے بیان ہو چکی ہے اور من جملہ ان اصول کے اعلیٰ قسم کا زیور ہے اور یہاں دو اصل ہیں ان میں ایک یہ ہے کہ سونا ایسی چیز ہے جس پر عجمی لوگ فخر کرتے ہیں اور سونے کے پہننے کے دستور کے جاری ہونے میں دنیا کی طلب زیادہ ہوتی ہے بخلاف چاندی کے، اسی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سونے کی بابت تشدد فرمایا اور فرمایا ''مگر تم چاندی کو اختیار کرو پس اس سے

کھیلا کرو“۔

دوسری اصل یہ ہے کہ عورتوں کو زینت کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے تا کہ ان کے شوہروں کو ان سے رغبت ہو یہی وجہ ہے کہ تمام عرب اور عجم کی یہ عادت جاری ہے کہ بہ نسبت مردوں کے عورتوں کی آراستگی زیادہ ہوتی ہے اس واسطے ضروری ہوا کہ عورتوں کو مردوں سے زیادہ زینت کی اجازت دی جائے اسی لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”سونا اور ریشم میری امت کی عورتوں پر حلال اور مردوں پر حرام کیا گیا ہے“۔

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سونے کی انگوٹھی کی نسبت جو ایک شخص کے ہاتھ میں تھی یہ فرمایا ”تم میں سے کوئی شخص آگ کے انگارہ کا قصد کرتا ہے اور اس کو اپنے ہاتھ میں رکھ لیتا ہے“ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے چاندی کی انگوٹھی کی مردوں کو اجازت فرمائی ہے خاص کر صاحب حکومت کے لئے اور فرمایا کہ ”ایک مثقال کے برابر اس کو پورا مت کرو“ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو غیر مقطع سونے سے منع فرمایا اور غیر مقطع وہ ہے جو سونے کا ایک بڑا سا ٹکڑا ہو، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”جو کوئی اپنے دوست کو آگ کا حلقہ پہنانا چاہے تو وہ اس کو سونے کا حلقہ پہنائے“ اور اسی طریق پر ہنسلی اور کنگن کو بیان فرمایا اور اسی طرح گلوبند اور بالی اور سونے کے توڑے کی تصریح آئی ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حکم کی وجہ بیان فرمائی ہے اور یہ فرمایا ”خبردار ہو جاؤ تم میں سے جو عورت نمائش کے لئے سونے کا زیور پہنے گی اس کو اسی کے ساتھ عذاب دیا جائے گا“ حضرت ام سلمہؓ کے پاس سونے کا ہار تھا اور ظاہر ہے کہ وہ مقطع کے قبیل سے تھا، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو یہ فرمایا کہ ”عورتوں کے لئے سونا حلال ہے“ تو اس کے یہی معنی ہیں کہ فی الجملہ حلال ہے۔

یہ جو کچھ ہم نے ذکر کیا ان احادیث کا مفہوم ہے اور مجھ کو ان احادیث کا کوئی متعارض نہیں ملا اور فقہا کا جو اس میں مذہب ہے وہ معلوم ومشہور ہے اور اللہ تعالیٰ نے حقیقت حال سے خوب واقف ہے۔

اور از آں جملہ بالوں کی زینت ہے اس کے اندر لوگوں کے مختلف طریقے تھے پس مجوس تو اپنی داڑھی منڈاتے اور مونچھوں کو بڑھاتے تھے لیکن انبیا علیہم السلام کا طریقہ اس کے خلاف تھا اس لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”مشرکین کی مخالفت کرو داڑھیوں کو بڑھاؤ اور مونچھوں کو

کترواؤ''۔

اور بعض لوگ ایسے تھے جو پراگندہ حال رہنے کو اور بکھرے بال رہنے اور بری صورت بنانے کو پسند کرتے تھے اور زینت کو مکروہ سمجھتے تھے اور بعض لوگ ایسے تھے جو زیبائش پر بڑا فخر کرتے تھے اور اس کو ایک فخر کی بات سمجھتے تھے اور دوسرے لوگوں کو ذلیل سمجھتے تھے پس ان سب کے طریقوں کا مٹانا مقاصد شرعیہ میں سے ایک مقصد تھا کیونکہ شرائع کا مبنی افراط اور تفریط کے مابین حالت پر اور ان دونوں مصلحتوں کے جمع کرنے پر ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''پانچ باتیں فطرت کی باتوں میں سے ہیں، ختنہ کرنا، زیر ناف بال کاٹنا، مونچھیں کترنا، ناخون کاٹنا اور بغلوں کے بال اکھاڑنا'' پھر ان کا وقت مقرر کرنے کی ضرورت پڑی تاکہ مخالف سنت پر اعتراض ہو سکے اور تاکہ بڑا پرہیزگار ہر روز بال مونڈنے میں اور اکھیڑنے میں نہ پڑ جائے اور سست آدمی سال سال بھر تک خبر نہ لے اس واسطے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مونچھوں کے کتروانے میں اور ناخونوں کے ترشوانے میں ل کے بال کے اکھڑوانے میں اور زیر ناف بال لینے میں یہ مدت مقرر فرمائی کہ چالیس روز سے زیادہ دیر نہ کی جائے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''یہود ونصاریٰ داڑھی نہیں رنگتے تم ان کے خلاف کرو'' اور اہل کتاب سر کے بالوں کو سدل کرتے تھے اور مشرکین مانگ نکالا کرتے تھے پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اول سدل کیا پھر مانگ نکالی پس سدل کے معنی پیشانی کے بالوں کا منہ پر چھوڑے رکھنا ہے اور یہ ایک پریشان صورت ہے اور فرق بالوں کو دو چوٹیاں بنا کر ہر چوٹی کو کنپٹی کی طرف پہنچا دینے کو کہتے ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سر کے بعض حصہ کو مونڈنے اور بعض حصہ کے بال رکھنے سے منع فرمایا ہے۔

میں کہتا ہوں اس میں راز یہ ہے کہ یہ ہیئت شیطانی ہے اور ایک قسم کا مثلہ ہے جس کو تمام نفوس سوائے ان نفوس کے جو اس کے عادی ہو کر ماؤف ہو گئے ہیں برا جانتے ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس کسی کے بال ہوں تو وہ ان کی عزت کرے'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سوائے تیسرے روز کے کنگھی کرنے سے منع فرمایا ہے اس سے آپ کی مراد افراط وتفریط میں میانہ روی ہے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''گودنے والیوں اور گدوانے والیوں اور منہ کے بال اکھڑوانے والیوں اور حسن کے لئے دانت باریک کرنے والیوں پر جو اللہ کی پیدائش کو بدلتی ہیں

اللہ تعالیٰ نے لعنت کی ہے'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان مردوں پر جو عورتوں کے ساتھ مشابہت کرتے ہیں اور ان عورتوں پر جو مردوں کے ساتھ مشابہت کرتی ہیں، لعنت کی ہے۔

میں کہتا ہوں اللہ تعالیٰ نے ہر نوع اور ہر صنف کا بدن میں ظہور احکام کے لئے مقتضی بنایا ہے مثلاً مردوں میں داڑھی کا شوق ہوتا ہے اور عورتیں خوشی (۱) اور خفت کی طرف کسی قدر مائل ہوتی ہیں پس اس معنی کی وجہ سے جو اصل مادہ میں ہوتے ہیں انواع کا احکام کو چاہنا بعینہ ان احکام کی اضداد سے نفرت کرنا ہوتا ہے اور اسی وجہ سے ہر نوع اور صنف کا اپنی مقتضائے فطرت پر باقی رہنا پسندیدہ ہوا اور پیدائش الٰہی کا بدلنا لعنت کا باعث ہوا اور اسی لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم خچروں کے پیدا ہونے کے لئے گدھے کو گھوڑے پر چھوڑنے سے منع فرمایا ہے، مگر بعض زینت ایسی ہوتی ہے جس سے طبیعت کے فعل کی تقویت اور اس کی تائید اور اس کی پیروی ہوتی ہے جیسے سرمہ لگانا اور کنگھی کرنا اور یہ زینت پسندیدہ چیز ہے اور بعض قسم کی زینت فعل طبیعت کے منافی ہوتی ہے جیسے انسان کو حیوانات کی ہیئت بنانا اور بعض قسم کی زینت ایسی ہوتی ہے جس میں طبیعت کے خلاف بہ تکلف کسی چیز کا پیدا کرنا ہوتا ہے اور ایسی زینت بھی غیر پسندیدہ ہے، جب انسان اپنی فطرت کے ساتھ اس پر غور کرے گا تو ضرور اس کو مثلہ خیال کرے گا۔

اور از آں جملہ کپڑوں اور دیواروں اور قالینوں میں تصاویر بنانا ہے پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے نہی فرمائی ہے اور اس ممانعت کا مدار دو چیزوں پر ہے ایک یہ ہے کہ اس میں ترفہ اور زینت کی صورت پائی جاتی ہے اس واسطے کہ وہ لوگ ان تصاویر سے فخر کیا کرتے تھے اور بہت سامان اس میں صرف کیا کرتے تھے پس وہ بھی مثل حریر کے شمار کی گئیں اور یہی بات درخت وغیرہ کی تصاویر میں پائی جاتی ہے دوسری چیز یہ ہے کہ تصاویر میں مشغول ہونا اور ان کو بنانا اور ان کی طرف رغبت کرنے کا دستور جاری ہونا ایسا امر ہے کہ اس سے بت پرستی کا دروازہ کھلتا ہے اور اس میں بتوں کی عظمت پیدا ہوتی ہے اور بت پرستوں کے لئے یاد دہانی ہوتی ہے اور اکثر امتوں میں جو بت پرستی پھیلی ہے تو اسی وجہ سے پھیلی ہے اور یہ بات صرف حیوانات کی تصاویر میں پائی جاتی ہے اسی واسطے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تصاویر کے سر کاٹنے کا حکم فرمایا ہے تا کہ وہ بہ منزلہ درخت

(۱) طرب

کے ہو جائیں اور درختوں کی تصویر بنانے میں اس قدر فساد نہیں ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس گھر میں تصویر ہوتی ہے اس میں فرشتے داخل نہیں ہوتے'' اور فرمایا ہے ''ہر مصور دوزخ میں ہے ہر تصویر کے عوض میں جو اس نے بنائی ہے ایک شخص مقرر کیا جائے گا جو اس کو جہنم میں عذاب دے گا'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس نے جو کوئی تصویر بنائی اس کو عذاب دیا جائے گا اور اس سے کہا جائے گا کہ اس میں جان ڈال اور وہ اس میں جان نہ ڈال سکے گا''۔

میں کہتا ہوں چونکہ تصاویر کے اندر بتوں کے معنی پائے جاتے ہیں اور ملاء اعلیٰ میں بتوں اور بت پرستوں پر لعنت اور غضب کا اقتضا پایا جاتا ہے اس واسطے ضروری ہوا کہ ملائکہ کو ان سے نفرت ہو اور قیامت کے روز سب لوگ اپنے اپنے اعمال کے ساتھ اٹھائے جائیں گے تو اس روز مصور کا عمل ان نفوس میں متمثل ہو جائے گا جن کا اس نے تصویر بناتے وقت تصور کیا تھا اور ان کی نقل بنانی چاہی تھی اس واسطے کہ انہیں نفوس کی صورت میں ظاہر ہونا نہایت مناسب ہے اور اس مصور نے ان حیوانات کی نقل بنانے پر جو اقدام کیا ہے اور اس میں نہایت درجہ کی کوشش کرنا اس تکلیف کی صورت میں ظاہر ہوگا کہ اس کو جان ڈالنے کا حکم دیا جائے اور وہ ڈال نہ سکے گا۔

اور از آں جملہ غم دور کرنے والی چیزوں میں مشغول رہنا ہے جو نفس کو دین و دنیا کے غم سے بے فکر کریں اور اوقات ضائع کریں مثلاً باجا اور شطرنج اور کبوتر بازی اور جانوروں کا لڑانا وغیرہ، کیوں کہ انسان جب ان چیزوں میں مشغول ہوتا ہے تو کھانے پینے اور ضروری کاموں سے بھی بے خبر ہو جاتا ہے اور بسا اوقات پیشاب پاخانہ روکے رہتا ہے اور اس کے لئے نہیں اٹھتا پس اگر ان چیزوں میں مشغول ہونے کا دستور عام ہو جائے تو تمام لوگ شہر پر بوجھ ہو جائیں اور اپنی اصلاح کی طرف متوجہ نہ ہوں۔

واضح ہو کہ ولیمہ وغیرہ کے اندر گانا اور دف بجانا تمام عرب و عجم کی عادت اور ان کا دستور ہے اس واسطے کہ یہ سرور اور خوشی کے حال کا مقتضی ہے پس وہ ان چیزوں میں سے نہیں ہے جو دین و دنیا کو خراب کرنے والی ہیں ان بے غم کرنے والی چیزوں میں فرق اس طور پر کیا گیا ہے کہ وہ چیزیں جن کا استعمال نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں حجاز اور آباد بستیوں میں اس فرح اور سرور سے زائد سمجھا جاتا تھا جو ولیمہ وغیرہ میں مطلوب ہیں تو وہ چیزیں ممنوع اور دنیا و عاقبت کو خراب

کرنے والی ہیں مثلاً مزامیر، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس نے شطرنج کا کھیل کھیلا (۱) اس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی'' اور آپ نے فرمایا ''جس نے چوپڑ کا کھیل کھیلا اس نے اپنا ہاتھ خنزیر کے گوشت اور خون میں رنگا'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''میری امت میں بلاشبہ کچھ گروہ ایسے ہوں گے جو فرج اور حریر اور شراب اور کھیل کی چیزوں کو حلال سمجھیں گے'' (۲) اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''نکاح کا اعلان کرو اور اس پر دف بجاؤ'' پس لہو ولعب کی دو قسمیں ہیں ایک حرام اور یہ وہ کھیل کی چیزیں ہیں جو سرور حاصل کرنے کے لئے استعمال کی جاتی ہیں مثلاً مزامیر اور ایک مباح اور وہ ولیمہ وغیرہ میں دف بجانا اور گانا ہے جس سے سرور پیدا ہو اور حدی اصل میں وہ ہے جس سے اونٹوں میں جولانی پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے مگر یہاں مطلق خوش الحانی اور گھٹاؤ بڑھاؤ کے ساتھ کسی چیز کا پڑھنا مراد ہے اور وہ مباح ہے کیونکہ وہ ملال دور کرنے والی چیز ہے اور ایسی چیز نہیں ہے جس سے دنیا وآخرت سے بےفکری ہو جائے۔

اور آلات حرب سے کھیلنا مثلاً تیراندازی اور چابک سواری اور نیزہ بازی، پس یہ درحقیقت کھیل میں داخل نہیں ہیں کیونکہ ان سے مقصود شرعی حاصل ہوتا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو آپ کی مسجد میں حبشیوں نے پٹا کھیلا ہے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کے متعلق جو ایک کبوتری کے پیچھے پیچھے جاتا تھا فرمایا ''شیطان شیطانہ کے پیچھے جاتا ہے'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جانوروں کے لڑانے سے ممانعت فرمائی ہے (۳)۔

اور از آں جملہ بلاضرورت صرف دکھانے اور فخر کرنے کے لئے بہت سے جانور اور سامان کا جمع کرنا ہے چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''ایک بستر مرد کے لئے اور ایک اس کی بیوی کے لئے اور ایک مہمان کے لئے کافی ہے اور چوتھا بستر شیطان کے لئے ہے'' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''بہت سے اونٹ اور بہت سے گھر شیطان کے لئے ہوتے ہیں، ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں شیطان کے لئے اونٹ تو میں نے دیکھے ہیں کہ تم میں سے کوئی شخص عمدہ عمدہ اونٹوں کو

---

(۱) چوسر، پچیسی، چوسر اور پچیسی میں اتنا فرق ہے کہ یہ بانسوں سے کھیلی جاتی ہے اور وہ کوڑیوں سے۔

(۲) ان کو حلال سمجھنا، دائرۂ کفر میں داخل کرتا ہے، اللہ کے احکام سے صریح بغاوت ہے۔

(۳) ہندوستانی مسلم سماج آج بھی اس مرض میں مبتلا ہے، جو زوال امت کے اسباب میں ایک اہم سبب رہا ہے۔

فربہ کر کے اپنے ساتھ لیکر نکلتا ہے ان میں سے کسی پر سوار نہیں ہوتا اور نہ کسی مسلمان بھائی کو جو راستہ میں تھکا ماندہ ملتا ہے اس کو سوار کرتا ہے"۔

اور اہل جاہلیت کو کتے پالنے کا بڑا شوق تھا اور کتا ایک ملعون جانور ہے جس سے ملائکہ کو نفرت ہے کیونکہ اس کو شیاطین سے مناسبت ہے جیسا کہ ہم نے گرگٹ کے بارے میں بیان کیا ہے اس واسطے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو پالنے سے منع فرمایا اور یہ فرمایا" جو شخص کتا رکھے بجز اس کتے کے جو مویشی یا شکار یا کھیتی کے لئے ہو تو ہر روز اس کے اجر میں سے ایک قیراط (۱) کم ہوتا رہتا ہے" اور ایک روایت میں دو قیراط آیا ہے اور بندر اور سور پالنے کا حکم بھی کتے کے حکم کے مانند ہے۔

میں کہتا ہوں اجر کے کم ہونے کی یہ وجہ ہے کہ اس فعل سے قوت بہیمی زیادہ ہوتی ہے اور ملکیت مغلوب ہوتی ہے اور قیراط کی مقدار کو بطور تمثیل کے ذکر کیا ہے اور اس سے جز قلیل مراد ہے اسی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دو قیراط اور ایک قیراط کے ساتھ بیان کرنے میں کوئی منافات نہ ہوئی اور از آں جملہ سونے چاندی کے ظروف کا استعمال ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" جو شخص چاندی کے برتن سے پیتا ہے بلاشبہ اپنے پیٹ میں جہنم کی آگ بھرتا ہے" اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" سونے اور چاندی کے برتن میں مت پیو اور اس کی رکابیوں میں مت کھاؤ کیونکہ کفار کے لئے وہ دنیا میں ہیں اور تمہارے لئے وہ آخرت میں ہیں" اور پہلے جو ہم بیان کر چکے ہیں اس سے اس کی وجہ بالکل ظاہر ہو سکتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" شام کے وقت برتنوں کو ڈھانک دیا کرو اور مشکیزوں کے دھانے باندھ دیا کرو اور دروازوں کو بند کر دیا کرو اور اپنے بچوں کو گھر سے نہ نکلنے دو کیونکہ شیطان پھیل جاتے ہیں اور اچکتے پھرتے ہیں اور سوتے وقت چراغوں کو گل کر دیا کرو اس واسطے کہ بسا اوقات چوہا بتی کو کھینچ لے جاتا ہے اور گھر والوں کو جلا دیتا ہے" اور ایک روایت میں یہ آیا ہے" کیونکہ شیطان نہ مشکیزہ کھول سکتا ہے اور نہ دروازہ کو کھولتا ہے اور نہ برتن کو کھولتا ہے" اور ایک روایت میں آیا ہے" کیونکہ سال بھر میں ایک رات ایسی ہوتی ہے جس میں وبا نازل ہوتی ہے پھر اس وبا کا جس کسی ایسے برتن پر گزر ہوتا ہے جس پر سر پوش نہیں یا

(۱) وزن اور پیمائش کی ایک مقدار جو مختلف زبانوں میں بدلتی رہی ہے، اب وزن میں مساوی چار دانہ گندم، ہونے میں مساوی تین دانہ گندم۔

کسی مشکیزہ پر سے گزر ہوتا ہے جو سر بند نہیں ہے تو اس میں اس وبا میں سے کچھ نازل ہوتا ہے''۔

میں کہتا ہوں شام کے وقت جنوں کا پھیلنا اس وجہ سے ہے کہ وہ اصل فطرت کے اعتبار سے ظلمانی ہیں پس تاریکی کے پھیلنے سے ان کو خوشی اور سرور حاصل ہوتا ہے اور وہ جہاں میں پھیل جاتے ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو یہ فرمایا کہ ''شیطان بند چیز کو نہیں کھولتا تو اس کا سبب یہ ہے کہ شیاطین کا اکثر اثر جو ہم کو معلوم ہوا ہے افعال طبیعہ کے ضمن میں ہوا کرتا ہے جس طرح کہ ہوا جب کسی گھر میں داخل ہوتی ہے تو اس کے ساتھ جن بھی داخل ہو جاتا ہے اور جب کوئی پتھر لڑکایا جائے اور اس کے لڑکانے میں کوشش کی جائے تو وہ مقتضائے عادت سے زیادہ لڑک جاتا ہے وعلی ہذا القیاس، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو یہ فرمایا کہ سال بھر میں ایک رات ایسی ہوتی ہے جس میں بلا نازل ہوتی ہے، اس کے یہ معنی ہیں کہ زمانہ طویل کے بعد ایسا وقت آتا ہے جس میں ہوا بگڑ جاتی ہے اور میں نے ایک مرتبہ اس کا مشاہدہ بھی کیا ہے کہ مجھے ایک خراب ہوا چلتی ہوئی محسوس ہوئی جس سے اسی وقت میرے سر میں درد پیدا ہو گیا پھر میں نے یہ دیکھا کہ اسی رات میں بہت سے لوگ بیمار ہو گئے اور ان میں امراض کے پیدا ہونے کی استعداد ہو گئی اور از آں جملہ بلند عمارتوں پر فخر کرنا اور ان کو مزین کرنا اور ان کی زیب و زینت کرنا ہے پس وہ لوگ اس امر میں نہایت تکلف کرتے تھے اور اس میں مال کثیر خرچ کرتے تھے پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت سخت ممانعت فرما کر اس کا علاج کیا اور فرمایا ''مومن کوئی خرچ ایسا نہیں کرتا جس میں اس کو اجر نہ دیا جائے گا بجز اس خرچ کے جو اس مٹی میں کرتا ہے'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''ہر عمارت اپنے بنانے والے پر وبال ہے مگر جس کے بغیر چارہ نہ ہو'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''میرے لئے زیبا نہیں یا یہ فرمایا کسی نبی کے لئے زیبا نہیں کہ آراستہ گھر میں داخل ہو'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اللہ تعالیٰ نے ہم کو یہ حکم نہیں دیا کہ ہم پتھر اور مٹی کو لباس پہنائیں''۔

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پیشتر لوگوں کا دستور تھا کہ وہ اپنے امراض اور آفات میں طب اور جھاڑ پھونک سے کام لیا کرتے تھے اور کسی آئندہ چیز کے معلوم کرنے میں فال اور شگون اور خطوط سے کام لیا کرتے تھے اور اس کا نام رمل (۱) ہے اور نیز کہانت اور نجوم اور تعبیر خواب سے کام

---

(۱) ایک فن ہے۔

لیتے تھے اور ان میں سے بعض میں غیر مناسب امور تھے اس واسطے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے منع فرمادیا اور باقی کو مباح کر دیا پس طب کی حقیقت ادویہ حیوانیہ یا نباتیہ یا معدنیہ کی طبائع سے کام لینا اور کم اور زیادہ کر کے اخلاط میں تصرف کرنا ہے اور قواعد ملیہ ان کو صحیح جانتے ہیں کیونکہ اس میں نہ تو شرک کا شائبہ ہے اور نہ دین و دنیا کا کچھ نقصان ہے بلکہ اس میں بڑا نفع اور لوگوں کی جماعت کا مجتمع کرنا ہے مگر شراب سے علاج کرنا ممنوع قرار دیا گیا ہے کیونکہ شراب میں ایک مزہ ہوتا ہے جو شراب پینے والے سے نہیں چھوٹتا اسی طرح خبیث ادویہ یعنی زہریلی اشیا سے علاج کرنا ممنوع ہے جب تک اس کے سوا دوسری اشیا سے علاج کرنا ممکن ہو کیونکہ اس سے بسا اوقات انسان مر جاتا ہے اور نیز جب تک اور چیز سے علاج ممکن ہو داغ لگا کر علاج کرنا ممنوع ہے کیونکہ آگ سے جلانا ایسی چیز ہے جس سے ملائکہ نفرت کرتے ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جو معالجات مروی ہیں ان میں اصل عرب کے تجربات ہیں، اور منتر کی حقیقت ایسے کلمات کا استعمال کرنا ہے جن کا عالم مثال میں تحقق اور اثر ہے اور جب تک ان میں کلمہ شرک نہیں ہے قواعد شرعیہ ان کو رد نہیں کرتی خصوصاً جبکہ وہ کلمات قرآن و حدیث سے ہوں جن میں اللہ کی طرف تضرع کے معنی پائے جاتے ہوں اور نظر حق ہے اور اس کی حقیقت دیکھنے والے کے نفس کے صدمہ پہنچانے کی تاثیر اور وہ صدمہ ہے جو دیکھنے والے کی تاثیر نفس سے پہنچتا ہے اور ایسا ہی جنات کی نظر کا حال ہے اور جن احادیث میں منتر اور تعویذ اور ٹوٹکے سے ممانعت آئی ہے تو وہ ان صورتوں کے ساتھ متعلق ہے جن میں شرک یا اسباب میں اس قدر منہمک ہونا پایا جاتا ہو جو باری تعالیٰ سے غافل کر دے، اور فال اور شگون کی حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی امر عالم بالا میں قرار پا چکتا ہے تو بسا اوقات وہ واقعات جو اپنی جبلت کے اعتبار سے ہر چیز کا عکس سرعت کے ساتھ قبول کر لیتے ہیں اس امر کا رنگ پکڑ لیتے ہیں پس ان واقعات میں سے ایک تو دلوں کے خیالات ہیں اور ایک وہ الفاظ ہیں جو بڑا قصد معتد بہ کے زبان سے نکل جاتے ہیں اور وہ ان خیالات خفیہ کے اشباح ہیں جن کی طرف بالذات قصد کیا جاتا ہے اور ایک ان میں سے وہ واقعات ہیں جو زمین و آسمان کے درمیان فضا میں ظاہر ہوتے رہتے ہیں کیونکہ ان کے اسباب طبیعت کے اعتبار سے اکثر ضعیف ہوتے ہیں اور ان کا کسی صورت کے ساتھ خاص ہونا اور کسی کے ساتھ نہ ہونا کسی سبب فلکی یا عالم بالا

میں کسی امر کے قرار پانے سے ہوتا ہے، اور عرب کے لوگ ان باتوں سے آئندہ ہونے والی چیزوں پر استدلال کیا کرتے تھے اور اس بات میں تخمین اور وہم کا پابند ہونا ہے بلکہ بسا اوقات کا کفر کا مظنہ اور اس بات کا احتمال ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ نہ رہے لہٰذا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بدشگونی سے بالکل منع فرما دیا اور فرمایا "ان میں بہتر فال ہے" یعنی کوئی اچھا کلمہ جو نیک آدمی کے منہ سے نکلے کیونکہ وہ ان قباحتوں سے بعید ہے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کی بیماری دوسرے کو لگ جانے سے انکار فرمایا نہ اس لئے کہ اس کی کچھ اصل نہیں بلکہ اس لئے کہ عرب کے لوگ اس کو ایک مستقل سبب خیال کرتے تھے اور توکل کو بالکل بھول جاتے تھے اور حق بات یہ ہے کہ ان اسباب کی سببیت اسی وقت تک رہتی ہے جب تک اللہ تعالیٰ کا حکم ان کے خلاف ثابت نہیں ہوتا کیونکہ حکم الٰہی ثابت ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ اس کو پورا کر دیتا ہے بغیر اس کے کہ نظام میں فرق آئے اور شرع کی زبان میں اس نکتہ کو اس طرح بیان کر سکتے ہیں کہ یہ چیزیں اسباب عادیہ ہیں اسباب عقلیہ نہیں ہیں، اور ہامہ(۱) سے غالباً شرک کا دروازہ کھلتا ہے اور اسی طرح غول سے اس واسطے ان امور کے اندر مشغول ہونے سے ان کو منع کیا گیا نہ اس واسطے کہ حقیقت میں ان کی کوئی اصل نہیں ہے اور یہ کیسے ہو سکتا ہے حالانکہ بہت سی احادیث سے جنات اور ان کا عالم میں منتشر رہنا ثابت ہے اور عدوی کا پایا جانا ثابت ہے اور بہت سی احادیث سے عورت اور گھوڑے اور مکان میں نحوست کا پایا جانا ثابت ہے پس لامحالہ ان کی نفی اس معنی کر کے ہوگی کہ ان میں مشغول رہنا منع ہے اور اس میں مخاصمت نہیں ہو سکتی پس کسی کا یہ دعویٰ مسموع نہ ہوگا کہ اس نے اپنا بیمار اونٹ میرے اونٹ کے پاس کر کے اس کو بیمار کر دیا یا مار ڈالا وعلیٰ ہذا القیاس۔

اور یہ کس طرح ہو سکتا ہے حالانکہ تم جانتے ہو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کہانت یعنی جنات سے خبر دریافت کر کے بتلانے سے سخت منع کیا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کاہن کے پاس جانے والے سے اپنی براءت کی ہے، پھر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کاہنوں کا حال دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ "فرشتے آسمانوں کے کناروں پر آتے ہیں اور عالم بالا میں جو کچھ قرار پا چکا ہے اس کا ذکر کرتے ہیں پس شیاطین مخفی طور پر وہاں سننے کے لئے جا پہنچتے ہیں اور کچھ سن لیتے

(۱) زمانہ جاہلیت کے اوہام کے موافق ایک جانور جو قبر میں پیدا ہو جاتا ہے۔

ہیں اور کاہنوں سے آکر کہہ دیتے ہیں کہ کاہن اس کے ساتھ سو جھوٹ ملا دیتے ہیں، یعنی ملا اعلیٰ میں جب کوئی امر قرار پا چکتا ہے تو ملائکہ سافلہ پر جو الہام کی قابلیت رکھتے ہیں اس کا القا ہوتا ہے پھر بعض جنات جو ذکی ہوتے ہیں ملائکہ سے اس کو معلوم کر لیتے ہیں پھر کسی مناسبت جبلیہ یا کسبیہ سے کاہن جنات سے حاصل کر لیتے ہیں پس تم اس بات میں ہرگز شک نہ کرنا کہ نہی کا مدار اس بات پر نہیں ہے کہ ان کا خارج میں کوئی وجود نہیں ہے بلکہ اس واسطے ان سے نہی کی گئی ہے کہ ان سب میں خطا اور شرک اور فساد کا گمان غالب ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے'' آپ فرما دیجئے کہ ان دونوں میں گناہ عظیم ہے اور لوگوں کے لئے منافع ہیں اور ان کا گناہ ان کے نفع سے زیادہ بڑا ہے''، لیکن ستاروں کا طلوع وغروب اور نجوم تو یہ بات بعید نہیں ہے کہ ان کی کچھ حقیقت ہو کیونکہ ان کے اندر مشغول رہنے سے منع فرمایا ہے نہ یہ کہ بالکل حقیقت کی نفی کی ہے، اور سلف صالح سے ان چیزوں میں مشغول نہ ہونا اور شغل رکھنے والوں کی برائی اور ان کی تاثیرات کا قبول نہ کرنا ثابت ہے نہ یہ کہ انھوں نے اس کی بالکل نفی کی ہے اور ان میں سے بعض چیزیں ایسی ہیں جو بدیہیات اولی کے درجہ کو پہنچ چکی ہیں مثلاً سورج اور چاند کے حالات مختلف ہونے سے فصلوں کا بدلنا وغیرذلک، اور بعض ایسی باتیں ہیں جو فکر اور تجربہ اور رصد سے ثابت ہوتی ہیں جس طرح تجربہ وغیرہ سے مثلاً سونٹھ کی حرارت اور کافور کی برودت ثابت ہوتی ہے اور یہ ممکن ہے کہ ان کی تاثیر دو طریقے سے ہو ایک طریقہ تو طبائع کے قریب قریب ہے پس جس طرح ہر نوع کے لئے طبائع ہوتی ہیں جو اسی نوع کے ساتھ خاص ہوتی ہیں جیسے حرارت اور برودت اور رطوبت اور یبوست جن سے امراض کے دفع کرنے کا کام لیا جاتا ہے اسی طرح افلاک اور کواکب کے لئے طبائع اور خواص ہیں جیسے آفتاب کے لئے حرارت اور چاند کے لئے رطوبت پس جب وہ ستارہ اپنے محل میں گزرتا ہے تو اس کی قوت زمین میں ظاہر ہوتی ہے، دیکھو عورت جو عورتوں کی عادات اور ان کے اخلاق کے ساتھ خاص ہے تو ان کا منشا اس کی طبیعت ہے اگرچہ اس کا ادراک ظاہر میں نہ ہوسکے، اور مرد جو جرأت اور آواز کے بھاری ہونے کے ساتھ مخصوص ہے تو اس کا منشا بھی اس کے مزاج کی کیفیت ہے پس تم اس بات سے انکار نہ کرو کہ جس طرح ان طبائع خفیہ کا اثر ہوتا ہے اسی طرح زہرہ اور مریخ کے قوی زمین میں حلول کر کے اپنا اثر ظاہر کریں۔

اور دوسرا طریقہ قوت روحانیہ اور طبیعت کے باہم ترکیب کے قریب قریب ہے اور اس کی مثال ایسی ہے کہ جس طرح جنین کے اندر ماں اور باپ کی طرف سے قوت نفسانیہ حاصل ہوتی ہے اور عناصر ثلثہ کو آسمان وزمین سے وہ نسبت ہے جو جنین کو ماں باپ سے ہوتی ہے پس یہ قوت عالم کو صورت حیوانیہ بعد ازاں صورت انسانیہ کے فائض ہونے کے لئے آمادہ کرتی ہے اور اتصالات فلکیہ کے اعتبار سے ان قویٰ کا حلول کئی اقسام کا ہوتا ہے اور ہر قسم کے خواص مختلف ہوتے ہیں پس کچھ لوگوں نے اس علم کے اندر غور کیا تو ان کو ستاروں کا علم حاصل ہو گیا جس کے ذریعہ سے آنے والے واقعات کا ان کو علم ہونے لگا مگر جب قضاء الٰہی اس کے خلاف مقرر ہو جاتی ہے تو ستاروں کی قوت کو ایک دوسری صورت میں ظاہر کر دیتی ہے جو اس صورت سے قریب ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے حکم کو پورا کرتا ہے بغیر اس کے کہ کواکب کے خواص کے انتظام میں کوئی فرق آئے اور اس نکتہ کو اس طرح سے بیان کیا جاتا ہے کہ ستاروں کے خواص عادت الٰہی جاری ہونے کی وجہ سے ہیں لزوم عقلی کی وجہ سے نہیں ہیں اور یہ خواص بہ منزلہ امارات اور علامات کے ہیں لیکن کثیر لوگ نہایت انہماک کے ساتھ اس علم میں مشغول ہو گئے یہاں تک کہ اس میں اللہ سے انکار اور عدم ایمان کا احتمال ہو گیا پس جو شخص اس علم میں مشغول ہو رہا ہے وہ خلوص دل سے یہ بات نہیں کہہ سکتا کہ اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی رحمت سے ہم پر یہ بارش ہوئی ہے بلکہ وہ یہی کہے گا کہ فلاں فلاں تارے کی وجہ سے ہم پر یہ بارش ہوئی ہے پس یہ امر اس ایمان سے جو نجات میں اصل اور بنیاد ہے مانع ہوتا ہے اور علم نجوم سے واقف نہ ہونے میں کچھ ضرر نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنی حکمت کے موافق عالم کا انتظام کرتا ہے خواہ کوئی اس سے واقف ہو یا نہ ہو اس واسطے شریعت کے اندر ضروری ہوا کہ اس کا علم نیست ونابود کر دیا جائے اور اس کے سیکھنے سے ممانعت کر دی جائے اور یہ بات ظاہر کر دی جائے کہ ''جس نے علم نجوم میں سے کچھ حاصل کیا اس نے جادو کا ایک شعبہ حاصل کیا جس قدر زیادہ سیکھے گا اسی قدر وبال زیادہ ہوگا'' اور اس کا حال توریت اور انجیل کا سا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص پر نہایت سختی کی ہے جو ان میں غور کرنے کا قصد کرے کیونکہ ان دونوں کتابوں میں تحریف ہو گئی ہے اور ان کے پڑھنے میں احتمال ہے کہ انسان قرآن عظیم کا پابند نہ رہے اس واسطے اس سے لوگوں کو ممانعت کر دی گئی۔

یہ جو کچھ بیان کیا گیا ہے ہماری رائے اور ہمارے تفحص کا نتیجہ ہے پس اگر سنت سے اس کے خلاف ثابت ہو تو جو سنت سے ثابت ہے وہی صحیح ہے، لیکن خواب سواس کی پانچ قسمیں ہیں ایک اللہ تعالیٰ کی طرف سے خوش خبری اور ایک ان عمدہ اور برے اخلاق کے انوار کا متمثل ہونا جو ملکی طریقہ پر نفس میں مندرج ہوتے ہیں اور ایک تخویف شیطانی اور ایک تخیلات نفسانی جن کا حالت بیداری میں نفس عادی ہوتا ہے قوت متخیلہ ان خیالات کو محفوظ رکھتی ہے اور وہ خیالات مجتمعہ حس مشترک میں ظاہر ہوتے ہیں اور ایک خیالات طبیعہ جو غلبہ اخلاط اور بدن کے اندر نفس کو ان اخلاط سے تکلیف پہنچنے پر نفس کو متنبہ ہونے سے پیدا ہوتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے بشارت سواس کی حقیقت یہ ہے کہ نفس ناطقہ کو حجابات بدنی سے بذریعہ اسباب خفیہ کے جن کو نفس بلا تامل معلوم نہیں کرسکتا جب فرصت حاصل ہوتی ہے تو اس میں اس بات کی قابلیت ہو جاتی ہے کہ منبع الخیر والجود سے اس پر کمال علمی کا فیضان ہو تب اس پر اس کی استعداد کے موافق وہ علوم فائض ہوتے ہیں جو اس کے پاس مجتمع تھے اور یہ خواب تعلیم الٰہی ہوتا ہے جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں معراج ہوئی کہ اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کو بہت اچھی صورت میں دیکھا، اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو کفارات اور درجات تعلیم فرمائے اور جس طرح خواب میں ایک اور معراج ہوئی جس میں مردوں کے وہ تمام حالات نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ظاہر ہوئے جو دنیاوی زندگی سے علیحدہ ہونے کے بعد مردوں پر گزرتے ہیں جیسا کہ جابر بن سمرۃؓ نے اس کو روایت کیا ہے اور جس طرح دنیا میں آئندہ ہونے والے حوادث کا علم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوا وہ بھی اسی قبیل سے تھا لیکن خواب ملکی سواس کی حقیقت یہ ہے کہ انسان کے اندر ملکات حسنہ اور ملکات قبیحہ ہیں لیکن ان ملکات کے حسن وقبح سے وہی شخص واقف ہوتا ہے جس کو صورت ملکی کی طرف تجرد حاصل ہوتا ہے۔ پس جو ان کی طرف مجرد ہوتا ہے اس کو اپنی نیکیاں اور برائیاں صورت مثالیہ میں ظاہر ہوتی ہیں، پس جس کو یہ بات حاصل ہوتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کو خواب میں دیکھ لیتا ہے اور اس کی وجہ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری ہے اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی دیکھتا ہے اور اس کی وجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمانبرداری ہے جو اس کے سینہ میں مرکوز ہوتی ہے اور وہ انوار کو بھی دیکھتا ہے اور اس کی اصل وہ عبادات مکتسبہ ہیں جو اس کے سینہ اور اعضا میں ہیں وہ عبادات انوار کی صورت

میں اور پاکیزہ چیزوں کی صورت میں مثل شہد اور گھی اور دودھ کے ظاہر ہوتی ہیں پس جو شخص اللہ تعالیٰ کو یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یا ملائکہ کو بری صورت میں یا غصہ کی حالت میں دیکھے تو اس کو سمجھ لینا چاہئے کہ اس کا اعتقاد ناقص اور ضعیف ہے اور اس کا نفس کامل نہیں ہوا، اور اسی طرح وہ انوار جو طہارت کے سبب سے حاصل ہوتے ہیں سورج اور چاند کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں اور جو خواب تخویف شیطانی ہوتا ہے وہ اس شخص کا ملعون حیوانات سے ڈرنا اور خوف کھانا ہوتا ہے جیسے بندر اور ہاتھی اور کتا اور سیاہ رنگ آدمیوں کا خواب میں دیکھنا پس جب خواب میں ایسی چیزیں دیکھے تو اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگے یعنی اعوذ باللہ پڑھے اور اپنے بائیں جانب تین دفعے تھوک دے اور جس کروٹ سے وہ سو رہا ہے اس کو بدل دے اور جو خواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے بشارت کے قبیل سے ہوتا ہے تو اس کی تعبیر ہوتی ہے اور تعبیر کے اندر بہتر طریقہ خیالات کا معلوم کرنا ہے کہ کون سی چیز کس چیز کا مظنہ ہوتی ہے پس کبھی ذہن مسمّٰی سے اسم کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ آپ عقبہ بن رافعؓ کے گھر میں ہیں اور ابن طاب کے باغ کے چھوارے آپ کے پاس لائے گئے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا پس میں نے اس خواب کی یہ تعبیر لی ہے کہ دنیا میں ہمارے لئے رفعت یعنی سربلندی ہوگی اور آخرت میں عافیت سے ہوں گے اور ہمارا دین پاکیزہ ہو گیا اور کبھی ذہن ایک چیز سے اس کے پاس والی چیز کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جیسے کوئی شخص خواب میں تلوار کو دیکھے تو اس کی تعبیر قتال ہوگی اور کبھی ذہن ایک وصف سے اس کے مناسب جوہر کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جیسے جس شخص پر مال کی محبت غالب تھی اس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سونے کے کڑے کی صورت میں دیکھا تھا۔

حاصل کلام یہ ہے کہ ایک چیز سے دوسری چیز کی طرف ذہن کے منتقل ہونے کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں اور یہ خواب نبوت کے شعبوں میں سے ایک شعبہ ہے اس واسطے کہ وہ فیضان غیبی اور اللہ تعالیٰ کا مخلوق کی طرف قریب ہونے کی ایک قسم ہے اور نبوت کی اصل یہی ہے (۱) لیکن خواب کے باقی اقسام سوا ان کی کچھ تعبیر نہیں ہوا کرتی۔

---

(۱) احادیث سے ثابت ہے کہ سچا خواب نبوت کا چالیسواں حصہ ہے۔ اور جو انسان جتنا سچا ہوگا اس کا خواب بھی اتنا ہی سچا ہوگا۔ خوابوں کی تعبیر لبیب یا حبیب سے دریافت کرنی چاہئے۔

آداب صحبت کا بیان

واضح ہو کہ من جملہ ان امور کے جن کو فطرت سلیمہ اور اشخاص انسان میں باہمی حاجات کا وقوع اور ارتفاقات واجب کرتے ہیں ایک آداب ہیں جن کو بنی آدم باہم عمل میں لاتے ہیں اور ان میں سے اکثر آداب تو ایسے ہیں جن کے اصول پر عرب اور عجم کے مختلف گروہ متفق ہیں اگرچہ ان کی صورتوں اور اشباح کے اندر ان کا اختلاف ہے پس ان آداب سے بحث کرنا اور ان آداب میں سے بھلے کو برے سے متمیز کرنا ان مصلحتوں سے ایک مصلحت ہے جن کو پورا کرنے کے لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے ہیں۔

ازاں جملہ ایک تحیہ ہے جس کو بعض بعض کے لئے عمل میں لایا کریں کیونکہ لوگوں کو اس بات کی ضرورت ہوا کرتی ہے کہ باہم خوشی کا اظہار کریں اور ایک دوسرے پر لطف و مہربانی کرے اور چھوٹا بڑے کو بزرگ سمجھے اور بڑا چھوٹے پر مہربانی سے پیش آئے اور آپس میں بھائی اور دوست بن کر رہیں کیونکہ اگر یہ نہ ہو تو باہمی صحبت کا کوئی فائدہ نہیں ہوا اور نہ کوئی نتیجہ حاصل ہوا اور اگر اظہار خوشی کے لئے کوئی لفظ مقرر نہ کیا جائے تو وہ ایک اندرونی چیز رہے جو بغیر قرائن سے استنباط کئے معلوم نہیں ہوتی اسی لئے ہر گروہ کے سلف کا طریقہ ان کی رائے کے موافق آپس میں سلام کے برتاؤ کا چلا آتا ہے پھر وہ ان کے مذہب کا شعار ہو گیا اور اس امر کا نشان ہو گیا کہ فلاں شخص ان میں سے ہے پس مشرکین یہ کہا کرتے تھے "**انعم الله بک عینا و انعم الله بک صباحا**" اور مجوس یہ کہتے تھے "ہزار سال برزی" اور قانون شرعی کا یہ مقتضیٰ تھا کہ اس امر میں وہ طریقہ اختیار کیا جائے جو انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے اور جس کو انبیاء نے ملائکہ سے سیکھا ہے اور وہ طریقہ دعا اور

ذکر الٰہی کے قبیل سے ہو نہ کہ دنیاوی زندگی پر مطمئن ہونے کے قبیل سے ہو جیسے درازی عمر اور زیادتی دولت کی آرزو کرنا اور نہ اس میں حد سے زیادہ تعظیم ہو یہاں تک کہ آدمی کو شرک کے قریب کر دے جیسے سجدہ کرنا اور زمین چومنا اور وہ سلام ہے پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اللہ تعالیٰ نے جب آدم کو پیدا کیا تو یہ فرمایا تو اس گروہ کے پاس جا اور ان کو سلام کر اور وہ ملائکہ کا گروہ بیٹھا ہوا تھا پس تو اس چیز کو سن جس کے ساتھ وہ تیرا تحیہ کرتے ہیں پس وہ تیرے لئے اور تیری اولاد کے لئے تحیہ ہے پس آدم علیہ السلام گئے اور انھوں نے کہا السلام علیکم پس فرشتوں نے کہا اسلام علیک ورحمتہ اللہ، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ملائکہ نے رحمتہ اللہ کا لفظ زیادہ کیا'' اور اللہ تعالیٰ کا یہ قول کہ ''تو ان پر سلام کر'' اس کے یہ معنی ہیں (واللہ اعلم) کہ اپنی رائے کے موافق ان کو سلام کر، پس ان کی رائے درست ہوئی اور انھوں نے کہا ''السلام علیکم'' اور اللہ تعالیٰ کا یہ قول کہ ''وہ تیرا تحیہ ہے'' یعنی وجوبا کیونکہ اس نے یہ معلوم کر لیا کہ اس کا حظیرۃ القدس سے القا ہوا ہے۔

اور اللہ تعالیٰ نے جنت کے بیان میں فرماتا ہے ''تمہارے اوپر سلام، خوش ہو تم اور ہمیشہ کے لئے جنت میں داخل ہو'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''تم جب تک ایمان نہ لاؤ گے جنت میں داخل نہ ہو گے اور جب تک باہم محبت نہ کرو گے مومن نہ ہو گے کیا میں تم کو ایسی چیز نہ بتلا دوں کہ جب تم اس کو عمل میں لاؤ تو باہم محبت پیدا ہو، تم آپس میں سلام کو پھیلاؤ''۔

میں کہتا ہوں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام کا فائدہ اور اس کی مشروعیت کا سبب بیان فرمایا کیونکہ لوگوں کا باہم محبت کرنا ایسی خصلت ہے جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہے اور سلام کا پھیلانا محبت پیدا کرنے کے لئے عمدہ ذریعہ ہے اور اسی طرح مصافحہ اور ہاتھ چومنا وغیرہ ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''چھوٹا بڑے کو سلام کرے اور چلنے والا بیٹھے ہوئے کو سلام کرے اور تھوڑے لوگ بہت سے لوگوں کو سلام کریں'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''سوار کو چاہئے کہ پیادہ چلنے والوں کو سلام کرے''۔

میں کہتا ہوں لوگوں میں یہ عام دستور تھا کہ باہر سے آنے والا گھر والوں کو سلام کرتا تھا اور ادنی درجہ کا اعلی درجہ والے کو سلام کرتا تھا پس اس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بدستور باقی رکھا صرف یہ تغیر کیا کہ آپ لڑکوں کے پاس سے گزرے تو ان کو سلام کیا اور عورتوں کے پاس سے گزرے تو ان

کوسلام کیا یہ سمجھ کر کہ انسان کا اس شخص کو بزرگ سمجھنا جو اس سے بڑا اور اشرف ہے شہر کی جماعتوں کا جمع کرتا ہے اور اس میں ایک طرح کی خود پسندی ہے پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دستور مقرر کیا کہ بڑے لوگ تو اضع کریں اور چھوٹے بڑوں کی تعظیم کیا کریں چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ''جو شخص چھوٹوں پر رحم نہ کرے اور بڑوں کی توقیر نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے''۔

اور سوار کو پیادہ پا کے لئے سلام کرنے کا طریقہ اس لئے مقرر فرمایا کہ سوار لوگوں کے نزدیک باہیبت اور اپنی ذات کے اعتبار سے باعظمت ہوتا ہے پس اس واسطے اس کے لئے تواضع کا حکم فرمایا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''تم یہود و نصاریٰ کو اول سلام نہ کرو اور جب ان میں سے کوئی تم کو راستہ میں بلائے تو کنارے کی طرف چلنے پر مجبور کرو''۔

میں کہتا ہوں اس میں راز یہ ہے کہ من جملہ ان مصلحتوں کے جن کے لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے ہیں ایک مصلحت یہ ہے کہ ملت اسلامیہ کی عظمت ہو اور تمام ملل سے اس کا اعلیٰ اور اعظم ہونا بغیر اس کے نہیں ہوسکتا کہ مسلمانوں کو تمام ملت والوں پر قدرت اور فضیلت ہو اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو شخص السلام علیکم کہے اس کے لئے دس نیکیاں ہیں اور جو اس میں 'ورحمتہ اللہ' زیادہ کہے اس کے لئے بیس نیکیاں ہیں اور جو 'وبرکاتہ' زیادہ کہے تو اس کے لئے تیس نیکیاں ہیں اور جو 'ومغفرتہ' بھی زیادہ کہہ دے تو اس کے لئے چالیس نیکیاں ہیں اور فرمایا کہ اسی طرح فضیلتیں زیادہ ہوا کرتی ہیں''۔

میں کہتا ہوں ثواب کے زیادہ ہونے کا سبب اور اس کا مدار یہ ہے کہ اس میں اس چیز کا پورا کرنا ہے جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے سلام شروع فرمایا ہے اور وہ چیز بشاشت اور الفت اور دوستی اور دعا اور ذکر اور اللہ تعالیٰ پر کام کا سونپنا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''گزرنے والوں کی جماعت میں سے ایک شخص کا سلام کر لینا پوری جماعت کی طرف سے کافی ہے اور بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے ایک شخص کا سلام کا جواب دے دینا ان سب کی طرف سے کافی ہے''۔

میں کہتا ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ معنوی اعتبار سے جماعت ایک کا حکم رکھتی ہے اور ان میں سے ایک کا سلام کرنا باہمی نفرت کو دور کر دیتا ہے اور ایک کی دوسرے کے ساتھ الفت کو پیدا کرتا

ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''تم میں سے جب کوئی شخص کسی مجلس میں جائے تو ان کو سلام کرے پس اگر وہ بیٹھنا چاہے تو بیٹھ جائے پھر جب وہاں سے کھڑا ہو تو سلام کرے اس واسطے کہ پہلا سلام دوسرے سلام سے بہتر نہیں ہے''۔

میں کہتا ہوں رخصت ہوتے وقت سلام کرنے میں چند فوائد ہیں من جملہ ان کے ایک یہ ہے کہ سلام کرنے سے کراہت اور نفرت سے کھڑا ہونے میں اور کسی ضرورت سے کھڑا ہونے میں اور واپسی کا ارادہ رکھنے میں فرق ہو جاتا ہے اور من جملہ ان فوائد کے ایک یہ ہے کہ تدارک کرنے والا جو کوئی بات یا مقصد وغیرہ رہ گیا ہے اس کو پورا کرے اور من جملہ ان کے ایک یہ ہے کہ اس کا جانا مخفی طور پر نہ ہو، اور مصافحہ کرنے میں اور مرحبا کہنے میں اور باہر سے آنے والے سے معانقہ کرنے وغیرہ میں یہ راز ہے کہ ان امور سے محبت اور خوشی بڑھتی ہے اور وحشت اور نفرت دور ہوتی ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جب دو مسلمان باہم مل کر مصافحہ کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی حمد کرتے ہیں اور اپنے گناہوں کی مغفرت چاہتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کے گناہ معاف کر دیتا ہے''۔

میں کہتا ہوں یہ اس وجہ سے ہے کہ مسلمانوں میں خوشی پیدا ہونا اور ان میں محبت اور مہربانی کا پایا جانا اور ان کے درمیان اللہ تعالیٰ کے ذکر کو جاری کرنا ایسی خصلت ہے جس سے اللہ تعالیٰ خوش ہوتا ہے اور تعظیم کے لئے کھڑے ہونے میں احادیث مختلف ہیں، پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس کو یہ بات پسند ہو کہ اس کے لئے کوئی شخص کھڑا رہے تو وہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں بنائے'' اور آپ نے فرمایا ''نہ کھڑے ہوا کرو جس طرح عجمی ایک دوسرے کی تعظیم کے لئے کھڑے ہوتے ہیں'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سعد کے بارے میں فرمایا ''تم اپنے سردار کے لئے کھڑے ہو جاؤ'' اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتی تھیں تو آپ ان کے لئے کھڑے ہو جاتے تھے پس آپ ان کا ہاتھ پکڑ کر بوسہ دیتے تھے اور ان کو اپنی جگہ پر بٹھاتے تھے، اور جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم فاطمہؓ کے پاس جاتے تھے تو وہ کھڑی ہو جاتی تھیں اور آپ کا دست مبارک پکڑ کر چومتی تھیں اور آپ کو اپنی جگہ پر بٹھاتی تھیں۔

میں کہتا ہوں میرے نزدیک ان احادیث میں حقیقتاً کوئی اختلاف نہیں ہے کیونکہ جن معانی پر امر و نہی کا مدار ہے وہ مختلف ہیں کیونکہ عجمیوں کی یہ حالت تھی کہ خدمت کرنے والے اپنے آقا

کے روبرو اور رعایا اپنے بادشاہوں کے روبرو کھڑی رہا کرتی تھی اور وہ ان کی نہایت درجہ تعظیم تھی حتیٰ کہ شرک میں واقع ہونے کا احتمال تھا اس واسطے اس سے ممانعت کی گئی اور اسی کی طرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول میں اشارہ ہے کہ آپ نے فرمایا ''کما یقوم الا عاجم'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ''من سرہ ان یتمثل'' عربی میں کہا جاتا ہے ''مثل بین یدیه مثولا'' جب خدمت کے لئے کوئی سیدھا کھڑا ہوتا ہے اور جو کھڑا ہونا مومن کی خوشنودی کے لئے اور اس کے اکرام اور اس کے دل خوش کرنے کے لئے ہو نہ یہ کہ اس کے سامنے خدمتگاری کے لئے کھڑا ہو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں اس واسطے کہ اس میں شرک کی آمیزش نہیں ہے، اور کسی نے دریافت کیا ''یا رسول اللہ ہم میں سے کوئی شخص اپنے بھائی سے ملے تو آیا اس کے واسطے جھک جائے؟ آپ نے فرمایا نہیں'' اور اس کا سبب یہ ہے کہ جھکنا رکوع نماز کے مشابہ ہے پس وہ بہ منزلہ سجدۂ تحیہ کے ہو جائے گا، اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''اے ایمان والو! اپنے گھروں کے سوا دوسرے کے گھروں میں مت داخل ہو یہاں تک کہ اجازت لو اور ان گھر والوں پر سلام کرو'' اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''اے ایمان والو! جو لوگ تمہارے ہاتھوں میں مملوک ہیں اور وہ لوگ جو تم میں سے بلوغ کو نہیں پہنچے ان کو چاہئے کہ وہ تم سے اجازت لیں'' الی قوله کما استاذن الذین من قبلهم'' پس اللہ تعالیٰ کا قول ''تستانسوا'' اجازت طلب کرو کے معنی میں ہے۔

میں کہتا ہوں اجازت کا طلب کرنا اس واسطے مقرر کیا گیا ہے کہ یہ ناپسندیدہ بات ہے کہ انسان آدمیوں کی شرمگاہوں پر جمع ہوں اور جس چیز کی طرف نگاہ کرنا وہ مکروہ سمجھتے ہوں اس پر کوئی نگاہ ڈالے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض احادیث میں یہ فرمایا ہے کہ ''اجازت لینا محض نظر نہ کرنے کے لئے مقرر ہوا ہے'' پس مناسب ہے کہ لوگوں کو مختلف ہونے سے وہ بھی مختلف ہو پس بعض ان میں سے اجنبی ہیں جن سے میل جول نہیں ہے پس ایسے شخص کے لئے مناسب یہ ہے کہ جب تک صریح اجازت نہ مانگ لے اور اس کو صریح اجازت نہ مل جائے داخل نہ ہو اسی واسطے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی عامر کے ایک شخص کلدہ بن حنبل کو تعلیم فرمایا کہ یہ کہے السلام علیکم: کیا میں داخل ہو سکتا ہوں؟

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اجازت طلب کرنا تین مرتبہ ہے پس اگر تجھ کو اجازت مل

جائے تو فبہا ورنہ لوٹ آ'' اور بعض ان میں سے احرار ہیں جو محارم نہیں ہیں مگر آپس میں میل جول اور دوستی ہے پس ان کا اجازت لینا بہ نسبت پہلے لوگوں کے کمتر ہے اور اسی لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن مسعودؓ سے فرمایا تھا ''تیرا اذن میرے اوپر یہی ہے کہ تو پردہ کو اٹھا دے اور تو میرے آہستہ کلام کو سنے حتی کہ میں تجھ کو منع کروں'' اور ان میں سے بعض لڑکے اور غلام ہیں جن سے پردہ واجب نہیں ہے پس ان کے لئے اذن کی ضرورت نہیں مگر ان اوقات میں جبکہ عادتاً کپڑے اتار دیئے جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ان تین اوقات (۱) کو اس لئے خاص کیا کہ وہ لڑکوں اور غلاموں کے آنے کے اوقات ہیں بخلاف نصف شب کے مثلاً، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''کسی شخص کے پاس اپنا قاصد بھیج دینا اس کا اذن ہے'' اس واسطے کہ جب اس نے اپنا آدمی بھیج دیا تو اس کے آنے کی خبر ہوگئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی کے دروازے پر تشریف لاتے تھے تو دروازہ کے سامنے سے نہیں آتے تھے بلکہ دائیں بائیں طرف سے آتے تھے پس آپ فرماتے تھے ''السلام علیکم السلام علیکم'' اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت لوگوں کے گھروں کے دروازوں پر پردے نہ تھے۔

اور از آں جملہ بیٹھنے اور سونے اور سفر وغیرہ کرنے کے آداب ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''کوئی شخص کسی کو اس کی جگہ سے اٹھا کر آپ نہ بیٹھے بلکہ یہ کہے کشادہ ہو کر اور وسعت سے بیٹھو''۔

میں کہتا ہوں یہ اس واسطے ہے کہ کسی کو اٹھا کر بیٹھنا غرور اور خود پسندی کی وجہ سے سرزد ہوتا ہے اور دوسرے کے دل میں ایسا کرنے سے رنج اور کینہ پیدا ہوتا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو شخص اپنی جگہ سے کھڑا ہو کر کہیں جائے اور پھر آئے تو وہ اس جگہ کا زیادہ حقدار ہے''۔

میں کہتا ہوں جو شخص ایسی جگہ پر پہلے بیٹھ جائے جو اس کے لئے مباح تھی خواہ وہ مسجد ہو یا خانقاہ ہو یا گھر ہو تو اس کا حق اس جگہ کے ساتھ متعلق ہو گیا پس جب تک اس کو اس جگہ کی حاجت ہو اس کو کوئی نہ اٹھائے جیسے بنجر زمین کا حال ہے اور پہلے اس کا بیان ہو چکا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''کسی شخص کے لئے جائز نہیں کہ دو شخصوں کے بیچ میں ان کو علیحدہ کر کے، بغیر ان کی اجازت کے بیٹھے''۔

---

(۱) صبح، دوپہر اور عشاء کے بعد کا وقت۔ (قاسمی)

میں کہتا ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ بسا اوقات دو شخص مسرت کی باتیں اور راز کی باتیں کرنے کے لئے باہم بیٹھ جاتے ہیں پس ان کے بیچ میں بیٹھ جانا ان کے دل کو مکدر کرنا ہے اور کبھی باہمی انس کی وجہ سے بیٹھ جاتے ہیں پس ان کے درمیان میں بیٹھنا ان کو متنفر کرنا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''تم میں سے کوئی شخص چت لیٹ کر ایک پاؤں کو دوسرے پاؤں پر نہ رکھے، اور لوگوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مسجد میں چت لیٹے ہوئے اور ایک پاؤں کو دوسرے پاؤں پر رکھے ہوئے دیکھا ہے۔

میں کہتا ہوں اس وقت میں لوگ لنگی باندھا کرتے تھے اور لنگی باندھنے والا جب ایک پاؤں کو دوسرے پاؤں پر رکھتا ہے تو اس میں ستر کھلنے کا اندیشہ رہتا ہے پس اگر پاجامہ پہنے ہوئے ہو یا ستر کھلنے سے مامون ہو تو اس طرح لیٹنے میں کچھ مضائقہ نہیں ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کے لئے جو الٹا لیٹا ہوا تھا فرمایا ''تحقیق یہ ایسا لیٹنا ہے جو اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے''۔

میں کہتا ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ایک منکر اور قبیح ہیئت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو شخص گھر کی چھت پر سوئے اور اس کی منڈیر نہ ہو تو اس سے ذمہ داری اٹھ گئی''۔

میں کہتا ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ اس نے اپنی جان کو ہلاک کرنے کا سامان کیا اور اپنے نفس کو ہلاکت میں ڈالا، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے 'اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو شخص حلقہ کے بیچ میں بیٹھے وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر ملعون ہے'' بعض نے کہا اس سے مراد وہ مسخرہ ہے جو اپنے آپ کو مسخرہ پن کے لئے پیش کرتا ہے تاکہ لوگ اس سے ہنسی مذاق کریں اور یہ شیطانی کام ہے اور اس معنی کا بھی احتمال ہے کہ ایک گروہ کی طرف پشت اور ایک کی طرف منہ کر کے بیٹھے کیونکہ اس سے بعض لوگوں کو کراہت ہوتی ہے۔

ایک مرتبہ راستہ میں مرد اور عورتیں جمع ہو گئیں تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں سے فرمایا ''تم پیچھے ہٹو تمہیں یہ مناسب نہیں کہ راستہ کے بیچ میں ہو کر چلو بلکہ راستہ سے ادھر اُدھر چلو پس اس کے بعد عورتیں دیوار سے مل کر چلتی تھیں، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع فرمایا کہ کوئی مرد عورتوں کے بیچ میں گزرے''۔

میں کہتا ہوں اس میں اندیشہ ہے کہ مرد غیر محرم عورت کو لگ جائے یا اس کی طرف دیکھے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جب تم میں سے کوئی چھینکے تو الحمد للہ کہے اور اس کا بھائی (یا یہ فرمایا اور اس کا دوست) یرحمک اللہ کہے پھر وہ جواب میں **یھدیکم اللہ ویصلح بالکم** کہے'' اور ایک روایت میں آیا ہے ''اور اگر وہ الحمد للہ نہ کہے تو اس کو جواب مت دو'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اپنے بھائی کی چھینک کا جواب تین بار دو پس اگر زیادہ چھینک آئے تو وہ زکام ہے''۔

میں کہتا ہوں چھینکنے کے بعد الحمد للہ کہنا دو وجہ سے مشروع ہوا ایک تو وہ دلیل شفا ہے اور دماغ سے ابخرہ غلیظہ نکلتے ہیں دوسرے وہ آدم علیہ السلام کی سنت ہے اور حمد کہنے سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ شخص انبیا علیہم السلام کی سنن کا تابع ہے اور ان کی ملت پر مضبوطی سے قائم ہے اسی واسطے جواب دینا واجب ہوا اور حقوق اسلام میں شمار کیا گیا اور جواب دینے والے کو جواب دینا اس لئے مسنون ہوا کہ وہ احسان کے بدلہ میں احسان کرنا ہے۔

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جمائی شیطان کی طرف سے ہے پس تم میں سے جب کوئی جمائی لے تو جہاں تک ہو سکے اس کو روکے کیونکہ تم میں سے جب کوئی جمائی لیتا ہے تو اس سے شیطان ہنستا ہے''۔

میں کہتا ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ جمائی طبیعت کی سستی اور غلبہ ملال سے پیدا ہوتی ہے اور اس کے ضمن میں شیطان کو فرصت مل جاتی ہے اور جب منہ کھول کر انسان آہ آہ کرتا ہے تو اس سے شیطان ہنستا ہے اس واسطے کہ وہ اس قبیح ہیئت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''تم میں سے جب کوئی جمائی لے تو اس کو چاہئے کہ اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لے اس واسطے کہ شیطان اندر گھستا ہے''۔

میں کہتا ہوں کہ شیطان مکھی یا مچھر کو اڑا کر اس کے منہ میں داخل کر دیتا ہے، اور بسا اوقات منہ کے اعصاب سکڑ جاتے ہیں اور ہم نے ایسا دیکھا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اگر لوگوں کو تنہائی کی برائیاں، جو میں جانتا ہوں معلوم ہو جاتیں تو کوئی سوار رات کو تنہا سفر نہ کرتا''۔

میں کہتا ہوں اس سے آپ کی مراد یہ ہے کہ بلا ضرورت دلیری کرنا اور مہالک میں پڑنا ایک ناپسندیدہ امر ہے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو رات میں تنہا خبر لانے

کے لئے جو بھیجا تھا تو وہ ضرورت کی وجہ سے تھا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جن رفیقوں میں کتا اور گھنٹہ ہوتا ہے فرشتے ان کے ساتھ نہیں ہوتے'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا گھنٹہ شیطان کا مزامیر ہے''۔

میں کہتا ہوں سخت اور تیز آواز شیطان اور اس کی جماعت کے موافق ہے اور فرشتے اپنے مزاج کے سبب سے اس سے نفرت کرتے ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جب تم ارزانی میں سفر کرو تو اونٹ کو پورا چارہ دو اور جب تم قحط سالی میں سفر کرو تو اس کو جلدی چلا کر راستہ کو طے کرو اور جب اخیر شب میں کہیں اترو تو راستہ سے ہٹ جاؤ کیونکہ رات میں وہ چوپاؤں کی رہ گزر اور حشرات الارض کی آماج گاہ ہوتا ہے''۔

میں کہتا ہوں یہ سب ظاہر ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''سفر عذاب کا ایک ٹکڑا ہے جو سونے کھانے اور پینے سے باز رکھتا ہے پس جب اپنی حاجت کو جو اس کو پیش ہے پورا کر چکے تو اپنے گھر والوں کی طرف جلد لوٹے''۔

میں کہتا ہوں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو مکروہ سمجھا کہ انسان چھوٹی چیزوں کے پیچھے پڑا رہے پس ان کی وجہ سے اس کے زیادہ عرصہ باہر ٹھیرنا پڑے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جب تم میں سے کوئی ایک مدت کے بعد سفر سے واپس آئے تو رات میں اپنے گھر نہ آئے''۔

میں کہتا ہوں بسا اوقات انسان کو بالوں کے پراگندہ ہونے کی وجہ سے نفرت طبعی ہو جاتی ہے پس وہ ان کے تکدر حال کا سبب بن جاتی ہے۔

از آں جملہ کلام کرنے کے آداب ہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے نزدیک بدترین ناموں کا وہ شخص ہے جس کو شہنشاہ کہا جاتا ہے'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بادشاہ نہیں'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوالحکم کنیت رکھنے کے بارے میں فرمایا ''حکم اللہ تعالیٰ ہی ہے اور اسی کی طرف حکم ہے''۔

میں کہتا ہوں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کنیت سے اس واسطے منع فرمایا کہ اس میں نہایت درجہ کی تعظیم ہے جو شرک کے قریب کرتی ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اپنے لڑکے کا نام نہ

یسار رکھو اور نہ رباح اور نہ نجیح اور نہ افلح اس واسطے کہ جب تو پوچھے گا کہ اس جگہ یسار ہے اور وہ نہیں ہوتا پس کوئی کہے گا نہیں'' اور جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ''نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد اس بات سے ممانعت کرنا تھا کہ یعلی اور برکت اور افلح اور یسار اور نافع اور اسی قسم کے نام رکھے جائیں پھر میں نے آپ کو دیکھا کہ اس کے بعد اس منع کرنے سے سکوت فرمایا پھر آپ کی وفات ہوگئی اور اس سے منع نہیں کیا۔

میں کہتا ہوں ان ناموں کے مکروہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ان سے اقوال میں ایک ایسی بری ہیئت پیدا ہوتی ہے جس طرح افعال میں ناک کٹا ہونا وغیرہ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''نکٹا شیطان ہے'' اور دونوں حدیثوں میں تطبیق اس طور پر ہے کہ آپ نے سخت ممانعت نہیں کی اور نہ اس میں تاکید کی مگر ارشاد کے طور پر بہ منزلہ مشورہ کے اس سے منع فرمایا یہ کہنا چاہئے کہ نہی کی علامات ظاہر ہوئیں پس راوی نے اپنے اجتہاد سے یہ کہہ دیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا، اور جس نے اصل قول کو یاد رکھا حجت ہے اس پر جس نے اس کو یاد نہ رکھا، اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ وجہ صحابہ کے فعل کے زیادہ موافق ہے کیونکہ وہ ہمیشہ اس قسم کے نام رکھا کرتے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''میرے نام پر نام رکھو اور میری کنیت پر کنیت مت کرو کیونکہ میں قاسم ہوں تم میں تقسیم کرتا ہوں''۔

میں کہتا ہوں اگر کسی کا نام نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نام رکھ لیا جاتا تو اس بات کا احتمال تھا کہ احکام میں اشتباہ واقع ہوتا اور ان احکام کی نسبت کرنے میں اور ان کے رفع کرنے میں تلبیس واقع ہوتی اور جب کہا جاتا کہ ابوالقاسم نے یہ کہا تو اس بات کا گمان ہوتا کہ حکم دینے والے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور بسا اوقات مراد کوئی اور ہوتا ہے اور بسا اوقات آدمی کا نام لیکر گالی دی جاتی ہے اور لڑائی جھگڑوں میں آدمی کے لقب کے ساتھ برائی کی جاتی ہے پس اگر نبی کے نام پر نام ہو تو اس میں ایک ہیئت سے منکرہ پائی جاتی ہے پھر یہ بات بہ نسبت علم کے کنیت میں زیادہ پائی جاتی ہے دو وجہ سے، ایک تو یہ ہے کہ لوگوں کو شرعاً اس بات سے ممانعت تھی اور عادتاً اس سے باز رہتے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو نام لے کر پکاریں اور مسلمان یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہہ کر پکارتے تھے اور ذمی لوگ یا ابوالقاسم کہتے تھے۔

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ عرب کے لوگ نام لیکر تعظیم یا تحقیر کا قصد نہیں کرتے تھے بلکہ کنیت سے تعظیم اور تحقیر کا قصد کرتے تھے جیسے ابوالحکم اور ابوجہل وغیرہ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کنیت ابوالقاسمؐ اس لئے ہوئی کہ آپ قاسم تھے پس کسی دوسرے کی یہ کنیت رکھنا گویا آپ کے برابر کرنا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو اس بات کی اجازت دینا کہ وہ آپ کے بعد اپنے لڑکے کا نام اور اس کی کنیت اور آپ کے نام کنیت پر رکھیں اسی وجہ سے تھا کہ آپ کے زمانہ کے بعد التباس رفع ہو گیا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''تم میں سے کوئی میرا بندہ یا میری باندی نہ کہے تم سب اللہ تعالیٰ کے بندے اور تمہاری سب عورتیں اللہ تعالیٰ کی باندیاں ہیں بلکہ یہ کہے میرا غلام اور میری لونڈی اور میرا لڑکا اور میری لڑکی اور غلام، یہ نہ کہے میرا رب بلکہ یہ کہے میرا سردار۔

میں کہتا ہوں کلام میں درازی کرنا اور لوگوں کو حقیر سمجھنا اس کا سبب خود پسندی اور تکبر ہے اور لوگوں کی دل شکنی کا باعث ہے اور نیز چونکہ اس نسبت کو جو خالق اور مخلوق کے اندر پائی جاتی ہے کتب الٰہیہ میں عبدیت اور ربیت کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے اس واسطے آپس میں اس کا اطلاق کرنا بے ادبی ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''انگور کو کرم نہ کہو بلکہ عنب اور حبلہ کہو اور یہ مت کہو اے زمانہ کی بدنصیبی کیونکہ زمانہ اللہ تعالیٰ ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ابن آدم زمانہ کو برا کہہ کر مجھ کو ایذا دیتا ہے اور میں ہی زمانہ ہوں، میرے ہی قبضہ میں ہر امر ہے میں ہی رات اور دن کو بدلتا ہوں''۔

میں کہتا ہوں جب اللہ تعالیٰ نے شراب سے ممانعت فرمائی اور اس کو ناقص قرار دیا تو اس کا یہ مقتضیٰ ہوا کہ جو شئے شراب کی عظمت کا باعث ہو اور جس بات سے اس کی عمدگی کا خیال پیدا ہو اس سے ممانعت فرمائی جائے اور انگور شراب کا مادہ اور اس کی اصل ہے اور اہل عرب اکثر اوقات شراب کو بنت کرم کہہ کر اس کو مشہور کرتے تھے اور اہل جاہلیت واقعات کو زمانہ کی طرف منسوب کیا کرتے تھے اور نیز اکثر اوقات دہر سے مراد مقلب الدہر لیتے تھے پس یہ ناراضگی اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہوتی تھی اگرچہ اس کے عنوان میں وہ خطا کرتے تھے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''تم میں سے کوئی شخص یہ نہ کہے کہ میرا نفس خبیث ہو گیا بلکہ یہ کہے کہ میرا نفس خراب ہو گیا۔

میں کہتا ہوں کتب الٰہیہ میں فقط خباثت کا استعمال اکثر خباثت باطنی اور بدطینی پر ہوا ہے

اس واسطے یہ کلمہ بہ منزلہ ہیئت شیطانیہ کے ہے اور لوگوں کے گمان کر لینے کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''یہ آدمی کی بری سواری ہے''۔

میں کہتا ہوں اس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد یہ ہے کہ بلا تحقیق وثبوت کے کسی بات کو بیان کرنا برا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''یہ نہ کہو کہ جو اللہ تعالیٰ نے چاہا اور فلاں نے چاہا بلکہ یہ کہو جو اللہ تعالیٰ نے چاہا پھر فلاں نے چاہا''۔ میں کہتا ہوں ذکر میں برابری کرنا رتبہ کے اندر برابری کا وہم پیدا کرتا ہے اس واسطے ایسے الفاظ کا بولنا بے ادبی ہے۔

واضح ہو کہ کلام میں حلق پھاڑنا اور چرب زبانی کرنا اور تکلف کرنا اور شعر اور مزاح میں زیادتی کرنا اور قصے کہانیوں میں وقت گزارنا یہ سب باتیں ان امور میں سے ہیں جو دین و دنیا سے غافل کرتے ہیں اور جن سے باہم تفاخر اور نمائش کی جاتی ہے پس ان کا حال اہل عجم کا سا ہے اس واسطے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ناپسند فرمایا اور ان کے نقصانات بیان فرمائے اور جس میں کراہت کے معنی نہیں پائے جاتے اس کی اجازت فرمائی اگر چہ بادی الرائے میں اس کے اندر اشتباہ پایا جائے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''فضول باتیں کرنے والے ہلاک ہوئے، اس جملہ کو آپ نے تین مرتبہ فرمایا'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''حیا اور کم گوئی ایمان کے دو شعبے ہیں اور بے حیائی اور زیادہ گوئی نفاق کے دو شعبے ہیں''۔

میں کہتا ہوں اس سے آپ کی مراد بے حیائی اور تکلف اور بیہودہ گوئی کا ترک کرنا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''تم میں سے مجھ کو زیادہ محبوب اور قیامت کے روز تم میں سے سب سے زیادہ میرے قریب تم میں سے وہ لوگ ہیں جن کے اخلاق عمدہ ہیں اور تم میں سے مجھ کو زیادہ ناپسندیدہ اور مجھ سے زیادہ دور وہ لوگ ہیں جو نہایت بداخلاق بک بک کرنے والے حلق پھاڑنے والے اور متکبر ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''میں نے جانا یا یہ فرمایا کہ مجھ کو حکم دیا گیا کہ میں مختصر کلام کروں کیونکہ اختصار بقدر کفایت بہتر ہے'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''تم میں سے کسی کا پیٹ پیپ سے بھرا ہوا ہونا جس کو کہ وہ دیکھتا ہے اس سے بہتر ہے کہ وہ اشعار سے بھرا ہوا ہو'' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسانؓ سے فرمایا ''تحقیق جب تک تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف

سے کفار کا مقابلہ کرتا رہے گا روح القدس تیری مدد کرتا رہے گا'' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''بلا شک مومن اپنی تلوار اور اپنی زبان سے جہاد کرتا ہے قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے مشرکین کی ہجو میں تمہارے اشعار ان کو تیر کی طرح لگتے ہیں''۔

ہم نے احسان کے باب میں آفات لسان کے اصول بیان کر دیئے ہیں جن سے حفظ لسان کی احادیث کے معنی واضح ہو جاتے ہیں جیسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو اللہ تعالیٰ اور قیامت کے روز پر ایمان رکھتا ہے اس کو چاہئے کہ اچھی بات کہے ورنہ خاموش رہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''مسلمان کو برا کہنا فسق ہے اور اس کو قتل کرنا کفر ہے'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''تم جانتے ہو غیبت کیا چیز ہے؟ اپنے بھائی کی ان باتوں کو بیان کرنا جو اس کو بری معلوم ہوں کسی نے عرض کیا اگر میرے بھائی کے اندر وہ بات پائی جاتی ہو جو میں بیان کرتا ہوں تو کیا وہ غیبت ہے؟ آپ نے فرمایا اگر اس کے اندر وہ بات موجود ہے جو تو بیان کرتا ہے تو وہ غیبت ہے اور اگر تو نے وہ بات کہی جو اس میں نہیں ہے تو تو نے اس پر بہتان باندھا''۔

علما نے فرمایا ہے ''غیبت کی حرمت سے چھ امور مستثنیٰ ہیں ایک اپنا ظلم بیان کرنا، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اللہ تعالیٰ بری بات کے ظاہر کرنے کو پسند نہیں فرماتا مگر جو شخص مظلوم ہے'' دوسرے بری بات کو اس لئے ظاہر کرنا کہ اس کو مٹایا جائے اور نافرمان کو بہتری کی طرف لوٹانے کا قصد کیا جائے جیسے زید بن ارقمؓ نے عبداللہ بن ابی کا قول نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کر دیا تھا اور عبداللہ بن مسعودؓ نے حنین کی غنیمت کے متعلق انصار کا قول بیان کر دیا تھا، تیسرے فتویٰ لینے کے لئے جیسے ہندہ نے کہا کہ ابوسفیان بخیل آدمی ہے چوتھے مسلمان کو شر سے بچانے کے لئے جیسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص سے فرمایا تھا کہ ''وہ اپنے کنبہ میں برا بھائی ہے'' اور جیسے محدثین راویوں پر جرح کرتے ہیں اور جیسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''معاویہ ایک تنگدست آدمی ہے اور ابوجہم اپنے کندھے سے عصا کو نہیں اتارتا'' یعنی بیویوں کو مارتا پیٹتا ہے، پانچویں علانیہ فسق کرنے والے سے نفرت دلانا جیسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''میں فلاں فلاں شخصوں کے متعلق یہ سمجھتا ہوں کہ وہ ہماری بات کچھ بھی نہیں جانتے'' چھٹے کسی کی حالت بیان کرنے کے لئے جیسے فلاں شخص کی آنکھ میں نقص ہے یا فلاں شخص لنگڑا ہے اور علما نے کہا ہے کہ جب کوئی مقصود بغیر کذب کے حاصل نہ

ہوسکتا ہو تو وہاں کذب میں کوئی مضائقہ نہیں چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' وہ شخص جھوٹا نہیں جو لوگوں میں اصلاح کی غرض سے اچھی بات کو منسوب کرے یا کوئی اچھی بات کہہ دے۔

نذروں اور قسموں کا بیان

اس بارے میں مختصر بات یہ ہے کہ نذریں مقرر کرنا اور قسمیں کھانا سب لوگوں کی عادات میں داخل ہے خواہ وہ عربی ہوں یا عجمی ہوں کسی فرقہ اور قوم کو تم نہیں پاؤ گے کہ اپنے موقعوں پر اس کا استعمال نہ کرتے ہوں اس واسطے ان سے بحث کرنا ضروری ہوا، نذریں کرنا اور قسمیں کھانا نیکی کے اصول میں سے نہیں ہیں لیکن جب انسان نے اپنے اوپر کوئی چیز واجب کر لی اور اللہ کا نام اس پر ذکر کیا تو یہ ضروری ہوا کہ اللہ کے معاملہ میں اور اس چیز میں جس پر اللہ کا نام ذکر کیا گیا ہے کوتاہی نہ کی جائے اسی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' نذریں نہ مانا کرو کیونکہ نذر ماننے سے کوئی امر مقدر دور نہیں ہوسکتا'' ان کے سبب سے بخیل سے کوئی شئے نکل جایا کرتی ہے یعنی انسان جب کسی مصیبت میں گرفتار ہو جاتا ہے تو اس وقت اس کو کسی قدر خرچ کرنا آسان ہو جاتا ہے اور جب اللہ تعالیٰ اس کو اس مصیبت سے نجات دے دیتا ہے تو گویا ایسا ہو جاتا ہے کہ کبھی اس کو کوئی مصیبت ہی پیش نہ آئی تھی اس واسطے ضرور ہے کہ جس شئے کو اس نے اپنے اوپر لازم کر لیا تھا اس کو نکالے جس سے اس کے قصد کی تاکید اور نیت کی صداقت پائی جائے، حلف کی چار قسمیں ہیں ایک یمین منعقدہ اور وہ اس قسم کا نام ہے جو کسی آئندہ آنے والی ممکن الوقوع شئے کے لئے کھائی جائے اور دل میں اس کے متعلق فیصلہ کر لیا ہو، اسی کی نسبت اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں'' اللہ تعالیٰ تم سے ان قسموں کا مواخذہ کرے گا جو تم نے منعقد کی ہوں گی، دوسرے یمین لغو جیسے لوگ بلا قصد کہہ دیا کرتے ہیں لا واللہ بلی واللہ، یا ایسی شئے پر قسم کھائے جس کے ہونے کا گمان ہو اور بعد میں اس کے خلاف ثابت ہو اس کی نسبت اللہ تعالیٰ فرماتا ہے'' اللہ تعالیٰ لغو قسموں میں تمہارا مواخذہ نہیں کرتا'' تیسرے یمین غموس اور وہ یہ ہے کہ قصداً جھوٹی قسم اس لئے کھائی جائے کہ اس سے کسی مسلمان کا مال ناحق ۔۔۔لیا جائے اور یہ قسم کبائر میں سے ہے، چوتھے کسی ایسی چیز پر قسم کھانا جو عقلاً محال ہے جیسے کوئی اس طرح قسم کھائے کہ گزشتہ کل کا روزہ رکھوں گا یا ضدین کا جمع کرنا یا وہ عادۃً محال ہے جیسے مردہ کو زندہ کرنا یا اشیا کی حقیقت بدلنا اور ان دونوں قسموں میں جن میں نص وارد نہیں ہے یہ

اختلاف ہے کہ ان میں کفارہ ہے یا نہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اپنے باپ دادا کی قسم نہ کھایا کرو پس جس کو قسم ہی کھانا ہے تو وہ اللہ کی قسم کھائے ورنہ خاموش رہے'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس نے اللہ کے سوا دوسرے کی قسم کھائی تحقیق اس نے شرک کیا''۔

میں کہتا ہوں کسی کے نام کی قسم اسی وقت کھائی جاتی ہے کہ اس میں عظمت اور اس کے نام میں برکت کا اعتقاد ہو اور اس کے حق میں کوتاہی کرنا اور جس امر کے لئے اس کا نام ذکر کیا گیا ہے اس کا ترک کرنا گناہ سمجھا جائے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو شخص قسم کھائے اور قسم میں لات اور عزیٰ کہے تو اس کو چاہئے کہ اس کے بعد لا الہ الا اللہ کہے اور جو اپنے دوست سے کہے آؤ قمار بازی کریں تو اس کو چاہئے کہ صدقہ کرے''۔

میں کہتا ہوں زبان دل کا ترجمان اور اس کا مقدمہ ہے اور جب تک حفظ لسان کا التزام نہ کیا جائے دل کی صفائی حاصل نہیں ہوسکتی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جب تو کسی بات پر قسم کھالے پھر اس کے بعد اس کے خلاف میں بہتری معلوم ہو تو قسم کا کفارہ دیکر اس سے بہتر شئے کو عمل میں لا'' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو شخص اپنے اہل وعیال میں قسم کھانے کی وجہ سے اس پر اڑا رہے تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس میں بہ نسبت اس کی ادائیگی کفارہ کے جو اس پر اللہ تعالیٰ نے فرض کیا ہے زیادہ گناہ ہے''۔ میں کہتا ہوں بسا اوقات انسان ایسی چیز پر قسم کھالیتا ہے جس کی وجہ سے خود بھی دقت میں پڑ جاتا ہے اور لوگوں کو بھی دقت میں ڈال دیتا ہے اور یہ بات مصلحت کے خلاف ہے اور کفارہ اس واسطے مقرر کیا گیا ہے کہ مکلف کے دل میں جو کچھ ہے دور ہو جائے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''تیری قسم جب معتبر ہے کہ تیرا مقابل بھی اس کو تسلیم کرتا ہو''۔

میں کہتا ہوں بعض آدمی مسلمان کا مال مارنے کے لئے کبھی حیلہ کرتا ہے اس طور پر کہ وہ قسم میں تاویل کرتا ہے مثلاً وہ اس طرح قسم کھاتا ہے کہ واللہ میرے ہاتھ میں تیرے مال کا کوئی حصہ نہیں ہے اور اس سے یہ مراد لیتا ہے کہ میرے ہاتھ میں کوئی چیز نہیں ہے گو وہ میرے تصرف اور قبضہ میں ہو اور یہ بڑے ظلم کی بات ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو شخص قسم کھائے اور انشاء اللہ کہہ دے تو وہ حانث نہیں ہوتا''۔

میں کہتا ہوں اس وقت دل کا قطعی فیصلہ اور ارادہ کی پختگی نہیں پائی گئی اور کفارہ ادا کرنے

میں یہی امر سبب ہوتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "اللہ لغو قسموں میں تم سے مواخذہ نہیں کرتا ہے لیکن جن قسموں کا تم نے مصمم قصد کرلیا ہے ان کا کفارہ یہ ہے کہ دس مسکینوں کا اوسط درجہ کا کھانا کھلایا جائے جو تم اپنے اہل وعیال کو کھلاتے ہو یا ان کو لباس پہنایا جائے یا ایک غلام آزاد کیا جائے اور جس کو اس کی قدرت نہ ہو وہ تین روزے رکھے یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے جب تم قسم کھاؤ"۔

میں کہتا ہوں کفارہ واجب ہونے کا راز پہلے بیان ہو چکا ہے پس اس مقام کو دیکھ لو، نذر کی چند قسمیں ہیں ایک نذر مبہم ہے اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "نذر کا کفارہ جبکہ نام نہ لیا جائے قسم کا کفارہ ہے، دوسرے نذر مباح، اس کی بابت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" اپنی نذر کو پورا کر" مگر پورا کرنا واجب نہیں ہے اس کے متعلق ابواسرائیل کا قصہ آنے والا ہے، تیسرے نذر طاعت ہے جو خاص جگہ یا خاص ہیئت میں کسی طاعت کے ادا کرنے کیلئے مانی گئی ہو اس کی بابت ابواسرائیل کا قصہ ہے انھوں نے نذر مانی تھی کہ میں کھڑا رہوں گا اور بیٹھوں گا نہیں اور نہ سایہ میں آؤں گا اور نہ بات کروں گا اور روزہ رکھوں گا پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اس سے کہو کہ بات کرے اور سایہ میں آئے اور بیٹھے اور اپنا روزہ پورا کرے اور اسی امر میں اس شخص کا قصہ بھی سند ہے جس نے نذر کی تھی کہ وہ مقام بوانہ میں جہاں نہ کوئی بت تھا اور نہ اہل جاہلیت کا کوئی میلہ ہوتا تھا ایک اونٹ ذبح کرے گا، آپ نے فرمایا "اپنی نذر پوری کرلے" چوتھے نذر معصیت ہے اس کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "جو شخص کسی گناہ میں نذر مانے گا تو اس کا کفارہ وہی ہے جو قسم کا کفارہ ہے" پانچویں نذر محال ہے اس کی بابت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو شخص ایسی چیز کی نذر مانے جس کو وہ ادا نہ کرسکے تو اس کا کفارہ وہی ہے جو قسم کا کفارہ ہے"۔

نذر کے باب میں قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ کفارہ گناہ سے روکنے کے لئے اور اس کے سینہ میں جو شئے اٹک رہی ہے اس کے دور کرنے کے لئے مقرر ہوا ہے اس واسطے جو شخص کسی طاعت کی نذر مانے تو اس کو پورا کرلے اور جو شخص طاعت کے سوا کسی اور شئے کی نذر مانے اور اپنے دل میں حرج پائے تو کفارہ واجب ہے، واللہ اعلم۔

مختلف ابواب

جن امور کے بیان کرنے کا ہم نے اس کتاب میں ارادہ کیا تھا اور جس کا التزام کیا تھا اس سے ہم فارغ ہو چکے ہیں لیکن جو اسرار شریعت ہمارے سینہ میں مخفی تھے وہ سب اس میں نہ آسکے اس واسطے کہ ہر وقت نہ تو دل ان اسرار کے ظاہر کرنے میں جو قابل بخل ہیں، فیاضی کرتا ہے اور نہ دل کے مضامین کے ظاہر کرنے میں زبان یاری کرتی ہے اور نہ ہر بات عوام پر ظاہر کرنے کے قابل ہوتی ہے اور نہ ہر بات کا بیان کرنا بدون تمہید مقدمات مناسب ہوتا ہے اور یہ بات بھی نہیں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب پر جو کچھ نازل کیا گیا ہے ہمارے دلوں کے راز ان کا احاطہ کرسکیں، وہ ذات جس پر وحی اور قرآن نازل ہوتا تھا اس کی اپنی امت کے ایک شخص سے کیا نسبت ہوسکتی ہے ان دونوں کی حالت میں بڑا فرق ہے اور نہ یہ بات ہے کہ جن علوم کو اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں جمع کیا تھا وہ ان تمام حکمتوں اور مصلحتوں کو محیط ہیں جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کے احکام میں ملحوظ ہیں اور اس بات کو خضر علیہ السلام نے یہ کہہ کر خوب واضح کر دیا کہ میرے اور تیرے (حضرت موسیٰ) علم کو اللہ تعالیٰ کے علم سے ایسی نسبت ہے جیسے اس سمندر کے ساتھ اس نمی کو جو چڑیا کی چونچ میں ہے پس ان مرتبوں سے معلوم ہوسکتا ہے کہ ان مصلحتوں کا پایہ کتنا بلند ہے جن کا احکام شرعیہ میں لحاظ رکھا گیا ہے یقیناً ان کی کوئی نہایت نہیں ہے اور جس قدر ان کے بارے میں ذکر کیا جاتا ہے اس سے ان مصلحتوں کا پورا حق ادا نہیں ہوسکتا اور نہ ان کی پوری حقیقت کے لئے کافی ہوسکتا ہے لیکن جو شئے تمام کی تمام حاصل نہ ہوسکے وہ سب کی سب ترک بھی نہ کی جائے، اب ہم کسی قدر سیرت اور فتنوں اور مناقب کو بطور اختصار کے بیان کرتے ہیں ان کا

بالاستیعاب بیان کرنا ہم کو مقصود نہیں ہے، واللہ الموفق و المعین و الیہ المرجع و المآب.

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عادات اور خصائل کا بیان

ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ نسب یہ ہے: محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبد مناف بن قصی، آپ عرب کے اس قبیلہ میں پیدا ہوئے جو نسب میں سب سے افضل اور شجاعت میں سب سے قوی اور سخاوت میں سب سے زیادہ فیاض اور زبان میں سب سے زیادہ خوش بیان اور فہم میں دانشمند تھا اور اسی طرح انبیا علیہم السلام اپنی قوم میں اعلیٰ نسب ہوتے ہیں کیونکہ لوگ سونے اور چاندی کی کانوں کے مثل ہوتے ہیں اور اخلاق حمیدہ انسان کو اپنے آبا واجداد کی طرف سے ملا کرتے ہیں اور نبوت کے وہی لوگ مستحق ہوتے ہیں جو اخلاق میں کامل ہوتے ہیں اور انبیا کی بعثت سے اللہ کی مراد یہ ہوتی ہے کہ حق ظاہر ہو جائے اور ان کے سبب سے کج رو فرقہ راستی پر آ جائے اور اللہ تعالیٰ ان کو لوگوں کا امام بناتا ہے اور اس منصب کے لئے زیادہ مناسب وہی ہوتے ہیں جو اعلیٰ نسب رکھتے ہوں، اور اللہ کے حکم میں لطف ملحوظ ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جہاں رسالت کو رکھتا ہے'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم صورت اور سیرت میں معتدل تھے میانہ قد تھے نہ زیادہ طویل اور نہ کوتاہ، سر کے بال نہ بالکل پیچیدہ تھے اور نہ بالکل سیدھے بلکہ بین بین تھے اور نہ آپ بہت موٹے تھے اور نہ آپ کا چہرہ بالکل گول تھا بلکہ چہرہ میں کسی قدر گولائی تھی، سر بڑا، ریش مبارک دراز، ہاتھ اور پاؤں پر گوشت، رنگ سفید، سرخی مائل اعضا میں فربہی زور اور باہ میں قوی، لہجہ سب لوگوں سے زیادہ پر صداقت اور طبیعت نہایت نرم تھی جو شخص دفعتہً آپ کو دیکھتا تھا اس کو ہیبت ہوتی تھی اور جب جان کر آپ سے ملتا جلتا تھا تو آپ پر فدا ہو جاتا باوجود بزرگی کے نہایت خاکسار اپنے گھر والوں اور خادموں پر نہایت نرم دل تھے، حضرت انس رضی اللہ عنہ نے دس سال تک آپ کی خدمت کی لیکن آپ نے کبھی ان کو اُف تک نہ کہا نہ کبھی یہ کہا کہ یہ کام تم نے کیوں کیا یا کیوں نہیں کیا، اہل مدینہ کی کوئی باندی آتی اور آپ کا ہاتھ پکڑ کر جہاں چاہتی لے جاتی، اپنے اہل کی خدمت خود کر دیا کرتے تھے آپ کی زبان میں نہ فحش تھا نہ لعنت کرتے اور نہ گالی دیتے اپنا جوتا خود سی لیا کرتے اور اپنا کپڑا خود سی لیا کرتے، بکری کا دودھ خود دوھ لیا کرتے اس کے باوجود آپ بڑے اولوالعزم تھے کوئی شے آپ کو مغلوب نہ کر سکتی تھی اور کوئی

مصلحت آپ سے فوت نہ ہوتی تھی لوگوں میں آپ سب سے زیادہ سخی، تکالیف برداشت کرنے میں سب سے زیادہ ثابت قدم اور لوگوں پر نہایت رحم کرنے والے تھے سوائے جہاد فی سبیل اللہ کے کسی کو آپ کی ذات سے برائی نہیں پہنچتی تھی نہ ہاتھ سے اور نہ زبان سے، تدبیر منزل کی اصلاح کا اور اپنے اصحاب کی رعایت کا اور سیاست مدینہ کا بڑا اہتمام کرنے والے تھے اس طرح سے کہ آپ سے زیادہ ہر شئے کی قدر پہچاننے والا خیال میں نہیں آسکتا، عالم ملکوت کی طرف آپ ہمیشہ متوجہ رہتے اور ذکر الٰہی کے فریفتہ تھے آپ کے کلام اور تمام حالات سے ذکر الٰہی کے آثار محسوس ہوتے تھے آپ کے جمیع حالات میں مدد غیبی تھی اور آپ مبارک مستجاب الدعوات تھے حظیرۃ القدس سے آپ پر علوم کا فیضان ہوتا رہتا تھا اور آپ سے معجزات ظاہر ہوتے رہتے تھے مثلاً دعاؤں کی قبولیت آئندہ واقعات کی پیشین گوئی اور جس شئے میں برکت کی درخواست کرتے اس میں برکت ظاہر ہوتی اور اسی طرح تمام انبیا علیہم السلام کی فطرت میں یہ صفات ہوتی ہیں اور اس فطرت کی وجہ سے جس پر اللہ تعالیٰ نے ان کو پیدا کیا ہے وہ ان صفات کی طرف مائل ہوتے ہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی دعا میں آپ کا ذکر کیا تھا اور آپ کی عظمت شان کی بشارت دی تھی اور حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ اور جمیع انبیا علیہم السلام نے آپ کے پیدا ہونے کی بشارت دی تھی آپ کی والدہ نے خواب میں دیکھا کہ ان کے اندر سے روشنی نکلی اور تمام زمین اس سے روشن ہوگئی پس اس کی یہ تعبیر دی گئی تھی کہ ایک بابرکت لڑکا پیدا ہوگا جس کا دین مشرق سے مغرب تک پھیل جائے گا، اور جنوں نے آوازیں دیں، کاہنوں اور نجومیوں نے آپ کی پیدائش اور علو شان کی خبر دی اور واقعات جو نے آپ کی سربلندی پر دلالت کی جیسے کسریٰ کے محل کے کنگرے گر پڑے اور تمام آثار نبوت نے آپ کا احاطہ کر رکھا تھا جیسے ہرقل قیصر روم نے ان کی خبر دی، آپ کی پیدائش اور شیر خواری کے زمانہ میں لوگوں نے بہت سے آثار برکت مشاہدہ کیے اور ایک مرتبہ فرشتہ ظاہر ہوئے اور آپ کا سینہ چاک کر کے قلب کو نکالا اور اس کو ایمان وحکمت سے بھر دیا یہ واقعہ عالم مثال اور عالم شہود کے درمیان پیش آیا تھا اسی وجہ سے قلب چاک کرنے سے آپ ہلاک نہ ہوئے لیکن زخم کے ٹانکوں کا اثر باقی رہا اور جس واقعہ میں عالم مثال اور عالم شہود کا اختلاط ہوتا ہے اس کی حالت ایسی ہی ہوا کرتی ہے۔

جب ابوطالب شام کے سفر میں آپ کو اپنے ہمراہ لے گئے تو راہب نے آپ کو دیکھا اور آپ کے اندر علامات نبوت دیکھ کر آپ کی نبوت کی شہادت دی جب آپ جوان ہوئے تو فرشتوں سے تعلق ظاہر ہونے لگا وہ کبھی آپ کو غیب سے آوازیں دیتے تھے اور کبھی متشکل ہو کر نظر آیا کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کی حاجت براری اس طور سے فرمادی کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو آپ کے ساتھ ہمدردی کا خیال پیدا ہو گیا اور وہ قریش کی عورتوں میں سب سے زیادہ سرمایہ دار تھیں۔

اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس کسی کو اپنا دوست رکھتا ہے اسی طرح اس کے لئے کوئی تدبیر کر دیتا ہے اور جب دوسرے لوگوں کے ساتھ آپ تعمیر کعبہ میں شریک تھے تو آپ نے عرب کے دستور کے موافق اپنے ازار کو دوش مبارک پر ڈال لیا پس اس سے آپ بے ستر ہو گئے اور بے ستر ہوتے ہی آپ بیہوش ہو کر گر پڑے اور اسی غشی کی حالت میں ستر کھولنے سے ممانعت ہوئی اور یہ نبوت کا ایک شعبہ اور مواخذہ فی النفس کی ایک قسم ہے اس کے بعد آپ خلوت کو پسند فرمانے لگے پس آپ غار حرا میں چند راتیں بسر کرتے پھر گھر تشریف لا کر اتنے ہی روز کی غذا ہمراہ لیتے اور تشریف لے جاتے کیونکہ دنیا سے آپ کی توجہ ہٹ گئی تھی اور اس فطرت کی جانب پھر گئی تھی جس پر اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے شروع شروع میں آپ کو سچے خواب دکھائی دیتے تھے پس آپ کوئی خواب نہیں دیکھتے تھے مگر وہ صبح صادق کی طرح ظاہر ہو جاتا اور کھل جاتا تھا اور یہ بھی نبوت کے اقسام ایک قسم تھی اس کے بعد جبکہ آپ غار حرا میں تھے حضرت جبرئیل اور وحی کا نزول شروع ہوا پس آپ کی طبیعت میں گھبراہٹ پیدا ہوئی جیسا کہ طبیعت کا دستور ہے کہ ملکیت کے غلبہ کے وقت بہیمیت حیران و پریشان ہوتی ہے تب حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا آپ کو ورقہ بن نوفل (۱) کے پاس لے گئیں اور یہ حالت بیان کی، انھوں نے کہا یہ وہی فرشتہ ہے جو موسیٰ پر نازل ہوا تھا اس کے بعد چند روز تک وحی منقطع ہو گئی اس کی وجہ یہ تھی کہ انسان میں دو مختلف جہتیں جمع ہوتی تھیں ایک جہت بشری دوسری جہت ملکی پس جب تاریکیوں سے نور کی جانب خروج ہوتا ہے تو مختلف مزاحمتیں اور الجھنیں پیش آتی ہیں یہاں تک کہ امر الٰہی پورا ہو جاتا ہے اور کبھی آپ فرشتہ کو

---

(۱) تورات کے ماہر عالم

آسمان وزمین کے درمیان بیٹھا ہوا دیکھتے تھے اور کبھی حرم میں کھڑے ہوئے کہ اس کے ازار باندھنے کی جگہ کعبہ تک پہنچتی تھی ومثل ذالک۔

اور اس کا راز یہ ہے کہ جن نفوس میں نبوت کی استعداد ہوتی ہے ملکوت ان کو تاکتے رہتے ہیں پس وہ نفوس بہیمیت سے الگ ہوئے اسی وقت ان کے سامنے ملکی بجلی چمکنے لگی جیسا وقت کا اقتضا ہوتا ہے ویسے ہی یہ حالت پیدا ہوتی ہے جس طرح نفوس عامہ خلاصی پاکر خواب میں بعض امور پر مطلع ہوجاتے ہیں، کسی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا ''یارسول اللہ آپ پر وحی کا نزول کس طرح ہوتا ہے؟ آپ نے فرمایا کبھی تو میرے پاس جھنکار کے مانند آواز آتی ہے اور اس کی مجھ پر زیادہ گرانی ہوتی ہے پس وہ آواز مجھ سے جدا ہوجاتی ہے اور میں اس کی بات کو محفوظ کرلیتا ہوں اور کبھی مجھ کو فرشتہ آدمی کی شکل میں نظر آتا ہے پس جو کچھ وہ کہتا جاتا ہے اس کو میں یاد کرتا جاتا ہوں''۔

میں کہتا ہوں اس آواز کی یہ حقیقت ہے کہ جب قوی تاثیر حواس سے ٹکراتی ہے تو حواس میں پریشانی اور تشویش پیدا ہوجاتی ہے پس قوت بینائی میں تشویش اس طرح پیدا ہوتی ہے کہ مختلف رنگ کی چیزیں سرخ، زرد، سبز وغیرہ نظر آتی ہیں اور شنوائی میں اس طرح اس کا ظہور ہوتا ہے کہ مبہم آوازیں جیسے بھنبھناہٹ، جھنکار اور گھوں گھوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں پس جب یہ اثر ختم ہوجاتے ہیں تو علم حاصل ہوجاتا ہے اور فرشتہ کا آدمی کی صورت میں نظر آنا ایسے محل میں ہوتا ہے جہاں عالم مثال اور عالم شہود دونوں کے بعض احکام یکجا جمع ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ فرشتوں کو بعض لوگ دیکھتے تھے اور بعض نہیں دیکھتے تھے اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا کہ لوگوں کو دین کی طرف بلائیں پس مخفی طور سے آپ اس میں مشغول رہے اس کا یہ اثر ہوا کہ حضرت خدیجہؓ اور حضرت ابوبکر اور بلال اور ان جیسے اصحاب رضی اللہ عنہم مشرب باسلام ہوئے پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا ''جو حکم تم کو دیا جاتا ہے اس کی علانیہ تعمیل کرو'' اور آپ کو حکم ہوا ''اپنے قریب رشتہ داروں کو ڈراؤ'' پس آپ نے علانیہ دعوت اسلام کی اور شرک کی رسموں کو باطل کرنا شروع کردیا اس وجہ سے لوگوں کو آپ سے تعصب ہوگیا اور زبان اور ہاتھ سے تکالیف دینے لگے چنانچہ ایک دفعہ آپ پر حالت نماز میں اونٹ کی اوجھڑی اور انتڑیاں ڈال دیں اور پٹکا ڈال کر آپ کا گلا گھونٹا

مگر آپ ان سب مصائب کو نہایت استقلال سے برداشت کرتے مسلمانوں کو فتح کی بشارت سناتے اور کافروں کو شکست کا خوف دلاتے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''عنقریب یہ جماعت شکست کھائے گی اور یہ لوگ پیٹھ پھیر کر بھاگ جائیں گے'' اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''یہاں کے لوگ جماعتوں سے بھاگ جائیں گے'' اس کے بعد ان کا تعصب اور بھی زیادہ ہو گیا پس انھوں نے باہم قسمیں کھائیں، مسلمانوں کو اور بنی ہاشم اور بن عبدالمطلب کو جو ان کے ہمدرد ہیں، خوب تکالیف پہنچائی جائیں۔ اس وقت مسلمانوں کو حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کی ہدایت ہوئی، وہاں ان کو وسعت کبری پہلے کسی قدر وسعت وکشادگی ہوگئی پھر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اور آپ کے چچا حضرت ابو طالب کا انتقال ہو گیا۔ اور بنو ہاشم کی طاقت منتشر ہوگئی تو اس کی وجہ سے آپ بے چین ہو گئے اور اجمالی طور پر آپ کے دل میں یہ القا ہوا تھا کہ ہجرت سے آپ کی شان بلند ہوگی اس واسطے آپ نے اپنے خیال وفکر سے ہجرت کا قصد فرمایا پس آپ کا خیال کبھی طائف کی طرف کبھی یمامہ کی طرف الغرض ہر طرف توجہ ومیلان ہوا پس آپ عجلت کر کے طائف کی طرف تشریف لے گئے وہاں آپ نے سخت تکالیف اٹھائیں اس کے بعد بنو کنانہ کی جانب تشریف لے گئے لیکن وہاں بھی کوئی خوشی کی بات نہ دیکھی تب زمعہ کے عہد میں پھر مکہ واپس آئے اور آیت نازل ہوئی ''اور ہم نے تم سے پہلے کوئی رسول اور نبی نہیں بھیجا مگر اس کا یہ حال تھا کہ جب وہ کوئی آرزو کرتا تھا تو شیطان اس کی آرزو میں وسوسہ ڈال دیتا تھا'' آپ کی آرزو یہ تھی کہ جن امور کو اپنے نفس میں غور کرتے تھے ان کے موافق وعدوں کے پورا ہونے کی خواہش رکھتے تھے اور شیطان کا وسوسہ ڈالنا یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کے ارادہ کے خلاف ہو اور اس کا نسخ یہ ہے کہ حقیقت حال کا انکشاف ہو اور آپ کے دل سے اس خیال کا ازالہ ہو اور آپ کو رات میں مسجد اقصیٰ تک سیر کرائی گئی پھر وہاں سے سدرۃ المنتہیٰ تک اور جہاں تک اللہ تعالیٰ کی مرضی تھی آپ تشریف لے گئے اور یہ سب باتیں جسم کے ساتھ حالت بیداری میں ہوئیں لیکن یہ واقعہ ایک ایسے مقام میں ہوا جو عالم مثال اور عالم شہادت کے درمیان برزخ کی طرح ہے جس میں دونوں کے احکام جمع تھے پس جسم پر روح کے احکام ظاہر ہوئے اور روح اور روحانی امور اجسام کی صورت میں بن گئے اسی لئے ان واقعات میں سے ہر واقعہ کی ایک تعبیر ہے، حضرت حزقیل اور حضرت موسیٰ وغیرہ انبیا علیہم السلام کو بھی اسی قسم کے

واقعات ظاہر ہوئے تھے اور اولیا امت کو بھی ایسے امور پیش آتے ہیں تا کہ اللہ کے نزدیک ان کے برتر مقامات کی حالت ایسی ہو جس طرح ان کی حالت خواب میں ہوتی ہے، واللہ اعلم۔

شق صدر اور ایمان سے اس کو پر کر دینے کی حقیقت انوار ملکیت کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر غالب ہونا اور طبیعت کی آگ کا فرو ہو جانا اور طبیعت کا اس قابل ہو جانا ہے کہ جو کچھ حظیرۃ القدس سے اس پر فائض ہو اس کو مطیعانہ اخذ کرے اور براق پر سوار ہونے کی حقیقت یہ ہے کہ آپ کے روح ہوائی پر جس میں کمال حیوانی ہوتا ہے نفس ناطقہ کا غلبہ ہو گیا پس آپ براق پر اس طرح سوار ہوئے جس طرح آپ کے نفس ناطقہ کے احکام بہیمیت پر غالب آئے اور اس پر مسلط ہو گئے، اور آپ کا مسجد اقصیٰ کی طرف سیر کرنا اس وجہ سے تھا کہ وہ مسجد شعائر الٰہیہ کے ظاہر ہونے کی جگہ ہے اور عالم بالا کی ہمتیں اس سے متعلق رہتی ہیں اور وہ انبیا علیہم السلام کی توجہات کی آماجگاہ ہے گویا کہ وہ مسجد عالم ملکوت کی کھڑکی ہے اور آنحضرت کا انبیا علیہم السلام سے ملاقات کرنا اور ان سے مفاخرت کرنا سو اس کی حقیقت یہ ہے کہ حظیرۃ القدس کے ساتھ ان کے ارتباط اور تعلق کی وجہ سے ان سب کا اجتماع ہوا اور انبیا علیہم السلام میں نبوت کے اوصاف کمال جو آپ کے ساتھ خاص تھے ان کا ظہور ہوا اور آپ کا درجہ بدرجہ آسمانوں پر چڑھنے کے معنی یہ ہیں کہ آپ نے منزل بہ منزل عرش الٰہی تک ترقی کی اور جو فرشتے وہاں مقرر ہیں اور جو بزرگ انسان ان کے ساتھ جا ملے ہیں ان سب سے تعارف ہوا اور اس تدبیر کا علم حاصل ہوا جس کی اللہ تعالیٰ نے آسمانوں میں وحی کی ہے اور آپ نے اس باہم گفتگو کو معلوم کیا جو آسمانوں کے فرشتوں میں ہوتی ہے، اور موسیٰ علیہ السلام کا رونا حسد کی وجہ سے نہ تھا بلکہ وہ رسالت عامہ کے حاصل نہ ہونے کی صورت تھی اور وہ کمال جو ان کو میسر نہ ہوا تھا اور جس کے وہ درپے تھے اس کے باقی رہ جانے کی صورت تھی، اور سدرۃ المنتہیٰ سو وہ وجود کا درخت ہے اور اس کا بعض بعض پر مرتب ہے اور اس کی تمام طاقتیں تدبیر واحد میں اس طرح سے مجتمع ہیں جس طرح درخت میں قوت غاذیہ و نامیہ وغیرہ سب قوتیں مجتمع ہوتی ہیں، اور یہ بات حیوان کی صورت میں اس لئے ظاہر نہ ہوئی کہ مجموعی اور اجمالی تدبیر جو سیاست سے مشابہ اس کے تمام افراد میں عموم اور کلیت ہے اور ایسی حالت کو زیادہ تر مشابہت تمام اشیاء میں درخت سے ہے نہ حیوان سے کیونکہ حیوان میں تفصیلی قوتیں ہیں اور اس میں ارادہ طبعی

سنن وقوانین سے زیادہ صریح اور ظاہر ہے، اور سدرۃ المنتہیٰ کی جڑوں میں سے نہروں کا بہنا سو وہ رحمت ہے جو عالم ملکوت سے عالم شہادت کی جانب جاری رہتی ہے اور اس کا اثر زندگی ہے اور بڑھانا ہے اسی وجہ سے اس جگہ بعض ایسے امور متعین ہوئے جو عالم شہود میں نافع ہیں جیسے نیل اور فرات اور وہ انوار جو سدرۃ المنتہیٰ کو ڈھانکے ہوئے ہیں وہ انتظامات الٰہی اور رحمانی تدبیرات ہیں جو عالم شہود میں اس شئے میں چمکتی ہیں جس میں ان کی استعداد ہوتی ہے اور بیت المعمور کی حقیقت سو وہ تجلی الٰہی کا نام ہے جس کی جانب انسان کے سجدے اور سجدوں کی عاجزانہ حالتیں متوجہ رہتی ہیں جو گھر کی شکل میں متشکل ہوتے ہیں جیسے بنی آدم کے نزدیک خانہ کعبہ اور بیت المقدس ہے۔

اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک پیالہ دودھ کا اور ایک پیالہ شراب کا حاضر کیا گیا پس آپ نے دودھ والا پیالہ پسند فرمایا تب حضرت جبرئیل علیہ السلام نے کہا فطرت کی جانب آپ کی رہنمائی کی گئی اگر آپ شراب پسند فرماتے تو آپ کی امت گمراہ ہو جاتی پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کا مجمع اور ان کے ظہور کا منشا ہیں اور آپ کا دودھ کو پسند فرمانا بعینہٖ آپ کی امت کا فطرت کو اختیار کرنا ہے اور شراب کا پسند فرمانا امت کا لذات دنیا کو اختیار کرنا ہوتا اور زبان مجاز سے آپ کو پانچ نمازوں کا حکم ہوا کیونکہ ثواب کے اعتبار سے وہ پچاس ہیں، پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی مراد کو یعنی پچاس کی تعداد کو آہستہ آہستہ واضح کر دیا تاکہ معلوم ہو جائے کہ تنگی بھی رفع ہوئی اور نعمت بھی کامل ہوئی اور یہ بات حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جانب اس وجہ سے منسوب ہوئی کہ وہ بہ نسبت اور انبیا کے امت کی اصلاح سے خوب واقف تھے اور ان کو امت کی سیاست کی بڑی پہچان تھی اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم قبائل عرب سے مدد طلب کرتے رہے پس اللہ تعالیٰ نے انصار کو اس امر کی توفیق عطا فرمائی اور انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دو بار بیعت کی ایک عقبہ اولیٰ میں اور دوسری عقبہ ثانیہ میں اور مدینہ کے ہر ہر گھر میں اسلام داخل ہو گیا اور اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو یہ بات صاف طور سے بتلا دی کہ آپ کے دین کی ترقی مدینہ کی طرف ہجرت کر جانے سے ہوگی تب آپ نے ہجرت کا مصمم ارادہ کر لیا اور قریش مکہ میں عداوت اور بھی زیادہ ہو گئی اور انھوں نے یہ منصوبہ تیار کیا کہ یا تو وہ آپ کو قتل کر دیں یا قید رکھیں یا آپ کو کہیں نکال دیں پس آنحضرت کے محبوب و مبارک اور فتحیاب ہونے کی نشانیاں ظاہر ہونے لگیں جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ غار میں داخل ہوئے تو ابوبکر صدیق کے پاؤں میں سانپ نے کاٹا اس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے برکت کی دعا کی اور فوراً ان کو آرام ہوگیا اور جب کفار غار کے منہ پر آ کھڑے ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی آنکھوں کو اندھا کر دیا اور ان کے خیالات کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے پھیر دیا اور جب سراقہ بن مالک نے دونوں حضرات کا پیچھا کیا تو آنحضرت نے اس پر بددعا کی جس کی وجہ سے اس کا گھوڑا پیٹ تک خشک زمین میں دھنس گیا اس طور سے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے زمین شق ہوگئی، اس پر سراقہ نے اس بات کی کفالت کہ وہ آپ دونوں حضرات سے دشمنوں کو روکتا رہے گا اور جب آپ ام معبد کے خیمہ کے پاس آئے تو آپ کے لئے ایسی بکری نے دودھ دیا جو دودھ دینے کے قابل نہ تھی پھر جب دونوں اصحاب مدینہ میں تشریف فرما ہوئے تو عبداللہ بن سلام آپ کے پاس آئے اور انھوں نے تین سوالات دریافت کئے جن کے جوابات سوائے نبی کے اور کوئی نہیں جانتا تھا، اول یہ کہ قیامت کی پہلی علامت کیا ہوگی، دوسرے اہل جنت کا پہلا کھانا کیا ہوگا، تیسرے کیا وجہ ہے کہ بچہ کبھی باپ کے مشابہ ہوتا ہے اور کبھی ماں کے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اوّل علامت قیامت کی آگ ہے جو شرق سے مغرب تک لوگوں پر پھیل جائے گی اور پہلا کھانا جو اہل جنت کھائیں گے مچھلی کا جگر ہوگا، اور جب مرد کا نطفہ عورت کے نطفہ سے پہلے رحم میں پہنچتا ہے تو بچہ باپ کے مشابہ ہوتا اور جب ماں کا نطفہ پہلے پہنچتا ہے تو بچہ ماں کے مشابہ ہوتا ہے یہ سن کر عبداللہ بن سلام نے اسلام قبول کرلیا اور ان کے اسلام لانے سے تمام علماء یہود میں خاموشی پیدا ہوگئی۔

اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں سے معاہدہ کر کے ان کے شر سے نجات پائی اور مسجد کی تعمیر میں مشغول ہو گئے، مسلمانوں کو نماز اور اس کے اوقات کی تعلیم فرمائی اور جس سے نماز کی خبر ہو جایا کرے اس کے بارے میں مشورہ کیا تب عبداللہ بن زیدؓ کو خواب میں اذان کے کلمات کی تعلیم ہوئی اور اس القا غیبی کا محل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے اگر چہ سفیر اور واسطہ عبداللہ ہو گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو جماعت اور جمعہ اور روزہ کی ترغیب دلائی اور زکوٰۃ کا حکم دیا اور ان کو زکوٰۃ کے حدود کی تعلیم فرمائی اور لوگوں کو علانیہ اسلام کی دعوت دینی شروع کی اور ان کو اپنے اپنے وطن سے ہجرت کرنے کی ترغیب دی اس لئے کہ اس وقت ان کے

وطن دارالکفر تھے اور وہاں رہ کر اسلام کو قائم نہیں رکھ سکتے تھے اور باہم مواخاۃ کے ذریعہ اور صلہ رحمی اور مصارف میں ایک دوسرے کی امداد اور اس مواخاۃ کی وجہ سے ورثہ پانے کو لازمی قرار دیکر تمام مسلمانوں کو مستحکم اور مضبوط کر دیا تاکہ ان میں وحدت پیدا ہو جائے اور وہ مجموعی طاقت سے جہاد کر سکیں اور اپنے دشمنوں کو روک سکیں اور اس وقت خاندان آپس میں ایک دوسرے سے مدد لیا کرتے تھے تب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں میں اتحاد اور قوت دیکھی تو اپنے نبی کو وحی کی کہ کفار سے جہاد کریں اور ان کے لئے ہرنا کہ پر بیٹھیں اور جب واقعہ بدر پیش آیا تو مسلمانوں کے پاس پانی نہ تھا پس اللہ تعالیٰ نے وہاں خوب بارش برسائی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے مشورہ کیا کہ ابوسفیان کے قافلہ کا قصد کرتے ہو یا لشکر کے مقابلہ کا پس آپ کی رائے کے موافق صحابہ کی رائے میں بھی برکت عطا ہوئی تب سب نے جنگ کرنے پر اتفاق کیا بعد اس کے کہ وہ اس پر متفق نہ تھے اور جب آپ نے دشمن کی کثرت کو دیکھا تو اللہ تعالیٰ کے حضور میں نہایت عاجزی کی اس وقت آپ کو فتح کی بشارت دی گئی اور وحی کے ذریعہ ان مواقع کی اطلاع دی گئی جہاں کفار قتل ہو کر گریں گے پس آپ نے فرمایا ''یہاں فلاں کی لاش ہوگی اور یہاں فلاں کی لاش ہوگی آپ اپنا ہاتھ رکھ کر بتلاتے جاتے تھے کہ یہاں فلاں ہوگا اور یہاں فلاں ہوگا پس ان میں سے کوئی اس جگہ سے نہ ہٹا جہاں آپ نے اپنے ہاتھ سے تعیین کر دی تھی'' اس روز فرشتے لوگوں کی آنکھوں کے سامنے نظر آتے تھے تاکہ موحدین کے قلوب مطمئن ہو جائیں اور مشرکین کے قلوب لرز جائیں اس لڑائی میں مسلمانوں کو بڑی فتح ہوئی جس کے سبب سے اللہ تعالیٰ نے ان کو غنی بنا دیا اور شرک کی طاقت کو ختم کر دیا اور قریش کے جگر گوشوں کو ہلاک کر دیا اسی واسطے اس جنگ کا نام فرقان ہے اور صحابہ اپنے پاس سے فدیہ لیکر کفار کے قیدیوں کو چھوڑ دینے کی طرف میلان کیا مگر یہ اللہ کی اس مرضی کے خلاف تھا کہ شرک کی جڑ کٹ جائے اس لئے وہ مورد عتاب ہو گئے پھر ان کو معافی دی گئی اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہود کی جلا وطنی کا سامان پیدا کیا کیونکہ مدینہ کے جوار میں یہودیوں کے رہنے کی وجہ سے مدینہ میں اللہ کا دین خالص نہیں ہو سکتا تھا انھوں نے عہد شکنی کی اس لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی نضیر اور بنی قینقاع کو جلا وطن کر دیا اور کعب بن اشرف کو قتل کرا دیا اور اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں ایسا رعب ڈال دیا کہ جن لوگوں نے ان سے مدد کے وعدے کئے تھے ان کی

جانب وہ رخ نہ کر سکے اور اللہ تعالیٰ نے صحابہ کے دلوں کو باہمت کر دیا، اللہ تعالیٰ نے ان کے مالوں کو اپنے نبی کی طرف بلا مشقت کے پھیر دیا اور یہ پہلی فراخ دستی تھی جو مسلمانوں کو حاصل ہوئی۔

اور ابورافع حجاز کا تاجر مسلمانوں کو ایذا دیا کرتا تھا پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی طرف عبداللہ بن عتیک رضی اللہ عنہ کو روانہ فرمایا اور اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے اس کو قتل کرنا آسان کر دیا۔ جب عبداللہ اس کے گھر سے باہر آ رہے تھے تو ان کی ٹانگ ٹوٹ گئی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اپنا پاؤں پھیلاؤ" آپ نے اس پر اپنا دست مبارک پھیر دیا وہ اسی وقت ایسا صحیح وسالم ہو گیا گویا کبھی کوئی مرض ہی نہ تھا اور جب جنگ احد میں مسلمانوں کی شکست کے بہت سے اسباب سماوی جمع ہو گئے تو اس موقعہ پر رحمت الٰہی بہت سے طریقوں سے ظاہر ہوئی پس اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ سے ان کے دین میں بصیرت اور عبرت پیدا کی اس شکست کا یہی سبب تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چند مسلمانوں کو ایک درہ پر جمے رہنے کا حکم فرمایا تھا لیکن وہ وہاں سے ہٹ گئے اور اللہ تعالیٰ نے اجمالی طور پر اپنے نبی کو شکست پر آگاہ کر دیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو خواب میں شکستہ تلوار اور ذبح کی ہوئی گائے دکھائی تھی پس شکست اور صحابہ کا شہید ہونا اسی کی تعبیر تھی اور اللہ تعالیٰ نے اس جنگ کو بہ منزلہ نہر طالوت کے بنا دیا جس سے مخلصین اور غیر مخلصین میں امتیاز ہو گیا تا کہ حد مناسب سے زیادہ کسی پر اعتماد نہ کیا جائے، اور جب عاصم اور ان کے رفقا شہید ہو گئے تو بھڑ وں نے ان کو چاروں طرف سے گھیر لیا پس کفار ان کے ساتھ جو برائی کرنا چاہتے تھے نہ کر سکے، جب قراء بیر معونہ میں شہید ہو گئے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی نماز میں قاتلوں پر بد دعا کرنے لگے اور اس میں ایک قسم کی عجلت بشری تھی اللہ تعالیٰ نے اس پر تنبیہ فرمائی تا کہ آپ کی ہر بات اللہ کی راہ میں اور اللہ کی وجہ سے اور اللہ کے لئے ہو اور قرآن کے اندران قرا کا یہ قول بھی نازل ہوا تھا: بلغوا قومنا انا قد لقينا ربنا فرضي عنا ورضينا عنه لتتسلی قلوبهم، پھر بعد میں یہ قول منسوخ ہو گیا۔

جب عرب کے قبائل نے مسلمانوں کا محاصرہ کر لیا اور مدینہ طیبہ کے چاروں طرف خندق کھودی گئی تو بہت سے طریقوں سے مسلمانوں پر رحمت الٰہی کا ظہور ہوا اللہ تعالیٰ نے کفار کی تدبیروں کو رد کر دیا اور مسلمانوں کو کسی طرح کی مضرت نہیں پہنچی اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے

کھانے میں اتنی برکت دی گئی کہ ایک صاع جو اور ایک بکری کا بچہ تقریباً ہزار آدمیوں کو کافی ہو گیا، خندق میں پتھر توڑتے وقت آپ کو کسریٰ اور قیصر کے محلات نظر آئے اور ان کے فتح ہونے کی آپ کو بشارت دی گئی اور تاریک شب میں اللہ تعالیٰ نے سخت ہوا چلائی اور کفار کے دلوں کو مرعوب کر دیا کہ وہ سب بھاگ نکلے، بنی قریظہ کا آپ نے محاصرہ کیا پس وہ حضرت سعد کے فیصلہ پر راضی ہو کر اپنے قلعوں سے نیچے اتر آئے، حضرت سعد نے حکم دیا کہ ان میں سے لڑنے کی طاقت رکھنے والوں کو قتل کیا جائے اور ان کی اولاد کو قید کر لیا جائے اس فیصلہ میں ان کی رائے حق کے موافق تھی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت زینبؓ کی جانت طبعی رغبت تھی اور چونکہ اس میں ایک دینی مصلحت تھی کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ لے پالک کی بیویاں ان کے لئے حلال ہیں اس واسطے اللہ تعالیٰ نے اس کو اس طرح سے پورا کیا کہ ان کے خاوند نے ان کو طلاق دے دی اور اللہ تعالیٰ نے ان کا نکاح نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کر دیا، ایک مرتبہ جمعہ کے روز آپ کا خطبہ پڑھ رہے تھے کہ ایک اعرابی نے کھڑے ہو کر عرض کیا ''یا رسول اللہ مویشی ہلاک ہو گئے اور بال بچے بھوکے مر گئے آپ بارش کے لئے دعا کیجئے اور اس وقت آسمان پر ابر کا ایک ٹکڑا بھی نہ تھا پس آپ نے ہنوز دعا سے ہاتھ نیچے نہیں کئے تھے کہ پہاڑوں کی طرح بادلوں کے دل کے دل اٹھے اور اتنا مینہ برسا کہ لوگوں کو نقصان کا اندیشہ ہونے لگا تب آپ نے فرمایا ہمارے اطراف برسے ہم پر نہ برسے جس طرف آپ ہاتھ کر کے یہ کہتے تھے اسی طرف سے بادل پھٹ جاتا تھا'' اور جس شئے میں آپ نے برکت طلب فرمائی بارہا اس میں برکت ہوئی جیسے حضرت جابر کے چھواروں کے انبار میں اور ام سلیم کی روٹیوں میں وغیر ذالک اور جب آپ نے بنی مصطلق سے جہاد کیا تو فرشتے ظاہر میں دکھائی دیئے جس کی وجہ سے دشمن خوفزدہ ہو گئے اسی جنگ میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگائی گئی اور اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے ان کی براءت ظاہر فرمائی اور جس نے اس فحش کو آپ کی جانب سے پھیلایا تھا اس پر حد قائم کی گئی اور جب سورج گرہن ہوا تو آپ نے اللہ تعالیٰ کے حضور میں نہایت عجز اور انکساری کی اس لئے کہ وہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک ایسی نشانی ہے کہ اس کے پائے جانے کے وقت برگزیدہ لوگوں کے دلوں میں خوف طاری ہوا کرتا ہے اسی نماز میں آپ نے اپنے اور دیوار قبلہ کے مابین جنت اور دوزخ کا مشاہدہ کیا اور یہ مشاہدہ مکان

خاص میں عالم مثال کے احکام کا ظہور ہے۔

اور اللہ تعالیٰ نے خواب میں آپ کو مطلع کیا کہ بلا خوف و ہراس فتح کے ساتھ حلق اور قصر کرا کر مکہ میں داخل ہوں گے اس واسطے لوگوں نے عمرہ کا قصد کیا حالانکہ عمرہ کا وقت نہیں آیا تھا اور اس میں اللہ تعالیٰ کو کفار سے صلح کرانا منظور تھی جو بڑی بڑی فتوحات کا سبب تھی اور لوگ اس سے بالکل بے خبر تھے اس کی نظیر حضرت عائشہ صدیقہؓ کا وہ قول ہے جو انھوں نے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے اس معارضہ میں کہا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فوت ہونے کے وقت واقع ہوا کہ ہر ایک کے قول میں ایک فائدہ ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عمر کے قول سے منافقین کی تردید کی اور حضرت ابوبکر کے قول سے حق کو ظاہر کر دیا اور معاملہ یہ آن پڑا کہ دونوں فریق باہم صلاح کریں گو اس صلح سے دونوں ناخوش تھے اور اس موقع پر بہت سے معجزات ظاہر ہوئے ،لوگ پیاسے تھے پانی صرف ایک برتن میں موجود تھا پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں اپنا دست مبارک رکھ دیا پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی انگلیوں میں سے پانی ابلنے لگا اور حدیبیہ کا تمام پانی صحابہ نے کھینچ لیا تھا یہاں تک کہ انھوں نے اس میں پانی کا ایک قطرہ بھی نہ چھوڑا تب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے برکت کی دعا کی جس سے اس کنوئیں میں اس قدر پانی ہو گیا کہ تمام لوگ سیراب ہو گئے اور انھوں نے اپنے جانوروں کو پانی پلایا اور مخلصین کے اخلاص کی جانچ کے لئے بیعت رضوان واقع ہوئی اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے خیبر کو فتح کر دیا وہاں سے اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو اس قدر مال عطا کیا جس سے وہ جہاد کی طاقت بڑھا سکیں اور انتظام خلافت کی ابتداء یہی تھی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم زمین پر اللہ تعالیٰ کے خلیفہ ہو گئے اور یہاں بہت سے معجزات ظاہر ہوئے اس جنگ خیبر میں یہودیوں نے آپ کے کھانے میں زہر ملا دیا اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس پر آگاہ کر دیا اور اسی جنگ میں سلمہ بن اکوع کو بڑی سخت ضرب پہنچی تھی پس آپ نے کئی بار اس پر دم کر دیا اس کے بعد پھر کبھی ان کو درد نہیں ہوا، آپ نے قضائے حاجت کا ارادہ فرمایا اور کوئی آڑ اور پردہ نہ تھا اس وقت آپ نے دو درختوں کو بلایا تو وہ اس طرح سے چلے آئے جیسے نکیل پڑا اونٹ مطیعانہ چلتا ہے جب آپ فارغ ہو گئے تو ان کو ان کی جگہ پر واپس کر دیا جب ایک محاربی نے آنحضرت پر حملہ کرنا چاہا اور تلوار کا ہاتھ اٹھایا اللہ تعالیٰ نے اس کے دل میں رعب ڈال دیا پس اس کا ہاتھ وہیں

رک گیا اور اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں اس بات کا القا کیا جو ملاء اعلیٰ میں قرار پا چکی تھی کہ سرکشوں کو لعنت کی جائے اور ان کی شوکت اور رسوم کو مٹا دیا جائے پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس امر میں سعی فرما کر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں تقرب حاصل کیا۔

قیصر اور کسریٰ اور تمام معاند سرکشوں کو نامے تحریر فرمائے، قیصر نے نامۂ مبارک سے بے ادبی کی اس لئے آپ نے اس پر بددعا کی پس اللہ تعالیٰ نے اس کی سلطنت کو پاش پاش کر دیا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے زید اور جعفر اور ابن رواحہ کو موتہ کی طرف بھیجا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ان کا حال ظاہر ہو گیا اس وقت آپ نے ان کے متعلق خبر شہادت آنے سے پیشتر خبر دے دی کہ وہ شہید ہو گئے، جب آپ تمام قبائل عرب کے جہاد سے فارغ ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے فتح مکہ کا سامان کر دیا پس قریش نے اپنے عہد کو توڑ ڈالا اور کورانہ روش اختیار کی اور حاطب ابن بلتعہ صحابی نے اہل مکہ کو آپ کے ارادہ پر مطلع کرنا چاہا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو حاطب کے اس فعل پر آگاہ کر دیا اور آپ نے مکہ کو فتح کر لیا اگرچہ کافروں پر یہ بات بہت شاق گزری اور اہل کوفہ میں اسلام اس طریقہ سے داخل ہو گیا کہ ان کو اس کا وہم وگمان بھی نہ تھا، اور جنگ حنین میں جب مسلمانوں اور کافروں کا مقابلہ ہوا اور مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ گئے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اہل بیت بڑی استقامت سے جمے رہے اور آپ نے اس کی طرف مٹی پھینکی۔ پس اللہ تعالیٰ نے آپ کی مٹی پھینکنے میں اپنی برکت دی کہ ان میں سے کوئی شخص نہ بچا، جس کی دونوں آنکھیں خاک سے نہ بھری ہوں اس وجہ سے وہ کفار پشت پھیر کر بھاگ پڑے اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے دلوں میں جمعیت اور اطمینان پیدا کیا اور سب نے مجتمع ہو کر ایسا حملہ کیا جس سے فتح حاصل ہو گئی اور آپ نے ایک شخص کے متعلق جو مدعی اسلام تھا اور جہاد میں دل کھول کر لڑا تھا یہ فرمایا کہ وہ دوزخی ہے پس قریب تھا کہ بعض لوگوں کو آپ کے ارشاد میں شک پیدا ہو لیکن بعد میں ظاہر ہوا کہ وہ خودکشی کر کے مرا ہے۔

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کر دیا گیا تھا آپ نے دعا فرمائی کہ اصل حال آپ پر منکشف ہو جائے تو خواب میں آپ کو دو شخص دکھلائی دیئے اور انھوں نے جادو اور جادوگر کا تمام حال بیان کر دیا اور ذوالخویصرہ نے آکر کہا کہ یارسول اللہ انصاف سے تقسیم فرمایئے پس آپ پر اس کا اور

اس کی قوم کا حال منکشف ہوگیا پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''وہ لوگوں میں سے ایک بہترین فرقہ سے جنگ کریں گے ان کی نشانی یہ ہے کہ ان میں ایک شخص سیاہ فام ایسا ہوگا جس کا ایک بازو عورت کی پستان جیسا ہوگا'' حضرت علیؓ نے ان سے جنگ کی اور جیسا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا اسی وصف کے ایک آدمی کو پایا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو ہریرہؓ کی والدہ کے لئے دعا فرمائی پس وہ اسی روز مسلمان ہوگئیں، ایک روز آپ نے یہ فرمایا کہ ''جب تک میں اپنی اس تقریر کو بیان کروں اس وقت تک جو کوئی شخص اپنا کپڑا پھیلائے رکھے اس کے بعد اس کو سمیٹ کر اپنے سینہ سے لگا لے تو وہ کبھی میری بات نہ بھولے گا چنانچہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے ایسا کیا پس وہ اس میں سے کچھ نہ بھولے، اور حضرت جریرؓ کے سینہ پر آپ نے ہاتھ مار کر فرمایا ''اے اللہ اس کو قائم رکھ'' پس اس روز کے بعد پھر کبھی وہ گھوڑے سے نہیں گرے حالانکہ اس سے پہلے وہ گھوڑے پر خوب جم نہیں سکتے تھے، ایک شخص دین سے پھر گیا تھا آپ نے اس کے لئے بددعا کی پس زمین اس کو قبول نہ کرتی تھی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کھجور کے ایک تنہ سے تکیہ لگا کر خطبہ دیا کرتے تھے پس جب آپ کے لئے منبر بن گیا اور اس پر قیام فرمایا تو اس تنہ نے گریہ وزاری کی یہاں تک کہ آپ نے اس کو پکڑ کر چمٹا لیا، ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک نہایت سست گھوڑے پر سوار ہوئے تو آپ نے فرمایا ''ہم نے تمہارے گھوڑے کو رفتار میں بحر کی طرح پایا'' اس کے بعد سے کوئی گھوڑا اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔

ان امور کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کو خوب مستحکم کر دیا اور ہر طرف سے ایلچیوں کی آمد و رفت شروع ہوگئی اور فتوحات ہونے لگیں تمام قبائل عرب میں عمال بھیج دیئے اور شہروں میں قاضی مقرر فرمائے اور خلافت مکمل حالت میں ہوگئی اس کے بعد آپ کے دل میں القا ہوا کہ مقام تبوک کی طرف نکلیں تاکہ رومیوں پر آپ کی شوکت ظاہر ہو اور وہاں کے لوگ آپ کے مطیع ہو جائیں اور یہ جنگ نہایت گرمی اور تنگی کے زمانہ میں واقع ہوئی تھی پس اس کو اللہ تعالیٰ نے خالص مومنین اور منافقین کے درمیان امتیاز کر دینے والا بنایا تھا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم وادی قریٰ میں ایک عورت کے باغ کے پاس سے گزرے تو اس کے پھلوں کا تخمینہ آپ نے بھی کیا اور صحابہ نے بھی کیا لیکن جیسے آپ نے فرمایا تھا وہ اس کے موافق برآمد ہوا، جب آپ دیار حجر کے قریب پہنچے تو لوگوں کو اس کے

پانیوں سے ممانعت فرمادی تا کہ لعنت کے مقام سے لوگوں کو نفرت رہے، ایک مرتبہ رات کے وقت باہر نکلنے سے آپ نے منع فرمایا تھا، اتفاقاً ایک شخص باہر نکل گیا تو اس کو ہوا نے طے کی پہاڑیوں میں پھینک دیا۔ ایک مرتبہ آپ کا اونٹ گم ہوگیا تو بعض منافقین کہنے لگے کہ اگر نبی ہوتے تو ان کو اپنے اونٹ کا پتہ معلوم ہوجاتا تب اللہ تعالیٰ نے اونٹ کے مقام اور منافق کے قول سے مطلع فرمادیا اور بعض مخلصین کو غلطی لگی اور وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جہاد میں شریک نہیں ہوئے اس کے بعد ان پر زمین باوجود کشادگی کے تنگ ہوگئی، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کا قصور معاف کردیا اور اچانک ایلہ کا بادشاہ حضرت خالد بن ولیدؓ کے زیر حراست ہوگیا پس جب اسلام قوی ہوگیا اور گروہ کے گروہ دین میں داخل ہونے لگے تو اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم فرمایا کہ مشرکین سے جو معاہدے ہیں ان میں سے ہر عہد کو تمام کردیں، اور سورہ برأت نازل ہوئی اور نجران کے عیسائیوں سے آپ نے مباہلہ کرنا چاہا لیکن انھوں نے عاجز ہوکر جزیہ قبول کرلیا اس کے بعد آپ حج کے لئے تشریف لے گئے، آپ کی معیت میں قریباً ایک لاکھ چوبیس ہزار صحابی تھے آپ نے ان کو مناسک حج تعلیم فرمائے اور شرک کی تحریفات کی تردید فرمائی، جب احکام الٰہی کی تکمیل ہوچکی اور وفات کا زمانہ قریب ہوا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو آدمی کی شکل میں بھیجا کہ سب لوگ ان کو دیکھتے تھے، حضرت جبرئیل علیہ السلام نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایمان، اسلام اور احسان کی حقیقت اور قیامت کا حال دریافت کیا پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم بیان فرماتے رہے اور حضرت جبرئیل علیہ السلام اس کی تصدیق کرتے رہے تا کہ وہ بہ منزلہ دین الٰہی کے خلاصہ کے ہوجائے، اور جب آپ مریض ہوئے تو برابر رفیق اعلیٰ کو یاد کرتے رہے اور ملاء اعلیٰ کی جانب شوق ظاہر فرماتے رہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو وفات دی، پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کے دین کو برقرار رکھنے کی ذمہ داری لی اور ایسے لوگوں کو اس نے کھڑا کیا جو کسی کی ملامت کی پرواہ نہ کرتے تھے پس انھوں نے مدعیان نبوت اور روم اور عجم سے مقاتلے کئے یہاں تک کہ امر الٰہی کی تکمیل ہوگئی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وعلی آلہ واصحابہ وسلم کا وعدہ پورا ہوگیا۔

فتنوں کا بیان

واضح ہو کہ فتنوں کی چند قسمیں ہیں ایک وہ فتنہ ہے جو انسان کے نفس سے متعلق ہے اس طور

پر کہ آدمی کا دل سخت ہو جائے پس اس کو نہ طاعت میں حلاوت معلوم ہو اور نہ مناجات میں کوئی لذت محسوس ہو اور انسان کے تین شعبے ہیں ایک تو دل ہے جو انسان کے تمام احوال کا مبداء ہے جیسے غضب، جرأت، حیاء، محبت، خوف، انقباض وانبساط وغیرہ، دوسرے عقل ہے جو ان علوم کا مبداء ہے جن کی طرف حواس منتہی ہوتے ہیں جیسے بدیہی احکام جو تجربہ اور حدس وغیرہ سے حاصل ہوتے ہیں، اور جیسے نظری احکام جو دلیل اور خطابیات وغیرہ سے حاصل ہوتے ہیں، تیسرے طبیعت ہے جو ان تمام نفسانی خواہشات کا مبدا ہے جو بدن کی بقا کے لئے خود ضروری ہیں یا ان کی جنس ضروری ہے جیسے وہ خواہش جو کھانے پینے خواب اور جماع وغیرہ کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔

پس جب قلب پر بہیمی خصلتیں غالب ہو جاتی ہیں تو اس کا انقباض اور انبساط ایسا ہو جاتا ہے جیسے بہائم کا انقباض اور انبساط ہوتا ہے جو طبیعت اور وہم کی تحریک سے پیدا ہوتے ہیں اور اس طرح کے قلب کو بہیمی کہتے ہیں اور جب قلب خواب یا بیداری میں شیطانی وسوسوں کو قبول کرتا ہے تو ایسے انسان کو شیطان الانس کہتے ہیں اور جب قلب پر ملکی صفتیں غالب ہوتی ہیں تو اس کو قلب انسانی کہتے ہیں پس اس کا خوف اور اس کی محبت اور اسی قسم کے جذبات اعتقادات حقہ کی طرف مائل ہوتے ہیں جس کو اس نے حاصل کیا ہے۔ اور جب قلب کی صفائی غالب اور اس کا نور زیادہ ہو جاتا ہے تو قلب روح ہو جاتا ہے تب اس میں بغیر انقباض کے ہمیشہ انبساط رہتا ہے اور بغیر قلق کے سکون ہوتا ہے اور اس کے احوال انفاس ہو جاتے ہیں اور ملکی خاصیتیں مثل عادت کے ہو جاتی ہیں اور وہ کسی امور کی طرح سے نہیں ہوتیں اور جب عقل پر بہیمی خصلتیں غالب ہوتی ہیں تو عقل سبک ہو جاتی ہے اور طبیعت کے دواعی کی طرف نفسانی خطرات کا میلان رہتا ہے پس اگر باہ کا غلبہ ہوتا ہے تو اس کے دل میں جماع کی خواہش پیدا ہوتی ہے اور اگر بھوک کا غلبہ ہوتا ہے تو کھانے کے خیال میں رہتا ہے، وغیر ذالک۔

اور جب عقل پر شیطانی وسوسوں کا غلبہ ہوتا ہے تو نفس کے اندر ایسے خیالات پیدا ہوتے ہیں جو عمدہ انتظامات میں مخل ہوتے ہیں اور سچے اعتقادات میں شبہات پیدا کرتے ہیں اور ایسے بڑے افعال کی طرف ان کا میلان رہتا ہے جن سے نفوس سلیمہ نفرت کرتے ہیں اور جب عقل پر ملکی خصلتوں کا کسی قدر بھی غلبہ ہو جاتا ہے تو وہ ایسی عقل ہوتی ہے جو ان علوم کی تصدیق کرتی ہے

جن کا تصدیق کرنا ضروری ہے جیسے وہ علوم جو تدابیر نافعہ سے متعلق ہیں یا احسان سے متعلق ہیں خواہ ان کا ثبوت بدیہی ہو یا نظری طور پر ہو، اور جب اس کی نورانیت اور صفائی زیادہ ترقی کر جاتی ہے تو اس کو سر کہتے ہیں تب نفس ان علوم کو قبول کرنے لگتا ہے جن کا فیضان عالم غیب سے ہوتا ہے خواہ ان کا ادراک بذریعہ خواب کے ہو یا فراست، کشف یا آواز غیبی وغیرہ کے ذریعہ سے ہو، اور جب عقل کا میلان ان موجودات کی طرف ہوتا ہے جو مکان و زمان سے بری ہوتے ہیں تو ان کو خفی کہتے ہیں اور جب طبیعت بہیمی خصائل کی طرف اتر آتی ہے تو وہ اس کا نام نفس امارہ بالسوء ہو جاتا ہے اور جب طبیعت بہیمیت اور ملکیت میں مذبذب ہوتی ہے اور اس کا میلان کبھی اس جانب ہوتا ہے اور کبھی اس جانب ہوتا ہے تو اس کو نفس لوامہ کہتے ہیں اور جب نفس شریعت کا پابند ہوتا ہے اور کبھی اس کی مخالفت نہیں کرتا اور اسی کے موافق خواہش کرتا ہے تو اس کو نفس مطمئنہ کہتے ہیں۔

لطائف انسان کی معرفت میں جو کچھ میرے علم میں تھا میں نے بیان کر دیا، واللہ اعلم

اور ایک انسانی فتنہ ہوتا ہے جس کا تعلق اس کے اہل سے ہوتا ہے اور وہ انتظامات خانہ داری کا بگڑ جانا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول میں اسی طرف اشارہ ہے کہ ''ابلیس اپنا تخت پانی پر بچھاتا ہے آخیر میں آپ نے فرمایا کہ ایک شیطان اس کے پاس آ کر کہتا ہے کہ میں نے فلاں شخص کو نہیں چھوڑا یہاں تک کہ اس میں اور اس کی بیوی میں جدائی کرادی تب ابلیس اس کو اپنے پاس بلا کر کہتا ہے تو بہت ہی اچھا ہے'' اور ایک وہ فتنہ ہے جو سمندر کی موج کی طرح موجزن ہوتا ہے اور وہ ملکی انتظامات کا برباد ہونا ہے اور بغیر استحقاق کے ہر ایک کا خلافت کی طمع کرنا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''شیطان اس بات سے ناامید ہو گیا ہے کہ جزیرۃ العرب میں نماز پڑھنے والے اس کی پرستش کریں لیکن باہمی فساد سے ناامید نہیں ہوا ہے'' اور ایک وہ فتنہ ہے جو مذہب سے متعلق ہے اور وہ اس طرح سے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حواری اصحاب دنیا سے اٹھ جائیں اور نااہل لوگ مذہب کے سرپرست بن جائیں پس ان کے درویش اور علما دین میں تکلفات پیدا کریں اور ان کے بادشاہ اور جاہل دین میں سستی ظاہر کریں کہ نہ بھلائی کا حکم دیں اور نہ برائی سے منع کریں اور زمانہ زمانہ جاہلیت کے مانند ہو جائے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''ہر نبی کے

حواری ہوتے ہیں'' الحدیث،

اور ایک عام فتنہ ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ لوگ انسانیت اور اس کے مقتضیٰ سے بالکل بدل جائیں سب سے ذکی اور اعلیٰ درجہ کے زاہد مقتضیات طبیعت کو بالکل ترک کردیں ان کی اصلاح کی پرواہ نہ کریں مجردات کے ساتھ مشابہت اور کسی نہ کسی طرح سے ان سے محبت پیدا کرلیں وغیرہ ذالک، اور ان کے عوام خالص بہیمیت میں جذب ہوجائیں اور لوگ دونوں کی درمیانی حالت میں ہوں کہ نہ اس طرف ہوں اور نہ اس طرف ہوں۔

اور ایک فتنہ وہ ہے جو واقعات جو (۱) سے متعلق ہے جن میں عام ہلاکت کی تخویف ہوتی ہے جیسے بڑے بڑے طوفانات کا ظاہر ہونا، وباء کا پھیلنا، زمین کا دھنس جانا اور اطراف عالم میں آگ کا پھیل جانا وغیرذالک۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اکثر فتنوں کی تشریح بیان فرمائی ہے آپ نے فرمایا ''تم پہلے لوگوں کے طریقوں کے قدم قدم پیروی کروگے یہاں تک کہ اگر کوئی سوسمار کے سوراخ میں داخل ہوا ہوا ہوگا تو تم بھی اس کی پیری کروگے'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''نیک لوگ درجہ بدرجہ فنا ہوتے جائیں گے اور بے قدر لوگ باقی رہ جائیں گے جیسے جو کی بھوسی اللہ تعالیٰ کو ان کی کچھ بھی پرواہ نہ ہوگی''۔

میں کہتا ہوں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوگیا تھا کہ جب نبی کا زمانہ دور ہوجائے گا اور آپ کے صحابہ میں حواری کے درجہ کے لوگ بھی ختم ہوجائیں گے اور نا اہل لوگ معتمد علیہ بنادیئے جائیں گے تو ضرور ان میں وہ رسوم جاری ہوں گی جو نفسانی اور شیطانی تحریکات سے پیدا ہوتی ہیں اور وہ رسوم سب کو محیط ہوجائیں گی الا ماشاء اللہ۔

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اسلام کی ابتدا نبوت اور رحمت سے ہوئی ہے اس کے بعد خلافت اور رحمت کا زمانہ آئے گا پھر اس کے بعد حکومت غالبہ ہوگی اس کے بعد ظلم وسرکشی اور زمین پر فساد ہوگا، ریشم، شرمگاہوں اور شراب کو لوگ حلال سمجھیں گے اسی حالت پر ان کو رزق ملے گا اور ان کی مدد کی جائے گی یہاں تک کہ وہ اللہ سے ملیں''۔

---

(۱) فضاء، ماحول۔

میں کہتا ہوں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے نبوت ختم ہوگئی اور وہ خلافت جس میں مسلمانوں کے درمیان باہم قتال نہ تھا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت سے ختم ہوگئی اور خلافت حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شہادت اور حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی معزولی سے ختم ہوگئی اور تکلیف دہ حکومت صحابہ کے ساتھ بنی امیہ کے جھگڑے ہیں اور ان کی سختیاں ہیں یہاں تک کہ معاویہ کی حکومت قائم ہوگئی اور جبر اور سرکشی بنو عباسیہ کی خلافت ہے کیونکہ انھوں نے قیصر و کسریٰ کے رسوم و رواج کے موافق خلافت کی بنیاد ڈالی تھی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''فتنے دلوں پر پیش کیے جائیں گے وہ دلوں پر محیط ہوں گے جیسے چٹائی کا ایک جز دوسرے جز کے ساتھ پیوست ہوتا ہے پس جن دلوں میں وہ فتنے سرایت کر جائیں گے ان میں ایک سیاہ نقطہ پیدا ہو جائے گا اور جو قلوب ان سے بیگانہ رہیں گے ان میں سفید نقطہ پیدا ہوگا حتی کہ دو قسم کے دل ہو جائیں گے ان میں سے ایک نہایت سفید اور نورانی ہوگا اس کو کوئی فتنہ ضرر نہ پہنچا سکے گا جب تک زمین و آسمان قائم ہیں۔

اور دوسرا سیاہ گرد آلود جیسے ٹیڑھا کوزہ وہ نہ نیکی کی شناخت کرتا ہے اور نہ بدی کی بجز اپنی خواہش کے جو اس میں سرایت کر گئی ہے۔

میں کہتا ہوں خطرات نفسانیہ اور خیالات شیطانیہ دلوں میں پیدا ہوتے ہیں اور اعمال فاسدہ دلوں کو گھیر لیتے ہیں اور اس وقت کوئی ارادہ نہیں ہوتا جو حق پر آمادہ کرے اس واسطے ان فتنوں کو وہی شخص برا سمجھتا ہے جس کے دل میں ان فتنوں کی مخالف ہیئت پیدا کی گئی ہے باقی اور سب کے دلوں میں یہ بری حالت سرایت کر جاتی ہے اور دلوں میں بھر جاتی ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''امانت لوگوں کے دلوں میں نازل ہوتی ہے پھر قرآن و حدیث کے ذریعہ سے لوگ اس کا علم حاصل کر لیتے ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے امانت کے جاتے رہنے کو اس طرح بیان فرمایا کہ ''انسان سو جاتا ہے پس اس کے دل سے امانت قبض کر لی جاتی ہے اور اس کا اثر مثل داغ کے رہ جاتا ہے پھر وہ سو جاتا ہے تو امانت قبض کر لی جاتی ہے پس اس کا اثر مثل آبلہ کے رہ جاتا ہے جیسے تو اپنے پاؤں پر انگارہ رکھے اور اس سے آبلہ پڑ جائے اور تو اس کو ابھرا ہوا دیکھے''۔

میں کہتا ہوں جب اللہ تعالیٰ نے ارادہ کیا کہ ملت اسلام کا غلبہ ہو تو ایک قوم کو اس نے پسند کیا

اوران کوفرمانبرداری اوراذعان کا عادی بنایا اور حکم الٰہی کے موافق ان کی ہمت اور قصد کو جمع کیا پھر اس اذعان اجمالی کی تفصیل کتاب وسنت میں مفصل احکام کے ذریعہ ہوگئی اس کے بعد یہ اذعان لوگوں کے دلوں سے رفتہ رفتہ غفلت اورنسیان میں نکلتا ہے پس آدمی بڑا عالی ظرف اور عقل مند دکھائی دیتا ہے مگر اس کے دل میں امانت کا ایک ادنیٰ حصہ بھی نہیں ہوتا نہ تو دین الٰہی کے اعتبار سے اور نہ لوگوں کے باہمی معاملات کے اعتبار سے، حضرت حذیفہؓ فرماتے ہیں کہ ''میں نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا اس خیر یعنی اسلام کے بعد شر یعنی کفر پھیل جائے گا جس طرح اسلام سے پہلے کفر پھیلا ہوا تھا آپ نے فرمایا ہاں، میں نے عرض کیا اس سے نجات کی کیا صورت ہے آپ نے فرمایا تلوار نجات دے سکے گی، میں نے عرض کیا کہ کیا بعد تلوار کے بھی کچھ شر باقی رہے گا؟ آپ نے فرمایا ہاں زبردستی اور ناخوشی کی حکومت ہوگی اور مکر وفساد سے صلح ہوگی، میں نے عرض کیا پھر کیا ہوگا؟ آپ نے فرمایا اس کے بعد گمراہی کی طرف بلانے والے لوگ پیدا ہوں گے پس اگر دنیا میں اللہ کا کوئی ایسا خلیفہ بھی موجود ہو جو تیری پشت پر درے مار کر تیرا مال چھینے تو اس کی اطاعت کیجئے ورنہ تو کسی درخت کے جڑ کے نیچے افسوس وغم کی حالت میں مرجائیو''۔

میں کہتا ہوں وہ فتنہ جس سے نجات تلوار کے ذریعہ ہوئی ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں اہل عرب کا مرتد ہونا تھا اور زبردستی کی حکومت سے مراد وہ جھگڑے ہیں جو حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے زمانہ میں پیش آئے اور مکر وفریب کی وہ صلح تھی جو امیر معاویہ اور حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما کے درمیان واقع ہوئی اور گمراہی کی طرف ملانے والے ملک شام میں یزید اور عراق میں مختار وغیرہ یہاں تک کہ عبدالملک کی حکومت قائم ہوگی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فتنہ احلاس (۱) کا ذکر فرمایا کسی نے عرض کیا کہ فتنہ احلاس کیا ہے؟ آپ نے فرمایا یہ وہ فتنہ ہے جس میں لوٹ مار اور بھگوڑ ہوگی، آپ نے فرمایا اس کے بعد فتنہ سرا ہوگا اس کا ظہور ایسے شخص کے قدموں کے نیچے سے ہوگا جو میرے اہل بیت سے ہوگا وہ گمان کرے گا کہ وہ مجھ سے ہے حالانکہ وہ مجھ میں سے نہیں ہوگا یقیناً میرے دوست متقی لوگ ہیں، اس کے بعد تمام لوگ ایک ایسے شخص سے صلح کرلیں گے جس کی حالت غیر مستقیم ہوگی، اس کے بعد فتنہ دہیماء ہوگا کہ اس امت کا کوئی شخص اس

---

(۱) احلاس حلس کی جمع بمعنی ٹاٹ، یعنی اس زمانہ میں گھر میں ٹاٹ کی طرح پڑا رہنا بہتر ہے۔

کے طمانچہ سے نہ بچے گا جب لوگ کہیں گے وہ ختم ہو گیا وہ اور زیادہ طویل ہو جائے گا۔

میں کہتا ہوں ہو سکتا ہے کہ فتنہ احلاس سے مراد (واللہ اعلم) وہ ہو جس میں اہل شام نے عبداللہ بن زبیرؓ سے جنگ کی تھی جبکہ وہ مدینہ سے بھاگ کر مکہ میں آ گئے تھے اور فتنہ سراء سے مراد یا تو مختار کا غلبہ اور قتل و غارت گری میں زیادتی کرنا ہے جو وہ اہل بیت کے قصاص کے بہانہ سے کرتا تھا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ ''وہ یہ گمان کرے گا کہ وہ مجھ سے ہے'' اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اہل بیت کے گروہ اور انصار میں سے ہو گا، اس کے بعد مروان اور اولاد مروان پر صلح ہو گئی تھی، یا اس فتنہ سے مراد ابو مسلم خراسانی کا عباسیوں کے مقابلہ کے لئے خروج کرنا ہے کیونکہ وہ بھی یہی کہتا تھا کہ میں اہل بیت کے لئے خلافت چاہتا ہوں اس کے بعد لوگوں نے سفاح کی خلافت پر صلح کر لی، اور فتنہ دہیماء سے چنگیز خانیوں کا مسلمانوں پر چیرہ دستی کرنا اور ممالک اسلام میں غارت گری کرنا مراد ہے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت کی علامات بیان فرمائی ہیں ان علامات کی انتہا ان مختلف فتنوں پر ہوتی ہے جن کا بیان اور ان کے اقسام اور ان کی کثرت پہلے گزر چکی کیونکہ ہلاکت مرض کے قریب ہونے سے ہوتی ہے اور نقصان اسی مقام سے آتا ہے جہاں سے ہلاکت آتی ہے اور اس کی شرح طویل ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''قیامت کی علامت میں سے ہے کہ علم اٹھ جائے گا جہالت بڑھ جائے گی زنا اور شراب نوشی کی کثرت ہوگی مرد کم ہو جائیں گے اور عورتیں زیادہ ہو جائیں گی یہاں تک کہ پچاس عورتوں کا انتظام ایک شخص کے سپرد ہو گا''۔

شریعت کی زبان میں حشر کے دو معنی ہیں ایک لوگوں کا ملک شام میں جمع ہونا اور یہ واقعہ قیامت سے پیشتر ہو گا جب زمین پر لوگوں کی قلت ہو جائے گی بعض لوگ تقریبات کی وجہ سے وہاں جمع ہو جائیں گے اور بعض کو آگ گھیر کر وہاں لے آئے گی، اور دوسرے معنی حشر کے ہیں مرنے کے بعد زندہ ہونا اور ہم اس سے قبل معاد کے اسرار بیان کر چکے ہیں، واللہ اعلم۔

وہ بڑے فتنے جن کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے چار ہیں اول فتنہ زبردستی کی حکومت کا قائم ہونا ہے اور یہ فتنہ صحابہ کے درمیان ان شورشوں پر صادق آتا ہے جو حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد خلافت معاویہ کے استحکام تک وقوع میں آئیں اور اسی کی طرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے

اپنے اس قول میں اشارہ کیا ہے کہ "ایک صلح فریب سے ہوگی" اور معاویہ وہ شخص ہیں جن کے کام کو بھلا بھی کہا جاتا ہے اور برا بھی کیونکہ ان کی حکومت بادشاہوں کے طرز پر تھی نہ کہ ان خلفاء کے طرز پر جو ان سے پہلے گزرے ہیں، دوسرا فتنہ احلاس اور جہنم کے دروازوں کی طرف بلانے والوں کا فتنہ ہے اور یہ فتنہ اس زمانہ پر صادق ہے کہ معاویہؓ کے انتقال کے بعد لوگوں میں اختلاف ہوا کہ خلافت کی آرزو میں انھوں نے آپس میں جنگ کی یہاں تک کہ عبدالملک کی حکومت جم گئی، تیسرا فتنہ سراء ہے جو زبردستی اور سرکشی کا زمانہ ہے اور وہ اس چڑھائی پر صادق آتا ہے جو عباسیوں نے بنی امیہ پر کی یہاں تک کہ خلافت عباسیہ قائم ہوگئی، انھوں نے خلافت کو شاہان عجم کے رسوم پر قائم کیا اور سختی اور ظلم شروع کیا، چوتھے وہ فتنہ ہے جو سب کو طمانچے مارے گا جب لوگ کہیں گے کہ وہ گزر گیا تو وہ اور طویل ہو جائے گا یہاں تک کہ لوگ دو حصوں میں منقسم ہو جائیں گے اور وہ فتنہ چنگیز خانی ترکوں کے اس حملہ پر صادق ہے جو انھوں نے عباسیوں کی خلافت پر کیا اور اس کو بالکل مٹا دیا، اور جو احادیث فتنوں کے باب میں وارد ہیں ان میں سے اکثر پہلے بیان ہو چکی ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اسلام کی چکی کی گردش پینتیس یا چھتیس برس تک رہے گی پس اگر لوگ ہلاک ہوئے تو ان کی ہلاکی ایسی ہوگی جیسے اگلوں کی ہوئی اور اگر ان کا دین قائم رہا تو ستر برس تک قائم رہے گا، راوی کہتا ہے میں نے کہا یہ مدت آئندہ سے ہے یا گزشتہ سالوں کو ملا کر؟ آپ نے فرمایا ان گزشتہ کو ملا کر" پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کے معنی کہ "اسلام کی چکی گردش کرتی رہے گی" یہ ہیں کہ اسلام حدود اور جہاد قائم رہنے کی حالت میں اس امت میں اتنی مدت تک رہے گا سو یہ حالت ابتداء وقت جہاد اور اوائل ہجرت سے لیکر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے وقت تک قائم رہی، اور پینتیس اور چھتیس کے عدد میں شبہ کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس کے متعلق اجمالی وحی کی تھی، اور آپ کا یہ قول کہ "اگر سب ہلاک ہو جائیں" اس کے معنی یہ ہیں کہ مصائب اور دشواریاں پیش آئیں گی اور حالت یہ ہو جائے گی کہ دیکھنے والا اگر بغور مطالعہ کرے گا تو اس کو شک ہوگا کہ قریب ہے کہ تمام امت تباہ ہو جائے اور ان کے تمام امور برباد ہو جائیں، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا قول "ستر برس" اس کی ابتدا آپ کی بعثت اور اس کی انتہاء امیر معاویہ کی موت ہے اور ان کے بعد گمراہ کرنے والوں کا فتنہ قائم ہو گیا، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم

کا یہ قول کہ ''اگر قائم رہا تو ستر برس تک'' اس کے معنی یہ ہیں کہ خوف طاری ہوگا اور دین پست ہو جائے گا اور اس مدت کے بعد دین کی استقامت نہیں رہے گی، واللہ اعلم۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''تم سے ایسی قوم جنگ کرے گی جس کی آنکھیں چھوٹی ہوں گی'' اس قوم سے مراد ترک ہیں ''وہ تم کو تین بار ہٹائیں گے'' الحدیث، اس کے معنی یہ ہیں کہ عرب ترکوں سے جہاد کریں گے اور ان پر غالب آجائیں گے جس سے باہم کینہ اور عداوت پیدا ہوگی۔ انجام کار یہ ہوگا کہ وہ عربوں کو اپنے ملک سے باہر کریں گے اور اسی پر اکتفاء نہیں کریں گے بلکہ بلاد عرب میں داخل ہو جائیں گے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول سے کہ ''تم ان کو جزیرہ عرب میں پاؤ گے'' یہی مراد ہے، پس ان کے پہلے حملہ میں وہ عرب نجات پائیں گے جو ان سے قتال نہیں کریں گے اور ان کے سامنے سے بھاگ جائیں گے چنانچہ یہ بات مقاتلہ چنگیز خانی پر صادق ہوئی کہ عباسیوں میں سے جو لوگ بغداد میں تھے ہلاک ہو گئے اور جو مصر کی طرف بھاگ گئے تھے وہ بچ گئے اور دوسرے حملہ میں بعض بچ جائیں گے اور بعض ہلاک ہو جائیں گے اور یہ بات تیمور کے حملہ پر صادق ہے جس نے ملک شام کو برباد کیا اور عباسیوں کو تہ و بالا کر دیا، اور تیسرے حملہ میں وہ سب کو برباد کر دیں گے، یہ بات حکومت عثمانیہ پر صادق ہے جو تمام امور سلطنت پر غالب آگئے، واللہ اعلم۔

مناقب کا بیان

صحابہ رضی اللہ عنہم کے مناقب چند امور پر مبنی ہیں از اں جملہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کسی کی اس نفسانی ہیئت اور حالت پر مطلع ہو جائیں جس کی وجہ سے آدمی جنت میں داخل ہونے کے قابل ہو جاتا ہے جیسے آپ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے حال سے واقف ہو گئے کہ ان میں تکبر نہیں ہے، اور انھوں نے ان خصائل و اوصاف کو مکمل کر لیا ہے جو جنت کے دروازوں کی صورت میں ظاہر ہوں گے پس آپ نے فرمایا ''میں امید کرتا ہوں کہ تو ان لوگوں میں سے ہے'' یعنی ان لوگوں میں سے جو جنت کے تمام دروازوں سے بلائے جائیں گے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا ''تم کو کبھی راستہ میں چلتا ہوا شیطان نہیں ملا مگر وہ تمہارا راستہ چھوڑ کر دوسرے راستہ پر ہو لیتا ہے''۔

اور نیز نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''میری امت میں اگر کوئی محدث (۱) ہے تو وہ عمر ہے''۔

اور ازاں جملہ یہ ہے کہ خواب میں آپ کو معلوم ہو جائے یا آپ کے دل میں ایسی بات کا القاء ہو جائے جو کسی شخص کے راسخ فی الدین ہونے پر دلالت کرے جیسے آپ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ جنت میں وہ آپ سے آگے آگے چلتے ہیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لئے جنت میں ایک محل دیکھا اور ان کو لمبی چوڑی قمیص پہنے ہوئے دیکھا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنا پس خوردہ دودھ عطا کیا پس آپ نے اس کی تعبیر دین اور علم کے ساتھ فرمائی، ازاں جملہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان سے محبت کریں ان کی توقیر کریں اور ان کے ساتھ سلوک اور ہمدردی کریں اور ان کا اسلام میں پیش قدمی کرنا پایا جاتا ہو پس ان سب امور سے ظاہر ہے کہ یہ سب باتیں ان میں اسی لئے پائی گئیں کہ ان کے دل نور ایمانی سے پر تھے۔

واضح ہو کہ ایک زمانہ کی دوسرے زمانہ پر فضیلت اور فوقیت ہر جہت اور ہر اعتبار سے ممکن نہیں ہے چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ''میری امت کی مثال بارش کی سی ہے کہ نہیں معلوم کہ اس کا اول اچھا ہے یا اخیر'' نیز آپ نے فرمایا ''تم میرے اصحاب ہو اور میرے بھائی وہ ہیں جو میرے بعد آئیں گے'' اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اعتبارات مختلف ہوتے ہیں اور فضیلت کی جہتیں ہر زمانہ میں مختلف ہیں اور یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ عمدہ زمانہ کے ہر شخص کو کم رتبہ زمانہ کے ہر شخص پر فضیلت ہو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ حالانکہ جو قرون بالاتفاق عمدہ تھے ان زمانوں میں ایسے لوگ بھی ہوئے جو منافق یا فاسق تھے، انہیں میں سے حجاج اور یزید بن معاویہ اور مختار اور قریش کے وہ نوجوان تھے جو لوگوں کو ہلاک کرتے تھے اور ان کے علاوہ اور بھی تھے جن کی بدعملی کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا لیکن یہ بالکل یقینی امر ہے کہ قرن اول کے جمہور قرن ثانی کے جمہور سے افضل تھے اور اسی طرح سے افضلیت درجہ بدرجہ ہے اور مذہب کا ثبوت نقل اور توارث سے ہوتا ہے اور توارث اس کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ ان لوگوں کی تعظیم کی جائے جنھوں نے مواقع وحی کو دیکھا اور اس کی تاویل کو پہنچانا، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا مشاہدہ کیا اور اس کے ساتھ تعمق اور سستی

(۱) وہ شخص جس کو غیبی انکشاف ہوتا ہے۔

کو مخلوط نہیں کیا اور نہ اس میں کسی دوسرے مذہب کی آمیزش کی اور امت میں جو قابل اعتماد لوگ ہیں ان کا اس پر اتفاق ہے کہ تمام امت میں سب سے افضل حضرت ابوبکر صدیقؓ اور ان کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہیں اس لئے کہ امر نبوت کے دو بازو ہیں پہلا علم کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے حاصل کرنا اور دوسرا اس کو لوگوں میں پھیلانا پس پہلے امر میں اللہ کی جانب سے علم حاصل کرنے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی بھی شریک نہیں ہے لیکن دوسرا امر یعنی اس کا پھیلانا تو وہ انتظام وتالیف قلوب وغیرہ امور کے بغیر پایا نہیں جاتا، اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ان امور میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اور آپ کے بعد شیخین رضی اللہ عنہما تمام امت سے زائد ہیں، واللہ اعلم۔

شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کی اہم مطبوعات

مجموعہ رسائل امام شاہ ولی اللہ (جلد اول)	مولانا مفتی عطاء الرحمن قاسمی	325.00
مجموعہ رسائل امام شاہ ولی اللہ (جلد دوم)	//	300.00
مجموعہ رسائل امام شاہ ولی اللہ (جلد سوم)	//	300.00
مجموعہ رسائل امام شاہ ولی اللہ (جلد چہارم)	//	300.00
دلی کی تاریخی مساجد (حصہ اول)	//	200.00
دلی کی تاریخی مساجد (حصہ دوم)	//	100.00
پنجاب و ہریانہ کی تاریخی مساجد	//	200.00
امام شاہ ولی اللہ اور ان کے افکار و نظریات	//	250.00
الواح الصنادید (حصہ اول)	//	150.00
الواح الصنادید (حصہ دوم)	//	100.00
مولانا عبدالماجد دریابادی، خدمات و آثار	//	200.00
ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کا حصہ	//	200.00
ہندو مندر اور اورنگ زیب کے فرامین (اردو)	//	20.00
ہندو مندر اور اورنگ زیب کے فرامین (ہندی)	//	20.00
نقوش خاطر (قلمی چہرے)	//	100.00
۱۸۵۷ء اور ہریانہ (ہریانہ کے مجاہدین آزادی کا تذکرہ)	//	250.00
المساجد التاريخيه بدهلي	//	500.00
معمار قوم ڈاکٹر اخلاق الرحمن قدوائی	//	300.00
مرد مومن ڈاکٹر اخلاق الرحمن قدوائی	//	300.00
شاہ ولی اللہ خصوصی نمبر (ماہنامہ براہین)	//	195.00
الامام الدہلوی خصوصی شمارہ (ماہنامہ براہین)	//	195.00
وقف ترمیمی بل ۲۰۱۹ء منظر، پس منظر	//	زیر طبع
ضمائر القرآن (ضمائر قرآن اور ان کے مراجع)	ڈاکٹر ابونصر محمد خالدی — مرتبہ مولانا مفتی عطاء الرحمن قاسمی	300.00
الاشباہ والنظائر فی القرآن الکریم (قرآن کے مرادف الفاظ اور امثال و نظائر)	//	350.00
وفیات اعیان الہند (امراء و سلاطین کی تاریخ ہائے وفات اور مختصر حالات)	//	300.00
مضامین خالدی (اسلامیات، قرآنیات اور دینیات پر مشتمل مقالات)	//	300.00
قرآنی تشبیہات و استعارات	//	150.00
نشریات (ریڈیائی تقریروں کا مجموعہ)	مولانا جنید احمد بنارسی	100.00
سفر وسیلۂ ظفر	خورشید انوار عارقی	100.00

SHAH WALIULLAH INSTITUTE

Masjid Kaka Nagar, Dr. Zakir Husain Marg, New Delhi-110003

Ph.: 011-26953430 Mob.: 9811740661

Email: shahwaliullah_institute@yahoo.in, urduqd@gmail.com

Website: www.shahwaliullah.in

مجموعہ

رسائل امام شاہ ولی اللہؒ

(رؤیا ومکاشفات، مکتوب، تصوف، آداب بیعت، سلاسل اولیا ومشائخ، رد بدعت
اور اصلاح عقائد پر مشتمل ومحیط امام شاہ ولی اللہ محدثؒ کے نادر ونایاب رسائل وکتب کا گرانقدر مجموعہ)

جلد ششم

تحقیق وتعلیق

مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی

شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی

مجموعۂ

رسائل امام شاہ ولی اللہؒ

(رؤیا و مکاشفات، مکتوب، تصوف، آداب بیعت، سلاسل اولیا و مشائخ، رد بدعت اور اصلاح عقائد پر مشتمل و محیط
امام شاہ ولی اللہ محدثؒ کے نادر و نایاب رسائل و کتب کا گرانقدر مجموعہ)

جلد ششم

تحقیق و تعلیق
مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی

شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی

نام کتاب	:	مجموعۂ رسائل امام شاہ ولی اللہ جلد ششم
مرتبہ	:	مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی
قیمت	:	۳۰۰
سن اشاعت	:	مارچ ۲۰۱۵ء
تعداد	:	۵۰۰
کمپوزنگ	:	ریاض احمد
مطبع	:	نیو پرنٹ سنٹر، دریا گنج نئی دہلی
آئی ایس بی این	:	978-93-84153-02-1
ناشر	:	شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ، مسجد کاکا نگر، نزد (این، ڈی، ایم، سی پرائمری اسکول) کاکا نگر نئی دہلی۔۱۱۰۰۰۳

بہ تعاون قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

Title	:	Majmua Rasail-e-Imam Shah Waliullah-VI
Editing	:	Maulana Mufti Ataur Rahman Qasmi
First Edition	:	March - 2015
Price	:	300
ISBN	:	978-93-84153-02-1
Composing	:	Riyaz Ahmed

Published by

Shah Waliullah Institute
Masjid Kaka Nagar, Near (N. D. M. C.
Primary School) Kaka Nagar, New Delhi-110 003
Ph. : 011-26953430, Mob.9811740661
website : www.shahwaliullah.com
Email : shahwaliullah_institute@yahoo.in

فہرست کتب

نمبر شمار	کتب		صفحہ
۱۔	مقدمہ	مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی	۵
۲۔	شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی حکمت کا اجمالی تعارف	مولانا عبیداللہ سندھیؒ	۱۵
۳۔	الدر الثمین فی مبشرات النبی الامین ﷺ	امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ	۹۷
۴۔	مکتوب مدنی	″	۱۲۱
۵۔	القول الجمیل فی بیان سواء السبیل	″	۱۴۵
۶۔	انتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ	″	۲۱۷
۷۔	البلاغ المبین	″	۳۴۳
۸۔	العقیدۃ الحسنۃ	″	۴۸۵

مقدمہ

الحمدللہ شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ اپنے قیام کے روز اوّل سے علمی وتحقیقی میدان میں تیز گام ہے اور اپنے بنیادی واساسی مقاصد واہداف کو بروئے کار لانے میں مصروف عمل ہے۔ اس میں کوئی دورائے نہیں ہے کہ شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ اپنے تحقیقی منصوبوں اور دینی وثقافتی پروگراموں کے حوالے سے ہندوستان ہی نہیں برصغیر میں جانا پہچانا جاتا ہے۔ اور قدر ومنزلت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا رہا ہے۔ اب تک متنوع موضوعات بالخصوص تفسیر وحدیث، فقہ وتصوف، تاریخ وثقافت اور آثار واوقاف کے موضوع پر ۲۵ سے زائد کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔

انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے جہاں متنوع موضوعات پر تحقیق وتصنیف کا کام جاری ہے، وہاں دوسری طرف مشاہیر علما اور معاصرین کی علمی خدمات پر قومی وبین الاقوامی سیمیناروں کا انعقاد بھی کیا جاتا رہا ہے اور فکر ولی اللہی سے تعلق رکھنے والے مستند علما ومشائخ اور دانشوروں میں سے ہر سال کسی ایک کو ''شاہ ولی اللہ ایوارڈ'' بھی دیا جاتا ہے اس کے زیر اہتمام ایک موقر ماہنامہ براہین بھی نکلتا ہے۔ شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے اب تک درجنوں قومی وبین الاقوامی سیمینار منعقد ہو چکے ہیں، جس میں ہند وبیرون ہند کے علما ومشائخ اور مقالات نگار حضرات شریک ہو چکے ہیں۔ شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے ۲۱، ۲۲، ۲۳ نومبر ۲۰۱۴ء کو ''شاہ ولی اللہ کے

افکار کی عصری معنویت'' کے موضوع پر ایک سہ روزہ بین الاقوامی سیمینار منعقد کیا گیا تھا جس میں ہندوستان کے دینی مدارس اور عصری یونیورسٹیوں کے اسکالروں اور مقالہ نگاروں کے علاوہ تاجکستان، کویت، ساؤتھ افریقہ اور مصر کے مقالہ نگار بھی شریک ہوئے تھے۔ اس سیمینار میں بھاری تعداد میں مقالات پڑھے گئے تھے اور اس سہ روزہ بین الاقوامی سیمینار کے افتتاحی اجلاس میں حضرت مولانا محمد سالم قاسمی صاحب مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند کو جناب ضمیر الدین شاہ (ریٹائرڈ لیفٹیننٹ جنرل) وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور پروفیسر طلعت احمد وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کی موجودگی میں دلی کے لیفٹیننٹ گورنر جناب نجیب جنگ صاحب کے ہاتھوں ''شاہ ولی اللہ ایوارڈ ۲۰۱۳'' جیسا باوقار اعزاز تفویض کیا گیا۔

اسی افتتاحی اجلاس میں شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کی گرانقدر نئی مطبوعات، مجموعۂ رسائل امام شاہ ولی اللہ جلد دوم، سوم، چہارم کا اجرا بھی عمل میں آیا تھا۔ جناب نجیب جنگ صاحب نے ان متعدد کتابوں کا اجرا کرتے ہوئے کہا کہ شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ قلت وسائل کے باوجود تحقیقاتی میدان میں غیر معمولی پیش رفت کر رہا ہے، جو میرے لئے باعث مسرت اور دوسرے اداروں کے لئے باعث عبرت ہے۔

جناب ضمیر الدین شاہ صاحب اور پروفیسر طلعت احمد نے بھی کہا کہ شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کی نئی مطبوعات سے شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کے معیار تحقیق اور اس کی فعالیت کا بحسن وخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ ہمیں کھلے دل سے اس کا اعتراف کرنا چاہیے

ڈاکٹر مولانا بدرالحسن قاسمی کویت نے بھی شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کے اس بین الاقوامی سیمینار کے انعقاد اور متعدد ضخیم کتابوں کی اشاعت پر اظہار مسرت کیا اور انسٹی ٹیوٹ کے علمی کاموں کا اعتراف کیا۔

حضرت علامہ سید سلیمان ندوی صاحب مصنف سیرۃ النبیؐ کے صاحبزادے اور مشہور ماہر اسلامیات پروفیسر سلمان ندوی صاحب سابق صدر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز ڈربن یونیورسٹی ساؤتھ

افریقہ نے بھی اس سیمینار کے افتتاحی اجلاس میں اپنا کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے شاہ ولی اللہ کی فقہی آرا کی روشنی میں ملت کو درپیش مسائل کے حل کرنے پر زور دیا اور آئندہ انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے حضرت شاہ صاحب کی فقہی آرا پر خواہ چھوٹا ہی سہی، ایک فقہی سیمینار کے انعقاد کا مشورہ بھی دیا، جسے سامعین نے بے حد پسند کیا اور اس کی عصری ضرورت کا احساس کیا، اس افتتاحی اجلاس میں دوسرے مہمانان خصوصی نے بھی تحسینی کلمات کا اظہار کیا تھا۔

آمدم بر سر مطلب! جیسا کہ آپ کے علم میں ہے کہ شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی نے حکیم الامت امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے جملہ رسائل و کتب کو ''مجموعۂ رسائل امام شاہ ولی اللہ'' کے نام سے تحقیق و تعلیق اور تصحیح و تنقیح کے ساتھ شائع کرنے کا ایک جامع منصوبہ بنایا تھا، جس کے تحت اب تک مجموعۂ رسائل کی پانچ ضخیم جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ اب اس مجموعۂ رسائل کی چھٹی جلد آپ کے ہاتھوں میں ہے، جو میرے لئے بے انتہائی خوشی و مسرت کا مقام ہے، چونکہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی عوامی مقبولیت کے باوجود (چند معروف کتابوں کا استثنیٰ کر کے) آپ کے زیادہ تر رسائل و کتب آج سے ۸۰، ۹۰ سال سے قبل ہی شائع ہوئے تھے جو عرصہ دراز سے نایاب تھے اور بازار میں کہیں بھی دستیاب نہیں تھے، البتہ کسی کسی قدیم کتب خانہ میں اور بعض بعض لائبریریوں میں بعض رسائل موجود ہیں۔ ان نادر و نایاب رسالوں اور کتابوں کو تلاش و جستجو کرنا بھی خاصا مشکل کام ہے اور اتفاق سے اگر بعض کتب خانوں میں موجود بھی ہیں تو قدامت و بوسیدگی اور کرم خوردنی کی وجہ سے لائق مطالعہ بھی نہیں ہیں اور متعدد نسخوں کے موازنہ و تقابل کے بعد ہی صحیح عبارت اور صحت املا کا علم ہو پاتا ہے۔

میں ان نادر و نایاب رسائل و کتب کی تلاش و جستجو میں دلی کے علاوہ ملک کی دوسری دینی لائبریریوں اور سرکاری کتب خانوں کی خاک چھانتا پھرتا رہا ہوں، بعض دوستوں کی کرم فرمائی سے بھی مجھے بعض رسائل دستیاب ہوئے ہیں، جن کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے۔

اس مجموعۂ رسائل میں مقدمہ تعارف کے علاوہ حکیم الامت حضرت امام شاہ ولی اللہ محدث

دہلویؒ کے چھ نادر و نایاب رسائل و کتب شامل ہیں۔

اس مجموعۂ رسائل جلد ششم کے شروع میں مشہور مجاہد آزادی مفکر اسلام مولانا عبید اللہ سندھیؒ کی ایک معرکتہ الآرا تحریر ''امام ولی اللہ دہلوی کی حکمت کا اجمالی تعارف'' شامل ہے، جس سے حضرت شاہ ولی اللہؒ کے افکار و نظریات کی تفہیم میں بڑی مدد ملتی ہے، حضرت مولانا سندھی فکر ولی اللہی کے شارح عظیم اور مفکر جلیل تھے، انھوں نے اس اجمالی تعارف میں الامام الدہلویؒ کے نظریہ تفسیر و حدیث، اور فقہ و تصوف پر بڑی عمیق بحث کی ہے اور حضرت شاہ صاحب کی سوچ اجاگر کی ہے، اس اجمالی تعارف میں حضرت شاہ صاحب کے بعض رسائل کا بھی تذکرہ ہوا ہے۔

اس مجموعۂ رسائل امام شاہ ولی اللہ جلد ششم میں شامل حکیم الامت حضرت امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے نادر و نایاب رسائل شامل ہیں جن میں پہلا اہم رسالہ ''الدر الثمین فی مبشرات النبی الامین صلی اللہ علیہ وسلم'' ہے جو عالم کشف، مشاہدہ اور رویا میں حضرت نبی ذی وقار صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت حدیث اور اکتساب فیض کے موضوع پر ایک قیمتی رسالہ ہے

حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں:

''کمترین خلائق احمد جو ولی اللہ بن عبدالرحیم العمری الدہلوی کے نام سے مشہور ہے، عرض کرتا ہے کہ احادیث مبارکہ میں سے یہ چالیس حدیثیں ہیں جو عالم خواب میں یا آپ کی روح مبارک کے مشاہدے کی حالت میں آپ سے روایت کی گئی ہیں، میں نے انہیں اس رسالے میں جمع کر دیا ہے، ان میں سے کچھ حدیثیں ایسی ہیں جنھیں کسی واسطے کے بغیر براہِ راست ذات اقدس سے میں نے اخذ کیا ہے اور بعض احادیث ایسی ہیں کہ آپ کی روایت میں میرے اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان دو یا تین واسطے ہیں میں نے اس کا نام الدر الثمین فی مبشرات النبی الامین صلی اللہ علیہ وسلم تجویز کیا ہے۔

(صفحہ ۲۴۷ تصوف فاؤنڈیشن لاہور)

۱۔الدرالثمین کے مطبوعہ نسخوں کے علاوہ اس کے مخطوطات بھی کتب خانہ دارالعلوم دیوبند، خدا بخش لائبریری پٹنہ اور رضا لائبریری رام پور میں موجود ہیں، یہ رسالہ عربی زبان میں ہے، اس کے مترجم مولانا سید محمد فاروق قادری صاحب ہیں، انھوں نے اس کا بڑا عمدہ و فصیح ترجمہ کیا ہے، یہ ترجمہ نیٹ پر بھی دستیاب ہے اور تصوف فاؤنڈیشن لاہور سے شائع ہوا ہے لیکن اس میں تاریخ اشاعت درج نہیں ہے۔ یہ کتاب متعدد بار متعدد اداروں سے شائع ہو چکی ہے۔

۲۔دوسرا المکتوب مدنی ہے، یہ مکتوب دراصل شیخ آفندی اسمٰعیل بن عبداللہ الرومی ثم المدنی کے ایک سوال کے جواب میں لکھا گیا ہے، جو انھوں نے مسئلہ وحدۃ الوجود و وحدۃ الشہود کے متعلق شیخ ابن عربیؒ اور حضرت شیخ مجدد الف ثانیؒ کے نظریات کے بارے میں استفسار کیا تھا اور ان کے درمیان تطبیق کی راہ تلاش کرنے کی درخواست کی تھی۔

چنانچہ حضرت شاہ صاحب رقمطراز ہیں:

''عبد ضعیف احمد ولی اللہ بن عبدالرحیم عفی اللہ عنہ کی طرف سے آفندی اسمٰعیل بن عبداللہ الرومی ثم المدنی کی طرف، اللہ تعالیٰ انہیں ان کی نیک امیدوں اور خواہشوں میں کامرانی عطا کرے!

امابعد! میں اس اللہ کی حمد وستائش کا تحفہ تمہاری طرف ارسال کر رہا ہوں، جس کے سوا کوئی معبود نہیں اور اس کے برگزیدہ رسول اور اس کے صحابہ وآل پر درود وسلام بھیجتا ہوں، تمہارا مکتوب مجھے ملا ہے، جس میں تم نے وحدۃ الوجود کے اس تصور کے بارے میں دریافت کیا ہے، جس کو شیخ اکبرؒ اور اس کے اتباع نے پیش کیا ہے اور وحدۃ الشہود کی اس تشریح کی وضاحت چاہتی ہے، جس کا ذکر مجدد الف ثانیؒ نے کیا ہے، تم نے یہ بھی پوچھا ہے کہ آیا دونوں بزرگوں کے نظریات میں تطبیق ممکن ہے۔

(مکتوب مدنی صفحہ ا، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور)

مکتوب مدنی عربی زبان میں ہے، اس کا قلمی نسخہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں ہے، یہ ۹ اوراق

پر مشتمل ہے، اس رسالہ کے ترجمہ نگار مولانا محمد حنیف ندوی صاحب ہیں، انھوں نے اس کا بڑا معیاری اور عمدہ ترجمہ کیا ہے، یہ ترجمہ پہلی مرتبہ ۱۸۶۵ میں ادارہ ثقافت اسلامیہ کلب روڈ لاہور سے شائع ہوا تھا، جس کے ناشر محمد اشرف ڈار صاحب ہیں، اس کا مطبوعہ نسخہ بھی خدا بخش لائبریری میں موجود ہے۔

۳۔ تیسری کتاب القول الجمیل فی بیان سواء السبیل ہے، جس کے مقدمے میں حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں:

> حمد وصلوٰۃ کے بعد بندہ ضعیف، رحمت خداوندی کا امیدوار ولی اللہ بن شیخ عبدالرحیم (اللہ تعالیٰ ہم دونوں کو اپنی خصوصی رحمت کا سایہ مرحمت کرے اور آخرت میں دائمی نعمت کے خزانے سے سرفراز کرے) عرض کرتا ہے کہ یہ کتاب اصول طریقت اور اس سے متعلق موضوعات پر مشتمل ہے، یہ وہ اصول اور قواعد ہیں، جنہیں ہم نے اپنے سلسلہ نقشبندیہ، سلسلہ قادریہ اور سلسلہ چشتیہ کے مشائخ سے حاصل کیا ہے، اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو، میں نے اس کا نام القول الجمیل فی بیان سواء السبیل' تجویز کیا ہے۔
>
> (صفحہ ۴۰ تصوف فاؤنڈیشن، لاہور)

اس میں بیعت، بیعت کی حیثیت، آداب اور شرائط مرشد، تعلیم وتربیت سالک، اشغال مشائخ قادریہ، اشغال مشائخ چشتیہ، اشغال مشائخ نقشبندیہ، حقیقت نسبت، خاندانی مجرب عملیات، علمائے ربانی کے آداب وفرائض وغیرہ اہم مباحث ومسائل بیان کئے گئے ہیں، یہ کتاب عربی زبان میں ہے، جس کے مترجم سید محمد فاروق قادری صاحب ہیں، جنھوں نے بڑے محتاط طریقے سے اس کا سلیس وبامحاورہ ترجمہ کیا ہے، یہ کتاب تصوف فاؤنڈیشن لاہور سے شائع ہوئی ہے، اس کا مخطوطہ بھی رضا لائبریری رام پور اور خدا بخش لائبریری پٹنہ میں موجود ہے۔

۴۔ اس سلسلہ کی چوتھی کتاب ''انتباہ فی بیان سلاسل اولیاء اللہ'' ہے جس میں۔سلسلہ ولی اللہی، سلسلہ قادریہ، سلسلہ نقشبندیہ، سلسلہ چشتیہ، سلسلہ سہروردیہ، سلسلہ کبریہ، سلسلہ مدینیہ، سلسلہ

شاذلیہ، اور سلسلہ شطاریہ جیسے مشہور سلاسل کا ذکر کیا گیا ہے اور ان سلاسل سے حضرت شاہ صاحب اور ان کے والد مرحوم کا بھی تعلق رہا ہے۔

چنانچہ شاہ صاحب لکھتے ہیں:

''احمد بن عبدالرحیم عمری دہلوی المعروف ولی اللہ (اللہ تعالیٰ اسے، اس کے مشائخ اور والدین کو اپنی عظیم رحمت میں ڈھانپ لے) عرض کرتا ہے کہ یہ رسالہ جس کا نام انتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ واسانید وارثی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رکھا گیا ہے، ان مشہور سلاسل کے تعارف پر مبنی ہے جس سے یہ فقیر ظاہری و باطنی علوم میں نسبت رکھتا ہے اور ان کی کسی نہ کسی شاخ سے منسلک ہے''۔ اللہ تعالیٰ اس تالیف کو خالص اپنی ذات کیلئے کرے اور مجھے اور عام لوگوں کو اس سے نصیب کامل عطا فرمائے۔

(صفحہ ۱۲۶، تصوف فاؤنڈیشن لاہور)

زیر تربیت قدیم مطبوعہ نسخہ انتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ کے سرورق پر مندرجہ ذیل عبارت موجود ہے۔

''ھو الولی

الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیھم ولاھم یحزنون

از تصنیف حضرت دستگاہ حقائق انتباہ، مجمع کمالات ظاہری و باطنی منبع مکارم حسنات صوری و معنوی زبدۂ مفسرین وقدوہ محدثین پیشوائی سالکین فانی اللہ باقی باللہ جناب جد امجدی حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ الموسوم بہ ''مترجم انتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ''

بہ تصحیح تام وصحت جس کولا کلام برائے فائدہ ہر خاص وعام عموی مکرم سید ظہیر الدین عرف سید احمد صاحب نے عرصہ ہوا طبع کرایا تھا۔ اور شائقین کے متواتر اصرار سے مرحوم کے ہمشیر زادے سید عبدالغنی جعفری کلیمی نواسہ وجانشین حضرت شاہ صاحب ممدوح نے

بار دوم۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

آرمی برقی پریس دہلی میں طبع کرایا''۔

انتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں لکھی گئی ہے اس کا قدیم اردو ترجمہ سید ظہیر الدین عرف ولی اللہی نے بہت پہلے آرمی پریس دہلی سے طبع کرایا تھا، اس کے بعد اسی قدیم اردو ترجمہ کو دوبارہ سید عبدالغنی جعفری کلیمی نے شائع کرایا تھا، یہی ترجمہ اس مجموعہ رسائل میں شامل ہے، اس ترجمہ کو میرے دوست جناب عبدالرحمٰن کوندو صاحب سری نگر، کشمیر نے مجھے عنایت فرمایا تھا۔ انھوں نے کہا تھا کہ اس کا دوسرا حصہ بھی ہے لیکن مجھے اس کا دوسرا حصہ دستیاب نہ ہوسکا ہے۔ اس ترجمہ کے علاوہ ایک دوسرا ترجمہ بھی مجھے دستیاب ہوا ہے جس کے ترجمہ نگار مولانا سید محمد فاروق قادری صاحب ہیں ان کا ترجمہ سادہ وسلیس ہے، مجھے افسوس ہے کہ یہ ترجمہ مجھے بعد میں دستیاب ہوا تھا، ورنہ یہی ترجمہ شامل کتاب ہوتا۔

انتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ کا قلمی نسخہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں موجود ہے۔

۵۔ اس مجموعہ میں پانچویں کتاب البلاغ المبین ہے جس کے ترجمہ نگار مولانا محمد علی مظفری صاحب گوجرانوالہ ہیں، جو مولانا عبداللہ قصوری کے پھوپھی زاد بھائی اور مولانا ابوالکلام آزاد کے بڑے معتقد تھے، ۱۹۱۵ء میں آپ نے کلکتہ کا سفر کیا تھا، اور مولانا آزادؒ سے ملاقات کی تھی اور وہاں مولانا آزاد کی مجالس وعظ میں شریک ہوتے تھے، آپ نے دہلی میں پروفیسر خواجہ عبدالحی صاحب فاروقی استاد جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ساتھ دعوت وتبلیغ کا کام بھی کیا، اور شدھی تحریک کے دور میں دہلی اور اس کے اطراف میں مرتدین میں کام کیا تھا، آپ کا تعلق مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب سے بھی تھا، قیام پاکستان کے بعد مولانا محمد علی مظفری صاحب سرکاری عہدہ پر بھی فائز رہے اور کئی مسجدوں میں امامت وخطابت کے فرائض بھی انجام دیئے۔

مولانا محمد علی مظفری بڑے قناعت پسند اور متوکل انسان تھے، مولانا آخر میں سخت بیمار ہوئے تو مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب دو دفعہ آپ کی مزاج پرسی اور عیادت کے لئے تشریف لے گئے تھے اور علاج ومعالجے کے لئے ایک رقم بھی عنایت فرمائی تھی آپ نے ۱۲؍ربیع الاول ۱۳۷۹ھ

میں تریسٹھ برس کی عمر میں وفات پائی تھی۔

البلاغ المبین ۲۰۰۲ میں قرآن آسان تحریک کے زیر اہتمام قومی پریس لاہور سے شائع ہوئی تھی، یہی نسخہ میرے سامنے ہے۔ مولانا محمد علی مظفری مرحوم نے اس کا بڑا عمدہ ترجمہ کیا ہے، اس کا قلمی نسخہ رضالائبریری رام پور میں ہے۔ جس کے متعلق ڈاکٹر ابوسعد اصلاحی صاحب لائبریرین رضالائبریری اپنے ایک مضمون 'رام پور رضالائبریری میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی تصنیفات کے قلمی نسخے'' میں لکھتے ہیں:

مخطوطہ نمبر ۴۲۱ بلاغ المبین فن عقائد

ورق ۸۷، سطر ۱۳، سائز ۱۷+۲۴ خط معمولی نستعلیق سنہ کتابت ۱۲۳۸ھ

''ابتداء! الحمد للہ...... این رسالہ ایست نامیدہ بلاغ المبین کہ آیات کلام رب الانام واحادیث صحیحہ رسول علیہ السلام وآثار صحابہ کرام واخبار اولیاء عظام اندران ترجمہ نمودہ آمد۔

ترقیمہ: بحسب ارشاد فیض بنیاد مولوی مکرمی مولانا رشید الدین خان صاحب دامت ارشادھم بلاغ المبین (۱۱۶۶) بتاریخ بست و چہارم شہر رجب ۱۲۳۸ در بلدہ اجمیر اتمام وست اختتام پذیرفت کتبہ میر شاہ علی۔

(صفحہ ۱۹۳، امام شاہ ولی اللہ اور ان کے افکار ونظریات مطبوعہ شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی)

۶۔ اس مجموعہ رسائل میں شامل آخری رسالہ ''العقیدۃ الحسنۃ'' ہے، جو علم عقائد میں ایک جامع ترین رسالہ ہے، جس کے فاضل ترجمہ نگار وشارح مولانا عبدالحمید صاحب سواتی ہیں، جو گوجرانوالہ کے مدرسہ نصرۃ العلوم کے مدرس تھے، اور اردو اور عربی کے بہترین ترجمہ نگار تھے۔ انھوں نے اپنی ترجمہ نگاری کے ذریعہ اپنی غیر معمولی صلاحیت کا ثبوت پیش کیا ہے۔ العقیدۃ الحسنۃ، امام طحاویؒ کی مشہور کتاب عقیدۃ الطحاوی کے طرز پر ایک جامع کتاب ہے، جو درس نظامیہ

کے نصاب تعلیم میں شامل کرنے کے لائق ہے اور اصلاح عقائد میں ایک گرانقدر تصنیف ہے۔

یہ رسالہ عربی زبان میں ہے اور اس کی عربی زبان بہت شستہ وشگفتہ ہے۔

مجھے خوشی ہے کہ مجموعہ رسائل امام شاہ ولی اللہ جلد ششم شائع ہو رہی ہے اس موقع پر بڑی ناسپاسی ہوگی اگر ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین صاحب ڈائریکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا شکریہ ادا نہ کیا جائے جنھوں نے اس مجموعہ کی اشاعت میں غیر معمولی دلچسپی لی اور ہر ممکن مدد کی ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں تمام شرور وفتن سے محفوظ رکھے اور علمی ترقیات سے نوازے۔ مولانا عبدالرحمٰن کوندو صاحب کا بھی بے حد شکرگزار ہوں کہ وہ شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کے علمی کاموں میں بڑی علمی معاونت فرماتے ہیں اور وہ ایک لائق ومخلص دوست ہیں۔

آخر میں محترمہ مسرت جہاں صاحبہ اور ڈاکٹر توقیر احمد راہی صاحب کا بھی شکرگزار ہوں کہ ان دونوں حضرات نے بھی اس تحقیقی کام میں بھرپور تعاون کیا ہے، اللہ تعالیٰ انہیں بھی بعافیت رکھے۔

مجھے یقین ہے کہ مجموعہ رسائل امام شاہ ولی اللہ کی دوسری جلدوں کی طرح یہ جلد ششم بھی ہاتھوں ہاتھ لی جائے گی اور علمی ودینی حلقوں میں قدر ومنزلت کی نگاہوں سے دیکھی جائے گی۔

عطاء الرحمٰن قاسمی

چیئرمین

شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ

نئی دہلی

امام ولی اللہ دہلویؒ
کی
حکمت کا اجمالی تعارف

تحریر دلپذیر

مولانا عبید اللہ سندھیؒ

تحقیق و تعلیق

مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی

فہرست مضامین

صفحہ	مضمون	نمبر شمار
۲۱	امام ولی اللہ دہلوی کی حکمت کا اجمالی تعارف از مولانا عبید اللہ سندھیؒ	۱۔
۲۱	باب اول (تحصیلی ملکات)	۲۔
۲۱	تحصیلی ملکات کی تشریح	۳۔
۲۲	شاہ عبدالرحیم کا علمی سلسلہ	۴۔
۲۲	فصل (۲) شاہ ولی اللہؒ کی ذہنیت کا بنیادی مسئلہ	۵۔
۲۴	فصل (۳) حکمت عملی کے باب میں شاہ ولی اللہ کا امتیاز اور اس کے اسباب	۶۔
۲۷	باب دوم (تکمیلی ملکات)	۷۔
۲۷	فصل (۱) شاہ ولی اللہ ارقرآن فہمی کے باب کی ایک عام غلط فہمی کی اصلاح	۸۔
۲۸	فصل (۲) قرآن میں قصص الانبیاء کی تکرار کا حل اور مضامین قرآن کی ولی اللہی تقسیم جس کی رعایت سے فہم قرآن کا دروازہ کھل جاتا ہے اور قرآن تک رسائی ہوسکتی ہے	۹۔
۲۹	عقدہ لا ینحل اور مسئلہ حقیقت روح	۱۰۔
۳۰	فصل (۳) شاہ صاحب کی تقسیم کے مطابق قرآن کا ایک اہم مضمون مخاصمۃ اور عام علما کی اس نکتہ سے بے اعتنائی	۱۱۔

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱۲۔	فصل (۴) متن قرآن سے شاہ ولی اللہ کا اعتنا اور اس کی برکات آپ کا ترجمہ قرآن ''فتح الرحمٰن'' اور اس کی خصوصیات	۳۳
۱۳۔	فصل (۵) آیات متشابہات کے متعلق شاہ صاحب کا مسلک	۳۵
۱۴۔	فصل (۶) رسوخ فی العلم کی تشریح	۳۷
۱۵۔	فصل (۷) مسئلہ نسخ فی القرآن اور شاہ صاحبؒ	۳۹
۱۶۔	فصل (۸) شاہ صاحب اور مقصد قرآن کی تعیین	۴۱
۱۷۔	فصل (۹) شاہ صاحب کی حکمت کی اساس و بنیاد	۴۲
۱۸۔	الامام کا لقب اور شاہ صاحبؒ	۴۳
۱۹۔	فصل (۱۰) مضامین قرآن کا ظاہری انتشار اور شاہ صاحبؒ	۴۳
۲۰۔	فصل (۱۱) ربط آیات اور شاہ ولی اللہؒ	۴۴
۲۱۔	فصل (۱۲) قرآن اور سنت کے باہمی تعلق کے بارے میں شاہ صاحب کی خاص رائے	۴۵
۲۲۔	فصل (۱۳) اجماع کا تعلق اور استنباط قرآن سے	۴۵
۲۳۔	باب سوم (علم حدیث)	۴۷
۲۴۔	فصل (۲) کتب حدیث پر شاہ صاحب کی تنقید اور طبقات کی تقسیم	۴۹
۲۵۔	مولانا محمد قاسم نانوتوی اور کتب حدیث کے متعلق ولی اللہی نظریہ کی عقلی تشریح	۵۱
۲۶۔	فصل (۳) ہمارا اپنا استقراء اور ولی اللہی نظریہ کی مزید تشریح	۵۵
۲۷۔	ائمہ تنقید حدیث کے تین طبقے	۵۶
۲۸۔	ائمہ فقہ الحدیث کے چار طبقے	۵۶
۲۹۔	ائمہ مصنفین کے دو طبقے	۵۷
۳۰۔	ان ائمہ کے بعد کے محدثین کی خدمات کی اقسام	۵۷
۳۱۔	فصل (۴) صحاح ستہ کی چھٹی کتاب ابن ماجہ ہے یا موطا مالکؒ	۵۸

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۳۲۔	سنن ابن ماجہ کا علمی درجہ	۵۸
۳۳۔	درجہ تکمیل	۵۹
۳۴۔	فصل (۵) صحیح وضعیف حدیثوں میں تمیز کا ملکہ پیدا کرنے کا ولی اللّٰہی طریقہ	۵۹
۳۵۔	شاہ صاحب کی تحقیق میں موطا مالک کی اہمیت واقدمیت	۶۰
۳۶۔	فقہاء سبعہ	۶۳
۳۷۔	فصل (۶) عام علما نے موطا کو اس قدر اہمیت کیوں نہیں دی	۶۴
۳۸۔	وصیت شیخ الہندؒ	۶۴
۳۹۔	مسند احمد	۶۵
۴۰۔	فتح الباری	۶۵
۴۱۔	سبب الرجوع الی الموطا	۶۶
۴۲۔	باب چہارم۔علم فقہ	۶۸
۴۳۔	فصل (۱) عرب اور رسول اللہ کی بعثت کا مقصد	۶۸
۴۴۔	قرآن اور دنیا میں انٹرنیشنل انقلاب کا پروگرام	۷۲
۴۵۔	انقلاب کا قرآنی پروگرام اور طاقت	۷۲
۴۶۔	عدم تشدد کا مسلک	۷۳
۴۷۔	قرآن کی انقلابی تحریک کا آئیڈیا	۷۳
۴۸۔	اس تحریک کو چلانے والی پارٹی یا حزب اللہ	۷۳
۴۹۔	سینٹرل کمیٹی کی تعیین	۷۴
۵۰۔	مسئلہ خلافت وامامت	۷۴
۵۱۔	فصل (۲) عجم	۷۵
۵۲۔	سلاطین اور علمائے کرام	۷۶
۵۳۔	سلاطین اسلام اور صوفیہ	۷۷

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۵۴۔	فصل (۳) تطبیق الفقہ والحدیث	۷۸
۵۵۔	ایران اور خراسان	۷۸
۵۶۔	حجازی اور عراقی فقہ کی تدوین	۷۹
۵۷۔	تدوین فقہ اور ہندوستان	۸۰
۵۸۔	شاہ ولی اللہؒ اور فقہ	۸۱
۵۹۔	حجاز پہنچ کر شاہ صاحب کا فقہی مسلک	۸۳
۶۰۔	مرکز کی تلاش اور پھر حنفی فقہ کی طرف رجوع	۸۳
۶۱۔	ہند میں فقہ حنفی اور شاہ ولی اللہؒ	۸۴
۶۲۔	حنفیت میں شاہ صاحب کی الہامی تجدید	۸۵
۶۳۔	شاہ صاحب بحیثیت مجتہد منتسب	۸۶
۶۴۔	امام عبدالعزیز دہلویؒ	۸۶
۶۵۔	مشائخ دیوبند	۸۷
۶۶۔	باب پنجم (تصوف وفلسفہ)	۸۸
۶۷۔	فصل (۲) عجمی اقوام اور فلسفہ اشراق	۹۰
۶۸۔	فصل (۳) آرین اقوام کو سامی نبوت سمجھانے کا ولی اللّٰہی طریقہ	۹۱
۶۹۔	فصل (۴) شاہ صاحب کی نظر میں تصوف کی اہمیت اور ضرورت	۹۲
۷۰۔	فصل (۵) اسلام اور ہندوستانیت	۹۳
۷۱۔	فصل (۶) نبوت کی رہنمائی کی ضرورت صرف امور آخرت ہی میں نہیں ہے بلکہ دنیاوی معیشت کا سنوارنا بھی نبوی ہدایات کا محتاج ہے	
	ابن خلدون کی ایک سنگین غلطی پر انتباہ	۹۴
۷۲۔	روحانیت اور اخلاق انسانی کا تعلق اقتصادیات سے شاہ صاحب کی نظر میں	۹۵

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمدللہ و کفٰی وسلام علٰی عبادہ الذین اصطفٰی

باب اول (تحصیلی ملکات)

شاہ ولی اللہ دہلوی (متوفی ۱۱۷۶ھ) کے تحصیلی ملکات کی تشریح سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ایسے مشائخ کا اجمالی تذکرہ کر دیا جائے جن کی صحبت نے ان کی ذہنیت کو صاف کیا ہے۔

تحصیلی ملکات کی تشریح

تحصیلی ملکات سے ہماری مراد ہے عربی زبان کا سیکھنا۔ منطقی اصطلاحات کا استعمال کرنا، سوسائٹی کے رائج الوقت قانون یعنی فقہ حنفی کے متون وشروح کا پڑھنا، اس قانون کے عقلی نظام یعنی اصول فقہ کا سمجھنا متکلمین کے مختلف اسکول اور ان کی باہمی مسابقت سے شناسا ہونا۔ اس کے بعد حقائق کائنات پر اپنی صاف ذہنیت سے غور کرنا اور اپنے کسبی اطمینان پر بھروسہ کرنا۔ یہ سب علوم وفنون تحصیلی ملکات کا ذریعہ ہیں اس وقت ہم آخری حصے پر سب سے پہلے بحث کرتے ہیں۔

آزاد ذہنیت سے حقائق کائنات کو سوچنے کا فلسفہ حقیقۃ الوجود اور اس کے تنزلات کو سمجھنے کا نام ہے، اس فن کے امام متاخرین صوفیہ میں حضرت شیخ اکبر (محمد بن علی) محی الدین ابن عربی متوفی ۶۳۸) ہیں، شاہ صاحبؒ کے مربی اصل میں سب سے پہلے ان کے والد شاہ عبدالرحیم

(متوفی ۱۱۳۱ھ) ہیں وہ ابن عربیؒ کے فلسفہ کے پورے ماہر استاذ تھے۔

شاہ عبدالرحیمؒ کا علمی سلسلہ

شاہ عبدالرحیم اپنے بھائی شیخ ابوالرضا محمدؒ (متوفی ۱۱۰۱ھ) کے شاگرد ہیں، شیخ ابوالرضا مذکورہ بالا فلسفہ میں ایک مستقل امام کا درجہ رکھتے ہیں، شاہ صاحب کی یہ ذہنیت اپنے والد اور چچا سے خاندانی خصوصیات کے ضمن میں بلا قصد تکمیل پاتی ہے شاہ صاحب کے والد اور چچا خواجہ عبداللہ المعروف بہ خواجہ خورد (متوفی ۱۰۷۵ھ) کے خاص صحبتی ہیں۔ خواجہ خورد اپنے والد خواجہ رضی الدین محمد باقی عرف باقی باللہ دہلوی (متوفی ۱۰۱۲ھ) کے پانچ شاگردوں کے ہم صحبت ہیں (۱) حضرت امام ربانی شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی (متوفی ۱۰۳۴ھ) (۲) شیخ اللہ داد دہلوی (متوفی) (۳) خواجہ حسام الدین دہلوی (متوفی ۱۰۴۰ھ) (۴) شیخ رفیع الدین متوفی ۱۰۵۲ھ) (۵) شیخ تاج الدین سنبھلی مکی (متوفی ۱۰۵۰ء) خواجہ باقی باللہ نظریہ وحدۃ الوجود کے بہت بڑے امام تھے۔ ان کی امامت اشراقی طرز کی ہے وحدۃ الشہود کا اسکول امام ربانی نے مرتب کیا ہے۔ خواجہ خورد اور شاہ صاحب کے والد اور چچا اگرچہ امام ربانی سے پورے مستفید ہوئے مگر ان کا فکر وحدت الوجود کی طرف مائل ہے۔ امام ولی اللہؒ نے ''انفاس العارفین'' میں اپنے والد اور چچا کے مقالات اور مقامات اس طرح ذکر کیے۔ جس سے مذکورہ مقالات اور مقامات کی شرائع الٰہیہ سے تطبیق ہو جائے ہر دو بھائیوں کے خاص نظریات کا ماحصل ایک ایسی شاہراہ بنانے کی سعی ہے جس پر مسلمان فلاسفر (صوفیہ و متکلمین) اور فقہا ساتھ ساتھ چل سکیں، کشف، عقل، نقل میں خصوصی مہارت پیدا کر کے جس طرح اہل علم فرقوں میں منقسم ہو گئے اسی طرح یہ افتراق فنا ہو جائے تاکہ اسلامی ذہنیت جو زنگ آلود ہو رہی ہے اپنے جوہر دکھا سکے، یہ شاہ صاحبؒ کی ذہنیت کا ایک اچھا مظاہرہ ہے، کہ وہ وحدۃ الوجود کے فلسفہ کو شرائع الٰہیہ کی تشریح و تفصیل میں استعمال کر سکتے ہیں۔

فصل (۲) شاہ ولی اللہؒ کی ذہنیت کا بنیادی مسئلہ

امام ولی اللہ حدیث شریف کی تکمیل کیلئے ۱۱۴۳ھ میں حرمین شریفین گئے، پورے دو سال وہاں رہے سب سے بڑا استاذ جس سے ان کو معنوی مناسبت پیدا ہوئی وہ شیخ ابو طاہر مدنی متوفی ۱۱۴۵ھ ہیں۔ شیخ مذکور زیادہ تر اپنے والد شیخ ابراہیم کردی (متوفی ۱۱۰۱ھ) سے مستفید ہوئے۔

حسن اتفاق سے شیخ ابراہیم کردی اور شاہ عبدالرحیم کی ذہنیت متقارب تھی، کیونکہ ہر دو کا سلسلہ تلمذ جلال الدین دانی تک پہنچتا ہے بنابریں شیخ ابوالطاہر مدنیؒ کی صحبت شاہ ولی اللہؒ کو بہت موافق آئی۔

ہم نے شیخ ابراہیم کردی کے بہت سے رسالے مطالعہ کیے، وہ شریعت اسلامیہ کو ابن عربی کے فلسفہ سے حل کرتے ہیں اور اس باب میں وہ ایک مستقل مفکر امام کا درجہ رکھتے ہیں۔ شیخ ابراہیم کی تاثیر شیخ ابوالطاہر کے ہر قول و فعل میں نمایاں نظر آتی ہے، ہماری سمجھ میں ان دو مختلف طریقوں کا شاہ صاحب کے والد و چچا کا طریق اور دوسرا شیخ ابوالطاہر مدنی اور شیخ ابراہیم کے دوسرے شاگردوں کا طریق جو حرمین میں تھے ایک فکر پر متحد ہونا شاہ صاحب کی ذہنیت کا بنیادی مسئلہ ہے، کوئی عالم خواہ کسی زمانے کا کسی مذہب و ملت کا ہو مگر اس کی تعلیمات شاہ صاحب کے اساسی فلسفہ پر پوری اترتی ہوں وہ سب عالم شاہ صاحب کے یہاں مصیب ہیں، ان کے مختلف اقوال کو جمع کرنا، ان میں تطبیق دینا شاہ صاحب کا علمی کمال ہے۔

(۱) اس کی ایک مثال یہ ہے کہ شیخ اکبر کی وحدت الوجود اور امام ربانی کی وحدت شہود کو شاہ صاحب ایک دوسرے پر منطبق مانتے ہیں تعبیرات کے اختلاف کو کچھ زیادہ وزن نہیں دیتے، اس مسئلہ کو شاہ صاحب نے مکتوب مدنی میں واضح کر دیا ہے شاہ صاحب کی مذکورہ بالا تطبیق کو "ائمہ مجددیہ" کو سخت ناگوار گزری ہے۔ تاہم وہ شاہ صاحب کے کمالات کے انھیں لفظوں میں معترف ہیں جن میں وہ اپنے ائمہ کا کمال بیان کرتے ہیں۔

(۲) ہم شاہ صاحب کے اس مسئلہ کو کہ وہ ائمہ فقہا میں حنفیہ اور شافعیہ کو ایک ہی درجہ پر قبول کرتے ہیں اسی اصول پر حل کرتے ہیں، انھوں نے دیکھا کہ ان کے والد اور چچا حنفی ہیں اور اس فلسفہ (وحدۃ الوجود) کو صحیح طریق سے جانتے اور چلاتے ہیں۔ نیز انھوں نے دیکھا کہ شیخ ابوالطاہر مدنی اور شیخ ابراہیم کردی شافعی المذہب ہیں پھر اس اصل کو اس طرح مانتے ہیں، بنابریں ان کے نزدیک حقیقت شناسی کے نقطہ نظر سے فقہ حنفی اور فقہ شافعی میں کوئی فرق نہیں ہونا چاہیے، شاہ صاحب اپنے ملک میں اپنی سوسائٹی میں، فقہ حنفی کے پابند ہیں، مگر ان کی عقلیت فقہ شافعی کی توہین برداشت نہیں کرتی جیسے عام فقہا کے مشاجرات،

بلاقصد، استخفاف مذکور پر منتج ہوتے ہیں۔

اسی مسئلہ کو ہم ذرا آگے بڑھاتے ہیں، شاہ صاحب فقہ حنفی کو امام ربانی محرر مذہب نعمانی، محمد بن الحسن الشیبانی (متوفی ۱۸۹ھ) کی کتابوں سے اخذ کرتے ہیں اور فقہ امام شافعی (متوفی ۲۰۴ھ) کو براہ راست امام شافعی کی کتابوں سے لیتے ہیں، پھر ان ہر دو اماموں کو امام مالک (متوفی ۱۷۸ھ) کا شاگرد پاتے ہیں، اس پر وہ یہ قاعدہ تجویز کر لیتے ہیں کہ موطا مالک فقہ کی اصل ہے جس سے مالکی، شافعی، حنفی مذاہب پیدا ہوئے پھر آگے بڑھ کر وہ اہل مدینہ کی فقہ کا مرکز حضرت فاروق اعظمؓ کو قرار دیتے ہیں، بنابریں ان مذاہب ثلثہ کو فاروق اعظم کے مذہب کی تشریح مانتے ہیں۔ ازالۃ الخفا میں وہ فاروق اعظم کو مجتہد مستقل اور ان ائمہ ثلثہ کو مجتہد منتسب کے درجے پر تسلیم کرتے ہیں اس سے وہ ائمہ اہل سنت کے مذہب کو قرآن وسنت کی صحیح تشریح قرار دیتے ہیں ہماری سمجھ میں یہ خبر اس رنگ میں جو متقدمین کی کتابوں میں بھی نظر نہیں آئی، شاہ صاحب کی اس مذکورہ بالا عقلی ذہنیت کی صفائی کا نتیجہ ہے۔

فصل (۳) حکمت عملی کے باب میں شاہ ولی اللہ کا امتیاز اور اسکے اسباب

چشتی طریقہ میں حضرت شیخ عبدالعزیز دہلوی البحرالمواج عرف شکر بار، مولف رسالہ عزیزیہ (یہ رسالہ انفاس العارفین میں پورا نقل ہے متوفی ۹۷۵) ایک بہت بڑے عالم، عارف، متشرع بزرگ گزرے ہیں، ان کے والد شیخ حسن بن طاہر (متوفی ۹۰۸ھ) سلطان سکندر لودی کے زمانہ میں دہلی آبسے تھے، شیخ عبدالعزیزؒ کے پوتے شیخ رفیع الدین بن قطب العالم بن عبدالعزیز ہیں، جو خواجہ باقی باللہ کے خواص اصحاب سے تھے، شیخ رفیع الدین شاہ عبدالرحیم کے نانا ہیں، ان سے اسی طریقے پر شاہ عبدالرحیم کو فیض پہنچا، شاہ عبدالرحیم کی پیدائش سے دو سال پیشتر آپ شاہ عبدالرحیم کی خلافت کی سند لکھ کر ان کی والدہ کو دے گئے تھے، یہ جملہ مشہور ہے کہ جس طرح مغلیہ خاندان میں سلطنت کا تسلسل رہا، اسی طرح شیخ عبدالعزیز کی اولاد میں شاہ ولی اللہ تک پھر اُن کی اولاد تک جو سراج الدین بہادر شاہ ثانی (متوفی ۱۲۷۴ھ) کے زمانے تک ہی، علم وعرفان کا تسلسل رہا ہے۔

شاہ عبدالرحیمؒ کے ایک استاد میر محمد زاہد ہروی (متوفی ۱۱۱۱ھ) ہیں، ان کا سلسلہ تلمذ شیخ

محقق جلال الدین دوانی (متوفی ۹۲۸ھ) پر ختم ہوتا ہے۔ سلطان محمد خان فاتح نے جب یورپین اقوام کو اسلام سے آشنا کرنا ضروری سمجھا تو اپنے اہل عصر علما کو شریعت وحکمت کی تطبیق پر متوجہ کیا ان میں سے محقق دوانی ایک نامور استاذ ہیں حکمت علمی میں اکثر افاضل زیادہ توجہ نہیں کرتے تھے مگر شیخ جلال الدین دوانی نے محقق نصیر الدین طوسی متوفی ۶۷۲ھ) کے بعد اخلاق جلالی لکھ کر اس فن کو زندہ کر دیا۔ شاہ عبدالرحیم نے شاہ ولی اللہ کو حکمت عملی سکھانے میں خصوصی توجہ برتی ہے۔ جس کا ذکر ''انفاس العارفین'' اور ''جز لطیف'' میں موجود ہے۔

شاہ عبدالرحیم قدس سرہ کا یہ کارنامہ بھی قابل احترام ہے کہ حکمت عملی سکھانے پر خاص زور دیتے تھے عام متکلمین نے ارسطو کی حکمت نظریہ کو اپنا مطمح نظر بنالیا ہے، وہ حکمت عملی سے سروکار نہیں رکھتے اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ علوم کلامیہ میں دلچسپی سے حصہ لینے والے فقہا اور متکلمین قومی زندگی کی ضروریات میں تدبر اور تفکر سے محروم ہوگئے۔ امام ولی اللہؒ فرماتے ہیں ''حضرت ایشاں با اخلاق سلیمہ مرضیہ از شجاعت وفراست وکفایت وغیرت بوجہ اتم موصوف بودند۔ وعقل معاش مثل عقل معاد کامل ووافر داشتند ودر مجلس صحبت، حکمت عملی وآداب معاملہ بسیاری آموختند۔ بحوالہ کتاب ''تمہید'' فی الانفاس'' ایں فقیر را در مجلس صحبت حکمت عملی وآداب معاملہ بسیارے آموختند۔ اس بنیاد پر شاہ ولی اللہؒ نے عظیم الشان عمارت کھڑی کردی ہے اپنے حالات میں جہاں اور انعامات الہیہ کا ذکر کرتے ہیں یہ بھی لکھتے ہیں۔'' حکمت عملی کہ صلاح ایں دورہ دوراں است بوسعت تمام افادہ فرمودند وتوفیق تشیید آن بہ کتاب وسنت وآثار صحابہ دادند'' (جزء لطیف) اگر شاہ ولی اللہ کے شاہ کار حجۃ اللہ البالغہ پر غور کیا جائے تو اس میں ایک امتیازی وصف یہ بھی نظر آتا ہے کہ وہ مباحث ارتفاقات میں حکمت عملی کا مفصل ذکر کر کے تمام احادیث کو انہیں ابواب پر تقسیم کر دیتے ہیں پھر خاص موقعہ پر حدیث کے ذیل میں حکمت عملی کا کوئی نکتہ ذکر کر دیتے ہیں۔

الغرض شاہ صاحب کی تمام کتابیں عبادات کے چار ابتدائی ارکان کے بعد حکمت عملی کے ابواب پر مرتب ہیں اس کا ایک نتیجہ ہماری سمجھ میں یہ ہے کہ شاہ صاحب نے حسن وقبح (یعنی بر واثم) کے معنی لفظی بحثوں سے مجرد کر کے ہر طالب حق کے لئے انکو مشخص کر دیا ہے۔ ان کی تحقیقات کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی چیز کو اچھا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے نوعی خواص اس میں کاملاً

پائے جاتے ہیں۔ مثلاً اگر ایک گدھے کو ہم اچھا کہیں گے تو مطلب یہ ہوگا کہ حماریت کے لازم اس میں پورے موجود ہیں۔ یہ نہیں کہ وہ مثلاً ایک انسان سے بھی بڑھ کر ہے۔ اسی طرح اگر ہم ایک نبات کو یا ایک جماعت کو اچھا کہیں گے تو اس کے نوعی خواص کے اعتبار سے اس کی قیمت لگائیں گے بنابریں ایک انسان کو اچھا کہنے کا مطلب یہ ہوگا کہ اس میں انسانیت نوعیہ کے خواص کاملاً پائے جاتے ہیں اسی طرح جس قدر ان اوصاف میں تنزل ہوگا اسی قدر اس کی خوبی میں نقص پیدا ہوتا جائے گا، انسانیت کے اوصاف کیا ہیں؟ اس کا جواب ایک ماہر حکمت کے نزدیک یہ ہوگا کہ تمام اقوام اور اصناف میں استقراء تام کے بعد جس قدر اوصاف مشترک پائے جاتے ہیں وہ انسانیت کا مصداق ہیں شاہ صاحبؒ کی حجۃ اللہ پڑھ کر دیکھئے وہ ہر بات میں کسی عمل کی، کسی خلق کی، کسی عقیدہ کی خوبی فقط اس طریقے سے ثابت کریں گے کہ وہ انسانیت کے عام افراد میں یعنی مشرق ومغرب میں اور عرب وعجم میں پایا جاتا ہے، یہ ایسا نفیس جوہر حکمت ہے جس سے عام مصنفین کی کتب خالی ہیں دوسرے علما کی کتابیں پڑھ کر حسن وقبح کی تمیز میں بر اوثم کی حقیقت معین کرنے میں خیالی فلسفہ گھڑنے سے زیادہ کوئی کمال پیدا نہیں ہوگا۔

شاہ صاحب کی اس استقرائی اجتماعیت کے بعد ایک طالب علم اس ورطہ سے یک لخت نکل جاتا ہے، وہ گھر کے نظام کو ایک سلطنت کے طور پر چلانے کی فکر صحیح اپنے اندر رکھتا ہے اسی کو بڑھا کر وہ محلے، مدینے اور مدن میں پھیلا کر دنیا کی سیاست پر حکمراں بن سکتا ہے، اس کے بعد وہ عالم سمجھ سکتا ہے کہ اسلام عالمگیر انقلاب کا مکمل پروگرام ہے جس پر قرآن عظیم حاوی ہے اور وہ اس نقطہ نظر سے اپنی تشریح آپ ہی کسی تکمیل اور تشریح کا محتاج نہیں، یہ شاہ صاحب کے فلسفہ کا بہترین نتیجہ ہے جس نے قرآن کو مسلمانوں کے اذہان کے قریب کر دیا۔

باب دوم (تکمیلی ملکات)

اب ہم شاہ صاحبؒ کے تکمیلی ملکات سے بحث کرتے ہیں۔ تکمیلی ملکات سے ہماری مراد یہ ہے کہ:

(الف) صاف عقلیت سے تمام معلومات کو مرتب کر لینا تا کہ ان میں کسی قسم کا تضاد اور تزاحم باقی نہ رہے۔

(ب) وہبی قوتوں سے سرشار ہونا تا کہ تمام اختلافات کی اصلاح کے لئے جو تدابیر الٰہیہ کام کر رہی ہیں وہ بھی محسوس ہونے لگیں۔ اس وقت وہبی کا استناد، اول اللہ کر قوت عقلی پر ہو، غرض اس پہلے عقلی فیصلہ کی اس قوت وہبی سے تائید ہو رہی ہو۔

(ج) اس کے بعد قرآن حکیم کے حقائق پر عقلی اور وہبی ہر دو قوتوں سے غور کرنا۔ اور اس کے تاریخی انقلابات کو مرتب طور پر سوچنا، سامنے لانا، اور واضح کرنا، پھر اس علم کی ایک تعلیم گاہ بنا کر راسخین فی العلم تیار کرنا جو اپنے زمانہ میں اور آئندہ آنے والے دور میں قرآنی تعلیمات کو ملل اور ادیان کے مقابلہ میں قائم رکھ سکیں۔ یہ نمبر سوم مذکورہ بالا قوتوں (عقلی اور وہبی) کے استعمال کا پہلا میدان ہے، اس کی تفصیل پر مختصراً آئندہ بحث آتی ہے۔

فصل (۱) شاہ ولی اللہؒ اور قرآن فہمی کے باب کی ایک عام غلط فہمی کی اصلاح

فقہاء عظام نے قرآن عظیم کو اپنی ''اصول فقہ'' میں پہلے درجہ پر رکھا ہے، مگر اس سے مراد ان کے یہاں چند آیات احکام ہیں جو اوامر و نواہی کی شکل میں قرآن حکیم میں مدون ہیں، اس

تخصیص کا یہ اثر پیدا ہوا کہ ایک عالم سارا قرآن سمجھنا ضروری نہیں جانتا پھر اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن کی تفسیر واعظوں اور قصہ گو افسانہ طراز لوگوں کے ہاتھ آ گئی اور فقہا کا اس میں دخل نہ رہا۔

ائمہ فقہا نے اپنے اصول میں بالاتفاق یہ مسئلہ درج کیا ہے کہ اگر قرآن شریف میں ایک آیت بلفظ عموم نازل ہوئی ہو اور مفسرین اس کا کوئی خاص واقعہ سبب بتاتے ہوں تو قرآن فہمی میں عموم الفاظ ہی مدنظر رہے گا خصوصیت محل کو اس میں دخل نہیں ہوگا۔

اس قاعدے پر اتفاق ہوتے ہوئے آپ جس تفسیر کو اٹھا کر دیکھیں گے ہر آیت کے ماتحت ایک جزئی واقعہ پائیں گے۔ مثلاً یہ آیت ابوجہل کے حق میں ہے، یہ عبداللہ بن اُبی منافق کے بارے میں نازل ہوئی، یہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی فضیلت میں اُتری، اس میں اہل بیت کے فضائل کا بیان ہے، عام اساتذہ اور طلبہ کو آپ انہیں جزئی چیزوں میں غور کرتا ہوا پائیں گے، شاہ صاحب نے ''الفوز الکبیر'' کی ابتدا میں اس غلطی کو نہایت وضاحت سے بیان کر دیا ہے۔ اور آیات احکام کا مطلب یہ بتلایا کہ اجتماعی طور پر انسان میں جو بداخلاقیاں اور بداعمالیاں موجود ہیں ان کو ان آیات کا سبب نزول سمجھنا چاہیے عرب یا عجم، زمانے کے تقدم یا تاخر سے ان کو کوئی تعلق نہیں۔ الفوز الکبیر میں ہے ''محقق آنست کہ وجود اعمال فاسدہ وجریان مظالم درمیان ایشاں سبب نزول آیات احکام است''۔

اس طریقے پر سوچنے والی ایک جماعت شاہ صاحب کے صحبت یافتہ لوگوں میں پیدا ہو گئی شاہ محمد عاشق پھلتی اور شاہ محمد امین کشمیری ولی اللّٰہی اس گروہ کے سرکردہ ہیں، سراج الہند مولانا شاہ عبدالعزیز (متوفی ۱۲۳۹ھ) نے شاہ ولی اللہ صاحب کے بعد ان سے پڑھ کر تکمیل کی۔

فصل (۲) قرآن میں قصص انبیا کی تکرار کا حل اور مضامین قرآن کی ولی اللّٰہی تقسیم جس کی رعایت سے فہم قرآن کا دروازہ کھل جاتا ہے اور قرآن تک رسائی ہو سکتی ہے۔

قرآن شریف میں انبیا کے قصے مکرر سکرر موجود ہیں، انسان بے ترتیبی سے پڑھتے پڑھتے اکتا جاتا ہے شاہ صاحب نے عامہ کتب الٰہیہ کے لئے تین اصول مقرر کئے ہیں جن کے بعد وہ تمام قصص ایک اعلیٰ روحانیت پیدا کرنے کا ذریعہ بن جائیں گے وہ تین اصول حسب ذیل ہیں۔

(۱) التذکیر بآلاء اللہ (۲) التذکیر بایام اللہ (۳)التذکیر بالموت وما بعدہ آپ نے ان تینوں فنون پر الفوزالکبیر کے مقدمے میں تفصیل سے بحث کی ہے۔قرآن شریف سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ ذکر، یعنی مطلق تذکرے کے لئے نازل ہوا، قال اللہ تعالی شانہٗ"ولقد یسرنا القرآن للذکر فھل من مدکر "تذکیر مذکور کی بحث کو مستقل طور پر کسی نے ہاتھ تک نہیں لگایا، عام واعظ اور قصہ گو لوگ ان آیتوں میں تصرف کرتے رہے اور ان کی بحثیں ایک طرح تلاعب کے درجہ تک جا پہنچیں۔

(۱) واضح رہے کہ مذکورہ بالا تذکیر میں مفسر کو ایک تو علوم طبعیات میں کافی مہارت ہونی چاہئے تا کہ الاء اللہ کی تشریح کر سکے، سطعات میں شاہ صاحب نے تصریح کر دی ہے کہ حکمت طبعیہ کو قرآن عظیم نے الاء اللہ کی تذکیر میں استعمال کیا ہے۔

(۲) تذکیر بایام اللہ کو فقط ایک مورخ اور فلسفہ تاریخ کا حاذق و ماہر ہی حل کر سکتا ہے کہ ایک قوم کس طرح بڑھی تھی، پھر کس طرح گری۔(۳) انسانی زندگی موت پر ختم نہیں ہوتی اس پر حنفی ادیان میں یہودی، نصرانی، مسلم سب متفق ہیں اور صابی ادیان میں سے سناتنی، بدھسٹ اور مجوس جو تناسخ کے قائل ہیں، وہ بھی موت پر زندگی کو ختم نہیں کرتے آزاد طبع عقلمندوں کی جماعت میں سے بھی بہت بڑا حصہ، انسانی زندگی کو موت پر ختم نہیں کرتا البتہ ادنی طبع کے چند بوالہوس شور مچاتے رہتے ہیں ان سے عوام متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے، اس غفلت سے انسان کو نکالنا اور اس کی زندگی کا مفہوم اسے سمجھانا، اس کے ثمرات جو اس دنیا میں پیدا ہوتے ہیں یا وہ ثمرات جو موت کے بعد پیدا ہونگے ان کو ذہن نشین کرانا قرآن عظیم کے مقاصد میں اہم چیز ہے۔

اس مسئلہ کو (تذکیر بالموت و مابعدہ کو) الٰہیات کا ایک بہت بڑا فاضل ہی سمجھا پڑھا سکتا ہے جسے عقلی الٰہیات کے ماسوا مختلف ادیان کے نظریات مابعدالموت پر پورا پورا عبور حاصل ہو۔

عقدہ لا ینحل اور (مسئلہ حقیقت روح)

یہاں ایک پیچیدگی غلط تفسیر سے پیدا ہوئی جس نے مسلم مفکرین کے اذہان کو جامد بنا رکھا

ہے، مابعد الموت کے مسئلہ پر غور کرنے سے پیشتر انسانی روح کو سمجھنا از حد ضروری ہے۔ عامہ مفسرین نے روح کے علم کو متشابہات میں داخل کر رکھا ہے، کوئی مفکر اس کے قریب نہیں جا سکتا، اس لئے تمام مسائل مابعد الموت تحت اللفظ ترجمہ پڑھنے سے زیادہ قابل غور نہیں سمجھے جاتے یہاں تک کہ عقائد کی کتابوں میں توحید اور نبوت کا مسئلہ تو عقلی مانا جاتا ہے اور عذاب القبر سے لیکر آگے کی تمام بحثیں نقلی سمجھی جاتی ہیں۔ عذاب القبر کو صرف اسلئے مانا جاتا ہے کہ حدیث شریف میں اس کا ذکر موجود ہے۔

شاہ صاحب نے اپنی تالیفات میں مسلمانوں کو اس غلطی سے بچالیا ہے، مابعد الموت جو زندگی قرآن ثابت کرتا ہے ان کے یہاں مسلسل عقلی نتائج کا مجمل بیان ہے، عقل صریح کی پوری تائید کے بغیر کوئی چیز قرآن منوانے کی خواہش نہیں رکھتا۔

اس ہمارے دور میں جب سے ہندوستان سے اسلامی حکومت چلی گئی ہے شاہ صاحب کے ان افادات پر توجہ نہ کرنا مسلمانوں کی سب سے بڑی بدقسمتی ہے۔

فصل (۳) شاہ صاحب کی تقسیم کے مطابق قرآن کا ایک اہم مضمون "مخاصمۃ" اور عام علما کی اس نکتہ سے بے اعتنائی

شاہ صاحب نے قرآن کے اصول میں سے پانچویں اصل مخاصمہ قرار دیا ہے جو یہود ونصاری، مشرکین اور منافقین کے ساتھ جاری ہے اس کی پوری تفصیل "الفوز الکبیر" کے مقدمہ میں ملے گی۔ ہماری سمجھ میں شاہ صاحب کے مباحث (درباره مخاصمہ) کا خلاصہ یہ ہے کہ علم اخلاق جو احکام شرعیہ کے ضمن میں ملحوظ ہے۔ اس کی تعلیم دو طرح دینی چاہئے اول بطریق اوامر ونواہی دوم ان اخلاق حمیدہ کے تارکین کی زندگی میں جو معائب پیدا ہوتی ہیں ان کی تفصیل بتائی جائے۔

ایک جماعت جو اپنے آپ کو احکام الٰہیہ کا پابند مان لیتی ہے پھر اس ملت کے متبعین کے لئے مرکز کا کام دیتی ہے اس جماعت کی خرابی سے ساری ملت برباد ہو جاتی ہے، ان کی مثالیں یہود ونصاری سے مخاصمہ کر کے واضح کر دی گئیں۔

ایک ایسی جماعت جو عقلی اصول پر اپنی ترقی تجویز کر لیتی ہے وہ اپنے مسلمہ اخلاق کی

پابندی کو ترک کر کے کس طرح برباد ہوتی ہے، اس کی توضیح مشرکین کے مناظرے میں آئے گی۔

ایک شخص جو اپنے آپ کو کسی مذہب کا پابند سمجھتا ہے پھر تساہل اور تہاون سے ان احکام کے مقصد کو پورا نہیں کرتا۔ اس کی غلطیاں منافقین کے مناظرے سے واضح ہونگی۔

شاہ صاحبؒ کی اس توضیح کے بعد مخاصمہ قرآن حکیم کے مقاصد میں نہایت اہم درجہ رکھتا ہے۔ فقیہ اس کو بے التفاتی سے پڑھ کر گزر جاتا ہے۔

ہمارے خیال میں بہت کم مفسرین ایسے ہونگے جو اس مقصد پر متوجہ ہوتے ہوں جن لوگوں نے یہ خیال بنایا تھا کہ فقیہ بننے کیلئے قرآن کریم کے فقط اوامر ونواہی کافی ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ وہ قرآن کو مس تک نہیں کر سکے۔

جب مسلمانوں کی مرکزی جماعت کا قرآن عظیم کے متعلق یہ خیال ہوا تو عوام بیچارے اس بارہ میں کہاں تک قابل ملامت قرار دیئے جاسکتے ہیں۔

شاہ صاحبؒ نے قرآن کے مضامین کو مذکورہ بالا پانچ ابواب میں تقسیم کر کے دنیائے اسلام پر رحمت کا دروازہ کھول دیا ہے، یہاں اگر ان کی کسبی عقلی اور وہبی اشراقی قوتیں کام نہ کرتیں تو ہمارے خیال میں قرآن کو اس طرح واضح کرنا ناممکن تھا۔

ہم نے امام فخر الدین رازی (محمد بن عمر متوفی ۶۰۶ھ) کی تفسیر پڑھی۔ نیز جاراللہ زمخشری (محمود بن عمر متوفی ۵۳۸ھ) کی تفسیر کا مطالعہ کیا، ان کے علاوہ معالم التنزیل از (ابو محمد حسین بن مسعود فرا) بغوی (متوفی ۵۱۰ھ) اور تفسیر حافظ (عماد الدین ابوالفدا اسماعیل بن عمر المعروف بہ ابن کثیر (متوفی ۷۷۴ھ) بھی پڑھی، ان سے ہمیں اپنی استطاعت کے مطابق سوائے تحیر کے کچھ نصیب نہیں ہوا، اگر طالب علمی کے عہد میں ہم نے نجم الائمہ حضرت شیخ الہند قدس سرہ (متوفی ۱۳۳۹ھ) سے چند آیتوں کی تفسیر نہ سنی ہوتی جو کتابوں میں نہیں ملتی اور ہمارے لئے وہ اطمینان کا ذریعہ بن سکی اور اس کے ساتھ ہی شیخ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی (متوفی ۱۲۹۷ھ) کے بعض تفسیری جملے ہم نے نہ پڑھے ہوتے تو ہم علم تفسیر کے حاصل کرنے سے قطعاً مایوس ہو جاتے، ہم مانتے ہیں کہ پہلے زمانہ میں مسلمانوں نے انھی کتابوں سے قرآن سمجھا تھا جب وہ قرآن کی حکومت

مجتہدانہ اصول پر قائم کر رہے تھے، مگر اس قسم کی تفسیروں سے قرآن فہمی ہمارے لئے ناممکن ہے۔

ہم نے مولانا شیخ الہند قدس سرہ سے اصول تفسیر پر کتابیں مانگیں، آپ نے کتاب الاتقان فی علوم القرآن'' از حافظ جلال الدین (عبدالرحمٰن بن ابی بکر سیوطی متوفی ۹۱۱ھ) ہمیں مرحمت فرمائی، میں نے پوری کوشش سے ساری کتاب بارہا پڑھی، سوائے چند اوراق کے مجھے اس میں کوئی چیز دلچسپ نظر نہ آئی جسے اصول کا درجہ دیا جا سکے یہ زمانہ ایسا تھا کہ میں اصول فقہ سے فارغ ہو کر اس میں ایک مستقل تصنیف لکھ چکا تھا، اسی زمانہ میں حضرت مولانا نے یہ بھی فرمایا تھا کہ ایک مختصر سا رسالہ اصول تفسیر میں شاہ ولی اللہ صاحب نے بھی لکھا ہے جس کا نام ''الفوز الکبیر'' ہے۔

یہاں میں خیال کرتا ہوں کہ حضرت مولانا قدس سرہ کی عادت مبارکہ کا ضمناً ذکر کروں، آپ جانتے تھے کہ امام فخر الدین رازی اور علامہ (مسعود بن عمر التوفی ۷۹۱ھ) تفتازانی کو عموماً طلبہ میں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے ان نامور حضرات کے مقابلہ میں طلبہ شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز کی بات سننے کے لئے بھی تیار نہیں نجم الائمہ شیخ الہند اگر کسی مسئلے میں امام رازی یا علامہ تفتازانی کی تغلیط کرتے تو مبہم طور پر یہ فرماتے کہ محققین کی رائے اس مسئلہ میں یوں ہے طلبہ سمجھتے کہ یہ محققین ان حضرات سے بھی کوئی متقدم ہستیاں ہوں گی، میں ایک لمبے عرصے کے بعد متفطن ہوا کہ محققین سے مراد حضرت شیخ الاسلام مولانا محمد قاسم اور ان کے اساتذہ کرام اور مشائخ عظام ہیں جو شاہ ولی اللہ صاحبؒ پر ختم ہو جاتے ہیں۔

یہ باعث تھا کہ آپ نے ''الفوز الکبیر'' مجھے شروع میں عطا نہ کی، بلکہ فقط اس کا تذکرہ کر دیا جب میں سندھ پہنچا تو مجھے ''الفوز الکبیر'' کا نسخہ ملا، اس سے پیشتر میں امام رازی کی تفسیر کا مطالعہ کر کے کافی پریشان ہو چکا تھا فصل اول کا مطالعہ ختم کر لینے کے بعد میں مطمئن ہو گیا کہ انشاء اللہ علم تفسیر مجھے آ سکتا ہے پھر اس دن سے آج تک میں ان کے مسلک سے باہر جانے کی ضرورت محسوس نہیں کر سکا۔

فصل (۴) متن قرآن سے شاہ ولی اللہ کا اعتنا اور اس کی برکات، آپ کا ترجمہ قرآن "فتح الرحمان" اور اس کی خصوصیات

قرآن شریف کو عامہ مسلمین کے اذہان کے قریب لانا ضروری تھا مسلمانوں کی ذہنی سطح استوار کرنے کے لئے سب سے پہلے شاہ عبدالرحیم نے یہ بہترین راستہ اختیار کیا کہ متن قرآن عظیم تحقیق وتفہیم سے پڑھانے لگے اس سے پہلے علما کا یہ دستور تھا کہ قرآن شریف فقط تلاوت کرنے کے لئے پڑھاتے اور مطالب سکھانے کے لئے جس فن سے انہیں دلچسپی ہوئی اس قسم کی ایک تفسیر طالب علم کو پڑھا دیتے جس سے قرآن شریف گویا اس فن کی ایک اعلی کتاب بن جاتی اور جو اخلاقی ذہنیت استاد کی طبیعت میں مرکوز ہوتی تفسیر پڑھنے سے اور راسخ ہو جاتی۔

شاہ ولی اللہ قدس سرہ لکھتے ہیں "غالباً در حلقہ یاران بیروں از تلاوت ہر روز دو سہ رکوع بہ تدبر و بیان معانی می خواندہ انفاس ص ۸۶ دوسرے موقع پر تحریر کیا ہے "از جملہ منن عظمی بریں ضعیف آن بود کہ چند بار در مدارست قرآن عظیم یا تدبر و شان نزول و رجوع بہ تفاسیر بہ خدمت ایشاں حاضر شدم و ایں معنی سبب فتح عظیم افتادہ، جز لطیف

اس کا اثر یہ ہوا کہ شاہ ولی اللہ صاحب نے متن قرآن کی حقیقت اپنے اشراق سے اس طرح معین کر لی کہ یہ کتاب بذات خود ایک کامل مکمل نصاب ہے اس پر اضافہ کی کوئی ضرورت نہیں، ہندوستانی مسلمانوں کی شاہی زبان فارسی تھی۔ ۱۱۵۰ھ میں آپ نے اس کتاب مجید کا فارسی میں "فتح الرحمٰن" کے نام سے ترجمہ کیا، جو ۱۱۵۱ھ میں ختم ہوا اور ۱۱۵۶ھ میں "فتح الرحمٰن" کی تدریس کا افتتاح ہوا، آپ نے ترجمہ کے ساتھ مختصر طور پر تشریحی فوائد بھی لکھے جن کی اہمیت میں یورپ جا کر سمجھ سکا ہوں۔

(الف) مثال کے طور پر "کتب علیکم القصاص فی القتلیٰ" کی تفسیر ملاحظہ ہو، قصاص کا ترجمہ مساوات اور مماثلت، غالباً آپ کو کسی تفسیر میں نہیں ملے گا۔ انسانی مساوات کو یہاں مبنائے حیات قرار دیا گیا ہے کما قال تعالیٰ شانہ "و لکم فی القصاص حیاۃ یا اولی الالباب لعلکم تتقون" پھر انسانی سوسائٹی کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے (الف) خود اپنی

قوم (ب) اور اجنبی، اجنبی کو "العبد بالعبد" سے تعبیر کیا گیا ہے اور اپنی قوم کو (ج) الذکر والانثی میں تقسیم کر دیا ہے، اس بنیادی چیز پر جہاں تک میری نظر کام کر سکی ہے کسی حکیم نے تنبیہ نہیں کی، ہمارے دور میں جبکہ ہم یورپ سے اشتراک عمل کرنے پر مجبور ہیں اور یورپین نظریات کو ہم بڑی عزت وعظمت سے لیتے ہیں اور اس کے مقابلہ میں انسانی سوسائٹی کو تحلیل کرنے والے حکما مسلمانوں میں کم نظر آتے ہیں تو نوجوان مسلمان کے دماغ پر اس کا اچھا اثر نہیں پڑتا، وہ یہاں پہنچ کر اپنی خودی گم کرنے لگتا ہے، اگر اساسی چیز اس کو قرآن حکیم میں سمجھا دی جائے تو وہ تفصیلات ہر اچھے عالم سے لے سکتا ہے اور اس کی اسلامیت کو کوئی صدمہ نہیں پہنچ سکتا۔

(ب) سورہ رعد کی آخری آیتوں اولم یروا انا ناتی الارض ننقصها من اطرافها واللہ یحکم لا معقب لحکمه وھو سریع الحساب الخ پر شاہ صاحب کا حاشیہ پڑھیے، اس سے مکہ معظمہ ہی میں "اسلامی حکومت" کی تاسیس آپ کو سمجھ آنے لگے گی اور اس سے بہت سے پیچیدہ مسائل کو حل کرنے میں آپ کو سہولت ہوگی، پارٹی پالیٹکس کی بنیاد اس بیان میں روشن نظر آتی ہے جس کی تفصیل "فیوض الحرمین" میں زیادہ موجود ہے وہاں آپ نے سلطنت کو خلافت ظاہرہ سے تعبیر کیا ہے اور سلطنت پیدا کرنے والی پارٹی کو آپ خلافت باطنہ کا نام دیتے ہیں۔ قرآن کی حکومت پیدا کرنے والی پارٹی ہی کا نام حزب اللہ ہے اس طرح سیاسی مسائل پر غور کرنے کی توجہ، شاہ صاحب کی کتابیں پڑھنے سے پیدا ہوتی ہے اس کے بعد یورپ کی موجودہ ترقی ہمارے لئے کوئی نئی چیز نہیں رہتی البتہ ہم اپنے چند غفلت شعار بادشاہوں اور امیروں کی سستی کا برا نتیجہ بھگت رہے ہیں۔ ہمارا مذہب اگر قرآنی قانون سے ماخوذ ہے تو ہم دنیا کے مقابلے میں پسپا نہیں ہو سکتے اگر بادشاہوں کی شکست کے بعد ان کی باقی ماندہ میراث کو ہم اسلام سمجھیں تو میری رائے یہ ہے کہ اس اسلام کی پوری شکست مان لینی چاہیے، تاکہ نئی نسل کو نئے سرے سے کام کرنے کی ہمت پیدا ہو، غلط اصولوں کی تصحیح میں ان کے دماغوں کو الجھانا نہیں چاہیے۔

قرآن عظیم کا مذکورہ بالا ترجمہ میرے نزدیک ایک ہندوستانی کے لئے تمام تفاسیر سے بہتر کتاب ہے، اس کے از بر کر لینے کے بعد دوسری تفاسیر پڑھنی چاہئیں۔ تب کہیں ان سے استفادہ

کیا جا سکتا ہے اگر یہ ترجمہ ایک استاد سے پڑھنے کے بعد ذہن میں راسخ نہیں ہوا تو میرے خیال میں ایک عجمی موجودہ تفاسیر سے کوئی معتد بہ فائدہ نہیں اٹھا سکتا خواہ وہ تفاسیر نقلی ہوں یا عقلی یا ادبی۔

فصل (۵) آیات متشابہات کے متعلق شاہ صاحب کا مسلک

قرآن حکیم نے آیات قرآنی کی تقسیم محکمات اور متشابہات میں کر دی ہے عموماً اہل علم متشابہات میں بحث کرنا ناممکن سمجھتے ہیں، پھر متشابہات کی ایسی واضح تعریف وتفسیر جس سے تمام ایسی آیتیں تحقیقی اور تحدیدی طور سے جدا کر لی جا سکیں کوئی متفق علیہ موجود نہیں ہے اس کا اثر یہ ہوا کہ ایک تو قرآن بتمامہ ناقابل فہم ہو گیا، اور متشابہات میں غور نہ کرنا ایک اصول اور عقیدہ مقرر ہو گیا، ایک کتاب کی نسبت جب یہ عقیدہ بن جائے کہ اس کے بعض حصے (جس کا پورا تعین بھی نہیں) فہم سے بالاتر ہیں تو انسانی متوسط عقول کے لئے ساری کتاب مشتبہ بن جاتی ہے طبیعت میں خدشات اور اوہام اٹھتے ہیں کہ فلاں فلاں آیات کا جو مفہوم ہم نے متعین کیا ممکن ہے کہ اس کی نقیض ان آیات میں موجود ہو جن کو ہم نہیں سمجھ سکتے، اس غلط فکر نے عمل کے لئے قرآن کی طرف سے مسلمانوں کے التفات کو یکسر ہٹا دیا۔

شاہ صاحب کے علوم میں یہ خاص قوت ہے کہ وہ متشابہات کے معانی راسخین فی العلم کے لئے تحقیقی راہ سے سمجھا سکتے ہیں۔ ان علوم کو ہم تکمیلی علوم میں شامل جانتے ہیں، بیشک ہر طالب علم اس درجہ پر نہیں پہنچ سکتا لیکن اگر وہ اپنی جدوجہد مسلسل جاری رکھے تو رسوخ فی العلم کا مرتبہ حاصل کر لینا اس کے لئے ناممکن نہیں ہے۔

اس یقین کو پیدا کرنے کے بعد قرآن کریم کے عالموں کی ایک مستقل سوسائٹی پیدا ہونا لازم ہے جس میں استاذ کامل ومکمل اور اہل علم اول اور دوم درجہ کے شامل ہوں، یہ قرآن کی تعلیمات کو دنیا میں کامیاب بنانے کے لئے مرکزی قوت ہوگی۔

مکہ معظمہ میں رہتے ہوئے ہمیں زیادہ تر واسطہ ان اہل علم سے پڑتا رہا جو شیخ الاسلام (حافظ تقی الدین احمد بن عبدالحلیم عرف) ابن تیمیہ (متوفی ۷۲۸ھ) کی امامت کے قائل ہیں، ظاہر یہ حنابلہ اور شافعیہ محدثین کی طرف ان کا علمی میلان ہے، وہ اسی وہم میں مبتلا تھے، کہ

متشابہات میں بحث کرنا فتنے کا دروازہ کھولنا ہے اور متشابہات کا علم یقینی طور پر حاصل کرنا کسی عالم کے لئے ممکن نہیں، اس طرح وہ ہماری تعلیم پر ایک پابندی عائد کرنا چاہتے تھے تاکہ ہم شاہ ولی اللہ کی تعلیمات کو کھلے طور پر طلبہ کے سامنے پیش نہ کرسکیں، کیونکہ شاہ صاحب متشابہات میں بحث کرتے ہیں، اور یہ ان کے اصول کے خلاف ہے۔

ہمیں اس سے تھوڑے دنوں پریشانی رہی اور ہم نرمی سے عقلی طور پر ان کو سمجھاتے رہے اتفاقاً ہمیں حافظ ابن تیمیہ کی تفسیر قل ہو اللہ احد مطبوعہ مصر ہاتھ آئی جو ہمارے لئے ایک حیرت کا سبب بن گئی، ابن تیمیہؒ نہایت شدت سے اس فکر کی تردید کرتے ہیں کہ متشابہات کا علم خدا تعالیٰ کے سوا کسی کو حاصل نہیں اور یہ نتیجہ ہے اس مشہور قاعدہ کا کہ ''**وما یعلم تاویله الا الله**'' پر وقف لازم مانا جاتا ہے ''**والراسخون فی العلم**'' کو اس سے منقطع کردیا جاتا ہے ابن تیمیہ پوچھتے ہیں کہ آیات متشابہات کا علم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تھا یا نہیں اور اس سے اوپر جبرئیل بھی جانتے تھے یا نہیں اگر جواب نفی میں ہے تو ان آیتوں کے نازل کرنے کا کیا مطلب تھا۔

ہم نے یہ نقل ان اہل علم کو دکھلانا شروع کی اس پر وہ حیران رہ گئے بعدازاں وہ خود ابن تیمیہ کی دوسری کتابوں سے اس کی تائیدات تلاش کر کے ہمیں آ کر سنانے لگے۔

میرا اپنا اس معاملے میں یہ حال ہے کہ جب سے میں نے ''مسلم الثبوت'' کی شرح از مولانا بحر العلوم (متوفی ۱۲۲۵ھ) پڑھی اور یہ ۱۳۰۷ھ کا واقعہ ہے، تو اس زمانہ سے میں اس پر مطمئن تھا کہ بحث اور مناظرہ سے تو متشابہات کا مطلب حاصل نہیں ہوسکتا مگر وہبی طریقہ سے اللہ تعالیٰ کاملین امت مرحومہ کو یہ علم عطا کرتا رہتا ہے اس کے بعد کافی زمانہ گزرنے پر خواجہ محمد معصوم سہرندی العروہ الوثقی (متوفی ۱۰۷۰ھ) کے مکتوبات میں میں نے پڑھا کہ حضرت امام ربانی وہبی طریقہ سے متشابہات کی تاویل پر قادر ہونے کو صحیح مانتے ہیں اور مقطعات کی تفسیر سمجھانے میں انھوں نے بڑی احتیاط برتی کہ اس مجلس میں سوائے خواجہ معصوم کے کوئی دوسرا حاضر نہ ہو۔

یہ میرے اساسی خیالات تھے شاہ ولی اللہ کی حکمت نے اس فکر کی تکمیل کردی، اس کے بعد قرآنی مفاہیم کو میں اطمینانی شکل میں سمجھ سکا، میرے خیال میں شاہ صاحبؒ کا اس فن کو تعلیم و تلقین

کے ذریعہ اپنی خاص جماعت میں عام کر دینا اس دوسرے ہزارہ میں ایک بہت بڑی نعمت ہے شاہ صاحب کے اتباع میں مولانا محمد اسماعیل شہید، (متوفی ۱۲۴۶ھ) پھر مولانا محمد قاسم اس حصے میں ایک استقلالی شان رکھتے ہیں یعنی اپنے اپنے زمانے کی اصطلاحات کے مطابق اہل علم کو مطمئن کر سکتے ہیں۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جو شخص تقدیر کے مسئلہ کو حجۃ اللہ البالغہ کے اصول پر حل نہیں کر سکتا وہ حکمت ولی اللہیہ سے کیا فائدہ اٹھا سکتا ہے، تقدیر کا مسئلہ بیان کرنے میں مولانا محمد قاسم کی بھی وہی شان ہے جو شاہ صاحبؒ کی ہے مگر شاہ صاحب اپنے متبعین کو سمجھاتے ہیں اور مولانا ایک عیسائی، ایک آریہ سماجی کو بھی سمجھا سکتے ہیں۔

جو لوگ ان اصطلاحات کے پابند ہیں جن سے ان مسائل پر غور کرنا کسی راسخ فی العلم کے لئے بھی جائز نہیں ہو سکتا (اور ان ہی سے مدارس اور مکاتب بھرے پڑے ہیں) میں نہیں سمجھ سکتا کہ وہ اس زمانہ میں اسلام کیلئے کس قدر مفید ہو سکتے ہیں۔

یہ میری تربیت کا اثر لازم ہے کہ میں اس قسم کے غوامض میں خود رائی پسند نہیں کرتا مگر کسی راسخ فی العلم جماعت سے تعلق بھی پیدا نہ کرنا اور ان مسائل کے متعلق ہر وقت پریشان دماغی میں مبتلا رہنا طالب علم کی شان سے دور جانتا ہوں۔

فصل (۶) رسوخ فی العلم کی تشریح

"رسوخ فی العلم" کا مطلب یہ ہے کہ ایسے عالم کے معلومات میں کہیں تناقض نہیں ملتا جو چیزیں بظاہر متعارض ہیں وہ ایک قاعدے کے اندر اس کی نظر میں جمع ہو جاتی ہیں شاہ ولی اللہ نے مکتوب مدنی کے شروع میں لکھا ہے کہ ہمارے دور کے علوم خاصہ میں سے چوٹی کا علم تطبیق آرا ہے، اسی کلیہ کے ماتحت وہ وحدت شہود اور وحدت وجود کی تطبیق اسی رسالہ میں بیان کرتے ہیں۔

شاہ رفیع الدین صاحبؒ (متوفی ۱۲۴۹ھ) نے تکمیل الاذہان میں تطبیق الآراء کو ایک مستقل فن بنادیا ہے مولانا محمد اسمٰعیل شہید "عبقات" میں وجودیہ ورائیہ اور شہودیہ ظلیہ میں تطبیق کی سعی کرتے ہیں مولانا محمد قاسم "قاسم العلوم" میں "راسخین فی العلم" کے مابین اختلاف تسلیم ہی

نہیں کرتے وہ لکھتے ہیں کہ جیسے دو سلیم الحواس ایک چیز کے دیکھنے سننے میں مختلف نہیں ہو سکتے اسی طرح دو راسخ فی العلم کسی عقلی، وجدانی مسئلے میں بھی کبھی مختلف نہیں ہو سکتے جو اختلاف بظاہر نظر آتا ہے وہ فقط صوری ہوتا ہے۔

ان مقالات پر غور سے تامل کرنے کے بعد راسخ فی العلم کے معنے محقق ہو جاتے ہیں ہم شاہ صاحب کو راسخین فی العلم کا امام مانتے ہیں۔

مثال کے طور پر شاہ صاحبؒ کی تحقیقات کا ایک نازک مسئلہ یہاں ذکر کر دیتے ہیں، حضرت شیخ اکبر جو وحدت وجود کے مسئلے کے مسلم امام ہیں، ان کے کلام میں دو مختلف نظریئے ملتے ہیں، ان کی تفصیل مولانا اسمٰعیل شہید کی زبان میں عینیہ اور ورائیہ ہے۔ یہ اصطلاح ''اخبار الاخیار'' میں بھی ملتی ہے اور'' **نفحات الانس** ''میں بھی موجود ہے، اہل علم کوئی قطعی فیصلہ نہیں کر سکتے کہ ان مختلف عبارات کا مرجع ومحمل کیا ہے جن میں ہر چیز کو وجود کا عین (بالفاظ دیگر واجب الوجود کا عین) کہا جاتا ہے اور پھر وہی عالم (شیخ اکبر) دوسرے موقع پر واجب الوجود اور ممکن الوجود میں فرق کرنے بیٹھ جاتا ہے پھر اس کے بعد تنزل وجود کا اصول تحقیق سے پیش کرتا ہے۔

اب شاہ صاحب کی تحقیق یہ ہے کہ عینیت، نفس کلیہ پر ختم ہو جاتی ہے اس تمام تر کائنات کا ایک نفس ہے جیسے ایک شخص کا ایک نفس ہے، اس حقیقت پر ابن عربی کے یہاں بھی پوری بحث موجود ہے اور حکما کے ہاں بھی شاہ صاحب نفس کلیہ اور اس کے ماتحت تمام کائنات کو من وجہ ایک دوسرے کا حقیقتاً عین مانتے ہیں، جیسے زید وعمر اور انسان من وجہ عین ہیں، شاہ صاحب نفس کلیہ کو جنس الاجناس قرار دیتے ہیں، ان کے نزدیک جوہر اور عرض دونوں جنسیں نفس کلیہ کے ماتحت آتی ہیں، عام حکما یونان کا جوہر وعرض سے اوپر جنس مشترک عالی کا نہ ماننا ان کی قصور نظر پر محمول ہے۔

نفس کلیہ کا بطریق ابداع ذات حق سے صادر ہونا، ذات حق کو ''وراء الوراء'' ثابت کر دیتا ہے نسبت ابداعیہ میں مبدع اور مبدع کے مابین ایک طرح کی وحدت کہی جا سکتی ہے۔ مگر وہ وحدت حقیقی نہیں ہوتی، انسانی عقل وہاں جا کر تھک جاتی ہے، درجہ ابداع پر پہنچ کر عقل کسی امتیاز کو قائم کرنے پر قادر نہیں ہوتی، اس لئے مجازاً وحدت (بین المبدع والمبدع) کا اطلاق کر لیا جاتا ہے۔

اب مسئلہ صاف ہو گیا نفس کلیہ تک کائنات کی عینیت حقیقیہ ہے، اسی لئے صوفیہ بحر اور موج کی مثال دیتے ہیں اس سے اوپر ایک معلوم الانیة مجهول الكيفية نسبت ہے جسے ابداع سے تعبیر کرتے ہیں، عقل کے احاطے سے خارج ہونے کے باعث اس میں ہر قسم کے مشتبہ الفاظ مجازاً استعمال کئے جا سکتے ہیں اس قسم کا فیصلہ دینا، اور اس کو محقق طور پر سلیم عقول کے دماغ تک پہنچانا اور تمام متعارض اقوال کی توجیہ پر قادر ہونا ایک راسخ فی العلم امام ہی کی شان ہے۔

فصل (۷) مسئلہ نسخ فی القرآن اور شاہ صاحبؒ

قرآن عظیم میں فکری انتشار کا ایک اور باعث مسئلہ ناسخ و منسوخ کی بحث بھی ہے، اہل علم منسوخ آیات کو متفقہ طور پر محدود و محصور نہیں کرتے، یعنی ایسی آیات کی تحدید میں وہ خواہ باہم مختلف ہیں اس کا اثر قرآن شریف پڑھنے والے پر یہ پڑتا ہے کہ وہ ہر عملی معاملے (حکم) میں اس کے منسوخ ہونے کا شبہ پیدا کر کے اپنے آپ کو فارغ الذمہ بنا لیتا ہے۔

شاہ صاحب کے رسوخ فی العلم کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ آپ نے نسخ فی القرآن کے مسئلہ کو اطمینان بخش طریقہ سے حل کر دیا۔ "الفوز الکبیر" میں اس کی مفصل بحث موجود ہے، شاہ صاحب نسخ کا لغوی ترجمہ متقدمین کی اصطلاح کو مانتے ہیں، متقدمین جب کسی آیت کو منسوخ کہیں گے تو اس سے اُن کی مراد کوئی خاص اصطلاحی معنی نہیں ہونگے، بلکہ لغوی مفہوم جو عام طور پر سمجھا جاتا ہے وہی ان کی مراد ہوتا ہے، اگر کوئی مضمون ایک دفعہ مطلق یا مجمل بیان کر دیا جائے اور دوسرے موقع پر مطلق کی قیود واضح کر دی جائیں یا اجمال کو تفصیل سے بدل دیا جائے تو لغوی طور پر دونوں جگہ کہا جائے گا کہ دوسرے مضمون نے پہلے کو منسوخ کر دیا۔

اس اعتبار سے بے شک قرآن کی آیات میں کثرت سے نسخ موجود ہے کی سورتوں میں عموماً اصول اور کلیات محقق کئے جاتے ہیں، اور مدنی سورتوں میں ان کی تشریح اور تفصیل آتی ہے۔ ایک قوم کو تدریجی ترقی دینے والا کوئی استاذ اس طریق بیان سے بچ نہیں سکتا، اس تبدیلی کو جو قطعاً طبعی ہے معیوب نہیں سمجھا جا سکتا اور نہ اس سے شکوک پیدا ہوتے ہیں۔ پھر متقدمین کے بعد متاخرین آتے ہیں۔ وہ نسخ کا ایک خاص مطلب معین کر لیتے ہیں۔ ان کے نزدیک جیسے تورات کے تفصیلی

احکام پر عمل کرنا قرآن کے تفصیلی اوامر کے بعد ممنوع ہے، اسی طرح قرآن میں بعض ایسی آیتیں موجود ہیں جن پر عمل کرنا مطلقاً جائز نہیں۔

یہ اصطلاح فقہا کے باہمی اختلاف اور تضارب کے بعد پیدا ہوئی، شاہ صاحب اس اصطلاح پر قرآن میں منسوخ نہیں مانتے۔ لیکن واضح رہے کہ شاہ صاحبؒ کا بیان اس فصل میں حکیمانہ ہے قوم کی عام حالت کو مدنظر رکھ کر انھوں نے اس مسئلہ کو تدریجاً سمجھانے کی سعی کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ پہلے اہل علم پانچ سو آیتیں منسوخ مانتے رہے، لیکن شیخ جلال الدین سیوطی اتقان میں بیس سے زیادہ آیتیں منسوخ تسلیم نہیں کرتے اس بارے میں سیوطی کا مقتدا اور شیخ قاضی ابوبکر (محمد بن عبداللہ المعروف بہ) ابن العربی مالکی (متوفی ۵۴۳ھ) ہے، شاہ صاحب مذکورہ بالا بیس آیتوں میں بھی تطبیق دے کر نسخ کو پانچ آیتوں میں منحصر کر دیتے ہیں، اس کے بعد ہماری رائے یہ ہے کہ جس شخص نے ان پندرہ آیتوں کی تطبیق غور سے پڑھی وہ باقی ماندہ پانچ آیتوں میں بھی بآسانی تطبیق دے سکتا ہے، شاہ صاحب صراحۃً یہ نہیں کہتے کہ قرآن شریف میں کوئی آیت منسوخ نہیں اور وہ اس طرح صراحۃً لکھتے تو بعض معتزلہ کے قول سے تشابہ ہو جاتا اور عامہ اہل علم اس پر غور کرنا ہی چھوڑ دیتے۔

اب صورت حال یہ ہے کہ مشکل آیتوں کو تو انھوں نے حل کر دیا اور نہایت آسان آیات میں نسخ مان لیا اگر اسلوب حکیم پر ان کے بیان کو حمل کیا جائے تو ہمارا مذکورہ بالا نتیجہ اخذ کرنا بعید نہیں ہوگا۔

ان پانچ آیات میں جو سب سے مشکل ہے ہم اس کو یہاں مثالاً بیان کر دیتے ہیں قال الامام ولی اللہ، کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت الآیة قلت منسوخة بآیة یوصیکم اللہ فی اولادکم وحدیث لا وصیة لوارث مبین للنسخ. الفوز الکبیر ۱۸۔

اگر وارثوں کے ایسے حالات نہ ہوتے جن میں وہ غیر وارث بھی بن سکتے ہیں تو اس کی توجیہ ناممکن ہوتی والدین خصوصاً ایسی حالت میں ہیں کہ وہ غیر وارث نہیں ہوتے، لہٰذا ان کے حق میں وصیت قطعی طور پر منسوخ ہونی چاہیے۔ اور آیت مذکورہ بالا میں مکتوبہ وصیت والدین کے لئے

ہے، اس لئے شاہ صاحب نے آیت مذکورہ کو قطعی طور پر منسوخ مان لیا، مگر میرے شخصی حالات ایسے تھے جن سے مجھے تنبہ ہوا، میری والدہ غیر مسلمہ میرے ساتھ موجود تھی، میں بیمار ہوا تو مجھے اس کی فکر لاحق ہوئی کہ اگر میں مرجاؤں تو اس بیچاری کو کوئی نہیں پوچھے گا، اس وقت اس کی جس قدر خاطر تواضع کی جاتی ہے وہ میری وجہ سے ہے میرے مرتے ہی یہ محروم ہو جائے گی، اب مجھے وصیت کا مطلب سمجھ میں آیا، کہ اگر حالات ایسے درپیش ہوں تو وصیت لازم ہے بنابریں کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت پر عمل کرنے کی ایک صورت نکل آئی اس لئے اس کو منسوخ کہنے کی ضرورت ہی نہیں اطلاق کو تطبیق کی خاطر مقید بیشک کر لیجئے۔ یہ تو فقہ قرآنی کا بہت بڑا وسیع باب ہے۔ علیٰ ہذا القیاس باقی ماندہ چارہ آیتوں میں تطبیق بہت آسان ہے وہ اولیٰ غیر اولی عزیمت ورخصت پر عمل کرنے سے حل ہو جاتی ہیں۔

میں اپنی سمجھ کے موافق شاہ صاحب کے بیان کو ایک حکیمانہ طرز بیان سمجھتا ہوں میں اسے قبول نہیں کر سکتا، کہ جس امر پر مجھے تنبہ ہوا، شاہ صاحب کی نظر ادھر جا ہی نہ سکتی تھی، اور باقی چار آیتوں کی مثالیں میرے مطلب کی شواہد ہیں، وہاں انہیں قواعد سے بآسانی تطبیق ہو سکتی ہے جن کو وہ دوسری آیات میں استعمال کر رہے ہیں میں سمجھتا ہوں کہ ذہنیت عامہ کو منتشر نہ کرنے کے لئے شاہ صاحب نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے اس کی مثال مسوی میں بھی ایک جگہ ملتی ہے، فرماتے ہیں کہ بعض اوقات غیر مطہر چیز کو شارع مطہر کے درجے پر رکھ دیتا ہے اس سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ یہ چیز (جس کی تطہیر زیر بحث ہے) نجس ہی نہیں ہے مگر چونکہ دیکھا جاتا ہے کہ نجاست کی نفی سے ذہنیت عامہ ابا کرے گی اس لئے ایک غیر مطہر چیز کو کہہ دیا جاتا ہے کہ "یطھرہ ما بعدہ"

فصل (۸) شاہ صاحب اور مقصد قرآن کی تعیین

قرآن شریف کا مقصد معین کرنے کے لئے "حجۃ اللہ" کا باب الحاجۃ الی دین ینسخ الادیان پڑھنا چاہئے اس کے بعد ازالۃ الخفا میں "ھو الذی ارسل رسولہ بالھدی ودین الحق الایۃ کی تفسیر پڑھنا ضروری ہے یہ تفسیر شاہ صاحب کے نوادر میں سے ہے یہ مسئلہ (تعیین مقصد قرآن) بہت بڑی اہمیت کا مالک ہے کہ پہلے تمام ادیان پر اس دین کو فوقیت

دینا کیوں ضروری ہے؟ پھر آیا اس کا تحقق بھی ہوا یا محض ایک امید افزا خیال ہے، دونوں کتابوں کے مذکورہ بالا دو مباحث (باب تنسیخ الادیان اور تفسیر ھوالذی ارسل رسولہ الخ) کے پڑھنے کے بعد مذکورہ بالا ہر دو سوالوں کا تشفی بخش جواب مل جاتا ہے اور اس سے قرآن شریف کی حکمت اساسی طور پر معین ہو جاتی ہے پھر اس کی مزید توضیح آپ کو حجۃ اللہ البالغہ کے باب ''اقامۃ الارتفاقات'' میں ملے گی۔ اس مقصد (وجہ غلبہ دین حق اور اس کا وقوع) کو تشخیص اور تعیین سے محفوظ کرنے کے بعد اسلام کی حقیقت روشن ہو جائے گی۔

فصل (۹) شاہ صاحب کی حکمت کی اساس و بنیاد

مذکورہ سابق مقصد قرآن کو ہم شاہ ولی اللہ کی حکمت کی اساس مانتے ہیں، جب کبھی ہم فلسفہ ولی اللّٰہی کہیں گے تو اس سے یہی مراد ہوگا، اس فلسفے کی تاریخ ارتقائی دنیا کی تکوینی ترقی کے ساتھ ساتھ تاویل الاحادیث میں ملے گی، آدم علیہ السلام کے زمانے میں جو شرائع مقرر تھے وہ اسی فلسفے کے ماتحت تھے اور اس زمانے کی حاجتوں کو پورا کرتے تھے جس قدر انسانیت ترقی کرتی گئی، اسی قدر اس فلسفے کی تفریعات میں بھی اضافہ ہوتا گیا، ابراہیمؑ سے پہلا دور (یعنی حنیفیت سے پیشتر کا دور) صائبین کا ہے تاویل الاحادیث میں اس دور کی (جس میں آدم، ادریس اور نوح تا قبل ابراہیم علیہ السلام داخل ہیں) پوری تشریح ملے گی، ادریس علیہ السلام ہی طبعیات، ریاضیات، الٰہیات کے بانی سمجھے جاتے ہیں حکمت کے ان اقسام کا مرکز بدلتا رہا، کبھی ہند، کبھی ایران، کبھی یونان اس کے بعد ابراہیمی دور آئے گا، حنفا اسی فلسفے کی شکل کو دوسرے رنگ میں بدل دیں گے، اس تبدیلی کے اسباب کیا تھے؟ اور تبدیلی کس شکل میں ہوئی، اس کی تفصیل ''تاویل الاحادیث'' میں ملے گی، اس اہم مسئلے کے حل کرنے پر انسانیت کی حقیقت مشخص ہوگی، فلسفہ وہی ہے جو دور صائبین میں تھا اس کی تشریعی صورت بدل جاتی ہے۔

دم بدم گر شود لباس بدل را
مرد صاحب لباس را چہ خلل

ہمارے حکماء اسلام اس مسئلے میں بہت تھوڑی بحث پر اکتفا کرتے رہے اس لئے وہ ''سورہ

انعام'' کو کبھی قابل اطمینان طریقے سے حل نہیں کر سکے، شاہ صاحب کی کتابیں عموماً اور ''تفہیمات الٰہیہ'' و بدور بازغہ خصوصاً اس مسئلہ کو پورے طور پر سمجھنے کے لئے بار بار پڑھنی چاہئیں۔

الامام کا لقب اور شاہ صاحبؒ

ہم نے امام کا لفظ شاہ ولی اللہ کے منصب میں اسی ضرورت کے لئے اضافہ کیا ہے کہ یہ اہم مسئلہ ہمیں کوئی پہلا امام نہیں بتلاتا، اگر ہم شاہ صاحب کو امام مان لیں گے تو دوسرے لفظوں میں اس مسئلہ کی اہمیت اصلی شان میں طلبہ کے سامنے آجائے گی۔ انھیں غور کرنا پڑیگا کہ شاہ صاحب کیوں امام کہلاتے ہیں تو اس خصوصیت کی طرف آسانی سے توجہ مبذول ہو سکتی ہے۔ تاویل الاحادیث میں ابراہیم علیہ السلام سے لے کر سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیا کی زندگی کو تدریجی ترقی کے اصول سے موجہ بنایا گیا ہے۔

یہاں ہمیں یہ امر واضح کر دینا چاہئے کہ کسی مفکر کا اس سلسلہ بیان میں کسی خاص حصے سے اختلاف کرنا ہمارے نزدیک کوئی معیوب بات نہیں ہم شاہ صاحب کی امامت کو اس تسلسل تاریخی میں منحصر کرنا چاہتے ہیں ہمیں کوئی بڑا امام ایسا نظر نہیں آتا کہ جن انبیا کا ذکر قرآن شریف میں ہے ان کی تاریخ کو کسی فلسفے کے ماتحت مرتب کردے، یہ خصوصیت خدا تعالیٰ نے شاہ صاحب کے لئے ودیعت رکھی ہوئی تھی، ہماری رائے یہ ہے کہ شاہ صاحبؒ کی اس حکمت کو محققانہ سمجھنے کے بعد اگر قرآن عظیم تحت اللفظ پڑھا جائے گا تو وہ کسی زائد تفسیر کا محتاج نہیں ہوگا۔

فصل (۱۰) مضامین قرآن کا ظاہری انتشار اور شاہ صاحبؒ

یہاں تک جس قدر بحث قرآن عظیم کے متعلق شاہ صاحب کی کتابوں سے ذکر کی گئی، اس کا موضوع قرآن کے مواد خمسہ کی عقلی تشریح ہے، قرآن نے ان مضامین کو ایک خاص طریقے سے بیان کیا ہے، مضامین مختلف سورتوں میں منقسم ہیں، سورتوں کے مضامین میں ایک ربط جیسا کہ علمی کتابوں کی شان ہے نظر نہیں آتا، مولوی شبلی مرحوم کی زبان میں اُسے مختلف پھولوں کا ایک ڈھیر کہا جا سکتا ہے، شاہ صاحب حکمت بیان کرتے وقت اس موضوع (ربط آیات) پر مطلق توجہ نہیں کرتے وہ فرماتے ہیں، اُمی قوم کی تفہیم کیلئے ان کی عادات کے مطابق خود ان کے محاورات میں

قرآن نے اپنے مقاصد واضح کردیئے، تکرار ہو یا اطناب اس سے بچنے کی کبھی سعی نہیں کی، مخاطبین کو عالم بنادینا مقصد ہے، اس میں قرآن کامیاب ہوگیا ایک حکیم کی نظر میں اگر ایک علمی کتاب اس طرح سوسائٹی کو بلند کردیتی ہے تو وہ تناسب آیات کی زیادہ ضرورت نہیں سمجھے گا، الفوز الکبیر میں شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں ''بیان این علوم بروش تقریر عرب اول واقع شدہ نہ بروش تقریر متاخران، پس مناسبت در انتقال از مطلبے بہ مطلبے رعایت نکرد، بلکہ آں چہ القائے آن بر عیاد خود مہم دانست، آن رانشر فرمود، ہر چہ مقدم شود گوشود و ہر چہ موخر شود گوشود''۔

فصل (۱۱) ربط آیات اور شاہ ولی اللہ

مگر یہ نہ سمجھا جائے کہ شاہ صاحب قرآن کی ادبی لطافت (نسق آیات) پر نظر نہیں رکھتے۔ ان کا مطلب فقط یہ ہے کہ سب سے پہلے مطالب پر غور کرنا چاہیئے جسے اکثر مفسرین فراموش کرچکے ہیں، علوم بلاغت اور اس کے توابع میں ہمارے متاخرین نے کوتاہی نہیں کی، مگر چونکہ حکمت کے اصول پر مطالب کو ذہن نشین کرنے کی طرف توجہ نہیں کرسکے، اس لئے ان کی ادبی موشگافیاں عقلمندوں پر زیادہ موثر نہیں ہوتیں، جب شاہ صاحب اصل مطلب سے فارغ ہوجاتے ہیں تو نمونہ کے طور پر ربط آیات پر توجہ دلانے میں کوتاہی نہیں کرتے جیسے سورہ بقرہ کی آیت ''یابنی اسرائیل'' کے حاشیہ سے ظاہر ہے ان کے بعد شاہ عبدالعزیز آئے، انھوں نے فتح العزیز میں ربط آیات پر التزام سے بحث کی اور اس فن کو ظاہر کرنے میں شاہ صاحب کو اتباع میں سے آپ نے سبقت کی۔

میری توجہ شروع سے اس فن (ربط آیات وسور) کی طرف منعطف رہی، بعض بعض لطیف نکتے سمجھ میں آنے لگے، میں نے مولانا شیخ الہند سے جب ذکر کیا، تو حضرت نے بعض نادر فوائد تلقین فرمائے، مثلاً ایک غزوہ کا ذکر کرتے ہوئے قرآن کے اندر ربوا کا مسئلہ آگیا ہے، حضرت مولانا نے اس کا ایسا لطیف ربط بتایا جو تفسیروں میں نہیں ملتا، مولوی احمدی صاحب نے مجھ سے سن کر اپنے حاشیے میں نقل کردیا ہے اس کے بعد مولانا فرماتے ہیں کہ جن لوگوں نے ربط آیات پر بحث کی اس قدر سرسری مضمون لکھتے ہیں کہ اس سے کہیں بہتر ہوتا کہ نہ لکھتے، حضرت خود اس طرف

زیادہ توجہ نہ دے سکے کہ یہ مسئلہ ان کا زیادہ وقت لیتا تھا۔

میں اس فن کی طرف قاضی ابوبکر بن عربی کا ایک مقولہ کتاب الاتقان میں پڑھنے کے بعد متوجہ ہوا وہ فرماتے ہیں کہ ہم نے ربط آیات کے تحت میں علوم جمہ مستتر پائے، مگر لوگوں کو اس کا طالب نہ دیکھا اس لئے توجہ ہٹالی میں خود تقریباً چالیس برس سے اس مسئلے پر غور کرتا رہا ہوں عموماً ان مقاصد قرآنیہ کو پیش نظر رکھ کر جو شاہ صاحب کی حکمت میں معین ہوئے، ایک ایک سورت کو ایک خاص موضوع اور معین مضمون کے لئے مقرر کر کے تسلسل قائم کرنے پر کامیاب ہوا مجھے کسی دوسرے حکیم کا قرار دادہ مضمون سلسلہ کلام الٰہی سے استنباط کرنے کی ضرورت نہیں ہوئی میں معانی کو شاہ صاحب کی حکمت سے باہر جانے نہیں دیتا۔ عام مفسرین سے جہاں کہیں اختلاف کرونگا وہ شاہ صاحب کے اصول سے تشبث کے تحت میں ہوگا، بعض ایسے مواقع بھی ملیں گے کہ میری سند مولانا شاہ عبدالعزیز، اور شاہ رفیع الدین اور مولانا محمد اسماعیل شہید اور مولانا محمد قاسم کے کلام میں ملے گی شاذونادر باتیں ایسی ہونگی جو خود میرے فکر کا نتیجہ ہیں میں ایسے موقع پر صراحۃً بتادیا کرتا ہوں کہ یہ میری سوچی ہوئی بات ہے اس کا ردو قبول ہر وقت سامع کے اختیار میں ہے مگر جن چیزوں میں ائمہ اور اساتذہ کی سند موجود ہے میرا جی چاہتا ہے کہ اہل علم تناسب آیات میں توجہ کریں اور ان کی تقلید سے اِبا نہ کریں۔

فصل (۱۲) قرآن اور سنت کے باہمی تعلق کے بارہ میں شاہ صاحب کی خاص رائے

عام اہل علم قرآن شریف کے ساتھ سنت اور اجماع کو ادلہ شرعیہ میں شمار کرتے ہیں، شاہ ولی اللہ صاحب سنت کو قرآن سے مستنبط چیز مانتے ہیں لیکن اس استنباط کا طریقہ وہ نہیں ہے جو ائمہ فقہا میں مروج ہے بلکہ حکمت کے اصول پر استنباط کرنے کے طریقے اور ان کے اصول شاہ صاحب کے یہاں علیحدہ مقرر ہیں۔ "خیر کثیر" میں اس مسئلہ کی انھوں نے تفصیل لکھدی ہے، اس طرح پر اگر سنت کو مانا جائے تو قرآن کے استقلال پر کوئی زد نہیں پڑے گی۔

فصل (۱۳) اجماع کا تعلق اور استنباط قرآن سے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے خلافت راشدہ کے آخری وقت تک یعنی شہادت

عثمان (۳۵ھ) تک شاہ صاحب کی تحقیق میں مسلمانوں میں کبھی اختلاف نہیں ہوا۔ اس دور کو وہ دور اجماع کہتے ہیں اس کی تفصیل "ازالۃ الخفا" میں مذکور ہے شہادت عثمان کے بعد اختلاف شروع ہوا اب اجماع وہی مستند ہوگا جو مذکورہ دور اول کے تتبع میں منعقد ہو، شاہ صاحب اسی دور کو خیر القرون قرار دیتے ہیں، اس کی پوری تفصیل "ازالۃ الخفا" میں موجود ہے، اسے ساری دنیا جانتی ہے کہ اس زمانے میں مسلمانوں کا مستند سوائے قرآن عظیم کے کوئی اور لکھی ہوئی چیز نہیں تھی اس پر یہ جماعت اپنے پارٹی پالیٹکس کے نظام کو ملحوظ رکھتے ہوئے عمل کرتی تھی، اس پارٹی کو سنٹرل کمیٹی کی طرف اشارہ ہے قرآن حکیم کی ذیل کی آیت میں السابقون الاوّلون من المهاجرين والانصار والذين اتبعوهم باحسان رضی الله عنهم ورضوعنه.

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور تعلیم سے جو جماعت قرآن پر عمل کرنے کے لئے تیار ہوئی اس کا وہ مرکزی حصہ جس کا ہر قول وفعل خدا تعالی کے ہاں پسندیدہ ہے وہ مہاجرین اور انصار کا پہلا طبقہ تھا، اس کی اتباع قرآن پر عمل کرنے کے لئے قیامت تک مسلمانوں کے لئے ضروری ہے، جو چیز اس زمانہ میں متعین ہوگئی۔ اس کو اُسی شکل میں اور اسی معنی میں قائم رکھنا اتباع بالاحسان ہے، زمانے کے تغیرات سے جو نئی چیز قابل بحث پیش آئے وہاں اس جماعت تبعین بالاحسان کا فیصلہ ماننا ضروری ہوگا یہ اس دور کے مابعد کے اجماع کا حاصل ہے، اس طرح اجماع قرآن کی حکومت قائم کرنے والی جماعت کے متفقہ فیصلے یا اغلبیت کے فیصلوں کا نام ہوگا، لہٰذا اجماع قرآن سے علیحدہ کوئی نئی چیز نہیں ہے بلکہ اجماعیات قرآن اصول کے تشریحی بائیلاز ہوں گے، اس سے کوئی ترقی کن جماعت، جو زمانہ کے طویل عرصہ میں کام کرے، خالی نہیں ہوسکتی، اس طرح اجماع بھی قرآن کے مقابل ایک مستقل اصل نہ بنا، بلکہ قرآن کی حکومت قائم کرنے والی جماعت کے اتفاق کا نام ہوا، اس طور سے مسلمانوں میں قرآن کے مستقل درجہ کا تعارف کرانے والی شخصیت امام ولی اللہ دہلویؒ ہیں۔

باب سوم (علم حدیث)

شاہ ولی اللہ سنت کے تمام ابواب کو قرآن عظیم سے مستنبط مانتے ہیں، مگر انبیا کے اصول استنباط کو ائمہ فقہا کے اصول فقہ سے علیحدہ قرار دیتے ہیں چنانچہ خیر کثیر میں فرماتے ہیں "میں کتاب الصلوٰۃ کے متعلق تمام صحیح حدیثوں کو قرآن سے استنباط کرنے پر قادر ہو گیا ہوں، میرا جی چاہتا ہے کہ اس کے متعلق ایک مستقل رسالہ لکھ دوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن عظیم سے خود سمجھ کر (جیسے شاہ صاحب فرماتے ہیں) یا مستقل وحی سے اخذ کر کے (جیسے اہل علم کہتے ہیں) قرآن پر عمل کرنے کا مفصل پروگرام دیا ہے جسے علما حدیث نے بڑی محنتوں سے دو سو برس کے عرصہ میں جمع کیا اس طرح انبیا کی سیرتوں کو جمع کرنا پہلے زمانے میں بھی رائج رہا ہے۔ سطعات میں شاہ صاحبؒ تصریح کرتے ہیں کہ قرآن عظیم کی طرح ایسی وحی جس کے معانی اور الفاظ مقرر ہو کر نازل ہوں اور پھر قطعی طور پر محفوظ رہیں، چند ٹکڑوں کے ماسوا کسی مذہب کی کتاب الٰہی میں یہ طریقہ نہیں برتا گیا، عام طور پر ائمہ دین کتابیں اپنے اجتہاد سے جمع کرتے ہیں جو اس نبی کی سیرت اور اس کے اقوال کو جمع کر دیتی ہیں۔ یعنی ان ہی کتابوں میں وہ چیز بھی آجاتی ہے جو براہ راست لفظاً اور معناً مقرر ہو کر نازل ہوئی (جیسے تورات کے احکام عشرہ یا انجیل کے بعض خطبات) نیز وہ چیز بھی آجاتی ہے جو نبی اپنے اجتہاد سے تعلیم دیتا ہے (یہ فیصلہ شدہ امر ہے کہ اگر نبی کے اجتہاد پر منجانب اللہ گرفت نہ ہو تو وہ حکماً وحی سمجھی جاتی ہے) ہماری امت میں کتب مقدسہ کی اس قسم کی مثال میں شاہ صاحبؒ صحیح بخاری و صحیح مسلم کو پیش کرتے ہیں۔

اس بظاہر سادہ تحقیق میں ایک بہت بڑے اشکال کا حل موجود ہے جو کتب مقدسہ کے متعلق ہمارے اہل علم کے اذہان پر مستولی ہے، ہمارے علما عموماً یہ سمجھتے ہیں کہ اصلی تورات اور انجیل غائب ہو چکی ہے چونکہ وہ کوئی کتاب قرآن شریف کی طرح محفوظ نہیں دیکھتے۔ اور ان کی ذہنیت میں یہ چیز راسخ ہے کہ سابقہ کتب الٰہی بھی قرآن کی طرح نازل ہوئی تھیں، اس لئے وہ ان کتابوں کو مقدس ماننے کے لئے کسی طرح تیار نہیں ہیں۔ اس نظریہ سے یہ برا نتیجہ پیدا ہوا کہ قرآن حکیم نے جہاں اہل کتاب کو اپنی کتابوں پر عمل کرنے کی دعوت دی اور عمل نہ کرنے کا الزام دیا اس کی صحیح تفسیر کرنے سے ہمارے علما عاجز آ گئے محض اسرائیلی یا خرافاتی روایات لکھنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ اگر کتب مقدسہ کو کتب حدیث کی طرح مان لیا جائے تو یہ اشکال من اصلہ رفع ہو جاتا ہے۔

سورہ والنجم کی آیت ''ان ھوالا وحی یوحیٰ'' کی دو طرح تفسیر کی جاتی ہے۔

(۱) شاہ صاحبؒ کے طریقے پر تحقیق یہ ہے کہ ضمیر ''ہو'' قرآن کی طرف راجع ہے اور ما ینطق عن الھویٰ'' میں بھی نقل قرآنی کے متعلق بحث ہے۔

(۲) مگر اہل علم کی دوسری جماعت اس آیت کو قرآن سے مخصوص نہیں مانتی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تمام تر اقوال کو ایک طرح وحی ثابت کرنے پر زور دیتی ہے ان کے نزدیک وما ینطق عن الھوی قرآنی نقل سے مقید نہیں ہے، بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر قول ''وما ینطق عن الھویٰ ''میں داخل ہے اور اسی کو ''ان ھو الا وحی یوحی ''میں وحی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

(۱) ان حضرات کے نزدیک حدیث کی اصل بھی وحی ہی سے ثابت ہے، فقط الفاظ کا فرق ہے، قرآنی الفاظ وحی سے معین ہوئے اور حدیث کے الفاظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے طبعی ملکہ سے صادر ہوتے ہیں، مگر معانی سب کے سب وحی ہیں۔

(۲) پھر ان کے نزدیک یہ فرق بھی موجود ہے کہ قرآن خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک مصحف میں کتابتہ محفوظ کر دیا گیا اور اس کی روایت بالتواتر قائم رہی، لیکن حدیث میں جو وحی آئی ان کے نزدیک بھی، نہ تو حضور کے زمانے میں اس کی کتابت ہوئی اور نہ اس کے لئے

تواتر ضروری ہے۔

ان لوگوں کی اصطلاح پر اگر کتب مقدسہ سابقہ کو کتب حدیث کا درجہ دیا جائے تو بطریق اولیٰ اس کو مستبعد نہیں سمجھنا چاہئے اگر یہ لوگ اس بات کو تسلیم کر لیں تو تمام اشکال حل ہو جائیں گے۔

(۱) ہماری کتب حدیث میں بالاتفاق غیر صحیح روایات بھی موجود ہیں (۲) نیز ان کتب حدیث میں ایک واقعہ کو مختلف طریقوں سے بھی روایت کیا گیا ہے (۳) ہماری بہت سی کتب حدیث میں بھی کاتبوں سے غلطیاں ہوتی رہتی ہیں جن کو محققین علما درست کرتے رہتے ہیں اس کے بعد اگر اناجیل اربعہ کو ہماری صحاح اربعہ (صحیحین ابوداؤد، ترمذی) کے درجہ پر رکھ دیا جائے تو ذرہ برابر اختلاف نظر نہیں آئے گا۔

میں نے انجیل کی شرح، مسٹر ہنری اسکاٹ کی اردو میں مطالعہ کی اس میں اناجیل اربعہ کے اختلافات کو اسی طرح جمع کرنے اور ترجیح دینے کی سعی کی گئی ہے، جیسے ہم کتب حدیث میں کرتے ہیں، اس دن سے میرے دماغ میں ایک نیا فکر پیدا ہوا جس سے کتب مقدسہ کی تحریف کا الزام جس طرح عموماً ہم اہل کتاب پر عائد کرتے ہیں اور مولانا رحمت اللہ مہاجر مکی نے ''اظہار الحق'' میں اس کو بڑی شد و مد سے ثابت کیا ہے، کمزور ہونے لگا اور جو محقق عالم تورات میں تحریف کا انکار کرتے ہیں جیسے امام بخاریؒ، شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور امام ولی اللہ دہلویؒ، ان کی تحقیق کا مطلب سمجھ میں آنے لگا، مگر یہ فکر کبھی مکمل نہیں ہو سکتا جب تک ہم مقدسہ سابقہ کو کتب حدیث کے درجہ پر نہ لے آئیں، جب ''سطعات'' میں میں نے شاہ ولی اللہ صاحب کی مذکورہ بالا تصریح پڑھی تو اطمینان کا سانس لیا۔

فصل (۲) کتب حدیث پر شاہ صاحب کی تنقید اور طبقات کی تقسیم

حدیث کی کتابیں دو طرح پر مرتب کی گئیں، پہلی قسم وہ ہے جن میں فقط صحیح احادیث درج ہیں، دوسری قسم وہ کتابیں ہیں جن میں صحیح روایات کے ساتھ غیر صحیح روایت بھی لکھی گئیں، مگر تصریح کر دی گئی کہ یہ روایات صحیح نہیں ہیں، پھر ان مصنفات کی روایات کا سلسلہ بھی یکساں قائم نہ رہ سکا

بعض صحاح ایسی ہیں جو تواتر کے قریب پہنچ گئیں، بعض ایسی بھی ہیں جو مشہور اور مستفیض کے درجے پر ہیں، اس فرق کو ملحوظ رکھ کر شاہ صاحب نے کتب احادیث کے طبقات مقرر کر دیئے۔

طبقہ اولیٰ میں موطا امام مالک، صحیح بخاری، صحیح مسلم کو رکھا، طبقہ ثانیہ میں سنن ابوداؤد، جامع ترمذی، سنن نسائی مقرر کی، ان چھ کتابوں کے ماسوا باقی طبقات میں کئی دہائیاں اور کئی سیکڑے کتب ملیں گی، شاہ صاحب کے نزدیک وہ سب قابل احتجاج نہیں ہیں۔

اس طرح شاہ صاحب نے علم حدیث میں ایک نئی روح پھونک دی، شیخ الاسلام ابن حجرؒ اور سیوطیؒ کے زمانے سے جو غیر محققانہ طریقہ اہل علم پر غالب آرہا تھا اس نئی روح نے اس کو مغلوب کر دیا۔

میں نے شیخ عبدالحق محدث دہلوی (م ۱۰۵۲ھ) کے مقدمہ مشکوۃ میں جب یہ مضمون دیکھا کہ پچاس کے قریب حدیث کی کتابیں ہیں، جن میں صحیح اور غیر صحیح احادیث جمع کی گئی ہیں اور شیخ نے ان سب کو ایک درجے پر رکھا ہے وہ صحاح ستہ میں بھی غلط روایات کا اختلاط اسی طرح مانتے ہیں جس طرح باقی کتب میں تو میرے دماغ پر ایک پریشانی طاری ہوگئی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ یہ سب کتابیں مجھے کسی کتاب خانہ میں یکجا ملیں، ان کے مطالعہ کے بعد علم حدیث کی جو تحقیق ثابت ہو اس پر اعتماد کیا جائے، خالی پانچ کتابیں پڑھ لینے سے کیا ہوتا ہے اس کے بعد میں متون مذکورہ بالا کی فراہمی میں لگ گیا مگر بہت جلد اپنے آپ کو اس سے عاجز ماننے لگا۔

مجھے حضرت مولانا شیخ الہند قدس سرہ نے اس قسم کی تشویش سے نجات دلانے کے لئے مشورہ دیا کہ میں ''حجۃ اللہ البالغہ'' کا مطالعہ جاری رکھوں، لیکن سندھ جانے سے پیشتر مجھے ایسا موقع دستیاب نہ ہوسکا، طبقات مذکورہ کی بحث جب ''حجۃ اللہ البالغہ'' میں مجھے سمجھ آئی اور معلوم ہوا کہ اصل قابل اعتنا فقط چھ کتابیں ہیں، جو پہلے اور دوسرے طبقے میں بیان ہو چکی ہیں تو طبیعت سے تمام بوجھ جاتا رہا۔

جن محدثین نے غیر صحیح احادیث جمع کر کے،

(الف) ان کی عدم صحت کی تصریح کر دی (ب) پھر ان کا فیصلہ بھی اہل علم کے نزدیک

مسلم ہے (ج) مزید اس کے ان کی کتابیں اہل علم میں رواج پذیر بھی ہیں، ان تین خصوصیات والی کتابوں کو شاہ ولی اللہ صاحب ان کتابوں کے درجے پر نہیں لانے دیتے جو خصوصیات مذکورہ بالا سے یکسر عاری ہیں۔

عام اہل علم اس دقیقے پر متنبہ نہیں ہو سکے، اور پچاس کتابوں کو مساوی درجے پر ایک فہرست میں درج کر گئے۔

شاہ ولی اللہ کی ''حجۃ اللہ البالغہ'' کا یہ مضمون شاہ عبدالعزیزؒ نے زیادہ تفصیل اور توضیح سے عجالہ نافعہ میں درج کر دیا ہے۔

مولانا محمد قاسم نانوتوی اور کتب حدیث کے متعلق ولی اللّٰہی نظریہ کی عقلی تشریح

مگر دونوں کتابوں میں یہ مضمون ایک وجدانی فیصلے سے آگے نہیں بڑھ سکا، ہر دو بزرگوں نے کوئی عقلی دلیل اس پر قائم نہیں کی، بلکہ محققین اہل علم کا اتفاق اس معاملہ پر کافی سمجھا گیا ہے، ابتدا میں ایک حد تک میری دماغی تڑپ کو پورا کرنے کے لئے یہ امر کافی تھا مگر میں اس سے زیادہ توضیح وتوثیق کا خواہشمند تھا۔

اتفاقاً میں شیخ الاسلام مولانا محمد قاسم کا رسالہ ''ہدیۃ الشیعہ'' مطالعہ کر رہا تھا، اس میں مولانا نے شاہ صاحب کے مذکورہ بالا مضمون کو عقلی طور پر مدلل کر دیا، اس طرح علم حدیث کی تنقید جو شاہ صاحب نے قائم کی تھی، ہمارے لئے قابل استفادہ ہوگئی۔

حضرت مولانا فرماتے ہیں:

> اوّل بطور تنبیہ گزارش ہے کہ کتابیں آدمیوں ہی کی تصنیف ہوتی ہیں، جیسے آدمی سب طرح کے ہوتے ہیں، جھوٹے سچے، معتبر غیر معتبر، فہمیدہ وغیرہ فہمیدہ، ایسے ہی کتابیں بھی سب طرح کی ہوتی ہیں۔
>
> (۱) ملحدان بے دین نے بہت سی کتابیں تصنیف کر کے اچھے اچھے بزرگوں کے نام لگا دی ہیں اور ان میں اپنی واہیات سیکڑوں بھر دی ہیں۔
>
> (۲) اور جو کتابیں کبرائے اہل سنت کی تصنیف ہیں، ان میں بھی اکثر ایسی ہیں کہ وہ

لوگوں کی فیض رسانی کے لئے تصنیف نہیں ہوئیں بلکہ بطور بیاض کے جمع کی گئیں تاکہ نظر ثانی کر کے ان کی روایات کا حال معلوم کریں اور اتفاق سے نظر ثانی کا اتفاق نہیں ہوا، یا ہوا اور کسی وجہ سے وہ بیاضیں لوگوں کے ہاتھ پلہ پڑ گئیں۔

(۳) اور بعض کتابیں ایسی ہیں کہ وہ بہت کم یاب اور بدرجہ غایت نادر الوجود بلکہ مفقود ہیں اور ملحدوں اور مبتدعوں کے وہ ہاتھ لگ گئیں۔ انھوں نے اپنی گھڑی ہوئی روایتیں ان میں داخل کر دی ہیں، یا اہل سنت کے مقابلہ کے وقت کسی روایت کو ان کتابوں کی طرف منسوب کر دیتے ہیں، تا کہ اہل سنت خاموش ہو جائیں۔

سنو! اہل تشیع اکثر ایسا ہی کرتے ہیں اور ایسی کتابوں کا حوالہ دیا کرتے ہیں اس لئے اہل حق کو لازم ہے کہ جب کسی شیعہ سے کسی کتاب کا حوالہ سنیں تو اول تو یہ دریافت کریں کہ یہ روایت اس کتاب میں ہے کہ نہیں دوسرے اس کتاب کا حال تحقیق کریں کہ معتبر ہے کہ نہیں۔

فصل (۲)

اور معتبر ہونے کی یہ صورت ہے کہ کسی کتاب کی روایات کے معتبر ہونے میں چند باتیں ضروری ہیں اول تو یہ کہ اس کتاب کے مصنف کو تفریح طبائع محزونہ کے لئے فقط قصہ گوئی اور افسانہ خوانی، مدنظر نہ ہو، بلکہ واقعات واقعی کے مشتاقوں کی تسکین کے لئے اس کتاب کو تصنیف کیا ہو، ورنہ چاہئے کہ ''بہار دانش'' اور ''بوستان خیال'' کے افسانے اور ''چہار درویش'' اور ''بکاولی'' کی کہانیاں، اور ''فسانہ عجائب'' اور ''فسانہ غرائب'' کے طوفان سب کے سب دستاویز خاص وعام ہو جائیں۔

دوسری یہ کہ مصنف کتاب کسی کی رو و رعایت، اور کسی کی بغض وعداوت نہ رکھتا ہو اور اس کا حفظ اخبار، اور صدق گفتار، اس درجہ مشہور ہو کہ اس کی تحریر کی نسبت کسی کے دل میں شک وشبہ نہ ہو، اور نہ طومار کے طومار اخباروں کے جو لڑکیوں کی زبانوں میں اپنے بزرگوں کی شجاعت اور ان کے غنیموں کی بزدلی سے مشحون ہوا کرتے ہیں

بالاتفاق مسلم ہو جائیں اور شیعہ سنیوں کی، اور سنی شیعوں کی سندیات پر سرو چشم رکھنے لگیں اور ہر کس و ناکس کی بات قبول کرنے لگیں اور یہ فرق قوت وصف حفظ، وتفاوت صدق و کذب، اور علی ہذا القیاس یہ تہمت رو و رعایت اور کینہ و عداوت ہرگز قابل لحاظ نہ رہے۔

تیسری یہ کہ مصنف کتاب، باوجود صدق و دیانت اور حفظ و عدالت کے اس فن میں جس کی وہ کتاب ہے دستگاہ کامل رکھتا ہو اور ملکہ کما ینبغی، نہ یہ کہ دین میں مثلاً نیم ملا ہو، جس سے خطرہ ایمان ہو یا طب میں مثلاً نیم طبیب ہو کہ بیماروں کو خطرہ جان ہو۔

چوتھی یہ کہ وہ کتاب باوجود شرائط مذکورہ کے قدیم سے مشہور و معروف اور اسی قسم کے لوگوں کے واسطہ جو مجموعہ اوصاف مرقومہ ہوں، دست بدست ہم تک پہنچی ہو، ورنہ لازم، کیا الزم تھا کہ انجیل و تورات جو کلام ربانی ہیں اور اس خدا کی تصنیف ہیں جو بوجہ اتم جامع اوصاف مذکورہ کیا، مجموعہ صفات کمال اور معدن جملہ کمالات جلال و جمال ہے، اعتماد و اعتبار میں ہم پلہ قرآن مجید اور فرقان حمید کے ہو جائیں۔

پانچویں یہ کہ روایت کی کتاب میں ضروری ہے کہ مصنف کتاب نے اول سے التزام اس بات کا بھی کیا ہو کہ بجز صحیح روایتوں اور محقق حکایتوں کے اور اپنی کتاب میں درج نہ کرونگا، جیسے صحاح ستہ کہ ان کے مصنفوں نے یہ شرط کر لی ہے کہ بجز صحیح روایت کے اپنی کتاب میں درج نہ کریں گے، اسی واسطے ان کتب کا نام صحاح ستہ مشہور ہو گیا۔

فصل (۳)

سو اگر کوئی کتاب کسی بیاض کی ہو کہ اس نے اس میں ہر قسم کی رطب و یابس روایتیں اور صحیح و غلط حکایتیں اس غرض سے فراہم کر لی ہیں کہ بعد میں نظر ثانی کر کے صحیح صحیح کو قائم رکھ کر باقیوں کو نقل کے وقت حذف کرونگا جیسا کہ امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے کیا۔ یا صحیح کو صحیح بتلا کر، موضوع، یعنی بنائی ہوئی باتوں، اور گھڑی ہوئی حکایتوں اور ضعیف

وغیرہ کو لکھ کر اس کے بعد لکھ جاؤں گا کہ یہ موضوع ہے یا ضعیف ہے مثلاً جیسے امام ترمذی نے کیا، لیکن اتفاقات تقدیر سے ان کا یہ ارادہ پیش نہ گیا اور یہ آرزو پوری نہ ہونے پائی تھی، جی کی جی ہی میں تھی کہ اجل نے آدبایا، تو ایسی روایات کا ہرگز اعتبار نہ ہوگا۔

ورنہ کونسا مصنف نہیں کہ اس نے اول ایک مجموعہ بیاض بطور کلیات کے فراہم نہیں کیا، خود امام بخاریؒ سے بہت سی سندوں سے منقول ہے کہ انھوں نے چھ لاکھ حدیثوں سے چھانٹ کر بخاری شریف کی حدیثیں نکالی ہیں۔

اور عبدالرزاق بخاری کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاری نے کوئی تین دفعہ حدیثوں کی بیاض اکٹھی کی تھی اور ان کو چھانٹ کر بخاری کا مسودہ کیا تھا۔

بہرحال ایسی بیاضوں کا جمع کرنا ایسے ایسے ائمہ حدیث کی نسبت بھی ثابت ہے سو اگر اتفاق سے امام بخاری مثلاً، بعد فراہمی بیاض کے قبل اس کے بخاری شریف کی حدیثیں اس میں سے چھانٹ کر بخاری تصنیف کریں، اس دارفانی سے کوچ کر جاتے تو وہ بیاض امام بخاری کی تصنیف سمجھی جاتی لیکن کوئی بتلائے تو کیا وہ قابل اعتبار کے ہو جاتی؟

سب جانتے ہیں کہ اگر وہ ایسی ہوتی تو امام بخاری کو چھانٹنے ہی کی کیا ضرورت تھی، تو اس صورت میں خود امام بخاری ہی اس بات کے گواہ ہیں کہ وہ میری بیاض قابل اعتبار نہیں، پھر ہم کیونکر فقط اس سبب سے اس کا اعتبار کرنے لگیں کہ وہ ایسے بڑے محدث امام المحدثین کی تصنیف ہے کہ جہاں میں کوئی اس کا ثانی ہوا ہے نہ ہوگا۔

غرض اگر کوئی اس قسم کی کتاب کسی کو مل جائے اور اس کے مصنف کو، گو وہ کتنا ہی بڑا محدث کیوں نہ ہو، اس کی تہذیب اور تالیف کا اتفاق نہ ہوا ہو تو وہ کتاب کسی طرح علما کیا، جہال کے نزدیک بھی بہ شہادت عقل قابل اطمینان نہیں۔" **انتھی کلماتہ الشریفة بحوالہ کتاب التمھید**"۔

شیخ الاسلام مولانا محمد قاسم کے ارشادات کے بعد علم حدیث کی جو تنقید شاہ صاحب نے قائم کی تھی ہمارے لئے قابل استفادہ ہو گئی۔

یہ تھا تذکرہ پہلے اور دوسرے طبقہ کا۔

فصل (۳) ہمارا اپنا استقرا اور ولی اللہی نظریہ کی مزید تشریح

شاہ صاحب نے تیسرے، چوتھے اور پانچویں طبقے میں جن کتابوں کا ذکر کیا ہے۔

(الف) یا تو ان کے مصنف ملتزم الصحۃ نہیں

(ب) یا ان کی روایت منقطع ہو گئی ہے یعنی کاتبوں کی بلا تصحیح نقل پر نسخوں کا انتشار تو ہوتا رہا مگر محدثین نے اپنے مشائخ سے پڑھ کر اس نسخہ کو صحیح کیا ہو، پھر اس طرح تسلسل قائم رہے کہ ہمارے زمانہ تک صحیح شدہ نسخے محفوظ طور پر مل سکیں، ایسا نہیں ہوا ایسے نسخے قابل اعتماد نہیں ہوں گے۔

(ج) ان کے سوا بعض ایسے محدثوں نے بھی کتابیں تصنیف کیں، جن کی لیاقت علمی بھی مسلم نہیں ہے۔

متاخرین محدثین نے جن کی ابتدا ابن السبکی (حافظ تاج الدین عبدالوہاب متوفی ۷۷۱ھ) سے ہوئی اور حافظ عراقی (عبدالرحیم بن حسین متوفی ۸۰۶) اور ابوالحسن ہیثمی (علی بن ابی بکر متوفی ۸۰۷) اور ابن حجر عسقلانی کے توسط سے سیوطی پر خاتمہ ہوا۔ ان غیر معتمد کتابوں کی روایتیں زوائد کے نام سے جمع کر دیں جس سے علم حدیث میں فتنے کا دروازہ کھل گیا اس ذخیرہ میں کافی سے زیادہ روایتیں ایسی موجود ہیں جن کو دوسرے طبقے کا مصنف ضعیف قرار دیتا ہے اور ان طبقات میں پہنچ کر ان متاخرین کے نزدیک وہ حدیث متواتر بن جاتی ہے۔

ہم نے کئی سال کی محنت سے شاہ صاحب کے طبقات کو استقرا کر کے یقین حاصل کیا، گو عقلی دلائل سے مولانا محمد قاسمؒ نے ہمیں مطمئن کر دیا تھا، مگر ہم نے اس کے ساتھ محدثین کی جو کتابیں مل سکتی ہیں ان میں عمل استقرا بھی جاری رکھا تو شاہ صاحب کے اس نظریہ پر (کہ پہلے اور دوسرے طبقے کی حدیثیں ہی صحیح ہیں) پورا اطمینان حاصل ہوا۔

مثال کے طور پر صحیح حدیث میں آیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ افضل الاعمال کیا ہے؟ آپ نے فرمایا ''الصلوٰۃ لوقتھا'' اس جملے کا صحیح ترجمہ یہی ہے کہ وقت سے نماز کو موخر نہ کیا جائے، یہ ضروری نہیں کہ اول وقت میں نماز ادا کی جائے، بلکہ بعض اوقات آخر وقت میں نماز ادا کرنا زیادہ مستحب مانا جاتا ہے، کما ثبت عنه علیه الصلوٰۃ والسلام، ابردوا الظهر الخ'' اس کے مقابل بعض رواتیوں میں ''افضل الاعمال الصلوة لاول وقتها'' آیا ہے، ترمذی نے اس روایت کی تضعیف کردی، اب مستدرک حاکم کو دیکھئے وہ اسی جملہ مضاعفہ کو تیس چالیس سندوں سے روایت کرتا ہے، ایک غیر محقق عالم اس کثرت اسانید سے متاثر ہوکر اس کی صحت یا اس کے درجہ شہرت اور تواتر پر یقین کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے، ہم نے حاکم کی ان روایات کی تنقید ''فتح الباری'' کی امداد سے شروع کی تو ان میں سے ایک سند بھی صحیح نہ نکلی۔

ان متاخر محدثین نے ائمہ متقدمین پر صحیح احادیث میں پورا اعتماد نہیں کیا۔

واضح رہے کہ ائمہ تنقید کے طبقات تین ہیں۔

ائمہ تنقید حدیث کے تین طبقے

(طبقہ اولیٰ) شعبہ بن الحجاج متوفی ۱۶۰) سفیان بن سعید ثوری (متوفی ۱۶۰)

(طبقہ ثانی) یحییٰ بن سعید القطان (متوفی ۱۹۸) عبدالرحمٰن بن مہدی (متوفی ۱۹۸)

طبقہ ثالثہ) یحییٰ بن معین (متوفی ۲۳۳) امام احمد بن حنبل (متوفی ۲۴۱)

ان کے بعد ائمہ فقہ الحدیث کو چار طبقوں پر تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

ائمہ فقہ الحدیث کے چار طبقے

(طبقہ اولی) سفیان ثوری	(امام مالک بن انس)
(طبقہ ثانی) عبداللہ بن المبارک	(امام شافعی)
(طبقہ ثالثہ) امام اسحٰق بن ابراہیم راہویہ	امام احمد بن حنبل
(طبقہ رابعہ) امام بخاری	امام ابوداؤد

ان کے بعد ائمہ مصنفین کے طبقے آتے ہیں۔

ائمہ مصنفین کے دو طبقے

(طبقہ اولیٰ) امام بخاری اور ابوداؤد

(طبقہ ثانی) مسلم و ترمذی، نسائی بھی اسی طبقہ میں شمار ہوتے ہیں، ان حضرات پر تصحیح احادیث کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد محدثین کی خدمات دو قسم کی ہیں۔

ان ائمہ کے بعد کے محدثین کی خدمات کی اقسام

اوّل، یہ کہ ان کتابوں کی خدمت کریں جن کا تعلق طبقہ اولیٰ اور ثانیہ سے ہے مثلاً ان کے اسماء الرجال لکھیں، ان کی فقہ پر بحث کریں، ان کی تائید میں طرق جمع کریں ان کی غلطیوں پر تنبیہ کریں، کیونکہ تھوڑی تھوڑی غلطیاں ہر مصنف سے ہوتی رہیں، حتیٰ کہ امام بخاری جو سب سے زیادہ متقن مانے جاتے ہیں، ان کی کتاب میں حافظ ابن حجر چالیس کے قریب ایسی حدیثیں مانتے ہیں جن کی اسانید ضعیف ہیں اور حافظ صاحب کے پاس بھی ان کا کوئی حل نہیں ہے، مگر جن ائمہ کی کتب پر اس طرح کی تنقید عمل میں آئی اور ان کی غلطیاں محدود اور معین ہوگئیں ان کی کتابوں سے استفادہ کرنا سہل ہو جاتا ہے۔

اس (قسم اول) کی طرح حدیث کی خدمت کرنے والے ائمہ محدثین ہمارے اساتذہ تک پائے جاتے ہیں، قسم دوم وہ محدثین ہیں جو علم حدیث میں جدت پیدا کر کے نئی تصانیف پیش کرنا چاہتے ہیں، ان کی تمام کتابیں اس قابل نہیں کہ ان سے کوئی دینی مسئلہ اخذ کیا جائے، ان میں جو نئی روایتیں ملیں گی وہ عموماً وہی ہوں گی جن کو پہلے ائمہ نے غیر صحیح سمجھ کر چھوڑ دیا ہے، اس طرح کی بے احتیاطی نے علم حدیث کو بجائے مفید ہونے کے ایک طرح مضر بنا دیا، اس دوسرے (جدت پسند) طبقے کی تصانیف میں وہ تمام نقائص پائے جاتے ہیں، جو اہل کتاب کی روایتوں میں ہمارے علما کے نزدیک قابل اعتراض ہیں۔

ہم نے حافظ ذہبی (شمس الدین محمد بن احمد متوفی ۷۴۸ھ) اور ابن تیمیہ حرانی متوفی ۷۲۷ اور حافظ ابوالحجاج مزی (یوسف بن زکی متوفی ۷۴۲) کے زمانہ تک علما میں تنقید کا مادہ واضح طور پر

پایا ہے اس زمانہ تک پہلی صنف کے عالم (یعنی محفوظ وصحیح کی خدمت کرنے والے) دوسروں سے ممتاز چلے آئے ہیں لیکن ابن السبکی سے لیکر پھر دونوں قسم کے علما میں اختلاط پایا جاتا ہے اور یہ سلسلہ اس طرح شاہ ولی اللہ تک ممتد ہے، شاہ صاحبؒ نے پھر تمیز پیدا کردی اور محققین کے اس طریقے پر چلنے والی ایک مستقل جماعت تیار کردی اسے ہم شاہ صاحبؒ ہی کی قوت تجدید کا ایک مظہر جانتے ہیں۔

فصل (۴) صحاح ستہ کی چھٹی کتاب ابن ماجہ ہے یا موطا مالکؒ

محدثین میں عموماً مشہور ہے کہ صحاح چھ کتابیں ہیں، ان میں سے پانچ متفق علیہ ہیں، صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابی داوٗد، جامع ترمذی، سنن نسائی، ششم میں اختلاف ہے، ایک بڑی جماعت موطا مالک کو چھٹی کتاب مانتی ہے، اس جماعت کے اولین امام قاضی عیاض (بن موسیٰ مالکی متوفی ۵۴۴) ہیں انھوں نے مشارق الانوار، موطا، بخاری، مسلم کی شرح میں لکھی، اسی عہد کے دوسرے امام قاضی ابوبکر بن عربی مالکی (متوفی ۵۴۳) میں ان کے بعد اس فکر کے داعی حافظ مجدالدین بن اثیر شافعی (مبارک بن محمد مولف جامع الاصول، ونہایہ متوفی ۶۰۶) ہیں جنھوں نے جامع الاصول میں ابن ماجہ کو نظر انداز کر کے موطا مالک کو چھٹی کتاب قرار دیا۔ ان کے بعد حافظ علاء الدین مغلطائی بن قلیج حنفی (متوفی ۷۶۲) ہیں، ان کی تصریح ہے اول من صنف الصحیح مالک وقاله فی المصفی پھر ان اساتذہ کی متابعت میں محدثین کی کثیر جماعتیں پیدا ہوئیں شاہ صاحب ان میں غالباً آخری ہستی ہیں۔

دوسری جماعت نے سنن ابن ماجہ کو چھٹی کتاب قرار دیا، پہلے جس عالم نے یہ تجویز کی وہ اسماء الرجال میں تو امام تھے، مگر فقہ اور تعامل مسلمین سے قطعاً نا آشنا ہیں، پھر ان کے تتبع میں عام طور پر یہی کتاب صحاح میں شمار ہونے لگی۔

سنن ابن ماجہ کا علمی درجہ

اس کتاب (ابن ماجہ) کا علمی درجہ فقہا محققین کے نزدیک یہ ہے کہ ہر وہ حدیث جس میں وہ منفرد ہے اگر موضوع نہیں تو ضعیف ضرور ہوگی۔

یہ کتاب ہمارے اساتذہ کے یہاں بھی درس میں مروج ہے، اس کو مذکورہ بالا قسم کی غیر صحیح کتب حدیث کے مطالعہ اور سمجھنے کے لئے نمونہ بنایا جاتا ہے، مگر طالب علم ابتدا تحصیل میں ان مشکل مسائل پر غور نہیں کرتے جب ایک عالم ہمارے مشائخ کے پاس درجہ تکمیل طے کرنے لگتا ہے تب اسے ان دقائق پر متوجہ کیا جاتا ہے۔

درجہ تکمیل

ہمارے یہاں درجہ تکمیل ایک قاعدے میں ضبط شدہ طریقہ نہیں بن سکا، عام طور پر فارغ التحصیل طلبہ جب اپنے طور پر پڑھانے لگتے ہیں تو ان کو شکوک پیدا ہوتے ہیں اور وہ ان کے ازالہ کے لئے پھر اساتذہ کی خدمت میں بار بار آتے ہیں اور تدریجاً ان شبہات کا حل کرتے کرتے درجہ اطمینان تک جا پہنچتے ہیں، ہم ان کو درجہ تکمیل کا فارغ مانتے ہیں۔

میری طالب علمی اسی طرح پر ہوئی، اور میں آخر میں دیکھتا ہوں کہ میں اپنے طرز میں منفرد نہیں تھا۔ میری طرح میرے ساتھیوں میں اور حضرات بھی تحقیق کرتے کرتے انہیں مسائل پر پہنچے، جہاں میں پہنچا تھا، اس تجربہ کے بعد میں نے یہ نظریہ قائم کرلیا ہے کہ تحصیل کے بعد غیر قانونی طور پر ہمارے اساتذہ اپنی صحبت میں رہنے والے عالموں کو مکمل بنا دیتے ہیں۔

نوجوان طبقہ کے ساتھ میرا ان مسائل پر مذاکرہ ہوتا رہا، انھوں نے عام علما کی شکایت کی میں نے ان کو اس خاص طبقے (میری تکمیل کرنے والے حضرات) کا تعارف کرایا جن سے وہ مطمئن ہوگئے جن لوگوں نے اپنی ضد نہیں چھوڑی میں نے انہیں یونیورسٹیوں کے متوسط الاستعداد گریجویٹوں کی کثیر مثالوں سے لاجواب کر دیا۔

فصل (۵) صحیح وضعیف حدیثوں میں تمیز کا ملکہ پیدا کرنے کا ولی اللہی طریقہ

یہ خرابی جو عام اذہان پر مستولی ہے، اس کی تہہ میں یہ مرض پنہاں ہے کہ حدیث کے فن کو خصوصاً تصحیح اور تضعیف کو تقلیداً اخذ کیا جاتا ہے، ایک ایسا عالم جو اپنی سمجھ سے صحیح حدیثوں کو صحیح سمجھتا ہو آج پیدا ہونا متعذر ہوگیا ہے، اسماء الرجال میں توثیق وتضعیف کا اختلاف پھر صحیح حدیث کی تعریف میں مختلف آرا طالب علم میں یکسوئی سے کوئی ملکہ پیدا ہونے نہیں دیتیں، آخر مجبور ہو کر فقہا

کا جو متوارث مسلک ہے اسی میں راجح و مرجوح کی تمیز پیدا کرنے کے بعد، جو حدیث اس مسلک کے موافق ہو اسے صحیح اور جو مخالف ہو، اس کو ضعیف بنانے کی استعداد حاصل ہونے پر طالب علم اپنا سفر ختم کر دیتا ہے۔

شاہ صاحب نے پہلے اس مرض کی تشخیص میں اپنی پوری طاقت صرف کر دی، اس کے بعد مرض کے ازالہ کا پورا نصاب تیار کر کے اپنے طریقہ کی تعلیم شروع کر دی، اب ان کے طرز پر چل کر مجتہد منتسب کی طرح ایک محقق محدث پیدا ہو سکتا ہے جو ایک نئی حدیث کی تصحیح میں اگرچہ اپنے آپ کو عاجز پاتا ہوگا مگر جن احادیث کو ائمہ نے عموماً صحیح کہا ہے ان کی صحت کے وجود معلوم کرنے میں وہ کسی سے پیچھے نہیں رہے گا اس اطمینان کے بعد وہ فقہ پر نظر ثانی کرے گا جو مسائل صحیح احادیث کے مطابق پالے گا انہیں کو راجح مانے گا۔

اس طریقے کے عالم پیدا کرنے سے شاہ ولی اللہ نے سلف کے طریقے کو زندہ کر دیا جس کی مثال تیسری صدی ہجری کے بعد ملنا مشکل ہے۔

شاہ صاحب کی تحقیق میں موطا مالک کی اہمیت واقدمیت

فن حدیث میں شاہ صاحب کی تجدید اس بنیاد پر مرتکز ہے کہ صحاح ستہ میں اصح الکتب بخاری نہیں بلکہ موطا ہے بوجوہ ذیل:

(۱) موطا مالک کے اسانید کی تصحیح سمجھنا بہت آسان ہے کیونکہ ان میں عموماً ایک دو ہی راوی ہوتے ہیں جن کا اکثر حصہ علماء مدینہ سے ہے جن کو عام ائمہ مسلمین معتمد علیہ اور ثقہ مانتے ہیں اس لئے ان اسانید کا سمجھنا بہت آسان ہے۔

(۲) ادھر امام مالک کی شاگردی امام شافعی اور امام محمد ہر دو نے کی، ان ہر دو اماموں کی تنقید موطا پر موجود ہے اس سے بھی انسان کو موطا کی تصحیح میں بڑی مدد ملتی ہے۔

یہ ہر دو مجتہد امام مالک کے استنباط کی مخالفت تو کرتے ہیں مگر روایت کی تضعیف نہیں کرتے یہ چیز طالب العلم کے لئے سرمایہ توثق ہے۔

(۳) اس کے بعد ائمہ حدیث، امام بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، امام مالک کی کتاب کی

شروح لکھتے ہیں، اس حصے کو شاہ صاحب نہایت وضاحت سے موطا کی شرح میں سمجھا دیتے ہیں۔

قال الامام ولی الله فی المسوّی من تتبع مذاهبهم ورزق الانصاف من نفسه علم لامحالة ان الموطا عدة مذهب مالک واساسه، عمدة مذهب الشافعي واحمد وراسه، ومصباح مذهب ابی حنیفة وصاحبیه ونبراسه، وهذه المذاهب بالنسبة لموطا كالشروح للمتون وهو منها بمنزلة الدوحة من الغصون، وان الناس وان كانوا من فتاوی مالک فی رد وتسلیم وتنكیث وتقویم، ما صفالهم المشرب ولاتاتی لهم المذهب الا بما سعی فی ترتیبه واجتهد فی تهذیبه وقال الشافعي لذلک لیس احدا منّ علیّ فی دین الله من مالک.

علم ایضاً ان الكتب المصنفة فی السنن كصحیح مسلم وابی داؤد والنسائی وما یتعلق بالفقه من صحیح البخاری وجامع الترمذی مستخرجات علی المؤطا مطمح نظرهم فیها وصل ما ارسله، ورفع ما اوقفه واستدراک ما فاته وذكر المتابعات والشواهد لما اسنده واحاطه جوانب الكلام بذكر ماروی خلافه، وبالجمله فلا یمكن تحقیق الحق فی هذا اولا ذلک الا بالاكباب علی هذا الكتاب، انتهی

وقال فی المصفطی"

بہ یقین معلوم شد کہ طریق اجتہاد وفقہ امروز مسدود است الا از یک وجہ کہ موطا را پیش گیرند، ووصل مرسل آں، وماخذ اقوال صحابہ وتابعین بہ شناسد ونظر مجتہدانہ اختیار کند وتعقبات شافعی وغیر آں درنظر وارد، بعد ازاں جہد کند بعلم احکام الٰہی ویقین یا غائب رائے حاصل کند بدلالت دلائل بر آں مسائل

وقال ایضاً: چوں مبتدی قدر بر زبان عربی یافت موطا مالک بخوانانند، وہرگز آں را معطل نگذارند کہ اصل علم حدیث است وخواندآں فیض ہا وارده

وقال فی الحجة الطبقة الاولی. من کتب الحدیث منحصرة بالاستقراء فی ثلثة کتب الموطا و صحیح البخاری وصحیح مسلم وقدووی الموطا عن مالک بغیر واسطه الف رجل وقال الشافعی اصح الکتب بعد کتاب اللہ موطا مالک واتفق اهل الحدیث علی ان جمیع مافیه صحیح علی رای مالک ومن وافقه واما علی رای غیره فلیس فیه مرسل ولا منقطع الا وقد اتصل السندبه من طرف اخری فلا جرم انها صحیحة من هذاالوجه باب طبقات کتب الحدیث.

وقال الامام عبدالعزیز فی العجالة النافعة، ونسبت دریں ہرسہ کتب (موطا وبخاری ومسلم)

آن است کہ موطا گویا اصل وام صحیحین است ودر کمال شہرت رسیدہ، وہزار کس از علمائے عصر مالک موطا را روایت کردہ اند وعدالت وضبط رجال این کتاب مجمع علیہ است، در مکہ ومدینہ وعراق وشام ویمن ومصر مشہور شدہ وبناء فقہاء امصار براں است۔

در زمان مالک، وبعد از زمان مالک نیز علما در تخریج بر موطا وذکر متابعات وشواہد احادیث آں سعی بلیغ نمودہ اندر، ودر شرح غریب، وضبط مشکلات وبیان فقہ وسائر وجوہ بیان آں قدر اہتمام نمودند کہ زیادہ براں متصور نیست صحیح بخاری وصحیح مسلم ہر چند در بسط وکثرت احادیث دہ چند موطا باشند، لیکن طریق روایت احادیث وتمیز رجال وراہ اعتبار واستنباط از موطا آموختہ اندر، انتہی۔

(قلت) فتقدیم الموطا علی سائر کتب الحدیث والفقه، تختلف الطریقة الولی اللهیة عن عامة الفقهاء والمحدثین اختلافا جوهریاً ومن لم یتفطن بذلک لا یصح ان یعد من اتباع الامام ولی اللہ انتهی. کتاب التمهید.

پس موطا امام مالک ایسی مرکزی کتاب ہے، جس پر فقہا اور محدثین سب متفق ہیں، اب اگر اس کتاب کو اصل قرار دیکر حدیث کی باقی کتابیں پڑھی جائیں تو ان کتابوں کی صحت پر یقین

حاصل ہوسکتا ہے، میں اس طریقہ پر دو ماہ میں طالب علم کو حدیث سمجھنے کا فن سکھا تا رہا ہوں، آخر میں مکہ معظمہ رہتے ہوئے بھی حرم محترم کے علمانے مجھ سے یہ فن سیکھا۔

قرآن عظیم ہماری دانست میں اپنے موضوع کی مستقل کتاب ہے، گزشتہ فصول میں ہم نے اس کی توضیح کرنے کی سعی کی ہے، مگر آیات احکام پر عمل کرنے کے لئے ہمیں دور نبوت اور خلافت راشدہ کا طرز عمل معلوم ہونا ضروری ہے، اس کے لئے ہمیں ایک فقہ کی کتاب درکار ہے، جس میں تصریح ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نمازیوں ادا کرتے تھے، مسلمانوں سے زکوۃ اس طرح وصول کرتے تھے، بیع وشری کے معاملات اس طرح طے ہوتے تھے۔ غرض جمیع آیات احکام کی تفصیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفا راشدین کے وفاقی دور (یعنی شہادت عثمانؓ تک سے معلوم ہونی چاہئے اور یہ چیز موطا میں ملتی ہے۔

حضرت علیؓ کے زمانے میں جب باہمی جنگیں شروع ہوئیں تو حضرت علیؓ مدینہ منورہ چھوڑ کر عراق تشریف لے گئے، یعنی اہل مدینہ نے جو علم سیکھا تھا اس پر فتنہ کا کوئی اثر نہیں پڑ سکا۔

اس کے بعد بنی امیہ کے دور میں سیاسی مرکز دمشق بنا، مگر انھوں نے علمی مرکز مدینہ طیبہ ہی کو تسلیم کیا، اس سے اہل مدینہ کا توارث بہت سے مسائل کو آسانی سے حل کرنے کا سبب بنا، اور یہ توارث موطا میں ملتا ہے، السنۃ التی لا اختلاف فیھا عندنا کذا وکذا، کا جملہ امام مالک جب ارشاد کرتے ہیں تو اس سے یہی توارث مراد ہوتا ہے، جو خلافت راشدہ سے شروع ہو کر بنی امیہ کے دور تک قائم رہا۔

فقہاء سبعہ

مدینہ منورہ میں صحابہ کرام کے بعد سات فقہا پیدا ہوئے (۱) سعید بن مسیب (۲) عروہ بن الزبیر (۳) قاسم بن محمد بن ابی بکر الصدیق (۴) خارجہ بن زید بن ثابت (۵) عبید اللہ بن عبد اللہ بن مسعود (۶) سلیمان بن یسار (۷) ابوبکر بن عبد الرحمٰن بن حارث یا سالم بن عبد اللہ بن عمر یا ابوسلمہ بن عبد الرحمٰن بن عوف، تعریب مقدمہ مصفی

ان فقہا سبعہ نے اہل مدینہ کے تمام تر علم کو محفوظ کر دیا، پھر ان کے شاگردوں (امام ابن

شہاب زہری وغیرہ) سے امام مالک نے علم لیا، لہٰذا اس سے بڑھ کر دنیا میں کسی کتاب کا صحیح ملنا ناممکن ہے۔

فصل (۶) عام علما نے موطا کو اس قدر اہمیت کیوں نہیں دی

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اہل علم نے کیوں اس کتاب کو موخر کر دیا؟ اس کا جواب معلوم کرنے کے لئے اس حقیقت کا سمجھنا ضروری ہے کہ جو علوم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مسلمانوں میں محفوظ رہے ان کی چار قسمیں قرار دی جاتی ہیں۔ (الف) علم فقہ (ب) مغازی وسیر (ج) تفسیر (د) فتن وملاحم، امام بخاری کی کتاب ان ہر چہار فنون کی جامع واقع ہوئی ہے، اور اس طرح کی جامع کتاب اور اس سے بڑھ کر صحیح مجموعے کا ملنا ممکن نہیں ہے بنا بریں اہل علم سب اسی پر ٹوٹ پڑے۔

امام ولی اللہ قرآن عظیم کے معانی کو علیحدہ علیحدہ ابواب میں تقسیم کر چکے ہیں اور ان کے نزدیک ہر ایک باب ان میں سے اپنے افادے میں مستقل ہے، نہ تو کسی پہلی کتاب کا محتاج ہے اور نہ کسی بعد کے علم و عمل سے متاثر ہوتا ہے۔ البتہ فن احکام عملی طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ سمجھنے کا محتاج ہے، خیر القرون میں جس طرح قرآن شریف پر عمل کیا گیا وہ اہل مدینہ کے یہاں محفوظ تھا اور موطا اس کا ایک اچھا نصاب ہے، اس لئے قرآن کریم پڑھنے کے بعد موطا کی ضرورت بہرحال باقی رہے گی۔

شاہ صاحب کی تقسیم میں احکام کے سوا جو فنون ہیں، ان میں قرآن حکیم کسی فن (مثلاً مغازی وتفسیر اور فتن وملاحم) کا محتاج نہیں ہے، اب ایک ایسے امام کے لئے جو اسلام کو قرآن شریف میں مکمل پاتا ہو، موطا جیسی فقہ کی کتاب کے سوا کسی چیز کی ضرورت نہیں ہوگی۔

پھر شاہ صاحب کو یہ بھی معلوم ہے کہ امام احمد بن حنبل مغازی، تفسیر اور ملاحم میں صحیح روایت کا انکار کر چکے ہیں۔

وصیت شیخ الہندؒ

مجھے مولانا شیخ الہند نے دو کتابوں کے مطالعہ کی وصیت فرمائی۔

(الف) فنون حدیث میں میرا شغف دیکھا کہ تمام کتابوں کو جمع کرنے کا از حد ساعی ہوں، تو حضرت نے مجھے فرمایا کہ تمہیں صحاح سے اگر مزید کی ضرورت ہے تو مسند امام احمد کو کافی سمجھو۔

(ب) اور شرح حدیث میں فتح الباری سے تمسک کرو۔

مسند احمد

شاہ صاحب کا طریقہ سمجھنے کے بعد مجھے صحاح سے زائد متون کی حاجت محسوس نہیں ہوئی۔

(۱) مسند احمد کے متعلق افسوس ہے کہ اس میں ان کے بیٹے عبداللہ کی روایتیں ملادی گئی ہیں

(۲) اور جن روایتوں کو امام احمد نے صراحتاً غیر صحیح کہا اور مسند سے ان کو کاٹ دیا تھا کاتبوں نے وہ بھی اس میں درج کردی ہیں۔

(۳) ایک اور اتفاقی مصیبت یہ پیش آئی کہ امام احمد جب گھر میں معتکف ہو چکے تھے اس وقت ان سے مسند پڑھا گیا ہے اور امام کے بیٹے عبداللہ کے سوا اس کا اور کوئی راوی نہیں ہے اور عبداللہ بن احمد اتنا لائق اور قابل اعتماد نہیں ہے جتنا کہ اس کتاب کی روایت کے لئے ثقہ ہونا ضروری ہے۔ یہ کتاب یا تو مجمع مسلمین میں پڑھائی جاتی اور متعدد لوگ اس کے راوی ہوتے اور یا عبداللہ سے کوئی بہت بڑا فاضل اس کا راوی ہوتا۔

ان حالات کے پیش نظر مجھے ادھر توجہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی، پھر بھی میں نے اس سے استفادہ کیا اور خاص خاص عالموں کے لئے میرا یہ مطالعہ مفید ہوسکتا ہے عام طور پر اس کے ذکر کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔

فتح الباری

اس کے بعد میں نے فتح الباری سے بہت زیادہ استفادہ کیا ہے اور اس کا یہ نتیجہ تھا کہ میں صحیح بخاری کو حافظ ابن حجر سے بھی بڑھ کر اصح الکتب مانتا تھا، جن چالیس حدیثوں پر ابن حجر نے جرح کر کے لکھا کہ اس جرح کا کوئی جواب نہیں بن پڑتا، میں ان کا بھی جواب دینے کے لئے تیار تھا، مجھے یہ برا معلوم ہوتا تھا کہ طالب علم کو حدیث کی جو پہلی مرکزی کتاب پڑھائی جائے اس پر بھی اس کو اعتماد کامل نہ ہو۔

سبب الرجوع الی الموطا

میرا کافی زمانہ اسی طرح گزرا، اس کے بعد شکوک پیدا ہونا شروع ہوئے جبکہ میں نوجوان تعلیم یافتہ گروہ سے ملنے لگا تو بعض چیزیں ان کو سمجھانا میرے لئے مشکل ہوا میں نے صحیح بخاری کے ابواب میں ربط پیدا کرنے کی اسی طرح کوشش کی جس طرح ایک سورت کی آیات میں تناسب پیدا کرتا رہا میں نے ان چیزوں میں سے بعض چیزیں مولانا شیخ الہند کو سنائیں آپ نے بہت پسند کیے، میں نے اس کے لئے قواعد کلیہ ضبط کر لئے ہیں جنھیں لکھ نہیں سکا، یہ چیز میرے پاس فتح الباری سے زائد تھی۔

مگر جس قدر میری توجہ قرآن عظیم کی طرف بڑھتی گئی اور نوجوانوں کو بخاری کی بعض احادیث کا سمجھانا مشکل ہوتا گیا، اسی قدر میرے سابقہ یقین میں تزلزل پیدا ہونے لگا میں اس کا کبھی قائل نہیں ہوا کہ دینی تعلیم اگر عربی مدارس کے طلبہ کو دی جائے تو اطمینان بخش ہو اور اگر وہی تعلیم کالج کے طلبہ کو دیجائے تو اطمینان پیدا نہ کر سکے، اگر ایسا ہو تو وہ تعلیم حقیقی اسلام کی تعلیم نہیں ہوگی۔ اس لئے کہ قرآن ساری دنیا کے لئے نازل ہوا ہے، اگر کالج کے طلبہ کو ہم قرآن کی تعلیم اسی طریقے پر (جو عربی مدارس میں کامیاب ثابت ہوا) نہیں دے سکتے تو غیر مسلم لوگوں کو ہم کیا پڑھا سکتے ہیں۔

اس طرح ابن حجرؒ کی تحقیقات سے میری طبیعت غیر مطمئن ہونے لگی، رحمت الٰہی کا ایک کرشمہ سمجھنا چاہئے کہ مجھے موطا مالک کی شرح التمہید از حافظ ابن عبدالبر (یوسف ابوعمر مغربی متوفی ۴۶۳ھ) مل گئی، اس نے فتح الباری کی جگہ لے لی، میں حافظ ابن حجر کی نسبت ابن عبدالبر کو بہت بڑا محقق مانتا ہوں ادھر شاہ ولی اللہ کا زور تھا کہ موطا کو سب پر ترجیح دینا لازم ہے، اب میں اس کا قائل ہونے لگ گیا موطا میں وہ تمام مشکل حدیثیں نہیں پائی جاتیں جن کا سمجھانا نوجوانوں کے لئے بہت مشکل ہے۔

اب ان مختلف اثرات کا مجموعی نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن عظیم کے بعد میں شاہ ولی اللہ کی کتاب مسوی شرح موطا کا پڑھنا، حدیث اور فقہ کے لئے کافی سمجھتا ہوں اور یہ اسلام میں ساری دنیا کو

سکھا سکتا ہوں مسلمانوں کو ائمہ فقہا کے طریقے پر اور غیر مسلموں کو حکمت کے اصول پر۔

جہاں تک میرا حلقہ اثر رہا، میں اس میں خدا کے فضل سے کامیاب رہا ہوں اس سے مجھے شاہ ولی اللہ کی اس تجدید کی (کہ موطا اصح الکتب ہے) برائی العین قدر و قیمت نظر آنے لگی متاخرین محدثین اس چیز کی طرف قطعاً متوجہ نہیں ہیں، میں ان کی تعلیمات کو درجہ تکمیل کے لئے تو جائز قرار دیتا ہوں مگر قرآن سمجھنے کے لئے ان کی تعلیمات کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔

مولانا حمید الدین مرحوم میرے بہت پرانے دوست تھے قرآن شریف کے تناسق آیات میں ہمارا مذاق متحد تھا، اگرچہ طریقے اور پروگرام میں کسی قدر اختلاف رہا، وہ بائبل مجھ سے بدرجہا اعلیٰ جانتے تھے اور میں حدیث ان سے زیادہ جانتا تھا جب تک میں ہندوستان میں ان ملتا رہا حدیث شریف کے ماننے نہ ماننے کا جھگڑا کبھی ختم نہیں ہوا، اتفاق جس سال میں مکہ معظمہ پہنچا ہوں اسی سال وہ بھی حج کے لئے آئے، ہماری باہمی مفصل ملاقاتیں رہیں، افکار میں بے حد توافق پیدا ہوگیا تھا، مگر وہاں بھی حدیث کے ماننے نہ ماننے پر بحث شروع ہوگئی، ہم نے سختی سے ان پر انکار کیا اور کہا کہ حدیث کو ضرور ہی ماننا پڑے گا، تنگ آکر فرمانے لگے، آخر آپ ہم سے کیا چاہتے ہیں؟ میں نے کہا موطا مالک! فرمایا ہم اس کو مانتے ہیں، میں نے کہا بس آج سے ہمارا نزاع ختم ہے، ہم آپ کو صحیح بخاری ماننے کے لئے مجبور نہیں کرتے! رہا یہ کہ صحیح بخاری میں میرے اشکالات کیا ہیں، اور میں ایک یورپین نومسلم کو وہ کتاب کیوں نہیں پڑھا سکتا، ان تفاصیل پر میں مجالس عامہ میں گفتگو کرنے کا روادار نہیں، اہل علم جو تکمیل کر چکے ہیں ہیں یا تکمیل کے قریب ہیں ان سے میں مذاکرات میں سب کچھ کہہ دونگا، میں نے یوروپ کا سفر سخت انقلابی حالات میں کیا ہے، اور بحمد اللہ شاہ ولی اللہ کے طریقہ پر قرآن دانی اور موطا مالک کی فقہ کو مانتا ہوا سالم نکل آیا ہوں یہ میں شاہ صاحب کی تجدید کی بہت بڑی برکت مانتا ہوں، کاش اہل علم ادھر توجہ کریں اور نوجوان مسلمانوں کی مرکزی طاقت (یعنی عربی مدارس اور کالج کے طلبہ) سے ہونہار افراد کو جمع کر کے ایک شیرازے میں باندھ دیں۔

باب چہارم (علم فقہ)

فصل (۱) عرب اور رسول اللہ ؐ کی بعثت کا مقصد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے متعلق سورۂ جمعہ میں تصریح کر دی گئی ہیں کہ اس کے پہلے مخاطب امیین ہیں، امیین سے مراد عرب کے وہ طوائف ہیں جنھوں نے قریش کی امامت کو تسلیم کر لیا ہے، بعثت کا مقصد دوسرے موقع پر قرآن عظیم نے اس طرح واضح کیا کہ ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام نے مل کر دعا کی کہ ہماری نسل سے ایک امت مسلمہ (یعنی ابراہیمی حنفی ملت پر پیدا کی جائے اور یہ "بیت" اس کا منبع اور اس کا مرکز ہو، اس امت مسلمہ کو ایک نبی کی ضرورت ہوگی جو ملت حنیفہ کی صحیح معنوں میں تعلیم دے اور ان کو اس کے لئے تیار کرے کہ اس دین کو وہ تمام امم میں پہنچا سکیں، یعنی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت قریش کے لئے ہے (؟) قریش عربی قوموں میں مل جل کر عرب بن چکے ہیں، یہ سلسلہ اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں پہلے طبقہ سے شروع ہوا، اسماعیل کی اولاد، قبائل میں تقسیم ہوگئی ہر جگہ انھوں نے اپنا مرکز دعوت قائم کیا اور اس گروہ خاص کی امامت حاصل کر لی یہاں تک کہ تورات میں جو بارہ سرداروں کی پیشگوئی ہے، اہل کتاب اس کو اسماعیل علیہ السلام کی بلا واسطہ صلبی اولاد پر حمل کرتے ہیں، ہم ان کی تاویل کو ملت عربیہ میں حنیفیت کی اشاعت کے لئے تسلیم کرتے ہیں کہ انھیں بارہ سرداروں (یعنی حقیقی بلا واسطہ فرزندان اسماعیل) نے حنیفیت کا مرکز عرب میں پیدا کیا، بہت دیر بعد قصی نے منتشر اولاد اسماعیلؑ کو مکہ معظمہ میں جمع کر دیا، یہاں سے خاتم النبیین کی بعثت کا ارھاص شروع ہوتا ہے، یہ لوگ جماعت

قصی بن کلاب، فقط عرب کی سرداری پر اکتفا کرنا نہیں چاہتے تھے بلکہ عراق وشام تک میں تجارت کے ذریعہ اپنا رسوخ پیدا کر رہے تھے اس طرح یہ مجمع الاقوام بنا کر ان پر سرداری اور حکومت کی متمنی تھے، یہ چیزیں ان کے یہاں خاندانی روایات کے ذریعے مستقل ہوتی رہتی تھی کہ ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے ایک بہت بڑا نبی پیدا ہوگا جو ہمیں تمام اقوام کا سردار بنادیگا، بنی اسرائیل میں بھی یہی جذبہ موجود تھا اور اس معنی میں ہر دو خاندانوں کی باہمی رقابت جاری تھی۔

بنی اسرائیل پہلے تو موسیٰ علیہ السلام کے بعد کسی کو ان کے برابر ماننے کے لئے تیار نہیں ہوئے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جو کام موسیٰ علیہ السلام نے کیا ان کے نزدیک وہی ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا مصداق تھا مگر ظاہر ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی تعلیم اسرائیلی قوموں سے باہر نہیں جاسکی۔

مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام ضرور ایسے بزرگ تھے جنھوں نے اس تعلیم کو غیر اسرائیلی لوگوں میں بالفاظ دیگر صابئین یا آرین قوموں میں بھی پہنچانے کی کوشش کی، مگر ان کی مرکزیت کو اسرائیلی قوموں نے ہی قبول کرنے سے انکار کردیا، یہود عموماً مسیح علیہ السلام کی تعلیم سے کم مستفید ہوئے، اگرچہ آگے چل کر موسیٰ علیہ السلام کی تعلیم کو دنیا میں سنبھالنے والے یہی لوگ رہے جو مسیح کے حوارییّن سے مستفید ہوئے، آج ہمارے زمانے میں جس قدر تورات کی اشاعت ہے کیا یہ یہودیوں کی محنت کا نتیجہ ہے؟ ہرگز نہیں، مسیح کی تعلیم کے شائع کرنے سے پہلے عہد قدیم کا شائع کرنا ضروری تھا، اس لئے مسیحی سلطنتیں، اشاعتی جماعتیں عہد قدیم کی اشاعت کا ذریعہ بنیں۔

ان چیزوں کا اثر قریش کے اولی الرائے بزرگوں پر پڑتا رہا، وہ دیکھتے تھے کہ عیسائیوں نے بڑی بڑی سلطنتیں قائم کرلیں، مگر وہ حنفی دین کو سنبھال نہیں سکے، اس سے قریش مکہ کے مرکز میں یہ توقع قصی کے بعد مسلسل روز سے قائم رہی کہ ہم میں سے کوئی آدمی پیدا ہوگا جو اصلی مرکز پیدا کرے گا۔

جملہ معترضہ! (اجتماعیت اسلامیہ، اورانفرادیت مخترعہ)

ہمارے اہل علم ایک لمبے زمانے سے سلاطین کی انفرادی تحریکوں کا شکار ہورہے ہیں، انھوں

نے اسلام کی اجتماعی قوت کو نظر انداز کر دیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور رسالت پر اس طرح غور کیا جاتا ہے کہ ساری نسل انسانی میں خدا تعالیٰ کو منظور تھا کہ ایک اکمل انسان پیدا کرے وہ فرد فرید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس ہے، اس موضوع کی ہر عالم اپنے فن سے توضیح کرتا ہے اسی پر سیرت کی کتابیں کثرت سے لکھی گئیں۔

ہم نے جب سے یورپ کی سیاسیات کا براہِ راست مطالعہ شروع کیا، ہمیں انسانی اجتماعی تحریک کے دونوں اسکولوں (یعنی سرمایہ دار اور محنت کش) کے مطالعہ کا ایک حد تک پورا موقع ملا، آج کل کے لیڈر بین الاقوامی تحریکوں کو چلانے کے لئے مذہب سے عداوت رکھنا ضروری خیال کرتے ہیں سوشلسٹ اپنے مافی الضمیر کو چھپانے کی ضرورت نہیں جانتے؛ وہ علانیہ مذہب پر حملہ کرتے ہیں سرمایہ دار اسکول معناً ان کا ہم صفیر ہے، مگر اپنی سیاست کو چلانے کے لئے مذہبی لوگوں کو استعمال کرتا رہتا ہے اس لئے یہ لوگ علانیہ مذہب سے دشمنی نہیں خریدتے۔

ہم نے اس اجتماعی تحریک کا لادینیت سے کوئی طبعی ربط محسوس نہیں کیا، اس لئے ہم نے لادینیت کو اجتماعی تحریک سے نکال کر باہر پھینک دیا، اب اسلام میں جو ہماری واقفیت تھی وہ دیوبندی اسکول میں تعلیم پانے سے شاہ ولی اللہ کی امامت پر مرتکز تھی، شاہ صاحبؒ کی کتابوں میں ہم نے اجتماعیت کا خاص زور دیکھا اگرچہ وہ اسے نمایاں نہیں کرنا چاہتے، کیونکہ ملک کی عام حالت اس کو برداشت نہیں کرسکتی تھی، ہمارا زمانہ شاہ پرستی کو چھوڑ کر بہت آگے بڑھ چکا ہے، مجھے کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ شاہ صاحب کی طرح میں بھی اجتماعیت اسلامیہ کو نمایاں کرنے میں تامل کروں، میرے لئے زیادہ سے زیادہ یہی نقصان ہوگا کہ میرے دوستوں میں جن لوگوں نے شاہ صاحبؒ کی حکمت غور سے نہیں پڑھی وہ میری مخالفت پر ڈٹ جائیں گے، لیکن اب ہماری حالت ایسی کمزور ہو چکی ہے کہ ان کمزور طاقتوں کی رعایت کرنا کوئی ضروری امر نہیں رہا، شاہ صاحبؒ کے زمانے میں پھر بھی مسلمانوں کا ایک سرمایہ محفوظ تھا، اس کی حفاظت کے لئے وہ مصالح وقتیہ کا خیال کرتے رہے، دو سو برس کے بعد وہ سب کچھ لٹ چکا ہے کوئی ایسی چیز باقی نہیں رہی جس کی حفاظت کیلئے ہم مصلحت وقتیہ کا خیال دل میں لاسکیں اس نے شاہ صاحب کی اصل تعلیم کو

پوست کندہ، تمام اصناف انسانیت میں شائع کرنا، میں نے اپنا مقصد زندگی بنالیا ہے۔

اس فیصلے کے بعد پہلا اثر میرے افکار پر یہ آیا کہ مجھے قرآن شریف کی تفسیر پر نظر ثانی کرنا پڑی اس میں سے انفرادیت کو خارج کر کے اصول اسلامیہ کی اجتماعی روح کو قائم رکھنا، میں نے اپنے لئے ضروری قرار دیا، ورنہ میں دنیا کی اقوام کے سامنے قرآن پیش نہیں کر سکوں گا۔

اگر قرآن شریف کی تعلیم کا مرکز میرے ذہن میں یہ ہوتا کہ وہ ایک اکمل ترین انسان کے ذریعہ نازل ہوئی اس لئے دنیا کو وہ پیغام سننا چاہئے تو مجھے اندیشہ ہے کہ ہر قوم اپنے بزرگ ومقتدا کو خصوصاً مسیحی قومیں معارضے میں اکمل ثابت کرنے کی سعی کریں گی اور وہ مقصد ان مبادی کے طے کرتے کرتے قابل توجہ نہیں رہے گا۔

میں قریش کی ہستی ابراہیم واسماعیل علیہما السلام کی دعا کا پہلا نتیجہ قرار دیتا ہوں کہ ایک امت ہونی چاہئے کہ وہ امم کو ہدایت دے (ومن ذریتنا امۃ مسلمۃ لک)

پھر اس امت کی ضرورتوں کے لئے ایک فرد امام درکار ہے اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق دنیا سے بواسطہ قریش ہے اس نکتہ سے میرے بہت سے عقدے حل ہو گئے۔

میں قریش میں فردیت اور حنیفیت کا قائل نہیں رہا، اس لئے ہاشمیت، صدیقیت اور فاروقیت کے الفاظ میرے دماغ سے نکل چکے ہیں، ایک حدیث میں آیا ہے "الائمۃ من قریش" ایک اور روایت میں آیا ہے کہ بارہ سردار پیدا ہوں گے "کلھم من قریش" مگر اب انفرادیت نے ہمارے دماغ خراب کر دیئے ہیں۔

اس کے بعد سورہ بقر کی آخری آیتوں میں "لانفرق بین احد من رسلہ" سے میں یہ سمجھا کہ پہلے ہمیں تمام انبیاء اللہ پر ایمان صحیح حاصل کرنا ضروری ہے، ان میں سے ایک فرد اکمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، جماعت انبیا سے قطع کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر غور کرنا میرے نزدیک صحیح نہیں رہا۔

ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شخصی اوصاف میں اس قدر انہماک کر چکے ہیں کہ ان

کی پیدا کی ہوئی جماعت کی قدر و قیمت ہماری نظروں سے جاتی رہی، مگر قرآن شریف کا ایک اشارہ ہمارے اس تخیل کو درست کرنے کے لئے کافی ہے۔

(۱) محمد رسول اللہ کے ساتھ "والذین معہ" ملا کر آپ کی تمام کامیابی کو جماعتی کام بنا دیا گیا ہے۔

(۲) کتب حدیث میں ایک جملہ معروف ہے کہ مسلمانوں کی ایک جماعت برسر حق رہے گی، اس کی تفسیر میں حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں "ما انا علیه و اصحابی"

(۳) قرآن عظیم نے جو دعا ہمیں اسلامی عقائد پر مضبوط رہنے کے لئے سکھائی وہ سورہ فاتحہ میں مذکور ہے، وہاں "صراط مستقیم" کی تفسیر "صراط الذین انعمت علیہم" سے کی گئی اور "الذین انعم اللہ علیہم" کی تفسیر خود قرآن شریف میں انبیاء صدیقین، شہدا اور صالحین سے کی گئی ہے اس سے فی البدایہ قرآن شریف کی تعلیم کو اجتماعی سمجھنا ضروری تھا، مگر کسی بے التفاتی کا شکار ہو کر ہم انفرادیت کی دلدل میں پھنس گئے۔

قرآن اور دنیا میں انٹرنیشنل انقلاب کا پروگرام

اس کے بعد میرے دماغ پر یہ اثر پیدا ہوا کہ قرآن عظیم دنیا کی تمام اقوام میں انٹرنیشنل انقلاب کا پروگرام ہے، اسے میں نے آیت "**هو الذی ارسل رسوله بالهدی و دین الحق لیظهره علی الدین کله ولو کره المشرکون**" سے استنباط کر لیا دین ہر قوم کا علیحدہ علیحدہ رہ چکا ہے، اور قومی افکار و اعمال کا مقدس حصہ اس قوم کا دین کہلاتا ہے جب اس دین حق کو تمام ادیان پر غالب کرنا منظور ہے تو تمام اقوام میں انقلاب پیدا کرنا ضروری ہوگا۔

انقلاب کا قرآن پروگرام اور طاقت

انقلاب مذکور کی دو صورتیں ہیں، اول یہ کہ تمام ادیان پر غلبہ فقط تعلیم و تربیت کے ذریعہ سے ہو، اس طرح اگر متحقق ہوتا تو قومیں اپنی خوشی سے اس دین حق کو قبول کرتیں جب اس کے ساتھ "**ولو کره المشرکون**" کا جملہ نازل ہو چکا ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ایک مرکزی طاقت کے زور سے اس دین کا غلبہ پیدا کیا جائے گا۔ انٹرنیشنل انقلاب کا ترجمہ اس سے زیادہ اور

کچھ ہم نہیں سمجھ سکے۔

عدم تشدد کا مسلک

آج کل ہندوستان میں ایک نئی اصطلاح پیدا کی گئی ہے کہ عدم تشدد کی پابندی سے اقوام پر غلبہ حاصل کر لیا جائے گا، اور انقلاب اس نئے طریقے پر ہوگا۔

اب تک جو انقلاب کا مطلب سمجھا گیا ہے یہ اس سے مختلف چیز ہے۔

جب تک یہ تھیوری عمل میں نہ آجائے قدیم فیصلوں کو منسوخ نہیں کر سکتی، میں ذاتی طور پر عدم تشدد کی پالیسی ایک محدود زمانے کے لئے معین کر چکا ہوں، اور مجھے یہ بھی سمجھ میں آسکتا ہے کہ تاریخ میں مقدس ہستیوں نے اس پالیسی کو ایک خاص وقت کے لئے ضرور استعمال کیا ہے مگر انسانی فطرت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ محض اسی کی بنیاد پر آخر تک کامیابی کبھی بھی حاصل نہیں ہوئی۔

خیر یہ (عدم تشدد کا نظریہ) تو جملہ معترضہ میں ایک دوسرا جملہ معترضہ تھا اب ہم پھر اس مطلب (تکمیل جملہ معترضہ) پر بحث کو مکمل کرنا چاہتے ہیں۔

اگر قرآن عظیم کی تعلیم کو انٹرنیشنل انقلاب کا پروگرام مان لیا جائے تو اس کے لئے تین چیزوں کی تعیین ضروری ہے۔

(الف) اس کا آئیڈیا، (ب) اس کا پروگرام (ج) اس پروگرام کو چلانے والی سنٹرل کمیٹی

کوئی انقلابی تحریک، پارٹی پالیٹکس کے سوا کامیاب نہیں ہوتی اور ہر پارٹی پالیٹکس میں ان تین چیزوں کی تعیین ضروری ہے۔

قرآن کی انقلابی تحریک کا آئیڈیا

(۱) میں نے قرآن عظیم میں غور کر کے اس کا آئیڈیا اس آیت کو مقرر کیا ”ھو الذی ارسل رسولہ بالھدی و دین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ و لو کرہ المشرکون“

اس تحریک کو چلانے والی پارٹی یا حزب اللہ

(۲) پروگرام کے لئے پہلے حزب اللہ کی تعیین و تحدید ضروری ہے حزب اللہ اس پارٹی کا نام ہے جو قرآن عظیم کے انٹرنیشنل انقلاب کو کامیاب بنانا مقصودِ حیات قرار دیتی ہے۔

حزب اللہ کی ضروریات پر قرآن عظیم کی مختلف سورتوں میں کافی ہدایتیں دی گئی ہیں، جہاں جہاں یا ایھا الذین آمنوا ، وغیرہ سے مومنین کو خطاب کیا گیا کہ وہ کفار اور منافقین کے راستے پر نہ چلیں، بلکہ فلاں فلاں حکم کی اس اس طرح پابندی کریں۔ ان تمام مواقع کو حزب اللہ کا پروگرام سمجھنا چاہئے۔ ''یا ایھا الذین آمنوا '' کے پہلے مخاطب حزب اللہ کے افراد ہی ہوتے ہیں، اس میں مرد وعورت، عرب وعجم سب شامل ہیں۔ اس کا پہلا نمونہ ''السابقون الاولون من المھاجرین والانصار '' ہیں اور ان کے بعد ''والذین اتبعوھم باحسان '' قیامت تک کی جمیع اقوام مسلمہ کو شامل ہے اس طرح یہ پروگرام قیامت تک جاری رہے گا

سینٹرل کمیٹی کی تعیین

(۳) اب فقط مرکزی کمیٹی کا سوال باقی رہ جاتا ہے میری سمجھ میں آیت ''السابقون الاوّلون من المھاجرین والانصار '' سنٹرل کمیٹی کو معین کردیتی ہے۔

مسئلہ خلافت وامامت

اس تخئیل پر تفصیل سے بحث کرنے کا یہ موقع نہیں ہے، مگر ایک آدھ مسئلہ کی طرف اشارہ کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے، خلافت راشدہ کے دور کے بعد مسلمان دو حصوں میں تقسیم ہو گئے، اہل سنت اور شیعہ اہل بیت، ہمارے اصول پر اس اختلاف کا حل نہایت سہل ہوگا، ابوبکر صدیقؓ کی تقدیم کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ اس قدر کمالات نفیسہ کے مالک تھے کہ پوری جماعت صحابہؓ میں کوئی آدمی ان کے مقابل نظر نہیں آیا، ہمارے نزدیک مرکزی جماعت (سنٹرل کمیٹی) نے فیصلہ کیا کہ ابوبکر مقدم ہیں، اس لئے وہ واجب الاتباع تھے، اگر جماعت، علیؓ یا عثمانؓ یا عمرؓ کو مقدم کردیتی تو مسلمانوں پر انھیں کی اطاعت ضروری ہوتی، اس منصب کے لئے جس قدر اہلیت امیدواروں میں ضروری ہے، اس میں یہ ہر چہار حضرات کامل اہلیت کے مالک ہیں، مسلمانوں کو ان کے ذاتی اوصاف دیکھ کر مسئلہ خلافت میں ایک کو ترجیح دینے کا فکر پیدا ہی نہیں کرنا چاہئے تھا جس سے یہ تحزب الاختلاف پیدا ہوا، جو جماعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیم کو چلانے کے لئے چھوڑی، وہ مہاجرین اور انصار کے پہلے طبقہ میں سے ایسے لوگ تھے جن پر یہ صادق آتا ہے رضی

اللہ عنہم ورضوعنہ، یہ جملہ اس طرف مشیر ہے کہ ان کا فیصلہ خدا تعالیٰ کے یہاں پسندیدہ اور مرضی ہے، اس لئے کسی کو ان کی اطاعت سے چوں وچرا کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

بظاہر یہ مرکزی کمیٹی کی تشخیص میرا اپنا فکر ہے، مگر قرۃ العین اور ازالۃ الخفا کو غور سے پڑھئے تو آپ کو شاہ صاحبؒ کا اصلی مطمح نظر یہی آئے گا، میرا کام اس میں ان کی بات کو عام سمجھدار طبقہ تک پہنچانے کے سوا کچھ نہیں رہے گا۔

یہاں پر مذکورہ بالا معترضہ ختم ہو گیا ہے۔

فصل (۲) عجم

سورہ جمعہ میں امیین کے بعد" وآخرین منهم لما یلحقوا بهم " کا ذکر آیا ہے، اس کی تفسیر میں ایسی روایات موجود ہیں، جن سے ایرانی قوم کی طرف اشارہ نکل سکتا ہے، ایران اس زمانہ میں آرین (صابی) قوموں کا مرکز بن چکا تھا، اس سے پہلے زمانے میں ہندوستان کو یہ مرکزیت حاصل تھی، ہماری سمجھ میں "وآخرین منهم " کے مصداق میں، ایران اور ہند وما یتبعهما شامل ہونے چاہئیں، ہم اس حصہ کو قرآن حکیم کی بین الاقوامی تعلیم کا متن سمجھتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت جیسے امیین کے لئے ہے ویسے ہی اخرین کے لئے بھی ہے۔ اس اجتماعی تحریک کا پہلا مرکز قریش ہیں، ہماری دانست میں ان کی حکومت پانچ سو برس تک رہی، اس حکومت کے پہلے حصے میں وہ بارہ سردار گزر چکے ہیں، جنھوں نے قیصر وکسری کی حکومتوں کو ملا کر رومن امپائر کے رقبہ سے دو چند ممالک پر حکومت کی، اس حکومت کی اگر سیاسی فلاسفی سے تحلیل کی جائے تو وہ انسانیت کے لئے ایک نمونہ کی حکومت ہے، ولید بن عبدالملک (متوفی ۹۶ھ) کہتے ہیں کہ داؤد وسلیمان علیہما السلام کی حکومت شام میں رہی وہ نبی تھے، اس سے قطع نظر کرلو، پھر میری حکومت کا ان کی حکومت سے مقابلہ کرو اور دیکھو کوئی اندھا نہیں جس کے لئے میں نے عصا کش مقرر نہ کیا ہو، کوئی بھوکا اور بیمار نہیں ہے جس کو کھانا اور دوانہ پہنچتی ہو۔

یہ ایک عرب بادشاہ کی حکومت ہے، خلیفہ راشد کی خلافت نہیں، خلیفہ راشد کی حکومت تو گویا آئیڈیل حکومت ہے اس کی نظیر پھر مسلمان پیدا ہی نہیں کر سکے، مگر قریش کے یہ بادشاہ اور سردار بھی

اس قدر اجتماعیت کے مالک تھے وہ اگر چہ اپنے گھروں میں اور اپنے خاندان کے افراد کے لئے قیصر وکسریٰ سے بھی زیادہ شاندار زندگی مہیا کرتے ہوں اور اس کا ہم انکار نہیں کر سکتے ،مگر وہ انسانی اجتماع کو اور اس کی ضرورتوں کو نظر انداز نہیں ہونے دیتے تھے۔

انفرادی فکر والے ہمارے مورخین نے ان کے ذاتی اور شخصی نقائص کو بڑھا چڑھا کر دکھایا ہے اس لئے کہ اس مورخ کے نزدیک جس خاندان کی حکومت چاہئے ،بدقسمتی سے حکمراں خاندان اور اس کی آپس میں جنگ ہے۔

اب ہم تاریخ اس طرح پڑھنا نہیں چاہتے ، دیکھنا یہ ہے کہ ایک بادشاہ نے عام انسانیت کے لئے کیا کام کیا، اگر شاہان اسلام کے اجتماعی کام اچھے ہیں تو ان کے شخصی نقائص اور تھوڑا سا مالی تفوق ہم برداشت کر سکتے ہیں، مسلمانوں سے باہر بھی بادشاہ گزرے ہیں، ہند اور یونان میں کوئی شخص اس طرح انسانیت کا خادم نظر نہیں آتا۔

سلاطین اور علمائے کرام

ان بادشاہوں میں اعتدال پیدا کرنے والی جماعتیں ہمارے نزدیک فقہا اور صوفیہ تھے، فقہا میں سے جب ایک فقیہ کو قاضی القضاۃ بنادیا جاتا، تو بادشاہ اپنی تمام قلمرو کے قضاۃ کے فیصلوں میں (جو قاضی القضاۃ کے نائب ہوتے تھے) کسی قسم کی مداخلت نہیں کرتا تھا اس نے اسلامی انصاف کو ایک استقلالی درجہ دے دیا ہے۔

ہمیں ہندوستان کی تاریخ میں ایسی چیزیں معلوم ہیں کہ سلطان عالمگیر کے نالائق جانشینوں نے اپنے سب سے بڑے قاضی کی مجالس خاصہ میں نہایت بے توقیری کی قاضی مذکور کے بعض احباب نے اس کو شرم اور غیرت دلائی کہ تم کیوں اس درجہ تک اپنی ہتک گوارا کر لیتے ہو، قاضی کا جواب یہ تھا کہ یہ شخص میری قضا کے فیصلوں میں میرا قلم نہیں روکتا، اس لئے اس کی سلطنت میں مسلمانوں کے فائدے کے لئے اپنی ہتک گوارا کر لیتا ہوں۔

اب دیکھئے اجتماعی فکر بدلنے سے میں اس ہتک کرنے والے (سلطان محمد شاہ) کی بھی تعریف کرتا ہوں اور پہلے میں اس قاضی کی بے عزتی کو اس کا سب سے بڑا جرم قرار دیتا تھا، یہ

چیز قاضی کے فیصلوں میں دخل نہ دینا، ہارون ومہدی ومنصور کے زمانے سے ایک حقیقت واضح بن چکی ہے اور قریش کے آخری زمانے تک نہایت سختی سے اس کی پابندی کی گئی، قاضی کے فیصلے کو وہ گویا خدا تعالیٰ کا حکم سمجھ کر نہایت ادب واحترام سے دیکھتے تھے۔

سلاطین اسلام اور صوفیہ

دوسرا عنصر جس نے شاہانہ طغیان سے ان بادشاہوں کو بچایا وہ صوفیہ کا مجمع تھا، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ (متوفی ۵۶۱) بغداد میں خلفا کے سامنے، اپنی خانقاہ میں ان کے احکام پر تنقید کرتے رہے اور وہ شیر مادہ کی طرح اسے پی جاتے تھے اور یہ عرب بادشاہوں کی سنزل کا آخری دور تھا، وہ جس وقت زیادہ صلاحیت کے مالک تھے تو صوفیہ اور زہاد کی صحبت اور نصیحت کو اپنی سعادت کا ذریعہ سمجھتے تھے۔

بغداد میں خلفا عباسیہ نے ایرانیوں کو حکومت کے لئے تیار کر دیا، اور بغداد کے زوال کے بعد بخارا کی حکومتیں برسرکار آگئیں اس سے غزنی پیدا ہوئی پھر غزمین سے لاہور اور دہلی عجمیوں کے مرکز بنے،

اگر اسلام کو عربی اقوام کے لئے معین کر دیا جائے تو یہ تمام محنتیں (بغداد، بخارا، غزنی، مصر، دہلی وغیرہ کو مرکز بنانا) اسلامی اجتماع پر ایک ذبل ہوں گی، آج ہم غلط فہم عربوں کو اسی میں مبتلا دیکھتے ہیں مگر جس وقت جس نے اسلام کی اساسی حکمت، بین الاقوامیت کو قرار دیا، تو ہمارے نزدیک قرآن کے مقاصد پورا کرنے والے عرب اور پھر ان کے بعد عجم ایک ہی درجہ پر آجائیں گے یہ اسی اجتماعی فکر کا اثر ہے کہ عربوں کی انفرادیت ہماری نظروں سے غائب ہو چکی ہے وہ (عرب) اس اجتماعی تحریک کے امام ہیں، انھوں نے سب سے پہلے اس اجتماعیت کو دنیا میں کامیاب کر دکھلایا، وہ قیامت تک انسانی نسلوں کے لئے قرآن کی اجتماعیت پر عمل کرنے کے لئے نمونہ رہیں گے مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہونا چاہئے کہ ان کی مرکزی قوت کے کمزور ہونے پر اسلام ختم ہو گیا۔

ہم امیر المومنین معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کی فتوحات اور قسطنطنیہ پر ان کے حملہ کو

جس قدر عزت واحترام سے دیکھتے ہیں، سلطان محمود غزنوی (متوفی ۴۲۱ھ) کی محنتوں کی بھی ہم ویسی ہی قدر کرتے ہیں یہ ہمارے ذہن سے عربی عجمی فرق کے زائل ہونے کا ایک نمونہ ہے۔

فصل (۴) تطبیق الفقہ والحدیث

انقلابی تحریکوں میں اساسی قانون غیر متبدل ہوتا ہے، اس کے بعد اس کے چلانے والی قوم کے طبعی خصوصیات کے مطابق دوسرے درجہ کا نظام سنٹرل کمیٹی پیدا کر لیتی ہے جسے بائیلاز کہا جاتا ہے۔ بنی امیہ کے آخری دور تک اسلامی تحریک کی مرکزیت حجاز میں رہی، بنوامیہ نے دمشق کو اپنی سیاست کا مرکز بنایا، مگر اصل اجتماعیت کا مرکز مدینہ منورہ ہی رہا، عباسیوں نے مرکزیت حجاز سے بغداد میں منتقل کر لی، اس لئے خلفا عباسیہ کے تمام وزراء ایرانی ہوئے، اور جب وہ اپنی ایرانیت میں آگے بڑھتے تو خلفا کے لئے ان کے قتل کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہتا تھا، خلیفہ منصور (متوفی ۱۵۸) نے ابو مسلم خراسانی (عبدالرحمٰن بن مسلم متوفی ۱۳۷) کو قتل کیا، خلیفہ محمد مہدی (متوفی ۱۶۹) نے ابوعبیداللہ اور ابوعبداللہ کو روندا، ہارون رشید (متوفی ۱۹۳) نے برامکہ کو موت کے گھاٹ اتارا اس کے بعد خلفا کی یہ طاقت ختم ہوگئی، مامون (متوفی ۲۱۵) خود وزرا علی الخصوص فضل بن سہل (پروردہ برامکہ) کا تربیت یافتہ تھا، پھر بھی اس نے اپنے اس عربی ذی الریاستین فضل بن سہل (متوفی ۲۰۲) کو قتل کرا دیا۔

مگر عباسی خلافت ہی نے ایرانیوں کو حکمرانی سکھلائی، بعد کے خلفا ایرانی وزیروں یا ایرانی قائدوں کے اشاروں پر چلتے تھے۔

ایران اور خراسان

ہماری سمجھ میں ایران اور خراسان کے درمیان حقیقی تضاد نہیں یہ دونوں قومیں ایک ہی قوم کے شعبے ہیں۔ اس لئے ترکیت کا جو خیال معتصم کے بعد پیدا کیا جاتا ہے ہم اسے قبول نہیں کرتے یہ سب ایرانیت تھی، ترکوں کے بچے ایرانی تہذیب سے مہذب ہو کر حکومت کرتے تھے، سلطان محمود غزنوی کو دیکھ لیجئے وہ نسلا ترک ہے مگر سوائے ایرانیت کے اس کے دربار میں کوئی چیز نہیں ہے ہندوستان میں بھی جس قدر سلاطین آئے وہ عموما ترکی نسل سے تھے، مگر ہم سب کو ایرانی

مانتے ہیں، ان کی زبان، فکر، فلسفہ تمام تر ایرانی تھا، اس تہذیب سے باہر نکل کر کوئی ترک حکومت کے کسی منصب پر نہیں پہنچا۔

یہ سمجھ بھی ہمارے اس اجتماعی تاثر کا نتیجہ ہے، جیسے ہم نے قریش کی تقسیم بھلادی اسی طرح ایرانیت کے اقسام ہماری نظر سے غائب ہیں

ہم "و آخرین منھم" کی اس تفسیر کو زیادہ صحیح مانتے ہیں، جس میں ایرانیوں کی طرف اشارہ ہے۔

ایرانی اشخاص ہمارے نزدیک زیادہ قدر و قیمت نہیں رکھتے، بلکہ ہمارے نزدیک ایرانیت سے مراد ایرانی تہذیب ہے۔

حجازی اور عراقی فقہ کی تدوین

جب اسلام کی مرکزی طاقت مامون کے عہد سے ایرانیوں کے ہاتھ آئی، تو قرآن کی اساسی اجتماعی تحریک کیلئے عربی بائیلاز کے علاوہ ایرانی "بائیلاز" کی ضرورت فقہا کو محسوس ہونے لگی، ہم اسلامی فقہ کے یہ دو اسکول (حجازی، عراقی) علیحدہ علیحدہ مانتے ہیں موجودہ اصطلاحات کے رو سے فقہ کا ترجمہ بائیلاز ہے، اسلام کی اجتماعی اساسی تحریک قرآن شریف میں منضبط ہے، اور وہ غیر متبدل رہے گی، خلافت راشدہ میں عربی ذہنیت کے مطابق اس کے بائیلاز تیار ہوئے اور وہ حجازی فقہ ہے جس کا مرکز مدینہ منورہ تھا، اور امام مالکؒ نے اس کو موطا میں ضبط کر دیا ہے۔

صحابہ کرامؓ میں ائمہ فقہا خلیفہ راشد کے مشیر رہا کرتے تھے، فاروق اعظمؓ کو یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ عراق فتح کرنے کے بعد اس میں ایک نیا مرکزی شہر بسایا جائے، نیز یہ بھی محسوس ہوا کہ میرے مشیروں میں سے ایک بڑا استاذ عراق کے بائیلاز بنانے کی بنیاد رکھ دے، اس کے لئے انھوں نے عبداللہ بن مسعودؓ کو اپنی صحبت سے جدا کر کے بطور معلم عراق بھیجا، عبداللہ بن مسعودؓ کی صحبت سے عراقی فقہا تیار ہوئے، جنھوں نے ایرانی مرکزی حکومت کے لئے بائیلاز (فقہ عربی) تیار کر دیئے۔

جس طرح اہل مدینہ کے فقہا امام مالک کے ذریعہ سے زندہ رہے اسی طرح اہل عراق کے

فقہا کا علم امام ابوحنیفہؒ کے ذریعہ محفوظ رہا، امام ابوحنیفہؒ نے ایک ایسی جماعت تیار کردی کہ ایرانی حکومتوں کے تبدلات میں وہ نئی نئی ضرورت کو پورا کر سکے گی۔

بغداد کے رہنے والے ایک تمدن رکھتے ہیں جو کہ عربی اور ایرانی تمدن کا مجموعہ ہے، بغداد میں جیسے فارسی بولی جاتی تھی، اسی طرح عربی بھی استعمال ہوتی تھی زوال بغداد پر عربی بولنے والی قوموں نے قاہرہ کا رخ کیا، اور فارسی بولنے والی قومیں دہلی میں جمع ہوگئیں، ایرانیت اور عجمیت میں بغداد اور دہلی یکساں مان لئے جائیں پھر بھی ان میں زمین وآسمان کا فرق ہے بغداد سے حکومت دہلی پہنچی اس میں اس نے بخارا اور غزنی کا راستہ طے کیا ہے، بغداد اور بخارا کے تمدن میں بھی اتنا فرق موجود ہے جتنا دو قوموں میں ہوسکتا ہے، اسی طرح بخارا اور غزنی کا فرق بھی قومیت سے کم درجے کا نہیں ہے اس کے بعد لاہور اور دہلی کا نمبر آتا ہے یہاں بھی قومیتیں بدلتی جاتی ہیں۔

امام ابوحنیفہؒ کے شاگردوں کو ہارون الرشید کے زمانے میں فقہ کی امامت تفویض ہوئی، امام ابو یوسف قاضی القضاۃ تھے اور امام محمد لا کالج کے پرنسپل ان کی تعلیم اور صحبت میں اس قدر بلند مرتبہ فقہا تیار ہوئے کہ دہلی تک پہنچنے میں جس قدر تبدلات پیش آئے ان کا لحاظ رکھ کر وہ اسلامی بائیلاز تیار کرنے میں کمال رکھتے تھے انہیں کے زور پر سلاطین اپنا عدالتی قانون قوموں کو منواتے رہے۔

دہلی میں قضا کا مستقل مرکز پیدا ہوا جسے دوسرے اسلامی ممالک اس لئے نہیں جانتے کہ اس کی تاریخ فقط فارسی زبان میں مدون ہے۔

تدوین فقہ اور ہندوستان

اس مرکز سے دو دفعہ اجتماعی تحریک میں تجدید پیدا ہوئی اس اسلامی فقہ کو جو بخارا سے یہاں پہنچی تھی، ہندوستان کے مطابق کرنے کی سعی کی گئی پہلی دفعہ تغلقوں کے عہد میں فتاویٰ تاتارخانیہ تیار ہوا، دوسری بار سلطان عالمگیر (متوفی ۱۱۱۸) کے زمانے میں خود سلطان نے فتاوی عالمگیری تیار کرایا۔ اور تمام قلمرو میں اس پر عمل واجب قرار دیا سلطان کے بعد بھی نادر شاہ کے حملے تک (یعنی ۵۲-۱۱۵۱ تک) یہ قانون ہندوستان میں متبوع رہا ہے۔

یہاں تک ہم نے فقہ حنفی کو سمجھنے کے لئے چند اصول پیش کئے ہیں۔

شاہ ولی اللہ اور فقہ

اب ہم شاہ ولی اللہؒ پر آتے ہیں، شاہ صاحب نے فقہ اپنے والد شاہ عبدالرحیم سے پڑھی، اور شاہ عبدالرحیم فتاوی عالمگیری کے مصنفین میں سے ایک عالم ہیں، ہمارے زمانے میں ہندوستان کے اندر جس قدر علمی تحریکیں مرکزیت رکھتی ہیں وہ سب کی سب ایسے اساتذہ پر ختم ہوتی ہیں جو عالمگیری دور کے ممتاز فرد تھے، شیخ محبّ اللہ بہاری (متوفی ۱۱۱۹) کی کتابیں اصول اور معقول میں ہمارے یہاں کافی رائج پذیر ہیں، اور ہندوستانی طریقہ تحصیل دوسرے اسلامی ممالک میں انہیں کتابوں کی بدولت ممتاز ہوگیا ہے۔ شیخ محبّ اللہ عالمگیری دور کے نامور فاضل تھے، فاضل خان ان کا لقب اور خطاب تھا، شاہ ولی اللہؒ کی اساسی تربیت فکریہ میں ہم شاہ عبدالرحیمؒ کو مرکز مانتے ہیں۔

(الف) قرآن شریف کا ترجمہ تفسیروں سے علاحدہ انھوں نے (شاہ عبدالرحیم نے) پڑھانا شروع کیا۔

(ب) وحدت وجود کا مسئلہ صحیح طریقے سے انھوں نے تعلیم دیا۔

(ج) حکمت عملی کو اسلامی علوم میں باوقعت بنانا انہیں کے ارشاد کا نتیجہ ہے۔

یہ چیزیں شاہ ولی اللہؒ کی تعلیم میں بہت اہم مانی جاتی ہیں لہٰذا ہم شاہ صاحب کے تمام کمالات کو بھی عالمگیری دور کا ایک نتیجہ بنانا چاہتے ہیں، شاہ صاحب اپنے والد کی وفات کے بعد ۱۲ سال تک دہلی میں درس دیتے رہے، یعنی جو کچھ انھوں نے اپنے والد سے سیکھا تھا وہ ان کے دماغ میں راسخ ہوگیا اس کے بعد وہ حجاز پہنچے اور شیخ ابراہیم کردی کے شاگردوں میں سے شیخ ابوالطاہر مدنی اور شیخ حسن بن علی عجمی (متوفی ۱۱۱۲) کے شاگردوں میں سے شیخ تاج الدین قلعی صحبتوں میں سے مستفید ہوئے شیخ ابوالطاہر شافعی تھے اور شیخ تاج الدین حنفی۔ شاہ ولی اللہ نے حجاز جا کر حنفیہ اور شافعیہ کو ایک درجے پر مان لیا۔

پہلے ہم ذکر کر چکے ہیں کہ امام مالک فقہ کے جامع ہیں ان کی شاگردی کے بعد امام شافعی نے حجازی فقہ کو عراقی فقہ کا مقابل بنا دیا امام شافعی کی فقہ کی خصوصیات پر اس موقعے پر ہم بحث کرنا

نہیں چاہتے۔ مگر اتنا بتلا دینا ضروری ہے کہ شاہ ولی اللہؒ نے جس قدر صوفیہ اور محدثین حجاز میں دیکھے وہ اکثر شافعی تھے۔

ادھر شاہ صاحبؒ یہ بھی جانتے ہیں کہ سلاطین عثمانیہ، سلاطین دہلی کی طرح حنفی ہیں، بنا بریں وہ اس چیز کو پسند نہیں کرتے کہ شافعیت اور حنفیت کے اختلافات پر زیادہ توجہ کریں۔ وہ اسلام کی بین الاقوامی سیاست میں جیسے عرب اور عجم کو مستقل مانتے ہیں (ہر دو نے سیاست اسلامیہ کے فرض کو ادا کیا) اسی طرح فقہ شافعیہ کو عرب کی جگہ اور فقہ حنفیہ کو عجم کی جگہ مانتے ہیں کیونکہ فقہ حنفی عجمیوں نے پیدا کی اور یہ ان کے مذاق کے عین مطابق ہے۔

اب شاہ صاحبؒ کی تجدید اور تحقیق یہ ہے کہ وہ فقہ کے ہر دو طریقوں کو امام مالک سے استنباط کرتے ہیں یعنی انھوں نے دو طریقوں میں ایک امر مشترک پیدا کر دیا ہے: حجازیوں میں بھی امام شافعی اہل مدینہ کی روایتوں کو مقدم مانتے ہیں اس لئے کہ انھوں نے ابتدا میں اہل مکہ سے پڑھا۔ بعدازاں امام مالک کی کتاب پڑھ کر فقہ میں ترمیم کر لی۔

اسی طرح عراقی علما میں سے امام محمد نے پہلے عراقی فقہ کی روایتیں پڑھیں اس کے بعد امام مالک سے موطا پڑھ کر عراقی تفقہ میں ترمیم کر لی۔

اس طرح فقہ حنفی اور فقہ شافعی تو مقابل بن گئیں مگر موطا امام مالک ان میں امر مشترک رہا، شاہ ولی اللہؒ یہ امر مشترک واضح طور پر دنیائے اسلام کو سمجھانا چاہتے ہیں، اس کا نتیجہ ہوگا کہ حنفی شافعی تخاصم ختم ہو جائے گا۔

شاہ ولی اللہؒ نے حجاز پہنچ کر اسناد کے سمجھنے میں تفقہ پیدا کی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حدیث کی پانچ کتابوں میں آپ نے موطا مالک کو اصل قرار دیا، صحیحین اور سنن موطا کی متابعات وشواہد ذکر کرنے والی کتابیں بنیں، اس طریق تفقہ سے شاہ صاحب کے شاگرد احادیث صحیحہ کو اپنے اجتہاد سے صحیح مان سکتے ہیں۔

جس طرح فقہا نے مجتہد منتسب کا درجہ مجتہد مستقل کے ساتھ مان رکھا ہے اگرچہ مجتہد مستقل پیدا ہونے ایک زمانے سے ختم ہو گئے مگر مجتہد منتسب ہمیشہ پیدا ہوتے رہتے ہیں، اور انہیں کے

ذریعے سے فقہ کی تجدید اور تحقیق قائم ہے، اسی طرح شاہ صاحب نے ائمہ محدثین کو مجتہد مستقل کا درجہ دیا اور مجتہد منتسب تیار کرنے کا راستہ موطا مالک کو مقدم مان کر تیار کر دیا۔ اب شاہ صاحب کے اتباع میں سے جو محقق عالم پیدا ہوں گے وہ صحیحین اور سنن ابی داؤد اور ترمذی میں سے صحیح حدیثیں نکالنے پر خود قادر ہوں گے، وہ مذکورہ بالا کتب حدیث کو اسی لئے صحیح نہیں مانتے کہ ان کے مصنف بہت بڑے عالم تھے بلکہ وہ اپنی ذاتی تحقیق اور اجتہاد سے ان ائمہ کی تصحیح کو قبول کرتے ہیں۔

علم کے اس مرتبے کی تعیین اور تعلیم کے بعد علم فقہ میں شاہ صاحب کا یہ مسلک قرار پایا کہ صحاح ستہ میں جو حدیثیں صحیح ہیں ان کے موافق جو فقہی عالم فتوے دیتا ہے اسی کو ترجیح دی جائے خواہ شافعی ہو یا حنفی

حجاز پہنچ کر شاہ صاحب کا فقہی مسلک

یہ پہلا درجہ ہے، ان کی فقہی تحقیق کا جو حجاز میں رہ کر انہیں سمجھ میں آئی، وہ عام علما کی طرح اس بات کو قبول نہیں کر سکتے تھے کہ فقط فقہ حنفی تمام مسلمانوں کو ایک نقطہ پر جمع کرنے کے لئے کافی ہے، اس لئے کہ عربی بولنے والے ممالک عموماً شافعی اور مالکی مذہب رکھتے ہیں، پھر اگر وہ لوگ سلطنت عثمانیہ کے مرکز سے دور ہیں تو وہ فقہ حنفی بہت کم جانتے ہیں مصر اور مغرب اس کی مثالیں ہیں اب شاہ صاحب کا فیصلہ یہ ہوا کہ حنفی، شافعی کو مساوی درجہ پر رکھا جائے اور موطا مالک کو اصل بنا کر کتب حدیث میں جو معروف اور اکثریت کی زیر عمل روایتیں ہیں (یعنی شواذ اور غرائب کو چھوڑ دیا جائے) ان کو انتخاب کر لیا جائے، اس کے مطابق اگر حنفی روایت ہے تو اس کو ترجیح دو، اگر شافعی ہے تو وہ راجح ہے، اگر اس فقہ کو اسلامی مرکز میں قائم کر دیا جائے تو مسلمانوں کا ایک نقطہ پر جمع ہو جانا آسان ہو جائے گا۔

مرکز کی تلاش اور پھر حنفی فقہ کی طرف رجوع

شاہ صاحب پہلے یہی فکر رکھتے تھے کہ شاید ان کا عمل تجدید حجاز میں مستقر ہوگا اور تمام دنیائے اسلام اس کو قبول کر لے گی مگر حجاز میں جا کر حالات کا پورا تتبع کرنے کے بعد، ان کی رائے بدل گئی، اس کی طرف تفہیمات الٰہیہ میں اشارہ موجود ہے۔

ہند میں فقہ حنفی اور شاہ ولی اللہؒ

اس کے بعد وہ دہلی آئے اور اسی کو مرکز بنالیا، دہلی کے مرکز میں فقہ شافعی کی مطلقاً ضرورت نہیں تھی، ہندوستان جب سے فتح ہوا اس میں حنفی فقہ برسر اقتدار رہی، ہم ہندوستان میں اس لئے فقہ حنفی کے خصوصی واجب ہونے کا فتویٰ دیتے ہیں کہ شروع اسلام سے یہاں سوائے فقہ حنفی کے اور کوئی فقہ معلوم ہی نہیں ہوتی، ایران کے اثر سے شیعہ کی حکومت یہاں قائم ہوئی، مگر وہ اسکول ہی علیحدہ ہے، اس سے ہماری بحث نہیں، مسلمانان ہند کی اکثریت حنفی مذہب کی پابند ہے، ہند میں جب اسلام آیا تو یہاں کے ایک بڑے حصے نے اس کو اجنبی سمجھا، مگر کافی زمانے کے تامل وتعاون اور بڑی بڑی سلطنتوں اور بڑے حکما اور صوفیہ کی محنتوں سے ہندوستانی قوم نے اسلام کو اپنی چیز بنالیا، یہ اسلام ان کے قلوب واذہان میں حنفی صورت میں آیا، اس لئے حنفیت ہندوستانی قوم کا قومی مذہب ہے، اب یہاں کوئی مصلح ومجدد اس طرح کبھی کام نہیں کرے گا کہ جہاں حنفیت کی رعایت ممکن ہو وہاں بھی اس کی پرواہ نہ کرے، اس مذہب نے ہندوستان میں اتنا توسع پیدا کرلیا ہے کہ ہر محقق کے لئے حنفیت سے باہر جانے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی، اس کو شاہ صاحب نے ''فیوض الحرمین'' میں ضبط کردیا ہے اور کئی بار لکھا ہے کہ مجھے حکم دیا گیا کہ لاتخالف عوام بلادک اسی بنا پر ہم نے شاہ صاحب سے تعلق رکھنے والے ایسے لوگوں کو جو حنفی بننا نہیں چاہتے، ہندوستانیت سے خارج کردیا ہے، انہیں کوئی حق نہیں ہے کہ ہندوستانی معاملات میں دخل دیں۔

پھر ان میں بھی دو قسم کے عالم ہیں (۱) جن لوگوں کو شاہ صاحبؒ کے اتباع میں سے حنفی مذہب پر پورا اعتماد نہیں رہا، ان میں سے بعض نے شافعی مذہب اور بعض نے حنبلی مذہب اختیار کرلیا اس کی چند نظیریں شاہ عبدالعزیز اور شاہ اسحٰق (متوفی ۱۲۶۲) کے شاگردوں میں پائی جاتی ہیں، یہ لوگ ہندوستانی بن سکتے ہیں، کیونکہ ان کو حنفیت سے مخاصمت نہیں مرکز اسلام میں یہ چاروں مذہب اسلام کے مساوی شارح سمجھے جاتے ہیں ایک حنفی کسی شافعی یا حنبلی سے عناد نہیں رکھتا۔

(۲) مگر ایسے عالم جن کو حنفیت پر اعتماد نہ ہو اور وہ مذاہب اربعہ میں سے کسی مذہب کے پابند ہوکر نہ رہ سکیں، ان سے شاہ ولی اللہ نے تبری کی ہے ان کو اپنے سلسلہ میں منتسب ہونے کی

اجازت نہیں دیتے، اس لئے ہم ایسے انسانوں کو اپنی تحریک کا قیم کبھی نہیں مان سکتے، یہ اصلی دیوبندیت ہے، شاہ صاحب کے علوم سے تباعد کرنا دیوبندیت نہیں ہے۔

حنفیت میں شاہ صاحب کی الہامی تجدید

ہندوستان کے لئے شاہ صاحب کو ایک نئی چیز الہام ہوئی، فیوض الحرمین میں فرماتے ہیں:

عرفني رسول الله صلى الله عليه وسلم ان في المذهب الحنفي طريقة انيفة هي اوفق الطرق بالسنة المعروفة التي جمعت ونقحت في زمان البخاري واصحابه وذلك ان يوخذ من اقوال الثلاثة قول اقربهم بها في المسئلة، ثم بعد ذلك يتبع اختيارات الفقهاء الحنفيين الذين كانوا من علماء الحديث، فرب شي سكت عنه الثلثة في الاصول وما تعرضوا لنفيه ودلت الاحاديث عليه فليس بد من اثباته والكل مذهب حنفي.

دوسری جگہ میں لکھتے ہیں: **ثم كشف لي انموذ جاظهر لي منه كيفية تطبيق السنة بفقه الحنفية من الاخذ بقول احد الثلثة وتخصيص عموماتهم والوقوف على مقاصدهم والاقتصار على ما يفهم من لفظ السنة وليس فيه تاويل بعيد ولا ضرب بعض الاحاديث بعضاً والا رفضا لحديث صحيح بقول احد من الامة، وهذه الطريقة ان اتمها الله واكملها فهي الكبريت الاحمر والاكسير الاعظم فيوض الحرمين.** ص۶۲

اس طریقہ سے شاہ صاحب نے حنفی فقہ میں تجدید کردی، اب ان کی رائے یہ ہے کہ جس قدر احادیث صحیحہ موجود ہیں، ان کے موافق فقہا حنفیہ میں سے کسی نہ کسی کا فتویٰ ضرور ملتا ہے اس لئے فقہ شافعی کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی، ایک حنفی جبکہ وہ حدیث میں تحقیق کے درجے پر پہنچ جائے اور اپنی تصحیح شدہ حدیثوں کے موافق فقہ حنفی میں سے روایات منتخب کرے، تو وہ فقہ واجب الاتباع ہوگی، شاہ عبدالعزیزؒ اس فقہ کے امام ہیں۔

شاہ صاحب بحیثیت مجتہد منتسب

ہم شاہ ولی اللہ کو حنفی اور شافعی ہر دو مذہبوں میں مجتہد منتسب مانتے ہیں جب وہ اپنے آپ کو مرکز اسلام (حجاز) میں تصور کرتے ہیں تو فقہ حنفی اور شافعی میں سے کسی ایک کو ترجیح دینا جائز سمجھتے ہیں اور جب وہ خود کو ہندوستان میں فرض کرتے ہیں تو اپنے والد کے طریقہ پر فقط حنفی کے مجتہد منتسب امام ہوتے ہیں اس کے متعلق فیوض الحرمین میں ایک تصریح موجود ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، فرماتے ہیں "نفخ فیّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نفخۃ فبین ان مراد الحق فیک ان یجمع شملا من الامۃ المرحومۃ بک فایاک وما قیل ان الصدیق لایکون صدیقا حتی یقول لہ الف صدیق انہ زندیق وایاک ان نخالف القوم فی الفروع فانہ منافضۃ لمراد الحق، ثم کشف لی نموذجا الی قولہ الاکسیر الاعظم"۔

امام عبدالعزیز دہلوی

امام عبدالعزیز شاہ ولی اللہ کی وفات پر نوعمر تھے، شاہ صاحب کے شاگردوں سے انھوں نے اپنی تکمیل کی، شاہ عبدالعزیز کے خسر شیخ مولوی نوراللہ بڈھانوی شاہ ولی اللہ کے خواص اصحاب میں سے تھے وہ فقہ حنفی کی تحقیق کا طریقہ شاہ صاحب سے سیکھ چکے تھے، شاہ عبدالعزیز نے ان سے اپنی تکمیل کر لی اور پھر اس طریقے پر ہندوستان میں شاہ صاحب کے علوم کو کامیاب بنانے والی جماعت تیار کرنے میں مصروف ہو گئے۔

شاہ عبدالعزیزؒ کے زمانے میں سیاسی تنزل انتہا تک پہنچ چکا تھا، سلاطین دہلی کے بالمقابل قوت (انگریز) بہت متیقظ اور چابک تھی، ان کی کڑی نگاہوں کے زیر اثر شاہ عبدالعزیزؒ کو کام کرنا پڑا، اس لئے ان کا تمرکز نمایاں نہیں ہے، اور ان کو تھوڑا سا کام کرنے میں لمبا وقت خرچ کرنا پڑا پھر بھی اوّل درجے کے کامیاب علما میں شمار کئے جائیں گے، انھوں نے شاہ صاحب کے نظریہ انقلاب کو کامیاب بنانے والی مرکزی جماعت پیدا کر دی (قلت هم الارکان الاربعۃ للنهضه الهندیۃ الامیر الشهید السید احمد البریلوی، الصدر السعید مولانا

عبدالحی الدھلوی، والصدر الشھید مولانا محمد اسماعیل الدھلوی، والصدر الحمید مولانا محمد اسحاق الدھلوی) اسے ہم شاہ ولی اللہؒ کی فقہ کی تجدید مانتے ہیں۔

مشائخ دیوبند

ہمارے اساتذہ دیوبند شاہ عبدالعزیز کے شاگردوں کے شاگرد ہیں ہم نے ان کا طریق نہایت تحقیق سے حاصل کیا، ہم افغانستان اور ترکی میں رہے ہمیں فقہا حنفیہ میں اپنے مشائخ سے بہتر عالم کہیں نظر نہیں آئے، اس کے بعد ہم حجاز میں رہے، جہاں حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی موجود ہیں اور حنابلہ کی حکومت ہے، اتفاقاً وہاں حنیفہ کو اچھی نگاہوں سے نہیں دیکھا جاتا، مگر ہم نے جب اپنا تعارف شاہ ولی اللہؒ کے طریقے پر کرایا تو علما حرمین کو ہمارے مسلک سے کوئی خصومت نہ رہی ہمارے حالات ایسے نہیں تھے کہ ہم اپنے مسلک کی عمومی تعلیم کا انتظام کر سکتے، مگر خواص علما نے شاہ صاحب کا طریقہ (تحقیق حدیث اور تحقیق فقہ) ہم سے خصوصی طور پر اخذ کیا، اسے ہم شاہ صاحب کے طریقے کے بہت بڑی کامیابی سمجھتے ہیں، ہم جانتے ہیں کہ ہندوستان کے لوگ شاہ صاحب کے طریقے کو عام طور پر اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے مگر اس کا سبب ایک سیاسی مقابلہ ہے جس پر ہم یہاں بحث کرنا نہیں چاہتے۔

باب پنجم (تصوف وفلسفہ)

(الف ا) عام طور پر متصوفین مبادی اخلاق سے اپنا مسئلہ شروع کرتے ہیں انسان کے بدن میں تین عضو ہیں جنھیں علمائے طب اعضائے رئیسہ کہتے ہیں، دماغ، قلب، کبد، ان اعضا رئیسہ کی مرکزی قوتوں کو لطیفہ عقل قلب ونفس کہتے ہیں، پھر ان کی ترکیب وتحلیل سے مختلف حالات اور مقامات پیدا ہوتے ہیں جن سے متصوفین اپنی کتب میں پورے بسط سے بحث کرتے ہیں۔

(الف۲) شاہ ولی اللہ ان لطائف ثلثہ سے پہلے ایک لطیفہ جوارح بھی تجویز کرتے ہیں، ان کی عبارت ''الطاف القدس'' میں سے بعینہا نقل کی جاتی ہے۔

> در ظاہر شرع کہ مسمّیٰ باسلام است مبحوث عنہ لطیفہ جوارح است، وتحقیق این لطیفہ آں ست کہ قلب وعقل ونفس بہ اعتبار تقویم جوارح، وآلہ بودن برائے تکمیل افعال جوارح وفنا در جوارح مسمے بہ لطیفہ جوارح می گردد، وبرائے تفہیم ایں لطیفہ بریں فقیر شترے ظاہر ساختند، کہ مشرف بر موت بود، غیر از رمقے از حیات با او باقی نماندہ وجمیع لطائف ثلثہ بازرہ او ضعیف گشتہ، اما اورا در قطارے بستہ بودند، واو غیر از رفتن قوتے نداشت، پس تا اخر اترہاق روح راہ مے رفت، بعد ازاں بمرد، از رفتن باز ماندنش ہماں ومردنش ہماں، دریں حال آگاہانیدند کہ ایں شتر فانی است در لطیفہ جوارح ومواخذہ اعمال شرائع برہمیں لطیفہ است۔ ص ۲۹، ۳۰

(ب ا) متصوفین کو کہنا پڑتا ہے کہ تعلیم شریعت ایک خاص نصاب رکھتی ہے اور تصوف

وطریقت اس کے ماوراء دوسری چیز ہے اور پھر یہ بھی ساتھ ہی کہنا پڑتا ہے کہ یہ تصوف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں رائج نہ تھا، اس کا سبب یہ بتاتے ہیں کہ حضور کی صحبت میں اتنا نور اور برکت تھی کہ اس علم کی طرف احتیاج ثابت نہیں ہوسکی۔

(ا) ہمیں اس قسم کی فکر میں ایک بین نقص نظر آتا ہے، گویا تعلیم فقہ علیحدہ چیز ہے، اور تصوف اس سے ایک جداگانہ غیر ضروری امر ہے یعنی جس کا جی چاہے اسے (تصوف کو) اخذ کرے اور اس کی مرضی نہ ہو اس سے سروکار نہ رکھے۔

(۲) پھر آگے چل کر ہم نے دیکھا کہ ایمان بالدار الآخرۃ ان متصوفین کی صحبت ہی میں مکمل ہوتا ہے اور یہ بھی واضح ہے کہ قرآن عظیم ایمان باللہ کو جس کے ساتھ ایمان بالیوم الاخر نہ ہو قابل اعتماد نہیں مانتا، اس سے ہماری طبیعت میں تشویش پیدا ہوئی کہ جو چیز ایمان بالیوم الآخر پر یقین دلاتی ہے، اس کو کمزور کیوں کردیا گیا۔

(ب۲) شاہ صاحب کی اس حکمت کو پڑھ لینے کے بعد ہمارا اطمینان ہوا، ہم انسانی زندگی کو وحدت غیر منقسم مانتے ہیں، دنیاوی زندگی اور اخروی زندگی دو متبائن چیزیں نہیں ہیں بلکہ ایک ہی سیر کے مختلف منازل ہیں۔

شاہ صاحب کے لطیفہ جوارح کا مطلب یہ ہے کہ لطائف ثلاثہ بارزہ دو رخ رکھتے ہیں، ایک جوارح کی طرف اس کی تکمیل کا ہونا شریعت ہے دوسرا رخ اپنے منبع کی طرف اس کی تکمیل تصوف، طریقت، فلسفہ کہلائے گی، ہر انسان ایک ہی جبلت لے کر نہیں آتا، بعض چیزیں ایک شخص کو شروع زندگی میں سمجھ میں آجاتی ہیں مگر دوسرے کو کافی زمانہ گزرنے پر ان کا علم حاصل ہوتا ہے اسی طرح یہ ہوسکتا ہے کہ ایک انسان اپنی انانیت کا مصداق بدن کو سمجھے اور اس کا فہم لطیفہ جوارح سے آگے نہ بڑھ سکے جیسے عامۃ الناس کی حالت ہے اور دوسرا انسان جوذکی ہے وہ اپنے افعال جوارح کو عقل، اخلاق اور طبیعت کے اقتضا میں تقسیم کرلیتا ہے وہ انسانیت کے لئے ایک مرکزیت پیدا کرسکتا ہے۔

اس طرح پر شریعت اور طریقت دو چیزیں نہیں ہوں گی بلکہ ایک چیز کے دو رنگ یا ایک

درخت کے دو ثمر ہیں، ایک پہلا ایک دوسرا، اس طریق پر حیات کی وحدت بھی قائم رہے گی، اور انسانیت میں اختلاف مدارج بھی معقول رہے گا۔

''الطاف القدس'' میں پہلا باب لطیفہ جوارح پر بحث کرنے کے لئے معین ہے، دوسرے باب میں لطائف ثلثہ کے دوسرے پہلو پر بحث ہے، تیسرے باب میں عقل اور قلب کے پہلے بطن پر بحث ہے چوتھے میں عقل اور قلب کے بطن البطن پر بحث ہے آخری درجہ پر پہنچ کر انسان کو اس تجلی سے ربط پیدا ہوتا ہے جو کائنات کی مرکزی قوت کے آئینہ میں ظاہر ہوئی۔

یہ مباحث مستقل توجہ سے پڑھنے کے قابل ہیں، اس وقت ان پر تفصیل سے بحث کرنا مقصود نہیں۔

تجلی الٰہی کی تشریح سمجھنے کے لئے کتاب سطعات کا پڑھنا لازم ہے اور ادراک انسانی کے تنوع کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے ''الطاف القدس'' کا مطالعہ کرنا ضروری ہے اور اسلام میں تصوف کا فلسفہ تاریخ سمجھنے کے لئے ہمعات کا مطالعہ کرنا چاہئے اور متصوفین کے طریق کی تفصیل ''انتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ'' میں دیکھنی چاہئے، شاہ صاحب نے اپنے والد ماجد سے جس طرح طریقہ حاصل کیا، اس کی تفصیل قول جمیل میں ملے گی، شاہ صاحب کے والد اور چچا کے سوانح حیات جن کو شاہ صاحب کے فلسفہ اور تصوف کی روح کہنا چاہئے ''انفاس العارفین'' میں مذکور ہیں، اس کتاب کے بعد اگر ''اخبار الاخیار'' از شیخ عبدالحق دہلوی اور ''نفحات الانس'' از مولانا جامی کا مطالعہ کیا جائے تو اسلام میں تصوف کی پوری تاریخ سامنے آجائے گی۔

فصل (۲) عجمی اقوام اور فلسفہ اشراق

جیسے ہم نے امام ابوحنیفہ کی فقہ کو ایرانی تہذیب کے مفتوح ہونے کے بعد اسلام کا ایک ضروری جز قرار دیا ہے، اسی طرح ایرانی مسلم کی طبیعت نے جب اپنا پرانا فلسفہ اسلامی رنگ میں لیا تو اس کا نام تصوف ہوا۔

آرین قوموں میں تہذیب کے دو عنصر ہیں (۱) ایک کسی مجتہد کا قانون فقہ جیسے منو جی کا دھرم شاستر، (۲) دوسرا اشراقی فلسفہ، یہ چیز ہند میں بھی تھی، اس کے علاوہ ایران اور یونان میں موجود

تھی، آرین تہذیب کے یہ تینوں مرکز ایک ہی طرح کا فکر رکھتے ہیں، ایران جب مسلمان ہوا تو ان کے مشائی فلاسفروں نے علم کلام پیدا کیا اور ان کے اشراقی حکما نے تصوف مدون کیا یہ چیزیں (مشائیت اور اشراقیت) ان اقوام کی ذہنیت کے لوازم میں سے ہیں۔

جب ان میں شہنشاہی پیدا ہوئی تب کہیں انہیں قانون ضابطہ کی ضرورت کا احساس ہوا، اس کا نتیجہ یہ قانون (لا، فقہ) ہے جو یونان، ایران، ہند سب میں مکتوب اور غیر مکتوب شکل میں پایا جاتا ہے جب یہ قومیں مسلمان ہوئیں تو اسلام کی تعلیم کا وہ حصہ جو جوارح کی تہذیب سے متعلق تھا، انھوں نے قانونی شکل میں مرتب کر لیا، اسی کا نام امام ائمہ ابوحنیفہ کی فقہ ہے، (۲) اس کے بعد تہذیب کا جو حصہ لطیفہ عقل کے ظاہر سے تعلق رکھتا ہے، اس کا نام فلسفہ مشائیت یا علم کلام ہے (۳) اور جو حصہ عقل کے بطن سے متعلق ہے اس کا نام حکمت یا فلسفہ اشراقیت ہے۔

اسلام نے بغداد کے مرکز میں جب ایرانیت پر پورا قبضہ کیا اور اس کو ابھار کر اسلام کی خدمت کے لئے تیار کیا، تو اسی مرکز سے تصوف پیدا ہوا اور اسی طرح فقہ حنفی بھی عراق ہی سے نکلی۔

ہند میں اسلام ایران کے راستہ سے آیا لہٰذا یہاں فقہ حنفی آئی اور تصوف بھی آیا، بنابریں ہند میں اسلام کی عظمت قائم کرنے والا کوئی محقق نہ فقہ حنفی سے قطع نظر کر سکتا ہے اور نہ تصوف سے بے نیاز ہو سکتا ہے۔

ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں کہ ترکی تحریک ایرانیت سے علیحدہ چیز نہیں ہے، ترک ایرانی تہذیب کے حامل ہو کر حاکم ہوتے رہے، اس لئے دہلی اور استنبول میں وہی تصوف رائج ہوا، جو بغداد میں پیدا ہوا تھا، ہمیشہ مختلف استعدادات کے اثر سے اس (تصوف) کی ظاہری شکل بدلتی رہے گی، مگر معنوں میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔

آرین قوموں کو حنفی طریقے پر نبوت کا قائل بنانا اس پر موقوف ہے کہ ان کے تصوف کی آخر تک اس طرح اصلاح کر دی جائے کہ وہ نبوت کے سمجھنے کا آلہ بن سکے۔

فصل (۳) آرین اقوام کو ساعی نبوت سمجھانے کا ولی اللہی طریقہ

(ج) فلاسفر، الٰہیات میں واجب الوجود کو بالاتفاق مانتے ہیں، مگر انسانی حواس کا اس سے

تعلق پیدا ہونا ناممکن سمجھتے ہیں، بخیال ان کے وہ جسمانیت سے اتنا مجرد ہے کہ انسانی حواس اس کو کسی طرح ادراک نہیں کر سکتے۔

اب دوسری طرف انبیا علیہم السلام کی تعلیمات کو لیجئے وہ واجب الوجود کا جونسا نام سکھائیں جیسے اللہ، لاھوت، لاہ یا ان کے ہم معنی کوئی اور لفظ اس ذات سے دیکھنے اور سننے کا تعلق ضرور پیدا کرتے ہیں، نبوت کا مطلب ہی یہی ہے کہ اس کے حامل نے خدا کی کوئی بات سنی اور وہ اپنے اتباع کو یقین دلاتے ہیں کہ اگر ان کے طریقے پر کوئی شخص تکمیل کرے تو وہ اللہ تعالیٰ کو دیکھے گا جس وقت تک اس مسئلہ کا حل اور اس اختلاف کی تطبیق آرین قوموں کو نہ سمجھائی جائے وہ اپنی طبیعت سے اسے قبول کرنے کو تیار نہیں ہو سکتے۔

(ج) شاہ صاحب کے تصوف میں یہی کمال ہے وہ تجلی الٰہی کا مسئلہ اس طرح سمجھاتے ہیں جس کی ایک طرف تو واجب الوجود سے من وجہ عینیت کی نسبت رکھتی ہے یعنی اس تجلی سے تعلق رکھنے پر کہا جا سکتا ہے کہ ہم اللہ تک پہنچیں گے۔

اور دوسری طرف تجلی اپنے مظہر کے رنگ میں اس طرح رنگین ہو جاتی ہے کہ انسانی عقل اور حواس باطنہ کا بطن اس تعلق پیدا کر سکتا ہے اور اس کے بعد یہ کہنا صحیح ہوتا ہے کہ میں نے خدا تعالیٰ کو دیکھا یا اس کی بات سنی۔

اس طرح کی تطبیق کے بعد آرین فلاسفی (حکمت) اور سامی نبوت میں اختلاف رفع ہو جائے گا۔

ہم نے جب سے عقلمندوں کو اسلام کی تبلیغ کرنا مقصد حیات بنایا، وہ خواہ مسلم ہوں یا غیر مسلم تو ہمیں اس تحقیق کی از حد ضرورت ہوئی، ہم نے نوجوان تعلیم یافتہ کو اس ضرورت پر متنبہ کرنے کے بعد شاہ صاحب کی تصوف کی کتابیں پڑھائیں، تو وہ اس علم کی ویسے ہی ضرورت محسوس کرنے لگے جیسے ایک عامی مسلمان جب نماز کی پابندی کا ارادہ کرے تو کسی فقہ کے سیکھنے کی ضروری سمجھتا ہے۔

فصل (۴) شاہ صاحب کی نظر میں تصوف کی اہمیت اور ضرورت

یہاں ہم شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی ایک عبارت نقل کر کے ان کے مسلک کو واضح کر دیتے ہیں

کہ وہ اس تصوف کی کتنی اہمیت مانتے ہیں، تفہیمات الٰہیہ میں فرماتے ہیں:

”لیس منا من لم تبدبر کتاب الله ولم یتفهم حدیث بنسمه صلی الله علیه وسلم لیس منا من ترک ملازمة العلما اعنی الصوفیة الذین لهم حظ من الکتاب والسنة او الراسخین فی العلم الذین لهم حظ من الصوفیة، او المحدثین الذین لهم حظ من الفقه، او الفقهاء الذین لهم حظ من الحدیث اما الجهال من الصوفیة والجاهدون للتصوف فاولائک قطاع الطریق ولصوص الدین فایاک وایاهم، جعلنا الله سبحانه ممن یطیعه ویتبع رضوانه ولا یشرک به شیئا فانما نحن به وله والسلام“

دوسرے ملکوں کے علما جو پچھلی صدی میں تجدید کا فکر رکھتے تھے، ان میں سے جن کو شاہ صاحب کے علوم قرآنیہ اور حدیثیہ اور فقہیہ پہنچے، وہ ان کی پوری قدر کرتے رہے، مگر شاہ صاحب کے تصوف کو ماننا ان کے لئے بہت گراں تھا، اس سے وہ سمجھتے ہیں کہ ہم ایرانیت اور ہندیت کے قریب چلے جا رہے ہیں، حالانکہ وہ سامیوں اور آرین قوموں میں ایک تضاد ثابت کرنا اپنے ترفع کے لئے ضروری مانتے ہیں، حجاز میں رہتے ہوئے اس طرح کے لوگوں سے ہمیں کافی واسطہ پڑا، مگر جب ہم نے انھیں ان مقاصد عالیہ پر متوجہ کیا، جو آرین قوموں کو سامی نبوت سمجھانے سے پیدا ہوتے ہیں، اور ان سے انسانیت جس قدر بلندی پر پہنچتی ہے اس کے لئے شاہ صاحب کے تصوف نے راستہ صاف کر دیا ہے تو وہ اس کی قدر کرنے لگے مگر اس پر احاطہ کرنے کے لئے وقت صرف کریں، یہ وسعت قلب ہم نے ان میں نہیں دیکھی، ان لوگوں کی طرف سے جو ہندوستانی مسلمانوں میں پروپیگنڈا ہوا اس میں تصوف قطعی طور پر نظر انداز کر دیا گیا، اس طرح وہ ہندوستانی جو پروپیگنڈا کا شکار ہوئے اپنے ائمہ کے کلام سے زیادہ مستفید نہیں ہو سکے۔

فصل (۵) اسلام اور ہندوستانیت

ہم نے محسوس کیا کہ ایک عرب جیسا اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے اسی طرح اپنی عربیت پر فخر کرتا ہے یہی حال ایرانی اور ترک کا ہے، مگر ایک ہندوستانی کو دوسرے ممالک میں جا کر اپنی

ہندوستانیت سے ایک قسم کی نفرت محسوس ہونے لگتی ہے اس لئے کہ وہ اسلام اور اس کی تعلیم کے ائمہ ہندوستان سے باہر ہی مانتا ہے۔

ہماری سمجھ میں یہ فکر مسلمانوں کے لئے نہایت مضر ہے، مسلمانوں کی اتنی آبادی کسی ملک میں نہیں جتنی ہندوستان میں ہے ان کی ترقی کا سامان جس قدر ہندوستان میں میسر ہے کسی مسلمان کو اپنے ملک میں حاصل نہیں، اس طرح اتنی بڑی قوم ترقی کے راستے سے بھٹک رہی ہے۔

اس کا علاج ہماری سمجھ میں یہی آتا ہے کہ وہ اپنی تعلیم میں بھی پہلے ہندوستانی ائمہ پر اعتماد کرنا سیکھیں، اس کے بعد ان ائمہ کے شرف کے ساتھ ہندوستانیت محترم ہو جائے گی اور ہندوستانی کو اپنے ملک میں ترقی کرنے کا خیال پہلے درجہ پر ہوگا اور دوسری قوموں سے مل کر ترقی کرنے کا فکر دوسرے درجہ پر آئے گا ہماری سمجھ میں یہی ان کے لئے راہ نجات ہے۔

اسی لئے ہم شاہ ولی اللہ کے علوم کا ہندوستانیوں میں تعارف کرانا ضروری جانتے ہیں ہماری ہندوستانیت کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے اسلام شاہ ولی اللہ سے سیکھا جو ہندوستانی تھے دہلوی تھے یہیں پیدا ہوئے یہیں دفن ہوئے۔

فصل (٦) نبوت کی رہنمائی کی ضرورت صرف امور آخرت ہی میں نہیں ہے بلکہ دنیوی معیشت کا سنوارنا بھی نبوی ہدایات کا محتاج ہے ابن خلدون کی ایک سنگین غلطی پر انتباہ

شاہ صاحب کے مکمل فلسفے کو سامنے رکھ لینے کے بعد حجۃ اللہ البالغہ کا مطالعہ کیا جائے تو یہ امر واضح ہو جائے گا کہ انبیا علیہم السلام نے جیسے انسان کو رویت الٰہی کے لئے تیار کر دیا، ویسے ہی تہذیب جوارح کا فرض بھی ادا کیا، انسان کی پوری زندگی کی تہذیب اور اصلاح نبوت کا اولین مقصد ہے۔

اس تبین کے بعد ابن خلدون کا یہ نظریہ خود بخود باطل ہو جائے گا کہ انسان کو ضرورت نبوت فقط امور آخرت معلوم کرنے کے لئے ہے، دنیاوی معیشت کا نظام محتاج نبوت نہیں، وہ اس پر یہ دلیل پیش کرتا ہے کہ غیر مسلم قوموں میں دنیاوی ترقی موجود ہے، یعنی ان میں نبوت کی روشنی نہیں اس طرح ابن خلدون نے عربی ذہنیت پر بہت برا اثر ڈالا ہے، عرب اس سے بڑھ کر کوئی حکیم

اپنے یہاں نہیں دیکھتے اور وہ انھیں دنیاوی ترقی میں انبیا کی ضرورت سے مستغنی کر دیتا ہے جس سے وہ بآسانی حکما یورپ کے پروپیگنڈا کے شکار ہو جاتے ہیں شاہ صاحب کی حکمت پڑھنے والا اس مصیبت سے ہمیشہ محفوظ رہے گا۔

فصل (۷) روحانیت اور اخلاق انسانی کا تعلق اقتصادیات سے شاہ صاحب کی نظر میں

شاہ صاحب نے لطیفہ جوارح کو اساس قرار دے کر ہمیں ایک دوسری مشکل سے بھی نجات دلائی ہے عام طور پر تصوف اور فلسفہ، اخلاق سے شروع کیا جاتا ہے، اقتصادی ضروریات حیوانی زندگی کے لئے بیشک ضروری مانی جاتی ہیں، لیکن ان کو انسانیت سے سیدھا تعلق نہیں تسلیم کیا جاتا اس نے ہماری سیاست کو کھوکھلا کر دیا ہے ہمارے بڑے عقلمند اور زیادہ بااخلاق سب اجتماعی سیاست سے دور رہنا اپنا کمال سمجھتے ہیں۔

مگر شاہ صاحبؒ اس اصول کو حجۃ اللہ میں متعدد مواقع پر نہایت وضاحت سے سمجھاتے ہیں چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں، انسانیت کے اجتماعی اخلاق اس وقت بالکل برباد ہو جاتے ہیں جب کسی جبر سے ان کو اقتصادی تنگی پر مجبور کر دیا جائے اس وقت وہ گدھے اور بیل کی طرح صرف روٹی کے لئے کام کریں گے جب انسانیت پر ایسی مصیبت آئے گی تو خدا انسانیت کو اس سے نجات دلانے کا کوئی راستہ ضرور الہام کرے گا، فرعون کی ہلاکت، قیصر اور کسریٰ کی تباہی اسی اصول پر لوازم نبوت میں شمار ہوتی ہے، اس طرح پورا فلسفہ نہایت اعلیٰ طریق پر مرتب ہو جائے گا، انسانی اجتماعی زندگی کے لئے اقتصادی نظام ایسا ہونا ضروری ہے جو ان کی ضروریات کو پورا کر دے اور اس کے بعد ان کے پاس کچھ وقت بچ جائے تا کہ وہ اپنے لطائف کی تکمیل پر غور کر سکیں۔

مذکورہ بالا الہام کبھی تو انبیا کے ذریعے سے صورت پذیر ہوتا ہے اور کبھی صدیق اور حکیم کے واسطہ سے۔ اقتصادی نظام کی درستی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انسانی اجتماعیت کے اخلاق مکمل ہوں گے اور ان اخلاق کی تکمیل ہی قبر اور حشر کی مصیبتوں سے نجات دلائے گی، پھر ان اخلاق کی تکمیل دوسرے درجہ پر جنت کی نعمتوں سے مستفید کرے گی، اور تیسرے درجے پر جا کر اس کو رویت رب العالمین کے لئے تیار کر دے گی۔

اس فلسفے میں کہیں ظفرہ نہیں آتا، اگر اسے نبوت کا مقصد قرار دیا جائے، اور جہاں نبوت نہ ہو وہاں انبیا کے اتباع صدیق اور حکیم ان کا کام کریں تو نبوت انسانیت کے لئے ایک فطری چیز بن جائے گی اور یہی شاہ ولی اللہؒ کی فلاسفی کی روح ہے جس کا ہم نے یہاں تعارف کرانا چاہا ہے۔

شاہ صاحبؒ نے ایک موقع پر "تحدیث نعمت" کے طور پر شاہ محمد عاشق کو (جن کا نام علی ہے) خطاب کرتے ہوئے خوب فرمایا ہے۔

علی! من مے شناسم ایں گہر در ذان حکمت را
فلاطون آہ گر میدید یونانے کہ من دارم

"و آخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمین، لقد جاء ت رسل ربنا بالحق"

الدر الثمین فی مبشرات النبی الامین صلی اللہ علیہ وسلم

تصنیف

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ

ترجمہ

مولانا سید محمد فاروق قادری

تحقیق و تعلیق

مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی

فہرست مضامین

صفحہ	مضمون	نمبر شمار
۱۰۳	مقدمہ	۱
۱۰۴	مثالی صورتیں	۲
۱۰۵	چادر مبارک	۳
۱۰۵	حسنین کریمین	۴
۱۰۵	تو مخلوق و آدم ہنوز آب و گل	۵
۱۰۶	ایک حدیث کی تشریح	۶۔
۱۰۶	شاہ ولی اللہ کا مقام	۷۔
۱۰۶	دست بہ کار دل بہ یار	۸۔
۱۰۷	شیخین کی فضیلت	۹۔
۱۰۷	مسلک فقہ	۱۰۔
۱۰۷	مختلف مسالک اور طریقے	۱۱۔
۱۰۸	ظاہر کی اہمیت و فضیلت	۱۲۔
۱۰۸	حضور صلی اللہ علیہ وسلم واسطہ ہیں	۱۳۔
۱۰۸	وہ دیتے ہیں سب کچھ	۱۴۔

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱۵۔	خواب میں بیعت	۱۰۸
۱۶۔	بال مبارک عطا کرنا	۱۰۹
۱۷۔	پسندیدہ درود	۱۰۹
۱۸۔	عالم بیداری میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری	۱۰۹
۱۹۔	ہدیے مشترک ہوتے ہیں	۱۱۰
۲۰۔	مشکل میں دستگیری	۱۱۰
۲۱۔	جمال محمدی	۱۱۰
۲۲۔	حیران ہوں آنکھیں بچھاؤں کہاں کہاں	۱۱۱
۲۳۔	میلاد کا اہتمام	۱۱۱
۲۴۔	حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہ سے سوال	۱۱۱
۲۵۔	مقام فنافی الرسول	۱۱۲
۲۶۔	مسجد یاقوت	۱۱۲
۲۷۔	کیا ہے جو ان پہ عیاں نہیں	۱۱۲
۲۸۔	تمباکونوشی بارگاہ نبوت میں ناپسند ہے	۱۱۳
۲۹۔	تمباکونوش کو بارگاہ نبوت میں اجازت نہ ملی	۱۱۳
۳۰۔	علی مرتضیٰؓ اولیاء اللہ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان واسطہ ہیں	۱۱۳
۳۱۔	شیخ ابوالرضاؒ کا مقام	۱۱۴
۳۲۔	بارگاہ نبوت میں شیخ قشاشی کا استغاثہ	۱۱۴
۳۳۔	اہل نسبت کے مقامات	۱۱۵
۳۴۔	اہل نظر کے آداب	۱۱۶
۳۵۔	آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت	۱۱۷
۳۶۔	مصافحہ مبارکہ کی شان	۱۱۷

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۳۷۔	اللہ کے قریب کون ہے	۱۱۸
۳۸۔	آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سورہ فاتحہ پڑھنا	۱۱۸
۳۹۔	سورہ اذازلزلت کی تعلیم بارگاہ نبوت سے	۱۱۸
۴۰۔	سورۂ کوثر سماعاوقراءۃً	۱۱۹
۴۱۔	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بخاری پڑھانا	۱۱۹
۴۲۔	حرف آخر	۱۱۹

بسم اللہ الرحیم الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

مقدمہ

سب تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں، جس نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اس قدر بلند فرمائی کہ جو بھی خواب میں آپ کی زیارت سے مشرف ہوا، اس نے بلاشبہ آپ ہی کو دیکھا۔ اس نے شیطان کو سرے سے طاقت ہی نہیں دی کہ وہ خواب میں آپ کی شکل اختیار کر سکے، میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ واحد لاشریک ہے، اسی طرح میں شہادت دیتا ہوں کہ ہمارے آقا و مولیٰ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے عبد خاص اور رسول ہیں اور شفاعت کبریٰ کا منصب صرف آپ ہی کے لئے مخصوص ہے، درود و سلام نازل ہوں آپ کی ذات اقدس پر اور آپ کے آل اور اصحاب پر جو ہدایت کے ستارے اور پرہیزگاری کے رہنما ہیں۔

کمترین خلائق احمد جو ولی اللہ بن عبدالرحیم العمری الدہلویؒ کے نام سے مشہور ہے، عرض کرتا ہے کہ احادیث مبارکہ میں سے یہ چالیس حدیثیں ہیں جو عالم خواب میں یا آپ کی روح مبارک کے مشاہدے کی حالت میں آپ سے روایت کی گئی ہیں، میں نے انہیں اس رسالے میں جمع کر دیا ہے ان میں سے کچھ حدیثیں ایسی ہیں جنہیں کسی واسطے کے بغیر براہ راست ذات اقدس سے میں نے اخذ کیا ہے اور بعض احادیث ایسی ہیں کہ آپ کی روایت میں میرے اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان دو یا تین واسطے ہیں۔ میں نے اس کا نام الدر الثمین فی مبشرات النبی الامین صلی اللہ علیہ وسلم تجویز کیا ہے۔

مثالی صورتیں

میں نے خواب میں سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی کہ میں آپ کے حضور حاضر ہوں اور سامنے بیٹھا ہوں، آپ ٹھوڑی مبارک سینہ اقدس پر رکھے مراقبہ کی کیفیت میں ہیں، اس وقت آپ کی تین مثالی صورتیں مجھ پر ظاہر ہوئیں، پہلی مثالی صورت جسم مخروطی ہے اس میں جسم کے دونوں حصے (اوپر نیچے والے) کھلے (چوڑے) تھے، مگر نیچے والا حصہ اوپر والے کے مقابلے میں زیادہ چوڑا نظر آیا دوسری مثالی صورت جسم مطبوح کی تھی گویا جیسے کسی سخت چیز میں لکڑی گڑی ہوئی ہو، تیسری مثالی صورت عود (لکڑی) کی تھی جو زمین میں گڑی ہوئی تھی اس لکڑی پر کسی ٹھوس چیز کی مانند جسم مبارک کی شبیہ تھی۔

اس کے بعد مجھ پر آشکار ہوا کہ پہلی صورت آپ کی نسبت مبارکہ کی تمثیل ہے، یہ نسبت سفلی جسمانی مراتب اور بلند روحانی مدارج دونوں کی جامع ہے۔ دوسری صورت ان سالکین راہ کی نسبت کی تصویر ہے جن کی نسبت کے لئے صرف اسفل کے قریب قریب کشادگی ہے اور تیسری صورت میں ان مجذوبوں کی نسبت کا اظہار ہے جن کی نسبت کو اعلیٰ کے قرب میں لگاؤ ہے۔

جونہی میں نے ان تینوں صورتوں کے مفہوم اور مراد کو سمجھ لیا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سر اٹھا کر تبسم فرمایا اور بیعت لینے کے لئے ہاتھ بڑھائے، میں آگے بڑھا، یہاں تک کہ میرے زانو آپ کے زانوئے مبارک سے مل گئے۔ آپ نے مصافحہ فرمایا اور دوبارہ ٹھوڑی مبارک سینہ اقدس پر رکھ کر مراقبہ میں چلے گئے اور آنکھیں بند فرمالیں۔ میں نے بھی آپ کی اتباع میں اپنی ٹھوڑی سینہ

پر رکھی اور آنکھیں بند کر لیں۔ اس دوران میرے دل میں وہ تمام نسبتیں ظاہر ہو گئیں جنھیں میں پہلے سمجھ چکا تھا۔

چادر مبارک

ایک دفعہ کھمبائت کے شہر میں عصر کی نماز کے بعد مراقبہ کی کیفیت میں تھا کہ آپ کی روح مبارک جلوہ گر ہوئی اور مجھے چادر اوڑھائی، اسی دم علوم شریعت کے بعض اسرار و رموز مجھ پر کھل گئے اور پھر یہ سلسلہ ہمیشہ بڑھتا رہا۔

حسنین کریمین

میں نے عالم خواب میں دیکھا کہ حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہم میرے غریب خانے پر تشریف لائے ہیں، حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں ایسا قلم ہے کی زبان (نوک) ٹوٹی ہوئی ہے۔ آپ نے اپنا ہاتھ بڑھایا تاکہ قلم مجھے عطا فرمائیں اور ساتھ ہی ارشاد فرمایا، یہ قلم میرے جد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔ پھر اچانک قلم آپ نے ہاتھ ہی میں روک لیا اور فرمایا، حضرت حسین رضی اللہ عنہ اسے درست کر دیں، پھر جب حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے قلم ٹھیک کر دیا تو آپ نے مجھے دے دیا، اتنے میں ایک چادر لائی گئی، حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے چادر اٹھاتے ہوئے فرمایا یہ چادر میرے نانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔ چنانچہ یہ چادر آپ نے مجھے اوڑھادی، بس اسی دن سے دینی علوم کی تصنیف و تالیف کے سلسلے میں میرا سینہ کھل گیا اور اس پر اللہ کا شکر ہے۔

تو مخلوق و آدم ہنوز آب و گل

میں نے روحانی طور پر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس حدیث کا مفہوم پوچھا "کنت نبیا و آدم منجدل بین الماء والطین" (میں تو اس وقت بھی نبی تھا جبکہ آدم ابھی گل گارے میں تھے) تو آپ کی روح مبارک میری روح پر جلوہ گر ہوئی اور مجھے آپ کی وہ مثالی صورت دکھائی گئی، جو عام اجسام میں آنے سے پہلے تھی۔ اس صورت کا فیضان عالم مثال میں جلوہ ریزی کر رہا تھا۔ گویا جس وقت حضرت آدمؑ کا گل گارے سے خمیر اٹھایا جا رہا تھا اس وقت آنحضرت صلی اللہ

علیہ وسلم کا عالم مثال میں مکمل ظہور موجود تھا اور اسی ظہور کو آپ نے اس حدیث میں ''میں اس وقت نبی تھا'' کے الفاظ سے تعبیر فرمایا۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپ عالم جسمانی میں جلوہ فگن ہوئے تو آپ کے ساتھ تمام مثالی قوتیں بھی عالم جسمانی میں منتقل ہوئیں، چنانچہ بے حد وحساب علوم ظاہر ہوئے۔

ایک حدیث کی تشریح

میں نے روحانی طور پر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس حدیث کی تشریح کے لئے عرض کیا کہ جب کسی نے آپ سے پوچھا، **این کان ربنا قبل ان یخلق خلقه** (مخلوق کی تخلیق سے پہلے ہمارا رب کہاں تھا) تو جواباً آپ نے سائل سے فرمایا **کان فی عماء مافوقه هواء وما تحته هواء** وہ ایسے نقابوں (پردوں) میں تھا کہ اس کے سوا کچھ نہ تھا، چنانچہ روح مبارک میری روح پر جلوہ گر ہوئی۔ روح مبارک ایک عظیم نور کی صورت میں تھی اور یہ اس ہیولانی بعد کی عظمت سے بھی بلند تھی جو خطوط شعاعیہ کے ملنے کے تمام مقامات کو محیط ہے۔ پھر کہا گیا کہ یہ نور ہے یعنی یہ وہی تجلی ہے جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور بعد ہیولانی وہ عماء ہے اور خطوط شعاعیہ کے احاطہ سے مراد وہ قہر ہے جس کا اشارہ اس ارشاد الٰہی میں کیا گیا ہے **وهو القاهر فوق عباده**۔

شاہ ولی اللہؒ کا مقام

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فقیر کو مخاطب کرتے ہوئے ایک روحانی اشارے میں فرمایا کہ منشاء الٰہی یہ ہے کہ امت مرحومہ کے تمام ایسے عمدہ خصائل جو ترک کر دیئے گئے ہیں، تمہارے اندر جمع کر دیئے جائیں۔

دست بہ کار دل بہ یار

روحانی طور پر میں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ میرے لئے دنیوی اسباب اختیار کرنا بہتر ہے یا ان سے کنارہ کشی کرنا، آپ کی روح مبارک سے میری روح پر ایسا فیضان ہوا کہ شروع میں میرا دل اسباب دنیا اور اولاد سے سرد ہو گیا، تھوڑی دیر بعد ایسی کیفیت کا ظہور ہوا کہ اب میری طبیعت اسباب دنیا کی طرف اور میرا دل فیض حقیقی کی طرف مائل ہے۔

شیخین کی فضیلت

روحانی طور پر میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ پر فضیلت کیوں حاصل ہے، جبکہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نسب کے اعتبار سے افضل، علمی لحاظ سے برتر اور شجاعت کی حیثیت سے اپنا ثانی نہیں رکھتے اور پھر تمام صوفیائے کرام کو بھی آپ ہی سے نسبت ہے۔ اس کے جواب میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے میرے دل پر فیضان ہوا، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دو حیثیتیں ہیں، ایک ظاہری اور دوسری باطنی، آپ کی ظاہری حیثیت کی نمائندگی حضرات شیخینؓ نے اس طرح کی کہ لوگوں میں عدل وانصاف قائم کرنے اور شرعی امور واحکام کی تبلیغ وترویج میں مصروف رہے۔ گویا اس طرح یہ دونوں خلفا آپ کے جسم مبارک کے جوارح قرار پائے، رہی آپ کی باطنی حیثیت، سو اس کا تعلق فنا وبقا کے مدارج اور آپ سے اخذ کردہ علوم سے متعلق ہے یہ بھی ایک اعتبار سے ظاہری حیثیت کے ضمن میں آجاتے ہیں۔

مسلک حقہ

میں نے روحانی طریقہ سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے شیعہ مسلک کے متعلق پوچھا مجھے اشارہ کیا گیا کہ یہ مسلک جھوٹا ہے اور اس کا غلط ہونا لفظ ''امام'' سے ظاہر ہے، اس کیفیت سے واپس آیا تو میں نے دیکھا کہ واقعی ان کے ہاں ''امام'' ایسے شخص کو کہا جاتا ہے جو معصوم ہوتا ہے، اس کی تابعداری فرض ہے اور اس پر باطنی وحی ہوتی ہے، حالانکہ یہی نبی کی تعریف ہے، لہٰذا اس عقیدے سے ختم نبوت کا انکار لازم آتا ہے اللہ تعالیٰ ہدایت دے۔

مختلف مسالک اور طریقے

میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف مذاہب اور طریقوں کے بارے میں پوچھا کہ آپ کے نزدیک ان میں سے کون سا مسلک یا طریقہ زیادہ پسندیدہ ہے، آپ کی طرف سے میرے دل پر فیضان ہوا کہ یہ مسلک اور طریقے برابر ہیں، ان میں سے کسی کو دوسرے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے۔

ظاہر کی اہمیت اور فضیلت

میں نے دیکھا ہے کہ جو علما اور محدثین اپنے علم پر عمل کرتے ہیں، اور ساتھ ہی اپنے ظاہری لطائف (ظاہری شریعت اور اخلاق و اعمال) کو درست رکھتے ہیں، وہ ان صوفیا کے مقابلے میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو زیادہ پسند ہیں، جو اپنے باطنی لطائف کی درستی پر تو بہت زور دیتے ہیں، مگر ظاہری آداب اور لطائف کی زیادہ پرواہ نہیں کرتے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم واسطہ ہیں

ایک دفعہ مجھ پر بھوک کا غلبہ ہوا، میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ وہ اس کے لئے کوئی انتظام کر دے، اس دوران میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارک کو دیکھا کہ وہ کھانا ہمراہ لے کر آسمان سے اتر رہی ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے آپ سے ارشاد فرمایا تھا کہ آپ میرے لئے کھانے کا بندوبست کر دیں، چنانچہ آپ نے کھانا مجھے عنایت فرمایا۔ اسی طرح اسی روز پچھلے پہر یا دوسرے روز علی الصبح میری یہ ضرورت پوری ہوگئی۔

وہ دیتے ہیں سب کچھ

ایک رات مجھ پر پیاس کا غلبہ ہوا، ہمارے دوستوں میں سے ایک کو الہام (۱) ہوا کہ دودھ بھرا پیالہ مجھے تحفۃً بھجوائے، دودھ آیا تو میں پی کر سو گیا، اس وقت میں باوضو تھا، میں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارک کی زیارت کی، آپ نے اشارتاً فرمایا کہ ''دودھ ہم ہی نے تمہیں بھجوایا تھا۔ تمہارے دوست کے دل میں ہماری طرف سے ہی یہ تقاضا ڈالا گیا تھا''۔

خواب میں بیعت

میرے والد گرامی نے بتایا کہ مجھے خواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کا شرف حاصل ہوا، میں نے آپ سے بیعت کی، اور آپ نے مجھے نفی و اثبات کا طریقہ اسی طرح تلقین فرمایا جیسے صوفیائے کرام کا معمول ہے۔ چنانچہ والد گرامی نے مجھ سے اسی طرح بیعت لی اور نفی و اثبات کے ذکر کی تلقین کی، جیسے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ان سے بیعت لے چکے تھے اور انہیں

---

(۱) بمعنی القا (قاسمی)

تلقین کر چکے تھے۔

بال مبارک عطا کرنا

میرے والد گرامی نے بتایا کہ ایک دفعہ میں بیماری کی حالت میں تھا۔ مجھے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔ آپ نے پوچھا "بیٹے! تمہارا کیا حال ہے؟" یہ کہہ کر آپ نے بیماری سے شفایابی کی خوش خبری دی اور داڑھی مبارک کے دو بال عنایت فرمائے میرے والد گرامی اس وقت تندرست ہو گئے اور نیند سے بیدار ہوئے تو ان کے پاس دو بال موجود تھے، چنانچہ آپ نے ان میں سے ایک بال مبارک مجھے دیا، جواب تک میرے پاس موجود ہے۔

پسندیدہ درود

میرے والد گرامی نے مجھے یہ درود شریف پڑھنے کا حکم دیا۔ اللھم صل علی محمد النبی الامی و آله وبارک وسلم اور آپ نے فرمایا کہ ایک دفعہ میں نے خواب میں یہ درود پڑھا، تو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پسند فرمایا۔

عالم بیداری میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری

میرے والد گرامی نے بتایا کہ میرے شیخ عبداللہ قاری (۱) رحمتہ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ میں نے قرآن مجید ایک ایسے پرہیز گار قاری سے حفظ کیا، جو بیابان میں رہتے تھے۔ ایک دفعہ ہم قرآن مجید کا ورد کر رہے تھے کہ اچانک اہل عرب کی ایک جماعت آگئی۔ آگے آگے ان کا سردار تھا انھوں نے قاری (ہمارے استاد) کی قرات سنی تو سردار نے کہا بارک اللہ تم نے قرآن مجید کی قرات کا حق ادا کیا ہے"۔ یہ کہہ کر وہ لوگ چل کھڑے ہوئے۔ اتنے میں اسی شکل وشباہت کا ایک اور شخص آگیا، اس نے بتایا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے گزشتہ رات فرمایا تھا کہ ہم فلاں جنگل میں قاری سے قرآن مجید کی قرات سننے جائیں گے، چنانچہ ہم نے سمجھ لیا کہ جو سب سے آگے آگے تھے وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تھے، وہ (استاد) کہنے لگے بلاشبہ میں نے اپنی ان ظاہری آنکھوں سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی ہے۔

---

(۱) مشہور قاری تھے، آپ کا ذکر انفاس العارفین میں موجود ہے۔ (قاسمی)

ہدیے مشترک ہوتے ہیں

میرے والد گرامی نے فرمایا کہ ابتدائے طلب میں میں نے مسلسل روزے رکھنے کا ارادہ کیا۔ پھر علما کے اختلاف کی بنا پر کچھ تردد ہوا تو میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف توجہ کی، خواب میں آپ کی زیارت ہوئی آپ نے مجھے ایک روٹی عنایت فرمائی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہدیہ میں سب شریک ہوتے ہیں آپ کی طرف بڑھا، تو آپ نے روٹی سے ایک ٹکڑا لے لیا۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وہی بات دہرائی کہ ہدیہ مشترک ہوتا ہے چنانچہ میں آپ کے روبرو حاضر ہوا تو آپ نے بھی ایک ٹکڑا لے لیا۔ اتنے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہدیے سب کے لئے ہوتے ہیں، میں نے عرض کیا اگر ساری روٹی آپس میں بانٹ لی تو میرے پاس کیا بچے گا؟ یہ سن کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ رک گئے۔

مشکل میں دستگیری

میرے والد گرامی نے بتایا کہ ایک دفعہ رمضان المبارک میں مجھے سفر کا اتفاق پڑ گیا۔ راستے کی تکلیف اور روزے نے بے حال کر دیا، اس دوران جونہی آنکھ لگی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے جمال جہاں آرا سے مشرف فرمایا اور نہایت لذیذ کھانا مجھے عنایت فرمایا، جو چاول، حلوے، گھی اور خوشبودار چیزوں پر مشتمل تھا، میں نے پیٹ بھر کر کھایا، پھر آپ نے ٹھنڈا پانی عطا فرمایا، میں نے سیر ہو کر پیا، آنکھ کھلی تو بھوک تھی نہ پیاس، البتہ ہاتھ زعفران کی خوشبو سے معطر تھے۔

جمال محمدی

میرے والد گرامی نے بتایا کہ مجھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث پہنچی انا املح واخی یوسف اصبح ، میں ملیح ہوں جبکہ میرے بھائی یوسف علیہ السلام صبیح تھے۔ مجھے اس کے معنی ومفہوم میں پریشانی ہوئی، اس لئے کہ صباحت کے مقابلے میں ملاحت عاشقوں کے لئے زیادہ بے قراری کا باعث بنتی ہے۔ جبکہ صورت یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے قصے میں مصری عورتوں کا ہاتھ کاٹ لینا اور بعض لوگوں کا جمال یوسفی کی تاب نہ لا کر جاں بحق ہو جانا ایک امر

واقعہ ہے، مگر ہمارے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ایسی کوئی روایت موجود نہیں ہیں، تردد کے دوران مجھے خواب میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی، میں نے اس بارے میں پوچھا، تو آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے غیرت کی بنا پر میرا حقیقی جمال لوگوں سے مخفی رکھا ہے، اگر میری اصلی حسن و جمال ظاہر ہو جائے تو لوگ اس سے کہیں زیادہ کر گزریں، جو انھوں نے حسن یوسفی کو دیکھ کر کیا تھا۔

حیران ہوں آنکھیں بچھاؤں کہاں کہاں

میرے والد گرامی نے بتایا کہ میں نے خواب میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی، اس دوران مجھ پر اللہ کی طرف سے عطا کردہ آپ کے بعض ایسے کمالات ظاہر ہوئے جنہیں دیکھ کر میں آپ کے سامنے سجدے میں گر گیا۔ آپ نے انگلی مبارک دانتوں میں دبائی اور مجھے سجدے سے منع فرمایا۔

میلاد کا اہتمام

میرے والد گرامی فرماتے تھے کہ میں یوم میلاد کے موقعہ پر کھانا پکوایا کرتا تھا، اتفاق سے ایک سال کوئی چیز میسر نہ آسکی کہ کھانا پکواؤں، صرف بھنے ہوئے چنے موجود تھے، چنانچہ یہی چنے میں نے لوگوں میں تقسیم کئے، خواب میں دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں، یہی چنے آپ کے سامنے رکھے ہیں اور آپ نہایت خوش اور مسرور دکھائی دے رہے ہیں۔

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے سوال

میرے والد گرامی نے بتایا کہ ایک دفعہ میں نے خواب میں حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کی زیارت کی۔ میں نے آپ سے اپنی قلبی نسبت کے بارے میں پوچھا کہ کیا میری نسبت بھی اسی انداز کی ہے، جو آپ حضرت آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت عالیہ میں حاصل فرمایا کرتے تھے۔ آپ نے فرمایا اپنے دل کی طرف توجہ کرو اور اپنی نسبت کا استحضار کرو، جونہی آپ نے اپنی نسبت کو بیدار کیا آپ نے فرمایا ہاں ہاں، یہی ہے۔

مقام فنا فی الرسول

میرے والد گرامی نے بتایا کہ ایک دفعہ میں نے خواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی، آپ نے مجھ پر اپنا تصرف فرمایا تو میں تمام مقامات طے کر کے ایسے مقام پر پہنچ گیا، جس سے آگے سوائے نبی کے اور کسی کا گزر ممکن ہی نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے میری روح کو اپنی روح مبارک کے جلو میں لے لیا۔ اس پرواز میں میں نے آگ کا ایک دریا دیکھا۔ پھر مجھ پر صبر، توکل اور اس قسم کے دوسرے طے شدہ مقامات ظاہر ہونے لگے، گویا اصلی مقامات یہی تھے اور جو کچھ پہلے گزرا وہ فروعی منزلیں تھیں۔

مسجد یاقوت

میرے والد گرامی نے بتایا کہ ایک دفعہ میں نے خواب دیکھا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسی مسجد میں تشریف فرما ہیں جو یاقوت کی طرح شفاف ہے، اس کا اندرونی حصہ باہر سے صاف نظر آرہا ہے۔ صحابہ کرام اور اولیائے عظام حلقہ کئے آپ کے پاس بیٹھے ہیں۔ میں دروازہ پر پہنچا تو حضرت سید عبدالقادر جیلانی اور شیخ بہاء الدین نقشبند رحمتہ اللہ علیہ دونوں میری طرف بڑھے، حضرت سید عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ فرمانے لگے کہ اس پر میرا حق زیادہ ہے، اس لئے کہ اس کے آباؤ اجداد میرے ہی طریقے سے منسلک تھے۔ حضرت شیخ بہاء الدین رحمتہ اللہ علیہ فرمانے لگے کہ میرا حق اس پر زیادہ فائق ہے، اس لئے کہ اس کی تربیت اپنے نانا کے پاس ہوئی ہے اور ان کا تعلق میرے سلسلے میں تھا۔ پھر دونوں کا اس بات پر اتفاق ہو گیا کہ پہلے شیخ بہاء الدینؒ میری تربیت کریں اس کے بعد حضرت سید عبدالقادر رحمتہ اللہ جو چاہیں فیض عطا فرمائیں۔ چنانچہ شیخ بہاء الدین رحمتہ اللہ علیہ مجھے مسجد میں لے گئے اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بٹھا دیا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے (مراقبہ سے) جونہی، چشم مبارک کھولی تو سب سے پہلے مجھ پر نظر ڈالی۔

کیا ہے جو ان پہ عیاں نہیں

میرے والد گرامی نے بتایا کہ ایک شخص جو اپنے آپ کو سید بتلاتا تھا، مجھے اس کے نسب کے

بارے میں شک تھا۔ میں نے دیکھا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک چارپائی پر لیٹے ہوئے ہیں اور وہ شخص آپ کی چارپائی کے نیچے سو رہا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اگر یہ صحیح النسب نہ ہوتا تو اس مقام پر نہ ہوتا۔

تمباکو نوشی بارگاہ نبوت میں ناپسند ہے

میرے والد گرامی نے فرمایا کہ ہمارے دوستوں میں سے ایک شخص خود تمباکو نوشی (حقہ وغیرہ) نہیں کرتا تھا مگر اس نے مہمانوں کے لئے یہ انتظام کر رکھا تھا، چنانچہ اس نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی (خواب میں یا بیداری میں اس کا صحیح علم نہیں ہے) دیکھا کہ آپ اس کی طرف تشریف لا رہے ہیں، پھر اچانک آپ نے رخ پھیرا اور واپس چل دیے۔ اس کا بیان ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قدم مبارک تیز تیز اٹھانے شروع کیے تو میں پیچھے دوڑا اور عرض کیا حضور! میرا قصور کیا ہے؟ فرمایا تیرے گھر میں حقہ ہے اور یہ ہمیں ناپسند ہے۔

تمباکو نوش کو بارگاہ نبوت میں اجازت نہ ملی

میرے والد گرامی نے بتایا کہ دو شخص صالحین میں سے تھے، ان میں سے ایک عابد بھی تھا اور عالم بھی، جبکہ دوسرا عالم نہ تھا مگر عابد تھا، دونوں نے ایک ہی رات ایک ہی وقت سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی، عابد کو تو مجلس مبارک میں باریابی کی اجازت ملی مگر (عالم و عابد) کو اذن نہ ملا، عابد نے وہاں پر موجود لوگوں سے عالم کو اجازت نہ ملنے کی وجہ دریافت کی تو انھوں نے بتایا کہ عالم تمباکو نوشی کرتا تھا اور تمباکو بارگاہ نبوت میں پسند نہیں ہے۔ صبح ہوئی تو یہ عابد عالم کے پاس پہنچا، دیکھا کہ رات کے واقعے کی بنا پر رو رہا ہے، عابد نے اسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اجازت نہ ملنے کا سبب بتایا، چنانچہ اس نے اسی وقت حقہ نوشی سے توبہ کی، دوسری رات دونوں نے اسی صورت میں پھر زیارت کی، اب کے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عالم کو بھی باریابی کی اجازت بخشی اور اپنے قرب سے نوازا۔

علی مرتضیٰؓ اولیاء اللہ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان واسطہ ہیں

میرے عم محترم نے بیان فرمایا کہ ایک دفعہ میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک ایسے راستے پر

چل رہا ہوں جہاں کوئی اور موجود نہیں ہے۔ اچانک ایک شخص نے مجھے اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا اور فرمایا اے سست رو! میں علی ہوں، مجھے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھیجا ہے کہ تمہیں ان کی خدمت میں لے چلوں، ہم دونوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ کے نیچے لیا اور پھر اپنا ہاتھ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو پیش کرتے ہوئے عرض کیا، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ ہاتھ ابوالرضا محمد کا ہے، چنانچہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت لی۔ پھر حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرمانے لگے کہ میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور اولیاء اللہ (یہ) لفظ بول کر آپ نے تیری طرف (شاہ ولی اللہ کی طرف اشارہ فرمایا) کے درمیان واسطہ ہوں اس کے بعد آپ نے مجھے ذکر واذکار تلقین کیے۔

شیخ ابوالرضاؒ کا مقام

میرے عم محترم نے بیان فرمایا کہ میں نے خواب میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی۔ آپ برابر مجھے اپنا قرب عطا فرماتے گئے، یہاں تک کہ میں آپ ہی کا وجود ہو گیا (یعنی میرا وجود مٹ گیا یہ فنافی الرسول کا مقام ہے)

بارگاہ نبوت میں شیخ قشاشیؒ کا استغاثہ

مجھے شیخ ابوطاہرؒ نے شیخ قشاشیؒ کے حوالے سے بتایا کہ ایک دفعہ شیخ قشاشیؒ نے اپنی کسی مشکل کے حل کی خاطر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ اقدس میں فریاد لکھی۔ اس استغاثے کا مضمون کچھ اس طرح تھا، یا رسول اللہ! آپ مجھ سے زیادہ قریب ہیں یا یہ (استغاثہ)؟ آپ کے اس قرب کے صدقے جو مجھے حاصل ہے میرے دور ہونے سے پہلے آپ نے میری دستگیری کی اور اسی قرب کے طفیل میری تمام دینی دنیوی مشکلیں آسان ہوئیں۔ اور کون ہے جو مجھے آپ سے زیادہ محبوب ہے؟ چھ ماہ گزرے تو سید محمد بن علویؒ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی آپ نے فرمایا احمد قشاشیؒ کو ہمارا سلام اور ہماری شفاعت کی خوشخبری پہنچا دو۔ دوسری رات انہیں پھر زیارت نصیب ہوئی تو آپ نے فرمایا احمد قشاشیؒ کو ہمارا سلام پہنچا دو اور کہو کہ وہ بہشت میں ہمارے ساتھ رہے گا۔

اہل نسبت کے مقامات

مجھے شیخ ابو طاہر نے شیخ احمد نخلیؒ کے حوالے سے بتایا، شیخ احمد نخلیؒ کا بیان ہے کہ شیخ عیسیٰ بن کنان خلوتیؒ نے مجھے حکم دیا کہ میں مکہ مکرمہ میں ان کی جانشینی کے فرائض انجام دوں تاکہ طریقہ خلوتیہ کے بزرگ تہجد کی نماز کے بعد میرے پاس جمع ہو کر ان کی تلقین کردہ اوراد وظائف پڑھا کریں، صورت یہ تھی کہ میرا دلی میلان سلسلہ نقشبندیہ کی طرف تھا، دوسری طرف شیخ عیسیٰ کی حکم عدولی بھی مجھ پر گراں تھی، میں بہت پریشان ہوا۔ چنانچہ میں نے استخارہ کیا اور استخارہ میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کو وسیلہ بنایا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اسی سال مجھے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف فرمایا، میں جونہی مدینہ منورہ پہنچا، جمعہ کے دن نماز جمعہ سے پہلے میں نے خواب میں دیکھا کہ میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ مقدسہ پر آپ کے سرہانے کی طرف سے اس دروازے کے سامنے موجود ہوں، جو محراب اور قبر انور کے درمیان واقع ہے۔ کیا دیکھتا ہوں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور چاروں خلفا کرام قبلہ کی طرف مسجد نبوی کے اس حصے میں تشریف فرما ہیں جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بعد میں شامل کیا تھا۔ میں تیزی سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے بڑھا، پہلے میں نے آپ کے ہاتھ چومے پھر باری باری خلفاء اربعہ کی دست بوسی کی، فارغ ہوا تو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وائیں ہاتھ سے مجھے پکڑا اور روضہ مقدسہ کی طرف لے چلے، خلفاء اربعہ بھی ساتھ ساتھ تھے، میں نے دیکھا کہ قبر انور کے سرہانے، پہلی صف کے برابر ایک نیا خوبصورت مصلیٰ بچھا ہوا ہے جیسا کہ عموماً محراب مساجد میں بچھایا جاتا ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ شیخ تاج کا مصلیٰ ہے اس پر بیٹھ جاؤ۔

حضرت شیخ تاج رحمتہ اللہ علیہ (اللہ ان کے ذریعے ہمیں دنیا و آخرت میں فائدہ مند کرے ولی اللہ اور عارف باللہ تھے۔ آپ ۱۰۴۰ھ تک مکہ مکرمہ میں اقامت پذیر رہے، آپ نے خاصا طویل عرصہ وہاں گزارا اور بالآخر مکہ مکرمہ ہی میں واصل بحق ہوئے۔

شیخ احمد نخلی رحمتہ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ یوں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمام مسلمانوں کے

مرشد ہیں مگر یہ میرے لئے آپ کی طرف سے خصوصی مسند ہے۔ شیخ احمد نخلیؒ نے شیخ ابوطاہرؒ کو خرقہ پہنا کر اجازت عطا فرمائی اور شیخ ابوطاہرؒ نے اس فقیر (شاہ ولی اللہ) کو خرقہ پہنا کر اجازت بخشی۔

اہل نظر کے آداب

مجھے شیخ ابوطاہرؒ نے بتایا، انھوں نے کہا مجھے خبر دی شیخ احمد نخلیؒ نے انھوں نے فرمایا مجھے خبر دی ہمارے شیخ السید السند احمد بن عبدالقادرؒ نے انہیں بتایا شیخ جمال الدین قیروانی نے، انہیں اطلاع دی ان کے مرشد یحییٰ خطاب مالکیؒ نے، انھوں نے کہا ہمیں خبر دی ہمارے چچا شیخ برکات خطاب مالکیؒ نے، انہیں خبر دی ان کے والد نے انہیں اطلاع دی ان کے والد شیخ محمد عبدالرحمن الخطابؒ نے، جو شارح ہیں "مختصر الخلیل" کے ان کا بیان ہے کہ ہم اپنے شیخ عارف باللہ عبدالمعطی التونسی رحمتہ اللہ علیہ کے ساتھ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے لئے روانہ ہوئے۔ جب ہم روضہ مقدسہ کے قریب پہنچے تو پاپیادہ ہو گئے۔ ہمارے شیخ عبدالمعطی رحمتہ اللہ علیہ چند قدم اٹھاتے، پھر رک جاتے، الغرض وہ اسی کیفیت میں روضہ مقدسہ پر پہنچے۔ وہاں پہنچ کر انھوں نے کچھ ایسی باتیں کہیں جو ہماری سمجھ سے بالا تھیں۔ واپس پلٹے تو ہم نے شیخ سے رک رک کر چلنے کی وجہ پوچھی، انھوں نے فرمایا، میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حاضری کی اجازت طلب کرتا تھا، اجازت ملتی تو قدم اٹھاتا، ورنہ رک جاتا، اسی طرح میں بارگاہ نبوی میں حاضر ہوا، میں نے آپ سے پوچھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بخاری نے آپ سے جو حدیثیں روایت کی ہیں وہ صحیح ہیں، فرمایا صحیح ہیں، میں نے عرض کیا، میں آپ سے وہ حدیثیں روایت کروں، فرمایا شوق سے، چنانچہ شیخ عبدالمعطی رحمتہ اللہ علیہ نے شیخ محمد خطابؒ کو یہ اجازت عطا فرمائی، پھر ان میں ہر ایک دوسرے کو اجازت دیتا رہا۔ چنانچہ شیخ احمد بن عبدالقادر رحمتہ اللہ علیہ نے شیخ نخلیؒ کو اس سند کے ساتھ روایت کرنے کی اجازت دی۔ شیخ نخلی رحمتہ اللہ علیہ نے ابوطاہرؒ کو اجازت بخشی اور شیخ ابوطاہر نے مجھے اجازت عطا فرمائی۔

میں نے شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے ہاتھ سے اسی سند کے ساتھ، انہی الفاظ میں یہ حدیث لکھی ہوئی دیکھی ہے۔ البتہ اس میں اتنا اضافہ ہے کہ شیخ عبدالمصطفیٰ رحمتہ اللہ علیہ نے

زیارت سے فارغ ہوکر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بخاری اور مسلم دونوں کتابوں کی احادیث کی صحت سے متعلق پوچھا، آپ نے دونوں کی تصدیق کی اور دونوں کی روایت کی اجازت عطا فرمائی

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت

مجھے شیخ ابوطاہرؒ نے بتایا، انہیں شیخ احمد نخلیؒ نے خبر دی، انہیں بابلی نے بتایا، انہیں سالم نے بتایا، انہوں نے نجم غیطی سے روایت کی، انھوں نے شمس محمد بن العثمانی کی زبانی بیان کیا کہ میں نے خواب میں مکہ مکرمہ میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی، آپ نے سورہ نحل کا ابتدائی حصہ پڑھ کر سورہ نحل اور تمام قرآن مجید کی اجازت عطا فرمائی، شیخ ابوطاہرؒ نے مجھے یہ اجازت بخشی۔

مصافحہ مبارکہ کی شان (۱)

مشابکہ کیا مجھ سے سید عمر بن بنت شیخ عبداللہ بن سالمؒ نے، انھوں نے کہا مشابکہ کیا مجھ سے میرے دادا نے، انھوں نے کہا مجھ سے مشابکہ کیا شیخ محمد بن سلیمانؒ نے اور انھوں کہا بلاشبہ جس نے مجھ سے مشابکہ کیا وہ جنت میں داخل ہوا اس لئے کہ یہ کہہ کر میرے ساتھ مشابکہ کیا میرے مرشد جزائری نے اور یہی بات کہہ کر مشابکہ کیا ان سے ابوعثمان مقریؒ نے، اور اسی طرح مشابکہ کیا ان سے ابوسالم تازیؒ نے، انھوں نے سید صالح زوماویؒ سے، انھوں نے عزالدین بن جماعتؒ سے، انھوں نے شیخ محمد شیریںؒ سے، انھوں نے شیخ سعدالدین زعفرانیؒ سے، انھوں نے اپنے والد محمود زعفرانیؒ سے، انھوں نے ابوبکر سواسیؒ اور ناصرالدین علی بن ابوبکر ذوالنون ملیطیؒ سے، ان دونوں نے محمد بن اسحاق القونویؒ سے، انھوں نے شیخ اکبر محی الدینؒ بن عربی سے، انھوں نے شیخ احمد بن مسعود شداد المقری موصلیؒ سے، انھوں نے شیخ علی بن محمد الجائکی الباصریؒ سے، انھوں نے شیخ ابوالحسن باغوزانیؒ سے مشابکہ کیا، شیخ ابوالحسن کا بیان ہے کہ میں نے خواب میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی، آپ نے اپنی انگلیاں میری انگلیوں میں ڈالتے ہوئے فرمایا اے علی!

---

(۱) یہ مصافحہ کی ہی قسم ہے اس میں دونوں ملنے والے محبت کی بنا پر ایک دوسرے کی انگلیاں آپس میں پھنسا لیتے ہیں اور اس طرح باتیں کرتے رہتے ہیں، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے از راہ کرم کسی کو یہ شرف بخشتے ہوئے کچھ فرمایا تو یہ سنت آگے چلتی رہی اسے مشابکہ کہتے ہیں۔

مجھ سے مشابکہ کر! جس نے مجھ سے مشابکہ کیا وہ جنت میں داخل ہوا، جس نے مجھ سے مشابکہ کرنے والے سے مشابکہ کیا، وہ جنت میں داخل ہوا اور اس طرح آپ نے سات تک گنا، اتنے میں میری آنکھ کھل گئی، میں نے دیکھا کہ میری انگلیاں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی انگلیوں میں تھیں۔ شیخ تازی نے فرمایا کہ جو کوئی کسی سے مشابکہ کرے، یہی کہے کہ مجھ سے مشابکہ کر جس نے مجھ سے مشابکہ کیا وہ جنت میں داخل ہوا۔

اللہ کے قریب کون ہے(۱)

مشافہہ کرایا مجھے شیخ ابوطاہرؒ نے اپنے والد شیخ ابراہیم کردیؒ سے انھوں نے شیخ احمد قشاشیؒ سے اور انھوں نے اپنے مرشد بھائی شیخ رحم القلعشدی میقاتیؒ سے، ان کا بیان ہے کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں اپنے شیخ احمد شناویؒ کے ہمراہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حجرہ مبارکہ میں داخل ہوا، ہم نے آپ کی خدمت میں سلام عرض کیا۔ میرے شیخ نے پوچھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اللہ تعالیٰ سے قریب ترین کون شخص ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا جو اپنی ذات وصفات کو اس کی ذات وصفات میں فنا کردے، میں نے کہا بالکل یہی خلاصہ ہے اس حدیث قدسی کا جس میں فرمایا گیا فاذا احببتہ بہ کنت سمعہ الذی یسمع بہ (الخ) اور جب میں اپنے بندے سے محبت کرنے لگتا ہوں، تو اس کے کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے۔ (الحدیث)

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سورہ فاتحہ پڑھنا

مشافہہ کرایا مجھے شیخ ابوطاہر نے اپنے والد سے، ان کا بیان ہے کہ میں نے قشاشیؒ سے سورہ فاتحہ، اور سورہ بقرہ کا ابتدائی حصہ، اسی طرح پڑھا جس طرح انھوں نے خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پڑھا تھا۔

سورہ اذا زلزلت کی تعلیم بارگاہ نبوت سے

مشافہہ کرایا مجھے شیخ ابوطاہرؒ نے اپنے والد سے، ان کا بیان ہے کہ میں نے سورہ اذا زلزلت

---

(۱) مشافہہ بھی مشابکہ کی طرح روایت حدیث کی ایک قسم ہے اس کا مطلب ہے کہ بیان کرنے والا سننے والے کے سامنے بعینہٖ وہ ہیبت اور کیفیت اختیار کرے جو اس نے روایت کے وقت اپنے شیخ کی حالت دیکھی ہے۔

فقیہ مصری شیخ تقی الدین عبدالباقی الحنبلیؒ سے اسی طرح پڑھی، جس طرح انھوں نے خواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پڑھی اور سنی۔

سورۂ کوثر سماعاً وقراءۃً

مشافہہ کرایا مجھے شیخ ابو طاہرؒ نے اپنے والد سے، ان کا بیان ہے کہ میں سورۂ کوثر کو سماعاً اور قراءۃً (پڑھنا اور سننا) عارف باللہ شیخ محمد بن محمد الدمشقی سے اس طرح روایت کرتا ہوں جس طرح خواب میں انھوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پڑھی، سنی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بخاری پڑھانا

مجھے شیخ ابو طاہر نے بتایا، انہیں ان کے والد نے خبر دی، انہیں قشاشیؒ نے بتایا، انہیں شناویؒ نے اطلاع دی انہیں ان کے والد نے خبر دی، انہیں شعراویؒ نے خبر دی، انہیں شیخ الاسلام زکریاؒ نے بتایا، انہیں شرف الدین ابوالفتح المراغیؒ نے خبر دی، انہیں شرف الدین اسماعیل الجبرتی الزبیدی العقیلیؒ نے بتایا، انہیں علی بن عمر الوانیؒ نے بتایا، انہیں شیخ محقق محمد بن علی بن عربیؒ نے بتایا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ مکہ مکرمہ میں ہوں اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم باب الجہاد اور باب الحزورہ کے درمیان محمد بن خالد الصلانی الصدفی التلستانی کو بخاری پڑھا رہے ہیں، مجلس برخاست ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رکن یمانی کی طرف منہ کرتے ہوئے دعا کے لئے ہاتھ اٹھا کر فرمایا اے اللہ! ہم نے اچھی باتیں سنیں اور ہمیں آگاہی ہوئی، ہمیشہ ہمیں سکون وعافیت عطا کر، ہمارے دلوں کو پرہیزگاری کی دولت عطا فرما اور ہمیں ان باتوں کی توفیق دے جن پر تو راضی ہے۔

یہ مبشرات میں سے چالیس حدیثیں ہیں جنہیں ہم نے اس مختصر سے رسالے میں جمع کر دیا ہے اور یہ سب اللہ تعالیٰ کی تائید ونصرت سے ہوا ہے۔

حرف آخر

میرے والد گرامی نے بیان فرمایا کہ میں نے خواب میں حضرت زکریا علیہ السلام کی زیارت کی۔ آپ نے طریقہ نقشبندیہ کے مطابق مجھے اسم ذات کے ذکر کی تلقین کی، چنانچہ جس طرح حضرت زکریا علیہ السلام نے انہیں تلقین کی تھی میرے والد گرامی نے مجھے تلقین کی۔

میں نے خواب میں دیکھا کہ کچھ لوگ آپس میں جھگڑ رہے ہیں، نوبت گالی گلوچ تک پہنچی۔ ان کی صورت خنزیر کی شکل کے ایک جانور کی مثال نمودار ہوگئی، میں لاٹھی اٹھا کر اس کے پیچھے دوڑا تا کہ اسے مار ڈالوں اس نے مجھے دیکھ کر کہا اگر تم مجھے مارو گے تو میری برائی اور شر کی قوت مجھ سے بدر جہا بدتر جانور کی شکل میں ظاہر ہوگی۔ میں مرعوب ہوگیا اور میں نے حضرت لوط علیہ السلام سے فریاد کی۔ آپ نے کرم فرمایا مجھ سے گفتگو کی تو میرا خوف جاتا رہا۔ پھر آپ نے فرمایا کہ ہم لوگ (انبیاء ورسل) مخلوق کو ہمیشہ فتنہ انگیزی اور شر وفساد سے روکتے آئے ہیں۔ یہ وہ چیز ہے کہ جب ایک دفعہ شروع ہو جاتی ہے تو پھر ہمیشہ کسی نہ کسی شکل وصورت میں چلتی رہتی ہے، اس پر یہ رسالہ مکمل ہوا اوّل وآخر ظاہر وباطن ہر حال اللہ تعالیٰ کی تعریف اور شکر ہے۔

یہ رسالہ اللہ تعالیٰ کی امداد سے تکمیل کو پہنچا۔ درود وسلام ہوں اس کے رسول حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر جو ثواب کی خوشخبری اور عذاب کی وعید لے کر آئے ہیں اور ان کے صدقے ان کی آل اور اصحاب پر جن کے ساتھ نرمی اور سہولت کا وعدہ کیا گیا ہے اور جو ارباب دانش وبینش ہیں۔

مکتوب مدنی

تصنیف

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ

ترجمہ

مولانا محمد حنیف ندوی

تحقیق و تعلیق

مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی

مکتوب مدنی

عبد ضعیف احمد ولی اللہ بن عبدالرحیم عفی اللہ عنہ کی طرف سے آفندی اسمٰعیل بن عبداللہ الرومی ثم المدنی (۱) کی طرف اللہ تعالیٰ انہیں ان کی نیک امیدوں اور خواہشوں میں کامرانی عطا کرے۔

امابعد! میں اس اللہ کی حمد وستائش کا تحفہ تمہاری طرف ارسال کر رہا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں اور اس کے برگزیدہ رسول اور اس کے صحابہ وآل پر درود وسلام بھیجتا ہوں۔ تمہارا وہ مکتوب مجھے ملا ہے جس میں تم نے وحدت الوجود کے اس تصور کے بارے میں دریافت کیا ہے جس کو شیخ اکبرؒ اور اس کے اتباع نے پیش کیا ہے اور وحدت شہود کی اس تشریح کی وضاحت چاہی ہے جس کا ذکر مجدد الف ثانیؒ نے کیا ہے، تم نے یہ بھی پوچھا ہے کہ آیا دونوں بزرگوں کے نظریات میں تطبیق ممکن ہے۔

تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ ہر زمانہ اور ہر ہر قرن میں علم کی کچھ نوعیتیں ہوتی ہیں جن سے اس دور کے بزرگوں کو بہرہ مند کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی تقسیم رحمت کا یہ خاص انداز ہے، یہ حقیقت اس وقت تمہاری نظروں سے اوجھل نہیں رہے گی جب تم غور وفکر کو اس نکتہ پر مرکوز کرو گے کہ ہمارے اسلاف کے سینے کیونکر اس وقت الہام حق کے آشیانے بنے جب کہ علوم شرع کی تدوین نہیں ہو پائی تھی اور فنون مترتب نہیں ہوئے تھے، اور ان معارف سے متعلق بحث وتمحیص کے

---

(۱) مکتوب الیہ نے حضرت شاہ صاحب سے وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کے مابین فرق واضح کرنے کے سلسلہ میں استفسار کیا تھا، حضرت شاہ صاحب نے اس کا مفصل جواب دیا تھا۔ (قاسمی)

پیمانے بھی حرکت میں نہیں آئے تھے۔ ان حالات میں ان امور سے متعلق لب کشائی کرنا یقیناً اس کی حکمت کی وجہ سے تھا۔

موجودہ دور میں اللہ تعالیٰ کی ارزانی لطف کا یہ تقاضا ہے کہ اسلاف کے جملہ علوم و معارف کا ہمارا دل و دماغ مخزن قرار پائے، قطع نظر اس کے کہ ان کا تعلق منقول و معقول سے ہے یا مکشوفات سے، اور پھر اس کی توفیق و مدد کے بل پر انہیں اس طرح تطبیق و توافق کے مواقع پیدا ہوں کہ اختلاف رائے کے بادل چھٹ جائیں اور ہر قول کا ایک صحیح حل متعین ہو جائے۔

یہ ہے ان مسائل سے نمٹنے کی ایک اساس، اس کی روشنی میں فقہ، کلام اور تصوف وغیرہ کے اختلافات کو دور کیا جا سکتا ہے، تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ حق، جیسا کہ حضرت خضرؑ نے کہا ہے، ایک بحر ذخار ہے جس کا نہ آغاز ہے نہ انتہا، اور جو لوگ اس میں اترتے ہیں اور اس کے متعلق بات چیت کرتے ہیں ان کی مثال اس سوئی کی سی ہے جو اس میں غوطہ زن ہوئی۔ ظاہر ہے اس بے پایانی میں کچھ فرق نہیں آتا۔ یا ان کی مثال ان چڑیوں کی سی ہے جنھوں نے سمندر کے پانی سے پیاس بجھائی اور پھر اڑ گئیں۔ گویا حق کے بارے میں ان لوگوں کی گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ انھوں نے صرف جزوی جمال ہی کی نشاندہی کی ہے۔

وعلى تفنن واصفيه بوصفه

يفنى الزمان وفيه مالم يوصف

(اس کی مدح و ثنا کرنے والوں کی گوناں گونی کے باوجود زمانہ ختم ہو جائے گا، مگر اس کی مدح کے تمام پہلو واضح نہ ہو سکیں گے) اس صورت میں سننے والے مختلف گروہوں میں بٹ جاتے ہیں، اب جس نے ہر ایک اشارے کے صحیح صحیح حل کو پالیا اور اس مقام کو ٹھیک ٹھیک سمجھ لیا جس کے متعلق خبر دی گئی ہے وہ تو مفہوم و معنی کی تہہ تک پہنچ گیا اور اس نے ہر قول کی مناسب تشریح پر قدرت حاصل کر لی اور جس کو عبارات کے اختلافات اور اشارات کی بوقلمونیوں نے خوف زدہ کر دیا اور وہ اس لائق نہ ہو سکا کہ اختلاف کی اصل نوعیت سے آگاہی حاصل کر لے وہ گویا الجھاؤ اور انتشار فکر کی حیرت زائیوں میں گم ہو کر رہ گیا، ان لوگوں کا حال ان اندھوں سے مختلف نہیں جنھوں نے کسی درخت کو گھیر لیا اور اسے چھوا، گرفت میں لیا اور چکھا، ان میں بعض کے حصے میں تو

صرف پتے ہی آئے، بعض نے آگے بڑھ کر ٹہنیوں تک رسائی حاصل کرلی، بعض اس کے بور اور پھل کو پالینے میں کامیاب ہو گئے اور بعض خوش قسمتوں کو اس کے اثمار اور میووں سے کام ودھن کی تواضع کا موقع بھی مل گیا، اب جس نے صرف درخت کو اپنی آغوش میں لیا تھا اس کا یہ بیان تھا کہ یہ تو صاف اور ٹھوس قسم کی چیز ہے، جس نے ٹہنیوں تک رسائی حاصل کی تھی اس نے اسے صرف لکڑی کی شاخیں سمجھا، جو ٹہنیوں اور بور تک پہنچ گیا تھا اس نے اسے بدرجہ غایت نرم اور نازک شے قرار دیا، اسی طرح اس کے مزے کے بارے میں بھی ان کی رائیں مختلف تھیں، کسی نے کہا اس کا پھل بہت میٹھا ہے، کسی نے کہا بہت کڑوا اور بکٹا ہے اور کوئی ایسا بھی تھا کہ جس نے سرے سے اسے بے مزہ اور بے کیف سمجھا، اگر ایک نے کہا کہ اس کی اچھی خاصی خوشبو تھی تو دوسرے نے اس کی تردید کی، ان کے اختلاف نے جب یہ صورت اختیار کرلی کہ ہر ایک دوسرے کی تکذیب کے درپے ہے اور سب دشنام اور گالی گلوچ میں مصروف ہے، تو اتنے میں ایک ایسا شخص آنکلا جو دیدۂ بینا رکھتا تھا، اس میں اگرچہ دوسروں کی نسبت کچھ خوبیاں کم ہی تھیں، مثلاً اس کی آواز حسن وترنم سے محروم تھی، اس کی قوت گرفت کمزور تھی اور اس کے ذوق سمع میں بھی قدرے خلل تھا، تاہم یہ ان میں بینا اور دیکھنے والا تھا، اس نے کہا تم سب درحقیقت صحیح کہتے ہو۔ غلطی فقط یہ ہے کہ تم نے اپنے اپنے مشاہدے میں حقیقت کو محصور سمجھ لیا ہے، اس کے بعد اس نے ان کے مشاہدات کی اس طرح تشریح کی اور ہر ہر قول کے محل ومقام کا اس طرح پتہ دیا کہ سب مطمئن ہو گئے۔

اس سلسلے میں یہ حقیقت بھی مدنظر رہنا چاہئے کہ اگرچہ کبھی کبھی ان عرفا کا کشف جو ظاہر وباطن کے علوم سے بہرہ مند ہیں صحیح ہوتا ہے، تاہم قدما کے کلام کی توجیہ وتعبیر میں ان سے خطا ولغزش کا بہت ارتکاب ہوسکتا ہے اور اس سے ان کے مرتبۂ عرفان میں کچھ کمی پیدا نہیں ہوئی، کیونکہ جہاں تک کسی بات کی صحیح صحیح تشریح اور یقینی مفہوم کا تعلق ہے یہ دائرۂ کشف سے یکسر خارج اور ایک علیحدہ شے ہے، جس میں کہ علما ظاہر اور عوام بھی اس کے شریک ہیں۔

ان تمہیدات کے بعد تمہیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ وحدت وجود اور وحدت شہود دو لفظ ہیں جن کا اطلاق دراصل مختلف معانی پر ہوتا ہے، کبھی کبھی ان کا استعمال ''سیر الی اللہ'' کے مباحث میں ہوتا ہے، چنانچہ کہا جاتا ہے کہ فلاں سالک وحدت الوجود کے مقام پر فائز ہے اور فلاں وحدت شہود

پر جاگزیں ہے۔اس سیاق میں وحدت الوجود کے معنی ایسے شخص کے ہوں گے جو حقیقت جامعہ کی تلاش وعرفان میں گم اور مستغرق ہے، استغراق کا یہ وہ مقام ہے جہاں یہ عالم رنگ وبو اپنے تمام امتیازات کے ساتھ فنا کے گھاٹ اتر جاتا ہے اور تفرقہ وامتیاز کے وہ سارے احکام ساقط ہو جاتے ہیں کہ جن پر خیر وشر کی معرفت کا دار ومدار ہے اور شرع وعقل جس کی پوری پوری نشاندہی کرتی ہے۔سیر وسلوک کا یہ مقام محض عارضی ہوتا ہے، سالک چندے یہاں ٹھہرتا ہے اور پھر اللہ تعالیٰ کی دستگیری وتوفیق اس کو جلد ہی اس مقام سے نکال لے جاتی ہے۔

اسی طرح وحدت شہود کے معنی اس سیاق میں یہ ہوں گے کہ سالک ایسے مقام پر متمکن ہے جہاں احکام جمع وتفرقہ کے ڈانڈے باہم ملے ہوتے ہیں یعنی سالک اس حقیقت کو پالینے میں کامیاب ہو گیا ہے کہ اشیا میں جو وحدت سے نظر آتی ہے من وجہ ہے اور کثرت جو اس کے متبائن محسوس ہوتی ہے وہ بھی من وجہ ہے۔

معرفت وسلوک کا یہ مقام پہلے مقام سے نسبتاً زیادہ اونچا ہے، وحدت الوجود اور وحدت شہود کی اس اصطلاح کو ہم نے شیخ آدم بنوری قدس سرہ کے بعض اتباع سے لیا ہے۔

کبھی کبھی ان الفاظ کا اطلاق حقائق اشیا کی نسبت سے ہوتا ہے، حادث وقدیم میں ربط وتعلق کی کون سی نوعیت کارفرما ہے؟ اس کے بارے میں دو نقطہ نظر پائے جاتے ہیں۔کچھ لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ یہ عالم جو اغراض مختلفہ کا ہدف ونشانہ ہے اس کی تہہ میں ایک ہی حقیقت جاری وساری ہے جیسے مثلاً شمع یا موم سے انسان، گھوڑے اور گدھے کی صورتیں بنائی جائیں، یہ سب اگرچہ رنگ وروپ میں مختلف ہوں گی مگر مزاج واصل کے لحاظ سے انہیں مختلف نہیں سمجھا جائے گا بلکہ ایک ہی قرار دیا جائے گا، یعنی کہا جائے گا کہ طبیعت شمعیہ ان سب میں مشترک اور بنیاد کے طور پر پائی جاتی ہے۔ان کی رنگا رنگ صورتوں کو اختیار کر لینے کے بعد شمع کا اپنا کوئی نام نہیں رہے گا، بلکہ اس کو انہیں ناموں سے پکارا جائے گا، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ یہی صورتیں درحقیقت انسان، گھوڑا اور گدھا کہلانے کی مستحق ہیں۔ہاں یہ البتہ صحیح ہے کہ ان کا اپنا کوئی وجود نہیں، کیونکہ جب تک شمع یا موم سے ضمیمہ وجود مستعار نہ لیا جائے ان کا عالم خارجی میں تحقق بھی نہیں ہو پاتا۔

دوسرا گروہ حادث وقدیم کے مابین ربط وتعلق کو اس طرح استوار کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ

یہ عالم دراصل اسماء وصفات کے ان عکوس وظلال سے تعبیر ہے کہ اعدام متقابلہ آئینوں میں ارتسام پذیر ہوتے ہیں، مثلاً قدرت کا عدم عجز ہے، لہٰذا جب قدرت کی ضوفشانیاں عجز کے آئینے میں ہوں گے تو اس سے قدرت ممکنہ ظہور میں آ جائے گی، جب موجودات کی یہ توجیہ فہم وفکر کی گرفت میں آ گئی تو تمام صفات وجود کو اسی پر قیاس کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں، پہلا نقطۂ نظر وحدت الوجود کی ترجمانی کرتا ہے اور دوسرا وحدت شہود کی۔

ہمارے خیال میں کشف پر مبنی یہ دونوں نتائج صحیح ہیں، ممکن ہے بعض حضرات یہ کہیں کہ وحدت شہود کی اس توجیہ کی تائید شیخ العربیؒ کے اقوال سے نہیں ہو پاتی۔ ہم کہیں گے کہ یہ سراسر سہو ہے، شیخ، ان کے اتباع، تلامذہ اور حکما سب اس کے قائل ہیں۔ اس لئے کہ اگر ان اقوال کو مجازات واستعارات سے قطع نظر کر کے کہ جن کی وجہ سے فہم وادراک کی مشکلات ابھرتی ہیں، حقیقت نفس الامری کا براہ راست مطالعہ کیا جائے تو حاصل کلام یہی نکلے گا کہ حقائق امکانیہ چونکہ شدید ضعف و نقص لئے ہوئے ہیں، اور حقیقت وجود یہ ہی ایسی چیز ہے جو اتم واقوی ہے، لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ یہ حقائق امکانیہ اعدام ہیں جن میں کہ موجودات کی مختلف النوع صورتیں ارتسام پذیر ہوتی ہیں، ظاہر ہے کہ وجود کی یہ تعبیر متفق علیہ ہے۔

تم نے جو چیز دریافت کی ہے وہ قدرے تفصیل چاہتی ہے اور غور وفکر کی متقاضی ہے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ وہ پہلی بات جس کو مسلمان سمجھتے ہیں اور جو کتاب وسنت سے ذہن میں متبادر ہوتی ہے اور عقل جسے تسلیم کرتی ہے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بھی اسی طرح موجود جزئی ہے جس طرح کہ یہ سارا عالم محسوس ہے، سوا اس کے کہ وہ اس کا خالق اور رزاق بھی ہے، علم وادراک کی یہ وہ نوعیت ہے جسے ہر ہر عاقل اپنے قلب وجگر میں جلوہ گر پاتا ہے، بغیر اس کے کہ وہ ریاضت ومجاہدہ کی سختیاں جھیلے یا عقل وخرد کی گہرائیوں میں اترے، اور اسی حد تک شرع نے ایک مسلمان کو مکلف بھی ٹھہرایا ہے اور شریعت الٰہی کے بارے میں یہ طے ہے کہ وہ انسان کو انہی چیزوں کا مکلف گردانتی ہے جو پہلے سے اس کی فطرت میں موجود ہوں اور اس کی صورت نوعیہ کا ضروری تقاضا ہوں، چاہے یہ چیزیں علمی ہوں، چاہے عملی۔ اسی طرح شریعت کی گرفت ومحاسبہ بھی انہی امور سے متعلق ہے کہ جو انسانی فطرت کے ضمیر میں پہلے سے موجود ہیں، ارشاد باری ہے: **فطرة الله التي فطر**

الناس علیها، لاتبدیل لخلق الله (اللہ کی وہ فطرت کہ جس پر اس نے انسانوں کو پیدا کیا اور خدا کے بنائے ہوئے قوانین بدلنے والے نہیں) حدیث میں ہے، کل مولود یولد علی الفطرة (ہر ہر مولود کو فطرت پر پیدا کیا جاتا ہے)۔

علم و ادراک کی یہ مقدار عرفان صحیح اور اشارۂ صادقہ پر مبنی ہے جس کا سرچشمہ خود تجلیات حق کی ایک تجلی ہے جو نفس رحمانی میں اس وقت ظہور پذیر ہوئی جب کہ زمانے کی گردشوں نے ابھی جنم نہیں لیا تھا اور حدوث و خلق کے قصے کا بھی آغاز نہ ہو پایا تھا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانی فطرت میں اللہ تعالیٰ کی طرف بڑھنے کا جذبہ و میلان اسی طرح کا پایا جاتا ہے جیسا کہ لوہے میں مقناطیس کی طرف کھنچنے اور سرکنے کی صلاحیت ہے، یا جس طرح آگ کے شعلے اوپر کی طرف اٹھتے ہیں، یا مثلاً زمین جس طرح نیچے کی طرف گرنے اور لڑھکنے پر مجبور ہے۔ اس حقیقت کو کس سچائی سے ایک شاعر نے پیش کیا ہے۔

لقد صرت مقناطیسها فقلوبنا

بجذبک ایاها الیک تمیل

(تو بمنزلہ مقناطیس کے ہوگیا ہے، لہٰذا ہمارے دل، اس کے جذب و کشش کی وجہ سے، تیری طرف بے اختیار مائل ہو رہے ہیں) یہی وہ تجلی ہے جس کو موت کے بعد "لقاء اللہ" سے تعبیر کیا ہے اور ان تمام ذرائع کو جو لقاء الٰہی کے لئے معین و سازگار ہوں، انشراح قلب اور روشنی قلب کا سبب ٹھہرایا ہے اور ان تمام چیزوں کو گناہ و معصیت قرار دیا ہے جو بعد اور دوری پیدا کریں، اس معنیٰ کی طرف اس حدیث میں اشارہ ہے، سترون ربکم عزوجل کما ترون القمر لیلة البدر۔ لا تضامون فی رویة فان استطعتم ان تغلبوا علیٰ صلوة قبل طلوع الشمس وقبل غروبها فافعلوا (تم اپنے رب کو اسی طرح دیکھو گے جس طرح چودھویں رات کے چاند کو دیکھتے ہو۔ اس کے دیکھنے میں تمہیں کسی قسم کی زحمت سے دوچار نہیں ہونا پڑے گا۔ پس اگر تم طلوع شمس سے پہلے اور غروب شمس سے پہلے نماز پڑھ سکو تو ضرور پڑھو) یہی تجلی خیر و شر کا معیار بھی ہے جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا ہے اور یہی وہ شی ہے جس پر اللہ تعالیٰ کے ننانوے اسماء منطبق ہوتے ہیں اور ایک حدیث میں آنحضرت صلعمؐ نے ایک شخص کے اس سوال پر کہ اللہ تعالیٰ

تخلیق سے پہلے کہاں تھا جو ارشاد فرمایا: **کان فی عماء مافوقه هواء وماتحته هواء** (خدا لامکان میں تھا) اس میں بھی یہی حقیقت پائی جاتی ہے۔ اسی طرح صوفیا کے اس قول میں بھی اسی مفہوم و معنی کی نشاندہی کی گئی ہے کہ وجود دو قسم کے مظاہر میں جلوہ گر ہوا ہے۔ ایک ایسے مظہر میں جس کے لیئے تاثیر، قہر و تغلب اور فعل و تنزہ واجب ہے، دوسرے ایسے مظہر میں جو امکان کے ساتھ تاثر، قہر، تغلب، انفعال اور تلوث کو قبول کرنے کی صلاحیتیں رکھتا ہے۔ مزید براں شیخ محی الدین بن العربیؒ کے اس قول میں بھی کہ اس عالم کون و مکان میں ایک ارادۂ متجددہ پایا جاتا ہے اسی صداقت کی طرف اشارہ ہے۔ ان دقائق کے پیش نظر جس شخص نے اس تجلی کا اثبات کیا اس نے گویا قدرت و فطرت کو پالیا کہ جس پر اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کو پیدا کیا ہے اور اسی طرح اس نے اس معاملے میں انبیا اور اولیا کے ذوق معرفت کی تائید کی، لیکن جس نے انکار کیا اس نے نہ صرف فطرت کا انکار کیا، بلکہ انبیا اور اولیا کے متفقہ ذوق عرفان کی تکذیب کی جو اللہ تعالیٰ کے اقرار و اثبات پر منتج ہوتا ہے۔ لہٰذا ایسے شخص کے زندیق و دہریہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

ٹھیک اسی طرح جس شخص نے اس علم کی تکذیب کی جس کو اللہ تعالیٰ نے فطرت انسانی میں ودیعت کر رکھا ہے اور جس پر کہ مسئلہ تکلیف و مکافات کا دار و مدار ہے وہ بھی زندیق ہے۔

یہ علم ہر ہر شخص کی فطرت میں سمویا ہوا ہے کہ حقائق اشیا ثابت نہیں، اور یہ کہ ہر شے مخصوص قسم کے امتیازات سے بہرہ مند ہے، مثلاً یہ کہ آگ کا خاصہ جلانا ہے، پانی آگ کو ٹھنڈا کرتا اور بجھاتا ہے، زنجبیل حار ہے، کافور بارد ہے، نماز کار خیر ہے اور زنا برائی۔

اس تفصیل کے معنی یہ ہوئے کہ جس شخص نے ان حقائق کو نہ مانا اس کے خلاف خود اس کے قلب و ضمیر میں دلائل و براہین کا لشکر صف آرا ہو گیا اور خود اس میں فطرت نے اس کے نفسانی رجحانات کی تکذیب کی، یعنی وہ اس سلسلہ اقوال و آراء کی پراگندی کا شکار ہوا اور ضلالت و گمراہی کے عمیق ترین گڑھوں میں جا گرا۔

ہم جانتے ہیں کہ شارع علیہ السلام نے علم و ادراک کی اس فطری مقدار سے آگے بڑھنے کی اجازت نہیں دی اور اس سلسلے میں مزید غور و فکر سے روکا ہے، لیکن باوجود اس کے کہ صوفیا نے ان مسائل پر گفتگو کی ہے ان کا عذر یہ ہے کہ جس چیز سے روکا گیا ہے وہ یہ ہے کہ طبیعت نوعی سے زیادہ

توقعات وابستہ کی جائیں اور فکر واستدلال کے لگے بندھے اصولوں کی روشنی میں قدم آگے بڑھائے جائیں۔لیکن اگر کوئی شخص عقل واستدلال کی راہوں سے بڑھ کر علوم ومعرفت کا کوئی اور انداز اختیار کرتا ہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، بہر حال کہنا یہ ہے کہ لوگوں نے اس فطری اصول کو مان لینے کے باوجود اس پر دوسرے انداز سے غور وخوض کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اشیائے معقولہ اور اشیائے محسوسہ دونوں میں نفس وجود کے اعتبار سے اشتراک پایا جاتا ہے اور وجود کا یہی وہ جانا بوجھا مفہوم ہے جس کے پیش نظر یہ چیزیں معدوم سے جدا ہوتی ہیں، مثلاً مثلث کے دو مفہوم ہیں: ایک وہ جس کا تعلق تعقل وتصور سے ہے اور دوسرا وہ جس کا تعلق محسوسات سے ہے۔ظاہر ہے کہ مثلث کا تعقل وتصور اس کے وجود سے مختلف ہے اور یہی اختلاف وہ فارق ہے جو اسے حیز معقولات سے نکال کر سطح وجود پر لا کھڑا کرتا ہے اور اسی مقام پر فائز ہو کر کسی شے میں قابلیت وفاعلیت کی خصوصیات ابھرتی ہیں، یعنی ایک تو شے کی ماہیت معقولہ ہے اور ایک یہ خصوصیات زائدہ یا امتیازات ہیں جو اس کے علاوہ ہیں، اور کہنا چاہیے کہ انہی کی بدولت گھوڑے، انسان اور گدھے وغیرہ کی ماہیت محسوس وممیز سانچوں میں ڈھلتی ہے۔اس مرحلے پر دو سوال ابھر کر نظر وفکر کے سامنے آتے ہیں: خود اس وجود کی حقیقت کیا ہے؟ اور خصوصیات زائدہ کے ساتھ اس کے ربط وانضمام کی نوعیت کیا ہے؟

اس کا ایک جواب یہ ہے کہ وجود امر انتزاعی ہے، یعنی صورت حالات یہ نہیں کہ خالق وفاطر کائنات نے پہلے تو ماہیات کو پیدا کیا ہو اور پھر ان پر خصوصیات وجود کا اضافہ فرمایا ہو، بلکہ واقعہ صرف اس قدر ہے کہ اس نے ماہیات کو وجود بخشا ہے (غرض یہ ہے کہ ماہیات کا تصور سراسر انتزاع وتجرید کا کرشمہ ہے، ورنہ وجود وماہیت دو الگ الگ چیزیں نہیں) ہم اس پر یہ کہیں گے کہ یہ بات ایک پہلو سے صحیح ہے اور ایک پہلو سے غلط ہے، غلط ان معنوں میں ہے کہ اس میں وجود کے عمومی مفہوم کو صرف ایک ہی شق میں منحصر کر دیا گیا ہے، حالانکہ ہم امور انتزاعیہ کا باقاعدہ ادراک رکھتے ہیں، ان کو صفت وجود سے متصف گردانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کا تعلق ماہیات اشیاء سے ہے۔ظاہر ہے کہ خود ماہیات اور امور انتزاعیہ کا اگر وجود نہ ہو اور ان کے اتصاف کی نوعیت ایسی نہ ہو کہ ان کو خلاق وفاطر کا کرشمہ تخلیق کہا جا سکے، تو انتزاع وتجرید کے لئے کیا بنیاد اور

اساس باقی رہ جاتی ہے؟

بعض حضرات اس مرحلے پر کہیں گے کہ خالق و فاطر نے تو دراصل اپنی ذات سے ماہیات ہی کا اصدار فرمایا تھا، پھر جب لوگوں نے دیکھا کہ ان میں فاعلیت و قابلیت وغیرہ کی صلاحیتیں پائی جاتی ہیں تو اس سے ان کے ذہن میں وجود کا تصور مرتسم ہوا، اس کے مقابلے میں ہمارا یہ کہنا ہے کہ اس تعبیر میں بھی خطا و صواب کے دوگونہ پہلو پائے جاتے ہیں۔ خطا کا پہلو یہ ہے کہ معرفت وجود کو ماہیات کی حد تک محدود کر دیا گیا ہے، حالانکہ یہ قطعاً ایسے امور کو جانتے بوجھتے نہیں جو خارج میں مخصوص و متعین سانچہ رکھتے ہیں اور ہم اس تعین کی بنا پر انہیں مختلف ناموں سے پکارتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ خصوصیت، یہ تعین اور وجود کا یہ سانچہ اس وجہ سے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ماہیات اشیا کے علاوہ ان کی تخلیق بھی فرمائی ہے، ذرا غور سے دیکھیں تو یہ حقیقت صاف طور پر علم و ادراک کی گرفت میں آئے گی کہ اس عالم رنگ و بو میں مختلف و متمیز وجود نہیں جنہیں ہم ماہیات سے تعبیر کرتے ہیں اور جن کے بارے میں ہم محسوس کرتے ہیں کہ یہ وجود کے دو خانوں میں تقسیم پذیر ہیں، ایک وہ وجود مطلق ہے جس کی وسعتیں اور پھیلاؤ موجودات کے پورے سلسلے کو اپنے آغوش میں لئے ہوئے ہے اور یہ درجے و رتبے میں دوسرے وجود سے متقدم ہے، دوسرا وجود وہ ہے جو خصوصیت و تمیزات کا حاصل ہے۔

وجودات خاصہ کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ صورت علمیہ کے تنزلات نہیں اور ان میں اور وجود مطلق میں ربط و تعلق کی جو نوعیت کارفرما ہے وہ اگرچہ معلوم نہیں مگر اس کے تحقق و اثبات میں شبہ نہیں، وجود کی اس وضاحت سے صاف صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ دونوں گروہ خطا و صواب کے ملے جلے موقف کے حامی ہیں جس سے کہ پوری پوری تشفی نہیں ہو پاتی۔

وحدت الوجود کے قائلین صوفیا کا کہنا ہے کہ وجود مطلق جو خارج میں مترتب آثار کا موجب ہوتا ہے دو حال سے خالی نہیں، یا تو خارج میں موجود ہونے اور ترتب آثار کا ہدف بننے کے لئے اسے ایک ضمیمہ یا شے زائد کے الحاق کی ضرورت پڑے گی یا نہیں پڑے گی۔ پہلی صورت میں ہم اسے ممکن کہیں گے اور دوسری صورت میں ''واجب''۔ اس ضمیمہ یا شئے زائد کی کیا حیثیت ہے؟ یہ ایک وجود منبسط ہے جو تمام پیکران محسوس و موجود کو اپنے گھیرے میں لئے ہوئے ہے۔ یہ قائم

بالذات حقیقت ہے، یہی نہیں، دوسری اشیا کے لئے مقوم بھی ہے۔ نیز فی نفسہ غیر متعین ہے اور جملہ آثار و خصوصیات سے تہی بھی۔ اس کا احساس ہمیں ذوق و وجدان کے ذریعہ ہو پاتا ہے۔ وجود مطلق کی اس صورت کو آگے چل کر تنزلات علمی و عینی کہیں گے جن سے کہ خصوصیات و آثار کا الحاق ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ تنزلات کی ترتیب کیا ہے۔ اس کو یوں سمجھئے کہ پہلے مرتبے پر تو خود اس کی ذات ذات کی سطح پر جلوہ فگن ہوتی ہے۔ تجلی کی یہ صورت جزئی نہیں ہوتی بلکہ اس طرح کی کلیت لئے ہوئے ہوتی ہے کہ کائنات کی کسی چیز کو بھی اس کی وسعتوں سے خارج نہیں کیا جا سکتا۔ دوسری تجلی میں اس شان کلی کی تفصیلات ہوتی ہے مگر صرف علم کی حد تک اعیان و افراد اس کی زد میں نہیں آتے، اس کے بعد آخری تجلی اعیان و افراد کی شکل میں ظہور پذیر ہوتی ہے۔

تجلیات کی اس تشریح کے بعد حقائق ممکنات کا سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ ان سے مراد وجود مطلق یا ذات کا ان صور و اشکال گوناں گوں سے متلبس ہونا ہے جو مختلف شئون و اعتبارات سے ابھرتی ہیں، اس کے معنی یہ ہیں کہ جب ذات گرامی ان مختلف اور رنگا رنگ حالات و شئون سے معترض ہوتی ہے تو اس تعرض و تلبس سے ماہیات ممکنات کی تعین ہوتی ہے۔

وجود ممکنات کا مطلب یہ ہے کہ یہی حقائق جو اب تک مرتبہ علم میں تھے پیراہن وجود سے آراستہ ہیں۔ لیکن ان حقائق کو پیراہن وجود سے آراستہ اس وقت کہا جاتا ہے جب وجود ممکن کی تمام شرائط مہیا ہو جائیں اور وہ تمام موانع دور ہو جائیں جو ان حقائق کو حیز وجود میں آنے سے روک رہے تھے۔

اس طرح ماہیات اشیا اور وجود میں ربط و انضمام کی ایسی نوعیت قائم ہو جاتی ہے جس کی کیفیت تو معلوم نہیں کی جا سکتی مگر جس کا تحقق و اثبات بہر حال جانا بوجھا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ربط و تعلق کے اس انداز کی وجہ سے ان پر خصوصیات و آثار کا ترتب ہونے لگتا ہے۔ اس مرحلے پر کہا جاتا ہے کہ وجود مطلق نے تنزل فرمایا ہے یا یہ کسی خاص مظہر میں ظہور پذیر ہوا ہے۔ وجود کے ظہور پذیر ہونے یا تجلی و تنزل کی اس سطح پر آنے کے معنی یہ ہیں کہ ہر ہر نوعیت کے آثار و خصوصیات کی پوری پوری تعین ہو گئی ہے۔

ہماری رائے میں یہ بات عقل اور کشف دونوں کی رو سے صحیح ہے، مثلاً تم میدان جنگ پر نظر

ڈال کر دیکھو، تمہیں معلوم ہوگا کہ اس کی ساری رونق و ہنگامہ آرائی ''جسم'' کی بدولت ہے۔ وہی قاتل ہے، وہی مقتول اور وہی آلۂ قتل بھی ہے۔ اسی طرح اس کو راکب و مرکوب قرار دیں گے اور اسی کو سیف وسناں اور ہازم ومہزم سے تعبیر کریں گے، اور وہی حملہ کرنے والا اور حملے کا ہدف ونشان بھی ہوگا۔

لیکن اس کے باوجود کہ ان تمام ظہورات میں جسم ہی کی کارفرمائیاں نظر آتی ہیں، تنہا جسم کو ان میں سے کسی نام کے ساتھ بھی متصف نہیں ٹھہرایا جا سکتا، تاآنکہ اس پر ایک کیفیت خاص اور معنی خاص کا اضافہ نہ کیا جائے اور خصوصیات وامتیازات کو بڑھایا نہ جائے، یوں اگر ان خصوصیات وآثار کا جسم سے صرف نظر کر کے مطالعہ کریں گے تو ان کی حیثیت معدومات سے زیادہ نہیں ٹھہرے گی کہ جن پر آثار وخصوصیات کا ترتب نہیں ہو پاتا، لیکن جونہی ان کو جسم کے مختلف سانچوں میں ڈھالا جائے گا یا ان کے ساتھ جسم کو جوڑا اور منضم کیا جائے گا، یہی کیفیات صدور آثار وکیفیات کا موجب وسبب بن جائیں گی۔

گویا جسم مطلق جہاں تک علم وتقدیر کا تعلق ہے پہلے سے ان معانی کا محل یا حامل ہے اور جب یہ معنی وجود خارجی کا سانچہ اختیار کر لیتے ہیں، تو مختلف اشیا کے روپ میں ظاہر ہوتے ہیں، چنانچہ اب ان میں کوئی راکب بن جاتا ہے کوئی مرکوب اور کوئی سیف وسناں کہلاتا ہے اور کوئی ہدف وقتیل۔

ان بوقلموں صورتوں اور متعدد شکلوں کو جن کا تعلق یکسر معانی اور ماہیات سے ہے جسم کے قالب میں ڈھلنے سے پہلے اعدام ممکنہ ہی کہنا چاہیے، مگر جب اسباب وشرائط مہیا ہو جاتے ہیں تو کوئی لوہار یا بڑھئی اٹھتا ہے اور انہیں تیشے اور ہتھوڑے کی مدد سے معرض وجود میں لے آتا ہے۔ اسی طرح ان معدومات موہومہ اور موجودات میں ربط وتعلق کی ایک نوعیت ابھر آتی ہے جس کی کنہ وکیفیت تو معلوم نہیں کی جا سکتی، البتہ اتنا یقینی ہے کہ ان میں رشتہ وربط کا یہ انداز ضرور پایا جاتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ جب ہم سیف وسنان کا لفظ بولتے ہیں تو اس سے ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ معنی معدوم اور وجود میں ایک طرح کا ربط وتعلق پیدا ہو گیا ہے، جس کی وجہ سے اس کو خاص نام کے ساتھ متصف گردانا جا سکتا ہے، ورنہ اس سے پہلے مطلق جسم کی

نسبت یہ تھی کہ اس کو صور مختلفہ کا ہدف قرار دیا جا سکتا تھا، یعنی وہ راکب بھی ہو سکتا تھا اور مرکوب بھی، سیف کے قالب میں بھی ڈھل سکتا تھا اور سنان کے سانچے میں بھی، لیکن اب جب کہ اس نے سیف کی صورت اختیار کر لی تو ہم کہیں گے کہ جسم مطلق نے ایک خاص تعین کو اپنا لیا ہے اور بوقلموں صورتوں اور شکلوں میں سے ایک صورت کو چن لیا ہے۔ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ جسم ایک متعین ظہور میں آشکار ہوا ہے۔

ظاہر ہے کہ تعبیر و بیان کا یہ انداز بالکل صحیح ہے جس کو تھوڑی دیر کے لئے لفظی مناقشوں میں تو الجھانا ممکن ہے مگر کسی عاقل کے لئے گنجائش انکار ہرگز نہیں۔

پھر یہ بات اگر جسم کے حق میں صحیح ہے تو وجود کے حق میں بطریق اولیٰ صحیح ہونا چاہئے۔ صوفیا جب یہ کہتے ہیں کہ ''العالم عین الحق'' تو اس سے ان کی مراد یہ نہیں ہوتی کہ ان وجودات خاصہ یا تعینات کی نفی کی جائے جو تنزل وظہور کا نتیجہ ہیں، بلکہ وہ صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ حق نے اس آب وگل میں ظہور فرمایا ہے، یعنی جس طرح ایک معقولی کہتا ہے کہ زید وعمر ایک ہیں اور اس کا اشارہ تماثل نوعی کی طرف ہوتا ہے، ممکن اتحاد کی طرف نہیں، یا جب وہ کہتا ہے کہ انسان اور گھوڑا ایک ہیں، تو وہ یہ بتانا چاہتا ہے کہ ان میں حیوانیت امر مشترک ہے، اسی انداز سے جب وہ شجاع اور شیر کو ایک قرار دیتا ہے تو اس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ ان میں جو وصف مشترک ہے اس کی نشاندھی کرے۔ ٹھیک اسی طرح اور انہی معنوں میں صوفیا ''العالم عین الحق'' کہتے ہیں اور اس سے ان کی غرض فقط یہ ہوتی ہے کہ اس وجود منبسط میں اور ہمارے گردوپیش پھیلی ہوئی اس وسیع تر حقیقت میں، جس نے کہ سارے عالم ہست وبود کا احاطہ کر رکھا ہے، حق کی جلوہ فرمائی ہے اور یہ کہ وجود کی یہ نوعیت براہ راست حق کے ساتھ وابستہ ہے، اس کے بعد کسی تنزل وظہور کے ساتھ نہیں، ورنہ جہاں تک آثار وتعینات میں فرق وامتیاز کا تعلق ہے ان میں کوئی بھی اس کی نفی کی جرأت نہیں کرتا۔

ہر مرتبہ وجود حکمے دارد
گر حفظ مراتب نہ کنی زندیقی

اس نہج سے جب یہ حضرات تنزل کی اہمیتوں پر زور دیتے ہیں تو اس سے مقصود ایک ایسا

معنی ہوتا ہے کہ ظہور و تنزل کے دونوں پہلوؤں یا مرحلوں کو اپنے آغوش میں لئے ہوئے ہے۔

تعبیر کی اس صورت پر یہ اعتراض وارد نہیں ہوتا کہ جب تم نے حق اول کو تسلیم کر لیا اور یہ بھی مان لیا کہ اس سے کائنات کا صدور ہوتا ہے تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ وجود و تحقق ان دونوں مرحلوں پر باتساوی مشتمل ہو، کیونکہ نہ تو حق اول اور مبداء وجود کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ موجود نہیں ہے اور نہ صادر کے متعلق یہ کہنا درست ہے کہ وہ غیر موجود ہے۔

یہ اعتراض اس بناء پر صحیح نہیں ہے کہ ہم جب وجود مشترک کا ذکر کرتے ہیں، تو اس کی حیثیت اس حقیقت کی نہیں ہوتی، انیاب اغوال کی طرح جو نفس الامر میں ثابت ہے، بلکہ ہم اس کو حقیقت مفروضہ مانتے ہیں جس کو عقل از راہ تعمیم مستنبط کرتی ہے، یہی وجہ ہے کہ جہاں تک عقل سلیم کا تعلق ہے وہ اگرچہ مراتب وجود میں جو ایک طرح کا تمائز پایا جاتا ہے اس کو تسلیم کرتی ہے اور حادث و قدیم کے مابین ایسے ربط و تعلق کو نہیں مانتی جو ان دونوں کو واقعی و حقیقی وحدت میں منسلک کر دے۔ تاہم تنزل صادق کا انکار بھی نہیں کرتی جو ابداع و تخلیق پر منتج ہوتا ہے بلکہ ایک اعتبار سے اسے ماننے پر مجبور ہوتی ہے۔

اس وضاحت سے قطع نظر یہ بات اپنی جگہ بالکل صحیح ہے کہ عقل، نفس اور ہیولیٰ تینوں میں اس طرح بالوجہ اشتراک و تماثل پایا جاتا ہے کہ ان میں کے ہر ایک کو دوسرے کا عین قرار دیا جا سکتا ہے، یعنی یہ کہا جا سکتا ہے کہ عقل عین نفس ہے اور نفس عین ہیولیٰ ہے۔ اس کی مثالیں ہم پہلے بیان کر آئے ہیں، یعنی جس طرح موم کے ایک ٹکڑے کو تعین کے مختلف سانچوں میں ڈھالا جا سکتا ہے اور جس طرح ایک انگوٹھی متنوع و بوقلموں نقوش کے ارتسام کی صلاحیت رکھتی ہے، اسی طرح ایک کلی جزئیات و افراد کے تعین کو اختیار کر سکتی ہے۔ اس کی بین مثال یہ ہے کہ تم ایک کلی کو ذہن میں فرض کرو۔ عقل اس معاملے میں یہی کہے گی کہ یہ کلی جزئیات ہی کی شکل میں پائی جاتی ہے۔ اب تعلق و ربط کی جو نوعیت کلی اور اس کی جزئیات میں رونما ہے وہی نفس ہیولیٰ میں ہے۔ اس لئے کہ ہیولیٰ سے ہماری مراد یہی ہے کہ نفس کلی نے تشخص و تعین کا روپ دھار لیا ہے لیکن اس کے باوجود وہ تشخص و تعین سے بالکل علیحدہ بھی نہیں ہے، بلکہ صحیح تعبیر تو یہ ہے کہ جب یہ اپنی کلی شکل میں موجود ہوگی تو نفس کلی کہلائے گی اور جب تعین کا لبادہ اوڑھ لے گی تو یہ ہیولیٰ سے موسوم ہوگی۔ عارف کو

چاہئے کہ جب وہ "عینیت" کے اس مرتبے کی تصریح کرے تو ایسے الفاظ ضرور استعمال کرے جو فرق اعتباری کو واضح کرسکیں۔ بہر حال یہ ایسی سچی بات ہے جس کو اکثر لوگ غلط معنی پہناتے ہیں، یعنی "کلمة حق ارید بها الباطل" شیخ مجددؒ کا کہنا ہے کہ صفات ثمانیہ (ہشت صفات) خارج میں موجود ہیں۔ اس لئے ان کو ذات سے خارج میں متمیّز ہونا چاہئے۔ ان صفات کی اثر آفرینیوں کی کیفیت یہ ہے کہ ہر ہر صفت کے مقابل ایک عدم ہے۔ مثلاً علم کا مقابل جہل ہے اور قدرت کا مقابل عجز ہے، اور یہ تمام "اعدام" علم حق میں متمیّز اور واضح ہیں اور تمیز و وضاحت کی اس نوعیت سے ان کو اسماء وصفات کے لئے بمنزلہ آئینوں کے کردیا ہے۔ یایوں کہئے کہ انوار حق کے نقطہ نظر سے ان کی حیثیت مہبط انوار یا تجلی گاہ کی ہے۔ ان معنوں میں حقائق ممکنات کا مطلب یہ ہوا کہ یہ اسماء وصفات کے ان عکوس وظلال سے تعبیر ہیں جو ان اعدام پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ گویا اعدام کو مادہ ٹھہرانا چاہئے اور یہ عکوس وظلال جو ان پر اثر انداز ہوتے ہیں صورت ہے جو اس مادہ میں حلول پذیر ہے۔

حقائق ممکنات کے بارے میں ابن العربیؒ اور جناب مجددؒ کے نقطہ نظر میں تھوڑا سا فرق ہے۔ ان کی رائے میں یہ اسماء وصفات ہی کا دوسرا نام ہے جب کہ یہ مرتبہ علم میں تعین و وضوح کی کیفیتوں کے حامل ہوں، بخلاف شیخ مجددؒ کے کہ ان کے خیال میں یہ اعدام نہیں جن پر انوار حق اثر انداز ہوتے ہیں۔ ہاں یہ البتہ درست ہے کہ ان اعدام اور عکوس کا محل اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے، لیکن جب اللہ تعالیٰ جو فاعل مختار ہے، یہ چاہتا ہے کہ ماہیات معلومہ میں سے کوئی ماہیت حیز علم سے نکل کر حیز وجود میں آئے اور تعین خاص کو اپنائے تو وہ اسے وجود ظلی بخش دیتا ہے اور اس کی یہ ماہیت مرتبہ علم سے نکل کر وجود ظلی کے لباس میں آشکار ہو جاتی ہے۔ اس عالم رنگ و بو سے متعلق ان کی رائے دوٹوک اور صاف نہیں بلکہ ان کے اقوال میں اختلاف رونما ہے۔ کبھی تو وہ فرماتے ہیں کہ یہ عالم وجود ظلی سے بہرہ مند ہے اور کبھی یہ موقف اختیار کرتے ہیں کہ یہ کائنات وجود موہوم سے آراستہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اتقان واستواری سے نواز رکھا ہے۔ اس لحاظ سے یہ عالم اگرچہ موہوم ہے مگر اس کے باوجود استوار و محکم بھی ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ حقائق ممکنہ کا اطلاق کئی معانی پر ہوتا ہے۔

(۱) ان سے مراد موجودات خاصہ ہیں، مثلاً ایک حقیقت انسان ہے، ایک حقیقت گھوڑا ہے

اور ایک حقیقت پانی ہے۔ یہ تمام حقائق وہ امور ہیں جو عالم خارجی میں ثابت و متحقق ہیں۔ اس اطلاق کی رو سے حقائق ممکنہ وہ امور ہیں جن کو ہر ایک شخص جانتا بوجھتا ہے۔ یہی مطلب ہے ان کے اس قول کا کہ حقائق اشیاء ثابت نہیں، یعنی ہر ذی عقل کو معلوم ہے کہ انسان کون ہے، گھوڑا کسے کہتے ہیں اور پانی کا اطلاق کس چیز پر ہوتا ہے۔

(۲) ان سے مقصود وہ امور ثابتہ ہیں جو ذاتی لحاظ سے نہ تو موجود ہیں اور نہ معدوم۔ مگر جب ان کے ساتھ ضمیمہ وجود کا الحاق ہو جاتا ہے تو کسوت وجود سے آراستہ ہو جاتے ہیں، ورنہ طاق عدم میں دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔

انہی امور کو ایک معقولی ماہیات سے تعبیر کرتا ہے اور ان کے بارے میں یہ رائے رکھتا ہے کہ یہ فی نفسہ نہ تو موجود ہیں اور نہ معدوم۔ ان کی حیثیت اس کے نزدیک صرف ثبوت کی ہے، مگر مرتبہ علم میں اول الاوائل (اللہ) اور فیض اقدس کے ساتھ ان کا تعلق و ربط کیسا ہے، اس کو یہ نہیں جان پاتا۔ یہ شرف اس صوفی کو حاصل ہے جو وحدت الوجود کا قائل ہے کہ اس پر اس ربط و تعلق کی ٹھیک ٹھیک نوعیت و ترتیب کا انکشاف ہوا ہے۔

اس کا عرفان یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات مقدسہ سے جو پہلی تجلی صادر ہوئی وہ خود ذات اقدس کی توجہ و التفات ہے کہ جو خود ذات ہی کی طرف ملتفت ہوئی۔ اس میں اس نے جانا کہ اس کی ذات گرامی کیا ہے، اس کے تحقیقی تقاضے کیا ہیں، اس کا کمال دائم کس نوع کے مظاہر کا مقتضی ہے، اور ان مظاہر کے ارتقاء و بوقلمونی کی کیا کیا صورتیں ہیں۔ علم و تجلی کی یہ نوعیت خاص ہے جسے عین اقتضا کہنا چاہیے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کو مجرد ارتسام صور یا استحضار اشیا سے تعبیر کیا جائے (کیونکہ علم و تجلی کی اس صورت میں ایک طرح کی فعلیت مضمر ہے جو صرف علم میں نہیں)۔ اس کے بعد مظاہر کلیہ تمیز اختیار کرتے ہیں اور ان کی استعداد معرض علم میں آتی ہے، جو فعال ہیں، ظاہر ہیں اور مقدس ہیں، ان کو اسماء و صفات کہنا چاہیے۔

تیسری تجلی مظاہر جزئیہ سے متعلق ہے، علم ادراک کے اس مرحلے میں اعیان ممکنہ کلیات سے جدا ہوتے ہیں جو اپنی فطرت و مزاج کے اعتبار سے یکسر منفعل، مقہور اور کسی درجہ میں وجود کی آلائشوں سے آلودہ ہوتے ہیں۔ ان معنوں میں ''حقائق ممکنہ'' کا مطلب یہ ہوا کہ ان کی ''حیثیت

معلومہ'' کی ہے جو حق کے علم وادراک کے ساتھ وابستہ ہیں۔

(۳) حقائق ممکنہ کی یہ تعبیر تھوڑی سی تمہید چاہتی ہے اور وہ یہ ہے کہ حقائق ممکنہ اور اسماء دونوں میں تمیز دوٹوک اور اس طرح کی نہیں کہ یہ دونوں دو الگ الگ اور منفصل خانوں میں انقسام پذیر ہوں بلکہ دونوں میں ایک طرح کا اشتراک ہے اور ایک دوسرے پر منطبق ہوتے ہیں، یعنی جو کچھ اسماوصفات میں مضمر ہے وہی حقائق ممکنات میں ظاہر ہوتا ہے۔

اس صورت حال میں حقائق ممکنہ اور حقائق اسما میں نسبت تضاد نہیں ہوگی، بلکہ ان دونوں کے مقابلے میں جو اضداد ہوں گے ان میں تقابل پایا جائے گا اور اس نسبت سے انہیں اضداد مقابلہ کہنا چاہئے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جہاں تک اسماء وصفات کا تعلق ہے ان میں جو حقائق مضمر ہیں وہ تو بدرجہ غایت قوت وفعلیت لئے ہوئے ہیں اور قوی اور صلاحیتیں جنھوں نے ابھی وجود کا جامہ نہیں پہنا، بوجہ عدم کے بدرجہ غایت کمزور اور ضعیف ہیں۔ گویا کچھ امور ثابتہ ہیں جن کے ڈانڈے ایک طرف تو اسماوصفات سے ملے ہوئے ہیں اور دوسری طرف اعدام متقابلہ سے۔

اب جو لوگ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ظہور کائنات کے سلسلے میں اصل شے اسماء وصفات ہیں وہ دو طرح سے اس مفہوم کو ادا کریں گے، اور ادا واظہار کے یہ دونوں اسلوب صحیح ہوں گے۔ یہ کہ حقائق ممکنہ اسماء وصفات ہی کا دوسرا نام ہے جو مرتبہ علم میں متمیز وواضح ہیں، اور یہ کہ حقائق ممکنہ اسما وصفات کے عکوس وظلال ہیں جو اعدام متقابلہ میں ارتسام پذیر ہو گئے ہیں۔

(۴) تعبیر کا یہ نہج بھی قدرے تمہید کا مقتضی ہے۔ یہ واضح رہے کہ یہاں حقائق ممکنہ کا لفظ نسبتاً محدود معنوں میں استعمال ہوا ہے اور اس کا دائرہ صرف سالک کے احوال تک سمٹا ہوا ہے، پوری کائنات تک وسعت پذیر نہیں۔ صاحب ''لمعات'' اسماء وصفات کو معشوق قرار دیتے ہیں، حقائق ممکنہ کو عاشق ٹھہراتے ہیں اور اس مرتبہ علیا کو جو ان سب میں ظاہر وباہر ہے لفظ عشق سے موسوم کرتے ہیں۔

اب اگر صورت حالات یہ ہو کہ معشوق خود عاشق کی طرف بڑھے (یا باصلاح صوفیا تدلی اختیار کرے)، یعنی عاشق کو اپنی طرف کھینچے اور محبت وجذب سے نوازے، تو سالک کو اس کیفیت کے پیش نظر ''مجذوب''، ''مراد'' اور ''محبوب'' کہا جائے گا جیسے حضرت ابراہیمؑ کے قصے سے عیاں

ہے کہ عنایت حق نے خود ان کی رہنمائی فرمائی اور ان کو یہ بات سمجھا دی کہ جو شے آفات و ذمائم سے دو چار ہو رب والہ نہیں ہو سکتی، رب والہ کیلئے ضروری ہے کہ نقص وعیب کی ان آلائشوں سے منزہ ہو۔

اکثر یوں بھی ہوتا ہے کہ کوئی شخص اللہ کی طرف ریاضت و مجاہدہ اور نفس و روح کی تجرید کے ذریعہ پڑھتا ہے۔ اس صورت میں اسے مرید، محب اور سالک کہنا چاہیئے۔

تیسری شکل یہ ہے کہ کچھ ذات تدلی اختیار کرتی ہے اور کچھ سالک ترقی کناں ہوتا ہے جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دونوں ایک نقطہ اتصال پر جمع ہو جاتے ہیں، ایسے خوش نصیب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ سالک ہے، مجذوب اور محبّ ہے مگر شان محبوبی لئے ہوئے۔

اس کلام کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ شخص اکبر کے دل میں تجلی افروز ہوتا ہے۔ یہ تجلی اس شان کی ہوتی ہے کہ اس کا انشراح وانبساط حظیرۃ القدس تک کو اپنے گھیرے میں لئے ہوئے ہوتا ہے اور اسی کے عکوس وظلال ملاء اعلیٰ کے سینوں پر سایہ فگن ہوتے ہیں اور تجلی کی یہی وہ قسم ہے جس پر کہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے اسماء وصفات کا انطباق ہوتا ہے۔ نیز تجلی کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کے علم وارادہ میں وقتاً فوقتاً تجدد رونما ہوتا رہتا ہے اور یہی وہ تجلی ہے جو اپنے جملہ مضمرات کے ساتھ سالک یعنی معشوق اور مطلوب ہے، اس لئے کہ نفوس بشریہ اسکی طرف مقناطیس کی طرح جذب وکشش کے داعیوں کو محسوس کرتے ہیں، ہم اس حقیقت کا ذکر مقالے کے شروع میں کر آئے ہیں۔

یہی تجلی سیر وسلوک کی منزل ہے اور یہی اتصال کی وہ کڑی ہے جس کے حصول کے لئے صوفیا کوشاں رہتے ہیں، کبھی کبھی غیب سے ایسے اسباب بھی پیدا ہو جاتے ہیں کہ حق اپنے کسی بندے کو اس وقت اپنی خوشنودیوں کے لئے چن لیتا ہے جب کہ وہ نفس کی بندگی میں مبتلا ہوتا ہے اور اسے خبر تک نہیں ہوتی۔ ایسے شخص کو اصطلاح میں ''مراد'' کہا جاتا ہے۔ اکثر یہ درجہ ریاضات ومجاہدات کی سختیاں جھیلنے اور نفس و روح کی تجرید سے حاصل ہوتا ہے۔ عرفان کا یہ مقام ہر شخص کی جبلت میں پہلے سے موجود ہوتا ہے مگر اس کو پانے کی توفیق کسی کسی کو ہی میسر ہوتی ہے۔ اس شخص کو ''مرید'' کے لفظ سے پکارا جاتا ہے۔ ایک مقام ان دونوں کا جامع ہے جس میں دوطرفہ دواعی کو تحریک ہوتی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے لطف وعنایت اور اختیار واختبار کو بس جنبش ہوتی ہے اور سعی وطلب کے تقاضے بھی بیدار ہوتے ہیں۔ چنانچہ کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک شخص بیک

وقت دونوں انداز کی سعادتوں سے دوچار ہے، سعی وطلب اور ریاضت ومجاہدہ کے انوار بھی ہیں اور غیب سے سامان لطف کی فراوانیاں بھی جو پکڑ پکڑ کر سالک کو قرب واتصال کی سرحدوں کی طرف دھکیل رہی ہیں، ایسی صورت میں کہا جاتا ہے کہ یہ شخص معرفت کے دونوں مرتبوں کا حامل ہے اور سلوک کے دونوں مشربوں میں امامت کے درجہ پر فائز ہے۔ اس کے معاملے میں کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ اس تجلی کے بعض پہلو اس پر غلبہ حاصل کر لیتے ہیں۔ اس لحاظ سے اسے ''مجذوب'' کہا جاتا ہے، جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ تجلی کے اس خاص پہلو نے اسے اپنی طرف جذب کر لیا ہے مثلاً اسماء وصفات کے نقطہ نظر سے ہوسکتا ہے کہ کوئی ایک اسم یا صفت اس کے احوال پر چھا جائے۔ اس صورت میں اس کے جذب کو اس اسم کی طرف منسوب کیا جائے گا، غرض یہ ہے کہ ایک عارف خوب جانتا ہے کہ ''اعیان ثابتہ'' میں سے اس کی استعداد کس تعین کے لئے زیادہ موزوں ہے اور پھر وہ اسی اسم کی پیروی اور نہج پر زندگی کی بازی لگا دیتا ہے، مثلاً اگر اس پر صفت رحمان کا غلبہ ہے تو اصطلاح میں کہا جائے گا کہ اس نے اسم رحمان کی حقیقت کو اپنا لیا ہے۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ یہ کہنا کہ حقائق ممکنات دراصل عکوس وظلال ہیں، جو اعدام متقابلہ میں ارتسام پذیر ہوتے ہیں، کسی طرح بھی شیخ ابن العربیؒ کی تصریحات کے خلاف نہیں۔ ہم مسئلے کے اس پہلو کی طرف پہلے اشارہ کر آئے ہیں اس لئے دوبارہ انہیں نقل کر کے تکرار کے مرتکب نہیں ہونا چاہیے۔

نیز حقائق ممکنات کو ان معنوں میں اسماء وصفات کے عین مترادف قرار دینا کہ وجود خارجی میں بہر حال انکے عکوس وظلال پائے جاتے ہیں جنہیں اعیان ممکنات کہا جاتا ہے، کسی انداز سے بھی شیخ مجددؒ کی تصریحات کے منافی نہیں۔ اسی طرح اگر شیخ کے قول کو ہم یہ معنی پہنائیں کہ ہر صفت واسم سالک کے لئے بمنزلہ رب اور مقصود ومنزل کے ہے کہ جس کی طرف اس کے سعی وطلب کے قدم بڑھنا چاہئیں، تو اس صورت میں بھی منافات وتعارض کا کوئی اندیشہ پایا نہیں جاتا۔ ہم اگر چاہیں تو دونوں بزرگوں کے اقوال کو بکثرت اس سلسلے میں پیش کر سکتے ہیں۔

باقی رہی یہ بات کہ حضرت مجددؒ نے شیخ العربیؒ اور اس کے بعض اتباع کے اقوال کو اپنے وجدان کے خلاف محسوس کیا ہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، یہ ایک ایسی لغزش ہے جس کا کشف

کی لغزش سے کوئی تعلق نہیں اور پھر جہاں تک اس طرح کی چھوٹی چھوٹی لغزشوں کا تعلق ہے ان سے محفوظ بھی کوئی رہ سکتا ہے۔اس لئے ان لوگوں کے مقام بلند میں ہرگز کوئی فرق نہیں پڑتا۔

ابن العربیؒ کے اس قول میں بھی یہاں کوئی اعتراض کا پہلو نظر نہیں آتا کہ صوفیاء صفات ثمانیہ میں تمیز واختلاف کے قائل نہیں، بلکہ ان کے نزدیک صفات عین واجب الوجود ہیں، کیونکہ ہمیں اس کے خلاف متکلمین کی عقلی ونقلی کوئی دلیل نہیں ملی۔ ہم اس قول کو دو وجہ سے حق بجانب ٹھہراتے ہیں۔

(۱) صفات کے باب میں زیادہ سے زیادہ جو بات صحت واستواری لئے ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ ایک ایسی حقیقت ضرور پائی جاتی ہے، عرفاً اور لغتاً جس کو سمیع وبصیر وغیرہ کہا جا سکتا ہے، لیکن یہ کہ یہاں صفات متمائزہ کا بھی وجود ہے اور یہ صفات ذات سے علیحدہ ایک مستقل حیثیت کی حامل ہیں، اس کی طرف قلب وذہن ملتفت نہیں ہو پاتا، قلب وذہن صرف آثار ونتائج کو دیکھتا ہے، فلسفیانہ تدقیقات کو نہیں۔

چنانچہ ہم جب کسی شے کو دیکھتے ہیں کہ متحرک ہے، چل رہی ہے اور اپنے اعمال وافعال کو حسن وجمال کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کر رہی ہے تو ہم بغیر ذات وصفات کے چکر میں پڑے کہہ دیتے ہیں کہ یہ زندہ ہے اور حیات وشعور سے بہرہ مند ہے اور قطعی یہ نہیں سوچتے کہ یہ صفات ذات سے زائد اور علیحدہ ہیں یا عین ذات ہیں۔

(۲) جہاں تک عقل وشعور کا تعلق ہے اس کا فتویٰ یہی ہے کہ اس کی ذات گرامی سے آثار ونتائج کا برابر صدور ہوتا رہتا ہے، رہی یہ بات کہ یہ صفات ذات سے الگ وجود رکھتی ہیں، تو اس کا کوئی تعلق عقل وخرد کے تقاضوں سے نہیں، بلکہ اگر انصاف سے کام لیا جائے تو کہا جائے گا کہ صفات کو بمنزلہ اغراض کے قرار دینا اور یہ کہنا کہ یہ انہی کی طرح اپنے محل وموصوف کے ساتھ وابستہ ہیں، اچھی خاصی تشبیہ کا مرتکب ہونا ہے۔

ممکن ہے کچھ لوگ اسے اہل سنت کا مذہب قرار دیں مگر ہمارا جواب یہی ہوگا کہ یہ صحیح نہیں، کیونکہ اہل سنت کا اطلاق معنی کے اعتبار سے نسبتاً محدود ہے، اس سے مراد صرف وہ قرون ہیں جن کے خیر ہونے کی گواہی خود آنحضرت صلعم نے دی ہے، اور یہ حقیقت ہے کہ ان میں کوئی شخص ایسا

نہیں جس نے کہ صفات کو بحث وفکر کا موضوع ٹھہرایا ہو اور یہ کہا ہو کہ یہ ذات خداوندی سے الگ وجود رکھتی ہیں، یا عین ذات ہیں۔ اور پھر اگر بر سبیل تاویل کسی نے ان کو غیر ذات سمجھا ہے تو اس پر مطلق بحث نہیں کی۔ یہ زیادت امور انتزاعی سے تعلق رکھتی ہے یا امور خارجی سے، ہاں متاخرین کے ایک گروہ نے جو اہل سنت ہونے کا مدعی ہے البتہ صفات پر بحث کی ہے۔ ان لوگوں کے اس فعل کو ہم بدعت نہ سمجھیں اور یہ نہ کہیں کہ یہ سلف کے بعد کی اختراع ہے، جب بھی یہ ضرور کہیں گے کہ ہم ان سے اس باب میں اتفاق رائے نہیں رکھتے۔ **ھم رجال ونحن رجال** (وہ بھی انسان تھے اور ہم بھی انسان ہیں)۔

اسی طرح شیخ کے اقوال میں جو اس نوعیت کا اختلاف پایا جاتا ہے کہ یہ عالم موجود خارجی ہے جو ظلیت وانعکاس لئے ہوئے ہے یا اس کی حیثیت اس موہوم کی ہے جس کو استواری واستحکام سے نوازا گیا ہے، زیادہ اہمیت کا حامل نہیں، کیونکہ ان کی تہہ میں یہ عقیدہ مضمر ہے کہ وجودات خاصہ تحقق پذیر ہیں جن سے کہ آثار ونتائج کا صدور ہوتا ہے۔

اور اگر تم مجھ سے صحیح صحیح بات دریافت کرو تو میں کہوں گا کہ جہاں تک ذات الٰہی کا تعلق ہے وہ اس سے بالا ومنزہ ہے کہ خارج یا اعیان میں پائی جائے، اس لئے کہ خارج تو خود نفس رحمان سے تعبیر ہے اور ''اعیان'' اس کی ذات پر دلالت کناں ہیں۔ ہاں یہ درست ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم تجلی ہے جس کا تعلق خارج سے ہے اور اللہ تعالیٰ کے بارے میں جب کہا جاتا ہے کہ وہ خارج میں یا عما (اس حدیث کے اشارہ سے جو آغاز مضمون میں گزر چکی ہے) میں موجود ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس نے ایسی تجلی عظیم کے تحقق کے بعد خارج یا اعیان کو اپنے وجود سے نوازا ہے۔

اس باب میں جو اقوال مختلفہ ہیں، اگر تم مجھ سے ان کی اسنادیں دریافت کرو تو میں کہوں گا کہ ان میں کوئی بات میرے دل میں کھٹک پیدا کرنے والی نہیں۔ میرے نزدیک یہ اختلافات یا انداز وتعبیر سے متعلق ہیں اور یا پھر ان کی حیثیت یہ ہے کہ کچھ چیزیں برمحل یا اپنے مقام وسیاق میں بیان نہیں ہوئی ہیں، ورنہ یہ ناممکن ہے کہ کوئی صاحب کشف بالکل ہی بے حقیقت بات کہہ دے۔ صفات ثمانیہ کی معنوی توجیہ میرے نزدیک یہ ہے کہ نفس رحمانی کے ان اوائل کو جن میں ذکر اور تجلی

اعظم تمثل پذیر ہوئی ہے اشاعرہ صفات کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صوفیا ان کو بالا یجاب صادر اور زمانا قدیم مانتے ہیں۔ اصل میں یہ ایک ہی حقیقت ہے کہ جس نے جہات واعتبارات کے اختلاف و بوقلمونی سے کثرت وتعدد کی صورت اختیار کر لی ہے اور جہت واعتبار کے کتنے ہی اختلاف ایسے ہیں کہ جن کو لوگوں نے حقائق کا اختلاف قرار دے دیا ہے، جیسے کہ بیاض اور ابیض ایک ہی حقیقت کے دو معنی ہیں، یعنی بیاض ابیض میں بشرط لا (یعنی بغیر اس شرط کے کہ بیاض کا کوئی ہدف وموصوف ہو) ماخوذ ہے اور ابیض اسی حقیقت پر بشرط شے دلالت کناں ہے، یعنی جہاں لفظ بیان مطلقاً ایک خاص رنگ پر دلالت کرتا ہے وہاں لفظ ابیض بھی اسی رنگ پر صفت کی شکل میں دلالت کرتا ہے۔

بالکل اسی نہج واندازسے جب ہم اس کی ذات کو حیات سے تعبیر کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اس کے علم کا منطقی نتیجہ ہے۔ جب اس کی ذات کو حقائق ممکنات اور علم کی صفت سے متصف گردانتے ہیں، تو مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس کی ذات حقائق اشیا میں تکوین سے قبل تمثل پذیر ہوتی ہے۔ ''قدرت'' کا لفظ بولتے ہیں تو یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اس کی ذات سے تخلیق کائنات کا فعل صادر ہوا ہے۔ جب اس کے لئے ارادہ کو ثابت کرتے ہیں تو اس سے غرض یہ ہوتی ہے کہ اس کی ذات نے دو متساوی الامکان چیزوں میں سے ایک کو ترجیح دی ہے۔ کلام کا اس کی طرف انتساب کرتے ہیں تو اس حیثیت سے کہ انبیا وملائکہ کے قلب پر اس کی طرف سے وحی نازل ہوتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح جب ہم اس کو سمیع وبصیر سے متصف قرار دیتے ہیں تو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ وہ تمام مبصرات ومسموعات کا مبداء انکشاف ہے۔ اسی طرح مولانا جامی کا قول بھی ہمارے نزدیک مان لینے کے لائق ہے (یہ قول بحث کے آغاز میں گزر چکا ہے) اس سے ان کا مقصد یہ ہے کہ اللہ کے سوا تمام حقائق کی اصالت کا انکار کیا جائے اور ان سب کو اعتبارات واضافات کے حکم میں رکھا جائے، یہ مطلب نہیں کہ وجود حق یا اس کی جلوہ فرمائیوں کا انکار کیا جائے۔ وہ یہ مانتے ہیں کہ حق نے ان میں ظہور فرمایا ہے۔ اسی طرح وہ فرق اعتباری کی بھی نفی نہیں کرنا چاہتے۔ جب ہم سوال کا مکمل وشافی جواب دے چکے تو اس مکتوب کو ختم کرنا چاہیے۔ والحمد للہ اولاً و آخراً و ظاھراً و باطناً وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہٖ محمد و آلہٖ و اصحابہٖ اجمعین۔

القول الجمیل
فی بیان سواء السبیل

تصنیف

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ

ترجمہ

مولانا سید محمد فاروق قادری

تحقیق و تعلیق

مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱	مقدمہ	۱۴۹
۲	بیعت	۱۵۱
۳	بیعت کی حیثیت، آداب اور شرائط مرشد	۱۵۴
۴۔	تعلیم و تربیت سالک	۱۶۰
۵۔	اشغال مشائخ قادریہ	۱۶۳
۶۔	اشغال مشائخ چشتیہ	۱۶۹
۷۔	اشغال مشائخ نقشبندیہ	۱۷۴
۸۔	نسبت کی حقیقت	۱۸۴
۹۔	مجرب خاندانی عملیات	۱۸۹
۱۰۔	علمائے ربانی کے آداب و فرائض	۲۰۳
۱۱۔	آداب و مقاصد وعظ و نصیحت	۲۰۸
۱۲۔	مصنف کے سلاسل طریقت	۲۱۲

مقدمہ

سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس نے بنی آدم کے دلوں کو فیضان انوار کے قابل اور معارف واسرار کی امانت کے لائق بنایا اور برگزیدہ انبیائے کرام کو ہدایت اور دعوت کے لئے منتخب فرمایا تاکہ وہ عبادات اور اذکار کے حصول اور ان پر عمل پیرا ہونے کے راستے متعین کردیں، پھر اس نے متقی اور جید علمائے کرام کو انبیا کا جانشین اور وارث بنادیا تاکہ وہ ان کے علم اور فیض کو ہمیشہ جاری وساری رکھیں۔

بلاشبہ ان میں سے ایک جماعت ہمیشہ حق وصداقت کی علمبردار رہے گی اور لوگوں میں سے گم کردہ راہ افراد ان کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکیں گے۔ یہ لوگ ایسے چراغ ہدایت ہیں جن کے ذریعے مخلوق نفس کے اندھیروں سے نکل کر قرب خداوندی کے راستے پر گامزن ہوتی ہے چنانچہ جو صاحب دل ہے اور اس نے کلام ہدایت توجہ سے سنا، وہ سرفراز ہوا اور دائمی نعمتوں اور جنت کی بہاروں کا مستحق ٹھہرا، البتہ جس نے روگردانی کی اور منہ پھیرا وہ راستے سے بھٹک گیا اور مقام انسانیت سے نیچے گر گیا، اس کے لئے دوزخ اور گرم پانی ہے اور اس کا کوئی مددگار نہیں۔

ہم اللہ تعالیٰ کی حمد کرتے ہیں اور اس سے مدد چاہتے ہیں اور اس سے مغفرت طلب کرتے ہیں اور اپنے نفس کی حرکتوں اور عمل کی برائیوں سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں، جسے اللہ ہدایت دے اسے کوئی گمراہ نہیں کرسکتا اور جسے وہ اپنی ہدایت کی توفیق ارزانی نہ کرے اسے کوئی راہ پر نہیں چلا سکتا ہم گواہی دیتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود حقیقی نہیں ہے وہ اکیلا ہے اس کا کوئی شریک نہیں

اور ہم شہادت دیتے ہیں کہ ہمارے آقا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے عبد خاص اور رسول ہیں آپ کو اللہ نے حق کے ساتھ بشیر و نذیر بنا کر بھیجا آپ پر اور آپ کے آل واصحاب پر اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اور درود و سلام ہوں۔

حمد و صلوٰۃ کے بعد بندہ ضعیف، رحمت خداوندی کا امیدوار ولی اللہ بن شیخ عبدالرحیم (اللہ تعالیٰ ہم دونوں کو اپنی خصوصی رحمت کا سایہ مرحمت کرے اور آخرت میں دائمی نعمت کے خزانے سے سرفراز کرے) عرض کرتا ہے کہ یہ کتاب اصول طریقت اور اس سے متعلق موضوعات پر مشتمل ہے یہ وہ اصول اور قواعد ہیں جنہیں ہم نے اپنے سلسلہ نقشبندیہ، سلسلہ قادریہ اور سلسلہ چشتیہ کے مشائخ سے حاصل کیا ہے اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوں، میں نے اس کتاب کا نام ''القول الجمیل فی بیان سواء السبیل'' تجویز کیا ہے، اللہ کی ذات ہی میرے لئے کافی اور بہتر کارساز ہے اور گناہوں سے اجتناب اور نیکیوں کی توفیق اسی کے فضل ہی سے ممکن ہے۔

باب۔۱

بیعت

ارشاد خداوندی ہے:

اِنَّ الَّذِیۡنَ یُبَایِعُوۡنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوۡنَ اللّٰہَ یَدُ اللّٰہِ فَوۡقَ اَیۡدِیۡہِمۡ فَمَنۡ نَّکَثَ فَاِنَّمَا یَنۡکُثُ عَلٰی نَفۡسِہٖ وَمَنۡ اَوۡفٰی بِمَا عٰہَدَ عَلَیۡہُ اللّٰہَ فَسَیُؤۡتِیۡہِ اَجۡرًا عَظِیۡمًا (الفتح ۱۰)

وہ جو تمہاری بیعت کرتے ہیں وہ تو اللہ ہی سے بیعت کرتے ہیں، ان کے ہاتھوں پر اللہ کا ہاتھ ہے، تو جس نے عہد توڑا اس نے اپنے بڑے عہد کو توڑا اور جس نے پورا کیا وہ عہد جو اس نے اللہ سے کیا تھا تو بہت جلد اللہ اسے بڑا ثواب دے گا۔

سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے کہ لوگوں نے آپؐ سے بیعت کی، کبھی ہجرت اور جہاد پر، کبھی ارکان اسلام کے قیام اور ادائیگی پر اور کبھی جہاد میں ثابت قدمی پر، اسی طرح بعض مواقع پر سنت کی پیروی، بدعات سے بچنے اور عبادات الٰہی میں ذوق وشوق پر بھی آپ سے بیعت کی گئی۔ صحیح روایات میں آیا ہے کہ آپ نے انصار کی عورتوں سے میت پر بین نہ کرنے پر بیعت لی۔

ابن ماجہ نے روایت کی ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ فقرائے مہاجرین سے اس بات پر بیعت لی کہ وہ لوگوں سے کسی چیز کا سوال نہیں کریں گے۔ چنانچہ ان میں سے اگر کسی سے دوران سفر کوڑا اگر جاتا تو وہ اپنے گھوڑے سے اتر کر اسے اٹھانے کو سوال پر ترجیح دیتا۔ لہٰذا اس بات میں کسی شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جو عمل اہتمام اور عبادت کے طور پر ثابت ہے اس کی حیثیت دینی سنت کے طور پر مسلم ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زمین پر اس کے خلیفہ، قرآن اور حکمت کے طور پر جو کچھ نازل ہوا اس کے عالم، کتاب وسنت کے معلم اور امت کے مزکی (پاک کرنے والے) تھے۔ چنانچہ آپ نے خلیفہ کی حیثیت سے جو عمل کیا وہ بعد والے خلفا کے لئے سنت قرار پایا اور آپ نے کتاب وسنت کے معلم اور مزکی کی حیثیت میں جو نمونہ پیش کیا وہ علمائے حقانی کے لئے سنت ٹھہرا۔

اب ہم بیعت پر کچھ گفتگو کر لیتے ہیں کہ وہ کون سی قسم سے متعلق ہے بعض حضرات کا خیال ہے کہ بیعت صرف خلافت کے لئے ہو سکتی ہے صوفیائے کرام نے بیعت کا جو سلسلہ شروع کر رکھا ہے اس کی شرعاً کوئی حیثیت نہیں۔

یہ نظریہ بالکل غلط ہے چنانچہ ہم ثابت کر چکے ہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض دفعہ ارکان اسلام کی اقامت پر بیعت لی ہے۔ بعض دفعہ آپؐ نے سنت کی پیروی پر بیعت لی ہے۔ صحیح بخاری شاہد ہے کہ آپؐ نے حضرت جریر رضی اللہ عنہ سے مسلمانوں کی خیر خواہی کے لئے بیعت لی۔ اسی طرح آپ نے انصار کی ایک جماعت سے اس بات پر بیعت لی کہ وہ اللہ کے بارے میں کسی کی پرواہ نہیں کریں گے اور کسی کا خوف دل میں نہیں لائیں گے اور ہر حال میں حق کا دامن نہیں چھوڑیں گے، چنانچہ ان میں سے ہر شخص امرا اور بادشاہوں پر کھل کر تنقید کرتا تھا۔ اسی طرح آپؐ نے انصار کی عورتوں سے میت پر بین (۱) نہ کرنے پر بیعت لی۔ ان کے علاوہ کئی اور امور پر بیعت ثابت ہے، ظاہر ہے یہ بیعت تزکیہ نفس، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ بیعت کی کئی قسمیں ہیں مثلاً بیعت خلافت، بیعت تقویٰ، بیعت ہجرت، بیعت جہاد، بیعت ثابت قدمی جہاد وغیرہ، دائرہ اسلام میں داخل ہونے پر بیعت بعد والے خلفا کے دور میں متروک رہی۔ اسی طرح خلفائے راشدین کے زمانے میں بھی اسلام کی بیعت نہیں ہوتی تاہم اس کی وجہ یہ تھی کہ خلفائے راشدین کے دور میں قبول اسلام شان وشکوہ اور حق کے دبدبے اور وقار کی بنا پر تھا جبکہ بعد والے بادشاہوں کے زمانے میں بیعت اسلام اس بنا پر متروک رہی کہ ان میں سے اکثر ظالم اور بدکردار تھے، انہیں احیائے سنت اور اقامت دین سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

---

(۱) نوحہ

اسی طرح تقویٰ اور پرہیزگاری پر بیعت بھی اس دور میں نہیں ہوتی، اس کی وجہ یہ تھی کہ خلفائے راشدین کے دور میں صحابہ کرام بڑی تعداد میں موجود تھے، یہ حضرات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت مبارکہ کے فیض یافتہ اور آپ کی ذات گرامی کی تربیت سے تزکیہ نفوس کے اعلیٰ مقام پر فائز تھے، چنانچہ تزکیہ نفس اور تصفیہ باطن کے لئے انہیں کسی خلیفہ سے بیعت کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ بعد والے بادشاہوں کے دور میں بیعت کا سلسلہ اس لئے نہ چلا کہ کہیں اس سے تفرقے کا دروازہ نہ کھل جائے یا اسے بیعت خلافت نہ سمجھ لیا جائے، اس سے فتنوں کا اندیشہ تھا۔ البتہ اس زمانے میں مشائخ صوفیا بیعت کی بجائے خرقہ پوشی سے دینی مقاصد حاصل کرتے رہے، بعد والے دور میں یہ رسم ختم ہوئی تو مشائخ صوفیا نے موقع غنیمت جان کر سنت بیعت کو دوبارہ لازم پکڑ لیا(۱)۔

---

(۱) لیکن بیعت بالجہاد اور بیعت بالمشائخ میں واضح فرق ہے، بیعت بالجہاد اب عملاً متروک ہے۔ (قاسمی)

باب۔۲

بیعت کی حیثیت آداب اور شرائط مرشد

یہاں سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ بیعت واجب ہے یا سنت، یا بیعت کے سنت ہونے میں حکمت کیا ہے، اسی طرح بیعت لینے والے کی اہلیت اور شرائط کیا ہیں، ایفائے بیعت کیا ہے اور بیعت توڑنے سے مراد کیا ہے؟ نیز ایک ہی بزرگ یا دوسرے بزرگوں سے دوبارہ بیعت جائز ہے کہ نہیں، اسی طرح بیعت کے لئے کون سے الفاظ منقول اور متداول ہیں۔

اس سلسلے میں عرض ہے کہ بیعت سنت ہے واجب نہیں، صحابہ کرام رضی اللہ عنہ نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کے ذریعے یقیناً قرب خداوندی حاصل کیا، مگر کسی شرعی دلیل سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ تارک بیعت کو گناہ گار قرار دیا گیا ہو، اس پر ائمہ دین میں کسی کا بھی اختلاف نہیں ہے، گویا بیعت کے واجب نہ ہونے پر اجماع ہے۔

اس میں حکمت یہ سمجھ میں آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی سنت اور طریقہ یہ ہے کہ اس نے نفس میں مخفی امور کو ظاہری افعال واقوال سے وابستہ کردیا ہے اور ایک اعتبار سے زبان کو دل اور ضمیر کا ترجمان قرار دیا ہے مثلاً اللہ تعالیٰ، اس کے رسول اور قیامت کی تصدیق قلبی مخفی امر ہے چنانچہ یہاں اقرار کو تصدیق قلبی کا قائم مقام بنادیا گیا ہے، اسی طرح خریدار اور دکاندار کا خریدی جانے والی چیز پر رضامندی یا سودا دراصل دلی معاملہ ہے مگر یہاں زبان کو باطن کا قائم مقام بنا کر طے شدہ ظاہری سودے کو تسلیم کرلیا گیا۔ ٹھیک اسی طرح توبہ، گناہوں سے اجتناب کا پختہ ارادہ اور تقویٰ کی رسی کو مضبوطی سے تھامنا ایک مخفی اور قلبی معاملہ ہے چنانچہ یہاں بیعت کو اقراراً اس کی پختگی کا قائم مقام بنادیا گیا ہے۔

مرشد کی اہلیت اور شرائط میں سب سے پہلی اور ضروری بات یہ ہے کہ وہ قرآن وحدیث کا علم رکھتا ہو، اس سے ہماری مراد یہ نہیں ہے کہ وہ ان علوم میں چوٹی کی مہارت رکھتا ہو اس سے مراد یہ ہے کہ وہ قرآن وحدیث کے ضروری علوم سے باخبر ہو مثلاً تفسیر مدارک یا جلالین یا اس قسم کی کوئی اور کتاب کسی جید عالم دین سے سمجھ چکا ہو، قرآن مجید کے مطالب ومعانی، اس کی لغات مشکلہ، شان نزول، اعراب اور قصص وغیرہ سے باخبر ہو، اسی طرح احادیث میں کم از کم وہ مشکوٰۃ المصابیح کو اچھی طرح سمجھ کر پڑھ چکا ہو، نیز اسے اس کے معانی، محاورات، مشکل اور نادر تراکیب سے واقفیت ہو، نیز وہ اعراب مشکل اور تاویل معضل کے سلسلے میں فقہا کی آرا سے مطابقت سے باخبر ہو (مشکل سے مراد وہ دشوار لفظ ہے جو باعتبار لفظ اور ترکیب نحوی پیچیدہ ہو اور معضل وہ ہے جس کے معنی مشتبہ ہوں کسی ایک معنی کی تعیین نہ ہو سکتی ہو)

اس کے لئے قرآن مجید کا حافظ ہونا یا راویوں کے حالات سے باخبر ہونا ضروری نہیں، آپ جانتے ہیں کہ تابعین اور تبع تابعین حدیث مرسل اور حدیث منقطع بھی قبول کر لیتے تھے، مقصد یہ ہے کہ حدیث کے بارے میں اس بات کا پختہ یقین ہو جائے کہ اس کی اسناد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف صحیح ہے۔

اسی طرح یہ بھی ضروری نہیں کہ شیخ (مرشد) اصول فقہ، علم کلام اور فقہ وفتویٰ کی معمولی جزئیات تک سے واقف ہو، ہم نے ابتدا میں شیخ کے لئے علم ضروری قرار دیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ بیعت سے اصلی غرض اور مقصود یہ ہے کہ مرید کو نیکی کا حکم دے اور برائی سے روکے اور قلبی سکون اور باطنی فیضان کے لئے اس کی رہنمائی کرے، اسی طرح اسے بری عادات وخصائل سے نجات دلائے اور اس میں اچھے اخلاق وعادات پیدا کرے تا کہ وہ یہ تمام چیزیں اپنے اندر جذب کر کے ان پر عمل پیرا ہو، اب جو شخص خود عالم نہیں ہے وہ یہ سارا کام کس طرح انجام دے گا۔

اس بات پر سارے مشائخ صوفیا متفق اللسان ہیں کہ وعظ وتقریر صرف وہی شخص کر سکتا ہے جو قرآن وحدیث جانتا ہو، سوائے اس کے کوئی چارہ کار نہیں، البتہ اگر کوئی ایسا شخص جس نے ظاہری علوم زیادہ حاصل نہ کئے ہوں مگر اس نے ایک لمبا عرصہ صاحب تقویٰ علما کی صحبت اٹھائی ہو، ان سے تربیت حاصل کی ہو اور وہ حلال وحرام کی تحقیق وتفتیش کے بارے میں انتہائی مستعد ہو،

کتاب وسنت کے مقابلے میں کسی چیز کو اہمیت نہ دیتا ہو، شاید سلوک وارشاد کا فریضہ انجام دینے میں یہ چیزیں اس کے لئے کافی ثابت ہو جائیں۔

مرشد کی دوسری شرط یہ ہے کہ وہ عدل وانصاف اور تقویٰ کے بلند مرتبے پر فائز ہو، اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ کبیرہ گناہ سے آزاد اور صغیرہ گناہوں پر اڑنے والا نہ ہو۔

مرشد کے لئے تیسری شرط یہ ہے کہ وہ دنیا کے مقابلے میں آخرت کو ترجیح دیتا ہو، اور اس کی طرف راغب ہو، موکد عبادات پابندی سے ادا کرتا ہو، اور صحیح احادیث میں وارد ذکر واذکار پر عامل ہو، ہمیشہ اپنے دل میں اللہ سے لو لگائے رکھے اور اسے یادداشت کی مشق کامل حاصل ہو۔

مرشد کے لئے چوتھی شرط یہ ہے کہ وہ ہمیشہ نیکی کا حکم دیتا رہے اور برائی سے روکتا رہے۔ صائب الرائے اور صاحب الرائے ہو مستقل مزاج ہو، نہ کہ ہرجائی، صاحب مروت اور عقل کامل کا مالک ہوتا کہ امر ونہی کے سلسلے میں اس پر اعتماد کیا جا سکے۔

ارشاد خداوندی ہے۔

مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ

''ایسے گواہ جن کو پسند کرو''۔ (البقرہ: ۲۸۲)

اس سے صاحب تلقین وارشاد (مرشد) کے بارے میں عدالت وتقویٰ کی اہمیت وضرورت کا اندازہ آپ خود کرلیں۔

مرشد کے لئے پانچویں شرط یہ ہے کہ وہ طویل عرصہ تک مسلمہ مشائخ کی صحبت اور تربیت سے فیض حاصل کر چکا ہو، اس نے دوران تربیت مشائخ سے باطنی نور اور قلبی سکون کی دولت حاصل کی ہو، یہ اس لئے کہ سنت الٰہی کے مطابق انسان اس وقت تک فلاح حاصل نہیں کرتا جب تک اس کا تعلق اور واسطہ فلاح یافتہ افراد سے نہ پڑے، جس طرح علما کی تعلیم وتدریس کے بغیر کوئی بھی علم حاصل نہیں کرسکتا۔ یہی صورت باقی پیشوں اور ہنروں میں ہے۔

اس معاملے (سلوک وارشاد میں) کرامات اور خوارق عادات کا ظہور ضروری ہے اور نہ شرط، اور نہ ہی یہ ضروری ہے کہ مرشد گزر بسر کے لئے کوئی دنیوی کام نہ کرے، کرامات اور خرق عادات، مجاہدات کا نتیجہ ہے کمال کی شرط نہیں ہے، مغلوب الحال لوگوں کو دلیل نہ بنایا جائے، سنت

یہ ہے کہ تھوڑے پر قناعت اور شبہات کے مواقع سے پرہیز کی جائے۔

بیعت کرنے والے کے لئے ضروری ہے کہ وہ بالغ، عاقل ہو اور اس معاملے میں شوق اور دلچسپی رکھتا ہو، حدیث میں آیا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیعت کے لئے ایک بچہ پیش کیا گیا، آپؐ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا، دعا فرمائی مگر اس سے بیعت نہ لی۔ بعض مشائخ صوفیا، تبرک اور نیک فال کے طور پر چھوٹے بچوں کی بیعت بھی درست سمجھتے ہیں۔

مشائخ کے ہاں بیعت کا جو سلسلہ جاری ہے اس کی تین صورتیں ہیں مثلاً گناہوں سے توبہ پر بیعت، اسناد حدیث کے سلسلے کی طرح مشائخ کے سلسلے میں شامل ہونے اور برکت حاصل کرنے کی نیت سے بیعت اور احکام الٰہی پر صدق دل اور مصمم ارادے کے ساتھ عمل پیرا ہونے اور دل کو اللہ جل شانہ سے وابستہ کرنے کے عزم پر بیعت اور یہی تیسرا طریقہ اصل اور مقصود ہے۔

پہلی دونوں صورتوں میں بیعت کی تکمیل اور اسے پورا کرنے یا اس کے ساتھ وفاداری نبھانے سے مراد یہ ہے کہ مرید کبیرہ گناہوں سے بچے صغیرہ گناہوں پر اصرار نہ کرے، فرائض، سنن اور مستحبات کی پابندی کرے، بیعت توڑنے یا اس عہد سے باہر نکل جانے سے مراد یہ ہے کہ مریدان ساری باتوں سے روگردانی کرے۔

تیسری صورت میں بیعت کے عہد کو نبھانے اور اسے پورا کرنے سے مراد یہ ہے کہ مرید ریاضت ومجاہدہ میں اتنی محنت کرے کہ بالآخر وہ اطمینان اور یقین کے نور سے منور ہو جائے، یہاں تک کہ یہ ساری چیزیں بطور عادت اور فطرت اس سے صادر ہونے لگیں اس حالت میں بعض دفعہ سالک کو ایسی چیزوں کی اجازت دی جاتی ہے، جن کی شریعت نے اجازت دی ہے اس میں بعض جسمانی فائدہ بخش چیزیں یا ایسی چیزیں جن کی ضرورت پڑتی ہے شامل ہیں مثلاً علوم دینی کی تدریس وتعلیم یا عہدۂ قضا، اس بیعت یا عہد کو توڑنا یہ ہے کہ مرید مذکورہ امور سے عمداً غافل ہو جائے۔

دوبارہ بیعت کرنا: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دوسری بار بیعت لینا ثابت ہے۔ اسی طرح مشائخ صوفیا سے بھی دوسری دفعہ بیعت لینا منقول ہے اگر دوسرے مرشد سے بیعت پہلے پیر میں کسی خلل یا غیر مشروع بات ظاہر ہونے کی وجہ سے ہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اسی طرح

مرشد کی وفات یا اس کے اس طرح غائب ہو جانے کی صورت میں بھی کوئی حرج نہیں جس میں اس کی واپسی کی امید باقی نہ رہی ہو، البتہ بلاوجہ دوسرے شیخ سے بیعت کرنا اسے ایک کھیل سمجھنا ہے، اس طرح نہ تو برکت حاصل ہوتی ہے اور نہ ہی مشائخ دلی توجہ کرتے ہیں۔

بیعت کے الفاظ: مشائخ سلف سے بیعت کا جو طریقہ بیان ہوا ہے اس کے مطابق پہلے شیخ خطبہ مسنونہ پڑھے جو یہ ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنَسْتَعِيْنُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّـئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلاَ هَادِيَ لَهُ وَاَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَآلِهِ وَصَحْبِهِ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ.

اس کے بعد مرید کو ایمان کی اجمالاً تلقین کرے اور کہے کہ کہو، میں ایمان لایا اللہ پر اور ایمان لایا اس پر جو کچھ اللہ کی طرف سے آیا، مراد خداوندی کے مطابق اور میں ایمان لایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اور جو کچھ اللہ کی طرف سے آپ کے پاس آیا آپ کی تشریح اور مراد کے مطابق اور دین اسلام کے سوا میں تمام دینوں سے برأت کا اظہار کرتا ہوں اسی طرح میں ہر قسم کے گناہوں اور نافرمانی سے توبہ کرتا ہوں، میں اسلام کی تجدید کرتا ہوں اور کہتا ہوں۔

اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ

اس کے بعد مرید سے کہے، کہو

میں نے بیعت کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کے خلفا کے واسطے سے، پانچ باتوں پر اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ اس گواہی پر کہ کوئی معبود برحق نہیں سوائے اللہ کے اور حضرت محمدؐ اللہ کے رسول ہیں اور نماز کے قائم کرنے پر اور زکوۃ کے دینے پر اور رمضان کے روزوں پر اور استطاعت کی صورت میں حج بیت اللہ پر، پھر مرید سے کہے، کہو۔

میں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کے خلفا کے واسطے سے اس بات پر بیعت کی کہ میں اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہیں کروں گا، چوری نہ کروں گا، بدکاری نہیں کروں گا، قتل نہیں

کروں گا اور اپنی طرف سے کسی پر بہتان نہیں لگاؤں گا اور کسی امر میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی نہیں کروں گا، اس کے بعد قرآن مجید کی یہ دو آیتیں پڑھے۔

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اتَّقُوْا اللّٰهَ وَابْتَغُوْا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ وَجَاهِدُوْا فِيْ سَبِيْلِهٖ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (المائدہ:۳۵)

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور اس کی طرف وسیلہ ڈھونڈو اور اس کی راہ میں جہاد کرو اور اس امید پر کہ فلاح پاؤ۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰى نَفْسِهٖ وَمَنْ اَوْفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهَ فَسَيُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا (الفتح ۱۰)

وہ جو تو آپؐ سے بیعت کرتے ہیں وہ تو اللہ ہی سے بیعت کرتے ہیں، ان کے ہاتھوں پر اللہ کا ہاتھ ہے، تو جس نے عہد توڑا اس نے اتنے بڑے عہد کو توڑا اور جس نے پورا کیا وہ عہد جو اس نے اللہ سے کیا تھا تو بہت جلد اللہ اسے بڑا ثواب دے گا۔

اس کے بعد مرشد اپنے لئے، اپنے مرید کے لئے اور حاضرین کے لئے دعا کرے اور کہے بَارَكَ اللّٰهُ لَنَا وَلَكُمْ وَنَفَعَنَا وَاِيَّاكُمْ ''اس کے بعد اس تلقین میں کوئی حرج نہیں ہے مرید سے کہے، کہو''

میں نے سلسلہ عالیہ نقشبندیہ اختیار کیا جو منسوب ہے شیخ اعظم قطب اکمل خواجہ نقشبند رحمۃ اللہ سے یا میں نے سلسلہ عالیہ قادریہ اختیار کیا جو منسوب ہے حضرت سید محی الدین عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف یا میں نے سلسلہ عالیہ چشتیہ اختیار کیا جس کی نسبت ہے حضرت شیخ معین الدین سجزی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ، بار الہ ہمیں اس سلسلے کی برکات نصیب کر اور ہمیں اس سلسلے کے اولیاء اللہ کے ساتھ اٹھا، اے ارحم الراحمین اپنی رحمت سے یہ توفیق ارزانی فرما۔

میں نے اپنے والد گرامی سے سنا، آپ نے فرمایا کہ میں نے خواب میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی، آپ نے میرے دونوں ہاتھ اپنے دونوں مبارک ہاتھوں میں کر لئے۔ چنانچہ میں بیعت کے وقت خواب کے مطابق مصافحہ کرتا ہوں، البتہ عورتیں بیعت کے وقت کپڑے کا ایک کونہ پکڑ لیں جبکہ دوسرا کونا مرشد اپنے ہاتھوں میں لے لے۔ واللہ اعلم۔

باب۔۳

تعلیم وتربیت سالک

سالکین کی تربیت کے کئی درجے ہیں، سب سے پہلی اور اہم بات یہ ہے کہ شیخ سالک کے فکر وعقیدے میں تبدیلی لائے، جب بھی کوئی شخص اللہ کے راستے پر چلنے کے سلسلے میں شوق اور آمادگی ظاہر کرے اسے سلف صالحین کے عقیدے کے مطابق اپنے نظریات صحیح کرنے پر تیار کرے، واجب الوجود کے اثبات، اس کی وحدانیت اور معبود برحق ہونے کا عقیدہ اس کے ذہن میں بٹھائے اور یہ کہ وہ تمام صفات کمال مثلاً حیات، علم، قدرت، ارادہ اور دوسری تمام ایسی صفات جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو متصف فرمایا ہے ان کا مالک ہے، اسی طرح وہ تمام صفات کمال جو مخبر صادق حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے روایات کے ذریعے ثابت ہیں صحیح اور حق ہیں۔ اسی طرح وہ اس بات کا عقیدہ رکھے کہ اللہ تعالیٰ نقص اور کمی کی تمام صورتوں مثلاً جسم، احتیاج مکانی، غرض ہونے، طرف اور جہت میں ہونے اور الوان واشکال سے منزہ اور پاک ہے۔

البتہ اس کے عرش پر متمکن ہونے، ہنسنے اور اس کے ہاتھوں کے سلسلے میں جو اشارات وارد ہوئے ہیں ہم اجمالی طور پر ان پر ایمان رکھتے ہیں، مگر ان کی تفصیلات علم الٰہی پر چھوڑتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ان چیزوں کی طرف نسبت ہمارے تصور نسبت سے بالکل مختلف ہے سچ یہ ہے کہ

لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَّهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ

ہمارے لئے اس قدر بس ہے کہ یہ چیزیں اس کے لئے ثابت ہیں جیسا کہ قرآن مجید شاہد ہے۔

اسی طرح شیخ مرید کے ذہن میں یہ عقیدہ جاگزیں کردے کہ تمام انبیائے کرام برحق ہیں۔

خصوصاً ہمارے آقا و مولیٰ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم آخری رسول ہیں، آپ کی تابعداری اور اطاعت فرض ہے، آپ نے جن چیزوں کا حکم فرمایا، جن باتوں سے منع فرمایا، جو کچھ آپ نے بیان فرمایا، چاہے اس کا تعلق ذات وصفات خداوندی سے ہے یا مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھنے سے، اسی طرح جنت، دوزخ، حشر، حساب، قیامت، عذاب قبر، حوض کوثر، صراط، میزان اور رویت الٰہی سے متعلق جو کچھ آپ سے صحیح روایات کے ذریعے ہم تک پہنچا ہے سب حق اور درست ہے اور اس پر ایمان لانا ضروری ہے۔

عقائد کی تصحیح کے بعد مرشد مرید پر اپنی توجہ مبذول کر کے اسے کبیرہ گناہوں سے اجتناب اور صغیرہ گناہوں پر ندامت کے لئے تیار کرے، سچ یہ ہے کہ کبیرہ ہر وہ گناہ ہے جس کے بارے میں قرآن مجید اور احادیث صحیحہ میں دوزخ، عذاب شدید کی وعید آئی ہے اور جو محدثین کے نزدیک واضح اور مشہور ہو یا اس کے مرتکب کو کافر قرار دیا گیا مثلاً آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ جس نے جان بوجھ کر نماز قضا کی اس نے کفر کیا، دوسری جگہ فرمایا گیا کہ مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان فرق نماز ہے، جس نے اسے چھوڑا اس نے کفر کیا یا کبیرہ وہ گناہ ہے جس کے مرتکب پر شریعت میں حد مقرر کی گئی ہے مثلاً چوری، زنا، رہزنی، شراب نوشی، اسی طرح ہر وہ گناہ جو عقل کے نزدیک برائی میں کبیرہ کے برابر یا اس سے بڑا ہے کبیرہ میں شامل ہے جیسے اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرانا عبادت میں یا روزی میں شفا وغیرہ کے سلسلے میں غیر اللہ سے مدد چاہنا، چنانچہ ان باتوں سے بچنے کیلئے اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح کاہن کی تصدیق، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی، قرآن مجید اور فرشتوں کے بارے میں سطحی گفتگو یا تمسخر بھی کبیرہ گناہوں کے ذیل میں آتے ہیں۔ ان کے علاوہ نماز، روزہ اور فرضیت کے باوجود حج ایسی ضروری عبادات کا ترک، قتل ناحق، اپنی اولاد کا قتل اور خودکشی بھی کبیرہ گناہ ہیں۔

اسی طرح زنا، لواطت، منشیات کا استعمال، چوری، ڈاکہ، سرکاری مال کی چوری، جھوٹی گواہی، جھوٹی قسم، پاک دامن عورت پر بدکاری کی تہمت، یتیم کا مال کھانا، والدین کی نافرمانی، قطع رحمی، ناپ تول میں کمی، سودخوری، میدان جہاد سے فرار، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جھوٹی بات منسوب کرنا، عدالتی امور میں رشوت لینا، محرکات سے نکاح کرنا، بدردیہ مردوں عورتوں کے

درمیان معاملات کرانا، حاکم کو بھڑکانا تاکہ وہ قتل کرے یا کسی کی جائیداد ضبط کر لے، دارالحرب سے دارالاسلام کی طرف ہجرت نہ کرنا، کافروں سے دوستی رکھنا اور مسلمانوں کے مقابلے میں ان کا خیر خواہ بننا، جوا کھیلنا اور جادو کرنا سب گناہ کبیرہ ہیں۔

گناہ صغیرہ وہ ہیں جن سے شریعت نے منع کیا ہے یا وہ کسی جائز حکم کے خلاف ہیں، ان سے دین کے کسی مسلم حکم کی خلاف ورزی ہوتی ہو۔

اس کے بعد مرشد مرید کی زندگی میں ارکان اسلام مثلاً طہارت، نماز، روزہ، زکوۃ اور حج کی محبت اوران پر عمل کا جذبہ پیدا کرے، یہ ارکان مرید سے ان آداب خصوصیات اور طریقوں کے مطابق ادا کرائے جائیں جس طرح آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا ہے۔

اس کے بعد شیخ سالک کی زندگی کے عمومی مسائل مثلاً کھانا پینا، لباس، کلام، مخلوق کے ساتھ میل جول وغیرہ پر نگاہ کرے اور ساتھ ہی اس کے خانگی معاملات مثلاً نکاح، نوکروں چاکروں کے حقوق اور اولاد کے حقوق کی اہمیت اس پر واضح کرے، اس کے بعد معاملات مثلاً خرید وفروخت، عہد و پیمان اور ہر قسم کے لین دین پر اس کی اس طرح تربیت کرے کہ وہ سنت نبوی کے مطابق بغیر سستی اور بوجھ کے صحیح صحیح ادا کرنے لگے۔

اب مرشد سالک کو صبح، شام اور رات کے وقت کے اذکار و اوراد کی تعلیم دے، اسی طرح اسے اخلاقی فضائل اور آداب سے آراستہ کرے، ریا، خود پسندی، حسد، کینہ وغیرہ سے اسے نجات دلائے اور اس میں قرآن مجید کی تلاوت، آخرت کی یاد، ذکر وفکر کی مجالس سے محبت اور مسجد سے تعلق خاطر پیدا کرے جس وقت مرید یہ آداب حاصل کر لے اور اس منزل پر آجائے تو اب اسے اشغال باطنی میں لگانا چاہئے، اب سالک ہر وقت اپنا دل اللہ سے لگائے رکھے اور نگاہ دل سے اس کے جمال میں مستغرق رہے۔

طوالت کے خوف سے ہم نے ان امور کا تفصیلی ذکر اس توقع اور امید پر چھوڑ دیا ہے کہ سالک قرآن مجید، حدیث مبارکہ، فقہ اور اوسط درجے کی کتابوں مثلاً "ریاض الصالحین" عقیدہ عضدیہ وغیرہ سے خود واقف ہے اور ان کا علم رکھتا ہے اگر کسی کو ان کتابوں سے براہ راست واقفیت میں دشواری ہو تو اسے چاہیے وہ کسی معتبر عالم دین سے دریافت کر لے۔

باب ۔۴

اشغال مشائخ قادریہ

مشائخ قادریہ، پیشوائے سلسلہ شیخ ابو محمد محی الدین عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ کے مریدین ہیں، یہ حضرات سب سے پہلے جس چیز کی تلقین کرتے ہیں وہ ذکر بالجہر ہے، ذکر جہری سے مراد بہت بلند آواز سے ذکر کرنا نہیں ہے، چنانچہ اس طرح آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کی خلاف ورزی نہیں ہوتی جس میں آپ نے فرمایا ہے۔ اپنے آپ پر نرمی کرو تم کسی بہرے اور غائب کو نہیں پکار رہے ہو۔

ذکر جہری میں ایک صورت اسم ذات (اللہ) کا ذکر ہے وہ یا تو ایک ضرب سے ہو اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ اسم ذات یعنی اللہ کو سختی، درازی اور بلند آواز سے دل اور حلق دونوں کی قوت کے ساتھ ادا کرے، پھر ٹھہر جائے، یہاں تک کہ ذاکر کی سانس اپنے ٹھکانے پر واپس آجائے پھر اسی طرح بار بار ذکر کرتا رہے۔

یا ذکر دو ضربی ہو، اس کا طریقہ یہ ہے کہ نماز کی نشست پر بیٹھے اور اسم ذات کو ایک بار داہنے زانو میں اور دوسری بار دل پر ضرب کرے اور اسے بغیر وقفہ کے بار بار کرے مناسب یہ ہے کہ ضرب قلبی قوت اور سختی کے ساتھ ہوتا کہ دل پر اثر ہو اور اس میں یکسوئی پیدا ہو، پریشان خاطری اور وسواس رفع ہو جائیں۔

یا ذکر سہ ضربی ہو، اس کی صورت یہ ہے کہ چارزانو بیٹھے ایک بار، داہنے زانو میں دوسری بار بائیں زانو میں اور تیسری دفعہ دل میں ضرب کرے اور ضرب سخت تر اور بلند تر ہو۔

اور ذکر چار ضربی کی شکل یہ ہے کہ چارزانو بیٹھے، ایک بار داہنے زانو میں، دوسری بار بائیں

زانو میں، تیسری بار دل میں اور چوتھی بار اپنے سامنے ضرب کرے چوتھی ضرب سخت تر اور بلند تر ہو۔

ذکر جہری میں ایک صورت نفی و اثبات کی ہے اور وہ ہے لا الٰہ الا اللہ۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ نماز کی صورت میں قبلہ رو ہو کر بیٹھے اور اپنی آنکھیں بند کر لے، لا کہے گویا اسے اپنی ناف سے نکالتا ہے، پھر اسے کھینچے یہاں تک کہ داہنے کندھے تک پہنچے، پھر الٰہ کہے گویا اسے دماغ کی جھلی سے نکالتا ہے، پھر الا اللہ کو دل پر شدت اور قوت کے ساتھ ضرب کرے اور ذات حق کا اثبات کرے۔ ہوسکتا ہے یہاں سوال پیدا ہو کہ آخر ضربات، انہیں سختی اور درازی کے ساتھ ادا کرنے اور انہیں مختلف مقامات سے دیگر جگہوں تک لے جانے میں کیا حکمتیں پوشیدہ ہیں، میں عرض کرتا ہوں کہ انسانی فطرت ہے کہ اس کی توجہ مختلف چیزوں اور مقامات کی طرف بٹتی ہے وہ مختلف آوازوں کی طرف دھیان دیتی ہے، اس کے دل میں خیالات کے ہجوم گردش کرتے ہیں، چنانچہ اہل طریقت نے کچھ ایسے اصول اور طریقے وضع کئے ہیں جن پر عمل کر کے انسان آہستہ آہستہ غیر سے توجہ ہٹانے، بیرونی خطرات اور اشارات سے یکسو ہونے اور بالآخر اپنی ذات کے دھیان سے بھی فارغ ہو کر اللہ تعالیٰ سے سچی لو لگانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

افضل یہ ہے کہ اہل سلوک فجر اور عصر کی نمازوں کے بعد حلقہ بنا کر اجتماعی انداز میں ذکر کریں، اکٹھے بیٹھ کر ذکر کرنے میں جو فوائد ہیں وہ اکیلے بیٹھ کر کرنے میں نہیں ہیں۔

جب طالب راہ پر ذکر جہری کے اثرات نمایاں ہو جائیں اور اس میں ذکر کا نور جھلکنے لگے تو اسے ذکر خفی کی رہنمائی کی جائے، ذکر جہری کے اثرات سے مراد یہ ہے کہ اس میں ذوق وشوق پیدا ہو جائے، اللہ کے نام سے اس کے دل کو سکون وچین ملے، پریشان خاطری اور وساوس چھٹ جائیں اور ذات الٰہی کو ہر چیز سے مقدم سمجھنے اور اسے اولیت دینے لگے۔

جو شخص ہر روز (دن رات میں) دو ماہ یا اس کے لگ بھگ کم وبیش چار ہزار دفعہ اسم ذات (اللہ) کا ذکر ان شرائط اور آداب کے ساتھ باقاعدگی سے کرے جو ہم نے بیان کئے ہیں تو اس کے اثرات کا وہ خود مشاہدہ کرے گا گو ذاکر غبی ہو یا تیز فہم۔

ذکر خفی: اب ہم ذکر خفی کا ذکر کرتے ہیں، اس کا طریقہ یہ ہے کہ اپنی دونوں آنکھیں اور لب

بند کرے اور زبان قلب سے کہے اَللّٰہُ سَمِیْعٌ، اَللّٰہُ بَصِیْرٌ اَللّٰہُ عَلِیْمٌ گویا یہ الفاظ اپنی ناف سے نکلتا ہے سینے تک اور سینے سے نکلتا ہے، دماغ تک اور دماغ سے نکلتا ہے عرش تک! پھر یوں کہا اَللّٰہُ عَلِیْمٌ اَللّٰہُ سَمِیْعٌ، اَللّٰہُ بَصِیْرٌ اپنی منزلوں سے اترتا آئے اور جن پر چڑھا، درجہ بدرجہ آئے، یہ چڑھنے اترنے کا عمل بار بار کرے اور راہ کے بعض شناور اَللّٰہُ قَدِیْرٌ کا اضافہ کرتے ہیں۔

پاس انفاس: ذکر خفی میں نفی و اثبات کی ایک صورت وہی ہے جو ہم ذکر جہری کے ضمن میں بیان کر آئے ہیں، دوسری یہ ہے کہ ذاکر اپنے سانسوں پر ہوشیار اور بیدار ہو۔ یعنی جب سانس باہر نکلے تو بلا ارادہ قصد اس کے دل سے آواز نکلے لا الٰہ اور جب سانس اندر جائے، اسی طرح بغیر ارادہ وقصد دل آواز دے۔ الا اللہ یہ پاس انفاس ہے دل کی صفائی کے لئے اور خطرات و وساوس اور پریشان خاطری سے نجات حاصل کرنے کے لئے پاس انفاس انتہائی موثر ہے۔

جس وقت سالک راہ کے اندر ذکر خفی کے اثرات ظاہر ہو جائیں اور اس میں ذکر کا نور معلوم ہو، تو اسے مراقبہ کی طرف لگایا جائے، ذکر کے اثرات اور نور سے مراد یہ ہے کہ طالب راہ پر محبت الٰہی کا غلبہ ہو جائے، وہ ہر دم غور و فکر کی کیفیت میں رہے۔ اللہ تعالیٰ کو ماسویٰ پر مقدم سمجھے اور اس کی طلب میں ہمہ تن وقف ہو جائے، چپ رہنے میں خوشی محسوس کرے زیادہ گفتگو اور بات چیت سے کنارہ کشی اختیار کرے اور دنیوی امور سے دامن چھڑانے میں راحت محسوس کرے۔

مراقبہ: مشائخ صوفیا کے ہاں مراقبہ کی کئی قسمیں ہیں ان سب کے ضمن میں جامع اور مکمل صورت یہ ہے کہ کوئی آیت قرآنی یا کلمہ زبان سے بولے یا دل میں اس کا خیال کرے اور اس کے معنی کو دل میں اچھی طرح جاگزیں کرے، پھر تصور کرے کہ یہ معنی کیونکر ہیں؟ اور اس کے تحقق اور ثبوت کی کیا صورت ہے۔ پھر دل کو اس صورت میں قائم کرے، یہاں تک کہ اس کے سوا دل میں کسی دوسرے معنی کا گزر نہ ہو اور اس میں استغراق کی کیفیت پیدا ہو جائے یعنی اس کے ماسویٰ سے ایک طرح کی غفلت اور ربودگی کی صورت ہو۔

مراقبہ کا ثبوت آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی ہے کہ "احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا اسے دیکھ رہے ہو اور اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے تو وہ یقیناً تمہیں دیکھ رہا ہے"۔

سالک دوران مراقبہ اپنی زبان سے کہے، اللہ میرے سامنے موجود ہے، اللہ مجھے دیکھ رہا ہے، اللہ میرے ساتھ ہے یا زبان سے نہ کہے مگر دل میں اس معنی کا تصور کرے، اللہ تعالیٰ کی حضوری، اس کی نظر اور اس کی معیت کو انتہائی مضبوطی اور پختگی کے ساتھ تصور کرے اور یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ اس کا ذات مکان اور طرف سے منزہ اور پاک ہے، اس تصور کو یہاں تک لے جائے کہ اس میں استغراق ہو جائے۔ یا اس آیت کا تصور کرے۔ **وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ** اور وہ تمہارے ساتھ تم کہیں ہو"۔ (الحدید:۴)

اس کی معیت یعنی ساتھ ہونے کا تصور اس قدر پختہ کرے کہ کھڑے، بیٹھے، لیٹے، تنہائی اور لوگوں سے ملاقات، مصروفیت اور فراغت، الغرض ہر صورت میں اس تصور سے غافل نہ رہے یا ان آیات میں سے کوئی آیت پڑھے۔

فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ

"تو تم جدھر منہ کرو ادھر اللہ تمہاری طرف متوجہ ہے"(البقرہ:۱۱۰)

اَلَمْ يَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ يَرٰى

"تو کیا حال ہوگا کیا نہ مانا کہ اللہ دیکھ رہا ہے"(العلق:۱۴)

نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطٌ

"اور ہم دل کی رگ سے بھی اس سے زیادہ نزدیک ہیں"(ق:۱۶)

اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ

"بے شک میرا رب میرے ساتھ ہے"(الشعراء:۶۲)

هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ

"وہی اوّل وہی آخر وہی ظاہر وہی باطن"(الحدید:۳)

یہ مراقبے اللہ تعالیٰ کے ساتھ دل کو متعلق کرنے کے سلسلے میں مفید ہیں۔

دنیوی بکھیڑوں سے نجات حاصل کرنے اور ان سے پوری طرح گلوخلاصی کرانے اور سکر و صحو کے لئے جو مراقبہ زیادہ فائدہ مند ہے وہ اس آیت کا مراقبہ ہے۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ

''زمین پر جتنے ہیں سب کو فنا ہے اور باقی ہے تمہارے رب کی ذات عظمت اور بزرگی والا''
(الرحمٰن:۲۷)

اس مراقبے کی صورت یہ ہے کہ سالک تصور کرے کہ وہ مرکر ایسی راکھ بن گیا ہے جسے ہوائیں اڑا رہی ہیں، آسمان ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا ہے، ہر چیز کی شکل وصورت مٹ کر بدل گئی ہے، البتہ اللہ موجود اور باقی ہے دیر تک یہ تصور جمائے، ہوش مندی کے لئے فائدہ مند ثابت ہوگا، اسی طرح اس آیت کا مراقبہ کرے۔

اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِی تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلَاقِیْکُمْ اَیْنَ مَا تَکُوْنُوْا یُدْرِکْکُمُ الْمَوْتُ وَلَوْ کُنْتُمْ فِی بُرُوْجٍ مُّشَیَّدَةٍ (النساء:۸۷)

''تم جہاں کہیں ہو موت تمہیں آلے گی اگرچہ مضبوط قلعوں میں ہو''۔

جس وقت طالب راہ پر اس مراقبہ کے اثرات واضح ہوجائیں اور اس کا نور جھلکنے لگے، تو اسے توحید افعالی کی طرف رہنمائی کی جائے۔ واضح رہے کہ شارع علیہ السلام نے خاص طور پر دو چیزوں کی طرف رغبت اور آمادگی دلائی ہے پہلی چیز ذکر ہے اور ذکر وہ ہے جو زبان سے بولا جائے اور دوسری چیز فکر ہے اور فکر سے مراد مراقبہ ہے۔

آئندہ رونما ہونے والے واقعات کا کشف: بعض مشائخ صوفیا کا کہنا ہے کہ آئندہ رونما ہونے والے واقعات کے کشف کے بارے میں ہمیں جو تجربہ حاصل ہوا ہے، وہ یہ ہے کہ طالب راہ اکیلی جگہ اپنی نشست قائم کرے، غسل کرے، عمدہ لباس پہنے، خوشبو لگائے اور مصلّی پر بیٹھ جائے، قرآن مجید کا ایک کھلا ہوا نسخہ اپنے سامنے رکھے ایک ایک کھلا ہوا نسخہ اپنے دائیں بائیں رکھے اور ایک نسخہ اپنے پیچھے رکھے اور اپنی توجہ اس طرف مبذول کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے انتہائی عاجزی سے دعا کرے کہ بارالٰہ فلاں مسئلہ یا واقعہ مجھ پر ظاہر فرما، اس کے بعد اسم ذات کا ذکر شروع کرے مگر آنکھیں کھلی رکھے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ ذکر کی ایک ضرب داہنے مصحف میں لگائے اور ایک بائیں میں، ایک ضرب پیچھے اور ایک سامنے والے مصحف میں۔ بالآخر وہ دل میں ایک خاص قسم کا نور اور کشادگی محسوس کرے گا، سات روز برابر خلوت میں یہ عمل دہرائے، انشاءاللہ اس پر سارا واقعہ کھل جائے گا۔ ہر چند مشائخ سے یہ اسی طرح منقول ہے تاہم میرے دل میں اس

کے بارے میں کچھ تردد ہے کہ اس میں ایک لحاظ سے قرآن مجید کی بے ادبی کا پہلو نکلتا ہے(۱)۔

آئندہ رونما ہونے والے واقعات کی اطلاع سے متعلق مخدومی میرے والد گرامی علیہ الرحمۃ کا پسندیدہ طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ان اسمائے گرامی کا ذکر اس طرح کرے یَا عَلِیْمُ یَا مُبِیْنُ یَا خَبِیْرُ یہ ذکر اوپر بیان کردہ شرائط کے مطابق ہو جس طرح ہم نے ذکر ایک ضربی یا ذکر دو ضربی کے ضمن میں بیان کیا ہے۔

کشف ارواح: مشائخ قادریہ نے فرمایا کہ کشف ارواح کے سلسلے میں ہمارے مجرب طریقہ یہ ہے کہ مذکورہ شرائط کے ساتھ دائیں طرف سبوح اور بائیں طرف قدوس کی ضرب لگائے اسی طرح آسمان میں رب الملئکۃ اور دل میں والروح کی ضرب لگائے۔

مشکل امور کے حل اور مصیبت کو دفع کرنے کے لئے شرائط مذکورہ کے ساتھ جتنی پڑھ سکے تہجد کی نماز پڑھے پھر داہنی طرف یا حی اور بائیں طرف یا وھاب کی ضرب لگائے، یہ عمل ایک ہزار بار کرے۔

دل کی کشادگی اور بسط: دل کی کشادگی اور مشکل میں آسانی کی خاطر دل میں اللہ کی ضرب لگائے اور لا الہ الا ھو کی ضرب اس طرح لگائے جس طرح ہم ذکر نفی واثبات کے ضمن میں بیان کر آئے ہیں، پھر داہنی طرف الحی اور بائیں طرف القیوم کی ضرب لگائے۔

مقصد برآری کے لئے: بیمار کے لئے شفاء، تنگدستی سے نجات، رزق کی فراوانی اور دشمن سے امن کے لئے مناسب ہے کہ اسمائے حسنیٰ میں سے اپنی ضرورت کے مطابق کسی اسم کا انتخاب کرے اور اس نام کا دو ضرب یا تین ضرب یا چار ضرب کے ساتھ ذکر کرے مثلاً اپنی طلب کے مطابق یا صمد (فاقہ کی صورت میں) یا رازق (کشائش رزق کے لئے) یا مذل (دشمن کو مغلوب کرنے کے لئے) کا ذکر کرے، اسی طرح دوسرے اسمائے حسنیٰ کا اپنی حالت کے مطابق انتخاب کرے۔

---

(۱) حضرت شاہ صاحب کی رائے صائب ہے۔ (قاسمی)

باب۔۵

اشغال مشائخ چشتیہ

یہ حضرات پیشوائے سلسلہ خواجہ معین الدین حسن چشتی رحمتہ اللہ علیہ کے مریدین ہیں، چشت آپ کے مشائخ کے گاؤں کا نام ہے رضی اللہ عنہ وعنہم اجمعین۔

مشائخ چشتیہ کا کہنا ہے کہ امام الاولیا حضرت علی مرتضٰی رضی اللہ عنہ آنحضورﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی یارسول اللہﷺ مجھے اللہ کی طرف جانے والا سب سے بہتر اور قریب ترین راستہ بتایئے۔ مگر یہ راستہ ایسا ہو، جس پر چلنا اور عمل کرنا بندوں کے لئے سب سے آسان ہو، آپ نے ارشاد فرمایا خلوت میں ذکر الٰہی کو وظیفہ بنالو انھوں نے پوچھا، حضور ذکر کس طرح کروں، آپ نے فرمایا آنکھیں بند کرلو اور تین دفعہ مجھ سے سنو پھر آپ نے تین دفعہ یہ ذکر کیا لا الہ الا اللہ۔ حضرت علی مرتضٰی رضی اللہ عنہ سنتے رہے، پھر اس کے بعد تین دفعہ حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہ نے ذکر کیا لا الہ الا اللہ، آنحضورﷺ سنتے رہے، بعد میں حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہ نے حضرت حسنؓ کو اس ذکر کی تعلیم دی۔

اسی طرح درجہ بدرجہ مشائخ کے ذریعہ ہم تک یہ سلسلہ پہنچا، یہ حدیث ہمیں اپنے مشائخ سے معلوم ہوئی ہے محدثین کے نزدیک اس میں لمبی بحث ہے۔

شیخ جس وقت مرید کو ارشاد و تلقین کا ارادہ کرے تو اسے حکم دے کہ وہ روزہ رکھے، اگر یہ پنج شنبہ (خمیس) کا دن ہو تو زیادہ بہتر ہے، پھر اسے تلقین کرے کہ وہ دس بار استغفار کرے اور دس مرتبہ درود پڑھے، پھر مرشد کے اللہ تعالیٰ اپنی محفوظ کتاب میں فرماتا ہے۔

فَاذْكُرُوْ اللّٰهَ قِيَاماً وَّقُعُوْداً وَّ عَلٰى جُنُوْبِكُمْ

''اللہ کی یاد کرو کھڑے اور بیٹھے اور کروٹوں پر لیٹے'' (النساء:۱۰۳)

چنانچہ اے سالک راہ کوشش کرو کہ تمہارا کوئی لمحہ ذکر الٰہی سے خالی نہ گزرے، تمہیں علم ہونا چاہئے کہ تمہارا دل بائیں چھاتی کے نیچے دو انگل پر ودیعت کیا گیا ہے اور اس کی شکل چلغوزہ کی ہے، اس کے دو دروازے ہیں ایک اوپر کی طرف اور دوسرا نیچے کی طرف، اوپر والا دروازہ ذکر جلی سے اور نیچے والا ذکر خفی سے کھلتا ہے۔

ذکر جلی: جس وقت ذکر جلی کا ارادہ کرو، چار زانو بیٹھو اور اس رگ کو پکڑ لو جسے کیاس کہا جاتا ہے۔ اسی طرح اپنے داہنے پاؤں کے انگوٹھے اور اس سے ملحقہ انگلی کو دبا کر رکھو، میرے والد گرامی قدس سرہ فرمایا کرتے تھے کہ کیاس وہ رگ ہے جو زانوں کے نیچے ران کی طرف سے اترتی ہے، اسے اس مشکل میں پکڑنا خیالات و خدشات سے چھٹکارے اور روحانی قوت کو ایک جگہ مرتکز کرنے کے لئے بے حد فائدہ مند ہے اور یہ عمل دل کو ایک عجیب گرمی اور کیفیت عطا کرتا ہے۔

پھر نماز کی ہیئت میں قبلہ رو ہو کر بیٹھ جائے اور اپنی باطنی ہمت کو یکجا کر کے سختی اور کشیدگی کے ساتھ دل کی گہرائیوں سے ذکر کرے لا الہ الا اللہ لفظ لا ناف سے نکالے اور اسے داہنے مونڈھے تک کھینچے، پھر الہ دماغ کی جھلی (ام الدماغ) سے نکالے گویا اس نے غیر اللہ کی محبت اپنے اندر سے نکال کر پیٹھ کے پیچھے پھینک دی ہے، اب دوسرا سانس لے اور الا اللہ کو دل میں سختی اور قوت کے ساتھ ضرب کرے۔

نفی و اثبات کی اس کیفیت میں راہ معرفت کا ابتدائی سالک غیر اللہ سے معبودیت کی نفی کرے متوسط غیر اللہ سے مقصودیت کی نفی کرے اور منتہی اللہ کے ماسوی وجود کی نفی کرے۔

اس ذکر کی اہم اور بڑی شرط یہ ہے کہ سالک اپنے ارادے اور باطنی قوت کو مجتمع کرے اور اس کے مفہوم و معنی کو سمجھے ذکر جلی کرنے والا سالک خوراک میں بہت زیادہ کمی نہ کرے صرف چوتھائی معدہ خالی رکھے اور مناسب ہے کہ کچھ چکنائی استعمال کرے تاکہ دماغ خشکی سے پریشان نہ ہو۔

اگر سالک پاس انفاس کا ارادہ کرے تو اپنے سانسوں کی نگرانی اور حفاظت کرے سانس خارج ہو تو کہے لا الہ گویا وہ خدا کے سوا ہر چیز کی محبت اپنے دل سے خارج کر رہا ہے سانس اندر کھینچے

تو کہے الا اللہ گویا وہ اپنے دل میں اللہ کی محبت داخل کر کے اسے قائم کر رہا ہے۔

مشائخ چشتیہ نے فرمایا ہے کہ راہ معرفت کا سب سے بڑا رکن دل کو اپنے مرشد سے جوڑنا ہے، یہ مرشد کی تعظیم اور اس کی صورت کے تصور کی شکل میں ہونا چاہئے۔ میں عرض کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے مظاہر بے شمار ہیں، چنانچہ ہر عابد چاہے وہ غبی ہے یا بہترین عقل کا مالک اللہ تعالیٰ اس کے سامنے اسی کے مرتبے اور حیثیت کے مطابق ظاہر ہو کر اس کا معبود بنا ہے، یہی وہ راز ہے جس کے سبب قبلہ کی طرف منہ کرنا اور استواء علی العرش (عرش پر متمکن ہونا) ایسی چیزیں شریعت میں نازل ہوئیں۔

آنحضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ جب تم میں کوئی نماز پڑھے تو اپنے منہ کے سامنے نہ تھوکے اس لئے کہ نمازی اور قبلے کے درمیان اللہ تعالیٰ ہے۔

اسی طرح ایک دفعہ آپ ﷺ نے ایک سیاہ رنگ والی باندی سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ کہاں ہے؟ اس نے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔ پھر آپ ﷺ نے اس سے پوچھا کہ میں کون ہوں تو اس نے انگلی سے اس بات کا اشارہ کیا کہ آپ ﷺ کو اللہ نے بھیجا ہے چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ مومنہ ہے۔

پس اے سالک! تمہیں ہر حال میں اللہ ہی کی طرف اپنی توجہ رکھنی ہے اور اسی کے ساتھ ہی اپنے دل کی لو لگانی چاہئے، یہ تصور اور توجہ عرش کے حوالے سے ہی کیوں نہ ہو، یعنی ایسے نور کا تصور جو اللہ نے عرش پر رکھا ہے اور جو اپنی چمک دمک میں چاند سے بھی کہیں بڑھ کر ہے، یا یہ توجہ اور دل کی لو قبلے کی طرف متوجہ ہو کر لگائی جائے۔ جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے، تو یہ ایک طرح سے ایک حدیث کا مراقبہ ہوا۔

جس وقت طالب راہ ذکر کے نور سے منور ہو جائے تو اسے مراقبہ کی طرف لگایا جائے، مراقبہ رقیب سے مشتق ہے، رقیب کے معنی محافظ اور نگراں کے ہوتے ہیں، اسے مراقبہ کا نام اس لئے دیا گیا ہے کہ سالک اس کے ذریعہ اپنے دل کی حفاظت اور نگرانی کرتا ہے۔ نیز وہ اللہ کے سامنے حاضر ہوتا ہے جیسے کہ اللہ تعالیٰ ہر وقت اس کا نگراں اور محافظ ہوتا ہے۔ مراقبے کے وقت زبان سے کہے یا دل میں خیال کرے اَللّٰهُ حَاضِرِیْ، اَللّٰهُ نَاظِرِیْ، اَللّٰهُ شَاهِدِیْ، اَللّٰهُ مَعِیَ

یا اس آیت کا مراقبہ کرے اَلَا اِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيطٌ یا اس تصور کا مراقبہ کرے کہ اللہ سالک اور قبلے کے درمیان موجود ہے اور وہ مشاہدہ کر رہا ہے۔

مشائخ چشتیہ کا کہنا ہے کہ جو شخص چلہ نشینی کا ارادہ کرے، وہ چند امور کا بطور خاص التزام کرے۔ ہمیشہ روزے سے رہے، رات کو ہمیشہ قیام کرے۔ کھانا، پینا، بولنا اور لوگوں سے میل ملاقات کم کردے اور سوتے جاگتے باوضو رہے۔ دل ہمیشہ مرشد کے ساتھ لگائے، غفلت کو اپنے اوپر حرام قرار دے دے، حجرے میں داخل ہوتے وقت داہنا پاؤں بڑھائے تو اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ کے بعد تین دفعہ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ پڑھے اور جب بایاں پاؤں داخل کرے تو یہ دعا پڑھے۔

اَللّٰهُمَّ اَنْتَ وَلِيِّ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ كُنْ لِيْ بِمَا كُنْتَ لِمُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَارْزُقْنِيْ مُحَبَّتَكَ اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنِيْ حُبَّكَ وَاشْغِلْنِيْ بِجَمَالِكَ وَاجْعَلْنِيْ مِنَ الْمُخْلِصِيْنَ اَللّٰهُمَّ اُمْحُ نَفْسِيْ بِجَذْبَاتِ ذَالِكَ يَا اَنِيْسُ مَنْ لَا اَنِيْسَ لَهٗ.

''الٰہی! دنیا و آخرت میں تو ہی میرا کارساز ہے، اسی طرح میری دستگیری کر جس طرح تو نے اپنے حبیب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کرم فرمایا، مجھے اپنی محبت عطا فرما، اپنے جمال کی مشغولیت نصیب فرما اور اپنے مخلص بندوں میں شامل کر بار الٰہ میرے نفس کو اپنی ذات کی کشش سے آزاد کر، اے ہر اس شخص کے مونس و رفیق جس کا کوئی مونس و رفیق نہیں، اے اللہ مجھے تنہا اور اکیلا نہ کرنا بلاشبہ تو سب سے بہتر وارث ہے۔

پھر مصلی پر کھڑا ہو کر اکیس دفعہ یہ آیت پڑھے۔

اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ

''میں نے اپنے منہ اس کی طرف کیا جس نے آسمان اور زمین بنائے ایک اسی کا ہو کر اور میں مشرکوں میں نہیں'' (الانعام:۸۹)

اس کے بعد دو رکعت پڑھے، پہلی رکعت میں آیۃ الکرسی اور دوسری میں اٰمن الرسول پڑھے، نماز کے بعد طویل سجدہ کرے اور عاجزی و زاری کے ساتھ دعا مانگے، اس کے بعد یا فتاح

پانچ سو بار پڑھے، اس سے فراغت کے بعد ان اذکار میں مشغول ہو جائے جن کا بیان اوپر گزر چکا ہے۔

مشائخ چشتیہ نے فرمایا ہے کہ سالک جس وقت کسی مزار پر جائے تو پہلے دو رکعت میں سورہ انا فتحنا پڑھے پھر میت کے سامنے والے رخ میں اسی کی طرف منہ اور قبلہ کی طرف پشت دے کر بیٹھ جائے اور پہلے سورہ ملک پڑھے پھر اللہ اکبر اور لا الہ الا اللہ پڑھے، اس کے بعد گیارہ دفعہ سورہ فاتحہ پڑھے اور قبر سے قریب ہو جائے اور اکیس بار یارب یارب پڑھے اس کے بعد یاروح کہے اور اسے آسمان میں ضرب کرے پھر یاروح الروح کی دل میں ضرب کرتا رہے یہاں تک کہ دل میں بسط (کشادگی) اور نور کی کیفیت محسوس کرے، اس کے بعد صاحب مزار کی طرف سے اپنے دل میں فیض کا انتظار کرے۔

صلوٰۃ معکوس: مشائخ چشتیہ کے ہاں ایک خاص نماز ہے جسے صلوٰۃ معکوس کا نام دیتے ہیں ہمیں احادیث اور فقہا کے اقوال میں اس کی کوئی ایسی بنیاد نظر نہیں آئی جس کی وجہ سے ہم اس پر زور دیں، اس لئے ہم اس کا ذکر ترک کرتے ہیں اور حقیقی علم اللہ ہی کے پاس ہے۔

صلوٰۃ کن فیکون: اسی طرح ان کے ہاں ایک اور نماز ہے جسے وہ صلوٰۃ کن فیکون کہتے ہیں، ان کے مطابق جسے کوئی انتہائی مشکل مسئلہ پیش آجائے اسے چاہئے کہ وہ بدھ، خمیس اور جمعہ کی راتوں میں دو رکعت نماز ادا کرے پہلے رکعت میں سورہ فاتحہ ایک بار اور قل ھو اللہ سو بار اور دوسری رکعت میں سورہ فاتحہ سو بار اور قل ہو اللہ ایک بار پڑھے، پھر کہے اے ہر دشواری کو آسان کرنے والے اور ہر تاریکی کو دور کرنے والے، پھر سو دفعہ درود پڑھ کر حضور قلب کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا کرے، تیسری رات یہ عمل پورا کر کے اپنی پگڑی یا ٹوپی سر سے اتار دے، آستین گلے میں ڈال کر گڑگڑائے اور رو رو کر پچاس بار اپنی مشکل اور مصیبت کے لئے دعا کرے اس کی دعا ضرور قبول ہوگی۔

باب۔۶

اشغال مشائخ نقشبندیہ

یہ حضرات پیشوائے سلسلہ نقشبندیہ خواجہ بہاء الدین نقشبند رحمتہ اللہ علیہ کے مریدین و منتسبین ہیں رضی اللہ عنہ وعنہم اجمعین۔

مشائخ نقشبندیہ کا کہنا ہے کہ اللہ تک پہنچنے کے تین راستے ہیں ان میں پہلا راستہ ذکر الٰہی کا ہے، ذکر کی ایک صورت ذکر نفی و اثبات ہے اور ذکر کی یہی صورت متقدمین مشائخ نقشبندیہ سے منقول ہے اس کا طریقہ یہ ہے کہ توجہ کو منتشر کرنے والی بیرونی چیزوں مثلاً لوگوں کی قیل وقال اور اندرونی باتوں مثلاً شدید بھوک، غصہ، درد اور ضرورت سے زیادہ پیٹ بھرنے ایسی تمام چیزوں سے خالی ہونے کو غنیمت جان کر سالک پہلے موت کو اپنے سامنے موجود سمجھے اور اللہ تعالیٰ سے اپنے کردہ گناہوں کی معافی طلب کرے، پھر اپنے دونوں لب اور آنکھیں بند کر لے اور سانس کو اندر روک کر دل سے کہے لا اسے اپنی ناف کے داہنی طرف سے نکالے اور کھینچتا ہوا مونڈھے تک لے آئے پھر کندھے کو سر کی طرف جھکا دے اور ہلائے اور کہے الٰہ پھر زور سے الا اللہ کو دل میں ضرب کرے۔

حبس دم: ان مشائخ کا کہنا ہے حبس دم (سانس کو روک کر نکالنا) عشق کو ابھارنے، باطنی نسبت کو مرتکز کرنے، باطنی قوتوں کو بیدار کرنے اور پریشان خیالی اور وساوس سے نجات حاصل کرنے کے سلسلے اکسیر ہے، حبس دم کی مشق بتدریج کرنی چاہیئے تا کہ طبیعت پر نا قابل برداشت بوجھ نہ پڑے، حبس میں افراط نہ کیا جائے۔ خیال رہے کہ مشائخ نقشبندیہ کے حبس اور جوگیوں کے حبس میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

اسی طرح طاق عدد کی بھی عجیب خصوصیات اور اثرات ہیں، جس دم میں پہلے ایک دم میں ذکر ایک دفعہ مشق کرے اور پھر ایک دم میں تین دفعہ اس کے بعد طاق اعداد میں ایک ہی سانس میں تعداد بڑھاتا جائے، یہاں تک کہ اکیس تک پہنچ جائے۔

اگر کوئی سالک اکیس بار تک ایک سانس ہی میں جس دم تک پہنچ جائے اور پھر بھی اس پر کشش ربانی کا دروازہ نہ کھلے اور باطن کے اللہ کی طرف مبذول ہونے اور دوسرے امور سے وحشت کی صورت پیدا نہ ہو تو وہ جان لے کہ اس کا عمل نہیں ہوا۔ اس میں کہیں نہ کہیں کمی رہ گئی ہے، چنانچہ وہ دوبارہ تین سے شروع کرکے اکیس بار تک پہنچے۔

ذکر کے طریقوں میں سے ایک مجرد اثبات ہے، یعنی صرف الا اللہ کا ذکر کرے۔ اسے خواجہ محمد باقیؒ یا ان کے کسی قریب العصر بزرگ نے نکالا ہے، متقدمین کے یہاں اس کا سراغ نہیں ملا۔

میں نے اپنے والد گرامی سے سنا، وہ فرمایا کرتے تھے کہ ذکر نفی و اثبات سلوک کے لئے مفید تر ہے اور ذکر اثبات خالی جذب اور کشش کے لئے بے حد مفید ہے۔

اس کا طریقہ یہ ہے کہ لفظ اللہ کو جس دم کے ساتھ اپنی ناف سے پوری قوت کے ساتھ نکالے اور اسے ام الدماغ تک کھینچے، اسے آہستہ آہستہ بڑھاتا جائے بعض نقشبندی مشائخ ایک ہی سانس میں ہزار دفعہ تک یہ ذکر کر لیتے ہیں۔ میں نے اپنے والد گرامی کے مریدین میں سے کسی ایک عورت کو دیکھا، وہ ایک ہی سانس میں اسم ذات اللہ کا ہزار سے بھی زیادہ ذکر کر لیتی تھی۔

میرے والد گرامی اپنے ابتدائے سلوک کا واقعہ بیان فرمایا کرتے تھے کہ میں ذکر نفی و اثبات ایک ہی سانس میں دو سو مرتبہ کر لیتا تھا۔

مشائخ نقشبندیہ کے نزدیک اللہ تک پہنچنے کا دوسرا راستہ مراقبہ ہے اس کی صورت یہ ہے کہ سانس کو تھوڑی دیر کے لئے ناف کے نیچے روکے اور اپنے تمام حواس مدرکہ کو اس مجرد اور بسیط معنی کی طرف مرکوز کر دے، جسے ہر سالک اللہ کا نام بولتے وقت تصور کرتا ہے، مگر ایسے افراد بہت کم ہیں جو اس معنی بسیط کا لفظ کے بغیر تصور کر لیں، لہٰذا سالک کو چاہئے کہ وہ اس معنی بسیط کو الفاظ سے جدا کرے اور اس کی طرف خیالات و خطرات کی مزاحمت اور ماسوی اللہ کی طرف التفات کے بغیر متوجہ ہو، بعض لوگوں سے اس قسم کا ادراک نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ بعض مشائخ ایسے شخص کے لئے ایک

دعا تجویز کرتے ہیں، اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ یہ دعا ہمیشہ دل سے کرے (زبان سے نہیں) اور کہے، اے میرے رب تو ہی میرا مقصود ہے، میں تیرے سوا ہر چیز کو چھوڑ کر تیری طرف آیا ہوں یا اس سے ملتی جلتی دعا مانگے۔ بعض مشائخ ایسے شخص کو خلائے مجرد یا نور بسیط کے تصور کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ چنانچہ سالک راہ بتدریج اس تصور سے مذکورہ توجہ کی منزل تک پہنچ جاتا ہے۔

مشائخ نقشبندیہ کے نزدیک وصول الی اللہ کا تیسرا طریقہ اپنے مرشد کے ساتھ کمال درجے کا رابطہ اور تعلق خاطر ہے، اس کی شرط یہ ہے کہ مرشد قوی التوجہ اور ''یادداشت'' کو دائمی مشق سے بہرہ ور ہو، ایسے مرشد کی صحبت اختیار کرے تو سوائے اس کی محبت کے اپنی ذات کے ہر شے کے تصور اور خیال سے خالی کرے اور مرشد کے فیض کا منتظر رہے۔ آنکھیں بند کر لے اور اگر کھلی رکھے تو مرشد کی دونوں آنکھوں کے درمیان نظر جمائے جس وقت فیضان کی آمد شروع ہو تو دل کی گہرائیوں سے اس کی حفاظت اور نگرانی کرے اور جب مرشد سامنے موجود نہ ہو تو انتہائی محبت اور تعظیم کے ساتھ اس کی صورت کو اپنی دونوں آنکھوں کے درمیان خیال کرے۔ اس کی شکل وصورت کا تصور سالک کو وہی فائدہ دے گا جو اس کی صحبت دیتی ہے۔

میرے والد گرامی فرمایا کرتے تھے کہ سالک کے لئے ضروری ہے کہ جس ہیئت اور شکل پر اسے کچھ حاصل ہو، وہ ہیئت اور شکل تبدیل نہ کرے اگر وہ کھڑا ہے تو نہ بیٹھے اور اگر بیٹھا ہے تو کھڑا نہ ہو۔

مشائخ نقشبندیہ میں سے بعض حضرات سالک کو تلقین کرتے ہیں کہ اپنے دل پر اسم ذات اللہ سونے سے لکھا ہوا ہونے کا تصور باندھے۔

میرے والد گرامی فرمایا کرتے تھے کہ میں دس برس کا تھا کہ خواجہ محمد ہاشم رحمۃ اللہ علیہ بخاری نے مجھے اسم ذات لکھنے کا حکم فرمایا، چنانچہ میں نے کثرت سے اس کی مشق کی اور اپنے دل میں یہ کیفیت اس قدر جمالی کہ ایک دفعہ ایک کتاب لکھتے ہوئے چار ورق لفظ اللہ لکھ گیا اور مجھے اس کا کوئی احساس نہ ہوا۔

اسی طرح آپ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے خواجہ خورد رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا کہ آپ اپنے ہاتھ کے انگوٹھے سے چاروں انگلیوں پر برابر کچھ لکھتے رہتے تھے۔ مجلس میں بیٹھے ہوں، بات کر رہے

ہوں، غرض کوئی کام کر رہے ہوں، یہ عمل جاری رہتا تھا، میں نے اس کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے فرمایا، ابتدائے عمر میں میں نے اس کی اتنی مشق کی ہے کہ اب اسے چھوڑنا میرے بس میں نہیں رہا۔

مشائخ نقشبندیہ کے ہاں چند اصطلاحات ہیں جو ان کے طریقے اور سلسلے کی اساس ہیں، بعض اصطلاحات سے ان اشغال کی طرف اشارات ملتے ہیں اور بعض کو تاثیر کے لئے کچھ شرائط ہیں، ہم ذیل میں ان کا ذکر کرتے ہیں۔

۱۔ ہوش دردم، ۲۔ نظر برقدم، ۳۔ سفر در وطن، ۴۔ خلوت در انجمن، ۵۔ یاد کرد، ۶۔ بازگشت، ۷۔ نگہداشت، ۸۔ یادداشت

یہ آٹھ کلمات خواجہ عبدالخالق غجدوانی رحمتہ اللہ علیہ سے منقول ہیں، اور یہ تین اصطلاحات خواجہ نقشبندیہ رحمتہ اللہ علیہ سے مروی ہیں۔

۱۔ وقوف زمانی، ۲۔ وقوف قلبی، ۳۔ وقوف عددی۔

ہوش دردم سے مراد یہ ہے کہ ہر سانس پر ہوشیاری اور بیداری یعنی سالک ہر سانس پر ہمیشہ بیدار اور ہوشیار رہے اور فکر مند رہے کہ اس کا ہر سانس ذکر سے وابستہ ہے یا غفلت پر مبنی ہے۔ اس طرح وہ بتدریج دائمی حضوری کی منزل حاصل کرلے گا، اس طرح کی پابندی مبتدی کے لئے ضروری ہے۔ البتہ جب سالک درمیانی منزل تک آجائے تو وقفے وقفے سے گزرے ہوئے وقت کے سانسوں کا جائزہ لیتا رہے، یعنی کچھ دیر بعد وہ دیکھے کہ اس کا یہ وقت غفلت میں تو نہیں گزرا۔ اگر درمیان میں غفلت آئی ہے تو استغفار کرے اور آئندہ یہ غفلت نہ کرنے کا پختہ عزم کرے، اس نگرانی اور حفاظت سے بالآخر وہ دائمی حضوری کی منزل کو پہنچ جائے گا۔ یہ دوسرے طریق کی نگرانی اور ہوشیاری وقوف زمانی کہلاتی ہے اور اسے خواجہ نقشبند نے وضع کیا ہے۔ ان کے نزدیک اس بیداری اور نگرانی کو بار بار نگاہ رکھنا خود متوسط سالک کے لئے پریشان خاطری کا موجب ہے، سالک کے لئے اصل بات توجہ الی اللہ میں استغراق ہے۔ اسے استغراق میں توجہ یا عدم توجہ کا علم رکھنے کی پابندی بجائے خود اصل سے توجہ ہٹانے کا باعث ہے۔

نظر برقدم سے مراد یہ ہے کہ سالک کے لئے ضروری ہے کہ وہ چلتے وقت اپنے قدموں کے

علاوہ کسی چیز کو نہ دیکھے، اسی طرح بیٹھتے وقت وہ صرف اپنے سامنے دیکھے۔ مختلف شکلوں اور تعجب آمیز رنگوں کو دیکھنا سالک کی باطنی کیفیت میں بگاڑ پیدا کرتا ہے اور اسے اس چیز سے پھیر دیتا ہے جس کی طلب میں وہ ہے، اسی طرح لوگوں کی باتیں سننے یا ان کے ساتھ زیادہ گفتگو کرنے کا نتیجہ بھی یہی ہے۔

میرے والد گرامی فرمایا کرتے تھے کہ نظر نیچی رکھنا مبتدی کے لئے ہے، رہا راہ طریقت کا منتہی طالب، اس کے لئے واجب ہے کہ وہ اپنے حال میں غور وفکر کرے اور دیکھے کہ وہ کس نبی کے قدم پر ہے، اس لئے کہ بعض اولیا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قدم پر ہوتے ہیں اور انہیں کمالات کی جامعیت حاصل ہوتی ہے اور بعض موسیٰ علیہ السلام کے قدم پر ہوتے ہیں علی ہذا القیاس، پھر جب سالک منتہی اپنے پیشوا اور متبوع کو پہچان لے تو اسے چاہئے کہ اپنے احوال، واقعات اور افعال اپنے پیشوا کے احوال و واقعات کے مطابق ڈھالے۔

سفر در وطن سے مراد یہ ہے کہ بشری صفات خسیسہ سے صفات ملکیہ فاضلہ کی طرف پرواز کی جائے، سالک پر فرض ہے کہ وہ برابر اپنے نفس پر نگاہ رکھے اگر اسے ابھی تک نفس میں مخلوق کی محبت کا شائبہ نظر آئے تو از سر نو توبہ کرے اور سمجھے کہ یہ میرا بت ہے پھر لا الہ الا اللہ کہہ کر اس چیز کی محبت کا خیال مٹا دے اور اس کی جگہ دل میں محبت الٰہی جاگزیں کر دے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دل کے اندرونی حصے میں محبت کی بہت سی رگیں ہیں، انہیں انتہائی باریک بینی اور تجسس کے بغیر تلاش کرنا اور نکالنا ممکن نہیں ہے۔ سالک کے لئے ضروری ہے کہ بغور دل کا جائزہ لے کہ کہیں اس میں کسی کے لئے حسد، کینہ یا کوئی اور نفرت تو موجود نہیں ہے؟ اگر ایسا ہے تو اسے ذکر کے اس کلمے پر مداومت کی مدد سے نکال پھینکے۔

خلوت در انجمن سے مراد یہ ہے کہ اپنے تمام احوال میں دل کو حق تعالیٰ سے شاغل رکھے۔ درس و تدریس ہو یا گفتگو، کھانے پینے کی صورت ہو یا چلنے کی، سالک اپنے باطن میں ایسا ملکہ پیدا کرے کہ وہ ان امور کے دوران متوجہ الی الحق رہے۔ خواجہ نقشبند قدس سرہ کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں اسی طرف اشارہ ہے۔

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ

سچ تو یہ ہے کہ فقیر کی وضع قطع بنانا اور ہر وقت ذکر کی کیفیت میں رہنا بعض اوقات ریا اور دکھاوے کی طرف لے جاتا ہے، بہتر یہ ہے کہ وضع قطع اور لباس عام لوگوں کا سا ہو مگر تقویٰ، دیانت اور عبادات وطاعات میں ہمت وکوشش فقرا کی ہو اور دل ہمیشہ حق تعالیٰ سے لو لگائے رکھے۔ خواجہ علی رامیتنی رحمۃ اللہ علیہ نے فارسی شعر میں یہی مفہوم کیا خوب ادا کیا ہے۔

از دروں شو آشنا واز بروں بیگانہ وش

ایں چنیں زیبا روش کم می بود اندر جہاں

(اندر سے آشنائی اور باہر سے بیگانگی، دنیا میں اس سے خوبصورت طریقہ اور کوئی نہیں)

''یاد کرد سے مراد یہ ہے کہ سالک مسلسل ذکر میں مشغول رہے چاہے ذکر نفی واثبات کی صورت ہو یا اثبات مجرد کی صورت میں'' اس کی تفصیلات گزر چکی ہیں۔

''بازگشت'' سے مراد یہ ہے کہ دوران ذکر ہر دفعہ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد تین دفعہ یا چار دفعہ مناجات کرے، یعنی دل کی گہرائی اور حضور سے دعا کرے، اے میرے رب! تو ہی میرا مقصود ہے میں نے دنیا وآخرت تیرے لئے چھوڑی ہے تو مجھے اپنی کامل نعمتیں نصیب فرما اور اپنے وصال سے شادکام کر، میرے والد گرامی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ''سالک کے لئے یہ دعا بمنزلہ شرط عظیم کے ہے لہٰذا اس کے لئے مناسب نہیں کہ وہ اس سے غفلت کرے ہمیں جو کچھ ملا ہے یا ہم نے جو کچھ پایا ہے اسی کی برکت سے پایا ہے''۔

''نگہداشت'' سے مراد یہ ہے کہ سالک نفس کے خطرات اور وسوسوں سے نجات حاصل کرے، یعنی وہ ہر وقت بیدار رہے اور دل میں کسی خیال وخطر کو راہ نہ دے، خواجہ نقشبند رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ خیال وخدشات کے آتے ہی سالک انہیں فوراً ذہن سے نکال پھینکے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر یہ چیزیں کچھ دیر کے لئے رہ گئیں تو نفس ان کی طرف مائل ہو جائے گا اور یہ چیزیں اپنے اثرات پیدا کر لیں گی اور پھر ان کا زائل کرنا مشکل ہوگا۔ چنانچہ نگہداشت کے ذریعہ سالک اپنے دل ودماغ کو خطرات وخدشات کے گزر اور وہم ووساوس سے بچا سکتا ہے۔

''یادداشت'' سے مراد یہ ہے کہ الفاظ وتخیلات سے خالی ہو کر حقیقت واجب الوجود کی طرف توجہ مبذول کرے۔ سچ بات یہ ہے کہ اس منزل پر فنائے تام اور بقائے کامل کے بغیر

استقامت حاصل نہیں ہوتی، اللہ تعالیٰ یہ مقام نصیب فرمائے۔

''وقوف زمانی'' کی تشریح ہم ''ہوش دردم'' کے ضمن میں بیان کر آئے ہیں۔

''وقوف عددی'' سے مراد یہ ہے کہ سالک ذکر میں طاق عدد کی پابندی کرے۔ اس کا بیان بھی پہلے گزر چکا ہے۔

وقوف قلبی سے مراد یہ ہے کہ سالک اس (حسی) قلب کی طرف توجہ رکھے، جو بائیں جانب چھاتی کے نیچے ودیعت کیا گیا ہے۔ اس توجہ کی حکمت تقریباً وہی ہے جو مشائخ قادریہ کے ہاں ذکر میں مختلف صورتوں کی ضربوں میں ہے۔

مشائخ نقشبندیہ کے کچھ اور عجیب تصرفات ہیں مثلاً کسی خاص مقصد کے لئے باطنی قوت اور ہمت کو مبذول کرنا، اب اس مقصد کا حصول باطنی قوت اور ہمت کے اندازے سے ہوتا ہے۔ طالب راہ میں تاثیر پیدا کرنا، مریض سے بیماری دفع کرنا، گنہگار کو توبہ پر آمادہ کر لینا، لوگوں کے دلوں کو اس طرح پھیر لینا کہ وہ تعظیم و تکریم کرنے لگیں، اسی طرح ان کے خیالات میں تصرف کرنا، یہاں تک کہ بڑے بڑے واقعات متمثل ہو کر سامنے آ جائیں۔ زندہ اور وصال کر جانے والے اولیاء اللہ کی نسبتوں پر مطلع ہو جانا، لوگوں کے دلوں میں جو خیالات، خطرات رونما ہو رہے ہیں اور ان کے سینوں میں جو تلاطم موجود ہے اس سے باخبر ہو جانا، آنے والے واقعات کا ان پر کھل جانا، نازل ہونے والی مصیبتوں کو دفع کرنا وغیرہ، ہم ذیل میں چند چیزیں بیان کرتے ہیں۔

مشائخ نقشبندیہ کے اکابر، جو فنا فی اللہ اور بقا باللہ کے مقام پر فائز تھے، تصرفات کے سلسلے میں عجیب شان کے مالک تھے۔ البتہ طالب کے اندر تاثیر پیدا کرنے کے سلسلے میں بعد والے تمام مشائخ نقشبندیہ کا طریقہ یہ ہے کہ مرشد سالک کے نفس ناطقہ کی طرف متوجہ ہو کر اپنی مضبوط باطنی قوت کے ساتھ اس سے ٹکرائے اور پھر جمعیت خاطر کے ساتھ اپنی نسبت میں ڈوب جائے، یہ تصرف اس کے بعد ہوگا کہ مرشد کا نفس مشائخ کی نسبتوں میں سے کون سی نسبت کا حامل ہے اور اسے اس نسبت کا ملکہ راسخہ حاصل ہو، یعنی یہ نسبت ہر وقت اس کے قابو میں ہو۔ پھر مرشد کی نسبت طالب کی طرف اس کی لیاقت اور استعداد کے مطابق منتقل ہوگی۔ بعض نقشبندی بزرگ اس توجہ کے ساتھ ذکر اور طالب کے دل پر ضرب لگانے کو بھی شامل کر دیتے ہیں اگر طالب سامنے موجود نہ

ہوتو اس کی صورت کا تصور کر کے توجہ دیتے ہیں۔

ہمت خاطر: ہمت خاطر سے مراد یہ ہے کہ سالک اپنی مراد حاصل کرنے اور آرزو کو پانے کے لئے اپنی باطنی قوت اور پختہ ارادہ اس طرح قائم کر لے کہ اس مقصود اور مراد کے حصول کی جدوجہد کے سوا اس کے دل میں کوئی خیال بھی نہیں آئے، یہ خیال اور ارادے کی پختگی اور یکسوئی اس طرح ہو جیسے پیاسے پر صرف پانی ہی کی دھن سوار ہوتی ہے۔

مجھے بعض انتہائی ثقہ اور قابل اعتماد مشائخ نے بتایا ہے کہ بعض بزرگ ذکر نفی و اثبات کے دوران یہ مراد لیتے ہیں کہ درپیش مصیبت کو ٹالنے والا اور رزق دینے والا اور کوئی نہیں سوائے اللہ کے وہی اس فعل کا فاعل حقیقی ہے۔

دفع مرض: دفع مرض یعنی بیماری کے دفع کرنے کی صورت یہ ہے کہ صاحب نسبت اپنے آپ کو مریض خیال کرے اور سمجھے کہ یہ مرض مجھے ہے، اس پر اپنی باطنی ہمت اور توجہ مرکوز کرے۔ اس کے سوا دل میں اور کوئی خیال نہ آنے دے۔ پس یہ بیماری اسی کی طرف منتقل ہو جائے گی، یہ قدرت الٰہی کا عجیب وغریب کرشمہ ہے۔

افاضہ توبہ: افاضہ توبہ (توبہ کی توفیق پیدا کر دینے کا عمل) کا طریقہ یہ ہے کہ صاحب نسبت اپنے آپ کو وہ گنہگار خیال کرے (جسے توبہ کرانا چاہتا ہے) اور پھر اس میں ایسی تاثیر کرے، گویا اس کی ذات اور اس گنہگار کی ذات سے مل جائے اور دونوں ذاتوں میں اتصال ہو جائے اس کے بعد دوبارہ یہ عمل شروع کرے، گنہ اور معصیت سے نادم ہو اور اللہ تعالیٰ سے استغفار کرے، چنانچہ وہ گنہگار جلدی توبہ کر لے گا۔

تصرف قلب: لوگوں کے دلوں میں اس طرح تصرف کرنا کہ وہ محبت کرنے لگیں یا ان کے دماغوں میں ایسا تصرف کرنا کہ ان میں واقعات متمثل ہو جائیں، اس کا طریقہ یہ ہے کہ اپنی باطنی قوت اور توجہ کے مطابق شیخ، طالب کے نفس سے ٹکرا جائے اور اسے اپنے نفس سے متصل کر لے، پھر محبت یا واقعہ کی صورت کا تصور کرے اور دل کی گہرائی سے اس کی طرف توجہ کرے، چنانچہ جس کی طرف توجہ کرے گا اس پر اثر ہوگا، اس کے دل میں محبت پیدا ہو جائے گی اور واقعہ اس کے ذہن میں صورت اختیار کر لے گا۔

نسبتوں پر مطلع ہونا: اولیاء اللہ کی نسبتوں پر مطلع ہونے کا طریقہ یہ ہے کہ اگر وہ زندہ ہے تو اس کے سامنے اور اگر وہ صاحب مزار ہے تو اس کی قبر کے سامنے بیٹھ جائے۔ اپنی ذات کو ہر قسم کی نسبتوں سے خالی کر لے اور کچھ دیر کے لئے اپنی روح کو اس کی روح تک پہنچا دے، یہاں تک کہ اس کی روح اس کی روح سے متصل ہو اور مل جائے، پھر اپنی ذات کی طرف رجوع کرے، اب جو کیفیت اپنے اندر محسوس کرے، یہی اس بزرگ کی نسبت ہے۔

اشراف خواطر: اشراف خواطر یعنی دوسرے کے دل کی بات معلوم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اپنی ذات کو ہر بات اور پیدا ہونے والے خیال سے خالی کر لے اور اپنی ذات (نفس) کو اس کی ذات تک پہنچا دے، اب عکس یا پرتو کی صورت میں جو بھی بات اس کے دل پر کھٹکے، وہی دوسرے کے دل کی بات ہے۔

آئندہ پیش آنے والے واقعات کے کشف یعنی ان پر مطلع ہونے کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے دل کو آئندہ پیش آنے والے واقعے کے علم کے انتظار کے سوا ہر چیز سے خالی کر لے۔ جس وقت اس کا دل ہر خیال سے خالی ہو جائے۔ اور اس واقعے کے بارے میں انتظار اس مرتبہ پر آ جائے جیسے پیاسے کو صرف پانی ہی کا انتظار اور خیال ہوتا ہے، اپنی روح کو تھوڑے وقفے سے استعداد کے مطابق ملاء اعلیٰ یا ملاء اسفل کی طرف بلند کرنا شروع کر دے اور صرف اسی بات پر یکسو ہو جائے چنانچہ جلد اس پر سارا واقعہ کھل جائے گا، خواہ غیبی آواز سے ہو، خواہ بیداری کی حالت میں پورا واقعہ نظر آ جائے یا خواب میں سامنے آ جائے۔

مصیبت کو ٹالنا: نازل ہونے والی مصیبت کو دفع کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس مصیبت کو ایک خیالی شکل دے پھر اسے دفع کرنے اور اس سے مقابلہ کرنے کے لئے پوری قوت اور ہمت کا تصور کرے اور اپنے عزم و ارادے کو اس پر مرکوز کر دے اس کے بعد اپنی روح کو وقفے وقفے سے ملاء اعلیٰ یا ملاء سافل کی طرف بلند کرے اور اس معاملے میں یکسو ہو جائے عنقریب وہ مصیبت ٹل جائے گی۔

یہ اور ان سے ملتے جلتے تصرفات کی اصل شرط یہ ہے کہ تاثیر دینے والے اور جسے تاثیر دی جا رہی ہے، اسی طرح فیض پہنچانے والے اور جسے فیض پہنچایا جا رہا ہے کا نفس اور روح ایک

دوسرے سے مل جائیں، جو لوگ بدنی حجابات سے پاک ہو گئے ہیں وہ نفس کے اس اتصال اور ملاپ کو بخوبی جانتے ہیں اور اس اتصال اور ملاپ پر قدرت رکھتے ہیں۔

یہ تصرفات اور اشغال جو ہم نے ذکر کئے ہیں، وہ ہیں جنہیں میرے والد گرامی پسند کرتے تھے۔

لطائف ستہ: حضرت شیخ احمد سرہندی رحمتہ اللہ علیہ کے ہاں کچھ اور اشغال بھی ہیں، ہم اجمالا ان کا ذکر کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان میں چھ لطائف پیدا کئے ہیں، اپنی اپنی جگہ ان کے حقائق اور خواص جدا جدا ہیں۔ حضرت شیخ اور ان کے خلفا کے کلام سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ یا نفس ناطقہ کے اعتبارات اور اطراف ہیں، جنہیں ایک اعتبار سے قلب اور دوسرے اعتبار سے روح کہا جاتا ہے یہی نظریہ میرے والد گرامی نے بھی اپنایا اور پسند کیا اور مجھے ان لطائف کی صورت بنا کر سمجھائی۔ آپ نے ایک دائرہ کھینچا اور فرمایا کہ یہ دل ہے پھر اس دائرے کے اندر دوسرا دائرہ بنایا اور کہا کہ یہ روح ہے۔ یہاں تک کہ چھٹا دائرہ کھینچا اور فرمایا کہ یہ میں ہوں، یعنی یہ حقیقت انسانی ہے، پھر فرمایا کہ بعض لطائف بعض کے اندر ہیں وہ اس معاملے میں اس حدیث سے استدلال فرماتے تھے جو صوفیا کی زبانوں پر عام طور پر سنی جاتی ہے کہ بلاشبہ انسان کے جسم میں دل ہے اور دل میں روح ہے اسی طرف لطائف ستہ کے آخر تک بیان ہوا، مجھے اس حدیث کے الفاظ پوری طرح یاد نہیں۔

لطائف کے مقام: الغرض حضرت شیخ احمد سرہندی علیہ الرحمتہ کی بات کا خلاصہ یہ ہے کہ ان لطائف میں سے ہر لطیفے کو بدن کے کسی نہ کسی عضو سے تعلق اور ارتباط ہے، دل بائیں چھاتی کے نیچے دو انگل پر ہے، روح دائیں چھاتی کے نیچے دل کے برابر ہے۔ سر دائیں چھاتی کے اوپر سینے کے درمیان کی طرف جھکاؤ میں ہے، خفی بائیں چھاتی کے اوپر وسط کی طرف مائل ہے۔ اخفی خفی کے اوپر ہے۔ سر وسط میں ہے اور نفس کا مقام دماغ کے بطن اوّل میں ہے، ان اعضا میں سے ہر ایک میں نبض کی مانند حرکت ہے، چنانچہ حضرت شیخ اس حرکت کی حفاظت اور اسے اسم ذات کا ذکر خیال کرنے کا حکم دیتے ہیں اور نفی و اثبات کا حکم دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ سالک لفظ لا تمام لطائف پر پھیلا دے اور ''الا'' دل پر ضرب کرے۔

باب ۔ ۷

نسبت کی حقیقت

مشائخ کے تمام طریقوں کا ماحصل انسانی نفس کی تہذیب و آراستگی ہے، مشائخ اسے نسبت کا نام دیتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ سکون قلبی اور نور کی شکل میں اللہ جل شانہ سے انتساب اور ربط کی صورت ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ نسبت نفس ناطقہ میں ایک ایسی کیفیت اور حالت کا نام ہے جسے فرشتوں سے تشبیہ دی جاسکتی ہے یا عالم جبروت پر مطلع ہونے کا نام دے سکتے ہیں۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ سالک جب طاعات، طہارات اور اذکار پر مستقل مزاجی سے عمل پیرا ہوجاتا ہے تو اس کے نفس ناطقہ میں ایک صفت قائم ہوجاتی ہے اور توجہ کا ملکہ راسخہ پیدا ہوجاتا ہے یہ دونوں نسبت کی صورتیں ہیں اور ہر صورت کی کئی اقسام ہیں۔

اقسام نسبت: نسبت کی ان اقسام میں ایک عشق و محبت کی نسبت ہے اس سے دل کے اندر محبت کی صفت محکم اور راسخ ہوجاتی ہے اسی طرح ایک قسم نفس شکنی اور اس کے مرغوبات سے نجات حاصل کرلینا ہے، میرے والد گرامی علیہ الرحمہ اس نسبت کو نسبت اہل بیت کا نام دیتے تھے۔

نسبت کی ایک قسم نسبت مشاہدہ ہے اس سے مراد ذات مقدس کے مجرد بسیط ہونے کی توجہ کا ملکہ ہے، الغرض حضور مع اللہ کے معنی محبت کے حصول یا نفس شکنی، یا ان کے علاوہ ''یادداشت'' کے مطابق رنگ برنگ ہے، ان رنگوں میں سے کسی رنگ میں نفس کو ملکہ راسخہ حاصل ہوجاتا ہے۔ اس ملکہ کو نسبت کہا جاتا ہے۔ نسبتیں بے شمار ہیں، البتہ صاحب راز ہر نسبت کا علیحدہ علیحدہ ادراک حاصل کرلیتا ہے، اشغال و اوراد سے اصل مقصود نسبت کا حصول، اس پر قائم رہنا اور اس میں ڈوب جانا ہے، تاکہ اس طرح نفس ملکہ راسخہ حاصل کرلے۔

یہاں یہ وہم نہ ہو کہ نسبت ان اشغال کے بغیر حاصل نہیں ہوتی، حقیقت یہ ہے کہ یہ اشغال واوراد نسبت حاصل کرنے کے بہت سارے طریقوں میں سے ایک طریقہ ہیں۔ نسبت حاصل کرنے کا صرف یہی ایک طریقہ نہیں میری غالب رائے یہ ہے کہ صحابہ کرام اور تابعین کے ہاں سکینت یعنی نسبت حاصل کرنے کے دوسرے ذرائع تھے، مثلاً نماز کی پابندی، خلوت میں خشوع اور حضور کی پابندی کے ساتھ اللہ کی پاکی اور حمد کا ذکر، ہمہ وقت طہارت سے رہنا، موت کی یاد اور نفس کی پسندیدہ چیزوں کی مذمت، فرمانبرداروں کے لئے ثواب اور انعام اور گنہگاروں کے لئے عذاب کا ذکر، اس طرح انہیں جسمانی لذات اور خواہشات سے چھٹکارا حاصل ہو جاتا تھا۔

صحابہ کرام اور تابعین کے ہاں نسبت حاصل کرنے کے دوسرے ذرائع یہ تھے۔

قرآن مجید کی تلاوت پر ہمیشگی اور اس میں غور وفکر، نصیحت کرنے والے کی بات غور سے سننا، احادیث میں سے وہ حدیثیں بطور خاص سننا جن سے دل نرم ہوتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ صحابہ اور تابعین کو ان باتوں پر مسلسل عمل کرنے اور انہیں وظیفۂ حیات بنا لینے کی وجہ سے ملکہ راسخہ اور ہیئات نفسانیہ حاصل ہو گئی تھی، چنانچہ وہ زندگی بھر ان امور کو پابندی کے ساتھ ادا کرتے رہے۔ پھر یہی مقصود اور حقیقت آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بطریق وراثت ہمارے مشائخ کے طریقوں میں چلی آئی، ہر چند ان کے رنگ اپنے اپنے اور حصول نسبت کے طریقے جدا جدا ہیں۔

میرے والد گرامی رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے ایک طویل خواب میں ذکر فرمایا کرتے تھے جس میں انھوں نے حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ اور امام حسین رضی اللہ عنہ اور آپ کے والد گرامی سید الاولیا حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہ کو دیکھا تو حضرت علی مرتضٰی رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ حضور میری نسبت ویسی ہے یا وہی ہے جیسی آپ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں حاصل تھی۔ اس پر حضرت علی مرتضیٰؓ نے انہیں نسبت میں استغراق کا حکم فرمایا اور تھوڑی دیر کے بعد فرمایا ہاں ہاں دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

نسبت پر مداومت کرنے والے سالک کے حالات بلند اور درجہ بدرجہ ہوتے ہیں، لہٰذا سالک انہیں غنیمت جانے اور سمجھے کہ یہ عبادات وطاعات کے قبول ہونے اور نفس کے باطن اور دل کی گہرائیوں میں اثر انداز ہونے کی نشانیاں ہیں۔

ان احوال میں سے ایک اللہ تعالیٰ کی اطاعت کو تمام چیزوں پر مقدم رکھنا اور اس پر غیرت کرنا ہے، امام مالکؒ نے موطا میں حضرت عبداللہ بن ابوبکر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ حضرت ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ اپنے باغ میں نماز پڑھ رہے تھے، آپ نے دیکھا کہ ایک خوش رنگ چڑیا ادھر ادھر اڑ رہی ہے اور درختوں کے جھکے ہوئے جھنڈ سے باہر نکلنے کا راستہ تلاش کر رہی ہے۔ اس دل ربا منظر نے تھوڑی دیر کے لئے حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کی توجہ کھینچ لی اور آپ کو یہ احساس نہ رہا کہ کتنی رکعات ادا ہو چکی ہیں اور کس قدر باقی ہیں۔ آگاہی ہونے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور کہا یا رسول اللہ میرا باغ میرے لئے فتنہ ثابت ہوا ہے، میری طرف سے یہ صدقہ ہے، جہاں مرضی آئے اسے خرچ کریں۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کا مشہور قصہ جس میں قرآن مجید کی اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔

فَطَفِقَ مَسۡحًا بِالسُّوۡقِ وَالۡاَعۡنَاقِ

''تو ان کی پنڈلیوں اور گردنوں پر ہاتھ پھرنے لگا'' (ص:۳۳)

اسی قبیل سے ہے۔

ذکر کردہ بلند تر احوال میں سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا خوف بدن اور جوارح پر ظاہر ہو چنانچہ حفاظ حدیث نے یہ حدیث روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سات شخصوں (سات قسم کے لوگوں) کو قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اپنے سایہ رحمت میں رکھے گا، ان میں سے ایک وہ ہوگا جس نے خلوت میں اللہ کو یاد کیا اور اس کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو گئیں، اسی طرح حدیث میں آیا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ایک قبر پر کھڑے تھے اور روتے روتے آپ کی داڑھی تر ہو گئی۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کیفیت یہ تھی کہ قیام شب (یعنی تہجد کے نوافل) میں آپ کے سینہ مبارک سے اس طرح جوش کی آواز سنائی دیتی تھی جس طرح ہانڈی سے آتی ہے۔

منجملہ بلند مدارج اور احوال سے سچے خواب ہیں۔ حفاظ حدیث نے روایت بیان کی ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، صالح آدمی کا اچھا خواب نبوت کے چھیالیس حصوں میں

سے ایک حصہ ہے اور آپ نے فرمایا کہ میرے بعد نبوت کی کوئی چیز باقی نہیں رہے گی، سوائے مبشرات کے صحابہ نے پوچھا مبشرات کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا وہ اچھا خواب جو نیک شخص دیکھے یا اس کے لئے کوئی دوسرا شخص ایسا خواب دیکھے جو نبوت کے چھیالیس حصوں میں سے ایک حصہ ہے، چنانچہ درج ذیل آیت کی ایک تفسیر یہ بھی منقول ہوئی ہے کہ بشارت دنیوی سے مراد سچا خواب ہے۔

لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا

''انہیں خوش خبری ہے دنیا کی زندگی میں'' (یونس: ۶۴)

رویائے صالحہ سے مراد خواب میں آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت ہے یا جنت ودوزخ دیکھنا، انبیا علیہم السلام اور اولیا اللہ کی زیارت، اس طرح متبرک زیارت گاہوں کو دیکھنا مثلاً بیت اللہ، مسجد نبوی، مسجد بیت المقدس، یا آئندہ رونما ہونے والے واقعات کہ پھر وہ اسی طرح وقوع پذیر ہوں جیسے انہیں دیکھا یا گزرے ہوئے واقعات کا دیکھنا یا انوار اور پاکیزہ چیزوں کا دیکھنا مثلاً دودھ پینا، شہد اور گھی کا استعمال کرنا بھی رویائے صالحہ کے ضمن میں آتے ہیں، تفصیلات رویا کی کتابوں میں مذکور ہیں اسی طرح خواب میں فرشتوں کو دیکھنا حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص رات کے وقت قرآن مجید کی تلاوت کر رہا تھا کہ اس پر اچانک ایک سائبان تن گیا جس میں چراغ نصب تھے۔

بلند احوال میں سے ایک فراست صادقہ ہے یعنی دل میں واقعے کا بعینہٖ متمثل ہو جانا۔ حدیث میں آیا ہے کہ مومن کی فراست سے ڈرو، وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔

احوال ومقام کی رفعت کی ایک اور صورت دعا کی قبولیت اور اس چیز کا ظہور ہے، جسے وہ اپنی باطنی ہمت کی مدد سے بارگاہ الٰہی سے طلب کر رہا ہے، غالباً اس حدیث میں اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

''بعض ایسے غبار آلود، پریشان مو اور پھٹے پرانے کپڑوں والے لوگ ہیں، جنہیں کوئی خاطر میں نہیں لاتا لیکن اگر وہ اللہ کے سہارے پر قسم کھا بیٹھیں تو اللہ تعالیٰ ان کی قسم کو سچا کر دیتا ہے''۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ اور اس قسم کے دوسرے احوال، سالک کے ایمان کی پختگی، اس کی طاعات قبول ہونے کی نشانی اور اس کے باطن میں نور الٰہی سرایت کر جانے کی علامات ہیں، لہٰذا سالک ایسے احوال و منازل کو غنیمت جانے۔

فنا فی اللہ، بقا باللہ: حصول نسبت کے بعد دوسری بلند منزل فنا فی اللہ اور بقا باللہ کی ہے، مگر اس سلسلے میں صحیح بات یہ ہے کہ مشائخ کی متصل سند کے ذریعے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی بات منقول نہیں ہوئی، یہ خداداد نعمت ہے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے بغیر کسی ذریعے اور سلسلے کے جسے چاہتا ہے عطا کر دیتا ہے، اس کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت خواجہ نقشبند رضی اللہ عنہ سے کسی نے ان کے مشائخ کے سلسلے سے متعلق پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ کوئی شخص بھی اللہ تک اپنے سلسلے کے ذریعے نہیں پہنچا، پھر فرمایا، مجھے توفیق ایزدی سے کشش ربانی نے اپنی طرف کھینچا اور یوں میں بھی اللہ تک پہنچ گیا، اس کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جس میں فرمایا گیا کہ اللہ کی طرف سے ایک کشش کی عنایت، جنات اور انسانوں کے عمل کے برابر ہے، اس کے باوصف حضرت خواجہ نقشبندؒ کا سلسلہ مشہور و معروف ہے جو شخص فنا اور بقا کی بلند منزل کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنا چاہے، اسے ہماری دوسری کتابیں پڑھنی چاہیں، اللہ تعالیٰ ہی ہمارا رہنما ہے۔

باب۔۸

مجرب خاندانی عملیات

برائے غنائے قلبی وظاہری: میرے والد گرامی نے مجھے وصیت فرمائی کہ ہر روز گیارہ سو دفعہ یا مغنی اور چالیس مرتبہ سورہ مزمل پابندی کے ساتھ پڑھنا غنائے قلبی اور ظاہری دونوں کے لئے مجرب ہے۔

اسی طرح آپ نے پابندی کے ساتھ ہر روز درود پڑھنے کی وصیت فرمائی اور فرمایا ہم نے جو پایا درود ہی کی بدولت پایا۔

برائے درد دنداں، درد سر وغیرہ: والد گرامی فرمایا کرتے تھے کہ جب بھی کوئی درد سر یا درد دانت کی شکایت لے کر آئے یا کسی کو ریاح ستا رہے ہوں تو ایک تختی پر پاک ریت ڈال کر اس پر کسی کیل وغیرہ سے ابجد، ہوز، حطی لکھے، پھر نوک دار کیل لے کر الف پر زور سے داب دے اور سورہ فاتحہ پڑھے، دوسری طرف درد والا آدمی اپنی انگلی درد کے مقام پر زور سے دبا کر رکھے اور اس سے پوچھے کہ آرام ہو گیا یا نہیں، اگر آرام ہو گیا تو بہتر، ورنہ کیل حرف ب پر رکھے دوبارہ فاتحہ اور اس سے پوچھے، اگر آرام نہیں ہوا تو اسے ج پر رکھے اور تین دفعہ فاتحہ پڑھے۔ الغرض جب تک مریض کو آرام نہ آئے کیل اگلے حرف پر رکھتا رہے اور فاتحہ پڑھتا جائے۔ آخری حرف تک جانے کی نوبت نہیں آئے گی کہ اللہ کے فضل سے مریض صحت یاب ہو جائے گا۔

برائے دفع حاجت، واپسی غائب اور شفائے مریض: والد گرامی فرماتے تھے کہ اگر کسی شخص کو کوئی مسئلہ پیش آ جائے یا کوئی غائب ہو جائے اور ہم چاہتے ہوں کہ وہ صحیح وسالم کامیابی، کامرانی کے ساتھ واپس آ جائے یا کوئی بیمار ہو اور اس کی شفایابی چاہتے ہوں تو فجر کی سنتوں اور فرضوں کے

درمیان اکتالیس بار سورۂ فاتحہ پڑھی جائے۔

برائے خوف جنون وگزیدن سگ دیوانہ: والدگرامی سے میں نے سنا انھوں نے فرمایا کہ اگر کسی کو باؤلا کتا کاٹ لے یا کسی شخص کے دیوانہ ہوجانے کا خوف ہوتو اسے چالیس دنوں تک ہر روز روٹی کے ایک ٹکڑے پر یہ آیت لکھ کر کھلاتا رہے۔

اِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ كَيْدًا وَّاَكِيْدُ كَيْدًا فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا

فاقہ سے نجات کے لئے: والدگرامی فرماتے تھے کہ جو شخص ہر رات سورۂ واقعہ کی تلاوت معمول بنالے وہ فاقہ سے محفوظ رہے گا۔اسی طرح آپ نے فرمایا جو شخص سوتے وقت سورۂ کہف کی یہ آیت پڑھے اور اللہ سے دعا کرے کہ مجھے رات کے فلاں حصے میں بیداری ہوجائے، ٹھیک اسی وقت اللہ تعالیٰ اسے بیدار کردے گا، آیات یہ ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا. خٰلِدِيْنَ فِيْهَا لَا يَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا. قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا. قُلْ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰى اِلَيَّ اَنَّمَا اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖ اَحَدًا (کہف:۱۰۷۔۱۱۰)

برائے حفاظت اطفال: والدگرامی فرماتے ہیں کہ جو شخص یہ تعویذ لکھ کر بچے کے گلے میں ڈالے گا، اللہ تعالیٰ اس بچے کی حفاظت کرے گا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّةِ مِنْ شَرِّ كُلِّ شَيْطَانٍ وَّهَامَّةٍ وَّعَيْنٍ لَّامَّةٍ تَحَصَّنْتُ بِحِصْنِ اَلْفِ اَلْفِ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ.

برائے امان از ہر آفت: والدگرامی کا ارشاد ہے کہ یہ دعا ہر آفت اور مصیبت سے امان اور پناہ ہے اسے صبح وشام پڑھا جائے۔

بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُمَّ اَنْتَ رَبِّيْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ عَلَيْكَ تَوَكَّلْتُ وَاَنْتَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ مَاشَاءَ اللّٰهُ كَانَ وَمَالَمْ يَشَآءُ لَمْ

يَكُنْ اَشْهَدُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَئٍ قَدِيْرٌ وَاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَئٍ عِلْمًا وَاَحْصٰى كُلَّ شَئٍ عَدَدًا اَللّٰهُمَّ اِنِّىْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّ نَفْسِىْ وَمِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ اَنْتَ اٰخِذٌ بِنَاصِيَتِهَا اِنَّ رَبِّىْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ وَاَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَئٍ حَفِيْظٌ اِنَّ وَلِيِّيَ اللّٰهُ الَّذِىْ نَزَّلَ الْكِتٰبَ وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ.

برائے خوف حاکم: والد گرامی نے فرمایا جس شخص کو کسی حاکم یا آفیسر کا خوف ہے، اسے چاہئے کہ کہے، كٓهٰيٰعٓصٓ كُفِيْتُ حٰمٓعٓسٓقٓ حُمِيْتُ ہر لفظ کا پہلا حرف بولے، اور ہر حرف کے ساتھ دائیں ہاتھ کی ایک ایک انگلی بند کرتا جائے۔ اسی طرح دوسرے لفظ کے ہر ہر حرف کے ساتھ بائیں ہاتھ کی ایک ایک انگلی بند کرتا جائے، پھر اس افسر یا حاکم کے سامنے انہیں کھول دے۔

آیات شفا برائے مریض: والد گرامی فرماتے تھے کہ قرآن مجید کی چھ آیات ہیں جنہیں آیات شفا کہا جاتا ہے، انہیں کسی برتن میں لکھے اور پانی سے دھو کر مریض کو پلائے، وہ آیات یہ ہیں۔

وَيَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ وَّشِفَآءٌ لِّمَا فِى الصُّدُوْرِ يَخْرُجُ مِنْ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَآءٌ.

برائے دفع سحر وحفاظت از وزدان وغیرہ: میں نے والد گرامی سے سنا انھوں نے فرمایا کہ قرآن مجید کی ۳۳ آیتیں ہیں جو جادو وغیرہ کے اثر کو زائل کرتی ہیں، چوروں، درندوں، اور شیطان سے محفوظ رکھتی ہیں، وہ آیات یہ ہیں۔

الٓمّٓ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَا اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ لَهٗ مَا فِى

السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَا يَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓئُهُمُ الطَّاغُوْتُ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ. اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍ بِاَمْرِهٖ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ. قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا. وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا فَالتّٰلِيٰتِ ذِكْرًا اِنَّ اِلٰهَكُمْ لَوَاحِدٌ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا

بَيْنَهُمَا وَرَبُّ الْمَشَارِقِ اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ نِ الْكَوَاكِبِ وَ حِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ لَا يَسَّمَّعُوْنَ اِلَى الْمَلَاِ الْاَعْلٰى وَيُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ دُحُوْرًا وَّلَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ فَاسْتَفْتِهِمْ اَهُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمْ مَّنْ خَلَقْنَا اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ وَّنُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرٰنِ. لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ. قُلْ اُوْحِيَ اِلَيَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا يَّهْدِيْٓ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا وَّاَنَّهٗ تَعٰلٰى جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَّلَا وَلَدًا وَّاَنَّهٗ كَانَ يَقُوْلُ سَفِيْهُنَا عَلَى اللّٰهِ شَطَطًا.

برائے امان از چیچک: والد گرامی فرماتے تھے کہ چیچک کی بیماری پھوٹ پڑے تو ایک نیلا تاگا لے کر اس پر سورہ الرحمٰن پڑھے۔ اور ہر دفعہ "فبای آلاء ربکما تکذبان" پر پہنچ تو تاگے کو گرہ دیتا جائے، سورہ مکمل ہو تو تاگے کو پھونک مارے اور بچے کے گلے میں ڈال دے، اللہ تعالیٰ اسے اس مرض سے محفوظ رکھے گا۔

برائے امان از غرق، آتش، از غارت گری، چوری وغیرہ: میں نے اپنے والد گرامی علیہ الرحمتہ سے سنا آپ نے فرمایا کہ اصحاب کہف کے نام پانی میں ڈوبنے، آگ میں جلنے، چوری اور ڈکیتی سے محفوظ رہنے کے لئے امان ہیں، یہ نام یہ ہیں۔ یملیخا، مکسلمینا، کشفوطط اذر فطیونس، کشا فطیونس، تبیونس، بوانس، بوس اوران کا کتا قطمیر۔

برائے حل مشکل: اسی طرح آپ نے فرمایا کہ جس شخص کو کوئی اہم مسئلہ درپیش آجائے، وہ

بارہ روز تک ہر دن بارہ سو دفعہ یابدیع العجائب بالخیر یابدیع پڑھے، اس کا مسئلہ حل ہو جائے گا اس فصل میں جن عملیات کا بیان ہوا ہے یہ وہ ہیں جن کی حضرت والد علیہ الرحمتہ نے دوسرے اعمال کے ساتھ مجھے اجازت عطا فرمائی۔

برائے نماز قضائے حاجت: مشکل حاجات کے پورا ہونے کے لئے چار رکعت نماز ادا کی جائے، پہلی رکعت میں فاتحہ کے بعد سو دفعہ یہ آیات پڑھے۔

لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّىْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ وَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ وَكَذٰلِكَ نُنْجِى الْمُؤْمِنِيْنَ

دوسری رکعت میں یہ آیت سو دفعہ پڑھے۔

رَبَّهٗٓ اَنِّىْ مَسَّنِىَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ

تیسری رکعت میں سو دفعہ یہ آیت پڑھے۔

وَاُفَوِّضُ اَمْرِىْٓ اِلَى اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ بَصِيْرٌ بِالْعِبَادِ

چوتھی رکعت میں سو دفعہ یہ آیت پڑھے۔

قَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ اس کے بعد سلام پھیرے اور سو دفعہ یہ آیت پڑھے

رَبِّ اِنِّىْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ

برائے رفع آسیب: اگر کسی کو آسیب کا خلل ہو تو اس کے بائیں کان میں سات بار یہ آیت پڑھے۔

وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمٰنَ وَاَلْقَيْنَا عَلٰى كُرْسِيِّهٖ جَسَدًا ثُمَّ اَنَابَ

اسی طرح اس کے کان میں سات دفعہ اذان کہے، سورہ فاتحہ، قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس، آیتہ الکرسی، سورہ والسماء والطارق، سورہ حشر کی آخری آیات اور سورہ والصفت پڑھے، آسیب جل جائے گا اس کے علاوہ آسیب کے لئے آسیب زدہ کے کان میں سورہ مومنون کی یہ آیتیں پڑھے۔

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ لَا بُرْهَانَ

لَهٗ بِهٖ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ وَ قُلْ رَّبِّ اغْفِرْ وَ ارْحَمْ وَ اَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ

اسی طرح آسیب زدہ کے لئے یہ عمل ہے کہ پاک پانی پر سورۂ فاتحہ، آیۃ الکرسی اور سورۂ جن کی درج ذیل پانچ آیتیں پڑھ کر دم کرے اور مریض کے چہرے پر اس کے چھینٹے مارے مریض ہوش میں آ جائے گا۔ اسی طرح اگر کسی مکان میں جن ہو تو اس کے اطراف میں اس پانی کے چھینٹے مارے جن دوبارہ وہاں نہیں آئے گا۔ وہ آیات یہ ہیں۔

قُلْ اُوْحِيَ اِلَيَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا يَّهْدِيْٓ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا وَّاَنَّهٗ تَعٰلٰى جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَّلَا وَلَدًا وَّاَنَّهٗ كَانَ يَقُوْلُ سَفِيْهُنَا عَلَى اللّٰهِ شَطَطًا وَّاَنَّا ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ تَقُوْلَ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا.

جنات سے حفاظت کے لئے: اگر جنات گھر کے قریب ہوں یا گھر میں پتھر پھینکتے ہوں تو لوہے کی چار میخوں پر پچیس پچیس بار یہ آیت پڑھے اور انہیں گھر کے چاروں کونوں میں ٹھونک دے آیت یہ ہے۔

اِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ كَيْدًا وَّاَكِيْدُ كَيْدًا فَمَهِّلِ الْكَافِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا

اسی طرح گھر کی دیواروں پر اصحاب کہف کے نام لکھنا بھی جنات و آسیب کو بھگانے کے لئے مفید ہیں۔

بانجھ پن کے لئے: بانجھ عورت کے لئے ہرن کی کھال کی جھلی پر زعفران اور گلاب کے پانی سے یہ آیت لکھ کر اس کے گلے میں ڈالے، آیت یہ ہے۔

وَلَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ اَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْاَرْضُ اَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتٰى بَلْ لِّلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِيْعًا

اسی طرح بانجھ پن کے لئے یہ عمل ہے کہ چالیس عدد لونگوں پر سات سات بار یہ آیت پڑھے اور ہر روز ایک لونگ عقیمہ عورت کو کھلائے عورت ایام مخصوصہ سے پاک ہونے کے فوراً بعد لونگ شروع کرے اور اس دوران مرد وظیفہ زوجیت بھی ادا کرے۔

آیت یہ ہے:

اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِىْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ اِذَآ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ.

برائے اسقاط جنین: جس عورت کا حمل سالم نہ رہتا ہو اور بچہ ساقط ہو جاتا ہو، اس کے لئے ایک کسم رنگ کا تاگا عورت کے قد کے برابر لے اور اس پر نو گرہیں لگائیں، ہر گرہ پر

وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِىْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ

اور سورہ قل یا ایہا الکافرون پڑھ کر پھونک مارتا جائے تاگا وہ عورت کمر میں باندھے۔

برائے درد زہ: جو عورت کو درد زہ ہو اس کے چھٹکارے کے لئے یہ آیت اور دعا کاغذ پر لکھے اور اس کا تعویذ بنا کر درد زہ والی عورت کی بائیں ران میں باندھے، خدا کے فضل سے جلد بچہ جنے گی، آیت اور دعا یہ ہے۔

وَاَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَتَخَلَّتْ وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ اِهْيًا اَشْرَاهِيًّا

میں نے درمنثور میں حضرت اعمش کی یہ روایت پڑھی تھی جس میں انھوں نے فرمایا کہ اِهْيًا اَشْرَاهِيًّا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا ہے، اس کا معنی یہ کہ اے زندہ قبل ہر چیز کے اور زندہ بعد ہر چیز کے۔

برائے فرزند نرینہ: جس عورت کے ہاں صرف بچیاں پیدا ہوتی ہوں، اس کے لئے حمل پر تین مہینے گزرنے سے پہلے ہرن کی جھلی پر زعفران اور گلاب کے پانی سے یہ آیات لکھے اور تعویذ بنا کر اس کے گلے میں ڈالے آیات یہ ہیں۔

اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى وَمَا تَغِيْضُ الْاَرْحَامُ وَمَا تَزْدَادُ وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْكَبِيْرُ الْمُتَعَالِ يَا زَكَرِيَّا اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلَامٍ اِسْمُهٗ يَحْيٰى لَمْ نَجْعَلْ لَهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا پھر یہ لکھے بِحَقِّ وَمَرْيَمَ اِبْنًا صَالِحًا طَوِيْلَ الْعُمْرِ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ وَّآلِهٖ.

جس کا لڑکا زندہ نہ رہتا ہو: مجھے ایک انتہائی بااعتماد اور معتبر شخص نے بتایا کہ جس عورت کا لڑکا زندہ نہ رہتا ہو، اس کے لئے اجوائن اور کالی مرچ پر سوموار کے روز دوپہر کے وقت چالیس بار سورۃ والشمس پڑھے، ہر دفعہ درود پاک سے شروع کرے اور اسی پر ختم کرے۔ آغاز حمل سے لے کر بچے کے دودھ چھڑانے تک ہر روز یہ عورت دونوں چیزیں کھاتی رہے۔

برائے فرزند نرینہ: جس عورت کے ہاں صرف بچیاں ہوتی ہوں، اس کے لئے ایک اور عمل یہ ہے کہ اس کے پیٹ پر انگلی کے اشارے سے ستر دفعہ گول لکیر کھینچے اور ہر دفعہ دائرہ بناتے وقت یا متین کہتا جائے۔

ہم دوبارہ اپنے ابتدائی کلام کی طرف رجوع کرتے ہیں والد گرامی رحمۃ اللہ علیہ نے مجھے جن اعمال کی اجازت عطا فرمائی ان میں نظر لگنے کا عمل ہے۔

نظر کا علاج: اگر بچے کو کسی عورت کی نظر لگ جائے تو چھری سے ایک گول لکیر کھینچے اور یہ آیات پڑھتا جائے۔

وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا وَيُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ وَيَمْحُوا اللّٰهُ الْبَاطِلَ وَيُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهٖ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ.

پھر پڑھے

اَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ مِنْ شَرِّ كُلِّ شَيْطَانٍ وَّهَامَّةٍ وَّعَيْنِ الْاَمَةِ يَا حَفِيْظُ يَا رَقِيْبُ يَا وَكِيْلُ يَا كَفِيْلُ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ.

اس کے بعد چھری دائرے کے اندر درمیان میں گاڑھے اور کہے کہ میں نے یہ چھری نظر لگانے والی کے دل میں ٹھونک دی ہے پھر اس دائرے کو کسی رکابی وغیرہ سے ڈھانک دے۔

سحر یا نظر سے بچاؤ: سحر یا نظر لگنے سے حفاظت کے لئے ایک عمل یہ ہے کہ بدنظری کرنے والے یا سحر کرنے والے شخص کو سامنے یا جس وقت اپنے طور پر اس کا ذکر کرے نام لے کر کہے او فلانے! اس سے اس شخص کو عمل بے اثر ہو جائے گا۔

اسی طرح نظر سے بچنے کا ایک عمل یہ ہے کہ جس وقت اس بات کی تحقیق اور تصدیق ہو جائے کہ مریض کو نظر لگی ہے اور یہ بھی تصدیق ہو جائے کہ فلاں شخص کو نظر لگی ہے تو نظر لگانے والے کا چہرہ، دونوں ہاتھ، دونوں پاؤں اور ناف سے گھٹنوں تک کا درمیانی حصہ پانی سے دھلوالیا جائے اور جسے نظر لگی ہے اس پر یہ پانی چھڑ کے مریض فوراً تندرست ہو جائے گا۔

میں عرض کرتا ہوں کہ امام مالک رحمتہ اللہ علیہ نے موطا میں جو روایت کی ہے اس کے مطابق نظر لگانے والے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قریب قریب یہی حکم ہے۔

نظر کے اثر سے نجات حاصل کرنے کا ایک طریقہ اور عمل یہ ہے کہ پاک تاگا تین ہاتھ لمبا ناپ کر نظر زدہ مریض کے پاس رکھ لے اور مریض پر درج ذیل عزیمت پڑھے، پھر تاگا ناپے، اگر وہ تین ہاتھ سے بڑھ جائے یا کم پڑ جائے تو سمجھ لے کہ مریض کو نظر کا اثر ہے، یہ عمل تین بار دہرانے سے نظر کا اثر ختم ہو جائے گا، عزیمت سے پہلے بِسْمِ اللّٰهِ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ تین مرتبہ اور سورہ فاتحہ تین دفعہ پڑھے عزیمت یہ ہے۔

عَزَمْتُ اِلَيْكَ اَيَّتُهَا الْعَيْنُ الَّتِيْ فِيْ یہاں مریض اور اس کی ماں کا نام لے بِعِزِّ عِزِّ اللّٰهِ وَبِنُوْرِ عَظَمَةِ وَجْهِ اللّٰهِ بِمَا جَرٰى بِهِ الْقَلَمُ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ اِلٰى خَيْرِ خَلْقِ اللّٰهِ مُحَمَّدِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَزَمْتُ عَلَيْكَ اَيَّتُهَا الْعَيْنُ الَّتِيْ فِيْ فُلَانِ ابْنِ فُلَانَةِ بِحَقِّ اَشْرَاهِيًّا بَرَاهِيًّا اَذُوْنِيًّا اَصْبَاْتُ اِلٰ شَذَاىَ عَزَمْتُ عَلَيْكَ اَيَّتُهَا الْعَيْنُ الَّتِيْ فِيْ فُلَانِ بْنِ فُلَانَةِ بِحَقِّ شَهَتْ بَهَتْ اِنْتَهَتْ يَا قَنْطَاعُ النَّجَا بِالَّذِيْ لَا يَقْوٰى عَلَيْهِ اَرْضٌ وَلَا سَمَآءٌ اخْرُجِيْ يَا نَفْسَ السُّوْءِ مِنْ فُلَانِ بْنِ فُلَانَةِ كَمَا اُخْرِجَ يُوْسُفُ مِنَ الْمَضِيْقِ وَجُعِلَ لِمُوْسٰى فِي الْبَحْرِ طَرِيْقٌ وَاِلَّا فَاَنْتِ بَرِئَيَةٌ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى وَاللّٰهُ تَعَالٰى بَرِيٌّ مِنْكِ اُخْرِجِيْ يَا نَفْسَ السُّوْءِ مِنْ فُلَانِ بْنِ فُلَانَةِ بِاَلْفِ اَلْفِ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اَللّٰهُ الصَّمَدُ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ اُخْرِجِيْ يَا نَفْسَ السُّوْءِ بِاَلْفِ اَلْفِ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ فَاللّٰهُ خَيْرٌ حَافِظًا وَّهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ حَسْبُنَا اللّٰهُ

وَنِعْمَ الْوَكِيلُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّآلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَسَلَّمَ.

سحر زدہ اور مایوس العلاج کے لئے: جس پر جادو کا اثر یا جس شخص کی بیماری سے اطبا عاجز آ چکے ہوں، اس کے لئے چالیس دن ہر روز چینی کی سفید طشتری پر یہ نقش لکھے اور اسے پاک پانی سے دھو کر مریض کو پلاتا رہے۔ میرے والد گرامی اس نقش پر سورہ فاتحہ کا اضافہ فرمایا کرتے تھے، نقش کے الفاظ یہ ہیں۔ یَا حَیُّ حِیْنَ لَا حَیُّ فِیْ دَیْمُوْمَۃِ مُلْکِہٖ وَبَقَآئِہٖ یَا حَیُّ۔

گم شدہ چیز کی واپسی کے لئے: جس کی کوئی چیز کھو جائے وہ بغیر کسی کمی اور زیادتی کے پورے ایک سو انیس بار یا حفیظ اور ایک سو انیس بار یہ آیت پڑھے۔

یٰبُنَیَّ اِنَّهَآ اِنْ تَکُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَکُنْ فِیْ صَخْرَةٍ اَوْ فِی السَّمٰوٰتِ اَوْ فِی الْاَرْضِ یَاْتِ بِهَا اللّٰهُ.

اللہ تعالیٰ اس کی گم شدہ چیز واپس کرا دے گا۔

چور کی شناخت: چور کی پہچان کے لئے دو آدمیوں کو آمنے سامنے بٹھا کر انہیں ایک بدھنا تھما دیا جائے جسے وہ اپنی کلمے کی دونوں انگلیوں سے پکڑ لیں، مشکوک شخص کا نام کاغذ پر لکھ کر اسے بدھنے میں ڈال دے من المکرمین تک سورہ یٰسین پڑھے۔ اگر وہی شخص چور ہوگا تو بدھنا گھوم جائے گا، اگر نہ گھومے تو دوسرے آدمی کا نام اس میں ڈال کر پھر یہی عمل دہرایا جائے۔ اسی طرح تمام مشکوک آدمیوں کا نام ڈالتا جائے اور من المکرمین تک سورۂ یٰسین پڑھتا جائے چور کا نام سامنے آ جائے گا۔

بھاگے ہوئے شخص کو واپس لانے کا عمل: اگر کوئی غلام (کوئی شخص) گھر سے بھاگ جائے تو درج ذیل آیات اور دعا کاغذ پر لکھ اس کا تعویذ بنائے اور ایک اندھیری کوٹھری میں اسے دو پتھروں (دو سخت اور وزنی چیزوں) کے درمیان رکھ دے۔ آیات میں فاتحہ اور آیۃ الکرسی لکھے اور یہ دعا لکھے۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ بِاَنَّ لَکَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَنْ فِیْهِنَّ فَاجْعَلِ اللّٰهُمَّ السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا فِیْهَا عَلٰی عَبْدِکَ فُلَانِ بْنِ فُلَانَةِ (یہاں بھاگے ہوئے شخص کا نام

لکھیں)

اَضِيقَ مِنْ خَلْقِهِ حَتّٰى يَرْجِعَ اِلٰى مَوْلَاهُ بِرَحْمَتِكَ يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ

اس کے بعد یہ آیت لکھے۔

اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ اِذَآ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ وَّاللّٰهُ مِنْ وَّرَآئِهِمْ مُّحِيْطٌ بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ.

اس کے بعد یہ دعا پڑھے۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْئَلُكَ بِحَقِّ هٰذِهِ الْاٰيَاتِ اَنْ تُصَلِّيَ عَلٰى نَبِيِّكَ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَسَلَّمَ وَاَنْ تَرُدَّ الْعَبْدَ اِلٰى مَوْلَاهُ بِرَحْمَتِكَ يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ.

حاجت برآری کا عمل: اگر چاہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی مراد پوری کر دے تو اتوار کے دن سے فاتحہ کا ورد اس طرح شروع کرے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے میم کو الحمد اللہ کے لام سے ملا کر پڑھے، یہ ورد فجر کی سنتوں اور فرضوں کے درمیان پہلے روز ستر بار دوسرے روز اسی وقت اسی طرح ساٹھ بار تیسرے دن پچاس بار پڑھے ہر روز دس کم کرتا جائے یہاں تک کہ ہفتے کے دن دس بار پڑھ کر عمل مکمل کر لے۔

استخارہ: اگر چاہے کہ خواب میں اسے اپنے مشکل مسئلے سے نجات یا اس کے حل کی کوئی صورت نظر آئے تو وضو کرے اور پاک کپڑے پہن کر قبلہ رو ہو کر داہنی کروٹ پر لیٹ جائے اور سورہ والشمس سات دفعہ، سورۂ واللیل سات دفعہ اور قل ھو اللہ سات دفعہ پڑھے۔ ایک روایت میں قل ھو اللہ کی بجائے سورہ والتین کا سات دفعہ پڑھنا آیا ہے پھر دعا کرے کہ بار الٰہ مجھے خواب میں اپنی حاجت کے حل یا اپنے مشکل مسئلے سے چھٹکارے کی سبیل کی طرف رہنمائی کر اور مجھے خواب میں اپنی دعا کے قبول ہو جانے کی کوئی علامت دکھا۔ اگر مقصد پورا ہو تو یہی بہتر ورنہ دوسری رات یہ عمل دہرائے، الغرض ساتویں رات سے پہلے پہلے سارا مسئلہ کھل جائے گا ہمارے کئی احباب اس کا تجربہ کر چکے ہیں۔

برائے تپ: جسے تپ چڑھتا ہو اس کے لئے یہ تعویذ کاغذ پر لکھ کر اس کے بازو میں باندھے انشاء اللہ جلد شفایاب ہوگا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ اِلٰى اُمِّ مِلْدَمٍ (تپ کی کنیت) اَلَّتِيْ تَاْكُلُ اللَّحْمَ وَتَشْرَبُ الدَّمَ وَتَهْشِمُ الْعَظْمَ اَمَّا بَعْدُ يَا اُمَّ مِلْدَمٍ اِنْ كُنْتِ مُؤْمِنَةً فَبِحَقِّ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاِنْ كُنْتِ يَهُوْدِيَّةً فَبِحَقِّ مُوْسٰى الْكَلِيْمِ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَاِنْ كُنْتِ نَصْرَانِيَّةً فَبِحَقِّ الْمَسِيْحِ عِيْسٰى ابْنِ مَرْيَمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ اَنْ لَّا اَكَلْتِ (مریض اور ان کی ماں کا نام) لَحْماً وَّلَا شَرِبْتِ لَهٗ دَمًا وَّلَا هَشَمْتِ لَهٗ عَظْمًا وَّتَحَوَّلِيْ عَنْهُ اِلٰى مَنِ اتَّخَذَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا آخَرَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ وَاِلَّا فَاَنْتِ بَرِيْئَةٌ مِّنَ اللّٰهِ تَعَالٰى وَاللّٰهُ تَعَالٰى بَرِيٌّ مِّنْكِ وَحَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّآلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَسَلَّمَ.

برائے خنازیر: جس کے گلے میں خنازیر ہوں اس کے لئے چمڑے کا تسمہ مریض کے قد کے برابر لے اور اس پر اکتالیس گرہ لگائے، ہر گرہ لگاتے وقت یہ دعا پڑھ کر پھونک مارتا جائے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اَعُوْذُ بِعِزَّةِ اللّٰهِ وَقُدْرَةِ اللّٰهِ وَقُوَّةِ اللّٰهِ وَعَظْمَةِ اللّٰهِ وَبُرْهَانِ اللّٰهِ وَسُلْطَانِ اللّٰهِ وَكَنَفِ اللّٰهِ وَجِوَارِ اللّٰهِ وَاَمَانِ اللّٰهِ وَحِرْزِ اللّٰهِ وَصُنْعِ اللّٰهِ وَكِبْرِيَآءِ اللّٰهِ وَنَظَرِ اللّٰهِ وَبَهَآءِ اللّٰهِ وَجَلَالِ اللّٰهِ وَكَمَالِ اللّٰهِ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ مِنْ شَرِّ مَا اَجِدُ.

برائے سرخ بادہ: جس کے بدن پر سرخ بادہ ظاہر ہو وہ درج ذیل دعا سات بار پڑھے اور ہر بار چھری سے اس کی طرف اشارہ کرتا جائے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ وَّبَارِكْ وَسَلِّمْ بِسْمِ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ الْكَرِيْمِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ رَبِّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ بِعِزَّةِ اللّٰهِ وَقُدْرَتِهٖ وَسُلْطَانِهٖ اَيَّتُهَا الْحُمْرَةُ جَآءَتْكِ جُنُوْدٌ مِّنَ السَّمَآءِ وَقَالَ سُلَيْمَانُ اَيَّتُهَا الرِّيْحُ اَجِيْبِيْ دَاعِيَ اللّٰهِ وَمَنْ لَّمْ يُجِبْ دَاعِيَ اللّٰهِ فَمَا لَهٗ مِنْ مَّلْجَاءٍ وَمَالَهٗ مِنْ

ظَهِيْرٍ بِسْمِ اللّٰهِ وَبِالثَّنَآءِ الطَّيِّبِ عَلَى اللّٰهِ اَللّٰهُ يَكْفِيْكَ وَاللّٰهُ يَشْفِيْكَ مِنْ كُلِّ دَآءٍ يُّؤْذِيْكَ وَمِنْ كُلِّ اٰفَةٍ تَعْتَرِيْكَ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا بِرَحْمَتِكَ يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ.

برائے ضعف بصر: جس شخص کی بینائی کمزور ہو وہ ہر نماز کے بعد یہ آیت پڑھے، فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ۔

برائے مرگی: جو شخص مرگی کے مرض میں مبتلا ہو وہ اتوار کے دن صبح کے وقت تانبے کی تختی پر ایک طرف یہ کھدائے یا قهار انت الذی لا یطاق انتقامه اور دوسری طرف یہ کھدائے یا مذل کل جبار عنید بقهر عزیز سلطانه یا مذل اور اسے گلے میں ڈالے۔

باب۔۹

علمائے ربانی کے آداب وفرائض

ارشاد خداوندی ہے:

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَ لِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ

تو کیوں نہ ہوا کہ ان کے ہر گروہ میں سے ایک جماعت نکلے کہ دین کی سمجھ حاصل کریں اور واپس آ کر اپنی قوم کو ڈر سنائیں اس امید پر کہ وہ بچیں (التوبہ:۱۲۲)

عالم ربانی جو انبیاء ومرسلین کا جانشین (وارث) ہے وہ ان چند امور کا بطور خاص خیال رکھے۔ وہ تفسیر، حدیث، فقہ، سلوک، عقائد اور صرف ونحو کی تعلیم دے، علم کلام، اصول اور منطق کا ہو کر نہ رہ جائے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ.

وہی ہے جس نے ان پڑھوں میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا کہ ان پر اس کی آیتیں پڑھتے اور انہیں پاک کرتے ہیں اور انہیں کتاب اور حکمت کا علم عطا فرماتے ہیں۔ (الجمعہ:۲)

دوران تدریس استاد کے لئے چند چیزیں بہت ضروری ہیں۔ لغت کے اعتبار سے نادر الفاظ کی تشریح کرے، نحوی حیثیت سے مشکل اور مغلق جملوں کی وضاحت کرے، مسائل کی توجیہ وتوضیح جزوی مثالوں سے اس طرح کرے کہ ان کی صورت باندھ دے، دلائل اس طرح اٹھائے

کہ بعض مقدمات دوسرے مقدمات اور لوازمات سے مل کر خود بخود نتیجہ پیدا کرتے جائیں، کلی قاعدوں اور تعریفات کے درمیان قیود اور استثناؤں کے فوائد کی وضاحت کرے، مسائل کے ضمن میں مختلف تقسیموں میں حصر کی وجوہات بیان کرے، اسی طرح ظاہر شبہات حل کرے، مثلاً دو مختلف مسالک جو آپس میں خلط ملط نظر آتے ہیں، انہیں توجیہات، عبارات اور مسالک کے لحاظ سے واضح کرے اور جو چیزیں تعریفات میں ممتنع ہیں مثلاً استدراک اور خفی تر کا ذکر، انہیں کھول کر بیان کرے، جو چیزیں براہین میں ممتنع ہیں مثلاً جزوی ہونا کبریٰ کا سالبہ ہونا صغریٰ کا انہیں وضاحت سے پیش کرے۔

کوئی عالم دین اس وقت تک اپنے تلامذہ کو صحیح فائدہ نہیں پہنچا سکتا جب تک وہ مذکورہ امور کی وضاحت نہ کرے اور دوران تدریس جگہ جگہ انہیں آگاہ نہ کرتا رہے۔

اسی طرح ایک عالم ربانی کے فرائض میں شامل ہے کہ اپنے تلامذہ کی روحانی تربیت کے لئے انہیں اشغال کی تعلیم دے، اشغال کا تفصیلی ذکر ہم بیان کر آئے ہیں، اس مقصد کے لئے وہ ایک وقت مقرر کرے، جس میں لوگوں کے ساتھ مجلس میں بیٹھے، انہیں نسبت کی توجہ دے، اللہ تعالیٰ کی حجت، ممکنہ استطاعت ہی کے ذریعے پوری ہوتی ہے اس کے بعد استطاعت میسرہ کا نمبر آتا ہے استطاعت میسرہ میں صحبت، قول و فعل سے اشغال و اعمال پر ابھارنا اور دل پر تصرف کرنا شامل ہیں اللہ زیادہ بہتر جانتا ہے اور اللہ کے فرمان ویز کیھم سے اسی طرف اشارہ ہے۔

عالم ربانی کا فرض ہے کہ وہ وعظ و نصیحت سے ذریعے لوگوں کی زندگی میں تبدیلی لائے۔ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ارشاد فرماتا ہے۔ فذکر ان فعت الذکری تم نصیحت فرماؤ اگر نصیحت کام دے (الاعلیٰ:۹)

قصے کہانیوں سے اجتناب کرے، حدیث کی کتابوں میں روایت کی گئی ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد آپ کے صحابہ وعظ و نصیحت کے کام لیتے تھے۔

سنن ابن ماجہ میں ہمیں ایک روایت ملتی ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں قصہ گوئی نہیں تھی۔ روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ صحابہ کرام قصہ خوانوں کو مسجدوں سے نکلوا دیا کرتے تھے۔ ثابت ہوا کہ قصہ گوئی کا وعظ

ونصیحت سے کوئی تعلق نہیں، یہ ناپسندیدہ چیز ہے جبکہ وعظ ونصیحت محمود اور پسندیدہ عمل ہے۔

قصہ گوئی سے مراد یہ ہے کہ عجیب وغریب حکایتیں بیان کرے اور فضائل اعمال وغیرہ کے سلسلے میں غیر مصدقہ روایات کے ذریعے بے جا مبالغہ سے کام لے اور اس سے اس کا مقصد لوگوں کو بتدریج سنت پر عمل کرانا اور انہیں اس کا عادی بنانا نہیں، بلکہ نادر حکایات اور فصاحت و بلاغت سے محض زبان آوری، خود پسندی اور دوسرے لوگوں سے اپنے آپ کو ممتاز ثابت کرنا ہو۔

خلاصہ یہ کہ قصہ گوئی اور وعظ میں فرق کرنا ضروری ہے، ہم وعظ ونصیحت کے آداب اور فضائل میں آئندہ صفحات میں ایک مستقل باب سپرد قلم کر رہے ہیں۔

اسی طرح عالم حقانی کا فرض ہے کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دے مثلاً وضو اور نماز کے سلسلے میں لوگوں کو آگاہ کرے اگر کسی نے وضو میں پوری رعایت ملحوظ نہیں رکھی تو آواز دے ویل للاعقاب من النار، ایڑیوں کے لئے عذاب دوزخ ہے، اسی طرح اگر کوئی شخص نماز میں تعدیل ارکان نہیں کرتا تو اسے کہے نماز دوبارہ پڑھو، تم نے نماز نہیں پڑھی، لباس، گفتگو اور دوسرے امور کے بارے میں بھی لوگوں کو سمجھائے۔

ارشاد خداوندی ہے:

وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ.

''اور تم میں ایک ایسا گروہ ہونا چاہیے کہ بھلائی کی طرف بلائیں اور اچھی بات کا حکم دیں اور بری بات سے منع کریں اور یہی لوگ مراد کو پہنچے''۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ نرمی اور شفقت سے انجام دے، سختی اور ڈانٹ ڈپٹ امراء اور بادشاہوں کا طریقہ ہے۔

ارشاد خداوند ہے: وجادلهم بالتي هي احسن ''اور ان سے اس طریقہ پر بحث کرو جو سب سے بہتر ہو''۔ (النحل ۲۵)

علمائے ربانی کے آداب میں سے ہے کہ وہ امکانی حد تک طالب علموں اور درویشوں کی خبر گیری کریں۔ اگر وہ خود کسی وجہ سے یہ خدمت پوری طرح انجام نہ دے سکیں تو اپنے ہم مزاج

برادران طریقت کو ایسے لوگوں کی خبر گیری اوران کی ضروریات کا خیال رکھنے کی ترغیب دیں اوران میں اس کا جذبہ پیدا کریں۔

ہم نے اوپر جو صفات بیان کی ہیں یہ جس شخص میں موجود ہوں اس کے وارث الانبیاء والمرسلین ہونے میں کوئی شک نہیں کرنا چاہئے۔ بلاشبہ ایسا شخص ملکوت آسمانی میں صاحب عظمت ہے، مخلوق خدا اسے دعا دیتی ہے، یہاں تک کہ مچھلیاں پانی کے اندر اس کے لئے دعا کرتی ہیں جیسا کہ حدیث میں وارد ہوا ہے، خیال کرنا ایسے شخص کی صحبت غنیمت سمجھنا، اسے ہاتھ سے نہ جانے دینا بلاشبہ ایسے مرد خدا کی صحبت اکسیر اعظم ہے، واللہ اعلم۔

خیال رہے کہ جو شخص ہدایت اور دعوت الی اللہ کے منصب پر فائز ہو، اگر اس سے ذکر کردہ امور میں سے کسی امر میں کوتاہی ہو تو جب تک وہ اس کا ازالہ نہ کرلے، اس کی کوتاہی ہی سمجھی جائے گی۔

میں طالب حق کو چند باتوں کی وصیت کرتا ہوں ان میں سے پہلی یہ ہے کہ دولتمندوں اور امراء سے صحبت نہ رکھے، البتہ اگر کوئی طالب حق مخلوق خدا کو ان کے ظلم سے بچانے یا انہیں کار خیر پر آمادہ کرنے کے لئے ان سے تعلق رکھتا ہے تو اس کے لئے مضائقہ نہیں، اس سے بخوبی ذہن سے وہ خلجان دور ہو جاتا ہے، جس کے مطابق ایک طرف احادیث میں بادشاہوں کی مصاحبت کی مذمت کی گئی ہے دوسری طرف بعض انتہائی صاحب تقویٰ علما نے بادشاہوں کی صحبت اختیار کی ہے۔

میری دوسری وصیت یہ ہے کہ سالک راہ حقیقت نہ تو جاہل پیروں کی صحبت اختیار کرے اور نہ جاہل عبادت گزاروں کی۔ اسی طرح وہ نہ زاہد خشک فقہا کے قریب پھٹکے اور نہ صرف ظاہر پر عمل کرنے والے محدثین (ظاہریہ) کی پیروی کرے، علوم عقلی اور علم کلام میں غلو کرنے والے صاحبان کے پیچھے بھی نہ لگے۔ سالک راہ حقیقت کو چاہئے کہ وہ عالم صوفی ہو، دنیا سے بے رغبتی کرتے ہوئے ہر وقت متوجہ الی اللہ رہے، اس کی نگاہ بلند ہو، سنت نبوی پر عمل اس کا مطمح نظر ہو، احادیث نبوی اور سیرت صحابہ کا پیروکار ہو، احادیث اور آثار صحابہ کی تشریح و تعبیر کے سلسلے میں ایسے محقق فقہا پر اعتماد کرے جو عقلیات کی بجائے حدیث سے زیادہ شغف رکھتے ہوں، عقائد کے

سلسلے میں ان علما سے تعلق قائم کرے جو عقائد کی بنیاد حدیث پر رکھتے ہوں، البتہ اپنی بات کو موکد کرنے کے لئے عقلی دلائل پر بھی ان کی نگاہ ہو۔

اصحاب طریقت میں سے ان لوگوں کی اتباع کرے جو علم اور تصوف کے جامع ہوں، ایسے نہ ہوں جو اپنے نفس پر بے جا بوجھ ڈالتے ہیں یا سنت پر اضافہ کرتے ہیں، جو شخص ان صفات کا مل نہ ہو، سالک کو اس کی صحبت اختیار نہیں کرنی چاہئے۔

عالم ربانی کے آداب میں سے یہ ہے کہ فقہا کے مختلف مکاتب اور مسالک میں بعض کو بعض پر ترجیح دینے پر زور صرف نہ کرے، بلکہ مجموعی طور پر ان تمام فقہی مسالک کو مقبولیت کے درجے پر رکھے، البتہ خود اس پر عمل کرے جو صریح اور مشہور حدیث کے مطابق ہو، اگر فقہا کے دونوں مسلک احادیث سے استنباط واستدلال کے لحاظ سے برابر ہوں تو اسے اختیار ہے وہ جس مسلک پر چاہے عمل کرے، البتہ وہ تمام مسالک کو کسی تعصب کے بغیر ایک ہی مسلک سمجھے۔

عالم ربانی کی ایک صفت یہ ہونی چاہئے کہ وہ مشائخ صوفیا کے سلاسل میں سے کسی ایک سلسلے کو ترجیح نہ دے، اسی طرح مجذوب (مغلوب الحال) حضرات پر نکیر کرے اور نہ ان لوگوں سے الجھے جو مسئلہ سماع میں تاویل کرتے ہیں۔ البتہ خود اس راہ پر عمل کرے جو سنت سے ثابت ہے اور جس پر بلند مرتبہ اور محققین علما عمل پیرا رہے ہیں، حق تعالیٰ توفیق عطا کرنے والا اور مددگار ہے۔

باب ۔۱۰

آداب و مقاصد وعظ و نصیحت

اللہ تعالیٰ اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ارشاد فرماتا ہے۔

فَذَكِّرْ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ

''تو تم نصیحت سناؤ تم تو یہی نصیحت سنانے والے ہو'' (الغاشیہ:۲۱)

حضرت موسیٰ کلیم اللہ سے ارشاد ہوتا ہے۔

وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰمِ اللّٰهِ

''اور انہیں اللہ کے دن یاد دلا'' (ابراہیم:۵)

وعظ و نصیحت دین کا بڑا رکن ہے، ہم وعظ کے آداب، وعظ کی کیفیت اور خصوصیات اور وعظ و نصیحت سے اصلی غرض وغایت کے بارے میں کچھ بیان کرتے ہیں، نیز اس کی بھی وضاحت کرتے ہیں کہ وعظ و نصیحت کے دوران کس کس چیز سے مدد لی جائے، یعنی وعظ کا ماخذ کیا ہو، وعظ کن باتوں پر مشتمل ہو اور وعظ سننے والوں کے آداب کیا ہیں اور اس دور کے واعظین کو کون کون سی آزمائش پیش آتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے مدد کی درخواست ہے۔

واعظ کے لئے ضروری ہے کہ وہ عاقل، بالغ اور متقی ہو اور ان شرائط کا حامل ہو جو راویان حدیث کے لئے ضروری ہے، وہ محدث ہو، مفسر ہو اور مجموعی طور پر سلف صالحین کے حالات اور ان کی زندگیوں سے اچھی طرح باخبر ہو۔

اس کے محدث ہونے سے ہماری مراد یہ ہے کہ وہ حدیث کی کتابوں پر عبور رکھتا ہو، یعنی اس نے حدیث کے الفاظ پڑھے ہوں، اس کا معنی و مفہوم سمجھا ہو اور ان کی صحت و سقم کو اچھی طرح جانتا

ہوں چاہے اسے یہ علم کسی حافظ حدیث (محدث) کے ذریعہ حاصل ہوا ہو، چاہے کسی فقیہ کے استنباط سے۔ اس کے مفسر ہونے سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ واعظ قرآن مجید کی آیات مشکلہ کی توجیہ، تاویل اور اس کی تشریح کے سارے پہلوؤں سے آگاہی رکھتا ہو، نیز اسے سلف کے تفسیری کام سے پوری واقفیت ہو۔

اس کے ساتھ مناسب ہے کہ وہ فصیح اللسان ہو لوگوں کی ذہنی استعداد کے مطابق بات کرنے کا اسے ملکہ حاصل ہو وہ مہربان صاحب خلق اور صاحب وجاہت ہو۔ جہاں تک وعظ کا تعلق ہے بہتر ہے کہ اس میں مناسب وقفہ رکھے (یعنی خاص خیال رہے کہ لوگوں میں اکتاہٹ اور بددلی پیدا نہ ہو، لوگوں کی دلچسپی اور رغبت دیکھ کر وعظ کہے اور ابھی یہ رغبت اور دلچسپی موجود ہو کہ ختم کردے۔

وعظ و نصیحت کی محفل پاکیزہ اور صاف ستھری جگہ مثلاً مسجد (۱) میں منعقد کی جائے، گفتگو کا آغاز اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اور آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود و سلام سے کرے اور ختم بھی اسی پر کرے، تمام مسلمانوں بالخصوص حاضرین کے لئے خصوصی دعا کرے۔

وعظ صرف ترغیب و ترہیب (شوق دلانا اور ڈرانا) تک محدود نہ رکھے بلکہ ملا جلا انداز اپنائے، جیسے اللہ تعالیٰ کی سنت اور طریقہ ہے کہ وہ وعدے کے ساتھ وعید اور خوشخبری و بشارت کے ساتھ انداز یعنی خوف دلاتا ہے، واعظ کے لئے مناسب ہے کہ وہ آسانی اور نرمی دکھائے نہ کہ سختی اور تنگی، خطاب میں عمومی انداز اپنائے، کسی خاص گروہ، فرقے یا شخص کو نشانہ نہ بنائے، بات کا انداز یہ ہو کہ کچھ لوگ اس طرح کہتے یا کرتے ہیں۔

وعظ میں لغو اور اخلاق سے گری ہوئی بات سے اجتناب کرے، اچھی بات اور عمل کی تحسین کرے اور بری بات کی تحقیر کرے، نیکی کا حکم دے اور برائی سے منع کرے۔

وعظ و نصیحت کے اصل مقاصد حاصل کرنے کے لئے واعظ پہلے اپنے دل میں اعمال، اخلاق، کردار اور زبان پر قابو کے اعتبار سے ایک حقیقی مسلمان کا تصور قائم کرے، یہ تصور قائم کرتے وقت اس کے باطنی احوال اور ذکر و فکر کے ساتھ اس کی دلچسپی اور عمل کو بھی ساتھ ملائے۔

---

(۱) موجودہ زمانہ میں ہال اور کانفرنس روم وغیرہ میں

پھر اسی جامع اور مکمل انسان کو نشان راہ بنا کر آہستہ آہستہ سامعین کے فہم کے مطابق ان کے دلوں میں اسے ثابت اور راسخ کر دے۔ پہلے لباس، نماز اور شکل وصورت وغیرہ کے سلسلے، نیکی اور اچھائی کی خوبیاں اور غلطیاں اور گناہوں کی برائیاں بتائے، ان پر عمل پیرا ہو جائیں تو انہیں ذکر اذکار کی تلقین کرے، پھر جب ان کے اندر ذکر کا اثر معلوم ہونے لگے تو انہیں دل اور زبان پر قابو رکھنے کی مشق کرائے، ان کے صحیح نتائج حاصل کرنے اور دلوں میں اثرات پیدا کرنے کے لئے گزشتہ واقعات اور ایام اللہ کے تذکرے سے اعانت حاصل کرے اور لوگوں کو بتائے کہ سنت الٰہیہ کیا ہے؟ انفرادی اور اجتماعی طور پر کامیابی و ناکامی کے پیچھے قدرت کے کون سے عوامل کارفرما ہیں اور اس دنیا میں مختلف قوموں کی تباہی و بربادی کے اسباب کیا تھے۔

اس کے بعد لوگوں کو برائیوں سے بچانے اور بہتر زندگی اپنانے کے لئے موت، عذاب قبر، یوم حساب کی سختی اور عذاب دوزخ سے ڈرائے اور مختلف ترغیبات سے بھی کام لے جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں۔

وہ اپنے وعظ کی بنیاد مندرجہ ذیل چیزوں پر رکھے۔

قرآن مجید، جو کچھ اس کی ظاہری عبارت اور تفسیر سے واضح ہو رہا ہے وہ حدیث نبوی، جو محدثین کے ہاں معروف اور رائج ہے، صحابہ کرام، تابعین اور سلف صالحین کے اقوال اور آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت طیبہ۔

وعظ میں بے سروپا قصے بیان نہ کرے، صحابہ کرام نے ایسے قصے کہانیوں کو سخت ناپسند کیا ہے، بلکہ بعض دفعہ ایسے قصہ گویوں کو مار پیٹ کر مسجدوں سے بھی نکال دیا ہے، اس قسم کے قصے کہانیوں کا تعلق اکثر وبیشتر اسرائیلی روایات سے ہے، ان کے صحیح ہونے کے بارے میں کچھ علم نہیں، سیرت اور شان نزول کے ضمن میں اکثر ان کا بیان ہوا ہے۔

وعظ ترغیب (نیکیوں پر ابھارنا) ترہیب (برائی سے ڈرانا) واضح مثالوں، صحیح اور دل میں رقت پیدا کرنے والی حکایات اور نفع بخش نکات پر مشتمل ہونا چاہئے، یہی وعظ ونصیحت کا صحیح طریقہ ہے۔

وعظ میں جو مسائل بیان ہونے چاہیں ان کا تعلق یا تو حلال وحرام سے ہو، یا مشائخ، صوفیا

کے آداب سے، اسی طرح یا ان کا موضوع دعائیں ہو اور یا عقائد اسلام، اصل بات یہ ہے کہ واعظ جو مسئلہ بیان کرے، وہ اسے اچھی طرح جانتا ہو اور اسے اس کے سکھلانے اور تعلیم دینے کا فن بخوبی آتا ہو۔

وعظ کے سامعین کے آداب یہ ہیں کہ وہ واعظ کے سامنے بیٹھیں، کھیل تماشا نہ سمجھیں، شور نہ کریں، آپس میں گفتگو نہ کریں، ہر معاملے میں واعظ سے سوال نہ کریں، اگر کسی کے دل میں کوئی سوال اٹھتا ہے اور اس کا بیان ہونے والے مسئلے سے کوئی گہرا تعلق نہیں ہے یا مسئلہ اس قدر باریک ہے کہ عام لوگوں کی سمجھ سے بالا ہے تو سائل دوران وعظ خاموش رہے، البتہ علیحدگی میں چاہے تو پوچھ لے، اگر اس مسئلے کا بیان ہونے والے موضوع سے گہرا تعلق ہے مثلاً کسی اجمال کی تفصیل یا مشکل اور نادر بات کی تشریح مقصود ہے تو جس وقت واعظ اپنی گفتگو ختم کرے، آخر میں اس سے دریافت کرلے۔

واعظ کو چاہئے کہ وہ اپنی بات تین دفعہ دہرائے۔

اگر مجلس وعظ میں مختلف زبانیں بولنے والے لوگ موجود ہوں اور واعظ ان زبانوں پر قدرت رکھتا ہو تو انہیں ان کی زبانوں میں سمجھائے، واعظ کو چاہئے کہ وہ مشکل اور بہت مختصر یعنی اجمالی گفتگو سے پرہیز کرے۔

ہمارے زمانے کے واعظین کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ موضوع اور صحیح احادیث کے درمیان فرق سے بے خبر ہیں، بلکہ ان کے وعظ کا زیادہ تر حصہ موضوعات اور محرفات پر مشتمل ہوتا ہے، نمازوں اور دعاؤں کے سلسلے میں وہ جو کچھ بیان کرتے ہیں، محدثین کے نزدیک وہ بیشتر موضوعات (گھڑی ہوئی) پر مشتمل ہوتا ہے۔

اسی طرح وہ ترغیب وترہیب کے بیان میں مبالغہ کرتے ہیں، واقعات میں تو خاص طور پر مبالغہ آرائی ہوتی ہے، بالخصوص واقعہ کربلا اور واقعہ وفات وغیرہ۔

باب ۔ ۱۱

مصنف کے سلاسل طریقت

ہماری صحبت اور طریقت وسلوک حاصل کرنے کا سلسلہ صحیح اور متصل و مسلسل سند کے ذریعہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک ثابت ہے۔ درمیان میں کوئی واسطہ منقطع نہیں ہے، ہر چند طریقت کے مخصوص آداب واشغال کی شکلیں بعینہٖ آپ سے ثابت نہیں ہیں، اس بندہ ضعیف ولی اللہ (اللہ اس سے درگزر کرے اور اسے سلف صالحین کے ساتھ شامل کرے) نے ایک لمبا عرصہ اپنے والدگرامی شیخ اجل عبدالرحیم رضی اللہ عنہ کی صحبت حاصل کی، آپ سے علوم ظاہری اور آداب طریقت سیکھے، اور آپ کی کرامات دیکھیں، آپ سے مشکلات کے بارے میں پوچھا اور طریقت وحقیقت کے بے شمار فوائد حاصل کیے ہیں، نیز واردات، احوال اور کرامات، جو آپ کے مشائخ اور آپ سے صادر ہوئیں، دیکھیں اور سنیں، اللہ تعالیٰ میری طرف سے اور آپ کے مریدین ومعتقدین کی طرف سے والدگرامی کو جزائے خیر عطا کرے۔

والدگرامی بہت سارے مشائخ کی صحبت میں رہے، ان میں سے تین انتہائی جلیل القدر ہیں، پہلے خواجہ خوردؒ ہیں، انھوں نے حضرت شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ، شیخ الہ داد اور خواجہ حسام الدینؒ کی صحبت اٹھائی، جبکہ یہ تینوں حضرات خواجہ محمد باقی رحمۃ اللہ علیہ کے صحبت یافتہ تھے، دوسرے بزرگ سید عبداللہؒ آپ شیخ آدم بنوریؒ کے صحبت یافتہ تھے۔ وہ شیخ احمد سرہندیؒ کے خلیفہ اور آپ خواجہ محمد باقیؒ کے خلیفہ تھے۔ تیسرے بزرگ خلیفہ ابوالقاسمؒ ہیں، آپ ملا ولی محمدؒ کے فیض یافتہ اور امیر ابوالعلاءؒ کے صحبت یافتہ تھے۔

خواجہ محمد باقیؒ، خواجہ محمد امکنگیؒ کے صحبت یافتہ وہ اپنے والد مولانا درویشؒ کے، وہ مولانا محمد

زاہدؒ کے، وہ خواجہ عبید اللہ احرارؒ کے اور امیر ابوالعلاءؒ کے صحبت یافتہ تھے، امیر ابوالعلاؒ، امیر عبداللہؒ کے صحبت یافتہ، وہ امیر یحییٰ کے، وہ خواجہ عبدالحقؒ کے اور وہ خواجہ عبید اللہ احرارؒ کے صحبت یافتہ تھے۔

خواجہ عبید اللہ احرارؒ نے بہت سارے مشائخ کی صحبت اٹھائی، ان میں سے مولانا یعقوب چرخیؒ (چرخ غزنی کا نواحی گاؤں) اور خواجہ علاؤ الدین غجدوانیؒ نمایاں ہیں، یہ دونوں بزرگ بلا واسطہ خواجہ نقشبندؒ سے فیض یافتہ تھے۔ شیخ یعقوب چرخیؒ خواجہ علاؤ الدین عطارؒ کی صحبت میں بھی رہے، اسی طرح خواجہ علاؤ الدینؒ نے خواجہ محمد پارساؒ کی بھی صحبت اٹھائی، جبکہ یہ دونوں بزرگ خواجہ نقشبندؒ کے بڑے خلفا میں سے تھے۔

خواجہ نقشبندؒ (کمخاب باف آپ اور آپ کے والد یہی پیشہ کرتے تھے) نے بہت سے مشائخ کی صحبت پائی، ان میں بزرگ ترین خواجہ محمد بابا سماسیؒ اور ان کے خلیفہ امیر سید کلالؒ ہیں، خواجہ محمد بابا سماسیؒ، خواجہ علی الرامیتنیؒ کے صحبت یافتہ تھے، وہ خواجہ محمود ابوالخیر تعنویؒ (بخارا کا ایک گاؤں) کے وہ خواجہ عارف ریوکریؒ (بخارا کا ایک قصبہ) کے وہ خواجہ عبدالخالق غجدوانیؒ (بخارا کا ایک موضع) وہ خواجہ یوسف ہمدانیؒ کے اور وہ حضرت علی فارمدیؒ (طوس کا قصبہ) کے صحبت یافتہ تھے۔

حضرت علی فارمدی رحمۃ اللہ علیہ نے کئی مشائخ کی صحبت اٹھائی، ان میں دو نمایاں ترین ہیں، ایک امام ابوالقاسم قشیریؒ (قشیر قبیلہ کا نام ہے) وہ ابوعلی الدقاقؒ کی صحبت میں رہے، وہ ابوالقاسم نصیر آبادیؒ، وہ ابوالحسن الخضری رحمۃ اللہ علیہ، وہ حضرت شبلیؒ اور وہ سید الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ کی صحبت میں رہے، حضرت علی فارمدیؒ کے دوسرے شیخ خواجہ ابوالقاسم گرگانیؒ ہیں، ان کے مرشد ابوعثمان مغربیؒ، ان کے مرشد ابوعلی الکاتبؒ، ان کے مرشد ابوعلی رودباریؒ اور ان کے مرشد حضرت جنید بغدادیؒ ہیں۔

حضرت جنید بغدادیؒ اپنے ماموں سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ کے صحبت یافتہ تھے اور وہ معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ کے، حضرت معروف کرخی نے کئی مشائخ سے فیض حاصل کیا، ان میں دو انتہائی معتبر نام ہیں، پہلے امام علی بن موسیٰ رضا رحمۃ اللہ علیہ ہیں، آپ اپنے والد موسیٰ کاظم کے، وہ اپنے والد امام جعفر صادق رحمۃ اللہ کے وہ اپنے والد امام محمد باقرؒ کے، وہ اپنے والد امام زین العابدین کے، وہ اپنے والد امام حسینؓ کے، وہ اپنے والد امیر المومنین علی بن ابی طالب کے اور وہ سید المرسلین

صلی اللہ علیہ وسلم کے صحبت یافتہ تھے۔ معروف کرخیؒ کے دوسرے مرشد حضرت داؤد طائیؒ ہیں، داؤد طائیؒ، فضیل عیاضؒ، حبیب عجمی رحمتہ اللہ اور ذوالنون مصری رحمتہ اللہ علیہ کی صحبت میں رہے، یہ تینوں حضرات بہت سے تابعین اور تبع تابعین کی صحبت میں رہے، بالخصوص انھوں نے حضرت حسن بصریؒ کی صحبت اٹھائی۔ ان میں سے تابعین نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کئی اصحاب سے فیض حاصل کیا ان اصحاب میں سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم اور آپ کی احادیث کے حافظ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا نام نامی نمایاں ہے، یہ ہماری صحبت اور فیض کا سلسلہ ہے جس کے متصل اور صحیح ہونے میں ذرا شک نہیں۔

امام جعفر صادقؒ کو ایک دوسری نسبت اپنے نانا قاسم بن محمد بن ابوبکر صدیقؓ سے بھی ہے، یعنی امام جعفر صادقؒ کو نسبت ہے اپنے نانا حضرت قاسم بن محمدؒ سے، انہیں سلمان فارسیؓ سے، انہیں حضرت ابوبکر صدیقؓ سے اور انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نسبت ہے۔

ان کے علاوہ ہمارے اور سلاسل بھی ہیں، جن میں بعض صحبت کے سلسلے ہیں اور بعض بیعت اور خرقہ پوشی کے یہ سارے سلسلے ثابت اور متصل ہیں۔

بندۂ ضعیف ولی اللہ نے سلسلہ حاصل کیا، (طریقہ لیا) اپنے والد شیخ عبدالرحیمؒ سے، انھوں نے سید عبداللہؒ سے، انھوں نے شیخ آدمؒ سے، انھوں نے شیخ احمد سرہندیؒ سے، انھوں نے اپنے والد شیخ عبدالاحدؒ سے، انھوں نے شاہ کمالؒ سے، شیخ احمد سرہندیؒ کو شیخ سکندرؒ سے اور انہیں اپنے دادا شیخ کمال مذکورؒ سے بھی سلسلہ ملا۔ شیخ کمالؒ نے سید فضیلؒ سے، انھوں نے سید گدا رحمٰنؒ سے، انھوں نے سید شمس الدین عارفؒ سے انھوں نے سید گدا رحمٰن بن ابوالحسنؒ سے، انھوں نے شمس الدین صحرائیؒ سے، انھوں نے سید عقیلؒ سے، انھوں نے سید بہاء الدینؒ سے، انھوں نے سید عبدالوہابؒ سے انھوں نے سید شرف الدین قتالؒ سے، انھوں نے سید عبدالرزاقؒ سے، انھوں نے اپنے والد بانی سلسلہ الشیخ ابومحمد سید عبدالقادر جیلانیؒ سے، انھوں نے ابوسعید مخزومیؒ سے، انھوں نے ابوالحسن القرشیؒ سے، انھوں نے ابوالفرح طرطوسیؒ سے، انھوں نے ابوالفضل عبدالواحد التمیمیؒ سے، انھوں نے اپنے والد شیخ عبدالعزیز التمیمیؒ سے اور انھوں نے ابوبکر شبلی (رحمہم اللہ اجمعین) سے، طریقہ لیا اور نسبت حاصل کی، حضرت شبلی سے آگے سلسلے کی سند بیان ہو چکی ہے۔

اس کے علاوہ ہمارے مرشد شیخ عبدالرحیمؒ نے اپنا نانا شیخ رفیع الدین محمدؒ کی روح سے بھی آداب طریقت کی تکمیل کی۔ شیخ رفیع الدین محمدؒ نے والد گرامی کی پیدائش سے کئی سال پہلے بطور کرامت انہیں طریقت کی اجازت عطا کی۔ جبکہ انہیں اپنے والد قطب عالمؒ سے اور انہیں نجم الحق چاپلدہؒ سے اور انہیں شیخ عبدالعزیزؒ سے یہ اجازت ملی۔

والد گرامی شیخ عبدالرحیمؒ کے اور بھی کئی طرق اور واسطے ہیں۔ انہیں اجازت عطا کی سید عظمت اللہ اکبرآبادیؒ نے، انہیں اجازت عطا کی اپنے آباء واجداد نے، انہیں شیخ عبدالعزیزؒ نے، انہیں قاضی خاں یوسف الناصحیؒ نے، انہیں حسن بن طاہرؒ نے، انہیں سید راجی حامد شاہؒ نے، انہیں شیخ حسام الدین مالک پوریؒ نے، انہیں خواجہ نور قطب عالمؒ نے، انہیں اپنے والد علاء الحق بن اسعد لاہوری ثم بنگالیؒ نے، انہیں اخی سراج عثمان اودھیؒ نے، انہیں شیخ نظام الدین اولیاؒ نے، انہیں شیخ فریدالدین گنج شکرؒ نے، انہیں خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ نے، انہیں خواجہ معین الدین سجزیؒ نے، انہیں خواجہ عثمان ہارونیؒ نے، انہیں حاجی شریف الزندنیؒ نے، انہیں خواجہ مودود چشتیؒ نے، انہیں اپنے والد خواجہ یوسف بن محمد بن سمعان چشتیؒ نے، انہیں اپنے ماموں خواجہ محمد چشتیؒ نے، انہیں اپنے والد خواجہ ابواحمد چشتیؒ نے، انہیں خواجہ ابواسحاق شامیؒ نے، انہیں ممشاد علو الدینوریؒ نے، انہیں ابوھبیرۃ البصریؒ نے، انہیں حذیفہ المرعشیؒ نے، انہیں ابراہیم بن ادہمؒ نے، انہیں فضیل بن عیاضؒ نے، عبدالواحد بن زیدؒ نے، انہیں خواجہ حسن بصری (رحمہم اللہ اجمعین) نے، انہیں حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور انہیں سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اجازت عطا فرمائی۔

اسی طرح میرے والد گرامی نے باطنی طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آداب طریقت سیکھے اور وہ اس طرح کہ انھوں نے خواب میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی اور آپ سے بیعت ہوئے، آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں ذکر نفی واثبات کی تلقین فرمائی۔ میرے والد گرامی نے حضرت زکریا علیہ السلام سے بھی طریقت کی تعلیم حاصل کی، انھوں نے والد گرامی کو اسم ذات کی تعلیم دی۔

میرے والد گرامی نے ائمہ طریقت کی ارواح سے بھی فیض حاصل کیا، حضرت شیخ ابو محمد عبدالقادر الجیلانیؒ، خواجہ بہاء الدین محمد نقشبندؒ اور خواجہ معین الدین بن حسن چشتی (رحمۃ اللہ علیہ) کو

انھوں نے خواب میں دیکھا، ان سے اجازتیں حاصل کیں اور ان کے دل پر ان بزرگوں کی اپنی اپنی نسبتوں کا جو فیضان ہوا انھوں نے اسے اچھی طرح معلوم کیا اور جانا، والد گرامی یہ واقعہ ہمیں سنایا کرتے تھے۔

علوم ظاہرہ تفسیر، حدیث، فقہ، عقائد، نحو، صرف، کلام، اصول اور منطق وغیرہ میں نے اپنے والد رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھے، انھوں نے ابتدائی کتابیں اپنے بھائی ابوالرضا محمدؒ سے اور بڑی کتابیں امیر زاہد ہرویؒ سے پڑھیں۔ امیر زاہد ہرویؒ کے درسی کتابوں پر حواشی مشہور ہیں۔ انھوں نے مرزا فاضلؒ سے انھوں نے ملا یوسف کوسجؒ سے، انھوں نے مرزا جانؒ وغیرہ سے، انھوں نے علامہ تفتازانیؒ اور علامہ شریف جرجانی رحمۃ اللہ علیہ کے تلامذہ سے یہ علوم پڑھے۔

مشکوۃ المصابیح، صحیح بخاری اور باقی صحاح ستہ کی اجازت مجھے، معتمد اور ثقہ عالم حاجی محمد افضلؒ سے ملی، انہیں یہ اجازت شیخ عبدالاحدؒ سے انہیں اپنے والد شیخ محمد سعیدؒ سے اور انہیں اپنے جد امجد شیخ سلسلہ شیخ احمد سرہند رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل ہوئی۔ حضرت شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کی طویل سند اپنی جگہ مذکور ہے۔ جو کچھ ہم اس رسالے میں بیان کرنا چاہتے تھے یہ اس کا حرف آخر ہے اور اوّل و آخر، ظاہر و باطن اللہ تعالیٰ ہی تعریف وثنا کا حق دار ہے۔

انتباہ
فی سلاسل اولیاء اللہ

تصنیف

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ

ترجمہ

سید عبدالغنی جعفری کلیمی

تحقیق و تعلیق

مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی

فہرست مضامین

صفحہ	مضمون	نمبر شمار
۲۲۱	مقدمہ	۱
۲۲۴	پہلی فصل	۲
۲۴۰	اشغال نقشبندیہ	۳
۲۴۲	دوسری فصل	۴۔
۲۴۶	تیسری فصل	۵۔
۲۴۹	چوتھی فصل	۶۔
۲۵۴	پانچویں فصل	۷۔
۲۵۶	چھٹی فصل	۸۔
۲۵۸	ساتویں فصل	۹۔
۲۷۴	آٹھویں فصل	۱۰۔
۲۹۵	نویں فصل	۱۱۔
۳۰۰	دسویں فصل	۱۲۔
۳۰۵	گیارھویں فصل	۱۳۔

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱۴۔	بارہویں فصل	۳۰۷
۱۵۔	تسبیح کی سند	۳۰۹
۱۶۔	دلائل الخیرات کی سند	۳۱۰
۱۷۔	حضرت شاہ ولی اللہؒ کے اساتذہ ومشائخ حرمین کے مختصر حالات	۳۱۲
۱۸۔	شیخ احمد شناویؒ	۳۱۲
۱۹۔	شیخ احمد قشاشیؒ	۳۱۴
۲۰۔	سید عبدالرحمٰن ادریسی المحجوبؒ	۳۱۷
۲۱۔	شمس الدین محمد بن العلا بابلیؒ	۳۱۹
۲۲۔	شیخ عیسیٰ جعفری مغربیؒ	۳۲۰
۲۳۔	محمد بن محمد بن سلیمان مغربیؒ	۳۲۱
۲۴۔	شیخ ابراہیم کردیؒ	۳۲۲
۲۵۔	شیخ حسن عجمیؒ	۳۲۵
۲۶۔	شیخ احمد نخلیؒ	۳۲۸
۲۷۔	شیخ عبداللہؒ بن سالم البصری	۳۲۹
۲۸۔	شیخ ابوطاہر محمد بن ابراہیم کردی المدنیؒ	۳۳۱
۲۹۔	شیخ تاج الدین قلعی حنفیؒ	۳۳۵
۳۰۔	حضرت شاہ ولی اللہ کے خودنوشت حالات زندگی	۳۳۷

مقدمہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سب حمد و ثنا خدائے جل شانہ کو ہے جس نے اپنے نبی محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بشیر ونذیر کر کے بھیجا یعنی اس کے حکم سے مسلمانوں کو بشارت دینے والے اور کافروں کو ڈرانے اور ان کو سراج منیر یعنی چراغ روشن کیا پھر ان کے اصحاب کو فضیلت بخشی کہ وہ آنحضرت صلعمؐ کے دیدار مبارک سے مشرف ہوئے، اور ان کی حدیث شریف سنی اور صحبت سے فیضیاب ہوئے۔ صحابہ کے بعد تابعین کو فضیلت عطا کی کہ آنحضرت صلعمؐ کے علم ظاہر و باطن کی ان سے سند لی جاتی ہے اور ان کے ظاہر و باطن کا اتصال آنحضرت صلعمؐ سے ظاہر و مستحکم ہوا سو وہ اللہ تعالیٰ کی حجت ہیں، اس کے بندوں پر اور اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ ہیں، اس کی مخلوق ہیں، اور ہدایت کے امام اور تقویٰ کے پیشوا ہیں اور علم آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اگر روایت اور منقول نہ ہوتا اسناد سے اور اس فہم سے جو اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے بخشتا ہے تو کوئی اللہ تعالیٰ کی عبادت نہ کرتا اور کوئی ہدایت نہ پاتا۔ اور نہ کوئی بشر مقرب ہوتا۔ اللہ جل شانہ کا **وصلی اللہ علی افضل خلقہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین** ۔ اس کے بعد کہتا ہے۔ احمدؒ بن عبدالرحیم عمری دہلوی عرف ''ولی اللہ'' خدا اس کو اور اس کے مشائخ اور والدین کو اپنی رحمت عظمیٰ میں ڈھانک لیوے۔ یہ رسالہ(۱) ہے کہ اس کا نام انتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ واسانید وارثی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ تالیف کیا گیا واسطے تعریف ان سلسلوں مشہورہ کے جن سے یہ فقیر علم ظاہر و باطن میں سند رکھتا ہے، خدا اس تالیف کو خالص لوجہ اللہ کرے اور مجھے اور اور لوگوں کو اس سے نصیب کامل عطا فرماوے۔

---

(۱) تصوف کے سلاسل میں شاہ صاحب کا یہ ایک اہم رسالہ ہے۔ (قاسمی)

مقدمہ: جاننا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کی جو نعمتیں اس امت محمدیؐ پر ہیں، صلی اللہ علیہ وسلم، ان میں سے ایک یہ ہے کہ سلسلوں کا ربط آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک صحیح وثابت ہے۔ اگر چہ بعض امور میں اوائل امت اور اواخر امت کا اختلاف ہوا ہو تو حضرات صوفیہ صافیہ جو اول زمانہ میں ہوئے ہیں۔ تو ان کا ارتباط صحبت اور تعلیم اور نفس کی تہذیب کے آداب سے مؤدب ہونے سے تھا۔ اس وقت خرقہ اور بیعت نہ تھی اور سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی قدس سرہ کے زمانہ میں خرقہ کی رسم ظاہر ہوئی۔ اور بعد اس کے بیعت کا دستور جاری ہوا۔ اور ارتباط ان امور کے سلسلۂ روشن کا متحقق یعنی صحیح وثابت ہے۔ اور ارتباط یعنی رابطے کی صورتیں جو مختلف ہیں ان سے کچھ ضرر نہیں۔ اور خرقہ اور بیعت کی اصل ہے سنت سینہ تو خرقہ کی اصل تو الباس عمامہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کو عطا فرمایا تھا۔ جب ان کو امیر لشکر کیا تھا اور بیعت کی اصل خود آنحضرت صلعم سے مستفیض اور متواتر یقینی ہے۔ کچھ پوشیدہ نہیں۔ پس زمانۂ اول میں علما کرام کا ارتباط، حدیثیں سننے اور ان کو اپنے دل میں محفوظ کرنا تھا۔ بعد اس کے کتابیں تصنیف ہوئیں اور قرأۃ اور مناولہ اور اجازت اور وجادت جاری ہوئی اور سلسلوں کا ارتباط ان سب امور میں صحیح ہے۔ اور صورتوں کے اختلاف کا اس میں کچھ مضائقہ نہیں۔ اور ان سب باتوں کی سنت سینہ میں اصل ہے۔

چنانچہ قرأۃ کی اصل تو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے اور اعرابی کا سوال اور مناولت کی اصل آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان لکھنے اطراف بلدان میں اور مناولہ صحیفہ عبداللہ بن جحشؓ اور اسی طور اجازت اور وجادت کے اصلین ہیں جن کا کتب حدیث میں بیان ہے۔ غرض صوفیہ کی رسم قدیم ہے کہ اپنے یاروں کو خرقہ پہناتے ہیں خواہ کلاہ، خواہ عمامہ، خواہ قمیص، خواہ قبا، خواہ چادر، خواہ ازار جو کچھ میسر ہو۔ اور اس کے تین طریقے ہیں۔ ایک تو خرقہ اجازت کہ جب چاہتے ہیں کہ اپنے کسی دوست کو طریقت کی اجازت دیں اور اس کو اپنا نائب کریں۔ تلقین میں اور صحبت میں کہ طالبوں سے بیعت لے اور خرقہ عطا کرے تو اس کو خرقہ دیتے ہیں۔ سو اس کی شرط ان امور کا قبول کرنا ہے۔ دوسری صورت خرقہ ارادت ہے کہ جب کوئی عزیز صوفیوں کے زمرہ میں داخل ہوتا ہے اور ان کے سے عمل جدوجہد کے کرنے لگتا ہے اس کو خرقہ عطا کرتے ہیں کہ اس کی صوفیوں میں

داخل ہونے کی علامت ہو۔ اور اس کی شرط ان امور میں دیکھ لینا ہے کہ وہ جہد و کوشش کرتا ہے۔ ان امور میں اور استقامت رکھتا ہے۔

تیسرا خرقہ تبرک ہے کہ جب کسی پر مہربان ہوتے ہیں کہ صوفیوں کی برکات اس کے شامل حال ہوں اس کو خرقہ دیتے ہیں، اس میں کچھ شرط نہیں بادشاہ ہو یا امیر یا سوداگر کوئی ہو اور اسی طرح بیعت بھی کئی قسم کی ہے، ایک بیعت تو یہ ہے کہ گناہوں سے توبہ کرے سو وہ عام ہے ہر مسلمان کے واسطے یعنی جس سے چاہے بیعت کرے اور جو چاہے بیعت لے لیوے اور ایک بیعت تبرک ہے کہ صالحین کے سلسلہ میں داخل ہو سو وہ بھی عام ہے اور ایک بیعت تحکیم ہے کہ شیخ کو سلوک طریقہ مجاہدہ میں اپنے پر حاکم کرے اور خوب کوشش سے اس راستے چلے سو یہ خاص ہے۔ ارباب ارادت کے ساتھ بیعت کے طور میں اختلاف ہے، ملک عرب کے کل صوفیوں کی بیعت کی تو یہ صورت ہے کہ شیخ اپنا داہنا ہاتھ مرید کے داہنے ہاتھ پر رکھتا ہے اور انگوٹھے اور انگلیوں سے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑتا ہے اور بعد سورۂ فاتحہ پڑھنے اور قرآن شریف کی آیتیں پڑھنے کے مرید کہتا ہے۔ اللھم (۱) انی اشھدک واشھد ملائکتک وانبیاءک واولیاءک انی قبلته شیخا فی الله ومرشدا وداعیا اور شیخ کہتا ہے۔ اللھم (۲) انی اشھدک واشھد ملائکتک وانبیائک انی قبلته ولدا فی الله۔ اس کے بعد دعا کرے اور ضروری باتوں کی وصیت کرے اور اسی آیت کا اشارہ ہے کہ آیہ کریمہ یدالله فوق ایدیھم میں اور جو طریقہ بیعت اس فقیر کے والد کو خواب میں آنحضرت ﷺ سے بیعت کا معلوم ہوا ہے۔ اور اس فقیر کو بھی آنحضرت ﷺ سے خواب میں معلوم ہوا ہے۔ اس کی صورت مصافحہ کی یہ ہے کہ دو ہاتھ مرید کے شیخ کے دونوں ہاتھوں میں ہوتے ہیں اور کلمات مبارک جو صحیح حدیث شریف میں وارد ہیں کہتے ہیں۔ اور بعد اس کے کہتے ہیں، اخترت (۳) الطریقة الفلانیة اور اس کا سب ذکر ہم نے کتاب قول الجمیل فی سواء السبیل (۴) میں ذکر کر دیا ہے۔ اور اب مقصد کے شروع کا وقت ہے۔

---

(۱) اے اللہ میں تجھ کو گواہ کرتا ہوں اور تیرے ملائکہ اور انبیا اور اولیا کو کہ میں نے اس بزرگ کو اپنا شیخ قبول کیا اللہ کی راہ میں اور اپنا مرشد اور اللہ کی طرف بلانے والا قبول کیا۔ (۲) اے اللہ میں بیشک تجھے گواہ کرتا ہوں اور تیرے ملائکہ اور انبیاء اور اولیاء کو کہ میں نے قبول کیا اس کو فرزند اللہ کی راہ میں۔ (۳) میں نے فلاں طریقہ اختیار کیا۔

(۴) یہ رسالہ بھی اسی مجموعہ امام شاہ ولی اللہ جلد ششم میں شامل ہے۔ (قاسمی)

پہلی فصل (۱)

اس فقیر کو ارتباط بیعت صحبت وخرقہ وفیض توجہ وتلقین عالم باطن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اس فقیر نے خواب میں دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حضور میں حاضر ہوا ہے اور روبرو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بیٹھا ہے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صورت مثالیہ دیکھی، اوّل تو ایک ایسا جسم کہ اس کا اعلیٰ اور اسفل پیرہن رکھتا ہے۔ اور اعلیٰ اسفل سے زیادہ چوڑا ہے اور درمیان اعلیٰ اور اسفل کے تدریج ہے۔ جیسے جسم مخروطی میں ہوتی ہے اور وہ تمثال (صورت) ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خاص نسبت کی، پھر ایسا معلوم ہوا ایک جسم مدوّر جیسے ایک طباق زمین پر رکھا ہوا ہے۔ اور اس میں ایک لکڑی گڑی ہوئی ہو۔ وہ تمثال سالکوں کی نسبت کی ہے، جنھوں نے جذب کا چنداں حصہ نہ پایا ہو، تیسرے ایسی شکل جیسی دوسرے سے مشابہ لیکن وہ اس طرح کہ جیسے لکڑی زمین میں گڑی ہوئی اور طباق اس کے اوپر ہو۔ وہ تمثال مجذوبوں کی نسبت کی ہے۔ جنھوں نے سلوک کا چنداں حصہ نہیں پایا اور ان تینوں تمثالوں کے دکھانے کے درمیان یہ بات دل میں ڈالی کہ خاص نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وہ ہے کہ طبقات مجردہ روحانیہ اور مراتب سفلانیہ جسمانیہ سب اپنے اپنے کمالات مناسبہ کے ساتھ متصف ہوں اور مراتب روحانیہ زیادہ قوی ہوں، اور مراتب روحانیہ سے کوئی ایسی چیز نہیں جس کا عالم نسمیہ میں خلیفہ اور نمونہ نہیں ہے۔ مثلاً محبت ذاتیہ کا نمونہ کیا ہے۔ محبت افعال اور روح کی اطاعت کا خلیفہ کیا ہے۔ سجدہ ظاہر اور جن لوگوں کو یہ جامعیت نہیں ملی ہے وہ دو

(۱) سلسلۂ ولی اللہی

قسم ہیں۔ ایک قسم تو مجذوب ہیں کہ انھوں نے مراتب روحانیہ کی تکمیل کی ہے۔ سوائے مراتب نسمیہ کے ان کی وسعت درجات فقط فوق ہے اور دوسری قسم سالک ہیں کہ مراتب سافلہ کی تکمیل کی ہے، سوائے مراتب روحانیہ کے ان کی وسعت کمالات فقط درجات تحت ہے اور بس جب یہ معرفت جلیلہ میری خاطر میں جمے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسکراتے ہوئے سر مبارک گریباں مراقبہ سے اٹھایا۔ اور اپنے دونوں مبارک ہاتھ اٹھائے اور اشارہ فرمایا بیعت اور مصافحہ کا۔ یہ فقیر اٹھا اور زانو بزانو متصل بیٹھ کر اپنے دونوں ہاتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ددونوں مبارک ہاتھوں میں رکھے اور بیعت کی بعد فراغ بیعت کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی مبارک آنکھیں بند کیں، اور اس فقیر نے بھی اپنی آنکھیں ان کے حضور مبارک میں بند کیں۔ اس وقت آپ نے وہی نسبت خاصہ جس کا علم القا فرمایا تھا۔ عطا فرمائی تو میں محیط ہو گیا۔ از روئے علم کے اور حاشا اللہ کہ اس واقعہ میں کچھ کلمہ وکلام درمیان نہ تھا فقط روحانی فیض تھا۔ یا اشارہ اور فعل تھا اور جب یہ فقیر مدینہ منورہ پہنچا اور ایک مدت تک روضہ انور میں متوجہ رہا۔

سب مراتب جذب وسلوک کے ابتداء سے انتہا تک طے کیے۔ اس وقت اس فقیر کو القاب زکی وحکیم سے ملقب فرمایا اور ایک طریقہ عنایت فرمایا اور جو جو علم میں مشکلات تھی میں نے پوچھی اور ان کا جواب باصواب پایا۔ ان میں سے اکثر میں نے رسالہ فیوض الحرمین (۱) میں لکھے ہیں اور طریقہ کا بیان رسالہ ہمعات (۲) میں میسر ہوا اور ایک ان جوابوں میں سے جو رسالہ فیوض الحرمین میں نہیں لکھا اس میں لکھا ہے وہ یہ ہے کہ اس فقیر نے ایک وجہ روحانی کلام سے حضور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں عرض کیا۔ کہ فرقہ شیعہ کے واسطے کیا ارشاد ہے؟ کہ یہ اہل بیت کی محبت کا دعویٰ کرتے ہیں اور اصحاب رضی اللہ عنہم سے عداوت رکھتے ہیں۔ تو افاضہ فرمایا کہ اس جماعت کا مذہب باطل اور ان کے مذہب کا بطلان ظاہر ہو جائے گا جب غور کرو گے لفظ امام کی تعریف میں جو انھوں نے مقرر کی ہے۔ انتہیٰ۔ بعد اس حالت کے افاقہ سے میں نے جو غور کی تو معلوم ہوا کہ یہ کہتے ہیں امام معصوم (۳) مفترض (۴) الطاعت ہوتا ہے اور وحی باطنی کی عبارت ہے حکم الٰہی کے

---

(۱) فیوض الحرمین جس میں حضرت شاہ صاحب نے اختلافی مسائل اور علمی مشکلات کے جواب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے بیان فرمائے ہیں۔ (۲) یہ رسالہ مجموعہ رسائل امام شاہ ولی اللہ جلد اول میں شامل ہے جو تصوف پر ایک معرکۃ الآرار رسالہ ہے۔ (قاسمی) (۳) معصوم جو شخص گناہ سے پاک ہو اور کبھی کوئی خطا اس سے سرزد نہ ہو یہ اہل تشیع کا عقیدہ ہے۔ (۴) مفترض الطاعت یعنی جس کی تابعداری فرض کی گئی۔

القا ہونے سے باطن میں یا الہام یا امن خطا سے اس مسئلہ میں ثابت کرتے ہیں۔ بطریق اجتہاد کے اور کہتے ہیں کہ اس کو خدا مقرر کرتا ہے لوگوں کے واسطے کہ ان کو احکام الٰہی پہنچا دے اور فی الحقیقت نبوت کے معنی یہی خصلتیں ہیں، اس واسطے کہ نبی کی تعریف یہی ہے کہ بعثة الله لتبليغ الاحکام یعنی اللہ نے اس کو بھیجا ہے واسطے احکام پہنچانے کے، اس کا حاصل یہی مقرر کرنا۔ اور افتراض طاعت ہے تو یہ لوگ درحقیقت ختم نبوت کے قائل نہیں ہیں (۱) اور اماموں رضی اللہ عنہم کے واسطے نبوت ثابت کرتے ہیں۔ اگرچہ نبوت کا نام نہ لیں اس عقیدہ سے بھی کوئی اور بدتر عقیدہ ہے۔ اور عالم ظاہر میں اس فقیر کو وجہ سے بیعت اور صحبت وخرقہ اور اجازت اور تلقین اشغال کے یہ سب امور یا ان میں سے بعضے امور اور سب خانوادوں کے طریقہ سے جو آج کے دن روئے زمین پر مشہور ہیں یا ان میں سے اکثر سے ربط حاصل ہے ان میں سے اس رسالہ میں مشہور خانوادوں کی سند لکھتا ہے۔

حاصل کلام یہ کہ سب طریقوں سے قادریہ طریقہ عرب اور ہندوستان میں بہت مشہور ہے۔ اور نقشبندیہ ہندوستان اور ماوراء النہر میں بہت مشہور ہے اور حرمین میں بھی شائع ہوا ہے اور چشتیہ طریقہ ہندوستان میں بہت مشہور ہے اور سہروردیہ خراسان وکشمیر، سندھ کے نواح میں۔ اور کبریہ طریقہ توران وکشمیر میں اور شطاریہ ہندوستان میں اور شاذلیہ مغرب ومصر اور اس کے نواح اور مدینہ میں فی الجملہ مغرب میں اور عیدروسیہ طریقہ حضر موت میں (۲)۔ اس فقیر کا سلسلہ صحبت تہذیب باطن کے طریق میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک مستفیض متصل یقینی الوقوع ہے کہ ہر ایک رجال سلسلہ نے اپنے شیخ کے ساتھ صحبت رکھی ہے اور آداب طریقہ حاصل کئے ہیں۔ بے شبہ ہر چند تعین ہونا ان آداب واشغال کا یقینی نہیں ہے۔ پس فقیر ایک مدت حضرت والد بزرگوار کی صحبت میں رہا ہے اور بیعت کی ہے اور آداب طریقہ سے بہت کچھ سیکھا ہے اور طریقوں کے اشغال اخذ کئے ہیں۔ اور خرقہ صوفیہ ان کے ہاتھ سے پہنا ہے اور خلوت میں اس ضعیف پر بہت توجہ فرمائی ہے اور اصل نسبت حضور کی ان کی توجہ سے حاصل کی ہے اور بہت کرامتیں اپنی آنکھوں سے دیکھی ہیں

(۱) حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین وخاتم المرسلین ہیں، آپ کے بعد سلسلہ نبوت ہمیشہ ہمیش کے لئے ختم ہو گیا ہے، یہی صحیح اسلامی عقیدہ ہے اور اسی پر ہمارا ایمان ویقین ہے۔

(۲) یہ مختلف سلاسل صوفیا ومشائخ ہیں، جن میں بعض ہندوستان میں معروف ہیں اور بعض دوسرے ممالک میں

اور واقعات عجیبہ اور اتفاقات غریبہ جو ان پر اور ان کے مشائخ پر واقع ہوئیں ہیں یاد کیے ہیں چنانچہ قسم اوّل کتاب انفاس العارفین (۱) میں بیان کیے ہیں اور آخر عمر میں اجازت تلقین اور بیعت وصحبت وتوجہ کی عنایت فرمائی ہیں اور کلمہ یدہ کیدی مکرر فرمایا ہے۔ یعنی اس کا ہاتھ جیسے میرا ہاتھ ہے سو الحمدللہ علی ذالک حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ اور انھوں نے صحبت رکھی ہے بہت سے شیوخ سے ان میں سے سید عبداللہؒ ہیں۔ کہ انھوں نے صحبت رکھی ہے شیخ آدم بنوریؒ سے انھوں نے شیخ احمد سرہندیؒ سے انھوں نے خواجہ محمد باقیؒ سے انھوں نے خواجہ امکنگیؒ سے انھوں نے مولانا درویش محمدؒ سے انھوں نے مولانا زاہدؒ سے انھوں نے خواجہ عبیداللہ احرارؒ سے اور وہ بہت سے شیوخ کی صحبت میں رہے ہیں کہ ان میں سے مولانا یعقوب چرخیؒ ہیں اور خواجہ علاء الدین غجدوانیؒ ہیں۔ یہ دونوں صحبت میں رہے ہیں۔ خواجہ نقشبندؒ کے بلاواسطہ اور مولانا یعقوب چرخی خواجہ علاء الدین عطارؒ کی صحبت میں بھی رہے ہیں اور خواجہ علاء الدین غجدوانیؒ خواجہ محمد پارساؒ کی صحبت میں رہے ہیں۔ اور یہ دونوں صاحب بڑے بڑے اصحاب خواجہ نقشبندؒ کی صحبت میں رہے ہیں کہ ان میں بہت بزرگ خواجہ محمد بابا سماسیؒ ہیں اور خلیفہ امیر سید کلالؒ ہیں اور خواجہ محمدؒ کے صحبت میں رہے ہیں۔ خواجہ علی برامیتنیؒ کے وہ صحبت میں رہے ہیں خواجہ محمود خیر فغنویؒ کے اور خواجہ محمودؒ صحبت میں رہے ہیں خواجہ عارف ریوکریؒ کے، خواجہ عارفؒ رہے ہیں صحبت میں خواجہ عبدالخالق غجدوانیؒ کے اور خواجہ عارفؒ رہے ہیں صحبت میں خواجہ عبدالخالق غجدوانیؒ کے اور خواجہ عبدالخالقؒ صحبت میں رہے ہیں خواجہ یوسف ہمدانیؒ کے خواجہ یوسفؒ صحبت میں رہے ہیں ابوعلی فارمدیؒ کے اور ابوعلیؒ بہت سے شیوخ کی خدمت میں رہے ہیں۔ کہ ان میں دو بہت بزرگ ہیں ایک تو امام ابوالقاسم قشیریؒ کہ وہ صحبت میں رہے ہیں ابوعلی دقاقؒ کے اور ابوعلی دقاقؒ ابوالقاسم نصیر آبادیؒ کے اور ابوالقاسمؒ ابوعلی رودباریؒ کے اور ابوبکر شبلیؒ اور ابوبکر واسطیؒ کے جنھوں نے صحبت پائی ہے سید الطائفہ جنید بغدادیؒ کی اور دوسرے خواجہ ابوالقاسم کرگانیؒ ہیں جو صحبت میں رہے ہیں ابوعثمان مغربیؒ کے اور ابوعثمان ابوعلی کاتبؒ کے اور ابوعلی کاتبؒ ابوعلی رودباریؒ کے اور ابوعلی رودباریؒ جنید بغدادیؒ کے اور جنید بغدادیؒ صحبت میں رہے ہیں اپنے ماموں سری سقطیؒ کے اور سری سقطی معروف کرخیؒ کے اور معروف کرخیؒ صحبت میں

---

(۱) یہ رسالہ مجموعہ رسائل امام شاہ ولی اللہ جلد سوئم میں شامل ہے۔ (قاسمی)

رہے ہیں بہت سے شیوخ کہ ان میں دو بہت بزرگ ہیں۔

ایک تو امام علی بن موسیٰ رضاؒ وہ اپنے والد امام موسیٰؒ کی اور وہ اپنے والد امام جعفر صادقؒ کے اور وہ اپنے والد امام محمد باقرؒ اور وہ اپنے والد امام زین العابدینؒ کے اور وہ اپنے والد امام حسینؓ کے اور وہ اپنے والد امیر المومنین علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہم اور وہ صحبت میں سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اور دوسرے ان میں کے داؤد طائیؒ کہ وہ صحبت میں رہے حبیب عجمیؒ کی اور وہ حسن بصریؒ کے اور وہ اصحاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ان میں سے انسؓ خادم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں اور سنت رسول اللہ کے حافظ ہیں۔

جاننا چاہئے کہ جو طریقہ آج کے دن محفوظ ہے۔ اس کا منشاء جنید بغدادیؒ ہیں اور خرقہ بھی محفوظ وہی ہے جو جنید بغدادیؒ کے واسطے سے ہے اور اس سلسلہ سے سید عبداللہؒ حامل تھے اور ان سے اوپر خواجہ محمد باقیؒ تک ہند میں مقتدا صوفیہ کے تھے۔ اور ان کے ارشاد سے ایک عالم منزل مقصود کو پہنچا اور خواجہ امکنہؒ سے خواجہ عبدالخالق تک ماوراء النہر کے ملک میں تھے۔ ہر ایک اپنے زمانہ میں صوفیوں کے مرجع اور طالبوں کے مقتدا اور فضل وارشاد میں مشہور تھے۔ وہ جو حضرت خواجہ محمد باقیؒ کے مکتوبات میں لکھا ہے اور ان کے پیرو اس پر ہیں۔ وہ یہی سلسلہ ہے جو لکھا گیا اور بعض کے شجرہ میں اہل بیت خواجہ محمد امکنہؒ کے لکھا ہے کہ خواجہ محمد امکنہ مریدی اور صحبت خفیہ میں خواجہ محمد درویشؒ سے رکھتے تھے اور مولانا زاہدؒ سے بھی ملے ہیں۔ اور یہ دونوں صحبت میں خواجہ عبیداللہ احرار کے رہے ہیں۔ واللہ اعلم

اور خواجہ نقشبندیہؒ سے اوپر طریقہ خواجگان کا کہلاتا تھا اور یہ مل کر ذکر جہر کیا کرتے تھے اور اس طرف خواجہ نقشبند سے طریقہ نقشبندیہ کہلاتا ہے اور انھوں نے خفیہ ذکر پر اکتفا کیا۔ اور خواجہ یوسف ہمدانیؒ سے جنیدؒ تک ابوالقاسم قشیریؒ کے طریق سے سب جامع تھے علم ظاہر وعلم باطن کے اور محدث تھے اور وعظ کہتے تھے۔ اور ابوالقاسم گرگانیؒ کے طریق سے سب کو مریدوں کے حال کے کشف سے اور ان کے سلوک راہ سے اور ہر ایک کو خصوصیت اپنے شیخ سے اس سلسلہ میں ازراہ صحبت وخرقہ وتلقین کے یقینی ہے کہ اس میں کچھ شک وشبہ کو دخل نہیں۔

جاننا چاہئے کہ اس سلسلہ میں جو بلا انقطاع پایا جاتا ہے۔ وہ تہذیب قلب وعقل ونفس ہے

لیکن تہذیب لطائف خفیہ کے اور جو حال اس کی تہذیب سے متفرع ہوتے ہیں وہ ثمرات ومواہب(۱) کی قسم سے ہیں اور جاننا چاہئے کہ بنور بفتح موحدہ وتشدید نون ایک شہر ہے توابع سہرند سے اور سہرند بکسر سین مہملہ وسکون ہا وفتح رائے مہملہ ایک شہر عظیم ہے۔ درمیان لاہور اور دہلی کے اصل میں اس کا نام سہرند ہے۔ یعنی جنگل شیر کا اور فارسی گووں کی زبان پر سرہند مستعمل ہوتا ہے(۲) اورامکنہ ایک موضع کا نام ہے شہر شیراز کے قریب اور اس کو انکنہ بھی کہتے ہیں۔ اور چرخ بجیم فارسی ورای مہملہ اور آخر خائے معجمہ ایک گاؤں کا نام ہے توابع غزنین سے، نقشبند نسبت ہے کم خات باقی کے خرقہ کی طرف کہ یہ اور ان کے والد یہ کام کرتے تھے کذافی سفینۃ الاولیاء اور غجدوان بغین معجمہ مکسورہ وسکون جیم ایک موضع کا نام ہے۔ توابع بخارا سے یہ یونہی مشہور ہے اور کفوی نے طبقات حنفیہ میں کہا ہے کہ بضم غین معجمہ وسکون جیم وضم دال مہملہ ایک گاؤں ہے بخارا سے چھ فرسنگ اور لب میں لکھا ہے بفتح دال مہملہ واللہ اعلم الخبیر۔

فغنی بفتح فاء سکون غین معجمہ ونون ایک گاؤں ہے بخارا کے توابع سے اور ریوکر بکسر راء مہملہ بھی ایک گاؤں ہے۔ توابع بخارا سے رامتین بفتح رائے مہملہ وکسر میم وسکون یائے تحتیہ وکسر مثناۃ آخر نون ایک قصبہ ہے توابع بخارا سے سماسی بفتح سین مہملہ کسر سین مہملہ ثانیہ ایک گاؤں ہے توابع شہر طوس سے کہ آج کل اس کو مشہد کہتے ہیں۔ اس گاؤں سے نسبت کر کے سماسی کہتے ہیں۔ سین مہملہ ثانیہ کی فتح اور دو یائ سے قشیری نسبت ہے بنی قشیر سے بضم قاف وفتح شین معجمہ عرب کا قبیلہ ہے۔ اور دقاق بتشدید قاف اول اور واسط ایک شہر ہے درمیان بصرے اور کوفی کے اور رودباری نسبت ہے ایک اطراف کی کہ ان کے اصول کا منشا ہے یعنی آبا واجداد کی پیدائش وہاں ہے کرگان بضم کاف عربی وتشدید مہملہ وکاف عجمیہ ایک گاؤں ہے مشہد کے گاؤں میں سے سری بفتح سین مہملہ وراء مہملہ وتشدید یائے تحتیہ لغت میں بمعنی جوانمرد ہے۔

سقطی نسبت بہ سقط فروشی ہے اور سقط متاع حقیر کو کہتے ہیں۔ اور بعض شجرہ میں سری سقطی مغلس دیکھا ہے مغلس بضم میم وفتح غین معجمہ وتشدید لام وسین مہملہ ساکن لغت میں اسے کہتے ہیں جو صبح کی نماز رات کی تاریکی میں پڑھے، سلسلہ صوفیہ علما کا سلسلہ بشارت کا لکھنا چاہئے اور طریقہ

---

(۱) مواہب جمع موہب بمعنی بخشش۔ (۲) حضرت مجدد الف ثانی کا مولد ومدفن۔ (قاسمی)

قادریہ کے شعبہ بہت ہیں اور بہت مضبوط اہل حدیث کے نزدیک شعبہ اکبریہ ہے۔ شیخ محی الدینؒ بن عربیؒ کی جہت سے اور بہت مشہور شعبہ جیلانیہ ہے۔ عوام میں سادات جیلانیہ کی جہت سے اور یمن میں بہت مشہور شعبہ مسرعیہ ہے۔

الغرض اس فقیر کو اکثر ان شعبوں سے ارتباط صحیح واقع ہے، پس اس فقیر کو ارتباط بیعت اور صحبت اور خرقہ اور تلقین اور اجازت کی رو سے اپنے والد بزرگوار(۱) سے ہے اور ان کو خرقہ اور تلقین اور صحبت و اجازت کی رو سے سید عبداللہؒ سے ہے۔ ان کو شیخ آدم بنوریؒ سے ان کو شیخ آحمد سہرندیؒ سے ان کو اپنے والد شیخ عبدالاحدؒ سے ان کو شیخ کمالؒ سے ان کو سید فضیلؒ سے ان کو سید گدارحمٰنؒ سے ان کو سید شمس الدین عارفؒ سے ان کو سید گدارحمٰن بن سید ابوالحسنؒ سے ان کو شمس الدین صحرائیؒ سے ان کو سید عقیلؒ سے، ان کو سید بہاء الدینؒ سے، ان کو سید عبدالوہابؒ سے، ان کو سید شرف الدین قتالؒ سے، ان کو سید عبدالرزاقؒ سے، ان کو اپنے والد امام الطریقہ ابو محمد شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے اور ان کو خرقہ کی جہت سے شیخ عظمت اللہ اکبر آبادیؒ سے بھی ہے ان کو اپنے والد سے اور ان کو اپنے دادا شیخ عبدالعزیزؒ سے ان کو سید ابراہیم ایرجیؒ سے، ان کو شیخ بہاء الدین قادریؒ سے، ان کو حسبی نسبی سید السادات ابوالعباس احمد بن حسن بن موسیٰؒ بن علی بن محمد بن حسن بن ابونصر بن ابوصالح بن عبدالرزاق بن قطب ابومحمد محی الدین عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ ان کو اپنے والد سے ان کو ان کے دادا سے اسی طور اوپر تک اور اس فقیر کو ارتباط خرقہ کی جہت سے شیخ ابوطاہر محمد بن ابراہیم کردیؒ سے ہے۔

اور انھوں نے خرقہ پہنا اپنے والد سے اور ان کے والد نے پہنا ہاتھ سے اپنے شیخ احمد قشاشیؒ کے اور ان کو خرقہ قادریہ میں کئی طریقہ ہیں، ایک ان میں سے یہ ہے کہ انھوں نے پہنا ہاتھ سے شیخ احمد شناویؒ کے ساتھ اس لباس کے جو انھوں نے اپنے والد علی بن القدوسؒ سے پہنا تھا۔ اور علی بن القدوسؒ نے پہنا شیخ عبدالوہاب شعراویؒ سے انھوں نے جلال الدین سیوطیؒ سے انھوں نے روضہ مصر میں شیخ کمال الدین محمد عرف امام الکاملیہؒ سے روبرو کعبہ شریف کے انھوں نے شمس الدین محمد بن محمد جزریؒ سے انھوں نے عمر بن حسن بن امیلہ المراغیؒ سے، انھوں نے عز احمد بن

---

(۱) حضرت شاہ عبدالرحیم محدث دہلویؒ

ابراہیم فاروقیؒ سے، انھوں نے امام محی الدین محمد بن علی بن عربیؒ سے قدس سرہ اسراہم اجمعین ویرحمنا بہم اور محی الدین عربیؒ نے پہنا جمال الدین یونس بن یحییٰ بن ابوالبرکات ہاشمی عباسیؒ سے، مکہ معظمہ میں سامنے رکن یمانی کے مسجد الحرام میں اور انھوں نے پہنا شیخ الوقت عبدالقادر جیلانیؒ سے اور ایک اُن طریقوں میں سے یہ ہے کہ شیخ احمد قشاشیؒ نے پہنا ہاتھ سے اپنے والد اور اپنے شیخ مدنیؒ کے، انھوں نے شیخ امین بن صدیقؒ سے، انھوں نے شیخ سراج الدین عمر جزئیل سے، انھوں نے شیخ عبدالقادر جنید مشرعؒ سے، انھوں نے اپنے والد جنید بن احمدؒ سے، انھوں نے اپنے والد احمد بن موسی مسرع یمنیؒ سے، انھوں نے شیخ اسمٰعیل بن صدیق جبرتیؒ سے انھوں نے شیخ محمد مزجاجیؒ سے، انھوں نے شیخ اسمٰعیل بن ابراہیم جبرتی یمنیؒ سے، انھوں نے شیخ سراج الدین ابوبکر بن محمد سلامیؒ سے، انھوں نے شیخ محی الدین احمد بن محمد بن احمد بن عبداللہ یوسف اسدیؒ سے، انھوں نے شیخ فخر الدین ابوبکر محمد بن علی بن نعیمؒ سے، انھوں نے شیخ ابواحمد محمد بن احمد بن عبداللہ بن یوسف اسدیؒ سے، انھوں نے اپنے والد ابومحمد احمد بن عبداللہ الاسدیؒ سے، انھوں نے اپنے والد شیخ عبید اللہ بن یوسف اسدیؒ سے، انھوں نے اپنے شیخ عبداللہ بن قاسم بن زربیہؒ سے، انھوں نے شیخ ابومحمد عبداللہ علی اسدی یمنیؒ سے، انھوں نے قطب غوث الفرد الجامع محی الدین ابومحمد عبدالقادر بن ابوصالح جیلانی قدس اللہ روحہ سے پھر شیخ ابومحمد عبدالقادر جیلیؒ نے خرقہ پہنا ہاتھ سے شیخ ابوسعید مبارک بن علی بن حسین بن بندار بغدادی مخرمیؒ کے، مخرم بکسر رائے مہملہ مشددہ اور یا نسبت کی ہے اور ایک محلّہ کا نام ہے بغداد کے کہ اس کو بزرگی ہوئی وہاں اتری تھی۔

بعض اولاد یزید بن مخرم کی ان سے مشہور ہوا وہ محلّہ اس نام سے اس کو ذکر کیا ہے۔ منذری نے ایسا ہی لکھا ہے، طبقات حافظ بن رجب حنبلی میں، اور شیخ ابوسعیدؒ نے ہاتھ سے ابوالفرح محمد بن عبداللہ طرطوسیؒ کے ان کو پہنایا ابوالفضل عبدالواحد بن عبدالعزیز بن حارث تمیمیؒ نے ان کو پہنایا ان کے والد عبدالعزیز بن حارث تمیمیؒ اور ان کے استاد ابوبکر بن محمد دلف بن حلف بن محمد بن حجذر شبلیؒ نے ان کو پہنایا سید الطائفہ استاد ابوالقاسم جنید بن محمد بغدادیؒ نے قدس سرہ و اسرارھم ورحمنا بھم پھر آگے وہی سند مذکور ہے۔ سلسلہ صحبت کی مگر صوفیوں کا اتفاق ہے اس امر پر کہ حسن بصریؒ نے اخذ کیا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اور ایک گروہ شجرہ لکھنے والوں کے اس مقام پر

سلسلہ نسب کا ثابت کرتے ہیں اور اس میں جائے گفتگو ہے، اس واسطے کہ کوئی ایسا قرینہ نہیں پایا جاتا کہ باطن کی تربیت اس سلسلہ میں ہوئی ہو واللہ اعلم۔

اور وہ سلسلہ یہ ہے کہ سیدی شیخ ابو محمد عبدالقادر جیلانی نے اخذ کیا اپنے والد ابو صالح موسیٰ جنگی دوست سے، انھوں نے اپنے والد سید عبداللہؒ سے، انھوں نے اپنے والد سید یحییٰ زاہدؒ سے، انھوں نے اپنے والد سید محمد رومی سے، انھوں نے اپنے والد سید داؤد سے، انھوں نے امیر محمد اکبر سے، انھوں نے اپنے والد موسیٰ ثانی سے، انھوں نے اپنے والد سید عبداللہؒ سے، انھوں نے اپنے والد سید موسیٰ جون سے، انھوں نے اپنے والد سید عبداللہ سے، انھوں نے اپنے والد سید حسن مثنی سے، انھوں نے اپنے والد امام حسن مجتبیٰ سے، انھوں نے اپنے والد اور والدہ سیدنا علی مرتضیٰ و سیدتنا فاطمۃ الزہراؓ سے اور ان دونوں نے نبی صلعم سے اور کتاب غنیۃ الطالبین و فتوح الغیب و مجالس ستین کے جو ملفوظ ہیں حضرت غوث کے اور اصل طریقہ ان کا ان میں مفصل ہے۔ اس فقیر نے اجازت حاصل کی شیخ ابو طاہر محمد بن ابراہیم کردی سے، انھوں نے اپنے والد سے، انھوں نے قشاشی سے، انھوں نے شناوی سے، انھوں نے عبدالرحمٰن بن عبدالقادر بن عبدالعزیز بن فہد ہاشمی علوی مکی سے، انھوں نے اپنے چچا جار اللہ بن عبدالعزیز بن فہد مکی سے، انھوں نے ابوالفضل جلال الدین سیوطی سے، انھوں نے کہا مجھے خبر دی شیخ جلال الدین بن ملقن نے کہا مجھے خبر دی ابو اسحاق تنوخی نے، ان کو ابوالعباس حجاز نے، ان کو احمد بن یعقوب مارستانی نے، اُن کو قطب الطریقہ شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی نے اور خبر دی ہم کو ہمارے شیخ ابو طاہر نے ان کو شیخ محمد سعید بن حسن قرشی کوکنی ثم المدنی نے اپنے رسالہ میں جس کا نام ہے۔ **ایقاظ الھمم بالاوراد والاذکار لتعرض نفحات العزیز الغفار** شیخ عارف باللہ شیخ ابراہیم کردی سے اور خبر دی ہم کو ہمارے شیخ ابو طاہر نے اپنے والد شیخ ابراہیم کردی سے۔ کہا خبر دی ہم کو ہمارے شیخ احمد بن محمد قشاشی مدنی نے یہ کہ ذکر طریقہ علیہ قادریہ کا اس طور پر ہے کہ مربع بیٹھے اور دونوں ہاتھوں کو دونوں رانوں پر رکھے کھلا ہوا اور آنکھوں کو بند کر لے اور شروع کرے ذکر کو بائیں طرف سے اور ارادہ کرے کہ اپنے دل سے نکالتا ہے اللہ کے ماسوا کو اور دل کا مقام بائیں پستان کے نیچے ہے "لا" سے شروع کرے اور کھینچے اس کو یہاں تک کہ ڈالے الہ کو حالت نفی میں اوپر داہنے مونڈھے کے اور اثبات کرے ساتھ لفظ

''الا'' کے داہنے مونڈھے کے اوپر سے اللہ کو بیچ دل کے جس کے ماسوائے الہ کو نکال ڈالا تھا۔ بہت شدت اور ضرب کے ساتھ کہ دل میں اثر ہو جائے، اور اس میں ذکر کا نور قرار پکڑے۔ انتہی۔

اور اسی سند سے ہے شیخ ابراہیم کردیؒ سے کہ انھوں نے کہا ہے بیچ ایقاظ القوابل (۱) کے حق سبحانہ تعالیٰ کے طالب کو چاہئے بعد ادائے فرائض کے سوال کرے طریقہ اللہ کے تقرب کا اپنے پر لازم کر لینے سے اس وظیفہ کے جس کی طاقت رکھتا ہو افعال واقوال مستحب سے خالص عبودیت کے ساتھ کہ اس کا نتیجہ محبت الٰہی ہے نتیجہ دینے والے اس شئے کا جو فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث قدسی میں یعنی نہیں نزدیکی کی طرف میرے بندہ نے میرے ساتھ کسی چیز کے جو محبوب تر ہو طرف میرے فرائض میرے سے اور ہمیشہ میرا بندہ میرا قرب چاہتا ہے ساتھ نوافل کے یہاں تک کہ میرا محبوب ہو جاتا ہے، تو میں ہوتا ہوں اس کے کان جن سے وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھیں جن سے وہ دیکھتا ہے اور اس کے ہاتھ جن سے وہ پکڑتا ہے اور اس کے پاؤں جن سے وہ چلتا ہے، اور بخاری کی اس روایت کے سوا اوروں نے یہ بھی زیادہ روایت کیا ہے کہ اس کا دل جس سے وہ سمجھتا ہے اور اس کی زبان جس سے وہ کلام کرتا ہے۔ انتہی۔

تو جو شخص اس پر عمل کرنا چاہے وہ صبح وشام ذکر کیا کرے اور غافلوں میں سے نہ بنے اپنے کاروبار کے شغل میں اور افضل الذکر لا الٰہ الا اللہ ہے پس اگر مجرد ہے کسی طرح کا بکھیڑا نہیں رکھتا تو بس وہ ذکر ہی کیا کرے اور جو دنیا کے کاروبار میں گھرا ہوا ہے تو وہ اپنی فرصت کے موافق ورد و وظیفہ مقرر کر لے اور اوسط کا درجہ ہے کہ لا الہ الا اللہ ایک ہزار بار بعد ہر صبح اور عشا اور تہجد کی نماز کے بعد ورد کر لے اور عذر کے وقت جس قدر آسان ہو اور ایک سو مرتبہ استغفار انہیں تینوں نمازوں کے بعد اور اس حدیث شریف پر عمل کرے کہ فرمایا آنحضرتؐ نے جو شخص استغفار چاہے مومنوں اور مومنات ہر روز ستائیس دفعہ وہ ہوگا ان میں سے جن کی دعا قبول ہوتی ہے۔ اور جن کے سبب اہل زمین روزی پاتے ہیں۔ اور یہ بعد نماز صبح کے ہے۔

اور اس حدیث شریف کے مضمون پر عمل کرے یعنی جو شخص مغفرت مانگے اللہ سے بعد ہر نماز کے تین مرتبہ اور کہے **استغفر اللہ الذی لا الٰہ الا ھو الحی القیوم واتوب الیہ** تو اس

---

(۱) لطائف کی بیداری

کے سب گناہ بخشے جاتے ہیں۔اگر چہ وہ جہاد میں سے بھاگا ہو پس کہے بعد صبح کے بعد دس مرتبہ ہر روز لا الہ الا اللہ وحدہ لاشریک لہ لہ الملک ولہ الحمد یحیی ویمیت بیدہ الخیر وھو علی کل شئ قدیر دس مرتبہ اور جو ہر نماز کے بعد کہے تو اولیٰ ہے اور ہر صبح اور عصر کے بعد دس دفعہ یہ پڑھے، اللھم صل علی سیدنا محمد وعلی آلہ واصحابہ عدد خلقک بدوامک اور دسویں دفعہ یہ اور پڑھ لیوے وعلی جمیع الانبیاء والمرسلین وعلیٰ الھم وصحبھم والتابعین وعلی اھل طاعتک اجمعین من اھل السمٰوات واھل الارضین وعلینا معھم برحمتک یا ارحم الراحمین عدد خلقک رضاء نفسک وزینۃ عرشک ومداد کلماتک کلما ذکرک الذاکرون وغفل عن ذکرک الغافلون اور جو ہر فرضوں کے بعد دس مرتبہ ورد کرلے تو اور بہت خوب ہے،اور ہر نماز فرض کے بعد دس دفعہ سورۂ اخلاص پڑھا کرے اور بعد دو رکعتوں چاشت کے سورتیں والشمس وضحھا اور والضحیٰ پڑھے اس کے بعد یوں کہے۔ سبحان اللہ والحمد اللہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم. عدد خلق اللہ بدوام اللہ دس مرتبہ اور یٰسٓ اور تبارک ہر صبح وشام پڑھے،اور مغرب کو بعد نماز کے سورہ الم سجدہ پڑھے اور جو یٰسٓ پڑھنے کا وقت نہ پائے رات کو تو الم سجدہ اور تبارک پڑھے اور بعد نماز مغرب کے چھ رکعتیں نفل اوابین اور بعد مغرب کے دو رکعتوں کے یہ کہے مرحبا بملائکۃ اللیل مرحبا بالملکین الکریمین الکاتبین اکتبا فی صحیفتی اشھدان لا الہ الا اللہ وحدہ لاشریک لہ واشھد ان محمدا عبدہ ورسولہ واشھد ان الجنۃ حق والنار حق والموت حق والقبر حق والسوال حق والحشر حق والحساب حق والشفاعۃ حق والصراط حق والمیزان حق واشھد ان الساعۃ اٰتیۃ لاریب فیھا وان اللہ یبعث من فی القبور. اللھم انی اودعک ھذہ الشھادۃ لیوم حاجتی الیھا اللھم احطط بھا وزری واغفربھا ذنبی وثقل بھا میزانی واوجب لی بھا امانی وتجاوزبھا عنی برحمتک یا ارحم الراحمین. اور بعد دو رکعت مغرب کے نیت کرے اور دو رکعتوں حفظ الایمان کی اوابین کے ساتھ اور بعد سلام کے یہ کہے اللھم سددنی

بالایمان واحفظه علی فی حیاتی وعند وفاتی وبعد مماتی.

اس کی وصیت کی ہے شیخ محی الدین قدس اللہ سرہ نے فتوحات مکیہ کے باب الوصایا میں یوں فرمایا ہے کہ پڑھے اس کو ہر رکعت میں سورۂ اخلاص چھ چھ مرتبہ اور قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس ایک ایک دفعہ اس کے بعد دو رکعتیں اوابین کی نیت سے ساتھ استخارہ کے یعنی مطلق جو اولیاء اللہ پڑھا کرتے ہیں، ہر روز اعمال شب و روز کے واسطے شیخ محی الدین قدس سرہ فرماتے ہیں۔ ہم نے تجربہ کیا ہے تو اس میں سراسر بہتری پائی ہے اور دعا استخارہ کی وہی ہے جو پہلے گذری اور ہر فرضوں کے بعد کہے۔ استغفر اللہ العظیم الذی لا الہ الا هو الحی القیوم واتوب الیه اللهم انت السلام ومنک السلام والیک یرجع السلام حینا ربنا بالسلام وادخلنا دار السلام تبارکت ربنا وتعالیت یا ذالجلال والاکرام پھر الحمد کی صورت پھر الهکم اله واحد لا اله الا هو الرحمن الرحیم. پھر کہے اللهم انی اقدم الیک بین یدی الله ذلک کله الله لا اله الا هو الحی القیوم وهو العلی العظیم تک پھر امن الرسول آخر سورہ تک پھر شهد الله انه لا اله الا هو ان الدین عند الله الاسلام تک پھر کہے وانا اشهد بما شهد الله به استودع الله هذه الشهادة وهی لی عند الله ودیعة پھر کہے قل اللهم مالک الملک سے بغیر حساب تک پھر کہے اللهم یا رحمن الدنیا والآخرة ورحیمهما رحمانی انت ترحمنی فارحمنی برحمة من عندک تعیننی بها عن رحمة من سواک پھر سورۂ اخلاص اور قل اعوذ برالفلق اور قل اعوذ برب الناس پھر کہے سبحان اللہ تینتیس دفعہ اور الحمدللہ تینتیس دفعہ اور اللہ اکبر چونتیس دفعہ، لا اله الا الله وحده لاشریک له له الملک والحمد یحیی ویمیت بیده الخیر وهو علی کل شی قدیر اللهم لا مانع لما اعطیت ولا معطی لما منعت ولا راد لما قضیت ولا ینفع ذالجد منک الجد ولاحول ولاقوة الا بالله العلی العظیم ان الله وملائکته یصلون علی النبی الخ آخر آیۃ تک پھر درود پڑھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر پھر دعا مانگے جو چاہے پھر کہے سبحان ربک رب العزة عما یصفون آخر آیۃ تک پھر لا الله دس مرتبہ یہ بعد ہر فرض نماز کے اور ہر روز بعد صبح کی نماز

کے کہے۔

یا اللہ یا واحد یا احد یا جواد انفحنی منک بنفحۃ خیر انک علی کل ماتشاء قدیر گیارہ دفعہ اور اس کو شروع کرے پنجشنبہ سے اس طور سے کہ پہلے حضرت غوث الثقلین قدس سرہ اور سب مشائخ سلسلۂ پہلے پچھلے سب کی فاتحہ دے جیسے اس کو شرط کیا ہے مشائخ نے اور کہے **یا عزیز** ہرروز بعد صبح کے اکتالیس مرتبہ اور **یا الہ الالٰھۃ الرفیع** پندرہ دفعہ اور **یا قیوم فلا یفوت شیٔ من علمہ و لا یؤدہ** ستائیس مرتبہ اور وقت میں گنجائش ہو تو کہے **سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم** سو مرتبہ اور ہر مہینے میں تین روزہ رکھے اور جو زیادہ رکھے اللہ زیادہ کرے اس کو اور جو اپنے نفس میں قوت پائے تو رکھے چھ روزہ عید کے اور بقرعید کے نو روزے اوّل تاریخ سے نویں تک اور ہمارے شیخ امامؒ اپنے اصحاب کو امر کرتے تھے کہ ان دس راتوں کو بیدار رہے، اور قرآن شریف پڑھے ہر رات کو دس سیپارے تو تین رات میں ختم کرے اور دسویں رات کو ایک ختم پورا کرے اس تقسیم سے اور ایام فاضلہ سے عاشورہ ہے اور پندرہویں رات شعبان کی اور رجب کے فضائل وارد ہیں حدیث ضعیف اسناد سے کہ ان پر عمل کرنا مضائقہ نہیں اگر آدمی اپنے میں قوت دیکھے، ان پر عمل کرے اور اللہ کے فضل کی امید پر ان میں سے ایک روزہ پہلی رجب کا ہے جس کا ثواب تین برس کا کفارہ ہے اور دوسرے کا روزہ دو برس کا کفارہ ہے اور تیسرا روزہ ایک برس کا کفارہ ہے، بعد اس کے پھر ہر روزہ ایک ایک مہینے کا کفارہ ہے اور ایک ان میں سے ہے کہ ماہ رجب میں ایک روزہ اور ایک شب ایسی ہے کہ جو اس دن روزہ رکھے اور اس رات کو عبادت کرے تو ایسا ہے جیسے برابر سو برس روزہ رکھے پس وہ واسطے تیسری رجب کے ہے اور بعض ان میں سے یہ ہے کہ جو سات روزے رکھے اس پر سات دروازے دوزخ کے بند ہوتے ہیں۔ اور جو آٹھ روزہ رکھے آٹھوں دروازے جنت کے اس کے واسطے کھل جائیں گے اور جو اپنے نفس میں قوت پائے تو حدیث شریف میں آیا ہے افضل روزہ میرے بھائی داؤد پیغمبر کا ہے کہ وہ ایک دن روزہ رکھتے تھے اور ایک روز افطار کرتے تھے اس کو روایت کیا ترمذی وغیرہ نے ابن عمرؓ سے واسطے شیخ سعید کوکیؒ کے اور کہا شیخ حسن عجمی مکیؒ نے اور مقدور ہو تو زیادہ کرے اس پر سورۂ اخلاص ایک ہزار مرتبہ پڑھے اور ہزار بار درود پڑھے اور ہر روز ہزار بار پڑھے **لا الٰہ الا**

الله وحده لا شریک له له الملک وله الحمد وهو علی کل شی قدیر اور ہر روز صبح کو پڑھے ایک ہزار بار سبحان الله وبحمده۔ انتہیٰ۔

لیکن طریقہ نقشبندیہ کے بہت شعبہ ہیں۔ ملک ہندوستان میں دو جہت سے شائع ہیں تو خواجہ محمد باقیؒ کی جہت سے اور دوسرا میر ابوالعلیٰؒ کی جہت سے اور ملک ماوراء النہر میں مخدوم اعظم مولانا خواجگی کی جہت سے مشہور ہے اور ان سب میں بہت مشہور بموجب تصوف کے رسالوں کے اور اشغال قوم کے بیان کے شعبہ جامیہ ہے اور پھر خواجہ محمد باقی کی جہت سے بہت شعبے ہیں ان میں دو شعبہ بہت مشہور ہیں۔ ایک شعبہ شیخ محمد معصوم کا اور ایک شعبہ شیخ آدم بنوری کا اور ان دونوں میں سے شغل ہیں سوائے اشغال متقدمان طریقہ کے اور اس فقیر کو ان سب شعبوں سے ارتباط صحیح واقع ہے پس ارتباط اس فقیر کو جہت صحبت و بیعت و تلقین اشغال و اجازت خرقہ سے اپنے والد شیخ عبدالرحیم قدس سرہ سے ہے اور ان کو چار مشائخ سے اس طریقہ سے ارتباط واقع ہے۔ پہلے سید عبداللہؒ سے دوسرے امیر ابوالقاسم اکبر آبادیؒ سے تیسرے خواجہ خورد ولد خواجہ محمد باقیؒ سے چوتھے میر نور العلیٰ خلف میر ابوالعلیٰؒ سے تو سید عبداللہ کو شیخ آدم بنوریؒ سے ان کو شیخ احمد سہرندیؒ سے ان کو خواجہ محمد باقیؒ سے اور خواجہ خورد کو شیخ احمد سہرندیؒ سے اور خواجہ حسام الدینؒ سے اور شیخ الہدادؒ اور ان سب کو خواجہ محمد باقیؒ سے اسی سند سے جو مذکور ہو چکی ہے سلسلہ صحبت میں اور میر ابوالقاسم اکبر آبادی الملقب بخلیفہ کو ملا ولی محمد اکبر آبادیؒ سے ان کو میر ابوالعلیٰؒ سے ان کو اپنے چچا امیر عبداللہؒ سے ان کو اپنے ماموں خواجہ عبدالحقؒ سے ان کو خواجہ یحییٰ سے اور ان کو اپنے والد خواجہ عبیداللہ احرارؒ سے اور میر نور العلیٰؒ سے ان کو خرقہ پہنچا ان کو اپنے والد امیر ابوالعلیٰ اکبر آبادیؒ سے اور اس فقیر نے اشغال طریقہ احمدیہ کو ملا محمد دلیل گلیانیؒ سے حاصل کیا انھوں نے اپنے شیخ میر موسیٰ بہٹی کوٹیؒ سے انھوں نے شیخ محمد معصومؒ سے، انھوں نے اپنے والد شیخ احمد سہرندیؒ سے اور اس فقیر کو خرقہ نقشبندیہ حاصل ہوا شیخ ابوطاہر مدنیؒ سے اور ان کو تین مشائخوں سے اپنے والد بزرگوار شیخ ابراہیم کردیؒ سے اور شیخ احمد نخلیؒ سے اور شیخ عبداللہ بصری مکیؒ سے اور شیخ ابراہیم کو ارتباط ہے شیخ احمد قشاشیؒ سے جہت سے تلقین وخرقہ کے ابوالمواہب شیخ احمد شناویؒ سے ان کو شیخ محمد بن محمد بن عبدالرحمٰن تہنیسیؒ سے ان کو مولانا محمد امین ملا جامیؒ کے بھانجے سے ان کو مولانا شیخ غیاث الدین احمدؒ سے ان کو مولانا علاء

الدین محمدؒ سے ان کو مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ سے ان کو مولانا سعید الدین کاشغریؒ سے ان کو مولانا نظام الدین خاموشؒ سے ان کو خواجہ علاء الدین عطارؒ سے ان کو خواجہ بہاء الدین نقشبندیہؒ سے اور شیخ احمد نخلیؒ نے اشغال اس طریق کے حاصل کیے سید میر کلال بلخیؒ سے انھوں نے ملا اکتہ شیر غائیؒ سے انھوں نے ملا خورد عزیزانؒ سے انھوں نے مخدوم الاعظم ملا خواجگیؒ سے انھوں نے مولانا محمد قاضیؒ سے انھوں نے خواجہ عبیداللہ احرارؒ سے اور شیخ عبداللہ بصریؒ نے خرقہ پہنا ہاتھ سے شیخ عبداللہ باقشیر مکیؒ کے ان کو پہنایا تاج الدین سنبھلی نزیل مکہؒ نے ان کو خواجہ محمد باقیؒ نے اسی سند مذکور سے پھر خواجہ نقشبندیہؒ نے حاصل کی، خواجہ عبدالخالق غجدوانیؒ کی روح سے اور خواجہ محمد بابا سماسیؒ اور خلیفہ امیر سید کلالؒ سے اور خواجہ محمد بابا سماسیؒ نے خواجہ عزیزانؒ سے جیسا ہم نے سلسلہ صحبت میں ذکر کیا ہے۔

مگر یہاں ایک اور نکتہ ہے اس سے آگاہ ہو پس شیخ ابو علی فارمدی نے بھی حاصل کیا ہے خواجہ ابوالحسن خرقانیؒ سے انھوں نے شیخ ابو یزید بسطامیؒ سے باطن کے طور پر ظاہر کے طور پر نہیں کیونکہ ولادت شیخ ابو یزید کی خواجہ ابوالحسنؒ کی ولادت سے بہت مدت پہلے ہوئی ہے اور شیخ ابو یزیدؒ نے سیدنا امام جعفر صادقؒ سے باطن کے طریق سے ظاہر کے طریق سے نہیں اس واسطے کہ ولادت شیخ ابو یزیدؒ کی بہت مدت کے بعد ہوئی ہے۔ وفات امام جعفر صادقؒ سے اور امام جعفر صادقؒ نے حاصل کیا دو طریق سے ایک تو اپنے آبا رضی اللہ عنہم کے طریق سے اور وہ ہم ذکر کر چکے ہیں اور دوسرے اپنے نانا قاسم بن محمد بن ابو بکر صدیقؓ سے اور قاسم نے حاصل کیا سلمان فارسیؓ سے اور انھوں نے سیدنا ابو بکر صدیقؓ سے انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے۔ میں کہتا قاسم کا سلمان سے حاصل کرنا ممکن نہیں، مگر باطن کی جہت سے یہ بات ظاہر ہوئی ہے اسماء الرجال کے تتبع سے۔ واللہ اعلم۔

اور حسن بصریؒ نسبت کیے گئے ہیں سیدنا علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے اہل سلوک کے نزدیک یقیناً اگرچہ اہل حدیث اسے ثابت نہیں کرتے اور تحقیق بہت تائید کی ہے شیخ احمد قشاشیؒ نے اہل سلوک کے کلام وافی وشافی سے اپنی کتاب ''عقد الفرید فی سلاسل اہل التوحید'' میں واللہ اعلم۔

جاننا چاہیے کہ گلیانی بفتح کاف فارسیہ اول وتشدید دوم یاء نسبت کی ہے قبیلہ افغانوں میں سے جو پشاور کے دوآبہ میں رہتے ہیں۔ اور قوم یوسف زئی کے چچازادوں میں ہیں، ہی کوٹ

دونوں تا ہندیہ ایک گاؤں ہے توابع جلال آباد سے اور جلال آباد ایک شہر ہے درمیان کابل اور پشاور کے بھنسی بفتح موحدہ والنون اور سین مہملہ بالقصر اور یاء نسبت کی ایک شہر ہے صعید مصر ادفی میں، ملا اکہہ بفتح الف وتشدید کاف عربی وہائی فارسی ابن یمین تخلص کرتے ہیں اور ان کا دیوان مشہور ہے چیرغان بجیم فارسی مضمومہ اور ہاء موحدہ اور راء مہملہ ساکن اور غین معجمہ ایک شہر ہے بلخ سے دو منزل شیرغان اس کی تعریف ہے۔ اور چیرغان لفظ ترکی میں اسے کہتے ہیں جو چیز ایک بعد ایک کے ہو، طول میں مانند قطار کی عزیزان لفظ تعظیم ہے جیسے میران وسیدی وغیرہ کے یاقشیر باللفظ یمن میں حرف نسبت کا ہے کہ کلمہ کے اول آتا ہے جیسے یاء نسبت کی آخر میں آتی ہے۔ سنبھل باء ہندیہ کہ ہا کے شامل ایک شہر ہے گنگا جمنا کے اس طرف قریب جبال شرقی دار الخلافہ دہلی کے کاتب حروف کہتا ہے کہ جب حضرت خلیفہ ابوالقاسمؒ نے مجھے اجازت دی۔ فرمایا کہ ہمارے طریقہ میں فرمان نہیں ہوتا اور وصیتیں نہیں لکھتے ہمارے طریق میں عمدہ کتاب فقرات ہے وہ ہم نے بھی مشائخ سے بطریق عنعن کے حاصل کی ہے اور ہمارے مشائخ اس کے حفظ اور عمل کرنے پر وصیت کرتے آئے ہیں۔ تم وہ میری کتاب سے نقل کرلو پس حضرت والد نے وہ نقل کرلی اور ان کی اجازت اس فقیر کو ہوئی اور اس میں بعض مقام مشکل اس فقیر نے ان سے دریافت کئے اور اس کے اشغال بہت اچھی طرح سیکھ لئے۔ والحمد للہ کاتب حروف کہتا ہے کہ شیخ تاج الدین سنبھلی خلیفہ حضرت خواجہ محمد باقیؒ کا ایک رسالہ ہے مختصر اشغال نقشبندیہ میں والد بزرگوار اس کو بہت پسند فرماتے تھے اور اسے شیخ تاج الدین کے بعض اصحاب سے لیکر اپنے ہاتھ سے نقل کیا تھا اور اسی طور طالبوں کو ارشاد فرماتے تھے۔ اس فقیر نے وہ رسالہ ان سے بحثاً ودرایۃً پڑھا ہے۔ میں نے چاہا اس کو بعینہٖ نقل کردوں اور توفیق اللہ کی طرف سے ہے۔

اشغال نقشبندیہ

الحمدللہ رب العالمین، والصلوٰۃ والسلام علی سیدنا محمد وعلیٰ آلہ وصحبہ اجمعین ۔ جان تو تجھ کو توفیق عطا کرے اللہ تعالیٰ کہ عقیدہ حضرات نقشبندیہ قدس اللہ اسرارہم کا وہ ہی ہے جو عقیدہ اہل سنت وجماعت کا ہے اور طریقہ ہے دوام عبودیت کا جو بغیر ادائے عبادت کے متصور نہیں، اور وہ عبارت ہے اس سے کہ ہمیشہ مع الحق ہو سبحانہ تعالیٰ کہ شعور بالغیر اس کے مزاحم نہ ہو ساتھ فراموشی کے صفت حضور بوجود الحق کے سبحانہ تعالیٰ اور یہ سعادت عظمیٰ بغیر جذبۂ الٰہی کے نہیں حاصل ہوسکتی اور طریق جذبہ میں کوئی بہت قوی سبب نہیں سوائے صحبت ایسے شخص کی جس کا سلوک بطریق جذبہ کے ہو شیخ ابوعلی دقاق قدس سرہ نے کہا ہے کہ جو درخت خودبخود اگتا ہے اس کا ثمر نہیں ہوتا اور جو اس میں ثمر لگا بھی تو اس میں لذت نہیں ہوتی اور سنت الٰہی جاری ہے اس پر کہ کوئی سبب ہو تو جیسے ظاہری توالد وتناسل بے ماں اور باپ کے نہیں حاصل ہوتا اسی طرح توالد معنوی کا حاصل ہونا بغیر مرشد کے مشکل ہے رسالہ مکیہ(۱) میں لکھا ہے **من لا شیخ لہ فالشیطان شیخہ**، یعنی جس کا کوئی مرشد نہیں اس کا شیطان پیر ہے اور یہ طریقہ علیہ نقشبندیہ حاصل کیا ہے اس فقیر نے جو نقصان میں کامل ہے اور معرفت رحمٰن میں عاجز ہے تاج الدین سنبھلی کہ حاصل کیا ہے مہدی زمان خواجہ محمد باقیؒ سے اور انھوں نے ملا خواجگی امکنگیؒ سے، انھوں نے ملا درویش محمدؒ سے، انھوں نے ملا محمد زاہدؒ سے، انھوں نے غوث الاعظم خواجہ عبیداللہ احرارؒ سے، انھوں نے شیخ الشیوخ یعقوب چرخیؒ سے، انھوں

(۱) رسالہ مکیہ غالباً ابوعلی دقاق مرحوم کی تصنیف ہے۔ فتوحات مکیہ تو شیخ بن عربی کی تصنیف ہے جیسا کہ اہل علم واقف ہیں (قاسمی)

نے حضرت خواجہ کبیر خواجہ بہاء الحق والدین معروف بہ نقشبند سے، انھوں نے سید کلالؒ سے، انھوں نے خواجہ محمد بابا سماسیؒ سے، انھوں نے حضرت عزیزانؒ سے، انھوں نے خواجہ علی رامتینیؒ سے، انھوں نے خواجہ محمود خیر فغنویؒ سے، انھوں نے خواجہ عارف ریوگریؒ سے، انھوں نے خواجہ عبدالخالق غجدوانیؒ سے، انھوں نے شیخ یوسف بن یعقوب بن ایوب ہمدانیؒ سے، انھوں نے ابوعلی فارمدیؒ سے، انھوں نے ابوالحسن خرقانیؒ سے اور شیخ ابوعلیؒ کو نسبت جذبہ وصحبت اور استفاضہ کی ہے شیخ ابوالقاسم گرگانیؒ سے بھی اور اس سبب سے محققین کے نزدیک شیخ تین ہوئے ہیں۔

ایک شیخ خرقہ اور ایک شیخ ذکر اور ایک شیخ صحبت اور شیخ صحبت ارتباط میں اکمل اور اتم ہے اور وہی شیخ حقیقی ہے، ہم نے ذکر کیا اسی وجہ ضروری سے شیخ ابوالقاسم کو کہ وہاں جاکر سلوک تمام ہوا شیخ ابوعلیؒ کا اور شیخ ابوالقاسمؒ سے امام علی بن موسیٰ رضاؒ تک درمیان میں واسطے ہیں۔ شیخ ابوعثمان مغربیؒ اور ابوعلی کاتبؒ اور ابوعلی رودباریؒ اور سید الطائفہ جنید بغدادیؒ اور سری سقطیؒ و معروف کرخی رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور معروف کرخی قدس اللہ سرہ کو ایک اور نسبت ہے جو ابوداؤد طائی کو جاملتی ہے حبیب عجمی سے ان کو حسن بصری سے قدس اللہ اسرارہم اور معروف کرخی کی نسبت حضرت باب مدینہ علم یعنی علی تک معروف اور مشہور ہے اور اب میں رجوع ہوتا ہوں آغاز کلام سے۔

پس جاننا چاہئے کہ شیخ ابوالحسن خرقانی نے حاصل کیا ابویزید بسطامی کی روح سے جیسے حضرت اویس قدس اللہ سرہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اور اسی طرح سلطان العارفین کی نسبت ہے، روحانیت امام جعفر صادقؒ سے اور وہ جو مشہور خدمت وصحبت ہے، وہ صحیح نہیں ہے اور امام جعفر صادقؒ نے باوجود اپنے آبا کی وراثت کے انوار اپنے نانا قاسم بن محمد بن ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہم سے حاصل کیا اور ساتویں فقہا سے ہیں۔ تابعین میں علم ظاہر اور علم باطن دونوں میں کامل اور ان کو نسبت ہے، سلمان فارسی سے رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور سلمان رضی اللہ عنہ کو باوجود شرف صحبت نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نسبت طریقہ سے حضرت صدیق رضی اللہ عنہ سے اور ان کو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اور دوسرا طریقہ امام جعفر کو باپ دادا سے وہ مشہور ہے در دروازہ شہر علم یعنی حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک۔

دوسری فصل (۱)

طریق وصول الی اللہ بطور حضرات نقشبندیہ کے یا فقط صحبت سے ہے یا ذکر سے یا مراقبہ سے اور طریق ذکر اس سلسلہ کا یوں ہے کہ ذکر کرے کلمہ طیبہ کا یعنی لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ حبس نفس سے اور گنتی میں طاق عدد کی رعایت رکھے اور جب ذکر اکیس مرتبہ سے گزر جائے اور اس کا کچھ اثر ظاہر نہ ہو تو یہ دلیل ہے اس کے قبول نہ ہونے کی۔ پھر نئے سرے سے ذکر شروع کرے اور ذکر کا اثر یہ ہے کہ جب کہ لا الہ تو وجود بشریہ کی نفی ہو جائے اور جب کہے الا اللہ تو ظاہر ہوں آثار تصرفات جذبہ الٰہیہ کے اور اثر اپنی اپنی استعداد کے موافق ظاہر ہوتا ہے بعضے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کو پہلے غیبت ماسوائے حق سے حاصل ہوتی ہے اور بعضے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کو پہلے مکر اور غیبت اور اس کے بعد عدم کا وجود ثابت ہوتا ہے اور اس کے بعد فنا جیسے شیخ عبداللہ انصاریؒ نے اس آیۃ کی تفسیر میں کہا ہے کہ واذکر ربک اذا نسیت کہ جب بھول جائے تو ماسوائے حق کے پھر بھول جائے تو اپنے ذکر کو پھر بھول جائے تو حق کے ذکر میں اپنے تئیں تو تیرا ذکر کامل ہو گیا اور اعلیٰ اور اتم درجہ ذکر کا فنا ہے یعنی تیری زبان کو خبر نہ رہے ماسوا اللہ کے اور کیفیت ذکر کی یہ ہے کہ زبان کو تالو سے لگائے اور لب کو لب سے اور دانتوں کو دانتوں سے اور حبس دم کرے اور شروع کرے کلمہ لفظ لا کو ناف سے دماغ کی طرف لے جائے اور جب دماغ کو پہنچے تو کہے الہ کو داہنے مونڈھے کی طرف الا اللہ کو بائیں مونڈھے کی طرف پھر اسے قلب صنوبری پر مارے ایسے زور سے کہ اس کا اثر اور حرارت سارے جسم میں معلوم ہو۔

---

(۱) سلسلۂ نقشبندیہ

اور لفظ محمد رسول اللہ کو بائیں طرف سے واہنی طرف کو یعنی ان کے درمیان اور اس کے بعد دل سے یوں کہے الٰہی انت مقصودی ورضاک مطلوبی یعنی اس ذکر سے تو ہی میرا مقصود ہے اور تیری ہی رضا مجھے مطلوب ہے۔ قلب کی توجہ سے ایسی طرح کہ دل میں اثر معلوم ہو اور دل اس سے متاثر ہو اور یہ سب اس طرح سے ہو کہ ظاہر میں حرکت نہ معلوم ہو جو کوئی پاس بیٹھا ہو وہ بھی نہ جانے اور حبس نفس کرے ایک بار ذکر کرے یا تین بار طاق عدد کی رعایت کرے اور حضرت خواجہ قدس سرہ نے کلمہ طیبہ کے معنی یوں فرمائے ہیں لا الٰہ نفی ہے آلھوں کی طبیعت سے اور الا اللہ اثبات ہے معبود کی محمد رسول اللہ اس کے معنی یہ ہیں کہ تو نے اپنے تیئں داخل کیا مقام فاتبعونی بالحق میں اور اس سلسلہ کے بعضے بزرگوں نے کہا ہے کہ معنی کلمہ طیبہ کے یہ ہیں کہ مبتدی تصور کرے لا الٰہ یعنی لا معبود اور جو متوسط ہوں خیال کرے لا مقصود اور منتہی سمجھے کہ لا موجود الا اللہ کا ملاحظہ ہووے اور بزرگوں نے کہا ہے کہ جب منتہی ہو جائے سیر الی اللہ اور قدم رکھے بیچ سیر فی اللہ کے اور ملاحظہ کرے لا موجود الا اللہ کا تو یہ کفر ہے اور بعضوں نے اس کے معنی کہے ہیں لا متصرف فی الملک والملکوت الا اللہ اور ضرور مناسب ہے کوشش کرنی ذکر کی مداومت کی کسی حال اور کسی وقت نہ ترک کرے۔

کھڑے نہ بیٹھے نہ باتیں کرتے، نہ سوتے۔ اور جو ذکر میں یا شیخ کی مجلس میں کچھ کیفیت حاصل ہو تو اس کو فرض کرے جیسے ایک خط مستقیم۔ اور جب یہ معنی خیال میں بس جاوے اور خیال اسی ایک امر میں مشغول ہو جاوے تو یہ جمعیت کے واسطے بہت مدد کرتا ہے اور بعض بزرگوں نے کہا ہے کہ جب ایک بال بھی بدن سے متغیر ہو جائے خیال کے واسطے اور اثر معلوم ہو تو چاہئے کہ اس کو چھوڑے نہیں یہاں تک کہ حاصل ہو جائے تعطیل جیسے بعض بزرگوں نے کہا ہے کہ الشغل ھو عدم الشغل وعدم الشغل ھو الشغل اور ملا سعد الدین کاشغری رحمۃ اللہ علیہ (۱) نے کہا ہے کہ شیخ عبد الکبیر یمنیؒ نے مجھ سے پوچھا کہ ذکر کیا ہے میں نے کہا کہ لا الٰہ الا اللہ کہا یہ تو عبارت ہے ذکر نہیں ہے۔ پھر میں نے کہا کہ آپ فرمائیے تو کہا ذکر یہ ہے کہ تم جانو یہ کہ تم اس کے وجدان پر قادر نہیں ہو اور سید الطائفہ جنید نے فرمایا ہے کہ تصوف یہ ہے کہ ایک ساعت معطل بیٹھے کل شی

---

(۱) کاشغر ایک ثقافتی شہر تھا جو اب چین میں واقع ہے۔ (قاسمی)

کے ملاحظہ سے اور شیخ الاسلام نے کہا کہ اس کے ملاحظہ میں حاصل ہوتا ہے۔ وصال بغیر جستجو کے اور دیدار بے نظیر کے اور مقصود صوفیہ کے طریقہ علیہ کا حصول ہے مشاہدہ حق کا کانک تراہ اور اس حضور کا نام انھوں نے مشاہدہ بالقلب رکھا ہے اور دیکھنا جو ہوتا ہے وہ سر کی آنکھوں سے ہوتا ہے اور فرق روایت اور مشاہدہ میں یہ ہے کہ رویت میں قادر نہیں ہوتا کہ اسے اپنے سے دور کرے اور مشاہدہ میں اختیار ہے۔

دوسرا طریق حضرات نقشبندیہ کا وصول کے سبب اور معرفت کے حصول میں اور وہ بہت آسان اور بہت قریب ہے سو وہ کیا ہے توجہ اور مراقبہ ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ معنی مقدس جو بغیر کیف اوران کی مثال نہیں مفہوم ہے، اللہ کے نام مبارک کا بے واسطہ عبارت عربیہ یا عبریہ یا فارسیہ وغیرہ اس کا لحاظ اور اس کی حفاظت کرے اپنے خیال میں اور متوجہ ہو تمام قوتوں اور مدرکوں سے قلب صنوبری کی طرف اور اس پر مداومت کرے اور تکلف کرے اس کے لازم کر لینے کو یہاں تک کہ کلفت درمیان سے جاتی رہے اور اس امر کا ملکہ ہو جائے اور بعض بزرگوں نے نقشبندیہ کے کہا ہے کہ معنی مقصود کے یہ ہیں کہ بیخودی ہو جائے پھر خیال کرے اس کو ایک نور بسیط کی صورت میں جو احاطہ کئے ہوئے ہے سب موجودات علمیہ وغیبیہ کو اور اس کو بصیرت کے مقابلہ کرے اور باوجود اس کی حفاظت کے قلب صنوبری کی طرف متوجہ ہو اپنے تمام قویٰ سے اور تدارک کرے اس امر کا کہ بصیرت قویٰ ہو جائے اور صورت جاتی رہے اور مترتب اس امر پر ظہور معنی مقصود کا حضرت خواجہ عبیداللہ احرارؒ نے فرمایا ہے کہ مراقبہ باب مفاعلہ ہے تو ضرور ہے تراقب دونوں طرف سے تو بس مراقبلہ کرنے والے کو ضرور چاہئے یہ کہ ہو مراقب اپنی اطلاع کا حق سبحانہ کے مطلع ہونے سے اس کے حال پر اور اس کی مداومت کرے اور یا مراقب ہو اپنی اطلاع کا اپنے موجد پر بلافتور اور پریشان خاطری کے اور ایک اور یہ طریق ہے کہ اپنے قلب صنوبری کا مراقب ہو اور اس میں کوئی خطرہ نہ آنے دے یہاں تک کہ اس کو اپنے قلب حقیقی سے ربط آسان ہو جائے بدون ملاحظہ معنی مفاعلہ کے اور مراقبہ کا طریق بہت اعلیٰ ہے۔ نفی اثبات کے طریق سے اور بہت قریب ہے جذبہ الٰہیہ سے اور مراقبہ کے طریق سے ممکن ہے وصول وزارت کا اور ملک وملکوت میں تصرف کا اور ممکن ہے معلوم کر لینا لوگوں کی دل کی باتوں کا اور دوسرے کی طرف بخشش کی نظر کرنے کا اور اس کے

باطن کو منور کرنے کا اور مراقبہ کے ملکہ سے جمعیت دائمی حاصل ہوتی ہے اور لوگوں کے دل کا ہمیشہ مقبول ہوتا ہے اور اسی بات کو کہتے جمع وقبول۔

اور تیسرا طریق رابطہ ہے اس شیخ سے جو مشاہدہ کے مقام کو پہنچا ہوا ہے اور تجلیات ذاتیہ سے متحقق ہوا ہے اس واسطے کہ اس کی رویت بموجب اس کے کہ اذا راوا ذکر اللہ ذکر کا فائدہ دیتی ہے اور اس کی صحبت بموجب اس کے کہ ہم جلساء اللہ اس صحبت مذکور کا فائدہ دیتی ہے اور جب ایسے عزیز کی صحبت میسر ہو جائے اور اپنے نفس میں اس کا اثر معلوم ہو تو چاہئے کہ اس کی حفاظت کرے جو اثر مشاہدہ کیا ہے جہاں تک کہ تجھ سے ممکن ہو اور جو اس میں فتور آجائے تو اس شیخ کی مصاحبت کی طرف رجوع ہو کہ پھر تجھ کو حاصل ہو اس کی برکت سے وہ اثر اور اسی طور کیا کرتا کہ وہ کیفیت ملکہ ہو جائے اور جو اس عزیز کی صحبت سے یہ اثر ظاہر نہ ہو لیکن اس سے محبت اور انجذاب حاصل ہو۔

تو چاہئے کہ اس کی صورت خیال میں رکھے اور قلب صنوبری کی طرف متوجہ ہو تاکہ حاصل ہو غیبت اور فنا نفس سے اور اگر وقفہ ہو جائے ترقی میں تو چاہئے کہ صورت شیخ کی اپنے داہنے مونڈھے کی طرف خیال کرے اور اپنے قلب کو ایک امر ممتد اعتبار کرے داہنے مونڈھے تک اور شیخ کو اس امر ممتد کے ساتھ اپنے قلب میں لائے اور امید ہے کہ اس سے حضور غیبت اور فنا کی (۱)۔

---

(۱) یہ صوفیا کا طریقہ ہے صوفیا کا بعض طریقہ عام انسانوں اور تصوف سے تعلق نہ رکھنے والوں کے لئے ناقابل فہم ہوتا ہے اور بظاہر غیر اسلامی محسوس ہوتا ہے۔ مگر حضرت شاہ صاحب اس کو قرآن وحدیث سے مستنبط کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ (قاسمی)

تیسری فصل (۱)

حضرت خواجہ عبدالخالق غجدوانیؒ کے کلمات قدسیہ ماثورہ کے بیان میں، اور وہ گیارہ کلمے ہیں جن پر نقشبندیہ کے طریقہ کی بنا ہے، سو وہ یہ ہیں۔ یاد کرد، باز گشت، نگاہ داشت، یادداشت، ہوش دردم، سفر در وطن، نظر بر قدم، خلوت در انجمن، وقوف زمانی، وقوف عددی، وقوف قلبی، اور چونکہ خواجہ عبدالخالق اس طریقہ کے سرحلقہ ہیں تو ان کے الفاظ مصطلح کا بیان ضرور ہے ہم ان کی شرح کرتے ہیں۔ اجمال و تفصیل کے درمیان وہ یہ ہے۔

یاد کرد: کہتے ہیں، ذکر زبان یا ذکر قلب کو یعنی ہمیشہ وہ ذکر کیا کرے، جو شیخ نے بتایا ہے تاکہ حضور حق حاصل ہو، اور طریقہ تعلیم ذکر کا یہ ہے کہ پہلے شیخ آپ کلمہ طیبہ کا ذکر کرے اور مرید اپنے قلب کو شیخ کے قلب کے مقابل کرے اور کھلی رکھے دونوں آنکھیں اپنی اور منہ بند کر لے جیسے ہم پہلے بتا چکے ہیں۔ حضرت خواجہ بہاء الدین قدس سرہٗ نے فرمایا ہے کہ مقصد ذکر سے یہ ہے کہ ہمیشہ قلب حاضر مع الحق ہو محبت اور تعظیم کے ساتھ، اس لئے کہ غفلت کو دفع کرتا ہے۔

باز گشت: یعنی ذاکر جب قلب سے ذکر کرے کلمہ طیبہ کا اس کے بعد زبان سے کہا، الٰہی انت مقصودی و رضاک مطلوبی یعنی اس ذکر سے الٰہی تو ہی میرا مقصود ہے اور تیری ہی رضا مطلوب ہے اس واسطے کہ یہ کلمہ فائدہ دیتا ہے ہر خطرہ اچھے اور برے کی نفی کا تاکہ ذکر خالص ہو جائے اور سر فارغ ہو جائے ماسوائے حق سے اور جو ذاکر اخلاص نہ پائے اس کلام میں تو مرشد کی تقلید کی رو سے کہے تو اس کی برکت سے اخلاص ہو جائے گا انشاء اللہ تعالیٰ۔

---

(۱) کلمات قدسیہ کی شرح و بیان میں

نگاہداشت: اور یہ عبارت ہے، خطروں کے مراقبہ کا یعنی جب دل میں کلمہ کی تکرار کرے تو اس کی رعایت کرے کہ کوئی خطرہ دل میں نہ آئے، اور اس میں کوشش کرے کہ اس کے دل میں کوئی خطرہ نہ آئے غیر کا ایک ساعت یا دو ساعت کیونکہ یہ امر بہت ضرور ہے بزرگوں کے نزدیک اور بعض کامل اولیا کبھی کبھی یہ بات حاصل ہوتی ہے۔

یادداشت: دوام حضور مع الحق کو بطریق ذوق کے اور بعض بزرگوں نے ان چار کلموں کی یوں شرح کی ہے، یاد کرد یعنی ذکر میں تکلف۔ بازگشت یعنی اللہ سے رجوع از راہ عجز کے نگاہداشت یعنی اس رجوع کی حفاظت، یادداشت یعنی سر کو راسخ کرے۔

ہوش دردم: یعنی اس طریقہ کی بنا اس امر پر ہے، اس کی حفاظت کرے درمیان دونوں نفسوں کے نہ غفلت سے داخل ہو کوئی نفس نہ نکلے غفلت سے کوئی سانس۔

سفر در وطن: یعنی سالک کا سفر طبیعت بشریہ میں ہے یعنی بری صفتوں کو چھوڑ کر اچھی طرح اختیار کرے جیسا کہ کہا ہے۔ بعضے بزرگوں نے یعنی آدمی کسی مکان کو جائے اس کی صفتیں بری اس کے ساتھ ہوتی ہیں جب تک ان سے نہ نقل کرے اور بعضوں نے کہا ہے کہ عیب کو دیکھے شہادت میں۔

نظر بر قدم: یعنی سالک کو چاہئے کہ اس کی نظر قدم پر ہو شہر میں چلے پھرے یا جنگل میں اس لئے کہ اس کی نظر متفرق نہ ہو جائے اور جس نے دیکھنا چاہئے اسے نہ دیکھے اور اس کا قلب متفرق ہو جائے اور یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ سالک کی نظر اول ہی مرتبہ سلوک کے نہایت پر ہو یعنی فقط حضرت ذات کی طرف جیسا فارس بن عیسیٰ بغدادی کا قول ہے کہ میں نے حلاج سے سوال کیا میں نے کہا مرید کون ہے انھوں نے کہا هو الرامی باول قصده الی الله فلا یعرج علی الشیٔ حتی یصل. اور احتمال ہے کہ ہو مراد اس سے وہ معنی جو شیخ رویم نے فرمایا ہے۔ ادب المسافران لایجاوز ہمتہ قدمہ یعنی مسافر کا ادب یہ ہے کہ اس کی ہمت کا قدم پیچھے نہ پڑے۔

خلوت در انجمن: یعنی سالک کو چاہئے کہ بظاہر خلقت کے ساتھ ہو اور باطن میں خالق کے ساتھ ساتھ کام میں اور دل حق سے رجوع اور کیا خوب کہا اس معنی میں یہ شعر

فمن داخل کن صاحبا غیر غافل

ومن خارج خالط کبعض الاجانب

بعض بزرگوں نے کہا ہے کہ اس طریقہ میں کہ جمعیت ہے اور تفرقہ ہے خلوت میں۔

وقوف زمانی: کہ اپنے اوقات کا حساب رکھے اگر اعمال خیر میں گزرے اس کا شکر کرے اور جو اعمال بد میں گزرے استغفار کرے اپنے اپنے مرتبہ کے موافق کیونکہ ان حسنات الابرار سیئات المقربین یعنی نیکیاں ابرار کے مقربین کے برائیاں ہیں۔

وقوف عددی: یعنی رعایت عدد کے ذکر قلبی میں جمعیت کے ساتھ متفرق خطرے نہ آئیں

وقوف قلبی: یعنی ہوشیاری اور حضور قلب کا اللہ جل شانہ کے ساتھ ایسی وجہ سے کہ قلب کو غیر حق سے کچھ غرض نہ ہو اور یوں بھی کہا ہے کہ ذاکر اپنے قلب سے واقف ہو یعنی ذکر کے درمیان قلب صنوبری کی طرف متوجہ ہو جس کو مجازاً قلب کہتے ہیں، وہ بائیں طرف ہے پستان کے مقابل اس کو ذکر میں مشغول کرے، ذکر سے غافل نہ ہونے دے اور اس کے معنی سے اور حضرت خواجہ نقشبند نے حبس دم نہیں لازم کیا اور نہ رعایت عدد کے ذکر میں لیکن وقوف قلبی ان کے نزدیک لازم ہے ذکر ہے یا رابطہ وغیرہما میں اور مقصود ذکر سے وقوف قلبی ہے اور کیا اچھا کہا کسی نے یہ شعر اس معنی میں۔

علی بیض قلبک کن کانک طائر

ممن ذلک الاحوال فیک تولد

(اپنے دل کے بیضہ پر رہ ایسا جیسا پرند اس امر سے تجھ میں حال پیدا ہوں گے)۔

چوتھی فصل (۱)

جب ذکر اور اشغال کے درمیان تفرقہ یا وسواس یا قبض معلوم ہو تو چاہیے کہ سرد پانی سے غسل کر ڈالے اور جو ٹھنڈے پانی پر قدرت نہ رکھے اپنے مزاج کے سبب تو گرم پانی سے نہا ڈالے اس کے بعد خلوت میں داخل ہو اور دو رکعتیں پڑھے اور بہت گریہ وزاری و عاجزی سے استغفار کرے اور اپنے حال اور وقت کی طرف متوجہ ہو، اور جو اپنا وقت نہ پائے اور وہی تفرقہ رہے تو تصور باندھ اپنے شیخ کا اپنے خیال میں جو تیرا مربی ہے کیونکہ امید ہے کہ اس کی برکت سے تفرقہ جاتا رہے اور جمعیت حاصل ہو، اور جو اس پر بھی تفرقہ نہ جائے تو کہے یا فعال تشدید کے ساتھ اور جو اس سے بھی تفرقہ نہ جائے تو کہے کہ یہ تفرقہ خدا کی طرف سے ہے اس سے موافقت کرے تو آپ عین جمعیت میں ہو جائے اور ایسا بہت کم ہے کہ تفرقہ اس لحاظ سے بھی رہے اور جو ایسا خطرہ آئے کہ متعلق اعمال سے ہے جیسے رغبت گھوڑے خریدنے کی یا اور کچھ جو شرع میں مباح ہے تو وہ کام کرے یا اسے اپنے قلب سے نکال ڈالے یہاں تک کہ اس خطرہ کو دشمن جان لے، اور کوشش کرے اس کے دفع کی اور تین خطروں کی نفی کرنی مرید کو لازم ہے خطرۂ نفسیہ وخطرۂ شیطانیہ وخطرۂ ملکیہ اور خطرۂ حقائق کو قائم رکھے اور خطروں کو پہچاننا اور تمیز کرنا بہت مشکل ہے اور بعض بیان کرتے ہیں کہ خطرۂ نفسی ارض قلب سے پیدا ہوتا ہے یعنی قلب کے نیچے سے اور خطرۂ شیطانی قلب کے بائیں طرف سے اور خطرۂ شیطانی قلب کے بائیں طرف سے اور خطرۂ ملکیہ قلب کے دائیں طرف سے اور جو خطرۂ حقانی ہوتا ہے وہ فوق قلب سے یعنی اوپر کی جانب سے ہوتا ہے اور

---

(۱) در بیان دفع وسوسہ

اسے وہ جان لیتا ہے جو صاحب تقویٰ اور زاہد اور پرہیزگار اور حلال طیب کھاتا ہو اور ہمیشہ خطروں کی نگہبانی کرتا ہوا پنے دل میں خطرہ کو آنے نہ دیتا ہو اور مقصود یہ ہے کہ وقت کی رعایت رکھے کیونکہ کوئی شئے وقت سے زیادہ عزیز نہیں ہے کیونکہ وقت سیف قاطع ہے جب وقت گیا تو پھر ہاتھ نہیں آتا اور ممکن ہے حفظ اوقات ذکر اور مراقبہ اور نماز اور تلاوت قرآن شریف سے اور نقشبندیہ بزرگوں نے سب وظیفوں میں تلاوت قرآن شریف سے اختیار کیا ہے رات کو **الحمد** اور **قل یا ایھا الکافرون** اور **قل ھو اللہ** اور **قل اعوذ برب الفلق** اور **قل اعوذ برب الناس** اور سورۂ حشر کا خاتمہ اور سورۂ بقر کا خاتمہ اور دن کا وظیفہ تلاوت قرآن شریف کا سورہ یٰسین اور حضرت خواجہ علی رامیتنی نے فرمایا ہے کہ جب تین قلب کسی مراد کے واسطے متفق ہو جائیں تو وہ مومن بندہ کے مراد حاصل کرنے کو کافی ہیں، قلب بندہ اور قلب رات کا اور قلب قرآن مجید کا یعنی تہجد کی نماز میں سورۂ یٰسین کو اخلاص دلی سے پڑھا مراد حاصل ہوئے اور نماز نوافل میں سے ایک تہجد اور نماز اشراق اور نماز استخارہ اور نماز چاشت اور تہجد کی بارہ رکعتیں ہیں۔

اگر ممکن ہو تو ہر رکعت میں سورۂ یٰسین پڑھے اور نہیں تو سورۂ یٰسین کو آٹھ رکعتوں میں اس ترتیب سے پورا کرے کہ پہلی رکعت میں **واجر کریم** تک اور دوسری میں **وھم مھتدون** تک اور تیسری میں **جمیع الدنیا محضرون** تک اور چوتھی میں **فلک یسبحون** تک اور پانچویں میں **ولا الی اھلھم یرجعون** تک اور چھٹی میں **ھذا صراط مستقیم** تک اور ساتویں میں **فھم لھا مالکون** تک اور آٹھویں میں سورۂ کے آخر تک اور باقی رکعتوں میں سورۂ فاتحہ کے بعد سورۂ اخلاص تین تین مرتبہ اور جو سورۂ یٰسین حفظ نہ ہو تو سورۂ فاتحہ کے بعد ساری نماز میں تین تین بار سورہ اخلاص پڑھے اور نماز تہجد چار رکعت سے کم نہ پڑھے اور نماز تہجد کا وقت اخیر تہائی رات ہے جیسا خدا تعالیٰ فرماتا ہے **قم** (۱) **اللیل الا قلیلا نصفحه او نقص منه قلیلا او زد علیه** اور صاحب قوۃ القلوب (۲) نے کہا ہے کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے **فتھجد به نافلة لک** اور فرمایا **کانوا قلیلا من اللیل مایھجعون** اور ہجوع نیند کو کہتے ہیں اور تہجد قیام کو تو تہجد

---

(۱) کھڑا رہ رات کو مگر کسی رات آدھی رات یا اس سے کم کر تھوڑا سا یا زیادہ اس پر۔

(۲) ''قوت القلوب'' کس بزرگ کی کتاب ہے، اس کا علم نہ ہو سکا ہے اس کی تحقیق کی ضرورت ہے۔ (قاسمی)

جب تک سوئے نہیں جائز نہیں اور کتاب شعی میں ہے کہ تہجد نہیں ہوتی مگر بعد سونے کے اور تہجد صلوۃ النوم ہے۔اور روایت ہے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے **قم من الليل قدر حلبة شاة** (۱)اور جب نماز مذکور پڑھ لے تو بیٹھے جلسہ التحیات کا قبلہ رو ہو کر صبح تک اور مشغول رہے توجہ میں مراقبہ میں یا ذکر میں اور جو نیند غلبہ کرے،تو سو رہے مگر صبح سے پہلے اٹھ کھڑا ہو اور وضو کرے اور سنتیں صبح کی نماز کی، اپنے گھر میں پڑھے اور مشغول ہو استغفار میں بطریق خفیہ کے جیسا اس سلسلہ کا طریقہ ہے اور مسجد کو استغفار پڑھتا ہوا جائے رستے میں اور جب نماز صبح جماعت سے پڑھ چکے تو اپنی جگہ میں بیٹھا رہے مشغول وظیفہ باطن میں جو جمعیت پائے اور نہیں تو اپنے گھر آ جائے اور مشغول ہو اپنے وظیفہ میں یہاں تک کہ آفتاب طلوع ہو اور اس کے بعد دو رکعت نماز اشراق پڑھے اور ہر رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد سورۂ اخلاص تین بار پھر اس کے بعد دو رکعت نماز استخارہ پھر اس کے بعد دعائے استخارہ اور وہ یہ ہے **اللهم خرلي واخترلي ولا تكلني الى اختياري اللهم اجعل الخيرة في كل قول وعمل اريده في هذ اليوم والليلة اللهم وفقني لما تحب وترضى من القول والعمل في عافية ويسر** اس کے بعد جو اس کو کوئی کام ضروری دینے کا ہو جیسے معاش کے لئے اس کے لئے جائے ساتھ حضور اور ہوشیاری کے اور یہ دعا پڑھے **اللهم كن وجهتي في كل جهة ومقصدي في كل قصد وغايتي في كل سعي وملجائي وملاذي في كل قصدة وهم ووكيلي في كل امر وتولني تولي محبة وعناية في كل حال** اور ہمیشہ قلب صنوبری سے متوجہ رہے جیسا خدا تعالیٰ نے فرمایا۔ **رجال لا تلهيهم تجارة ولا بيع عن ذكر الله** اور جب دنیاوی کاموں سے فارغ ہو وضو کرے تازہ اور خلوت میں داخل ہو اور پہلے جب بیٹھے اپنے شیخ کی رویت حاضر کرے، پھر مشغول ہو اپنے وظیفہ سے مراقبہ سے یا ذکر سے اور نماز چاشت کی بارہ رکعتیں ہیں، ہر رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد تین تین بار سورۂ اخلاص اور دو رکعت سے کم نہ پڑھے اور اول وقت چاشت میں نہ چاہیے پڑھنی بلکہ تاخیر کرے اتنی کہ پھر بھر دن چڑھ جائے اس واسطے کہ مشکوۃ شریف میں زید بن ارقمؓ سے ہے تحقیق دیکھا انھوں نے ایک قوم کو کہ وہ نماز چاشت پڑھتے تھے، پس کہا اور لوگوں

---

(۱) اٹھ تو رات کو بقدر بکری کے دودھ دوہنے کے۔

نے جانا ہے کہ تحقیق نماز اس وقت میں اس سے بہتر ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ نماز اوابین جس وقت کہ گرم ہو فصال پڑھنی چاہیے۔

روایت کی مسلم نے اور رمض کے معنی ہیں شدت گرمی کی تاب آفتاب سے ریت وغیرہ پر یعنی جس وقت پائے فصیل گرمی آفتاب کی اور فصیل اونٹ کے بچہ کو کہتے ہیں اور بعد نماز کے جو موجود ہو کھانا کھاوے جو یاروں کے ساتھ مل کے کھائے تو بہت اچھا ہے اور نہیں اپنے گھر والوں کے ساتھ کھائے، بیوی بچوں کے ساتھ اور حتی المقدور اکیلا نہ کھائے پھر اس کے بعد قیلولہ کرے یعنی سورہے پھر مسجد میں حاضر ہو۔

اوّل وقت اور عصر کو بھی اول وقت حاضر ہو مسجد میں اور نماز عصر کے بعد اپنے مکان میں بیٹھے اور شغل کرے وظیفہ باطنی کا اور حتی الامکان اس وقت کو ضائع نہ کرے اور اس میں اپنے نفس سے محاسبہ کرے اور مغرب اور عشا کے درمیان کے وقت کی حفاظت اولیا کے نزدیک سب سے زیادہ ضروری ہے اور عشا کے بعد اپنے بسر میں پڑھے، **قل یا ایھا الکفرون** اور سورۂ اخلاص اور معوذتین اور آخر سورۂ حشر اور آخر سورہ بقر کا ساتھ حضور کے اور سورہے شغل کرتا ہوا ذکر کا اور سونے پہلے یہ استغفار تین بار پڑھے، استغفر اللہ الذی لا الہ الا ھو الحی القیوم واتوب الیہ اور یہ حال ہے ایسے صوفی کا جو کاروبار میں رہتا ہو اس صوفی کا نہیں جو فارغ البال ہو کہ اس کو چاہیے کہ وہ رات دن مستغرق ومستہلک حق میں رہے جیسا کہا ہے شیخ ابوالعباس قصابؒ نے کہ میرے نزدیک نہ شام ہے نہ صبح کا اس کا باطن غرق ہوتا ہے دریائے فنا میں اور اس کا ظاہر حاضر ہے واسطے صادر ہونے احوال وافعال کے اور اہل فنا وبقا بعد طلب ومجاہدہ کے مشرف ہیں وصول سے طمانیت دل اور سرور اور مشاہدہ کے اور وہ اپنی عین مراد ہیں اور مراد سے پھر گئے ہیں بغیر مراد کے اور انھوں نے مقامات وکرامات کو حجاب سمجھا ہے اور اپنے مشرب کو بہت دور کر دیا ہے تمام خط جسمانی اور روحانی سے اور فنا کا وصول علامت ہے حقیقت محبت ذات کے وصول کی اور مقام فنا محض بخشش اور اختصاص الٰہی میں اور سنت الٰہی اس طرح جاری ہے اور عطا محض کہ بخشش کی حقیقت وہی ہے عاریت نہیں ہوتی تو ایسے سبب سے اس میں رجوع نہیں ہے اور اسی واسطے کہا ہے اولیا نے کہ **الفانی لا یرد الی اوصافہ** اور کہا کہ ہے **ذو النون مصری قدس سرہ، ما رجع من رجع الا من الطریق**

وماوصل اليه احد فرجع عنه ۔ ذوالنون مصری نے کہا: نہیں لوٹا جو لوٹا مگر راستہ سے اور نہیں پہنچا اس کی طرف کوئی پس وہ اس سے واپس آیا ہو۔

پانچویں فصل (۱)

حضرت خواجہ نقشبند قدس سرہ سے سوال کیا گیا کہ فنا کتنی وجہ پر ہے تو فرمایا دو وجہ پر ہے اگرچہ بزرگوں نے کہا ہے کہ اس سے زیادہ وجوں پر ہے لیکن جس کا مرجع ان دو وجہوں پر ہے اوّل تو فنا وجود ظلماتی طبیعی سے اور دوسری فنا وجود نورانی وحی سے اور حدیث شریف نبویؐ ان دو وجہوں پر ناطق ہے کہ ان اللہ سبعین الف حجاب من نور و ظلمۃ پس فنا پہلے تو بواسطے ظہور حق سبحانہ کے ہے اور دوسری یہ کہ فنا بھی جاتی رہی یعنی باقی نہ رہی وجود نورانی کے لئے کچھ شعور اس لئے کہ شعور تو وجود روحانی کی صفتوں میں سے ہے اور اس کو لازم ہے کہ جس وقت شعور کا شعور جاتا رہا تو لازم آیا وجود روحانی کا جانا اس مقام میں روح ذاکر ہے اور قلب ساجد ہے اور اس مقام میں سالک کی صحبت صحیح ہے لیکن اس کی ترتیب اور مرید کو اس کی طلب صحیح نہیں ہے اور ذکر قلب یہ ہے کہ جو حضور حق سبحانہ کا اور حضور خلق کا اس کی نسبت برابر یعنی اس میں اس کے ساتھ وہ ہو اور ذکر زبان کے بیان کرنے کی کچھ حاجت نہیں اور ذکر روح یہ ہے کہ جو حضور حق سبحانہ کا غالب او پر اس حضور کے جو خلق کے ساتھ ہے اور ذکر سر یہ ہے کہ اس کو حضور غیر حق سبحانہ کے ہووے ہی نہیں اور کچھ زمانہ سے خبر نہ ہو اور ذکر خفی یہ ہے کہ چھپ جاوے روح کا وجود جیسے سر میں موجودات تو باقی نہ رہے سوائے مذکور کے اور حاصل یہ ہے کہ غیر بالکل جاتا رہے ہر وجہ سے خفا میں تو اس مقام میں متحقق ہوتی ہے سیر فی اللہ تو تحقیق بندہ کو بعد فنا مطلق کے جو ایسی ہے کہ فنا ذات و فنا صفات سے خلعت ہوتا ہے وجود حقانی یہاں تک کہ مشرف ہوتا ہے۔

---

(۱) فنا اور بقا میں

اس وجود سے اوصاف الٰہیہ کے ساتھ اور متخلق ہوتا ہے اخلاق ربانیہ کے ساتھ اور اس مقام میں متحقق ہوتا ہے بی یسمع(۱) وبی یبصر وبی یبطش وبی یمشی وبی یعقل کا کیونکہ ذات وصفات فانیہ اس مقام میں بدل جاتی ہے لباس وجود باقی سے خارج ہوتی ہیں قبر پوشیدگی سے ظہور کے محشر میں اور جذبات حق کے تصرف اس وقت برابر ہوتے ہیں بندہ کے باطن پر اور اس کے باطن سے جاتی رہتی ہیں سب وسوسے اور برے خطرے اور اس وقت اس میں حق تصرف کرتا ہے اپنی صفاتوں سے اور معزول کر دیتا ہے اس کو بالکل اس کے تصرف سے کہ وہ اپنے میں آپ تصرف نہیں کرتا اور اس وقت ہو جاتا ہے بندہ محفوظ وظائف شرعیہ امر و نہی کے مجاوزت سے اور یہ دلیل ہے صحت حال فنا و بقا کی۔ شیخ ابوسعید خرازؒ نے کہا ہے اسی معنی میں کل باطن(۲) یخالفه الظهور فهو باطل اور بعد تحقیق فنا و بقا کے یعنی سیر الی اللہ وسیر فی اللہ کے جو فنا کے بعد ہے متحقق ہوتی ہے سیر عن اللہ کے جو فنا کے بعد ہے متحقق ہوتی ہے سیر عن اللہ اور سیر باللہ کہ وہ مقام تنزل ہے خلق کی عقلوں کی رسائی کا کہ وہ دعوت کرتے ہیں حق کی طرف اور یہ مقام ہے خواص انبیاء اور مرسلین کا اور مقام تنزل میں یہ رجوع ہوئے ہیں ہر امر میں حق کی طرف زاری اور استغفار کرتے ہوئے اور اولیا کو اس مقام میں انبیا کی متابعت میں حصہ ملا ہے جیسا خدا فرماتا ہے قل(۳) هذه سبیلی ادعوا الی الله علی بصیرة انا ومن اتبعنی اس واسطے کہ شیخ ایسا ہوتا ہے جیسے نبی اپنی قوم میں اور اس مقام میں مرید کی طلب اور تربیت صحیح ہے بشرط اجازت شیخ کے اور اس مقام میں ہر تصرف اس کے فعل کا اگرچہ اس کی طرف منسوب ہے، لیکن وہ اس کا نہیں اس واسطے کہ وہ تو تصرفات بشریہ سے بالکل معزول ہے۔ وما رمیت(۴) اذ رمیت ولکن الله رمیٰ ممکن ہے کہ اسی معنی میں ہو۔

---

(۱) مجھ سے ہی سنتا ہے مجھ سے ہی دیکھتا ہے مجھ سے ہی حملہ کرتا ہے مجھ سے ہی چلتا ہے مجھ سے ہی سمجھتا ہے۔

(۲) جو باطن ظاہر کے خلاف ہے وہ باطل ہے۔

(۳) کہہ دو کہ میں اور میرے پیرو اللہ کی طرف بلاتے ہیں بصیرت کے واسطے اور یہ میرا طریقہ ہے۔

(۴) اور نہیں پھینکا تو نے جبکہ پھینکا تو نے لیکن اللہ تعالیٰ نے پھینکا۔

چھٹی فصل (۱)

مرید کے باطن میں تصرفات کرنے کے طریق میں اور دفع مرض میں ایسا مرض کہ واقع ہوا ہے لوگوں پر اس کے دو طریقے ہیں ایک تو یہ ہے کہ جس وقت کسی کو بیماری ہو یا کسی گناہ میں مبتلا ہو جائے تو وضو کرے اور دو رکعتیں پڑھے اور اللہ سے بہت عجز وانکسار کے ساتھ رجوع ہو اور اس میں طلب کرے اللہ سے کہ اس شخص کو پاک کردے اس سے جو اسے عارض ہوئی ہے اور دور کردے اس سے اور دوسرا طریق یہ ہے کہ اپنے تئیں صاحب مرض و معصیت بنائے اور اس کی جگہ آپ ہو اور مشغول ہو اس قدر اور متوجہ ہو اس سے اس کے دفع کا پہلے نزول حضرت عزرائیل کے کیونکہ جب وہ نازل ہوئے تو ان کا خالی جانا محال ہے اور ضرور ہے بدل اور اس وقت مریض ثابت کرے اپنے اعضا کی جگہ اور متوجہ اپنی ہمت کے ساتھ اور بیماری میں مدد بہت طرح ہے اول تو یہ کہ متوجہ ہو ہمت کے ساتھ واسطے اس بیماری کے زائل ہونے کی دوسری طرح یہ ہے کہ اٹھائے ہو اس سے بیماری اپنے اوپر تیسری یہ کہ متوجہ ہو متفرق خطروں کے دفع کرنے کو اور مرض کے دفع سے کچھ معترض نہ ہو اس لئے کہ بیماری میں درجے بلند ہوتے ہیں اس واسطے کہ بیماری سبب ہے تنقیہ و تصفیہ کا قوائے دماغی کے اور جس وقت پاک اور صاف ہو گیا دماغ تو اس قوت دماغیہ سے متعلق ہوگا نور مطلق بسیط محیط جمیع موجودات ایسا کہ وہی مقصود ہے تمام کائنات کا اور خطرے مانع ہیں اس امر کے حصول کی اور تصرف کے طالب حقیقی میں اس طرح اسے اپنے سامنے بٹھائے اور اس سے کہے کہ کل خطروں سے اپنے نفس کو خالی کرلے پھر متوجہ ہو ہمت کے ساتھ واسطے اٹھائے

---

(۱) چھٹی فصل مرید کے باطن میں تصرف کرنے اور دفع مرض میں

حجاب ظلماتی کے پھر حجاب نورانی کے۔

اور جب اسے غیبت حاصل ہو جائے تو اس کے واسطے توجہ نہ کرے مگر جو کوئی گرہ پڑ جائے تو اسے کھول دے اور وہ نسبت کی جاتی ہے کسی شخص کی طرف احوال آنے والے سے وہ یہ ہے کہ جس وقت حاضر ہو کوئی اجنبی اور خاطر میں حاصل ہو ایک چمک ایمان یا نماز یا روزہ یا تحصیل علم دین کی تو کہتے ہیں۔ اس سے نسبت اسلام اور دیانت وعلم کی حاصل ہوئی اور حاصل یہ ہے کہ ظاہر ہوا بسبب اس وصل کے یہ معنی اور ہے وجود اس کا خاطر میں اس کے انفاس کی مقتضیات سے اور جو اس کے ملنے سے محبت وعشق ظاہر ہو سکتے ہیں نسبت جذبہ اس سے ظاہر ہوئے اور میت کے حال کی معرفت کے واسطے یوں ہے کہ مقابل قبر کے بیٹھے اور آیۃ الکرسی ایک بار اور سورۂ اخلاص بارہ دفعہ پڑھے اور اپنے نفس کو سب خطروں سے خالی کرے تو پھر جو کچھ دل میں چمکے گا تو وہ اسی سے ہے اور جب مرید سے کوئی بے ادبی ہو جائے تو شیخ کو نہیں مناسب کہ اس کے سلب حال کے واسطے کوشش کرے لیکن متوجہ ہو اپنی ہمت سے طریق معلوم کے موافق دفع کرنے میں اس کی ظلمت اور کدورت کے یا اس کو امر کرے کہ نفی اور اثبات کا ذکر کرے تو اس سے اس کی ظلمت جاتی رہے گی اس طرح سے کہ ملاحظہ کرے جانب نفی میں تمام محدثات کا فنا کی نظر سے اور جانب اثبات میں تصور کرے ذات معبود بحق کو ساتھ بقا کے۔

ساتویں فصل (۱)

آداب ظاہرہ حق سبحانہ کے ساتھ یہ ہیں کہ قائم ہوئی امر ونہی شریعت پر اور ہمیشہ طہارت سے رہے اور استغفار پڑھتا رہے اور سب امروں میں احتیاط کرتا رہے اور آثار سلف صالح کا پیرو اور تابع رہے اور اس پر عمل کرے اور باطن کا ادب یہ ہے کہ اپنے قلب کی حفاظت کرے کہ اس میں غیر کا خطرہ نہ آئے خواہ نیک ہو وہ یا بد ہو اس لئے کہ حجاب ہونے میں دونوں برابر ہیں اور آداب نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اسی قیاس پر ہیں اور اولیا کا ادب یہ ہے کہ ان کی مجلس میں اپنے خطروں کی حفاظت کرے اور ان کے حضور میں بلند آواز سے نہ بولے اور ان کے حضور میں نماز نوافل نہ پڑھے اور ان کے ساتھ اگر پڑھے تو بہت اچھا ہے اور ان کے کلام کے درمیان بول نہ اٹھے بلکہ جب تک وہ خود نہ پوچھیں کچھ نہ کہے اور جس کو وہ مکروہ جانیں اسے آپ بھی مکروہ سمجھے اور ان کے گھر میں ان کے اسباب اور اخراجوں کی طرف نظر نہ کرے اور دل میں یہ خطرہ نہ لاوے اور شیخ کی خدمت میں جاوے اور اس سے فیض حاصل کرے بلکہ یہ اعتقاد رکھے کہ یہ تیرا پیر تجھ کو پہنچاوے گا، تیرے مولا کے پاس اور اپنے پیر کے سوا اور سے تعلق نہ کر کیونکہ یہ موجب تیرے تفرقہ کا ہوگا، الحاصل یہ ہے کہ جس کو طبیعت انسانی مکروہ جانے اس سے الگ رہے اور بچے اس سے کیونکہ بے ادبی خصوصا مشائخ کی راہ خدا کی مانع ہے اور اس کے سبب فیض سے محروم رہتا ہے۔ اور تجھے چاہئے کہ تیرے دل میں اور نظر میں غیر حق اور اس کے نام کی نہ ہو اور ہمیشہ رہو با خدا کہ غفلت راہ نہ پائے اور کیا خوب کہا ہے یہ

---

(۱) آداب میں

شعر

اذا کنت (۱) فی الوقت عن الحق غافلا

فـانـت فـی الـکـفـر لـکـن بـخـفـیة

فان دمت فی ذی الحال صاحب غفلة

فـانـک لـلاسـلام سـد بـحـفـوة

اور غیروں کے خطرہ دیکھنے سے رنگ اور شکلیں مختلف اور نیز ہوتا ہے کتابوں کے مطالعہ سے اور ایسی صحبت سے جو تفرقہ ڈالے تو سالک کو چاہیے کہ کچھ دنوں بے ملاحظہ اغیار کے رہے کسی ایسے صاحب دولت کی صحبت میں جس کو پوری پوری سعادت ہو جمعیت کی کہ اس کی برکت سے سالک کو ملکہ حضور اور جمعیت کا حاصل ہو کیونکہ ملکہ حضور سے حاصل ہوتا ہے رضا و تسلیم جو کہ نہایت عبودیت کے ہیں اور عبادت کی اور اسلام کا کمال تسلیم میں ہے اور تفویض میں کیونکہ صاحب تسلیم کے اگر گلے میں لعنت کا طوق بھی ڈالا جاوے جیسے ابلیس کے تو وہ راضی ہوگا اس سے اس حیثیت سے کہ وہ قضا ہے حق کی اور تقدیر الٰہی ہے ایسا جیسے ایمان و اسلام سے راضی ہے اس لئے کہ طالب صادق راضی ہے قضا و قدر سے اس کا نفس کچھ نہیں کرتا اور جب طلب کو مکروہ پہنچے اور اس کا تفاوت ہو تو وہ اپنے نفس کا بندہ ہے اور جو تفاوت نہ ہو تو وہ اس کا بندہ ہے۔ ہر امر کی اصل اور بنیاد یہ ہے۔ تو اے سالک تجھے چاہیے کہ تو ہمیشہ بندہ ہو اس کا جیسے اللہ تعالیٰ ہمیشہ رب ہے اور جب مدح اور مذمت میں فرق ہوا تو عبادت اپنے دل کے بتوں کی کرتا ہے۔ سب سر خواص و عوام کا ذکر کر دیا گیا۔ اور اللہ توفیق دینے والا ہے۔ الحمد للہ رب العالمین و الصلوٰۃ و التسلیم علی سیدنا محمد سید الاولین و الاخرین و علی الٰہ و اصحابہ و التابعین لھم باحسان الی یوم الدین انتھی. کاتب حروف کہتا ہے کہ شیخ عبدالاحد بن شیخ محمد بن سعید بن شیخ احمد سہرندی کے طریقہ احمدیہ کے اشغال کے بہت عمدہ مکتوب ہیں ان میں سے تین مکتوب جو انھوں نے لکھوا کر حضرت والد بزرگوار کو بھیجے تھے اور ان کے آخر اپنے ہاتھ سے یہ عبارت لکھی تھی کہ

---

(۱) جس وقت کہ ہو تو حق سے غافل پس تو کافر ہو گیا لیکن خفیہ طور پر پس اگر تو ہمیشہ رہا اس حال میں اے غفلت والے پس تحقیق تو نے اسلام کے واسطے ایک دیوار بنائی یعنی تجھ کو اسلام نہیں حاصل ہوگا۔

''مخدوما عرفاں پناہا'' اس خاکسار کے تینوں مکتوب اپنے مطالعہ سے مشرف کرنا۔ وہ مکتوب اس رسالہ میں بعینہٖ نقل کئے جاتے ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ الحمدللہ علی کل حال

ہمشیرہ عزیزہ خداپرست نے لطیفہ انسانی پوچھے تھے۔ سو معلوم کریں، کہ پانچ لطیفہ انسانی کہ قلب وروح وسر وخفی واخفی ہیں عالم امر سے ہیں ان کا مقام فوق العرش ہے، جسے لا مکان کہتے ہیں اور عالم ارواح بھی اسے کہتے ہیں حق جل وعلیٰ کمال قدرت سے اپنے ان لطائف کو بدن انسانی سے تعشق اور تعلق دیکر وہاں سے نیچے اتار کر ہر ایک کو ایک خاص جگہ میں انسان کے بدن میں جو اس کے مناسب تھا جگہ دی ہے قلب کو سینہ کے بائیں طرف پستان میں جگہ دی ہے۔ روح کو جو قلب سے زیادہ لطیف ہے، اس کے مقابل دائیں جانب اخفی کہ لطیف اور احسن لطائف ہے، درمیان حقیقی سینہ کے سر کو درمیان قلب اور اخفی کے خفی کو درمیان روح اور اخفی کے اور ولایت اس میں سے ہر ایک لطیفے کے زیر قدم ایک اولالعزم پیغمبر کے ہے چنانچہ قلب کی ولایت حضرت آدم علی نبینا وعلیہ السلام کے زیر قدم ہے، اور روح کی ولایت حضرت ابراہیم علی نبینا وعلیہ السلام کے زیر قدم ہے اور سر کی ولایت حضرت موسیٰ علی نبینا وعلیہ السلام کے زیر قدم ہے اور خفی کی ولایت حضرت عیسیٰ علی نبینا وعلیہ السلام کے زیر قدم ہے۔ اور اخفی کی ولایت حضرت خاتم الانبیا علیہ وعلیہم الصلوٰات والتسلیمات کے زیر قدم ہے۔

جاننا چاہئے کہ اولیا کے قدموں کے تفاوت انہیں لطیفوں کی راہ سے ہے تو جو زیر قدم حضرت آدم علیہ السلام کے ہے اس کی ولایت، ولایت قلب ہے اور وہ صاحب استعداد ولایت کے ایک درجہ کا ہے، پانچ درجوں میں سے اور جو حضرت ابراہیم علی نبینا وعلیہ السلام کے زیر قدم ہے اس کی ولایت، ولایت روحی ہے اور اس کو دو درجوں کی ولایت کی استعداد ہے پانچوں درجوں میں سے۔ اور جو زیر قدم حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہے اس کی ولایت ولایت سری ہے وہ ولایت کے تین درجوں کی استعداد رکھتا ہے درجات خمسہ سے اور جو زیر قدم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہے اس کی ولایت ولایت خفی ہے اور وہ چار درجہ ولایت کی استعداد رکھتا ہے ان درجوں میں سے اور جو حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زیر قدم ہے اس کی ولایت ولایت اخفی ہے اعظم

واعلیٰ اوراحسن سب درجوں کی اوراس ولایت کے صاحب کو قابلیت پانچوں درجوں کی ولایت کی ہے،اور جاننا چاہئے کہ انبیا علیہم السلام کے قدموں کی تفاوت ان کے آپس میں اس راہ سے نہیں ہے بلکہ نبوت کی راہ سے ہے پس جو ان بزرگواروں میں سے اس راہ میں پیش قدم ہوگا وہی دوسروں سے افضل ہوگا چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے مقام نبوت میں پیش قدم ہیں،اس لئے حضرت عیسیٰؑ سے افضل ہیں اگرچہ مقام ولایت میں حضرت عیسیٰ حضرت موسیٰ سے غالب ہیں جیسا اوپر لکھا گیا۔

دوسرے یہ امر جاننا چاہئے کہ اگر مرشد ومربی طالب کا صادق المشرب ہوگا تو اس سے ہوسکتا ہے کہ جس راستے آپ قطع منازل کئے ہیں اسی راہ طالب کو بھی چلائے اور ولایت محمدیؐ کے کمالات کو پہنچائے اور وہ مرید اگرچہ خود اپنی استعداد کمتر رکھتا ہو یہاں سخن بہت طول وعرض رکھتا ہے کہ حد سے زیادہ ہے معذور رکھیں اور پھر کسی وقت پر موقوف فرمائیں اور انوار لطائف کے رنگ پوچھے تھے سو معلوم کریں کہ ہر شخص نے اپنے کشف ونظر کے موافق کچھ کہا اور لکھا ہے اور اس کے اوپر بنا تعبیر واقعات اور تفسیر معاملات کی رکھی ہے مگر میں نے اب جو حضرت عالی درجات سے سمجھا ہے مگر میں نے اب جو حضرت عالی درجات سے سمجھا ہے لکھتا ہوں۔

جاننا چاہئے کہ قلب کا نور زرد ہے اور روح کا نور سرخ ہے اور سر کا نور سفید ہے۔اور خفی کا نور سیاہ ہے اور اخفی کا نور سبز۔ظاہر حقیقت ومائیت نفس جو دریافت کی تھی آپ کو معلوم ہو کہ نفس خبیثہ ہے عالم خلق سے اور اس کا محل دماغ ہے بالذات شرارت وخباثت سے متصف ہے اور اپنے تئیں لطائف کی طرح لطیفہ نفیسہ ظاہر کیا ہے اور ریاست ودانائی کا دعویٰ کر کے تمام اجزا ولطائف پر تصرفات فاسد کر کے شیطان علیہ اللعن کے بہکانے سے تمام لطائف واجزا کو اپنے اوصاف ذمیمہ سے متصف کر دیا ہے اور درگاہ پاک خداوندی کی طرف متوجہ ہونے سے محروم رکھ کر نقصان ابدی کو پہنچایا ہے عنایت ازلی نے جس کی دستگیری ورہنمائی کی اس نے اس کی شرارت وخباثت پر اطلاع پائی اور اس کے فریبوں اور مفسدوں سے مومنہ پھیر کر متوجہ اس درگاہ پاک کا ہوا اور سعادت ابدی کو پہنچا اور جب نفس پاک ومطہر ہو جاتا ہے اور اپنے سب وصف رذائل بالکل چھوڑ دیتا ہے۔ البتہ اللہ سبحانہ کے فضل وکرم سے بڑے مرتبہ سے ولایت کے اور قرب اور مشاہدہ اور مقام رضا کے

مشرف ہوتا ہے اور سب لطائف انسانی سے بالا دست ہو جاتا ہے اور اس کی سیر سب سے بلند ہوتی ہے اس کو حصول کمال کے بعد تخت صدر پر اجلاس فرماتے ہیں اور ریاست وکیاست سب لطائف کی اس کو ملتی ہے عجب بھید ہے کہ جو سب سے خبیث زیادہ ہے بعد پاک اور منور ہونے کے اشرف سب سے ہو جاتا ہے اولٹک (۱) یبدل اللہ سیاتھم حسنات فرمایا علیہ الصلوٰۃ والسلام نے خیارکم (۲) فی الجاھلیۃ خیارکم فی الاسلام اذا فقھوا والسلام علی من اتبع الھدی۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ !

اس کے بعد بعد جاننا چاہیے کہ جب سالک اپنی ہستی اور خود پرستی سے نکل آتا ہے اور اس کے باطن کی آنکھ معرفت کے کحل الجواہر سے سرمہ سا ہو جاتی ہے تو ضرور آیتیں اور کرامتیں جو اس کے نفس میں چشم بصیرت میں امانت رکھی ہوئی ہے بموجب وفی انفسکم افلا تبصرون ای فی انفسکم آیات عظیمۃ افلا تبصرون کی وہ مشاہدہ کرتا ہے۔ اس کے بعد مقتضائے من عرف نفسہ فقد عرفہ ربہ کے بارگاہ قدس میں دخل پاتا ہے قالب انسانی میں جو حقائق اور آیتیں تعبیہ میں کچھ ان میں سے مذکور ہوتی ہیں بگوش ہوش سے سنو جان لو کہ انسان کہ اس کو عالم صغیر کہتے ہیں ان اجزا سے مرکب ہے جن کی اصلیں عالم کبیر میں ہے اور عالم کبیر مجموعۂ کائنات ہے خلق ہو خواہ امر ہو ان دس میں پانچ تو عالم خلق سے ہے ایک تو نفس اور چار عنصر اور ان میں پانچ عالم امر سے ہیں جس طور چار عناصر کی اصلیں عالم خلق میں موجود ہیں اس طور لطائف خمسہ مذکور کی اصلیں عالم امر میں جو عرش کے اوپر لامکان مشہور ہے متحقق ہیں اور فوق عرش مجید اور تحت اور اصول کے قلب ہے اور اسی سبب قلب کو برزخ درمیان عالم خلق و عالم امر کے فرمایا ہے اس واسطے کہ عالم خلق کی انتہا عرش مجید ہے اور اس وجہ سے کہ عرش مجید عالم خلق کی نہایت منتہی ہے اور امر کی طرف منہ رکھتا ہے اسے بھی برزخ کہتے ہیں اور اصل قلب کی فوق اصل روح ہے اور اس کے فوق اصل سر اور اس کے فوق اصل خفی اور اس کی فوق اصل اخفی جب تعالی شانہ نے چاہا کہ انسان کو اپنی

---

(۱) وہ لوگ ہیں کہ بدلتا ہے اللہ تعالیٰ ان کی بدیوں کو نیکیوں سے۔

(۲) جو جاہلیت میں پہلے اچھے تھے وہ اسلام میں بھی اچھے ہیں۔

حکمت بالغہ کے مقتضیٰ سے اس نوع سے ترکیب دے تو بعد قالب کے تسویہ کے ان لطائف خمسہ سے ہر ایک کو اس عنصر جسمانی سے تعلق اور تعشق دے کر فوق العرش سے اوتار کر مقام خاص میں جس کو جس مقام سے مناسبت تھی متمکن کیا لطیفۂ قلب کو اس مضغہ میں جو زیر پستان چپ ہے اور اسے قلب صنوبری کہتے ہیں جگہ دی اور اسے صنوبری اس واسطے کہتے ہیں کہ وہ مانند صنوبر کے پھل کے ہے جو الٹا ہوا ہو۔ اور اصل الاصل اس لطیفہ کے صفت اضافی حق کی ہے کہ اسے فعل اور تکوین کہتے ہیں اس کا کمال یہ ہے کہ حق جل وعلیٰ کے فعل میں فانی ونیست ہو جائے اور اسی فعل سے بقا پائے اس وقت سالک اپنے تئیں مسلوب الفعل پائے گا اور اپنے افعال حق وجل وعلیٰ سے درست نسبت کرے گا، فنا قلب وتجلی فعلی اسی سے کنایہ ہے اور اس کا نشان یہ ہے کہ علمی وحسبی تعلق اس کو غیر حق سے نہ ہوگا یعنی قلب ماسوئ کو بالکل فراموش کردے گا یہاں تک کہ اگر برسوں تکلف کرے تو بھی ایک لحظہ ماسوا کو یاد نہ کرے گا۔ اس وقت جیسا علم اشیا اس سے زائل ہو گیا ہے۔ محبت اشیا بطریق اولی جاتی رہے گی اور جب سالک فنا قلب سے مشرف ہوا۔ اولیا کی جماعت میں داخل ہو گیا اور یہ فنا قلب بدون طے کرنے تمام دائرہ امکان کے جو مرکز فرش سے عرش تک اور عرش سے تمام عالم امر تک ہے۔ اور بغیر طے کرنے مراتب عشرہ کے یعنی زہد، صبر، توکل، رضا، تسلیم، قناعت، یاس لوگوں سے، فقر، فراغ، ریاضت جو صوفیہ علیہ نے ان کا بیان کیا ہے حاصل نہیں ہوتے اور نور قلب کو نور زرد فرمایا ہے اس لطیفہ کی ولایت حضرت آدم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے زیر قدم ہے۔

اور جو آدمی المشرب ہے اس کا وصول درگاہ قدس کی طرف اسی لطیفہ کی راہ سے ہوئے گا مگر زبردستی وکشش پیر کامل سے اور اس مشرب کے صاحب کو استعداد حصول ایک درجہ کی پانچوں درجوں ولایت میں سے ہوگی۔ مگر زبردستی سے کسی زبردست کے اور لطیفہ روح جو بہت لطیف ہے، قلب سے اس کو مناسبت راستوں سے زیادہ تھی اس واسطے اس کو سینہ کے راستہ کی طرف زیر پستان جگہ دی اور اصل الاصل اس لطیفہ کی صفات ثبوتیہ حق ہے اور ایک قدم حضرت ذات کی طرف فعل سے نزدیک تر ہے، سالک بعد حصول فنا اس لطیفہ کے ساتھ تجلی وصفاتی کے اپنی صفات کو اپنے سے مسلوب پائے گا۔ اور اس لطیفہ کا نور سرخ فرمایا ہے اور اس لطیفہ کی ولایت حضرت ابراہیم علی نبینا

وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے زیر قدم ہے اور جو کوئی ابراہیم المشرب ہوگا اس کی سیر جناب قدس کی طرف اسی لطیفہ سے ہوگی بعد از قطع مراتب قلب کے اور اس مشرب والے کو استعداد حصول دو درجہ کی پنج گانہ مراتب ولایت سے ہوگی مگر زبردستی سے کسی زبردست کے اور سر کا لطیفہ کہ روح کے لطیفہ سے بہت لطیف تھا اس کو نزدیک وسط سینہ کے قلب کی جانب جگہ دی اور اصل الاصول شیونات ذاتیہ ہے کہ ایک قدم صفات سے حضرت ذات کی طرف نزدیک ہے، اور حاصل ہوتا اس لطیفہ کی فنا کا شیونات کی تجلی سے ربط رکھتا ہے اور اس لطیفہ کی ولایت حضرت موسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے زیر قدم ہے اور جو موسوی مشرب ہوگا اس کا وصول جناب قدس میں اسی لطیفے کی راہ سے ہوگا مگر بعد قطع پہلے لطیفوں کے اور اس مرتبہ والے کو استعداد تین مرتبہ کی ہوگی مراتب پنج گانہ ولایت میں سے لیکن زبردستی سے کسی زبردست کی اور اس لطیفہ کا نور سفید تعین فرمایا ہے اور لطیفہ خفی کو کہ سر سے بہت لطیف ہے درمیان روح اور وسط کی جگہ دی ہے۔

اور اصل الاصول اس لطیفہ کے صفات سلبیہ تنزیہیہ ہے کہ شیونات ذاتیہ کے فوق ہیں اور حصول اس لطیفہ کی فنا کا اسی صفت کا وصول ہے اس لطیفہ کا نور سیاہ تعین کیا ہے اور اس لطیفہ کی ولایت حضرت عیسیٰ علی نبینا وعلیہ السلام کے زیر قدم ہے اور جو زیر قدم حضرت عیسیٰ کے ہے اس کو راہ جناب قدس میں اسی لطیفہ سے ہوگی بعد قطع لطائف سابق کے مگر بقسر قاسر اور اس مشرب کے صاحب کو استعداد حصول چار مرتبہ کے ہے پنج گانہ مراتب ولایت میں سے اور لطیفہ اخفی کہ بہت لطیف اور احسن اور اجمل سب لطائف عالم امر سے ہے اور بہت قریب ہے، حضرت اطلاق سے اس کو سینہ کے وسط حقیقی میں مرکز ہے اور بہت مناسبت رکھتا ہے حضرت اجمال سے جگہ دی ہے اور اصل الاصل اس لطیفہ کی ایک مرتبہ ہے، مثل برزخ کے درمیان تنزیہہ اور درمیان احدیت مجردہ کے اور اس لطیفہ کی فنا بھی مربوط اسی مرتبہ مقدسہ کے تحت سے ہے اور اس لطیفہ کے نفیسہ کا نور سبز نور بیان فرمایا ہے اور اس لطیفہ کی ولایت حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زیر قدم ہے اور اس بلند مرتبہ والے کو بالذات استعداد حصول تمامی مراتب پنج گانہ ولایت کے ہے حضرت قطب الاقطاب سلمہ ربہ کے زبان الہام بیان سے میں نے سنا ہے کہ ایک روز حضرت مجدد الف ثانیؒ نے ایسا فرمایا کہ صبح کی نماز اندھیرے میں پڑھے تو فنا اخفی حاصل ہوتی ہے۔

جاننا چاہئے کہ لطائف خمسہ عالم امر کا عروج دائرۂ اولیٰ ولایت کبریٰ تک جو متضمن تین دائرہ اور ایک قوس کا ہے، ہوگا جب اس دائرہ سے معاملہ ترقی کرے اور دائرہ اصل اور اصل الاصل میں سیر کرے، نفس سے معاملہ پڑے گا اور نفس کو پوری فنا کامل بقا حاصل ہونے سے کشادگی سینہ اور اسلام حقیقی کا حصول اور اطمینان کے مقام رضا کی ترقی سے مشرف ہوگا اس کے بعد جب ولایت علیا میں سیر ہوگی تین عنصر سے معاملہ پڑے گا یعنی ناری وآبی وہوائی سے اور اگر وہاں سے خدا تعالیٰ کے فضل سے ترقی ہوئی تو کمالات نبوت میں سیر واقع ہوگی معاملہ اجزائے ارضی سے پڑے گا اور جو وہاں سے ترقی واقع ہوئی تو خواہ کمالات رسالت خواہ حقائق ثلثہ میں یعنی حقیقت کعبہ وحقیقت قرآن وحقیقت صلوٰۃ میں معاملہ ہیئت وحدانی سے جو مجموع اجزاءعشرۂ عالم خلق اور امر سے ہے، بعد ہونے کمالات جدا جدا ہر ایک کے پڑے گا۔

بعد ازاں ہماری تمہاری عقل وفہم سے معاملہ برتر ہے۔ اللہ سبحانہ تعالیٰ محض عنایت بے نہایت سے اپنے ان کمالات سے بھرپور عنایت فرمائے۔ انه قريب مجيب اللہ سبحانہ کا شکر ہے کہ بطفیل حضرات عالی درجات قدس اللہ اسرارہم کے ان مراتب مذکورہ اور معاملات سے جن میں ان کی نسبت زمین وآسمان کا فرق ہے اپنی استعداد کے لائق بلکہ استعداد سے زیادہ بہرہ کرامت فرمایا ہے اور اس ذرہ کو خاک مذلت سے اٹھا کر آفتاب کی برابر کر دیا ہے اس مرتبہ کا شکر اگر ہزار سال، سو ہزار زبان سے ہزاروں طرح سے ظاہر کرے تو ہزار میں سے ایک بھی نہ کر سکے فله الحمد والمنة لله كما يليق بشانه ويحرى والسلام على رسوله وآله وصحبه البورة النقى اس قسم کی باتوں کو ظاہر کرنے سے اگرچہ فخر وبڑائی کا وہم ہوتا ہے لیکن اظہار النعمۃ من الشکر کے خصوصاً ایسے دوستوں سے جو مخلص اور محرم اسرار اور اس کے مشتاق ہوں ان آثار واخبار کے مذکور کیا گیا۔ ربنا(۱) لا تواخذنا ان نسينا او اخطانا بحرمة سيدنا محمد النبى الامى العربى صلى الله عليه وسلم .

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم الحمد للہ والسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ۔ میرے بھائی شیخ محمد کبیر معلوم کریں کہ قرب نوافل اسے کہتے ہیں کہ سالک اپنے تئیں فاعل پائے اور حق کو اپنے اعضا چنانچہ بی

(۱) اے رب ہمارے نہ پکڑ ہم کو اگر ہم بھولیں یا چوکیں بحرمتہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔

یسمع وبی یبصر اس کا اشارہ ہے۔ اور قرب فرائض اسے کہتے ہیں کہ سالک اپنے تئیں اعضا پائے اور حق کو فاعل جیسے الحق ینطق علی لسان عمر اس کی طرف اشارہ ہے اور یہ قرب ثمرہ دیتا ہے فنا وجود سالک کا بخلاف پہلے قرب کے اور جمع بین القربین یہ ہے کہ سالک اپنے تئیں درمیان میں کچھ نہ پائے نہ فاعل نہ اعضا چنانچہ بعض اہل دل نے اس مقام سے ایسا اشارہ کیا ہے

مصرعہ

عشق ست درمیانہ برمانہد بہانہ

اور یہ آیۃ کریمہ ومارمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمٰی گویا تینوں مقام کی خبر دیتا ہے کیونکہ مارمیت قرب فرائض سے ہے اور اذ رمیت کنایہ قرب نوافل سے ہے ولکن اللہ رمٰی اشارہ جمع بین القربین سے ہے والسلام علی من اتبع الھدی والتزم متابعۃ المصطفیٰ علیہ وآلہ الصلوٰت والتسلیمات العلٰی۔ وہ تینوں مکتوب ہو چکے اور آخر میں ان ورقوں کے شیخ عبدالاحدؒ نے اپنے ہاتھ سے یہ فائدہ تحریر فرمایا کہ مشائخ کرام کی عادت ہے کہ سالک مبتدی کو اوّل ذکر قلب سے مشغول کرتے ہیں تا جوہر اور ملکہ ہو جائے اس کے بعد ذکر روح فرماتے ہیں بعد ازاں ذکر اخفی بعد ازاں ذکر نفس اور اس کی جائے دماغ ہے اس کے بعد اگر چاہیں ذکر سر اور خفی فرمائیں بعد ازاں سریان تمام اعضا میں تا حصول ملکہ وسلطان ذکر ہو جائے اور اکثر ایسا ہے کہ ذکر قلب وروح واخفی پر اکتفا کرتے ہیں، اور کبھی ذکر قلب پر اکتفا کرتے ہیں، مگر شرط یہ ہے کہ ذکر قلب کا جوہر ہو جائے اور اکثر ایسا دیکھا گیا ہے کہ فقط ذکر قلب کہنے سے سلطان ذکر اور سریان تمام اجزا و اعضا میں متحقق ہوا ہے حاصل یہ کہ بقدر استعداد مبتدی کے سلوک چاہیے کرنا، والسلام علی من اتبع الھدی تمام ہوا وہ جس کا ہم نے ارادہ کیا تھا شیخ عبدالاحد قدس سرہ کے کلام سے۔

کاتب الحروف کہتا ہے کہ ملا محمد دلیل نے ذکر کیا ہے کہ امیر موسیٰ بھٹی کوٹی کو ایک نے بزرگوں میں سے احمد یہ خانوادہ کے یہ مکتوب لکھا تھا اور امیر موسیٰ نے اس کی بہت سی تعریف کی اور اپنے یاروں سے کہا اس کی نقل لکھ لو۔ باسمہ سبحانہ نحمدہ ونصلی ونسلم خدام ولایت پناہ ہدایت دستگاہ سیادت مرتبت نجابت منزلت میر محمد موسیٰ سلمہ ربہ سلام دوستانہ اور تحیہ مخلصانہ اس فقیر حقیر محمد ہادی

عفی اللہ عنہ کا مطالعہ فرمائیں اور مانگنے والا دعاء سلامتی خاتمہ اور عفو وعافیت دنیا و آخرت کا گنیں فقیر کو جو ضعف بدن بہت تھا اس سبب جس کا امر ہوا تھا وہ نہ بجالا سکا اب کچھ تخفیف پائی ہے تو لکھتا ہے کہ جب طالب صادق شیخ کامل و مکمل کے روبرو جائے اول ذکر دل کا کہ اس کا ٹھکانا بائیں ہاتھ کی طرف ہے، امر فرمائیں جب اس کا ملکہ ہو جائے تو ذکر روح کہ اس کی دائیں طرف ہے ارشاد کریں جب اس ذکر کا بھی ملکہ ہو جائے تو ذکر سر جو دل کے متصل ہے لیکن دائیں طرف بتائیں اور جب اس کا بھی ملکہ ہو جائے تو ذکر خفی کا جو روح کے پہلو میں ہے مگر بائیں طرف روح کے ہے مامور فرمائیں اور جب وہ بھی ملکہ ہو جائے ذکر اخفی کا کہ سب کے درمیان ہے اور وسط سینہ میں اس کی جگہ ہے اسے حکم کریں اور یہ جوہر اخفی تمام جوہروں سے عالم امر کے اعلیٰ ہے چنانچہ آئے گا انشاء اللہ تعالیٰ اور جب اخفی کا بھی ذکر ہو جائے تو ذکر نفس کا حکم کریں کہ نفس کا مقام دماغ ہے اور یہ لطائف ستہ ذکر سے متجر ہو جائے تو ذکر نفی و اثبات فرمائیں بطریق معلوم اور جب عدد اکیس تک پہنچے اس کے نصاب پورے ہو گئے اور فنا قلب جو اطوار ولایت میں اول قدم ہے ظہور فرمائے اور فنا قلب اس تجلی افعال کا اثر ہے جو اس کی اصل ہے کیونکہ قلب افعال الٰہی ہے اور وہ مربی ولایت حضرت آدم کا ہے علی نبینا وعلیہ السلام اس کے بعد بقا قلب ایک تھوڑا افعال ایزدی ہے جل شانہ اس کے لئے کہ ہر ظل کو اپنی اصل کے راستہ ہی اس میں فنا ہونے کا اور اس سے باقی ہونے کا اس کے بعد معاملہ فنا روح ہے اور اس کے بقا اپنی اصل سے کہ حق کے صفات ہیں اور صفات مربی ولایت نوحی و ولایت ابراہیمی ہے علی نبینا وعلیہما الصلوٰۃ والسلام کہ دونوں ولایتیں مربوط روح سے ہیں اور اس کی اصل سے کہ صفتیں ہیں باعتبارات مختلفہ کہ ولایت ابراہیمی تفصیلی ہے اور ولایت نوحی اس سے مجمل ہے اس کے بعد معاملہ سر سے ہے اور فنا و بقا اس کی اصل ہے کہ شیون ایزدی ہے تعالیٰ شانہ اور شیون ہماری اصطلاح میں اسے کہتے ہیں جو عبارتیں حضرت ذات واجب تعالیٰ میں مندرج ہوں کہ معانی زائد برذات نہ ہو اور صفات ہے اور جو معانی زائد برذات سبحانہ ہو ویں، اور خارج میں موجود ہو ویں، اور ولایت سر ولایت موسوی ہے علی نبینا علیہ الصلوٰۃ والسلام پھر معاملہ خفی سے ہے اور اس کے بعد فنا و بقا اس کی اصل سے ہے اور وہ تقدیس و تنزیہات سبحانیہ ہے اور یہ ولایت ولایت عیسوی ہے علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام۔

پھر معاملہ اخفیٰ سے ہے اور اس کی فنا و بقا اس کی اصل سے ہے کہ وہ شان جامع اسماء وصفات اور شیون اور اشارات اور تقدیسات وتنزیہات ہے اور یہ ولایت ولایت محمد یہ ہے ان پر ہزار ہزار درود وسلام اور مربی اس ولایت کا حقیقۃ الحقائق اور اقرب الولایت اور اجمع الولایات ہے اور اعلیٰ اور اشرف اور افضل ولایات ہے اور مستحق ولایت خمسہ ہے اور تقاضا کرنے والی ہے زوال عین کا اور اثر معرفتوں کا پہنچانے والی ہے اور وہی محبوبیت ہے پھر معاملہ نفس سے پڑتا ہے اور اس کی فنا تمام اور اس کی بقا بہت کامل ہے پھر معاملہ ان کی اصلوں سے اور اصلوں کی اصلوں سے پڑتا ہے یہاں تک کہ منتہی ہوتا ہے ذات حق تعالیٰ تک اور وہاں ترقی فنا سے نہیں بلکہ ایک اور امر سے ہے کہ وہ اپنے مقام میں ظاہر ہوگی والسلام والاکرام۔

کاتب حروف کہتا ہے کہ سلوک طریقہ اختیاریہ کا ان تحریروں میں فی الجملہ واضح ہوگیا اب تھوڑی روش طریقہ احسنیہ کی جو منسوب ہے، شیخ آدم بنوری سے ذکر کرتا ہے اس ضمن میں مکتوب شیخ عبدالنبی سیام چوراسیؒ (۱) کا کہ جو اس زمانہ میں احسنیہ طریقہ کے مقتدا تھے اور سب اس طریقہ والوں کی کیا خاص اور کیا عام ان کی طرف توجہ تھی اور جمہور اس طریقہ کے متفق ہیں اس امر پر کہ ان کو سالکوں کی ترتیب میں اس طریقہ کی روش میں قدم راسخ تھا ایک عزیز صالح نے مکہ معظّمہ میں ذکر کیا یہ مکتوب شیخ عبدالنبیؒ کا ہے اور ان کے کام کی بنا اس پر تھی۔ ہم نے ان کے پاس سے لکھ لیا۔ واللہ اعلم بالصواب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم الحمدللہ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفےٰ خصوصاً علیٰ نبیہ محمد والہ واصحابہ اجمعین۔ جان خدا تجھ کو رہنمائی کرے کہ طریقہ احسنیہ نقشبندیہ طریقہ میں بہت قریب ہے وصول سے اور سالکوں کے لئے اس کی تفصیل ضروری ہے تھوڑی سی بطریق اجمال ان سطروں میں لکھے جاتے ہیں۔

جاننا چاہئے کہ جب کوئی طالب صادق اللہ سبحانہ کی توفیق سے کسی عزیز کا اس طریق کے بزرگوں میں سے متوسل ہوتا ہے پہلے اسے استخارہ فرماتے ہیں اور استخارہ کا طریق یہ ہے کہ بعد

---

(۱) یہ شیخ عبدالنبی سیام چوراسیؒ ہیں۔ شیخ عبدالنبی گنگوہی دوسرے بزرگ ہیں جو اکبر بادشاہ کے اتالیق رہے ہیں۔ (قاسمی)

نماز عشا جب سونے کا وقت ہو اور کچھ دنیا کا ذکر نہ ہو تازہ وضو کرے، وضو کے بعد ایک سو ایک دفعہ استغفر الله ربی من کل ذنب واتوب الیه بہت صدق سے پڑھے اس نیت سے کہ تمام تقصیروں بدنی اور روحی سے جو مجھ سے ہوئی ہیں میں نے توبہ کی اور نئے سرے سے میں مسلمان ہوا پھر اٹھ کر دو رکعت نماز استخارہ اس نیت سے کہ پڑھتا ہوں دو رکعت نماز استخارہ کہ حق تعالیٰ مجھ کو متابعت پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بواسطہ حصول رضا اپنے پیر کے مضبوط رکھے۔ پہلی رکعت میں الحمد کے بعد آیۃ الکرسی ایک بار اور دوسری رکعت میں الحمد کے بعد قل یا ایہا الکافرون ایک بار خوب خشوع کے ساتھ اپنے تئیں حاضر کرے اور گریہ وزاری کرے بعد از نماز ایک سو ایک بار درود شریف پڑھے اور ایک سو ایک بار کلمہ تمجید پڑھے پھر خوب عجز و انکسار سے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگے بعد اس کے جب نیند غلبہ کرے زمین پر سور ہے اور جو معذور ہو تو اختیار ہے یعنی زمین پر نہ سوئے بعد اس کے جو خواب میں بشارت ہو، اپنے مرشد سے ظاہر کرے اور جو پہلے روز بشارت نہ ہو تو تین دن تک استخارہ کرتا رہے یا یہ کہ استخارہ کے بعد اپنے قلب پر نظر کرے اگر اپنے قلب کو استخارہ کے بعد اعتقاد میں ویسا ہی مضبوط پاتا ہے جیسے پہلے تھا تو یہ ہی بشارت ہے پھر مرشد کو چاہئے کہ خلوت میں اللہ کا نام تعلیم کرے جو کہ اسم ذاتی ہے اس طریقہ سے کہ اپنی زبان کو تالو سے لگائے اور نظر خیالی کو قلب صنوبری پر ڈالے اور نظر ظاہری کو بند کرے اور قلب صنوبری کا مقام زیر پستان چپ ہے قدر دو انگشت کے اور یقین کرلے کہ اسے قلب کہتے ہیں پھر اپنے تئیں مضغہ سے متوجہ کرے اور مضغہ کے باطن سے اسم اللہ جل شانہ کہوائے اس طرح سے کہ اس کو سوائے ذات کے نہ جانے اور اس ہیئت کو حتی المقدور اٹھتے بیٹھتے چھوڑے نہیں پھر مرشد کو چاہئے کہ خود متوجہ اس کے قلب کا ہو۔

توجہ کے یہ معنی ہیں کہ اپنی ہمت مرید کے قلب کی طرف لگائے اور اپنے قلب کا دہن مرید کے قلب کے دہن پر تصور کرے اس طرح سے کہ اور کوئی خطرہ اپنے قلب میں نہ آنے دے اور خوب خشوع سے جناب سبحانہ تعالیٰ سے التجا کرے کہ نور سالک کے دل میں قوت پیدا کرے اور جذبہ قلبی اور ہمت باطنی سے مرید کے قلب کو اپنی طرف کھینچے ایک ساعت کم وبیش اسی طور مرید کے حال پر متوجہ رہے اور اس طریقہ کے بزرگوں کی ارواح مبارک کو اپنے شامل حال سمجھے اس تصرف

کو ان کی امداد جانے اب بھی اور آئندہ بھی پھر مرید سے دریافت کرے اگر خوب سمجھ گیا ہے اور آرام پایا ہے فاتحہ پڑھے اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑے بیعت کرے اور اسے خدا کو سونپے اور آگاہ کردے کہ یہ طریقہ احسنیہ نقشبندیہ بہ طریق میں حضرت خلیفہ وقت سیدی شیخ آدم بنوری کا ہے قدس اللہ سرہ العزیز اس کے بعد جب مرید نے اسم ذات کے ذکر میں لذت پیدا کی تعلیم نفی واثبات کو بطریق مشہور اکیس تک پہنچائی اور اثر دل میں اپنے پائے شکر حق بجالائے پھر لطیفہ روحی کے ذکر کی تعلیم فرمائے اور اس کی جگہ زیر پستان راست ہے اور لطیفہ روحی کا نور سفید جیسے گھر سفید تصور کرکے اسم ذات کے ذکر کو جیسا لطیفہ قلبی میں کہا گیا ہے خوب خشوع کیساتھ کرتا رہے اور ہر وقت اس سبق کو پڑھتا رہے یہاں تک کہ ذکر قلبی کے مانند جمعیت ولذت یہاں بھی حاصل کرے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ سالک کو ان دو لطیفوں میں تجلیات ظاہر ہوتے ہیں مگر چاہئے کہ تا بمقدوران تجلیوں کا مغلوب نہ ہو جائے بلکہ حق تعالیٰ کے تنزیہہ کو نظر قلبی سے یقین کرے اس کے بعد تعلیم لطیفہ سری کی کرے اور مکان خاص اس لطیفہ کا وسط سینہ ہے دونوں پستان کے بیچ میں اور فرمادے کہ ذکر اسم ذات جس طور مذکور ہو چکا ہے، کرتا رہے اور بالکل اپنے تئیں ہر وقت ایسے ذکر میں رکھے یہاں تک کہ لذت وجمعیت خوب پیدا ہو جائے پھر تعلیم لطیفہ خفی کی کرے اسی طور سے اور اس کا خاص مکان پیشانی میں ہے اور اسم ذات کا اسی طرح سے ذکر یہاں بھی کرے بعد جمعیت اس لطیفہ کے لطیفہ اخفی کی تعلیم کرے اور اس لطیفہ کا مقام سر کے اوپر تالو میں ہے بطریق مذکور یہاں بھی اسی طرح ذکر کرے یہاں بھی لذت حاصل کرے یہیں بیان ہے حدیث قدسی کا جو یہ ہے۔

ان(۱) في جسد بني آدم لمضغة وفي المضغة قلب وفي القلب فواد وفي الفواد سر وفي السر خفي وفي الخفي اخفي وفي اخفي انا. اے عزیز ان کی اصطلاح میں اس سیر کو سیر لطائف کہتے ہیں مگر جب تکرار سے یہ سیر تمام ہو جائے اور سالک کو اپنی استعداد کے موافق اجمال بالتفصیل اس سیر کی حاصل ہو جائے تو چاہئے کہ پھر اس لطیفہ قلبی پر لائیں اور تعلیم یادداشت اس میں کریں اس واسطے کہ پہلے اس سے تکرار اسمی نہ تھی۔

---

(۱) تحقیق جسد بنی آدم میں مضغہ ہے اور مضغہ میں قلب اور قلب میں فواد اور فواد میں سر اور سر میں خفی اور خفی میں اخفی اور اخفی میں، میں یعنی اللہ تعالیٰ۔

اور یادداشت اسمی کا طریقہ یہ ہے کہ اسم اللہ کو قلب اندرونی سے جو ایک نور محض ہے کہے اس طور کہ قصد تکرار کا نہ کرے بلکہ اسم اللہ پر مد دراز کھینچے مانند ایک تانبے کے برتن کی آواز کے اور اسی ایک آواز کو جہاں تک ہو سکے محافظت سے نگاہ رکھے اور قطع نہ ہونے دے اور جو قطع ہو جائے تو پھر نئے سرے سے شروع کرے اور یادداشت اسمی کی قوت کے واسطے نفی واثبات بھی دراز مد کے ساتھ حبس دم کے ساتھ یا بے حبس دم کے اختیار کرتے ہیں جب یہ نسبت ایسی قوت پکڑے کہ اپنے قلب میں بلکہ جمیع لطائف میں بلکہ تمام بدن میں جو نورانیت کے ساتھ اس آواز محض کو یکساں پائے تو ذکر لطائف جو بواسطہ جسم کے تھا، تمام ہوا۔

اب لطائف کے ذکر میں جو بے واسطے لفظوں کے بھی کوشش کرنی چاہئے بعد یادداشت اسمی کے یادداشت مسمی کے تعلیم کرنی چاہئے یعنی مکان خاص قلب کو نظر میں رکھ کر لطیفہ کے اندروں کہ ایک امر نورانی ہے جیسا اوپر بیان ہوا نظر ڈال کر ایمان محض سے حق سبحانہ تعالیٰ کو حاضر بے پردہ یقین کرے مگر بے کیفی اور بے جہتی اور جہات ستہ کو نظر سے گرادے اور جانے کہ حق تعالیٰ حاضر ہے بے کیف و بے جہت پس اس جاننے کو کسی وقت اپنی دید و دانش سے نہ چھوڑے اگر غفلت ہو جائے تو پھر اس امر کو حاضر کرے یہاں تک کہ مشاہدہ سر سے پاؤں تک گھیرے اور پورا استغراق پیدا ہو ایسا کہ سوائے نور حق کے اپنے تئیں اور اپنے غیر کے تئیں کچھ نہ پائے وہی ایک نور حق ہی پائے اس نسبت میں اگر حق تعالیٰ کا احاطہ اور معیت کے شہود کے غلبہ کے سبب اشیا کو عین حق پائے تو اس کو ان کی اصطلاح میں توحید وجودی کہتے ہیں اور جو اشیا کو گم کیا اور جمال ذوالجلال کا مشاہدہ ورائے حاصل کیا اور اشیا کو نظر سے گرادیا تو توحید شہودی کہتے ہیں۔

جاننا چاہئے کہ یہ دونوں مرتبہ ولایت خاصہ ہیں جو کہ ولایت امت ہی ظاہر ہوتی ہے اور اس سے پہلے جو تجلیات وغیرہ سیر لطائف سے یادداشت اسمی تک پیش آتی ہیں اولیا کے ظل ولایت میں ہیں اگرچہ اہل ولایت اولیا بہ نسبت اس ولایت کے اہل ظل کے کمال تمام رکھتا ہے لیکن ابھی تک وصول مطلوب حقیقی بے تلبیس اشیا ہے سالک کو چاہئے کہ ان تجلیات ومشاہدات سے لذت پاکر بے پروانہ ہو جائے بلکہ ترقی کا طالب ہو اس کے بعد اگر پیر کامل ہوگا تو ان غلبات کے بھنور سے محض اپنی توجہ سے مرید کو نکال لے گا اور ذہن کو ان تجلیوں اور مشاہدوں اور توجہات سے خالی

کردے گا اور تعلیم اس کے نایافت کی جو ذہن میں حق اور غیر حق کے قرار پکڑتی ہے اور تصور میں آتی ہے اگرچہ لطیف والطف ہی ہو۔ اس کے دفع کے درپے ہو اور آئینہ سری کو ان کے تاریکی سے خالی کرے اور بالکل ہر وقت سب کے فقدان میں توجہ سابقہ کے مقرر کرے تاکہ اس کے باطن میں توجہ الی المطلوب اور غیر مطلوب سے کچھ نہ ہو بلکہ بے توجہی سے یقین صاف مطلوب کا کرے یہاں تک کہ معلوم کچھ نہ رہے بجز نور یقین کے اس معاملہ میں سالک جب تک کہ توجہات کے دفع کرنے میں ہی سالک مرتبہ ولایت اخص کا ہے اور جب حاجت نفی کی نہ رہے اور آئینہ آمد ورفت توجہات وتصورات سے صاف ہو گیا اور بے توجہی و بے تکلفی حاصل ہوئی واصل کمالات ولایت اخص کا ہو گیا مگر ابھی توجہ وتصور اس واصل کا معلوم نہیں ہوا بلکہ مقصود ہے جیسے ذکر ہوا پہلے مکتوب میں وہ ولایت بالاصالت خاصہ چار ملائک مقربین علیہم السلام کا ہے اور اولیا امت کو تبعاً نصیب ہے اگر مناسبت استعدادی پیدا ہو جائے۔ اور جاننا چاہئے کہ ولایت خاصہ کے مرتبہ میں توحید وجودی وتوحید شہودی کا جو ہم نے بیان کیا ہے توحید وجودی لطیفہ قلبی کے نفس سے پیدا ہوتی ہے اور توحید شہودی لطیفہ روحی کے نفس سے ظاہر ہوتی ہے اور نسبت نایافت خاصہ لطیفہ سری کا ہے واللہ اعلم کہ کس کو ہزاروں میں سے وہ عنایت ہو ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء واللہ ذو الفضل العظیم۔

جاننا چاہئے کہ بعد مرتبہ نایافت کے حقیقت نایافت پیش آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ جب سالک نے لطیفہ سری کو تخلیات سے خالی کیا اگرچہ مشاہدہ کا ہی تخیل ہو دائرہ حقیقی میں داخل ہوا لیکن اس نسبت کی حقیقت سے مطلع نہیں ہے اسی سبب سے ہے کہ وہ ارباب جہل سے ہے پس اگر فضل الٰہی نے اس کی دستگیری کی ایک بارگی اپنے تئیں تمام مراتب عنصری ونوری سے فوق پاتا ہے اور چاہئے کہ اس نسبت کا واصل حقیقت ہو جائے اور وہ ایک قابلیت ہے نور اول کی قابلیات میں سے اور نور اول نور محمدی ہے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اسے شہود اوّل بھی کہتے ہیں اور مرشد کی تعلیم سے بھی پایا ہے یا کوئی کوئی تعلیم غیبی سے کہ میرا وصول مطلوب سے جو ولایت خاصہ میں تھا اپنے علم سے تھا اور اپنے علم کی خصوصیات سے۔

ان دنوں جو مجھے اس علم سے نوازا ہے اس نعمت کا حصول خدا تعالیٰ کے علم اور خصوصیات سے ہے اب میرے علم کو اپنی خصوصیات توقف اور محض بیکاری ہے جو کچھ میرا علم جانتا ہے ساتھ کسی

خصوصیت کے حصہ خصوصیات علم حق تعالیٰ کا جاننا ہے جب سمجھ کر ہر وقت اپنے تمام مراتب ذاتیہ وصفاتیہ وکمالاتیہ کی ذات وصفات وکمالات حق تعالیٰ کا مظہر دیکھتا ہے اور سوا مظہریت محض کے کچھ نہیں پاتا من لم یذق ولم یدر قضیہ مقرر ومشہور ہے جو کہ ہر مرتبہ ولایت کا ابتدا اور وسط اور انتہا رکھتا ہے۔ تو بیچ مرتبہ ابتدا بلند اخیرہ کے جس کا نام ولایت انبیا ہے علی نبینا وعلیہم الصلوٰت والتسلیمات فقط کوشش باطن کے خالی کرنے میں ہے حقیقت کی رو سے یافت حق اور غیر حق کے اور وسط میں اس مرتبہ کے خلو سیر ہے اور اطلاع حقیقت خلو پر اور حقیقت اطلاع ہے اوپر حقیقت اپنی مظہریت صفات کے صفات حق تعالیٰ کے واسطے اس مرتبہ میں اگر جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم سے میں عالم ہوں اور اس کے بصر سے بصیر ہوں اور اس کی قدرت سے قادر ہوں علی ہذا القیاس مگر ابھی تک حقیقت نسبت صفات کے ساتھ ذات حق تعالیٰ کے کما حقہ اس عارف کو مفصلا اور علما ظاہر نہیں ہوئی پس جب جانے گا کہ صفات حق تعالیٰ کے ذات پر زائد نہیں ہیں کہ عالم بہ علم اور بصیر بہ بصر وغیرہ علی ہذا القیاس کہہ سکے بلکہ ذات بذاتہ علیم ہے اور علم قابلیت ذاتیہ ذات کے ہے اور ذات بذاتہ بصیر ہے اور بصر قابلیت ذاتیہ اس کی ہے کذالک فی جمیع الصفات بلی اطلاق عینیت وغیریت ساتھ اطلاق محض کے پس عالم حق ہے خود بخود سبحانہ باصر حق ہے سبحانہ اور اس عارف کے واسطے بجز مظہریت ذاتیہ وصفاتیۂ کمالاتیہ کے اور کوئی دوسرا امر نہیں ہے اور بجز یقین صرف کے اس مرتبہ کے نہایت سے اس وقت مشرف ہوگا مگر اجمالا اور اس مرتبہ کی تفصیل سے جس کو چاہئے نوازیں **ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء واللہ ذو الفضل العظیم** ای برادر نسبت خلو کے جس قدر زیادہ ہوگی اسی قدر اس ولایت کے دائرہ میں دخل زیادہ ہوگا اور انبیا علیہم الصلوٰۃ والتسلیمات کے نبوت کے کمالات کیا بیان کروں کہ تقریر وتحریر سے اس مرتبہ کی حقیقت زیادہ ہے مگر اس قدر ظاہر کیا جاتا ہے اگرچہ ولایت انبیا اور اس کی نبوت علیہم الصلوٰت دونوں دائرہ اصالت میں ہیں اور دونوں ظلیت سے مبرا ہیں مگر اتنا ہے کہ ولایت میں وصول حقیقت صفات عز شانہ کا ہے اور نبوت میں وصول حقیقت ذات جل برہانہ کا ہے استعداد کے درجوں کے تفاوت کے موافق جیسا خدا فرماتا ہے۔ **تلک الرسل فضلنا بعضھم علی بعض الحمد للہ الذی ھدانا لھذا وما کنا لنھتدی لولا ان ھدانا اللہ لقدجاءت رسل ربنا بالحق۔**

آٹھویں فصل (۱)

اور طریقہ چشتیہ کے شعبے بہت ہیں ان میں تین بہت مشہور ہیں۔ نصیریہ، سراجیہ اور صابریہ اور اس فقیر کو ان تینوں سے ارتباط ہے پس اس فقیر کو ارتباط بیعت اور تلقین و اجازت و خرقہ و صحبت کی حیثیت سے اپنے والد بزرگوار شیخ عبدالرحیم قدس سرہ سے ہے اور ان کو خرقہ و اجازت شیخ عظمت اللہ اکبر آبادی اور ان کو اپنے والد سے اور ان کو اپنے والد سے ان کو شیخ عبدالعزیز سے اور نیز وصیت، اجازت اشغال اپنے نانا شیخ رفیع الدین محمد سے ان کو اپنے والد شیخ قطب العالم سے ان کو شیخ عبدالعزیز سے ان کو شیخ نجم الحق سیھنوی سے ان کو شیخ عبدالعزیز سے، پھر شیخ عبدالعزیز کو دو جہت سے ہے ایک شیخ یوسف قاضی خان سے ان کو شیخ حسن بن طاہر سے ان کو سید راجی حامد شاہ سے ان کو شیخ حسام الدین مانک پوری سے ان کو شیخ نور قطب العالم سے ان کو اپنے والد شیخ علاء الحق سے ان کو شیخ سراج الدین عثمان اودھی سے ان کو شیخ نظام الدین اولیا سے اور دوسری جہت سے سید عبدالوہاب بخاری سے ان کو اپنے والد سید محمود سے ان کو اپنے والد راجو قتال سے ان کو سید جلال الدین مخدوم جہانیان سے ان کو شیخ نصیر الدین چراغ دہلی سے ان کو شیخ نظام الدین اولیا سے اور نیز حضرت والد کو خرقہ و اجازت و صحبت سید عبداللہ سے متصل ہے شیخ آدم بنوری سے ان کو شیخ احمد سہرندی سے ان کو اپنے والد شیخ عبدالاحد سے ان کو شیخ رکن الدین سے ان کو اپنے والد شیخ عبدالقدوس سے ان کو شیخ محمد بن عارف سے ان کو اپنے والد شیخ عارف سے ان کو اپنے والد شیخ احمد عبدالحق سے ان کو شیخ جلال الدین پانی پتی سے ان کو شیخ شمس الدین ترک سے ان کو مخدوم علی صابر

(۱) طریقہ چشتیہ

سے ان کو اپنے شیخ اور ماموں شیخ فرید الدین مسعود گنج شکر سے۔

اور اس فقیر کو ایک اور بھی ارتباط ہے کہ فقیر کے بڑے ماموں نے اس فقیر کو خرقہ دیا اور فاتحہ پڑھی اپنے والد سے اور انھوں نے اپنے والد سے اور انھوں نے اپنے والد سے انھوں نے شیخ نظام الدین نارنولی سے ان کو خواجہ خانو گوالیاری سے ان کو خواجہ اسمٰعیل بن حسین سے ان کو اپنے والد خواجہ حسن سرمست سے ان کو اپنے والد خواجہ سالار فاروقی سے ان کو اپنے شیخ خواجہ اختیار الدین عمر سے ان کو خواجہ محمد ساوی سے ان کو خواجہ نصیر الدین سے اور کتاب اخبار الاخیار میں یوں مذکور ہے کہ خواجہ خانو نے اخذ طریقہ کیا خواجہ شہاب الدین ناگوری سے اور کہتے ہیں خواجہ شہاب الدین ان کے شیخ صحبت ہیں اور پہلے شیخ بیعت ہیں واللہ اعلم۔

پھر شیخ نظام الدین کو اخذ طریقت ہے شیخ فرید الدین مسعود گنج شکر سے ان کو خواجہ قطب الدین بختیار اوشی سے ان کو خواجہ معین الدین حسن سنجری سے ان کو خواجہ عثمان ہارونی سے ان کو حاجی شریف زندنی سے ان کو خواجہ قطب الدین مودود چشتی سے ان کو اپنے والد خواجہ ابو احمد چشتی سے ان کو ابو اسحاق شامی سے ان کو شیخ علو دینوری سے ان کو خواجہ ہبیرۃ البصری سے ان کو خواجہ حذیفہ مرعشی سے ان کو سلطان ابراہیم بن ادہم بلخی سے ان کو شیخ فضیل بن عیاض سے ان کو شیخ عبد الواحد بن زید سے ان کو حسن بصری سے ان کو سیدنا علی کرم اللہ وجہہ سے سیہنہ بکسر سین وسکون تحتیہ وفتح ہا اور آخر اس کے نون ایک شہر ہے دار الخلافہ دہلی کے مضافات سے راجا ہندی زبان میں بادشاہ کو کہتے ہیں۔

اور سید حامد شاہ کو راجہ کہتے تھے بطریق تعظیم کے اس لحاظ سے کہ ان کے آبا کرام مانک پور کی ریاست رکھتے تھے مانک پور ایک شہر ہے پورب میں اس کو کڑا مانک پور بھی کہتے ہیں اودھ بفتح الف وبفتح واو وسکون دال ہندی ہا سے ملی ہوئی ایک بڑا شہر ہے پورب میں سادات بخاریہ ایک قبیلہ ہے بڑا حضرت جعفر بن علی بن رضا رضوان اللہ علیہم کی اولاد سے چونکہ ان کے جد سید جلال الدین کچھ مدت بخارا میں رہے ہیں۔ ان کو جلال الدین بخاری کہتے ہیں اور سادات بخاریہ نسبت ہے جلال الدین بخاری سے راجو ہندی نام ہے مشتق راج سے بمعنی بادشاہی کے اور قتال بسبب نفس کے ریاضت کے کہتے تھے چراغ دہلی لقب ہے شیخ نصیر الدین کا اس لئے کہ دہلی میں صاحب ارشاد تھے پانی پت ایک شہر ہے تین منزل دہلی سے لاہور کی طرف نارنول ایک شہر ہے دہلی کے

مضافات سے گوالیار ایک شہر ہے مضافات اکبرآباد سے اوش فرغانہ ایک قصبہ ہے توابع اندجان سے سنجری بکسر سین وسکون جیم وکسر رائے معجمہ نسبت بہ سیستان اور سیستان کو عربی زبان میں سجستان وسنجر کہتے ہیں اور یہ تعریب ہے اور بدلنا سین کا را سے تعریب کی تغیرات سے ہے۔

ہارونی فقیر کے نزدیک خواجہ عثمان کے وطن کا نام ہرنو ہے اور ہارونی نسبت اس سے ہے بخلاف قیاس لوگوں کے زبان میں مشہور چشتی بکسر جیم فارسی ملا عبدالغفور لاری نے بفتح جیم فارسی لکھا ہے۔ سمعان بکسر سین مہملہ وسکون میم وعین مہملہ مشائخ چشتیہ کے شجروں میں شیخ علوممشاد دینوری لکھتے ہیں اور اس کا مقتضی یہ ہے کہ شیخ ممشاد و شیخ علو ایک شخص ہو اور بعضوں کے کلام سے ظاہر یہ ہے کہ اس سلسلہ میں شیخ علو ہے اور وہ غیر ممشاد ہے علو بکسر عین مہملہ وسکون لام ہبیرہ بضم ہا وفتح موحدہ وسکون تحتیہ وفتح رائے مہملہ مرعشی بفتح میم وسکون رائے مہملہ وفتح عین مہملہ وکسر شین معجمہ نسبت ہے مرعش سے کہ ایک شہر ہے توابع شام سے۔

اور اس فقیر نے نقل کیا ہے کتاب عزیزیہ کو جو تصنیف شیخ عبدالعزیز کی ہے اور اشغال واوراد وصبح وشام کے اور اوراد مواسم کے اور تعویذ اور دعائیں اس میں لکھی ہیں ملا محمد شاکر کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے جو اپنے شہر کے بڑے فضلا میں تھے اپنے زمانہ میں اور سب فرزندوں سے شیخ عبدالعزیز کثرت تدریس میں زیادہ اور ممتاز تھے اور عزیزیہ کا مطالعہ کیا ہے اس نسخہ میں جو شیخ یحیٰ جنیدی نے اپنے ہاتھ سے شیخ عبدالعزیز کے نسخہ سے نقل کیا ہے۔ واللہ اعلم۔

اور حضرت والد بزرگوار قدس سرہ نے اس سب کی اجازت دی ہے اور میں نے لکھا ہے کہ کتاب مفتاح الفیض کو جو تالیف شیخ حسن طاہر کی ہے علم سلوک میں اور وہ اس باب میں بہت نفیس کتاب ہے، اس نسخہ سے جو شاہ محمد خیالی کی اولاد کے پاس پایا میں نے تبرکات اجداد سے ان سے کہا ہے شیخ عبدالعزیز نے عزیزیہ میں کہ جب کوئی چاہے کہ کسی کو ذکر تلقین کرے تو چاہیے کہ اس کو فرمائے کہ روزہ رکھے اگر روزہ پنجشنبہ ہو تو بہت اچھا ہے اس کے بعد اس سے دس دفعہ استغفار اور دس دفعہ درود شریف پڑھوائے اور کہے جو عبادت کہ ہے سب کے واسطے وقت مقرر ہے مگر ذکر کہ ہمیشہ رات دن یاد حق تعالیٰ فرض عین ہے کہ العطلة حرام

یک لحظہ زکوئے یار دورے

در مذہب عاشقان حرام است

اور حق تعالیٰ فرماتا ہے۔ **یذکرون اللہ قیاما و قعوداً و علی جنوبھم** یعنی اللہ تعالیٰ کا ذکر کریں کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے ہوئے تو آدمی ان تین حال سے خالی نہیں یا دل سے یا زبان سے حق کی یاد لازم ہے تو جب ذکر ایسی عبادت اور حرفت ہے کہ ہرگز ساقط نہیں ہوتی استاد کو چاہئے کہ اس کو سکھائے اور بتائے کہ دل سینہ کے بائیں طرف ہے صنوبر کی صورت اور اس کے دو دروازہ ہیں ایک اوپر کو ایک نیچے کو اور دونوں دروازہ بند ہیں اوپر کا دروازہ کھلنے کا ذکر جہر فرماتے ہیں اور نیچے کے دروازہ کھلنے کا ذکر خفی یا حبس نفس فرماتے ہیں اور دل کی مثال مثل اس آئینہ کے ہے جسے زنگ لگ گیا ہے اس کے واسطے صیقل کرنے والا چاہئے کہ اس کو وہ سکھائے اور نہیں تو آئینہ خراب ہو جائے گا فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے **لکل شیء مصقلة و مصقلة القلب ذکر اللہ تعالیٰ** یا دل کی مثال چق مق کی ہے جس سے آگ نکالتے ہیں تو جب لوہا پتھری پر مارنا سیکھے اور آگ نکالنی سیکھے اور آگ نکلے اور نہیں تو توڑ ڈالے اور مطلب بر نہ آئے غرضیکہ مرشد بغیر گزارہ نہیں چنانچہ حضرت امیر المومنین علی کرم اللہ وجہ نے حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا کہ **یا رسول اللہ دلنی (۱) الی اقرب الطریق الی اللہ و افضلھا عند اللہ و اسھلھا بعبادہ (۲) فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم علیک بملازمة الذکر فی الخلوة فقال علی کرم اللہ وجھہ کیف اذکر یا رسول اللہ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غمض عینیک و اسمع منی ثلاث مرات بنی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم قال لا الٰہ الا اللہ ثلاث مرات وعلی یسمع ثم قال علی کرم اللہ وجھہ لا الٰہ الا اللہ ثلث مرات نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم یسمع ثم لقن علی کرم اللہ وجھہ الحسن البصری رضی اللہ عنہ حتی وصل الی یومنا ھذا،** پس کہے اسے کہ چارزانو بیٹھے اس طور کہ رگ کیماس پکڑے دو انگلیوں سے یعنی

---

(۱) سکھاؤ مجھ کو بہت نزدیک اللہ کا راستہ اور بہت افضل اللہ کے نزدیک، بہت آسان ہو۔

(۲) اس کے بندوں کو فرمایا رسول اللہ صلعم نے اپنے ملازمہ کو کہ تو خلوۃ میں ذکر کر پس کہا علی کرم اللہ وجہ نے کہ کیسے ذکر کروں یا رسول اللہ فرمایا کہ آنکھیں بند کر اور مجھ سے سنو اسی طرح تین دفعہ پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم تین دفعہ لا الٰہ الا اللہ کہا اور علی کرم اللہ وجہہ سنتے تھے پھر حضرت علیؓ نے تین دفعہ کہا اور حضرت سنتے تھے کہا پھر سکھایا حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے حسن بصریؒ کو یہاں تک کہ ہمارے زمانہ تک پہنچا۔

دائیں پاؤں کے انگوٹھے اور اس کے برابر کی انگلی......اس واسطے کہ اس طور پکڑنے میں دو فائدے ہیں ایک خطروں کی نفی دوسرے دل کی حرارت اور یہ دونوں مطلوب ہیں اور یا اس طرح بیٹھے جیسے نماز میں بیٹھتے ہیں اور خود کعبہ کی طرف پیٹھ کرے اور اس کو اپنے سامنے بٹھائے اور کہے کہ نکالے زیر ناف سے لا الٰہ الا اللہ مد دراز کے ساتھ اور نفی ماسوی اللہ کرے کہ نہیں ہے کوئی معبود و مقصود موجود مگر حق تعالیٰ مبتدی کو ارادہ عوام بتائے کہ نہیں ہے کوئی معبود اور متوسط کو ارادہ خاص کہ نہیں ہے کوئی مقصود اور منتہی کو ارادہ اخص الخواص کہ نہیں ہے کوئی موجود یہاں تک کہ اپنی بھی نفی کرے اور دائیں مونڈھے تک پہنچائے اور وہ ارادہ کرے کہ غیر حق تعالیٰ کو میں نے دل سے نکال دیا اور پس پشت پھینکا پھر دم نیا لے الا اللہ کی ضرب سخت زور سے دل پر لگائے کہ بت باطن کا ٹوٹ جائے اور وقت اثبات کے مطلوب کو اپنے ساتھ جائے بلکہ پالیا تصور کرے بلکہ یقین جانے کہ وہی اثبات کرتا ہے اور اپنے تئیں درمیان سے نکال دے۔

یار آمد درمیان ما از میان برخاستیم

مگر مقصود کلی یہ ہے کہ کلمہ کے معنی دل میں ضرور ہوں تا اس وعید میں نہ آجائے کہ من (۱) ذکرنی بالغفلة ذکرته باللعنة واذا ذکر عبدی عبثا اھتز عرشی غضبا اور یہ مطلوب ہے کہ مرشد کی صورت اپنے سامنے تصور کرے اس کے بعد ذکر کرے الرفیق ثم الطریق انہیں کے حق میں ہے اور نفی خطرات کے لئے بہت اثر رکھتی ہے بلکہ حضرت سلطان الموحدین وبرہان العاشقین حجۃ المتوکلین شیخ جلال الحق والشرع والدین مخدوم مولانا قاضی خان یوسف ناصحی قدس اللہ سرہ العزیز ایسا فرماتے تھے کہ صورت مرشد کہ ظاہر دیکھی جاتی ہے مشاہدہ حق سبحانہ تعالیٰ کا ہے آب وگل کے پردے میں اور جو صورت مرشد کہ خلوت میں نمودار ہوتی ہے وہ مشاہدہ حق سبحانہ وتعالیٰ کا ہے بے پردہ آب وگل کے ان (۲) اللہ خلق آدم علی صورة الرحمن و (۳) من رانی فقد رای الحق اس کے حق میں درست ہوا ہے۔

---

(۱) جو مجھ کو غفلت سے یاد کرے میں اس کو لعنت سے یاد کرتا ہوں اور جب میرا بندہ لہو ولعب سے مجھے یاد کرتا ہے تو عقب سے عرش ہل جاتا ہے۔ (۲) تحقیق اللہ نے پیدا کیا آدم کو رحمٰن کی صورت پر اور (۳) جس شخص نے مجھ کو دیکھا حق کو دیکھا۔

شعر

گر تجلی ذات خواہی صورت انسان ببین
ذات حق را آشکارا اندر وخندان ببین

اور یہ بھی فرماتے تھے کہ چار ہزار پیران طریقت رضوان اللہ علیہم اجمعین کا اجماع ہے اس پر کہ وصول حق تعالیٰ کا دو چیز سے ہوتا ہے ایک ذکر دوسرے بھوکے رہنا پھر فرمایا جو شخص ذکر جلی کرتا ہے اس کو بہت بھوکے رہنے کی حاجت نہیں ہے بلکہ چوتھائی پیٹ خالی رکھے اور گھی کھائے کہ مغز خشک نہ ہو جائے اور دماغ میں خلل نہ آجائے اور جب ذکر جلی سے فارغ ہو یا کوئی مانع پیش آئے تو ذکر خفی سے کہ وہ پاس انفاس ہے مشغول ہو اور دوام شغل مبتدی کو بھی ذکر خفی سے کہ پاس انفاس ہے میسر ہوتا ہے اور اس کا طریق یہ ہے کہ جو دم کہ خارج ہو لا الٰہ کہے اور جو دم داخل ہو الا اللہ تصور کرے اور اس دم کو دل سے ربط ہے اور اس کے سبب دل ذاکر ہو جاتا ہے فردا کے قیامت کو پوچھا جائے گا کہ اپنے دم کہاں صرف کیے تو جو یاد حق تعالیٰ میں صرف کیے ہوں گے خلاصی پائے گا۔

شعر

ہر یک نفس کہ میرد دراز عمر گوہری است
کان را خراج ملک دو عالم بود بہا
مپسند کاین خزانہ دہی رائیگاں بباد
آنکہ روی بخاک تہید ست وبینوا

ابو علی دقاق رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ ذکر منشور ولایت ہے جس کو ذکر کی توفیق ملے اس کو منشور ولایت مل گیا یعنی خلعت ولایت انتم اولیاء حقا سے مشرف ہو گیا اور جس سے توفیق ذکر کی سلب کرے بیشک اسے مقام ولایت سے معزول کیا ایسا ذکر کے باب میں فرمایا ہے کہ ذکر خدا تعالیٰ مریدوں کی تیغ ہے جب دشمن کی ہلاکت کی ہمت کریں یا دفع بلا چاہیں اور اس طرف دل لگائیں دشمن ہلاک ہو جائے گا۔ اور دفع بلا ہو جائی گی۔ قال اللہ تعالیٰ واذکر ربک اذا نسیت یعنی یاد کر اپنے پروردگار کو جس وقت کہ فراموش کرے تو اپنے نفس کو اور نفس کی فراموشی اس کی مخالفت میں ہے چاہئے کہ اپنے نفس سے مخالفت کرے کہ سب عبادتوں کی سردار ہے اس واسطے

کہ کوئی دشمن اس سے زیادہ قوی نہیں ہے جیسا فرمایا ہے مشائخ رحمہم اللہ نے مخالفة (۱) النفس راس العبادة و موافقة النفس راس الکفر

گر حیات (۲) خوب خواہی نفس را گردن بزن
زانکہ از نفست قوی تر، ہیچ دشمن دار نیست

اسی سبب سے ایک بزرگ نے فرمایا ہے کہ سو ہزار بھوکے بھیڑیوں کا ریوڑ بکریوں میں ایسا نقصان نہیں کرتا جیسا کہ ایک شیطان کرتا ہے اور سو ہزار شیطان ایسا نہیں کرتے جیسا ایک برا ہم نشین کرتا ہے اور سو ہزار برے ہم نشین ایسا نہیں کرتے جیسا ایک نفس آدمی کے جسم میں قال (۳) المشائخ رحمھم اللہ النفس ھی الصنم الاکبر اسی معنی میں کسی بزرگ نے بھی فرمایا ہے۔

تا یک (۴) نفس از نفس تو پیداست ہنوز
بر در گہہ دل زدیوغوغا ست ہنوز

فرمایا اللہ تعالیٰ نے فاذکروا اللہ ذکرا کثیرا یعنی اللہ کو یاد کرو، یاد کرنا بہت پس ذکر کے خصائص میں سے ہے یہ بھی کہ کسی وقت منع نہیں بلکہ سب وقت ثواب پاتا ہے نقل ہے حضرت بندگی شیخ عبداللہ قدس سرہ العزیز سے کہ مجھ سے فرمایا پیر دستگیر بندگی حضرت شیخ قطب الدین حاجی قدس سرہ العزیز فرماتے تھے کہ ذکر جہر بارہ برس صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک کیا میں نے جو فائدہ ذکر میں پایا وہ کسی عبادت میں نہیں پایا جب میں ختم قرآن شریف کرتا تھا تو تین سے کم نہ کرتا تھا اور نماز پڑھتا تھا ہزار رکعت سے کم نہیں پڑھتا تھا اور جب دعوات اسما کرتا تھا تو ایک لاکھ بار سے کم نہ کرتا تھا مگر جو ثمرہ اور فائدہ ذکر میں دیکھا ایسا ان میں کسی میں نہ دیکھا اور چاہئے کہ ذاکر گناہوں سے توبہ کرے تا کہ زبان اور دل آلودہ سے حق تعالیٰ کا نام نہ لے اس لئے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وحی کی گئی کہ اپنی امت کے گناہگاروں سے کہو کہ مجھے آلودگی سے نہ یاد کریں میں نے

---

(۱) نفس کی مخالفت عبادت کا سر ہے اور نفس کی موافقت کفر کی بنیاد ہے۔ (۲) اگر تو اچھی زندگی چاہتا ہے تو نفس کی گردن مار، کس سبب سے کہ تجھ کو دشمن رکھنے والا نفس سے زیادہ اور کوئی نہیں ہے۔ (۳) مشائخ رحمہم اللہ علیہم نے کہا ہے کہ نفس بھی ایک بڑا بت ہے۔ (۴) جب تک تیرے نفس سے ایک سانس بھی باقی ہے دل کی درگاہ پر دیو سے ایک غوغا ہے۔

اپنی ذات کی قسم کھائی ہے تحقیق جو مجھے غفلت سے یاد کرے میں اس کو لعنت سے یاد کروں تو جو گناہگار مجھے غفلت سے یاد کریں گے میں ان کو لعنت سے یاد کرونگا یہ وعید ہے ان گناہگاروں کے حق میں جو غافل نہیں تو کیا حال ہوگا ان کا جو غافل بھی ہوں اور گناہگار بھی ہوں کذافی احیاء العلوم ابویزید رحمۃ اللہ علیہ نے ایک روزا اپنے یاروں سے کہا کہ آج شب کو میں نے صبح تک کوشش کی کہ لا الٰہ الا اللہ کہوں میں مگر مجھے قدرت نہ ہوئی یاروں نے کہا کیوں، کہا میں نے لڑکپن میں تو ایک کلمہ کہا تھا وہ یاد آ گیا۔ اس سے وحشت ہوئی اور اس نے نہ کہنے دیا لا الہ الا اللہ اور کیا تعجب ہے اس شخص سے جو اللہ تعالیٰ کو یاد کرے اور حالانکہ موصوف ہو کسی صفات بشریہ سے کذافی العوارف۔

ہزار بار بشستم دہن زمشک وگلاب
ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی ست

بعدہ اسے مراقبہ فرمائیں اس سے کہیں کہ مراقبہ مشتق رقیب سے ہے رقیب کے معنی نگہبان ہے یعنی دل کی پاسبانی کرے کہ دل میں غیر حق کو جانے نہ دے۔

رباعی

پاسبان (۱) دل شو اندر کل حال
تانیابد ہیچ دزد آنجا مجال
ہر خیال غیر حق را دزد دان
این ریاضت سالکان را فرض دان

پس دل میں خیال کرے اور اللہ حاضر ہے اللہ ناظر ہے اور اللہ شاہد ہے اللہ ساتھی ہے ہمیشہ حق تعالیٰ کو ساتھ اپنے اور اپنے تئیں ساتھ حق تعالیٰ کے جانے جدائی خدا سے محال ہے کہا اللہ تعالیٰ نے وفی انفسکم افلا تبصرون یعنی تمہارے دلوں میں ہے کیوں نہیں دیکھتے اس لئے کہ حق تعالیٰ لطیف مطلق ہے جس قدر لطافت زیادہ اسی قدر احاطت زیادہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا الا انہ بکل شی محیط یعنی آگاہ ہو کہ تحقیق حق تعالیٰ ہر شئے کا محیط ہے جیسے روح کا احاطہ جسم کے

---

(۱) ہر حال میں تو دل کا نگہبان رہ۔ تاکہ کوئی چور وہاں مجال نہ پاوے۔ خدا کے غیر کے ہر خیال کو چور خیال کر۔ سالکوں کے واسطے اس ریاضت کو فرض جان۔

ساتھ ہے کہ جسم کا کوئی جز وایسا نہیں کہ روح ساتھ اس کے نہیں ہے باوجود اس کے نہ متصل ہے نہ منفصل ہے نہ خارج ہے نہ داخل ہے۔

فائدہ جب چاہے کہ چلہ میں بیٹھے تو چاہئے کہ پہلے دایاں پاؤں حجرہ میں رکھے اعوذ اور بسم اللہ پڑھے اور قل اعوذ برب الناس تین دفعہ پڑھے پھر بایاں پاؤں حجرہ میں رکھے اور کہے انت ولیئی فی الدنیا والاخرۃ کن لی کما کنت لمحمد علیہ السلام وارزقنی محبتک اللھم ارزقنی حبک فی شغفی واجذبنی بجلالک وجمالک واجعلنی من المخلصین اللھم امح نفسی بجذبات ذاتک یا انیس من لا انیس لہ رب لا تذرنی فردا وانت خیر الوارثین پھر مصلی پر قبلہ رو کھڑا ہو اور اکیس بار پڑھے انی وجھت وجھی للذی فطر السموٰت والارض حنیفا وما انا من المشرکین پھر دو رکعت نماز اجلال اللہ تعالیٰ پڑھے پہلی رکعت میں بعد الحمد کے آیۃ الکرسی اور دوسری میں الحمد کے بعد امن الرسول آخر سورۃ تک بعد فراغ سجدے میں جائے اور یہ دعا پڑھے اللھم کن لی انیسا فی خلوتی ومعینا فی وحدتی اللھم اجعل خلوتی ھذہ موجبۃ لمشاھدتک ووفقنی لما تحب وترضی اللھم اعوذبک من سخطک واسالک رضاک اللھم جنبنی ان اعبد الھوی اللھم اکشف الغطاء عن عینی وارفع الغین عن قلبی حتی اشاھد جمال لا الہ الا اللہ پھر دوگانہ جن کا ذکر ہو چکا ہے پڑھے اور ایک دوگانہ ماں باپ کی روح کو، اگر وفات پا گئے ہوں پڑھے اور نہیں تو ان کی سلامتی کے واسطے پڑھے اور چار رکعت ایک سلام سے اور پڑھے ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کے پچاس بار سورۂ اخلاص اور پانچ پانچ دفعہ معوذتین پڑھے تاکہ خدا تعالیٰ کی پناہ میں رہے اور پانسو بار یا فتاح کہے بعدہ ذکر نفی واثبات ساتھ ارادہ خاص الخاص یعنی لاموجود کے مشغول ہو اور کبھی ذکر اسم ذات کرے ساتھ ملاحظہ اور مفہوم ملاحظہ کے اور واسطے کے مشغول رہے چنانچہ ایک لحظہ ذکر نفی واثبات سے خالی نہ رہے یہاں تک کہ وضو کے وقت اور کھانے کے وقت اس کے تصور میں رہے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت جل جلالہ میں مناجات کی کہ الٰہی میں سب وقت تجھ کو یاد کر سکتا ہوں مگر دو وقت ایک تو پاخانہ کے وقت اور ایک جب غسل کی حاجت ہو حکم ہوا اذکرنی فی کل حال

یعنی مجھے یاد کر ہر حال میں تو اس وقت بھی تصور سے خالی نہ ہو جیسا کہ فرمایا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہانے کان النبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم یذکر اللہ علی کل حال احیان یعنی ذکر دو قسم ہے ایک دل سے دوسرا زبان سے اور پہلا اعلیٰ ہے اور حدیث شریف میں بھی اسی سے مراد ہے اور فرمایا اللہ تعالیٰ اذکروا اللہ ذکراً کثیراً اور وہ یہ ہے کہ فراموش نہ کرے خدا تعالیٰ کو کسی جائے اور حضرت نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دونوں قسم میں کمال تھا مگر حالت جنابت اور داخل ہونے بیت الخلا کے سو جان لیا تم نے کہا اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک قسم پر اختصار کرتے تھے ایسی قسم پر جس میں جنابت کو دخل ہی نہیں یعنی ذکر دل اور اسی سبب سے جب بیت الخلا سے باہر آتے تو فرماتے۔غفرانک پس حالت خلا میں یہی فکر و خیال کہ شکستگی و آسودگی اپنی اور پاکی حق تعالیٰ کے کافی ہے اور یہ عین ذکر ہے۔

ذکر کشف قبور جان کہ ذکر کشف قبور کے واسطے اوّل جب مقبرہ میں آئے دوگانہ ان بزرگ کی روح کے واسطے پڑھے اگر سورہ فتح یاد ہو پہلی رکعت میں پڑھے اور دوسری میں سورۂ اخلاص اور نہیں تو ہر رکعت میں پانچ پانچ بار اخلاص پڑھے اور پھر قبلہ کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھے اور ایک بار آیۃ الکرسی اور بعض سورتیں جو زیارت کے وقت پڑھتے ہیں۔جیسے سورہ ملک اور اس کے سوا بعدہ قل کہے بعد فاتحہ کے گیارہ بار سورۂ اخلاص پڑھے اور ختم کرے اور تکبیر کہے بعدہ سات دفعہ طواف کرے اور اس میں تکبیر پڑھے اور شروع دائیں طرف سے کرے پھر پاؤں کی طرف رخسار رکھے اور نزدیک میت کے منہ کے بیٹھے اور کہے یارب اکیس دفعہ بعدہ اول طرف آسمان کے کہے یا روح اور دل میں ضرب کرے یاروح الروح جب تک کہ انشراح پائے یہ ذکر کرے انشاء اللہ تعالیٰ کشف قبور و کشف ارواح حاصل ہوگا۔

اور طریقہ ختم خواجگان چشت قدس اللہ اسرارہم کہ بعض اولاد شیخ نظام الدین نارنولی سے اس طرح پہنچا ہے کہ جب کوئی حاجت پیش آئے وضو کرے رو بہ قبلہ بیٹھے اوّل دس مرتبہ درود شریف پڑھے اس کے بعد تین سو ساٹھ بار یہ دعا پڑھے لا ملجا ولا منجی من اللہ الا الیہ بعد اس کے تین سو ساٹھ بار الم نشرح پڑھے پھر تین سو ساٹھ دفعہ وہی دعاء مذکور پڑھے پھر دس دفعہ درود شریف پڑھے اور ختم تمام کرے اور تھوڑی شیرینی پر فاتحہ عام خواجگان چشت کے نام سے

پڑھے اور اپنی حاجت اللہ تعالیٰ سے عرض کرے اسی طرح روز کرے انشاء اللہ چند یوم میں مقصد حاصل ہوگا۔

بیان طریقہ سہروردیہ، یہ طریقہ ملک ہندوستان میں مخدوم بہاء الدین زکریا کی جہت سے شائع ہوا ہے اور خراسان میں شیخ نجیب الدین بزغش کی جہت سے اور اس فقیر کو ان دونوں شعبوں سے ارتباط ہے پس ارتباط اس فقیر کو اپنے والد شیخ عبدالرحیم قدس سرہ سے ان کو شیخ عظمت اللہ اکبر آبادی سے ان کو اپنے والد سے ان کو اپنے دادا شیخ عبدالعزیز سے ان کو سید عبدالوہاب بخاری سے ان کو سید صدر الدین راجو قتال سے ان کو اپنے بھائی سید جلال الدین مخدوم جہانیان سے ان کو شیخ رکن الدین ابوالفتح سے ان کو اپنے والد شیخ صدر الدین سے ان کو اپنے والد شیخ بہاء الدین زکریا سے ان کو شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردی سے اور ایضا اس فقیر نے خرقہ شیخ ابوطاہر مدنی کے ہاتھ سے پہنا ہے۔

انھوں نے شیخ احمد قشاشی سے انھوں نے شیخ احمد شناوی سے انھوں نے اپنے والد ان کے دادا شیخ عبدالوہاب شعراوی سے اور انھوں نے خرقہ پہنا ہاتھ سے شیخ الاسلام زکریا بن محمد انصاری کے روحی لہ الفدیۃ بلباسہ لہا شہاب احمد کے ہاتھ سے فقیہ علی بن محمد ومیاطی عرف زلیانی سے انھوں نے ہاتھ سے ابوبکر بن محمد خوانی صاحب الوصایا القدسیہ کے انھوں نے ہاتھ سے شیخ نورالدین عبدالرحمٰن مصری سے انھوں نے شیخ جمال الدین یوسف کورانی کے انھوں نے شیخ حسام الدین شمشیری اور نجم الدین اصفہانی کے ہاتھ سے انھوں نے شیخ نورالدین عبدالصمد طنزی کے انھوں نے شیخ نجیب الدین علی بن بزغش سے انھوں نے عارف باللہ شیخ شہاب عمر سہروردی روح اللہ روحہ وارواحہم ورحمنا بہم پس تحقیق حاصل ہونے خرقہ سہروردیہ کی تیسری وجہ واللہ اعلم۔

اور شیخ عارف باللہ شیخ شہاب الدین عمر سہروردی کے لئے دو جہتیں ہیں ایک تو انہوں نے پہنا خرقہ اپنے چچا قاضی وجیہ الدین عمر بن محمد عرف عمویہ سے انھوں نے اپنے والد معمر محمد عمویہ بن عبداللہ سعد سے اور شیخ اخی فرح زنجانی دونوں کے ہاتھ مشارکت میں انھوں نے اپنے والد شیخ احمد اسود دینوری سے انھوں نے ممشاد دینوری سے اور اخوالفرج زنجانی سے انھوں نے ابوالعباس نہاوندی سے انھوں نے ابوعبداللہ محمد بن حنیف شیرازی سے انھوں نے ابومحمد رویم بن احمد بغدادی

سے اور ممشاد اور رویم نے سید الطائفہ القاسم جنید بغدادی سے اور دوسری جہت شیخ شہاب الدین عمر سہروردی کی یہ ہے کہ انھوں نے تلقین پائی اپنے چچا ابونجیب سہروردی سے انھوں نے شیخ احمد غزالی سے انھوں نے شیخ ابوبکر نساج سے انھوں نے شیخ ابوالقاسم گرگانی سے انھوں نے شیخ ابوعثمان مغربی سے انھوں نے ابوعلی کاتب سے انھوں نے ابوعلی رودباری سے انھوں نے ابوالقاسم جنید بغدادی سے نفحات میں فرغانی سے نقل ہے کہ شیخ الشیوخ شیخ سہاب الدین سہروردی نے نسبت خرقہ ابوالقاسم جنید تک کی ہے آگے نہیں کی اور جنید سے مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک صحبت سے نسبت دی ہے خرقہ سے نہیں دی مگر شیخ مجد الدین بغدادی نے کتاب تحفۃ البررہ میں لکھا ہے کہ نسبت خرقہ متصل ہے پیغامبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک حدیث درست متصل مفیض سے انتہی۔

میں کہتا ہوں حق وہی ہے جو سہروردی نے کہا ہے اور اس فقیر نے درود وظیفہ و شغل و اعمال طریقہ سہروردیہ کے اخذ کئے ضمن میں عوارف المعارف کے شیخ ابوطاہر سے انھوں نے اپنے والد شیخ ابراہیم کردی سے انھوں نے احمد قشاشی سے انھوں نے احمد شناوی سے انھوں نے اپنے والد سے انھوں نے ان کے دادا سے انھوں نے شیخ عبدالوہاب شعراوی سے انھوں نے زین زکریا سے انھوں نے حافظ شہاب الدین احمد بن حجر عسقلانی سے انھوں نے ابوالحسن بن ابوالمجد دمشقی سے انھوں نے تقی سلیمان بن حمزہ مقدسی سے انھوں نے شیخ پیشوا شیخ شہاب الدین عمر سہروردی سے اور وصایا قدسیہ کے ضمن میں رسالہ شیخ زین خوانی کا سند مذکور سے شیخ زین الدین تک و میاط بکسر دال مہملہ اور بعضوں نے کہا ذال معجمہ اور سکون میم اور تخفیف یای تحتیہ ایک شہر مشہور ہے گوران بفتح کاف عجمیہ ایک قبیلہ ہے کردوں میں سے نطنزی بفتح نون وطائے مہملہ وسکون وکسر زائ معجمہ بزغش بضم یائے موحدہ وسکون زائ معجمہ وضم غین معجمہ وشین معجمہ عمومیہ بضم غین مہملہ وضم میم مشددہ وسکون واو وتشدید یائ تحتیہ ایسا کہا ہے۔

ملا عبدالغفور نے اور اس میں کلام ہے بلکہ ظاہر تخفیف یائے تحتیہ کی ہے مانند راہویہ و مدویہ وغیرہما کے اخی فرج بفتح فا و فتح راء مہملہ وجیم زنجانی بفتح رائ معجمہ وسکون نون و فتح جیم والف ونون مکسورہ و یائ نسبت اور نفحات میں ابوالعباس نہاوندی کو شاگرد جعفر خلدی کا لکھا ہے اور وہ شاگرد جنید بغدادی کے ہیں۔

خلد بضم خائے معجمہ ایک محلہ ہے بغداد میں کہا ہے شیخ زین الدین خوافی نے کتاب وصایا قدسی میں ومنہا العصم یعنی وہ اپنے اوقات کو ضبط کرتے ہیں اور صرف کرتے ہیں ہر وقت اپنا جو اس وقت کے لائق ہو جب صبح صادق طلوع ہوتی ہے چاہئے کہ تجدید کرے شہادت کی اور کہیں اللھم انی اصبحت اشھدک واشھد حملة عرشک وملائکتک وانبیائک ورسلک وجمیع خلقک بانک انت اللہ لا الہ الا انت وحدک لاشریک لک وان محمدا عبدک ورسولک اللھم انی اصبحت لا استطیع دفع ما اکرہ ولا املک نفع ما ارجو واصبح الامر بید غیری واصبحت مرتھنا بعملی فلا فقیر افقر منی اللھم (۱) لاتشمت بی عدوی ولا تسؤلی صدیقی ولا تجعل مصیبتی فی دینی ودنیائی ولا تجعل الدنیا اکبر ھمی ولا مبلغ علمی ولا تسلط علی من لا یرحمنی اللھم صل علی محمد وعلی آل محمد وسلم پھر کہے اللھم (۲) ما اصبح بی من نعمة او باحد من خلقتک فمنک وحدک لاشریک لک فلک الحمد ولک الشکر تین مرتبہ کہے پھر کہیں اللھم (۳) لک الحمد حمدا دائما مع دوامک ولک الحمد حمدا خالدا مع خلودک ولک الحمد حمداً لامنتھی لہ دون مشیتک ولک الحمد حمداً لاجزاء لقائلہ الارضاک ولک الحمد طرفة عند کل عین وتنفس کل نفس ولک الحمد

---

(۱) الٰہی میرے دشمنوں کو مجھ پر خوش نہ کیجئے اور میرے دوست کو کبھی رنجیدہ نہ کیجئے اور مجھے کوئی دین ودنیا کی مصیبت نہ دیجئے اور میرے بڑے مقصود دنیا نہ کیجئے اور نہ میرے مبلغ علم کو اور مجھ پر ایسے کو تسلط نہ دیجئے جو مجھ پر رحم نہ کرے الٰہی محمد اور آل محمد پر درود وسلام بھیج۔

(۲) الٰہی مجھ پر جو نعمت ہے یا اور کسی پر تیری خلقت میں وہ تیری ہی دی ہوئی ہے تو یگانہ ہے کوئی تیرا شریک نہیں پس تیرے ہی واسطے ہی حمد ہے اور تجھ ہی کو شکر ہے۔

(۳) الٰہی تجھ کو حمد ہے ایسے جو دائم ہے تیری دوام کے ساتھ اور تم کو ایسی حمد ہے جو ہمیشہ ہے بڑی ہمیشگی کے ساتھ اور تجھ کو ایسی حمد ہے جس کے نہایت نہیں سوا تیرے علم کے اور تم کو حمد ہے ایسی جس کا منتہی نہیں سوائے تیری مشیت کے اور تجھ کو حمد ہے ایسی جن کی جزا اس کے کہنے والے کو سوائے تیری رضا کے نہیں ہے اور تجھ کو حمد ہے پل پل اور دم بدم اور تجھے حمد ہے ایسی جو تیری نعمتوں کو کافی ہو اور کفایت کرے تیرے زیادہ دینے والے کو۔

حمدا یوافی العمل ویکافی مزیدک پھر کہے سبحان(۱) اللہ وبحمدہ عدد خلقہ ورضاء نفسہ وزنۃ عرشہ ومداد کلماتہ جس قدر میسر ہو کہے جو فرصت پائیں کہیں سبحان (۲) اللہ وبحمدہ اضعاف ما سبحہ ویسبحہ جمیع خلقہ وکما یحب ربنا ویرضی وکما ینبغی لکرم وجہ ربنا وعز جلالہ ولا الہ الا اللہ اضعاف ماھللہ ویھللہ جمیع خلقہ وکما یحب ربنا ویرضی وکما ینبغی لکرم وجہ ربنا وعز جلالہ ولاحول ولاقوۃ الا باللہ العلی العظیم اضعاف مامجدہ ویمجدہ جمیع خلقہ وکما یحب ربنا ویرضی وکما ینبغی لکرم وجہ ربنا وعز جلالہ پھر پڑھیں دو رکعت سنت نماز صبح کی پہلی رکعت میں الحمد کے بعد قل یاایہا الکافرون اور دوسری میں قل ھو اللہ پھر کہیں سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم وبحمدہ استغفر اللہ ایک سو دفعہ یا جس قدر ہو سکے پھر درود پڑھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جس قدر ہو سکے پھر پڑھیں دعاء ماثورہ درمیان سنت وفرض کے اللھم انی اسئلک رحمۃ من عندک تھدی بھا قلبی وتجمع بھا امری وتلم بھا شعثی وتصلح بھادینی ونقضی بھادینی وتحفظ بھا غایتی وترفع بھا شاھدی وتبیض بھا وجھی وتزکی بھا عملی وتلھمنی بھا رشدی وترد بھا الفنی وتعصمنی بھا من کل سوء اس کو عوارف میں ذکر کیا ہے پھر فرض جماعت سے پڑھے جن میں فائدے ہوں کلیہ اور وہ مشہور ہیں اور فقراء کو یاد ہیں ان سے سیکھ لے پھر پڑھے حسب

(۱) پاک ہے اور اس کو حمد ہے اس کے مخلوق کی گنتی کے برابر اور اس کی رضا کے برابر اور اس کے عرش کے وزن کی برابر اور اس کے کمالات کے درازی کے برابر۔ (۲) بہت پاکیزگی ہے اللہ کو اور اس کو حمد ہے اس سے دو چند جو اس نے پاکیزگی کہی ہے اور اس کی تمام خلقت نے اور جیسے ہمارے رب کو محبوب ہے اور راضی ہے اس سے اور جیسے سزاوار ہے رب وجہ کریم کو اس کے بزرگ جلال کو اور حمد ہے اللہ تعالیٰ کو دو چند اس سے جو اس نے کی ہے اور اس کی تمام خلقت نے کی ہے جیسے ہمارے رب کو پیاری ہے اور راضی ہے اور جیسے لائق ہے اس کے بزرگ ذات کو اور بزرگ دعا سب جلال کو اور کوئی معبود برحق نہیں سوا اللہ کے دو چند اس سے جو اس نے کہا ہے اور اس کی تمام خلقت اور جیسا اس کو دوست ہے اور پسند ہے اور جیسا چاہئے اس کے بزرگ ذات کو اور بزرگ جلال کو اور نہ گناہوں سے بچتا ہے اور نہ عبادت کی قوت ہے مگر اللہ اور بلند وعظیم ہی ہے دو چند اس سے جو اس نے بزرگی کہی ہے اور اس کی بزرگی کرتی ہے تمام خلقت اس کی اور جیسے اسے محبوب ہے ہمارے رب کے وجہ کریم کو اور اس کے بزرگ جلال کو۔

معمول پھر مشغول ہولا الٰہ الا اللہ کے ذکر سے جس طرح تلقین کیا ہے اور جیسا کہہ دیا ہے اس سے کہ حروف ذکر کے مخرجوں سے نکالے اور خوب ہمت سے کہے سر کو جھکائے اوپر ناف کے اور وہاں سے لا الٰہ نکالے اور وہی جگہ ہے ظہور نفس کی کھینچ کر لائے لا الٰہ کو دائیں مونڈھے تک نظر کرتا ہوا، دل سے اللہ کی کبرو عظمت کو تا کہ صاف ہووے نفس اور میل دے سر کو بائیں طرف اور الا اللہ کی ضرب خوب شدت سے قلب لحمی صنوبری پر کہ بائیں طرف بائیں پستان کے نیچے سینہ کے برابر ہے لگائے ایسی حیثیت سے کہ قلب میں اثر ہو اور ذکر کے آگ کی حرارت قلب کو پہنچے اور پگھل جائے چربی جو دل پر ہے اور اس کی ایک خاص بو ہے جلنے کے وقت اور پگھلنے کے وقت اور اس آگ کے پیچھے نور ہے تو ذکر کے لئے نار بھی ہے نور بھی ہے اس کی نار خالی کر دیتی ہے اور اس کا نور آراستہ کر دیتا ہے تو جب اثر ہوتا ہے نار اور نور کا قلب کے درمیان بیچ گاڑھے خون کے جو وسط قلب میں ہے اور وہ منبع ہے حیات حیوانیہ کا اور وہیں سے جاری ہیں نہریں خون کی شرائین میں سب اعضاء کی طرف تو وہ نار تصرف کرتی ہے بخار لطیف میں جو مرکب کرتا ہے خون سرایت کرنے والے کو اعضا میں اور وہ بخار ہے روح حیوانی ہے اور وہی نفس انسانیہ ہے جو مرکب ہے روح انسانی کا پس جس وقت تصرف کیا ذکر نے اس بخار میں تو بیشک تصرف کیا نفس میں اور سارے بدن میں سرایت کئے ہوئے ہے پس تحلیل ہوتے ہیں اعضاء بدن کے ذکر کی تاثیر سے اور نفس متاثر ہوتا ہے نار ذکر سے اور نور ذکر سے اور جیسا ہم نے کہا ہے کہ اس کی نار خالی کرتی ہے اور اس کا نور آراستہ کرتا ہے بدل جاتی ہیں نفس کی ظلمتیں انوار سے اور بری عادتیں زائل ہو جاتی ہیں اور آراستہ ہو جاتا ہے اچھے اخلاق سے تو خلاص ہو جاتا ہے قلب ظلمات نفس سے اور زیادہ ہوتا ہے قلب کا نور علی نور پس مستعد ہو جاتا ہے فیضان انوار کا صفات الٰہی کے اور بمقدار ملازمت کے نتیجہ ظاہر ہوتا ہے اور قریب آئے گا زیادہ بیان ذکر کا اور اس کے انوار اور احوال تقلبات اور تغیرات کا انشاء اللہ تعالیٰ اور چاہیئے کہ حاضر کرلے نفس یعنی دم کو اوپر قلب کے اور الا اللہ کے ''ہا'' کو ایک ایسا دائرہ کرے کہ قلب کے دائرہ پر پورا ہو جائے قوت سے اور اثبات کی جانب ملاحظہ زیادہ نفی کی جانب کے ملاحظہ سے اور نیت کرے مبتدی کلمہ لا الٰہ الا اللہ سے لا معبود غیر اللہ اور متوسط نیت کرے لا مطلوب یا لا مراد یا لا مقصود الا اللہ اور جس وقت اپنے دل میں مخلوق کی محبت پائے جو اللہ

اوراس کے درمیان واسطہ نہ ہوتو نیت کرے لامحبوب الا اللہ اور چاہئے کہ سچا ہوتینوں معنی میں یچ نفی اور اثبات کے خالص کرے اپنی ہمت سے اپنے نفس کو متعلقات دنیا سے اور مشتبہات اور مستلذات سے بچے کہ یہی ہیں معبود باطل اور رغبت نہ کرے کشف وکرامات کی طرف حق کو طلب کرے تنہا اور پاک کرے طلب کو ہوائے نفس سے کیونکہ کشف وکرامات بھی نفس کی ہوا اور خواہش کی قسم سے ہیں اور جس نے ان کی طرف التفات کیا اور اس کو مدنظر ذکر میں اور اس کا مقصد ذکر سے بھی ہوتو وہ ممکورین میں درج ہے بلکہ اگر واقع ہو بلا طلب اس کے تو اس پر استدراج کا خوف ہے بعضے بزرگوں نے کہا ہے کہ سالک جب باغ میں جائے اور درختوں کے پرند اس باغ میں اپنی زبان میں کہیں اسلام علیک یا ولی اللہ تو وہ اگر نہ جانے کہ یہ مکر ہے تو تحقیق یہ اس کے ساتھ مکر ہے اور اسے شعور نہیں اور سب مرشد مریدوں کو نفرت دلاتے رہے ہیں۔

کرامات عیانیہ کی رغبت سے اور کہا ہے کہ کرامات مردوں کا حیض ہے پھر جب منور ہو جاتا ہے قلب انوار وحدانیت سے جو امانت ہے ملازمت ذکر میں لا الٰہ الا اللہ کے اور منعکس ہوتے ہیں۔ انوار مخلوقات پر سب طرف سے تو دیکھتا ہے ذکر کہ وجودات جو یہ ہیں ان کی حقیقت نہیں یہ سب مجاز یہ ممکنہ غیر واجبیہ ہیں اور مشاہدہ کرتا ہے وجود حق کا جو واجب ازلی ابدی ہے۔ تو اس حال میں کہے لا الٰہ الا اللہ اور نیت کرے لا موجود الا اللہ یعنی وجود حقیقی ہمیشہ تکرار کرے لا الٰہ الا اللہ کی اسی معنی سے یہاں تک کہ مضمحل ہو جائے سب ظلمات کائنات کی اس کی نظر شہود میں اور ظاہر ہو نور توحید کا اور یہاں پاؤں پھسلنے کی جائے ہے سو انشاء اللہ بعد میں بیان ہوگی۔

اور بعض ذاکرین یہ سمجھے ہیں مشائخ کے اس قول سے کہ حصر نفس کرے قلب پر واسطے وصول حرارت نفس کے قلب کی طرف کہ ذاکر سانس نہ لے اور سانس کو ضبط کرے یہاں تک کہ بعضے کہتے ہیں کہ سانس کتنے ضبط ہوئے سو یہ ان کو وہم ہوا ہے حصر نفس سے یہ مراد نہیں جو ان کو وہم ہوا بلکہ یہ تو ہندوؤں کے جوگیوں کا کام ہے جو ریاضت کرتے ہیں ان کو اس میں دنیا کے مقصد ہیں۔ سالک کو چاہئے اس سے احتراز کرے اور وہی کرے جو ہم نے کہا ہے اور سانس کو چھوڑ دے راحت میں اور شمار نہ کرے پھر مبتدی قدرت نہیں رکھتا کہ ملاحظہ کرے معنی احسان کے ساتھ ملاحظہ معنی ذکر کے پس خیال کرے دل میں اوّل معنی ذکر کے اور اسے بار بار دل میں گذارے

یہاں تک کہ جب اثر کر جائے معنی ذکر کے قلب میں تو اس وقت ملاحظہ کرے معنی احسان ذکر کے کانہ براہ پھر جب چمکے بجلی ابر کرم سے اور آفتاب غیب کی شعائیں ہوں اس وقت متوجہ ہو اپنی سر سے واسطے مشاہدہ کے سوا خوب طرح دیکھنے کے بلکہ سر جھکا دے واسطے بزرگی اور تعظیم کے اور کیا خوب کہا ہے بعضے مشاہدہ کرنے والوں نے کہ میں ان کا مشتاق تھا جب وہ ظاہر ہوا میں نے سر جھکا لیا اس کے جلال سے اس کی تعظیم کے واسطے اور تحقیق کہا ہے اللہ تعالیٰ نے جب تو مجھے دیکھے تو میرا ذکر نہ کر اور جب نہ دیکھے تو میرے نام سے جدا نہ ہو اور یہ مقام ان باتوں کے ذکر کا نہ تھا ان کا تو وعدہ ہی آگے بیان کرنے کا ہے، انشاء اللہ تعالیٰ لیکن بات میں بات نکل آتی ہے پھر جب اس نے ذکر بہت کیا اور آفتاب بلند ہوا بقدر ایک نیزہ کے یا دو نیزہ کے اور اس کو ماندگی ہوئی تو ترک کرے ذکر کو اور مراقبہ کرے مذکور کا اور ملاحظہ کرے۔ پہلے اللہ تعالیٰ کی نظر اپنی طرف اپنے وجود کے ذرہ ذرہ کی طرف اور اپنے تئیں اللہ تعالیٰ کی نظر میں احاطہ کئے ہوئے جانے کیونکہ یہ جہت میں ہے اور اللہ تعالیٰ جہت سے منزہ ہے تو ممکن نہیں متوجہ ہو کسی طرف لیکن جب ملاحظہ کرے نظر اللہ تعالیٰ کی اس کی طرف سب جانب سے صغیر معلوم ہوگا وجود اپنا اور جب صغیر معلوم ہوا اپنا وجود پیچھے ہوگی اس کی وہ نظر اور وہ بھاگے گا اس کے وجود کی طرف یہاں تک کہ اس کے واسطے باقی نہیں رہے گا کوئی ٹھکانا بھاگنے کا **وان الی ربک یومئذٍ المستقر** پھر جب اٹھ جائیں گے جسمیت اور نابود و نیست ہو جائیں گے جہتیں تو ملاحظہ کرے گا۔

قرب صفات کو اور تکلفات کی کچھ حاجت نہیں رہنے کی اور عالم ارداح منزہ ہیں جہتوں سے تو ادراک کرے گا قرب اللہ تعالیٰ کا ساتھ معنی اور صفت کے پھر ترقی کرے گا اس کے فوق کی طرف پھر جب حرکت کریں گے خطرے یہ دعا پڑھے **اللھم انی اعوذبک من تفرقة القلب اللھم اجعلنی فارغ القلب مجموع اللھم بحیث لا یخطر فی قلبی سواک** پھر پڑھے نماز اشراق دو رکعت پہلی میں الحمد کے بعد **اللہ نور السمٰوات والارض بکل شی علیم** تک دوسری میں **اذن اللہ ان ترفع بغیر حساب** تک پھر کئی دفعہ ذکر کرے اور دعا مانگے پھر مشغول ہو تلاوت قرآن شریف سے فکر کے ساتھ اور نصیحت ماننے کے ساتھ اور ترتیل کے ساتھ اور حفاظت وادب کے ساتھ اس طور کہ گویا اللہ تعالیٰ کے آگے پڑھ رہا ہوں اللہ

سن رہا ہے قلب کو حاضر کر کے دعا کرتا ہوا اور صفا حال اور ادب کرتا ہوا اور خشوع کرتا ہوا اور پڑھے مقدار ایک سپارہ یا دو سپارہ کے اور بہت سا پڑھنے کا خیال نہ کرے بلکہ نصیحت وعبرت کا خیال رکھے کیونکہ بہت قرآن پڑھنے والے ایسے ہیں کہ وہ قرآن پڑھتے ہیں اور قرآن ان کو لعنت کرتا ہے اس لئے کہ وہ حروف صحیح نہیں کرتے اور نہ وقتوں کی رعایت کرتے ہیں اور نہ عبرت پکڑتے ہیں اور نہ اس کی مثلون میں اور زجروں میں۔

پھر جب تلاوت سے فارغ ہو نماز چاشت پڑھے دو یا چار رکعتیں ان میں الحمد کے بعد والضحی والم نشرح پڑھے اور جو چار پڑھے تو اور دو سورتیں جو ان سے پہلے ہیں والشمس اور واللیل پڑھے، الحمد کے بعد اور اس قدر پر بس کرے جو لوگ اس سے حاجت رکھتے ہوں علم پڑھنے کی نیت خالص کریں اور نفس کی آسودگیوں سے پاک ہوں اور اللہ کے واسطے پڑھاوے وہ علم جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اور جو ہوذ کی قابل کہ قرآن وحدیث سے اصطلاحیں نکالے تو جس قدر کی حاجت ہو اور فضول اور زوائد نہ ہو کہ اپنے ہمسروں پر فخر کرے اور اس سے بادشاہ کا تقرب حاصل کرے نعوذ باللہ من الخذلان والخسران پھر کہا ہے کہ جب فارغ ہو کھانے سے اس نیت سے اور اس وصف سے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے تو سورہے قیلولہ کرے کہ رات کو جاگنے میں مدد ملے پھر جب جاگے اٹھے تو وضو کرے اور دو رکعتیں شکر اللہ کی پڑھے۔ اور ذکر سے مشغول ہو یہاں تک کہ آفتاب کو زوال ہو پھر جب آفتاب زائل ہو چار رکعتیں نفل ایک سلام سے پڑھے خواہ شافعی مذہب ہو خواہ حنفی ہو اس طور سے پڑھی ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان میں پڑھے۔ بعد فاتحہ کے جس قدر ہو سکے ایک سیپارہ یا زیادہ یا کم اور جو قرآن حفظ نہ ہو تو ہر رکعت میں فاتحہ کے بعد تین دفعہ آیۃ الکرسی پھر پڑھے چار سنت ظہر کی۔ پھر فرض جماعت کے ساتھ پھر دو رکعتیں سنت پڑھے پھر دو رکعتیں نفل پڑھے پھر جو اس کا کاروبار معاش کا ہو یا مطالعہ کتاب کا ہو یا کتابت کرنی ہو اس سے مشغول ہو عصر کی نماز تک پھر چار سنتیں عصر کی پڑھے۔ پھر فرض پڑھے جماعت سے پھر اپنا وظیفہ معمولی اذکار میں سے پڑھے پھر مشغول ہو ذکر لا الٰہ الا اللہ سے جیسے ہم ذکر کر چکے ہیں غروب آفتاب تک اور جو پہلے فارغ ہو جائے تو مشغول ہو تسبیح واستغفار سے پھر مغرب کی نماز پڑھے پھر دو سنتیں پڑھے پھر دو رکعتیں بقاء ایمان کے واسطے پڑھے ان میں الحمد کے بعد آیۃ

الکرسی ایک ایک دفعہ دونوں میں اور قل ہو اللہ اور معوذتین بھی ایک ایک دفعہ دونوں رکعتوں میں پھر سلام پھیر کر دس بار درود شریف پھر تین بار یہ دعا مانگے ۔اللھم(۱) انی استودعک دینی فاحفظہ علیّ فی حیاتی وعند وفاتی وبعد مماتی ،تا کہ ثابت رکھے اس کے تئیں اللہ تعالیٰ اوپر ایمان کے اور امن میں رکھے جان کنی اور عذاب ورسوائی سے ایسا ہی افادہ فرمایا ہے ہم کو ہمارے پیر قدس اللہ سرہ نے پھر جبکہ طالب علم ہو تو مطالعہ میں مشغول ہو مغرب سے عشاء تک یا تکرار علم میں اور کلام نہ کرے اس وقت میں کہ اس وقت میں بات کرنے سے قلب مکدر ہوتا ہے اور تر و تازگی وقت کی جاتی رہتی ہے تو صاف نہیں ہوتا قلب آخر شب تک اور اسی طرح نماز عشا کے بعد بھی نہ باتیں کرے مگر شرعی عارضے سے کیونکہ اس سے نقصان نہیں اگر بقدر حاجت ہو اور جو طالب العلم نہ ہو تو اس کو بھی اولیٰ ہے کہ لا الٰہ الا اللہ کے ذکر میں مشغول ہو اسی طور سے جو سیکھا ہے کیونکہ اس وقت ذکر قلب کو صاف کرتا ہے امور طبیعہ سے جو دن میں گذرے ہیں تو امادہ ہو جائے صفا کے ساتھ واسطے حضور کے جو عمل شب کو کرے گا۔

پھر چار سنتیں عشا کی پڑھے پھر جماعت سے فرض پڑھے۔ پھر چار سنتیں اور چاہے دو سنتیں پھر جب اپنے مکان کو پھر کر آئے چار رکعت پڑھے ایک سلام سے الحمد کے بعد پہلی میں آیۃ الکرسی اور دوسری میں امن الرسول آخر سورۃ تک اور تیسری میں اول سورہ حدید سے علیم بذات الصدور تک اور چوتھی میں آخر سورہ حشر کا لو انزلنا سے پھر ذکر سے مشغول ہو اور رعایت رکھے وظیفہ کی جیسا مشاہدہ کیا ہے۔یعنی سورہ فاتحہ تین بار پڑھے پھر ذکر سے مشغول ہو ساتھ فقراء کے جو ہوں، نہیں تو اکیلا ذکر کرے پھر جس وقت اس کا قلب حظ پائے اور نفس ملول ہو مراقبہ مذکور کرلے پھر جب خطرے حرکت کریں تو وہی دعا پڑھے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

اور ایک سو مرتبہ درود شریف پڑھے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر پھر درود شریف پڑھے جبرئیل، میکائیل، اسرافیل وعزرائیل حاملین عرش اور ملائکہ مقربین اور تمام انبیاء مرسلین پر تین مرتبہ جیسا دیکھا ہے مجلسوں میں فقرا کے پھر ستر دفعہ استغفار پڑھے اور خیال کرے اپنی سستی اور

---

(۱) الٰہی میں امانت رکھتا ہوں تیرے پاس اپنے دین کو پس حفاظت کر تو اس کی میری زندگی میں اور وقت میرے مرنے کے اور بعد میرے مرجانے کے۔

غفلت روز کی یا پہلے پھر دعا مانگے اور کچھ پڑھے قرآن شریف میں سے والدین اور پیر واستاد اور اپنے یاروں اور بھائیوں کے واسطے اور سب مومنین اور مومنات کی روح کو بخشے ثواب تکبیر اور درود شریف پڑھے جیسے دیکھا ہے فقرا سے پھر جو ہو طالب علم نیند کے غلبہ تک مطالعہ کرے اور جو سالک ہو تو ذکر لا الہ الا اللہ سے مشغول ہو۔ نیند کے غلبہ تک اور جب نیند غلبہ کرے تو اس کو دفع نہ کرے نہیں تو تہجد کو ضرر کرے گی سورہے نیت کر کے عبادت پر مدد کی اور نفس کے حق ادا کرنے کی حاضر ہو دل سے اور اللہ تعالیٰ کے نظر کرنے کو دیکھتا ہو اور اس سے شرماتا ہو کہ اس کے سامنے پاؤں پھیلاتا ہے ایسی صورت سے جیسے مرتا ہے اور روح کو اللہ کو سونپتا ہے اس کا حکم بجالاتا ہے کہ **قم الليل الا قليلا** اور پڑھے آیۃ الکرسی اور آمن الرسول اور آخر سورہ کہف **ان الذين آمنوا وعملوا الصالحات** سے اور کلمہ شہادت پڑھے اور کہے **باسمك اللهم**(۱) **وضعت جنبي وبك ارفعه اللهم قني عذابك يوم تجمع عبادك** اور اس کے ارادہ میں ہو کہ اٹھے گا اور کہے گا **اللهم** (۲) **ايقظني في احب الاوقات اليك واشغلني بطاعتك فيه** پھر جب اس کو بیدار کردے اللہ تو چاہئے کہ کھڑا ہو جائے اور اللہ کا ذکر کرے اور کہے **الحمد** (۳) **لله الذی احيانا بعد ما اماتنا ورد الينا ارواحنا واليه البعث والنشور** اور سبحان اللہ کہے اور استغفار پڑھے۔

اور وضو کرے اور دو رکعتیں پڑھے پھر وقت پر نظر کرے اگر ایسا وقت ہے کہ تہجد ادا کر سکتا ہے تو شروع کرے تہجد دو رکعتیں پڑھے آیۃ الکرسی اور امن الرسول کے ساتھ پھر سبحان اللہ کہے کتنی دفعہ اور ذکر کرے کتنی بار اور درود شریف پڑھے پھر دو رکعتیں پڑھے بڑی دونوں میں سورہ سجدہ اور سورہ دخان پڑھے پھر دو اور پڑھے سورہ یٰسین اور انا فتحنا اور سورہ زمر یا سورہ حدید یا جون سی سورۃ چاہے پھر اور دو رکعتیں پڑھے سورہ ملک اور سورہ مزمل پھر دو اور رکعت میں سورہ طٰہٰ تمام یا کسی قدر پھر وتر پڑھے سبح اسم اور **قل يا ايها الكافرون وقل هو الله** اور جمع کرے دعا قنوت میں

---

(۱) الٰہی تیرے نام سے میں لیٹا اور تیری مدد سے میں اٹھوں گا اور بچا مجھ کو عذاب سے اس دن کہ تیرے بندے جمع ہوں۔ (۲) الٰہی بیدار کر مجھ کو اچھے وقت میں اور مشغول کر مجھ کو عبادت میں اس وقت۔ (۳) شکر ہے اس کے واسطے جس نے زندہ کیا ہمارے مرنے کے پیچھے اور پھر تو ہماری روحیں بعث اور نشور اس کی طرف ہے۔

حنفیہ وشافعیہ کا قول پھر درود شریف پڑھے پھر ذکر سے مشغول ہو جو جانتا ہے اوّل سحر تک اور وہ چھٹا حصہ شب کا باقی ہے مغفرت چاہے اللہ سے اپنے لئے اور اپنے والدین اور جمیع مومنین ومومنات کے اور مسلمین ومسلمات زندہ اور اموات کے واسطے تو ادا ہو جاتے ہیں اس استغفار سے جمیع حقوق مومنین ومومنات کے پھر جب صبح قریب ہو تو دعا ایسی جو لائق ہو اصحاب محبت اور عالی ہمتوں کے کیونکہ یہ وقت وقت خاص دعا کے قبول کا ہوتا ہے تو دعا کرے وہ جو اللہ کی طرف سے الہام ہو موافق اپنے مقام کے اور طالب حق کو چاہئے دعا میں بچے ایسی دعاؤں سے جو کمینہ ہیں بہت اور دعا اس کے فرمان بجالانے کے واسطے ہے کہ اس نے فرمایا ہے۔ ادعونی استجب لکم اور واسطے تمکن اور اپنی ذلت ومحتاجی ظاہر کرنے کو کیونکہ اس نے اپنے کرم وبخشش کی راہ سے کہا ہے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان مبارک پر جو اللہ سے نہ سوال کرے اس شخص سے خدا غصہ ہوتا ہے اور نہیں تو اس کا لطف وکرم کافی ہے۔

اور اس کی بخشش وغنا وافی ہے ہم کو ہست کر دیا حالانکہ ہم کچھ بھی نہ تھے اور ہم پر بڑی نعمتیں ظاہر وباطن کی فراخ کیں ہمارا کچھ استحقاق نہ تھا نہ کوئی سابقہ خدمت وعبادت کا اب بھی اس کا ہم پر احسان ہے اور آئندہ بھی انشاء اللہ تعالیٰ بفضلہٖ وکرمہٖ، لیکن اس کی حکمت کا مقتضا ہے کہ اس کی طاعات وعبادات کریں اور ذکر اور دعائیں اور استغفار تاکہ ہم کو زیادہ کرے اپنے فضل سے اور جس پر ظاہر ہوئے اسرار اس کی صفات ازلیہ ابدیہ کے اور پہچانتا ہے کہ جو امور واقع ہوئے اور ہوتے ہیں اور ہوں گے تمام کائنات میں اور جو جو امر اور نہی صادر ہوئے عبادت میں وہ مقتضی ہے۔ اس کی صفات کا جو اس کی ذات کے واسطے ہیں ازلا اور ابداً تو وہ حجت اور برہان نہیں طلب کرتا اور تسلیم ویقین ظاہر کرتا ہے، انشاء اللہ مراتب کمال ایمان واحسان وعرفان کو پہنچے گا، پھر جب صبح صادق ہوا کرے تو وہی کرے اور کہے جس کا ذکر ہو چکا ہے۔ والحمد علی التوفیق۔

نویں فصل (۱)

اور طریقہ کبریہ کے شعبے بہت ہیں۔ان میں بہت مشہور ترکستان و کشمیر وغیرہ میں امیر سید علی ہمدانی کا شعبہ ہے اور بہت نادران کا خرقہ کبریہ ہے خواجہ نقشبند کی جہت سے اس فقیر نے یہ خرقہ پہنا ہے شیخ ابو طاہر کے ہاتھ سے اور انھوں نے اپنے باپ سے انھوں نے شیخ احمد قشاشی سے انھوں نے شیخ احمد شناوی سے انھوں نے اپنے والد کے ہاتھ سے انھوں نے ان کے دادا شیخ عبدالوہاب شعراوی سے انھوں نے شیخ الاسلام زین الدین زکریا سے انھوں نے شمس محمد بن عمر واسطی سے انھوں نے ابوالعباس احمد زاہد سے اور انھوں نے شہاب دمشقی سے انھوں نے عبدالرحمٰن شرقی سے انھوں نے احمد رودباری سے انھوں نے رضی الدین علی بن سعید غزنوی سے جو لالا مشہور ہیں۔ انھوں نے محمد بغدادی سے انھوں نے شیخ نجم الدین کبری سے اور نیز شیخ ابوطاہر نے پہنا اپنے والد شیخ ابراہیم کردی سے انھوں نے قشاشی سے انھوں نے شناوی سے انھوں نے سید غضنفر بن جعفر نہروانی نزیل مدینہ مشرفہ سے انھوں نے شیخ تاج الدین عبدالرحمٰن بن مسعود گازرونی سے انھوں نے حافظ نورالدین احمد طاؤسی سے کہا پہنا میں نے تبرکا محقق شریف سید علی برجانی سے انھوں نے خواجہ علاء الدین عطار سمرقندی سے انھوں نے خواجہ بہاء الدین محمد مشہور نقشبند سے انھوں نے شیخ سلطان الدین سے انھوں نے شیخ احمد مولانا سے انھوں نے شیخ بابا کمال حیدری سے انھوں نے شیخ مقتدا نجم الدین کبری سے اور نیز اس فقیر نے یہ طریق حاصل کیا اور خرقہ پہنا اپنے والد شیخ عبدالرحیم سے انھوں نے سید عبداللہ سے انھوں نے شیخ آدم بنوری سے انھوں نے شیخ احمد سہرندی

---

(۱) طریقہ کبریہ

سے انھوں نے شیخ یعقوب صرفی کشمیری سے انھوں نے شیخ حسین خوارزمی سے انھوں نے شیخ حاجی محمد صدیق جو شالی سے انھوں نے شاہ علی بیداوزی سے انھوں نے شیخ رشید الدین محمد بیداوازی سے انھوں نے سید عبداللہ برزش آبادی سے انھوں نے شیخ اسحٰق ختلانی سے انھوں نے امیر سید علی ہمدانی سے پھر امیر سید علی ہمدانی نے حاصل کیا طریقہ شیخ شرف الدین محمود بن عبداللہ مزدقانی سے اور شیخ تقی الدین علی دوستی سمنانی سے۔

اور ان دونوں نے شیخ علاء الدین ولد احمد بن محمد سمنانی سے انھوں نے شیخ نور الدین عبدالرحمٰن کسرفی اسفرائی سے انھوں نے شیخ جمال الدین احمد جوزفانی سے انھوں نے شیخ رضی الدین لالا سے انھوں نے شیخ نجم الدین کبری سے پھر شیخ مقتدا نجم الحق والدین ابوالجناب احمد بن عمر بن محمد خوارزمی خیوقی معروف کبری مشہور شیخ ولی تراش کو دو جہتوں سے ہے۔ ایک تو انھوں نے صحبت پائی اور خرقہ پہنا اور حاصل کیا طریقہ شیخ عمار بن یاسر سے انھوں نے شیخ ابونجیب عبدالقاہر بن عبداللہ سہروردی سے انھوں نے اپنے والد سے انھوں نے اپنے چچا عمر بن محمد سے انھوں نے اپنے والد محمد بن عویہ سے انھوں نے احمد بن یسار سے انھوں نے ممشاد دینوری سے انھوں نے ابوالقاسم جنید سے ساتھ سند مذکور کے اور دوسری جہت یہ کہ انھوں نے صحبت پائی اور اصل خرقہ پہنا اور طریقہ حاصل کیا شیخ اسمٰعیل قصری سے انھوں نے محمد بن المالکیل سے انھوں نے شیخ داؤد بن محمد عرف خادم الفقرا سے اور انھوں نے شیخ ابوالعباس بن ادریس سے اور انھوں نے شیخ ابوالقاسم بن رمضان سے اور انھوں نے شیخ ابو یعقوب نہرجوری سے اور انھوں نے شیخ ابو یعقوب سوسی سے اور انھوں نے شیخ عبدالواحد بن زید سے اور انھوں نے شیخ کمیل بن زیاد سے اور انھوں نے سیدنا علی سے رضی اللہ عنہ وقدس اللہ اسرارہم ورحمنا بہم آمین۔

طاؤسی نسبت طاؤس تابعی مشہور ہیں۔ کسرفی بفتح کاف وکسر سین مہملہ وفا ونوں ہے۔ جو ریان بضم جیم وسکون واؤ ورائے مہملہ ویائے عجمیہ ہے۔ ابوالجناب فتح جیم وتشدید نون ویائے موحدہ ہے۔ خیوقی بکسر خائے معجمہ وسکون یائے تحتہ وفتح وکسر قاف ہے۔ قصری بفتح قاف وسکون صاد مہملہ وکسر رائے مہملہ ہے۔ شیخ نجم الدین کبری نے خرقہ اصل شیخ اسمٰعیل قصری کے ہاتھ سے پہنا ہے اور خرقہ اصل سے مراد یہ ہے کہ تبرک کی جہت سے نہ ہو محمد بن مالکیل بہ سکون لام وکسر

کاف وسکون یائے مثناۃ تحتیہ ولام ہے۔ کاتب حروف کہتا ہے کہ بعضے نسخوں میں مانکیل یعنی نون بجائے لام اول کے لکھا ہوا ہے۔ نہر جوری بفتح نون وسکون ہا وفتح رائے مہملہ وضم جیم وسکون واؤ وکسر رائے مہملہ ویائے تحتیہ ہے۔ سوسی بواؤ میان دوسین مہملہ اول مضموم وثانی مکسور نسبت ہے سوس سے کہ ایک شہر ہے مغرب میں یا وہ شہر سوس نام کہ جس میں قبر سے دانیال پیغمبر کی۔ شیخ مجد والدین بغدادی نے کتاب تحفۃ البررہ میں لکھا ہے کہ خرقوں کی نسبت متصل ہے پیغامبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک حدیث درست متصل مستفیض سے اور فرمایا ہے کہ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خرقہ پہنایا امیر المومنین علی کرم اللہ وجہ کو اور تمام اس سلسلہ کا ذکر کیا ہے میں کہتا ہوں اور محققین اہل حدیث نے انکار کیا ہے اس اتصال کا نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اور باوجود اس کے ہمیشہ نسبت اس سے کرتے ہیں ابوالقاسم جنید بغدادی تک اور جوان کے طبقہ میں ہیں۔ واللہ اعلم۔

خبر دی مجھ کو حضرت والد نے اجازت کی۔ کہا خبر دی مجھ کو شیخ عظمت اللہ اکبر آبادی نے اجازت کی اپنے والد ان کے دادا شیخ عبدالعزیز دہلوی سے کہ انھوں نے فرمایا کہ منقول ہے حضرت مولانا نورالحق والدین جعفر نور اللہ مرقدہ سے کہ کیفیت اوراد اور اوقات کے سلسلہ کامل محقق صمدانی علی ثانی امیر سید علی ہمدانی قدس اللہ سرہ العزیز کی یہ ہے کہ جب صبح صادق طلوع ہو دو رکعت نماز سنت فجر پڑھے جب سلام پھیرے اس تسبیح کو ایک سو دفعہ پڑھے **سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم وبحمدہ استغفر اللہ** نقل ہے ان حضرات سے کہ اپنے منشیات میں لکھا ہے کہ جب میں سراندیپ میں واسطے زیارت قدم گاہ آدم صفی علیہ السلام کے گیا جب نزدیک قدمگاہ کے پہنچا صبح کو واقع عظیم یعنی خواب دیکھا کہ بہت سے مشائخ کبار اس درویش کے دیکھنے کو آئے ہیں ان میں ایک شیخ نجم الدین کبری بھی تھے قدس اللہ سرہ العزیز۔

میں نے اس حال میں شیخ سے سوال کیا کہ کونسا ذکر بہت افضل ہے کہ اس پر مواظبت کرنے سے بندہ کو حق تعالیٰ کا قرب میسر ہو جائے شیخ نے فرمایا کہ سب اخبار واردہ اور صحیح حدیثوں کو میں نے غور سے دیکھا جو عظمت کہ اس تسبیح میں پائی کسی میں نہ پائی جب میں ہشیار ہوا تو یہ حدیث حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مجھے یاد آئی۔ **کلمتان (۱) خفیفتان علی اللسان**

---

(۱) کلمات جو زبان پر ہلکے ہیں میزان پر بھاری ہیں۔ اللہ کے پیارے ہیں اور وہ یہ ہیں **سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم**۔

ثقیلتان فی المیزان حبیبتان الی الرحمٰن وھما سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم وبحمدہ استغفر اللہ سچے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور شیخ محی الدین بن عربی قدس سرہ نے فتوحات مکیہ میں لکھا ہے کہ جو کوئی اسے سو دفعہ صبح کو یہ تسبیح پڑھے اس کا کوئی گناہ نہ رہے اور یہ مشائخ کے وصایا میں سے ہے کہ جو کوئی اسے سو دفعہ ہمیشہ پڑھا کرے اس کی برکت اور صفائی مشاہدہ کرے گا۔

اس دعا کو جو عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے حضرت رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی ہے کہ صبح کی سنتوں اور فرضوں کے درمیان پڑھے اللھم انی اسئلک رحمۃ آخر تک پڑھ کر پھر فرض صبح کے پڑھے جب سلام پھیرے اوراد فتحیہ پڑھنے میں مشغول ہو کہ ایک ہزار چار سو ولی کامل کے متبرک کلام سے جمع ہوا ہے اور فتح ہر ایک کی ان میں سے ایک کلمہ میں ہوئی ہے جو حضوری کے ساتھ اپنے پر لازم کر لے اس کی برکت اور صفائی مشاہدہ کرے گا اور ایک ہزار چار سو ولی کی ولایت سے حصہ پائے گا واللہ التوفیق۔

اب اگر فضائل اور خواص اس اوراد کے بیان کیے جائیں تو بہت طویل ہو جائے اس واسطے کہ آنحضرت نے اپنی ساری عمر میں معمورۂ عالم کی تین مرتبہ سیر کی ہے اور چودہ سو ولی کامل سے ملے ہیں اور ان میں سے چار سو کو ایک مجلس میں سلطان محمد خدا کے بندے نے دیکھا ہے اور ہر ولی سے رخصت کے وقت دعا اور رقعہ کی التماس کی ہے اور ان رقعوں کو اپنے جامہ پر مرقع کیا ہے اور ان دعاؤں کو اور ذکروں کو جو بے اختیار ان کی زبان پر جاری ہوتے تھے جمع کیا ہے یہ اوراد ہو گئے ہیں منقول ہی انھیں حضرت سے کہ جب بارہویں دفعہ کعبہ شریف کی زیارت کو گیا مسجد اقصیٰ میں پہنچا حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ اس درویش کی طرف تشریف لا رہے ہیں میں اٹھا اور آگے گیا اور سلام کیا آپ نے اپنی آستین مبارک سے ایک جزو نکالا اور اس درویش سے فرمایا کہ خذ ھذہ الفتحیۃ یعنی اس فتحیہ کو لے جب میں نے حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دست مبارک سے اور نظر کی تو یہی اوراد تھے اس اشارہ سے ان کا نام فتحیہ رکھا گیا۔ واللہ الھادی الی صراط مستقیم پس ذکر اوراد فتحیہ کا تمام ہوا اور حضرت والد قدس سرہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا طریق ختم میر سید علی ہمدانی کا۔ اول آدھی رات کو اٹھے اور وضو تازہ کرے

اور دو رکعت نفل پڑھے اور ہر رکعت میں الحمد کے بعد پندرہ دفعہ سورہ اخلاص بعد سلام کے ہزار دفعہ کہے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اس کے بعد ہزار دفعہ پڑھے۔ **یا خفی الطاف ادرکنی بلطفک الخفی** اس کے بعد ایک ہزار اور ایک مرتبہ یا بدوح اور سر گریبان میں جھکا دے اور مراقبہ کرے دیکھے عالم غیب سے کیا چیز مشاہدہ ہوتی ہے جب اس سے فارغ ہو، دوگانہ پڑھے اس کا ثواب میر سید علی ہمدانی کو بخشے۔ انتہی۔

دسویں فصل (۱)

طریقہ مدینیہ کے شعبے بہت ہیں ان میں بہت مشہور مغرب میں شعبۂ مغاربہ ہے اور حضر موت میں شعبۂ عیدروسیہ ہے۔ سید عبداللہ عیدروس کبیر کی جہت سے اوراس فقیر کو ہر ایک سے ارتباط ہے، حاصل کیا میں نے اس طریقہ کو شیخ ابوطاہر سے انھوں نے دوشیخوں حرم کے مکے سے شیخ احمد نخلی سے اور شیخ عبداللہ بن سالم بصری سے انھوں نے شیخ عیسیٰ مغربی سے انھوں نے اپنے شیخ سعید بن ابراہیم جزائری مفتی عرف قدرہ سے انھوں نے شیخ محقق سعید بن مصری سے انھوں نے ولی کامل احمد محی دہرانی سے انھوں نے شیخ الاسلام عارف باللہ سیدی ابراہیم تازی سے انھوں نے شیخ الطریقہ سیدی صالح بن موسیٰ زوادی سے انھوں نے شیخ معمر محمد بن مخلص سے انھوں نے شیخ مغلطائی بن فلیح سے انھوں نے ابوعبداللہ عریاں سے انھوں نے اپنے والد شیخ جماعت طویل نامدی سے انھوں نے شریف ابومحمد ناجوزی سے انھوں نے قطب ابومحمد صالح سے انھوں نے قطب الطریقہ شیخ ابومحمد بن مغربی سے اور نیز حاصل کیا یہ طریقہ اس فقیر نے شیخ ابوطاہر سے انھوں نے شیخ احمد نخلی مکی سے انھوں نے سید عبدالرحمٰن بن علی باعلوی شاگرد سید عبداللہ بن علوی حداد اپنے داماد سے انھوں نے سید عبداللہ بن علوی حداد سے اور انکی نسبت طریقہ میں ہے سید محمد بن علوی نزیل مکہ کی طرف انھوں نے سید عبداللہ بن علی صاحب الزہد سے انھوں نے شیخ بن عبداللہ عیدروس سے جنکی قبر احمد آباد میں ہے انھوں نے اپنے والد سید عبداللہ بن شیخ سے انھوں نے اپنے چچا سید ابوبکر عیدروس صاحب عدن سے انھوں نے اپنے والد قطب سید عفیف الدین عبداللہ

---

(۱) طریقہ مدینیہ

عیدروس سے اور وہ بزرگ جن کی طرف نسبت کیا جاتا ہے شعبہ عیدروسیہ انھوں نے اپنے چچا سید عمر محضار سے انھوں نے اپنے والد سید عبدالرحمٰن بن محمد شفاف سے انھوں نے اپنے والد محمد بن علی مولیٰ دویلہ سے۔ انھوں نے اپنے والد علی بن علوی سے انھوں نے اپنے والد علوی بن محمد سے انھوں نے اپنے والد محمد بن علی سے کہ وہ جد ہیں آل سادہ باعلوی کے انھوں نے شیخ ابومدین مغربی سے بواسطہ دو شخصوں کے ایک شیخ عبداللہ صالح مغربی اور ایک شیخ عبدالرحمٰن مقتدی مغربی اور شیخ ابومدین نے بھیجا تھا شیخ عبدالرحمٰن کو کہ خرقہ پہنائے فقیہ مقدم محمد بن علی کو سو وہ بیمار ہوگئے مکہ میں تو بھیجا شیخ عبداللہ نے حضرموت کی طرف تو ان کو خرقہ پہنایا۔

پھر شیخ مقتدی ابومدین شعیب بن حسن مغربی نے طریقہ اخذ کیا اور خرقہ پہنا اپنے شیخ ابویعزا سے انھوں نے شیخ علی بن علی حرزہم سے انھوں نے فقیہ حافظ قاضی ابوبکر محمد بن عبداللہ بن محمد معاضری عرف ابوبکر بن عربی اندلسی شبیلی سے انھوں نے امام حجۃ الاسلام ابوحامد محمد غزالی سے انھوں نے امام الحرمین عبدالملک سے انھوں نے اپنے والد شیخ امیر محمد عبداللہ بن یوسف جوینی سے انھوں نے شیخ عالم عارف ابوطالب مکی محمد بن علی بن عطیہ حارثی سے انھوں نے ابوبکر دلف بن حجدر شبلی سے انھوں نے سید طائفہ ابوالقاسم جنید بغدادی سے اور محمد بن علی فقیہ مقدم کو دوسری جہت ہے طریقہ کی کہ وہ آبائی واجدادی ہے اور وہ یہ ہے کہ انھوں نے طریقہ اخذ کیا اپنے والد علی سے اور انھوں نے اپنے والد محمد صاحب مرباط سے انھوں نے اپنے والد خالع قسم سے انھوں نے اپنے والد علوی سے انھوں نے اپنے والد محمد سے انھوں نے اپنے والد علوی سے انھوں اپنے والد عبداللہ سے انھوں نے اپنے والد مہاجر فی اللہ احمد سے انھوں نے اپنے والد عیسی سے انھوں نے اپنے والد محمد سے انھوں نے اپنے والد علی عریضی سے انھوں نے اپنے والد امام جعفر صادق سے اور اسی طرح ابومدین کا طریقہ دوسرا ہے کہ رجوع ہوتا ہے نوری کی طرف اور وہ یہ ہے کہ شیخ ابومدین نے اخذ طریقہ کیا شیخ ابویعزا بنور سے اور انھوں نے شیخ ابوشعیب ایوب ساریہ بن سعید ضبہاجی سے انھوں نے شیخ عبدالجلیل سے انھوں نے شیخ ابوالفضل جوہری سے انھوں نے اپنے والد ابوعبداللہ حسین جوہری سے انھوں نے شیخ ابوحسین نوری عرف ابن البغوی رفیق جنید سے انھوں نے سری سے اور نیز خرقہ پہنا ابومدین نے امام ابوبکر طوسی سے انھوں نے شاشی سے انھوں نے شبلی

سے انھوں نے جنید سے اور اسی طرح امام حجتہ الاسلام کا دوسرا طریقہ ہے جہت سے ابوعلی فارمدی سے اور اسی طرح ابوطالب مکی کا طریقہ دوسرا ہے جس پر اعتماد کیا ہے صاحب نفحات نے اور وہ یہ ہے کہ انھوں نے اخذ کیا طریقہ ابوالحسن محمد بن ابوعبداللہ احمد بن سالم بصری سے انھوں نے سہل بن عبداللہ تستری سے اور شیخ ابوطالب مکی ہیں۔

صاحب کتاب قوت القلوب لوگوں نے کہا ہے کہ کوئی تصنیف اسلام میں اس کی مثل نہیں دقایق طریقہ میں میں کہتا ہوں یہی کتاب اصل تصوف ہے سوائے اس کے اور جو کتابیں سلوک میں تصنیف ہوئیں اس سے نکالی گئیں جیسے احیاء اور غنیۃ الطالبین اور عوارف اور میری اسناد قوت القلوب کی یہ ہے کہ میں نے حاصل کی اجازت شیخ ابوطاہر سے انھوں نے شیخ احمد نخلی سے انھوں نے شیخ محمد بن علاء البابلی سے انھوں نے احمد بن عیسی بن جمیل کلبی سے انھوں نے علی بن ابی بکر قرانی سے انھوں نے ابوالفضل جلال الدین سیوطی سے انھوں نے شہاب احمد بن محمد حجازی سے انھوں نے ابواسحاق برہان تنوخی سے انھوں نے ابوالعباس احمد بن ابوطالب حجازی سے انھوں نے عبدالعزیز بن دلف سے انھوں نے ابوالفتح محمد بن یحییٰ بردانی سے انھوں نے ابوعلی محمد بن محمد بن عبدالعزیز مہدوی سے کہا خبر دی ہم کو عمر بن ابی طالب نے کہا خبر دی ہم کو ہمارے والد ابوطالب مکی نے پھر ذکر کیا۔

مزید، زاء معجمہ سے ہے امیلہ بفتح الف وکسر میم وسکون تحتیہ بعد اس کے لام ہے اسی طور ضبط کئے ہیں ہم نے دونوں لفظ ابوطاہر سے۔ مراغی بغین معجمہ وفتح میم نسبت ہے مراغہ کی طرف وہ ایک شہر ہے آذربیجان میں فاروث بروزن فاروق آخر میں تا مثلثہ ایک قریہ ہے درمیان واسط اور بصرہ کے کہا ہے یافعی نے ۶۲۸ میں کہ زواوی نسبت ہے زواوہ کی طرف وہ ایک بڑا قبیلہ ذات بطون وافخاذ ہے اور اس کا مسکن اعمال اویسقیہ ہے انتہی۔

وہط بفتح واو وسکون ہا آخر اس کے طاء مہملہ ایک گاؤں ہے نزدیک عدن کے، عدن ایک شہر ہے یمن میں سے کنارہ پر دریا کے عتیروس بہ تحتیہ اور مثناۃ شہر کے ناموں میں مشتق ہے عترسہ سے بمعنی اخذ بعنف وشدت کے اور وہ لقب شیخ عبداللہ کا ہے پھر بولنے میں عیدروس تا دال ہوگئی ہے اور وہ بعین مہملہ اور یاء مثناۃ ساکنہ اور دال مہملہ اور رائے مضموم پھر واؤ ساکن حاء مہملہ وفتح ضاد

معجمہ آخراس کے رائے مہملہ لقب ہے بسبب جلدی حاضر ہونے کے وقت فریاد کے۔

سقاف بہ سین مفتوح وقاف مشددہ مفتوحہ آخراس کے فا لقب ہے صیغۂ مبالغہ سے بیچ سرحال کے مولی الدویلہ یعنی صاحب شہر کہنہ المقدم یعنی مقدم التربت مقبرہ میں پہلے ان کی زیارت کرتے ہیں اس کے بعد باقی سادات کی پس اس لئے اس کو مقدم التربتہ کہتے ہیں۔ ابومدین بفتح میم وسکون دال مہملہ وفتح تحتیہ آخراس کے نون ابویعزا بفتح تحتیہ وعین مہملہ وزائے معجمہ حرزہم بکسر حائے مہملہ وسکون رائے مہملہ وکسر رائے معجمہ آخر جمع مذکر مغافری بفتح میم وعین مہملہ وبعد الف فائے مکسورہ پھر رائے مہملہ غزالہ بفتح غین معجمہ تخفیف زائے معجمہ ایک قریہ ہے مضافات طوس سے جوینی بفتح جیم وبفتح واؤ سکون تحتیہ اس کے بعد نون اور یائے نسبت جوین ایک ناحیہ بڑا ہے نیشاپور کے نواحی میں۔

ابوطالب محمد بن عطیہ حارثی۔ عطیہ بفتح عین مہملہ وکسر طاء مہملہ ویائے مثناۃ تحتیہ حارثی بحائے ورائے مھملتین وثاء مثلثہ دلف بضم دال مہملہ وفتح لام آخرہ فا، جحدر بفتح جیم وسکون حاء مہملہ وفتح دال مہملہ ورائے مہملہ شبلی بکسر شین معجمہ وسکون موحدہ بعد باء لام نسبت ہے طرف شبلہ کے جو ایک گاؤں ہے۔

اسروشنہ بضم ہمزہ وسکون سین مہملہ وضم رائے مہملہ وفتح شین معجمہ وفتح نون بعد اس کے ہائے ساکنہ ایک بہت بڑا شہر ہے سمرقند کے اس طرف ماوراء النہر کے شہروں میں سے صاحب مرباط یعنی شہر ظفار قدیمہ قاموس میں کہا ہے مرباط بروزن محراب ایک شہر ہے کنارہ ہند کے خالع قسم نے خرید کی تھی ایک زمین میں بیس ہزار دینار کو اور قسم نے اس کا نام وہی رکھا جو بصرہ میں اس کے کنبے کے لوگوں کے زمین کا تھا اور وہاں درخت لگائے پھر وہ قریہ ہوگیا۔ پھر منتقل ہوا اس سے دوسرے قریہ کی طرف تو بولنے لگے خالع قسم عریض مصغر نام ہے ایک وادی کا جو قریب مدینہ مشرفہ کے ہے اس کی طرف منسوب ہیں علی عریضی۔

ہم نے نقل کیا یہ سلسلہ عیدروسیہ سید عبدالقادر عیدروس کا اور ضبط اسماء مبہم کئے نفحات قدوسیہ سے خرقہ میں عیدروسیہ سید عبدالقادر کے اور مشروع مردودی کے بیچ آل باعلوی کے سید محمد شبلی کے خبر دی ہم کو شیخ ابوطاہر نے ان کو شیخ احمد نخلی نے انھوں نے کہا ہم کو اجازت دی اس دعا کے پڑھنے

کی پانچویں نمازوں کے بعد۔ سید عبدالرحمٰن بن علی باعلوی شاگرد سید عبداللہ حداد اور ان کے داماد سے اپنے شیخ سید عبداللہ بن علوی حداد باعلوی سے اور وہ یہ ہے، یا اللہ یا لطیف یا رزاق یا قوی یا عزیز اسئلک تالھا الیک واستغراقا فیک وفناء ربک عمن سواک ولطفا شاملا جلیا وخفیا ورزقا طیبا ھنیئا مریئا وقوۃ فی الایمان والیقین وصلابته فی الحق والدین وعزابک یدوم ویتخلد وشرفا یبقی ویتابد لایخالطه تکبر ولا تملوا وارادۃ فساد فی الارض ولا علوانک سمیع قریب وصلی اللہ علی سیدنا محمد واله وصحبه وسلم.

میں کہتا ہوں سید عبداللہ حداد کا ایک دیوان ہے اشعار کا نہایت لطف وفصاحت کے ساتھ اکثر اس میں نصیحت اور سلوک ہے ان کے بعضے قصیدے مجھے لا کر دیئے ان کے بھانجے سید عبداللہ عیدروس وعیدروسی نے میں کہتا ہوں مجھ کو خبر دی ایک جماعت نے آل باعلوی کی ان میں سے سید عبداللہ بن جعفر مدہر نے کہ حضرات باعلوی ہمیشہ ایک طبقہ کی وصیت کرتے آئے ہیں احیاء العلوم کے پڑھنے کی اور اس کے یاد کرنے کی اور اس پر عمل کرنے کی اور اس کے اوراد کی مواظبت کی اور ان کا مذہب عقائد میں اہل سنت وجماعت ہے اور فقہ میں ان کا نام مذہب شافعی ہے سلوک میں جو احیاء العلوم میں ہے اس پر قیام کرتا ہے واللہ اعلم۔

گیارھویں فصل (۱)

اس فقیر نے خرقہ پہنا ہاتھ سے شیخ ابو طاہر کے انھوں نے اپنے والد شیخ ابراہیم کردی سے انھوں نے شیخ احمد قشاشی سے انھوں نے اخذ کیا ایک جماعت سے کہ ان میں سے سیدی احمد بن قاسم علامہ دولی کبیر سیدی حسن الانجیہی اور شیخ ابراہیم علقمی اور سیدی محمد بن زین الدین ان سب نے صحبت پائی ہے شیخ الاسلام کمال الدین طویل کی اور آداب یافتہ ہوئے ہیں ان کے آداب سے اور خرقہ پہنا ہے ان کے ہاتھ سے اور وہ صحبت میں رہے ہیں علامہ محمد بن محمد جزری کے اور انھوں نے صحبت پائی ہے اور اخذ خرقہ کیا ہے تاج سبکی سے اور انھوں نے سیدی احمد بن عطاء اللہ اسکندری صاحب حکم سے اور انھوں نے سیدی ابو العباس مرشی سے اور انھوں نے قطب ابو الحسن شاذلی سے اور شیخ ابو طاہر نے خرقہ پہنا اور اخذ تلقین کیا شیخ حرم شیخ احمد نخلی سے اور شیخ عبداللہ بن سالم سے اور انھوں نے شیخ عیسیٰ مغربی سے انھوں نے شیخ ابو عثمان سعید بن ابراہیم جزائری سے اور نیز پہنایا ابو طاہر کو شیخ نے خرقہ اپنے شیخ کا کتابت اور اجازت کے ساتھ شیخ محمد بن محمد بن سلیمان مغربی نزیل مکہ سے طلب کیا تھا شیخ ابراہیم نے ان سے خرقہ اپنی اولاد کے واسطے انھوں نے خرقہ بھیجا ان کے واسطے طرف مدینہ کے اور اجازت لکھی جس وقت صحیح ہوئی یہ روایت اور مجتمع نہیں ہوئے شیخ ابو طاہر ان سے خرقہ پہنے میں ان کے شیخ ابو عثمان جزائری کے ہاتھ سے خرقہ پہنے کو ابو عثمان مغربی سے انھوں نے پہنا ابو العباس احمد حجی وحراق سے انھوں نے ابو سالم سیدی ابراہیم تازی سے انھوں نے صالح بن موسیٰ زواوی سے انھوں نے ابو عبداللہ محمد بن محمد بن مخلص طیبی سے انھوں نے شیخ

(۱) طریقہ شاذلیہ

علاء الدین مغلطائی سے انھوں نے سید زین الدین ابوبکر اور سید ابوعبداللہ بن سید ابوالحسن شاذلی سے اور ان دونوں نے قطب ابوالحسن شاذلی سے پھر قطب نور الدین ابوالحسن علی بن عبداللہ بن عبدالجبار مشہور شاذلی نے اخذ طریقہ کیا اور خرقہ پہنا اپنے شیخ عبدالسلام بن مشیش سے اور انھوں نے سید عبدالرحمٰن بن زیات مدنی سے انھوں نے شیخ تقی الدین صوفی عرف بفقیر مصغر اور انھوں نے شیخ فخر الدین سے انھوں نے شیخ ابوالحسن علی سے انھوں نے شیخ تاج الدین محمد سے انھوں نے شیخ شمس الدین محمد سے انھوں نے شیخ زین الدین محمد قروینی سے انھوں نے شیخ ابواسحاق ابراہیم بصری سے انھوں نے شیخ ابوالقاسم مروانی سے انھوں نے شیخ فتح السعود سے انھوں نے شیخ سعید قروانی سے انھوں نے شیخ ابومحمد جابر سے انھوں نے سید شہید امام حسین بن علی سے انھوں نے اپنے والد امام امیر المومنین علی بن ابی طالب سے انھوں نے سید المرسلین شفیع المذنبین قائد الغر المحجلین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے۔

اور اس فقیر نے حزب البحر اخذ کیا شیخ ابوطاہر سے انھوں نے شیخ احمد نخلی سے انھوں نے شیخ محمد بن علاء سے انھوں نے سالم سنہوری سے انھوں نے نجم غیطی سے انھوں شیخ الاسلام زکریا سے انھوں نے عز عبدالرحیم بن فرات سے انھوں نے تاج عبدالوہاب بن علی سبکی سے انھوں نے اپنے والد تقی علی بن کافی سبکی سے انھوں نے شیخ احمد بن عطاء اللہ سے انھوں نے امام ابوالعباس احمد بن عمر مرسی سے انھوں نے ابوالحسن شاذلی سے اور اخذ کیا حکم اس عطا کا اسی سند سے شیخ احمد بن عطا سے اور مجھ کو خبر دی شیخ ابوطاہر نے کہا خبر دی مجھ کو شیخ احمد نخلی نے کہا خبر دی مجھے شیخ یحییٰ شاوی نے اس کی تلقین کی شیخ سعید جزائری نے انھوں نے شیخ سعید مقری سے انھوں نے ولی کامل احمد حجی سے انھوں نے عارف باللہ سیدی ابراہیم سے واسطے پڑھنے چار سورتیں قرآن کے ہمیشہ شب و روز میں اور وہ یہ ہیں۔ اقراء باسم ربک الذی خلق. انا انزلنا فی لیلة القدر، اذا زلزلت الارض زلزالها و لایلاف قریش۔

بارہویں فصل (۱)

اور طریقہ شطاریہ کی اس ملک میں بھی ایک جہت ہے شیخ محمد غوث گوالیری سے اور فی الحقیقت شیخ محمد غوث گوالیری سے پہلے کچھ اس طریقہ کی شہرت نہ تھی اور ہندوستان میں جو پہلے ہوا عبداللہ شطاری سے ہوا اور جس نے پہلے یہ طریقہ جاری کیا وہ شیخ خدا قلی ماوراء النہری ہیں غرض اس فقیر نے خرقہ شیخ ابوطاہر کردی کے ہاتھ سے پہنا اور انھوں نے اس کے عمل کی اجازت دی جو جواہر خمسہ میں ہیں اپنے والد شیخ ابراہیم کردی سے انھوں نے شیخ احمد قشاشی سے انھوں نے شیخ احمد شناوی سے صبغتہ اللہ سے انھوں نے شیخ وجیہ الدین گجراتی سے انھوں نے شیخ محمد غوث گوالیری سے اور نیز پہنا یہ خرقہ شیخ ابوطاہر سے شیخ احمد نخلی سے انھوں نے سید میر کلاں سے انھوں نے شیخ عیسیٰ سندی برہانپوری سے انھوں نے شیخ لشکر محمد سے انھوں نے شیخ محمد غوث سے پھر شیخ محمد غوث گوالیری صاحب جواہر خمسہ اور رواج دینے والے طریقہ شطاریہ کے نے اخذ کیا طریقہ شیخ ظہور سے انھوں نے شیخ ہدیۃ اللہ سرمست سے انھوں نے شیخ محمد قاضی سے انھوں نے شیخ عبداللہ شطاری سے انھوں نے شیخ محمد عارف سے انھوں نے شیخ محمد عاشق سے انھوں نے شیخ خدا قلی ماوراء النہری سے انھوں نے ابوالحسن خرقانی سے انھوں نے ابوالمظفر ترک طوسی سے انھوں نے شیخ ابویزید عشقی سے انھوں نے شیخ محمد مغربی سے انھوں نے تلقین پائی روحانیت سے شیخ ابویزید بسطامی کے انھوں نے تلقین پائی روحانیت سے سیدنا امام جعفر صادق کے بموجب سند سابق کے اور نیز یہ فقیر حج کے سفر میں جب لاہور پہنچا اور دست بوسی شیخ محمد سعید لاہوری کی حاصل کی۔

---

(۱) طریقہ شطاریہ

انھوں نے دعائے سیفی کی اجازت بلکہ اجازت جمیع اعمال جواہر خمسہ کے بیان کی اور یہ اس زمانہ میں بہت بڑے مشائخ طریقہ احسدیہ وشطاریہ کے تھے اور جب کسی کو اجازت دیتے تھے اس کو دعوت کی رجعت نہ ہوتی تھی رحمتہ اللہ تعالی۔

سند کہا ہے شیخ معمر ثقہ حاجی محمد سعید لاہوری نے کہ میں نے اخذ کیا طریقہ شطاریہ اور اعمال جواہر خمسہ سیفی وغیرہ شیخ محمد اشرف لاہوری سے انھوں شیخ عبدالملک سے انھوں نے شیخ بایزید ثانی سے انھوں نے شیخ وجیہ الدین گجراتی سے انھوں نے شیخ محمد غوث گوالیری سے اور نیز اس فقیر کو اجازت شطاریہ کی حاصل ہوئی حضرت والد بزرگوار قدس سرہ سے ان کو شیخ لال میرٹھی سے ان کو شاہ پیر میرٹھی سے ان کی سند اس وقت مجھے یاد نہیں، میں نے کتاب عزیز میں پائی معلوم ہوتی ہے سید ابراہیم ایرجی سے ان کو شیخ بہاء الدین شطاری سے کہ انھوں نے کہا ہے کہ جان لینا چاہئے کہ ذکر مشرب شطاریہ کا اسم ذات سے زبان سے یا دل میں کہے اور ملاحظ اسماء صفات کا کرے یعنی سمیع، بصیر، علیم، خیال میں لائے اور برزخ یعنی صورت واسطے کی پیش نظر رکھے اور مد کھینچے اور شد کرے اور زیر ناف سے شروع کرے اور معنی ملاحظہ کرے یعنی سننے والا اور دیکھنے والا اور جاننے والا دل میں قرار دے اور ایک دم میں ایک دفعہ کہے دم کے اوّل سے دم کے آخر تک میں اور یہ جب ہے کہ محاربہ کبیر نہ ہو اور محاربہ کبیر ہو تو دو سو دفعہ اور زیادہ کہے تو اور اچھا ہے جب صفات قرار پا جائیں تو اور صفات تلقین کرے کہ ان صفات کو نبات کہتے ہیں یعنی سمیع، بصیر، علیم، شنوا، بینا، دانا، دائم، قائم، حاضر، شاہد ہے۔ جب ایک مدت اس شغل میں مستقیم ہو جائے تو فرماتے ہیں یعنی قادر، واحد، حی، قیوم، ظاہر، باطن، رؤف، نور، ہادی، بدیع، باقی، عروج، نزول۔

ہر ذکر واسم میں شرط ہے جب ایک مدت اس میں مستقیم ہو جائے تو ملفوظات تلقین فرمائیں یعنی العلی الاعلی العظیم الاعظم الکبیر الاکبر القریب الاقرب اللطیف الالطف الکریم الاکرم النور الانور العلیم الاعلم اس کے بعد محاربہ کبیر کا شغل کرائیں کہ دم روک کر خوب شدت سے ساتھ تصور ملاحظہ کے اتنا ذکر کہے کہ بدن سے پسینہ مینہ کی طرح برسنے لگے اور ذکر کرنے والا بیہوش ہو جائے اور فائدہ یہ ہے کہ جس قدر بھوکے رہنے سے اور بہت جاگنے سے حاصل ہوتا ہے وہ سب اس سے حاصل ہو جاتا ہے اور اس قدر کافی ہے باقی مرشد سے معلوم ہو جائے گا۔

جاننا چاہئے کہ مراقبہ تین طور پر ہیں ایک تو یہ کہ اس طرح بیٹھے جیسے نماز میں بیٹھتے ہیں اور اس علم کو لازم کرے یعنی یقین سے یوں جانے کہ اللہ تعالیٰ دیکھتا اور سنتا اور جانتا ہے اور جب اس عالم سے ایک لحہ بھی غافل ہو تو مراقبہ نہیں اور اس مراقبہ میں ربط شیخ لازم ہے اور نماز و تلاوت اور تمام احوال کو لازم جانے اور جب اس میں استقامت ہو جائے۔ دوسرا مراقبہ جسے مشاہدہ بھی کہتے ہیں شروع کرے۔ اور اس میں بھی اسی شکل سے بیٹھے اور منہ دل کے وسط کی طرف جھکائے اور آنکھیں بند کرے اور چشم باطن سے دل کو دیکھیں اور تصور کرے کہ خدا عز و جل کو دیکھتا ہے اور جب یہ شغل کمال کو پہنچ جائے حجاب تشبیہ کا اٹھ جائے گا تو تحقیق جائے گا کہ خدائے تعالیٰ کو دیکھتا ہے پھر اس سے ترقی کرے تیسرے مراقبہ میں کہ اسے معائنہ بھی کہتے ہیں اس میں مشغول اور وہ یہ ہے کہ اسی طور سے بیٹھے مگر نظر آسمان کی طرف کرے اور آنکھیں اونچی کرے اسی طرح جیسے مرنے کے وقت یہ خیال کرے کہ میری روح قالب سے نکل گئی اور آسمانوں سے گزر گئی اور حق تعالیٰ کے معائنہ میں مشغول ہوئی اگر کسی کو اس پر استقامت حاصل ہوگی تو ایک ڈورا سبز ظاہر ہوگا اس کا ایک سرا ساتویں آسمان پر ہوگا اور دوسرا سرا اس کے دل میں۔ اور اعلیٰ مرتبہ اور مشغول جو مشائخ کہتے ہیں یہی ہے اور اس میں واسطہ درست نہیں۔

تسبیح کی سند

وہ مجھ کو دی سید عمر شیخ عبداللہ بصری مکی کے نواسے نے کہا کہ مجھ کو دی میرے نانا شیخ عبداللہ نے ان کو دی ان کے شیخ محمد بن محمد بن سلیمان مغربی نے اور کہا مجھ کو دی ابوعثمان جزائری نے ان کو ملی ابوعثمان مقری سے ان کو سید احمد حجی سے ان کو سید ابراہیم تازی سے ان کو ابوالفتح مراعی سے ان کو ابوالعباس احمد بن ابوبکر رواد سے ان کو مجدالدین محمد بن یعقوب بن محمد فیروز آبادی لغوی سے ان کو جمال الدین یوسف بن محمد دمیری سے ان کو تقی الدین بن ابوشا محمود بن یعلی سے ان کو مجدالدین عبدالصمد بن ابوالجیش مقری سے ان کو اپنے والد سے ان کو ابوالفضل سَمد بن ناصر سے ان کو ابومحمد عبداللہ سمرقندی سے ان کو ابوبکر محمد بن علی سلامی حداد سے ان کو ابونصر عبدالوہاب بن عبداللہ بن عمر سے ان کو ابوالحسن علی بن حسین بن قاسم صوفی سے انھوں نے کہا میں نے سنا ہے حسن مالکی سے اور

تحقیق میں نے دیکھا ان کو تسبیح ہاتھ میں رکھتے ہیں کہا انھوں نے یونہی دیکھا تھا اپنے حضرت جنید کو اور ان سے کہا تھا حضرت ابھی تک آپ تسبیح ہاتھ میں رکھتے ہیں انھوں نے کہا میں نے ایسا ہی دیکھا تھا اپنے مرشد سری بن مفلس سقطی کو اور ان کے ہاتھ میں تسبیح تھی تو میں نے کہا حضرت ابھی تک آپ تسبیح رکھتے ہیں انھوں نے کہا میں نے ایسا ہی دیکھا تھا اپنے مرشد معروف کرخی کو اور ان کے ہاتھ میں تسبیح تھی اور میں نے یونہی پوچھا تھا جس طرح تم نے مجھ سے پوچھا تو انھوں نے کہا میں نے یونہی دیکھا تھا اپنے مرشد بشر حافی کو ان سے یونہی دریافت کیا جیسے تم نے مجھ سے انھوں نے کہا میں نے دیکھا اپنے حضرت عمر مکی کو ان کے ہاتھ میں تسبیح تھی میں نے سوال کیا اسی طرح جس طرح تم نے مجھ سے۔

انھوں نے کہا میں نے دیکھا اپنے استاد حسن بصری کو ان کے ہاتھ میں تسبیح تھی میں نے کہا اے حضرت آپ باوجود ایسی عظمت شان اور ایسی نیک عبادت کی اور ابھی آپ کے ہاتھ میں تسبیح ہے انھوں نے کہا کہ یہی ایک ایسی شئے ہے کہ ہم ابتدا میں اس کا استعمال کرتے تھے تو ہم نے نہایت میں بھی نہ ترک کیا میں دوست رکھتا ہوں اس امر کو کہ ذکر اللہ دل سے کروں اور ہاتھ سے اور زبان سے شیخ ابوالعباس روداد فرماتے ہیں کہ حسن بصری کے قول سے روشن ہوا کہ تسبیح صحابہ کے عہد میں موجود تھی، جو انھوں نے کہا یہ ایسی شئے ہے کہ ہم ابتدا میں کیا کرتے تھے اور ابتدا حسن بصری کی بیشک تھی اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ کیونکہ وہ یقینی پیدا ہوئی۔

جب دو برس خلافت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ہوئے تھے اور انھوں نے دیکھا حضرت عثمان وعلی وطلحہ رضی اللہ عنہم کو اور جب حاضر ہوئے یوم الدار کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قضیہ میں تو ان کی عمر چودہ برس کی تھی اور انھوں نے حدیث کی روایت کی ہے عثمان وعلی وعمران بن حصین ومعقل بن یسار وابوبکرہ وابوموسیٰ وابن عباس وابن جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہم سے اور بہت صحابہ سے اور ان کا حضرت علیؓ سے روایت کرنے میں اختلاف مشہور ہے۔ انتہیٰ۔

دلائل الخیرات کی سند

اور دلائل الخیرات کی ہم کو اجازت دی ہمارے شیخ ابوطاہر انھوں نے شیخ احمد نخلی سے انھوں

نے سید عبدالرحمٰن ادریسی مشہور مجوب سے انھوں نے اپنے والد احمد سے انھوں نے ان کے دادا محمد سے انھوں نے ان کے پیر دادا احمد سے انھوں نے اس کے مصنف سید شریف محمد بن سلیمان جزولی رحمتہ اللہ علیہ سے۔ قصیدہ بردہ کی سند ہم کو خبر دی قصیدہ بردہ کی ابو طاہر نے شیخ احمد نخلی سے انھوں نے محمد بن علا عالمی سے انھوں نے سالم سہوری سے انھوں نے نجم غیطی سے انھوں نے شیخ الاسلام زکریا سے انھوں نے ابواسحاق صالحی سے انھوں نے صلاح محمد بن محمد بن حسن شاذلی سے انھوں نے علی بن جابر ہاشمی سے انھوں نے اس کے ناظم شرف الدین بن محمد بن سعید حماد بوصیری رحمتہ اللہ علیہ سے کاتب حروف کہتا ہے یہ ہی بیان سلاسل کا اس رسالہ میں میسرا ہوا اور علم حدیث وفقہ وغیرہما کی سند کا ذکر بعد ہوگا۔ فقط والحمد للہ اولاً وآخراً وظاہراً وباطناً وصلی اللہ علی سیدنا محمد وآلہ واصحابہ اجمعین۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ کے اساتذہ ومشائخ حرمین کے مختصر حالات

تمام تعریفیں اس ذات کے لئے ہیں جس نے حرمین شریفین کو خیر البلاد بنایا اور ہر دور میں ان میں اپنے منتخب بندوں کو ٹھہرایا اور درود وسلام ہوں ہمارے آقا سید الکونین محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے آل اور اصحاب پر۔

فقیر ولی اللہ کہتا ہے کہ یہ چند کلمات جنھیں انسان العین فی مشائخ الحرمین کے نام سے موسوم کیا گیا ہے حرمین شریفین کے بعض ان مشائخ صوفیا اور علمائے محدثین کے حالات پر مشتمل ہیں جن سے اس فقیر کو سلسلۂ خرقہ صوفیا اور اسناد حدیث پہنچی ہیں، جزاهم الله تعالىٰ عني خير الجزاء۔

شیخ احمد شناویؒ

آپ علی بن عبدالقدوسؒ بن محمد عباس شناوی کے فرزند ارجمند ہیں۔ آپ کے آبا واجداد گرامی اولیائے کبار میں سے ہو گزرے ہیں۔ شیخ عبدالوہاب شعراوی نے ان کے کچھ حالات لکھے ہیں۔ آپ علوم شریعت وطریقت کے جامع تھے۔ علم حدیث شمس رملی اپنے والد بزرگوار سید غضنفر اور شیخ محمد بن ابی الحسن بکری سے حاصل کیا اور اپنے والد بزرگوار سے خلافت پائی۔ ان کی صحبت کے بعد سید صبغۃ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کے ہاتھوں بھی خرقۂ خلافت پہنا۔ آپ ان کی صحبت سے درجات عالیہ پر پہنچ کر ان کے خلیفہ بنے کہا جاتا ہے کہ تربیت سالکین کے سلسلے میں انھوں نے کہا لو كان الشعراوی حيا ما وسعه الا اتباعي (یعنی اگر شعراوی زندہ ہوتے تو وہ بھی میرے اتباع کرتے) آپ کا قول ہے کہ عهدنا بحفظ وان لم يحفظ. کاتب الحروف (شاہ ولی اللہ کہتا ہے کہ متاخرین اہل حرمین کی اصطلاح میں قبول بیعت سے مراد اخذ عہد ہے، یعنی جب بھی مشائخ صوفیا کسی کی بیعت قبول کرتے ہیں تو اس سلسلے کے تمام مشائخ چاہے

زندہ ہوں یا گزشتہ کی برکات اس کے شامل حال ہو جاتی ہیں۔

آپ کا قول ہے کہ **لایدخل النار من رانی ورای من رانی الی یوم القیامۃ** (وہ شخص دوزخ میں داخل نہیں ہوگا جس نے مجھے دیکھا یا جس نے مجھے دیکھنے والے کو دیکھا یہ سلسلہ قیامت کے دن تک رہے گا)

کہتے ہیں کہ ایک روز آپ اپنے حجرے میں لیٹے ہوئے تھے کہ ایک گرگٹ کو دیوار پر جاتے ہوئے دیکھا حکم شرعی کے تحت آپ نے اسے مارنا چاہا مگر شہود وحدت نے آپ کے اس ارادے کو متزلزل کر دیا، ایک بار پھر اس کو مارنے کا ارادہ کیا مگر شہود وحدت مانع رہا۔ غرض ان دو اندیشوں کے درمیان الجھے ہوئے تھے کہ آخر کار حکم شرعی کی تعمیل کا پختہ ارادہ کرتے ہوئے ایک پتھر اسے دے مارا، نشانہ چوک گیا اور گرگٹ بھاگ گیا آپ بہت خوش ہوئے اور کہا شکر ہے اس خدا کا جس نے ہمارے لئے دونوں باتیں جمع کر دیں، شیخ احمد قشاشیؒ نے اس حکایت کے بعد کہا کہ اگر وہاں میں ہوتا تو ہرگز تامل نہ کرتا اور فوراً اس گرگٹ کا سر کچل دیتا۔ کاتب الحروف (شاہ ولی اللہ) کہتا ہے کہ قشاشی کی مراد یہ تھی کہ وحدت فی الحقیقت کثرت میں اس طرح جلوہ گر ہے کہ کثرت اور اس کے احکام کے ساتھ ان کا کوئی تضاد نہیں اگرچہ پانی اور آگ دونوں وجود کے لحاظ سے ایک ہیں لیکن چونکہ ان میں سے ہر ایک فیض خاص کا مظہر اور استعداد مخصوص کا منبع ہے، لہٰذا پانی آگ سے اڑ جاتا ہے اور آگ پانی سے بجھ جاتی ہے، اور حکم شرع اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اس کثرت کے احکام میں نظم و ترتیب قائم رہے اور شہود کامل یہ ہے کہ وحدت، کثرت سے مزاحم نہ ہو اور کثرت وحدت کے راستے میں رکاوٹ نہ بنے۔

چوں کہ بیرنگی اسیر رنگ شد
موسوی با عیسوی در جنگ شد

(چونکہ بے رنگی نے رنگ کا روپ اختیار کر لیا اس لئے موسوی عیسوی کے خلاف میدان جنگ میں کود پڑا)

آپ ۱۰۲۸ھ میں وصال فرما کر جنت البقیع میں مدفون ہوئے۔

شیخ احمد قشاشیؒ

آپ محمد بن یونس القشاشی المعروف عبدالنبی بن شیخ احمد الدجانی کے فرزند ارجمند ہیں۔ ''دجانہ'' (بہ تخفیف جیم) بیت المقدس کے قصبات میں سے ایک قصبہ ہے۔ آپ اسی قصبے کے نہایت بزرگ باشندے تھے۔ شیخ عبدالوہاب نے طبقات میں ان کے حالات زندگی لکھے ہیں۔ شیخ یونس کو عبدالنبی کے نام سے اس لئے پکارا جاتا تھا کہ وہ لوگوں کو اجرت دے کر مسجد میں بٹھاتے تا کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود وصلوٰۃ پڑھیں۔ آپ کو قشاشی اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو چھپانے کی غرض سے مدینہ منورہ میں قشاشہ فروشی کی دکان کرتے تھے اور قشاشہ پرانے سامان کو کہتے ہیں مثلاً دواتیں، پرانے جوتے اور اسی طرح کی دوسری اشیاء، آپ کے والد بزرگوار محمد مدنیؒ بھی عالم اور مرد صالح تھے۔ شیخ احمد قشاشی علم حقیقت وشریعت کے امام تھے۔ حقائق معرفت کے بارے میں آپ کی گفتگو آیات واحادیث سے مدلل ہوتی تھی، کئی مشائخ کی صحبت میں رہے اور خرقۂ خلافت اپنے والد سے حاصل کیا، مگر انہیں گوہر مقصود شیخ احمد شناویؒ سے حاصل ہوا۔ اسی لئے انھوں نے خود کو ان کی طرف منسوب کیا، کہا جاتا ہے کہ شیخ احمد قشاشیؒ نے مشائخ صوفیا کی تلاش میں سفر اختیار کیا، جب واپسی پر جدہ پہنچے تو حالت کشف میں ان پر یہ ظاہر ہوا کہ شیخ احمد شناوی سامنے کھڑے ہیں اور ان کی شرمگاہ سے مادہ منویہ خارج ہو رہا ہے جس کی وجہ سے ان کے پاؤں اور کپڑے آلودہ ہیں۔ جب بیدار ہوئے تو ان کے ذہن میں اس واقعے کی یہ تعبیر آئی کہ شیخ شناوی مرتبۂ تکمیل کو پہنچ گئے ہیں لیکن ان سے اکتساب فیض کرنے والا ابھی تک کوئی نہیں، اس کے فوراً بعد وہ حضرت شناویؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انھوں نے جب انھیں دیکھا تو فرمایا ہم اس شخص کو مرحبا کہتے ہیں جو ہم سے ہمارے علوم کا فیض پانے کے لئے آیا ہے۔

کہتے ہیں کہ ایک رات شیخ احمد قشاشیؒ نے خواب میں دیکھا کہ شیخ محی الدین بن عربی (۱) نے انھیں خرقۂ خلافت پہنا کر اپنی ہمشیرہ ان کے نکاح میں دے دی ہے۔ اس کی تعبیر انھوں نے یہ

(۱) شیخ ابوبکر محی الدین بن علی المعروف ابن عربیؒ و شیخ اکبرؒ ۱۷ رمضان ۵۶۰ھ مطابق ۱۱ر جولائی ۱۱۶۵ء میں مرسیہ میں پیدا ہوئے جو اندلس کے جنوب مشرق میں واقع ہے آپ کا تعلق مشہور عرب قبیلے ''بنو طے'' سے تھا۔ آپ ۵۶۸ھ میں اشبیلیہ آئے جو اس وقت علم وادب کا مرکز تھا۔ آپ نے تقریباً تیس برس کا طویل عرصہ تعلیم وتعلم اور اسلامی فلسفے کے مطالعے میں گزارا۔ ۳۸ برس کی عمر میں بلاد مشرق کی طرف روانہ ہو گئے اور مصر و مشرق قریب اور ایشیائے کوچک کی سیاحت میں مصروف ہو گئے۔ اس دوران آپ بیت المقدس، (باقی اگلے صفحہ پر)

سمجھی کہ ان کی وحدت الوجود کی معرفت تکمیل کو پہنچ گئی ہے، کیونکہ شیخ ابن عربیؒ کی ہمشیرہ کے ان

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، بغداد اور حلب گئے بالآخر دمشق میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ شیخ ابن عربیؒ وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اپنے نظریۂ وحدت الوجود کے فلسفہ کی عقلی و شرعی تشریحات کی بنا پر پوری دنیا پر بالعموم اور عالم اسلام پر بالخصوص ہمہ گیر اثرات ڈالے ہیں۔ حقیقت کائنات ذات واجب الوجود، مابہ الموجودیت امر و خلق، انسان اور خدا ایسے بنیادی اور دقیق مسائل پر جس جامعیت سے انھوں نے قلم اٹھایا ہے اس میں وہ اپنے انداز فکر، قوت استدلال اور حقیقت پسندی کے اعتبار سے ہر مذہب و ملت کے مفکرین سے بازی لے گئے ہیں۔ اسلامی تاریخ کے مطابق ہر دور کے مسلمان فلاسفہ، مفکرین اور تمام سلاسل کے صوفیا نے نہ صرف یہ کہ ان کے نظریات کو تسلیم کیا بلکہ خراج عقیدت کے طور پر انہیں شیخ اکبر کے نام سے موسوم کیا ہے، مشائخ صوفیا کے تمام سلاسل میں سے صرف دو بزرگوں شیخ علاء الدین سمنانیؒ اور حضرت مجدد الف ثانیؒ نے وحدۃ الوجود پر ان سے اختلاف کیا جسے زیادہ اہمیت حاصل نہ ہو سکی یہاں تک کہ بعض روایات کے مطابق حضرت مجددؒ خود بھی آخر عمر میں وحدۃ الوجود کی طرف لوٹ آئے تھے۔ اگر یہ روایت صحیح نہ بھی ہو تو بھی تمام سلاسل بشمول سلسلۂ نقشبندیہ کے مشائخ کا وحدۃ الوجود پر اجماع ہے ایسی صورت میں ایک دو بزرگوں کا اختلاف کسی خاص اہمیت کا حامل نہیں پھر حضرت مجدد کا نظریۂ وحدت الشہود اس وقت کے بعض سیاسی حالات کا تقاضا بھی تھا کیونکہ اس وقت مسلمانوں کو ایک علیحدہ ملت کا تشخص دینے کی اشد ضرورت تھی لیکن بعد میں برصغیر کے متشدد المسلک حضرات نے اس کی زیادہ ترویج کی، حضرت شاہ ولی اللہ وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود میں تطبیق کی کوشش کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ سارا لفظی نزاع ہے۔ عجب لطیفے کی بات یہ ہے کہ ہمارے جدید دانشور اور مبصر گزشتہ پچاس سالہ پروپیگنڈے کی بنا پر بغیر سوچے سمجھے چھوٹتے ہی نظریۂ وحدت الوجود پر برس پڑتے ہیں اور قطعاً نہیں سمجھتے کہ سلوک و کشف سے قطع نظر خالص عقلی طور پر بھی وحدۃ الوجود کے مانے بغیر آخر توحید کا اثبات کیسے ہو سکتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ خدا کی ہستی (ہستی اعلیٰ) اور اس کا اقرار وہ ابدی سچائی ہے جو کم و بیش ہر مذہب میں کسی نہ کسی طرح مسلم رہی ہے محض اس بات سے دھوکہ کھانا کہ وحدۃ الوجود کے بعض تصورات ویدانت یا دیگر عجمی افکار سے ملتے ہیں کس قدر لغو اور کمزور دلیل ہے اس سلسلے میں مولانا شبلی نعمانی کی رائے بہت وقیع ہے کہ "اگرچہ بظاہر وحدت الوجود پر بہت اعتراضات کئے گئے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسے مانے بغیر چارہ نہیں"۔ مولانا جامیؒ نے آپ کی تصانیف پانسو سے بھی زیادہ بتائی ہیں۔ آپ نے ۶۳۲ھ میں خود اپنی کتابوں کی جو فہرست مرتب کی اس میں ۲۵۱ کتابوں کے نام درج ہیں آپ کی تصانیف تفسیر، حدیث، سیرت، ادب، متصوفانہ شاعری، علوم طبیعی، ہیئت اور علوم مخفیہ پر مشتمل ہیں آپ کی مشہور زمانہ تصنیف "**المفتوحات المکیہ فی معرفۃ الاسرار المالکیہ والملکیہ**" سب سے ضخیم اور غالباً آخری تصنیف ہے جو ۶۲۹ھ میں مکہ مکرمہ میں مکمل ہوئی۔ "فصوص الحکم" دمشق میں ۶۲۷ھ میں لکھی گئی۔ "تنزلات" بھی اسی دور کی یادگار ہے۔ شیخ اکبر نے ۶۳۸ھ۔ ۱۲۴۷ء میں انتقال فرمایا۔ آپ کا مزار مبارک جبل قاسیون میں زیارت گاہ خلائق ہے اور زبان حال سے یہ پکار رہا ہے۔ ؏

زیارت گاہ اہل عزم و ہمت ہے لحد میری
کہ خاک راہ کو میں نے بتایا راز الوندی

کے نکاح میں آنے کی تعبیر یہی ہو سکتی ہے۔ سید محمد بن علویؒ نے انھیں لکھا کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی ہے، انھوں نے مجھے فرمایا کہ احمد قشاشی سے میرا سلام کہو اور اسے میری شفاعت کی بشارت دو اور اس سے اگلے روز دوبارہ سید محمد بن علویؒ نے کہا میں نے دوسری دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی تو انہیں یہ فرماتے سنا احمد قشاشیؒ سے میرا سلام کہو اور اسے یہ مژدہ سناؤ کہ وہ جنت الفردوس میں میرا جلیس ہوگا۔

کہتے ہیں جب کبھی گفتگو کے دوران مقامات کا ذکر آتا تو شیخ احمدؒ فرماتے ہمارے لئے کوئی مقام نہیں اس لئے کہ ہم اہل یثرب میں سے ہیں اور خدا تعالی نے فرمایا ہے **یا اهل یثرب لا مقام لکم**، گویا اس سے مقام بے نشان کی طرف اشارہ کر رہے تھے اور یہ کہ وہ حضور ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم پر کاربند تھے۔

شیخ احمد قشاشیؒ کے عجائب روزگار کرامات میں سے ایک یہ ہے کہ انھوں نے مکمل قرآن مجید خواب کی حالت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سنایا۔ شیخ ابراہیمؒ سے منقول ہے کہ ایک روز شیخ قشاشی نے اپنی مجلس میں یہ حدیث بیان کہ **ما علی احدکم ان یکون فی بیته محمد و محمد ان ثلثة** اسی وقت میرے دل میں یہ خیال آیا کہ خدا مجھے تین فرزند عطا کرے گا جس میں ہر ایک کا نام محمد ہوگا۔ اس کے بعد میں اس فکر میں پڑ گیا کہ ایک کو دوسرے سے کیسے متمیز کر سکوں گا۔ شیخ قشاشیؒ میرے خدشے پر مطلع ہو گئے اور فرمایا ان میں سے ایک ابوسعید، دوسرا ابوالحسن، اور تیسرا ابوطاہر کنیت اختیار کرے گا۔ ایک مدت بعد ویسے ہی ہوا جیسا انھوں نے فرمایا تھا۔

شیخ ابراہیمؒ ہی سے منقول ہے کہ ایک روز شیخ قشاشیؒ نے میرے دل کی ایک بات کہہ ڈالی، مجھے خیال آیا کہ کاش یہ بات آج سے پہلے واقع ہوتی تو شیخ نے میری طرف کوئی توجہ نہ دی اور فرمایا کہ اگر اللہ چاہتا تو میں تمہیں یہ بات بتاتا اور نہ سمجھا سکتا۔ شیخ قشاشیؒ کی اس طرح کی کرامات اور تصرفات بے شمار روایت کی گئی ہیں۔

الغرض شیخ قشاشیؒ کی زندگی فقہا کے طرز پر تھی اور نہ ہی خشک مزاج زاہدوں کے انداز پر بلکہ عین سنت کے مطابق، تکلف سے خالی اور اعتدال سے عبارت تھی۔ آپ امراء کے ہاں کبھی نہیں جاتے تھے۔ اگر وہ خود ان کی زیارت کو آتے تو خوش خلقی اور بشاشت سے ان کے ساتھ ملاقات

کرتے اور ہر ایک سے اس کی قدر و منزلت کے موافق سلوک فرماتے۔ قوم کے سردار کی بہت زیادہ عزت فرماتے۔ آپ بڑی نرمی کے ساتھ نیکی کی تلقین فرماتے اور زیارت کرنے والوں کو نصیحت کے بغیر نہ جانے دیتے۔

شیخ عیسیٰ مغربیؒ نے آپ کے بارے میں کہا کہ میں جب بھی شیخ قشاشیؒ کی محفل سے اٹھا تو دنیا میری نظروں میں حقیر ترین اور میرا نفس انتہائی ذلیل ہوتا تھا۔ خواہ میں کتنی بار بھی ان کے پاس حاضر ہوتا میرا یہ تاثر اپنی جگہ قائم رہتا۔ آپ نے ۱۹ رذی الحجہ ۱۰۷۱ھ میں انتقال فرمایا رحمتہ اللہ علیہ

سید عبدالرحمٰن ادریسی المحجوبؒ

آپ مغرب کے شہر کناسہ میں پیدا ہوئے۔ مغرب، مصر، روم اور شام کی سیاحت کے بعد حرمین شریفین تشریف لے آئے اور کئی برس یہاں کی مجاورت کی۔ اس کے بعد زیارت اولیاء کی خاطر یمن تشریف لے گئے کیونکہ انھوں نے یہ مشہور مقولہ سن رکھا تھا کہ یمن میں اولیاء ایسے پیدا ہوتے ہیں جیسے زمین سے گھاس، یہاں کے اولیاء کی مجالس میں ان کو عجیب وغریب قسم کے واقعات اور دلچسپ ورنگین صحبتیں میسر آئیں، پھر جب مکہ واپس آ گئے اور یہاں مستقل اقامت اختیار کر لی تو اہل مکہ نے ان سے استفادہ کیا اور کئی لوگوں نے خرقۂ صوفیا بھی حاصل کیا۔ آپ سے بے شمار کرامات روایت کی جاتی ہیں۔

شیخ زین العابدین شافعیؒ مفتی مدینہ سے میں نے سنا انھوں نے اپنے والد جو کہ سید محمدؒ کے خادم تھے اور یہ سید محمدؒ سید عبدالرحمٰنؒ کے معتقد تھے سے نقل کیا کہ شریف مکہ کو کوئی ضرورت پیش آئی سید عبدالرحمٰن مجحوبؒ کی طرف دعا کے لئے رجوع کیا، سید عبدالرحمٰنؒ ایک لمحے تک سر بگریباں رہے، کچھ سوچا اور اس کے بعد فرمایا کہ مکہ کے فلاں محلے میں ایک اس قسم کا گھر ہے بیت المال کے افسر کو چاہئے کہ جس قدر شریف مکہ کو ضرورت ہے اسی قدر اس میں سے مال لے لے اور باقی احتیاط سے وہیں پر چھوڑ دے۔ لوگ اسی وقت وہاں پہنچے اور اس گھر کو ویسے ہی پایا جیسے سید صاحب نے فرمایا تھا۔ وہاں سے انھوں نے بیس ہزار اشرفیاں اٹھالیں اور صندوقوں کو مقفل کر دیا۔ یہ رقم سید صاحب کے پاس لے آئے آپ نے شریف مکہ کے حوالے کر دی تا کہ وہ اس سے اپنی ضرورت پوری کر لے۔ دوسری بار شریف مکہ نے چاہا کہ باقی دولت بھی اپنے تصرف میں لے آئے مگر گھر کا

پتہ ملا نہ مال۔ لوگ حیران رہ گئے اور سید عبدالرحمٰنؒ سے اس معاملے کا راز پوچھا، آپ نے فرمایا کہ ایران کا ایک شخص اپنے ملک میں فوت ہوگیا، اس کا کوئی وارث نہ تھا، میں نے تصرف کر کے اس کے گھر کو مکہ میں لا کھڑا کیا، وہاں سے جو کچھ تم نے لینا تھا، لے لیا، اور جب ضرورت پوری ہوگئی تو مکان اپنی سابقہ جگہ پر پہنچ گیا۔ کہتے ہیں کہ سید عبدالرحمٰنؒ ایک دفعہ سید احمد بن علوان کے مزار مبارک کی زیارت کے لئے تشریف لے گئے۔ سید احمد نے اپنے خادم کو خواب میں سید عبدالرحمٰن کے آنے کی خبر دی اور فرمایا کل ان کا استقبال و تعظیم بجا لانا، خادم استقبال کی غرض سے شہر سے باہر نکلا بہت تلاش کیا مگر سید صاحب کا کہیں پتہ نہ چلا، ناامید ہو کر واپس لوٹ آیا تو دیکھا کہ سید صاحب مزار کے قبہ میں تشریف فرما ہیں حالانکہ دروازہ بند تھا اور اس کی چابی خادم کے پاس تھی۔

شیخ ابو طاہر کا بیان ہے کہ ایک بار شیخ ابراہیم کو قبض (بندش لطائف) لاحق ہوگئی۔ مسلسل چھ ماہ روتے رہے، کسی کی سمجھ میں اس کا سبب نہیں آتا تھا۔ جب حج کے ایام آئے اور ان کے بعض شاگرد شام سے قافلہ حج میں آئے تو انھوں نے شیخ ابراہیمؒ کے لئے شیخ قشاشیؒ سے حج پر جانے کی اجازت چاہی۔ شیخ قشاشیؒ نے اجازت دے دی جب شیخ ابراہیم کے بھائی عبدالرحمٰنؒ نے ان کی نشست گاہ سے کتابیں اٹھانا چاہیں تو ان کے نیچے کاغذ کا ایک ٹکڑا پایا جس پر شیخ قشاشیؒ کے قلم سے لکھا ہوا تھا اے ابراہیم! ہم نے تمہارا آدھا حصہ غرق کر دیا ہے۔ اگر تم نے رجوع نہ کیا تو ہم تمہیں سارے کا سارا ڈبو دیں گے۔ اس وقت انھیں پتہ چلا کہ ان کے رونے کا سبب کیا تھا۔ جب حضرت شیخ ابراہیم مکہ پہنچے اور سید عبدالرحمٰن مجوب کی خدمت میں حاضر ہوئے تو سید صاحب شیخ ابراہیم پر گلاب کا پانی چھڑکنے لگے۔ چونکہ شیخ ابراہیمؒ احرام کی حالت میں تھے اور ان کے لئے خوشبو کا استعمال ممنوع تھا اس لئے گلاب کا پانی چھڑکنے کے ساتھ ہی شیخ ابراہیم کی حالت قبض رفع ہوگئی۔ گویا یہ شیخ قشاشی اور شیخ ابراہیم کے درمیان مصالحت تھی جسے سید ابراہیم نے انجام دیا سید عبدالرحمٰن جہاں باطنی کمالات سے متصف تھے وہاں کمالات ظاہری میں بھی بلند مقام پر فائز تھے جود و کرم میں اپنی مثال آپ تھے۔ ان کے دستر خوان پر صبح و شام بہت سے لوگ جمع ہوتے اور وہ ان تمام کے ساتھ خوش خلقی سے پیش آتے، آس پاس کے اسلامی شہروں سے ان کی خدمت میں نذر و نیاز پیش ہوتیں جسے آپ فقرا میں تقسیم فرما دیتے، تقریباً دو سو غلاموں کو آزاد کیا۔ جو بھی ایک

دفعہ آپ کی محفل میں بیٹھ جاتا آپ کی شیریں کلامی اور خوش خلقی کی بنا پر اٹھنے کا نام نہ لیتا۔ اس قدر زیرک و دانشمند تھے کہ جس سے بھی ایک بار ملاقات کر لیتے چاہے ایام حج میں بھی کیوں نہ ہو، اسے دوبارہ فوراً پہچان لیتے۔ جو بھی ان کی زیارت کو آتا، استعداد کے مطابق اسے درود، تلاوت، استغفار اور اوراد، ایسے نیک امور کی تلقین فرماتے، اور اسی طرح جس سے استعداد دیکھتے اسے صوفیا کے کلام اور ان کے معتقدات بالخصوص شیخ اکبر ابن عربی قدس سرہ کے مطالعہ کی ترغیب دلاتے۔ میں نے ان کے لقب محجوب اختیار کرنے کی وجہ ہر چند اہل مکہ سے معلوم کرنے کی کوشش کی مگر پتہ نہ چل سکا قرین قیاس یہ ہے کہ آپ سماع کے دوران چہرے کو ڈھانپ لیا کرتے تھے۔ جب گرمی شوق کے آثار ظاہر ہونے لگتے تو چہرے سے نقاب ہٹا دیتے۔ اس وقت عجیب انوار و تجلیات کا ظہور ہوتا جس کا اثر اہل مجلس پر بھی پڑتا تھا، شیخ احمد نخلیؒ نے بھی اسی توجیہ کی طرف اشارہ کیا ہے، واللہ اعلم۔

شمس الدین محمد بن العلا بابلیؒ

آپ حافظ حدیث اور اپنے زمانے میں مصر اور حرمین کے استاذ تھے۔ نیز پسندیدہ اخلاق مثلاً تواضع، ذکاوت اور اخلاق و محبت سے متصف تھے۔ کہتے ہیں کہ انہیں ابتدائے حال میں شب قدر کی نعمت حاصل ہوئی اور اس مبارک رات کے بعض عجیب و غریب آثار مشاہدہ کئے۔ اسی وقت آپ نے دعا کی کہ بار خدایا! مجھے حافظ ابن حجر عسقلانی (۱) کی طرح بنا دے۔ چنانچہ آپ کی یہ دعا مستجاب ہوگئی۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ کوئی شخص جب کسی کتاب کی تالیف کرے تو مندرجہ ذیل سات شرائط کو پیش نظر رکھے، پہلی یہ کہ ایسی چیز تالیف کرے جس کی طرف اس سے پہلے کسی کا ذہن نہ ہو گیا ہو، دوسری یہ کہ کوئی چیز نا مکمل ہو جس کی تکمیل مقصود ہو، تیسری کوئی چیز متعلق ہو اور اس کی شرح پیش نظر ہو، چوتھی یہ کہ کوئی چیز طویل ہو اسے مختصر کرنا مقصود ہو مگر اس اختصار میں حل معانی

---

(۱) احمد نام، ابوالفضل کنیت، اور ابن حجر کے عرف سے مشہور ہوئے۔ آپ کا تعلق عرب کے مشہور قبیلہ بنو کنانہ سے تھا۔ نو برس کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا اپنے دور کے مشہور شیوخ سے علوم حاصل کئے۔ اکثر اسلامی بلاد کا سفر کیا۔ علم حدیث میں آپ نے کمال حاصل کیا۔ آپ کی تصانیف ڈیڑھ سو کے لگ بھگ ہیں۔ آپ کے حافظہ، ثقاہت، امانت، معرفت اور علوم و فنون میں مہارت کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ آپ کی تصانیف میں سے شرح بخاری، تہذیب التہذیب، لسان المیزان، تعلیق التعلیق، نخبۃ الفکر مشہور و معروف کتابیں ہیں۔ آپ نے ۸۵۲ھ میں انتقال فرمایا۔ قاہرہ کے باہر نماز جنازہ ہوئی اور جامع دیلمی کے قریب مدفون ہوئے۔

اور تفسیر مطالب کو راہ نہ دے، پانچویں کسی بات میں خلط مبحث ہو جسے صحیح ترتیب میں لانا مقصود ہو چھٹی کوئی ایسی چیز جس میں پہلے مصنف نے غلطی کی ہو اور یہ اس کی تصحیح چاہتا ہو، ساتویں کوئی چیز منتشر ہو جسے جمع کیا جائے، اگر کسی کتاب کی تالیف میں مندرجہ بالا سات وجوہ میں سے کوئی ایک وجہ نہ پائی جائے تو ایسی تصنیف تضیع اوقات کے سوا کچھ نہیں۔

آپ نے صحیح بخاری، موطا اور دیگر تمام کتابیں سالم سنہوری اور دوسرے لوگوں سے روایت کیں۔ موطا، بخاری اور حدیث کی دوسری کتابوں میں آپ کے پاس مسلسل اسناد تھیں۔ آپ نے مسلسل اسناد ہی کے ذریعے ان کتابوں کا سماع کیا تھا۔ شیخ عیسیٰؒ مغربی نے آپ کی تمام اسانید کو ایک رسالہ میں ضبط کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ متاخرین کی اسناد کا اصل یہی اسانید ہیں، جو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کے مصداق ہے **نضر الله امرأ سمع منی الحدیث** الخ آپ کی شان وعظمت اور جلالت وبزرگی کا عجیب انداز تھا، بادشاہ، امراء اور وزراء آپ سے توجہ ودعا کے طلبگار رہتے تھے۔ اور آپ کے کسی حکم سے سر مو انحراف نہیں کرتے تھے۔ قرآن مجید کی تلاوت آپ کا دائمی معمول رہا۔ آپ نے ۱۰۷۷ھ میں انتقال فرمایا۔ بابل جس کی طرف وہ منسوب تھے مصر میں ایک گاؤں ہے۔

شیخ عیسیٰؒ جعفری مغربی

آپ کی پیدائش اور نشو ونما مغرب میں ہوئی۔ مروجہ علوم کے کچھ متون بھی آپ نے اسی علاقے میں پڑھے، پھر الجزائر میں آگئے اور سجل ماسی کے پاس دس برس سے زیادہ عرصے تک رہ کر علوم میں تبحر حاصل کیا۔ اس کے علاوہ آپ نے قسطنطنیہ، مصر اور حرمین کے علما سے بھی روایت کی۔ پھر آپ نے مکہ معظمہ کو مستقل وطن بنالیا۔ آپ نے ''مقالید الاسانید'' کے نام سے ایک معجم (۱) بھی تصنیف فرمائی، الغرض وہ ایک متقی عالم جمہور اہل حرمین کے استاذ اور حدیث وقرأت کے امام تھے۔ سید عمر نے ان کے بارے میں کیا خوب رائے پیش کی ہے کہ ''جو چاہے کسی ایسے شخص کو دیکھے جس کی ولایت شک وشبہ سے بالاتر ہو تو وہ شیخ عیسیٰ کی زیارت کرے'' اور سید محمد بن علویؒ نے ان

(۱) حدیث کی وہ کتاب جس میں احادیث کو بہ ترتیب شیوخ جمع کیا گیا ہو۔ اس کے موجد ابن قانع (۳۵۱ھ) ہیں۔ معاجم کو حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب کرنے کا سہرا طبرانی (۳۶۰ھ کے سر ہے)

کے بارے میں کہا کہ "وہ اپنے وقت کی ایک باکمال شخصیت تھی"۔ انہیں اعمال حسنہ، پابندی نماز باجماعت، کثرت طواف اور مداومت صیام وقیام جیسی خوبیاں ودیعت کی گئی تھیں۔ آپ تمام امور میں اعتدال پسند تھے۔ ننگ وناموس میں نہ مبالغہ سے کام لیتے تھے اور نہ تساہل سے، اگرچہ آپ کا تعلق کئی مشائخ کے ساتھ تھا تاہم سلسلۂ شاذلیہ سے باقاعدہ منسلک تھے اور ان پر تادم آخر اسی سلسلے کی نسبت کا غلبہ رہا۔ آپ نے مسلک امام ابوحنیفہؒ کے مطابق ایک مسند (۱) بھی تالیف فرمائی جس میں متصل عنعنہ کے ساتھ حدیث کی روایت کی ہے۔ اس سے لوگوں کے اس خیال کی تردید ہوتی ہے کہ آج کل سلسلہ حدیث (۲) متصل نہیں رہا۔ آپ ۱۰۸۰ھ میں رحلت فرمائے خلد بریں ہوئے

محمد بن محمد بن سلیمان مغربیؒ

آپ حافظ حدیث تھے اور علم وریاضت اور دین ودنیا دونوں کے فنون کے جامع تھے۔ آپ کو شیخ ابومدین مغربی سے خرقۂ مدینہ حاصل تھا۔ درحقیقت کتب حدیث کا طریق تصحیح اور نسخۂ نبویہ کا تعارف حرمین میں آپ ہی کے ذریعے ہوا۔ آپ تمام اہل حرمین کے استاذ اور متبحر وثقہ عالم تھے۔ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ اسلامبول تشریف لے گئے وہاں ایک شخص نسخۂ نبویہ فروخت کر رہا تھا۔ آپ علم کے اس قدر شائق اور قدرشناس تھے کہ وہ نسخہ تین ہزار رائج الوقت سکے کے عوض خرید لیا۔ اس نسخے سے آپ کو اس قدر محبت تھی کہ ایک بار مسجد حرام میں ایسا سیلاب آگیا کہ وہاں کے لوگوں کو غرق ہونے کا اندیشہ پیدا ہوگیا مگر محمد بن سلیمانؒ نے یہ نسخہ سر پر رکھا اور طواف میں مشغول ہوگئے تاکہ اسے کوئی گزند نہ پہنچے اس فقیر (شاہ ولی اللہ) نے اس نسخے کی زیارت کی ہے اور اس کا مطالعہ بھی کیا ہے، شیخ تاج الدین قلعیؒ کا بیان ہے کہ جس طرح شیخ محمد بن محمد بن سلیمان علم روایت میں کمال رکھتے تھے اسی طرح وہ بہت سے عجیب وغریب علوم وفنون میں بھی ید طولی رکھتے تھے۔ آپ

(۱) اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں احادیث کو بہ ترتیب صحابہ جمع کیا گیا ہو باعتبار حروف تہجی، بلحاظ سبقت الاسلام باعتبار شرافت نسبی، بعض لوگوں کے نزدیک سب سے پہلی مسند موسیٰ کاظمؒ (۱۸۳ھ) کی ہے اس کے بعد مسند ابوداؤد طیالسی ہے۔

(۲) متصل السند وہ حدیث ہے جس کی سند سے کوئی راوی کسی مقام سے ساقط نہ ہو بلکہ سند کے ہر راوی نے روایت بلاواسطہ غیرا پنے شیخ سے بذات خود سن کر روایت کی ہو۔

اللہ تعالیٰ کے اس فرمان زاده بسطة في العلم والجسم کے مصداق تھے۔تدبیر معاش میں انہیں اس قدر کمال حاصل تھا کہ سارے مکۂ معظمہ کا نظام کار آپ کے ہاتھ میں آ گیا، اس پر حاسدوں کو موقع مل گیا اور جو کچھ ہونا تھا ہو گا، واللہ اعلم۔اس فقیر (شاہ ولی اللہ) نے شیخ مذکور کے صاحبزادے محمد وفد اللہؒ سے ان کے والد بزرگوار کی تمام مرویات کی اجازت لی ہے، کیونکہ انھوں نے اپنے والد سے ان تمام مرویات کی قرأت، سماعت اور اجازت حاصل کی تھی۔اس کے علاوہ میں نے مکمل موطا بروایت یحییٰ بن یحییٰ بھی شیخ وفد اللہ کے سامنے پڑھی اور انھوں نے موطا شیخ حسن عجمی اور دیگر مشائخ سے پڑھی تھی۔والحمدللہ۔

شیخ ابراہیم کردیؒ

آپ عالم و عارف تھے اور فقہ شافعی، حدیث اور عربی ادب میں مہارت کاملہ رکھتے تھے ان تمام علوم میں آپ کی تصانیف موجود ہیں۔آپ نے اپنے وطن میں علم کی تکمیل فرمائی، پھر حج کے ارادے سے نکلے اور تقریباً دو سال تک بغداد میں مقیم رہے، اس اثنا میں آپ اکثر سیدی شیخ عبدالقادر قدس سرہ کے مزار مبارک کو مرکز توجہ بنایا کرتے تھے اور یہیں سے ہی آپ کو اس راہ (معرفت) کا ذوق وشوق پیدا ہوا۔اس کے بعد آپ نے شام میں چار سال قیام فرمایا پھر مصر سے ہوتے ہوئے حرمین شریفین تشریف لائے۔اور شیخ احمد قشاشیؒ سے ملاقات کی اور دونوں کے درمیان عجیب قسم کے روابط و تعلقات پیدا ہو گئے۔شیخ ابراہیم کردیؒ نے شیخ قشاشیؒ سے حدیث روایت کی، ان سے خرقہ پہنا اور ان کی صحبت کے فیض سے اعلیٰ کمالات پر فائز ہوئے۔آپ فارسی، کردی، ترکی اور عربی سب زبانیں اچھی طرح جانتے تھے۔آپ ذہن کی تیزی، تبحر علم، زہد، انکساری، صبر اور حلم و حوصلہ ایسے خصائل حمیدہ سے متصف تھے۔کہتے ہیں کہ شام میں قیام کے دوران ایک دفعہ آپ نے شیخ محی الدین بن عربیؒ کے مزار مبارک کی طرف اس نیت سے توجہ کی کہ آگے سفر مفید ہے یا نہیں، چنانچہ آپ نے (کشف میں) دیکھا کہ شیخ اکبر ان کے پاپوش سے گرد وغبار جھاڑ رہے ہیں۔آپ نے سمجھ لیا کہ ابھی اقامت کا حکم ہے، شیخ ابو طاہر کا بیان ہے کہ ایام حج میں مدینہ منورہ میں جب مصری لوگ آئے تو شیخ ابراہیمؒ اپنے احباب و معتقدین کے ہمراہ اہل مصر کی ایک جماعت سے ملاقات کے لئے تشریف لے گئے۔راستے میں وہ ایک ایسی جگہ سے

گزرے جہاں کچھ گانے بجانے والی لڑکیاں گانے بجانے اور لہو ولعب میں مشغول تھیں۔ آپ کے شاگردوں میں سے سید محمد برزنجی نے ڈنڈا اٹھا کر انہیں اس فعل قبیح سے روکنا چاہا۔ شیخ نے انہیں ایسا کرنے سے منع کیا، کیونکہ اس طرح ہنگامہ ہو جانے کا خطرہ تھا، سید محمد برزنجی خشک مزاج واقع ہوئے تھے شیخ کے روکنے سے تنگ دل ہوئے، جب شیخ اور ان کے رفقا منزل مقصود پر پہنچے تو گانے والیوں میں سے ایک نے اپنے نغمے کا آغاز اس شعر سے کیا۔

ان شرقوا سادقي وان غربوا ويلي

وان عاشروا غيرنا ويلا علی ويلي

یہ شعر قاعدۂ عروض کے مطابق نہیں تھا مگر متاخر عروضیوں کے قواعد سے موافق تھا۔ جب یہ شعر شیخ ابراہیمؒ نے سنا تو ان کی حالت متغیر ہوگئی اور چہرہ ڈھانپ کر گریہ شروع کر دیا۔ اس مجلس میں جس نے بھی شیخ کی آواز سنی یا ان کی شکل دیکھی وہ رو پڑا حالانکہ ان میں رقیق القلب بھی تھے اور سنگدل بھی! سید محمد برزنجی بھی رو پڑے اور ان کے دل سے سیاہی اعتراض دھل گئی۔

شیخ ابو طاہرؒ کا بیان ہے کہ بادشاہ روم کا استاذ جسے وہاں کے لوگ خوجہ کہتے ہیں، مدینہ منورہ کی زیارت کو آیا اور علماء واحباب کی ایک کثیر جماعت کے ساتھ شیخ ابراہیمؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ملاقات کے دوران اس نے شیخ سے کہا کہ میں نے شام میں ایک کھلم کھلا بدعت دیکھی جس کا قلع قمع کرنے میں میں نے انتہائی کوشش سے کام لیا۔ شیخ نے پوچھا وہ بدعت کیا تھی؟ کہنے لگا مساجد میں ذکر بالجہر۔ شیخ نے یہ آیت پڑھی **ومن اظلم ممن منع مساجد الله ان يذكر فيها اسمه وسعى في خرابها** (۱) (اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ کی مسجدوں میں نام خدا لینے سے روکے اور ان کی ویرانی میں کوشش کرے) خوجہ کا رنگ متغیر ہو گیا اور وہ نہایت مشکل میں پڑ گیا فتاوی قاضی خاں وغیرہ سے فقہ کی چند جزئیات جو لکھ کر لایا تھا جیب سے نکالیں اور شیخ کے ہاتھ میں تھما دیں شیخ نے فرمایا اگر تقلید کی بات ہے تو میں کسی کا مقلد ہوں اور آپ کسی اور کے، اس لئے اس صورت میں آپ کے دلائل کو تسلیم کر لینا میرے لئے ضروری نہیں ہوگا۔ اور اگر تحقیق مطلوب ہے تو بندہ مناظرے کے لئے حاضر ہے۔ حضرت شیخ نے بہت جلد اس موضوع پر

---

(۱) البقرہ ۱۱۴

دلائل سے بھرپور رسالہ تحریر فرمایا اور خوجہ کے شبہات کے مسکت جوابات دیئے، چونکہ حضرت شیخ کے احباب نے خوجہ کے تغیر مزاج کو دیکھ لیا تھا اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ وہ دولت عثمانیہ میں بلند رتبے پر فائز ہے اس لئے انھوں نے حضرت شیخ سے عرض کیا کہ اس قدر تردید مناسب نہیں۔ شیخ نے فرمایا حق بات کہنے سے نہیں ٹلنا چاہئے چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ خوجہ اور اس کے ساتھی اس رسالے کے جواب میں کچھ نہ کہہ سکے وہ مبہوت ہو کر رہ گئے اور یہ حقیقت کھل کر سامنے آ گئی کہ حق ہمیشہ بلند رہتا ہے کبھی پست نہیں ہوتا۔

شیخ ابوطاہرؒ مزید بیان کرتے ہیں کہ شیخ یحییٰ شاذلیؒ حرمین میں آئے ہوئے تھے۔ اس دوران انھوں نے شیخ ابراہیمؒ سے بھی ملاقات کی جب وہ روم واپس چلے گئے تو وزیر روم جو شیخ ابراہیمؒ کا معتقد تھا، نے شیخ یحییٰ سے پوچھا کہ آپ نے ہمارے شیخ ابراہیمؒ کو کیسا پایا، اس نے کہا وہ تو ایک بت ہیں۔ وزیر یہ سن کر بھڑک اٹھا اور شیخ یحییٰ کو بے عزتی کے ساتھ مجلس سے نکال دیا۔ اس واقعہ کے بعد یحییٰ شاذلی کو شیخ ابراہیمؒ کے ساتھ سخت کینہ پیدا ہو گیا اور اس نے شیخ کو ایذا پہنچانے کی نیت سے حرمین آنے کا ارادہ کیا، لوگوں نے یہ بات شیخ ابراہیم کو پہنچائی تو آپ نے فرمایا جو ہاتھیوں کو قابو کر لیتا ہے وہ اسے بھی روک لے گا"۔ جب شیخ یحییٰ طور کے قریب پہنچے تو بیمار پڑ گئے اور اسی جگہ انتقال کیا۔ شیخ ابراہیمؒ کی سیرت یہ تھی کہ وہ خود پسند فقہا اور صوفیا کی طرح بڑے بڑے عمامے، لمبی آستینیں، اور پھٹے پرانے لباس سے بیزار تھے۔ آپ اہل حجاز کی طرح متوسط درجے کا لباس پہنتے تھے جو مختصر سی پگڑی، اون کی دھاری دار عبا اور بڑے رومال پر مشتمل ہوتا۔ آپ کبھی کسی محفل میں نمایاں جگہ بیٹھنے اور گفتگو میں پہل کرنے کے ذریعے اپنی حیثیت کا اظہار نہیں فرماتے۔ آپ کے معتقدین اور مذاکرے آپ سے استفادہ کرتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے "بہر حال یہ ایسے ایسے ہے کیا تمھیں فلاں فلاں بات سے اس کی سمجھ نہیں آتی"۔ اگر کوئی ان سے کسی مسئلے کے بارے میں سوال کرتا تو توقف فرماتے یہاں تک کہ تحقیق وانصاف کے ساتھ اس اشکال کو حل کر دیتے، عبداللہ لیاشی نے ان کے بارے میں کہا کہ آپ کی مجلس نمونہ جنت تھی۔ جب مسائل حکمت پر گفتگو فرماتے تو اس ضمن میں حقائق صوفیا بھی بیان فرماتے اور کلام صوفیا کو حکما کی تحقیق پر ترجیح دیتے اور فرماتے کہ یہ فلاسفہ گرتے پڑتے حق کے قریب تو پہنچ گئے، لیکن اس تک ان کی رسائی نہیں ہوئی۔

آپکی تاریخ وفات اس زمانے کےایک خطیب نے ان الفاظ سے نکالی ہے۔ **واللہ انا علی فراقک یا ابراھیم لمحزنون۔** ۱۱۰۷ھ

شیخ حسن عجمیؒ

آپ شیخ الحدیث، جامع علوم وفنون اور فصاحت، یادداشت اور تیزی فہم کے پیکر تھے۔ آپ اکثر وبیشتر شیخ عیسیٰ مغربیؒ کی صحبت میں رہے اور ان سے استفادہ کیا۔ ان کے علاوہ کئی دوسرے شیوخ مثلاً شیخ احمد قشاشیؒ، شیخ محمد بن العلاء بابلیؒ اور امام ومفتی شوافع شیخ زین العابدین بن عبدالقادر طبری کی صحبت میں بھی رہے اور ان سے روایت کی۔ شیخ ابوطاہرؒ کا بیان ہے کہ شیخ حسن عجمیؒ نے شیخ نعمت اللہ قادریؒ اور دوسرے صوفیائے کرام سے بھی ملاقات کی تھی آپ دعوت اسماء کے سلسلے میں بھی مشہور تھے۔ شیخ ابوطاہرؒ ہی کا بیان ہے کہ یوں تو شیخ حسن حنفیؒ تھے مگر سفر کے دوران ظہر وعصر اور مغرب وعشا کی نمازیں اکٹھی پڑھ لیتے تھے اور امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ بھی پڑھتے تھے، آپ ہمیں وصیت فرمایا کرتے تھے کہ اپنی عورتوں کو تنگی میں نہ ڈالا کرو بلکہ انھیں حنفی مسلک کی آسانیوں سے مطلع کر دیا کرو تا کہ وہ نماز پڑھ سکیں جیسے درہم برابر نجاست میں جو اجازت دی گئی ہے اور اسی طرح کے دیگر مسائل کہ جن میں آسانی اور رخصت ہے۔

کاتب الحروف (شاہ ولی اللہ) کہتا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ شیخ حسن عجمیؒ باوجود حنفی ہونے کے، تمام امور میں ایک معین فقہی مسلک کی پیروی ضروری نہیں سمجھتے تھے بلکہ فریقین کے ہاں کسی حقیقت ممتنعہ کے ثابت ہونے یا نہ ہونے کی پروا کیئے بغیر وہ تمام فقہی مکاتب سے اقوال لے لیا کرتے تھے، واللہ اعلم

شیخ ابوطاہر مزید کہتے ہیں کہ میرے شیخ حسن عجمی خوب صورت نہیں تھے بلکہ ان کی ایک آنکھ میں ایک عیب بھی تھا اس کے باوجود جب حدیث پڑھتے تو ان کے چہرے پر انوار ظاہر ہوتے اور وہ دنیا بھر سے زیادہ حسین دکھائی دیتے تھے۔ یہ اس قول نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا اثر تھا کہ **نضر اللہ عبدا** (۱) الحدیث، آپ نے اپنی اسانید حدیث کو ایک رسالے کی صورت میں ضبط کیا ہے جس سے علم حدیث میں ان کے تبحر کا بخوبی پتہ چلتا ہے، آپ فرماتے تھے لوگ کہتے ہیں کہ عالم

(۱) نضر اللہ عبدا سمع مقالتی دوعاہ یعنی خدا اس شخص کو شگفتہ رکھے جو میری حدیث کو سن کر یاد کر لے

کا فرزند نصف عالم ہوتا ہے۔ تو یہ صحیح ہے کیونکہ ایسا کہنے سے عالم کے دو نصف ہو جاتے ہیں، ایک خود عالم اور دوسرا اس کا فرزند جبکہ یہاں یہ بات واضح ہے کہ والد تو عالم ہے ہی، ایسی صورت میں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ عالم کا فرزند نصف عالم ہے کیونکہ عالم کے دو نصف نہیں کیے جاسکتے، گویا خلاصہ کلام یہ نکلا کہ یہ ضروری نہیں کہ عالم کا بیٹا بھی عالم ہو، آپ ہر سال رجب کے مہینے میں مدینہ منورہ کی زیارت کے لئے تشریف لاتے اور مسجد نبوی میں صحاح ستہ میں سے ایک حدیث کی کتاب بطریق سرد پڑھتے اور اہل مدینہ آپ سے روایت کرتے تھے شیخ ابو طاہرؒ آپ کے قاری ہوتے۔ اگر ان کے علاوہ اور قرأت حدیث کرتا تو خوش نہ ہوتے، یہاں یہ بات واضح رہے کہ علمائے حرمین کے نزدیک کتب حدیث کی تدریس کے تین طریقے رائج ہیں پہلا طریقہ سرد سے جس کے مطابق شیخ سامع ہو یا تلاوت کرے دونوں صورتوں میں لغوی وفقہی مباحث چھیڑے اور نہ ہی اسماء رجال کے بارے میں کوئی بحث وتمحیص کرے۔

دوسرا طریقہ بحث وحل ہے، اس میں ایک حدیث کی تلاوت کے بعد اس میں لفظ غریب، مشکل ترکیب اسمائے اسناد میں سے نادر الوقوع اسم، ظاہری شان نزول اور منصوص علیہ مسائل پر تامل کر کے اسے نہایت اعتدال کے ساتھ حل کر دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد اگلی حدیث تلاوت کر کے اسے بھی اسی طرح حل کیا جاتا ہے علی ہذا القیاس۔

تیسرا طریق امعان وتعمق ہے اس کے مطابق ہر ہر لفظ کا، لہ وما علیہ اور اس کے متعلقات کو نہایت توضیح وتشریح کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر کلمہ غریبہ اور کسی مشکل ترکیب کی تشریح میں کلام شعراء سے استشہاد کیا جاتا ہے اور الفاظ کے متعلقات کو اشتقاق ومحال کے پیش نظر پرکھا جاتا ہے اس کے علاوہ اسماء الرجال کی تشریح کرتے ہوئے رجال حدیث کے حالات اور سیرت واخلاق تفصیل سے بیان کئے جاتے ہیں نیز فقہی مسائل کی منصوص علیہا مسائل سے تخریج کرتے ہوئے اس کے ساتھ تھوڑی سی مناسبت رکھنے والے قصے اور عجیب وغریب حکایات بھی بیان کی جاتی ہیں۔ علمائے حرمین شریفین کے ہاں یہی تینوں طریقے مذکورہ تفصیلات کے مطابق رائج ہیں۔ شیخ حسن عجمیؒ، شیخ احمد قطان اور شیخ ابو طاہر کا پسندیدہ طریقہ بھی طریق سرد تھا، مگر یہ طریقہ صاحبان علم وفضل اور منتہی طلبائے حدیث کیلئے زیادہ موزوں سمجھا گیا ہے تا کہ وہ جلد از جلد اپنے سماع حدیث

اور سلسلۂ روایت کو مکمل کرلیں اور دوسرے مباحث شروح کی مدد سے حل کریں کیونکہ آج کل ضبط حدیث کا انحصار شروح پر ہی ہے اور مبتدی و درمیانی درجے کے طلبائے حدیث کیلئے طریقہ بحث وحل ہے تاکہ علم حدیث کے بارے میں ضروری معلومات حاصل کر کے فائدہ اٹھائیں۔ جہاں تک شروح کا تعلق ہے تو وہ انہیں پیش نظر رکھیں تاکہ بحث وتمحیص کے دوران ان کی طرف رجوع کرسکیں۔

تیسرا طریقہ قصاص ہے اس کا مقصد روایت وتحصیل علم نہیں بلکہ علم وفضل اور تحقیق وتدقیق کے اعلیٰ مراتب کا حصول ہے۔ اسی ضمن میں یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ ایک محدث کو رجال اسناد کے حالات، تصحیح اسماء ان کی ثقاہت کی معرفت، خصوصاً صحیحین (بخاری ومسلم) اور صحاح کی دوسری کتابوں میں اور **لیس منا من فعل کذا** اور **فان اللہ قبل وجھه** اور اسی طرح کے دوسرے جملوں کی تاویلات فقہی فروعات فقہا کے اختلافات مذاہب، مختلف روایات میں باہمی موافقت پیدا کرنے اور بعض احادیث کی بعض پر ترجیح میں تحقیق وتدقیق اور گہرائی وگیرائی پر حاوی ہونا چاہئے مگر اس امت مرحومہ کے متقدمین علماء ان امور میں دلچسپی نہیں رکھتے تھے ہاں فقہاء ومتکلمین اس سلسلے میں غور وخوض کرتے ہیں لیکن آج اس کی بھی ضرورت باقی نہیں رہی۔ واللہ اعلم۔

شیخ حسن اپنے مشائخ سے انتہائی تواضع اور انکساری سے پیش آتے اور ہر لحاظ سے ان کا دل رکھنے کی کوشش کرتے۔ شیخ حسن کہتے ہیں کہ میں نے شیخ عیسیٰ سے دریافت کیا کہ اگر کسی کا شیخ موجود ہو تو کیا وہ کسی دوسرے شیخ کی بیعت کرسکتا ہے۔ تو انھوں نے فرمایا باپ تو ایک ہی ہوتا ہے مگر چچا، تایا کئی ہوتے ہیں۔ کاتب الحروف (شاہ ولی اللہ) کہتا ہے کہ آپ کی اس بات کا مفہوم یہ ہے کہ شیخ اول کہ جس کے باعث مزید دائرہ بشریت سے نکلا، یا اس نے ظاہری علوم حاصل کیے، کا مقام تو یہ ہے کہ اس کا مرتبہ حقیقی والدین کا سا ہے جبکہ دوسرے بزرگ کہ جن سے اس نے دائرہ بشریت سے خروج کے علاوہ دیگر خارجی فیوض کا اکتساب کیا ہے، کا معاملہ اعمام کا ہے لہٰذا انہیں اس طرح سمجھنا چاہئے۔ شیخ حسن آخری عمر میں مکہ مکرمہ سے ترک سکونت کر کے طائف میں گوشہ نشین ہوگئے تھے۔ آپ کا مقولہ ہے **لیس بمکة من یقر الیه** آپ نے طائف ہی میں ۱۱۱۳ھ میں انتقال فرمایا اور حضرت ابن عباسؓ کے مزار کے قریب مدفون ہوئے۔

شیخ احمد نخلیؒ

آپ علوم ظاہری و باطنی دونوں کے جامع تھے، مشائخ وطریقت اور علمائے شریعت کی بے شمار صحبتوں سے مستفیض ہوئے۔ سید احمد نخلیؒ سید محمد رومی، سید عبداللہ سقاف اور میر کلاں بن میر محمود بلخی وغیرہ سے خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ آپ نے حدیث کی تعلیم محمد بن العلاء بابلی، شیخ عیسیٰ مغربی اور اسی طبقے کے دوسرے شیوخ سے حاصل کی اور انہیں سے بخاری و موطا کے سماع میں تسلسل حاصل کیا۔ آپ کا مشائخ کے کئی خانوادوں سے تعلق تھا، ابتدا ہی سے علم وعلما کی محبت کی طرف مائل ان کی صحبت میں حاضر، صوفیائے کرام سے عقیدت مندی اوران کے اعمال اور اشغال پر ثابت قدم تھے۔ آپ حرمین شریفین اور باہر سے آنے والے مشائخ کی صحبتوں سے استفادہ کرتے رہے۔ مختصر یہ کہ شیخ احمد نخلیؒ اعیان مکہ معظمہ میں سے وہ عظیم المرتبت بزرگ تھے جن کی برکات کا فیض عام اور دعوات مستجات تھیں۔ شیخ احمد نخلیؒ کے فرزند شیخ عبدالرحمٰن نخلیؒ بیان کرتے ہیں کہ ان کے دادا کے ہاں نرینہ اولاد زندہ نہیں رہتی تھی جس کی وجہ سے وہ بہت پریشان رہتے تھے۔ جب شیخ احمد پیدا ہوئے تو ان کیلئے اولیاء اللہ سے دعا کی درخواست کی اوران سے استمداد اور روحانی توجہ کے طالب ہوئے، وہ ہر جمعہ کے دن شیخ احمد نخلیؒ کو شیخ تاج سنبھلی کی خدمت میں بیٹھتے تھے۔ ایک روز اتفاق سے شیخ تاج سنبھلی نے قدرے تامل کے بعد شیخ احمد کو لانے والے خادم کے ہاتھ کہلا بھیجا کہ یہ بچہ آپ کی طرح کا نہیں، بلکہ آپ سے بڑھ کر صاحب فضل اور سعادت مند ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کی عمر کم ہے جب خادم اپنے مالک کے پاس پہنچا اور انہیں شیخ تاج سنبھلیؒ کا پیغام دیا تو انھوں نے اسے یہ کہہ کر فوراً واپس بھیجا کہ میری طرف سے حضرت شیخ تاج سنبھلیؒ کی خدمت میں التماس کرو کہ آقائے من! میں نے اپنی عمر اس بچے کو دے دی ہے اور اس بارے میں آپ سے سفارش کا طالب ہوں، جب حضرت شیخ نے یہ پیغام سنا تو فوراً توجہ کی اور چند لمحوں کے بعد اس خادم سے کہا کہ اپنے مالک سے کہہ دو کہ ان کا مدعا پورا ہوگیا ہے اور اپنی طرف سے انہیں (شیخ احمد نخلی کے والد کو) تین ماہ کی مہلت سفر آخرت کی تیاری کے لئے عطا کی۔ چنانچہ شیخ احمد نخلی کے والد اسی مدت میں اس عالم فانی سے رخصت ہوگئے اور شیخ احمد نخلی نے نوے سال کی عمر پائی۔ شیخ عبدالرحمٰن کا مزید بیان ہے کہ تمام دنیاوی معاملات اور لین دین میں میں اپنے والد کا وکیل تھا۔ جب والد بزرگوار (شیخ احمد نخلی) اپنی آخری عمر کو پہنچے اوران پر ضعیفی غالب آگئی تو میں نے ایک روز ان کی خدمت میں قرض خواہوں کے مطالبات کی شکایت کی اور عرض کی کہ مجھے اندیشہ ہے کہ اگر خدانخواستہ آپ کی وفات کا حادثہ پیش

آ گیا تو یہ تمام قرضے میرے ذمے پڑ جائیں گے اور میرے عزیز و اقارب میری وکالت کا اعتبار نہیں کریں گے، والد بزرگوار نے فرمایا اس خدشے کو اپنے دل میں ہرگز راہ نہ دو مجھے امید کامل ہے کہ میں اس وقت تک نہیں مروں گا جب تک کہ میرے ذمے تمام واجب الادا قرض ادا نہ ہو جائیں اور میرا خیال ہے کہ وہ رات میری زندگی کی آخری رات ہوگی جس میں مجھ پر کسی کا قرض باقی نہیں ہوگا۔ آپ کی وفات سے کچھ عرصہ پہلے ان تمام قرضوں کی ادائیگی جتنی رقم ایسی جگہ سے حاصل ہوگئی جہاں سے توقع بھی نہیں تھی اور آپ کے کہنے کے مطابق آپ کی اس دنیا کی وہ آخری رات آ ہی پہنچی جبکہ آپ کے ذمے کوئی واجب الادا قرض باقی نہیں تھا۔

شیخ احمد نخلیؒ فرماتے ہیں کہ طریقہ خلوتیہ میں میرے شیخ، شیخ عیسیٰ بن کنعان خلوتی نے جب مجھے اس طریقے کی اجازت بخشی تو مجھے مکہ معظمہ میں اپنا خلیفہ بنایا تا کہ خلوتیہ طریقہ کے تمام پیروکار میرے سامنے اکٹھے ہو کر نماز تہجد کے بعد جیسا کہ ان کا طریق ہے اوراد و وظائف میں مشغول ہو جائیں اس بات سے میرے دل میں غایت درجہ تردد تھا کیونکہ میرا میلان پوری طرح نقشبندیہ سلسلے کی طرف تھا اور شیخ خلوتی کے سامنے مجھے لب کشائی کی جرأت بھی نہیں تھی اسی تردد کے عالم میں میں نے حضور ختم الرسل علیہ الصلوات والتسلیمات کی بارگاہ میں رجوع کیا اور اسی سال روضۂ مقدسہ کی زیارت سے مشرف ہوا تو جمعہ کے روز نماز جمعہ سے قبل مجھے خواب میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی، میں نے دیکھا کہ زیارت عثمانیہ میں چاروں خلفاء کے ہمراہ جلوہ افروز ہیں میں آپ کی طرف تیزی سے بڑھا اور دست مبارک چومنے کے بعد بالترتیب خلفائے کرام کے ہاتھوں کو چومنے کی سعادت حاصل کی۔ بعد ازاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے مزار مقدس کے سرہانے صف اوّل کے متوازی بچھے ہوئے ایک نئے سجادے کی طرف لائے اور فرمایا ''یہ شیخ تاج کا سجادہ ہے اس پر بیٹھ جاؤ'' میں سمجھ گیا کہ آپ کا اشارہ طریقۂ نقشبندیہ کی طرف ہے اور آپ نے اس طریقے کی اجازت عطا فرمادی ہے۔

شیخ عبداللہؒ بن سالم البصری

آپ نے بہت ساری حدیث کی نایاب کتابوں کی ترویج و اشاعت میں نمایاں کردار انجام دیا، مثلاً مسند امام احمدؒ جس کے بارے میں یہ خدشہ تھا کہ شاید روئے زمین پر اس کا کوئی مکمل نسخہ ملنا

محال ہو جائے۔ آپ نے مصر، عراق، شام اور اطراف واکناف کے قدیم کتب خانوں سے اس کے متفرق اجزا کمال احتیاط سے جمع کر کے ان تمام کو ایک ہی نسخے کی صورت میں ترتیب دیا اور اسے صحت کے ساتھ ایک اصلی نسخے کی صورت میں عام کر دیا۔ اس کے علاوہ صحاح ستہ کی روشنی میں آپ نے کئی اصول وضع کیئے اور نسخہ نبویہ اصل کی نسبت زیادہ بہتر انداز میں اپنے قلم سے لکھا۔ آپ نے صحیح بخاری کی شرح ''ضیاء الساری'' کے نام سے لکھنی شروع کی تھی جسے بڑھاپے اور کمزوری کے سبب مکمل نہ کر سکے۔ آپ نے ساری زندگی سرد بحث طریقوں سے روایت حدیث میں گزاری، الغرض آپ واقعتاً اس آخری دور کے حافظ الحدیث تھے۔ اس اجمالی گفتگو کی تفصیل یہ ہے کہ صحت حدیث کے ضبط کے امت مرحومہ میں تین دور رائج رہے ہیں۔ پہلا دور صحابہ و تابعین کا ہے، جس میں احادیث کو زبانی یاد کر لیتے تھے اور اچھی طرح یاد کر لینا ہی ان کے ہاں ضبط حدیث کہلاتا تھا، دوسرا دور تبع تابعین اور ساتویں آٹھویں طبقہ تک کے متقدمین محدثین کا ہے۔ یہ حضرات احادیث کو لکھ لیتے تھے ان کے نزدیک ضبط اِن اصولوں پر مبنی تھا۔ صفائی تحریر، حرکات وسکنات اور نقاط میں احتیاط، ہیئت حروف کی حفاظت، احادیث کا اصول صحیحہ سے موازنہ اور کتاب کو ہر قسم کے خارجی اثرات سے محفوظ رکھنا۔ تیسرا دور وہ ہے کہ جس میں حفاظ حدیث نے اسماء رجال اور مشکل وغریب الفاظ کے ضبط میں کتابیں تالیف کیں۔ مفصل شرحیں لکھیں اور پیچیدہ ومشکل مقامات حدیث کی تشریح میں رسائل لکھے۔ آج ضبط حدیث کا یہ عالم ہے کہ کوئی بھی شخص ان تصانیف وشروح کو پیش نظر رکھ کر ان کے مطابق روایت شروع کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب علمائے حدیث ان اصولوں میں تساہلی سے کام لینے لگے ہیں جن پر قدما سختی سے کاربند تھے، چونکہ متوسطین نے حفظ حدیث میں سستی برتی اور صرف عبارت پر ہی اکتفا کر لیا، جس کے نتیجے میں طبقات سابقہ کے برعکس ان میں وجادت (۱) اور اجازت مجردہ اور اس کی دوسری چیزیں رائج ہو گئیں۔ حاصل کلام یہ ہو کہ ضبط حدیث کا یہ طریقہ شیخ عبداللہ کے ہاں بکمال موجود تھا جبکہ اس

---

(۱) کوئی شخص کسی محدث کی لکھی ہوئی تحریر یا کتاب حاصل کرے لیکن اس شخص نے ان روایات کو نہ اصل سے سنا نہ ہی اس کو روایت کی اجازت ہو، ایسی صورت میں راوی ثانی اگر ان احادیث کو روایت کرنا چاہے تو یوں کہے گا، او جدت بخط فلاں، فلاں شخص کی تحریر سے میں نے ایسا پایا یا قرأت بخط فلاں اسے وجادہ کہتے ہیں۔

سلسلے کی بقا کا سبب بھی انہی کی ذات بنی، حضرت شیخ عبداللہ بچپن ہی سے علم وعلماء اور صلاح وتقویٰ کو دل وجان سے عزیز جانتے تھے، روزانہ قرآن مجید کے دس پارے تلاوت فرماتے مگر بڑھاپے میں حسب استطاعت تلاوت فرماتے۔ آپ کے وقت کا کوئی حصہ بھی درس وتدریس، تلاوت کلام پاک، نماز یا ضروری گفتگو سے خالی نہ ہوتا تھا۔ میں (شاہ ولی اللہ) نے سنا ہے کہ جب شیخ عبداللہ کے فرزند شیخ سالم نے شریف مکہ کے دربار میں ملازمت اختیار کرلی تو شیخ عبداللہ، شیخ سالم کے کھانے میں شریک ہوتا تو درکناران کے گھر کے نمک سے بھی احتراز فرماتے تھے۔ آپ نے حجرہ کعبۃ اللہ میں دوبار صحیح بخاری ختم کی، پہلی بار مرمت کعبہ کے وقت اور دوسری دفعہ اس وقت جبکہ کعبہ مکرمہ کا دروازہ درست کیا جارہا تھا اور مسند امام احمد بن حنبل تصحیح وجمع کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مزار مقدس کے سرہانے مسجد نبوی میں چھپن روز میں ختم کی۔ آپ نے طویل عمر پائی جوسب کی سب رضائے الٰہی میں گزری۔ آخر عمر تک سمجھ بوجھ، حافظہ اور حواس درست رہے، البتہ قوت سماعت میں کچھ کمی واقع ہوگئی۔ عمر کے آخری حصے میں شیخ عبداللہ مغربی نے آپ سے کتب صحاح ستہ پڑھیں اور اہل مکہ نے آپ سے سماع حدیث کیا، آپ ۴/رجب ۱۱۲۴ھ میں واصل بحق ہوئے۔

شیخ ابوطاہر محمد بن ابراہیم کردی المدنیؒ

آپ ابتداء ہی سے علم اور علماء کی طرف راغب تھے، خرقۂ خلافت اپنے والد بزرگوار سے حاصل کیا، جنھوں نے آپ کیلئے بے شمار بزرگوں سے خرقہ واجازت حاصل کی تھی، ان بزرگوں میں سے ایک شیخ محمد بن سلیمان مغربیؒ تھے آپ نے کتب عربیہ کی تعلیم سیبویۂ وقت سید احمد ادریس مغربی سے حاصل کی، شیخ ابوطاہر سید احمد ادریس کا ایک واقعہ نقل کرتے ہیں کہ ان کے ایک فاضل شاگرد نے مسجد نبوی کے محراب میں سورۂ تبت تلاوت کی جب وہ نماز سے فارغ ہوکر سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ اس پر برس پڑے اور فرمانے لگے میں یہ ہرگز برداشت نہیں کرسکتا کہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور وہ سورت پڑھو جس میں ان کے چچا (ابولہب) کا نام (اہانت کے ساتھ) مذکور ہے۔ کیونکہ خدا جیسے چاہے اپنے رسول سے خطاب کرے لیکن ہمارا یہ مقام نہیں! کاتب الحروف (شاہ ولی اللہ) کہتا ہے کہ اگرچہ اس طرح کی باتیں سید الکونین صلی اللہ

علیہ وسلم کے ساتھ انتہائی محبت کا نتیجہ ہیں تاہم یہ ارباب تقویٰ و تحقیق کا مقام ہے مگر ہمارے لئے تو صحابہ وتابعین کا طرز عمل ہی کسوٹی ہے۔ وہ یوں کیوں نہیں سمجھتے کہ اس سورت میں تو حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی انتہائی مدح ومنقبت کا پہلو نکلتا ہے، کیونکہ یہاں اس سورت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرنے والے آپ کے ایک دشمن پر خدا تعالیٰ نے لعنت کی ہے۔

شیخ ابوطاہر نے فقہ شافعی کی تعلیم شیخ طولونی مصری سے معقولات، روم کے مشہور زمانہ متبحر عالم منجم باشی سے اور علم حدیث اپنے والد بزرگوار سے حاصل کیا۔ اس کے بعد وہ شیخ حسن عجمی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے بہت زیادہ استفادہ کیا۔ انکے بعد شیخ احمد نخلی اور شیخ عبداللہ بصری کی صحبت میں پہنچے اور شیخ عبداللہ بصری سے شمائل النبی صلی اللہ علیہ وسلم پڑھی اور انہی سے مسند امام احمد دو ماہ سے بھی کم عرصے میں سنی۔ ان کے علاوہ آپ نے وقتاً فوقتاً حرمین شریفین میں باہر سے آنے والے علماء ومشائخ سے بھی بہت کچھ حاصل کیا۔ ان میں ایک شیخ عبداللہ لاہوری تھے جن سے آپ نے ملا عبدالحکیم سیالکوٹی (۱) کی کتابیں روایت کیں اور ان کا سلسلہ شیخ عبداللہ لبیب کے ذریعے خود مولانا تک پہنچا ہے۔ اسی طرح شیخ عبدالحق دہلویؒ (۲) کی کتابیں بھی آپ نے اسی واسطے سے پڑھیں۔ مولانا سیالکوٹی نے خود ان سے ان کتابوں کی روایت کی اجازت لی تھی اور ان میں سے شیخ سعید کوکنی سے بھی آپ نے بعض عربی کتابیں اور فتح الباری کا چوتھا حصہ پڑھا۔ الغرض

---

(۱) ملا عبدالحکیم سیالکوٹیؒ اپنے دور کے یگانہ روزگار فاضل ملا کمال الدین متوفی ۱۶۰۸ء کے شاگرد رشید ہیں، آپ علمی تبحر اور مسلمہ حدیث کی شہرت پوری اسلامی دنیا میں ہے۔ کچھ وقت اکبر آباد کے سرکاری مدرسے میں مدرس رہے۔ آپ کی تصانیف زیادہ تر درسی کتابوں کے حواشی وشروح سے متعلق ہیں۔ حواشی تفسیر بیضاوی، حاشیہ شرح عقائد، حاشیہ شرح شمسیہ، تکمہ حاشیہ عبدالغفور اور حاشیہ خیالی جس کی نسبت کسی نے کہا ہے۔

خیالات خیالی بس عظیم است
رائے حل او عبدالحکیم است

علمی دنیا میں مشہور اور ماخذ کا درجہ رکھتی ہیں۔ شاہان مغلیہ آپکے علمی مقام ورتبے کو ہمیشہ خراج عقیدت پیش کرتے رہے۔ ۱۶۵۶ء میں آپ کا انتقال ہوا۔ مزار سیالکوٹ میں شہابان روڈ پر ہے۔

(۲) سرخیل صوفیاء، امام المحدثین، عاشق مصطفیٰ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ عالم اسلام کی وہ مایہ ناز شخصیت ہیں کہ جنھوں نے ایک بار پھر دنیائے اسلام کو اس کا بھولا ہوا سبق یاد دلاتے ہوئے مقام محمدی کی عظمتوں کی طرف بلایا اور اسے حب رسول کا جاں بخش پیغام دیا۔

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

آپ سلف صالحین کے تمام اوصاف مثلاً تقویٰ، عبادت، علمی شغف اور بحث و تمحیص میں انصاف پسندی سے متصف تھے۔ جب آپ سے کسی مسئلے کے بارے میں رجوع کیا جاتا تو جب تک پورا غور وفکر اور کتابوں سے اس کی تحقیق نہ کر لیتے، جواب نہ دیتے۔ آپ اس قدر رقیق القلب تھے کہ جب بھی کوئی اس طرح کی حدیث پڑھتے تو آنکھیں پرنم ہو جاتیں، لباس وغیرہ میں کوئی تکلف نہ برتتے۔ اپنے تلامذہ اور خدام سے بھی تواضع سے پیش آتے۔

صحیح بخاری کی قرأت کے دوران جب روایات احادیث اور فقہ کے اختلافات سامنے آتے تو شیخ ابوطاہر فرماتے کہ یہ تمام اختلافات سرورکائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی انتہائی جامعیت (جامعیت کبریٰ) کا نتیجہ ہیں جو اپنے اندر کونین کی تمام تر اضداد و موافقات سموئے ہوئے ہیں۔ راقم الحروف (شاہ ولی اللہ) کہتا ہے کہ یہ ایک نہایت گہرا نکتہ ہے جس پر تدبر کی ضرورت ہے۔

ایک دن احوال صوفیا اور ان کی باہمی تردید وتنقید جو بعض دفعہ ان کے پیروکاروں میں بھی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

آپ ایک مشہور علمی وروحانی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ تعلیم دہلی ہی میں مکمل فرمائی۔ کچھ وقت فتح پور سیکری میں جو دارالحکومت ہونے کی وجہ سے علمی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ تعلیم وتدریس اور تصنیف وتالیف کا شغل اختیار کیا۔ ۱۵۷۷ء میں شیخ موسیٰ گیلانی (المعروف موسیٰ پاک شہیدؒ) سے بیعت کی۔ ۱۵۸۸ء میں زیارت حرمین کے لئے تشریف لے گئے اور وہاں دو تین سالہ قیام کے دوران مشائخ حرمین کے علاوہ براہ راست بارگاہِ رسالت سے فیوض حال کئے۔ ہندوستان کے تمام اکابر داعیان کے ساتھ آپ کے تعلقات قائم رہے۔ ۱۵۹۹ء میں خواجہ محمد باقی باللہ سے بیعت کر کے ان سے خلافت حاصل کی۔ آپ کے برادر طریقت شیخ مجدد الف ثانی کے ساتھ اختلافات پیدا ہو گئے۔ آپ نے حضرت مجدد کے بعض مکشوفات کی تردید میں ایک رسالہ بھی لکھا۔ حضرت مجددؒ کے ساتھ آپ کے اختلاف خالص علمی اور احوال صوفیا کے اختلاف تھے جو آخر دم تک قائم رہے لیکن باہمی وقار اور احترام کی فضا میں! اس سلسلے میں حضرت شیخ کے رجوع کا سارا قصہ محض عقیدتمندی کا فسانہ ہے۔ حضرت محدث کا سب سے بڑا کارنامہ مصائب وآلام میں گھری ہوئی امت مسلمہ کو محبت نبوی اور دامن رسالت پناہی سے وابستگی کی دعوت کی تجدید ہے۔ یہی وہ تریاق ہے جو مسلمان قوم کو نئی زندگی بخش سکتا ہے۔ آپ کی تصانیف میں سے لمعات، شرح مشکوٰۃ، مدارج النبوۃ، جذب القلوب، اخبار الاخیار، زاد المتقین زندہ جاوید کتابیں ہیں۔ آپ نے ۱۶۴۶ء میں چورانوے برس کی عمر میں رحلت فرمائی ع

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

چل پڑتی ہے پر گفتگو چھڑ گئی تو شیخ ابو طاہر نے فرمایا کہ میں صوفیا کے بارے میں کچھ کہنے سے بہت ڈرتا ہوں۔ اگر چہ میرے بعض اسلاف بعض صوفیا کے بارے میں ناقدانہ رائے رکھتے تھے مگر جہاں تک میرا تعلق ہے میرے دل میں ان کے لئے تردید وتنقید کا معمولی جذبہ بھی موجود نہیں، یہاں آپ نے ایک قصہ سنایا کہ شیخ یحییٰ شاذلی میرے والد سے کچھ اختلافات رکھتے تھے اور یہ بات ان کی طرف سے میرے دل میں کھٹکتی رہی، اسی اثناء میں شیخ یحییٰ شاذلیؒ اس دنیا سے کوچ کر گئے۔ ایک عرصے کے بعد جب انہیں کسی وجہ سے لحد سے باہر نکالا گیا تو اس طرح صحیح وسالم تھے جیسے آج سوئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی پر کسی عارف سے اختلاف کے سبب طعن وتشنیع نہیں کرنی چاہئے، یہاں انھوں نے مزید فرمایا کہ شیخ محی الدین بن عربیؒ نے اس سلسلے میں ایک عجیب وغریب وصیت فرمائی ہے یہ کہہ کر انھوں نے شیخ ابن عربی کے اپنے قلم سے لکھا ہوا فتوحات کا نسخہ نکالا اور اس میں سے باب الوصیت پڑھ کر سنایا۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ شیخ اکبر فرماتے ہیں کہ میں ایک شخص سے اس لئے عداوت رکھتا تھا کہ وہ شیخ ابو مدین مغربی پر طعن وتشنیع کرتا تھا، جبکہ میں شیخ مغربی کی مقبولیت وبزرگی کا معترف تھا۔ ایک دن میں نے حضور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں فرماتے ہوئے سنا کہ "تمہیں فلاں شخص سے کیوں بغض ہے؟ میں نے عرض کی اس لئے کہ وہ ابو مدین سے عداوت رکھتا ہے جبکہ میں انھیں بزرگ سمجھتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کیا وہ شخص اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت نہیں رکھتا؟ میں نے عرض کیا رکھتا ہے۔ فرمایا گویا تمہیں ابو مدین سے اس کے بغض کی بنا پر تو عداوت ہے، لیکن میرے محب ہونے کی حیثیت سے الفت نہیں۔ شیخ اکبر فرماتے ہیں کہ اس کے بعد میں نے اللہ سے اس بغض کی توبہ کی۔ اس شخص کے گھر گیا، اسے معذرت کے ساتھ سارا واقعہ سنایا اور ایک قیمتی کپڑا اس کی نذر کر کے اسے راضی کیا۔ اس کے بعد میں نے اس سے ابو مدینؒ کے بارے میں ناراضگی کا سبب پوچھا۔ اس نے جو وجہ بتائی وہ ایسی نہ تھی کہ اس کی بنا پر ابو مدینؒ سے عداوت رکھی جاتی، تو میں نے اسے حقیقت حال سمجھائی جس پر اس نے خدا تعالیٰ سے توبہ کی اور ابو مدینؒ کے بارے میں طعن وتشنیع سے رجوع کر لیا اور اس طرح سب کے دلوں میں الفت نبیؐ کی برکات جاری وساری ہو گئیں اور اس پر اللہ کا شکر ہے جس روز میں (شاہ ولی اللہؒ) وطن واپس ہوتے وقت شیخ ابو طاہرؒ کی خدمت میں الوداعی

سلام کے لئے حاضر ہوا۔ تو بے اختیار میری زبان پر یہ شعر آ گیا۔

نسیت کل طریق کنت اعرفه

الا طریقا یودینی لربعکم

(میں تیرے گھر کی طرف جانے والے راستے کے علاوہ باقی سارے راستے بھول گئے)

یہ شعر سنتے ہی حضرت شیخ پر گریہ طاری ہو گیا اور بہت متاثر ہوئے۔ آپ رمضان المبارک ۱۱۴۵ھ میں رحلت فرمائے، خلد بریں ہوئے۔

شیخ تاج الدین قلعی حنفیؒ

آپ قاضی عبد المحسن کے فرزند اور مکہ مکرمہ کے مفتی تھے کئی مشائخ حدیث کی صحبتوں میں پہنچ کر ان سے علوم حاصل کئے اور ہر ایک سے اجازت بھی حاصل کی، آپ ابھی کمسن تھے کہ والد بزرگوار نے شیخ عیسیٰ مغربی سے آپ کے لئے اجازت حاصل کی۔ آپ فرماتے تھے کہ شیخ محمد بن سلیمان مغربیؒ کے درس میں سنن نسائی کے ختم کے موقع پر حاضر ہوا، انھوں نے ختم کے بعد تمام حاضرین مجلس کو اجازت دی جن میں میں بھی شامل تھا، آپ نے علم حدیث کا اکثر حصہ شیخ عبداللہ بن سالم بصریؒ کی خدمت میں مکمل کیا، فرمایا کرتے تھے کہ یہ ساری کتابیں میں نے بحث و تنقیح کے ساتھ ان سے پڑھیں، صحیحین (بخاری و مسلم) شیخ حسن عجمی سے پڑھیں اور جس قدر روایات ان کی نظر میں صحیح تھیں، ان کی اجازت بھی حاصل کی، اس کے علاوہ شیخ صالح زنجانی کی خدمت میں ایک عرصے تک رہ کر ان سے فقہ میں مکمل استفادہ کیا، آپ نے شیخ احمد نخلیؒ سے بھی اجازت و روایت حاصل کی۔ شیخ احمد قطان بھی آپ کے مشائخ میں سے تھے جن کی صحبت میں سالہا سال رہ کر ان سے درس کا طریقہ سیکھا، شیخ تاج الدینؒ فرمایا کرتے تھے کہ شیخ احمد قطانؒ کی وفات کے بعد میرے تمام مشائخ یعنی شیخ عبداللہ مصریؒ اور شیخ احمد نخلیؒ وغیرہ اس پر مصر ہوئے کہ شیخ احمدؒ کی جگہ حرم کعبہ میں مصلیٰ مالکی پر بیٹھ کر حدیث کا درس دوں، جیسے کہ میرے شیخ کا معمول تھا مگر مجھے ایسے اکابر کی موجودگی میں یہ جرأت نہیں پڑتی تھی اس لئے میں اس پر آمادہ نہ ہوا اس کے باوجود ان کی طرف سے اصرار بڑھتا گیا تو میں نے حسن عجمی جو ان دنوں طائف میں مقیم تھے، کی خدمت میں ساری صورت حال لکھی بھیجی، انھوں نے بھی مشائخ کا کہنا مان لینے کی تاکید کی آخر کار اس معاملے

میں ہر طرح استخارہ وغور وفکر کر کے میں اس فریضے کو انجام دینے کے لئے تیار ہو گیا اور مسند شیخ قطان پر بیٹھ کر بخاری کا درس اسی مقام سے شروع کیا جہاں شیخ نے چھوڑا تھا، ختم بخاری کی مجلس میں تمام علماء ومشائخ موجود تھے۔ آپ نے شیخ ابراہیم کردیؒ سے بھی ان تمام علوم کی اجازت حاصل کی حدیث (۱) مسلسل بالاولیت بھی انہی سے حاصل کی۔

کاتب الحروف نے شیخ تاج الدینؒ سے ایک عجیب وغریب حکایت سنی جو یہ ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ ایک دفعہ سخت بیمار ہو گا۔ اس بیماری نے اس قدر طول پکڑا کہ ضعف وناتوانی کے مارے ہاتھ پاؤں ہلانے کی سکت بھی نہ رہی، اسی حالت میں ایک رات خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ جیسے کوئی آ کر کہنے لگا کہ اس مریض کے شفا کے لئے مرغ پکا کر اس پر پورا قرآن مجید دم کیا جائے تا کہ بیمار اسے کھا کر شفایاب ہو، جب میں بیدار ہوا تو خواب کو عملی جامہ پہنانے کا پختہ ارادہ کر لیا، اگلی رات میں نے پھر خواب میں دیکھا کہ گویا امام محمد بخاری میرے غریب خانے پر تشریف لائے ہیں۔ اپنے ہاتھوں سے دیگچہ چڑھا کر آگ جلائی اور اس میں صبح سے لے کر شام تک مرغ پکاتے رہے جب پک کر تیار ہو گیا تو میرے سامنے لا کر رکھ دیا اور کہنے لگے میں نے اس کھانے پر سارا قرآن پڑھا ہے اسے کھاؤ اسے کھاتے ہی مجھے اس قدر افاقہ ہوا کہ اس قدر لطف وکرم سے مجھے جتنی مسرت وشادمانی حاصل ہوئی وہ مرض سے نجات پانے میں بھی نہ ملی۔ کاتب الحروف (شاہ ولی اللہ) شیخ تاج الدین کے درس میں جو ان دنوں بخاری کے درس میں مشغول تھے دو تین روز لگاتار حاضر ہوا۔ اس دوران اسے صحاح ستہ اور موطا امام مالک کے کچھ حصے مسند دارمی، امام محمد کی کتاب الآثار اور موطا ساعت کیں، حضرت شیخ نے ان تمام کتابوں کی اجازت تمام اہل مجلس کو عطا کیں جن میں فقیر بھی شامل تھا اور حدیث مسلسل کے سلسلے میں یہ میری پہلی حدیث تھی جو میں نے زیارت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے واپسی کے بعد شیخ ابراہیمؒ سے ساعت کی۔ ۱۱۴۴ھ۔

---

(۱) حدیث مسلسل سے مراد یہ ہے کہ حدیث کی سند کی روایت کرنے والوں کی روایت کے وقت ایک صفت یا ایک حالت مسلسل قائم رہی ہو خواہ یہ حالت اور صفت سند کے الفاظ میں ہو یا راویوں کے حالات میں، اس کی کئی اقسام ہیں مثلاً مسلسل بسمعت، مسلسل باخذ اللحیہ، مسلسل فان قیل لفلان.

حضرت شاہ ولی اللہ کے خود نوشت حالات زندگی

بسم اللہ الرحمن الرحیم، الحمد لہ الذی بدا بالنعم قبل استحقاقھا وخص من شاء بمعرفۃ الاسماء واذواقھا والصلوٰۃ والسلام علی سیدنا محمد المتحلیٰ بتیجان الکرامات واطواقھا المکرم بصنوف العطیات واطباقھا وعلیٰ آلہ واصحابہ الذین بھم قیام الملۃ ورواج اسواقھا، اما بعد

فقیر ولی اللہ بن عبدالرحیم (خدا سے اور اس کے والدین کو بخشے اور اسے اور اس کے والدین کو احسان سے نوازے)، رقمطراز ہے کہ یہ چند کلمات میں نے اپنے حالات زندگی کے بارے میں ''الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف'' کے نام سے تحریر کئے ہیں۔ میری ولادت بروز بدھ ۴ شوال ۱۱۱۴ھ بوقت طلوع شمس ہوئی۔ بعض ستارہ شناسوں نے علم نجوم کے مطابق یہ کہا کہ میری پیدائش کے وقت حوت کا درجہ دوم طالع میں تھا اور شمس بھی اسی درجہ میں تھا۔ زہرہ آٹھویں، عطارد اکیسویں، زحل دسویں اور حمل ومشتری پندرھویں درجے میں تھے اور وہ سال علوبین کے قران کا سال تھا۔ یہ قران درجہ اوّل میں تھا اور مریخ اس سے دوسرے درجے میں تھا اور راس سرطان تھا، واللہ اعلم بالصواب

بعض احباب نے میری تاریخ پیدائش ''عظیم الدین'' سے نکالی ہے(۱)، میرے والدین قدس اللہ تعالیٰ سرہما اور کئی دیگر صلحاء کو میرے بارے میں میری پیدائش سے پہلے اور اس کے بعد بشارتیں ہوئیں۔ چنانچہ ایک قریبی برادر اور مخلص دوست نے یہ ساری تفصیلات دوسرے واقعات کے ساتھ اپنے رسالے ''قول جلی'' میں بیان کی ہیں، اللہ اسے اس کی بہترین جزا عطا فرمائے اور اسے اور اس کے اسلاف واخلاف کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آئے اور اس کے دینی ودنیوی مقاصد پورے فرمائے پانچ سال کی عمر میں مکتب میں بیٹھا اور سات سال کا تھا کہ والد بزرگوار نے

---

(۱) عظیم الدین سے ابجد کے حساب سے تاریخ ۱۱۱۵ھ نکلتی ہے۔ چونکہ آپ کی ولادت ماہ شوال ۱۱۱۴ھ میں ہوئی جبکہ نئے سال یعنی ۱۱۱۵ھ کے شروع ہونے میں صرف دو ماہ باقی رہ گئے تھے اسی لئے شاید تاریخ نکالنے والوں نے یہ دو ماہ شمار نہیں کئے۔

مجھے نماز کے لئے کھڑا کر دیا اور روزہ رکھنے کا حکم دیا، ختنہ بھی اسی سال ہوا، اور مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے قرآن مجید بھی اسی سال ختم کر کے عربی فارسی کتابیں شروع کیں۔ دس برس کا تھا تو شرح ملا پڑھتا تھا، اسی دوران مجھ پر مطالعہ کی راہ کھلی، چودہ برس کی عمر میں میری شادی ہوگئی۔ والد بزرگوار کو میری شادی کے بارے میں بڑی جلدی تھی۔ جب میرے سسرال والوں نے سامان شادی وغیرہ کے مہیا نہ ہونے کا عذر کیا تو والد بزرگوار نے انہیں لکھ بھیجا کہ اس عجلت میں بھی ایک راز ہے اور یہ راز مجھ پر اس وقت کھلا جب میری شادی کے بعد میری ساس، میری اہلیہ کے نانا، شیخ ابوالرضاء محمد قدس سرہ کے خلف الرشید شیخ فخر العالم، میرے بڑے بھائی شیخ صلاح الدین کی والدہ اور والد بزرگوار جو ضعیف ہونے کے سبب طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہو گئے تھے یکے بعد دیگرے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ الغرض اس طرح خاندان کے بہت سارے بزرگ اس دار فانی سے کوچ کر گئے اور ہر خاص و عام کو معلوم ہو گیا کہ اگر اس وقت میری شادی نہ ہو جاتی تو پھر برسوں اس کا امکان نہ تھا۔ پندرہ برس کی عمر میں والد بزرگوار سے بیعت کر کے اشغال صوفیا خصوصا مشائخ نقشبند کے اشغال میں مصروف ہو گیا اور ان کی توجہ و تلقین سے بہرہ ور ہوتے ہوئے ان سے آداب طریقت کی تعلیم اور خرقۂ صوفیا حاصل کر کے اپنے روحانی سلسلے کو درست کر لیا، اسی سال بیضاوی شریف کا کچھ حصہ پڑھا تو اس موقع پر والد بزرگوار نے ایک عام دعوت کا اہتمام کیا اور درس کی اجازت عطا فرمائی۔ خلاصہ یہ کہ اس علاقے کے تمام علوم متداولہ سے پندرہ برس کی عمر میں حاصل کر لی۔ میں نے تمام علوم کی کتابیں ذیل کی ترتیب کے مطابق پڑھیں۔ علم حدیث میں کتاب البیع سے کتاب الاداب تک کا حصہ چھوڑ کر باقی مکمل مشکوٰۃ، صحیح بخاری کتاب الطہارۃ تک، شمائل النبی صلی اللہ علیہ وسلم مکمل (والد بزرگوار سے ان کتابوں کی قرأت بعض ہم درس ساتھیوں نے کی) تفسیر بیضاوی و مدارک کے کچھ حصے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کے عظیم احسانات میں سے مجھ پر ایک احسان یہ ہے کہ چند مرتبہ والد بزرگوار سے مدرسے میں قرآن عظیم کے معانی، شان نزول اور کتب تفاسیر کی طرف رجوع کرتے ہوئے کلام قدسی میں تدبر حاصل کرنے کا موقع ملا جو میرے لئے ایک عظیم فتح تھی اور اس پر خدائے قدوس کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ فقہ میں شرح وقایہ اور ہدایہ کا اکثر حصہ، اصول فقہ میں حسامی اور توضیح تلویح کا کچھ حصہ منطق میں شرح شمسیہ مکمل اور شرح مطالع

کا کچھ حصہ۔ کلام میں شرح عقائد مکمل اور خیالی و شرح مواقف کے کچھ حصے، سلوک میں عوارف المعارف کا کچھ حصہ اور رسائل نقشبندیہ وغیرہ۔ حقائق میں شرح رباعیات مولانا جامی، لوائح، مقدمہ شرح لمعات اور نقد النصوص، خواص اسماء و آیات میں والد بزرگوار کا خاص مجموعہ جس کی انھوں نے چند بار اجازت دی، طب میں موجز القانون، حکمت میں شرح ہدایہ الحکمت وغیرہ، نحو میں کافیہ اور اس پر شرح ملا، معانی میں مطول کا اکثر حصہ اور مختصر معانی کا وہ حصہ جس پر ملا زادہ کا حاشیہ ہے اور ہندسہ و حساب میں بعض مختصر رسائل۔

اس حصول علم کے دوران ہر فن کے کئی قیمتی نکات میرے ذہن میں پیدا ہوتے تھے جو مزید غور و فکر سے کئی اور راہیں سمجھا دیتے، میں اپنی عمر کے سترہویں برس میں تھا کہ والد بزرگوار بیمار پڑ گئے اور اسی علالت میں رحمت خداوندی کی آغوش میں چلے گئے۔ آپ نے مرض الموت کے دوران مجھے بیعت وارشاد کی اجازت عطا فرمائی۔ اور یہ جملہ کہ یده کیدی اس (شاہ ولی اللہ) کا ہاتھ میرا ہاتھ ہے) دوبارہ ارشاد فرمایا میرے نزدیک سب سے بڑی نعمت یہ ہے کہ والد بزرگوار ساری زندگی مجھ سے راضی رہے اور اسی عالم میں اس دنیا سے رخصت ہوئے، مجھ پر ان کی اس قدر توجہ تھی کہ کسی بات کو اپنے بیٹے پر نہیں ہو سکتی۔ میں نے کسی ایسے والد، استاذ یا مرشد کو نہیں دیکھا کہ جو اپنے فرزند، شاگرد اور مرید کے ساتھ ایسی شفقت سے پیش آتا ہو جس شفقت کے ساتھ والد بزرگوار مجھ سے پیش آتے تھے (اے اللہ مجھے اور میرے والدین کو بخش دے، اور ان پر رحم فرما جیسے کہ انھوں نے مجھے بچپن میں پالا اور ان کی ہر شفقت، رحمت کا انھیں ہزار در ہزار گنا اجر عطا فرما بے شک تو قریب اور دعاؤں کا قبول کرنے والا ہے) والد بزرگوار کی وفات کے بعد کم و بیش بارہ برس تک میں دینی اور عقلی کتابوں کی تدریس میں مشغول رہا اور ہر علم میں خاصا درک حاصل ہوا۔ جب میں والد گرامی کے مزار مبارک پر مراقبہ کرتا تو مسائل توحید حل ہو جاتے۔ جذب کا راستہ کھل جاتا سلوک میں سے وافر حصہ میسر آتا اور وجدانی علوم کا ذہن میں ہجوم لگ جاتا، مذاہب اربعہ اور ان کے اصول فقہ کی کتابوں اور ان احادیث جن سے وہ استدلال کرتے ہیں، کے مطالعے کے بعد مجھے نور بصیرت سے معلوم ہوا کہ فقہائے محدثین کی روش ہی اختیار کی جائے۔ اس بارہ سال کے عرصے کے بعد میرے سر میں حرمین شریفین کی زیارت کا سودا سمایا، ۱۱۴۳ھ کے اواخر

میں حج کی سعادت سے مشرف ہوا اور ۱۱۴۴ھ میں مجاورت مکہ مکرمہ، زیارت مدینہ منورہ شیخ ابو طاہر قدس سرہ اور دوسرے مشائخ حرمین سے روایت حدیث کا شرف حاصل کیا۔ اسی دوران حضرت سید البشر علیہ افضل الصلوٰۃ واتم التحیات کے روضۂ اقدس کو مرکز توجہ بنا کر فیوض حاصل کیے، علمائے حرمین اور دیگر لوگوں کے ساتھ دلچسپ صحبتیں رہیں اور شیخ ابو طاہرؒ سے خرقہ جامعہ حاصل کیا جو بلاشبہ تمام سلاسل کے خرقوں کا جامع ہے، اسی سال کے آخر میں فریضہ حج ادا کیا، ۱۱۴۵ھ میں عازم وطن ہوا اور اسی سال بروز جمعہ ۱۴ رجب المرجب صحیح وسالم وطن پہنچ گیا۔ واما بنعمة ربک فحدث (اور اپنے رب کا شکر ادا کرو) اور خاکسار پر اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا انعام یہ ہے کہ اس نے مجھے ''خلعت فاتحیہ'' سے نوازا اور اس آخری دور کا آغاز میرے ہی ہاتھوں کرایا۔ اور مجھے اس طرف رہنمائی کی گئی کہ فقہ میں سے پسندیدہ مسالک کو یکجا کر کے فقہ حدیث کی نئے سرے سے بنیاد رکھوں، اسی طرح اسرار حدیث، مصالح احکام، ترغیبات اور جو کچھ حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرف سے لائے ہیں اور جن کی آپ نے تعلیم دی ہے۔ ان تمام کے اسرار ورموز کا بیان ایک مستقل فن ہے جس کے بارے میں اس فقیر سے زیادہ وقیع بات کسی اور سے نہیں بن آئی ہے اگر کسی کو اس فن کی عظمت وبلندی کے باوجود میرے بیان میں شبہ گزرے تو اسے شیخ عزالدین بن عبدالسلام کی کتاب ''قواعد کبریٰ'' دیکھنی چاہیے جس میں انھوں نے کس قدر زور مارا ہے مگر پھر بھی وہ اس فن کے عشر عشیر تک نہیں پہنچ پائے اور طریقہ سلوک جو کہ خدائے بزرگ وبرتر کے نزدیک بہت پسندیدہ ہے اور جسے اس دور میں رائج ہونا ہے۔ اور مجھے الہام کیا گیا، جسے میں نے اپنے دو رسالوں ''لمعات'' اور ''الطاف قدس'' میں قلم بند کر دیا ہے میں نے قدیم علمائے اہل سنت کے عقائد کو دلائل وبراہین کی روشنی میں جس طرح ثابت کیا اور جس طرح انہیں معقولیوں کے شکوک وشبہات سے پاک کیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ اب ان پر مزید بحث کی گنجائش ہی نہیں رہی اور مجھے کمالات اربعہ یعنی ''ابداع:: خلق تدبیر اور تدلی جو اس دنیا کے طول وعرض میں موجود ہیں اور نفوس انسانیہ کی استعداد اور ان کے کمال اور انجام کو جاننے کا علم عطا کیا گیا ہے۔ یہ دونوں علوم اس قدر اہم ہیں کہ اس فقیر سے پہلے کوئی ان کی گرد تک نہیں پہنچا اور حکمت عملی جس کے ذریعے اس دور کی اصلاح کی جاسکتی ہے مجھے پوری طرح ودیعت کی گئی ہے اس کے

ساتھ مجھے کتاب وسنت اور آثار صحابہ کے ذریعے اس حکمت عملی کو مستحکم کرنے کی توفیق بھی بخشی گئی ہے۔ اور جو کچھ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام سے منقول ہے یا دین میں جو کچھ اضافے کیے گئے ہیں یا تحریف کی گئی ہے اور جو کچھ سنت ہے یا ہر فرقے نے جو نئی چیزیں دین میں رائج کی ہیں ان تمام کی مجھے پرکھ عطا فرمائی گئی ہے۔ اگر میرا ہر بن مو زبان بن جائے تو بھی میں کما حقہ اس کا شکر نہیں بجا لا سکتا اور تمام تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں جو عالمین کا پروردگار ہے۔

البلاغ المبین
فی احکام رب العالمین

تصنیف

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ

ترجمہ

مولانا محمد علی مظفریؒ

تحقیق و تعلیق

مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱	قبر پرستوں کی عادات	۳۵۴
۲	آیت من یشرک باللہ کی تفسیر	//
۳	اشراک باللہ	۳۵۵
۴۔	خر من السماء	//
۵۔	خطف الطیر	۳۵۶
۶۔	مشرک دو قسم کے ہوتے ہیں	//
۷۔	حقیقت ظلم	۳۵۷
۸۔	قصہ ہابیل وقابیل	//
۹۔	بت پرستی کی ابتدا	//
۱۰۔	صحت کا معیار	۳۵۹
۱۱۔	اندھی محبت کا فتنہ	۳۶۰
۱۲۔	اللہ تعالیٰ کے سوا غیر کو رب بنا لینے کی تشریح	//
۱۳۔	بنی اسرائیل پر کیوں لعنت ہوئی	۳۶۱

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱۴۔	آثار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم	۳۶۴
۱۵۔	پہلا واقعہ	//
۱۶۔	دوسرا اہم واقعہ	//
۱۷۔	تیسرا واقعہ	۳۶۵
۱۸۔	منقوشہ پتھر بالکل جھوٹے ہیں	//
۱۹۔	نصب کی تشریح (مفسرین کرام کی شرح میں لکھتے ہیں)	۳۶۶
۲۰۔	حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسجد ضرار کو گرا دیا	۳۶۷
۲۱۔	قبر سے چراغ اور قندیل کا اٹھا دینا	۳۶۸
۲۲۔	ایسی نذر معصیت ہے	//
۲۳۔	چوتھا واقعہ	//
۲۴۔	عصائے موسیٰ علیہ السلام	۳۷۱
۲۵۔	بدعتیوں کا اپنے پیروں کو شہرت دینے کا طریقہ	//
۲۶۔	تنبیہ	//
۲۷۔	مقام ابراہیم علیہ السلام	۳۷۲
۲۸۔	شیاطین کا ڈھنگ	۳۷۴
۲۹۔	جھوٹی حدیثیں	۳۷۵
۳۰۔	ایک بڑی غلط فہمی	//
۳۱۔	حدیث ابی الہیاج الاسدیؒ	۳۷۶
۳۲۔	شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ کا اس حدیث کے متعلق خیال	۳۷۷
۳۳۔	اسلام اور قبر پرستی	۳۷۸
۳۴۔	قبر پرستوں کا غلو	۳۷۹
۳۵۔	عملی غلو	//

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۳۶۔	چیلنج	۳۸۰
۳۷۔	حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ	۳۸۲
۳۸۔	حدیث لا تجعلوا قبری عیداً	۳۸۲
۳۹۔	معجزات و کرامات	۳۸۳
۴۰۔	جماعت ثنویہ	۳۸۴
۴۱۔	جماعت پیر پرست	//
۴۲۔	دعا عبادت کا نام ہے	//
۴۳۔	انبیا یا اولیا سے مدد چاہنا ان کی عبادت کے مترادف ہے	۳۸۶
۴۴۔	شرک شفاعت کے منافی ہے	//
۴۵۔	زیارت قبور سے مقصود کیا ہونا چاہئے؟	۳۸۷
۴۶۔	زیارت قبور کا مسنون طریقہ	۳۸۸
۴۷۔	پہلی حدیث	//
۴۸۔	دوسری حدیث	۳۸۹
۴۹۔	تیسری حدیث	//
۵۰۔	ان تینوں حدیثوں کا مفہوم	//
۵۱۔	بچنے کا طریق	۳۹۰
۵۲۔	اختلاف فتنہ ہے جس نے قوموں کو ہلاک کر دیا	//
۵۳۔	حدیث اہل بیت	۳۹۲
۵۴۔	مقبولیت بارگاہ الٰہی کی علامت	۳۹۳
۵۵۔	عقائد میں آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرامؓ کے ساتھ مطابقت ضروری ہے	//
۵۶۔	معیار صحت	۳۹۵

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۵۷۔	اسوۂ ابراہیم علیہ السلام	۳۹۶
۵۸۔	اسوۂ حضرت اسحاق علیہ السلام	۳۹۶
۵۹۔	اسوۂ یعقوب علیہ السلام	۳۹۷
۶۰۔	اسوۂ یوسف علیہ السلام	۳۹۸
۶۱۔	صاحبی السجن کی تفسیر صوفیا کے نزدیک	//
۶۲۔	حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اسوہ	۳۹۹
۶۳۔	ایک اعتراض اور اس کا جواب	//
۶۴۔	واقعہ معراج	//
۶۵۔	دوسرا اعتراض اور اس کا جواب	//
۶۶۔	ایک اور اعتراض	۴۰۰
۶۶۔	باب تذکرۂ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، اسوۂ صدیقی رضی اللہ عنہ	۴۰۱
۶۸۔	واقعہ رحلت مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم	//
۶۹۔	صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی تقریر	//
۷۰۔	اسوۂ فاروقی رضی اللہ عنہ	۴۰۲
۷۱۔	اسوۂ عثمانی رضی اللہ عنہ نمبر ۱	۴۰۳
۷۲۔	اسوۂ عثمانی رضی اللہ عنہ نمبر ۲	//
۷۳۔	اسوۂ فاروقی رضی اللہ عنہ	۴۰۵
۷۴۔	خیر الناس کا قصہ	۴۰۶
۷۵۔	شیخ نصیر الدین محمود قدس سرہ	۴۰۸
۷۶۔	شہاب الدین عمر سہروردی رحمتہ اللہ علیہ	//
۷۷۔	اسوۂ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم	//

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۷۸۔	علم کی فضیلت	۴۰۹
۷۹۔	غلو فی الدین	۴۱۲
۸۰۔	الصوفی لا مذہب لہ	۴۱۳
۸۱۔	حضرت شیخ محی الدین جیلانی حنبلی المذہب تھے	۴۱۴
۸۲۔	بت پرستوں اور قبر پرستوں میں مشابہت	۴۱۵
۸۳۔	بیرونی شہادت	۴۱۷
۸۴۔	ایک عابد کا واقعہ	//
۸۵۔	علامہ ابو العباس رحمتہ اللہ علیہ کا خیال	۴۱۸
۸۶۔	حضرت شیخ جیلانی رحمتہ اللہ علیہ کا ایک عجیب واقعہ	۴۲۲
۸۷۔	قصہ تلاوت سورۃ النجم	۴۲۴
۸۸۔	شیخ عبد الوہاب منڈوی اور شیخ عبد الحق دہلوی کے واقعات	۴۲۶
۸۹۔	زیارت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم	۴۲۷
۹۰۔	زیارت نبویؐ کے متعلق تین خیال	۴۲۸
۹۱۔	ابن سیرین رحمتہ اللہ علیہ کا قول	//
۹۲۔	ایک عجیب واقعہ	//
۹۳۔	ہمزاد کی موت کہیں مذکور نہیں	۴۲۹
۹۴۔	ایک مغالطہ	//
۹۵۔	تفسیر سورۃ الناس	۴۳۱
۹۶۔	رب، ملک اور الہ کی تشریح	۴۳۳
۹۷۔	درجہ فنا فی الشیخ کا مطلب	//
۹۸۔	ہر بستی کے لئے حاجت روا جدا ہے	۴۳۴

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۹۹۔	قبر پرستوں کی گپیں	۴۳۴
۱۰۰۔	محکمات اور متشابہات	//
۱۰۱۔	ایک صحابی رضی اللہ عنہ کا واقعہ	۴۳۵
۱۰۲۔	تنبیہ	۴۳۶
۱۰۳۔	حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد	۴۳۷
۱۰۴۔	طریقہ اہل سنت	//
۱۰۵۔	وظائف شرکیہ	۴۳۸
۱۰۶۔	شرکیہ وظائف کے چند نمونے	//
۱۰۷۔	ایسے وظیفے پڑھنے کی ممانعت	۴۳۹
۱۰۸۔	ایک عجیب خبط	۴۴۰
۱۰۹۔	حقیقت، شریعت کے مخالف نہیں	۴۴۲
۱۱۰۔	ابوسلیمان دارانی علیہ الرحمۃ کا قول	۴۴۳
۱۱۱۔	حضرت ابوسعید خزاز رحمۃ اللہ علیہ کا قول	//
۱۱۲۔	حضرت بہاء الدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ	//
۱۱۳۔	شیخ ابوعبداللہ حارث بن اسدی رحمۃ اللہ علیہ کا قول	۴۴۴
۱۱۴۔	ابوحفص کبیر حداد رحمۃ اللہ علیہ کا قول	//
۱۱۵۔	ابو یزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کا قول	//
۱۱۶۔	حضرت جنید بغدادی علیہ الرحمۃ کا قول	//
۱۱۷۔	مشائخ کا حزم واحتیاط	۴۴۵
۱۱۸۔	عقائد میں حضور ﷺ اور صحابہ کرامؓ سے موافقت ضروری ہے	۴۴۸
۱۱۹۔	تنبیہ	۴۵۰

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱۲۰۔	فاسق و فاجر سے میل جول کا انجام عذاب الٰہی ہے	۳۵۱
۱۲۱۔	مسلم کی ایک روایت	//
۱۲۲۔	مکالمہ	۳۵۲
۱۲۳۔	قبلہ توجہ کی دلیل	۳۵۷
۱۲۴۔	دوسری دلیل	۳۶۰
۱۲۵۔	اس کا جواب	//
۱۲۶۔	ایک وضعی حدیث	//
۱۲۷۔	اس کی تشریح	۳۶۱
۱۲۸۔	ایک اور حدیث	۳۶۳
۱۲۹۔	اصل فقیر کیا ہے	۳۶۴
۱۳۰۔	کما یئس الکفار من اصحاب القبور کی تفسیر	۳۶۵
۱۳۱۔	صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تفسیر	۳۶۶
۱۳۲۔	تفسیر ابن جریر	۳۶۷
۱۳۳۔	تفسیر مدارک	//
۱۳۴۔	تفسیر معالم التنزیل	//
۱۳۵۔	مسئلہ توسل	۳۶۸
۱۳۶۔	آیت کے معنی	//
۱۳۷۔	حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا خواب	۳۶۹
۱۳۸۔	حب پیغمبر علیہ السلام بھی وسیلہ ہے	//
۱۳۹۔	سجدۂ تعظیمی	//
۱۴۰۔	ایک سوال اور اس کا جواب	۳۷۱

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱۴۱۔	وسیلہ کی بحث	۴۷۳
۱۴۲۔	نابینا والی حدیث	//
۱۴۳۔	حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اسوہ	۴۷۵
۱۴۴۔	خیالی اضطراب	۴۷۶
۱۴۵۔	قبیح طریقے	//
۱۴۶۔	شیخ عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ	۴۷۷
۱۴۷۔	ایک حدیث	//
۱۴۸۔	قرب الٰہی کا وسیلہ صرف دو چیزیں ہیں	۴۷۸
۱۴۹۔	نتیجہ بحث	//
۱۵۰۔	تین مسافروں کا قصہ	۴۷۹
۱۵۱۔	نتیجہ	//
۱۵۲۔	پیروں کے ساتھ محبت کرنے کا معیار	۴۸۰
۱۵۳۔	شفاعت کن لوگوں کے لئے	//
۱۵۴۔	عمل مطابق سنت ہی قرب کا وسیلہ ہے	۴۸۱
۱۵۵۔	عمل صالح کی تعریف اور وسیلہ نجات	۴۸۲
۱۵۶۔	شرک فی العبادات کا مفہوم	//
۱۵۷۔	عدم خلوص قرب کا وسیلہ نہیں	//
۱۵۸۔	خاتمہ سخن	۴۸۴

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نَحْمَدُکَ یَامَنْ اَنْزَلْتَ الْکِتَابَ الَّذِیْ لَارَیْبَ فِیْهِ هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ عَلٰی نَبِیِّنَا مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَسَلَّمَ وَبِمَا اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِهٖ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ یُوْقِنُوْنَ اُوْلٰئِکَ عَلٰی هُدًی مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ نَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ وَحْدَکَ لَاشَرِیْکَ لَکَ لَانَعْبُدُ اِلَّآ اِیَّاکَ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ وَاَنَّ مُحَمَّداً خَاتِمُ الْاَنْبِیَآءِ مُقْتَدَی الْاَوْلِیَآءِ عَبْدُکَ وَرَسُوْلُکَ رَحْمَةٌ لِّلْعَالَمِیْنَ۔

امابعد! اس رسالہ کا نام البلاغ المبین (۱) ہے۔ اس میں آیات کلام الٰہی احادیث صحیحہ رسول علیہ السلام، آثار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور اخبار اولیا عظام کو اس امید پر درج کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت پر رحمت نازل فرمائے اور اس فتنہ کو دور فرمائے جو ہندو مشرکوں کے ساتھ میل جول سے ہم میں صرف پیدا ہی نہیں ہو گیا بلکہ پھیل بھی گیا ہے اور جس کی وجہ سے مسلمان:

وَمَا یُؤْمِنُ اَکْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِکُوْنَ (۱۰۶:۱۲)

اور ان میں سے اکثروں کا حال یہ ہے کہ اللہ پر یقین لاتے ہیں تو اس حال میں لاتے ہیں کہ اس کے ساتھ شریک بھی ٹھہراتے ہیں۔

لِیُحِقَّ الْحَقَّ وَیُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ کَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ

تاکہ حق کو حق کر کے دکھاوے اور باطل کو باطل کر کے اگرچہ ظلم و فساد کے مجرم ایسا ہونا پسند نہ کریں۔ (الانفال:۸:۸) کا مصداق بنے ہوئے ہیں۔

یہ خدائے کریم کا وعدہ ہے، یہ گمراہ کن فتنہ ایک سیاہی ہے جس نے ان کے ٹیڑھے دلوں کو اندھا کر رکھا ہے اور نور خداوندی کے نہ ملنے کی وجہ سے توحید پرست ملت بیضا کو گمراہی کے گڑھے میں سر کے بل ڈال دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَنْ یُّشْرِکْ بِاللّٰهِ فَکَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّیْرُ اَوْتَهْوِیْ بِهٖ

(۱) نہ صرف مطبوعہ نسخوں میں بلکہ مختلف مخطوطات میں بھی اسی نام سے یہ کتاب موسوم ہے۔ (قاسمی)

الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ (۳۱:۲۲)

(جو شخص کسی چیز کو خدا کا شریک ٹھہراتا ہے (اس کی مثال ایسی ہے) کہ گویا وہ بلندی سے گر پڑا اب یا تو اسے پرندے اچک لے جاتے ہیں یا ہوا اس کو کسی دور جگہ پھینک دیتی ہے۔ یعنی آوازِ حق سننے کے مقام سے بہت دور ہو جاتا ہے)

قبر پرستوں کی عادت

یاد رکھنا چاہئے کہ وہ فتنہ (جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے) قبر پرستی کی بیماری ہے، اور قبر پرستوں کو پیر پرست پر بھی کہتے ہیں، یہ لوگ قبر پرستی جیسے قبیح فعل کو فرض عبادات اور مسنون وظائف سے بہتر وافضل سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک قبر پرستی تو ہر قسم کی عبادات کا بدل ہو سکتی ہے لیکن یہ دوسری کسی عبادت کو قبر پرستی کا بدل نہیں سمجھتے، جس دن کسی بزرگ کا عرس مناتے ہیں اس کی قبر پر بکثرت اکٹھے ہو جاتے ہیں اور اسی دن عرس میں شامل ہونا فرض عبادات کی بجا آوری اور علوم دین کی تحصیل سے زیادہ ضروری یقین کرتے ہیں اور اس کا بدترین نتیجہ یہ ہے کہ ہر دنیاوی مشکل کے لئے ان قبروں کی طرف دوڑتے ہیں۔

جس طرح عاجزی، انکساری، خشوع اور خضوع کا اظہار قبروں کے سامنے کرتے ہیں اس کا دسواں حصہ بھی حاضر و ناظر خدا کے سامنے مسجدوں کے اندر اپنی نمازوں میں نہیں کرتے، یہ لوگ قبر کے پاس صاحب قبر کا نام لے لے کر پکارتے اور دعا کرتے ہیں، ان سے اولاد اور رزق مانگتے ہیں، باادب متوجہ ہو کر قبر کے پاس اعتکاف میں بیٹھے رہتے ہیں۔ ان قبروں پر قیمتی غلاف اور لباس چڑھاتے ہیں اور ان پر خوشبوئیں ملتے ہیں، چراغوں، شمعوں اور قبروں کی سجاوٹ کے دیگر سامانوں کو ثواب سمجھ کر وہاں خرچ کرتے ہیں اور اس فضول خرچی اور اسراف سے صاحب قبر کی روح کو خوشی اور اس کا قرب تلاش کرتے ہیں، یہ اور قسم کے بے شمار افعال قبروں پر جا کر کرتے ہیں جو کہ تمام کے تمام مشرکان ہنود اپنے بتوں کے سامنے کرتے ہیں۔

آیت مَنْ یُّشْرِکْ بِاللّٰهِ کی تفسیر

جب یہ بدترین فتنہ (قبر پرستی) معلوم ہو گیا تو معلوم ہونا چاہئے کہ آیت کریمہ مَنْ یُّشْرِکْ بِاللّٰهِ جس کا ترجمہ اوپر ہو چکا ہے۔ انہی چار باتوں کا مفہوم پایا جاتا ہے۔

(۱) اِشْرَاکُ بِاللّٰہِ (۲) خَرٌّ مِنَ السَّمَاءِ (۳) خَطْفُ الطَّیْرِ (۴) اِلْقَاءُ الرِّیْحِ فِیْ مَکَانٍ سَحِیْقٍ

اشراک باللہ

اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرانا یہ ہے کہ ان تمام صفات کو جو ذات باری کے ساتھ مخصوص ہیں، مثلاً زندہ کرنا، مارڈالنا، اولاد بخشنا، روزی دینا اور پوشیدہ امور سے واقف ہونا وغیرہ وغیرہ خدائے تعالیٰ کے سوا کسی اور کی طرف منسوب کرنا اور اعتقاد رکھنا کہ یہ کام اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی دوسرا بھی کرسکتا ہے۔ ورنہ ایسا کوئی شخص نہیں جو یہ کہے کہ خدائے تعالیٰ کا شریک کوئی اور خدا بھی ہے۔

خَرٌّ مِنَ السَّمَآءِ

اور اس کا آسمان سے گر پڑنا یہ ہے کہ دین توحید آسمان کی طرف ایک بلند مقام ہے جہاں پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کی روشنی آفتاب عالم تاب کی طرح مومنوں کے دلوں کو منور کرتی ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے آثار روشن ستاروں کی طرح فرزندان اسلام کی رہنمائی کرتے رہتے ہیں۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَصْحَابِیْ کَالنُّجُوْمِ بِاَیِّهِمْ اِقْتَدَیْتُمْ اِهْتَدَیْتُمْ [1]

---

(۱) یہ حدیث کئی صحابہ کرام سے مروی ہے، یہ الفاظ حضرت جابرؓ کے ہیں جسے ابن عبدالبرؒ نے (جامع بیان العلم ۲/۹۱) میں اور ابن حزمؒ نے (الاحکام ۶/۸۳) میں اپنی سندوں سے ذکر کیا گیا ہے۔ مگر دونوں نے اسے ناقابل اعتبار قرار دیا ہے، البتہ شعرانی نے اپنی کتاب () المیزان ۱/۲۸) میں کہا ہے: اس حدیث میں اگرچہ محدثین کے نزدیک کلام ہے مگر اہل کشف کے نزدیک صحیح ہے۔

یہ حدیث تھوڑے سے فرق کے ساتھ ابن عباسؓ (الکفایہ للخطیب ص:۴۸) عمر بن خطابؓ (الکفایہ ص۴۸) ابن عمر (المنتخب لعبد بن حمید ۷۸۳ص۲۵۰) اور ابو ھریرہؓ (مسند الشھاب للقضاعی ۲،۱۳۴۶/۲۷۵) نے روایت کی ہے مگر سب کے سب موضوع ہیں۔ مزید ملاحظہ ہوں، مختصر المنھاج للبیھقی (۵۵) وجامع البیان العلم (۲/۱۰۴) والکامل بن عدی ترجمہ حمزۃ الجرزی والمعتبر کلزرکشی (ص۸۱:۸۵) وابطال القیاس ابن حزم (ص:۵۳) ومیزان الاعتدال (۱/۶:۵) پیر ابو اللیث الخیر آبادی.

اس حدیث سے کچھ قرب کا مفہوم مسلم کی روایت کردہ ابوموسی اشعریؓ کی روایت میں ہے جس میں آپ نے فرمایا آسمان کے ستارے جب تک قائم ہیں یہ آسمان قائم ہے۔ جب ستارے مٹ جائیں گے تو آسمان سے اللہ کا وعدہ سامنے آئے گا، میں اپنے صحابہ کے لئے باعث امان ہوں۔ جب میں نہ رہوں گا تو صحابہ سے کیا وعدہ سامنے آئے

میرے صحابہ رضی اللہ عنہم روشن ستاروں کی مانند ہیں۔ ان میں سے جس کی اتباع کرو گے ہدایت پاؤ گے۔

پس جس نے دین توحید کو چھوڑ دیا وہ گویا آسمان جیسے بلند مقام سے گر پڑا کا نما حرف تشبیہ اسی نکتہ کی طرف اشارہ کرنے کیلئے لایا گیا ہے جس سے اس کی خوبی اور لطافت ظاہر ہوتی ہے۔

خطفُ الطیر

خطف الطیر یعنی جانوروں کا اچک لے جانا یہ ہے کہ یہ شیاطین مشرکین کو لے جانے کے لئے فضا آسمانی میں تیرتے رہتے ہیں اور جس طرح چیل اور کوئے چیونٹی اور ٹڈی دل کا شکار کرتے ہیں اسی طرح یہ مشرکین کو اپنا شکار بناتے ہیں۔

مشرک دو قسم کے ہوتے ہیں

لیکن یہاں ایک اور بات قابل غور ہے، وہ یہ ہے کہ مشرک دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جن پر دنیا میں صریح اور صاف شرک کا حکم لگا سکتے ہیں اور دوسرے وہ جب قیامت کے روز مشرکین کے زمرہ میں شمار ہوں گے، تو خطف الطیر کی تمثیل میں پہلی قسم کے مشرکین کا ذکر ہے۔ جو شیاطین کے قبضہ میں پورے پورے آچکے ہیں اور تھوی به الریح میں دوسری قسم کے مشرکین کا ذکر ہے اور وہ ہوا نفسانیت کی ہوا ہے کہ اکثر منافقوں کی ہلاکت و موت کا موجب ہو جاتی ہے اور دوسری جگہ اہل نفاق کے متعلق ارشاد ہوتا ہے۔

اِنَّ الْمُنَافِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ (۴:۱۴۴)

بلاشبہ منافقین دوزخ کے سب سے نیچے کے طبقہ میں ڈالے جائیں گے۔

پس اس امر پر بھی غور کرنا چاہئے کہ ریح سے مراد نفس پرستی کی ہوا ہی ہے تو پھر مکان سحیق سے کیا مراد ہے؟ یہ کہ جہاں خواہشات نفسانی کی ہوا لے جا کر پٹخ دیتی ہے جہاں سے انسان باہر نہیں آسکتا۔ یاد رکھنا چاہئے کہ مکان سحیق سے مراد مقام تقلید ہے جہاں پہنچ کر کہا جاتا ہے۔

گا۔ اور میرے صحابہ امت کے لئے جائے امان ہیں جب وہ چلے جائیں گے تو امت سے کیا گیا وعدہ سامنے آئے

گا۔ اور میرے صحابہ امت کے لئے جائے امان ہیں جب وہ چلے جائیں گے تو امت سے کیا گیا وعدہ سامنے آئے

گا۔ (صحیح مسلم فضائل صحابہ اور مسند احمد ۴/۲۷۵:۳۸۳) میں یہ حدیث بروایت عمر بن خطابؓ بالفاظ مروی ہے۔ بحوالہ مشکوٰۃ باب المناقب الصحابہ

اِنَّا وَجَدْنَا آبَآءَ نَا عَلٰی اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰی آثَارِھِمْ مُقْتَدُوْنَ (۴۳:۵۳)

ہم نے اپنے باپ داداؤں کو ایک طریقہ پر پایا ہے اور ہم بھی انہی کے پیچھے چلے جا رہے ہیں۔

حقیقت ظلم

جب معلوم ہو گیا کہ شرک وہ بلائے بد (ظلم عظیم) ہے جس کا پھل ہمیشہ کھلی ہلاکت و تباہی ہوتا ہے تو کھلی بدعات و محدثات سے جو شرک کا مقدمہ اور شجر ہیں، پوری پوری قوت اور انتہائی ہمت کے ساتھ پرہیز اور علیحدگی اختیار کرنی چاہئے کیونکہ ظلم کی بنیاد گو ابتدا میں تھوڑی تھی لیکن آنے والی نسلیں اس پر ہمیشہ اضافہ کرتی ہیں۔

قصہ ہابیل و قابیل

آدم علیہ السلام کی جس قدر اولاد پیدا ہوتی تھی تمام کی تمام احکام الٰہی کی فرمانبردار اور آپ کی پیرو تھی۔ سب سے پہلا فساد جو عالم انسانیت میں ہوا اس کا سبب حرام کی طرف رجحان و میلان تھا کہ قابیل نے خلاف دستور اپنی جڑواں بہن کو اپنے نکاح میں لینا چاہا اور رب العالمین کی نافرمانی کا داغ اپنی پیشانی پر لگایا۔ جب بدکاری اور ہوائے نفس کا جذبہ اس کے دل پر غالب آ گیا تو گناہوں کے ارتکاب کی خاطر اس نے اپنے حقیقی بھائی کو قتل کر دیا۔ اس کے قتل کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو یہ حکم فرمایا کہ جب کبھی دنیا میں قتل ناحق کا ارتکاب ہو گا۔ اس کے مطابق قاتل کا جرم اور بوجھ قابیل کے نامۂ اعمال میں بھی لکھا جائے گا۔

بت پرستی کی ابتدا

حضرت آدم علیہ السلام کی وفات کے معاً بعد آپ کے فرزند نامدار حضرت شیث علیہ السلام باپ کی وصیت کے مطابق قائم مقام بنے اور اللہ تعالیٰ کی وحی سے نبی ہوئے۔ جب ان کا بھی انتقال ہوا تو بقول بعض اسی وقت تصویر پرستی کی بنیاد پڑ گئی اور بعض مورخین کا خیال ہے کہ ان کے بعد ان کی اولاد میں رشد و ہدایت کا منصب باقی تھا، یہاں تک کہ حضرت ادریس علیہ السلام جو حضرت شیث علیہ السلام کے مکرم پوتوں میں سے تھے۔ حضرت شیث علیہ السلام کے زمانۂ نبوت کے بعد خلعت نبوت سے مشرف ہوئے اور آپ کو کئی قسم کے علوم عطا ہوئے حتیٰ کہ علم نجوم بھی آپ

ہی کی ذات سے شروع ہوا اور جب آپ کو بھی اللہ تعالیٰ نے آسمان کے راستہ سے جنت میں داخل فرمایا تو آپ کی قوم کے دل میں آپ کی زیارت کا بے حد شوق پیدا ہوا، حتی کہ آپ کی جدائی کے صدمہ سے بعض لوگ حیران و پریشان ہو گئے اسی اثنا میں شیطان لعین جو انسان کا کھلا دشمن ہے، آپ کی اولاد یا بعض احباب اور معتقدین کے پاس انسانی شکل میں حاضر ہوا اور کہا:

میں نے حضرت ادریس علیہ السلام کی روشن و مبارک شکل کو خواب میں دیکھا ہے اور مصوری کی صنعت میں بھی کمال کو پہنچا ہوا ہوں۔ اگر اشارہ ہو تو آنحضور کی تصویر بنا دوں تا کہ اس تصویر کو ان کے خلوت کے کمرہ میں بحفاظت رکھو اور ایک عدد یکساں طول و عرض والا آئینہ اس پر لگا دیا جائے اور لوگوں میں منادی کر دی جائے کہ وہ اس جگہ حضرت کی زیارت کے لئے آئیں۔ پس وہاں لوگ آتے تھے اور نذر و نیاز لاتے تھے اور اس تصویر کی شکل کو دیکھ کر وجد اور شوق کا اظہار کرتے تھے، وہ لوگ جو راہِ راست پر ہدایت خداوندی سے بہرہ ور تھے ان ناجائز باتوں سے روکتے تھے اور خود اللہ تعالیٰ کے دین کی سیدھی راہ پر ڈٹے رہے لیکن مشیت ایزدی کا اقتضا یہ ہے کہ اس دنیا میں خیر کے ساتھ شر کا وجود بھی قائم رہے، اس لئے نیکو کاروں کی مزاحمت نے بدکاروں کے دل پر کچھ اثر نہ کیا۔ پس ہوتے ہوتے اس قوم میں بت پرستی اور قبر پرستی ظاہر ہونے لگی، چنانچہ صالح لوگوں کی وفات کے بعد عوام ان تصویروں کی پرستش کرتے تھے اور ان بتوں کے نام ان بزرگوں کے نام پر رکھتے تھے اور بتوں کی تعظیم و تکریم کو بزرگوں کی تعظیم و تکریم شمار کرتے تھے۔

سورہ نوح میں ہے: لَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا وَّلَا يَغُوثَ وَيَعُوقَ وَنَسْرًا (النوح ۲۳)

(اپنے معبودوں کو بالخصوص ود، سواع، یغوث و یعوق اور نسر کو مت چھوڑو)

اس آیت کی شرح میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور بعض دیگر بزرگان سلف فرماتے ہیں کہ ود، سواع وغیرہ نیک لوگوں کے نام ہیں جو قوم نوح میں ہو گزرے ہیں۔ جب ان بزرگوں میں سے کوئی مر جاتا تو لوگ ان کی قبروں پر اعتکاف کرتے اور ان سے حاجتیں طلب کرتے۔ آہستہ آہستہ ان کے معتقدوں نے ان کے مجسمے اور بت بنا لئے اور پرستش شروع کر دی۔ [1]

(۱) تخریج اثر ابن عباسؓ۔ دیکھیں، بغوی کی معالم التنزیل (۵/ ۴۰۹) اور الدر المنثور (۸/ ۲۹۲-۲۹۵)

چنانچہ اللہ تعالیٰ سورہ نوح میں ان بتوں کے متعلق فرماتا ہے:

قَالَ نُوحٌ رَّبِّ اِنَّهُمْ عَصَوْنِيْ وَاتَّبَعُوْا مَنْ لَّمْ يَزِدْهُ مَالُهٗ وَوَلَدُهٗٓ اِلَّا خَسَارًا وَمَكَرُوْا مَكْرًا كُبَّارًا وَقَالُوْا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا وَّلَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا وَقَدْ اَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا ضَلٰلًا (النوح:۲۱:۲۴)

حضرت نوح نے کہا کہ اے میرے رب! انھوں نے میری نافرمانی کی اور اس کی پیروی کی جس کے لئے اس کے مال اور اولاد نے نقصان ہی بڑھایا۔ اور انھوں نے بڑے بھاری حیلے کیے اور کہا اپنے معبودوں کو نہ چھوڑو اور ودّ کو نہ چھوڑو اور نہ سواع کو اور نہ یغوث اور یعوق اور نسر کو، اور انھوں نے بہتوں کو گمراہ کیا اور تو ظالموں کی ہلاکت ہی بڑھائیو۔

غرض جب یہ بات معلوم ہوگئی کہ قبر پرستی، تصویر پرستی اور قبور وتصاویر کی حد سے زیادہ تعظیم کرنا شرک کی بنیاد ہے تو ان سب بے اصل گمراہیوں، بدعتوں اور پرستشوں سے بے حد بچنا چاہیے اور ان باتوں کی طرف مطلق توجہ نہیں کرنی چاہیے جو قبر پرستی کی اشاعت کے لئے بمنزلہ تمہید کے ہوتی ہیں اور نہ ہی بزرگوں کے متعلق خوابیں اور مکاشفات جو عوام میں ہندی قبر پرستوں کی طرف سے پھیلائی جاتی ہیں۔ یہ سب خدائے ذوالجلال کے کلام کے صریح مخالف ہوتی ہیں۔

صحت کا معیار

یادر ہے کہ امور دینیہ کی بنیاد تین چیزوں پر ہے! (۱) واضح احکام جو کہ قرآن (کلام خدا) ہیں (۲) احادیث صحیحہ جو کہ حقانی کلام ہیں اور (۳) اجماع صحابہ رضی اللہ عنہم جو بات ان تینوں یا تینوں میں سے کسی ایک کے خلاف ہوگی اسے مردود سمجھنا چاہیے اور اس پر کبھی عمل نہ کرنا چاہیے جب معلوم ہوگیا کہ ان تینوں اصولوں کے برخلاف بات رد کرنے کے قابل ہے تو قبر پرستی کی بیماری کی اصل بھی ان تینوں میں تلاش کرنی چاہیے۔ اگر ممانعت ثابت ہو جائے تو چھوڑ دیں،

---

(۱) آیت محکم۔ وہ آیت ہے، جس میں اللہ نے کوئی شرعی حکم دیا ہے اور حلال وحرام بتایا ہے جس کے الفاظ کے معانی ہر لغت وشریعت سے سمجھ سکتے ہیں۔

کیونکہ جان لینے کے بعد گمراہی کا راستہ اختیار کرنا بدترین بدنیتی اور کھلی لعنت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهُ هَوَاهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهِ وَقَلْبِهِ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهِ غِشَاوَةً فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْ بَعْدِ اللّٰهِ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ. (۴۵:۲۳)

(سو کیا آپ نے اس شخص کی حالت بھی دیکھی جس نے اپنا خدا اپنی خواہش نفسانی کو بنا رکھا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس شخص کو علم کے باوجود گمراہ کر دیا ہے۔ اس کے دل اور کانوں پر مہر لگا دی ہے اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے۔ پس ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ کے گمراہ کر دینے کے بعد کون ہدایت کرے۔ کیا تم عبرت نہیں پکڑتے۔

اندھی محبت کا فتنہ

تاریخ و تفسیر (۱) کی معتبر کتابوں میں مذکور ہے کہ انبیا علیہم السلام کے تشریف لے جانے کے بعد جس چیز نے بنی اسرائیل کو برباد کیا وہ اندھی محبت کا فتنہ تھا۔ یہود نے اپنے احبار کو، جو ان کے علما اور ارشاد و ہدایت کے منصب دار تھے، اپنا رب اور حاجت روا بنا لیا اور نصاریٰ نے اپنے مشائخ کو، جو زاہد تھے، اور عیسیٰ علیہ السلام جو نبی تھے، یہودیوں کی مانند ارباباً من دون اللہ مقرر کر لیا۔ چنانچہ ہر مصیبت اور مہم میں یہود اپنے احبار کی طرف اور نصاریٰ اپنے مشائخ اور درویشوں کی طرف رجوع کرتے اور جو کچھ وہ ان کو حکم دیتے وہی بجالاتے اور کبھی غور نہ کرتے کہ احبار ورہبان کا فرمان احکام الٰہی کے موافق بھی ہے یا نہیں، حالانکہ ان کے پیغمبروں نے خدائے تعالیٰ کی طرف سے ان کو معبود واحد کی عبادت کا پیغام پہنچا دیا تھا۔

اللہ تعالیٰ کے سوا غیر کو رب بنا لینے کی تشریح

بنی اسرائیل کی عادات میں ذکر آتا ہے کہ وہ اپنے بزرگوں کو سجدہ بھی کیا کرتے تھے، اس لئے اللہ نے ان کے ایسے افعال کو شرک سے تعبیر فرمایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ

(۱) دیکھیں علامہ سیوطیؒ کی تفسیر الدر المنثور (۱۶۴-۱۷۲/۴)

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (التوبہ:۳۱)

ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر اپنے علما اور مشائخ کو اپنا پروردگار بنالیا اور مریم کے بیٹے مسیح کو بھی، حالانکہ انہیں جو کچھ حکم دیا گیا تھا وہ اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ ایک خدا کی بندگی کرو کوئی معبود نہیں ہے مگر وہی پاک ہے وہ اس شرک سے جو یہ اس کی ذات میں ٹھہرا رہے ہیں۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان کے افعال کو شرک سے تعبیر فرمایا ہے۔پس معلوم ہوا کہ جو کوئی مذکورہ کام کرے گا اسے مشرک کہنا بھی درست ہے۔یہی حال ان لوگوں کا ہے جو اس زمانے میں کہتے ہیں کہ پیر صاحب کے ہر حکم کی اطاعت فرض ہے،خواہ وہ حکم شریعت کے مخالف ہی ہو اور اس کی تائید میں حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کے مجازی شعر کو حقیقت مان کر بطور سند پیش کرتے ہیں۔

بے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود زراہ و رسم منزل ہا

جائے نماز کو اگر پیر کہے تو شراب سے رنگین کردو، کیونکہ سالک ان منزلوں کے راستوں اور رسوم سے بے خبر نہیں ہوتا۔

تو حقیقت میں یہ لوگ بھی بنی اسرائیل کے مشرکوں کی طرح شرک کی وادی میں بھٹک رہے ہیں۔حق تعالیٰ انہیں توبہ کی توفیق عطا فرمائے اور ہمیں بھی توبہ اور استقامت نصیب کرے۔آمین۔

بنی اسرائیل پر کیوں لعنت ہوئی

یہود و نصاریٰ کی یہ عادت تھی کہ نبیوں اور بزرگوں کی قبروں کو عبادت گاہ کی طرح سمجھتے تھے اور بزرگوں کے قبرستان میں مساجد بنانا اور عبادت کرنا بہ نسبت کسی دوسری جگہ کے افضل جانتے تھے۔مقابر پر روشنی کرتے،ان کا طواف کرتے،ان کو سجدہ کرتے،ان کو مزین اور آراستہ رکھتے، ان پر خوشبوئیں جلاتے اور ان میں نماز پڑھنا ضروریات دین میں سے سمجھتے تھے۔ان ہی کے متعلق سرور عالم حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے:

لَعَنَ اللّٰهُ الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارٰی اِتَّخَذُوْا قُبُوْرَ اَنْبِيَآءِ هِمْ مَسَاجِدَ

اللہ تعالیٰ نے یہود و نصاریٰ پر لعنت کی کہ انھوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا(۱)

یہ حدیث صحاح اور مصابیح میں موجود ہے اور صاحب مجالس الابرار نے بھی اس حدیث کو اس گروہ کے رد میں تحریر فرمایا ہے اور لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہود و نصاریٰ پر اس لئے لعنت فرمائی کہ وہ انبیا کرام کی قبروں پر نماز پڑھتے تھے اور یہ خیال کرتے تھے کہ قبروں میں یا قبروں کی طرف سجدہ کرنا دفن شدگان کی تعظیم کے لئے ہے، حالانکہ یہ شرک جلی ہے۔ نیز وہ لکھتے ہیں کہ بزرگان دین کی قبروں میں نماز پڑھنے سے مقصود اگر یہ ہو کہ نماز کی حالت میں بزرگوں کا قرب حاصل کرنے کے لئے ان کی قبروں کی طرف متوجہ ہونا دو طرح کی عبادت ہے۔ ایک پرستش الٰہی دوسرے تعظیم بزرگان تو یہ شرک خفی ہے۔ قوم نوح علیہ السلام میں سجدۂ تعظیم ہی سے صنم پرستی شروع ہوئی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت اس بارے میں اوپر گزر چکی ہے جو ود، سواع، یغوث و یعوق کے متعلق ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی فرمایا۔ صحاح میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

لَا تَتَّخِذُوْا قَبْرِیْ وَثَنًا

میری قبر کو بت مت بنانا (۲)

اور جناب الٰہی میں بھی دعا فرماتے تھے۔

اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلْ قَبْرِیْ وَثَنًا يُّعْبَدُ

---

(۱) اسے امام بخاریؒ نے اپنی صحیح (الفتح ۳/۲۰۰ حدیث ۱۳۳۰) اور امام مسلم نے اپنی صحیح (۱/۳۷٦ حدیث ۵۲۹) میں حضرت عائشہؓ سے روایت کیا ہے۔ محمد ابو اللیثؒ اور بروایت عائشہ متفق علیہ (بحوالہ مشکوٰۃ باب المساجد و مواضع الصلوٰۃ) تخریج احکام الجنائز/ص ۲۱٦

(۲) مصنف ابن ابی شیبہؒ (۲/۳۷۰) کتاب الصلوٰۃ

یاالٰہی میری قبر کو بت نہ بنانا کہ اس کی پرستش ہونے لگے۔ (۳)

اس سے واضح ہوگیا کہ وثن کا لفظ صنم سے زیادہ عام ہے کہ علما نے وثن کا اطلاق قبر اور مورت دونوں پر کیا ہے، تو اس سے یہ معلوم ہوا کہ جس قبر کی پرستش کی جاوے وہ بھی وثن کے حکم میں داخل ہے اور اللہ نے وثن کی پوجا سے منع فرمایا ہے۔ ارشاد ہے:

فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ (الحج:۳۰)

اوثان کی پلیدی سے بچو۔

حضرت ابوبکر بن شیبہ رحمۃ اللہ علیہ جو کہ محدثین سلف میں سے ہیں، اپنی تصنیف میں ایک واقعہ لکھتے ہیں کہ ایک شخص مدینہ منورہ میں گنبد خضرا کے پاس کھڑا ہو کر کچھ کہہ رہا تھا۔ حضرت امام زین العابدین بن حسین رضی اللہ عنہ نے اسے دیکھ کر منع کیا اور فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ:

لَا تَتَّخِذُوْا قَبْرِیْ وَثَنًا

میری قبر کو بت نہ بنانا

حضرت علی بن حسین رضی اللہ عنہ کے اس قول سے یہ بات یقینی اور واضح طور پر ثابت ہوتی ہے کہ قبروں کے سامنے ان باتوں میں سے کوئی بھی نہ کی جائے جو بت پرست اپنے بتوں کے سامنے کرتے ہیں کیونکہ قبروں کے سامنے ایسی حرکات کرنے کے بعد وہ قبریں اوثان کی حد میں داخل ہو جاتی ہیں اور اس سے بچنا ضروری ہے۔ خواجہ بہاء الدین نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ جن کا طریقہ سراسر سنت کے مطابق ہے فرماتے ہیں:

تو تا کے گور مرداں را پرستی
بگرد و کار مرداں کن درستی

تو کب تک مردوں کی قبروں کو پوجے گا۔ لوٹ آ اور خود لوگوں کے کام بنا۔

---

(۱) اسے ابو ہریرہؓ سے امام احمدؒ نے مسند میں (۲/۲۴۶)
وابو یعلیؒ (۶/۱۳۵ رقم ۶۶۵۱) صحیح سند سے روایت کیا ہے موطا امام مالک اور حضرت ابن ابی شیبہؒ (۲/۳۷۵)
زید بن اسلم سے مرفوعاً ہے لفظ اَللّٰھُمَّ لَا تَجْعَلْ قَبْرِیْ وَثَنًا یُعْبَدُ یُصَلِّیْ اِلَیْهِ

آثار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تو عادت تھی کہ جس کام سے انہیں شرک خفی کی بھی بو آتی اس سے نہایت کوشش کے ساتھ پرہیز فرمایا کرتے۔ پھر قبر پرستی جیسے باطل فعل کی تائید میں کوئی قول یا فعل ان سے کیسے مروی ہو سکتا ہے؟ اس کے برعکس ان کا ہر قول و فعل قبر پرستوں کے ہر خیال کی پرزور تردید کر رہا ہے۔

پہلا واقعہ

امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں ایک دفعہ سخت خشک سالی کا سامنا ہوا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ صحابہ کرامؓ کی ایک بڑی جماعت کے ساتھ دعا استسقا کے لئے مدینہ منورہ سے باہر گئے اور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو وسیلہ بنا کر دعا کی۔

اَللّٰهُمَّ اِنَّا كُنَّا نَتَوَسَّلُ بِنَبِيِّكَ وَنَحْنُ الْاٰنَ نَتَوَسَّلُ بِعَمِّ نَبِيِّكَ

اے اللہ ہم اپنی دعاؤں میں تیرے نبی کو وسیلہ بنایا کرتے تھے۔ اب ہم تیرے نبی کے چچا کو وسیلہ بناتے ہیں۔ (۱)

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے اس قول سے ثابت ہوا کہ آپ نے غائب اور گزشتہ کو وسیلہ بنانا جائز نہیں ٹھہرایا، ورنہ روز روشن کی طرح ظاہر ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حضرت عباس رضی اللہ عنہ افضل نہ تھے۔ یہ کیوں نہ کہہ دیا کہ پہلے ہم تیرے پیغمبر کو وسیلہ قرار دیا کرتے تھے اور اب ہم پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روح کو وسیلہ پکڑتے ہیں؟

دوسرا اہم واقعہ

مکہ معظمہ کی راہ میں ایک کیکر کا درخت تھا۔ اس درخت کے نیچے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے جہاد پر بیعت لی جو بیعت رضوان کے نام سے مشہور ہے۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے جب دیکھا کہ لوگ اس درخت کے پاس اہتمام سے جاتے اور اس کے نیچے نوافل پڑھتے ہیں تو آپؓ نے اس درخت کو جڑ سے اکھڑوا دیا تا کہ فتنہ بند ہو

(استسقاء ۳ فضائل صحابہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم بخاری سوال الناس الامام الاستسقاء (۲/۳۹۴)

اور شرک نہ پھیلے۔(۱)

تیسرا واقعہ

مکہ مکرمہ کے اسی راستے میں ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فجر کی نماز کے بعد لوگوں کو ایسی جگہ نوافل پڑھنے کی کوشش کرتے دیکھا جہاں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اتفاقاً ایک بار سفر کی حالت میں نماز پڑھی تھی، فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو اس سے بھی روکا اور فرمایا:

اِنَّمَا هَلَکَ مَنْ کَانَ قَبْلَکُمْ بِمِثْلِ ذٰلِکَ کَانُوْا یَتَّبِعُوْنَ اٰثَارَ الْاَنْبِیَآءِ

تم سے پہلی قومیں اسی وجہ سے ہلاک ہوگئیں کہ تمہارے اس فعل کی طرح انبیا کے نشانات کی پیروی کرتی تھیں۔(۲)

یعنی جس جگہ لوگ پیغمبروں کے نشانات دیکھتے تھے اسے متبرک ومقدس سمجھنے لگتے تھے۔

منقوشہ پتھر بالکل جھوٹے ہیں

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے اس قول سے ثابت ہوگیا کہ جو لوگ آج کل منقوشہ قدم اور پتھر کے گھڑے ہوئے پنجے کسی مقام پر گاڑ دیتے پھر انہیں زیارت اور نذر و نیاز کا محل قرار دیتے اور کہتے ہیں کہ یہ فلاں بزرگ کا ہاتھ اور فلاں بزرگ کا پاؤں ہے(۳)۔ ان کا یہ فعل پیغمبروں کی سنت اور صالحین کے طریقہ کے سخت خلاف ہے بھلا جس صورت میں ان کی محض زیارت و تعظیم ہی سنت کی شدید ترین خلاف ہو تو ان سے دعا والتجا کرنا یا حاجت روائی چاہنا یہ کس درجہ کی گناہ گاری ہوگی؟ حاشا یہ ایک ایسا ناپاک عمل ہے جو فلاح اخروی کے قطعاً منافی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

---

(۱) اسے ابن ابی شیبہؒ نے مصنف (۲/۳۷۵) میں روایت کیا ہے، لیکن اسے نافعؒ نے براہ راست حضرت عمرؓ سے روایت کیا ہے، جبکہ ایک دوسرے کی لقا ثابت نہیں ہے، غالب گمان ہے کہ ان دونوں کے مابین حضرت عبداللہ بن عمرؓ ہیں د/ الخیر آبادی (درمنثور ۷/۵۲۲)

(۲) اسے بھی ابن ابی شیبہؒ نے مصنف میں (۲/۳۷٦) روایت کیا ہے اور اس کی سند علی شرط الشیخین صحیح ہے۔ د/ الخیر آبادی

(۳) دہلی کی جامع مسجد میں ایسا نقش کیا ہوا پتھر رکھا ہوا ہے جس کی یہ کہہ کر زیارت کروائی جاتی ہے کہ یہ قدم رسول کا نقش ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (المائدہ ۹۰)

مسلمانو! بلاشبہ شراب، جوا، بت، معبودان باطلہ کے نشان اور پانسے ناپاک شیطانی عمل ہیں، ان سے بچو تا کہ تمہیں فلاح حاصل ہو۔

نصب کی تشریح

مفسرین کرام انصاب کی شرح میں لکھتے ہیں

اَلْاَنْصَابُ جَمْعُ نُصُبٍ بِضَمَّتَيْنِ اَوْ جَمْعُ نَصْبٍ بِفَتْحِ النُّوْنِ وَسُكُوْنِ الصَّادِ وَهُوَ كُلُّ مَا نُصِبَ وَعُبِدَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ تَعَالٰى مِنْ شَجَرٍ اَوْ حَجَرٍ اَوْ قَبْرٍ اَوْ غَيْرِ ذٰلِكَ

انصاب، نصب کی جمع ہے، خواہ نون اور صاد دونوں مضموم ہوں یا نون مفتوح اور صاد ساکن اور نصب (اللہ تعالیٰ کے سوا) ہر وہ چیز ہے جس کو زمین میں گاڑ کر پوجا جائے خواہ وہ درخت ہو یا پتھر اور قبر وغیرہ

اس آیہ کریمہ کو اسی تفسیر اور انصاب کی اسی تشریح کے ساتھ صاحب مجالس الابرار اپنی کتاب میں قبور پر نماز پڑھنے، ان سے استمداد و استعانت چاہنے اور ان پر چراغاں کرنے کی ممانعت کے بیان میں لائے ہیں۔ لکھتے ہیں:

وَالْوَاجِبُ هَدْمُ ذٰلِكَ كُلِّهٖ وَمَحْوُ اَثَرِهٖ كَمَا اَنَّ عُمَرَ بَلَغَهٗ اَنَّ النَّاسَ يَتَنَابُوْنَ الشَّجَرَةَ الَّتِيْ بُوْيِعَ تَحْتَهَا بِالنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ اَرْسَلَ اِلَيْهَا فَقَطَعَهَا

ایسی تمام باطل چیزوں کا ڈھا دینا اور نشان تک مٹا دینا واجب ہے کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جب معلوم ہوا کہ لوگ قصداً اس درخت کے پاس جاتے ہیں جس کے نیچے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دست مبارک پر (جہاد کیلئے) بیعت کی تھی تو آپ نے ایک شخص کو کہہ کر اس درخت کو جڑ سے اکھڑوا دیا۔

حضرت عمر کا یہ فعل تخریج کے ساتھ پیچھے گزر چکا ہے۔

یہ روایت تمام ایسی چیزوں کو مٹا دینے کے عین موافق ہے جن کے معبود بن جانے کا اندیشہ ہو۔

مصنف مذکور اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ سلوک اس درخت کے ساتھ کیا جس کے نیچے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے (جہاد پر) بیعت لی تھی اور جس درخت کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں فرمایا ہے۔

لَقَدْ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَکَ تَحْتَ الشَّجَرَۃِ

بے شک اللہ تعالیٰ ان مومنین سے راضی ہو گیا، جب یہ لوگ تیرے ہاتھ پر اس درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے۔

تو اس درخت کے علاوہ اور ایسی چیزوں کے ساتھ کس قسم کا سلوک کرنا لازم ہو گا جو انصاب میں داخل ہیں اور جن کے سبب سے (عالم اسلام میں) ایک فتنہ عظیم برپا ہے۔ اور ایک سخت مصیبت پیش آ چکی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسجد ضرار کو گرا دیا

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے اس عمل سے بڑھ کر سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مسجد ضرار کو گرا دینا ہے، جو دلیل ہے کہ اس امر کی کہ تمام ایسی عمارتوں کو گرا دینا چاہئے جو فتنہ وفساد کے لحاظ سے مسجد ضرار کا برابر یا بڑھ کر ہوں، جیسے قبرستان کی مسجدیں وغیرہ اسلام کا حکم ایسی عمارتوں کے متعلق یہی ہے کہ ان کو گرا کر سطح زمین کے برابر کر دیا جائے۔ ایسے ہی قبر کے گنبد کا گرا دینا واجب ہے جو قبروں پر بنائے گئے ہوں کیونکہ ان کی بنیاد ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کی مخالفت اور نافرمانی پر ہے، اور ظاہر ہے کہ جس عمارت کی بنیاد ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کی مخالفت پر ہو اس کا ڈھا دینا مسجد ضرار کے ڈھا دینے سے کس قدر اولیٰ وانسب ہو گا۔ نیز ایسی عمارت کے گرا دینے کے وجوب کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے قبروں پر مسجدیں بناتے ہیں (۱) غرض ہر ایسی چیز کے گرا دینے میں جلدی کرنا واجب ہے جس

(۱) دیکھو حدیث ابو ہریرہؓ مسند احمد (۲/۲۹۲/۴۷۴)

کا بنانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منع فرمایا ہے اور جس کا بنانے والا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نزدیک ملعون ہے۔

قبر سے چراغ اور قندیل کا اٹھا دینا

اسی طرح قندیلوں اور چراغوں کا اٹھا دینا بھی واجب ہے جو قبروں پر روشن کئے جائیں اس لئے کہ قبروں پر چراغ جلانے والوں پر بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لعنت فرمائی ہے اور جس فعل پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لعنت فرمائی اس کا ارتکاب کبیرہ گناہ ہوتا ہے۔(۱)

ایسی نذر معصیت ہے

ایسے ہی موقع کے متعلق علما نے کہا ہے کہ قبروں کے لئے چراغ اور روغن وغیرہ کی نذر ماننا ناجائز ہے۔ اس لئے کہ یہ معصیت ہے اس کا پورا کرنا جائز نہیں اور اگر کوئی شخص ایسی نذر مان کر اسے پورا بھی کر دے تو اس پر کفارہ قسم کی مانند کفارہ دینا لازم آتا ہے پھر یہ بھی جائز نہیں کہ تیل وغیرہ کی قسم کی کوئی چیز قبروں کے لئے وقف کی جائے کیونکہ ایسا وقف صحیح وقف نہیں ہے اور اس کا قائم و نافذ ہونا بھی حلال۔

چوتھا واقعہ

معلوم ہوا کہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ وہ ہیں جن کے حق میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا۔

لَوْ كَانَ بَعْدِيْ نَبِيٌّ لَكَانَ عُمَرُ

اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ عمر (رضی اللہ عنہ) ہوتے۔(۲)

وہ فتنہ قبر پرستی وغیرہ جو گزشتہ اقوام اور ہماری قوم میں شرک کا سرچشمہ بن رہا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے قول اور عمل سے اس طرح ملیامیٹ کر دیا کہ موحد مسلمان کے ذہن میں اس کا کوئی تصور بھی باقی نہ رہ گیا جس میں مبتلا ہونے کا خوف ہوسکتا۔

---

(۱) لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم زائرات القبور والمتخذين عليها المساجد والسرج ، رواه ابن عباس اخرجه ابوداؤد والجنائز ۷۸) والترمذی (الصلوٰۃ ۱۲۱) والنسائي (جنائز ۱۰۴) هم (۱/۲۲۹،۲۸۷،۳۲۴،۳۳۸) والحاكم (۱/۳۷۴)

(۲) اخرجه احمد (۴/۱۵۴) والترمذی (۵/۶۱۹) والحاكم (۳/۸۵) وهو حسن

صحیحین میں عابس بن ربیعہ رضی اللہ عنہ سے جو بعض کی رائے میں صحابی اور بعض کے نزدیک تابعی ہیں۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے متعلق علاوہ ان امور کے جن کا ذکر ہو چکا ہے اور جو تیز تلوار کی طرح اس شہر کا قلع وقمع کرتے ہیں، ایک روایت میں درج ہے۔

قَالَ رَأَيْتُ عُمَرَ يُقَبِّلُ الْحَجَرَ وَيَقُوْلُ لَاَعْلَمُ اَنَّکَ حَجَرٌ لَاتَنْفَعُ وَلَا تَضُرُّ وَلَوْلَا اِنِّیْ رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّمَ يُقَبِّلُکَ مَا قَبَّلْتُکَ

عابس بن ربیعہؓ نے کہا میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ حجر اسود کو بوسہ دیتے ہوئے فرما رہے تھے۔ میں خوب جانتا ہوں کہ تو ایک پتھر ہے جو نہ نفع پہنچا سکتا ہے نہ نقصان اگر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تجھے بوسہ دیتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا تو میں تجھے کبھی نہ چومتا۔(۱)

پس حجر اسود کا یہ حال ہے کہ جو خدا نے بہشت سے اتارا اور بیت اللہ شریف کے کونہ میں نصب کیا گیا تو دوسرے پتھروں، درختوں اور مقبروں کی کیا حقیقت ہے جو شرف ومرتبت میں اس کے سامنے حقیر و بے حقیقت ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے یہ الفاظ جو تمام تر ہدایت میں، یہ بات ظاہر کرتے ہیں کہ حجر اسود کے چھونے یا چومنے کی دلیل لینا قیاس مع الفارق ہے اور عقل اسے ٹھکراتی ہے اور حجر اسود کا چھونا یا چومنا محض سنت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اتباع کی خاطر جاری کیا گیا ہے۔

آپؓ کے اس ارشاد میں ایک اور بھی اشارہ ہے کہ اگر کوئی شخص حجر اسود میں نفع ونقصان پہنچانے کی طاقت تسلیم کرے اور اس وجہ سے خوف یا طمع دل میں رکھ کر اس کی تعظیم کرے یا اس کو بوسہ دے تو یہ شرک ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے حکم اور ارادہ کے بغیر کوئی چیز نفع یا نقصان نہیں پہنچا سکتی۔

صحیحین میں ہے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ:

لَمْ اَرَ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّمَ يَسْتَلِمُ مِنَ الْبَيْتِ اِلَّا الرُّكْنَيْنِ الْيَمَانِيَيْنِ. (۱)

---

(۱) ح۔ حج ۹(۵) ۳۴۲،۷(۸) م حجر ۲۴۷۔ ت حج ۳۵

میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دو رکن یعنی رکن یمانی اور حجر اسود کے سوا کعبہ کی کسی اور چیز کو بوسہ دیتے نہیں دیکھا۔

اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رکن یمانی کو چوما جمہور کا بھی یہی خیال ہے۔ رکن شامی کے چومنے میں البتہ کلام ہے، لیکن اس پر بھی شیخ عبدالحق رحمتہ اللہ علیہ محدث دہلوی مشکوۃ شریف کے ترجمہ میں فرماتے ہیں کہ صرف حجر اسود کو چومنا چاہئے اور رکن یمانی کو چھونا ہی کافی ہے۔

محمد بن اسماعیل بخاری رحمتہ اللہ علیہ اپنی صحیح میں زبیر بن عربی تابعیؒ سے ایک روایت لائے ہیں کہ ایک شخص نے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالی عنہما سے حجر اسود کو چومنے کے متعلق سوال کیا تو ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ يَسْتَسْلِمُهُ وَيُقَبِّلُهُ

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اسے چھوتے اور چومتے دیکھا ہے۔(۱)

اس سے معلوم ہوا کہ قرون اولی میں مسلمان شرک خفی سے بھی اس قدر ڈرتے اور عقیدہ توحید پر قائم رہنے کے لئے اس قدر اہتمام کیا کرتے تھے کہ حجر اسود کو چومنے سے پہلے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور علما سے دریافت کرلیا کرتے تھے اور جب انہیں ایسا کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت سے ثابت ہو جاتا تو اسے چومتے تھے۔(۲)

مگر افسوس آج کل مسلمان بالکل بے باک ہو کر صراط مستقیم چھوڑ کر اور ٹیڑھی راہ اختیار کرتے ہوئے نہیں گھبراتے۔ وہ جس پتھر اور مقام کی نسبت سن پاتے ہیں کہ فلاں بزرگ کی یادگار ہے اسی پر جھک جاتے اور دور دراز مقامات سے اس کی زیارت کے لئے اور حاجت روائی کی خاطر اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ پھر اس پر شیرینی، پھول اور خوشبوئیں چڑھا کر اس شخص کا قرب ڈھونڈتے ہیں جس کی طرف اس چیز کی نسبت ہو اس طرح تسبیح کو خاک شفا اور صحت بخش جانتے

---

(۱) ح۔ جز ۶۔ ن مناسک ۱۰۰ حم ۲/۱۵۱

(۲) جیسا کہ حضرت عمر سے منقول ہے کہ انھوں نے حجر اسود کو بوسہ دیتے ہوئے کہا کہ مجھے معلوم ہے کہ تو ایک پتھر ہے نہ نفع پہنچا سکتا ہے نہ نقصان۔ اگر میں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تجھے بوسہ لیتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا تو میں تجھ کو بوسہ نہ دیتا۔

ہیں اور پیر کے عصا کو پیر کا قائم مقام سمجھتے ہیں۔

عصائے موسیٰ علیہ السلام

یہ بات مشہور و معروف ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے عصا کی کبھی تعظیم نہیں کی، نہ لوگوں کو اس کی زیارت کا حکم دیا، حالانکہ یہ عصا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حضرت شعیب علیہ السلام کی معرفت ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام سے ملا تھا، قرآن مجید میں مذکور ہے کہ آپ نے اس عصا کے متعلق صرف اسی قدر فرمایا۔

هِيَ عَصَايَ اَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا وَاَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِيْ وَلِيَ فِيْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰى

یہ میری لاٹھی ہے اس کا سہارا لیتا ہوں اسی سے اپنی بکریوں کے لئے درختوں کے پتے جھاڑ لیتا ہوں اور میرے لئے اس میں اور بھی طرح طرح کے کام ہیں۔

بدعتیوں کا اپنے پیروں کو شہرت دینے کا طریقہ

پھر کوئی تو کہتا ہے کہ صاحب مجھے فلاں بزرگ کی گدڑی سے وہ فیض ملا ہے جو زندہ بزرگوں سے ہرگز نہیں مل سکتا۔ اور کوئی کہتا ہے اجی! فلاں پیر کا جبہ پہنتے ہوئے جو کیفیت مجھ پر طاری ہوتی ہے وہ کسی دوسرے وقت دیکھنے میں نہیں آتی۔

پھر ان مریدوں میں سے اکثر تو ان اشیا کو عطر اور خوشبوئیں لگا کر ہمیشہ سنبھالے رکھتے ہیں بعض کبھی کبھی تبرک جان کر ان چیزوں کو استعمال بھی کر لیتے ہیں اور بعض جو ہوشیار مرید ہوتے ہیں سال میں ایک دن ان کی زیارت کے لئے مقرر کرتے ہیں۔ اور اسی روز ان چیزوں کی طرف تکلف سے متوجہ ہو کر بیٹھتے ہیں اور اس ساری تعظیم و تکریم کو منسوب الیہ بزرگ کی خوشنودی و رضامندی کا باعث یقین کرتے ہیں۔

تنبیہ

مخفی نہ رہے کہ اشیاء بزرگان کی تعظیم و تکریم فوراً ہی کفر و شرک کا موجب نہیں بن جایا کرتی۔ یہ مرض آہستہ آہستہ ترقی کرتا ہے۔ اور جب حد سے بڑھ جاتا ہے تو طبیعت میں شرک کے ساتھ منافقت بھی پیدا کر دیتا ہے جس کا اظہار اس وقت ہوتا ہے جب کوئی عالم ربانی ان کو ان کی تعظیم کرنے سے روکتا ہے۔ اس وقت یہ لوگ عذر اور حیلے پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ لوگ

معرفت سے نابلد اولیاء اللہ سے ناواقف اور ان کی کرامتوں کے منکر ہیں۔ یہود نے اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو حضرت عزیر علیہ السلام کا منکر کہا تھا، اور عیسائی اسی طرح مسلمانوں کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا منکر کہتے ہیں اور ان گمراہوں کے نزدیک حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور مسلمانوں کا قصور فقط اس قدر ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام، عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا نہیں مانتے تھے اور مسلمان کہتے تھے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا کے بندے تھے، بیٹے نہیں تھے۔

اصل بات یہ ہے کہ گمراہ لوگ قدرتی طور پر حق پرستوں کو بدنام کرنے کے خواہشمند ہوتے ہیں اس لئے ان کے خلاف لوگوں میں نفرت پیدا کرنے کے لئے مشہور کرتے ہیں کہ یہ گروہ فلاں بزرگ یا کرامت کا منکر ہے۔

چنانچہ مشرکین مکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے اصحاب رضی اللہ عنہم کو صابی یعنی بے دین کہتے تھے اور ملت ابراہیمی کے منکر شمار کرتے تھے، لیکن اہل بصیرت پر لازم ہے کہ فتنہ کے زمانہ میں محفوظ طریقہ اختیار کریں اور ایسی راہ نہ چلیں جس کا نتیجہ شرک و بدعت ہو۔ جیسا کہ انبیاء کرام علیہم السلام اور ان کے سچے متبعین کی سنت رہی ہے (چنانچہ اللہ تعالیٰ ایک مقام پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذکر میں فرماتا ہے)

وَكَيْفَ اَخَافُ مَآ اَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُوْنَ اَنَّكُمْ اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ مَالَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا فَاَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (الانعام:۸۱)

اور میں ان چیزوں سے کیوں کر ڈروں جن کو تو نے شریک بنایا ہے، جبکہ تم اس بات سے نہیں ڈرتے کہ تم نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان چیزوں کو شریک ٹھہرایا ہے جن پر اللہ تعالیٰ نے کوئی دلیل نازل نہیں فرمائی، سو ان دو جماعتوں میں سے بے خوفی واطمینانی کا زیادہ حق دار کون ہے؟ (بتاؤ) اگر تم علم رکھتے ہو۔

مقام ابراہیم علیہ السلام

وہ پتھر جس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کھڑے ہو کر کعبہ کی تعمیر کرتے تھے (اور بقول بعض) دیوار کے ساتھ ساتھ خود بخود بلند ہوتا گیا، اور تمام عمارت میں کسی دوسرے پتھر کی ضرورت ہی نہ

پڑی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دونوں قدموں کی انگلیوں کے نشان اس میں پڑ گئے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے اس طرح حدیث میں مذکور ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

الرُّكْنُ وَالْمَقَامُ يَاقُوْتَتَانِ مِنْ يَاقُوْتِ الْجَنَّةِ طَمَسَ اللّٰهُ نُوْرَهُمَا وَلَوْلَا ذٰلِكَ لَاَضَاءَ اَمَّا بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ.

رکن یمانی اور مقام ابراہیم جنت کے دو موتی ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کی چمک دمک بجھا دی ہے۔ اگر ایسا نہ کرتا تو مشرق و مغرب ان کے نور سے منور ہو جاتے۔(۱)

اس پتھر کا نام اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں مقام ابراہیمؑ رکھا ہے اور اس جگہ نماز پڑھنے کا حکم فرمایا ہے۔

وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهِيْمَ مُصَلًّى (البقرہ:۱۲۵)

(اور ہم نے حکم دیا) کہ ابراہیم علیہ السلام کے کھڑے ہونے کی جگہ ہمیشہ کے لئے نماز کی جگہ بنالی جائے۔

خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس پر نماز پڑھا کرتے تھے غرض اس پتھر کی بابت کہیں یہ مذکور نہیں کہ کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا صحابہ رضوان اللہ علیہم میں سے کسی ایک نے اس پر ہاتھ پھیرا یا اسے کسی وقت بوسہ دیا ہو۔ ہاں اس کے برعکس ان باتوں سے ان کا انکار کرنا ضرور مروی ہے۔ (ابن ابی شیبہ۴؍۶۱)

چنانچہ مصنف ابن ابی شیبہ، عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے ایک ایسے گروہ کو دیکھا جو مقام ابراہیمؑ کو چھو رہے تھے۔ آپؓ نے ان کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا:

''دیکھو! خدا نے تمہیں اس کو چھونے کا حکم نہیں دیا، اس کا حکم تو صرف اس قدر ہے کہ اس کے قریب نماز پڑھو''۔

---

(۱) اسے عبداللہ بن عمر بن خطابؓ نے نہیں بلکہ عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ نے روایت کیا ہے۔ یہ حدیث مسند احمد (۳۱۳/۲) اور سنن ترمذی (الحج، باب فضل الحجر الاسود۳/۲۲۶) اور صحیح ابن الخزیمہ (۲۱۹/۴) اور صحیح ابن حیان (الموارد۱۰۰۴) اور مستدرک حاکم (۴۵۶/۱) وسنن بیہقی (۷۵/۵) اور فاکہی کی اخبار کلمہ (۴۴۰/۱، ۹۶۰) میں ہے اور اس کی سند صحیح ہے۔ دارالخیر آبادی)

اسی طرح مجالس الابرار نے لکھا ہے کہ عربی میں اس کا ترجمہ لکھا جاتا ہے۔ محققین سلف نے اس پتھر پر ہاتھ پھیرنے سے بھی منع کر دیا جس پر خدا نے نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے اور ارزقی نے آیت وَ اتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهِيْمَ مُصَلًّى۔ کی تفسیر میں حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ لوگوں کو مقام ابراہیم علیہ السلام پر صرف نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے اس کو چھونے کا حکم نہیں دیا گیا۔ پھر لکھا ہے کہ علما اس بات پر متفق ہیں کہ حجر اسود کے سوا (کعبے کی) کسی چیز کا چھونا اور چومنا جائز نہیں بجز رکن یمانی کے کہ اس کو بھی چھونا صحیح ہے چومنا صحیح نہیں۔ (الدر، ۱/۲۹۲)

شیاطین کا ڈھنگ

لیکن شیاطین کا ڈھنگ ہی جیسا کہ ذکر ہو چکا، نرالا ہے۔ وہ ہر زمانہ اور مقام میں پہلے تو ایک بزرگ کی قبر کو تعظیم کے لئے چن لیتے ہیں پھر اس کو اللہ کے سوا عبادت اور بندگی کے لئے بت بنا ڈالتے ہیں اور اپنے ہم نشینوں میں اس امر کی اشاعت کرتے رہتے ہیں کہ جو شخص اس کی پوجا سے روکے یا اس پر اجتماع کرنے سے منع کرے وہ درحقیقت اس بزرگ کی بے عزتی کرنا چاہتا اور اس کے حق کو تلف کرنا چاہتا ہے پس (اس پراپیگنڈہ کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ) وقت کے جاہل لوگ ان غیر اسلامی حرکات سے روکنے والوں کے قتل کی کوشش کرتے ہیں اور اس کو کافر قرار دیکر سزا کے درپے ہو جاتے ہیں، حالانکہ ان کا اس کے سوا اور کوئی جرم نہیں ہوتا کہ وہ اس بات کا حکم دیتے ہیں جس کا اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا اور ایسی بات سے روکتے ہیں جس سے اللہ اور اس کے رسولؐ نے روکا ہے پھر لکھا ہے کہ چند باتوں نے ان قبر پرستوں کو فتنہ میں ڈالا جن میں سے ایک نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مبعوث ہونے کی اس علت غائی سے جہالت و بے خبری ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حق کی تحقیق اور شرک کے اسباب کی بیخ کنی کے لئے بھیجا ہے، پس جن لوگوں کو علم کا حصہ بہت کم ملا ہوتا ہے جب ان کو شیاطین قبر پرستی کے فتنہ کی طرف بلاتے ہیں تو چونکہ ان کے پاس اس قدر علم نہیں ہوتا کہ ان کی دعوت کو رد کر سکیں اس لئے قبول کر لیتے ہیں اور جو کچھ جہالت و کم علمی ہوتی ہے وہ محفوظ رہتی ہے۔

جھوٹی حدیثیں

منجملہ ان دلائل کے جو یہ لوگ قبر پرستی کے حق میں پیش کرتے ہیں ایسے ایسے اقوال ہیں جو بت پرستوں کی طرح انھوں نے خود گھڑ لئے اور معتبر بنانے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف منسوب کر دیئے ہیں۔ مثلاً یہ جھوٹی حدیث کہ:

(۱) اِذَا تَحَيَّرْتُمْ فِي الْأُمُوْرِ فَاسْتَعِيْنُوْا بِاَهْلِ الْقُبُوْرِ. یا یہ حدیث وضعی کہ

(۲) اِذَآ اَعْيَاكُمُ الْأُمُوْرُ فَعَلَيْكُمْ بِاَصْحَابِ الْقُبُوْرِ. یہ جھوٹی حدیث کہ

(۳) لَوْحَسَّنَ اَحَدُكُمْ ظَنَّهٗ بَحَجَرٍ لَنَفَعَهٗ. (۴)

ایک بڑی غلط فہمی

یہ اور اس قسم کی اور بے شمار جھوٹی حدیثیں ہیں جو اصول دین کے خلاف ہیں۔ (جو ان قبور کے بتوں کی عبادت کرنے والوں سے جاہل اور گمراہ لوگوں میں مشہور ہوگئی ہیں)۔ جاہل اتنا نہیں سمجھتے کہ اللہ تعالیٰ نے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس لئے بھیجا تھا کہ پتھروں اور درختوں سے نفع ونقصان کا اعتقاد رکھنے والوں کو قتل کر دیں۔ پس حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہر ممکن طریقہ سے مسلمانوں کو قبروں کے ساتھ نفع ونقصان کا اعتقاد رکھنے سے ہمیشہ روکا ہے۔

اس طرح قبر پرستوں نے جو من گھڑت حکایتیں اپنی تائید کے لئے مشہور کر رکھی ہیں ان میں سے یہ بھی ہے کہ ایک شخص مصیبت میں مبتلا تھا۔ جب فلاں قبر والے سے مدد مانگی تو مصیبت سے نجات پائی، فلاں شخص پر آفت نازل ہوئی اُس فلاں جگہ پر پہنچ کر صاحب قبر سے دعا مانگی پس صاحب قبر نے اس کی تکلیف کو رفع کر دیا اور فلاں شخص نے اپنی حاجت برآری کے لئے دعا مانگی اس کی حاجت پوری ہوگئی۔ ان خادموں اور مجاوروں کے پاس ایسی ایسی باتیں ہیں جن کا ذکر طوالت کا باعث ہے۔

الغرض یہ لوگ خدا کی مخلوق میں سب سے زیادہ جھوٹے ہیں اس لئے مردہ اور زندہ دونوں کی طرف جھوٹ منسوب کرتے رہتے ہیں۔ انسانی طبیعت نفع کی طالب اور نقصان سے خائف

---

(۱) جب تمہیں کسی امر میں پریشانی آئے تو اہل قبور سے مدد طلب کرو۔

(۲) جب تم مشکلات میں پھنسو تو اہل قبور کا دامن پکڑنا لازم سمجھو۔

(۳) تم میں سے اگر کسی کا پتھر پر بھی اعتقاد ہو تو وہ اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

(۴) (کشف الخفاء، ۲/۱۵۳، ۲۰۸۷)

واقع ہوئی ہے اور انسان اپنی ضروریات کے حل کے لئے بے چین رہتا ہے۔ اور خصوصاً جب تکلیف پہنچتی ہے تو جلد از جلد اس سے نجات پانے کا ہر شخص خواہشمند ہوتا ہے اور ہر طریق سے خواہ برائی ہو علاج چاہتا ہے ہر مصیبت زدہ جب یہ سن لیتا ہے کہ فلاں قبر حاجت روائی میں تریاق کا حکم رکھتی ہے تو دوڑ کر اس کی طرف جاتا اور پوری توجہ، زاری، عاجزی اور مسکینی کے ساتھ دعا کرتا ہے اور خداوند کریم اس کے عجز کو دیکھ کر اس کی دعا سن لیتا اور حاجت پوری کر دیتا ہے، پھر یہ شخص یقین کر لیتا ہے کہ قبر میں دعا کے قبول کرنے کی تاثیر ہے۔ اتنا خیال نہیں کرتا کہ خداوند کریم تو ہر مضطرب کی دعا سن لیتا ہے۔ اور اس کی حاجب برآری کرتا ہے خواہ وہ کافر ہو۔ اگر یہ شخص اسی ذلت اور فروتنی سے دکان، بازار یا حمام میں بھی دعا کرتا تب بھی اللہ تعالیٰ اس کی حاجت پوری کرتا اس امر میں قبر کی تاثیر سمجھنا نادانی ہے جس کسی کی دعا قبول ہوتی ہے اس کے لئے خدا کی خوشنودی اور محبت ضروری نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ مومن، کافر اور فاجر سب کی دعا قبول کرتا ہے۔

يَسَّرَنَا اللّٰهُ تَعَالىٰ مِنَ الدُّعَآءِ وَالْعَمَلِ مَا يَكُوْنُ مُوَافِقًا لِرَضَائِهٖ وَبِلُطْفِهٖ وَكَرَمِهٖ اِنْتَهٰى

حدیث ابی الہیاج الاسدیؓ

صحیح مسلم ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے حضرت ابی الہیاج الاسدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا کہ:

اَلاَ اَبْعَثُكَ عَلٰى مَا بَعَثَنِي عَلَيْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّمَ اَلاَّ تَدَعَ تِمْثَالاً اِلاَّ طَمَسْتَهٗ وَلاَ قَبْرًا مُشْرِفًا اِلاَّ سَوَّيْتَهٗ.

کیا میں تمہیں اس کام پر نہ بھیجوں جس پر مجھے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھیجا یہ کہ کسی مورت کو مٹائے بغیر اور بلند قبر کو سطح زمین کے برابر کئے بغیر نہ چھوڑو۔(۱)

حضرت ابی الہیاج الاسدی رضی اللہ عنہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں:

نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يُّجَصَّصَ الْقُبُوْرُ وَاَنْ يُّكْتَبَ عَلَيْهَا وَاَنْ تُوْطَاءَ

---

(۱) م۔ جنائز۔ ۹۳۔ (جنائز۔ ۶۸) ت جنائز۔ ۹۹۔ حم ۹۶، ۱۲۹

منع فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قبروں کو پختہ بنانے سے اور ان پر لکھنے اور ان کے روندنے سے۔(۱)

شیخ عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ محدث دہلوی ترجمہ مشکوٰۃ میں یقعد کے نیچے لکھتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے منع فرمایا کہ قبر پر بیٹھا جائے کیونکہ قبر پر بیٹھنا مومن کی عزت کے منافی ہے اور بعض نے کہا کہ قبر پر بیٹھنے سے مراد قضائے حاجت کے لئے بیٹھنا ہے۔

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ کا اس حدیث کے متعلق خیال

حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ اغاثہ میں امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کرتے ہیں کہ جس سبب کی بنا پر شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے قبروں کو سجدہ گاہ بنانے سے منع فرمایا اور جس کے سبب سے خدا کی بے شمار مخلوق شرک جلی میں مبتلا ہوگئی وہ سب یہ ہے کہ جو شخص اپنی تمام قسم کی فلاح اور اصلاح قبر کے ساتھ وابستہ رکھتا ہے وہ اپنے اعتقاد واثر کے لحاظ سے اس شخص کی نسبت کہیں زیادہ قریب ہوتا ہے جو کسی درخت یا پتھر کو اپنی حاجت وتوقعات کا قبلہ وکعبہ سمجھتا ہے اور تو دیکھتا ہے کہ اکثر آدمی اس قدر اس کے قریب گڑگڑاتے، روتے اور خشوع وخضوع کرتے ہیں۔ خاص بیت اللہ شریف میں اور سحری کے وقت بھی ظاہر نہیں کرتے۔(۲) اس طرح قبروں پر نماز پڑھنے اور دعا مانگنے کے وقت وہ جس طرح برکت کے امیدوار ہوتے ہیں ویسے مساجد میں نماز پڑھنے اور دعا مانگنے کے وقت نہیں ہوتے پس اسی فساد عظیم کے مادے کو مٹانے کے لئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے لوگوں کو مقبرے میں نماز پڑھنے سے منع فرمایا خواہ نماز پڑھنے والے کے ذہن میں نماز پڑھنے کے وقت قبر کی کوٹھری کی برکت ملحوظ بھی نہ ہو۔(۳) جیسے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے طلوع، استواء اور غروب آفتاب کے وقتوں میں نماز پڑھنے سے منع فرمایا کیونکہ وہ مشرکوں کے آفتاب کی عبادت کے وقت ہیں۔ اسی سے سمجھ لو کہ جس وقت کوئی شخص قبر کے نزدیک حصول برکت کی نیت

(۱) مسلم (۳/۶۱) ابوداؤد (۳/۷۰) والنسائی (۱/۲۸۵) والترمذی (۲/۱۵۳) وہود (م۴۳) ومسند الطیاسی (۱/۱۶۸) واحمد

(۲) ابوسعید قال نہی صلی اللہ علیہ وسلم ان یبنی علی القبور ویقعد علیہا اور یصلی علیہا (ابن ماجہ ابویعلیٰ (۲/۶،۱۶-۱)

(۳) مسلم بروایت عقبہ بن عامرؓ بحوالہ مشکوٰۃ باب اوقات النہی

سے نماز پڑھتا ہے تو اس کا نماز پڑھنا درحقیقت قبر کی پرستش کرنا ہوتا ہے، پس یہ ارادہ صریح کفر ہے، اور خدا اور رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے فرمان کے خلاف ہے، اس میں سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اللہ نے ایسا کرنے کا حکم نہیں دیا۔

صاحب مجالس الابرار نے لکھا ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان اوقات میں نماز پڑھنے سے صرف اس لئے روکا کہ کہیں غیر اللہ کی عبادت کے لئے دلیل جواز نہ بن جائے تو قبروں سے مدد طلب کرنے کا کیا کہنا جو خود ہی شرک اور شرک جلی کا کھلم کھلا ذریعہ ہے، بہت لوگوں کو حاجتوں کے ہجوم نے برباد کیا کہ گھبرا کر اہل قبور سے حاجتیں مانگنے لگے اور کئی ایک کو اس اعتقاد نے ہلاک کر دیا کہ مسجدوں کی بہ نسبت انبیا کرام کی قبروں کے پاس نماز پڑھنا افضل ہے۔

اسلام اور قبر پرستی

حافظ ابن قیم رحمتہ اللہ علیہ اغاثہ میں فرماتے ہیں:

اگر کوئی شخص موجودہ مسلمانوں کے اقوال وافعال کا موازنہ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سنت اور آثار صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ساتھ کرے تو وہ ان کی کسی چیز کو بھی آثار وسنت کے موافق نہ پائے گا، کیونکہ دونوں کی آپس میں ضد اور عدم مطابقت ظاہر ہے۔ مثلاً

۱۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے قبور انبیا پر نماز پڑھنے سے منع فرمایا مگر آج مسلمان شوق سے پڑھتے ہیں۔(۱)

۲۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قبروں پر مسجدیں بنانے سے روکا مگر آج ان پر بڑی بڑی عمارتیں بنائی جاتی ہیں اور ان کا نام مشاہد و درگاہ رکھا جاتا ہے۔

۳۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے قبور پر چراغاں کرنے سے منع فرمایا مگر قبر پرست مسلمان قبروں پر قندیلیں اور شمعدان روشن کرتے اور اس کام کے لئے جائیدادیں وقف کر جاتے ہیں۔

۴۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے قبروں کو پختہ بنانے سے روکا، مگر یہ مسلمان ان پر شاندار گنبد بناتے ہیں۔(۲)

---

(۱) مسلم بروایت ابی مرثد غنوی لاتجلسوا علی القبور و لا تصلو علیھا بحوالہ مشکوۃ باب دفن المیت

(۲) عن ابی الزبیر عن جابرؓ (ابن ابی شیبہ ۳/ ۳۳۷)

۵۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قبر پر زائد مٹی ڈالنے سے منع فرمایا مگر یہ لوگ مٹی کی بجائے اینٹ، پتھر اور چونہ سے ان کو پختہ بناتے ہیں (۱)۔

۶۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قبروں پر عمارت بنانے اور قبروں پر کتبے لکھنے سے منع فرمایا، مگر یہ لوگ شاندار عمارتیں بنا کر آیات قرآنی قبروں پر لکھتے ہیں۔

۷۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا قبروں کو عیدگاہ نہ بناؤ (۲) مگر یہ لوگ ان پر عید کی طرح اجتماع کرتے اور دن مقرر کر کے سالانہ عرس منعقد کرتے ہیں۔

غرض یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہر حکم کے مخالف اور دین کی ہر رسم کے دشمن نظر آتے ہیں۔

قبر پرستوں کا غلو

صاحب مجالس الابرار اس کے بعد لکھتے ہیں کہ یہ فرقہ ضالہ اس حالت تک پہنچ گیا ہے کہ بعض حد سے بڑھانے والوں نے بیت اللہ (اللہ تعالیٰ اس کی عظمت اور شرف کو بڑھائے) کی طرح قبروں کے آداب اور ارکان مناسک مقرر کر دیئے ہیں اور اس موضوع پر کتابیں لکھ کر ان کا نام مناسک حج المشاہد رکھ دیا ہے۔ اس کے بعد لکھتے ہیں، مگر مخفی نہ رہے کہ ایسا کرنا درحقیقت اسلام کی جگہ بت پرستی اختیار کرنا ہے، کیونکہ ان کا طریقہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طریقہ سے بالکل مختلف ہو گیا ہے۔

عملی غلو

پس دیکھئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت اور اس کے درمیان جو انھوں نے قبور کے متعلق مذہب بنا رکھا ہے کس قدر فرق ہے اور اس میں ذرہ بھر شک کی گنجائش نہیں کہ شرک کی اس گمراہ کن بدعت کے مفاسد حد سے زیادہ ہیں اور ایک یہ فساد ہے کہ قبروں کو مساجد پر جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک افضل اور محبوب ہیں، فضیلت دیتے ہیں، یہ جب قبروں پر جاتے ہیں تو اس قدر رقت اور ادب، خشوع اور عاجزی کے ساتھ قبرستان میں داخل ہوتے ہیں کہ خدا کی مساجد میں اس

---

(۱) مصنف نے یہ بات ولا قبر مشرفا سے اخذ کی ہے۔

(۲) عن جابر مرفوعا ابن ابی شیبہ (۳/۳۴۰) ت ک ۸ ب ۵۸ ن ک ۲۱ ب ۹۶ جم ک ۶ ب ۴۳

کیفیت کے ساتھ کبھی داخل نہیں ہوتے۔ ان کے نزدیک قبروں کو سجدہ گاہ بنانا، ان پر چراغاں کرنا، اعتکاف کرنا، پردے لٹکانا، عود و اگربتی جلانا اور ان کی صفائی کیلئے ملازم مقرر کرنا اور ان کی پوجا کے لئے اشاعت کرنا، ان کی مجاورت سے افضل اور ان کی خدمت مساجد کی خدمت سے بہتر ہے۔

صاحب مجالس الابرار نے جو کچھ کہا اظہر من الشمس ہے، ان لوگوں کی حرکات رازہائے سربستہ نہیں ہیں، میں نے اپنی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھا ہے اور اس گروہ کی باتوں کو اپنے کانوں سے سنا ہے۔

چیلنج

آگے لکھا ہے کہ قبروں کے لئے نذریں ماننا، ان کی زیارت کے لئے دور اور نزدیک سے سفر کر کے آنا۔ ان کے پاس نمازیں پڑھنا، ان کے گرد طواف کرنا، ان کو چومنا یا چھونا اور ان پر ہاتھ یا منہ رگڑنا، ان کی مٹی یا کنکر اٹھا کر گلے میں لٹکانا، اہل قبور سے دعا مانگنا، رزق اور اولاد کے لئے یا بیماری سے شفا یا قرض سے خلاصی کیلئے دعائیں کرنا یا دیگر مہمات دنیوی میں ان سے مدد چاہنا بھی اس قبر پرستی میں شامل ہیں علاوہ ازیں تمام وہ حاجتیں جو بت پرستوں سے چاہتے ہیں یہ ان قبروں سے مانگتے ہیں۔ اس کے بعد لکھتے ہیں:

وَلَيْسَ شَيْءٌ مِنْهَا مَشْرُوْعاً بِاتِّفَاقِ اَئِمَّةِ الْمُسْلِمِيْنَ اِذْ لَمْ يَفْعَلْ شَيْئاً مِنْهَا رَسُوْلُ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَلاَ اَحَدٌ مِنْ اَصْحَابِهٖ وَالتَّابِعِيْنَ وَسَائِرِ اَئِمَّةِ الدِّيْنِ صَلَوٰةُ اللّٰهِ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلَيْهِمُ السَّلاَمُ.

مسلمانوں کے تمام مسالک فکر کے علما کا اتفاق ہے کہ ان میں سے ایک کام بھی جائز نہیں کیونکہ ان میں سے کوئی بات نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کی نہ صحابہ کرام میں سے کسی نے کی اور نہ مسلمانوں کے اماموں نے کی۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، صحابہ کرام اور تابعین عظام کا دور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد کے مطابق خیر القرون (۱) (بہترین زمانہ) ہے جب ان لوگوں نے ایسے کام نہیں کیے تو ان کاموں کا جائز اور اچھا ہونا محال ہے۔

---

(۱) متفق علیہ بروایت عمران بن حصین خیر امتی قرنی ثم الذین یلونھم (مشکوٰۃ باب مناقب الصحابہ)

اب جو شخص ایسی باتوں کے ارتکاب کی جرأت کرتا ہے جس کا ثبوت ان زمانوں میں نہیں ملتا تو اس کے فاسق ہونے پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے گواہی دی ہے، آگے لکھا ہے:

جو شخص ہمارے کلام میں شک کرے اسے چاہیئے کہ ان تین زمانوں میں سے کوئی ایک مثال پیش کرے جس سے قبر پر نماز پڑھنا تو بڑی بات ہے صرف اتنا ہی ثابت ہو سکے کہ صحابہ کرام، تابعین یا تبع تابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے فلاں شخص نے اپنی مصیبت میں فلاں قبر کا قصد کیا، اس سے مدد چاہی یا اسے چوما اور چھوا چہ جائیکہ قبروں کے نزدیک نماز پڑھنے اور ان سے حاجت روائی چاہنے کو ان بزرگوں کی طرف منسوب کیا جائے ہرگز ہرگز ایسا ممکن نہیں۔

ہاں قرون ثلاثہ کے بعد ان لوگوں نے ایسی حرکتیں کی ہیں جو نا خلف جانشین تھے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَخَلَفَ مِنۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا

لیکن پھر ان کے بعد ایسے نااہل جانشین ہوئے جنھوں نے نماز کی حقیقت کھو دی اور نفسانی خواہشات کے پیچھے پڑ گئے سو قریب ہے کہ ان کی سرکشی ان کے آگے آئے۔

اصل بات یہ ہے کہ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا اور عہد رسالت دور تر ہوتا گیا، یہ فتنہ رواج پاتا گیا اور اب نوبت یہاں تک پہنچی کہ اس موضوع پر کتابیں لکھی گئیں، جن میں سے بعض کو پڑھ کر افسوس ہوا کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، خلفائے راشدین، صحابہ کرام اور تابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین سے ان میں ایک لفظ بھی منقول نہیں، بلکہ گور پرستی کے خلاف بہت سی مرفوع روایات ہیں جن کی سند مسلسل آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہے انہی میں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد بھی ہے:

كُنْتُ نَهَيْتُكُمْ عَنْ زِيَارَةِ الْقُبُوْرِ فَمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّزُوْرَ فَلْيَزُرْ فَلَا تَقُوْلُوْا هُجْرًا (۱)

میں نے تمھیں قبروں کی زیارت کرنے سے منع کر دیا تھا پس جو کوئی قبروں کی زیارت کا ارادہ کرے وہ جائے مگر بے ہودہ گفتگو نہ کرے۔

---

(۱) تخریج ن خبائز ۱۰۰۔ حم ۳/ ۶۳، ۶۶، ۲۳۷، ۲۵۰، ۶/ ۳۶۱

صاحب مجالس الابرار لکھتے ہیں کہ ہجر کے معنی بے ہودہ گفتگو ہیں اور فرماتے ہیں کہ ان شرکیہ افعال واقوال سے بدتر کون سی بیہودہ بات ہوگی جو یہ لوگ قبروں کے پاس کرتے ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ

صحابۂ کرام رضی اللہ علیہم اجمعین کے ان بدعتوں کے رد میں اس قدر بے شمار واقعات ہیں کہ ان کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا، ان میں سے ایک یہ ہے، جو صحیح بخاری میں ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کو ایک قبر کے قریب نماز پڑھتے دیکھا تو تیزی سے کہا:

القبر! القبر! (قبر ہے قبر) قبر سے پرہیز کر

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا القبر! القبر! فرمانا اس امر کی دلیل ہے کہ قبر کے قریب نماز پڑھنے سے بچنا چاہیے۔ اہل عرب کا قاعدہ ہے کہ جب کسی چیز سے ڈرانا ہو تو اس کا نام بار بار لیتے ہیں تاکہ اس سے جلدی بھاگ جائے۔ جیسے جب ایک شخص کو شیر کے قریب پہنچا ہوا دیکھتے ہیں یا مہلک سانپ کے قریب پاتے ہیں تو کہتے ہیں: شیر! شیر!، سانپ! سانپ!

حافظ ابن قیم رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کا قبر کے قریب جا کر نماز پڑھنا اس بات کی علامت نہیں کہ وہ قبر کے قریب جائز سمجھ کر نماز پڑھتے تھے۔ غالب احتمال ہے کہ انہیں قبر کا علم ہی نہ ہو یا انھوں نے دیکھی ہی نہ ہو اور یہ بات صحیح معلوم ہوتی ہے کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم قبر کے قریب جا کر نماز پڑھنے کی ممانعت سے خوب واقف و باخبر تھے۔ پس جونہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ڈرایا کہ قبر ہے تو معلوم ہو گیا کہ قبر ہے۔(۱)

حدیث لاتجعلوا قبری عیدا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث صحیح مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

---

(۱) اس اثر کو امام بخاریؒ نے (الفتح ۱/ ۴۳۷) میں بغیر سند کے ذکر کیا ہے البتہ عبدالرزاقؒ نے مصنف میں (۱/ ۴۰۴، ۱۰۸۱) میں اور ابوالحسن دینوریؒ نے جزء فیہ مجالس من امالی ابی الحسن القزوینیؒ ل ۳/ ۱) میں اپنی اپنی سندوں سے روایت کیا ہے اور یہ سند صحیح ہے۔ د/ الخیر آبادی

لَاتَجْعَلُوْا قَبْرِیْ عِیْدًا وَصَلُّوْا عَلَیَّ فَاِنَّ صَلٰوتُکُمْ تَبْلُغُنِیْ حَیْثُ کُنْتُمْ

میری قبر کو عید گاہ نہ بناؤ البتہ مجھ پر درود پڑھو تم جہاں ہو گے مجھے تمہارا درود پہنچ جائے گا۔(۱)

غور کرو جب گنبد خضرا کو مسجد بنانے سے روک دیا گیا جو شرف اور فضیلت میں دنیا بھر کے مقابر و مآثر سے افضل ہے تو دوسری قبریں بہت زیادہ اس ممانعت کی اہل ہیں۔ نیز آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد وَصَلُّوْا عَلَیَّ فَاِنَّ صَلٰوتُکُمْ تَبْلُغُنِیْ حَیْثُ کُنْتُمْ میں ایک لطیف اشارہ ہے کہ چونکہ درود پڑھنے کا ثواب دور و نزدیک سے یکساں طور پر ملتا ہے، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قبر کو عید گاہ بنانے کی ضرورت نہیں اور قبروں کے عید گاہ بنانے میں خرابیاں ہیں، جن کی تفصیل سے اللہ تعالیٰ ہی بہتر واقف ہے۔

معجزات و کرامات

مذکورہ بالا احادیث و آثار مرویہ کو بغور و فکر دیکھنے سے ثابت ہوتا ہے کہ صراط مستقیم یہی ہے کہ انبیا کرام اور اولیا اللہ، اللہ تعالیٰ کے عاجز اور فرمانبردار بندے ہیں، زندگی میں اور مرنے کے بعد بھی اس کے کارخانہ میں کچھ بھی قدرت و اختیار نہیں رکھتے، رہے ان کے معجزات و کرامات، تو ان کی حقیقت یہ ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے غلبہ کے لئے اللہ تعالیٰ اپنی قدرت اور اختیار سے ان کے دخل کے بغیر، بعض اوقات مافوق الفطرت امور کا اظہار ان کے ہاتھ سے فرما دیتا ہے جن سے مقصود یہ ہے کہ لوگ ان کے پیچھے لگ کر صراط مستقیم پر جو انہیں انعام کے طور پر نصیب ہوا ہے، چل سکیں اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کریں جو انسان کی پیدائش کی اصلی غرض ہے پس جن لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت اور صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے طریق کو چھوڑ دیا اور زید و بکر کے قول و فعل پر فریفتہ ہو کر یوں کہنے لگے۔

مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَا اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى (۳۹:۳)

ہم صرف اس لئے انہیں پوجتے ہیں کہ ہمیں خدا کا مقرب بنا دیں۔

تو یہ لوگ پہلی گمراہ اور باطل قوموں کی طرح غلط راہ پر ہیں، اللہ تعالیٰ (ان کے اور اہل ایمان کے درمیان جو اختلاف ہے) اس کا فیصلہ قیامت کے روز کرے گا۔

---

(۱) حدیث ۲۰۴۲، احمد (۲/۳۶۷) وسندہ حسن

اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِيْمَا هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ

لوگوں میں شرک کی قسموں کے حالات میں لکھا ہے کہ ایک مشرک جماعت کا نماز ثنویہ ہے۔

جماعت ثنویہ

۱۔ اس جماعت کا اعتقاد یہ ہے کہ موجودات کے دو خالق ہیں یزدان اور اہرمن۔

۲۔ ستارہ پرست، ان کو صابی بھی کہتے ہیں۔

۳۔ ہنود، ان کا خیال ہے کہ منتظمین عالم مختلف روحانی وجود رکھتے ہیں۔ اور ان منتظمین عالم کو راضی رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ ان کی مورتیاں بنا کر پوجا جائے۔

۴۔ پیر پرست اس جماعت کے شرکیہ عقائد کی تفصیل یہ ہے کہ جب کوئی خدا کا نیک بندہ اپنی ریاضت اور مجاہدہ کی وجہ سے مستجاب الدعوات اور عنداللہ مقبول ہو جاتا ہے تو مرنے کے بعد اس کی روح کو بہت سی قوت و وسعت عطا ہو جاتی ہے اگر اس بزرگ کے نشست و برخاست کے مقام پر یا اس کی قبر پر اس کا تصور باندھ کر عاجزی اور ذلت کا اظہار کیا جائے تو بہ سبب قوت و وسعت مذکورہ کے اس کے حال سے واقف ہو جاتی ہے اور دنیا اور آخرت میں اس کی شفاعت کرتی ہے۔

جماعت پیر پرست

اس جماعت کے رد میں بے شمار آیات الٰہی اور احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وارد ہیں اللہ کا ارشاد ہے:

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَآءَ قُلْ اَوَلَوْ كَانُوْا لَا يَمْلِكُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَعْقِلُوْنَ

کیا ان مشرک لوگوں نے خدا کے سوا دوسروں کو معبود قرار دے رکھا ہے جو ان کی سفارش کریں گے؟ آپ کہہ دیجئے کہ اگرچہ یہ کچھ بھی قدرت نہ رکھتے ہیں اور کچھ بھی علم نہ رکھتے ہوں؟

دعا عبادت کا نام ہے

اور ارشاد ہوتا ہے:

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ غٰفِلُوْنَ.

اور اس شخص سے بڑھ کر کون گمراہ ہے جو اللہ کو چھوڑ کر ایسے شخص کو پکارتا ہے جو قیامت کے دن تک بھی اس کا کہنا نہ کرے اور ان کو اس کے پکارنے کی خبر بھی نہ ہو۔

سچ ہے غیر اللہ کو پکارنے والے سے بڑھ کر دنیا میں کوئی گمراہ نہیں۔ اس آیت کریمہ سے واضح ہوتا ہے کہ جن غائب ارواح اور پوشیدہ اجسام کی دنیا میں پرستش ہو رہی ہے اور ان سے حاجت روائی کے لئے دعائیں کی جاتی ہیں وہ ارواح و اجسام دعائیں مانگنے والوں کی دعاؤں سے بھی غافل اور بے خبر ہیں، خواہ وہ انبیا علیہم السلام کے ارواح و اجسام ہوں یا اولیائے کرام رحمھم اللہ اجمعین کے اور یہ بھی ظاہر ہوا کہ قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ انہیں بتلائے گا اور وہ اپنے پکارنے والوں کی باتوں پر مطلع ہوں گے تو بجائے اس کے کہ وہ ان کی سفارش کریں یا ان پر خوش ہوں، الٹے ان کی عبادت سے انکار کریں گے۔

وَإِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوا لَهُمْ أَعْدَآءً وَّكَانُوا بِعِبَادَتِهِمْ كَافِرِينَ

اور جب تمام لوگ اکٹھے کئے جاویں گے تو وہ ان کے دشمن ہو جاویں گے اور ان کی عبادت ہی کا انکار کریں گے۔

اس آیت سے دریافت ہو گیا کہ ان کی دعا عبادت ہے، پہلی آیت میں صرف دعا کا ذکر تھا۔ اب دعا کو عبادت سے بدل کر حقیقت واضح کر دی کہ دعا ہی عبادت ہے، چنانچہ اس کی تائید دوسری جگہ سے بھی ہوتی ہے۔ ارشاد ہے:

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ.

اور تمہارے پروردگار نے فرمادیا ہے کہ مجھ کو پکارو، میں تمہاری درخواست قبول کروں گا، جو لوگ میری عبادت سے سرتابی کرتے ہیں وہ عنقریب ذلیل ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ

دعا ہی عبادت ہے۔(۱)

(۱) تخریج تفسیر ۲:۲۰۰، ۱۶، ۱۴۰ اس کی سند صحیح ہے۔ ج دعا۔ حم ۴/ ۲۶۷، ۲۷۱، ۲۷۶ ت دعا ۱۔ اس کی سند ضعیف ہے۔

اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ

دعا عبادت کا مغز اور اصل ہے۔

انبیا یا اولیا سے مدد چاہنا ان کی عبادت کے مترادف ہے

پس ثابت ہوگیا کہ اولیا اللہ سے حاجت روائی چاہنا، ان کو پکارنا اور ان کی قبروں پر فریاد کرنے کے لئے جانا ان کی عبادت کرنا ہے۔ اگرچہ یہ لوگ اپنے خیال میں ایسا نہیں سمجھتے اور کہتے ہیں کہ ہم تو صرف قبروں کی زیارت کرتے ہیں ان کی عبادت نہیں کرتے۔

دراصل ان کے ایسے فضول بہانوں سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد کا راز کھل جاتا ہے کہ یہی وہ مقاصد تھے جن کے پیش نظر اولاً حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زیارت قبور سے بالکل روک دیا تھا، جیسا کہ فرمایا:

كُنْتُ نَهَيْتُكُمْ عَنْ زِيَارَةِ الْقُبُوْرِ فَزُوْرُوْهَا فَإِنَّهَا تُذَكِّرُ الْآخِرَةَ.

میں نے تمہیں قبروں کی زیارت سے روک دیا تھا (مگر اب اجازت دیتا ہوں) پس قبروں پر جایا کرو کیونکہ ان کی زیارت کرنے سے آخرت کی یاد آتی ہے۔(۱)

مطلب یہ کہ قبروں کی زیارت سے بہت سے فتنوں کا خیال کرتے ہوئے میں نے منع کر دیا تھا، لیکن قبروں کی زیارت میں نفع بھی ہے اور وہ آخرت کا یاد آنا ہے، لہٰذا میں کہتا ہوں کہ زیارت کریں کہ اس دینی نفع کے خیال سے قبروں کی زیارت مباح ہے۔ پس اس صورت میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کی قبور پر جانے کا نفع برابر ہے، کیونکہ قبر کا دیکھنا بھی جنازہ کو دیکھنے کی طرح موت کی یاد دلاتا ہے۔ اور ثابت شدہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی والدہ کی قبر کی زیارت کے لئے تشریف لے گئے تھے۔

شرک شفاعت کے منافی ہے

جیسا کہ مسلم رحمۃ اللہ علیہ نیساپوری نے صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ روایت تحریر کی ہے۔

---

(۱) تخریج ۲ ک ۱۱ ح ۱۰۵ ک ۳۵ ح ۲۷/د ک ب ۷۵ د ک ۲۵ ب ۷ حم ا۔ ۱۲۵، ۴۵۲، ۲/ ۳۴۴۱/ ۳۸، ۶۳، ۶۶، ۲۳۷، ۲۵، ۲۵۰، ۲۵۵ مرتبہ ۳۵

زَارَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَبْرَ اُمِّهٖ فَبَكٰى مَنْ حَوْلَهٗ فَقَالَ اِسْتَاْذَنْتُ رَبِّيْ فِيْ اَنْ اَسْتَغْفِرَ لَهَا فَلَمْ يُؤْذَنْ لِيْ وَاسْتَاْذَنْتُ فِيْ اَنْ اَزُوْرَ قَبْرَهَا فَاُذِنَ لِيْ فَزُوْرُوا الْقُبُوْرَ فَاِنَّمَا تُذَكِّرُ الْمَوْتَ.

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی والدہ کی قبر کی زیارت کی تو آپ کے ساتھی رو پڑے اور (آپؐ نے) فرمایا کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے اپنی والدہ کے لئے بخشش مانگنے کی اجازت چاہی تھی مگر نہ ملی پھر میں نے قبر کی زیارت کے لئے درخواست کی تو منظور ہوگئی پس تم قبروں کی زیارت کیا کرو کیونکہ ان کی زیارت کرنے سے اپنی موت یاد آتی ہے۔(۱)

غور کرنے کا مقام ہے کہ جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی والدہ کے لئے بخشش مانگنے کی اجازت چاہی اور وہ نہ ملی تو جو لوگ بزرگوں کی قبروں پر جاتے ہیں اس لئے کہ شرکیہ افعال کریں وہ ایسا کر کے ان بزرگوں کی شفاعت کے مستحق کیونکر ہو سکتے ہیں، جبکہ شرک شفاعت ہی کے منافی ہے۔

زیارت قبور سے مقصود کیا ہونا چاہیئے؟

غرض جب معلوم ہو گیا کہ زیارت قبور سے ذکر موت وآخرت ہے تو موت وآخرت کو یاد کرنے، دنیا سے بے رغبتی حاصل کرنے اور اہل قبور کے لئے بخشش مانگنے کی غرض سے اگر کوئی سنت کے مطابق زیارت کے لئے جائے تو کوئی حرج کی بات نہیں اور جو لوگ اس کے برخلاف طلب حاجات اور ارتکاب منکرات کے لئے وہاں جاتے ہیں، ممکن ہے ایسے زائرین قبور لعنت کے مستحق بھی ہو جائیں، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بعض زائرین پر لعنت بھی فرمائی ہے۔ ابوعیسیٰ ترمذی، امام احمد بن حنبل اور ابن ماجہ رحمہم اللہ اجمعین نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

لَعِنَ زُوَّارَاتِ الْقُبُوْرِ.(۱)

کہ قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر لعنت ہے۔

---

(۱) تخریج د/ جنائز ۷۸۔ت صلوٰۃ ۱۲۱۔ن/ جنائز ۱۰۴۔جم/۱/ ۲۲۹، ۲۸۷، ۳۲۴، ۲۳۷ تحذیر المساجد ص ۲۲۵

بعض علما نے کہا ہے کہ عورتوں پر قبروں کی زیارت اس لئے منع ہے کہ عورتیں نرم دل ہونے کی وجہ سے رونے پیٹنے سے باز نہیں رہ سکتیں اور بین کرنے لگتی ہیں جو حرام فعل ہے، غرض وہی زیارت لعنت کا موجب ہوگی جس میں خلاف شرع امور کا ارتکاب ہوتا ہو خواہ ایسا کرنے والی عورتیں ہوں یا مرد اسی طرح وہ زیارت جائز ومباح ہے جو مسنون طریقہ سے کی جائے خواہ مستورات ہی کریں یا مرد، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے حضرت سید الشہد احمزہ رضی اللہ عنہ کی قبر کی زیارت کی اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور اپنے بھائی عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کی قبروں کی زیارت کی۔

زیارت قبور کا مسنون طریقہ

اب ہم بیان کرتے ہیں کہ قبروں کی زیارت میں کیا کرنا چاہئے، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا کیا دستور رہا ہے، مشکوۃ باب زیارت القبور پہلی فصل میں بروایت مسلم بریدہ اسلمی رضی اللہ عنہ سے مذکور ہے کہ

پہلی حدیث

كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُعَلِّمُهُمْ اِذَا خَرَجُوْا اِلَى الْمَقَابِرِ السَّلَامُ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الدِّيَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُسْلِمِيْنَ وَاِنَّا اِنْشَاءَ اللّٰهُ بِكُمْ لَلَاحِقُوْنَ نَسْئَالُ اللّٰهَ لَنَا وَلَكُمُ الْعَافِيَةَ.

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابہ رضی اللہ عنہم کو سکھایا کرتے تھے کہ جب کسی قبرستان میں جائیں تو یوں کہیں سلامتی ہو تم پر اے بستی کے باسی۔ مسلمانو! اللہ تعالیٰ نے چاہا تو ہم بھی تم سے ملنے والے ہیں، ہم اپنے اور تمہارے لئے اللہ تعالیٰ سے خیر و عافیت مانگتے ہیں۔(۱)

اسی باب کی دوسری فصل میں بحوالہ ترمذی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا گزر مدینہ کے قبرستان سے ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قبروں کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا۔

---

(۱) تخریج، مسلم بروایت بریدہ مشکوۃ باب زیارت القبور

دوسری حدیث

اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ يَا اَهْلَ الْقُبُوْرِ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَنَا وَلَكُمْ وَاَنْتُمْ سَلَفُنَا وَنَحْنُ بِالْاَثَرِ

اے اہل قبور! تم پر سلامتی ہو اللہ تعالیٰ ہمیں اور تمہیں بخش دے تم ہمارے سلف ہو اور ہم تمہارے پیچھے آرہے ہیں۔(۱)

تیسری حدیث

اور تیسری فصل میں مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا میں اگر قبرستان میں جاؤں تو کیا کہوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: یوں کہا کرو:

اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الدِّيَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنَّا وَالْمُسْتَاخِرِيْنَ وَاِنَّا اِنْشَاءَ اللّٰهُ بِكُمْ لَاحِقُوْنَ. (مسلم بروایت عائشہ۔ باب زیارۃ القبور)

سلامتی ہو اس بستی کے باسی مومنو! اور مسلمانو! تم پر، اللہ تعالیٰ ہمارے اگلوں اور پچھلوں پر رحم فرمائے۔ ہم بھی انشاءاللہ تم سے آملنے والے ہیں۔

ان تینوں حدیثوں کا مفہوم

ان تمام احادیث سے صاف معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نزدیک زیارت قبور سے بجز ذکر موت و یاد آخرت کے کوئی اور چیز مقصود نہ ہوتی تھی اور آپ اپنے لئے اور اہل قبور کے لئے دعائے رحم و مغفرت فرمایا کرتے تھے، تاکہ اہل قبور کو زندوں کی دعائے مغفرت سے فائدہ پہنچے اور ہمیں بھی اس کار خیر سے اجر نصیب ہو۔ کیونکہ کسی کا اپنے لئے اور مردوں کے لئے دعائے مغفرت کرنا مشترکہ طور پر دونوں کے واسطے موجب ثواب ہے۔

لیکن جو لوگ فائدے حاصل کرنے اور نقصانات سے بچنے کے لئے زیارت کرتے ہیں اور بزرگوں کی روحوں کو تمام حالات سے باخبر جان کر عاجزی اور انکساری کے ساتھ ان سے دعائیں کرتے ہیں اور کہتے ہیں، ہماری فلاں حاجت پوری کرو اور فلاں مشکل حل کرو تو ان لوگوں کے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور اہل بیت عظام رضی اللہ عنہم سب اس

(۱) ترمذی بروایت ابن عباسؓ، وقال ہذا حدیث حسن غریب۔ مشکوۃ باب زیارۃ القبور

نئے دین سے سخت بیزار ہیں۔

بچنے کا طریق

مسلمانوں کو چاہئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے احوال و اقوال کی پیروی کریں۔ جن کو ہزار ہا دیندار و متقی اہل علم نے جمع کیا اور زید و بکر کے بے سروپا اقوال کے پیچھے نہ جائیں، جن کی صحت کی کوئی صحیح سند نہیں ملتی۔ اس فتنہ کے زمانے میں لازم ہے کہ اپنے بزرگوں کے اقوال کو بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے طریق کے میزان میں تول لیا کریں۔

لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ أَمْرِ اللّٰهِ إِلَّا مَنْ رَّحِمَ (سورہ ہود:)

کیونکہ اس شرک و بدعت کے زمانے میں رحمت الٰہی کے سوا بچانے والا کوئی نہیں۔

اختلاف فتنہ ہے جس نے قوموں کو ہلاک کر دیا

مسند احمد ایسے فتنوں کے متعلق بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بواسطۂ وحی ظاہر ہو گیا تھا کہ اختلاف اور تفریق کا سمندر میری امت کو بھی قوم نوح علیہ السلام کی طرح طوفان ضلالت و گمراہی میں غرق کر دے گا۔ اور میرے اور میرے اصحاب اولاد (رضی اللہ عنہم کی) جو حقیقی معنوں میں میرے اہل بیت ہیں، سنت کی کشتی میں سوار ہوئے بغیر کوئی صورت بچنے کی باقی نہ رہ جائے گی، پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے باآواز بلند فرمایا:

اَلَا اِنَّ اَهْلَ بَيْتِىْ فِيْكُمْ مِثْلُ سَفِيْنَةِ نُوْحٍ مَنْ رَكِبَهَا نَجَا وَمَنْ تَخَلَّفَ عَنْهَا هَلَكَ

میرے اہل بیت تمہارے لئے سفینہ نوح کی مانند ہیں، اس ناؤ میں بیٹھ گیا بچ گیا، اور جس نے اس میں بیٹھنے سے پس و پیش کیا وہ ضرور ہلاک ہو گیا۔

حدیث اہل بیت

بظاہر یہ حدیث صرف اہل بیت کے تعریف میں معلوم ہوتی ہے چنانچہ حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اپنی مسند میں اس کو اہل بیت ہی کی تعریف میں لائے ہیں، مگر معناً خلفائے راشدین رحمہم اللہ بھی اس میں شامل ہیں جیسے عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ والی حدیث شاہد ہے

جو صحاح اور سنن میں وارد ہے، کہ خلفائے اربعہ کے ذکر میں اہل بیت بھی داخل ہیں اور وہ حدیث میں وارد ہے، کہ خلفائے اربعہ کے ذکر میں اہل بیت بھی داخل ہیں اور وہ حدیث یہ ہے۔(۱)

مَنْ يَّعِشْ مِنْكُمْ بَعْدِيْ فَسَيَرٰى اِخْتِلَافًا كَثِيْرًا فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ مِنْ بَعْدِيْ تَمَسَّكُوْا بِهَا وَعَضُّوْا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِدِ وَاِيَّاكُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْاُمُوْرِ فَاِنَّ كُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ.

جو میرے بعد زندہ رہا وہ بہت اختلاف دیکھے گا پس تم پر لازم ہے کہ میری اور خلفائے راشدینؓ کی سنت کو دانتوں سے مضبوط پکڑے رہو اور بدعات سے بچو کیوں کہ ہر بدعت گمراہی ہے۔

غرض آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی پیروی تمام مسلمانوں کے لئے ہر زمانہ ہر مقام میں لازم وواجب ہے۔ اور یہ متابعت کسی شخص کی خاطر چھوڑی نہیں جا سکتی اور فاسقوں کی علامات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ جان بوجھ کر سنت کو ترک کرتے ہیں۔ صحیح مسلم میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ عَمِلَ عَمَلاً لَيْسَ عَلَيْهِ اَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ.(۲)

جس نے ایسا عمل کیا جو ہمارے دین کے مطابق نہیں ہے وہ مردود ہے۔ اس کا یہ مطلب بھی ہے کہ ایسے شخص کا اتباع کرنا بھی ٹھیک نہیں اور وانستہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی متابعت چھوڑ کر پیروں فقیروں کی اطاعت کرنا ان کو معبود بنا لینے کے برابر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہود ونصاریٰ کو احبار ورہبان کا پرستار اسی لئے کہا کہ وہ ان کا اسی قسم کا اتباع کرتے تھے۔ جب آیت اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (۳) نازل

---

(۱) تخریج، احمد، ابوداؤد، ترمذی، بحوالہ مشکوٰۃ (باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ)

(۲) مسلم بروایت حضرت عائشہؓ باب نقض الاحکام الباطلہ ورد محدثات الامور

(۳) الدر (۳/۴/۱۷۴) اخرجه ابن سعد وعبدبن حميد والترمذی وحسنة وابن المنذر وابن ابی حاتم والطبرانی وابوالشيخ وابن مردويه والبيهقی فی سننه عنه واللفظ، قال اتيت النبیؐ وهو يقرأ فی سورة براة (اتخذوا) وقال مانهم لم يكن يعبد ولعنهم ولكنهم كانوا اذا احلوالهم شيئا استحلوه واذا حرموا عليهم شيئا وحرموه

ہوتی تو حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خدا نے ان کو کس لیئے عالموں اور درویشوں کا پرستار کہا حالانکہ وہ ایسا نہیں کرتے تھے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب دیا کہ جس حرام چیز کو احبار ورہبان حلال کرتے تھے اسے حلال جانتے تھے اور جس حلال چیز کو حرام کرتے تھے، حرام جانتے تھے۔ حالانکہ ان کا حکم شریعت کے صریح مخالف ہوتا تھا اور یہی ان کی پرستش ہے۔

مقبولیت بارگاہ الٰہی کی علامت

صراط مستقیم میں امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جو لوگ اپنی طرف سے کسی چیز کو حلال یا حرام اور واجب، یا مستحب قرار دے کر لوگوں کو اس پر چلنے کا حکم دیتے ہیں وہ اپنے متبعین سے کہیں زیادہ ملامت کے قابل ہیں جو ان کا کہنا مانتے ہیں۔

سنن ابی داؤد اور جامع ترمذی میں ثوبان رضی اللہ تعالیٰ عنہ مولیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

اِنَّمَا اَخَافُ عَلٰی اُمَّتِیَ الْاَئِمَّةِ الْمُضِلِّیْنَ (۱)

مجھے اپنی امت کے گمراہ کن اماموں کا خوف ہے۔

صحیح مسلم میں ہے کہ آپ نے فرمایا:

یَکُوْنُ اَمَّةٌ لَّا یَهْتَدُوْنَ بِهِدَایَتِیْ وَلَا یَسْتَنُّوْنَ بِسُنَّتِیْ وَسَیَقُوْمُ فِیْهِمْ رِجَالٌ قُلُوْبُهُمْ قُلُوْبُ الشَّیَاطِیْنِ. (۲)

میرے پیچھے ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو نہ میری ہدایت پر عمل کریں گے اور نہ میری سنت پر چلیں گے، ان میں سے ایسے لوگ بھی ہوں گے ان کے پیشوا جن کے دل شیطانوں جیسے ہوں گے۔

غرض مقبولیت بارگاہِ الٰہی کی علامت یہ ہے کہ تمام اوامر ونواہی میں سنت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی متابعت کی جاوے اور درگاہ ایزدی سے مردود ہونے کی نشانی یہ ہے کہ جملہ امور میں کسی

---

(۱) بروایت ثوبانؓ بحوالہ مشکوٰۃ (کتاب الفتن)
(۲) مسلم بحوالہ مشکوٰۃ کتاب الفتن)

ایک سنت کی بھی مخالفت کی جائے اور اس قانون میں امیر و غریب سب برابر ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے سالکان منزل عشق الٰہی کے لئے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ارشاد فرمادیا ہے کہ ان کو کہہ دیجئے۔

إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ

اگر تم واقعی اللہ سے محبت رکھتے ہو تو تمہیں چاہئے میری پیروی کرو اگر تم ایسا کیا تو اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا۔ اور تمہاری خطائیں بخش دے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ خدا تعالیٰ کی محبوبیت اور گناہوں کی مغفرت کا حاصل کرنا بغیر سنت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اتباع کے ناممکن ہے۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلفائے راشدین کا اتباع بھی جیسا کہ آپ نے ارشاد فرمایا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اتباع میں داخل ہے، اس لئے ہر مسلمان پر لازم ہے کہ دینی امور میں جو کچھ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے کیا وہی کرے۔ اور جس چیز سے انھوں نے پرہیز کیا اس سے بچ کر رہے تاکہ صحیح معنوں میں سنت کا متبع یا سنی ہو جائے۔

عقائد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے ساتھ مطابقت ضروری ہے

کسی شخص کا زندگی کے سارے اعمال و احوال میں سنت کا ایسا پابند ہو جانا کہ کوئی عمل بھی سنت کے خلاف نہ رہے۔ اللہ تعالیٰ کی عنایت خاص کے بغیر محال ہے ہاں اتنی بات ہر مسلمان کے لئے ضروریات ایمان سے ہے کہ عقائد میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے ساتھ مکمل اتفاق کرتا ہو کیونکہ علمائے محققین نے فرمایا ہے کہ درجات و مراتب میں فرق ہو تو عقائد کے لحاظ سے تمام خاص و عام مسلمان برابر ہیں۔

معیار صحت

مناسب ہے کہ گور پرستی اور پیر پرستی جو کہ ان بزرگوں کے عقیدوں کے خلاف ہے کہ تحقیق قرآن مجید کی محکم آیتوں سے کریں۔ مگر خیال رہے کہ اگرچہ قرآن مجید فاسد خیالات اور بیمار قلوب کے لئے اکسیر بن کر آیا ہے لیکن اگر اس پر عمل کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے احکام کی

خلاف ورزی بھی کر لی جائے تو اس روگ کا کوئی علاج نہیں اور ایسا کرنا اپنے نفس پر ظلم کرنا ہے۔

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَاهُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا.

ہم نے جو کچھ قرآن میں نازل کیا ہے تو وہ یقین کرنے والوں کے لئے روح کی ساری بیماریوں کی شفا اور رحمت ہے۔ اور جو نافرمان ہیں تو انہیں کچھ فائدہ ہونے والا نہیں بجز اس کے کہ انکار و بدبختی کی وجہ سے اور زیادہ تباہ ہوں۔

بالفاظ دیگر کلام پاک بمنزلہ مفید دوا و صالح غذا کے ہے کہ جس سے صحیح مزاج کے لوگ تو مستفید ہوتے ہیں اور طاقت ور ہو جاتے ہیں مگر فاسد مزاج کے لوگ کے اجسام میں داخل ہو کر ان کے مرض یعنی دنیا اور آخرت کے خسارہ کو اور زیادہ کرتا ہے۔

شعر

باراں کہ در لطافت طبعش خلاف نیست
در باغ لالہ روید ودر شورہ بوم خس

بارش کی برکت میں کلام نہیں فرق یہ ہے کہ اسی سے باغ میں گل و لالہ اُگتے ہیں اور بنجر زمین میں گھاس پھوس۔ اور فرمایا:

وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ وَالَّذِيْ خَبُثَ لَا يَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيَاتِ لِقَوْمٍ يَّشْكُرُوْنَ.

اور دیکھو اچھی زمین اپنے پروردگار کے حکم سے اچھی پیداوار ہی نکالتی ہے مگر جو زمین نکمی ہے اس سے کچھ پیدا نہیں ہوتا مگر یہ نکمی چیز پیدا ہو، اس طرح ہم حکمت و عبرت کی نشانیاں ان لوگوں کے لئے دہراتے ہیں جو خدا کی نعمتوں کے شکر گزار ہیں۔

اور فرمایا:

وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰنَا لِهٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَآ اَنْ هَدٰنَا اللّٰهُ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ.

جنتی کہیں گے ساری ستائش اللہ کے لئے ہے جس نے ہمیں اس زندگی کی راہ دکھائی

ہم بھی اس کی راہ کبھی نہ پاتے اگر وہ ہماری راہنمائی نہ کرتا۔

بلاشبہ ہمارے پروردگا کے پیغمبر سچائی کا پیغام لے کر آئے تھے۔

اور فرمایا:

فَرِيْقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيْقٌ فِي السَّعِيْرِ (۴۲:۷)

ایک فریق بہشت میں ہوگا اور ایک دوزخ میں۔

اسوۂ ابراہیم علیہ السلام

پس جب یہ معلوم ہوگیا کہ انبیا علیہم السلام اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ عقائد میں موافقت رکھنا ضروری ہے تو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ انبیا علیہم السلام اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنی حاجات ومہمات میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے انسان کی طرف توجہ نہیں کی۔ چہ جائیکہ وہ بتوں کی طرف رجوع کرتے۔ وہ ساری مخلوق کو رب العزت کے مقابلہ میں اپنی طرح بیچارہ وعاجز سمجھتے رہے اور اس کی نافرمانی سے بھاگ کر اس کی رضا کی طرف دوڑتے تھے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کہ تمام مسلمانوں کے ہادی وپیشوا ہیں، جس وقت آپ منجنیق سے جدا ہوکر آتش نمرود کی طرف فضا میں سے جارہے تھے اس وقت آپؑ نے اپنے قول وفعل سے دو باتوں کی طرف اشارہ فرمایا اور رہنمائی کی۔ ان میں سے ایک یہ کہ ایسے حالات میں ہر مومن پر آپ کا اتباع لازم ہے۔ دوسرے یہ کہ مقربان بارگاہِ الٰہی کو وہ شرف عطا کیا گیا ہے کہ عوام اس کو بمشکل حاصل کرسکتے ہیں۔ معتبر کتب تواریخ وتفاسیر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حال میں لکھا ہے کہ جب آپ کو آگ میں ڈالا جارہا تھا تو جبرائیل علیہ السلام نے حاضر ہوکر کہا:

جس بات کی ضرورت ہو بتائیے۔

آپ علیہ السلام نے فرمایا مَا اِلَيْكَ حَاجَتِيْ۔ کچھ بھی ہو آپ کی حاجت نہیں۔ جبرائیلؑ نے کہا تو اللہ تعالیٰ ہی کی درگاہ میں دعا کیجئے۔ آپؑ نے فرمایا حَسْبِيْ عَنْ سُوَالِيْ عِلْمُهٗ بِحَالِيْ۔ دعا کی کیا ضرورت ہے جبکہ وہ میرے حال سے بخوبی واقف ہے۔ دونوں عبارتوں پر غور کیجئے۔ کہ پہلے جملہ کی ترکیب نحویوں کے نزدیک دراصل مَهْمَا يَكُنْ مِنْ بَلَاءٍ فَلَا حَاجَةَ اِلَيْكَ ہے جو دوسروں کے سامنے حاجت پیش کرنے کے ناجائز ہونے پر دلالت کرتی ہے خواہ وہ

غیر، خدا کا رسول ہی کیوں نہ ہو، علما محققین نے کہا ہے کہ یہ واقعہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے امتحانوں میں سے ایک امتحان تھا کہ خدائے تعالیٰ نے جس طرح آپ کو کلمات کی آزمائش میں ڈالا تھا ویسا ہی معاملات میں بھی آزمایا اور جبرائیل علیہ السلام کے آنے کی علت میں لکھا ہے کہ جبرائیلؑ کو آپ کے حال زار پر رحم آیا۔ پس اللہ تعالیٰ سے عرض کی کہ اگر حکم ہو تو ان کی مدد کروں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا جا اور پوچھ۔

ابتلا کے اس واقعہ کی مثال یہ ہے کہ کوئی بادشاہ اپنے خزانہ پر کسی شخص کو مقرر کر کے ہدایت کرے کہ میرے سوا کسی کو خزانہ کی چابی نہ دینا۔ پھر خود ہی اس کی اطاعت کا امتحان لینے کے لئے اپنے ایک مقرب کو بھیج دے کہ جا کر چابی طلب کرو، مگر یہ نہ کہنا کہ بادشاہ نے چابی کے لئے مجھے تیرے پاس بھیجا ہے۔ اب اگر وہ بادشاہ کی ہدایت خاص کے مطابق اس کو بھی چابی نہ دے تو بادشاہ جان لے گا کہ یہ شخص واقعی وفادار ملازم ہے۔

اسوۂ حضرت اسحاق علیہ السلام

لکھا ہے کہ حضرت اسحاق علیہ السلام کی خواہش یہ تھی کہ ان کے بعد ان کا بڑا بیٹا عیص علیہ السلام نامی وارث نبوت قرار پائے، لیکن اس خواہش کی تکمیل کے لئے آپ نے اپنے والد حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی روح سے مدد نہ چاہی اور بحکم خداوندی کہ وہ اپنے بندوں پر غالب ہے۔ هُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ عیص علیہ لسلام کی بجائے یعقوب علیہ السلام نبی ہو گئے۔

اسوۂ یعقوب علیہ السلام

حضرت یعقوب علیہ السلام، حضرت یوسف علیہ السلام کے صدمۂ جدائی میں اس قدر خستہ حال ہوئے کہ روتے روتے آنکھیں سفید ہو گئیں۔ اور پکار اٹھے۔

يَاَسَفٰى عَلٰى يُوْسُفَ وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيْمٌ

آہ! یوسف کا درد فراق! اور شدت غم سے روتے روتے اس کی آنکھیں سفید پڑ گئیں اس کا سینہ غم سے لبریز تھا۔

لیکن باوجود اس بے قراری کے حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے آبائے کرام سے جو سب کے سب نبی تھے، اور ان کی ازواج مطہرات سے جو امہات المومنین تھیں، کبھی مدد نہ چاہی،

حالانکہ یہ سب آپ کے قریب مدفون تھے۔آپ نے بڑی سے بڑی تکلیف میں اگر کہا تو یہ کہا:

اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ

میں تو اپنے رنج وغم کی شکایت صرف اللہ تعالیٰ سے کرتا ہوں۔

سورۂ یوسف میں حضرت یعقوب علیہ السلام کا قول نقل ہے چونکہ انما کلمہ حصر ہے جس سے معلوم ہوا کہ استمد اد تو رہی درکنار، آپ نے کبھی کسی سے اپنا حال دل بیان نہیں کیا، چنانچہ آپ کا دوسرا قول ہمارے مطلب کی تائید کر رہا ہے، جہاں آپ فرماتے ہیں:

وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ

اور جو باتیں تم بناتے ہو، ان میں اللہ کی مدد درکار ہے۔

اُسوۂ یوسف علیہ السلام

پھر حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھو جنھوں نے عزیز مصر کے گھر میں اپنے والد حضرت یعقوب علیہ السلام کی شبیہ مبارک دیکھ کر ایک نہایت ہی اہم آزمائش سے نجات پائی تھی۔ جب قید خانہ کی مصیبتیں جھیل رہے تھے، کبھی والد ماجد کی روح سے مدد نہ چاہی بلکہ اس کے برعکس دوسرے قیدیوں کو بھی (جو غیر اللہ کی محتاجی کرنے کے عادی تھے) غیر اللہ کی عبادت سے ہٹا کر خالص ایک خدا کا محتاج رہنے کے قائل کر دیا۔قرآن مجید میں آپ کا تبلیغی خطبہ مذکور ہے:

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ.

اے ہر دو یاران مجلس! کیا بہت سے رب بہتر ہیں یا ایک اللہ جو سب پر غالب ہے؟ تم اس کے سوا جن ہستیوں کی پوجا کرتے ہو ان کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ محض چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ داداؤں نے رکھ لئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے لئے کوئی سند نہیں اتاری۔ حکومت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے اور اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی پوجا نہ کرو، یہی اصل دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

صاحبی السجن کی تفسیر صوفیا کے نزدیک

صوفیائے کرام جو کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سچے پیرو تھے ان کے نزدیک دو قیدیوں سے مراد دو قسم کے لوگ ہیں، اول جو سیم وزر کے غلام ہیں، خدا ان پر لعنت کرے اور یہ امرا اور سلاطین کا طبقہ ہے۔ دوسرے وہ جو نفس نابکار کے غلام ہیں، جن کی بے عزتی ذات باری تعالیٰ نے خود کی ہے۔

اَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهُ هَوَاهُ

کیا تم نے ایسے شخص کو بھی دیکھا جس نے اپنی نفسانی خواہشات کو اپنا معبود بنالیا۔

یہ گروہ شدید ترین دشمن، یعنی نفس کا غلام ہے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اَعْدٰى عَدُوِّكَ نَفْسُكَ الَّتِيْ بَيْنَ جَنْبَيْكَ

سب سے بڑا دشمن تیرا نفس ہے جو دو پہلوؤں کے درمیان ہے۔ اور جان لینا چاہئے کہ حکومت اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی نہیں۔

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ اور بقول مخبر صادق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

اَلدُّنْيَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ وَجَنَّةُ الْكَافِرِ (۱)

دنیا مومن کے لئے قید خانہ ہے اور کافر کے لئے جنت ہے۔

جس کا مفہوم دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ آخرت کافروں کے لئے قید خانہ اور مومنوں کے لئے جنت ہوگی۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اسوہ

جناب پیغمبر اسلام محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کفار کے ساتھ اکثر جنگیں پیش آئیں اور دشمنوں کے ہاتھوں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بے شمار تکلیفیں اٹھائیں۔ خصوصاً مکی زندگی میں آپ سخت بیچارگی کی حالت میں تھے مگر باوجود اس کے آپؐ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ارواح سے کبھی مدد نہیں مانگی، حالانکہ منصب ہدایت کے علمبردار ہونے کے ساتھ وہ آپؐ کے جدامجد بھی تھے۔

---

(۱) مسلم بروایت ابو ہریرہؓ۔ مشکوٰۃ کتاب الرقاق

ایک اعتراض اور اس کا جواب

اگر کوئی قبر پرست کہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قبر مکہ سے بہت دور تھی، اس لئے آپ معذور تھے، تو اسے کہنا چاہئے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قبر تو حطیم کعبہ کے اندر تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معلوم بھی تھی کیونکہ آپ نے ہجرت سے پہلے، اس پر کوئی چیز بطور نذر نہ چڑھائی حالانکہ آپ ان دنوں خوشحال بھی تھے اور غم وفکر کی حالت میں اس پر چہرہ نہ ملا؟ مگر اصل بات یہ ہے کہ آپؐ جیسے مظہر رشد وہدایت سے مشرکانہ افعال کا صدور ہی ناممکن تھا۔(۱)

واقعہ معراج

واقعہ معراج سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنی قبر میں نماز پڑھتے دیکھا مگر اس واقعہ میں کہیں بھی درج نہیں کہ ان سے کسی قسم کی مدد مانگی ہو، بلکہ واقعۂ معراج سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جس کسی سے ملاقات ہوئی، آپ کی طرف سے انہیں کو نفع پہنچا۔ چنانچہ بیت المقدس میں تمام انبیاء علیہم السلام کی ارواح مقتدی ہوئیں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم امام ٹھہرے اور آپ کا ان کو پہلے اسلام علیکم کہنا (جو ایک قسم کی دعا ہے) اسی غرض سے تھا۔ اسی طرح بعض کا آپ کو مرحبا بابن الصالح اور بعض کا مرحبا بالاخ الصالح کہنا اسی بات کی دلیل ہے کہ ان کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نفع عظیم پہنچا۔ اسی لئے انھوں نے مرحبا کہا:(۲)

دوسرا اعتراض اور اس کا جواب

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حدیث معراج میں مروی ہے۔(۳)

فَرَضَ اللّٰهُ عَلٰى اُمَّتِیْ خَمْسِیْنَ صَلٰوةً فَرَجَعْتُ بِتِلْکَ حَتّٰی مَرَرْتُ عَلٰی مُوْسٰی فَقَالَ مَا فَرَضَ اللّٰهُ عَلَیْکَ وَعَلٰی اُمَّتِکَ قُلْتُ فَرَضَ خَمْسِیْنَ صَلٰوةً قَالَ فَارْجِعْ اِلٰی رَبِّکَ فَاِنَّ اُمَّتَکَ لَا تُطِیْقُ ذٰلِکَ فَرَجَعْتُ فَوَضَعَ شَطْرَهَا. الی آخره

---

(۱) صاحب اللمعات الدرجات مرقات ہر دو حضرات نے اس کا اثبات کیا ہے۔ اس پر کلام ہے

(۲) مسلم بروایت ابوہریرہؓ۔ بحوالہ مشکوٰۃ شریف باب المعجزات

(۳) تخریج متفق علیہ بروایت ابوذر۔ مشکوٰۃ باب المعجزات

اللہ تعالیٰ نے معراج میں میری امت پر ۵۰ نمازیں فرض کیں۔ میں لوٹا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام ملے انھوں نے پوچھا آپ کے لئے اور آپ کی امت کے لئے کیا کچھ فرض کیا گیا ہے؟ میں نے کہا پچاس نمازیں: موسیٰ علیہ السلام بولے آپ اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ جائیں اور کمی کرائیں، کیوں کہ آپ کی امت سے اتنا بوجھ نہ اٹھایا جائے گا چنانچہ میں پھر اللہ تعالیٰ کے پاس گیا اور نصف معاف ہوگئیں۔ الی آخرہ۔

تو یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے آپ کا مدد مانگنا نہیں ہے۔ یہ تو بلکہ اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عالم بالا کی وہ کیفیت باوجود قرب اتم حاصل ہونے کے، اب تک معلوم نہ ہوسکیں، جو سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر فوراً منکشف ہوگئی۔ یہی سبب ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو دریافت کرنا پڑا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی امت پر کیا فرض کیا۔ مدد طلب کرنے کی تو یہ صورت ہوتی کہ آپ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس بالارادہ تشریف لاتے اور فرماتے کہ اللہ تعالیٰ نے میری امت پر اتنا بوجھ ڈال دیا ہے آپ اس میں کمی کے لئے سفارش کریں، پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس تشریف لے جاتے اور یہ تخفیف عمل میں آتی مگر یہاں تو بات ہی اور ہے۔ حدیث کے الفاظ میں مررت علی موسیٰ یعنی موسیٰ علیہ السلام پر میرا گزر ہوا۔ ظاہر ہے کہ کسی پر گزر ہونا ایک اتفاقی بات ہے جس میں قصد وعزم کو دخل نہیں۔

ایک اور اعتراض

اگر کوئی پیر پرست کہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود اللہ تعالیٰ کے رسول تھے، آپ کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ قرب اتم حاصل تھا۔ اس لئے آپ کو کسی واسطہ کی ضرورت نہ تھی کیونکہ آپ بغیر کسی واسطے کے اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوسکتے تھے، مگر بزرگوں کی ارواح کو واسطہ بنانے کی اس لئے ضرورت ہے کہ ہم پیغمبر اور رسول نہیں ع چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔ تو ان جاہلوں کو سمجھنا چاہئے کہ حضرت ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ، حسنؓ اور دیگر صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین بھی اللہ کے رسول نہ تھے اس پر بھی مہمات دینی ودنیوی میں تمہاری مانند صاحب گنبد خضراء حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مدد نہیں مانگتے تھے۔

باب تذکرہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم

اسوۂ صدیقی رضی اللہ عنہ

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے دو سال سے زیادہ خلافت کی۔ اور اس مدت میں آپ کو کوئی قسم کی تکلیفیں پیش آئیں مگر کسی روایت سے ثابت نہیں ہوتا کہ آپ نے کسی بھی مصیبت میں صاحب گنبد خضرا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مدد مانگی ہو اور آپ ایسا شرکیہ فعل کیوں کر کر سکتے تھے۔ جب کہ اس کے برعکس آپ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے موقع پر اپنی تقریر میں پیر پرستی کی ایسی تردید کی کہ اس کی بیخ و بنیاد ہی ہمیشہ کے لئے اکھاڑ کے رکھ دی۔

واقعۂ رحلت مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

لکھا ہے کہ جب سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انتقال فرمایا تو عمر فاروق رضی اللہ عنہ صدمہ جدائی کے سبب ایسے پریشان حال اور حواس باختہ ہو گئے تھے کہ کسی کو یہ کہنے کی اجازت بھی نہیں دیتے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وفات پائی۔ اس وقت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ دوسرے مکان میں کسی دوسرے محلّہ میں تشریف لے گئے تھے صحابہ رضی اللہ عنہم نے آپ کو بلوا بھیجا تو آپ آئے اور حجرہ کے اندر تشریف لے گئے۔ جہاں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وجود مبارک تھا، آپ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیشانی پر بوسہ دیا اور پڑھا۔ (۱)

اِنَّکَ مَيِّتٌ وَاِنَّهُمْ مَيِّتُوْنَ

(اے نبیؐ) آپ کو بھی مرنا ہے اور ان (لوگوں) کو بھی مرنا ہے۔

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی تقریر

پھر مسجد نبویؐ کے اندر تشریف لائے، کھڑے ہو کر حمد و ستائش الٰہی کے بعد یہ آیت تلاوت فرمائی:

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ

(۱) حوالہ (الدر المنثور ۴/۳۳۷، ابن المنذر عن ابی هریرةؓ والبیهقی فی الدلائل عن عروةؓ) مصنف نے ابن المنذر والی روایت لی ہے۔

عَلٰٓی اَعْقَابِكُمْ وَمَنْ یَّنْقَلِبْ عَلٰی عَقِبَیْهِ فَلَنْ یَّضُرَّ اللّٰهَ شَیْئًا وَسَیَجْزِی اللّٰهُ الشّٰكِرِیْنَ

اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے سوا کیا ہیں کہ اللہ کے رسول ہیں اور ان سے پہلے بھی اللہ کے رسول گزر چکے (جو اپنے اپنے وقتوں میں ظاہر ہوئے اور راہ حق کی دعوت دے کر دنیا سے چلے گئے) پھر اگر ایسا ہو کہ وہ وفات پا جائیں یا قتل ہو جائیں تو کیا تم الٹے پاؤں راہ حق سے پھر جاؤ گے؟ اور جو کوئی راہ حق سے الٹے پاؤں پھر جائے گا تو وہ (اپنا ہی نقصان کرے گا) خدا کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا اور جو لوگ شکر گزار ہیں تو قریب ہے کہ خدا انہیں ان کا اجر عظیم عطا فرمائے گا۔

اس سے آپ کی مراد یہ تھی کہ لوگوں کو ڈرایا جائے تاکہ یہ لوگ اس حادثۂ عظیم کے سبب سے حواس باختہ ہو کر دین میں سست نہ ہو جائیں۔ پھر فرمایا:

اَیُّهَا النَّاسُ مَنْ كَانَ یَعْبُدُ مُحَمَّدًا فَقَدْ مَاتَ مُحَمَّدٌ ایک روایت میں ہے (فَاِنَّهٗ قَدْ مَاتَ) وَمَنْ كَانَ یَعْبُدُ اللّٰهَ فَهُوَ حَیٌّ لَا یَمُوْتُ

لوگو! جو شخص محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عبادت کرتا تھا وہ سن لے کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فوت ہو گئے اور جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہے تو اللہ زندہ وقائم ہے کبھی فوت نہ ہوگا۔

عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس بے نظیر تقریر کو سن کر ہوش وحواس قائم کیے، صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ آیت "وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ" گویا ہمارے سینوں سے محو ہو گئی تھی۔ جب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے پڑھی تو ہمارے سینے روشن ہو گئے۔

اسوۂ فاروقی رضی اللہ عنہ

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اسوۂ حسنہ بھی پیر پرستی وگور پرستی کی بنیاد اکھیڑ دینے والا ہے اور بزرگوں کی متروکہ اشیا کی تعظیم کو مٹا دینے والا ہے۔ آپ نے ایک موقعہ پر اپنے ہمراہیوں سے فرمایا تھا جب کہ وہ ایک مقام پر نماز پڑھنے کے لئے لپک کر جا رہے تھے، جہاں ایک دفعہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اتفاقیہ نماز پڑھی تھی۔

اِنَّمَا هَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ كَانُوْا یَتَّبِعُوْنَ اٰثَارَ الْاَنْبِیَآءِ

تم سے پہلی قومیں اسی وجہ سے ہلاک ہو گئیں کہ انبیا علیہم السلام کے نشانات کی پیروی کرتی

تھیں اور انہیں کو قابل عبادت بنا لیتی تھیں)

اسوۂ عثمانی رضی اللہ عنہ نمبر ۱

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنے عہد خلافت میں خطبہ کہنے کے وقت بپاس ادب منبر نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس پایہ کو چھوڑ دیا کرتے تھے جس پر سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خطبہ دیا کرتے تھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے عہد خلافت میں دو پائے چھوڑ دیا کرتے تھے ایک سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اور دوسرا خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ کا۔ شیخین کا یہ عمل اتفاق اور عادت کے طور پر تھا۔ عبادت کے خیال سے نہ تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد میں جرأت سے کام لیا اور باوجود اپنے بے مثل ادب اور حیا کے منبر نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پہلے ہی پایہ پر کھڑے ہو گئے جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پایہ تھا۔ آپ نے یہ فعل اس لئے کیا کہ لوگ شیخین کے معمول کو بزرگوں کے موقف اور نشست گاہ تعظیم کیلیے حجت نہ بنالیں اور شرک خفی اور پیر پرستی کے فتنہ کا دروازہ نہ کھل جائے کیونکہ یہی وہ فتنہ ہے جو پہلوؤں میں تعظیم کے نام سے شروع ہوا اور پچھلوں میں **اتخذوا ارباب من دون اللہ** تک پہنچ کر رہا اور ضرور ہے کہ امت مرحومہ کے حق میں بھی اسی طرح ہوتا، کیوں کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

وَاللّٰهِ لَتَرْكَبُنَّ سُنَنَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ(۱)

بخدا تم وہی طریقے اختیار کرو گے جو اگلوں نے کئے۔

اور بعض روایتوں میں شبرا شبرا فرمایا۔ یعنی ہر وہ گناہ جو پہلی امتوں میں رواج پا گیا تم میں بھی ہونے لگے گا، الحمدللہ کہ اس فتنہ کا دروازہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اس عمل سے بند ہو گیا۔

اسوۂ عثمانی رضی اللہ عنہ نمبر ۲

جس طرح مذکورہ بالا فعل سے فتنہ تعظیم کی ابتلا رک گئی اسی طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ایک اور فعل سے ایک دوسرے فتنہ کی مدافعت بھی ہو گئی کہ وہ پیشواؤں کے غیر شرعی امور وافعال سے چشم پوشی کرنے کا فتنہ ہے اور ان کے خلاف شرعی احکام کی تعمیل کو بھی واجب جاننا ہے حالانکہ یہی اللہ کے سوا دوسروں کو معبود بنانا ہے، جس کا ذکر اوپر ہو چکا۔ امام احمد رحمتہ اللہ علیہ جو

(۱) حوالہ ترمذی، بروایت ابوواقد لیثی بحوالہ مشکوٰۃ باب الفتن

ائمہ اربعہ میں سے ہیں، طحاوی، ابوبکر بن شیبہ اور ابن عبدالبر رحمہم اللہ اپنی تصنیفات میں لکھتے ہیں:

اِنَّ عُثْمَانَ صَلّٰی بِالنَّاسِ بِمِنٰی اَرْبَعًا فَاَنْکَرَالنَّاسُ عَلَیْهِ فَقَالَ اَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ تَاَهَّلْتُ بِمَکَّةَ مُنْذُ قَدِمْتُ وَاِنِّیْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ مَنْ تَاَهَّلَ بِبَلَدَةٍ فَلْیُصَلِّ صَلٰوةَ الْمُقِیْمِ فِیْهَا. (۱)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے منی میں لوگوں کے ہمراہ چار رکعت نماز پڑھی (حالانکہ مسافر ہونے کی وجہ سے صرف دو پڑھنی ضروری تھیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معمول تھا کہ منی میں دوگانہ ہی پڑھتے تھے) لوگوں نے اس پر اعتراض کیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جواب دیا لوگو! جس وقت سے میں مکہ میں آیا ہوں میں نے باقاعدہ یہیں سکونت اختیار کر لی ہے، یعنی مکہ میں میرے اہل وعیال موجود ہیں اور میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے کہ جو شخص کسی شہر میں باقاعدہ اہل بنالے اس کو چاہئے کہ اس شہر میں پوری نماز ادا کرے۔

یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معمول تھا کہ منی میں دوگانہ پڑھا کرتے تھے۔ مگر جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مدینہ منورہ سے حج کیلئے تشریف لائے تو آپؓ نے لوگوں کے ساتھ چار رکعت نماز پڑھی اور ہر چند کہ دو رکعت چار رکعت میں داخل ہیں، مگر پھر بھی بہ سبب تغیر، سنت صحابہ رضی اللہ عنہم نے آپؓ کے اس فعل پر انکار و اعتراض کیا اور جب تک آپؓ سے معقول شرعی عذر نہ سن لیا، خاموش نہ رہے، حالانکہ آپؓ اس وقت کے خلیفہ اور سب کے امام و پیشوا تھے تو آپؓ نے فرمایا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب مکہ میں تشریف لائے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حالت مسافرانہ ہوتی تھی، اس لئے آپ دوگانہ پڑھا کرتے تھے، مگر میری حالت اس سے مختلف ہے۔ بات یہ تھی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے آتے ہی مکہ شریف میں ایک عورت سے شادی کر لی تھی۔ اس لئے آپؓ کی حالت مکہ شریف میں مقیم کی سی ہوگئی تھی اور ایسی صورت میں اجماع کا فیصلہ ہے کہ پوری نماز پڑھنا واجب ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ پیشواؤں کے ان احکام واعمال پر اعتراض نہ کرنا جو سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طریقہ کے خلاف ہوں اور پیر پرستوں کا یہ کہنا کہ پیر جو کچھ حکم دے اس کو بلا تامل ماننا ضروری ہے اور اس کی دلیل میں شعر پیش کرنا کہ:

(۱) حوالہ طحاوی باب صلوۃ المسافر

اگر شہ روز را گوید شب است ایں

بباید گفت اینک ماہ و پرویں (۱)

بالکل لغو اور بے ہودہ عذر ہے۔

اسوۂ فاروقی رضی اللہ عنہ

اس فتنہ کے دور کرنے کی تائید میں ایک واقعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بھی ہے جس میں ان کی رائے کے مطابق قرآن مجید کی آیات اتریں، وہ واقعہ (۲) یہ ہے کہ جب مشہور منافق عبداللہ بن اُبی بن سلول مر گیا تو اس کا بیٹا، جس کا نام بھی عبداللہ ہی تھا اور وہ مخلص مومن تھا۔ خدمت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ حضور میرے باپ کی قبر پر تشریف لے چلئے اور اس کی مغفرت کے لئے دعا فرمایئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کی دلداری کے لئے تشریف لے گئے اور اس کی قبر پر کھڑے ہو کر دعا کرنی چاہی۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چادر پکڑ لی اور کہا یا رسول اللہ...... آپ ایک منافق کی قبر پر کھڑے نہ ہوئیے اور نہ دعا فرمایئے، کیونکہ وہ خدا (اور اس کے رسول کا) دشمن تھا۔ اسی جگہ نزول وحی ہوا اور یہ آیت کریمہ اتری۔

وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓی اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰی قَبْرِهٖ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ

اور ان میں سے کوئی مر جائے تو اس کے جنازہ پر کبھی نماز نہ پڑھیئے اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہوئیے کیونکہ انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا ہے اور حالت کفر ہی میں مرے ہیں۔

جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو منع کرنے کا حق حاصل تھا اور اس پر نہ صرف یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ناراض نہیں ہوئے بلکہ اس کی تائید و موافقت میں آیت نازل ہوئی، جو کہ اللہ تعالیٰ کی رضامندی اور خوشنودی کی دلیل ہے تو لازم آتا ہے کہ نہ تو

---

(۱) اگر بادشاہ کہے دن کو کہ اس وقت رات ہے تو جواب میں یہی کہنا چاہیے کہ ہاں! یہ دیکھئے چاند اور تارے۔
(۲) حوالہ مسلم بروایت ابن عمر۔ باب فضائل عمرؓ

پیروں کے آداب حد سے زیادہ بڑھائے جائیں، نہ ان کے اتباع کو سنت کے اتباع پر ترجیح دی جائے کیوں کہ ایسا کرنا سچے مسلمان کی شان سے بعید ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا (۵:۱۱۵)

اور جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت کرے گا بعد اس کے کہ اس پر امر حق ظاہر ہو چکا تھا اور مسلمانوں کا راستہ چھوڑ کر دوسرے راستے ہوے گا تو ہم اس کو جو کچھ وہ کرتا ہے کرنے دیں گے اور اس کو جہنم میں داخل کریں گے اور وہ بہت بری جائے قرار ہے۔

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس قول کا بھی یہی مطلب ہے کہ:

اُنْظُرْ اِلٰى مَا قَالَ وَلَا تَنْظُرْ اِلٰى مَنْ قَالَ

جو بات کہی گئی ہے اس کو دیکھ۔ کہنے والے کی طرف مت دیکھ۔

یاد رکھنا چاہئے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ قول ایسی مکمل نصیحت ہے کہ ہمیشہ کام آنے والی ہے۔ دجال کے عہد میں جن لوگوں کا عمل اس کے خلاف ہوگا وہ اس کی کرشمہ سازیوں اور شعبدہ بازیوں کی پہلی ہی جھلک میں گمراہ ہو جائیں گے اور ہر اس راہ کو جو جہنم کی طرف جاتی ہے جنت کی راہ سمجھ کر اس کے پیرووں میں داخل ہو جائیں گے۔

خیر الناس کا قصہ (۱)

صحیحین میں ایک واقعہ دجال کے ذکر میں آتا ہے کہ جب دجال مدینہ کے قریب ایک بنجر زمین میں پہنچے گا تو ایک شخص جس کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ:

وَهُوَ خَيْرُ النَّاسِ اَوْ مِنْ خَيْرِ النَّاسِ

وہ سب لوگوں سے اچھا ہوگا یا اچھے لوگوں میں سے ہوگا۔

دجال کے پاس آئے گا اور کہے گا کہ میں گواہی دیتا ہوں اور اعلان کرتا ہوں کہ تو وہی دجال ہے جس کی نسبت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پیشین گوئی فرمائی تھی۔

دجال حاضرین سے کہے گا اگر میں اس شخص کو قتل کر کے پھر زندہ کر دوں تو کیا میری

---

(۱) متفق علیہ بروایت ابوسعید خدریؓ بحوالہ مشکوۃ باب بین یدی الساعۃ

صداقت میں کچھ شک ہے۔ اس کی جماعت کے لوگ کہیں گے نہیں تو دجال اس کو قتل کردے گا مگر وہ شخص پھر بھی یہی کہے گا کہ اب تو مجھے یقین آ گیا ہے کہ تو واقعی دجال موعود ہے، کیونکہ اس واقعہ کی خبر بھی پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی پیشین گوئی میں دے دی ہے۔ اب کے دجال دوبارہ اس کو قتل کرنے کی کوشش کرے گا مگر نہ کر سکے گا۔

الحمد للہ کہ ایمان و اسلام کا انحصار خلاف معمول باتوں کے ماننے پر نہیں رکھا گیا۔ اگر ایسا ہوتا تو کوئی شخص بھی دجال کے عہد میں کفر سے نہ بچ سکتا۔

حاصل یہ کہ اس وقت بھی ہم پر لازم ہے کہ کسی کا قول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول و فعل کے موافق ہو تو مانیں ورنہ رد کریں۔ نہ اس پر عمل کریں اور نہ اس کو حجت جانیں۔

باب ذکر المشائخ

مشائخ کا فعل حجت نہیں

شیخ نصیر الدین محمود قدس سرہ

شیخ الاسلام نصیر الدین محمود قدس سرہ جو چراغ دہلی کے نام سے مشہور ہیں، سلطان المشائخ نظام الدین اولیا کے خلیفہ تھے، آپ نے فرمایا ہے کہ کہ مشائخ کا کوئی فعل حجت نہیں، بعض لوگوں نے آپ کے اس قول پر اعتراض کیا تو حضرت سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیا رحمتہ اللہ علیہ نے اعتراض کرنے والوں سے کہا کہ محمود صحیح کہتا ہے۔

شہاب الدین عمر سہروردی رحمتہ اللہ علیہ

سیر المشائخ میں لکھا ہے کہ ایک دن شیخ الشیوخ شہاب الدین عمر سہروردی رحمتہ اللہ علیہ نماز کے لئے اپنی نشست گاہ سے باہر تشریف لائے، آپ کے مرید وضو کر رہے تھے، جب آپ کو دیکھا تو وضو چھوڑ دیا۔ لیکن ایک مرید وضو کرتا رہا اور فراغت پا کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور سلام عرض کیا حضرت شیخ نے اس کی یہ ادا پسند کی اور اس سے کہا "بھائی تو نے اچھا کیا کہ خدا کی تعظیم کو مخلوق کی تعظیم پر مقدم رکھا"۔

اسوۂ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

لوگوں کو آداب سکھانے کیلئے اس سے بڑھ کر ایک واقعہ حدیث میں آتا ہے کہ کچھ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت کیلئے یمن سے مدینہ آئے۔ ابھی اونٹوں پر ہی تھے کہ چہرۂ انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دیکھ لیا سب کے سب اونٹوں سے نیچے کود پڑے اور بھاگ کر خدمت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں حاضر ہو گئے۔ مگر اس جماعت میں ایک شخص تھا، جو پہلے مسجد (نبوی) میں گیا دو رکعت نماز ادا کی اور اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس شخص پر سب سے زیادہ خوشی اور شفقت کا اظہار کیا۔(۱)

اس قسم کے بے شمار واقعات ہیں جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تابعین رحمہم اللہ اور مشائخ سالکین رحمتہ اللہ علیہم کے حالات میں ملتے ہیں۔

علم کی فضیلت

اصل میں ساری مصیبت جہالت اور بے خبری کی وجہ سے ہے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

هَلْ يَسْتَوِی الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ

کیا ارباب علم اور جاہل لوگ برابر ہو سکتے ہیں؟ یقیناً وہی لوگ نصیحت حاصل کرتے ہیں جو اہل عقل ہیں۔

ایک حدیث میں لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ماہ رجب کی کسی رات مسجد میں تشریف لائے تو دیکھا کہ حضرت ابوبکر صدیق اور علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہما یہ آیت پڑھ کر رو رہے تھے

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ

اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور مال جنت کے بدلے میں خرید لئے ہیں۔

تو یہ خوف الٰہی کی دولت تھی، جو اللہ تعالیٰ نے علم کی بدولت ان کو عطا فرمائی تھی۔علم وہ چیز ہے جس کی ترقی کے لئے اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ دعا تلقین فرمائی حالانکہ خود ان کو سارے جہاں کے لئے معلم بنا کر بھیجا:

رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا

اے میرے پروردگار میرا علم بڑھا۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے۔

طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ وَّ مُسْلِمَةٍ

---

(۱) تخریج۔شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اپنی کتاب مدارج النبوۃ حصہ دوم میں روضۃ الاحباب اور دوسرے ارباب کے حوالہ سے یہ واقعہ نقل کیا ہے۔یہ وفد عبدالقیس کا تھا جس میں عبداللہ شیخ پہلے مسجد نبوی میں آئے غسل کیا دوگانہ ادا کیا پھر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اس کے اس طرز عمل کو حضورؐ نے بہت پسند فرمایا اور فرمایا کہ تم میں دو خصلتیں ہیں جو اللہ کو بہت پسند ہیں۔حلم اور بردباری

علم حاصل کرنا ہر مسلم مرد و عورت پر فرض ہے۔

شیخ سعدی رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا۔ شعر

پے علم چوں شمع باید گداخت

کہ بے علم نتواں خدارا شناخت

مگر جاہل صوفی جن کے متعلق بجا طور پر کہا گیا ہے کہ:

مَنْ تَصَوَّفَ وَلَمْ یُفَقِّهُ فَتَزَنْدَقَ

جو شخص تصوف اختیار کرتا ہے لیکن اسے سمجھتا نہیں وہ کافر ہو جائے گا۔

اس آیت اور حدیث کے معانی الٹ کر یوں بیان کرتے ہیں۔

کہ جس علم کو حاصل کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہ وہ علم ہے جو سینہ بہ سینہ چلا آتا ہے، ان لیٹروں نے اس فریب سے کئی لوگوں کو لوٹا اور ایسا برباد کیا ہے کہ معرفت کی راہ اور صراط مستقیم ان پر ہمیشہ کے لئے گم ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ ایسے وسوسہ اندازوں کے شر سے بچائے جو لوگوں کے سینوں میں شیطان کی طرح وسوسہ اندازی کرتے رہتے ہیں۔

یہ بد بخت علم جیسی نعمت، کو جسے حاصل کرنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہر مسلمان پر فرض فرمایا: دماغ سوزی قرار دیتے ہیں، اور ذو معنی اشعار سنا سنا کر لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں اور آیات واحادیث کے معانی اور بزرگوں کے اقوال کا مفہوم الٹ کر جاہلوں کے ایمان کو لوٹتے رہتے ہیں۔ مثلاً اس قسم کے اشعار پڑھتے ہیں

علم حق در علم صوفی گم شود

ایں سخن کے باور مردم شود

کہ تصوف کے علم میں ہی حق کا علم گم ہے۔ مگر لوگ اس حقیقت کو کب مانتے ہیں۔

ان میں سے جو عربی جانتے ہیں وہ عربی عبارتیں اپنے مدعا کی تائید میں پیش کر دیتے ہیں تا کہ بے فہم و جاہل مخاطب اسے فرمودہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سمجھ کر ان کا مطیع و منقاد ہو جاتے ہیں۔ مثلاً یہ سناتے ہیں کہ:

اَلْعِلْمُ حِجَابٌ اَکْبَرُ وَالْجَهْلُ عِنْدِیْ اَحَبُّ مِنَ الْعِلْمِ

علم بہت بڑا پردہ ہے اور جہالت مجھے علم کی بہ نسبت زیادہ پسندیدہ ہے۔

حاشا وکلا ایسے وہم میں ڈالنے والے کلمات آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فرمودہ نہیں ہوسکتے صوفیائے متاخرین کا قول ہے کہ اَلْعِلْمُ حِجَابٌ اَکْبَرُ میں العلم سے مراد خودی کا علم ہے۔ جس کے سبب سے علوم الٰہی کے دروازے اس پر وا نہیں ہوسکتے اور اَلْجَھْلُ عِنْدِیْ اَحَبُّ مِنَ الْعِلْمِ میں الجہل سے مراد عارفانہ تجاہل ہے جیسے کوئی شخص عالم ہونے کے باوجود اپنے آپ کو جاہل سمجھے، تاکہ نفس کی شرارت سے محفوظ رہے۔

تو ان اقوال کو اگر کم از کم بزرگان دین کے اقوال بھی تسلیم کرلیا جائے تب بھی ان کے معانی یہی ہوسکتے ہیں جو صوفیائے متاخرین نے بیان کیے ہیں، نہ کہ وہ جو یہ گمراہ فرقہ بیان کرتا ہے۔

سلطان الاولیا ابراہیم بن ادہم بلخی رحمۃ اللہ علیہ بڑے مشائخ میں سے ہیں، آپ نے کئی سال علوم دین کی تحصیل اور ریاضت و مجاہدہ کی سعادت حاصل کرنے میں صرف کئے آپ کی ایک رباعی ہے۔

ہرگز دل من زعلم محروم نہ شد
کم بود ز اسرار کہ مفہوم نہ شد
ہفتاد و دو سال سعی کردم شب و روز
معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد

(میرا دل علم سے محروم نہیں رہا۔ بہت کم ایسے بھید ہیں جو مجھ پر نہیں کھلے، بہتر برس دن رات میں نے طلب علم میں کوشش کی مگر بالآخر یہی معلوم ہوتا تھا کہ مجھے کچھ بھی نہیں آتا) گویا کہ یہ **ماعرفناک حق معرفتک** کا صحیح ترجمہ ہے۔

انصاف کی نظر سے دیکھو بزرگان دین کے کلام اور ان بھیڑیوں کے شور میں کتنا فرق ہے۔

یہ تو اصل میں لوگوں کو پھاڑ کھانے کے لئے دنیا کے جمعدار بنتے ہیں اور شیخ سدو کی طرح جو حقیقت میں راہ دین کے لئے سد راہ ہے تصوف کا دعویٰ کر کے ناجائز طریقہ سے لوگوں کا مال ہڑپ کرتے رہتے ہیں۔

بہ بیں تفاوت راہ از کجا است تا بہ کجا

صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔(۱)

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَقْبِضُ الْعِلْمَ اِنْتِزَاعاً یَنْتَزِعُہٗ مِنَ الْعِبَادِ وَلٰکِنْ یَقْبِضُ الْعِلْمَ بِقَبْضِ الْعُلَمَاءِ حَتّٰی اِذَا لَمْ یَبْقَ عَالِمٌ اِتَّخَذَ النَّاسُ رُؤُسَ جُھَّالاً لَا نَسْئَلُوْا فَاَفْتَوْا بِغَیْرِ عِلْمٍ فَضَلُّوْا وَاَضَلُّوْا

اللہ تعالیٰ علم کو لوگوں سے چھین کر نہیں اٹھائے گا۔ اصل میں علما حق کے اٹھ جانے سے علم خود بخود اٹھ جائے گا، یہاں تک کہ جب ایک بھی عالم ربانی باقی نہ رہے گا تو لوگ جاہلوں کو امام و پیشوا بنالیں گے اور ان سے مسائل پوچھیں گے وہ بغیر علم کے فتویٰ دیں گے اور یوں خود گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔

اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَعُوْذُبِکَ مِنَ الضَّلَالِ وَنَسْئَلُکَ الْعِلْمَ وَالْھِدَایَۃَ

الٰہی ہم گمراہی سے تیری پناہ چاہتے ہیں اور علم وہدایت کا تجھ سے سوال کرتے ہیں۔

غلو فی الدین

قرآن مجید کی تعلیم سے ظاہر ہوتا ہے کہ دین میں مبالغہ کرنا وہ فتنہ ہے جس نے اہل کتاب کو گمراہ کر دیا۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو سمجھانے کے لئے بنی اسرائیل سے فرماتا ہے۔

یَا اَھْلَ الْکِتَابِ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ غَیْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوْا اَھْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا کَثِیْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِیْلِ.

اے اہل کتاب! اپنے دین میں سچائی اور حقیقت کے خلاف غلو نہ کرو اور اس قوم کی خواہشات کی پیروی مت کرو جو تم سے پہلے گمراہ ہو چکی اور جس نے بہتوں کو گمراہ کر دیا اور خود راہ راست سے بھٹک گئی۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ نفسانی خواہشات کی پیروی کرنا گمراہی ہے۔ چاہے وہ اپنی ہوں یا غیر کی۔ راہ راست یہی ہے کہ دین میں غلو اور مبالغہ نہ کیا جائے۔ مگر مسلمان فتنہ میں اسی طرح مبتلا ہو گئے جس طرح بنی اسرائیل مبتلا ہوئے تھے اور علمائے حق کی نصیحتوں پر کان نہیں دھرتے۔ حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ:

---

(۱) حوالہ متفق علیہ بروایت عبداللہ بن عمرو مشکوٰۃ کتاب العلم

عُلَمَاءُ اُمَّتِیْ کَاَنْبِیَاءِ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ (باتفاق ائمہ بے بنیاد حدیث ہے)۔

میری امت کے علماء انبیاء بنی اسرائیل کی مانند ہیں۔

بنی اسرائیل میں ایک جماعت کا یہی حال تھا جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اگلی آیت میں اس طرح فرمایا ہے۔

لُعِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ عَلٰی لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ ذٰلِکَ بِمَا عَصَوْا وَّکَانُوْا یَعْتَدُوْنَ کَانُوْا لَایَتَنَاھَوْنَ عَنْ مُّنْکَرٍ فَعَلُوْہُ لَبِئْسَ مَا کَانُوْا یَفْعَلُوْنَ

بنی اسرائیل میں سے جنہوں نے کفر کیا وہ حضرت داؤد و عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کی زبان سے لعنت کیے گئے یہ اس لئے کہ انھوں نے نافرمانی کی اور حد سے نکل گئے۔ ان کا یہ معمول تھا کہ ایک دفعہ برائیوں میں پڑ جاتے تو باز نہیں آتے تھے ان کا یہ فعل بے شک بہت برا تھا۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ارتکاب معاصی پر اصرار کرنا ہی اس بدنصیب گروہ کی گمراہی کا سبب بنا، جس سے نوبت یہاں تک پہنچی کہ منکرات کو مباح کہنے لگے اور جب انبیا نے اس سے منع فرمایا تو حکم عدولی کرنے لگے، اور خدا کی لعنت کے مستحق ہوں گے۔

حضرت داؤد علیہ السلام نے ان پر اس لئے لعنت فرمائی تھی کہ سبت (۱) کے روز جس میں شکار کھیلنا ممنوع تھا، حیلہ بازی کر کے مچھلیوں کا شکار کرتے تھے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس لئے لعنت فرمائی کہ ان کی دعا سے ملی ہوئی نعمتوں میں سے جن کا ذخیرہ رکھنا ممنوع تھا، کچھ حصہ چرا کر فروخت کر ڈالتے تھے۔

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن وحدیث کے خلاف عمل کرنا اور حیلہ بازی سے حلال کو حرام بنالینا خدا کی رحمت سے دور کر دیتا ہے۔

فقہا کے نزدیک گناہ کو جائز جاننا ہی کفر ہے چنانچہ لکھا ہے کہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے حق میں بدزبانی کرنا بھی کفر ہے۔

الصوفی لا مذہب لہ

غرض یہ قبر پرست، پیر پرست، آثار پرست اور تصویر پرست وہ تمام چیزیں کرتے ہیں جو

(۱) ہفتہ میں مچھلی کا شکار یہود کے لئے ممنوع تھا۔

مشرکان قدیم وجدید کرتے ہیں اور جب سمجھایا جائے تو انہیں کا سا جواب دیتے ہیں۔ جاہلوں سے کہتے ہیں کہ پیر پرستی خدا کو مقبول ہے اور تعلق باللہ کا واحد ذریعہ یہی ہے۔ ملا لوگ یونہی بکواس کرتے ہیں۔ ان کی باتیں قطعاً نہیں سننی چاہیئے۔ صرف پیروں کے ارشادات کو دل میں جگہ دینی چاہیئے۔ حنفی، شافعی کے فضول جھگڑوں میں، ہرگز نہیں پڑنا چاہیئے۔ بزرگوں نے فرمایا ہے کہ الصوفی لامذہب لہ (صوفی کا کوئی مذہب نہیں ہوتا)

حضرت شیخ محی الدین جیلانی حنبلی المذہب تھے

واضح ہو کہ حضرت سید محی الدین جیلانی رحمتہ اللہ علیہ مذہب حنبلی رکھتے تھے اور فتویٰ شافعی مذہب کا دیتے تھے حضرت معین الدین چشتی رحمتہ اللہ علیہ شافعی تھے۔ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی رحمتہ اللہ علیہ بھی شافعی تھے۔ اور خواجہ عبدالخالق غجدانی رحمتہ اللہ علیہ خواجہ احمد بسوری رحمتہ اللہ علیہ اور خواجہ بہاء الدین نقشبندی رحمتہ اللہ علیہ جو سلسلہ نقشبند اور بسویہ سے تعلق رکھتے تھے، حنفی المذہب تھے۔ کوئی پوچھے، یہ لامذہب صوفی جو اپنے بزرگوں کو بدنام کرنے والے ہیں، قیامت کے دن کس جماعت میں اٹھیں گے؟ ان کے القاب تو دیکھو تو کوئی قادری کہلاتا ہے، کوئی چشتی، کوئی سہروردی، کوئی نقشبندی، یہ القاب علویہ، جعفریہ، افطحیہ، زیدیہ، اثنا عشریہ اور مہدیہ جعفریہ، امامیہ کی طرح بالکل جھوٹے اور بے معنی ہیں۔ جن بزرگوں کی طرف یہ لوگ اپنی نسبت کرتے ہیں۔ ان کے عقائد و اعمال میں سے تو ایک چیز بھی ان کے پاس نہیں۔ اوحدی نے کہا

روح قرآں برآسماں بردند　　نقد تحقیق ازمیاں بردند
درحقیقت بدست کورے چند　　مصحفے ماند وکنہ کورے چند
کور باکس نمے گوید　　سر قرآن کسے نمے جوید

قرآن کریم کی روح آسمان پر چلی گئی اور تحقیق بھی لوگوں کے درمیان سے اٹھالی گئی اب تو بس چند اندھوں کے ہاتھوں میں قرآن مجید اور اس پر چند اعتراضات رہ گئے ہیں۔ اب یہ حال ہے کہ اندھا نہ کسی سے بات کرتا ہے نہ کوئی خود قرآن کے معنی تلاش کرتا ہے۔ یعنی قرآن مجید میں غور نہیں کرتے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اَفَلَا یَرَوْنَ اَلَّا یَرْجِعُ اِلَیْهِمْ قَوْلاً وَّلَا یَمْلِکُ لَهُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا

کیا یہ نہیں دیکھتے کہ وہ ان کی کسی بات کا جواب نہیں دیتا اور نہ ان کے نفع ونقصان کا کچھ اختیار رکھتا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:(۱)

عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّمَ يُوْشِكُ اَنْ يَّاتِيَ عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ لَا يَبْقٰى مِنَ الْاِسْلَامِ اِلَّا اِسْمُهٗ وَلَا يَبْقٰى مِنَ الْقُرْآنِ اِلَّا رَسْمُهٗ مَسَاجِدُهُمْ عَامِرَةٌ وَهِيَ خَرَابٌ مِنَ الْهُدٰى عُلَمَاءُ هِمْ شَرُّ مَنْ تَحْتَ اَدِيْمِ السَّمَآءِ مِنْ عِنْدِهِمْ تَخْرُجُ الْفِتْنَةُ وَفِيْهِمْ تَعُوْدُ.

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''لوگوں پر ایک وقت آئے گا جب اسلام کا صرف نام اور قرآن کے صرف نقوش ہی باقی رہ جائیں گے۔ مسلمانوں کی مسجدیں نمازیوں سے بھری ہوں گی مگر ہدایت کا نام ونشان تک ان میں نہ ہوگا اس وقت کے علماء دنیا میں بدترین خلائق ہوں گے۔ انہی سے ایک فتنہ پیدا ہوگا اور انہی کی طرف لوٹے گا۔

اس حدیث کو ابوبکر احمد بن حسین بیہقی رحمتہ اللہ علیہ نے شعب الایمان میں بیان کیا ہے۔ ہاں بعض اللہ کے بندے آج بھی موجود ہیں جو سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور طریق صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ ساتھ طریقت ومعرفت کی راہ پر چل رہے ہیں۔ اگر ایسی ہستیوں کا وجود بھی ہم میں نہ ہوتا تو اسلاف کی بزرگی و پارسائی بھی ان نام نہاد و جاہل صوفیوں کی ناشائستہ حرکات کی وجہ سے مشتبہ ہو جاتی۔

بت پرستوں اور قبر پرستوں میں مشابہت

۱۔ جس طرح بت پرست بتوں کو ریشمی لباس پہناتے ہیں۔ اسی طرح یہ لوگ قبروں پر ریشمی غلاف ڈالے رکھتے ہیں۔ ان سے پوچھنا چاہئے کہ اگر قبر پیر کی قائم مقام ہے جیسا کہ تم سمجھتے ہو تو جس طرح پیر کے لئے ریشم پہننا حرام تھا، اس کی قبر کے لئے بھی حرام ہوگا۔ اگر قبر پیر کی قائم مقام نہیں تو تمہارا اس سے مرادیں مانگنا کیا معنی رکھتا ہے۔

۲۔ جیسے بت پرست حاجت روائی کے لئے بتوں اور ان کے مجاوروں کے لئے نذریں لے

(۱) بیہقی بروایت علیؓ (بحوالہ مشکوٰۃ کتاب العلم)

جاتے ہیں، ویسے ہی قبر پرست بھی اپنی تمام مشکلات میں بزرگوں کی قبروں اور ان کے مجاوروں کے لئے نذر و نیاز لے جانا ضروری سمجھتے ہیں۔

۳۔ بت پرستوں کی ایک یہ بھی عادت ہے کہ ہر بت کی زیارت کے لئے ایک دن شمسی ماہ کے حساب سے مقرر کرتے ہیں، جس میں سب اکٹھے ہو کر پھول، شیرینی، نقد اور جنس وغلہ وغیرہ اس پر چڑھاتے ہیں اور اس کو سجدہ کرتے ہیں، پیر پرست بھی ہر قبر کی زیارت کے لئے قمری ماہ کا ایک دن مقرر کرتے ہیں، جس میں نہ صرف اکٹھے ہو کر وہ سب کچھ کرتے ہیں جو مذکور ہوا بلکہ سرود ورقص وارتکاب فواحش بھی ...... پیر کا مجرا سمجھ کر کرتے ہیں۔ یہ جو (درحقیقت) حشر کے دن ان کے بداعمال میں شمار ہوگا۔ افسوس اس جماعت نے ہنسی مذاق کو دین کی طرح محکم پکڑ رکھا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کو کافر فرمایا ہے جو دین کو ہنسی مذاق بنا لیتے ہیں اور ان پر جنت کا آب ودانہ حرام کر دیا ہے۔ ارشاد ہے:

اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَهْوًا وَّلَعِبًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فَالْيَوْمَ نَنْسٰهُمْ كَمَا نَسُوْا لِقَآءَ يَوْمِهِمْ هٰذَا وَمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ.

اللہ تعالیٰ نے جنت کا آب ودانہ کافروں پر حرام کر دیا ہے جنھوں نے اپنے دین کو لہو ولعب بنا رکھا تھا اور جن کو دنیوی زندگی نے دھوکہ میں ڈال رکھا تھا۔ سو آج ہم بھی ان کو اسی طرح بھلا دیں گے جس طرح انھوں نے اپنے اس دن کی ملاقات کو بھلا دیا تھا اور جس طرح ہمارے احکام کا انکار کرتے تھے۔

۴۔ بت پرستوں کی یہ بھی عادت ہے کہ مقررہ ایام میں اپنے بتوں کو سجا کر جلوس نکالتے ہیں۔ پیر پرست اور قبر پرست بھی جھوٹی قبروں کا تعزیہ بنا کر ایام عاشورہ میں گھماتے ہیں۔

۵۔ بت پرست اپنے بتوں کے نام کے جھنڈے بلند کرتے ہیں اور ان کو بتوں کا قائم مقام سمجھ کر ادب سے اٹھائے پھرتے ہیں، پیر پرست بھی شاہ مدار، خواجہ معین الدین چشتی، سالار مسعود غازی اور سخی سرور سلطان رحمہم اللہ کے نام کے جھنڈے ایام مقررہ میں اٹھا کر پھرتے ہیں اور گلی کوچوں میں گھما گھما کر ان کی منسوبہ قبروں پر گاڑ دیتے ہیں اور اس تمام کارروائی کو کار ثواب جانتے اور مشکلات کے حل کا ذریعہ سمجھ کر کرتے ہیں۔

بیرونی شہادت

بعض اہل علم باہر سے ہندوستان میں وارد ہوئے جنھوں نے یہ سب کارروائیاں بچشم خود ملاحظہ کیں، اس جماعت کے حالات دیکھے اور ان کی باتیں سنیں ان بزرگوں میں سے بعض کے الفاظ یہ ہیں:

هٰؤُلَاءِ عِنْدَ الشُّيُوْخِ وَالْقُبُوْرِ يَقْتَدُوْنَ بِكُفْرَةِ الْهِنْدِ وَنِي عِبَادَةِ الْأَصْنَامِ.

یہ لوگ قبروں پر اور اپنے پیروں کے سامنے اسی طرح کرتے ہیں جس طرح مشرکین ہند اپنے بتوں کے سامنے عبادت کرتے ہیں۔

حالانکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَاجْتَنِبُوْا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ.

پس چاہئے کہ بتوں کی ناپاکی سے بچے رہو، نیز جھوٹ بولنے سے۔

۶۔ آتش پرستوں اور بت پرستوں کی یہ بھی عادت ہے کہ سال میں ایک دن بتوں کی عید مناتے ہیں۔ ان کی مانند یہ لوگ بھی عید غدیر مناتے ہیں، بزرگوں کے عرس منعقد کرتے ہیں، مشرکین کی طرح داد عیش وطرب اور لہو ولعب دیتے ہیں اور شیطانوں کی خبیث ارواح کو خوش کرتے ہیں۔

ایک عابد کا واقعہ

چنانچہ بعض معتبر لوگوں کی زبانی سنا کہ ایک عابد خواجہ قطب الدین رحمتہ اللہ علیہ کے عرس پر آیا کرتا تھا اور ایام عرس میں ایک عالم کے پاس فروکش ہوا کرتا تھا۔ اس نے دیکھا جس عالم کے پاس ٹھہرتا ہے وہ عرس میں شریک نہیں ہوتا۔ اس نے وجہ پوچھی تو عالم نے کہا۔ ایام عرس میں زیارت کرنا کچھ ضروری نہیں۔ بلکہ اہل بدعت کے مجمع کو رونق نہ دینا ہی بہتر ہے کیوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قبروں کو عیدگاہ بنانے سے منع فرمایا ہے۔ اس کے بعد عابد مذکور نے خواب میں دیکھا کہ حضرت خواجہ اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑے ہوئے کمر تک قبر سے باہر نکلے اور لوگوں کے اژدہام وہجوم سے بیزاری کا اظہار کر رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر عابد مذکور نے بھی عرس میں شامل ہونا چھوڑ دیا اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس ممانعت سے کہ میری قبر کو عیدگاہ نہ بنانا

ہدایت حاصل کی۔(۱)

علامہ ابوالعباس رحمتہ اللہ علیہ کا خیال

علامہ ابوالعباس احمد رحمتہ اللہ علیہ مفتی شام جو اپنے زمانے میں حجت الاسلام کے لقب سے مشہور تھے، اپنی تصنیف صراط مستقیم میں زیر حدیث مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ (کہ جس نے کسی قوم کی ریس کی وہ انہی میں سے ہے) لکھتے ہیں "مشرکین کے ساتھ ہر قسم کا تشبہ ممنوع ہے" اس کی تائید حضور کے اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے۔

خَالِفُوا الْمُشْرِكِيْنَ(۲)

(مشرکوں کی مخالفت کرو)

علامہ موصوف رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی کتاب میں ایک باب باندھا ہے، جس کا نام ہے باب تحریم تشبیہ بالکفار در اعیاد و رسوم و عادات، اور اس میں آیات، احادیث اور آثار صحابہ رضی اللہ عنہم سے مثالیں دیتے ہوئے ثابت کیا کہ مسلمانوں کو اپنی عیدوں اور رسوم و عادات میں کفار کی ریس کرنا حرام ہے۔ آگے چل کر زیر حدیث۔

مَا اَحْدَثَ قَوْمٌ بِدْعَةً اِلَّا نَزَعَ اللّٰهُ عَنْهُمْ مِنْ سُنَّتِهِمْ مِثْلَهَا.

جب کسی قوم نے کوئی بدعت ایجاد کی، اللہ تعالیٰ نے اُسی جیسی ایک سنت ان سے اٹھا لی (۳)

لکھتے ہیں:

"ایام عاشورہ کی بدعات جو شیعہ و روافض کرتے ہیں، تشبہ بالکفار میں داخل ہیں" آگے لکھتے ہیں۔

---

(۱) تخریج۔ یہ حدیث سنن ابی داؤد (۴۰۳۱) و مشکل الاثار طحاوی (۸۸/۱) و احمد (۵۱۱۴، ۵۱۱۵، ۵۶۶۷) میں حضرت ابن عمرؓ سے مرفوعاً مروی ہے) ابن تیمیہؒ نے اقتضا الصراط المستقیم میں (۳۹/۲) جید اور حافظ عراقی نے تخریج احادیث الاحیا (۳۴۲/۱) میں صحیح اور ابن حجر نے فتح میں حسن قرار دیا ہے۔

(۲) متفق علیہ بروایت ابن عمرو لفظہ خالفوا المشرکین اوفوا اللحٰی واحفوا الشوارب و بروایت ابوھریرہ ولفظہ ان الیھود والنصرٰی والصابیون خالفوھم. مشکوٰۃ شریف.

(۳) تخریج۔ احمد بروایت غضیف بن الحارث ولفظہ ما احدث قوم بدعتہ الا رفع مثلھا من السنۃ. (دارمی بروایت حسان ولفظہ وما ابتدع قوم بدعتہ فی دینھم الا نزع اللہ من سنتھم مثلھا. بحوالہ مشکوٰۃ باب الاعتصام.

پتھروں کا طواف کرنا ایام جاہلیت کی رسم تھی۔ اب اس کی مثل قبوں کا طواف کرنا ایجاد کیا گیا ہے۔ یہ ہرگز اسلامی رسم نہیں۔ اس کے لئے اجتماع کرنا اور اکٹھے ہوکر قبور کے پاس گانا بجانا منکرات میں سے ہیں۔

پھر لکھتے ہیں:

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک چلا چلا کر دعا کرنا اور دعاؤں میں حد سے زیادہ ہاتھوں کو بلند کرنا اور قبروں پر مردوں اور عورتوں کا اکٹھا ہونا بدعت ہے۔

آگے لکھتے ہیں:

عید کی دو قسمیں ہیں، عید مکانی اور عید زمانی یعنی کسی مقام پر اکٹھے ہونا یا مقررہ روز جمع ہونا

اور فرماتے ہیں:

کسی مقام پر جمع ہونا، مقررہ روز جمع ہونے سے بدتر ہے۔ اس لئے کہ بت پرستی سے مشابہ ہے کیونکہ کسی مقام پر بت پرست اس لئے جمع ہوتے ہیں کہ اس مقام کے بت کی خوشنودی حاصل کریں، اسی طرح قبر پرستوں کا کسی جگہ جمع ہونا بھی اس لئے ہوتا ہے کہ اس بزرگ کی خوشنودی حاصل ہو۔

ایام جاہلیت میں لات، منات اور عزی کے پاس اجتماع ہوتا تھا۔ اہل عرب کے یہ تین بت تھے، لات اہل طائف کا بت تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے نزدیک یہ کسی نیک آدمی کا نام تھا، جو حاجیوں کو ستو پلایا کرتا تھا۔ جب وہ مرگیا تو لوگ اس کی قبر پر جمع ہونے لگے۔ آہستہ آہستہ اس کا مجسمہ بنالیا اور اس کی پرستش کرنے لگے۔

منات مدینہ والوں کا بت تھا۔ لوگ اسے الہ العالم کہا کرتے تھے، اور اس کے قریب اپنی قربانیاں کیا کرتے تھے۔

''عزی ایک درخت کا نام تھا، جس کے پاس لوگ قربانیاں کرتے تھے، آہستہ آہستہ لوگ اس درخت کی عزت کرنے لگے، اور اس کے نام کا بت بنا کر اس کی پوجا شروع کردی۔ اسی طرح ذات انواط ایک درخت تھا، جس پر کفار جنگ کے وقت ہتھیار لٹکایا کرتے تھے۔ حدیث میں ہے ایک دفعہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس قسم کے درخت مقرر

کردینے کی درخواست کی تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ناراض ہوئے اور اسے تشبیہ بالکفار قرار دیا"

آگے لکھتے ہیں:

جب درخت پر ہتھیار لٹکانے میں کفار کی ریس کرنے کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تشبیہ بالکفار قرار دیا تو جو شخص کسی قبر پر قبہ بنائے، اس سے حصول برکت کی امید رکھے اور مساجد کی بہ نسبت قبہ میں نماز اور ذکر و دعا کو افضل جانے، اس کا کیا حال ہوگا۔

آگے لکھتے ہیں:

یہ لوگ قبوں پر روشنی کرنے کے لئے تیل ڈالنے کی نذر مانتے ہیں، حالانکہ فقہا کے نزدیک ایسی نذر ماننا ناجائز ہے۔ چنانچہ ایسی نذروں کے متعلق فقہ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ نذر ماننے والے پر کفارہ لازم آتا ہے۔ امام احمد رحمتہ اللہ علیہ کا بھی یہی خیال ہے اور ان کے دربانوں، مجاوروں، خادموں اور معتکفین کے لئے نقدی وغیرہ کی نذریں ماننا بھی ناجائز ہے۔

آگے لکھتے ہیں:

یہ دربان تو لات اور عزی کے دربانوں کی مانند ہیں، جو لوگوں کا مال ناجائز طریق سے کھاتے اور ان کو صراط مستقیم سے روکتے ہیں، یہ مجاور ان لوگوں کی مانند ہیں جن سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مخاطب ہو کر فرمایا تھا۔

مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عَاكِفُوْنَ

کہ یہ مورتیاں ہیں کیا چیز، جن پر تم صبح و شام بیٹھے رہتے ہو۔

تمام وہ قدم اور قبریں جو بلا سند انبیا و صلحا کی طرف منسوب کی جاتی ہیں، مثلاً مسجد الکف (دمشق) میں ایک ہتھیلی کی تصویر رکھی ہوئی ہے جسے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ہتھیلی کہا جاتا ہے، سب اسی حکم میں داخل ہیں۔

۷۔ ہندو ہر سال کرشن جی کا یوم ولادت مناتے ہیں، یہ لوگ بھی ۱۳ رجب کو ہر سال حضرت علی رضی اللہ عنہم کا یوم ولادت مناتے ہیں۔ مزید برآں، مجوس کی طرح نوروز بھی مناتے ہیں، حالانکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ ہر دن ہمارے لئے نوروز ہے۔

۸۔ ہنود ملاقات کے وقت سلام کی بجائے جے سیتارام یا رام رام کہتے ہیں۔ یہ لوگ بھی

سلام کی بجائے ''یا علی مدد'' کہتے ہیں۔

۹۔ مشرک اقوام میں اگر بڑا آدمی مر جائے تو میت کے ساتھ باجہ بجاتے ہیں۔ جاہل مسلمان اور پیر پرست بھی اسی طرح کرتے ہیں۔

۱۰۔ مشرکین کی یہ بھی عادت ہے کہ بت خانوں میں عبادت کے وقت ڈھول وغیرہ بجاتے ہیں، اور ایسا کرنا اللہ تعالیٰ سے تقرب کا ذریعہ اور اس کی رضامندی کا وسیلہ سمجھتے ہیں۔ قبر پرست بھی قبروں پر باجے اور ڈھول وغیرہ بجاتے ہیں (قوالی وغیرہ) اور یہ ممنوع چیزیں باوضو ہو کر سنتے ہیں۔

۱۱۔ مشرکین کی یہ بھی عادت ہے کہ بالکل برہنہ رہنے والوں کو بزرگ سمجھتے ہیں، اور ان کے ہاتھ سے بھنگ جیسی نشہ آور چیز متبرک جان کر نوش کر جاتے ہیں (اسی طرح پیر پرست مجاوروں کے حکم سے بھنگ اور چرس کا استعمال شروع کر دیتے ہیں اور نماز پڑھنا ترک کر دیتے ہیں)

۱۲۔ مشرکین صبح کے وقت بزرگوں کا شجرۂ نسب وظیفہ کے طور پر پڑھتے ہیں، پیر پرست بھی ہر روز پیر کا نسب نامہ اہتمام اور التزام کے ساتھ پڑھتے ہیں اور اس کے مقابل فرض نماز کی پرواہ نہیں کرتے۔

۱۳۔ مشرکین پانی پلانے والی جگہ کا نام جسے عرف عام میں سبیل کہتے ہیں۔ اپنے بزرگوں کے نام پر رکھتے ہیں۔ پیر پرست بھی حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے نام کی سبیل لگاتے اور انہی کے نام سے پانی پلاتے ہیں اور اس فعل کو حضرت امام کی نذر رکھتے ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے نام کی نذر ماننا قطعاً حرام ہے۔ کاش اس کے بجائے اگر یوں کرتے کہ محتاج کو کھانا وغیرہ اللہ کی رضامندی کے لئے کھلا کر اس کا ثواب حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کو یا کسی اور کو پہنچا دیتے تو ثواب بھی ہوتا اور شریعت کی پابندی بھی برقرار رہتی۔

۱۴۔ مشرکین کی یہ بھی عادت ہے کہ بتوں کے نام پر جانور کھلا (آزاد) چھوڑ دیتے ہیں، پیر پرست بھی قبور کے نام پر جانور کھلا چھوڑ دیتے ہیں۔

۱۵۔ مشرکین ادب کی وجہ سے بت خانہ کو ٹھاکر دوارہ کہتے ہیں۔ اسی طرح یہ تعزیہ خانہ کو امام باڑہ کہتے ہیں۔

۱۶۔ مشرک بتوں کی نیاز کو متبرک سمجھتے ہیں۔ اسی طرح شیعہ لوگ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی نیاز کو متبرک سمجھتے ہیں۔

۱۷۔ ہنود بتوں کی پوجا کے بعد ماتھے پر قشقہ لگاتے ہیں۔ قبر پرست بھی مجاوروں کے ہاتھ سے قبر کے پرانے غلافوں کے ٹکڑے سر پر بندھواتے ہیں۔

۱۸۔ مشرک بت خانہ کے خادموں کو بہت دوست رکھتے ہیں اور انہیں خدا کے ہاں اپنا وکیل وشفیع سمجھتے ہیں۔ قبر پرست بھی مجاوران قبور کو خدا کے ہاں اپنا شفیع سمجھتے اور ان کی ناراضگی سے ڈرتے ہیں۔

۱۹۔ ہنود کا عقیدہ ہے کہ انسان مرنے کے بعد چھتیس جیونوں میں بدلتا ہے کوئی کسی جانور کی شکل میں کوئی کسی جانور کی شکل میں قبر پرستوں اور پیر پرستوں کا بھی یہی عقیدہ ہے۔

مَعَاذَ اللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ.

حضرت شیخ جیلانی رحمتہ اللہ علیہ کا ایک عجیب واقعہ

اللہ تعالیٰ نے انسان کی آزمائش کے لئے شیطان کو تصرف کی قوت بخشی ہے۔ اس کے ساتھ وہ ہمیشہ انسان کو گمراہ کرتا رہتا ہے۔ سلف سے حضرت شیخ جیلانی رحمتہ اللہ علیہ کا ایک واقعہ منقول ہے۔ حضرت شیخ رحمتہ اللہ علیہ نے بیان کیا کہ ایک دفعہ مجھے ایک بے آب وگیاہ جنگل میں چند روز ٹھہرنا پڑا۔ اتفاقاً ایک دن مجھے پیاس شدت سے لگی ہوئی تھی۔ میں پانی کی تلاش کرنے لگا مگر نہ ملا۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ آسمان پر ایک بادل کا ٹکڑا نمودار ہوا، جس سے پانی برسنے لگا۔ بارش ختم جانے کے بعد بادل میں سے ایک روشنی نکلی، جو تمام آسمان پر پھیل گئی۔ اس روشنی میں ایک عجیب صورت نمودار ہوئی، جو مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگی۔

اے عبدالقادر! میں تمہارا پروردگار ہوں۔ تم پر تمام چیزیں حلال کرتا ہوں جو جی چاہے کھاؤ اور جو پسند ہو کرو۔ میں نے کہا اے ابلیس ملعون دور باش اور استغفار پڑھنے لگا اس کے بعد وہ صورت ناپید ہوگئی اور اندھیرا چھا گیا اور آواز آئی: اے شیخ تو نے اپنے علم ومرتبہ کے سبب مجھ سے نجات پائی، ورنہ میں اس مقام پر ستر بزرگوں کو گمراہ کر چکا ہوں، میں نے الحمدللہ پڑھا اور کہا اے

ملعون! علم و مرتبہ کے سبب سے نہیں، محض اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے۔

اس واقعہ پر غور کرو اور حضرت شیخ رحمتہ اللہ علیہ کے آخری کلمات کو پھر پڑھو، کہ آزمائش میں ثابت قدم رہنے کو اللہ تعالیٰ کا فضل سمجھا، محض اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے۔

مجھے اپنی ذات پر کبھی بھروسہ نہیں ہوا۔ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی رحمت پر اعتماد رہا ہے جس طرح اس نے اس امتحان سے بچایا، آرزو ہے کہ اسی طرح آخری منزل تک اس کا فضل شامل حال رہے۔

شیخ عبدالحق دہلوی رحمتہ اللہ علیہ نے اس واقعہ کو اخبار الاخیار میں لکھا ہے اور حضرت شیخ نے اپنی تصنیف فتوح الغیب میں بھی ذکر کیا ہے۔

یاد رہے کہ اس سے بھی زیادہ قدرت شیطان کو گمراہ کرنے کے لئے حاصل ہے، اس لئے بہتر یہی ہے کہ انسان آخری دم تک شیطان کے فریب سے غافل نہ رہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے امتحان میں ثابت قدم رہنے کے لئے اس کے فضل کا طالب رہے۔

فَلَا يَأْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ

تو خدا کی مخفی تدبیروں سے بے خوف نہیں ہو سکتے مگر وہی جو تباہ ہونے والے ہیں۔

اور یہ بھی ثابت ہوا کہ حضرت رحمتہ اللہ علیہ جیسا واقعہ کسی دوسرے کو پیش آ جائے اور وہ ثابت قدم رہے تو اس کو مغرور نہ ہونا چاہئے اور یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اب راہ حق کی تمام منزلیں طے کر چکا ہوں اور شیطان کے فریب سے وراء الوراء مقام پر پہنچ گیا ہوں۔

بھلا جہاں حضرت شیخ رحمتہ اللہ علیہ جیسے ستر بزرگ گمراہ ہو گئے ہوں وہاں کسی کو اپنی ذات پر کیا اعتماد ہو سکتا ہے۔

نجات کی صرف یہی صورت ہے کہ کتاب و سنت کا دامن نہ چھوڑے اس کے موافق احوال کو قبول کرے اور ناموافق کو رد کرتا رہے۔

واقعہ مذکور شیخ سعدی رحمتہ اللہ علیہ کے اس قول کی بھی تصدیق کرتا ہے کہ بے علم نتواں خدارا شناخت جاہل خدا کو نہیں پہچان سکتا۔

اور علم و معرفت بغیر فقہ پڑھنے کے حاصل نہیں ہوتی، نہ دین درست رہ سکتا ہے اور نہ راہ حق

کی منزلیں طے ہوسکتی ہیں اور فقہ بغیر علم قرآن وحدیث کے حاصل نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ کہا گیا ہے

علم دین فقہ است وتفسیر وحدیث   ہر کہ گیرد غیر ازیں گردد خبیث

اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن، حدیث اور فقہ سے جاہل رہنے کا انجام یہ ہوتا ہے کہ آدمی شیطانی وساوس کا شکار ہوکر خبیث ہوجاتا ہے، ہروقت نفسانی خواہشات کی طرف دھیان رہتا ہے اور شعبدوں کی وجہ سے چاہ گمراہی میں گر کر اپنے آپ کو لوگوں کا امام وپیشوا سمجھنے لگتا ہے۔

قصہ تلاوت سورۃ النجم

لکھتے ہیں کہ شیاطین میں سے ایک سفید شیطان ہے، جو لوگوں کو مذکورہ بالا طریق سے گمراہ کرنے کے کام پر مامور ہے۔ سورۃ النجم کے قصہ میں مذکور ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ سورت نماز مغرب میں پڑھ رہے تھے۔ جب اس آیت پر پہنچے۔(۱)

اَفَرَئَیْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰی وَمَنٰوۃَ الثَّالِثَۃَ الْاُخْرٰی.

(کیا تم نے لات وعزیٰ اور تیسرے منات کو دیکھا)

تو سفید شیطان نے آپ کی آواز میں آواز ملا کر یوں کہہ دیا۔

تِلْکَ الْغَرَانِیْقُ الْعُلٰی وَاِنْ شَفَاعَتُھُنَّ لَتُرْجٰی

(یہ بڑے بت ہیں، ان کی شفاعت کی توقع کی جاسکتی ہے)

یہ سن کر مشرکین آپ سے خوش ہوگئے اور مسلمانوں کے ساتھ سجدۂ تلاوت میں شریک ہوگئے اور کہنے لگے۔

آج تو (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہمارے بتوں کی تعریف کی۔ شاید اب ہم میں موافقت ہوجائے۔

محققین اہل سلوک نے کہا ہے کہ سفید شیطان کی من جملہ دیگر خصوصیات سب سے خطرناک خصوصیت یہ ہے کہ ظلمات کو نور سے مشتبہ کردیتا ہے اور معصیت اور گنہ گاری کو اطاعت مقبول اور نور تجلی کر کے دکھا دیتا ہے جس کی وجہ سے اس کے متبع نار کو نور سمجھ لیتے ہیں اور دوسروں کو

---

(۱) تخریج۔ ابو حاتم۔ طبری، ابن منذر، ابن اسحٰق، موسیٰ بن عقبہ اور ابو معشر ی نے اسے روایت کیا ہے اگرچہ اس کے اکثر راوی ضعیف ہیں، راوی منقطع مرسل مضطرب اور غیر صحیح ہیں۔ امام فخر الدین رازی اور قاضی عیاض نے بھی اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ بحوالہ مدارج النبوۃ جلد دوم صفحہ ۶۰

اس اطاعت کی طرف دعوت دینے لگتے ہیں۔ ایسے وقت بقول ئے۔

يَهْدِ اللّٰهُ بِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ

(اللہ جسے چاہتا ہے اپنے نور کی ہدایت فرماتا ہے)

مومن لوگ جو مضبوطی سے شریعت کی راہ پر قائم رہنے کی وجہ سے شیطانی فریبوں سے محفوظ رہتے ہیں، اس طرح اعلان کرتے ہیں۔

وَ يٰقَوْمِ مَالِيْٓ اَدْعُوْكُمْ اِلَى النَّجٰوةِ وَتَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَى النَّارِ تَدْعُوْنَنِيْ لِاَكْفُرَ بِاللّٰهِ وَاُشْرِكَ بِهٖ مَالَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ وَّاَنَا اَدْعُوْكُمْ اِلَى الْعَزِيْزِ الْغَفَّارِ

(اور اے میری قوم یہ کیا بات ہے کہ میں تو تمہیں نجات کی طرف دعوت دیتا ہوں اور تم مجھے آگ کی طرف بلاتے ہو! تم مجھے بلاتے ہو کہ میں اللہ تعالیٰ کو چھوڑ دیں اور اس کے ساتھ دوسروں کو شریک کروں جس کا مجھے کچھ علم نہیں میں تمہیں زبردست بخشنے والے کی طرف دعوت دیتا ہوں)

مگر جاہل لوگ شیاطین کی دعوت پر لبیک کہتے اور ان کے ہاتھ سے شعبدہ بازی دیکھ کر ان کے دام فریب میں پھنس جاتے ہیں مگر جو لوگ عروۃ الوثقٰی لانفصام لھا کو پکڑتے ہیں وہ ہر وقت ہر جگہ شیطان کے شر سے محفوظ رہتے ہیں۔

شیخ عبدالوہاب رحمۃ اللہ علیہ منڈوی
اور
شیخ عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ دہلوی کے واقعات

شیخ عبدالحق دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اخبار الاخیار میں شیخ عبدالوہاب رحمۃ اللہ علیہ منڈوی کے حالات میں لکھا ہے کہ آپ نے فرمایا:

بعض اوقات استدراج سے فاسق اور بدعتی لوگوں کو ایسی قوت حاصل ہو جاتی ہے کہ عوام کے دل اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں اور شریعت سے بے خبر لوگوں کو راہ حق سے متزلزل کر دیتے ہیں۔

چنانچہ اپنا ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک دفعہ مجھے دکن جانے کا اتفاق ہوا، میں قاضی شہر عبدالعزیزؒ کے ہاں فروکش ہوا۔ قاضی صاحب سے میں نے ایک روز پوچھا: ''آپ کے شہر میں کوئی صالح اور فقیر منش آدمی ہو تو بتلائیں۔ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں'' قاضی صاحب نے فرمایا ''ایک شخص ہے تو سہی، مگر میں اس کی خلاف شرع حرکات کی وجہ سے اس سے خوش نہیں ہوں''۔ بہر حال میں اس فقیر کے پاس گیا اور دیکھا کہ وہ ایک بلند مقام پر بیٹھا ہے۔ ارد گرد مردوں اور عورتوں کی بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ فقیر نے مجھے آتا دیکھ کر خوش آمدید کہا اور آؤ بھگت کرنے کے بعد شراب منگائی پہلے خود پی، پھر مجھے دی۔ میں نے کہا میں نہیں پیوں گا۔ یہ حرام اور ممنوع ہے۔ اس نے کئی بار کہا۔ مگر میں انکار ہی کرتا رہا آخر کہنے لگا۔ دیکھو میں تمہارے ساتھ کیا کرتا ہوں۔ یہ سن کر چلا آیا اور کسی سے یہ واقعہ بیان نہ کیا، رات کو جو سویا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک خوبصورت باغ ہے، جس میں بے شمار میوہ اور درخت ہیں اور نہریں بہہ رہی ہیں۔ لیکن راہ اس قدر پر خطر اور دشوار گزار ہے کہ وہاں تک پہنچنا سخت مشکل ہے۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ وہی فقیر شراب کا پیالہ لئے ہوئے آن پہنچا اور کہنے لگا

کہ یہ شراب کا پیالہ پی لو تو اس باغ میں پہنچا دوں گا۔ میں نے پھر انکار کر دیا۔ اس کشمکش میں میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے لاحول پڑھی اور کروٹ بدل کر پھر سو گیا۔ لیکن بار بار یہی واقعہ پیش آتا میں پھر جاگ پڑتا اور لاحول پڑھتا آخر جب کئی مرتبہ یہ صورت پیش آئی تو میں تنگ آ کر اٹھ بیٹھا، وضو کیا نوافل پڑھے درود شریف پڑھا اور دعا مانگ کر سو گیا، اب کے خواب میں اپنے آپ کو بارگاہِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں حاضر پایا، میں نے دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ میں عصا ہے اور وہ بدعتی وہاں بھی آن پہنچا اور مجھ سے لگا وہی حرکت کرنے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے مارنے کے لئے اپنے ہاتھ والی لکڑی اس کی طرف پھینکی، لکڑی لگتے ہی وہ کتے کی صورت بن گیا اور دربارِ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھاگ گیا۔ آپ نے فرمایا اس شہر میں نہیں رہے گا۔ اس کے بعد میری آنکھ کھلی تو صبح کا وقت تھا، نماز پڑھ کر میں اس کے مقام پر گیا تو سنا کہ واقعی وہ وہاں موجود نہیں چند لوگ بیٹھے کہہ رہے تھے کہ خدا جانے اسے کیا ہوا، اپنا مکان گرا کر کہیں بھاگ گیا ہے۔

زیارت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

خواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت کرنا بلاشبہ انسان کے دل اور روح کو منور کرنے والی چیز ہے لیکن وساوس شیطانی کی وجہ سے محققین اہل سلوک رحمہم اللہ نے بہت سی شرائط مقرر کر دی ہیں اور لکھا ہے کہ صرف وہ زیارت معتبر اور صحیح ہے جس میں آپ کی آخری شکل نظر آئے، جبکہ آپ کے تقریباً بیس بال سر اور داڑھی میں سفید ہو گئے تھے۔

مشکوٰۃ کتاب الرویا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

مَنْ رَآنِي فِي الْمَنَامِ فَقَدْ رَآنِي فَإِنَّ الشَّيْطَانَ لَا يَتَمَثَّلُ فِي صُوْرَتِي اور مَنْ رَآنِي فَقَدْ رَأَى الْحَقَّ (۱)

(جس نے مجھے خواب میں دیکھا اسے یقین رکھنا چاہئے کہ مجھ کو دیکھا، کیونکہ شیطان میری صورت نہیں بن سکتا۔ جس نے مجھے دیکھا بلاشبہ اس نے مجھی کو دیکھا)

حضرت شیخ عبدالحق دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ''ان ارشادات نبویہ صلی اللہ علیہ وآلہ

(۱) متفق علیہ بروایت ابوہریرہؓ ابوقتادہؓ مشکوٰۃ کتاب الرویا

وسلم سے ثابت ہوتا ہے کہ جس شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کوخواب میں دیکھا اس نے واقعی آپؐ ہی کو دیکھا، کیونکہ کذب وبطلان کو آپ کی ذات میں دخل نہیں اور وساوس شیطانی سے آپ کی ذات والا صفات بالاتر ہے اور یہ سنت اللہ ہے کہ شیطان باوجود قوت تصرف کے آپ کی صورت اختیار نہیں کرسکتا، علمائے کرام نے اس چیز کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خصوصیات میں شمار کیا ہے اور لکھا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سوا دوسرے کسی شخص کو یہ خصوصیت حاصل نہیں اور شیطان ہر بڑے سے بڑے شخص کی صورت اختیار کرسکتا ہے۔

زیارت نبویؐ کے متعلق تین خیال

لیکن اس کے باوجود زیارت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق تین خیال پائے جاتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ جس نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آخری عمر کی صورت میں دیکھا اس کا خواب صحیح ہے۔ دوسرا یہ کہ جوانی، ادھیڑ اور آخری عمر کی شکلوں میں سے جونسی دیکھے، صحیح ہے۔ تیسرا خیال پہلے سے ملتا ہے صرف اتنی اور قید لگائی گئی ہے کہ وہی صورت دیکھے جو رحلت کے وقت تھی جب کہ سر اور داڑھی میں قریباً بیس بال سفید تھے۔

ابن سیرین رحمتہ اللہ علیہ کا قول

مشہور معتبر علامہ ابن سیرین رحمتہ اللہ علیہ کا معمول تھا کہ جب کوئی شخص زیارت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا واقعہ آپ سے بیان کرتا تو آپ اس سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حلیہ پوچھتے جو اس نے خواب میں دیکھا۔ اگر وہ خاص حلیہ بیان کرتا جو ابن سیرین رحمتہ اللہ علیہ کے نزدیک درست تھا تو اس کی تصدیق کرتے ورنہ کہتے "تم نے کسی اور شخص کو دیکھا ہے"۔

آگے لکھتے ہیں:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان مبارک سے خواب میں سنا ہوا کلام آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کی کسوٹی پر پرکھنا چاہئے۔ اگر صحیح اور موافق نظر آئے تو تصدیق کرنا چاہئے، ورنہ بیان کنندہ کی سماعت کا نقص سمجھنا چاہئے۔

ایک عجیب خواب

میں نے مفتی عبدالوہاب رحمتہ اللہ علیہ سے سنا کہ بلاد مغرب کے ایک فقیر نے خواب میں سنا

کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شراب پینے کی اجازت دے رہے ہیں۔ مشائخ وقت کے سامنے اس خواب کو پیش کیا گیا تو ہر شخص نے اپنی عقل کے مطابق اس کی تاویل کی۔ ان دنوں مدینہ منورہ میں ایک بزرگ رہتے تھے جو سنت کے نہایت شائق اور پابند تھے۔ جب آپ سے پوچھا گیا تو فرمایا:

''بیان کنندہ کی سماعت کا قصور نظر آتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لاتشربوا الخمر (شراب مت پیو) فرمایا ہوگا۔ اس نے اشربوا الخمر (شراب پیو) سمجھا ہوگا''

بعض علما نے کہا کہ جیسے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں شیطان نے ایک دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آواز میں آواز ملا کر لوگوں کو دھوکہ دیا تھا اسی طرح ممکن ہے کہ خواب میں فقیر کو مغالطہ دیا ہو، حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خواب میں اس شخص سے بولے بھی نہ ہوں ہمارے نزدیک یہی درست ہے۔

ہمزاد کی موت کہیں مذکور نہیں

غرض اس واقعہ پر غور کرو اور دیکھو کہ جہاں بڑے بڑے متقی عالم خواب میں دھوکا کھا گئے وہاں دوسرے بزرگوں کا کیا اعتبار، جن کی صورت شیطان اختیار کر سکتا ہے؟ مزید برآں، ہر شخص کا ہمزاد اس کی موت کے بعد بھی زندہ ہی رہتا ہے، اس کی صورت اختیار کر کے دھوکا دے سکتا ہے اور جملہ شیاطین کے سالار اعظم ابلیس علیہ اللعنۃ کا زندہ رہنا تا قیام قیامت نص قرآنی سے ثابت ہے تو ابلیس اور اس کے معاونین کے فریبوں سے بچنے کی راہ صرف یہ کہ کتاب و سنت پر عمل کیا جائے اور زندگی کے ہر گوشہ میں اسوہ حسنہ کی پیروی کی جائے۔ بحکم الہ العالمین آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ اِنِّیْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ (۵۱:۵۰)

خدا کی طرف دوڑو میں اس کی طرف سے تمہیں کھلا کھلا ڈرانے والا بن کر آیا ہوں۔

ایک مغالطہ

پیر پرست کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرح ہمارے پیر کی شکل اختیار کرنا بھی شیطان کے لئے ناممکن ہے، کیونکہ پیر صاحب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کی طرح مظہر ہدایت ہیں، مگر یاد رہے کہ یہ مغالطہ ہے۔ صحیح بات وہ ہے جو شریعت سے ثابت ہے۔ ان کے اس

قول کی تردید خود انہی کی بیان کردہ حکایتوں سے ہو رہی ہے۔ مثلاً وہ بیان کرتے ہیں کہ:

ہم نے حسنین رضی اللہ عنہما کو تعزیہ کے ساتھ ننگے سر پھرتے دیکھا اور ناچار ان کی پیروی کی۔ اور ایک رات مجھے فلاں بزرگ کے مقبرہ میں ایک مرد و عورت نظر آئے جو زنا کاری کر رہے تھے۔ مجھے ان کی حرکت سے طیش آگیا اور دھکے دے کر مقبرہ کی چار دیواری سے باہر نکال دیا۔ اس کے بعد جو سو گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ صاحب قبر مجھ سے خفا ہو کر فرما رہے ہیں: ''اے بے خبر خشک ملا! وہ دونوں عاشق و معشوق تھے۔ مدت سے وصال کے طالب تھے۔ آج یہاں انہیں موقع ملا تو تم نے ان کی تمنا پوری نہ ہونے دی تمہیں اتنی عقل بھی نہ آئی کہ انھیں روکنا ضروری ہوتا تو ہم خود روک سکتے تھے۔ یہ کہہ کر مجھے ایسی لات ماری کہ لنگڑا کر دیا۔

قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ (۹:۳۰)

خدا انہیں غارت کرے کہاں جا رہے ہیں۔

سنا ہے کہ اس واقعہ کے بعد اس مزار کے خادموں نے کسی برے سے برے فعل میں بھی مداخلت نہ کی۔ اور جب پوچھا جائے تو کہتے ہیں کہ جب ہمارا پیر پردہ پوشی کرنا چاہتا ہے تو ہم اس کی متابعت کیوں نہ کریں؟ اگر کہا جائے کہ تمہارا پیر مظہر ہدایت ہو کر برے کاموں سے کیوں نہیں روکتا تو کہتے ہیں، یہ اس کی مرضی۔ پھر دیوان حافظ کا یہ شعر پڑھ دیتے ہیں۔

نہ قاضیم نہ امیرم نہ محتسب نہ فقیہ

مرا چہ شود کہ منع شراب خوارہ کنم

(میں نہ قاضی نہ امیر نہ محتسب اور نہ فقیہ ہوں مجھے کیا پڑی ہے کہ شراب خوری سے روکتا پھروں)

غرض ان داستانوں سے واضح ہوتا ہے کہ شیطان انہیں گمراہ کرنے کے لئے بزرگوں کی صورتیں اختیار کر لیتا ہے۔ نیز اس حدیث پر غور کرنا چاہئے کہ دجال جب ایسے لوگوں سے ملے گا جو اس کی دعوت قبول نہیں کریں گے اور کہیں گے کہ ہمارے بزرگ دین اسلام پر گزرے ہیں اور ہمیں بھی اسی پر قائم رہنے کی تاکید ہے تو دجال شیاطین کو حکم دے گا کہ ان کے بزرگوں کی صورتیں اختیار کر کے لوگوں کو گمراہ کرو۔ تو وہ ایسا کر کے انہیں گمراہ کر دیں گے۔

مثنوی مولانا روم رحمتہ اللہ علیہ میں اس کے متعلق کہا گیا ہے کہ ؎

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست

پس بہر دستے نباید داد دست

(بہت سے شیطان آدمی کی شکل میں پھرتے ہیں۔ پس ہر شخص کے ہاتھ میں ہاتھ نہیں دے دینا چاہئے)

اور خود اللہ تعالیٰ نے کلام پاک کی آخری صورۃ میں من الجنۃ و الناس فرمایا ہے جس کا مطلب ہے کہ خناس جنوں میں سے بھی ہوتے ہیں اور انسانوں میں سے بھی۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سورۃ کی مختصر تفسیر کر دی جائے۔

تفسیر سورۃ الناس

اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے عبادت غیر اللہ کی کامل طور پر تردید فرمائی ہے اور اس کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ مَلِكِ النَّاسِ اِلٰهِ النَّاسِ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ الَّذِیْ يُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ. (سورۃ الناس)

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم کرنے والا ہے۔

آپ کہئے کہ میں آدمیوں کے مالک، آدمیوں کے بادشاہ، آدمیوں کے معبود کی پناہ لیتا ہوں وسوسہ ڈالنے والے، پیچھے ہٹ جانے والے (شیطان) کے شر سے، جو لوگوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے، خواہ وہ وسوسہ ڈالنے والا جن ہو یا آدمی۔

اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی بعض صفات کا ذکر بندوں کی نسبت سے کیا ہے حالانکہ نسبت کے لحاظ سے ان صفات کا تعلق جیسا ان سے ہے۔ ویسا ہر مخلوق سے ہے۔ یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ بنی نوع آدم کا پروردگار ہے اسی طرح باقی تمام مخلوق کا بھی ہے اور جس طرح انسانوں کا مالک اور معبود ہے اسی طور پر کائنات کی ہر چیز کا مالک و معبود ہے۔

وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ (۱۷:۴۴)

اور کوئی بھی چیز ایسی نہیں جو تعریف کے ساتھ اس کی پاکی بیان نہ کرتی ہو لیکن تم لوگ ان کی پاکی بیان کرنے کو سمجھتے نہیں ہو۔

رب، ملک اور الٰہ کی تشریح

مفسرین کرام نے اس جگہ خاص طور پر رب، ملک اور الٰہ کے لائے جانے کے متعلق عجیب عجیب نکتے بیان فرمائے ہیں، جن میں سے بہترین خیال یہ ہے کہ لوگ چونکہ غیر اللہ میں انہی اوصاف کا اعتقاد رکھنے کی بنا پر کفر اور شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو مطلع فرما دیا ہے کہ یہ صفات صرف اللہ تعالیٰ ہی کا خاصہ ہیں۔ ان میں سے کسی صفت کو غیر اللہ میں نہ ماننا چاہیے، کیوں کہ کسی مخلوق کی نسبت ایسا اعتقاد رکھنا بلاشبہ شیطانی وسوسہ ہے بلکہ اوصاف مذکورہ کو صرف اللہ تعالیٰ کا خاصہ مان کر اس کی پناہ طلب کی جائے۔

اس میں کچھ شبہ نہیں کہ اکثر لوگ ان صفات کو غیر اللہ میں ماننے کی وجہ سے شرک کے مہلک مرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ دنیا کی مختلف اقوام کے عقائد پر نظر ڈالو تو تم دیکھو گے کہ مدتوں سے بعض قومیں اس ہلاکت کے گڑھے میں پڑی ہوئی ہیں کہ آج تک برابر اس مرض میں مبتلا ہیں:

عَافَانَا اللّٰهُ وَإِيَّاهُمْ مِنْ كُلِّ بَلَاءِ الدُّنْيَا وَعَذَابِ الْآخِرَةِ

اللہ تعالیٰ ہمیں اور ان کو دنیا کی آفتوں اور آخرت کے عذاب سے بچائے۔

درجہ فنافی الشیخ کا مطلب

کفار کے مذاہب باطلہ کو چھوڑیں اور قبر پرستوں کو لیں۔ قبر پرست بھی انہی بیماریوں میں مبتلا ہیں۔ ان کے نزدیک یہ امر واجبات میں سے ہے کہ عبادت کرتے وقت پہلے پیر کا تصور باندھا جائے اور اس میں اس طرح مستغرق ہو جائیں کہ اپنے تئیں بھول جائیں۔ اس چیز کو ان کے ہاں فنافی الشیخ کہا جاتا ہے اور جس پر یہ کیفیت طاری ہو جائے اسے فانی فی الشیخ کہتے ہیں۔

غور کرنے سے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ لوگ شیخ میں ربوبیت کی صفت مانتے ہیں۔ اس لئے اس کی شکر گزاری میں محو رہنا لازم سمجھتے ہیں یا اس کی وجہ یہ ہے کہ پیر کو کرامات کا مالک سمجھتے ہیں اور اس کی پہنچ سے باہر نکلنا ناممکن خیال کرتے ہیں۔ اس لئے ایسا کرتے ہیں یا پھر ایسا اس لئے کرتے ہیں کہ شیخ جی کو مَا كَانَ وَمَا يَكُوْنُ کا پورا علم حاصل

ہونے کا یقین رکھتے ہیں۔ان باتوں کا ثبوت چاہو تو دیکھ لو کہ جب ان میں سے کوئی مصیبت میں گرفتار ہوتا ہے تو کس کی طرف رجوع کرتا ہے، خدائے زندہ وتوانا کی طرف یا مردوں کی روحوں کی طرف؟ حالانکہ خداوند کریم کی صفت مالکیت کا یہ خاصہ ہے کہ وہ اپنے عاجز بندوں کی حاجتیں پوری کرتا ہے۔

قُلِ اللّٰهُ يُنَجِّيكُم مِّنْهَا وَمِن كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ أَنتُمْ تُشْرِكُونَ (٦:٦٤)

کہہ دو کہ اللہ تعالیٰ ہی تمہیں اس (موجودہ) تکلیف سے اور ہر غم سے نجات بخشتا ہے لیکن تم پھر بھی اس کا شریک ٹھہراتے ہو۔

لیکن یہ لوگ بیماری میں شفا وصحت اور تنگدستی میں خوشحالی وفارغ البالی کے لئے پیروں ہی سے دعا کرتے ہیں، حالانکہ اللہ میں صفت ربوبیت ماننے کے یہی معنی ہیں کہ چونکہ وہ تمام مخلوقات کو صحت اور رزق عطا فرما کر قائم رکھتا ہے اس لئے مخلوقات کا رب ہے۔ پھر یہ لوگ بزرگوں کی قبروں پر ایسی باتیں کرتے ہیں جنہیں بیت اللہ میں کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ مثلاً غلاف چڑھانا، قربانی کرنا، اس کے غسل کے پانی کو آب زمزم کی طرح متبرک سمجھنا، عبادت سمجھ کر قبروں کی زیارت کرنا، ان کو قبلۂ توجہ بنانا اور ان میں عبادت کرنے کو تمام مقامات سے بہتر خیال کرنا وغیرہ وغیرہ۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کو الٰہ الناس ماننے کے معنی ہی یہ ہیں کہ اس کے مقرر کردہ آداب اس کے گھر میں جاکر بجالائے جائیں، اور کسی دوسری جگہ ایسی حرکتیں نہ کی جائیں۔

ہر بستی کے لئے حاجت روا جدا ہے

قبر پرستوں نے ہر شہر اور ہر بستی کے لئے الگ الگ ولیوں کی قبریں مقرر کر رکھی ہیں اور ان کی طرف تمام مشکلات ومصائب میں حاجت روائی کے لئے رجوع کیا جاتا ہے۔ بعض جگہ جب بچوں کی شادی کرتے ہیں تو دولہا کو اس ولی کی قبر پر سلام کے لئے لے جاتے ہیں۔ دولہا اس کی پائنتی میں کھڑے ہو کر سلام کرتا ہے اور کچھ نذرانہ ادا کر کے برات میں شامل ہوتا ہے۔

یہ لوگ مجاوروں کا اس طرح احترام کرتے ہیں جس طرح شاہی خدام کا کیا جاتا ہے اور مہمات میں ان کو اپنا وکیل مقرر کرتے ہیں تاکہ وہ صاحب قبر کے پاس ان کی سفارش کر دیں۔ عرس کے موقع پر ان کے ہاتھ سے دستار بندی کراتے ہیں اور ان کی دی ہوئی پگڑی کو شاہی خلعت کی طرح قابل فخر وعزت سمجھتے ہیں۔

كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ (۵۳:۲۳)

تمام گروہ جو کچھ ان کے پاس ہے اس پر خوش وخرم ہیں۔

قبر پرستوں کی گپیں

قبر پرست گپیں بہت ہانکتے ہیں کہ مثلاً کہتے ہیں کہ ایک چشتی نے نقشبندیوں کی حدود میں قدم رکھنا چاہا مگر کچھ پیش نہ گئی اور اسے بے نیل مرام واپس جانا پڑا۔

یا شاہ مدار رحمتہ اللہ علیہ ہندوستان میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ جب تک کہ خواجہ معین الدین چشتی رحمتہ اللہ علیہ سے اجازت نہیں لے لی وغیرہ وغیرہ۔ غضب ہے کہ ایسی ایسی بے سروپا کہانیاں فقرا کی سوانح عمریوں میں بھی درج کر دی گئی ہیں۔

محکمات اور متشابہات

علمائے محققین نے کہا ہے کہ اولیا کے احوال کی دو قسمیں ہیں۔ محکمات اور متشابہات۔ جو احوال شریعت کے موافق ہوں وہ محکمات میں سے ہیں اور جو نا موافق ہوں وہ متشابہات سے ہیں وہ کہتے ہیں کہ جو احوال محکمات کی مانند اشتباہ سے پاک ہیں وہ قابل حجت بھی ہیں اور پیروی کے لائق بھی۔ لیکن جو احوال متشابہات کی طرح مشتبہ المراد ہیں ان سے بچنا ہی لازم ہے وہ نہ قابل حجت ہیں نہ لائق اتباع ہیں۔ ان کے سبب سے کئی لوگ ہدایت یاب ہو جاتے ہیں اور کئی گمراہ ہو جاتے ہیں۔

يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِیْ بِهٖ كَثِيْرًا (۲۶:۲)

(گمراہ ہو جاتے ہیں اس کے سبب بہت سے اور ہدایت پاتے ہیں اس سے بہت سے)

محکمات اور متشابہات کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَاتَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ. (۷:۳)

اللہ تعالیٰ نے تم پر کتاب نازل فرمائی۔ اس کی بعض آیتیں ہر قسم کے شبہ سے محفوظ ہیں اور یہی آیتیں اس کتاب کا اصل مدار ہیں اور بعض آیتیں ایسی ہیں جو مشتبہ المراد ہیں، پس جن لوگوں

کے دلوں میں ٹیڑھا پن ہے وہ اس کے دوسرے حصہ کی پیروی کرتے ہیں جو مشتبہ المراد ہیں، دین میں فتنہ پیدا کرنے اور غلط مطلب ڈھونڈنے کی غرض سے حالانکہ ان کا صحیح مطلب اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

صاحب مصابیح رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اُنْزِلَ الْقُرْآنُ عَلٰی خَمْسَةِ اَوْجُهٍ حَلَالٌ وَحَرَامٌ وَمُحْكَمٌ وَمُتَشَابَهٌ وَاَمْثَالٌ فَاَحِلُّوْا الْحَلَالَ وَحَرِّمُوْا الْحَرَامَ وَاعْمَلُوْا بِالْمُحْكَمِ وَاٰمِنُوْا بِالْمُتَشَابَهِ وَاعْتَبِرُوْا بِالْاَمْثَالِ. (۱)

قرآن مجید میں پانچ قسم کی آیتیں اتاری گئی ہیں۔ حلال، حرام، محکم، متشابہ اور امثال۔ پس ان کے حلال کا حلال جانو، حرام کو حرام سمجھو، محکم پر عمل کرو، متشابہ پر ایمان رکھو اور امثال سے عبرت پکڑو۔

غرض اولیا کے بعض احوال پر صرف اپنی سمجھ کے فتویٰ پر عمل نہ کرنا چاہیے، کیونکہ بسا اوقات ایسا کرنا فساد کا موجب ہوتا ہے۔

ایک صحابی رضی اللہ عنہ کا واقعہ

کتب احادیث میں ایک بدری صحابیؓ کا واقعہ مذکور ہے بدری صحابیؓ وہ ہیں جن کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بحکم خدا یہ مژدہ سنایا تھا کہ

اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ قَدْ غَفَرْتُ لَكُمْ (۲)

یعنی اللہ فرماتا ہے کہ آج کے بعد جو تمہارا جی چاہے کرو میں نے تمہیں بخش دیا۔

انہی میں سے ایک شخص نے شراب پی لی۔ جب گرفتار کر کے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے لایا گیا تو کہنے لگا میں ان لوگوں میں سے ہوں جنھیں خدا نے بخش دیا۔ اس لئے نہ مجھ پر اس فعل سے حد قائم ہو سکتی ہے اور نہ میں گنہگار کہلا سکتا ہوں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ عذر بالکل

---

(۱) بیہقی بروایت ابوہریرہؓ۔ مشکوٰۃ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ

(۲) فتح تفسیر سورہ ۶۰۔ ادسنہ ۸ جہاد، ۹۸ تفسیر سورہ ۱۰۶

نہ سنا اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے مشورہ سے اس پر حد لگادی۔ اس سے ثابت ہوا کہ تمام مسلمان بلا لحاظ مرتبہ یکساں طور پر شرعی احکام کے لئے مکلّف ہیں اور جو عمل شریعت کی نگاہ میں برا ہے وہ کسی ولی یا متقی کے کرنے سے اچھا نہیں ہوسکتا اور نہ کوئی متقی یا ولی اس دنیا میں احکام اسلام کی خلاف ورزی کر کے شرعی مواخذہ سے چھوٹ سکتا ہے۔(۱) باقی رہا عاقبت کا معاملہ، سو وہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے۔

فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ (۲:۲۸۴)

جسے چاہے بخش دے اور جسے چاہے عذاب دے۔

تنبیہ

یاد رکھنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندوں کے ساتھ محبت کرنے یا عداوت رکھنے کے لحاظ سے خوارج و روافض کی طرح لوگوں کی دو جماعتیں ہوگئیں ہیں اور دونوں غفلت میں مبتلا اور گمراہی اور ضلالت میں پڑی ہوئی ہیں اور خارجی منش آدمی کہتا ہے کہ فلاں شخص نے اگرچہ بہت سے نیک اعمال کئے ہیں۔ مگر ناشائستہ بات کی وجہ سے مردود ہے اور قابل پیروی نہیں، اور رافضی روش کہتا ہے کہ فلاں بزرگ کا ہر عمل مستحسن اور واجب الاتباع ہے چاہے اس کا ہر عمل احکام اسلام کے مخالف ہو جیسا کہ حافظ شیرازی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

بمے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود زراہ ورسم منزلہا

یعنی مرشد کہے تو شراب پی لو، کیوں کہ سالک منزل طریقت کی راہ ورسم سے ناواقف نہیں ہوتا۔

---

(۱) اخرجہ البخاری (المغازی باب فضل من شہد بدراً) ومسلم (فضائل الصحابہ، وفضائل اہل بدر، ۲۴۹۴)
وابوداؤد (الجہاد، باب فی حکم الجاسوس اذا کان مسلماً ۳/ ۱۰۸، ۱۱۰، ۲۶۵۰)
والترمذی التفسیر سورۃ الممتحنہ ۳۳۰۲ (والدارمی (ارقاق ۲/ ۳۱۳)
عن ابی ہریرۃ واحمد (۱/ ۸۰/ ۲۰۸۰/ ۲۹۶۔ ابو ہریرہ) والنسائی
فی تفسیرہ (۲/ ۴۱۴، ۶۰۵)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد

حضرت امام احمد بن حنبل رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی مسند میں روایت کیا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے فرمایا: ''اے علی تیری مثال حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح ہے، کہ یہود نے ان کی عداوت میں یہاں تک کہ غلو کیا کہ معاذ اللہ ان کی والدہ محترمہ پر بہتان باندھے اور نصاریٰ نے ان سے محبت کی تو خدا کا بیٹا بنا کر چھوڑا۔ خود حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا ہے:

يَهْلِكُ فِيَّ رَجُلَانِ مُحِبٌّ مُفْرِطٌ يُفْرِطُنِيْ بِمَا لَيْسَ فِيَّ وَمُبْغِضٌ يَحْمِلُهُ شَنَانِيْ عَلٰى اَنْ يَّبْهَتَنِيْ

میری وجہ سے دو قسم کے لوگ ہلاک ہوں گے ایک حد سے زیادہ مجھ سے الفت کرنے والے کہ مجھ میں وہ چیز ثابت کریں گے جو مجھ میں نہیں ہے اور دوسرے مجھ سے دشمنی کرنے والے کہ بے جا عداوت کی وجہ سے مجھ پر بہتان باندھیں گے۔ (۱)

غرض الفت وعداوت میں مبالغہ کرنے کی وجہ سے گمراہی میں مبتلا ہو جانے کی یہ دلیل کافی ہے۔

طریقہ اہل سنت

مفسرین کرام نے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ سے مراد یہود ہیں، جن کی مثل مسلمانوں میں فرقہ خوارج ہے، جو بزرگوں کی شان میں گستاخی کرتا ہے اور ضالین سے مراد نصاریٰ ہیں، جن کی مثال اہل اسلام میں روافض کی جماعت ہے، جنھوں نے تعظیم والفت کو حدِ تحریم تک پہنچا کر چھوڑا ہے۔ راہ توسط پر چلنے والی صرف ایک جماعت ہے یعنی اہل سنت، جو ہر قسم کے افراط وتفریط سے محفوظ ہیں۔ اہل سنت کا اصول ہر معاملہ میں:

خُذْ مَا صَفَا وَدَعْ مَا كَدَرَ

(اچھی چیز لے لو اور بری چیز کو چھوڑ دو)

پر ہے۔ یہ جملہ اس حدیث کا ہم معنی ہے، جس میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت

---

(۱) مسند احمد (۱/۱۶۰) والحاکم (۳/۱۲۳) وصححہ وخالفہ الذہبی بقولہ! الحکم بن عبدالملک وھاہ ابن معین

حسنؓ بن علی رضی اللہ عنہما کو فرمایا:

دَعْ مَا يُرِيْبُکَ اِلٰى مَا يُرِيْبُکَ

(مشکوک چیز کو چھوڑ دو اور غیر مشکوک چیز اختیار کرو)

اہل سنت سلف صالحین رحمہم اللہ کے حق میں سوائے نیک گوئی کے لب کشائی نہیں کرتے۔

ان کی دعا ہے:

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ (۳:۸)

رَبَّنَا اغْفِرْلَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (۵۹:۱۰)

اے ہمارے پروردگار! ہدایت دینے کے بعد ہمارے دلوں کو ٹیڑھا نہ کیجیو، اور ہمیں اپنے پاس سے رحمت عطا فرمائیو (کیوں کہ) تو ہی رحمت عطا فرمانے والا ہے۔

اے پروردگار ہمارے! ہمیں بخش دے اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی جو ہم سے پہلے ایمان لا چکے ہیں، اور ہمارے دلوں میں مومنوں کی طرف سے کینہ پیدا نہ ہونے دے، اے ہمارے پروردگار! تو ہی مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔

وظائف شرکیہ

قبر پرستوں کی دوسری علامت یہ ہے کہ اپنے شیخ کو واقف الاسرار سمجھتے ہیں اور دور اور نزدیک سے اپنی جملہ مہمات میں شیخ کو امداد کے لئے پکارتے ہیں۔ بعض لوگ اس قسم کے وظیفے، جو بالکل سلسلہ کے ناموں پر مشتمل ہوتے ہیں، مسنونہ اوراد واذکار کی طرح بلا ناغہ صبح وشام پڑھتے ہیں۔ بعضوں نے پیروں کے نام کے استخارے تجویز کر رکھے ہیں، تاکہ ان کو پڑھ کر مہمات کا انجام بزرگوں کی ارواح سے معلوم کرلیں۔

شرکیہ وظائف کے چند نمونے

بعض لوگ اٹھتے بیٹھتے ''یا بہاء الدین مشکل کشا'' پڑھتے ہیں، اور اپنے آپ کو حضرت خواجہ بہاء الدین کا محب کہتے ہیں۔ بعض فراخی رزق کیلئے ''یا نظام الدین اولیاء زری زر بخش'' کا وظیفہ

پڑھتے ہیں اور بعض ہر مشکل کیلئے ''یا شیخ عبدالقادر جیلانی شیاءللہ'' کا وظیفہ پڑھتے ہیں۔(۱)

ایسے وظیفے پڑھنے کی ممانعت

خبردار رہنا چاہئے کہ یہ وظیفے سب افترا اور بہتان ہیں یہ صحیح طریقت کے کسی پیر سے مروی نہیں ہیں۔ اور نہ ان کی روایت کرنے والے معتبر ہیں، بلکہ بزرگوں کے صحیح حالات دیکھنے سے ثابت ہوتا ہے کہ تمام بزرگ اپنے مریدوں کو مخلوق کی طرف نگاہ امید رکھنے سے سختی کے ساتھ منع فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ عوارف المعارف میں حضرت شیخ الشیوخ رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

لَایَتَحَقَّقُ صِدْقُ الْمُرِیْدِ وَاِخْلَاصُهٗ اِلَّا بِاِتِّبَاعِ السُّنَنِ وَبِمُتَابِعَةِ اَمْرِ الشَّرْعِ وَقَطْعِ النَّظَرِ عَنِ الْخَلْقِ وَکُلُّ الْاٰفَاتِ حَلَّتْ عَلٰی اَهْلِ الْبِدَایَةِ لَمَوْضِعِ نَظْرِهِمْ اِلَی الْخَلْقِ وَبَلَغَنَا عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ قَالَ لَا یَکْمُلُ اِیْمَانُ الْمَرْءِ وَحَتّٰی یَکُوْنَ النَّاسُ عِنْدَهٗ کَالْاَبَاعِرِ ثُمَّ یَرْجِعُ اِلٰی نَفْسِهٖ فَیَرَاهَا اَصْغَرَ صَاغِرًا

کسی مرید کا صدق و اخلاص صحیح اور درست نہیں ہوسکتا۔ جب تک کہ شریعت کا پورا پیروکار نہ ہو جائے اور مخلوق سے پورے طور پر بے نیاز ہو کر امید منقطع نہ کر لے۔ اس راہ کے مبتدیوں پر اسی لئے آفتیں نازل ہوتی ہیں کہ ان کی نگاہ امید مخلوق پر لگی ہوتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اس وقت تک کوئی شخص مومن کامل نہیں ہوسکتا جب تک کہ تمام انسان اس کے نزدیک اونٹ جیسے نہ ہوں اور جب تک کہ اپنے کو سب سے کم درجہ نہ سمجھے (یعنی جب تک تمام انسانوں کو اپنے سے زیادہ درجہ والا نہ سمجھے گا اور دوسروں کے مقابلہ میں اپنے کو معمولی نہ سمجھے گا اس وقت تک مومن کامل نہ ہوگا)

خواجہ علاء الدین عطار رحمتہ اللہ علیہ کے احوال میں مولانا جامی رحمتہ اللہ علیہ اپنی کتاب نفحات الانس میں فرماتے ہیں کہ آپ نے ایک دفعہ خواجہ بہاء الدین نقشبند رحمتہ اللہ علیہ کا ذکر کیا کہ وہ فرمایا کرتے تھے!

---

(۱) اخرجہ الترمذی (القیامتہ باب (توکل ۲۵۲۰) والنسائی (۸، ۳۲۷، ۳۲۸) باب الحث علی ترک الشبہات) واحمد (۱/۲۰۰) وقال الترمذی حسن صحیح۔ الحاکم (۲/۱۳، ۱۳، ۴/۹۹) کلہا عن حسن بن علیؓ۔ صححہ ووافقہ الذہبی والبغوی (۸/۷، ۱، ۲۰۲۳) عن الحسن بن علی وصححہ ابن حبان (۵۱۲)

"خدا کا مجاور بننا اس کی مخلوق کے مجاور بننے سے بہتر ہے"۔ خواجہ صاحب اکثر یہ شعر پڑھا کرتے تھے۔

تو تا کے گور مرداں را پرستی
بگرد و کار مرداں کن درستی

تو کب تک قبر پرستی کرے گا۔ جا لوگوں کے کام آ۔

حضرت سید المشائخ ابو محمد محی الدین جیلانی رحمۃ اللہ علیہ جو اولیا محققین کے سرخیل و سپہ سالار ہیں، اپنی کتاب فتوح الغیب میں فرماتے ہیں:

مَنْ اَرَادَ السَّلَامَةَ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ فَعَلَیْهِ بِالصَّبْرِ وَالرِّضٰی وَتَرْکِ الشَّکْوٰی اِلَی الْخَلْقِ وَاِنْزَالِ حَوَائِجِه بِرَبِّه عَزَّوَجَلَّ وَانْتِظَارِ الْفَرَجِ مِنْهُ تَعَالٰی اِذْ هُوَ خَیْرٌ مِّنْ غَیْرِه

جو شخص دنیا اور آخرت میں سلامتی کا طالب ہے، اسے چاہئے کہ صبر کو اپنا شعار بنائے، ہر حال میں راضی برضا رہے، مخلوق سے شکایت نہ کرے اور اپنی حاجات کا سوائے پروردگار کے بذریعہ دعا و سوال یا زبان قال و حال کے اور کسی سے ذکر نہ کرے۔ ہر ایک مشکل کشائی کی توقع اسی کی ذات سے رکھے، کیوں کہ اسی کی ذات تمام موجودات سے برتر و اعلیٰ ہے۔

ایک عجیب خبط

قبر پرستوں کی یہ بھی عادت ہے کہ جب آیات کلام الٰہی، احادیث رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا اقوال اولیا کرام رحمہم اللہ پیش کیے جائیں تو ان کا جواب اپنی عقلی تاویلوں سے دیتے ہیں، کہتے ہیں ارواح اولیا کرام رحمہم اللہ اگرچہ خدا کی مخلوق ہیں مگر بوجہ اس قرب کے جو ان کو بمقابلہ دوسری مخلوق کے اپنے خدا کے ساتھ حاصل ہے، ان کو حاجت روا سمجھ کر پکارنا برا نہیں، جیسا کہ کہا گیا ہے۔

اولیا راہست قدرت از الٰہ   تیر جستہ باز گردانند ز راہ

(اولیاء اللہ کو خدا کی طرف سے ایسی قوت حاصل ہوتی ہے کہ وہ چھوڑے ہوئے تیر کو راہ سے واپس پلٹا دیتے ہیں)۔

حاشاوکلا! اللہ تعالیٰ یہ فرماتا ہے:

وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلاَ كَاشِفَ لَهٗ اِلَّا هُوَ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلاَ رَآدَّ لِفَضْلِهٖ. (۱۰:۱۰۷)

اگر اللہ تعالیٰ تجھے نقصان پہنچانا چاہے تو کوئی شخص اس کو دور نہیں کر سکتا اور اگر وہ کوئی راحت پہنچانا چاہے تو بھی اس کے فضل کو کوئی روک نہیں سکتا۔

اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد ہے:

لَوْجَمَعَ الْعِبَادُ عَلٰى اَنْ يَّنْفَعُوْكَ بِشَيْءٍ لَمْ يَقْضِهِ اللّٰهُ لَكَ لَمْ يَقْدِرُوْا عَلَيْهِ وَلَوْجَمَعَ الْعِبَادُ عَلٰى اَنْ يَّضُرُّوْكَ بِشَيْءٍ لَمْ يَقْضِهِ اللّٰهُ عَلَيْكَ لَمْ يَقْدِرُوْا!

اور تمام لوگ اکٹھے ہو کر تجھے کوئی فائدہ پہنچانا چاہیں جو خدا کو منظور نہیں تو نہیں پہنچا سکتے اور (اسی طرح) اگر نقصان پہنچانے پر اکٹھے ہو جائیں جو خدا نے تیرے مقدر میں نہیں لکھا تو نہیں پہنچا سکتے۔(۱)

اس حدیث کا پہلا حصہ یہ ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے روایت کیا ہے کہ:

بَيْنَ اَنَا رَدِيْفُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّمَ اِذْ قَالَ لِيْ يَا غُلَامُ اِحْفَظِ اللّٰهَ يَحْفَظْكَ اِحْفَظِ اللّٰهَ تَجِدْهُ اَمَامَكَ فَاِذَا سَئَلْتَ فَاسْئَلِ اللّٰهَ وَاِذَا اسْتَعَنْتَ فَاسْتَعِنْ بِاللّٰهِ جَفَّ الْقَلَمُ بِمَا هُوَ كَائِنٌ الخ (رواہ الترمذی مشکوٰۃ باب التوکل)

میں ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے سوار تھا کہ آپ نے فرمایا اے لڑکے! تو اللہ تعالیٰ (کے امر و نہی کو) نگاہ میں رکھ اللہ تعالیٰ تیری حفاظت کرے گا اگر تو اللہ تعالیٰ کی طرف نگاہ رکھے گا تو اس کو اپنے سامنے پائے گا۔ اگر سوال کرنے کی حاجت ہو تو اللہ تعالیٰ سے سوال کر، اور اگر مدد کی ضرورت ہو تو اس کی مدد مانگ، ہر چیز کی نسبت قلم لکھ کر خشک ہو چکا۔

تمام کتب صحاح میں مختلف الفاظ کے ساتھ یہ حدیث آئی ہے۔ فتوح الغیب میں اس حدیث کے بعد لکھا ہے:

---

(۱) اخرجہ الترمذی (قیامۃ ۵۹، ۲۶۳۵) وقال حسن صحیح احمد (۲۹۳/۱، ۳۰۳، ۳۰۷) والقضاعی فی مسند الشہاب (۴۳۴/۱، ۴۲۵) والطبرانی فی الکبیر (۱۱۲۴۳)

فَيَنْبَغِي لِكُلِّ مُؤْمِنٍ اَنْ يَّجْعَلَ هٰذَا الْحَدِيْثَ مِرْاٰةً لِقَلْبِهٖ وَشِعَارِهٖ وَدِثَارِهٖ وَحَدِيْثِهٖ فَيَعْمَلُ بِهٖ جَمِيْعَ حَرَكَاتِهٖ وَسَكَنَاتِهٖ حَتّٰى يُسْلَمَ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَيَجِدِالعِزَّةَ فِيْهِمَا بِرَحْمَةِ اللّٰهِ تَعَالٰى.

ہر مومن کو چاہیے کہ اس حدیث کو اپنے دل کا آئینہ بنائے، اور اپنی گفتگو، لباس اور جملہ حرکات وسکنات میں اس پر عمل کرے تاکہ خدا کی رحمت سے دنیا وآخرت میں نجات اور عزت پا سکے۔

آگے لکھا ہے:

وَاَرْضَاهُ مَنْ سَأَلَ النَّاسَ مَا سَئَلَ اِلَّا بِجَهْلِهٖ بِاللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ وَضُعْفِ اِيْمَانِهٖ وَمَعْرِفَتِهٖ وَيَقِيْنِهٖ وَقِلَّةِ صَبْرِهٖ.

جو شخص ضرورت کے وقت لوگوں سے مانگتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی صفات سے بے خبر ہے۔ یہ اس کے ایمان کی کمزوری ہے اور طبیعت کی بے صبری کی علامت ہے۔

حدیث شریف اور شیخ جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول سے معلوم ہوا کہ پیر پرستوں کا طریق شریعت اور طریقت دونوں سے جدا ہے اگر وہ کہیں کہ یہ مقام حقیقت کی باتیں ہیں تو انہیں بتانا چاہیے کہ منزل طریقت وحقیقت کے امام حضرت شیخ جیلانی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب فتوح الغیب میں فرماتے ہیں:

كُلُّ حَقِيْقَةٍ لَايَشْهَدُ لَهَا الشَّرْعُ فَهِيَ زِنْدَقَةٌ

(جو حقیقت شریعت کے مخالف ہو وہ کفر والحاد ہے)

حقیقت، شریعت کے مخالف نہیں

اس قول کی تشریح میں شیخ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ حقیقت، شریعت کے مخالف نہیں ہوسکتی، کیونکہ کسی چیز پر ایمان لانے کے یہ معنی ہیں کہ اس پر کاربند ہو کر اس کی حقیقت کو پہنچ سکیں۔ اور یہ ایک ہی راستہ ہوگا۔ جس کی انتہا اس کی ابتدا کے مخالف نہیں۔ پس اگر کسی کو کوئی امر خلاف شرع نظر آئے تو اسے باطل سمجھنا چاہیے اور اس پر عمل نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ جان بوجھ کر باطل پر عمل کرنے والا کافر ہوتا ہے۔

ابو سلیمان دارانی علیہ الرحمتہ کا قول

ابو سلیمان دارانی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں: بسا اوقات مجھ پر ایک نکتہ ظاہر ہوا مگر میں نے اسے اس وقت تک قبول نہ کیا جب تک کہ کتاب وسنت سے اس کی تصدیق نہ کر لی۔

آگے فرماتے ہیں:

جان لو کہ (حدود شریعت کی حفاظت کے ساتھ) مقام شہود وتوحید صدیقوں اور عارفوں کا مقام ہے اور یہ وہ مقام ہے جہاں بہت سے سالک پہنچ کر حیران وششدر رہ جاتے ہیں، بلکہ بعض تو ایمان و دین سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔

پھر فرماتے ہیں:

یاد رہے کہ دین ایک ہے شریعت، طریقت اور حقیقت جدا جدا، تینوں دین نہیں ہیں بلکہ یہ اسی ایک کی شاخیں ہیں، واللہ بقول الحق وھو یھدی السبیل......انتھی کلامہ۔

حضرت ابو سعید خزاز رحمتہ اللہ علیہ کا قول

ابو سعید خزاز رحمتہ اللہ علیہ اکابر مشائخ میں سے گزرے ہیں۔ آپ کا قول ہے:

كُلُّ بَاطِنٍ يُخَالِفُهُ الظَّاهِرُ فَهُوَ بَاطِلٌ وَّمَلُوْمٌ

جس باطن کا ظاہر مخالف ہو وہ باطن باطل ہے، اور ملامت کے قابل ہے۔

حضرت بہاء الدین زکریا رحمتہ اللہ علیہ کا واقعہ

کتاب سیر المشائخ میں باطن کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک دفعہ حضرت بہاء الدین زکریا رحمتہ اللہ علیہ ملتانی حسب معمول صبح کی جماعت میں شریک ہوئے ایک رکعت ہو چکی تھی اس لئے تشہد میں امام کے سلام پھیرنے سے پہلے اٹھ کھڑے ہوئے۔ نماز کے بعد امام نے کہا: اے شیخ! امام کے سلام پھیرنے سے پہلے مقتدی کو اٹھنا جائز نہیں۔ کیوں کہ ممکن ہے ابھی کچھ باقی ہو اور امام کی متابعت فوت ہو جائے" شیخ نے جواب دیا "اگر نور باطن سے پتہ لگ جائے کہ نماز ہو چکی اور کچھ باقی نہیں تو ایسی صورت میں سر امام سے پہلے اٹھنے میں کیا مضائقہ ہے"۔ امام نے کہا "ہرگز جائز نہیں۔ جو نور شریعت کے مخالف ہو وہ نور نہیں تاریکی ہے"۔ اس پر حضرت شیخ نے کہا "آمنا"

شیخ ابوعبداللہ حارث بن اسدی رحمتہ اللہ علیہ کا قول

شیخ ابوعبداللہ حارث بن اسدی محاسبی رحمتہ اللہ علیہ متقدمین اہل طریقت کے علما میں سے ہیں۔آپ فرماتے ہیں:

مَنْ صَحَّ بَاطِنُهُ بِالْمُرَاقَبَةِ وَالْاِخْلَاصِ زَيَّنَ اللّٰهُ ظَاهِرَهُ بِالْمُجَاهِدَةِ وَاتِّبَاعِ السُّنَّةِ

جس کا باطن مراقبہ واخلاص سے درست ہوگیا اس کا ظاہر اللہ تعالیٰ سنت کی پیروی اور ریاضت سے آراستہ فرمادیتا ہے۔

ابوحفص کبیر حداد رحمتہ اللہ علیہ کا قول

ابوحفص کبیر حداد رحمتہ علیہ فرماتے ہیں:

مَنْ لَّمْ يَزِنْ اَحْوَالَهُ وَاَقْوَالَهُ وَاَفْعَالَهُ بِمِيْزَانِيْ الْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ وَلَمْ يَتَّهِمْ خَوَاطِرَهُ فَلَا تَعُدُّوْهُ فِيْ دِيْوَانِ الرِّجَالِ

جوشخص اپنے اقوال،احوال اورافعال کوکتاب وسنت کے مطابق نہیں رکھتااورخواہشات کی پیروی کوبرانہیں سمجھتااسے مردوں کی فہرست میں شمارمت کرو۔

ابو یزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ کا قول

سلطان العارفین ابو یزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

وَلَوْ نَظَرْتُمْ اِلٰى رَجُلٍ اُعْطِيَ اَنْوَاعاً مِّنَ الْكَرَامَاتِ حَتّٰى يُطِيْرُ فِي الْهَوَآءِ اَوْ مَشٰى عَلَى الْمَآءِ لَاتَعْتَبِرُوْا بِهٖ حَتّٰى تَنْتَظِرُوْا كَيْفَ تَجِدُوْنَهٗ بِاَدَاءِ الْاَمْرِ وَالنَّهْيِ وَحِفْظِ الْحُدُوْدِ وَاَدَآءِ اَحْكَامِ الشَّرِيْعَةِ

اگرتمہیں ایساشخص نظر آئے جوتمہاری دانست میں بے شمارکرامتوں سے مشرف کیا گیا ہو، یہاں تک کہ ہوامیں اڑسکتا ہواورپانی کی سطح پرچل سکتا ہوتوجب تک یہ نہ دیکھ لوکہ وہ امرونہی،حفظ حدودشرعی اور پابندئ احکام اسلامی میں کیسا ہے،کبھی اعتبارنہ کرواوراس کی کرامات کے قائل نہ ہو

حضرت جنید بغدادی علیہ الرحمتہ کا قول

امام طریقت سیدالطائفہ حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

طُرُقٌ اِلَى اللّٰهِ بِعَدَدِ اَنْفَاسِ الْخَلَائِقِ وَكُلُّهَا مَسْدُوْدَةٌ عَلَى الْخَلْقِ اِلَّا عَلٰى مَنِ اقْتَفٰى اَثَرَ اَثَرِ الرَّسُوْلِ

اللہ تک پہنچنے کے راستے خلق خدا کی سانسوں کی مقدار کے مطابق ہیں مگر یہ سب اس وقت تک ہر شخص پر بند ہیں جب تک کوئی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قدم بقدم نہ چلے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ ان تمام بزرگوں نے سنت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی اور امر و نہی پر استقامت کو واجب سمجھا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ (۶:۱۲۰)

ظاہر اور باطن دونوں طرح کے گناہ چھوڑ دو۔

یہ اس امر کی دلیل ہے کہ شریعت کی ظاہر میں مخالفت کرنا بھی گناہ ہے اور یہ کسی کے لئے بھی جائز نہیں۔ اسی طرح شریعت کی خلاف ورزی کرنے والے کی پیروی کرنا بھی ظاہری گناہ ہے اور یہ کسی کے لئے جائز نہیں۔ حدیث شریف میں ہے کہ ابراہیم بن میسر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ وَقَّرَ صَاحِبَ بِدْعَةٍ فَقَدْ اَعَانَ عَلٰى هَدْمِ الْاِسْلَامِ

جس نے کسی بدعتی کی تعظیم کی اس نے (گویا) دین حقہ اسلام کی تباہی اور بربادی میں امداد دی۔

یعنی یہ صحیح ہے کہ کسی بدعتی کی کبھی تعظیم وتوقیر نہ کی جائے کیونکہ بدعت کی عزت کرنا درحقیقت اسلام کی تذلیل وتحقیر کرنا ہے۔

مشائخ کا حزم واحتیاط

شریعت کی مخالفت سے بچنے کے لئے اکابر مشائخ کا یہ حال تھا کہ ہر معاملہ میں کمال درجہ احتیاط سے کام لیتے تھے، لکھا ہے کہ حسین بن منصور حلاج رحمتہ اللہ علیہ بہت ہی عبادت گزار شخص تھا۔ ہزار نفل ایک رات میں پڑھا کرتا تھا۔ مگر باوجود اس زہد وعبادت کے جب اس نے انا الحق کہا

یہ حدیث ضعیف ہے۔ اس کی تخریج ابن عدی نے الکامل (ل۔۹/۴) اور ابن حبان نے الضعفاء (۱/۲۳۵) میں اور ابن جوزی نے موضوعات میں (۱/۲۷۱) کی ہے۔

تو سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ اور وقت کے دوسرے مشائخ نے اس کو قابل سزائے موت قرار دیا اور اس کے قتل کا فتویٰ لکھ کر پھانسی پر لٹکا دیا۔

اخبار الاخیار میں لکھا ہے کہ حضرت نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ سے شیخ ابن منصور حلاج کی نسبت دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا وہ مردود ہے۔ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو مردود کہا جو وقت کا پیشوا تھا۔

سید محی الدین جیلانیؒ کے حالات میں لکھا ہے کہ آپ نے فرمایا: ''منصورؒ کی کسی شخص نے اصلاح نہ کی، اگر میں اس وقت موجود ہوتا تو اس کی اصلاح کرتا اور نوبت یہاں تک نہ پہنچتی''۔ ہوسکتا ہے جس چیز کو منصور کے مخالف حق سمجھتے ہوں وہی چیز ان کے بزرگوں کے نزدیک غلط ہو۔

غرض اس قصہ سے یہ ثابت ہوا کہ جو لوگ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے طریقہ کے مخالف ہیں وہ مشائخ و بزرگان دین کے طریقہ کے بھی مخالف ہیں۔ ایسے لوگوں کا اپنے آپ کو محبّ مشائخ کہنا غلط ہے، بقوائے۔

يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ (۳:۱۶۷)

(جو بات منہ سے کہتے ہیں وہ ان کے دل میں نہیں)

اس جماعت کا عجب حال ہے۔ جب آیات واحادیث اور آثار مشائخ رحمہم اللہ سے دلائل پیش کئے جائیں تو روافض کی طرح لاجواب ہو کر کہتے ہیں کہ ہمارے بزرگوں سے یہ باتیں مروی نہیں ہیں، ممکن ہے کہ یہ باتیں انھوں نے اپنے خاص لوگوں سے کہی ہوں، خیال کرو کہ یہ لوگ کس طرح اپنے بزرگوں پر تقیہ کی تہمت لگاتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسے ہی لوگوں کی نسبت ارشاد فرمایا اور ان سے بچنے کی تاکید فرمائی۔ ارشاد ہے:

يَكُوْنُ فِيْ اٰخِرِ الزَّمَانِ كَذَّابُوْنَ دَجَّالُوْنَ يَاْتُوْنَكُمْ مِنَ الْاَحَادِيْثِ بِمَالَمْ تَسْمَعُوْا اَنْتُمْ وَلَا اٰبَآءُكُمْ فَاِيَّاكُمْ لَا يُضِلُّوْنَكُمْ وَلَا يَفْتِنُوْنَكُمْ (۱)

آخری زمانہ میں کذاب اور دجال پیدا ہوں گے۔ تم ان سے ایسی باتیں سنو گے جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے نہ سنیں۔ ان سے بچنا، کہیں تمہیں گمراہ نہ کردیں اور فتنہ میں نہ ڈال دیں۔

---

(۱) مسلم (مقدمہ ۶) مسند احمد (۲/۳۴۹) بغوی (۱/۲۲۳) الحاکم (۱/۱۰۳)

لفظ ''دجالون'' ظاہر کرتا ہے کہ وہ کس عیاری سے اپنے شعبدوں کو کرامت ثابت کر کے گمراہ کریں گے، ان سے بچنے کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اتباع سنت کی تاکید فرمائی ہے:

مَنْ تَمَسَّكَ بِسُنَّتِي عِنْدَ فَسَادِ اُمَّتِي فَلَهُ اَجْرُمِائَةِ شَهِيْدٍ

جو شخص فساد کے وقت میری سنت کی متابعت کرے گا اسے سو شہید کا ثواب ہے۔

حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زمین پر ایک خط کھینچا اور فرمایا: هذا سبيل الله (یہ اللہ کا راستہ ہے) پھر اس کے دائیں بائیں خط کھینچے اور فرمایا: هذا سبيل على كل سبيل منها الشيطان يدعو اليه (۱) (ان راستوں میں سے ہر ایک پر شیطان ہے جو اپنی طرف بلا رہا ہے) پھر یہ آیت تلاوت فرمائی۔

هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ. (۶:۱۵۳)

یہ میرا راستہ سیدھا ہے اس پر چلو دوسری راہوں پر مت چلو ورنہ خدا کی راہ سے ہٹ جاؤ گے۔ یہ خدا کا تاکیدی حکم ہے تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔

یعنی دین حق کی بتلائی ہوئی صراط مستقیم پر چلے بغیر، شیطانی راہوں سے بچنا محال ہے۔

شرح السنہ میں عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِّمَا جِئْتُ بِهٖ

کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کی خواہشات اس چیز کے تابع نہ ہوں جو میں

---

(۱) من حدیث ابن عباس رواہ ابن عدی فی الکامل (ل۹۰/ب) وابن بشران فی امالیہ (ل۹۳......م،۳۴۱ب) وسنده ضعيف جداو عزاه المنذرى في الترغيب (۱/۸۰) الى البيهقى ورواه ابونعيم في الحلية (۸/۲۰۰) والطبرانى فى الاوسطه كما فى المجمع (۱/۱۷۲) قال ابونعيم "غريب" وقال الهيثيمى ومحمد ابن صالح العدوى لم ارمن ترجمه ومنه تعلم ان قول المندرى: واسناده الاباس به ليس كما ينبغى مسند احمد (۱/۴۳۵، ۴۶۵) والدارمى فى سننه (المقدمة، باب كراهيته اخذ الآى ۱/۶۷) والحاكم (۲/۲۳۹/۳۱۸ وصححه ووافقه الذهبى

لے کر آیا ہوں۔

مطلب یہ ہے کہ آدمی کو چاہئے کہ مقدمات ایمانی اور امور اسلام میں خواہش نفس کی پیروی نہ کرے، ورنہ ایمان جاتا رہے گا اور وہ قیود شرع سے آزاد ہو کر شیطان کی غلامی میں پھنس جائیگا۔

عقائد میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہ سے موافقت ضروری ہے

مخفی نہ رہے کہ دین اسلام دو چیزوں پر مشتمل ہے، عقائد اور اعمال بلاشبہ یہ مشکل امر ہے کہ ہمارے اعمال زندگی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اعمال جیسے ہو جائیں اور جو جو کام انھوں نے اپنی مبارک زندگیوں میں انجام دیئے ہم بھی انجام دے لیں۔ یعنی اعمال میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ساتھ پوری پوری مماثلت پیدا کر لینا چونکہ ہر شخص کے لئے مشکل بات تھی اس لئے شریعت نے ہر شخص کو بقدر طاقت ووسعت مکلّف کیا ہے لیکن عقائد کی حالت اس سے بالکل مختلف ہے۔ عقائد میں تو ان کے ساتھ پوری مماثلت پیدا کرنا ہر مسلم کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے اور ادنیٰ سی مخالفت کو بھی بے دینی اور گمراہی بتایا گیا ہے، کیا یہ انبیا علیہم السلام سے عقائد میں اختلاف کرنے کا نتیجہ نہ تھا جس نے یہود ونصاریٰ کو گمراہ کر دیا اور وہ اکہتر اے، بہتر ۷۲ فرقوں میں تقسیم ہو گئے؟ اسی چیز سے متنبہ کرنے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا کہ:

لَيَأْتِيَنَّ عَلٰى اُمَّتِيْ زَمَانٌ كَمَا اَتٰى عَلٰى بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ حَتّٰى اِنْ كَانَ مِنْهُمْ مَنْ اَتٰى اُمَّهٗ عَلَانِيَةً لَكَانَ فِيْ اُمَّتِيْ مَنْ يَّصْنَعُ ذٰلِكَ وَاِنَّ بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ تَفَرَّقَتْ عَلٰى اِثْنَيْنِ وَسَبْعِيْنَ مِنْهُ وَتَفَرَّقَ اُمَّتِيْ عَلٰى ثَلَاثٍ وَّسَبْعِيْنَ مِلَّةً كُلُّهُمْ فِي النَّارِ اِلَّا مِلَّةً وَّاحِدَةً قَالُوْا مَنْ هِيَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ (صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) قَالَ مَا اَنَا عَلَيْهِ وَاَصْحَابِيْ (۱)

جو واقعات بنی اسرائیل پر گزرے ہیں وہی واقعات میری امت پر گزریں گے۔ ٹھیک ایسے ملتے جلتے جیسے ایک جوتی دوسری جوتی کے برابر ہوتی ہے یہاں تک کہ بنی اسرائیل میں سے

(۱) الترمذی الایمان باب افتراق ہذہ الامۃ وقال حدیث حسن وغریب

اگر کسی نے اپنی ماں سے بدکاری کی ہوگی تو مسلمانوں میں بھی ایسے شخص پیدا ہوں گے جو اسی طرح کریں گے۔ اور بنی اسرائیل بہتر۷۲ فرقوں میں بٹ گئے۔ مسلمان تہتر۷۳ فرقے بن جائیں گے جن میں صرف ایک جماعت جنتی ہے باقی تمام دوزخی ہیں۔ پوچھا گیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جنتی گروہ کونسا ہے؟ فرمایا اس طریق پر چلنے والے جس پر میں اور میرے صحابہؓ ہیں۔

اس حدیث کو ابو عیسیٰ ترمذی رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی جامع میں روایت کیا ہے۔ مسند امام احمد بن حنبل رحمتہ اللہ علیہ میں اس کے خاتمہ پر یہ الفاظ بھی ہیں:

وَهِيَ الْجَمَاعَةُ وَإِنَّهُ سَيَخْرُجُ فِي أُمَّتِي أَقْوَامٌ تَتَجَارٰى بِهِمْ تِلْكَ الْأَهْوَآءُ كَمَا يَتَجَارٰى الْكَلْبُ بِصَاحِبِهٖ وَلَا يَبْقٰى مِنْهُ عِرْقٌ وَلَا مَفْصِلٌ إِلَّا دَخَلَهٗ. (۱)

وہ ناجی گروہ ایک جماعت ہے اور مسلمانوں میں ایسے لوگ بھی پیدا ہوں گے جن میں یہ باتیں (بنی اسرائیل کی عادتیں) اس طرح سرایت کر جائیں گی جس طرح دیوانے کتے کا زہر آدمی کے جسم میں سرایت کر جاتا ہے کہ وجود میں کوئی پٹھہ اور ریشہ اس کے اثر سے بچا ہوا نہیں رہتا۔

حاصل یہ ہوا کہ ہوائے نفس کے پیچھے چلنا بے دینی پیدا کرتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے طریق کی پیروی کرنا یقیناً موجب نجات ہے پس جب یہ صحیح ہے کہ سنت کی پیروی میں نجات اور اس کی مخالفت میں ہلاکت اور تباہی ہے تو ہر حال میں اپنے احوال، افعال اور اقوال کو کتاب وسنت کی ترازو پر جانچتے رہنا چاہیئے۔ بڑے بڑے علما و مشائخ نے یہی کہا ہے اور ان کے اقوال اوپر گزر چکے ہیں۔ حضرت شیخ سعدی رحمتہ اللہ علیہ نے اس وسیع مضمون کو ایک شعر میں ادا کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں

خلاف پیمبر کسے راہ گزید   کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

(جس نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف راستہ اختیار کیا وہ ہرگز منزل مقصود تک نہیں پہنچے گا)۔

بلا شبہ عملی مخالفت بھی معصیت اور گناہ ہے لیکن اگر اس کے مرتکب کو اپنے اپنے قصوروں کا اعتراف ہو تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفاعت سے یہ گناہ معاف ہو سکتا ہے۔ حضرت شیخ

(۱) احمد (۱۰۲/۴) ابوداؤد (۵/۵، ۴۵۹۷) السنۃ باب اول اسنادہ صحیح

سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے متعلق بھی اشارہ فرمایا ہے۔

نماند بعصیاں کسے درگرد — کہ وارد چنیں سید پیشرد

جو شخص محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جیسا پیشوا رکھتا ہے وہ ہرگز گناہوں کے بدلے عذاب میں نہ جائے گا۔

شیخ موصوف رحمۃ اللہ علیہ کے اس ارشاد میں پیشرو کا لفظ عمل میں کوتاہی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ کیوں کہ جو لوگ سرے سے اعتقاد ہی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ متفق نہیں، آپ ان کے پیشرو کس طرح ہو سکتے ہیں۔ قرآن مجید میں ہے:

إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ إِنَّمَا أَمْرُهُمْ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُم بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ. (۱۵۹:۶)

جن لوگوں نے اپنے دین کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے اور گروہ گروہ ہو گئے (اے نبیؐ) آپ کا ان سے کوئی تعلق نہیں۔ ان کا معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ ان کو ان کی کارگزاریاں جتلا دے گا۔

تنبیہ

اے مدعیان طریقت، زمانہ نبوت کو گزرے مدت دراز ہوگئی اور قرون ثلاثہ کا وہ دور ختم ہوسکتا، جس کی دینداری وتقویٰ کی تعریف خود رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کی تھی۔ اب یاد رکھنا چاہیئے کہ اولیا کرام رحمہم اللہ اور علمائے دین کے مشہور اقوال واحوال کا معاملہ جو تواتر کے ساتھ ثقہ راویوں سے مروی نہیں، بالکل اہل کتاب کی روایتوں کے مانند ہوگیا ہے، جن کا ایک حصہ قرآن مجید کے موافق ہے، دوسرا مخالف ہے اور تیسرا نہ مخالف ہے نہ موافق۔ ہمیں حکم یہ دیا گیا ہے کہ جو حصہ موافق ہے اس کی تصدیق کرو اور جو مخالف ہے اس کی تکذیب وتردید کرو اور تیسرے حصہ سے کچھ سروکار نہ رکھو۔

علمائے ربانی کا ارشاد ہے کہ شعائر اسلام کی مخالفت کرنے والے کو سمجھانا چاہیئے اور اس کی بدعملی سے بیزاری کا اظہار کرنا چاہیئے اور اس کے ساتھ ہم نشینی نہ رکھنا چاہیے۔ کیوں کہ ایسا کرنا ان سے پیار کرنے کے برابر ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ اَحَبَّ قَوْماً فَهُوَ مِنْهُمْ. (۱)

جس نے کسی قوم کو دوست رکھا وہ انہی میں سے ہے۔

فاسق و فاجر سے میل جول کا انجام عذاب الٰہی ہے

یہودیوں میں سبت کے روز مچھلی پکڑنا حرام تھا۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں ان کی تین جماعتیں ہو گئیں۔ ایک وہ جس نے سبت کے دن مچھلیاں پکڑنی شروع کر دیں۔ دوسری وہ جو ان کو منع کرتی رہی اور تیسری وہ جو مذکورہ بالا جماعتوں کے بین بین رہی یعنی پکڑنے والوں کو تو کچھ نہیں کہا، لیکن روکنے والوں کو روکنے سے منع کرتی رہی۔ اللہ تعالیٰ نے ان تینوں کا حال یکجا بیان فرمایا ہے:

اَنْجَیْنَا الَّذِیْنَ یَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ وَاَخَذْنَا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍ بَئِیْسٍ بِمَا کَانُوْا یَفْسُقُوْنَ (۷:۱۶۵)

ہم نے (صرف) ان لوگوں کو نجات دی جو برائی سے روکتے تھے اور باقی ظالموں کو سخت عذاب میں پکڑ لیا کیونکہ وہ حکم عدولی کرتے تھے۔

مفسرین کا خیال ہے کہ عذاب الٰہی سے صرف وہ جماعت بچ سکی جو روکنے والی تھی۔ باقی دونوں جماعتیں بسبب ارتکاب و اعانت فسق ہلاک ہو گئیں۔ یعنی وہ بھی جو سبت کی بے حرمتی کرتی تھی اور وہ بھی جو یہ کہتی تھی:

لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْماً اللّٰهُ مُهْلِکُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِیْدًا (۷:۱۶۴)

(یعنی تم کیوں ایسی قوم کو نصیحت کرتے ہو جنہیں اللہ ہلاک کرے گا یا عذاب شدید کا مزہ چکھائے گا۔)

مسلم کی ایک روایت

صحیح مسلم کی مندرجہ ذیل حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ جب مدافعت کی طاقت نہ ہو اور بالکل بیچارگی کی حالت ہو گئی ہو تو بھی منکرات کے مرتکب سے بغض و نفرت رکھنا ضروری ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

مَا مِنْ نَبِیٍّ بَعَثَهُ اللّٰهُ فِیْ اُمَّتِهٖ قَبْلِیْ اِلَّا کَانَ لَهٗ فِیْ اُمَّتِهٖ حَوَارِیُّوْنَ وَاَصْحٰبٌ

---

(۱) ان الفاظ میں یہ حدیث ابھی تک نہیں ملی البتہ ص ۲۷ پر ایک حدیث بلفظ المرء مع من احب سے آئی ہو جو صحیح ہے

يَأخُذُوْنَ بِسُنَّتِهٖ وَيَقْتَدُوْنَ بِاَمْرِهٖ ثُمَّ اِنَّهَا تَخْلُفُ مِنْ بَعْدِهِمْ خُلُوْفٌ يَقُوْلُوْنَ مَالاَ يَفْعَلُوْنَ وَيَفْعَلُوْنَ مَالاَ يُؤْمَرُوْنَ فَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِلِسَانِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِقَلْبِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَيْسَ وَرَاءَ ذٰلِكَ مِنَ الْاِيْمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ (۱)

دنیا میں کوئی نبی نہیں آیا مگر اس کی امت میں ایک جماعت حواریوں کی ہوتی ہے جو نبی کی سنت پر چلتے اور اس کا حکم مانتے ہیں جب یہ لوگ اٹھ جاتے ہیں تو ایسے لوگ پیدا ہوتے ہیں جو ایسی باتیں کہتے ہیں جنہیں خود نہیں کرتے اور ایسی باتیں کرتے ہیں جنہیں کرنے کا حکم نہیں۔ ایسے لوگوں کے خلاف زبان اور دل سے جہاد کرنے والا مومن ہے اور زبان سے جہاد کرنے والا مومن ہے اور دل سے جہاد کرنے والا مومن ہے اور جو دل سے بھی جہاد نہیں کرتا وہ رائی کے دانہ برابر بھی ایمان دار نہیں ہے۔ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ سنت کی مخالفت کرنے والے سے محبت رکھنا کفر سے قریب اور ایمان سے دور کر دیتا ہے اور ضمناً یہ بھی ثابت ہو گیا کہ قبور پر منکرات کا ارتکاب کرنے والوں سے اولیائے کرام کی روحیں اگر بدنی اور لسانی جہاد سے قاصر ہیں تو بدرجہ اقل قلبی بغض تو ضرور رکھتی ہوں گی۔

مکالمہ

ایک دفعہ جوانی کے ایام میں مجھے ایک پیر پرست سے گفتگو کرنے کا اتفاق ہوا کہنے لگا متشرع لوگ اولیاء اللہ کی قدر نہیں جانتے۔ انہیں جامد اور بے خبر سمجھتے ہیں اور ان کے مزاروں سے فائدہ نہیں اٹھاتے حالانکہ کہا گیا ہے۔

مردان خدا خدانہ باشند   لیکن ز خدا جدا نہ باشند

اللہ کے بندے خدا تو نہیں ہوتے لیکن خدا سے جدا بھی نہیں ہوتے۔

میں نے کہا ”اہل شریعت اولیا اللہ کی نسبت ایسا خیال کیوں کر سکتے ہیں جبکہ انہیں معلوم ہے کہ قرآن مجید میں کہا گیا ہے کہ شہدا فی سبیل اللہ زندہ ہیں اور پروردگار کے ہاں سے رزق پاتے ہیں! وہ تو ان کی پرستش سے منع کرتے ہیں، ورنہ ان کی قبروں کی زیارت کرنے اور ان کے حق میں دعائے مغفرت کرنے سے نہیں روکتے۔ رہا ان کے مزارات سے فائدہ اٹھانے کی بدعت تو یہ بعض

(۱) مسلم الایمان باب بیان کون النہی عن المنکر من الایمان (۱/۶۹-۷۰، ۵۰) واحمد (۱/۴۵۸، ۶۱)

فقیروں کی من گھڑت ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین اور تبع تابعین رحمہم اللہ سے اس کا ثبوت نہیں ملتا۔ بلکہ حضرت سلطان المشائخ رحمتہ اللہ علیہ کے زمانہ تک بھی اس کا وجود نہیں پایا جاتا۔ چنانچہ لکھا ہے کہ حضرت سلطان المشائخ رحمتہ اللہ علیہ ایک دفعہ حضرت خواجہ قطب الدین رحمتہ اللہ علیہ کی قبر کی زیارت کے لئے تشریف لے گئے اور قبر پر پہنچ کر انہیں خیال آیا کہ خدا جانے میرے آنے کی خبر حضرت خواجہ کو ہوتی ہے یا کہ نہیں، اس پر قبر سے آواز آئی۔ من آیم بجان، گرتو آئی بہ تن۔

''تو جسم کے ساتھ آیا ہے تو میں جان سے حاضر ہوں''۔

اس نے کہا: ''اس سے یہ کیوں کر ثابت ہوا کہ حضرت سلطان المشائخ رحمتہ اللہ علیہ کے زمانے میں قبروں سے فائدہ اٹھانے کا وجود نہیں تھا، حالانکہ سلطان المشائخ رحمتہ اللہ علیہ کا یہ خیال ہی اس بات کی دلیل ہے کہ آپ فائدہ اٹھانے کے قائل تھے''۔

میں نے کہا: ''آپ کا اس شک میں پڑ جانا کہ خدا جانے میرے آنے کی خبر ان کو ہوئی ہے یا نہیں، یہی بات میرے خیال کی تائید کرتی ہے''۔

اس نے کہا: ''تو ان کے سوا باقی بزرگ سب قائل ہوں گے کیونکہ اس زمانہ کے کسی بزرگ سے انکار مروی نہیں''۔

میں نے کہا: ''لو سنو! حضرت خواجہ بہاء الدین رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

تو تا کے گور مرداں را پرستی ... بگردد کار مرداں کن درستی

اس نے کہا: ''کہاں فائدہ اٹھانا اور کہاں پرستش''

میں نے کہا: ''فائدہ اٹھانے کا طریقہ بتاؤ''

اس نے کہا: ''جس طرح زندہ بزرگ کی صحبت میں بیٹھ کر باطنی توجہ کرنے سے فائدہ ہوتا ہے اسی طرح بزرگوں کے مزارات سے فائدہ حاصل ہوتا ہے کیوں کہ اولیا اللہ مرتے نہیں ہیں۔

ان اولیاء اللہ لایموتون،

میں نے کہا: ''یہ قول تمہارے دعویٰ کی دلیل نہیں ہو سکتا، کیوں کہ امور دینیہ کی دلیل صرف کتاب اللہ، سنت رسول اللہ اور اجماع امت پر مبنی ہے، نہ زید، بکر، عمر کے اقوال پر چنانچہ

اخبار الاخیار میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ حضرت شیخ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کے بعض مریدوں نے دف کے ساتھ گانا شروع کیا تو حضرت شیخ نصیر الدین محمود رحمۃ اللہ علیہ مجلس سے اٹھ کر چلے گئے، دوستوں نے بٹھانا چاہا، مگر نہ بیٹھے اور فرمایا:

''یہ کام سنت کے خلاف ہے''۔

دوستوں نے کہا کیا آپ سماع کے منکر ہیں، حالانکہ آپ کے پیر و مرشد اس کے جواز کے قائل تھے۔ آپ نے فرمایا: مشائخ کا کوئی فعل شرعی حجت نہیں، لکھا ہے، اس بات کا ذکر حضرت شیخ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں ہوا تو حضرت شیخ نے فرمایا: ''نصیر الدین نے سچ کہا ہے'' اس نے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ حضرت شیخ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد شیخ نصیر الدین سماع کے قائل ہو گئے تھے۔

میں نے کہا: خیر المجالس میں تو لکھا ہے کہ ایک دفعہ آپ سے ساز کے ساتھ گانے اور رقص کے متعلق پوچھا گیا تو فرمایا: دیکھو جو شخص مقام طریقت سے گرے گا، مقام شریعت میں پڑے گا، لیکن اگر مقام شریعت سے بھی گر جائے تو جہنم کے سوا کہاں جائے گا۔ پھر فرمایا، پہلے تو مطلق سماع ہی میں اختلاف ہے، بعض مشائخ نے چند در چند شرائط کے ساتھ خاص الخاص لوگوں کے لئے جائز کہا ہے اور وہ بھی بغیر ساز کے۔ ساز کے ساتھ تو بالا جماع حرام ہے۔

اس نے کہا شیخ موصوف نے سماع تو کیا ہے، خواہ مزامیر کے ساتھ نہ کیا ہو۔

میں نے کہا: اگر انھوں نے سماع کیا ہے تو میں انہی کے الفاظ میں کہوں گا کہ مشائخ کا کوئی فعل شرعی حجت نہیں ہے، خواجہ بہاء الدین رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول ہے کہ میں نہ ساز کے ساتھ سماع کرتا ہوں نہ بغیر ساز کے۔

میں نے کہا: آپ کو قبروں سے فائدہ حاصل کرنا ثابت کرنا تھا۔

اس نے کہا: اس موضوع پر بے شمار کتابیں لکھی ہوئی موجود ہیں، شاید آپ نے دیکھی نہیں۔

میں نے کہا: یہ سب مجاوران قبور کی تصنیف ہیں، جن میں بزرگوں پر بہتان لگائے گئے ہیں، چنانچہ خیر المجالس کے حوالہ سے اخبار الاخیار میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ ایک شخص نے شیخ نصیر الدین محمود رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا کہ خواجہ عثمان ہارونی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں لکھا ہے

کہ آپ نے فرمایا:

دو مادہ گائیں ذبح کرنا ایک قتل انسان کے برابر اور دس بھیڑ بکریاں ذبح کرنا ایک قتل انسان کے برابر ہے۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا خواجہ صاحب ہارونی نہیں تھے۔ ہردن ایک بستی کا نام ہے جو آپ کا وطن تھا۔ پھر فرمایا یہ الفاظ خواجہ صاحب کے نہیں ہو سکتے۔ میں نے اور بھی اس قسم کی باتیں ان کے متعلق سنی ہیں۔ مگر یہ سراسر بہتان وافترا ہے، جو خواجہ صاحب پر ان کے ناخلف مریدوں نے تراشا ہے پھر فرمایا، حضرت شیخ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ میں نے کوئی تصنیف نہیں لکھی، کیوں کہ مجھ سے بہتر شیخ فریدالدین اور شیخ قطب الدین و دیگر چشتی خواجگان رحمۃ اللہ علیہم اجمعین نے کوئی تصنیف نہیں لکھی۔

اس نے کہا: اس کی کیا وجہ ہے؟ دیگر اصفیا وعلما نے ہزاروں تصانیف لکھی ہیں۔

میں نے کہا: شاید اس لئے کہ کوئی تصنیف نہ لکھی ہوگی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کوئی تصنیف نہیں لکھی۔ مزید برآں یہ خیال آیا ہوگا کہ بزرگان سلف کی تصانیف لوگوں کی ہدایت کے لئے کافی ہیں۔

اس نے کہا: صوفی کے لئے سلف کے طریقے کی متابعت ضروری نہیں ہے کیونکہ کہا گیا ہے کہ الصوفی لا مذہب لہ اور مولانا روم فرماتے ہیں۔

ملت عشق از ہمہ ملت جدا است   عاشقان را مذہب وملت خدا است

عشق کا مذہب تمام مذاہب سے نرالا ہے، عاشقوں کا مذہب خدا ہے۔

میں نے پوچھا: کس طریقہ سے تعلق رکھتے ہو؟

اس نے کہا: تینوں طریقوں سے، مگر سلطان المشائخ کے ساتھ میری خاص محبت ہے۔

میں نے کہا: فوائد الفواد دیکھی ہے:

اس نے کہا: ہاں دیکھی ہے، یہ کتاب فقرا کے نزدیک قرآن مجید کے بعد سب سے بلند درجہ رکھتی ہے۔

میں نے کہا: اس کتاب میں لکھا ہے کہ حضرت سلطان المشائخ بزرگان سلف کا مذہب رکھتے تھے اور اپنے مریدوں کو بھی سلف کے اعمال وعقائد کی پیروی کا حکم دیتے تھے اور آپ کا یہ قول بھی

مذکور ہے جو شخص مقام طریقت سے گرے مقام شریعت میں پڑے گا لیکن جو شخص مقام شریعت سے تجاوز کرے گا وہ کہیں کا نہ رہے گا۔

اسی کتاب میں ایک مقام پر لکھا ہے کہ حسن سنجری رحمۃ اللہ علیہ سے ایک شخص نے کہا: آپ کے مرید اکٹھے ہو کر ساز سن رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا: میں نے تو اس سے ان کو منع کر دیا ہے۔ نہیں باز آتے تو برا کرتے ہیں۔ میرے نزدیک تو نماز میں غلطی سے امام کو آگاہ کرنے والی عورت کو تالی بجانا بھی جائز نہیں کیوں کہ یہ حرکت ساز بجانے سے مشابہ ہے اور لہو میں داخل ہے۔

اسی کتاب میں آپ سے ایک حکایت منقول ہے۔ آپ نے فرمایا:

قیامت کے دن ایک شخص سے سوال ہو گا، کیا تو نے سماع کیا۔ وہ کہے گا ہاں یا اللہ۔ پھر کہا جائے گا تو تو مضامین سماع کو ہی ہمارے اوصاف سمجھتا ہو گا۔

وہ اثبات میں جواب دے گا تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا شاعروں کے مضامین میں بیان کردہ اوصاف تو فانی تھے اور ہماری ذات قدیم ہے۔ فانی کا اطلاق ذات قدیم پر کیوں کر درست سمجھا؟ عرض کرے گا بار خدایا! تیرے ساتھ محبت کی وجہ سے اس پر اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ اگر میرے ساتھ محبت کی وجہ سے ایسا کیا تو معاف کرتا ہوں۔ یہ حکایت بیان کر کے آپ رو پڑے اور فرمایا، غور کرو، جب اللہ تعالیٰ اپنی محبت کے متوالوں سے اس طرح باز پرس کرے گا تو دوسروں کا کیا حال ہو گا۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں، میں نے کہا! اے بھائی تمہارا کلام موضوع سے دور جا پڑا۔ آپ نے فرمایا تھا کہ جس طرح زندہ پیر سے استفادہ ہو سکتا ہے اسی طرح پیر کی قبر سے بھی ہو سکتا ہے۔ مگر میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ یہ خیال آپ کے ذہن میں کس طرح بیٹھ گیا۔ جب کہ یہ امر اظہر من الشمس ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور سلف صالحین رحمتہ اللہ علیہم اجمعین سے اس کا ثبوت مذکور نہیں۔

اس نے کہا: ان لوگوں سے تو ہمیں بھی اتفاق نہیں جو مردہ پیر کو زندہ پیر کی طرح قادر برکمالات سمجھتے ہیں، اور قلبی اور لسانی ذکر کے لئے محض قبروں کو قبلہ توجہ بناتے ہیں لیکن جو شخص قبر کی بجائے صاحب قبر کی روح کو قبلہ توجہ بنا کر ذکر الٰہی کرے اس سے جواز میں کیا کلام ہے؟

میں نے کہا: دیکھو، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آپؐ کی

زندگی میں قبلہ توجہ نہ بنایا اور نہ بعد وفات آپ کی پاک روح کو یہ منصب دیا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اس کی تمام امت کے لئے صرف ایک قبلہ توجہ الی اللہ قرار دیا، جسے کعبہ کہتے ہیں اور اس کے سوا کسی بشر کو اجازت نہیں دی کہ کسی نیک آدمی کی روح کو قبلہ توجہ بنا کر مشغول ذکر اللہ ہو۔ اگر اس کے بعد بھی کوئی شخص ایسا کرے تو دین اسلام سے اس کے باغی ہو جانے میں کیا شک ہے، کیوں کہ وہ اپنے لئے نئی شریعت تجویز کرتا ہے، جس کا اللہ تعالیٰ نے اس کو حکم نہیں دیا۔

اس نے کہا: کیا متاخرین نے اس معاملہ میں غلطی کھائی؟

میں نے کہا: اگر متاخرین نے نہیں کھائی تو کیا متقدمین نے غلطی کھائی جن میں تابعین رحمہم اللہ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں، کہ اختیاری قبلہ کو چھوڑ کر مجبوری قبلہ اختیار کیا اور اتنی بڑی پابندی اپنے سر لے لی؟

اس نے کہا: ہمارے نزدیک کسی نے خطا نہیں کی متقدمین نے اگر ذکر ودعا کے وقت ارواح ووسائط کے فیض سے بے پروائی کی تو اس زمانے کے لئے وہی ٹھیک تھا اور اگر متاخرین نے فائدہ اٹھانے کا طریقہ گھڑا تو اس وقت تعلق باللہ کی یہی قریب ترین راہ ہے۔

قبلہ توجہ کی دلیل

میں نے کہا: اس سے تو یہ ثابت ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد اب بھی دین میں نسخ جاری ہے اور احکام میں تغیر وتبدل ہوسکتا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ دین مکمل کر چکے اور نسخ اور تبدیلی کو بند فرما چکے ہیں۔

ارشاد ہے: اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (۵:۳)

میں نے آج تمہارے لئے دین کو مکمل کر دیا۔ تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور دین اسلام کو تمہارے لئے پسند فرمالیا ہے۔

اس نے کہا: آگے بھی تو پڑھئے:

فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۵:۳)

لیکن وہ شخص جو گناہ کی طرف مائل ہونے والا نہیں، اگر بھوک کی وجہ سے بے قرار ہو کر ایسا کرے تو اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔

یعنی دین اسلام میں جس طرح حرام اور حلال مقرر ہو چکا ہے اور اضطرار و اضطراب کی حالت میں پھر بھی حرام چیز سے فائدہ اٹھانا جائز ہے، اسی طرح دور اول کے مقابلہ میں جو آفتاب نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے انوار سے پوری طرح منور تھا، اس زمانہ میں جب کہ اندھیری رات جیسے تاریک فتنوں کے ظہور نے بنی نوع انسان کے قلوب کو بالکل بے نور کر دیا ہے ارواح بزرگان سے نور حاصل کرنا جائز ہے تا کہ خدا کی راہ (صراط مستقیم) پر چلنے میں مدد ملے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

جب کسی امر میں پریشانی ہو تو اہل قبور سے مدد مانگ لیا کرو۔

میں نے کہا: ٹھہرو! ٹھہرو! یہ جو کچھ تم نے پڑھا ہے، حدیث نہیں ہے، مجاوروں کا قول ہے، جو تحصیل نذر و نیاز کے لئے انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ کتب صحاح میں اس کا نام و نشان تک نہیں۔ محدثین و صوفیائے محققین رحمہم اللہ علیہم اجمعین نے کہا ہے کہ یہ قول اور اس قسم کے دوسرے اقوال مثلاً جب مشکل پیش آئے تو اہل قبور سے مدد مانگ لیا کرو اور اگر کسی کا پتھر پر اعتقاد ہو تو وہ بھی فائدہ دے سکتا ہے، یہ سب قبر پرستوں کی بنائی ہوئی حدیثیں ہیں۔ باقی رہا آپ کا خیال کہ فتنہ کے زمانے میں بزرگوں کی ارواح سے روشنی حاصل کرنا جائز ہے۔ بالکل لغو خیال ہے، یہ خیال سنت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بالکل خلاف ہے اور سلف صالحین رحمہم اللہ سے اس کی نسبت کچھ بھی منقول نہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فتنوں سے بچنے کے لئے کتاب و سنت کے اتباع کرنے کا حکم فرمایا ہے اور کہیں یہ نہیں فرمایا کہ اضطرار کی حالت میں ملائکہ یا ارواح انبیا سے نور حاصل کر لیا کرو، چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت فرماتی ہیں کہ میں شب قدر میں کیا پڑھوں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب دیا، یوں کہا کرو۔

اَللّٰھُمَّ اِنَّکَ عَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّیْ. (۱)

(۱) النسائی فی عمل الیوم واللیلۃ (ص۴۹۹۔۸۷۳) الترمذی (۴/۲۶۴۔۳۵۱۳) قال حسن صحیح ابن ماجہ (الدعا باب الدعا بالعفو (۲/۳۳۵) ۳۸۹۵ احمد (۶/۱۷۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۲۰۸-۲۵۸) والحاکم (۱/۵۳۰) وصححہ علی شرط الشیخین

اے اللہ تو معاف کرنے والا ہے اور معافی کو پسند کرتا ہے، مجھے معاف کر دے۔

حالانکہ ظاہر ہے کہ شب قدر میں فرشتوں اور ارواح کا نزول ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوحُ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِم مِّن كُلِّ أَمْرٍ (سورۃ القدر)

شب قدر ہزار مہینوں سے افضل ہے۔ اس میں فرشتے اور روح، اللہ کے حکم سے برابر خیر کو لے کر اترتے ہیں۔

اور تمہارا یہ کہنا کہ اضطرار کی وجہ سے ارواح کو قبلہ توجہ بنانا جائز ہے، یہ بھی غلط ہے، کیونکہ یہ شرک یا مشابہ شرک ہے، جو حرام ہے۔ غور کرو وہ کلمہ کفر جو اضطرار کی حالت میں جان بچانے کے لئے کہنا جائز ہے اس کے ساتھ یہ شرط لگا دی گئی ہے کہ صرف زبان سے کہے دل سے اس پر یقین نہ رکھے۔ کیونکہ دل سے کسی چیز کو مان لینا اضطرار میں داخل نہیں ہے، اضطرار کی تو یہ کیفیت ہے کہ غالب جان مارنے کی دھمکی دے اور مغلوب معلوم کرے کہ حرام عمل کے ارتکاب کے بغیر چھٹکارا نہیں، تو حرام عمل کا ارتکاب کر لے، مگر دل میں اس سے نفرت ہی رکھے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

مَن كَفَرَ بِاللّٰهِ مِن بَعْدِ إِيمَانِهِ إِلَّا مَنْ أُكْرِهَ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ وَلٰكِن مَّن شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ (۱۶:۱۰۶)

جو ایمان لانے کے بعد اللہ کا انکار کرے سوائے اس شخص کے کہ جس پر زبردستی کی گئی ہے، مگر اس کا دل ایمان پر قائم ہے۔ لیکن جو شخص دل کھول کر انکار کرے تو ایسے لوگوں پر اللہ کا غضب ہے، اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے۔

اس آیت پر غور کرو، میں نے صرف تمہارے سمجھانے کے لئے لمبی تقریر کی ہے، ورنہ خود تمہاری پیش کردہ آیت تمہارے لئے شافی جواب ہے، کیونکہ وہ آیت فطرت انسانی کی صحیح ترجمان ہے۔ ارشاد ہے

فَمَنِ اضْطُرَّ فِي مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّإِثْمٍ فَإِنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ (۵:۳)

پس جو شخص بھوک سے بے قرار ہو اور گناہ کی طرف مائل ہونے والا نہ ہو، اسے ایسا کرنے کی اجازت ہے۔

یعنی مجبور، اگر عمداً گناہ کا ارتکاب کرنا چاہتا ہے، یا علانیہ شریعت کی مخالفت کرنے پر کمربستہ ہے تو ایسے مجبور سے ہرگز بخشش اور مغفرت کا وعدہ نہیں ہے۔

غرض انصاف سے بتاؤ کہ بزرگ کی روح زندوں کی التجا پر متوجہ ہو سکتی ہے اور ذکر و تعلیم کا القا کر سکتی ہے؟ کیا یہ محض ظن نہیں ہے؟ جیسا کہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ.

وہ محض بے اصل خیالات پر چلتے ہیں اور بالکل قیاسی باتیں کرتے ہیں۔

دوسری دلیل

اس نے کہا، یہ آیت تو بدگمانی کے بارے میں نازل ہوئی ہے کہ بدظنی سے اجتناب کیا جائے مگر ہم حسن ظن رکھتے ہیں، جس کا ذکر اسی حدیث قدسی میں ہے کہ:

اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِيْ بِيْ (۱)

یعنی میں اپنے بندے کے ساتھ اس کے ظن کے مطابق ہوں

اس کا جواب

میں نے کہا: یہاں تو ''بی'' (میرے ساتھ فرمایا گیا ہے، نہ کہ بقبر عبدی (میرے بندے کی قبر کے ساتھ)

اس نے کہا: ہم فقیر لوگ جھگڑا نہیں کرتے۔

میں نے کہا خوب: اب تک فقیر لوگ کیا کرتے رہے؟

ایک وضعی حدیث

اس نے کہا: ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم يَا عِبَادَاللّٰهِ فَاَعِيْنُوْنِيْ (اے اللہ کے بندو! میری مدد کرو) کے متعلق کیا کرو گے، جو صحیح حدیث میں وارد اور صاف طور پر بندگان خدا سے استعانت پر دلالت کرتی ہے اور استفادہ بھی استعانت ہی کی ایک قسم ہے۔

---

(۱) بخاری (التوحید باب ۱۵، ۱۳، ۳۸۴/۱۳۔ ۷۴۰۵) ومسلم (التوبہ، باب ۱، ۲۱۰۲/۴۔ ۲۶۷۵)

اس کی تشریح

میں نے کہا، تم نے اسے صحیح حدیث کیوں کر مان لیا، درآن حالیکہ محمد بن اسماعیل بخاری رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں اور امام مسلم اور دیگر اصحاب صحاح ستہ رحمتہ اللہ علیہم نے اپنی اپنی کتابوں میں، امام مالک رحمتہ اللہ علیہ نے موطا میں اور حضرت امام احمد بن حنبل رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی مسند میں اس کا ذکر نہیں کیا۔ یہ حدیث غالباً حصن حصین میں بروایت طبرانی مذکور ہے۔ مگر اس سے پہلے کہ ہم اس کے معانی پر غور کریں، یہ معلوم کر لینا ضروری ہے کہ آیا طبرانی سے لے کر روایت کنندہ صحابی تک جس قدر راوی ہیں، ثقہ بھی تھے یا نہیں؟ اور آیا یہ حدیث متواتر ہے یا مشہور، منقطع ہے یا مرسل اور ضعیف ہے یا صحیح؟

دوسرے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حصن حصین میں یَا عِبَادَاللّٰہِ فَاَعِیْنُوْنِیْ کی بجائے اَعِیْنُوْنِیْ یَا عِبَادَاللّٰہِ لکھا ہوا ہوگا۔ تیسرے اس کے سیاق وسباق پر غور کرنا بھی لازم ہے، نہ کہ بے دین لوگوں کی طرح صرف لَاتَقْرَبُو الصَّلٰوۃَ پر اڑے رہنا۔

جمع الجوامع میں ابویعلیؒ سے یہ حدیث اس طرح مروی ہے:

اِذَا انْفَلَتَتْ دَآبَّۃُ اَحَدِکُمْ بِاَرْضٍ فَلَاۃٍ فَلْیُنَادِ یَا عِبَادَ اللّٰہِ اِحْبِسُوْا عَلَیَّ یَا عِبَادَ اللّٰہِ اِحْبِسُوْا عَلَیَّ فَاِنَّ لِلّٰہِ فِی الْاَرْضِ حَاضِرًا یَحْبِسُہُ اللّٰہُ عَلَیْکُمْ۔

جب بیابانات میں تمہارا کوئی چار پایہ گم ہو جائے، تو کہا کرو، اے اللہ کے بندو، میرے چار پایہ کو روکو، کیوں کہ اللہ کی طرف سے زمین پر حاضر رہنے والے مقرر ہیں، جو تمہارے جانوروں کو روک رکھتے ہیں۔

اور عتبہ بن غزوان سے اس طرح مروری ہے۔

اِذَا ضَلَّ اَحَدُکُمْ شَیْئًا اَوْ اَرَادَ غَوْثًا وَھُوَ بِاَرْضٍ لَیْسَ بِھَا اَنِیْسٌ فَلْیَقُلْ یَا عِبَادَ اللّٰہِ اَعِیْنُوْنِیْ یَا عِبَادَ اللّٰہِ اَغِیْثُوْنِیْ فَاِنَّ لِلّٰہِ عِبَادًا لَا تَرَوْنَھُمْ۔

جب تم میں سے کسی کا کچھ جاتا رہے یا وہ مدد چاہے اور ایسی جگہ پر ہو جہاں کوئی یار و مددگار نہ ہو، تو وہ یوں کہے:

"اے اللہ کے بندو! میری فریادرسی کرو تو ان کی امداد کے لئے اللہ تعالیٰ سامان پیدا کر دے

گا کیوں کہ خدا کی طرف سے لوگوں کی امداد کے لئے صحراؤں میں ایسے نفوس مامور ہوتے ہیں جو دکھائی نہیں دیتے۔

ان دونوں حدیثوں سے حسب ذیل امور ظاہر ہوتے ہیں۔

اول: یہ کہ صرف ان بندگان خدا کو امداد کے لئے پکارنا جائز ہے جو خدا کی طرف سے لوگوں کی امداد کے لئے صحراؤں میں مامور ہیں۔

دوم: یہ کہ اس قدر استعانت بھی اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ زندوں میں سے کوئی اس کا یار و مددگار موجود نہ ہو۔

سوم: استعانت ایسے امور میں ہو جن میں لوگ ایک دوسرے کی امداد کیا کرتے ہیں۔

چہارم: اگر یہ حدیث معتبر ہے تو یہ استعانت خاص طور پر بحکم پیغمبر علیہ السلام مشروع ہوگی اور اگر یہ حدیث ہی معتبر نہ ہو تو حدیث کی رو سے اس پر عمل کرنا ممنوع ہوگا۔

اب صحیح حدیث سنو! آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے فرمایا ہے۔

وَاِذَا اسْتَعَنْتَ فَاسْتَعِنْ بِاللّٰهِ(۱)

جب مدد مانگو تو صرف اللہ تعالیٰ سے مدد مانگو

پھر قرآن شریف میں ارشاد ہے۔

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ.

اے اللہ تعالیٰ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔

جس میں عبادت اور استعانت دونوں پر الگ الگ لفظ ''ایاک'' آیا ہے، جو حصر کے لئے ہے (یعنی عبادت و استعانت دونوں اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ مخصوص ہیں) بہرحال جملہ اَعِيْنُوْنِيْ يَا عِبَادَ اللّٰهِ سے استعانت بالقبور کے جواز کی دلیل لینا یا استفادہ من القبور کو استعانت کے مساوی جاننا گویا حاضر اور غائب کو برابر جاننے یا دو مخالف چیزوں کو ایک چیز سمجھنے کے مترادف ہے جو محال ہے کیوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے (اس حدیث میں اگر صحیح ہے) ان

---

(۱) سورہ قیامۃ (۵۹، سورہ حم ۱/ ۲۹۳، ۳۰۳، ۳۰۷)

بندگان خدا کی زندگی، ان کا وظیفہ حیات اور ایسے مواقع پر ان کا حاضر ہونا سب کچھ واضح کر دیا ہے کہ ان لله عباد لا ترونهم اللہ تعالیٰ کے ایسے بندے موجود ہوتے ہیں جو نظر نہیں آتے۔

اس کے برعکس، اہل قبور کی وفات ورحلت اور اس دنیا سے انتقال ورخصت ایک ثابت شدہ امر اور ایک مسلمہ چیز ہے۔

ایک اور حدیث

اور اگر صوفیائے کرام ہی کی روایات پر اعتبار ہو تو سنو اس حدیث کو صوفیا نے روایت کیا ہے۔ یعنی:

مَنْ زَارَ حَيًّا وَّلَمْ يُرْزَقْ شَيْئًا فَكَاَنَّمَا زَارَ مَيِّتًا

(جس شخص نے کسی زندہ سے ملاقات کی اور اسے کچھ نہیں دیا گیا اس نے گویا مردہ کی زیارت کی (کیوں کہ مردوں سے کچھ دستیاب نہیں ہوتا)

ثمرات الحیات میں لکھا ہے کہ صوفیا اس سے یہ مراد لیتے ہیں کہ آدمی اگر کسی شخص سے ملے اور کھانے پینے کی کوئی چیز نہ پائے تو اس نے گویا مردہ سے ملاقات کی۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں جو انھوں نے کیے ہیں۔ بلکہ یہ مطلب ہے کہ جس نے کسی زندہ ولی کو پایا اور اس سے کوئی باطنی فائدہ حاصل نہ کیا تو اس نے گویا مردے کی زیارت کی۔ (انتہی کلامہ) اور بقول حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی سہروردی رحمتہ اللہ علیہ اس حدیث میں رزق کے معنی عام ہیں، یعنی کھانے پینے اور فائدہ اٹھانے کی چیزیں، لکھا ہے کہ بعض درویشوں نے جب آپ (شیخ بہاء الدین) پر اس وجہ سے اعتراض کیا تو آپ نے فرمایا، فلاں بزرگ اپنے ملنے والوں کو اس حدیث کی بنا پر کچھ نہ کچھ کھانے پینے کو ضرور دیا کرتے تھے اور اگر کوئی شخص آپ کی عطا کردہ چیز نہ لیتا یا اس تکلف کی وجہ دریافت کرتا تو آپ یہ حدیث پڑھ کر سنا دیا کرتے تھے۔ غرض (آپ کے نزدیک) ظاہری اور باطنی دونوں طرح کے فائدہ اٹھانے پر رزق کا اطلاق ہو سکتا ہے، یہی وجہ ہے۔ لم یرزق شیئًا کہا گیا ہے لم یَرْزُقْ طعامًا نہیں کہا گیا جیسے کہ اس مسنون دعا میں علم وفہم وغیرہ کے عطا کیے جانے پر رزق کا لفظ بولا گیا ہے۔

اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنِيْ عِلْمًا نَافِعًا وَّفَهْمًا كَامِلاً

(یعنی الٰہی، مجھے فائدہ دینے والا علم اور فہم عطا فرما)

اس نے کہا: اگر یہی بات ہے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو زیارت قبور کا حکم دیا ہے اس سے کیا فائدہ ہے؟

میں نے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تو خود ہی اس کا فائدہ بیان فرما دیا ہے کہ اس سے موت اور آخرت یاد آتی ہے مگر جو فائدہ تم ڈھونڈتے ہو، وہ کسی ایسے فقیر کی ایجاد ہے جس نے نذر و نیاز کی طمع سے یہ بدعت اختراع کی ہے، اور جس کا فقر قریب ہے کہ کفر ہو جائے كَادَ الْفَقْرُ اَنْ يَّكُوْنَ كُفْرًا (۱) اس کا فقر وہ فقر نہیں جس کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے لئے فخر کہا تھا (اَلْفَقْرُ فَخْرِىْ (۲)) اور جس کی سب سے بڑی صفت ہر بدعت سے اجتناب و پرہیز ہے۔

اصل فقر کیا ہے

حضرت سید محی الدین جیلانی رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی وصایا میں فرمایا ہے کہ:

حَقِيْقَةُ الْفَقْرِ اَنْ لَّا تَفْتَقِرَ اِلٰى مَنْ هُوَ مِثْلُكَ

(اصل فقر یہ ہے کہ اپنے جیسے محتاج انسان کے سامنے اپنی ضرورت و احتیاج کبھی پیش نہ کرے)

اور قرآن مجید کی رو سے تمام لوگ یکساں طور پر اللہ تعالیٰ کے محتاج ہیں ارشاد ہے:

يٰاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ اِلَى اللّٰهِ (۳۵:۱۵)

اے لوگو! تم سب اللہ تعالیٰ کے محتاج ہو۔

اس نے کہا: اس طرح تو ہدایت وارشاد کا کارخانہ اور پیری مریدی کا سلسلہ بالکل درہم

---

(۱) حديث كاد الفقر ان يكون كفرا رواه احمد بن بنسع عن ابى نعيم فى الحلية و ابن السكن فى مصنف و البيهقى فى شعب الايمان (ابن عدى فى الكامل وهو ضعيف) انظر مقاصد الحسنة (ص ۳۱۱) و كشف الخفاء (۲/۱۰۷-۱۰۸) حديث كاد الفقر ان يكون كفرا اخرجه بلفظ الفاقة يناد (۳/۲۶۸-۱۴۱۶) و ابن ابى شيبه (۹/۹۴) و ابونعيم فى الحلية (۳/۵۳، ۱۰۹، ۲۵۲/۸) وفى اخبار اصبهان (۱/۲۹) و ابن الجوزى فى العمل المتناهية (۲/۳۲۰) اور یہ حدیث ضعیف ہے۔

(۲) وحديث الفقر فخرى فهو موضوع باطل كما قال ابن حجر انظر المقاصد الحسنة (ص ۳۰۰) و كشف الخفاء (۲/۸۷)

برہم ہو جائے گا اور بزرگان دین پر خطا لازم آئے گی، حالانکہ کہا گیا ہے

ع خطائے بزرگاں گرفتن خطاست

(بزرگوں کی نکتہ چینی کرنا گناہ ہے)

میں نے کہا: اصل یہ ہے کہ جو فعل گناہ ہے وہ تو کسی بزرگ کے کرنے سے بھی گناہ ہی رہے گا۔ اور ایسے فعل کی پیروی کرنے والا بھی گنہگار ہوگا مگر میرے نزدیک اسی مصرعہ کا یہ مطلب ہے کہ بزرگوں کی عیب چینی کرنا اور عیب نمائی کے لئے ان کی اجتہادی غلطیوں کا جا بجا ذکر کرنا خطا ہے لیکن تحقیق حق کے لئے ذکر کرنا گناہ نہیں اور اس سے ان کی اجتہادی خطائیں قابل عفو و مغفرت ہیں۔ اور اس سے پیری مریدی کا سلسلہ درہم برہم نہیں ہو سکتا۔ دیکھو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی قبر کو عیدگاہ بنانے سے منع فرمایا اور لوگوں کو تاکید فرمائی کہ آپ کے مرقد پاک کے ساتھ پرستاری کا ہرگز کوئی معاملہ نہ رکھیں۔ مگر تا حال آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیغمبری اور پیروی اسی طرح برقرار ہے اور قائم و جاری رہے گی۔

كَمَا يَئِسَ الْكُفَّارُ مِنْ اَصْحَابِ الْقُبُوْرِ کی تفسیر

اس نے کہا، میں نے مندرجہ ذیل آیت کی تفسیر ایک پیر صاحب سے اس طرح سنی ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ قَدْ يَئِسُوْا مِنَ الْاٰخِرَةِ كَمَا يَئِسَ الْكُفَّارُ مِنْ اَصْحٰبِ الْقُبُوْرِ. (۶۰:۱۳)

اے مسلمانو! اس قوم کو دوست مت رکھو جس پر اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہوا۔ وہ لوگ آخرت کے ثواب سے اس طرح مایوس ہیں جس طرح کفار جو قبروں میں مدفون ہیں، ناامید ہیں۔

پیر صاحب نے فرمایا: میرے قلب پر اس آیت کے متعلق وہ چیز القا کی گئی ہے، جو متقدمین اور متاخرین کی تفسیروں میں بھی نہیں اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس قوم سے دوستی مت قائم کرو جس پر اللہ تعالیٰ ناراض ہے، اس لئے کہ وہ آخرت کے فائدہ سے اسی طرح مایوس ہے جس طرح اس امت کے کافر لوگ اہل قبور کے استفادہ سے مایوس ہیں۔

میں نے کہا: تفسیر تو نئی ہے، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور جملہ مفسرین کرام رحمۃ اللہ علیہم کی تفسیر کے مخالف ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا

ہے اور احادیث صحیحہ میں موجود ہے کہ جس نے اپنی رائے کے مطابق قرآن کی کسی آیت کی تفسیر کی اس کا مقام جہنم ہے۔

اس نے کہا: قرآن پاک کی ساری تفسیر تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بھی منقول نہیں، ضروری بات ہے کہ مفسرین نے بعض آیات کے معانی اپنی رائے کے مطابق کئے ہوں گے۔

میں نے کہا: ضروری بات یہ ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمتہ اللہ علیہم ان کے معانی کے مخالف نہ ہوں یہ مطلب نہیں کہ ان کی رائے سے ملتی ہوئی رائے بھی نہ ہو اور جو کچھ تمہارے پیر نے کہا وہ تو بالکل مخالف ہے اسے رد کرنا چاہئے۔

اس نے کہا: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اس آیت کے متعلق کیا مذکور ہے؟

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تفسیر

میں نے کہا: اصحاب القبور سے مراد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نزدیک مرے ہوئے کافر ہیں، اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ مغضوب قوم اجر آخرت سے اسی طرح مایوس ہو چکی ہے۔ چنانچہ درمنثور میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا، مغضوب لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور نہ اس کی آمد کے امیدوار ہیں۔ وہ اجر آخرت سے ایسے مایوس ہو چکے ہیں جیسے مرے ہوئے کافر ناامید ہو چکے ہیں۔ (۱)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس سے مراد مرے ہوئے کافر ہیں، جو آخرت کے ثواب سے مایوس و ناامید ہیں۔ یہ قول ابھی نہیں ملا۔

حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اصحاب القبور سے مراد مرے ہوئے کافر ہیں۔ حضرت مجاہد اور عکرمہ رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ کفار جب قبروں میں داخل ہوتے ہیں تو اللہ کی رحمت سے مایوس ہوتے ہیں۔ (۲)

---

(۱) درمنثور (۸/۱۴۴) عزاہ الیہ الفیر ابی وابن جریر وابن ابی حاتم والطبرانی

(۲) تفسیر ابن کثیر (۴/۳۵۶) نقول مجاہد وعکرمہ ومجاہد کا یہ قول ابن جریر نے تخریج کیا ہے (۲۸/۸۲)

تفسیر ابن جریر

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی منقول ہے کہ کفار میں سے جب ایک شخص مرجاتا ہے تو پس ماندگان اس کے دوبارہ جی اٹھنے سے مایوس ہوجاتے ہیں، کیوں کہ ان کا یہ اعتقاد ہے کہ انسان مرنے کے بعد زندہ نہ ہوگا۔

حضرت امام حسینؓ نے فرمایا، جیسے زندہ کافر، مردہ کافروں سے مایوس ہو چکے(۱)۔

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا، اس سے مراد یہود ہیں، جو آخرت میں جی اٹھنے سے مایوس ہوگئے ہیں جیسے کفار مرکر جی اٹھنے سے مایوس ہیں(۲)۔

حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ نے فرمایا، اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو اپنے کفر کی وجہ سے آخرت کے ثواب سے مایوس ہو چکے ہیں جیسے کفار اپنے اعمال سے آخرت کو مایوس ہوں گے۔(۳)

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا جب ایک کافر مرجاتا ہے تو اس کے پس ماندگان اس کی ملاقات سے مایوس ہوجاتے ہیں، جیسا مرنے والا آخرت کے اجر و ثواب سے مایوس ہوجاتا ہے(۴)۔

تفسیر مدارک

تفسیر مدارک میں ہے کہ زندہ کافر آخرت کے اجر سے مایوس ہیں، جیسے ان کے اسلاف جو قبروں میں آخرت کے ثواب سے مایوس پڑے ہیں۔

تفسیر معالم التنزیل

تفسیر معالم التنزیل میں ہے کہ مغضوب قوم سے مراد یہود ہیں، اس طرح کہ محتاج مسلمان امرائے یہود کو مسلمانوں کی خبریں پہنچایا کرتے اور ان سے اس خدمت کا اجر لے لیا کرتے تھے۔ جب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس بات سے منع کر دیا تو یہود اپنی شرارتوں کے کامیاب ہونے سے ایسے مایوس ہوگئے جیسے مرے ہوئے کافر اجر آخرت سے مایوس ہیں۔

غرض میں نے کہا: صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ کی تفسیر تو یہ ہے، اب تمہیں معلوم

---

(۱) (ابن جریر ۸۱/۲۸) (۲) ابن جریر ۸۲/۲۸ (۳) اخرجہ مجاہد فی تفسیرہ (۶۷۰/۲)
(۴) ابن جریر ۸۲/۲۸

ہو گیا ہوگا کہ پیر صاحب کے معانی ان کے مفہوم کے کس قدر متضاد ہیں۔

اس نے کہا: اتنی روایتیں تمہیں کیوں کر یاد رہ گئیں۔

میں نے کہا: دو تین روز سے میں تمہارے سوالات پر غور کر رہا تھا اور خیال تھا کہ شاید یہ آیت تمہارے لئے وسوسہ کا موجب ہو، اس لئے معتبر تفاسیر کے حوالے یاد کر لئے۔

وَاللّٰهُ وَلِيُّ التَّوْفِيْقِ وَهُوَ الْهَادِيْ اِلٰى سَوَآءِ الطَّرِيْقِ.

مسئلہ توسل

اس نے کہا: تقرب الٰہی کے لئے بزرگوں کو وسیلہ بنانا کیسا ہے؟

میں نے کہا: جائز ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ وَجَاهِدُوْا فِيْ سَبِيْلِهٖ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (۵:۳۵)

مسلمانو! اللہ سے ڈرو اور اس کی طرف وسیلہ تلاش کرو، اور اس کی راہ میں جہاد کرو، تاکہ فلاح پاؤ۔

لیکن اس کا استفادہ من القبور سے کوئی تعلق نہیں کسی بزرگ کو وسیلہ بنانے کا یہ مطلب ہے کہ قرب الٰہی حاصل کرنے کے لئے اس کے اعمال حسنہ کی پیروی کی جائے جو کتاب وسنت کے مطابق ہوں۔

آیت کے معنی

مفسرین کرام نے لکھا ہے کہ اصل میں ہر شخص کا وسیلہ اس کا اپنا عمل ہے نیک عمل اللہ کی رضا کا وسیلہ اور برا عمل اس کے غضب کا وسیلہ ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ایمان وتقویٰ کا وسیلہ اس سے پہلے کیا گیا ہے۔ دوسری جگہ فرمایا:

اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ (۳۵:۱۰)

اچھا کلام اسی تک پہنچتا ہے اور عمل صالح اس کو پہنچاتا ہے۔

بعض نے اس سے قرآن مجید کی تلاوت مراد لی ہے اور حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ

علیہ کے خواب کا قصہ پیش کیا ہے۔

حضرت امام احمد بن حنبل رحمتہ اللہ علیہ کا خواب

حضرت امامؒ نے کئی مرتبہ اللہ تعالٰی کو خواب میں دیکھا اور سوال کیا کہ بارخدایا! تیرا قرب کس چیز سے حاصل ہوسکتا ہے؟ جواب یہی ملتا رہا کہ قرآن مجید کی تلاوت سے۔ حضرت امامؒ نے عرض کیا کہ تلاوت بے فہم یا بافہم؟ جواب ملا کہ دونوں طرح کی تلاوت سے۔

حبّ پیغمبر علیہ السلام بھی وسیلہ ہے

بعض علما متاخرین نے کہا ہے کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم واہل بیت عظام اور اولیا اللہ رحمتہ اللہ علیہم کے ساتھ محبت رکھنا بھی وسیلہ نجات ہے، کیوں کہ محبت اعمال قلبی میں سے ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے، **المرء مع من احب** (۱) اس حدیث کا یہ مطلب ہے کہ ہر شخص قیامت کے دن جس کی ہمراہی چاہتا ہے دنیا میں اس کے ساتھ محبت رکھتا ہے۔

سجدۂ تعظیمی

اس نے کہا: اچھا وسیلہ سے مراد عمل صالح ہے، تو جہاد فی سبیل اللہ سے کیا مراد ہے؟ میں نے کہا: جہاد فی سبیل اللہ کفار اور نفس نابکار کے ساتھ جنگ کرنے کا نام ہے۔ کفار کے ساتھ جنگ کرنے کی وجہ تو ظاہر ہے۔ نفس امارہ بھی ضرر رسانی میں کفار سے کم نہیں یہ لذت وآرائش دنیا کے سبز باغ دکھا دکھا کر گمراہ کرتا ہے اور ان لوگوں کو جو عمل صالح کی پروانہ کرتے ہوئے بزرگوں کو مان لینا ہی تقرب الٰہی کا وسیلہ سمجھتے ہیں، یہ سبق سکھا کر صراط مستقیم سے روکتا ہے کہ بزرگ اگرچہ مخلوق خدا ہیں تاہم عوام کے لئے بمنزلہ خالق کے ہیں اور چونکہ انہیں حاضر وناظر وغیب کا تمام علم حاصل ہے، اس لئے ان کی تعظیم کرنا لازم ہے اور ان میں سے بعض حد سے بڑھنے والوں نے شیخ کے لئے سجدۂ تعظیمی بھی جائز بنالیا ہے۔ ان کے نزدیک یہ سجدہ عبادت کے لئے نہیں صرف تعظیم کے لئے ہے۔ کوئی پوچھے کہ کیا عبادت کے لئے جو سجدہ کیا جائے اس میں مسجود کی تعظیم مد نظر نہیں ہوتی؟ اگر ہوتی ہے تو دونوں میں فرق کیا رہ گیا؟

---

(۱) اخرجہ من ابی موسیٰ الاشعری البخاری ۱۰/ ۵۵۷ ومسلم ۴/ ۲۰۳۴ مسند احمد ۴/ ۳۹۲ وھناد فی زھد ۱/ ۱۵۷

اس نے کہا: کیا شیخ کو وسیع العلم ماننا جائز نہیں؟

میں نے کہا: نہیں یہ صحیح نہیں، کیوں کہ کامل الاطلاع اور وسیع العلم ہونا اللہ تعالیٰ کی ذات کا خاصہ ہے۔ قرآن مجید میں ذکر ہے کہ امام الحنفا حضرت ابراہیم خلیل صلوٰت اللہ تعالیٰ علی نبینا وعلیہ السلام نے ان مشرکوں کو جو بزرگوں کی ارواح کو وسیع العلم مانتے تھے، یہی دلیل پیش کر کے ڈرایا کہ:

وَلَآ اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ رَبِّيْ شَيْئًا وَسِعَ رَبِّيْ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ. (۶:۸۰)

(میں ان سے نہیں ڈرتا جن کو تم خدا کا شریک بناتے ہو، ہاں اگر میرا پروردگار ہی کوئی امر چاہے تو دوسری بات ہے کیوں کہ میرے پروردگار کا علم ہر چیز پر حاوی ہے کیا تم اس سے نصیحت اندوز نہیں ہوتے؟)

اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سامری اور اس کی جماعت کے رد میں جو گوسالہ پرستی کرتے اور گوسالہ کے پاس مراقبہ کے اعتکاف میں بیٹھے تھے، یہ ارشاد فرمایا کہ:

وَانْظُرْ اِلٰٓى اِلٰهِكَ الَّذِيْ ظَلْتَ عَلَيْهِ عَاكِفًا لَنُحَرِّقَنَّهٗ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهٗ فِي الْيَمِّ نَسْفًا. اِنَّمَآ اِلٰهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا. (۲۰:۹۷-۹۸)

اور دیکھ تیرے گھڑے ہوئے معبود کا اب کیا حال ہوتا ہے، جس کی پوجا پر تو جم کر بیٹھ رہا تھا، ہم اسے جلا کر راکھ کر دیں گے اور وہ راکھ سمندر میں ڈال دیں گے معبود تو تمہارا اللہ ہی ہے، اس کے سوا کوئی نہیں وہ ہر چیز پر اپنے علم سے چھایا ہوا ہے۔

فرشتوں کی زبانی اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ وہ یوں کہا کرتے تھے:

رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِيْنَ تَابُوْا وَاتَّبَعُوْا سَبِيْلَكَ (۴۰:۷)

(اے ہمارے پروردگار! تو نے ہر چیز کو اپنے علم اور رحمت میں گھیر رکھا ہے۔ پس توبہ کرنے والوں اور اپنی راہ پر چلنے والوں کو بخش دے)

غرض نفس کا جہاد یہی ہے کہ اس نابکار کو شریعت کے خلاف کہنے، کرنے اور سوچنے سے روکا جائے، تاکہ نجات حاصل ہو۔

ایک سوال اور اس کا جواب

میں نے کہا: اے بھائی اب تک تو تم سوال کرتے رہے اور میں جواب دیتا رہا۔ اب میں ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔ اب تم اس کا جواب دو۔ سوال یہ کہ قرآن مجید سے سامری اور اس کے متبعین کا تعلق گوسالہ کے ساتھ صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ وہ اس کے پاس بیٹھے رہتے تھے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا ایک قول نقل کیا ہے۔

قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عٰكِفِيْنَ حَتّٰى يَرْجِعَ اِلَيْنَا مُوْسٰى (۲۰:۹۱)

انھوں نے حضرت ہارون علیہ السلام کو جواب دیا کہ جب تک موسیٰ علیہ السلام، ہمارے پاس واپس نہ آجائے، ہم اس کے پاس اعتکاف میں بیٹھے رہیں گے۔

شریعت موسوی کا انکار ان سے کہیں مروی نہیں، بلکہ شریعت کی رو سے اپنے فعل کی یوں تاویل کرتے تھے کہ:

هٰذَآ اِلٰهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰى فَنَسِيَ (۲۰:۸۸)

(یہی ہمارا اور موسیٰ علیہ السلام کا معبود ہے مگر وہ بھول میں پڑ گیا)

یعنی وہ اتنا کہنے سے کافر ہوگئے۔ اور جب موسیٰ علیہ السلام واپس آئے تو ان کو توبہ کرائی گئی۔ اور ایسا کرنے والوں کو قتل کیا گیا، کیوں کہ ان کے ہاں شرک کی توبہ اسی طرح قبول ہوسکتی تھی کہ مشرک کو قتل کردیا جائے۔ تو اب میں پوچھتا ہوں کہ کسی چیز میں قدرت الٰہی کا ظہور دیکھ کر اسے فیض رساں سمجھنا اور اس سے مستفید ہونے کے لئے اس پر اعتکاف بیٹھنا اور ایسا کرنے کو عبادت سمجھنا یا ثواب کا موجب جاننا ہماری شریعت میں کیسا ہے؟

اس نے کہا: ہماری شریعت میں مباح ہے اور طریقت میں واجب، مثنوی شریف میں مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے۔

ابلہاں تعظیم مسجد مے کنند — در جفائے اہل دل جدے کنند
آں مجاز است ایں حقیقت اے خراں — نیست مسجد جز درون سروراں
مسجدے کاں اندرون اولیا ست — سجدہ گاہ جملہ واں جا خدا است

(۱) بیوقوف مسجد کی تو تعظیم کرتے ہیں، مگر اہل دل کو ایذا دیتے ہیں۔

(۲) ان سے کہیے اے بیوقوفو! وہ مجاز ہے اور یہ حقیقت۔ اصل مسجدیں تو برگزیدہ لوگوں کے سینوں میں ہیں۔

(۳) اولیاءاللہ کے اندر جو مسجد ہے وہی تمام لوگوں کی سجدہ گاہ ہے اور اسی جگہ خدا ہے۔

میں نے کہا: تو ان مظاہر کی عبادت و پرستش کی دلیل و جواب یہی مثنوی شریف کے اشعار ہیں یا کبار اہل طریقت کا کوئی قول بھی ہے۔؟

اس نے کہا: ''اہل طریقت اس مسئلہ کی پوشیدہ اشاعت کرتے تھے اور اپنے خاص دوستوں کے سوا کسی سے یہ راز نہیں کہتے تھے''۔

میں نے کہا: شریعت وطریقت کے جس قدر امور ہیں وہ تو سب کھلے کھلے اور ظاہر باہر ہیں، باقی جس قدر پوشیدہ راز بتلائے جاتے ہیں وہ سب بے ہودہ خیال اور بزرگوں پر تہمت والزام ہیں، جن سے ان کا وجود بری اور پاک ہے اور مظاہر کی تعلیم میں مبالغہ کرنے والوں کی نیت اگرچہ نیک ہو مگر اس میں کیا شبہ ہے کہ انھوں نے غلط راہ اختیار کر رکھی ہے۔ ان کا اتباع کسی صورت میں بھی جائز نہیں نہ شریعت میں نہ طریقت میں۔ بزرگان طریقت نے واضح طور پر فرمادیا ہے کہ:

كُلُّ حَقِيقَةٍ لاَ يَشْهَدُ لَهَا الشَّرْعُ فَهِيَ زَنْدَقَةٌ.

ہر ایسی حقیقت کفر ہے جس پر شریعت کی مہر تصدیق نہ ہو۔

اس نے کہا: یہ کس بزرگ کا قول ہے؟

میں نے کہا: یہ قول فتوح الغیب میں درج ہے، جو حضرت سید محی الدین جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف ہے۔

اس نے کہا: جو کچھ آپ نے بیان فرمایا درست اور صحیح ہے۔ کاملان طریقت نے بجا فرمایا ہے:

از حق جز حق مخواہ توحید ایں است | از سایہ خود گریز تفرید ایں است

توحید یہ ہے کہ خدا سے حق کی طلب کر اور تفرید یہ ہے کہ اپنے سایہ سے بھی بھاگ

میں نے کہا: اے شیخ، واقعی یہ سب رسمی اور رواجی باتیں ہیں جو ایک دوسرے کو دیکھ کر رواج پاگئی ہیں، شریعت میں ان کی کوئی اصل نہیں۔

اس نے کہا: حضرت میں سمجھ گیا، انشاء اللہ تمام ایسی رسوم کو اپنے خاندان سے محو کردوں گا۔

میں نے پڑھا:

وَآخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

یہ بحث رسالہ ہذا میں اس لئے لکھ دی گئی ہے کہ تا کہ ناظرین اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں سے واقف ہو جائیں۔ قبر پرست عام طور پر اسی قسم کے سوالات کیا کرتے ہیں۔

وسیلہ کی بحث

اب تک جو کچھ بیان ہوا، مرض قبر پرستی کے لئے بیان کیا گیا۔ اب کتاب ختم کرنے سے پہلے مناسب نظر آتا ہے کہ وسیلہ کی تشریح بھی کردی جائے اور ایسی حدیثوں کا ترجمہ لکھ دیا جائے جو اس مسئلہ کا ماخذ ہیں، تا کہ یہ مسئلہ پوری طرح روشن ہو جائے اور غلط اور صحیح وسیلہ میں پہچان پیدا ہو سکے۔

نابینا والی حدیث

ایک نابینا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا، اور اس نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! اللہ سے دعا فرمائیے کہ مجھے بصارت عطا فرمائے۔ آپؐ نے فرمایا، وضو کر کے دو رکعت نماز پڑھ اور اس طرح دعا کر:

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ وَاَتَوَجَّهُ اِلَيْکَ بِنَبِيِّکَ مُحَمَّدٍ النَّبِيِّ الرَّحْمَةِ يَا مُحَمَّدُ يَا نَبِيَّ اللّٰهِ اِنِّیْ اَتَوَجَّهُ بِکَ اِلٰی رَبِّیْ فِیْ قَضَاءِ حَاجَتِیْ لِيُقْضِيَهَا اَللّٰهُمَّ فَشَفِّعْهُ فِيَّ. (ترمذی)(۱)

اے اللہ میں تیری جناب میں التجا کرتا ہوں، اور تیرے نبی محمدؐ نبی الرحمۃ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تیری طرف متوجہ ہوتا ہوں، یا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، میں اپنی اس حاجت میں آپ کے ساتھ اپنے رب کی طرف متوجہ ہوتا ہوں تا کہ اللہ تعالیٰ میری حاجت پوری کردے۔ یا اللہ میری اس حاجت میں اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ

---

(۱) رواہ الترمذی (دعوات ۴/۲۸۱_۳۵۷۸) کما قال المصنف وقال الترمذی حدیث حسن صحیح غریب ورواہ ایضا النسائی (عمل الیوم واللیلۃ ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰) وابن ماجہ (اقامۃ صلوٰۃ الحاجۃ (۱/۲۵۲_۱۳۸۱) وابن خزیمہ (۲/۲۲۵_۱۲۱۹) والحاکم (۱/۳۱۳، ۱/۵۲۶) واحمد (۴/۱۳۸)

وسلم کی شفاعت قبول فرما۔

نابینا نے اس طرح دعا کی اور اللہ تعالیٰ نے اسے بصارت عطا فرمائی۔

اس حدیث سے وسیلہ کے دو طریق صحیح معلوم ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو شرک کی آمیزش سے سالم ہے اور دوسرا وہ جو اسلم ہے۔

اسلم طریق یہ ہے کہ یہ صورت جو حدیث کے الفاظ سے نظر آئی ہے وہ زمانہ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مخصوص تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں ایک نابینا آیا اور آپ کی تلقین کے مطابق اس نے عمل کیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اس کے ساتھ دعا میں شریک ہو گئے۔ اس کی تائید چار باتوں سے ہوتی ہے۔ (اوّل) الفاظ اَللّٰھُمَّ فَشَفِّعْهُ فِیَّ سے (دوم) علما نے اس واقعہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معجزہ شمار کیا ہے (سوم) آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان الفاظ کے ساتھ دعا کرنے کا اعلان نہیں فرمایا اور (چہارم) اصحاب کبار میں سے کبھی کسی نے اس طرح دعا نہیں کی۔ اور احادیث پر نظر رکھنے والوں سے یہ امر مخفی نہیں کہ بہت سی ایسی حدیثیں موجود ہیں جن پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عمل نہیں کیا اس لئے ان کا حکم جاری نہیں رہا، انہی میں سے یہ دعا بھی ہے۔

واقعہ کی یہ صورت معلوم ہوتی ہے کہ نابینا کی درخواست پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کی شفاعت کرنے پر متوجہ ہوئے اور جب نابینا کو معلوم ہو گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کی دعا میں شریک ہیں تو اس نے یوں عرض کیا، یا اللہ اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفاعت میرے حق میں قبول فرما۔

اس کو ایک مثال سے سمجھئے، فرض کیجئے کہ ایک بادشاہ کی طرف سے کسی شخص کو تکلیف پہنچی۔ وہ بادشاہ کے وزیر خاص کے پاس گیا، اور کہا: ایسی تدبیر بتلایئے جس سے بادشاہ میری تکلیف دور فرمائے۔ سائل کی اس درخواست پر وزیر نے یہ صورت بیان کی کہ میں بادشاہ کی طبیعت سے خوب واقف ہوں وہ عجز وانکساری کو پسند کرتا ہے۔ اس لئے جب تک کمال عاجزی سے تو خود اس کے حضور میں اپنے مدعا کو عرض نہ کرے گا، اس وقت تک تیرے متعلق میری سفارش موثر ومقبول نہ ہوگی۔ تمہاری درخواست کی صورت یہ ہونی چاہئے کہ جب بادشاہ کے دربار میں آؤ تو پوری توجہ

کے ساتھ اس کی طرف دھیان رکھو، اور ضرورت بیان کرنے کے بعد میرے ساتھ جو دلی الفت ہے اس کا اظہار بھی ان الفاظ میں کرو کہ اے بادشاہ! تو اپنے وزیر پر بڑا مہربان ہے اور میں اس کے شیدائیوں میں سے ہوں۔ اس کی محبت کے وسیلہ سے تیرے دربار تک پہنچا ہوں۔ اور دیکھ لے یہ تیرا وزیر بھی میرے ساتھ تیرے دربار میں موجود ہے اور میرے لئے سفارش کر رہا ہے۔ پھر میری طرف مخاطب ہو کر کہنا کہ اے میرے بادشاہ کے وزیر میں نے اپنی عاجزی اور انکساری کی رو سے اپنی اس حاجت میں جو آپ کو معلوم ہے، آپ کا وسیلہ اختیار کیا ہے اس امید پر کہ بادشاہ میری یہ حاجب پوری کر دے اس وقت میں تیرے لئے سفارش کروں گا۔ مگر غافل نہ ہو جانا، میری سفارش کے بعد فوراً اس طرح عرض کرنا۔

اے شہنشاہ اپنے وزیر کی سفارش میرے حق میں قبول فرما، اور میری حاجت پوری کر، کیوں کہ تیرے سوا کوئی حاجت روا نہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اسوہ

بعینہ یہی مفہوم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایک فعل میں پایا جاتا ہے جب کہ آپ (رضی اللہ عنہ) نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے توسل سے باران رحمت کے لئے دعا کی تھی۔ آپ رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ خشک سالی کے زمانہ میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو اپنی دعا کا وسیلہ بنا کر اس طرح دعا فرمائی۔

اے خدا! ہم پہلے ایسی حالت میں تیرے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وسیلہ بنایا کرتے تھے اب تیرے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا رضی اللہ عنہ کو (اپنی دعا کا) وسیلہ بنا کر عرض کرتے ہیں کہ ہم پر باران رحمت نازل فرما۔

اس سے ثابت ہوا کہ اگر اس طرح زندوں کو اپنی دعاؤں میں وسیلہ بنایا جائے تو جائز ہے اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے طریق اور سنت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے موافق ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نابینا کو اسی طرح سکھایا تھا۔ اس میں یاد رکھنے کے قابل یہ بات ہے کہ دعا میں کسی بزرگ کو شریک کرنے سے بجز توسل کے اور کوئی چیز مطلوب و مقصود نہ ہو۔

طریق سالم یہ ہے کہ اس کلام میں مشارالیہ چونکہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات ہے اس

لئے مخاطب بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات ہی ہو سکتی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عدم موجودگی میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات کو مشار الیہ سمجھنا مجازی طور پر ہو سکتا ہے حقیقی طور پر نہیں ہو سکتا تو اب اطلاق مجاز کے لئے علاقۂ مجاز کا ہونا لازمی ٹھہرا ہے۔ جس کے معانی یہ ہیں کہ چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات مخاطب ہے، اور سائل کی مراد اس سے یہ ہے کہ اے خدا! محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت پر ایمان لانا میری دعا کی قبولیت کا وسیلہ ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یا محمدؐ کے ساتھ اسی لئے یا نبی اللہ کا جملہ تعلیم فرما دیا تھا۔

خیالی اضطراب

حاصل یہ کہ خدا سے دعا کرنے والا بعض اوقات اپنے دل میں حصول مراد کے لئے ایک خیالی اضطراب پیدا کر لیتا ہے۔ اگر یہ خیالی اضطراب مفضی الی الشرک نہ ہو تو بسا اوقات دعا کے قبول ہونے کا سبب بھی بن جاتا ہے۔ مگر عام طور پر یہ چیز چونکہ شرک میں مبتلا کر دیتی ہے اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کا خاص طور پر کئی جگہ علاج ارشاد فرمایا اور یہاں بھی جملہ اَللّٰهُمَّ فَشَفِّعْهُ فِيَّ اسی غرض کے لئے لایا گیا ہے کہ کلمہ یا محمد حقیقی خطاب نہیں بلکہ خیالی خطاب ہے۔ اگر حقیقی ہوتا تو ''اے خدا پیغمبر کو میرا شفیع بنا'' کی بجائے ''اے پیغمبر میری شفاعت فرما'' کہا جاتا۔

ایک بزرگ کا قول ہے کہ فَشَفِّعْهُ میں ضمیر غائب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف لوٹتی ہے اگر سائل کے قول ''یا محمد'' میں حقیقی خطاب ہوتا تو فَشَفِّعْهُ کی بجائے فَشَفِّعْ هٰذَا النَّبِيُّ کہا جاتا۔ بہر حال طریق اول اسلم عن الشرک اور اقرب الی الصواب ہے۔

قبیح طریقے

اب وسیلہ کے ناجائز اور غیر صحیح طریقوں کا ذکر کیا جاتا ہے جن میں ایک سب سے زیادہ برا وہ ہے اور دوسرا قبیح۔

۱۔ سب سے زیادہ برا وہ ہے جو قبر پرستوں نے اختیار کر رکھا ہے کہ ارواح سے حاجت روائی چاہنا مسنون و مستحب سمجھتے ہیں، اس میں اقبحیت کی وجہ یہ ہے کہ جو چیز شریعت کے نزدیک گناہ اور معصیت ہے اسے حلال ماننا پڑتا ہے اور یہ کفر ہے۔

۲۔ اور قبیح حال یہ ہے کہ ارواح کو حاجت روائی کے لئے اپنا شفیع بنانا اور ان کی شفاعت کو

اپنے لئے قبولیت کا یقینی سبب خیال کرنا، اس میں قباحت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر امور دین میں ایک نئی چیز تجویز کرنی پڑتی ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَالَمْ يَاْذَنْ بِهِ اللّٰهُ (۴۲:۲۱)

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَآءَ قُلْ اَوَلَوْ كَانُوْا لَا يَمْلِكُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَعْقِلُوْنَ. (۳۹:۴۳)

''کیا ان کے اور (بھی) شریک ہیں جنھوں نے ان کے واسطے ایسا دین مقرر کر دیا ہے جس کی اللہ نے اجازت نہیں دی؟''۔

اور فرمایا

''کیا انھوں نے اللہ کو چھوڑ کر اور معبود بنائے ہیں۔ اے نبی کہہ دے کیا اگر چہ وہ عقل سے کورے ہوں اور کچھ بھی اختیار نہ رکھتے ہوں۔

شیخ عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ

اس وہم کے رد میں اسے کافی جاننا چاہئے، یہ بہت لوگوں کے پھسل جانے کا مقام ہے۔ انھوں نے سفارش کرنے والے اور جس کی سفارش کی جائے دونوں میں فرق نہیں سمجھا۔ کہتے ہیں یا شیخ عبدالقادر جیلانی شیاء اللہ یعنی اے عبدالقادر ساکن جیلان خدا کے لئے کچھ دے۔ اس کلام میں انھوں نے خدا کو سفارشی بنایا ہے اور حضرت شیخ رحمتہ اللہ علیہ کو دینے والا۔ حالانکہ حقیقت اس کے برعکس معلوم ہوتی ہے۔

ایک حدیث

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس ایک اعرابی آیا اور کہا، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں خدا کو آپ کے پاس شفیع لاتا ہوں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اعرابی کے اس قول سے ناراض ہو گئے۔ چہرۂ مبارک سرخ ہو گیا، اور فرمایا اللہ تعالیٰ اس سے بلند ہے کہ کسی کے پاس اسے شفیع بنا کر لایا جائے۔ (۱)

اس سے ثابت ہوا کہ زندہ اور غیر مخلوق کے پاس اللہ تعالیٰ کو شفیع بنا کر لانا اس کا واسطہ دے

(۱) اخرجہ ابوداؤد (السنۃ، باب فی الجهمية: ۵/۹۴۔ ۴۷۲۶)

کر مخلوق سے حاجت روائی چاہنا گویا خدا کو عاجز سمجھنا اور مخلوق کو توانتر جاننا ہے معاذ اللہ من ذلک۔

قرب الٰہی کا وسیلہ صرف دو چیزیں ہیں

جان لینا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کے قرب کا وسیلہ صرف دو چیزیں ہیں اعمال صالحہ (کسبی ہوں یا حسبی) اور اوصاف حمیدہ ان دونوں کا ذکر اذان کی دعا میں موجود ہے، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امت کو تلقین فرمائی ہے۔

دعا یہ ہے:

اَللّٰهُمَّ رَبَّ هٰذِهِ الدَّعْوَةِ التَّامَّةِ وَالصَّلٰوةِ الْقَائِمَةِ اٰتِ مُحَمَّدَنِ الْوَسِيْلَةَ وَالْفَضِيْلَةَ وَالدَّرَجَةَ الرَّفِيْعَةَ وَابْعَثْهُ مَقَامًا مَّحْمُوْدَنِ الَّذِىْ وَعَدْتَّهٗ.

(اے اللہ! تو جو رب ہے اس پوری دعوت کا اور نماز کا جو ابھی قائم ہونے والی ہے، دے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وسیلہ کی بزرگی اور بلند درجہ اور پہنچا دے آپ کو مقام محمود میں جس کا تو نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وعدہ کر رکھا ہے۔(۱)

اس دعا میں لفظ وسیلہ یا تو مصدر ہے یا صفت بمعنی ما یتوسل بہ اور دونوں صورتوں میں یہ کسی صفت کا نام ہوگا نہ کہ ذات اور جنس کا۔

پس وسیلہ اگر صفت کا نام ہے تو آت محمد الوسیلۃ کے یہ معنی ہوں گے کہ خدایا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وہ صفت عطا کر جو مقام محمود کے حصول کا باعث ہو، مزید برآں وسیلہ کے ساتھ فضیلت کا لفظ ہے، جو ظاہر کرتا ہے کہ جس طرح فضیلت ایک صفت کا نام ہے، وسیلہ بھی کسی صفت کا نام ہوگا۔

نتیجہ بحث

مذکورہ بالا بحث سے نتیجہ نکلا کہ جو لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال وافعال کی

---

(۱) الحدیث بدون والدرجة الرفیعه اخرجه البخاری (فتح الاذان، باب الدعاء عند النداء ۴/۹۴،۶۱۴) وغیرہ مثل ابی داؤد والنسائی والترمذی وابن ماجه وغیرهم ولیس عندهم "الدرجة الرفیعة" وقعت تلک الزیادة عند ابن السنی فی عمل الیوم واللیلة (۹۳) وقد جرح بذلک ابن حجر فی التلخیص (ص۷۸) والبخاری فی المقاصد الحسنة (ص۲۱۲) مع ان الحدیث عن طریق النسائی فهی مدرجة من بعض النسّاخ

پیروی چھوڑ کر، جو حقیقی وسیلہ ہے محض بزرگوں کی ذات کو وسیلہ بناتے ہیں، غلطی پر ہیں، کیونکہ وسیلہ اعمال صالحہ اور اوصاف حمیدہ کا نام ہے۔

تین مسافروں کا قصہ

صحیحین میں ایک قصہ مذکور ہے کہ ایک دفعہ تین آدمی صحرا میں سفر کر رہے تھے۔ جب ایک پہاڑ کے قریب پہنچے تو زور کی بارش آگئی۔ بارش سے بچنے کے لئے انھوں نے ایک غار میں پناہ لی۔ ابھی داخل ہوئے ہی تھے کہ ایک بہت بڑا پتھر کھسک کر غار کے منہ پر آگیا اور وہ تینوں اس کے نیچے آگئے۔ جب مسافروں نے اپنے آپ کو اس طرح گھرا ہوا اور بے بس پایا تو ایک دوسرے سے کہنے لگے بھائیو! بچنے کی ایک صورت ہے وہ یہ ہے کہ ہر شخص اپنے خالص ترین عمل کو وسیلہ بنا کر خدا سے دعا کرے شاید اللہ تعالیٰ ہمیں اس مصیبت سے نجات بخشے۔ اس پر ایک شخص نے اپنے زنا سے بچنے کا واقعہ بیان کر کے اس طرح کی دعا کی۔ (۱)

اَللّٰھُمَّ اِنْ کُنْتَ تَعْلَمُ اِنِّیْ فَعَلْتُ ذٰلِکَ ابْتِغَاءَ وَجْھِکَ فَافْرُجْ عَنَّا

(کہ اے پروردگار، اگر تیری نگاہ میں میں نے یہ کام صرف تیری رضا جوئی کے لئے کیا تھا تو اس غار کا منہ کھول دے)

اس کا دعا ختم کرنا تھا کہ غار کا منہ اتنا کھل گیا کہ آسمان نظر آنے لگا۔ پھر دوسرے نے دعا شروع کی اور اپنے بوڑھے والدین کی خدمت گذاری کا ایک واقعہ بیان کیا اور آخر میں انہی الفاظ میں دعا کی۔ اب غار کا دو تہائی منہ کھل گیا۔ اب تیسرے نے ایک مزدور کے ساتھ معاملہ میں اپنی امانت داری کا واقعہ بیان کیا اور انہی الفاظ پر دعا ختم کی تو پتھر کھسک کر بالکل ہٹ گیا اور وہ باہر نکل آئے۔

نتیجہ

جو لوگ اللہ تعالیٰ کی محبت کو مقصد اوّل جانتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت کو اس کا وسیلہ گردانتے ہیں اور آپ کی پیروی کرنا اپنے لئے ضروری سمجھتے ہیں اور بزرگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پیرو ہونے کی حیثیت سے دوست رکھتے ہیں، ان لوگوں کے لئے یہ فعل

---

(۱) بخاری (فتح الباری ۶/۵۰۵ حدیث ۳۴۶۵، الانبیا باب حدیث الغار) مسلم (الذکر باب قصہ اصحاب الغار الثلاثۃ ۴/۲۰۹۹ حدیث ۲۷۴۳)

وسیلہ نجات ہوگا چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

اَحِبُّوا اللّٰہَ لِمَا یَغْذُوْکُمْ مِنْ نِعَمِہٖ وَاَحِبُّوْنِیْ لِحُبِّ اللّٰہِ وَاَحِبُّوْا اَھْلَ بَیْتِیْ لِحُبِّیْ۔ (۱)

اللہ تعالیٰ سے محبت کرو اس لئے کہ وہ تمہیں نعمتیں دیتا ہے اور مجھ سے محبت کرو اس لئے کہ اللہ تعالیٰ میرے ساتھ محبت رکھتا ہے اور میرے اہل بیت سے پیار کرو اس لئے کہ میں ان سے پیار کرتا ہوں۔

پیروں کے ساتھ محبت کرنے کا معیار

مسلمانوں کو چاہئے کہ اس حدیث کو معیار ٹھہرالیں اور کسی پیر کے ساتھ اس وقت تک رشتہ الفت نہ جوڑیں جب تک یہ معلوم نہ کرلیں کہ اس کا قول وفعل نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول وفعل کے مطابق ہے۔

لیکن قبر پرستوں کے اس قسم کے اقوال مثلاً عصائے پیر بجائے پیر اور گور پیر بحکم پیر تو یہ شریعت وطریقت دونوں سے خارج ہیں اور وسیلہ کے کسی مفہوم میں داخل نہیں۔ قبر پرستوں نے اس قسم کے اقوال عوام الناس کو مغالطہ دے کر خود ان کے پیشوا بننے کے لئے مشہور کر رکھے ہیں۔ ان سے بچنے کے لئے یاد رکھنا چاہئے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی قرب الٰہی کا وسیلہ بنانا صرف آپ کی پیروی کرنے ہی کے ذریعہ سے ممکن ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ وَیَغْفِرْلَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ. (آل عمران ۳۱)

اے نبی کہہ دو کہ اگر اللہ کے ساتھ محبت رکھنا چاہتے ہو تو میری اتباع کرو۔ اللہ تعالیٰ تم سے پیار کرے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا۔

اس سے ثابت ہوگیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی متابعت کرنا ہی وسیلہ ہے۔

شفاعت کن لوگوں کیلئے

اگر کوئی کہے کہ قیامت کے روز آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفاعت وسیلہ نجات ہوگی تو

---

(۱) ترمذی بروایت ابن عباسؓ۔ بحوالہ مشکوۃ باب مناقب اہل بیت۔

اسے بتانا چاہئے کہ کسی شخص کی شفاعت اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر نہیں ہوگی۔

چنانچہ ارشاد ہے:

مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗۤ اِلَّا بِاِذْنِہٖ. (۲:۲۵۵)

ایسا کون ہے جو اس کے اذن کے بغیر اس کے پاس سفارش کرے۔

اور اللہ تعالیٰ کا اذن مومن کے لئے ہوسکتا ہے۔ غیر مومن کے لئے نہیں ہوسکتا۔ تو اس طرح بھی نتیجہ وہی نکلا کہ آدمی کا اصل وسیلہ اس کا اپنا ایمان ہے، جو بندے کا عمل ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے۔

کار خود کن کار بیگانہ مکن — در زمین دیگران خانہ مکن

دوسروں کا کام چھوڑ کر اپنا کام کر دوسروں کی زمین میں اپنا گھر نہ بنا۔

عمل مطابق سنت ہی قرب کا وسیلہ ہے

اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ وہی چیز اللہ کے قرب کا وسیلہ ہو سکتی ہے جو سنت کے مطابق ہو لیکن اس کے برعکس وسیلہ کو جو لوگ سنت کے مطابق سمجھتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔ چنانچہ جن لوگوں نے قبروں کو وسیلہ سمجھ رکھا ہے جیسے کفار مورتیوں کو سمجھتے ہیں تو یاد رکھنا چاہئے کہ وہ لوگ بے خبری میں غیر ہادی کا اتباع کر رہے ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

اَفَمَنْ یَّهْدِیْۤ اِلَی الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ یُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا یَهِدِّیْۤ اِلَّاۤ اَنْ یُّهْدٰی فَمَا لَكُمْ كَیْفَ تَحْكُمُوْنَ. وَمَا یَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْئًا. (۱۰:۳۵-۳۶)

بھلا جو حق و صداقت کی راہ دکھا سکتا ہے وہ قابل اتباع ہے یا وہ جو بے بتلائے خود بھی راستہ نہ پاسکے۔ تمہیں کیا ہوگیا ہے؟ کس طرح انصاف کرتے ہو؟ اصل بات یہ ہے کہ یہ لوگ صرف وہم کی پیروی کرتے ہیں حالانکہ حق کے مقابلے میں وہم کی کوئی حقیقت نہیں۔

اس آیت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ظن کی پیروی کرنے والوں کے عذاب کا موجب ان کا اپنا عمل ہے نہ کہ کسی اور کا۔

عمل صالح کی تعریف اور وسیلۂ نجات

الغرض ہر شخص کے لئے عمل ہی وسیلۂ نجات ہو سکتا ہے۔ پھر جو معاملہ بزرگوں کی قبروں کے ساتھ کیا جاتا ہے وہ اگر عمل صالح میں داخل نہیں ہے تو کیوں کر نجات کا وسیلہ ہو سکتا ہے؟ کیوں کہ عمل صالح کی تعریف تو یہ ہے کہ سنت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مطابق ہو، تفسیر حسینی نے آیت

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا. (۱۱۰:۱۸)

کی تفسیر لکھتے ہوئے بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اقوال نقل کئے ہیں کہ عمل صالح وہی ہے جو سنت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مطابق ہے۔

پس جو شخص اپنے رب سے ملنے کا آرزومند ہے، اسے نیک عمل کرنا چاہئے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہیں کرنا چاہئے۔

شرک فی العبادات کا مفہوم

آگے شرک فی العبادات اور شرک بالعبادات کے درمیان فرق بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

غیر کی ذات کو اللہ کی عبادت میں شریک ٹھہرانا یہ ہے کہ اس کی ذات کو اپنے حق میں مثل عبادت الٰہی مفید اور فائدہ مند جانے۔ اس کی مثال جاہلوں کا یہ عمل ہے کہ بزرگوں کی عزت اور ان کے ناموں کو وسیلہ سمجھتے ہوئے اعمال صالح ترک کر کے صرف ان کی ذات کا واسطہ دے کر خدائے تعالیٰ سے دینی اور دنیاوی ترقی چاہتے ہیں، یہ شرک فی العبادات ہے، یعنی عبادت میں ریا اور دکھاوا کیا جائے۔

عدم خلوص قرب کا وسیلہ نہیں

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ دکھاوا کرنے اور شہرت چاہنے کی وجہ سے عبادت کے اندر خلوص نہیں رہتا۔ اور ایسی عبادت آدمی کو شرک خفی میں مبتلا کر دیتی ہے کیونکہ اس نے اپنی عبادت کو شرک کا ذریعہ بنایا۔ بہرحال صرف وہی عبادت تقرب الٰہی کا وسیلہ ہوتی ہے، جو خالص اللہ کے لئے ہو۔

پس غور کرو! جب خدا کی عبادت بھی خلوص نیت کے بغیر اس کے تقرب کا وسیلہ نہیں ہو سکتی تو

غیر کی عبادت خدا کے تقرب کا وسیلہ کیوں کر ہو سکتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَاعْبُدِاللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ. اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ

پس اللہ کی عبادت خالص نیت سے کرو اور یاد رکھو خلوص نیت سے بندگی کا مستحق اللہ ہی ہے۔

خاتمہ سخن!

اے اللہ! میں اس کتاب کو تیرے تقرب کا وسیلہ بناتا ہوں، اور تیری وسیع بخشش کے لئے اسے ایک ذریعہ گردانتا ہوں۔ تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔ تو پاک اور بے نیاز ہے۔ تیرے دربار میں غلامی کے لئے حاضر ہوا ہوں۔

اے الہ مجھے بخش دے۔ اور امت مسلمہ پر رحم فرما۔ ہم تیری ہی عبادت کرتے اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔ ہمارا بھروسہ تجھی پر ہے۔ تیری طرف رجوع کرتے ہیں اور ہم سب کو تیری ہی طرف لوٹنا ہے۔

اے اللہ! ہماری ذمہ صرف تبلیغ کرنا ہے۔ ایسی تبلیغ کہ گمراہ اور نافرمان کے سوا کوئی ہلاکت میں نہ رہے۔ سو اللہ کا دین واضح ہوگیا۔ اور اس کی مدد آگئی۔ اب ہم بری ہیں اس بات سے کہ بے دین لوگ محروم رہیں۔

اے اللہ! اپنی بہترین مخلوق حضرت محمدؐ اور ان کی ساری آل اور ان کے تمام اصحاب پر ہزاروں رحمتیں نازل فرما۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

العقیدۃ الحسنۃ

تصنیف

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ

ترجمہ

عبدالحمید سواتی

تحقیق و تعلیق

مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سیدنا محمد خاتم النبیین وآلہٖ وصحبہٖ اجمعین

اما بعد! پس کہتا ہے بندہ اپنے رب کی رحمت کا محتاج، احمد جس کو ولی اللہ بن عبدالرحیم کے نام سے پکارا جاتا ہے اللہ تعالیٰ ان دونوں پر احسان فرمائے کہ میں اللہ تعالیٰ کو اور جو ملائکہ، جنات اور انسان حاضر ہیں، ان کو گواہ بنا کر اپنے عقائد کے بارے میں کہتا ہوں (۱) کہ میں خلوص قلب سے اس بات کا اعتقاد رکھتا ہوں کہ تمام عالم کا ایک صانع (بنانے والا) قدیم ہے جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا، اس کا وجود واجب ہے اور اس کا عدم ممتنع ہے (جس کا ہونا ضروری اور اس پر فنا اور عدم، محال) اور وہ بڑا اور عالی شان ہے اور تمام کامل صفات کے ساتھ متصف ہے اور زوال اور نقص کی تمام علامتوں سے پاک اور منزہ ہے وہ تمام مخلوقات کا خالق ہے اور تمام کائنات کی باتوں کا جاننے والا ہے اور تمام مخلوقات پر پوری قدرت رکھتا ہے اور تمام کائنات کی (ایجاد و قیام) کا ارادہ کرنے والا ہے اور زندہ ہے، سننے اور دیکھنے والا ہے، کوئی چیز اس کے مشابہ نہیں اور نہ کوئی چیز اس کی ضد اور مقابل ہے اور نہ کوئی چیز اس کی مثل ہے اور اس کے واجب الوجود ہونے اور عبادت کے استحقاق پیدا کرنے اور تدبیر میں کوئی اس کا شریک نہیں پس عبادت کا استحقاق اس کے سوا کسی

یہ رسالہ جس کا نام "العقیدۃ الحسنۃ" ہے، علم عقائد کے موضوع پر ایک جامع رسالہ ہے جو عقیدۃ الطحاوی کے طرز و انداز پر ہے اور یہ اصلاً عربی زبان میں ہے بلاشبہ یہ رسالہ اس لائق ہے کہ جو دینی مدارس کے نصاب تعلیم میں داخل ہو اور اہل مدارس کو اس رسالہ کو داخل نصاب کرنے پر غور کرنا چاہیے۔ (قاسمی)

کے لئے نہیں اور عبادت انتہائی درجہ کی تعظیم کو کہا جاتا ہے کسی مریض کو اس کے سوا کوئی شفا نہیں بخشتا اور نہ کسی کو اس کے سوا کوئی روزی پہنچاتا ہے اور ضرر اور تکلیف کو اس کے سوا کوئی دور نہیں کر سکتا۔

اور اس کا یہ کام اس طرح ہے کہ جب وہ کسی چیز کو (بغیر ظاہری اسباب کے) کہہ دے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے اس طرح نہیں جس طرح ظاہری اور عادی اسباب کے تحت کوئی چیز ہوتی ہے جیسا کہ لوگ کہتے ہیں کہ طبیب نے مریض کو شفا دی اور امیر لشکر نے لشکر کو رزق دیا کیونکہ یہاں مراد ظاہری اسباب کے تحت علاج و معالجہ کرنا اور تنخواہ وغیرہ دینا ہوتا ہے یہ معنی اس کے علاوہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے لئے بولا جاتا ہے اگرچہ الفاظ ایک جیسے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا کوئی معین اور پشت پناہ نہیں اور نہ وہ کسی دوسری چیز میں حلول کرتا ہے اور نہ وہ غیر کے ساتھ مل کر متحد ہوتا ہے اور اس کی ذات کے ساتھ کوئی حادث چیز قائم نہیں ہو سکتی (نو پیدا چیز جو پہلے نہ تھی) پس اس کی ذات میں اور صفات میں کسی قسم کا حدوث نہیں ہے البتہ جب اس کی صفات کا تعلق اپنے متعلقات کے ساتھ ہوتا ہے تو اس تعلق میں حدوث ہوتا ہے تا کہ افعال ظاہر ہوں۔ اور حقیقت میں یہ تعلق بھی حادث نہیں ہے حادث صرف ان صفات کے متعلقات (تمام کائنات کی اشیاء اللہ تعالیٰ کے سوا) ہی ہوتے ہیں، اس لئے اس تعلق کے احکام بھی مختلف اور متفاوت ہوتے ہیں (ورنہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات میں مطلقاً کسی قسم کا حدوث نہیں) اور وہ باری تعالیٰ ہر وجہ اور ہر طریق پر حدوث اور تجدد سے بری اور پاک ہے اور وہ نہ جوہر ہے (جو کسی زمان یا مکان میں خود قائم ہوتا ہے) اور نہ عرض ہے (دوسری چیز کے ساتھ قائم ہو جیسا رنگ، شکل وغیرہ) اور نہ وہ جسم ہے اور نہ کسی مکان یا جہت میں ہے اور نہ اس کی طرف یہاں اور وہاں کے ساتھ اشارہ کیا جا سکتا ہے اور اللہ تعالیٰ اپنی ذات اور صفات میں نہ حرکت کرتا ہے اور نہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتا ہے اور نہ بدلتا ہے اور اس میں جہل اور کذب بھی روا نہیں یعنی کذب اور جہل کا صدور اس سے محال ہے اور وہ عرش کے اوپر ہے جیسا کہ اس نے خود اپنے بارے میں فوق العرش ہونا بیان کیا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ عرش اس کا مکان ہے اور فوق اس کی جہت ہے بلکہ اس کی فوقیت اور استواء کی حقیقت اس کے سوا کوئی نہیں جانتا، یا پھر وہ پختہ کار علما جانتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے علم لدنی عطا فرمایا ہے۔ اور

باری تعالیٰ کا دیدار ایمان والوں کو قیامت کے دن نصیب ہوگا اور اس دیدار کی دو طرح وضاحت کی گئی ہے ایک اس طرح کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان مومنین پر ایسا انکشاف تام ہو جائے گا جو عقل تصدیق سے بہت زیادہ ہوگا۔ گویا کہ آنکھ سے ہی دیکھا ہے، لیکن اس میں سامنا، مقابلہ اور جہت، رنگ اور شکل نہیں ہوگا۔

اور یہ وجہ ایسی ہے کہ اس کا قول فرقہ معتزلہ نے اور دوسرے لوگوں (مثلاً شیعہ وغیرہ) نے بھی کیا ہے اور یہ بات فی نفسہ حق اور درست ہے، لیکن ان کی غلطی یہ ہے کہ وہ رویت کا یہی معنی (بیان) کرتے ہیں یا رویت کو اسی معنی میں منحصر مانتے ہیں (جس کی وجہ سے رویت بالابصار کا انکار کرتے ہیں) اور دوسرا معنی رویت کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مختلف صورتوں میں ان کے سامنے متمثل ہو جیسا کہ سنت اور احادیث میں مذکور ہے، پس وہ لوگ باری تعالیٰ کو اپنی آنکھوں کے ساتھ شکل، صورۃ اور رنگ اور آمنے سامنے کی طرح دیکھیں گے جیسا کہ خواب میں واقعہ ہوتا ہے جس کی خبر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے جہاں آپ نے فرمایا ہے کہ ''میں نے اپنے رب کو اچھی صورۃ میں دیکھا ہے''۔ اسی طرح لوگ قیامت میں اس کو عیاناً یعنی بالکل ظاہر آنکھوں سے دیکھیں گے جس طرح دنیا میں خواب کے اندر دیکھتے ہیں اور رویت کی یہ دونوں صورتیں ایسی ہیں جن کو ہم سمجھتے ہیں اور ان پر اعتقاد رکھتے ہیں۔

اور اگر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد رویت سے ان کے علاوہ کوئی اور معنی ہو، تو پھر ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں کی مراد ہے۔ اگر چہ ہم بعینہٖ اس معنی کو نہ سمجھتے ہوں، اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے وہ ہوتا ہے اور جو نہ چاہے وہ نہیں ہوتا۔ اور کفر اور دیگر معاصی اور گناہ اس کے پیدا کرنے اور ارادہ کرنے سے ظاہر ہوتے ہیں لیکن وہ ان کو پسند نہیں کرتا۔ اور وہ ایسا غنی اور بے نیاز ہے جو اپنی ذات اور صفات میں کسی چیز کی طرف احتیاج نہیں رکھتا، اور نہ اس پر کوئی حاکم ہے اور نہ اس پر کوئی چیز کسی غیر کے واجب کرنے سے واجب ہوتی ہے۔ ہاں لیکن وہ خود (ازراہِ لطف وکرم) کسی چیز کا وعدہ فرماتا ہے۔ تو پھر وہ اس کو پورا کرتا ہے اس وعدے کے خلاف نہیں کرتا۔ جیسا کہ حدیث میں اس قسم کے الفاظ آئے ہیں'' کہ وہ چیز اللہ کے

ذمہ ہے یا اللہ تعالیٰ اس کا ضامن ہے''، اور اللہ تعالیٰ کے تمام کام حکمت اور مصلحت کلیہ (عمومی مصلحت) جیسا کہ وہ بہتر جانتا ہے، پر مشتمل ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ پر کسی خاص فرد یا خاص جزی چیز کے بارے میں جو بات اصلح (بہتر بات) ہو واجب نہیں (جیسا کہ معتزلہ وغیرہ کا اعتقاد ہے کہ جو چیز بندہ کے لئے اصلح ہو وہ اللہ تعالیٰ پر واجب ہوتی ہے) اور کوئی بات اللہ تعالیٰ کی طرف سے قبیح نہیں ہوتی، اور اللہ تعالیٰ کو اپنے کاموں میں اور اپنے فیصلوں میں ظلم اور ناانصافی کی طرف منسوب نہیں کیا جاسکتا (اللہ تعالیٰ کسی پر ظلم اور ناانصافی نہیں کرتا، اللہ تعالیٰ نے جو کچھ پیدا کیا ہے یا جو حکم دیا ہے اس میں حکمت کی رعایت فرمائی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اپنی ذات وصفات میں کسی شئے سے تکمیل حاصل کرتا ہے (حکمت کی رعایت سے اس کی ذات یا صفات میں کچھ کمال پیدا ہوا ایسا نہیں) اور اس کو کسی چیز کی طرف حاجت اور غرض بھی نہیں کیونکہ یہ کمزوری اور قباحت (بری) بات ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے پاک ہے اس کے سوا کوئی حاکم نہیں۔ پس عقل کیلئے اشیا کے حسن وقبح میں کوئی حکم یا دخل نہیں ہے (جیسا کہ معتزلہ وغیرہ کہتے ہیں کہ اشیا کا حسن وقبح عقلی ہے) اور اسی طرح کسی فعل کے ثواب یا عقاب کے سبب ہونے میں بھی عقل کا دخل نہیں ہے، اشیا کا حسن وقبح اللہ تعالیٰ کے فیصلہ اور اس کے حکم سے ہوتا ہے اور اس وجہ سے کہ اس نے لوگوں کو مکلف بنایا ہے (یعنی حسن وقبح امور شرعیہ کے مکلف ہونے کی وجہ سے ہے نہ کہ عقل کی وجہ سے) اب بعض باتیں ایسی ہیں کہ عقل ان کو سمجھتی ہے اور ان میں ثواب یا عقاب کی مصلحت اور مناسبت کو بھی جانتی ہے۔

اور بعض چیزیں ایسی ہیں کہ عقل ان کے حسن وقبح کا ادراک نہیں کرسکتی جب تک کہ اللہ تعالیٰ کے رسول خدا تعالیٰ کی طرف سے بتلا نہ دیں اور اللہ تعالیٰ کی ہر ایک صفت اپنی حقیقت اصلیت کے اعتبار سے واحد ہے، اور باعتبار تعلقات کے غیر متناہی اور بے انتہا ہے۔ اور حدوث وتجدد اس صفت میں نہیں بلکہ اس چیز (ممکن وحادث اشیاء) میں ہوتا ہے جس کے ساتھ اس صفت کا تعلق ہے اور اللہ تعالیٰ کے ملائکہ ہیں جو عالم بالا میں رہتے ہیں اور وہ مقرب بارگاہ ہیں اور کچھ دوسرے ملائکہ ہیں جو لوگوں کے اعمال کے لکھنے اور ان کی حفاظت پر مقرر ہیں۔ اور کچھ ایسے ہیں جو بندوں کی مہلک خطرات سے اور ہلاکتوں سے حفاظت کرتے ہیں اور کچھ دعوت الی الخیر دیتے

ہیں اور بندوں کی طرف اچھے خیالات ڈالتے رہتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کا ایک مقام اور ٹھکانا مقرر ہے جو کچھ اللہ تعالیٰ ان کو حکم دیتا ہے اس کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو حکم ہوتا ہے اس کی تعمیل میں سرگرم رہتے ہیں۔

اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں شیاطین بھی ہیں جن کا کام یہ ہے کہ انسانوں میں برے خیالات اور وسوسے ڈالتے رہتے ہیں، اور قرآن کریم، اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی ہمارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اتارا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے (سورۃ زخرف آیت ۱۵) ''کہ کسی بشر کیلئے یہ ممکن نہیں کہ خدا تعالیٰ اس سے کلام کرے۔ مگر یہ کہ وحی کے ذریعہ سے یا پس پردہ، یا کسی فرشتہ کو بھیج دے کہ جو پیغام اللہ تعالیٰ کو منظور ہو وہ فرشتہ اس کے حکم سے پہنچا دے'' اور یہی وحی کی حقیقت ہے اور اللہ تعالیٰ کے اسما پاک اور اس کی صفات میں الحاق (زیادتی) جائز نہیں (یعنی اللہ تعالیٰ کے ناموں اور صفتوں کے ساتھ دوسرے اسماء اور صفات اپنی طرف سے بڑھائیں جائیں) لہٰذا اللہ تعالیٰ کے ناموں اور صفات کے اطلاق میں شریعت پر توقف کرنا چاہئے۔ جو نام اور صفت شریعت میں وارد ہو اس کا اطلاق درست ہوگا، ورنہ درست نہ ہوگا۔

اور قیامت کے دن جسم کے ساتھ زندہ ہونا برحق ہے جس میں لوگوں کے اجسام جمع کئے جائیں گے اور ان جسموں میں روحوں کو لوٹایا جائے گا اور یہ ابدان وہی ابدان ہوں گے جو دنیا میں تھے۔ اور شریعت اور عرف میں جن کو ابدان سمجھا جاتا ہے اگرچہ ان میں قامت کی درازی یا کوتاہی ہو، جیسا کہ احادیث میں آیا ہے، کہ کافر کا دانت اُحد پہاڑ کے برابر ہوگا۔ یا وہ اجسام لطیف خوبصورت اور پاکیزہ ہوں جیسا کہ حدیث میں اہل جنت کے بارے میں آیا ہے اس کی مثال ایسی ہے جس طرح چھوٹا بچہ جو بعینہٖ وہی ہوتا ہے جو ایک وقت جوان اور دوسرے وقت بوڑھا ہو جاتا ہے، چاہے اس کے اجزا بدن میں ہزار مرتبہ سے بھی زیادہ تبدیلی کیوں نہ واقع ہوئی ہو (لیکن ہوتا وہی ہے)

اور اعمال کی جزا اور حساب اور پل صراط اور میزان برحق ہے اور جنت اور دوزخ حق ہیں، اور یہ اس وقت مخلوق ہیں (یہ بات نہیں کہ ان کو قیامت میں پیدا کیا جائے گا جیسا کہ معتزلہ کہتے

ہیں بلکہ فی الوقت موجود ہیں)۔ اور کسی نص نے ان کا محل اور مکان متعین نہیں کیا بلکہ یہ دونوں وہاں ہیں جہاں اللہ تعالیٰ چاہے کیونکہ ہم اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوق اور جہانوں کا احاطہ نہیں کر سکتے۔

اور کسی مسلمان کو جس سے کبیرہ سرزد ہوا ہو ہمیشہ دوزخ میں نہیں رکھا جائے گا اور اس بات کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم سورہ نساء آیت ۳۱ میں اس طرح فرمایا ہے کہ ''جن کاموں سے تم کو منع کیا جارہا ہے اگر تم ان ممنوعات میں سے جو بڑے بڑے گناہ ہیں ان سے بچتے رہوں گے تو ہم تمہارے چھوٹے چھوٹے قصور تم سے زائل کر دیں گے''، یعنی نماز اور دیگر کفارات کی وجہ سے اور یہ بات جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ کبیرہ گناہوں کو معاف کر دے لیکن اللہ تعالیٰ کے افعال دنیا اور آخرت میں دو طرح ہیں، ایک یہ کہ دستور اور عادت کے مطابق واقع ہوں اور دوسرے یہ کہ عادت اور دستور کے خلاف ہے، جو شخص کبیرہ گناہ کا مرتکب ہو اور بلا توبہ مر جائے اس کو معاف کر دینا جائز ہے لیکن یہ بات عادت اور دستور کے خلاف ہے۔ اور اسی طرح حقوق الناس کو معاف فرما دینا بھی جائز ہے مگر عادت و دستور کے خلاف ہے۔

اور یہی تطبیق ہے ان متعارض نصوص میں جو بظاہر ایک دوسرے سے متعارض معلوم ہوتی ہے اور شفاعت حق ہے اس کے لئے جس کے بارے میں خدائے رحمٰن اجازت دے گا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت آپ کی امت کے اہل کبائر کے لئے برحق ہے اور آپ کی شفاعت مقبول ہوگی اور جہاں قرآن میں شفاعت کی نفی واقع ہوئی ہے اس سے مراد وہ شفاعت ہے جو اللہ تعالیٰ کی اجازت اور رضا کے بغیر ہو۔

اور قبر میں فاسق اور بدکار کے لئے عذاب کا ہونا اور نیکوکاروں اور ایمان والوں پر نعمت کا ہونا حق ہے اور قبر میں منکر و نکیر (دو فرشتوں) کا سوال و جواب، مردوں سے حق ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا مخلوق کی ہدایت کے لئے رسولوں کا مبعوث فرمانا حق ہے اور انہیں انبیا و رسل کی زبانوں پر امر و نہی کرنا اور بندوں کو شرعی احکام کی تکلیف دینا برحق ہے اور یہ انبیا علیہم السلام چند باتوں کے ساتھ ممتاز ہوتے ہیں یہ باتیں اکٹھی دوسرے لوگوں میں نہیں پائی جاتیں اور یہ باتیں اس کا ثبوت ہوتی ہیں کہ یہ انبیا ہیں۔

ان میں سے ایک خرق عادت (معجزات) کا ان سے ظاہر ہونا۔ اور ان باتوں میں یہ بھی ہے کہ ان کی فطرت سلیم ہوتی ہے اور ان کے اخلاق کامل درجہ کے ہوتے ہیں اور اس کے علاوہ اور بھی بہت سی باتیں ہیں جو انبیا علیہم الصلوٰۃ میں پائی جاتی ہیں۔

اور تمام انبیا علیہم السلام کفر، شرک اور عمداً گناہ کبیرہ سے اور صغائر پر اصرار کرنے سے معصوم اور پاک ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو بچاتا اور معصوم رکھتا ہے تین طریقوں سے، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ ان کو پیدائشی طور پر ہی سلیم الفطرت اور اخلاق کے کامل اعتدال پر پیدا کرتا ہے۔ اس لئے وہ معاصی میں رغبت نہیں کرتے بلکہ ان سے متنفر ہوتے ہیں۔

دوسری یہ کہ اللہ تعالیٰ ان کی طرف وحی نازل کرتا ہے کہ معاصی پر خدا تعالیٰ کی طرف سے سزا ہوگی اور طاعات اور نیکیوں پر اچھا بدلہ دیا جائے گا اور یہ وحی ان کے لئے گناہوں اور معاصی سے روکنے کے باعث ہوتی ہے۔

اور تیسری صورت یہ ہے ان انبیا علیہم السلام کے درمیان اور معاصی کے درمیان اللہ تعالیٰ حائل ہو جاتا ہے کسی لطیفہ غیبیہ کے ظاہر کرنے سے جیسا کہ یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں حضرت یعقوب علیہ السلام کی صورت کا ظاہر ہونا، انگلی کو دانتوں سے دبائے ہوئے۔ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں آپ کے بعد کوئی نبی نہیں (آپ کے بعد کسی کو نبی نہیں بنایا گیا آپ پر اس مرتبہ کو ختم کر دیا گیا ہے جیسا کہ آپ نے فرمایا "خُتِمَ بِیَ النَّبِیُّوْنَ" کہ مجھ پر نبیوں کو ختم کر دیا گیا ہے) اور آپ کی دعوت تمام جن وانس کے لئے عام ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس خصوصیت کی بنا پر اور اس کے علاوہ دیگر خصوصیات کی وجہ سے تمام انبیا سے افضل ہیں۔

اور اولیا کرام کی کرامات برحق ہیں اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے ان کرامتوں کے ساتھ نوازتا ہے اور اپنی رحمت کے ساتھ خاص کرتا ہے جس کو چاہتا ہے اور اولیا، ان مومنوں کو کہا جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کی صفات کی معرفت رکھتے ہیں اور ایمان میں پختگی اور مضبوطی کے ساتھ نیکیاں کرنے والے ہوتے ہیں۔ اور ہم جنت اور بہتری کی گواہی دیتے ہیں عشرہ مبشرہ کے حق میں (یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ دس صحابہ جن کو آپ نے ایک ہی مجلس میں بہشت کی بشارت سنائی تھی

خلفا اربعہ، سعیدؓ، سعدؓ، طلحہؓ، زبیرؓ، ابوعبیدہ ابن جراحؓ، عبدالرحمٰن بن عوفؓ)، اسی طرح ہم حضرت فاطمہؓ اور ام المومنین خدیجہؓ اور ام المومنین عائشہ صدیقہؓ اور حسنؓ اور حسینؓ کے حق میں بھی جنت کی گواہی دیتے ہیں۔

اور ہم ان کی تعظیم وتوقیر کرتے ہیں اور اسلام میں ان کے عظیم مرتبہ کا اعتراف کرتے ہیں اور اسی طرح اہل بدر اور اہل بیعۃ الرضوان کے حق میں بھی بہتری اور بہشت کی گواہی دیتے ہیں۔

اور امیر المومنین حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد امام برحق ہیں ان کے بعد حضرت عمرؓ، ان کے بعد حضرت عثمانؓ، ان کے بعد حضرت علیؓ، اللہ تعالیٰ ان سب سے راضی ہو۔

ان چاروں بزرگوں کے زمانہ تک خلافت راشدہ ختم ہوگئی (۱)۔ ان کے بعد جو خلفا ہوئے ہیں وہ بادشاہ تھے۔ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب لوگوں سے افضل ہیں پھر ان کے بعد فضیلت میں حضرت عمرؓ کا مرتبہ ہے اور ان بزرگوں کے افضل ہونے کا یہ معنی نہیں کہ یہ تمام وجوہ سے دوسروں سے افضل ہیں حتی کہ نسب، شجاعت، قوۃ، علم اور اس جیسے دیگر امور میں (ممکن ہے کہ بعض دوسرے صحابہ افضل ہوں) بلکہ ان بزرگوں کے افضل ہونے کا یہ معنی ہے کہ اسلام میں ان سے جو نفع عظیم ہوا ہے وہ دوسروں سے نہیں ہوا، پس امیر تو اصل میں آنحضرت ﷺ ہیں اور ابوبکرؓ، عمرؓ آپ کے دو وزیر ہیں۔ انھوں نے حق کی اشاعت میں ہمت بالغہ سے کام لیا ہے، کیونکہ نبی کریم ﷺ کی دو جہتیں ہیں۔ ایک جہت اللہ تعالیٰ سے اخذ کرنے کی ہے اور دوسری جہت مخلوق کو دینے کی ہے۔ اور ان دونوں بزرگوں (شیخینؓ) کو خلق خدا کی ہدایت میں اور لوگوں کو جمع کرنے میں اور جہاد کی بہتر تدبیریں کرنے میں بہت کمال حاصل تھا۔

اور تمام صحابہ کے بارے میں ہم اپنی زبانوں کو روکتے ہیں اور سوائے بھلائی اور خیر کے ان کا ذکر نہیں کرتے (یعنی ان پر کسی قسم کی تنقید وجرح نہیں کرتے) وہ دین میں ہمارے مقتدا اور پیشوا ہیں، صحابہ کو گالی دینی حرام ہے اور ان کی تعظیم واجب ہے، اور ہم اہل قبلہ میں سے کسی کو کافر نہیں

---

(۱) صرف ۲۳ سال تک روئے زمین پر قرآن کی حکومت قائم رہی ہے وہ خلفائے راشدین کا دور ہے، آج بد قسمتی سے روئے زمین پر کہیں بھی قرآنی حکومت قائم نہیں ہے۔ (قاسمی)

کہتے ہیں جب تک کوئی ایسی بات نہ ہو جس سے خدا تعالیٰ صانع، قادر المختار کی نفی ہو۔ یا غیر اللہ کی عبادت کرے، یا معاذ اور قیامت کا انکار کرے یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کرے یا دوسری ضروریات دین کا انکار کرے (ضروریات دین میں کسی ایک چیز کا انکار یا ان کی غلط تاویل کرنے سے کافر ہو گیا)۔ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر واجب ہے بشرطیکہ کسی فتنہ میں مبتلا ہونے کا خطرہ نہ ہو اور قبول کرنے کا گمان ہو۔

یہ میرا عقیدہ ہے اسی کے ساتھ میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری کرتا ہوں، ظاہراً و باطناً اور اوّل، آخر، ظاہر، باطن میں سب ستائش اللہ تعالیٰ کیلئے ہے۔ اے اللہ میرا حشر بھی ان لوگوں کے گروہ میں فرما جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایمان لانے والوں کا اتباع کرتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی رحمت نازل ہو اس کی مخلوق میں سب سے بہتر ہستی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اور آپ کی آل اور تمام صحابہ اور ان کے اتباع پر اور اللہ تعالیٰ سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔

شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کی اہم مطبوعات

مجموعہ رسائل امام شاہ ولی اللہ (جلد اول)	مولانا مفتی عطاء الرحمن قاسمی	325.00
مجموعہ رسائل امام شاہ ولی اللہ (جلد دوم)	//	300.00
مجموعہ رسائل امام شاہ ولی اللہ (جلد سوم)	//	300.00
مجموعہ رسائل امام شاہ ولی اللہ (جلد چہارم)	//	300.00
دلی کی تاریخی مساجد (حصہ اول)	//	200.00
دلی کی تاریخی مساجد (حصہ دوم)	//	100.00
پنجاب وہریانہ کی تاریخی مساجد	//	200.00
امام شاہ ولی اللہ اور ان کے افکار ونظریات	//	250.00
الواح الصنادید (حصہ اول)	//	150.00
الواح الصنادید (حصہ دوم)	//	100.00
مولانا عبدالماجد دریابادی، خدمات وآثار	//	200.00
ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کا حصہ	//	200.00
ہندو مندر اور اورنگ زیب کے فرامین (اردو)	//	20.00
ہندو مندر اور اورنگ زیب کے فرامین (ہندی)	//	20.00
نقوش خاطر (قلمی چہرے)	//	100.00
۱۸۵۷ء اور ہریانہ (ہریانہ کے مجاہدین آزادی کا تذکرہ)	//	250.00
المساجد التاریخیہ بدھلی	//	500.00
معمار قوم ڈاکٹر اخلاق الرحمن قدوائی	//	300.00
مرد مومن ڈاکٹر اخلاق الرحمن قدوائی	//	300.00
شاہ ولی اللہ خصوصی نمبر (ماہنامہ براہین)	//	195.00
الامام الدہلوی خصوصی شمارہ (ماہنامہ براہین)	//	195.00
وقف ترمیمی بل ۲۰۱۹ء منظر، پس منظر	//	زیر طبع
اعجاز القرآن (اعجاز قرآن اور اس کے مراتع)	ڈاکٹر ابو اسعد محمد خالدی — مرتب مولانا مفتی عطاء الرحمن قاسمی	300.00
الاشباہ والنظائر فی القرآن الکریم (قرآن کے مرادف الفاظ اور امثال ونظائر)	//	350.00
وفیات اعیان الہند (امراء وسلاطین کی تاریخ ہائے وفات اور مختصر حالات)	//	300.00
مضامین خالدی (اسلامیات، قرآنیات اور دینیات پر مشتمل مقالات)	//	300.00
قرآنی تشبیہات واستعارات	//	150.00
نشریات (ریڈیائی تقریروں کا مجموعہ)	مولانا جنید احمد بنارسی	100.00
سفر وسیلۂ ظفر	خورشید انور عارفی	100.00

SHAH WALIULLAH INSTITUTE

Masjid Kaka Nagar, Dr. Zakir Husain Marg, New Delhi-110003

Ph.: 011-26953430 Mob.: 9811740661

Email: shahwaliullah_institute@yahoo.in, urduqd@gmail.com

Website: www.shahwaliullah.in

مجموعہ

رسائل امام شاہ ولی اللہؒ

التفہیمات الٰہیہ، البدور البازغہ دراصل حضرت شاہ صاحبؒ کے واردات قلبی، مکاشفاتِ روحانی، اسلامی احکام، معاشرتی مسائل، مصطلحات علوم اسلامی کا شاہکار نمونہ اور علوم الٰہیات کا نادر خزینہ ہیں۔

(جلد ہفتم)

(حصہ اول)

تحقیق و تعلیق

مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی

شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی

مجموعہ

رسائل امام شاہ ولی اللہؒ

التفہیمات الٰہیہ، البدور البازغہ دراصل حضرت شاہ صاحبؒ کے واردات قلبی، مکاشفاتِ روحانی، اسلامی احکام، معاشرتی مسائل، مصطلحات علوم اسلامی کا شاہکار نمونہ اور علوم الٰہیات کا نادر خزینہ ہیں

(جلد ہفتم)

(حصہ اوّل)

تحقیق و تعلیق:

مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی

شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی

نام کتاب : مجموعۂ رسائل امام شاہ ولی اللہ جلد ہفتم
مرتبہ : مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی
قیمت : 300
سن اشاعت : دسمبر ۲۰۱۵ء
تعداد : 500
کمپوزنگ : ریاض احمد
آئی ایس بی این : 978-93-84153-04-5
ناشر : شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ، مسجد کاکا نگر،
نزد (این، ڈی، ایم، سی پرائمری اسکول) کاکا نگر نئی دہلی۔۱۱۰۰۰۳

بہ تعاون قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

Title : Majmua Rasail-e-Imam Shah Waliullah-VII
Editing : Maulana Mufti Ataur Rahman Qasmi
First Edition : December 2015
Price : Rs.300/-
ISBN : 978-93-84153-04-5
Composing : Riyaz Ahmed

Published by

Shah Waliullah Institute
Masjid Kaka Nagar, Near (N. D. M. C. Primary School) Kaka Nagar, New Delhi-110 003
Ph. : 011-26953430, Mob.9811740661
website : www.shahwaliullah.com
Email : shahwaliullah_institute@yahoo.in

فہرستِ کتب

نمبر شمار			صفحہ نمبر
۱- مقدمہ	:	مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی	۵-۲۰
۲- التفہیمات الالٰھیہ حصہ اول	:	امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ	۲۱-۵۱۲
ترجمہ	:	مولانا عقیدت اللہ قاسمی	
نظر ثانی	:	ڈاکٹر خلیل الرحمٰن راز	
۳- البدور البازغہ	:	امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ	
ترجمہ	:	ڈاکٹر قاضی مجیب الرحمٰن	
نظر ثانی	:	جسٹس مولانا عبدالقدوس قاسمی	

مقدمہ

شیخ الاسلام حضرت الامام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی المتوفی ۱۱۷۶ھ اٹھارویں صدی عیسوی کی نابغۂ روزگار شخصیت ہیں۔ آپ فی الحقیقت حجۃ اللہ فی الارض اور آیۃ من آیات اللہ ہیں۔ برصغیر میں تحریک رجوع الی القرآن والحدیث، اصلاح و دعوت اور اسلامی علوم وفنون کے احیا وتجدید کی تاریخ پر آپ نے بڑے گہرے اور دوررس اثرات چھوڑے ہیں۔ آپ نے امت کی اصلاح وتربیت کے لیے جو الہامی نقشہ اور لائحۂ عمل مرتب ومدون کیا تھا اور اپنی مساعی جمیلہ سے اس میں رنگ بھرے، اس کے نقوش وخطوط اور اثرات صدیاں گزرنے کے باوجود آج بھی زندہ وتابندہ ہیں اور آئندہ بھی مشعل راہ رہیں گے۔ آپ نے مختلف علمی میدانوں میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ چنانچہ آپ کے علمی وتجدیدی کارناموں کا دائرہ بہت وسیع الاطراف ہے۔ امام غزالیؒ اور علامہ ابن تیمیہؒ کے بعد امت میں کوئی ایسی شخصیت نظر نہیں آتی جو حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی جیسی جامعیت، ہمہ گیری اور ہمہ جہتی کی حامل رہی ہو۔

حضرت شاہ صاحب ایک کثیر التصانیف مصنف اور عظیم مفکر ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ نے جہاں حجۃ اللہ البالغہ تصنیف کی جو برصغیر ہی میں نہیں بلکہ پورے عالم اسلام میں بڑی عزت و وقعت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے اور بطور حوالہ پیش کی جاتی ہے۔ وہیں التفہیمات الالٰہیۃ جیسی معرکۃ الآرا کتاب لکھی جو تصوف کے اسرار ورموز اور احکام شریعت کے مسائل ومقاصد پر محیط ہے۔

التفہیمات الالٰہیۃ، حضرت امام شاہ ولی اللہؒ کی معرکۃ الآرا کتابوں میں ایک منفرد وا چھوتی کتاب ہے، جس میں شاہ صاحب چند سطریں عربی میں تو چند سطریں فارسی میں اور چند صفحات عربی میں تو چند صفحات فارسی میں لکھ دیتے ہیں اور اسی رنگ وآہنگ میں پوری کتاب تصنیف ہوئی ہے۔ جس کا کوئی خاص موضوع نہیں ہے بلکہ متنوع موضوعات پر محیط ہے۔ دراصل یہ نادر کتاب حضرت شاہ صاحب کے قلبی واردات اور روحانی مشاہدات کا شاہکار نمونہ ہے۔ جس میں قرآنی آیات واحادیث کی تشریح، محدثین وفقہائے امت کے آثار واقوال کی توضیح،

مکاشفات ورویا کی تعبیر اور مصطلحات تصوف کی تفہیم و تلمیح پیش کی گئی ہے۔

گاہ بگاہ اسلامی احکام وعقائد پر عائد اعتراضات واشکالات کا مدلل ومفصل جواب بھی دیا گیا ہے اور فرق باطلہ کی تردید بھی کی گئی ہے۔

التفہیمات الالٰہیۃ کی دونوں جلدوں میں کل ۳۳۰ تفہیمات ہیں۔ ان میں سے ہر تفہیم میں قرآن وحدیث، فقہ وکلام اور تصوف واحسان کے کسی نہ کسی مغلق وادق مسئلہ کی توضیح وتشریح کی گئی ہے اور حضرت امام شاہ ولی اللہ کا قلم گوہر بار اور معارف آگاہ، حکمت ومعرفت کے موتی بکھیرتا ہوا نظر آتا ہے۔ بالفاظ دیگر یہ تفہیمات، فلسفۂ الٰہیات اور مصطلحات تصوف کی عقدہ کشائی میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔

التفہیمات الالٰہیۃ کی دونوں جلدیں پہلی مرتبہ ۱۳۵۵ھ مطابق ۱۹۳۶ء میں علامہ حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری سابق شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند اور شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی اور مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کی نگرانی میں المجلس العلمی ڈابھیل، سورت، گجرات سے شائع ہوئی تھیں۔ جب یہ اساتذۂ کرام تلامذہ شیخ اور مشائخ حدیث دارالعلوم دیوبند میں بعض امور پر اختلاف پیدا ہو جانے کی وجہ سے ڈابھیل چلے گئے تھے اور اس وقت جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل نے دارالعلوم ثانی کا درجہ حاصل کر لیا تھا۔ آج بھی اس جامعہ کا شمار گجرات کے اہم مدارس میں ہوتا ہے جس کے موجودہ مہتمم مولانا احمد بزرگ صاحب ہیں جن کے دادا حضرت مولانا احمد بزرگ صاحبؒ تھے جو حضرت شیخ الہندؒ اور مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے شاگرد تھے ان ہی کی دعوت پر شاہ صاحب ڈابھیل گئے تھے۔ مولانا موسیٰ افریقی صاحب بھی اس کے محرک تھے جو شاہ صاحب کے خادمِ خاص تھے۔ حضرت مولانا احمد بزرگ صاحب موجودہ مہتمم جن سے میری ملاقات مولانا معزالدین قاسمی صاحب کے دسترخوان پر ہوئی تھی، ان کے ہمراہ مولانا مفتی ابوبکر پٹنی صاحب بھی تھے۔ علامہ انور شاہ کشمیری اور ان کے رفقائے کار نے التفہیمات الالٰہیۃ کے دستیاب مختلف مخطوطات (قلمی نسخوں) کے موازنے و تقابل کے بعد صحیح ترین نسخہ تیار کیا تھا اور صحت متن کے ساتھ دو جلدوں میں شائع کیا تھا۔

اس المجلس العلمی ڈابھیل سے سب سے پہلے الخیر الکثیر شائع ہوئی تھی، جب کہ مقدمہ میں فاضل ناشر کی طرف سے البدور البازغہ اور تفہیمات الٰہیہ کو شائع کرنے کا عزم وارادہ ظاہر کیا گیا تھا۔

چنانچہ مولانا سید محمد احمد رضا بجنوری سکریٹری المجلس العلمی ڈابھیل لکھتے ہیں:

قد كنا وعدنا فی اواخر مقدمة "الخير الكثير" ان نطبع المولفات الاخر المهمة لشيخ الاسلام الشاه ولی الله المحدث دهلوی قدس سره وقدذكر نا بخصوص فی هذاالذيل اسماء الكتابين الجليلين له "البدور البازغه" و"التفهيمات الالهية" وهما من اعظم تاليفاته النادرة واجلها قدراً واكمل تصنيفاته الباهرة واتمهانفعاً.

"ہم نے "الخیر الکثیر" کے مقدمہ میں وعدہ کیا تھا کہ ہم شیخ الاسلام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی قدس سرہ کی دوسری مہتم بالشان تالیفات بھی شائع کریں گے۔ اس سلسلہ میں ہم نے شاہ صاحب کی دو اہم ترین کتابوں البدور البازغة اور التفهيمات الالهية کا ذکر کیا تھا، کہ یہ دونوں کتابیں آپ کی عظیم و نادر ترین کتابیں ہیں۔ قدر و منزلت کے لحاظ سے بہت بلند مرتبہ اور کامل ترین نیز نفع کے اعتبار سے مکمل ترین ہیں۔"

اس کے بعد مولانا محمد احمد رضا بجنوری التفهيمات الالهية کے دستیاب مخطوطات (قلمی نسخوں) کے موازنے و تقابل کے بعد صحیح ترین و مستند ترین نسخہ مرتب و مدون کرنے سے متعلق کلمۃ الناشر میں لکھتے ہیں:

توجهنا الى" التفهيمات الالهية" وقاسينا فی جمع عدة نسخ منها ، والنسخ التی اعتمدنا عليها فی هذه المطبوعه، النسخة الخطية فی مكتبة مظاهر العلوم "السهارنفورية، ترتيب نسختنا فی الاكثر على ترتيبها بحسب التقديم والتاخير فی التفهيمات. ثم النسخة الخطية لصديقنا المحترم مولانا نورالحق الاستاذ فی كلية الالسنة المشرقية ببلدة لاهور (الهند)وهی نسخة حسنة الخط

"پھر ہم نے التفهيمات الالهية پر کام شروع کیا اور اس کے نسخے جمع کرنے لگے۔ اس سلسلہ میں ہم نے سب سے زیادہ اس قلمی نسخہ پر اعتماد کیا ہے جو مظاہر العلوم سہارنپور کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ یہ نسخہ ہمارے نزدیک نسق و ترتیب کے لحاظ سے سب سے بہتر ہے۔ اس لئے ہم نے اپنے نسخہ کی ترتیب یعنی تفہیمات کی تقدیم و تاخیر میں اسی کی ترتیب کو بنیاد بنایا ہے۔ اس کے بعد ہم نے صدیق محترم مولانا نورالحق استاذ کلية السنة المشرقية لاہور کے قلمی نسخہ کو بھی پیش نظر رکھا۔

جيدة الضبط، استفدنا منها كثيراً في تصحيح نسختنا ولكنها ناقصة، ليس فيها شطر من الكتاب ثم النسخة الخطية في مكتبة "الجامعه الانكليزية الاسلاميه" ببلدة على گره (الهند) وهي نسخة كاملة جيدة النسخ والضبط ايضًا والنسخة الخطية الاخرىٰ ايضاً في تلك المكتبة ، وهذه النسخة وان كانت ناقصة، لها اهمية خاصة من حيث انها اقدم النسخ التي وجدنا هاالان واصحها عندنا، وان عليها تحريراً (في صورة حاشية مختصرة) بيد الشيخ محمد عمر بن حضرة الشيخ مولانا محمد اسمعيل الشهيد الدهلوى قد سره وقدقابلنا نسختنا بهاتين النسختين كليهما ايضا من الاول الى الاخر"(صفحه ٢ كلمة الناشر)

یہ نسخہ خوشخط ہے۔ ہم نے اپنے نسخہ کی تصحیح میں اس سے بہت زیادہ استفادہ کیا ہے لیکن یہ نسخہ ناقص ہے کہ اس میں کتاب کا ایک حصہ موجود ہی نہیں ہے۔ پھر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی لائبریری والے قلمی نسخہ کو سامنے رکھا، یہ نسخہ نسخ و ضبط میں سب سے بہتر اور کامل ہے۔ ہمارے سامنے لائبریری کا دوسرا قلمی نسخہ بھی رہا ہے جو اگرچہ ناقص ہے پھر بھی اس کی اس حیثیت سے بڑی اہمیت ہے کہ اب تک ہمیں جو نسخے دستیاب ہوئے ہیں، ہمارے نزدیک ان میں یہ سب سے قدیم اور سب سے زیادہ صحیح نسخہ ہے۔ اس کے حاشیہ پر شیخ محمد عمر بن حضرت الشیخ محمد عمر بن حضرت الشیخ مولانا محمد اسمٰعیل شہید دہلوی قدس سرہ کے ہاتھ کی تحریر ہے۔ ہم نے ان دونوں نسخوں کو شروع سے آخر تک اپنے لئے بنیاد بنایا ہے۔"

ان مخطوطات کے علاوہ التفہیمات الالٰہیۃ کا ایک قلمی نسخہ رضا لائبریری رامپور میں بھی موجود ہے جس کے بارے میں ڈاکٹر ابوسعد اصلاحی لائبریرین رضا لائبریری رام پور لکھتے ہیں:

"مخطوطہ نمبر ۳۱۶۸ التفہیمات الالٰہیہ ، فن سلوک

ورق ۱۵۷، سطر ۲۶، سائز ۲۰+۳۲، خط نستعلیق، زمانہ بارھویں صدی ہجری

مصنف کے عہد کی نہایت اہم کاپی ہے، یہ کتاب شاہ صاحب کے واردات قلبی و وجدانی مضامین پر مشتمل ہے۔"

امام شاہ ولی اللہ اور ان کے افکار و نظریات
ص ۱۹۶ مطبوعہ شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ مرتبہ مولانا عطاء الرحمٰن قاسمی۔

اس کے علاوہ اس کے قلمی نسخے کہاں کہاں ہیں۔ اس کی تحقیق کی ضرورت ہے۔ اس کا ایک نسخہ غالبًا ماسکو میں بھی موجود ہے۔ میرے لیے سردست التفهيمات الالٰهية کے دستیاب مخطوطات کا موازنہ وتقابل کرنا مشکل ہے۔ البتہ جب میں اس مجموعۂ رسائل امام شاہ ولی اللہ کی تحقیق وتدوین اور اشاعت سے فارغ ہو جاؤں گا تو پھر حضرت شاہ ولی اللہ کی عربی وفارسی کتابوں کو ان کے مخطوطات عربی وفارسی سے موازنہ وتقابل کے بعد صحیح ترین نسخے تیار کر کے شائع کروں گا۔ انشاء اللہ کیونکہ حضرت شاہ صاحب کی مطبوعہ کتابوں کو کمالِ صحت اور تحقیق متون کے ساتھ از سرنو شائع کرنا شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کے علمی منصوبوں میں شامل ہے۔

التفهيمات الالٰهية مطبوعہ المجلس العلمی ڈابھیل کا نسخہ میرے پیش نظر ہے، جو دو جلدوں میں ہے اور اسی مطبوعہ نسخہ ڈابھیل کا اردو ترجمہ کیا گیا ہے، جس کے شروع میں خطبۂ افتتاحیہ ہے، جس میں حضرت شاہ ولی اللہ نے خصوصیت کے ساتھ شیخ نور اللہ پھلتی ثم بڑھانوی کا ذکر کیا ہے۔ جنہوں نے حضرت شاہ صاحب سے علوم تصوف کے اکتساب کے لیے پرصعوبت سفر کیا تھا اور حضرت شاہ صاحب سے استفادہ کیا تھا: جو آپ کے اجل تلامذہ میں تھے، جن کے نام حضرت شاہ صاحب کے ۲۹ مکتوبات ہیں۔ ان میں زیادہ تر مکتوبات مسائل تصوف پر ہیں۔

التفهيمات کے خطبۂ افتتاحیہ کے مطالعہ سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت شاہ صاحب نے شیخ نور اللہ بڑھانوی کا انتخاب، اشارہ غیبی کی بنیاد پر کیا تھا اور اس میں ان کے والد کا روحانی تصرف بھی شامل رہا ہے۔ حضرت شاہ صاحب نے التفهيمات الالٰهية میں شیخ نور اللہ پھلتی کا ذکر بڑے واضح الفاظ میں کیا ہے۔

اور ''اخینا الفاضل اللبیب الکامل الحبیب الشیخ نور اللہ بن معین الدین البھلتی'' لکھا ہے، اس کے بعد ایک مکاشفہ کا بھی ذکر کیا ہے'' چنانچہ لکھتے ہیں۔

ثم بعد ذالک انا جالس عند قبر سیدی الوالد صاحب الکرامات الجزیلة والمقامات الجلیلة المنوه به فی اعلی السطور ضاعف الله له الاجور اذ لوحت روحه الکریمة تلویحاً روحانیا تأمرنی ان القن صاحبی المذکور ملاحظة التهلیل

''اس کے بعد جب ایک روز میں اپنے والد صاحب کی قبر کے پاس بیٹھا ہوا تھا، جو بڑے صاحب کرامات اور قدر ومنزلت کے حامل تھے۔ (اللہ تعالیٰ ان کے مرتبے و درجات مزید بلند فرمائے) ان کی روح نے اشارہ کیا کہ میں اخی مذکور کو نقشبندی بزرگوں کے نزدیک معتبر ومستند

على النمط المعتبر عند السادة النقشبندية سقاهم ربهم من السلسبيل ففاتحته بها من غير ان يسبق منه الطلب والسوال حيث كنت على بصيرة من تلويحات اكابر الرجال فكان ذلک ببرکة نفسه.

قرار دی جانے والی تسبیحات و وظائف کی تلقین کروں۔ چنانچہ میں نے اس کی طلب کے بغیر اس کو ان امور کی تلقین کا سلسلہ شروع کر دیا جو مجھے میرے بزرگوں کی ہدایات و رہنمائی کے طور پر معلوم ہیں۔ اور یہ میرے والد قدس اللہ سرہ کی برکت کا نتیجہ تھا کہ اس میدان میں اس کو سہولتیں ملتی چلی گئیں۔"

حضرت شاہ صاحب جہاں متبحر عالم دین اور بلند پایہ صوفی کامل ہیں۔ وہاں عربی و فارسی کے صاحب اسلوب ادیب و شاعر بھی ہیں۔ آپ ان دونوں زبانوں پر یکساں طور پر عبور و کمال رکھتے ہیں۔ آپ نے شیخ نور اللہ پھلتی کے بارے میں دو شعر بھی کہے ہیں:

لقد بلوتک فی سلم و فی عتب
فما وجدتک الا خالص الذهب

میں نے تمہیں عیش و آرام اور سختی و پریشانی ہر میدان میں آزمایا اور پرکھا تو میں نے تمہیں خالص سونے جیسا ہی پایا:

ولم تسم بنوراللہ الا لانه
عما قلیل تکون النورفارتقب

اور تمہارا نام صرف اس لیے نور اللہ نہیں رکھا گیا کہ نور تھوڑا رہے بلکہ اس کو بڑھاتے رہو۔

حضرت شاہ صاحب نے التفهيمات الالهية کے خطبۂ افتتاحیہ میں جس طرح شیخ نور اللہ پھلتی کا ذکر کیا ہے، اس سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ کتاب دراصل حضرت شیخ نور اللہ پھلتی کی روحانی تعلیم و تربیت کے لیے لکھی گئی ہے۔ اور اس کا سبب تصنیف شیخ نور اللہ کی ذات ستودہ صفات ہی ہے۔ جس کے لیے غیبی اشارات کئے گئے ہیں۔ جو آپ کے اوپر حضرت والد صاحب کی قبر پر معتکف ہونے کے دوران منکشف ہوئے تھے۔

حضرت شاہ صاحب نے تفہیم اول میں تین عظیم امور کی تفصیل بیان کی ہے، جن کی طرف رسولوں اور نبیوں نے دعوت دی ہے اور یہی کار نبوت اور بار نبوت ہیں جو انبیا و رسل کے خاتم اور آخری رسول حضرت ذی وقار صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی اصلاح کے لیے علما مصلحین

کے سپرد ہوئے ہیں۔ اور اب یہی رجال کار اور اصحاب دعوت، مسئول و ذمہ دار ہیں۔

حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں:

اما بعد فيقول خادم العلماء والصوفيه والمتمسک باذيالهم العلمية ولی الله بن عبدالرحيم عاملهما الله بفضله العظيم ان من اجل نعم الله تعالیٰ التی لا يستطيع العباد شكرها ان بعث الانبياء مترجمين عن الغيب ليهلک من هلک عن بينة ويحيی من حی عن بينة ثم جعل لهم ورثة يقومون بعلمهم بين الناس و يحيون سننهم و يدعون الی رشدهم هادين الی طرق التقرب الی الله تعالیٰ ومعظم مادعت الی اقامة الرسل امور ثلاثة تصحيح العقائد فی المبدا والمعاد والمجازاة وغيرها وقد تكفل بهٰذا الفن اهل الاصول من علماء الامة شكر الله تعالیٰ مساعيهم و (۲) تصحيح العمل فی الطاعات المقربة والا رتفاقات الضرورية علی وفق السنة وتكفل بهذا الفن فقها الامة فهدی الله بهم كثير ين واقام بهم فرقة عوجا و (۳) تصحيح الاخلاص والاحسان اللذين هما اصلاً للدين الحنيفی الذی ارتضاه الله لعباده (صفحه ۱۱ التفهيمات)

علما وصوفیا کا خادم اور ان کی اعلیٰ روایات کا حامل ولی اللہ بن عبد الرحیم عاملهما الله بفضله العظيم . کہتا ہے، اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں میں سے جن کا بندے شکر ادا نہیں کرسکتے، یہ بھی ہے کہ اس نے ان انبیا کو مبعوث فرمایا جو غیب کی ترجمانی کی رہنمائی کرنے والے ہیں، تاکہ واضح دلائل کے سامنے آ جانے کے کرنے والے اور اللہ تعالیٰ کی طرف تقرب کی راہوں بعد جس کو ہلاک ہونا ہے، اس کو ہلاک کردے اور جس کو حیات نو حاصل کرنی ہو، اس کو حیات نو عطا کردے۔ پھر ان کے ایسے وارث بنائے جو لوگوں کے درمیان ان کے علوم و روایات کے علم بلند کرتے ہیں، اور ان کی سنتوں کو زندہ کرتے ہیں، اور ان کو رشد و ہدایت کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ اور رسولوں کی تعلیمات و روایات کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ ان میں تین امور عظیم ہیں (۱) مبدا و معاد اور مجازاۃ وغیرہ کے سلسلہ میں عقائد کی تصحیح۔ اس فن کی ذمہ داری علماء میں سے اہل اصول نے سنبھالی۔ اللہ تعالیٰ ان کی کوششوں و مساعی کو کامیاب فرمائے (۲) سنت کے مطابق مقبول طاعات اور ضروری فوائد والے عمل کی تصحیح، اس فن کی ذمہ داری فقہائے امت نے سنبھالی۔ چنانچہ

اللہ نے ان کے ذریعہ بیشمار لوگوں کو ہدایت عطا فرمائی۔ اور ان کے ذریعہ راہ راست پر چلنے والے فرقہ کو قائم فرمایا۔ (۳) اور اخلاص و احسان کی تصحیح جو کہ اس دین حنیف کے اصول و بنیاد ہیں جس کو اللہ نے اپنے بندوں کے لئے پسند فرمایا ہے۔

التفهيمات الالهية کے مندرجات میں خلافت ظاہرہ وباطنہ ، عارف کا حال، کامل کے اوصاف، لاہوت و جبروت کی حقیقت ، وجدان، انواع مکاسب، احکام ظاہرہ میں انبیاء ورسولوں کے درمیان فرق، ذات باری میں غور وفکر اور عجیب خطاب، حضور پر درود بھیجنے کے فائدہ کے انکار کا جواب، شیخ عبدالقادر جیلانی کے قول "حنفیہ مرجیہ ہیں" کے معنی، خوابوں کی تعبیر، باری تعالیٰ کا فیض، ایمان اور اس کی صفات کا بیان، شرح صدر کی حقیقت، رحمٰن کی تجلی، ابداع کی حقیقت ، اوقات کی تاثیر، ذات الٰہی کا عکس، پردوں کا اصول، علم طلسمات، مقدس دائرہ، علم اور معلوم کا اتحاد، توجیہ حنفی ، نبوت اور فطرت، اقطاب مرشدین کا ذکر، فرد اور قطب، معارف جلیلہ کا ذکر وثبوت اور وجود کے درمیان فرق، ازل کا معنی، پوشیدہ معارف، مخلوقات میں کواکب کی تاثیر، حلول سرمدی، توکل کا مقام، عقائد حق، کلی اور جزئی، ملاء اعلیٰ کی حقیقت ، حظیرۃ القدس، تجلی کی اصناف ، ختم نبوت ، اس کا راز، حکمت وعصمت اور سیادت کا راز، فنا النفس، حدوث عالم، محدث اور مقرب، صحابہ کی قسمیں اور علم تکوین کے اہم مباحث ومسائل زیر بحث آئے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی بہت ہی اہم مباحث شامل ہیں۔ جن کا ذکر یہاں طوالت کے خوف سے چھوڑ دیا گیا ہے۔

حضرت شاہ صاحب نے التفهيمات الالهية میں قرآن وحدیث کی آیات، صحابہ، صحابیات کے اقوال وآثار، فقہائے امت اور صوفیا ومشائخ طریقت کے فرمودات وآراء سے استشہاد واستدلال کئے ہیں، جن لوگوں کے کتاب مین حوالے منقول ہیں، ان میں حضرت جنید بغدادی، حضرت سفیان ثوری، حضرت عبدالقادر جیلانی، حضرت شیخ ابن عربی، شیخ امیر سید کلال ، امام معروف کرخی، شیخ شہاب الدین نقشبندی، شیخ بہاء الدین زکریا، شیخ عفیف الدین تلمسانی ، شیخ امام غزالی ، شیخ صدر العالم ،عبدالوہاب شعرانی، جاراللہ زمخشری ، جنائی

معتز ولی، جلال الدین سیوطی، ابو ہاشم، شیخ قطب الدین بختیار کا کی، شیخ رفیع الدین، خواجہ باقی باللہ، حضرت مجدد الف ثانی، شیخ نور اللہ بڑھانوی ثم پھلتی اور شیخ محمد عاشق پھلتی وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

حضرت شاہ صاحب نے ان مباحث کو بڑے وجدانی، والہامی اسلوب میں لکھا ہے، اوران کا فلسفیانہ ومنطقیانہ تجزیہ پیش کیا ہے۔اوران مسائل کا اتنی گہرائی سے جائزہ لیا ہے کہ ان کی گہرائی تک عام قارئین کے لئے پہنچنا محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

میں نے حضرت شاہ صاحب کی زیر تذکرہ کتاب کے علاوہ دوسری کتابوں کو بار بار پڑھا ہے۔تاہم میں یہ دعوی نہیں کرسکتا کہ میں نے ان کی کتابوں کو کما حقہ سمجھ لیا ہےاوران کے بیان کردہ مطلب ومقصد کو پورے طور پر اخذ کرلیا ہے۔حالانکہ حضرت شاہ صاحب کا اسلوب بیان عام فہم اور بامحاورہ ہوتا ہے۔البتہ بعض فلسفیانہ اور منطقیانہ مباحث میں اپنی وضع کردہ اصطلاحات ضرور استعمال کرتے ہیں کہ جن کو سمجھنے کے لیے ان کی دوسری کتابوں کا مطالعہ ضروری ہوتا ہے۔ورنہ ان کی وضع کردہ اصطلاحات کو سمجھنا خاصا مشکل ہے۔چونکہ حضرت شاہ کا معمول ہے کہ وہ اپنی کسی نہ کسی کتاب میں اپنی وضع کردہ اصطلاحات کی تشریح وتوضیح ضرور کرتے ہیں اور دوسری جگہ ان اصطلاحات کواستعمال کرتے ہیں جن کو سمجھنے کے لیے صرف ان کا ترجمہ کافی نہ ہوگا اور جن مترجمین نے ان کی تشریح وتوضیح کو نظر انداز کرتے ہوئے ترجمہ کرنے کی جسارت کی ہے، انہوں نے دھوکہ کھایا ہے۔

تفہیمات کے آخر میں وصیت نامہ اور مختلف طبقات کے نام خطابات ہیں جو بڑے ہی موثر اور عبرت انگیز ہیں؟ حضرت شاہ صاحب صاحب نسبت بزرگ اور تصوف کے قائل تھے، لیکن آپ نے متصوفین اوراپنے عہد کے نام نہاد مشائخ سے دور رہنے کا مشورہ بھی دیا ہے اور ان سے بیعت نہ کرنے کی وصیت کی ہے۔

آنست کہ دست دردست مشائخ این زمان ہرگز نباید داد و بیعت باایشاں نباید کرد و بغلو عام مغرور نباید بود و نہ بکراماتزیرا کہ اکثر غلو عام بسبب رسم است و امور رسمیہ رابحقیقت اعتباری نیست وکرامات فروشان ایں زمانہ

”یہ ہے کہ اس زمانہ کے مشائخ کے ہاتھوں میں ہاتھ ہرگز نہ دیا جائے، اور ان کی بیعت نہیں کرنی چاہیے اور نہ غلو عام سے اور نہ ہی کرامات سے دھوکا کھائیں، اس لیے کہ اکثر غلو عام رسم کی وجہ سے ہے۔اورامور رسمیہ کا

همہ الا ماشاء اللہ طلسمات و نیرنجات را کرامات دانستہ اند۔
(صفحہ۲۴۰ التفہیمات)

حقیقت میں کوئی اعتبار نہیں ہے۔ اور اس زمانہ کے تمام کرامات فروش الا ماشاء اللہ طلسمات و فریب کو کرامات سمجھتے ہیں۔“

حضرت شاہ صاحب کی دوسری کتابوں میں بھی متصوفین و نام نہاد مشائخ کی مخالفت اور تصوف میں در آئی بے اعتدالیوں اور غیر اسلامی طریقوں پر تنقید ملتی ہے۔ جس کے ثبوت میں بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے، لیکن یہاں اس کی گنجائش نہیں ہے، البتہ حضرت شاہ صاحب کی ہمہ جہت شخصیت کے متعلق ایک بات واضح طور پر محسوس کرتا ہوں کہ حضرت شاہ صاحب اپنے افکار و نظریات میں بالکل منفرد ہیں، اور انہیں کسی مخصوص حلقہ اور مخصوص موضوع و میدان میں محصور و مقید کرنا نہ صرف غیر مناسب بات ہے بلکہ شاہ عدم شناسی بھی ہے۔

میں حضرت شاہ صاحب کی کتابوں کو پڑھنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ حضرت شاہ صاحب ایک مخصوص سوچ و فکر کے آدمی ہیں، ان کو اسی رنگ و آہنگ اور ذوق و مذاق میں دیکھنے پرکھنے کی کوشش کرنی چاہیے، اور ان کی شخصیت کو کسی مخصوص مسلکی گروہ میں رکھنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ اور عجلت و جلدی بازی میں ان کی کسی کتاب یا کسی عبارت کے بارے میں یہ بدگمانی بھی نہیں کرنی چاہیے کہ یہ کتاب یا عبارت الحاقی ہے۔

میں **التفہیمات الالہیۃ** مطبوعہ المجلس العلمی ڈابھیل کے حال ہی میں کئے گئے اردو ترجمہ کے مطالعہ اور ترتیب و تقدیم میں مصروف تھا کہ ایک صاحب کی ایک تحریر نظر سے گزری کہ **التفہیمات الالہیۃ** مطبوعہ المجلس العلمی ڈابھیل میں ایک عبارت کے ذیل میں ایک لفظ الحاقی ہے اور کسی مخطوطہ کا حوالہ بھی دیا گیا ہے۔ مخطوطات کی ایڈیٹنگ میں اس طرح کے امکانات ہوئے ہیں۔ اور ہو سکتے ہیں، مجھے اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

میں **التفہیمات الالہیۃ** کے اردو ترجمہ (جو برصغیر ہندو پاک میں پہلی مرتبہ ہوا ہے) کی پروف ریڈنگ اور تنقیح میں اتنا مصروف تھا کہ مطبوعہ **التفہیمات الالہیۃ** ڈابھیل کا موازنہ و تقابل مخطوطات **التفہیمات الالہیۃ** سے نہ کر سکا۔ اس لیے سر دست میرے لیے کسی تحریر کی تردید یا تائید مناسب نہیں ہے۔ البتہ **التفہیمات الالہیۃ** مطبوعہ المجلس العلمی ڈابھیل حضرت علامہ انور شاہ کشمیری، شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا سید محمد احمد رضا صاحب کے اہتمام و نگرانی میں دستیاب مختلف مخطوطات کو سامنے رکھ کر **التفہیمات الالہیۃ** کا

یہ مستند نسخہ تیار کیا گیا تھا، جن کی دیانتداری وامانت اور تقویٰ وطہارت پر پورا پورا اعتماد وبھروسہ ہے۔ ان کی طرف سے کسی قسم کی علمی خیانت کا شبہ بھی نہیں کیا جاسکتا۔ والعلم عند اللہ۔

شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ نے سر دست شیخ الاسلام حضرت امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے دستیاب تمام رسائل وکتب کو مجموعۂ رسائل شاہ ولی اللہ کے نام سے شائع کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ جس کے تحت اب تک ۶ شائع ہو چکے ہیں۔

ان مجموعہ رسائل کی اشاعت وطباعت کے بعد شیخ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی تمام عربی و فارسی کتابوں کو ان کے دستیاب مخطوطات (قلمی نسخوں) کے موازنے وتقابل کے بعد صحیح ترین اور مستند ترین نسخے تیار کرنے اور شائع کرنے کا جامع منصوبہ ہے۔ جس کے لیے ابھی سے عربی وفارسی کتابوں کے مخطوطات جمع کئے جا رہے ہیں اور ایک حد تک ان پر کام بھی شروع ہو گیا ہے۔ اہل علم سے اس سلسلہ میں علمی تعاون کی درخواست ہے۔ جیسا کہ آپ کے علم میں ہے کہ شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ نے اپنے طویل المیعاد جامع منصوبہ کے تحت امام شاہ ولی اللہ کی تمام عربی وفارسی کتابوں اور رسالوں کے دستیاب اردو تراجم کو تحقیق و تنقیح اور تقدیم وحواشی کے ساتھ شائع کرنے کا جامع منصوبہ بنایا ہے۔ جس کے تحت مجموعہ رسائل امام شاہ ولی اللہ کی ساتویں جلد آپ کے ہاتھوں میں پہنچ چکی ہے اور اس کی آٹھویں جلد بھی جلد پہنچنے والی ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی بیشتر عربی وفارسی کتابوں کے اردو تراجم ہو چکے ہیں۔ البتہ ان کی بعض اہم عربی وفارسی کتابوں کے ابھی اردو تراجم نہیں ہو سکے ہیں، ان میں ایک اہم ومعرکۃ الآرا کتاب التفہیمات الالٰھیۃ بھی ہے یہ کتاب جیسا کہ شروع ہی میں بیان کیا گیا پہلی مرتبہ ۱۳۵۵ء/۱۹۳۶ء میں المجلس العلمی ڈابھیل گجرات سے شائع ہوئی تھی اور مدینہ برقی پریس بجنور یوپی میں چھپی تھی، اس کے بعد پروفیسر غلام مصطفیٰ قاسمی نے سندھ پاکستان سے شائع کی تھی۔ میرے سامنے المجلس العلمی ڈابھیل گجرات کا قدیم ترین مطبوعہ نسخہ ہے۔ پروفیسر غلام مصطفیٰ قاسمی صاحب کا ترتیب دیا ہوا نسخہ مجھے دستیاب نہیں ہوا ہے۔

حیرت ہے کہ عرصہ دراز بیت جانے کے باوجود کسی صاحب علم وفضل نے التفہیمات الالٰھیۃ کا اردو ترجمہ کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ اس کے اسباب کچھ بھی ہو سکتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کا اردو ترجمہ علامہ انور شاہ کشمیری سابق شیخ الحدیث

دارالعلوم دیوبند، شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی اور مولانا سید محمد احمد رضا بجنوری صاحب مقیم ڈابھیل کے دور مسعود میں ہو جاتا تو زیادہ معیاری و مستند ہوتا، لیکن ہر کام کے لیے ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔ جیسا کہ آپ کے علم میں ہے کہ التفہیمات الالٰہیہ اور البدور البازغہ یہ دونوں کتابیں المجلس العلمی ڈابھیل سے شائع ہوئی تھیں، اور حضرت انور شاہ صاحب کشمیری کی نگرانی میں ہوئی تھیں۔ یہاں ایک وضاحت طلب بات یہ ہے کہ التفہیمات اور البدور کے متون ان کے متعدد مخطوطات کو پیش نظر رکھ کر مرتب و مدون کیا گیا ہے اور ان میں کوئی حذف و اضافہ نہیں کیا گیا ہے۔ البتہ ان مضامین و تفہیمات کے ذیلی عنوانات ناشر فاضل اور مرتب علام کی جانب سے لگائے گئے ہیں اور یہ عنوانات اصل مخطوطات تفہیمات، بدور میں موجود نہیں ہیں۔ شروع میں خود میرا ارادہ ہوا تھا کہ ان اضافی عنوانات کو حذف کر دوں اور مصنف کے ہی اصل متون ہی پر اکتفا کروں لیکن میں نے محسوس کیا کہ یہ اضافی عنوانات متون کے مطالب و مفاہیم کی تفہیم اور تعبیر میں بڑے معاون و مددگار ہیں۔ اس کے پیش نظر ان اضافی عنوانوں کو باقی رکھا۔

قارئین سے التماس ہے کہ ابواب و فصول کے ان ذیلی عنوانات کو حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے قائم کردہ عنوانات تصور نہ کریں اور ناشر اوّل کی جانب سے متعین کردہ عنوانات ہی خیال فرمائیں۔

آمدم برسر مطلب! مولانا ڈاکٹر خلیل الرحمٰن راز جو اردو و عربی زبان کے ادیب و شاعر ہیں اور ایک طویل عرصہ تک دوحہ قطر میں رہے ہیں۔ ایک دن غریب خانہ پر تشریف لائے اور مجموعہ رسائل امام شاہ ولی اللہ کی مطبوعہ جلدیں طلب فرمائیں۔ میں نے ان کی خدمت میں یہ تمام جلدیں پیش کر دیں تو بہت خوش ہوئے اور شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کی علمی کاوشوں کو سراہا۔ جو شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کے لئے یقیناً اعزاز و افتخار کی بات ہے۔

اس کے بعد ایک دن مجھے اپنے در دولت پر طلب فرمایا اور میرے سامنے التفہیمات الالٰہیہ کی دونوں جلدوں کا اردو ترجمہ رکھ دیا اور فرمایا کہ انہیں آپ شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ سے شائع کر دیں۔ مولانا ڈاکٹر عقیدت اللہ قاسمی صاحب نے ان کا اردو ترجمہ کیا اور میں نے ان پر نظر ثانی کی ہے۔ میں نے کہا کہ جب مولانا عقیدت اللہ قاسمی صاحب نے اس کا ترجمہ کیا ہے اور آپ نے نظر ثانی کی ہے تو مجھے اس پر اطمینان ہے کہ اردو ترجمہ اچھا ہی ہوگا۔ مولانا

خلیل الرحمٰن زار صاحب نے یہ کہتے ہوئے ترجمہ میرے حوالہ کر دیا کہ پھر بھی دیکھ لیں۔

میں آپ کی ہدایت کے مطابق یہ اردو ترجمہ گھر لے آیا۔ ترجمہ کچھ دنوں تک یوں ہی رکھا رہا۔ میں عدیم الفرصتی کی وجہ سے اس کو دیکھ نہ سکا۔ کچھ دن بعد ترجمہ کو دیکھا تو **التفهيمات الالهية** کا اردو ترجمہ پسند آیا۔ بڑا سلیس وشگفتہ اور بامحاورہ ترجمہ کیا گیا ہے۔ بڑی حد تک اس کی روح تک پہنچنے کی کوشش کی گئی ہے۔

شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کے ذمہ داروں سے برصغیر ہند و پاک کے اصحاب علم ودانش کی جانب سے برابر مطالبہ کیا جاتا رہا ہے کہ اس نادر و نایاب کتاب کا ترجمہ اردو زبان میں ہونا چاہیے تاکہ عوام وخواص اس کتاب کے اسرار ورموز اور مقاصد شریعت سے واقف ہو سکیں۔

مجھے خوشی ہے کہ مولانا ڈاکٹر عقیدت اللہ قاسمی صاحب اور مولانا خلیل الرحمٰن راز صاحب نے غیر معمولی کدوکاوش کے بعد اس کا اردو ترجمہ کیا ہے۔ میں تحدیث بالنعمۃ کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ التفہیمات الالٰہیہ کا یہ اردو ترجمہ بلند پایہ ومعیاری ہے اور یہ اس نئی صدی کا تحفۂ بیش قیمت ہے جو اہل علم ودانش کے ہاتھوں میں پہنچ رہا ہے۔

اس مجموعہ میں شامل دوسری کتاب البدور البازغہ ہے، جو حضرت شاہ صاحب کی اہم کتابوں میں شامل ہے۔ جس کے متعلق خود حضرت شاہ صاحب البدور البازغہ کے خطبۂ افتتاحیہ میں لکھتے ہیں:

> ”امابعد! بندۂ عاجز ولی اللہ بن عبدالرحیم (اللہ تعالیٰ دونوں باپ بیٹے کو اپنے لطف وکرم سے نوازے) عرض کرتا ہے کہ زیرِ تالیف کتاب ان تفہیمات الٰہیہ پر مشتمل ہے جو خدائے مہربان کے فیضانِ عنایت سے پہلے میرے دل پر القا ہوئیں، پھر وہاں سے زبان اور پھر سرانگشت (پوروں) پر (تحریر وقلم کی صورت میں) ظاہر ہوئیں اور عصرِ حاضر (کی استدلالی ذہنیت) کا تقاضا ہوا کہ ان کو برہان ودلیل کے ساتھ پیش کیا جائے۔ میں نے اس کا نام ”البدور البازغہ“ رکھا ہے جو ایک مقدمہ اور تین مقالوں پر مشتمل ہے۔“

حضرت شاہ صاحب نے البدور البازغہ میں اسلام اور اسلامی ملک کے نظریۂ اقتصادیات، معاشیات، سیاسیات، سماجیات اور اخلاقیات سے بحث کی ہے۔ حضرت شاہ صاحب اسلامی معاشرہ اور اجتماعی زندگی کا سرچشمہ انسان کی ذات کو مانتے ہیں اور ان کا ماننا

ہے کہ انسان کے فطری تقاضے اجتماعی زندگی ہی میں پورے ہو سکتے ہیں۔

جماعتیں کس طرح تشکیل میں آتی ہیں، اور اس کے فطری تقاضے کیا ہوتے ہیں، الگ الگ فصل میں تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ حضرت شاہ صاحب ماہر اقتصادیات اور ماہر عمرانیات بھی ہیں۔ اسی وجہ سے اس میں اقتصادی اور عمرانیاتی نقطۂ نظر سے بحث کی ہے۔ جو اقتصادیات اور عمرانیات کے اسکالروں کے لیے نہایت ہی مفید کتاب ہے۔

اس میں خطبۂ افتتاحیہ کے علاوہ تین مقالات ہیں، اور ایک مقدمہ ہے، مقدمہ کے اندر مندرجہ ذیل قابلِ ذکر مباحث ہیں، مبحثِ وجود، جواہر اور اعراض کا امتزاج، انسان کی صورتِ نوعیہ اور اس کے طبعی تقاضے۔

اس کے پہلے مقالہ میں ۲۳ فصول ہیں، ان فصول میں نسمہ کی حقیقت، حکمت کی تعریف، ارتفاقات چارگانہ کے حقائق پر مجمل بحث، ارتفاق اول، ارتفاق ثانی، ارتفاق ثالث، اور ارتفاق رابع کے مباحث بڑے اہم ہیں۔ (شاہ صاحب کے نزدیک ارتفاق تدبیر منزل کے معنی میں ہیں)۔ اور حضرت شاہ صاحب نے ارتفاق کو ایک اقتصادی فلسفہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔

کھانے کے آداب، زینت و زیبائش، آداب لطافت، مکان و مسکن، سفر، نشست و برخاست اور چلنے پھرنے کے آداب، صنفی تعلقات کے آداب، مرض کے آداب، تدبیر منزل، مرد اور عورت کی جسمانی اور ذہنی قوتوں میں اختلاف اور اس کے فائدے، مدارج معیشت میں اختلاف فطری امر ہے، ازدواج کی ضروریات اور آداب ان فصول میں حقوق و آداب برائے آقا و غلام، فنِ معاملات، اصول کسب، اہم ذرائع معاش، اختلاف مکاسب کے وجوہ، مبادلات و تبرعات، عقد مزارعت، عقد مضاربت۔

امام المسلمین کے فرائض، امام کے اخلاق سبعہ، امامت کے آداب، امیر کی سیرت و کردار، تعلیم و تربیت کی قسمیں، معلم کے اوصاف حمیدہ۔

متولی و نقیب کے آداب و فرائض، امام کے معاون، معاونوں کی ضرورت اور بنیادی شرائط، امام کے سات معاون۔

وزیر اعظم، سپہ سالار اعظم، امیر البحر، قاضی القضاۃ، شیخ الاسلام، حکیم و طبیب، ناظر خانہ، معاونین پر کڑی نظر رکھنا، امام کے فرائض میں ہے وغیرہ اہم مباحث ہیں۔

مقالہ ثانی میں معرفت باری تعالیٰ کا بیان، حیوانوں پر انسانوں کی فوقیت کی دو وجہیں، خداشناسی بذریعہ عقل معاشی، اللہ تعالیٰ کے اسماوصفات کا اجمالی اثبات، اسمائے حسنیٰ کی تشریح، ایمان بالقدر کے ثبوت، شرک کی حقیقت، تحریف کی حقیقت۔

تیسرے مقالہ میں ملتوں اور شریعتوں کا بیان، ملت کی حقیقت اور اس کے ظہور میں آنے کے اسباب، ملت حنیفیہ کی حقیقت، علم تشریع اور اس کے قوانین، تدابیر اصلاح، خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت مطہرہ کے مقاصد اور دینِ اسلام کے اصول وغیرہ مباحث زیر بحث آئے ہیں۔

حضرت شاہ صاحب نے البدور البازغہ میں گاہ بگاہ تصوف اور الٰہیات کے مسائل پر بھی گفتگو کی ہے۔ یہ کتاب بھی دراصل تفہیمات الٰہیہ کے جز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور ان دونوں کتابوں کے مسائل بڑی حد تک مشترک ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان دونوں کتابوں کے بارے میں عمومی طور پر کہا جاتا ہے کہ یہ شاہ صاحب کے وارداتِ قلبی اور مشاہدات روحانی کی عکاس ہیں۔

ان دونوں کتابوں کو مطالعہ کرنے والے اصحابِ علم اس نقطۂ نظر کو واضح طور پر محسوس کریں گے یہی وجہ ہے کہ میں نے ان دونوں کتابوں کو ایک ساتھ ہی شائع کیا ہے۔ اس کتاب کے اردو مترجم ڈاکٹر قاضی مجیب الرحمٰن صاحب ہیں، ڈاکٹر قاضی مجیب الرحمٰن صاحب کے حالات زندگی اور ان کے علمی کارناموں کے بارے میں مجھے زیادہ علم نہیں ہے لیکن ان کی ترجمہ نگاری اور شاہ شناسی سے انداز ہوتا ہے کہ یہ عربی اور فارسی زبان کے ماہر اور فکر ولی اللّٰہی سے تعلق رکھنے والے صاحبِ علم بزرگ ہیں۔ جنھوں نے بڑا سلیس اور عمدہ ترجمہ کیا ہے۔ جس کے لیے میں ان کا شکر گزار ہوں۔ جسٹس مولانا عبدالقدوس قاسمی صاحب نے اس پر نظر ثانی کی ہے۔ یہ بھی صاحب نظر دانشور اور عالم معلوم ہوتے ہیں، اللہ ان کی خدماتِ علمی کو قبول فرمائے۔ یہ کتاب ادارہ مطبوعات اردو بازار لاہور سے ۲۰۰۰ء میں شائع ہوئی تھی۔ اور میرے پیش نظر نسخۂ لاہور ہی ہے۔ جسے حضرت مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی صاحب پاکستان سے لائے تھے، میں نے حضرت مولانا کاندھلوی صاحب سے کچھ دنوں کے لیے مستعار لی ہے۔ مولانا نور الحسن کاندھلوی صاحب میرے کرم فرما اور فکرِ ولی اللّٰہی کے ماہر عالم دین ہیں۔ اور ان کے ذاتی کتب خانے میں حضرت شاہ صاحب کی تمام نایاب کتابیں موجود

ہیں۔میں ان کا شکر گزار ہوں کہ آپ ازراہ کرم شاہ صاحب سے متعلق کتابیں عنایت فرماتے ہیں۔میں نے اپنے مقدمے کے شروع میں لکھا ہے کہ المجلس العلمی ڈابھیل سے حضرت شاہ صاحب کی تفہیمات الٰہیہ اورالخیرالکثیر شائع ہوئی تھیں۔اوراسی مجلس علمی نے البدورالبازغہ کو بھی مولانا محمدانورشاہ کشمیری اوران کے رفقا وتلامذہ کی نگرانی میں شائع کی تھی اورشاہ صاحب کے تلامذہ میں مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی،مولانا بدرِعالم میرٹھی،مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی،مولانا سعیداحمد اکبرآبادی،اور مولانا سیداحمد رضا بجنوری وغیرہ تھے۔میرا اپنا خیال یہ ہے کہ ان حضرات نے شاہ صاحب کی ان کتابوں کی تحقیق وترتیب اوراشاعت میں ضرور دلچسپی لی ہوگی۔میں یہاں ایک وضاحت حسب سابق کرنا ضروری خیال کرتا ہوں کہ التفہیمات الالٰہیۃ کی طرح البدورالبازغہ میں بھی فاضل ناشراول نے فہرست سازی اورعنوان سازی کی ہے،اوریہ فہرست مضامین اصل مخطوطہ میں موجود نہیں ہے۔اس فہرست مضامین کو حضرت شاہ ولی اللہ کی طرف منسوب نہ کیا جائے۔اور ناشراوّل ہی کی طرف منسوب کیا جائے لیکن چونکہ یہ اضافی عنوانات البدورالبازغہ کے مفاہیم ومطالب کی افہام وتفہیم میں بے حد مفید ہیں،اس کے پیش نظران اضافی عنوانات کو برقرار رکھا گیا ہے۔امید ہے کہ قارئین حضرات دورانِ مطالعہ اس فرق کو ملحوظ رکھیں گے۔

بڑی ناسپاسی ہوگی اگر میں اپنے دوست مولانا محمدافتخارحسین مدنی شیخ الحدیث مدرسہ عبدالرب کشمیری گیٹ کا شکریہ ادا نہ کروں جنھوں نے اس کتاب کی تصحیح اور پروف ریڈنگ میں خاص مدد کی ہے۔اللہ تعالیٰ انہیں شروروفتن سے محفوظ رکھے۔

عطاالرحمٰن قاسمی
چیرمین

التفہیمات الالٰہیہ

(جلداول)

تصنیف:

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ

ترجمہ

مولانا عقیدت اللہ قاسمی

نظرثانی:

ڈاکٹر خلیل الرحمٰن راز

تحقیق وتعلیق:

مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی

فہرست (جلد اوّل)

خطبہ اور شیخ نور اللہ کو بیعت و درس و ارشاد کی اجازت		۳۳
۱-تفہیم	تین امور عظیم اور ان کی تفصیل جن کی طرف رسولوں نے دعوت دی	۳۷
۲-تفہیم	عارف کا حال، اس کے سامنے حقائق کی حقیقت آ جانے کے بعد	۴۲
۳-تفہیم	"الکامل" اور اس کے اوصاف	۴۳
۴-تفہیم	اسرار	۴۵
۵-تفہیم	صوفی کے علم کا حق جل شانہ کے علم کے ساتھ اتحاد	۴۵
۶-تفہیم	ہر ایک کیلئے نقطۂ لاہوت یا نقاط جبروت کی قربتوں میں سے ایک قربت ضروری ہے	۴۶
۷-تفہیم	وجدان—واقعہ کے مطابق ہی ہوتا ہے، اس پر اعتراض اور اس کا جواب	۴۷
۸-تفہیم	ذات باری کے بارے میں غور و فکر اور خطاب عجیب سے مخاطب کیا جانا	۴۹
۹-تفہیم	کسب اور کمائی کی قسموں کا بیان	۵۰
۱۰-تفہیم	احکام ظاہرہ میں انبیا اور اولیا کے درمیان فرق	۵۰
۱۱-تفہیم	کہنے والے کا قول کہ نبیؐ پر درود بھیجنے کا کوئی فائدہ نہیں اور راس کا جواب	۵۳
۱۲-تفہیم	شیخ عبدالقادر الجیلانی کے قول "حنفیہ، مرجئہ ہیں" کے معنی	۵۷
۱۳-تفہیم	باری تعالیٰ جل مجدہٗ کا فیض	۶۰
۱۴-تفہیم	خوابوں کی تعبیر	۶۱
۱۵-تفہیم	ایمان کا بیان اس کی تمام صفات اور اطوار سمیت اور ایمان کے ادوار کا بیان	۶۳
۱۶-تفہیم	اسلام کیلئے شرح صدر—شرح صدر کی حقیقت اور اس کی مختلف شکلوں کا بیان	۷۵
۱۷-تفہیم	رحمٰن کی تجلی اور دنیا میں جو کچھ بھی پایا جاتا ہے، سب اسی سے ہے	۸۲
۱۸-تفہیم	ابداع کی حقیقت کا بیان	۹۳
۱۹-تفہیم	وجود کے نظاموں کا ان کی انواع سمیت بیان	۹۷

۲۰-تفہیم اوقات کی تاثیر ۱۰۱
۲۱-تفہیم شیخ صدر عالم کے رسالہ کا ذکر ۱۰۲
۲۲-تفہیم ذات الٰہی کا عکس اور ذات کے لئے لازم عقل کثرت ۱۰۵
۲۳-تفہیم پردوں کا اصول ۱۰۶
۲۴-تفہیم علم طلسمات اور علم شرائع کی بنیادیں ۱۰۷
۲۵-تفہیم مقدس دائرہ ۱۰۷
۲۶-تفہیم علم اور معلوم کا اتحاد ۱۰۸
۲۷-تفہیم توحید حنفی کیا ہے؟ ۱۰۹
۲۸-تفہیم نبوت اور فطرت ۱۱۰
۲۹-تفہیم عارف الی اللہ کے دو طریقے ۱۱۱
۳۰-تفہیم قصیدۂ تائیہ ۱۱۳
۳۱-تفہیم عقل کے لحاظ سے حقائق کی تمیز کا بیان ۱۱۸
۳۲-تفہیم وہ دو حالتیں جن کا ہم ادراک کرتے ہیں ۱۲۵
۳۳-تفہیم ''کامل'' کی حقیقت ۱۲۷
۳۴-تفہیم اقطاب مرشدین کا ذکر ۱۳۲
۳۵-تفہیم فرد اور قطب ۱۳۵
۳۶-تفہیم علم اصول دعا ۱۳۶
۳۷-تفہیم مجددیت ۱۵۰
۳۸-تفہیم مرید کو بیعت کی اجازت ۱۵۳
۳۹-تفہیم معارف جلیلہ کا ذکر ۱۵۵
۴۰-تفہیم ثبوت اور وجود کے درمیان فرق ۱۵۹
۴۱-تفہیم بعض اشکالات کا جواب ۱۶۱
۴۲-تفہیم ''ازل'' کے معنی ۱۶۳
۴۳-تفہیم زمانہ میں تصوف کا دعوی کرنے والوں کی قسمیں ۱۶۴

۴۴-تفہیم طبقہ اوراس کے بعد کے احوال ۱٦۸

۴۵-تفہیم تجلی اعظم کے امور کا اختلاف اور یہ کہ وہ انبیا علیہم السلام کے علوم کے..... ۱٦۸

۴٦-تفہیم بعض علوم کشفیہ کے بارے میں مصنف کی خبر ۱٦۹

۴۷-تفہیم شفاعت سیدنا المسیح عیسیٰ علیہ السلام ۱۷۳

۴۸-تفہیم پوشیدہ معارف کا ذکر ۱۷۳

۴۹-تفہیم نفوس کاملین کے معاد کے لئے درجۂ اعلیٰ ۱۸۳

۵۰-تفہیم عارف کے احوال کے اختلاف کی وجوہ ۱۸۵

۵۱-تفہیم مخلوقات میں کواکب کی تاثیر ۱۸٦

۵۲-تفہیم اہل اللہ کے نفوس سے مدد طلب کرنا ۱۸٦

۵۳-تفہیم قدیم سے حادث کا صدور اور اس کی کیفیت ۱۸۸

۵۴-تفہیم سالک کے انبیاء و اولیا علیہم السلام کے مراتب تک پہنچنے کے معنی ۱۸۹

۵۵-تفہیم اس عالم میں سعادت عظمیٰ ۱۹۰

۵٦-تفہیم طول سرمدی کے بعد کیا ہوتا ہے؟ ۱۹۱

۵۷-تفہیم ایک نکتہ سے دوسرے کی طرف نقل کے طریقے ۱۹۲

۵۸-تفہیم وحدت میں کثرت اور کثرت میں وحدت کی تجلی کی حقیقت ۱۹۳

۵۹-تفہیم توکل کا مقام، اور تمام مقامات کی طرح اس کے بہت سے بطون ہیں ۱۹۵

٦۰-تفہیم اللہ کیلئے اپنے بندوں کی طرف نسبت کے دو طریق اور ان دونوں کی تفصیل ۱۹۸

٦۱-تفہیم شیخ خواجہ محمد باقی قدس سرہ کا ذکر ۱۹۹

٦۲-تفہیم مرید کو وصیت ۲۰۱

٦۳-تفہیم لسان استعداد کی رعایت اور قلب کی شہادت ۲۰۲

٦۴-تفہیم قرآن کو خوش الحانی کے ساتھ پڑھنے کی فضیلت ۲۰۲

٦۵-تفہیم عقائد حق کا بیان ۲۰۳

٦٦-تفہیم اہل اللہ کی تین قسمیں ۲۰۹

٦۷-تفہیم شیخ خواجہ خرد کے سوالات کے جوابات ۲۱۸

۶۸-تفھیم کلی اور جزئی ظہور کی بحث ۲۵۶
۶۹-تفھیم ملاء اعلیٰ کی حقیقت۔ حظیرۃ القدس ۲۶۸
۷۰-تفھیم لمحات الٰہیہ کی بعض مشکلات کا حل، شیخ صدرالدین کی تالیف میں سے.... ۲۹۰
۷۱-تفھیم زمانہ میں اللہ کے نزدیک پسندیدہ سلوک کا بیان ۲۹۳
۷۲-تفھیم بدی کا بدلہ اسی کے برابر اور نیکی کا دس گنا ہونے کا راز ۲۹۵
۷۳-تفھیم دعائیں ۲۹۶
۷۴-تفھیم خلیفۃ اللہ فرد، تحقق کے معنی ۳۰۲
۷۵-تفھیم جزا کا سبب بننے والے اعمال کی انواع ۳۰۷
۷۶-تفھیم شاگرد شیخ عبدالرحمٰن اور ان کو درس و تلقین کی اجازت ۳۰۸
۷۷-تفھیم رب العالمین کی ربوبیت اور تقدیر سے تکلیف کے اشتقاق کی تحقیق ۳۱۱
۷۸-تفھیم سعادت اخرویہ کی تحقیق ۳۲۳
۷۹-تفھیم اس مسئلہ کی تحقیق جو مسائل خلق میں اصل الاصول ہے ۳۳۳
۸۰-تفھیم ارشاد باری ولقد همت به وهم بها الاية کی تفسیر ۳۳۸
۸۱-تفھیم تجلی کی اصناف اور اس کے بہت سارے معانی کا بیان ۳۳۹
۸۲-تفھیم بندہ کا اللہ سبحانہ کی ذات کی نسبت ایک ساتھ عاشق و معشوق ہونا ۳۴۶
۸۳-تفھیم انبیاء کے طریقہ پر چلنے والا ہونا ۳۴۷
۸۴-تفھیم ممتاز قوت عطا کی گئی ۳۴۹
۸۵-تفھیم ان کی فطری قوت کے معادان کے ساتھ ہیں ۳۵۰
۸۶-تفھیم سیدنا محمدؐ کے نبوت سے قبل و بعد کے مراتب احوال: ۳۵۱
۸۷-تفھیم حکمت و عصمت اور سیادت کا راز ۳۵۳
۸۸-تفھیم عالم نبوت میں ذکر حقیقی کی کیفیت ۳۵۴
۸۹-تفھیم انبیاء علیہم السلام کی عبادت روحانی اور اس کی مراد ۳۵۵
۹۰-تفھیم حکمت اور صحت کے معنیٰ کا بیان ۳۵۶
۹۱-تفھیم باری تعالیٰ کے ارشاد "انا عند ظن عبدی بی" کی تاویل اور راز کا بیان: ۳۵۱

۹۲-تفہیم	خاص حالت کا ذکر	۳۶۰
۹۳-تفہیم	انبیاء علیہم السلام کے قرب کا بیان	۳۶۰
۹۴-تفہیم	اللہ کی اپنے بعض بندوں کی طرف نظر، ان کے نزدیک دنیا و مافیہا سے....	۳۶۲
۹۵-تفہیم	حکمت کیا ہے؟ اور وجاہت کی حقیقت	۳۶۴
۹۶-تفہیم	ارشاد نبوی 'کلمة الحکمة ضالة المؤمن' کے معنی	۳۶۵
۹۷-تفہیم	توحید کے انکشاف کے بعد ظاہر ہونے والی حیرت کی حالت	۳۶۶
۹۸-تفہیم	اللہ تعالیٰ کے بندہ کو اپنے لیے منتخب کرنے کے بعد اس کے مراتب	۳۶۷
۹۹-تفہیم	خاتم الاولیاء کا بیان	۳۶۹
۱۰۰-تفہیم	خواب اور اس کی تاویل جلیل	۳۹۶
۱۰۱-تفہیم	طویل گفتگو سلوک کے شروع ہونے اور مقامات کے بیان......	۳۷۰
۱۰۲-تفہیم	وجود کے مقام کی تمثیلوں سے علم کا مقام	۳۷۲
۱۰۳-تفہیم	قضیہ 'واحد سے واحد ہی صادر ہوتا ہے' کا مصدق اور صادق اول سے مراد	۳۷۳
۱۰۴-تفہیم	تجلی ذاتی کی حقیقت کا تفصیلی بیان	۳۷۶
۱۰۵-تفہیم	صورت کے اعتبار سے دوری اور اس کا استفاضہ میں اس طرح مخل ہونا.....	۳۸۱
۱۰۶-تفہیم	فناء النفس-اس کی صفات اور ان دونوں کے درمیان تلازم کا بیان	۳۸۲
۱۰۷-تفہیم	حضرت آدم کی پیدائش اور ان کی ذریت کے اخراج والی حدیث کی تحقیق	۳۸۴
۱۰۸-تفہیم	قوائے الٰہیہ کی قسمیں اور لطائف ستہ کا بیان	۳۸۷
۱۰۹-تفہیم	حدوث عالم اور اس کے دو معنی	۳۸۹
۱۱۰-تفہیم	اللہ تبارک و تعالیٰ کی اپنی مخلوق سے نسبت	۳۹۰
۱۱۱-تفہیم	جوہریت اور عرضیت عالم محسوس کی بدعات میں سے ہیں	۳۹۰
۱۱۲-تفہیم	اللہ تعالیٰ تک پہنچانے والا علم حضوری ہے نہ کہ حصولی	۳۹۱
۱۱۳-تفہیم	اللہ تعالیٰ علم حضوری بنفسہٖ سے عالم ہے	۳۹۲
۱۱۴-تفہیم	مقامات کا فرق اور اعتبارات کا اختلاف	۳۹۲
۱۱۵-تفہیم	طلب حاجت کے لیے قبروں کی زیارت کا حکم	۳۹۴

۱۱۶-تفہیم اللہ تعالیٰ کے بالاختیار یا بالا یجاب ہونے میں اختلاف ہنزاع لفظی ہے ۳۹۴
۱۱۷-تفہیم نبی کی دعا اور ولی کی خواہش کا بیان ۳۹۵
۱۱۸-تفہیم طاعات سے مقصود ۳۹۵
۱۱۹-تفہیم لغت کے لحاظ سے جذب کے معنی اور عرف میں مجذوب سے مراد ۳۹۸
۱۲۰-تفہیم فناء اول کے معنی ۳۹۹
۱۲۱-تفہیم لفظ وجود اور دو معنوں پر اس کا اطلاق ۴۰۰
۱۲۲-تفہیم ایجاد کی حقیقت کے سلسلہ میں صوفیا کا قول اور اس کی تحقیق ۴۰۲
۱۲۳-تفہیم مقام عظیم وجاہ کریم کا ذکر ۴۰۴
۱۲۴-تفہیم اللہ کی بعض نعمتوں کا ذکر ۴۰۵
۱۲۵-تفہیم بعض احوال کی طرف اشارہ کرنے والے اشعار اور گویا کہ یہ توحید وجودی..... ۴۰۶
۱۲۶-تفہیم ایسے بندہ کیلئے کامل سعادت جس کے لئے اللہ سبحانہ نے تجلی فرمائی ۴۰۸
۱۲۷-تفہیم حکم اور نبوت کے معنی ۴۰۹
۱۲۸-تفہیم اللہ تعالیٰ کے نور السموات والارض ہونے کے معنی ۴۰۹
۱۲۹-تفہیم بعض تجلیات کی تفصیل ۴۱۲
۱۳۰-تفہیم وصایہ اور مفردیہ کے ایک ساتھ جمع کرنے کا مرتبہ ۴۱۳
۱۳۱-تفہیم انتہائی کمال حاصل کرنے کا مرتبہ ۴۱۴
۱۳۲-تفہیم اس تجلی کے احوال جو کہ جہنم کا منبع اور جنت کا منبع ہے ۴۱۵
۱۳۳-تفہیم رذیل اخلاق پر مواخذہ کے سلسلہ میں امام غزالی کا قول اور اس بارے..... ۴۱۶
۱۳۴-تفہیم تمام اقسام پر مطلع ہونا اور ان کا ادوار سبعہ نام رکھنا ۴۱۷
۱۳۵-تفہیم دورات سبع کی شرح ۴۱۸
۱۳۶-تفہیم ان ساتوں ادوار میں ہر نبی کا مخصوص مقام ہے ۴۲۹
۱۳۷-تفہیم صاحب ظاہر، صاحب باطن اور صاحب فردیت کا ذکر ۴۳۱
۱۳۸-تفہیم بصیر کے معنی اور مفردین کا ذکر ۴۳۲
۱۳۹-تفہیم اسم رحمٰن کی طرف پہنچنا جو کہ اصل تجلیات ہے اور ان کے لیے... ۴۳۵

۱۴۰-تفہیم اللہ تعالیٰ کے بندہ کو برگزیدہ بنانے کے مراتب ۴۳۷

۱۴۱-تفہیم اس امر کا بیان کہ وجود کے بہت سارے مراتب ہیں اور اس بارے میں تحقیق انیق ۴۳۷

۱۴۲-تفہیم اس کلمہ کے احوال جو وجود کی اصل اور اس کے کمالات کا منبع ہے ۴۴۱

۱۴۳-تفہیم میرا اندرونی حال عجیب ہے ۴۴۲

۱۴۴-تفہیم بندہ کی حیرت اس وقت جب وہ حقیقت الحقائق کی طرف ترقی کرتا ہے ۴۴۴

۱۴۵-تفہیم توحید کے طریق مستقیم پر ثابت قدم رہنے کی وصیت ۴۴۵

۱۴۶-تفہیم جس پر توحید کا انکشاف ہو جائے اس پر تین واجبات ہیں ۴۴۶

۱۴۷-تفہیم بندہ کی دو عقلیں ۴۴۷

۱۴۸-تفہیم سالک کی تشویش اور اس کے اسباب ۴۴۸

۱۴۹-تفہیم سالک کا علوم توحیدیہ کے دقائق شعریہ حکمیہ کیساتھ ملانے کی طرف میلان اور۔۔۔ ۴۵۰

۱۵۰-تفہیم قلت طعام اور دوام صیام کی وصیت اور شعر کی مراد ۴۵۱

۱۵۱-تفہیم ہمت اور اس کی فنا کی کیفیت ۴۵۲

۱۵۲-تفہیم فناء شفائی کے موانع ۴۵۵

۱۵۳-تفہیم مانگنے میں اللہ تعالیٰ کے سامنے آہ وزاری اور تضرع ۴۵۶

۱۵۴-تفہیم خواب پریشان کے درجہ میں سالک کی تشویش ۴۵۶

۱۵۵-تفہیم مجرد مقدس کی طرف توجہ کا طریقہ ۴۵۷

۱۵۶-تفہیم خواب اور ان کی تعبیر ۴۵۸

۱۵۷-تفہیم قیامت کے دن سوال نہ ہونا اور آپ کا جنت میں داخل ہونا ۴۵۸

۱۵۸-تفہیم حضور مجرد کا حصول اور اس کی حقیقت کا بیان ۴۵۹

۱۵۹-تفہیم اللہ تعالیٰ کے ساتھ علم حضوری اور علم حصولی کے معنی ۴۵۹

۱۶۰-تفہیم بنی آدم کے رحمٰن کی انگلیوں کے درمیان ہونے کے احوال ۵۶۱

۱۶۱-تفہیم خارجی اسباب سے دل تنگ نہ ہونا اور حدیث نفس کے ترک کی کوشش کرنا ۴۶۲

۱۶۲-تفہیم انکسار خاطر کے معنی ۴۶۲

۱۶۳-تفہیم اپنے بعض اصحاب کو بعض اشعار کے پڑھنے اور قرآن کی تلاوت وغیرہ کی وصیت ۴۶۳

۱۶۴-تفہیم سالک کے قلب کا اضطراب اور اس کا علاج ۴۶۴
۱۶۵-تفہیم سالک کی ترقیوں پر تنبیہ ۴۶۴
۱۶۶-تفہیم بندوں کا مختلف طبقات میں پیدا ہونا ۴۶۶
۱۶۷-تفہیم وحدت قصوی تک پہنچانے والا سفر اور اس سلسلہ میں حق امور ضروریہ کا.... ۴۶۷
۱۶۸-تفہیم ایک ساتھی کو اہم وصیت ۴۷۰
۱۶۹-تفہیم جہاد کی عظیم انواع ۴۷۱
۱۷۰-تفہیم لوگوں کی رہنمائی کے لیے طریق خاص کی تلقین ۴۷۲
۱۷۱-تفہیم حجاب کو وہم سے ڈھانپنا اور اس کا علاج ۴۷۳
۱۷۲-تفہیم فرائض کے قرب کے کمال کا بیان ۴۷۴
۱۷۳-تفہیم عالم مثال کے دو مرتبے ۴۷۴
۱۷۴-تفہیم حال عین اور اس کے کمال کی وضاحت ۴۷۵
۱۷۵-تفہیم قول اور خبر وغیرہ کی تحقیق ۴۷۵
۱۷۶-تفہیم وعظ کے صیغوں کا بیان ۴۷۵
۱۷۷-تفہیم مسئلہ کی صورت اور اس کا حکم ۴۷۶
۱۷۸-تفہیم دعا اور وہ کہاں نفع دیتی ہے ۴۷۶
۱۷۹-تفہیم وجاہت کا مسمی کیا ہے؟ ۴۷۷
۱۸۰-تفہیم حقیقت مطلقہ سے خطاب فقط مخاطب تک اکتفا نہیں کرتا بلکہ اس کا رجوع.... ۴۷۷
۱۸۱-تفہیم قول باری تعالیٰ الم نشرح لک صدرک الخ ۴۷۹
۱۸۲-تفہیم محدث اور مقرب کا ذکر ۴۸۰
۱۸۳-تفہیم قول باری تعالیٰ "وجعلنا فی الأرض رواسی...الخ" کے معنی ۴۸۰
۱۸۴-تفہیم امر مجرد اور اس کے متعلقات میل جول اور استقرار کا بیان ۴۸۱
۱۸۵-تفہیم ایمان اور حکمت، عفت، تفرس اور سکینہ کے درمیان فرق اور ان کے معانی ۴۸۲
۱۸۶-تفہیم نماز کے اوقات اور ان کے مقرر و مخصوص کرنے کا راز ۴۸۴
۱۸۷-تفہیم تنقیح کی دو قسمیں ہیں ۴۸۵

۱۸۸-تفہیم قرب فرائض کے مقامات کی دو قسمیں ہیں	۴۸۵
۱۸۹-تفہیم الحی القیوم کی تمثیلوں سے نماز	۴۸۶
۱۹۰-تفہیم صحابہؓ کی قسمیں	۴۸۶
۱۹۱-تفہیم ظہور کے مراتب	۴۸۷
۱۹۲-تفہیم اشیاء کی نسبت اللہ اور بندہ کی طرف کرنے کا ضابطہ	۴۸۷
۱۹۳-تفہیم انسان کو اولا اور اس کے بعد کیا حاصل ہوتا ہے، اس کا بیان	۴۸۸
۱۹۴-تفہیم مصائب کی غرض	۴۸۸
۱۹۵-تفہیم اسم حادث کے اطلاق کی علامت	۴۸۸
۱۹۶-تفہیم انبیاء پر وحی اور ملائکہ مقربین پر قضا کس طرح نازل ہوتے ہیں؟	۴۸۹
۱۹۷-تفہیم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد "العلم ثلاثه" کی تشریح	۴۸۹
۱۹۸-تفہیم شرع کے دو اصول	۴۹۰
۱۹۹-تفہیم آدمؑ کے اولاً جنت میں داخل ہونے اور بعد میں زمین پر استقرار کا راز	۴۹۰
۲۰۰-تفہیم یونس علیہ السلام کی آزمائش کے راز کا ذکر	۴۹۱
۲۰۱-تفہیم تربیت باطنہ اور تربیت ظاہرہ کا بیان	۴۹۱
۲۰۲-تفہیم تفہیم اور محدثیت وغیرہ کے معنی	۴۹۲
۲۰۳-تفہیم اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص نعمتوں پر مصنف کو بشارت دیا جانا	۴۹۴
۲۰۴-تفہیم ذوق اور تفہیم اور وحی کے معنی کا بیان	۴۹۴
۲۰۵-تفہیم ضحیٰ و تہجد کی نماز اور ہر مہینہ کے تین دن کے روزے جو انبیاءؑ کی وراثت ہیں	۴۹۴
۲۰۶-تفہیم چاروں ادوار کے احکام	۴۹۶
۲۰۷-تفہیم علم تفسیر کی تعلیم آسان زبان میں	۴۹۶
۲۰۸-تفہیم قرب کمال کے خصائص کا بیان	۴۹۶
۲۰۹-تفہیم کمالات اور شرور کے اکیلا ہونے کے معنی اور دجال کے خروج اور قیامت کے اسرار	۴۹۷
۲۱۰-تفہیم اعمال کی صورتوں کا صحیفوں میں قائم ہونا اور جنت و جہنم کا راز	۴۹۸
۲۱۱-تفہیم سلوک کا قریب ترین راستہ اور اس طریق کا امام ہونا	۴۹۹

۲۱۲-تفہیم خاص منقبت	۴۹۹
۲۱۳-تفہیم مسرت یا مصیبت کے وجود سے پہلے تبشیر اور انذار اور ان دونوں میں راز	۵۰۰
۲۱۴-تفہیم جو شخص عالموں کے مقابل کو سمجھتا ہے اس پر علم تکوین اور......	۵۰۲
۲۱۵-تفہیم اللہ نے بندہ کو اپنی معاش کا ذمہ دار بنایا ہے	۵۰۳
۲۱۶-تفہیم آدمی کے اندر پانچوں قربتیں متعدد وجوہ سے ایک ہو جاتی ہیں	۵۰۴
۲۱۷-تفہیم طریق کو ظاہر کرنا، جو کہ تمام طریقوں کی بنیاد اور......	۵۰۴
۲۱۸-تفہیم دو مقدس افاضے جن سے تمام قربتوں کا نظام ہے	۵۰۵
۲۱۹-تفہیم طریق کا سالک وحی کا خازن ہے	۵۰۵
۲۲۰-تفہیم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کمال سے پیدا ہونے والے شعبے	۵۰۵
۲۲۱-تفہیم اولیاء کی اقسام کا بیان	۵۰۷
۲۲۲-تفہیم واقعات سے پہلے بنیادوں کا آگے بڑھنا	۵۰۸
۲۲۳-تفہیم اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سب سے زیادہ محبوب	۵۰۸
۲۲۴-تفہیم محدث کی مثال	۵۰۸
۲۲۵-تفہیم وصایہ کی حقیقت اور یہ کہ ہر زمانہ کے لیے وصی کا ہونا ضروری ہے	۵۰۹
۲۲۶-تفہیم ہر نبی کے لیے مجدد کا ہونا ضروری ہے	۵۰۹
۲۲۷-تفہیم مجددیت	۵۱۰
۲۲۸-تفہیم قرب قیامت کا ذکر	۵۱۰
۲۲۹-تفہیم عوام اور انبیاء کے درمیان فرق کا مبدأ	۵۰۱
۲۳۰-تفہیم رسول اللہ کا ارشاد: "تم اپنے سے پہلے والوں کی اتباع کرو گے"۔ اور....	۵۱۱

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

خطبہ اور شیخ نور اللہ کو بیعت و درس و ارشاد کی اجازت

الحمد لله الذی امر العلماء ان يدعوا الناس اليه وحث الناس ان يهتدوا بهديهم ويعضوا بنواجذهم عليه، نحمده ونستعينه ونستغفره ونعوذ باللّٰه من شرور انفسنا ومن سيئات اعمالنا من يهد الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادی له، واشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريک له واشهد ان سيدنا محمدا عبده ورسوله صلى الله عليه وعلى آله واصحابه وسلم.

امابعد۔ بندۂ ضعیف احمد المدعو بولی اللہ بن شیخ عبدالرحیم تغمدهما الله تعالیٰ بفضله العظيم وجعل مآلهما النعيم المقيم عرض کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر بے پناہ فضل وکرم فرمایا ہے اور اپنے احسان وعنایات کی خوب بارش فرمائی ہے۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمایا ہے ان لربکم فی ايام دهركم نفحات الا فتعرضوا لها (تمہارا رب تمہارے اوپر شب و روز فضل وعنایات کی بارش کرتا رہتا ہے، تم ان کو حاصل کرو) اس نے ان نعمتوں اور فضل وعنایات سے ہمارے بھائی فاضل دانشور شیخ نور اللہ بن معین الدین البہلتی (نور اللہ ظاہرہ و باطنہ بنور مرضیاتہ) کو بھی وافر حصہ عطا کیا ہے کہ ان کے دل و دماغ کو علوم دین، حدیث، تفسیر، فقہ اور اصول وغیرہ کے حصول کی طرف متوجہ فرمایا ہے۔ اس سلسلہ میں ان کی رہنمائی فرمائی اور ان کو توفیق عطا فرمائی۔ ان کے دل میں ان علوم کی طلب کا داعیہ پیدا فرمایا اور ان کے دل میں اس کی رغبت پیدا فرمائی۔ چنانچہ وہ

اپنے وطن سے چل کر میرے پاس پہنچے اوران علوم کے حصول میں مشغول ہو گئے۔اس مقصد کے لئے انہوں نے سفراور غریب الوطنی کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔محنت و مشقت اور جدوجہد بھی کی۔ پھر بحمداللہ مختصر اور مفصل جو کچھ مقدر میں تھا۔خوب حاصل کیا۔درس کے فروع واصول پر قدرت وغلبہ ومہارت حاصل کی۔اس کے بعد جب ایک روز میں اپنے والد صاحب کی قبر کے پاس بیٹھا ہوا تھا، جو بڑے صاحب کرامات اور قدرومنزلت کے حامل تھے۔ (اللہ تعالیٰ ان کے مرتبے ودرجات مزید بلند فرمائے) ان کی روح نے اشارہ کیا کہ میں اخی مذکور کو نقشبندی بزرگوں کے نزدیک معتبر ومستند قرار دی جانے والی تسبیحات ووظائف کی تلقین کروں۔چنانچہ میں نے اس کی طلب کے بغیر اس کوان امور کی تلقین کا سلسلہ شروع کر دیا جو مجھے میرے بزرگوں کی ہدایات ورہنمائی کے طور پر معلوم ہیں۔اور یہ میرے والد قدس اللہ سرہ کی برکت کا نتیجہ تھا کہ اس میدان میں اس کو سہولتیں ملتی چلی گئیں۔اس کے دل ودماغ کے قفل کھلتے چلے گئے اوراس راہ کی دشواریاں آسان ہوتی چلی گئیں۔اللہ کی طرف سے اس کی مدد ہوتی گئی، اور وہ یکے بعد دیگرے اس میدان کی منزلیں طے کرتا چلا گیا، جن منازل کو اللہ کے نیک بندے طے کرتے رہے ہیں، وہ مئے توحید سے سرشار ہوتا گیا۔ذاتی اغراض ومفادات کی خواہش اور خودغرضی کی تکمیل کے تصور سے آزاد ہو گیا۔غرور وگھمنڈ کی غلاظت سے پاک ہو گیا۔توحید کے میدانوں میں مقام بلند حاصل کر لیا۔یہاں تک کہ خالص شہود کے مرتبہ پر پہنچ گیا۔پھر صاف شفاف میدان کی طرف لوٹ آیا جیسا کہ سلف وخلف صالحین کا طریقہ ہے کہ جہاں تک خارق عادت واقعات کا تعلق ہے، وہ تو نفوس کے مزاج کے تابع ثمرات ہوتے ہیں، جو اصل یقین پر زاید ہوتے ہیں، اس دوران وہ میری صحبت میں زیادہ سے زیادہ وقت گزارتا رہا۔اس کے دل میں میری محبت ہر لحہ بڑھتی رہی۔چنانچہ گزشتہ دنوں میں نے اس کی شان میں یہ دو شعر کہے:

لقد بلوتک فی سلم وفی عتب
فما وجدتک الا خالص الذهب
ولم تسم بنور الله الا لانه
عما قليل تكون النور فارتقب

''میں نے تمہیں عیش و آرام اور سختی و پریشانی ہر میدان میں آزمایا اور پرکھا تو میں نے تمہیں خالص سونے جیسا ہی پایا اور تمہارا نام صرف اس لئے نور اللہ نہیں رکھا گیا کہ نور تھوڑا ہی رہے بلکہ اس کو بڑھاتے رہو۔''

اب میں اس کو اجازت دیتا ہوں کہ لوگوں کو صوفیا کے مشاغل کی اس طرح تلقین کرے جیسے میں نے اس کو تلقین کی ہے۔ اور ان سے اس طرح بیعت لے جس طرح میں نے اس سے بیعت لی ہے۔ اور صوفیا کا خرقہ اس کو پہنائے جس کو اس کا اہل پاوے جیسے میں نے اس کو پہنایا تھا۔ ان تمام امور میں اس کا ہاتھ بمنزلہ میرے ہاتھ کے، اس کی زبان بمنزلہ میری زبان کے ہوگی۔ اور اس طرح کے معاملات میں میرے مشائخ میرے حق میں اور رسول اللہ کی سنت آپ کے امراء و خلفا کے بارے میں اسی طرح کہتے ہیں جیسا کہ فرمایا ان کی طاعت میری طاعت ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا **ان الذین یبایعونک انما یبایعون اللہ** ''جو لوگ آپ سے بیعت کر رہے ہیں وہ اللہ ہی سے بیعت کر رہے ہیں''۔ اور فرمایا **من اطاع الرسول فقد اطاع اللہ** ''جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی''۔ اور میں نے اس کو اس امر کی بھی اجازت دی کہ مجھ سے میری ان کتابوں اور رسائل کی روایت کرے جو میں نے تصوف وغیرہ کے سلسلہ میں تالیف کی ہیں۔ ان میں سے وہ بھی ہیں جو اس نے میرے سامنے پڑھی ہیں، جیسے کتاب فیوض الحرمین یا نہیں پڑھیں۔ اور مجھ سے صحیح بخاری، صحیح مسلم اور باقی صحاح ستہ اور مشکوٰۃ المصابیح و ریاض الصالحین، والحصن الحصین وغیرہ کی روایت کرے جن کی روایت کرنا میرے لئے ان شرائط کے ساتھ صحیح ہے جو اہل فن کے نزدیک معتبر ہیں۔ اور میں اس کو خاص اس کی ذات کے سلسلہ میں اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے، اور نفسانی خواہشات سے اجتناب اور اذکار کی پابندی اور غصہ کو پی جانے سوائے اللہ کے معاملہ کے، اور سنت کے راستہ کی پابندی کرنے، اور لوگوں سے سوال کرنے کو ترک کرنے کی وصیت کرتا ہوں۔ اور یہ کہ محدثین و فقہائے اسلام اور مشائخ صوفیا سے حسن عقیدت کی وصیت کرتا ہوں اور یہ کہ جہاں تک ممکن ہو اپنے نفس کو خلاف شرع لغو و بے حیائی کی باتوں سے بچا کر رکھے اور اس کو اس کے ساتھ کے لوگوں کے معاملہ میں وصیت کرتا ہوں کہ ان کو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرے ''بھلائی کا حکم کرے اور برائی سے روکے'' اور اللہ کی اطاعت پر

ابھارے اور جہاں تک ممکن ہو فقرا و غربا کے معاملہ کی اصلاح کے لئے جدوجہد کرے۔ اور جو اس کی اتباع کریں، ان کو اذکار مسنونہ کی ترغیب دے۔ اور ان میں سے اہلیت رکھنے والوں کو اشغال قلبی اور مراقبہ کے لئے مخصوص کرے۔ اور اس کو میں اپنی ذات کے سلسلہ میں یہ وصیت کرتا ہوں کہ میرے لئے اللہ سے دعائے خیر کرے اور میرے لئے استغفار کرے۔ اور ایسا ہی میرے مشائخ کے سلسلہ میں کرے۔ سو اگر وہ ان شرائط کو پورا کرے تو وہ میری امیدوں پر پورا اترے گا اور اگر ان کی خلاف ورزی کرے گا تو وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون. "ظلم کرنے والے عنقریب جان لیں گے کہ وہ کس انجام کو پہنچیں گے۔" (الشعراء: ۲۲۷) اور اس فقیر عفا اللہ عنہ نے تینوں طرق نقشبندیہ و جیلانیہ (قادریہ) اور چشتیہ اپنے والد شیخ عبدالرحیم سے حاصل کئے اور ان کی صحبت میں ایک طویل مدت گزاری اور ان کی کرامات کو دیکھا۔ اور ان سے ان کے واقعات و کرامات اور ان کے مشائخ کی کرامات کے سلسلہ میں جو کچھ سنا، ان کو یاد رکھا اور ان کے دست مبارک سے خرقۂ فقیری پہنا۔ اور ان سے بیعت ہوا (رضی اللہ عنہ و جزاہ عنی خیرا)۔ اور ان سے احادیث روایت کیں۔ اور شیخ ابوطاہر محمد بن ابراہیم الکردی وغیرہ مشائخ الحرمین سے بھی خرقہ زیب تن کیا۔ اور ہم نے اسانید کو اپنے رسائل میں تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ اس لئے جو کوئی ان کے بارے میں جاننا چاہے، وہ ان سے رجوع کرلے۔ واسأل اللہ عز و جل ان یثبتنی وایاہ علی الطریقۃ المرضیۃ ویختم لی ولہ بالحسنی والحمد للہ اولاً و آخراً صلی اللہ علی خیر خلقہ محمد و آلہ واصحابہ اجمعین (اور میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ مجھے بھی اور اس کو بھی اپنے طریقہ مرضیہ پر ثابت قدم رکھے اور میرا اور اس کا خاتمہ بالخیر فرمائے۔ اور تمام تعریفیں اول و آخر اللہ ہی کے لئے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ اپنی مخلوقات میں سب سے بہتر ہستی محمدؐ اور آپ کی تمام آل و اصحاب پر رحمت فرمائے۔

فقیر ولی اللہ بن شیخ عبدالرحیم غفراللہ لہ و لوالدیہ و احسن الیھما والیہ نے یہ سب کہا۔ اور بروز جمعہ ۲۶ جمادی الاخریٰ ۱۱۴۶ھ کو لکھا۔

۱- تفهیم

تین امور عظیم اور ان کی تفصیل جن کی طرف رسولوں نے دعوت دی

الحمد لله الذی انعم فاجزل واعطی فافضل، ونحمده ونستعینه ونستغفره ونعوذ باللّٰه من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یهد الله فلا مضل له ومن یضلله فلا هادی له، واشهد ان لا اله الا الله وحده لا شریک له واشهد ان سیدنا محمدا عبده ورسوله، صلی الله علیه وعلی آله واصحابه وبارک وسلم، قال الله تعالیٰ یایها الذین آمنوا اتقوا الله وابتغوا الیه الوسیلة وجاهدوا فی سبیله لعلکم تفلحون (المائدہ: ۳۵) وقال تعالیٰ فلولا نفر من کل فرقة منهم طائفة لیتفقهوا فی الدین ولینذروا قومهم اذا رجعوا الیهم لعلهم یحذرون. (التوبہ: ۱۲۲) وقال ان الذین یبایعونک انما یبایعون الله ید الله فوق ایدیهم فمن نکث فانما ینکث علی نفسه ومن اوفی بما عاهد علیه الله فسیؤتیه اجرا عظیما. (الفتح: ۱۰) اما بعد:

علماء وصوفیا کا خادم اور ان کی اعلیٰ روایات کا حامل ولی اللہ بن عبدالرحیم عاملهما الله بفضله العظیم کہتا ہے، اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں میں سے جن کا بندے شکر ادا نہیں کر سکتے، یہ بھی ہے کہ اس نے ان انبیا کو مبعوث فرمایا جو غیب کی ترجمانی کرنے والے اور اللہ تعالیٰ کی طرف تقرب کی راہوں کی رہنمائی کرنے والے ہیں، تاکہ واضح دلائل کے سامنے آ جانے کے بعد جس کو ہلاک ہونا ہے، اس کو ہلاک کر دے اور جس کو حیات نو حاصل کرنی ہو، اس کو حیات نو عطا کر دے۔ پھر ان کے ایسے وارث بنائے جو لوگوں کے درمیان ان کے علوم و روایات کے علم بلند کرتے ہیں، اور ان کی سنتوں کو زندہ کرتے ہیں، اور ان کو رشد و ہدایت کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ اور رسولوں کی تعلیمات و روایات کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ ان میں تین امور عظیم ہیں (۱) مبدا و معاد اور مجازاۃ وغیرہ کے سلسلہ میں عقائد کی تصحیح۔ اس فن کی ذمہ داری علماء میں سے اہل اصول نے سنبھالی۔ اللہ تعالیٰ ان کی کوشش و مساعی کو کامیاب فرمائے (۲) سنت کے مطابق مقبول طاعات اور ضروری فوائد والے عمل کی تصحیح،

اس فن کی ذمہ داری فقہائے امت نے سنبھالی۔ چنانچہ اللہ نے ان کے ذریعہ بیشمار لوگوں کو ہدایت عطا فرمائی۔ اور ان کے ذریعہ راہ راست پر چلنے والے فرقہ کو قائم فرمایا۔ (۳) اور اخلاص واحسان کی تصحیح جو کہ اس دین حنیف کے اصول وبنیاد ہیں جس کو اللہ نے اپنے بندوں کے لئے پسند فرمایا ہے۔ ارشاد باری ہے وما امروا الا لیعبدوا اللہ مخلصین لہ الدین حنفاء ویقیموا الصلوۃ ویؤتوا الزکوۃ و ذلک دین القیمۃ ''اوران کو اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ اللہ کی بندگی کریں۔ اپنے دین کو اس کے لئے خالص کر کے بالکل یکسو ہو کر۔ اور نماز قائم کریں اور زکوۃ دیں اور یہی صحیح و درست دین ہے۔'' (البینۃ: ۵) اور فرمایا ان المتقین فی جنت وعیون، آخذین ما آتٰھم ربھم انھم کانوا قبل ذلک محسنین، کانوا قلیلاً من اللیل ما یھجعون، وبالاسحارھم یستغفرون، وفی اموالھم حق للسائل والمحروم، وفی الارض آیات للموقنین، وفی انفسکم افلا تبصرون ''یقیناً متقی لوگ باغوں اور چشموں میں ہوں گے، جو کچھ ان کا رب انہیں دے گا۔ اسے خوش خوش لے رہے ہوں گے کہ بیشک وہ اس دن کے آنے سے پہلے نیکوکار تھے۔ راتوں کو کم ہی سوتے تھے۔ اور راتوں کے پچھلے پہر میں معافی مانگتے تھے اور ان کے مالوں میں سائل اور محروم کے لئے حق تھا۔ ایمان و یقین اختیار کرنے والوں کے لئے زمین میں بہت سی نشانیاں ہیں۔ اور خود تمہارے اپنے وجود میں بھی ہیں، کیا تمہیں سوجھتا نہیں''؟ (الذاریت ۱۵ تا ۲۱) اور رسول اللہؐ نے فرمایا انما الاعمال بالنیات ''اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے''۔ (بخاری)۔ اور حضرت جبرئیلؑ کے جواب میں فرمایا الاحسان ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک ''احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا کہ تم اس کو دیکھ رہے ہو۔ اگر تم اس کو نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔'' (متفق علیہ) اور قسم اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے یہ تیسرا امر مقاصد شریعت میں ماخذ کے لحاظ سے سب سے زیادہ دقیق اور اصل کے اعتبار سے سب سے زیادہ عمیق ہے۔ اور وہ تمام شریعتوں کے سلسلہ میں ایسے ہی ہے جیسے جسم کے لئے روح یا لفظ کے لئے معنی۔ اس کی ذمہ داری صوفیا رضوان اللہ علیہم نے اپنے کاندھوں پر لی۔ سو انہوں نے خود ہدایت پائی اور دوسروں کی رہنمائی کی۔ خود فیضیاب ہوئے اور دوسروں کو فیض پہنچایا۔ چنانچہ وہ بہت بڑی سعادت حاصل کرنے میں کامیاب

ہوئے اور بڑے حصہ کے مالک قرار پائے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے نفع کو جس طرح عام کیا اور ان کے نور کو کمال کے درجہ پر پہنچایا، یہ اس کا فضل و کرم ہے۔

چونکہ علماء امت سے حق تعالیٰ کی رضا ہی تھی کہ وہ انبیا صلوات اللہ علیہم سے اخذ کردہ نور کی بقا اور اس کی اشاعت کے لئے سعی اور جدوجہد کریں اور لوگوں کو اس سے ہدایت حاصل کرنے کی ترغیب دیں۔ جیسا کہ فرمایا ہے فلولا نفر من کل فرقة منهم طائفة ليتفقهوا في الدين ولينذروا قومهم اذا رجعوا اليهم لعلهم يحذرون. "ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کی آبادی کے ہر حصہ میں سے کچھ لوگ نکل کر آتے اور دین کی سمجھ پیدا کرتے اور واپس جا کر اپنے علاقہ کے باشندوں کو خبردار کرتے، تاکہ وہ (غیر مسلمانہ روش سے) پرہیز کرتے۔" (التوبہ ۱۲۲) اور فرمایا ولكن كونوا ربانيين بما كنتم تعلمون الكتاب وبما كنتم تدرسون "سچے ربانی بنو جیسا کہ اس کتاب کی تعلیم کا تقاضہ ہے جسے تم پڑھتے اور پڑھاتے ہو۔" (آل عمران ۷۹) ہر زمانہ اور ہر طبقہ میں اپنے خلفا کے تقرر اور داعیوں کے مبعوث کرنے کی روایت وراثت میں پائی تاکہ اللہ کا کلمہ بلند ہو، اور اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنی کتاب محکم میں جو وعدہ فرمایا، وہ ان کے ذریعہ پورا ہو جائے۔ ارشاد ہے انا نحن نزلنا الذكر وانا له لحافظون "اس ذکر کو ہم نے ہی نازل کیا ہے اور ہم خود ہی اس کے نگہبان ہیں"۔ (الحجر ۹)

خلافت کی دو قسمیں ہیں، ایک خلافت ظاہرہ، دوسرے خلافت باطنہ۔ خلافت ظاہرہ کا مقصد جہاد، قضاء اور حدود کا قائم کرنا اور عشور و خراج کا جمع کرنا، ان کو مستحقین میں تقسیم کرنا اور اسلام کے پیروکار بادشاہوں کا عدل و انصاف کے ساتھ ان کی ذمہ داری کو اٹھانا ہے۔ اور خلافت باطنہ کی غرض کتاب و حکمت کی تعلیم اور پرزور و پراثر وعظوں اور پرکشش صحبتوں کے ذریعہ نور باطن سے ان کا تزکیہ کرنا ہے۔ جیسا کہ اللہ عزوجل نے فرمایا لقد من الله على المومنين اذ بعث فيهم رسولاً من انفسهم يتلو عليهم اياته ويزكيهم ويعلمهم الكتاب والحكمة وان كانوا من قبل لفي ضلال مبين "درحقیقت اہل ایمان پر تو اللہ نے یہ بہت بڑا احسان کیا ہے کہ ان کے درمیان خود انہی میں سے ایک ایسا پیغمبر مبعوث کیا جو اس کی آیات انہیں سناتا ہے، ان کی زندگیوں کو سنوارتا ہے اور ان کو کتاب اور دانائی کی تعلیم دیتا ہے۔

حالانکہ اس سے پہلے یہی لوگ صریح گمراہیوں میں پڑے ہوئے تھے" (آل عمران ۱۶۴) اور انہی کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا العلماء ورثة الانبیاء "علماء انبیا کے وارث ہیں" اور فرمایا فضل العالم علی العابد کفضلی علی ادناکم "عالم کو عابد پر اس طرح فضیلت حاصل ہے جس طرح مجھے تمہارے ادنی ترین شخص پر ہے"۔ اور خلیفہ صرف وہی شخص ہوسکتا ہے جو مقاصد ثلاثہ مذکورہ کو جمع کرے، کتاب وسنت کو یاد کرے اور قوانین سلوک وتربیت سالکین کے قوانین کا عادی ہو۔

اور جہاں تک داعین کا تعلق ہے تو ان کے لئے صرف عدالت، نیک راستہ پر چلنے اور خلیفہ کی اس شرط کو پورا کرنے کو لازم قرار دیا جاتا ہے جو تبلیغ کے لئے اس کو ذمہ دار بنانے کا باعث ہوتی ہے۔ اور ان تمام امور میں جیسا کہ ہم نے دوسرے موقع پر اس کو تفصیل سے بیان کیا ہے، نبیؐ سے یہی طریقہ چلا آرہا ہے۔

ہمارے بھائی شیخ محمد عابد بن علاء الدین بن سیف اللہ، حبیب اللہ صلوات اللہ علیہ وسلامہ کی اتباع کی بڑی رغبت رکھتے ہیں اور اللہ کے ذکر اور اس کی نعمتوں میں غور وفکر کے بڑے شیدائی ہیں، **زاداللہ فی توفیقہ** ۔ وہ میرے والد اور نانا قدس اللہ اسرارہما کی صحبت میں رہے ہیں۔ انہوں نے ان دونوں سے نقشبندی، جیلانی (قادری) اور چشتی تینوں طرق کے اشغال حاصل کئے اور بہت مدت تک ان پر عمل کرتے رہے ہیں۔ پھر ان دونوں کے بعد اس فقیر عفی اللہ عنہ کے ہم صحبت رہے اور سکون باطن اور جتنی چاہیں یادداشت حاصل کیں۔

بالآخر اللہ تبارک وتعالی نے مجھے شرح صدر عطا فرمایا کہ ان کو طرق ثلاثہ کے اشغال کی طرف دعوت دینے والا قرار دے دوں ۔ اور اللہ کے بندوں میں سے اصحاب توفیق کی صحبت کے فیض سے زندگیاں سنوارنے والے کی حیثیت سے پسند کرلوں ۔ اور مجھے یہ الہام کیا کہ وہ اس کے مستحق ہیں کہ ان سے اشغال حاصل کئے جائیں۔ اور سالک ان کے نور صحبت سے ضیاء حاصل کریں۔ اور یہ کہ اللہ عزوجل ان کی صحبت میں لوگوں کے لئے خیر پیدا کرنے والے ہیں۔ اس لئے اب میں ان کو ان لوگوں کے لئے جن کے اندر وہ خیر و بھلائی دیکھیں، ان اوراد ووظائف کی تبلیغ کی اجازت دیتا ہوں جو انہوں نے مجھ سے اور میرے دونوں مذکورہ بالا بزرگوں سے سنے ہیں، اور ان پر عمل کیا ہے۔ اور ان کے آثار ملاحظہ کئے ہیں۔ جیسا کہ

مجھے میرے والد قدس سرہ نے نبی کریم تک پہنچنے والی اپنی متصل سند اور صحبت واحسان سے اجازت دی تھی۔ اب انشاء اللہ تعالیٰ ان کا ہاتھ میرے ہاتھ کی طرح اور ان کا امر میرے امر کی طرح ہوگا۔

میں انہیں خاص ان کی ذات کے بارے میں اللہ کا تقوی اختیار کرنے، خواہشات نفسانی سے احتراز، بادشاہوں اور امراء کی صحبت ترک کرنے، اذکار کی پابندی، سوائے اللہ کے معاملہ کے دوسرے امور میں غصہ پر قابو رکھنے، خوشی و پریشانی ہر حال میں سنت کا دامن تھامے رہنے اور لوگوں سے سوال کرنے سے بچنے کی وصیت کرتا ہوں اور یہ کہ محدثین وفقہا کے بارے میں حسن اعتقاد رکھیں اور اپنے نفس کو خلاف شرع اور بے حیائی کی باتوں اور جن باتوں کو شریعت ناپسند کرتی ہے، ان سے حتی الامکان دور رہیں۔

اور ان کے ساتھ والوں کے سلسلہ میں وصیت کرتا ہوں کہ ان کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر (بھلائی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے) کا کام کرتے رہیں۔ اور ان کو اللہ کی اطاعت پر ابھاریں۔ اور ان کے معاملات کی اصلاح اور ان پر شفقت کی کوشش کرتے رہیں۔ اور جو بھی ان سے بیعت کرے، اس کو اذکار مسنونہ کا حکم دیں۔ اور استعداد رکھنے والوں کو قلبی اشغال اور مراقبہ پر ابھاریں۔ اور میں اپنی ذات کے بارے میں انہیں وصیت کرتا ہوں کہ اللہ سے میرے لئے دعائے خیر کریں، اور خود بھی خیر کا معاملہ کریں۔ اور میرے مشائخ کے ساتھ بھی اسی طرح کا معاملہ کریں۔ اب اگر وہ اس شرط کو پورا کرتے ہیں تو یہ میرا ان کے بارے میں حسن ظن ہے۔ اور اگر اس کی خلاف ورزی کرتے ہیں تو ظلم کرنے والوں کو عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ وہ کس انجام سے دوچار ہوتے ہیں۔

اس فقیر عفی اللہ عنہ والحقہ بسلفہ الصالحین نے یہ طرق ثلاثہ اپنے والد شیخ عبدالرحیم سے حاصل کئے۔ ان کی صحبت میں ایک طویل مدت گذاری۔ ان کی بہت سی کرامات کا مشاہدہ کیا۔ وہ جو کچھ اپنے مشائخ سے روایت کرتے تھے ان کو بہت دھیان سے سنا۔ انہوں نے اپنے جن مشائخ اجلہ سے جو کچھ حاصل کیا تھا، ان میں ایک سید عبداللہ ہیں۔ انہوں نے شیخ آدم بنوری سے، انہوں نے شیخ احمد سرہندی سے حاصل کیا۔ اور ان میں خواجہ خرد ہیں۔ انہوں نے خواجہ حسام الدین اور شیخ الہداد سے، انہوں نے خواجہ محمد باقی سے حاصل کیا۔ اور

ان میں خلیفہ ابوالقاسم بھی ہیں، انہوں نے ملا ولی محمد سے، انہوں نے امیر ابو یعلی سے اخذ کیا۔ ان میں شیخ عظمت اللہ اکبر آبادی نے اپنے والد سے، انہوں نے اپنے دادا سے، انہوں نے شیخ عبدالعزیز سے حاصل کیا۔ اور انہوں نے طریق چشتیہ قاضی خاں یوسف ناصحی سے، انہوں نے شیخ حسن سے اور طریق جیلانی (سلسلہ قادریہ) سید ابراہیم الایرجی سے حاصل کیا۔ ان تینوں سلسلوں میں سند کے اتصال کو جاننے کے بارے میں اس شخص کے لئے اتنا بیان کرنا کافی ہوگا جو قوم کے سلسلوں کو جانتا ہے۔ **واسال اللہ عز وجلّ ان یثبتنی علی الطریقة المرضیة ویختم لی ولہ بالحسنی** "میں اللہ عزوجل سے دعا کرتا ہوں کہ انہیں اور مجھے اپنی رضا کے راستہ پر ثابت قدم رکھے اور میرا اور ان کا خاتمہ بالخیر فرمائے۔ **والحمد للہ رب العالمین اولا وآخرا وصلی اللہ علی خیر خلقہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین.**

۲- تفہیم:

عارف کا حال، اس کے سامنے حقائق کی حقیقت آجانے کے بعد

جان لو کہ عارف کے سامنے جب اسماء اور ان کے قدرتی تعینات سے وابستہ حقائق کی حقیقت اس طرح واضح ہو جاتی ہے جیسے حصولی اور حضوری دونوں طرح سے ساری دنیا کو معلوم ہیں تو اس انکشاف کے بعد اس امر سے محفوظ ہو جاتا ہے کہ اس حقیقت کے علاوہ کو اپنی توجہ کے لئے قبلہ اور اس کی حقیقت کے تعبد کے لئے امام بنائے۔ ہاں اس کے بعد یا اللہ کو ایسا تصور کرے جیسا کہ وہ نہیں ہے یہ دو چیزیں ہوتی ہیں، ایک[1] اس حقیقت کی شرح اور ہر اسم کی علیحدہ معرفت۔ یہاں تک کہ شریعت کی اصطلاح میں معاملہ اسم اعظم تک اور تصوف کی زبان میں حقیقت محمدیہ اور اشراق کی اصطلاح میں عقل اول تک پہنچ جاتا ہے۔ جب معاملہ یہاں تک پہنچ جائے تو خالص ذات بغیر پردہ اور بغیر آئینہ کے پوری طرح واضح ہو جاتی ہے۔ جیسے اس معرفت کی حقیقت باری تعالیٰ کے ساتھ ہوتی ہے بلکہ اس عارف کی معرفت بعینہ اس حقیقت کی معرفت ہوتی ہے۔

اور دوسرے[2] اس عارف کی روح کا نشاط، حزن، جرأت اور بے حوصلگی کے احوال

میں ظاہر ہوتا ہے۔ سو جس حصہ کے ذریعہ یہ عارف کامیاب ہوتا ہے وہ بغیر کسی اختلاط کے اس حقیقت میں منحصر ہوتا ہے اور روح اس رنگ میں رنگی ہوئی ہوتی ہے۔ ان دونوں سے عجیب حالت پیدا ہوتی ہے جس میں عارف مستغرق ہوتا ہے اور معاملہ سرخ یا سبز شیشہ کے مشابہ ہو جاتا ہے۔ چیز اس کے واسطہ سے دکھائی دیتی ہے جس کی وجہ سے شیشہ کا رنگ اور نظر آنے والی چیز اس کی حس مشترک میں مل جاتی ہے۔

۳۔ تفہیم :

"الکامل" اور اس کے اوصاف

وکم من بعاد کان قربا حقیقة
وکم من فراق کان للوصل جالبا
فلا تک فی تلک الوقائع ناظراً
الی الشبح لکن للحقیقة طالبا
ففی القرب للناسوت شوب وربما
بعاد لاهل السر ینفی الشوائبا

"کتنی ہی دوریاں ہیں جو حقیقت میں قرب ہیں اور کتنی ہی جدائیاں ہیں جو وصل کے لئے کھینچنے والی ہیں۔ پس دھوکہ اور فریب میں مبتلا نہ ہو بلکہ حقیقت شناس بنو۔ مادہ کے لئے قرب میں عیب ہوتا ہے اور کبھی اہل اسرار و راز داروں کے لئے عیوب کی نفی ہو جاتی ہے۔"

الکامل جس کا مبدأ وجود عقل مقدس ہوتی ہے۔ وہ ہے جو اسباب کی فراہمی کے وقت نفس کے وجود کا تقاضا کرتا ہے اور وہ جس نے بدن کی تدبیر کی اور نطفہ اور جنین کی شکل میں اور ان کے بعد کے حالات میں حسن تخلیق سے پورا پورا فیصلہ کیا۔ جب اس کی بدنی ترتیب بکھری تو اس کو جبروت، قدرتی جلال کے سلسلہ میں شامل کر دیا گیا اور اس کی عقل کو اللہ کے ناموں میں سے ایک نام قرار دے دیا گیا اور اس کا نفس جزئی تصرفات اور ارادات حادثہ میں اس عقل کا خادم بن گیا۔ تب بالفعل وہ کمال پیدا ہوا جو اس سے پہلے پیدا نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ کبھی یہ عقل نفس کے واسطہ سے زمینی ربط کی طرف قصد کرتی ہے تو اس میں داخل ہو جاتی ہے اور انسان کو

پیدا کر دیتی ہے جو آدمیوں میں ایک آدمی ہو جاتا ہے۔اور اس تخلیق کی صورت یہ ہے کہ زمین سے تیار ایک حصہ کی طرف متوجہ ہوتی ہے، پھر پختہ ارادہ سے کام لیتی ہے اور جمعیۃ خاطر سے چاہتی ہے کہ انسان بن جائے۔اس طرح عقل کلی اور نفس کلی سے انسان کی صورت میں فیضان کے لئے سبب بن جاتی ہے۔اور کبھی اللہ کے بندوں میں سے کوئی دعا کرنے والا اس سے دعا کرتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ اس نفس کی قوت سامعہ سے سنتا ہے پھر جمعیۃ خاطر سے ہمت قویہ اس کی مدد کرتی یا اس کو بشارت دیتی یا اس سے بات کرتی ہے تاکہ اس جیسے نفس سے اچھی ساخت کے انسان کی شکل اختیار کرلے یا آگ سے مشابہت اختیار کرے جیسا کہ حضرت موسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلوۃ والسلام وغیرہ کے ساتھ کیا جس کی اس کی مصلحت متقاضی ہوتی ہے۔اور اس مشابہت کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اس کا ارادہ صورت مثالیہ کے منبع یعنی عالم مثال کے فیضان کا مددگار ہو جاتا ہے۔اس طرح ہیولی (مادہ) اس صورت سے تصور میں آنے لگتا ہے۔چنانچہ وہ بشارت وغیرہ کا جو ارادہ کرتا ہے، وہ مکمل ہو جاتا ہے۔اور کبھی اپنی ماؤں کے پیٹوں میں پیدا ہونے والے۔جنینوں میں سے کسی جنین کے بدن میں داخل ہو جاتا ہے۔ اور اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ جمعیۃ خاطر سے چاہتا ہے کہ انسان ایسا اور ایسا ہو جائے پس جیسا چاہتا ہے ویسا پیدا ہوتا ہے جیسا کہ ماں کا نفس اس کی طبیعت کے مطابق عمل کرتا ہے۔اور کبھی مصلحت انسان کی قوت کے ظہور یا پہاڑ کے پھٹنے جیسے خلاف عادت یا فضائی حادثوں میں سے کوئی عجیب حادثہ۔اس طرح اس نفس میں اس واقعہ کے مطابق صورت نقش ہو جاتی ہے۔ اس لئے عنایت رحمانی خیر مطلق اور پھر خیر نسبی کے لئے بہت فیاض ہے۔اور یہ عقل عنایت کی لڑی میں پروئی ہوئی ہے اور نفس اس کا خادم ہے۔اس لئے اللہ تعالیٰ سبحانہ جمعیۃ خاطر اور ہمت کے لئے اس نفس کے ارادہ کے مطابق ہی اس کے ظہور کا ارادہ کرتا ہے اور یہ اس کے بعد ہی ہوتا ہے کہ اللہ اس نفس سے اس کی انانیت سلب کر لیتا ہے۔چنانچہ اس کے اندر یہ خیال ہی باقی نہیں رہتا کہ وہ فلاں بن فلاں ہے بلکہ اس وقت اس کی ساری حقیقت یہ ہوتی ہے کہ وہ اللہ کے کمالات میں سے ایک کمال کی شرح ہے، اس کے علاوہ کچھ نہیں۔اب میں اس درجہ اور اس کی شان کی بلندی کیسے بیان کروں۔اس وقت حق سے اس کی خوشی و مسرت اس طرح ہو جاتی ہے جیسے حق تعالیٰ کی خوشی و مسرت خود اپنی ذات سے ہوتی ہے۔اور جیسے اللہ تعالیٰ کے

ناموں کی خود اپنے آپ سے فرحت و سرور۔ اور حق بات تو یہ ہے کہ فوز کبیر بہت بڑی کامیابی ہے۔ اور بالجملہ یہ امور ایسے ہیں کہ اگر موت نہ ہو تو ہم ان کو نہیں پا سکتے۔ ہائے موت کا شوق کہ ہم اس کے بعد ہی اللہ کے ناموں میں سے کسی نام کو دیکھ سکیں گے۔ اور حالت ایسی ہو گی کہ نہ ہی زبان نے اس کو بیان کیا اور نہ ہی کانوں نے اس کو سنا۔ واللہ اعلم

۴- تفہیم:

اسرار

لوگوں کو یہ بات پہنچاؤ کہ یہ فقیر مختلف زبانوں کا حامل ہے۔ ایک زبان سے ولی اللہ بن عبدالرحیم ہے۔ دوسری سے انسان ہے۔ ایک سے حیوان، دوسری سے نامی بڑھنے والا۔ ایک سے جسم، ایک سے جوہر، اور ایک سے موجود ہستی ہے۔ اور اس زبان کے اعتبار سے پتھر بھی، درخت بھی، گھوڑا بھی، ہاتھی بھی، اونٹ بھی، بکری بھی۔ لوگوں کے ناموں کی تعلیم کو میں تھا۔ اور جو کچھ نوح پر طوفان ہوا اور ان کی نصرت کا سبب ہوا، میں ہی تھا۔ جو کچھ ابراہیم پر گلزار ہوا، میں ہی تھا۔ موسیٰ کی توریت، میں تھا۔ مردے کو عیسیٰ کا زندہ کرنا میں تھا۔ مصطفیٰ کا قرآن میں تھا۔ والحمد للہ رب العلمین

۵- تفہیم:

صوفی کے علم کا حق جل شانہ کے علم کے ساتھ اتحاد

علم حق درعلم صوفی گم شود

این سخن کے باور مردم شود

"علم حق صوفی کے علم میں گم ہو جاتا ہے، یہ بات لوگوں کے لئے قابل یقین کیسے ہو سکتی ہے۔"

سالک ابتدا میں خود کو علم حضوری سے جانتا ہے اور خدا کو علم حصولی سے۔ جب وہ توحید سے مشرف ہوتا ہے، اس کا علم حضوری حق کے ساتھ نافذ ہو جاتا ہے۔ اور علم حصولی وقت استوا (نیم روز یا دوپہر) کے پیمانہ کے سایہ کے رنگ میں علم حضوری میں بے حقیقت یا گم ہو جاتا ہے۔ یہ بات نوافل کے قرب کے لحاظ سے ہے۔ عارف جب اس دنیاء فانی سے خلاصی پا لیتا ہے تو حق تعالیٰ کے جوار میں سے ایک جارحہ (آلہ قوت) اور اس کے حواس میں سے ایک

حاسہ ہوجاتا ہے۔ آج حق سبحانہ کی عالمیت موجودات سے مشابہ ہوگئی ہے۔ اس کی عالمیت سے صوفی کے تمام علوم کے اعتبار سے ان کے طبقات پر موجودات ہیں۔ علم حق اس میں پوشیدہ ہے اور ایک اعتبار سے سب کچھ علم حق ہے۔ صوفی کا علم ایک مثال ہے نہ کہ غیر۔ اس لئے کہ صوفی آج اسماء حسنی میں سے ایک اسم ہے۔ جیسا کہ فرمایا ہے اور اس کا قول حق ہے۔ **وھو الذی ینزل الغیث من بعد ما قنطوا وینشر رحمته وھو الولی الحمید** "وہی ہے جو لوگوں کے مایوس ہوجانے کے بعد مینہ برساتا ہے اور اپنی رحمت پھیلا دیتا ہے اور وہی قابل تعریف ولی ہے" (الشوری ۲۸)۔ تم بالکل نہیں جانتے کہ یہ کونسی صورت اختیار کرے گا۔ پھر کوئی نہیں کہتا کہ ولی کا باپ فلاں اور ماں فلاں ہے اور اس زمانہ میں اور اس مقام پر بشر تھا۔ اسی نکتہ پر صلح کرلو، مستی میں گیت یاد دلانے میں مصلحت نہیں ہے۔

۶- تفہیم:

ہر ایک کیلئے نقطۂ لاہوت یا نقاط جبروت کی قربتوں میں سے ایک قربت ضروری ہے

بشنواز نے چوں حکایت میکند
واز جدائیہا شکایت میکند

"بانسری کی آواز سنو جب وہ حکایت بیان کرتی ہے اور جدائی کے بارے میں شکایت کرتی ہے۔"

کز نیستاں تا مرا ببریدہ اند
از نفیرم مردوزن نالیدہ اند

"کہ جنگل سے جس سے مجھے کاٹ کر لاتے ہیں، میرے نالہ وفریاد سے مردوزن روتے ہیں۔"

گر نگرد دباز مسکین زین سفر
نیست درعالم از و مجبور تر

"اگر مسکین اس سفر سے واپس نہیں لوٹتا تو دنیا میں کوئی اس سے زیادہ پریشان ومجبور نہیں ہے۔"

ہر شخص کے لئے نقطۂ لاہوت (ذات الٰہی) یا نقاط جبروت (طریقۂ صفات) کی تدلیات میں سے ایک تدلی ضروری ہے، اور معاملہ اسی طرح چلتا ہے، یہاں تک کہ انسان اللہ تک پہنچ جاتا ہے اور یہ عالم مومن کا درجہ ہوتا ہے۔ اور ہر شخص کو اپنے معاد کی سیر میں اس نقطہ تک پہنچنا پڑے گا جو وجود کا مبدا ہے، وہاں پہنچ کر مضمحل ہو جائے گا۔ اور جو اس کے وجود کے مبدا کا نقطۂ لاہوت ہے، وہ اکسیر اعظم ہے۔ کبریت احمر صدیاں گذرنے کے بعد وجود میں آتا ہے۔ قوائے فلکیہ اور طبائع عنصریہ سے جدائی کے وقت اس کو عجیب حالت پیش آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اسم اعظم ہوتا ہے اور قیومیۂ حق دنیا میں اس کے واسطہ سے ہوتا ہے۔ اس وقت رحمت کے درجہ پر پہنچتا ہے اور اس جگہ سچی دوستی پیدا کرتا ہے۔ وہ اس کو نگل لیتا ہے اور یہ اس کو۔ پھر معاملہ ظاہر نہیں ہوتا۔

۷- تفہیم:

وجدان- واقعہ کے مطابق ہی ہوتا ہے، اس پر اعتراض اور اس کا جواب

وجدان ذاتی طور پر صرف واقعہ کے مطابق ہی ہوتا ہے۔ اس قاعدہ پر وہ اعتراض وارد ہوتا ہے جس کے بارے میں ایک شخص نے مجھ سے سوال کیا تھا۔ اس نے کہا تم شیخ محی الدین بن عربی کے ان دو باہم متضاد اقوال کے بارے میں کیا کہتے ہو جن میں سے ایک لازمی طور پر سچا اور دوسرا جھوٹا ہے؟ میں نے کہا اس کا تعلق زبانوں کے اختلاف سے ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ اس ذات انسانی کی بہت سی حقیقتیں ہیں اور ہر حقیقت کے کچھ خواص اور علوم ہیں۔ اور ہر خاصہ کی ایک زبان ہے جس کے ذریعہ تعبیر کی جاتی ہے۔ اس طرح عارف کبھی حقیقت شخصی کی طرف متوجہ ہوتا ہے، کبھی حقیقت انسانی کی طرف۔ اِس طرح کبھی حقیقت حیوانی اور نامی کی طرف اور کبھی وجود ناسوتی و عالم اجسام کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ کبھی وجود روحانی کی طرف اور کبھی وجود جبروتی (خدا کے جلال) کی طرف۔ اور وہ ہر زبان میں بات کرتا ہے۔ جب کہ یہ ضروری نہیں ہوتا کہ ایک ہی حالت میں تمام زبانوں کو جمع کرے۔ اس طرح کبھی ایک حقیقت میں ہوتا ہے اور اس میں بات کرتا ہے اور دیگر حقائق کو بھلا دیتا ہے۔ پھر کسی دوسری حقیقت میں ہوتا ہے۔ اس لئے اس کے کلام میں اختلاف نظر آتا ہے

جب کہ حقیقت میں کوئی تناقض نہیں ہوتا۔

سوال کرنے والے نے کہا تم شیخ کے کلام میں فرعون کے ایمان اور اس کے کفر سے متعلق جیسے اختلاف کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ میں نے کہا کہ وجدان حقیقت میں یہ ہے کہ تم اپنے آپ میں کچھ محسوس کرو مثلاً جس کا معدہ خالی ہوتا ہے، وہ بھوک محسوس کرتا ہے۔ اور جس کو متلی کی شکایت ہوتی ہے، وہ بھاری پن محسوس کرتا ہے۔ اس طرح اگر تم اپنے نفس یعنی مزاج کی طرف اس صورت میں متوجہ ہو کہ وہ شر کے فیض کو قبول کرے، تو تم معاصی اور زمین میں فساد انگیزی کی طرف کشش محسوس کرو گے، اور اگر اپنے جسم کی طرف توجہ کرو گے تو کھانے پینے کی چیزوں کی اور ان تمام چیزوں کی جن سے بدن کو تقویت حاصل ہو یا جن کو بدن چاہے اور تقاضہ کرے، ان کی محبت تمہارے اندر پیدا ہوگی۔ اور اگر اپنے دل یعنی روح کی طرف دھیان دو گے۔ اس طرح کہ طبیعت سے اختلاط کرے اور شر والے نہیں بلکہ ملکی فیض کو قبول کرے تو ملائکہ کا الہام، کشادہ دلی اور وسعت نظر پاؤ گے۔ اور اگر اپنی روح یعنی اپنے اس وجود کی طرف دھیان دو گے جس کے بارے میں رب العالمین نے انسان کی تخلیق سے دو ہزار سال قبل فیصلہ کر دیا تھا تو تم سے ہر وہ شر دور ہو جائے گی اور ہر قسم کا شرح صدر ہوگا نور اور لوگوں کی اصلاح والفت کا جذبہ ہوگا۔ فرشتے الہام کریں گے اور حکم مثالی باقی رہ جائے گا۔ اسی میں فلکی قوتیں شامل ہیں۔

پھر جب تم اپنے اندرون کی طرف دیکھو گے تو وجود میں صرف ایک تدبیر پاؤ گے جو مختلف رنگوں میں نظر آئے گی۔ اس طرح یہ سب وجدان کی قسمیں ہیں۔ یا یہ کہ تم اپنے نفس میں ایسی حالت پاؤ جو تمہارے اندر اس وقت جب تم بلند یا پست حقیقت کی طرف توجہ کرو، اس طرح نقش ہو جائے جیسے صورت آئینے میں نقش ہو جاتی ہے۔ تب تم اپنے نفس میں نقش ہونے والی اس حالت کو اس کے ملاحظہ کے لئے آلہ بنالو جس پر وہ شے پائی جاتی ہے۔ جیسا کہ تم آئینہ کو اس شے کے ملاحظہ کا ذریعہ بناتے ہو جو تم سے مخفی ہے۔ یہ وجدان کی دوسری نوع ہے۔

اس طرح خارجی طور پر پائی جانے والی اشیا کے وجدان سے علم کئی طرح سے ہوتا ہے۔

ان میں سے ایک یہ ہے کہ کوئی شے آپ کے خواب میں کسی شکل میں آئے یا آپ سے کوئی فرشتہ گفتگو کرے۔ یہ صورت حس سے گڈمڈ ہوتی ہے اور اکثر امور میں تعبیر کی محتاج

ہوتی ہے، سوائے نبی مرسل کے۔ اوران میں سے ایک یہ ہے کہ تم اللہ کی تخلیق میں اس کی تدبیر کی طرف متوجہ ہو۔ اس مقام پر شے کی کچھ آمادگی اور کچھ تقاضے ہوتے ہیں اور کچھ تقاضے اس کے عدم کے ہوتے ہیں۔ پھر رحمٰن وکریم خیر نسبی کا فیصلہ کرتا ہے تو کبھی تمہارے اندر ایک تقاضہ نقش ہو جاتا ہے اور تم اس کے ذریعہ بات کرتے ہو۔ اور تقاضوں کے اجتماع اور اس ون رحمٰن کی طرف سے خیر کے فیصلہ کے بعد اس کی طرف جو امر لوٹتے ہیں، وہ نقش نہیں ہوتے۔ تو اس طرح کے معاملات میں اختلاف اور تناقض واقع ہو جاتا ہے۔ لیکن عارف کا مقصد صرف اس تقاضہ کو بیان کرنا ہوتا ہے۔ اور جو کچھ وہ کہتا ہے، اس میں مثبت اور منفی کے لحاظ سے وہ سچا ہوتا ہے۔ اس کی غرض واقعہ سے صرف فرض کے طور پر ہوتی ہے اور اس کے قول کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اگر یہ تقاضا متحقق ہو جائے اور اس کے لئے حکم ہو اور معاملہ اس طرح ہو۔ پھر اگر آپ پوری طرح غور وفکر سے کام لیں گے تو آپ کو وجدان میں تناقض نہیں ملے گا۔

۸- **تفہیم:**

ذات باری کے بارے میں غور وفکر اور
خطاب عجیب سے مخاطب کیا جانا

ایک دن میں باری تعالیٰ کی ذات اور اس کے شرف وعظمت کے بارے میں غور وفکر کرنے لگا جو بڑے پردوں کے پیچھے پوشیدہ ہے۔ اس حالت میں مجھے عجیب طرح سے خطاب کیا گیا۔ مجھ سے کہا گیا کہ اس عالم میں انسان پر واجب ہے کہ اس کی توجہ ان کی توجہ کی طرح اور اس کی عظمت وشرف ان کی عظمت اور شرف کی طرح ہو۔ اور محسوس ہوا کہ اشارہ جنات کی صنف کی حقیقت کی طرف ہے۔ **اللہ اعلم من شانھم** : جب صورت ان کے نفوس یا خیال کی لوح میں نقش ہوئی تو قائم ودائم ہو گئی اور زائل ہی نہیں ہوئی۔ گویا کہ اس پر سیاہی غالب آ گئی۔ اس طرح اس کا خلاصہ خیالوں میں جاگزیں ہو گیا۔ اس طرح وہاں سے صورت کا محو ہونا دشوار ہو گیا۔ اور جب ان سے کسی چیز کی پسندیدگی قوت عزم میں جاگزیں ہو گئی تو پھر ایسا قصد وعزم ہو گیا کہ چھ ماہ تک بلکہ سال دو سال تک اس کا خیال نہ نکل سکا۔ واللہ اعلم۔ پس اس عالم کا کمال اس کے لئے ہوتا ہے جس کی روح قوی اور خشک ہو اور اس کی شان

یہ ہو کہ جب اس کے خیال میں ایک صورت بیٹھ جائے تو پھر زائل نہ ہو۔

۹-تفہیم:

کسب اور کمائی کی قسموں کا بیان

تجلی الٰہی چمکی۔ جس کی تعبیر یہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے کمانے والے بندوں کے لئے کسب وکمائی کی کئی قسمیں قرار دی ہیں جن سے ان کی معاشیات قائم ہوتی ہیں۔ ان قسموں میں سے ایک ان افعال پر مبنی ہے جو قوائے حیوانیہ سے صادر ہوتے ہیں جیسے باربرداری اور کاشت کرنے والے وغیرہ کے کام۔ اور ان میں سے ایک قسم ان افعال پر مبنی ہے جو ان قوائے حیوانیہ سے صادر ہوتے ہیں جو قوائے انسانیہ کے نور سے سجائے وسنوارے جا چکے ہوں۔ جیسے باریک بینی والی صنعتیں وغیرہ جن کے لئے فہم وذکاوت کی حاجت ہوتی ہے۔ اور ان میں ایک قسم ان افعال پر مبنی ہوتی ہے جو قوی انسانیہ سے صادر ہوتے ہیں۔ جیسے غزوات میں حصہ لینے والے اور شہروں کا نظم ونسق کرنے والے۔ اور ان میں ایک قسم ان افعال پر مبنی ہوتی ہے جو قوائے انسانی سے انوار ملکی کے نور سے تہذیب واصلاح کے بعد صادر ہوتے ہیں۔ جیسے اصحاب علم حاملین قرآن اور واعظ۔

اور کسب وکمائی کی سب سے اعلیٰ قسم وہ ہے جو انوار ملکی کے نور سے سجے سنورے قوائے انسانی سے صادر ہونے والے افعال پر مبنی ہے اور یہ دنیا میں سب سے کم پائے جاتے ہیں۔ تاہم یہ کبریت احمر سے بھی زیادہ قیمتی ہوتے ہیں۔ اور یہ وہ افعال ہوتے ہیں جن کی کمائی دعا ہوتی ہے۔ کہ جب بھی کسی چیز کی ضرورت ہوتی ہے اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے دعا کرتے ہیں تو اللہ ان کی دعائیں قبول کر لیتا ہے۔ تجلی کہتی ہے اللہ تعالیٰ نے تم پر یہ احسان کیا کہ تمہاری فطرت کو کسب وکمائی کی اعلیٰ انواع میں بنایا۔

۱۰-تفہیم:

احکام ظاہرہ میں انبیا اور اولیا کے درمیان فرق

روایت ہے کہ علی کرم اللہ وجہہ کو اپنی زرہ ایک یہودی کے پاس ملی تو فرمایا یہ میری زرہ ہے۔ لیکن یہودی نے آپ کے دعویٰ کو تسلیم نہیں کیا اور زرہ آپ کو دینے سے انکار کر دیا تو آپ

مقدمہ قاضی شریح کے پاس لے گئے۔ وہاں قاضی شریح نے دلیل طلب کی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ابورافع اور حسن بن علی کو پیش کیا۔ تب قاضی شریح نے کہا جہاں تک حسن کا سوال ہے تو وہ آپ کے بیٹے ہیں، اِس لئے ان کی گواہی آپ کے حق میں قبول نہیں کی جائے گی۔ جواب میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ آپ نے عمر بن خطاب کو نبیؐ سے یہ روایت کرتے ہوئے نہیں سنا انهما سيد اشباب اهل الجنة "یہ دونوں (حسن وحسین) اہل جنت میں سے نوجوانوں کے سردار ہیں؟" اب اگر آپ کہتے ہیں کہ حسنین رضی اللہ عنہما کی طرح علی کرم اللہ وجہہ بھی ان لوگوں میں شامل ہیں جن کو جنت کی بشارت دی گئی ہے۔ پھر انہوں نے قاضی شریح کو دلیل طلب کرنے پر یہ جواب کیوں نہیں دیا کہ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جن کو جنت کی بشارت دی جا چکی ہے کہ ان کا ظاہر صدق پر مبنی ہے اور دعویٰ کی سچائی نبیؐ کی بشارت سے واضح ہے۔ یہ امر اس سے بھی زیادہ مکمل ہے جو دلیل وثبوت سے واضح ہوتا ہے۔ پھر گواہوں کے سلسلہ میں علی کے سلسلہ میں اجتہاد کی مخالفت کے جواب میں نبی علیہ الصلوۃ والسلام کا قول اقضاكم علی "تم میں سب سے زیادہ صحیح فیصلہ کرنے والے علی ہیں" اور یہ ارشاد اللهم ادر الحق معه حيث دار (اے اللہ! حق کو ان کے ساتھ ساتھ گھمادے، جدھر بھی وہ گھومیں۔" پھر ان تمام امور میں شریح سے بحث کو ترک کرنے اور ان کو ایک جواب دینے اور دوسری بات کو چھوڑ دینے کی کیا وجہ ہے؟

میں کہتا ہوں کہ جن لوگوں کو نبیؐ کی زبان مبارک سے جنت کی بشارت دی گئی ہے، وہ دوسرے تمام لوگوں کی طرح نہیں ہیں اور نہ ہی ان کو ان کے ماسوا دوسروں پر قیاس کیا جائے گا کہ وہ خبائث سے بری ہیں۔ برے افعال اور شیطانی وسوسوں کی گندگی سے پاک ہیں۔ ان پر کوئی تہمت نہیں لگائی جاسکتی۔ اور ان کے بارے میں صرف وہی ظن وگمان کیا جاسکتا ہے جو ان کے شایان شان ہو۔ لیکن وہ بھی آسمانی شریعتوں پر عمل کے پابند ہیں اور وہ بغیر کسی امتیاز کے تمام انسانوں پر شرعی قوانین کے انعقاد کے سلسلہ میں دوسرے لوگوں کے ساتھ مشترک ہیں۔ چنانچہ ان کی مثال خوش حال مسافر جیسی ہے کہ اس کے لئے نماز کا قصر اور روزہ کا افطار کرنا دونوں جائز ہیں۔ کیونکہ ارشاد باری و ان كنتم على سفر (البقرہ ۲۸۲) میں لفظ سفر کے ساتھ شرعی قانون بیان کیا گیا ہے۔ اگرچہ وہ حکمت جس نے سفر کو اس کے لئے سبب قرار دیا یعنی دشواری وہ یہاں مفقود ہے۔ یہی معاملہ شرع میں وارد ہونے والا فرمان نبوی

البينة على المدعي واليمين على من انكر ہر ایک کے لئے ہے۔ حضرت علی کے لئے تسلیم کرنے کے سوا کچھ بھی ممکن نہ تھا۔ اگر چہ وہ حکمت جس نے اس کو شرعی قانون بنایا کہ لوگ اپنے مالوں اور خون کا دعویٰ کریں، یہاں مفقود ہے۔ اور اس طرح ان کو احکام ظاہرہ اور مناظرات میں دیگر تمام لوگوں سے اس فہم کی بنیاد پر ممتاز قرار نہیں دیا جا سکتا جس سے اللہ تعالیٰ نے خصوصیت کے ساتھ ان کو نوازا تھا۔ ورنہ ان کی اطاعت فرض قرار پاتی اور وہ انبیا کے مقام پر پہنچ جاتے کہ من اطاعهم اطاع الله ومن عصاهم فقد عصى الله "جس نے ان کی اطاعت کی، اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے ان کی نافرمانی یا مخالفت کی، اس نے اللہ کی نافرمانی کی"۔ پردہ زائل ہو گیا۔ اور تکلیف لازم ہو گئی اور یہ حکمت کا مقتضی نہیں ہے کہ یہ صرف نبی کے ساتھ خاص ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وما كنا معذبين حتى نبعث رسولا "اور ہم عذاب دینے والے نہیں ہیں جب تک کہ (لوگوں کو حق و باطل کا فرق سمجھانے کے لئے) ایک پیغمبر نہ بھیج دیں (بنی اسرائیل ۱۵)۔ اس طرح تکلیف صرف ازالۂ خفا اور بعثت و دعوت کے ثبوت کے بعد ہی دی جا سکتی ہے۔ اس لئے علی کرم اللہ وجہہ اپنے اجتہاد کے سلسلہ میں لوگوں کے الزام سے بچنے کی غرض سے خاموش رہ گئے۔ حالانکہ آپ کا اجتہاد نبی کی دعا کی بنیاد پر حق تھا۔ اور جب شہادت کی عدم قبولیت مسئلہ اجتہادی پائی گئی اور یہ بات منصوص تھی ممن ترضون من الشهداء "گواہوں میں سے جن سے تم راضی ہو" تو قرابت و عداوت سے تہمت کے اسباب کا استنباط کیا اور اس کو بندہ کے سلسلہ میں عیب پایا۔ شہادت میں ان کے لئے پسندیدہ بات یہ تھی کہ اجتہاد کو ناقص قرار دیتے اور جن لوگوں کو جنت کی بشارت دی گئی ہے، ان کو ان کے قاعدہ سے مستثنیٰ قرار دیتے۔ اس لئے کہ اجتہادی قوانین ان پر لازم نہیں آتے۔ اور جان لو کہ افراد اور اولیا اس سارے معاملے میں ان لوگوں کی طرح ہیں جن کو جنت کی بشارت دی گئی ہے۔ اور یہ بھی جان لو کہ یہ لوگ اگر چہ تمام عیبوں اور گناہوں سے بری اور پوری طرح پاک ہیں، پھر بھی لوگوں کو ان کے ساتھ مکلف نہیں کیا گیا ہے۔ اور نہ ہی ان کی اطاعت کو فرض قرار دیا گیا ہے۔ اور کسی شخص کا ہر علم میں حق کہنے والا ہونا، اس کو مفروض الطاعت نہیں بناتا یعنی اس کی اطاعت کو فرض قرار نہیں دیتا جیسا کہ شیعوں نے اس کا ذکر اس امر کے جواز کے لئے کیا ہے کہ نہ خفا دور ہو اور نہ لوگوں پر حجت لازم آئے۔

۱۱- تفہیم:

کہنے والے کا قول کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنے کا کوئی فائدہ نہیں، اور اس کا جواب

الحمد لله رب العلمين والصلوة والسلام علی سیدنا محمد واله اجمعین. امابعد. کہنے والے کا یہ کہنا خلاف نص ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوۃ، درود بھیجنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ صلوۃ کے معنی رحمت یا عزت وشرف بڑھانا یا جزاو بدلہ دینا ہے۔ اور نبیؐ اس مقام پر پہنچ چکے ہیں کہ اس پر کوئی زیادتی نہیں ہوسکتی۔ نص یہ ہے کہ من صلی علی واحدة صلی الله علیه عشرا ''جس نے مجھ پر ایک بار صلوۃ درود بھیجی، اللہ اس پر دس بار درود بھیجے گا۔'' اس طرح یہ فائدہ خود صلوۃ درود بھیجنے والے کو ہی ہوتا ہے۔ پھر اس عمل کے ثواب کا سبب بننے کی علت کے بارے میں بحث کرنا جائز نہیں ہے جیسا کہ تمام اعمال کی جزاؤں کے سبب کی علت کے بارے میں بحث کرنا جائز نہیں ہے۔ اس لئے کہ عمل کے ثواب وعقاب کا سبب ہونے کے معنی میں حسن وقبح اہل سنت کے نزدیک شرعی ہیں۔ اور تمام دیگر امور سے قطع نظر نبیؐ کے لئے سوال کے آپؐ سے محبت وخلوص اور رب کی طرف تضرع کی جہت سے ثواب کا سبب ہونے میں کوئی بعد نہیں ہے۔

پھر کہنے والے کا کہنا کہ نبی علیہ الصلوۃ والسلام کے لئے کوئی کمال منتظر نہیں ہے بلکہ آپ کو تمام کمالات حاصل ہو چکے ہیں۔ اگر ہم اس قول سے علم ظاہر کے لحاظ سے بحث کریں تو کہیں گے کہ کمال ایک ایسی صفت ہے جس سے صاحب صفت کی مدح وتعریف کی جاتی ہے۔ اور کتنی ہی صفات کے بارے میں صحیح احادیث اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ وہ آپ کو قیامت کے دن حاصل ہوں گی۔ جیسے شفاعت اور جس طریقہ کی حمد کا ذکر حدیث میں آیا ہے اور جن نعمتوں کا اللہ تعالیٰ نے جنت میں دینے کا وعدہ فرمایا ہے۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ وہ کمالات ہیں اور وہ بالفعل حاصل نہیں ہیں بلکہ ان کا اللہ نے وعدہ کیا ہے۔ اب اگر کوئی یہ دلیل دیتا ہے کہ جس چیز کا آپ کے لئے ہونا ممکن ہے، اگر وہ آپ کو حاصل نہیں ہے تو اس سے نقص لازم آتا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ نقص منفی یہ ہے کہ گناہوں اور عیوب سے متصف کیا جائے۔ یہ

کیسے ہوسکتا ہے جب کہ اللہ تعالیٰ نے بالآخر آپ کے لئے آپ کے دین کو پوری طرح بیان کردیا اور آپ کو فتح مبین عطا فرمادی۔ باوجودیکہ آپ کو نہ اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد نقص سے متصف فرمایا۔ اور یہ کیسے ہوسکتا ہے جب کہ انبیا علیہم السلام میں سے اللہ نے بعض کو بعض پر فضیلت عطا فرمائی۔ تو جس کو فضیلت حاصل ہے، لامحالہ اس کو ایسا کمال حاصل ہے جو اس کے لئے مخصوص ہے۔ جس پر فضیلت عطا کی گئی ہے، اس میں وہ کمال نہیں پایا جاتا۔ جب کہ اس کو ناقص بھی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ پھر یہ جاننا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ ان سے صفات الواجب جل مجدہ، علم بالغیب، تخلیق عالم پر قدرت وغیرہ کی نفی کی جائے اور یہ بھی کوئی نقص نہیں ہے۔ اور انبیاء علیہم السلام کا بھوک، پیاس، فقر وحاجات وغیرہ سے متصف کیا جانا ثابت ہے، اور یہ بھی کوئی نقص نہیں ہے۔ اور نبی کا ایسی صفات سے متصف نہ کیا جانا جن کی بنیاد پر ان کے بعض امور میں لوگوں کی مدح کی جاتی ہے کیونکہ ان کے اشرف وافضل ہونے کا ثبوت ہے جیسے لکھنا اور شعر کہنا اور جو اس سے متعلق ہیں نقص نہیں ہے۔ اور بالجملہ نقص کے کوئی معنی نہیں ہیں بلکہ آنے والے امور میں کمال ہیں یا آپ کی صنف، یا نوع قریب یا جنس بعید یا واجب اور ممکن سے زیادہ عام موجود کی شان ہے، بلکہ وہ امور ہیں جن کو شرعاً یا عرفاً عیب قرار دیا جاتا ہے۔

اور اگر ارشاد باری تعالیٰ **اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی** "میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کردیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کردی" (المائدہ ۳) سے دلیل لیتا ہے تو ہم کہیں گے کہ دین کے مکمل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ نہ اس کے بعد کوئی حکم منسوخ کیا جائے گا اور نہ اس میں کوئی زیادتی کی جائے گی اور نعمت کے تمام پوری کرنے کا مطلب ان کے ماسوا پر ان کو فضیلت اور بلند درجات عطا کرنا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ میں ارشاد فرمایا **ویتم نعمته علیک** "اور تم پر اپنی نعمت پوری کرے گا" (یوسف ۳) پھر اس آیت میں خطاب آپ تک محدود نہیں ہے بلکہ آپ ساری امت کے ساتھ مخاطبوں میں شامل ہیں۔ اب اگر اس آیت سے یہ دلیل پکڑی جائے کہ کوئی کمال آپ کا منتظر نہیں، سب کچھ حاصل ہو چکا ہے تو یہی بات آپ کی امت کے لئے بھی لازم آئے گی جب کہ اس کا کوئی مطلب ہی نہیں ہے۔ اور اگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے

اس ارشاد سے دلیل لی جائے فتجلی لی کل شی ''میرے لئے ہر چیز واضح ہوگئی'' تو ہم کہیں گے کہ یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے في التوراة تفصيلا لكل شيء ''تورات میں ہر چیز کی تفصیل دیدی گئی ہے''۔ کہ عام امور میں اصل مناسب تخصیص ہوتی ہے۔ اور اگر یہ بات تسلیم کرلی جائے تو یہ اللہ کے اپنا ہاتھ آپ کے کاندھوں کے درمیان رکھنے کے وقت ہے پھر جب وہ دور ہوگیا تو اس میں کوئی بعد نہیں رہا کہ ان امور کی تعلیم دوبارہ دوسری حالت میں نعمت مشکورہ کے طور پر ہو۔ اور ان سب کے بعد نعمتیں تعلیم میں منحصر نہیں ہوتیں بلکہ وہ نعمتوں میں سے ایک نعمت ہوتی ہے۔ جہاں تک شاعر کے قول کا تعلق ہے

فان فضل رسول الله ليس له

حد فيعرب عنه ناطق بفم

''بیشک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت کی کوئی حد نہیں ہے کہ جس کو کوئی بیان کرنے والا اپنی زبان سے بیان کرسکے۔''

پھر یہ جاننا چاہئے کہ ہمارے قول ليس له حد او غير متناه ''اس کی کوئی حد نہیں ہے یا اس کی کوئی انتہا نہیں ہے۔'' کے تین مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ حساب کرتے وقت ہمارے اندر جو طاقت پائی جاتی ہے۔ وہ عددوں میں محصور نہیں کی جاسکتی۔ جیسے ہم کہتے ہیں بنو تميم ليس لهم حد او هم غير محصورين ''بنی تمیم کی کوئی حد نہیں ہے یا وہ لامحدود ہیں۔'' اور اسی امر پر شاعر مندرجہ بالا شعر سے اشارہ کرتا ہے۔ مزید یہ کہ:

دع ما ادعته النصاری في نبيهم

واحكم بما شئت مدحا فيه واحتكم

''نصاری اپنے نبی کے بارے میں جو دعوی کرتے ہیں اس کو چھوڑ دو اور ان کی مدح کے سلسلہ میں جو چاہے حکم لگاؤ اور فیصلہ کرلو۔''

اور دوسرا یہ ہے کہ وہ نہ کسی حد پر رکتا ہے نہ اس سے تجاوز کرتا ہے۔ اس معنی میں متکلمین کا یہ قول ہے مقدورات الله تعالیٰ غير متناهية اللہ تعالیٰ کی مقدورات غیر متناہی ہیں'' اور تیسرا یہ ہے کہ شے بالفعل غیر متناہی ہو۔ اس بارے میں یہ قول ہے وجود مالا يتناهى محال ''غیر متناہی کا وجود محال ہے''۔ جہاں تک اس قول کا تعلق ہے لو صلى عليه مصل

بقولہ اللهم صل علی محمد بعدد معلوماتک فقبلت صلوتہ ''اگر نمازی نے آپ پر ان الفاظ میں صلوۃ درود بھیجی، اے اللہ! محمد پر اپنی معلومات کے عدد کے مطابق درود فرما تو نماز قبول ہو جائے گی۔'' کہ اس کا کوئی مطلب ہی نہ رہا۔ تو جاننا چاہئے کہ بظاہر یہ ایک مشکل سوال ہے اس لئے کہ اللہ کی معلومات غیر متناہی، لامحدود ہیں کیونکہ ان میں موجود، معدوم، واجب اور ممکن و ممتنع سب شامل ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ علم کا تعلق حقیقت ممتنع یا اس کے مفہوم سے ہے۔ اس لئے کہ یہ دونوں تقدیروں پر صادق آتا ہے کہ وہ معلوم ہے۔ تو اگر ہم ان کے عدد کے لحاظ سے صلوۃ فرض کرلیں تو ان میں برہان تطبیق جاری ہوگی لیکن ہمیں اس کی نظیر حدیث میں ملتی ہے جس میں آپؐ نے فرمایا سبحان اللہ مداد کلماتہ اور کلمات غیر متناہی ہیں جیسا کہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے لو ان ما فی الارض من شجرۃ اقلام الآیۃ (لقمان ۲۷) ''اس کے ظاہری معنی غیر متناہی ہونے کے ہی ہیں۔ اس لئے اس کی تاویل کرنا ضروری ہے۔ اور مجھے تو یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ تنزیہ اللہ تعالیٰ کے لئے ہر اس صفت کے ثبوت سے ثابت ہے جو مخلوقات سے اعلیٰ و برتر ہے۔ اس لئے کہ تنزیہ کے معنی اس کے حدوث کی صفات سے بعد کے ہیں۔ اور وہ اپنے سے اعلیٰ صفات کے اختلاف سے مختلف ہو جاتے ہیں۔ اس طرح سبحان اللہ مداد کلماتہ کے معنی وہ عظیم تنزیہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے لئے کلمات کے ثبوت کے اعتبار سے ثابت ہوتے ہیں۔ اس طرح اس کا یہ قول صرف ایک تسبیح ہوتا ہے جو تمام تسبیحات سے اعظم و برتر ہو۔ اسی پر قیاس کرتے ہوئے صلوۃ مذکورہ کا معنی ایسی عظیم رحمت کی طلب ہے جس کی عظمت غیر متناہی سے مشابہ ہو۔ اور اگر ہم اس بارے میں علم باطن کے لحاظ سے بحث کریں تو کمال کا مطلب اللہ تعالیٰ کا اس کے ناموں اور صفات کے ساتھ بقا ہوگا۔ اور اللہ نے عبد کے لئے تجلی کی اور اس کے قریب ہوا وغیرہ۔ اور عارف کے لئے ذات اسماء اور تجلیات سب کی طرف وصول برابر ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ وصول الی الذات کا مطلب اس کا علم و ادراک ہے، اور اس مسئلہ کے بارے میں محققین کے کلام سے ہم نے جو کچھ ذکر کیا ہے، اس کے خلاف جو وہم پیدا ہو، اس کا مطلب علم و احاطہ کی نفی ہے، نہ کہ نفس وصول کی نفی۔ اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ سالک جب اس حقیقت تک پہنچ جاتا ہے جس کو انا سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اس کو اس کے کم تروں سے دور کر دیتا ہے تو اس کا التفات، تحقق، تقرر اور وجود کی طرف ہو جاتا ہے اور ان سب کی اصل

وجود مطلق ہے اور اس کے نیچے بہت سی شکلوں میں مختلف منزلیں ہیں تو اس سلسلہ میں اس شکل اور منزل کے احساس سے ہر شکل اور منزل کے التفات کو پہچان لیتا ہے پھر مثال کا صرف مثال سے ادراک کرتا ہے اور روح کا صرف روح سے۔ اسی طرح رجعت قہقری ہوتی ہے یہاں تک کہ اس حقیقت کا ادراک کر لیتا ہے جس سے اوپر کوئی حقیقت نہیں تو وہاں وصول ہوتا ہے۔ وہاں نہ انا کے بغیر علم ہوتا ہے اور نہ ہی انا کے بغیر ادراک۔ اس نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شیخ عارف عفیف الدین التلمسانی نے بہت ہی اچھی بات کہی ہے

دعوا منکری فوزی بها یتفطروا
یحق لهاتیک القلوب انفطارها
وما ذا علی من صار خالافخدها
اغار ابوها ام تنبه جارها

''میری کامیابی کا انکار کرنے والوں کو چھوڑ دو کہ وہ پھٹ پڑیں۔ ان کے دل پھٹنے ہی کے لائق ہیں۔ اور اس پر کیا الزام ہے جو کہ ماموں ہو گیا اور اس کے رخسار پر کیا باپ نے غیرت کی یا اس کے پڑوسی کی نیند اڑی ہے۔''

اس طرح ان کے لئے کمال وصول الی الذات بالفعل متحقق ہوتا ہے۔ اور اسی طرح اسمائے تجلیات کے اصول سے فنا، بقا اور تحقق ہے۔ اس میں ان کے لئے حالت منتظرہ کا ہونا جائز نہیں ہوتا۔ ہاں اس کے بعد ان تمام نشاتوں سے جن کا انسان یکے بعد دیگرے تصور کرتا ہے۔ ہر نشاۃ سے خاص احکام ہوتے ہیں۔ گویا کہ ان دونوں اصولوں میں اس کا اجمالاً احاطہ کر لیا ہے۔ اب تفصیل کے سوا کچھ باقی نہیں رہا۔ اس طرح اس معنی میں کمال کی ترقیات غیر متناہی ہیں۔ تو ممکن ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو امت کی صلوۃ سے رحمت اور شرف و مرتبہ اور ثواب حاصل ہو، باوجودیکہ آپ کے لئے معنی اول میں کمال منتظر نہیں ہے۔

۱۲۔ **تفہیم:**

شیخ عبدالقادر الجیلانی کے قول ''حنفیہ، مرجئہ ہیں'' کے معنی

الحمد لله رب العلمین وصلی الله علی سید المرسلین وبارک وسلم وعلی آله وصحبه اجمعین. امابعد. مجھ سے ایک شخص نے غنیۃ میں امام

طریقت قطب الحقیقت شیخ عبدالقادر الجیلانی کے فرق غیر ناجیہ کے ذکر کے دوران ارشاد کردہ اس قول کے بارے میں سوال کیا جہاں انہوں نے مرجئہ کی بارہ قسمیں بیان کی ہیں اور ان میں ایک فرقہ حنفیہ کو بھی قرار دیا ہے۔ پھر تفصیل بیان کرنے کے بعد فرمایا۔ جہاں تک حنفیہ کا تعلق ہے وہ ابوحنیفہ نعمان کے اصحاب ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ایمان، اقرار، معرفت اور اللہ اور اس کے رسولوں اور جو کچھ اس کے پاس سے آیا ان سب کا اقرار ہے جیسا کہ کتاب الشجرہ میں برہوتی نے ذکر کیا ہے۔ اس شخص نے کہا کہ شیخ قدس سرہٗ کے اس قول سے خود انہی پر دو طرح سے اعتراض وارد ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ حنفیہ بالاتفاق اہل سنۃ میں سے ہیں۔ اس صورت میں شیخ کا ان کو فرق مرجئہ میں شمار کرنا، گمراہ قرار دینا اور ان کے سلسلہ میں غیر ناجی ہونے کا حکم لگانا صحیح نہیں ہے۔ اور دوسرے یہ کہ شیخ نے ان عقائد کو بیان کیا ہے جن کی وجہ سے مرجئہ کو مرجئہ کہا گیا ہے اور حنفیہ کو ان میں شامل کیا ہے تو ان کے کلام کا مقتضی یہ ہوتا ہے کہ حنفیہ ان عقائد کو مانتے ہیں جب کہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ شیخ نے کہا ہے کہ مرجئہ کا یہ نام اس لئے رکھا گیا ہے کیونکہ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ جب کسی مکلّف نے **لا الٰہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ** کہہ دیا اور اس کے بعد تمام معاصی کا ارتکاب کرتا رہا پھر بھی وہ بالکل بھی جہنم میں نہیں جائے گا۔ جب کہ اس میں ذرا بھی شک کی گنجائش نہیں کہ حنفیہ اس اعتقاد سے بالکل بری ہیں۔ میں نے اس شخص سے کہا کہ ارجاء (مرجئہ۔ ارجاء مصدر کا اسم فاعل ہے) کی دو قسمیں ہیں ایک ارجاء وہ ہے جس کا قائل سنت سے خارج ہو جاتا ہے۔ دوسرے وہ جس کا قائل سنت سے خارج نہیں ہوتا۔ اول وہ جو یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ جس نے اقرار باللسان اور صدق بالجنان کا عمل پورا کر لیا یعنی زبان سے اقرار اور دل سے تصدیق کر لی۔ اس کو معصیت، گناہ کوئی نقصان نہیں پہنچاتے۔ دوسرا وہ ہے جو یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ اگرچہ عمل ایمان کا حصہ نہیں ہے لیکن ثواب اور عذاب اس پر مرتب ہوتے ہیں۔ اور ان دونوں کے درمیان فرق کا سبب یہ ہے کہ صحابہ اور تابعین کا مرجئہ کو غلط قرار دینے پر اتفاق ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ عمل پر ثواب و عقاب مترتب ہوتے ہیں۔ اب ان کی مخالفت کرنے والا گمراہ اور بدعتی ہے۔

جہاں تک دوسرے مسئلہ کا تعلق ہے وہ ان مسائل میں سے نہیں ہے جن کے بارے میں سلف سے اجماع ظاہر ہوا ہے بلکہ دلائل متعارض ہیں۔ چنانچہ بہت سی حدیثیں، آیتیں اور امر اس

بات پر دلالت کرتے ہیں کہ ایمان، عمل سے الگ ہے اور بہت سی دلیلیں قول و عمل کے مجموعہ پر ایمان کے اطلاق پر دلالت کرتی ہیں۔ تنازعہ صرف لفظی ہے کیونکہ سب کا اتفاق ہے کہ عاصی گنہگار آدمی ایمان سے خارج نہیں ہوتا اور وہ عقاب کا مستحق ہوتا ہے۔ پھر دلائل اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ ایسا مجموعہ ہے اس کے ظاہر سے ذرا سی توجہ سے صرف نظر کی جا سکتی ہے۔

اور امام ابوحنیفہ دوسرے قول کے قائلین میں سے ہیں۔ اور وہ اہل سنت کے اکابر اور ائمہ میں شامل ہیں۔ البتہ ان کے مذہب کے پیروکاروں اور ان کی اتباع کرنے والوں میں فروعات میں مختلف آرا پیدا ہو گئی ہیں۔ ان میں سے معتزلہ بھی ہیں جیسے الجبائی، وابی ہاشم اور زمخشری۔ ان میں مرجئہ بھی ہیں اور دوسرے لوگ بھی ہیں۔ یہ لوگ فقہی فروعات میں امام ابوحنیفہ کی اتباع کرتے تھے۔ اصولی اعتقاد میں امام صاحب کی اتباع نہیں کرتے تھے۔ پھر بھی اپنے باطل عقائد کو امام ابوحنیفہ کی طرف منسوب کرتے تھے۔ اس طرح اپنے مذہب کی اشاعت کرتے تھے اور امام ابوحنیفہ کے بعض اقوال سے تعلق قائم کرتے تھے۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے حنفیوں میں سے اہل حق طحاوی وغیرہ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے امام ابوحنیفہ کے مذہب کو وضاحت اور تفصیل کے ساتھ بیان کیا اور آپ کی طرف جو باتیں ان لوگوں نے منسوب کر دی تھیں، ان کو چھانٹ کر الگ کر دیا۔ اس امر پر بہت سے اقوال شاہد ہیں۔ جس نے بھی کتابوں سے رجوع کیا ہے اس پر یہ سب مخفی نہیں ہیں۔ اس طرح حنفیہ اور اہل سنت کے درمیان عموم خصوص من وجہ کی نسبت ہے۔

جب آپ کو یہ معلوم ہو گیا تو یہ بھی جان لیجئے کہ شیخ رضی اللہ عنہ نے گمراہ مرجئہ فرقوں میں ان اہل ارجاء کا ذکر کیا ہے جو سنت سے خارج ہیں۔ اور اس لئے فرمایا انما سموا مرجئۃ الخ اور ان میں حنفیہ کا ذکر فرمایا یعنی ان لوگوں کا جو فروع میں امام ابوحنیفہ کا اتباع کرتے ہیں اور دعویٰ یہ کرتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ اس مذہب میں ان کے موافق تھے۔ پھر ان چیزوں کا ذکر کیا جو امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اقوال سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس لئے فرمایا زعم ان الایمان ھو الاقرار الخ. اب جب ہم نے اس طرح وضاحت کر دی تو دونوں اعتراض بیک وقت کمزور پڑ گئے۔ اور یہ ظاہر ہو گیا کہ شیخ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نہ امام ابوحنیفہ پر اتہام لگایا ہے اور نہ ہی حنفیہ میں سے ماتریدیہ پر۔ اعاذہ اللہ من ذالک اور مرجئہ میں

ان لوگوں کی طرف کچھ منسوب کیا ہے سو کیا ہے۔ وہ اپنی نسبت فروع میں امام ابوحنیفہ کی طرف کرتے ہیں اور آپ کے ظاہری قول سے اپنا تعلق بیان کرتے ہیں اور امام صاحب کے کلام کو بے موقع و محل استعمال کرتے ہیں۔

۱۳- تفہیم:

باری تعالیٰ جل مجدہٗ کا فیض

جب میں نے دیکھا کہ ایک کامل مرادات میں سے کسی چیز میں غور و خوض کر رہا ہے۔ اور اس کے زمانہ میں کوئی جماعت اس سے الجھ رہی ہے تو میں نے سمجھ لیا کہ معاملہ دو حال سے خالی نہیں ہے، یا تو یہ کہ اس مراد میں غور و خوض اور اس کی تحصیل میں کوشش کسی نشاۃ کے حکم کی تکمیل کے لئے ہوگی۔ اس نے بھوک، پیاس اور حرارت و برودت پر پیدا کیا ہے اور اس کا نفس ذکی اور مستعلی پیدا کیا گیا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اگر اس جبلت کا حکم اس کی پوری معاش میں چلتا ہے، یا یہ کہ قدر دنیا کی نشاۃ کے پورا ہونے سے پہلے ہی اس طرح جاری رہے کہ اس سے آثار صادر ہوں اور یہ جاہ و مرتبہ اور مال یا علم میں انتہا تک پہنچ جائے۔ یا کسی قطعۂ زمین میں امام ہو یا ملت میں کجی پیدا ہونے کے بعد اس کو درست کرنے والا یا اللہ کی زمین میں اس کا خلیفہ ہے جس کی طرف ہر مظلوم رجوع کرتا ہے۔ یا ہادی ہے جس کے ذریعہ اللہ اپنے بندوں کی جماعتوں کو ہدایت سے سرفراز فرماتا ہے۔ اس طرح جب بھی اس شے کے ظہور پر جس کو اللہ نے اپنے علم میں جو پہلے سے اس کے پاس موجود ہے، اس کے لئے مقدر کر دیا ہے، اسباب پیدا ہو جائیں گے، اس کے نفس کی لوح میں اس واقعہ کے لئے محبت کی صورت ڈھل جائے گی۔ اس لئے وہ اس کی تحصیل کے لئے کوشش کرے گا، اور اس کی تکمیل میں بہت محنت کرے گا۔ یہاں تک کہ جب مطلوب پورا ہو جائے گا نہ اس میں کوئی کوتاہی کرے گا، نہ کسی کمزوری سے کام لے گا، نہ کسی کا کوئی اثر قبول کرے گا جس کے لئے اس کو طلب کیا اور طویل مدت تک اس کے ساتھ رہا۔ اور آخری بات یہ کہ اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ نے اپنے بندوں میں سے کسی بندہ کے حق میں مقدر کر دیا کہ وہ ملت مصطفیٰ کے لئے مجدد بن جائے، اس کے اسرار کو بیان کرے جو اس کے سامنے آئیں جیسے کوئی تازہ نباتات ہو جس کو نہ ہاتھوں نے میلا کیا، نہ

ہی اس سے اوہام نے کھلواڑ کیا، نہ ہی اس کے بندوں کے کلیجے مشتاق ہوئے۔ اس کے علوم کی نہروں سے اپنی استعداد کے بقدر سیراب ہوتے ہیں اور خوب سیراب ہوتے ہیں۔ تو یہ بندہ ایسا ہے کہ اس کی تقدیر نے اس کے اندر اس راز کی تکمیل کے لئے ایک داعیہ ودیعت کر دیا ہے۔ اور کبھی کبھی میں اس کا اس حال میں مشاہدہ کرتا ہوں کہ اس کے ہاتھ میں نور کا نیزہ ہے اور وہ اللہ تبارک وتعالی کے گھر کی طرف چلتا ہے اور وہ نیزہ بڑھتا اور طویل ہو جاتا ہے یہاں تک کہ آسمان کی بلندی کو پہنچ گیا اور سورج کا نور بن گیا۔ پھر اس کا نور پوری طرح مکمل ہو گیا۔ زبانیں اس کا وصف بیان کرنے سے عاجز رہ گئیں۔ پھر اپنی سابقہ حالت کی طرف لوٹ گیا۔ اس وقت گردنیں اس کے سامنے جھک گئیں اور نفس تابع فرمان ہو گئے۔ پھر کچھ زمانہ کے بعد بادشاہوں اور امرا نے اس کی زیارت کی اور نیک وصالح لوگوں اور علما نے اس سے استفادہ کیا۔ اس طرح وہ باطل کے زوال اور حق کے ظہور کا سبب بن گیا۔ اس کے اوپر ظاہری وباطنی نعمتوں کی بارش ہونے لگی۔ اس کی ذریت واصحاب میں برکت دیدی گئی۔ پھر جب پینسٹھ سال کے درمیان میں پہنچا تو اس نے اس نشاۃ سے اس سے اوپر والی نشاۃ کی طرف انتقال کیا۔ تب اللہ کے جوارح اور اسباب میں شمار ہونے لگا۔ پھر ایسی عقل ہو گیا جس کی خدمت نفس کرتا ہے۔ اور وہ اس سے سننے، دیکھنے اور کلام کرنے لگا۔ میری اپنی ذات کی قسم! اگر وہ نہ ہوتا تو دنیا پیدا نہ کی جاتی۔

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز
ورنہ در محفل رنداں خبری نیست کہ نیست

"پردہ اٹھانے میں مصلحت نہیں ہے۔ پردہ اٹھانا مصلحت کے خلاف ہے، ورنہ رندوں کی محفل میں ہر خبر موجود ہے۔"

۱۴- **تفہیم:**

خوابوں کی تعبیر

ایک صاحب کے خوابوں کی تعبیر کے سلسلہ میں۔ جن خوابوں کے بارے میں لکھا گیا ہے، اگر وہ سؤ مزاج کے قبیل سے نہ ہوں جو کہ بیماری ہوتی ہے، وہ بقا کے حصول پر دلالت کرتے ہیں۔ اس لئے کہ بقا اس وقت تک درست نہیں ہوتی جب تک بندہ خود حضرت حق کی

شان کبریائی نہ دیکھے۔ بعض خوابوں میں خود کو عورتوں کی صورت میں دیکھتا ہے اور عورتوں سے متعلق کام انجام دیتا ہے۔ اس مسئلہ کی تحقیق یہ ہے کہ خواب میں جس چیز کو دیکھا گیا ہے یہاں اس کا مادہ سے پاک ادراک یہ ہے کہ اس بندہ کا نفس اس کے رنگ میں رنگ گیا اور اس میں فنا ہو گیا اور اس کے ساتھ اس کی بقا رہ گئی۔ لیکن جس معاملہ میں مادہ سے پاک اس ادراک کی شرح و بیان صورتوں اور مناسب قالب یعنی جسم کے قیام سے کرتے ہیں تو اگر یہ رنگ کامل ہو اور نفس کو تمام جہتوں، غضبیہ، شہویہ و حکمیہ وغیرہ سے گھیر لیتا ہے تو مجبوراً عورتوں کی صورت میں مشاہدہ کرتا ہے۔ اس لئے کہ قوت شہویہ کا ترتیب دینے والا عورتوں کی صورت کے سوا کسی چیز کا تصور نہیں کرتا کہ وہ اس قوت کا قبلہ ہوتی ہیں۔ اس فقیر نے کھنبایت میں خواب دیکھا گویا حضرت حق تعالیٰ ایک ایسے خوبصورت حسین جوان کی صورت میں سامنے آئے جو اپنی بیوی کے ساتھ کھیل رہا ہے اور اس کو چاندی کی ایک چیز دے رہا ہے اور میں بھی ان کے ساتھ ہوں اور ان کے ساتھ کھیل میں شریک ہوں اور چاندی دینے میں ان کے درمیان واسطہ کا کام کر رہا ہوں۔ درحقیقت قوت شہویہ کی بقا کی جہت سے وہ خوبصورت جوان میں ہی ہوں اور وہ چاندی فرمان الٰہی سے میرے حق میں دنیا کا مال و دولت تھا کہ عارف کے لئے ہر چیز قربانی ہو جاتی ہے جب کہ برے لوگوں کے حق میں جداگانہ تقرب پاتا ہے۔

اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حالت میں دیکھنا کہ بچہ کی دیکھ بھال کر رہے ہیں جو کہ آپ کی بہترین اور خاص صفت ہے۔ اور دوسرے کام کر رہے ہیں۔ یہ خاص طور سے فرائض سے قربت کے معنی میں ایک قسم کی صورت آرائی ہے۔ گویا حضرت حق جل مجدہ ملت کے سلسلہ میں کوئی معاملہ چاہتے ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مطلوبہ امر کی تکمیل کے سلسلہ میں جوارح اور عوامل کی حیثیت میں ہیں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح دیکھنا کہ مکہ فتح کر رہے ہیں اور چند لوگ بھاگ رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ قوم آپ کی رہنمائی سے ہدایت پا گئی ہے اور آپ کی سفارش سے ان کے اسلام نے قبولیت کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔ اس خواب میں دوسری بشارت یہ ہے کہ یہ طریقت کے معاملہ میں قدم کی پختگی پر دلالت کرتی ہے کہ ہم نے اس کو حضرت پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام سے سند متصل سے پایا ہے۔ حق سبحانہ تعالیٰ نے اس بندۂ عاجز اور تمام دوستوں اور مخلص احباب کو شریعت، طریقت اور

حقیقت کے آداب کے سلسلہ میں ثابت قدم قرار دیا کہ ہمیں سلسلہ مجددیہ کا علمبردار گردانے۔ وانہ لا یخلف المیعاد۔ ”وہ کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتا“۔ اور جہاں تک اس امر کا تعلق ہے کہ ہم نے ابتدائے کلام میں سوٗ مزاج سے عدم اختلاط کی جو قید لگائی ہے، اس کی صورت یہ ہے کہ اہل تحقیق کے ارشادات اس امر پر متفق ہیں کہ جو خواب کوئی بیمار دیکھے اور اس میں سوٗ مزاج کا دخل ہو تو اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ واللہ اعلم

۱۵- تفہیم:

ایمان کا بیان اس کی تمام صفات اور اطوار سمیت، اور ایمان کے ادوار کا بیان

تصویر: لفظ ایمان دو معنوں میں بولا جاتا ہے۔ ان میں سے ایک وہ ہے جس پر امن اور جان و مال کی حفاظت کے سلسلہ میں دنیاوی احکام نافذ ہوتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں لفظ کفر آتا ہے۔ اور اس کی بنیاد اللہ، اس کے رسول اور یوم آخرت کا یقین رکھنا اور زبان سے اقرار کرنا ہے۔ اگرچہ اس میں کتنی ہی خطائیں پائی جائیں۔ اس کو اسلام بھی کہا جاتا ہے اس لئے کہ لغت کے اعتبار سے اس کے معنی اطاعت اور اتباع کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے قالت الاعراب آمنا قل لم تؤمنوا ولکن قولوا اسلمنا ولما یدخل الایمان فی قلوبکم ”وہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے، ان سے کہو تم ایمان نہیں لائے بلکہ یوں کہو کہ ہم مطیع و فرماں بردار ہو گئے۔ ایمان ابھی تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا ہے۔“ (الحجرات ۱۵) اور دوسرے وہ ہے جس پر نجات، درجات کی کامیابی اور بندہ کا اللہ سے اس کے گروہ اور لشکر سے قریب ہونا جیسے آخرت کے احکام لاگو ہوتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں لفظ نفاق اور دل کا مرض آتا ہے اور اس کی بنیاد پر صحیح عقیدہ، پسندیدہ و نیک عمل اور بہترین مہارت ہے۔ اس طرح یہ نیکی کی تمام قسموں کے لئے ایک عام نام ہے اور اس میں کمی و بیشی ہوتی ہے اور یہ خارج و داخل بھی ہوتا ہے۔ اور جب بشاشت قلب، خوش طبعی کے ساتھ داخل ہو جاتا ہے تو ارتداد سے محفوظ ہو جاتا ہے۔

اور اسی طرح لفظ نفاق بھی دو معنی کے لئے بولا جاتا ہے۔ خواہ وہ لفظ کے اشتراک سے

ہو یا معنی کے اشتراک سے۔ ایک ظاہری طور پر اطاعت و فرماں برداری اور پوشیدہ طور پر کفر و انکار۔ اور ایسا کرنے والا جہنم کے سب سے نچلے طبقہ میں جائے گا۔ اور دوسرے بندہ کا گناہوں میں غرق ہونا اور اس حالت پر مطمئن ہونا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے **واطمئنوا بالحیوۃ الدنیا** ''وہ دنیاوی زندگی پر مطمئن ہیں'' اور لذتوں اور رسموں کا غالب ہونا۔ اور کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو کفر ظاہر کرتے ہیں اور ایمان چھپاتے ہیں، ایسا کرنا ہمارے نزدیک کبیرہ گناہوں میں سب سے بڑا گناہ ہے۔ اور اس کا حکم ان لوگوں جیسا ہے جنہوں نے استطاعت کے باوجود مکہ سے ہجرت نہیں کی تھی اور ان کے بارے میں نازل ہوا **ان الذین توفتھم الملئکۃ ظالمی انفھسم قالوا فیم کنتم قالوا کنا مستضعفین فی الارض قالوا الم تکن ارض اللہ واسعۃ فتھاجروا فیھا فاولئک ماواھم جھنم وسائت مصیراً** ''جو لوگ اپنے نفسوں پر ظلم کر رہے تھے جب ان کی روحیں فرشتوں نے قبض کیں تو ان سے پوچھا کہ تم کس حال میں مبتلا تھے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہم زمین میں کمزور و مجبور تھے۔ فرشتوں نے کہا، کیا خدا کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کرتے؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے۔ اور وہ بڑا ہی برا ٹھکانا ہے۔'' (النساء ۹۷) اور ان میں کچھ وہ ہیں جو عمل صالح کرتے ہیں اور نیکیاں و خیرات ملاتے ہیں۔ اور وہ بھی ہیں جو اعمال صالحہ اور اعمال سیئہ ملاتے ہیں۔ اور اسی طرح وہ لوگ بھی ہیں جو نفاق اور ایمان کے درمیان تردد میں مبتلا رہتے ہیں، اس شخص کی طرح جو ہمیشہ اس کے دربار میں حاضر رہتا ہے پھر بھی نماز نہیں پڑھتا یا شراب پیتا ہے۔

تاکید (استوار کرنا): یہ تفصیل قرآن کریم کی آیتوں اور رسول اللہ کی حدیثوں سے معلوم ہوتی ہے اس لئے ہم ان کا ذکر کرتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ وسلم نے فرمایا جس نے ہماری طرح نماز پڑھی اور ہمارے قبلہ کو قبلہ بنایا، اس کی طرف رخ کیا اور ہمارے ذبیحہ کو کھایا وہ مسلمان ہے۔ جس کا اللہ اور اس کے رسول نے ذمہ لیا ہے۔ تو اللہ کی ذمہ داری میں عہد شکنی مت کرو۔ اور فرمایا مجھے حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں سے جنگ کرو یہاں تک کہ وہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہیں اور نماز قائم کریں اور زکوۃ دیں۔ جب انہوں نے یہ کرلیا تو مجھ سے اپنے جان و مال کو محفوظ کرلیا، سوائے اسلام کے حق کے۔ اور فرمایا مجھے نمازیوں کو قتل کرنے سے منع کردیا گیا ہے۔

اور ایسے شخص پر مسلمانوں والے حکم کے اجراء پر اجماع ہے جس نے اپنی زبان سے

اسلام کا اقرار کرلیا اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے انما المؤمنون الذين اذا ذكر الله وجلت قلوبهم واذا تليت عليهم آياته زادتهم ايماناً وعلى ربهم يتوكلون، الذين يقيمون الصلوة ومما رزقناهم ينفقون، اولئک هم المومنون حقاً "سچے اہل ایمان تو وہ لوگ ہیں جن کے دل اللہ کا ذکر سن کر لرز جاتے ہیں۔ اور جب اللہ کی آیات ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے اور وہ اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے (ہماری راہ میں) خرچ کرتے ہیں۔ ایسے ہی لوگ حقیقی مومن ہیں" (الانفال ۲ تا ۴)۔ اور فرمایا انما المؤمنون الذين آمنوا بالله ورسوله ثم لم يرتابوا وجاهدوا باموالهم وانفسهم فی سبيل الله اولئک هم الصادقون "حقیقت میں تو مومن وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے۔ پھر انہوں نے کوئی شک نہ کیا اور اپنی جانوں اور مالوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ وہی سچے لوگ ہیں۔" (الحجرات ۱۵) اور فرمایا قد افلح المومنون، الذين هم فی صلوتهم خاشعون "یقیناً فلاح پائی ہے ایمان لانے والوں نے۔ جو اپنی نماز میں خشوع اختیار کرتے ہیں۔" (المومنون ۱-۲) اور اسی طرح جب جب بھی اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں مومنوں کی صفت بیان کی ہے، وہ صفت ایمان کی حقیقت کھولنے والی ہوتی ہے۔ دوسرے وہ ہے کہ جس کے بارے میں ہم چاہتے ہیں کہ اس موقع پر آپ کو سکھائیں۔ وراس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایمان کی تفسیر ہر ایک خیر سے کی ہے۔ چنانچہ فرمایا لدين النصيحة. المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده. اذا سرتک حسنتک وسائتک سيئتک فانت مومن. لا يؤمن احدكم حتى يحب لاخيه مايحب لنفسه. لا يؤمن احدكم حتى يكون هواه تبعا لما جئت به "دین خیر خواہی کا نام ہے۔ مسلم وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلم محفوظ ہوں۔ جب تمہیں اپنی نیکی سے مسرت اور برائی پر افسوس ہو تو تم مومن ہو۔ تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک اپنے بھائی کے لئے وہ پسند نہ کرے جو وہ اپنے لئے پسند کرتا ہو۔ تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کی خواہشات اس کے تابع نہ ہوں جو میں لایا ہوں۔" اور آپؐ سے ایمان کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا

الصبر والسماحۃ یعنی ایمان صبر اور فیاضی وسخاوت کا نام ہے۔اور اللہ تعالیٰ نے منافقوں کے بارے میں فرمایا یقولون لئن رجعنا الی المدینۃ لیخرجن الاعز منھا الاذل ''وہ کہتے ہیں ہم مدینہ واپس پہنچ جائیں تو جو عزت والا ہے، وہ ذلیل کو وہاں سے نکال باہر کرے گا۔'' (المنافقون ۸) اور ان کی صفات دھوکہ وفریب اور اللہ کی آیات کا جھٹلانا اور مذاق اڑانا بتائیں۔اور یہ بھی بتایا کہ وہ جہنم کے سب سے نچلے طبقہ میں ہوں گے۔اور حدیث میں ہے، چار چیزیں ایسی ہیں کہ جس شخص میں وہ ہوں گی وہ خالص منافق ہوگا۔اور جس میں ان میں سے کوئی ایک خصلت ہوگی، اس میں منافق کی ایک خصلت ہوگی، یہاں تک کہ وہ اس کو چھوڑ دے۔ وہ یہ ہیں کہ اس کے پاس کوئی چیز بطور امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت کرے۔اور بات کرے تو جھوٹ بولے،اور کوئی عہد کرے تو غدر، عہد شکنی کرے،اور لڑے تو گالیاں بکے۔اور فرمایا کہ یہ منافق کی نماز ہے کہ بیٹھا ہوا سورج کو دیکھتا رہتا ہے یہاں تک کہ جب وہ شیطان کے دونوں سینگوں کے درمیان پہنچ جاتا ہے تو کھڑا ہو کر چار ٹھونگیں مار لیتا ہے۔اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا واذا قاموا الی الصلوۃ قاموا کسالی یراء ون الناس ولا یذکرون اللہ الا قلیلا ''اور جب وہ نماز کے لئے اٹھتے ہیں تو کسماتے ہوئے محض لوگوں کو دکھانے کی خاطر اٹھتے ہیں اور اللہ کو کم ہی یاد کرتے ہیں۔'' (النساء ۱۴۲) اور فرمایا فاعقبھم نفاقاً فی قلوبھم الی یوم یلقونہ ''انہوں نے اللہ کے ساتھ جو بدعہدی کی اس کی وجہ سے ان کے دلوں میں قیامت کے دن تک کے لئے نفاق بٹھا دیا۔'' (التوبہ ۷۷)

احاطہ (گھیراؤ): یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے اس کی نوعیت کے لحاظ سے اس کے بدن کی ایک مخصوص ہیئت بنائی ہے۔اس لئے ضروری ہے کہ ہر فرد بشر کا چہرہ مُکھڑا، قدوقامت کے لحاظ سے معتدل، بڑے ناخن اور گول سر ہو۔اور اسی طرح اللہ نے اس کے ڈھانچہ کی بھی نوعیت کے لحاظ سے ایک مخصوص ہیئت بنائی ہے۔اس لئے ضروری ہے کہ اس کو عقل کا ایک ایسا درجہ حاصل ہو جو حیوانوں کے درمیان اس کے لئے مخصوص ہو۔اور اس کے ہر فرد کو حاصل ہو۔ہم ''الخیر الکثیر'' میں یہ بیان کر چکے ہیں کہ مرکز وجود اس کے حقائق میں سب سے نچلا درجہ ہے۔

اب یہ جان لینا چاہئے کہ کمال کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ وجود کی نشاۃ، پیدائش میں حق

ظاہر ہو۔ اور یہ کہ وہ شرور کی آلودگی سے پاک جبلت ہے، ایسی پاک جو روح کی تخلیق کے لائق ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کل مولود یولد علی فطرۃ الاسلام ''ہر بچہ فطرت اسلام پر پیدا ہوتا ہے''۔ اور اس کا راز خیر تام سے اس کی تخلیق میں اس کا قرب ہے لیکن اس کی دو قوتیں ہوتی ہیں، عاملہ اور عاقلہ۔ قوت عاملہ کھانے، پینے، لباس، نکاح اور ظلم پر انتقام اور اپنے ابنائے جنس پر تکبر کا تقاضہ کرتی ہے۔ جب کہ قوت عاقلہ کلام، احساس، تخیل اور وجود میں ہر قوت کا مطالبہ کرتی ہے اور اس کی شان یہ ہے کہ جب مشق ہو جاتی ہے تو ہر روز بڑھتی ہے۔ اور جب غالب آجاتی ہے تو نفس اس کی پیروی کرتا ہے۔ اور اس کا راز دنیا میں وجود کے مطابق فیض الٰہی کا تنہا جاری ہونا ہے۔ پھر جب ظرف وسیع ہو جاتا ہے تو اس میں پانی بھی کثرت سے آتا ہے۔ پھر جب دونوں قوتوں کے اقتضا میں وجود بھیجا جاتا ہے تو اس سے جڑیں زمین کی گہرائیوں میں چلی جاتی ہیں اور مستحکم ہو جاتی ہیں اور اس عالم میں آلودگی کی وجہ سے مطمئن ہو جاتی ہیں۔ اور روح متصلہ واحدہ ہے جیسا کہ بدن متصل واحد ہوتا ہے۔ پھر جب اس کے ایک طرف کا حصہ ماؤف ہو جاتا ہے تو آفت دوسری طرف منتقل ہو جاتی ہے۔ اور عالم ارواح کے قرب کے علوم میں سے یہ ہے کہ یہ سرکشی ایک طرح کی گرمجوشی ہے جو شیطان کی طرف سے پیدا کی جاتی ہے اور اس بارے میں ہم ''الخیر الکثیر'' میں بیان کر چکے ہیں۔ شریعت میں اس لحاظ سے کہا جاتا ہے کہ گمراہی شیطان کی طرف سے ہوتی ہے اور ایمان کا دوران شرور کے دور کرنے اور فطرت کی بقا سے عبارت ہے۔ اور اس مقصد کے لئے انبیا مبعوث کئے گئے اور قرآن نازل کیا گیا۔ جیسا کہ آپ کو آگے چل کر معلوم ہوگا۔ اور اس سے جنت میں داخلہ متعلق ہے۔ اور اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشاروں میں نہیں بلکہ واضح عبارتوں کے ذریعہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ چنانچہ جب فطرت تعلیمات الٰہیہ اور تنبیہات حقانیہ کے ذریعہ پاک ہو جائے اور دار آخرت وغیرہ کو یاد کرنے لگے تو کمالات کے لحاظ سے اس کی تین قسمیں ہوتی ہیں۔

اوّل عفاف: اس کا مطلب ہے، اخلاقی اور عملی طور پر لذت کوشی میں مبتلا نہ ہونا۔ اور یہ قوت عاملہ کے لحاظ سے ہے۔ اس لئے قوت عاملہ صرف ان امور میں استعمال ہوتی ہے جن کی رب تبارک وتعالیٰ نے اجازت دے رکھی ہے اور ایمان کے دور کی بنیاد قوتوں اور ان

کے آلودہ آثار کی بقا پر ہوتی ہے لیکن وہ بھی اس وقت جب اس بارے میں اذن دیا جائے۔
اس صفت کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو متقین اور صالحین سے موسوم کیا ہے۔ جیسا کہ فرمایا فی ذلک آیات لقوم یتقون "اس میں متقی قوم کے لئے آیات اور نشانیاں ہیں۔"
اس سے مراد وہ لوگ ہیں جن کی فطرت تنبیہات حقانیہ کے ذریعہ پاک ہوگئی جس کے نتیجہ میں ان کے دلوں کی آنکھیں کھل گئیں۔

دوسرے علم: اس کا مطلب ہے ان امور پر حکم لگانا جو الٰہیات اور معادیات (آخرت و قیامت) وغیرہ کی قسم سے غائب ہیں، سامنے موجود نہیں۔ چنانچہ اثبات واجب یعنی اللہ تعالیٰ کے بیان کی بنیاد پر ان پر یقین کیا جاتا ہے۔ اللہ کا نہ جسم ہے نہ ہی اس کی ہماری طرح آنکھ یا قوت بینائی ہے۔ اس کے باوجود وہ موجود ہے اور دیکھتا ہے۔ اور آیات اور نشانیوں سے مقصود قوت عاقلہ اور محسوسات سے فوری طور پر اللہ کی عظمت اور اس کی قدرت کی طرف ذہن کا منتقل ہونا اور مانوس محسوسات سے اس کے ربط کا ختم ہونا ہے۔ اس صفت کے لحاظ سے اللہ نے مومنوں کو علماء، عقلا، متفرس (اصحاب فراست) اور متوسم (صاحب بصیرت) کہا ہے۔

اور تیسرے سکینہ ہے: اس کا مطلب ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والا ایک نور۔ اس کی علامتوں میں سے عبادتوں کے وظائف کی پابندی، پریشانیوں اور سختیوں پر صبر اور اللہ کے دشمنوں پر خفا و غضبناک ہونا ہے۔ اس کو روح کے اندر راسخ ملکہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اور جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا من صام رمضان ایمانا و احتسابا "جس نے ایمان اور خود احتسابی کے ساتھ رمضان کے مہینہ میں روزہ رکھا۔" مطلب یہ ہے کہ جس نے سکینہ کے غلبہ اور حال کی قوت سے اس طرح روزہ رکھا کہ اس حالت میں برقرار رہا۔ جیسا کہ آدمی غیظ و غضب کے غلبہ کی حالت میں اپنی عادت کے لحاظ سے انتقام لیتا ہے اور دونوں قوتوں میں سے ہر ایک کی طرف یکساں طور پر اس جامع ہیئت کے مطابق ہے جو اپنی نسبت، اتصال کے ساتھ پوری طرح وجود پر طاری ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وانزل اللہ سکینتہ علی رسولہ وعلی المومنین والزمھم کلمۃ التقوی و کانوا احق بھا واھلھا "اللہ نے اپنے رسول اور مومنوں پر سکینت نازل فرمائی اور مومنوں کو تقوی

کی بات کا پابند رکھا کہ وہی اس کے زیادہ حق دار اور اس کے اہل تھے۔" (الفتح ۲۶)

اکتناہ (کنہ، حقیقت کا پتہ لگانا): یہ خصائل جو ہم نے بیان کیے ہیں، ایمان کی بنیاد اور ستون ہیں۔ اور اگر زیادہ ہو جائیں تو ان کے کلیات ہوتے ہیں جو ہم نے بیان کیے ہیں۔ ان میں ایک توحید ہے اور یہ شرک کی تمام قسموں کو دور کرنا اور اللہ تعالیٰ سبحانہ کے شایان شان اس کی تعریف کرنا ہے۔ دوسرے نشاط، حسن رغبت، اور شرح صدر کے ساتھ احتساب نفس کرتے ہوئے سکینت کے ساتھ عبادت کرنا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے لئے کمال شوق کا مظاہرہ کرے۔ یہاں تک کہ غیظ وغضب ختم ہو جائے۔ اس کے ذریعہ اس کے غضب کے حق کی ادائیگی کے لئے آثار ظاہر ہوں نہ کہ اس سے نیچے دفع ضرر کے لئے ہو اور نہ جلب منفعت کے لئے۔ یا جن چیزوں کا وعدہ کیا گیا ہے ان کی تصدیق کرتے ہوئے اور ان پر یقین رکھتے ہوئے۔ تیسرے حسن خلق، خیر خواہی، صلح وچشم پوشی اور صدق اور اللہ، اس کے رسول اور مومنوں کے ساتھ مختلف معاملات میں سے جن امور کے لئے آپ کو مبعوث کیا گیا ان پر عمل کا ملکہ۔ اور چوتھے بدعات سیئہ سے دور رہنا۔ بدعات کی تین قسمیں ہیں۔ ایک جن باتوں کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بغیر پابندی کیے ہوئے ترغیب دی ہے ان پر سختی سے عمل کرنا جیسے تراویح۔ یہ بدعت حسنہ ہے۔ دوسرے ان مباح چیزوں کی عادت بنا لینا جن کی اسلاف میں پابندی نہ کی گئی ہو اور یہ ظاہر ہے۔ اور تیسری قسم مسنون کو ترک کرنا یا مشروع میں تحریف کرنا ہے اور یہ گمراہی ہے۔

پانچویں کبیرہ گناہوں سے دور رہنا ہے۔ اور یہ ہمارے نزدیک وہ چیزیں ہیں جن پر اللہ نے وعید فرمائی ہے یا اس کو کفر یا فحش قرار دیا ہے یا اس پر حد لگانے کا حکم دیا ہے۔ چھٹے دل میں نقش ان ملکات سے دور رہنا جن کی وجہ سے آدمی حق کے انکار اور زمین میں فساد پر اکسایا جاتا ہے۔ اور نفاق کے سلسلہ میں جامع بات یہ ہے کہ یہ گھٹیا ورذیل ملکہ میں فنا ہوتا ہے۔ اس سے میری مراد یہ ہے کہ ملکہ اس کے دل میں راسخ ہوگا۔ کبھی کبھی اس سے قول یا فعل صادر ہوتا ہے جب کہ وہ اس کے خواص میں سے ہوتا ہے اور اس پر اکساتا ہے۔ چنانچہ کبھی یہ ملکہ بخل ہوتا ہے اور کبھی کھانوں کی لذتوں اور نفیس لباسوں اور شہوت رانی اور پاکیزہ خوشنما وشاندار رہائش گاہوں وغیرہ کا شوق ہوتا ہے۔ اور کبھی حسد اور کینہ وبغض ہوتا ہے۔ الغرض اس کے بہت سے

شعبے ہوتے ہیں۔ اور ان میں سب سے زیادہ شدید وہ ہے جس میں کئی رذیل خصلتیں جمع ہوں۔ اس سے ایک مجموعی ہیئت صاف ہوجاتی ہے، اس میں نفس فنا ہوجاتا ہے۔

اور احادیث و آیات میں ان باتوں کا ذکر کیا گیا ہے جن میں اصحاب بصیرت کے لئے بہت کچھ موجود ہے، جیسے زمین میں فساد پھیلانا، جن امور میں اللہ نے قطع تعلق کا حکم دیا ہے، ان میں تعلق قائم کرنا، اطاعت میں بخل سے گریز، ہواوہوس، خواہشات نفسانی کی اتباع، ہر صاحب رائے کا اپنی رائے پر مغرور ہونا، جب لڑے تو حد سے تجاوز کرے اور جب عہد کرے تو عہد شکنی کرے اور بات کرے تو جھوٹ بولے۔ ارشاد باری ہے **والذین یبخلون ویامرون الناس بالبخل** ''اور جو خود بھی بخل سے کام لیتے ہیں اور دوسروں کو بھی بخل کا حکم دیتے ہیں''۔ (النساء ۳۷) اور جو باہمی سرگوشیوں اور تحقیر و تذلیل اور فحش گوئی وغیرہ سے مومنوں کو اذیت پہنچاتے ہیں۔ اور نفاق کی اکثر وجوہ کا وجود، محسوسات سے طبیعت کا اس طرح مانوس ہونا کہ یہ نہ سمجھے کہ اس سے بڑھ کر بھی کوئی امر ہے جس کی فطرت، الٰہیات کی فطرت جیسی نہیں ہے۔ چنانچہ تشبیہ کی طرف مائل ہوجائے اور اللہ کے سوا دوسروں کو رب بنالے۔ اور معادیات کی طرف کوئی توجہ نہ کرے۔ جو عادتوں کے سلسلہ میں قریب تر ہو۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے دو لوگوں کی بات چیت کا قصہ بیان کیا ہے کہ جب ان میں سے ایک نے کہا **ما اظن ان تبید هذه ابدا وما اظن الساعة قائمة ولئن رددت الی ربی لاجدن خیرا منها منقلبا** ''مجھے توقع نہیں ہے کہ قیامت کی گھڑی کبھی آئے گی۔ تاہم اگر کبھی مجھے اپنے رب کے حضور پلٹایا بھی گیا تو ضرور اس سے بھی زیادہ شاندار جگہ پاؤں گا۔'' (الکھف ۳۶) اس کا مطلب یقینی انکار نہیں بلکہ انسیت کی پختگی اور ان امور کو بعید الامکان قرار دینا ہے۔ اگرچہ ان کا عادت کے طور پر اقرار بھی کیا۔ بالجملہ اس کی نماز، دعا، صدقہ اور ذکر یا تو تمام عادتوں کی طرح ہوتی ہیں کہ نہ اس کے لئے کمزوری و حقارت کا احساس پاتا ہے اور نہ ہی بشاشت۔ اور اس لئے کہ یہ ان چیزوں میں سے ہے جن کے ذریعہ آدمی لوگوں کی نظروں میں عظمت حاصل کرتا ہے۔ اور یہ پہلی بات سے بھی زیادہ قبیح ہے۔

ہدایت: جو شخص یہ مرتبہ حاصل کرنا چاہتا ہو، اس کے لئے ضروری ہے کہ قرآن کریم کو وضاحت کے ساتھ پڑھے، پھر برابر اس کی تلاوت کرتا رہے کہ اس میں اللہ کی نشانیوں اور

جزا و سزا کا ذکر ہے۔ اس میں قصے ہیں، مواعظ ہیں، بحثیں اور دلیلیں ہیں اور اس کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منکر ونکیر سے متعلق سوال والی حدیث میں اشارہ فرمایا انھما یسألان المؤمن بم ثبت ذلک عندک فیقول تلوت کتاب اللہ سبحانہ ''وہ مومن سے سوال کریں گے تمہارے نزدیک یہ کیسے ثابت ہوا؟ وہ کہے گا، میں نے اللہ کی کتاب کی تلاوت کی تھی۔'' اور اس شخص پر یہ لازم ہے کہ جہاں تک ممکن ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث پڑھے جن سے اس کی طبیعت میں نرمی پیدا ہو اور اس کے اخلاق سنوریں اور اس کے عقیدے درست ہوں اور سنت و سیرت کا علم حاصل کرے۔ اور جو شخص قرآن و حدیث کی ان تفصیلات سے جن کے بغیر چارہ نہیں۔ فنون عربی کے زیادہ حصول اور علم اسماء رجال وغیرہ اور لوگوں میں رائج تاریخ اور اصول فقہ علم کلام اور تمام فنون کے گہرے مطالعہ میں مشغول ہو تو وہ علماء زھرۃ الحیوۃ الدنیا ''دنیاوی زندگی کا حسن و جمال قرار پانے والے علماء میں سے ہے۔'' اس کے لئے ایمان کی حقیقت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ یہی معاملہ مشائخ صوفیا کے اوراد و وظائف میں مشغولیت کا ہے۔ اور ان کی مشقتوں میں اصلاً کوئی چیز نفع دینے والی نہیں ہے۔ اس پر لازم ہے کہ ہر دن، رات اور گھڑی میں موت کو یاد کرے۔ اللہ کے عذاب کا دھیان رکھے اور اللہ کی عظمت کو یاد کرے اور ایک گھڑی میں اس طرح اللہ کی تسبیح بیان کرے۔ لا الہ الا اللہ اور اس کی تکبیر اس طرح کہے کہ اس کے قلب میں اس وقت اللہ کے علاوہ کسی چیز کی کوئی خواہش وگنجائش نہ رہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول طاعات کو، ان کے علاوہ جو دوسروں سے منقول ہوں، اپنے لئے لازم قرار دے۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جملہ وظائف میں سے فرض نماز اول وقت میں، اطمینان قلب، ترتیل قرأت اور حضور قلب کے ساتھ اور تہجد اور چاشت واشراق کی نمازوں کی پابندی کرے۔ اور تہجد میں سنت یہ ہے کہ تقریباً دو سو آیتیں پڑھے۔

اور اسباب سے متعلق نمازوں میں صلوۃ الکسوف (سورج اور چاند گرھن کے وقت کی نمازیں) اور صلوۃ استسقا، تحیۃ الوضو وتحیۃ المسجد کی نمازیں اور استغفار ہیں اور روزوں میں رمضان کے ہر مہینہ تین دن کے، یوم عاشورہ اور ذی الحجہ کے نو روزے اور صدقات میں اگر اس کے پاس مال ہو تو جن صدقات کا احادیث میں تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے، ورنہ ہر چیز میں

سے ایک صاع صدقہ فطر طبیعت کی بشاشت اور شرح صدر کے ساتھ ہے اور اس کے اس کھانے کے لئے جو کچھ بھی ہو اس میں مسکینوں کا بھی حصہ مقرر کرے۔ اس طرح جو بھی اس کے پاس پہننے کے لئے ہو اس میں ان کا حصہ رکھے۔

تحقیق: اس منصوبہ میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی معرفت، اس کی تسبیح وحمد بیان کرنا ہے۔ تسبیح کا مطلب اس کی طرف اس طرح توجہ کرنا ہے کہ وہ اس سے اعلیٰ و برتر ہے کہ کوئی اس کو احاطۂ خیال میں لا سکے۔ اس طرح نہ ہو کہ اس کا ادراک حاصل کیا جا سکتا ہے یا اس کا احاطہ کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ کہ وہ انتظار وحیرت سے مشابہ حالت ہے جیسے کوئی شخص کسی چیز کو دیکھنے کا ارادہ کرتا ہے لیکن اس کو نہیں پاتا۔ اسے یقین ہوتا ہے کہ وہ شے موجود ہے، اس لئے ہمت کرکے دوبارہ دیکھنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کوشش میں ہر چیز سے غافل ہو جاتا ہے۔ اور یہ حالت انسانوں، درندوں اور پرندوں سب کو ان کے وجود کے مطابق پیش آتی ہے۔ اور جو علم اس کے ضمن میں کھلے اگرچہ اس کے تقاضوں میں جو اس کے جاتے رہنے سے غافل ہو جائیں۔ اور اس کی طرف اللہ سبحانہ نے یوں اشارہ فرمایا **تسبح له السموات السبعُ والارض ومن فيهن، وان من شيء الا يسبح بحمده ولكن لا تفقهون تسبيحهم** ''آسمانوں اور زمین میں جو بھی کچھ ہے، سب اللہ کی تسبیح کرتے ہیں۔ کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو اس کی حمد وتسبیح نہ بیان کرتی ہو، لیکن تم ان کی تسبیح کو سمجھتے نہیں ہو۔'' (بنی اسرائیل ۴۴) اور ان کے درمیان انسان کی ایک خصوصیت بغیر احاطہ وادراک کے صفات واجبہ کا اثبات ہے۔ اس لئے وہ کہتا ہے اللہ سننے والا ہے لیکن ہماری طرح نہیں۔ دیکھنے والا ہے لیکن ہماری طرح نہیں، علم والا ہے لیکن ہمارے علم کی طرح نہیں۔ اور اس کی جو حمد وتسبیح بیان کی جاتی ہے، اور اس دور میں پھیلی ہوئی مکمل معرفت اس کی حمد وتسبیح استعاذہ اور اس استغفار سے تجاوز نہیں کرتی جو اس کے مماثل ہے جو کہ شر سے بیزاری کا اظہار کرتا ہے۔ اس کی تفصیل ہم نے ''الحجة البالغه'' میں انبیاء سے مخصوص علوم کے سلسلہ میں بیان کر دی ہے۔

اور اس منصوبہ میں واضح ہو کر سامنے آنے والی توحید یہ ہے کہ اللہ کے ساتھ شرک کی تمام وجوہ سے برأت کا اظہار کیا جائے جیسا کہ عنقریب ذکر کیا جائے گا۔ اور یہ کہ اللہ کے انعامات اور سزاؤں پر جو اس نے اپنے بندوں پر ظاہر کئے ہیں، ایمان لایا جائے۔ اور یقین یہ

ہے کہ نفسانی خواہشات کو اس کے مخالف امور کی طرف میلان پر مجبور نہ کریں اور اللہ کے وعدوں اور وعیدوں کی تصدیق کی جائے۔ اور توکل یہ ہے کہ بدفالی بیماری، کھوپڑی، بھوت، ماہ صفر، اس میں تزلزل پیدا نہ کریں۔ اور محبت یہ ہے کہ کھانے پینے کی چیزوں، نکاح، لباس، اہل وعیال اور مال واسباب کو اللہ کے غیظ وغضب کے معاملہ میں ہلکا سمجھے۔ اگرچہ اپنی جبلت وطبیعت کے مطابق مذکورہ بالا اشیا سے بھی محبت کرے۔ اور خوف یہ ہے کہ اللہ کی سزا وگرفت دنیا میں مصیبتوں اور آخرت میں عذاب سے ڈرے۔ اور رجا یہ ہے کہ دنیا اور آخرت میں اللہ کی نعمتوں کی امید رکھے۔ اور فنا یہ ہے کہ صغیرہ گناہوں پر اصرار اور کبیرہ گناہوں اور ہر اس چیز کی مخالفت میں جن کی لذت کوشی سے اللہ سبحانہ وتعالیٰ ناخوش ہو خود کو فنا کرلے، اور عبادتوں میں جیسا کہ ہم نے بیان کیا اور اللہ کی حمد وتسبیح کرے۔ اور جب آدمی ان سے ترقی کرکے شرح صدر کے درجہ پر پہنچتا ہے تو یہ امر، دوسرے امور بن جاتے ہیں۔ اور آدمی کو مال کی محبت اس وقت کوئی نقصان نہیں پہنچاتی جب کہ وہ اس طرح نہ ہو جیسا کہ ہم نے بیان کیا۔ اس طرح نہ ریاست کی محبت اور نہ کھانے پینے کی چیزوں لباس، نکاح کی محبت۔ اور اپنی ذات کے لئے انتقام بھی اس وقت تک ضرر ونقصان نہیں پہنچاتے جب تک ان میں زیادتی اور حق کا انکار نہ ہو۔ والحمد للہ اولاً وآخراً۔

تعلیم: معلوم ہونا چاہئے کہ انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام مخلوق کے سامنے دورۂ ایمان کے ساتھ آئے۔ اور یہ بھی جان لینا چاہئے کہ مقربین میں سے ہر شخص کے لئے خواہ وہ قرب کے فنون میں کتنا ہی ماہر ہوگیا ہو، ایسا قرب ضروری ہے جس میں اس کو ثابت قدمی حاصل ہوجائے۔ اور تمام فنون اس کے تابع ہوجائیں۔

پھر یہ جان لینا چاہئے کہ صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین ایمان کے معاملہ میں ثابت قدم ہوگئے۔ چنانچہ ان کے لئے تمام کمالات شعار اور راز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے حال اس طرح مستقل نہیں رہتے کہ اصلاً ہر طرف سے اس میں گھر کرر ہ جائیں۔ اور ایمان اوپر سے اوڑھے ہوئے کپڑے کے مانند ہے، کہ اس کے اوپر ان کے اشارے منطبق کئے جاتے ہیں اور اس کی طرف ان کی عبارتیں منسوب کی جاتی ہیں۔ اس میں راز یہ ہے کہ ان کے تمام کمال اس اسم کے کمال سے منضبط ہوتے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک سے ظاہر ہوتا

ہے۔اور وہی ہے جس سے اللہ سبحانہ نے ایمان کا دورہ قائم کرنے کا ارادہ کیا۔

جہاں تک ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا تعلق ہے تو آپؓ ایک جہت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروکار تھے اور وہ قرب کمال کا دورہ ہے۔اور اس جہت سے ایک خاص مرتبہ پر فائز ہوئے اور وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف توجہ ہے۔اور اس طرح اولیا کے لئے یادداشت کی مثال ہے۔پھر عمر فاروق رضی اللہ عنہ ایک جہت سے رسول اللہ تعالیٰ کی پیروی کرنے والے ہیں اور وہ قرب فرائض ہے۔اور عثمانؓ ایمان کے معاملہ میں رسول اللہ کی اقتداء کرنے والے ہیں۔ آپؓ کے لئے قرب وجود کی طرف آپ کی فطرت کی صفائی کی حیثیت سے ایک راستہ ہے اور جب معاملہ آپ کے ذریعہ پورا ہوگیا تو خالص ایمان کی طرف اتر گئے۔اور جہاں تک علیؓ کا تعلق ہے تو ان کے قدم قرب وجود میں گڑ گئے اور ان سے جڑیں زمین کی گہرائیوں میں پیوست ہوگئیں۔اور ان کو شریعت کی حکمتیں حاصل ہوئیں۔پھر انہیں وہ شریعت دکھائی گئی جس کو عالم ارواح اٹھائے ہوئے ہے۔پھر آپؓ کو اس کی طرف عروج حاصل ہوا پھر رسول اللہ کی شریعت اور دین کی شرح میں لگ گئے۔اور یہی وصایہ یا وصیت ہے۔

اور جہاں تک مہاجر وانصار تمام صحابۂ قدما کا تعلق ہے، تو ان میں سے کچھ ایمان کے معاملہ میں کم درجہ والے ہیں۔ان کی جستجو حکمت کی طرف ہے، انہیں فقہ تقویٰ اور وسیلہ میں مقام و مرتبہ حاصل ہوا۔پھر جہاد اور تنازعات کی طرف تحقیق ہے۔اور جن لوگوں نے احسان و بھلائی کے ساتھ ان کی اتباع کی، وہ ایمان کے دورۂ ایمان میں نچلے درجہ پر ہیں۔ان کے لئے شرح صدر کی تحقیق ہے اور وہ سب خیر خواہی، استقامت اور تشبہ بالتحقیق کے ایک درجہ پر ہیں جو ان کے علاوہ کسی کے لئے کبھی ثابت نہیں ہوا۔اور سنی وہ ہے جو وضع مستقیم میں ان کی موافقت اختیار کرے۔

افادہ: دورۃ الایمان کے مناصب میں سے ایک منصب مجددیہ ہے۔رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا **یبعث اللہ فی امتی بعد کل مائۃ سنۃ رجلا یجدد لھا دینھا** ''میری امت میں اللہ تعالیٰ ہر سو سال بعد ایک ایسا شخص پیدا کرے گا جو اس کے دین کی اس کے لئے تجدید کیا کرے گا'' اور مجدد ایسا شخص ہوتا ہے جس کو اللہ سبحانہٗ قرآن اور حدیث کے علم سے ایک حصہ عطا کرتا ہے، پھر سکینہ کا لباس پہناتا ہے اور حرام، واجب، کراہیت و مستحب اور مباح کو ان کی جگہ پر رکھتا ہے۔اور موضوع احادیث، قیاس کرنے

والوں کے قیاسات اور ہر افراط وتفریط سے شریعت کی تنقیح کرتا ہے۔ پھر اللہ نے دلوں کو اس کی طرف مائل کیا تو انہوں نے اس سے علم حاصل کیا اور اس (مجدد) کے اور وحی کے درمیان فرق یہ ہے کہ وہ ظاہر علم سے متعلم ہے۔ اور وصی نے رسول اللہ کی شرح سے حصہ لیا۔ پھر اس کو ظاہر علم کے موافق بنایا۔ اور ہمارے نزدیک سو سال کا لفظ محض اندازہ اور تخمینہ کے لئے ہے۔ تعین کے لئے نہیں۔ اور اس کا اعتبار آپ کی وفات سے کیا جاتا ہے۔ پھر مجددیت سے سب سے زیادہ قریب محدث متقدمین ہیں جیسے بخاری و مسلم وغیرہ۔ اور جب مجدد پر دورۃ الحکمہ پورا ہو گیا تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مجھے مجددیت کی خلعت سے سرفراز فرمایا۔ چنانچہ میں نے مختلف امور کے درمیان جمع کرنے کا علم معلوم کر لیا اور یہ بھی جان لیا کہ شریعت میں اپنی رائے کا استعمال تحریف ہے اور قضا کے معاملات میں معظم ومکرم ہے۔

تتمیم (تکمیل): رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا علم تین قسم کے ہیں۔ ان کے سوا سب زائد ہیں۔ (۱) آیات محکم یا (۲) سنت قائمہ یا (۳) فریضۂ عادلہ۔ آیات سے مراد قرآن کا علم ہے۔ اور سنت سے وہ باتیں مراد ہیں جو عبادات و عادات وغیرہ کے سلسلہ میں رسول اللہ سے منقول ہیں۔ اور فریضۂ عادلہ سے مراد علم القضاء ہے کہ آپ کے لئے اس میں اپنی رائے سے عمل کرنا جائز ہے۔ اب اگر آپ سے پہلے کوئی ایسا شخص موجود ہے جس کو وہ امر پیش آیا ہے اور آپ کا خیال بھی اس سے موافقت کرتا ہے تو اس سے تجاوز نہ کرو اور وہ اجماع ہے۔ سنت میں نہ اجماع کے لئے کوئی گنجائش ہے نہ قیاس کا کوئی دخل ہے۔

۱۶- تفہیم:

اسلام کے لئے شرح صدر۔ شرح صدر کی حقیقت اور اس کی مختلف شکلوں کا بیان

تاسیس (بنیاد): اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے افمن شرح اللہ صدرہ للاسلام فھو علی نور من ربہ "اب کیا وہ شخص جس کا سینہ اللہ نے اسلام کے لئے کھول دیا اور وہ اپنے رب کی طرف سے ایک روشنی پر چل رہا ہے (اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جس نے ان باتوں سے کوئی سبق نہ لیا ہو)" (الزمر ۲۲) اور فرمایا فمن یرد اللہ ان یھدیہ یشرح

صدرہ للاسلام ''اللہ جس کو ہدایت دینا چاہتا ہے، اس کا سینہ اسلام کے لئے کھول دیتا ہے ۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی علامات کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا: التجافی عن دار الغرور والانابة الی دار الخلود والاستعداد للموت قبل نزوله ''دار فنا سے من کا خالی ہونا اور دار بقا کی طرف میلان ہونا اور موت کے آنے سے پہلے اس کے لئے تیار ہونا۔'' اور اللہ تعالیٰ نے محسنین کی تعریف میں فرمایا کانوا قلیلا من اللیل ما یھجعون، وبالاسحار ھم یستغفرون، وفی اموالھم حق للسائل والمحروم ''وہ راتوں کو کم ہی سوتے تھے، پھر وہ رات کے پچھلے پہروں میں معافی مانگتے تھے ۔اور ان کے مالوں میں سائل اور محروم کے لئے حق تھا۔'' (الذاریت ۱۷تا۱۹) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے احسان کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا اَنْ تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانه یراک ''تم اللہ کی اس طرح عبادت کرو گویا کہ تم اسے دیکھ رہے ہو، اگر تم نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تو تمہیں دیکھ رہا ہے۔'' اور اس کی حقیقت وجود کے جوہر میں جذب کی چوٹ سے اس کا ٹوٹ جانا ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ وجود اپنے علم کی طرف رحم و مہربانی کے ساتھ اس کی ضروریات کو دیکھتے ہوئے مائل ہے۔اس کا وزن اس کی قوت عاقلہ و عاملہ میں معلوم ہے۔ چنانچہ اس کے اوپر نشاۃ ثانیہ کا حکم غالب آجاتا ہے۔اس کی کشش اس کے عالم کی طرف ڈھل جاتی ہے اور اس کا اپنے تقاضوں و ضروریات کا طلب کرنا اور اس کے آثار کا اس کی قوت میں متعین وزن سے افراط و تفریط کے لحاظ سے زائل ہو جانا ہے۔اور یہ ہر موجود شے کا اللہ سبحانہ سے رابطہ ہے، یہ اس کے عین تعبد کی شرح ہے اور اس کی حقیقت کے سجدہ کے لئے ازل سے ابد تک ایک مثال اور نمونہ ہے۔

موجودات میں سے کچھ قوی کشش والے ہیں اور کچھ ضعیف۔اور کشش اسی طرح موجود شے ہے جس طرح اس عالم میں دوسرے امور پائے جاتے ہیں۔اور کشش تیز چلنے والی ہوا کی طرح ہے کہ جس چیز کے اوپر سے بھی گزرتی ہے، اس کے جوہر کو توڑ دیتی ہے، یعنی اس کے مخصوص آثار کو اس سے دور کر دیتی ہے، جس کی وجہ سے وہ فیض کے مشابہ ہو جاتی ہے جو اس کے قوام سے نشاۃ ثانیہ کے قوام کو پیدا کرتا ہے۔اور ہمارا طریقہ عموم کشش کے اصول پر رکھا گیا ہے جو وجود کے طبقات اور نفس اور آنکھ کو یکے بعد دیگرے کاٹنے والی ہے۔اور یہ

ٹوٹ پھوٹ کبھی پہلے قوت عاقلہ میں ظاہر ہوتی ہے اور کبھی عاملہ میں۔ اور ان میں سے کچھ وہ ہیں جو قرب صحابہ کے لئے مقدمہ الجیش ہوتے ہیں اور کچھ ولایت اور فنا کے لئے۔

تعریف: شرح صدر کی حقیقت ایک ہی ہوتی ہے اور وہ وجود کے جوہر کا ٹوٹنا ہے۔ اس کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ آدمی اس عالم سے اعراض کرنے والا بن جائے، اس کی لذتوں سے آنکھ بند کر لے جیسا کہ بعض حضرات نے کہا ہے کہ مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی کہ اس کی طاعات پر غیرت کرتے ہوئے کسی عورت کو دیکھوں یا کسی دیوار کو۔ جیسا کہ ایک انصاری صحابی نے جن کو ان کے باغ میں جب وہ نماز پڑھ رہے تھے، میٹھے انگور کی بیل اچھی لگی، کہا، میں اس کو اللہ کی راہ میں خرچ کروں گا کہ اس نے مجھے نماز سے غافل کر دیا۔ ان کو ان معاملات میں اپنی ذات کے لئے غصہ نہیں آیا جو کہ عام طور سے عادت ہوتی ہے کہ دار آخرت میں باغ بناتے ہوئے غصہ دکھائیں۔ ان پر طاعات کے وہ وظائف آسان ہو جاتے ہیں جو کہ دوسروں کے لئے دشوار ہوتے ہیں۔ یہ صورت صحابہ میں پائی جاتی تھی، گویا کہ یہ قوت عاملہ کی جانب ٹوٹ پھوٹ کا ظہور ہے۔ ان میں سے علم بھی ہے۔ اس سے میری مراد سکینہ کے نور اور ٹھنڈک میں کمزوری ہے جو بلاؤں پر صبر میں دکھاتا ہے۔ اور طاعات، امر بالمعروف ونہی عن المنکر (بھلائی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے) اور اللہ کے دشمنوں کے ساتھ مجاہدہ پر صبر، تابعین اور ان کے بعد کے علماء میں بہت پایا جاتا تھا۔ وہ اس قسم کے کمال میں کامیاب رہے تھے۔ ان کے ذریعہ امت کا نظم درست ہوا، اور جب یہ لوگ جوان ہوئے بیسیوں صحابہ موجود تھے۔ اور ان میں سے ایک بھی اس طریقہ پر نہیں تھا جو یہ سمجھتا ہو کہ وہ بیکار ہیں۔ اور حدیث میں آیا ہے العالم فضله على العابد كفضلي على ادناكم "عالم کو عابد پر ایسی فضیلت ہے جیسے مجھے تمہارے معمولی آدمی پر ہے۔" اس میں وہی لوگ مراد ہیں۔ اور ان میں یہ بھی ہے کہ ایسے خواب دیکھے جو طاعات کی قبولیت پر کثرت سے دلالت کریں۔ اور جن میں بشارت بھی پائی جائے اور ڈرایا بھی جائے۔ اس طرح وہ واقعہ کے مطابق ہو جائیں۔ اور اس پر ماضی اور مستقبل کے امور کا کشف ہو۔ اور انبیا و اولیا وغیرہ کے وجود دکھائے جائیں۔ اور اس کو بلند آواز سے بھی پکارا جائے اور الہام بھی کیا جائے اور دل میں بھی خیالات آئیں اور ان میں توحید الحبۃ (محبت کی توحید) بھی ہے جو دنیا اور جو

کچھ اس میں ہے، سب سے اس کے نفس کی جڑوں کو اکھاڑ دے اور اس کو دوام حضور حاصل ہو جائے اور اس کی طبیعت کی اصلاح ہو جائے۔ اور اس کی اور بھی صورتیں ہیں جن کو ہم نے ''الخیر الکثیر'' میں بیان کیا ہے۔

ہمیں معلوم اس کی بہترین صورتوں میں سے فناء اللطائف (باریکیوں کی فنا) ہے۔ اور اس صورت کی بھی کئی قسمیں ہیں۔ ان میں ایک بہترین صورت وہ ہے جس سے اللہ سبحانہ نے مجھے خاص طور سے نوازا ہے کہ میرے علم میں اللہ نے مجھ پر اولاً افاضہ اور فعالیت کی صورت میں تجلی فرمائی پھر وہ مجھ سے غائب ہوگئی۔ اور دوسری تجلی افاضہ کے لئے ملکہ کی صورت میں فرمائی پھر وہ بھی غائب ہوگئی پھر تیسری تجلی تمام امور اور قابلیتوں کے مجموعہ کی صورت میں ہوئی۔ اور چوتھی ممکنہ عیوب کے سلب کی صورت میں اور پانچویں فقط ذات کے متعین کرنے کی صورت میں۔ اور اس دن میں ششدر و حیران تھا کہ معاملہ کس طرح ظاہر ہو رہا ہے پھر غائب ہو رہا ہے۔ اس کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ یہ فناء اللطائف ہے۔ پھر ذات میں لوٹنے کی قوت کمزور ہوگئی اور فناء تام متحقق ہوگئی۔ اور اس کی قسموں میں سے توحید افعالی ہے۔ چنانچہ اللہ سبحانہ کو فاعل فی الوجود دیکھتا ہے پھر وہ نہ کسی سے ڈرتا ہے اور نہ کسی سے امید رکھتا ہے۔

توقیف (توقف کرنا): شرح صدر کے کئی احوال ہوتے ہیں۔ ان میں سے تجلی اور پردہ ہیں۔ آدمی کو قدسی چمک اپنے گھیرے میں لے لیتی ہے اور وہ یہ ہے کہ نفس ناطقہ اس عین کے جو خالص امر قدسی ہے، اور اس وجود کے درمیان جو اس عالم گندگی کے امور میں سے ایک امر ہے، برزخ ہے۔ چنانچہ جب وجود ان امور کو خود سے دور کر دیتا ہے جن پر اس کی جبلت بنائی گئی ہے اور احکام نفس میں مشغول ہو جاتا ہے تو اس کے لئے معرفت کی ایک قسم واجب ہو جاتی ہے، جو مجرد عن المادہ کے مشابہ ہوتی ہے۔ اس وقت وہ تجلی ہوتی ہے۔ اور جب وہ اپنی اصل کی طرف لوٹتی ہے تو پردہ ہو جاتی ہے۔

ان میں خوف و رجا بھی ہیں۔ ان کا راز یہ ہے کہ وجود کی جبلت دو صورتوں میں ہوتی ہے۔ ایک وہ اوہام ہوتے ہیں جو ناامیدی اور بزدلی کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ اور یہ سردی و رطوبت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ دوسرے وہ اوہام ہیں جو حسن امید اور شجاعت کی طرف مائل

ہوتے ہیں۔ اور یہ حرارت اور خشکی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اور یہ اوہام کبھی عام علوم سے مل جاتے ہیں تو وجود میں ہیئت کا فائدہ دیتے ہیں۔ ان کا نام نشاط اور حزن رکھا جاتا ہے۔ اور کبھی ان علوم سے ملتے ہیں جو حضرت شارع علیہ السلام لائے۔ ان کو خوف ونشاط کہا جاتا ہے۔ اور کبھی اس سے قدسی چمک ملتی ہے۔ تب اس کو قبض وبسط کہا جاتا ہے۔ اور اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک چمک کے حصول سے پہلے ہوتی ہے تو وہ بسط کہی جاتی ہے اور اس کا حصول نہ ہو تو قبض ہو جاتا ہے۔ اور دوسری اللہ تعالیٰ کا خوف پیدا کرنے والی اور امید پیدا کرنے والی صفات سے چمک کے حصول سے پہلے ہوتی ہے۔ اور علم الاسما صرف اہل ذوق کو حاصل ہوتا ہے جب کہ دوسروں کو صرف علم صفات ہوتا ہے۔ اور صفات ہمارے علم کے مطابق خبریں اور افعال ہوتے ہیں۔ اور ظاہر میں کتنے ہی اسم حقیقت میں صفت ہوتے ہیں۔ اور اہل ظاہر ان کا ادراک صرف صفات میں کرتے ہیں۔ اور خوف پیدا کرنے والے یا امید پیدا کرنے والے اسماء کا حکم تجلی الٰہی پر ظاہر ہوتا ہے۔ بعض کے نزدیک اس کو قبض وبسط کہا جاتا ہے لیکن ہم اس کو جلال وجمال کہتے ہیں۔

تعلیم: شرح صدر والے کے لئے تین امور کا حاصل ہونا ضروری ہے۔ ایک ذکاء حالی اس کو تلطیف السر (راز کی باریکی) بھی کہتے ہیں۔ اور دوسرے اللہ کو اس کے علاوہ سب پر ترجیح دینا۔ اور تیسرے اوہام وجوارح کا حالت انشراح کا مطیع ہونا۔ اور اس کے حصول میں تدریج ضروری ہے۔ اور کیا ذکاء وخیر اور تنبیہ دو قسمیں نہیں ہیں؟ ایک ذکاوت علم میں ہوتی ہے۔ چنانچہ کتنے ہی لوگ ایک لحظہ میں خفی چیز کا ادراک کر لیتے ہیں اور بہت سے لوگوں کو صریح مقصود کا ادراک دو تکرار کے بعد ہوتا ہے۔ دوسرے ذکاوت حال میں ہوتی ہے چنانچہ بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جب وہ غم زدہ کے پاس بیٹھتے ہیں تو غم ان کی طرف بڑھتا ہے یا نشاط والے کے پاس بیٹھتے ہیں تو ان کی طرف نشاط بڑھتا ہے۔ اور کتنے ہی لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی یہ حالت تکرار کے بعد ہوتی ہے۔ ہم نے اس سے جو مراد لی ہے، وہ تیقظ حالی (حال کی بیداری) ہے۔

اور کچھ لوگ ہیں جو خوشی کے نغمے سن کر لطف اندوزی حاصل کرنا چاہتے ہیں اور کبھی وحشت کے نغمے سنکر اور کبھی دنیا سے بے رغبتی اور آخرت سے رغبت پیدا کرنے والے اور

سخاوت وشجاعت کا جذبہ ابھارنے اور پاکیزہ عشق پیدا کرنے والے وعظ سن کر۔ اس طرح جب وہ دل کے تعلق کے ساتھ اس کے محاسن وشمائل کے ذکر اور اپنے نفس کے نزدیک عشق کی صفت کی تحسین کے ساتھ چلتا ہے تو اس کو عشق کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے۔ اور اس سے اس کے دل کا تعلق قائم ہو جاتا ہے۔ پھر جب وصل کی کیفیت بڑھتی ہے اور محبوب اس کی طرف توجہ کرتا ہے تو اس کے دل کو نشاط اور شرح خاطر حاصل ہوتے ہیں۔ اور جب ہجر وجدائی کی کیفیت شدت پکڑتی ہے اور محبوب اس سے منہ پھیرتا ہے تو وہ غمزدہ ورنجیدہ ہوتا ہے اور اس کو انقباض خاطر ہوتا ہے۔ پھر جب بار بار اس پر یہ کیفیت طاری ہوتی ہے تو اس کو معنوی لذت حاصل ہوتی ہے جو حسی لذتوں سے بھی زیادہ لذیذ ہوتی ہے۔ اور اس کو معنوی بدمزگی معلوم ہوتی ہے تو وہ جائز کھانے پینے والی چیزوں سے بھی زیادہ بدمزہ ہوتی ہے۔ جبکہ ہمارے نزدیک حس لطیف، واعظ کے کلام اور کتاب اللہ کو تدبر کے ساتھ پڑھنے سے حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ آخرت کا عذاب اس کی آنکھوں کے سامنے رہتا ہے گویا کہ وہ اس کو دیکھ رہا ہے چنانچہ اس کو ناپسند کرتا رہتا ہے۔ جیسا کہ زید بن حارثہ نے اپنے نفس کے بارے میں ذکر کیا تھا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے سوال فرمایا تھا **ماحقیقة ایمانک** ''تمہارے ایمان کی حقیقت کیا ہے؟ اور ان کے اسرار کا لطف یہاں تک پہنچ گیا تھا کہ ادنیٰ تحریک سے مر گئے۔ وہ عادتوں کے معاملہ میں کسی کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ اور قریب ہے کہ تم ان کی کتابوں کو غور سے دیکھو تو پاؤ گے کہ ایک شخص نے قوال کو یہ شعر پڑھتے ہوئے سنا

کل بیت انت ساکنه

غیر محتاج الی السرج

''جس گھر میں بھی تم رہتے ہو، اس کو چراغ کی ضرورت نہیں ہوتی۔'' تو وہ وہیں مر گیا۔

الہام: اصحاب طریقت کے درمیان اس قانون کی تشکیل میں جس سے شرح صدر حاصل ہوتا ہے، مختلف اقوال پائے جاتے ہیں۔ لیکن جہاں تک میرا تعلق ہے، اللہ نے مجھے الہام فرمایا کہ میں نے تمہیں سلوک کا سب سے قریب کا اور سب سے یقینی طریقہ عطا فرمایا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ جب کوئی تمہاری طرف راغب ہو تو اس کو نفی اور اثبات کی تعلیم دو (لا الہ الا اللہ) شرط یہ ہے کہ وہ نفی کے سلسلہ میں اس کے ماسوا سب سے لاتعلقی کا اظہار کرے۔ اور

اثبات کے سلسلہ میں کلی طور پر اللہ سبحانہ کی طرف راغب ہو۔ یہاں تک کہ جب اس کے اندر محبت راسخ ہوجائے اور اس سے وسوسے زائل ہوجائیں تو اس کو حضور خالص کی تعلیم دو جو حرف وآواز سے خالی ہو۔ یہاں تک کہ جب اس کے حضور کو دوام حاصل ہوجائے اور اس کی طبیعت کی اصلاح ہوجائے تو اس کو توحید افعالی کی تعلیم دو۔ اور وہ خلق الافعال اور فعل کے ساتھ استطاعت کا مسئلہ ہے۔ یہاں تک کہ جب اس کا توکل اور تفویض مکمل ہوجائے تو اس کو یہ تعلیم دو کہ ہر صفت اللہ سبحانہ کی صفات میں سے ہے۔ اور یہ توحید صفاتی ہے یہاں تک کہ جب اس کے لئے یہ صحیح ہوجائے تو اس کو اللہ عزوجل کے تقرر میں فناء التقرر (تعین کا فنا ہوجانے) کی تعلیم دو۔ یہاں تک کہ جب مدرِک اور مدرَک کے درمیان اتحاد تک معاملہ پہنچ جائے تو اس کے اور اس کے امر کے درمیان معاملہ چھوڑ دو۔ اور اس کا امر حضور مجرد سے ہے۔ اور اس کے نفس کی حد بندی توڑنے میں سعی کرو۔ تو جب فناء قریب آجائے تو لامحالہ فنا ہوجائے گا۔ اور جب کمالات کے رنگ میں پوری طرح رنگ گیا تو ہم نے یقینی طور پر جان لیا کہ قرب کے لئے سیدھا طریقہ وہی ہے جس پر رسول صلوات اللہ علیہم اجمعین چلے تھے۔ اور جو مشقت بھری طاعات جیسے مسلسل صوم الدھر، رات کے آخر تک قیام اور ہر رات میں ختم قرآن وغیرہ سے شرح صدر کے دور میں عام باریکیوں سے حاصل ہوتا ہے۔

اور جن دقیق مسائل کی طرف احیاء العلوم اور کیمیائے سعادت رہنمائی کرتی ہیں، ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس میں اللہ کا طریقہ کیچڑ بھرا ہے۔ جس نے اپنے نفس سے ٹال مٹول سے کام لیا اور ہمیشہ کے لئے زمین میں داخل ہوگیا تو اس کو کیچڑ نے اس کے ٹخنوں تک یا گھٹنوں تک یا نرخرہ تک جکڑ لیا۔ سعید و نیک بخت وہ ہے جو نہ راستہ کی پرواہ کرے، نہ راستہ میں پائی جانے والی چیزوں کی۔ اور مقصود میں چاروں طرف سے گھر گیا اور ساری رات اور صبح کو بھی بغصہ جلدی کی یہاں تک کہ دورۂ شرح کے شخص کی طرح موت سے ہمکنار ہوگیا۔ کہ ان میں سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا، ان میں سب سے زیادہ اس سے محبت کرنے والا، سب سے زیادہ اس کا ذکر کرنے والا، سب سے زیادہ سخی، سب سے اچھے اخلاق والا، یعنی امور میں سب سے کم مشغول ہونے والا، وسیع النفس، عدل کے اعتبار سے کامل عقل والا، اللہ کے معاملہ میں سب سے زیادہ سخت، اللہ کی کتاب کو سب سے زیادہ جاننے والا، اپنے

قلب میں اللہ کی طرف دعوت کا جذبہ رکھنے والا کہ اسی کے لئے حکم دے اور اسی کے لئے روکے، سب سے زیادہ صبر کرنے والا، سب سے زیادہ شکر کرنے والا اور یہ وہ مقدار ہے کہ جس کو عام لوگ انبیا صلوات اللہ علیہم اجمعین کی نبوت پر یقین کے بعد پہچان لیتے ہیں۔

۱۷۔ تفہیم:

رحمٰن کی تجلی اور دنیا میں جو کچھ بھی پایا جاتا ہے، سب اسی سے ہے

اجمالی تشریح: جاننا چاہئے کہ وحدت کبری یا وجود اقصی اس کو کچھ بھی کہیں، اس کی تفسیر مسلسل سامنے آنے والی تجلیوں سے کی جاتی ہے کہ اس کا معاملہ اس تجلی کی طرف مائل ہو جائے جس کو شریعت کی اصطلاح میں الرحمٰن کہا جاتا ہے۔ اور اسی طریقہ سے پھیل گیا اور فطری طور پر موجود شرط کے ساتھ پایا گیا جو کہ دو امور کا مجموعہ ہے۔ عرش جس پر الرحمٰن مستوی ہوا اور پانی جو کہ عالم امکان پر قوی ہے۔ اور یہ تمام صورتیں عرش میں ہیں اور ہر صورت عرش سے تجاوز کرتی ہے۔ چنانچہ وہ عدم محض اور امتناع ذاتی ہے۔ عرش سے میری مراد عرش تکوین ہی ہے جو جسمانی و روحانی امر ہے۔ اپنے طریقہ اور شرط قضا دونوں امور کے لئے جامع ہے۔

الرحمٰن نے عرش کی شرط سے سب سے پہلے جو فیصلہ کیا، وہ عناصر اور افلاک کی ان کی طبیعتوں کے ساتھ ایجاد ہے۔ چنانچہ افلاک، فاعل کے اصنام ہیں اور عناصر قابل کے اصنام۔ تو عرش وہ ہے جو موجودات کے اصول سے اس کو جمع کرے یا اس پر قبضہ کر لے۔ جیسا کہ ہم نے ایک شخص کے لئے کہا، اس کی عین ثابتہ ہے۔ میری مراد وہ ہے جو عین کے مشابہ ہے۔ تحصیلات کی ایسی عبارت سے تعبیر کرتے ہوئے جس سے مغائرت محسوس ہوتی ہے۔ اور وہ الرحمٰن ہے۔ اس کو فلاسفہ نے اپنی اصطلاح میں عقل فعال کہا ہے۔ اور اس کا نفس ناطقہ ہے جو کہ اس کی ایسی شخصیت ہے جس کی بنیاد پر اس کا وجود ہے۔ اور اس کا ایسا وجود ہے جو عناصر و افلاک سے اس کے اعضا میں جاری و ساری رہتا ہے۔ اور افلاک ہر تدبیر کا مرجع ہیں جو اس کے لئے مخصوص ہے۔ اور اس کی طبعی قوتیں ہیں جو اس کے اعضا میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اور قوی اور اکیہ ہیں جو پوری طرح اس کے اوپر طاری ہیں۔ اور اس کے قوی قلبی ہیں۔ ان میں سے جزئی احکام ہیں۔ اس کے بعد معدنوں کا فیصلہ کیا، پھر نباتات کا، اس کے طویل زمانوں کے

بعد حیوانات کے بارے میں فیصلہ کیا اور حیوانات کو پیدا کیا، اور ان کے بہت زمانوں کے بعد انسانوں کے بارے میں فیصلہ کیا۔ پھر قریب تھا کہ اس کے تمام اعضا میں فساد پھیل جاتا تو سب کمزور پڑ جاتے اور عرش اور پانی کے سوا کچھ بھی باقی نہ رہتا۔ اور ہوائے عدم ان دونوں پر یکے بعد دیگرے چوٹیں مارتی، عرش سے اس کی عرشیت کے ذریعہ اور پانی سے اس کی مائیت کے ذریعہ جو ہر وقت معدوم ہوتی۔ اور امر واجب کے لحاظ سے ہر لحہ باقی رہتی جو کہ دونوں اس کے سایہ ہیں۔ اس وقت نہ کوئی عنصر باقی رہتا، نہ آسمان، نہ خیال اور نہ کوئی ادراک کرنے والا۔ تب مملکت بغیر محافظ کے ہوتی۔ پھر خلو تام سے ایک خاص مدت کے بعد الرحمٰن شروع ہوتا ہے۔ چنانچہ اپنی فیاضی اور سخاوت سے معاملہ کرتا ہے اور آسمان اور زمین کو پیدا کرتا ہے جیسا کہ وہ تھے۔ اس طرح اس دورہ کا حساب ان امور میں سے ہے جو انسان بلکہ فلک سے بھی ممتنع ہیں۔ اور دورہ سابقہ کی باتیں کہیں مذکور نہیں ہیں، نہ ہی ان کی طرف کوئی اشارہ پایا جاتا ہے، نہ آسمان میں، نہ زمین میں، نہ خیال میں نہ کسی ادراک کرنے والی قوت میں، اور نہ ہی کوئی زبان اس کی تعبیر بیان کرتی ہے۔ اور نہ ہی دل میں اس کا خیال آتا ہے۔ ہم نے الرحمٰن میں اضمحلال دکھایا تو اس راز کو سمجھا۔

ومن العجائب ان افوه بذکرها
ولقد اغار بان یمر بخاطری

''اور عجیب بات یہ ہے کہ میں اس کا ذکر کرتا ہوں اور اس حد تک غیرت آتی ہے کہ وہ میرے دل سے بھی گزر جائے۔''

تصویر (نقشہ کشی): جاننا چاہئے کہ انجاس (کسی چیز کے جاری ہونے اور پھوٹنے) کی دو قسمیں ہیں۔ ایک التسمی (نام پانا) اور دوسرے خلق، پیدا ہونا۔ نام پانے کا مطلب ہے حقیقت صادقہ کا ذات سے جدا ہونا۔ چنانچہ اسم اور ذات یقینی طور پر ایک لحاظ سے ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں اور ایک لحاظ سے ایک دوسرے پر صادق آتے ہیں۔ تفارق یا ایک دوسرے سے جدا ہونا، ان کی اصل کے لحاظ سے ہے۔ اور تصادق (ایک دوسرے پر صادق آنا) ہر ایک کے دوسرے کے لئے شامل ہونے کے لحاظ سے ہے۔ اور خلق کا مطلب ہے حقیقت غیر صادقہ کا ذات سے جدا ہونا۔ اس طرح حقیقت غیر صادقہ اور ذات ہر لحاظ سے

ایک دوسرے سے جدا ہوتی ہیں۔ جب کہ اصل وجوہ کی دوسری وجہ سے ایسا نہیں ہوتا۔ اور تفارق اول کی پختگی کا مطلب اطلاق اور مطلق سے مطلق کے لئے شرح کرنا ہے۔ اور پختگی ثانی کا مطلب تقید، قید میں ڈالنا اور مقید سے مطلق کی شرح کرنا ہے۔ یاد رکھنا چاہئے کہ مفہوم کلیات میں سے ایک کلی ہے۔ اور کلی مفہومات میں سے ایک مفہوم ہے۔ اور یہ دونوں اپنی حقیقت میں ایک دوسرے سے ممتاز ہوتے ہیں۔ مفہوم وہ ہے جو سمجھا جائے اور جس کا ادراک کیا جائے۔ اور کلی وہ ہے جو عام ہو اور شامل ہو۔ اس طرح اس مثال سے تلطف (نرمی و مہربانی) کر سکتے ہیں اور اس بات کو سمجھ سکتے ہیں کہ یہ نسبت ایک ایسی نسبت ہے جس کو تفارق بالذات اور تصادق بالعرض کہا جاتا ہے۔ اور یہ نسبت اللہ کی ذات اور اس کے ناموں اور ایک نام اور دوسرے نام کے درمیان واقع ہے۔ اس طرح ذات ایک لحاظ سے عین اسماء ہے اور دوسرے لحاظ سے غیر اسماء ہے۔ اسی لئے اس جدائی کو ہم نے مطلق رکھا ہے۔ اس کے مقابلہ میں التسمی (نام پانا) ہے۔ اس طرح بات ثابت ہو جاتی ہے۔

تحقیق: کیا میں آپ کو اطلاق کی حقیقت کے بارے میں بتاؤں؟ کیا وجوب، موجود کو دو جہتوں، جہت فاعل اور جہت قابل سے نہیں گھیر لیتا؟ ایسی صورت میں اس موجود کا راز ان دونوں میں محفوظ ہے اور موجوب کا سلسلہ وجوب حق پر منتہی ہوتا ہے۔ اس طرح موجودات کے تمام اسرار ٹوٹ کر ایک راز میں جمع ہو جاتے ہیں، جو کہ اس میں داخل ہوتا ہے۔ اور وجوب حق یا وجوب یقینی، قطعی یا وحدۃ قصوی جو چاہو تم کہہ لو۔ پھر کہئے کہ وہ اطلاق اول ہے۔ پھر ہر وہ چیز جو اس پر بالعرض صادق آئے اگرچہ بالذات مطلقاً جدا بھی ہو۔ اور اطلاق کے لوازم میں سے یہ بھی ہے کہ مطلق کے لئے صورت اور مادہ نہ ہو۔ اس کے اعتبارات مختلف ہیں بلکہ امر واحد ایک اعتبار سے موجود جہت واحد کی شرح اور ایک اشارہ ہے۔ اس طرح اطلاق کا دائرہ وسیع ہو گیا۔ اور اس کی وحدت میں کثرت ہے۔ جہاں تک وحدت کا تعلق ہے تو ہر وجود کی وجود قطعی کی طرف ایک نسبت ہوتی ہے۔ تو جب قید سے کوئی آلودگی نہ ہو تو آپ کے لئے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ وہ وجود قطعی کے لئے وجود شرح ہے۔ اسی کی طرف اشارہ ہے۔ اور جہاں تک کثرت کا تعلق ہے تو وہ بالذات شارح اور مشروح اور اشارہ اور مشار الیہ کے تعدد کے لئے ہوتی ہے۔ اور یہ دونوں وجہیں وحدت اور کثرت بیک وقت

ساتھ ساتھ صدور اور ظہور میں خلط ملط ہوتی ہیں۔ چنانچہ خواہ وہ کتنی ہی چمک دار ہوں، ناظر کے لئے اپنی ازلی نظر میں ان کے درمیان فرق کرنا کبھی بھی صحیح نہیں ہوتا۔ واضح رہے کہ عقل کے تصرف اور مطلقات کا ایک طویل سلسلہ ہے، جس کا اول آخر ہوتا ہے۔ یا ایک دائرہ ہے، جس کا مرکز اس کا احاطہ کئے ہوئے ہوتا ہے۔ آپ چاہیں تو یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس کی مثال سورج کی شعاعوں جیسی ہے جو آفاق میں پھیلی ہوئی ہوتی ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس کی ایک وحدت ہو جس سے آگے کوئی چہرہ نہ ہو۔ اس تحقیق کو ذھن نشین کر لو۔

تمیز: اسم کا جو مفہوم عام لوگ اپنے محاوروں میں لیتے ہیں اس کا گمان نہ کرو۔ وہ لوگ اس کو ایک ایسے امر کے مقابلہ میں مطلق رکھتے ہیں جس کا ذہن احاطہ کرتا ہے یا زبان سے بولا جاتا ہے۔ جب کہ ہمارے نزدیک وہ حقیقت قدسی ہے جو ان موجودات سے زیادہ برحق ہے جس کا عام لوگ عقل یا وجدان یا احساس سے احاطہ کرتے ہیں۔ البتہ وہ غیر مادی ہوتا ہے اور وہ کسی اشارہ یا زمانہ کے تحت نہیں ہوتا۔ اور اس کا پایا جانا زیادہ موکد ہوتا ہے۔ اور اسماء اور صفات کے درمیان فرق ہوتا ہے کہ اسماء حقائق مجردہ ہوتے ہیں اور اسماء اور صفات اور ذات واجب کے درمیان تفارق بالذات اور تصادق بالعرض کی نسبت ہوتی ہے۔ اور صفات ان امور کی خبر میں ہے جو تنزہ، تقدس اور عزت و کبریائی کے سلسلہ میں حقیقت میں اللہ عزوجل سے متعلق ہیں، اور یہ سب اس زبان میں ہیں جس کو عام لوگ سمجھتے ہیں۔ اور اللہ سبحانہ کے اسماء کا علم ان امور میں سے ہے جن کا ادراک صرف ذوق سے کیا جاتا ہے۔ اس لئے رسول صلوات اللہ علیہم نے ان کے بارے میں سکوت اختیار کیا اور اللہ سبحانہ کی صفات کا علم ان امور میں سے ہے جن کے لئے صرف وہی قوت کافی ہے جس کو ہم عقل وجودی کہتے ہیں۔ اس لئے اس کے بارے میں رسولوں نے کلام کیا ہے۔ اور کتنے ہی بظاہر اسماء حقیقت میں صفت ہیں۔ اس طرح کتنی ہی بظاہر صفات قرار پانے والے حقیقت میں اسم ہیں۔

تنزل: قارئین عزیز! ہم نے بڑی محنت و کاوش سے تحقیقات کو آپ کے ذہن کے قریب تر کر دیا ہے۔ چنانچہ ہم نے کہا ہے کہ اسم اول نہ اس طرح واقع ہوتا ہے کہ اس سے پرے کوئی شے ہو اور نہ ہی وہ کوئی صادر ہونے والا ہے۔ وجوب حق کی طرف اس کی نسبت تقرر یا فعلیت یا ذات یا ماہیت کی طرف تحقیق کی نسبت ہے اور ہم ان الفاظ کی پرواہ نہیں

کرتے جن کے بارے میں فلاسفہ نے خود گمان کیا۔ پھر اس اسم سے اسم وجودی صادر ہوا۔ گویا کہ وہ تحقق میں وجود قطعی کے ظہور کی جہت کا بیان ہے یا اسم اول، چاہے آپ اس کو کچھ بھی نام دیں اور اسم سلبی گویا کہ وہ عریاں کرنے کی جہت کی شرح ہے جس کے مقابلہ میں نہ معقول آتا ہے نہ موجود اور نہ مفروض۔ اور جس کو تحقق کہا جاتا ہے اس کی شرح ایسے ہی ہے جیسے آپ کہیں، میں شئے مطلق کو توصیف کے دائرہ میں لے آیا۔ اور وہ جس پر مبنی ہے، اس کے بارے میں خبر دینے کا عمل مطلق کیسے ہو سکتا ہے؟ اصلا وہ عالم قید میں قطعی مطلق کے مقابلہ میں ہے۔ پس اس پر غور کرو۔

کیا یہ امر عجائبات میں سے نہیں ہے کہ لازم اول، اطلاق اول سے پیچھے نہیں رہتا، نہ وجود میں اور نہ سلب میں۔ جہاں تک وجود کا تعلق ہے تو وہ بنفسہ ہے اور سلب اس کی مشابہت سے ہے۔ اس بارے میں سب سے اچھی بات ہمارا یہ قول ہے **لم یغادر صغیرۃ ولا کبیرۃ الا احصاھا** "اس نے تو نہ کسی چھوٹی چیز کو چھوڑا نہ بڑی کو، سب کا احاطہ کر لیا" اس بارے میں آپ کو جس نے یہ بتایا کہ اس کو کسی عدم نے ڈھانپ لیا ہے اس کو وہم ہوا ہے۔ جہاں تک اسم وجودی کا تعلق ہے اس سے کچھ نکلا۔ اس میں ظہور کو واضح کیا، پھر ایک مجموعہ کے بعد ظہور تقییدی کے لئے ملکہ بدلا، پھر ظہور بالفعل تبدیل ہوا اور اسی سے ازل محض کا نظام مکمل ہوا۔ دوسری طرف اسم سلبی سے شاخیں نکلیں جو ہر ظہور پر متفرق ہو جاتی ہیں گویا کہ وہ سیف ازل ہے جو ہر فاسد کو کاٹتی اور صحیح کی حمایت کرتی ہے۔ اور ہم نے آپ کو ایسے اسماء دیئے ہیں کہ ان سے ایجاد کے بھید وابستہ ہوتے ہیں۔ اور آپ کو نہیں معلوم کہ شاید اس وضاحت کے نتیجہ میں ناموں کے حقائق برآمد ہوں۔ آپ سوچیں گے کہ ہم اس کی شرح نہیں کر سکتے۔

معذرت: ہم نے "الخیر الکثیر" میں تفارق اسماء اور ان کے ایک دوسرے سے ممتاز احکام کو کثرت سے بیان کر دیا ہے اور وہاں ہمارے طریقہ سے دو طرح سے ہٹا ہے۔ اول یہ کہ ہم نے ازل کے حکم کو مختلف احکام میں تقسیم کر دیا ہے اور ان میں سے بعض کو ثبوتی اور بعض کو سلبی قرار دیا ہے۔ اسی طرح بعض کو بالقوہ اور بعض کو بالفعل۔ اگرچہ یہ تقسیم واقعہ کے مطابق ہے لیکن وہ عرفان جو واقعہ کی اصل سے زیادہ مشابہ ہوتا ہے وہ اس کو اس قسم سے مفید ہوتا ہے جو غلبۂ حال کے حکم سے متغیر ہوتی ہے۔

دوسرے یہ کہ ہم نے ہر مرتبہ کو اسماء حسنیٰ میں سے اسم کے حال اور ذوق کے تقاضہ کے مطابق قرار دیا ہے۔ شاید کہ قرآن عظیم میں ان سے مراد وجود کی لغت میں صفات نہیں اور عارف احوال کی تبدیلی اور مقامات کے اختلاف میں لازمی طور پر ہمیں معذور قرار دے گا۔ شاعر نے کہا ہے

وعذرالهوی العذری بین جفونها
اذاهی لامت عاشقیها یلومها

''اور عشق کے عذر والا عذر اس کی پلکوں کے درمیان ہے وہ جب اپنے عاشقوں کو ملامت کرتی ہے تو وہ عشق اس کو ملامت کرتا ہے۔''

اور حدیث قدسی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا **انی لست کل کلام الحکیم اتقبل ولکن اتقبل همه وهواه فان کان همه و هواه فی طاعتی جعلت صمته حمداً لی ووقارا وان لم یتکلم** ''میں حکیم کے ہر کلام کو قبول نہیں کرتا لیکن اس کی نیت اور خواہش کو قبول کرتا ہوں۔ اگر اس کی نیت اور خواہش میری اطاعت گزاری میں ہوتی ہیں تو اس کی خاموشی کو بھی اپنی حمد اور وقار بنا لیتا ہوں، چاہے وہ بولے بھی نہیں۔'' (دارمی)

تحدیق (گہری نظر ڈالنا): کیا ایسا نہیں ہے کہ ہر شے اپنے آپ میں ایک غیر شے ہے اور کبھی شے نہیں ہے یعنی وہ اپنے آپ میں اپنا غیر نہیں ہے۔ ورنہ آپ کے لئے اس پر حکم لگانے کا موقع نہیں ہوتا کہ وہ ایسا ہے اور ایسا نہیں ہے۔ تو وہ نہ وحدت حقہ ہے اور نہ ہی اطلاق حق۔ کہ وحدت حقہ اور اطلاق حق جو کہ وہ ہوتے ہیں اور وہاں غیر مثبت یا منفی نہیں ہوتے۔ پھر جب تم کسی چیز کو پاؤ اور اس کی نسبت اس کی طرف کرو تو آپ کے لئے یہ نہیں ہوگا کہ غیر کہو۔ پھر کتنا آسان ہے کہ تم یقین کے ساتھ کہو کہ اطلاق عالم تقیید کے گرد جمع ہوتا ہے اور وحدت، کثرتوں پر۔ اور یہ کہ کتاب اطلاق اگر اب تقیید کو شامل نہیں ہوتی تو کسی چیز میں اطلاق نہیں ہوتا۔ کیا ایسا نہیں ہے کہ ہر موجود اس وقت تک نہیں پایا جاتا جب تک اس کو اوپر اور نیچے سے علتیں نہیں گھیر لیتیں، اور گھیرا ہوا وجوب تک نہیں پہنچ جاتا۔ چنانچہ جب واجب اپنے طریقہ سے ہوتا ہے تو موجود کو پیدا کر لیتا ہے۔

پھر یہ واجب اگر بسرّ واحد اور کلمۂ واحدہ سے پایا جاتا ہے تو وہ اپنی علت پر صادق ہوتا

ہے، اور اگر مختلف کلمات میں پایا جاتا ہے تو آلودہ ہوتا ہے۔ اور علت کے ساتھ صرف اس لئے متحد ہوتا ہے کہ وہ اس سے پایا جاتا ہے۔ اور مختلف کلمات میں پایا جانے والا جب کہ اس کی خصلت میں تعدد ہے تو اس کو اسمیت سے معزول کر دیتا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہے کہ انیات ازلیہ کی دو وجہیں ہوتی ہیں۔ ایک وجہ فعلیہ جو کہ غیر منتظرہ ہوتی ہے اور اس کے نزدیک واقع نہیں ہوتی کہ اس کے پیچھے کوئی امر ہوا ہے۔ دوسرے وجہ القوہ کہ ہر وجہ فعلیہ اسی سے ہوتی ہے کیونکہ ہر فعلیہ ایک دوسری فعلیہ کے ساتھ جمع ہوتی ہے جو اس کے پیچھے ہوتی ہے۔ اس طرح ہر موجود میں کل ہوتا ہے جو اطلاق کی شرح ہوتا ہے۔ ان دونوں کا حق ادا کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اور جب یہ اصول واضح ہو گیا تو لازمی طور پر یہ تصدیق ہو گئی کہ اسماء ازلیہ کے لئے ایک خاتم اور عالم تقیید کے لئے ایک مبدا ہے۔ اور وہ اسم مطلق ہے جس کے طریق سے موجود کل پایا جاتا ہے۔ اور یہ کہ موجود کل میں دو ضم (ملاوٹیں) ہیں۔ ضم فعلیت اور ضم قوت۔ اور اصطلاح کا سلسلہ اس طرح چلتا ہے کہ خاتم الاسماء کا نام الرحمٰن رکھا گیا اور موجود کل کا انسان اکبر اور فعلیت کو عرش اور قوت کو ماء (پانی) کہا گیا۔

توضیح: میں آپ کو عموم اسم الرحمٰن کے بارے میں کیسے بتاؤں جب کہ وہ ان فعلیات کے ساتھ جمع ہے جو رحمت و مہربانی کی جہت سے ملا ہوتا ہے۔ اور یہ بالفعل افاضہ ہے کیونکہ محض ازل سے ممتاز ہے۔ حقیقت اعلیٰ پر پوری طرح صادق آتا ہے۔ ارشاد ہے فادعوا الله او ادعوا الرحمن ایا ما تدعوا فله الاسماء الحسنی ”اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر پکارو، کسی بھی نام سے پکارو، اس کے سارے نام اچھے ہیں۔“ (الاسراء:۱۱۱) اور میں کہتا ہوں کہ رحمان وہ طریق ہے جس سے افاضہ ہوتا ہے اور تجلیات ازلیہ کی شرط سے ازل وابد میں انسان اکبر پر تحقق اور تقرر ثابت ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیں کہ انسان اکبر ایک ایسا شخص ہے جس کی دو وجہیں ہیں۔ ایک وجہ سے وہ شئے عام ہے جس کی بنیاد پر اس کا وجود ہے یا جو اس کے ہم شکل ہے۔ اور دوسری وجہ سے وہ شئے خاص ہے کہ اس خصوص کے بغیر وہ ممکن ہی نہیں۔ اور انسان اکبر وجہ اول کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ اور دوسرا شرط اول اور اس کے واسطہ سے ہوتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ دو بناوٹیں ہیں بلکہ وہ ایک ہی بناوٹ اور کلمہ واحدہ ہے۔ کیا ہم آپ کو یہ نہیں بتا چکے ہیں کہ کلی اور جزئی دو امر ہیں۔ جو تعقل کی صنعت سے ہیں،

اور وہ دونوں اس شخص کے نزدیک جو تعقل سے مقام کے لحاظ سے بلند و برتر ہے، امر واحد ہے۔ اوران دونوں کی شان، شان واحد ہے اور جہت کے لحاظ سے واضح ہے۔ اس طرح کلی اپنے مرتبہ میں جزئی ہے اور جزئی اپنے مرتبہ میں کلی ہے۔ اور مطلق اپنے اطلاق کے دائرہ میں متعین ہے اور اس کا تعین، تعین آخر ہے کہ اس کا اطلاق متصادم نہیں ہوتا۔ اور متعین تعین کے دائرہ میں مطلق ہے۔ اور اس کا اطلاق، اطلاق آخر ہے، اس کا تعین متصادم نہیں ہوتا۔ اس طرح یہ مبائن مادہ کی قید میں بند عقل کی بدعتیں ہیں۔

اور میں کہتا ہوں کہ اس عرش کی شان ان چیزوں جیسی نہیں ہے جو کسی ایک ہی صورت میں پائی جاتی ہیں بلکہ اس کی تمام صورتیں اپنے حقائق کے ساتھ مجمل طور پر بالفعل موجود ہیں اور ہر صورت جو عرش سے ماورا ہو وہ معدوم محض اور ممتنع خالص ہے۔ اور میں کہتا ہوں کہ عرش اور پانی میں سے ہر ایک میں چار معنی شامل ہوتے ہیں۔ اوّل یہ کہ وہ یہاں ہے یا وہاں۔ دوسرے یہ کہ وہ آج ہے یا کل۔ تیسرے یہ کہ اگر وجود میں ملایا جائے گا تو وجود میں آ جائے گا اور اس کو کھویا جائے گا تو کھو جائے گا۔ چوتھے یہ کہ وہ بالفعل ایسا ہے یا ایسا نہیں ہے۔ تو اہل خرد نے اس کی فساد نظر کے لحاظ سے کئی قسمیں قرار دی ہیں۔ اور ان کو مکان، زمان اور ہیولی اور صورت کے نام دیئے ہیں۔ جب کہ دوسرے لوگوں نے ان کو وہم قرار دیا ہے۔

تاسیس (بنیادی بات) عرش کے واسطہ سے پانی میں رحمٰن کا فیصلہ یا اس کی ایجاد یا تکوین آپ کچھ بھی کہہ لیں، ازل میں بھی اور ابد میں بھی ایک ہی ہوتا ہے۔ اس کا اول آخر ہوتا ہے اور آخر اول۔ یہاں ایک ہیئت فیاضی ہوتی ہے جس کی قضا دوسری سے ممتاز نہیں ہوتی اور وہ ہر اس ممکن صورت کی قضا کے لئے کافی ہے جس سے تحقق کی مملکت پوری طرح ڈھانپ دی گئی۔ القاء کرنے والے کے القا سے قضا ممتاز ہوگئی۔ تو جب کبھی قبول کرنے والا عام ہوتا ہے تو اس سے قضائے عام پھیلتا ہے اور جب وہ خاص ہوتا ہے تو اس سے قضاء خاص پھیلتا ہے اور وہ جہتیں اور اعتبارات جو اپنے مرتبہ میں صنعت عقل کے اعتبارات سے مشابہ ہوتے ہیں تو اپنے بعد آنے والے موجود کے وجود یا متحقق کے تحقق کے مثل ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ بعد میں آنے والے کا جانب اول میں اعتبار ہوتا ہے اور اس کی شانوں میں سے صرف یہی ایک شان ہوتی ہے۔ اور مجھے معتبر وثقہ ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ جس شخص کو کتا کاٹ

لے اس کا مزاج کتے جیسا ہو جاتا ہے، وہ کتے کی طرح بھونکنے لگتا ہے۔ پھر اس کے پیشاب کے قطرات میں کتے جیسی صورتیں ظاہر ہونے لگتی ہیں۔ تو میں تمہیں بتاتا ہوں کہ اس سے یہ پتہ لگانے کی کوشش کرو کہ جس شے کا کوئی خاص مزاج ہوتا ہے۔ اس کے اجزا میں سے ایک جز پر ایسی صورت ظاہر ہوتی ہے جو اس کے مزاج کے مشابہ ہوتی ہے۔ اس طرح یہ اہم اصول ہیں ان کو مضبوطی سے گرہ میں باندھ لو یہاں تک کہ آپ کے سامنے ان کے اعمال کا موقع آ جائے۔

تمہید: انسان اکبر کی روح عرش اور پانی سب میں چلتی ہے۔ کیا ایسا نہیں ہوتا کہ جو انسان اصغر اپنی صورت پر پایا جاتا ہے، اس کی روح خود اس کے نفس کے مد مقابل ہوتی ہے؟ کیا ایسا نہیں ہے کہ تمام انسان اکبر شخص واحد ہوتا ہے۔ اور یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ شخص واحد نہ ہو، جب کہ وہ کلمہ واحد یعنی خاتم الاسماء سے پایا جاتا ہے۔ اور واحد کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ کلمۂ واحد سے ہو اور اس کا ایک نفس ہو۔ اور یہ کیسے ممکن ہے کہ اس کا نفس نہ ہو جب کہ وہ اپنی اصلی شکل میں ہی پایا جاتا ہے اور کوئی نفس ایسا نہیں ہوتا کہ یہ حیوان اس سے متعلق نہ ہوتا ہو۔ اور کوئی نفس ناطقہ ایسا نہیں ہوتا کہ یہ حیوان ناطق اس سے متعلق نہ ہوتا ہو۔ اور اس کا ایک جسم ہوتا ہے اور اس کا جسم کیوں نہ ہو درانحالیکہ آپ جسموں کو دیکھتے ہیں۔ کیا یہ اس کے بغیر ہوتا ہے" ہرگز نہیں؟ بلکہ اس کے بغیر کوئی چیز نہیں ہوتی۔ اور اس کی طاقتیں ہوتی ہیں کہ آپ جن چیزوں میں اجسام کا مشاہدہ کرتے ہیں، کیا ان میں قوتوں کا مشاہدہ نہیں کرتے؟ کیا وہ انسان اکبر کی قوتوں کے بغیر ہوتے ہیں؟ ہرگز نہیں بلکہ اس سے خارج کوئی قوت نہیں ہوتی۔ تو اب جب کہ آپ نے ان اصولوں کو تسلیم کر لیا تو آپ کے لئے لازم ہے کہ ایک ایسی قوت جسمانی کا اعتراف کریں کہ تمام قوی اس کی طرف رجوع کرتے ہوں۔

تقریب (بات کو قریب الفہم کرنا): روح کی قوتوں کے لحاظ سے انسان اکبر کی تین قسمیں ہیں، جیسا کہ ہم آگے چل کر بیان کریں گے۔ اور اسی طرح انسان اصغر کی روح کی بھی تین قسمیں ہیں۔ ان میں سے ایک علمی ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ اس تدبیر کے صدور کے بارے میں جو کہ موجودات کی اصل اور اس کے کمالات کی جامع ہے اس علم کے بغیر کچھ کہیں جس کو تدبیر سے پہلے یا اس کے بعد جانتے ہوں؟ کیا مادہ اور اوقات کے اختلاط سے خالی اوقات کا انتشار تدبیر نہیں ہے؟ چنانچہ اس کے علم سے علم تعقل اور علم توہم اور علم تخیل کا ہونا

ضروری ہے۔ اور کبھی بھی روح کے تعلق کا انکار نہ کرنا۔ اس سلسلہ میں جو امر حق ہے اس کے بارے میں ہم آپ کو جلد ہی بتائیں گے۔

اور ان میں سے ایک طبعی ہے۔ کیا ایسا نہیں ہے کہ کوئی بھی جسم گرمی یا سردی سے اپنی وضع میں طول یا قصر لمبے ہونے یا چھوٹے ہونے جیسی صفات سے خالی نہیں ہوتا۔ اور جسموں کا معاملہ موجودِ کل کی طرف لوٹتا ہے۔ اس طرح ہر قوت جس کا آپ مشاہدہ کرتے ہیں، کل کی قوت کا ایک حصہ ہے۔

اور ان میں سے ایک قلبی ہے۔ کیا ایسا نہیں ہے کہ علم تدبیر سے ہے۔ وہ تدبیر کا انتشار نہیں ہے۔ چنانچہ ضروری ہے کہ اس کے تحت ایک قوت جامعہ ہو جو ان دونوں قوتوں کو مسخر کر لے۔ اور اپنے نفس سے ایک اثر کو صادر کر لے۔ اگر دونوں قوتوں کا اجتماع نہ ہوتا تو وہ ظاہر نہ ہوتا۔ کیا ایسا نہیں ہے کہ جیسا ہم نے اس کو کشف کیا ہے کہ وہاں ایجاب واحد ہے جس سے تاثیر میں انتشار کے بغیر موجودات پیدا ہوتی ہیں۔ اور اصطلاح یہ بھی ہے کہ موجودِ کل کے تعقل اور اس کے توہم اور تخیل کو نمونہ اور مثال کہا جاتا ہے۔ اور قوت، قلبیہ قضا ہے۔ اور ہمیں عام لوگوں نے اور ان کے خواص نے بھی قوت طبعیہ کے بیان سے بے نیاز کر دیا ہے۔ اس لئے دوسری قوتوں کے احکام کو جمع کرو اور ان کو دھیان سے سنو۔

تفتیش: قوت علیہ کے احکام میں سے جن کا ہم نے ذکر کیا کہ وہ عالم حیات ہیں، ان میں غیر زندہ کا پایا جانا ممکن نہیں ہے۔ کیا ایسا نہیں ہے کہ حیات کے بہت سے مراتب ہوتے ہیں؟ چنانچہ آپ کی پوری حیات کا ایک مرتبہ ہے۔ اور آپ کے گوشت یا اعصاب کی حیات اس سے ناقص ہے اور آپ کے بالوں یا ناخنوں کی حیات اس سے بھی زیادہ ناقص ہے۔ اسی سے اندازہ لگا لو کہ عالم مثال اور اسی طرح عالموں میں سے ہر عالم کی حیات، انسان اکبر کی حیات سے ناقص ہے جب کہ ان میں سے بھی بعض کو بعض پر فضیلت حاصل ہے۔ اور ہر وہ وجود جو جسم سے جدا ہے، اس کی حیات اس کے مقابلہ میں زیادہ مکمل ہے جو اس سے ملا ہوا نہیں ہے۔

اور ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس کی بنیاد معانی کے جسم اور جسموں کی روح پر ہے۔ ہم نے تمہیں جو کچھ سکھایا ہے کیا اس میں ایک ایسا علم نہیں ہے جو تمام عالموں کی نگہداشت کرتا

ہے۔ پس جان لو کہ ہر معنی کا ایک جسم ہوتا ہے اور ہر جسم کا معنی ہوتا ہے۔ اس طرح یہ منتقلی موجودات مثالی کا مادہ ہے۔

اور ان میں سے یہ بھی ہے کہ جو بھی عالم اجسام میں موجود ہے، وہ اس تشخص اور اسی کلمہ کے ساتھ عالم مثال میں بھی موجود ہے۔ اور تمہارے خیال کے لحاظ سے یہ بات زیادہ معتبر معلوم ہوگی کہ چیز سے اس کی اصل صورت جدا ہو جاتی ہے اور اگر تمہارا خیال غلط ہو جائے تو موجود کل غلط نہیں ہوگا بلکہ وحدت اور کثرت، شے سے متعلق اس کے علم سے پیدا ہوتی ہیں، خواہ وہ واحد ہو یا کثیر۔ ایسا نہیں ہوتا کہ اس کا علم خارج کے مطابق ہو۔ اس طرح وجود مثالی لطیف ہوتا ہے جو جسم میں پوشیدہ ہوتا ہے پھر جب وجود ختم ہوتا ہے تو معاملہ اس کی طرف لوٹتا ہے۔ اور انسان یا تو اپنی صفات اور ہیئتوں کے لئے باقی رہ جاتا ہے یا اس کلمہ کے ساتھ جس کے ساتھ خاص اس کا تعلق ہوتا ہے، کسی غیر کے ساتھ نہیں۔

اور ان میں سے یہ بھی ہے کہ عالم مثال میں اشخاص کا اپنے خواص اور اپنی قوتوں کے ساتھ پایا جانا ممکن ہوتا ہے۔ کہ اس کا وجود مثال سے خارج نہیں ہوتا۔ اس کی حیات ہماری حیات کے مشابہ ہوتی ہے بلکہ زیادہ مکمل اور فراخ و وسیع ہوتی ہے۔

اور ان میں سے یہ بھی ہے کہ اس قوت کی دو وجہیں ہوتی ہیں ایک وجہ وہ کہ رحمان کی وحدت میں درج ہونے والی قدر اسکے مقابل ہوتی ہے پھر یکے بعد دیگرے اس سے قضا ظاہر ہوتی ہے۔ پھر جب رحمٰن عرش کے اوپر سے کسی امر کا فیصلہ کر دیتا ہے تو صورت پوری طرح تعقل میں نقش ہو جاتی ہے پھر جب اسماء جزئیہ اور استعداد عالم کے مطابق اس قضا کی شرح ہوتی ہے تو توہم میں نقش ہو جاتی ہے۔ پھر خیال میں صورت متعین ہوتی ہے۔ پھر فیصلہ خارج میں ظاہر ہوتا ہے۔ اور دوسری وجہ وہ ہوتی ہے کہ عالم شہادت اس کے مقابل ہوتا ہے۔ اس طرح کوئی واقعہ ایسا نہیں ہوتا جس کی کوئی ایسی صورت نہ ہو کہ تم گمان کرو کہ عالم کے اوپر دوسرا فیصلہ کیا جائے گا اور وجہ اول مثال کے ساتھ خاص ہوتی ہے اور دوسری نگراں حال یا صحیفۂ عاملہ کے ساتھ۔

اور ان میں سے یہ ہے کہ جب انسانِ صغیر رحمٰن کی عطا کی ہوئی شکل میں پایا جاتا ہے اور اس کے اوپر تعقل اور توہم اور تخیل غالب ہوتا ہے تو ان میں سے ہر ایک کے لئے اس قوت کی طرف ایک راستہ ہوتا ہے۔ ان سے اس کے خواص اور علوم میں مدد آتی ہے تو تعقل کی مدد

سے امور عامہ اور حکمت الٰہیہ کے دقائق اور علوم صوفیا ہوتے ہیں اور تو ہم کی مدد سے علم جفر و رمل اور خطابت اور علوم شعراء اور حساب اور مہندس (انجینئرنگ اور جیومیٹری) کے علوم ہوتے ہیں۔اور تخیل کی مدد سے خواب اور حادثات وغیرہ ہوتے ہیں۔

اور ان میں سے تخیل کے دو درجے ہوتے ہیں۔ایک درجہ ہمارے حافظہ کے مشابہ ہوتا ہے اور دوسرا ہماری حس مشترک (کومن سینس) کے مشابہ ہوتا ہے اور دوسرے میں فرشتوں اور جنات کا ذکر کیا جاتا ہے اور اس عالم کے عجیب عجیب امور ظاہر ہوتے ہیں۔

تفحص (کھود کرید کرنا): قضاء ہیئت ایجابیہ ہے۔قوی کے لئے وحدانیت ہے۔ اس کی وحدت مختلف علتوں پر مبنی ہے اور اس کے اٹھانے والے ہیں جنہیں عرش کو اٹھانے والے کہا جاتا ہے۔اور یہ وہ معاملہ ہے کہ رحمٰن کا پہلا فیصلہ امور کلیہ ہوتے ہیں جن کو اس کی قوتیں اٹھاتی ہیں۔اس سلسلہ میں آپ کے لئے مثال جنین کی حالت میں موجود ہے کہ اس کی پہلی تکوین قلب اور طبیعت اور دماغ کی تکوین ہوتی ہے۔ پھر اشخاص کلیہ کا فیصلہ کیا جاتا ہے کہ ان میں سے بعض گویا مکمل عالم ہیں اور بعض اس کی کوئی ایک نوع ہیں۔پھر ان کے اعیان پر تجلی کی جیسا کہ ہم عنقریب بتائیں گے تو ان کی تجلی کا حکم ہی قضا ہو گیا۔تو جب کبھی عالم ،صورت فیضان کے لئے تیار ہو گیا تو فرشتوں کے امام اور سید کے دل میں وجہ کلی کی بنیاد پر اس کے وجود کے ساتھ معاملہ نازل ہو گیا۔پھر جب کبھی تیاری زاید ہو گئی،ان کے دلوں میں وجہ تشخص کی بنیاد پر پختگی آ گئی اور اس کے وجود کے ساتھ معاملہ نازل ہو گیا۔اس طرح انسان صغیر کے اعیان کے امام کو یہ علم خلط ملط ہو گیا اور رحمٰن نے اس پر ارادہ ،قضا ،خلق اور تکوین کے ساتھ تجلی کی اور ان کے حواس و جوارح کو اس تجلی کے مطابق اپنا غلام بنا لیا۔اس طرح جب روح نے کہا کہ اللہ ایسا اور ایسا ہے تو اس کی مراد یہ تھی کہ اس صورت میں تجلی کی۔پھر جب تم علوم ارواح میں دور تک چلے جاؤ گے تو یہ تمہاری نظروں کے سامنے ہو گا جس کی طرف تم اشارہ کر سکتے ہو۔

۱۸- تفہیم:

ابداع کی حقیقت کا بیان

السلام علیکم۔امابعد۔میں اللہ کی حمد بیان کرتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں اور اس کے نبی اور ان کی تمام آل پر صلوۃ بھیجتا ہوں۔تم نے ابداع کے بارے میں معلوم کیا ہے کہ وہ کیا ہوتی

ہے؟ تو میں کہتا ہوں کہ وہ بغیر مادہ کے کسی شے کی ایجاد ہے اور اولین مبدع (ایجادات) قلم ہے پھر لوح، پھر عرش اور پانی ہے جس کی طرف اللہ تعالیٰ کے ارشاد میں اشارہ کیا گیا ہے۔ و کان عرشه علی الماء ''اور اس کا عرش پانی پر تھا'' پھر اللہ تعالیٰ نے پانی سے جو چاہا پیدا کیا۔ اور اسی مقام سے تخلیق کا عمل شروع ہوا۔ اور وہ بغیر نام کے ہے۔ اور تم نے مجھ سے بعض لوگوں کے اس قول کے بارے میں سوال کیا ہے کہ بعض صفات کمالیہ وجوبیہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے لئے انسان کامل کے واسطہ سے ثابت ہوتی ہیں۔ اس بارے میں، میں کہتا ہوں کہ ایسا دو وجہوں سے ہوتا ہے۔

ایک یہ کہ عرش اور نفوس افلاک سے جو کچھ عرش کے جوف میں ہے، اس کے لئے اس کے رب کی معرفت ہے۔ اور کسی چیز کی معرفت اس وقت تک صحیح نہیں ہوتی جب تک نفس عارف سے صورت علمیہ قائم نہ ہو جائے جو کہ اس شے کو ظاہر کرنے والی ہے۔ اور اگر عارف اس صورت کی طرف متوجہ نہ ہو تو بھی کوئی حرج نہیں ہے کہ ان کے نفوس کی الواح میں صورت علمیہ ثابت ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کے کمالات ابداع اور خلق وغیرہ کو ظاہر کرنے والی ہے۔

اور نفوس بشری جب اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں کہ اس کی معرفت حاصل کرلیں تو ان کے اوپر عرش کی، اور جو کچھ اس میں ہے، اس کی معرفت کی روشنیوں میں سے کوئی روشنی واقع ہوتی ہے۔ اس طرح یہ روشنی اس کی معرفت کے لئے گمان کی جاتی ہے جیسا کہ انسان کسی چیز کو دیکھنے کا ارادہ کرتا ہے تو اپنی آنکھ کو کھول کر شے کی طرف دیکھتا ہے۔ تب اس کے اوپر سورج اور تمام ستاروں کی روشنی پڑتی ہے۔ اس طرح اس شے کی صورت آنکھ میں بنتی ہے یا اس کی بینائی کی شعاع شے سے متعلق ہوتی ہے اور وہ بینائی کے انکشاف کے لئے تیار ہو جاتی ہے۔ ہم نے اس کا یقینی ادراک اللہ تعالیٰ کی مدد سے حاصل کیا۔ اور یہ صورت علمیہ قربتوں کی اصل و بنیاد ہوتی ہے۔ پس جو قربت حظیرۃ القدس (ملا اعلیٰ) میں ہوتی ہے اور اس سے شریعتوں کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کا انعقاد اس قربت کی روحانیت کے اس نزدیکی کے لئے اجمالی استعداد سے ملنے سے ہوتا ہے۔ اور جو قربت معاد میں ظاہر ہوتی ہے بندہ بغیر ترجمان کے بالمشافہ کلام کرتا ہے۔ اس کا انعقاد اس قابلیت کی روحانیت کے ملنے سے ہوتا ہے جو اس انسان کے مثل ہوتا ہے جس کو شریعتوں میں روح اعظم کہا جاتا ہے اور جس کی تعریف کثیر چہروں، زبانوں اور لغتوں سے کی جاتی ہے۔ چنانچہ انسان کامل کی تعبیر عرش سے

اور جو کچھ اس کے اندر ہے اس سے کی جاتی ہے کہ وہ انسان اکبر ہے اور یہ کمالات اس کے واسطہ سے ظاہر اور متحقق ہوتے ہیں۔

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ انسان کا کمال اس کی روح کے جسم سے جدا ہونے کے بعد ہوتا ہے۔ جیسا کہ آپ خصوصیات کی چادر سے نکل جانے کے بعد دیکھتے ہیں۔ اس وقت اس کے نزدیک نہ صبح ہوتی ہے اور نہ شام ہوتی ہے اور نہ ہی وہ فلاں یا فلاں سے مخصوص ہوتی ہے۔ اور نہ ہی اس کے نزدیک اخلاق اور علوم ہوتے ہیں۔ جو اس کے بدن کے یا روح کے مزاج کے سبب پیدا ہوتے ہیں۔ اس وقت صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ باقی رہتا ہے۔ اس وقت وہ باری تعالیٰ کے جوارح کا ایک حصہ بن جاتا ہے۔ چنانچہ کبھی مصلحت بندہ کے دل میں کسی شے کے الہام کی ہوتی ہے۔ اس وقت اس کا ارادہ ملأ اعلیٰ میں منعقد ہوتا ہے۔ تب اس نفس میں الہام کے لئے درستگی مترشح ہوتی ہے۔ اور اگر یہ بندہ اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اس کا مقصد پوری قوت کے ساتھ یہ ہو کہ یہ قوی الہیہ میں سے ایک قوت ہے۔ یہ نہیں کہ وہ کوئی نفس یا فرشتہ یا کوئی چیز ہے تو وہ بہت ساری مصلحتوں کے لئے سبب ہوتا ہے۔ اور اگر یہ بندہ ذکی، ذہین و سمجھ دار ہوتا ہے تو اصلاً اس نفس کے واسطہ سے بالکل نہیں سمجھتا۔ وہ یہی گمان کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے قلب میں الہام کیا ہے۔ یہی انسان کامل ہوتا ہے۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کے جود و کرم کی بہت ساری باتوں کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔

اور تم لوگوں نے مجھ سے آنجناب رضی اللہ عنہ کے اس قول کے بارے میں دریافت کیا ہے کہ "وجودی آمیزشوں میں اپنے رب پر نظر کامل یا کامل پر نظر حق کو تدبیر کہا جاتا ہے" تو یہ کونسی تدبیر ہے؟ میں کہتا ہوں کہ یہ حق تعالیٰ کی تدبیر کا ایک شعبہ ہے۔ اور اصل تدبیر ازل میں حق کا یہ ارادہ ہے کہ انسان اکبر اپنے تمام اعضا اور ہیئتوں کے ساتھ پایا جائے۔ پھر وقتاً فوقتاً جو کچھ متحقق ہوتا رہتا ہے وہ اس کا سرمایہ اور اس کے تحقق کی اصل ہے اور یہی ارادۂ قدیم ہے۔ پھر جب عارف پر اطلاق کے گوشہ کا انکشاف ہوتا ہے تو وہ ایسی نظر پاتا ہے جو حق کو اخذ کرنے والی ہوتی ہے اور اس کی طرف منتہی ہوتی ہے۔ تربیتوں میں داخل ہو جاتی ہے اور تربیت میں الگ ہی رنگ میں ظاہر ہوتی ہے اور وہ خالص اسی کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ اور یہ وہ نظر ہے جس کو ہم وجاہت کہتے ہیں۔ اور وہی ہے جو اس کے نفس میں کمال کے ساتھ متحقق ہوتی ہے۔

اور کبھی کبھی ہم اس کو اس کے بعض آثار کے ظہور کے وقت تجلی کمالی کہتے ہیں۔

اور جان لو کہ کامل کی روح اس برکت کے درجہ میں ہو جاتی ہے جس میں صاف پانی ہوتا ہے۔ جس میں سورج کی روشنی اندر تک پہنچ جاتی ہے پھر اس میں صورت علمیہ پیدا ہو جاتی ہے اور شخص اکبر سے اور مقدس دائرہ سے اس کو جان لیتا ہے یا اس سے غافل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ کبھی کامل دنیوی باتوں یا کسی لذت کے عمل میں مشغول ہوتا ہے، یا تکان کا شکار ہوتا ہے، یا کسی کام میں مشغول ہوتا ہے۔ اس حالت میں یہ صورت یاد دہانی اور حفظ اور دل میں خیال کے طور پر پیش نہیں آتی ہے، اور اس حالت میں اس کی طرف ذہین آدمی ہی متوجہ ہوتا ہے اور اس سے مدد حاصل کرتا ہے۔ چنانچہ اس کے حق میں وہ صورت تمام معارف الٰہیہ کو کھولنے والی ہو جاتی ہے اور عارف اس کو محسوس نہیں کرتا۔

اور جان لو کہ بندہ کی اپنے رب کی طرف توجہ اور اس توجہ کے دوام سے حاصل ہونے والی کیفیت کو نسبت اور سکینہ کہا جاتا ہے۔ اور نسبت کی کئی اقسام اور انواع ہوتی ہیں۔ لیکن جمہور اہل اللہ پانچ اقسام میں سے کسی ایک سے خالی نہیں ہوتے۔ اور ہر قسم کا ایک خاص اثر ہوتا ہے اور ہر قسم کا آئینہ کے درجہ میں ایک خاص منبع ہوتا ہے اور ان کی جہت شمال کی طرف ہوتی ہے۔ اس لئے اس میں کواکب شمالی ظاہر ہوتے ہیں پھر ان کی جہت جنوب کی طرف ہوتی ہے۔ تب ان میں کواکب جنوبی ظاہر ہوتے ہیں۔

ان میں پہلی وجود واحد میں موجودات کے اضمحلال کی نسبت اور اس میں ان کا اندراج ہے۔ اور ان کا اس کے ساتھ قائم ہونا ہے اور ان کا آفاقی اثر خیر و شر کے درمیان فرق کے لئے کم ہی ظاہر ہوتا ہے۔ اور اس کا اثر نفسی اطلاق کے دائرہ کے لئے استعداد اور خصوصیت کی قمیص کا اتارنا ہے اور اس کا منبع ابداع و خلق کا کمال ہے۔

دوسرے احسان کی نسبت ہے اور دو چیزوں سے مرکب حالت ہے۔ ایک طہارتوں اور اذکار سے پیدا ہونے والے انوار کا مطالعہ اور مثال میں منعقد ہونے والی حقیقت کو جان لینا اور یہی وہ چیز ہے جس کا ہم نے ذکر کیا ہے کہ وہ خضوع اور تعظیم کے وصف کے ساتھ صورت علمیہ ہے۔ اور اس نسبت کا اثر شریعتوں سے لذت حاصل کرنا اور انسان کا اس سے بصیرت پر ہونا ہے۔

تیسرے ارواح کی لڑی میں پروئے جانے کی نسبت ہے اور وہ انسیت اور انشراح کے ظہو

راور گھٹیا قسم کی ہیئتوں کے خاتمہ اور ہیئات ملکہ کے اختیار سے ہے۔ اوراس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ بہت سارے خواب نظر آتے ہیں اور مبشرات صادقہ حاصل ہوتے ہیں۔ اوراس کے لئے برکت عظیم ظاہر ہوتی ہے اوراس کی دعائیں قبول کی جاتی ہیں۔ اور لوگوں کو خوابوں میں ایسی باتیں نظر آتی ہیں جو اس کے عظیم المرتبہ ہونے اوراس کے منبع کے مقدس دائرہ میں ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔

چوتھے عشق کی نسبت ہے۔ اس سے میری مراد شوق اور قلق ہے۔ اوراس کی بہت سی تہیں ہوتی ہیں جن کے اندر مغز بھرا ہوتا ہے۔ مغز کا مطلب وجود کے مخفی معنی کی اصل کا اس کے منبع کی طرف میلان ہے۔ اور چھلکے کچھ وہمیہ ہوتے ہیں، اور کچھ فطریہ یا طبعیہ اور کچھ عام جو اوہام وغیرہ سے مرکب ہوتے ہیں۔ یہ سالک کی ایک ایسی حالت ہوتی ہے جو اس پر غالب ہوتی ہے۔ اس کو عشق کہا جاتا ہے اور مغز محبت ذاتی ہوتی ہے اوراس کے اہل کم ہی لوگ ہوتے ہیں۔

پانچویں حق تعالیٰ کے لئے مثالی صورت علمیہ کی طرف توجہ ہے۔ اوراس سے مثال کا نیچے اترنا اور نفس میں سرایت کر جانا ہے۔ ان میں سے بعض کا ہم ذکر کر چکے ہیں۔ البتہ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کا نفس اصل فطرت میں غبی ہوتا ہے۔ اس لئے اس کو یہ بات صرف ہیئات وہمیہ کے ضمن میں ہی متحقق ہوتی ہے۔ اس بات کو ہمارے اس مقالہ میں آخری ہونا چاہئے۔ والحمد للہ اولا وآخرا

۱۹- تفہیم:

وجود کے نظاموں کا ان کی انواع سمیت بیان

جان لو کہ وجود میں بہت سارے نظام ہوتے ہیں، علوی بھی، سفلی بھی اور مثالی بھی۔ ان کا حکم بڑے بڑے حوادث میں جمع ہوتا ہے جس طرح دیکھنے والے اور آئینہ کا حکم آئینہ میں ظاہر ہونے والی صورت میں جمع ہوتا ہے۔ اوران میں ایک کا حکم دوسرے کے بعد آتا ہے۔

اور نظام مثالی کا بیان یہ ہے کہ روح اعظم کا سایہ ولادت کی حالت میں اس وقت تک واقع نہیں ہوتا جب تک کہ انسان میں بہت ساری مناسبتیں اور بہت ساری استعدادیں پائی جائیں۔ پھر ایک مزاج (مکسچر) انسان کامل کو تمام وجوہ سے مستحق ہوتا ہے اور ایک مزاج غیر انسان کے لئے لازم ہوتا ہے۔ اوران دونوں کے درمیان بہت سارے مزاج ہوتے

ہیں۔ جیسے ہوا کو ٹھنڈ لگتی ہے تو وہ پانی بن جاتی ہے پھر شدید گرمی لگتی ہے تو وہ دوبارہ ہوا بن جاتا ہے۔ اور ان دونوں کے درمیان یکے بعد دیگرے بہت سارے درجات ہوتے ہیں۔ پھر یہ کہ بشر کا احاطہ کرنے والے انوار میں جو صورت حاصل ہوتی ہے وہ ولادت کی حالت میں اس کے عکس کے وقوع کے لئے سبب ہوتی ہے۔ اس طرح دور (چکر) ہو جاتا ہے۔ چنانچہ مناسبتوں یا منافرتوں کا وجود انوار اعلیٰ میں اس کی صورت کے نقش ہونے کا سبب ہوتا ہے اور اس کا نقش ہونا بشر پر اس کے عکس کے وقوع کا سبب ہوتا ہے۔ اسی طرح سلسلہ جاری رہتا ہے یہاں تک کہ قیامت آ جائے گی اور منقش صورتوں سے اس کے مدارک خالی ہو جائیں گے۔ چنانچہ جب طرح طرح کے بشر پائے جائیں گے تو ان کی استعداد کا اختلاف لازم آئے گا کہ ان میں سے بعض ان سہاروں کے خلاف حرکتیں کریں جن پر نظام بشر مبنی ہیں۔ یہاں تک کہ اپنے بعض حالات کے لحاظ سے چوپایوں سے جا ملیں گے اور یہ کہ انہیں تکلیف اور تکان جو جس کی وجہ سے ان کو تنگی اور دشواری ہو اور وہ چیخ و پکار کرنے لگیں گے۔ پس جب یہ باتیں بہت زیادہ ہو جائیں تو نفوس اعلیٰ میں ایسی ہیئت نقش ہو جائے گی جو روح اعظم کے اسی طرح خلاف ہوگی جیسے گرمی پانی کی حقیقت کے خلاف ہوتی ہے۔ پھر وہ ہیئت شر کا ذخیرہ ہو جاتی ہے۔ وہاں سے شیطان الہام کرتے ہیں اور ان کے اندر بڑھاوا دیتے ہیں۔ اور بشر میں ان کا عکس واقع ہوتا ہے، تب اکثر میں ان کا مادہ سخت نفوس کے فیضان کے لئے تیار ہوتا ہے۔ ان کے راستے قبول الہام کے لئے بند ہو جاتے ہیں، جب کہ شیطان کے الہام کو کثرت سے قبول کرنے والے ہو جاتے ہیں۔ یہی شر اول ہے۔

اللہ تعالیٰ کی تدبیر یہ ہے کہ وہ کسی بھی ایسی شر کو پیدا نہیں کرتا جس کے مقابلہ میں کوئی خیر پیدا نہ کرتا ہو۔ تاکہ حق، باطل کو مٹا دے۔ اس لئے کہ وہ مٹنے ہی والا ہوتا ہے۔ اور اس شر کے مقابلہ میں جو حق نازل ہونے والا ہوتا ہے، وہ فرشتے کا پھیلاؤ اور بشر سے ان کی سختی کا ظہور ہے۔ چنانچہ فرشتہ بنی آدم میں صورت انسانیہ کی طرف سے داخل ہوتا رہتا ہے۔ اور خون کی طرح رگوں میں دوڑتا رہتا ہے اور اس سے فرض کی ادائیگی کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس طرح شیطان بھی بنی آدم میں طبیعت کی طرف سے داخل ہوتا رہتا ہے اور خون کی طرح رگوں میں دوڑتا رہتا ہے اور اس سے اپنے شیطانی فرض کی ادائیگی کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس طرح دو سختیاں

باہم متعارض ہوتی ہیں۔ ایک تحتی خیر کی طرف بلاتی ہے اور دوسری شر کی طرف۔ اور کبھی ان میں سے کوئی ایک اپنے نفس کے معنی میں غالب آجاتی ہے۔ اس صورت میں شیطان کی طرف سے بہت سی تکلیفیں پہنچتی ہیں۔ فرشتے ان کو باطل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور فرشتوں کے اجتماعات ہوتے ہیں جن میں وہ اللہ کا ذکر کرتے ہیں اور مومنوں کے لئے دعائیں کرتے ہیں۔

دوسری طرف شیطانوں کے بھی اجتماعات ہوتے ہیں جن میں وہ بنی آدم کو گمراہ کرنے کے لئے حیلے کرتے ہیں، جیسا کہ حدیث میں ذکر کیا گیا ہے۔ پھر وہ اس شر کو انوار اعلی میں نقش کرتا ہے جس سے اس کی میٹنگ منعقد ہوتی ہے جو پہلی والی کے بہت زیادہ خلاف ہوتی ہے۔ اور اس کا خزانہ وسیع ہوتا ہے جس کی وجہ سے اس کا عکس زمین میں واقع ہوتا ہے۔ اس طرح اکثر میں ان کا مادہ دجالی اور فرعونی نفوس کے فیضان کے لئے تیار ہوتا ہے۔ جو خیر کے الہامات کی تلقین کرنے والوں اور سمجھانے والوں کے مقابلہ میں شر کے الہامات القا کرنے کو لازم تصور کرتے ہیں۔ خواہ رویت کی شکل میں ہوں یا فیضان کی صورت میں۔ تب خلاف عادت امور اور ہمت کی تاثیر ان کا ساتھ دیتے ہیں۔ اس طرح لوگوں پر ان کے دین اور ان کے وسائل کو مشتبہ بنا دیتے ہیں۔ اور فرشتوں کی دعوت اور اقلیموں کی حفاظت میں سے جن کا اعتبار کیا جاتا ہے، وہ سمٹ جاتی ہیں۔ پھر زلزلوں، وباؤں، آندھیوں، جانوروں میں وبا اور اموات کے ذریعہ عذاب دیا جاتا ہے۔ اور چیخوں کے ذریعہ شہر تباہ ہوجاتے ہیں اور مصیبتیں غالب آجاتی ہیں چنانچہ طبیعت کلیہ ایسے عضو کے منقطع ہونے کی تیاری کرنے لگتی ہے جس کے منقطع ہونے سے اس کی صحت برقرار رہتی ہے۔ اور حق جو اس کے مقابلہ میں نازل ہوتا ہے اور اس کو مٹاتا ہے کیونکہ وہ مٹنے ہی والا ہے، وہ رسولوں کو بعثت اور لوگوں میں سے تمام عالم کے لئے ایک امت کی تیاری ہے۔ اور ان کے دلوں میں جہاد کا داعیہ اور اللہ کے معاملہ میں مخاصمت پیدا کرنا ہے، اور ایسے مضبوط خلیفہ کا پیدا کرنا ہے جو انہیں خیر پر مجبور کرتا ہے، خواہ وہ اس کو چاہیں یا اس کا انکار کریں۔ اور اس وقت اللہ کے دشمنوں کو قتل کرنا پوری پوری تنبیہات کا قائم کرنا اور مقررہ شریعتوں کا نزول ہی حق ہوتا ہے۔

اور یہ جان لو کہ جب بھی زمانہ کو پیچھے کی طرف لوٹایا جاتا ہے، عالم اس کے لئے تیار

ہو جاتا ہے جو بعض کے حق میں بشر کی تقدیم کی جہت سے پہلے سے زیادہ سخت اور شدید ہوتا ہے، یہ ایک ہیئت مخالف ہوتی ہے، اور اس کے لئے بھی تیار ہو جاتا ہے جو بشر کی ترقی کی جہت سے پہلے سے زیادہ ذہین اور گہرا اور خیر کی معرفت میں زیادہ شدید ہوتا ہے۔ یہ مجالس کاملہ ہوتی ہیں جو قوم کے لئے آگے پہنچنے والا اجر اور ذخیرہ آخرت ہوتی ہیں۔

اور چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں پھیلا ہوا شر، توحید کی فراموشی تھی، حق تعالیٰ نے اس کے مقابلہ میں توحید کی اشاعت اور طہارت، صلوۃ، زکوۃ، حج وصوم اور ذکر جیسی عبادتوں کی ترویج کو نازل کیا۔ اور جب ہمارے نبی محمدؐ کے زمانہ میں پھیلا ہوا شر ملتوں کا بگاڑ اور خاص طور سے اصحاب وسائل کا انقلاب تھا اور معاملہ بہت شدید اور سخت تھا، حق تعالیٰ نے اس کے مقابلہ میں جہاد، عبادتوں کی اشاعت اور ان کے لئے مقررہ اوقات نازل کئے اور روم وعجم کی مملکتوں کے زوال اور چوتھے وسائل کی ہیئت کی طرح امر نبوت کے انتظام کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ نبی کریمؐ نے خیر کا ایک باب کھول دیا جو آپؐ سے پہلے نہیں کھلا تھا اور اس کے ذریعہ لوگوں میں سے اس امت کا انتظام کیا جو لوگوں کے لئے نکالی گئی بہترین امت ہے۔

اور ہم سے وعدہ کیا کہ آخر زمانہ میں ایک ایسا شخص نکلے گا جو شر کی کنجی ہوگا، وہ دجال اکبر ہوگا۔ پھر اس کو عیسیٰ علیہ السلام مٹائیں گے اور بڑی بڑی جنگیں پیش آئیں گی، پھر وہ جنگیں احاطہ کرنے والے انوار کی طرف لوٹیں گی، پھر ان کا عکس پڑے گا، تب عالم، فضا کے واقعات میں سے ایک واقعہ عظیمہ کے لئے تیار ہوگا۔ انسان اور تمام مخلوقات ہلاک ہو جائیں گی اور ہر عنصر اپنے محل کے لئے لوٹ جائے گا۔ پھر بارش ہوگی اور معتدل ہوائیں چلیں گی اور زمین میں اس کا شباب پھونک دیا جائے گا۔ پھر تمام جاندار جو مر چکے تھے، اٹھ کھڑے ہوں گے۔ اور وہ جسم کے لئے رب سے زیادہ شدید سرگشتگی ہوتی ہے۔ اور اس کی دم کی جڑ باقی رہ جائے گی یعنی وہ علامت جس سے یہ معلوم ہو جائے گا کہ یہ فلاں کا بدن ہے، وہ جسم پر چمٹ جائے گی اور وہ زندہ ہو جائے گا۔ اور جنس آخر محبت کی دیوانگی ہوتی ہے لیکن اس کی دم کی جڑ باقی نہیں رہتی۔ پھر زمین سے جسم میں اعتدال پھونکا جائے گا اور جنس آخر ارواح کے ہیجان کے وقت مستحق ہوتی ہے۔ اور اس کی بلندی یہ ہے کہ وہ مثالی جسد جیسے فرشتوں اور شیاطین سے تقویت حاصل کرتا ہے، اس صورت میں وہ حیات ابتدائی نہیں ہوگی بلکہ اس کے اندر پائے

جانے والے مجازات کی تکمیل کے لئے ہوگی۔ پھر وہ جسم ہیئت مادی حاصل کریں گے، اور حشر کے مسائل سے دوچار ہوں گے، اور جس طرح بشری ہیئتوں کا احاطہ کرنے والے انوار کی طرف لوٹتے ہیں، اسی طرح شیاطین کے ساتھ ملائکہ کا جہاد پہلے مرحلہ میں اس کی طرف لوٹتا ہے اور کفار کے ساتھ مخاصمت رکھنے والے انبیا کے فیضان کے لئے تیار ہو جاتے ہیں اور دوسرے مرحلہ میں اللہ کی طرف متوجہ ہونے والی ارواح کی ہیئتیں اپنے علوم کے ساتھ لوٹتی ہیں۔ اور علوم کی اشاعت کا فائدہ دیتی ہیں اور عصری، عربی اور شرعی علوم پھیلتے ہیں۔ جو پہلے سے موجود نہیں تھے۔ اور تیسرے مرحلہ میں یہ ارواح ان علوم کے ساتھ لوٹتی ہیں تب عالم سے ہیئت کے جدا ہونے کا فائدہ دیتی ہیں۔ اور جب ان کی ہیئت ملاء اعلیٰ میں نقش ہو جاتی ہے تو وہاں عالم حشر کے لئے تیاری کے سوا کچھ نہیں رہتا۔

۲۰- تفہیم:

اوقات کی تاثیر

جان لو کہ نفس ناطقہ بدن کے اندر اتر جاتا ہے اور بدن دوسری تمام چیزوں کے مقابلہ میں اس ہوا سے زیادہ متاثر ہوتا ہے جو اس کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اور ہوا رات اور دن کی ساعتوں میں سورج کی وضع کی تبدیلی سے تبدیل ہوتی ہے۔ اس سے میری مراد سردی اور گرمی وغیرہ نہیں ہیں بلکہ ان ساعتوں میں اس کی خاصیت کے ساتھ تاثیر ہوتی ہے۔

اس تاثیر کے معاملہ کا میں نے کئی بار خود اپنے اوپر تجربہ کیا کہ رات کا آخری حصہ تضرع میں عجز و انکسار اور مناجات میں نفس کو لذت کے حصول کا وقت ہوتا ہے۔ اور فجر کا وقت اللہ کے جلال پر مطلع ہونے سے نفس کے اندر پائی جانے والی خوشی و مسرت سے لذت کے حصول کا وقت ہوتا ہے۔ اشراق، طاعات اور طہارتوں کے انوار کے ظہور کا وقت ہے۔ ظہر اس قوی تاثیر کی قبولیت سے حاصل ہونے والی لذت کا وقت ہے جو باطن میں بے قراری پیدا کرتی ہے۔ اور اس میں اس کلمہ کی طرح جدوجہد اور قوت کے ساتھ داخل ہوتی ہے جو عشق کو برانگیختہ کرتا اور قلق پیدا کرتا ہے۔ ضحیٰ یا چاشت، اشراق اور ظہر کی حالتوں کے درمیان کیفیت متوسط کے ظہور کا وقت ہے۔ ان میں سے ہر ایک سے کچھ نہ کچھ اخذ کرنے کا وقت ہوتا ہے۔

مغرب تھوڑے سے قلق اور ہلکے سے شوق کا وقت ہے۔ اور ظہر اور مغرب کی دونوں حالتوں کے درمیان کی حالت کے ظہور اور ان دونوں سے اخذ کرنے کا وقت ہوتا ہے اور عشا تامل اور گہری نظر سے غور وفکر کا وقت ہے۔ اس طرح نفس جب حیوانی پردوں اور سختی سے خلاصی حاصل کر لیتا ہے اور اس پر کوئی کیفیت غالب نہیں آتی تو ہماری بیان کردہ کیفیتوں میں سے کسی کیفیت کی طرف رخ کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔

۲۱-تفہیم:

شیخ صدر عالم کے رسالہ کا ذکر

شیخ صدر عالم نے ایک رسالہ تالیف کیا اور اس میں چند واقعات بیان کئے۔ ان میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی رویت اور ان کا بعض علوم کی تعلیم فرمانا بھی ہے۔ ان میں شق قمر کی رویت بھی ہے، ان میں ایک حضرت علی کے ذریعہ پیش آیا۔ پھر بدر کامل شق ہوا۔ ایک صبح صادق کا سفیدہ ہے اور یہ تمام واقعات پیش آئے ہیں جن سے حقیقت میں نشانات محمدی معلوم ہوتے ہیں۔ اس رسالہ کی بنیاد حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے مناقب کے بیان پر ہے جس میں تمام صحابہ پر حضرت علی کی کلی فضیلت ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تالیف کے بعد انہوں نے یہ رسالہ اس فقیر کو بھیجا۔ اس کے مطالعہ کے بعد یہ اشعار حوالۂ قرطاس وقلم کئے۔

رعاک الله یا صدر الموالی
وطول الدهر کان لک البقاء

"اے صدر موالی! اللہ آپ کی حفاظت فرمائے، اور آپ طویل مدت تک زندہ باد و پائندہ باد رہیں۔"

لقد اوتیت فی الآباء فخرا
وبالآباء یرتفع العلاء

"آپ کو آباواجداد پر فخر کی دولت سے نوازا گیا ہے، اور آباواجداد سے درجات بلند ہوتے ہیں۔"

وجدک آیة لا ریب فیها
وبحر لا تکدرہ الدلاء

''اور آپ کے جدامجد بلاشبہ ایک نشانی ہیں، وہ ایک ایسا سمندر ہیں جس کو ڈول آلودہ نہیں کرتے۔''

وفی کشف المعارف کان فردا
وما فی القوم کان له کفاء

''اور وہ حقائق ومحاسن کے انکشاف، ان سے پردے اٹھانے والے فرد واحد ہیں۔ قوم میں ان کا کوئی ہم پلہ نہیں ہے۔''

لقد کوشفت ما کوشفت حقا
وفضل الله لیس له انتهاء

''آپ کے اوپر جو کشف ہوئے حق ہی کشف ہوئے، اللہ کے فضل کی کوئی انتہا نہیں۔''

اتاک الثلج والایقان لما
رایت الشق والکشف اللواء

''آپ کو شق قمر کے دیکھنے سے فرحت وسرور اور یقین کی دولت حاصل ہوئی اور آپ نے اس نشان سے پردہ اٹھا دیا۔''

واذ ادناک سیدنا علی
باکرام وعلم ما یشاء

''اور چونکہ آپ کو سیدنا علی سے اکرام کے لحاظ سے قریب کر دیا تو جو چاہا آپ کو سکھا دیا۔''

تؤلف فی مناقبه کتابا
وعند الله فی ذاک الجزاء

''آپ ان کے مناقب میں کتاب تالیف کرتے ہیں تو اللہ آپ کو اس کی جزائے خیر عطا فرمائیں گے۔''

ومکثر مدح مولانا علی
مقل لا یکون له وفاء

"مولانا علی کی جتنی بھی مدح کی جائے گی، کم ہی رہے گی، وہ کبھی پوری نہیں ہوگی۔"

فما من مشهد الا وفيه

له فخر كبير وازدهاء

"کوئی بھی جگہ ہو ہر جگہ ان کے لئے فخر ہی کی جگہ ہوگی۔"

وما من منهل الا وفيه

له شرب عظيم وارتواء

"اور کوئی بھی گھاٹ ہو ان کی سیرابی کے لئے وہاں عظیم سامان موجود ہے۔"

وللقرآن تنزيل وظهر

يقاتلهم عليه الانبياء

"قرآن کریم کی ایک ظاہری صورت ہے جس کی بنیاد پر انبیاء لڑتے اور جنگ کرتے ہیں۔"

وللقرآن تاويل وبطن

يخاصمهم عليه الاوصياء

"اور قرآن کریم کے دوسرے باطنی معنی ہیں۔ جن کی بنیاد پر اوصیا خصومت کی راہ اختیار کرتے ہیں۔"

قبول الناس للتنزيل فيه

سياسات له منها نماء

"اس میں نازل شدہ احکام و تعلیمات کو لوگوں کا قبول کرنا، اس کی تدبیر و سیاست ہے جس سے ان کو فروغ و ترقی حاصل ہوتے ہیں۔"

فمنها رد تحريف وسد

لاسباب له منها انتشاء ۹

"اس میں تحریف کو رد کر دیا گیا ہے اور اس کے دروازے بند کر دیئے گئے۔ ان اسباب کی وجہ سے ان میں ایک دیوانگی اور سرور ہے۔"

وصلح واختصام وائتلاف

باقوام قلوبهم هواء

"اوران لوگوں کے ساتھ صلح، لڑنے جھگڑنے اور تالیف قلب کی باتیں ہیں جن کے دل خواہشات کے غلام ہیں۔"

لهذا القسم اسرار عظام
وللشيخين فيه اعتلاء

"اس باب کے بہت بڑے بڑے اسرار ہیں، اوراس میں شیخین کو بہت بلند مرتبے حاصل ہیں۔"

وفي علم النبوة ان هذا
ملاک الامر ليس به خفاء

"اور علم نبوت کے دائرے بہت وسیع ہیں، یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔"

وما زال الصحابة عارفيه
يقينا مثل ما طلعت ذكاء

"اور یقینا صحابہ ان کو پہچانتے تھے جیسا کہ سورج نکلتا ہے۔"

فالبت ذاک للشيخين واختر
من الاوصاف مدحا ما تشاء

"تو اس سلسلہ میں شیخین کے اوصاف ثابت کرو اور جتنی چاہے ان کے بعد کسی کی مدح کرو۔"

۲۲- تفہیم:

ذات الٰہی کا عکس اور ذات کے لئے لازم ظل کثرت

آج رات دل میں یہ بات آئی کہ جب نفس کلیہ ظہور میں آیا، اس میں ذات الٰہی کا عکس اور ذات کے لئے لازم ظل کثرت دونوں منقش ہوئے۔ اور یہ معنی حقائق کے تعین کا منشا قرار پائے۔ اور حضرت حق کی قربتوں میں قربت اعظم کی ذات کا عکس ہیں۔ اور حقائق امکانیہ کی پیدائش ظل کثرت ہے۔ پھر اس ظل ذات کے جو کہ قرب عظیم ہے، تقید کے عالم میں بہت سے عکس ہیں۔ اور اس کا عکس افراد و تحمل کے نفوس کے عالم میں ہے اور اعراض

کے عالم میں شریعتیں اور ملائکہ کے عالم میں جبرئیل ہیں۔ مشاہدہ یہ ہوا ہے کہ اس قرب کو ہر فرد سے نسبت نظری ہے جو اس کی ذات کی اصل میں نفوذ رکھتی ہے۔ پس اس فرد کا نفس ناطقہ سب سے غفلت قبول کرتا ہے اور اس نظر کے پیچھے رہتا ہے۔ اس کے ساتھ باقی اور دیگر سب سے فانی ہوتا ہے۔ اس مرحلہ میں اس پر احدیت کا دروازہ کھلتا ہے اور وہ حقیقت کو انا کے ضمن میں دیکھتی ہے۔ لیکن اس انا کے ضمن میں نہیں جو روح اور مادہ کا مقولہ ہے بلکہ وہ انا جو کہ اس کی تعین کے اصل کا مقولہ ہے۔ جس فرد کا اس مقام پر وجود عنصری ہوتا ہے، وہ دیکھتا ہے کہ عجیب جامعیت رکھتا ہے اور اس قرب کے اجمالاً یا تفصیلاً ظہور کی اکثر انواع دریافت ہوتی ہیں۔ چونکہ دین کی تجدید اور طریقہ کا قیام وغیرہ اس سب کے باوجود انتہائی ہوشیاری سے ہوتا ہے اور اصلاً اس کے مقام کے آس پاس کوئی مست و دیوانہ نہیں ہوتا۔ والسلام

۲۳- تفہیم:

پردوں کا اصول

رسول اللہؐ نے فرمایا اس کے حجاب نور ہیں۔ اگر وہ ان پردوں کو اٹھا دے تو اس کی مخلوق میں سے جہاں تک اس کی نظر پہنچے، اس کے چہرہ کے جلال سے سب جل جائیں۔ اس سلسلہ میں، میں کہتا ہوں کہ پہلا پردہ موجودات کے حقائق پر پھیلا ہوا وجود ہے، اور وہ نور ہے۔ پھر وہ پانی ہے جس میں مخلوقات کو پیدا کیا۔ پھر عرش کو اٹھانے والے فرشتے اور افلاک کے نفوس ہیں۔ چنانچہ ایک بشر سورج کی روشنی کے دیکھنے کے لئے تیار ہونے کے درجہ میں ان نفوس کی تیاری سے علم حق تک پہنچتا ہے۔ پھر ملاء اعلیٰ اور مقدس دائرہ اور عناصر اور انسانیت پر پیش قدمی کرنے والی صورتیں ہیں۔ اور یہ پردوں کے اصل ہیں، اگرچہ ان کی تفصیل کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ چنانچہ اگر اللہ پردوں کو اٹھا دے تو منزلۂ ارض میں مخلوقات باقی نہ رہیں۔ مثلاً اگر وہ پردے نہ ہوتے تو ان سے پیدا ہونے والی مخلوقات نہ ہوتیں اور نہ ہی صورت کلیہ انسانیہ کے مرتبہ پر ہوتیں۔ اگر وہ نہ ہوتیں تو یہ فرد نہ ہوتا۔ یہاں مخلوقات سے مراد اکثر مخلوقات ہیں۔ ورنہ اس کے اور اس کے رب کے درمیان تسلسل کو ختم کرنے کے لئے کوئی پردہ نہیں ہے۔

۲۴- تفہیم:

علم طلسمات اور علم شرائع کی بنیادیں

جاننا چاہئے کہ انسان سوتے وقت جو خواب دیکھتا ہے، ان میں زیادہ تر صورتوں میں سے کوئی صورت نظر آتی ہے۔ اور اسی طرح اس کے دل میں کوئی خیال آتا ہے۔ چنانچہ اس خیال سے دوسرا خیال پیدا ہو جاتا ہے۔ اور ذہن کی یہ منتقلی کسی عقلی لزوم کے قبیل سے نہیں ہوتی بلکہ یہ دوسری نوعیت کی ہوتی ہے۔ اور اسی طرح کے انتقالات پر عالم مثال میں نظر آنے والے امور مبنی ہوتے ہیں۔

اب جب آپ نے یہ بات سمجھ لی ہے تو یہ جان لیجئے کہ انسان جب کسی کی صورت اور ڈھانچہ کو دیکھتا ہے اور اس کا خیال کرتا ہے تو اس تصویر اور ڈھانچہ پر قوی فعالہ کے لئے برانگیختگی پیدا ہوتی ہے اور اس پر علم طلسمات اور نیرنگ مبنی ہوتے ہیں۔ اور پھر علم شرائع مبنی ہوتے ہیں۔ اور اس کا راز یہ ہے کہ افراد بنی آدم جب ان حقائق کے ساتھ ان فکر انگیز امور سے تعلق زیادہ رکھتے ہیں تو ان کے اور حقائق کے درمیان اختلاط ہو جاتا ہے اور عالم مثال میں مناسبت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور یہ ان کے نفوس کے اندر نقش ہو جاتا ہے۔

۲۵- تفہیم:

مقدس دائرہ

نفس کلیہ ایک آئینہ ہے جس میں مبدأ المبادی، اول الاوائل کی صورت نقش ہو جاتی ہے اور تمام ممکنہ استعدادات کی صورتیں مصلحت کلیہ کے مطابق ہوتی ہیں۔ پس مبدأ المبادی کی صورت موجود الکل میں بمنزلہ قلب کے ہوتی ہے اور وہ اس کے تمام اعضا و اطراف میں تصرف کرتی ہے اور ملائکہ کی ہمتیں اور کاملین کی ارواح اس کو گھیر لیتی ہیں۔ اس لئے اس مقام کو مقدس دائرہ کہتے ہیں۔ چنانچہ جب گھیرے کی کثرت ہو جاتی ہے تو صورت الٰہیہ انتہائی تیزی میں بمنزلہ جوہر شفاف ہو جاتی ہے۔ اس سے نظر اس سے اوپر والے کی طرف نفوذ کرتی ہے۔ اور کوئی اس بات سے نہ واقف ہوتا ہے، نہ سمجھتا ہے کہ وہاں ایک شے متوسط تھی، پھر اس کا احاطہ جوہر کثیف بمنزلہ چونہ کے کر لیتا ہے تب بعض انوار بعض کی طرف پلٹ آتے ہیں۔ اور منعکس ہو کر محسوس طور پر نظر آنے والے ہو جاتے ہیں، تو یہ قرب، اوّل امر ہوتا ہے اور یہ

لوٹنا اور پلٹنا نیا نظر آنے والا ہوتا ہے۔

۲۶- تفہیم:

علم اور معلوم کا اتحاد

جاننا چاہئے کہ تجلیات خواہ کتنی ہی زیادہ ہوں، ان کا مرجع دو چیزیں ہوتی ہیں، ایک صورت علمیہ جو حواس خمسہ میں سے کسی ایک میں نقش ہوتی ہے۔ پھر اس صورت علمیہ کی دو وجہیں ہیں، وجہ واحد سے وہ نفس عالم میں قائم عرض ہے اور دوسری طرف سے وہ معلوم کے ساتھ نوع اتحاد سے متحد ہو جاتی ہے اور اس وجہ سے وہ ادراکی یا خیالی یا وہمی ساخت میں معلوم کے لئے تجلی ہوتی ہے۔ اور دوسری رقیقہ ہے جو ذات الٰہیہ کے مقابل ہوتی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ مثلاً جب زید نے اس میں گہری نظر سے دیکھا تو ظاہر ہوا کہ وہ انسان، حیوان، جسم، ناطق، حساس، صاحب ارادہ، نامی (بڑھنے والا) چلنے والا، لکھنے والا، ہنسنے والا، شاعر، رومی، حبشی وغیرہ ہے۔ اور ہم نے جو کچھ کہا ہے وہ ذاتیات اور عرضیات کے باب سے ہے۔ چنانچہ وہ ایسا امر کلی ہے جو اس فرد کے ساتھ تقید سے متشخص ہوتا ہے۔ اور وہ نفس امر میں کسی وطن یا میدان میں موجود ہے اور ہم اس موجود کو رقیقہ کا نام دیتے ہیں۔

اور رقیقہ جو ذات الٰہی کے مقابل ہوتی ہے، وہ موجو میں ایک لمبا چمکدار نقطہ ہوتا ہے اور وہ چونکہ موجود ہے، اس لئے اس میں وہ وجود ہے جس میں موجودات اور وجود برابر ہوتے ہیں۔ وہ ذلت سے نیچے اترتا ہے۔ چنانچہ ان مراتب میں جن میں وجوب کے احکام غالب ہوتے ہیں، یہ نقطہ ظاہر ہے اور تمام مراتب میں پوشیدہ ہے۔ چنانچہ جب ظاہر ہوگا، وہ شخص ایک فرد ہوگا اور بہت زیادہ تامل کرتا ہے یہاں تک کہ اس نقطہ تک پہنچ جاتا ہے، پھر اس میں فنا ہو جاتا ہے اور اس کے علاوہ سے غافل ہو جاتا ہے۔ اور وہی تجلی ذاتی ہے اور یہی رقیقہ بعینہا شخص اکبر میں موجود ہے۔ اور وہ اس میں بمنزلۂ روح ہے اور وہ اللہ اور نفس کلیہ کے درمیان واسطہ ہے۔ اور وہ پہلو جو اس نقطہ پر ختم ہوتا ہے، مقدس دائرہ ہے۔ لیکن اس نقطہ کے لئے مراتب ملکی وروحی میں فضیلتیں مظہر ونمود اور تجلیات ہیں۔

اور ان مراتب کے لباس ہیں جو سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں حاصل ہوئے۔

اور وہ لباس تجلی کے مغایر امر نہیں ہیں بلکہ بمنزلہ شعائر اللہ ایسی شے ہیں جس میں اثر الٰہی پھونک دیا جاتا ہے۔ تب بنی آدم کے ساتھ رسولوں اور کتابوں کے ظہور سے عقد تشریع اور ارادۂ خیر متحقق ہوتا ہے۔ اور وہی لباس نبی الانبیاء ہے۔ پھر اس لباس کے لئے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں فراخی و وسعت اور ظہور ہوا، اس لئے آپ کی ملت ثابت قدم ہوگئی اور بعد میں فنا نہیں ہوئی۔

۲۷- تفہیم:

توحید حنفی کیا ہے

میرے نزدیک یہ بات متحقق ہوگئی ہے کہ اول دور میں اکثر حوادث قوی الافلاک پیدا ہوئے۔ چنانچہ بنی آدم کے افراد پر ان کی مناسبت والے علوم کی بارش ہوئی۔ بعض پر وحی کے ذریعہ بعض پر غور و فکر اور خوابوں کے ذریعہ۔ چنانچہ ان علوم کے کچھ مقدمات ہیں جن پر احوال نجوم مثلاً ہیئت، ہندسہ اور سیاروں کی حرکات کا پتہ لگانے کے ذریعہ زائچہ کی معرفت موقوف ہے۔ اور ان میں احکام نجوم بھی ہیں، اور وہ بھی جو کواکب، بروج بیوت اور منازل پر امور موجودہ کی تقسیم سے متعلق ہیں۔ پھر فصول اربع چار موسموں کے درمیان مقابلہ کا بیان ہے، اور ان میں ان کے لواحق ہیں جیسے کواکب کو بلانا، طلسمات اور جادو کا علم۔ ساری دنیا ان علوم سے بھری پڑی ہے۔ جس نے سب سے پہلے یہ باب کھولا وہ ہراسہ (نجوم کے علما) میں سے ایک ہرسہ تھا۔ (مشتری سیارہ سے متعلق فرشتہ کا ہم نام عالم)

پھر مقدس دائرہ کا قوی عالم ظاہر ہوا۔ اور اس میں اللہ تعالیٰ کے لئے قرب عظیم ظاہر ہوا۔ پھر وہاں سے بنی آدم کے اشخاص پر اس قرب سے مناسبت رکھنے والے علوم برسے۔ اور یہ باب سب سے پہلے جس نے کھولا، وہ ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ آپ حنیف خالص مسلم تھے۔ مشرکوں میں سے نہیں تھے۔ آپ نے نجوم کو باطل قرار دیا اور ان کے احکام سے اختلاف کیا، مگر تھوڑا سا۔ اور تمام علوم اس قرب اور ملاء اعلیٰ کی دعاؤں کی طرف سونپ دیئے گئے اور ان شریعتوں کے مقابلہ میں جن کو اول دورہ والے اٹھائے ہوئے تھے، وہ شریعتیں نازل ہوئیں جو اللہ سے قربت پیدا کرنے والی ہیں۔ پس کعبہ پایا گیا جب کہ سورج اور چاند کے ہیکل اور مندر تھے اور نماز، روزے،

ہدایت، ذبح، تسبیحات اور اللہ کی ثنا اسی طرح نازل ہوئیں جیسے پہلے لوگ سورج اور چاند اور تمام کواکب کے ساتھ معاملہ کرتے تھے۔ اور اس زمانہ میں نفع رسانی کی قربت اور ملاء اعلیٰ سے قرب اور ان کی رحمت قریب ہوگئے۔ چنانچہ وہی شریعتیں نازل ہوئیں جو قدس کے دائرہ میں راسخ تھیں۔ اور یہ رسوخ طویل مدت کے بعد ہوتا ہے۔ اور تمام امور ملاء اعلیٰ کی طرف بلند ہوئے لیکن وہ ان تک صعود کرنے اور پہنچنے میں برابر نہیں ہوتے بلکہ بعض، بعض سے زیادہ قوی ہوتے ہیں۔

الغرض جب بھی کوئی شے ملاء اعلیٰ میں نقش کے قابل قدس کے دائرہ میں منعقد ہوتی ہے، اس کے مطابق شریعتیں نازل ہوتی ہیں اور شریعتوں کا معاملہ بارش کے مشابہ ہوتا ہے۔ چنانچہ جس طرح بھاپ اور دھواں زمین سے بلند ہوتے ہیں اور فضا میں چڑھتے ہیں اور سخت ٹھنڈ کی قوت اس پر چوٹ مارتی ہے تو وہ برسنے والے بادل بن جاتے ہیں۔ تب آسمان سے زمین کی طرف نازل ہوتے ہیں اور اس سے چشمے اور نہریں جاری ہوتی ہیں اور سبز گھاس اگتی ہے۔ اسی طرح لوگوں کے علوم، عقائد اور اعمال کا معاملہ ہے جن کو وہ کثرت سے استعمال کرتے ہیں تو ان کی تدبیر کے مقام، قضا کے محکمہ اور ان پر ہونے والی عنایت کی جگہ یعنی قدس کے دائرہ تک بلند ہوتے ہیں۔ پھر ان پر حق کی جود وسخا اور تدبیر چوٹ مارتی ہے تو فرشتہ متوجہ ہوتا ہے۔ اور اس دن اللہ کی مخلوق میں سب سے زیادہ پاکیزہ پائے جانے والے قلب پر نازل ہوتا ہے پھر اس شخص سے لوگوں کے قلوب کی طرف انوار ملکیہ جاری ہوتے ہیں جو اس ناموس کلی سے پھوٹنے والے علوم جزئی کی طرف ہدایت کرتے ہیں۔

۲۸- تفہیم:

نبوت اور فطرت

جاننا چاہئے کہ نبوت، فطرت کے تحت ہے اور جس طرح انسان کے خلوص دل اور اس کے نفس کی جڑ میں کبھی علوم وجود داخل ہوتا ہے اس کا فیضان اس کے اوپر خوابوں کے ذریعہ ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ خواب میں ان امور کو دیکھتا ہے جو اس کے دل میں جمع ہیں۔ اسی طرح ہر قوم و اقلیم کی الگ فطرت ہوتی ہے جس پر ان کو پیدا کیا جاتا ہے۔ ان کے امور کی بنیاد پوری طرح اس فطرت پر ہوتی ہے جیسے ذبح کو قبیح قرار دینا اور عالم کے قدیم ہونے کا قول وہ فطرت ہے جس پر

ہندوؤں کو تخلیق کیا گیا ہے۔اور ذبح کا جواز اور عالم کے حادث ہونے کا قول وہ فطرت ہے جس پر عرب اور فارس کے بنوسام کو پیدا کیا گیا ہے۔ چنانچہ جب نبی آتا ہے تو ان کے پاس جو اعتقاد اور عمل ہوتا ہے۔ وہ اس میں غور وفکر کرتا ہے پھر ان میں سے جو کچھ تہذیب نفس کے موافق ہوتا ہے۔ اسی کو ان کے لئے برقرار رکھتا ہے۔ اور اس کی طرف ان کی رہنمائی کرتا ہے، اور جو کچھ تہذیب نفس کے خلاف ہوتا ہے اس سے ان کو روکتا ہے۔ اور کچھ اختلافات جو دوسخا کے نزول کے اختلاف کے قبیل سے ہوتے ہیں جیسا کہ ہم نے بیان کیا کہ مجوس کی توجہ آسمانی قوتوں کی طرف ہوتی ہے اور حنفا (مسلمانوں) کی توجہ ملاء اعلیٰ کی طرف ہوتی ہے، کسی غیر کی طرف نہیں۔ جیسا کہ ہم نے تمام انبیا کے برخلاف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے عموم اور آپ کی خاتمیت کا ذکر کیا۔ چنانچہ نبوت بمنزلہ کسی چیز کے بنانے کو مہذب کرنے اور اس کو اتنا احسن بنانے کے ہے جو کہ مناسب ہو، خواہ وہ چیز موم ہو یا مٹی۔ اور فطرت اور ملت بمنزلہ مادہ اور شمع اور مٹی کے ہیں، اس لئے انبیاء علیہم السلام کے احوال کے اختلاف اور ان کے ان امور کے اختلاف پر تعجب نہ کرو جن کا تعلق مادہ سے ہے۔ چنانچہ اصل نبوت اللہ تعالیٰ کی تعظیم کے عقیدہ، اس کی طرف توجہ اور ایسے اعمال کے ساتھ تہذیب نفس ہے جو دنیا اور آخرت میں اللہ کے عذاب سے نجات دے اور سیئات سے بچائے۔ چنانچہ دورہ اولی میں نہ بعث بعد الموت کی معرفت پر موقوف ہوتا ہے اور نہ فرشتوں پر۔ اور دوسرے دورہ میں اللہ پر اور صفات تعظیمیہ اور فرشتوں اور اس کی کتابوں اور رسولوں اور بعث بعد الموت کے ایمان پر موقوف ہوتا ہے۔

جہاں تک عالم کے قدیم اور حادث ہونے کا مسئلہ ہے اور تناسخ اور ذبح کی تحریم و حلت اور اللہ تعالیٰ کی ان صفات کا تعلق ہے جن میں تجدد، تنقل اور صفات محدثہ کی ایک نوع ہے جیسے اللہ کی رویت، نزول، ارادۂ متجددہ اور آغاز فطرت وغیرہ تو ان تمام کا تعلق فطرت اور مادہ سے ہے۔ اور نبوت اصلاً ان سے بحث نہیں کرتی۔

۲۹- تفہیم:

عارف الی اللہ کے دو طریقے

جاننا چاہئے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی معرفت حاصل کرنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک

طریقہ واسطوں کا ہے اور دوسرے میں کوئی واسطہ نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد میں اسی طرف اشارہ ہے من ذکرني في نفسه ذکرته في نفسي ومن ذکرني في ملاء ذکرته في ملاء خير منه "جو شخص میرا ذکر اپنے نفس میں کرتا ہے، میں اس کا ذکر اپنے نفس میں کرتا ہوں اور جو میرا ذکر لوگوں کے درمیان کرتا ہے، میں اس کا ذکر اس جماعت میں کرتا ہوں جو اس کے لوگوں سے بہتر ہیں۔ اور ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ ذکر اور طاعات کا رنگ نفس میں داخل ہوتا ہے تب نفس اس کے رنگ میں رنگ جاتا ہے۔ پھر اس رنگ کا خلاصہ نفس سے نفس ناطقہ کی طرف چڑھتا ہے۔ پھر اگر نفس ناطقہ میں شخص اکبر میں قوت عازمہ کی طرف پہنچنے والی ہمت پائی جاتی ہے، اس سے میری مراد مبدأ المبادی کی صورت ہے، تو کیفیت قدس کے دائرہ کی طرف ہمت کے طریقہ سے بلند ہوتی ہے اور نبی کریمؐ کے ارشاد سے یہی مراد ہے۔ اتق دعوة المظلوم فانه لا حجاب بينها وبين الله "مظلوم کی دعا سے بچو کہ اس کے اور اللہ کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں ہوتا" اور آپؐ کے اس قول سے بھی یہی مراد ہے لا اله الا الله لا حجاب بينه و بين الله کہ لا الہ الا اللہ اور اللہ کے درمیان کوئی حجاب نہیں ہوتا۔ اور اس طرح شے کی طرف شوق کی کیفیت اور اس کے حدوث کی وہ ہمت ہے جو شخص اکبر کے قلب تک پہنچتی ہے۔ پھر اگر وہاں اس کی ہمت کو روکنے کی مصلحت حاکمہ نہ ہو تو اس کو قبول کر لیا جاتا ہے اور یہ طریق باطن ہے۔

اور کبھی اللہ تعالیٰ بآواز بلند ذکر کرتا ہے تو ذکر کی صورت اس سے قریب والے فرشتوں کے نفوس میں واقع ہوتی ہے اور وہ عنصری ہوتے ہیں جو بمنزلہ نور کے شعلہ کے ہوتے ہیں۔ ان کے بعد ان سے دور والوں کے نفوس میں، پھر ان سے دور والوں کے نفوس میں واقع ہوتی ہے یہاں تک کہ ملائکہ کی وہ جماعت اس کا ذکر کرتی ہے جو ذکر سے متعلق ہے۔ پھر ان کے رنگ ان فرشتوں کی طرف اٹھتے ہیں جو اس جماعت سے اوپر ہوتی ہے۔ اور اسی طرح قدس کے دائرہ تک پہنچ جاتی ہے۔ چنانچہ طریق اول میں نفس ناطقہ کے رنگنے اور اس کی ہمت کے دائرہ قدس کے کمال تک پہنچنے کی شرط لگائی جاتی ہے اور دوسرے میں ملائکہ سے لاحق ہونے اور انہی سے مشابہت کی شرط لگائی جاتی ہے، کسی دوسرے سے نہیں۔

اب جب آپ نے اس تحقیق کو سمجھ لیا تو آپ پر اذان سے متعلق نبی کریمؐ کی اس

حدیث کا راز کھل گیا ان الحجر والمدر تشهد له يوم القيامة وانما شهادتهم ظهور لما عمله في الدنيا ''اس کے حق میں قیامت کے دن پتھر اور ڈھیلے گواہی دیں گے اور قیامت کے دن ان کی گواہی اس عمل کا ظہور ہوگی جو وہ دنیا میں کرتا رہا ہے۔'' اور آپ کو یہ بھی معلوم ہوگیا کہ لسانی اور بدنی اعمال کی تاثیر طریق ثانی میں زیادہ واقع ہوتی ہے اور وہ زیادہ شدید ہوتی ہے۔ اور مراقبات اور ہمت وغیرہ کی تاثیر طریق اولیٰ میں زیادہ واقع اور زیادہ شدید ہوتی ہے اور ملائکہ عنصریہ کے نفوس میں نقش ہونے والی صورت جس کا ہم نے مشاہدہ کیا ہے، شعلۂ نوریہ سے قریب ہوتی ہے اور آپ پر اس حدیث کا راز بھی کھل گیا اذا ذكر العبد ربه اخذ الملك ذلك الذكر بعينه فصعد به فحى بها وجه الرحمن ''بندہ اپنے رب کا ذکر کرتا ہے تو فرشتے بعینہٖ اسی ذکر کو اخذ کر لیتے ہیں اور اس کو لے کر اوپر کی طرف چڑھتے ہیں تب رحمٰن اس کا استقبال فرماتا ہے۔'' الغرض شریعت دائرہ قدس میں اس قربِ عظیم کی زبان ہے اور دائرہ قدس کا ذکر بہت ساری حدیثوں میں آیا ہے۔

۳۰- تفہیم:

قصیدۂ تائیہ

الا كل حال دون حالي ورتبتي
لقد فاق عن حد المدارك صبوتي

''یاد رکھو! ہر حال میرے حال اور مرتبہ سے کم تر ہے، میرا اشتیاق حواس و مشاعر کی حد سے بالاتر ہوگیا۔''

ولم يبق لي حالي سوى الحق نفسه
تساوت لي الحالات من بعد نسبتي

''میرے لئے حق کے سوا کوئی حال خود باقی نہیں رہا، میری نسبت کے بعد میری طرف حالات برابر ہوگئے۔''

وكانت مقامات تحل بنسمة
بفسحة صدر او طهارة فطرة

''اور ایسے مقامات تھے جو دل کی وسعت یا فطرت کی طہارت سے نفس کے اندر اترتے ہیں۔''

وکانت مقامات تحل بانفس
تجل صراح اوبجذب محبة

''اور ایسے مقامات تھے جو خالص طور پر یا جذب محبت سے نفوس سے حل اور روشن ہوتے ہیں۔''

فجاء ت رجال بعدهم ففطنوا
بان كمال العين اعلى الوسيلة

''چنانچہ ان کے بعد لوگ آئے اور انہوں نے سمجھ لیا کہ عین کا کمال سب سے اعلیٰ وسیلہ ہے۔''

وجاء ت رجال مفهمون ففهموا
باسرار ذی الجبروت و جلّت وعزّت

''اور سمجھنے والے لوگ آئے اور انہوں نے سمجھا دیا کہ عظمت و قدرت والے کے اسرار بہت عظیم اور بلند ہیں۔''

ونبئت بالرحموت عز مكانها
لكل من الجبروت والدهر عمت

''اور بڑی رحمت کے ذریعہ مجھے رحمت کی اور طاقت وقدرت کی اور سارے زمانہ کی خبر دی گئی۔''

كان هناك الدهر شجرة سدرة
وجبروتها نار الكليم تجلت

گویا وہاں زمانہ شجرۂ سدرہ تھا اور اس کی طاقت کلیم کی آگ تھی جو بہت روشن تھی۔

كان هناك الدهر جوهر عنصر
وجبروتها فيض الحيوة لنسمة

''گویا وہاں زمانہ عنصر کا جوہر تھا، اور اس کی طاقت نفس کے لئے زندگی کا فیضان تھا۔''

کان هناک الدهر ارض کثیفة
وجبروتها شمس وضرب اشعة

''گویا وہاں زمانہ ایک موٹی تہہ والی زمین تھی، اور اس کی طاقت سورج تھی اور شعاعوں کی مار تھی۔''

کان هناک الدهر جسم طبیعة
وجبروتها کم سرت فتساوت

''گویا وہاں زمانہ ایک طبیعی جسم تھا اور اس کی طاقت ایک آستین تھی جو چلی اور برابر ہو گئی۔''

فشاهدتها فی الحق غارت عیونها
وما ثم من وجد وصحو ونشوة

''میں نے ان کا مشاہدہ ذات حق میں کیا جہاں ان کی آنکھیں دھنس گئیں، اور وہاں لہر نشہ اور مستی کچھ نہیں۔''

وشاهدت ان الامر فیه مرتب
طواه تفاصیل الوجود بوحدة

''اور میں نے مشاہدہ کیا کہ اس میں معاملہ مرتب شکل میں ہے، وجود کی تفصیلات وحدت میں لپٹ گئیں۔''

وکل تجل حکمه فی مقامه
وان لیس من بعد المقام بصولة

''اور ہر ایک اس کے حکم کی ہر تجلی کے مقام میں ہے، اور یہ کہ مقام کے بعد کوئی غلبہ و دبدبہ نہیں رہتا۔''

وکل کلام من تجل فانما
ینادی لمن تحت التجلی بجهرة

''اور ہر کلام کی ایک تجلی ہے، اور جو تجلی کے تحت ہے، اس نے اس کو اعلانیہ پکارا۔''

وکل تجل شمس حق شعاعها
افاضات انوار بصرف الصحوة

"اور ہر تجلی حق کا سورج ہے جس کی شعاع، بے نیازی کے تصرف سے انوار کا فیضان ہے۔"

اذا ما اقتضی امرا واوجب موجبا

تصرف فیہ بالوجوب بسطوۃ

"جب بھی کسی امر کا تقاضا کیا اور کسی فریضہ کو، اس کے وجوب کی مداخلت کے غلبہ کے ساتھ واجب کیا۔"

وذلک ان العبد فیہ محدق

بحق وباضمحلالہ فی الحقیقۃ

"اور وہ یہ کہ بندہ اس میں گہری نظر کرنے والا ہے، حق سے اور حقیقت میں اس کے اضمحلال سے بھی۔"

فان لاح ترکیب ھیولی وصورۃ

لعدت معانیہ لہ من طبیعۃ

"اگر ھیولی اور صورت کی ترکیب ظاہر ہو جائے، تو اس کے معانی طبعًا شمار کئے جائیں گے۔"

ترکنا الصیاصی العنصریات خلفنا

ومتنا عن الناسوت ایۃ موتۃ

"ہم نے عنصریات کے قلعوں کو اپنے پیچھے چھوڑ دیا اور ہم اس مادی دنیا سے مردوں کی طرح مر گئے۔"

ھناک وجدنا الناس خمسۃ اضرب

وخمسین صنفامن تفاصیل صنعۃ

"وہاں ہم نے لوگوں کی پانچ قسمیں پائیں، اور صنعت کی تفصیلات سے وہ پچاس قسمیں تھیں۔"

ومتنا عن الاحداث من بعد ھذہ

وسرنا عن الحقر الحقیر بمرۃ

"اور اس کے بعد ہم تمام حادثات سے آزاد ہو گئے، اور حقارت و ذلت کی دنیا سے

ایک ہی بار چلے گئے۔"

ارانی طباع الانس من بعد هذه
اماما لاعیان الانام بنزهة

"میں نے دیکھا اس کے بعد انسانوں کی طبیعتیں، مخلوق کے خواص کے لئے امام کی حیثیت سے ہنسی خوشی رہتی ہیں۔"

اری کل انسان یصول لجردة
کعضو من الاعضاء من بین جثتی

"میں نے ہر شخص کو دیکھا کہ وہ ننگے پن پر غالب آ گیا جیسے جسم کے اعضا میں سے کوئی عضو غالب آ تا ہے۔"

اری الکل معذوراً بما قد اصابه
قلیلاً او کثیراً من تقاسیم رحمة

"میں نے ہر ایک کو جو اس کو پہنچا اس کے سلسلہ میں رحمت کی تقسیم سے کم یا زیادہ معذور پایا۔"

ظفرنا خیال العرش لا بد ظفرة
وصرنا وجودا من تصاریف کلمة

"ہم نے عرش کے خیال میں کامل کامیابی حاصل کی، اور ہم نے کلمہ کی تصریفات میں ایک وجود کی حیثیت اختیار کر لی۔"

تعریت من تیک الملابس کلها
ولم نک عرّجنا علی نحو صورة

"میں نے ان تمام لباسوں کو اتار دیا، اور ہم کسی صورت کی طرح بلندیوں پر نہیں چڑھے۔"

فشاهدت امرا لیس یوصف شانه
اذا الوصف یستدعی قیام علامة

"پھر میں نے ایک امر کا مشاہدہ کیا جس کی شان بیان نہیں کی جا سکتی۔ اس لئے کہ بیان علامت کے قیام کا تقاضہ کرتا ہے۔"

وكل لسان النطق عند ظهوره
واعطى تمام العلم والفهم حيرتي

"اور بولنے والی ہر زبان نے اس کے ظہور کے وقت میرے تمام علم وفہم کو حیرت زدہ کر دیا۔"

ويرجو ولي الله في حق نفسه
وفي الصحب والاولاد اوسع رحمة

"اور ولی اللہ اپنے نفس کے حق میں اور اپنے اصحاب واحباب اور اولاد کے حق میں رحمت واسعہ کی امید کرتا ہے۔"

۳۱- تفہیم:

عقل کے لحاظ سے حقائق کی تمیز کا بیان

قلم اعلیٰ کے درجہ میں جس کو عقل بھی کہتے ہیں، اشیاء کے حقائق تمیز کی ایک قسم سے متمیز ہوتے ہیں۔ اور وہ تمیز اشیاء کے تعین کا مبدأ قرار پاتی ہے۔ اور ان سب سے ایک نمونہ ذات الٰہی اور اس کی مشابہت آتی ہیں اور دیگر نمونوں اور مثالوں کے حقائق ذات میں پوشیدہ استعداد ہوتی ہیں۔ پھر جب معاملہ نیچے اترا اور لوح نے صورت اختیار کر لی اور وہ تمام حقائق دوسری شکل میں تمیز سے متمیز ہو گئے تو وہ حقیقت جو ذات کا نمونہ ہے بمنزلہ، قلب لوح اور تمام حقائق بمنزلہ جوارح ہو گئے۔ اور اس کے قویٰ اور اصل دائرہ قدس قلب ہے۔ اور ہر نفس جزئی میں نقطہ کی میراث کے حکم میں ہے جس کا بازار قلب ہے۔ مثلاً زید موجود ہے، وہ ناطق بولنے والا، ماشی چلنے والا، لکھنے والا اور ہنسنے والا وغیرہ ہے۔ یہ تمام معمولات جو احکام صادقہ میں مذکور ہوتے ہیں، لامحالہ زید میں مصدر ومصداق حملی رکھتے ہیں۔ ورنہ صرف زبردستی کا حکم اور عقل کا فیصلہ ہوگا۔ اور ان سب میں یہ محمول موجود ہے کہ جب ہم اس کی حقیقت میں غور وفکر کرتے ہیں تو حقیقۃ الحقائق پیدا ہو جاتا ہے جس پر موجودات کا سلسلۂ امر ختم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ زید میں ایک ایسا نقطہ ہے جو حقیقۃ الحقائق کی حکایت بیان کرتا ہے۔ اور یہ امر بہت زیادہ دقیق ہے جو کافی غور وفکر کے بغیر واضح نہیں ہوتا۔ چنانچہ آپ کے اوپر تامل صادق لازم ہے۔ اور افلاک اور ان کے عناصر کی اصل، قویٰ وجوارح ہیں۔ پھر جب افلاک وعناصر پیدا

ہو گئے اور دریائے حقیقت میں دوسری موجد پیدا ہوئی اور نفس کلیہ کی قوت ادراک جو کہ ان کی لوح ہے اور تمام افلاک کے نفوس، سلسلۂ واحد ہو گئے اور آشکارا اور کشادہ عالم مثال ظاہر ہو گیا۔ اور اس جگہ بھی تمام حقائق متشکل ہو گئے، اور ذات کی صورت نے اس قلب کے ساتھ پیوست ہو کر اس کی شرح و تفصیل کر دی اور دائرہ حظیرۂ قدس کی وسعت کا سبب سامنے آ گیا، چنانچہ عالم مثال سے صورت اجمالیہ میں پنہاں یہ حقیقت جبل اللہ ہے کہ اس کی مدد کے بغیر اس کی حقیقت تک نہیں پہنچا جا سکتا۔ اور تجلی اکبر ہے کہ اس کے بغیر اس قلب کو جو ذات کا نمونہ ہے، شناخت نہیں کیا جا سکتا۔ اور قربتوں کی اصل یہی صورت ہے اور اس کی تدبیر کے باب میں حاکم ہے، پیدا ہونے والی چیزیں اولاً اس مثالی تخلیق میں اجمالی طور پر ظاہر ہوتی ہیں، اور وہ انواع اور حوادث کے مشابہ ہوتی ہیں۔ دوسرے اس کی تفصیلی استعداد کی ایک مدت کے بعد تفسیر کی جاتی ہے اور ان استعدادوں کو ارواح کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ اس خیال کے ساتھ نہیں ہے کہ غیر انسان کی روح نہیں ہوتی بلکہ ہر شے کی ایک روح ہوتی ہے۔ جیسے اس مقام میں قحط ہوتا ہے۔ دوسرے اس کے ساتھ دین و کفر اور مرض وغیرہ۔ تیسرے ایک زمانہ کے بعد دوسری تفسیر اشکال مثالی سے کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے عرب کے گھروں میں قطرات کی صورت میں فتنوں کی شکل کو مشاہدہ فرمایا۔ اور آدم علیہ الصلوۃ والسلام نے اپنی اولاد کو ذریت کی صورت میں اور ان شکلوں میں دیکھا۔ پھر جب وہ وقت آیا کہ وہ حقائق مادی صورت اختیار کر لیں تو عنصری اور فلکی ترکیب پانا شروع کر دیا۔ چنانچہ بعض استعدادات اور ان کے مابعد میں ثابت ہیں تاکہ وہاں رہنے والی ارواح ہمیشہ رہیں۔ اور پھر ظاہر ہو جائیں اور جب کسی فرد کا مادہ مجتمع ہو جاتا ہے اور وہ وقت آ جاتا ہے کہ تمام عالم سے متعلق نفس کلیہ اس مادہ کے واسطہ نیچے اتر آئے اور خاص صورت میں اس مادہ کا مربی ہو جائے اور وہ صورت نفس معدنی یا نباتی یا حیوانی یا ملکوتی یا انسانی ہو جائے۔ چنانچہ انسان کا نفس ناطقہ مثلاً وہ نفس کلیہ ہے کہ جو ایک خاص شکل میں ظاہر ہوتا ہے کہ وہ صورت نوعی و روحی و ذریتی تمام اس پر منطبق ہوتی ہیں۔ اور ہر ایک کے تعلق سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ وہی ہے۔ اور اسی طرح تمام نفوس اور تمام مخلوقات کا معاملہ ہے۔ اچھی طرح سمجھ لو۔ اور وہ حقیقت کہ فراخی کے وقت میں انسان کی طرح روحوں کے مقابلہ میں بازار کی ذات واقع ہو جائے تو وہ بالذات ایک ہے۔ اور جب نمونہ کے مرتبہ

میں کشادہ ہوتو اس کو نبی الانبیاء کہا جاتا ہے۔اسی طرح بہت سے لوگوں کی شناخت ہوتی ہے۔مثال انسانی سے جو کہ اس کا مظہر ہے،ایک فرد ہے۔پس اگر اس مرتبہ میں تربیت کا حوالہ اس کی تخلیق سے ہوتا ہے تو فرد کامل ہوجاتا ہے۔ورنہ صرف فرد۔اور اس سلسلہ میں اللہ کی سنت یہ رہی ہے کہ جب بدن فرد مجتمع ہوجاتا ہے اور فیضان روح کے لئے تیار ہوجاتا ہے اور اس بدن میں قدس کا دائرہ گہری نظر کرتا ہے تاکہ وہ نظر اس میں نفس ناطقہ کے تولد کا سبب ہوجائے ،اور اس نظر کی تاثیر سے اس کا نفس ناطقہ تمام انسانوں کے خلاف کوئی اور چیز ہوجائے۔اصل علم میں اس کی انانیت ذات کی شعاعوں میں سے ایک شعاع ودیعت کردیتے ہیں اور جب اس شعاع فانی میں علم کو نقش کرلیتے ہیں اور اس شعاع کے ساتھ باقی رہ جائے اور ذات الٰہیہ کا علم فوارہ کی طرح جوش مارے،اس فرد کا وجود خواہ عالم حیات میں ہو یا عالم برزخ میں تمام نفوس پر علم ذات کے فیضان کا سبب نظر کی شعاعوں کے بمنزلہ سیت جانیں یا نہ جانیں۔اور چونکہ یہ نفوس اور جوان سے نیچے ہیں،عالم انسان وملائکہ میں پیدا ہوتے ہیں اور دائرۂ قدس کی جانب سے متوجہ ہوکر اس مقام کے رنگ میں رنگین ہوجاتے ہیں۔دائرۂ قدس کے چاروں طرف ایک دوسرا نور اسی جیسا پیدا ہوجاتا ہے اور وہ مثال یاقوت رمانی ہے کہ شب تاریک میں چمکتا ہے۔اور اس کا احاطہ کرنے والا روشنی کا ایک جسم معلوم ہوتا ہے۔اب جب کہ یہ مقدمات واضح طور پر سامنے آگئے تو جاننا چاہئے کہ ادوار واوقات کے حکم سے اس دائرہ قدس کے رنگ ہیں اور ہر رنگ کا نفوس انسانیہ سے ایک مظہر اور ایک عنوان ہے۔جس کو خاتم اور فاتح کہتے ہیں۔اور اس مسئلہ میں اصل بات یہ ہے کہ دائرہ قدس دوسرے رنگ میں رنگین ہوتا ہے۔اور وہ رنگ ملاء اعلیٰ اور ملاء سافل میں سرایت کرتا ہے۔اور افلاک میں سے ہر فلک کو اس رنگ کا حصہ پہنچتا ہے۔چنانچہ مشاہدہ میں یہ آیا ہے کہ عرش اور جو کچھ اس میں ہے اس کیفیت سے لبریز ہوتا ہے اور اس کے بعد وہ رنگ چاہتا ہے کہ بنی آدم کے نفوس میں داخل ہوجائے،پس اولاً ایک پاکیزہ نفس میں جس کی پیدائش دائرہ قدس کی نظر سے ہوئی ہے،اور اصل میں اس کی انانیت ذات پنہاں کی شعاعوں میں سے ایک شعاع بنی ہے،ظاہر ہوتی ہے۔اور اس طرح تمام نفوس تک پہنچتی ہے۔چنانچہ ایک دوسرا امر ہوتا ہے جو جہت باطن سے اس معنی کے دائرۂ قدس میں استقرار کا سبب ہوتا ہے۔اور ظاہر علوم اور اس پاکیزہ نفس کے خوف

کی جہت سے ایک تازگی پیدا ہوتی ہے۔

بہار عالم حسنش جہاں را تازہ میدارد
برنگ ارباب صورت را بہ بواصحاب معنی را

''اس کے حسن کی بہار کا عالم دنیا کو تازہ رکھتا ہے۔صورت پر نظر رکھنے والوں کو رنگ کے ذریعہ اور معنی پر نظر رکھنے والوں کو خوشبو کے ذریعہ۔''

اور جب بات یہاں تک پہنچ گئی، اس پاکیزہ نفس کو خاتم رنگ اول اور فاتح رنگ دوم کہتے ہیں۔اور خاتم و فاتح بہت زیادہ ہیں۔اس دورہ میں ان کے پہلے فرد حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں کہ ان کے مطمح نظر اور ان کی ہمت کی تدبیر میں ملائکہ وشیاطین کی کثرت اور ظہور لوح محفوظ میں صورت انسانی کا مبدأ ہو گئی۔اور دوسرے حضرت ادریس علیہ السلام ہیں کہ جو علوم صورت انسانیہ کا مقتضی تھے۔وسائل کے استنباط اور لغت کے استخراج اور نیکی و بدی کے بیان وغیرہ کے مراحل طے کر کے حوادث یومیہ کے مبادی کی تحقیق میں قدم رکھا اور اس جگہ سے بوجہ اتم مخلوق میں تصرف شروع کیا۔اور آپ صلوات اللہ علیہ علوم نجوم وطبیع وطب وطلسم کا مبدأ ہوئے۔اور آپ کے اسرار ساری دنیا پر اس حیثیت میں چھا گئے کہ دنیا بھر میں کوئی ایک ذرہ بھی ایسا نہیں ہے جو بقدر حوصلہ خود ان اسرار کا حامل نہ ہو۔اور کوئی بھی نفی کرنے والا اس کی نفی نہیں کرتا۔اور تیسرے حضرت نوح علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں کہ تمام ستارے اور آسمان اور ملاء اعلیٰ کے احکام یکجا ہو کر ان کے اسرار کے حامل ہیں جو ڈرانے والے (منذر) ہیں اور وہ پہلے شخص ہیں جو مقابلہ کرنے والے رسول قرار پائے کہ ان سے پہلے نبوت محض حکمت ورویت کی نمائندہ تھی۔ان کے اسرار بھی ساری دنیا میں پھیل گئے۔عرش سے فرش تک سب ان کے رنگ میں رنگ گئے اور آج تک حوادث یومیہ میں کواکب کا حکم صریح تر اور قوی تر ہے۔اور دائرہ قدس کے فیض کے سرایت کرنے کا حکم پوشیدہ اور نہیں کے درجہ میں ہے۔میں کہتا ہوں کہ یہ اس کے ساتھ مل جاتا ہے اور کوئی ایک دوسرے پر ترجیح قوی نہیں پاتا۔اس کے بعد دائرۂ قدس پر ایک دوسرا رنگ طاری ہوا۔اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ انتہائی مبارک اتصالات مسعودہ ہو کر اس طرح دکھائی دیتا ہے کہ یہ اتصالات تمام کواکب کی قوت اور حسن حال کے بغیر کوئی صورت اختیار نہیں کرتے۔خاص طور سے سورج، مشتری، زہرہ اور زحل۔

اور یہ اتصالات ملائکہ عظام اور انسانوں میں سے افراد کرام کے نفوس کے حدوث کا سبب ہو جاتے ہیں۔ اور یہ نفوس طلسمات کا حکم رکھتے ہیں کہ قوائے کواکب علی وجہ اتم اس جگہ ودیعت ہیں۔ اور اس حال میں صریح کواکب کا حکم باطل ہے۔ اس لئے کہ اس وقت تدبیر عالم تجلی اعظم کی تسخیر میں ہے۔ جب کہ ملائکہ کو تصرف کا موقع مخلوقات میں ملتا ہے۔ جب یہ معنی درجۂ کمال کو پہنچ گیا تو کواکب سے رجوع کا راستہ بند کرنے اور اس تجلی کے سلسلہ میں تضرع کے وجوب کا فیصلہ ہوا۔ تب تمام آسمان وزمین ان اسرار سے لبریز ہو گئے اور حضرت ابراہیم علیہ الصلوۃ والسلام ان اسرار کا عنوان قرار پائے۔ اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ اس خاتم وفاتح کا مثل تمام اعتبارات سے نہیں بلکہ محض دائرہ قدس کے جوش کے اعتبار سے اس سے پہلے پیدا نہیں ہوا تھا۔ واللہ اعلم۔ ایک طویل زمانہ کے بعد دائرہ قدس کے حکم روحانی نے مثالی صورت اختیار کی اور شکلوں کی صورت اپنائی اور عجیب شورش کے ساتھ زمین میں سلطنت کی۔ اور حضرت موسیٰ علیہ الصلوۃ والسلام ان اسرار کے خاتم وفاتح بنے لیکن اس وقت تک اس تجلی سے متعلق علوم واحکام مثالی صورت میں ظاہر نہیں ہوئے تھے۔ اور اس تجلی نے نفوس میں ہر نفس کی استعداد کے مطابق روحانیت وسرایت اختیار نہیں کی تھی۔ ان کے بعد حضرت داؤد علیہ الصلوۃ والسلام پیدا ہوئے اور قواعد کلیہ ناموسیہ سے تخریج کا باب کھولا۔ اور انبیاء سابقہ اور ان کے خلفا کے دین میں ان کے انبیاء کی نیابت سے ایک قسم طریقۂ اجتہاد کی لائے۔ ان کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ والسلام شریعت کلیہ سے قطع نظر علم باطن کی ایک قسم اور اسرار باطن کے تکلم کے فاتح ہوئے۔ اس طرح ایک زمانہ کے بعد صورت مثالی سلطنت کرتا ہے اور زمین میں جس کے قریب احکام سیر کرتے ہیں، جو حکم روحانی حضرت ابراہیم علیہ الصلوۃ والسلام کے اسرار ہیں اور احساس کے قریب آ کر اور زمین میں آمد ورفت کر کے نفوس انسانی میں بے حد وشمار فیوض داخل ہوتے ہیں۔ اور کارآمد ہوتے ہیں اور فبھداھم اقتدہ (ان کی ہدایت و رہنمائی کی پیروی کرو) کے حکم کے مطابق ہر اس فتح سے جو حضرت ابراہیم علیہ الصلوۃ والسلام کے زمانہ سے اس وقت تک متحقق ہو چکا ہے، نصیب کامل اور حظ وافر بروئے کار رہا اور وہ تمام کمالات کلیہ بلکہ احکام اور اسرار ورموز اور امثال بھی ایک ایک کر کے تمام ایک جگہ جمع ہو گئے۔ چنانچہ مثال میں تجلی نے ظہور کیا، اس کے احکام نے بھی ظہور فرمایا اور اس کا حکم ہر نفس میں

سرایت کر گیا، اور ضبط شکل اور قواعد کلیہ سے تخریج اور خلافت کبری نیز نبوت کے ساتھ قیام بھی ظاہر ہوا اور علم باطن کے باب کا فتح روشن تر ہوا۔ اور ان اسرار کا عنوان ہمارے پیغمبر افضل الخاتمین والفاتحین خاتم النبوۃ وفاتح الولایۃ صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے۔ اور آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام قیامت کی ایک نشانی ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قیامت کے سلسلہ میں ہاتھ کے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کی طرح اس معنیٰ میں باہم پیوست ہیں کہ آنحضرتؐ راہ ولایت کے فاتح ہیں کہ دنیا کے برطرف ہونے کی صورت رکھتے ہیں اور فنائے خالص کا ایک مقدمہ ہیں۔ آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد جو بھی فاتح یا خاتم موجود ہے وہ باب ولایت میں ہے۔ اور اس امت مرحومہ کے فاتح اول حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ ہیں کہ آنحضرت کی فاتحیت کے لئے بمنزلہ جارحہ ہو کر شعلۂ نبوت کو جو کہ اس کی چنگاری ہے جو بلند ہو جاتی ہے، الٹا کر دیتی ہے۔ حتی کہ اس کی چنگاری باطن میں پنہاں ہو جائے۔ اس کے بعد جو بھی ترقی ہوئی وہ باطن میں ہوئی اور حضرت امیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت پیغمبر کی نیابت فتح اجمالی کے سوا نہیں کی اور حضرت امیر کرم اللہ وجہہٗ کے اسرار آپ کی اولاد میں سرایت ہوئے اور حضرت جنید قدس سرہٗ کے زمانہ تک کے خاندان سے یکے بعد دیگرے افراد اس شعلہ کے حامل ہوتے رہے اور اس کی چنگاری باطن کی طرف متوجہ ہوتی رہی۔ اور یہی اسرار ہیں کہ شیعہ صاحبان اہل بیت کے ائمہ کے کلام کو جو کہ ان کے مقابلہ میں ہوتا ہے، اس کے محمل کے خلاف محمول کر کے ظاہر شرع کے وصایا سمجھتے ہیں۔ اور دوسرے خاتم وفاتح سید الطائفہ جنید قدس سرہ ہیں کہ اس شعلہ کو خود اپنے اندر لے کر اوپر کی طرف توجہ کی اور اس وقت توکل وتسلیم وغیرہ کے احوال ظاہر ہوئے۔ اس دورہ سے پہلے دورۂ شریعت تھا۔ اور یہ دورہ، دورۂ طریقت ہے جو اولیاء امت میں سے کسی دوسرے کو حاصل نہیں ہے۔ مگر ایک باطنی وجہ سے سید الطائفہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ بخدا چہرہ بھی ظاہر ہے کہ یہ چہرۂ باطن مثل فرقہ یا اجازت ہوتا ہے۔ چنانچہ ان وجوہ میں سے کسی بھی وجہ کے ساتھ اولیاء امت میں سے کوئی خاندان حضرت مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے سوا کسی سے مربوط نہیں ہے۔ اور دوسرے خاتم وفاتح سلطان الطریقہ ابوسعید بن ابوالخیر ہیں، قدس اللہ سرہٗ۔ کہ انہوں نے احوال کی بساط کو لپیٹ کر دائرہ کا مرکز اور فنا کی ہمتوں کو بلند رکھنے کی نظر کو وجود وبقا کے نقطہ کا ذریعہ بنایا۔ اور دیگر خاتم وفاتح شیخ اکبر شیخ

محی الدین بن علی بن عربی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ العزیز ہیں۔ انہوں نے اپنے وجدان سے حقائق الٰہیہ وکونیہ کے کشف کو اپنا مطمح نظر بنایا۔ ان تمام اعمال واحوال اور فنا وبقا کو متعدد امور شمار کیا۔ اور خاتم وفاتح دیگر وہ شخص ہے جس نے کئی صدیوں کے بعد پیدا ہو کر تمام کمالات انسانیہ کو تقسیم کر دیا اور ہر ایک کو اس کے لئے مناسب جگہ پر رکھ دیا اور ان کے آس پاس کے علوم سے خلط ملط نہیں کیا۔ چنانچہ ان علوم کو جن کا مقصد جمہور عالم کی نسبت سے خیر کا افاضہ ہے اور ان کا سرچشمہ حضرت خاتم الانبیاء علیہ وعلیہم الصلوٰت والتسلیم کا قلب مبارک ہے، اس کو تمام دیگر علوم سے خالص الگ تھلگ رکھا۔ ایک قوم نے احکام شرعی اور مصلحتوں پر نظر رکھتے ہوئے بدعت کے طریقے پیدا کر لئے اور ایک جماعت نفس کی تہذیب کی راہ پر چل کر زہد کی گہرائیوں کو ظہور میں لائی۔ ایک جماعت نے عقائد اسلامیہ کے مسلک میں گھوڑے دوڑا کر انبیا علیہم السلام کی باتوں کو تحقیقات عقلیہ کے ساتھ جو فلاسفہ کے علوم سے سرقہ کی ہوئی تھیں، خلط ملط کر دیا۔ ایک فرقہ نے حضرت شارع صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں کو جو کہ علوم فلاسفہ پر عمل کے واسطے بیان کی گئیں، اس طرح توحید اور فنا وبقا پر محمول کیا، گویا اس شخص کا مقصد تخلیق ہی ان تمام علوم کو مٹانا تھا۔ اس طرح کہ اس کی بو کی تاثیر سے اس کے کلام سے قطع نظر ان کی روح باطل ہوگئی اور ان کی تازگی خشکی میں تبدیل ہوگئی۔ چنانچہ اس میں کوئی باریکی کو دیکھنے والا نظر نہیں آتا اور کسی نور کے شناسا نے اس کو نہیں پہچانا۔ اے اللہ! مگر ایک قوم جو ایک زمانہ سے اس سے الفت رکھتی ہے اور ان کے استحسان کا منشا یہی الفت ہے، اور ان علوم کو پاک کرتا ہے جن کی پیدائش، ناقص تصورات سے غبار کا وجدان ہے کہ اہل وجدان میں سے بیشتر کو غلط اندازہ ہوا ہے۔ چنانچہ اہل وجدان کا ایک دوسرے سے اختلاف پیدا ہو گیا اور ان علوم کو جن کا منشا برہان ہے، اس نقصان سے جو عدم وجدان کے سبب ان میں داخل ہو جاتا ہے دور کیا۔ اس خاتم وفاتح کی ایک خصوصیت مجددیہ، وصایہ اور قطبیہ ارشادیہ کا ایک ساتھ قیام ہے۔ جیسا کہ میں نے کہا ہے۔

فثلث اطوار العلوم بساحتے
رسوخ وتاویل و آخری جلائل

"علوم کے تین طریقے ایک میدان میں ہیں۔ رسوخ وتاویل اور دوسرے بڑے

کارنامے۔"

چنانچہ مجددیت کے فروع کے سلسلہ میں کہ فقہ میں سنت کے طریقہ پر ہو اور جو نوامیس قیاسیہ کی کسی بھی قسم کی آمیزش کے بغیر ہو تکلم ہے اور علم کلام میں صحابہ و تابعین کے طریقہ پر تکلم ہے۔ اور وصایہ کے فروع کے شعبوں میں احکام و ترغیبات و ترہیبات و تاویل اور انبیا علیہم السلام کے قصے وغیرہ کے اسرار تکلم ہے اور جو کچھ انبیا صلوات اللہ علیہم نے بیان کیا ہے اور قطبیہ ارشادیہ کے فروع کے شعبوں سے اس طریقہ کا ضابطہ ہے کہ ترجمان لسان فیض نے بیان کیا جو کہ باطن کے مطابق اس زمانہ میں فیض پہنچانے والی ہے۔ امید یہ ہے کہ اگر اللہ نے چاہا تو اس کے ہاتھ پر زمانہ تازہ ہو جائے گا۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے ان الزمان قد استدار کھیئۃ یوم خلق اللہ السموٰت والارض "تاریخ نے خود کو دہرایا اس دن کی طرح جب اللہ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا۔" خاتموں اور فاتحوں کے پیچھے ایک قوم ہے کہ ارشاد کے اسرار کا ان میں ظہور ہوتا ہے۔ اور وہ اصحاب طریق ہوتے ہیں۔ سبحانک لا علم لنا الا ماعلمتنا انک انت العلیم الحکیم "تمام نقائص سے پاک تو صرف آپ ہی کی ذات ہے، ہم تو بس اتنا ہی علم رکھتے ہیں جتنا آپ نے ہمیں دے دیا ہے۔ حقیقت میں سب کو جاننے والے اور سمجھنے والے آپ ہی ہیں۔" (البقرہ:۳۲)

۳۲- تفہیم:

وہ دو حالتیں جن کا ہم ادراک کرتے ہیں

اللہ آپ پر رحم کرے۔ اس بات کو سمجھ لو کہ ہماری دو حالتیں ہیں ہم جو کچھ ادراک کرتے ہیں، انہی سے کرتے ہیں۔ ان میں ایک مدرک (ادراک کرنے والی قوت) کے لئے، اس عارف کی تربیتوں میں سے مناسب تربیت (نشأۃ) ہے۔ اور دوسری تمام حقائق کا احاطہ کرنے والی، حقیقت عامہ جبروتیہ ہے، جس سے تربیتیں پیدا ہوئیں۔ اور پہلے مسئلہ کی تحقیق یہ ہے کہ یہ بندہ موجودات میں سے ایک موجود ہے۔ چنانچہ اس میں لازمی طور پر وجود کے اسرار کا اور تمام بلند و عام حقائق کے اسرار کا جو تحقق کے اقلیم پر پردہ ڈالنے والے ہیں،

اندراج ہوگا۔اور عارف پر سے جب توحید کے اسرار کا پردہ ہٹ گیا اور اس نے دیکھا کہ اس کا ممکن التحقق وجود کے باطن سے فیض پہنچانے والی آنکھوں سے وجود کے ظاہر کا انضمام اور امتزاج ہے تو یہ کشف اس کے لئے اجمالی ہے۔اس وقت اس کی بصیرت کی نگاہِ ازلی ان تمام پردوں کے ساتھ یقینی وجود پر پڑتی ہے جو اس مشہود کی شرح نہیں کرتے۔اور اس کا کشف بعد میں ہوتا ہے۔اور اسی طرح اس میں ہر اس پیدائش کے اسرار ہیں جو اس مادی صورت میں اس کے تحقق اور ظہور پر مقدم ہے۔چنانچہ اس میں ہر اس گھومنے والے فلک کا فیض ہوتا ہے جو خاص اس صورت میں اجمالی فیض کی تخصیص کی شرط شمار کی جاتی ہے۔اور ہر مقرب فرشتے کو دنیا کی تدبیروں میں ایک دخل ہوتا ہے۔اور ہر عنصر جس سے اس کا ہیکل مرکب ہوا ہے اور معدنیت و نباتیت، حیوانیت اور انسانیت کی ہر صورت، خاص اس صورت اور ہر اس تخلیق کے فیضان کے لئے تمہید ہو جاتی ہے جو اس فیض پہنچانے والی صورت سے پیدا ہوتی ہے جیسے نشأۃ قبریہ اور حشریہ۔اور اسی طرح اس میں حقیقت جبروتیہ کا پردہ شامل ہے جو نوعِ انسانی کی تدبیر و تربیت کے ساتھ قائم ہے۔چنانچہ اس عارف کے لئے ممکن ہے کہ وہ اپنے نفس میں شامل ہر طبقہ میں غور و فکر کرے۔اور اس میں اس پیدائش کے احکام کو دیکھے جس کی وجہ سے وہ طبقہ ہے جیسے آئینہ۔اس میں وہ رنگ اور شکلیں چمکتی ہیں جو اس کی مقابل ہوتی ہیں۔چنانچہ جب بھی ہم روحوں میں سے کسی ایک روح کی طرف توجہ کرتے ہیں۔اس کی منزل کمال کے مقامات پر پاتے ہیں۔چنانچہ ہمارے کمالات میں سے کسی ایک کمال نے جو ہمارے اندر شامل ہے۔ہماری منزلت اور مقدار کے لئے ایک آئینہ قائم کر دیا۔اور اللہ سے متعلق ہماری معرفت کی انتہا کو بیان کر دیا۔چنانچہ روح کی صفت ہمارے وجود کے طبقات میں سے اس روح کے لئے مناسب طبقہ کے آئینہ میں پوری طرح ظاہر ہوگئی۔پس جب بھی ہم نے جنت کی طرف توجہ کی تو اس کی اس حقیقت کو دیکھا جو ہمارے اعمال اور اسکے اوپر حکم مثالی میں فیض پھیلانے والے ہمارے اخلاق کے احاطہ میں ہے۔اور ہمیں حوروں نے پکارا جس کی وجہ سے ہم پوری طرح سرور و مستی میں آگئے۔

جہاں تک تیسرے مسئلہ کی تحقیق کا سوال ہے تو وہ یہ ہے کہ صاف شفاف نفس اس وقت حقائق جبروتیہ کے رنگ میں رنگ جاتا ہے جب وہ ان حقائق کی طرف ان کے مناسب نظریہ سے دیکھتا ہے۔پھر جب وہ اس رنگ میں رنگ جاتا ہے تو ان حقائق میں جو چاہتا ہے،

دیکھتا ہے۔ اور یہ بھی ان کے نفس کے رنگ کے واسطہ سے ہوتا ہے اور کبھی عارف اس حقیقت کا اور ہر اس چیز کا جو اس میں شامل ہے بغیر کسی رنگ اور آئینہ کے ذاتی تجلی کے حال کی طرح مشاہدہ کر لیتا ہے۔ اور یہی علم کی انتہائی غایت ہے۔

۳۳۔ تفہیم:

''کامل'' کی حقیقت

جب دوسروں پر سبقت لے جانے والے آگے، بڑھنے والے پر عنایت و توجہ کا نزول ہوا جو کہ عظیم المعرفت اور قوی العلم ہے کہ اس کا نفس مطلق بہت بلند ہے اور ان امور الہامات کا بیان کرنے والا ہے جن سے نہ نفس کی تنگی روکتی ہے اور نہ ہی غیب سے حاصل ہونے والے علم سے طبیعت کا کوئی وسوسہ۔ اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول علوم کا احاطہ کر لیا اور اپنے قلب میں شریعت کی ان چیزوں کو نقش کر لیا جن پر ملاء اعلیٰ نے اتفاق کیا اور یہ وہ ہے جس کو نبیؐ نے کھول دیا۔ پھر اس عنایت الٰہیہ نے نزول فرمایا جو لوگوں کی ہدایت کی اور ان کے اندر ملت کی حفاظت کی مقتضی تھی۔ عنایت مطلق ہی نہیں بلکہ وہ عنایت جو محمدؐ کے سینہ مبارک میں ظاہر ہوئی۔ چنانچہ تمام علوم تمام حدود اور مقداروں کو ان کی وجہ پر پہچان لیا اور ملاء اعلیٰ میں ان کے انعقاد کی وجہ اور اس وجہ کو پہچان لیا جس پر حدود و مقادیر سے نبیؐ نے اجتہاد کیا اور اس کو دو زبانیں عطا کی گئیں۔ ایک زبان وہ جس کی تفصیل نبیؐ نے اصحاب یمین کے لئے بیان کی۔ یعنی عقائد اور فقہ۔ اور دوسری زبان وہ جس کو سبقت کرنے والوں کے لئے مجمل رکھا جس میں حکمتیں اور معارف الٰہیتہ ہیں۔ اور اس کو تمام وجوہ سے دین کا مجدد بنایا۔

اور وہ یہ کہ جب اس کو اس کے رب کی طرف سے لکھا ہوا کلام عجیب عطا ہوا جو علیحدہ سے ہر کمال تک دراز تھا اور وہ تیار تھا، اس نے استقبال کیا تو ہر کمال اس کا جز تھا۔ اس ذکی و فطین بندہ نے اس کے ہر جز کو گہری اور تیز نظر سے دیکھا۔ پھر ہر جز کو مقامی لباس عطا کیا۔ تب حق تعالیٰ نے اس کی طرف نظر رحمت سے دیکھا۔ تب اس پر لباس کامل کر دیا تو وہ اکیلا نہیں تھا بلکہ حقیقت میں کثیر تھا۔ اس کا ایک وجود وہ ہے جو ملاء اعلیٰ کے وجود کے مشابہ ہوتا ہے، اس کو انہی میں شمار کیا جاتا ہے۔ پھر جب ملاء اعلیٰ میں نزاع ہوا تو اس سلسلہ میں وہ ان

کے ساتھ ہوا۔اور اس کا ایک وجود قدرت الٰہی میں ہے اور وہ اس کے مختلف طریقوں میں غور و فکر کرتے ہوئے جبروت اور لاہوت کو محسوس کرتا رہا۔اور اس کا ایک وجود رحموت میں شامل ہے۔اس کے ذریعہ جبروت سے ممتاز کو محسوس کرتا ہے۔اور اس کا ایک وجود مادی عقول میں ہے جو اس کے لئے نفس کے مدمقابل ہے اور اس کو ہمیشہ اپنے جسم کے طریقوں کے بارے میں غور وفکر سے مناسبت رہی ہے۔اور ایک وجود دنیا میں پائے جانے سے پہلے ارواح سے رہا ہے جیسا کہ تمام انسانوں کا ہوتا ہے۔اور ایک وجود عالم مثال میں ہے۔اور ایک وجود دنیا میں ہے۔تو یہ سب وجود ایک دوسرے سے ممتاز شکل میں موجود ہیں۔اور اس کے لئے اس کے دوسرے بہت سے مثالی وجود ہیں۔ان میں سے ایک وجود ملاء اعلیٰ کے مشابہ ہے،ایک وجود ملاء سافل سے۔اسی طرح ہر کمال جو آدم علیہ السلام سے لے کر قیامت کے دن تک انسانوں کو حاصل ہوا ہے،اس کا ایک وجود ہے جو ہر کمال کا حامل اور نمائندہ ہے۔

پھر وہ کمالات جو نور محمدی کے ان کے قلب میں پلٹنے سے جمع ہوئے اس کے ہر کمال کے مقابلہ میں اس کا وجود مثالی ہے۔اس کا ایک وجود وہ ہے جو کمال صحابہ کا حامل ہے۔ایک وجود ولایت وفنا اور بقا کا حامل ہے،اور ایک وجود وصایا کا حامل ہے۔اور اس سے مراد احکام کے معانی اور حکمتوں اور حدود و مقدار اور ان کے اسرار کو سمجھنا ہے۔اسی طرح قصص کے معانی کا سمجھنا ہے اور ایک وجود مجددیت اور ظاہر علم کا حامل ہوتا ہے۔اس میں خبر ہے کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط ہے۔اور اس میں علم حدیث اور علم فقہ ہے جو سابقین کے لائق ہے۔اور وہ فقہ ہے جو اصحاب یمین کے لائق ہے اور علم کلام ہے۔اور دوسرا سلوک دیا گیا جو آج پائے جانے والے تمام طرق میں سے جذب کے سبب سے زیادہ قریب ہے۔اور اس وقت پائے جانے والے تمام طرق نقشبندیہ قادریہ اور چشتیہ وغیرہ کا حامل ہے۔

اور اس پر اللہ تعالیٰ کے عجیب وغریب لطائف میں سے ایک بات یہ ہے کہ قرب روحانی اس سے خارج ہوا،اور دنیا میں داخل ہو گیا،اور اس میں روحانی طور پر سرایت کر گیا، اور اس سے مادی قرب نکلا اور عالم میں داخل ہو گیا اور مادی چال چلا۔چنانچہ وہ تمام طرق اور مذاہب کے منسوخ ہونے کے لئے سبب ہوا۔چنانچہ ان کے مذہب کے بعد کوئی مذہب اور ان کے طریقہ کے بعد سلوک کا کوئی ایسا طریقہ آپ نہیں دیکھیں گے جو روح جذب پر مشتمل

ہو۔ ہاں آپ ایسے اہل طریق و مذاہب کو دیکھیں گے جو مذاہب اور طریقوں کے رسوم کو پکڑتے ہیں اور سلوک کی کسی نوع کے لئے مفید اشغال میں مشغول رہتے ہیں۔ لیکن جہاں تک جذب کا سوال ہے وہ مفقود ہے۔ چنانچہ یہ قیامت وہی ہے جس کا اس وصی کے لئے وعدہ کیا گیا۔ دنیا میں پائے جانے سے قبل اس کے کمال کا وعدہ کیا گیا۔ اور قربتیں انہی میں منحصر نہیں ہیں جو ہم نے بیان کیں بلکہ اس کو عالم حجر یہ میں بھی قرب ہے اور عالم شجر یہ میں اور عالم حیوانیہ میں بھی۔ اور ہر قرب اس صورت کے علوم کو پہچاننے کے لئے آئینہ ہے۔

اور جاننا چاہئے کہ موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں لوگ جادو سے شغل رکھتے تھے، اس میں غلو رکھتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام پر عصا اور ید بیضا کا معجزہ نازل فرمایا۔ اسی طرح انہیں اسی فن میں عاجز کر دیا جس کے وہ ماہر تھے۔ اس فن پر کامیابی کی امید میں نظریں گاڑے رہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسا اس لئے کیا تاکہ اپنی حجت ظاہر کر دے اور جادو کے سلسلہ میں ان کی تیاریوں کا قلع قمع کر دے۔ اور اس کے ذریعہ عذاب وعتاب سے دوچار کر دے۔ اور ہمارے نبیؐ کے زمانہ میں لوگ اشعار اور خطبوں سے شغل رکھتے تھے اور ان کی رفعت شان اور عظمت و بلندی وضاحت سے متعلق تھی۔ تو اللہ تعالیٰ نے قرآن کا معجزہ نازل فرمایا۔ اس طرح ان کو عاجز کر دیا اور انہیں چیلنج دیا۔ اس طرح اپنی حجت کو ظاہر کر دیا کہ انہیں اس میدان میں عاجز کیا جس کے وہ ماہر تھے۔

اسی طرح انبیا کے وارث مجددین اور اوصیا کا معاملہ ہے۔ البتہ شریعت کی تاویل اور تجدید کی صورت اقوام کے اختلاف کے لحاظ سے مختلف ہوا کرتی تھی۔ چنانچہ جب ان میں خطابت پھیلی ہوئی تھی تو اللہ کے جود و کرم میں یہ واجب قرار پایا کہ وصی کی تاویل اور شریعت کی تفسیر، خطابت کی زبان میں ہو اور جب ان میں برہان پھیلی ہوئی ہو تو اللہ کے جود و کرم میں یہ قرار پایا کہ شریعت کی تاویل اور تفسیر برہان کی زبان میں ہو۔

جہاں تک اس وصی کا تعلق ہے اس کا وجود اس زمانہ میں ہوا جب لوگوں میں تین چیزیں پھیلی ہوئی تھیں۔ ایک برہان اور یہ اہل یونان کے علوم سے اختلاط اور قوم کے کلام میں اشتغال کی وجہ سے ہوا۔ حتیٰ کہ عقائد کے سلسلہ میں ایسا کوئی کلام نہیں پایا جاسکتا کہ وہ برہانی مناظروں سے لبریز نہ ہو۔

اور وجدان لوگوں کو مشرق ومغرب میں ہر جگہ صوفیا کو قبول کرنے اور ان کی اتباع پر جمع کرنے کے لئے ہے، یہاں تک کہ ان کے اقوال اور احوال، کتاب وسنت اور ہر چیز کے مقابلہ میں ان کے دلوں سے زیادہ تعلق رکھتے ہیں۔ حتی کہ ان کے رموز واشارات تک لوگوں میں پھیل گئے ہیں۔ چنانچہ جس نے ان کے رموز واشارات سے انکار کیا یا کسی بھی طرح انکار کرنے والوں کے ساتھ ہو گیا تو اس کو قبول نہیں کیا جاتا۔ اور نہ ہی اس کو صالحین میں شمار کیا جاتا ہے۔ اور ممبروں پر کوئی واعظ ایسا نہیں ملتا جس کے کلام میں صوفیا کے اشارات شامل نہ ہوں۔ اور کوئی ایسا عالم نہیں ہے جس کو لوگ جانتے ہوں جو ان کے کلام کا معتقد نہ ہو اور اس میں غور وفکر نہ کرتا ہو۔ یا پھر یہ کہ وہ چوپایہ بہائم جیسی طبیعت رکھنے والا ہوگا۔ اور امرا وغیرہ کی کوئی مجلس ایسی نہیں ہے جس میں شریک ہونے والوں کی زبانوں کی پیشکش اور ان کے ہاتھوں کی کوشش اور ان کی محفلوں کی خوش طبعی کا اہم حصہ صوفیا کے اشعار اور ان کے نکات نہ ہوں۔

اور سماع اور یہ ان کے ملت اسلامیہ میں داخل ہونے کی وجہ سے ہے اور یہ اس زمانہ میں پیدا ہوا جب ہر صاحب رائے نے اپنی رائے کی اتباع کی۔ اور اس میں آپ کسی کو ایسا نہیں پائیں گے جو متشابہات اور علم کے میدان میں پیش آنے والی مشکلات سے واقف ہو۔ اور آپ کسی ایسے شخص کو بھی نہیں دیکھیں گے جو احکام کے معانی اور ان کے اسرار کے سمجھنے میں غور وخوض کرتا ہو اور اس سلسلہ میں معقول امور کی طرف میلان رکھتا ہو۔ اور ہر شخص کے لئے مذہب اس کے مطابق ہو گیا جو اس نے سمجھ لیا۔ اور ان کا حال یہ ہو گیا کہ لڑو جھگڑو بحث کرو، نہ اتفاق ممکن ہے، نہ کوئی اصلاح ہے۔

انہوں نے فقہ کی اقسام میں بھی اختلاف کیا ان میں کچھ حنفی ہیں اور کچھ شافعی۔ اور ہر ایک اپنے اصحاب کے سلسلہ میں تعصب رکھتا ہے اور دوسروں پر نکیر کرتا ہے۔ ہر مذہب میں تخریجات کثرت سے ہو گئی ہیں۔ یہاں تک کہ حق پردے میں چلا گیا ہے۔ یہ اللہ کا جود وکرم، اس کی رحمت ومہربانی اور لطف وحکمت ہے کہ شریعت سے متعلق اس وحی کی تفسیر ایسی بنا دی کہ اگر وہ اس میں غور وفکر سے کام لیں تو اختلاف بہت کم رہ جائے اور حق کا ہر راز معلوم ہو جائے۔ وہ لوگ ایک پاؤں کو اس کے سمجھنے کے نام پر آگے بڑھاتے ہیں اور دوسرے پاؤں کو پیچھے دھکیلتے ہیں۔ جب کہ اس کا کلام ایسا ہوتا ہے کہ جو برہان، وجدان اور منقول سے

مطابقت رکھتا ہے اور اس کی قوم کے علوم کی مکمل معرفت حاصل ہے۔ اور وہ ایسا شخص ہے کہ اس کی رائے سے اس طرح شفا حاصل کی جاتی ہے جس طرح اونٹ تتنے سے شفا حاصل کرتا ہے۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر یہ وصی چابکدستی کا سہارا لیتا تو فلسفی کے ساتھ اس کے فلسفہ میں بات کرتا، متکلم کے ساتھ اس کے علم کلام میں، محدث کے ساتھ اس کی حدیث میں، مفسر کے ساتھ اس کی تفسیر میں، فقیہہ کے ساتھ اس کے فقہ میں اس طرح بات کرتا اور تصوف والے کے ساتھ اس کے تصوف میں کوئی بھی صاحب فن عاجز نہ ہوتا اور ہر خواہش رکھنے والا مبہوت رہ جاتا اور نہ کوئی اس بات کو جانتا کہ وہ کس بات سے بے خبر ہیں اور ان کو اس پر متنبہ کر دیتا جو ان سے پوشیدہ ہے۔

اور میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ آپ اس وصی کو دیکھیں گے کہ اپنی پوری قوت کے ساتھ معارف کو شمار کرتا ہے اور آپ اس کی زبان کی فصاحت میں لاہوت، جبروت، ملاء اعلی اور ملاء سافل کی خبر پائیں گے اور آپ دیکھیں گے کہ اس کا قلب زمین میں تدبیر الٰہی کے مسائل اور دنیا و آخرت میں اس کے فیصلوں میں مصروف و مشغول رہتا ہے اور ہر چیز کے لئے ضوابط و قوانین دیے گئے ہیں جن میں نہ کوئی منتقل ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی تبدیل ہوتا ہے۔ اور جو کچھ دیا گیا وہ یقین و سکون ٹھنڈک ہدایت، رحمت اور لطف ہے، بغیر اس کے کہ اس کے ساتھ کوئی مادی وسوسہ اور اندیشہ شامل ہو۔

اور یہ بھی جان لو کہ لوگوں کے ہر اجتماع میں ایک ایسے پسندیدہ بندہ کا ہونا ضروری ہے جس کی طرف حق اپنی رحمت سے دیکھتا ہے۔ اور لوگوں کی طرف اس کی نظر میں دیکھتا ہے تو انہیں رزق دیا جاتا ہے اور ان کی مدد کی جاتی ہے اور ان کے اوپر اس کے طفیل میں برکتیں نازل ہوتی ہیں۔ اور یہ وصی وہ پسندیدہ فرد ہے جس کے ذریعہ دوسرے محبوب بندوں کو رزق ملتا ہے۔ اور ان کی مدد کی جاتی ہے، اور وہ حق کا تقرب حاصل کرتے ہیں۔ اور اس کے طفیل اس کی طرف وسیلہ حاصل کرتے ہیں، اور اس کی نظر کے ضمن میں اس کی طرف حق کی نظر اس کی رحمت اور اس کے سینہ سے ملے ہوئے اس کے لطف کے ساتھ ہوتی ہے۔ میری اپنی عمر کی قسم! وہ آسمانوں اور زمین کی میخ ہے، اگر وہ نہ ہوتا تو زمین فرش کی شکل میں باقی نہ رہتی۔ نہ آسمان بنا رہتا۔ اور اگر وہ نہ ہوتا تو برکتیں نازل نہ ہوتیں۔ اور اگر وہ نہ ہوتا تو رشد و ہدایت نازل نہ

ہوتے۔ چنانچہ وہ کتنا اچھا ہے، پھر کتنا اچھا ہے، پھر کتنا اچھا ہے، اور اللہ جس کو چاہتا ہے بے حساب دیتا ہے۔

۳۴-تفہیم:

اقطاب مرشدین کا ذکر

لوگوں پر احسان کی صفت کی جہت سے حق تعالیٰ کی عنایت نے قوم کو آمادہ کیا تو انہوں نے اقطاب کا نام مرشد رکھ لیا۔ چنانچہ ان میں خلق کی طرف حق تعالیٰ کی نظر اس اعتبار سے متوجہ ہوئی جس سے وہ اپنے دین اور احسان کی طرف ہدایت پاتے ہیں۔

چنانچہ ان میں کوئی احسان اور خضوع سے کام لینے والا فرشتوں کے مشابہ ہو گیا۔ اس کو قبولیت کا درجہ عطا کیا گیا۔ اس کے اندر عظیم اسرار پھونک دیے گئے اور لوگ اس کی طرف راغب ہو گئے۔ اس طرح انہوں نے اس کے ذریعہ ہدایت حاصل کی اور اس نے احسان اور قلب کی صفائی کے میدانوں میں چلنے سے بلند مقامات قبولیت کا درجہ حاصل کرنے والی دعائیں، خواب، کشف اور احوال قلبی حاصل کئے۔ پھر یہ باتیں اس سے نقل کی گئیں اور وہ لوگوں میں عام مثالوں کی طرح پھیل گیا۔ اور لوگوں نے اس کے ہدایت کے راستہ پر چلنے سے طرق و مذاہب حاصل کر لئے۔

اب جو سخت علاقہ میں رہتے تھے جیسے ترک، انہوں نے مشقت والے اشغال کا استنباط کیا جو قوت بہیمیہ کو توڑ دیتے ہیں۔ اور جو اقلیم معتدل میں تھے، انہوں نے مسلسل فیضان والے اشغال کا استنباط کیا۔ اور جس کی طرف فکر و بہیمیت والے راغب ہوئے، انہوں نے دعاؤں اور وظیفوں کے باب کے اشغال کا سلسلہ رکھا۔ اور جس کی طرف قوی بہیمیت والے راغب ہوئے، اس نے تبتل غیر ازدواجی زندگی گزارنے، علیحدگی پسندی، روزہ، شب بیداری اور دنیوی لذتوں سے مکمل قطع تعلق کا استنباط کیا۔ اس کے بعد ان کا حالات و مقامات سے سابقہ پڑا تو جس کا تعلق شدت والوں کے طبقہ سے تھا، اس کو اس کے مناسب قواعد کا فائدہ ہوا اور جس کا تعلق ضعیفوں سے تھا، اس کو اس کے مناسب قواعد کا۔ اور جو اخلاق سلیمہ والوں میں سے تھا، یا اس کی طرف نفوس راغب ہوئے، اس نے اپنی مناسبت سے یادداشت اور وجدو

اشغال قلبی اور اکثر احوال نفسانی کا اجتہاد کیا۔

اور ان میں سے جو اپنے احسان کے ساتھ فانی اور باقی تھا یا فردیت کے شعبہ سے تعلق رکھتا تھا، اس نے اپنے کلام کی لغزشوں اور اپنی زبان کی وضاحت سے جبروت، لاہوت اور تدلیات (قرب) کے احکام کے امور حاصل کیے۔ اور جب بھی ان میں سے کسی نے اللہ کی عنایت اور توجہ کو اپنے حاصل کیے ہوئے علوم میں ملی ہوئی دلیلوں کے ساتھ محسوس کیا، پھر کسی قوم نے ان رموز کو اپنے دل کے کانوں سے سنا تو اس کو انہوں نے محفوظ اور مرتب کر لیا۔ اور دوسری قوم نے ان کو اپنے کانوں سے سنا تو وہ خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا۔

اس طرح تصوف میں مختلف مذاہب پیدا ہو گئے، اور لوگ بہت سارے گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ اس لئے کہ انہوں نے ان کے ظاہر اور ان کی صورتوں کو دیکھا تو انہی پر اکتفا کیا اور یہ نہیں سمجھا کہ حق کی عنایت حقیقت میں ایک ہی ہے۔ آج لوگوں کی مصلحت کے لحاظ سے اس کے بہت سارے رنگ اور مختلف قسمیں ہیں۔ ان میں کچھ مذاہب صرف احسان کے لئے مفید ہیں اور اس سلسلہ میں وصی کا کوئی ایک حکم نہیں ہے بلکہ ہر نفس کی شریعت الگ ہوتی ہے۔ اور لوگ اسی لحاظ سے حکم لگاتے ہیں جس لحاظ سے وہ سلوک میں بڑھتے ہیں اور جس لحاظ سے لوگوں کے اندر استعداد دیکھتے ہیں۔ اور ان میں سے کچھ وہ ہیں جو فنا اور بقا کے لئے مفید ہیں اور جب بھی کبھی صاحب ارشاد مجذوب ہو جاتا ہے اور اس کے اندر عنایت کی روح پھونک دی جاتی ہے تو اس کی صحبت اور توجہ لوگوں کے اندر جذب کا مادہ پیدا ہونے کا فائدہ دیتی ہے۔ پھر جب اس سے عنایت خارج ہو جاتی ہے، اس کا جذب والا طریقہ باقی نہیں رہتا۔ وہ زائد ہو جاتا ہے، خواہ اشغال کے نسیان کی وجہ سے یا صاحب جذب کی معرفت کی وجہ سے۔ اور جہاں تک جذب کی روح کے کھینچ لینے کا سوال ہے، تصرف سلوک باقی رہتا ہے جو احسان کے لئے مفید ہوتا ہے نہ کہ فنا و بقا کے لئے۔

اور قادریہ، نقشبندیہ اور چشتیہ طریقوں کی فہم کی علیحدہ خاصیت ہے۔ قادریہ، اویسیہ اور روحانیہ سے قریب ہے، اگرچہ تعلیم شیخ ظاہر سے ہو اور شیوخ سے اس کا قدیم رابطہ ہو اور مشائخ کی توجہ خاص طالب کی طرف ہو کسی اور کی طرف نہ ہو۔ اور وہ اس لئے ہے کہ شیخ عبدالقادر کے عالم میں چلنے کے لئے بہت سے شعبے ہیں اور وہ یہ ہے کہ جب ان کی وفات ہوئی تو وہ ملاء

اعلیٰ کی ہیئت میں ہو گئے تھے اور ان کے اندر سارے عالم میں چلنے پھرنے والا وجود نقش ہو گیا تھا۔ اس وجہ سے ان کے طریقہ میں روح حاصل ہو گئی۔

طریقۂ نقشبندیہ بہیمیت کو ضبط کرنے اور یادداشت کے ذریعہ اس کو توڑنے میں بہت زیادہ قوی ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ شیخ بہاء الدین سرزمین ترک میں احسان کے مجدد مقرر کئے گئے۔ اور وہ لوگ بہیمی قوت والے تھے اور شیخ مجذوب تھے۔ ان کے ملکوتی اسرار نے نور الٰہیہ و تدلیہ (قرب) کو قبول کر لیا تھا۔ چنانچہ ان کی نسبت اور تربیت سے ان لوگوں کے لئے طریقۂ مفیدہ، بہت زیادہ فائدہ والا پیدا ہوا جو اصحاب اخلاق سلیمہ یا اہل محبت وعشق میں سے تھے۔

چشتیہ میں روح قبول پھونکی گئی، چنانچہ چشتیوں میں سے جس کو بھی مقرر کیا گیا اس کو قبولیت عظیمہ عطا کی گئی۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس طریقہ والے اکثر سرزمین ہند میں پائے گئے۔ اور اہل ہندوستان میں ان کے علاوہ کسی میں بھی احسان کی طرف داعیہ نہیں تھا۔

جہاں تک اس وصی کا تعلق ہے تو اس نے اپنے رب سے عہد و پیمان لیا اور اس پر بہت اصرار کیا کہ اس کے طریقہ میں چشتیہ کی طرح قبولیت کی روح پھونک دی جائے، جب وہ عنایت کا مستقر تھا۔ اور یہ کہ اس کی روح کے لئے ترقی کی طرف گامزن ہونا مقدر کیا جائے یہاں تک کہ اس کا طریقہ روحانی اویسی طریقہ ہو جائے۔ اور اس امر کی تکمیل خود اس کے بعد ہو گی جیسا کہ شیخ عبدالقادر کے بعد ہوا۔ اور حق کی فہم یہ ہے کہ عنایت الٰہیہ اس بات کا تقاضہ کرتی ہے کہ لسان جلی اشاعت حدیث کی طرف مائل ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ بدعات والے مذاہب کی جڑ کاٹ دیتا ہے خواہ کچھ مدت کے بعد ہی ہو۔ اور لسان خفی کسب احسان کی طرف مائل ہوتی ہے۔ اور احسان کے تین درجے ہوتے ہیں۔

پہلا درجہ ان لوگوں کے لئے ہوتا ہے جو کسب معاش میں مشغول رہتے ہیں جیسے عسکریہ (فوجی) اور طالب علم اور صنعت وحرفت وغیرہ کے شعبوں سے تعلق رکھنے والے، اور وہ اذکار لسانی سے کام لیتے ہیں جیسے سبحان اللہ و بحمدہ ولا الہ الا اللہ اور صبح و شام اور سونے کے وقت کی مناسبت سے دعائیں اور تہجد میں سورۃ یٰسین کے التزام اور اس کے بعد دعا جو سورۂ ملک کے قریب ہو اور اس کے بعد ایک ساعت ذکر اور یہ سب کچھ فجر سے پہلے پہلے اور اس سے متصل ہو۔ اور یہ کہ وتر کو رات کے آخری حصہ تک کے لئے موخر کرے۔ پھر

اس کی پانچ، سات، نو یا گیارہ رکعتیں پڑھے پھر طلوع فجر تک اللہ کا ذکر کرے اور اس وقت صلوٰۃ اشراق وضحیٰ (چاشت) پڑھے۔ اور نماز زوال وقت میں پڑھے اور وجدان کے قریب تر یہ ہے کہ ظہر اور عصر کو ایک مجلس میں ہی پڑھ لے اور اس دوران درس اور اس جیسے کاموں میں مشغول رہے اور طریقہ سنت کی طرف دعوت دینے والے سے معاہدہ کرے کہ ہر ہفتہ دو دن لوگوں کو قرآن وسنت کی یاد دلائے اور عصر کے بعد زردی پھیلنے سے پہلے کچھ احادیث کا مطالعہ کرے۔ اور یہ چیز اس اشتغال والوں اور ان جیسے لوگوں کی وجہ سے کبھی ترک نہ کرے۔

دوسرا ان لوگوں کے لئے ہے جو طریق حق کے سلوک میں رغبت رکھتے ہیں۔ ان میں سے جن کو فرصت ہو اور اس کے لئے تجرد ہو اور وہ ذکر بالجہر، کثرت سے روزے، شب بیداری اور اعتکاف ان لوگوں کے لئے جن کی جبلت قوی ہو، اور ذکر خفی اور حق کی طرف کثرت توجہ سے ان لوگوں کے لئے جن کی جبلت ضعیف ہو۔ اور معاملہ ان دونوں کے درمیان مرکب ہوتا ہے جس کا معاملہ بین بین ہوتا ہے۔ اور سنت کی طرف دعوت دینے والے سے معاہدہ کرے ہر دن رات میں ایک بار لوگوں کی طرف توجہ کرے اور قوت بہیمیہ کی طرف ایسی ہمت سے توجہ کرے کہ اس کو توڑ ڈالے اور اس سلسلہ میں جو مناسب سمجھے، ان سے گفتگو کرے۔ حتیٰ کہ جب یادداشت حاصل ہو جائے اور ظاہری احوال توکل، تسلیم و رضا اور وجد کا غلبہ حاصل ہو جائے اور اس عمل کو اس وقت تک نہ چھوڑے جب تک اس کی عادت نہ ہو جائے اور مراد حاصل نہ ہو جائے۔

تیسرا طریقہ ان لوگوں کے لئے جن کو فنا و بقا کے حصول میں رغبت ہو۔ وہ توحید محبت پھر توحید افعال پھر توحید صفات پھر توحید ذات پھر یادداشت پھر اس کی پابندی کی طرف ہدایت پائے۔ یہاں تک کہ اس کا نفس اس کے رنگ میں رنگ جائے۔

۳۵- تفہیم:

فرد اور قطب

حامل عنایت فرد اور حامل عنایت قطب میں بہت بڑا فرق ہے۔ فرد وقت کا مشتاق ہوتا ہے اور ہدایت پہنچانا اس کے کمالات میں سے ایک شے ہوتا ہے۔ اس کا نفس اس کی

گہرائی میں غوطے نہیں لگاتا، نہ ہی مضمحل ہوتا ہے۔ اور قطب مضمحل ہو جاتا ہے اور ہدایت و ارشاد کے عمل میں فنا ہو جاتا ہے۔ اسی لئے قطب سے اس کے فنا و بقا کا رنگ ظاہر ہوتا ہے۔ جب کہ فرد سے صرف اتنا ہی ظاہر ہوتا ہے جس کا جود و کرم کے مقتضا سے زمانہ کو حکم دیا جاتا ہے۔ جیسے ہمارے اس زمانہ میں احسان۔ اور بسا اوقات یہ قطب، ارشاد کے معاملہ میں اس نکتہ کی وجہ سے فرد سے زیادہ قوی ہوتا ہے۔

۳۶- تفہیم:

علم اصول دعا

اللہ تعالیٰ نے مجھ پر شیخ ابوالحسن شاذلی اور شیخ ابوالعباس لیونی اور ان کے پیروکاروں کی دعا کے اصول کے بھید ظاہر کردیے۔ اور میرے دل میں یہ بات ڈالی کہ جس نے ان اصولوں کا احاطہ کرلیا اس نے ان کی تمام دعاؤں اور اہم امور کا احاطہ کرلیا اور اس کے اوپر نکلنے والے فروع کی معرفت اور استنباط سے نظر آنے والے امور کے علاوہ کچھ باقی نہیں رہا۔ اور اللہ نے مجھ پر بعض عجیب وغریب علوم جیسے جفر، رمل اور فال کے راز بھی ظاہر کردئے اور میں یہاں جو کچھ ممکن ہے بیان کرتا ہوں۔

معلوم ہونا چاہئے کہ نبی کریمؐ کی بعثت سے قبل ایک طویل مدت تک یونان اور بابل کے حکما، سحر اور طلسمات کے علوم میں مشغول رہے تھے۔ اور ان سے متعلق ان کے پاس قاعدے اور ضابطے تھے جن کا انہوں نے اپنی کتابوں میں ذکر کیا ہے۔ ان کا مرجع کواکب کے خواص اور ان کی تاثیرات اور جو کچھ ہر کوکب کے ساتھ خاص ہے اور جس کی حکایت بیان کی جاتی ہے اور جو جو ہر و عرض کے معنی میں اس کے موافق ہے، ان سب کی معرفت سے ہے۔

پھر موتیوں، طلسمات اور انگوٹھی وغیرہ میں کواکب کی قوتوں کے ودیعت کئے جانے کی معرفت جس کا تعلق اس جوہر سے ہوتا ہے جو مطلوبہ کوکب کے ساتھ مخصوص ہوتا ہے، اور اس وقت کی معرفت جس میں اس سے متعلق مخصوص سعادت ونحوست غالب ہوتی ہے، اور وہ صورت وہیئت جو کوکب کی قوت کی وجہ کو ان اجسام کی طرف مائل کرتی ہے کہ علماء کے ساتھ مخصوص ہیئت مشتری سے مناسبت رکھتی ہے اور سفاک ترکوں سے تعلق رکھنے والی ہیئت مریخ

سے مناسبت رکھتی ہے وعلی ہذا القیاس۔ اوران کواکب سے استمداد کی طرف نفس کی توجہ سے اس میں ان کی قوت کا گنتی کی چند راتوں میں احوال عالم معلوم کرنے کے لئے ستاروں کو ہر کوکب کے لئے مخصوص دعا اوراس کی ثنا اور ندا کے ساتھ دیکھنا۔

پھر ایک اندازہ کے مطابق کچھ اشیا کے ذبح، اور روزوں اور دعا اور ذی روح کے ترک اور فرشتوں کے نزدیک ناپسندیدہ اشیا کے ترک وغیرہ کے ذریعہ کواکب کی روحانیت کی تسخیر کی معرفت۔ اوران تمام اعمال کی اصل یہ ہے کہ اس دورہ کی ابتدا میں وہ حوادث تھے جو خود کواکب کی قوتوں سے صادر ہوتے ہیں۔ پھر طبیعت کلیہ مدبرہ نے نفوس انسانی میں سے مستعد پائے جانے والے مجموعہ کلیت کے لئے ان علوم کا فیضان کیا جو اس اصل سے جاری ہوتا ہے۔

پھر جب دائرہ نصف ہو گیا تو دائرۂ قدس کے اردگرد کچھ ملائکہ ظاہر ہوئے جو بمنزلۂ طلسمات کواکب قوتوں میں ودیعت رکھے گئے ہیں بلکہ اثر کے لحاظ سے ان سے بھی زیادہ قوی ہیں۔ اور زمین سے وہ نفوس اوپر کو چڑھے جو ملائکہ سے لاحق ہو گئے حتی کہ فضا ان کے انوار سے بھر گئی۔ تب شخص اکبر کے قلب میں ودیعت کی گئی تدبیر نے ایک دوسری صورت اختیار کر لی جو پہلے والی سے مختلف تھی۔ تب اللہ کے نور نے اوراس کی اس تجلی نے جو وہاں قائم تھی۔ ان روحانیات کو فرشتوں اوران سے ملنے والی ارواح سے مسخر کر لیا اوران روحانیات نے ضعیف روحانیات کو مسخر کیا جو روئے زمین پر پھیلی ہوئی تھیں۔ اور یہ، وہ لشکر ہیں جو پرندوں اور درندوں کے بمنزلہ صفات جمع شدہ لشکر ہیں۔ جب بھی جانب اعلی سے کسی فعل کا الہام ہوتا ہے ان میں سے فوجیں امر مطلوب کی طرف متوجہ ہو جاتی ہیں جب کہ وہ یہ نہیں جانتیں کہ ان کے سینوں میں یہ شوق کیوں بھڑکا ہے۔ اور انہیں کہاں سے الہام ہوا ہے۔ چنانچہ اللہ کے جود و کرم اوراس کی حکمت میں واجب قرار پایا کہ انسانوں میں سے تیار نفوس پر ان علوم کا فیضان کیا جائے جو اس اصل سے جاری ہوتے ہیں جیسے شہد سے بھرے ہوئے برتن سے شہد کی حلاوت اور رطوبت ٹپکتی ہے تب مکھیوں اور چیونٹیوں کو الہام کیا جاتا ہے کہ برتن کا طواف کریں اور ٹپکے ہوئے شہد میں سے جو ان کے لائق ہوں پئیں۔ بالکل اسی طرح انسانوں کے نفوس کو الہام کیا جاتا ہے کہ علم کی اس نوع کی طرف متوجہ ہوں۔ اور وہ نہ اس کی اصل کا احاطہ کرتے ہیں اور نہ ہی تدبیر کو اس کی ابتدا والی صورت سے کسی دوسری صورت میں تبدیل کرنا جانتے ہیں۔ اوراس

لئے ابراہیم علیہ السلام کے بعد مقرب لوگ، ملائکہ اور ان کے تصرف اور زمین میں ان کے پھیلنے کو ثابت کرتے رہے ہیں اور دائرۂ قدس کی طرف توجہ کرتے رہے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے شیخ ابوالحسن الشاذلی اور شیخ ابوالعباس البونی اور ان کے گروہوں پر ان دائروں کا بھید کھول دیا جن کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔ جس کا حاصل طلسمات اوائل کی طرف نظر اور اس کو بعد کی تبدیلی اور دوسری تجلی کی مناسبت سے تبدیل کرنا ہے۔ تب انہوں نے ان میں سے کچھ چیزوں کو چھوڑ دیا اور کچھ چیزوں کو باقی رکھا اور کچھ چیزوں کو بدل دیا۔ انہوں نے جن چیزوں کو چھوڑا وہ قربانیاں روزوں، دعا اور انسان اور حیوانوں اور انگوٹھی کی صورتیں اور وہ تمام اشیاو امور ہیں جن سے شریعت نے روکا ہے ان کے ذریعہ نفس کواکب کی طرف توجہ ہے۔ اور انہوں نے گوشت نہ کھانا اور ناپسندیدہ چیزوں کو باقی رکھا۔ اس لئے کہ انہیں اس میں نہی صریح نظر نہیں آئی۔ اور انہوں نے احوال معلوم کرنے کے لئے ستاروں کو دیکھنے وغیرہ کو دھونیوں اور مناسبت رکھنے والے اسماء و آیات کی تلاوت سے بدل دیا۔ اس طرح ان کا پہلا اصول اور ناموس الٰہیہ و معارف اولیا سے نسبت سے زیادہ مشابہت رکھنے والا دائرہ قدس کے وسط میں قائم نور کی طرف توجہ ہے جو انسانی ضرورتوں میں ان کے مبعوث کرنے کی تدبیر کے لئے حفاظت کرنے والے ملائکہ پر غالب ہے۔ اور یہ توجہ ان اعمال میں ہوتی ہے جو نفس کو نسبت اویسیہ و نسبت سکینہ اور طہارت کا فائدہ دیتے ہیں۔ اور ان لوگوں کو حکم دیا گیا کہ جب اس نور کی طرف توجہ مکمل ہو جاتی ہے اور اس سے نفس متاثر ہو جاتا ہے اور اس سے ہیئت نورانیہ پائی جاتی ہے تو اس کے قلب میں حاجت مطلوبہ کا خیال آتا ہے اور نفس اس کی طرف قصد سے بھر جاتا ہے یہاں تک کہ وہ روح کے مسام سے دائرہ قدس کی طرف ترقی کر جاتی ہے اور اس دائرہ میں بمنزلہ دخول خواطر کے داخل ہو جاتی ہے جو اس کے نفس میں مبعوث ہوتا ہے۔ تب اس کی حرکت اس نور کی حرکت ہوتی ہے پھر اس تحریک سے زیادہ تر وہ معراج حاصل ہوتی ہے جس سے بعض ملائکہ علویہ متاثر ہوتے ہیں پھر ملائکہ سفلیہ۔ اور یہ ان کے اعمال کے اصول میں سے ایک اصل ہے۔ اس پر ایک عظیم جمگھٹے کا استخراج کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ انہوں نے بلندیاں مقرر کرنے اور دو معنی کے ڈھانچوں اور سایوں میں جدوجہد کی ہے۔ ایک دائرہ قدس کی طرف توجہ اور دوسرے نمازوں، اعتکافوں، ریاضتوں اور اسماء و آیات کی تلاوت سے دائرہ

قدس کی قوت کا حاجت مطلوبہ کی طرف مائل کرنا۔ اس موقع پر دو نکتوں پر تنبیہ ضروری ہے:

(۱) یہ سمجھنا مناسب نہیں ہے کہ یہ اعمال نبی کریمؐ اور آپ کے صحابہ سے منقول ہیں جیسا کہ عوام سمجھتے ہیں۔ البتہ اللہ تعالیٰ نے ان کے قلوب میں ایک ملکہ ودیعت فرمایا اور ان کے دلوں میں فراست پیدا فرمائی۔ اس سے جو چاہتے ہیں، استنباط کر لیتے ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ وہ اس طرح دیکھتے ہیں جیسے طبیب مرض، مریض اور دوا اور اس کی قوت کو دیکھتا ہے۔ پھر اس مقدار کا تخمینہ لگاتا ہے جو اس کے لے کافی ہو۔ اسی طرح یہ لوگ، لوگوں کے نفوس کو اور دائرہ قدس کی طرف جو توجہ ان کے لئے مفید ہوتی ہے، دیکھتے ہیں۔ اور وہ قرآن میں تدبر غور و فکر کرتے ہیں اور ہر آیت پر ٹھہرتے ہیں اور ان معانی کو سمجھتے ہیں جن پر کلام کا مضمون اور اشارے اللہ تعالیٰ کی صفات اور اس کے افعال پر دلالت کرتے ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا قول **ھو الذی خلق لکم مافی الارض** (وہی ہے جس نے تمہارے لئے وہ سب کچھ پیدا کیا جو زمین میں ہے) اللہ تعالیٰ کے زمین اور اس میں موجود باغوں اور کھیتی کی تسخیر کی صفت سے متصف ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ چنانچہ یہ باغوں اور کھیتی کی تیاری کی طرف دائرہ قدس کی قوت کی توجیہ کے لئے ایک بہترین آلہ ہے۔

پھر تلاوت، پانی سے مٹانے، اس کو چھڑکنے، زمین کے نواح میں کتاب کے لئے دفن ٹھیکروں پر اس کو پڑھنے اور ٹھیکروں کو زمین کے اطراف میں پھینکنے وغیرہ کے لحاظ سے اس کے استعمال کی کیفیت کا اندازہ لگاتے ہیں۔ اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد **یھب لمن یشاء اناثا** (الایۃ) اللہ تعالیٰ کے اولاد عطا کرنے کی صفت سے متصف ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ کہ وہ تناسلی قوتوں کی اصلاح کی طرف دائرہ کی قوت کی توجہ کے لئے بہترین آلہ ہے۔ وہ اسماء حسنیٰ میں سے ہر اسم پر رکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی صفات سے اس کے مدلول کو پہچانتے ہیں اور اس کو دائرہ کی قوت کی اس طرح توجیہ کے لئے جو اس کے مناسب ہو بہترین ذریعہ کے طور پر اختیار کرتے ہیں۔ اور سلف سے منقول دعاؤں پر ٹھہرتے ہیں جو صدیوں تک ان کو پھیلانے اور ان سے تقرب حاصل کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ اس طرح ان کو اس قوت کی توجہ کے لئے ذریعہ بناتے ہیں۔ ان کا زیادہ تر اہتمام آیات اور اسماء اور ادعیہ ماثورہ کا ہوتا ہے، نہ کہ گھڑے ہوئے کلمات کا۔ اس لئے کہ ملائکہ نے اپنے قلوب کی تھیلیوں کو ان اذکار کے

انوار سے اولیا اور انسان کے ان سے متعلق ہونے کے بعد قبولیت دعا کا درجہ حاصل کرنے اور اس کے قبلہ نے اور اس کی طرف جھکنے نے اس کو طویل مدت یعنی صدیوں تک مستحسن قرار دیا۔ چنانچہ لامحالہ یہ دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ مفید اور زیادہ حق ہے۔ لیکن دعاؤں کی اس قسم کی اصل شریعت میں ہے اور شریعت نے بعض کا ذکر کیا ہے۔ اور اس قبیل سے ذوالنون (یونس) علیہ السلام کی دعاؤں میں ترغیب اور اسم اللہ الاعظم کی تعلیم ہے۔ واللہ اعلم۔

(۲) جو شخص ان پر عمل کرنا چاہتا ہو اس کے لئے یہ جاننا مناسب ہے کہ اللہ تعالیٰ سمیع و بصیر ہے، وہ ہر چیز کو سنتا اور دیکھتا ہے، بغیر اس کے کہ سنتا اس دائرہ قدس کے ساتھ مخصوص ہے جس کا نتیجہ قبولیت اس وقت تک نہیں نکلتا جب تک کہ نفس اس خیر میں اپنی پوری ہمت کے ساتھ نہیں اترتا، اور جب تک شوق اپنی مراد کی خاطر جوش نہیں مارتا اور اس کی مراد نفس کے مسام سے نفوذ نہ کر جائے اور اس کی ہمت اس دائرہ کی طرف نہ ہو۔ اور اس امر میں بہت فرق ہے کہ بہت سے لوگوں کو یہ امور ایک مہینہ سے پہلے حاصل نہیں ہوتے جب کہ بہت سے لوگوں کو یہ سارے ایک ساعت میں حاصل ہو جاتے ہیں۔ البتہ استغراق اور پھر دائرہ سے اپنے نفس کے لئے انفعال پھر اس کی طرف مراد کے لئے نفوذ پھر ملائکہ کے لئے تسخیر اور ان کے شوق کے لئے مبعوث ہوتا ہے۔ پھر اس کے بعد امر ناسوت (مادی دنیا) کی طرف اترتا ہے۔ اس لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ مایوس ہو جائے اور تنگ دلی ہو جائے اور کہنے لگے میں نے دعا کی، میں نے دعا کی لیکن میری دعا قبول نہیں ہوئی۔

اور ان مشائخ کے لئے دوسری اصل یہ ہے کہ انہوں نے ایسے اوقات اختیار کئے جن میں ان کواکب کی روحانیت غالب آ جاتی ہے جن کی طرف امر مطلوب منسوب ہوتا ہے۔ اور انہوں نے چاہا کہ ان کی قوتوں کو ایک چیز میں رکھ دیں تا کہ یہ شے اٹھا لے۔ اس لئے انہوں نے صورتوں کی تصویریں ایک طرف ڈال دیں اور ان کی جگہ ان کواکب کے لئے مخصوص جوہر پر اسماء اور آیات لکھ دیں اور احوال عالم معلوم کرنے کے لئے ستاروں کو دیکھنا چھوڑ دیا اور ان کی جگہ ورق وغیرہ پر تلاوت کا عمل اختیار کیا اور اس کے ذریعہ توجہ سے ایک شے کو دائرہ قدس کی طرف اس بھید کے لئے لاحق کر دیا جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔

تیسری اصل یہ ہے کہ انہوں نے اپنے سے پہلے کے مشائخ سے وہ دعائیں روایت

کیں جن کا ان کو اس وقت الہام ہوا تھا جب ان کو کسی امر کا وہم ہوا تو اللہ نے ان کی برکت سے ان کی پریشانی کو دور کر دیا۔ اور اسی طرح وہ دعائیں روایت کیں جو قوم نے خوابوں میں دیکھیں، قوم امراض میں مبتلا ہوئی ان کو حاجات درپیش ہوئیں تو خواب میں ان کے توسل سے کام لینے کا حکم دیا گیا اور اللہ نے ان دعاؤں کی برکت سے ان کی بیماریوں کو دور کر دیا اور حاجتیں پوری کر دیں۔ انہوں نے ان سب کو اپنے رسائل میں جمع کر دیا اور ان کا تجربہ کیا تو جیسا بیان کیا گیا، ویسا ہی پایا۔

چوتھی اصل یہ ہے کہ یونان اور مغرب کے حکما فن سیمیا (کیمیا) کے راز سے واقف ہوئے۔ انہوں نے اس کو اپنے معاملات میں استعمال کیا۔ سیمیا (کیمیا) کی تحقیق جس کا راز اللہ نے مجھ پر کھولا یہ ہے کہ ہیکلوں کے جواہر جیسے شکل، عدد، وضع، آوازوں کی تقطیع سے حاصل ہونے والے حروف اور نغمات کی ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح تالیف سے حاصل ہونے والا الحان کہ ہیئت تالیفیہ اپنے علاوہ سے اپنے خواص میں ممتاز ہو جائے اور اپنی قوت عاقلہ میں حرکت نفس سے حاصل ہونے والے خیالات وافکار خواہ اپنے آپ ہوں یا کسی آلہ کے ذریعہ پیش کئے جانے پر اللہ نے عطارد میں اس کے معنی کی تفصیل پیدا کی۔ اور ان سب کو ایک ہی امر جمع کرتا ہے اور وہ تمام جواہر کا ان کی ذات میں جھاگ ہے۔ اس طرح ان کے وجود کو ان کی ذات میں بھر دیتا ہے جس کے ذریعہ پیدا ہونے والی، پیدا ہوتی ہے، اس کے ساتھ قائم ہوتی ہے پھر جب یہ تخلیق مکمل ہو جاتی ہے اور ہر ایک دوسرے سے اپنے خواص اور آثار کے لحاظ سے جدا ہو جاتا ہے اور اس کی ذات مشخص وممتاز ہو جاتی ہے۔ یہ عطارد میں ودیعت کئے گئے معنی کی تفصیل ہے۔ اور ہم نشاۃ کی تکمیل کے معنی اور اس کی ذات کا تشخص ایک مثال کے ذریعہ بیان کرتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ شعر کی اصل معانی متنوع کے مقابلہ میں تقطیع شدہ آوازیں ہیں۔ چنانچہ جب تخلیق حرفی مکمل ہو جاتی ہے تو اس میں دوسرے طریقہ سے تصرف کرنا ممکن ہو جاتا ہے اور وہ عروض افاعیل وتفاعیل کے ساتھ تطبیق اور قافیہ کی پابندی ہے۔

پھر اس تصرف نے بیشمار جنسیں اور نوعیں پیدا کر دیں۔ شعر ایک وسیع تخلیق ہے۔ تقطیع شدہ آوازوں کا جھاگ ہے اور تقطیع (تحلیل عروض) شدہ آوازیں حلق، زبان، منہ کے تالو اور دونوں ہونٹوں کی ہیکلوں کا جھاگ ہیں کہ یہ اس وقت پائے جاتے ہیں جب تقطیع شدہ آواز

نکالی جاتی ہے۔اوراس کی ہیئتیں اس کے ساتھ قائم ہوتی ہیں تو یہ تخلیق جو اپنے میدانوں میں موجود ہوتی ہے، عطارد کے لشکروں میں سے ایک لشکر ہوتا ہے اور نفس اولی کے لئے تنزلات کلیہ جیسے کواکب کی ارواح، ملاء اعلیٰ اور پورا انسان، ان میں وہ سب کچھ ودیعت کیا جاتا ہے جو نفس اولی کی شرح اور اس کی تفصیل ہوتی ہے لیکن اس تنزل کے رنگ میں بمنزلہ اس کے ہے کہ اگر تمہاری آنکھوں پر سبز رنگ کا شیشہ رکھ دیا جائے تو تمہیں ساری دنیا سبز نظر آئے گی اور اگر زرد شیشہ رکھ دیا جائے تو ساری دنیا زرد نظر آئے گی۔وعلی هذا القياس. اس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت سے عطارد کے لشکروں میں وہ سب کچھ ودیعت کر دیا جو نفس کلیہ کی تفصیل ہے۔جیسا کہ تمام تخلیقات کلیہ میں اللہ کی سنت ہے۔پھر ایک عدد وہ ہے جو سورج سے مناسبت رکھتا ہے، ایک چاند سے مناسبت رکھتا ہے، ایک عدد کواکب متحیرہ (چلنے پھرنے والے) اور ثوابت (ایک جگہ قائم رہنے والے) سے ان کی تفصیلات کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے۔اوران میں سے کچھ ایسے ہیں جو آدمی سے مناسبت رکھتے ہیں۔کچھ وحشی حیوانوں سے، کچھ مانوس پالتو حیوانوں سے اور کچھ ایسے ہیں جو بادشاہوں سے مناسبت رکھتے ہیں۔کچھ انسانوں سے اور کچھ تاجروں سے اور کچھ علماء سے اور کچھ موسیقی کاروں سے مناسبت رکھتے ہیں۔کچھ گرم مزاجوں اور کچھ سرد مزاجوں سے مناسبت رکھتے ہیں۔اور کچھ چوتھے دن آنے والے بخار سے اور کچھ صفراوی بخار سے مناسبت رکھتے ہیں۔کچھ درد اور ورم سے مناسبت رکھتے ہیں تو کچھ نشاط وسرور سے۔وعلی هذا القياس حروف، قیام وقعود اور لیٹنے اور جھکنے کی ہیئتوں وغیرہ سے۔

اور جہاں تک خیالات وافکار کا تعلق ہے تو ان کی بہت سی جنسیں اور انواع ہر نوع بلکہ دنیا میں ہر فرد کے مقابلہ میں ہیں جو ظاہر ہیں پوشیدہ نہیں ہیں۔اور یہ کہ عطارد کواکب ملائکہ کے سب سے زیادہ لشکر والا ہے اور وہ اس لئے ہے کہ اس میں قوت ہوائیہ ہے اور ہوا سے ملائکہ سفلیہ کی تکوین ہوتی ہے۔تو اللہ کی حکمت یہ ہے کہ ملائکہ پائے جائیں اور ان کے نفوس میں یہ الہام کیا جائے کہ وہ اعداد وحروف، وضع اور افکار وغیرہ کی خدمت کریں۔

اور زہرہ کے اکثر لشکروں کا کام اس خدمت کو انجام دینا ہے جو دائرہ قدس میں اللہ کی تجلی کے لئے مناسب ہے، نہ کہ حروف وغیرہ کی خدمت تو یہ خدمت حروف اور اعداد کی ہے۔

ان کو طبیعی جبلی الہام کیا جاتا ہے کہ دنیا میں اس کے آثار کی چال پر سعی کریں جس طرح مشتری کے لشکر دنیا میں صورت نوعیہ کے آثار کی چال میں سعی کرتے ہیں۔ بعض حکماء حروف، اعداد، اشکال اور ان کے خادم ملائکہ کے خواص کے بھیدوں پر مطلع ہوئے۔ انہوں نے سیمیا (کیمیا) کا استنباط کیا جو ان خواص کے واسطہ سے دنیا میں تصرف ہے۔ اور ان کے پاس وہ علوم باقی رہ گئے جن کے استخراج کا حق ادا کرنے کے بعد انہوں نے استخراج کیا تھا۔ اور وہ انسان کی وضع اور اس کے خیالات وغیرہ کے واسطہ سے دنیا میں تصرف ہے۔ اور نیک فالی وبدفالی کی وضع کے خواص کی معرفت سے پیدا ہوتی ہے۔

اور یہ کہ دنیا جب کسی حادثہ کے لئے تیار ہوئی اور وہ حادثہ عالم مثل میں قائم ہو گیا تو نفس کلیہ اور موکل ملائکہ نے حیوانوں کی حرکتوں میں شدت پیدا ہونے والی ہیئتوں اور وضعوں کے پیدا کرنے میں اس حادثہ کے لئے افاضہ کیا۔ پھر جب انسان ان مناسبتوں سے واقف ہوا تو اس نے واقعہ کے مطابق فیصلہ کیا۔ اور اسی طرح جب انسان کے سونے یا بیداری کی حالت میں ان خیالات کا اضافہ کیا جو اس حادثہ کے مشابہ وقائم ہیں تو انسان پر ان مناسبتوں کا بھید کھلا تب اس نے درست فیصلہ کیا۔ اس طرح فن اول علم فال ہے اور دوسرا عالم خواب وخیال۔

علم جفر کا مرکز عطارد ہے۔ اور اس لئے ہے کہ دنیا میں پائے جانے والے نظام کی عطارد کے خیال میں ایک صورت ہے اور جب انسان کسی قاعدہ کے بھید سے مطلع ہوتا ہے تو اس کے ذریعہ دنیا کے بعض حوادث سے ان کے وقوع سے قبل ہی مطلع ہو جاتا ہے۔ پھر ان قواعد میں سے کچھ ایسے ہیں جن کا حکم صرف اس مجلس میں ہوتا ہے کسی دوسری میں نہیں ہوتا۔ جیسے الہام ہوا کہ ہر کوئی جس کے نام میں حرف ح پایا جاتا ہے اس کا حال ایسا اور ایسا ہوتا ہے۔ اب جب تک وہ اس مجلس میں رہتا ہے۔ اس کے دل میں اس شخص کے علاوہ کچھ نہیں رہتا جس کا حال وہ ہوتا ہے۔ پھر جب وہ اس مجلس سے اٹھ جاتا ہے تو بسا اوقات اس کے دل میں اس شخص کا خیال آتا ہے جس کے نام میں ح ہوتا ہے جب کہ وہ ایسا نہیں ہوتا۔ اور ان میں سے وہ شخص جس کے حکم میں زمانے چلتے ہیں جیسے دو سو سال یا زیادہ پھر وہ ہو جاتا ہے۔ بالجملہ پھر شیخ ابوالحسن اور شیخ ابوالعباس وغیرہ آئے۔ اور ان پر وہ بھید کھل گئے جو ان سے پہلے حکما پر کھلے تھے۔ اور انہوں نے کچھ وہ باتیں کہیں جو انہوں نے کہیں تھیں۔ جب ان کو دیکھا کہ وہ پوری طرح

خلاف شرع نہیں ہیں اور دنیا میں اوضاع واحوال کے خواص سے باب تصرف میں وہ ہے جو کہا جاتا ہے کہ قولنج کا مریض جب سوتے ہوئے کتے کو جگاتا ہے اور اس کو اٹھا کر اس کی جگہ پیشاب کرتا ہے تو قولنج کتے کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور مریض اس مرض سے چھٹکارا پا جاتا ہے۔ اور جو یہ کہا جاتا ہے کہ ایسی اور ایسی ہیئت میں بیٹھنا فقر اور بربادی کو دعوت دیتا ہے۔

اور جاننا چاہیے کہ بعض مقربین ان خواص کی طرف بالکل توجہ نہیں دیتے جب کہ دائرہ قدس کے وسط میں قائم نور کی طرف پوری توجہ دیتے ہیں اور وہاں سے اپنا مقصود طلب کرتے ہیں۔ جب ان کی طلب ان کے نفوس کے مسامات سے دائرہ قدس کی طرف ترقی کرتی ہے اور ان کا وہ مطلوب بحر نور سے ایک جانب کو حرکت کرتا ہے، تب اس حرکت سے ملائکہ کی افواج متاثر ہوتی ہیں اور ان کے قلوب میں اس فعل کی طرف شوق پیدا ہوتا ہے جو مطلوب سے مناسبت رکھتا ہے۔ اور انسانوں اور حیوانات کے نفوس ان کے شوق کے لئے متاثر ہوتے ہیں۔ اور بسا اوقات دائرہ قدس سے عالم ارض کی طرف ایسا امر نازل ہوتا ہے جو اس کے افراد میں طبیعت وفطرت کے حکم سے مشابہ ہوتا ہے۔ اور اسباب سفلی سے وہ متعلق ہوتا ہے جو نظام ارض کے مطابق مراد کی طرف پہنچاتا ہے اور اس کا تعلق قضاء نازل کے سبب سے ہوتا ہے۔ پھر کبھی وہ سبب اعداد وحروف اور اوضاع وغیرہ میں سے کوئی چیز ہوتا ہے اور وہ یہ نہیں جانتا کہ حادثہ کہاں سے پیش آیا اور اس کا سبب کیا تھا اور اس کی طرف بالکل متوجہ نہیں ہوتا۔ اس وقت اس کے تصرف کا نام فرق رکھا جاتا ہے لیکن اہل کیمیا کے تصرف کو فرق نہیں بلکہ دائمی عادت کہا جاتا ہے۔ اس پر غور کرو۔

اصل خامس یہ ہے کہ ان لوگوں کو بعض ایسی ساعات کے بارے میں اطلاعات حاصل ہوئیں جن میں روحانیت عالم ارض میں پھیلتی ہے۔ جیسے لیلۃ البراءۃ اور لیلۃ القدر خواہ یہ صاحب شریعت علیہ الصلوۃ والتسلیمات کے اشارہ سے ہو یا اس ساعت میں انوار ومکاشفات کے دیکھنے سے۔ تو انہوں نے اپنے لوگوں کو ان انوار سے اثر لینے اور اپنے نفوس میں مضبوطی سے متمکن کرنے اور پھر اپنے نفوس کی توجہ کے واسطہ سے مقصود کی طرف ان کی توجہات کے لئے کہا جو متاثر انوار سے لبریز ہیں۔ ان میں وہ امور شامل ہیں جو ان کے رنگ میں رنگے ہوتے ہیں۔ اس طرح یہ ایک بڑی اصل ہے، جس کی بنیاد پر انہوں نے تمام

نیک دعاؤں کا استخراج کیا اور یوم جمعہ، لیلۃ القدر، لیلۃ البراءۃ، وقت صلوۃ فجر، نصف لیل اور بخشش والی راتوں وغیرہ کی امید بھری ساعتوں کو اختیار کیا کہ یہ وہ ساعتیں ہیں جن کی فضیلتوں کی طرف شریعت نے اشارے کیے ہیں اور وجدان نے ان کی عظمت کی شہادت دی ہے۔

اور انہوں نے طہارتوں، صدقات، صلوات اور بڑی باعظمت مسجدوں میں جانے اور مسلمانوں کے اجتماعات میں اہل وعیال کی ضروریات سے فراغت اور حال کے تحقق کے ساتھ تبرک کے حصول میں لگ کر اپنے نفوس میں انوار کو متمکن کیا اور انہوں نے مراد کی طرف توجہ دلانے کے سلسلہ میں اللہ کا ذکر ایسے نام کے ساتھ اختیار کیا جو حاجت مطلوبہ کے لئے مناسب ہو۔ اسی طرح اللہ کے ناموں اور اس کی مناسبت رکھنے والی آیتوں کو اچھے کاغذ پر اچھی روشنائی کے ذریعہ اچھے طریقہ سے لکھنے یا پینے اور کھانے کی کچھ ایسی چیزوں پر جو حاجت مطلوبہ کے لئے مناسبت رکھتی ہیں، تلاوت کرنے یا دھاگوں پر پھونک مارنے اور ہر پھونک مارتے وقت ان میں گرہ لگانے وغیرہ کے طریقے اختیار کیے۔ اور لوگوں کے اپنے پسندیدہ طریقوں کے سلسلہ میں بہت سے مذاہب ہیں۔

چھٹی اصل یہ ہے کہ اکثر فرشتے اس وقت نفوس انسانی سے متاثر ہوتے ہیں جب وہ طہارتوں اور عبادتوں میں لگ کر مسلسل بلند ہمتی اور قوی عزائم کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ان میں سب سے پہلی انسان کی وہ جبلت ہے جو مسلسل ہمت، پختہ عزم اور اپنے اردگرد کے تمام فرشتوں وغیرہ کی تسخیر پر مبنی ہے۔ اور دوسرے ان اشیا کا حاصل کرنا جو اس جبلت کو تقویت پہنچائیں اور اس کو انوار وبرکات سے ڈھانپ دیں۔ اور تیسرے فرشتوں کے نفوس میں قوی مار والی تاثیر۔ یہ تاثیر قسم سے پیدا ہوتی ہے، جب کہ بیشتر فرشتے یہ نہیں سمجھتے کہ قسم میں کونسا لفظ استعمال کیا گیا اور کس زبان میں قسم کھائی گئی کہ وہ صرف تاکید، توجہ وتوبیخ اور مبالغہ کو سمجھتے ہیں۔

اور قسم ایک ایسی شئے سے ہوتی ہے کہ صاحب دعا اپنے نفس میں اس سے بڑی کوئی چیز نہیں پاتا، نہ ہی اس سے زیادہ پروقار یا زیادہ فضیلت والی کوئی شے پاتا ہے۔ پھر جب اس شے کے نام سے قسم کھاتا ہے اور قسموں میں اس طرح مبالغہ کرتا ہے کہ اس وقت اس کا پورا نفس اچھی طرح مجتمع ہو جاتا ہے اور عزیمت میں زیادہ قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور قسم اس کے نفس میں انتہا کو پہنچ جاتی ہے۔ پھر فرشتے قسم دلاتے ہیں اور اس کا پابند بناتے ہیں کہ وہ اس امر پر قادر

نہیں ہوتے کہ دعا کرنے والے کو یوں ہی بے سہارا چھوڑ دیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے اسماء صفات، آیات اور شعائرِ حق میں انوار سے قسم کھانے میں وہ سب سے زیادہ پرہیزگار اور سب سے زیادہ عالم ہو جاتا ہے۔

اور کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو کواکب اور اولیا و انبیا کی ارواح کی قسم کھاتے ہیں۔ اور یہ وہ اصل کبیر ہے جس کی بنیاد پر انہوں نے دعاؤں میں کوئی ایک اچھا صالح جملہ نکالا اور وہ اس کے امر سے ناواقف و بے خبر محض اس کی تلاوت کرتے ہیں جس کی وجہ سے کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اس لئے مناسب یہی ہے کہ قسم کے اصل مفہوم کا قصد کرے اور اس کی پابندی کرے اور یوں کہے کہ اے ارواح! اس اور اس معاملہ میں ایسا اور ایسا کرو۔ اور یہ یقین رکھے کہ وہ اس کی دعا اور اس کی قسم کے خلاف نہیں کریں گی۔ یہ عزیمت کا بھید ہے اور اہل جاہلیت وادی کے سردار جن پر قسم کھاتے تھے تو شارع علیہ السلام نے ان کو اس سے روک دیا اور اس کی جگہ ان کو اعتصام باللہ کے معاملہ میں بلیغ الفاظ کے ساتھ اس سے استعاذہ (پناہ طلب کرنے) کا طریقہ بتایا۔ واللہ اعلم۔

ساتویں اصل یہ ہے کہ انہوں نے ان اصولوں کو ایک دوسرے سے خلط ملط کرنے کا ارادہ کر لیا تاکہ دعا میں اثر شدید، قوت زیادہ اور نفوس میں فائدہ عام ہو جائے کہ بعض نفوس اصل حق کے پورا کرنے پر قادر نہیں ہوتے بلکہ دوسرے کے حق کے ایفا پر قادر ہوتے ہیں۔ پس اگر دعا دونوں مشرب سے لینے والی ہے تو دونوں قسمیں تمام فائدے اٹھاتی ہیں۔ تب انہوں نے اسما کے لکھنے، آیات کی شکلیں بنانے اور اعداد کو خلط ملط کر دیا۔ اور آیتوں و اسماء کی تلاوت اور ان اعداد کے استعمال کا حکم دیا جو حروف اور اعداد کا حساب دیتے ہیں۔ اور بعض خواص طبیعیہ کو بعض خواص اسمائیہ کے ساتھ خلط ملط کر دیا۔ جیسا کہ پینے کی چیزوں اور دواؤں پر اسماء اور آیات کی تلاوت کا اجمالی حکم دیا گیا۔ اور خواص اسمائیہ کو خواص اوضاع کے ساتھ خلط ملط کر دیا جیسے الفت اور محبت پیدا کرنے والے اعمال میں حکم دیا گیا کہ اس باقی بچی ہوئی شمع پر عمل کیا جائے جو یوم زفاف کو زوجین کے درمیان جلائی گئی تھی۔ اور بغض و تفرقہ پیدا کرنے والے اعمال میں اس مٹی پر عمل کیا جائے جو منہدم شدہ قبروں اور ویران گھروں سے لی جائے۔ پس اب جب کہ آپ ان ساتوں اصولوں کو سمجھ گئے اور ایک نظیر کو دوسری پر قیاس کر لیا اور عموم

کے حکم کو ان کے جزئیات پر منطبق کرلیا تو مجھے امید ہے کہ ان اعمال میں سے کسی بھید کو سمجھنے میں آپ کو کوئی توقف نہیں ہوگا، جن کا ذکر ابوالحسن شاذلی اور ابوالعباس البونی اور ان کے ساتھیوں نے کیا ہے۔ واللہ المستعان وعلیہ التکلان۔

اور یہ بھی جان لو کہ میرے اور فن سیمیا (کیمیا) کے درمیان پڑا ہوا ایک حجاب حائل ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ میں نے اس کے اصولوں کا احاطہ کرلیا اور میں مبدأ کی جہت سے جامعیت کے ساتھ اس پر غالب آ گیا۔ اور میں نے اس کے فروع کا احاطہ نہیں کیا اور وجود ناسوتی کی جانب سے اور تفصیل کی جہت سے اس کے آثار کے تواضع کی تحقیق نہیں کی۔ چنانچہ جو نقطہ مجھ سے عطاود کے مقابلہ میں آتا ہے، اس نے ڈھانپ لیا اور اس سے اس کی اس چمک کو ڈھانپ لیا جو ان فنون کی طرف لے جاتی ہے۔

اور جو شخص تجلی الٰہی کی طرف توجہ کے واسطہ سے وجود میں تصرف کرتا ہے، اس کی مثال اس شخص جیسی ہے جس نے بادشاہ سے کسی چیز کے بارے میں سوال کیا اور وہ نہ تو اس کے خزانہ کو پہچانتا ہے نہ اس کے خازن کو اور نہ ہی اس کے خازن کی طرف بھیجے ہوئے قاصد کو۔ البتہ صرف اس بادشاہ کو پہچانتا ہے جو اس امر کا نگراں ہے، یہاں تک کہ جو اس کو دیا گیا اس تک پہنچا دیا گیا۔

اور جو شخص اسماء کی خدمت کی طرف توجہ کے واسطہ سے وجود میں تصرف کرتا ہے، اس کی مثال اس شخص جیسی ہے جو بادشاہ کے خازن کو پہچانتا ہے اور اس کے خزانہ کی بھی اس کو اطلاع ہے اور اس کے خازن کی طرف بھیجے گئے بادشاہ کے قاصد سے بھی خالص دوستی رکھتا ہے تاکہ بادشاہ کے وجود کے توسط سے ان امور کو انجام دے سکے۔ اور اس کا طرز عمل یہ ہے کہ اس کو محروم نہ کرے جس میں ان کی معرفت اور دوستی جمع ہوگئی۔ اس طرح ان دو آدمیوں میں کتنا بڑا فرق ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

اور جاننا چاہئے کہ ملائکہ اسماء کی دو طرح سے خدمت کرتے ہیں۔ ایک یہ کہ دعا کرنے والا اسم کی تلاوت کرتا ہے اور تلاوت کے ضمن میں اپنے بہت سے مبدا کی طرف اس طرح چڑھتا ہے کہ وہ جان بھی نہیں پاتا۔ تب اس کے نفس میں اس اسم سے مناسبت رکھنے والی روح الٰہی فیضان کرتی ہے۔ پھر کسی جدوجہد کی پرواہ نہیں کرتی یہاں تک کہ وہ روح ایک

امر مستقر یا اس کے نفس میں ایک شکل اختیار کرنے والی مثال ہو جاتی ہے اور اللہ کی سنت یہ ہے کہ ہر نفس یا ہر نوع میں ایک ملکہ کی شکل پیدا کی جاتی ہے یا اس کی کوشش کا نتیجہ پیدا کیا جاتا ہے، تب وہ اس کے ساتھ صرف وہی معاملہ کرتا ہے جو اس کے اندر پایا جاتا ہے، اور طبیعتوں اور نفوس پر الہام ہوتا ہے اور ایک حالت طاری ہوتی ہے تاکہ خارج میں ان حوادث کو ظاہر کر دے جو اس معاملہ کے ضمن میں ہوتے ہیں، اور ان پر غالب آجائے۔ پس جس نے اپنے نفس میں وسعت رزق کی صورت پیدا کی اور شریعت میں اس نکتہ کی تعبیر یہ کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نطفہ کے مؤکل فرشتہ کی طرف وحی کی کہ وہ یہ لکھے کہ اس کا رزق وسیع ہے، اور فن نجوم میں یہ بات ہے کہ پیدا ہونے والے بچہ کی قسمت کے خانوں میں سے بیوت المال مسعود ہے، اس کی کمائی میں منافع ہیں اور اس کے اسفار میں نجاح و کامیابی ہے۔ اس کے دوست اس کا ساتھ دینے والے ہیں، اس کے رفقاء کار اس پر مہربان ہیں۔ اور یہ مصلحت جزوی ہے جو مصلحت کلی سے پیدا ہوتی ہے، اور اجزاء عالم ایک دوسرے سے جڑے ہوتے ہیں۔ بلاشبہ حکیم کے امر ایک دوسرے کے مشابہ ہوتے ہیں۔ پھر اگر وہاں کساد بازاری یا کثیر بیونت ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ مشتری کے لشکروں میں سے کسی ملک (فرشتہ) کو الہام کرتا ہے کہ اس کی کامیابی اور نفع رسانی کی سعی کرے۔ یہاں تک کہ جو اس کی جبلت کے لئے مناسب ہو، وہ پورا ہو جائے۔ اسی طرح مصلحت کلیہ اس دعا کرنے والے سے مطابقت اختیار کرتی ہے جب کہ وہ اسم کی تلاوت میں اس کے رنگ میں رنگا ہوتا ہے۔ اپنے نفس میں روح الٰہی کی شکل اختیار کئے ہوتا ہے۔ پھر مصلحت جزئیہ جب اس وقت میں مصلحت کلیہ اور اس نفس کے درمیان پیدا ہوتی ہے، مشتری یا زہرہ کے لشکروں میں سے یا جن پر کوکبین کی روحانیت پوری طرح غالب آتی ہے، ان میں سے فرشتہ کو الہام کیا جاتا ہے کہ لوگوں کو الہام کرنے میں سعی کرے یہاں تک کہ جو اس کے امر کے مناسب ہے، وہ پورا ہو جائے۔

اور دوسرے یہ کہ اسم کے ساتھ دعا کرنے والا جب الحاح وزاری کرتا ہے اور اس کے حروف کے غرائب کے تتبع میں زور لگاتا ہے اور حروف کی تکرار کرتا ہے، یہاں تک کہ وہ اس نصاب کو پہنچ جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے ایسے معاملات میں اپنے نزدیک مقرر کیا ہے تو وہ عطارد کے لشکروں میں سے اس سے مناسبت رکھنے والے ملائکہ کے قلوب میں ایک داعیہ پیدا کرتا

ہے جو کہ طبیعت کلیہ کے توسط سے ہوتا ہے تو وہ اس داعیہ کے مقتضی کے مطابق سعی کرتے ہیں، یہاں تک کہ اس کے مقتضی کو پورا کر دیتے ہیں اور جو امر ہونے والا ہوتا ہے، اللہ اس کا فیصلہ کر دیتا ہے۔

اور اگر آپ حق صریح چاہتے ہیں تو کوئی ایسا نہیں ہے جو طبیعت کلیہ کے واسطہ کے بغیر کسی شے میں تاثیر پیدا کر سکے۔ خواہ وہ اس امر کو جانتا ہو یا نہ جانتا ہو کہ کسان زمین میں ہل چلانے، بیج ڈالنے، سنچائی کرنے اور نرائی کرنے، گھاس پھونس صاف کرنے یہاں تک کہ فصل پک کر تیار ہو جانے وغیرہ نظم عالم کے سلسلہ میں جو کچھ جانتا ہے، سب عمل کرتا ہے اور یہ نہیں جانتا کہ وہ صرف طبیعۃ کلیہ کے باب کو ہی کھٹکھٹاتا ہے اور صرف مصلحت کلیہ کی خدمت ہی انجام دیتا ہے اور یہ زمین میں ہل چلانے، بیج بونے اور سنچائی کرنے، بیج کے پھولنے اور اگنے میں صرف نبات کی طبیعت کی موافقت کی جہت سے ہی تدبیر کے ذریعہ جب درست ہوتا ہے، اس کے نمو میں مناسبت ہوتی ہے۔

اور نباتات کی طبیعت، طبیعت کلیہ کی جزئی ہوتی ہے اور اس کے اقنوم (عناصر) کا ایک ہیکل اور اس کی روح کے لئے ایک بلندی اور اس کی حقیقت کے لئے ایک مظہر ہوتی ہے۔ اور اسی طرح ملاح کشتی بناتا ہے اس میں بادبان نصب کرتا ہے، اس سے چھوٹی کشتیاں جوڑتا ہے، اس کو اوپر اٹھاتا ہے اور سمندر میں لنگر ڈالتا ہے، چپو سے کشتی کو جدھر چاہتا ہے چلاتا ہے، اور دل میں خوش ہوتا ہے کہ دنیا میں اس کا اپنا ایک اثر ہے، اور اس نے اپنی کاریگری سے ایک شے بنائی ہے جب کہ یہ غریب و مسکین نہیں جانتا کہ اس نے جو کچھ بنایا ہے وہ صرف پانی کی طبیعت کی موافقت ہے۔ اور اس کے لئے اس طرح پیش کیا ہے کہ جس سے اس کی مراد پوری ہوتی رہے۔ جیسے کوئی شخص پانی کی روانی کی شدت میں وہ کچھ پیش کرتا ہے جو پانی کی رواں دھار کی سمت میں چلتا ہے کسی دوسری طرف نہیں چلتا۔ اور پانی کی طبیعت طبیعات کلیہ کا ایک جزء ہے۔ اور اس کے اقنوم (عناصر) کا ایک ہیکل اور اس کی روح کی بلندی اور اس کی حقیقت کا ایک مظہر ہے۔ پس دنیا میں پھیرنا کسی بھی وجہ سے ہو، وہ اسباب ظاہریہ یا خفیہ یا دائرہ قدس کے وسط میں قائم تجلی پر الحاح سے صرف طبیعۃ کلیہ کے موافق ہوتا ہے۔ اور اس کے لئے طلب اور اس دن اس کے اور صورت عالم کے درمیان تعلق قائم کرنے کے لئے ایک عمل ہے۔ پھر حادثہ سے جو

چاہتا ہے، پیدا کرتا ہے اور اسی لئے میں کہتا ہوں کہ خرق عادت، دائمی عادت ہے۔

اور یہ بھی جان لو کہ یہ تمام اعمال ڈھانچے ہیں اور ان کی ارواح دعا کرنے والے کی ہمت اور ملائکہ کے لئے جذب کرنے والی صفتیں ہیں۔ اور اس شخص کی مثال جس نے اس کی ارواح پر نہیں ان کی شکلوں اور ڈھانچوں پر اکتفا کیا جیسے کسی شخص نے کسی سچ بولنے والے کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ شجاع و بہادر کے لئے تلوار سے قتال کرنا ممکن ہے۔ تو اس کے لئے یہ بھی ممکن ہے کہ عصا لاٹھی ڈنڈے سے لڑے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اپنے دشمن کو سختی سے پکڑ لے اور زور و قوت سے پچھاڑ دے۔ اب وہ اگر گمان کر لے کہ اکیلی تلوار یا لاٹھی ہی دشمن کو دفع کرنے کے لئے کارآمد ہوگی اور شجاعت و قوت کی قید کو نظر انداز کر دے تو کر لے۔ اور یہ اس مقالہ کی آخری بات ہے۔ والحمدللہ اولاً و آخراً۔

۴۷- تفہیم:

مجددیت

ہم چاہتے ہیں کہ تمہیں ایک عظیم معرفت کے سلسلہ میں خاص طور سے بتا دیں۔ وہ یہ ہے کہ حق جل مجدہ کی اس زمانہ میں بہت زیادہ عنایتیں ہو رہی ہیں اور وہ اس زمانہ میں بڑے بڑے عظیم علوم کا فیضان فرما رہا ہے۔ اور اس کا سبب یہ ہے کہ نفوس ناطقہ میں نفس کلیہ جس دن نازل ہوتی ہیں، صرف شخص اکبر کی صورت میں نازل ہوتی ہیں۔ جب انبیاء اور اولیا کے انوار اپنے احوال اور مقامات کے اختلاف پر کسی دائرہ میں جمع ہوتے ہیں تو واجب ہوتا ہے کہ نفس کلیہ، نفس زکیہ کے ساتھ نازل ہو۔ آپ اس کے اندر اولین کے تمام مقامات اور ان کے علوم کو پائیں گے بلکہ پورے عالم کو اس کے جوہر کے اندر پائیں گے۔ چنانچہ کوئی علم یا مقام ایسا نہیں ہے جس کے اندر وہ موجود نہ ہو۔ چنانچہ جو شخص اس نفس کا مالک ہو، اگرچہ وہ سلف سے ممنون ہی ہو اس لئے کہ وہ نفوس متقدمہ کی شرط سے ہوگا اور اس کا سبب ہوگا۔ اس لئے اس کا قدم علم میں راسخ ہوگا اور علم صرف اس کے منبع ہی سے حاصل کرے گا اور اس کو صرف اسی طرح حاصل کرے گا جس طرح وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہر چیز کو اس کے محل میں رکھتا ہے تو یہ شخص تاج کا موتی ہے

اور عقد کا واسطہ ہے اور اس کے آگے اور پیچھے، دائیں اور بائیں نفوس زکیہ ہیں جو اس کے وجود کی بنیاد یا اس کے نور کا عکس یا اس کے جود وکرم کے طفیلی ہیں۔ پس جب دائرہ قدس میں آدمی کی ہیئت معلوم ہوگئی تو جو لوگ وہاں پہلے سے موجود تھے، انہوں نے اس کو تنبیہ کی اور اس کی طرف اشارے کئے۔ بہر حال علم صریح آدمی کا خاص نصیب ہے۔ اور یہ شخص اپنے نفس میں نفیس مطلب پاتا ہے جو ہر اس عارف کامل المعرفت کے مقابلہ میں ہوتا ہے جو اس سے قبل ہو۔ اور اس شخص کی خاصیت یہ ہے کہ وہ اس تمام الہام کے قابل ہوتا ہے جو حق تعالیٰ نے اس سے قبل اپنے کسی بندہ پر بطریق تعلیم و تکمیل کیا تھا یا وہ الہام طبیعی رہا ہو، بغیر اس کے کہ قوۃ سے فعل کی طرف اس استعداد میں سے کچھ بھی خارج نہ ہو، سوائے اشکال کلیہ کے تقاضہ اور مصلحت کلیہ کے مطابق صورتوں کی ترتیب کے وقت کے۔ پس اگر یہ فرض کرلیا گیا کہ یہ شخص ایک زمانہ میں ہو اور اسباب اس امر کا تقاضہ کریں تو لوگوں کی اصلاح جنگوں کے پھیلنے سے ہوگی اور اس کے قلب میں ان کی اصلاح کا صور پھونک دیا گیا تو یہ شخص جنگ کے سلسلہ میں پوری طرح اٹھ کھڑا ہوگا اور جنگ کے میدان میں امام ہوگا۔ اس کو رستم اور اسفندیار وغیرہ پر قیاس نہ کیا جائے بلکہ رستم اور اسفندیار وغیرہ اس کے طفیلی ہیں اس سے مدد طلب کرتے ہیں اور اس کے پیروکار ہیں۔

اور اسی طرح اگر یہ فرض کرلیا گیا کہ یہ شخص ایک زمانہ میں ہوگا اور اسباب کا تقاضہ یہ ہو کہ لوگوں کی اصلاح علوم ریاضی نجوم اور ہیئت وغیرہ کے استنباط سے ہو اور اس کے قلب میں ان کی اصلاح کا صور پھونک دیا گیا تو وہ علوم ریاضی کے ساتھ پوری طرح قائم ہو جائے گا۔ اور وہ ان علوم میں امام ہوگا اور بطلیموس اس کا تلمیذ شاگرد اور طفیلی ہوگا جو اس سے مدد کا طلبگار اور اس کی اقتدا کرنے والا ہوگا۔

اور اسی طرح اگر یہ فرض کرلیا گیا کہ اس کے قلب میں صنعت مہندسیہ (انجینئرنگ اور فن تعمیر کی صنعت) کے استنباط کے ذریعہ اصلاح عالم کی روح پھونک دی گئی اور یہ شخص اس صنعت کا امام، اس کا رئیس و سردار اور اس کا دستور ہوگا۔ اور اس شخص کی حالت عجیب ہوگی کہ وہ گمان کرے گا، آج جو کچھ بھی صنعتیں موجود ہیں، وہ سب اس کے فکر سے نکلی ہیں، وہ اس کا پہلا کاریگر ہے۔ اس طرح اس کے اندر انتہائی خوشی و مسرت پیدا ہوگی۔ اور ملاء اعلیٰ میں ایک ایسا علم منعقد ہوگا کہ حق تعالیٰ اس دن شان الٰہی کے تقاضہ کے مطابق دورہ کی مصلحت کے لحاظ سے اپنی

ساری مخلوق پر اس کے فیضان کا ارادہ کرلے اور عقد ایسے رجل کامل کی طرف ہوگا جس کا کچھ حال ہم نے بیان کر دیا ہے۔ پھر اس سے پہلے کے اور اس زمانہ کے مستعدین کے دلوں میں اس علم کی شبیہ اور حقیقت محض کے بغیر اس کی مثال نقش ہو جائے گی۔ پھر وہ شخص آئے گا اور اس کے اوپر فیضان ہوگا۔ اور اس کی مثال اس دورہ اور اس شان کے مطابق ہے جس میں ہم ہیں۔ اور اس دورہ کے امام اور قیم کے مطابق سابقین نے وحدۃ الوجود کے مسئلہ میں غلو سے کام لیا۔ اور میں نے ان کی معرفت کے سلسلہ میں اللہ کی طرف رجوع کیا تو ملاء اعلیٰ میں ایک علم واقع ہوا اور وہ اتحاد حقیقی اور تغایر اعتباری کے تنزل اور تغایر حقیقی اور اتحاد اعتباری کے تنزل کے فرق کا بیان ہے۔ اور شیخ مجدد آئے اور اس کے اردگرد پھرے تو ایک بار کہا عالم موجود خارجی ہے، اور دوسری بار کہا عالم موہوم مضبوط ہے، اور ایک بار کہا، عالم اسماء کا سایہ ہے اور یہ بیان نہیں کیا کہ ان کا موقف کیا ہے۔ تب قیم دورہ آیا اور معاملہ کی حقیقت سے پردہ اٹھایا۔

اور انبیا علیہم السلام دو قسم کے ہیں، ایک بڑے کبار ہیں۔ یہ وہ ہیں جو دورہ اور کلی قربانیوں اور اتحاد کی زبان میں بات کرتے ہیں اور نصرت و غلبہ ان کے لئے لازم ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **ولقد سبقت کلمتنا لعبادنا المرسلین، انھم لھم المنصورون. وان جندنا لھم الغلبون** ”اپنے بھیجے ہوئے بندوں سے ہم پہلے ہی وعدہ کر چکے ہیں کہ یقیناً ان کی مدد کی جائے گی اور ہمارا لشکر ہی غالب ہو کر رہے گا“ (الصّٰفّٰت ۱۷۱ تا ۱۷۳)۔ اور ان میں سے ایک وہ ہیں جنہوں نے مخلوق پر الزام حجت کے لئے بات کی اور ہر حادثہ سے قبل حق تعالیٰ کی سنت کے مطابق ڈرانے اور خبردار کرنے کا کام کیا۔ اور اسی طرح انبیا قتل کئے جاتے ہیں اور ان پر لوگ ایمان نہیں لاتے۔

اور اسی طرح توحید کے اسرار پر گفتگو کرنے والوں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ لوگ ہیں جو دورہ اور قرانات کلیہ، سیاروں کے مکمل اتحاد اور دائرہ قدس میں بلند و بالا ہیکلوں کی زبان میں بات کرتے ہیں۔ ان کے لئے لوگوں میں اپنے علوم کا ظاہر کرنا ممنوع ہوتا ہے۔ اور ایک وہ لوگ ہیں جو اس سلسلہ میں اپنی خاص استعداد کے مطابق گفتگو کرتے ہیں، وہ بھیدوں سے بھرے ہوتے ہیں، ضرورت کے مطابق لبریز ہوتے ہیں اور بالجملہ اس زمانہ میں اور اسی شان کے وقت یہ ایک عظیم بنیاد ہے۔ اکثر لوگ اس سے غافل ہیں۔ **والحمد للہ اولا و آخراً.**

۳۸-تفہیم:

مرید کو بیعت کی اجازت

الحمدلله الذی بنعمته تتم الصالحات وعلی فضله المعول فی جمیع الحالات وصلی الله علی سیدنا محمد واله وصحبه وسلم. ''تمام تعریفیں اسی اللہ کے لئے ہیں جس کی نعمتوں کے ساتھ نیکیاں تکمیل پاتی ہیں اور اسی کے فضل پر تمام حالات میں فریاد و بھروسے کئے جاتے ہیں۔ اور اللہ رحمتیں نازل فرمائے سیدنا محمد اور ان کے آل و اصحاب پر اور سلامتی نازل فرمائے۔ امابعد، عبد ضعیف، اللہ کریم کی رحمت کا طالب احمد ولی اللہ بن عبدالرحیم العمری الدھلوی۔ اللہ اس پر، اس کے مشائخ پر اور اس کے والدین پر اپنا فضل و احسان فرمائے، کہتا ہے کہ ۱۱۵۳ کے مہینوں میں ہمارے پاس ہمارے دینی بھائی محمد شریف بن خیر اللہ بن عبدالغنی المتوطن اکھبا کوٹ، سندھ، اللہ کے ساتھ وصل حاصل کرنے کی غرض سے صوفیا کے طریقہ کی طلب میں ہجرت کر کے آئے جب کہ وہ اس سے پہلے ایک مدت تک اعمال و اشغال طریقت اور مراقبوں میں مشغول رہ چکے تھے، اور اس راہ کی مشکلات کو اچھی طرح سمجھ چکے تھے، اس کی برائیوں اور عیوب و مصائب کو پہچان چکے تھے۔ میں نے ان کو نفس کی باریکیاں اور ہر باریکی کی طرف منسوب مقامات اور باریکی سے مختص نسبتوں اور اس نسبت کا جس پر مشہور طریقوں کا مدار ہے، سب کا تعارف کرایا اور تلمیذ کے ایک باریکی سے دوسری کی طرف اور ایک نسبت سے دوسری کی طرف نقل کی کیفیت اور تمام اہم ترین دقائق کی پہچان کرادی اور خوارق عادات اور ان سے متعلق موروثی توجہات کے اظہار کی کیفیت سب کچھ اسی طرح اس پر ظاہر کیں جیسے اللہ نے ان سے متعلق پردے میرے اوپر سے اٹھائے اور مجھے ان کی سمجھ دی، اور جو کچھ میں نے اپنے مشائخ سے وراثت میں پایا تھا، اس میں میرے لئے برکت دی۔ انہوں نے سب کچھ پہچان لیا جیسا کہ مناسب تھا، اور میں نے ان کو اس میزان کا وارث بنایا جو میرے رب نے مجھے عطا کی تھی۔ اور ان کو میں نے صحیح پایا۔ الحمدللہ۔ اب میں ان کو طریقۂ صوفیا میں طالبین کے ارشاد و ہدایت کی تمام انواع کی اور ان کے لئے خرقہ پہنانے اور ان کی طرف توجہ کرنے پھر ان کے ساتھ صحبت کی اجازت دیتا ہوں اور خرقہ پہنا تا

ہوں جیسا کہ میرے شیخ والد اور سیدی وسندی نے اس کی مجھے تلقین کی، اجازت دی اور پہنایا۔ اوران پر تمام امور میں میرے معتمد نے احسان کیا۔ اللہ تعالیٰ ان کی روح کو راحت وسکون عطا فرمائے۔ روح اللہ تعالیٰ روحه وقدس سره وسائر مشائخي من اهل الحرمين المتحرمين زادهما الله تعالىٰ شرفا. اور میں نے انہیں بتایا کہ سہروردیہ کا بہترین طریقہ کتاب العوارف میں مذکور ادوار اذکار کی پابندی ہے۔ اور میں نے انہیں یہ بھی بتایا کہ میں نے مدینہ کے مشائخ سادات میں سے اپنے دوسیدوں سے سنا کہ ان کے نزدیک سب سے بہتر عمل وہ ہے جو احیا اور قوت القلوب میں ہے۔ اور میں نے یہ بھی ذکر کیا کہ تمام طوائف جو جنید کی طرف رجوع کرتے ہیں اشغال، اذکار اور مراقبات میں باہم مختلف ہیں اور نسبت اور تہذیب اللطائف میں متفق ہیں۔ اگر چہ طریق بعض نسبتوں کی قوت میں بعض کے لحاظ سے مختلف ہیں اور تہذیب النفس کی تعبیر میں بھی مختلف ہیں۔ چنانچہ ان میں سے کچھ لوگ وہ ہیں جو بغیر لطیفہ، (باریکی) باریک نکتہ کا نام نہیں رکھتے لیکن اس کے لئے مختص نسبت اور اس کی تہذیب پر مرتب ہونے والے ثمرات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ہم اس کی مثال بیان کرتے ہیں۔

جان لو کہ اصحاب طریقۂ چشتیہ مرتبۂ ملکوت، جبروت اور لاہوت کا ذکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ فلاں کے اوپر سے اللہ نے ملکوت کے پردے اٹھا دئے مثلاً جب اس پر حالت سرور وانس میں اور انبیا کی ارواح کے ساتھ اجتماع سے تہذیب روح کے ثمرات ظاہر ہو گئے۔ اور کہتے ہیں کہ فلاں کے اوپر اللہ نے جبروت کے پردے کھول دئے جب اس پر حق میں خلق اور خلق میں حق کی رویت سے نکتۂ خفیہ کی تہذیب کا ثمرہ ظاہر ہو گیا۔ اور کہتے ہیں اللہ نے فلاں کے اوپر لاہوت کے پردے کھول دیے جب اس پر تہذیب الاخفی کا ثمرہ ظاہر ہو گیا۔

عبار اتنا شتى و حسنک واحد
وکل الى ذاک الجمال يشير

ہماری عبارتیں مختلف ہیں اور آپ کا حسن واحد ہے، اور ہر ایک اس جمال کی طرف اشارہ کررہا ہے۔

اور اب میں ان کو خاص اپنے نفس کے بارے میں پوشیدہ اور اعلانیہ ہر حال میں اللہ کا

تقویٰ اختیار کرنے، اور سنتوں اور شرعی احکام کی پابندی اور صوفیائے جنیدیہ کے طریقہ پر مداومت اختیار کرنے کی وصیت کرتا ہوں اور طالب حق اور قرب الی اللہ کے حق میں ان کو وصیت کرتا ہوں کہ انتہائی شفقت و رحمت کے ساتھ ان کی صحبت اختیار کریں اور ان کو معروف کا حکم کریں اور منکرات سے روکیں اور ان کو نبیؐ کی احادیث کی روایت کی ترغیب دیں۔
والحمدللہ اولاً و آخراً

۳۹-تفہیم جلیل:

معارف جلیلہ کا ذکر

اے حبیب باتدبیر! اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ محبت و الفت کا معاملہ فرمائے اور تمہارے مقاصد کو پورا فرمائے۔ تمہیں معلوم ہو کہ میں نے رمضان کے عشرۂ آخر میں اعتکاف کیا تو مجھ پر اس خلوت میں معارف جلیلہ کا فیضان فرمایا گیا۔ چنانچہ میں نے ان کی تعریف یا ان میں سے کچھ کی تعریف کے لئے جو بھی ممکن ہو تمہیں خاص کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ واللہ الموفق۔

ان معارف جلیلہ میں سے ایک معرفت جلیلہ بہت بلند ہے۔ بہت کم لوگ اس امر سے واقف ہیں کہ شخص اکبر میں تین انانیات ہوتی ہیں۔ (۱) انانیۃ کبریٰ: یہ نفس کلیہ کا علم ہوتا ہے بنفسہا وہ بھی اور جو کچھ اس میں ہوتا ہے سب مل کر شے واحد ہوتا ہے۔ (۲) انانیۃ وسطیٰ: یہ نفس کلیہ کے قلب کا علم ہوتا ہے جسے ہماری زبان میں تجلی اعظم کہا جاتا ہے۔ بنفسہا اس حقیقت سے کہ جو کچھ کائنات میں ہے وہ سب پر غالب ہوتا ہے۔ اس میں موثر ہوتا ہے، اس میں اس کا حکم نافذ ہوتا ہے، جس کو چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور جس کو منع کردے کوئی دینے والا نہیں ہے۔ اور (۳) انانیۃ صغریٰ: یہ ملائکہ، انسان، حیوانوں اور جنات کے صاحب ارادہ نفس کا علم ہے اور یہ وہ انانیت ہے جس کے بارے میں ہر فرد کو خبر دی جاتی ہے کہ وہ اپنے صاحب ساتھی سے ممتاز ہے اور اس کے لئے ہم شخص اصغر کی مثال دیتے ہیں۔ اور وہ نوع انسان سے فرد واحد ہے۔ اس میں اس کلیۃ کے لئے نفس مدبرہ ہے جو اپنے بدن میں اپنے نفس کا انانیت کے ساتھ ادراک کرتا ہے۔ پھر اس میں اس کلیۃ پر ایک قلب ماہر ہے جس کے بدن میں قوتیں اور جوارح ہیں۔ اگر قلب رسانی کے لئے کوئی ایسا علم ہے جو یہ جانتا ہے کہ وہ جواہر اور

قوی پر غالب ہے، اس کے اوپر حاکم اس میں موثر ہے لیکن وہ اس سے لاعلم ہے اور تجلی اعظم میں کوئی جہل والا علم نہیں ہے تو یہ علم وہاں پوری طرح ظاہر ہوتا ہے۔ پھر ہر جارح اور ہر قوت کا الگ ایک مزاج ہوتا ہے۔ تو اگر ان میں سے علم ہو تو وہ خود بخود معلوم ہو سکتا ہے اور اس کی انانیت ظاہر ہو سکتی ہے لیکن وہ بے خبر رہا، اور یہ بے خبری صاحب ارادہ میں نفس کلیہ کے اعضا سے نہیں ہے۔

اور ان میں سے میں یہ سمجھتا ہوں کہ اعیان کمال غیب کے مرتبہ میں قبل اس کے کہ وجود روحی یا مثالی اختیار کرے ان انانیات کے اظہار اور ان کو مخفی رکھنے کے درمیان اختلاف کیا گیا ہے۔ جیسا کہ گھروں کی برابری میں بچوں کی پیدائش کی صورت میں اور کواکب کے مقامات اور ان کے ظہور کی مقدار اور ان کے قوی میں اختلاف کیا گیا ہے۔ چنانچہ انانیت وسطیٰ انانیت صغری پر غالب ہوتی ہے، اس کو اپنے احاطہ میں لئے ہوتی ہے، مشتری کے احتراق کے وقت اس پر بمنزلہ نسبت شمس و مشتری غالب ہوتی ہے۔ اور انانیت کبری نظر سے ساقط ہو جاتی ہے اور یہ عین سیدنا عیسیٰ علیہ وعلی نبینا الصلوٰۃ والسلام ہے۔ ان کی اپنے رب سے معرفت یہ تھی کہ کہا لاہوت ناسوت کے ذریعہ قمیص پہنتی ہے۔ اور انانیت وسطی، انانیت صغری پر غالب ہوتی ہے۔ مقابلہ کے وقت بمنزلہ نسبت شمس و قمر غالب ہوتی ہے اور انانیت کبری نظر سے ساقط ہوتی ہے اور یہ تمام اولوالعزم انبیا علیہم السلام کے اعیان اور اشخاص کی حالت ہوتی ہے۔ اور وہاں کچھ صفات ہوتی ہیں جو ایک دوسرے سے مختص ہوتی ہیں۔ اس پر ہمارے نبی محمد صلوات اللہ علیہ متعین ہوئے۔ اس میں مقابلہ اور غلبہ پوری طرح محقق ہوئے تو آپ نے فرمایا میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔ اور انانیت صغری کی صفت کواکب کے معانی میں سے وسیع معنی ہے۔ اس پر موسیٰ علیہ السلام متعین کئے گئے اور مقابلہ محقق ہو گیا جیسا کہ ہم نے بتایا۔ اور انانیت صغری کی صفت کواکب اور عناصر کے تمام معانی میں سے حدت اور منیری ہے اس پر سیدنا داؤد علیہ السلام متعین کئے گئے۔ اس میں مقابلہ محقق ہوا اور انانیت صغری کی صفت عناصر کے معانی میں سے وسیع معنی کی ہے۔

اور کبھی انانیت وسطی اور انانیت صغری کے درمیان شمس و قمر سے بمنزلہ تثلیث محبت و مودت کی نظر ہوتی ہے اور یہ عین سیدنا ابراہیم علیہ وعلی نبینا السلام ہیں۔ اور انانیت کبری نظر

سے ساقط ہے پھر دونوں ثابت آنکھوں میں نظر جما کر دیکھا جو اس کے ارد گرد تھا تو انانیت وسطی وصغری کے درمیان نظر مودت پائی اور ان کی انانیت تثلیث با مقابلہ یا احتراق کے وقت ان صفات کاملہ سے متصف پائی گئی جو شمس کے اپنے شرف یا مقام کے بمنزلہ ہے۔ اور میں نے اس قوت کی آنکھوں میں انانیات کو نہیں پایا۔ چنانچہ اس نے مجھے پستی میں کر دیا۔

اوران میں سے یہ ہے کہ وحی میں انبیا صلوات اللہ علیہم کے احوال انانیت وسطی کے ساتھ انانیت صغری کی نسبت میں ان کے اختلاف کے لحاظ سے مختلف ہوتے ہیں۔ ہم نے جس نسبت کا ذکر کیا کہ وہ عین ہمارے نبیؐ ہیں تو وحی میں اس کا مقتضی یہ ہے کہ نبیؐ سے سرور و راحت کے نکتۂ تجلی اعظم کا مقابلہ بمنزلہ مشافہ وندا کیا جائے، اور اس پر وہ سارا فیضان کیا جائے جو آپ کے عین کا مستوجب ہے اور جس کا تقاضہ اس دن مصلحت عالم تبلیغی علوم ایک ہی مرتبہ میں کرے پھر یہ مقابلہ اور یہ افاضہ اس وقت تک جاری رہے کہ ترکیب بکھر جائے۔ تو یہ افاضہ خاص طور سے ان علوم کے لئے وہ کلام الٰہی ہے جو حق کی صفت ہے جس کی طرف وحی کی جاتی ہے۔ اس کے نفس کے حالات کے اختلاف کے لحاظ سے کبھی نیند ہو جاتا ہے کبھی کوفت و بلند آواز اور کبھی الہام۔ اس طرح اس کا نفس احوال کے اعتبار سے اس کے جسم سے متعلق ہوتا ہے۔

اور جس نسبت کے بارے میں ہم نے ذکر کیا کہ وہ عین سیدنا عیسیٰ علیہ السلام ہے تو اس کا مقتضی یہ ہے کہ یہ جانا جائے کہ لاہوت کے ناسوت کے ذریعہ قمیص دینے والی ہونے اور بعض اوقات نقطۂ لاہوت کے دوسرے قوی پر غالب رہنے کی اصل خیال اور وہم میں ایک صورت اعلیٰ یا کلام اختیار کرتی ہے پھر ختم ہو جاتی ہے اور ہر قوت کو اس کے حال پر بحال کر دیتی ہے۔

تلقيته منى و منى اخذته

ونفسى كانت فى عطائى ممدتى

”میں نے اس کو اپنے آپ حاصل کیا اور میرا نفس ہی اس کو عطا کرنے والا اور مدد کرنے والا ہے۔“

اور جس نسبت کے بارے میں ہم نے کہا کہ وہ عین سیدنا ابراہیم علیہ السلام ہے تو اس کا مقتضی فراست، گمان وتخمینہ اور سمجھ داری ہے۔

اوران میں سے یہ ہے کہ نفس جزئیہ کسی بھی نفس کا ہوخواہ انسان کا نفس ہو یا حیوان کا، وہ نفس کلیہ کو اتارتا رہتا ہے۔اوراس کی مثال اس صورت سے ہوتی ہے جس کا اعتبار کیا جاتا ہے۔ پھر جب نفس جزئیہ اترتا ہے تو وہ صرف عالم کی شکل میں اترتا ہے۔ پھر اگراس دن اس کو شمس اپنے شرف یا اپنے مقام میں اتارتا ہے تو نفس میں شمس اپنے شرف یا اپنے مقام میں ظاہر ہوتا ہے۔اوراسی طرح تجلی اعظم کی اور ملاء اعلی اور دنیا میں جو کچھ ہے سب کی صورت اس نفس میں عالم سے اس کی وضع کے بقدر ظاہر ہوتی ہے۔ پھر اگراس کے نازل ہونے کے دن تجلی اعظم اور ملاء اعلی کی نسبت عالم سے شمس کی نسبت کی طرح ہو جب کہ وہ وسط سماء میں ہو تو نفس میں لمبا خوبصورت نقطہ ظاہر ہوتا ہے جو اس نفس اوراس کے مجسمہ اور بت میں تجلی اعظم کی میراث ہے۔ اور لمبے نقطہ کے گرد بہت سارے نقطے ظاہر ہوتے ہیں جو اس کو گھیرے ہوتے ہیں۔ یہ اس نفس میں ملاء اعلی اوران کے مجسموں اور تصویروں اور بتوں کی میراث ہے۔ چنانچہ یہ فقیر عفی عنہ اپنے نفس میں تجلی اعظم کے مقابلہ میں ایک نقطہ اور ملائکہ مقربین کے مقابلہ میں نقاط اور انبیا و اولیا کے مقابلہ میں نقاط بلکہ میں ہر موجود شے کے مقابلہ میں نفس میں ایک نقطہ پاتا ہے، اور یہی ان کے اس قول کے معنی ہیں کہ جو کچھ عالم میں ہے، کامل اس میں عالم ہے۔

اوران میں سے یہ ہے کہ میں نے اہل بیت کے ائمہ کی ارواح کو دائرہ قدس میں پوری طرح اور خوبصورت شکل میں دیکھا، اور مجھے معلوم ہوا کہ ان کا منکر اوران سے کینہ رکھنے والا عظیم خطرات سے دوچار ہے، لیکن ان کے چہرے باطن کی طرف پھرے ہوئے ہیں۔اور خلافت صرف اسی کے لئے مناسب ہے جس کا چہرہ ظاہر کی طرف پھرا ہوا ہو۔ چنانچہ انہوں نے اس سبب سے خلافت طلب کی لیکن اس وجہ سے اس کو پا نہ سکے۔اسی طرح ہر وہ شخص جس کو دائرہ قدس میں ثابت قدمی حاصل ہے، اس پر انکار اوراس سے دل میں کینہ دنیا میں بربادی کا باعث ہوتا ہے۔اور اللہ تعالٰی سے بعد پیدا کرتا ہے۔اور جب اس کے اوراس کے رب کے درمیان سے پردے اٹھ جاتے ہیں تو ایسا کانٹا پاتا ہے جو اس کو چبھتا ہے۔

اور جان لو کہ جس علم کے بارے میں اس تفہیم میں، میں نے متنبہ کیا ہے وہ علم شریف جلیل القدر ہے۔اعیان ثابتہ کے ظہور کے مرتبہ میں رحمت الٰہیہ کی تقسیموں کے انکشاف سے حاصل ہوتا ہے اور یہ صرف ایک کے بعد ایک کو ہی ملتا ہے۔ والحمد للہ اولاً و آخراً۔

۴۰-تفہیم:

ثبوت اور وجود کے درمیان فرق

ذات الٰہیہ سے اولاً وہ سب کچھ صادر ہوا جو اس کی شان میں ایک ہی بار میں صادر ہونا تھا۔ تو اسی صدور سے صادر ہونے والا ثابت ہوگیا نہ کہ موجود۔ اور ثبوت اور وجود کے درمیان فرق، عدد کے مراتب میں تحقیق کی دو قسم کے ملاحظہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ ایک وہ تحقیق جو محاسب کے ذہن میں موجود عدد کے مراتب سے ہوتی ہے اور وہ ثبوت ہے۔ اور دوسرے وہ امام جس کی اقتدا محاسب اپنے تصور میں کرتا ہے اور وہ طبیعت عددیہ سے موجود ہونے سے پہلے پیدا ہوتا ہے۔ اور شرطیت کے صدق کے ملاحظہ سے نفس الامر میں ملازمت صادق آتی ہے، اگر چہ مقدم اور تالی متحقق نہ ہوں۔ اور اس شجر کے ملاحظہ سے جو خارج میں پائے جانے سے قبل نوات گٹھلی یا بیج میں موہومہ شکل میں قائم ہے۔ اور اس کے صدور ثبوتی کے لئے اقتضا اور احتمال کسی نہ کسی وجہ سے ذات الٰہیہ کے ساتھ قائم ہوتے ہیں۔ لیکن یہ اعراض کے اپنے محل میں قیام کی طرح نہیں ہوتے اور اس اقتضا کو فیض اقدس کہا جاتا ہے۔ اور اس طرح صادر ہونے والے عالم کو صوفیا کے نزدیک اعیان ثابتہ کہا جاتا ہے۔ اور حکما کے نزدیک عقل نام دیا جاتا ہے۔ البتہ حکما خارج میں ہر موجود کو اہتمام کے ساتھ عین ثابت یا عقل سے، جو چاہو کہہ لو، نہیں سمجھتے۔ وہ ہر فلک کو فقط اپنی عقل سے سمجھتے ہیں۔ پھر ذات الٰہیہ سے صادر ثبوتی کی شرط سے دوسرا امر صادر ہوتا ہے جو نفس رحمانی ہے۔ میری مراد یہ ہے کہ یہ شرط ذات الٰہیہ کے ساتھ اجمالی طور پر قائم ہے اور فلک اور عنصر وغیرہ کی خصوصیات نہیں جیسا کہ حکماء گمان کرتے ہیں۔ اور نفس رحمانی کی حقیقت بالفعل تحقق، تقرر اور موجود ہونا ہے اور جس سے موثر، موثر اور متاثر متاثر ہوتا ہے۔

پھر نفس رحمانی کے واسطہ سے دوسرا امر صادر ہوا۔ اس نے عالم شہادت کی بنیاد رکھی اور اولاً حقائق ثابتہ اور نفس رحمانی کے درمیان نکاح حاصل کیا تو اس نکاح سے موجود ہوگیا۔ اور دوسرے نفس رحمانی اور بنیاد کے درمیان تو اس سے متعین ہوگیا۔ اور ان سے یہ دونوں نکاح اعیان اور خارج میں اشیاء ہوگئیں اور اسماء سے خارج اور اعیان ان دونوں نکاحوں کے اسماء

سے۔ اور اشیاء ظاہرہ کے خارج میں کچھ مراتب ہیں۔

ان میں سے ایک وہ ہے جس میں جہت نفس رحمانی اور ثبوت غالب ہوتے ہیں، اس لئے اس میں نکاح کا فائدہ نہیں ہوتا، فقط احکام کا تعین ہوتا ہے۔ اور ان میں سے ایک وہ ہے جس میں بنیاد کی جہت غالب ہوتی ہے تو وہ ایک ہی جسم ہوتا ہے جیسا کہ ہم قوتوں کے تفاوت سے شخص اصغر میں مشاہدہ کرتے ہیں۔ اور خارج میں سب سے پہلے نور ظاہر ہوا۔ وہ اس کلیت پر ظاہر ہوا جو نفس رحمانی کے دائرہ میں ہے۔ اور یہ خارج میں حق کی سب سے عظیم تجلی ہے اور اسی طرح اسماء حسنیٰ کا اس معنیٰ میں انطباق ہوا کہ ذات الٰہی کے لئے اس تجلی کے ساتھ ظاہر ہونے کی شرط کے ساتھ ان احکام سے تعبیر و احکام ثابت ہوئے جو اسماء، صفات، نفوس کاملہ اور ملائکہ علویہ ہیں۔ اس کی طرف اس کی کشش ایسی ہی ہوتی ہے جیسی مقناطیس کی طرف لوہے کی ہوتی ہے۔ اور وہاں ایک روحانی مقام ہوتا ہے جس کو حظیرۃ القدس کہا جاتا ہے۔ اس میں عالم مثال کے قوی ہوتے ہیں۔ اور اس کی تعبیر شریعت کی زبان میں وہ ہرتی ہے جو اللہ کے نزدیک ہوتی ہے۔ اور یہ تجلی ارادہ اور قصد کے ساتھ اکوان پر غالب ہوتی ہے اور وہاں فعل اور ترک کے استوا کی سچائی پائی جاتی ہے۔ اور حظیرۃ القدس میں بندوں کی طرف توجہ ان کے اس تجلی کی عظمت کی تعریف، ان پر اس تجلی کے حقوق اور زمین میں حق کی شریعتوں کے اظہار اور ان کے لئے شریعت کے عقد سے حاصل ہوتی ہے۔ اور اس نعت میں تعریف جس کو وہ جانتے ہیں، اس وقت تک ممکن نہیں ہوتی جب تک کہ صفات ان کے مبادی کے وجود کے معنیٰ میں نہیں بلکہ ان کی عنایت کے وجود کے معنیٰ میں استعمال نہ کی جائیں۔ اور یہ کہ بادشاہ کے کسی شہر کی تسخیر کے لئے وضع شدہ الفاظ مستعار لئے جائیں اور رعایت پر اس کو مقدم رکھا جائے۔ اور جواہر اور اعراض سے ہر نوع کا افاضہ اس طرح کیا جائے کہ خالق، شافی (شفا دینے والا)، مذل، معز کہا جانے لگے۔ اور اس سے نقائص سلب کر لئے جائیں، خاص طور سے وہ جن کی طرف ظالم لوگ اس کے حق میں دھیان دیتے ہیں۔ اور ان تعریفات میں یہ شرط لگائی جاتی ہے کہ اس طرح صراحت کی جائے کہ اس جیسی کوئی شئے نہیں ہے اور کلمہ کو اس طرح استعمال کیا جائے کہ مخاطبین کو صریح ابہام کا وہم نہ ہو کہ وہ بہیمیت سے آلودہ ہے اور یہ مخاطبین کے لحاظ سے مختلف ہوتا ہے۔

۴۱۔ **تفہیم:**

بعض اشکالات کا جواب

مخدوم معین کے سوال کے جواب میں جو تائید الٰہی کے شامل حال ہونے اور لوگوں کے اقوال کے پرکھنے سے متعلق بعض اشکالات کے سلسلہ میں ہے۔ عنایت نامہ موصول ہوا جس سے وہ امور ظاہر ہوتے ہیں کہ ان کے عواقب انشاء اللہ تعالیٰ بخیر ہوں گے۔ فقیر کو خلوص اور دعا گوئی میں شامل حال تصور کریں۔ جعل الله لكم من كل ضيق مخرجا. اللہ تعالیٰ آپ کو ہر تنگی سے نکلنے کی راہیں دکھائے۔ اس فقیر کے نزدیک جو کچھ مقرر ہے وہ یہ ہے کہ پہلی چیز جو سب سے پہلے بطریق ابداع صادر ہوئی وہ نفس کلیہ ہے۔ اور نفس کلیہ میں دو صفت موجود ہیں۔ ایک حیثیت فعلیہ اور اس کے سبب سے عرش ظاہر ہوا۔ دوسرے حیثیت قوۃ کہ اس کے سبب سے پانی جو افلاک و عناصر کا ہیولی ہے، ظاہر ہوا۔ اور عرش کی شرط سے پانی میں افلاک و عناصر کی صورتیں ظاہر ہوئیں۔ اور نفس کلیہ اول الاوائل کے ساتھ اس حیثیت سے ایک نسبت رکھتا ہے کہ اگر اس کا نام رکھا جانا درست قرار پائے، اور اگر اس کو صفت کہیں تو یہ بھی بجا ہو اور اگر مبدع کہیں تو یہ بھی دور از کار نہ ہو۔ بالجملہ متکلمین کی زبان میں یہ وہی ہے جس کو صفت علم و قدرت اور امام مبین کہتے ہیں۔ حضرت مبدا واجب بالذات اور قدیم بالذات ہے۔ اور اس کی صفات واجب بالغیر اور قدیم بالغیر ہیں۔ اور زمانہ کی حقیقت فقط مقدار حرکت دوریہ ہے بلکہ کوئی بھی حرکت ہو وہ زمانہ کی تقدیم کی کیفیت یا اینیت ظاہر کرتی ہے اور اگر اس نظر سے باریک تر ہو تو معلوم ہوتا ہے کہ مقوم زمانہ صرف بالفعل ہی حرکت نہیں ہے بلکہ ہر حرکت بالقوہ بھی ہے اور نہ صرف اعراض کے مقولہ میں حرکت ہے بلکہ اگر جواہر وغیرہ میں بھی کوئی حرکت واقع ہوتی ہے تو زمانہ سے تقویم نوعی جاری کی جا سکتی ہے۔ اور ان مقدمات سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ موہوم کے بعد استخراج صرف نفس کلیہ میں ہو سکتا ہے کہ اس کا مفہوم قوۃ بہ فعل سے شے کا مطلق خروج ہو سکتا ہے۔ چنانچہ نفس کلیہ کے بعد جو کچھ بھی ہے وہ موہوم کو بڑھا کر مسبوق ہے۔ اور وہ وہی ہے جس سے متکلمین، زمانہ مراد لیتے ہیں۔ اس طرح اللہ اور اس کی صفات کے ماسوا کے حدوث پر زمانہ کے لحاظ سے برہان، وجدان اور

اہل ملت کا اجتماع قائم ہو گیا۔ اور اگر چہ کمالات الٰہیہ کو اعداد میں محصور نہیں کیا جا سکتا، تاہم جیسا کہ میرے رب تبارک و تعالیٰ نے مجھے سمجھایا ہے وہ چار درجوں میں محصور ہیں۔ (۱) ابداع (۲) خلق (۳) تدبیر اور (۴) تدلی یا قرب۔ اور جو اسماء و صفات ابداع کی طرف راجع ہوتے ہیں، ان سب کا مصداق خارج میں نفس کلیہ ہے۔ اور جو اسماء و صفات حق کی طرف راجع ہوتے ہیں، ان سب کا مصداق نفس کلیہ ہونا اس حیثیت سے ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ایک کے بعد ایک فیض قبول کیا جاتا ہے۔ اور یہ سب اس کی ذات کے کل میں داخل ہیں۔ اور جن اسماء و صفات تدبیر اور تدلی کی طرف راجع ہوتے ہیں، ان میں تجدد اور شروعات ہوتی ہے۔ اور امور سفلانی کے لئے اس میں ایک وجہ سے تاثیر ہوتی ہے۔ اور وہ وجہ تمام حالات میں ان کے لحاظ سے مصلحت کلیہ اور فیضان میں حفظ ہے۔ پھر جب امور سفلانیہ موجود ہوتے ہیں تو مصلحت کلیہ کا تقاضہ عالم کے کسی ایک قسم پر ہونے کا ہوتا ہے۔ تو اس قسم کا صدور مصلحت کلیہ کے وجود کی وجہ سے واجب ہو جاتا ہے۔ اس لئے ابداد اور خلق، حق کے دوام کے ساتھ دائمی ہو جاتے ہیں۔ لیکن خلق اور تدبیر کے اضافات متغیر ہو جاتے ہیں۔ تب بعض امور میں رزق اور بعض میں نصر (مدد) کہا جاتا ہے۔ اور بعض میں نصر (مدد) اور بعض میں خذل (محرومی) کہا جاتا ہے۔ اور جمع ضدین کی دو قسمیں ہیں (۱) حقیقی (۲) مجازی۔ حقیقی خود امکان کے دائرہ میں نہیں ہے اور مجازی محقق ہے۔ اور مجازی کی دو قسمیں ہو سکتی ہیں، ایک ارضی (زمینی) میں کہ آدم کی بقیہ مٹی پیدا کی گئی ہیں۔ اس مثال و خیال میں زمانہ بھی ظاہر ہوتا ہے۔ اور وہ ارض بمنزلۂ خیال، افلاک و ملاء اعلیٰ کے آشیانہ کے ہو گیا ہے۔ اور اس کی تعبیر حکما کے نزدیک جابرسا اور جابلقا سے ہے۔ (دیکھئے کتاب اشارات کی شرحیں) چنانچہ اس ارض میں ممتنعات موجود ہوتے ہیں اور نقیضین ظہور میں آتے ہیں اور اس موقع پر اشکال کا حل اس کلمہ سے ہو سکتا ہے کہ فرض المحال، محال نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ بعض بلند قوتیں اس ہمت کو ابھارتی ہیں جن کا مقتضی شئے کا وجود ہے۔ اور بعض قوتیں اس ہمت کو ابھارتی ہیں جس کا مقتضی اس شے کا عدم ہے۔ اس طرح ملاء سافل میں طرفین میں سے ہر ایک کی اس ثبوت سے ذہنیہ کی سچائی ثابت ہوتی ہے جس کی اصل ملاء اعلیٰ میں موجودہ حالت میں انہی کلمات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ کلام کو طول دینے کی فرصت نہیں ہوتی اور یہ بھی حسب امر واقع ہوتا ہے۔ ورنہ جو کچھ ان

صاحب نے جامع انداز میں لکھ دیا ہے، وہی کافی ہے، شعر

عبارا تناشتی و حسنک واحد
وکل الی ذاک الجمال یشیر

"ہماری تعبیرات مختلف ہیں اور آپ کا حسن ایک ہی ہے، اور ہر ایک اسی جمال کی طرف اشارہ کرتا ہے۔"

۴۲-تفہیم:

"ازل" کے معنی

الحمدللہ الذی ظہر بکل ماظہر وبطن فی کل مابطن واستترو ہوفی مرتبۃ ذاتہ......

تمام تعریفیں اسی اللہ کے لئے ہیں جس نے جو چاہا ظاہر کیا اور جس میں چاہا پوشیدہ رہا جب کہ اپنی ذات کے مرتبہ میں رہتے ہوئے پردہ کیا۔ اس کے علم کا کوئی پوری طرح ادراک نہیں کرسکتا، کوئی خبر اس کو پکڑ نہیں سکتی۔ اگر چہ اس کے انوار کھل جائیں اس کی طرف منتہی ہونے پر نظر جل جائے۔ اور اپنے مرتبہ کے ظہور میں آج کی طرح اس کی ایک شان ہوتی ہے جس کو وہ بلند اور پست کرتا ہے اور وہ اپنے بندوں پر غالب ہے۔ اور نماز پڑھنے والے کے سامنے اس کے مقابلہ میں قائم اور حاضر ہوتا ہے اور صلوۃ وسلام ہو سید بشر پر جن کو، شہریوں اور دیہاتیوں کی طرف سچے معارف کے ساتھ بھیجا گیا، اور آپ کی آل واصحاب پر بھی درود ہو جب تک مقفی مسجع زبان استعمال کی جائے۔

امابعد۔ سب سے زیادہ فضل وکرم کرنے والے اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سب سے زیادہ محتاج احمد کو جس کو ولی اللہ بن عبدالرحیم العمری الدہلوی کے نام سے پکارا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ وہ عطا فرمائے جس سے اس کو آراستگی حاصل ہو۔ جو اس کی شان کے خلاف ہو اس سے محفوظ رکھے۔ وہ کہتا ہے کہ مجھے ایک مکتوب موصول ہوا جو مکرم ومعظم مخدوم یعنی آں جناب کی جانب سے ہے کہ جن کی خصوصیت فیاضی وسخاوت اور عطا ہے جو تحقیقات جلیلہ کے میدان میں سبقت لے جانے والے اور مشکلات عقلی کے حل میں عارف کامل ہیں۔ مولانا، دین و

سنت کے لئے مددگار ہیں اللہ تعالیٰ ان کی تمناؤں کو پورا فرمائے۔ آمین۔ چنانچہ جب لفافہ کھولا گیا اور اس کے اندر پوشیدہ راز سامنے آیا تو گویا میرے سامنے فتنوں کا انبار لگ گیا، بلاؤں کا عظیم طوفان آ گیا۔ ان کے حل نے عاجز کر دیا۔ اس کی شکایت اللہ ہی سے کی جا سکتی ہے اور وہی مددگار ہے۔ سارے معاملات اسی کے حوالہ ہیں اسی پر بھروسہ ہے اور اللہ سے امید رکھنا ایک قسم کی دعا ہے اور دعا برے فیصلوں کو رد کرتی ہے، توقع ہے کہ لاحق، سابق سے بہتر ہو جائے اور فوت ہونے والی شے تدارک کر کے وہ کچھ دے جو لاحق ہونے والا ہے۔ اچانک مجھے ایک ایسا مسئلہ پیش آ گیا کہ مجھے اس کی طرف راغب کر دیا گیا اور اس کے بارے میں بحث کا حکم دیدیا گیا۔ اور وہ تکوین کا مسئلہ ہے۔

اس فقیر کے نزدیک صفات کے مسئلہ میں بڑی طویل بحثیں ہیں جو کئی جلدوں میں ہی سما سکتی ہیں، ان کے ذریعہ متکلمین، حکما اور صوفیا کے مذاہب کے مابین جمع کی صورت حاصل ہو سکتی ہے۔ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے بارے میں تحریر کی توفیق عنایت فرمائے۔ البتہ اگر ہم اس کو ترک کر دیں اور قوم کے مذہب کی تحقیق کی طرف رجوع کر لیں تو ازل کسی طویل مدت کا نام نہیں ہے جو ایک زمانہ سے پہلے رہی ہو بلکہ اللہ تعالیٰ تغیر سے پاک ہے جو کہ زمانہ کے استخراج کا منشا و مبدا ہے۔ اس طرح جائز ہوتا ہے کہ فعل ازلی ہو اور مفعول زمانی، اور اس کی نظیر وجود ہے کہ جو جسم میں ہوتا ہے اور اس پر اس مرتبہ ذاتیہ کی جہت سے حکم لگانا صحیح نہیں ہوتا جو کہ ایک جگہ میں منحصر رہتا اور تغیر وغیرہ جسم کے خصائص ہوتے ہیں اور اس کلام کی شرح آپ پر مخفی نہیں ہے۔

۴۳- **تفہیم:**

زمانہ میں تصوف کا دعوی کرنے والوں کی قسمیں

صوفیا میں جنیدیہ سلوک مقبول ہے اور یہ افراط و تفریط کے بغیر راہ حق میں وسط اور انتہائی مشرف و منزلت کا حامل ہے۔ ان کے علاوہ کی بہت ساری جماعتیں ہیں کہ ان کی نسبت احساس سے مانوس چیزوں سے ہے۔ اور بہت سے رنگ پیدا کر کے تھاہ تلاش کرتے کے سبب اس کی کنہ (حقیقت) کو نہیں پہنچا جا سکتا۔ میں سب کے احوال لکھتا ہوں، تا کہ ان بہت ساری جماعتوں کی معرفت کے واسطہ ایک نمونہ سامنے آ جائے۔ اللہ ہی مدد کرنے والا ہے۔ (۱)

تصوف کی راہ اختیار کرنے والوں کی ایک جماعت زنانہ لباس استعمال کرتی ہے۔ ساتھ ہی پیروں اور گلے میں زیور بھی پہنتی ہے۔ اس جماعت کا سربراہ موسیٰ سہاک ہے جس کی قبر احمد آباد میں واقع ہے۔ ان کے سلف کی فطرت عجیب واقع ہوئی ہے اور ان کی نسبت کو اوہام و خیالات عادیہ کے ساتھ عجیب وغریب تعلق پیش آیا ہے۔ اس گروہ کو بطریق سلوک نہیں بطریق جذبہ نسبت محبوبیہ ہاتھ آ گئی ہے۔ چنانچہ جو نظر کہ نفوس بشریہ کے ساتھ تجلی اعظم بلکہ لطیف حس حاصل ہے، ان پر اس کی حقیقت واضح ہے۔ اگرچہ وہ نظر چند پردوں کے پیچھے ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ اس راستہ سے ان لوگوں کو عجیب خوشی حاصل ہوتی ہے۔ اور یہ نسبت جذبیہ ان کی روح میں عجیب استعداد پر صادق آتی ہے جو عورتوں کے ساتھ مناسبت کا مقتضی ہے۔ مخنثوں کے مزاج سے مشابہت اور عجیب نیکی کا وہم ہوتا ہے اور اس طرح وہ محبوبۂ عالیہ کو محبوبیہ معشوقان کے ساتھ خلط ملط کر کے ظاہر کرتے ہیں اور اپنے زعم میں تحقیق و استقلال کے بھید سے یہ لباس وشکل اختیار کرتے ہیں اور آثار عجیبہ دعاؤں کی قبولیت اور دلوں پر توجہ کے لحاظ سے جذب کے سبب سے ظاہر ہوتے ہیں۔ ان کی شبیہ تمام لوگوں میں نظر آتی ہے۔ ایک بڑی جماعت ان کی تقلید کرتی ہے۔ اس طرح ایک نیا گمراہ طبقہ پیدا ہو گیا۔ (۲) ایک دوسری جماعت نے امرد لڑکوں کے نظارہ کو اپنا پیشہ بنا رکھا ہے۔ انہوں نے شراب اور بھنگ کے پینے اور نافرمانی و بیبا کی کی راہ اختیار کر رکھی ہے۔ اسی قبیل سے ماضی میں بھی ایک فرقہ تعلق رکھتا تھا جو خود کو فخر الدین عراقی، اوحد الدین الکرمانی اور مولانا رومی کے دامن سے وابستہ قرار دیتا تھا۔ اور ایک فرقہ ہے جو خود کو خواجہ خرد سے منسوب کرتا ہے۔ جب کہ وہ محققین کی جماعت تھی اور مقامات عالیہ پر پہنچی ہوئی تھی، لیکن اصل میں ان کی فطرت شہوانیہ کی تخلیق اس طرح ہوئی ہے کہ پوری طرح دل و دماغ کی قید میں نہیں آتی اور ان کو پوری طرح ہر لحاظ سے عفت میسر نہیں ہوتی۔ چنانچہ ان کے لطائف کی تہذیب کے بعد بقا کی صورت پیدا کی گئی ہے اور ملی جلی صورت پیدا ہوئی ہے۔ چنانچہ خدا کے ساتھ ان کی نسبت نے لذات حسیہ وخیالیہ اور وہمیہ پر تکیہ کر لیا ہے اور اس کے ساتھ توحید کو ملا لیا ہے۔ اور مبدا فیاض کی اشیا کا مظہر ان پر ظاہر ہو گیا۔

من كل شيء لذيذ احتسى قدحا
وكل ناطقة في الكون تطربني

"ہر لذیذ چیز کا میں ایک پیالہ پیتا ہوں اور ہر بولنے والی چیز مجھے مست کر دیتی ہے۔"

(۳) ایک اور جماعت افیون و بھنگ اور تمام منشیات استعمال کرتی ہے۔ البتہ شرم گاہ وغیرہ کی شہوات سے دور رہتی ہے اور پوری طرح مجرد رہتی ہے۔ اس جماعت کو قلندر کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ خود کو سلسلۂ قادریہ یا سہروردیہ سے منسوب کرتے ہیں۔ ان کے سربراہ ان طریقوں سے تجرید، شہوت کی آگ کو بجھانے اور ترک دنیا کی تلقین کرتے ہیں اور غیوبت کی نسبت سے لذت حاصل کرتے ہیں۔ اور جب اس کو ختم کر دیتے ہیں تو بحر نوم میں غرق ہو جاتے ہیں یا افیون کو اس کا قائم مقام بنا لیتے ہیں اور ان دونوں کے درمیان فرق ان پر واضح نہیں ہوتا۔ اور آرام و سکون کی استعداد اور ترک اشغال اس گمان کو دوبالا کر دیتے ہیں۔ بیت

زبنگ ہیچت اگر نیست ایں نہ بس کہ ترا
دمی زوسوسۂ عقل بے خبر دارد

"اگر بھنگ سے تجھ کو کچھ حاصل نہیں ہوتا تو یہ کافی نہیں ہے کہ تجھ کو عقل کے وسوسہ سے ایک دم کے لئے بے خبر کر دیتا ہے۔"

(۴) ایک اور جماعت وہ ہے جس نے مشائخ سے سماع و وجد کے طریقہ کا مشاہدہ کیا اور اس سلسلہ کی کچھ نمائش ان کو بھی حاصل ہو گئی۔ اس کے بعد انہوں نے ناقص جبلت کی وجہ سے رجوع کر لیا کہ غنا کی پابندی اور خاص حالات سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ اور غنا اور خاص حالات کی پابندی کے سبب جو حیرت و اضطراب اس پر طاری ہوتے ہیں، ان کو وجد و حال کا قائم مقام سمجھتے ہیں جس سے شبہ دوبالا ہو جاتا ہے۔ (۵) اور ایک جماعت کے نفوس پر نسبت اویسیہ سایہ فگن رہتی ہے۔ وہ جب اپنے نفوس کے خیالات و اوہام کی غفلتوں میں مدہوش رہتے ہیں تو ارواح کاملین سے فیض کا حصول اس ہیئت کے اختیار کئے بغیر جو عام حالات میں انتہائی محبت یا تعظیم کے ہم پلہ ہو اس کا امکان نہیں ہوتا۔ چنانچہ وہ بھید کے فائدہ کو دیکھ کر ان امور میں مشغول ہو جاتے ہیں، خواہ دوسرے لوگ کتنا ہی مسترد و ناپسند کریں۔ بیت

خلق می گوید کہ خسرو بت پرستی میکند
آری آری میکند باخلق و عالم کار نیست

"دنیا کہتی ہے کہ خسرو بت پرستی کرتا ہے، ہاں ہاں کرتا ہے، اس کو مخلوق اور دنیا سے

کوئی سروکار نہیں ہے۔"

میر ابوالعلی کے پیروکاروں میں سے خواجہ محمد ماہ عزیزی پہاڑ گنج کے قریب اقامت پذیر ہیں۔ سید حسن رسول نما کی صحبت میں رہ چکے ہیں۔ نقل کرتے ہیں کہ ایک دن سید حسن نے ایک شعر ایک قوال سے سنا جس کے مضمون میں خود کو محبوب کے کتے سے تشبیہ دی گئی تھی اور اس تشبیہ سے سب لطف اندوز ہوئے۔ مگر وہ لذت آئی بھی اور چلی بھی گئی۔ اس کو استقرار نہ ہوا تو ایک گوشہ میں گئے اور ایک رسی گلے میں باندھ کر اس کو ایک مضبوط کھونٹے سے باندھ دیا اور خود پر تجلی ڈالی پھر اسی شعر کو پڑھنے اور اس کھونٹے کے گرد گھومنے لگے۔ اس کیفیت سے اس لطف ولذت نے ان کے اندر استقرار کر لیا اور اس طرح ان کی فتح کا دروازہ کھل گیا۔

(۶) ایک جماعت کے مزاج پر جنون طاری ہو گیا ہے جو ان کے اصلی عارضہ کا باعث ہے۔ اور وہ عارضہ اوہام وخیالات سے ان کے حواس کے تعطل کا عین بیداری کی حالت میں سبب بنا ہے۔ چنانچہ جس چیز کو عوام سونے اور خواب کی حالت میں دیکھتے ہیں، یہ جماعت اس کو بیداری کی حالت میں دیکھتی ہے۔ اور بعض خیالات وتقاضے جو کہ عوام کے لئے بہت بلند و بالا معلوم ہوتے ہیں۔ ان کو بہت واضح طور پر معلوم ہو جاتے ہیں۔ اور ان کے الہاموں اور انکشافات سے لوگ بڑے بڑے حساب لگاتے ہیں اور ان سے حسن اعتقاد رکھتے ہیں۔ (۷) ایک جماعت ہے کہ ان کے اندر طہارت کی نسبت متمکن ہو گئی ہے۔ اور وہ اس کو وسوسوں کے ساتھ کھینچ کھینچ کر وضو کے پانی وغیرہ میں لے جاتے ہیں۔ اس جماعت کو سندھی زبان میں درش کہتے ہیں۔

(۸) ایک جماعت کے اندر طہارت کی نسبت اور ملائکہ سفلیہ سے مناسبت متمکن ہو گئی ہے۔ وہ لوگ ازدواجی تعلقات کو ترک، مردوں کے ساتھ اختلاط اور گوشت وحیوانات کو ترک کر کے ان دونوں سے متعلق لطف ولذت اس معنی میں حاصل کرتے ہیں۔ اور اپنی تحقیق کی بنیاد پر اس کو لازم قرار دیتے ہیں۔ اس کے باوجود بہت سے خلاف شرع امور میں مبتلا رہتے ہیں۔ اس جماعت کو کشمیری زبان میں ریشی کہتے ہیں۔ فقیر نے ایک شخص کو دیکھا جس کو طہارت وعبادت کی نسبت سے حصہ حاصل تھا۔ ایک تیز رفتار گھوڑے پر سوار تھا اور وہ بھی اور اس کا گھوڑا بھی دونوں شباب اور طبعی جوش وخروش سے بھرے ہوئے تھے اور نظر رحمت اس شخص کی طرف متوجہ تھی اور دونوں حالتوں کے اجتماع سے اس کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔ اور

ایک دوسرے واقعہ میں دیکھا کہ جنگ و جدال پر کمر بستہ اور تنگ دلی و بے آرامی میں مبتلا ہندوستان کے گاؤں میں گھوم رہا ہے، اور ان لوگوں سے جن کو اسلام اور اس کے احکام سے کوئی مناسبت نہیں ہے اور ان کو سمجھ بھی نہیں سکتے، الجھ رہا ہے اور ان کی بت پرستی پر ان کو عار دلا رہا ہے اور ہاتھوں اور منہ کو اس طرح چلا رہا ہے جیسے نچلے طبقہ کی عورتیں آپس میں لڑنے جھگڑنے کے وقت کیا کرتی ہیں۔ اور اس عزیز کو اوہام و جبلت سے ایک نفیس امر ملا ہوا ہے۔ اور آیت قرآنی خلطوا عملا صالحا و آخر سیئا "انہوں نے اعمال صالح و سیئہ کو باہم خلط ملط کر رکھا ہے" سے بہت زیادہ مطابقت ہے۔ اور جو کچھ یہاں لکھا گیا ہے اس کو ان اقسام کا ایک نمونہ سمجھا جا سکتا ہے۔ والحمدللہ اولا و آخرا و ظاھرا و باطنا

۴۴۔ تفہیم:

طبقہ اور اس کے بعد کے احوال

اس فقیر کو خبردار کیا گیا کہ فقیر کے طبقہ میں اور اس طبقہ میں جو اس کے بعد ہوگا علوم ظاہرہ اور تیسرے طبقہ میں علوم باطنہ ظاہر ہوں گے۔ اور اس جگہ طبقہ ثانیہ سے مراد اولاد ہے اور طبقہ ثالثہ سے مراد پوتے یا چھوٹے بچے ہیں جو پوتوں کے درجہ میں ہیں۔ اور یہاں مراد ان کے علوم کا شائع و عام ہونا اور ان کے امر کا ظہور ہے۔ اور علوم ظاہرہ سے مراد کتاب و سنت ہے۔ اور علوم باطنہ سے وہ علوم مراد ہیں جو لطائف خفیہ (پوشیدہ نکات) سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور تجلی اعظم کے نقطہ انانیت کبریٰ سے متعلق ہیں۔

۴۵۔ تفہیم:

تجلی اعظم کے امور کا اختلاف اور یہ کہ وہ انبیا علیہم السلام کے علوم کے اختلاف کے مطابق ہوتا ہے

تجلی اعظم کے حالات جو کہ قوائے وجوبیہ کا فوارہ ہے، مختلف ہوتے ہیں جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کل یوم ھوفی شان "وہ ہر روز ایک نئی حالت میں ہوتا ہے۔" پس انبیا جو کہ اقدم اور ابدی زبان کے ترجمان ہیں، اس حالت کی جو ان کے زمانہ میں پیدا ہوتی ہے،

اوران کی بعثت اس شان کے لئے ہوتی ہے، خبر دیتے ہیں۔ اور اسی طرح انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام اپنے وجدان کے حاسہ کے ذریعہ بہت سے معارف و معاد و مبدا اور الٰہی نشانیوں کا ادراک کرتے ہیں۔ چنانچہ جونکتہ ان کی تخلیق کے مبدأ میں غالب ہے، وہ سبقت کرتا ہے اور اس نکتہ کے رنگ میں ان کی خبر ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ اسی جہت سے انبیاء علیہم السلام کے علوم کا اختلاف ملتا ہے خواہ شرائع کے تعلق سے ہو یا علم سلوک یا علم معاد وغیرہ کے تعلق سے۔ اور اسی جگہ سے حضرت عیسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلوۃ والسلام کے قول کہ معاد روحانیہ کی لذتیں اپنے لطائف کے جوش سے اور حضرت تجلی اعظم کی شان کے اس میں نقش ہونے اور ملاء اعلی وغیرہ کی لڑی میں پروئے جانے اور سید المرسلین صلوات اللہ وسلامہ علیہ کے قول معاد جسمانیہ، کھانے، پینے، نکاح کی شہوت اور لباس کی لذتیں ہیں، میں فرق کیا جاسکتا ہے۔ اس لئے کہ جس شان کے ترجمان حضرت عیسیٰ علیہ السلام تھے وہ ایک خاص نکتہ اور سرور وح کے نکتہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اور جس شان کے ترجمان حضرت خاتم علیہ الصلوۃ والسلام تھے، اس نے لطائف ظاہرہ لطیفہ جوارح اور لطائف عالیہ سے توجہ فرمائی اور ہر ایک اس کی شان کے مطابق تھا جس کا ترجمان ہوا، کہ حکیم حقیقی کے کارخانہ میں تخمینہ اور اٹکل پچو کا معاملہ نہیں ہے۔ واللہ اعلم

۴۶- تفہیم:

بعض علوم کشفیہ کے بارے میں خبر

اس فقیر کو خبردار کیا گیا کہ مبتدی بلکہ بہت سے وہ لوگ بھی جو خود کو کامل سمجھتے ہیں، اصلا تجلی اعظم یا نفس کلیہ کی حقیقت سے باخبر نہیں ہیں۔ خالص ذات سے بہت دور ہیں، بلکہ وہ جس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اس توجہ میں وہ ان کے نفس ناطقہ کے نقاط کے درمیان ایک نقطہ ہے کہ تجلی اعظم کی صورت، نفس کلیہ سے مشابہ ہے۔ اگر فضل الٰہی سے اس مقام سے جس کی کوئی حد وانتہا نہیں ہے، خلاصی حاصل ہوجاتی ہے تو اور اس نقطہ کے رنگ میں توجہ کے واسطہ سے تجلی اعظم کی حقیقت ہوجاتا ہے۔ اور اس مقام پر ایک عجیب حالت پیش آتی ہے اور وہ حالت یہ ہے کہ تجلی اعظم یاقوت کی مانند چراغ جیسی ہوتی ہے اور شعاع وروشنی اس کا احاطہ کرلیتی ہے اور دور سے ایسی نظر آتی ہے کہ گویا کوئی بڑا انگارہ چمک رہا ہے اور حقیقت میں یہ

انگوٹھی کے نگینہ کے یاقوت کی مانند ہوتا ہے۔ اور اس کی دوسری شعاعیں اور روشنیاں شدت اتصال کی وجہ سے اس کی گنجائش نہیں رکھتیں کہ یاقوت اور اس کی شعاع کے درمیان، نظر فرق کر سکے۔ اسی طرح اس شخص کے اندر جو نکتہ ودیعت کرتے ہیں وہ تجلی اعظم سے مل جاتا ہے۔ اور ان دونوں بصیرتوں کے درمیان فرق نہیں کرتا اور خود بھی متحیر ہوتا ہے۔ اور کبھی خود اپنے اندر تجلی اعظم کا گھل مل جانا سمجھتا ہے۔ اس کے ساتھ اپنا قیام جانتا ہے جب کہ یہ وجود نادر ہوتا ہے جس میں خود کو نابود تصور کرتا ہے جیسا کہ کہا گیا ہے عرض کا وجود اس کے محل کے لئے خود اس کے نفس کے لئے وجود ہے۔ اور کبھی اپنے اندر انانیت کا احساس کرتا ہے اور اس سے تعین وتقید کی ایک قسم اٹھتی ہے جب کہ حقیقت میں اس معاملہ سے ملا ہوا کام تنگ ہو جاتا ہے۔ اور نقیضین کا حکم لگانا پڑ جاتا ہے۔ جب اس فقیر کو اس حالت سے دوچار کیا تو اپنے فضل وکرم سے یہ آگاہی دی کہ اس فقیر کا معاد یہی ہے کہ اس روشنی کی سطح میں غائب ہو جائے اور اپنی انانیت کو تمام دائرہ قدس میں جاری انانیت میں رکاوٹ نہ سمجھے۔ یہ اس قدر ہے کہ یہ روح اور نفس ناطقہ اس کو تعین وتشخص عطا کرتا ہے۔ اور اس کے لئے واسطہ مہیا کرتا ہے کہ جس وقت نفس کلیہ کے سلب سے مصلحت کلیہ جوش مارتی ہے، اس نکتہ کی راہ سے عالم شہادت میں کسی چیز کے فیضان سے اس وقت یہ نکتہ اس کے افاضہ کے واسطہ جارح ہو جاتا ہے۔ اور جس طرح تشخص امر کلی کو جزئی کر دیتا ہے، اس طرح روح اور نفس ناطقہ کا الحاق اس افاضہ کو مشخص کر دیتا ہے۔ اور یہ بھی آگاہی دی کہ اس قبیل کے حجر بحت (نکات) بہت ہیں جو تجلی اعظم کے اردگرد پہنچ جاتے ہیں۔ اور شعاعوں کے رنگ میں اس کے اردگرد احاطہ کر لیتے ہیں۔ اور دائرہ قدس کی وسعت اسی سمت سے پیدا ہوتی ہے۔ حکم کلی کا احکام جزئیہ میں تنزل اسی جہت سے متحقق ہوتا ہے اور یہ سب تجلی اعظم کے جوارح ہیں۔ بلکہ باعتبار قوۃ عازمہ الہیہ نفس کلیہ کے جوارح بلکہ اس سے صادر ہونے والے نفس کلیہ کے اعتبار سے ذات محض کے جوارح ہیں۔ اور یہ سب انانیات کے تزاحم اور ٹکراؤ سے آسودہ ہوتے ہیں۔ اور سوائے اس تعین وتشخص کے کہ جو تشخیص احکام جزئیہ کی مصلحت کے واسطہ ان سے لاحق ہوتا ہے کوئی مغائرت ان کے حال میں تشویش پیدا کرنے والی نہیں ہے۔ اور یہ افراد انسان کے معادوں میں معاد اعظم ہے۔ اور آگاہی دی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لفظ اب وابن کے اطلاق اور لفظ عینیت کے اطلاق سے یہی

معنی مراد ہے۔ اور یہی حالت اس وقت مراد لیتے ہیں جب کہتے ہیں کہ جب اس عالم سے انتقال کرتا ہوں خود کو جمع کرتا ہوں، اور آسمانوں سے گزر جاتا ہوں، اور اپنے والد (بزرگ) کے پہلو میں بیٹھتا ہوں، اور ان کی اجازت سے دنیا کی اصلاح کرتا ہوں، اور آخرت میں زندوں اور مردوں کے لئے شفیع بنوں گا وغیرہ۔ ان نصوص میں سے ہیں جو اس طرح کے معنی پر دلالت کرتے ہیں۔ اور حضرت پیغمبرؐ کی شفاعت کبریٰ سے بھی یہ حالت مراد ہے کہ صلاح عالم کا نزول تجلی اعظم کے نقطہ کے واسطہ سے نفس ناطقہ اور روح کی مدد سے ہے۔ اور اس فقیر کے نزدیک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خود اپنے واسطہ شفاعت کبریٰ بیان کرنے اور ہمارے پیغمبرؐ کے اس کو اپنے واسطہ بیان کرنے میں کوئی ٹکراؤ نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ دونوں ایک ہی نہر سے جوش مارنے والے فوارے اور دونوں ایک ہی بانسری سے ظاہر ہونے والے نغمے ہیں۔ جیسے اگر زید کہتا ہے کہ میں انسان ہوں اور عمرو بھی کہتا ہے کہ میں انسان ہوں اور دونوں کی انسانیت کے ثبوت میں نہ کوئی مشکل حائل ہو رہی ہے نہ ہی کوئی تعارض ہے۔ اور آگاہ کیا کہ نفس کلیہ میں وصول کے بعد علمی تھکن نہیں ہے اور کوئی حال ایسا نہیں ہے کہ جس کو تازگی عطا کریں۔ وہ ایک ایسا وجود ہے کہ اپنے بعض ان متحملات میں جو ثبوت کے مرتبہ میں پوشیدہ تھے، ظاہر ہو گیا۔ اور اس کے مراتب کو پورا کرنے کا متحمل بنا دیا گیا۔ یہ دونوں اصلاً حدوث کی آمیزش سے پاک ہیں اور تجدد کی کدورت سے مبرا جو کچھ بھی ثبوت کے مرتبہ میں پوشیدہ ہو اس کے داخل ہونے سے وجود ظاہر ہو جاتا ہے اور ایک خاص شکل میں نکلتا ہے۔ اور یہ شکل مختلف شکلوں میں اپنے طول میں بھی حقیقت الحقائق میں پوشیدہ ہوتی ہے اور تقدیر کا بھید جس کو انبیاء صلوات اللہ وسلامہ علیہم نے بیان کیا ہے اور اس نہی کی طلب میں پوری کوشش کی ہے، وہ بھی اسی سے متعلق ہے۔ اور آگاہ کیا کہ اصل میں حقیقۃ الحقائق پوشیدہ ہے جس کے کئی ادوار ہوتے ہیں اور ہر دور میں دوسری کسوٹی پوشیدہ ہوتی ہے۔ کل یوم ھو فی شان. ہر روز اس کی نئی شان ہوتی ہے اور ہر شان کے لئے ایک ترجمان چاہئے کہ اس کی فلکی شکل میں اس بھید کے افشا کے قابل ہو۔ چنانچہ اس کی تجلی اعظم کے نقطہ میں اولاً وہ رنگ نازل ہوتا ہے جس وقت اس کی روح اور نفس ناطقہ میں اس سے قطرہ ٹپکتا ہے اور رطوبت متعدی منتشر ہو جاتی ہے اور انہی قطرات اور رطوبتوں سے چشمۂ عین الحیوۃ پھوٹتا

ہے۔ وذلک تقدیر العزیز العلیم. یہ اللہ عزیز وعلیم کا مقرر کردہ نظام ہے۔ اور خبر دار کیا کہ ساری دنیا وجوب کی عنایتوں سے بندھی ہوئی ہے۔ ایک دریا ہے جس کی گہرائی وجوب ہے اور اس کی جوش مارتی ہوئی موجیں امکان ہے۔ اور آگاہ کیا کہ نفس کلیہ، ہیولی اولی میں عمل کرنے والا نقطہ ہے اور نفس کلیہ کے معنی کو نفس نباتی کے قیاس سے سمجھا جا سکتا ہے کہ اس کی اصل استعداد تخم میں پوشیدہ ہوتی ہے اور تخم کو پانی، ہوا اور مٹی کی مدد حاصل ہونے کے بعد وہ استعداد بروئے کار آتی ہے۔ اور اس کا کام اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ پانی، ہوا اور مٹی سے ملنے والے اجزا میں ایک خاص تصرف کرے اور اس کو ایک خاص شکل عطا کر کے جو کہ صورت نوعیہ کا مقتضی ہے اور اس کی صورت فردیہ کے مناسب ہے، ظاہر کر دے۔ اور اسی طرح نفس کلیہ، ہیولی اولی کی سطح میں نقطۂ فعالہ ہے۔ اور ہیولی کے معنی تشخص وتعین کے ہیں چنانچہ تصویر کے تشخص وتعین کی سطح میں مختلف صورتیں اختیار کرتی ہے اور یہ ہیولی تمام موجودات میں ایک طرز مستقیم ہے خواہ وہ قوائے الٰہیہ ہوں جو تجلی اعظم کے واسطہ سے مبعوث کیے جائیں یا امور کونیہ۔ اور تشخص وتعین سے اس جگہ یہ مفہوم ظاہر ہوتا ہے کہ تشخص وتعین سے ہم ایک خاص امر مراد لیتے ہیں جو معنی مذکور کے ساتھ ہیولی اولی اور نفس کلیہ کے مجموعہ میں پیدا ہوتا ہے اور اس کو وجود بھی کہتے ہیں۔ اور یہ آگاہی بھی دی کہ عالم مثال میں شعائر الٰہیہ حقائق کے مانند ہوتے ہیں۔ اور اس سے صورت مثالیہ وسیع پیمانہ پر ان شعائر سے ملتی ہے اور ملائکہ افواج کی شکل میں ان شعائر کا احاطہ کرتے ہیں۔ اور معنی شعائر اشیا کونیہ محسوسہ جن کے واسطہ سے اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جا سکتی ہے جیسے کعبہ کہ اس کا طواف باری تعالیٰ کی عبادت ہے اور قرآن کہ اس کی تلاوت ذریعہ قرب خداوندی ہے۔ اور لفظ اللہ ورحمٰن اور تمام اسماء الٰہیہ کہ ان کا ذکر باعث تقرب الٰہی ہے اور صدقہ اور روزہ وغیرہ اور جو کچھ بھی شعائر اللہ ہوں، بنی آدم پر ان کی تعظیم واجب ہے۔ اور قرآن کی حقیقت سے اس ضعیف پر مخاطب متوجہ ہوتے ہیں اور اس کی حلاوت وطراوت کا ادراک ہوتا ہے۔

۴۷-تفہیم:

شفاعت سیدنا المسیح عیسیٰ علیہ السلام

اصل شفاعت میں اشتراک اور شفاعت کبریٰ میں ایک طرح کا دخل حضرت روح اللہ کو حاصل ہے، اور اس شفاعت کا مرکزی دائرہ ہمارے پیغمبرؐ ہیں۔ اس طرح آنحضرت کی شفاعت کبریٰ سے تخصیص اس جہت سے ہے کہ اس کے علمبردار ہیں اور اس کے دائرہ کے مرکز واقع ہوئے ہیں۔ اور اس کے علاوہ ایسا بھید ہیں کہ جس کو عبارت میں بیان نہیں کیا جاسکتا، صرف اتنا کہا جاسکتا ہے کہ جو نور بھی منبع انوار سے جدا ہوتا ہے۔ اس نور کے مطابق احکام پیدا ہوتے ہیں کہ ان انوار کے تابع پر واجب ہوجاتا ہے اور اس منبع الانوار کو فی حد ذاتہ کسوٹی اور ہر نور میں عجیب اختلاط ہے۔

یار ماچوں آب در ہر رنگ شامل می شود
صافی اندر گوہر است و تیرہ در گل می شود

''ہمارا یار پانی کی طرح ہر رنگ میں شامل ہوجاتا ہے، گوہر کے اندر صفائی ہے اور مٹی کے اندر تاریکی ہوتی ہے۔''

اور ہر مظہر میں ایسا ہے گویا عین ہے اور گویا کوئی دوسری جگہ نہیں ہے جس نے اس میں ظہور کیا ہو جو کچھ بھی ہے سب کچھ اس جگہ ہے۔ اسی باب سے حق کے تراجم وعنوانات ہیں کہ اگر تحقیقات سے کوئی چیز واقع ہوتی ہے تو اس کو خصوصیات اور ظہور کے لوازم میں سے سمجھنا چاہئے۔ اس طرح ہر طرف سے یہ معنیٰ بروئے کار آیا ہے۔

۴۸-تفہیم:

پوشیدہ معارف کا ذکر

الحمدللہ الذی بعث النبیین مبشرین و منذرین والی دین الحق ھادین و داعین.

تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے انبیا کو مبشر ومنذر بنا کر مبعوث کیا اور دین

حق کی طرف ہدایت کرنے اور دعوت دینے والا بنایا۔ پھر ان کی ہدایت کو ان کے بعد کلمہ باقیہ اوران کے اصحاب میں میراث متوارث قرار دیا۔ قائم رہنے والا یکے بعد دیگرے اس کے ذریعہ قائم رہا۔ اوراس کے چلانے سے ایک کے بعد ایک عظیم سلسلہ رہا یہاں تک کہ اس نے نبی آخر کو مبعوث فرمادیا اور وہ تدبیر اول کے سوا ایک تدبیر نازل کرتا ہے۔ اوراس وقت امر کو ازسرنو شروع کرتا ہے اور بھید کو ظاہر کرتا ہے۔ اور جب افضل المرسلین و خاتم النبیین کو مبعوث فرمایا تو آپ سے وعدہ فرمایا کہ آپ کے بعد آپ کے بھید کی اس وقت تک حفاظت فرمائے گا جب تک قیامت واقع ہوگی اور دنیا کو روانگی کی ندادی جائے گی۔

پھر آپ کی امت کے حواریوں کو الہام کیا کہ ایک کے بعد ایک قرآن میں خلیفہ بناتے رہیں تاکہ جس امر کا وعدہ کیا گیا ہے، خلفا اس کا عنوان ہوجائیں اوراس قضا کا وجود بن جائیں جس کو پختہ اور مضبوط کردیا۔ نحمده ونستعينه ونستغفره ونعوذبه من شرور انفسنا ومن سيأت اعمالنا من يهده الله فلامضل له ومن يضلله فلا هادى له واشهد ان لااله الاالله وحده لاشريك له واشهد ان محمدا عبده ورسوله صلى الله عليه وعلى اله واصحابه وبارك وسلم. قال الله تبارك وتعالى يا ايهاالذين آمنوا اتقوا الله وابتغوا اليه الوسيلة وجاهدوا فى سبيله لعلكم تفلحون. "اے لوگو جو ایمان لائے ہو۔ اللہ سے ڈرو اوراس کی جناب میں باریابی کا ذریعہ تلاش کرو! اوراس کی راہ میں جدوجہد کرو۔ شاید کہ تمہیں کامیابی نصیب ہوجائے۔" (المائدہ ۳۵) اوراللہ تعالیٰ نے فرمایا: فلولانفر من كل فرقة منهم طآئفة ليتفقهوا فى الدين ولينذروا قومهم اذا رجعوآ اليهم لعلهم يحذرون "ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کی آبادی کے ہر حصہ میں سے کچھ لوگ نکل کر آتے اور دین کی سمجھ پیدا کرتے اور واپس جاکر اپنے علاقہ کے باشندوں کو خبردار کرتے تاکہ وہ (غیرمسلموں والی روش سے) پرہیز کرتے۔" (التوبہ۱۲۲) اوراللہ تعالیٰ نے فرمایا: ان الذين يبايعونك انما يبايعون الله يدالله فوق ايديهم فمن نكث فانما ينكث على نفسه ومن اوفى بما عهد عليه الله فسيؤتيه اجرا عظيما "اے نبی! جو لوگ تم سے بیعت کررہے تھے وہ دراصل اللہ سے بیعت کررہے تھے۔ ان کے ہاتھ پر اللہ کا ہاتھ تھا۔ اب جو اس عہد کو توڑے گا، اس کی عہد شکنی

کا وبال اس کی اپنی ہی ذات پر ہوگا۔ اور جو اس عہد کو وفا کرے گا جو اس نے اللہ سے کیا ہے، اللہ عنقریب اس کو بڑا اجر عطا فرمائے گا۔" (الفتح ۱۰)

امّا بعد. خادم العلماء والصوفیا اور ان کے بلند مرتبہ دامنوں سے وابستہ فقیر ولی اللہ ابن عبدالرحیم عاملہما اللہ تعالیٰ بفضلہ العظیم کہتا ہے کہ ان معارف پوشیدہ میں سے جن کو صرف اصحاب معرفت تامہ ہی جانتے پہچانتے ہیں، ایک یہ ہے کہ حق کی ہر روز ایک نئی شان ہوتی ہے اور ہر شان کے الگ احکام ہوتے ہیں۔ اور یہی نسخ و تبدیلی کا حق کے ترجمانوں اور ترجموں کے اختلاف اور فاتحین و خاتمین کے وجود کا بھید ہے۔ دورۂ اولی میں حق کی شان یہ تھی کہ عناصر کے تصادم اور ان کے امتزاج کے حادثہ کے معاون کی طرف نظر رحمت سے دیکھا اور ان سے اس طرح خطاب کیا کہ تیرے ذریعہ ربوبیت ظاہر ہوئی، تو میری مخلوقات کے درمیان میری تخلیق کا خلاصہ ہے۔ میں نے جو کچھ بھی پیدا کیا تیری وجہ سے پیدا کیا ہے اور آسمانوں اور زمین کو تیرے لئے مسخر کیا ہے۔ پھر اسی طرح اس کو مخاطب کرتا اور اس سے بات چیت کرتا رہا، یہاں تک کہ دورہ گذر گیا اور صورت معدنیہ نے اللہ کی طرف رجوع کیا اور وہ اس کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ اس کے قریب ہوئی، اس سے چمٹ گئی، پھر صورت معدنیہ پر حق کی طرف سے فیض عجیب صادر ہوا کہ اس کے اندر غذائیت و نمو عطا کرنے والی قوتیں پیدا کیں جس کی وجہ سے اس کے اندر زیادہ استعداد پیدا ہوئی اور نبات ظاہر ہوئی اور معدنیہ پر صورت نباتیہ مشتمل ہوئی۔ معدنیت اس کے اندر پوشیدہ ہوگئی اور شان بدل گئی تب حق نے نبات کی طرف نظر رحمت سے دیکھا اور فرمایا میں نے جو کچھ بھی پیدا کیا تیری وجہ سے پیدا کیا تو میری مخلوق میں میری تخلیق کا خلاصہ ہے تو مقصود ہے اور سارا عالم تیرے تابع ہے۔ پھر اسی طرح اس کو مخاطب کرتا اور اس سے بات کرتا رہا یہاں تک کہ دورہ گذر گیا اور صورت نباتیہ نے اللہ کی طرف رجوع کیا اور اس کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ اس کے قریب ہوئی۔ اس سے چمٹ گئی پھر حق کی طرف سے اس وقت صورت نباتیہ پر فیض عجیب صادر ہوا۔ اس کے لئے وہ سب سے افضل طور پر مستعد ہوئی۔ تب اس کے اندر ادراک، حس، ارادہ اور عزم کی قوتیں پیدا کیں۔ اور حیوان حادث ہوا اور معدنیت و نباتیت پر مشتمل ہوا اور دونوں اس میں پوشیدہ ہوگئیں اور شان بدل گئی۔ اس وقت حق نے حیوان کی طرف نظر رحمت سے دیکھا اور فرمایا تو میری مخلوق کے

درمیان میرا شاہکار ہے تو میرا محبوب ہے۔ تو میرا مطلوب ہے تو عالم کے اندر تعاقد کا واسطہ ہے تو طبیعت اور مخلوق کی ایجاد میں علت غائی ہے۔ پھر اسی طرح اس کو مخاطب کرتا اور اس سے بات کرتا رہا یہاں تک کہ دورہ گذر گیا اور اس نے اللہ کی طرف رجوع کیا اور اس کے سامنے کھڑا ہوا، اس کے قریب ہوا اور اس سے چمٹ گیا۔ تب حق کی طرف سے اس پر صورت انسانیہ کا فیضان ہوا جس سے وہاں موجود تمام اشیا میں سب سے افضل تیار ہوا۔ اور صورت انسانیہ کی اصل پورا لطیفہ، قبیلہ، عقلیہ اور نفسیہ ہے پھر نوع انسانی ظاہر ہوئی۔ ان میں سب سے پہلے آدم علیہ السلام ہیں۔ تب شان بدل گئی اور حق نے ان کی طرف نظر رحمت فرمائی اور فرمایا تو عالم کا پروگرام، منصوبہ ہے اور اس کا اجمال ہے۔ تو عالم صغیر ہے جو عالم کبیر کی حکایت بیان کرتا ہے۔ تو آسمانوں اور زمینوں اور پہاڑوں کے بغیر امانت کے ساتھ قائم ہے۔ میں نے سارے عالم کو تیرے لئے مسخر کر دیا ہے اور بارش برسائی ہے۔ تیرے نباتات کو اگایا ہے، اور تیری وجہ سے زمین میں حیوانوں کو پھیلایا ہے۔ تو میری مخلوق میں میرا محبوب ہے۔ اس طرح اس شان کا حکم ہوا کہ تراجم کو نصب کر کے ان سے قریب ہو، اور اس کی تراجم کی طرف اولاً عروق کی جانب سے اور پھر ملاء اعلیٰ کی جانب سے تجلی اعظم کے نکتہ میں اور میرے اندر روحی کی۔ اور ان کے اندر داعیہ الٰہیہ پھونکا اور ان کو اپنے حق اور مخلوق پر اس کے شعائر کے حق کی تعریف کے لئے مقرر کیا۔ اور اس کے لئے ان کے دلوں اور دماغوں کو مسخر کیا پھر ان کی زبانوں کو قوت گویائی عطا کی۔ اور اس کے اندر اپنے کلام کو اور ہر اس کلام کو جاری کیا جس سے تراجم کا نطق کیا جائے۔ چنانچہ وہ سب اسی منبع سے ہیں۔ اور بنی آدم کے لئے چوپایوں کا ذبح کرنا اس وقت حلال کیا جب شان ان کے لئے ان کی تسخیر کی تھی اور ان کو ان کے سہارے کے لئے مکمل کیا جن پر وہ سوار ہوتے ہیں اور ان کو اپنے قابو میں کرتے ہیں اور ان کا گوشت کھاتے ہیں اور ان کا دودھ پیتے ہیں اور ان کی اون اور چمڑے کے بنے ہوئے لباس پہنتے ہیں اور ان کی کھالوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اور یہود میں سے جس نے ذبح کے حرام ہونے کی بات کہی وہ دورہ کے حکم سے نابلد اور جاہل ہے۔ اور ہمارے نبی محمدؐ اس دورہ کے خاتم اور دوسرے دورہ کے فاتح ہیں۔ یہ پہلی تفصیل ہے اور اسی کی شرح ہے۔ پھر نظر رحمت اس زمانہ میں روح اور راز کی طرف تبدیل ہوئی۔

اور اس زمانہ میں محبوب اور کامل اور مقرب السید المرتضی، امام مصطفیٰ، غایت قصوی اور صاحب مبدأ و منتہا تھے جن کے اندر راز اور روح دونوں لطیف نکات پیدا ہوئے۔ پھر ان کے اندر ان دونوں کے آثار ظاہر ہوئے، پھر اہل ارشاد کو الہام کیا گیا کہ لوگوں کو ان دونوں نکات کی طرف دعوت دیں، اور ان کے نزدیک ان دونوں کے معاملہ کی عظمت بیان کریں۔ اور یہ الہام مسلسل ہوتا رہا۔ اور اس کے ذریعہ فیض پہنچا جس کو آپ یکے بعد دیگرے دیکھیں گے۔ پھر ایک عظیم قوم پیدا ہوئی۔

پھر محمد بن علی العربی کے زمانہ میں نظر رحمت پوشیدہ نکتہ کی طرف متوجہ ہوئی، اس زمانہ میں محبوب وہ شخص تھا جس میں پوشیدہ نکتہ بیدار ہوا۔ اور جس میں نکتہ بیدار نہیں ہوا وہ رجل مقرب نہیں ہے۔ اور نہ اس کی طرف نظر ہوگی، نہ ہی وہ محبوب ہوگا۔ پھر اہل ارشاد کو علوم توحید اور حقیقت واحدہ میں اضمحلال عالم کا الہام ہوا اور الہام مسلسل ہوتا رہا۔ اور اس میں بار بار فیض پہنچتا رہا اور پھر ایک عظیم قوم پیدا ہوئی۔

پھر ہمارے زمانہ میں نظر رحمت تجلی اعظم کے اور میرے نکتوں کی طرف متوجہ ہوئی۔ چنانچہ سید مرتضی، امام مصطفیٰ، غایت القصوی اور صاحب مبدأ و منتہا اور جس کی طرف اشارہ ہے اور جس سے عبارت ہے یعنی جس کے اندر تجلی اعظم اور میں بیدار ہوتے ہیں اور جس میں یہ دونوں بیدار نہ ہوں وہ امام اور سید نہیں ہے اور جس نے نکات کی بیداری کے درمیان اس دورہ کے جمع کا اجمالا و تفصیلا حکم لگایا اور ان دونوں لطیف نکات میں ان کی خصوصیات کے ساتھ گہری نظر۔

اور میرے اوپر برسنے والی اللہ کی نعمتوں میں سے جن پر کہ مجھے کوئی گھمنڈ نہیں ہے، ایک یہ ہے کہ مجھے اس دورہ کا ناطق اور حکیم اور اس طبقہ کا قائد اور زعیم بنایا۔ میری زبان کو گویائی عطا کی اور میرے نفس میں پھونکا۔ اب اگر میں قوم کے اذکار اور اشغال سے نطق کرتا ہوں تو ان کے جوامع سے نطق کرتا ہوں اور ان کے تمام مذاہب پر آتا ہوں۔ اور اگر ان کی آپس کی اور ان کے اور ان کے رب کے درمیان کی نسبت کے بارے میں بات کرتا ہوں تو مجھے ان کے کاندھے دکھائے جاتے ہیں اور ان کے جوانب و اطراف کھول دیئے جاتے ہیں اور ان کے کوہان کی بلندی پوری کر دیتا ہوں۔ اور ان کی تکمیل کے مجامع کو پکڑ لیتا ہوں۔ اور اگر لطائف انسانیہ کے اسرار کو خطاب کرتا ہوں تو اس کی گہرائیوں میں جا کر حقائق کا پتہ لگاتا ہوں

اس کی کمزوری کو دور کرتا ہوں اور ان کی قمیضوں کو پکڑتا ہوں اور ان کے کاموں کو درست کرتا ہوں۔ اور اگر دراز ہو جائے تو نفوس اور ان کے مبلغ کا علم ظاہر ہو جاتا ہے۔ اس طرح میں اس کو بیان کرنے والا پہلا شخص ہوں۔ ان کے سامنے ایسی عجیب باتیں بیان کرتا ہوں جن کا کوئی شمار نہیں اور ایسی عجیب باتیں کہ جو اس سے چپکتی نہیں اور نہ ہی ان کے جمنے کی امید کی جاتی ہے۔ اور اگر میں علم شرائع ونبوات سے بحث کرتا ہوں تو میں اس میدان کا شیر ہوں اور اس کھلیان کا محافظ ہوں۔ اور ان خزانوں کا وارث اور ان کی خرید وفروخت کا ماہر ہوں۔

وكم لله من لطف خفي

يدق خفاه عن فهم الذكي

''اللہ کی کتنی ہی باریکیاں پوشیدہ ہیں، ان کی پوشیدگی ذہین آدمی کی فہم سے زیادہ باریک ہے۔''

اور اس کے بعد ہمارے بھائی فاضل کامل، اپنے کامل آباؤ اجداد کے رازداں اور اپنے اجداد کے وارث جو میزان علم وعمل میں سبقت لے جانے والے، سب کو جوڑنے والے تھے، لغزشوں اور خطاؤں کے اسباب سے پوری طرح اجتناب کرنے والے غایت پر پہلے پہنچنے والے، صاحب نشانی شیخ محمد عاشق بن مولانا مکرم معظم، فضائل عظیمہ کسبیہ ووہبیہ سے متصف شیخ عبیداللہ متع الله المسلمين ببقائه بن شیخ اکمل واعظم عارف ولی اللہ الصمد مولانا شیخ محمد قدس اللہ سرہ العزیز اور وہ ہیں کہ اللہ ان سے راضی ہوا میں نے اپنے نانا، اپنی والدہ کے والد اور ان سے بہت سی اشیا وراثت میں پائی ہیں۔ جب اپنے نفس میں تامل کرتا ہوں تو ان کو دیکھتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے متواتر کثرت سے ان پر اپنی نعمتوں کی فراوانی فرمائی جن کا کوئی حد وشمار نہیں۔ نہ ہی اس بارے میں کسی کو کوئی بحث ہے، اور نہ ہی اس کا کوئی امکان ہے، کہ ان کی پہلی نوازش سے میری محبت کو چھوڑ دیں۔

اور میرے سید والد، صاحب کرامات جلیلہ ومقامات جزیلہ تھے قدس سرہ العزیز۔ مجھے دکھایا گیا کہ میں اور وہ اللہ کے لئے محبت کرنے والے ہیں، چنانچہ وہ کہتے تھے اور اس کے ذریعہ مجھے خوش کرتے تھے۔ قریب ہے کہ ان کی ایک شان ہو پھر مجھ سے طریق حق کی طلب کا الہام کیا اور اس طریقہ میں مجھے حکم دیا اور محبت عظیمہ عطا کی جو اپنے ظاہر وباطن میں اور قلب و

قالب میں بہت کافی تھی اوران کی زبان نے مجھ سے اخذ کرنے میں اقبال تام عطا کیا۔تب اللہ تعالیٰ بلندیوں پر چڑھنا آسان فرماتا رہا یہاں تک کہ میں نے ان میں اپنی اور تجلی عظیم کی باریکی کو بیدار ہوتے دیکھ لیا۔اور حتیٰ کہ میں نے ان میں تمکن تام اور استقرار قوی دیکھ لیا اور میں ان کے احوال کی تبدیلی اوران کے اقوال کے تذبذب سے مامون ہوگیا۔اور میں نے دیکھا کہ ان کے لئے ان کے اوران کی عین ثابتہ کے درمیان باب کھل گیا۔تب وہ بغیر کسی تقلید کے اس کے منبع سے جو کچھ چاہتے ہیں، لے لیتے ہیں اور میں ان کے اخلاق واعمال سے راضی ہوگیا اور میں نے ان کے اطوار واوضاع کی تحسین کی۔

اور میں نے خواب میں دیکھا کہ میں ملائکہ اور ارواح صالحین کی ایک جماعت عظیم میں بیٹھا ہوا ہوں کہ اچانک مجھے ایک صحیفہ ملا جس میں اسماء اللہ الحسنیٰ لکھے ہوئے ہیں، میں نے چاہا کہ اس کو اپنے برادر مذکور کے نام سے پڑھوں اور اشارہ اسی کی طرف تھا تو میں نے اس میں تین اسما پڑھے السید، الرحمٰن اور الرحیم۔پھر مجھے ایک دوسرا صحیفہ ملا جس میں اسماء نبیؐ لکھے ہوئے تھے تو میں نے ان میں سے بھی اس کے نام پر اوراس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پڑھا تو میں نے اس میں دو نام پڑھے السید اور ابو فاطمہ۔پھر میں نے بیدار ہونے سے پہلے یہ سمجھ لیا کہ عنقریب ان کو ایک شان حاصل ہوگی اور جلد ہی ان کو اللہ تعالیٰ کے اوراس کے نبی مصطفیٰؐ کے اسماء سے خوشبو کا ایک حصہ ملے گا۔

اور سید اور ابو فاطمہ کی تخصیص کے بھید میں واللہ اعلم، میرا خیال یہ ہے کہ اللہ کی طرف دعوت ہے۔ان کے بعد بھی کلمہ باقی رہے گا اوران کی ذریت میں ہمیشہ رہنے والا عطیہ ہوگا۔ اور ایک دن میری زبان پر جاری ہوگیا اور مجھے اس میں شک نہیں ہے کہ وہ زبان پر بطور عادت جاری ہونے والا نہیں تھا بلکہ اس طرح جاری ہوا کہ یہ شعر اس کے مخاطب میں نہیں تھا

وانی وان خاطبت الف مخاطب

فانت الذی اعنی وانت المخاطب

”اور میں اگرچہ ہزاروں مخاطبوں کو خطاب کرتا ہوں، لیکن میری اصل مراد تو ہی ہے اور تو ہی مخاطب ہے۔“

اور وہ اللہ کے فضل وکرم سے مجھ سے پُر خلوص تعلق رکھنے والے، میرے علم کو محفوظ

رکھنے والے، میرے اسرار کے محافظ اور میری کتابوں کو سمجھنے والے ہیں۔ بلکہ ان میں سے بہت سی کتابوں کی تحریر، تصنیف وتالیف کا سبب ہیں اور بہت سی کتابوں کی تمبیض میں شریک رہے ہیں۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ میرے علوم لوگوں میں اسی کے واسطہ سے باقی رہیں گے۔ واللہ اعلم۔ مجھے الہام کیا گیا کہ لوگوں میں ان کی خبر عام کردوں اور ان کے بھید کو پردہ میں نہ رہنے دوں اور ان کو یوں ہی نہ چھوڑ دوں۔ چنانچہ میں نے ان کو خرقۂ صوفیا پہنا دیا جو نیابت اور حفاظت کا لباس ہے جیسا کہ مجھے سیدی والد صاحب نے نیابت اور حفاظت کا لباس پہنایا تھا۔ اور جس طرح شیخ ابوطاہر المدنی نے پہنایا تھا اور بحمد اللہ ان دونوں کے خرقے اولیا کے تمام خرقوں کو اپنے اندر لئے ہوئے ہیں۔ انشاء اللہ تعالی۔ اور میں نے انہیں اجازت دی ہے کہ اشغال صوفیا کی تلقین کریں خواہ وہ مجھ سے سنے ہوں یا نہ سنے ہوں کہ وہ بحمد اللہ ان لوگوں میں سے ہیں جو اس اجتہاد کے سلسلہ میں خصوصیت کے حامل ہیں اور ان کی فراست پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ اور یہ کہ راہ سلوک کے مریدوں میں تصرف کریں۔ اور لوگوں کے تمام طبقات میں فتوح اختیار کریں، اور یہ کہ حدیث، تفسیر، فقہ اور تمام علوم دین کا درس دیں جو انہوں نے مجھ سے حاصل کئے ہیں۔ یا مشائخ الحرمین المحترمین علیہم رحمۃ رب العالمین سے اخذ کرنے میں میرے ساتھ شریک رہے ہیں۔ اور یہ کہ لوگوں کو بیعت کریں اور ان کو صوفیا کا خرقہ پہنائیں۔ اور یہ کہ جب بھی انہیں یا ان کے اصحاب کو کوئی مرض یا حاجت وغیرہ پیش آئے آیات اسما اور ادعیہ ماثورہ پڑھیں۔

اور خاص ان کے نفس کے سلسلہ میں خلوت وجلوت میں اللہ کے تقوی کی وصیت کرتا ہوں اور ان کے ساتھ جو طالب ہیں، ان کو وصیت کرتا ہوں کہ شفقت پر کسی قسم کی طمع رکھے بغیر ان کی صحبت اختیار کریں۔ اور ان سے اور ان کی اتباع کرنے والوں سے کہتا ہوں کہ جو کچھ لوگوں کے پاس ہے، اس سے بالکل مایوس ہوجائیں باہم اعزا بن کر رہیں اور اللہ عزوجل کے سوا کسی سے سوال نہ کریں۔ اور اللہ کے فضل کے علاوہ کسی سے طمع نہ رکھیں اور علم اور طریقت میں ان کے مشائخ کے سلسلہ میں وصیت کرتا ہوں کہ ان کے ساتھ نیکی کریں، اور ان کے تاثر کو پھیلائیں، اور ان کا صرف ذکر خیر کریں، اور ان کی نسبت سے ہمیشہ نرم رہیں، اور ان کو وصیت کرتا ہوں کہ میرے اور میرے بعد والوں کے لئے دعا کریں۔ اور یہ کہ علوم دین

کی اقامت کے سلسلہ میں مجھ سے جو خواہش کی جائے، اس میں مجھے تقویت پہنچائیں۔

اور میں ان کو جانتا ہوں کہ ان میں لطیفہ روحیہ ایک طرح سے ضعیف ہے اور اسی وجہ سے نفس سے تاریکی کا دھواں ان کی طرف بڑھتا ہے اور ان کے اندر تلخی پیدا کر دیتا ہے۔ جس سے تشویش پیدا ہوتی ہے مگر یہ ان کے لئے نقصان دہ نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ قلق خاطر اور انقباض صدر پیدا ہوتا ہے اور نہ ہی یہ ان کے اصحاب کے لئے نقصان رساں ہے کہ ان کے قلب کی جڑ میں ایک راز ہے جس سے وہ ہر حال میں نفع اندوز ہوں گے۔

اور میں جانتا ہوں کہ ہر زمانہ کی ایک شان ہوتی ہے اور اس زمانہ کی شان یہ ہے کہ لطائف بارزہ و متوسط اجمالی طور پر مہذب ہوں۔ اور حکمت، مصلحت کلیہ کی موافقت ہے اور انقیاد وقت کی شان ہے۔ اس لئے آپ کے دل میں اس کی تہذیب کے آثار کے ظہور کی کمی سے کوئی حرج پیدا نہیں ہونا چاہئے۔ اور میں نے ان کو ان تمام کتابوں کی روایت کی اجازت دی ہے جو میں نے متنوع علوم سے تصنیف کی ہیں جو انہوں نے مجھ سے پڑھے ہیں وہ اکثر ہیں۔ یا نہیں پڑھے۔ اور اس طرح میں نے ہر اس شخص کو اجازت دی ہے جو ان کی نسل سے ایک کے بعد ایک طبقہ کی شکل میں میرے علم کی نشر و اشاعت کے لئے کھڑا ہو۔ اس طرح ان میں سے ہر ایک میری طرف سے بغیر کسی واسطہ کے مجاز ہے۔ اور ان میں سے ہر ایک انشاء اللہ اپنے نفس میں اللہ کی تائید اور اس کے لطف سے اس طرح اس اجازت کا اثر دیکھے گا کہ وہ ہمارے علوم سے وہ کچھ حاصل کرے گا جو دوسرے حاصل نہ کر سکیں گے۔ یہ ایک بھید ہے جو میرے دل میں ڈالا گیا، اور ایک بجلی ہے جو میرے دل میں چمکی۔ میں نے ان کو اور ان کے اصحاب اور ذریت میں سے صالح لوگوں کو اللہ کے پاس امانت رکھ دیا ہے۔ وہ اللہ کے پاس میری امانت ہیں، اور امید کرتا ہوں کہ اللہ میری امانت کی حفاظت فرمائے گا اور میرے ترکہ کی نگہداشت فرمائے گا۔ اور ان کے ذریعہ جادۂ جلیلہ سنیہ چلاتا رہے گا۔ اور ان کے ذریعہ قوی وصاف راستہ کو ثابت فرمائے گا۔ اور ان کو دین نبیؐ کی نشر و اشاعت اور آپ کی حدیث کی روایت کی توفیق عطا فرمائے گا۔ اور ان کے ذریعہ اہل قرن کے ایک کے بعد ایک طبقہ کو اپنی مدد اور عنایت سے ہدایت عطا فرمائے گا، کہ وہ قریب و مجیب ہے۔ میں نے یہ سطور یکشنبہ ۷ ربیع الاول ۱۱۵۵ھ کو قلم بند کی ہیں والحمد للہ اولا و آخرا و ظاہرا و باطنا۔

والحمدلله الذی بنعمته تتم الصالحات وعلی فضله المعول فی جمیع الحالات وصلی الله علی سیدنا محمد واله و صحبه اجمعین

''اور تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس کی نعمت سے اعمال صالحہ کمال کو پہنچتے ہیں۔ اور تمام حالات میں اسی کے فضل سے فریاد کی جاسکتی ہے۔ اور اللہ رحمتیں فرمائے، سیدنا محمد اور آپ کی آل واصحاب تمام پر۔'' امابعد۔ یہ وہ بات ہے جو زبان پر جاری ہوئی ہے اور ہمارے برادر مذکور کے تاثر سے انگلیوں کے پوروں نے حرکت کی۔ کان اللہ تعالیٰ لہ اور ان کے لئے میرے نزدیک اس سے بھی زیادہ درجہ ہے، اور میرے دل میں ان کا مقام و مرتبہ ہے، اور ان کے حق میں بشارتیں ہیں، اور ان کے لئے جن چیزوں کے اشارات ہیں ان کو سمجھانے سے نہ سمجھا جاسکے گا، اور نہ ہی ان کا کلام پوری طرح احاطہ کر سکے گا، اور تھوڑا زیادہ کا نمونہ ہوتا ہے (چاول کے چند دانوں سے دیگ کا حال معلوم کیا جاسکتا ہے) چلو بھر پانی بحر کبیر کی حالت بتا دیتا ہے۔

وراء ذاک فلا اقول لانه

سرلسان النطق عنه اخرس

''اس سے آگے میں کچھ نہیں کہتا، اس لئے کہ یہ ایک راز ہے جس سے نطق کی زبان خموش ہے۔''

والحمدلله اولا واخرا وظاهرا وباطنا المطلوب من اخینا المشارالیه وذریته ان یشرکوا معهم فی الدعاء لانفسهم اخانا خواجه محمد امین کان الله له الکاتب لهذه الصحیفة والباعث علی تسویدها زادالله تعالیٰ فی توفیقه واوصله الی مایتمناه. بل الی ماهو فوق تمناه. واسبل علیه کنفه الذی یسبل علی اولیائه برحمته انه قریب مجیب.

''اور تمام تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں اول بھی آخر بھی، ظاہر بھی باطن بھی۔ اور ہمارے جس بھائی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اس سے اور اس کی ذریت سے یہ مطلوب ہے کہ وہ اپنے ساتھ اپنے لئے مانگی جانے والی دعا میں ہمارے بھائی خواجہ محمد امین کان اللہ لہ کو بھی شریک کرلیں جو اس صحیفہ کے کاتب اور اس کے مسودہ کی تیاری کا باعث ہیں۔ اللہ ان کو

مزید توفیق عطا فرمائیں اور ان کی تمناؤں کو پورا فرمائیں بلکہ ان کو بھی جو ان کی تمناؤں سے بڑھ کر ہیں اور ان کو اپنی رحمت وحفاظت کے پردوں میں ڈھانپ لیں۔ جن میں وہ اپنی رحمت سے اپنے اولیا کو ڈھانپتے ہیں۔

۴۹-تفہیم:

نفوس کاملین کے معاد کے لئے درجۂ اعلیٰ

نفوس کا معاد جسموں سے جدا ہونے اور اتنی مدت گذرنے کے بعد کہ اس میں اس کے مالوفات و مانوسات کا غبار تہ نشین ہو جائے، اس عالم کی طرف ہوتا ہے جو اس کے نقاط میں سے نقطۂ عالیہ کا دائرہ ہے۔ چنانچہ نفوس کمال کا اعلیٰ معاد دو چیزیں ہوتی ہیں یا تو یہ کہ نقاط نفس کے درمیان سے تجلی اعظم کا نقطہ ان پر غالب ہوتا ہے اور وہ اپنے دائرہ میں جو کہ تجلی اعظم ہے، جدائی کے دو مرحلوں میں پیش آتا ہے۔ یا یہ کہ نفس کلیہ کو اپنے اوپر طاری کرتا ہے اور پہلے علوم مصلحت کلیہ اور تدبیرات جمالیہ کو اس کے اوپر مفتوح کرتا ہے۔ دوسرے علم انانیۃ کبریٰ اس نفس جزئیہ کے درمیان سے فوارہ کی طرح جوش مارتا ہے۔ اور تیسرے مفارقت کے بعد رجوع کر کے یہ نقطہ اور وہ سب کچھ جو نفس کلیہ میں نقش ہے، اپنے دائرہ میں اس نفس جزئیہ میں نقش ہو جاتا ہے۔ اور وہ نسخہ اجمالیہ نفس کلیہ ہوتا ہے، اور چند مصالح جو اس مقام سے وابستہ ہوتے ہیں، مکمل ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد شان الٰہی اپنا کام کرتی ہے اور یہ نفس معدوم ہو جاتا ہے۔

اس معاد سے نیچے دو جنس واقع ہیں اور اس کی ہر جنس کے دو نشیب اور ایک بلندی ہوتے ہیں۔ اور نشیب و بلندی کے ہر مرتبہ کی ایک سعادت ہوتی ہے۔ اور ان نفوس اول کی جنس کی ایک شقاوت ہوتی ہے۔ کواکب کے قویٰ کی طرف ان کا میل طبعی بہت زیادہ ہوتا ہے۔ اور اس جنس کی بلندی وہ ہے جو ان کواکب کی حقیقت سے لوٹتی ہے۔ اور ان کواکب کے معانی کی وسعت میں ان نفوس کی ایک صورت ہیولی ہوتی ہے اور استعداد کے لحاظ سے یا ان کو کم کرنے کے لحاظ سے اس مقام سے ایک خوشی حاصل کرتے ہیں جو اس کے لئے بعض ہیئات حسیہ کی جہت سے مستعد ہوتے ہیں جو کہ اس کی صحبت اختیار کرتے ہیں، ایک حد تک

رنجیدہ ہوتے ہیں۔ اس وقت رحمت رب العالمین آگے آتی ہے اور و کشفنا مابہ من ضر (اس کو جو ضرر پہنچنے والا ہوتا ہے، ہم اس کو دور کر دیتے ہیں) کے معنی جلوہ افروز ہوتے ہیں۔ اور اس جنس کا نشیب یہ ہے کہ ان کواکب کے منسوبات بعض سے میل کھاتے ہیں۔ اور اس علاقہ کی قدرتی نباتی وحیوانی اشیا واقع ہوتی ہیں اور ان نفوس کی جنس کا مقتضی اس وقت تدبیر کلی ہو جاتا ہے۔

اس بحث کو شارع نے بیان نہیں کیا ہے، ان کے بیان نہ کرنے کا سبب یہ ہے کہ ملاء اعلیٰ کے شیوع اور ان کے انوار کے ظہور کے بعد قوائے کواکب کی جو کسوٹی ہونی چاہئے نہیں ہوتی۔ اور شریعت اس عالم کا حکم اور اس کی شان زیادہ تر بیان کر دیتی ہے جیسا کہ بہت سے مقامات پر ہم اشارہ کر چکے ہیں۔

اور ان نفوس کی جنس ثانی وہ ملائکہ ہیں کہ قوائے ملاء اعلیٰ اور عالم مثال ان پر غالب ہوتے ہیں۔ اور ان کے معاد کی جو بلندی ملاء اعلیٰ سے ان کے عکس اور ضو کے حجاب سے ان نفوس میں لاحق ہوتی ہے، وہ ان کے معاد کی پستی اور تغیر کے بغیر بعض عالم جزئیہ سے لاحق ہوتی ہے کہ ان معانی میں ملاء اعلیٰ ان نفوس کی استعداد کے مطابق عالم مثال کے قوی سے مخلوط ہو جاتے ہیں۔ ہر نفس کے لئے ایک الگ رنگ متعین ہوتا ہے کہ وہ رنگ دوبارہ نہیں ہوتا۔ ہر نفس کا الگ رنگ ہوتا ہے کہ کوئی دوسرا نفس اس میں اس کا شریک نہیں ہوتا۔ وما یعلم جنود ربک الا ھو "تیرے رب کے لشکروں کو خود اس کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔"

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ عالم حیات میں ہر نفس کو اپنے معاد کی طرف کشش اور میلان ہوتا ہے۔ اور اس مقام کے علوم سے ایک حصہ حاصل ہوتا ہے۔ اور ایسا کیوں نہ ہو کہ اس نفس کی استعداد اتنی ہوتی ہے کہ یہ اس معاد کا مقتضا ہو جاتا ہے۔ یہ سب اقوال ہو جاتے ہیں اور وہ سب افعال۔ یہ سب اجمال ہو جاتا ہے اور وہ سب اجمال کے علم کی تفصیل۔ اور تفصیل کا معاد اور اطمینان ہر سالک کو اس حالت میں حاصل ہوتا ہے کہ خود معاد کے نقطہ سے علم اور حال کے اعتبار پر پہنچ جاتا ہے یہ علم کبیر ہے۔ اس کو معلوم کر لو، میلان اور اطمینان میں بنی آدم کے اختلاف کے راز سمجھ لو۔ اور معاد کے بیان میں ہر زمانہ میں حق کے ترجمانوں کے اختلاف راز کا ادراک کر لو۔ وماتوفیقی الا باللہ علیہ توکلت وھورب العرش العظیم

۵۰-تفہیم:

عارف کے احوال کے اختلاف کی وجوہ

عارف کی نسبتوں کا اختلاف، معاملہ کے زمانوں کے اختلاف کے لحاظ سے مقرر ہوتا ہے۔ خواجہ نقشبندان کے اختلاف کو اجمال و تفصیل وغیرہ کے اعتبار سے قبض اور بسط سے تعبیر کرتے ہیں۔ بعض اوقات اچانک جمعیت اتنی نیچے اتر جاتی ہے کہ باوجودیکہ دل کو امور سفلی میں مشغول کر دیتی ہے وہ جمعیت نہیں گذرتی۔ اور بعض اوقات اس قدر زیادہ ہمت سے کام لیتی ہے کہ اس کا عشر عشیر بھی ہاتھ نہیں آتا۔

اب اس بارے میں کہنا چاہئے کہ اس اختلاف کا سبب کیا ہے؟ بہت سی دفعہ کے وجدان کے طریقہ سے معلوم ہوا ہے کہ اس اختلاف کا سبب اعظم، احوال فلکیات کا اختلاف ہے۔ چنانچہ شمس کے ساتھ قمر کی تثلیث اور تسدیس کے وقت اور اسی طرح زہرہ یا مشتری کے ساتھ اس کے قران تثلیث اور تسدیس کے وقت، اور اسی طرح ثریا یا سعد ذابح یا رنگین کیفیت سے گذرنے کے وقت اور اسی طرح ہیئت محمودہ و مسعودہ سے فضا بھر جاتی ہے۔ اور کیفیت محمودہ اور نفس عارف اس کیفیت سے ٹکراتی ہے۔ چنانچہ اس کی نسبت اس کے لحاظ سے متغیر ہو جاتی ہے اور اسی پر اس وحشت اور انقباض کو قیاس کرنا چاہئے جو فلکیات میں نحس و متوحش ہیئتوں کی جہت سے پیدا ہوتی ہے۔ اور کبھی یہ اختلاف یومیہ فلکیہ کی ہیئتوں کے ساتھ اس کے طالع کے دائرہ کی نسبت کے اختلاف کے لحاظ سے ہوتا ہے اور اس کی تحقیق انتہائی مشکل ہے۔

بالجملہ اس قدر جاننا چاہئے کہ اہل ارض پر روحانی ملکی ہیئتوں کے افاضہ کے اختلاف میں اور عارف کے احوال کے اختلاف میں فلک کے احوال کے اختلاف کو بہت قوی دخل ہے۔

شب قدر وہ رات ہے کہ اس میں ہیئات فلکیہ ہیئات روحانیہ ملکیہ کے عام ہونے کی مقتضی ہوتی ہیں جب کہ وہ مسلمانوں کے صیام و قیام کی برکات سے بہرہ ور ہوتی ہیں کہ اس کا حکم روز عرفہ اور استسقا کے حکم کے مانند قیاس کرنا چاہئے۔ چنانچہ جب برکات ارض اور برکات سما دونوں جمع ہو جاتی ہیں، اس وقت جو طاعت و عبادت متحقق ہوتی ہے، اس کا ثواب دو چند ہو جاتا ہے اور جو دعا اس وقت مانگی جاتی ہے قبول ہوتی ہے۔ والحمدللہ اولاً و آخراً وظاہراً و باطناً۔

۵۱-تفہیم:

مخلوقات میں کواکب کی تاثیر

اس فقیر کو آگاہی دی گئی کہ چشمِ زخم اور ہوس رانی میں تاثیر کا سبب اور ہمت وہی ہے جس کو ہم نے بسط خالص میں عالم عناصر کے عنوان سے ظاہر کیا ہے اور جو کچھ عناصر میں مقرر ہے سب کچھ کواکب کے ساتھ مسخر ہے۔ چنانچہ جس وقت نفس کلیہ نفس جزئیہ ہو جاتا ہے ہر قوت جو صورت عالم میں اختیار و اقتدار رکھتی ہے۔ اس نفس جزئیہ کی صورت میں بھی وہی قوت سلطان ہوتی ہے اور اس کی سعادت و شقاوت اسی قوت کے لحاظ سے ہوتی ہے۔ اور چونکہ ہر عالم کی تخلیق کی بنیاد مصلحت کلیہ اور تدبیر پر ہوتی ہے، تمام افراد اس قوت سے متاثر ہوتے ہیں، اس لئے نفوس جزئیہ میں درج ہیئتیں عالم حس کے تغیرات میں بہت سے امور کے صدور کا منشاو مرکز ہو جاتی ہیں۔ یہ اس کی مراد کے حصول میں تمام نفوس کا متاثر ہونا ہے اور یہ تغیر مندرجہ نقطہ کے سبب سے ہوتا ہے۔ اور یہ نفس، نفس کلیہ میں شمس کے مقابلہ میں ہوتا ہے۔ اور اس سے تمام نفوس اس کی بے کیف محبت میں متاثر ہوتے ہیں اور وہ زہرہ کے عجائبات کا ایک شعبہ ہے۔ اور ان سب میں ہمت کا بندھنا، نظر بد لگنا اور ہوس رانی دکھانا ہے۔ اور اس سے مراد قوت ہے جو مریخ کے مقام پر نفس جزئیہ میں عالم خارج میں ہوتی ہے۔ اور نحوست و سعادت کا سبب اس کے قوی کا ان قوی نفس کے ساتھ سوئے ترتیب ہے جن سے اس کا معاملہ ہوتا ہے۔ وہ ایک ایسا نفس ہے کہ اس میں مریخ بیت اول میں واقع ہوتا ہے۔ زہرہ کو دیکھنے والا جاری بیت میں نظر مودت سے دیکھتا ہے۔ چنانچہ ضروری ہے کہ اس کے نفس میں مریخیت پائی جائے کہ اپنے راستوں سے اس عشق جاری کو پیدا کرے۔ اور اس سے تدبیر کا جو مقتضی ہوتا ہے اس کو عالم جاریہ میں پیدا کرتا ہے جو کہ قوت زہرہ میں پیدا ہو چکا ہوتا ہے اور اس کے نفس کی ہیئت میں تعلق خاطر اور گرمی محبت سے مریخ کا رفیق ہونا درج ہوتا ہے۔ اور اس پر ان تمام معاملات کو قیاس کرنا چاہئے جو نفوس کے درمیان گزرتے ہیں اور ان کی ایک دوسرے سے تاثیر و تاثر ہوتے ہیں اور یہ ایک بہت بڑی معرفت ہے۔ فتدبر۔

۵۲-تفہیم:

اہل اللہ کے نفوس سے مدد طلب کرنا

حوادث آفاقی سے امور نفسی میں اہل اللہ کے نفوس سے مدد طلب کرنا دو طرح سے ہوتا ہے۔ایک ان لوگوں کی جماعت ہے جو تجلی اعظم سے عجیب آمیزش پیدا کئے ہوئے ہوتے ہیں اور عجیب طرح سے غوطہ لگا کر اور اضمحلال نادر حاصل کر کے حضرت تجلی اعظم نے اس معنی میں جو اس کے شایان شان ہے، معاملہ کیا۔اور اپنی ایک شعاع سے یا اپنی اعراض سے تصور کیا اور علم تجلی اعظم اپنی انانیت کے ساتھ اس کی تجلی اعظم میں اس طرح شامل ہو گیا گویا خود اس کا عین ہے۔اس نے بھی اس معاملۂ کریمانہ کو شکر کے ساتھ ادا کیا اور خود کو درمیان سے الگ کر لیا کہ جس جگہ تو ہوگا کسی شخص کو وہاں رہنے کی کیا مجال؟ یہ نفی واثبات کی عجیب ہیئت پیدا ہوئی اور معیار نوری ہو گیا۔گویا پیمانہ کو آفتاب کی شعاعوں سے پر کر دیا۔ایک شخص اس پیمانہ سے نور کو لٹکاتا ہے بلکہ ملاتا ہے اور خود کو اس کے در پر ڈال دیتا ہے کہ میں اس در کا غلام ہوں، میرے لئے اس در کے علاوہ کوئی جگہ نہیں ہے۔اس طرح یہ نیاز مندی جود وکرم کے اس باب کو جو حضرت تجلی اعظم کے لوازم سے ہے، ہر قالب میں داخل ہو کر، جیسا کہ شیخ اکبر نے کہا ہے کہ رب، رب ہے چاہے نیچے اتر آئے، قرعہ ڈالتی ہے، اور اس قرعہ کے مطابق تجلی اعظم کا قبول نزول فرماتا ہے اور وہ اثر جو جامع حکم مادہ وصورت ہے، متحقق ہوتا ہے، اس جگہ کہاں ہمت اور کہاں تعریف۔یہ شخص اپنے آپ میں گرویدہ ہے اور نئے نئے دواعی اپنے آپ نیچے گرتے ہیں۔اور ایک جماعت صفائی کی بعض توجہات کے اعتبار سے اور ایک جمعیۃ قوائے سفلیہ کی شورش پیدا کرتی ہے۔اس صفا کے ساتھ ملا دیتی ہے اور نفسانی معرکوں میں ضرب وحرب برپا ہو کر، ہمت ودعوت کے رنگ میں دوسرا لباس پہن لیتا ہے، اور ان دونوں امور میں بڑا فرق ہے۔

کارپاکاں را قیاس از خود مگیر
گرچہ باید درنوشتن شیر شیر

”بزرگوں کے کاموں کو اپنے اوپر قیاس مت کرو، اگرچہ لکھنے میں شیر (درندہ) اور شیر (دودھ) ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔“

۵۳-تفہیم:

قدیم سے حادث کا صدور اور اس کی کیفیت

مصلحت کلیہ کس طرح رہتی ہے۔ استاد دانا، قالین کے تانے بانے کو اس طرح رکھتا ہے کہ آخر امر میں متناسب پھول اور ایک ہی جیسے دائرے اور برابر برابر ٹکڑے بن جاتے ہیں۔ اس لئے تانے بانے کو اس طرح آراستہ کرنا ثبوت پیش کرنے میں تمام امور مطلوبہ کی تحقیق ہے، اور یہی عقل عالم کا وجود ہے۔ اور ان امور کا ایک خاص صورت میں ارادہ کرنا اور اس کے عزم کا اظہار کرنا عنایت ہے۔ اور اس عنایت کا باعتبار مطمح نظر ہونا مصلحت کلیہ کے امور کے اجراء میں ہے۔ چنانچہ اگر اس مصلحت کلیہ کے ساتھ اجمالا وتفصیلا احاطہ نہ کیا جائے تو اس استاد دانا کے افعال کے تناسب کو نہیں پہچانا جاسکتا۔ اگر مورچہ (ایک چھوٹی چیونٹی) صرف ایک دائرہ کے اوپر سے گزرتی ہے تو وہ اس دائرہ کی تحقیق کی حکمت اور اس کے حسن کی وجہ کو نہیں سمجھ سکتی۔ اسی طرح زندانیان انانیات جزئیہ خاصہ، مصلحت کلیہ کی معرفت سے عاجز ہوتے ہیں۔

پشہ کے داند کہ بستان از کے است
دربہاراں زاد و مرگش ازوے است

"مچھر کیا جانے کہ باغ کب سے ہے، وہ تو اس بہار میں پیدا ہوا اور اسی میں مرگیا۔"

جی ہاں کلیہ اطلاقیہ کے قوی کی ایک جماعت کو انانیت صغری کے درمیان سے جوش پیدا ہوا ہے۔ اور اس جوش کے اعتبار سے معانی اجمالیہ نے ان کی عقلوں میں ایک صورت اختیار کی ہے۔ واقفان اسرار جانتے ہیں کہ یہ سب کچھ تعبیر کا محتاج ایک خواب ہے کہ شکلوں کے لباس کے معنی پوشیدہ ہیں اور یہ علم اجمالی ہے جس نے تفصیل کو اپنے اندر پوشیدہ کرلیا ہے۔ وہ علم اجمالی صرف حق ہے۔ اور وہ تفصیل حق کی نگہبان اور محافظ۔ اگر کبھی عقلوں کی تنگی کی جہت سے ان ترجمانیوں میں سے کچھ کلام دوسرے کلام سے اختلاف رکھتا ہے تو وہ اختلاف، کلام کے اس اختلاف کی مانند ہوتا ہے۔ جیسے زید کی محبت کو بیان کریں تو ایک کہتا ہے **محبته فی قلبی اعظم من الجبل** "میرے دل میں اس کی محبت پہاڑ سے بھی بڑی ہے۔" اور دوسرا

کہتا ہے **محبتہ فی قلبی بلغت عنان السماء** ''میرے دل میں اس کی محبت آسمان کے حدود سے بالاتر ہے۔'' اس صورت میں یہی کہا جائے گا کہ ان کی تمام تر مراد قوت محبت کی تصویر کشی ہے، نہ کہ اس خاص صورت کی تحقیق۔ اور اگر ان کے کلام میں تناقض واقع ہو جائے تو اس تناقض سے چشم پوشی کرنی چاہئے۔ جیسے کوئی شخص کہتا ہے کہ مجہول مطلق موجود نہیں ہے نہ ذہن میں اور نہ ہی خارج میں۔ ایسی صورت میں اس کی بات پر یہ اعتراض وارد ہوگا کہ موضوع کی موجودگی حکم کے لئے شرط ہے۔ اگر وہ مجہول مطلق تیرے ذہن میں حاضر ہوتا ہے تو وہ مجہول مطلق نہیں ہے۔ اور حاضر نہیں ہے تو یہ حکم صحیح نہیں ہے۔ قدیم سے حادث کے صدور کا مطلب یہی ہے۔ اور عالم کے حدوث اور قدم کا قول بھی اسی باب سے ہے۔ واقفان اسرار ان اختلافات میں زیادہ نہیں پڑتے۔ **فلا تمار فیهم الا مرآء ظاهرا ولا تستفت فیهم منهم احدا** ''پس ان کے بارے میں لوگوں سے بحث نہ کرو، اور نہ ان کے متعلق کسی سے کچھ پوچھو۔'' (الکہف ۲۲)

۵۴- تفہیم:

سالک کے انبیاء اولیا علیہم السلام کے مراتب تک پہنچنے کے معنی

ایک شخص نے میرے سامنے کہا کہ بعض مشائخ متاخرین اپنے مریدوں کے حق میں بشارت دیتے ہیں کہ وہ جنید کے مرتبہ کو پہنچ گیا ہے، یا فلاں پیغمبر کی ولایت کو پہنچ گیا ہے اور یہ صرف تصنع ہے۔ میں نے کہا اس بات کو میں تمہیں ایک مثال کے ذریعہ سمجھاتا ہوں۔ سیبویہ نے ایک مدت دراز تک محنت کی اور علم نحو کو ترتیب دیا۔ اہل عرب کے اشعار اور ان کے استعمال میں جستجو کی اور قواعد کلیہ کی تخریج میں جن پر جزئیات منطبق ہوتی ہیں، اس سلسلہ میں اس نے یہ اتنا بڑا کام کیا کہ اس سے زیادہ بشر کے مقدور میں نہیں ہے۔ عزیزوں نے ان قواعد کا اختصار کیا اور کوزہ میں دریا کی طرح مختصر رسالہ میں تہذیب کے ساتھ اچھے طریقہ سے بیان کر دیا۔ اب وہ اس رسالہ سے دس سالہ بچہ کو تعلیم دیتے ہیں، وہ اس کو ازبر کر لیتا ہے اور اس کے قواعد کو سمجھ لیتا ہے جب یہ نوبت آ گئی کہ مزید ترقی کرے تو اس کے بارے میں ہم کہتے ہیں کہ یہ سیبویہ کا مقام تھا۔ اب تو نے سیبویہ کا مقام حاصل کر لیا۔

اس کے بعد ہم اس کو امام اعظم کے فقہ کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ اور ان کے اصحاب نے برسوں تک جدوجہد کی اور ادلۂ تفصیلیہ سے مسائل نکالے اور ان کی تخریج وتفریع میں سعی بلیغ کی اور تمام مسلمانوں کے سامنے ان کو انتہا کو پہنچا دیا۔ اور عزیزوں نے دریا کو کوزہ میں بند کر دیا اور مختصر الفاظ میں اچھے انداز سے ان کو بیان کر دیا تو ہم اس بچہ کو فقہ کے رسائل میں سے ایک رسالہ پڑھاتے ہیں، وہ اس کو ازبر کر لیتا ہے اور اس کے قواعد کو سمجھ لیتا ہے۔ اب ہم اس سے کہتے ہیں یہ ابوحنیفہ کا مقام ہے۔ اب تو اس سے آگے بڑھ گیا ہے۔

اس کے بعد ہم اس کو علم حدیث کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ امام احمد اور اصحاب کتب ستہ نے اس سلسلہ میں زبردست جدوجہد کی تھی، اور مسلمانوں کے شہروں میں گھومے پھرے تھے، اور قطرہ قطرہ جمع کر کے آرا کے تدارک اور افکار کو باہم ملا کر دریا بنا دیا۔ اور عزیزوں نے اس کا حاصل رسائل میں قلم بند کر دیا اور اسانید کو اشاروں میں بیان کر دیا۔ اب وہ بچہ ان رسالوں میں سے ایک رسالہ یاد کر لیتا ہے اور اس کے بعد اس اسلوب میں ایک علم کو دوسرے علم میں منتقل کرتا ہے۔

اس صورت میں اگر کوئی شخص کہتا ہے کہ ایک وقت میں سیبویہ کے مقام پر تھا اس کے بعد ترقی کر کے ابوحنیفہ کے مقام پر پہنچ گیا، اس کے بعد ترقی کر کے امام احمد اور بخاری کے درجہ پر پہنچ گیا تو کہا جائے گا کہ اس نے درست کہا۔ اور اگر کوئی شخص کہتا ہے کہ یہ بچہ سیبویہ، ابوحنیفہ اور بخاری کے مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتا اس کو کیا مقدور ہے کہ ان بزرگوں کے ساتھ برابری کا تصور کرے؟ تو اس کو بھی درست کہا جائے گا۔

۵۵-تفہیم:

اس عالم میں سعادت عظمیٰ

اس دنیا میں اس سے بہتر کوئی سعادت نہیں ہو سکتی کہ عارف تجلی اعظم کے نکتہ کا حصہ ہو جائے اور عرض کے جوہر کے ساتھ پیوست ہونے کی طرح اور تمام قوائے نفس روح، عقل اور قلب پر یہ کیفیت غالب آ جائے پھر عالم ابدی ودائمی کا کوئی رنگ۔ یا میں کہتا ہوں ایک تھوڑا سا خیال زمانہ کے کنارہ کے راستوں سے، یا تجلی اعظم کے نکتہ کی راہ سے بساط کے دائرہ

سے خواب فراموشی اس نفس میں پڑ جاتی ہے۔اور ایک کیفیت حادث ہوتی ہے کہ کہنے میں بھی بالکل درست نہیں ہوتی۔آج اتنے ہی پر صلح کر لینی چاہئے۔کل انشاء اللہ تعالیٰ یہ رنگ حقیقت بن جائے گا۔اور تھوڑا سا خیال عین متحقق ہو جاتا ہے اور یہ خواب فراموشی خود اس کا مصداق ہو جاتا ہے۔

حجاب چہرہ جاں می شود غبار تنم
خوش آں زماں کہ ازیں چہرہ پردہ برفگنم

"چہرہ کا حجاب میرے تن کا غبار ہو جاتا ہے، وہ وقت بہت اچھا ہوتا ہے جب میں اس چہرہ سے پردہ اٹھا دیتا ہوں۔"

۵۶-تفہیم:

حلول سرمدی کے بعد کیا ہوتا ہے؟

جوہر کے ساتھ عرض کے پیوست ہونے کے درجہ میں سرمد کے پیوند ہونے کے بعد کہ اس کا وجود فی نفسہ اپنے آپ میں غیر وجود لمحلہ نہیں ہے، کیا ہوگا؟ سوائے اس کے کہ وہ اپنے محل میں موجود ہے، نہیں ہے، یہ ایک بہت دقیق مسئلہ ہے، آج اسی تھوڑے سے خیال کا ماجرا بیان کرتے ہیں۔اس تھوڑے سے خیال پر صلح کر لینی چاہئے، ایک حد تک اس فنا و بقا کو چاہتے ہیں، اس کے بعد دوسرا دورہ شروع کر کے اس میں تجلی اعظم سے پیدا ہونے والے ارادہ کلیہ کی تشخیص کے سبب کا دورہ ہوتا ہے اور خندہ پیشانی سے ملنے اور جنبش کرنے اور اس کی رضا و غضبنا کی کا منبع نکل آتا ہے اور بہت سے احکام جو کہ تجدد کا رنگ رکھتے ہیں، برآمد ہوتے ہیں اور اس کے بعد پھر دورہ لوٹ آتا ہے۔اور یہ سارے انوار حقیقۃ الحقائق میں عود کرتے ہیں۔ اور سر اور روح کا رشتہ کہ اس کا پابند ہوتا ہے، ٹوٹ جاتا ہے۔تب خوشی، سرور اور انانیت میں دیوانے ہو جاتے ہیں کہ اس کی عاریت سے متمتع ہو چکے ہوتے ہیں۔بحکم **ان اللہ یا مرکم ان تؤدوا الامانات الی اھلھا** "اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہل امانت کو ادا کر دو" (النساء ۵۸) اس کے مالک کی طرف رخ کرتے ہیں اور ہم حرکات تبعیہ دوریہ کے مثل ہوتے ہیں اور کشاکش تعلق خود سے توڑ دیتے ہیں۔**ذالک تقدیر العزیز العلیم**۔

۵۷- تفہیم:

ایک نکتہ سے دوسرے کی طرف نقل کے طریقے

اگر ہم چاہیں کہ کسی شخص کے قلب کے نکتہ کو جنبش دیدیں اوراس کو بیدار کردیں، اس کو حرکت دینے اور بیدار کرنے کا طریقہ عشق پاکیزہ ہے کہ اس جگہ اقبال سروری میں وحشیانہ نحوست کا دور پیدا ہوجاتا ہے۔ اور معشوق کی بعض اوائیں اوراس کی ہیئتیں قلب سے متعلق ہوجاتی ہیں نہ کہ جماع کی شہوت، بوس وکناراور نغمات کا سماع۔ اور واعظ کے قول وغیرہ کے سننےاور جہری ذکر سے وجد طاری کرنا۔

اوراگر چاہیں کہ قلب کے نکتہ سے روح میں منتقل کریں تو اس کا طریقہ اولا وضواور غسل کی کثرت اوران چیزوں کے استعمال سے جو ہم نے ہمعات میں لکھی ہیں۔ طہارت و مناجات کی نسبت نسبت اویسیہ کے ساتھ مقرر کرنا ہے۔ اور دوسرے حضور دل کے ساتھ لمبے لمبے سجدوں اور خود کو اللہ کی بارگاہ میں ڈال دینے اور چہرہ کو خاک آلود کرنا۔ اور تیسرے آنحضرت کی جناب میں درودخوانی، دلائل الخیرات اور قصائد مدحیہ کے ورد کی کثرت، دل کی حضوری، طہارت، تعظیم اور خلوت کے ساتھ۔

اوراگر ہم عقل کے نکتہ کو حرکت دینا اوراس کو بیدار کرنا چاہتے ہیں تو اس کا طریقہ مراقبات، فکروتدبر مقرر کرنا اور پوری قوت کے ساتھ اس طرف متوجہ ہونا ہے۔ شیخ محی الدین بن عربی نے فرمایا ہے کہ اس عمل میں میری استاد بلی ہے، جب وہ چوہے کے سوراخ کی طرف متوجہ ہوتی ہے میں نے اس جگہ سے سبق لیا ہے۔

اوراگر ہر عقل کے نکتہ کو اسرار کی طرف نقل کرنا چاہتے ہیں تو اس کا طریقہ اللہ کے ماسوا تمام سے قولاً وعملاً اعراض کے ساتھ اسرار کو لطیف بناتے ہوئے مراقبہ کی کثرت ہے۔ یہ عمل بہت مشکل ہے اگر ممکن نہ ہو تو کسی ایسے شخص کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا ہے جو اسرار کی توجہ کا ملکہ رکھتا ہو۔ یہاں تک کہ یہ شعلہ اس کے اندر بھڑک اٹھے جیسے دوسرے کے چراغ کی بتی میں شعلہ بھڑک جاتا ہے۔

اور خفیہ نکتہ کو بیدار کرنے کا طریقہ لا موجود الا اللہ ماسوائے اللہ کے انتہائی اعراض کے

ساتھ ملاحظہ اور اس معنی کی پوری ہمت ہے۔ اور اگر یہ صورت میسر نہ ہو تو اس کا پیدا کرنا ایسے عزیز کے ساتھ صحبت میں رہنا ہے جو اس کا ملکہ رکھتا ہو، تا کہ اس کا رنگ اختیار کر کے دوسرے کے چراغ سے اپنا چراغ روشن کر کے طالب اپنے نفس میں غور و خوض کرے۔

اور تمام لطائف کا انتقال کسبی اعمال اور توجہات سے وابستہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسے امر کا ظہور ہے کہ اصل میں اس کا تعین کر دیں۔ ان مسائل کو ہر چند کہ چند الفاظ میں بیان کر دیا جائے۔ یہ عظیم الفوائد، جلیل العوائد سمندر ہے۔ شاید کہ راہ صواب کا الہام کرنے والے حضرت حق جل مجدہ پھر کبھی اس کی شرح کی توفیق عطا فرمائیں۔ انه علی کل شیء قدیر

۵۸- تفہیم:

وحدت میں کثرت اور کثرت میں وحدت کی تجلی کی حقیقت

میں کہتا ہوں کہ حقیقت وجوبیہ کو جو کہ عکس اور ضیاء الٰہیہ کا منبع ہوتی ہے، اس سے ضیا اور عکس کیا نسبت رکھتے ہیں؟ گویا چودھویں رات میں بدر کامل آسمان کے جگر میں موجود ہے اور اس کی شعاعیں سمندر کی سطح پر یکساں طور پر بکھری ہوئی ہیں۔ اچانک ایک تیز ہوا چلتی ہے اور سمندر کی سطح کو درہم برہم کر دیتی ہے اور مختلف مقداروں کی ہزاروں سطحیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اور وہ شعاع ہر سطح میں بند ہو جاتی ہے۔ اور ہزاروں چاند نظر آنے لگتے ہیں اور ہر سطح میں چاند کی نمائش جداگانہ طور پر ہوتی ہے۔ پھر ایک مدت کے بعد وہ ہوا ساکن ہوتی ہے اور وہ سطحیں بھی غائب ہو جاتی ہیں اور ایک سطح پیدا ہو جاتی ہے اور وہ شعاع جیسے پہلے یکساں تھی، اسی طرح یکساں ہو جاتی ہے اور وہاں کوئی چاند ظاہر نہیں ہوتا۔ ہاں اصل شعاع چاند کے دوام کے ساتھ دائم و موجود ہوتی ہے۔ اور ان مختلف چاندوں کی حقیقت میں وہی شعاع تھی اور وہ تعدد خیالی تھا، آئے اور جلد ہی چلے گئے۔

اسی طرح تجلی اعظم کا سورج، نفس کلیہ کے جگر میں درخشاں ہے۔ اس کی ایک شعاع ہے جو نفس کلیہ کے تمام اطراف میں بکھری ہوئی ہے۔ ناگاہ باد تکوین کو جنبش ہوتی ہے اور نفس کلیہ کی سطح وحدانی کو درہم برہم کر دیتی ہے، اور بے شمار سطحیں پیدا ہو جاتی ہیں، اور ہر سطح میں اس کے حوصلے کے بقدر شمس ظاہر ہوتا ہے، اور بہت سارے سورج سامنے آ جاتے ہیں۔ ایک

مدت کے بعد وہ ہوا ساکن ہوتی ہے اور وہ ساری سطحیں غائب ہو جاتی ہیں اور وہ سطح وحدانی ظاہر ہو جاتی ہے اور ان کئی سورجوں نے جو اصل میں سورج کی شعاعیں تھیں نفس کلیہ کے تمام اطراف میں بکھرے ہوئے شمس کے دوام کے ساتھ دائم ہو کر ایک میں رجوع کر لیا اور ایک خلعت اور ایک لباس ہوا میں نظر آیا۔ **وتلک الامثال نضر بھا للناس وما یعقلھا الا العالمون** ''اور یہ مثالیں ہیں جو ہم لوگوں کے لئے پیش کرتے ہیں اور ان کو صرف عالم لوگ ہی سمجھتے ہیں۔''

میں کہتا ہوں کہ وحدانیت کی حقیقت جس میں تمام موجوات و مفہومات مقرر ہیں اور جس کو ہم اپنی زبان میں نفس کلیہ کہتے ہیں، اپنے ظہور کے اطوار و اوضاع کے ساتھ اور اپنے تعین کے تنوعات و اقسام کے ساتھ جو کہ وجودات خاصہ ہیں، کیا نسبت رکھتے ہیں؟

واحد، محاسبی کے ذہن میں تجلی پھیلاتا ہے اور اس جگہ اس کے ذہن کی سطح میں نشیب و فراز کے جانے کے سبب سے جو کہ محاسبان کے لئے لازم ہے مختلف قسم کے التفات پیدا ہوتے ہیں۔ اور ہر التفات میں جداگانہ نام رکھا جاتا ہے۔ جب دوبار التفات کرتا ہے اس تثنیہ سے نظر ملتفت ہوتی ہے تو اس کو اثنین کہتے ہیں۔ اور جب تین بار التفات کرتا ہے تو اس تثلیث سے نظر آگاہ ہوتی ہے تب ثلثہ کہتے ہیں۔ اسی طرح جتنا زیادہ احصاء کیا جا سکتا ہے نشیب و فراز پھیلتا ہے اور دائیں بائیں دوڑتا ہے اور ہر پھیلنے اور دوڑنے میں اپنے آپ میں ایک نازش اور اپنے آپ پر ایک نظر رکھتا ہے اور ہر مرتبہ میں ایک عدد متحقق ہوتا ہے۔ لسان حال ہنستی ہے کہ اوہام کا ایک زبردست لشکر تیار کرنا اور ہدایت کے ہاتھ میں تلوار دینا اور جنگ کا حکم دینا اور کسی ایک کی فتح پر خوش ہونا اور دوسرے کی ہزیمت پر آزردہ ہونا کیا بے معنی سی بات ہے۔ اچانک ایک پتھر اوپر سے محاسب کے سر پر گرتا ہے اور اس کو درد و تکلیف میں مبتلا کر دیتا ہے اور وہ لشکر اوہام بھی بکھر جاتا ہے اور غائب ہو جاتا ہے۔ واحد اپنی وحدانیت سے رجوع کرتا ہے اور خلعت اور لباس ہوا میں نظر آتا ہے۔

سمجھو کہ دریاب جس کے بارے میں اہل معقولات کہتے ہیں کہ عشرہ، دس وحدتیں ہیں نہ کہ پانچ یا چار اور چھ کا مجموعہ۔ اور ہم کہتے ہیں کہ یہاں عدد کثیر مراد ہے جس کو چشم پوشی کے ساتھ ایک نام دیتے ہیں اور ہر عدد کی حقیقت محاسب کے التفات کی طرح ہے۔ اس طرح دس علیحدہ

سے دوسری وحدت عددی ہے اور چار اور چھ دوسرا عدد ہے وعلی ہذالقیاس۔ جس کی طرف بھی علیحدہ سے التفات کرتے ہیں وہ ایک علیحدہ عدد ہوتا ہے۔ البتہ کبھی اختصار سے کام لیتے ہیں اور چشم پوشی کرتے ہوئے لفظ دس سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس لئے تعبیر میں یہ کھلا اور صاف معاملہ ہے۔

اب ہم پھر اصل مسئلہ کی طرف رجوع کرتے ہیں کہ اسی طرح نفس کلیہ اپنے بعض کمالات کے لحاظ سے ہیئتیں ہیں جو ظاہر ہوتی ہیں۔ اور اس جگہ بعض اعتبارات سے تعدد و تکثر پیدا ہوتا ہے اور بعض سابق اوضاع، لاحق اوضاع کی استعداد کا تعین کرتی ہیں یہاں تک کہ ایک کثرت پیدا ہوجاتی ہے اس مقام پر خلعت ولباس کلیہ کا تصور نہیں کیا جاتا۔ ہاں بعض صورتوں پر آخری وضع کی بقا ہوتی ہے کہ اصل ترکیب دوسری صورتوں کی ہوسکتی ہے۔ اور اس آمدورفت میں بعض تصرف جاری نہیں ہوتے۔

بس کنم مرزیرکاں را ایں بس است

''میں بات کو یہی ختم کرتا ہوں کہ سمجھداروں کے لئے یہی کافی ہے۔''

۵۹۔ تفہیم:

توکل کا مقام، اور تمام مقامات کی طرح اس کے بہت سے بطون ہیں

تمام مقامات کی طرح توکل کے بھی بہت سارے بطون ہیں جن میں سے بعض کے مقابلہ میں بعض اعلیٰ ہیں۔ چنانچہ ایک توکل وہ ہے جس کا منشا اس امر پر پختہ عقیدہ ہے جس کی شارع نے عالم تکوین میں امور کے جاری ہونے کے سلسلہ میں حضرت واجب جل مجدہ کے ارادہ واختیار کے مطابق ہونے اور اس کی مراد کی خلاف ورزی نہ ہونے، اس کی مقرر کردہ تقدیر میں تغیر نہ ہونے اور اس کے علم میں تمام ممکنات بلکہ مفہومات کی شمولیت کی خبر دی ہے۔ چنانچہ عقل میں یہ اعتقاد اچھی طرح بیٹھ جاتا ہے اور قلب اور نفس عقل کے ذریعہ حکمرانی کرتے ہیں اور جبلت استقامت اور عدم تذبذب حال اس کا مؤید ہوجاتا ہے۔ چنانچہ ایک ہیئت نفسانی حاصل ہوتی ہے، جس کو توکل کہتے ہیں۔

اور جس توکل کی ہم بات کرتے ہیں اور جس کی طرف ہم اشارہ کرتے ہیں، وہ عارف کے عین ثابتہ کے فوارہ میں تولی حق کی درآمد ہے اور قوالب موہومہ کے اعیان ثابتہ کا

وجود مثلث، مربع، مسدس اور مدور فواروں کی طرح ہے جو کہ جمع کئے ہوئے پانی کو چھوڑنے سے قبل ہوتا ہے۔ اور وہ فوارے ان کے احکام اور وجود وغیرہ کا تعین کرتے ہیں۔ چنانچہ اس شخص کا عین ثابتہ اس طرح واقع ہوتا ہے کہ وجوب و امکان دونوں کے ظہور کا مستوجب ہوتا ہے۔ اس پانی کی تجلی اعظم کے درمیان سے قوائے وجوبیہ کے دریا کا بہاؤ گرتا ہے اور انا کے بہاؤ کے نکتہ کے درمیان سے نفس کلیہ کے قوی کے درمیان کا بہاؤ اور روح اور سر کے بہاؤ کے درمیان عالم روح و مثال کے دریا کا بہاؤ اور قلب، نفس و عقل کے بہاؤ کے درمیان صورت انسانیہ کے احکام کا بہاؤ یعنی حقیقت کلیہ جوان چار بکروں میں سے ایک ہے جو تکوین کئے ہوئے عرش کو اپنی پشت پر اٹھائے ہوئے ہے۔ اور جوارح کے بہاؤ کے نکتہ کے درمیان صورت حیوانیہ کے احکام کا بہاؤ اور اس بہاؤ کے جسم کے نکتہ کے درمیان صورت نامویہ و معدنیہ کے احکام کا بہاؤ اور اسی طرح ہر فلک اور عنصر کے مقابلہ میں درحقیقت ایک لمبا نقطہ ہے۔ جس کے تمام احکام، فلک اور عنصر کی حکایت بیان کرتے ہیں۔ اس طرح تمام قوی کے جمع کرنے کے سبب سے تولی خاص کو مستوجب ہوتا ہے کہ تمام افراد انسانی غیر تولی ہوتے ہیں اور قرآن عظیم میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے ان ولیے الله الذی نزل الکتاب وھو یتولی الصالحین ''میرا ولی اللہ ہی ہے جس نے کتاب نازل کی اور وہی صالحین کی تولی کرتا (ذمہ داری لیتا) ہے۔''

اور اس تولی خاص کا منشا و مرکز جو کہ تمام مخلوقات کے تولی سے ممتاز ہے، تجلی اعظم اور اس کی انانیت کی وسعت ہے اور اس راہ کا بند نہ کرنا ہے کہ جوان کے اور تجلی اعظم اور انانیت کبری کے درمیان واقع ہے۔ اور فلکیات سے بھی ایک قوت اس کی مددگار اور اس کی شارح ہوتی ہے۔ اگرچہ موجودہ حالت میں اس قوت فلکیہ کی تشخیص نہیں ہوتی۔

بالجملہ یہ تمام ہیئتیں جو حاصل ہوئی ہیں ہوا کے ساتھ ہوا کی گرد کے قیام کی ہیئت کے مانند اور آب رواں کے کوڑا کرکٹ اور اجزاء ارض کے قیام کے مانند ہیں۔

چنانچہ یہ انا ہر اس ارادہ کو پیدا کرنے والی ہے جو اس میں اٹھتا ہے اور ہر اس داعیہ کو پیدا کرنے والی ہے جو اس کی خاطر سے ابھرتا ہے۔ یہ سب بھی انا کے سر سے پانی کی مانند آتے ہیں اور اس کے پاؤں سے چلے جاتے ہیں اور اس طرح اس کی اصلاح معاش و معاد

میں حقیقت نظری نہیں ہے۔اور وہی تجلی اعظم اور انانیت کبریٰ اس باب تولی میں اس کی معاش ومعاد کی اصلاح کرتی ہے جو کہ خود اس کی تمام مخلوقات کی نسبت سے لازم واجب ہے۔وہ دوسری ہے اور یہ تولی جو تجلی اعظم کے نکتہ سے پیدا ہوتی ہے اور اس قوائے فلکیہ کے تابع ہوتی ہے، دوسری ہے۔اسی طرح تمام افراد انسان کے ساتھ قرب حق دیگر ہے کہ نحن اقرب الیه من حبل الورید "ہم اس سے اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں" (ق ۱۶) اور اس کا قرب محسنین کے ساتھ امر دیگر ہے کہ ان رحمة الله قریب من المحسنین "اللہ کی رحمت محسنین سے قریب ہے" وانا عندہ اذا ذکرنی وتحرکت بی شفتاہ "جب وہ میرا ذکر کرتا ہے میں اس کے قریب ہوتا ہوں اور مجھ سے ہی اس کے لب حرکت کرتے ہیں"۔

چنانچہ خالص کمال والوں کا توکل اسی تولی سے پیدا ہونے والی تمکین تام اور بقائے مطلق ہے بلکہ اگر سچ پوچھیں تو یہی عین تولی ہے، یہی ایک چیز ہے کہ دو جہت کے اعتبار سے اس کے دس نام رکھتے ہیں۔اور میں نے متولی جل مجدہ کی زبان سے اس تولی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے

ناگزیر توام اے بے نظیر
روگرداں بعد ازیں از ناگزیر

"جس کی کوئی نظیر نہیں میں تیرے لئے ناگزیر ہوں، اس بات کو جان لینے کے بعد ناگزیر سے منہ مت پھیر۔"

من ترا مشفق ترم از صد پدر
با من آمیز و مرا محکم بگیر

"میں تیرے اوپر سیکڑوں باپوں سے بھی زیادہ مشفق ہوں، میرے ساتھ مل جا اور مجھے مضبوطی سے پکڑ لے۔"

غیر من گر با تو بایستی بود
آں وبال است و عذاب است وسعیر

"اگر میرے علاوہ کوئی تیرے لئے لائق و بہتر ہو تو وہ وبال ہے اور عذاب وجہنم ہے۔"

۶۰-تفہیم:

اللہ کے لئے اپنے بندوں کی طرف نسبت کے دو طریق اور ان دونوں کی تفصیل

اللہ تعالیٰ کے اپنے بندوں کی طرف نسبت کے دو راستے ہیں، ایک اندرونی دوسرا بیرونی۔ اندرونی راستہ سے مراد یہ ہے کہ استعداد عین ثابتہ عمل میں آتی ہے اور نفس ناطقہ کے وسط سے خوداس کی اصل جانب جو کہ نفس کلیہ ہے، میل بے کیف اٹھتا ہے اور خوداس کے قبلہ سے جو کہ تجلی اعظم ہے ایک توجہ جوش مارتی ہے اور اس کے تمام قویٰ ان کیفیات مقدسہ ومنزہہ کے تابع ہو جاتے ہیں اور ایک تہذیب متحقق ہو جاتی ہے۔

اور بیرونی راستہ سے مراد یہ ہے کہ فرشتوں میں سے ملاء سافل اس شخص سے ایک رنگ جو ان کے لئے مناسب ہوتا ہے قبول کرتے ہیں۔ اور وہ رنگ برسوں تک ملاء اعلیٰ کی طرف ترقی کرتا ہے اور ایک دوسری مدت کے بعد تجلی اعظم کے حضور کے لائق ہوتا ہے۔ اور عین عنایت ملحوظ ہوتا ہے۔ اور تدبیر عالم میں جو کہ مصلحت کلیہ پر مبنی ہے داخل ہوتا ہے اور اس عنایت کو ملاء اعلیٰ باجمال قبول کرتے ہیں اور ان نفوس کی صلب میں ایک وسعت پیدا کرتے ہیں جس سے ایک تفصیل متحقق ہو جاتی ہے۔ اس وقت بعض ایسے لمحات ہیں کہ جب قوائے افلاک مناسب ہوتے ہیں۔ وہ امر ملاء اعلیٰ کے نفوس میں متمثل ہو کر زمین میں نازل ہوتا ہے اور ملاء سافل کی فوجیں اس کو اپنی استعداد کے مطابق قبول کرتی ہیں۔ اور بعض لمحات میں جو کہ عنصر اصل کے مناسب ہوتے ہیں جو عناصر اربعہ کا منشا و مرکز ہوتا ہے، اس سے ایک رنگ قبول کرتا ہے جو حواس ظاہرہ سے محسوس ہونے والا اور انوار ظاہرہ کے مثل ہوتا ہے کہ وہ اور تمام انسان اس کے ادراک میں شریک ہوتے ہیں۔ جب کہ حقیقت میں مرد کامل کو دونوں راستوں سے ایک حصہ دیتے ہیں اور ہر حصہ سے سہولت فراہم کرتے ہیں۔ اس لئے کہ عارف کے مسامات خوداس کی اصل سے نقطہ کے لطائف درمیان سے کھلے ہوئے ہوتے ہیں جو کارخانۂ الٰہی میں درکار ہوتے ہیں سب آمادہ اور منتظر فرمان کھڑے ہوتے ہیں تاکہ مصلحت

کلیہ کی زبان سے جو کچھ فرمایا جائے اس کے مطابق معاملہ انجام پائے۔

اسباب طرب جملہ مہیا
یک روئے تو می باید وبس

"سارے اسباب طرب موجود و تیار ہیں، اب صرف تمہاری ضرورت ہے۔"

حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام وغیرہ کے سابقہ ادوار میں بیرونی راستے زیادہ تر کھلے ہوئے تھے۔ اس وقت اندرونی راستہ سے ایک حصہ دیا گیا تھا تا کہ اہل کمال کی جامعیۃ کا حکم جاری ہو۔ اور ہمارے رسولؐ کے دورہ میں دونوں راستے درجۂ کمال پر فیض رساں ہیں۔ تاہم اس دورہ کے اوائل راہ بیرونی کے مشابہ ہوتے ہیں اور اواخر راہ اندرونی کے مشابہ ہوتے ہیں۔ ہم اواخر میں آئے ہیں اور اندرونی راستہ سے مطلع ہوئے ہیں۔ راہ بیرونی کی خبر کو جامعیت کے حکم سے احاطہ کئے بغیر یاران خوش طبع اپنی طبیعتوں کی خوشی پر نازاں ہیں اور اس فکر میں پڑے ہوئے ہیں کہ اپنے رنگ میں اندرونی راہ کو حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت صالح اور حضرت موسیٰ علی نبینا وعلیہم الصلوٰۃ والسلام پر منطبق قرار دیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔ بالکل بھی نہیں۔

گوہر جام جہاں بیں زجہان دگراست
تو توقع زگل کوزہ گراں میداری

"اس جام کا گوہر جس سے دنیا کو دیکھا جاسکے، دوسری دنیا کی بات ہے۔ تم مٹی کے پیالہ سے بیکار ہی اس کی امید کر رہے ہو۔"

۶۱-تفہیم:

شیخ خواجہ محمد باقی قدس سرہ کا ذکر

ہمارے شیخ مشائخ خواجہ محمد باقی (باللہ) قدس سرہ نے آخر عمر میں عزلت گزینی اختیار کر لی تھی اور رشد و ہدایت کا سلسلہ بند کر دیا تھا۔ لوگوں نے ان سے اس کا سبب معلوم کیا تو فرمایا، ہمیں ایک مقام دکھایا گیا ہے، تھوڑے سے انتظار کے بعد اس مقام پر پہنچ جائیں گے۔ لوگوں نے پوچھا اس مقام کا وقت کونسا ہے اور اس کے لوازم کیا ہیں، فرمایا اس کا وقت وہ ہے کہ

ہماری عمر چالیس سال ہو جائے اور اس کے لوازم یہ ہیں کہ جو شخص بھی ہمیں دیکھے سجدہ کرے۔ جب آپ کی عمر مبارک چالیس سال ہوئی تو عالم فانی سے رحلت فرمائی۔ اسعدک اللہ۔ جان لو کہ یہ بزرگ مجرد رو اور سریع السیر تھے۔ اگر چہ آپ کو ابتدا میں سلوک کے بہت سے مواقع پیش آئے، فنا و بقا کی تنگی بھی پیش آئی جیسا کہ دوسروں کے ساتھ ہوتا ہے۔ مرنے کے بعد محبوس نہ رہے۔ اس عبارت سے حقیقت جبروتیہ کے حصول کی طرف اشارہ کیا جو کہ ہر ساجد و عابد کا مسجود و معبود ہے۔ اور اپنی خودی سے فقط علم کے لحاظ سے بلکہ حال کے لحاظ سے بھی بیزار ہو جانا اور ایک دوسرے میں اور متحد پیوست ہو جانا اور عجیب قسم کا ربط کہ جو اس کو نہیں سمجھتا وہ نہیں جانتا۔ اے خدائے پاک میں تیرا شکر کس زبان سے ادا کروں۔ میرے جوارح میری روح سب کچھ تیرا ہی شکر اور حمد و ثنا ہے۔ ہر حمد و ثنا کرنے والا نامراد خود ہی شکستہ دل ہے، کونسا فیض ہے کہ جو تو نہیں پہنچاتا، اور کونسا لطف ہے کہ تو نہیں کرتا، سب کچھ تو پہنچاتا ہے حالانکہ وہ دنیاوی زندگی میں ہے۔ معبودیت و مسجودیت وجود کے پردے اس کو کاروبار سے مانع نہیں ہوتے، اس کے بعد تو نے اس کو وہ مقام دکھایا کہ جو بہت بلند ہے۔ اور تو نے اس کو اس کا مشتاق بنایا اور اس کو ایک خاص وقت کے ساتھ مخصوص کر دیا اور وہ بھی اس کو فراہم کر دیا اور حقیقت رحمانیہ کے ساتھ عجیب ارتباط کر دیا کہ اس کے ماوراء عالم جبروت میں کوئی حقیقت نہیں ہے۔ چنانچہ کچھ عرصہ بعد تو نے علم مقید اور حال مقید کو تنگیوں سے نکالا۔ وجود مقید کو تنگی سے نکالا کہ میں ایک ایسی حد کی امید کرتا ہوں جس کے بعد کوئی وجود نہیں ہے۔ نہیں، نہیں، استغفر اللہ میں نے کیا کہہ دیا بلکہ وجود آخر جو اصلا اس میں عدم نہیں ہے۔ خداوند! تو نے اس کی جان کو اپنے اشتیاق میں جلا دیا اور اس کے نزدیک مرنے کو تو نے باپ بیٹے اور زمین کی ہر چیز سے زیادہ محبوب بنا دیا۔ اے خداوند! تھوڑا سا خیال جس سے تو اس کو دکھانا چاہتا ہے تاکہ اس کی مستی آسمانوں سے گذر جائے، میں نہیں جانتا کہ جب حقیقت حال کو پہنچ جائے گا تو کس قدر ہوگا۔ بیت

خیال روئے تو امشب مرا ز خویشم برد
اے خوش آں روز کہ بینم رخ زیبائے ترا

"آج رات تیرے رخ زیبا کے خیال نے مجھے اپنے آپ سے بیگانہ کر دیا۔ کیا ہی اچھا ہوگا وہ دن جب میں تیرے رخ زیبا کو دیکھوں گا۔"

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم
راحت جان طلبم در پے جاناں بروم

"وہ دن بہت ہی اچھا ہوگا جب میں اس منزل ویران سے جاؤں گا۔ راحت جاں طلب کروں گا اور جاناں کے در پہ لے جایا جاؤں گا۔"

اے خدائے پاک! کیا لطف ہوگا اگر اجل کے بارے میں تو کم جان کاری دے اور مقصد پورا کر دے۔" انک علی کل شیء قدیر

بشنواز نے چوں حکایت می کند
وزجدائی ہا شکایت می کند

"بانسری جب حکایت بیان کرتی ہے، اور جب وہ جدائی کی شکایت کرتی ہے، تو اس کی آواز کو سنو۔

کزنیستاں تامرا ببریدہ اند
از نفیرم مرد وزن نالیدہ اند

"کہ مجھ کو جنگل سے کاٹ لائے ہیں، اب میری فریاد سے مرد وزن روتے ہیں۔"

۶۲- تفہیم:

مرید کو وصیت

کسی بھی حال میں حضرت حق کی طرف توجہ میں کوئی فتور نہ لائیں اور کسی بھی حال میں خود کو شعائر اللہ اور علم باللہ سے مستغنی نہ رکھیں کہ یہ محرومی کی علامت ہے۔ اور ہمیشہ درس حدیث و تفسیر کو لازم قرار دیں۔ اگر چہ دوسرے دروس بھی ہوں اور خود طاعات بدنیہ مالیہ سے آزاد نہ رکھیں۔ اگر چہ بجو دقلب سے جو کہ عبادت کا مغز ہیں متصف ہوں۔ اس لئے کہ عاشق بہر حال مشتاق ہے۔ رباعی

ہر چند رخ از وصال من کم یابی
اشکم بود از شوق لبت عنابی

"ہر چند کہ میرے وصال کی طرف تو کم ہی توجہ کرتا ہے، میرے اشک تیرے لب

کے شوق سے عنابی ہو گئے۔"

مستقی رامیان بحرار یابی
شک نیست کہ شاکی از بے آبی

"اگر مرض استقا میں مبتلا شخص کو سمندر کے درمیان بھی پاؤ گے، اس میں شک نہیں کہ اس کو پانی نہ ہونے کی شکایت کرتا ہوا پاؤ گے۔"

سعادت مند افراد کی صفت یہ ہے کہ وہ لوگوں کو شغل باطن سے بھی فائدہ پہنچاتے ہیں اور اگر ان کی عدم موجودگی کا وقت میسر آتا ہے جس کو غیوبت سے تعبیر کرتے ہیں تو یہ توجہ کی تاثیر کے اسباب اعظم میں سے ہے۔

۶۳-تفہیم:

لسان استعداد کی رعایت اور قلب کی شہادت

ہم ہر حال میں اور تمام لوگوں کے حق میں استعداد کی زبان کے محکوم ہیں اور ہم کسی بھی حال میں خواہ سلامتی کا ہو یا غصہ اور خفگی کا، جو بھی بات کہتے ہیں، دوستوں کے دل کی گواہی کے مطابق اور ان کی استعداد کے اظہار کے مطابق ہی کہتے ہیں۔ اگر عتاب اور غصہ و خفگی ہے تو وہ بھی دل کی بے ادبی اور بدحالی پر ہے اور اگر صلح ہے تو وہ بھی دل کے حسن ادب پر ہے نہ کہ زبان پر

شخص تصویریم بیدل از کمال ما مپرس
کار ما نا کردنی وحرف ما نا گفتنی است

"بیدل ہمارے کمال کے بارے میں مت پوچھو، ہمارا کام نا قابل عمل ہے اور ہماری بات نا قابل بیان ہے۔"

۶۴-تفہیم:

قرآن کو خوش الحانی کے ساتھ پڑھنے کی فضیلت

حدیث میں آیا ہے اللہ تعالی نے جن چیزوں کا حکم دیا ہے ان میں ایک یہ ہے کہ نبی کو قرآن کریم خوش الحانی سے اور بآواز بلند پڑھنے کا حکم دیا ہے۔ اور حدیث میں یہ بھی

آیا ہے کہ جو قرآن کو خوش الحانی سے نہ پڑھے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ اس کا راز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کو عربی زبان میں نازل کیا ہے اور وہ اشعار میں مشغول رہتے تھے ان کو اپنی محفلوں میں پڑھتے تھے اور اپنی خلوت وجلوت میں خوش الحانی سے پڑھتے تھے۔ اس کی حکمت یہ ہے کہ صرف ایسی عربی میں خطاب کیا کریں جو بلاغت میں حد کمال کو پہنچی ہوئی ہو تا کہ صرف اس جنس میں معجزہ ہو جس میں وہ مشغول رہتے ہیں اور اس کی تہ کو پہنچنے کی کوشش کریں تا کہ مخالف کو الزامی جواب دینے اور دلیل کے ذریعہ لاجواب کرنے میں سب سے زیادہ بلیغ ہو جائے۔ اور پڑھنے میں صرف یہ شرط لگائی جاتی ہے کہ ہر لفظ جدا جدا ہو اور اس کے اجزا میں ایک اندازہ کے مطابق مطابقت ہو۔ اور یہ شرط اس وجہ سے ہے کہ پڑھنے کا عمل انسانوں کی ہر جماعت میں پایا جاتا ہے اور ان کے اوزان مختلف ہوتے ہیں۔ چنانچہ عربوں کے الگ اوزان ہیں اور ہندوؤں کے الگ ہیں۔ ہم نے بدوؤں کی جماعت کو دیکھا ہے کہ وہ اوزان معروفہ کی قید کے بغیر اشعار پڑھتے ہیں۔ ہم نے جو بیان کیا ہے وہ اس معاملہ کا خلاصہ ہے۔ پھر قرآن نازل ہوا تو یہ اہل عرب کے اشعار پڑھنے کی عادت کے مطابق تھا۔ اور صحیح بات یہ ہے کہ ان نغمات واشعار کو ان طریقوں سے پڑھا جائے جو ان کے نزدیک مقرر ہیں۔ اور خوش الحانی سے یہی مراد ہے۔ اس کو نبیؐ نے یوں تعبیر کیا ہے۔ اس کی مراد کی موافقت کے سبب سے دھیان سے سننے پر راضی ہوتا ہے۔ اس لئے کہ کوئی ایسا کلام نہیں ہے جس کی تعبیر اس عبارت سے زیادہ صحیح طریقہ سے کی جا سکے۔ واللہ اعلم۔

۶۵-تفہیم:

عقائد حق کا بیان

الحمدللہ رب العلمین والصلوۃ والسلام علی سیدنا محمد خاتم النبین والہ وصحبہ اجمعین۔

امابعد۔ رحیم وکریم اللہ کی رحمت کا محتاج ولی اللہ بن عبدالرحیم، **احسن اللہ تعالیٰ الیھما** کہتا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کو اور اس وقت موجود ملائکہ اور جن وانس کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ

میرا صمیم قلب کے ساتھ یہ عقیدہ ہے کہ اس عالم کا ایک صانع (بنانے والا) قدیم ہے۔ وہ لم یزل و لایزال ہے، ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ نہ وہ کبھی زوال کی کیفیت سے دوچار ہوا اور نہ آئندہ ہوگا۔ وہ واجب الوجود ہے۔ اس کا عدم ممتنع ہے۔ وہ بہت بڑا اور بہت بلند مرتبہ والا ہے۔ تمام صفات کمال سے متصف ہے۔ نقص وزوال کی تمام علامات سے پاک ہے۔ وہ تمام مخلوقات کا خالق ہے۔ تمام معلومات کا عالم ہے۔ تمام ممکنات پر قادر ہے۔ تمام کائنات، ہونے والی چیزوں کا ارادہ کرنے والا ہے۔ زندہ ہے، سننے والا ہے، دیکھنے والا ہے اس کی کوئی شبیہ نہیں ہے نہ ہی اس کا کوئی مدمقابل ہے، نہ اس کا کوئی مثل ہے، نہ وجوب الوجود میں اس کا کوئی شریک ہے، نہ ہی عبادت میں، نہ تخلیق میں اور نہ ہی تدبیر میں۔ اس لئے عبادت یعنی انتہائی تعظیم کا اس کے سوا کوئی مستحق نہیں اور نہ اس کے سوا کوئی شفا دیتا ہے، نہ رزق دیتا ہے اور نہ ہی ضرر، نقصان کو دور کرتا ہے، نہ اس معنی میں کسی شے کے لئے کہتا ہے کہ کن، ہوجا، فیکون اور وہ ہو جاتی ہے۔ اور نہ ہی ظاہری عادت کے سبب کے معنی میں۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے طبیب نے مریض کو شفا دیدی، اچھا کر دیا اور امیر نے لشکر کو رزق دیا، کہ یہ اس سے الگ دوسری بات ہے۔ اگر چہ الفاظ میں اس کے مشابہ ہے۔ اس کا کوئی ظاہر نہیں ہے، نہ ہی وہ کسی دوسرے میں حلول کرتا ہے، نہ ہی کسی غیر کے ساتھ متحد ہوتا ہے، اور نہ ہی وہ اپنی ذات میں حادث ہے کہ نہ اس کی ذات میں حدوث ہے اور نہ ہی اس کی صفات میں۔ حدوث صفات کے اپنے تعلقات کے ساتھ تعلق میں ہے جس سے کہ افعال ظاہر ہوتے ہیں۔ اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ تعلق بھی حادث نہیں ہے۔ بلکہ اصلاحات متعلق ہے جس کی وجہ سے متعلقات کے تفاوت کے لحاظ سے تعلق کے احکام مختلف ظاہر ہوتے ہیں۔ اور وہ تمام وجوہ سے حدوث اور تجدد سے بری ہے۔ وہ نہ جوہر ہے نہ عرض ہے اور نہ جسم ہے۔ وہ نہ کسی خاص مقام کی حدود میں ہے نہ کسی جہت میں اور نہ ہی اس کی طرف یہاں یا وہاں کے طور پر اشارہ کیا جاسکتا ہے۔ نہ اس پر اس کی ذات میں اور نہ ہی صفات میں حرکت، انتقال اور تبدل کا حکم لگانا صحیح ہوتا ہے۔ اور نہ ہی جہل کا نہ کذب کا، اور وہ عرش کے اوپر ہے جیسا کہ خود اس نے اپنے بارے میں بتایا ہے لیکن ایسا کسی دائرہ اور جہت میں محدود ہونے کے معنی میں نہیں ہے۔ بلکہ اس تفوق اور استوا کی حقیقت کو خود اس کے اور علم راسخ رکھنے والوں کے سوا کوئی نہیں جانتا، جن

کواس نے اپنے پاس سے خاص علم دیا ہے۔اور قیامت کے دن اس کی رویت دوطرح سے ہوگی۔ایک یہ کہ وہ پوری طرح انکشاف بلیغ کے طور پر جوعقل کی تصدیق سے بھی زیادہ ہوگا کھل کر سامنے آجائے گا۔گویا کہ آنکھ سے دیکھنے کی طرح ہوجائے گا مگر نہ تو کسی کے مدمقابل میں ہوگا نہ مقابلہ میں اور نہ کسی سمت میں نہ کسی رنگ اور شکل میں۔اس بات کومعتزلہ وغیرہ نے کہا ہے اور وہ حق ہے۔البتہ ان کی غلطی اس معنی میں رویت کی تاویل اور رویت کواس معنی میں حصر کرنے میں ہے۔اور دوسرے یہ کہ ان کے سامنے بہت ساری صورتوں اور شکلوں میں آئے گا جیسا کہ حدیث میں مذکور ہے۔چنانچہ وہ اس کوشکل، رنگ اور جہت میں ایسے ہی دیکھیں گے جیسا کہ خواب نظر آیا کرتے ہیں جیسا کہ نبیؐ نے خبر دی ہے کہ جس طرح وہ اس کا اہل اور مستحق ہے۔جیسا کہ فرمایا میں نے اپنے رب کواحسن صورت میں دیکھا۔چنانچہ وہ وہاں اسی طرح آنکھوں سے دیکھیں گے جیسا کہ خواب میں دیکھا کرتے ہیں اور ہم ان دونوں صورتوں کو سمجھتے ہیں اور ان کا عقیدہ رکھتے ہیں اور اگر اللہ اور اس کے رسول نے رویت سے ان کے علاوہ کچھ اور مراد لیا ہے تو ہم اللہ اور اس کے رسول کی مراد پر ایمان لاتے ہیں خواہ ہم اس کو بعینہ نہیں جانتے۔جو اللہ چاہتا ہے وہ ہوتا ہے اور جو نہیں چاہتا وہ نہیں ہوتا۔چنانچہ کفر اور معاصی اس کی تخلیق اور ارادہ سے ہوتے ہیں نہ کہ رضا سے۔اور وہ غنی ہے اپنی ذات و صفات میں کسی کا محتاج نہیں ہے۔نہ اس کے اوپر کوئی حاکم ہے نہ ہی کسی کے واجب کرنے سے اس پر کچھ واجب ہوتا ہے۔ہاں وہ کسی چیز کا وعدہ کر لیتا ہے تو اس کو پورا کرتا ہے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے، کہ وہ اللہ پر واجب ہو جاتا ہے۔اور اس کے تمام افعال میں کلی طور پر حکمت و مصلحت پائی جاتی ہے جیسا کہ معلوم ہوتا ہے، اور اس پر لطف جزئی خاص یا اصلح خاص واجب نہیں ہوتا۔نہ اس سے کوئی قبیح ہوتا ہے، اور جو کچھ وہ کرتا ہے یا جس کا حکم دیتا ہے اس میں سے کسی کی جور وظلم کی طرف نسبت نہیں کی جاسکتی۔اس نے جو کچھ پیدا کیا یا جس کا حکم دیا اس میں حکمت کی رعایت رکھتا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ خود اسکی اور کسی چیز میں اس کی صفات کی تکمیل کرتا ہو۔نہ ہی یہ بات ہے اس کو کوئی حاجت یا غرض ہو کہ یہ ضعف اور قبح ہے۔اس کے سوا کوئی حاکم نہیں ہے۔چنانچہ اشیا کے حسن و قبح اور فعل کے ثواب وعقاب کا سبب ہونے میں عقل کو کوئی حکم ؟ تو نہیں ہوتا۔کہ اشیا کا حسن و قبح اللہ کے فیصلہ اس کے حکم اور لوگوں کو مکلف

کرنے کی بنیاد پر ہوتا ہے۔اب ان میں سے کچھ کی وجہ، مصلحت اور ثواب وعقاب سے مناسبت کا ادراک عقل خود کر لیتی ہے اور کچھ کا ادراک صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسولوں کے خبر دینے سے کرتی ہے۔اور اس کی صفات میں سے ہر صفت واحد بالذات کے تعلق کے لحاظ سے غیر متناہی ہوتی ہے اور تعلق میں تجدد معنی مذکور میں ہی ہوتا ہے۔

اور اللہ کے بہت سارے فرشتے علوی اور مقرب ہیں اور بہت سارے فرشتے اعمال کے لکھنے اور بندوں کی ہلاکت و بربادی سے حفاظت کرنے اور خیر کی دعوت دینے کے لئے مقرر ہیں۔اور بندوں کو خیر کی علت الہام کرتے ہیں ان میں سے ہر ایک کا مقام مقرر ہے۔انہیں جو حکم دیا جاتا ہے اس کی خلاف ورزی نہیں کرتے جو حکم دیا جاتا ہے اس کو پورا کرتے ہیں۔اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں سے ہی شیطان بھی ہیں ان کو فطرت ابن آدم کے ساتھ شر ہے۔

اور قرآن اللہ کا کلام ہے۔اللہ نے اس کو ہمارے نبیؐ پر وحی کے ذریعہ نازل کیا۔ **وماکان لبشر ان یکلمه الله الا وحیا اومن ورآئ حجاب اویرسل رسولا فیوحی باذنه مایشاء** ’’کسی بشر کا یہ مقام نہیں ہے کہ اللہ اس سے روبرو بات کرے۔اس کی بات یا تو وحی (اشارے) کے طور پر ہوتی ہے یا پردے کے پیچھے سے یا پھر وہ کوئی پیغامبر (فرشتہ) بھیجتا ہے اور وہ اس کے حکم سے جو کچھ وہ چاہتا ہے وحی کرتا ہے‘‘۔(الشوریٰ ۵۱) یہی وحی کی حقیقت ہے۔اور اللہ کے اسما اور اس کی صفات میں الحاق جائز نہیں چنانچہ اطلاق شرع پر موقوف ہوتا ہے۔

اور معاد جسمانی حق ہے۔جسم جمع کیے جائیں گے اور ان میں روح لوٹائی جائیں گی۔ اور بدن وہی ہوں گے جو شرعا اور عرفا ہوتے ہیں اگر چہ وہ لمبے یا چھوٹے ہوں گے جیسا کہ روایت میں آیا ہے کہ کافر کی داڑھ احد پہاڑ جیسی ہوگی۔اور اس سلسلہ میں سب سے لطیف بات وہ ہے جو اہل جنت کے بارے میں وارد ہوئی ہے کہ جیسے بچہ جوان ہوتا ہے پھر بوڑھا ہوتا ہے اور یہ کہ اس میں اجزا ہزاروں بار تبدیل ہوتے ہیں۔جزا سزا، حساب صراط اور میزان حق ہیں۔اور جنت بھی حق ہے اور جہنم بھی حق ہے اور وہ پیدا کی جا چکی ہیں البتہ کسی نص میں ان کی جگہ کے تعین کی تصریح نہیں کی گئی ہے۔اللہ نے جہاں چاہا وہاں وہ موجود ہیں۔اس لئے کہ ہمیں اللہ کی تمام مخلوقات اور اس کی تمام کائنات کا احاطہ نہیں ہے اور کبیرہ گناہوں کا مرتکب

مسلمان ہمیشہ کے لئے جہنم میں داخل نہیں کیا جائے گا۔اسی بات کو اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا ہے ان تجتنبوا کبآئر ماتنهون عنه نکفر عنکم سیاتکم ''اگر تم ان بڑے بڑے گناہوں سے پرہیز کرتے رہو جن سے تمہیں منع کیا جارہا ہے تو تمہاری چھوٹی برائیوں کو ہم تمہارے حساب سے ساقط کردیں گے۔'' (النساء ۳۱) یعنی نمازوں اور کفارات کے ذریعہ۔اور کبیرہ گناہوں کا معاف کرنا بھی جائز ہے۔البتہ دنیا اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کے افعال کی دو صورتیں ہیں ایک اللہ کی سنت کے مطابق ہے اور دوسری علی سبیل خرق العوائد خلاف عادت ہے اور جو شخص بغیر توبہ کئے مرجائے اس کے کبیرہ گناہوں کا معاف کرنا خلاف عادت جائز ہے۔اور اسی طرح حقوق العباد کا بھی خلاف عادت معاف کرنا جائز ہے۔بادی النظر میں متعارض معلوم ہونے والی نصوص میں مطابقت کی یہ ایک صورت ہے۔

اور شفاعت حق ہے جس کے لئے اللہ اجازت دیدے۔اور رسول اللہ کی امت میں سے کبیرہ گناہوں کا ارتکاب کرنے والوں کے لئے آپ کی شفاعت حق ہے۔اور آپ کی شفاعت قبول کی جائے گی۔اور شفاعت کی نفی کی جو حدیث وارد ہوئی ہے۔اس سے مراد وہ شفاعت ہے جو اللہ کے اذن اور رضا کے بغیر ہو۔اور فاسق کے لئے عذاب قبر اور مومن کے لئے وہاں کی نعمتیں حق ہیں اور منکر ونکیر کا سوال حق ہے۔اور مخلوقات کی طرف رسولوں کی بعثت حق ہے۔اور رسولوں کے ذریعہ اللہ کا اپنے بندوں کو امر ونہی کا مکلف بنانا حق ہے۔اور وہ ایسے امور کے ذریعہ دوسروں سے ممتاز ہیں جو اجتماعی طور پر ان کے سوا کسی میں نہیں پائے جاتے۔اور جو ان کے انبیاء ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔ان میں ان کو حاصل خرق عادت امور (معجزات) بھی شامل ہیں۔اور ان میں ان کی فطرت کی سلامتی اور کمال اخلاق وغیرہ بھی شامل ہیں۔اور انبیا کفر اور کبائر کے عمداً ارتکاب اور ان پر اصرار سے معصوم ہیں۔اللہ تعالیٰ ان کو تین وجوہ سے معصوم ومحفوظ رکھتا ہے۔

ایک یہ کہ ان کو سلامتی فطرت اور اخلاق کے اعتدال کے کمال کے ساتھ پیدا کرتا ہے۔اس لئے وہ معاصی کی طرف راغب نہیں ہوتے بلکہ ان سے متنفر ہوتے ہیں۔دوسرے یہ کہ ان پر وحی کی جاتی ہے کہ معاصی کے ارتکاب پر مواخذہ کیا جائے گا اور طاعات پر ثواب دیا جائے گا۔اس طرح یہ وحی ان کو معاصی سے روکتی ہیں۔اور تیسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ ان کے اور

معاصی کے درمیان لطیف نظر نہ آنے والے غیبی امور کو حائل کر دیتا ہے جیسا کہ یوسف علیہ السلام کے قصہ میں یعقوب علیہ السلام کی صورت اپنی انگلیاں کاٹتے ہوئے ظاہر ہوئی۔

اور محمدؐ خاتم النبیین ہیں، آپ کے بعد کوئی نبی نہیں اور آپ کی دعوت تمام انسانوں اور جنات کے لئے عام ہے۔ آپ اس خاصہ اور اسی طرح کے دوسرے خواص کے لحاظ سے افضل الانبیا ہیں۔ اور اولیا کی کرامات حق ہیں جو کہ اللہ تعالیٰ اور اس کی صفات پر ایمان رکھنے والے اور اس کی معرفت رکھنے والے ہیں اور اپنے ایمان میں محسن ہیں۔ اللہ ان کرامات کے ذریعہ جس کو چاہتا ہے۔ عزت و تکریم سے نوازتا ہے اور جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت کے لئے خاص کر لیتا ہے۔

اور عشرہ مبشرہ فاطمہ، خدیجہ، عائشہ، حسن اور حسین رضی اللہ عنہم کے لئے جنت اور خیر کی شہادت دیتے ہیں۔ ان کی عزت و احترام کرتے ہیں۔ دین اسلام میں ان کے بلند مرتبہ اور عظمت کا اعتراف کرتے ہیں۔ اسی طرح اہل بدر اور اہل بیعت رضوان کی عظمت و مرتبۂ بلند کا اعتراف کرتے ہیں۔ اور رسول اللہؐ کے بعد ابو بکر صدیق امام حق ہیں۔ آپ کے بعد عمر پھر عثمان اور پھر علی ہیں۔ رضی اللہ عنہم۔ پھر دور خلافت ختم ہو گیا اور اس کے بعد بد خلق بادشاہت تھی۔

اور ابو بکر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تمام انسانوں میں سب سے افضل ہیں، پھر عمر ہیں۔ افضلیت سے مراد ہم تمام وجوہ سے نہیں لیتے کہ اس میں نسب، شجاعت، قوت، علم وغیرہ سب شامل ہو جائیں بلکہ اس کے معنی اسلام میں عظمت نفع ہیں، چنانچہ امیر الملت نبیؐ ہیں اور آپ کے دو وزیر ابو بکر و عمر اشاعت حق میں کمال ہمت کے لحاظ سے ہیں۔ نبیؐ کے دو رخ ہیں ایک رخ اللہ سے لینا ہے اور دوسرا رخ مخلوق کو عطا کرنا ہے۔ اور ان دونوں رخوں سے مخلوق کو عطا کرنے میں لوگوں کی تالیف اور ان کو جمع کرنے اور جنگ کی تدابیر میں ید طولیٰ حاصل ہے۔

اور ہم صحابۂ کرام کا ذکر صرف خیر کے ساتھ کرتے ہیں۔ وہ دین کے معاملات میں ہمارے امام اور قائد ہیں۔ ان پر سب و شتم کرنا حرام اور ان کی تعظیم واجب ہے۔ اور ہم اہل قبلہ میں سے کسی کی تکفیر نہیں کرتے، سوائے اس کے جس میں صانع، قادر مختار کی نفی ہے یا غیر اللہ کی عبادت یا معاد نبی اور تمام ضروریات دین کا انکار ہو۔

اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر واجب ہے لیکن اس کی شرط یہ ہے کہ اس سے کوئی

فتنہ نہ پیدا ہو۔ اور اس کی قبولیت کا یہ میرا عقیدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ظاہری اور باطنی طور پر اس کو مستحکم فرمائے۔ والحمدللہ اولا و آخرا و ظاھرا و باطنا۔

۶۶- تفہیم:

اہل اللہ کی تین قسمیں

دین کے طریقوں اور مذاہب میں تقسیم ہونا اور امت کا ان کی بنیاد پر گروہوں اور فرقوں میں بٹنا اور جمع و مجتمع ہونا امر عظیم ہے جس نے ان کے عوام و خواص کو گھبراہٹ میں مبتلا کر دیا ہے۔ چنانچہ اہل اللہ میں سے کسی کو شریعت محمدیہ علی صاحبہا الصلوات والتسلیمات کے ساتھ فقہائے اسلام کے ہر قول کو مربوط کرنے کے سلسلہ میں کشف ہوا لیکن ان کو راہ راست کا کشف نہیں ہوا جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے قائم کی ہے، اور اس کے تعلق سے ان سے راضی ہوا ہے اس کی بنیاد پر جو کامیاب ہو گیا وہ تو ایک بڑے حصہ (حظ وافر) کے ساتھ کامیاب ہوا اور جس نے اس میں خطا کی وہ حظ وافر کے ساتھ کامیاب نہیں ہوا۔ اگرچہ اس کو اس کی کوشش کا اجر ملے گا۔ چنانچہ وہ بعض اقوال کو دوسرے اقوال پر ترجیح دینے اور ان کے اختلاف کو عزیمت اور رخصت پر محمول کرنے سے خاموش رہا۔ چنانچہ جو عزیمت میں قوی اور مضبوط ہے وہ اس کو اخذ کر لیتا ہے اور جس کی قوت جسمانیہ یا قوت روحانیہ اس سے قاصر رہ گئی اس کو چاہئے کہ وہ رخصت سے کام چلا لے۔ اس سلسلہ میں ان کا کلام بہت بسیط و مفصل ہے جیسا کہ شعراوی نے اپنی کتاب میزان میں یہ طریقہ اختیار کیا ہے اور اس کی اصل میں ان پر شیخ محی الدین محمد بن علی بن عربی سبقت لے گئے۔

اور کچھ اہل اللہ کو وہ راہ راست دکھائی گئی جو ظاہر شریعت تک پہنچا دیتی ہے اور جو جمہور مسلمانوں کو بڑے بڑے نقاد تابعین کے ذریعہ بڑے بڑے صحابہ کے واسطہ سے نبیؐ سے بطور وراثت حاصل ہوئی ہے اور انہوں نے اس کو ظاہری طور پر اس طرح حاصل کیا ہے جیسے کوئی چیز ہاتھ سے حاصل کی جاتی ہے یا انہیں بطور وراثت بعینہٖ وہی چیز حاصل نہیں ہوئی لیکن وہ اس سے مشابہ شے کے وارث ہو گئے اور اس کے پیچھے وہ اہل الرائے کے مذاہب کو دیکھتے ہیں جو

کہ احاطوں اور کناروں کی مانند ہیں۔ چنانچہ متکلم نے دین کی مدد کرنے اور اس سے پریشانی کو دور کرنے کے لئے ترجیح الراجح کی راہ دیکھی جیسا کہ اکثر فقہا محدثین نے کیا کہ انہوں نے اس سلسلہ میں بہت کوششیں کیں۔

اور اہل اللہ میں سے وہ لوگ ہیں جن پر دونوں امر کی حقیقت کھل گئی تو ان تمام کو ایسے معنی پہنائے کہ وہ دائرہ شرع میں آتے ہیں۔ اور یہ کہ عبادت کے لئے اس کے دین کی کشادگی میں اللہ تعالیٰ کی خاطر دین پر عمل کرنے والے اس کے نزدیک معذور ہیں۔ البتہ فضیلت راہ مستقیم کو حاصل ہے اور وہی اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ ہے۔

اور میرے اوپر اللہ کا سب سے بڑا انعام یہ ہے کہ اس نے مجھے تیسری جماعت میں شامل کیا ہے اور میرے لئے شریعت کی اصل حقیقت اور اس کو اس طرح بیان کرنے کی راہ کھول دی جس طرح وہ نبیؐ کی زبان مبارک سے حاصل ہوئی ہے جیسا کہ ارشاد باری ہے لتبین للناس مانزل الیھم "تا کہ آپ لوگوں کے سامنے اس امر کو بیان کر دیں جو ان کی طرف نازل ہوا ہے۔" اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے اقیموا الصلوۃ و آتوا الزکوۃ "نماز قائم کرو اور زکوۃ دو"۔ لفظ اقامت، قامت السوق سے ماخوذ ہے اور یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب بازار میں خرید وفروخت جاری ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اشاعت اور رواج کا عمل جاری ہے، اس لئے نبیؐ نے فرمایا کہ اس کے جاری ہونے سے مقررہ اوقات کی پابندی، رکعتوں کا تعین، نماز کی صفت وکیفیت کی تعلیم، اذان دینا، جماعت کے معاملہ کی تاکید، مسجدوں کی تعمیر کے لئے جمع ہونا اور اس میں حصہ لینا اور ان میں حاضری مقصود ہے۔ اس طرح یہ سب اقامت صلوۃ کے لئے بیان ہیں اور اگر اس کا بیان واضح اور مفصل نہ ہوتا تو ہم اس بارے میں کبھی بھی کچھ بھی نہ جان پاتے۔ اور اسی طرح رسول اللہؐ نے ایتاء الزکوۃ کو نصاب کی تعیین، واجب مقدار، اس کے نکالنے کی تفصیل اور اس سے نکالی جانے والی جنس واجب وغیرہ کو بیان فرمایا۔

پھر اس کی وضاحت اور اس کے اصول وفروع کی تدوین مجتہدین متقدمین کے ذریعہ ہوئی۔ اس کی مثال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اذا قمتم الی الصلوۃ فاغسلوا وجوھکم وایدیکم الی المرافق وامسحوا برءوسکم وارجلکم الی الکعبین "جب تم نماز کے

لئے کھڑے ہوتو اپنے چہروں کو اور کہنیوں تک اپنے ہاتھوں کو دھولو اور اپنے سروں پر مسح کرلو اور ٹخنوں تک اپنے پیروں کو دھولو۔" (المائدہ ۶) پھر مجتہدین نے بیان کیا کہ غسل کا مطلب صرف پانی کا بہانا ہے یا اس میں ملنے کی بھی شرط ہے اور یہ کہ چہرہ کی حد کہاں سے کہاں تک ہے اور یہ کہ الی المرافق (کہنیوں تک) کا مطلب کہنیوں سمیت دھونا ہے۔ اور یہ کہ کیا مسح کے لئے ایک یا دو بالوں پر ہاتھ پھیر لینا کافی ہے یا اس کے لئے چوتھائی سر یا پورے سر کا مسح ضروری ہے۔

پھر ان کے مذاہب، اقوال اور ان کے قواعد کی بنیاد پر مسائل کی تخریج کے بارے میں جو ہر مذہب کے متاخرین فقہا کے ذریعہ شرح کی گئی ہیں، ان میں سے ہر ایک کے بارے میں نفس الامر میں واقع اس کی ترتیب اس طرح کھل کر سامنے آ گئی گویا کہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ چنانچہ میں نے ہر اس قول کو جو دین کے بارے میں کہا گیا ہے بالواسطہ یا بلاواسطہ اصل شریعت سے مربوط دیکھ لیا۔ اور اس سلسلہ میں کیا ہی اچھی بات کہی گئی ہے کہ اس کی مثال ایک ایسے بڑے درخت کی ہے جس سے بڑی بڑی اور موٹی شاخیں نکلیں اور ان سے چھوٹی پتلی شاخیں نکلیں اور ان چھوٹی و پتلی شاخوں میں پتے اور پھول نکلے۔ یا اس کی مثال اس چشمہ کی ہے جس سے بڑی بڑی نہریں نکلیں اور ان بڑی نہروں سے دوسری چھوٹی نہریں نکلیں اور چھوٹی نہروں سے پانی برتنوں میں بھرا اور ان میں سے کچھ نرم جگہوں اور درختوں کے اگنے کی جگہوں میں جائے۔

اور مجھ پر ان راستوں کے حقائق بھی کھل گئے جن کی رات، دن کی طرح اور ان کا اول ان کا آخر ہے۔ اور ان راستوں کے حقائق بھی کھل گئے جو پوشیدہ و تاریک مقامات میں ہیں۔ جو اس منزل پر جہاں نبیؐ ہیں بڑی محنت و مشقت، غور و فکر اور تکالیف اٹھانے کے بعد اور تقلید کی بڑی بڑی تکلیفوں کے برداشت کے بعد پہنچاتا ہے جن میں آدمی خطا اور ثواب کے مسائل سے گذرتا اور کسی قول سے مسائل کے اخراج کی دشواریوں کو برداشت کرتا ہے اور حق و باطل کو الٹ پلٹ کرتا ہے۔

اور میرے لئے اس رائے کی حقیقت سے بھی پردہ اٹھا دیا گیا، اسلاف نے جس کی مذمت کی ہے، اور اس کی طرف اپنے فقہا میں سے کچھ لوگوں کی نسبت کی ہے۔ چنانچہ سنت ظاہرہ کی مثال اس لغت کی ہے جس کے مطابق نبیؐ قرآن پڑھا کرتے تھے۔ اور ان اقوال کی

مثال جو اس کے دائیں اور بائیں ہیں ان حروف کی ہے جن کے مطابق قرآن کو پڑھنے کی اس لئے اجازت دی کہ آپ کی امت کو دشواری پیش نہ آئے۔ اور سنت ظاہرہ کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص خلیفہ کی محفل میں شریک ہوا اور دونوں کان کھول کر اس کی باتیں سنیں اور اس کو بات کرتے ہوئے دیکھا اور پوری طرح اس کی طرف توجہ دی۔ اور قوم کے قواعد سے نکالے جانے والے اقوال کی مثال اس بازار کی ہے جو خالص خلیفہ کے احکام کے مطابق چلتا ہے اور جس کے بارے میں گمان کیا جاتا ہے کہ ایسی بات کا حکم دیتا ہے جو اس کو ذہانت و فطانت کی طرف اور بعض امور میں گمان کی طرف چلائے۔

اور آپ عام لوگوں کو خاص طور سے دور حاضر میں ہر ملک میں دیکھیں گے کہ متقدمین کے مذاہب میں سے کسی مذہب کے ساتھ مقید کرتے ہیں اور جو انسان کسی مذہب کی تقلید کر رہا ہے اس سے اس کے کسی ایک مسئلہ میں بھی خروج کو ایسا سمجھتے ہیں جیسے ملت سے خروج ہو۔ گویا کہ وہ کوئی نبی ہے جو ان کی طرف مبعوث کیا گیا ہے اور اس کی اطاعت ان پر فرض کی گئی ہے۔ جب کہ چوتھی صدی سے قبل امت کے دور اول کے لوگ کسی ایک مذہب کے ساتھ مقید نہیں تھے۔

ابو طالب نے اپنی کتاب قوت القلوب میں کہا ہے کہ ”کتابیں اور مجموعے محدث ہیں اور لوگوں کے اقوال اور فتاوی لوگوں کے ایک مذہب سے متعلق ہیں۔ اور ان کا قول اور حکایت ہر چیز میں اختیار کیا گیا ہے اور تفقہ ان کے مذہب پر ہے۔ اس پر لوگ قدیم نہیں ہیں۔“ صحیح بات تو یہ ہے کہ عام لوگ آج وضو، غسل، نماز، زکوۃ، روزہ، حج، نکاح اور خرید و فروخت وغیرہ کے طریقے جو اپنے آباواجداد کے قائم مقام لوگوں اور اپنے شہروں کے معلموں سے سیکھتے ہیں، اور جب کوئی بڑا مسئلہ درپیش ہوتا ہے تو مفتیوں سے رجوع کرتے ہیں خواہ وہ اہل مدینہ ہوں یا اہل کوفہ، سب کا یہی حال ہے۔ اس طرح مفتی جو فتوی دیتے ہیں، وہ اس پر عمل کرتے ہیں۔ جب کہ خواص میں سے جو صاحب حدیث ہوتا ہے اس کو احادیث اور آثار سے جو بات واضح ہو جاتی ہے، اس میں صرف صاحب شریعت کی تقلید کرتا ہے۔ اس کے علاوہ کسی کی تقلید نہیں کرتا۔ اور جو بات اس کے سامنے واضح نہیں ہوتی اس میں اقوال اور آرا کی اتباع کرتا ہے، یہاں تک کہ اس کو اطمینان قلب حاصل ہو جاتا ہے۔ اور جو صاحب تخریج ہوتا ہے جن امور میں اس کے سامنے کوئی نص نہیں ہوتی وہ کسی فقیہ کے نصوص یا اس کے بیان کردہ

قواعد سے مسائل کا استنباط کرتا ہے۔ اور عوام کے مذاہب کے ساتھ تقید کے زمانہ میں بعض اہل کشف شیخ ابن عربی وغیرہ کسی ایک مذہب کے ساتھ تقید نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے فتوحات مکیہ وغیرہ میں کہا ہے کہ بندہ جب کسی ایک مذہب کا پابند ہو کر قوم کے راستہ پر چلتا ہے تو وہ کسی دوسری طرف نہیں دیکھتا۔ اس لئے ضروری ہوتا ہے کہ خاص اسی مذہب تک محدود رہیں، جن مسائل کا اس کے امام نے استنباط کیا ہے۔ اور جہاں تمام ائمہ کے اقوال ایک ہی منبع سے اخذ ہوتے نظر آتے ہیں، وہاں لازمی طور پر اس سے اپنے مذہب کی پابندی ختم ہو جاتی ہے اور اس سے پہلے وہ جس پر تکیہ کر رہا تھا اس کے برخلاف تمام مذاہب کے مساوی ہونے کا حکم لگاتا ہے۔ جب کہ ان میں سے بعض پابندی کی بات کہتے ہیں یا تو اس وجہ سے کہ اس سلسلہ میں عوام کے درمیان اختلاف نہ پیدا ہو یا بعض جہات کے لحاظ سے، بعض مذاہب کے رجحان کی وجہ سے، جو ان کو خواب وغیرہ میں دکھائے جاتے ہیں۔ جب کہ ابو محمد الجوینی وغیرہ بعض نقاد علما خود ذاتی طور پر عمل کرنے یا دوسروں کو فتوی دینے میں کسی ایک مذہب پر عمل کی پابندی نہیں کرتے۔ چنانچہ انہوں نے ایک کتاب المحیط تصنیف کی اور اس میں کسی معاملہ میں بھی کسی ایک مذہب کا التزام نہیں کیا۔

اور جلال الدین سیوطی اور عبدالوہاب شعرانی نے ایک بڑی جماعت سے جن کا شمار کرنا دشوار ہے یہی موقف نقل کیا ہے۔ اور اکثر فقہا ایک ہی مذہب کی پابندی پر زور دیتے ہیں جیسا کہ مشہور ہے۔ اس طرح اس سلسلہ میں ان کے اختلاف نے قوم کو پریشانی اور انتشار میں مبتلا کر دیا اور ان کو ایک دوسرے کے انکار پر برانگیختہ کر دیا۔ جب کہ یہ بات نبیؐ کے عہد میں نہیں پائی جاتی تھی۔ اب میرے اوپر اللہ کا ایک بڑا فضل و کرم یہ ہے کہ اس نے مجھ پر مذاہب کے حالات کی حقیقت اور بعض مذاہب کے تقید کی حالت اور اس شخص کی حالت کا کشف کر دیا جو ایک مذہب کا پابند رہنے کے بعد دوسرے مذہب کو اختیار کرنے کا ارادہ کرتا ہے۔ اور اس شخص کا حال واضح کر دیا جو بعض مسائل میں ایک مذہب کو اختیار کرتا ہے اور بعض مسائل میں دوسرے کو۔ کہ کیا شارع نے اس سلسلہ میں اختیار دیا ہے یا ہر شخص کے لئے لازم ہے کہ وہ ایک مذہب کا التزام کرے۔

اور میرے اوپر اللہ کا ایک بڑا انعام یہ ہے کہ میرے اوپر یہ حقیقت کھول دی کہ شارع

نے ہمیں علم کی دو قسمیں عنایت فرمائی ہیں جو اپنے احکام میں ایک دوسرے سے ممتاز اور اپنے مراتب میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اور مصالح اور مفاسد کا علم اور دوسرے شرائع اور حدود کا علم۔ اور گویا کہ میں ان دونوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ اور دونوں قسموں میں تمیز کر لیتا ہوں اور دونوں معاملات کو پہچانتا ہوں۔ اور یہ ایسا علم ہے کہ میں نے اپنے آپ سے پہلے کسی کو اس کو بیان کرتے اور اس کے اصول و فروع کی وضاحت کرتے اور مسائل کو اس پر منطبق کرتے نہیں دیکھا۔

اور میرے اوپر اللہ کا ایک بڑا انعام یہ ہے کہ میرے لئے راہ مستقیم کے احکام کے بعد فقہا کے اختلاف کے اسباب واضح کر دیے جن کی طرف میں نے بعض ان تفصیلات اور فروعات میں اشارہ کیا ہے جو مقدمات کلیہ میں مستحکم طور پر محصور ہیں۔ جو ان پر یقین کرے گا اس کو مواضع اختلاف میں سے کسی چیز کو سمجھنے میں کوئی توقف نہیں ہوگا۔ وہ راہ مستقیم کو اپنی آنکھوں کے سامنے واضح شکل میں اس طرح دیکھ لے گا جیسے اس کے سامنے اس کا بیٹا یقینی صورت میں ہوتا ہے۔ اور اس میں مختلف تفصیلات کو ایک ایسے امر ضروری کے طور پر دیکھے گا جو ملت کے لئے ان کے ماخذ سے استنباط کرنے والوں اور ان کے منبع سے اخذ کرنے والوں کی فہم کے اختلاف سے پیدا ہوتی ہیں۔

اور میرے سامنے یہ امر واضح کیا کہ اختلاف کے چار درجے ہیں، ایک اختلاف مردود وہ ہے جس کے لکھنے والے اور اس کی تقلید کرنے والے کے لئے بعد میں کسی عذر کی گنجائش نہیں ہوتی۔ یہ صورت چاروں مدون مذہبوں میں قلیل الوجود ہے، دوسرا اختلاف مردود وہ ہے جس کے قائل کو اس وقت تک عذر کی گنجائش ہوتی ہے جب تک اس کے سامنے ایسی صحیح حدیث نہ آجائے جو اس کے خلاف پر دلالت کرتی ہو۔ پھر جب اس کو وہ حدیث مل جائے تو اس کے لئے عذر کا کوئی موقع نہیں رہتا۔ تیسرا اختلاف مقبول ہے جس کے دونوں پہلوؤں کو اختیار کرنے کا شارع نے مطلق اور ظاہری طور پر مکلفوں کو اختیار دیا ہے جیسا کہ قرآن کو سات قرأتوں پر پڑھنا۔ اور چوتھا اختلاف وہ ہے جس کے دونوں پہلوؤں کے مقبول ہونے کا ادراک ہم نے شارع صلوات اللہ علیہ کے بعض ارشادات سے اجتہاد اور استنباط کے ذریعہ کیا ہے اور انسان اس کا مکلف ہے لیکن مطلق نہیں بلکہ بشرط اجتہاد۔ اور جس

کو یہ درجہ حاصل ہو اس کی تقلید اور گمان غالب کی شرط کے ساتھ مکلف ہے۔

اور میرے لئے اس قبیل کے دوسرے بہت سارے علوم کے بارے میں بھی وضاحت کر دی گئی اور یہ بھی پردہ اٹھا دیا گیا کہ ہر مذہب میں ظاہر اور شاذ ہوتے ہیں۔ چنانچہ امام ابوحنیفہ کے مذہب میں ظاہر الروایہ وہ ہے جس میں اصول خمسہ جمع کیے گئے ہیں۔ اور جس میں محمد بن الحسن نے تصریح کی ہے کہ یہ ابوحنیفہ کا مذہب ہے۔ اور ان کے قول پر اعتماد کیا گیا ہے اور مالک کے مذہب میں ظاہر الروایہ وہ ہے جس کی تصریح ابن القاسم نے کی ہے اور جس کا مدونہ میں ذکر کیا گیا ہے کہ یہ امام مالک کا قول ہے جس پر ان کا اعتماد ہے۔ اور امام شافعی کے مذہب میں ظاہر الروایہ وہ ہے جس پر شیخین رافعی اور نووی نے اعتماد کیا ہے اور دونوں نے تصریح کی ہے کہ وہ امام شافعی کا مذہب ہے اور ان کا مشہور معمول بہ قول ہے۔ اور اس کے سوا ان کی روایت سے ان کے مذہب میں جو کچھ غیر مشہور اور خلاف ضابطہ پایا جاتا ہے وہ شاذ ہے۔ اس طرح شریعت مطہرہ مصطفویہ علی صاحبہا الصلوات والتسلیمات ظاہر اور شاذ ہے اور شریعت مصطفویہ کے ظاہر کے درجات ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ قوی وہ ہے جو نص قرآن میں پایا جائے اور جس کو اس طرح بیان کیا گیا ہو کہ زبان کو جاننے والے پر اس کی مراد مخفی نہ رہے اور اس کو اس طرح تلاوت کرے جیسے ان احادیث میں بیان کیا گیا ہے جو شیخین ابوعبداللہ بخاری اور مسلم نیشاپوری کی صحیحین میں اور موطا مالک میں مروی صحیح روایتوں سے اخبار کے تعارض اور روایات کے الفاظ میں کھلے اختلاف کے بغیر حاصل ہوتا ہے۔ اس سے میری مراد وہ ہے جس میں چار شرطیں جمع ہوں اور اپنے معنی پر صریح دلالت کرتی ہوں کہ زبان کو جاننے والے پر اس کی مراد مخفی نہ ہو اور اس سے اس طرح فیض حاصل ہوتا ہو کہ اس کو تین یا زیادہ صحابہ نے روایت کیا ہو اور پھر ہر طبقہ میں راوی برابر زیادہ ہی ہوتے رہے ہوں یہاں تک کہ حفاظ حدیث اور نقاد فقہا کا طبقہ آ گیا اور انہوں نے اس پر رضامندی کا اظہار کیا اور اس کو بیان کیا اور وہ ان تینوں کتابوں میں مروی ہو۔ اسلام میں اس کی ایک ایسی شان ہے جو اس کے علاوہ کو حاصل نہیں ہے اور اس کو علماء حدیث وفقہ کے نزدیک ایسی قبولیت حاصل ہے جو اس کے علاوہ کو حاصل نہیں ہے۔ اور اس کو ایسی صحت کا درجہ حاصل ہے کہ ایسی شہادت علما نے اس کے علاوہ کے بارے میں نہیں دی ہے۔ اور اس کو مشرق ومغرب کے حجاز، شام اور

عراق کے علماء حدیث وفقہ میں ایسی شہرت حاصل ہے کہ اس کے علاوہ کو حاصل نہیں ہے اور قوم ان کے غرائب کی شرح، ان کی مشکلات کے ضبط، ان کے فقہ کے استنباط اور ان کے راویوں کے ذکر میں اس قدر اشتغال رکھتی ہے کہ ان کتابوں کے علاوہ کسی میں اتنا اشتغال نہیں رکھتی۔ اور یہ ایسا امر ہے کہ جو قوم کے مدارک ومناہج سے ناواقف کے سوا کسی پر مخفی نہیں ہے۔ اور نبیؐ پر خاص طور سے ان کتابوں میں اخبار کا تعارض نہیں ہے۔ اور مالک نے موطا میں اس کو اس طرح بیان کیا ہے کہ یہ کبار صحابہ وتابعین کا مذہب ہے اور اس پر زمانۂ نبوت سے ان کے زمانہ تک اہل مدینہ کا عمل رہا ہے۔ پھر شافعی، احمد اور بخاری وغیرہ حدیث وفقہ کے درمیان جمع کرنے والوں نے اس میں اقرار شدہ امر پر گرفت نہیں کی بلکہ اس پر رضامندی واتفاق کا اظہار کیا، اس کو بیان کیا اور اس کی ان اخبار سے صریح تائید کی جو نبیؐ سے صحیح یا حسن شکل میں آئی ہیں اگرچہ وہ اخبار الاحاد سے یا ان کی دلالت یا اشارہ سے یا صحابہ اور تابعین کے جم غفیر سے یا واضح قیاس یا قوی استنباط سے ہی کیوں نہ رہی ہوں۔

اور مالک نے جو حکم بیان کیا ہے اس میں معاملہ اس طرح ہے جیسا کہ سفیان ثوری وغیرہ نے بیان کیا ہے، لیکن امام مالک کے بیانات زیادہ ہیں اور اس امر کے زیادہ موافق ہیں جب کہ ان کے علاوہ کے بیان میں یہ بات بہت کم پائی جاتی ہے۔ اور اس میں وہ حکم بیان کئے ہیں جن کی تائید میں کتب مشہورہ میں صحیح یا حسن حدیث آئی ہے اور اسی جیسی سے حجت قائم ہوتی ہے اور اس سے فقہا کی ایک بڑی جماعت نے استنباط کیا ہے یا استنباط صحیح وقوی ہوا ہے جس کی صحت کی ایک بڑی جماعت نے گواہی دی ہے۔ واللہ اعلم۔

یہ سب کچھ شریعت نبوی علی صاحبہا الصلوات والسلام کا ظاہر اور آپ کی سنتوں سے راہ مستقیم ہے اور اس کا رشد واضح اور اس کی قدر ظاہر ہے۔ اور جس نے اس کی مخالفت کی وہ مردود ہے اس لئے کہ اگر وہ قرآن عظیم اور مشہور حدیث یا اجماع یا قیاس جبلی کا مخالف ہے تو کسی بھی طرح معذور نہیں ہے۔ اور اگر اس کے علاوہ کسی اور کا مخالف ہے تو بھی اس کو معذور قرار دیا جائے گا یہاں تک کہ اس کو حدیث پہنچ جائے اور حجاب اٹھ جائے۔ پھر جب امر واضح ہو جائے تو اس کے بعد اس کے مقلد کے لئے عذر کی کوئی گنجائش نہیں ہوگی۔ نہ ہی اس کے مقلد کو یہ کہنے کا حق ہوگا کہ میں حدیث پر عمل نہیں کروں گا بلکہ میں تو اپنے امام کے قول پر ہی

عمل کروں گا، چاہے اس کے خلاف دلیل صحیح ہی کیوں نہ ہو۔

اب آپ پر واجب ہے کہ اس بیان سے شریعت کے سلسلہ میں جو کچھ ثابت ہو گیا اس میں اچھی طرح غور وفکر کریں حتی کہ اس کے علاوہ سے وہ ممتاز ہو جائے اور واضح شکل میں آپ کے سامنے آ جائے اور آپ کے دل میں اچھی طرح بیٹھ جائے۔ پھر آپ اس کو مضبوطی کے ساتھ اختیار کر لیں اور اپنے ہاتھوں سے قوت کے ساتھ پکڑ لیں اور اس میں جو آپ کی مخالفت کرے، اس کی بالکل پرواہ نہ کریں۔ پھر اس راہ مستقیم کے احکام کے بعد کبھی بعض اسباب کی وجہ سے اختلاف ہو جاتا ہے تو جو ماخذ سے قریب ہو اور ظاہر میں اس میں کوئی تقصیر نہ ہو تو اس کا بالکل انکار نہ کرو بلکہ اس قبیل کی جو بات بھی کہی جائے اس کو تسلیم کر لو۔ اور اس کی مثال کسی ایک مذہب کے مقلد فقہا کے اقوال جیسی ہے جب ان کے درمیان امام کی عبارت کی تفسیر یا وجوہ کے استنباط یا مذاہب کے پابند افراد کے نزدیک اقوال اور وجوہ کی تصحیح میں اختلاف واقع ہو جائے۔ کیونکہ وہ اس کو ایک دوسرے کے خلاف مذہب نہیں مانتے اور اس طرح کے معاملات میں چشم پوشی سے کام لیتے ہیں۔

اور اس طرح تم راہ مستقیم کو مذہب واحد بناؤ اور مختلف اقوال میں چشم پوشی سے کام لو اور شریعت محمدیہ سے راہ مستقیم سے کوئی چیز باہر مت نکالو۔ اس راہ سے خارج کی مثال وضو میں دونوں پیروں کا مسح اور نکاح متعہ کو حلال قرار دینا اور نشہ آور شراب کا تھوڑا سا پینا اور پالتو گدھوں کو حلال قرار دینا اور یہ قول ہے کہ ظہر کا آخری وقت وہ ہوتا ہے جب سایۂ اصلی کے بعد سایہ دو انسانوں کے برابر ہو جائے اور راہ راست کو تسلیم کر لینے کے بعد اختلاف کی مثال روزہ کے سلسلہ میں ان کا یہ اختلاف ہے کہ زوال کے بعد مسواک کرنا مکروہ ہوتا ہے یا نہیں۔ اور نماز سبحانک اللّٰھم سے شروع کی جائے یا وجہت وجھی سے یا کسی بھی چیز سے شروع نہ کی جائے۔ اور یہ کہ تشہد ابن مسعود کی طرح پڑھا جائے یا ابن عباس کی طرح یا ابن عمر کی طرح۔

پھر اگر علم کے معاملہ میں ہمت تمہارا ساتھ دے اور تمہاری عزیمت تقوی میں قوی ہو تو ان تفاصیل کو صریح کتاب ظاہر سنت اور اکثر اہل علم کے فعل اور قیاس قوی پر پیش کرو اور مختلف احادیث کے درمیان جمع و تطبیق کرو اور محدثین کی کتابوں میں مروی صحیح، حسن اور ضعیف اخبار میں تتبع سے کام لو اور ان میں جو سب سے زیادہ قوی، قیاس کے سب سے زیادہ قریب اور سب

سے زیادہ احتیاط کے مطابق ہو اس کو اختیار کرلو، ورنہ پھر تم عام مسلمانوں میں سے ایک شخص ہو۔

اب اگر تم یہ کہتے ہو کہ آپ نے جو بیان کیا میں اس کو تسلیم کرتا ہوں کہ وہ شریعت مصطفویہ میں سے صراط جلیل ہے لیکن میں دوسرے کے مقابلہ میں اس کے سلسلہ میں کس طرح تمیز کروں؟ اور شاید اس کے لئے احادیث میں سے بہت سی چیزوں کو جمع کرنے کی حاجت ہوگی اور ہمارے زمانہ میں یہ ایک مشکل کام ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اتنے کام کے لئے موطا اور صحیحین اور سنن ابوداؤد اور جامع ترمذی سے زیادہ کی حاجت نہیں ہے۔ اور یہ کتابیں معروف و مشہور ہیں ان کا حاصل کرنا مختصر مدت میں ممکن ہے۔ البتہ راہ مستقیم قوی و جلیل کی معرفت کے لئے اس نور باطن کی اور جس زبان کو تم جانتے ہو اس کو سمجھنے کی حاجت ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ پیدا فرماتا ہے۔ اب اگر تمہارے قلب میں وہ نور نہیں پایا جاتا اور تمہارے بعض بھائی اس سلسلہ میں تم پر سبقت لے گئے تو اس کے بعد تمہارے لئے کوئی عذر باقی نہیں رہا۔ والعلم عنداللہ تعالیٰ۔

۶۷- **تفہیم:**

شیخ خواجہ خرد کے سوالات کے جوابات

سبحانک لاعلم لنا الاماعلمتنا. انک انت العلیم الحکیم. امابعد۔

میرے بھائی! تم نے مجھ سے اپنے کشف کے تقاضہ کے مطابق ان سوالوں کے جواب لکھنے کے لئے کہا ہے جو ہمارے شیخ کے شیخ خواجہ خرد نے اپنے بعض معاصرین سے پوچھے تھے، تم ان پر اعتماد کرسکو تو میں آپ کے سوال کا جواب دیتا ہوں۔ خواجہ خرد نے کہا۔ پہلا مسئلہ ایسے مسائل کثیرہ پر مشتمل ہے جو ایک دوسرے سے قریب ہیں اور جو اہل کشف و ذوق کے نزدیک جسم کی حقیقت کے بارے میں ثابت ہوئے کہ وہ بسیط ہے یا مرکب۔ اگر بسیط ہے تو مقدار جوہری یا کچھ اور۔ دوسری صورت میں ایسے جوہر فرد سے مرکب ہے جو کبھی تقسیم نہیں ہوتا یا ہیولی اور صورت سے مرکب ہے یا ان چھوٹے چھوٹے اجسام سے مرکب ہے جو عملاً تقسیم نہیں ہوتے یا دوسرے امور سے؟ پھر اجسام فلکیہ عنصریہ ہیں یا نہیں؟ اور اسی طرح کرسی اور عرش دو جسم ہیں یا معقولان ہیں؟ اگر جسم ہیں تو عنصری ہیں یا نہیں؟ اور دونوں صورتوں میں ان

دونوں پر خلاف عادت اور عادت کے مطابق ہونے کا اطلاق کرنا صحیح ہے یا نہیں؟ پھر خلا کے چاروں یا تینوں پیمانے فلک پر منتہی ہوتے ہیں اور افلاک اور اسی طرح عرش وکرسی کروی ہیں، ہمیشہ حرکت کرتے رہتے ہیں یا نہیں؟ اور اجسام مثالی کی حقیقت کیا ہے؟ وہ بسیط ہیں یا مرکب؟ اور عالم مثال میں حیات، علم، ارادہ اور قدرت وغیرہ نفوس کی صفات ہیں یا نہیں؟ اور اس عالم میں تکلیف، نکان، قیام، کفر و اسلام اور طاعت و معصیت ہیں یا نہیں؟ کیا اس میں جہت اور مکان و زمان ہیں؟ اور زمانہ موجود ہے یا نہیں؟ اگر موجود ہے تو حادث ہے یا قدیم؟ اور دونوں صورتوں میں اس کی حقیقت کیا ہے؟ اور قدیم ہونے کی صورت میں ترتیب کس طرح صحیح ہوتی ہے اور زمان الٰہی کیا ہے؟ اور افلاک سات ہیں یا زیادہ جیسا کہ بعض محققین کی رائے ہے؟ اور صورت جنتی اور اسی طرح جہنمی عالم مثال سے ہے یا نہیں؟ اور ان تمام مسائل میں مطلوب وہ امر ہے جس پر کشف یا شہود یا برہان نے حکم لگایا ہے نہ کہ کچھ اور۔

قولہ: - آنجناب قدس سرہ کا قول جسم کی حقیقت بسیط ہے یا مرکب۔ الخ

اقول: - میں کہتا ہوں ہم نے اپنے وجدان سے جو ادراک کیا ہے، اس میں بلاشک وشبہ حق صریح یہ ہے کہ موجودات کے چار مرتب طبقات ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے قیام کا مرکز ہیں اور ان کے تحقق کی اصل لاہوت، جبروت، رحموت اور ناسوت ہیں۔ چنانچہ جبروت کی طرف لاہوت کی نسبت جیسے ماہیت کی نسبت چار اور زوج کی طرح، اس کے لوازم ذاتی کی طرف ہوتی ہے۔ اور رحموت کی طرف جبروت کی نسبت اس کلی کی طرح اس فرد کی طرف واحد ہے جو فرد واحد میں منحصر ہوتی ہے اور ناسوت کی طرف رحموت کی نسبت نفس کی بدن یا صورت کی ہیولی کی طرف نسبت کی طرح ہے۔ بلکہ ناسوت کے ساتھ اس کا ربط ان ارتباطات سے زیادہ ہے اور اس میں اس طرح زیادتی ہوتی ہے کہ وہ ناسوت کے وجود کا منبع ہے اور اس کے تحقق کو قائم کرنے والا ہے۔ پھر رحمت اور ناسوت کے درمیان افلاک اور عناصر پیدا ہوتے ہیں۔ پھر اس کا جو امر روحانیت سے قریب ہوتا ہے وہ ملکوت ہے اور جو جسمانیت سے قریب ہوتا ہے وہ مولید ہے۔ فلاسفہ کی اصطلاح میں ان چاروں مراتب کو انیۃ الاولی، عقل، نفس اور ہیولی کہا جاتا ہے۔

اب جب آپ نے اس بات کو سمجھ لیا تو یہ جان لو کہ جسم کی حقیقت ایک لحاظ سے بسیط

اور ایک لحاظ سے مرکب ہے اور وجوہ کا اختلاف قوم کے اختلاف کا سبب ہوتا ہے اور یہ شرعی اصطلاح میں عماء (دھند) ہے اور وہ ایک ہیولانی طبیعت ہے جو تمام روحانی اور جسمانی صورتوں کو قبول کرنے والی ہے اور اس کا قیوم قائم رکھنے والا رحموت ہے اور وہ اس کے اس طرح وجود کے لئے شرط ہے کہ اس کی قیومیت عماء کے ساتھ اس قیومیت کے مقابلہ میں کافی ہو جائے جس کا ہیولی صورت کلی کا محتاج ہوتا ہے۔ اور عماء زمانہ کے لحاظ سے قدیم اور ذاتی طور پر حادث ہے۔ نبیؐ سے سوال کیا گیا تھا کہ ہمارا رب مخلوق کی تخلیق سے قبل کہاں تھا؟ تو آپ نے فرمایا وہ عماء میں تھا جس کے اوپر بھی خلا تھا اور نیچے بھی خلا تھا۔ اور عماء رحموت کے لئے آئینہ کی طرح ہے اس میں اس کا جمال ظاہر ہوتا ہے اس صفت کے لحاظ سے اس کو ہیولی کہا جاتا ہے اور اس کے رحموت کے ساتھ تقوم (قیام) کے اعتبار سے جسم اور آثار کے ظہور کے لئے مبدا ہونے کے اعتبار سے طبیعت کلیہ اس کا نام رکھا جاتا ہے۔

اور اس کا پہلا مقتضی افلاک میں حرکت دوریہ یومیہ اور عناصر میں تکوین وفساد کی حرکت تقلبیہ ہے۔ اور عناصر اور افلاک کی دو طبیعتیں ہوتی ہیں۔ ان میں سے ظاہر حرکت دوریہ اور تقلبیہ ہے اور وہ طبیعت کلیہ کا ایک فرد ہے جو اس کے لئے اس کی ذات سے قبل نہیں ہوتا۔ اور دوسری طبیعت خفیہ ہوتی ہے اور وہ ہر فلک سے مختص حرکت ہے۔ اور ہر عنصر کی طبیعت مخصہ ہوتی ہے۔ یہ وہ ہے جس میں رحموت ودیعت کیا گیا ہے اور اس کی فطرت اول میں اس پر اس کی جبلت بنائی گئی ہے۔ چنانچہ جس نے یہ دیکھا کہ یہ شے اصل الاجسام ہے اور وہ بعینہ واحد ہے۔ اور اس میں اجزا کا تعدد بمنزلہ انسان میں اس حیثیت سے ان کے تعدد کے مثل ہے کہ حیوان اور ناطق اس کو متضمن ہے۔ اس لئے یہ تعدد اس کی وحدت میں کوئی نقص پیدا نہیں کرتا۔ اس نے کہا کہ اجسام کی حقیقت بسیط ہے۔ اور جس نے اس تعدد کو دیکھا اور کام کو غیر محکم نہیں چھوڑا اس نے مرکب کیا **ولکل وجھۃ ھو مولیھا** ”ہر ایک کے لئے ایک رخ ہے جس کی طرف وہ مڑتا ہے۔“

اور عماء کے قدیم ہونے پر اللہ کے سوا تمام عالم کے حدوث پر ملتوں کے اتفاق سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا، اس لئے کہ انیۃ اولی، عماء میں تجلی کرتی ہے۔ اس وقت اس تجلی سے احکام ظاہر ہوتے ہیں جن کو احکام الوجوب کہا جاتا ہے۔ چنانچہ ملتوں کا کہنا ہے کہ یہ حقیقت

اللہ تعالیٰ کے ناموں اور اس کی صفات سے ظاہر ہوتی ہے اور یہ نہ تمام وجوہ سے عین ذات ہے اور نہ ہی تمام وجوہ سے غیر ذات ہے اور یہ زمانہ کے لحاظ سے قدیم ہے اور اس لحاظ سے بالذات حادث ہے کہ یہ ذات الٰہیہ کے ساتھ موجود ہے۔ چنانچہ اس بیان سے یہ امر ظاہر ہو جاتا ہے کہ ان کے نزدیک عالم کا اطلاق عماء کے نفس پر نہیں ہوتا بلکہ عماء پر اس حیثیت سے ہوتا ہے کہ اس میں حقائق امکانیہ ظاہر ہوتے ہیں۔ فتدبر۔

اور زمانہ کی حقیقت کے سلسلہ میں نزاع میرے نزدیک لفظی ہے اس لئے کہ زمانہ کی اصل ایک حال سے دوسرے کی طرف تغیر ہے خواہ وہ حرکت دوریہ سے ہو یا حرکت کیفیہ وغیرہ سے۔ اور جب عماء ظاہر ہو گیا تو اس کے خواص سے تغیر اور تقلب ہے اور تغیر اس کے لوازم سے ہے۔ چنانچہ جس نے اصل کی طرف دیکھا، اس نے کہا کہ زمانہ کی حقیقت جوہر مجرد ہے اور اس کا برسوں اور مہینوں میں پھیلاؤ حرکت دوریہ کے ساتھ قائم ہے۔ چنانچہ جس نے اس کی طرف دیکھا اس نے کہا کہ یہ حرکت دوریہ کے ساتھ قائم عرض ہے۔ اور اہل لغت زمانہ سے صرف حادث کے حادث کے ساتھ مقدور ہونے کا ادراک کرتے ہیں۔ چنانچہ جس نے اہل لغت کے استعمال کے لحاظ سے زمانہ کے مفہوم کی طرف دیکھا، اس نے کہا کہ اس کی حقیقت حادث کی حادث کے ساتھ تقدیر ہے۔ اس طرح نزاع ایک ہی جگہ میں وارد نہیں ہوتا۔

اور یہ بھی سمجھ لو کہ رحموت بعینہٖ جبروت ہی ہے، اس کے اور جبروت کے درمیان صرف ایک صفت کے لحاظ سے فرق ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ جب اپنے خاص مقام سے نیچے اتر گیا اور ناسوت میں داخل ہو گیا تو رحموت ہو گیا۔ اور اسی طرح جبروت اور لاہوت میں بھی ایک صفت کے علاوہ کوئی فرق نہیں ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ جب وحدت اولیٰ کشادہ ہو گئی اور ازل سے ابد تک اپنے تمام مقتضاؤں کی طرف متوجہ ہو گئی اور وہ مقتضیات عالم مجرد میں ایک ہی بار میں زمان اور مکان کی شکل میں آ گئے تو جبروت ہو گیا اور وہاں ہر شکل کی حقیقت یہ ہے کہ شان واجب اپنے تحقق کی جہات سے ایک جہت ہے اور واجب لذاتہ اپنی تمام جہات سے واجب ہے۔ اسی لئے شرعی اصطلاح میں اس فرق کو لغو قرار دیا جاتا ہے اور تمام کو اس لحاظ سے الٰہ قرار دینا کہ وہ کمال کی صفات سے متصف ہے، حی ہے، آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان میں ہے سب کو قائم رکھنے والا ہے، ہر ایک نے جو کچھ کمایا ہے اس پر قائم ہے اور ناسوت کو جس میں صورتیں ظاہر ہوئی ہیں

عالم نام رکھنا۔ مختصر یہ کہ دائرۃ الوجود میں اللہ اور عالم کے سوا کچھ نہیں ہے۔

اور فلاسفہ کے کلام کا محل جیسا کہ ہم نے ذکر کیا، اگر ان کا یہ قول ہے کہ جسم ورنہ ہیولی اور صورت سے مرکب ہے تو ٹھیک ہے اور اچھی بات ہے ورنہ ہم ان کی بات تسلیم نہیں کرتے۔ اور حکماء قدیم میں جرمیون (جسم ماننے والوں) نے جو کہا ہے اور ان سے متکلمین نے استفادہ کیا ہے کہ اجسام، اجزاء لا تجزی ان اجزا سے مرکب ہیں جن کو تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ یہ کلام فی نفسہ صحیح ہے میرے نزدیک یہ اس مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ اس لئے کہ ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ ایک خاص مدت میں پہاڑ میں سخت چٹان کی تھوڑی سی کمی آ جاتی ہے اور ہم اس طرح توڑتے ہیں کہ کمی ایک بار میں حاصل نہیں ہوتی بلکہ یہ بیشمار بار میں ہوتی ہے۔ پھر جتنی بار میں وہ کمی ہوتی ہے جب ہم اس مقدار کو اتنے بار میں تقسیم کرتے ہیں تو اتنی مقدار بھی نہیں نکلتی جس کا تخیل بلکہ وہم بھی کیا جا سکے اور اس جیسا کاٹنا یا توڑنا ممکن نہیں ہوتا۔ اور یہ بہت واضح طور پر معلوم ہے۔ یہ وہی ہے جس کا لوگوں نے ارادہ کیا پھر یہ بھی معلوم ہے کہ وہ اجزا اس لائق نہیں ہوتے کہ انہیں آگ یا ہوا کہا جا سکے۔ لیکن ہوا اور آگ اس سے مرکب کا نام ہے۔ چنانچہ صفات مرکب پر عارض ہوتی ہیں نہ کہ اجزاء لا تجزی پر۔ (ان اجزا پر جن کے مزید اجزا نہ کئے جا سکیں۔) اور ان کی یہ بحث مبحث عماء کو ایک طرح سے بالکل نہیں چھوتی۔

اور یہ بھی جان لو کہ شرع میں کوئی بھی چیز ان تردیدوں اور ردعمل سے منصوص نہیں ہے۔ جانے والے اس طرف اپنے افکار اور عقلوں سے گئے ہیں، جب کہ اصلی غرض شریعتوں کا اثبات ہے۔ تو جس نے شریعتوں کے اثبات کے لئے ان کی صورتوں سے اتفاق کیا اور ان تردیدوں (رد اعمال) کے چکر میں نہ پڑا تو یہ اس کے لئے بہت اچھی بات ہے اور جو اس چکر میں پڑ گیا اور اس نے صحیح اور ایک دوسرے سے مربوط کلام اخذ کر لیا اور اس پر مبنی مباحث شرع کی، فروع کا استنباط کر لیا تو اس کے فائدہ کی بات ہے۔ اور اس میں متکلمین کے ساتھ موافقت واجب نہیں ہے۔ البتہ ان میں سے اہل سنت اپنی تمام عزیموں کے ساتھ شارع سے اخذ کرنے میں ان کی تائید کرتے ہیں۔

قوله:- آنجناب کا قول اجسام فلکیہ عنصری ہیں یا نہیں؟

اقول:- میں کہتا ہوں۔ حق صریح جس کا ہم نے اپنے وجدان سے ادراک کیا ہے۔

یہ ہے کہ رحموت اولاً عرش سے مربوط ہوتا ہے۔ پھر اس کے واسطہ سے عماء کے تمام اجزا سے مربوط ہوتا ہے۔ جیسا کہ اللہ عزوجل نے فرمایا الرحمن علی العرش استوی ''رحمٰن عرش پر مستوی ہوگیا'' (طٰہٰ ۵) اور رسول اللہؐ کے ارشاد سے مستفاد ہوا کہ اللہ، عرش کے اوپر ہے اور یہ کہ وہاں سے ہی فیصلے نازل ہوتے ہیں اور اس طرح کی نصوص کی تاویل ان امور میں سے ہے کہ مومن کے لئے ان پر چلنا مناسب نہیں ہے۔ اس لئے یہ کہنا واجب ہوگیا کہ رحموت کو عرش کے ساتھ ارتباط خاص ہے۔ اور یہ کہ وہاں سے امور، وحی اور تکوین وغیرہ کے ذریعہ نازل ہوتے ہیں۔ اور جب ہم نے طبیعت کلیہ کی حقیقت پر توجہ کی اور اس کے علاوہ سے قطع تعلق کرلیا اور اس کے ساتھ ہی بقا حاصل کی تو ہمیں عرش سے ارتباط خاص حاصل ہوگیا۔ اور اس کے علاوہ سے واسطہ سے ربط حاصل ہوا۔ اور وجدان سے ہمیں کرسی کی حقیقت معلوم نہیں ہوئی۔ نہ ہی یہ معلوم ہوا کہ وہ عین عرش ہے یا اس کے علاوہ کچھ ہے۔ اور عرش کی جسمیت اور اس کی معقولیت میں صاحب وجدان سے تردید اور ردعمل ان کا مرکز و مدار منشا، واللہ اعلم، یہ ہے کہ اس محدود دائرہ والے جسم کے ماورا ایک اور عرش مثالی ہے، اس کا رنگ چاند کے رنگ کی طرح صاف چمکدار ہے۔ اس سے روشنی کا فیضان اولاً سورج پر ہوتا ہے پھر تمام سیاروں پر اور تیسرے نمبر پر آگ اور روشن اجسام ارض پر۔ اور اس سے سیارے اپنے قوائے معنویہ میں مدد حاصل کرتے ہیں۔

اور جب ہمارے اوپر اس نور اعظم کا انکشاف ہوا تو ہم نے اس میں ہر قسم کا ظہور پایا۔ چنانچہ سورج میں غلبہ کا ظہور ہے اور زہرہ میں محبت کا اور چاند میں کفایت کا ظہور ہے وغیر ذالک۔ اور ان امور سے زمینی معانی مرکب ہوتے ہیں۔ اور یہ عرش مثالی، عین عرش جسمی نہیں ہے، نہ ہی تمام وجوہ سے اس کے مغائر ہے بلکہ ظاہر ہوجاتا ہے کہ یہ حقیقت واحدہ ہے جو مثال میں عرش مثالی سے اور ناسوت میں عرش جسمی سے ظاہر ہوتی ہے۔ اور کبھی ظاہر ہوتا ہے کہ عرش نوری متجلی اعظم ہے جس کو نفس کلیہ نے سب سے پہلے قبول کیا۔ اور اس کی بہت سی صفات ہیں اور اس کی پہلی صفت عرش اور افلاک سے تجلی اعظم کے نکتہ میں اس کا ظہور ہے۔ اور دوسرے اس کا ظہور نفوس کاملہ سے تجلی اعظم کے نکات میں ہے۔ اس طرح ان میں سے ہر ایک کے لئے عرش مثالی اور عرش تکوینی کہا جاتا ہے۔ اور حقیقت میں اس سے قضا نازل ہوتی

ہے۔اور اس عرش کی طرف ارتباط کے معنی میں منسوب کی جاتی ہے۔جیسا کہ کبھی قلب صنوبری لوتھڑے کو کہا جاتا ہے اور کبھی قوت نفسانیہ کے لئے بھی ارتباط کے لحاظ سے کہا جاتا ہے۔اس طرح یہاں ارتباط ان دونوں میں سے ہر ایک کے لئے عرش کے نام کا حامل ہے۔

چنانچہ عرش نہ خلاف عادت (فرق) کو قبول کرتا ہے، نہ ہی اس سے مطابقت کو جیسا کہ متکلمین نے ذکر کیا ہے۔البتہ افلاک ان دونوں کو قبول کرتے ہیں لیکن وجدان اس امر کا ادراک کرتا ہے کہ فرق والتیام (خلاف عادت اور اس کی مطابقت) کا قبول کرنا دو طرح سے ہوتا ہے۔ایک یہ کہ صورت اپنے منبع یعنی رحموت کی طرف لوٹتی ہے۔اس طرح بدن جدا ہو جاتا ہے اور عماء خالص ہو جاتا ہے۔اور دوسرے یہ کہ بدن جدا ہو جاتا ہے یا خلل واقع ہو جاتا ہے اور وہاں اس میں صورت کی بقا کے ساتھ حاصل ہوتا ہے جیسے انسان کو کوئی پریشانی لاحق ہو جاتی ہے یا کوئی بیماری ہو جاتی ہے جس سے وہ مر جاتا ہے تب نفس نطقیہ اپنے حال پر باقی رہ جاتا ہے۔جہاں تک وجہ اول کا تعلق ہے تو وہ افلاک میں موجود ہے۔اگر ایسا نہ ہوتا تو افلاک، اللہ کی مخلوق میں سب سے زیادہ شقی، بد بخت ہوتے اور رحمت سے سب سے زیادہ دور ہوتے۔اس لئے کہ ہر طبیعت خاصہ والے کا کمال یہ ہے کہ طبیعت کلیہ کی طرف رجوع کرے اور جہاں تک وجہ ثانی کا تعلق ہے تو رب العالمین نے اس کی نفی کرتے ہوئے فرمایا مالها من فروج. ''اس میں کہیں کوئی رخنہ نہیں ہے۔''

اب اگر تم کہو کہ کیا آپ وجدان سے جان جاتے ہیں کہ افلاک کب فنا ہوتے ہیں؟

تو میں کہتا ہوں! ہاں میں اس کو اجمالی طور پر جانتا ہوں لیکن تفصیلی طور پر نہیں جانتا۔ جیسا کہ جو کوئی خواب دیکھتا ہے اور پھر اس کو بھول جاتا ہے اور جب تعبیر کو دیکھتا ہے تو جو کچھ بھول گیا تھا اس کو سب یاد آ جاتا ہے۔

اور جب یہ حساب فنا ہو جائے گا جس کی طرف اہل زمین اپنے استدلال سے وسیلہ لیتے ہیں اور جب وہ حساب فنا ہو جائے گا جو افلاک کی جبلت میں ودیعت کیا گیا ہے تو قیامت عظمی آ جائے گی۔تب افلاک اور عناصر سب فنا ہو جائیں گے۔

یہ مصیبت عظمی جو ہمارے اس زمانہ سے تین سو یا چار سو سال بعد آئے گی اس وقت بادل چھٹ جائیں گے۔اب جہاں تک استفصات بحث میں انتہا تک پہنچنے کا سوال ہے تو یہ

ایک اعتبار سے دو اور ایک اعتبار سے چار ہیں۔ اول وجدان سے زیادہ قریب ہے۔ تو جب اس میں ہوا سے کواکب کی شعاع لگتی ہے، وہ آگ ہو جاتی ہے اور جب اس کی شعاع پانی سے لگتی ہے تو مٹی یا زمین ہو جاتی ہے جس میں تخلیقات عمل میں آتی ہیں۔ واللہ اعلم۔ اور اس طرح کے معاملات میں میرے نزدیک نزاع لفظی ہے۔ اس میں وجدان کا کوئی حکم لاگو نہیں ہوتا اور افلاک اور عناصر سب کر یہ متحرکہ ہیں۔ ان میں پہلا حرکت دوریہ وضعیہ سے ہوتا ہے اور دوسرا حرکت تقلبیہ کیفیہ سے۔

اب اگر تم کہو کہ یہ پانی کیا ہے جس کے بارے میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا **وکان عرشہ علی الماء** ''اس کا عرش پانی پر تھا۔'' (ھود ۷)

میں کہتا ہوں کہ اس سے مراد ''فتح'' ہے۔ اس کو ''ماء'' سے اس لئے موسوم کر دیا کہ وہ پانی کی طرح جلدی سے صورتیں قبول کر لیتا ہے جیسا کہ عرش کو عرش اس لئے کہا گیا کہ وہ پھٹتا نہیں ہے اور اس پر رحمان مستوی ہوا۔

قولہ:- آنجناب قدس سرہ کا قول، اجسام مثالیہ کی حقیقت کیا ہے؟

اقول:- میں کہتا ہوں کہ وجدان صریح یہ حکم لگاتا ہے کہ مثال کی دو قسمیں ہیں ایک منبع دوسرے مظہر۔ منبع کا تعلق جسم ناسوتی کے باب سے نہیں ہے۔ اور نہ ہی اس پر کفر اور اسلام وغیرہ کا حکم لاگو ہوتا ہے۔ اور اس کی حقیقت طبیعت کلیہ کے لئے قوت ہے تو جس طرح طبیعت کلیہ کے لئے قوت جسمیہ ہوتی ہے۔ اس سے افلاک اور عناصر کے جسم وجود میں آتے ہیں۔ اسی طرح اس کے لئے مجرد اور محسوس کے درمیان قوت ہوتی ہے جو خارج سے نقش ہونے والی روشنیوں، رنگوں اور شکلوں کو قبول کرتی ہے۔ اور اس سے افلاک اور بنی آدم اور بے زبان حیوانات کے خیالات مدد حاصل کرتے ہیں۔ پھر جب اللہ تعالیٰ کسی شے کو وجود بخشنے کا فیصلہ فرماتے ہیں تو اس شے کا وجود اس قوت میں مقرر فرما دیتے ہیں۔ تب افلاک کو اس کا پتہ چلتا ہے پھر ملاء اعلیٰ کو اور پھر نفوس بشریہ کو جیسا کہ رسول اللہ ؐ نے کہانت کے اسرار کے بارے میں بیان فرمایا۔ اور فرشتوں اور جنات کو اس قوت کے ساتھ ربط فطری ہے۔ پھر اس کی مدد سے جیسی چاہتی ہے شکل اختیار کرتی ہے۔ چنانچہ اس منبع میں متقابلات کی قسم کی کوئی چیز نہیں ہے۔ وہاں صرف ایک حیات ہوتی ہے جس میں نقش کے طریقہ سے تمام موجودات کی شکلیں بنتی ہیں۔ اوپر

سے بھی اور نیچے سے بھی اور اس کی مثال ہم میں سے کسی کے بھی خیال کی طرح ہوتی ہے۔

اور مظہر کبھی نفوس بلند سے کوئی نفس ہوتا ہے۔ وہ اپنی جبلت سے منبع میں وجود میں آنے والے بھید کو پالیتا ہے۔ تب اللہ رحمٰن اس کی طرف اپنی نظر ازلی سے دیکھتا ہے۔ اس وقت طبیعت کلیہ مربوط ہوتی ہے۔ اور اس نشاۃ جزئیہ نفسیہ میں حقائق مثالیہ ظاہر ہوتے ہیں جیسا کہ اللہ رحمان نے فیصلہ کیا ہوتا ہے۔ اور یہ نفس ہی لوح ہے۔ جو نفوس اعلیٰ کو مکمل کرتا اور ان کا تزکیہ کرتا ہے۔ اور اس سے فرشتوں کو پتہ چلتا ہے اور کبھی نفس ارضی ہوتا ہے جو اجمالی مصلحت کلیہ پر متوجہ ہوتا ہے تب اس کی طرف طبیعت کلیہ متوجہ ہوتی ہے۔

پھر جب قوت کلیہ مثالیہ، زمین اور آسمان کے کسی جز سے مربوط ہو جاتی ہے تو ایک ایسی حالت پیدا ہوتی ہے جو ناسوت اور مثال کے درمیان تردد میں ہوتی ہے۔ تب ناسوت میں رنگ، وضع، شکل اور مقدار والا جسم ظاہر ہوتا ہے۔ البتہ جب تک وہ نظر باقی رہتی ہے وہ پھٹاؤ اور جدائی کو قبول نہیں کرتا۔ اس باب سے حضرت موسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کی آگ ہے۔ اور حدیث میں ہے کہ جنت اور جہنم نبیؐ پر دونوں ظاہر ہوئیں۔ جو آپ کے اور قبلہ کی دیوار کے درمیان تھیں۔ تب آپ نے جنت کی ہوا اور جہنم کی تپش محسوس کی۔

اور جب لوگوں کو جمع کیا جائے گا تو ان کا حشر عناصر میں ہوگا اور ارواح کا تعلق دم کے پچھلے حصہ کی طرح ہوگا۔ اس طرح اس سے انسان کو پیدا کیا جائے گا اور جب تمام اجزائے جسمانی دم کی جڑ وغیرہ باطل ہو گئے اور نفس اس کے پیچھے نہیں آیا اور ایک وضع سے دوسری وضع کی طرف متغیر نہیں ہوا۔ ویسے یہ صورت انتہائی نادر ہے تو ان کا حشر اس حالت کی طرح ناسوت اور مثال کے درمیان ہوگا جو تبدیل ہونے والوں کے لئے اس وقت ہوگی، جب ان کے لئے زمین لپیٹ دی جائے گی اور اس کی طرح جو ہمارے نبی محمدؐ کے لئے اس وقت ہوئی جب آپ کو معراج کی رات لے جایا گیا تھا۔ پھر جب حساب اور سوال کا وقت آئے گا تو ان کے بدن نوری ہو جائیں گے۔ یعنی مثال اور ناسوت کے درمیان موسیٰ علیہ السلام کی آگ کی طرح۔ اور جبریل کے اس وقت کے جسم کی طرح جب انہوں نے نبیؐ کے پاس آکر آپ سے ایمان، اسلام، احسان اور ساعت کے بارے میں سوال کیا تھا۔ اور اس مثالیہ اور اجسام خالصہ کے درمیان صرف چند وجوہ سے فرق ہے۔ ایک یہ کہ یہ عناصر سے نہیں بلکہ عرش کے

خیال سے شروع ہونے والی قوت سے ہوتی ہے۔ اور دوسرے یہ کہ اس میں معانی کا ظہور اجسام کی صورت میں اکثر ہوتا ہے۔ اور تیسرے یہ کہ کواکب کے اتصال اور عناصر کے طبائع کے احکام کی رعایت وہاں واجب نہیں ہوتی بلکہ معاملہ خالص نظر الٰہی کے لئے ہوتا ہے۔ اسی لئے رب العزت نے فرمایا سنفرغ لکم ایھا الثقلان ''اے زمین کے بوجھو! عنقریب ہم تم سے باز پرس کے لئے فارغ ہوئے جاتے ہیں''۔ (الرحمٰن ۳۱) اس لئے شارع نے اس کے اور اجسام کے درمیان فرق نہیں کیا ہے سوائے اس کے کہ جنت اور جو کچھ اس میں ہے، سب نورانی ہے۔ اور اس طرح فرق کے وجوہ اور جنت میں مومنوں کی اور جہنم میں کافروں کی شکلوں کا بدلنا۔ بغیر کسی فرق کے ملائکہ کے شکل بدلنے کی طرح ہے۔ اور عالم مثال کے لئے بعض اجسام یا اعراض کے ضمن میں احکام اور ظہور ہیں۔ اگر ہم ان کے سلسلہ میں برسوں تک بھی بات کرتے رہیں تب بھی نہ ان کا احاطہ کر سکتے ہیں نہ ان کی کسی قسط کا۔ واللہ اعلم بخلقه

قال: آنجناب نے فرمایا دوسرا مسئلہ بھی مسائل کثیرہ متناسبہ پر مشتمل ہے کہ اہل کشف کے نزدیک نفوس انسانیہ کا تجرد ثابت ہے یا نہیں۔ اور وہ قدیم ہیں یا حادث۔ یا بعض قدیم اور بعض حادث اور قدم و حدوث سے قطع نظر اجسام سے تعلق سے پہلے اس کا وجود ہے یا نہیں؟ یا بعض کا وجود ہے بعض کا نہیں؟ اور کیا نفوس فلکیہ اور عقول کا وجود ثابت ہے؟ اور نفوس اور عقول سے ماوراء دوسرے مجردات کا جو نہ تدبیر کرنے والے ہوں اور نہ موثر ہوں، پایا جانا ممکن ہے یا نہیں؟ اور کیا عقول اور نفوس ذاتی اور اس طرح نفوس فلکیہ اور انسانیہ کے درمیان امتیاز ثابت ہے یا نہیں؟ اور نفس انسانی کے لئے نفوس فلکیہ پر غلبۂ قوت اس طرح ممکن ہے کہ نہیں کہ فلک جس طرح چاہے گھومے؟ اور کیا عقول ان کے وجود کی تقدیر پر عدد معین پر منتہی ہوتی ہیں۔ اور ان کے نزدیک کیا ثابت ہوا ہے کہ وجود، واجب پر زاید ہے یا اس کا عین ہے؟ اور اگر واجب پر زاید ہے تو ان براہین عقلیہ سے کیسے نجات ملے، جو اس کی عینیت پر دلالت کرتی ہیں جب کہ وہ اس قدر کثرت سے مشہور ہیں کہ یہاں ان کے ذکر کی حاجت نہیں۔ اور جیسا کہ مخالفین سمجھتے ہیں وہ قطعی ہیں، یہی معاملہ تعین وجودی کا ہے جیسا کہ ہمارے شیخ قدس سرہ کی رائے ہے۔

قوله: - کیا نفوس کا تجرد ثابت ہے؟

اقول: - جہاں تک تجرد خالص، تجلی اعظم کے نکتہ کا سوال ہے یعنی یہ کہ شے فی نفسہ نہ

زمانی ہوتی ہے اور نہ مکانی اور نہ اپنے فعل میں ہوتی ہے اور نہ تعلق میں۔ تو اس کا نفوس میں بالکل بھی تصور نہیں کیا جا سکتا۔ وہ شان جبروت ہے جہاں تک تجرد کا اس معنی میں سوال ہے کہ فی نفسہ نہ زمانی ہوتا ہے اور نہ مکانی۔ اگر چہ اپنے فعل میں ہو تو یہ ان صور نوعیہ وجنسیہ اور نفوس ناطقہ کی شان ہے جو صور شخصیہ ہیں۔ اور وہ حدوث بدن کے وقت حادث ہیں۔

اور اصحاب وجدان کے ان کے حدوث اور قدم میں تردد کا مقصد یہ ہے کہ ایک نفس کلیہ ہے جو نفوس خاصہ کا منبع ہے۔ اور اس کے قیام پر قوی ہے، میری مراد اس سے طبیعت اولی ہے۔ اور وہ قدیم بالزمان ہیں۔ چنانچہ جس نے ان کی طرف ان کی خصوصیت کے ساتھ دیکھا، اس نے ان کو حادث کہا۔ اور جس نے ان کو ایسی نظر سے دیکھا کہ ان کے قوی ہونے تک پہنچتی ہے، اس لئے کہ ان کے تحقق کے جوہر میں نفس کلیہ کی طرف ایک طریق ہے، ان کی طرف اشارہ ہے، ان کے لئے عاجزی ہے۔ اس نے ان کو قدیم قرار دیا اور جسموں کے ساتھ ان کے تعلق سے قبل ان کے وجود میں ان کے تردد وتحول کا مقصد یہ ہے کہ اس کے نزدیک ان کا حدوث اس وجود کا اشتباہ ہے جس کا ناسوت میں مثال میں فیصلہ کیا جاتا ہے اور جس وجود کا بعض نفوس کلیہ اور ملاء اعلی میں مثال میں اس وجود سے دو ہزار سال قبل فیصلہ کیا جاتا ہے اور یہ وہ ہے جس کی خبر نبیؐ نے دی ہے کہ ارواح، اجساد سے دو ہزار سال قبل پیدا کی گئیں تو جس کا ادراک ہم نے اپنے وجدان صریح سے کیا کہ اللہ تعالیٰ اولا اپنے بندوں کے وجود کا لوح محفوظ میں فیصلہ فرماتا ہے اور یہ عرش وافلاک کے دائرہ میں وجہ اجمالی ہے تو اس کو لوح نے حاصل کر لیا۔ جس طرح معمار اپنے نفس میں دیوار کی ہیئت پاتا ہے۔ اور دوسرے جب بعض اسباب فوقانیہ کا تقاضہ ہوتا ہے تو اس کا فیصلہ کر دیتا ہے تب وجود تفصیلی ہوتا ہے اور اس قضا کے قوت، ضعف، اجمال اور تفصیل کے لحاظ سے درجات ہوتے ہیں اور اس کے لحاظ سے بنو آدم کی تخلیق ہوئی اور ان سے میثاق لیا گیا۔ اور تیسرے جب تمام اسباب ارضی وسماوی تیار ہو جاتے ہیں تو ان کے وجود کا فیصلہ فرماتا ہے اور اس کو نفخ روح سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جب وجود کا فیصلہ فرماتا ہے تو اس کے ساتھ وجودات سابقہ متحد ہو جاتے ہیں۔ اور بالجملہ وجود نفس کا جس کا فیصلہ حدوث بدن کے وقت کیا جاتا ہے اور وجود روح جس کا فیصلہ اس سے تقریباً دو ہزار سال قبل کیا گیا ظاہری بادی الرائے میں متحد اور ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہوتی

ہیں۔اس اختلاط کی وجہ سے اکثر اصحاب وجدان ان دونوں کے درمیان تمیز نہیں کر پاتے۔

اب اگر تم حق بات معلوم کرنا چاہتے ہو تو جان لو کہ جس کا بھی تعلق عماء سے ہے وہ پوری طرح مجرد نہیں ہے بلکہ وہ عماء میں وجود کی ایک وجہ ہے جیسا کہ انسان ایک دائرہ میں ہوتا ہے اور اس کا انسان، حیوان اور ناطق ہونا دائرہ میں نہیں ہوتا بلکہ وہ اس کے وجود کی ایک وجہ ہے جو کہ دائرہ میں ہے۔

اور یہ کہنا کہ انسان جب مر جاتا ہے تو اس کی روح ہوائی باطل ہو جاتی ہے اور اس کا نفس ناطقہ مجرد باقی رہ جاتا ہے۔ ہمارے نزدیک درست نہیں ہے۔اس لئے کہ روح باطل نہیں ہوتی اور اگر وہ باطل ہو جاتی ہے تو انسان کو نہ عذاب دیا جائے گا نہ انعامات اور نعمتوں سے نوازا جائے گا۔اس لئے کہ تنہا نفس مجردہ تعذیب اور تنعیم کے مادہ کا حامل نہیں ہوگا اور جب وہ اس کا حامل نہیں ہوگا تو اللہ تعالیٰ کی حکمت میں عذاب دیا جانا اور نعمتوں سے نوازا جانا صحیح نہیں ہوگا۔جیسا کہ جب بدن باطل ہو جاتا ہے تو وہ اس کی صلاحیت نہیں رکھتا کہ اس کو بخار اور ورم لاحق ہو اور اس کی تکلیف سے دوچار ہو۔اس لئے کہ بخار اور ورم کے مادے عضلات ہوتے ہیں۔ بلکہ حق بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق میں اس کا بھید یہ ہے کہ کسی شے کے ساتھ کوئی ایسا معاملہ نہ کرے جو اس کی جبلت کے تقاضہ کے خلاف ہو۔چنانچہ نفس ناطقہ کی جبلت یہ ہے کہ اس کا جسم سے اسی طرح کا تعلق ہو جیسا کہ صور معدنیہ، نباتیہ، حیوانیہ اور انسانیہ کا جسم سے ہوتا ہے۔ان صورتوں کے سایہ میں جسم ان صورتوں کے مقتضا کے مطابق اس معنی میں متغیر ہوتا ہے کہ روشنی کا سایہ جن چیزوں میں ہوتا ہے۔وہ ان میں خاص رنگوں اور شکلوں کا تقاضہ کرتی ہے۔چنانچہ حق کی تدبیر اس طرح کارفرما ہوتی ہے جیسا اس کے سایہ میں تقاضہ ہوتا ہے۔بعینہ یہی حال نفس نطقیہ میں ہوتا ہے۔چنانچہ روح امراض شدیدہ میں مبتلا ہوتی ہے تو اس کے اجزا تحلیل ہو جاتے ہیں لیکن پوری طرح فنا نہیں ہوتے بلکہ اس قدر باقی رہتے ہیں جس کے ذریعہ نفس نطقیہ کا تعلق درست ہوتا ہے۔جس طرح برتن کو پوری طرح خالی کر دیا جائے تو اس میں ہوا باقی رہ جائے گی تاکہ خلا لازم نہ آئے۔اور اگر اس کو بھی نکال دیا جائے تو برتن پھٹ جائے گا تاکہ نظام کل ختم نہ ہو جائے۔اسی طرح یہاں روح کی ایک مقدار باقی رہ جاتی ہے اور روح اولاً نفس سے متعلق ہوتی ہے پھر بدن سے، پھر جب انسان مر جاتا ہے

تو جسم باطل ہو جاتا ہے اور اس کی روح باقی رہ جاتی ہے۔ اور اس میں اس کے قوائے قلبیہ و دماغیہ کو جوہر ہوائی میں اٹھاتے ہیں اور اگرچہ گوشت پوست والا جسم باطل ہو جاتا ہے پھر بھی برزخ میں عذاب وثواب کا معاملہ اسی روح کے ساتھ ہوگا یہاں تک کہ قیامت آ جائے گی۔ اس وقت اس کے ساتھ جسم مرکب ہو جائے گا۔ ہم نے اپنے وجدان سے یہی ادراک کیا ہے۔

قوله:- قدس سرہ:- کیا نفوس فلکیہ اور عقول کا وجود ثابت ہے؟

اقول:- ہاں! افلاک کے نفوس بلند وبالا ہیں جو نفس کلیہ سے مشابہ ہیں۔ ان کی تکمیل کی تجدید نہیں ہوتی بلکہ وہ پوری طرح موجود ہیں جو صورتوں کے عطیہ سے فیضیاب ہوتے ہیں۔ چنانچہ اللہ رحمٰن جب بھی کسی شے کا ارادہ فرماتے ہیں، ان میں اس کی صورت نقش ہو جاتی ہے اور تمام افلاک، حق اول سے اخذ اور خیر کی طلب میں برابر ہیں لیکن جب اس کا ارادہ کسی شے کے وجود سے متعلق ہو جاتا ہے تو ان ارادوں کا ظہور بہت سے اسلوبوں اور پہلوؤں سے ہوتا ہے۔

اور افلاک کے لئے عقول ہیں۔ اور وہ جبروت میں درج اعتبارات اور جہات ہیں۔ اور ان کی قریب ترین تعبیرات اسماء اللہ تعالیٰ ہیں لیکن ہمارا وجدان مختلف و متعدد وجوہ سے فلاسفہ کے کلام کی مخالفت کرتا ہے۔

ایک یہ کہ عقول۔ افلاک کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں بلکہ صاحب کمال بشر کے لئے بھی عقول ہوتی ہیں۔ چنانچہ جب ہم نے اپنے وجدان کی طرف توجہ کی تو ہمیں معلوم ہوا کہ ہمارے جوہر میں وجود عقلی ہے۔ اور ہمیں یہ بھی معلوم ہوا کہ ان کو تیقظ اور علم حضوری ہے جیسا کہ نفس نطقیہ خود جان لیتا ہے۔ اور اس کو وہ تمام احوال تفصیل کے ساتھ یاد آ جاتے ہیں جو اس پر ناسوت میں طاری ہوئے تھے۔ اور ہم نے لاہوت سے عظیم تعلق معلوم کیا اور تمام حقائق پر لپٹنا معلوم کر لیا اور جو علوم عرشیہ عالم کو اپنے احاطہ میں لئے ہوئے ہیں۔ ان میں سے بعض پوشیدہ رہ گئے اور بعض ہمارے نفوس ناطقہ پر مترشح ہو گئے۔

دوسرے یہ کہ عالم میں نہ یہ عقول فعال کام کرنے والی ہیں اور نہ ہی عقل فلک قمری۔ البتہ ان کے نفوس فیض الٰہی کے لئے تیار رہتے ہیں اور اس کمال کے لئے وجود عقلی میں لامحالہ ایک قسم کے اندراج کا ہونا ضروری ہے بلکہ اصل فعال رحمٰن ہے۔ وہی صورت جوہریہ وعرضیہ

کا فیضان کرتا ہے، وہ اپنے بندوں پر غالب ہے۔ سب کچھ اس کے غلبہ میں ہے اور اس کی انگلیوں کے درمیان ہے، اس کو جس طرح چاہتا ہے گھماتا ہے اور نفوس فلکیہ اور طبائع عناصر طبیعت کلیہ کے لئے مادوں اور اعضا و سامان کی طرح ہیں۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

تیسرے یہ کہ عقول ان کے نزدیک جواہر مستقل ہیں اور ہمارے نزدیک اسماء الٰہیہ اور اول الحق کے لئے اعتبارات و جہات ہیں۔ میں نے ان کو دیکھا کہ جب لاہوت کی طرف بلند ہوتے ہیں تو مضمحل ہوتے ہیں اور جب نیچے کی طرف اترتے ہیں تو میں نے ان کے لئے تحقق اسی دیکھا۔ اور میرے نزدیک یہ مخالفت متاخرین کے کلام سے ہے۔ ورنہ ان کے اسلاف کی رائے ہمارے بیان سے قریب ہی ہے۔ واللہ اعلم۔ اور جب کمال کے لئے نفوس بشریہ کے جسم جدا ہوتے ہیں تو ان کے لئے اشکال مثالی اختیار کرنا ممکن ہوتا ہے یا جب بدن کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو ان پر حیات کا فیضان ہوتا ہے جس طرح نفس نطقیہ کا فیضان ان کے بدن پر ہوتا ہے۔ اس طرح نہیں کہ وہ اپنے امر کے لئے نفس قائم یا قائمہ ہو بلکہ وہاں نفس اخری ہوتا ہے۔ اور اس کے لئے اپنے وجود میں تیاری ہوتی ہے اور اس کو بروز کہا جاتا ہے۔ اور ان کے لئے افلاک سے متعلق ہونا ممکن ہوتا ہے لیکن وہ تعلق محبت کا ہوتا ہے نہ کہ تسخیر کا۔ اور ان میں سب سے زیادہ کامل وہ ہوتا ہے کہ جب اس کا نفس اس کے بدن سے جدا ہوتا ہے تو اس کا الحاق عرش سے ہو جاتا ہے۔ اور وہ طبیعت کلیہ سے متصل ہو جاتا ہے اور عالم کے اوپر فیضان کرنے والے تمام احکام اس طرح ہو جاتے ہیں جیسے نفس کا حکم اس کے بدن میں ہوتا ہے۔ اور جب نفس اپنے منبع سے ملتا ہے تو اس نفس کے علاوہ ہر نفس مضمحل ہو جاتا ہے۔ البتہ یہ مضمحل نہیں ہوتا حتیٰ کہ رحموت سے مل جاتا ہے۔ اور عدد میں عقول کا حصر ممکن نہیں ہے کہ وہ غیر متناہی ہوتی ہیں۔

قولہ قدس سرہ:۔ کیا تمہارے نزدیک یہ ثابت ہو چکا ہے کہ وجود زائد ہے۔

اقول:۔ وجود الواجب اس معنی میں عین اس کی ذات ہے کہ اس کی ذات وجود ہے اور وہ ماہیت ہے۔ وہاں ایک چیز وجود اور ماہیت کے لئے کافی ہوتی ہے بلکہ تمام صفات وجود کے بعد بھی اس معنی میں لاحق ہوتی ہیں کہ وہاں اس مرتبہ میں صرف امر بسیط ہوتا ہے۔ پھر جب اس سے نیچے اترتا ہے اور ان حقائق کی طرف دیکھتا ہے۔ اور اس کے لئے فوائد کافی نہیں ہوتے۔ پھر اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے جو وہاں پاتا ہے کہ وہ بسیط ایسا امر ہے جو اپنی بساط میں

ہر ایک کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔کوئی اس سے خارج نہیں ہوتا۔

لیکن متکلمین کا یہ قول کہ وجود الواجب علی ذاتہ زاید ہے، حق ہے۔اس لئے کہ وجود سے ان کی مراد معنی انتزاعی ہوتا ہے۔جس کی تعبیر تکوین سے کی جاتی ہے۔اور جس طرح اس کی ذات ماہیت کے احکام سے کافی ہوتی ہے۔اسی طرح وجود کے احکام کافی ہوتے ہیں۔ اور انہی میں سے اس تکوین کا الگ ہونا ہے۔تو واجب کے لئے تکوین انتزاعی ہے اور لازم ہے کہ وہ ذات پر زاید ہو۔اور جہاں تک تعین وجودی کا سوال ہے تو یہ شیخ مجدد رحمہ اللہ کی اصطلاح ہے۔اور تفتیش میں ان سے کثیر فائدے نہیں ہیں۔اور یہ کہنا کہ تعین اول کیا ہے؟ تو اس لفظ کے دو معنی ہیں۔اگر سائل تعین اعتباری کے معنی مراد لیتا ہے تو وہ امر انتزاعی ہے۔اس کا تحقق صرف معتبر کے اعتبار سے ہے۔تب منتزع اس کی طرف ترقی کرتا ہے جس کی طرف اس کی معرفت کو منسوب کرتے ہیں۔پھر جب وہ اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے تو وہ اس کی معرفت کے اعتبار سے تعین اول ہوتا ہے۔اور اگر معتبر کے اعتبار کے بغیر امر خارج مراد لیتا ہے تو وہ مرتبہ عقلیہ ہوتا ہے جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

قال:- تیسرا مسئلہ بھی مسائل کثیر پر مشتمل ہے جو باہم ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔لطائف سبعہ کا کیا مطلب ہے؟ اور ان کے درمیان اختلاف حقیقی ہے یا اعتباری؟ اور ان میں سے ہر ایک کا علیحدہ ذکر ہے یا نہیں؟ اس موقع پر تفصیل آپ کی عنایت کی محتاج ہے۔ اور ہر ایک پر فنا اور بقا عارض ہوتی ہے یا نہیں؟ اور ان میں سے ہر ایک کی فنا اور بقا کی کیا حقیقت ہے؟ اور فنا اور بقا سالک کے صفات وجدیہ سے متصف ہونے کا سبب ہوتی ہیں یا نہیں؟ اور کیا توحید ذاتی کی حقیقت تک پہنچنا حقیقت واحدہ کی معرفت ہے جس نے ایک شکل اختیار کی۔علم اور عین کے اعتبار سے ہر معنی وصورت میں حالات کے لحاظ سے ظاہر ہوئی۔اور اس میں پوشیدہ اعتبارات ہر صورت میں شکل اختیار کرنے کی قوت کا سبب ہوتا ہے بلکہ ہر معنی میں ظاہر ہوتا ہے چنانچہ کم ترین درجہ کا مرید گمان کرتا ہے کہ وہ سبب بنتا ہے۔چنانچہ سالک جب ہیولی الکل تک تمام صورتوں سے پہنچتا ہے تو تمام کائنات کے لئے پہنچ جاتا ہے لیکن اس معنی میں نہیں کہ پہلے بندہ تھا اب رب ہو گیا۔بلکہ وہ اب بھی پہلے کی طرح بندہ ہی ہے۔لیکن اس وہم باطل کی قید سے آزاد ہو گیا جو یہ حکم لگاتی ہے کہ عبد اور رب دو مختلف حقیقت ہیں اور

یہاں صرف ایک حقیقت ہے اور وہ یہ کہ رب باعتبار صفات فعلیہ ہے اور عبد باعتبار صفات انفعالیہ بلکہ یہ دوسرے معنی میں ہوتا ہے۔ یہ امر آپ سے مخفی نہیں ہے۔ چنانچہ ضروری ہے کہ صفات اصلیہ خاص طور سے خلق اور تمثل کی صفت میں ظاہر ہو۔ اور چونکہ خلق کی حقیقت تمثل ہے، اس لئے جب عارف فنا کی حقیقت تک پہنچتا ہے اور اس پر وحدت کا راز کھل جاتا ہے تو اس کو خلق کی قوت حاصل ہو جاتی ہے۔ چنانچہ جو چاہتا ہے پیدا کر دیتا ہے۔ اور یہ خلق صرف اس معنی میں ہوتا ہے کہ جس صورت میں چاہتا ہے ظاہر ہو جاتا ہے۔ اس طرح توحید ذاتی کی حقیقت تک پہنچنے والے کی علامات میں سے جس صورت اور معنی میں چاہے تمثل اور ظہور ہوتا ہے چنانچہ حقیقت الامر کے عارف کے لئے یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ وہ مٹی ہو جائے یا پانی یا ہوا یا آگ ہو جائے یا دوسرے انسان کی شکل اختیار کر لے یا عجم کے حیوانات میں سے کوئی حیوان بن جائے یا کوئی نبات یا جماد ہو جائے۔ اور اس کے لئے یہ بھی ممکن ہوتا ہے کہ آن واحد میں بہت ساری صورتوں میں متصور ہو جائے بلکہ اس کے لئے یہ بھی ممکن ہوتا ہے کہ ملک فرشتہ، یا فلک یا کوکب ہو جائے یا معانی قائمہ بالغیر ہو جائے اور یہ مقام اپنے کمال کے ساتھ قطب محمدی کے ساتھ مخصوص ہے جو اپنی قطبیت کے ساتھ توحید اعلیٰ کے مقام پر متحقق ہو گئے۔ اور چونکہ قوت تمثل مقام توحید کا اختصاص ہے۔ احقر ترین مرید نے اس کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔ ورنہ عارف توجوب اور قدم کے علاوہ الوہیت کی تمام صفات سے متصف ہے اور اس بیان کا مقصد حقیقت امر سے پردہ اٹھانا اور یہ معلوم کرنا ہے کہ یہ گمان حقیقت الامر کے مطابق ہے یا نہیں؟ اور جو شخص قطبیت الارشاد کے مقام پر پہنچ گیا، اس کے لئے مختلف قسم کے رجال غیب کی اور ان کے اس قطب کی صحبت لازم ہے یا نہیں جو مدار اور اس کی مدد کرنے والے خضر کے نام سے معروف ہے اور ان کے تفصیلی احوال پر موقوف ہے؟ اور یہ کہ افلاک کے طبقات میں اپنے اختیار سے دخول ممکن ہے یا نہیں؟ اور اس کو جن و ملک سے روحانی سفلی اور علوی پر اطلاع اور ان کی تسخیر لازم ہے یا نہیں؟

قولہ قدس سرہ:۔ لطائف السبع، سات لطیفوں سے کیا مراد ہے؟

اقول:۔ میں نے اپنی ذات میں جو کچھ پایا ہے وہ یہ ہے کہ انسان اس کی آنکھ، ہاتھ اور پیر ہیں۔ پھر یہ کہ انسان ایک ہی بار میں موجود نہیں ہو جاتا بلکہ اس کے بہت سارے

طبقات ہیں اور ہر طبقہ کا ایک وجود ہے۔ اور اس کی ایک اجل معین ہے جس سے اس کی ابتدا ہوتی ہے اور دوسری اجل پر اس کی انتہا ہوتی ہے۔ اور اس کا ایک نظام اور مدد ہے، یہاں تک کہ جس نے ایک طبقہ کو دیکھا اور اس کے سوا کچھ نہیں دیکھا۔ اس نے سمجھ لیا کہ وہ اس میں محصور ہے۔ چنانچہ طبقۂ ظاہرہ بدن ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان کھانا کھاتا ہے، مشروب پیتا ہے اور اس میں قوت ہاضمہ اور قوت غذا بخش تصرف کرتی ہیں اور اس کو کیلوس اور کیموس بنادیتی ہیں۔ پھر اس کے ایک حصہ سے منی، ایک سے خون اور ایک سے روح بناتی ہیں تو منی کھانے اور پینے کی چیزوں کی بدلی ہوئی شکل ہے۔ پھر وہ عورت سے مجامعت کرتا ہے تب منی اس کے رحم میں جاتی ہے اور اس کے ساتھ عورت کا مادہ ملتا ہے پھر برابر خون اطلاق کرتا رہتا ہے اور اس ملنے سے بدن انسانی وجود میں آتا ہے۔ جیسے بیج اور مٹی اور پانی سے بدن شجری وجود میں آتا ہے یہ نظام قالب ہے اور وہ طبقۂ سافلہ ہے۔ پھر طبقۂ لطیفہ ہوتا ہے جس کو ہم نسمہ (روح) کہتے ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ لطیف اپنی اخلاط سے قلب کی طرف انجذاب کرتا ہے۔ جس کو حرارت قلب لاحق ہوتی ہے اور وہ روح طیب معتدل ہو جاتی ہے۔ پھر نفس نطقیہ کے لئے ایک حلقہ بن جاتا ہے۔ اس طرح انسان حقیقت میں یہی نسمہ ہوتا ہے اور بدن اس کے اوپر غلاف ہوتا ہے جو اس کی حفاظت کرتا ہے اور جب بدن جدا ہو جاتا ہے تو یہی نسمہ اپنے حال پر باقی رہ جاتا ہے۔ اور اس سے اخلاق اور احساس ظاہر و باطن متعلق ہوتے ہیں۔

اور اس نسمہ کے تین شعبے ہوتے ہیں۔ ایک شعبہ وہ ہے جو بدن کی تدبیر کرتا ہے کھانے، پینے اور نکاح اور ہر لذت سے اس کی خواہشات کا طالب ہوتا ہے۔ اس پر اس کے بدن کی صلاح موقوف ہوتی ہے۔ یا وہ اشیا پیدا ہوتی ہیں جو اس کے بدن کو اخلاط سے بھر دیتی ہیں۔ اور نسمہ کا غلبہ اس کے تحت ہوتا ہے اور اس شعبہ کو صوفیا کی اصطلاح میں نفس کہا جاتا ہے اور یہ وہ کھڑکی ہے جس سے شیطان ان امور کی وحی کرتا ہے جو شر، خبث اور وحشت کی طرف مائل کرتے ہیں۔ اور جو امور اس سے بھی زیادہ اور وسیع ہوتے ہیں وہ باب دجالیہ سے ہو جاتے ہیں۔ دوسرا شعبہ وہ ہے جو اپنی قوت عملیہ میں نفس نطقیہ کے حکم کا تابعدار، اس کے فیضان کا مظہر اور اس کے حال کی صفائی کی بنیاد ہوتا ہے۔ اور اس پر اس صورت میں سکینہ، نظافت، عبادت اور قدس کی نقل بیان کرنے والے تمام حالات ظاہر ہوتے ہیں۔ اس شعبہ کو

صوفیا کی اصطلاح میں قلب کہا جاتا ہے۔اور یہ وہ روشندان ہے جس کے واسطہ سے فرشتہ وحی کرتا ہے۔اور اس سے انسان خوش ہوتا ہے۔پھر جب انسان اس شعبہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اس کو سکینہ اور نظافت حاصل ہوتی ہے۔اور وہ اللہ کے سامنے ویسی عاجزی کا اظہار کرتا ہے جو عاجزی کے اظہار کا حق ہے اور اپنے قلب میں احوال پاتا ہے۔ان میں سے ایک اللہ کی محبت، اس کے ذکر سے شغف اور اس کی طرف بہت دھیان اور گہرائی سے دیکھنا ہے۔اور تیسرا شعبہ وہ ہے جو نفس نطقیہ کے احکام کے ظہور کے لئے ان کی قوت عملیہ میں بیان ہوتا ہے۔اس کو عقل کہا جاتا ہے اور عقل سے مدرکات اور محسوسات کا ادراک محقق ہوتا ہے۔اور عقل سے ہی انسان اپنے رب کی طرف توجہ کی کسی قسم سے متوجہ ہوتا ہے۔اور عقل پہلا لطیفہ ہے جو بالطبع تجلی اعظم کی طرف دور تک چلی جاتی ہے۔

اس طرح یہ تین لطائف ہیں جو ہر انسان میں پائے جاتے ہیں۔ان کے اثبات پر فلاسفہ، اہل نقل اور اہل وجدان متفق ہیں۔اور ان کے اثبات پر شواہد اور دلائل کی وجہ سے مجبور ہیں جو فلق صبح وغیرہ کی شکل میں پائی جاتی ہیں۔

ان دلائل میں سے ایک یہ ہے مثلاً جب سو انسان ایک جگہ جمع ہوتے ہیں اور ہم ان کے حالات کا پتہ لگاتے ہیں تو تمدن کے مختلف احوال سامنے آتے ہیں۔مثلاً جب ہم ان کے سامنے کوئی لذیذ کھانا رکھتے ہیں تو انسانی طبیعت اس کی طرف اضطراری طور پر مائل ہوتی ہے۔ایسے میں ہم کہہ دیتے ہیں کہ جو شخص اس طرح کے کھانے کی طرف مائل ہوتا ہے، وہ کتنا برا ہے۔وہ تو بالکل بمنزلہ بہیمہ کے ہے، اس کے لئے تو پوری طرح تباہی و بربادی ہے تو کچھ لوگ وہ ہوں گے جو کھانے کی طرف راغب ہوں گے اور اس کو کھائیں گے حالانکہ وہ ہماری بات سن رہے ہوں گے اور سمجھ رہے ہوں گے اور اس پر خفا ہو رہے ہوں گے کہ اس کھانا کھانے کی وجہ سے ان پر ذلت طاری ہوگی۔لیکن کھانے کی لذت ان پر غالب آ رہی ہوگی اس لئے اس پر اس طرح ٹوٹ پڑ رہے ہوں گے جیسے مٹھائی پر مکھیاں ٹوٹ کر پڑتی ہیں۔آپ چاہیں تو ایسے شخص کی حالت کی تصویر اس طرح کھینچ سکتے ہیں کہ گویا اس کا نفس ایک ترازو ہے اس کے ایک پلڑے میں ذلت وحقارت رکھی ہوئی ہے اور دوسرے میں لذت طعام کا حصول ہے ایسے میں وہ لذت کے حصول کو ترجیح دیتا ہے یہ وہ شخص ہے جس پر صوفیا کی اصطلاح میں

لطیفۂ نفس غالب آ گیا ہے اور فلاسفہ کی اصطلاح میں نفس شہو یہ غالب آ گیا ہے۔

اور ان میں کوئی شخص ایسا ہو گا جو اس بات کو سن کر غصہ سے بھڑک اٹھے گا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو جائے گا اس کی گردن کی رگیں پھول جائیں گی اور وہ کہے گا کیا ہمیں اس طرح کی گھٹیا اور بری باتوں کا سامنا کرنا پڑے گا؟ اللہ کی قسم میں نہ یہ کھانا کھاؤں گا، نہ اس مجلس میں بیٹھوں گا اور نہ ان ذلیل لوگوں کے ساتھ رہوں گا۔ پھر وہاں سے نکل کر چلا جائے گا۔ خواہ لوگ ہزار عذر و معذرت کرتے رہیں۔ وہ کسی کی معذرت قبول نہ کرے گا۔ اس پر صوفیا کی اصطلاح میں قلب اور فلاسفہ کی اصطلاح میں نفس سبعیہ غالب آئے گا۔

اور کوئی شخص ایسا ہو گا جو کہے گا۔ تم نے اس طرح کے کھانے کے بارے میں ایسی بات کیوں کہی ہے کہ اس کا کھانا مناسب نہیں ہے۔ اس کی وجہ بتاؤ۔ اگر کوئی ایسا امر ہو گا جس کو عقل قبول کر لے گی تو میں اس کو چھوڑ دوں گا خواہ کتنا ہی لذیذ ہو اور اس کی طرف طبیعت کتنی ہی راغب ہوتی ہو۔ اور اگر معاملہ یہ ہے کہ تم بلا وجہ یوں ہی کہہ رہے ہو تو کھانے سے منع کرنا تمہاری غلطی ہے، تمہاری بات کا کوئی اعتبار نہیں ہو گا۔ اور اس کا نفس اپنے معاملہ میں مطمئن ہو گا۔ یہ وہ شخص ہے جس پر صوفیا اور فلاسفہ سب کی اصطلاح میں لطیفہ عقلیہ غالب آ گیا ہے۔

اور یہی حال اس وقت ہو گا جب کوئی حسین عورت سامنے آ جائے اور اس کی طرف دیکھنے میں ذلت و رسوائی کا اندیشہ اور قیامت کے دن کے عذاب کا خوف ہو تو جس پر طبیعت غالب ہو گی وہ تو اس کی طرف دیکھے گا۔ اور لذت نظر اس کے دل و دماغ کی مالک ہو گی اور توہین و بدنامی کا اندیشہ اور عذاب کا ڈر اس پر قوی نہ ہو گا۔ ایسا شخص صاحب نفس ہے۔ اور جو اس کو اہانت کے اندیشہ اور لوگوں میں رسوائی کے ڈر سے چھوڑ دے۔ اگرچہ اس کی طرف اس کی رغبت سچی ہو اور وہ خلوت میں اس سے جیسے چاہے فائدہ اٹھا چکا ہو۔ وہ صاحب قلب ہے اور جو اپنے خوف میں شارع کی دی ہوئی خبر کی تصدیق کرتا ہے اور اس کی طرف سے نظر پھیر لیتا ہے۔ اس کے حق میں خلوت اور محفل برابر ہے۔ وہ شرائع کی تربیت یافتہ عقل والا ہے۔

اور جب انسان اس طرح کے معاملات میں غور و فکر کرتا ہے تو لازمی طور پر یہ تینوں لطائف ثابت ہوتے ہیں اور اس کا انکار کرنے والا ظالم ہے۔ پھر تامل و تدبر سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ عقل اور قلب میں سے ہر ایک کے دو دو طبقات ہیں اور لوگ ان طبقوں میں جبلت

اور کسب کے لحاظ سے مختلف ہوتے ہیں۔ اور یہ اس لئے کہ عقل کا اعلیٰ طبقہ عالم قدس کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اس سے خوابوں وغیرہ میں علم حاصل کرتا ہے۔ اور اس کی آنکھوں کے سامنے زمان ومکان سے مجرد ثابت ہوتا ہے اور وہ اس کو ملاحظہ کرتا ہے اور اس کا مشتاق ہوتا ہے۔ اور ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو عقل کا استعمال صرف محسوسات میں کرتے ہیں اور ان کے اندر اتنی قوت نہیں ہوتی کہ مجرد کی طرف متوجہ ہوں۔ اور کبھی انسان کند ذہن بالکل جامد طبیعت کا حامل ہوتا ہے۔ پھر طرح طرح کی ریاضت کرتا ہے جس سے اس کی عقل مجرد کی طرف متوجہ ہونے کے قابل ہو جاتی ہے جو کہ پہلے نہیں تھی۔ اس طرح طبقہ علیا راز ہے اور جس کی جبلت ایسی ہو کہ وہ اس پر غالب آجائے وہ اپنی اصل فطرت میں صاحب راز ہے۔ اور جس نے اس کو کسب سے حاصل کیا اس نے لطیفۃ العقل سے لطیفۃ السر کی طرف ترقی کی۔

اور اس طرح قلب کے بھی دو طبقے ہیں۔ ایک طبقہ سافلہ ہے جس میں بے قرار محبت اور وجد ہوتی ہے جو کودنے، پھاندنے، اچھلنے کودنے، کپڑے پھاڑنے، گرجنے کی راہ پر چلاتی ہے۔ اور دوسرا طبقہ عالیہ ہے، اس میں محبت انسیہ ہوتی ہے جو دائی روح، حصول لذت، سکوت اور سکون کی طرف لے جاتی ہے۔ اس طرح اول الذکر صاحب لطیفۃ القلب ہے خواہ وہ اس کے اندر جبلت کے اعتبار سے ہو یا کسب کے۔ اور دوسرا صاحب لطیفۃ الروح ہے، اس کے لئے بھی برابر ہے کہ جبلت کے لحاظ سے ہو یا کسب کے۔ اس طرح یہ پانچ لطائف ہوئے جو انسان میں واضح طور پر بنائے گئے ہیں جیسے غلبہ اور ضعف، کدورت اور صفائی اور ان کے اختلاف سے لوگوں کے اخلاق، احوال اور اعمال میں اختلاف پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ جب انسان اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اس کے ذکر اور اس کے سامنے عجز وانکسار کے ہر اس لطیفہ کو قبول کر لیتا ہے جس کی اس کی جبلت متقاضی ہوتی ہے۔ اور جب بھی نفس ناطقہ کی طرف ترقی کرتا ہے تو نفس ناطقہ پر غالب نسمۃ سے پیدا ہونے والے امر سے زیادہ صاف اور حسین ہو جاتا ہے۔ یہ پانچ ظاہری لطائف کی بات ہوئی۔

لطائف خفیہ پوشیدہ کے بارے میں ان صوفیا نے کوئی بات نہیں کہی جو پہلے زمانہ میں تھے اور جن متاخرین نے اس بارے میں کلام کیا ہے، ان کے اقوال مختلف ہیں اور ان کے اختلاف کا منشا ان کے راہ سلوک میں سفر کا اختلاف ہے جو ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف ان کے

توجہ دینے کے وقت کے احوال سے وارد ہوتا ہے۔ اور ہم نے پوشیدہ لطائف کو اپنے بعض رسائل میں تفصیل سے بیان کردیا ہے جس کو ہمارے وجدان نے واجب قرار دیا۔ اور اب ہم ان امور کا ذکر کرتے ہیں جو سالکین پر اس وقت وارد ہوتے ہیں جب وہ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ یہ واردات وہ ہیں جو پوشیدہ لطائف کے اثبات کے لئے اسباب ہوتے ہیں اور میں نے ان کے نام ان کی انواع کے لحاظ سے رکھے ہیں۔

ہم کہتے ہیں کہ انسان کا امتیاز گھوڑے سے اور اس طرح حیوان کا امتیاز نبات سے، حقیقت میں رنگوں، شکلوں اور نقش و نگار خدوخال کا امتیاز نہیں ہے۔ اسی طرح ایک انسان کا امتیاز دوسرے انسان سے انہی رنگوں وغیرہ کا امتیاز نہیں ہوتا جس کا ہم نے ذکر کیا۔ بلکہ یہ سب ایک دوسری حقیقت مجردہ کے تابع ہوتے ہیں اور اس مجرد کی اصل رحموت ہے لیکن رحموت کے بھی بہت سارے درجات ہوتے ہیں اور یہ سب رحموت کے لئے تقید، تنزل اور تعین ہیں۔ اور رحموت سے علم حضوری پیدا ہوتا ہے جو کہ ''انا'' ہوتا ہے۔ اور جب انسان اس لطیفہ کی طرف متوجہ ہوا اس کے لئے علم حضوری مجرد ہوگیا اور ''انا'' سے بیدار ہوگیا پھر اس کا تقرر حق کے تقرر میں مضمحل طور پر پہچانا گیا۔ پھر نور تمام ہیکلوں پر پھیلا ہوا پایا گیا۔ پھر وہ اس نور کی طرف مجرد ہوگیا جس کو فارسی میں ہست (موجود) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ تو نظر اس متقید سے خیرہ ہو جاتی ہے اور وہی باقی رہ جاتا ہے جس کو ''ہست (موجود) کہتے ہیں اور وہ تجلی ذاتی ہے۔ پھر اس کی طرف علم کثرت لوٹتا ہے، تب اس کے لیے حق تعالیٰ کے ساتھ تحیتط ہوتا ہے جس کو ''یادداشت'' (ذاکرۃ) کہتے ہیں۔ پھر جب ''یادداشت'' میں پہنچ گیا اور اس کو اوپر اور نیچے سے لپیٹ لیا تو اس کو نور الٰہی حاصل ہوگیا جو بدءِ اول سے فیضان کرنے والا ہے۔ اس کی مثال موسیٰ کی آگ جیسی ہے۔ البتہ وہ اپنے نفس نطقیہ کے ساتھ قائم ہو کر پیش آئی جس کا تحقق حق کو پالینے سے ملا ہوا ہے۔ اور یہ نور الٰہی ہے جس کی طرف قرآن کریم میں اشارہ کیا گیا ہے۔ فرمایا اللہ نور السمٰوٰت والارض، مِثل نوره كمشكوٰة فيها مصباح، المصباح في زجاجة، الزجاجة كانها كوكب دری يوقد من شجرة مبركة زيتونة لاشرقية ولاغربية، يكاد زيتها يضيء ولو لم تمسسه نار، نور علی نور، يهدی الله لنوره من يشآء ويضرب الله الامثال للناس، والله بكل شيء عليم

"اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے (کائنات میں) اس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے ایک طاق میں چراغ رکھا ہوا ہو۔ چراغ ایک فانوس میں ہو، فانوس کا حال یہ ہو کہ جیسے موتی کی طرح چمکتا ہوا تارا، اور وہ چراغ زیتون کے ایک ایسے مبارک درخت کے تیل سے روشن کیا جاتا ہے جو نہ مشرقی ہے نہ مغربی، جس کا تیل آپ ہی آپ بھڑکا پڑتا ہو، چاہے آگ اس کو نہ لگے۔ (اس طرح) روشنی پر روشنی (بڑھنے کے اسباب جمع ہو گئے ہوں) اللہ اپنے نور کی طرف جس کی چاہتا ہے رہنمائی فرماتا ہے۔ وہ لوگوں کو مثالوں سے بات سمجھاتا ہے۔ وہ ہر چیز سے خوب واقف ہے۔" (النور ۳۵)

اور یہاں علم شریف یہ ہے کہ یہ نور فیض پھیلا رہا ہے۔ اس کی حقیقت عجیب ہے، وہ اس حقیقت سے مجرد صورتوں اور نفوس ناطقہ سے بمنزلہ رنگوں اور نوروں کے ہے۔ تو جس طرح جوہری، حیوانی یا شجری صورت کو نفس کلیہ پیدا ہوتا ہے اور اس ظہور کے لحاظ سے جسم کی تدبیر کی جاتی ہے تو تدبیر الٰہی مقتضی ہوتی ہے کہ جسموں، شکلوں، رنگوں اور نقش و نگار پر فیضان کرے۔ مصلحت کلیہ کا تقاضا ہوتا ہے کہ ان امور کا ان مجرد صورتوں کے ساتھ دائمی تعلق ہو۔ یہ امور خارجی صورتوں کی مدد چاہتے ہیں۔ چنانچہ شکلوں اور پتوں کی وجہ سے ہی کہا جاتا ہے کہ یہ انگور ہے اور وہ خرما ہے اور انگور اور خرما حقیقت میں دو مجرد صورتیں ہیں یہی معاملہ ظاہر ہونے کا ہے جس کو نفس کلیہ ظاہر کرتا ہے تاکہ شخص انسانی نرم ہو جائے۔ اس کی وجہ سے احوال، اعراض، اوضاع، معاملات اور مناقشات کا اس فرد پر عام فیضان ہو جائے۔ اور یہی ہے جس کو حکما کے نزدیک بخت کہا جاتا ہے اور ان رقائق (باریکیوں) کے اندر تمام رقیقہ ہیں جو تجلی اعظم کے مدمقابل ہوتے ہیں۔ اور اسی کی وحی سے نور الٰہی کا فیضان ہوتا ہے اگرچہ اس نور کا مادہ تجلی اعظم کے ساتھ بیدار ہوتا ہے اور یہ رقیقہ حجر بخت ہوتا ہے اور اس نور الٰہی سے جو طاری ہے، اللہ کے شاذ و نادر بندوں کے علاوہ کوئی منفرد نہیں ہوتا۔ بالجملہ یہ جو ہم نے ترتیب سے بیان کی ہے، اکثر عارفین محققین کی سیر ہے اور ان میں سے ایک جماعت بہت سے نقطۂ قصوی کی طرف ترقی کرتی ہے اور وہ نہ عین خارجہ کو پہچانتے ہیں اور نہ ہی ملاء اعلیٰ کو۔ اس لئے وصول کی وجہ سے نقطۂ قصوی (اعلیٰ آخری نقطہ) کی طرف چلتے ہیں اور کمال کے وجوہ کو گھیرے ہوئے ہوتے ہیں اور ان میں نقصان بالکل نہیں ہوتا۔ لیکن جب ان کا اس لطیفہ کی طرف عروج یا اس

سے نزول ہوتا ہے تو اس کا حکم اور اس کی معرفت ان پر قوی ہو جاتی ہے۔اس طرح تمام اسرار جن کے بارے میں تمام کاملین مختلف علوم کے ساتھ بولتے ہیں، ان پر یہ دو نقطوں کے ضمن میں بولا جاتا ہے۔ایک ظہور الوحدت فی الکثرت اور دوسرے باطن الوجود کے احکام کا ظہور ظاہر الوجود میں، اور ان کے مناسب الفاظ ہوتے ہیں۔

قوم کی اصطلاح یہ ہے کہ موجودات کے ہیکلوں پر پھیلے ہوئے نور کے مشاہدہ کو خفی نام دیا جاتا ہے اور جو نور نفس پر بمنزلہ نار موسیٰ نازل ہوتا ہے اس کو اخفی نام دیا گیا۔اور علم حضوری جس کو ہم نے ''انا'' سے تعبیر کیا ہے، وہ ظہور خاصہ ہے جس کو نفس کلی نے ظاہر کیا، اس کو نفس نام دیا گیا۔اب اگر اسفل السافلین میں دھکیل دیا گیا تو وہ اللہ کی مخلوق میں سب سے زیادہ جاہل اور سب سے بڑا کافر ہوگا۔اور اگر اپنے منبع کی طرف ترقی کرتا ہے تو اللہ کی مخلوق میں سب سے بڑا عالم اور سب سے افضل ہوگا۔اور یہاں ایک دوسری سیر ہے جو اللہ اپنے بعض کامل بندوں کو عطا فرماتا ہے۔اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ یہاں ایک دوسرا لطیفہ ہوتا ہے۔اور وہ وجود ہے جس کا فیصلہ اس کے ناسوت میں تعین سے قبل کیا گیا۔اور یہ مثال کی جگہوں میں سے ایک جگہ ہے۔اور اس کی اصل یہ ہے کہ صورت انسانی نے جب مثال میں شکل اختیار کی اور اس کا وجود ملاء اعلیٰ میں پیدا ہوا تو باری تعالیٰ نے اس کی طرف نظر رحمت سے دیکھا۔اور وہ ہر اس انسان کے لئے وسیع ہوگئی اور اس کا انشراح ہو گیا جو آنے والے زمانہ میں پیدا کیا جائے گا۔جیسے آدم علیہ السلام سے بنایا گیا۔بلکہ وجدان یہ حکم لگاتا ہے کہ وہ آدم سے اللہ کی صورت انسانیہ میں صفت سے حکایت کے طور پر بنایا گیا تھا۔چنانچہ ہر انسان کا خارج میں تحقق وجوہ مثالی سے ہے۔اور جب سالک اس لطیفہ کی تجرید میں پہنچا تو اس پر ظہور الوحدت فی الکثرت اور احادیث کی تاویل کی شرح ہوگئی۔اب وہ ہر کلمہ کی تاویل علی وجہہ پہچان لیتا ہے اور جب ترقی اس لطیفہ میں واقع ہوئی تو ازل لا زال میں اس کے اندراج کے لئے متنبہ ہوا۔پھر ازل کا اندراج وحدت بسیطہ میں ہوا۔چنانچہ اس کے لئے وہاں وسیع علوم ہوتے ہیں پھر یہ متنبہ اس لطیفہ کے اوپر کامل خلعت ہو گیا۔اور ہم ان کمالات کو قرب وجود کا نام دیتے ہیں۔

اس کے بعد دوسرا لطیفہ آتا ہے اور وہ انسانی صورت ہے جو ملاء اعلیٰ میں متصور ہوتی

ہے۔اس لئے اس نوع کے ہر شخص کی شخصیت ساقط ہو جاتی ہے تو اس کی اصل نوع باقی رہ جاتی ہے اور جب سالک اس لطیفہ پر پہنچتا ہے تو اس پر ان علوم وجدانیہ کا دروازہ کھل جاتا ہے جن کا صورت انسانی تقاضہ کرتی ہے۔ جیسے بھوکے کو کھانے کی اور پیاسے کو پانی کی طلب اور جنسی خواہش رکھنے والے کو عورت کی طلب سے حاصل ہوتا ہے۔ اور یہ عبادت، نظافت، حکمت اور مدنیت کے علوم کو واجب کرتا ہے جس طرح اس کا طریقہ ہے۔اور ارشاد باری سے یہی مراد ہے **واتیناہ حکما و علما** "اور ہم نے ان کو حکمت اور علم عطا کیا" (القصص ۱۴) **واوحینا الیھم فعل الخیرات** "اور ہم نے انہیں وحی کے ذریعہ نیک کاموں کی ہدایت کی"۔(الانبیاء ۷۳)

اور انبیاء میں یہ لطیفہ بہت قوی طور پر بیدار ہوتا ہے پھر جب اس راستہ سے رحمان کی طرف ترقی ہوتی ہے اور نقطۂ لاہوت سے اس طرح مطلع ہوتا ہے جو اس کے لئے مناسب ہوتا ہے تو اس کو صورت انسانیہ پر خلعت الٰہیہ آتی ہے۔اور کبھی ہم ان کمالات کو تفہیم اور قرب فرائض کہتے ہیں۔اور کبھی یہ خلعت انبیا کے لئے خلعت نبوت، رسالت اور وصایت ہوتی ہے۔اور اس کے بعد دوسرا لطیفہ آتا ہے اور وہ روحوں کی روح ہے اور پیدائشی صورت ہے اور وہ پہلی شے ہے جو افلاک اور عناصر کی تکمیل کے بعد رحمان سے جاری ہوئی۔اور جب سالک اس تک پہنچا تو اس کے اپنے نفس کو جامع للعالم پایا۔اور یہ جمعیتہ کا پہلا مرتبہ ہے۔ پھر اکثر سالکوں کو رحموت میں ترقی ہوتی ہے۔اور یہ میرے نزدیک ان کی طرف چھلانگ ہے۔اور امر حق وہ ہے جو میرے افلاک اور عناصر کے حقائق میں چلنے سے واقع ہوا۔اور وہ یہ کہ انسان ارواح فلکیہ اور حقائق عنصریہ سے مرکب ہے اور یہ ترکیب جسد خاکی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ اس کے لئے ہر وجود فوقانی ہے۔اس میں افلاک اور حقائق عناصر اور ان کے اصول سے مدد ہوتی ہے۔ پھر جب سالک رحموت تک پہنچتا ہے تو اس کو دنیا کے تمام موجودات کا اجمالی علم اس طرح حاصل ہو جاتا ہے جیسے اس کو خود اپنے نفس کا علم ہوتا ہے۔

اور کچھ لوگ اس کو ظل الصفات کا نام دیتے ہیں۔اس لئے کہ جبروت اپنی پوری وسعت کے ساتھ رحموت میں ظاہر ہوتی ہے۔میں کہتا ہوں یہ لفظ اس کے مفہوم کو ادا کرنے سے قاصر ہے۔ پھر اس کے بعد جبروت ہوتی ہے اور اس کو صفات سے تعبیر کرنے میں زبان

قاصر ہے۔اس کے بارے میں سب سے بہتر تعبیر یہ ہے کہ یہ اسماء ہیں۔اور اسی طرح جس نے یہ کہا ہے کہ ان لطائف کے اصول عرش کے اوپر موجود ہیں تو اس پر امر مشتبہ ہو گیا ہے۔اور وہ یہ ہے کہ عارف جب نفس ناطقہ کی طرف مجرد ہوتا ہے تو جمیع علم کو نفس نطقیہ کے طور پر پاتا ہے۔اور اس کی نظر سے نفس کے سوا سب کچھ اوجھل ہو جاتا ہے تو اس کو اپنے سر سے عالم بناتا ہے۔اور اسی طرح جب عین خارجیہ کی طرف مجرد ہوتا ہے تو دنیا میں موجود ہر شے کو تحقق عینیہ کے طور پر پاتا ہے۔اور جس نے اس کو غیر عین کے طور پر دیکھا اس کی نظر سے حقیقت اوجھل ہو گئی۔اس لئے اس نے اپنے دماغ سے اس کا نام عالم رکھ دیا۔اور یہ وہ امر ہے جو میرے وجدان نے بیان کیا ہے۔اور میں یہ نہیں کہتا کہ میں نے جو کچھ کہا ہے سابق عارفین کی بالکل یہی مراد تھی۔اور سیر کی یہ تفصیل اہل اللہ سے شاذ و نادر ہی ہے۔اس لئے وہ ان مقامات میں سے ہر مقام کو تفصیلی طور پر جانتے ہیں اور ان پر ہر مقام کے آثار علیحدہ سے ظاہر ہوتے ہیں۔

اب اگر تم کہو کہ مجھے نبوی و رسالتی حکمتوں کے بارے میں بتاؤ کہ وہ کیا ہیں اور کیا ان میں سے بعض کا اکتساب غیر انبیا کو وراثتاً ممکن ہے؟ اور مجھے ملاء اعلیٰ اور نفوس افلاک کے کمالات کے بارے میں بتاؤ جو کہ اپنی شان کے اعتبار سے اعظم اور ملاء اعلیٰ کی معرفت کے لحاظ سے بہت وسیع ہیں۔اگر چہ راز اکثر عارفین پر اس فطرت کے سبب سے پوشیدہ ہے جو ہم نے بیان کی ہے۔

ھلکت: نبوت کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی اصلاح کا ارادہ فرماتا ہے تو ایسے وجود کے لئے ان سے قریب ہوتا ہے جو اس وجود عرضی سے مشابہ ہوتا ہے جو پاکیزہ فطرت، تام الاخلاق شخص کے ساتھ قائم ہوتا ہے۔اس سے لطیفۂ انسانیہ، متنبہ ہوتا ہے۔یہ نہیں کہا جا سکتا کہ علماء اہل السنت اس طرف گئے ہیں کہ نبوت محض اللہ تعالیٰ کا فضل ہے۔اس میں بندہ کی کوئی خصوصیت نہیں ہے۔اور آپ ان کے لئے ان کی استعداد میں خصوصیت ثابت کرتے ہیں۔اس لئے کہ ہم کہتے ہیں کہ یہ ایسا قول ہے جو اس زمانہ کے کئی قرون کے بعد سامنے آیا جس کے بارے میں خیر ہونے کی شہادت دی جا چکی ہے۔اس لئے کہ کتابوں اور سنت کا مدلول اور جس پر سلف کا اجماع ہے، وہ یہ ہے کہ جو خصوصیت کثرت الکمال اور چہرہ کی صباحت وغیرہ ان صفات کی طرف راجع ہوتی ہے، جن پر عام لوگ فخر کیا کرتے ہیں، ان

کو نبوت میں کوئی دخل نہیں ہے۔ اور کفار کہا کرتے تھے کیا اللہ تعالیٰ کو اپنی رسالت کے لئے ابوطالب کے یتیم کے سوا کوئی اور نہیں ملا۔ لولا نزل هذا القرآن على رجل من القريتين عظيم "یہ قرآن دونوں شہروں کے بڑے آدمیوں میں سے کسی پر کیوں نہ نازل ہوا؟" (الزخرف ۳۱) تب اللہ تعالیٰ نے شبہ کو دور فرمایا اور پوری طرح اس کو رد کر دیا۔ ہاں جہاں تک صفات باطنیہ کا تعلق ہے جن کے بارے میں ہم بات کر رہے ہیں تو بلا شبہ انبیا اتم الاخلاق، اخلاق کے لحاظ سے سب سے زیادہ قوی اور سب سے زیادہ پاکیزہ نفس ہوتے ہیں۔ اور جو اس کا انکار کرے وہ اس کا مستحق نہیں ہے کہ انبیا کے مقام سے دور ہونے کی وجہ سے اس سے بات کی جائے۔ کیا آپ نے دیکھا نہیں کہ ہرقل نے کس طرح کہا تھا۔ "اور اسی طرح انبیا اپنی قوم میں سب سے اعلیٰ حسب و نسب والے ہوتے ہیں۔"

اور بالجملہ رسالت کے دو رکن ہوتے ہیں۔ ایک رکن رسول کے اندر قبول کرنے والا اور دوسرے مرسل بھیجنے والے سے قربت اور تدبیر۔ چنانچہ انبیا کا وارث رکن اول کے لحاظ سے وہ ہوتا ہے جس میں وہ لطیفہ بیدار ہوتا ہے، اور اس کا مزاج ان کے مزاج کے مشابہ، اور اس کا کمال ان کے لئے سبب ہوتا ہے۔ اور رکن ثانی کے لحاظ سے ان کا وارث وہ ہوتا ہے جس سے حق قریب ہوتا ہے۔ اس لئے اس کو نبی کا وصی بنانا اس کے علوم کو متحمل ہوتا ہے اور اس کو ہدایت کے مذہب پر مقرر کرنا دین کی تجدید کے لحاظ سے اور اس سے جاہلوں کی تاویل اور غلط باتیں منسوب کرنے والوں کے انتساب کو دور کرنے اور مخلوق کی رہنمائی اور ان کو ظاہر میں شریعت کی طرف دعوت اور باطن میں آداب طریقت کی دعوت کے لئے ہوتا ہے۔ اور اس کے سوا جو کچھ ہے اس کا وحی میں پایا جانا ضروری نہیں ہے۔ اور اس کی تحقیق یہ ہے کہ مدبر حق لوگوں کے معاملہ کو یوں ہی بیکار نہیں چھوڑ دیتا۔ بلکہ وہ ان کے ساتھ لطف ازلی کا معاملہ کرتا ہے اور بہترین نظام کا قیام چاہتا ہے۔ اسی وجہ سے اس نے انبیا کو مبعوث فرمایا اور جب انبیا کا دور ختم ہو گیا تو اس لطف کا تقاضہ ہوا کہ لوگوں میں ان کے علم و رشد کا ان کی امت میں سے کسی شخص کے واسطہ سے تحفظ کیا جائے۔ چنانچہ لوگوں میں سے کسی نے اس لطف و تدبیر کا ادراک کر لیا اور اس کا ماہر ہو گیا اور کسی نے ادراک نہیں کیا۔ اور لوگ دونوں رکنوں کے اختلاف کے لحاظ سے اور تلون کی شدت اور اس کے ضعف کے لحاظ سے نبوت کے کمالات کے رنگ میں

بہت سارے درجوں پر ہیں۔اور جب وہ وارث کمزور پڑ گیا تو اس کے نفس میں ہیئت اجمالیہ نور یہ نقش ہو گیا نہ کہ غیر۔

اور ملاء اعلیٰ کی حقیقت یہ ہے کہ وہ ایسی اقوام ہیں جو روحانیات الافلاک اور لطائف العناصر سے پیدا ہوئی ہیں۔ پھر جب اتصالات مبارکہ متفق ہو گئے اور قوی افلاک مبارک و حسن جوش میں آئے تو عناصر سے حقائق صاف اور ازکی، پاکیزہ منعقد ہوئے اور ان دونوں کے درمیان ایسے نقوش پیدا ہوئے جن کا اکثر میلان روحانیت کی طرف تھا۔اور عنصر ان کے قوی کے تعین کے لئے ہے نہ کہ غیر۔اور اس کے علاوہ ایسی بھی اقوام ہیں جنہوں نے بنی آدم کو کمال کے درجہ پر پہنچایا۔اپنے احجار کو تجلی اعظم میں فنا کر دیا تو وہ روشن جوہر کے بمنزلہ شعاعوں کے ہو گئے اور ان میں سے ہر ایک تجلی اعظم کے ارد گرد مجتمع ہے تو ان کو ملاء اعلیٰ کہا جاتا ہے۔اور ان کے مقابلہ میں وہ اقوام ہیں جو اتصالات موحشہ فاسدہ میں پیدا ہوئیں، اور عنصر خبیث دخولی کو شیاطین نام دیا جاتا ہے اور پاکیزہ اخلاق وعلوم اور ہمتیں طیب لوگوں کے لئے ہوتی ہیں، اور ان میں سے خبیثات، خبیثون کے لئے تو ملاء اعلیٰ کے کمالات انطباع کی طرف رجوع کرتے ہیں یعنی ان کے الواح صدور میں دو چیزیں نقش ہوتی ہیں۔ایک قضا اور رضا اور غضب اور لعنت اور شکر۔اور ان کے سینوں میں جو کچھ نقش ہوتا ہے۔اس کے لحاظ سے ہمت اور دعا کی طرف سے منطبع ہوتے ہیں۔اور میرے وجدان نے یہ فیصلہ کیا کہ وہاں اللہ قربت الٰہیہ کے لحاظ سے ان میں کاملین کے صدور میں ہوتا ہے۔اسی سے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر لعنت فرماتا ہے اور ان کے شکر کو قبول کرتا ہے اور ان کی طرف ہنستا ہے اور اسی سے انبیا کی طرف وحی نازل ہوتی ہے اور کامل اولیا پر الہام ہوتا ہے۔

اور ان میں سے دوسرا قضائے الٰہیہ اور ایجادات کا نقش ہوتا ہے۔چنانچہ ہر وجود اور قضا ان کے الواح صدور پر نقش ہو جاتے ہیں اور قوت مثالیہ اس کی خدمت کرتی ہے تو یہ نقش اس قوت کے ساتھ موجود خارجی ہو جاتا ہے اور اصل قضا اور ایجاد بہتر نظام کا تقاضہ کرتے ہیں۔اور اس کا دوسرا رکن اس نظام سے مطلوب علم عقلی تو ہمی اور تخیلی ہے جب وہ دونوں جمع ہو گئے تو اس کے لئے مطلوب وجود خارجی اس سے قبل حاصل ہو گیا کہ اس باب میں ناسوت اور لوح میں اس کے ظہور کی آن پائی جائے۔چنانچہ جو بشر ملاء اعلیٰ سے قریب الاستعداد ہوگا،

اس کی لوح میں دو صورتیں نقش ہوں گی اور اس کی ہمت بہت بلند شمار کی جائے گی گویا کہ وہ ملاء اعلیٰ سے ہے۔

البتہ محبت و عشق، فنا، بقا اور ہر حال نفس کی لگام اور ناسوت کی تاریکیوں سے خروج یا قربت الٰہی کے رنگ کے درجہ کی طرف رجوع کرتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ اس سے ملاء اعلیٰ کو دیکھتا ہے اور ملاء اعلیٰ کے لئے دوسری عنایت کے بغیر اس کی عنایت کے نقش کے اعتبار سے آپس میں نزاع ہوتا ہے۔ چنانچہ ہر ایک غیر طبعین کے قبض یا بسط کی طرف اس کے لئے بغیر تبدیلی و تصرف کے اپنے طریقۂ اولیٰ پر عنایت کا ظہور چاہتا ہے **واللہ یقضی بینھم بالقسط** "اور اللہ ان کے درمیان اعتدال کے ساتھ فیصلہ فرماتا ہے۔"

جہاں تک افلاک کا سوال ہے تو ان کے کمالات بہت وسیع ہیں۔ ان کا احاطہ عارفین میں سے شاذ و نادر علما ہی کر پاتے ہیں تو ان کے لئے رحمت کے طریق سے جبروت اور لاہوت کے علوم اور بہتر نظام کے لئے ارادۂ اولیٰ کی ہمراہی میں تقاضا اور عرش مثالی سے مدد عظیم ہوتی ہے۔ اس لئے ہر فلک میں ایک کوکب ہوتا ہے **واللہ اعلم بمراتب خلقه** "اپنی مخلوق کے مراتب کو اللہ زیادہ بہتر طور پر جانتا ہے۔"

قوله قدس سرہ:- ہر ایک پر فنا اور بقا پیش کئے جاتے ہیں یا نہیں؟

اقول:- ہاں ہر طبقہ کے لئے بقا اور فنا ہے لیکن ان کے فنا کا مطلب وہ نہیں ہے جو اوہام سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بالکل ہی معصوم ہو جاتا ہے یا اپنے نفس سے اس طرح نکل جاتا ہے جیسے ایک لباس اتار کر دوسرا لباس پہن لیا جاتا ہے۔ بلکہ ان کے فنا اور بقا کا مطلب مغلوبیت اور غلبہ ہے کہ جب انسان پر ان لطائف سے کوئی شے غالب آ جاتی ہے اور انسان اس کے سامنے مغلوب ہو جاتا ہے اور اس پر اس کے احکام غالب ہو جاتے ہیں تو کہتے ہیں، آدمی اس میں فنا ہو گیا اور اس کو اس میں بقا حاصل ہو گئی۔ اور فنا اور بقا کی بہت ساری قسمیں ہیں جب بھی انسان ایک لطیفہ سے دوسرے کی طرف ترقی کرتا ہے تو لطیفۂ اولیٰ کے مقتضی سے فنا ہو جاتا ہے اور اس کو لطیفۂ ثانیہ میں بقا حاصل ہو جاتی ہے اور کبھی اس طرح کے معاملوں میں یہ بھی کہا جاتا ہے، لطیفۂ فلانیہ فنا ہو گیا اور لطیفۂ فلانیہ کو بقا ہو گئی۔ اس طرح مختلف قسم کے بیانوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

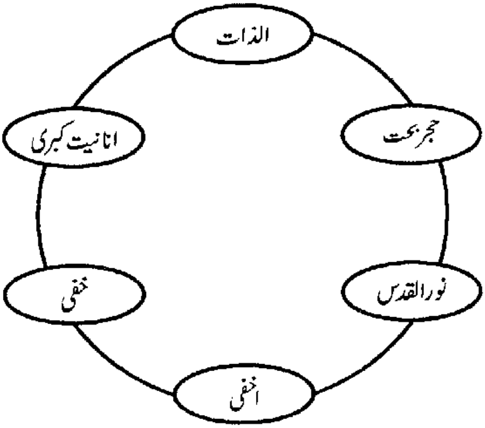
اور خواجہ نقشبند قدس سرہ نے ان انواع کو دو جنسوں میں محدود کیا ہے۔ یہ امر ان سے

خواجہ محمد پارسا قدس سرہ نے رسالہ قدسیہ میں روایت کیا ہے۔ان میں ایک فناء وجود ظلمانی اور بقا بالوجود روحانی ہے۔اور دوسری فناء وجود روحانی اور بقا لوجود الٰہی ہے۔اور تمام صوفیا نے جب بھی مطلق استعمال کیا تو اس سے ثانی کو مراد لیا۔اور وجود ظلمانی اور بقائے وجود روحانی کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے اول امر میں اعتقاداً عملاً اور احوالا اپنے نفس کے شہود کا تابعدار ہوتا ہے۔اور خواطر اصلا اللہ کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔پھر جب مطیع وفرماں بردار ہو جاتا ہے ،اسلام قبول کر لیتا ہے اور اس کے نفس میں نور ایمان اثر کر جاتا ہے تو لازمی طور پر اس کا اعتقاد،اس کے اعمال اور احوال وخواطر متغیر ہو جاتے ہیں۔پھر جب اس کا حال اللہ کے ذکر سے استہزا کرنے والوں اور اپنی نظروں سے اللہ کی نافرمانی کرنے والوں کے حال جیسا ہو جاتا ہے تو کہا جاتا ہے،اس کا وجود فنا ہو گیا اور اس کا وجود روحانی باقی رہ گیا۔اور یہ امر واضح ہے،اس کا انکار جان بوجھ کر حق کی مخالفت کرنے والا گھمنڈی ہی کر سکتا ہے۔

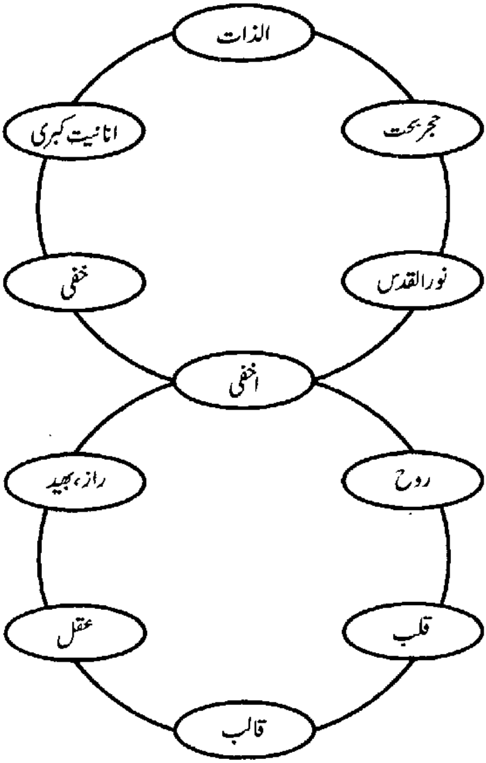
اور فنائے وجود روحانی اور بقائے وجود الٰہی کا مطلب یہ ہے کہ لطائف ظاہرہ کے آثار کو قلب،عقل،روح اور اسرار کی کوئی حاجت نہ رہے اور اس پر لطائف پوشیدہ کے احکام غالب آ جائیں اور لطیفۂ خفیہ کا غلبہ ہو جائے۔پھر اس سے تمام موجودات میں پھیلی ہوئی انانیت کبریٰ کی طرف ترقی کر جائے۔اور راہ سلوک کی طرف چلنے کے دوسرے مرحلہ میں اس پر نور القدس غالب آتا ہے پھر حجر بحت کی طرف ترقی کرتا ہے تب اس کے علوم اور احوال ان امور کی مناسبت سے متغیر ہو جاتے ہیں۔اس فنا کو غلبة کون الحق علي کونک کہتے ہیں اور فني في الله و بقي به کہا جاتا ہے۔یہ سب وہ تعبیرات ہیں جو ہم نے بیان کیں اور یہ لطائف اپنے حدود،حقائق اور خواص سے خارج نہیں ہوتے ہیں بلکہ لطائف ظاہرہ بڑھتے اور لطائف پوشیدہ ظاہر ہوتے ہیں۔

اور لطائف خفیہ کے احکام جو انانیت کبریٰ پر غلاف کی طرح ہیں تمام موجودات اور ان کے مناسب امور میں حقیقت واحدہ کے چلنے کی معرفت ہے۔اور انانیت کبریٰ کے احکام کل عالم میں ظہور قیومیت اور اپنے نفس کی اس طرح رویت ہے کہ وہ قیام ہے۔اور یہ کہ وہ ملک (فرشتہ) میں ملک،حجر میں حجر اور شجر میں شجر وغیرہ ہے جن کی گنتی بہت طویل ہے۔اور نور القدس کے احکام ملاء اعلیٰ کے تنازعہ اور وہاں سے نازل ہونے والے فیصلہ اور حجر بحت کے

احکام کی معرفت ہے۔ یہ تجلی اعظم ہیں بلا کیف اضمحلال ہے۔ پھر انسان کی حقیقت کا جوارح میں سے کسی جارح میں اس کے نفس کا زاید انگلی کی طرح مطلع ہونا ہے۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔ اگر تم عالم مثال میں لطائف پوشیدہ کی صورت کی معرفت حاصل کرنا چاہتے ہو تو وہ یہ ہے



اس طرح اخفی سب سے نیچے ہے اور اس کے دائیں جانب اس سے اوپر نورالقدس اور اس سے اوپر حجر بحت ہے۔ گویا کہ حجر بحت نورالقدس کا خلاصہ ہے اور گویا کہ وہ تجرد اور ترقی کے بعد ہے۔ اور اس سے بائیں جانب اس سے اوپر خفی اور اس سے اوپر انانیت کبری ہے اور گویا کہ وہ تجرد اور ترقی کے بعد ہے جیسا کہ ہم نے قلب، روح، عقل اور راز میں بیان کیا ہے۔ اور ذات الٰہیہ سب سے اوپر ہے اور ان لطائف پوشیدہ کا جسد کے کسی جز کے ساتھ مختص کرنا مناسب نہیں ہے۔ جب کہ قلب کا قدم مضغہ صنوبری سے اور عقل کا قدم دماغ سے بندھا ہوا ہے۔ اور نفس کا قدم جگر سے بندھا ہوا ہے۔ اور بدن میں روح صرف اتنی ہے کہ اس کی نظر فلک کی طرف ہے اور بدن میں نظر صرف اتنی ہے کہ اس کی نظر دماغ کی طرف ہے۔ اور نفس ناطقہ کی چار نظریں ہیں۔ دو نیچے کی طرف روح اور راز تک اور دو نظریں اوپر کی طرف خفی اور نورالقدس تک۔ اور نفس ناطقہ موضع اخفی میں ہوتا ہے۔ اور اگر تم ظاہر اور پوشیدہ سب کی شکل دیکھنا چاہتے ہو تو وہ یہ ہے۔



اب اگر تم کہو کہ جب اخفی تمام لطائف پوشیدہ میں سب سے نیچے ہے تو پھر اس کو اخفی کیوں نام دیا گیا۔ میں کہتا ہوں کہ اس کو اخفی اس لئے نام دیا گیا کہ علم اجمالی دونوں سیروں کا جامع حاصل ہے جو دو سیروں کے بعد حاصل ہوتا ہے اور سالک اس تک ان دونوں کی تکمیل کے بعد پہنچتا ہے۔ اسی لئے اس کا نام اخفی رکھا گیا۔ اور نفس ناطقہ کے اس اجمال کے ساتھ اس کا نفس قائم ہے۔ اس وقت علم لطائف کے سلسلہ میں ہمارے اتنے ہی بیان کو محفوظ کرلو۔ یہی کافی ہوگا حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ بسط و تفصیل کا فیصلہ کردے۔

قولہ قدس سرہ:۔ کیا فنا اور بقا سالک کے صفات وجوبیہ سے متصف ہونے کا سبب ہوتی ہیں؟

اقول:- وجدان صریح کا حکم ہے کہ عبد، عبد ہے خواہ کتنی ہی ترقی کر جائے اور رب رب ہے خواہ اپنے مقام سے کتنا ہی نیچے اتر جائے اور بندہ کبھی بھی وجوب یا صفات لازمہ للوجوب سے متصف نہیں ہوسکتا اور نہ ہی غیب کی باتوں کو جان سکتا ہے الا یہ کہ کوئی شے اس کے لوح صدر میں نقش ہو جائے۔ اور یہ علم غیب نہیں ہے۔ یہ وہ ہے جو من ذاتہ ہوتا ہے ورنہ انبیا اور اولیا لامحالہ بعض ان چیزوں کو جانتے ہیں جو عام لوگوں سے غائب ہوتی ہیں۔ اور نہ ہی وہ تکوین اور خلق سے متصف ہوتا ہے، سوائے اس کے کہ اس کے ساتھ قوت الٰہیہ کا فیضان ہوتا ہے۔ جیسا کہ زنجبیل (سونٹھ) کا کھانا بدن میں مبدأ اول سے حرارتوں کے فیضان کا سبب ہوتا ہے۔ اور اس مسئلہ میں عارف کے تردد کا مقصد یہ ہے کہ پوشیدہ متعینہ امور سے افلاک اور عناصر کے قوی سے امور عظیمہ ہوتے ہیں جن کو ہم تدلیات کہتے ہیں۔ وہ رب العالمین سے قریب العہد ہیں۔ ان میں جبروت کے لئے حکایت ہے اور لاہوت کے لئے اشارہ ہے۔ جب ان قربتوں سے حق ظاہر ہو گیا تو ان کے لئے لوگوں کی تواضع اور عاجزی واجب ہو گئی۔ اور ان مداخلتوں سے پاک ہونے اور ناسوت مرکب میں افلاک کی روحانیات اور عناصر کے لطائف سے منعقد ہونے والی ان قربتوں سے فرق کے لئے ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اس وقت اشارہ کیا تھا جب آنکھ سے رویت حق کے امکان کے بارے میں یہ آیت پیش کی گئی **لاتدرکه الابصار وهويدرك الابصار** "نظریں اس کا ادراک نہیں کرسکتیں اور وہ نظروں کا ادراک کرے گا" (الانعام ۱۰۳) تو انہوں نے کہا اس کا مطلب یہ ہے کہ جب اس کے نور میں تجلی ہوگی جو اس کا نور ہے یعنی تدلیات قربتوں کو رب العالمین نے اس لئے ظاہر کیا تا کہ مخلوق سے قریب ہو جائے اور وہ نورانیت کے پردے ہیں۔

بہت سے احکام الٰہی ہیں جو ان تقربات میں حق کے ظہور کے واسطہ سے اس سے متصف ہوتے ہیں۔ اور ہمارے لئے اس کی حقیقت کے کشف میں دو مقام ہیں۔ مقام اول سب اِنی کا بیان اس کے وجود کے ساتھ ہے، یہ ہم اس وقت کہتے ہیں جب تدبیر حق ہوتی ہے۔ اول لوگوں میں علم کا ظہور یا تکمیل ناقص وغیرہ ہیں۔ اس مراد کے لئے اسباب ارضی کافی نہیں ہوتے۔ اب اگر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے خیر کا ارادہ ہوتا ہے اور اس

کا علم یہ ہوتا ہے کہ خیر کا ظہور فلاں فلاں طریقہ سے ہوگا تو ظہور سے مستعمل ہوتا ہے اور افلاک اور ملاء اعلیٰ تمام کے تخیلات ہیئت خیالیہ کے تصور کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اور حق اول سے مطالبہ یہ ہوتا ہے کہ یہ ہیئت خارج میں پائی جائے اور پانی صورت قدسیہ کے رنگ میں ہوتا ہے اس کا نیا عہد رب کے ساتھ ہوتا ہے جیسا کہ عادت کے مطابق عناصر سے ظاہر ہونے والی صورت میں ہوتا ہے۔ چنانچہ خارج میں وہ شے متحقق ہوتی ہے جس کو جبروت کہا جاتا ہے اور جو لاہوت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اس کا جسم ملائکہ کی روحانیات ہوتی ہیں اور ان کی ہمتیں پانی میں نقش ہوتی ہیں اور اس کی روح لوگوں کے ساتھ حق کا ارادہ ہوتا ہے۔ اور اگر حق چاہتے ہو تو ملائکہ کی شکل ہی میں ایک راز ہے کہ جب وہ کسی خاص شکل میں رغبت کرتے ہیں تو اس کا مستقیم وقوی تخیل کرتے ہیں۔ اور ان کے تخیل میں طبیعت کلیہ کی قوت عجیبہ مدد کرتی ہے۔ چنانچہ پانی اس کا رنگ اختیار کرتا ہے اور جب تک تخیل قائم رہتا ہے۔ وہ باقی رہتا ہے۔ پھر یہ محقق کبھی موسیٰ علیہ السلام کی آگ اور جبرئیل کی مکمل بشری صورت کی طرح باب جواہر سے ہوتا ہے اور کبھی عرض نفسانی کے باب سے۔ تو جس طرح غضب اور محبت وغیرہ وہ صورتیں ہیں جن سے نفس ناطقہ کیفیت حاصل کرتا ہے، اسی طرح جب نفوس کاملین حق اول کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور ان کو تجلی ذاتی علی وجہہ حاصل ہوتی ہے تو وہ جبروت کی صورت علمی ومحا کی کیفیت اختیار کرتے ہیں پھر ان صورتوں میں آگے بڑھتے ہیں تو اس کا نفس پر خلع الٰہی (الٰہی لباس) ہوتا ہے۔ اور اس سے خارق عادت امور صادر ہوتے ہیں۔ اور جس شخص میں یہ کیفیت ہوتی ہے، وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ حق اس کے اندر نازل ہو گیا اور وہ ان اختلاطات اور محاکات کی وجہ سے عین حق ہو گیا ہے۔ اور اگر تم تحقیق چاہتے ہو تو ان تدلیات (قربتوں) کی مثالیں دنیا میں بہت ہیں اور یہ ان کے دین ودنیا کا انتظام ہے۔

ان میں سے ایک قرآن عظیم ہے اور وہ اس لئے کہ قرآن کے الفاظ عربی لغت سے ہیں جن کو ہمارے نبی محمدؐ جانتے اور سمجھتے تھے اور ان کے بارے میں تخیل غور وفکر کرتے تھے۔ اور معانی غیب سے معلوم ہوتے تھے جو آپ کو سکھائے جاتے تھے ان میں حق کی طرف قربت کرتے ہوئے کلام الٰہی ہو جاتا ہے۔ اور وہ اس لئے ہوتا ہے کہ انسانوں کے ساتھ خیر کا ارادہ

نبیؐ کے خیال میں اعانت و مدد کرتا ہے۔ یہ وہ صورت ہے کہ الفاظ اور ان کا نظام جمع ہو جاتا ہے پھر معاملہ اس نظام میں بڑھتا ہے اور جبروت کو لباس الٰہی محاکی پہناتا ہے، تو اس سے قربت الٰہی ہو جاتی ہے اور اس کو کلام اللہ اور اسی طرح لفظ اللہ کا نام دیا جاتا ہے اور ان کی تعظیم اس لئے واجب ہوتی ہے کہ وہ ذات عظیمہ پر دلالت کرتے ہیں۔ اور اس میں ایک اشارہ ہے جو اس نسبت میں بڑھاتا ہے پھر اس نسبت کے جسم میں روح الٰہی کا فیضان ہوتا ہے۔ اس طرح یہ اسم قرب الٰہی ہو جاتا ہے جس کی تعظیم واجب ہوتی ہے۔

دوسرا مقام سماعت اور عقل کے لحاظ سے اس کا اثبات ہے۔ جہاں تک سماعت کا تعلق ہے تو آپ کہیں گے کہ موسیٰ علیہ السلام کی آگ لامحالہ عناصر کے قبیل سے نہیں تھی اور اس کا فیضان موسیٰ علیہ السلام کے لئے اس کی ربوبیت سے ہوا تھا۔ اور وہ صدقاً وحقاً اس طرح کلام کرتی تھی کہ انی انا اللہ "میں ہی اللہ ہوں"۔

اور جہاں تک عقل کا تعلق ہے تو آپ کہیں گے کہ یہ بات ثابت ہے کہ عالم میں مبدأ تکوین، اللہ کی عنایت ہے۔ اور وہ یہ علم ہے کہ نظام خیر اسی صورت میں ہوتا ہے۔ پھر جب اسباب ارضی وفلکی اس صورت کے اہتمام سے قاصر رہ جاتے ہیں تو وہ غیب سے ارادہ اور علم کے تصرف سے ظاہر ہوتی ہے اور افلاک اور ملاء اعلیٰ کے خیالات چاروں طرف سے گھیر لیتے ہیں اور پانی میں عام صورتوں کی طرح رنگ نقش ہو جاتا ہے۔ تو اس صورت کے لئے بھی ایک فضیلت اور تمام صورتوں کی طرف نسبت کے رجحان کا ہونا لازمی ہوتا ہے۔ اس لئے ہم اس کو تدلی الٰہیہ کہتے ہیں اور اس برہان سمعی و عقلی کا پوری طرح بیان یہاں ممکن نہیں ہے، اس لئے کسی دوسرے موقع پر بیان کریں گے۔

قولہ قدس سرہ:- کیا توحید ذاتی کی حقیقت تک پہنچنا ہر صورت میں تمثیل ونمائندگی کی قوت بلکہ ہر معنی کے ظہور کا سبب ہوتا ہے؟

اقول:- حقیقت توحید تک وجدان کے لحاظ سے پہنچنے کی حقیقت یہ ہے کہ وہ یقین پیدا ہو جائے جو بہت سے لباسوں میں ملبوس ہوتا ہے کہ وہ موجود ہے اور عالم میں ہر صورت کے لئے وہ ہیولی ہے اور یہ قوت تمثیل وصورت کو انسانی یا حیوانی، یا نباتی یا عرضی قائم بالغیر کے لحاظ سے موجب نہیں ہوتی۔ وہ علم اجمالی ہے جو اس حقیقت جامعہ سے مترشح ہوتا ہے کہ

اس میں کل کی قابلیت ہے۔ اور یہ علم اجمالی اس یقین کے لحاظ سے صادق ہے جو اس کی زبان پر بھروسہ کرتا ہے۔ لیکن وہ تعینات کے گڑھے میں بھرا ہوا ہے بہت سے پردوں میں دبا ہوا ہے۔ وہ تمثل کے ظہور سے اس کو منع کرتا ہے۔ ہاں! جب عارف سے جزء غلیظ ارضی مضمحل ہوگیا اور باقی وہ رہا جس کا تعلق ملاء اعلیٰ سے ہے، اور جب طبیعت عرشیہ کلیہ کا حق اس سے زایل ہوگیا کہ فلاں ابن فلاں ہے اور وہ بدن میں اس طرح اور اس طرح تھا اور اس کے نزدیک اسماء الٰہیہ اور جوارح حق سے ایک جارحہ ہوگیا اور اس کی انانیت، انانیت حق کی طرف منقلب ہوگئی تب وہ کل عالم کو بنفسہ اپنے عالم کے ضمن میں جانتا ہے جس طرح طبیعت کلیہ جانتی ہے۔ تو اس وقت کبھی حق ظہور تدلی کا ارادہ کرتا ہے تب وہ اس تدلی کے لئے روح تھا یا خلق یا بشر کے ظہور کا ارادہ کیا تو وہ اس کی طرف اس طرح نازل ہوا جیسے طبیعت کلیہ نازل ہوتی ہے۔

اب اگر تم کہو کہ توحید وجودی کی تحقیق کیا ہے تو میں کہتا ہوں کہ توحید وجودی کی تحقیق یہ ہے کہ یہ خارج اور نفس الامر میں صرف ایک حقیقت ہے۔ اور وہ وجود ہے۔ اور تحقیق اور تقرر کے معنی میں ہے نہ کہ معنی مصدری میں[1]۔ اور تمام موجودات اس سے۔ اس طرح قائم اور اس کے لئے اس طرح عارض ہیں جس طرح موجوں کی ہیئتیں سمندر کے ساتھ قائم ہوتی ہیں یا اعراض کا عروض ان کے محلوں میں ہوتا ہے۔[2]

اس طرح ان کی موجودیت کی حقیقت یہ ہے کہ ان کا انضمام حقیقت الوجود سے ہے اور ان کے تمام حقائق توحید پرست صوفیا کے نزدیک عوارض الوجود ہیں۔ اور دوسروں کے نزدیک وجود، ماہیت کے لئے عارض ہے۔ اور وجود کو عارض ہونے والے یہ حقائق بذات خود امور مستقل نہیں ہیں۔ بلکہ وہ وجود کی شان اور اس کے اعتبارات اس معنی میں ہیں کہ جب وہ بنفسہ لنفسہ تجلی کرتا ہے تو قابلیات کثیرہ اس معنی میں ظاہر ہوتی ہیں کہ کبھی اس کا ان احکام سے متعلق ہونا ممکن ہوتا ہے اور کبھی دوسروں سے۔ تو اگر ان سے متعلق ہوتا ہے تو انسان کہا جاتا ہے۔ اور دوسروں سے متعلق ہوتا ہے تو گھوڑا (فرس) کہا جاتا ہے۔

پھر ان قابلیات سے جو کہ تمام حقائق میں شامل کلیہ ہیں۔ انسان اور ضاحک کے تصادق جیسا تصادق ہے۔ چنانچہ انسان کا مفہوم اس مفہوم سے مختلف ہے جو ضاحک کا ہے۔

اور اسی فرق کی وجہ سے وہ ایک دوسرے سے مختلف مستقل دو ہو گئے۔ لیکن وہ دونوں صدق میں مجتمع ہوتے ہیں کہ جب بھی اس کا تحقق ہوتا ہے، اس کا بھی تحقق ہوتا ہے۔ یا تمام حقائق خاصہ سے متعلق اجمالی تدبیر کی شمولیت ہوتی ہے جیسا کہ علم غیب اور عالم میں نظام خیر کا ارادہ ہے۔ یا تمام کی شمولیت ہے۔ تب حقائق اس کے لئے قیود کے انضمام کے ساتھ صرف اس کے اقسام ہوتے ہیں جیسا کہ خارج میں تحقق اس سے اس قید کا الحاق کرتا ہے کہ وہ قائم بنفسہ ہے۔ ایسی صورت میں وہ جوہر ہو جاتا ہے یا وہ قائم بغیرہ ہوتا ہے تو عرض ہو جاتا ہے۔ پھر جوہر کے ساتھ یہ قید لاحق ہوتی ہے کہ یہ تحیز سے مجرد ہے۔ یا یہ قید لگائی گئی کہ وہ صاحب وضع متحیز ہے۔ پھر متحیز یا تو نامی ہوگا یا نہیں ہوگا۔ اور نامی یا تو صاحب احساس، صاحب حرکت ہوگا یا نہیں۔ اور صاحب احساس ناطق ہوگا یا نہیں۔ ھلم جرا

پھر حقیقت اجمالی قیود خاصہ کے رفع سے حاصل ہوتی ہے۔ تمام میں پوری طرح شامل ہوتی ہے۔ اور یہ حقائق جب ان سے متعلق ہوتے ہیں تو وہ اسماء الٰہیہ ہوتے ہیں۔ ان میں سے کچھ فلک، عنصر، جوہر، عرض، نبات اور معدن وغیرہ کی طرح خاص ہوتے ہیں۔ اور وہ حقائق ممکنات ہوتے ہیں۔ چنانچہ وجود کے دو کمال ہوتے ہیں۔ ایک کمال باطن اور وہ اس کے حقائق متکثرہ ہونے کے لئے قابلیت ہے۔ دوسرے کمال ظاہر اور وہ اس کے تحقق اور تقرر خارجی کا متصرف ہوتا ہے۔ اور جب ان قابلیات اور ظاہر الوجود کے درمیان نسبت حاصل ہوتی ہے جو اس کے مناسب ہوتے ہیں۔ اور کہا جاتا ہے کہ شئے فانی موجود ہوگئی تو اس کے خارج میں صرف ایک حقیقت ہوتی ہے اور وہ وجود صرف ہے۔ اور اعیان علمیہ کو وجود کی خوشبو بالکل نہیں پہنچتی۔ البتہ یہ وجود اس کے احکام اور آثار سے متعلق ہوتا ہے۔ چنانچہ عالم اعراض ہوتا ہے جو عین واحدہ میں مجتمع ہوتی ہیں اور اس کے لئے کثیر ہیئتوں میں تقلبات ہوتے ہیں۔

اور یہ صوفیا کا ذوق اور ان کا وجدان ہے۔ اور یہ ذوق حق ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ رحموت نے جب عماء کو قائم کیا اور اس کے وجود کا سبب ہو گیا اور معدومیت ہیولانیہ پر غالب آ گیا تو یہ مفہوم اخذ المتقوم فیہ اس میں سیدھا کرنے کے معنی میں ہو گیا نہ کہ خارج میں تنزل الٰہیہ کے لحاظ سے سیدھے کی شرط لگانے کے معنی میں جو کہ آخری تنزلات الٰہیہ ہے۔ اس لئے صوفیا نے اس کا نام وجود صرف رکھا۔ اور وہ اس پر طاری ہونے والی تمام صورتوں کو قبول کرنے والا

ہے۔اور صورتیں رحموت سے جاری ہوتی ہیں۔اس لئے اس کو باطن وجود سے جاری ہونے والا نام دیا گیا۔اس لئے کہ انہوں نے تقوم اور مقوم فیہ کو اختیار کیا۔اور اس کا قرینہ یہ ہے کہ انہوں نے پھیلے ہوئے اس وجود کو جس میں حقائق متعین ہوئے حق تبارک وتعالیٰ سے پہلا صادر ہونے والا بنایا۔لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ عبارت میں زیادہ حق اور بیان میں زیادہ صریح بات یہ ہے کہ رحموت، اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک نام ہے اور عماء ایک ہیولانی شے ہے، اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے نہیں ہے۔پس جس طرح شے خاص اس کی مستحق نہیں ہوتی کہ اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک نام شمار کی جائے اسی طرح میلی کچیلی شے ہیولی جس میں عدم کا مزاج ہے۔اس کی مستحق نہیں ہوتی اگرچہ صادر بالا بداع واللزوم ہو۔جب کہ یہ متقوم، حال متعلق سے اسم ہے اور متقوم کا نفس محال نہیں ہوتا۔اور اس کی مثال اسمیت اور امکان میں وجود اور عدم کے احوال جیسی ہے۔اس کے قائلین کے نزدیک اس کے لئے تحقق باقی رہتا ہے۔اس لئے اس مقوم کے لئے اسمیت بالعرض ہے۔

قولہ قدس سرہ:-قطبیہ ارشادیہ کے مقام تک کون پہنچا؟

اقول:-طرق الی اللہ کثیر ہیں۔اور جہاں تک جزئیات کا سوال ہے وہ تو اللہ کی طرف چلنے والوں کی تعداد کے برابر ہیں۔بلکہ حق بات تو یہ ہے کہ ہر نفس کے لئے ہر وقت ایک الگ ہی شان ہوتی ہے۔جو دوسرے وقت کی شان سے الگ ہوتی ہے۔البتہ کلیات کی تین اعلیٰ قسم ہوتی ہیں۔ایک کامل یعنی جن میں لطائف ظاہرہ غالب ہوتے ہیں۔دوسرے سابقون، یہ وہ ہیں کہ جن میں قلب، عقل اور نفس پر روح اور راز کا لطیفہ غالب ہوتا ہے۔یا ان میں ان کے مزاج کی استقامت اور ذکر وقربات میں ان کے اشتغال کی کثرت کے ساتھ قلب اور عقل کے لطیفہ کی شرع سے تہذیب غالب ہوتی ہے۔اور مزاج کی استقامت کے معنی یہ ہیں کہ نہ اس کی بہیمیت انتہائی ضعیف ہو اور نہ ہی ملکیت انتہائی پستی میں ہو۔تیسرے اصحاب الیمین وہ ہیں کہ ان کے مزاج کی صحت کے ساتھ ان کے قلب اور عقل کی ایک جانب مہذب ہوگئی اور دوسری جانب نہیں ہوئی یا قربات الٰہیہ بہت زیادہ کرلیں اور ان پر دوام اختیار کیا۔الا یہ کہ ان کی بہیمیت انتہائی ضعف میں ہو اور ان کی ملکیت انتہائی سافلیہ ہو تو جو سابقون نے پالیا، وہ انہوں نے نہیں پایا۔تو اصحاب الیمین میں سے یہ باقی رہ گئے اور اہل ارشاد کے لئے یہ

واجب ہے کہ وہ سابقون میں سے ہوں۔اوران کے لئے ان امور میں جو دین کی طرف رجوع کرتے ہیں بلند مرتبہ اور ظہور کا فیصلہ کیا جائے۔ پھران میں سے کچھ وہ ہیں جن پر روح اور راز غالب ہو گئے۔اور کچھ وہ ہیں جن پر قوت بہیمیہ اور قربات الٰہیہ میں کثرت اشتغال کے ساتھ عقل اور قلب غالب ہو گئے۔اوران سے غایت ضعف میں ملکیت کا نہ ہونا تو یہ قدر اہل ارشاد میں واجب ہے۔اب اگر اس کے ساتھ کچھ کامل لوگ ہوں تو اچھا اور بہتر ہے۔

جہاں تک رجال الغیب کا تعلق ہے تو وہ نفوس بشریہ ہیں جو جبلت اور کسب کے لحاظ سے ملائکہ سے لاحق ہیں، تو ان میں سابقون وہ ہیں جن کی بہیمیت اور ملکیت قوی ہو اور ملائکہ سے ان کا تشبہ قوی ہو۔اوران میں عالم مثال قوی ہو، وہ مصلحت الٰہیہ کے لئے عالم مثال و ناسوت سے برزخ میں قائم ہوئے۔ان میں اصحاب یمین کی ملکیت سافل پست اور بہیمیت ضعیف رہی۔اور ملائکہ سے ان کا تشبہ قوی ہو گیا۔اور وہ بمنزلہ ملائکہ عنصریہ ضعیفہ کے ہو گئے۔ اور وہ مصلحت کبھی ایسی ہوتی ہے کہ وہ نظام عالم میں اس امر کی محتاج ہوتی ہے کہ ناسوت میں ایسے نفوس ہوں گے جو بشریت اور ملکیت کو جمع کرتے ہیں تو ان کو الہام کیا جاتا ہے۔چنانچہ وہ ایسے امور کی تدبیر کرتے ہیں جن کا تقاضہ تنہا اسباب ارضیہ نہیں کرتے۔اوران میں سے خضر علیہ السلام ہیں اور وہ سب سے افضل ہیں۔اوران میں ابدال ہیں۔اور کبھی فیض مستقیم اس مثال میں شکل اختیار کرنے والے ناسوت کی طرف نازل ہوتا ہے جس کے لئے ملکوت میں امر کلی کے طور پر فیصلہ کیا گیا۔ چنانچہ وہ نظام خیر میں ایسے نفوس کے محتاج ہوتے ہیں جن کو نظام خیر کی طلب علی وجہ خاص قوی ہمت ہوتی ہے۔تا کہ ان کی ہمتیں ناسوت میں امر کلی کی مشخص ہوتی ہیں اور وہ قطب اوران کا لشکر ہے۔اور اہل ارشاد کو ان کے طریقہ کا علم نہیں ہے۔اور وہ ایک دوسرے سے دور ہیں۔اللھم،الا یہ کہ کوئی شخص تمام وجہوں سے پایا جائے۔واللہ اعلم

اور اہل ارشاد انبیا علیہم السلام کے وارث ہیں۔اور قطب ایک خاص مقام یا زمانہ کے لئے ہوتا ہے اور اس کے لشکر ابدال اوران کے جیسے لوگ ہوتے ہیں۔وہ تکوین کے راز کے ساتھ قائم ہوتے ہیں نہ کہ تشریع کے راز کے ساتھ۔اور کاملوں کے لئے ان کے کمال کے لحاظ سے ایسی اسناد نہیں ہوتیں جس سے یہ کمال حاصل کرتے ہیں۔ان میں بعض انبیاء ہوتے ہیں۔ان کو بھیجا جاتا ہے اوران کے لئے فیصلہ کیا جاتا ہے کہ وہ علم یا رشد کے ظہور میں حق کے

جوارح ہوں۔ اور ان میں سے بعض اولیا ہوتے ہیں۔ ان کے لئے اس کا فیصلہ کیا جاتا ہے لیکن اللہ کی حکمت یہ ہے کہ کامل کی طرف اس طرح متوجہ ہوتی ہے کہ وہ جانے یا نہ جانے۔ یہ ایک اسناد اور سلسلہ ہوتا ہے جو اس کی طرف جاتا ہے جو اس سے قبل مقام ارشاد پر قائم کیا گیا تھا۔ تاکہ وہ برکات ملکیہ کا ذاکر ہو اور اس کا اہتمام کرنے والا ہو جس کا اس سے ارادہ کیا گیا ہے۔ ذالک تقدیر العزیز العلیم۔

اور اہل کمال کی ایک قوم ہوتی ہے جن کو افراد کہا جاتا ہے۔ وہ اس لئے پائے جاتے ہیں تاکہ ان کے ذریعہ دائرہ حظیرۃ القدس کے پیچھے چلائے اور لوگوں میں ان کا کوئی ذکر نہیں ہوتا۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ ان کے علم کی وجہ سے ترجیح دیتے ہیں۔ ان کو اللہ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا اور انبیا میں سے ایک جماعت دوسروں کی تابع ہوتی ہے۔ ان کو اتمام حجت کے لئے بھیجا جاتا ہے۔ اور ان کے لئے ظہور کا فیصلہ نہیں ہوتا۔ نہ ہی ان کو کسی شے کے ظہور میں حق کے جوارح بنایا جاتا ہے۔ یہ ایسے لوگ ہوتے ہیں کہ کبھی کبھی ان پر ایک شخص بھی ایمان نہیں لاتا اور ان میں صرف وہی واجب ہوتا ہے جو فقط اہل ارشاد میں واجب ہوتا ہے۔ اور ہم قطب اور خضر کو اور ان کے لشکروں کو صرف اس محل سے پہچانتے ہیں جس میں کمال تقسیم کیا گیا۔ ان کو ان کے ایمان سے نہیں پہچانتے۔ اور یہ آخری بات ہے جو ہم نے خواجہ خرد قدس سرہ کے سوالات کے جواب میں لکھی ہے۔ والحمدللہ اولا و آخرا

۶۸۔ تفہیم:

کلی اور جزئی ظہور کی بحث

الحمدللہ الکبیر المتعال الکثیر النوال وصلی اللہ علی خیر خلقہ محمد والہ وصحبہ وسلم امابعد. یہ علوم شریفہ اور معارف جلیلہ ہیں جن کو عبد ضعیف، اللہ الکریم کے محتاج ولی اللہ بن عبدالرحیم کان اللہ لھما فی الاخرۃ والاولی نے سمجھا ہے۔ نفس کلیہ نفوس جزئیہ کو نیچے اتارتا ہے اور اس اتارنے میں ایک ترتیب ہوتی ہے اور بعض کا اتارنا بعض پر موقوف ہوتا ہے جیسا کہ ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ مثلاً نفوس انسانیہ کی پیدائش عنصر ارض کی پیدائش پر موقوف ہوتی ہے۔ اور ہر ترتیب کے لئے ایک شے ہوتی ہے جو اول

مبدا ہے، وہ کسی شے پر موقوف نہیں ہوتی اور وہ نور اعظم ہے جو نفس کلیہ میں تمثال ذات ہے۔ جو کچھ نفس کلیہ میں ہے وہ سب پر غالب ہے۔ چنانچہ کوئی بھی جوہر ہو یا عرض اور کوئی بھی تدبیر ہو وہ اس تجلی اعظم کی تاثیر سے ظاہر ہوتی ہے۔ اور اس تجلی کی شان ارادہ اور اختیار ہے۔ اور یہ اختیار اگر اس تجلی کے لئے ہو تو واجب ہے۔ اگرچہ اس کا مرجع حقیقت میں ایجاب کی طرف ہو۔ اور ہم اس کے لئے ایک مثال دیتے ہیں۔ کیا ایسا نہیں ہوتا کہ رطوبت درخت کے پتوں میں جمع ہوتی ہے تو اس میں تعفن پیدا ہو جاتا ہے۔ پھر اس کا تعفن نفوس حیوانیہ سے حدوث نفس کی طرف بڑھتا ہے تو واجب ہوتا ہے کہ اس میں اختیار اور حرکت بالارادہ پائے جائیں تو حیوان اپنے نفس میں اپنی ذات کی طرف نسبت سے استوائے فعل اور ترک پاتا ہے۔ اور اس کو حسن قصد پاتا ہے جس کی طرف فعل کی نسبت کی جاتی ہے۔ اور یہ بلاشبہ انصاف والا ہے۔ پھر یہ کہ اس میں اس اختیار کا وجود اضطراری ہوتا ہے جو وجوب سے حادث ہوتا ہے۔ اور اسی طرح حیوان کی ہر نوع کے لئے ایک خاص استعداد ہوتی ہے۔ چنانچہ اس میں اختیار خاص طریقہ سے ہی ہوتا ہے جو اسی کو خاص قرار دیتا ہے اور اس کی استعداد اس کی مدد کرتی ہے۔ ایسی صورت میں یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ اختیار واجب ہے اور یہ کہ صورت اختیار کی صورت ہوتی ہے اور حقیقت وجوب کی حقیقت۔

اب جب کہ عالم میں معاملہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ ہم نے بیان کیا تو اول الحقائق اولی ہے کہ اس میں ارادہ اور اختیار ہو۔ اور اس کا اختیار اور ارادہ ایجاب میں مضمحل ہوتا ہے۔ اور جب تم نے اس کو سمجھ لیا تو تمہیں اطمینان اور یقین حاصل ہو گیا اور تمہارا نفس عقلا کے درمیان برپا ہونے والے اس تنازعہ میں مضطرب نہیں ہوگا جو مسئلہ ایجاب و اختیار میں ہوتا ہے۔ اور جو بندوں کے اپنے افعال میں اختیار اور ان کے افعال میں اختیار کی طرف نسبت کے مسئلہ میں اور ان کے اپنے افعال کا سبب ہونے میں ہوتا ہے۔ باوجودیکہ خالق اللہ تعالیٰ ہے اور اس نور اعظم کے عکس اور چکر ہوتے ہیں۔ اور اب ہم ان عکسوں کا تذکرہ کرنا اور ان کے مراتب کے کلیات کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں کہ یہ ایسا علم شریف ہے جس کے بارے میں حق کے ترجمانوں نے کم ہی گفتگو کی ہے۔

فاقول: اس لئے میں کہتا ہوں کہ سب سے پہلے جو ظاہر ہو وہ تجلی اعظم ہے۔ اس

کے لئے نہ کوئی قید ہے اور نہ ہی ایسا وصف ہے جس سے اس کو معین اور ماسوا سے ممیز کیا جائے۔ سوائے اس کے کہ یہ اول تعین ہے جس کو نفس کلیہ نے قبول کیا پھر جب افلاک جدا ہو گئے تو ان کے لئے نفس مجردہ رہ گئے اور وہ نفس کلیہ رہ گیا اور وہ نفس کلیہ کے بعد نفس جزئیہ ہو گیا۔ پھر جب وہ نیچے اترا تو صورت حق کے ساتھ اترا۔ اس طرح نفوس افلاک میں پہلا لطیفہ نور سفیدی غالب ہے اور تجلی اعظم کا نام اس کے اس نور کی تفسیر کرنے والے کے اعتبار سے ہے نہ کہ اس سفیدی کے لحاظ سے جو غالب ہے۔

اس موقع پر ہم تمہیں ایک عجیب لطیفہ سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں اور وہ یہ کہ حکما کے کلام میں غور و فکر کرنے والے یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے نزدیک انوار قاہر سفید یہی عقول عشرہ ہیں۔ جب کہ معاملہ ایسا نہیں ہے کہ مرتبہ عقلیہ، نفس کلیہ سے پہلے ہوتا ہے اور مرتبۂ عقلیہ، مرتبۂ ثبوت ہوتا ہے۔ اور مرتبۂ نفس کلیہ مرتبۂ وجود ہوتا ہے۔ لیکن انوار قاہرہ حجر بحت ہوتے ہیں جو کہ تجلی اعظم کی شکل میں نفوس افلاک میں اترتے ہیں۔ اور جس پر ان انوار قاہرہ کا انکشاف ہو گیا اس کو ایجاب، تکوین اور تحقیق کے سوا کچھ معلوم نہیں ہوا۔ اور اس کے لحاظ سے اس کو خیر اور شر کے درمیان تمیز نہیں ہوئی۔ اور اس کے بعد دوسرا مرتبہ ہوتا ہے اور وہ نفوس مجردہ میں حجر بحت ہوتے ہیں جن کو افلاک کا نام دیا جاتا ہے۔ اور وہ ایسی قوم ہیں جو صرف اس جہت سے پائے جاتے ہیں کہ مصلحت کلیہ اطلاق، تقیید، وجوب اور امکان کے مراتب کے جامع موطن الٰہی کے وجود کا تقاضہ کرتی ہے۔ اور وہ اس لئے ہے تاکہ دونوں قبیلوں کے درمیان واسطہ اور برزخ ہو جائے تو یہ مصلحت فرشتوں کی اس قوم کے وجود کے لئے تقاضہ کرتی ہے۔ اور مادہ کی خصوصیت اس مصلحت کے لئے اہتمام کے طور پر آئی تو ان احجار بحتہ نے تجلی اعظم کے گرد احاطہ کر لیا جس طرح یاقوت کا احاطہ شعاعیں کرتی ہیں۔ اور بعض لوگوں نے جن کو کمال وجدان حاصل نہیں ہے، کہا ہے کہ نفوس کاملہ دورۂ اولی میں تھے۔ پھر برابر تجلی اعظم سے ملحق ہوتے رہے حتی کہ ان کے احجار بحتہ تجلی اعظم میں فنا ہو گئے اور اس دورہ میں لوگ ان کو اسماء ارضیہ سے موسوم کرتے تھے۔ اور ان کو آخری شے جو حاصل ہوئی وہ شفاعت کبری ہے۔ پھر دورہ محو ہو گیا اور نفوس انفرادیت اور تجلی اعظم سے الحاق میں بہت دور تک چلے گئے اور دوسرا دورہ آ گیا تو ان کو اس دورہ کے فضل میں بڑھے ہونے کے طور پر پیش کیا۔ اور ان کے اسماء

ارضیہ نہیں پہچانے تو ان کے لئے ان کے اوصاف کے لحاظ سے اسماء کا اشتقاق کیا اور اس طرح نام رکھا کہ یہ جبرئیل ہے اور وہ اسرافیل ہے اور وہ عزرائیل و میکائیل ہیں۔ پھر لوگ ملے تو ان کے نزدیک اسماء علامات کے اسما ہو گئے اور وہ اس امر کو بھول گئے کہ وہ ایک دوسرے سے جدا نفوس ہیں اور اس اعتبار سے تجلی اعظم کا نام عبرانی زبان میں لاہوت اور لاہا اور عربی میں اللہ ہے۔ اور اس سلسلہ میں متاخرین کا کلام جس طرف اشارہ کرتا ہے وہ تمہیں دھوکہ میں نہ ڈال دے کہ اللہ اس ذات باری کا باعتبار ذات نام ہے کہ یہ ایک قسم ہے جس میں مراتب ایک دوسرے سے خلط ملط ہو گئے۔ اور ہم صرف اپنے وجدان سے ہی تمہیں بتاتے ہیں کہ ہم نے دوسرے لوگوں کے اقوال کو ایک طرف ڈال دیا۔ اور یہ وہ شان ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں ظہور فرمایا کہ آپ کی زبان کے ذریعہ نجوم کو حرام قرار دیا، علم طلسمات وخزرات وغیرہ کو باطل کیا اور یہ سب اس ظہور اور اس شاخ کی شاخیں ہیں۔ اول کی مثال نور محض ہے اور اس شان کی مثال صاف شفاف نور ہے۔ اور انبیا علیہم السلام اس ملت پر قائم رہے جو ان کو اس تجلی کے ساتھ حاصل ہوتی ہے جو ملائکہ کی نسبت اور سیہ کے صدور سے پیدا ہوتی ہے۔ تب ان پر علوم حکمت، علوم تشریع ومخاصمت، علوم تذکرے بآلاء اللہ وایام اور علوم فتن وغیرہ کا فیضان ہوتا ہے۔ اور انبیا کو ہر زمانہ میں پورے بدن سے ان کے نفوس کے خالص ہونے کو سمجھایا جاتا ہے جس سے ان کی ہمتوں کی شعاعیں ملائکہ سے لاحق ہوتی ہیں اور ان کے اردگرد کو درجہ بدرجہ گھیر لیتی ہیں یہاں تک کہ فضا پوری طرح بھر جاتی ہے اور ان کے آخری سیدنا وشفیعنا محمدؐ ہیں اور آپ سے حجر بحت انتہائی صاف وشفاف تھا۔

پھر حق تبارک وتعالیٰ کو دوسری شان کلی حاصل ہوئی اور وہ اس کا عالم مثال کی صورت میں ظہور ہے۔ اور اس کی تحقیق یہ ہے کہ عالم مثال نفس کلیہ کے لئے بمنزلہ خیال ہے جو عرش سے ایک قسم کا تعلق رکھتا ہے۔ پھر جب عالم مثال فراخ و وسیع اور تمام ہو گیا تو واجب ہو گیا کہ اس میں تجلی اعظم کی صورت اس کے پہلے اور دوسرے ظہور کے ساتھ ظاہر ہو۔ چنانچہ صورت نورانیہ کاملہ ظاہر ہوئی۔ البتہ پہلے دونوں ظہوروں اور اس ظہور کے درمیان اس لحاظ سے بہت بڑا فرق ہے کہ پہلے دونوں ظہوروں میں وجوب ظاہر ہے اور یہ ظہور بمنزلہ اس شے کی صورت کے ہے جو آئینہ میں ظاہر ہوتی ہے کہ جب آئینہ میں آگ ظاہر ہوتی ہے تو اس ظاہر ہونے

والی آگ میں آپ گرمی وحرارت نہیں پاتے۔ کہ وہ آگ کی صورت ہے اور اس کو ظاہر کرتی ہے اور اس تجلی کے اردگرد کو دو قوموں نے بھر دیا۔ ان میں ایک نفوس انسانیہ کی جماعت ہے جو اس پر راز اور عقل کے لطائف کے درمیان غالب ہے۔ اور ان دونوں لطیفوں کو عالم مثال کے ساتھ خفیہ مناسبت ہے بلکہ ظاہر یہ ہوتا ہے کہ راز اور عقل عالم مثال کے لئے سایہ ہیں۔ پھر جب یہ قوم مرگئی اور حق کی صورت ان کے اسرار اور عقلوں میں مستقر رہی تو واجب ہوا کہ ان نفوس میں مثال میں موجود حق کی صورت کی طرف جذب وکشش ہو۔ تو اس کے اردگرد تجلی اعظم کے اردگرد ملاء اعلیٰ کے گھیراؤ کی طرح گھر گیا۔ اور دوسری جماعت ملائکہ عنصریہ کی ہے ان کا مادہ نفوس زکیہ اور عالم مثال کے امن کی مدد کا مستوجب ہوا۔ چنانچہ ان کے نفوس مثال میں حق کی صورت کے آئینہ کی طرح ہو گئے اور ان کی طرف اس طرح کشش ہوئی جیسے لوہے کی کشش مقناطیس کی طرف ہوتی ہے۔ اور اس تجلی کے لئے اس سے ملا ہوا کشادہ میدان ہے۔ اس میں اسماء الٰہیہ بسیطہ رحمٰن، رحیم اور وہاب اور مرکبہ مثلاً هو الذی یخرج الحی من المیت "وہ ایسا ہے جو زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے" اور وهو الذی انزل من السماء ماء فاحی به الارض بعد موتها "اس کی ذات وہ ہے جس نے آسمان سے پانی نازل کیا پھر اس سے زمین کو زندہ کیا جو پہلے مرچکی تھی۔" (البقرہ:۱۶۴) کی صورتیں متعین ہوتی ہیں۔ چنانچہ ہر صفت کے لئے جو کتب الٰہیہ میں مذکور ہیں اور افضل بندے ان کی تلاوت کرتے ہیں اور ان کے وسیلہ سے اپنے رب کی طرف تقرب حاصل کرتے ہیں۔ اس مقام پر ایک قسم کا نمونہ ہے اور ہر صورت کے لئے خادم ملائکہ ہیں جو ان کی لمبائی و درازی کے ساتھ متعلق ہیں اور ان کی محبت میں مستغرق ہیں اور یہ صورتیں اپنے نفوس کے آئینہ کے مد مقابل آتی ہیں حتی کہ اس میں ان کا عکس ظاہر ہوتا ہے۔ اس مقام سے اسماء الٰہیہ کے اہل دعوت مدد طلب کرتے ہیں اور اس سے نیچے مقام مثالی ہے جس میں اعتقادات بشر واضح ہوتے ہیں جن پر ان کی زندگی اور موت واقع ہوتی ہیں۔ اور ان کے نزدیک پھیلے ہوئے مسلمات ہو جاتے ہیں پھر کبھی اس مقام سے ایک نفس ملتا ہے اور ہم وہاں سے ان اعتقادات کو خواب میں یا صورتوں اور شکلوں کے فیضان سے اخذ کرتے ہیں اور اس کی حقیقت کا یقین کرتا ہے۔ اور حق بات یہ ہے کہ اس مقام پر حق اور باطل ہوتا ہے اور اس مقام پر کبھی وہ شکل پیدا ہوتی ہے جس کے وجود پر

بعض اسباب پختگی کے ساتھ قائم ہوتے ہیں۔ پھر اس کو بعض دوسرے امور عارض ہوتے ہیں پھر وہ خارج میں نہیں پایا جاتا۔ اور اسی مقام سے شیفتہ ہونے والا ابتدا میں اللہ کا شیفتہ ہوتا ہے۔ اور اسی مقام سے بعض اہل اللہ کسی چیز کے بارے میں اشارہ کرتے ہیں لیکن وہ خارج میں نہیں ہوتی۔ اور محقق کے نزدیک اس مقام پر اعتماد نہیں ہوتا۔ البتہ حظیرۃ القدس پر اور جو کچھ وہاں منعقد ہوتا ہے اس پر اعتماد ہوتا ہے۔ چنانچہ تجلی اعظم کے لئے یہ تین برزات (ظہور) کلیہ ہوتے ہیں اور ہر برزہ (ظہور) میں ایک حکم ہوتا ہے جو دوسرے برزہ میں نہیں پایا جاتا۔ چنانچہ اگر تمہیں برزۂ اولی کا کشف ہوتا ہے تو تم کلیہ ازلیہ کی توجہ سے مشابہ ارادہ دیکھو گے اور نور روشن دیکھو گے۔ اور تم سمندر میں غرق اس شخص کی طرح ہو جاؤ گے جو نہ اپنے نفس کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور نہ اس سمندر کی طرف جس میں وہ غرق ہوتا ہے۔ اور اگر تمہیں برزۂ ثانیہ کا کشف ہوتا ہے تو اس ارادہ کو دیکھو گے جو قصد متجدد کے مشابہ ہوتا ہے اور مصلحت کلیہ کو دیکھو گے جو وہاں خفیہ طور پر نکلتی ہے، اس سے سمجھا بھی نہیں جا سکتا۔ اور وہاں حوادث کلیہ کے لئے قضا، مخاصمت، ایجاب تشریع اور انبیا و رسولوں کے لئے بعثت دیکھو گے اور ایسا مقام دیکھو گے کہ اس کے عجائب تم پر غالب آ جائیں گے۔ اور اگر تم پر برزۂ ثالثہ کا کشف ہوتا ہے تو صورت الٰہیہ کو جو تمام کمالات کی جامع ہے خاموش اور بے حرکت دیکھو گے۔ اور اس کے اردگرد ایسے نفوس کو دیکھو گے جو بے حرکت حیران ہوں گے۔ تمہیں کسی بات کا جواب نہیں دیں گے۔ وہ کاغذ پر نقش تصویروں کی طرح ہوں گے اور یہ ساری باتیں برزات کلیہ کی ہیں۔ جب کہ برزات جزئیہ میں وہاں سب سے بڑی چیز وہ نقوش ہیں جو نفوس انسانیہ میں پوشیدہ ہوتے ہیں اور وہ یہ کہ نفس کلیہ جب نفس جزئیہ ہو جاتا ہے تو وہ صورت عالم میں اتر جاتا ہے پھر ضروری ہو جاتا ہے کہ عالم میں تمام نشأت کلیہ نفوس جزئیہ میں ودیعت اور محفوظ کر دیئے جائیں۔ پھر ہر فلک یا سیاروں وغیرہ میں سے کسی کوکب کے مقابلہ میں ایک پوشیدہ تحریر ہوتی ہے اس کے لئے کوئی حکم نفس نطقیہ یا نسمۂ ہوائیہ کی لوح پر پیش کی گئی صورتوں کے ظہور کے بغیر ظاہر نہیں ہوتا اور ان صورتوں کے ظہور کا سبب تدبیر ہے اور وہ یہ کہ تدبیر کا تقاضہ ہوتا ہے کہ کسی بھی نفس کے ساتھ معاملہ صرف ان تحریروں کے مطابق کیا جائے جو اس میں پوشیدہ ہیں اور یہ وہ راز ہے جس کو قدماء نے فلاسفہ سے سمجھا اور اس کا نام بخت رکھا۔ اس نفس میں بسا اوقات ایک خفی تحریر

ہوتی ہے جو اس کے دامن یا بازو میں واقع مریخ کے مقابلہ میں ہوتی ہے۔ تو نفس کے لئے وحشت، انقباض اور تند خلقی پیدا ہوتی ہے جو ان خبیث افعال کا سبب بنتی ہے اور یہ افعال اس پوشیدہ تحریر کی شرح ہو جاتی ہے اور اسی طرح اس نفس میں تحریر اجمالی ہوتی ہے۔ اس نے مریخ کی طرف جو کہ فاسد الطبع ہے، محبت یا عداوت کی نظر سے دیکھا تو تدبیر الٰہی میں اس طرح کے نفس کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ بعض ان لوگوں کو جن کے نفس میں مریخیت خبیثہ ہے، یہ الہام کرے کہ اس کے ساتھ کوئی ایسا معاملہ کرے جس سے اس میں وحشت اور انقباض خاطر پیدا ہو اور وہ وحشت اجمالی تحریر کے لئے بنیاد ہو جائے۔

اب جب تم نے اس کو سمجھ لیا تو یہ بھی جان لو کہ سب سے خوش نصیب نفوس وہ ہیں جن کو نفس کلیہ اپنے بہترین احوال میں پوشیدہ کواکب سعیدہ سے برکات کے پھیلاؤ کے وقت ہوتا ہے، خاص طور سے ان احوال میں جو ان میں لاہوت کی طرف سعادت روحانیہ کی طرح جو زہرہ میں پوشیدہ ہے، رغبت رکھتے ہیں۔ جب کہ وہ اپنے شرف میں اترتا ہے۔ خاص طور سے جب عالم برکات فلکیہ اور ملکیہ سے بھر جاتا ہے اور ان کے ضمن میں اس طرح سیر لاہوتی سے بھر جاتا ہے جیسے سمندر کی طرف سے ہوا آتی ہے تو اس کے جوہر میں پانی کے چھوٹے چھوٹے اجزا شامل ہوتے ہیں۔ ایسے وقت میں کہا جاتا ہے کہ پانی ہوا کے ساتھ نازل ہوتا ہے۔ اور اس طرح کہا جاتا ہے کہ لاہوت فلاں ساعت میں فلاں کوکب سے نازل ہونے والی برکت کے ضمن میں نازل ہوتا ہے پھر جب وہ ساعت جس میں نفس کلیہ، نفس جزئیہ کے طور پر اترتا ہے ساعت حمیدہ ہوتی ہے جس میں لاہوت کی برکات پھیلتی ہیں اور اس حیثیت میں ہوتی ہیں کہ شرع میں کہا جاتا ہے کہ اللہ سماء دنیا اور زمین کی طرف نزول فرماتا ہے تو اللہ کی حکمت اور اس کی تدبیر میں واجب ہوتا ہے کہ اس نفس میں پوشیدہ تحریر تمام یا بعض برزات کلیہ کے مقابلہ میں بجلی کی طرح مستقل بنفسہ روشن ہو۔ پھر اللہ کی حکمت اور تدبیر میں ضروری ہوا کہ ایک وقت میں اس نفس نطقیہ یا نسمۂ ہوائیہ میں اس صورت عرضیہ کا فیضان ہو جو اس اجمالی تحریر کی تشریح کر دے۔ اور وہ اپنی اصل کے مطابق ہو جائے۔ پھر رقم اجمالی کے لئے متحقق ہو جائے اور اس طرح نازل ہو جائے جس طرح ملکۂ کتابت اس صفت کی طرف اس وقت نازل ہوتا ہے جب کاتب بالفعل لکھتا ہے۔ پھر اللہ کی حکمت اور تدبیر میں یہ ضروری ہوتا ہے

کہ اس صورت عرضیہ سے اس کے مناسب علوم اور احوال پیدا ہوں اور جو شخص اس کی استعداد رکھتا ہو، اس کے قلب میں اس کے لئے اس صورت عرضیہ کی شعاعوں کے عکس ظاہر ہوں۔ پھر جب یہ نفس ایسا ہو کہ اس کے لئے شرافت اور قدر و منزلت کا فیصلہ ہوا اور یہ کہ وہ علم میں صاحب مذہب یا صاحب ملت ہو اللہ کی حکمت اور اس کی تدبیر میں ضروری قرار پایا کہ اس نفس پر اور اس کے علوم و احوال پر اس کے بندوں کی جماعتیں قرناً بعد قرن جمع ہوں جو اس کے مذہب اور ملت کی مدد کریں اور اس کے امر کو شائع کریں اور اس کے علم کی تشریح کریں پھر یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے یہاں تک کہ دورہ پورا ہو جاتا ہے اور دوسرا دورہ شروع ہو جاتا ہے۔ پھر یہ سب کچھ پوشیدہ تحریر کی شکل اختیار کرتا ہے اور اس کے علوم، احوال، شعاعیں اور ان شعاعوں کی تفسیر عالم مثال میں دوبارہ شارحین کی استعداد کے مطابق ہو جاتے ہیں اور اسی لئے میں نے ان کا نام فلک رکھا جب کہا

ارى كل تدوير يثور كانه
سماء من الارشاد للخلق شامل

''میں دیکھتا ہوں کہ ہر دور اس طرح جوش مارتا ہے گویا کہ ارشاد سے آسمان ہے جو خلق کے لئے شامل ہے۔'' یہی برزات جزئیہ ہیں۔

اور جان لو کہ پوشیدہ تحریروں کی بھی جو برزات کلیہ کی شارح ہیں، تین قسمیں ہیں۔ لیکن جب ہم اجمال کو ترجیح دیتے ہیں تو ہم ان کا ایک ہی نام رکھتے ہیں اور وہ حجر بحت ہے۔ اور جب ہم تفصیل کو ترجیح دیتے ہیں تو ہر تحریر کا حکم علیحدہ بیان کرتے ہیں تو پہلی تحریر یزدان کے مقابلہ میں ہے کہ جب عارف اس میں مستغرق ہوتا ہے تو اس پر کشف ہوتا ہے کہ دورہ لامتناہی ہیں۔ اور جس پر عام لوگ شیفتہ ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ نبیؐ نے معراج کی رات میں اونٹوں کی ایک قطار دیکھی، اس کا اول و آخر ہی معلوم نہیں ہوتا تھا ہر اونٹ پر بیشمار انڈے تھے ہر انڈے میں بہت بڑا عالم تھا۔ ان میں سے ہر ایک، ایک رمز ہے جن کی بعض عارفین نے وضاحت کی اور کامل کے لئے ان کی مثالیں دیں۔ جب ان پر یہ بات کھلی کہ دورات غیر متناہی ہیں۔ اگرچہ اس حدیث کو محدثین کے مطابق نبی تک مرفوع قرار دینا صحیح نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔ اور دورات کے علم کے استقصا کی امید ان نفوس کے لئے کی جا سکتی ہے

جو اپنے ہیکلوں میں محصور ہیں۔ اس لئے کہ یقینی مقدار و تعداد کی نہ گنتی کی جاسکتی ہے، نہ احصا کیا جاسکتا ہے۔

اور ہم تمہیں ایک نکتہ پر متنبہ کرنا چاہتے ہیں، وہ یہ کہ دورات جزئیہ میں کبھی کواکب کی طرف منسوب امور کے حال کا عکس پایا جاتا ہے۔ مثلاً مریخ کی طرف منسوب سورج کی طرف منسوب ہوجاتا ہے اور سورج کی طرف منسوب مریخ کی طرف منسوب ہوجاتا ہے۔ ایسی صورت میں قیاس گڑبڑ ہوجاتا ہے اور علم نجوم باطل ہوجاتا ہے۔ پھر اللہ اپنے کسی ایسے بندے کو پیدا کرتا ہے جس میں کواکب کی قوتیں اس طرح ودیعت کرتا ہے جس طرح ہم نے بیان کیا ہے۔ پھر ان میں علم نجوم کو دوسری طرح نکالتا ہے۔ جو ان کو دوسرے طریقہ سے بیان کرتے ہیں۔ اور اگر تم قول کو قبول کرنے میں ایک آدمی کو آگے بڑھاتے اور دوسرے کو پیچھے ہٹاتے ہو اور کہتے ہو کہ احوال کیسے بدل جاتے ہیں؟ تو جان لو کہ کواکب کی طرف منسوب امور ان کے بروج کے اختلاف سے مختلف ہوجاتے ہیں۔ مثلاً کبھی مریخ کی طرف منسوب اور اس کے مقابلہ میں اہل کشف کے قلوب میں پیدا ہونے والی تصویر سرخ رنگ کے آدمی کی ہوتی ہے جس کا شباب پھوٹا پڑتا ہے۔ سخت گرفت اور شدت والا ہوتا ہے۔ اور کبھی ایسی عورت کی تصویر ہوتی ہے جس کا رنگ سرخ، آنکھیں نیلی، قد طویل ہے اور جو زبان دراز اور بدگو بیہودہ کلام کرنے والی ہے اور مرد کی یہ صورت اس کے اس برج میں ہونے کی قید کے ساتھ ہے اور وہ صورت اس کے اس برج میں ہونے کے ساتھ ہے۔ اسی طرح ان کواکب کے لئے سیر خفی ہے کہ محاسبوں کے لئے اس کو دائرہ ضبط میں لانا ممکن نہیں ہوتا۔ وہ کواکب کے احوال کے اختلاف اور اس کے منسوبات کے انقلاب کو اس طرح مستوجب ہوتا ہے کہ ذہین و دانشور کے لئے بھی اس کا سمجھنا دشوار ہوتا ہے اور بشر کو سب کا احاطہ کرنے والا علم اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتا جب تک وہ ان متغیر ہونے والے جسموں کے اندر ہے۔ ہاں ان کو اس وقت علم خاص حاصل ہوتا ہے جب ان میں سے کسی نوع کی تدبیر کا تقاضہ ہوتا ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ کی سنت جاری ہے کہ ہر دور میں ایسی شریعت نازل کرتا ہے جو اس دور کے لئے مناسب ہوتی ہے چنانچہ جس نے امتوں کی جماعتوں میں سے نسخ کا انکار کیا اس نے طریق حق میں غلطی کی اور راہ راست سے دور ہوگیا۔ پھر جب ان دورات جزئیہ کا یہ حال ہے تو دورات کلیہ کے

بارے میں تمہارا کیا گمان ہے؟

اور جب عارف اس تحریر میں مستغرق ہوتا ہے جو لاہوت کے مقابلہ میں ہوتی ہے تو وہ اپنے نفس میں قضا، ایجاب، ترحیم اور ملاء اعلیٰ کے لئے مقالات پاتا ہے۔ پھر کبھی خواب میں ایسی چیزوں کو دیکھتا ہے جو اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ قضا ایسی اور ایسی ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس مسئلہ میں ایسا اور ایسا حکم فرمایا ہے۔ اور اس وقت ملاء اعلیٰ میں ایسی اور ایسی بحث چل رہی ہے۔ اور جب عارف نبی ہوتا ہے تو کبھی اس کے پاس فرشتہ آتا ہے اور اللہ کی طرف سے اسے خبر دیتا ہے۔ اور کبھی اس کو اجتہاد، ایک قسم کی فکر، مقدمات کی ترتیب، تجسس و تحقیق اور کلیات سے جزئیات کی طرف اور جزئیات سے کلیات کی طرف نجات ہوتی ہے۔ تو یہ اس کے سینہ میں علم طویل کا سبب بنتا ہے اور یہ سب صورت عرضی ہیں جو اس پوشیدہ تحریر کی حکایت بیان کرتی ہیں جو لاہوت کے مقابلہ میں ہوتی ہے اور جب عارف اس پوشیدہ تحریر میں مستغرق ہوتا ہے جو برزہ مثالیہ کے مقابلہ میں ہوتی ہے تو اس کے راز اور روح میں تعلق اس کی عقل اور قلب میں اعتقاد دائم، التفات، تصور اور یادداشت پیدا ہوتے ہیں اور اگر وہ اس کی پوری عمر بھی باقی رہتا ہے تو بھی اس کو کوئی جواب نہیں ملتا۔

اور یہ شخص کبھی دعا کرتا ہے تو وہ قبول کی جاتی ہے، اس کو جواب ملتا ہے اور کبھی اس کو کسی حادثہ کے پیش آنے سے پہلے ہی پتہ چل جاتا ہے۔ پھر جیسا اس کو معلوم ہوا ویسا ہی ہوتا ہے اور کبھی دلوں کا حال اسے معلوم ہو جاتا ہے تو وہ دلوں کی باتیں بتا دیتا ہے۔ یہ سر تکوینی ہیں جو اللہ کی تدبیر سے پیدا ہوتے ہیں کسی شے میں ملاء اعلیٰ کی توجہ سے نہیں ہوتے۔ اور اللہ نے کفار کو الزامی جواب دیا **فمن یھدی الی الحق احق ان یتبع ام من لا یھدی الا ان یھدی** ''اتباع کا زیادہ حق دار وہ شخص ہے جسے حق کی طرف رہنمائی کی گئی یا وہ جسے کوئی ہدایت نہیں مگر یہ کہ ہدایت دے دی جائے۔'' (یعنی ہدایت کا خود محتاج ہے۔) (یونس ۳۵) ''اس کا حاصل یہ ہے کہ بشر کی توجہ نہ اس وقت تک سیدھی ہوتی ہے اور نہ ہی اس کو نجات کا راستہ ملتا ہے جب تک کہ اس حقیقت کلیہ کی طرف توجہ نہیں ہوتی جو بندوں کو ہدایت دیتی ہے اور ان کے سامنے شریعت عامہ پیش کرتی ہے اور اسی کو لاہوت کا نام دیا جاتا ہے جہاں تک عالم مثال میں نقشہ پیش آنے کا سوال ہے تو وہ شریعت حقہ عامہ کی طرف رہنمائی کرنے والا نہیں ہوتا۔

اور جب نبی کو مبعوث کیا گیا تو آپ کے وجود کے وقت عالم مثال سے قسط عظیم زمین کی طرف منتقل کی گئی۔ برزہ مثالیہ ظاہر ہوئی اور برزہ لاہوتیہ ایک طرح سے پوشیدہ ہوگئی اور اس کی وجہ سے وحی کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ اور لوگ عام حالت میں آ گئے۔ شریعت کے صرف ظواہر کو سمجھتے ہیں۔ پھر وہ علوم نازل ہوئے جن کی شان صرف عقل ہے نہ کہ حجر بحت۔ تب انہوں نے علم نحو، لغت، عربی زبان اور اس کے اشعار میں کلام اور بحثیں کیں اور علوم حدیث، تفسیر، فقہ اور کلام کو مدون کیا اور ان میں تفصیل سے بحثیں کیں۔ اور افکار و خیالات کو شامل کیا اور آراظاہر کیں۔ حتی کہ وہ اصل وجود کی طرف خارج ہوا جو کہ حساب نہیں تھا۔ اور اس زمانہ میں توجہ مثال میں ظاہر ہونے والی حقیقت کی طرف ظاہر ہوگی تو اس زمانہ میں کسی نے بھی سر لاہوت و یزدان کے بارے میں کلام نہیں کیا۔ پھر وہ زمانہ آیا جس میں روشنیوں کے عکس ان کے مغرب کی طرف ظاہر ہوئے اور زمین اپنے رب کے نور سے روشن ہوگئی **ذلک تقدیر العزیز العلیم**۔ ”یہ غالب اور علم والے کا فیصلہ ہے۔“

اور برزات جزئیہ کی ایک دوسری قسم ہے۔ وہ یہ کہ افلاک ایک قسم کی توجہ سے ایک بقعۂ زمین کی طرف متوجہ ہوئے یا ملاء اعلیٰ یا برزۂ مثالیہ متوجہ ہوئے تو وہاں توجہ کے سبب سے صورت عرضیہ متحقق ہوئی جو برزات کلیہ کی حکایت بیان کرتی ہے جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ ہوا جب آپ نے پہاڑ پر آگ دیکھی یا جب عرض کیا رب ارنی انظر الیک ”اے میرے رب! مجھے تو اپنے آپ کو دکھا دے کہ میں تجھے دیکھ لوں۔“ اس کی تحقیق یہ ہے کہ مقام بلند سے توجہ سلسلۂ تدبیر کو حرکت دے دیتی ہے۔ اس وقت قضا عناصر لطیفہ کے آمیزہ کو جمع کرتی ہے جو کہ وہاں کے تمام موجودات سے اپنی خوبی کے لحاظ سے ممتاز ہوتے ہیں۔ پھر ان پر ان روشنیوں کا فیضان ہوتا ہے جو کہ دیکھنے والے کی حیرت اور مدہوشی کا سبب ہوتی ہے۔ پھر وجود عرضی اور وجود ذہنی کے درمیان واقع ایک وجود سے لباس پہناتا ہے۔ تب اس لباس سے وہ حکایت بیان کرتا ہے جو جبروت میں ہوتی ہے۔ اور مجھ سے ایک صاحب تصوف نے اپنے شیخ کے حوالہ سے بیان کیا کہ انہوں نے کہا کہ میں نے حق کو ایک شخص کی جہت سے نور کی شعاع میں دیکھا۔ میرے نزدیک اس قصہ کی تاویل یہ ہے کہ جو خوبی اسباب ارض سے حاصل ہوتی ہے، اس نے اس وجود سے لباس لطیف نہیں لیا جو کہ عرض اور وجود ذہنی کے درمیان تھا اور اس

لباس سے تجلی الٰہی ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ کی تخلیق میں بے شمار اسرار ہیں۔

قولہ:- ان برزات میں کیا اسرار ہیں اور وہاں تجدد کہاں سے آیا؟

اقول:- اس مسئلہ کی حقیقت انتہائی گہرائی میں ہے۔ اس موقع پر زیادہ سے زیادہ جو کچھ کہا جاسکتا ہے وہ یہ ہے کہ برزات کلیہ اپنے وجود کے پردہ میں مصلحت کلیہ ہے پھر مصلحت کلیہ وہ ہے جو اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ تجلی اعظم فلاں فلاں زمانہ میں ظاہر ہو۔ اسی طرح "برزہ اور فلاں فلاں زمانہ میں" کا معاملہ ہے۔ اور اس کی مثال اس درخت کی سی ہے جس میں یہ امر ودیعت کیا گیا ہے کہ درخت جب فلاں وفلاں زمانہ میں ہوگا تو وہ بڑھے گا اور نہ اس میں پتے آئیں گے اور نہ ہی پھل۔ اور جب فلاں حد کو پہنچ جائے گا تو اس میں پتے بھی لگیں گے اور پھل بھی آئیں گے اور اسی طرح ہر طبیعت جزئیہ کا حکم ہے جس کی مدت مقرر ہے اور یہ تمام طبیعتیں طبیعت کلیہ میں مدغم ہیں کہ وہ اپنے ظہور کے ادوار کے لئے مقتضی ہیں۔ یہ راز زیادہ بہتر اور قابل توجہ ہے۔

برزات جزئیہ کے لئے مصلحت کلیہ میں شامل ہونے کے بعد دوسرے اسباب ہوتے ہیں وہ افلاک میں قرانات کلیہ ہیں۔ اور افلاک میں سر عجیب ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو طبائع بسیط سے پیدا کیا ہے۔ ان کی بساطت میں مختلف قسم کی طبیعتیں شامل ہوتی ہیں پھر ان کو گھمایا تاکہ گھمانے سے بہت سی مختلف شکلیں اور جگہیں ظاہر ہوجائیں۔ پھر ان کا سایہ عالم ارض پر پڑے اور زمین میں بہت سارے اور مختلف قسم کے حوادث پیش آئیں اور اللہ کی حکمت اس کی مخلوق میں مکمل ہوجائے اور جس طرح زمین میں مختلف قسم کی شکلیں پیدا ہوتی ہیں، ملکوت میں بھی مختلف قسم کے احوال ظاہر ہوتے ہیں اور وہ یہ کہ ان کواکب میں ان کے احجار بحتہ کے لئے خادم روحانیت ہے۔ تو مصلحت کلیہ احجار بحتہ کے واسطہ سے ان کی روحانیت کی طرف نازل ہوتی ہے، تو عالم مثال میں حوادث اور تجلیات شکل اختیار کرلیتی ہیں۔

اور اسی طرح ان کی روحانیت کی جانب سے احجار بحتہ کی طرف ان احجار کے حضور کی جہت سے محل ارفع میں احوال ترقی کرتے ہیں اور ان کا ربط اس روحانیت کے ربط کی طرح ہے۔ اور اگر یہ ربط نہ ہوتا تو وجوب کی طرف امکان کے جمع سے مقام متحقق نہ ہوتا۔ چنانچہ بسا اوقات ملکوت میں حادث بعض ان امور کا شارح ہوتا ہے جو محل ارفع میں ہوتے ہیں۔ اور

کبھی ملکوت میں حادث ان امور کے ظہور کا متقاضی ہوتی ہے جو محل ارفع میں بصورت خاصہ ہوتا ہے اور دوسری صورت کو چھپانے کا متقاضی ہوتا ہے۔ اس صورت میں محل ارفع میں تجدد اور تلون آتا ہے۔ و ذلک تقدیر العزیز العلیم.

۶۹- تفہیم:

ملاء اعلی کی حقیقت۔ حظیرۃ القدس

الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی. امابعد. پوشیدہ علم جس کے ذریعہ حق تبارک وتعالی اپنے بندوں میں سے چنے ہوئے برگزیدہ لوگوں کو مخصوص کرتا ہے، ملاء اعلی کے مقالات کا علم ہے۔ اور وہ یہ کہ وہ تجلی اعظم اور ملاء اعلی کے اردگرد کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو ان کے نفوس کی لوح میں ان اعلی ہستیوں کے بعض علوم نقش ہو جاتے ہیں جیسا کہ موم میں مہر کے نشانات نقش ہو جاتے ہیں تو ان کے علوم ان کے علوم ہو جاتے ہیں۔ پھر اس طرح ہو جاتے ہیں گویا وہ ان کو بذات خود جانتے ہیں پھر ان علوم کے مطابق چلتے ہیں اور ملاء اعلی کے نزدیک ان کا جو حسن ہے اس کو ظاہر کرتے ہیں۔ اور ان کے نزدیک اس کا جو قبح ظاہر ہوا ہے اس کو قبیح تصور کرتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی عظیم ترین نعمتوں میں سے یہ ہے کہ اس نے ان کے کچھ مقالات کا دروازہ مجھ پر کھول دیا۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ان میں سے جن کا ذکر آسان ہے وہ ان اوراق میں تمہارے لئے بیان کردوں۔ اے برادر صادق طالب! اللہ خیر میں تمہاری رغبت بڑھائے، ان میں سے کچھ کا بیان یہاں ایک مقدمہ کے ساتھ شروع کرتے ہیں۔

یہ جان لو کہ ملاء اعلی ایک جماعت کے اجار بحتہ تجلی اعظم سے بمنزلہ یاقوت کے شعاعوں کی گرد کے ہوگئے اور عالم سے تجلی اعظم بمنزلہ انسان کے قلب کے ہوگئے۔ چنانچہ اس میں مصلحت کلیہ کے مطابق اجمالی تحریریں ظاہر ہوتی ہیں جو عالم میں خیر کے نظام کے لئے اللہ تعالیٰ کی عنایت کی حکایت ہیں۔ ان میں سے کچھ حوادث ایسے ہیں کہ ان کے وجود کے اسباب ارادہ کی پختگی کے ساتھ جمے رہتے ہیں۔ اور ان میں سے کچھ بنی آدم کے افعال، اقوال، عقائد اور رسوم کے لئے مستحسن اور قابل نفرت ہیں۔ پھر ان کا دائرہ ملاء اعلی میں وسیع ہوا اور خفیہ تحریریں حظیرۃ القدس میں ہیکل کی شکل میں ہوگئیں۔ اور یہ وہ مقام ہے جس میں ملاء

اعلیٰ کی ہمتیں عالم مثال کی سطح میں متعین ہوتی ہیں۔ پھر وہ ہیکل مثالیہ نفوس بشریہ میں نقش ہوتی ہیں۔ اس کے بعد ان کے بدن جدا ہو جاتے ہیں۔ درآں حالیکہ وہ تجلی اعظم سے فیضان کرنے والے قوی الٰہیہ کے لئے جوارح ہیں۔ پھر وہاں تحقق شہادی و حضوری متحقق ہوتا ہے۔

اور جان لو کہ چونکہ نوع انسان کا نظام اعظم مصالح سے ہے۔ اس لئے واجب قرار پایا کہ ان اجمالی تحریروں سے ایک قسط معتدبہ (قابل لحاظ قسط) ہو، تجلی اعظم کے رنگ کے لئے ان کی مطابقت سے استحسان ہو۔ اور اس وقت اس کی شان، اس کے طور طریقے موجود ہوں جن کو محققین نے دورہ حاضرہ میں وضع کیا ہے۔ اسی طرح اس طریق مستقیم سے ان کے انحراف، اس سے ان کے بعد کے بقدر قباحت کا بیان ہو۔ اس مقام پر ایک علم ہوتا ہے جو تمام افراد بشر سے اجمالی طور پر متعلق ہوتا ہے جیسا کہ ہم میں سے ہر ایک اپنے نفس کو جانتا ہے تو وہ اپنے نفس سے متعلق اپنے نفس کے ضمن میں اپنے جوارح اور اپنے قول کو اجمالی طور پر علم حضوری کی حیثیت سے جانتا ہے۔ تو جب بھی ان میں نظام خیر کے لئے موافقت پیدا ہوتی ہے تو رضا ایک شکل اختیار کر لیتی ہے اور جب بھی ان میں منافرت پیدا ہوتی ہے تو غضب و ناراضگی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ جیسا کہ ہم میں سے کسی کی جلد کا کوئی حصہ گرم چیز پر پڑتا ہے تو اس کی حرارت کو محسوس کرتا ہے اور جلد کو اس سے تکلیف ہوتی ہے اور اس کو روکتی ہے۔ پھر وہاں پوشیدہ تحریریں ظاہر ہوتی ہیں۔ پھر ملاء اعلیٰ میں توسع پیدا ہوتا ہے تو چھوٹی تحریر بڑی ہو جاتی ہے یا اس کی طرف اجمالی طور پر متوجہ ہونے والے معنی صورت ذہنی ہو جاتے ہیں جو آنکھوں کے سامنے موجود ہوتے ہیں۔ پھر ان نفوس پر جن کا معاملہ ہم نے بیان کیا ملاء اعلیٰ کے علوم کا فیضان ہوتا ہے۔ تو وہ نفوس ان کا احاطہ کر لیتے ہیں، ان کو جمع کر لیتے ہیں اور اپنے لئے خاص کر لیتے ہیں۔ پھر ان کے نفوس سے دو شریف علم پیدا ہوتے ہیں۔

ان میں سے ایک علم الاحکام ہے کہ فلاں شے واجب ہے، اور فلاں شے حرام ہے۔ اور دوسرا علم گمراہ لوگوں سے مخاصمہ ہے اور وہ یہ ہے کہ ان کی جو بہت سی فاسد عادتیں، باطل اقوال، گھٹیا شبہات ظاہر ہوتے ہیں اور علوم حقہ سے ان کی منافرت ظاہر ہوتی ہے اور غیظ و غضب واقع ہوتا ہے، تو ان سادات کرام کے دلوں میں ان کے لئے اقوال اور جواب آتے ہیں اور یہ دونوں علم قرآن کے عظیم ترین علوم میں سے ہیں اور ہم ان اوراق میں علم مخاصمہ کا

ایک حصہ بیان کریں گے۔

اور یہ بھی جان لو کہ انسان اکبر سے تجلی اعظم انسان اصغر سے بمنزلہ قلب کے ہے، تو جس طرح قلب کے لئے حسن کی طرف، دوسری شکل میں ہر عضو کی طرف میلان ہوتا ہے۔ اسی طرح تجلی اعظم کے لئے تمام انواع کے افراد کی طرف اور دوسری تدبیر سے ہر نوع کے افراد کی طرف میلان ہوتا ہے۔ اور جو تدبیر افراد انسان کی نسبت سے تجلی اعظم سے ظاہر ہوتی ہے، وہ متعدد علوم کے افاضہ سے تمام تدابیر سے ممتاز ہوتی ہے۔

ان میں سے ایک باری تعالیٰ جل مجدہ کی آیات پر اطلاع کے ضمن میں اس کی معرفت اور اس کے لئے بلندی وعظمت کا اقرار ہے۔ اور ان میں سے حق اپنے بندوں کے افعال پر ان سے درگزر کرنے کی معرفت ہے۔ اور ان کی معرفت جو ان کو موت کے وقت اور اس کے بعد عذاب وثواب لاحق ہوتے ہیں، اور حق کی طرف تقرب کے وجوہ کی معرفت، اور وہ نیکی اور گناہ کا باب ہے۔ اور ان میں سے گھر اور شہر و ملک کے نظم میں عدل کی معرفت ہے۔ اور گمراہ فرقوں کے ساتھ مخاصمت و جدال کی معرفت ہے۔ یہ ایسے علوم ہیں کہ تجلی اعظم افراد انسان پر برابر ان کا فیضان کرتی رہتی ہے۔ اور اسی لئے قوم ان کو حاصل کرتی رہتی ہے حتی کہ یہ علم ان کے اندر کسی نہ کسی طرح ظاہر ہو جاتا ہے خواہ وہ بالکل درست ہو یا اس میں کچھ غلطیاں بھی شامل ہوں۔

اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ جب کوئی نیا دور آتا ہے، وہ ان علوم کو ان لوگوں کے دلوں میں الہام کر دیتا ہے۔ جن کی شان کو اس دورہ میں نمایاں کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ معاملہ اسی طرح چلتا رہا حتی کہ دورہ عظیمہ آ گیا اور اللہ نے سیدنا محمدؐ کو وجود میں لانے اور آپ کی شان نمایاں کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور آپ کی طرف ان علوم کو اس طرح کلام بلیغ میں وحی کیا کہ باطل نہ آپ کے سامنے سے آتا ہے نہ پیچھے سے۔ اور ان علوم کو آپ کی طرف خالص کر کے پیش کیا کہ اس میں خطا، غلطی شامل نہیں ہوتی تا کہ آسمان سے زمین تک نازل ہونے والی طویل رسی ہو جائے جس نے اس کو پکڑ لیا وہ اوپر چڑھ گیا اور نجات پا گیا۔ اور جس نے اس سے اعراض کیا وہ پستی میں گر گیا اور گمراہ ہو گیا۔

اور یہ بھی جان لو کہ نبیؐ میں دو فضیلتیں جمع ہیں، ایک نبوت اور دوسری آپ کے سبب

سے قریش کی سعادت۔ نبوت تو تمام اصناف کے لئے عام ہے۔ ان امور میں گورا اور کالا سب برابر ہیں جن پر اس فیض کی طرف رجوع کیا جاتا ہے جو باب نبوت سے ہے۔ اور اسی لئے مصلحت کلیہ نے جب ترکوں کی سلطنت کے عموم کا فیصلہ کیا تو ان کو دین اسلام کے قبول کرنے کے بارے میں الہام کیا۔ اور قریش کی سعادت کا سبب ایک طویل زمانہ تک ان کی خلافت کا ہونا ہے۔ اور جس نے یہ یقین کیا کہ مثلاً ہندوؤں کا اقلیم ہندوستان پر عام غلبہ مستقل ہو گیا تو اللہ کی حکمت میں ضروری ہوا کہ ان کے سرداروں کو دین اسلام قبول کرنے کے بارے میں الہام کر دیا۔ جیسا کہ ترکوں کو الہام کیا تھا۔ اور یہ آپ کی نبوت کے عموم اور آپ کے صاحب ملت ہونے کا شعبہ ہے اور نبیؐ کے لئے بہت سے مراحل ہیں، آپ کبھی اپنی نبوت کی جہت سے کلام کرتے ہیں اور کبھی اس جہت سے کہ وہ قریش کی سعادت کا منشا ہوتا ہے۔

اور جب ہم نے اس امر کا ذکر کر دیا جو اس بات کا مستحق ہے کہ ملاء اعلیٰ سے مستفاد مقالات پر مقدم ہو تو اب ہم دوسرے امور کا ذکر کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ میں کہتا ہوں کہ میرے دل میں ملاء اعلیٰ کی جانب سے ایک داعیہ پیدا ہوا اور ان کے علوم کے نقش ہونے سے ایک ہیئت حاصل ہوئی۔ واللہ علی مانقول وکیل "ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں اللہ اس پر گواہ ہے۔" اے لوگو! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کے ساتھ ان کو شریک کرتے ہو جن کے حق میں کوئی سلطان، دلیل نہیں ہے۔ ہر شہر والوں نے اپنے احبار و رہبان کو اللہ کو چھوڑ کر اپنا رب قرار دے لیا۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ اللہ تم سے دور ہے اور یہ تم سے قریب ہیں۔ ہرگز نہیں حق تعالیٰ علی اور کبیر ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ تمام کمزوریوں اور برائیوں سے پوری طرح منزہ ہے۔ اپنی مخلوقات سے قریب ہے تو جب بھی کوئی شخص کہتا ہے یا ربی، یا ربی، تو وہ اس کے مقابلہ میں کہتا ہے یا عبدی، یا عبدی۔ یہ اس کا قریب ہونا اس کی قدوسیت کے منافی نہیں ہے۔ اور اس کے ایک کام میں مشغول ہونے سے دوسرے کام میں مشغولیت میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی۔ یا تمہیں ان آثار نے دھوکہ میں ڈال دیا ہے جن کو تم ان کے سامنے تضرع کے بعد دیکھتے ہو۔ جن سے سمجھ لیتے ہو کہ وہ تمہاری فریاد پوری کر دیں گے؟ ہرگز نہیں یہ تضرع جود و سخا کے کسی دروازہ کو کھٹکھٹانا ہے اور ان کی طرف تضرع وہ کھٹکھٹانا نہیں ہوتا۔ بلکہ لوگوں کی ہر جماعت کے مجوس اور ہنود ہوتے ہیں اور ایسی جہت ہوتی ہے جس کی طرف وہ متوجہ ہوتے

ہیں۔اور قبلہ ہوتا ہے جس کے پاس تضرع کرتے ہیں تو ان کے خیال میں ان کا تضرع قبول کر لیا جاتا ہے۔اور حق بات تو یہ ہے کہ تدبیر غیب کی طرف تضرع جودوسخا کے باب کو کھٹکھٹانے کے لئے مفید ہوتا ہے۔تو جس نے حق واجب، دائم جل مجدہ کی طرف تضرع کیا، اس نے صحیح کام کیا اور کامیاب ہوا اور جس نے اس کے غیر احبار ور ہبان کی طرف یا کواکب کی طرف تضرع کیا اس نے غلطی کی اور گمراہ ہوا۔اور اس سے تضرع غیب کی طرف نکل گیا اور اس کی ضروریات کی کامیابی میں فائدہ مند نہ ہوا۔جب کہ ان سے پہلے بھی امتیں گزری ہیں۔

اور ہر امت یا جماعت ان کی طرف تضرع کرتی ہے جن کو تضرع کا مستحق سمجھتی ہے، تو آپ دیکھتے ہیں کہ انہیں تضرع کی طرف کبھی کچھ اور راغب کر دیتا ہے۔اور کبھی انسان صاحب قبر کی طرف تضرع کرتا ہے۔تو اس کا تضرع جودوسخا کے ان دروازوں کو کھٹکھٹاتا ہے جو اسباب کو سبب کی طرف فیضان کے مشابہ ہوتا ہے۔وہ اس لطف کے مشابہ نہیں ہوتا جس کا منبع تجلی اعظم ہوتی ہے۔تو فیضان کرنے والا خاص طور سے مدعو کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔وہ اس امر کی طرف متوجہ ہوتا ہے کہ اس نے غیب کی طرف تضرع کیا ہے اور اس نے جودوسخا کے دروازہ کو کھٹکھٹایا ہے۔اور جو کریم کے دروازہ کو کھٹکھٹاتا ہے، وہ کھول ہی لیتا ہے۔اور نفع وضرر دو امر ہیں۔نظام عالم اس کے مطابق چلتا ہے۔اس میں فاسق وصالح اور شقی وسعید برابر ہیں۔

اور اشراک یا شریک کرنے سے نفی سے مراد یہ ہے کہ انسان کا نفس اپنے ہی جیسے متعین ومتشخص کی طرف توجہ کے ساتھ ملوث نہ ہو۔اور جب بھی مصلحت کلیہ کسی نفع یا ضرر کے حصول کی طرف مائل ہوتی ہے تو اس کے عقیدہ میں مبتلا شخص کے لئے وہ شکل اختیار کر لیتا ہے یا اس کو خواب میں نظر آجاتا ہے کہ فیض پہنچانے والا فلاں ہے۔جب کہ حقیقت میں وہ فلاں اس کے خیال میں فیض کے لئے عنوان ہوتا ہے اور حقیقت میں فیض رساں خود افاضۂ حق ہوتا ہے۔

اور بہت سے انسان ملاء اعلیٰ کے سادات میں سے کسی عظیم القدر عبد کو شعور وغیرہ سے محسوس کر لیتے ہیں اور وہ اس لئے ہوتا ہے کہ ہر انسان کے باطن ایسے مسامات ہوتے ہیں جن کی جہت سے علوم فوقانیہ مترشح ہوتے ہیں جن کی وجہ سے اس کا معاملہ اس کو حیران وششدر کر دیتا ہے تو وہ کہتا ہے **ماھذا بشر اِن ھذا الاملک کریم** ”یہ انسان نہیں ہے یہ تو کوئی معزز فرشتہ ہے“۔حالانکہ درحقیقت وہ ملاء اعلیٰ سے ایک بندہ ہوتا ہے جو مامور ہوتا ہے اور ایسی

استطاعت نہیں رکھتا کہ جس امر کا اس کو حکم دیا گیا ہے اس سے روگردانی کرلے۔ وہ دعا کرتا ہے تو وہ قبول کی جاتی ہے۔ پکارتا ہے تو اس کو جواب دیا جاتا ہے۔ دنیوی نفع وضرر کی طرف التفات کرنا چھوڑ دو۔ البتہ دینی نفع وضرر کا اہتمام کرو۔ اور وہ یہ ہے کہ بندہ کی بصیرت جب عالم میں اس تجلی کی تدبیر کی کوشش کرتی ہے اور زمین میں جو بھی موجود ہیں، سب کو اپنی تدبیر میں شامل کرنا جان جاتا ہے اور اس کے قلب کی ہمت اس کی طرف متوجہ ہوتی ہے تو اس کا نفس ایک طرح سے تجلی سے چپک جاتا ہے۔ تب وہ نجات پاتا ہے اور درجات عالیہ پر فائز ہو جاتا ہے اور جب اس کی بصیرت اپنے ہی جیسے مقہور و مامور بندہ سے چپکتی ہے اور وہ اپنی تدبیر پر عقیدہ کرتا ہے اور ہمت کے ساتھ اس کی طرف توجہ کرتا ہے تو اس کا نفس عالم تقید وخصوص سے چپکتا ہے۔ اور عالم تجرد، اطلاق اور صرافہ (خالص) سے دور ہو جاتا ہے۔ قرآن عظیم نے ان دونوں قسم کے دینی نفع وضرر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بیان کیا ہے اور ان دونوں کی طرف تجلی اعظم سے یہ لطیف وفصیح اشارہ کرتا ہے۔

اور ان میں سے ایک یہ ہے کہ میں اپنے دل میں کہتا ہوں کہ ہمارے زمانہ میں یہ اہل تصوف جو خود گمراہ ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔ میں اللہ کے لئے ان ہی کو گواہ بناتا ہوں کہ وہ اسلام میں ایسا نیا فرقہ ہیں جس کا اصل اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ جیسے کسان غذا کے کام آنے والے نفع بخش دانے بوتا ہے، پھر اس کی سینچائی کرتا ہے۔ تو پانی کی کثرت اور زمین کی نرمی کی وجہ سے سبزہ اور گھاس پھونس اگ آتے ہیں تو کسان کا مقصد ان کو کاٹنے اور تلف کئے بغیر پورا نہیں ہوتا۔ اسی طرح اللہ نے اپنی کھیتی بوئی اور وہ محمدؐ اور آپ کے علوم کے حامل لوگ ہیں۔ پھر اس کی قرآن اور حکمتوں سے سنچائی کی اور وہ زمین اچھی ہوئی تو مطلوبہ کھیتی اگی اور اس کے ساتھ ہی گمراہ فرقہ بھی پیدا ہوا۔ جو فہم وذکا کا حامل ہے۔ اور اس عالم کے معاملات میں ان کے نفوس جو تقاضہ کرتے ہیں بعض ان باتوں کی طرف بھی میلان رکھتے ہیں تو جب علوم کا پانی ان کو ملا، انہوں نے اس سے وہ غذا حاصل کی جو اس میں سب سے اہم تھی جس سے ان کے قلوب میں وہ مذاہب پیدا ہوئے جو اللہ اور رسول کے نزدیک مطلوب تھے اور جن کے بارے میں کتاب وسنت سے استمداد اور ان کے حاملین کی ذہانت وفطانت اور قول وعمل میں ان کے قائم رہنے کی وجہ سے سمجھا جاتا ہے کہ وہ مذہب حق ہیں۔

اسلام میں جو پہلا فرقہ ان لوگوں سے پیدا ہوا جن کے دلوں میں ریاست کا داعیہ پیدا ہوا اوران کے دلوں میں نسب وحسب کی برتری تھی۔ اوران میں بلند ہمتی اور ریاست کی طلب تھی۔ پھر جب انہوں نے دیکھا کہ انبیا ریاست عاملہ، ولالت علی الخیر اور اللہ کی خلافت کے ساتھ آئے ہیں تو انہوں نے گمان کرلیا کہ ساری سعادت انسان کے فاطمی علم ہونے میں ہے پھر وہ تلوار لے کر نکلے تا کہ لوگوں پر غالب آ جائیں اوران کے درمیان سیرت حسنہ کے ساتھ چلیں اور انہیں بھلائی کا حکم دیں اور برائی سے روکیں مگر ان کے اس گمان کے پیچھے ہولناک بلائیں، اختلافات اور فرقہ بندیاں تھیں۔ جب کہ اللہ کے نزدیک مطلوب امر اختلاف اور فرقہ بندی کو ترک کرنا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے دو معنوں کے لئے خلافت کا وعدہ کیا ہے لیکن دوسری کو چھوڑ کر صرف فاطمیوں کو خاص نہیں کیا۔ جیسا کہ فرمایا **وعداللہ الذین امنوا منکم و عملوا الصلحت لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم ولیمکنن لھم دینھم الذی ارتضی لھم ولیبدلنھم من بعد خوفھم امنا** ”اللہ نے وعدہ فرمایا ہے تم میں سے ان لوگوں سے جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ ان کو اسی طرح زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو بنا چکا ہے ان کے لئے ان کے اس دین کو مضبوط بنیادوں پر قائم کردے گا جسے اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں پسند کیا ہے۔ اوران کی (موجودہ) حالت خوف کو امن سے بدل دے گا۔“ (النور ۵۵)

اور دوسرا فرقہ تنگ دست، بدحال، پراگندہ بال میلے کچیلے گندے رہنے والوں کا ہے۔ انہوں نے اللہ کے لئے تجرد اختیار کرلیا۔ تلاش معاش کو ترک کردیا۔ لوگوں سے قطع تعلق کرلیا اور حتی الامکان اقل ترین پر اکتفا کرلیا اور رسول اللہؐ کے ارشاد پر عمل نہیں کیا جس میں آپ نے اپنی امت سے عہد لیا تھا کہ عمل میں اعتدال کی راہ اختیار کریں۔ انہوں نے دوام صوم اور دوام قیام کی راہ اختیار کرلی۔ ان کے اس اجتہاد کے پیچھے تین ظاہری لطائف میں نورانیت آ گئی جب کہ ان میں حق بھی آیا اور باطل بھی۔ حق تو ان کی وہ نورانیت ہے۔ اور باطل بعض وہ امور ہیں جو انہوں نے خلاف سنت اختیار کئے جیسا کہ ہم نے بیان کیا۔ پھر سید الطائفہ جنید بغدادی تشریف لائے۔ آپ نے اس طریقہ کو سنت کے مطابق تیار کیا۔ اس کی تہذیب اور تلخیص کی۔ چنانچہ جنید کا طریقہ پوری طرح خیر ہی خیر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس میں

برکت کی روح پھونک دی اور بیشمار طائفوں (جماعتوں) کو اس پر جمع کر دیا۔ پھر لوگ دوسری رسوم اون کے کپڑے پہننے، لوگوں کے خلاف طنز و تشنیع اعتراضات اور الزام تراشی کرنے اور گانے سننے وغیرہ میں طویل مدت تک مبتلا رہے۔ پھر اللہ نے اس طریقہ کی تجدید شیخ ابوسعید بن ابوالخیر کے ذریعہ اور پھر شیخ ابن عربی کے ذریعہ کی۔ اور شیخ ابن عربی پر علوم و معارف کے اتنے دروازے کھول دئے جن کا کوئی حساب نہیں۔

پھر ایک فرقۂ خبیثہ پیدا ہوا یہ وہ فرقہ ہے جس کا گمان ہے کہ اللہ عین العالم ہے۔ اور عالم عین اللہ ہے اور یہ کہ نہ کوئی حساب ہے نہ عذاب۔ ہمارے نزدیک محقق بات یہ ہے کہ اس کا حکم کہ اللہ تعالیٰ فرد واحد ہے، وہ موجود ہے، راضی بھی ہوتا ہے اور خفا بھی ہوتا ہے۔ معاف بھی کرتا ہے اور مواخذہ بھی کرتا ہے، وہ واجب ہے، انسان کی جبلت اور فطرت تقاضا کرتی ہے تو جس نے اس عقیدہ میں کوئی قصور کیا وہ زندیق کافر ہے۔ اور اگر تم اس مسئلہ میں حق کی تحقیق چاہتے ہو تو سمجھ لو کہ ہم نے جب زمین میں گٹھلی بوئی اور اس کا پانی، ہوا اور زمین نے احاطہ کر لیا تو لازم ہو جاتا ہے کہ وہ گٹھلی ان مذکورہ اشیا سے چھوٹے چھوٹے اجزا کو اپنی طرف جذب کرے، اپنے ساتھ ملائے اور ان کے حجم کو بڑھائے پھر برابر جذب کرتی اور بڑھاتی رہے حتی کہ اس کو اپنی طبیعت کے تقاضہ کے لحاظ سے اس سے زیادہ بڑھانا مناسب نہ رہے۔ پھر طبیعت نے ان مادوں میں تصرف کر کے ان پتوں میں پھر ڈالیوں، ٹہنیوں، پھر بڑے درخت اور پھولوں اور پھلوں میں بدلے، یہاں تک کہ ڈھانچہ کے جدا ہو جانے کا وقت آ جائے۔ تو یہاں لوگ صرف چھوٹے چھوٹے اجزا دیکھتے ہیں جو ان اشیا کے اردگرد ہوتے ہیں۔ لیکن عقل کامل والے جب یہ دیکھتے ہیں کہ یہ گٹھلی کھجور کا درخت بن رہی ہے اور وہ انگور اور دوسرا بیری بن رہی ہے۔ اور ہر نظم کے لئے دوسرے سے مختلف نظم ہے تو وہ محض نفس نباتیہ کے اثبات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں کہ جسم نہیں ہے لیکن جسم کی اس تربیت کے سایہ میں ہوتا ہے۔ اور فطرت سلیمہ اس نفس کا ادراک بغیر برہانی دلیل کے کسی سابق کسب کے بغیر محض عطیۂ اور ہبۂ الٰہی سے کر لیتی ہے۔ اب صورت مجردہ کو یاد رکھو اور اس کو اپنے پیش نظر رکھو۔ پھر ان سے نفوس حیوانیہ، نفوس انسانیہ، نفوس ملکیہ اور نفوس فلکیہ کی طرف منتقل ہو جاؤ۔ اور نفوس اور ان کے اختلاف مراتب اور ایک دوسرے پر مبنی ہونے کو اپنے پیش نظر رکھو اور وہ سب مجرد

ہیں۔جسموں کے ساتھ تعلق تدبیر کے طور پر متعلق ہیں۔پھران سے اس نفس کی طرف منتقل ہو جوام النفوس ہے۔ ہر نفس اسی سے ظاہر ہوتا ہے۔اسی کے ساتھ قائم ہوتا ہے جیسا کہ حروف کے لئے سیاہ خط اور تمام مراتب اعداد کے لئے واحد ہوتا ہے۔

پھر نفس میں ایک ترتیب ہوتی ہے۔تو اس میں جو پہلی چیز متعین ہوئی وہ ذات الٰہیہ کی صورت ہے جو مبدأ المبادی ہے اور وہ صورت ''سفید نور'' ہے جو اپنے سوا سب پر غالب ہے۔ نبیؐ کے ارشاد میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، جب سوال کیا گیا ہمارا رب اپنی مخلوق کو پیدا کرنے سے قبل کہاں تھا، تو فرمایا عماء میں تھا کہ اس کے اوپر بھی ہوا تھی اور اس کے نیچے بھی۔ اور اسی کی طرف اللہ تبارک وتعالیٰ کے اس ارشاد میں اشارہ کیا گیا ہے۔ الله نور السموات والارض. مثل نوره الاية ''اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے (کائنات میں) اس کے نور کی مثال ایسی ہے............(النور ۳۵) یہاں مثل نوره کا مطلب مومن کے قلب میں اس کے نور کی مثال ہے۔جیسا کہ ابن عباس نے پڑھا ہے۔اور اس نور سے مراد حجر بحت ہے اور یہ صورت الٰہیہ قدیم دائم غیر حادث ہے کہ اس کا وجود غیر منقطع ہے اور وہ فرد واحد ہے۔اس پر ایمان لانا فرض ہے۔

اور جس نے ان علوم سے اغماض کیا جن سے اللہ کے بندوں میں سے کچھ افراد مختص ہیں کہ نفس کلیہ جب نفس جزئیہ ہو گیا اور احکام خصوص سے متعین ہو گیا تو وہ جس دن نیچے اترے گا بصورت عالم اترے گا۔ چنانچہ تمام افراد عالم کے درمیان انسان کو اس طرح مختص کیا کہ اس سفید نور کے مقابلہ میں جو کہ غالب ہے اور وہی حجر بحت ہے اس کے نفس میں نقطہ ظاہر ہوا۔ پھر وہ نقطہ اپنے دائرہ میں اور اپنے ٹھہرنے کے مقام پر جذب ہو گیا جس طرح لوہا مقناطیس کی طرف کھنچتا ہے۔ پھر اس جذبے سے نوع انسان میں تکیف پیدا ہوا اور اس جذب سے دوسری سعادت وشقاوت تھیں۔اور اس جذب سے محبت ذاتی پیدا ہوئی جس کے ساتھ افاضل عباد اللہ مخصوص ہیں اور اس نقطہ کے طریق سے دواعی الٰہیۃ کلیہ اور علوم اطلاقیہ نازل ہوتے ہیں۔

پھر یہ جان لو کہ اس نور غالب میں اللہ عزوجل کی طرف میلان اس کے ظہور کے اعتبار سے اصل فطرت ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو پیدا کیا ہے۔اب جس نے نور کا اعتراف نہیں کیا اور یہ نہیں کہا کہ وہ فرد واحد ہے اور نہ دنیا و آخرت میں مجازات کے بارے

میں کہا اور نہ اخروی سعادت وشقاوت کے بارے میں کہا تو وہ اللہ کے تمام انبیا اور محدثین و متکلمین کی زبان میں زندیق کافر ہے۔ جو سوائے حق تعالیٰ اور اس کی صفات و اسماء کے سارے عالم کے حدوث کے قایل ہیں۔ اور یہ کہ حق فرد واحد ہے۔ قدیم اور غالب ہے، وہ صحیح بات کہنے والے اور محقق ہیں اور اس بارے میں جو بھی ان کی بات کو رد کرتا ہے وہ باطل زندیق ہے۔ البتہ اللہ کے کچھ شاذ و نادر بندے جو محقق ہیں، جانتے ہیں کہ یہ تفصیلی علم ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔ اور عام لوگ علم اجمالی پر ہی توقف کر لیتے ہیں۔ اور نقلی اہل تصوف جو یہ کہتے ہیں کہ عالم عین اللہ ہے اور اللہ عین عالم ہے، وہ زندیق ہیں۔ ان کا نقصان عام لوگوں کو شدید اور بہت بڑا ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک نوامیس الٰہیہ ذلیل وحقیر ہیں اور ان کی نظریں مغلوبین کے اشاروں کی طرف اٹھ گئی ہیں۔ اور عشاق کے کلام آنکھوں سے اوجھل ہو گئے ہیں۔ وہ بیان نہیں کیے جاتے۔

اور جان لو کہ تجلی اعظم کے افلاک کی وضعوں اور قرانات کلیہ کے لحاظ سے بہت سی حالتیں ہیں۔ اور نفوس کلیہ، ملاء اعلیٰ، نفوس انسانیہ وغیرہ میں اس کے بلند عکس ہیں۔ دورۂ اولیٰ میں سورج اور تمام ستاروں اور آگ اور نور میں اس کے بلند عکس کے ظہور کے لحاظ سے اس کی شان عظیم ظاہر ہوئی۔ پھر اس کا وہ ظہور صورت انسانیہ کے قیاس پر تھا جیسا کہ آئینہ میں عکس صرف آئینہ کے قیاس سے ہوتا ہے۔ تو اگر تلوار کی طرح طویل ہوگا تو صورت طولانی ہوگی اور اگر آئینہ چوڑا عریض ہوگا تو صورت عریض ہوگی اور اگر گول ہوگا تو گول ہوگی۔ چنانچہ وہ عکس جس کے ذریعہ صورت انسانیہ کی طرف توجہ کی، اس سے زیادہ قریب ہوگا جس سے نور بسیط مشابہ ہے تو قول غالب آجائے گا اور وہ خیر محض اور لطف ورحمت ہے۔ اس کو اس اعتبار سے یزدان کہتے ہیں اور ان مناسبتوں سے نور، آگ اور سورج کو اس کی طرف قبلۂ توجہ بنایا۔ پھر تجلی اعظم سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ سے قبل قریب ہوئی اور ملاء اعلیٰ کے ذہنوں میں بمنزلہ صورت ذاتیہ محفوظ ہو گئی اور پہلا طریقہ محو ہو گیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے نور اور نار کی طرف توجہ فرمائی اور اللہ کی طرف تقرب ہمارے اس زمانہ میں ہوا کہ اس کی طرف توجہ ملاء اعلیٰ کے ضمن میں ہوئی اور اس کے مطابق جو وہاں ہے اور اس علم شریف میں ہم نے بہت بار قائم کیا تو ہم حجر بحت کے ساتھ باقی رہ گئے اور اس کے سوا ہر لطیفہ سے فنا ہو گئے پھر حجر بحت تجلی اعظم میں

غوطہ لگایا تو ہم تجلی اعظم کے ساتھ باقی رہ گئے اور جوہر کی نسبت سے عرض کی طرح ہو گئے اور ایسے ہو گئے کہ بنفسہ تجلی اعظم کے علم سے اور اس کے تمام اطوار سے جانیں۔ اور ہم نے اس کے تمام اطوار کو اجمالا جان لیا اور ہم کبھی نور غالب قاہر کی طرف اترے جس کو یزدان (رحمٰن) کہا جاتا ہے تو ہم نے ایک امر عجیب دیکھا۔ پھر ہم کبھی دوبارہ اترے کہ خلق ملاء اعلیٰ میں ثابت ہے اور ہم نے دونوں شانوں کے درمیان فرق کا محقق ثابت ادراک کیا۔ اللہ کا شکر ہے جو علوم کا فیضان کرنے والا اور حقائق کا اس طرح ہبہ کرنے والا ہے جیسی کہ وہ اصل میں ہیں اور یہ مکمل ترین سعادت ہے جیسا کہ میں جانتا ہوں۔ **والعلم عند اللہ تعالیٰ۔**

اور ان میں سے ایک یہ ہے کہ میں ان فقہا سے کہتا ہوں جو اپنے کو موٹا کئے ہوئے ہیں اور تقلید پر جمود اختیار کئے ہوئے ہیں کہ ان کو نبیؐ سے اسناد صحیح سے حدیث پہنچتی ہے جس کو فقہا متقدمین میں سے ایک بڑی تعداد نے اختیار کیا ہے۔ اور جو اس کو اختیار نہیں کرتا، اس کے لئے تقلید کے سوا کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ اور ان ظاہر پرستوں سے کہتا ہوں جو ان فقہا کا انکار کرتے ہیں جو اصحاب علم ہیں اور اصحاب دین کے ائمہ ہیں کہ وہ سب بیوقوفی کی راہ پر اور کمزور رائے اور گمراہی پر ہیں اور یہ کہ حق بین بین ہے۔ اور اللہ کے لئے اللہ ہی کو گواہ بناتا ہوں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ سب سے زیادہ شان والا اور سب سے زیادہ عدل والا ہے۔ وہ اس سے پاک وبے نیاز ہے کہ لوگوں کو ایک شریعت کا مکلف بنائے کہ قیامت تک اس پر عمل کریں پھر اس کو ان پر ایسی مشتبہ بنادے کہ حق اور باطل میں تمیز نہ کر سکیں۔ بلکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حق کو روشن اور ظاہر کر دیا ہے حتیٰ کہ سوائے نافرمان اور سرکش کے اللہ کے بارے میں ایسی بات کوئی نہیں سوچ سکتا۔ اس نے کتاب محکم نازل فرمائی جس میں انسانوں کا کلام التباس نہیں کر سکتا۔ اور اس کی اس میں کوئی تحریف راہ نہیں پا سکتی اور اس کا سلسلہ متواتر فرمادیا کہ اس کے بارے میں دو آدمی بھی مختلف نہیں ہوتے۔ اور اس کے رسول صلوات اللہ علیہ نے احکام بیان فرمائے۔ اور حکم دیا تو اس سے ایک جماعت الفاظ یا معنی سے مستفیض ہوئی۔ مستفیض باللفظ سے میری مراد وہ حدیث ہے جس کو رسول اللہؐ سے تین یا زیادہ صحابہ نے روایت کیا اور ان کا حال صدق وتقویٰ میں معلوم ہے کہ رسول اللہؐ نے ان کے بارے میں شہادت دی کہ وہ بہترین جماعت ہیں اور لوگوں کو ان کی تعظیم کی رغبت دی۔ اور ان کو سب وشتم کا نشانہ بنانے

سے روکا۔اس طرح سے ملنے والی احادیث متواتر یا تواتر سے ملحق ہیں اور وہ فقہ اور سیرت کے ہر باب میں بہت زیادہ موجود ہیں۔خواہ ان کے الفاظ ایک دوسرے سے متفق ہوں یا مختلف۔

اور مستفیض بالمعنی سے میری مراد یہ ہے کہ مسلمانوں کے اپنے مذاہب کے اختلاف اور احوال کے تضاد کے باوجود ان کے زعماء نے شریعت حق کے بیان میں کفالت کی ہے جو رسول اللہؐ سے مروی ہے۔ان میں سے اہل السنہ بھی ہیں اور ان کے علاوہ بھی۔ان مسائل میں انہوں نے باہم اتفاق کیا یا تھوڑا اختلاف کیا۔سمجھنے والا سمجھ لیتا ہے کہ اس طرح کی باتیں ہر اس معاملہ میں پائی جاتی ہیں جو ایک دوسرے سے نقل کیا جاتا ہے اور اس کا سلسلہ طویل زمانہ تک چلتا ہے۔یا مسلمانوں نے اختلاف کیا لیکن سواد اعظم سختی کے ساتھ ایک امر پر قائم رہا اور جس نے اس میں مخالفت کی اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔اور مخالفت کے اختلاف کو حل یا عقد میں قابل اعتنا ماننے سے انکار کر دیا اور مخالف ان کی جمعیت کے خوف سے کھل کر سامنے آنے سے بچتا رہا۔محفل سے دور رہا، مجمع سے چپکے سے کھسک کر پناہ ڈھونڈتا رہا۔یا جمہور جو کچھ کہہ رہے تھے تقیہ کرتے ہوئے خود بھی وہی کہتا رہا، تا کہ اپنی جان و مال کو بچا لے۔اور یہ کہ وہ کوئی فیصلہ کر دیں اور یہ ایسی دلیل کی طرف ہے کہ صرف بدعی مذاہب سے ہی کامیاب ہوا۔یہ بات کبھی مسلمانوں کے کانوں میں نہیں پڑی حتی کہ اس شخص نے بیان کی تو اس طرح کے معاملے بہت کم ہیں اور ان کو شمار میں نہیں لایا جا سکتا۔یہ ملت قیمہ اسی قدر رہی جس سے خفا اور پردہ زائل ہو گیا۔ اور اس پر دلائل قائم ہو گئے۔اب خود ہی انصاف کر لو کہ مومن وہ ہے جو خود انصاف کر لے کہ منقول ملتوں کے لئے کیا اتنے زمانہ تک یہ ممکن ہو گا کہ اس سے بہتر طریقہ کی تحقیق کرے اور اس کا احاطہ کرے جس کو اللہ تعالیٰ نے ملت مصطفویہ کے لئے پسند کیا۔

پھر اس کے بعد احادیث کو عدول (معتبر) صحاح اور حسان لوگوں سے نقل اور روایت کیا گیا جن کے صدق کی گواہی اس شان والوں نے دی۔اور اگر ان کو عام لوگوں نے نہیں پہچانا تو تم پر ان کا تتبع اور ان کی اقتدا لازم ہے۔اور جن امور میں پہلے اختلاف ہو چکا ہے، ان کے بارے میں صحابہ اور تابعین کے دور سے ہمارے زمانہ تک دو رائے چلی آ رہی ہیں۔کوئی ان میں سے کسی ایک قول کو رد کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا کہ اس پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔ صرف ترجیح کی بات کرتی ہے اور اس کی معرفت اصول کے زیادہ مشابہ ہے۔اس لئے تم پر

لازم ہے کہ ان کے اقوال، قیاسوں اور استنباطوں سے باہر مت جاؤ کہ ان میں ان کی عقلیں اور آرا مختلف ہوئی ہیں۔ تو تم پر ان میں سے کوئی شے واجب نہیں ہوتی۔ سوائے اس کے جو قوی جلی ہو۔ تو جو شریعت کے مرتبہ کو نہیں سمجھتا اور ہر مرتبہ کے حق کو ادا نہیں کرتا اور اولی کو ایسی سختی سے اختیار نہیں کرتا کہ اس میں مخالفت کرنے والے کو بدعتی قرار دے دے۔ اور دوسرے کو حد احتیاط کے ساتھ اس کے لئے کسی عالم کو امام بنائے بغیر نہیں پکڑتا تو وہ جاہل گمراہ ہے۔

اور اللہ کے لئے اللہ ہی کو گواہ بناتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی حاکم نہیں اور حکم صرف اللہ کا ہے کہ اللہ نے واجب، مندوب، مباح، مکروہ اور حرام کا حکم اپنے عرش کے اوپر سے دیا، پھر یہ سب کچھ ملاء اعلی میں اور اس کی تجلی اعظم کے گرد قائم شعاعوں میں متحقق ہوا، پھر لوگوں میں شریعت کو اس ذات کی زبان سے نازل فرمایا جس کو اس نے اپنی رسالت کے لئے منتخب فرمایا۔ اب جس نے کسی چیز کے بارے میں واجب یا حرام ہونے کی بات بغیر کسی ثبوت اور معتبر حوالہ کے کہی، اس نے اللہ کے خلاف جھوٹی الزام تراشی کی۔ اللہ کا ارشاد ہے **ولاتقولوا لما تصف السنتکم الکذب ھذا حلل وھذا حرام لتفتروا علی اللہ الکذب ان الذین یفترون علی اللہ الکذب لایفلحون** ”اور یہ جو تمہاری زبانیں جھوٹے احکام لگایا کرتی ہیں کہ یہ چیز حلال ہے اور وہ حرام تو اس طرح کے حکم لگا کر اللہ پر جھوٹ نہ باندھا کرو۔ جو لوگ اللہ پر جھوٹے افترا باندھتے ہیں وہ ہرگز فلاح نہیں پایا کرتے۔“ (النحل ۱۱۶)

بلکہ حق بات مرتبہ اولی میں یہ ہے کہ جو بات معلوم ہے، اس پر اعتقاد کے ساتھ اس طرح قائم ہو جاؤ کہ اس کے خلاف کچھ بھی قبول نہ کرو اور ایسے قول کو مرتبہ ثانیہ میں رکھ دیا جائے۔ پھر کہا جاتا ہے کہ مثلاً صحابہ سے دو قول مروی ہیں مگر ہمیں یہ قول محبوب ہے اور یہ سنت سے زیادہ قریب ہے۔ اور میں اللہ کے لئے اللہ کو گواہ بناتا ہوں کہ ایسے شخص نے اللہ کے سلسلہ میں کفر اختیار کیا کہ امت کے کسی ایسے شخص کے بارے میں جو خطا بھی کرتا ہے اور صحیح بات بھی کہتا ہے، یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ اللہ نے اس کے اتباع کا حتمی حکم دیا ہے اور یہ کہ میرے اوپر واجب وہ ہے جو یہ شخص میرے اوپر واجب کرتا ہے۔ حالانکہ شریعت حقہ نے اس شخص سے ایک زمانہ پہلے ثابت کر دیا تھا جس کو علما نے یاد رکھا اور راویوں نے روایت کیا اور اس پر فقہا نے حکم لگایا۔ البتہ لوگوں نے علماء (مجتہدین) کی تقلید پر اس معنی میں اتفاق کیا ہے کہ وہ نبیؐ سے شریعت کو

محسن ہے۔ یہ مرتبہ نبیؐ اور اوائل امت سے منقول سنن و آداب اور تورعات یا منقول پر قیاس کئے جانے والے امور کا ہے۔ اور دونوں مرتبوں کے درمیان بہت بڑا فرق ہے۔ اس فرق کو چھوڑ دینا بڑا خسارہ اور جہالت ہے۔ اور ان دونوں کے درمیان فرق کو چھوڑنے سے علماء کا غالب اختلاف پیدا ہوتا ہے۔ ہم اس کو مثالوں میں بیان کرتے ہیں۔ مرتبۂ اولی میں تنزیہ شدید نہیں بلکہ تنزیہ متوسط ہے۔ ان امور میں تنزیہہ کی جاتی ہے جو بندوں کے ساتھ امت امی کے نزدیک ظاہر حق کی مساوات کا سبب ہوتی ہے۔ جس کی لغت میں قرآن نازل ہوا۔ اور ان تشبیہات سے تنزیہ کی جاتی ہے جن کو جماعتوں نے استعمال کیا اور ان کو بڑھایا اور ایک کے بعد ایک طبقہ نے ان کو بطور وراثت منتقل کیا۔ حتی کہ طول وعرض والا فرقۂ باطل پیدا ہو گیا۔ اس فرقہ کو اس تشبیہ کے راستے پوری طرح بند کئے بغیر پامال کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس طرح کہ بالکل ڈھیل نہ دی جائے اور اس کے ماسوا کوئی بغیر کسی تعرض کے چھوڑ دیا جائے۔ اور تشبیہ کا علاج ایسے اجمالی کلمہ سے کیا جائے جس کا ہر مومن اعتقاد رکھتا ہے۔ اور وہ یہ ہے لیس کمثلہ شیٔ "اس جیسی کوئی چیز نہیں ہے" وھو السمیع العلیم "وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔" اور اس سے زیادہ میں مشغول نہ ہو۔ اور ہم نے ان قیود میں علم کثیر کو ملا دیا ہے۔ اگر تم اس کو سمجھنے کی اہلیت رکھتے ہو تو سمجھ سکتے ہو۔

اور ان اسرار کے لئے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات توقیفی ہوں۔ کسی کو ان کے بارے میں کلام کرنے کی اس سے زیادہ اجازت نہ دی جائے جس کا ذکر شارع نے کیا ہے۔ اور یہ اس لئے کہ ان مصالح کی مراعات وہ لوگ نہیں کر سکتے۔ اس لئے شریعت نے ان کی ذمہ داری لی اور فساد کا دروازہ بند کر دیا۔ اور اللہ نے اپنا نام سمیع و بصیر اور علیم رکھ لیا اور ذائق (چکھنے والا) اور شام (سونگھنے والا) نہیں رکھا۔ اور ضحک (ہنسنے) کلام اور نزول کے اطلاق کو جائز قرار دیا لیکن چلنے، بھوک، حزن اور نیند کے اطلاق کو جواز نہیں دیا۔ اور ولد اور شریک کے اثبات سے روکا، باوجود یکہ اگر ان امور کے حقائق کے اس مفہوم کا ارادہ کرے جو مخاطب کے نزدیک ہو تو دونوں فریق سمجھتے ہوں کہ اس سے کوئی چیز ثابت نہیں ہے۔ اور اگر ان کے حقائق کے علاوہ کا ارادہ کرے تو ہر ایک کے لئے وجہ ہے۔ لیکن اللہ کے لئے ہر اس امر میں جس کو مباح قرار دیا، یا جس سے روکا اسرار ہیں۔ اور اس کے نزدیک ہر چیز مقررہ مقدار میں

ہے۔اور مرتبہ اولی میں واجب ہوتا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر شدت اور ضعف کے ساتھ ہو۔ اور مرتبہ اولی میں احتیاط اور تورع نہیں ہے۔اس میں یہ ہے کہ ان امور سے اجتناب کرے جن کی حرمت ثابت ہے۔اسی وجہ سے صحابہ کا عمل مختلف رہا کہ ان میں غازی، حرفت پیشہ اور تاجر ہیں جو معاش کے امور میں مشغول رہتے ہیں، زمین پر سفر کرتے ہیں، اور اصل شریعت پر اکتفا کرتے ہیں۔اور ان میں ایسے تمام کاموں سے خالی، عابد و زاہد ہیں ،انہوں نے مرتبہ ثانیہ اختیار کیا اور آداب کی پوری پوری رعایت کی۔اور ان میں بین بین بھی ہیں۔اپنی معاش کے کاموں میں مشغول لوگوں خاص طور سے غلاموں، باندیوں، کسانوں اور حرفت پیشہ لوگوں کو مرتبہ اولی سے زیادہ کا حکم دینا مناسب نہیں ہے۔ورنہ شریعت ان پر شاق ہوجائے گی اور معاملہ اس کو ترک کرنے اور اس سے تنفر کا ہوجائے گا۔یہ امر حدیث میں داخل ہے ان منکم منفرین ''تم میں تنفر پیدا کرنے والے ہیں''۔اور قرآن اور نبی کی حدیثوں میں خواص سے زیادہ ان عوام کے حال کی رعایت رکھی گئی ہے۔اور ان عام لوگوں کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ اپنے علوم کو صوفیا اور متکلمین کے علوم سے خلط ملط کریں۔بلکہ ان کے لئے واجب ہے کہ ظاہر کتاب وسنت سے جو سمجھا جاتا ہے۔اس پر اکتفا کریں۔

اور لوگوں کے ہر فرقہ کو میں ان پر ملاء اعلی کو پیش کرتے ہوئے مخاطب کرتا ہوں۔پھر معاملہ عام ہوگیا ہر صاحب رائے اپنی رائے کی اتباع کرتا ہے۔تم نے اس طریقہ کو ترک کردیا جو اللہ نے لوگوں کے ساتھ لطف وکرم اور رحمت کا معاملہ کرتے ہوئے اور ان کے لئے ہدایت ورہنمائی کرتے ہوئے محمدؐ کی زبان پر نازل کیا۔تو تم میں سے ہر ایک نے الگ امام مقرر کرلیا اور لوگوں کو اس کی طرف بلانے لگے اور سمجھ لیا کہ اس کا نفس ہادی مہدی (خود ہدایت یافتہ اور دوسروں کو ہدایت دینے والا) ہے۔جب کہ وہ خود گمراہ ہے، دوسروں کو گمراہ کرنے والا ہے۔ ہم ان لوگوں سے راضی اور خوش نہیں ہیں، جو لوگوں کو اس لئے بیعت کرتے ہیں تاکہ اس کے ذریعہ تھوڑی سی دولت حاصل کرلیں یا علم حاصل کرکے دنیوی اغراض پوری کرلیں۔اس لئے کہ اہل ہدایت سے تشبہ اختیار کئے بغیر دنیا حاصل نہیں ہوتی۔اور نہ ہی ان لوگوں سے راضی ہیں جو اپنے نفس کی طرف بلاتے ہیں۔اور اپنے نفوس کے مطابق حکم دیتے ہیں۔یہ راہزن ہیں، دجال ہیں کذاب ہیں، فتنوں میں پڑے ہوئے گمراہ دیوانے ہیں۔خود گمراہ ہیں تمہیں

بھی گمراہ کرتے ہیں۔صرف ان لوگوں کی اتباع کرو جو کتاب اللہ اور اس کے رسول کی سنت کی طرف دعوت دیتے ہیں۔اپنے نفس کی طرف دعوت نہیں دیتے۔اور ہم مجالس و محافل میں صوفیا کے اشارات کی اشاعت سے خوش نہیں ہیں۔راضی اور خوش ہونے کا ذریعہ و سبب احسان ہے۔تمہارے لئے اللہ تبارک وتعالی کے اس ارشاد میں عبرت ہے وان هذا صراطي مستقيما فاتبعوه ولاتتبعوا السبل فتفرق بكم عن سبيله ”میرا یہ سیدھا راستہ ہے اسی کی اتباع کرو اور دوسرے راستوں کی پیروی مت کرو کہ پھر تم اس کے راستہ سے بھٹک جاؤ گے۔“(الانعام ۱۵۳)

اور میں طلباء علم سے کہتا ہوں کہ اے بے وقوفو! تم علما کے واسطہ سے اپنے نفس کو موٹا کر رہے ہو۔تم علوم یونانی، صرف، نحو اور معانی میں مشغول رہتے ہو، اور سمجھتے ہو کہ یہی اصل علم ہے۔حالانکہ علم تو اللہ کی کتاب کی آیات محکمہ ہیں۔کہ تم ان کو ان کی تفسیر غریب، سبب نزول، ان کی مشکلات کی تاویل کے ساتھ سیکھو، یا رسول اللہ کی سنت قائم کو سیکھو اور یاد کرو کہ نبیؐ نے نماز کس طرح ادا کی؟ وضو کیسے کیا؟ اور قضائے حاجت کے لئے کس طرح جاتے تھے؟ اور کیسے روزہ رکھتے تھے؟ کیسے حج اور جہاد کرتے تھے؟ اور آپ کا کلام کیسا ہوتا تھا؟ آپ اپنی زبان کی حفاظت کیسے فرماتے تھے؟ اور آپ کے اخلاق کیسے تھے؟ پھر آپ کی ہدایت کی اتباع کرو۔پھر آپ کی سنت پر اس طرح عمل کرو کہ وہ ہدایت ہے اور سنت ہے، اس لئے نہیں کہ وہ فرض ہے یا تمہارے اوپر لازم کر دیا گیا ہے یا فریضہ عادلہ ہے کہ سیکھو وضو کے ارکان کیا ہیں؟ نماز کے ارکان کیا ہیں؟ اور زکوۃ کا نصاب کیا ہے؟ اور واجب کی مقدار کیا ہے؟ میت کے فرائض کے سہام کیا ہیں؟ البتہ سیرتیں اور جو آخرت کی رغبت پیدا کرنے والی صحابہ و تابعین کی حکایتیں ہیں تو وہ فضل ہیں۔اور ان میں سے تم ایسی جن چیزوں میں مشغول ہوتے ہو، جو دم گھونٹنے والی ہیں تو وہ علوم آخرت نہیں ہیں۔وہ علوم دنیا ہیں۔تم نے اپنے سے پہلے فقہا کے استحسانات اور ان کی تفریعات میں خوب غور و خوض کیا ہے۔کیا تم نہیں جانتے کہ حکم وہ ہے جس کا حکم اللہ اور اس کے رسول نے دیا ہے؟ اور تم میں سے کتنے انسان ہیں جن کو حدیث کی فہم اور ان کی بنیاد پر فیصلہ کی اہلیت، بکمال مہارت شان کے ساتھ حاصل ہوئی ہے؟ اور ائمہ ایسے نہیں تھے جن پر یہ حدیث اور امر پوشیدہ رہا ہو لیکن انہوں نے اس کو صرف اس لئے چھوڑ

دیا کہ ان کے لئے دین میں منسوخیت یا مرجوحیت ظاہر ہوئی۔

اور یہ بھی جان لو کہ یہ کسی بھی طرح دین نہیں ہے کہ تم اپنے نبی پر ایمان لاؤ، پھر کسی دوسرے کی اتباع کرو، خواہ وہ مذہب کے لحاظ سے اس کے خلاف ہو یا موافق ہو۔ حق کی مرضی تو یہ ہے کہ اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت میں شروع ہی سے مشغول رہو۔ پھر اگر ان دونوں کو اختیار کرنا تمہارے لئے سہل ہو تو فبہا و نعمت اور اگر سمجھنے میں تمہاری فہم کا قصور ہو تو ان علماء رائے سے مدد لو جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں اور جن کو تم زیادہ حق صریح و واضح اور سنت سے زیادہ موافق سمجھتے ہو۔ اور ان علوم آلیہ میں صرف اس لئے مشغول ہو کہ وہ علوم آلیہ ہیں، اس طرح نہیں کہ وہ امور مستقل ہیں۔ کیا اللہ نے تم پر یہ واجب نہیں کیا کہ علم کی اشاعت کرو حتی کہ عالم اسلام میں شعائر اسلام ظاہر ہو جائیں؟ مگر تم شعائر کو ظاہر نہیں کرتے۔ اور لوگوں کو اس طرح حکم دیتے ہو کہ وہ زوائد میں مشغول ہوں۔ اور تم ان کی نظروں میں خود کو حق اور دین کا طلب کرنے والا ظاہر کرتے ہو۔ کیا تم دیکھ نہیں رہے ہو کہ بڑے بڑے شہر علماء سے خالی ہو رہے ہیں۔ جب کہ ان کی فہم بھی شعائر کے ظہور سے کم تر ہے۔

اور میں فاسق واعظوں، عبادت گزاروں اور خانقاہوں میں بیٹھنے والوں سے کہتا ہوں کہ اے عبادت گزارو! تم نے ہر مشکل اور ذلت کو برداشت کیا ہے اور ہر رطب و یابس کو اختیار کیا ہے۔ اور لوگوں کو موضوع گھڑی ہوئی اور باطل باتوں کی دعوت دی ہے، اور مخلوق کو تنگی میں مبتلا کیا ہے، حالانکہ تمہیں آسانی پیدا کرنے والا بنا کر بھیجا گیا تھا نہ کہ تنگی پیدا کرنے والا بنا کر۔ اور تم نے عشاق میں سے مغلوبین کے کلام کو اختیار کیا حالانکہ عشاق کا کلام پر پیچ اور پوشیدہ ہوتا ہے۔ وہ ظاہر نہیں ہوتا۔ اور تم وسوسوں کو اچھا سمجھتے ہو اور ان کو احتیاط قرار دیتے ہو۔ حالانکہ حق کی مرضی یہ ہے کہ احسان کو اس کے اعتقادی اور عملی جزئیات کے ساتھ سمجھو۔ اس کو مغلوبین کے احوال اور مکاشفہ والوں کے اشارات کو ملائے بغیر حاصل کرو، اور لوگوں کو اس کی طرف دعوت دو، اور اس کو حاصل کرو۔ کیا تم نہیں جانتے کہ رحمت مکمل رحمت ہے اور ہدایت مکمل ہدایت ہے جو محمدؐ لائے؟ کیا آپ تمہارے جیسا یہ فعل کرتے تھے یا آپؐ کے صحابہ اس طرح کے افعال کرتے تھے؟

اور میں بادشاہوں سے کہتا ہوں کہ اے بادشاہو! ملاء اعلیٰ کے نزدیک اس زمانہ میں

یہ ہے کہ تلوار سونت لو اور پھر ان کو میان میں مت کرو حتی کہ اللہ مسلمانوں اور مشرکوں کے درمیان فرقان قائم کر دے اور حتی کہ کفار اور فساق کے سرکش لوگوں کو ان کے ضعفا کے ساتھ ملا دے۔ پھر ان کے لئے کسی چیز کی استطاعت نہ رہے۔ اور یہی اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا مطلب ہے وقاتلوهم حتى لاتكون فتنة ويكون الدين كله لله ''اور ان کے ساتھ قتال کرو حتی کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین پوری طرح اللہ کے لئے ہو جائے۔'' (انفال ۳۹) پھر جب فرقان ظاہر ہو گیا تو ملاء اعلیٰ کی رضا یہ ہے کہ ہر جہت میں اور ہر تین دن اور چار دن کی مسافت پر امیر عادل مقرر کر دو جو ظالم سے مظلوم کا حق لے اور حدود قائم کرے اور اس امر کی کوشش کرے کہ ان میں سرکشی پیدا نہ ہو، نہ جھگڑا، ارتداد اور کبیرہ گناہ پھیلیں۔ اور اسلام کو پھیلائیں اور اس کے شعائر کو ظاہر کریں۔ اور ہر ایک اپنے فرائض کو اختیار کرے۔ اور ہر شہر کے امیر کی ایک شان وشوکت ہو جس کے ذریعہ وہ اپنے شہر کی اصلاح پر قادر ہو لیکن ایسی شوکت نہ ہو جس کے سبب خود فائدہ اٹھائے اور سلطان کی نافرمانی کرے۔ اور ہر اقلیم کبیر میں ایک امیر مقرر کیا جائے۔ اس کی ذمہ داری صرف قتال ہو اس کی جمعیت بارہ ہزار مجاہدین پر مشتمل ہو جو اللہ کے معاملہ میں کسی لومتہ لائم کی پروانہ کرتے ہوں۔ وہ ہر باغی اور سرکش کے ساتھ قتال کریں۔ یہ سب کچھ ہو جائے تو ملاء اعلیٰ کی رضا یہ ہے کہ اس وقت نظام منزلی اور عقود (معاملات) وغیرہ پر توجہ دے، حتی کہ کوئی بھی امر خلاف شرع نہ رہے اور لوگ ہر لحاظ سے مامون ہو جائیں۔

اور میں امراء سے کہتا ہوں، اے امراء! کیا تم اللہ سے نہیں ڈرتے ہو؟ تم فنا اور ہلاک ہونے والے کی ذات میں مشغول ہوتے اور رعیت کو چھوڑ دیتے ہو، جو ایک دوسرے کو کھاتے ہیں۔ کیا شراب کھلے عام نہیں پی جارہی ہے اور تم نکیر نہیں کرتے؟ کیا زنا شراب پینے اور جوئے کے لئے مکان نہیں بنائے جارہے ہیں اور تم روک نہیں رہے ہو؟ کیا ایسے بڑے بڑے شہر نہیں ہیں جہاں چھ سو سال یا زیادہ سے حد جاری نہیں ہوئی؟ تم جس کو ضعیف پاتے ہو اس کو کھا لیتے ہو اور جس کو قوی پاتے ہو اس کو چھوڑ دیتے ہو، اور حد سے گزر جانے دیتے ہو۔ تمہارے افکار کا زور کھانے کی لذتوں عورتوں کے ساتھ آسودگی، کپڑوں کے محاسن اور گھومنے پر ہوتا ہے۔ اللہ کی طرف سر اٹھا کر دیکھتے بھی نہیں۔ اس کا جو کچھ ذکر کرتے ہو۔ صرف تمہاری زبانوں تک ہوتا ہے تمہاری حکایات ایسی ہوتی ہیں، گویا تم اللہ کے نام کے ذریعہ انقلاب لانا چاہتے ہو۔ کہتے ہو

اللہ اس پر قادر ہے تمہارا مقصد یہ ہوتا ہے کہ زمانہ میں اسی طرح انقلاب آ جائے گا۔

اور میں فوجیوں سے کہتا ہوں، اے فوجیو! اللہ نے تمہیں جہاد کے لئے نکالا ہے تا کہ کلمۂ حق بلند کرو اور شرک اور اہل شرک کو ختم کر دو۔ تو جس مقصد کے لئے تمہیں نکالا تھا، تم نے اسے چھوڑ دیا۔ گھوڑے باندھنا اور صلح مصالحت کے ذریعہ کمائی کرنے کا راستہ اختیار کر لیا۔ اس کے ذریعہ تم جہاد کی نیت اور قصد و اعتدال کے بغیر اپنے اموال بڑھاتے ہو۔ شراب اور بھنگ پیتے ہو، داڑھیاں کٹاتے ہو، مونچھ بڑھاتے ہو، لوگوں پر ظلم کرتے ہو، اس کی پرواہ نہیں کرتے کہ کیا کھاتے ہو۔ اللہ کی قسم! تم جلد ہی اللہ کی طرف لوٹو گے۔ تب وہ بتا دے گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو۔ تمہارے بارے میں حق کی مرضی یہ ہے کہ نیک و صالح غازیوں کی ہیئت اختیار کرو، داڑھیاں بڑھاؤ، مونچھیں کٹاؤ، پنج وقتہ نمازیں ادا کرو، لوگوں کے اموال کے سلسلہ میں اللہ سے ڈرو، حرب اور حرج و نقصان میں صبر کرو۔ نماز کی ہیئت جیسے قصر و جمع، ترک سنت اور تیمم کے بارے میں علم حاصل کرو پھر ان کی پابندی کرو، فرائض کو پابندی کے ساتھ ادا کرو، اپنی نیتوں کی اصلاح کرو۔ تمہارا رب تمہارے جانوروں اور غلاموں میں برکت دے گا۔ اور تمہارے دشمنوں کے معاملہ میں تمہاری مدد کرے گا۔

اور اہل حرفہ و صنعت سے کہتا ہوں، تمہاری امانتیں ضائع ہو گئیں۔ تم اپنے رب کی عبادت کے سلسلہ میں ڈھیلے سست پڑ گئے۔ اپنے رب کے ساتھ شرک کر لیا۔ اپنے طاغوتوں کے نام پر ذبح کرنے لگے۔ مدار اور سالار کی طرف بار بار جانے لگے، تمہارا یہ عمل بہت برا ہے۔ تم میں سے کچھ لوگ اپنے مال اور کمائی کو اڑانے لگے تو اپنے لباس، ہیئت اور کھانے میں ایسے تکلفات کرنے لگے کہ ان کی کمائی ان کے لئے کافی نہیں ہوتی تو اپنے گھر کی عورتوں کے حقوق ضائع کرتے ہیں۔ اور تم میں سے کچھ لوگ شراب پینے اور شرم گاہوں کو کرایہ پر حاصل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ وہ اپنے معاش و معاد کو ضائع کر دیتے ہیں۔ اللہ نے تمہارے لئے کمائی کے راستے مہیا کئے ہیں جو تمہارے اور تمہارے ذوالحقوق کے لئے کافی ثابت ہوں، اگر تم اس اعتدال اور قناعت سے کام لو جس کا غلبہ معاد کی طرف ہوتا ہے۔ لیکن تم نے اپنے رب کی نعمتوں کی ناشکری) کر کے بہت برا راستہ اختیار کیا۔ کیا تم جہنم کے عذاب سے نہیں ڈرتے؟ کتنی بری بات ہے۔ اپنے صبح و شام اللہ کے ذکر میں اور سارا دن اپنے حرفہ پیشہ میں

اور رات اپنی عورتوں میں گذارو، خرچ کو آمدنی سے کم رکھو۔ جو بچ رہے، اس میں غریب وفقیر کا حصہ رکھو۔ اور کچھ اپنی اتفاقی ضرورتوں اور حاجتوں کے لئے رکھ چھوڑو۔ اگر تم ان امور کی خلاف ورزی کرو گے تو غلطی کرو گے۔

اور تمام مسلمانوں کی جماعتوں سے ایک عمومی خطاب کے طور پر کہتا ہوں، اے بنی آدم کی جماعتو! تم اپنے رب سے غافل ہو گئے، تمہارے اوپر حرص و لالچ غالب ہو گئے، تمہارے اوپر شیطان نے غلبہ پالیا۔ عورتیں مردوں پر دہاڑنے لگیں اور مرد عورتوں کو حقیر سمجھنے لگے۔ تم حرام اشیا علاج کے لئے استعمال کرنے لگے۔ حلال کو بے مزہ سمجھنے لگے۔ اللہ کی قسم! اللہ نے نفس کو اس کا مکلف بنایا ہے جس کی وہ طاقت رکھتا ہے۔ اپنی شرم گاہوں کی شہوت کا علاج نکاح سے کرو، اگرچہ زیادہ ہو۔ اور اپنے نفقہ اور ہیئت میں ایسا تکلف نہ کرو جس کی تم طاقت نہ رکھتے ہو۔ اور عورتوں کو گنہگار نہ کرو کہ وہ معلق ہیں۔ اور اپنے اوپر معاملات کو تنگ نہ کرو۔ اگر تم تنگی میں مبتلا کرو گے تو تمہارے نفس فسق کی حد تک چلے جائیں گے۔ اور اللہ چاہتا ہے کہ اس کی رخصتوں کو اختیار کیا جائے جیسا کہ وہ چاہتا ہے کہ اس کی عزیمتوں کو اختیار کیا جائے۔ اور اپنے بیٹوں کی خواہش کا کھانوں کے ذریعہ علاج کرو اور اتنا کماؤ جو تمہارے لئے کافی ہو۔ پوری طرح لوگوں پر انحصار نہ کرو کہ تم ان سے مانگو اور وہ نہ دیں۔ اور نہ ہی پوری طرح خلفا اور امرا پر انحصار کرو۔ تمہارے لئے پسندیدہ تمہاری اپنی کمائی ہے۔ سوائے اس بندہ کے جس کو اللہ نے الہام کر دیا ہو کہ اللہ تیرے لئے کافی ہے اور اللہ تجھے فرق کی آفتوں سے محفوظ رکھے گا۔ یا معشر بنی آدم! جس کو اللہ نے رہنے کے لئے اتنی جگہ دیدی جو اس کے لئے کافی ہو اور پینے کے لئے اتنا دے دیا جو اس کے لئے کفایت کرے اور کھانے کے لئے اتنا عطا کر دیا کہ اس کا پیٹ بھر دے اور پہننے کے لئے اتنا دیدیا جو اس کے جسم کو ڈھانپ لے اور نکاح کرا دیا جس سے اس کی شرمگاہیں محفوظ ہو جائیں اور اس کی معیشت میں اس کی مدد کر دی تو اس کو دنیا سے سب کچھ دیدیا۔ اسے چاہئے کہ اللہ کا شکر ادا کرے اور اتنی کمائی کرے جو اس کے لئے اکتفا کرے۔ اس کی مثال قناعت اور معیشت میں اعتدال ہونی چاہئے۔ اور چاہئے کہ فرصت کو اللہ کے ذکر کے لئے غنیمت جانے اور تین وقتوں صبح، شام اور سحر کی حفاظت کرے، اور کلمہ، تسبیح اور تلاوت قرآن سے اللہ کا ذکر کرے۔ اور حدیث کو دھیان سے سنو اور

ذکر کے حلقوں میں حاضر رہو۔

اے معاشر بنی آدم! تم نے دین میں تغیر کر کے فاسد رسوم کو اختیار کر لیا۔ یوم عاشورہ میں باطل کاموں میں جمع ہوتے ہو۔ ایک قوم نے اس کو ماتم کا دن بنا لیا۔ کیا تم یہ نہیں جانتے کہ تمام دن اللہ ہی کے ہیں اور حوادث اللہ کی مشیت سے پیش آتے ہیں اور اگر حسین رضی اللہ عنہ اس دن شہید کر دیے گئے تو کون سا دن ہے جب کوئی محبوب نہ مرا ہو۔ اور انہوں نے اس دن کو اپنی نیزہ برداری اور اپنے ہتھیاروں سے کھیل بنا لیا ہے۔ اور ایک قوم نے تمہاری ان حرکتوں کو عبادت کا درجہ دے دیا ہے۔ تم یوم برأت میں جمع ہوتے ہو ایک قوم کھیلتی کھلواڑ کرتی ہے، لہو ولعب میں مبتلا رہتی ہے اور ایک قوم یہ گمان کرتی ہے کہ مردوں کے لئے زیادہ سے زیادہ کھانا کھلانا واجب ہے۔ قل ھاتوا برھانکم ان کنتم صادقین "تم کہو اگر تم اپنے دعوی میں سچے ہو تو اپنی دلیل لاؤ۔" (البقرہ ۱۱۱) اور تم نے ایسی رسوم اختیار کر لی ہیں جو تمہارے لئے تنگی و پریشانی کا باعث ہیں۔ جیسے ولیموں میں افراط اور طلاق کی ممانعت اور عورت کو اس کے شوہر کے بعد نکاح سے روکنا، اس طرح تم نے اپنے اموال اور اوقات کو رسوم میں ضائع کر دیا۔ اور ہدایت صالح کو ترک کر دیا۔ حالانکہ اچھی بات یہ تھی کہ ان رسوم کو اختیار کرتے ہوئے سہولت کی راہ اپناؤ جس میں کوئی تنگی اور دشواری نہ ہو۔ تم نے ماتم کو عید بنا لیا۔ کھانا زیادہ بنانا تم پر واجب تھا اور تم نے نماز ضائع کر دی۔ لوگ اپنی کمائی میں مشغول رہے، اس لئے نماز نہیں پڑھ سکے۔ اس فساد کا منشا یہ ہے کہ انہوں نے اس رخصت کو اختیار نہیں کیا جو اللہ نے دی تھی۔ لوگ حکایات واحادیث، قصہ کہانیوں میں وقت گزارنے اور تفریح میں مشغول رہے۔ اگر انہوں نے اپنی مجالس کا اہتمام مسجدوں کے پاس کشادہ مقامات پر کیا ہوتا تو ان کے لئے نماز کی ادائیگی آسان ہوتی۔ اور تم نے زکوۃ کو ضائع کر دیا۔ کوئی غنی ایسا نہیں ہے جس کے متعلق محتاج نہ ہوں کہ وہ ان کو کھلائے اور ان کو سیراب کرے۔ اور اگر وہ زکوۃ اور عبادت کی نیت کر لے تو یہ بھی اس کے لئے کافی ہے اور تم نے رمضان کے روزوں کو ضائع کر دیا تو قوم نے بھی ضائع کر دیا اس لئے کہ فوجی بن گئے۔ اس لئے روزہ پر قادر نہیں رہے۔ حالانکہ انہیں کوئی محنت نہیں کرنی پڑ رہی ہے۔ جان لو کہ تم نے بری تدبیر اختیار کی ہے۔ تم نے اپنا نان ونفقہ سلطان کے ذمہ کر دیا ہے اور جب سلطان تمہیں دینے کے لئے کچھ نہیں

پا تا تو رعایا پر تنگی کرتا ہے۔ تو تمہاری یہ حرکت کتنی قبیح ہے۔ اور لوگ ہیں کہ سحر خیزی نہیں کرتے اور نہ ہی ان اعمال سے اجتناب کرتے ہیں جو ان پر شاق گزرتے ہیں اور یہ ان کی بدتدبیری اور بدعقلی ہے۔ اور اس زمانہ میں ملاء اعلیٰ کے مقالات بہت زیادہ ہیں یہ چلو بھر پانی بڑے سمندر سے لیا گیا ہے۔ کوزہ میں سمندر سمویا گیا ہے کہ قلیل، کثیر کا نمونہ ہوتا ہے۔

۷۰- تفہیم:

نفحات الٰہیہ کی بعض مشکلات کا حل، شیخ صدرالدین کی تالیف میں سے شیخ محمد عاشق کے مطالعہ کے لئے

حقائق و معارف سے باخبر برادرم شیخ محمد عاشق سلمہ اللہ تعالیٰ، سلام محبت مشام کے بعد دو تحریریں موصول ہوئیں۔ مطالعہ میں آئیں۔ ان میں شیخ کبیر صدرالدین قدس سرہ کی تالیف نفحات الٰہیہ کے مشکل مقامات کے بارے میں استفسار کیا گیا ہے۔ فقیر کو یہ بات اتنی اچھی لگی کہ ان مسائل میں جو کچھ بطریق وجدان ظاہر ہوا ہے جواب میں لکھتا ہے۔ اور شیخ کے کلام پر اس مکتوب کی تطبیق آنجناب کی فہم کے حوالہ کرتا ہے۔

علوم وجدانیہ میں سے ایک یہ ہے کہ عالم اعلیٰ میں حوادث کی صورتیں متحقق ہوتی ہیں۔ اور بنی آدم میں سے نفوس زکیہ ان صورتوں کو بطریق انعکاس اس عالم اعلیٰ سے لیتے ہیں۔ ان کو اختیار کرنے کی شکلیں مختلف ہوتی ہیں۔ کبھی ان صورتوں کو جیسی کہ وہ ہیں بعینہ بغیر اختلاف صورت کے لے لیتے ہیں اور کبھی ایسے اختلاف کے ساتھ کہ اس راز کے کشف کی تعبیر ہو سکتی ہے۔

اور اختلاف کا سبب دو میں سے ایک امر ہوتا ہے یا تو یہ کہ اس نفس میں کوئی سختی قسوۃ حقیقت کے نقش میں مانع ہوتی ہے۔ اس لئے نقش نہیں ہوتی۔ مگر جسم اور مثالوں کے پس پردہ ایک چیز آئینہ کی طرح زنگ کا ملمع کر دیتی ہے کہ بعینہ اس صورت کی کاشف نہیں ہو سکتی۔ یا یہ ہے کہ اس نفس کو علوم نشأت و تطابق بعض وہی یا بعض بوجہ کمال دیتے ہیں۔ اور اس جگہ راز یہ ہے کہ یہ نفس تجلی اعظم کی حقیقت کے ساتھ سارے عالم کے لئے جمع ہے۔ اور صورت الٰہیہ میں بوجہ قہر و تاثر۔ اور اس کی تفصیل کا عالم یہ ہے کہ اظہار مغلوبیت و تاثیر کے رنگ میں ربط جلی

واقع ہے۔اور وہ ربط علوم نشأت کے فیضان کا موجب ہوتا ہے۔اسے جانیں یا نہ جانیں۔ چنانچہ وہاں جمع علوم اور اوقات کا حکم ہجوم کرتا ہے اور اس صورت کو جسم اور مثالوں میں لیتے ہیں۔اسی جگہ سے کشف متوسطوں کی تعبیر کے بغیر اور مبتدیوں کی اور ملتھیوں کی تعبیر کے ساتھ ہوتا ہے۔ایسا بھی بکثرت ہوتا ہے کہ عارف کے خواب متعدد بطون کے نشأت ومزاج رکھتے ہیں۔اور ہر بطن ایک الگ حادثہ پر دلالت کرتا ہے۔یا یہ ہے کہ اس کے افاضہ کی اصل سے مراد وہ علمی خواب ہوتا ہے،اور اس خاص صورت سے مراد دوسرا علم ہوتا ہے اور ان امور کی فہم تک پہنچنا کچھ دشوار نہیں ہے۔

یہاں ایک نکتہ ہے اس کو بھی جان لینا چاہئے کہ ان علوم میں ان کے افاضہ کا سبب فقط مفاض کی استعداد ہوتی ہے بلکہ اصلاح عالم کا ارادہ اور اس علم کا تعدیہ واضافہ اس تبع سے تمام نفوس بشریہ سے بھی ان کے افاضہ کا سبب ہوتا ہے۔اور ان سے مراد انبیا کے علوم ہیں۔تبلیغی احکام میں اس فنا و پردہ کو نہیں گزارتے ہیں۔یا وہ ہے کہ تعبیر کا کشف کرتے ہیں۔یا یہ ہے کہ حقیقت حال عنقریب روشن کردیتے ہیں تاکہ کوئی اشتبا واقع نہ ہو۔اور اصلاح عالم میں خلل کی صورت پیدا نہ ہو۔اور ان میں سے ایک یہ ہے کہ عالم مثال شہادت اور غیب کے درمیان برزخ ہے۔اسی جہت سے شہادت وحضور کا ایک رنگ پیدا ہوتا ہے اور عالم مثال میں شامل ہوجاتا ہے۔اور اجمالی تدبیر کو جو کہ عالم غیب سے مثال کے راستہ سے گزرتی ہے،ایک خاص صورت اختیار کرتی ہے۔اس کی مثال یہ ہے کہ زمین سے ابخارات اٹھتے ہیں اور زمہریر کے طبقہ میں پہنچ جاتے ہیں اور اس جگہ سے پوشیدہ بارش کی شکل میں زمین پر گرتے ہیں۔اور سبزہ کے اثبات اور ہوا کی رطوبت کی شکل میں تاثیر ظاہر ہوتی ہے۔فقیر کے نزدیک اسماء اور ادعیہ کی تاثیر غالب اسی دقیقہ سے متفرع ہے۔بنی آدم کے افراد اس کے پابند ہوتے ہیں اور ان کا تفرع وانقسام ان کی شکل اختیار کرتا ہے۔اور عالم مثال میں جسم صحیح شکل میں پیدا ہوتا ہے۔ اور جسموں کی صورت ملائکہ عنصریین کے قلوب میں فیضان کرتی ہے۔چنانچہ ان دعاؤں کا سلسلہ ہوتا ہے جو ملائکہ عنصریین کے قلوب کو ان کے ذریعہ حرکت دی جاسکتی ہے۔اسی جہت سے آثار عجیبہ بروئے کار آتے ہیں۔اور اسی مقام سے اعمال کا فساد اور عالم کی وضع بعض اعمال کی تاثیر میں نقصان دیتے ہیں۔اور کبھی عنایت الٰہی عالم مثال میں زمین پر آنے کے

لئے مستعد ہوتی ہے۔تقویت کی جہت سے اہل صلاح کا معاملہ اوران کے حال کی اصلاح اس وقت میں یہ صالح ذکر عنایت ہوتا ہے۔اوراس کا ہدف ہوتا ہے اوراس کی محبوبیت اس شخص کی محبوبیت سے زیادہ سخت ہوتی ہے جو اس سے مختلف حالت میں ہوتا ہے۔اگر چہ بالفعل اس کے اعمال کے آثار ظاہر نہیں ہوتے اور وعدہ ابر آخرت کے علاوہ کے دائرہ کی وسعت کا ہوتا ہے۔اوران میں سے ایک یہ ہے کہ نفس کلیہ صورتوں کا منبع ہے۔اور ہر صورت جو دنیا میں جوہر اورعرض سے پیدا ہوتی ہے، اسی مقام سے آتی ہے۔لیکن ان صورتوں کا نزول گھومنے والے گھوڑے کی چال کی طرح ہوتا ہے کہ اس کے چلنے میں فرصت یا امکان وجود کے لئے گنجائش نہیں ہوتی۔جیسے کسی انسان سے غیب کے پردہ سے نقطۂ محبوبیت عالم شہادت میں ظہور کرتا ہے۔اسی کی طرف حدیث میں اشارہ کیا گیا ہے احببت ان اظھر فخلقت الخلق ''میں نے چاہا کہ خود کو ظاہر کروں تو میں نے مخلوق کو پیدا کیا۔''اس فرد کا پیدا ہونا اس وقت تک نہیں ہے، جب تک فرد معدنی پیدا ہو اور دنیا میں اپنی عمر کی مدت قیام کرے۔اوراس کے بعد لباس شہادت وحضور اتارے۔اوراس لباس سے ایک لباس معنوی اتارے اوراپنے ساتھ لے جائے تو نقطۂ محبوبیت اس لباس میں پوشیدہ ہو جائے۔پھر اس عالم میں ایک فرد نباتی پیدا ہو جاتا ہے اور وہ حال ہو جاتا ہے جو ہم نے بیان کیا۔پھر حیوانی اور پھر انسانی ہوتا ہے پھر جب کام مکمل ہو جاتا ہے اور نقطۂ محبوبیت اپنی مراد کو پہنچ جاتا ہے۔اوراس لباس کے پہننے اور اتارنے میں ایک کو اختیار کرنا اور ایک جگہ میں صرف کرنا ہے۔اپنے آثار میں تصرف طبیعت کے مشابہ ایک تصرف ہے۔اور یہ بحث جوہری صورتوں میں ہے۔اوراسی طرح کا حکم عرضی صورتوں میں ہوتا ہے کہ اعمال خیر وشر بھی اسی قبیل سے تعلق رکھتے ہیں۔مثلاً نیک لوگوں کی ایک جماعت کسی عمل خیر کے ذریعہ تقرب حاصل کرنا چاہتی ہے۔اوران کی ہمت کا ساتھ ملاء اعلیٰ دیتے ہیں تو وہ عمل منظور ہو جاتا ہے اور قبولیت کا درجہ حاصل کر لیتا ہے اوراس کو تجلی اعظم کی جانب سے تجلی اعظم کے رنگ میں ایک خاص خلعت پہناتے ہیں۔پھر بنی آدم اس عمل کے ذریعہ دوسرے دورہ میں مامور ہوتے ہیں۔اور یہ بار زیادہ تر اول محل سے رحمت اور منظور نظر ہو کر لطف ہو جاتا ہے۔اوراجر کے بڑھنے کا موجب ہو جاتا ہے۔اوراس حدیث میں اسی معنی کی طرف اشارہ ہے کہ حضرت موسیٰ صلوات اللہ والسلام علیہ کی امت نے بہت عمل کیا اور تھوڑا

سا اجر پایا۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی امت نے اس سے کم علم کیا اور انتہائی اجر پایا اور حضرت پیغمبرؐ کی امت عمل میں ان سے بہت کم رہی اور دوہرا اجر پایا۔ اس سلسلہ میں یہ اعتراض وارد نہیں ہوتا کہ خدائے تعالیٰ نے فرمایا ہے لاتزر وازرۃ و زر اخری "کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔" اس لئے کہ یہ تدبیر حوادث ساویہ کا حکم رکھتی ہے جو آدمی کے اختیار کے بغیر اس پر گزرتی ہے۔ اور آیت کا محل بشری اختیار کے اعمال ہیں ۔ والسلام والاکرام.

۷۱۔ **تفہیم:**

زمانہ میں اللہ کے نزدیک پسندیدہ سلوک کا بیان

معلوم ہوا کہ اس زمانہ میں اللہ کو خاص طور سے یہ سلوک پسند ہے کہ سالک پہلے بیداری کے وقت کی طرح طہارت اختیار کرے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ خلوت اختیار کرے، اور کھانا پینا کم رکھے، اور مکرر غسل کرے، اور طہارت کی پابندی کرتا رہے یا نور کا ذکر کرے اور نور بسیط کے ملاحظہ کو لازم قرار دے۔ اور احوال کے اختلاف کے لحاظ سے چند روز نور طہارت کو روشن کرے۔ اس سلسلہ میں حدیث نفس اور اخلاط ردیہ دمویہ وسوداویہ کی کثرت اور منی سے تناسل کے دواعی کا امتلا اور حیوانات ملعونہ کی صحبت، نور طہارت کے ظہور کے لئے رکاوٹ ہوتی ہے، ان سے اجتناب کیا جانا چاہئے۔ نور طہارت کے ظہور کی علامت، راحت پہنچانے والے واقعات، اطمینان خاطر، نفس کی انسیت، بغیر لذت حسیہ حاصل کئے اور حدیث نفس کے لئے تنہا بیٹھنا اختیار کرے۔

اس کے بعد ملاء اعلیٰ کی مناسبت کا اکتساب کرے اور یہ تین چیزوں سے حاصل ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ خلوت اختیار کرے، نماز کثرت سے پڑھے اور سورہ فاتحہ اور ربنا لاتزغ قلوبنا الخ جیسی آیت پر اکتفا کرے۔ اور رکوع وسجود میں کوئی ذکر تسبیح وغیرہ نہ پڑھے۔ ذکر و تسبیح کے بجائے نور پر نظر ڈالے۔ جب نماز شروع کرنی چاہے، اس سے پہلے وضو کر کے قبلہ کی طرف متوجہ ہو کر بیٹھے۔ اور اپنے دل میں رشتہ نورانی فرض کرے کہ اس کی ایک جانب دل کے اوپر پائے جانے والے سیاہ نقطہ میں ہے اور دوسری جانب اس نور سے متعلق ہے جو عرش کے

اوپر ہے۔ جب یہ تصور دل نشین ہو جائے تب نماز شروع کرے اور نماز کے دوران دل کی نظر کو اس رشتہ سے نہ ہٹائے اس طرح کی نماز مکرر قریب دو رکعت روزانہ ادا کرے تو لازماً ملاء اعلیٰ سے مناسبت پیدا ہو جائے گی۔

اور دوسرے یہ کہ زبان سے یا اللہ! یا اللہ! کا ورد کرے اور تصور کرے کہ اس لفظ کی ادائیگی کے وقت ایک نور اس کے منہ سے نکلتا ہے۔ اس طرح قریب تین سو ہزار بار کہنے کے بعد اس کو اس اسم کی حقیقت سے ایک مناسبت پیدا ہو جاتی ہے جو کہ عالم ملکوت میں مستقر ہے۔ تیسرے یہ کہ خلوت میں اللہ تعالیٰ سے بکثرت مناجات کرے اور دینی و دنیوی چھوٹی بڑی تمام حاجات کا ذکر کرے۔ اور ہر مکروہ سے پناہ طلب کرے اور اپنی ہمت وقوت کو فانی سمجھے اور حق سبحانہ کو اپنے سامنے تصور کرے۔

اور نور صلاۃ کے حصول کی علامت خلوت صلاۃ میں راحت پانا اور نماز میں مجرد حضور دل کی نظر ملاء اعلیٰ کی جانب کھولنا اور اس کی محبت اپنے اندر پانا اور ان کی نسبت اپنے اندر ایک انجذاب وانس دیکھنا ہے۔

اور اسم مبارک کے نور کے حصول کی علامت اس اسم سے دلبستگی اور اس اسم کی نسبت سے اپنے اندر شغف وانس اور لذت پانا ہے۔

اور نور مناجات کے حصول کی علامت اس کے دل کی دنیا کے دل میں رقت اور مناجات میں لذت ہے۔ جب سلوک کی راہ اس قدر طے کر لی تو طاعات پر وقت کی تقسیم کو جو کہ اہل تصوف کے درمیان ایک مشہور فصل ہے، مامور کرے۔ بلاشبہ صلوات اور دعاؤں کے ان اصولوں کی تمہید کے بعد سالک کے نفس کی تہذیب ہو جائے گی۔

چنانچہ چاہیئے کہ مقامات قلب پر نظر رکھے کہ صبر اور یقین دونوں راستے اس کے مانند ہیں کہ کونسا ظاہر ہوا اور کونسا ظاہر نہیں ہوا۔ جو ظاہر نہیں ہوا اس کو اس کے استحسان کے اعتقاد اور اس کے گمان میں وقوع سے بیداری ہوتی ہے۔ اور اس کے بعد نسبت اویسیہ کو پالنا ہے۔ اس کے بعد یادداشت کو۔ اور خاص اس زمانہ میں توحید کی نسبت ان تمام نسبتوں کو جمع کرنا پسندیدہ ہے۔

۷۲-تفہیم:

بدی کا بدلہ اسی کے برابر اور نیکی کا دس گنا ہونے کا راز

اللہ نے ہمارے بھائی پر احسان کیا جو وجدان اور ذوق سے جن چیزوں کا ادراک کیا جاتا ہے، ان کے سلسلہ میں توفیق پانے والے کو ملنے والے فوق الفوق کی طرف متوجہ ہے۔ یعنی شیخ محمد عاشق، اللہ ان کو سلامت و باقی رکھے، اور جس کی وہ تمنا کریں ان کو عطا کرے۔

امابعد، شریعت متواترہ میں وارد ہوا ہے کہ اللہ بدی کا بدلہ اسی کے برابر دیتا ہے اور حسنہ کا اس سے دس گنا۔ اللہ تعالیٰ تمہاری معرفت کو اس کے ذریعہ بڑھائے۔ تم نے مجھ سے اس امر کے راز کے بارے میں سوال کیا ہے تو میں کہتا ہوں وباللہ التوفیق۔ یہ مسئلہ دو مقدموں پر موقوف ہے۔ ایک یہ کہ بلاشبہ جو صورت اپنے آپ میں اس گھوڑے کے لئے کشف کرنے والی ہے، وہ اس صورت سے مختلف ہوتی ہے جو اس گدھے کے لئے کشف کرنے والی ہوتی ہے۔ اور یہ مقدمہ بدیہی، وجدانی ہے۔ اس لئے ہم اس مسئلہ پر گفتگو کرتے ہیں کہ کیا اس صورت کا اختصاص اس سے ہے، اور اس کا ان اوصاف جسمانی رنگ اور مقدار وغیرہ سے؟ ہرگز نہیں، بلکہ ہمارے نفس میں وہ اوصاف جسمانی بالکل نہیں ہیں۔ تو انسان کو یہاں سے سمجھنا چاہئے کہ عالم مثال اور عالم شہادت میں مناسبات جبلی اور مناسبات طبیعی ہیں۔ ان کو مصلحت کلیہ نے واجب قرار دیا ہے اور ان مناسبات پر خوابوں کا معاملہ مبنی ہوتا ہے۔

دوسرا مقدمہ جان لو کہ انسان جب اچھا یا برا عمل کرتا ہے تو اس کی طرف شخص اکبر میں پیدا ہونے والے قوی ادراکیہ بڑھتے ہیں۔ جن کا تحقق اس شخص میں اسی طرح واجب ہوتا ہے جس طرح ہر فلک میں، جو ضرورت عقلی سے حرکت کرتا ہے۔ مرکز، منطقہ، قطبین اور محور کا تحقق واجب ہوتا ہے۔ اور یہ قوی نوری جسموں میں ودیعت کئے ہوئے ہوتے ہیں، ان کو ملاء اعلیٰ کا نام دیا جاتا ہے، اس امر پر تمام اہل ذوق کا اتفاق ہے، تو اس صورت میں یہ انسان نقش ہوتا ہے جو کہ اس عمل کا عامل ہوتا ہے جو عالم مثال میں اس کے مقابلہ میں متحقق ہے۔ یہ بمنزلہ اس صورت کے ہے جو انجینئر گھر کو خارج میں بنانے سے قبل کاغذ پر بناتا ہے۔ اور یہ تصویر سازی ملاء اعلیٰ کی تاثیر کی طرح ہوتی ہے تو جس کو اچھا سمجھتے ہیں، اس کو نقطۂ نورانیہ میں نقش کرتے

ہیں، اور جس کو برا سمجھتے ہیں، اس کو نقطۂ ظلمانیہ میں۔ اور یہ نقاط اس طرح ہوتے ہیں کہ ان سے دنیا اور آخرت میں جزا کی کیفیت ظاہر ہوتی ہیں۔ یہ بمنزلہ اس کے ہوتا ہے جس کو گھوڑے کی صورت سے خارج میں موجود گھوڑے کی حقیقت سے بیان کیا جاتا ہے۔ اور یہ ان جبلی مناسبتوں کی وجہ سے ہے جو مصلحت کلیہ سے پیدا ہوتی ہیں، جیسا کہ ہم نے صورت خیالیہ کا حال بیان کیا۔

جب تم نے ان دونوں مقدموں کو سمجھ لیا تو ہم کہتے ہیں۔ مثل اس امر سے عبارت ہے جس کا تقاضا اس نقطۂ نورانیہ یا ظلمانیہ کی طبیعت کرتی ہے۔ جس کا بیان یہاں جزا کے امر کو لکھنے کے وقت کیا جاتا ہے۔ پھر یہ کہ جب انسان دنیا سے پیچھے ہٹ جاتا ہے، تو اس کی بہیمیت ضعیف اور ملکیت قوی ہو جاتی ہے۔ تو اگر اپنے رب پر ایمان رکھنے والا ہے اور اس کے اور اس کے رب کے درمیان دروازہ کھلا ہوا ہے، خواہ سوئی کی نوک کے برابر ہی کیوں نہ ہو، وہ اس دروازہ کو بڑھا لیتا ہے۔ اور اس پر ملکیت کے انوار نازل ہوتے ہیں تو اس وقت وہ نقطہ اس طرح دکھائی دیتا ہے کہ واضح طور پر وسیع ہو چکا ہوتا ہے۔ تو شرع میں کہا جاتا ہے کہ مومن کو اس کی حسنات کے بدلہ میں دس گنا زیادہ بدلہ دیا گیا اور اگر اس نے بدی کی اور انوار ملکیہ آ گئے تو برائی معدوم ہو گی یا بالکل مضمحل ہو گی۔ اور اگر محو نہیں ہوئی اور نہ مضمحل ہوئی تو وہاں اس نقطہ کے لحاظ سے صرف اس برائی کے برابر ہی رہ جائے گی۔ تو شرع میں کہا جائے گا، مومن کو اس کی سیئات کے برابر جزا دی گئی۔ یا اس سے معاف کر دیا گیا۔ اور جہاں تک اس شخص کا سوال ہے کہ اس کے اور اس کے رب کے درمیان باب بالکل ہی نہیں کھلا تو وہ تمام آزمائشوں میں مبتلا ہے۔ ہم اس قدر پر اکتفا کرتے ہیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ اسی میں کفایت ہو جائے گی۔
والحمد للہ اولا و آخرا۔

۷۳- تفہیم:

دعائیں

اے اللہ! ہر چیز کے مالک اور بادشاہ! میں تجھ سے ان علوم کا سوال کرتا ہوں جو تو نے اپنے بندے اور رسول سیدنا محمدؐ پر نازل کئے جو تیری مخلوق میں منتخب و چنیدہ اور تیری مملکت کے

دولہا ہیں۔ تیری صلوات وتسلیمات آپؐ پر یوم التناد (قیامت کے دن) تک بلکہ ابدالآباد تک نازل ہوتی رہیں۔ اور تیرے ان علوم کا سوال کرتا ہوں جو تو نے آپؐ کے بھائیوں انبیا و مرسلین پر نازل کئے۔ اور جن کا الہام آپؐ کے اہل بیت طیبین وطاہرین اور آپؐ کے ہدایت یافتہ اور ہدایت دینے والے صحابہ اور تمام فقہاء مجتہدین اور ثقہ محدثین اور صاف و پاکیزہ صوفیا پر ان کے طبقات کے اور ان کے مقامات کے اختلاف کے لحاظ سے کیا جیسا کہ تو ان کو جانتا ہے۔ اور اے اللہ! میں تجھ سے تیری تجلی اعظم کے عکسوں کا سوال کرتا ہوں جو انبیا و مرسلین اور انبیا کے انوار کے بہترین وارثوں کے سینوں میں نقش ہوئے۔ اور ان کے اصحاب واحباب کے سینوں میں قیامت کے دن تک بلند ہونے والے عکسوں کی شعاعوں کا سوال کرتا ہوں۔

اور اے اللہ! میں تجھ سے ان تمام علوم، عکسوں، روشنیوں اور شعاعوں کا سوال کرتا ہوں جن کی مقداریں مختلف اور جن کے مراتب میں فرق ہے۔ جب وہ وجود ناسوتی سے قبل وجود ملکوتی میں تیرے نزدیک باہم مجتمع ومخلوط ہو کر چمٹے تو تو نے ان کی طرف رحمت ورافت اور استحسان کی نظر سے دیکھا۔ اور ان کی تربیت تیری قدرت کے اختیار میں ہے جیسے انسان کی تربیت پھولوں اور ان کے پودوں کی طرح کی جاتی ہے۔ پھر جب عالم ارضی میں جنین تیار ہو گیا، اس میں روح پھونک دی، اور وہ نفس کلیہ میں بدلنے کے قریب ہو گیا جو کہ تیرے جمال کا آئینہ تیرے کمال کے ظاہر ہونے کی جگہ ہے۔ اس جنین کی مقدار کا نفس جزئیہ ہے، اس میں تو نے اپنے عرش، کرسی، آسمان وزمین اور تو نے آسمان وزمین میں جو تمام پیدا کئے ہیں، ملائکہ اور موالید ثلاثہ سب کو ودیعت کر دیا اور اس میں تو نے ملاء اعلی، حقائق الانبیا اور رسولوں، اپنے تمام کامل بندوں کو ودیعت کر دیا اور اس میں ان عکسوں کو بھی ودیعت کیا جو ظاہر ہونے والے ہیں، خواہ وہ شخص واحد کے لحاظ سے اجمالاً چمٹے ہوئے ہیں یا نہیں۔ اور بیشمار اشخاص کے طور پر اس کی وضاحت دوسری تفصیل کی شکل میں کی گئی۔ پھر اس شخص واحد کو از سر نو عالم کے طور پر چلایا گیا جس میں وہ سب کچھ شامل ہے جو عالم کبیر میں ہے۔ وہ حقائق الحق والکون کے لئے نسخہ جامعہ ہے اور تیرے عکسوں، روشنیوں، اور علوم کی قسموں کے لئے مکمل داعیہ ہے۔ تیری تجلی اعظم کے لئے نمونہ ہے، نفس کلیہ سے پھوٹنے والا چشمہ ہے۔ وہ اپنی انانیت کبری سے جوش مارتا ہے۔ جو کہ اس لوح کی طرح ہے جس پر تمام انانیات صغری کی تصویر بنائی گئی

ہو۔اوران تمام امور کواس کی نظر میں جمع کر کے اس کے نفس ناطقہ نے تیرے نبی یوسف علیہ السلام کی زبان میں خفیہ اشارہ کیا۔ جب انہوں نے کہا رب قدآتیتنی من الملک و علمتنی من تاویل الاحادیث فاطر السموات والارض انت ولی فی الدنیا والاخرۃ توفنی مسلما والحقنی بالصالحین ''اے میرے رب تو نے مجھے حکومت بخشی، اور مجھ کو باتوں کی تہہ تک پہنچنا سکھایا، زمین و آسمان کے بنانیوالے، تو ہی دنیا اور آخرت میں میرا سرپرست ہے، میرا خاتمہ اسلام پر کر اور انجام کار مجھے صالحین کے ساتھ ملا۔'' (یوسف ۱۰۱) فحاشا جناب یوسف اس طرح کی جامع وکامل دعا اپنے نفس میں جمع ہونے والی باتوں کی جہت سے نہیں کر سکتے، جو سفلیات سے جوش مارتی ہیں۔ وہ اس سے دور ہیں اور بہت دور ہیں۔ انہوں نے یہ بات اس نظر کی ترجمانی کرتے ہوئے کہی، جو ثابت ہے، اوّلاً اس جمع اور اجمال کی، اور دوسرے کشف وتفصیل کی مقتضی ہے۔ بلکہ اس حقیقت جامع کی ترجمانی کرتے ہوئے کہی جو یوسفؑ وغیرہ پر مشتمل ہے جن میں کہ یہ خصائل شامل ہیں۔ چنانچہ اس وقت اشارہ کیا گیا کہ حقیقت جامعہ یوسفؑ پر اور ان تمام پر مشتمل ہے جو اس طرح کے خصائل میں شریک ہیں۔ میں تجھ سے استعداد کا سوال کرتا ہوں اور تو کسی ایسے سائل کو ناامید نہیں کرتا جو تجھ سے استعداد کا سوال کرتا ہے کہ ان نمونوں کا حامل آخر زمان میں شخص واحد ہو۔ جب تو دنیا کو کمالات انسانیہ کی قسم سے اس کی بادشاہی اور ملکیت کے انقضا کا حکم دے اور اس کو باتوں کی تہہ تک پہنچنے کا علم سکھائے جو صرف اس جامعیت سے پیدا ہوتا ہے۔ اور تو دنیا وآخرت میں اس کا ولی ہو۔ اور اس کے معاد و معاش اور تمام احوال میں ظاہری اور باطنی طور پر اس کے معاملہ کا ذمہ دار ہو جس طرح دایہ، انا بچہ کے معاملہ کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ تیری ہمت اور قوت کے بغیر کہیں نہ پھرے۔ اور اس کو صالحین میں شامل فرما۔ اور صالح بھی کیسا جس کی شان مکمل اور برہان اعظم ہے۔ تیری مخلوق میں سے منتخب اور تیرے ملک کا دولہا محمد صلوا تک علیہ اور تیرے ارشاد میں دوسرا خفیہ اشارہ کیا گیا ہے۔ وھو الذی انشاکم من نفس واحدۃ فمستقر ومستودع ''اور وہی ہے جس نے ایک جان سے تم کو پیدا کیا۔ پھر ہر ایک کے لئے ایک جائے قرار اور ایک سونپے جانے کی جگہ ہے۔'' (الانعام ۹۸) اور بلاشبہ یہ خطاب افراد انسان، حیوان اور موالید سب کے لئے ہے۔ اور یہ

سب صرف نفس کلیہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ نفس کلیہ میں ظہور متعینہ کے دو وجود ہیں۔ ایک وجود استقرار، اور وہ نفوس جزئیہ ہیں جو ابتداء خلق سے انتہائے امر تک ظاہر ہیں۔ دوسرے وجود استبداع اور وہ جمع کی ہوئی استعداد اور خفیہ طور پر جمع کی ہوئی تحریریں ہیں جو اس نفس میں ودیعت کی گئی ہیں جس کو تو نے از سر نو عالم اور نسخہ جامعہ اور مکمل داعیہ بنایا ہے۔

اے اللہ! اور میں تجھ سے تیری اس نظر خاص کا سوال کرتا ہوں جس سے تو نے اس میں پلٹ دیا جو ایک کے بعد ایک طبق تھا۔ اور اس میں بدلا جو یکے بعد دیگرے حال تھا۔ حتی کہ وہ تجھ میں فنا ہو گیا اور اس کا کچھ بھی باقی نہ رہا۔ نہ وہ بعینہ رہا، نہ اس کا اثر، ذکر یا خبر رہی، وہ پہلو جو منتقل ہوا، تیری محبت کا نقطہ تھا۔ جس کے شہادت و حضور کی طرف منتقل ہونے سے نفس جزئیہ پایا جاتا ہے۔ پھر نامویہ میں داخل ہوتا ہے۔ پھر نباتی جدا ہونے والے جسم پر سوار ہوا۔ پھر جب وہ نباتی جسم کھل گیا اور نقطہ جدا ہو گیا تو اس نے تیری طرف رجوع کیا۔ اور تیرے سامنے روحانی لباس پہن کر کھڑا ہو گیا جو جسم نباتی کے مدمقابل ہوتا ہے، تو نے اس کو نظر امتنان واستحسان سے دیکھا اور حکم دیا کہ جدا ہونے والے حیوانی جسم پر سوار ہو جا۔ پھر جب وہ جسم حیوانی کھل گیا اور اس سے نقطہ جدا ہو گیا تو اس نے تیری طرف رجوع کیا اور تیرے سامنے وہ روحانی لباس پہن کر کھڑا ہو گیا جو جسم حیوانی کے مدمقابل ہوتا ہے۔ تو نے اس پر رحم کیا، اس کا اکرام کیا۔ اس کے ساتھ احسان کیا اور اس کو حکم دیا کہ جدا ہونے والے انسانی جسم پر سوار ہو جا۔ پھر اس میں روح پھونک دی۔ اور تو اس کی طرف اپنی تجلی اعظم سے نعمت، رحمت اور رافت کے ساتھ متوجہ ہوا۔ اور اس کو اپنی نظر سے تکریم اور تعظیم کے ساتھ گھیر لیا۔ تو تو نے اس میں اس نظر سے اچھائی پائی جیسے سورج کھلے آئینہ کے سامنے آتا ہے۔ تو اس میں شعلۂ نور پیدا ہوتا ہے۔ تو یہ شعلہ تیری اپنی مخلوق میں سے تھا جو تیری جبروت کی حکایت بیان کرتا ہے جیسے دن میں پانی کی حوض سورج کی روشنی کی حکایت اس وقت بیان کرتی ہے جب نصف النہار اور ہوا کے رک جانے کے وقت صاف ہوتی ہے۔ چنانچہ تیری جبروت میں اس طرح فنا ہو جاتا ہے جیسے شعاع صاحب شعاع میں، اور عرض جوہر میں، اس حیثیت سے کہ عرض کا وجود فی نفسہ اس کی وضع کا وجود ہے۔ پھر جب تو نے اس کو دنیا سے قبض کر لیا، اٹھا لیا تو قبض اس کے لئے دوسری پیدائش ہو گئی۔ چنانچہ جوہر تیری جبروت کی شعاع ہو جاتا ہے۔ اور نفس ناطقہ شے

زائد ہو جاتا ہے۔ جیسے انسان کے ہاتھ میں چھٹی انگلی ہوتی ہے۔ اس سے صرف خاص طور سے تیری قضا کی تعیین ہوتی ہے۔ پھر تیری دوسری شان نہیں ہوتی جس کی وجہ سے روح ہوائی مضمحل ہو جاتی ہے نفس معدوم ہو جاتا ہے اور جوہر پوشیدہ ہو جاتا ہے۔ اور شعاع معدوم ہو جاتی ہے۔ اس وقت سفر مکمل ہو جاتا ہے اور دورہ پورا ہو جاتا ہے۔ نقطۂ محبت اپنے مبتدا کی طرف لوٹ جاتا ہے۔ اور سفر کی تکان سے آرام کرتا ہے۔ اس وقت زبانیں اس کی تعریف و توصیف چھوڑ دیتی ہیں اور خیالات اس کے وصف سے قاصر رہ جاتے ہیں۔

اے اللہ! اور میں تجھ سے تیرے مقدس داعیہ کے سرایت کرنے سے تیرے تقدس کے سمندروں سے اٹھنے والے اور مصلحت کلیہ سے پیدا ہونے والے تیرے نور کے خالص ہونے کا سوال کرتا ہوں، جو اس صاف شفاف جوہر میں مصلحت جزئیہ ہونے والی ہے۔ جیسے سمندر کی بارش کا ساحل کے قریب برسنا۔ پھر اس شخص سے روح اور راز میں اس رطوبت کے ظہور کا، پھر اس شخص سے قلب وعقل (دل ودماغ) میں جو رطوبت نازل ہوتی ہے۔ پھر اس کے اثر کے اقطار ارض تک مشرق ومغرب میں خشکی اور سمندر میں اس ہوا کی طرح پھیلنے کا جو گیلی زمین کے اوپر سے گزرتی ہے جو گارا ہو جاتی ہے تو جب ٹیلوں اور مٹی کے ڈھیر پر سے گزرتی ہے تو ان کو مرطوب کر دیتی ہے سوائے ہر خشک اور دور دراز چیز کے جو مصلحت کے مطابق جھکنے سے انکار کر دیتی ہے۔

اے اللہ! اور میں تجھ سے اس شخص کے تیری اس شان کے لئے اطاعت گذار ہونے کا سوال کرتا ہوں جو تو نے اس زمانہ میں اختیار کی ہے۔ بیشک تیری ہر روز الگ شان ہے۔ اور تیرے نزدیک ایک دن ہزار سال کی برابر ہے، جو لوگ گنتے ہیں۔ اور انسان کی صورت صاف شفاف جوہر میں اس طرح ڈھلتی ہے۔ جیسے آئینہ میں شعلہ کی صورت ظاہر ہوتی ہے، جب تاریک رات میں روشن چراغ اس کے سامنے لایا جاتا ہے، یا نیر اعظم کی صورت پانی کے پیالہ میں ظاہر ہوتی ہے۔ پھر علوم کی شاخوں کا سوال کرتا ہوں، جو اس شان کے مناسب ہوں، جو روح اور راز اور قلب وعقل کے جوہر سے قریب ہوتی ہے۔

اے اللہ! تو نے فرمایا ہے اور تیرا فرمان حق ہے۔ اللہ نور السموات والارض، مثل نورہ کمشکوۃ فیھا مصباح، المصباح فی زجاجۃ، الزجاجۃ کانھا

کوکب دری یوقد من شجرۃ مبارکۃ زیتونۃ الایۃ ''اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔(کائنات میں)اس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے ایک طاق میں چراغ رکھا ہو۔ چراغ ایک فانوس میں ہو، فانوس کا حال یہ ہو کہ جیسے موتی کی طرح چمکتا ہوا تارہ۔ اور وہ چراغ زیتون کے مبارک درخت کے تیل سے روشن کیا جاتا ہو۔'' (النور ۳۵)

تو نے زیتون کو اس داعی و مبلغ کے لئے مثال بنایا جو تیرے خالص قدس سے نازل ہوتا ہے۔ اور تو نے چراغ کو جو کہ یہاں بمعنی فتیلہ ہے۔ صاف شفاف جوہر کے لئے مثال بنایا۔ اور فانوس کو روح اور راز کے لئے اور طاق کو قلب اور عقل کے لئے مثال بنایا۔

اے اللہ! تیرے اس مبلغ کو اس کے تمام امور و معاملات میں حاکم مقرر کرنے کا سوال کرتا ہوں کہ یہ اسی طرح تیری قدرت میں ہے جیسے مردہ غسل دینے والے کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ اس کا ارادہ تیرے ارادہ کے تحت ہے اور اس کا قصد تیرے قصد میں فنا ہے اور اس کا اختیار تیرے اختیار میں محو ہے۔ وہ کوئی حرکت نہیں کرتا اور وہ صرف تیری وجہ سے اور تیری قدرت اور ارادہ سے کمزوری دکھاتا اور خوش ہوتا ہے۔

اے اللہ! جو کچھ میں نے ذکر کیا ہے اس کا سوال کرتا ہوں کہ مجھے اس نور وجدانی ذات سے ملا دے جو اوصاف کے لحاظ سے متعدد ہے بلکہ اس میں فانی ہے۔ اس کے ساتھ قائم بنا دے حتیٰ کہ تیرے حاکم بنانے سے تیرے اس کو حاکم بنانے کے ضمن میں اس جھونکے کی طرف لوٹے۔ اور مجھے اپنی رحمت کے ضمن میں اپنی رحمت کی نظر میں شامل فرما لے۔ اور اپنی ان بشارتوں کے ضمن میں اپنی بشارت سے روشن کرنے کے لئے جس کو تو نے دوچند کرنے میں اس میں نافذ کیا۔ جامع ہے تیری کتاب کے لئے۔ اور تیری مقدس مجرد روشنیوں کے لئے حکایت کے ضمن میں۔ اس کے صاف و شفاف جوہر سے تیری ایک روشنی نے مجھ پر غلبہ پالیا۔ اور تیری اس شان نے میرا احاطہ کر لیا جو اس زمانہ میں اس سے قریب ہے۔ اور جس کو تو نے اس کا ترجمان۔ اس کی طرف سے بولنے والا، اس سے اس کے احاطہ کے ضمن میں اس کو بیان کرنے والا بنایا۔

اے اللہ! اور میں تجھ سے سوال کرتا ہوں کہ مجھے اس صاف شفاف جوہر سے ملا دے، حتیٰ کہ میں اس کے ساتھ دنیا اور آخرت میں شے واحد کی طرح ہو جاؤں۔ اس کے ساتھ مخلوط، اس

کے وجود کے ساتھ موجود، حتی کہ اس کے دوام کے ساتھ دائم۔ تیری شانوں میں سے ایک شان، اوراس کے تجھ سے ہونے کے ضمن میں تیری روشنیوں میں سے ایک روشنی ہو جاؤں۔

اے اللہ! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اور تجھ سے الحاح کرتا ہوں کہ راز و روح اور فنا کے مقام سے میری تمام حاجتیں پوری فرما جن کا تو نے ان کی زبان سے مجھ سے وعدہ کیا۔ اور اپنے انوار میں سے ایک نور کو میرے ہاتھ پر پورا فرما، جس کو تو نے ان کی زبان پر ظاہر فرمایا۔ اور مجھے اپنے علوم اور ان معارف کا حافظ بنا جو ان پر نازل ہوئے اور تیری اس شان کے لئے موافقت اس سے ظاہر ہوئی جو اس زمانہ میں اس سے قریب ہے۔ اے اللہ! میری طرف سے سوال ہے اور تیرے ذمہ قبول کرنا ہے۔ میری طرف سے عجز وانکساری ہے اور تیرے ذمہ کامیاب کرنا ہے۔ تو رحیم وکریم، رؤف، قریب، مجیب، سمیع اور بصیر ہے۔ تیرے سوا کوئی معبود نہیں اور تیرے سوا کوئی رب نہیں۔ تو میرا مولی ہے اور تو ہر چیز پر قادر ہے۔

۷۴۔ تفہیم:

خلیفۃ اللہ فرد، تحقق کے معنی

الحمدللہ الذی بنعمته تتم الصالحات. واشهد ان لاالٰه الااللہ واشهدان محمداعبده ورسوله صلی اللہ علیه وعلی اله وصحبه وسلم. امابعد. عبد ضعیف اپنے رب کریم کا محتاج ولی اللہ بن عبدالرحیم عفی عنہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں۔ وہ اسماء صفات ہیں۔ اور ایک اسم ذات ہے۔ اور بندہ کے لئے ان میں سے ہر ایک کا تحقق ممکن ہے۔ اور ہماری مراد تحقق سے یہ ہے کہ مثلاً اس پر یہ کشف کرے کہ اللہ کے سوا کوئی علیم نہیں۔ اللہ کے سوا کوئی بصیر نہیں اور اللہ کے سوا کوئی سمیع نہیں۔ اور جس طرح بصر، سمع اور علم کو دیکھا جاتا ہے تو یہ وحدۃ الوجود کی اصل پر اللہ کی سمع اس کی اور اس کے علم کے شعبے ہیں۔ اور یہ وحدۃ الوجود کا کشف ہے یا اس کے شعبوں میں سے ایک شعبہ ہے اور تحقق نہیں ہے۔ اور تحقق سے مراد یہ ہے کہ بندہ اپنے نفس سے فنا ہو جائے اور اللہ کے ساتھ باقی رہ جائے۔ اور ہبہ کئے ہوئے وجود کو عطا کر دے۔ پھر اس کے تداخل سے اللہ عزوجل کے اسماء ہوں۔ پھر اس کے نفس میں ان اسماء کے قوی ظاہر ہوں اور عالم ان قوتوں کے لحاظ سے اس کا مطیع ہو۔

اور اللہ تعالیٰ کے اسما کا متحقق دو میں سے ایک آدمی ہے۔ ایک وہ آدمی جس کے قوائے طبیعیہ جو عناصر سفلیہ اور قوائے فلکیہ سے پیدا ہوئے، تمام ہوں۔ پھر اس کا حجر بحت تام ہو، وہاں سے ان قوائے طبیعیہ پر رشحات الٰہیہ ٹپکتے ہوں۔ جو اپنے رنگ میں رنگے ہوئے ہوں تو وہ عالم میں خلیفۃ اللہ ہے۔ اور دوسرا شخص جس کا حجر بحت تام ہو گیا، اور اس کے قوائے طبیعیہ تام نہ ہوئے ہوں پھر وہاں سے رشحات الٰہیہ ٹپکتے ہیں، پھر اس کے نفس میں نور کے مشابہ آثار ظاہر ہوتے ہیں، اور اس کے آثار خارج میں صرف اس طرح ظاہر ہوتے ہیں تو یہ فرد اللہ عزوجل ہے۔

اور متحقق باسم الذات کی حقیقت میرے نزدیک یہ ہے کہ اس سے لطیفۂ روحیہ ترقی کرے۔ حتی کہ صیقل شدہ آئینہ کے مشابہ ہو جائے۔ اور تجلی اعظم اس کے مقابلہ میں آجائے تو اس سے رنگ اس میں نقش ہو جیسا کہ آئینہ اس رنگ سے بھرا ہوا ہوتا ہے، جو اس کو ڈھانپ لیتا ہے۔ یا جس طرح موم میں مہر کے نشانات نقش ہو جاتے ہیں، تو اس کو انس عجیب اور جوش غریب حاصل ہوتا ہے۔ اس کو اس کی کنہ نہیں چھپاتی۔ اور میرے نزدیک یہ ہے کہ شارع نے نماز کے حکم سے اس کی نیت کی اور اس کو اسلام کے ارکان میں سب سے اعظم قرار دیا۔ اور فرمایا انکم سترون ربکم. الحدیث "تم اپنے رب کو عنقریب دیکھ لوگے۔" اس لئے کہ اس سے باطن کا بطن لطیفہ روحیہ میں ایک رنگ ہے، جو تجلی اعظم سے نازل ہوتا ہے، اور وہ اسم ذات کا عین تحقق ہے۔ اور حجر بحت تجلی اعظم سے لاحق ہو جاتا ہے اور اس میں فنا ہو جاتا ہے۔ پھر کبھی نفس ناطقہ حیران و پریشان باقی رہتا ہے۔ اور کبھی اس میں عظیم جوش مترشح ہوتا ہے۔ اور تجلی اعظم کا علم بنفسہ گویا کہ اول میں تجلی اعظم کو ایسی شے کے طور پر جانتا ہے جو اس کا مقصود ہے۔ اور دوسرے میں اس کو بنفسہ اس کے علم کی طرح جانتا ہے۔ اور یہ بھی اسم الذات کا عین التحقق ہے۔

اور جان لو کہ سلوک کی حقیقت یہ ہے کہ ایک لطیفہ کا حکم دوسرے لطیفہ پر غالب آتا ہے اور اس لئے فنا دو قسم کی ہوتی ہیں۔ فناء الوجود الظلمانی اور فناء الوجود الرحمانی۔ فناء وجود ظلمانی یہ ہے کہ لطیفۂ قلبیہ و عقلیہ کا حکم نفس بشریہ اور نفس سبعیہ پر غالب آجاتا ہے۔ اور نفس امارہ رسوم و عادات کی حفاظت کرتا ہے۔ اس لئے نہ شہوت کی پیروی کرتا ہے نہ ہی رسم کی، سوائے اس کے بعد کہ اس کو عقل صحیح قرار دے۔ حتی کہ آدمی اپنے وصف سے بدل جائے اور ایسا ہو جائے گویا کہ

وہ، وہ نہیں جو تھا۔ پھر اس پر لطیفۂ روحیہ وسریہ کا حکم غالب آ جائے اور اس پر لذت معنویہ غالب ہو جائے جو روح کے انس اور راز کی معرفت سے حاصل ہو جائے۔ پھر تمام لذات سے متنفر ہو جاتا ہے اور اس کی ہمت کا قبلہ صرف یہ ہو جاتا ہے۔ اس وقت کہا جاتا ہے اس کا وجود ظلمانی فنا ہو گیا۔ اور وجود روحانی کی فنا یہ ہے کہ اس پر موجودات میں پھیلی ہوئی انانیت کبری کا حکم غالب آ جائے۔ جو اس کو کاٹنے والی ہے۔ تب انانیت صغری مضمحل ہو جاتی ہے۔ تب موجود جانتا ہے کہ وہ لفظ انا کے اشارہ میں کس حیثیت سے موجود ہے۔ اور پوری طرح جوش میں آ جاتا ہے یا اس پر حجر بحت کا حکم غالب آ جاتا ہے جو تجلی اعظم میں غوطہ لگانے والا ہے۔ اس سے ظاہر ہونے والا عود ظاہر ہوتا ہے تو انانیت فعالہ قہارہ لفظ انا میں اس کے اشارہ سے جانتی ہے۔

اور جان لو کہ نصاری نے روح اللہ صلوات اللہ علیہ کے کلام کی تاویل میں غلطی کی اس لئے سمجھ لیا کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ میں عین اللہ تعالی ہوں۔ حاشا وکلا بالکل ایسا نہیں تھا۔ آپ کے قول کے معنی حجر بحت کے حکم پر غالب آ گئے، جو تجلی اعظم سے اس طرح ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں غوطہ لگانا شروع کر دیا تو میرا علم میری انانیت سے بدل کر عالم میں انانیت فعالہ قہارہ کا علم ہو گیا۔ اور اس پتھر سے حق کے علوم اور ارادہ پر مترشح ہوتا ہے۔

اور جان لو کہ عالم میں حقیقت فعالہ قہارہ ہے۔ تو جس طرح فرد نباتی میں نفس ہے جو قوی تغذیہ وتنمیہ کا متحمل ہوتا ہے۔ اور اس نفس کا حکم ہر ورق، ہر ڈال، پھول اور پھل میں جاری ہے۔ اور اگر ان اشیا کی زبانیں ہوتیں تو وہ اس نفس کی طرح تضرع کرتیں اور کہتیں اے میرے آقا! میں نے تیری طرف توجہ کی اور تجھ میں رغبت کی اور تیرا قصد کیا۔ اور اپنی ہمت وقوت کو تیری ہمت وقوت میں فنا کر دیا، تو میرا وہاب ہے میرا خلاق، میرا باری اور میرا مصور ہے۔ اسی طرح اس میں شخص اکبر حقیقت فعالہ موثرہ ہے۔ اس سے اس کے سوا کے لئے ارادہ، اختیار اور تسخیر ہیں۔ اور اس سے نیچے والے کا احاطہ کرتا ہے۔ اور اس کے ماسوا ہر ایک معاون ونباتات اور حیوان اس کی طرف تضرع کرتا ہے۔ لسان حال سے اس کے پاس ہاتھ پھیلائے ہوئے۔ لیکن انسان نفس کے لحاظ سے مخلوقات میں سب سے زیادہ پاکیزہ، عقل کے لحاظ سے سب سے زیادہ مکمل اور تخمینہ کے لحاظ سے سب سے زیادہ سخت ہے۔ اس لئے واجب ہوا کہ زبان حال کے مقابلہ میں اس کی ایک زبان فعال ہونی چاہیے۔ اور ان دونوں

زبانوں کے مقابلہ میں ایک زبان فعل ہونی چاہئے۔ اس پر حقیقت فعالہ ثابت ہوئی۔ حق ہے کہ اس پر ایمان لایا جائے اور اس کی طرف عاجزی وانکساری کی جائے۔ اور جان لو کہ وہ موثر فعالہ ہے۔ چنانچہ انسان کے لئے اس کی تربیت کو واجب قرار دیا گیا کہ ملکوت میں اس کے لئے ایک شریعت مقرر کی جائے۔ پھر لوگوں میں ایک رسول بھیجا جائے جو اس کا ترجمہ کرے، جو ان کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔

اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن عظیم میں بار بار فرمایا ہے **له مافی السموات ومافی الارض** ''آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے، سب اسی کا ہے''۔ اس کا راز یہ ہے کہ آسمانوں اور زمین پر اور جو کچھ ان میں ہے، ان پر غلبہ پانا اور ان سب کو گریبانوں سے پکڑنا اور ان کی پیشانیوں پر قبضہ کرنا اور اس میں مشیت کی تنفیذ اور ان کا احاطہ کرنا، پہلی چیزیں ہیں، جو تجلی اعظم کے خواص میں شامل ہیں، تو یہ خاصیت اللہ کے کلام میں مقدم رہی، جس کا ترجمہ تجلی اعظم کے خواص سے ان کے طبعی طور پر مقدم ہونے کے لحاظ سے کیا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ اسم ذات سے حدیث تحقق ہے جیسا کہ ہم اپنے نفوس میں بار بار پاتے ہیں۔ البتہ اسماء صفات سے تحقق تو اس کی حدیث کے مطابق ہے جس کو ہم اپنے نفوس میں پاتے ہیں جس کو اللہ نے ہم پر اس طرح کھولا ہے کہ اس کی کئی قسمیں ہیں۔

ان میں سے ایک بوجہ انفعال اور قبول اثر کا تحقق ہے جیسے مغنی، معطی، منعم، وہاب، رزاق، عارف۔ ان اسماء میں سے کثیر کی طرف یا تو اپنے قلب کے آئینہ کے ساتھ متوجہ ہوتا ہے، ان کی تلاوت، ورد اور مثالوں میں پائے جانے والے ان کے حقائق کی طرف توجہ ہے، یا دونوں وجھوں سے اس کا نفس منفعل ہوتا ہے اور خاص اس صفت کے لئے استطاعت ظاہر کرتا ہے۔ تو اس میں اس صفت کا رنگ پیدا ہوتا ہے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ کی حکمت یہ ہوتی ہے کہ اسباب کو مغلوب کرے حتی کہ مرزوق، منعم علیہ، معطی لہ اور موہوب لہ ہو جائے تاکہ نظام نفسی اور خارجی کے مطابق ہو جائے۔

اور ان میں سے تحقق بوجہ تشبہ ہے جیسے عزیز، عظیم، ذوالجبروت، غنی اور واجد۔ عارف یا تو ان میں سے کثیر کی تلاوت اور ورد کرتا ہے یا ان کے حقائق مثالیہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے یا دونوں معاملے کرتا ہے حتی کہ اس کے سبب سے ان اسماء کے مقابلہ میں اس میں ودیعت کیا ہوا

رقیق حرکت کرتا ہے۔اس متحرک کے سبب سے اس میں ودیعت کیے ہوئے رقیق نجوم اور قوی فلکیہ میں سے سورج اور چاند وغیرہ کے مقابلہ میں کھلتے ہیں۔تو وہ اس طرح ہو جاتے ہیں گویا کہ وہ سوئے ہوئے تھے،اب بیدار ہو گئے۔اس وقت اللہ تعالیٰ کی حکمت یہ ہوتی ہے کہ اس کے ساتھ اہل سعادت وجد جہد اور اہل ملک و جبروت میں سے اس کا معاملہ کرے جو اپنی جبلت میں ان رقیقوں سے قوی ہو۔

اب جب کہ یہ تمہید تمہارے سامنے آ گئی تو ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے میرے نزدیک ایک اچھی بات یہ ہے کہ میں نے اسم حی کی تحقیق کی اور وہ یہ کہ میں نے اس حقیقت کا مشاہدہ کیا جو حظیرۃ القدس میں شکل اختیار کر کے سامنے آئی پھر میری طرف متوجہ ہوئی تا کہ مجھ پر نازل ہو۔تو اولاً قوی فلکیہ میں جگہ بنائی اور اس میں زہرہ کی طرف منسوب قوت کو اختیار کیا۔پھر اس قوت کا ساتھ دیتے ہوئے میری طرف نیچے اتری اور میری اس عمر میں زیادتی کر دی جو میری والدہ کے شکم میں میرے لئے لکھی گئی تھی۔اور وہ زیادتی اس قوت میں ظاہر ہوئی جو زہرہ کی جانب سے ودیعت کی گئی تھی۔پھر ملاء اعلیٰ میں دوبارہ جگہ بنائی اور اس کا ارادہ کیا۔پھر ان کی ہمت کے ساتھ میری طرف اتری۔پھر میری اس عمر میں زیادتی کی جو میری والدہ کے بطن میں مجموعی طور پر میرے لئے لکھی گئی تھی۔اور اس زیادتی میں جو زہرہ کی جانب سے زیادہ کی گئی تھی۔اور یہ میرے لئے اللہ کی عجیب کاری گری تھی۔الحمد للہ۔

اور ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ میں نے اس طرح کے امور میں اسم العزیز کی بھی تحقیق کی،تو اس تحقیق کا مشاہدہ کیا جو حظیرۃ القدس کی شکل میں سامنے آئی۔وہ میری طرف دو بار متوجہ ہوئی۔ایک بار زہرہ کی طرف سے اور دوسری بار ملاء اعلیٰ کی طرف سے۔تو میں نے اپنے نفس میں اس علم کی زیادتی دیکھی جس کو اس میں نہیں دیکھا جو میرے لئے میری ماں کے پیٹ لکھا گیا تھا۔اور اکثر اسماء حسنیٰ میں اسی طرح کا معاملہ ہے۔والحمد للہ۔

اور یہ بھی جان لو کہ تحقق کے سوا ایک اور چیز ہے جو اللہ صوفی کو عطا فرماتا ہے۔وہ مراقبہ ہے۔اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ احکام الحدوث سے بلند و بالا ہے۔نہ اس کا بیان کرنا ممکن ہوتا ہے،نہ لوگ اس کو پہچانتے ہیں،سوائے اس کے کہ اس کو سمجھتے ہیں اور اس کو ترتیب دیتے ہیں تو اس نے اپنے نفس کا بیان بشری صفات سے تنزیہ کے طور پر کیا اور اس زیادتی کے ساتھ

اس کا ذکر کیا جو ان کی عقلوں میں آ جائے۔ جیسے اس کا ارشاد ہے وان یوما عند ربک کالف سنة مما تعدون "تیرے رب کے نزدیک ایک دن تمہاری گنتی کے حساب سے ایک ہزار سال کا ہوتا ہے۔" (الم السجدة ۵)۔ یہ اس امر کے مطابق ہے جو ان کی عقلوں میں ایک ہزار سال تک عمل کے بعد ہی آ سکتا ہے۔ اور اللہ کے نزدیک یہ آسان ہے کہ اس کو ایک دن میں کر دے۔ اور ان میں سے ہر صفت اسم مرکب ہے اور ہر ایک کے طریقہ کا مراقبہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر اس کے اسم ذاتی سے کرے۔ پھر امر مجمل کی طرف متوجہ ہو جس کو ہر کوئی اللہ کے نام سے آواز اور حرف سے مجرد صورت میں سمجھتا ہے۔ پھر ان صفات میں سے کسی ایک صفت کو یاد کرتا ہے۔ اور اس صفت سے اس کے متصف ہونے کا تصور اس طرح کرتا ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کے جلال کے لائق ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ اس کی آنکھ کھل جاتی ہے اور وہ کشف الٰہی کے لئے اپنی استعداد کے لحاظ سے تیار ہو جاتا ہے۔ اور یہ وہ آخری شے ہے جس کو ہم نے اس ورق میں بیان کرنے کا ارادہ کیا۔ والحمدللہ تعالیٰ اولا و آخرا وظاھرا وباطنا.

۷۵۔ تفہیم:

جزا کا سبب بننے والے اعمال کی انواع

اللہ تمہارے ساتھ بہتر معاملہ کرے اور تمہیں زیادہ توفیق دے اور تمہیں اس حد تک ترقی دے جس کی تم میرے لئے تمنا کرتے ہو۔ بلکہ اس حد تک جو اس سے اوپر ہے کہ وہ کریم، جواد، رؤف اور رحیم ہے۔ امابعد۔ فجۂ اولی وثانیہ کا راز ان کے وقتوں سے متعلق نظام عالم میں مصلحت کلیہ کی طرف لوٹتا ہے جس کے بیان کا مطالبہ نہیں کیا جاتا۔ اور نہ وہ برہان سے ثابت ہوتا ہے کہ فلک اطلس کی حرکت کی تخصیص پر ایک جہت سے اور ستارے والے آسمان کی تخصیص پر دوسری جہت سے برہان قائم کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ اس کی تفصیل ہے جو عنایت ازلیہ میں درج ہے۔ اور وہ حقیقت اولی کی مقتضی ہے اور وہ اقتضا اولا اسکے وجود کے لئے عنایت میں اور دوسرے خارج میں موجب ہے۔ اور جو اعمال جزا کے مستوجب ہوتے ہیں، ان کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جو ظاہر روح سے چپکتے ہیں۔ چنانچہ جب روح کے بعض اجزا بکھر گئے تو ان کی صورتیں مضمحل ہو گئیں۔ چنانچہ ان کو قبر میں عذاب دیا جائے گا نہ کہ معاد

میں۔ اوران میں سے کچھ وہ ہیں جو روح کے باطن سے چپکتے ہیں جو نفس ناطقہ سے قریب ہوتے ہیں۔ ان کو معاد میں عذاب دیا جاتا ہے نہ کہ قبر میں۔ اور امت مرحومہ کے اکثر لوگ جن کی بہیمیت ضعیف ہے، ان کی ملکیت بھی ضعیف ہے۔ اس لئے ان میں سے اکثر کو عذاب، قبر میں ہوگا۔ اور ان کو ہلکا پھلکا اٹھایا جائے گا کہ ان کے اوپر کوئی بوجھ نہ ہوگا۔ اور جن کی بہیمیت شدید ہوگی ان کو اکثر امم سابقہ کی طرح قبر سے زیادہ معاد میں عذاب دیا جائے گا۔ بلکہ ممکن ہے کہ ان میں سے کسی جماعت کو قبر میں بالکل عذاب نہ دیا جائے، صرف معاد میں دیا جائے۔

اور جو لوگ بلاحساب جنت میں داخل ہوں گے، یہ وہ لوگ ہوں گے کہ ان کی فطرت پاکیزہ ہوچکی ہوگی۔ ان کی بہیمیت ان کی ملکیت کے رنگ میں رنگی جاچکی ہوگی۔ چنانچہ ان کی روح میں ایسا کچھ باقی نہ رہے گا جو ان کے جنت میں دخول کا یا ان کی ایسی رحمت عظیمہ کی شمولیت کا موجب ہو جو ان کی خطاؤں کا کفارہ بن جائے۔

اور ہم ان اعمال کے اختلاف کی مثال جو جزا کا موجب ہوتے ہیں، اختلاف امراض سے دیتے ہے۔ وہ یہ ہے کہ انسان کی فطرت کی اصل کے مخالف امراض کی دو قسمیں ہوتی ہیں، ایک وہ پھوڑے پھنسی جو بدن کے اخلاط سے بھر جانے سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور جب اخلاط کا استفراغ ہوجاتا ہے تو مرض جاتا رہتا ہے۔ دوسرے یہ کہ آدمی کے دونوں پیر اور دونوں ہاتھ کٹے ہوئے ہوتے ہیں تو استفراغ اخلاط سے یہ مرض نہیں جاتے۔ لیکن جب یوم المعاد میں جمع ہوں گے تو صورت نوعیہ پوری طرح ظاہر ہوگی، اور انسان مکمل ہوجائے گا۔ اور اسی طرح مختلف مراتب پر امراض نفسانیہ ہوتے ہیں۔ یہ وہ امر ہے جو سوال کے جواب میں فی الحال میسر آیا۔ والحمدللہ اولاً و آخراً

۷۶- تفہیم:

شیخ عبدالرحمٰن اور ان کو درس و تلقین کی اجازت

الحمدللہ الذی انعم و خول ونول فاجزل ووفق فسهل وفی جمیع الحالات علی فضله المعول واشهد ان لااله الااللہ القدیم الاول واشهد ان محمدا عبده ورسوله اکرم مرسل والفضل مفضل صلی اللہ علیه وعلی اله

وصحبه الامثل فالامثل. ’’تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس نے انعام عطا کیا، نگہبانی و حفاظت کی، اور خوب دیا۔ اور توفیق دی اور سہولت عطا کی۔ اور تمام حالات میں اس کے فضل پر بھروسہ کیا جاتا ہے۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے جو قدیم ہے، اول ہے۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد اس کے بندے اور رسول اکرم ہیں۔ وہ بھیجے گئے ہیں، افضل اور مفضل ہیں۔ اللہ آپ پر اور آپ کی آل واصحاب پر رحمت نازل فرمائے جو ایک کے بعد ایک امثل ہیں۔ امابعد۔ اللہ کریم کی رحمت کا محتاج ولی اللہ بن عبدالرحیم عفا اللہ تعالیٰ عنہ والحقہ بالصالحین کہتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالی اپنے بندوں پر ان کے باطن میں پوشیدہ طور پر لطف وکرم کرتے ہوئے، ان کے ادراک کو عزت اور نعمتیں بخشتا ہے اور جو کچھ اس کے اور ان کے درمیان ان کے جذب کے لحاظ سے ہیں ان کے معنی کا سمجھنا دشوار ہوتا ہے۔

اور ان پوشیدہ الطاف اور عظیم نعمتوں میں سے ہمارے نیک وصالح اخی فی اللہ جو مصلح ہیں اور ان کے اوقات طاعات سے لبریز ہیں۔ ان کے انفاس حسنات کے سمندروں میں ڈھکے ہوئے ہیں۔ یعنی حافظ عبدالرحمٰن بن حافظ نظام الدین التقوی شہر دہلی میں ہماری اقامت گاہ پر آئے۔ اللہ ان پر دنیا اور عقبی میں احسان فرمائے۔ اور اولی واخری میں اپنی نعمتیں ان پر عام فرمائے۔ ان کو اللہ نے میرے پاس بھیجا اور ان کو مجھ سے صوفیا کے طریقہ خاص کے طلب کے لئے الہام فرمایا۔ پھر اس طریقہ کے سہل اور دشوار اعمال پر صبر اور اس راہ کے رطب ویابس کو طے کرنے میں مشکلات کو برداشت کرنے کا الہام کیا اور ان کو مراقبات وتوجہات کے اہتمام کی توفیق دی۔ ان پر توحید کا کشف کیا۔ قوم کے نزدیک معتبر نسبتوں، نسبت احسان، نسبت اویسیہ، نسبت یادداشت، نسبت توحید اور نسبت عشق کے دروازے کھولے۔ اور انہیں خرق عادت اشیا کا عامل بنایا۔ مناجات کی حلاوت کا ذائقہ چکھایا۔ مختلف قسم کی عبادتوں کی لذت عطا فرمائی۔ نور ارواح دکھایا۔ لطیف گزرگاہوں پر چلایا۔ اسماء وآیات کے کچھ خواص پر اللہ اور اس کے رسول کے لئے اور مشائخ طریقت کے لئے ان کی ظاہری و باطنی خیرخواہی و خلوص کے ساتھ مطلع کیا۔ اور ان کے سینہ کو کینہ وحسد سے سلامت رکھا۔ حرص اور لمبی لمبی امیدوں کی طرف میلان کم کیا۔ مشکلات، شدائد اور امراض میں صبر کی قوت عطا کی، اور عبادت میں اشتغال کے وقت ان آلام کے احساس کو ختم کیا۔ اس طرح بہت سے الطاف و

کرم اللہ تعالیٰ نے فرمائے، جن کا بیان طول کا متقاضی ہے۔ اوران کی تعداد بیان کرنا مشکل ہے۔ اور وہ ان معاملات وحالات میں تقریباً بیس سال تک رہے ہے۔ واللہ اعلم۔

اوران پوشیدہ الطاف اور عظیم نعمتوں میں سے یہ بھی ہے کہ ان کو مجھ سے علم حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔ چنانچہ انہوں نے مجھ سے کچھ پڑھا۔ ان میں اول سے آخر تک عاصم سے حفص کی روایت میں میرے اس سلسلہ سے جو نبیﷺ تک پہنچتا ہے، قرآن عظیم، صحیح بخاری وصحیح مسلم، موطا محمد بن الحسن تھوڑے حصہ کے استثنا کے ساتھ، شرح سنہ کا ایک حصہ، سنن نسائی نصف کے قریب اور پھر دوبارہ دوسرے طالب علم کے میرے سامنے پڑھنے پر صحیح بخاری کی سماعت بھی کی۔ اس کے علاوہ اور جامع ترمذی، سنن ابوداؤد، سنن ابن ماجہ، مسند دارمی، مشکوۃ المصابیح، حصن الجزری اور نسائی کا ایک حصہ شامل ہیں۔ انہوں نے مجھ سے میری بعض تصنیفات مثلاً فتح الرحمٰن ترجمۃ القرآن، الحجۃ البالغہ اور مسوی وغیرہ بہت سے رسائل بھی سنے جن کی تعداد بیان کرنا مشکل ہے۔

اس سب کے بعد اللہ نے مجھے شرح صدر عطا کیا کہ ان کی تعریف وتحسین کروں۔ اور مشہور طرق والے صوفیا کے اشغال کی تلقین کے لئے انہیں اجازت دوں۔ چنانچہ میں نے کہا کہ ان کا ہاتھ میرے ہاتھ کی طرح ہے جیسا کہ میرے حق میں یہی بات سیدی والد صاحب قدس سرہ نے کہی تھی۔ اوران کو خرقۂ صوفیا پہنایا۔ جو خلیفہ اور نائب کا لباس ہوتا ہے، اور مشہور طرق کی اسناد اوران کے بعض اشغال واذکار عطا کئے۔ جو الانتباہ فی سلاسل اھل اللہ نامی ہمارے رسالہ میں مذکور ہیں۔ اور میں نے ان کو اس سب کی اجازت دیدی جو انہوں نے میرے سامنے پڑھا، یا مجھ سے سنا، یا ان کے نزدیک جن کا میری مرویات ہونا صحیح ہے، اور کتب حدیث کی اسناد ہمارے رسائل میں درج ہیں۔ اور میں نے انہیں آیات عظمی، اسماء حسنی اور ادعیۂ مبارک کی تلاوت اوران کے حروف اور اوقاف کی کتابت کی اجازت دی۔ جیسا کہ مجھے ان کی اجازت میرے والد قدس سرہ نے دی تھی۔

اور میں نے ان کو خاص ان کی ذات کے بارے میں بتادیا کہ ان کے قوت خیال میں بعض خلل ان امراض کی وجہ سے ہیں جو ان پر غالب ہیں۔ اور یہ مناسب نہیں ہے کہ اپنے واقعات پر مراجعت اور فراست صادقہ کی تائید کے بغیر بھروسہ نہ کریں اور یہ کہ ان کے لطائف

میں سے غالب لطیفۃ الروح ہے۔ خاص طور سے اس کی وہ صورت جو عقل سے قریب ہے۔ اس لئے اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ اس کو آسودگی اور خوشحالی وفراوانی حاصل ہو جائے کہ یہ نسبت اویسیہ ہے اوران کی نسبت احسان ہے۔ اور یہ کہ ان کا نفس ناطقہ اس طرح پیدا کیا گیا کہ وہ اپنی قوت ملکیہ اور بہیمیہ کو جذب کر لیتا ہے۔ اور یہ دونوں قوتیں غایت درجہ کی قوی نہیں ہیں۔ چنانچہ جب وہ کسی قسم کے حال میں پوری طرح مشغول ہوگا تو اس کا نام اس کے ماقبل سے رکھا جائے گا گویا کہ وہ کوئی شے مذکور ہی نہیں تھی۔ اس لئے حزن میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لئے کہ حال اول کی اصل گئی نہیں ہے بلکہ پوشیدہ ہوئی ہے۔ اور تمام پہلوؤں کو جمع کریں اور تمام اضداد کے احاطہ کا لالچ نہ کریں اس لئے کہ کشاکش والا نفس اس کی طاقت نہیں رکھتا۔ اور ایک حال سے دوسرے حال میں بدلنا اور تلون اس صنف کی جبلت کے لوازم سے ہے۔

اور میں ان کو ان امور کی وصیت کرتا ہوں جن کی وصیت میرے مشائخ نے مجھے کی تھی۔ یعنی احکام شرعیہ اور آداب صوفیا پر استقامت اور یہ کہ میرے لئے میرے مشائخ اور میرے اصحاب کے لئے دعا کریں۔ اقول قولی ھذا واستغفر اللہ ارحم الراحمین والحمدللہ رب العالمین ان سطور کی کتابت ۲۹ رمضان ۱۱۶۰ھ کو بروز جمعرات ہوئی والحمد للہ تعالیٰ اولا وآخرا وظاھرا وباطنا وصلی اللہ علی خیر خلقہ محمد والہ وصحبہ وسلم۔

۷۷-تفہیم:

رب العالمین کی ربوبیت اور تقدیر سے تکلیف کے انشقاق کی تحقیق

الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی امابعد. یہ تقدیر سے تکلیف کے انشقاق کی تحقیق اور انبیا علیہم الصلوات والتسلیمات کے خصائل کے بیان، انبیا سے تشبہ رکھنے والے نفوس جو خلافت کا استحقاق رکھتے ہیں، کے انواع کے بیان، خلافت کے معنی اور شیخین وعلی مرتضی رضوان اللہ تعالیٰ علیہم کے سلسلہ میں چند کلمات ہیں۔

جاننا چاہئے کہ نوع انسان کی نسبت سے رب العالمین کی ربوبیت کے شعبے ہیں۔

ایک نوع انسانی کی تکوین وتخلیق اور دوسرے انسان کے لئے تشریع، قانون سازی۔ اور اس ربوبیت کو ہم ایک نکتہ سے واضح کرتے ہیں کہ جب ہم کسی بیج یا گٹھلی کو زمین میں بوتے ہیں اور وہ اجزاء مائیہ، ارضیہ اور ہوائیہ اور جو اس کے لئے مناسب ہوتے ہیں کو خود جذب کرتا ہے تو وہ اجزا کے مادہ کے مناسب جامہ سے لباس شجری اختیار کرتا ہے۔ لامحالہ اس مادہ میں خود اپنی نوعیت کے اعتبار سے درجہ بہ درجہ تصرف کرتا ہے۔ اولا اس پر سبزہ طاری ہوتا ہے، پھر کچھ پتے آتے ہیں، اس کے بعد سبزہ کو تقویت عطا کرتے ہیں اور تنا درخت بن جاتا ہے اور شاخیں اور پتے ظاہر کرتا ہے۔ اس کے بعد پھول اور پھل آتے ہیں جیسا کہ رب تبارک وتعالی نے فرمایا **كزرع اخرج شطأه فازره فا ستغلظ فاستوى على سوقه** "گویا ایک کھیتی ہے، جس نے پہلے کونپل نکالی، پھر اس کو تقویت دی، پھر وہ گدرائی، پھر اپنے تنے پر کھڑی ہوگئی (الفتح ۲۹)۔ اب اگر اپنی عقل رکھتے ہو تو صورت نوعیہ اور اس کے ان احکام کا جو بیج کے اندر داخل ہیں، سب کا ایک ایک کر کے تماشہ دیکھو۔ وہ درخت ان احکام اجمالی کے لئے جو اس کے اندر ہیں، بمنزلہ آئینہ کے ہے۔ اور وہ صورت نوعیہ بمنزلہ دیکھنے والے کے ہے، کہ اس کی صورت آئینہ کے اندر نظر آتی ہے۔ چنانچہ جاننا چاہئے کہ پتوں، پھولوں اور پھلوں اور ان کی شکلوں اور رنگوں اور ذائقوں کی کیت اور وہ خواص جن سے علم طب میں بحث کرتے ہیں، حرارت و برودت وغیرہ، اور وہ خواص کہ جن سے نجار (بڑھئی) بحث کرتے ہیں۔ یعنی نرم اور سخت وغیرہ۔ مختلف قسم کے بہت سے خواص بالجملہ جن کے ذریعہ اس قسم کے درخت کو دوسرے درختوں سے امتیاز حاصل ہوتا ہے۔ یہ تمام احکام اس کی صورت نوعیہ ہیں جو کہ بیج کے اندر پوشیدہ اور شامل ہوتے ہیں۔ وہ اس مادہ میں واضح اور ظاہر ہوتے ہیں۔

گرتامل قفص بیضۂ طاؤس شود
درشبستان عدم نیز چراغانی ہست

"مور کے انڈے کی ساخت کے بارے میں غور کیا جائے کہ شبستان عدم میں بھی ایک چراغاں اور حسن ہے۔"

اور بیج اور درخت کی طرح ہی منی اور حیض کے خون کو قیاس کرو کہ جو مادے چوپایوں کے رحم میں جمع ہو کر جنین کی صورت اختیار کرتے ہیں۔ اور اس کی نوع کے احکام کے دائرہ کو

مزید کشادہ کر کے دیکھو اور نفس کی حرکات کو جو ساعت بساعت قوت فعل سے صادر ہوتی ہیں، قوائے ادراکیہ اور قوائے عملیہ کے قبیل سے سب کا اس سے الحاق کر لو۔

انسان کا معاملہ بھی اسی طرح کا ہے۔ البتہ اس کی نوع کے خاص ارتفاقات و انتظامات اور مجازات نفسانیہ اور سعادت و شقاوت نوعیہ وغیرہ کے لحاظ سے اس پر زیادتی ہوتی ہے۔ اس طرح اس نوع کے تمام احکام ہیں جو افراد میں دکھائی دیتے ہیں۔ جب تم اس حد تک سمجھ گئے تو نظر کو اور بلند کرو اور دیکھو کہ نوع موجد حقیقی کی تاثیر کے لئے ایک قالب اور ایک خصوصیت ہے، نہ کہ بذات خود موثر۔

کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں
مصلحت را تہمتے برآ ہوئے چیں بستہ اند

"مشک افشانی تو تیری زلف کا کام ہے لیکن عاشق لوگ اپنی مصلحت کی وجہ سے آہوئے چین کے سر الزام تھوپتے ہیں۔"

اس لئے جس طرح ایک ماہر مصور پتھر کا ٹکڑا یا لکڑی لیتا ہے اور عظیم الشان تصویر اعضا کے تناسب کے ساتھ بناتا ہے۔ جب کہ فی الحقیقت اس صورت کا حسن ایک صنم اور خاص اس صورت کا نمونہ ہے، جو اس تصویر کو بنانے سے پہلے مصور کے ذہن میں پیدا ہوئی تھی، بلکہ خاص اس کلی اجمالی استعداد کا نمونہ ہے جو اس کے نفس کی قوت عملیہ میں ثابت ہے۔ اس لئے ہم اس مصور پر مکمل مہارت کا حکم لگاتے ہیں۔ اسی طرح واجب جل مجدہ کے سلسلہ میں نوع کے یہ تمام احکام اس کے علم میں پوشیدہ ہوتے ہیں بلکہ اس کی ذات کے اقتضا کے لحاظ سے اتنا فرق ہے کہ یہ احکام واجب تعالیٰ میں قہر غلبہ اور تاثیر کی صفت کے طور پر پوشیدہ ہوتے ہیں۔ اور مخلوق میں مغلوبیت اور تاثر کے رنگ میں ظاہر ہوتے ہیں۔

اب جب تم نے اس نکتہ کو بھی سمجھ لیا تو نظر کو مزید کشادہ کرو اور یہ سمجھ لو کہ واجب جل مجدہ میں اس کی نوع و احکام تفصیلیہ تمام اسی ترتیب کے ساتھ شامل ہوتے ہیں جو کہ اس کے علم میں اولاً تقاضہ کی صفت سے ظاہر ہوئی جس کو لوح محفوظ اور امام مبین سے تعبیر کیا گیا ہے۔ وہ سب خود اس کے علم کے ضمن میں اپنے تقاضہ کی صفت سے مقرون ہو کر عملی شکل میں سامنے آئی۔ دوسرے ملاء اعلیٰ کے ذہنوں میں جو کہ عرش تکوین کے حامل ہیں، نقش و تخیل کی صفت

سے، تیسرے اس کے بعد جب علویہ وسفلیہ کو اس کے ساتھ اس قدر کھینچا گیا کہ قضاء سے پہنچ گیا، اور قوت سے فعل میں آ گیا، انسان خارجی انسان کا مقدر ہوگیا۔ اور اس کے تمام احکام نمایاں ہو گئے اور بالفعل رب العالمین کی تربیت و پرورش انسان کی نوع اور اس کے خاص احکام کی نسبت سے ہوگئی۔

اور ربوبیت کے اس مرتبہ میں دو شعبے ہوئے۔ ایک ربوبیت ان احکام کے لحاظ سے کہ اس کے عصروں اور ادوار کے لئے احوال و افعال اور اخلاق مثلاً نطق، ضحک، جرأت و بزدلی، دانش مندی اور اس کے ضروری ارتفاقات اور اس کے اصول جو شہد کی مکھی اور چڑیا کو طبیعی الہامات کے رنگ میں کر دئے جاتے ہیں، تغیر اور تحویل نہیں ہے۔ اور ان احکام کے لحاظ سے جو ربوبیت کو عصروں اور ادوار (زمانوں) کے تغیر کے لحاظ سے متغیر اور متحول ہوتے ہیں اور ان احکام متغیرہ سے غرض انسان کی صورت نوعیہ سے مقرون ان ادوار اور عصروں کے حکم اور اس پر اصول کے اطلاق اور اس کی مناسبت سے جسموں کے لباس سے اس کی مشابہت ہے۔

اس نکتہ کی تفصیل یہ ہے کہ جس طرح صورت نوعیہ کے لحاظ سے درختوں کے لئے احکام ہیں کہ ان احکام سے ایک قسم کا اعتدال حاصل ہوتا ہے۔ اسی طرح ان درختوں کے لئے گرمی اور سردی کے موسم میں ایسے مختلف احکام ہیں کہ اس صورت نوعیہ کو فصل اور وقت کے احکام سے ملے ہوئے حاصل ہوتے ہیں۔ اور بالجملہ اس کے تغیر سے متغیر احوال و اوضاع سے قرانات کلیہ میں، اور جو کچھ تجلی اعظم کے تشبہ کا موجب ہوتا ہے، اور جو کچھ اس ہیئت کا موجب ہوتا ہے، جو تشبہ کی ضد ہے، بالآخر تمام نقش ہو جاتا ہے۔ چنانچہ بہت ساری حدیثوں میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اور صورت نوعیہ کا حکم اس لحاظ سے ایک بار ہو جاتا ہے اور اس کی وجہ سے شریعت میں شعبے ہو جاتے ہیں۔

اور یہ عالم تکلیف کی ابتدا ہے اور جو اس تکلیف کی بقا سے مشابہ ہوتا ہے اس کو عروق کی راہ سے ملاء اعلی سے کھینچ لیا جاتا ہے۔ اور اس جگہ نیکی اور بدی کے سائے اور اس زمانہ کی شریعت خاصہ کی صورت ظاہر ہوتی ہے۔ اور اس ندی کے درمیان جو کہ ملاء اعلی کے احجار بحت اور تجلی اعظم کے درمیان واقع ہے، شریعتوں کی صورت میں عملی شکل اختیار کرتی ہے، اور اس صورت کی رضا و خفگی دونوں ضدوں سے تعلق رکھتی ہے۔

اس کے بعد بھی ربوبیت تشریعیہ تقاضا کرتی ہے کہ ایک ایسے شخص کو جو اپنی چند کامل جارح خصلتوں کا جامع ہو، بنائے اور عالم بشر میں اپنا نمونہ قرار دے۔

ان خصائل میں سے ایک تجلی اعظم سے اس کی حجر بحث سے مشابہت ہے۔ دوسری اس کی قوت خیالیہ کی ملاء اعلیٰ سے مشابہت ہے۔ اور یہ خصلت ملاء اعلیٰ سے علوم کی قبولیت کا سبب ہوتی ہے۔ تیسری ملاء اعلیٰ سے اس کی قوت عملیہ کی مشابہت ہے اور یہ خصلت اس کی عصمت اور طہارت کا سبب ہو جاتی ہے۔ اور اس کے گناہوں اور آلودگی سے مختلف قسموں سے اس کے اوپر صورت اعتدالیہ کی بقا صفت عدالت ہے۔ چوتھی انسان کے نفس کا سماجی ہونا ہے۔ یعنی اس کا نفس ناطقہ ایسی خاصیت رکھتا ہے کہ اس کا سایہ عالم خارج میں پڑتا ہے اور افراد انسان اس کے سبب سے خاص ترتیبی اور انتظامی سایہ اختیار کرتے ہیں۔ پانچویں اس کی ہر ہمت اور قصد میں ملاء اعلیٰ کی تائید تا کہ جو کچھ سوچا جائے ملاء اعلیٰ اس کی مناسبت کے واسطہ سے سوچیں۔ اور یہ خصلت خرق عادت ظہور کا سبب ہوتی ہے۔ اور چھٹی اس کے قوائے ثلثہ کا اعتدال یعنی اس کی قوت شہویہ باوجود سبوغ و وفور کے اس کے نفس سبعیہ کی مقہور و مغلوب ہو۔ اور اس کا نفس سبعیہ باوجود کمال شدت و غلیان اس کی قوت عقلیہ کا مغلوب و مقہور ہو۔ اور اس کی قوت عقلیہ باوجود صلابت اور گرانباری و مضبوطی ملاء اعلیٰ کی مغلوب ہو۔ ساتویں اعدا پر اس کی نصرت میں اس کا بخت مسعود اور احباب کے قلوب میں اس کی محبت کا الہام اور اس کی ملت و دولت کی زمانہ دراز تک بقا۔

جب یہ سات خصلتیں کسی شخص میں بکمال متحقق ہو جاتی ہیں، اس کی ربوبیت تشریعیہ خود جارحہ ہو جاتی ہے اور عالم بشر میں اپنا نمونہ بنا دیتی ہے اور اپنی بات اس کی زبان میں رکھ دیتی ہے اور اس کو اس مقام کا خبر دینے والا قرار دے دیتی ہے اور اس کی عزیز عزت سے اپنے معمولی کام سرانجام دیتی ہے۔

اور یہ نفس شریف قدسی، عالم بشر میں چند کام کرتا ہے۔ ایک یہ کہ بھلائی اور گناہ کے صول و اتفاق علوم اجمالیہ کلیہ حکمیہ کی اس طرح تفصیل بیان کرتا ہے کہ الہام کے مطابق افراد انسانی اجمال کو قبول کر لیتے ہیں۔ لیکن اس کی شرح پر خلاف اصل علوم اجمالیہ رسوم باطلہ سے کر سکتے ہیں جیسا کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کل مولود یولد علی **فطرة الاسلام لم ابواه**

یھودانه اوینصرانه اویمجسانه ''ہر بچہ فطرت اسلامی پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے والدین اس کو یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔'' چنانچہ پیغمبر، ان رسوم باطلہ کو منہ کے بل گرادیتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ان ادوار اور عصروں کے تغیر سے جو اس عصر کا حصہ ہوتے ہیں، تغیر اختیار کرتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ بعض مجملات کی تفصیل کا اس طرح سبب ہوتے ہیں جیسے جب تک بادبان نہ ہو، ہوا کی قوت، کشتی کا مقابلہ نہیں کرتی۔ اسی طرح جب تک اس نفس کی گرانباری و مضبوطی نہ ہو، روح القدس کی تائید اور ملاء اعلیٰ کی خوشنودی و خفگی حاصل نہیں ہوتی۔ بالجملہ اسی طرح جب اس نفس شریفہ قدسیہ سے جو کامل بالفعل ہے، یہ نوبت گذرتی ہے، نفوس مشتبہ کے نفوس کی تفتیش اس کام کو انجام دیتی ہے۔

انبیا سے مشابہت رکھنے والوں کی بہت سی قسمیں پیدا ہوتی ہیں۔ بعض کچھ خصائل جزئیہ کے لحاظ سے مشابہ ہوتے ہیں، اور بعض اکثر خصائل کلیہ کے لحاظ سے مشابہ ہوتے ہیں۔ اصل تشبہ ہر ولی، عالم، صالح اور بادشاہ عادل کو حاصل ہوتا ہے۔ لیکن ہماری بحث کلیات کے لحاظ سے تشبہ میں ہے۔ اور بالجملہ ممکن ہے کہ ایک شخص ان تمام خصائل میں پیغمبر سے مشابہ ہو لیکن درمیان میں اس قدر فرق ہو کہ نفس پیغمبر بغیر ریاضت بدنیہ و نفسانیہ اور بغیر توسط بشری اس مقام پر فائز ہو جائے اور اس شخص کا نفس، ریاضت کے واسطہ سے اور نفس پیغمبر سے فیض حاصل کر کے اس مقام پر پہنچے جس طرح عالم متبحر ایک ذکی و ذہین طالب عالم کی تربیت کرتا ہے۔ اور اس ذہین و ذکی کا نفس اس عالم کی تربیت سے بیدار ہو جاتا ہے۔ اور وہ عالم متبحر ہو جاتا ہے اور علم کے اصول و فروع کا بغیر تقلید کے بصیرت سے احاطہ کر لیتا ہے۔ اسی طرح صوفی مرشد اپنے کسی مستعد تلمیذ کی جو کہ پہلے عام آدمی تھا تربیت کرتا ہے اور وہ فنا و بقا سے مشرف ہو جاتا ہے۔ اور جس طرح گھر میں سورج کی جانب کھڑکی کھولتے ہیں اور اس کے مدمقابل ایک آئینہ رکھ دیتے ہیں اور آئینہ کی روشنی زمین پر پڑتی ہے اور سورج کی روشنی آئینہ کے واسطہ سے گھر کے اندر حلول کرتی ہے۔ اگرچہ اس شخص کو اس کام کے لئے مقرر نہیں کرتے اور امت کی تربیت کے نام پر اس سے کوئی چیز ظاہر نہیں ہوتی۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک شخص اصل فطرت کے لحاظ سے انبیا کے ان خصائل میں قریب الحل ہو اور وہ امور جو دراصل پیغمبر کی بعثت سے مقصود الٰہی تھے۔ پیغمبر، ان امور کی بنیاد

رکھتا اوران کی اصل بیان کرتا ہے۔اور ابھی کام پورا نہیں ہوتا کہ پیغمبر کی عمر پوری ہو جاتی ہے اور وہ ملاء اعلیٰ کو انتقال کر جاتا ہے، تب وہ شخص اس کے کام کو پورا کرتا ہے۔اور عنایت الٰہی کی ہوا،اس کے نفس کے بادبان سے ٹکراتی ہے،اور وہ اس کام کو علما عملا اور فتوحا انجام دیتا ہے۔ حالانکہ اس شخص نے پیغمبر کی صحبت حاصل نہیں کی تھی اور اس سے علوم حاصل نہیں کیے تھے۔

اور اسی نکتہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے **واما نرینک بعض الذی نعدھم اونتوفینک** ''یا تو ہم تمہیں وہ دکھادیں جس کا ہم نے ان سے وعدہ کیا یا تمہیں اس سے پہلے ہی اٹھالیں گے۔'' (یونس ۴۶) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا **ھلک کسری فلاکسری بعد وھلک قیصر فلاقیصر بعد** ''کسری ہلاک ہوگیا،اب اس کے بعد کوئی کسری نہ ہوگا اور قیصر ہلاک ہوگیا اس کے بعد کوئی قیصر نہ ہوگا۔'' اور فرمایا **لتفتحن کنوز کسری ولنقسمنھا** ''کسری کے خزانے کھول دیے جائیں گے اور ہم ان کو تقسیم کرلیں گے۔'' اور اپنے رب کے حوالہ سے فرمایا **ان اللہ فلمقت عربھم وعجمھم وانما بعثتک لابتلیک بھم وابتلیھم بک** ''اللہ ان کے عرب وعجم ہونے کو ناپسند کرتا ہے۔اور میں نے تمہیں صرف اس لئے مبعوث کیا ہے تاکہ تمہیں ان کے ذریعہ آزماؤں اور انہیں تمہارے ذریعہ آزماؤں۔'' (الحدیث) اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا **ان علینا جمعه وقرآنه** ''اس کو یاد کرادینا اور پڑھوادینا ہمارے ذمہ ہے۔'' (القیٰمۃ ۱۷)

یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی شخص اپنی فطرت کے لحاظ سے پیغمبر سے اخذ کرنے کے قریب ہو اور علوم کو پیغمبر سے حاصل کرے اور امت کی سیاست ان کا نظم وضبط، حدود کا قائم کرنا، ان کے مقدمات کا فیصلہ کرنا،علوم کی تعلیم،امر بالمعروف نہی عن المنکر کا ملکہ اس سے حاصل کرلے اور پیغمبر کے بعد اس کی امت میں اس کا خلیفہ ہو جائے۔ اگرچہ ان کاموں میں سے کچھ بھی باقی نہ رہا ہو۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ جب پیغمبر ان خصائل کے احاطہ کے بعد دعوت خلق کے کام میں متوجہ ہو اور اپنا کچھ رنگ خلق میں منتقل کردے تو کوئی دوسرا شخص بھی اس کی موجودگی میں سورج سے آئینہ کی نورانیت کے مانند اس کا قلب مبارک اکتساب کرلے اور اس کے پیغمبر سے اجتماع کے سبب بنی آدم کی نورانیت بڑھ جائے جیسے چند آئینوں سے آفتاب کی روشنی کو گزاریں اور ان کے واسطہ سے زمین میں سورج کی روشنیوں کا عکس پڑے اور ایک عجیب حالت پیدا

ہو جائے جیسے ایک شعلہ تاریک گھر میں لے آئیں اور وہاں دیواروں میں آئینے نصب ہوں جن سے شعلہ کی روشنی کا عکس ظاہر ہو اور ایک دوسرے سے ٹکرا دے تو عجیب وغریب نیرنگی ظاہر ہو۔ حدیث میں اسی فضیلت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ **الحمدللہ الذی ایدنی بھما ای بابی بکر وعمر** ''تمام حمد وثنا اللہ کے لئے ہیں جس نے ان دونوں یعنی ابوبکر اور عمر کے ذریعہ میری تائید فرمائی۔'' اور حدیث میں یہ بھی آیا ہے کہ ابوبکر اور عمر کان اور آنکھ کی مانند ہیں۔ بالجملہ افراد امت میں یہ خصلتیں فضل کلی رکھتی ہیں اور افضلیت انہی خصلتوں کے لحاظ سے ہوتی ہے۔ اور دیگر فضائل کو ان میں منفی اور مثبت کے لحاظ سے کوئی دخل نہیں ہے۔ اور یہ بھی جاننا چاہئے کہ خلیفۂ پیغمبر حقیقت میں اس آواز کے مانند ہے جو بانسری بجانے والے کے منہ میں ہوتی ہے۔

او بجز نائے وما جز نے نیم
او دمے بے ماوما بے وے نیم

''وہ ہمارے بغیر گانے والا ہے اور ہم اس کے بغیر بانسری کے سوا کچھ نہیں ہیں۔ وہ ہمارے بغیر ایک پھونک ہے اور ہم اس کے بغیر کچھ نہیں ہیں۔''

چنانچہ ارادہ الٰہی ہوتا ہے اور علم کا ظہور افراد انسان میں ہو جاتا ہے۔ اور ان کے مظالم رفع اور عالم مطیع وفرماں بردار ہو جاتا ہے۔ یہ مفہوم ارادہ کے بالکل خلاف نہیں ہے جیسا کہ باری تعالیٰ نے فرمایا ہے **ولقد سبقت کلمتنا لعبادنا المرسلین، انھم لھم المنصورون، وان جندنا لھم الغالبون** ''اپنے بھیجے ہوئے بندوں سے ہم پہلے ہی وعدہ کر چکے ہیں کہ ان کی مدد کی جائے گی اور ہمارا لشکر ہی غالب ہو کر رہے گا۔'' **(الصّٰفّٰت ۱۷۱تا۱۷۳)**

اور اس کی مثال ایسی ہے کہ بانسری بجانے والے کے دل میں ایک عزم پیدا ہوتا ہے کہ مقامات راست یا مثلاً عشاق کے لئے فلاں غزل کے ضمن میں گائے۔ اس کے بعد ایک رنگ اسی مقصد سے پیغامبر کے قوائے عقلیہ قلبیہ میں نزول کرتا ہے اور اس کے قویٰ میں اس مقصد کے لئے مناسب قرار پانے والے افعال میں جوش پیدا کرتا ہے اور پیغامبر اس رنگ کا تابع ہو کر ہر ممکن روش سے اس مقصود کی ہیئت میں مداخلت کرتا ہے۔ اور یہ اس کے مشابہ ہے

کہ بانسری بجانے والا ایک آواز اپنے گلے سے نکالتا ہے جو کہ اس نفس کا اجمال ہوتا ہے کہ جس کو انجام دیا جائے، خواہ آواز کو بلند کرنے کی غرض سے یا اس کی تحسین کی غرض سے۔ بانسری کو ہاتھ میں لیتا ہے اور اپنے منہ پر رکھتا ہے۔ اس کے بعد وہی ارادۂ الٰہی پیغامبر کی ہمت اس کی عزیمت، اس کی مداخلت سے اور اس کے سبب سے ایک شخص کے نفس میں جو اس کام کے لئے تیار ہوتا ہے عمل کرتا ہے، اور اس سے وہ افعال صادر ہوتے ہیں۔ اور یہ اس طرح ہے جیسے بانسری سے غمگین آواز نکلتی ہے۔ جب کہ وہ آواز سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی۔

یہی نبوت کی خلافت کے معنی ہیں اور قابلیت واستعداد سے قطع نظر یہ ایک فضیلت ہے۔ اگر فضیلت میں تمام مشترک ہوں اور فیصلہ الٰہی مصلحتوں کے اعتبار سے ان میں سے ایک تخصیص کا ہو کہ خدائے تعالیٰ اپنے علم میں منفرد ہے، تو یہ شخص امت میں سب سے افضل ہوگا۔ اور اس موقع پر پیغمبر کا مطلق نائب وجود بالفعل مطلوب ہے۔ نہ کہ وجود بالقوی اور انبیا کا تفاضل اس لحاظ سے امت کی کثرت سے واقع ہے۔ حدیث معراج میں آیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی کثرت دیکھی تو رقت کے ساتھ فرمایا **بعث بعدی غلام یدخل الجنة من امته اکثر بمن یدخل من امتی** ''میرے بعد ایک شخص کو مبعوث کیا گیا جس کی امت کے لوگ میری امت کے مقابلہ میں زیادہ جنت میں داخل ہوں گے۔'' اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے **تزوجوا فانی مکاثر بکم الامم** ''نکاح کر و تا کہ میں تمہاری وجہ سے دوسری امتوں کے مقابلہ میں فخر کروں۔''

اگر اس فضیلت میں وجود بالفعل نہ ہوتا تو کثرت کیوں طلب کرتے؟ حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت فی نفسہ وہ ہے جس کا بیان اوپر گزر چکا۔ پس اس جگہ وجود خارجی ارادۂ الٰہی کی شرح کرتا ہے۔ اور جتنا زیادہ کثرت سے فائدہ ہوگا نبوت کی خلافت محکم تر ہوگی۔

اور یہ فضیلت ایک ایسا امر ہے کہ جب تک عارف تحقق اور تخلیق کے لحاظ سے اس رنگ میں نہ رنگا جائے گا۔ اس کی باریکی کو نہیں جان پائے گا۔ اور تمام فضائل پر اس کے رجحان کو نہیں سمجھے گا۔ اور اس فقیر نے جب تک اس بستان کی روح نہ سونگھ لی، اس سے آشنا نہیں ہوا۔ اور یہ فضیلت اپنی حقیقت کے لحاظ سے کسی استعداد سے مشروط نہیں ہے

تو چوں ساقی شوی در وے تنگ ظرفی نمی ماند

بقدر بحر باشد وسعت آغوش ساحلہا

"تم جب ساقی ہو گئے تو اس میں ظرف کا چھوٹا پن نہیں رہا، ساحلوں کی آغوش کی وسعت سمندر کے حساب سے ہوتی ہے۔"

لیکن اللہ کی سنت یہ جاری ہے کہ یہ فضیلت اس شخص کے سوا کسی کو نہیں دی جاتی جو جلیتا اور کسبا مختلف فضائل کا جامع ہوتا ہے۔ مدت تک رحمت الٰہی جس پیغامبر کی طرف متوجہ رہی ہے، اس پیغامبر کے ضمن میں اس شخص نے بھی اپنا کام کیا ہو اور اخلاق کاملہ کا حامل ہو اور علوم پیغامبر کو بوجہ کامل اس نے اخذ کیا ہو۔ ان شرائط کی شرطیت اس لحاظ سے اٹھ جاتی ہے۔

جاننا چاہئے کہ جب ہم نے حظیرۃ القدس میں جو کہ افضل ترین لوگوں کی ہمتوں کو جمع کرنے والا ہے، غور و خوض کیا تو شیخین اور مرتضیٰ رضی اللہ عنہم کی ارواح کا پتہ چلا اور ان کے کمالات جدا جدا ہماری سمجھ میں آئے۔ ہم نے انتہائی روشنی میں شیخین کی روحوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بمنزلہ شعلہ پایا۔ کہ آئینے گھوم رہے ہیں اور روشنیوں کے ایک دوسرے پر عکس کے سبب وہ روشنی دوبالا ہو گئی ہے جو نور زمین پر پھیلا ہوتا ہے۔ وہ سب ایک ہی کشتی نظر آتا ہے۔ شعلہ کی شعاع کا اس پھیلے ہوئے نور کے درمیان آئینوں کی شعاع سے تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اور اسی طرح شیخین کی ارواح کی شعاعیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شعاعوں کے ساتھ یکساں ہو گئی ہیں اور باہم گھل مل گئی ہیں۔ اب شیخین کی ارواح کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روح سے جدا کر کے نہیں پہچانا جا سکتا۔

رق الزجاج ورقت الخمر

فتشابها وتشاكل الامر

"شیشہ پتلا ہو گیا اور شراب پتلی ہو گئی، دونوں ایک دوسرے کے مشابہ ہو گئے معاملہ متشابہ کا ہو گیا اور معاملہ کو سمجھنا مشکل ہو گیا۔"

فكا نها خمرو لاقدح

وكانها قدح ولاخمر

"گویا کہ شراب ہے اور پیالہ نہیں ہے اور گویا کہ پیالہ ہے شراب نہیں ہے۔"

ہم نے علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی روح کو آنحضرتؐ کے تعلق سے بمنزلہ چاند کی روشنی

کے پایا جو کہ سورج کے مقابلہ میں واقع ہے اور اس سے نورانیت کسب کر کے خود دوسری صورت اختیار کر کے اپنے جمال سے ظاہر ہوتا ہے۔ اسی طرح مرتضی رضی اللہ عنہ کی روح جو ولایت کا راستہ کھولنے والی ہے، آنحضرت کی روح میں داخل ہو کر اس میں شامل ہوئی، جتنا اس کے لائق تھا پھلی اور پھر بذات خود قائم ہوئی

آں بادۂ شعلہ گوں کہ دارد خورشید

درکاسۂ ماہ چوں رسد شیر شود

''وہ شعلہ گوں شراب جو خورشید میں ہے جب چاند کے جام میں پہنچتی ہے تو دودھ ہو جاتی ہے۔''

اسی کی شرح یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سبب سے تجلی اعظم کے مرتبوں میں سے ایک مرتبہ جو کہ ملاء اعلیٰ کی ہمتوں کے رنگ میں رنگین تھا، ختم ہو گیا۔ اور دوسرا مرتبہ جو عالم مثال کے رنگ میں واقع ہے، پیدا ہو گیا۔ پہلی راہ نبوت کی راہ تھی اور یہ دوسری ولایت کی راہ ہے۔ پس شیخین رضی اللہ عنہما کے ایام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے ایام ہیں اور مرتضی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ایام دورۂ ولایت کے ایام ہیں۔

حضرت صدیق رضی اللہ عنہ میں فنا اور عکس کے اعتبار سے ہم نے زیادہ شعاعیں پائیں۔ اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صدیق کے بارے میں فرمایا لو کنت متخذا خلیلا غیر ربی لاتخذت ابا بکر خلیلا ''اگر میں اپنے رب کے علاوہ کسی کو خلیل بناتا تو ابوبکر ہی کو خلیل بناتا۔'' یہ اسی فنا اور عکس کی طرف اشارہ ہے۔

اور حضرت فاروق میں تشبہ کا زیادہ تر ادراک ہم نے آپ کے دست مبارک پر کام کی تکمیل کے مطلوب ہونے اور حظیرۃ القدس کی تائید کے اعتبار سے کیا۔ اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لو کان بعدی نبی لکان عمر ''اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمر ہوتے۔''

اور حضرت مرتضی رضی اللہ عنہ میں ہم نے قوائے ثلث کے اعتدال اور ان میں بعض کے بعض کے ساتھ انتظام کے اعتبار سے زیادہ تر دیکھا۔ اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ھو منی و انا منہ ''وہ مجھ سے ہیں اور میں ان سے ہوں۔''

جاننا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ تب فیض خاص محل خاص میں نازل فرماتا ہے اور یہ حکمت

کے قبضہ میں لازمی ہے۔ اس لئے کہ عنصری ہیئتیں اور فلکی ہیئتیں اس فیض کی اس میں تخصیص کرتی ہیں تا کہ مقتضائے حکمت باطل نہ ہو۔ چنانچہ جس وقت اللہ تعالیٰ نے فیض نبوت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمایا تو معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بدن مبارک اس فیض خاص کے لئے جہت عنصر سے تیار تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شرکت حاصل ہوگئی۔

اور اسی طرح اگر استعداد فلکی بعض میں پائی جاتی ہے تو لامحالہ اس شرکت کی جہت سے بعض فیوض ظاہرہ میں شرکت حاصل ہوگی۔ جیسا کہ تاریخ کی کتابوں میں پایا جاتا ہے کہ سلطان محمود غزنوی کا طالع زائچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طالع زائچہ سے کواکب سیارہ کے مواضع، ان کے مناظرات، قران علوی، اور شمس و مریخ وغیرہ کی سعودیت کی جہت سے مکمل مشابہت تھی۔ چنانچہ سلطان محمود سے فتوح اور مجاہدات عظیمہ ظہور میں آئے۔ علی ھذاالقیاس. وجدان کے طریقہ سے معلوم ہوا کہ حضرت مرتضی رضی اللہ عنہ کی استعداد عنصری آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی استعداد عنصری سے مشابہ تھی اور اسی جہت سے ایک قسم کا قرب حضرت مرتضی کو حاصل ہوا۔ اور یہ معنی قرابت قریبہ کے بغیر حاصل نہیں ہوتا لیکن یہ فضیلت جزئیہ ہے جو مقامات ولایت سے تعلق رکھتی ہے نہ کہ من حیث النبوۃ انبیا کے ساتھ تشبہ کے باب سے۔

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت علی پر شیخین رضی اللہ عنہم کی فضیلت کے راز کے بارے میں روحانی سوال کیا حالانکہ وہ نسباً ان سے اشرف، حکماً ان سے بہتر فیصلے کرنے والے، اعضا کے لحاظ سے ان سے زیادہ شجیع و بہادر ہیں اور صوفیا بھی اپنی آخری نسبت انہی سے قائم کرتے ہیں۔ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے میرے قلب پر یہ فیضان ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دو جہت ہیں، جہت ظاہر اور جہت باطن۔ وجہ ظاہر لوگوں میں عدل کے قیام، ان کی تالیف اور ظاہر شریعت کی طرف ان کی رہنمائی ہے۔ اور شیخین اس میں آپ کے لئے بمنزلہ جوارح کے ہیں۔ اور جہت باطن مرتبہ فنا و بقا اور آپ کے علوم مرویہ کی طرف ہے اور ان سب کا تتبع وجہ ظاہر سے ہوتا ہے۔ اور اسی کے ساتھ ہماری جو مراد تھی وہ پوری ہوگئی۔ والحمدللہ تعالیٰ اولا و آخرا وظاھرا وباطنا.

۷۸-تفہیم:

سعادت اخرویہ کی تحقیق

الحمدللہ الذی بنعمته تتم الصالحات و علی فضله المعول فی جمیع الحالات وصلی اللہ علی سیدالبشر شفیع الناس فی المحشر وعلی اله و صحبه وسلم. امابعد. یہ سعادت اخرویہ کی تحقیق کے سلسلہ میں چند کلمات ہیں۔ جاننا چاہئے کہ سعادت اخرویہ کی تحقیق تین مقدمات پر موقوف ہے۔ حقیقت روح، اس کی علت اور انیت مجازات۔

چنانچہ روح ایسی چیز سے عبارت ہے کہ اس کا جسم سے ملنا جسم کی زندگی اور اس جسم میں حرکت بالارادہ اور حس کے ظہور کا سبب ہوتا ہے۔ اور اس کا جسم سے جدا ہونا جسم کی موت اور اس جسم سے حس وحرکت بالارادہ کے زوال کا سبب ہوتا ہے۔ اور جب ہم اس روح میں غور وخوض کرتے ہیں تو تہہ بر تہہ تین جز پاتے ہیں۔

ایک نسمہ ہے اور وہ بخار لطیف ہے جو خلاصۂ دم سے قلب میں پیدا ہوتا ہے، اور عمل قوی دکھاتا ہے، اور تمام اعضا میں سرایت کرتا ہے اور اس میں تغلیظ (گاڑھے پن) ترقیق (پتلے پن) تصفیہ، تکدیر (گندہ ہونا) تقلیل (کم ہونا) اور تکثیر (زیادہ ہونا) کی جہت سے طب کی تدبیر کا تصرف جاری ہے۔ اور ان حالات میں سے ہر ایک کا اس میں مبتلا شخص کے اخلاق واوضاع پر اثر پڑتا ہے۔ اور یہ روح کے جسم میں جذب ہونے، جسم سے اس کے تعلق اور روح کے اخلاق ظلمانیہ، شہویہ وسبعیہ میں گرفتار ہونے کا سبب ہے۔

دوسرے نفس ناطقہ ہے اور اس کی حقیقت نفس کلیہ مدبرہ کا مافی الکون کے لئے خاص مرتبہ میں تنزل ہے کہ اس مرتبہ کی شرط کے ساتھ اس جسم میں نظام انسانی تقاضہ کرتا ہے اور یہ جز و نفس کلیہ میں جذب اور معیت وہم آہنگی کی راہ میں کشادہ ہونے اور حقیقت جامعہ سے دور ہونے کا سبب ہوتا ہے۔ تیسرے روح سماوی اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ عنایت اولی میں وہ صورت انسانی بنتی ہے جو کہ انسان کے ہر فرد پر منطبق ہو جاتی ہے کہ اس پر قیاس کرتے ہیں۔ اور نفس عرش کہ شریعتوں میں ذکر اس سے عبارت ہے یہ صورت کو قبول کرتا ہے۔ اور اس طرح

اس کی پیروی میں تمام نفوس افلاک صورت کو قبول کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ عالم ساوی میں قائم ایک صورت اس طرح متعلق ہو جاتی ہے گویا کوئی قائم نہیں ہے۔ اس طرح بہت سارے چراغ حاضر کرتے ہیں اور سب کی روشنی داخل ہوتی ہے۔ اور ہر روشنی کی اسناد ایک خاص چراغ کے ساتھ شکل اختیار کرتی ہے۔ جو کچھ عالم ناسوت میں موجود ہے اس کے وجود میں آنے سے پہلے اس مقام پر شکل اختیار کرتا ہے اور اس کو کتاب کی شریعتوں میں محو و اثبات کہتے ہیں۔ چنانچہ مدتوں کے بعد بعض اوضاع فلکی اس کے مقتضی ہوئے کہ انسان کلی کی صورت کی تفسیر ان افراد سے کی جائے جو اوضاع فلکی اور استعداد ارضیہ اس دور میں اس کا تقاضہ کریں پھر ایسی شکل اختیار کرتا ہے کہ اگر اس وضع اور اس استعداد میں انسان پیدا ہوتا ہے تو یہ نفس چاہتا ہے اور اگر اس وضع اور اس استعداد میں موجود ہوتا ہے تو وہ نفس چاہتا ہے۔ اور جو کچھ حضرت آدم علیہ السلام پر ظاہر ہوا وہ اسی کتاب کا نسخہ تھا۔

اور بالجملہ ہر انسان کے مقابلہ میں حظیرۃ القدس میں جو کہ عالم مثال میں تجلی الٰہی سے عبارت ہے اور اس کے گرد ملاء اعلیٰ کے نفوس مکمل بشر میں اس طرح جذب ہیں جیسے لوہے کی کشش مقناطیس کی طرف ہوتی ہے۔ ایک صورت ہے جیسے معمار کے ذہن میں گھر کی شکل، جیسی وہ تعمیر کرنا چاہتا ہے، قائم ہوتی ہے۔ اور یہ صورت انسان پر سر بہ سر ہو بہو منطبق ہوتی ہے اور ایک اعتبار سے یہ کہنا کہ وہ جیسی ہونی چاہئے ویسی ہی ہے، صحیح ہے۔ اور جب روح انسان کے جسم میں پھونکی جاتی ہے، وہ ان میں سے کوئی ایک صورت اختیار کر لیتا ہے، اور لطافت کے حکم سے نفس ناطقہ اور روح ساوی کا حظیرۃ القدس میں حضور ہر فرد میں حظیرۃ القدس کی طرف ایک جذب اور کشش مجہول ہے۔ جانیں یا نہ جانیں۔ اور اس کی سعادت حظیرۃ القدس کی طرف میلان ہے اور اس سے مناسبت پیدا کرنا اور اس کی شقاوت حظیرۃ القدس سے داخلا اور زمین کی طرف اعراض ہے اور حظیرۃ القدس کی طرف پشت کرنا ہے۔

اور بالجملہ اس قدر جاننا چاہئے کہ آدمی کی روح بمنزلہ کمان ہے کہ اس میں جانور کا سینگ اور لکڑی دونوں پنہاں ہوتے ہیں اور مضبوط و محکم ہوتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے سے اس طرح پیوست ہوتے ہیں کہ ایک کی حرکت سے دوسرا متحرک ہو جاتا ہے۔ البتہ حکیم نکتہ شناس جانتا ہے کہ آگ سے نرم ہونا سینگ کا کام ہے اور کمان کو کھینچنے کے وقت شدت اور

ممانعت لکڑی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ یا بمنزلہ سیماب ہوتی ہے کہ اس میں پانی اور نقرہ دونوں کے اجزا جمع ہوتے ہیں تاہم حکیم نکتہ شناس جانتا ہے کہ اس کا سیلان، بہاؤ پانی کی وجہ سے اور بھاری پن چاندی کی وجہ سے ہوتا ہے۔

اور موت حقیقت میں نسمہ کے تعلق کا جسم سے منقطع ہو جانا ہے۔ کہ حیات اس وقت تک ہے جب تک ہر لحہ خلاصۂ دم جگر سے قلب کی طرف بلند ہوتا رہتا ہے اور روح طبعی پیدا ہوتی ہے اور اعضا میں سرایت کرتی ہے۔ اور اس کا ایک حصہ تحلیل ہو جاتا ہے اور دوسرا آ جاتا ہے

یکے میرود دیگر آید بجائے

''ایک چلا جاتا ہے اور دوسرا اس کی جگہ آ جاتا ہے۔''

جب موت نسمہ اور بدن کے درمیان حائل ہوتی ہے تو وہ مدد منقطع ہو کر جو کچھ قلب میں تھا نفس ناطقہ کی سواری ہو جاتی ہے۔

اس موقع پر یہ جاننا چاہئے کہ تعلق منقطع ہونے کے وقت اگر قلب اور تمام اعضا روح طبعی سے بھرے ہوتے ہیں تو نفس ناطقہ کا نسمہ سے گٹھنا قوی تر ہوتا ہے اور قوائے نسمہ واضح تر ہوتے ہیں۔ اور اگر بھرے ہوئے نہ ہوں جیسا کہ امراض مزمنہ محللہ میں محسوس کرتے ہیں تو طبیعت کلیہ نہیں گزارتی ہے کہ اس میں سے تھوڑا سا جو کہ نفس ناطقہ کی سواری ہو سکتی ہے، باطل ہو جاتی ہے۔ اور اسی کی طرح یہ کہ ہوا کے عنصر کی ایک طبیعت ہے کہ جب تک مقدار معین کثافت اور کھوکھلے پن کی گنجائش رہتی ہے اور جب اس مقدار سے زیادتی گزرتی ہے تو کھوکھلے پن اور کثافت کے لئے گنجائش نہیں رہتی۔ چنانچہ اگر شیشہ میں ہوا پھونکی جائے تو کثافت کو قبول کرتی ہے، حتی کہ کثافت کے لئے گنجائش نہیں رہتی۔ اس لئے شیشہ ٹوٹ جاتا ہے۔ اور اس راستہ سے ہوا نکل جاتی ہے۔ یا نفخ کو پھونکنے والے کا منہ رد کر دیتا ہے۔ اور اگر شیشہ سے ہوا کو چوس لیتے ہیں تو خالی پن کو اس حد تک قبول کرتا ہے کہ دوسرا کوئی امکان نہیں رہتا۔ اس وقت شیشہ اندر کی طرف پچک جاتا ہے اور ٹوٹ بھی جاتا ہے۔ یا ہوا کو چوسنے کی ممانعت ظاہر ہوتی ہے، ورنہ خلا کا وجود لازم آتا ہے۔ اور طبیعت کلیہ بھرنے کا تقاضہ کرتی ہے اور اسی طرح شیشہ ٹوٹنے کے قریب ہو جاتا ہے۔ نفخ یا ہوا کا شدت سے چوسنا ایک طبعی امر ہے۔ اسی طرح نسمہ سے بقائے جزوی جو نفس ناطقہ کی سواری ہوتی ہے، ایک طبعی امر ہے۔

اگر فرض کریں کہ نسمہ کے خالی ہونے کے ہزار سبب موجود ہیں تو اس تقاضاء طبعی کے سبب ان اسباب کی اس سے حد معین ہے۔لامحالہ دست کوتاہ کر لیتے ہیں۔

بالجملہ جب نفس ناطقہ کی سواری جدا ہو جاتی ہے اور بدن میں اس کا تصرف منقطع ہو جاتا ہے تو صورت نباتی کے احکام پوشیدہ ہو جاتے ہیں۔اور معدنیاتی قسم کی ایک چیز ظہور میں آتی ہے۔اس طرح کہ درخت اپنی جگہ سے اکھڑ جاتا ہے اور وہ جسم اس صورت میں مدت تک رہتا ہے۔اس جگہ سے غذا کا حصول اور نشو ونما پانا بند ہو جاتا ہے۔اور وہ معدن کے مشابہ ہو جاتا ہے۔اسی طرح انسان کا جسم نسمہ کے جدا ہونے کے بعد معدن کے مشابہ ہو جاتا ہے۔اور جو نسمہ نفس ناطقہ کی سواری ہے،وہ بھی معدن کے مشابہ ہو جاتا ہے اور یہ ممکن ہوتا ہے کہ طبیعت کلیہ اس کی تحلیل کے قریب بعض حوادث کے سبب ہوا کے عنصر سے بھیجتی ہے،جیسا کہ اجسام ملائکہ سفلیہ میں ہوتا ہے۔ان کا ایک جسم ہوتا ہے جو لطائف عناصر سے پیدا ہوتا ہے۔اور کیڑوں کے مزاج کے مشابہ ایک مزاج ہوتا ہے۔جب عناصر کے اجزائے کثیفہ متعفن ہو جاتے ہیں اور ان میں اجزاء حیاتی کا فیضان ہو جاتا ہے،تو کیڑوں کی اخلاط کے تعفن سے مشابہ ایک تعفن ہوتا ہے،پس اگر اجسام ملائکہ میں بعض حوادث کے سبب سے تحلیل پیدا ہوتی ہے تو اس کی جگہ طبیعت کلیہ،لطائف عناصر سے مدد بھیجتی ہے۔اور وہ وجود اور فساد کے نزدیک ہوتی ہے،نہ کہ غذا اور نمو حاصل کرنے کے نزدیک۔

اور ہم جو کہتے ہیں کہ اس بات کی ایک حد معین ہے کہ امتلا نفس ناطقہ کو قبول کرے۔ اس کی مراد یہ ہے کہ نسمہ کے چند اجزا جو قوائے ادراکیہ اور قوائے نفس بہیمیہ کو اٹھاتے ہیں،اپنی جگہ رہ جاتے ہیں۔اس حالت میں طبیعت کلیہ کے حکم سے خود بخود حس مشترک سمع وبصر کا کام کرتی ہے اور کلام وافادہ اور استفادہ قوائے قلبیہ کی مدد سے قوائے ادراکیہ اس طرح دکھاتے ہیں کہ ملائکہ بھی اس کی طرح کرتے ہیں۔

اور بالجملہ ملائکہ اور ارواح مفارقہ ایک معدنی رُخ سے مشابہت رکھتے ہیں اور وہ رخ ضبط وحفظ نفس ہے۔جسم خود کو بغیر غذا اور نمو کے حصول رکھتا ہے۔اور ایک دوسرا رُخ حیوان ہے۔اور وہ رخ نسمہ کا اپنے قوی کے ساتھ جمع ہونا ہے۔

دراصل مجازاۃ،حیوان میں بلکہ نباتات میں بھی پائے جاتے ہیں۔اور وہ یہ ہے کہ

ایک چیز کے افعال میں سے ایک فعل حالت کی ترتیب کا سبب ہوجاتی ہے کہ نظام کلی کے حکم میں اس سے لذت پاتی ہے یا رنجیدہ ہوتی ہے۔ مثلاً حیوان عادت سے زیادہ چارہ کھالیتا ہے اور بدہضمی میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ یا سم کے درخت سے کھالیتا ہے اور سخت درد میں مبتلا ہوجاتا ہے یا درخت طبیعت سے زیادہ رطوبت جذب کرلیتا ہے تو پھلوں کے فساد میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ وعلی هذا القیاس.

اور چونکہ انسان کو تمام نفوس سے زیادہ ذکی اور لطیف نفس دیا گیا ہے۔ لامحالہ اس کے مجازدو قسم میں منقسم ہوتے ہیں۔ اول وہ افعال کہ جو بدن سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً امتلا کے بعد بدہضمی کا لاحق ہونا یا زنجبیل کو کھانے کے بعد حرارت کا عارض ہونا۔ اور اس قسم میں فعل کا صدور شرط مجازاۃ کے اختیار میں نہیں ہے۔ کہ خواہ زہر کو زبردستی یا غلطی سے کھلایا جائے ہر حال میں مرجائے گا۔ بخلاف قسم ثانی کے اس جگہ جب تک بندہ کا ارادہ واختیار مطلوب نہ ہوگا۔ نفس ناطقہ اپنے فعل کے رنگ کو اپنے اندر نہیں کھینچے گا۔ اور جزا کی ہیئت منعقد نہ ہوگی۔ اور ایک قسم اپنے نفس کا تعلق رکھتی ہے اور حقیقت مجازاۃ متعلقہ اس کے نفس سے ہے کہ اس کے نفس کے تین جز ہیں اور ہر جز کا ایک قبلہ ہے کہ اس میں جذب ہوتا ہے اور ایک چیز ہے کہ اس کی خواہاں ہے جب اس جگہ پہنچتی ہے تو ساکن ہوجاتی ہے۔ اور جب مناسب صفات اس جگہ کسب کرتی ہیں تو لذت حاصل کرتی ہے۔ اور اگر اس جگہ نہیں پہنچتی اور اس جگہ صفات مباینہ اکتساب کرتی ہیں تو رنجیدہ ہوتی ہیں۔ چنانچہ نسمہ قوائے شہویہ، بہیمیہ، ادراکیہ کو جذب کرنے والا ہے۔ اور روح سماوی حظیرۃ القدس، ملاء اعلی کو جذب کرنیوالی ہے اور نفس ناطقہ حقیقت میں جامعہ کی طرف، جذب کرنے والا اور چھڑانے کی طرف متوجہ ہے اور ہر ایک کی سعادت خود وجدان میں ملائم ہے اور اس کی شقاوت وجدان منافر ہے اور یہ کشاکش زندگی کے حال میں بھی ہے۔ جہاں تک مغمور ڈوبے ہوئے) غیر ظاہر کا تعلق ہے۔ وہ اذکیا کے ساتھ مخصوص ہے۔ اور موت کی حالت میں نسمہ بدن کو الوداع کہہ دیتا ہے اور آلات بدنیہ کو دورہ دکھادیتا ہے اور اس کی مدد کا سلسلہ منقطع ہوجاتا ہے اور رقیق اور ضعیف ہوجاتا ہے اور قوائے شہویہ، سبعیہ وادراکیہ سب ضعیف ہوجاتے ہیں۔ اور روح سماوی کا حکم غالب آجاتا ہے۔ اور جذب وکشش حظیرۃ القدس کی جانب ہوجاتی ہے۔ اور دوسری آنکھ کھل جاتی ہے۔ لقد کنت فی

غفلة من هذا فكشفنا عنک غطاء ک فبصرک الیوم حدید ''اس چیز کی طرف سے تو غفلت میں تھا، ہم نے وہ پردہ ہٹا دیا جو تیرے آگے پڑا ہوا تھا، اور آج تیری نگاہ خوب تیز ہے۔'' (ق ۲۲)

اور اس حالت میں اگر یہ نسمہ، حظیرۃ القدس کی صفات ملائمہ و مناسبہ کسب کرتا ہے تو لذت بے کیف پاتا ہے۔ اور اگر ہم صفات منافرہ کا اکتساب دکھاتے ہیں تو روح سماوی کے ساتھ اپنی ترکیب اور اس کے ساتھ انعقاد کے سبب رنج و تکلیف اٹھاتا ہے۔

اور ہر شخص اپنے اوپر تجربہ کرتا ہے کہ مقام رویا میں ایک عالم سے اس پر علم گرتا ہے۔ چنانچہ اس علم بسیط کی صورتوں اور شکلوں کا پرتو عالم فوقانی سے ہے اور وہ صورتیں اور شکلیں نسمہ کے خزانہ سے۔ اور اپنے گمان کی جگہ میں انسان کے دل پر بلکہ چوپایوں کے دلوں پر بھی الہام ہوتی ہیں۔ اور درحقیقت رویا یہی کیفیت ہے کہ دل پر گزرتی ہے اور حواس کے تعطل کے سبب حس مشترک و متصرفہ اس کی طرف متوجہ ہوتی ہیں اور اس کو مناسب خلعت پہناتی ہیں۔ اور بیداری کی حالت میں جب حواس اپنے کلام میں مشغول ہوتے ہیں، اس کو صورت وہمیہ کے سوا کچھ میسر نہیں آتا۔

اور اگر تم اس کیفیت پر جو لوگوں کے دلوں پر گزرتی ہے، غور کرو گے تو پاؤ گے کہ بعض کواکب کی طبیعتیں اور ان کے بعض خیالات جو عالم مثال سے عبارت ہیں، گرتے ہیں۔ اور بعض دوسرے ملائکہ علویہ سفلیہ سے عقلاً و نقلاً ثابت ہے کہ ان سے لوگوں کے دلوں پر آثار کا فیضان ہوتا ہے۔ اگر عقل پیش دستی کرتی ہے تو وہ فیضان خاطر ہوتا ہے اور اگر دل سبقت کرتا ہے تو وہ فیضان حال ہوتا ہے اور بعض دوسرے شیاطین سے اور بعض طبیعتوں سے جیسا کہ اس کی تفصیل، رویا کی اقسام میں بیان ہو چکی۔

اور بالجملہ ہر مقدمہ جو فیضان کرتا ہے۔ اگر اس کے اندر اس کی استعداد ہے جس کا تقاضہ کیا گیا ہے تو جب بدن ارضی کی کدورتوں کی روح الگ ہوتی ہے اور لامحالہ وہ مافوق کی کیفیتوں اور احوال سے ملاپ کی استعداد خود پیدا کر لیتی ہے۔ اور اس پر عالم مثال اور ملاء اعلیٰ سے علوم و خواطر نازل ہوتے ہیں۔ اور اپنے احوال اعمال اور اقوال کو روشن دیکھتی ہے، ایک قسم سے متنفر ہوتی ہے۔ جب کہ دوسری قسم سے لذت حاصل کرتی ہے۔ اور اس کے اکثر نفوس

کے لحاظ سے دفعات و درجے ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ نسمہ کے اجزا اس قدر تحلیل ہو جاتے ہیں، اور نفس کی ذکاوت اس قدر ہو جاتی ہے۔ اور کبھی یہ ہوتا ہے کہ اس شخص کو عذاب دینے اور نعمتوں سے نوازنے کے لئے ملائکہ کو اس طرح الہام کیا جاتا ہے کہ اس شخص کی تقدیر کے تقاضہ کے مطابق ملائکہ کو الہام ہوتا ہے اور یہ مصلحت کلیہ کے مقتضیات کا ایک شعبہ ہے اور یہ حالت موت کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ اس عالم میں بھی جزا و سزا کا یہ مقولہ واقع ہوتا ہے۔

عقل، شرع کے طبقات میں ادراک کرتی ہے کہ جزا و سزا کے چار مقام ہیں۔ ایک اس دنیا میں، اور اس کی دو قسمیں ہیں، ایک اس شخص کے نفس میں ملاء اعلیٰ سے نفرت کا ترشح، دوسرے ملائکہ کا الہام کہ اس کے انعام و آلام کے مقتضیات کو انجام دیں۔ اور یہ الہام بنی آدم کے نفوس یا چوپایوں یا ملائکہ سفلیہ کے نفوس میں قرار پاتا ہے۔ اور یہ جماعت اس کو انعام اور آلام پہنچاتی ہے اور یہ جزا و سزا اسباب سماویہ وارضیہ سے مخلوط ہوتی ہے۔ چنانچہ اگر اسباب سماویہ وارضیہ اس کے انعام کے مقتضی ہوتے ہیں، اور فیصلہ مجازاۃ بھی انعام کا مقتضی ہوتا ہے، تو دوگنی نعمتیں دی جاتی ہیں، اور اگر مقتضی آلام کا ہے تو اس کے طبعی راستہ سے نعمت کم کر دی جاتی ہے، اور اگر اسباب سماویہ وارضیہ اس کو رنج و تکلیف پہنچانے کا تقاضہ کرتے ہیں تو اگر فیصلہ مجازاۃ بھی تکلیف والم پہنچانے کا مقتضی ہوتا ہے تو تکلیف دوگنی کر دی جاتی ہے۔ اگر مقتضی انعام کا ہے تو اس کی تکلیف کو کم کر دیا جاتا ہے یا تکلیف کے دوران گناہوں کی اس تکلیف کو روک کر انعام دیا جاتا ہے۔ یا اس شخص کے نفس کو فرحت عطا کر دی جاتی ہے۔ اور اگر اسباب سماویہ وارضیہ دونوں جانب سے ساکت ہوتے ہیں تو حق جزا و سزا مکمل کر دیا جاتا ہے۔ اور جب یہ شخص معاد کی طرف انتقال کرتا ہے تو گویا وہ امور سے فارغ ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا بھی مطلب ہے سنفرغ لکم ایها الثقلان ''اے زمین کے بوجھو! عنقریب ہم تم کو فارغ کر دیں گے۔'' (الرحمٰن ۳۱)

اور جب اس عالم سے انتقال کرتا ہے اور عالم برزخ میں جاتا ہے تو وہاں بھی جزا و سزا کے دو قسم کے فیصلے متحقق ہوتے ہیں۔ ایک جو کچھ اعمال دنیا میں کئے تھے، ان کی لذت و تکلیف کا ادراک ملکات حسنہ وسیئہ سے۔ اور اس شخص کو خوشی و شادمانی یا نفرت سے ملاء اعلیٰ کے گھیر لینے کا ادراک، خواہ یہ ادراک بے پردہ ہو جیسا کہ بیدار شخص اپنے اوپر طاری ہونے والی

کیفیتوں کا احساس کرتا ہے یا پس پردہ چند صورتیں۔ اور جسم اس کے خیال میں آ جاتے ہیں۔ جیسا کہ سونے والا اپنے غیظ و غضب کو درندہ کی شکل میں دیکھتا ہے۔ اور اپنے صفراوی مزاج کو آگ کی شکل میں دیکھتا ہے۔ اور اس کے شعلوں کا ادراک نہیں کرتا۔

اور دوسرے ان ملائکہ کو جو اس مقام پر موکل ہیں، انعام عطا کرنے یا رنج والم پہنچانے کا الہام کرنا۔ چنانچہ یہ ملائکہ خود کو انس ومحبت کرنے والی یا وحشت زدہ کرنے والی صورت میں ظاہر کرتے ہیں۔ نرمی اور لطف کی یا تند وسخت باتیں کرتے ہیں۔ اور نعمت یا عذاب کی کیفیت ظاہر کرتے ہیں۔

اور جب اس مقام سے گزر جاتا ہے اور دوسرا عالم پیش آتا ہے جس کو شرع کی زبان میں یوم الحشر کہتے ہیں اور اس کی حقیقت وہ مقام ہے کہ اس میں نفوس ارضیہ بہت سے احکام فردیہ کو جو عناصر کے اختلاط اور مادہ تاریک کی جہت سے پیدا ہوتے ہیں، الٹ پلٹ کر دیتا ہے۔ اور یہ نفس بمنزلہ جسم شفاف صورت نوعیہ کی حکایت بیان کرتا ہے۔ اور صورت نوعیہ کے احکام ظہور اور غلبہ کے طریق سے اس طرح ظاہر ہوتے ہیں کہ افراد انسان میں صورت نوعیہ محسوسات میں تقاضہ کرتی ہے کہ دونوں ہاتھ، دونوں پاؤں، دونوں آنکھیں اور دونوں کان پیدا ہوں لیکن کبھی استعداد مادہ کی کوئی رکاوٹ اس سے منع کرتی ہے اور جنین ناقص الخلقت اندھا، ہاتھ کٹا ہوا اور مخنث پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ سب مادہ کے قبیل سے ہوتا ہے نہ کہ صورت نوعیہ کے قبیل سے۔ اسی طرح امور منقولہ میں صورت نوعیہ کا تقاضہ یہ ہے کہ عقل سلیم اوہام کی آلودگی میں ملوث نہ ہو کر مبدأ فیض سے علوم حقہ کی قبولیت کی استعداد رکھے، اور صحیح خیال سے شے کو جو اپنی مناسب صورت میں عالم مثال کی شکل کے طبق پر ہے، ظاہر کرے۔ چنانچہ احکام فردیہ مغلوب اور احکام نوعیہ غالب آ جاتے ہیں۔ نوع کے تمام مقتضیات عقل وخیال میں انجام پاتے ہیں اور صورت فردیت احکام نوع کے ظہور کو قبول کرتی ہے۔ اور مکمل وجود سے اس کو اس طرح بیان کرتی ہے کہ افراد نوع میں ممکن نہیں ہوتا کہ اس سے بہتر نوع کے احکام ظاہر ہوں۔ **فکشفنا عنک غطاء ک فبصرک الیوم حدید** ''ہم نے وہ پردہ ہٹا دیا جو تیرے آگے پڑا ہوا تھا اور آج تیری نگاہ خوب تیز ہے۔'' (ق ۲۲)

چنانچہ اس مقام پر چند وقائع ظاہر ہوتے ہیں۔ میزان، حساب، تجلی الٰہی، حوض،

اعمال ناموں کا دائیں اور بائیں ہاتھوں میں دیا جانا۔ ہاتھوں اور پیروں کی شہادت، پل صراط سے گزرنا، چہروں کا سفید اور سیاہ ہونا اور رسولوں کی شفاعت۔

چنانچہ میزان اعمال حسنہ وسیئہ کی مقدار کی صورت کے ظہور اور دونوں قسم میں سے ہر ایک کی تاثیر کو اس شکل میں پہچاننا جس کا عالم مثال تقاضا کرتا ہے، عالم مثال کے درمیان ترازو کے دونوں پلڑوں وغیرہ سے۔ اور عالم شہادت اس معنی میں کہ اجسام خارجیہ قوائے مثالیہ اور ان کی مانند کی شکل قبول کرنے والے ہوجائیں۔ جیسا کہ جبرئیل نے ایک اعرابی کی صورت اختیار کر کے ایمان، اسلام، احسان اور قیامت کی شرائط کے بارے میں ہمارے پیغمبرؐ سے سوال کیا تھا۔ اور جس طرح حضرت داؤدؑ کے سامنے آپس میں لڑنے والوں کی شکل اختیار کر کے فرشتے آئے تھے۔ اور حساب اس شخص کی اطلاع سے عبارت ہے، جس کے اعمال کے مساوی ومحاسن اس طرح ہوں کہ ان کے مترتب اجزا علوم غیبیہ کے اس شخص پر فیضان کے سبب سے واضح ہوجائیں۔

اور تجلی الٰہی، تجلی اعظم کے منزہ اور مقدس صورت میں اس طرح ظہور سے عبارت ہے کہ انسان کی صورت نوعیہ اس کی معرفت کی استعداد رکھے۔ اور چونکہ بعض الٰہیات کے ماہروں کو تجلی نوری متحقق ہوجاتی ہے لیکن اس جگہ اس تجلی کی استعداد رکھنے والا اس کی خصوصیت فردیہ ہوجاتی ہے۔ اور اس جگہ تجلی، صورت نوعیہ کلیہ کو چاہے گی۔ تجلی ہمیشہ نہیں ہوتی، سوائے اس کے کہ جس کے لئے تجلی کی جارہی ہے، اس کی استعداد کے مطابق ہوتی ہے۔

اور حوض ہدایت ورشد کی صورت ہے جو کہ تجلی اعظم سے بہ نفس نفیس حضرت پیغامبر صلی اللہ علیہ وسلم پر ڈالی گئی۔ اور وہاں سے پیغامبر صلی اللہ علیہ وسلم کے قوی کے واسطہ سے عالم شہادت میں جاری ہوئی۔ اور حوض کے برتن ان ہدایات کے بقدر صورت ہیں جن کو افراد مسلمین نے قبول کیا ہے۔

اور اعمال نامے صورت نفس انسانیہ سے عبارت ہیں کہ عالم مثال میں، جس کی شرح ہم بیان کر چکے ہیں، ظاہر ہوتی ہے۔ اور سفید وسیاہ نقاط محاسن اعمال کو بیان کرتے ہیں۔ اور ان کے برے اعمال اس میں منقش ہوتے ہیں۔

اور ہاتھوں اور پاؤوں کی شہادت ان صورتوں کی دوسری نمائش ہے، اس نفس کے اس

صورت کے ساتھ من وجہ اتحاد کے اعتبار سے۔

اور صراط اس راستہ سے عبارت ہے جو فطرت سلیمہ انسانیہ کا مقتضی ہے کہ تمام شریعتوں میں اس کا بیان اور شرح ہوتے ہیں اور اس پر تیزی اور سستی سے چلنا اور دوزخ کی آنکھیں یا گرم سلاخیں سب اس فطرت سلیمہ کی موافقت اور اس سے منافرت ہے۔ اس امر سے کہ جو موافقت اور منافرت کو ہوتی ہے۔

اور سفیدی اور سیاہی وغیرہ نور نفسانی کے ظہور سے جو کہ اعمال حسنہ کے کسب سے ہوتا ہے اور ظلمت نفسانی جو اعمال سیئہ کے ارتکاب کے سبب حاصل ہوتی ہے، صورت ہیئۃ حسیہ کی ایک نمائش ہے۔ جو اس نور وظلمت کے مشابہ ہوتی ہے۔ عالم مثال کے حکم کے بارے میں اس قدر جان لینا چاہئے کہ یہ سب کچھ عالم اجسام میں ہے لیکن اس طرح کہ قوائے مثالیہ غالب ہوں اور استعداد جسمی مغلوب۔ اسی طرح تمام اجسام اخرویہ یہی حکم رکھتے ہیں۔

اور شفاعت ایک خاص رحمت کے نزول سے عبارت ہے۔ جو نفوس بشریہ سے حضرات انبیا خصوصاً حضرت خاتم النبیین صلوات اللہ علیہ وعلیہم اجمعین کے واسطہ سے گناہوں کو زائل کرنے والی ہوتی ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ دنیا میں کبھی ایک شخص کو ملاء اعلیٰ کی برکات حاصل ہوجاتی ہیں، اور جو گناہ اس کے دامن پر لگے ہیں، وہ متاثر ہوتے ہیں۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا شاید اللہ نے اہل بدر سے کہہ دیا ہے کہ تم جو چاہے کرو، میں نے تمہیں معاف کردیا۔ اور اس مقام پر ملاء اعلیٰ کی نفرت اور ان کی رحمت سخت اور نرم خطابات سے ظاہر ہوتی ہے۔ اور ملائکہ رحمت و عذاب ظاہر ہوتے ہیں۔ اور اعمال کے مناسب ہولناک صورتیں اونٹ اور بیل وغیرہ کی اختیار کرتے ہیں، اپنے منہ سے کاٹتے ہیں، اپنے سینگوں سے مارتے ہیں اور اپنے پاؤں سے روندتے ہیں۔ اس طرح کہ اس جگہ ملائکہ سفلیہ وغیرہ کے نفوس پر ملاء اعلیٰ سے الہام ہوتے ہیں، اور اسی طرح جیسے ظہور کے مقامات میں ہوتا ہے، اس جگہ اجسام اخرویہ خیال کے مقام سے پہلے قوائے مثالیہ اثر پذیر ہوتے ہیں۔

اور جب اس مقام سے گزر جاتے ہیں تو دوسرا مقام پیش آجاتا ہے۔ اور اس جگہ رحمت و غضب الٰہی صورت نوعیہ انسان کے مقتضیات کی صورت میں ظاہر ہوتی ہیں۔ اس لئے کہ انسان کی صورت نوعیہ ایک بدن کا ایسا اور ایسا تقاضہ کرتی ہے اور بدن میں قوائے ادراکیہ و

طبعیہ شہویہ تقاضا کرتی ہیں۔اور ہر قوت کی ایک لذت اور تکلیف ہوتی ہے۔چنانچہ رحمت الٰہی ہر قوت کی لذت کی صورت میں اور غضب ہر قوت کے رنج والم کی شکل میں ظہور کرتی ہے۔اور چونکہ رحمت وغضب اعمال واخلاق اور نفوس کی ہیئتوں سے متعلق ہوتے ہیں۔ان میں لذتیں اور آلام، رحمت وغضب کے مراتب سے ہوتے ہیں۔مثلاً مقربین کے کھانے، پینے اور رہنے کے عطایا ابرار کے عطایا سے بہتر ہوتے ہیں۔

مقربین کا عطیہ آب چشمہ تسنیم ہوتا ہے جو کہ لذات عقلیہ کی مثال ہے کہ مجردات کے ادراک سے حاصل ہوتا ہے۔

اور عطیہ ابرار وہ شراب ہے جس میں آب تسنیم کی آمیزش ہے۔جو کہ لذت وہمیہ و خیالیہ کی مثال ہے کہ اس میں لذت عقلیہ کی روح تجلیات صوریہ کی مثال پر پھونک دی جاتی ہے جو کہ علوم مجردہ کی حکایت بیان کرتی ہے۔اور ہر ہیئت حسی بجائے ہیئت عقلی بیٹھ جاتی ہے، اور اسی کی حکایت ظاہر ہوتی ہے، اور اس موقع پر واجب ہے کہ صورت نوعیہ کے تمام مقتضیات نکاح، کھانا، پینا، مجالس، دلکشائی اور راحت افزا خطابات ظاہر ہوں۔اور انجیل میں جو مذکور ہوا ہے کہ معاد میں فقط لذت عقلیہ ہوگی، تو یہ مجازات جمی کا بیان ہے کہ تنہا برزخ کے مقام میں ان کے قوائے عقلیہ غالب تر ہیں۔ورنہ جب خصوصیت فردیہ کا پردہ پوری شفافیت پیدا کر دیتا ہے تو لازم ہو جاتا ہے کہ اس سے تمام قوی جو بدن ارض میں صورت نوعیہ کے مقتضی ہوتے ہیں، تمام فرشتوں کے ساتھ مل جاتے ہیں اور قوائے طبیعیہ سے چھڑانا اگرچہ ایک قسم کا کمال ہے۔صورت نوعیہ کی جانب اقطع (ہتھ کٹا)، اعمی (اندھا) اور اسک (مخنث) کا حکم رکھتا ہے۔اور یہ آخری شے ہے جو ہم نے ان اوراق میں پیش کی ہے۔**والحمدللہ تعالیٰ اولاً و آخراً۔**

۷۹-تفہیم:

اس مسئلہ کی تحقیق جو مسائل خلق میں اصل الاصول ہے

مسائل خلق میں اصل الاصول یہ مسئلہ ہے کہ اس میں رایوں کا بہت زیادہ اختلاف ہے۔البتہ جو کچھ کشف سے ثابت ہوا ہے ہم اس کو بیان کرتے ہیں۔اس کے بعد مختلف آرا کی تطبیق کے طور پر خفیہ اشارے سے مطلع کریں گے۔

یہ مسئلہ دو قاعدوں پر مبنی ہے۔ پہلا قاعدہ قرع اور انبیق (لوکی اور بیر) میں ہے جب پانی ہوا ہو جاتا ہے اور پھر ہوا پانی ہو جاتی ہے۔ اور ہم قوی دانائی سے ادراک کرتے ہیں کہ ایک چیز باقی ہے اور جو چیز بر سبیل تبدل متوارد متغیر ہو گئی ہے۔ وہ عناصر اور موالید کا ہیولی باقی ہے۔ اور وہ چیز صورت نوعیہ کا متبدل ہے۔

منصور کا مذہب یہ ہے کہ یہ ہیولی وہی صورت جسمیہ ہے جو بذات خود قائم ہے یا اپنی ذات کی حد میں صورت ہے اور دونوں صورتوں کے اعتبار سے اس پر ہیولی ہے۔

اور یہ صورت جسمیہ خارج میں ہیولی اولی پر معتمد نہیں ہے جیسا کہ مشائین ثابت کرتے ہیں۔ البتہ عقل کہتی ہے کہ اس کی دو جہت ہیں، جہت فعلیت اور جہت قوت۔ دونوں جہتیں خارج میں ایک موجود سے نکلی ہوئی ہیں۔ رئیس مشائین نے جہت کے دو ہونے کو اس طرح بیان کیا ہے کہ خارج میں دو کے وجود کا وہم پیدا ہوتا ہے۔

اور ایسی صورت جسمیہ کے کچھ خواص ہیں ایک یہ کہ اس کا دایاں بائیں سے غیر اور فوق تحت سے غیر ہوتا ہے۔ مجبورا تقسیموں کا بے انتہا احتمال ہوتا ہے کہ مختلف صورتوں کا مقتضا نہ رہے۔ دوسرے یہ کہ مشار الیہ یہاں اور وہاں ہو جاتا ہے۔ تیسری یہ کہ ہمیشہ متحرک ہوتا ہے یا ساکن۔ ان دونوں حالتوں سے خالی کبھی نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ بہت سی صورتوں کا جوہریہ و عرضیہ مورد ہے۔ اور ہر صورت کا ایک مقتضا ہوتا ہے۔ اگر اس میں وہ ایک صورت اور اس کا مقتضی موجود ہے تو سکون ہے اور اگر دوسری صورت اور اس کا مقتضی ظاہر ہوتا ہے تو حرکت ہے۔ اور یہ حرکت مقولات میں بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اور اسی میں کیفیت وغیرہ ہوتی ہے۔

چوتھے یہ کہ کبھی صورت نوعیہ سے جدا نہیں ہوتی۔ اس جسم کے تحقق سے پہلے سارا عالم فعل تھا اور سارا ایک حال پر ثابت تھا، اور مکان کے اشارہ سے تمام خالی صورت جسمیہ تھی۔ یہ بدعتیں درمیان میں آگئیں۔

دوسرا قاعدہ مرجع خلق دو صفت ہیں کہ جس جمع و تفریق کا ہم مشاہدہ کرتے ہیں۔ وہ بعض اشیا کی تخلیق سے اور بعض اشیا کے فنا سے ہوتا ہے۔ جمع و تفریق وہ اجزا ہیں کہ حیوان یا نباتات کا بدن بھی بکھرتا ہے اور اس کی تالیف کی صورت منتشر ہو جاتی ہے اور خاک خاک ہو جاتی ہے، ہوا ہوا اور پانی پانی۔ اور الفت کا تعلق بھی ٹوٹ جاتا ہے اور پھر دوسری مخلوق میں

دوسری ترکیب سے آتا ہے۔ اور اس ترکیب کے آثار ہو جاتے ہیں۔ اور اسی طرح اور اسی طرح یہاں تک کہ دنیا ختم ہو جائے گی۔

اور یہ جمع وتفریق چھوٹے اجزا میں ہوتی ہے، اس طرح کہ نمو میں حیوانوں اور نباتات کو دیکھتے ہیں کہ ہر روز، ہر ساعت اور ہر آن سارے بدن میں اجزا منتشر ہوتے ہیں اور پھر تحلیل ہو جاتے ہیں۔

اس صورت میں کہ ڈول کی رسی پتھر سے بڑی قوت کے ساتھ ٹکراتی ہے۔ جس سے پتھر ایک انگشت کے برابر گھس جاتا ہے اس انگشت کو ہم بیس سال پر تقسیم کرتے ہیں تو لازما جو چیز گھسی ہے اس کی مقدار کو رب العزت کے سوا کوئی نہیں پہچانتا۔ متکلم کہتا ہے کہ یہ تجزیہ اس مرتبہ پر منتہی ہوتا ہے جو کہ جزلا یتجزی ہے اور دیمقراطیس کہتا ہے کہ وہ تجزیہ بالفعل چھوٹے چھوٹے سخت اجسام پر منتہی ہوتا ہے کہ ان کو بھی نہیں توڑا جا سکتا۔ فقیر کے نزدیک دونوں اقوال کا ایک دوسرے پر انطباق ہے۔ جزلا یتجزی کا مطلب یہ ہے کہ اس کی تقسیم نہ کاٹنے سے ممکن ہے نہ توڑنے سے، نہ وہم سے نہ فرض سے۔ اور خود کاٹنے اور توڑنے کی تقسیم کی انتہا میں اختلاف نہیں ہے۔ اب ہم وہمی اور فرضی تقسیم پر آتے ہیں۔ تقسیم وہمی کے دو معنی ہیں۔ ایک یہ کہ اس جز کی صورت کو ہم اپنے خیال میں نقل کریں اور اس کو دو قسموں میں تحلیل کریں۔ یہ وہمی تقسیم ایک حد پر منتہی ہو جاتی ہے، اس لئے کہ خیال ایک منتہی قوت ہے جو ایک جگہ جا کر منقطع ہو جاتی ہے۔ اور دوسرے یہ کہ دو ہونے کا ادراک وہم میں اس طرح کیا جائے کہ اس کی ایک جانب فوق ہے اور ایک جانب تحت۔ اور یہ کسی جگہ منقطع نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ صورت جسمیہ کے خواص سے یہ ہے کہ دو ہونا اس کے اجزا میں واقع ہو۔

اور اسی طرح تقسیم فرضی کے دو معنی ہیں، ایک یہ کہ اس کے معیار معین کا ادراک عدد اور کم متصل میں کرتے ہیں۔ مثلاً ایک ذراع (ہاتھ) کے ہزار جز ہیں۔ دوسرے یہ کہ ہم مجرد دو ہونے کو پہچانتے ہیں اور منحوت (کھرچے ہوئے) عدد اور کم متصل کے معیار کی تعیین پر قادر نہیں ہیں۔ جیسا کہ ہم نے سخت پتھر کے گھسنے کی صورت میں بیان کیا ہے۔

چنانچہ متکلم نے تقسیم وہمی وفرضی کو معنی اول میں لیا۔ اور کہا کہ جزءلا یتجزی وہمی وفرضی تقسیم کے قابل نہیں ہے۔ اس طرح اس نے صحیح کہا ہے اور فلسفی نے وہمی وفرضی تقسیم کو

دوسرے معنی میں لیا ہے۔ اور کہا ہے کہ جو کچھ یہاں اور وہاں کے اشارہ میں آیا ہے، وہ تقسیم وہمی و فرضی کے قابل ہے۔ سو اس نے بھی صحیح کہا ہے۔

جب یہ دو باتیں بیان کردی گئیں تو اب ہم اصل بات پر آتے ہیں کہ اس صورت جسمیہ قائمہ اور صورت نوعیہ متبدلہ کی حقیقت کیا ہے۔ متکلم کہتا ہے کہ صورت جسمیہ جو حقیقت میں اجزاء لاتیجزی ہے، وہ بھی آئی ہے۔ اس کا طول وعرض اور عمق امر انتزاعیہ ہے۔ کثرت و قلت اجزا بھی اس امر میں، جس سے ہم بحث کر رہے ہیں، منتزع ہو گیا ہے۔ اور اس نے بھی صحیح کہا ہے۔ اس لئے کہ ہر جز یہاں اور وہاں کے اشارہ کے قابل ہے۔ اور ایک سے دوسرے اسی طرح دوسرے سے تیسرے اور تیسرے سے چوتھے کا معاملہ ہے۔ اور یہ اجزا طول وعرض اور عمق میں بھی منتقل ہوتے ہیں جیسا کہ بارش کی اوپر سے آنے والی بوند کا معاملہ ہوتا ہے کہ وہم اس کو خط مستقیم سمجھتا ہے۔

اور صورت نوعیہ کی ترکیب متنوع ہے اور رنگ مختلف شکلیں کہ ہر ایک کو خدائے تعالیٰ نے اپنی سنت میں خواص و حرکات معینہ سے باندھا ہے تو اس کا کہنا بھی درست ہے۔ اس لئے کہ اس کو آدمی کہتے ہیں اور اس دوسرے کو گھوڑا۔ اس کو کھجور کا نام دیتے ہیں اور اس کو کیڑا کہتے ہیں۔ جب اس اطلاق اور تسمیہ کی تفتیش کرتے ہیں تو ہمارے خیال میں خاصہ کے اعراض اور ترتیب خاص کے سوا کچھ نہیں آتا۔ اور اگر فرض کرلیں کہ یہی مستقیم القامہ گھوڑا بشر کی رہنمائی کرنے والا، خطاب کو سمجھنے والا، ناطق اور ضاحک ہو جاتا ہے تو گھوڑے کے نام کا اطلاق اس پر نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس کا نام انسان ہوگا۔

ان انواع پر جوہر اور جسم کے نام کا اطلاق صور متبدلہ متواردہ کے اعتبار سے نہیں بلکہ دونوں حالوں میں قائم ایک اصل کے اعتبار سے ہے۔ اور گھوڑا جس کو ہم جوہر کی شکل میں جانتے ہیں اور اجسام کے قبیل سے شمار کرتے ہیں باعتبار صفات اس کا خاصہ ہے جیسا کہ ترکی اور زنگی دونوں کو باعتبار ترکیت و زنگیت بلکہ باعتبار معنی مشترک بھی انسان کہتے ہیں۔

فلسفی کہتا ہے کہ صورت جسمیہ کی حقیقت اولاً عنایت اولیٰ میں بوجہ تحقق عقلی کے شکل اختیار کرتی ہے۔ اس کے بعد چاندی کی انگوٹھی کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے کہ بمنزلہ ہانڈی کے جو حوض کے پانی سے بھری ہوئی ہو، عالم عقل سے برآمد ہوتی ہے۔ عالم اشارہ حسیہ ہو جاتی

ہے۔اور صورت نوعیہ کی حقیقت مقید قوم میں امور عاجز ہوتے ہیں کہ اولا مرتبہ عقل میں ظاہر ہوتی ہے اس کے بعد چاندی کی انگوٹھی میں پہنچتی ہے جو کہ آئینہ میں نظر آنے والے مختلف عکسوں کی صورت کے درجہ میں نقش ہونے والی صورت جسمیہ کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔امور عاجز عقل کے مرتبہ میں بمنزلہ مہر کے نقش کے ہیں کہ اسم کے حروف کا محصل ہے۔ مثلاً زید ہے عمرو نہیں۔اور صورت نوعیہ موم یا مٹی میں مستقر نقوش کے منزلہ میں ہے کہ شخص حروف ہے کہ یہ نفس خاص جو موم اور مٹی کے وجود اور اطوار سے عبارت ہوتا ہے،اس کو پہنچتا ہے۔وہ مرتبہ اولی وجود عقلی ہے۔اور یہ مرتبہ ثانیہ نفس اور صورت نوعیہ ہے۔صورت نوعیہ ہیولی میں حال ہے۔اس طرح کہ یہ نقش خاصہ موم اور مٹی میں حال ہے۔قوم مقیدہ میں عنایت اولی میں حال نہیں ہے بلکہ اپنے فاعل کے ساتھ قائم ہے،اور اشارۂ حسیہ کے ساتھ تلبس کے بغیر محقق ہے۔

فقیر کہتا ہے کہ حکیم فلسفی نے اس مقالہ میں درست کہا ہے اور تحقیق کا موتی سوراخ کیا ہوا ہے۔لیکن متکلم کے ساتھ ایک نزاع پیدا ہو گیا۔اس لئے کہ یہ نکتہ کہ عالم عقل سے عالم اشارہ حسیہ پڑ گیا ہے۔اس کے خواص میں سے یہ ہے کہ دایاں بائیں کا غیر ہوتا ہے اور یہی اشارۂ حسیہ کا معنی ہے۔

جب ہم نے یہ نکتہ ملاحظہ کر لیا کہ بکھرے ہوئے اجزا آپس میں مل گئے اور یہ مختلف صورتیں جو ہیولی میں منقش ہیں اول خارج میں ان کا ظہور عالم مقدس سے تالیفات اشکال اور الوان میں وہ تالیفات، اشکال اور الوان ان صورتوں میں بغل میں ہاتھ دئے ہوئے برآمد ہوتے ہیں۔راقم الحروف اصل نکتہ کو قریب لے آیا۔حکیم نے باریک ترین نکتہ بیان کیا ہے

عبار اتنا شتی وحسنک واحد

وکل الی ذاک الجمال یشیر

"ہماری عبارتیں بکھری ہوئی مختلف ہیں اور تمہارا حسن واحد ہے اور ہر ایک اس جمال کی طرف اشارہ کرتا ہے۔"

۸۰-تفہیم:

ارشاد باری ولقد همت به وهم بها الاية کی تفسیر

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ولقد همت به وهم بها لولا ان رای برهان ربه ''اور وہ عورت حضرت یوسف کی طرف بڑھی اور حضرت یوسف بھی اس کی طرف بڑھتے اگر وہ اپنے رب کی برہان نہ دیکھ لیتے۔'' (یوسف ۲۴) جاننا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ برائی اور فحش کاموں سے اپنے بندوں کی حفاظت دو طریقوں سے کرتا ہے۔ایک یہ کہ اس کی روح تقوی کے رنگ میں رنگ جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی زجر و توبیخ اور اس کی وعیدوں کو سنتا ہے۔تو وہ قلب پر موقع عظیم میں واقع ہوتی ہے۔اور اس کی وجہ سے اس کی جبلت میں پیدا کی ہوئی پوشیدہ دیانت ظاہر ہوتی ہے۔تب تقوی ہر طرف سے روح کا احاطہ کر لیتا ہے۔پھر اس کی جڑ میں داخل ہوتا ہے اور معصیت کے ملکہ کو سرے سے ختم کر دیتا ہے۔اور یہ علیین اور اہل اللہ کی عصمت ہے یعنی جن لوگوں کا قرب اللہ سے قوی ہوتا ہے۔اور اس کا ذریعہ اعمال اور ملکات ہیں۔اور دوسرا یہ ہے کہ اس کی روح کسی بھی رنگ میں نہ تقوی کے رنگ میں اور نہ فجور کے رنگ میں رنگی ہے بلکہ وہ خالی اور صافی ہوتی ہے۔اور اس پر تجلیات الٰہیہ کے تنوع احکام کے ظہور سے جو کچھ وارد ہوتا ہے جو تولی، فیضان شرائع اور اللہ کے جوارح وسنت سے منتقلی سے علی عینہ قائم ہے، اس پر وارد ہوتا ہے، اس کے لئے تیار رہتی ہے۔جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا الحق ينطق على لسان عمر ''حق عمر کی زبان سے بولتا ہے۔'' یا جبروت، ملکوت اور ناسوت سے اس کے وجود کی نشأتوں میں سے ہر نشاۃ کے حکم کا ظہور، تجلیات معنویہ اور احوال سنیہ، بہیہ اور مختلف طریقوں کے اختیار کرنے، اس کے عینا تنزلات میں وجود کے طریقوں کے اختیار کرنے کے مقابلہ کی حالت کے درمیان تعاقب پر ہوتا ہے۔لیکن اس شخص کا اوپر سے بھی اور نیچے سے بھی وہ اسم احاطہ کر لیتا ہے جو بندہ کو دوست بنانے کا مقتضی ہوتا ہے۔چنانچہ وہ اس کو اس طرح نہیں چھوڑتا کہ وہ ہلاکت میں پڑ جائے۔اگرچہ اس کے حال کے عموم اور طریقوں کے اختیار کرنے میں شیوع عام روش کے لئے اس میں ملکات سوء موجود ہوتے ہیں۔اس لئے کہ باطل ایسی نشاۃ سے خالی نہیں ہوتا جو اس کا موجب ہوتا ہے۔اور اس کا تحقق اس کی طبیعت کے لحاظ سے ہوتا

ہے۔اور وہ اپنی ذات میں خیر بحت ہے۔اگرچہ اس کا حکم اس مقام پر فساد قابل کے لئے شر میں بدل جائے۔اس لئے اس وقت عبد نہ کسی رنگ میں رنگا ہوا ہوتا ہے اور نہ ہی اپنے راز کی بنیاد کے لحاظ سے تقوی میں مقید ہوتا ہے۔لیکن تقوی اس کے اوپر سے اللہ کا لباس ہے۔اور یہ اللہ کی طرف سے اصحاب تجلیات کی عصمت ہے۔اور یہ پہلی والی سے زیادہ اشرف، اکمل اور زیادہ خوبصورت ہے۔اور یوسف علیہ السلام بلکہ تمام انبیا اس عصمت سے معصوم تھے۔اور اسی لئے تم ان کو مباحات، بیویوں اور بیٹیوں سے گلے ملنے اور کمانے، زمین جائدادوں، اولاد کے مفقود ہو جانے پر رونے، نرم پڑنے، مرض سے بیقرار ہونے اور اس کے ازالہ کا سوال کرنے میں مختلف حالتوں میں بدلتے دیکھو گے۔ جب کہ صوفیائے مقید جن کی روح ملکوت و جبروت کو دیکھنے میں فنا ہو گئی، اس کا دسواں حصہ بھی نہیں کرتے کہ ان کی ہمتوں نے دنیاوی زندگی کے ماورا تک اس مجامع کو قبول کر لیا ہے۔ چنانچہ وہ ایسے ہو گئے کہ وہ دیوار اور عورت اور اخص العیش اور اس کو عطا کرنے والے میں امتیاز نہیں کرتے۔اور اس کے حسب حال میں کہا ہے یاحبذا المکروھان الموت والفقر...... ''ناپسندیدہ چیزیں کتنی اچھی ہیں موت اور فقر''۔اور بالجملہ یوسف علیہ السلام نوجوان تھے، معتدل مزاج تھے اور عورت انسانوں میں سب سے زیادہ حسین و جمیل تھی، جو آپ کی محبت میں بے قابو ہو رہی تھی۔ چنانچہ اس نے اپنے آپ کو حضرت یوسف پر پیش کر دیا اور ہر طرح کا جمال اختیار کیا۔اور آپ کو اپنے نفس کی طرف راغب کیا۔دروازے بند کر لئے تو آپ کے مزاج ناسوتی کے لئے واجب ہو گیا کہ اس کا ارادہ کر لیں لیکن آپ کو دوست بنانے والے نے آپ کو پالیا۔اور وہ آپ کے سامنے ایسی برہان کی صورت میں آ گیا جس کو آپ نے دیکھ لیا۔اور اللہ نے آپ کو نجات دیدی۔اللہ تعالیٰ کا معاملہ مخلصین کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔فتدبر۔غور و فکر سے کام لو اور ثابت قدم رہنے والوں میں شامل ہو جاؤ۔

۸۱-**تفہیم:**

تجلی کی اصناف اور اس کے بہت سارے معانی کا بیان

جاننا چاہئے کہ ہماری زبان میں تجلی کا اطلاق بہت سارے معانی پر ہوتا ہے، جو تین قسموں میں جمع ہیں۔ پہلی تجلیات وجودیہ ہیں اور ان کی حقیقت مظاہر جبروتیہ وامکانیہ میں ہر

مظہر میں احکام خاص اور آثار متمایزہ کے ساتھ تحقق خارجی کے لحاظ سے وجود کا ظہور ہے۔ اور دوسری تجلیات شہودیہ ہیں اور ان کی حقیقت یہ ہے کہ سالک جب اپنی پوری ہمت کے ساتھ اللہ سبحانہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے، اور اس کے لئے مختلف رنگوں میں اور مختلف وضعوں میں آخری حد تک حقیقت کھل جاتی ہے تو اس پر نکلنے والے ہر رنگ اور وضع کو تجلی کہا جاتا ہے۔ اور یہ اس کے اللہ تعالیٰ کے علم اور اس کی معرفت کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ اور تیسرے تجلیات کمالیہ ہیں۔ اور ان کی حقیقت یہ ہے کہ اپنے نفس سے فانی فی اللہ اور جس سے جبروت کی طرف تطلع مقدس کے وقت اس کی طبیعت کے کینہ و کدورت کی جڑیں اکھڑ جائیں۔ اور اس کو اس کیفیت پر دوام حاصل ہو گیا تو اس کا نفس جبروت کے رنگ میں رنگ گیا۔ اور اس پر جبروت کے احکام کے ظہور کے لئے سوار ہو گیا تو وہاں وہ نشاۃ متحقق ہو گئی۔ جو جبروت سے فیضان کرنے والی ہے۔ اس کی نسبت نفس ناطقہ کی طرف اس کے جواہر کی طرف اعراض کی نسبت ہے۔ اور مبادی جبروتیہ کی طرف اس کی نسبت وجود خارجی کی طرف وجود ذہنی کی نسبت ہے۔ اور اس فیضان کرنے والی بلندی اور اس کی صورت اپنے حال میں مستغرق سالک کے نزدیک یہ ہے کہ وہ حقیقۃ الحقائق پر مطلع ہو گیا۔ لیکن جب نفس نے ڈھانپ لیا اور اس رنگ کی طرح ہو گیا جو اس کا احاطہ کرنے والا ہے تو لازم ہے کہ وہ خارج میں موجود شے ہے جس سے نفس متصف ہوا۔

تجلیات شہودیہ کی کئی قسمیں ہیں۔ ان میں سے ایک تجلی افعالی ہے اور وہ یہ ہے کہ سالک اپنی ہمت کو اللہ کی طرف جمع کرتا ہے تو اس کی محبت اللہ تعالیٰ کے ماسوا سب سے زایل ہو جاتی ہے۔ اور اس کی محبت اور نشاط، اللہ میں منحصر ہو جاتی ہے اور جب یہ کامل ہو جاتی ہے تو حقیقت واحدہ منکشف ہوتی ہے جس کے ہاتھ میں منع کرنا و عطا کرنا، مارنا اور زندہ کرنا اور فقر و غنا وغیرہ بندوں کے احوال اور ان کے وجود میں تقلبات ہوتے ہیں۔ جب وہ نطفہ تھے اور ان کی ظاہری اور باطنی نعمتوں کی اقسام تربیت وغیرہ میں۔ اور یہ مقام توکل، تفویض اور تسلیم جیسے احوال کے پیچھے رہتا ہے۔

اور ان میں سے ایک تجلی صفاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ مظاہر متعدد میں حقیقت واحد کے ظہور کا انکشاف ہو جائے۔ اور کبھی تحقق اور وجود کے اعتبار سے ہوتا ہے اور کبھی ظہور کے اعتبار سے، کبھی صفت کے اعتبار سے، جیسے ان مظاہر میں سمع، بصر۔ اور حس۔ اور یہ مقام علم الاتحاد

کے پیچھے چلتا ہے، کبھی کثرت میں وحدت کے اندراج سے اور کبھی وحدت میں کثرت کے اندراج سے، اور کبھی مزاحمت کے طور پر دونوں امور کو جمع کر کے اور کبھی بغیر مزاحمت کے سکون قلب کے طور پر۔

اور ان میں سے ایک تجلی ذاتی ہے اور وہ حقیقت الحقائق کا انکشاف ہے جیسا کہ وہ اصل میں ہے، نہ کہ آئینہ میں عکس کے طور پر اور نہ مظہر کے طور پر بلکہ بنفسہ۔ اور یہ مقام حیرت کا تتبع کرتا ہے اور متکلم سطح کا مقتضی نہیں ہوتا اور کبھی اتحاد کے باریک نکات اور ایک شے کا وحدت سے اندراج اور دوسرے موقع پر کثرت سے۔ اور یہ چاروں یعنی محبت کی توحید، افعال کی توحید، صفات کی توحید اور ذات کی توحید سب ایسے مقامات ہیں کہ سالک ان کو عبور کرتا ہے۔ اور ان سے یکے بعد دیگرے اللہ کی طرف صعود کرتا ہے۔ اور تجلیات صوریہ اور ان کی حقیقت یہ ہے کہ اگر کامل ہے تو تجلی کمالی سے ٹپکے یا اس کے اللہ کے علم سے۔ اور اپنی حس مشترک میں اپنی ہمت کو جمع کرے۔ اس مقام پر اس میں جمع صورتوں میں سے کوئی صورت سے مترشح منزہ حکم کے اعتبار سے منعقد ہوتی ہے۔ تب اس کو وہ صورت حکم کرتی ہے اور حسن خطاب سے مخاطب کرتی ہے۔ یا اس کے ساتھ ناز و نخرہ اور رحمت و نرمی کا معاملہ کرتی ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے کہ آپ نے اللہ تعالیٰ کو خواب میں ایک نوجوان آدمی کی شکل میں دیکھا تو کفارات، درجات کے بارے میں سوال کیا۔

اور اس تجلی کی علامتوں میں سے یہ ہے کہ سالک اس کے ظہور کے وقت میں یہ عقیدہ رکھے کہ وہ اللہ ہے یا یہ کہ یہ اس حقیقت کی اس صورت میں بدلی ہوئی شکل ہے۔ یا وہ صورت مبارکہ معظمہ ہے جس کو سالک نے دیکھا ہے۔ اور اس وقت میں یہ عقیدہ نہ رکھے تو یہ اس کی طاعتوں کی قبولیت پر دلالت کرنے والے واقعات ہیں، نہ کہ تجلیات صوریہ۔ اور کبھی عالم مثال سے اس پانی پر صورت کا فیضان ہوتا ہے جو کہ موجودات عنصریہ کی اصل ہے۔ تب اس کا درجہ مثال سے ہوتا ہے اور اس کی حقیقت تجلیات کمالیہ میں سے کوئی تجلی ہے۔ جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام کے لئے درخت پر ہوا، اور جب پہاڑ جلا اور یہ بھی تجلیات معنویہ کی ایک قسم ہے۔

اور اس کی حقیقت اس معنی کا ظہور ہے جس کو وہ اللہ کی صفات کے معنی سے سمجھتا ہے تو نفس دراز ہو جاتا ہے، یا کسی زمانہ میں ایک رنگ میں رنگ جاتا ہے۔ اور یہ اس نوع کا ہوتا ہے

کہ کبھی حیوان یا نبات یا جماد کی ایک صورت دیکھتا ہے تو اللہ سبحانہ کے فعل کے لئے آئینہ کی طرح ہو جاتا ہے تو اس پر اس صورت کے حسن سے اس کے فعل کا حسن ظاہر ہوتا ہے۔ اور اس پر یہ علم غالب ہو جاتا ہے۔ اور وہ شراب معرفت سے جام لذیذ نوش کرتا ہے تو سکران اس کی عقل پر مغلوب رہتا ہے، یا وجودیا اس صورت میں تمام صفات کے ظہور کے لئے آئینہ کی طرح ہو جاتا ہے۔ تب اس کو حسن مظہر کی جانب سے حسن ظاہر باقی رہتا ہے اور اس کو سکر ہو جاتا ہے۔ اور اس کا قدس نفوس مقدسہ و ملائکہ اور عالم مثال کے احوال کی طرح ملکوتیہ یا اسماء اور تجلیات کمالیہ کی طرح جبروتیہ کی خاصیت سے لبریز ہو جاتا ہے۔ تو اللہ کے جمال کے لئے وجہ خاص اور حیثیت خاص کے اعتبار سے آئینہ کی طرح ہو جاتا ہے۔ اس سے اس کو سکر عجیب ہوتا ہے۔ اور کبھی اس پر معقولات ثانیہ جیسے تقدم و تاخر وغیرہ کی مانند معنی ظاہر ہوتے ہیں۔ تب اللہ کے حضور ترکیب پاتا ہے اور اس سے حال عجیب اور سکر پیدا ہوتا ہے اور نفس کا رنگنا ہوتا ہے۔ مثلاً وہ شخص اس وحدت کو دیکھتا ہے جو عالم ناسوتی میں ایک اور وحدت کبریٰ کے لئے آئینہ ہو جاتا ہے تو بھرپور خوشی و مسرت حاصل ہوتی ہے۔ یا روح کے احوال جیسے نشاط، حزن، جرأت اور سخت دل ہونا۔ تو اس سے اور حضور سے عجیب حال جیسے انس، ہیبت، نرمی و خوش خلقی، اور اللہ کے بارے میں چھچھوراپن اور عشق وغیرہ پیدا ہوتے ہیں اور ان تجلیات کے لئے مستعد ہر ذی علم اور سریع التاثر حال کے اعتبار سے حق کے ظہور کے لئے سخت رنگ والا۔ اور بہت سے ایسے ہیں کہ ان کے درمیان اہلیت رکھنے والا صحبت اختیار کرتا ہے اور وہ اللہ کے افعال اور اس کی صفات کو یاد کرتے ہیں۔ تب ان کے قلوب میں تجلیات معنویہ لذیذہ جوش مارتی ہیں۔ بلکہ کبھی وہ گیت اور ترانے، عشاق کی اپنے محبوبوں کے ساتھ بیان کی ہوئی حکایات سنتے ہیں۔ اس سے احوال عجیب پیدا ہوتے ہیں۔ اور کبھی شعر ظریف کی طرف مائل ہوتے ہیں تو ایک امر کا دوسرے امر پر فیضان ہوتا ہے۔ اور یہ تجلیات صوریہ و معنویہ ان مقامات پر نہیں ہیں کہ ان میں بندہ اللہ کی طرف صعود کے طور پر ترقی کرے بلکہ اس کے مقام کا نتیجہ اس کے علوم، حالات اور استعداد سے اس کے مقام کے مشابہ ہو جاتا ہے۔ تب وہ نتائج ظاہر ہوتے ہیں۔

☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اللهم ربنا لا مانع لما اعطيت ولا راد لما قضيت المهدی من هديت تبارکت وتعاليت سبحانک لا تخالطک الظنون ولا يصفک الواصفون ولا يغيرک المنون ولا يبدلک الظنون تقدست عن الامثال والانداد وتنزهت عن الاشباه والاضداد وتباينت عن الارواح والاجساد وتکبرت عن الاحصاء والاعداد لک الحمد ملاء سموٰاتک وزنة عرشک وعدد کلماتک ومبلغ علمک توحدت بحولک الوسيع وتفردت بطولک الرفيع وتفوقت بعزک المنيع وتبارکت بمجدک النصيع لبيک وسعديک اخلصت بانقطاعي اليک واقبلت بکلي عليک وانتصبت بجملتي بين يديک ليس بقلبي لمن سواک مثقال ذرة ولابقالبي لمن دونک مقدار حبة ولا بوجهي لمن غيرک موضع شعرة ولا بعيني الالک مکان قطرة اياک اعبد وبک استعين اليک ارغب واليک ارهب وکيف يعبد من يتضرع اليک ويختضع لديک واني يستعان من هو مغلوب في امره مقهور في عمره واين يرغب اليه ومسکتة الحدوث بين عينيه ومتي يرهب من ان شئت امته وان شئت احييته وان شئت اضحکته وان شئت ابکيته فانت دون کل مسئول منه موضع مسألتي وانت دون کل مطلوب اليه ولي حاجتي وانت المخصوص قبل کل مرجو برفدلي وانت المتعين قبل کل مدعو بدعوتي لايشارکک احد في رجائي ولا يوا فقک واحد معک في دعائي ولا ينظمه واياک ندائي ولا يزن سواک جناح بعوضة في شدتي ورخائي اشهد ان لا اله الا انت وحدک لا شريک لک کثرت نعمائک وزادت الائک وعظم فضلک وکبرمنک لم قصر شکري وساء صنيعي فاغفرلي مغفرة من عندک وارحمني رحمة من لدنک انت التواب الوهاب ذوالقوة المتين وان لم تغفرلي وترحمني لا کونن من الخاسرين

واشهد ان محمّد اعبدک ورسولک ختمت به انبیاء ک وصدرته علی اصفیائک جعلته وسیلة المقتربین وشفعته فی المذنبین یوم الدین. اللّٰهم ربنا فصل وبارک وسلم علیه کما امرتنا ان نصلی علیه وصل وبارک وسلم علیه کما تحب وترضی ان تصلی علیه وصل علی اخوانه من الانبیاء وجازهم احسن الجزاء کما هدوا الی الصراط المستقیم وقادوا الی المنهج القویم وعلی اله الطهرة الاصفیاء واصحابه البررة الاتقیاء. امین

اے اللہ! اے ہمارے رب! جسے تو عطا کرے اسے کوئی منع کرنے والا (رکاوٹ) نہیں ہوسکتا اور تو جو فیصلہ کردے اس کو کوئی رد کرنے والا نہیں ہوسکتا۔ ہدایت یافتہ وہ ہے جس کو تو ہدایت دے۔ تو برکتوں والا ہے، تو بہت بلند ہے۔ تیری ذات پاک ہے۔ تیرے ساتھ گمان وخیالات آمیزش نہیں کرتے۔ صفت بیان کرنے والے تیری صفت بیان نہیں کرسکتے۔ جن پر احسان کیا جائے وہ تجھے بدل نہیں سکتے۔ نہ ہی گمان تجھے بدل سکتے ہیں۔ تو ہم جنسوں اور شریکوں سے پاک ہے اور مشابہت وضدوں سے پاک ہے۔ ارواح اور اجسام سے دور ہے۔ اعداد واحاطہ سے بہت بڑا ہے۔ تیرے لیے تیرے آسمانوں کے برابر، تیرے عرش کے وزن کے برابر، تیرے کلمات کے اعداد کے برابر اور تیرے علم کے برابر تعریفیں ہیں۔ تو اپنے وسیع اردگرد میں تنہا ہے۔ اور اپنے بلند وبالا طول میں منفرد ہے۔ اور اپنے مضبوط غلبہ میں فائق ہے اور اپنی خیر خواہانہ عظمت میں بہت برکت والا ہے۔ میں حاضر ہوں، تیری فرماں برداری کے لیے تیار ہوں۔ میں پورے خلوص کے ساتھ تیری طرف متوجہ ہوں۔ میں نے اپنا رخ کلی طور پر تیری طرف کرلیا ہے۔ اپنے پورے وجود کے ساتھ تیرے سامنے حاضر ہوں۔ میرے دل میں تیرے سوا کسی کے لیے ذرہ برابر بھی گنجائش نہیں ہے۔ اور نہ ہی میرے قالب پر تیسرے سوا کسی کا دانہ برابر کوئی اثر ہے۔ اور نہ میرے چہرہ پر تیرے سوا کسی کے لیے بال برابر کوئی جگہ ہے۔ اور نہ ہی میری آنکھ میں تیرے سوا کسی کے لیے کوئی بوند برابر اثر ہے۔ میں تیری ہی عبادت کرتا ہوں، اور تجھ ہی سے مدد مانگتا ہوں۔ تیری ہی طرف رغبت رکھتا ہوں۔ تجھ ہی سے ڈرتا ہوں۔ جو تیری طرف عاجزی کرتا ہے اور تیرے سامنے انکساری کے ساتھ آتا ہے اس کی عبادت کیسے کی جاسکتی ہے؟ جو اپنے معاملہ میں مغلوب ہے، اپنی زندگی میں مجبور

ہے اس سے کہاں سے مدد چاہی جا سکتی ہے؟ اور کہاں اس کی طرف مائل ہوا جا سکتا ہے حدوث کا وقفہ اور سکتہ اس کے سامنے ہے اور وہ شخص کب ڈرے کہ جس کو تو چاہے تو مار دے اور تو چاہے تو زندہ کر دے۔ تو چاہے تو ہنسا دے تو چاہے تو رلا دے۔ تو ہر سوال کرنے والے کے سوال کی جگہ سے قریب ہے اور ہر مطلوب سے زیادہ قریب ہے۔ میرے لیے میری ضرورت ہے اور تو میرے گروہ میں ہر امید سے پہلے مخصوص ہے اور تو میری دعوت میں ہر مدعو سے پہلے متعین ہے۔ اور تا کہ جو ان سے لطف اندوز ہونے کا مستحق ہے وہ لطف اندوز ہو۔ میں نے ان کا نام التفہیمات الالٰہیۃ رکھا ہے۔ حسبی اللہ ونعم الوکیل۔

میری امیدوں میں تیرا کوئی شریک نہیں ہے۔ میری دعا میں تیرے ساتھ کوئی شامل نہیں ہے، نہ ہی اس کو کوئی پورا کرتا ہے۔ صرف تجھے ہی پکارتا ہوں۔ میری نرمی اور سختی میں تیرے سوا کوئی مچھر کے پر کے برابر وزن نہیں رکھتا۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اکیلے تیرے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ تیرا کوئی شریک نہیں ہے۔ تیری نعمتیں بہت زیادہ ہیں۔ تیرے انعامات بیشمار ہیں۔ تیرا فضل بہت بڑا ہے اور عظیم ہے۔ تیرا احسان بہت بڑا ہے۔ پھر میرا شکر بہت کم ہے اور میرا عمل بہت برا ہے۔ بس تو اپنی مغفرت سے مجھے بخش دے اور اپنے پاس سے مجھ پر رحمت فرما۔ تو توبہ قبول کرنے والا ہے، بہت عطا فرمانے والا ہے۔ صاحب قوت متین ہے اور اگر تو نے میری مغفرت نہ فرمائی اور مجھ پر رحم نہ فرمایا تو میں بہت خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہو جاؤں گا اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تیرے بندے اور تیرے رسول ہیں۔ تو نے آپ پر اپنے انبیاء کا سلسلہ ختم کر دیا اور اپنے مخلصین میں آپ کو صدر مقام عطا فرمایا، تو نے آپ کو بے سہارا لوگوں کے لیے وسیلہ اور قیامت کے دن گناہگاروں کے لیے شفاعت کرنے والا بنایا۔ اے اللہ! اے ہمارے رب آپؐ پر درود وسلام اور برکت فرما جیسا کہ تو نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم آپؐ پر درود بھیجیں اور آپ پر درود وسلام اور برکت فرما جیسا کہ تجھے پسند ہے اور جس سے تو راضی ہے کہ آپ پر درود بھیجا جائے اور آپ کے بھائی انبیاء پر درود وسلام فرما اور ان کو احسن جزا عطا فرما جیسا کہ انہوں نے صراط مستقیم کی طرف ہدایت فرمائی اور منہج قویم پر قیادت فرمائی اور آپ کی مخلص وپاکیزہ آل پر اور آپ کے نیک ومتقی پرہیزگار اصحاب پر بھی۔ آمین

امابعد! عبد ضعیف ولی اللہ کان اللّٰه له فی الآخره والاولیٰ واتم علیه نعمته العظمیٰ ورحمته الکبریٰ کہتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ جو چاہتا ہے جس کو چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔ کوئی اس کے حکم کو رد کرنے والا نہیں ہے اور نہ اس کے جود وسخا کی کوئی حد بندی کرنے والا ہے اور اس کا ایک عظیم فضل اور وسیع احسان یہ ہے کہ اس نے مجھے وہ علوم عطا فرمائے ہیں کہ ان کے بارے میں کچھ کہنا اور انہیں بیان کرنا مشکل ہے۔ اور مجھے ایسے اسرار سے نوازا ہے کہ ان کی تعبیر سے نوع انسانی کی طاقت مضمحل ہو جاتی ہے۔ اپنی کثرت کی وجہ سے وہ ہر وقت زبان پر چڑھے رہتے ہیں اور ان کے تہہ بہ تہہ ہونے کی وجہ سے بھائیوں کی مخاطبت میں دروازہ کھل گیا۔ اس لیے میں نے چاہا کہ ان کو ایک رسالہ میں جمع کردوں تا کہ وہ ضائع اور فوت نہ ہو جائیں۔

۸۲- تفہیم:

بندہ کا اللہ سبحانہ کی ذات کی نسبت ایک ساتھ عاشق ومعشوق ہونا

عشق معشوقاں نہان ست وستیر
عشق عاشق بادوصد طبل ونفیر

"معشوقوں کا عشق پوشیدہ اور چھپا ہوا ہوتا ہے، عاشقوں کا عشق سیکڑوں ڈھول باجے اور آہ وزاری نالہ وفریاد کے ساتھ ہوتا ہے۔"

میرے دل کے دو خانے ہیں۔ ایک معشوقی اور دوسرا عاشقی۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جب خلاق اپنے آپ پر عاشق ہوا تو خلق وجود میں آئی۔ ہماری معشوقیت وہی معشوقیت ہے۔ پھر اس نے اپنے جمال کو دیکھا اور عاشق ہو گیا۔ ہماری عاشقیت وہی عاشقیت ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اس کی صفت ہمارے اندر حلول کر گئی ہے یا ہماری صفت اس کے اندر حلول کر گئی ہے یا اس کی عین ہوتی ہے۔ "تعالیٰ الله عن ذلک علوا کبیرا" اللہ تعالیٰ ایسی باتوں سے بہت دور اعلیٰ وبرتر ہے۔ وہ بہت بڑا ہے۔ اب اگر میں تمہارے اس وجود کی گہرائی میں جو عاشقیت کی طرف متوجہ ہوتا ہے غور وفکر کرتا ہوں تو تمہارا معشوق ہو جاتا ہوں۔ چنانچہ اس لیے کہ تمہاری عاشقیت میں التفات کی حالت میں جب علم انا رجعت قہقری میں رجوع

کرتا ہے تو معشوقیت کے مرتبہ میں پڑ جاتا ہے۔ اس لیے کہ وہ ذاتی طور پر اس مرتبہ کے مدمقابل ہے۔ اور اگر تمہارے اس وجود کی گہرائی میں غور وفکر کرتا ہوں جس کا رخ معشوقیت کی طرف ہے تو تمہارا عاشق ہو جاتا ہوں۔ اس لیے کہ تمہاری معشوقیت میں التفات کی حالت میں جب علم انا رجعت قہقری میں رجوع کرتا ہے تو عاشقیت کے مرتبہ میں پڑ جاتا ہے۔ اس لیے کہ ذات کے اعتبار سے وہ اس کے مرتبہ کے مدمقابل ہے۔ اگر میں عاشق ہوں تو ایسا کہ میری جیسی عاشقی نہیں ہے اور اگر معشوق ہوں تو ایسا کہ میری جیسی معشوقی نہیں ہے۔ میری عاشقی ام العاشقیت ہے اور میری معشوقیت ام المعشوقیات ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ مجنوں اور فرہاد کی عاشقی میری عاشقی کا ایک شعبہ ہے اور لیلیٰ وشیریں کی معشوقیت میری معشوقیت کا ایک پرتو ہے تو میرا کہنا درست ہوگا۔ ہرگز نہیں بلکہ حق بات تو یہ ہے کہ حقیقت میں میری عاشقی کے سوا کوئی عاشقی ہی نہیں ہے اور میری معشوقیت کے علاوہ کوئی معشوقیت ہی نہیں ہے۔ اور میری عاشقی اور معشوقی کے سوا دائرۂ امکان میں کچھ نہیں ہے۔ بلکہ وہ صحرا عدم میں ہے۔ اور صحیح بات تو یہ ہے کہ میں نہ عاشق ہوں نہ معشوق۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ جسم بلوری مخروطی سرخ نگینہ میرے مرکز پر ہے۔ اور ناصر علی نے جو کہا ہے

دلی دارم علی یک شہر معشوقاں بقربانش
محبت بلبلے دارد کہ گل ریزد ز آہنگش

"اے علی! میرے پاس وہ دل ہے کہ معشوقوں کا ایک شہر اس پر قربان ہے، محبت وہ بلبل ہے کہ اس کی آواز سے گل لرز کر گر پڑتا ہے۔"

یہ غلط ہے۔ بالکل کھوکھلا دعویٰ ہے کہ اس نے معشوقیت اور عاشقیت کو سمجھا ہی نہیں۔

۸۳-تفہیم:

انبیاء کے طریقہ پر چلنے والا ہونا

اے میرے بزرگو! میں ایک غریب مضطر انسان ہوں۔ میں نہ کسی کمال کا دعویٰ کرتا ہوں نہ خرق عادت کا اور نہ کسی وسیع وعریض حال کا اور نہ ہی کسی مقام کریم کا۔ اور میں دعویٰ کر بھی کیسے سکتا ہوں جبکہ مجھے اس کا حق ہی نہیں ہے۔ میں صرف ایک بات کہتا ہوں کہ اللہ

عز وجل نے اپنے جودوکرم سے مجھے راہ مستقیم اور سمت عبقری، نفیس اور عمدہ کی ہدایت فرمائی۔

میرے نزدیک علم تام حق کی بنیاد پر امر یہ ہے کہ یہ انبیاء و مرسلین اور سابقین کا طریقہ ہے جو کہ اولین میں سے ایک جماعت کثیر ہیں۔ اور آخرین میں تھوڑے ہی ہیں۔ چنانچہ مجھے مبدأ و معاد کا علم حاصل ہوا اور میں نے حدیث اور قرآن کے معنیٰ کو بغیر کسی تاویل کے سمجھا۔ اس لیے میں اس دیوان کا پورا پورا سمجھنے والا اور اس بقعۂ مکان کا جاننے والا ہوں۔ اور میں اپنے بھائیوں سے کہتا ہوں کہ میں تمہیں ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں کہ دو دو مل کر اور تنہا بھی کھڑے ہو کر سوچو کہ کیا تمہارے صاحب پر کسی جنون کا کوئی اثر ہے۔

فان حاولوا منی الجحود أو الردیٰ

فھذا دمی حل لھم لست اجحد

''اگر وہ میرے لئے کفر و انکار یا ہلاکت کی کوشش کریں تو میرا خون ان کے لیے حلال ہے، میں انہیں نہیں روکوں گا۔''

علی من ی شناسم ایں گہر وزدان حکمت را

فلاطون آہ گرمی دید یونانی کہ من دارم

''اے علی! حکمت کے موتیوں کی چوری کرنے والے ان لوگوں کو میں پہچانتا ہوں جو کچھ میرے پاس ہے اگر افلاطون اس یونان کو دیکھتا تو وہ بھی آہ کرتا۔''

نم جرم محبت خانہ زاداں فیضہا دارد

گلستانی کند دوزخ زدامانی کہ من دارم

''محبت کے جرم کی نمی خانہ زادوں کو فیض پہنچاتی ہے، میرے پاس جو دامن ہے اس کی وجہ سے دوزخ بھی گلستانی کرتی ہے۔''

دلے دارم جواہر خانہ عشق ست تحویلش

کہ دارد زیر گردوں میر سامانی کہ من دارم

''میرا وہ دل جو عشق کا جواہر خانہ ہے، اس کی تحویل میں ہے جو آسمان کے نیچے ہے اور میر سامان ہے جو میں رکھتا ہوں۔''

بدست آوردہ ام دل راز ایمانم چہ می پرسی
ہمہ تصویر معشوق است قرآنی کہ من دارم

''میں نے اپنے ایمان سے دل کو ہاتھ میں لے لیا ہے، تم کیا پوچھتے ہو سب کچھ معشوق کی تصویر ہے جو قرآن میرے پاس ہے۔''

دلی دارم علی یک شہر محبوبان بقربانش
محبت بلبلی دارد کہ گل ریزدز آہنگش

''اے علی! میرے پاس وہ دل ہے کہ محبوبوں کا ایک شہر اس پر قربان ہے۔ محبت ایک ایسی بلبل ہے کہ اس کی آواز سے پھول کھلتے ہیں اور جھڑتے ہیں۔''

۸۴- **تفہیم:**

ممتاز قوت عطا کی گئی

مجھے ممتاز قوت کی فطرت عطا کی گئی ہے۔ میں نے جس کسی بھی معقول یا معلوم لغت کی طرف توجہ کی، اس کی گردن مروڑ دی گئی اور اس کو پیروں اور ہاتھوں میں ہتھ کڑی اور بیڑیاں ڈال کر میرے سامنے پیش کر دیا گیا۔ اس کے بارے میں جو چاہتا ہوں حکم لگاتا ہوں چاہوں تو اس کو ختم کر دوں، اور چاہوں تو اس میں کاٹ چھانٹ کر دوں، اور اس کو مثلہ بنا دوں۔

بملک نکتہ گیری خسر وشیریں مقالم من
بہ پیشم بستہ می آرند ہرجاہست مضمونی

''میں نکتہ گیری کے ملک کا بادشاہ ہوں، شیریں بیان ہوں، اچھا مضمون جہاں بھی ہوتا ہے، اس کو میرے سامنے دستہ بستہ لے آتے ہیں۔''

اس کے باوجود نور نبوت فطری قوت ہے گویا کہ وہ ایک ایسی شراب ہے جس کا مزاج اپنی حدت اور حرارت کے لحاظ سے زنجبیل ہے۔

ازیں افیوں کہ ساقی دری افگند
حریفاں را نہ سرماند نہ دستار

''جس افیون کو ساقی شراب میں ڈالتا ہے، حریفوں کو اس کی وجہ سے سر و دستار کا ہوش

نہیں رہتا۔"

تن خاکی زمن در وجد وروح آسمانی ہم

عبارت ازصریر خامہ میر قصد معانی ہم

"میرا خاکی بدن وجد میں اور روح میں آسمانی بھی ہے، قلم کی آواز کی عبارت کے بھی معنی رقص کرتے ہیں۔"

۸۵-تفہیم:

ان کی فطری قوت کے معاد ان کے ساتھ ہیں

"اللّٰھم صل علی محمد و آلہٖ واغفرلی ذنبی کلہ جلہ وقلہ" اے اللہ! محمد پر اور آپ کی آل پر درود وسلام فرما اور میرے تمام چھوٹے بڑے گناہوں کو بخش دے۔ سبحان اللہ! یہ فطری قوت جو میرے ساتھ ہے اور میری دشمنی میں کھڑی ہوگئی اور میرے ساتھ ریش وگریبان کی طرح ہے۔ کبھی میں اس کو پچھاڑ دیتا ہوں اور کبھی وہ مجھے پچھاڑ دیتی ہے۔ جب وہ مجھے پچھاڑتی ہے تو میں اس کا بندہ ہوجاتا ہوں اور وہ مجھ پر غالب آجاتی ہے۔ پھر جب وہ مجھ پر غالب آجاتی ہے تو مجھے لبالب بھرے ہوئے پیالے سے سیراب کردیتی ہے، تب میں مست ومخمور ہوجاتا ہوں۔ اور ہر چیز کی مثال دیتا ہوں پھر وہ مجھے مجروح کردیتی ہے۔

چو گل زخندۂ عشرت ہمیں نصیبم بود

کہ پارہ پارہ بزخم ندامتم کردند

"پھول کی طرح کھلنا اور عیش وعشرت میرا نصیب تھا، کہ زخم ندامت کی وجہ سے مجھ کو پارہ پارہ کردیا۔"

اور جب میں اس کو پچھاڑ دیتا ہوں تو کبھی اس کو قتل کردیتا ہوں اور اس کے ٹکڑے کردیتا ہوں اور اس کی دوسری شکل بنادیتا ہوں۔

تو اللہ کی قسم اگر وہ باقی رہ جاتی ہے تو میں اس کو قتل کردیتا ہوں لیکن اس کا مثلہ نہیں بناتا کہ اس کا استہزا کیا جائے، اور اللہ کی قسم! اگر میں اس پر قوی غالب ہوجاؤں تو اس کو ایسی زمین میں جلاؤں جہاں پانی نہ ہو۔ وہ میرے ساتھ ایسا معاملہ کرتی ہے جو کوئی سگا

اور جڑواں بھائی بھی نہیں کرتا۔ اور ہم اس کی یہ مثال دیتے ہیں کہ کیا ٹھیٹھ عربی فصیح کلام بیان نہیں کرتا؟ پھر جب سوال کیا جاتا ہے کہ تو نے اس کو نصب اور اس کو رفع کیوں دیا تو چکرا جاتا ہے اور کوئی جواب نہیں دے پاتا۔ اور اگر انساب کی طرف لوٹتا ہے یہاں تک کہ جب اس کی عقل درجۂ کمال کو پہنچ جاتی ہے تو اس وقت اس کے نزدیک ہر چیز کی ایک مقدار ہوتی ہے۔ اور نحوی اپنی ممتاز قوت کی فطانت کے باوجود نہ اس کی طرح بیان کرتا ہے، نہ اس کی جیسی فصاحت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ حتیٰ کہ جب اس کا عقدۂ تمیزی حل ہو جاتا ہے اور اس کا گھیرا ٹوٹ جاتا ہے تو اس وقت وہ حیوان ناطق ہو جاتا ہے۔ تو یہی ہمارے اس قول کے معنیٰ ہیں۔ "اللّٰھم صل علی محمدن النبی الامی" اللّٰھم تم نے کہا ہے اور تمہاری بات صحیح ہے۔ امن یجیب المضطر اذا دعاہ ویکشف السوکون ہے جو پریشان حال کی دعا سنتا اور اس کا جواب دیتا ہے۔ دعا کو قبول کرتا ہے اور اس سے برائی کو دور کرتا ہے۔" "اللھم" میں ایک ضعیف، نحیف ونزار، غریب، بےبس اور پریشان بندہ ہوں۔ میں تجھ سے دعا مانگتا ہوں کہ مجھ سے برائی کو دور کر دے اور میرے دشمن کو ہلاک کر دے اور مجھ سے عناد رکھنے والے کو قتل کر دے اور مجھ سے لڑنے والے کے مقابلہ میں میری مدد فرما۔ اے اللہ! وہ چاہتا ہے کہ مجھے قتل کر دے اور مجھ سے میرا ملک چھین لے اور مجھے اپنے ہاتھ گردن سے باندھنے پر مجبور کر دے۔ اے اللہ! مجھ سے اس کے شر کو دور کر دے اور اس کی گرمی و سردی کو دور کر دے۔

۸۶۔ تفہیم:

سیدنا محمدؐ کے نبوت سے قبل و بعد کے مراتب احوال:

ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت سے قبل اوائل حال ہی میں حکمت، عصمت قطبیت باطنیت سب کا اکتساب کر لیا تھا۔ اس کے بعد وحی، رویت ملائکہ اور بعثت الی الحق سے مسند نبوت پر جلوہ افروز ہوئے۔ اور اسی درجہ میں عصمت کی حفاظت کے مقام پر فائز ہوئے اور حکمت کے ساتھ تلقین کے کام سے وابستہ ہوئے۔ اور حضرت ہدایت سے آپ کے اوپر ایک قسط کا فیضان ہوا تب آپ کی حقیقت دوسری حقیقت نبوی ہو گئی۔ اس وقت آنحضرت

بطریق خفیہ دعوت فرماتے تھے اور اغیار سے ان اسرار کو پوشیدہ رکھتے تھے۔ پھر آپ سے کہا گیا "**فاصدع بما تومر** "آپ کو جس امر کا حکم دیا گیا ہے اس کا اظہار کردو۔" اور کفار کے مقابلہ میں آجانے کا حکم دیا گیا اور اس مقام پر دائرۂ حفظ مکمل ہوگیا۔ چنانچہ دائرۂ عصمت مکمل ہوکر ہلال تلقین شمس الحکمت کے مقابلہ میں بدر کے مقام پر پہنچ گیا اور وہ عرش قطبی باطنی کے مقابلہ میں خاص طائفہ عرب کے لیے جامع قسط ہدایت فلکی ہوگیا۔ پھر حقیقت رسولیت ہوگئی پھر کفار و مشرکین کی طرف سے ظلم وزیادتی کی انتہا ہوجانے کے بعد مدینہ مطہرہ کے لیے ہجرت فرمائی اور عرب وعجم کے جہاد کے لیے مامور ہوئے۔ اور اس مرتبہ میں یہ تینوں مذکورہ بدر مرتبۂ شمس میں پہنچ گئے۔ ہر ایک کمان خود پیدا ہوئی۔ اس وقت اس کی تفصیل کی گنجائش نہیں۔ چنانچہ اس کی حقیقت لوگوں کے لیے کافی حقیقت ہوگئی اور یہی مرتبہ ہے جس میں اولین وآخرین کا علم دیا گیا۔ اور اس مرتبہ میں اسود واحمر کی طرف مبعوث کیا گیا۔ اور اس مرتبہ میں ثقلین (جن وانس) کی طرف مبعوث کیا گیا۔ اور اس عرشی نے مختلف افلاک (عظیم شخصیات) کو ایجاد فرمایا۔

پھر آپ سے کہا گیا **إنا فتحنالک فتحاً مبیناً لیغفرلک اللّٰہ ما تقدم من ذنبک وماتاخر ویتم نعمتہ علیک ویھدیک صراطاً مستقیماً وینصرک اللّٰہ نصراً عزیزاً** "ہم نے تمہیں کھلی فتح عطا کردی تا کہ اللہ تمہاری اگلی پچھلی ہر کوتاہی سے درگزر فرمائے اور تم پر اپنی نعمت کی تکمیل کردے اور تمہیں سیدھا راستہ دکھائے اور تم کو دست نصرت بخشے۔" (الفتح:۱-۳) تب آپ کی حقیقت، حقیقت خاتمیہ ہوگئی اور ہر قوس (کمان) بدر کامل ہوگئی اور آپ کے کمالات نے دار اخری کی طرف تجاوز کیا جیسا کہ اس میں شروع ہوا تھا۔ اور آپ کی طرف ارشاد وہدایت کے مد مقابل فرشتہ کی مدد ملادی گئی اور حفظ وتزکیہ اور مغفرت کے مد مقابل جزیاتی توجہات اور تقوے کی مدد شامل حال ہوئی۔ اور یہ مقام ہے کہ اس سے اوپر کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔

چنانچہ آنحضرت کے وارثوں کی بھی تین قسمیں ہیں: ایک وہ جنہوں نے حکمت، عصمت اور قطبیت باطنیہ حاصل کی۔ وہ آپ کے خاص اہل بیت ہیں۔ دوسرے وہ ہیں جنہوں نے حفظ، تلقین اور قطبیت ظاہرہ ارشادیہ اخذ کی اور آپ کے اصحاب کبار جیسے خلفاء اربعہ اور

تمام عشرہ مبشرہ اور تیسرے وہ وارث ہیں جنھوں نے (فضائی توجہات) اور تقویٰ وعلم اخذ کیے۔ یہ آپ کے وہ اصحاب ہیں جو احسان کے ساتھ لاحق ہوئے جیسے متاخرین میں سے انس اور ابو ہریرہ وغیرہ۔ اور یہ تینوں مراتب خاتم الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کے کمال سے متفرع ہیں۔

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند
آنچہ استاذ ازل گفت بگو میگویم

''آئینہ کے پیچھے مجھے طوطی کی صفت کے ساتھ رکھ دیا ہے، جس بات کو کہنے کے لیے استاذ ازل کہتا ہے میں وہی کہتا ہوں۔''

۸۷- تفہیم:

حکمت وعصمت اور سیادت کا راز

حضرت حق سبحانہ نے جماعت انبیاء کو معاملہ کے شروع میں ایک خاصیت عطا فرمائی اور وہ یہ کہ ان کی روح اور جسم کی صورت مزاجیہ ایسی نہیں ہے جو ان کے اصول سے بہت زیادہ دور ہو کہ ان دونوں کی صورت جو یہ پیدا ہو جائے ان کے اخلاق اور اعمال سے صرف وہ مضبوط حکایت ہوتی ہیں جو اصول پر مشتمل ہوتی ہیں۔ اور ان مکرمین کے علاوہ کے مضبوط اعمال واخلاق صورت مزاجیہ کی بدعات سے ہوتے ہیں اور اس فضیلت کے جزئیات میں سے ایک وہ ہے کہ ان بزرگوں کے نزدیک تجلی ذاتی اس صورت جو یہ کے علیحدہ ہونے سے عبارت ہے۔ اس لیے کہ وہ فضیلت اضمحلال اور جدائی کے شرف پر ہے۔ چنانچہ جب بھی انہوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کی وہ فضیلت دقتاً فوقتاً مضمحل ہوگئی تو یہ حکمت، عصمت اور سیادت کا راز ہے۔

اور ان کے من جملہ میں سے ایک کمالات کی اصل ولایت ہے۔ اس کے سوا کچھ نہیں ہوسکتی کہ وہ حق سبحانہ کو اس طرح جانتے ہیں کہ اس کے علاوہ سے پوری طرح غافل ہو جاتے ہیں اور اس کا علم ان کو حضوری بسیط ہوتا ہے۔ وہاں صفات کا بھی خیال نہیں آتا بلکہ صرف اسماء پیش نظر ہوتے ہیں خواہ بر سبیل حیرانی و مدہوشی اور اضطراب ہی کے کیوں نہ ہوں۔ تو یہ ان کے اذکار کی اصل ہے جو ان کے کمالات کا افق ہے اور یہ بزرگان کرام صلوات اللہ علیہم کنارے پر ہو گئے اور ان کی بلند ہمتی اس امر سے مانوس ہوگئی کہ ان کا ذکر ہوتا رہا اور ان کے ذکر کی ماہیت

کو کوئی بیان نہیں کرسکتا، سوائے اس کے جو نور نبوت کا وارث ہو کہ وہ علم حالی ذوقی کو جانتا ہے اور اس کی زبان اس کے بیان کے وقت جلدی جلدی چلتی ہے۔ اور اس پر کبھی بھی کسی نے ظاہر نہیں کیا، اور نہ ان میں سے کسی نے اس کی طرف اشارہ کیا، اور نہ ہی کبھی کوئی ظاہر کرے گا، اور نہ ہی کبھی اشارہ کرے گا۔ اور ہم اس کے بیان کے درپے ہوتے ہیں اور نتائج قوت متمیزہ کے سوا کوئی بیان نہیں ہے کہ جب بھی فطرت بنائی گئی ہے اسی پر بنائی گئی ہے۔ اور میں جلد ہی اس کو قتل کردوں گا۔ اور انشاء اللہ تعالیٰ، اللہ کے فضل وکرم اس کی توفیق اور اس کے الہام سے گہرے کنویں میں دفن کردوں گا، تب میں خالص امی ہو جاؤں گا کہ نہ کوئی کلمہ جانوں گا، نہ کوئی حرف۔ تب میرے رب کی وہ نعمت مکمل ہو جائے گی جس کا اس نے میرے لیے اس وقت وعدہ کیا تھا جب یعقوب علیہ السلام نے حقیقت علیا کی حکایت بیان کرتے ہوئے کہا تھا ویتم نعمته علیک وعلی آل یعقوب "اور تم پر اور آل یعقوب پر اپنی نعمت مکمل کردے گا۔" پھر یوسف علیہ السلام نے حقیقت جمالیہ کی حکایت بیان کرتے ہوئے کہا تھا انت ولی فی الدنیا والآخرة توفنی مسلماً والحقنی بالصالحین "تو دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی میرا ولی ہے، تو مجھے بحیثیت مسلم موت دے، اور مجھے صالحوں میں شامل فرما۔" اور اللہ عزوجل نے فرمایا وھو یتولی الصالحین "اور وہ نیک وصالح لوگوں کو دوست رکھتا ہے۔" اللّٰھم اجعلنی صالحاً بفضلک واحسانک وجودک وامتنانک انت الذی بدأت النعمة علی فاتممھا وانت الذی اھدیت انوار قدسک فاعممھا "اے اللہ! مجھے اپنے فضل واحسان اور جود وسخا سے نیک وصالح بنا۔ تیری ذات وہ ہے کہ جس نے مجھ پر اپنی نعمت ظاہر فرمائی۔ تو اب اس کو مکمل فرمادے اور تیری ذات وہ ہے جس نے اپنی قدوسیت کے انوار کو ظاہر فرمایا تو اب ان کو عام فرمادے۔"

۸۸۔ تفہیم:

عالم نبوت میں ذکر حقیقی کی کیفیت

عالم نبوت میں ذکر حقیقی یہ ہے کہ وہ بدن سے کام لیتے ہیں اور خودی سے اس معنیٰ میں خود برأت کا اظہار کرتے ہیں کہ اولاً حق سبحانہ کو اس کی عظمت اور کبریائی میں دیکھتے ہیں اور اس

سے آشنا ہوتے ہیں (معرفت ذاتی، فطری، جبلی) اس وقت اس کے ظہور اور مظاہر خاصہ وعامہ کو پہچانتے ہیں اور ظلماتی و نورانی پردوں کو جانتے ہیں۔ اس وقت کرم ازلی حضرت اعلیٰ جل وعز وعلا بغیر کسی واسطہ کے اس کی تربیت فرماتا ہے اور مرتبہ علیا سے خالص عبادت روحانیہ کی اس طرح تعلیم فرماتا ہے کہ اس کی شکل کسی سے مشابہ نہیں ہوتی۔ یہ اولیا کے عجائبات ہیں۔ جاننا چاہیے کہ عبادت دماغ صورت جویہ کو توڑ دیتی ہے۔ اور اصل الاصل کے ساتھ مراجعت کرتی ہے۔ **فترى الجبال تحسبها جامدة وهي تمر مر السحاب** "تم پہاڑوں کو دیکھتے ہو تو ان کو جامد گمان کرتے ہو حالانکہ وہ بادل کی طرح چلتے ہوں گے" اور جاننا چاہئے کہ عبادات کے معرکوں میں دوام حضور وغیرہ بچہ کی مکتبی پڑھائی سے زیادہ نہیں ہوتے اس سے مغرور ہو جانا مردوں کو زیب نہیں دیتا۔ اشارہ کو سمجھو اور زیادہ عبارت کی بجائے اسی پر اکتفا کرو۔

علی در پردہ میگوئم تماشا کردہ ام چیزے
سخن جان است عریاں چوں توانم ساختن جاں را

"اے علی! میں در پردہ کہتا ہوں، میں نے ایک چیز کا تماشا دکھایا، سخن کھلی ہوئی جان ہے، میں جان کو کب بنا سکتا ہوں۔"

۸۹- تفہیم:

انبیاء علیہم السلام کی عبادت روحانی اور اس کی مراد

میرا یہ کہنا ہے کہ انبیاء علیہم الصلوات والسلام کو عبادت روحانی کا الہام ہوتا ہے۔ اس سے صورت جویہ کے لیے دماغ متاثر ہوتا ہے۔ اب جو کہتا ہے کہ ان کے لیے ان کے فطری کمال کے ادھر اکتساب کا راستہ ہوتا ہے، وہ ان کی اصلی تیز استعداد کا وارث ہوتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ معرفت ہے یا توجہ کی ایک قسم ہے یا ان کے لیے اختیاری ہے، یہ امر اضطراری ہے۔ وہ اس کی طرف لامحالہ تدافع کرتے ہیں جیسا کہ ایک امر دوسرے امر کی طرف فیضان کرتا ہے یا نظر نتیجہ کی طرف فیضان کرتی ہے تو اس کے درمیان اور جس کا ان سے آخرت میں وعدہ کیا گیا ہے، اس کے درمیان فرق ظاہر ہے۔ اور الخیر الکثیر میں انبیاء کے مزاجوں کی تحدید سے مراد یہ ہے کہ ہر چیز جو عالم محسوس یا عالم مجرد میں پائی جاتی ہے، اس کی فی نفسہ

ایک کیفیت ہوتی ہے جس سے وہ دوسری چیز سے متمیز ہوتی ہے اور جس طرح ان کے مزاج میں جوش پیدا ہوتا ہے تو اس سے بھی زیادہ خاص مراد لیتا ہوں یعنی ایسی خلط جس سے ایسے آثار پیدا ہوتے ہیں کہ ان میں سے نہیں ہوتے جو سوائے مراحل کے اول امر میں ہوتے ہیں۔ جیسا کہ اطباء کے نزدیک مثلاً نوشدارو کے اخلاط کے خصوصی آثار ہوتے ہیں، پھر جب وہ ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو اس کی شکل دوسری ہو جاتی ہے جیسے حرارت غالب، بارد سے ٹوٹتی ہے اور اسی طرح برودت غالب، حرارت سے ٹوٹتی ہے۔ پھر جب ایلوا جو کہ ڈھیر میں چھ ماہ تک دبا رہتا ہے تو اس میں اس کے خلطی مزاج کی بجائے دوسرا مزاج پیدا ہو جاتا ہے جو اس سے ممتاز ہوتا ہے۔ کبھی کسی شئے کی اخلاط موافق غذائیں ہوتی ہیں۔ تو جب مخلوط ہو جاتی ہیں تو بدن کو نقصان پہنچاتی ہیں۔ اور جب مل جاتا ہے تو سم قاتل ہو جاتا ہے کبھی اخلاط سم قاتل ہوتی ہیں۔ چنانچہ وہ جب مخلوط ہو جاتی ہیں تو مضر ہو جاتی ہیں۔ اور جب مل جاتی ہیں تو بہت زیادہ نفع بخش ہو جاتی ہیں۔ جاننا چاہیے کہ ان دونوں باتوں میں کوئی تناقض نہیں ہے۔ اور میں کہتا ہوں کہ ارادہ بالذات علم کی طرح متحد ہے۔ یہی معاملہ ملاک سرمایہ کا ہے جس سے میری مراد یہ ہے کہ علم ناشی تعین اول کے بعد ہے خواہ وہ فعلی متحد بالذات اس ذات کے مرتبہ میں کیوں نہ ہو جو ممکن میں ماہیت کے مرتبہ کے مقابلہ میں ہے جیسے وہاں ارادہ نوع واحد اور سبیل واحد سے اس امر پر متحد ہے کہ وہاں بھی تقدم اور تاخر قدس ہیں۔ اور کہنے والے نے کیا اچھی بات کہی ہے۔

گر تامل قفص بیضہ طاؤس شود — در شبستان عدم نیز چراغانی ہست

غور و فکر سے قفص مور کا انڈا ہو جاتا ہے — عدم کی تاریکی میں بھی ایک چراغاں ہے

چنانچہ مرتبۂ ظہور میں حضرت العلم سے مکمل انتشار اور مرتبۂ ذات میں درجہ میں اس سے مطابقت ہے۔ اس لیے کوئی تنازعہ نہیں ہے۔

۹۰- تفہیم:

حکمت اور عصمت کے معنیٰ کا بیان

بارہا گفتہ ام و بار دگر میگویم — کہ من گم شدہ ایں رہ نہ بخود می پویم

"میں بارہا کہہ چکا ہوں اور ایک بار پھر کہتا ہوں، کہ میں اس راہ میں کھویا ہوا اپنے آپ نہیں دوڑ رہا ہوں۔"

من اگر خارم وگر گل چمن آرائے ہست   ہم بدانسان کہ دہد پرورشم می رویم

''میں اگر خار ہوں اور اگر گل ہوں یہ سب چمن آرائی ہے، کہ جس طرح میری پرورش ہوئی ہے، اسی طرح میں اگ رہا ہوں۔''

درپس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند   آنچہ استاد ازل گفت بگو میگویم

''آئینہ کے پیچھے طوطی کی صفت کے ساتھ مجھے رکھتے ہیں، جو کچھ کہنے کے لیے استاد ازل کہتا ہے میں وہی کہتا ہوں۔''

اے بھائی کیا تم جانتے ہو کہ حکمت کیا ہے۔ وہ اللہ کی زمین میں اس کی حجت ہے۔ جس نے اس کو مضبوطی سے پکڑ لیا وہ نجات پا گیا۔ گویا وہ کتاب مبین ہے جس میں رطب ویابس سب کچھ ہے۔ کیا تم جانتے ہو کہ عصمت کیا ہے؟ یہ وہ ہے جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے خواص میں سے ایک خاصہ بتایا۔ حدیث صحیح میں فرمایا کہ یہ نبوت کے پچیس اجزاء میں سے ایک جز ہے اور یہ خاصہ سمت صالح ہے۔ کیا تم جانتے ہو کہ قطبیت کیا ہے؟ وہ اللہ کے نزدیک پانچ سو کا درجہ ہے کہ بنگال کے بادشاہ کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ صوبۂ کابل میں کوئی سمندر نہیں ہے۔

چو مژگان ناز بر دل میکند ہر خار صحرائش   زیارت کردہ ام نخچیر گاہ خوش نگاہاں را

''جب اس کے صحرا کا ہر کانٹا دل پر ابرو کی طرح ناز کرتا ہے۔ تو میں خوش نگاہوں کی شکار گاہ کی زیارت کرتا ہوں۔''

سواد چشم خوباں است رنگ پائے طاؤسش   مپرس از خوبی رعنا گلستانی کہ من دارم

''حسینوں کی آنکھ کی سیاہی اس کے مور کے پاؤں کا رنگ ہے، میرے پاس جو گلستاں ہے اس کی آرائش وزیبائش کی خوبی مت پوچھو۔''

کاش لوگ جانتے کہ اس قوم کے لوگ کون اور کیسے ہیں تا کہ ان کے پاؤں کی مٹی ہو جاتے۔

۹۱۔ **تفہیم:**

باری تعالیٰ کے ارشاد ''انا عند ظن عبدی بی'' کی تاویل اور راز کا بیان:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رب العالمین عزوجل سے روایت کرتے ہوئے فرمایا

"انا عند ظن عبدی بی ان ذکرنی فی نفسه ذکرته فی نفسی وان ذکرنی فی ملاء ذکرته فی ملاء خیر منه" میں اپنے بندے کے گمان کے ساتھ ہوں، اگر وہ میرا ذکر اپنے نفس میں کرتا ہے تو میں اس کا ذکر اپنے نفس میں کرتا ہوں، اور اگر وہ میرا ذکر لوگوں کی جماعت میں کرتا ہے تو میں اس کا ذکر اس جماعت میں کرتا ہوں جو اس سے بہتر ہے۔ اس ارشاد میں ایک راز اور ایک رمز پوشیدہ ہے، جس کو صرف حکماء ربانی ہی سمجھتے ہیں۔ جن کے بارے میں سیدالبشر نے فرمایا کہ علم ایک ہیئت پوشیدہ ہے جس کو صرف اللہ کو جاننے والے علماء ہی جانتے ہیں کہ جب وہ بولتے ہیں، جس کا انکار صرف اللہ سے غافل لوگ ہی کر سکتے ہیں اور میں انشاء اللہ اس کو بیان کروں گا جہاں تک اللہ زبان سے اس کو بیان کرائے گا کہ زبان اسی کے اختیار میں ہے، چاہے تو بیان کرادے اور چاہے تو گونگا بنادے۔ یعنی اللہ کے اسماء اور صفات ہیں جو اس کی طرف ان دونوں میں بینائی کے نفوذ کے اعتبار سے عین ذات ہیں جیسے چار کے لئے جفت۔ وہ اس میں نفوذ کی معنویت اور اس کی طرف فیضان کے اعتبار سے غیر ذات ہے۔ اس بات کو سمجھ لو۔ پھر اس کے عکس ہیں جو ممکنات کے حقائق ہیں۔ چنانچہ ممکنات کو شکل انہی سے حاصل ہوتی ہے۔ اور ان کو صرف اسماء سے شکل حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ نہ کسی کو معارف میں سے کوئی معرفت ہوتی ہے۔ نہ اعمال میں سے کسی کا کوئی عمل ہوتا ہے۔ اور نہ ہی اخلاق میں سے کوئی خلق ہوتا ہے، سوائے اس کے کہ وہ تمثیل کے طبقات پر اس رسم کی تمثیلوں میں سے ہوتا ہے جیسا کہ ہم کئی بار کہہ چکے ہیں کہ سارا عالم ہر عین کے تحت ڈھکا ہوا ہے۔ ہم اس کی ایک مثال دیتے ہیں۔ کیا سمندر (آگ کا کیڑا) کی آنکھ نہیں ہوتی اس کا ذوق اور سماعت اور گوشت اور ہڈی نہیں ہوتے؟ اور یہ کہ اس کا گوشت اس کی ہڈی سے زیادہ نمناک وتازہ اور گرم اور نرم وملائم ہوتا ہے اور اس کی ہڈی اس کے گوشت سے زیادہ خشک وٹھنڈی اور سخت ہوتی ہے اور اس کے ذوق قوت ذائقہ میں ترابیت، خاکی پن غالب ہوتا ہے اور اس کی سماعت پر ہوائیت غالب ہوتی ہے۔ اسی طرح سمندر کے طبقات ہوتے ہیں اور ہر طبقہ خالص ناریت، آگ کے تحت ڈھکا ہوا ہوتا ہے

کز تامل قفس بیضہ طاؤس شود در شبستان عدم نیز چراغانی ہست

"غور وفکر اور تامل سے قفس مور کا انڈا ہو جاتا ہے، عدم کی تاریکی میں بھی ایک چراغاں ہے۔"

پھر مگر مچھ کے بھی طبقات ہوتے ہیں اور ہر طبقہ خالص مائیت میں ڈھکا ہوا ہوتا ہے۔ اس کے اجزاء اوصاف کے لحاظ سے بادی النظر میں سمندر کے مماثل ہوتے ہیں۔ جبکہ حکماء کی نظر میں ان میں بہت فرق ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک سمندر کی مائیت، مائیت کے لباس میں ناریت ہوتی ہے اور مگر مچھ کی ناریت، ناریت کے لباس میں مائیت ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے ہم اعلان کرتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام کے جلال نے جلال کی صورت میں جمال پیدا کیا۔ اس امر کو اچھی طرح سمجھ لو۔

پھر جان لو کہ اللہ عزوجل کی معیت، معیت خفی ہے۔ وہ تمام معارف کی تمثیلوں کے لیے متعدد و متنوع رنگوں میں علت ہے۔ چنانچہ جس نے اللہ عزوجل کو خلوص دل سے اس طرح پہچان لیا کہ وہ رحمٰن ہے، اس نے یہ جان لیا کہ وہ اسم رحمٰن کی تمثیل سے ہے اور یہ کہ اللہ کے ساتھ اس کی معیت دلیل لمی سے نہ کہ دلیل انی سے بسبیل رحمت ہے۔ نبی علیہ السلام کے اللہ عزوجل سے روایت والے ارشاد "انا عند ظن عبدی بی" کے یہی معنی ہیں۔ اور ہم کہتے ہیں کہ ذکر نفسی اس کے امر کا سہارا و سرمایہ ہے۔ اور اس کے قوام ہونے کی دلیل تجلی ذاتی ہے جو حالی فطری ہونے سے عام ہے جیسا کہ حکماء نے کہا ہے، یا علمی کسبی ہونے سے عام ہے جیسا کہ اولیا کہتے ہیں۔ وہ معیت ذاتی کی تمثیلوں میں سے ہے۔ اور یہ کہ ذکر لسانی اس کے امر کا سرمایہ و سہارا ہے۔ وہ واسطوں کی معیت کی تمثیلوں میں سے موجودات کی ہیکلوں پر پھیلا ہوا زیادہ عام اور اپنے تحت زیادہ شمولیت رکھنے والا امر ہے۔ اس طرح مذاق حکمت ربانیہ کے لحاظ سے حدیث کی دو تاویل ہیں۔ ایک یہ کہ جس نے میرا ذکر، ذکر نفسی کے طبقات پر اپنے نفس میں کیا تو اسے جان لینا چاہیے کہ میں نے اس سے پہلے معیت ذاتی میں اس کا ذکر کیا تھا۔ اور جس نے میرا ذکر، ذکر لسانی کے طبقات پر اپنی زبان سے جماعت میں کیا، اسے جاننا چاہیے کہ میں نے اس کا ذکر ملاء اعلیٰ میں واسطوں کی تجلی کے ساتھ کیا۔ اور دوسرے یہ کہ جس نے وصول ذاتی سے وصل کا ارادہ کیا، اس پر اس کے طبقات کے اعتبار سے ذکر نفسی لازم ہے۔ چنانچہ عوام ذکر قلبی یا تزکیہ اور تصفیہ کے ذکر سے وصل کرتے ہیں اور اولیاء تجلی ذاتی سے اور حکمی حظیرۃ القدس میں اپنی حضوری اور وجود اور انسیت کی گہرائیوں میں غوطے لگانے کے لحاظ سے۔ اور یہ امر بہت عمیق ہے بہت زیادہ عمیق ہے۔ اور جس نے واسطوں کے لحاظ سے

وصول کا ارادہ کیا، اس پر ذاکرین کے طبقات پر ذکر لسانی کے لحاظ سے لازم ہے۔ اس سلسلہ میں عوام کا معاملہ تو ظاہر ہے۔ اور اولیاء جس کو سلوک کہتے ہیں، وہ جذب کے علاوہ ہے

علی درپردہ میگویم تماشا کردہ ام چیزے
سخن جان است عریاں چوں توانم ساختن جاں را

"اے علی! میں درپردہ کہتا ہوں، میں نے ایک چیز کا تماشا دکھایا ہے، سخن کھلی ہوئی جان ہے جبکہ میں جان کو کب بنا سکتا ہوں۔"

۹۲- **تفہیم:**

خاص حالت کا ذکر

براں عزم اگر خود میرود سر
کہ سرپوش از طبق بردارم امشب

"اگر میرے اس عزم سے میرا سر خود بخود (کٹ کر) گر جاتا ہے تو آج رات سرپوش کو طبق سے اٹھا دوں گا۔"

ممکن ہے کہ جلد ہی میرا ساقی رحیم مجھے جام لبریز عطا فرمادے تو میں مست ومخمور ہو جاؤں، اور ہر چیز کی مثال بیان کردوں، اور نغمات گنگناؤں، اور مست ومخمور ہو کر ناز و انداز سے چلوں، اور ان رازوں سے پردہ اٹھادوں جن کو کبھی کسی نے ظاہر نہیں کیا اور نہ ہی کبھی کوئی ظاہر کر سکے گا کہ یہاں مذہب باطل ہو جاتا ہے اور مشربوں میں تکدر پیدا ہو جاتا ہے اور صوفی، متکلم، فقیہ اور فلسفی سب کے سب بحر ذخار میں غرق ہو جاتے ہیں تو کوئی نہ ایک کلمہ دہراتا ہے نہ ایک حرف۔ یہ وہ قیمت ہے جس کا مجھ سے وعدہ کیا گیا۔ **واللہ لا یخلف المیعاد** "اللہ وعدہ خلافی نہیں کرتا۔"

۹۳- **تفہیم:**

انبیاء علیہم السلام کے قرب کا بیان

کیا جہلاء اور اہل کمال کے نزدیک یہ سب سے پہلی ضرورت اور بداہت نہیں ہے کہ

انبیاء علیہم السلام، اللہ کے نزدیک انتہائی مقرب ہستیاں ہیں؟ لیکن ہمارے نزدیک معاملہ ایسا نہیں ہے اور الکتاب سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو ایک لحاظ سے اللہ کی نظر میں ایک خاص مقام حاصل ہے جو اس کی نظر میں ہمیں حاصل مقام سے ممتاز ہے۔ اس طرح یہ معنیٰ جو حق سے ثابت ہے حق تنقیح ادا کر دیتا ہے۔ چنانچہ محاورہ میں کہا جاتا ہے فلان اقرب إلی السلطان من فلان "فلاں شخص فلاں کے مقابلہ میں سلطان سے زیادہ قریب ہے۔"
اس محاورہ سے صرف یہی مراد ہوتا ہے کہ سلطان اس کو احسان اور تحسین کی نظر سے دیکھتا ہے اور یہ کہ وہ سلطان کے دل سے زیادہ قریب ہے۔ پھر جاننا چاہئے کہ اس قرب کے لوازم میں اس پر انعامات کی کثرت اور اس کی دعا کی قبولیت وغیرہ شامل ہیں۔ یہ اس مرتبہ کے معنی ہیں جو عوام کے لائق ہیں۔ اور جو معنی پوری طرح صادق آتے ہیں، وہ حکماء کے ساتھ مختص ہیں۔

اور اس طرح ہم کہتے ہیں کہ اصحاب علم کے نزدیک یہ امر بدیہی ہے کہ حکم اور نبوت ایک دوسرے کے مغایر ہیں۔ اور یہ کہ حکمت نبوت سے پہلے ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں فرمایا ہے و آتیناہ حکماً و علماً "ہم نے ان کو حکم و علم عطا فرمائے"۔ اور فرمایا و آتینا لقمن الحکمۃ "ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی۔" یہ بھی ارشاد ہے: ومن یوت الحکمۃ فقد اوتی خیرا کثیرا "اور جس کو حکمت دی گئی، اس کو خیر کثیر دے دی گئی۔" (البقرہ ۲۶۹) اور حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات سے قبل بھی شرک سے کراہیت کرتے تھے۔ حالانکہ وہ مشرکوں میں ہی پیدا ہوئے تھے۔ اور ان کو بتوں کی عبادت سے روکتے تھے۔ اور اس طرح نماز ادا کرتے تھے جیسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات سے تین سال قبل ان کی ایک رائے قائم ہو گئی تھی۔ اور یہ کہ وہ پہلے شخص ہیں جس نے اپنی رائے کی بنیاد پر کہا السلام علیک۔ اور زید بن عمرو بن النفیل پہلے مرحلہ میں یہودیت یا نصرانیت میں سے کسی ایک کو اختیار کرنا چاہتے تھے۔ پھر ان کو دین حنیف کی طرف ہدایت ملی۔ وہ نوزائدہ بچیوں کو زندہ رکھتے تھے، اور صرف اس چیز کو کھاتے تھے جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو۔ اور بتوں کی عبادت کرنے والوں کے معاملہ میں بہت شدت سے پیش آتے تھے۔ حتیٰ کہ آپ کو شہید کر دیا گیا۔ اور آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ بشارت دی گئی۔ اور یہ کہ لوگ نبی علیہ السلام کی مدینہ میں آمد سے قبل ہی جمعہ کی نماز پڑھنے لگے

تھے۔اور امیر المؤمنین حضرت عمر بن خطاب کی رائے بہت سے مسائل میں وحی کے موافق ہوتی تھیں۔اور جاننا چاہیے کہ رائے بہرحال ایک رائے ہوتی ہے گویا کہ وہ وحی باطنی ہے جو الہیات، نبوات اور معادیات وغیرہ پر دلالت کرتی ہے۔اور عوام کے لیے اس سے زیادہ حکمت کا بیان کرنا ممکن نہیں ہے۔البتہ حکما کا منصب یہ ہے کہ وہ جانیں کہ وہ کون سی چیز ہے او رکس سے ہےاور کس میں ہے؟

اور اس طرح ہم کہتے ہیں کہ اس امر میں کسی کو شک وشبہ نہیں ہے،خواہ وہ عامی ہو یا عالم کہ انبیاء علیہم السلام نبوت سے پہلے بھی صدق،عفت،تقویٰ اور اعمال حسنہ پر فطری طور پر ثابت قدم ہوتے تھے۔اور انبیاء کے سوا بھی کچھ لوگ ان خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں۔ اور اس خصلت کو عصمت کہا جاتا ہے۔اور حکما جانتے ہیں کہ یہ کیا ہےاور اس کی ماہیت کیا ہے اور یہ کس میں پائی جاتی ہے۔تقریر کا حاصل یہ ہے کہ ان خصلتوں کے اصول تین ہیں جن پر تمام لوگ متفق ہیں اور یہ ہر ایک کے ذہن میں مرکوز ہے،خواہ وہ عالم ہو یا جاہل۔البتہ اس سے متصف ہونا اس کی ماہیت کی تحقیق اور اس کی تہہ تک پہنچنا،اس شخص کے ساتھ خاص ہے جس کو خیر کثیر دی گئی۔جیسا کہ ہم یقین کے ساتھ جانتے ہیں کہ بادل،بارش کا سبب ہوتا ہے۔البتہ پانی کے گیس میں بدلنے کی کیفیت کا علم اہل بصیرت کے ساتھ مختص ہوتا ہے۔اس طرح میری بات کا تعلق اس سے نہیں ہے۔اور غیر نبی کے لیے اس کا اثبات ایک امر کی ایجاد بدعت ہے۔اور مسلمانوں کے اجتماع کو توڑتا ہے۔اس کا انکار صرف مغرور اور گھمنڈی لوگ ہی کر سکتے ہیں۔

۹۴-تفہیم:

اللہ کی اپنے بعض بندوں کی طرف نظر،ان کے نزدیک دنیا و مافیہا سے زیادہ لطف ولذت والی ہوتی ہے

اللہ کے کچھ بندے ایسے ہوتے ہیں جن کی طرف وہ احسان وتحسین کی نظر سے دیکھتا ہے،جیسا کہ خود حق سبحانہ نے فرمایا ہے: **ولتصنع علی عینی** "اور تا کہ تمہاری پرورش میری نگرانی میں کی جائے۔" (طہ:۳۹) چنانچہ اس نظر کی وجہ سے وہ پوری طرح خوش ومسرور ہوتے ہیں،اور اس کا شکر ادا کرتے ہیں۔البتہ ان کا اس کا شکر ادا کرنا یہ ہوتا ہے کہ وہ اس کے لیے اپنی

جانوں، اپنے مالوں اور اپنی اعراض کو اور جو کچھ آسمان وزمین میں ہے، سب کو فدا کر دیتے ہیں۔

علی امشب بدید شاہ خوباں رفتہ ام از خود
بقربان سرش گرد اندہ ام دین را و دنیارا

"علی! آج رات شاہ خوباں کو دیکھ کر میں اپنے آپ سے بیگانہ ہو گیا ہوں، اس کے نام پر اپنے دین و دنیا کو قربان کر چکا ہوں۔"

اور وہ نظر ان کے نزدیک زمین اور اس میں پائی جانے والی تمام چیزوں سے زیادہ لطف ولذت والی ہوتی ہے۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ اہل مرتبہ جو بھی ایسا عمل کرتے ہیں جس سے اللہ کا وصل حاصل کرتے ہیں، اس کی وجہ سے اللہ وقتاً فوقتاً ان کی طرف دیکھتا رہتا ہے۔ اور جب وہ نظر مستقل ہو جاتی ہے کہ وہ اس کے حامل ہو جاتے ہیں، اور اس سے لذت اندوز ہونے لگتے ہیں تو ان کے جمال کے دو ہاتھ ہو جاتے ہیں۔ جمال کے دو پاؤں ہو جاتے ہیں، جمال کی دو آنکھیں ہو جاتی ہیں، اس کی ہر شان جمال میں جمال ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لولاک لما خلقت الافلاک "اگر آپ کو پیدا نہ کرتا تو افلاک کو پیدا نہ کرتا۔" یعنی افلاک آپ کی بدولت رقص کرتے ہیں اور یہ کہ عناصر اور پیدا کرنے والیوں کے وجود اور فساد کا حکم آپ کے لیے چلتا ہے کہ میں نے آپ کی طرف لطف وکرم کی نظر سے دیکھا تو وہ سب خوشی ومسرت سے اس کے پاس آئے۔

بذوق ایں نکتہ آمد جہان وجاں بوجود
اس نکتہ کے ذوق سے جہان وجان وجود میں آئے

اگر وہ خاموش ہو جائیں تو ان کا سکوت اس کی وجہ سے ہوگا اور اگر وہ فخر کریں تو ان کا فخر اس کی وجہ سے ہوگا۔ اسی طرح کی یہ مثال ہے۔

دل را بدل رہی ست دریں گنبد سپہر
دل کو دل سے اس آسمان کے گنبد میں راہ ہوتی ہے

وہ ان سے محبت کرتا ہے تو وہ اس سے محبت کرتے ہیں اور وہ ان کی طرف مودت ومحبت کی نظر سے دیکھتا ہے چنانچہ وہ نظر ان پر وہ اثر کرتی ہے جو دماغوں پر شراب کیا کرتی ہے۔

۹۵- تفہیم:

حکمت کیا ہے؟ اور وجاہت کی حقیقت

کل رات میں نے لقمان حکیم کو دیکھا تو ان سے پوچھا: حکمت کیا ہوتی ہے؟ انہوں نے کہا "عین یقین" یعنی اس سے اللہ کا ادراک ہوتا ہے۔ اور اس کا ادراک علم حضوری مقدس سے ہوتا ہے۔ میں نے کہا، کیا حکمت مکمل طور پر یہی ہے جس کی طرف آپ نے ایک شان کے ساتھ اشارہ کیا ہے، اور برہان کے لحاظ سے اس سے بڑا ہے۔ تو انہوں نے کہا "ہاں" اور میں اس کو جانتا ہوں اور عنقریب میں اس کے بارے میں آپ کو بتاؤں گا۔ پھر میں متنبہ ہوا، اور میں نے علی رضی اللہ عنہ کی جانب دیکھا جو کہہ رہے تھے تم ہمارے بھائی ہو اور یہ ہمارے معتقد ہیں۔ یہ ان اوراق کی طرف اشارہ کر رہے ہیں، جو میں نے لکھے ہیں۔ میرے بھائی! میں آپ کو ہزار وجاہتوں میں سے ایک کے بارے میں بتاتا ہوں۔ جب بندہ وجیہ، صاحب جمال وکمال ہو جاتا ہے تو اس کا جو قدم بھی اٹھتا ہے، نیکی کی طرف اٹھتا ہے۔ اور وہ جو حرکت بھی کرتا ہے، اس سے نیکی کی حرکت کرتا ہے، اور جب لقمہ اٹھا کر اپنی بیوی کے منہ میں دیتا ہے تو وہ بھی نیکی ہوتا ہے۔ اور جب اس کا گھوڑا آگے پیچھے دوڑتا ہے تو اس کے ہر قدم کے بدلہ میں اس کو نیکی ملتی ہے۔ اور جب وہ سوتا ہے تو اس کے دائیں بائیں کروٹیں بدلنے میں نیکیاں ملتی ہیں اور اللہ اس کے شکر پر اتنا خوش ہوتا ہے کہ اس کے علاوہ کے کئی گنا شکر پر بھی اتنا خوش نہیں ہوتا۔ اور وہ اللہ کا محبوب قرار پاتا ہے اور جو کچھ پیدا کیا جاتا ہے، اس کی وجہ سے پیدا کیا جاتا ہے۔ اور جب عصمت پوری ہو جاتی ہے تو اس کے تمام افعال حق قرار پاتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ حق کے مطابق ہوتے ہیں بلکہ وہ بعینہٖ حق ہوتے ہیں۔ بلکہ حق ایسا امر ہوتا ہے جو ان افعال کا عکس ہوتا ہے جیسا کہ سورج کی روشنی ہوتی ہے۔ اور اس کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ کیا جب اللہ تعالیٰ سے حضرت علی کے لیے دعا فرمائی **اللّٰھم ادر الحق معه حیث دار** "اے اللہ! حق کو ان کے ساتھ گھما دے جیسے جیسے یہ گھومیں۔" یہ نہیں فرمایا کہ **ادره حیث دار الحق** "انہیں اس طرف گھما دے جیسے حق گھومے۔"

مپرس از خوبی رعنا گلستانے کہ من دارم
سوادِ چشم خوبان است رنگ پائے طاؤسش

"میرے پاس جو گلستاں ہے اس کی آرائش وزیبائش کی خوبی مت پوچھو، حسینوں کی آنکھ کی سیاہی اس کے مور کے پاؤں کا رنگ ہے۔"

چو مژگان ناز بردل میکند ہر خار صحرائیش
تماشا کردہ ام نخچیر گاہی خوش نگاہاں را

"جب ناز ونخرے والی ابرو کے صحرا کا ہر خار دل پر چوٹ مارتا ہے تو میں خوش نگاہوں کی شکارگاہ کا تماشا دیکھتا ہوں۔"

در شہر فنا ہم نمودیم اقامت
ازبسکہ علی تیز جہاں دیم فرس را

"ہم شہر فنا میں قیام نہیں کرتے، جہاں تک ممکن ہے گھوڑے کو تیز دوڑا دیتے ہیں۔"

تاز مضمون الفتی دارم کہ لعل اشک من
تاج خوباں رابفرق خودنشاندن آرزوست

"مضمون سے ایسی الفت رکھتا ہوں کہ میرے آنسو کا لعل حسینوں کے تاج کو اپنے سر پر رکھنے کا آرزومند ہے۔"

صائب امروز بایں تازہ غزل صلح مکن
اول جوش بہار است گلستان ترا

"اے صائب! آج اس تازہ غزل پر اکتفا نہ کرو، تمہارے گلستاں میں بہار کا پہلا جوش ہے۔"

۹۶- تفہیم:

ارشاد نبوی 'کلمة الحكمة ضالة المؤمن' کے معنی

حکیم اپنے بیشتر اوقات میں ایک امر سے دوسرے امر کی طرف منتقل ہوتا رہتا ہے۔ تمام لوگوں کی استعداد سے بڑا ہوتا ہے۔ اور حدیث شریف میں اسی کی طرف اشارہ ہے کلمة الحكمة ضالة الحكيم فحيث وجدها فهوا حق بها 'حکمت کی بات حکیم کی متاع گمشدہ ہے، تو جہاں بھی اس کو پاتا ہے وہ اس کا حقدار ہوتا ہے۔" اگر علم کے

ثبوت سے یہ مراد ہے تو ہمارے نزدیک اس میں اصلاً کوئی حرج نہیں ہے۔ اور قانون سازی میں قبیلہ کی عادتوں اور شہر کی وضع کو مکمل دخل صحیح ہوتا ہے اور یہ اس قول کا راز ہے کہ عامة الشریعة تختلف باختلاف الزمان والمکان "عام شریعت زمان ومکان کے اختلاف سے مختلف ہو جاتی ہے"۔ اور اسی طرح کی ایک مثال ہے کہ بارش آسمان سے صاف اور لطیف الطبع برستی ہے، پھر زمین پر گرنے کے بعد اس میں ہوا اور مٹی کا اثر داخل ہو جاتا ہے، تو اقلیم اول وثانی کے کنویں کا پانی یکساں نہیں ہوتا (یعنی ایک سے دوسرے علاقہ کے پانیوں میں اختلاف ہوتا ہے)

۹۷-تفہیم:

توحید کے انکشاف کے بعد ظاہر ہونے والی حیرت کی حالت اور اس کا نام رکھنا

توحید کے انکشاف کے بعد پیش آنے والی حیرت کی حالت اس فقیر کے نزدیک قوت تمیزیہ کا زوال ہے۔ اور وہ حکیم کے لیے ضروری ہے، سوائے اس کے کہ حکیموں کی مردہ قوم کا کام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات میں تجلی ذاتی سے متحیر ہوتے ہیں۔ پھر اللہ سبحانہ کے اسماء ابتدائیہ اور عودیہ سے تنقیح کرتے ہیں۔ پھر نشاۃ اولیٰ واخریٰ ثابت کرتے ہیں۔ اور ان نشاتوں میں سے شریعت اور عبادتوں کی نشاۃ ہے۔ پھر ان کے لیے عصمت تامہ، حکمت کاملہ اور وجاہت عامہ ثابت کرتا ہے، تو اس طرح ہو جاتے ہیں، گویا وہ انبیاء ہیں، لیکن ان کی طرف وحی نہیں کی جاتی، سوائے ان کے جنہوں نے ترتیب طبعی سے سلوک کا نکتہ دکھایا۔ ان کی تمام عادتیں انبیاء کی تحویلات کے مطابق ہوں گی اور ان کے حال کا کوئی اضطراب دامن گیر نہیں ہے، اور قوت تمیزیہ کا زوال ان کے حق میں بغیر حیرت واضطراب کے ایک امر بسیط وجدانی ہوگا۔ اور جن کا سلوک اسباب خارجیہ یا داخلیہ سے ترتیب طبعی پر نہیں ہے بلا شبہ انہیں ذات اور اسماء تک داخلہ کا راستہ معلوم نہیں ہے۔ قوت ممیزہ کا زوال ان کے حق میں عین اضطراب وحیرت ہوگا

ہر سخن وقتی وہر نکتہ مکانی دارد

"ہر بات کا ایک وقت اور ہر نکتہ کے لیے ایک جگہ ہوتی ہے۔"

۹۸- تفهیم:

اللہ تعالیٰ کے بندہ کو اپنے لیے منتخب کرنے کے بعد اس کے مراتب

جب اللہ کسی بندہ کو اپنے لیے منتخب کرتا ہے تو پہلا کام یہ کرتا ہے کہ اس کی طرف یکے بعد دیگرے مرتبے جذب کرتا ہے، حتیٰ کہ وہ تجلی ذاتی تک پہنچ جاتا ہے۔ اور اس کے لیے فنا اور پھر بقا متحقق ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ اس کے لیے جمہور اولیاء نے اصطلاح مقرر کی ہے۔ پھر اس کے لیے وصول آخر ہوتا ہے، اور وہ اس کا جہت سے خالی ہونا ہے جس پر وہ ازل اور ابد کے لحاظ سے رہا ہے، تب اس کے لیے اس کے سوا نہ کوئی علم رہتا ہے اور نہ ہی اس کے سوا کوئی کرامت۔ پھر مرتبۂ شارحہ میں اس کی تین تمثیل ہوتی ہیں۔ ایک حکمت اور یہ بعینہٖ وہ جہت ہے کہ جب مظاہر علمیہ میں شکل اختیار کرتی ہے دارنحالیکہ وہ قرابت جلیلہ ہے جس کے ذریعہ علم کے فنون حاصل کیے جاتے ہیں۔ اور اشیاء کے حقائق کا ان کی ماہیت کے طور پر ادراک کیا جاتا ہے۔ اور دوسری عصمت ہے۔ یہ بعینہٖ وہ جہت ہے کہ جب نشاۃ اعمالیہ میں شکل اختیار کرتی ہے۔ اور یہ وہ ہے جو لوگوں کو اپنے ارد گرد سے اچکتی ہے پھر جب وہ اس میں داخل ہوتے ہیں تو ان کے خون، اعراض اور اموال نفس اور شیطان سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ اور اس کی تمثیلوں میں سے ایک حرم بیت اللہ عزوجل ہے۔ اور تیسری قربت ہے اور یہ وہ تعلق ہے جو اللہ سبحانہ سے شروع ہو کر اس بندہ کو عطا کیا گیا ہے۔ اور وہ تحقیق کے مطابق اس جہت کا نفس ہے، اللہ اس کو رویت احسان و تحسین سے دیکھتا ہے اور ایسا وہ اس وقت کرتا ہے جب وہ اللہ سبحانہ کی نظر و نگاہ ہو جاتا ہے۔

جب یہ اصول ثلاثہ اپنے احکام، تاثیر اور لوازم کے ساتھ ظاہر ہو چکے جیسا کہ ہم نے ان کی تفصیل الخیر الکثیر میں بیان کی ہے، اور بندہ کو خیریت تامہ کے ساتھ تحقق میں انبیاء کا خلیفہ بنا دیا گیا اور علوم الٰہیہ اور شرعیہ ذوق وعرفان کے ساتھ اس مقام پر اتر گئے جو عالم میں علت فاعلہ اور علت قابلہ کی خصوصیت سے ان کے آثار میں جاری ہیں، خاص طور سے سخت مصائب اور عظیم احسانات سے اس کے نفس پر جاری ہوتے ہیں، یہ اس کے لیے اس وقت پیش آتے ہیں جب وقت ہر اس شخص کے ہاتھ سے نکل جاتا ہے جو ظاہر اور باطن ہر حیثیت

سے اور ہر جہت سے پوری طرح ظاہر ہے جس کے لیے جمہور کے مذہب میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ اس بندہ کے لیے تربیت دینے والا اور مدد کرنے والا ہے۔

اور کامل خروج پر حرام کردیا گیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے کسی کی تقلید کرے اور یہ بھی ذوق سے تحقیق کی بنیاد پر اور جزئیات تشریع وسلوک کے ہر جزء میں وحی کی تقلید کی بنیاد پر ہو اور یہ کہ آبا سے کسی چیز کا وارث نہ ہو چاہے مال ہو یا جاہ ومرتبہ۔ اور اس مقام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رسول اللہؐ نے فرمایا **نحن معاشر الانبیاء لا نرث ولا نورث ماترکناہ صدقة** "ہم انبیاء کی جماعت نہ وراثت پاتے ہیں اور نہ ہی کوئی ہم سے وراثت پاتا ہے ہم جو کچھ چھوڑتے ہیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔" اور اس کے لیے حق ہے کہ امتحان اور آزمائش کے میدان میں بار بار اور نئے نئے قالبوں میں گھلایا جائے۔ اور یہ ہر اس امر میں ہوتا ہے جس میں اللہ سبحانہ اس کی طرف چلانے کو اس کی وجاہت، کمال فضل اور جود وسخا کے عموم میں اس کو نفع بخش دیکھتا ہے۔ اس طرح وہ اللہ سبحانہ کا اپنے راز، قربت اور توجہ کے لحاظ سے شکر ادا کرتا ہے اور اس کی آزمائش پر مخلوق میں اپنے معاملات کی انواع اور اپنے جسم کی اخلاط کی تخلیق کی حیثیت سے صبر کرتا ہے اور اللہ سبحانہ نے اس مقام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: **إن في ذلك لآيات لكل صبار شكور** "اس میں ہر صبر اور شکر کرنے والے کے لیے نشانیاں ہیں۔" اور فرمایا **وما اصاب من مصیبة الا باذن من اللہ** "تم پر جو بھی مصیبت آتی ہے وہ اللہ ہی کی طرف سے ہوتی ہے۔" اور جو اللہ پر ایمان رکھتا ہے وہ اپنے دل کی رہنمائی کرتا ہے **ومن یؤمن باللہ یھد قلبہ** اور وہ ان سب میں وسیع القلب، شدید الصبر، بہترین امید رکھنے والا، سخت عصمت والا، عظیم الحکمت اور قوی قربت والا ہوتا ہے۔

اس کے مال، جاہ ومرتبہ، اولاد اور سکون قلب میں سخت ترین مصیبتیں آتی ہیں، حتیٰ کہ وہ اپنی صورت جو یہ سے پوری طرح نکل جاتا ہے۔ چنانچہ اس کے لیے نہ اسماء عودیہ کے سوا کوئی جہت باقی رہتی ہے اور نہ ہی ارادہ کے علاوہ کوئی مرجع۔ اور ہم نے ان دونوں کی تفصیل الخیر الکثیر میں بیان کردی ہے، اس لیے اعادہ کی کوئی ضرورت نہیں رہی۔ **حسبی اللہ ونعم الوکیل ولا حول ولا قوة إلا باللہ العلي العظیم** "میرے لیے اللہ ہی کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے اور نہ مجھ میں ہمت ہے، نہ طاقت وقوت، سوائے اللہ کے جو علی وعظیم ہے۔"

۹۹- **تفہیم:**

خاتم الاولیاء کا بیان

ہمارے نزدیک خاتم الاولیاء وہ ہے جو صورتِ مزاجی کے عالم میں خاتم الانبیاء کے مقابلہ میں ہو۔ اس سے میری مراد یہ ہے کہ وہ مظہر تامہ ہو اور اس کا تجبر ذات کی گہرائی اور حقیقت کی وضاحت میں ہو۔ اور اولیاء کی دو قسمیں ہیں، ان میں ایک حالی ہے کہ اس پر اس کا حال غالب رہتا ہے، اور دوسرا علمی ہے، اس پر اس کا علم غالب رہتا ہے۔ اور خاتم الاولیاء کے لیے علمی ہونا ضروری ہے۔ اور اس کا ذات کی گہرائی میں تجبر ضروری ہے کہ علمی لباسوں میں ہو۔

۱۰۰- **تفہیم:**

خواب اور اس کی تاویل جلیل

لک الحمد ان انجزتنی ماوعدتنی
فلست اخاف الضیر بعد ولا ھضما

"تیرے ہی لیے حمد ہے کہ تو نے مجھ سے جو وعدہ کیا وہ پورا کیا، اب مجھے نہ کسی نقصان کا ڈر ہے نہ کسی پستی کا۔"

وھبت مقاماً بعد حکم کانہ
تقضم من کل المقامات لی قضما

"مجھے حکم کے بعد ایسا مقام دیا گیا گویا کہ وہ، میرے لیے سارے مقامات سے مجھ پر کچھ نہ کچھ حصہ رکھتا ہے۔"

چھبیس ذی الحجہ کی رات میں، میں نے دیکھا گویا کہ میں ایسے مقام بلند میں داخل ہوا ہوں جس کے بہت سارے خدام ہیں، اور اس میں آنے والوں کی بہت بڑی تعداد ہے۔ شاید کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد یا کوئی اور جگہ ہے۔ اور وہاں ایک بلند قبہ ہے اور اس کے گرد لوگ بیٹھے ہیں۔ ان میں سے ایک شخص کے ہاتھ میں تصویریں ہیں جو وہ لوگوں کو دکھا رہا ہے۔ لوگوں کے چہرے اس کی طرف مائل ہیں، میں اس منظر کو دیکھ کر رک گیا اور قبہ

میں داخل ہوگیا۔ وہ شخص بھی اس میں داخل ہوگیا اور قبہ کے صدر مقام پر بیٹھ گیا، پھر مجھ پر ایک عجیب حال طاری ہوا جو پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ اور وہ یہ کہ میں اللہ سبحانہ کی زبان ہوں، وہ میرے ذریعہ کلام کررہا ہے اور میرے ذریعہ غیظ وغضب کا اظہار کررہا ہے۔ چنانچہ میں اس کی طرف کھڑا ہوا اور اس سے کہا تو دنیاوی زندگی کے حسین ترین علماء میں سے ہے اور یہ اللہ سبحانہ کا کلام ہے جو اس نے میری زبان سے کہلایا۔ تب اس کا سر جھک گیا اور اس کو بہت زیادہ خجالت وشرمندگی ہوئی پھر میں قبہ سے نکلا تو اچانک میں عربی ہوگیا۔ میری زبان عربوں کی زبان ہوگئی اور میرا لباس عربوں کا لباس ہوگیا۔ اچانک لوگ ٹوٹ پڑے، وہ مجھے اس بات پر مبارکباد دے رہے تھے کہ اللہ نے میری زبان سے کلام کیا ہے اور اس امر پر تعجب کا اظہار کررہے تھے، مجھ سے مصافحہ کرکے برکت حاصل کررہے تھے۔ پھر مجھے الہام کیا گیا کہ یہ وہ کلام ہے جو اللہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے میرے بھائی ابن عباس کے حق میں ادا کیا ہے۔ حالانکہ وہ اس سے عناد رکھتا تھا اور اس کو ایذا پہنچاتا تھا۔

اس خواب کی تاویل بہت عظیم وجلیل ہے۔ اپنی حقانیت پر ناز کرتا ہوں اور اپنی بطلانیت (ہیرو ہونے) پر نازاں ہوں۔ میرا عربی ہونا میرا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مشابہ ہونے کی وجہ سے ہے جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ پر فرائض کے قرب کا فیضان فرمایا۔ اور الہام کا مطلب یہ ہے کہ میں نازاں ہونے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نائب ہوں۔ اور دین میں فقاہت کی حیثیت سے میں ابن عباس ہوں اور اپنی جسمانیت کی حیثیت سے ان کا بھائی ہوں۔ میں اس خواب کی وجہ سے بہت خوش ہوا مجھے زبردست مسرت حاصل ہوئی۔ اور میں نے جان لیا کہ اللہ سبحانہ نے محض اپنے فضل سے فرائض کا قرب اور مقام امیت عطا فرمایا۔ والحمد للہ رب العالمین۔

۱۰۱۔ تفہیم:

طویل گفتگو سلوک کے شروع ہونے اور مقامات کے علی الترتیب بیان کے بارے میں

میں اپنے سلوک کے شروع ہونے کے بارے میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں۔ اور

مقامات کو بالترتیب بیان کرنا چاہتا ہوں۔ اللہ سبحانہ نے مجھ پر سب سے پہلے جس چیز سے پردہ اٹھایا، وہ یہ ہے کہ میں نے خواب دیکھا کہ گویا شیخ حسین بارک اللہ فی عمرہ مجھے حکم دے رہے ہیں کہ میں اپنے شیخ اور والد قدس سرہٗ سے اس امر کے بارے میں سوال کروں جس سے دوام ذکر حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ میں نے ان سے سوال کیا تو انہوں نے فرمایا کہ اگر تم اس کا ارادہ رکھتے ہو تو فلاں شخص سے تلمذ اختیار کرو، اور ان سے سیکھو۔ وہ ایک ایسے شخص کی طرف اشارہ کر رہے تھے جس کے پاس نہ علم ہے اور نہ ہی اس کو سلوک حاصل ہے۔ میں بیدار ہوا تو میں نے اس خواب کی یہ تعبیر لی کہ اس شخص سے تلمذ حاصل کرنے کا مطلب انکسار نفس اور شیخ حسین سے طریق اخذ کرنا ہے کہ ان کے پاس بہت زیادہ علم نہیں ہے۔ میں ان کے پاس گیا تو اللہ نے ان کی صحبت سے مجھ پر دو قسم کی نسبتیں کھول دیں۔ نسبت ہمارے مفہوم میں کسی بھی ایک رنگ کے حضور میں رنگنا ہے جیسے محبت، خشوع، تعظیم وغیرہ۔ اور میرے رب نے مجھے الہام کیا کہ میں اس کا احاطہ کرلوں اور اس کی باریکی تک پہنچ جاؤں۔ چنانچہ میں نے اس کے اثر کا اتباع کیا تو مجھے نسبت کی ایسی قسمیں عطا کی گئیں، جن تک کوئی شخص کم ہی پہنچا ہوگا۔ اور جذب کی ایسی اصناف عطا کی گئیں کہ کسی مجذوب کو ان میں سے کم ہی عطا کی گئی ہوں گی۔ چنانچہ میں ایک زمانہ تک مطمئن رہا۔ پھر مجھے ایک واقعہ پیش آیا اور وہ یہ کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ گویا اللہ سبحانہ نے میرے لیے ایک مقام رفیع کھول دیا ہے۔ اور وہ حضور مجرد ہے جو نہ زمانہ میں ہے نہ مکان میں۔ چنانچہ میں پوری طرح اس کی طرف مائل ہو گیا اور اس کے علاوہ سب کو چھوڑ دیا اور گمان کرلیا کہ میں مطلب اقصیٰ میں کامیاب ہو گیا۔ پھر دوسرا امر ظاہر ہوا وہ اللہ سبحانہ کے اسماء کے افاضیات ہیں۔ اس وقت میں نے گمان کیا کہ اللہ سبحانہ نے اسی امر کا فیضان فرمایا۔ پھر چند روز کے بعد مجھ پر اس سے زیادہ لطیف امر کا کشف ہوا۔ اور یہ وہ شئے ہے جس کو بالفعل افاضہ ہے لیکن بعینہٖ بالفعل افاضہ نہیں ہے۔ پھر چند دن کے بعد مجھ پر واضح ہوا کہ گویا وہ امر سلبی ہے یعنی وہ تنزیہ کے ساتھ متحد ہے اور وہ کائنات انسیہ زمانیہ ومکانیہ کے لیے سلب سے ہے اور چند روز کے بعد گویا وہ استعداد ہے جس سے سلبیات وغیرہ پیدا ہوئی ہیں۔ اور چند دن کے بعد گویا کہ وہ امر بسیط ہے، حق بساطت، نہ اس میں تعدد ہوتا ہے نہ تکثر۔ اور میں ان دنوں یہ گمان کرتا تھا کہ امر ثانی امر اول کے لیے ناسخ ہے۔ اس طرح معاملہ جاری

رہااوراس کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ وہ فناء لطائف ہے۔

پھر میں اپنے شیخ قدس سرہ کی قبر کے پاس اللہ سبحانہ کی طرف توجہ کر کے اس امر بسیط کا پوری طرح ادراک کرتے ہوئے بیٹھا ہوا تھا کہ جس چیز کا بھی اپنے رب سے ادراک کر سکتے ہو، اس کو دیکھو تو میں نے کہنا شروع کر دیا۔ نہ حس ظاہر ہے، نہ باطن اور نہ نفس ناطقہ ہے۔ پھر مجھ سے کہا گیا: پھر تم کس سے ادراک کرتے ہو؟ تو میں نے کہا اپنے تقرر اور وجود سے۔ پھر کہا گیا تو اپنے تقرر کے معنی بتاؤ، وہ کیا ہے؟ اور ضروری ہے کہ وہ بدن مشاعر اور نفس سے بھی پرے ہو کہ تقرر اللہ سبحانہ ہے۔ تو میں نے کہا مدرک۔ اور مدرک واحد ہے۔ پھر مجھ سے کہا گیا اس مسئلۂ علیہ پر یقین رکھو اور اللہ سبحانہ سے خالص وحدت اور علم حضوری بسیط کے ساتھ ڈرو۔ اس وقت فناء تام حاصل ہوا۔ پھر میں ایسا ہو گیا گویا میں بحر معارف ہوں۔ پھر مجھ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اولیاء کے مقام اور علم آخرت، علم شرائع، علم تکوین اور علم الٰہیات وغیرہ علوم عجیبہ کا کشف ہوا۔ اور مجھ پر حکمت اور اس کے آداب کھول دیئے گئے۔ تو میرے لیے میرے رب کے فضل سے اس کا وجود متحقق ہو گیا۔

۱۰۲۔ تفہیم:

وجود کے مقام کی تمثیلوں سے علم کا مقام

اے بھائی! کیا تم جانتے ہو کہ علم کا مقام وجود کے مقام کی تمثیلوں سے ہے۔ جیسا کہ اللہ سبحانہ نے فرمایا: **ثم جعلنا الشمس علیه دلیلا** "پھر ہم نے سورج کو اس پر دلیل بنایا" یعنی اس کے وجود کی علت۔ یہاں لفظ دلیل کو علت کے استعارہ کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ دلیل وجود علمی عطا کرنے والی ہے۔ اور علت وجود خارجی عطا کرنے والی ہے۔ اور اول ثانی کی تمثیلوں میں سے ہے۔ تو یہ استعارہ کا تعلق ہے۔ جاننا چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو حدیث قدسی میں فرمایا: **انا عند ظن عبدی بی** "اس کا معنیٰ یہ ہے کہ اپنے بندہ کی استعداد کے وقت وہ میں ہوں، وہ خارج اور واقع کے اعتبار سے ہے۔ اور جو امر افاضیہ کے اعتبار سے مجھ تک پھیلا ہوا ہے، اس سے فرائض کے قرب سے کنایہ کیا ہے۔ اب اگر تم کہو کہ ان دونوں قربتوں کو یہ دونوں نام کیوں دیئے گئے؟ تو میں کہتا

ہوں کہ یہ اس لیے ہے کہ اللہ سبحانہ کی طرف چلانے والے طرق کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جس کو وحی اور انبیاء کے معارف نے ثابت کیا ہے۔ اور وہ فرائض کے قرب سے مناسبت رکھتا ہے اور اس کی طرف لے جاتا ہے، اس لیے اس کو اس سے کنایہ کیا گیا۔ اور دوسری قسم وہ ہے جس کو الہام اور اولیاء کے معارف نے ثابت کیا ہے اور وہ نوافل کے قرب سے مناسبت رکھتا ہے، اس لیے اس کو اس سے کنایہ کیا گیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے طاعات کے قبیل سے آپ کو جن امور کی بھی وحی کی ہے تو وہ یا تو فرض ہیں یا فرض کی جنس سے ہیں۔ جیسے نفل نمازیں اور قرآن کی تلاوت، یہ فرض کی جنس سے ہیں اور جن امور کا اللہ سبحانہ نے اولیاء کو الہام کیا ہے، وہ طرق موصلہ ہیں جیسے حضور اور ذکر قلبی اور تزکیہ، توکل اور توحید افعال وغیرہ یہ سب نفل ہیں۔ یعنی فرض کی جنس سے نہیں ہیں، بلکہ زیادتی ہیں۔

۱۰۳- تفہیم:

قضیہ 'واحد سے واحد ہی صادر ہوتا ہے' کا صدق اور صادق اول سے مراد

اس قضیہ کا کہنے والا کہ 'واحد سے واحد ہی صادر ہوتا ہے' اپنے قول میں سچا ہے۔ اور حقیقت واحدیہ سے صادر ہونے والا اللہ سبحانہ کے اسماء میں سے ایک اسم ہے۔ یہ عقل نہیں ہے جیسا کہ فلاسفہ نے گمان کیا ہے۔ اور اسم سے مراد یہ ہے کہ جو کسی کا عنوان ہوتا ہے اور اس پر صادق آتا ہے۔ اور اس سے صرف اس امر میں ممتاز ہوتا ہے کہ وہ شئے اپنی ماہیت کے لحاظ سے وہ اسم نہیں ہوتی بلکہ اس کے اخذ کے اعتبار سے اس کے ساتھ ایک خصوصیت ہوتی ہے، جو شئے کی ماہیت کی شارح ہوتی ہے جیسے جفت چار کے لیے ہوتا ہے۔ یا خصوصیت زائدہ اجنبیہ ہوتی ہے، ماہیت کے اقتضا سے نہیں ہوتی جیسے انسان کے لیے کاتب ہونا۔ یہ علی سبیل العموم اسم کی ماہیت ہے اور یہ جو صادر ہونے والی ہے تو یہ یقیناً اول کے قبیل سے ہے یعنی ماہیت کی لازم ہے اور وہ اس لیے کہ اس کی ماہیت اس کے وجود کا عین ہوتا ہے تو جو وجود کا لازم ہوتی ہے، ماہیت کے اقتضا کے بغیر اس کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اور عقل ایک دوسرا جوہر ہے، وہ نہ واجب کا عنوان ہے، نہ اس پر صادق آتی ہے۔ اور اس مطلب کے اثبات کے لیے ہمارے پاس کئی وجوہ ہیں۔

اول مقدمہ کی تمہید کے ساتھ مسبوق ہے۔ وہ یہ کہ لازم کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جس کا ماہیت تقاضہ کرتی ہے اور وہ ماہیت کو بنانے کے علاوہ نئے سرے سے کسی عمل کا بنایا ہوا نہیں ہوتا۔ اور دوسری قسم وہ ہے جس کا ماہیت بنفسہٖ تقاضا نہیں کرتی بلکہ ایسا وجود کی شرط کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور اس کا وجود ماہیت کے وجود کا غیر ہوتا ہے۔ اور نئے سرے سے بنایا ہوا ہوتا ہے۔ یہ وہ نظر جلی ہوتی ہے جس کی تصریح فلاسفہ نے کی ہے اور نظر دقیق یہ حکم کرتی ہے کہ ماہیت کا تقاضا اس کے لازم کے لیے ہوتا ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ خالص ہونے کے درجہ میں ماہیت صرف وہی ہوتی ہے اور وہ اس حالت میں مجمل ہوتی ہے۔ اس کی شرح مرتبۂ متاخرہ میں صرف اس کی لازم ہوتی ہے۔ وہ اس کے نفس سے جاری ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اس کی حقیقت اس ماہیت کے سوا خصوصیت شارحہ اور ہیئت تفصیلیہ کے ساتھ کچھ نہیں ہوتی جو ماہیت کے اجمال اور اس کے آگے بڑھنے سے صادر ہوتی ہے جیسے چار کے لیے جفت یا جوڑا۔ اس لیے کہ چار جب اپنے آپ میں چار اکائی ہوگا، وہ چار اکائی ہونے میں اپنے خالص ہونے کی شدت کے لیے اپنے آگے بڑھنے کے اعتبار اور لحاظ کے بغیر اپنے مرتبہ میں شکل اختیار کرے گا۔ اس لیے نہیں کہ وہ امر اجنبی ہے اس پر زائد ہے، اور یہ کہ اپنے لازم کے لیے وجود سے مشروط ماہیت کے تقاضہ میں وہ اپنے بنانے والے کی طرف اس کی سند کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ اور وہ جب محققین کے نزدیک اس طرح متحقق ہوتا ہے کہ ماہیت اور فعلیت کے درمیان فاصلہ یہ ہے کہ جب شئے کی طرف اس کی ماہیت کا لحاظ کیا جاتا ہے تو ماہیت کے لقا کا لحاظ کیا جاتا ہے۔ اور جب اس کی طرف اس حیثیت سے لحاظ کیا جاتا ہے کہ اس کی نسبت اس کے بنانے والے کی طرف ہے تو فعلیت کے لقا کا لحاظ کیا جاتا ہے۔ اس وقت تقسیم صحیح ہوتی ہے کہ لازم یا تو ماہیت کے اجمال کے لیے تفصیل ہے اور اس کے لیے شرح ہے اور ان دونوں کا ایک دھاگہ میں پرو دیا جانا ان دونوں کو ایک ایسے امر کے لیے بنانے والا ہے جو ان دونوں کو جمع کر دیتا ہے۔

اور جب مقدمہ کی تمہید بندھ گئی تو ہم کہتے ہیں کہ حقیقت واجبہ سے صادر اول لازم ہے کہ وہ اس حقیقت کی تفصیل اور اس کی شرح ہو۔ اور وہ اس لیے کہ اگر اصلاً لازم نہ ہو تو اس کا صدور محال ہوگا۔ اس لیے کہ جو شئے، شئے سے واجب نہیں ہوتی، اس سے صادر نہیں ہوتی۔ اور نہ ہی یہ

ممکن ہوتا ہے کہ لازم اجنبی ہو۔ اس کو ایک امر جمع کرتا ہے۔ اس لیے کہ واجب جل مجدہ سے اوپر کوئی امر نہیں ہے اور جو کچھ ہوگا کسی شئے کی شرح اور تفصیل ہوگا۔ وہ اس پر صادق آئے گا اور اس کا عنوان ہوگا۔ اور وہ اس لیے کہ اس پر صادق نہیں آیا تو یقینی طور پر اس میں امر اجنبی اس حقیقت کی ضد ہوگا۔ یہ خلاف واقعہ ہے۔ اس لیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔

اور دوسری وجہ بھی مقدمہ کی تمہید پر موقوف ہے، وہ یہ کہ ہر بنانے والے کے لیے اپنی بنائی ہوئی چیز سے خصوصی نسبت ہوتی ہے۔ چنانچہ اس کے علاوہ کوئی مستوجب نہیں ہوتا اور نہ ہی کوئی بنایا ہوا پایا جاتا ہے۔ سوائے اس کے کہ اس پر علت واجبہ کا وجوب وسبقت لے جاتا ہے جیسے اس کے وجود کا ہونا واجب ہے اور ہر ممکن کے طبائع میں اس کی اصل فعلیت میں، اس کے بنانے والے کی طرف نسبت ہوتی ہے۔ اور جب تحقق کے بقعہ میں ہونا ممتنع ہو گیا یعنی یہ متحقق ہو گیا کہ امر یہ تھا کہ اس کی جہت واجب جل مجدہ سبحانہ میں موقر روح نہیں ہوتی اور اللہ سبحانہ کی تمجید بزرگی کی صورت یہ ہے کہ کہا جائے کہ وہ فعلیت کے مفہوم کے اقلیم کو محیط ہے خواہ وہ مفروضہ ہو یا عملاً غیر متناہی احاطہ ہو۔ ایسی صورت میں کلی نہیں ہوگا اور نہ ہی جزئی ہوگا۔ جہاں تک یہ سوال ہے کہ وہ کلی نہیں ہے تو یہ اس لیے کہ نہ اس میں نفع ہے اور نہ ہی نقصان ہے۔ وہ خیر محض ہے، اور مکمل طور پر خالص ہے، اور جہاں تک اس کے جزئی نہ ہونے کا سوال ہے تو وہ اس لیے کہ وہ اس سے زیادہ عام نہیں ہے۔ اور نہ ہی ایسا مفہوم ہے کہ اس کے اوپر سے اس کا احاطہ کرے۔ اور زیادہ حق بات جو اس کے سلسلہ میں کہی جاتی ہے، یہ ہے کہ وہ واحد ہے لیکن عوام میں مشہور معنی کے لحاظ سے نہیں۔

اور اسی طرح جب صادر اول کا تغیر، جہت واجبہ جامعہ ہوتی ہے تو اس کے لیے حق ہے کہ اس اطلاق کے ساتھ مطلق ہو جس کی تفسیر ہم نے واجب جل مجدہ کی ہیئت سے کی ہے۔ اس طرح نہیں جیسے گمان کرنے والوں نے گمان کیا ہے کہ واجب کے لیے جزئیات مطلق لازم ہوتی ہیں۔ پھر یہ کہ صادر اول اس کی ماہیت کے قبل سے جزئیات کے سامنے جزئی ہوتا ہے۔

اور اگر ایسا ہوتا جیسے یہ لوگ قیاس کرتے ہیں تو اولاً لازم نہیں ہوتا اور نہ ہی اس کا بننا بسیط ہوتا۔

اور جب مقدمہ کی تمہید بندھ گئی تو تم کہو گے کہ اللہ سبحانہ کے سوا جو کچھ ہے، اس کا وجود اللہ سبحانہ میں فنا ہے۔ اور یہ اس حکم کے لحاظ سے ہے جس کی بنیاد ہم نے اس طرح رکھی ہے کہ

اللہ ہر ایک کا احاطہ کیے ہوئے ہے تو اس کے اوپر یکے بعد دیگرے لازم خصوصیات کے امتیاز اور تعدد کی حیثیت سے ہے اور کسی چیز میں فنا ہونے والے ہر ایک پر اس کا محمول کرنا اس وقت ممکن ہوتا ہے جب وہ مطلق ہو اور وہ اس لیے کہ صرف خصوصیت کی وجہ سے امتیاز ہے اور یہ کہ وہ نہ اس کے اطلاق میں اور نہ ہی اس کے تحقق میں اس کی ضد ہے۔ چنانچہ صادر اور اس پر محمول ہے اور اس کا عنوان ہے۔

تیسری وجہ بھی ایک مقدمہ کی تمہید کی محتاج ہے۔ وہ یہ کہ ایجاد کی شکل بناو تخلیق کی شکل نہیں ہے، اور نہ ہی جعل مرکب ہے، جس کا اثر ہیئت خلطیہ ہے۔ بلکہ حق یہ ہے کہ اس کے اثر کی بسیط نے شئے بنفسہٖ بنائی اور وہ نظر جلی ہے، پھر نظر دقیق یہ حکم لگاتی ہے کہ صادر اول کسی بھی صادر کرنے والے کے لیے ایک مثال ہے، اور یہ کہ جاری ہونا صرف مصدر کی جہت کے لیے ان خصوصیات کے ظہور سے ہے جو بے حد و بے شمار ہیں۔ اور صادر اول مختلف صادرات کے لیے مجموعی طور پر جامع ہے۔ اس لیے کہ اگر امر خاص صادر ہو گیا تو اس کا غیر صادر نہیں ہوا۔ اس لیے واحد سے صرف واحد ہی صادر ہوتا ہے۔ اور میری مراد خصوصیت الٰہیہ ہے جو جہت اور اس سے صادر ہونے والے کے درمیان فرق کرنے والی ہے۔ اور ضرورت فطری اس طرح پوری ہوئی کہ مظاہر کے لیے شئے جامع کی مظہر کے بھی رنگ میں نہیں رنگی جاتی۔ ورنہ وہ جامع نہیں ہوگی۔

اور جب مقدمہ کی تمہید بندھ گئی تو اب تم کہو گے کہ صادر اول واجب جل مجدہ کی جہت کے لیے پوری پوری تمثیل ہے جو کسی بھی چھوٹے بڑے امر کو نہیں چھوڑتی سب کا احاطہ کر لیتی ہے۔ اور اس سے صرف خصوصیت شارحہ سے ممتاز ہوتی ہے۔ بلاشبہ وہ اللہ سبحانہ کے ناموں میں سے اسم اعظم ہے "والحمد للہ اولاً وآخراً ظاھراً وباطناً وصلی اللہ علی خیر خلقه محمد والہٖ اجمعین"۔

۱۴۳۔ تفہیم:

تجلی ذاتی کی حقیقت کا تفصیلی بیان

تم اپنے علم کے موقف میں ثابت قدم رہو اور اس امر کا پورا یقین رکھو کہ تجلی ذاتی کی حقیقت اللہ سبحانہ کا اس طرح عرفان ہے کہ وہ اپنے ماسوا ہر شئے کا مبدأ اور اپنے تقرر و ثبات

میں پختہ ہے۔ خواہ صفات کی بات ہو یا ذوات کی اور اس حیثیت سے کہ اس کی ذات کی احدیت تمام جہات وجودیہ کے لیے جامع ہے۔ اس کی پہلی مثال اللہ سبحانہ کے اسماء ہیں پھر الگ سے اعیان ہیں۔ اور وہ یہ کہ پہلا اجرا اجمال کی تفصیل ہے۔ اور دوسرا سورج سے روشنی ہے۔ پھر اس کی ذات کے سوا تمام سے رجوع ہے، خواہ وہ اسماء ہوں یا ان کے علاوہ۔ یہاں تک کہ اس کی ذات کے سوا کچھ بھی باقی نہیں رہتا اور اُس کی ذات کے جلال میں اس کے سوا سب کچھ فنا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اللہ بنفسہٖ توحید حضوری اجمالی میں پایا جاتا ہے اور یہ وہ امر ہے جس پر جمہور اہل اصول متفق ہیں۔

چنانچہ اولیا میں سے کچھ لوگ وہ ہیں جو اس کو توحید کا نام دیتے ہیں اور ابوعبداللہ راہ سلوک کی منزلوں میں اس طرح چلنے والوں میں سے ہیں کہ انہوں نے اس کو آخر مقامات قرار دیا ہے۔ اور ان میں سے کچھ لوگ اس کو فنا یا جذب کا نام دیتے ہیں جیسے شیخ الطریقت خواجہ نقشبند اور شیخ شہاب الدین۔ اور ان میں سے بعض اس کی تعبیر اس طرح کرتے ہیں کہ سالک کسی مسلمان کے برتن کی طرح ہوتا ہے، جیسے شیخ اعظم محی الدین عبدالقادر۔ اور ان میں سے کچھ لوگ اس کو تجلی ذاتی کا نام دیتے ہیں جیسے شیخ اکبر ابن عربی اور ان کے پیروکار۔ اور اللہ عزوجل کے حکماء بھی جو اس کے رنگ میں رنگے ہوئے اور راہ کو عبور کرنے والے ہیں۔ البتہ یہاں دو مقام ہیں جن میں اختلاف کرتے ہیں۔ اول یہ کہ آیا وہ جائے قرار ہے جس میں وہ قرار اختیار کرتا ہے، یا راستہ کی چڑھائی کا حصہ ہے جس پر چلتے ہیں اور اس میں رکتے نہیں ہیں۔ چنانچہ اولیاء شیوخ اس کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اس میں رہتے ہیں۔ لیکن حکماء اس میں رہنے اور اس کے تحقق کی استطاعت نہیں رکھتے، کیونکہ ان کے ساتھ جذب قوی اور سرعت سیر ہوتی ہے۔ ان کا ٹھہرنا صرف توحید کی عبادت کی طرف ہوتا ہے۔ اور دوسرے یہ کہ وہ برقی ہے یا دائم۔ تو اولیاء میں سے باخبر اصحاب کا اس کے برق ہونے پر اجماع ہے اور حکماء کے مذہب سے اس کے اجمال کا دوام ظاہر ہوتا ہے، اس طرح کہ دائرہ تنگ ہو جاتا ہے۔ اور اس کی تفصیل کا اختلاف اس حیثیت سے کہ وسیع ہوتا ہے۔ اور اس میں راز یہ ہے کہ ان کی رائے بغیر تحقق و استغراق کے اس سے رنگی ہوئی ہوتی ہے۔ پھر یہ متحقق ہوتا ہے کہ حکماء کے لیے وصول تام سے اس نوع کے بعد دوسرا وصول ہوتا ہے۔ وہ اس کے ساتھ مختص ہوتے ہیں

وما كل عين بالجمال قريرة
ولا كل من يهوى تجلى له السر

''ہر آنکھ کو جمال سے ٹھنڈک نہیں ملتی، اور نہ ہی ہر عشق والے پر بھید اور راز کھلتے ہیں۔''

بے شک مشق و ریاضت کرنے والوں پر واضح ہے کہ ممکنات کے حقائق اسماء کا عکس ہوتے ہیں۔ اس لیے کمالات کے اصول و فروع پر اس عکس سے فیضان ہوتا ہے۔ اور ہر کمال کا اس عکس میں اس کے فضل پر اجمال ہے۔ وہ یہ کہ ان میں سے وہ ہیں جن پر صورت مزاجیہ جمع ہو جائیں۔ اور ان میں سے وہ بھی ہیں جن کی خواہش نہ کی جائے۔ اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کی تجلیات کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وجودیہ یعنی جس سے فیضان کے لیے وجود حاصل ہوتا ہے۔ اور اس کی بنیاد ہمارے نزدیک وحدت الوجود کی اصل پر اس معنی میں ہے جو کتاب الخیر الکثیر کے شروع میں ذکر کیا گیا۔ اور دوسرے شہودیہ ہے یعنی جس سے بندہ کی تعلیم حاصل ہوتی ہے اور اس کی طرف تعریف ہوتی ہے اور یہ اولی کے لیے عکس ہے۔ اور وہ ہمارے نزدیک وجودیہ ظہوریہ کے لیے کمالات علمیہ، ادراکیہ کے عکس سے متحقق تحقیق پر مبنی ہے۔ جیسا کہ اس کتاب میں اس کی طرف بار بار اشارہ کیا گیا ہے۔

پھر بحث و مباحثہ کے بعد معلوم ہوا کہ حکما کے لیے وصول کی قسط ہے۔ اور کمال سے حظ و حصہ ہے۔ ادراکیات کا عکس وجودیات کے اصول میں داخل ہوتا ہے جیسا کہ سورج کا عکس موسم گرما میں دوپہر کے وقت داخل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ حکیم بنفسہٖ طاعت، عرفان، ذوق اور وجدان ہو جاتا ہے۔ چنانچہ وہاں اس وصول علمی کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے جو اصحاب تدقیق کے نزدیک نیرنگ اور طلسم ہوتا ہے۔ اور بندہ پوری طرح اللہ کے لیے، اور اس کے افعال واقوال کلی طور پر اللہ کے لیے، اور اللہ کے نزدیک اور فی سبیل اللہ ہو جاتے ہیں۔ پھر اس کے دور میں شہود کے اصول پر ان کا شہود ہوتا ہے اور اہل جذب پر ان کا جذب اور ان کا سلوک ہوتا ہے۔ اور اس مقام سے موسوم ہونے کا زیادہ حقدار اخلاص اور صلاح ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اولي الأيدي والأبصار انا اخلصناهم بخالصة ذكرى الدار ''بڑی قوت عمل رکھنے والے اور دیدہ ور لوگ۔ ہم نے ان کو ایک خالص صفت کی بنا پر برگزیدہ کیا تھا اور وہ دار آخرت کی یاد تھی۔'' (ص: ۴۵-۴۶) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ نے اپنے آپ کو عبد صالح

سے موسوم کیا۔ اور دوسرے الفاظ میں وہ حقائق اپنی مجرد اور متحیز مثالوں پر ظاہر ہوتے ہیں۔ چنانچہ تم ان کو عدم کے حکم میں کرو گے کیونکہ وہ اپنی جبلت میں صورت جو یہ، براقیہ، صیقلیہ سے اس پر پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس کا عرفان اس کا نفس اس کی سماعت اس کا نفس، اور اس کی بصارت اس کا نفس ہو جاتا ہے جیسا کہ وہ شروع میں اسی طرح تھا۔

اور اس کے مثل پر رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے حفاظت فرمائی۔ جب فرمایا اگر میں اس کے بعد اپنی نماز میں بھول جاؤں تو لوگوں کو چاہئے کہ وہ تسبیح پڑھیں، اور عورتوں کو چاہیے کہ وہ ہاتھ پر ہاتھ ماریں۔ اور وہاں وہ بذات خود اللہ سبحانہ کی تجلی ہوتا ہے اور یہ وہ مقام ہے جس کو ہم نے اپنی کتاب الخیر الکثیر میں حکماء کے ساتھ خاص معنی میں تجلی ذاتی کا نام دیا ہے۔ اب سمجھو اور جان لو۔ اور دوسرے الفاظ میں اللہ عزوجل کے سامنے مثال ہوتی ہے جیسا کہ نفس الامر میں اس کی صورت معلومہ اس کے سامنے ازل میں بھی اور ابد میں بھی خاص دائرہ میں مثال ہوتی ہے۔ نہ کلمہ کو لوٹاتا ہے نہ حرف کو۔ اور اللہ عزوجل کی صنعت میں اس کا نام رکھا جاتا ہے۔ اس لیے فرمایا واصطنعتک لنفسی "میں نے تجھے اپنے لیے بنایا۔"

دل را بدل راھیست دریں گنبدِ سپھر

اس آسمانی گنبد میں دل کو دل سے راہ ہے

اور دوسرے الفاظ میں وہ ربط مقدس ہے جس کی طرف اللہ نے احسان فرمایا۔ اس کو یہ بندہ بعینہٖ اسی سے موسوم کرتا ہے، سوائے اس کے کہ یہاں اس سے عبد الی اللہ تعبیر ہوتی ہے۔ اس طرح ربط کی ذات ایک ہے اور جہتیں مختلف ہیں۔ اور یہ ہمارے نزدیک حکماء نے ذکر کیا اور بالجملہ اولیاء میں سب سے زیادہ وسیع علم رکھنے والے شیخ اکبر اسی مقام کے بارے میں کہنے والوں اور اس کی تحقیق کرنے والوں میں سے ہیں جس کو ہم نے ان سے چار عبارتوں سے تعبیر کیا ہے۔ اور شیخ اکبر نے اس کا نام حیرت عظمیٰ رکھا ہے اور وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اعیان کو اجمالی معرفت ہوتی ہے۔ اور یہ ام المعارف ہوتی ہے جیسا کہ اشعۃ اللمعات میں ہے۔ اور وہ اپنے لیے ایک مقام ولایت سے اوپر اور نبوت سے نیچے ثابت کرتے ہیں، جیسا کہ فحات میں ہے اور خاتم الانبیاء کے بعد نبوت باطنیہ کے اثبات اور نبوت تشریعیہ کے انقطاع پر بے قرار ہیں۔ جیسا کہ الفصوص میں ہے۔ اور کہتے ہیں کہ غایت الکمال جس کے لیے تجلی کی

جائے، اس کے عین میں اللہ سبحانہ کی تجلی ہے، اور اس سے اوپر کوئی کمال نہیں ہے جیسا کہ شیخ احمد سرہندی کے مکتوبات میں نقل کیا گیا ہے، اور وہ مباحثہ جس کو شیخ مجدد نے وہاں وارد کیا ہے، غیر وارد ہے۔ پھر کہتے ہیں کہ یہ مقام کریم تجلی ذاتی پر دو وجہ سے راجح ہے۔ اول یہ کہ وہ عبودیت میں پختگی ہے، دوسرے خالص تالہ یعنی معبود بن جاتا ہے۔

در دیار نیرنگی عالم خدائی ہاست

نیرنگی کے دیار میں خدائی کا عالم ہے

اور عبودیت تالہ سے اولیٰ ہے اور چونکہ وہ خلاف شرع حکما سے صادر نہیں ہوا جو کہ ان کے غیر سے ثانی صادر رہا ہے کہ وہ حق محقق ہے اور ثانی خالص نیرنگ ہے۔

بخواب اندر مگر موشی شترشد

خواب میں چوہا اونٹ ہو جاتا ہے۔

اور چونکہ وہ ایسے کمزور قضیات کی بنیاد پر حکما کا حکم ہے جس کے لیے کوئی بے قرار نہیں ہوتا۔ تحقیقات نہیں ملتیں۔ اور ان کے مقامات محفوظ اور شرعی ہیں۔ پھر ہم اس مقام میں حکماء کے آداب کے تعلق سے کہتے ہیں کہ اللہ، اولیاء کے مخالف مرید کو رد کر دیتا ہے، جو ان کی مخالفت کو پسند کرتا ہے۔ پھر وہ کوئی بات نہیں کہتے، اور نہ کشف ہوتا ہے نہ کرامت۔ اور نہ ہی کسی کی رہنمائی کرتے ہیں۔ سوائے اپنی مقدس طبیعتوں کی تقلید سے افعال ظاہرہ کے۔

تو از تمکیں من از حیرت نہ ایمائی نہ تقریری

بداں ماند کہ ہم بزم ست تصویری بتصویری

"تو سنجیدگی سے اور میں حیرت سے، نہ کوئی اشارہ ہے نہ تقریر و بیان ہے، ایسی حالت میں ہیں کہ یہ بھی ایک تصویر سے دوسری تصویر کے ساتھ محفل آراء ہے۔"

اور انہوں نے جب بھی کسی امر کا ارادہ کیا اللہ نے ان کی مراد کو اس طرح اُلٹ دیا کہ وہ ان کے لیے ارادہ کرنے والا ہے اور یہ کہ ان کی مراد کی فصل اس حیثیت سے ہے کہ وہ موجب ہے حتیٰ کہ وہ اپنے مقام پر پہنچ جاتا ہے، اور کمال ملکوتی متحقق ہو جاتا ہے۔ اور ان میں سے جس نے یہ دعویٰ کیا کہ اللہ تعالیٰ اس مقام میں اس سے کلام کرتا ہے، اس نے جھوٹ بولا۔ جیسا کہ اولیاء میں سے کسی نے دعویٰ کیا کہ اس پر امر مشتبہ ہو گیا۔

۱۰۵- تفہیم:

صورت کے اعتبار سے دوری اور اس کا استفاضہ میں اس طرح مخل ہونا کہ جو افاضہ میں نقصان رساں نہ ہو

بعد صوری صورت کے اعتبار سے دوری افاضہ میں نقصان نہیں کرتی لیکن وہ استفاضہ میں مخل ہوتی ہے۔ اس لیے کہ فضل وزیادتی میں افاضہ وجہ کلی سے صادر ہوتا ہے۔ اللّٰھم۔سوائے اس کے کہ اس کی مثالوں کی کئی قسمیں ہوتی ہیں اور اس سے نیچے تھوڑے پہاڑ ہوتے ہیں۔ ابتداء کرنے والوں کے لیے استفاضۂ نافع وہ ہوتا ہے جو بوجہ جزئی ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ہی باقی رہتا ہے۔ جو چاہتا ہے کہ ایسے خالی وقت میں غور وفکر کرے کہ نہ گرمی ہو نہ سردی، نہ فتنہ وفساد ہو نہ غیظ وغضب۔ اس کو چاہیے کہ وضو کرے اور جتنی اللہ چاہے نماز پڑھے۔ پھر اس جگہ بیٹھ جائے اور ایک ایسے شخص کی صورت کا تصور کرے کہ پوری ہمت سے اور سارے خطرات کو دور کرتے ہوئے اس کی طرف شوق بھڑکے حتیٰ کہ اس کی صورت سامنے حاضر ہو جائے۔ پھر اس کو لازم ہو جائے یہاں تک کہ اس کی تمام معلومات اس کے نفس کے علاوہ اور اس صورت کے علاوہ جاتی رہیں اور یہ عمل اکثر پہلے ہی روز حاصل ہو جاتا ہے۔ اس کے لیے بہت زیادہ مشقت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اگر پہلے دن حاصل نہ ہو تو دو دن یا تین دن۔

اور میں اس حالت کی وضاحت کرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ یہ حواس کا فتور اور بدن کی کسلمندی ہے جیسا کہ سونے کی تیاری کرنے والے کو ہوتا ہے۔ پھر جب وہ حاصل ہو جاتا ہے تو اس کو اس شخص کی روحانیت سے مناسبت حاصل ہو جاتی ہے اور اس کے قلب کی طرح صاف ہو جاتی ہے۔ پھر اس میں پناہ لینے اور اس سے استفاضہ کے بعد صورت کا ملاحظہ ترک کر دیتا ہے۔ اور ذکر کو لازم کرے خواہ اسم ذات کا ذکر ہو یا نفی اور اثبات، ضرب قوی سے اور پوری ہمت جمعی کے ساتھ، اگرچہ وہاں حس نہ ہو۔ اور یہ خیال کرے کہ اللہ اس کا محبوب ہے اور اس کے سوا کوئی محبوب نہیں ہے۔ حتیٰ کہ محبت سارے بدن میں سرایت کر جائے۔

اور میں اس حالت کی وضاحت کرتا ہوں۔ اس لیے کہتا ہوں کہ وہ بدن میں حرارت

اور نفس میں اضطراب ہے جیسا اس شخص کو ہوتا ہے جو معشوق سے عشق کرتا ہے، اور اس کے عشق میں بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے، اور اس سے ملاقات کے لیے آتا ہے، مگر اس کو پاتا نہیں ہے۔ تو کیا اس کو دل کا خفقان اور نفس کا اضطراب پیدا نہیں ہو جاتا؟ اور یہ کیفیت مطلوب ہوتی ہے۔ پھر جب یہ حاصل ہو جائے تو ذکر ترک کر دے اور شوق مذکور کا خیال کرے جو کہ ذکر کا حاصل ہے۔ اور میں وضاحت کرتا ہوں تو کہتا ہوں کہ شدت سے عشق میں مبتلا ہونے والے کے لیے کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ عشق، شوق اور اضطراب پیش آئے؟ کیا شدت سے بھوک میں مبتلا شخص کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ اس کو بھوک پیش آئے اور کوئی دوسری چیز پیش نہ آئے؟ یہی وہ وجدانیات ہیں جن پر اس وجدان کو قیاس کیا جا سکتا ہے۔ پھر جب یہ حاصل ہو جائے تو روزانہ ایک ساعت نجومیت یا اس جیسی کسی شئے کی طرف متوجہ ہو۔ خواہ اس صورت کا خیال کرے یا نہ کرے۔ پھر ذکر کرے۔ پھر کیفیت معہودہ کو سامنے لائے اور پورے دن ذکر اور شوق سے غافل نہ ہو۔ زیادہ باتیں کرنا چھوڑ دے اور یہ سب کچھ اس کے لیے آسان ہوتا ہے جس کے لیے اللہ آسان کر دیتا ہے۔

تا در نزنی بانچہ داری آتش
ہرگز نشود حقیقت وقت تو خوش

"جب تک تو اس کو آگ نہ لگائے گا جو بھی تو رکھتا ہے، ہرگز تیرے وقت کی حقیقت خوش نہیں ہوگی۔"

۱۰۶- **تفہیم:**

فناء النفس- اس کی صفات اور ان دونوں کے درمیان تلازم کا بیان

فناء نفس اور صفاء نفس ایک دوسرے کے لیے لازم ملزوم ہیں۔ اس لیے کہ فنا جہت مخلوقیہ کے جہت خالقیت میں مغلوب ہونے سے عبارت ہے اور بغیر صفائی کے کہ علائق حسیہ سے نفس کے مجرد ہونے سے کنایہ ہے۔ یہاں تک کہ وہ مرتبہ ہو جائے کہ علوم کی صورتیں تمام بلند راستوں سے اس میں منقش ہو جائیں ایسا محالات کے قبیل سے ہو سکتا ہے۔ اسی طرح ہر ایک کے برعکس کا معاملہ ہے۔ اس لیے کہ یہ صرف اس بندہ اور اللہ عزوجل اور اس کی صفات

کے درمیان شدید مناسبت سے ہی متحقق ہوتے ہیں۔لیکن صوفیا اس میں اس جگہ دقیق نظر سے فرق کرتے ہیں۔اس طرح کہ خمر شراب کو دو آتشہ کریں یا سہ آتشہ، اس سے بھی زیادہ بہرحال اس میں خمر شراب کی صورت باقی رہتی ہے۔اگرچہ گندگیوں سے پاک ہوجاتی ہے اور ہر درجہ میں ایک لطیف تر تاثیر پیدا ہوجاتی ہے۔اور جب خمر میں نمک ملاتے ہیں تو اولاً صورت خمری صورت خلیہ میں تبدیل ہوجاتی ہے اور اگر نہیں ملائیں تو بھی اس کی کدورتیں صاف ہوجاتی ہیں۔اسی پر سالک کو قیاس کریں کہ اولاً علائق حسیہ سے پاکی حاصل ہوتی ہے۔اگرچہ اس کے نفس کی قباحت جو اس کی گندگی میں ہوتی ہے، نہیں بدلتی۔اس طرح نفس کی صفائی کی علامتوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس میں حب جاہ باقی ہو اور انا کا لطیفہ اپنی جگہ رہے۔اس لیے کہ بندہ کی دو کھانوں میں تعیین وتقیید ثابت کرکے اس کا سبب ہوتی ہے کہ الوہیت کا دعویٰ جو کہ حب جاہ کا ثمرہ ہے، اس سے سرزد ہوجاتا ہے اور تمام صفائی فنا کے لیے مستلزم ہے۔اس لیے کہ ایسی نسبت کی معرفت کا نقش ہونا جو بندہ اور اس کے رب کے درمیان ہوتی ہے، اہم ترین مہم اور سب سے بلند کشف ہوسکتی ہے اور وہ انا کے لطیفہ کے فنا کی تابع ہوتی ہے۔اس موقع پر ایک راز ہے، وہ یہ کہ جب علم مقدس علم فعلی ہے اور ہر چیز کے انفعال کا عالم قدس سے بندہ پر فیضان ہوتا ہے، صورت علیہ کی قسم سے اس کی حقیقت تابع ہوجاتی ہے۔اور اگر سالک کو جوہر نفس میں اس طرح شکست ہوجاتی ہے جیسے تخت کو لوہے کی ضرب سے توڑ دیتے ہیں اور لکڑی کے ٹکڑوں کو خاکستر کردیتے ہیں، اسی طرح چھ لطیفوں کو ایک توحید سے توڑ دیتے ہیں اور لطیفۂ قلب کو افعال کی توحید سے اس طرح نابود کردیتے ہیں کہ وہ اپنی اصل سے جو تکوین کی صفت ہے، راجع ہوجاتا ہے۔اور اس نئے مزاج کو بھی اس طرح توڑ دیتے ہیں جیسے تخت کی صورت مزاجیہ ٹوٹ پھوٹ کے بعد صورت ارضی کی طرف عود کرجاتی ہے۔اس پر روح وغیرہ کے لطیفہ کو قیاس کرسکتے ہیں کہ یہ سب جو نفس ناطقہ کے اعتبارات اور وجود ہیں، ٹوٹ جاتے ہیں۔اور اپنی اصل کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔اور اس طرح انا کا لطیفہ کہ گویا نفس ناطقہ کی علت صوریہ اور حضرت ذات باری کی تجلی کا اس رنگ میں ایک شعبہ ہے کہ ایک بلبلا دریا سے اٹھتا ہے اور اس طرح عدم میں مل جاتا ہے کہ بلبلا ہوا میں مل جاتا ہے۔اور اس لطیفہ کا اس رنگ میں فی نفسہ کوئی مزاج نہیں ہے کہ مٹی کو بغیر مزاج کے حدود کے پانی سے ملا دیتے ہیں۔اس طرح یہ

لطیفہ حضرت حق کی طرف لوٹ جاتا ہے۔ یہی فنا ہے۔ اور یہ صفا کا تابع ہوتا ہے۔ اس لیے کہ جب زمین آسمان کی صفت کی ہو جاتی ہے اور مقدس ہیکل کے دائرہ میں آجاتی ہے تو بلاشبہ صورت علمیہ مقدسہ اس میں متحقق ہو جاتی ہے۔ حاصل یہ کہ فنا اور صفا کے درمیان فرق اس کے مماثل ہے جو مرید اور مراد کے درمیان ہوتا ہے کہ بالآخر ہر ایک دوسرے سے وابستہ ہے۔

۱۰۷- تفہیم:

حضرت آدم کی پیدائش اور ان کی ذریت کے اخراج والی حدیث کی تحقیق

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: اللہ نے جب حضرت آدم کو پیدا فرمایا تو ان کے دائیں کاندھے پر مارا اور ان کی ذریت کو نکالا جو سفید موتی کی طرح تھی۔ اور ان کے بائیں کاندھے پر مارا اور ان کی ذریت کو نکالا جو کہ سیاہ کوئلہ کی طرح تھی۔ پھر جو ان کے داہنی طرف تھے، ان کے لیے جنت کا حکم فرمایا۔ اور فرمایا مجھے کسی کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔ اور جو ان کے بائیں کاندھے میں تھے، ان کے لیے جہنم کا حکم فرمایا اور ارشاد فرمایا مجھے کسی کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔ (مسند احمد) اور اس حدیث کے عمر بن خطاب، ابی الدرداو ابن عباس اور ابی بن کعب وغیرہ سے بہت سارے طریق ہیں۔ مرفوعاً بھی موقوفاً بھی، سنداً بھی مرسلاً بھی۔ بالجملہ اس کی صحت میں کوئی شک نہیں ہے۔

اس حدیث کی تحقیق میں اس عبد ضعیف کے لیے جو نقص ہیں، وہ چند کلمات ہیں۔ ان میں سے ایک یہ کہ کیا تم نے آئینہ اور اس میں نظر آنے والی صورت کو نہیں دیکھا کہ اس کے لیے دو اعتبار کس طرح متحقق ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک صورت کا اس طرح اعتبار ہے کہ وہ آئینہ میں جو حاصل ہوتی ہے۔ اس کے صیقل ہونے کی قوت اور اس کی تخن کی نفی کے لیے عرض ہے۔ اور اس اعتبار سے یہ آثار مخصوصہ جیسے آئینہ کا اس مخصوص رنگ سے متصف ہونا، اور اس آئینہ کی قابلیت سے اس کا صادر ہونا، اور اس کی شفافیت سے اس کا ظہور ہے۔ اور دوسرے صورت کا اس طرح اعتبار گویا وہ صاحب صورت کے لیے انکشاف ہے جو اس کی جسمانیت، اس کے رنگ اور اس کی تاثیر سے حاصل ہوتا ہے۔ اور اس اعتبار سے یہ آثار مخصوصہ کے لیے مصدر ہے۔ صاحب صورت کے حال اس کے کشف، اس کی خلقت اور اس کی مخصوص شان،

مخصوص حیثیت ہونے اور اس سے صادر اور منقش ہونے کی ہیئت کی طرح۔ اور یہ دونوں اعتبار ان دونوں کے لیے ان دونوں کے مجموعہ سے آثار ہیں جو خارج میں پائے جاتے ہیں۔

اور ان میں باپ کے ساتھ بیٹے کی نسبت ہے جو صاحب صورت کے ساتھ صورت کی نسبت سے مشابہ ہے۔ اور وہ اس لیے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ بیٹے کی تخلیق باپ کے نطفہ سے ہوتی ہے۔ اور وہ اس کی تکوین میں اصل ہوتا ہے کہ وہ اس کے لیے اس وجود حسی میں علت ہوتا ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ وہ وجود مقدس میں علت ہے یعنی اعیان ثانیہ ہیں۔ اور وہ اس لیے کہ جو کچھ بھی عالم حسی وغیرہ میں پایا جاتا ہے وہ عالم عین میں مقرر کے لیے عکس ہے۔ اور چونکہ وہ عالم عین میں علت ہے تو عالم ارواح میں بھی بالضرورت علت ہوتا ہے۔ اور اس میں بھی شک نہیں کہ وہ متن واقع میں بھی سرفہرست ہے۔ اور اس کا یہ صدور واقعہ کے آئینہ کے عزیز علام کی قدرت سے شفافیت کے بعد ہوتا ہے۔ اس صورت میں ہم نے مشابہت کے سلسلے میں جو کچھ بیان کیا ہے، وہ ظاہر ہو جاتا ہے۔

پھر یہ جان لو کہ جس طرح صورت کے لیے اعتبار اول تحقق ثابت ہے، اعتبار ثانی سے بھی زیادہ حقدار ہے۔ حتیٰ کہ قریب ہے کہ دوسرے کو اول کی جانب میں خالص شعوری وذہنی کے طور پر گمان کر لیا جائے۔ اسی طرح واقع لاشے محض کی طرف اس کی نسبت کی طرف قیاس کرتے ہوئے ولد کی نسبت والد کی طرف ہوتی ہے۔ اور میرے خالص شعور کی مثال صورت ذہنیہ وخارجیہ کے میرے اعتبار کی طرح ہے۔ اور ان میں سے ایک کا متحقق ہونا، دوسرے سے زیادہ حق ہے۔ حتیٰ کہ اول وجود خارجی ہو جاتا ہے جس پر آثار مترتب ہوتے ہیں۔ اور دوسرا ذہنی ہے لیکن اس مرتبہ میں نہیں۔ اور ہمارا یہ کہنا کہ وہ واقعہ کے آئینہ کی شفافیت کے بعد ہے تو اس کی تحقیق یہ ہے کہ اللہ عزوجل کی دونوں جانب فاعل اور قابل میں تاثیر ہوتی ہے۔ اور اس نے جب اس امر کا ارادہ کیا کہ خلقت کو پیدا کرے تو عدم خالص میں فیضان فرمایا اور واقع صادر ہو گیا اور واقع کی تفسیر عدم کا اپنی اصل سے خارج ہونا ہے۔ اس وقت اللہ سبحانہ نے اپنے اسماء اور صفات سے تجلی فرمائی تو واقع کے متن میں علم صادر ہوا۔ اور اللہ نے جس خلقت کو بھی پیدا کیا واقع کا ظرف اس پر بالذات مقدم رہا۔

اور ان میں سے ایک یہ ہے کہ پورا وجود اس وقت متحقق ہوتا ہے، جب وہ اور اس کے

وجوہ اور اس کے اعتبارات جس کا تقاضہ کرتے ہیں، اس سارے کی پیروی کرنے والا متحقق ہوتا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کا دائرہ وسیع کیا اور اپنی صفات کو مکمل کیا اور جب اس کی صفات مکمل ہوگئیں تو ان کے عکس ظاہر ہوئے اور یہ عکس عالموں کے تقررات کی اصل ہیں۔ اور اس طرح جو اس کے اخلاق کے ساتھ متصف ہوکر پیدا ہوتے ہیں، ان کے لیے ان کی طرح وسعت ہے۔ جیسے آنکھ جب بھر جاتی ہے تو جھاگ پھینکتی ہے اور یہ بعینہ ولایت کا راز اور فناء النفس ہے۔ اور کہنے والے کا یہ قضیہ کہ واحد سے صرف واحد ہی صادر ہوتا ہے، حق ہے۔ اس سے الگ نہیں ہے۔ لیکن پہلے قضیہ والا اسم اعظم ہے جس میں تمام اسماء شامل ہیں۔ لیکن میں یہ نہیں جانتا کہ جب یہ اسم ظاہر نہیں ہوا تھا تو اولاً کیا ظاہر ہوا۔ اور اشراق اور برہان نے اس بات کا انکار کیا ہے کہ عالم کا صدور اور خلق کا فیضان ذات کی وسعت کے راستہ سے ہوتا ہے۔ اور کیا یہ ممکن ہے کہ اس طرح صادر ہو جائے، سوائے اس کے کہ جس کی شان ذات کی شانوں میں سے اور اعتبار اس کے اعتبارات میں سے ہو۔

اور ان میں سے ایک یہ کہ اللہ سبحانہ نے جب اس تخلیق میں حضرت آدم کو پیدا کیا تو اپنے جود وسخا کے سمندر سے ان پر فیضان کیا تو یہ افاضہ اجمالیہ پوری طرح وسیع تھا۔ حتیٰ کہ انہوں نے ان معارف وعلوم کو جان لیا جن کو ملائکہ کی جماعت نہیں جانتی تھی۔ حتی کہ وہ اس وسعت کی وجہ سے ملائکہ کے مسجود ہو گئے۔ یہاں تک کہ وہ رحمان کی صورت پر پیدا ہو گئے۔ پھر ان کے اندر اللہ کی مکرم روح پھونکی گئی جس کا ان پر فیضان ہوا۔ حتیٰ کہ وہ اللہ سبحانہ کے ہاتھوں سے پیدا ہو گئے۔ اور یہ سب اس افاضہ کے لیے امارات ہیں۔ اور اس سے کفایات ہیں، میں نے نہیں کہا کہ افاضہ اولاً تھا اور اس کا وجود ثانیاً یا اس کے بالعکس لیکن افاضہ اجمالیہ کا وجود اس کے تمام توابع کے ساتھ تھا۔ اور کبھی بھی اس سے منقطع نہیں ہوا اور نہ اس کے لیے مدت تھی نہ وقت۔ اس لیے جاننا چاہیے کہ چونکہ اللہ سبحانہ تعالیٰ علم فعلی کے طور پر جانتا تھا کہ آدم علیہ السلام ابوالبشر ہیں۔ اس لیے وسعت بشر کی ابوت کی جانب زیادہ اور شدید تھی۔ اور اس میں شک نہیں کہ ان کا وجود ان سے یکبارگی ذریت کے خروج کا تابع تھا۔ اعتبار ضعیف کا شدید طور پر فیضان ہوا اور وجہ سید ھے طور پر ہوئی۔ پھر یہ وجہ فقط مستقل ہوگئی اور اس واقع کے ظرف کی محتاج نہیں رہی۔ جن کا اس میں انتشار تھا بلکہ واقع ہوگیا، اس کے مدمقابل ہوگیا، اس کے لیے واقع ہوگیا

،اور اس کا ظرف ہو گیا اور یہ سب کچھ اس جانب افاضۂ شدیدہ کی برکات سے ہے۔

اور ان میں سے ہی یہ ہے کہ ظاہر ہونے والوں اور آدم علیہ السلام کے درمیان اس حیثیت سے کہ وہ ابوالبشر ہیں، ایک نسبت اور مشابہت ہے۔ اس سے عالم حس میں ان خارج ہونے والوں کو آدم علیہ السلام سے اس حیثیت سے کنایہ بنانا صحیح ہوتا ہے۔ اور وہ اس لیے کہ ظہور وظاہر ہونا جس میں نطفہ کے خروج کے لیے مصدر ہے جیسا کہ وہ اس حیثیت سے عالم تجرد میں ذریت کے خروج کے لیے مصدر ہے۔ اور صاحب کشف پر منکشف ہونے والے راز سے یہ ہے کہ افاضہ کی حیثیت سے ذات اور ہاتھ کے درمیان اور اسی طرح ذات کے اس حیثیت سے کہ اس سے اخذ کرنا مقصود ہے اور وجہ کے درمیان ایسا تعلق ہے کہ ان میں سے ایک کا دوسرے کی تفسیر ہونا صحیح ہوتا ہے۔ بلکہ یہ جارحہ اس حیثیت کے لیے حکایت ہے جیسا کہ ہویۃ جارحہ ذات عین ثابتہ کے لیے حکایت ہے۔ اور عالم مثال میں کسی چیز کی ایسی صورت سے جس کی ایسی وجوہ ہوں جن کا ہم نے ذکر کیا، تمثیل ہیں۔ اور علی ہذا القیاس۔ چنانچہ دائیں اور برکت کے درمیان اور بائیں اور نحوست اور بیاض اور حق اور ظلمت اور باطل کے درمیان شدید مناسبتوں کا اعتبار کیا گیا اور یہ مناسبتیں مبدا کے اعتبارات اور اس عالم محسوس کے درمیان امر حق ہیں۔ اور اسی طرح معاد میں اسی عالم اور اس کے جسموں کے اعتبارات کے درمیان۔ کیا تمہارے کانوں میں معراج میں دودھ والی حدیث اور فاسقوں کے حیوانوں کی شکل اختیار کرنے سے متعلق حدیث نہیں پڑی؟

۱۰۸- تفہیم

قوائے الٰہیہ کی قسمیں اور لطائف ستہ کا بیان

تجرید اور تجزیہ کرنے والوں کے لیے یہ متحقق ہے کہ قوائے الٰہیہ جو ارواح میں عمل کرتے ہیں، پانچ قسم کے ہیں۔ صنف اول اضافیات ہیں اور وہ تاثیرات اور افعال ہیں، اور یہ اہل عالم سے سب سے زیادہ قریب ہیں۔ صنف ثانی صفات ثبوتیہ غیر اضافیہ ہیں جیسے حیات، سمع اور بصر وغیرہ۔ اور یہ اضافیات سے ارفع وبلند ہیں۔ صنف ثالث علم کے تحت لئے ہوئے امور ہیں اور یہ اول الذکر دونوں صنفوں کے اصول ہیں۔ اس لیے کہ صفات جب

حضرت التحقق کے تحت الٹی ہوئی ہوں گی تو تحقق سے جو پیدا ہوا اس کے لیے اس کے پیدا ہونے سے پہلے ہوگا۔ لامحالہ یہ ایسے امور ہوں گے جو ان صفات کی اصل ہیں۔ چوتھے صفات سلبیہ ہیں اور وہ امور مذکورہ کے لیے سگے بھائیوں کی طرح ایک ہی اصل کی دو شاخ ہیں۔ اس لیے کہ ان میں ایک مفہوم کی طرف التفات اور اس سے انکار ہے جیسا کہ اول میں ایک مفہوم کی طرف التفات اور اس کے لیے قبولیت ہے۔ بلکہ صفات سلبیہ ایک لحاظ سے ان سے زیادہ قریب ہیں۔ اس لیے کہ انکار اس تکثیر سے ہے جو اس کی قبولیت سے حضرت اجمال میں زیادہ لائق ہے۔ اگرچہ یہ بھی تکثیر کی وجوہ میں سے ایک ہے۔ پانچویں صفت تحقق ہے اور یہ ام الصفات، خلاق العالم اور تمام وجود کے لیے جامع ہے۔ اور اس کے بعد جاننا چاہیے کہ نفس ناطقہ کے لیے ان تمام کلیات کے مقابلہ میں جو اس میں نقش ہوتی ہیں جو اصحاب بصیرت کے لیے مدرک ہیں۔ اس کی سختی پر احکام ہیں اور اس کے خصوص پر آثار اور کشف ہیں۔ جن کا انہوں نے اس حیثیت سے کہ وہ اضافیات کا عکس ہیں، قلب نام رکھا ہے۔ اور اس کی فنا کا طریقہ توحید صفاتی ہے اور شئونات کے عکس کا نام روح رکھا۔ اور اس کی فنا کا طریقہ توحید صفاتی ہے، اور شئونات کے عکس کا نام راز رکھا اور اس کی فنا کا طریقہ توحید شئونی ہے، اور سلبیات کے عکس کا نام خفی رکھا اور اس کی فنا کا طریقہ توحید سلبی ہے۔ اور ام الصفات کا عکس اخفی ہے۔ اور اس کی فنا کا طریقہ توحید ذاتی ہے۔

اور جس امر پر نظر دقیق کا فیضان ہوا وہ یہ ہے کہ یہاں وحدت ہے جو حق اعلیٰ جل مجدہ سے واسطوں پر مستعار ہے۔ یعنی وحدت نفس مستعار ہے عین ثابتہ سے، اور اس کی وحدت مستعار ہے وحدت اسم سے۔ جو اولاً بالذات اس کا عکس ہے اور اس کی وحدت مستعار ہے، وحدت اسم اعظم سے۔ اور اس کی وحدت مستعار ہے وحدت ذات سے، اور وہ وحدت اگرچہ واسطوں سے ہے لیکن ایک لحاظ سے وہ ذات حق سے سب سے زیادہ قریب ہے۔ اور اس وجہ سے میرے نزدیک یہ واقعہ ہے کہ اس وحدت میں کوئی بہت بڑا اور واضح تغیر نہیں ہوتا، جس سے اس کی قدر و قیمت گھٹ جائے۔ تو اس حقیقت کی مثال اس وحدت کے ساتھ ایسی ہوتی ہے جیسے زید نے اس میں کلیات سے کچھ صنف ملا دیں جیسے جسم نامی، حساس اور ناطق۔ پھر اس کو اس سے وحدت حاصل ہوئی۔ اور یہ وہ امر ہے جو شیخ محی الدین ابن عربی نے اس میں

مراد لیا ہے جس کو ہم دیکھتے ہیں۔ اور اس امر کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس نے یہ حکم کس حیثیت سے لگایا کہ ذاتی کی تجلی صرف اس صورت پر ہوتی ہے جس پر تجلی ڈالی گئی ہے۔

پھر اس لطیفہ وجدانیہ کا نام نفس رکھا گیا اور اس کے فنا کو توحید ذاتی یعنی تجلی ذاتی کہا گیا اور پھر اللہ نے اس کو اس کے مشارکات سے ممیز کیا اور اس کے ارد گرد والوں میں اس کی قدر و قیمت بلند کی اس کو اس کی وہ انانیت عطا کی جو اس کے لیے مخصوص ہے اور اس کو کبریائی و تسخیر کی خلعت بخشی۔ اور کیوں نہ عطا کرتا اور کیوں نہ خلعت بخشتا جبکہ وہ اپنے علاوہ سب کے مقابلہ میں حضرت ذات سے زیادہ قریب ہے۔ لیکن یہاں ایک باریک نکتہ ہے اور وہ یہ کہ یہ جلیل القدر فضائل ممکن میں صرف فساد قابلیت کی برائی پیدا کرتے ہیں۔ تو یہ اس حیثیت سے بالکل عدم وفنا کے قریب ہے۔ یہ وہ فضائل ہیں جو اس کو حاصل ہیں نہ کہ خیر تمام کے فیضان کی حیثیت سے۔ اس لیے کوئی حرج نہیں ہے کہ فنا کے بعد رئیس اللطائف ہو جائے۔ اور کہنے والے نے کیا اچھی بات کہی ہے۔

رفتم از خود چو بتاں عشوہ نوازم کردند
وحشتم گشت کہ آئینہ نازم کردند

"میں اس وقت اپنے آپ کو کھو بیٹھا جب بتوں کی طرح مجھ کو ناز و نخرے والا بنا دیا، مجھے وحشت ہوگئی جب مجھے ناز کا آئینہ بنا دیا۔"

اور یہ کہنے والے کا راز کتنا گہرا ہے۔

بغل چو برق کشادم وداع خود کردم
شرار ہستیم آئینہ خرام کہ بود

"میں نے بجلی کی طرح بغل کھولی یعنی ہاتھ اٹھایا اور خود کو کھو دیا، تو میری ہستی کا شرر کس کے خرام اور رفتار کا آئینہ ہے۔"

اس طرح یہ چھ نکات ہیں۔ والعلم عند اللہ۔

۱۰۹- تفہیم:

حدوث عالم اور اس کے دو معنی

ہمارے اس قول کے کہ عالم حادث ہے، دو معنی ہیں۔ ایک عام دوسرے خاص۔ اور وہ دونوں معنی درست ہیں۔ عام کا مطلب یہ ہے کہ جو گزرے ہوئے زمانہ اجسام اور اعراض

میں دیکھا گیا اس سے پہلے زمانہ موجود نہیں تھا۔ اور خاص سے مراد یہ کہ ہر صاحب وضع کا جسم ہو یا عرض یا عرش اور پانی میں سے کوئی، ایسے زمانہ کے بعد آیا جس میں وہ موجود نہیں تھا۔ یا موہوم مدت کی درازی کہ اس میں وہ موجود نہیں ہے۔

۱۱۰-تفہیم:

اللہ تبارک وتعالیٰ کی اپنی مخلوق سے نسبت

حق تام اللہ عزوجل کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اور اپنی مخلوق سے اس کی نسبت اس نسبت کی طرح ہے جو جسم بلوری مخروطی کی ہوتی ہے جو اپنے مرکز پر نقش ہوتا ہے۔ سرخی اپنی انتہا میں جدا ہو گئی تو اس پر اس سے رنگ کا عکس پڑا۔ اور صفات کی مثال ماہیات کے لوازم جیسی ہے اور عالم کی مثال وجود کے لوازم جیسی ہے اور اللہ جل مجدہ کے علم والے کے لیے کسی وجدانی کیفیت وہیئت کا جاننا ہے اور جو اپنی کیفیت سے غلبہ کے حال میں حکم کرتا ہے کہ عالم، عین اللہ تعالیٰ ہے جو ہر اس سے بڑا ہیچو اس کی کبریائی کے لائق نہ ہو۔ اور اس سے حکم لگایا جاتا ہے

علم حق در علم صوفی گم شود
این سخن کے باور مردم شود

"حق کا علم صوفی کے علم میں گم ہو جاتا ہے، اس بات پر لوگ کیسے یقین کر سکتے ہیں۔"

۱۱۱- تفہیم:

جوہریت اور عرضیت عالم محسوس کی بدعات میں سے ہیں

جوہریہ اور عرضیہ اس عالم محسوس کی بدعتوں میں سے ہیں۔ جہاں تک عالم اعلیٰ کا تعلق ہے تو وہاں نہ استقلال ہے اور نہ ہی عدم استقلال ہے بلکہ وہاں تمام حقائق برابر ہیں۔ اور تم میرے دعویٰ کی تصدیق کرو گے۔ یہ اس عالم مقدس کی طرف نظر کے عطا کرنے سے ہے۔ اگر چہ میرے پاس اس کی کوئی دلیل نہیں جسے اہل عقل و دانش سن سکیں

وان فزت من ذاک الجمال بنظرة
لا صبح منک العقل یسبی ویسلب

"اگرچہ میں اس جمال سے ایک نظر میں کامیاب ہو گیا، لیکن تم سے عقل دور ہو جائے گی اور سلب کر لی جائے گی۔"

۱۱۲۔ تفہیم:

اللہ تعالیٰ تک پہنچانے والا علم حضوری ہے نہ کہ حصولی

علم حضوری اللہ جل مجدہ اور اس کی صفات تک پہنچانے والا ہوتا ہے۔ اور حصولی کو اس مضبوط دائرہ تک رسائی صرف استدلال سے ہوتی ہے۔ اس لیے کہ حصولی سرد ہے اور صاحب صورت کے لیے صورت مغائر ہے جبکہ وہ اس کی عین ہے۔ بلاشبہ وہ ایک لحاظ سے علم سے سجایا ہوا جھوٹ ہے اور اس میں کسی کو شک نہیں ہے کہ ذہن کے اندر نقش ہونے والی صورت امکان کے رنگ میں رنگی ہوئی ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ اس واقع کی حکایت ہے جو اس پر ہوتا ہے، جس پردہ نہیں ہوتا۔ اور علم حضوری میں ان رنگوں کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ اور اللہ جل مجدہ کی طرف اس کے ایصال کی وجہ یہ ہے کہ علم حضوری شخص کے تقرر کے عین سے اس وقت چھلک گیا جب برتن جھاگ سے بھر گیا۔ اور کیا یہ تقرب اس کے لیے اس کے نفس کی جانب سے ہے؟ ہرگز نہیں بلکہ وہ فی نفسہ باطل ہے۔ متحقق، مقرر اور ذات واجب کے فیضان سے موجود ہے۔ وہ قابل محض ہے نہ اِنّ کے ساتھ اور نہ ھُنّ کے ساتھ یعنی نہ اس شکل میں اور نہ اُس شکل میں۔ لامحالہ اس کے لیے فیاض حق کی طرف راستہ ہے۔ اس کی مثال اس صاف شفاف اور مخروطی جسم کی سی ہے جو اپنے مرکز پر نقش ہو گیا جس پر انتہائی سرخ رنگ کا نگینہ لگا ہے۔ چنانچہ وہاں بنیاد کا رنگ نہیں ہے صرف بعینہٖ مرکز کا رنگ اور اس کی زینت ہے۔ اب اگر تم نے تقرب میں مبالغہ سے کام لیا تو تمہاری نظر قیوم حق اور اس کی صفات مقدسہ کی طرف جائے گی۔ چنانچہ جس نے اپنے نفس کو علم حضوری کے ذریعہ جانا اس نے اس علم میں عارف اور جاہل کے درمیان واضح فرق سے اپنے رب کو جان لیا۔ کیا ایسا نہیں ہے کہ وہ اس مخروطی اور گاؤدم جسم کے سلسلہ میں دو قسموں کا ماہر ہو گیا کہ اس کی اہم ترین قسم مخروطی جسم ہے اور اس کی نظریں مرکز کے لیے صرف عرض اور تابع رہنے والے ایصال سے ہوتی ہیں۔ اور یہ ایک قسم کا اہم مرکز ہوتا ہے اور اس کی نظریں نہ جسم کی طرف ہوتی ہیں نہ عرض کی طرف اور نہ ہی آلیت کی طرف۔

۱۱۳- **تفہیم:**

اللہ تعالیٰ علم حضوری بنفسہٖ سے عالم ہے

اللہ تعالیٰ علم حضوری بنفسہٖ سے عالم ہے۔ اس علم میں علم اپنی تمام صفات اور اپنی تمام مخلوقات کے ساتھ شامل ہے، فقط اتحاد کی حیثیت سے ہی نہیں بلکہ غیریت کی حیثیت سے بھی۔ اور وہ اس لیے کہ واجب جل مجدہ کی صفات بمنزلہ لوازم ماہیت کے ہیں اور اس کی مخلوقات بمنزلہ لوازم وجود کے ہیں۔ چنانچہ اس کے تقرر مقدس کی وجوہ سے وہ وجہیں اور اس کی ذات اعلیٰ کی شانوں میں سے شان صرف اس امر پر ہوتی ہے کہ عرفان نے برہان کے مقابلے میں شہادت دی کہ صفات عینیہ اور لوازم ماہیہ سے علم اس کے علم حضوری بنفسہٖ میں داخل ہے۔

۱۱۴- **تفہیم:**

مقامات کا فرق اور اعتبارات کا اختلاف

کیا تم نے دیکھا نہیں کہ مثلاً زید اور اس پر صادق آنے والے اس کے احکام ان کی بہت سی اقسام ہیں، اور مختلف مثالیں ہیں جو قائم، ناطق اور جزئی ہیں اور انسان، حیوان اور موجود ہیں، اس پر قائم صرف اس وقت صادق آتی ہے جب موضوع اس جسم کو بنایا جائے جو صاحب قامت مستویٰ ہو، اس کے ساتھ قیام اور اس کا ترک خلط کے ظرف میں اور تعریہ صحیح ہو یعنی ایسا ظرف جس میں موضوع کو اس طرح نہ لیا جائے کہ وہ محمول سے ملا ہوا ہے۔ اور نہ اس طرح کہ وہ اس سے خالی ہے بلکہ خلط سے خالی ہیئت کے طور پر لیا جائے۔ اور تعریہ ان دونوں سے عام ہوتا ہے اور ان دونوں کا احتمال رکھتا ہے۔ چنانچہ اگر تم نے موضوع کو اس طرح لیا کہ وہ حیوان سے اور صرف نطق سے حاصل ہوا ہے تو یہ جھوٹ ہوگا۔ اور اگر تم نے موضوع کو اس طرح لیا کہ محمول اس سے مخلوط ہے تو یہ لغو بات ہوگی۔ اور اگر موضوع کو اس طرح لیا کہ یہ حیوان ہے جو قیام سے عاری ہے تو تم نے محال کا ارتکاب کیا۔

پھر یہ جاننا چاہیے کہ قیام، زید پر صرف ایک وجہ سے صادق آتا ہے اور اس کو پیچیدگیوں کو حل کرنے میں اسوہ بناتا ہے جو اس کو سمجھنے کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہیں۔ چنانچہ اللہ سبحانہ ایک

طرف ایک مرتبہ میں اور ایک لحاظ سے صفات سے مجرد ہے اور دوسرے لحاظ سے اور دوسرے مرتبہ میں صفات سے مقرون ہے۔ اور اس پر قیاس کرتے ہوئے یہ اعتبار کیا گیا کہ نفس الامر کے مقامات متفاوت ہیں۔ ان میں سے ایک اسباب کا مقام ہے۔ اور اس میں صرف علت اور معلول ہیں اور سبب اور مسبب ہیں بس۔ اور ہمارے نزدیک امر محقق یہ ہے کہ اس نے اسباب کو کبھی بھی ترک نہیں کیا اور نہ ہی ترک کرے گا۔ اور تم اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔ معجزات وکرامات امور اسبابیہ ہیں۔ ان پر وسعت غالب آگئی ہے۔ اس لیے تمام اسبابیات جدا ہو گئے۔ چنانچہ شان، کمال قناعت ہے جبکہ توکل خالص کی، مغلوبین کے سوا کسی کے لیے گنجائش نہیں ہے۔ اور اس جگہ ہم سے سلف کی تقریر کے مطابق جنت کے لیے عمل کی سببیت متحقق ہوتی ہے اور وہاں اس کی نسبت فاعل مختار کی طرف ہوتی ہے۔ اور دعا کا نفع ان امور میں سے ہے جو نازل ہوتا ہے اور نازل نہیں ہوتا۔ اور دعوت وشفاعت کی حقیقت ہے۔

اور اس مقام پر دو دعائیں ہیں۔ ایک دعا وہ ہے جس میں تاثیر محسوس ہوتی ہے اور موثر اور متاثر دو محسوس ہیں، جیسے زید کا قتل۔ اور جو امور اس سے مشابہ ہوں۔ اور ایک وہ دعا ہے جس میں ان دونوں میں سے ایک غیر محسوس ہے۔ یا تاثیر کا معنیٰ غیر محسوس ہے جیسے دعا اور ارادہ وخواہش اور عمل جو جنت یا جہنم کی طرف لے جانے والا ہے۔ اور اس دعا کا فائدہ یہ ہے کہ مثلاً قتل کا ارادہ وقصد اور دعا اس وقت زیادہ سریع الاثر ہوتے ہیں جس کے بارے میں ارادہ یا خواہش کی جارہی ہے یا جس کے لیے بددعا کی جارہی ہے، جب وہ مریض ہوتا ہے۔ اور جب صحیح وتندرست ہوتا ہے تو معاملہ بین بین ہوتا ہے۔ اور دوسری صورت میں جب کہ وہ مثلاً بے کار ہو۔ کیا ان مقامات پر قتل ظاہری نہیں ہوتا؟ اور قتل معنوی قتل ظاہری کی طرح ہے۔ اور ان میں سے ایک ایجاب، دعا کا قبول ہونا ہے۔ اور اس میں صرف یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی صفات کے واسطہ سے کسی امر کا فیصلہ فرماتے ہیں۔ اور وہاں نہ علت ہوتی ہے نہ معلول، وہاں تمام امور تدبیر سے ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں قبول فرما لیتے ہیں۔ اور اس میں اعمال کے بارے میں یہ صادق آتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں۔ اور جو کچھ ہونے والا ہے، اس کے بارے میں فیصلہ ہو چکا، وہ ہو کر رہے گا۔ البتہ اللہ نے مجھے اپنی رحمت میں ڈھانپ لیا۔ اور اس میں بہت بڑی سعادت ہے۔

اوران میں سے ان دونوں مقامات کے درمیان ایک مقام گویا برزخ ہے اور اس میں دو رنگ ہیں۔ اول یہ کہ اللہ تعالیٰ فاعل ہے اور یہ اس کے مظاہر ہیں۔ چنانچہ علت اس میں اللہ تعالیٰ کے علیت سے ظہور کی علت ہے اور معلول معلوم ہے۔ اللہ تعالیٰ اس میں معلولیت پیدا فرماتا ہے۔ اور ایک جماعت کے نزدیک اس حالت کا نام فرائض کے قرب سے کشف ہے۔ اور دوسرے یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کی قوت، قدرت اور مشیت سے فاعل ہے۔ اور اس کا نام نوافل کا قرب ہے۔ اوران دونوں حالتوں میں سے ایک اوحدین اور عراقی اوران دونوں کے مشابہ لوگوں کے لیے کھلی ہوئی ہے۔ اور یہ مقام پہلے دونوں مقامات کے ملنے والے مرکزوں میں سے ہے۔

۱۱۵۔ **تفہیم:**

طلب حاجت کے لیے قبروں کی زیارت کا حکم

جو شخص کوئی حاجت طلب کرنے کے لیے اجمیر شہر یا سالار مسعود کی قبر اور ان جیسے دوسرے مقامات پر جاتا ہے وہ قتل اور زنا سے بھی زیادہ بڑے گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ کیا اس کی مثال ایسی نہیں ہے جیسے کوئی مصنوعات کی عبادت کرے یا جیسے کوئی لات وعزیٰ کی عبادت کرے۔ البتہ میں خاص اس معاملہ میں حضرت شارع علیہ السلام سے کوئی نص وارد نہ ہونے کی وجہ سے صریح کفر کا حکم نہیں لگاتا۔ جس نے بھی مردہ کو زندہ تصور کیا اور اس سے کوئی حاجت طلب کی، اس کا دل گنہگار ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں داخل ہے "ذالکم الفسق"

جب کسی عارف نے کسی مرید کو حکم دیا کہ شراب وغیرہ خرید لے جس کو شارع نے مباح قرار نہیں دیا جیسا کہ مولانا رومی کے ساتھ شمس الدین تبریزی کے لیے پیش آیا تو مامور کے لیے مناسب یہی ہے کہ اس کام کو نہ کرے۔ اور کھلے طور پر معذرت کر دے۔ البتہ اس کو سب وشتم نہ کرے تو شاید اس کے تحت اکثر صوفیا کے نزدیک زبردست اختلافات ہیں۔

۱۱۶۔ **تفہیم:**

اللہ تعالیٰ کے بالاختیار یا بالایجاب ہونے میں اختلاف، نزاع لفظی ہے

فلاسفہ اور متکلمین کا یہ نزاع کہ اللہ تعالیٰ بالاختیار خالق ہے یا بالایجاب، نزاع لفظی

ہے۔ یہ کسی بھی طرح کوئی معرکۃ الآراء بحث نہیں ہے۔ اس لیے کہ جب ارادہ فلاسفہ کے نزدیک عین ذات ہے تو ابداع وجوبی ہی ہوگا۔

۱۱۷۔ **تفہیم:**

نبی کی دعا اور ولی کی خواہش کا بیان

نبی کی کبھی کوئی خواہش نہیں ہوتی، وہ صرف دعا ہوتی ہے۔ اور ولی کی دعا نہیں ہوتی، وہ خواہش ہوتی ہے، جس کو خواہش نسمیہ (روحانی) کشف کرتی ہے۔ اور نسمہ کا مفہوم ایسی شئے ہے جو نفس ناطقہ اور روح طبعی سے مخلوط ہو۔ پھر یہاں روحیہ اور روح سے مراد نفس مجرد ہے۔ پھر صفائیہ سب سے زیادہ لطیف ہے۔ پھر دعا اس طرح طلب کرنا ہے کہ اس میں کوئی تاثیر نہ ہو۔ اور وہ دونوں صفات اور اسماء سے استمداد میں شریک ہیں اور تاثیر و تاثر میں جدا ہیں۔ اور دوسرا عبودیت کے لئے مناسب ہے۔

اور نبی کے دو علم ہیں۔ ایک اللہ تعالیٰ کے ساتھ علم حضوری اور اس سے کمل فنا متحقق ہوتا ہے اور دوسرے اللہ تعالیٰ اور اس کی صفات کے ساتھ علم حصولی، اور اس سے اخبار متحقق ہوتا ہے، اور اس سے دعا حاصل ہوتی ہے۔ نبی کا علم حضوری ولی کے علم سے اس طرح جدا ہوتا ہے کہ اس میں غیریت کا مقدس اندراج حضرت ذات خالص میں صفات کے اندراج کی طرح ہوتا ہے۔ اور نبی کا کشف گویا کہ وہ ایک مزاج ہے جس کی صورت محسوسات جوفی کی کائنات کی طرح ہوتی ہے۔ اور ولی کا کشف موالید ثلاثہ کی طرح صورت ہے۔ اور نبی کے کشف کے لیے حق کی حقیقت کی طرف سوراخ ہوتا ہے۔ اور ولی کے کشف کے لیے ایک سوراخ ہوتا ہے جس سے وہ نکلتا ہے۔ پھر بند ہو جاتا ہے۔ نبی محجوب ہوتا ہے اس پر کشف کا فیضان ہوتا ہے۔ اور ولی کی ذکاوت قوی ہوتی ہے۔ اور اس کی صفائی سخت ہوتی ہے جس پر عکس پڑتا ہے۔ جیسا کہ ہم نے کہا، نبی فرائض کے قریب ہوتا ہے اور ولی نوافل کے قریب ہوتا ہے۔

۱۱۸۔ **تفہیم:**

طاعات سے مقصود

تمام طاعات سے مقصود نفس ناطقہ کی توجہ اللہ عزوجل کی طرف کرنا، اس کو رذائل سے

خالی کرنا اور شمائل سے آراستہ کرنا ہے۔ حتیٰ کہ یہ ملکہ اس کے لیے ہو جائے اور ہماری شریعت میں اصل یہ نکتہ ہے۔ پھر اس کے پیچھے مصالح چلتے ہیں کہ جوارح خیال کے مطیع و فرماں بردار ہوتے ہیں، اور وہ وہم کا تابعدار ہوتا ہے، اور وہ نفس ناطقہ کا اطاعت گزار ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جوارح کے لیے طاعت کا قانون بنایا تاکہ ان سے نور کو نفس کی طرف جاری فرمائے، اور وہ اس کے لیے ملکہ ہو جائے۔ اور طاعات میں لازم ہے کہ ان امور کے درمیان سے جھگڑنے اور گھٹنے کو دور کیا جائے۔ جیسے نفس حق سبحانہ کی طرف متوجہ ہو اور وہم صفات بہیمیہ میں جلدی سے داخل ہوتا ہے تاکہ ان کو ایک دوسروں سے تقویت پہنچائے۔ اور تخلیہ و تجلی مکمل ہو جائے۔ پھر تاکہ تجلی کو مکمل کرے۔ طاعات سے طاعات مفروضہ کا مراد لینا ضروری ہوتا ہے جس میں ذہین اور کند ذہن اور مشہور و غیر معروف سب شریک ہوں تاکہ کوئی اس کو ناپسند نہ کرے اور تاکہ ان سب سے فوائد حاصل ہوں۔ اگرچہ طبیعت اس کے موافق نہ ہو۔ چنانچہ حق تعالیٰ میں مستغرق اگر طاعات کی طرف متوجہ نہیں ہوتا تو اس کی معاش فاسد ہو جاتی ہے اور اس کے اعمال ضائع ہو جاتے ہیں اور اگر گھٹیا لذتوں میں مستغرق شخص ان کی طرف متوجہ نہیں ہوتا تو ذات قدسی کی رَسّی ٹوٹ جاتی ہے اور امر متوسط ظاہر ہے، اس میں کوئی خفا نہیں ہے۔ اور ان میں سے وہ ہے جو مندوب ہوتا ہے۔ ان کو وہ زیادہ کرتا ہے جو اس کے رتبہ کا فیصلہ کرتا ہے اور جو اس کے علاوہ ہے وہ اس کو کم کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تنبیہات اور زجر و توبیخ کا قانون بنایا تاکہ نافرمانوں کو ان کی نافرمانی پر زجر و توبیخ کرے۔ ان میں انسانی بنیادوں کو ڈھانے کی بھی سزائیں ہیں جیسے قصاص اور دیت اور ان میں ان کی ہدایت اور رہنما کی تابعداری کو ناپسند کرنے کی بھی زجر و توبیخ ہے جیسے جہاد اور جزیہ، اور قتل مرتد۔ اور ان کی عقلوں کے فساد پر بھی تنبیہ ہے جیسے اختیاری طور پر شراب پینے کی حد اور اضطراری معاملہ میں بچہ اور بے وقوف کو روکنا۔ اللہ تعالیٰ نے قضایا کے لیے بھی قانون بنایا۔ جب وہ آپس میں لڑتے جھگڑتے ہیں تو قضایا کا حکم دیتا ہے۔ جبکہ انسان کی جبلت یہ بنائی کہ وہ اپنے لیے منافع اختیار کرے۔ اور ان کو شہادتوں اور قسموں پر مبنی قرار دیا تاکہ ظلم و زیادتی کی نفی کرے۔ اللہ تعالیٰ نے معاملات میں کچھ امور کو قانون بنایا تاکہ ان کے ذریعہ لڑائی جھگڑے سے بچیں۔ جیسا کہ بیع کو اس وقت فاسد قرار دیا جب ثمن معلوم نہ ہو یا سلم کی شرائط معلوم نہ ہوں۔

ان کی بہت سی عادتیں ہیں جن میں وہ کبھی افراط سے اور کبھی تفریط سے کام لیتے ہیں، جس کی وجہ سے ظلم وزیادتی ہوتی ہے، یا ذات قدسی کے سلسلہ میں ان دونوں میں اعراض ہوتا ہے۔ جیسے ایک آدمی ملبوسات کے سلسلہ میں تکلف سے کام لیتا ہے اور دوسرا انکار رہتا ہے، ایک گوشت کھاتا ہے اور دوسرا خواہش وارادہ کرتا ہے کہ مصلحت کا تقاضہ ایک ایسی وضع کا ہو جاتا ہے کہ اس سے وہ تجاوز نہیں کر پاتے۔ ان کو کچھ ایسے امور پیش آتے ہیں جو اباحت اور ممانعت کے درمیان گردش کرتے ہیں۔ اس سے کسی کو اس کے دین یا مال میں نقصان ہوتا ہے یا کوئی دوسرا نقصان ہوتا ہے۔ اس لیے حکمت کا تقاضہ ہوا کہ ان کے لیے ایسی عبادات کا قانون بنایا جائے جو ایک لحاظ سے بعینہٖ عقوبت ہیں جیسے قسم، قتل خطاء اور ظہار کا کفارہ۔ ان کے اخلاف قابل مذمت ہوتے ہیں، جو فساد کی جڑ ہیں۔ ان کا دفع کرنا اور اس کے مقابلہ میں ملکات حمیدہ کا حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اس لیے روزہ، زکوٰۃ اور حج کو مشروع قرار دیا اور غصہ کا علاج بیٹھنے اور لیٹنے سے کیا گیا اور حج اور جہاد کا حکم دیا گیا۔

اور جاننا چاہیے کہ جس طرح عالم اجسام میں کچھ امور ایسے ہوتے ہیں کہ ادراک کرنے والا ان کو قبیح قرار دیتا ہے جو کہ اس عالم میں اس کی دلیل ہے یعنی حواس۔ اور کچھ امور ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی تحسین کرتا ہے تو دونوں طرح کے امور حق ہیں ان کا انکار صرف سوفسطائی گھمنڈی ہی کر سکتا ہے۔ اس طرح عالم خیال اور عالم وہم کے امور مستحسنہ اور امور قبیحہ ہیں۔ اور دونوں طرح کے امور حق ہیں، اثر کرتے ہیں۔ اور ان امور کا دائرہ محسوس اور مجرد کے درمیان واقع ہوتا ہے۔ اس اصل کو اختیار کرو اور پھر اس کو جہاں تک چاہو پھیلا دو۔ نماز میں دیکھو۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو تخلیہ اور تحلیہ و آراستگی کی جانب چلنے کے لیے مشروع کیا۔ عالم شہادت میں ظاہری نجاستوں سے بچنا ہے اور ان کو بدن اور جگہ سے دور کرنا ہے۔ اور ایسے کام کرنا ہے جو تعظیم کے طور پر ہی کیے جاتے ہیں۔ جیسے سیدھا کھڑا ہونا، رکوع کے لیے جھکنا اور تواضع کے ساتھ سجدہ کرنا اور سب کا ساتھ بیٹھنا۔ اور ایسے اقوال کہنا جو اللہ کے لیے محبت اور ایسے لوگوں کے لیے بغض کا باعث ہوں جو وسوسوں میں مبتلا رہتے ہیں۔ ان کے معانی اجتناب میں موثر ہوتے ہیں۔ اور الفاظ ان امور کو منور کرتے ہیں جن کو معنی اپنے دائرہ میں لیتے ہیں۔

اور عالم وہم میں نجاسات حکمیہ سے طہارت ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ جس نے پاخانہ یا

پیشاب کیا اور بغیر آواز کے یا آواز سے ریح خارج کی، چاہے اس کو کوئی ایسی چیز نہ لگی ہو جس سے طبیعت کو ناگواری ہوتی ہے۔ لیکن ان اشیاء کے نجاستوں کے منبع سے گزرنے سے وہم میں گندگی میں ملوث ہونے کا اثر ہوتا ہے۔ پھر جب وہ اپنے اطراف، ہاتھ، پاؤں اور چہرہ کو دھو لیتا ہے اور سر پر مسح کر لیتا ہے تو ملوث ہونے کا وہ امر دو طرح سے دور ہو جاتا ہے۔ ایک یہ کہ اوہام میں یہ بات راسخ ہوتی ہے کہ دھونے سے ظاہری نجاستیں زائل ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ متوہمیات میں یہ حکم ناک کے لیے جاری ہوتا ہے اور وہم ناک کو مسخر کرتا ہے۔ اور دوسری یہ کہ دھونا ارادہ اور خواہش کو جمع کرتا ہے۔ خاص طور سے اطراف ہاتھ، پاؤں اور چہرہ کا دھونا۔ چنانچہ حدث سے حادث ہونے والی پراگندگی زائل ہو جاتی ہے۔ اور جو شخص ناپاک ہو گیا اور اس کا وہم لذیذ کی لذت میں داخل ہو گیا پھر اس نے عالم قدس تک ترقی کی تو وہ بہت دوری کی دو حرکتوں کے درمیان ہوگا۔ اس لیے غسل واجب ہو گیا۔

اور یہ پورے بدن کو دو لحاظ سے اپنے دائرہ میں لے لیتا ہے۔ ایک کثیر و قلیل تلوث وہمی کے مقابلہ میں طہارت وہمی کے وقوع کے لحاظ سے جو کثیر ہو اور مشکل سے واقع ہو۔ اور دوسرے یہ کہ یہ لذت پورے بدن میں رطوبت برقیہ کہربائیہ کو بھڑکاتی ہے۔ چنانچہ ملنے اور دھونے سے بدن صحیح و درست ہوتا ہے اور جن پیروں پر موزے ہوتے ہیں نجاست وہمیہ ان پیروں کی طرف سرایت نہیں کرتی۔ اس لیے ان پر مسح کو واجب کرنا کافی ہو گیا۔ اور جس کو پانی کے استعمال پر قدرت نہ ہو اس کے لیے دونوں طہارتوں میں تیمم کو کافی قرار دیا۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ جو آلودگی میں ملوث ہو اور پانی نہ پائے تو وہ اپنے عضو کو مٹی سے رگڑ لیتا ہے۔ اور کلی کرنے اور ناک میں پانی دینے میں ناک کی ریزش کا ازالہ ہے جو ناک کے نتھنوں میں رک جاتی ہے، اور حس مشترک اور وہم کو اذیت دیتی ہے، اور بیت اللہ کی طرف توجہ اخلاص اور تجرید میں مددگار رہتی ہے۔ اور یہ بھی جان لو کہ یہ اضافہ صرف اعتبار کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ اس کے لیے شرعی سبب اور چلانے والا نور ہے۔

۱۱۹- تفہیم:

لغت کے لحاظ سے جذب کے معنی اور عرف میں مجذوب سے مراد

جذب کے لغوی معنی ہیں "اخذ بالشدت" سختی سے پکڑنا۔ اور یہ معنی سالک سے

جدا نہیں ہیں۔ اس لیے کہ اگر اس کو توفیق نہ ملتی تو وہ راہ پر چل ہی نہ سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے یحبھم ویحبونہ "وہ ان سے محبت کرتا ہے اور وہ اس سے محبت کرتے ہیں۔" لیکن ہماری مراد مجذوب سے ایسا شخص ہوتا ہے جو اس امر پر ایمان رکھتا ہو کہ معبود حق ہے۔ وہ مجرد خالص اور وجود خالص ہے۔ خواہ رسول سے یا اس کے نام سے سن کر یا کسی کہنے والے کی تقلید کرتے ہوئے یا ایسی دلیل قطعی کی بنیاد پر جو اس قول میں پناہ لیتی ہے۔ جیسا کہ حضرت خلیل علیہ السلام کے لیے تھا۔ پھر جب ان کا ایمان ثابت ہو گیا، تو اس کی طرف اشتیاق پیدا ہوا، اور ایسی فطرت کی طرف متوجہ ہوئے جس پر ان کی فطرت بنائی گئی تھی۔ یہ ایسے کسب کے لیے جو کسی بھی حالت کا سبب بنتا ہو یا مجذوب کی عنایت کے لیے کہ وہ جیسے چاہے تصرف کرے پھر جب ایسے شخص کے لیے اشتیاق پیدا ہو گیا جس کو حی قیوم سے اعراض ہو اور وہ باآواز بلند کہے 'میں ایسے رب کی عبادت نہیں کرتا جس کو میں نے دیکھا نہیں ہے'۔ تو ایسا شخص مجذوب ہے۔ اور اس نسبت کے دوام کی شرط نہیں لگائی جاتی۔ نہ ہی ایسے مراتب کی تفصیل کی شرط لگائی جاتی ہے جو ایک مجرد سے دوسرے مجرد کی طرف واقع ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اور بہت سے دقیق امور ہیں۔

۱۲۰- تفہیم:

فناء اول کے معنی

فنا اول یہ ہے کہ اس کے دل کا اللہ سبحانہ سے تعلق دائمی ہو، حتیٰ کہ قلب کی عادت آنکھوں میں بصارت جیسی ہو جائے۔ اور یہ کہ ہر ماسوا سے اس کا تعلق منقطع ہو جائے۔ پھر کوئی اس کے دل میں داخل کسی شئے کی خواہش نہ کرے۔ اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے معلم قرار دے دیا جائے۔ قیافہ والی فطرت خوابوں، واقعات اور کشف کے ساتھ خاص ہوتی ہے۔ خاص طور سے تکوینی امور میں اور متوسط فطرت الہام، واقع، خاطر، ہاتف، فراست اور اشراف کے ساتھ خاص ہوتی ہے۔ اور المعی (ذکی و تیز ذہن) فطرت، عقل اور قوت قدسیہ کی تجرید کے ساتھ خاص ہوتی ہے۔ اور یہ کہ خوش ہشاش بشاس، شفیق انبساط والا ہو جائے کہ نہ حسد ہو نہ بغض و کینہ، نہ تنگ دلی و بے قراری، نہ لالچ ہو نہ کوئی امید۔ جب حکم دیا تو کلی۔ اور

کچھ دیکھا تو کلی اور صاحب برکت ہو جائے کہ اس کی وجہ سے لوگوں کو رزق دیا جائے اور بارش برسائی جائے۔ اور ڈھیل دی جائے۔ اور یہ فناء اول ہے۔ جب آدمی اس کو مکمل کر لیتا ہے تو وہ نیک و ابرار اور شریف و معزز لوگوں میں شامل ہو جاتا ہے۔

۱۲۱- **تفہیم:**

لفظ وجود اور دو معنوں پر اس کا اطلاق

جاننا چاہیے کہ لفظ وجود کا اطلاق دو مفہوموں پر ہوتا ہے۔ ایک وجود فی نفسہ اور اس کا حاصل تحقق اور تقرر ہے اور اس کا کوئی چیز ہونا ہے۔ اور دوسرا وجود بغیرہ۔ اور اس کا حاصل انتزاعی مفہوم کے ساتھ ارتباط ہے۔ اس کا وجود صرف وجود فی نفسہ سے الگ رہتا ہے۔ اس موجود کے ساتھ جو اس انتزاع میں اس سے الگ کیا گیا ہے اور اس پر محمول ہوتا ہے۔ اور وجود پر اس اسم کا اطلاق دوسرے معنیٰ میں بطریق مجاز ہوتا ہے۔ اور نظر جلی اس طرح حکم لگاتی ہے کہ ماہیات جو ہر یہ اور عرضیہ کا وجود فی نفسہ ہوتا ہے۔ اور غیر کے لیے وجود مفہومات انتزاعیہ کی شان ہوتی ہے۔ اس کے انتزاع کے وقت یا اس کے موضوعات پر حمل کے وقت۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ لیکن نظر خفی اس طرح حکم لگاتی ہے کہ ممکن کے لیے فی نفسہ وجود سے کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ اس کا حصہ صرف وجود بغیرہ ہوتا ہے اور وہ اس لیے کہ اس کی ذات کی وجہ سے معدوم ہے اور علت کی وجہ سے پایا جاتا ہے اور جب تک وہ موجود رہے یہ ایجاد منقطع نہیں ہوتی۔ بخلاف اس کے جس کا ناقص لوگوں نے گمان کیا ہے کہ ایسی صورت میں ممکن کے وجود کی حقیقت اس کو واجب قرار دینا اور افاضہ ذاتہ ہے اس کے علاوہ نہیں۔ اور وجود کی افاضہ اور بنانے کے لحاظ سے کئی قسمیں ہیں۔ اس مدعا کا ذکر صوفیا نے اس طرح کیا ہے کہ ممکن مقید اور اعتباری ہے۔ اس کی شان کی حقیقت واجب کے شئون سے ہے۔

پھر ہم کہتے ہیں یہ ربط ایک شئے کے دوسری شئے کے ساتھ ربط کی طرح نہیں ہے۔ خواہ کسی بھی طرح ہو۔ مستقل فی نفسہ ہے اور ممکن باطل ہے۔ اس ربط کے بغیر کوئی شئے نہیں ہے۔ ایسے میں ربط سے مقصود واجب کا اس حالت پر ہوتا ہے کہ وہ شان اس وجود امکانی کی تفسیر کرتی ہو۔ اور دوسری شان پر وہ اس وجود امکانی سے تفسیر کرتی ہو۔ ”وعلی ھذا

القیاس" اور مفہومات انتزاعیہ کے حال کا اعتبار کیا گیا ہے۔ چنانچہ حصول اور تکوین کے معنیٰ یہ ہیں کہ وجود کا وجود کی طرف اور اس کے کسی اعتبار کی طرف لحاظ کیا جائے۔ مثلاً صحت اس پر آثار کو مترتب کرتی ہے۔ اس اعتبار سے اس کی وہ صفت جدا ہو جاتی ہے جس کو تکوین کہا جاتا ہے اور اس پر محمول کیا جاتا ہے اور یہ کہ اس مفہوم کی طرف لحاظ کیا جاتا ہے جس کو وہ جدا کرتا ہے۔ اور اس موجود کی طرف اس کی نسبت کی جاتی ہے۔ اس طرح مفہوم انتزاعی کے دو مقام ہیں۔ ایک مقام انتزاع اور وہ جس سے جدا کیا گیا ہے۔ اس میں کمزور ہے۔ اس سے ایک شان ہے اور اس کا وجود صرف غیر کے لیے ہے۔ اور مقام حمل اس میں وجود خارجی کے مقابلہ میں اس طرح ہوتا ہے کہ تم اس کو از سر نو شے بناؤ اور جس سے اس کو جدا کیا جائے اس پر اس کو محمول کرو۔

اور اس محمول کرنے کا راز کٹا ہوا ہونے کے لحاظ سے اس کا ملاحظہ ہے۔ جس میں اس کے صدور کی حقیقت اور اس کے وجود کے قوی ہونے کے سلسلہ میں نرمی کی جائے۔ اس طرح کے حال کی مثال واجب اور ممکن میں ہوتی ہے۔ ممکن کے لیے دو مقام ہوتے ہیں۔ ایک وہ جس میں نظر نفوذ کر جاتی ہے اور اس کا تحقق قوی ہوتا ہے، اور اس میں واجب کے امور سے ایک امر ہوتا ہے۔ اپنی وحدت حق میں مضمحل ہوتا ہے۔ اور ایک مقام وہ ہوتا ہے جس میں نظر اپنے تحقق کی قوت سے نرم ہوتی ہے اور اس ظاہر کے لیے کافی ہوتی ہے جو آثار کے صدور اور عدم خالص سے امتیاز سے دیکھی جاتی ہے۔ جس کے بارے میں بالکل خبر نہیں دی جاتی۔ تو وہ اس مقام میں موجود مقرر ہو جاتا ہے۔

پھر یہ جان لو کہ اللہ تعالیٰ کا علم دو طرح کا ہے۔ ایک علم اجمالی۔ اور یہ اس کے تقرر اور تحقق کا عین ہے، جب اس سے آثار علمیہ کے صدور کی طرف قیاس کیا جاتا ہے، جیسا کہ وہ عینیت ذات وصفات کی تحقیق میں مذہب ہے۔ اور دوسرا علم تفصیلی ہے، اور وہ مختلف قسم کے امور میں مطلق تحقق کے قریب ہوتا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہے کہ محققین نے جو حکم لگایا ہے کہ واجب کا صادر اول سے ایک ربط ہوتا ہے، وہ اس کی ایجاد، اس کا علم بعینہٖ، اس کی قدرت، اس کا ارادہ اور ان تمام اوصاف کی طرف اس کی عنایت وتوجہ ہے جن کا لحاظ کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ممکن کا ظہور بعینہٖ اس کی ایجاد ہے۔ اور بعینہٖ واجب کے امور میں سے ایک امر میں واجب کا قرب ہے۔ اور بعینہٖ اس کا علم، اس پر قدرت اور اس کا ارادہ ہے۔ اس طرح وجہ اول علم اجمالی، عین

واجب ہے اور اس کی وحدت میں تمام ممکنات بھی شامل ہیں۔ لیکن مضمون ہونے کی حیثیت سے نہ کہ موجودات کی حیثیت سے ان سے وہ آثار صادر ہوتے ہیں جن کی ان کی طرف نسبت کی جاتی ہے۔ اور علم اجمالی ممکنات کی حیثیت سے عین ممکنات نہیں ہے۔ اور علم تفصیلی عین ممکنات خارجہ وذہنیہ ہے۔ اس لیے کہ وہ ایک ایسی شان کا نام ہے جو واجب کے ان امور سے مقید ہے جو اس کے قریب ہیں۔ اور وہ بعینہٖ ممکن کی ایجاد اور اس کا ظہور ہے۔ اور ممکن کے لیے بھی علم اجمالی ہے۔ اور وہ اس علم کا ملکہ ہے جو کسی حال میں بھی اس سے جدا نہیں ہوتا۔ خواہ شیئ معین کو جانتا ہو یا نہ جانتا ہو۔ اور علم تفصیلی عین صورت ذہنیہ اور عین معلوم ہے۔

"فتدبر ولا حول ولا قوۃ إلا باللّٰہ العلی العظیم"

۱۲۲۔ تفہیم:

ایجاد کی حقیقت کے سلسلہ میں صوفیا کا قول اور اس کی تحقیق

صوفیا رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ ایجاد کی حقیقت یہ ہے کہ ظاہر وجود اس رنگ میں رنگ جائے۔ وہ اس کا عنوان یہ قرار دیتے ہیں کہ حق سبحانہ کے دو کمال ہیں۔ ایک باعتبار نفس ذاتہ اور وہ اس اعتبار سے محض فعلیت، تحقق، وجود اور وجوب ہے۔ اور دوسرا تمام ان حقائق واعیان کی شمولیت کے اعتبار سے جس کی شان متحقق ہوتا ہے۔ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اور صاحب حقیقت سے اور اس کے نفس میں اس کے بالفعلیت ووجوب اور تحقق بالفعل یا بالقوۃ سے اس کا امتیاز ہے۔ چنانچہ وجود ایک ایسی بساط ہے جو کل پر پھیلی ہوئی ہے اور کل وجود اور اس کے فروض کی تقادیر اور اس کے تقیدات ہیں۔ پھر جب اللہ نے یہ ارادہ کیا کہ کوئی حقیقت خارج میں پائی جائے۔ اس کی ایجاد یہ ہے کہ فعلیت اس کی کسی مفروضہ مثال میں اور اس کی مقدر کی ہوئی کسی قید میں ظاہر ہوتی ہے۔ اور فعلیت کا ظہور ایک حقیقت میں ہے جس کی تعبیر وہ اپنے مندرجہ بالا قول 'ظاہر وجود اس رنگ میں رنگ جانے سے کرتے ہیں۔

اور میں کہتا ہوں کہ ایجاد کی حقیقت کے سلسلہ میں یہ تعبیر اس زبان میں ہے جس میں ایک قسم مسامحت، نرم برتاؤ کی ہے۔ اور صحیح بات یہ ہے کہ فعلیت اور تحقق کی ذات کے لئے جس کو وہ ظاہر الوجود کہتے ہیں، اس کے معلول کا وجود ضروری ہے۔ تحقیق میں اس کا وجود اس

کی علت کے لیے ہے۔ چنانچہ معلوم کا وجود علت کے لیے اس حیثیت سے کمال ظاہری ہے کہ اس کا وجود جب اس کے نفس میں پھیل گیا، معلول بالضرورت ظاہر ہو جاتا ہے۔ اس طرح معلول اور اس کی علت کے درمیان ذات علت کے لیے لزوم ہے نہ کہ غیر کے لیے۔ اور اس طرح معلوم کو دوسرا معلوم لازم آتا ہے۔ اور اس طرح سلسلہ جاری رہتا ہے۔

چنانچہ جس طرح وجود کا باطن حقائق مقیدہ پر مشتمل ہوتا ہے جو تمام بالقوہ اور عرض ہیں، اسی طرح ظاہر وجود ان کو بالفعل شامل ہوتا ہے۔ اور ظاہر وجود سے حقائق کے صدور کا لزوم اس کے نفس سے ہوتا ہے، اشتمال باطنی کے لیے نہیں۔ اور اس طرح اس کا اقتضا معلول کے لیے ہے، وہ اپنے نفس سے ہے، حقائق مشتملہ سے نہیں۔ اور صوفیا چونکہ وجود کے باطن کے عادی ہیں ان کے سامنے باطن سے ظاہر کے پھیلنے کے سلسلے کی تعبیر جلدی سے آ گئی۔ اس لیے انہوں نے نرمی کا برتاؤ کیا جبکہ حق اس کے برخلاف ہے جو پوشیدہ نہیں ہے۔ اس اختلاف کا ثمرہ ماہیات بنانے کے سلسلہ میں ظاہر ہوا۔ جبکہ صوفیا کے نزدیک حقائق مشمولہ وہ ہیں جن سے ظاہر وجود رنگا جاتا ہے۔ انہوں نے حقائق کی ذات میں تاثیر نہیں دیکھی، اس لیے کہ فعلیت کے لیے تحقق کو واجب قرار دینے والی تقادیر موجود کی تکوین کے وجوب کی طرح موجود ہیں۔ یا قادر وغیرہ کے لیے قادریت کے وجوب کے مثل ہیں، اور وجود میں نہیں ہیں۔ اس لیے کہ وہ فعلیت واجبہ ہے کہ تاثیر رنگنے اور متصف کرنے میں ہے۔ اور ہم نے جو کہا ہے جس نے اس کا ادراک کر لیا، اس نے کہا کہ ماہیات اپنے آپ میں جعل بسیط سے بنائی ہوئی ہیں۔ اس لیے کہ حقائق ظاہرہ کا صدور واجب سے ہے۔ اور ہم جعل یا بنانے سے یہی مراد لیتے ہیں اور یہ کہ اس کے مقدم فروض اور تقادیر ہیں۔ اس لزوم میں ان کے داخل ہونے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ وہ قانون کی طرح ہیں اور ہم اس کے لیے تعمیر کی مثال دیتے ہیں۔ جب کسی عمارت کی تعمیر کا ارادہ کرتے ہیں، تو ارادہ کرنے والے کی قدرت اور اس کا علم مرکب ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ عمارت کی صورت اس کی ذات میں متحقق ہو جاتی ہے۔ پھر اس کی قدرت خارج میں ظاہر ہوتی ہے تو صورت خارج میں متحقق ہو جاتی ہے، اور اس ظہور خارجی کے اور اس کو بنانے والے کی تاثیر کے درمیان وہ عرض متقدم خلل پیدا نہیں کرتی۔ اگرچہ معاملہ ایک دوسرے سے مشابہ ہوتا ہے۔

۱۲۳- **تفہیم:**

مقام عظیم وجاہ کریم کا ذکر

لک الحمد ربی انت قصدی ووجهتی
وفی بحرک الرحموت غاصت نسمتی

''اے میرے رب! تیرے ہی لیے تمام تعریفیں ہیں۔ تو ہی میرا مقصود اور تو ہی میری جائے پناہ ہے۔ اور تیری ہی رحمت کے سمندر میں میری روح نے غوطہ لگایا ہے۔''

إلیک یدی تلقاک عینی ضراعته
وفی نورک المغمور قلبی ومهجتی

''تیری ہی طرف میرے ہاتھ اٹھتے ہیں، تیری ہی طرف میری آنکھیں جھکتی ہیں اور تیرے ہی نور سے میرا دل اور میری روح بھرے ہوئے ہیں۔''

اللہ تعالیٰ نے مجھے مقام عظیم اور اعلیٰ مرتبہ عطا فرمایا جس کی وجہ سے شرفا مجھ پر رشک کرتے ہیں۔ بڑے بڑے لوگوں میں ان مقامات ومراتب کا شوق دیکھا جاتا ہے۔ اے انسانی گروہو! میں کسی بھی معاملہ میں تمہارا محتاج نہیں ہوں۔ خواہ تھوڑا ہو یا زیادہ۔ اور میری تعلیم کتاب نہیں ہے۔ اور اس کی تحریر کو میری طرف رجوع کی ضرورت ہے۔ میرے رب نے مجھے غنی وبے نیاز کر دیا ہے اور وہ تمہارے لیے ہے۔ تاکہ کوئی یہ نہ کہے کہ میں اس کے لیے آیا ہوں۔ جب میرے پاس وہ آ گیا تو میں نے ذکر سے اعراض کر لیا تو جس نے اس پر دھیان دیا اور توجہ سے سنا، سمجھا، اس کے لیے بہت اچھا ہے۔ اور جس نے اعراض کیا اور بہرا بنا تو اس کے لیے میرے سینہ میں کوئی تنگی نہیں ہے۔ میرا سینہ اس کے لیے کشادہ اور کھلا ہوا ہے، جس کے لیے اس کو اللہ تعالیٰ نے کھول دیا ہے۔ میں تمہارے درمیان غریب اجنبی ہوں، تم مجھے نہیں پہچانتے، میرے سر پر تاج ہے اور میرے ہاتھوں میں تلوار ہے۔ اور میرا قلب حلیم بردبار ہے اور میری زبان شیریں ہے۔ اے لوگو! اللہ سے توبہ کرو اور اپنے معاملات کی اصلاح کرو۔ ایک دوسرے سے بغض نہ رکھو، نہ دشمنی واختلاف رکھو، نہ تعلقات منقطع کرو۔ جس نے مجھ سے دشمنی رکھی، اس نے اپنا کھلا نقصان کیا۔

جہانیاں بمن آیند وہمتی طلبند
ازاں سبب کہ منم ایں زماں مطاع جہاں

"اہل دنیا میرے پاس آتے اور دعا کے طالب ہوتے ہیں، اسی وجہ سے کہ میں اس زمانہ میں ساری دنیا کا مخدوم و مستحق اطاعت ہوں۔"

کنوں وصی رسولم خزانہ دار علوم
بدست ماست کنوں خیزا نتفاع جہاں

"اس وقت میں اپنے رسول کا وصی ہوں علوم کا خزانہ رکھتا ہوں، اب ہمارے ہاتھ سے دنیا کو نفع پہنچتا ہے۔"

۱۲۴- تفہیم:

اللہ کی بعض نعمتوں کا ذکر

للہ الحمد کہ آں نقش کہ خاطر می بست
آمد آخرز پس پردہ تقدیر پدید

"اللہ ہی کے لیے سب تعریفیں ہیں کہ جس نقش سے دل بندھتا ہے، تقدیر کے پردے کے پیچھے سے ظاہر ہو گیا۔"

قید فرنگ میں پیغام ربانی کی مستی سے دل اور قاصد کی جلد بازی سے سرسخت تنگ ہے مالا یدرک کلہ لا یترک کلہ "جو پورا نہ پائے وہ سارا چھوڑے بھی نہیں"۔ کے مصداق دو گراں بہا گوہر مجھے دیئے گئے ہیں جن کے حصول کا حوصلہ میرے اندر نہیں تھا۔ ایک دورۂ کمال کا مکمل کرنا تفصیل کے ساتھ اول سے آخر تک، وہ یہ کہ اس کے شوق میں اگر وبا اور جنون کو میں نے فلک تک پہنچا دیا ہوتا کہ اس کا رنگ سخت رنگین ہے، اس کا مزا بہت شیریں میٹھا ہے، اس کی بو بہت خوشبو والی ہے۔ الا یہ کہ حق کا سورج اس کے مغرب سے طلوع ہو جائے

فبشرى ثم بشرى ثم بشرى
لا بنائي واخوانى وقومى

"بشارت و خوشخبری ہے پھر خوشخبری ہے پھر خوشخبری ہے، میرے بیٹوں، میرے

بھائیوں اور میری قوم کے لیے۔"

وطوبی ثم طوبی ثم طوبی
لا صحابی ومعتکفی وحومی

"اور خوشخبری ہے پھر خوشخبری ہے پھر خوشخبری ہے، میرے اصحاب ساتھیوں میرے ساتھ مسجد میں بیٹھنے والوں اور میرے اردگرد پھرنے والوں کے لیے۔"

دوسرے وہ وصایا کہ علی مرتضی کرم اللہ وجہہ اس کا جوش مارتے ہیں

افلت شموس الأولین وشمسنا
ابدا علی افق العلی لا تغرب

"اولین کے سورج غروب ہو گئے اور ہمارا سورج، ہمیشہ اعلیٰ افقوں پر رہتا ہے اور غروب نہیں ہوگا۔"

اس کے قدسی باغوں کی ایک خوشبو ہے جس نے مجھے سختی سے اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔ سب میرا منہ دیکھتے ہیں۔

لیکن میرا شیوہ اختیار نہیں کرتے اور مستی کی شورش قافیہ کا تغایر کرتی ہے اور نظام کا نظم بھی ٹوٹ جاتا ہے

ایں زماں بگذار تا وقت دگر

اس زمانہ کو دوسرے وقت کے آنے تک گزار دو۔

۱۲۵۔ تفہیم:

بعض احوال کی طرف اشارہ کرنے والے اشعار اور گویا کہ یہ توحید وجودی یا شہودی ہے

فتونک فی معنی الوصال فتوننا
تکونک طور الم طورا تکوننا

"وصال کے نام پر تمہارا فریفتہ کرنا ہمیں فتنہ میں ڈالنا ہے، ہم تمہارے لیے ایک

طریقہ ہوں گے پھر تم ہمارے لیے ایک طریقہ ہو گے۔"

فكناك احيانا فتم وصالنا
وليس وصالا ان نراك عيوننا

"ہم کبھی تمہارے لیے ہو گئے تو ہمارا وصال مکمل ہو گیا، اور وصال یہ نہیں ہے کہ تمہیں ہماری آنکھیں دیکھیں۔"

ومذ كنت إيانا راينا تحكمت
على جملة الاكوان منا ظنوننا

"اور جب تم ہمارے تھے ہم نے دیکھا کہ، تمام تکوینوں پر ہم سے ہمارے گمانوں نے حکم چلایا۔"

توليتنا كل الامور جميعها
فليت سوى منكم إلينا شئوننا

"تم نے ہمیں تمام امور کا ذمہ دار بنا دیا، پس کاش تمہارے علاوہ ہمارے امور کسی اور طرف نہ ہوتے۔"

بك امتلئت عيني وقلبي وقالبي
وفيك امتحت إياك صارت فتوننا

"تمہاری شخصیت سے میری آنکھ، میرا دل اور میرا قالب بھر گیا، اور تمہارے اندر، ہمارے فتنے محو ہو گئے۔"

تبدلت الاركان منا بنوركم
تغوص اغصانا جفتنا جفوننا

"ہم سے ارکان تمہارے نور کی وجہ سے بدل گئے، شاخیں غوطہ لگاتی ہیں ہمارے پپوٹے خشک ہو گئے۔"

فتنا وافتنا فكنا بفائن
ولم يك مفتون فتم فتوننا

"ہم فتنہ میں پڑ گئے اور فریفتہ ہو گئے ہم فتنہ گر ہو گئے، وہ مفتون نہیں تھا اس لیے

ہماری فتنہ گری مکمل ہوگئی۔"

۱۲۶۔تفہیم:

ایسے بندہ کیلئے کامل سعادت جس کیلئے اللہ سبحانہ نے تجلی فرمائی

یہ جان لو کہ پوری سعادت یہ ہے کہ اللہ سبحانہ نے بندہ کے لیے تجلی فرمائی، خواہ وہ مقدار عین پر ہو تو اللہ اس بندہ کو ولی قرار دے دیتا ہے۔ اس لیے کہ تجلی کے آثار اس قیاس پر ہوتے ہیں جس کے لیے ہیئت سے یا وزن یا مقدار سے مختص کیا ہو۔ یا تم جو چاہے اس کا نام رکھلو۔ اور عین کو بندہ کے لیے قانون بنا دیا گیا۔ اس کے آثار، کمالات اور مقالات صرف اس کے میزان و معیار اور مقدار پر ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہ تجلی عین کے لیے تحقق اور تقرر کی وارث ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ آثار اللہ کے رنگ میں رنگ گئے اور یہی تولی ولی مقرر کرنے سے مراد ہے۔ اور نفس ناطقہ کی مقدار پر جو اس عالم سے بندہ ہونے میں راز ہے۔ اور اس کے ماسوا سب اس پر متفرع ہیں۔ اور اس سے مدد طلب کرنے والے ہیں۔ اور اس کے لیے مثال ہیں۔ تب بندہ اللہ کے ذریعہ دیکھتا ہے۔ اللہ کے ذریعہ پکڑتا ہے اور اللہ کے ذریعہ سنتا ہے۔ اس لیے کہ نفس روح کے کمالات کا اجمال ہے۔ چنانچہ جب تجلی اس کے وزان اور موازنے سے مختص ہوگئی تو روح کے کمالات متحقق ہوگئے۔ اس کا قصد روشن ہوگیا اور اس کے اشارات اور جلوے صاف ہوگئے۔ شیخ بہاؤ الدین نقشبندی نے کہا: میں چالیس برس سے آئینہ کو دیکھ رہا ہوں، اس نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ انہوں نے آئینہ سے مراد یہ تجلی ہی لی تھی۔

پھر جس بندہ کو اللہ عزوجل نے ولی قرار دیا ہے۔ اولاً تجلی اس کی روح میں سرایت کرتی ہے۔ چنانچہ روح تمام شرور سے صاف اور اللہ کی مرضیات کے موافق ہو جاتی ہے۔ پھر اس کی روح کو توڑنے میں چلتی ہے اور وہ شرح صدر ہے۔ پھر دنیا و مافیہا سے اعراض کرتا رہتا ہے اور اللہ عزوجل سے محبت کرتا اور خشوع کرتا رہتا ہے۔ پھر اس کے نفس ناطقہ میں سرایت کر جاتا ہے تو اس کی تمام حرکات و سکنات اور اس کے کلمات اللہ کی مرضی سے ہو جاتے ہیں۔ اس کی ذات سے نہیں رہتے۔ اس وقت نسبت اور اوصاف کی فنا متحقق ہو جاتی ہے۔ اب جو اس سے بغض رکھتا ہے، وہ اللہ سے بغض رکھتا ہے۔ اور جو اس سے محبت رکھتا ہے، وہ اللہ سے

محبت رکھتا ہے۔ پھر دوسری بار آنکھ میں سرایت کرتا ہے، تب نعمت اور رحمت مکمل ہو جاتی ہیں۔

۱۲۷۔ تفہیم:

حکم اور نبوت کے معنی

اللہ عزوجل نے بنی اسرائیل کے سلسلہ میں فرمایا: **و آتیناھم الکتب والحکم والنبوۃ** ''اور ہم نے انہیں کتاب اور حکمت اور نبوت دی'' میں کہتا ہوں یہاں حکم سے مراد علم حقیقی اور اس کی مشابہ عالم شہادت میں علم کتاب اور اباحت ہے۔ اور نبوت ریاست حقیقی اور اس کی مشابہ خلافت اور امامت ہیں۔ اور ہر نبی کے لیے لازم ہے کہ وہ حکیم ہو اور ہر خلیفہ کے لیے لازم ہے کہ وہ نیک علامہ ہو۔

۱۲۸۔ تفہیم:

اللہ تعالیٰ کے نور السموات والارض ہونے کے معنی

اللہ عزوجل نے ارشاد فرمایا ''**اللہ نور السموات والأرض، مثل نورہ کمشکوۃ فیھا مصباح، المصباح فی زجاجہ، الزجاجۃ کانھا کوکب دری یوقد من شجرۃ مبارکۃ زیتونۃ لا شرقیۃ ولا غربیۃ یکاد زیتھا یضیء ولولم تمسہ نار، نور علی نور، یھدی اللہ لنورہ من یشاء ویضرب اللہ الامثال للناس، واللہ بکل شئی علیم**'' اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ (کائنات میں) اس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے ایک طاق میں چراغ رکھا ہوا ہو۔ چراغ ایک فانوس میں ہو۔ فانوس کا حال یہ ہو کہ جیسے موتی کی طرح چمکتا ہوا تارا۔ اور وہ چراغ زیتون کے ایک ایسے مبارک درخت کے تیل سے روشن کیا جاتا ہو جو نہ شرقی ہو نہ غربی۔ جس کا تیل آپ ہی آپ بھڑکا پڑتا ہو، چاہے آگ اس کو نہ لگے، اور اس طرح روشنی پر روشنی بڑھنے کے تمام اسباب جمع ہو گئے ہوں۔ اللہ اپنے نور کی طرف جس کی چاہتا ہے رہنمائی فرماتا ہے۔ وہ لوگوں کو مثالوں سے بات سمجھاتا ہے اور وہ ہر چیز سے خوب واقف ہے۔'' (النور: ۳۵) میں کہتا ہوں کہ اللہ وہ ہے جس نے مختلف قسم کی تجلیاں فرمائیں، ان میں سے خلق اور تصویر (تدبیر) اور ہدایت بھی ہے اور ہر تربیت، تربیت ہے۔ اور

تدبیر آسمانوں اور زمین میں تدبیر ہے۔اور وہ انوار اور تجلیات ہیں۔وہ سب ایک اعتبار سے عین لذاتہ ہیں۔اور ایک اعتبار سے اس کا غیر ہیں۔اس لیے یہ کہنا صحیح ہے کہ وہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔اور یہ کہنا بھی صحیح ہے کہ یہ سب اس کے انوار ہیں۔پھر نور محمدی جس کے ذریعہ اپنی شریعت، ہدایت اور کمالات کا انتظام فرمایا "علیه افضل الصلوٰت وایمن التحیات" اس کی مثال ایسی ہے جیسے چراغ ایک فانوس میں ہو اور وہ طاق میں ہو۔

چراغ اسم متجلی کے مقابلہ میں عین کے وزن میں برابر ہے۔اس لیے انتہائی چمک میں اس سے مغلوب ہے۔سبقت مزاج ہے۔اور ہر چیز کا مادہ ہے۔اس کی جانب سے مدد آتی ہے۔جیسے غذائیں بدن کے عناصر سے پیدا ہوتی ہیں۔اور اس تجلی کا مادہ مرید کے نام کا فیضان ہے، نہ مکان میں ہے، نہ زمانہ میں اور درخت نہ شرقی رخ ہے، نہ غربی رخ۔اور اس تجلی کی وسعت لکڑی کے کمالات سے ہوتی ہے۔اور اگر لکڑی کے کمالات نہ ہوں تو قریب ہے کہ اس سے بھی روشن ہو جائے۔جس سے صفائی اور علو فطرت ہے۔لیکن وہ اس سے مل گیا تو مکمل ہو گیا اور بعد میں روشنی ہوگا۔اور فانوس وہ تجلی ہے جو نفس ناطقہ میں اس اسم کے سرایت کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔اس لیے کہ نفس اگرچہ اس عالم کی ہی ایک شے ہوتا ہے لیکن اس کی ہیئت صاف اور منظر لطیف ہوتا ہے۔اس میں شک نہیں کہ وہ فانوس کی طرح ہے اور نفس میں پایا جانے والا نور، فانوس میں پائے جانے والے نور کے مشابہ ہے۔پھر تجلی جسم میں پائے جانے والے عرض کے مشابہ ہے۔اس لیے وزن میں اس کے برابر ہوتا ہے جو اس کے اوپر ہے اور اس کے لیے ہے۔اب اگر تم کہو کہ رب تبارک وتعالیٰ نے فرمایا ہے "کمشکوۃ فیها مصباح، المصباح فی زجاجة" جیسے ایک طاق ہو، اس میں چراغ ہو، چراغ فانوس میں ہو۔یہ نہیں فرمایا طاق ہو، اس میں فانوس ہو، اس میں چراغ ہو۔میں کہتا ہوں کہ ایسا اس امر کا اعلان کرنے کے لیے کیا کہ فانوس جس طرح چراغ سے اولاً روشنی کو قبول کرتا ہے بغیر کسی کے تابع ہوئے۔اسی طرح طاق بھی اس سے اولاً روشنی کو قبول کرتا ہے، بغیر فانوس کے تابع ہوئے۔اسم الٰہی کا ہر دورہ میں سرایت کرنا یکساں ہے۔اور طاق اس روح سے عبارت ہے جو اسماء کے انوار کے عکس کے لیے طبیعت کی تاریکیوں کو ترک کرنے والی ہے۔اس میں اس علم سے ایک دوسری عبارت ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہے جو کمال کے دورہ سے پیدا ہوئی ہے۔چنانچہ اس بلندی

پر پہنچ گئی جو اس سے ممکن ہے۔ تو عین پر اعتماد کرنے والا اس کا اسم عام ہو گیا۔ اور نفس پر اعتماد کرنے والی اس کی تجلی مکمل ہو گئی۔ اور آپ کا سینہ کھل گیا۔ اور آپ کی روح ایمان لے آئی۔ تو آپ کے نام سے تولی کے آثار ہیں۔ جیسے جبریل علیہ السلام کو اس نبوت کے ساتھ بھیجنا جو تقسیم کے لیے نظام شمار کیا گیا ہے۔ اور ہجرت، جب مصائب عام ہو گئے، تولی خالص ہو گئی۔ اہل یثرب میں سے ایک قوم نے آپ کی اتباع کی تو آپ کے دل میں ہجرت کا خیال پیدا فرما دیا۔ اس طرح اللہ نے آپ کے خیال کی تصدیق فرمائی اور بدر کا نام مصلحت میں چلا۔ اللہ کے دشمن مصیبت میں مبتلا ہو گئے اور یوم التقی الجمعان (جس دن دونوں بڑے گروہ ٹکرائے) فرقان کو نازل فرمایا اور حدیبیہ اس طرح مصلح کی طرف بڑھی کہ نہیں جانتے تھے۔ اور وہ فتح کا مبدأ ہو گئی اور خیبر، حنین، طائف اور فتح مکہ وغیرہ اور حق کے ان آثار کے القاب جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قل جاء الحق وزهق الباطل ”آپ فرما دیجئے حق آ گیا اور باطل مٹ گیا“۔

اور کیا میں تمہیں بتاؤں کہ تولی کیا ہے۔ وہ بخت کی طرح ہے مگر یہ کہ بخت میں تاریکی ہوتی ہے اور اس میں چمک ہوتی ہے اور بخت سے سعید روحیں سعادت حاصل کرتی ہیں جبکہ بد بخت شقاوت و بدبختی کے شکار ہو جاتے ہیں۔ بخت بدیہی امر ہے اس کا انکار صرف ان لوگوں نے کیا ہے جو اہل تمیز نہیں ہیں۔ اور اس کی تجلی اشرافات ہیں۔ مثلاً یہ کہنا کہ تم نے اپنے گھر میں ایسا اور ایسا کیا اور کل ایسا اور ایسا ہو جائے گا۔ اور معجزات جزئیہ جیسے مریضوں کے لیے دعا اور کھانے پینے کی چیزوں کا زیادہ ہو جانا۔ البتہ شق القمر ہمارے نزدیک معجزہ نہیں ہے، وہ قیامت کی نشانیوں میں سے ایک ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اقتربت الساعة وانشق القمر ”قیامت قریب آ گئی ہے اور چاند کے ٹکڑے ہو گئے“۔ (القمر: ۱،۲) لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے سلسلے میں اس کے وجود میں آنے سے پہلے ہی خبر دے دی تھی۔ اس لیے اس لحاظ سے یہ معجزہ ہے۔

شیخ بہاؤ الدین نقشبندی نے کہا میں نے ۴۰ سال تک آئینہ پر نظر رکھی۔ اس نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ انہوں نے آئینہ سے مراد یہی تجلی لی تھی۔ نفس کی جبلت اشراف اور ارادہ وخواہش والی ہے لیکن وہ دونوں کبھی تکذیب کرتے ہیں اور کبھی تصدیق کرتے ہیں۔ تو جب تجلی متحقق ہو جاتی ہے تو آدمی التباس سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ اور اللہ سبحانہ نے اپنی کتاب میں نہ ان

معجزات میں سے کسی کا ذکر کیا، نہ ہی ان کی طرف کبھی انوکھے راز کے طور پر اشارہ کیا۔ اور وہ یہ ہے کہ قرآن اسم ہے، اس لیے اس میں ان کا کوئی ذکر نہیں کیا جاتا جو اس کے تحت ہیں۔ اور ان میں سے اکثر مدینہ میں پیش آئے۔ اور آپ کے شرح صدر سے مراد یہ ہے کہ آپ لوگوں میں اللہ سے سب سے زیادہ ڈرنے والے، سب سے زیادہ تقویٰ والے، سب سے زیادہ عبادت کرنے والے اور سب سے زیادہ علم والے ہیں۔ اور ہر وقت اللہ کو یاد رکھتے تھے اور اس دھوکے کے گھر، دنیا سے اعراض کرنے والے اور ہمیشگی کے گھر کی طرف متوجہ رہنے والے تھے۔ حضرت انس دس سال تک آپ کی صحبت میں رہے۔ انہوں نے کبھی کوئی کام کیا تو آپ نے یہ نہیں فرمایا تم نے یہ کیوں کیا اور نہ ہی کسی کام کے نہ کرنے پر یہ فرمایا تم نے یہ کیوں نہیں کیا؟ اور کبھی کسی سائل کو ''نہیں'' نہیں کہا۔ آپ کا وعظ ایسا ہوتا تھا کہ اس کو سن کر آنکھوں سے آنسو بہتے تھے اور دلوں میں ڈر پیدا ہوتا تھا۔ خود آپ اللہ کے خوف سے اور اس کی محبت میں اور اس کی طرف شوق کی وجہ سے روتے تھے۔ اور یہ امور آپ کے کمالات ہیں جو اہل سنت کے علماء اور ان کے اکابر کو پہنچے ہیں۔ اس لیے انہوں نے دوسرے امور پر ان کی فضیلت بیان کی۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے، ہمارا ان کی فضیلت بیان کرنا سب سے زیادہ مکمل اور سب سے زیادہ روشن ہے۔

اور آپ کے ایمان میں آپ کی صلہ رحمی، پاک دامنی اور شرع کے مطابق اور مباح طریقہ پر آپ کے معاملات، آپ کی طاعات، سنت اور اپنی بیویوں اور خدام کے ساتھ آپ کی معاشرت، رہن سہن، آپ کا لباس، طرز گفتگو، کھڑا ہونا، بیٹھنا ہے۔ اور بالجملہ وہ سب کچھ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے اس کی چار قسمیں ہیں جیسا کہ ہم نے بیان کیا۔ تو جو ان پر اس طرح ایمان رکھتا ہے جس طرح ہم ایمان رکھتے ہیں۔ اس نے اس طرح ایمان رکھا جس طرح ایمان رکھنے کا حق ہے۔

۱۲۹- تفہیم:

بعض تجلیات کی تفصیل

آں شد اے خواجہ کہ در صومعہ بازم بینی
کار ما بارخ ساقی ولب جام افتاد

"اے خواجہ ایسے ہو گیا کہ صومعہ اور بت خانہ میں مجھ کو پھر سے دیکھ سکتے ہو، ہمارا واسطہ ساقی کے رخ اور لب و جام سے پڑ گیا ہے۔"

بقا جو کہ ولایت کا خانہ ہے، ایک ایسا امر ہے کہ اس جگہ ہرگز "نہ" نہیں ہوگا اور ابدالآباد تک نہیں ہوگا۔ اس جگہ فوق الفوق ایک ایسا امر ہے کہ اس کی تعبیر نہیں کی جا سکتی۔ اللہ کے فضل سے، اللہ کے قرب سے، اس کی انواع اور اس کے احکام و تفاصیل جس قدر دیئے گئے ہیں، معلوم نہیں کسی اور کو دیئے گئے ہوں، بلکہ اس پر ہمارا یقین ہے، اس پر نہ کوئی فخر و گھمنڈ ہے، نہ تعجب۔ اس جگہ ہر حرکت فوقیہ اور ہر تجلی جس پر تجلی کی جاتی ہے، اس کا احاطہ کرنے والی ہے کہ وہ اس میں غرق ہے، لا یہ کہ مسکین بے دست و پا ہے کہ ہر تجلی جس کو میں گلے سے اتارتا ہوں، اور وہ سب جن کو میں بغیر کسی اضطراب اور بغیر زیادہ حاصل کرنے کی کوشش کے سینہ سے لگاتا ہوں۔ گویا میں نے اس کا اوپر سے احاطہ کر لیا ہو۔ حتیٰ کہ رحمان کی تجلی اس طرح مجھے اپنی آغوش میں لے لیتی ہے۔ اور میں اس کو اپنی آغوش میں لے لیتا ہوں۔ حتیٰ کہ دونوں باہم متحد اور منعدم ہو جاتے ہیں اور میں نہیں جانتا کہ کسی کا علم اس حد تک پہنچا ہو۔ اس گفتگو میں بہت تفصیل ہے۔ میں اسی پر بس کرتا ہوں۔

۱۳۰- تفہیم:

وصایا اور مفردیہ کے ایک ساتھ جمع کرنے کا مرتبہ

یہ ضروری نہیں ہے کہ سلف کو کوئی مقام یا مرتبہ حاصل نہ ہوا ہو، اور انہوں نے صریحاً یا ضمناً اس کی خبر نہ دی ہو۔ البتہ خلف کو یقینی طور پر ایسا کچھ ملا نہیں بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ متاخرین کو کوئی چیز ملی ہو اور ہمارے تمام متقدمین نے اس سے غفلت کا مظاہرہ کیا ہو۔ اس کی دلیل کے لیے حضرت خاتم النبوت علیہ الصلوٰۃ والسلام کافی ہیں۔ اور اس سلسلہ کا ایک اختصاص وصایا اور مفردیہ کے جمع کرنے کا معاملہ ہے۔ اگرچہ جو بھی مر جاتا ہے، خاک ہو جاتا ہے لیکن صحیفہ عامہ کلیہ میں اس کے حال کی حقیقت منقش ہے۔ میں نے اس میں تلاش کیا تو نہیں پایا کہ کسی نے جمع کیا ہو۔ بلکہ میں نے پایا کہ کسی نے نہیں کیا۔ اگر تحقیق سے پوچھتے ہو تو یہ دو امر ہیں کہ ان سب میں ایک کا حصول دوسرے سے وابستہ ہے۔ اگرچہ تجلیات کی

جزئیات امور غیر متناہیہ ہیں۔ البتہ ان کے کلیات کچھ زیادہ نہیں ہیں۔ اگر چہ ہر ایک کلیات سے خالی، بے سروپا ہے۔ لیکن کوئی ایک حضرت خلاق علیم کی مخلوق میں موجود ہے کہ ان سب کو قدم موہبت سے طے کیا ہو۔ اور میں نے اس کے بعد کسی دوسرے میں کمال وتجلی نہیں پائی۔ نہ اس جہاں میں اور نہ اس جہاں میں۔ سوائے اس شخص کے جو خود روشن بصیرت والا ہو۔ اور اس کے اوپر سے احاطہ کر کے آئے۔ اس حالت میں کہ عین ذات تک پہنچ جائے۔ اس کی نسبت تمام تجلیات ومقامات میں ایک ہو جائے۔ اور اس کا کوئی اثر، کوئی درد اور کوئی توجہ باقی نہ رہے۔ جو چاہے اس لحاظ سے توجہ کرے کہ وہ اس کے حال کے نیچے کی شئے ہے۔ اب یہ امر پوشیدہ نہیں ہے۔ خود اپنی آنکھ سے دیکھ لیا کہ میں ایک بشر ہوں جو کشمکش میں مبتلا ہو گیا ہے۔ طبیعت اچاٹ ہو گئی اور جو آداب اس سفر میں پہنچنے کا باعث ہوئے درست ہوئے۔ نہ کہ اس کا علم اس وقت پر منحصر ہے جب وہ قبر میں اتارا جائے۔ اور ایک دوسرا عالم پیش آئے۔ اور جو آداب اس کو اس سفر میں پیش آئے ہیں، انہیں اختیار کرے اور اس طرح سلسلہ چلتا ہے یہاں تک کہ اس کی تجلی اور سفر منتہی ہو جاتا ہے۔ جو کہ اللہ عزوجل کی ذات ہے۔ وہ اس میں سے کسی چیز میں تجلی غیر محتجب کہلاتی ہے۔

۱۳۱۔تفہیم:

انتہائی کمال حاصل کرنے کا مرتبہ

یہاں کچھ اسرار ہیں جن کو لکھنے سے قلم قاصر ہے۔ وہ انتہائی کمال کا حصول ہے اور یہ انتہائی مقصود ہے۔ لیکن اللہ کے بعد کوئی انتہا نہیں ہے۔ جو چیز بھی موجود ہے یا موجود تھی یا آئندہ ہوگی، آدم سے لے کر قیامت کے دن پائے جانے والے آخری آدمی تک وسیع ہو کر اس کمال کا دائرہ ہے یا جزئیات یا شرائط سے کوئی امر ہے۔ یا اس کمال کا حصہ ہے۔ اے اللہ! تو جو کچھ دینا چاہے اس کو کوئی روکنے والا نہیں ہے اور اس بارے میں، میں نے کہا ہے۔

قرون خلت لیس الحساب یعدھا
خلیا عن النور المبین المعاصر

"وہ صدیاں جو گزر گئیں انہیں حساب گن نہیں سکتا، وہ بیان کرنے والے تعبیر کرنے

والے نور سے خالی ہو گئیں۔"

واعنی بذاک النور نور سماءہ
سمت فوق سبع الطبقات الدوائر

"اور میں اس نور سے اس کے آسمان کا نور مراد لیتا ہوں، کہ سات تہہ در تہہ گھومنے والے آسمانوں کے اوپر ہے۔"

اتی بعدھا عبد ضعیفا فصانہ
وکان لہ اذ بین ناہ وآمر

"ان کے بعد ایک کمزور بندہ آیا جس کو اس نے بچایا، حالانکہ وہ اس وقت منع کرنے والے اور حکم دینے والے کے درمیان تھا۔"

علی صورۃ العین الوسیعۃ تارۃ
وطور اعلیٰ وجہ علی الدنس ھامر

"کبھی وسیع و عریض آنکھ کی شکل میں، اور کبھی خستہ حال چہرہ کی صورت میں۔"

جمعنا لہ الشمل الشتیت مسددا
حمیداً اماما فوق اعلیٰ المنابر

"ہم نے اس کے لیے بکھرے ہوئے پرزوں کو جمع کیا، جو کہ اونچے منبروں پر محمود امام بن کر رہا۔"

وکنالہ ردء لضیر وحافظاً
فلیس لہ شئی ھناک بضائر

"اور ہم اس کے لیے کسی بھی نقصان سے رکاوٹ اور اس کے محافظ بن گئے، اب اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔" (غالباً اس سے مراد بشمول شاہ صاحب اولیاء اور اہل حق ہیں)

۱۳۲-تفہیم:

اس تجلی کے احوال جو کہ جہنم اور جنت کا منبع ہے

حضرت حق سبحانہ نے وعدہ فرمایا ہے اور اللہ کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتا، جس شخص کو اس

تجلی خاص سے جو کہ جہنم کا منبع ہے تعلق تام ہو جائے۔اور وہ اس میں فنا ہو جائے، وہ مغفور ازلی ہے۔اس کو کبھی بھی عذاب نہیں دیا جائے گا۔

یحرق النار من یمس به
ومن هو النار کیف یحترق

''آگ جس کو بھی چھوتی ہے جلا ڈالتی ہے، اور جو خود ہی آگ ہو اس کو کیسے جلائے گی۔''

اور جس شخص کو اس تجلی خاص سے رابطہ قائم ہو جائے جو جنت کا منبع ہے اور وہ اس میں خود کو فنا کر دے، اس کو نقد جنت دے دیتے ہیں۔اگر چاہے تو ابھی اس میں چلا جائے اور چاہے تو کچھ وقت کے بعد چلا جائے۔حور اس کو ابھی بھی رنجیدہ آواز میں کمال شوق سے چاہتی ہیں کہ اس کی مشتاق ہوتی ہیں۔اس کے اجزاء کی طرف کمال اشتیاق رکھتی ہیں کہ کل کا جمال بعض کے جمال اور اس کے اضعاف کو شامل ہوتا ہے۔اور حدیث میں جو وارد ہوا ہے کہ جنت تین افراد کی مشتاق ہے۔عمار بن یاسر، سلمان فارسی، اور بلال (حبشی) یہ ان کے فقر، صبر اور ان کے راہ مستقیم سے وابستگی کی قوت کے لحاظ سے ہے۔پھر تمہارا اس شخص کے بارے میں کیا خیال ہے جو اس میں فنا ہو جائے جو جنت اور جہنم سب کی اصل ہے۔

۱۳۳۔تفہیم:

رذیل اخلاق پر مواخذہ کے سلسلہ میں امام غزالی کا قول اور اس بارے میں مصنف کی تحقیق

امام غزالی نے احیاء العلوم اور کیمیائے سعادت میں رذیل اخلاق سے بہت زیادہ ڈرایا ہے اور یقین کے ساتھ کہا ہے کہ بداطوار لوگوں سے مواخذہ کیا جائے گا اور اس فقیر کے نزدیک جہنم کی تجلی میں گہرائی کے ساتھ دیکھنے کے بعد جو واضح ہوا ہے، وہ یہ ہے کہ آدمی میں تین قسم کی قوتیں پیدا کی گئی ہیں۔طبعیہ، ادراکیہ اور قلبیہ۔اور جو کچھ مواخذہ ہے وہ قوائے قلبیہ سے ہے۔پھر قوائے قلبیہ کی دو قسمیں ہیں۔ہیئتیں جو اصلاً روح میں پیدا ہوتی ہیں۔اور افعال ذمیمہ۔ان کی شرح اور بیان یہ ہے کہ جو ہیئتیں بنی نوع کے ازدحام کے سبب طاری

ہوتی ہیں جیسے ریا اور سنا وغیرہ جو انتہائی حد کو پہنچ جائیں اور اس طرح حرص اور لمبی چوڑی امیدیں اور حسد وغیرہ جب ان میں نفس فنا نہ ہو بلکہ اس سے دکھی اور رنجیدہ ہو۔ جو بھی مواخذہ ہے وہ قسم اول سے ہے، نہ کہ ثانی سے۔ ثانی میں تشویش بہت ہوتی ہیں۔ جب آدمی حق کی طرف نظر کرتا ہے اور اس راہ سے نظر گزرتی ہے۔ اس کی علامت وہ امر ہے کہ آدمی کے اندر یہ رذیل اعمال حاکم نہیں ہوتے۔ الا یہ کہ اپنے ہم جنس کے ساتھ کوئی تنازعہ مناقشہ ہو۔ چنانچہ جب وہ تنازعہ دور ہو جاتا ہے تو وہ غائب ہو جاتا ہے۔ جہاں تک نئی قید کی مثال کے ساتھ قسم اول کا سوال ہے، وہ آدمی کے چاروں طرف ہو جاتی ہے۔ اور وہ برائیوں سے رنجیدہ ہوتا ہے اور طویل مدت وزمانہ کے بعد ہی خلاصی پاتا ہے۔ اور اس قسم میں سب سے مشکل شرک جلی ہے۔ بلکہ شرک خفی کی بعض قسمیں بھی اس میں شامل ہیں۔ اعاذنا اللہ من جمیع ذلک ''اللہ ہمیں ان سب سے محفوظ رکھے۔'' اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: الذین یجتنبون کبائر الإثم و الفواحش إلا اللمم ''جو لوگ بڑے بڑے گناہوں اور کھلے کھلے قبیح افعال سے پرہیز کرتے ہیں الا یہ کہ ان سے کچھ قصور سرزد ہو جائے۔'' (النجم:۳۲) والحمد للہ علی ماانعم.

۱۳۴۔ تفہیم:

تمام اقسام پر مطلع ہونا اور ان کا دوائر سبعہ نام رکھنا

اس مسکین کا یہ کمال ہے کہ حق سبحانہ نے اپنے فضل سے اس مسکین پر لم نجعل لہ من قبل سمیا ''ہم نے اس نام کا کوئی آدمی اس سے پہلے پیدا نہیں کیا۔'' (مریم:۷) کے مطابق کرم فرمایا اور وہ کمال کی تمام قسموں سے باخبر کرنا ہے۔ اور اس فقیر نے ان کی سات قسمیں کی ہیں۔ اور ان کا نام دوائر سبعہ رکھا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کا ایک ظاہر اور ایک باطن ہے۔ ظاہر والا اس کمال کا اوپر سے احاطہ کرتا ہے اور صاحب باطن اس کے اندر مستغرق ہو جاتا ہے۔ اور صاحب ظاہر کا علم اور اس کی تعبیرات اپنے حال سے دوسری وضع پر ہیں۔ اور صاحب باطن کا علم اور اس کی تعبیرات اپنے حال سے دوسرے نہج پر ہیں۔ اس کی مثال آنکھ جیسی ہے۔ صاحب باطن علوم باصرہ سے گفتگو کرتا ہے کہ یہ زرد ہے اور وہ سرخ، اور یہ مثلث ہے اور وہ مربع وغیرہ۔ اور اگر ہم دور کی چیزوں کو دیکھنا چاہتے ہیں تو یہ نہیں ہو پاتا۔ اور اگر

قریب کی چیزوں کو دیکھنا چاہتے ہیں تو اس کا حال بھی ایسا ہی ہے۔ اور صاحب ظاہر کہتا ہے کہ باصرہ روح صافی میں ودیعت کی ہوئی قوت ہے۔ جو دماغ سے نیچے آتی ہے۔ اور اس کے اوپر سات حجاب ہوتے ہیں۔ اور ہر حجاب میں دوسرا فائدہ ہے۔ اور اگر روح نیچے کی طرف گری ہوئی پتلی رقیق ہے تو ظاہر ہو جاتی ہے۔ حرارت کے اوقات ضعیف البصر ہوں گے اور دور سے نہیں دیکھ سکیں گے۔ اور اگر روح غلیظ ہے تو معاملہ اس کے برعکس ہوگا۔ اور دونوں صاحب مقام باصرہ ہیں۔ اس فقیر کا عقیدہ یہ ہے کہ دوائر سبعہ کا عالم ظاہری طور پر اور باطنی طو پر اور ادب کے لحاظ سے اور آثار کے لحاظ سے ذوق اور وجدان کے طریقہ سے ان کا پانے والا ہے۔ اور ان کا محقق ہے اور جو ایسا ہو فقد فاز فوزاً عظیماً ''اس نے بہت بڑی کامیابی حاصل کرلی'' یا اس کے آگے نہیں ہے۔ ان ساتوں کلیات اور امہات کا کمال ہے اور جزئیات جو فاعلات اور قابلات کے امتزاج سے صورت اختیار کرتی ہیں، وہ محصور نہیں ہیں، اور ان کا علم اصول کے احاطہ کے بعد سب سے سہل امر ہے۔ اور اگر اس سے گزر جائے تو اس بات کا امکان نہیں رہتا کہ وہ مزید ترقی کرے گا، نہ اس دنیا میں اور نہ ہی اس دنیا میں۔ البتہ ہر مرتبہ میں ایک الگ ذوق رکھتا ہے اور دوسرے مرتبہ میں دوسری لذت کا حامل ہوتا ہے۔ جو اس جگہ کاملوں کو قرون کے بعد حاصل ہوگا اور اس کا حوالہ اس جگہ نقد موجود ہے۔ بلکہ اس سے بہتر ہے۔ اس کا جنت میں جانا۔ اس کی تکمیل کے لیے نہیں بلکہ اس لیے ہے کہ طریقہ کی نشات کا حکم ہو۔

۱۳۵- **تفہیم:**

دورات سبع کی شرح

اللہ تبارک وتعالیٰ جو چاہتا ہے اور جس کو چاہتا ہے عطا کرتا ہے، نہ اس کے حکم کے لیے کوئی رکاوٹ ہے اور نہ ہی اس کی جود وسخا کی کوئی حد ہے۔ اور اس کا ایک عظیم فضل اور وسیع احسان یہ ہے کہ اس نے مجھے طریق کمال عطا فرمایا۔ اور میرے لیے اس کے قوانین متعین فرمائے۔ اور اس کے ہنر اور انواع بیان فرمائے۔ اور یہ سب کچھ مجھے اللہ تعالیٰ سے تقرب رکھنے والوں کے مقامات اور ان کے احوال تفصیلی اور اجمالی طور پر سکھانے کے بعد ہوا۔ اور ان میں سے رسولوں صلوات اللہ علیہم کے مقامات اور احوال کی مثالیں ہیں۔ اور ان میں وہ

کمال بھی ہیں جن کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہتے ہوئے اشارہ فرمایا: کمل من الرجال کثیر "مردوں میں سے بہت سارے لوگ صاحب کمال ہوئے ہیں۔" اور جان لو کہ ہمارا طریقہ یہی ہے۔ اس کی تشریح دورات سبعہ میں منتہی ہوتی ہے۔ ان میں سے جب بھی ایک دورہ منتہی ہوتا ہے دوسرا بڑھ جاتا ہے۔

ان میں سے پہلا ایمان حقیقی ہے۔ کیا ہم نے تمہیں اپنے بعض رسائل میں انسان کے وجود کے راز کے بارے میں نہیں بتایا؟ اور یہ کہ اس کے ابدان کا سب سے نچلا حصہ نسمہ (روح) ہے۔ جس سے تم نے سمجھ لیا کہ اس کی فطرت گندگی کی برائیوں سے پاک بنائی گئی ہے۔ جیسا کہ سید المرسلین صلوات اللہ علیہ وسلامہ نے فرمایا کل مولود یولد علی الفطرۃ "ہر پیدا ہونے والا فطرت پر پیدا کیا جاتا ہے"۔ لیکن وہ عاملہ یا عاقلہ کی جگہ سے کسی ایک قسم کی طغیانی سے لاحق ہوتی ہے۔ پھر جب فطرت پاک ہوجاتی ہے اور شرور سے خلاصی پالیتی ہے تو وہ ایمان ہے۔ اور یہ وہ ادنی شئے ہے جس کی طرف دعوت کے لیے رسول اللہ کو مبعوث کیا گیا۔ اور قرآن کو اس کے مناقضات کے اثبات اور نفی کے لیے نازل کیا گیا۔ اور ایمان دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جس پر امن اور جان و مال کے تحفظ کے تعلق سے دنیاوی حکم لاگو ہوتا ہے۔

اور اس کے مقابلہ میں کفر آتا ہے۔ اور اس کے ستون اللہ سبحانہ اور اس کے رسول اور یوم آخر کے لیے اپنی زبان واقرار مطیع وتابع ہوتا ہے۔ اور اس پر نجات، درجات کی بلندی اور بندہ کا اللہ سبحانہ اور اس کے گروہ اور لشکر سے قریب ہونے کے سلسلہ میں آخرت کا حکم لاگو ہوتا ہے۔

اور اس کے مقابلہ میں نفاق اور دل کا مرض آتا ہے۔ اور اس کے ستون عبادت اور استعانت میں اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرنے سے اور عبادات میں نشاط و حسن رغبت اور وسعت نفس کے ذریعہ احتساب وسکینت کے لحاظ سے اور ہر اس امر کے ذریعہ جس کی طرف اللہ اور اس کے رسول اور مسلمانوں کے ساتھ مختلف قسم کے معاملات میں حسن اخلاق اور خیر خواہی کے ذریعہ بڑھتے ہوئے روح میں سخت برائیوں کے ملکہ سے باز رہنا ہے۔ اور ہم ایمان سے مراد اس بعد والے کو لیتے ہیں اور وہ کم بھی ہوتا ہے اور زیادہ بھی۔ اور یہ وہ ہے کہ جب اس کی بشاشت قلب میں داخل ہوجاتی ہے تو پھر نہیں نکلتی۔ اور یہی وہ ہے جس کے ستر (۷۰) سے زیادہ شعبے ہیں۔

اور ہم نے اس کے چار ذاتیات استنباط کیے ہیں۔ جن کو آگے بیان کریں گے۔

پھر اللہ سبحانہ کے ساتھ عبادت میں شرک کا مطلب غیر اللہ کی ایسی تعظیم ہے جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی قربت یا آخرت میں نجات طلب کی جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں ہمارے زمانہ میں اعظم الامراض سب سے بڑا مرض اپنے زندہ یا قبروں میں مردہ شیوخ کی عبادت کرنا ہے۔ اور ہندوستان میں جہلا، کفار اپنے بتوں کی عبادت اور ان کے اعمال میں اقتدا کرتے ہیں۔ اور اللہ کے ساتھ استعانت میں شرک کا مطلب یہ ہے کہ کسی سے اپنی حاجت روائی یہ جانتے ہوئے طلب کرے کہ اس میں محض اپنے ارادہ کے نفاذ سے اس کی تکمیل کی قدرت ہے۔ جیسے مرض میں شفاء اور زندہ کرنا اور مار دینا اور رزق اور بچہ پیدا کرنا وغیرہ۔ جو اللہ تعالیٰ کے ناموں کے ضمن میں آتے ہیں۔ اور اللہ کے ساتھ دعا میں شرک یہ ہے کہ اللہ سبحانہ کے سوا کسی کو یہ جانتے ہوئے یاد کرے کہ اس کا یہ فعل اس کے مفاد میں یا اللہ کی طرف اس کے قرب میں نفع بخش ہے۔ جیسا کہ صبح کے وقت اپنے شیوخ کو یاد کرتے ہیں اور ذبح میں اللہ کے ساتھ شرک یہ ہے کہ جانور کو کسی کے لیے ذبح کرے یا اس کے لیے چھوڑ دے کہ اگر اس جانور کو ذبح نہیں کرے گا تو وہ حاجت پوری نہیں ہوگی جو اس کے دل میں ہے۔ اور نذر و قسم میں اللہ کے ساتھ شرک کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے نام کے شرف اور اس کی ذات کو خدا بنانے کو ضروری سمجھے۔

اور سب سے برا ملکہ وہ بخل اور حرص و لالچ ہے جس کی پیروی کی جائے۔ اور ہر صاحب رائے کا اپنی رائے پر گھمنڈ کرنا ہے۔ اور یہ کہ جب لڑے تو حد سے تجاوز کرے، فسق و فجور سے کام لے اور جب عہد کرے تو اس کی خلاف ورزی کرے اور جب بات کرے تو جھوٹ بولے۔ اور ہمارے نزدیک گناہ کبیرہ وہ افعال ہیں جن پر اللہ نے جہنم کی آگ کی وعید فرمائی ہے۔ یا اس کا ارتکاب کرنے والے کو کافر کہا، یا اس پر حد کو مشروع کیا، یا ان کو فحش قرار دیا۔ چنانچہ سیئات عیب لگانے والے امور ہیں، خواہ تہذیب نفس میں یا تدبیر منزل میں، یا اساس مدنیہ میں۔ یا اس کا سبب کوئی شر یا گناہ کبیرہ ہوتا ہے۔

اور بدعات وہ امور ہیں جو انبیاء کے بعد لوگوں نے تحریفات کی ہیں جن کو انہوں نے عبادت سمجھا، یا ان کو ایسی عادت بنا لیا جن پر عمل کیا جائے۔ اور سب سے بڑی بدعت وہ ہے جو انہوں نے قبروں کے معاملہ میں گھڑلی ہے۔ اور ان کو عید تیوہار بنا لیا اور مقررہ اوقات کی عبادتوں میں جو مشائخ کے اوراد و وظائف اختیار کر لیے۔ اور فرائض وہ افعال ہیں جن کے

ترک کرنے والے کو اللہ سبحانہ نے کافر قرار دیا ہے یا اس پر جہنم کی وعید فرمائی۔ اور حسنات وہ افعال ہیں جن کے کرنے والے کے لیے غیر قطعی طور پر جنت کا وعدہ فرمایا ہے۔ چنانچہ جس نے تمام سیئات و بدعات سے اجتناب کیا اور حسنات پر عمل کیا وہ مومن کامل ہے اور جس نے بعض سے اجتناب کیا تو وہ ان کے لحاظ سے ہوگا۔

دوسرے شرح صدر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: افمن شرح اللّٰہ صدرہ للإسلام ''جس کا سینہ اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیا'' اور الم نشرح لک صدرک ''کیا ہم نے آپ کے لیے آپ کا سینہ نہیں کھول دیا؟'' اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی علامات کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا ''دار الغرور والا نابۃ سے دار خلود کی طرف قرار پانا اور اس کی حقیقت جذب پر قابو پا کر روح کا اپنے جوہر میں انکسار ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ہر موجود کے لیے اللہ کے ساتھ ایک ربط ہوتا ہے۔ اور وہ شرح ہے، تاکہ عین اس کی عبادت کرے اور حقیقتاً ازلاً و ابداً اس کو سجدہ کرے۔

موجودات میں سے کچھ قوی الجذب ہیں، اور کچھ ضعیف الجذب، جو تیز ہوا کے مانند ہیں۔ اس کے لیے تیز ہوا ضروری ہے، جو اس کی شدت کو ختم کرے، اور اس کی قوت سے ٹکرائے۔ اور نور نبوت کا طریقہ عموم جذب پر رکھا گیا ہے جو یکے بعد دیگرے تمام طبقات پر مشتمل ہے۔ اور اس کا انکسار اس شخص کے لیے شرح صدر کی صورت اختیار کر لیتا ہے جو ایمان کو درست کر لیتا ہے۔ دنیا کے نظام سے چشم پوشی کرتے ہوئے اعراض کرتا رہتا ہے۔ اللہ کی رضا کا طالب ہو کر دار آخرت پر نظریں گاڑے رکھتا ہے اور جو حق درستگی کے ساتھ اس کو درست نہیں رکھتا، اس کے نزدیک جلد ہی توحید المحبت میں تصور پیدا ہو جاتا ہے۔ تب وہ اللہ سبحانہ کے ماسوا سب سے اپنے نفس کا تعلق ختم کر لیتا ہے۔ ان میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ان کے نزدیک دوام الحضور میں تصور پیدا ہو جاتا ہے۔ بالجملہ اہل ولایت کے نزدیک اس کو فناء اول کہا جاتا ہے اور جس پر یہ دورہ منتہی ہو جاتا ہے اور وہ ذہین و فطین ہو تو اس کے لیے چھ فناء لطائف الگ الگ قسموں پر منکشف ہوتے ہیں۔

ان میں سے ایک وہ ہے جس کو اللہ سبحانہ نے میرے لیے مخصوص کیا۔ اور وہ مرکز ہے، اور واسطۂ عقد یہ ہے کہ اللہ سبحانہ نے مجھ پر میرے عمل میں فعالیت کے ساتھ پھر تمیز، پھر

جامعیت، پھر قدوسیت اور پھر قیومیت کے ساتھ تجلی کی۔ پھر میں ذات خالص میں مضمحل ہوگیا اور فناء تام متحقق ہوگیا۔ اور ان میں سے ایک وہ ہے جو توحید افعالی وصفاتی جیسے شخص یا وجود کے مشابہ ہوتا ہے اس کو دوامر اجمال اور تنکر احاطہ کرتے ہیں۔

تیسرے قرب نوافل ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نقل کرتے ہوئے بیان فرمایا: بندہ نوافل کے ذریعہ مجھ سے قرب حاصل کرتا رہتا ہے، حتیٰ کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں۔ پھر جب میں اس کو محبوب بنالیتا ہوں تو اس کی وہ قوت سماعت بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے۔ وہ قوت بصارت بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، وہ ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے، وہ پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔ اور اس کی حقیقت جوہر نفس کا توڑنا ہے اور اس کی سب سے واضح صورت وہ ہے جو ہم نے بیان کی کہ وہ تقرر مضمحل ہوگیا۔ جس سے اللہ تعالیٰ کی ذات میں معدوم سے موجود کا امتیاز ہوتا ہے۔ چنانچہ ظاہر ہوا کہ تقرر اس کی شرحوں اور تمثیلوں سے ہے۔ اور یہ خوشی ومسرت اور تفاخر کے اوقات ہوتے ہیں۔ اور گمان یہ ہے کہ حسین بن منصور کے نفس سے یہ کیفیت ظاہر ہوئی تھی۔ اور حدیث میں ہے کہ صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی کہ وہ اپنے نفس میں کچھ ایسی کیفیت پاتے ہیں جس کا بیان کرنا بہت بڑی بات معلوم ہوتی ہے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ کھلا واضح ایمان ہے۔

اور قرب نوافل کی بہت سی قسمیں ہیں جو ایک دوسرے کے مخالف ہیں کہ اہل وظائف میں سے بہت سے لوگوں کے نزدیک یہ اشتراک لفظی سے مشترک ہے۔ چنانچہ اس کی انواع میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ سبحانہ اس کے نفس کی ہیئت میں ایسی تجلی فرماتے ہیں جو خارج میں متحقق ہوتی ہے اور وہ بہت بلند مقام اور مرکز دائرہ ہے۔ اور حدیث میں اس کی طرف اشارہ ہے، جس میں فرمایا "كنت سمعه" میں اس کی قوت سماعت ہوجاتا ہوں۔ اور اس کے مشابہ وہ ہے کہ اس امت کے صرف ایک یا دو افراد کو عطا کیا گیا جیسا کہ ہم نے ان کی قربت کا پتہ لگانے میں غور وفکر کیا اور وہ خضر اور شیخ عبدالقادر ہیں۔

اور ان میں سے ایک یہ ہے کہ نفس کی سختی جذب کی تیزی سے ٹکراتی ہے۔ چنانچہ جذب اس میں کوشش کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ سوکھی گھاس کے کانٹا جیسا ہوجاتا ہے۔ اس

کی حقیقت جاتی رہتی ہے، اوراس کی صورت باقی رہ جاتی ہے۔اور شیخ بہاؤالدین خواجہ نقش بندی اس قسم کی بلندی پر قائم تھے اوران کا جذب عمر بھر اسی طرح رہا۔

اوران میں سے ایک وہ ہے جس میں انکسار سے ہم ہیں۔اس میں ہمارا طریقہ صرف عمومی ضرورت اور اطلاق سے شامل ہوتا ہے اوراس قرب کی صورتیں حلول اور اتحاد کا مشاہدہ ہیں۔اور جوان دونوں کے مناسب ہیں اور ہمارے نزدیک اعتدال کی راہ میں یہ ہیں کہ اللہ سبحانہ نے جس بندہ کو بھی قرب عطا فرمایا، اس کے حق میں فرائض کی ادائیگی کے بعد عبادات تامہ خالصہ پسندیدہ (مرضیہ) ہے۔اور سنتوں پر دوام یہ ہے کہ اس قرب میں پوری طرح مستغرق ہوجائے اور جماعت میں مضمحل ہوجائے جس سے یہ جان جائے کہ اس مقرب کی عبادت اس کی ذات سے اس کی ذات کے لیے اس کی ذات کا حضور ہے۔اوراس کو تجلی ذاتی کہا جاتا ہے۔

چوتھے حکمت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ومن یوت الحکمة فقد اوتی خیرا کثیرا ''جس کو حکمت دے دی گئی اس کو خیر کثیر دے دی گئی۔'' اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابدال کی صفت میں فرمایا: ان کو فضیلت نہ کثرت نماز سے حاصل ہوتی ہے نہ کثرت روزہ سے، ان کو فضیلت نفس کی سخاوت وفیاضی سے حاصل ہوتی ہے۔اور ہمارے نزدیک وہ قرب وجود ہے اوراس کی حقیقت بندہ کا اس حالت پر ہمیشہ باقی رہنا ہے جس پر وہ ہے۔اس طرح کہ اس کی آنکھ اللہ سبحانہ کو سجدہ کرنے اس کی عبادت کرنے پر جمی رہے، اس کا قرب حاصل کرنے کی کوشش کرتی رہے، برائی اور فحش کاموں سے پاک وصاف رہے اور یہ علوم سابقہ، کامل عصمت کے گمان کی جگہ اور وجاہت سابقہ کے مقام کے اوقات ہیں۔

اور جب ہم اس مقام پر فائز ہوگئے تو ہمارے اوپر علم اسماء، علم تکوین، علم قرب باللہ، علم شرح، علم معاد اور علم عجائب الانسان کا کشف ہوا اور ہمیں اس لذت سے بھرا ہوا پیالہ عطا کیا گیا جس پر ہمیں ہمیشگی حاصل ہے۔اور ہم نے ایک ایسی چیز کے لیے قانون بنایا جو تشریع کے منافی ہے اور ہم ایسے میدان میں چکر لگاتے ہیں جہاں ہماری طبیعتیں لے جاتی ہیں لیکن اتباع شریعت کے میدان سے تجاوز نہیں کرتے۔جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا: اللّٰھم ادر الحق معه حیث دار ''اے اللہ! حق کو ان

کے ساتھ گھما دے جیسے بھی یہ گھومیں۔'' اور جب ہمارے ساتھ یہ دور پورا ہو گیا تو ہمیں اس کی زبان سے حکم فرمایا کہ ہم مخلوق کو اللہ سبحانہ کی طرف دعوت دیں اور ان کو نصیحت کریں اور اس طرح جب کوئی بھی دورہ پورا ہوتا ہے تو بندہ کو اس کی زبان سے حکم دیا جاتا ہے کہ منصب ارشاد پر فائز ہو جائے۔

اور لوگوں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جن کی جبلت، ذکاوت و فطانت پر بنائی گئی ہے۔ اور دوسری قسم وہ ہے جن کے کانوں کو روک دیا گیا۔ اور اس دورہ میں بندہ کے لیے خواہ وہ قطب ہو یا کوئی اور۔ کم سے کم جس چیز کی تحقیق ضروری ہے وہ تقدیر کے رازوں میں سے سکون قلب ہے۔ جیسا کہ نوافل کے قرب میں کم از کم جو چیز واجب ہے وہ احکام شرع کے ساتھ توحید کے مخالف سکون قلب ہے۔ اور اولیاء ہمیشہ ایمان پر ثابت قدم رہے۔ ان کے لیے نفس ناطقہ کی فنا کی طرف ایک راستہ ہوتا ہے۔ چنانچہ فنا ایک شعار اور ایک راز ہے۔ ان کا حال مستقل نہیں رہتا کہ اصلاً اس میں گھر کر رہ جائیں۔ ایمان ایک چادر اور عرض ہے۔ اسی پر ان کے اشارے منطبق ہوتے ہیں اور اس کی طرف ان کی عبارتیں منسوب ہوتی ہیں۔ حتیٰ کہ اس طرح کے کچھ صوفیا پائے گئے ہیں۔

ان میں سے ایک داؤد طائی ہیں پھر معروف کرخی اور سری سقطی ہیں۔ چنانچہ وہ شرح صدر میں راسخ قدم رہے اور ان کے معانی نے فنا کی طرف اشارہ کیا۔ پھر جب اس مرحلہ میں ان کے قدم فنا میں راسخ ہو گئے اور ظاہر ہو گیا کہ اس کا احاطہ اور اس کی حقیقت کو پہچاننے کا عمل مکمل ہو گیا، یہ نہیں کہ قرب نوافل، قرب فرائض سے اس کے احکام اور آثار کے ساتھ جدا ہو گیا تو اس میں اس کے بعد آنے والوں نے اس کی اتباع کی حتیٰ کہ ابو سعید اور احمد جامی کا طبقہ پیدا ہوا۔ ان کے لیے راستہ مختصر ہو گیا اور صلب نفس سے کمال ظاہر ہوا۔ اور اللہ سبحانہ نے شیخ عبدالقادر کے لیے تجلی فرمائی اور شیخ بہاء الدین کے ذریعہ جذب کی ہوا چلائی۔

پھر اللہ سبحانہ نے کمال کی نشاۃ اخری کی۔ چنانچہ شیخ محی الدین بن عربی کے لیے فنا کی حکمت سے آمیزش کر دی۔ اس سے علوم ظاہر ہوئے اور جب ظاہر ہو گیا کہ اس کا احاطہ مکمل ہو گیا تو اہل ذکاوت اس میں برابر حصہ لیتے رہے۔ پھر شیخ احمد سرہندی پائے گئے۔ وہ عیسیٰ علیہ السلام کے ظہور کے لیے ایک بنیاد ہیں۔ پھر ان پر اجمالی طور پر نور نبوت ظاہر ہوا۔ پھر میرے

اوپر انوار غیب کا فیضان کیا گیا تو میں مقام حکمت پر قائم ہو گیا۔ اور اس وقت میں یوسف علیہ السلام کا نائب تھا۔ اس لیے انبیاء کے درمیان انہی کے لیے حکمت خالص کی گئی۔ اور میرے لیے زمانہ کا ایک حصہ ٹھکانا اور ماوی بنا دیا گیا۔ اور مجھ سے اس کی زمین کی گہرائیوں میں نالیاں چلائی گئیں پھر میں نور نبوت کے لیے بے چین ہوا تو جو ہوا وہ ہوا۔ والحمد للہ رب العالمین.

پانچویں قرب فرائض ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ سبحانہ سے روایت فرمایا: میرا بندہ کسی ایسی چیز سے میرے قریب نہیں ہوا جو مجھے اس چیز سے زیادہ محبوب ہو جو میں نے اس پر فرض کی ہے۔ اب کیا میں تمہیں یہ بتاؤں کہ قرب فرائض کا یہ نام کیوں رکھا گیا اور اس کا نام قرب نوافل کیوں نہیں رکھا گیا؟ اس لیے کہ قرب ثانی جیسا کہ اس کا حق ہے ان طاعات سے حاصل ہوتا ہے جو جنس فرائض سے نہیں ہیں اور جس سے اول عطا کیا جاتا ہے اور جو اس کے لیے لازم ہیں۔ وہ اس کی جنس کی طاعات ہیں، اس لیے ان کو بطور کنایہ اجمالی استعمال کیا گیا جیسا کہ شارع کا طریقہ ہے۔ اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ سبحانہ نے اس کی نظر میں تجلی وجوبی فرمائی جو خارجی طور پر متحقق ہے تو ہمیں سب سے پہلے یہی نام سوجھا۔ اس کو ممکنات مقیدہ سے متمیز نہیں کیا جا سکتا، پھر میرے رب جل جلالہ نے تجلیات جمالیہ وجلالیہ سے میری تربیت کی۔

قریب تھا کہ جلال میرے نفس کو لے جائے اور روح کو توڑ دے اور ٹکڑے کر دے اور اس پر زمین جتنی کشادہ ہوئی تھی، اتنی ہی تنگ ہو گئی۔ اور جمال کی خوشبو اس میں سے اس طرح پھوٹی جس طرح مشک میں سے پھوٹتی ہے، جو سب سے زیادہ وسیع اور کشادہ تھی۔ اور سب سے زیادہ چشم پوشی کرنے والی اور سب سے زیادہ دیکھنے والی ہو گی۔ اس طرح ان دونوں سے نعمت تام ہو گی اور نسمۂ روح غائب ہو گئی۔ اور اسم عام ہو گیا اور اس طرح مطلق ہو گیا کہ نہ اس کی ضد رہی نہ مثل۔

اور مجھے میرے رب جل جلالہ نے سمجھایا کہ جو نام مطلق ہو گیا۔ اس کی علامات میں سے یہ ہے کہ بندہ اس کے مقتضا میں نفوس العالمین کی اتباع کرے اور کسی بھی ضرورت کے لیے اس مشاہدہ کی طرف دفع کرے جو عموم میں قوی اور اطلاق میں شدید ہے اور جب ہم سے یہ دورہ ختم ہو گیا تو ہم سے چند امور پر عہد لیا۔

ایک یہ کہ میں اپنے قلب وقالب کو ہمیشہ اس کی طاعت کے لیے فارغ رکھوں اور دوسرے جو شخص بھی میری طرف مائل ہو یا جس نے دل اپنا میری تائید میں متوجہ کیا یا تو صرف ایمان کی طرف یا دوسری قربتوں کی طرف اور اس کو غیر اللہ کی عبادت یا اس سے استعانت کرنے اور ختم قرآن کی مجلس اور توحش اور جوان دونوں کے مناسب ہوں، ان سے روک دوں۔ اور تیسرے میرے اور کسی اور کے درمیان محبت کا صرف ایسا ربط ہو جو اللہ کے رنگ میں رنگا ہوا ہو۔ چوتھے انبیاء کے راستہ پر چلوں اور ان کی سنت کی اتباع کروں۔ پانچویں جب تک زندہ رہوں دنیوی زندگی کی ظاہری رونق کی طرف میلان رکھنے والے علماء میں سے نہ ہوں، تا کہ دنیا اور اس کے طلب گاروں کی طرف علم یا معاملہ کے لحاظ سے مائل ہو جاؤں۔ چھٹے قرب ملکوتی ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جب کسی بندہ سے محبت کرتے ہیں تو جبرئیل کو بلاتے ہیں اور فرماتے ہیں، میں فلاں شخص سے محبت کرتا ہوں، اس لیے تم بھی اس سے محبت کرو۔ آپ نے فرمایا: جبرئیل اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ پھر آسمان میں منادی کرتے ہیں، اور فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فلاں شخص سے محبت کرتے ہیں۔ اس لیے سب اس سے محبت کرو تو اہل آسمان اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ پھر اس کے لیے زمین میں مقبولیت رکھ دی جاتی ہے۔ اور اللہ سبحانہ نے فرمایا ہے: إن الذين آمنوا وعملوا الصالحات سيجعل لهم الرحمن ودا ”یقیناً جو لوگ ایمان لے آتے ہیں اور عمل صالح کر رہے ہیں، عنقریب رحمٰن ان کے لیے دلوں میں محبت پیدا کر دے گا۔“ (مریم:۹۶) اور اس کی حقیقت اسم طالع کو اپنے دل سے دوست رکھنا ہے۔ اسماء مقرب فرشتوں اور انبیاء مرسلین کے سینوں سے طلوع ہوتے ہیں۔ اسماء میں سے جو بھی اسم ہوتا ہے، اس کا کمال متحقق ہوتا ہے، اور اس اسم میں اس کے نور کا عکس پایا جاتا ہے۔

حکایت

سکندر کے پاس چین اور روم کے مصور جمع ہوئے، ان میں سے ہر فریق یہ دعویٰ کر رہا تھا کہ وہ دوسرے کے مقابلہ میں زیادہ اچھی تصویر بناتا ہے۔ اور اس کے نقش زیادہ لطیف ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان کے درمیان ایک دیوار تقسیم کر دی اور حکم دے دیا کہ اس پر وہ جو چاہتے ہیں بنائیں۔ چنانچہ اہل چین نے بڑی محنت سے نقش ونگار بنائے اور اہل روم نے اتنا

کچھ کیا کہ اس سے زیادہ صفائی نہیں کر سکتے تھے حتیٰ کہ اس کو آئینہ کی طرح بنا دیا۔ چنانچہ جب ان کے درمیان سے پردہ ہٹایا گیا تو صورت کا عکس لطافت اور چمک سے نظر آنے لگا جس کی وجہ سے اہل چین مغلوب ہو گئے۔

اور جب دورہ درمیان میں آ گیا تو سارے عالم کو ہماری ہتھیلی میں رکھ دیا گیا۔ تدبیر کے لحاظ سے بھی اور تسخیر کے لحاظ سے بھی۔ اور ہمیں شریعت کے منبع اور اس کے لیے انبیاء کی شرحوں کی تفصیل اور تفسیر کے ساتھ اطلاع دی گئی اور جب ہر کمال کی انتہاء میں عکس منتہی ہو گیا، آدم سے لے کر اس آخری شخص تک جو قیامت کے قریب پایا جائے گا، ہو گیا اور ہو جائے گا۔ تو وہ ہر کمال کے لحاظ سے اس کی وحدت پر بہت خوش ہوا اور ان کے علوم احوال اور ان کے مقامات سب کا اکیلا متحمل ہو گیا۔ اور محبوبیت کے ساتھ اس کی تخصیص اس کی جمیل خوشنمائی کی مانند ہو گئی اور زیورات سے آراستہ ہو گئی پھر جس نے اس کو دیکھا سو دیکھا پھر وہ اپنی جان سے گیا اور کل کی شام آج نہیں دیکھ پایا۔ اور وہ سید المرسلین وسند المقربین صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام ہے اور مجھ سے کہا گیا، میں تمام امور میں اور ان کی جزئیات میں ظاہراً اور باطناً تمہارا ولی ہوں۔ اور میں تمہارے لیے قریب ترین عزیز سے بھی زیادہ رحم کرنے والا ہوں۔ تم اس بات سے بچو کہ میرے سوا کسی کو قبول کرو۔ اور کون سا نقصان پہنچانے والا اس سے زیادہ نقصان پہنچا سکتا ہے جس پر میرا غضب میری محبت اور میری برگزیدگی سے زیادہ اثر انداز ہو۔

ساتواں دورۂ کمال ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مردوں میں سے بہت سے لوگ کامل ہوئے ہیں لیکن خواتین میں سے خدیجہ بنت خویلد، مریم بنت عمران، آسیہ زوجہ فرعون اور فاطمہ بنت محمد کے سوا کوئی کامل نہیں ہوئی۔ اور اس کی حقیقت بندہ کو اس کے مختلف قسم کے کمالات کے ساتھ منفرد کرتا ہے کہ وہ اللہ سبحانہ کی طرف متوجہ ہو۔ اپنی زبان کی استعداد کے مطابق اس سے سوال کرنے والا ہو۔ چنانچہ کمال کی دوسری قسم عطا کی۔ وہ پورے کا پورا ان چھ عناصر کے امتزاج سے حاصل ہوا۔ ان پر صورت مقدسہ کا فیضان ہوا اور وہ اس دورہ میں حبیب اللہ (یعنی شاہ صاحب) ہیں جو کہ یوسف علیہ السلام کے مشابہ ہیں، پھر یکے بعد دیگرے نمو ہوتا رہا حتیٰ کہ خاتم النبیین ہو گئے۔ (یعنی صورت مقدسہ کے فیضان کے حوالہ سے)

اور اس دورہ میں جو واقعہ ہوا اس نے حقانیت کا لباس پہنا۔ اس سے میری مراد یہ ہے

کہ اس کے تمام ملکاؤں کا نظام اس طرح اثر انداز ہوتا ہے جیسے قرب نوافل کے نزدیک صلب نفس پر اثر انداز ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کی شجاعت، سخاوت، فصاحت اور ذکاوت وہ نہیں ہیں جن پر جمہور لوگوں کا توارد ہوتا ہے بلکہ حق اس کی تمام صفات میں ہلکے سایہ کی طرح ظاہر ہوتا ہے۔ پھر اس کی ہر نسبت اس کی طرف اثر انداز ہوتی ہے، تو ایسا ہو جاتا ہے کہ جو اس سے محبت کرتا ہے وہ اللہ سے محبت کرتا ہے، اور جو اس سے بغض رکھتا ہے، وہ اللہ سے بغض رکھتا ہے۔
اور اللہ سبحانہ نے اپنے حبیب کے کمال کے بارے میں خبر دی۔ جیسا کہ فرمایا: وما رمیت اذ رمیت ولکن اللّٰہ رمی "جب تم نے کنکریاں پھینکیں تو تم نے نہیں بلکہ وہ اللہ نے پھینکیں۔" ومن یطع الرسول فقد اطاع اللّٰہ "جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔" قل إن کنتم تحبون اللّٰہ فاتبعونی یحببکم اللّٰہ "آپ فرما دیجئے اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو تب اللہ تم سے محبت کرے گا۔" یہ سوال اور استعاذہ (پناہ طلب کرنے) کا مقام ہے جیسا کہ حدیث قرب میں ان دونوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔
اور یہ جان لو کہ یہ متشابہ ہے۔ اس لیے کہ اس میں ترتیب کی رعایت کے بغیر اقترابات اور ان کے لوازم جمع ہو گئے۔ اس کی تفسیر سے اس کے ورثاء میں سے صرف افراد ہی رو کتے ہیں۔

اور جب ہم سے یہ دورہ شروع ہوا۔ دراں حالیکہ میں عصر کے بعد بیٹھا ہوا تھا۔ گویا کہ میرے سارے کپڑے اتار لیے اور میں بالکل ننگا ہو گیا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تجلیوں میں سے ایک تجلی حاضر ہوئی اور وہ میرے بائیں جانب کھڑی ہو گئی۔ اور میں نے حقانیت کا لباس پہن لیا تو روح چیخ اٹھی۔ اور کہنے لگی حق حق حق۔ پھر مجھے اطمینان حاصل ہو گیا تو یہ مجمل طور پر حقانیت کا فیضان تھا۔ پھر میرے اوپر سے دائیں سے اور بائیں سے دائمی بارش کا فیضان ہوا۔ جو کہ اس کی لغت کی زبانوں سے تھا اور اس کے وصف سے سینے تنگ ہو گئے۔ فالحمد للہ رب العالمین۔ اور یہ آخری امر ہے جس کے اس طریقت میں سے میں نے مجمل طور پر اشارہ اور امر میں بیان کرنے کا ارادہ کیا جو مجھے عطا کیا گیا۔

۱۳۶- تفہیم:

ان ساتوں ادوار میں ہر نبی کا مخصوص مقام ہے

جب میرے نام نے ملائکہ مقربین کے ناموں کے ساتھ دوستی کی تو اس میں ان تمام کمالات کا عکس پیدا ہو گیا۔ جو آدم سے لے کر قیامت کے قریب آنے والے آخری آدمی میں پائے گئے اور پائے جائیں گے۔ پھر ان سے ایک جملہ متحقق ہوا۔ جڑ پکڑنے والے کمال کو میں نے سمجھ لیا اور جس کمال کی اتباع کی جائے وہ ضمناً باقی ہیں۔ اور ہر نبی کے اپنے مقامات ہیں۔ ان میں کچھ وہ ہیں جو اس کو ہاتھ میں دیدیئے جاتے ہیں۔ اور کچھ وہ ہیں جو اس کو درجہ اور قربت عطا کرتے ہیں۔ اور ہر نبی کے لیے ان ساتوں ادوار میں سے مقام مخصوص ہے۔ اس کا حکم اس کی طرف عزت پاتا ہے اور وہ اس میں امام ہوتا ہے۔ اگرچہ اجمالی طور پر ان کے کمال کی طبیعتوں میں ادوار کا مکمل عبور ہوتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے سلطان ایک شہر میں مستقل طور پر رہتا ہے پھر اپنے لشکروں کو آفاق میں دور دور تک بھیج دیتا ہے۔ جو ان ملکوں کو مسخر کر لیتے ہیں۔ چنانچہ تمام شہر ملک اور سلطنت کے لحاظ سے برابر ہوتے ہیں اور جس شہر میں بادشاہ رہتا ہے۔ وہ اس کے لیے کچھ خصوصیات رکھتا ہے۔

آدم علیہ السلام اپنی روح کے کمال میں شدت کے ساتھ علاج کرتے رہے حتیٰ کہ صبح ظاہر ہو گئی۔ اور حق واضح ہو گیا اور اس لیے ان کے مجاہدات شیطان کے ساتھ تھے۔ اور ان کے مقامات اور علوم روح کے کمال میں پیدائش اور تکمیل کے لحاظ سے تھے۔ اور ان کے علوم میں سے ایک علم یہ ہے کہ الفاظ کے معانی کے مقابلہ میں رکھ دیا گیا۔ اور ادریس علیہ السلام روح کی فنا میں شدت کے ساتھ علاج کرتے رہے، وہ روزہ رکھتے تھے اور افطار نہیں کرتے تھے۔ راتوں کو قیام کرتے تھے، اور سوتے نہ تھے حتیٰ کہ صبح ظاہر ہو گئی۔ پھر ان کو آسمان پر اٹھا لیا گیا۔ اور ان کے علوم میں سے علوم ہیولی وصورت اور علم نجوم ہیں۔ اور ان کی تقلید ان کے مقام اور علوم میں فلاسفہ نے کی، پھر انہوں نے تحریف کرنی شروع کر دی حتیٰ کہ ان کے پاس سے نکل گئے۔

اور نوح علیہ السلام صاحب قرب نوافل ہیں۔ اور اللہ سبحانہ نے ان کی نظر میں ان کے نفس ناطقہ کی ہیئت سے پوری پوری تجلی فرمائی۔ چنانچہ ان کے نفس نے قوت ملکوتیہ کا کسب کیا

اس لیے اپنی قوم کی ہلاکت کا شدید اور مؤثر فیصلہ کیا۔ اور وہ زمین پر پہلے رسول ہیں جو شریعت لے کر آئے۔ اور اپنی قوم کے ساتھ بحث ومباحثہ کیا اور وہ اس لیے کہ یہ ان قربتوں میں سے پہلا قرب ہے جن میں اللہ کے رنگ میں رنگا جاتا ہے۔ اور ان کے علوم میں سے علم تدبیر وتسخیر ہے۔ اور ان کے بعد ہود وصالح علیہما السلام آئے اور انہوں نے اپنا کام کیا اور ابراہیم علیہ السلام صاحب قرب الوجود ہیں لیکن جب وہ صاحب قرب شدید ہوئے تو قرب الوجود ان پر قرب فرائض سے مشتبہ ہوگیا۔ اور ان کے علوم میں سے علم حکمت ہے۔ کیا تم نے دیکھا نہیں کہ انہوں نے واجب الوجود کے اثبات میں استدلال کیا اور لوط واسماعیل اور اسحاق ویعقوب علیہم السلام ان کے مقابل ہوئے ہیں۔ اور اپنے نفسوں کی تربیت قرب کے لیے کرتے ہیں۔ ان کی حکمت نقل کی گئی، پھر جب یوسف علیہ السلام پائے گئے۔ انہوں نے اپنا نفس اور اس کی طرف جو لے جاتا ہے، سب کچھ ترک کردیا۔ اس طرح حکمت ان کے لیے خالص کردی گئی۔

اور شعیب علیہ السلام گویا کہ موسیٰ علیہ السلام کی بنیادوں میں سے تھے۔ آپ صاحب قرب فرائض تھے، اور موسیٰ علیہ السلام قرب فرائض میں راسخ القدم تھے۔ چنانچہ آپ سے نظام پر اثر انداز ہونے والے آثار صادر ہوئے۔ آپ کے لیے پہاڑ کو اوپر اٹھایا گیا اور پتھر سے پانی کے چشمے پھوٹ نکلے اور سمندر پھٹ گیا۔ اور بہت وسیع ہوگیا۔ آپ سے ملک ووعظ وغیرہ کے شعبے نکلے۔ پھر ان کے بعد انبیاء آئے جو ان کے شعبوں میں سے کسی شعبہ میں مضمحل رہے۔ اور قرب فرائض سے ان کو اختیار کرنے کے بعد ان کو مکمل کرتے ہیں۔ چنانچہ یوشع علیہ السلام صاحب ملک تھے۔ اور شعیب علیہ السلام کو ان کی ساری امت نے اذیت پہنچائی تو اللہ نے اس امت کے عذاب کو ایک کلمہ پر موقوف رکھا۔ چنانچہ جب ان لوگوں کے شر اپنی حد کو پہنچ گئے تو آپ نے وہ کلمہ کہہ دیا۔ چنانچہ آپ کی زبان مبارک سے وہ کلمہ اضطراری طور پر نکلا، پھر زکریا علیہ السلام پائے گئے۔ آپ عیسیٰ علیہ السلام کے لیے بنیاد تھے۔ انہوں نے قرب ملکوت کسب کیا، پھر عیسیٰ علیہ السلام خالص ملکوتی ہوگئے۔

اور جان لو کہ فرشتے اگرچہ احیاء اور تربیت میں قوی ہیں۔ ان کی تاثیر شجر کے اگنے کی جگہ میں پانی کے حلول کی مانند ہے۔ جو ہر شاخ اور پتہ تک صرف درخت کی طبیعت کی پراگندگی کے مطابق پہنچتا ہے۔ اور عیسیٰ علیہ السلام چونکہ عالم کے لیے ہیں، اس سے اوپر نہیں ہیں،

ان کی تاثیر خرق عوائد کا جزئیہ ہے۔ چنانچہ آپ نے مردوں کو زندہ کیا اور مادر زاد اندھوں اور برص کے مریضوں کو ٹھیک کیا۔

اور رسول اللہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم دورۂ کمال میں نشاۃ اول کے طور پر پیدا ہوئے۔ آپ کے لیے تمام اقترابات بیک وقت جمع ہوئے۔ آپ صاحب کتاب متعین ہیں۔ اور آپ کے علاوہ جو صاحب حکمت متعینہ ہیں آپ ان سب میں زیادہ ہیں۔ آپ کا شرح صدر ہوا اور معراج ہوئی۔ یہ دونوں امر اس دورہ جامعہ سے ہیں۔ اور آپ پر نبیوں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ یعنی آپ کے بعد کوئی ایسا نہیں پایا جائے گا جس کو اللہ سبحانہ تشریع علی الناس کا حکم فرمائیں۔

اور ابو بکر رضی اللہ عنہ دورۂ کمال میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا کرنے والے ہیں۔ آپ کا کمال بہت جمیل و حسین ہوا۔ اور اس کے ذریعہ آپ نے اللہ سبحانہ کی طرف توجہ فرمائی۔ اور عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وراثت میں قرب فرائض پایا۔ اور عثمان رضی اللہ عنہ قرب وجود میں مقام قسط پر ہیں۔ پھر دورۂ ایمان اور شرح صدر میں اترے۔ اور علی رضی اللہ عنہ حکمت کاملہ ہیں۔ پھر قرب ملکوتی کی طرف گئے، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شرح کے لیے شرح میں اترے، پھر اس میں قیام پذیر ہوئے۔ اس لیے آپ کا نام وصی رکھا گیا اور یہی وصایہ ہے۔

۱۳۷- تفہیم:

صاحب ظاہر، صاحب باطن اور صاحب فردیت کا ذکر

صاحب ظاہر کے ارشاد و تلقین میں سرعت ہوتی ہے، گویا وہ حیران ہوتا ہے اور صاحب باطن کی صحبت میں انتہائی سست رفتار ہے، اور صاحب فردیت اصول کمالات کا جامع ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اولیاء کا جب انتقال ہو جاتا ہے۔ اس کے کرم، اشراف اور کرامت سب معدوم ہو جاتے ہیں اور ان کے نفس پر تجلی سالع کے سوا کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ اور یہ اصل ہے اور دیگر فروع ہیں۔ اور اس کے فروع نور اور اس کے مفرور اس کے انوار کے بغیر ہاتھ میں تجلی آتی ہے۔ اور اس کے فروع کہ دیر ماندگی اور اس میں خوشی کے ساتھ ہاتھ میں مقام نہیں آتا ہے۔ اور اسی طرح حکمت اور اس کے اصول کی مفہمیت کو جمع کرتا ہے۔ اور اس جہان میں معلوم ہوگا کہ کام اصول سے ہوتا ہے نہ کہ فروع سے۔

۱۳۸-**تفہیم:**

بصیر کے معنی اور مفردین کا ذکر

تمہارا یہ کہنا کہ بصیر کے معنی بصر کی صورت میں تجلی ہے۔ تمہارے اس مقام سے قریب ہے جس میں تم قائم ہو۔ اس لیے کہ تمہارا وہ تقرر جس کے ساتھ تم نشاۃ نفوس میں ہو، حق کے تقرر میں اضمحلال آ گیا اور جو حق کے تقرر میں مضمحل ہو گیا وہ ہر تقرر کو اپنی نشاۃ میں مضمحل دیکھے گا۔ اس لیے تم نے بصر کے لیے حق میں اضمحلال دیکھا۔ اور اس سے پہلے کہ تم اپنے مقام میں ہو تمہارے اندر جو جمع کیا گیا وہ یہ ہے کہ بصیر سے مراد ایسی ذات ہے جس کی خصوصیت اس کی بصیرت میں ظاہر ہو۔ اس طرح تمہارا مقام تمہارے علم کے مشابہ ہو گیا اور یہ علم دوہرا ہو گیا اور اس طرح اہل مقام وحال میں سے ہر شخص کا مقام اس کے علم کے مشابہ ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کو علوم حاصل ہو جاتے ہیں۔ اور وہ اس کے مقام اور اس سے نیچے کی طرف نسبت سے حق ہے اور جو مفرد لوگ ہر چیز کا احاطہ اوپر سے کرتے ہیں ان کے نزدیک کل کا انکشاف اس سے ہوا، جو اس کے نفس میں ہے اور جس کے ساتھ وہ ہر قوم کے نزدیک ہے

مصلحت نیست کہ از پردہ برون افتد راز
ورنہ در محفل رنداں خبرے نیست کہ نیست

''یہ بات مصلحت کے مطابق نہیں ہے کہ راز فاش ہو جائے، ورنہ رندوں کی محفل میں کوئی خبر ایسی نہیں ہے جس کا علم نہ ہو۔''

ہمارا یہ کہنا کہ مفردین ان کے نفوس کا احاطہ تجلیات سے کرتے ہیں، نہ کہ کرنوں اور ان کی روشنیوں سے، تو اس کے معنی گہرے ہیں۔ اپنے جوامع قلب سے دھیان سے سنو کہ حق کی ہر تجلی اس کی عبادت، اس کی عبادت کے حق کے طور پر کرتی ہے۔ جو اس کے نیچے ہو وہ گمان کرتا ہے کہ حق اس میں اس کے مقام کے لحاظ سے محصور ہے۔ اگر چہ علم اس کی فکر اور نظر کے لحاظ سے ہو کہ حق کے لیے اس کے ماسوا میں بھی اس شخص کی طرح ظہور ہے جس پر حق نے اولیاء کی جہت سے مثالی تجلی فرمائی، تو وہ اس کی عبادت اس طرح کرتا ہے کہ اس کی عبادت عین عبادت ہوتی ہے، اور اس کی معصیت عین اللہ کی معصیت ہوتی ہے۔

اور جس نے عالم مثال میں عموماً اور اس تجلی میں خصوصاً اس کے فاعلات، قابلات، اس کے نکات اور اس کے اسرار کی جانب سے علم کا احاطہ کرلیا تو اس کے نزدیک وہ اس کے دور کرنے سے نہیں ہے، بلکہ اس کی اتباع کرتا ہے۔ اس لیے کہ حق کی صورتوں میں سے اس نشاۃ میں وہ ایک صورت ہے، اس کی عبادت میں اور پہلی عبادت میں واضح فرق ہے۔ اور اس طرح جو انبیاء علیہم السلام میں سے کسی نبی کی امت سے ہو۔ وہ اللہ کی معصیت اس عمل کے ارتکاب میں دیکھتا ہے جس کو اس نبی نے اس کے حال کی طرف سے حرام قرار دیا ہے۔ اور جس نے اس کے فکر کو قبول کیا، اس کا علم یہ ہے کہ وہ حلال ہوسکتا ہے، نبی کے نزدیک نہیں تو اس وقت وہ معصیت نہیں ہوگی۔ چنانچہ اللہ سبحانہ اس نبی کے ظہور کے دو چند اضافات میں تجلی فرمانے والا ہے۔ اس پر اس کے عرفان کے لحاظ سے معاملہ کرتا ہے۔

اور جس نے انبیاء کے علوم کا ان کے ظاہر سے اور باطن سے بھی احاطہ کرلیا۔ تو اس سے یہ حجاب سر پر چلا گیا، یعنی اٹھ گیا۔ اگرچہ اس نے بعینہٖ نبی کی اتباع کی تو اول کا وہ عقیدہ ہوگا جو دوسرے کا نہیں ہوگا۔ اور اس طرح تجلیوں میں سے ہر تجلی کا معاملہ ہے۔ چنانچہ فانی کسی بھی تجلی میں ہو، اس کے لیے عموم ہوگا اور تجلی کی طرف نسبت سے شمس وقمر کی طرف نسبت سے کرنوں اور روشنیوں کی طرح اس کے مثال احوال ہوں گے۔ اور یہ کرنیں ان کے دوروں پر ہیں یعنی اس طرح کہ وہ قابل اور فاعل کے ملاحظہ کے بغیر خالص ہیئت پر ہوں گے جو مفردین کے نزدیک باقی نہیں رہتا۔ اور مفردین کے نزدیک یہ ہے کہ یہ کرنیں نشاۃ اور ان عالموں اور دنیاؤں سے ملحق ہیں جو اللہ سبحانہ سے قابلات اور فاعلات سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور ہم نے جو کہا ہے کہ اولیاء مر جاتے ہیں، پھر ان کے اشراقات وکرامات معدوم ہو جاتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اولیاء جب مر جاتے ہیں تو وہ ان کمالات کی طرف چڑھ جاتے ہیں جو ان کے دنیاوی کمالات سے زیادہ عام ہیں۔ اس وقت ان سے کرامات ساقط ہو جاتی ہیں اور وہ متفاوت ہوتے ہیں۔ ان میں زیادہ پاکیزہ بھی ہیں اور زیادہ لطیف بھی، زیادہ سریع بھی اور زیادہ غبی بھی، زیادہ سخت بھی اور زیادہ مؤخر بھی۔ یہاں تک کہ وہ جمع ہوگئے اور بالکلیہ ساقط ہوگئے اور کوئی چیز باقی نہ رہی۔ اور یہ وہی ہیں جن میں لوگ پناہ لیتے ہیں، چڑھ گئے۔ اور ان کے کمال کی صورت کے علاوہ ان سے کچھ بھی باقی نہ رہا۔ اور جن میں سے وہ ہیں اگر ان میں سے تیز رفتار سے چلنے

والے ہیں تو صورت بھی باقی نہیں رہی۔ اور مبتدیوں کے استفاضوں میں سے کچھ بھی حادث نہیں ہوگا۔ بیشک ہر پتھر یوسف ہے یعنی یوسفؑ نے کنویں میں اللہ کی رحمت کو قریب پایا، جیسا کہ کہا گیا ہے۔ اگر وہ پتھر پر ہمت جمع کر لیں تو وہ اللہ کی رحمت کو قریب ہی پالیں۔ اس طرح کہ وہ اپنے کمال کی صورت میں ہوں گے اور اس کے اثر کے بقایا ہوں گے۔

اور جان لو کہ جس نے تجلی الٰہی کا حکم لگایا یعنی تجلی کسی بھی نشاۃ میں ہو تو اس شخص کے حق میں جو حق کو اس میں محصور سمجھتا ہے۔ جیسا کہ ہم نے کہا کہ اس کے اوپر اس کا فیضان ہوگا جو اس نے اپنے قول اور حال سے طلب کیا۔ اور وہ اس کے پاس ہوگا جب اس کو پکڑے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فرمایا: ''آب زمزم جب اس کو پیا اور قرآن جب اس کو پڑھا''۔ بعینہ اس راز کے لیے ہے۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ وہ کسی چیز کی طلب کے موافق نہیں ہوتا۔ سوائے اس کے جو اس تجلی کے یا کسی دوسری تجلی کے نزدیک ہو۔ اس تجلی کی طرف اس کی نسبت کپڑے سے بنے ہوئے شیر کی طرف ہوا کی نسبت کی مانند ہے۔ یا اس کی تجلی کے نزدیک وہ ربط ہے جو تجلی سے ہے۔ اور تفصیل کے مطابق نہیں ہوتا۔ اور افاعیل کے مبادی کا بعض کا بعض سے امتیاز ہے۔ بخلاف مفرد کے کہ اس کے نزدیک ہر تجلی کی ایک مقدار ہے۔ اور اس کی استطاعت نہیں رکھتا کہ اس سے طلب کرے یا اس سے امید رکھے سوائے اس کے جو اس کی نظر میں اس کی مقدرت میں، تفصیلی تمیزی ہو۔ اور یہ حکمت اللہ تعالیٰ کے قول انا عند ظن عبدی بی کے بطن سے ہے۔

اور تمہارے اوپر واجب ہے کہ ان مثالوں میں مشغول نہ ہو جو میں نے عارف سے بصیر میں بیان کی ہے۔ بلکہ جب وہ سامنے آئے تو اس بارے میں غور کرنا بند کر دو اور اپنے نفس کو روک لو یہاں تک کہ کتاب اپنی اجل کو پہنچ جائے۔ اس وقت تمہارے اوپر بے شک معارف کی بارش ہوگی اور تمہارے سامنے سے اور پیچھے سے اور دائیں سے اور بائیں سے تمہارے اوپر تیزی سے گریں گے۔ اور تمہارے حق میں مجھے سب سے زیادہ محبوب یہ ہے کہ دس دن کا اعتکاف کرو۔ پھر جب تم اپنے معتکف میں داخل ہو تو دو رکعت نماز پڑھو۔ اور اللہ سبحانہ سے تشویشوں کا رفع ہونا اور تجلیات کا بہاؤ طلب کرو۔ پھر ذکر کثیر اور حضور قلب اور دائمی سوال پر قائم ہو جاؤ۔ گویا کہ تم بعینہ سوال ہو اور تم عجائب دیکھو تو مجھے ان کے بارے میں خبر دو۔ اور ان سے

میری آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچاؤ۔ ماشاء الله لا حول ولا قوة إلا بالله توكلت عليه وفوضت امري إلى الله سبحانه وبحمده "اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے، میرے اندر تو نہ ہمت ہے نہ قوت مگر سب کچھ صرف اللہ کے فضل و کرم سے ہے۔ میں اسی پر توکل کرتا ہوں اور اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔ اس کی ذات پاک ہے اور حمد اسی کے لیے ہے۔"

۱۳۹۔ تفہیم:

اسم رحمٰن کی طرف پہنچنا جو کہ اصل تجلیات ہے اور ان کے لیے تمام تجلیات منکشف ہوئیں

جان لو کہ زبانیں گنگ ہو گئیں، لغتیں فوت ہو گئیں، اشارے ختم ہو گئے۔ آج میں نے بیان کو کمال تک پہنچا دیا اور اس سلسلہ میں ایک کے بعد ایک تجلی، ایک کے بعد ایک راز اور ایک کے بعد ایک میدان عبور کرتا گیا، حتیٰ کہ اسم رحمٰن تک پہنچ گیا جو تجلیات کی اصل ہے۔ اور ان کے معاملہ کا سرمایہ ہے تو اس کے ذریعہ میں جہاں تک پہنچ سکتا تھا پہنچ گیا۔ پھر وہ میرے معدن میں اتر گیا تو میں نے ہر وہ مقام، علم اور کمال دیکھا جو نوع انسانی کے اول افراد کو حاصل ہوا۔

میں یہ نہیں کہتا کہ یہ آدم ہے، بلکہ آدموں میں پہلے آدم سے اس آخری شخص تک جو زمانہ کے ختم ہونے اور افلاک کے ہموار ہو جانے کے وقت پایا جائے۔ خواہ اس کو اس دنیا میں حاصل ہو یا قبر میں یا حساب میں یا جنت میں، میں نے ان سب کا احاطہ اس طرح کر لیا کہ کوئی امر باقی نہیں رہا۔

اور شائد کہ کہنے والا کہے کہ یہ کیسے ممکن ہے اور اس کی صورت کیا ہے؟ تو میں کہتا ہوں کیا اللہ سبحانہ نے ہر فعلیت کا اس طرح احاطہ نہیں کیا کہ نہ کسی چھوٹی چیز کو چھوڑا نہ بڑی کو مگر اپنی خالص وحدت میں سب کا احاطہ کر لیا۔ چنانچہ تمام کمالات اور فعلیات کا سرمایہ اس کے لیے ایک ہو گئے۔ اس طرح یہ تجلی ہے۔ اس نے ہر تجلی، ہر مقام اور ہر علم کا احاطہ کر لیا۔

یہ تجلی علم کی طرح عین تجلیات ہے۔ تجلیات کی تفصیلات کے ساتھ علم حضوری کی حیثیت سے جو ہمارے نزدیک علم ہے اور علم حصولی جہل ہے جو اس کا نام علم رکھتا ہے وہ جہل کو علم سمجھتا ہے اور میں نے اس تجلی کو اس طرح گلے سے لگا لیا کہ اس کا ہر جزء میرے ہر جزء میں داخل ہو گیا یا یوں کہوں کہ میں نے اس کو نگل لیا حتیٰ کہ وہ اس طرح چلا جیسے پانی نالیوں میں

چلتا ہے۔ یا یہ کہوں کہ میں وہ ہوگیا اور وہ میں ہوگیا۔ بلکہ میں ایسا کوئی لفظ نہیں پاتا جس سے اس کا اظہار کروں جو میں ظاہر کرنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ میں ان تمام کے لیے جامع ہوں جو اس تجلی نے جمع کیے۔ والحمد للہ

چنانچہ میں پہچانتا ہوں کہ قبر میں کون سی تجلی ظاہر ہوتی ہے اور حساب میں کون سی تجلی ظاہر ہوتی ہے اور جنت میں کونسی تجلی ظاہر ہوتی ہے۔ یہ سب تجلیات میرے پاس موجود ہیں بلکہ میرے سینہ میں ہیں۔ میں نے ان کا احاطہ اس طرح کرلیا ہے جیسے کلی جزئی کا احاطہ کرلیتی ہے۔ اور میں نے افلاک، معادن، اشجار، بہائم، ملائکہ، جن، لوح، قلم اور اسرافیل اور ہر اس چیز کے کمال کا مکمل اور شامل احاطہ کرلیا جو وجود کے تحت داخل ہے۔

پھر جب میں اس تجلی تک پہنچ گیا تو اللہ سبحانہ اپنی عزت وشان کے ساتھ ظاہر ہوا اور ہزار، ہزار تجلیوں کے ساتھ رحمان کی طرح احاطہ کرلیا بلکہ متناہی کو غیر متناہی سے کوئی نسبت ہی نہیں ہے۔ چنانچہ ہر معاملہ سے طیب معاملہ اور ہر رحمت سے زیادہ لذت دار رحمت، ہر علم سے زیادہ شامل علم حاصل ہوگئے۔ تو میں نے اس میں اپنے کمال کے لحاظ سے عرفان حاصل کرلیا۔ جس کا بعد میں ذکر کروں گا۔ چنانچہ جس نے میرے بارے میں تحقیق کی، اس نے میرے لیے کوئی کمال نہیں پایا بلکہ میں کمال ہوں اور کمال میں ہوں اور میرے ہاتھ، میرے پیر، میرا چہرہ اور میرا سینہ کمال ہے۔ میں قبر میں اپنے کمال کے لحاظ سے داخل ہوا اور میں انتظار کرتا ہوں کہ ہر کمال اس طرح داخل ہوجائے کہ گویا وہ میرے اندر داخل ہے۔ اس لیے شاید میرا وجود قیامت کے دن کمال کے لیے قائم ہوجائے۔ اور ہمارے کچھ اسرار ہیں، میں ان کو بیان نہیں کرسکتا، اس لیے میں نے کہا ہے

وعندی علوم لا یکاد یحیطها
سماء ولا برو بحر وساحل

"میرے پاس علوم ہیں جن کا کوئی احاطہ نہیں کرسکتا، نہ آسمان نہ بحر نہ بر اور نہ ساحل۔"

ولکن ابناء الزمان وجدتهم
تساوی لدیهم عاقل ثم غافل

"لیکن میں نے اہل زمانہ کو ایسا پایا کہ ان کے نزدیک عاقل وغافل سب برابر ہیں۔"

۱۴۰- تفہیم:

اللہ تعالیٰ کے بندہ کو برگزیدہ بنانے کے مراتب

جان لو، اللہ تم پر رحم و کرم فرمائے کہ جب اللہ بندہ کو اس ذکر کے گرد برگزیدہ بنالیتا ہے جس کو یادداشت کہتے ہیں جو آواز، حروف اور اشارہ قلبیہ وغیرہ سے خالی ہوتا ہے جن کو عام لوگ اپنے حق میں تجلی الٰہی پاتے ہیں۔ اس سے ارشاد و کرامات وغیرہ کا امر لقم پاتا ہے۔ پھر جب کبھی اللہ تعالیٰ اس کو دوبارہ پسندیدہ قرار دیتا ہے تو اس کو وہ قوت عطا فرماتا ہے جس سے نفس ناطقہ کے تعین سے قبل تعین پر مطلع ہوتا ہے۔ تب یہ تجلی الٰہی مضمون ہو جاتی ہے گویا کہ یہ موجود ہی نہیں ہے۔ جیسا کہ اس کا اضمحلال شیخ ابن عربی کے نزدیک ہے۔ پھر اس کو دوبارہ برگزیدہ بناتا ہے تو اس پر اس تعین کی تجلی فرماتا ہے جس کو ہم نے پہلے عین کہا ہے، تب اس کو کمال کی دوسری قسم حاصل ہوتی ہے۔ پھر کبھی دوبارہ اس کو منتخب کرتا ہے تو یہ تجلی مضمحل ہو جاتی ہے اور وہ بعینہٖ اسم رحمٰن ہو جاتی ہے۔ حتیٰ کہ اس تجلی والا یہ سمجھتا ہے کہ وہ اور اسم رحمان بحر اخضر کی مانند ہیں۔ باطن کا ظاہر موجیں مارتا ہے اور اس کا رنگ قمر کے رنگ کے مشابہ ہو جاتا ہے اور عربوں کے نزدیک وہ زہرہ ہے

هو البحر لا قفر ولا ساحل له

احطت به خبراً وما نال نائل

”وہ سمندر ہے چٹیل میدان نہیں اور اس کا ساحل نہیں، میں نے اس کا خبر سے احاطہ کیا اور جو کسی پانے والے نے پایا۔“

پھر دوبارہ کبھی اس کو منتخب کرتا ہے تو یہ اسم اللہ سبحانہ کی ذات میں مضمحل ہو جاتا ہے۔

۱۴۱- تفہیم:

اس امر کا بیان کہ وجود کے بہت سارے مراتب ہیں اور اس بارے میں تحقیق انیق

کیا ایسا نہیں ہے کہ موجودات خارجیہ و ذہنیہ میں سے ہر شئے کی ایک حقیقت ہوتی

ہے۔ جو دوسری حقیقت سے متغایر ہوتی ہے، پھر یہ کہ وجود کے اسم میں وہ سب شامل ہوتی ہیں۔ اس لیے یہ حکم لگانا ضروری ہے کہ ہر موجود شئے مقید ہے اور یہ کہ اطلاق محض وجود ہوتا ہے۔ اس حد تک کوئی بھی عارف دوسرے عارف سے کوئی بحث نہیں کرتا۔ پھر یہ کہ میرے نزدیک وجود کا صرف ایک ہی مرتبہ نہیں ہے، بلکہ تعداد کے لحاظ سے اس کے بہت سارے مرتبے ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک، تحقیق کے پورے میدان کو گھیر لیتا ہے۔ اور ان میں سے ہر ایک کی اپنی ساتھی کے ساتھ نسبت ہوتی ہے جو اشیاء مقیدہ کے درمیان پائی جانے والی نسبت کے علاوہ ہوتی ہے۔ میں اس کی دو مثالیں پیش کرتا ہوں۔

ایک یہکہ جب ایک ہی گھر میں بہت سارے چراغ روشن ہو جاتے ہیں تو ان میں سے ہر ایک کی روشنی دوسری میں داخل ہو جاتی ہے۔ اور امر معنوی میں ممتاز ہوتی ہے۔ اور وہ چراغوں کی تعداد ہے۔ البتہ یہ مثال ایک وجہ سے ہمارے اس مسئلہ پر منطبق نہیں ہوتی۔ اور وہ یہ ہے کہ افتراق اور تصادق ان مراتب میں ایک کلمہ سے ہوتے ہیں اور چراغوں میں دو کلمات سے۔ اور وہ یہ کہ مراتب بلند ہیں، وہ ایک ہی فیض سے ممتاز ہوتے، پائے جاتے اور متحقق ہوتے ہیں۔ اس طرح ان کی حقیقت وہ فیض ہوتا ہے جیسا کہ مِنْ (بمعنیٰ 'سے') ایک لحاظ سے حرف ہے اور وہ ہمارے قول مثلاً ذھبت من البصرۃ میں بصرہ سے چلا گیا۔ میں بصرہ سے جانے کے سلسلے میں ربط کا ایک ذریعہ ہے۔ اور یہاں اگر تم 'مِنْ' کی طرف دیکھو گے اور اس کا تصور کرو گے یا اس پر کوئی حکم لگاؤ گے تو اس کو حرفیت سے خارج کر دو گے اور اس کو ایسا اسم بنا دو گے جس کا مستقل ملاحظہ کیا جائے گا۔

اس طرح اعلیٰ مراتب کا وجود ایک جہت اور ایک اعتبار سے ہے کہ وہ اس جہت اور اس اعتبار سے پایا جاتا ہے۔ چنانچہ افتراق ایک جہت اور ایک اعتبار سے تصادق سے ہم آغوش ہو جاتا ہے۔

اور ان میں سے دوسرا مفہوم کلی اور لفظ مفہوم کا مفہوم ہے۔ اس لیے کہ مفہوم کلی کلیات سے ہے اور کلی بہت سارے مفہوموں میں سے ایک مفہوم ہے۔ یہ سب ہر ایک مفہوم اور ہر کلی پر منطبق ہوتے ہیں۔ اور ان دونوں کے درمیان ایسا افتراق ہے جو تصادق سے ہم آغوش ہوتا ہے۔ اور دونوں مثالوں میں یہ مثال زیادہ قریب ہے۔ اس لیے اس کو کل کہنا انہی مراتب سے

ہے۔ اگر چہ انتہائی تنگی میں ہو۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ ان میں پہلا تعین عام ہے جو تعین سے اصلاً مزاحم نہیں ہوتا، شئی مطلق کی طرف نسبت سے مطلق شئے کے ملاحظہ کے مانند۔

شاید شئے مطلق اور مطلق شئے کے درمیان فرق تم پر واضح ہے۔ تو جس طرح یہ ملاحظہ، ملاحظہ پر منطبق ہوتا ہے۔ البتہ اس میں ایک تاخر ہے، اسی طرح تعین اول وحدت قصوی پر منطبق ہوتا ہے، سوائے اس کے کہ اس میں ایک تاخر ہے۔ اور اس تاخر سے ہم نے اس کو اسم آخر کا نام دیا ہے۔

اور یہ کہ تم جب شیشہ میں سے دیکھتے ہو تو تمہاری نظر کتاب پر پہنچتی ہے تو اس میں پہلا مقصد کتاب کو دیکھنا ہوتا ہے، اور شیشہ کو دیکھنا بطور واسطہ کے ہوتا ہے۔ اور یہ نظر، کتاب کی طرف نظر محبت سے ممتاز ہوتی ہے۔ چنانچہ اس قسم کا فرق وحدت قصوی اور تعین اول کے درمیان متحقق ہوتا ہے۔ پھر اس تعین کی تفسیر دو دوسرے تعینوں سے کی جاتی ہے۔ ان میں سے ایک قصد اول اس تعین کی طرف اور بالتبع وحدت قصوی کی طرف ہے۔ اور دوسرے قصد اول وحدت قصوی کی طرف اور بالتبع اس تعین کی طرف ہے اور یہ عین تعین اول نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ وحدت قصوی کی طرف قصد کی جہت سے پایا جاتا ہے کسی اور جہت سے نہیں۔ پھر اس قصد نے اس قصد کی طرف قصد کیا اگر چہ بالتبع ہی سہی وہ عین قصد اول نہیں ہوا۔

اور یہ دونوں تعین دو فوارے ہیں۔ ان دونوں سے تحقیق اور وجود اور موجودات تالیہ میں ہر حدوث کا پانی بہتا ہے۔ چنانچہ دوسرے اور ہر تخلیق اور کسی شئے کی قابلیت سے وہ اول ہوتا ہے جس کی تفسیر اول سے ظہور، تحقق اور فعلیت کے معنی میں کی گئی ہے۔ اور اس کی مناسبت اول سے علم القصد بالقصد کی مناسبت کی مانند ہوتی ہے۔ اور اوّل کی تفسیر ثانی سے اس طرح کی گئی ہے کہ اس کے مانند کوئی شئے نہیں ہے۔ اس طرح دونوں جمع ہو گئے اور تقید کا مفہوم حاصل ہو گیا۔ وہ صرف یہ ہے کہ یہ شئے اس کی غیر نہیں ہے۔ چنانچہ یہی اسماء بلند سے بلند ترین ازدواج (جڑنے) کا نتیجہ اولی ہے۔

اور اس نتیجہ کے مفہوم کا حاصل استعداد بعید ہے۔ چنانچہ ہمارا یہ کہنا ہے کہ وہ وہی ہے، اس کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔ اس کے بعد ہمارے اس قول کے لیے بالفعل افاضہ ہے اور اس افاضہ کے لیے موجود کل پایا گیا۔ اور موجود کل سے میری مراد وہ ہے جس میں تمام محسوسات،

معقولات اور متخیلات شامل ہیں۔ اور ہر وہ شئے جس میں تقید ہے اس موجود کے تحت داخل ہے۔ اور جب موجود الکل پایا گیا تو اس میں قوی کی تین اصناف پائی گئیں۔ اور تین اشیاء ان قوی کی جنین کی مانند یا شکم مادر میں اس کے جو بھی اعضاء تکوین پاتے ہیں ان کی مانند قوی کی تین قسموں کی حامل ہوتی ہیں۔ جیسا کہ علم طب میں اس کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ ان میں سے ایک ادراک دوسرے طبیعت اور تیسرے قضا ہے۔ چنانچہ ادراک معنوی پیائش (مساحت) کا حامل ہے اور یہاں ادراک کے تین مراتب ہیں۔ ایک تعقل محض، دوسرے توہم اور تیسرے تخیل۔ اور طبیعت ظاہر پیائش کی حامل ہوتی ہے۔ چنانچہ افلاک اور عناصر اپنی تفصیلات کے ساتھ ہو جاتے ہیں۔ اور قضا اس مقام کے ہر درجہ میں تجلیات الٰہیہ کا حامل ہوتا ہے۔

پھر عناصر مل گئے اور ادراکات اس حیات کی صورت میں بھر گئے جو موجود مکمل کی حیات سے مستفاد ہوتی ہے۔ اور قضاء ایجادی خلاق معدن کی طرف متوجہ ہوئی تو معاون اپنی تمام قسموں اور طبیعتوں کے ساتھ پائے گئے۔ پھر معاون مل گئے اور ادراکات معدن کی صورت میں بھر گئے۔ اور قضاء ایجادی خلاق نبات کی طرف متوجہ ہوئی پھر اسی طرح سلسلہ چلا حتیٰ کہ حیوان اور انسان پائے گئے۔

اور جو شئے بھی پائی گئی۔ اولاً اس کی صورت کلیہ تعقل میں پائی گئی۔ پھر اس کی وضاحت کی گئی یہاں ایک شئے سے دوسری شئے کے لیے کوئی تعین نہیں ہے۔ چنانچہ خلاق، صورت انسانیہ کلیہ سے بعید ہو گیا۔ ایک شئے دوسری شئے سے بہت زیادہ ممتاز اور پھر واضح طور پر ممتاز ہو گئی۔ پھر اس طرح سلسلہ چلتا رہا حتیٰ کہ اس عالم میں اس کے وجود کا فیصلہ کیا گیا۔ اب اگر ایک حقیقت دوسری حقیقت سے اس صورت کلیہ کے بغیر ممتاز نہیں ہوتی تو ان کے اس قول کا کیا مطلب ہوگا کہ بعض حقائق انسانیہ تمام اشیاء سے پہلے منعقد ہو گئے۔ اور یہ کیسے ہو گیا جب کہ ارشاد باری تعالیٰ کے مطابق **قد اتی علی الانسان حین من الدهر لم یکن شیئاً مذکوراً** "انسان پر ایک وقت ایسا بھی آیا جب وہ کچھ بھی نہیں تھا۔" (الدہر:۱) اس کی اس کے علاوہ کوئی صورت نہیں کہ انہوں نے اس میں اس حالت میں دیکھا کہ وہ ان کے ممنون احسان تھے چنانچہ وہ ان میں بالضرورت عام اور شامل ہو گئیں۔

۱۴۲-تفہیم

وجود کی اصل اور اس کے کمالات کا منبع ہے

جو کلمہ اس فقیر کی اصل ہے اور کمال وغیرہ کے تمام کاروبار اس سے متعلق ہیں، اس کا تصور اس امر کے مانند کرنا چاہیے جو نازل من السماء یعرج إلیه في یوم کان مقداره الف سنة "اس آسمان سے اترنے والا ہے جس کی طرف اس دن میں چڑھتا ہے جس کی مقدار ایک ہزار سال کے برابر ہے۔" وہ کبھی اس عالم کے کمالات میں داخل ہوتا ہے اور اس کا اثر اس جگہ لوگوں کے دلوں کو مسخر کرنا، تولید اور سعادات دنیویہ و اخلاق مرضیہ کا فیضان ہے۔ اور کبھی عالم قبر میں چلا جاتا ہے اور وہاں اس کا اثر کمالات نفسانیہ کا تمثل حضور تجلیات و احوال قدسانیہ اور اپنے مفصل کمالات پر نظر ہوتا ہے۔ اور کبھی عالم حشر و معاد میں جاتا ہے۔ چونکہ فقیر صورت مزاجیہ والی فطرت کے مبدأ میں نہیں ہے، اس جگہ اس کا اثر دائرہ کی وسعت پیدا نہیں کرتا اور کبھی امام اعیان و اشخاص میں غوطہ کھاتا ہے۔ اور سطح میں نقطہ کی طرح مضمحل ہو جاتا ہے اور اس جگہ ایک اثر خاص ہوتا ہے جو اس کے خواص کی ایک تشریح ہے اور کبھی اسم رحمٰن میں غائب ہو جاتا ہے، کیا کہوں کہ اس جگہ اس کا اثر کیا ہوتا ہے۔ بالجملہ میرا کلمہ ہمیشہ اس کے گرد نقطۂ جوالہ کی طرح ہوتا ہے جہاں بھی جاتا ہے اور جس مقام سے بھی گزرتا ہے اس جگہ ایک بلندی ایک رفعت، قدرت اور ریاست جو اس مقام کے ساتھ خاص ہوتی ہے، پیدا کر دیتا ہے۔ اور سرعت حرکت کے سبب میں یہ نہیں کر سکتا کہ مقام کے آثار کو جداگانہ طور پر بروئے کار لے آؤں۔ ہاں اگر حضرت حق چاہتا ہے کہ اس کا کوئی اثر بروئے کار لائے تو کسی شخص کو کھڑا کر دے گا، اور اس کے دل میں داعیہ پیدا کر دے گا کہ اس راز کا افشا کرے اور اس نور کو مکمل کر دے۔ جاننا چاہیے کہ مفتاح الغیب میں کہتا ہے کہ کلمۂ تامہ کاملہ کسی چیز پر وجود کے لحاظ سے نہیں گزرتا الا یہ کہ اس چیز کے اقصائے کمالات اس وقت میں شکل اختیار کر لے اس طرح کہ نباتیہ کے وقت میں افضل نباتات ہو جائے اور حیوانیہ کے وقت میں افضل و اکمل حیوانات۔ اور اس پر قیاس کرو۔ فقیر کہتا ہے کہ اس طرح کلمۂ تامہ کاملہ کے لیے عالموں پر حسب حال ایک رہ گزر ہے، کہ وہ موت اہل فردیہ کے ساتھ مختص ہے۔ اور اپنی حرکت دوریہ میں کسی بھی عالم پر نہیں گزرتا، الا یہ کہ اس عالم کے افضل

واکمل حالات اس کلمہ کے لیے شکل اختیار کر لیتے ہیں۔اور مفتاح الغیب میں یہ بھی کہتا ہے کہ کلمۂ تامہ کاملہ کسی عالم پر نہیں گزرتا ہے، بلا یہ کہ اپنا علم حضوری اس عالم کے مطابق اس کو حاصل ہو جائے جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کنت نبیاً و آدم بین الماء والطین "میں اس وقت نبی تھا جب آدم پانی اور مٹی کے درمیان تھے۔" فقیر کہتا ہے اس طرح کلمہ تامہ کاملہ کسی بھی عالم کے اوپر نہیں گزرتا، بلا یہ کہ کوئی شخص اس سے تجلیہ الٰہیہ اور احوال سیۂ وعالیہ کا استفاضہ کرے۔اس کا فیضان اس کلمہ سے حاصل ہوتا ہے۔میں نے ثقہ لوگوں سے سنا ہے کہ میں جس دن پیدا ہوا میرے دادا نے میرے والدین کو میری طرف متوجہ کیا۔اور اسی جگہ سے میں اپنے حال کی ترقی کا مشاہدہ کر رہا ہوں۔

۱۴۳—تفہیم:

میرا اندرونی حال عجیب ہے

میرا اندرونی حال اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے عجیب ہے اور وہ یہ کہ میں تمہارے اس عالم سے مر گیا۔ چنانچہ بغیر بدن کے باقی رہ گیا۔اس وقت میں نے تجلیات الٰہیہ کی طرف کوئی التفات نہیں کیا جس کا میں نے اکتساب کیا ہو۔اور کھانا، پینا اور جسم سے متعلق معاملات میں سے ہر شئے مجھ سے جدا کر دی گئی۔اس لیے کہ وہ جسم سے متعلق ہے۔میں گیا جہاں تک گیا اور اس وقت میں نے پہچانا کہ لوگ میری طرح نہیں ہیں۔بعض لوگ تو ایسی گہری نیند سوئے ہوئے ہیں کہ اس کے بعد بیداری نہیں ہے اور بعض افسوس کرتے ہوئے بیدار ہیں اور بعض اس عالم کی طرف متوجہ ہیں جس سے وہ کوچ کر چکے ہیں۔

پھر میں دوبارہ مر گیا۔نسمہ اور روح سے، تم جو چاہے اس کو نام دو۔اس لیے کہ نام رکھنے میں کوئی کوشش نہیں کرنی پڑتی۔ چنانچہ میری انانیت عالم دراکہ میں باقی رہ گئی اور ہر آدمی عرش کی قوت دراکہ میں باقی نہیں رہتا بلکہ بعض حس مشترک میں رہتے ہیں۔بعض تخیلہ میں اور بعض وہم میں۔پھر میں تیسری بار نفس ناطقہ اور انانیت سے مر گیا تو میں وہی تھا جو ازل سے تھا اور جو کچھ عرش کے تحت ہے، وہ ازل سے غنی ہے۔اس پر غور کرو اس وقت میں، نہ میں تھا نہ وہ، بلکہ ایسا انسان تھا جس میں، میں اور وہ اجمالاً جمع ہوتا ہے اور مفصلاً نہ میں ہوتا ہے نہ وہ۔

پھر چوتھی بار مراجب اللہ کی طرف جانے والوں میں چلا گیا۔

فضت عیون مهاة الرمل فی جسدی

ان لیس یبقی له عین ولا اثر

''نیل گائے کی آنکھیں میرے جسم میں داخل ہوگئیں، اس طرح کہ نہ کوئی نیل گائے باقی رہی نہ کوئی نقش قدم رہا۔''

پھر اللہ سبحانہ نے مجھے دوبارہ زندہ کیا یعنی مجھے دوبارہ ایجاد کیا۔ چنانچہ میں ناسوتی الہامی آدمی ہوگیا۔ دونوں وصفوں کو جمع کردیا کہ اگر میں ناسوتیت میں مشغول ہوجاؤں تو بھی مجھے کچھ ضرر نہ پہنچے اور اگر الٰہیت میں مشغول ہوجاں تو بھی مجھے کوئی ضرر نہ ہو۔ اور یہ ایک رمز ہے جو میں نے اپنے حال سے تمہارے سامنے پیش کی ہے۔ اس میں گہری نظر سے غور وفکر کرو۔

پھر معاملہ احتمالات کے درمیان گردش کرتا ہے یا تو یہ کہ اللہ سبحانہ نے زمین کے قطعہ مبارک وپاکیزہ مطہرہ سے شر کو اس کے ذریعہ دور کرنے کا ارادہ کیا۔ یا یہ کہ اللہ سبحانہ نے یہ ارادہ کیا کہ وجود اقصیٰ کی طرف رجوع کرے یا یہ کہ شر کو دور کرنے کا ارادہ کیا۔ پھر شر کے رجوع کا اور اس کے لیے سب برابر ہیں، نہ کوئی راجح ہے، نہ مرجوح اور میری مراد اس کلام سے یہ نہیں ہے کہ میں نے اس کو واقعتاً دیکھا یا خواب میں۔ میری مراد حقیقی موت ہے، البتہ موت کی دو قسمیں ہیں۔

ایک وہ جو تمام انسانوں سے متعلق ہے اور روح کا جسم سے اس طرح جدا ہونا ہے کہ اس سے بدن کا نظم منتشر ہوجاتا ہے۔ اور ایک مفردین کے ساتھ خاص ہے، وہ روح کا بدن سے اس طرح جدا ہونا ہے کہ بدن کا نظام منتشر نہیں ہوتا

وراء ذاک فلا اقول لانه

سر لسان النطق عنه اخرس

''اس سے آگے میں نہیں کہتا اس لیے کہ، زبان نطق کا راز بیان سے باہر ہے (اس سے گونگی ہے)۔''

معنیً به لطف الکثیف فاصبحت

شم الجبال هی الغصون المیس

"اس کا معنی کثیف کا لطف ہے، پہاڑ خوشبودار ہو گئے گویا وہ کوئی درخت کی لچکدار شاخ ہے۔"

امر له وبه ومنه تعينت

اعياننا ووجودنا المتلبس

"امر اس کے لیے ہے اس میں ہے اسی سے ہے، ہماری آنکھیں اور ہمارا ان سے جُڑا ہوا وجود اس سے متعین ہے۔

پھر ہم کہتے ہیں میرا اندرونی دوسرا حال اس سے بھی زیادہ عجیب ہے جو تم نے سنا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ میرے اوپر کچھ لحات ایسے گزرے ہیں کہ ان میں میرا علم ہر انسان کبیر سے اس طرح متعلق ہو گیا جیسے آدمی کا علم اپنے نفس اور بدن سے متعلق ہوتا ہے۔ علم حضوری اس کے سارے جسم میں چلتا ہے۔ نجوم سے میری معرفت کے لیے اور ان لحات سے سیاست کے لیے۔

اور شاید تمہاری قوت سامعہ ان چیزوں سے بھر گئی ہو گی جن سے صوفیا نے فتنہ وفساد برپا کیا کہ ذات بحتہ ومحض سے علم متعلق نہیں ہوتا۔ اور نہ ہی اس کے قدم فنا میں گردش کرتے ہیں۔ اور نہ ہی اس کے اور کسی کے درمیان دائر ہونے والی نسبت سے کوئی شئے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے تو مجھے لازم اول کے طریق سے اس وحدت قصوی سے مناسبت تامہ ہے اور اس لیے ان ناموں میں سے اس مناسبت کو فنا یا علم وغیرہ کا نام دیا جاتا ہے کہ اگر ہم تمہاری زبان میں بات کریں تو کہیں گے حیرت در حیرت۔ اور اگر ہم اپنی زبان میں بات کریں تو کہیں گے علم فی علم (علم در علم)

۱۴۴- **تفہیم:**

بندہ کی حیرت اس وقت جب وہ حقیقت الحقائق کی طرف ترقی کرتا ہے

جب بندہ حقیقت الحقائق اور وحدت قصوی کی طرف ترقی کرتا ہے اور اس پر تمام حالات، تمام تجلیات اور تمام نشأت مستوی ہوتے ہیں تو اس کو ایک حیرت حاصل ہوتی ہے۔ اس سے میری مراد حیرت مذمومہ نہیں ہے جو یقین سے ٹکراتی ہے۔ نعوذ باللہ منہا. بلکہ اس معنی

میں کہ وہ کسی ایک حالت، ایک تجلی اور ایک نشاۃ کے نزدیک نہیں ٹھہرتا۔ اس کے لیے سارے مراتب جمع ہو جاتے ہیں اور ایک شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ ان میں سے اس بندہ کے نزدیک ایک یہ ہے کہ اس کے لیے حکم تجلی ہوتا ہے جو ذاتی، برقی اور آنی ہوتا ہے۔ پھر ایک مدت کے بعد یہ حیرت مضمحل ہو جاتی ہے اور اس کا قلب ہر نشاۃ کے نزدیک جس میں وہ مبتلا ہو ٹھہر جاتا ہے۔ اور ان دونوں حالتوں کے درمیان پایا جانے والا فرق شئے مطلق اور مطلق شئے کے درمیان پائے جانے والے فرق کے مشابہ ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کے نزدیک امور آزمائش پر موقوف ہوتے ہیں کہ اگر تبتل، تجرد اور تفرد میں مبتلا ہو گیا تو متفرد ہو گا، اور اگر اس نظام کی مداخلت میں مبتلا ہو گیا جس پر عالم ہدایت سے مبنی ہے تو ہدایت پا گیا اور یہاں ایک شخص ہے جس کے حق میں مشیت ازلی یہ منعقد ہوئی کہ زمین میں ایک زمانہ میں ہدایت پائے اور زمین میں ایک زمانہ میں متفرد ہو۔ واللہ غالب علی امرہ.

۱۴۵—تفہیم:

توحید کے طریق مستقیم پر ثابت قدم رہنے کی وصیت

تمہارے قدم اس راہ مستقیم سے نہ ڈگمگائیں جو تمہیں توحید سے حاصل ہوا ہے۔ تمہیں یہ معلوم ہو گیا کہ وہاں ایک راز ہے جس تک تم بعد میں نہیں پہنچے اور ممکن ہے کہ تمہارے لیے بحر جذب و محبت ایک کے بعد ایک موج جاری کر دے تو اس کی اتباع کرو حتیٰ کہ تم ایسے ہو جاؤ گویا کہ تم کبھی تھے ہی نہیں۔ اور کہنے والے نے جو کہا ہے اس کو یاد رکھنا

ولا تقل لمدير الكاس عن ملل
مهلا فديتك فالتسويف في المهل

”گلاس چلانے والے سے ملول ہو کر مت کہہ، کہ آہستہ کر، میں تیرے قربان آہستگی میں ٹال مٹول ہے۔“

واصمت إلى ان تراها فيك ناطقة
فان وجدت لساناً قائلاً فقل

”اور خاموش رہ یہاں تک کہ تو شراب کو اپنے اندر بولتا ہوا پائے، اور جب تو اسے

بولتی ہوئی زبان پائے اس وقت کہہ۔“

میرے بھائی! تم فلاں سے واقف ہو تم نے اس کو افسوس کے سوا ہر عذاب سے محفوظ پایا ہے۔ اور وہ بھی شدید نہیں ہے۔ اس لیے آج کے بعد اپنے دل کو اس سے متعلق نہ رکھنا۔

۱۴۶۔ تفہیم:

جس پر توحید کا انکشاف ہو جائے اس پر تین واجبات ہیں

جس کے لیے توحید یعنی فنا کا انکشاف ہو جائے اس پر تین امور واجب ہیں۔ ایک یہ کہ اپنے نفس کو مال، جاہ اور لوگوں سے ہر تعلق سے مجرد کر لے اور یہ مقام نفی اور اثبات پر مداومت سے حاصل ہوتا ہے۔ اس طرح کہ اس کے ساتھ تمام تعلقات سے تجرید نفس کو ملاحظہ کرے۔ اور مناسب یہ ہے کہ اپنے نفس سے ہر اس چیز کے بارے میں بحث کرے جس کی طرف وہ مائل ہوتا ہو اور جس چیز سے بھی وہ تعلق رکھتا ہو، قصد اول کے ساتھ اس کی نفی کرے۔

دوسرے یہ کہ اپنے نفس کی نگرانی کرے کہ اس کو اس طرح نہ چھوڑے کہ وہ اللہ کے ذکر سے لحہ بھر کے لیے بھی غافل ہو جائے۔ بلکہ ذُکر (ذال کے پیش کے ساتھ) یعنی یادداشت سے۔ اور وہ اس لیے کہ آدمی جس طرح مرتا ہے اسی طرح مبعوث کیا جاتا ہے۔ اور فنا موت ہے اور بقا بعثت ہے پھر جب وہ ذکر کے ساتھ فنا ہو جاتا ہے تو اللہ اس کو حضور دائم کے ساتھ بقا عطا فرماتا ہے۔

تیسرے یہ کہ اپنی زبان کی حفاظت کرے کہ کسی ایسے مسئلہ کا انکار نہ کرے جو شارع نے بیان کیا ہو اور وہ توحید کے بعد تکثیر کے معنیٰ پر مبنی ہوتا ہے۔ چنانچہ تم جانتے ہو کہ یہاں ایک بھید ہے۔ کیا تم پر اس کا انکشاف نہیں ہوا اور میں تمہیں ان مسائل کا فقہ اور ان کا راز سکھاتا ہوں۔ تجرید قلب و فقہ میں یہ ہے کہ توحید کا حال اللہ سبحانہ اس لیے عطا فرماتے ہیں تاکہ اس کے ذریعہ نفس کی سختی اور اس کے قوام کی اصل ٹوٹ جائے اور اس کا انکسار اگرچہ مقدور بشر نہیں ہے لیکن اس کے لیے اعراض ہے۔ اس کے ادنی لوگوں سے چمٹتا ہے۔ چنانچہ مناسب ہے کہ اس کو اس کی ضدوں سے بدل دے تاکہ آدمی بقا کی صورت کے لیے مستعد ہو جائے۔

اور اس کی مثال اس شخص کی ہے جس نے پانی کو ہوا سے بدلنے کا ارادہ کیا۔ تو اس کی تدبیر یہ ہے کہ اس کے ٹھنڈے ہونے کو دھیرے دھیرے گرمی سے بدل دے حتیٰ کہ مکمل

نصاب تک پہنچ جائے۔ تو پانی اللہ سبحانہ کے اذن سے ہوا میں بدل جائے گا۔ اسی طرح جو شخص فنا چاہتا ہے اس کے لئے تدبیر یہ ہے کہ اعراض کو نفس کے ادنیٰ امور سے متعلق کر دے اور وہ محبت کی قسموں سے خفیہ تعلقات ہیں اور یہ ایسا علم ہے جس کی تفصیل بیان کرنا مشکل ہے۔ اور یہ اس شخص کے لیے آسان ہے جس کو اللہ تعالیٰ چلاتا ہے اور جس کو اللہ نے توحید کا حال عطا فرما دیا۔ پھر اس سے اپنے دائیں بائیں سے جذب کے بارے میں سوال کرے تو جو امر اس کے لیے سخت تھا اس کو آسان کر دیتا ہے۔

اور ذکر دائم کا فقہ یہ ہے کہ ذکر وہ ہے جس کو فنا کے بعد تجلی الٰہی میں بدل دے تو جب ذکر، نسمہ اور نفس دونوں کو گھیر لے تو تجلی اس طرح آتی ہے کہ ان دونوں کو کاملاً وتاماً گھیر لیتی ہے۔ پھر آثار حقانیہ دنیا، قبر اور یوم الحساب میں نفس اور نسمہ پر ظاہر ہوتے ہیں۔ اور انکار سے زبان کی حفاظت میں فقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اولیاء پر انکار سے مبارزت کمال کے اصول کو مٹانے والے خذلان و رسوائی کا سبب بن جاتا ہے۔ تو اس سے بچو، بچو۔

۱۴۷۔ تفہیم:

بندہ کی دو عقلیں

جب تم نے لوگوں سے قطع تعلق کر لیا تو اللہ کے فضل اور اس کی رحمت پر یقین کامل رکھو۔ کیا تم نہیں جانتے کہ اصحاب کہف نے کس طرح ہمت کا مظاہرہ کیا؟ تو رب باری نے ان کے ساتھ ان کے ارادہ کے مطابق معاملہ کیا۔ تو اس آیت کو پڑھو **واذ اعتزلتموهم وما يعبدون إلا الله فاووا إلى الكهف ينشرلكم ربكم من رحمته** "اب جبکہ تم ان سے اور ان کے معبودان غیر اللہ سے بے تعلق ہو چکے ہو تو چلو اب فلاں غار میں چل کر پناہ لو۔ تمہارا رب تمہارے اوپر اپنی رحمت کا دامن وسیع کرے گا۔" (الکہف: ۱۶)

اور جان لو کہ بندہ کی ایک عقل وہ ہے جس سے وہ اپنے معاش میں تصرف کرتا ہے۔ اور ایک عقل وہ ہے جس سے خوف، توکل، تسلیم اور اعمال خیر پر رغبت کے اپنے مفاد میں تصرف کرتا ہے۔ اور ایک عقل وہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی ذات کے تصور میں تصرف کرتا ہے، کسی اور میں نہیں۔ پھر جان لو کہ یہ تمام درجات ایک دوسرے سے ممتاز ہیں، تو یہ معرفت

مفاتح الجمعیۃ ہوگی۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ اب جب تم نے عقل معاشی کو ترک کر دیا تو عقل معادی باقی رہ گئی۔ اب یہاں تمہیں اہل وعیال اور مال وجاہ کی الفت ڈگمگا نہ دے، لیکن تمہارے اندر آل کی محبت اور کمال میں احادیث النفس رہے۔ پھر جب تم نے عقل معادی سے بھی قطع تعلق کر لیا تو عقل الٰہی باقی رہ گئی۔ یہاں تمہیں کوئی خطرہ، وسوسہ اور کوئی حدیث نفس نہ ڈگمگا دے۔ تو انشاء اللہ تعالیٰ تم اللیس الصرف (نفی خالص) کی طرف بغیر کسی رکاوٹ کے ترقی کر لو گے۔ انشاء اللہ۔ اور عقل معاشی ومعادی کا ترک ان دونوں کے عرفان، تصور اور امتیاز کے بعد تجل اور عزلت میں دشوار نہیں ہے۔ اور ان کے ترک پر کلمہ طیبہ سے جہراً وخفیۃ استعانت اس طرح کرو جس کا وقت اور حال تقاضہ کریں۔ ان میں ان دونوں میں سے ہر ایک نفی کا ملاحظہ کرتا ہے۔ اور کوشش کرو کہ عقل معاشی کو جان لو کہ وہ کیا ہے؟ اور کس چیز کا تقاضہ کرتی ہے۔ اور کون سی چیز میں تصرف کرتی ہے؟ اور ان کے مدرکات کا کیا وزن ہے؟ پھر یہ کہ عقل معادی کو جان لو کہ وہ کیا ہے؟ اور کس چیز میں تصرف کرتی ہے؟ کیا تم نہیں جانتے کہ رائے برہانی رائے شعری سے الگ ہوتی ہے۔ پھر جب رائے برہانی کمزور ہو جاتی ہے تو رائے شعری غالب آجاتی ہے۔ اسی طرح اس کا برعکس ہوتا ہے۔ اور ذہین آدمی رائے برہانی کو پہچانتا ہے جو کہ افکار برہانیہ کا مبدا ہے۔ تو وہ اس پر عمل کرتا ہے۔ اس پر علوم برہانیہ نازل ہوتے ہیں۔ اور اگر تم فکر میں امعان وتدبر سے کام لو تو شاید اس کو پہچان لو۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

۱۴۸- تفہیم:

سالک کی تشویش اور اس کے اسباب

جان لو کہ کبھی سالک کو تشویش لاحق ہو جاتی ہے جس سے اس کا نفس بے قرار ہو جاتا ہے اور یہ تحقیق میں ہوتا ہے یا تو انقباض کی وجہ سے کہ اس کی طبیعت کو بعض امور طبعیہ لاحق ہوتے ہیں جیسے امور کا ازدہام اس کی فکر طبعی میں تردد پیدا کر دیتا ہے اور طبعی نرمی کا فقدان جس کے نزدیک طبیعت کو نشاط رہتا ہے۔ اور اس کی مثال سونے والے کے خواب ہیں۔ اگر اس کا مزاج صفراوی ہوتا ہے تو زرد خیالات دیکھتا ہے اور اگر دموی ہوتا ہے تو سرخ دیکھتا ہے۔ اس کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔ اور وہ افکار جن کی وحی شیطان اس کے قلب کی طرف کرتا ہے، جیسے وہ

افکار جو منزل پر پہنچنے سے مایوسی کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ یا جس کو اللہ اپنے ہاتھ سے فیض عطا فرماتا ہے، اس میں عیب تلاش کرنا وغیرہ۔ اور اس کی مثال سوتے میں شیطان کا ڈرانا ہے۔ ایسی صورت میں اس کمال کی طرف جمعیت خاطر واجب ہے جو کہ کمال ہے۔ اور ان خیالات کو مسترد کر دینا اور ان کی برائی، شناعت، وقبح کا یقین ہے۔

اور جان لو کہ احساس کے ساتھ الفت رکھنے والا خالص ادراکی علوم پر یقین نہیں رکھتا۔ چنانچہ ممکن ہے کہ ان کا نام علم یقین رکھ دے، پھر اس حالت سے ترقی کرے، پھر اس پر یقین کرے، اور یہ مستحب ہے کہ ان کی پابندی کرے اور اس کے لیے اس میں وقیق امور اور اسرار ظاہر ہوں۔ اور وہ ان کو دوسروں پر ترجیح دے۔ پھر ممکن ہے کہ اس بات کا یقین کرے کہ احساس کوئی چیز نہیں ہے۔ اور یہ کہ کمال یہی تعقل ہے۔ اس سے سالکین کے حال کا اعتبار کیا گیا کہ ان کے لیے ظاہر ہو گیا تو وہ محسوس یا متوہم یا متخیل یا ادراک سے گھیرے ہوئے کے ساتھ تعلق کی پرواہ نہیں کرتے۔ اور یہ ظہور ایسا امر ہے جس میں بندہ اس طرح مستغرق ہوتا ہے کہ وہ اس کے سوا کچھ نہیں جانتا کہ وہ اس کو ہر طرف سے اوپر سے بھی نیچے سے بھی اپنے ادراک اور اپنے علوم سے گھیرے ہوئے ہے۔ یہ سقوط باطل ہے۔ ایسے شخص کے لیے کبھی بھی آسان نہیں ہوتا جس کے لیے اللہ تعالیٰ اس سے خیر چاہتا ہے۔

ہاں یہ بات کہ اول امر میں حق کا ظہور اور وہ علم جس کا کہ وہ عقیدہ رکھتا ہے اور جس کے تدارک پر اعتماد کرتا ہے، دونوں شکل اختیار کرتے ہیں۔ تو سالک ایسی امارت کا محتاج ہوتا ہے جس کے ذریعہ حق کو باطل سے پہچان سکے۔ اور یہ علامت ہمارے نزدیک یہ ہے کہ اپنے نفس کو ان علوم سے مجرد کر لے۔ بلکہ یکے بعد دیگرے اللہ سبحانہ کی محبت کے علاوہ ہر علم سے مجرد کر لے۔ اور ان کو بھول جائے۔ اس طرح باطل مٹ جاتا ہے اور حق ثابت ہو جاتا ہے۔ اور یہ عوام کے لیے تجرد تام اور غلبۂ محبت کے ساتھ مسلسل بڑھتا رہتا ہے۔ ہاں خواص اور اہل دانش کے سلسلہ میں ہیئت وجود اقصیٰ اور اس میں استغراق میں اس کے ادراک کے احاطہ کے بغیر اس کی اضمحلالیت کے لیے ہے بلکہ حیرت زدہ شخص کی حیرت ان کے نزدیک دن کے اجالے میں زیادہ ظاہر ہوتی ہے اور حق، قلب کی رطوبت داخل ہونے کے بعد اس کے اہل پر خوف پیدا کرنے والا نہیں ہوتا۔

۱۴۹-تفہیم:

سالک کا علوم توحیدیہ کے دقائق شعریہ وحکمیہ کے ساتھ ملانے کی طرف میلان اوراس کی مضرت

اکثر ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ سالک کا میلان علوم توحیدیہ کہ دقائق شعریہ یا حکمیہ کے ساتھ ملانے کا ہوتا ہے۔ اور یہ اشیاء میں سب سے زیادہ ضرر پہنچانے والا ہے۔ اور اس کو جذبات توحیدیہ کے مخرج سے آواز یا صورت کے لطائف سے حاصل ہوتا ہے۔ اور یہ اول سے بھی زیادہ ضرر رساں ہے۔ ان سب کا سبب یہ ہے کہ اس شخص کا میلان طبعی، شعر میں یا دقائق حکمیہ یا آواز یا صورت میں فانی ہوجاتا ہے، جس طرح جوہر نفس پر انکسار واقع ہوتا ہے۔ یہ انکسار ان اشیاء کی صورت میں باہر آتا ہے اور صاحب حال کے کام میں فساد پیدا کردیتا ہے، ایسا فساد کہ اس کے ازالہ کی امید نہیں کی جاتی۔ جیسا کہ اوحد کرمانی کو ہوا۔ چنانچہ شیخ الشیوخ نے اس کو فاسق قرار دیا اور مولانا رومی نے فرمایا کاش! اس نے یہ کام کیا ہوتا اور گزر جاتا۔ اور جیسا کہ عراقی کے لیے لطائف شعریہ وجمالیہ کو ملانے میں ہوا کہ امر فاسد ہوگیا

غیر معشوق ار تماشائی بود
عشق نبود ہرزہ سودائی بود

''اگر غیر معشوق کوئی تماشائی ہو، تو عشق نہیں ہوگا بلکہ ایک بیہودہ جنون ہوگا۔''

اور شاید اگر تمہارا نفس کوشش کرتا ہے تو تمہارے لیے اشتیاق اور بے قراری ہوں گے اور شاید کہ جب تمہارے نزدیک مضمون بدیع واقع ہو تو تم اپنے قلب میں اس سے مسرت محسوس کرو۔ اور گویا کہ تم اس سے لذت پاؤ۔

اور تمہارا قلب اس سے مطمئن ہوجائے۔ چنانچہ یہی امر ہے کہ میں تمہیں اس سے منع کرتا ہوں۔ ان دنوں میں مخلوق کے ساتھ کم صحبت رکھنے اور کثرت کلام سے باز رہنے اور شعر پڑھنے اور حکمت پڑھنے کو ضروری سمجھتے ہیں اور صحبت یار با استغفار کے معنی باریک ہیں کہ سانپ اور بچھو سے بھی زیادہ مضر ہیں۔ اس سلسلہ میں تدبیر کو واجب سمجھتے ہیں۔ واللہ یصحبک السلام و العافیۃ.

۱۵۰-**تفهیم:**

قلت طعام اور دوام صیام کی وصیت اور شعر کی مراد

قلت طعام اور دوام صیام تند مزاج کو موافق مزاج کرتے ہیں۔ ایسا نہیں ہوتا کہ طبیعت کا نشاط جاتا رہے بلکہ کاروبار اس سے وابستہ ہے۔ اور شعری جائے پناہ سے اس فقیر کی مراد شعر نہیں بلکہ تشبیہ تخیلیہ ہے۔ اگرچہ نثر ہو۔ اور حقائق الٰہیہ کے ادراک میں عادی امور کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور اس کے تحت اس سے مغلوبیت متاثر ہوتی ہے۔ اور انجذاب اس کی جانب مانع کاروبار ہے۔ اس قضیہ کو بھلائی کے ساتھ غور کر کے سمجھو۔ اگر موجودات کے اضمحلال کے معنی ایک امر بسیط وحدانی کے تحت اور دائیں بائیں اور اوپر نیچے سے اس طرح لاتے ہیں کہ محبت تامہ و جمع ہمت اور تمام راستوں کو بند کرنے کے باوجود ہو۔ اس سے جدائی کی گنجائش نہ رہے، اور اگر اس کے نزدیک اس قدر جوش ہو بلکہ اس کے بغیر اس کے معنی کا تصور وتعقل زیادہ لذیذ اور زیادہ پاکیزہ ہو۔ عقل کے نزدیک تمام تصورات سے بہتر وہ ہے کہ تعلقات اور محبتوں کی نفی اور تمام قوتوں سے دوام توجہ کہ اپنے حوصلہ میں اس پر زیادہ نہ پایا جائے مشغول ہوں۔ اس وقت تک کہ اس معنی کی دلیل ظاہر ہو جائے، اور اتنا جلوہ دکھائے کہ اپنے اوپر ایسی سختی نہ کریں کہ حواس پراگندہ ہو جائیں۔ اور نشاط جس کو ہندی میں امنگ کہتے ہیں، مسلوب ہو جائے کہ ہاتھ سے کام کرنا مزاج کی صحت، حواس کی سلامتی اور نشاط کے وجود کا منتظر ہوتا ہے۔ اور جمع خاطر، خلوص نیت نشاط کے وقت میں حکیم سینائی کے شعر پڑھیں اور خلوت میں توجہ کریں۔

زیں سپس دست ما و دامن دوست
زیں سپس گوش ما و حلقہ یار

”اس سے پیچھے ہمارا ہاتھ اور دوست کا دامن ہے، اس سے بہت پیچھے ہمارا کان اور یار کا کنڈا۔“

فقیر نے نشاط کے بعض اوقات میں جو دو شعر کہے ہیں ان کی تاثیر دیکھی ہے۔ رباعی

اے دوست توئی دیدہ بینائی من
ہم قوت شنوائی و دانائی من

"اے دوست تو ہی میری آنکھ اور بینائی ہے، میری قوت سماعت اور دانائی بھی ہے۔"

عشقم تو دہم تو دل غم دیدۂ من
و ندر دل غم دیدہ شکیبائی من

"میں نے اپنا عشق تجھے دے دیا تو میرا دل غم دیدہ ہے، اور دل غم دیدہ کے اندر تو ہی میرا صبر ہے۔"

۱۵۱۔ تفہیم:

ہمت اور اس کی فنا کی کیفیت

یقین رکھیں کہ آدمی فی الحقیقۃ اپنی صورت شخصیہ سے عبارت ہے، جسے نفس ناطقہ کہتے ہیں۔ اور اپنی یہ صورت اپنی باریکی اور لطافت کی وجہ سے ہر کسی کو معلوم نہیں ہوتی۔ جو اثر ہم اس کے اوپر ڈالتے ہیں، اس کی تدبیر یہ ہے کہ اس کی کیفیات لازمہ پر ڈالتے ہیں۔ تاکہ اس کی تبدیلی سے جو ہر نفس کی تبدیلی میسر آئے اور نفس کا سب سے خاص لازمہ وہ ہے جسے ہمت کہتے ہیں، کسی کی ہمت وسیع ہوتی ہے جبکہ کسی کی تنگ۔ علم وادراک اور تمام صفات نفسانیہ سب ہمت کی تفصیل ہیں۔

ہمت ترا بلنگرۂ کبریا برد
ایں سقف خانہ را بہ ازیں نردباں مخواہ

"ہمت تجھ کو کبریائی کی بلندی پر پہنچا دے گی، گھر کی اس چھت کے لئے اس سے بہتر کوئی سیڑھی نہ طلب نہ کر۔"

میں ہمت کی تبدیلی پر یقین نہیں کرتا، جب تک کہ علم ضروری سے نہ بھر جائے۔ اور حق جلی وعلی کی یاد سے اور شجاعت وغضب اور مختلف قسم کی لذتوں اور کسی سفلی مراد کی طرف انجذاب خاطر سے یہ سب ٹوٹ جاتا، نابود ہو جاتا ہے۔ جب ہم اس کو جان لیتے ہیں تو یقین کر لیتے ہیں کہ تبدل ہمت متحقق ہو جاتا ہے۔ اگر یہ معنی صبح کو متحقق ہوتا ہے تو تجلی الٰہی شام کو آتی ہے اور اگر شام کو متحقق ہوتا ہے تو وہ صبح کو آتا ہے۔ البتہ فناء ہمت کی کثرت کے بغیر جب تک وہ نہیں ہوتا کہ آدمی مایوس ہو جاتا ہے اور اس سے زیادہ اجتہاد محال جانتے ہیں۔ اس تفصیل سے

ہماری غرض یہ ہے کہ اپنی نشاط اور ہمت کو خدا میں گم کر دیتے ہیں اور اچھا تامل کرتے ہیں تا کہ تمہارے ذہن سے حاصل ہوتا ہے کہ ہمت کیا ہے اور اس کی فنا کس طرح ہوتی ہے

اے برادر تو ہمیں اندیشۂ
مابقی تو استخواں وریشۂ

''اے بھائی تو سوچ کا نام ہے، ورنہ تجھ میں ہڈی اور گوشت کے علاوہ کچھ بھی باقی نہیں ہے۔''

گر گل است اندیشۂ تو گلشنی
ور بود خارے ہمہ تو گلخنی

''اگر گل ہے تیرا فکر گلشن ہے، اور اس میں کانٹا ہے تو سب گلخن آگ کی بھٹی ہے۔''

ایک ہیئت ایسے عاشق کی طرح پیدا کرنی چاہیے جو عشق میں افراط کی وجہ سے مجنوں ہو گیا ہو کہ اس کی زبان خشک ہو گئی اور اس کا جسم بھی خشک ہو گیا۔ اگر کوئی کھانا اس کے سامنے لائیں تو اس کو کوئی لذت حاصل نہ ہو اور اگر کوئی مشروب دیں تو حواس کی سلامتی اور نشاط کی کثرت کے باوجود اس کی شیرینی اور نمکینی میں امتیاز نہ کر سکے۔ لیکن اس کا انحصار ایک میں ہے۔ اور بالجملہ اگر ہر مرد نیک اپنے آپ میں غور و فکر اور تدبیر کرے تو لازمی طور پر جاننا چاہیے کہ اس کے دل کا ہر طرف میلان ہے۔ اور میلان متعدد ہیں اور اس کی ہمت و عزم ہے کہ جب ایک ہمت ہو جائے اور ایک جہت میں راجح ہو تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی لذیذ طعام، لذیذ مشروب کھاتا پیتا اور خوش واچھے مناظر کو دیکھتا ہے لیکن اپنے اندر ان کی لذت نہیں پاتا ہے۔ اس لیے کہ جب ہمت ایک جانب چلی جاتی ہے تو اس کے ساتھ رہنے سے ادراکات حواس بھی چلے جاتے ہیں۔ اگر آدمی اپنے آپ میں خود غور و فکر کرتا ہے یا کلام کرتا ہے یا اپنے آگے کی طرف نظر ڈالتا ہے اور پاجامہ پہنتا ہے اور اپنے اندر اس کا استحسان اور شوق نہیں پاتا ہے۔ اس وجہ سے نہیں کہ بے ہوش و بے حس ہے بلکہ قوت مستحسنہ کے اشتغال اور ایک امر مقدس کے اشتیاق کے واسطہ سے مہلکات دینی حسد و غضب وغیرہ سے بچتے ہوئے اور اسی طرح شوق و ارادہ و خواہش اور ہر وہ چیز جو ہمت کے جزئیات سے ہے کم ہو جاتی ہے۔ اور ایک رو اور ایک جہت ہو جاتا ہے۔ تمہاری رو سے یہ ہے کہ جلدی فانی ہو جاتا ہے اور ہماری آرزو یہ ہے کہ دیر

تک فانی رہے کہ غیر معین لوگ الگ الگ تمہاری جہت پر بکھر جائیں۔ اور اس وقت اپنے آپ میں نہیں رہتا اور ایک زمانہ تک محفوظ رہتا ہے۔ اس وقت شوق دوسری بار اٹھتا ہے اور اجتماعیت کو منتشر کر دیتا ہے۔ امر جسیم سے کامیاب ہوتا ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ کسی نے کہا تھا کہ بیدل اپنے غلاموں کو مضمون اور معنی سے نام رکھتا تھا اور یہ شعر میں اس کی قوت مستحسنہ پر دلالت کرتا ہے۔ جب آدمی اپنے آپ سے کلی طور پر باہر ہو جاتا ہے، اس وقت خدا کا مل شفا تجلی کے ساتھ متجلی ہوتا ہے۔ اور اگر جہات سے ایک جہت باقی ہے تو تجلی شفاہی محال ہے۔

کسی در صحن کاخی قلبہ جوید
اضاع العمر فی طلب المحال

''جو شخص بلند عمارت کے صحن میں زمین جوتنے کا ہل تلاش کرتا ہے، وہ امر محال کی تلاش میں عمر ضائع کرتا ہے۔''

غوث اعظم شیخ عبدالقادر فنا کی اس حالت سے ارادہ تعبیر فرماتے ہیں۔ اور امیر سید کلال اس کے آبخورہ کی مثال دیتے ہیں کہ جب تک اس میں ذرا سی بھی نمی باقی ہے، اس لائق نہیں ہے کہ اس کو خمران تصرف میں رکھیں۔ اور خواجہ نقشبند اس کو مختلف وجوہ فنا کہتے ہیں

عبارا تنا شتی وحسنک واحد
وکل إلی ذاک الجمال یشیر

''ہماری عبارتیں مختلف ہیں اور تمہارا حسن ایک ہی ہے، اور ہر کوئی اس جمال کی طرف اشارہ کرتا ہے۔''

یادداشت کے تمام اوقات صبح و شام، دن اور رات، کھڑے اور بیٹھے بوصف محبت نامہ اور تجرید کامل اس حیثیت سے کہ غیر کی غفلت و محبت کو کسی ایک وجہ سے بھی دخل نہیں رہتا اور سب نیست ہو جاتے ہیں، مشغول ہونا چاہیے

یا بخود آتش تواں زد یا دلی باید گداخت
گر دماغ عشق داری ایں چنیں ہا کردنی است

''یا تو خود میں آگ لگا دے یا دل کو پگھلا دینا چاہیے، اگر عشق کا دماغ رکھتے ہو اس طرح کرنا ہے۔''

۱۵۲-تفہیم:

فناء شفاہی کے موانع

ہم نے تامل کیا تو ہونٹوں سے فنا کی موانع چند چیزیں پائیں۔ ایک یہ کہ آدمی کو ایک مراد سفلیہ باقی رہ گئی ہو۔ بلاشبہ اس کی مقدار میں نفس ناطقہ مجرد نہیں ہوتا اور جذب اس حال میں پہنچ کر فنا حجابی ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ آدمی کی محبت مزاج اور مادہ جنون کے اختلاط سے مل گیا ہو۔ وہ تمام مالوفات سے ہر طرح سے جدا ہو جاتا ہے۔ اس کی تجرید اختلاط مزاج کی مدد سے ہوتی ہے۔ اس کی فنا شفاہی نہیں ہوتی۔ اس لیے ہم نے اپنے کلام کو سلامت مزاج و فور نشاط سے مشروط کیا ہے۔ دوسرے یہ کہ باریک طبع عادی جبلت والا نہیں ہوتا۔ خیالی و تشبیہی، جائے پناہ اور نکتہ فہمی و لطیفہ گوئی اس کے نزدیک تمام لذتوں سے زیادہ طیب اور زیادہ لذت دار اور بالجملہ سبک روح اور دقیقہ فہم ہوتی ہے۔ اور اس کی تجلی اس کے دقائق کے مطابق ہوتی ہے۔ شفاہی نہیں ہوتی۔ صفا ایک امر محمود ہے۔ البتہ باریک طبعی اس سے الگ ہے اور لوگوں کی عادتوں کے علاوہ کہیں محمود نہیں ہے۔ دوسرے دائمی یادداشت اس کا حاصل نہیں ہوتی یا یادداشت ضعیف ہوتی ہے۔ اور یہ تجلی وہی یادداشت ہے۔ دوسرے میں جب حال ضعیف ہو گیا تو تجلی ضعیف ہو گئی۔ دوسرے یہ کہ اس سے پہلے کہ خود سے نہ پھرے فانی ہوتی ہے اور یہ مسئلہ سخت باریک ہے۔ مقصد یہ ہے کہ آدمی اولاً حال میں مستغرق ہوتا ہے اور اس کی آنکھ حال کا احاطہ نہیں کر پاتی، حتیٰ کہ اس میں مہارت پیدا کرے۔ اس وقت خود سے نہیں پھرتی اور حال کو اپنے پہلو میں تلاش کرنا چاہیے۔ اور اس کو اوپر سے پکڑے، اس وقت اس کے ساتھ دوسری بو ہوتی ہے۔ اور اس کو اس کی جگہ سے اکھاڑ دیتی ہے اور تجلی کا معاملہ مکمل ہو جاتا ہے۔ اور ان پانچوں مواقع سے مقصود یہ ہے کہ تبصرہ کرنے والا اس سے احتراز کرے۔ بزرگوں نے کہا ہے کہ سالک کو اس میں کوشش کرنی چاہیے تاکہ منزل مقصود کو پہنچ جائے۔ بحمد اللہ. اس مسکین کو علم کے اتنے راستے دکھا دیئے گئے ہیں کہ معلوم نہیں کسی دوسرے کو دکھائے گئے ہوں۔

۱۵۳- تفہیم:

مانگنے میں اللہ تعالیٰ کے سامنے آہ وزاری اور تضرع

حضرت حق طلب کے واسطہ سب کا سر چشمہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک جگہ سے خون نہ ٹپکے اور ہمتیں خاک آلود نہ ہو جائیں۔ اور ہر سامان و آہنگ جو اپنے اندر پاتا ہے معدوم نہ ہو جائے۔ اور اس سعادت کے آس پاس بھی نہیں پہنچ سکتا اگر یہ خرق عادت مستقل طور پر کسی ایک فرد کے بارے میں واقع ہو جائے۔ وہ خود مستثنیٰ ہے۔ اور بیرونی حساب سے وظیفہ وہ ہے کہ اس پر اپنی ساری رضاؤں کو قربان کر دیا جائے۔ اور ادب کے ساتھ آئندہ کے مقامات کی طلب اور سوال کیے جائیں۔ إنه جواد رحيم كريم.

۱۵۴- تفہیم:

خواب پریشان کے درجہ میں سالک کی تشویش

ایسا کم ہی ہوتا ہے کہ میں کوئی چیز لکھوں اور لکھنے سے پہلے میں نے ہر لحاظ سے اس کا احاطہ نہ کر لیا ہو۔ سوائے ان تشویشات کے کہ غالباً یہ بدعات طبعیہ، بشریہ و تدنسیہ ہیں کہ ہمیں ان کا جواب حاصل نہیں ہوا۔ اور خود بھی اوقات عزیز تشویش میں جو کہ امر تدنسی انتہائی باریک ہے صرف نہیں کیے۔ ان کی مثال خواب پریشاں کی سی ہے کہ ان سے نا کردہ اخبار بہتر ہیں اور یہ شیطان کے ڈراوے ہیں۔ فاستعذ باللّٰه من الشيطٰن الرجيم "شیطان مردود سے اللہ کی پناہ طلب کرو۔" اپنی نظریں اس میں گاڑ دو، سوائے تجرید توحید کے۔ اور ذات قصوی پر توجہ راہ اضمحلال سے قائم کر دو۔ اور اگر احادیث نفس اور اس پر دلالت کرنے والے خیالات الفاظ (میری غرض طبیعت شعریہ سے اس کے قریب رہتی ہے) اس کی راہ میں رکاوٹ نہیں تو دل کی گہرائی کے ساتھ توبہ کریں۔ اور اللہ سے پناہ طلب کریں اور توحید فی اللہ کی نشاط مضبوطی سے پکڑیں۔ یہ مسکین بھی دل و جان سے اس معنی کا خواہاں ہے۔

توحید، تجرید توحید الی اللہ اور نشاط فی اللہ میں اضمحلال سے تم اپنی ہیکوں پر قائم ہو جاؤ

تو تمہارے لیے سب کچھ ظاہر ہو جائے گا۔ اللہ سبحانہ کے حضور کی طرف تمہارے لیے راستہ اس طرح سہل ہو جائے گا کہ حاضر امر قدوسی ہو جائے گا۔ اور اس کی علامت یہ ہے کہ تم جان جاؤ گے کہ تمہیں جس امر کا اشتیاق ہے، اس کے بعد کہ تم اس کو غیریت کے علم سے جانتے تھے اور اس حیثیت سے کہ حاضر بعینہٖ قدوسی ہوتا ہے جس کے ذریعہ ہر ممکن کامیاب ہو جاتا ہے۔ وہ تمہیں بالفعل حاصل ہو گیا ہے۔ اور اس کی نشانی یہ ہے کہ تمہارے نزدیک ایک ایسی شئے حاضر ہوتی ہے جو حس کو ڈھانپ لیتی ہے اور قوت مدرکہ کو ابھارتی ہے، وہ علم حضوری ہے جس کی طرف تم اضمحلال تقرر سے پہلے آئے تھے، اور علم حصولی جس نے تم کو ڈھانپا وحشی مدرکہ ہے۔ پھر اللہ سبحانہ عرش کے اوپر سے تجلی جلیل الشان کا فیصلہ فرماتا ہے جس کی برہان پوری طرح ظاہر ہوتی ہے۔ تمہارے اوپر سے تمہارا احاطہ کرتی ہے، پھر جو ہوتا ہے ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ میرے رب جل جلالہ نے مجھے سکھایا اور مجھے اس دنیا میں اور دار آخرت میں بوجہ اجمالی تمہیں حاصل ہونے والے کمالات کے بارے میں تمہیں خبر دینے کی اجازت نہیں دی۔

۱۵۵- تفہیم:

مجرد مقدس کی طرف توجہ کا طریقہ

تمام تر جدوجہد کوشش کر کے سب کچھ سینہ سے باہر نکالیں اور بغیر حرف و آواز کے مجرد مقدس منزہ کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ دلجمعی کے مکمل غلبہ کی حالت میں نفی و اثبات کی خاطر یکسو ہوں بلکہ صرف اثبات میں مشغول ہوں جب یہ معنیٰ نصب العین ہو جائے سانس کو زیر ناف محبوس رکھیں اور اس معنیٰ کی جو کہ نصب العین ہو گیا ہے، محافظت کرنی چاہیے، اس وقت تک کہ طبیعت کفایت کرے، ساتھ دے۔ جب پریشانی ہونے لگے تو سانس کو چھوڑ دیں اور اثبات مجرد کی طرف توجہ کریں، جب دوسری مرتبہ نصب العین، مرکز نگاہ حاصل ہو جائے، پھر سانس کو زیر ناف روک کر رکھیں اور اس کی حفاظت کریں۔

۱۵۶- تفہیم:

خواب اوران کی تعبیر

سونے والا جس طرح خواب میں دیکھتا ہے۔ میں نے دیکھا کہ روحانی شخصیتوں کا اجتماع تھا۔ان کا سربراہ دو صحیفوں کو پڑھ رہا تھااور وہ سب لوگ ان کو سن رہے تھے۔ایک صحیفہ میں اللہ سبحانہ کے اسماء تھے،ان میں سے میں نے تین یاد کر لیے۔السید الرحمٰن اور الرحیم ۔اور دوسرے میں سیدنا و مولانا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسماء تھے۔اس میں سے میں نے دو یاد رکھے۔ السید اور ابو فاطمہ۔پھر میں نے سمجھا کہ اس نے دونوں صحیفوں کو میرے بھائی محمد عاشق کی وجہ سے اوران کے ذکر پران کی طرف اشارہ اور ان کے سامنے پیش کرنے کے طور پر پڑھا۔ مجھے اس خواب سے بہت مسرت حاصل ہوئی۔اور میں جان گیا کہ اس کے لیے حظ وافر اور نصیب تامہ ہے۔پھر میں نے ان میں سے ایک شخص کو دیکھا جو چھاج چھاور رہی کی اصلاح کر رہا تھا حتیٰ کہ وہ بہترین ہیئت پر ہو گیا اور میں سمجھ گیا کہ اس نے اس کی اصلاح ہمارے گھر والوں میں سے ایک خاتون کی طرف اشارہ پر کی ہے۔چنانچہ میں جان گیا کہ اس خاتون کے لیے تلخی وترشی اور کدورت پر نجات وسعادت سے ایک حصہ ہے۔اس طرح اللہ عزوجل نے مجھے جو کچھ سمجھایا،اس پر میں نے اس کی حمد کی۔اور امید ہے کہ میرا رب اس کو درست قرار دے دے گا۔

۱۵۷- تفہیم:

قیامت کے دن سوال نہ ہونا اور آپ کا جنت میں داخل ہونا

مجھ سے کہا گیا کہ تم ان لوگوں میں سے ہو جن سے قیامت کے دن سوال نہیں کیا جائے گا۔اور تم بغیر حساب کتاب کے جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔اور جب تمہیں قبر میں داخل کیا جائے گا تو ہر علم اور ہر تجلی کو چھوڑ دیا جائے گا۔سوائے اس تجلی ذاتی کے جو اسم رحمٰن سے اوپر ہے۔ تو اس میں پوری طرح اضمحلال ہو جائے گا۔اور وہ نعمت کبریٰ ہے۔تم اس سے اوپر نہیں سوچ سکتے۔اور جب تم جنت میں داخل ہو گے تو وہاں لوگوں کی دو قسمیں ہوں گی۔اہل علم و تجلی اور اہل علم واحوال۔اور ان شاء اللہ تم اہل تجلیات میں سے ہو گے۔اور تجلی اور حال میں فرق یہ ہے کہ تجلی امر الٰہی ہے،اور حال اُمرنا سوتی ۔والحمد للہ علی ما أنعم وعلی مالم نعلم۔

۱۵۸- تفہیم:

حضور مجرد کا حصول اور اس کی حقیقت کا بیان

بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ صاحب زعم کے مطابق حضور مجرد حاصل ہو جاتا ہے۔ حالانکہ نفس الامر میں وہ مجرد نہیں ہوتا۔ اس مقصد کے لیے ہم نے ایک پیمانہ مقرر کیا ہے کہ ارض کثیف ہے اور پانی لطیف۔ اور اس کے لطیف ہونے کے معنی رنگا رنگ نہ ہونا اور چار یا چھ خانوں میں بانٹنے کے اثر کا باقی نہ رہنا ہے۔ اور ہوا اس سے بھی زیادہ لطیف ہے۔ اور الطف زیادہ لطیف ہونے کے معنی ان دونوں صفتوں میں انتہائی مقام کو پہنچنا ہے۔ اور بھوک و پیاس اور غضب اور تمام صفات نفسی ہوا سے زیادہ لطیف ہیں اور ان کے زیادہ لطیف ہونے کے معنی چھ اور چار وغیرہ خانوں میں بانٹنے کی تاثیر وانفعال کا نہ ہونا ہے۔ اور کسی شئے میں مظروفیت (Contained) کا نہ ہونا ہے اور صورت انسانیہ کلیہ ان اوضاع واشکال سے قطع نظر جو انسان کے ساتھ مخصوص ہیں۔ بلکہ امر مجرد بسیط جوہری ان سے بھی زیادہ لطیف ہے۔ اور ان کے لطیف ہونے کا معنی کسی خاص شئے کے ساتھ اس کا عدم تخصص اور اس کی نسبت کا تمام افراد کا مع الواحدہ استوا اور اس کا اشیاء خارجیہ میں سے ایک شئے ہونا ہے۔ اور ذات مجردہ حضرت حق ان سے بھی زیادہ لطیف ہے۔ اور اس کی الطفیت کے معنی اس کی نسبت کے تمام ممکنات کے ساتھ حسب وجود کہ وہ شئے واحد ہے، استوا کے باوجود کسی چیز میں اس کا عدم حلول ہے۔ اور اسی طرح بتدریج ان امور کو ملاحظہ کرتے ہیں اور اپنے امر وجدانی کو قیاس کرتے ہیں۔ اور جب تک ان میں سے ہر ایک کے لیے نہ ہوگا وہ غیر مجرد ہوگا۔ اگر غور وفکر سے کام لو تو یہ زیادہ واضح ہے۔

۱۵۹- تفہیم:

اللہ تعالیٰ کے ساتھ علم حضوری اور علم حصولی کے معنی

اب تمہارے اندر وہ قابلیت پیدا ہو گئی ہے جو امر منزہ کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔ اس کا ادراک میں نے ذوق صادق سے کیا ہے۔ مجھے یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے کہ تم نے خود کو ترک وتجرد میں ڈال دیا ہے۔ غالباً اس کا سبب یہ ہے کہ تمہارا علم بحق سبحانہ حضوری ہے۔ تم

چاہتے ہو کہ علم حصولی کا احاطہ کرلو اور اس کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اتنا جانتے ہیں کہ علم حضور شعور محض سے عبارت ہے، امر منزہ سے برآمد نہیں ہوتا کہ علم العلم اس سے محیط ہو جائے۔ کہ جب ہم علم العلم پر آتے ہیں، اس سے اعراض کر لیتے ہیں تا کہ محمول اور موضوع کر کے اس کے ساتھ ایک حکم جوڑ دیں کہ جب ہم ایسا کرتے ہیں، اس سے روگردانی کرتے ہیں۔ تمہارا حیلہ یہ ہے کہ علم حضوری حق کو جدا کردیں اور دل کو نقوش کونیہ سے جس سے کہ علم حصولی اٹھتا ہے، اس طرح خالص کردیں کہ انا کو سمجھ کر کہ کیا ہے، اس جگہ پہچان لیں کہ یہ انا ایک جگہ پہنچا دیتی ہے۔ اور اس کی اصل کیا ہے۔ اس امر کے احکام کے بعد علم حصولی کو بھی حضرت حق کی جناب میں مصروف کرتے ہیں۔ ہمیں شک نہیں ہے کہ ایسے وقت میں علم حصولی منزہ بحال ہوجائے گا۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ تم اس کے قابل ہوگئے کہ زمان ومکان سے مجرد امر کی طرف توجہ کرو۔ اس میں شبہ نہیں ہے لیکن تمہارے نزدیک ایک اشتباہ اور ایک اختلاط ہے، یہ شبہ ہو یا اس جیسا کچھ۔ لیکن اتنی قوت نہیں ہے کہ علم العلم کے نزدیک توجہ مجرد کے ساتھ رہتی ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ علم العلم کو گزرنے دیں اور علم حرف کو اختیار کریں۔ یقین جانیں کہ حق سبحانہ کے تجرد کے درجات ہیں۔ اس کا درجہ ادنیٰ زمان ومکان سے تجرد ہے اور محض اس تجرد سے وہ اللہ ہے۔ آدمی کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ تمہارا وہ ادراک نفس ناطقہ کے حاسہ سے ہے کہ اس کی شان ادراک مجردات ہے، بر سبیل احساس، تخیل اور توہم نہیں۔ بلکہ ان امور سے شان اعظم ضمناً یادگیری میسر ہے۔ اس بارے میں ہمیں کوئی شک نہیں ہے۔ حاصل یہ کہ تلفظ، احساس، تخیل اور توہم کے قیود سے تخلیص مدرکہ کی بھرپور کوشش کرتے ہیں تب اگر اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں تو صورت اختیار کر لیتا ہے، اور اپنے احوال سے خبر کر دیتا ہے اور خود کو خفا نہیں کرتے ہیں اور مایوسی کو اپنے اندر کوئی موقع نہیں دیتے ہیں۔

(**فائدہ**) لفظ علم حصولی کا اطلاق علوم توہمیہ وتخیلیہ کے مقابلہ میں کیا جاتا ہے، اور علم حضوری کا اطلاق علوم مجردہ منزہہ کے مقابلہ میں، جو کہ نفس ناطقہ کی صلب سے اٹھتا ہے۔ اس تعلق کے ساتھ جب تک علم حضوری جو کہ انا ہے خدا سبحانہ سے نہ بدل جائے، یہ علم حاصل نہیں ہوتا، دھیان رکھو، سمجھ لو۔

۱۶۰-تفہیم:

بنی آدم کے رحمٰن کی انگلیوں کے درمیان ہونے کے احوال

جاننا چاہیئے کہ احوال بنی آدم رحمٰن کی دو انگلیوں کے درمیان ہیں۔ان میں ایک انگلی جلال کی ہے اور دوسری جمال کی۔لازم ہے کہ ان دونوں کا مقتضا جلوہ گر ہو۔ان وحشتوں کو تیار شدہ میں شمار کرنا چاہیے اور ہر وحشت اپنے پہلو میں ایک انس رکھتی ہے۔اگر تمہیں یقین نہیں تو تجربہ کرلو

گو یند سنگ لعل شود درمقام صبر
آرے شود و لیک بخون جگر شود

"کہتے ہیں کہ صبر کے مقام میں پتھر لعل و گوہر ہو جاتا ہے، ہاں ہو جاتا ہے لیکن خون جگر سے ہوتا ہے۔"

اگر تامل سے کام لو تو پاؤ گے کہ وحشت دوسری طبیعت کا تعلق ہے اور جو وحشت اسماء جلالیہ کے عکس سے ہے، وہ دوسری ہے۔ یہ وحشت انسی ہے۔ وحشت رنگِ وحشت مزاج بخلاف اولیٰ یہی ہے کہ طمع کو قطع کر دیتے ہیں، اور خود کو مردہ تصور کر لیتے ہیں۔ وحشت اولیٰ اپنے عدم میں چلی جاتی ہے۔اس وقت اگر کوئی وحشت چاہیں تو دوسرے کے قبیل سے چاہیں گے کہ ابھی تمہیں خروج اور انسانی آہستہ روی اور دھوکہ کا لالچ پکڑے ہوئے ہے۔لازم ہے کہ تم اپنے آپ کو ان سے بچاؤ۔

لنگ ولوک وخفتہ شکل و بے ادب
سوء او می خیز او رامی طلب

"کمزور و عاجز اور سوئی ہوئی پژمردہ شکل اور بے ادب، اس کی طرف اٹھ اور اس کو طلب کر۔"

یحدثنی نفسی بانک واصل
الی نقطة قصواء وسط المراکز

"میرا نفس مجھ سے کہتا ہے کہ تم مراکز کے درمیان انتہائی نقطہ تک پہنچنے والے ہو۔"

وانک فی بیت البلاد تفخم
بکفک یوما کل شیخ وماھر

''اور تم شہروں کے اندر پھولے ہوئے ہوگے، ایک دن ہر بوڑھا اور ماہر تمہارے قبضہ میں ہوگا۔''

۱۶۱۔تفہیم:

خارجی اسباب سے دل تنگ نہ ہونا اور حدیث نفس کے ترک کی کوشش کرنا

اگر تمہارے اندر ہوس مداخلت کرتی ہیں، وہ غالباً طبیعت کے اندر سے نہیں خارج سے ہوتی ہیں کہ ہم تمہاری حقیقت سے باخبر ہوئے ہیں۔ خارجی وسوسوں کے محاربہ سے تمہاری طبیعت فارغ ہوگئی اور محاربۂ نفس فطرت میں داخل ہے۔ خارج سے میری مراد شیطان اور بعض لوگوں کی صحبت کا اثر یا مزاج کی سستی ہے جو ان اوہام وغیرہ سے چھٹکارا حاصل کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ اور میں تمہارے لیے رجوع قہقری سے اللہ کی پناہ چاہتا ہوں۔ اور انشاء اللہ تعالیٰ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ اگر وقت انس و جمعیت کا موقع دے، ہر طرح سے چھٹکارا حاصل کرو۔ حدیث نفس کو ترک کرنے کی کوشش کرو۔ ہاں انشاء اللہ اس سے چھٹکارا اور خالص توحید اور مدرک کے اتحاد کا حسن درجۂ اتم وصریح صورت میں حاصل ہو جائے۔ شاید معلوم ہوگا کہ جو بھی ترقی حاصل ہوتی ہے، انس کے اوقات میں ہوتی ہے اور وحشت کے اوقات میں حاصل ہونے والی کیفیت پر محافظت غنیمت شمار کی جاسکتی ہے۔

۱۶۲۔تفہیم:

انکسار خاطر کے معنی

تمہارا کہنا ہے کہ گالی وغیرہ سننے سے طبیعت ٹوٹ جاتی ہے تو یہ کیسے کہا جاتا ہے کہ نفس کے جوہر اور اس کے قوام میں انکسار پیدا ہوتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ منکسر اور گالی سننے یا اہل وعیال میں کسی خیر کے مشاہدہ کے وقت تم سے جو ملولی ظاہر ہوا وہ جزء نسمی ہے اور نسمہ اپنی طبیعت کے مطابق اس سے پوری طرح زائل نہیں ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ اس باب میں ہے کہ

وہ فنا کی ابتداء میں، نفس کے رنگ میں رنگ جاتا ہے۔ چنانچہ دیکھتے ہیں کہ وہ اپنی طبیعتوں میں زائل ہوجاتی ہے لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔

۱۶۳- تفہیم:

اپنے بعض اصحاب کو بعض اشعار کے پڑھنے اور قرآن کی تلاوت وغیرہ کی وصیت

کبھی کبھی یہ شعر پڑھا کریں

یا بخود آتش تواں زد یا دلی باید گداخت
گر دماغ عشق داری ایں قدر ہا کردنی است

"یا تو خود کو آگ لگا سکتے ہو یا دل کو گھلا دینا چاہیے، اگر عشق کا خیال رکھتے ہو تو اتنا تو کرنا ہی ہے۔"

اور یہ شعر بھی پڑھا کریں

غیر معشوق ار تماشائی بود
عشق نبود ہر زہ سودائی بود

"اگر کوئی غیر معشوق تماشائی ہو، تو عشق نہیں ہوا بلکہ ایک جنونی بکواس ہوئی۔"

تمہاری افتاد طبع عاشق مزاج واقع ہوئی ہے۔ تمہاری طبیعت اس طرح کے اشعار اور اس طرح کے خیالات سے جو کہ محبوب کی عظمت اور اس کی طلب کے مشتاق کی تحقیر، اس کے وصل کے پہلو اور خیال فنا میں اشیاء کے تابع سایوں اور شکلوں کی رویت وغیرہ میں تمہارے اندر احداث میں عجیب تاثیر چاہے گی اور کبھی کبھی قرآن مجید کی تلاوت اور بعض اوقات نادرہ میں ایسے اشعار پڑھنا جو محبت کے اظہار کے وقت مشتاق طلب کے استحقار کے بیان میں ہوں اور جو توحید کے بیان میں ہوں علی سبیل الندرت نفع سے خالی نہیں ہیں اور بدن سے کلی طور پر انس کے اوقات میں ایسی حیثیت دینے میں کوئی اتم حالت درآمد ہو زیادہ قربت پیدا کرنے والی نہ ہوگی اور وحشت کے اوقات میں کہ ڈوبنے والا ہر گھاس کو پکڑتا ہے اختیار کریں۔

۱۶۴- **تفہیم:**

سالک کے قلب کا اضطراب اور اس کا علاج

غالباً تمہیں واضح ہو گیا ہو گا کہ مدرک حق سبحانہ ایسے ادراک سے کہ اگر تمام تقررات کا اضمحلال اللہ تعالیٰ کے وجود میں بجائے اس کی شرح کے رکھ دیں تو موافق و درست ثابت ہو اور اگر حضور امر کو یہ طریق حصول صورت بجائے اس کی شرح کے رکھ دیں تو وہ بھی موافق اور درست ہو۔ ان کا مدرک نہ حس ظاہر ہے نہ حس باطن اور نہ قلب جو کہ منبع اخلاق ہے۔ بلکہ خوف ورجا اور محبت وصلابت فی امر اللہ جیسے احوال والا امر دیگر ہے جو ان سے اعلیٰ واتم ہے۔ چنانچہ یہ بہت بڑی بات ہے کہ اس راز کا عارف جو حس باطن ہے یا اس کا قلب، تشویش میں مبتلا ہو اس طبیعت کے لحاظ سے کہ حق عزوجل نے آدمی کو اس طرح پیدا کیا ہے۔ اس کا قلب رحمان کی دو انگلیوں کے درمیان رہتا ہے۔ کہتا ہے کہ میں تشویش میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ یہ حالت اس قدر ہے کہ جب قلب مجموع ہوتا ہے، اسے چاہیے کہ بادشاہوں والے کام کرے، اس کا شکر، اس کی اتباع کرے اور ملک کا کام سرانجام دے اور جب قلب تشویش میں مبتلا ہو تو اس طرح رہتا ہے کہ کوئی نہ کوئی کام کرتا رہتا ہے اور حکم کرتا ہے اور اس کی بات کو کوئی قبولیت کے تصور کے ساتھ نہیں سنتا ہے۔ لیکن بادشاہ کا حال کسی حال میں متغیر نہیں ہوتا اگر شکایت کرتا ہے تو قلب سے کرتا ہے نہ کہ نفس ناطقہ سے۔ ان علامتوں سے غرض یہ ہے کہ بسا اوقات اس کی تشویش خواب پریشاں کا درجہ رکھتی ہے اور اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ اپنے دل کو مضبوط رکھیں اور لکھیں کہ یہ نکتہ اچھا معلوم ہوتا ہے یا نہیں۔

۱۶۵- **تفہیم:**

سالک کی ترقیوں پر تنبیہ

عنقریب حقیقت امر سے پردہ اٹھ جائے گا اور دائمی آسودگی میسر آئے گی اور بالجملہ جو کچھ حال علم غیرت سے اس کا ادراک کرتا ہے، جلوہ گر ہوتا ہے یعنی خالص تنزیہہ کہ ایک بار بھی رجوع خواہ وہ تھوڑی ہی کیوں نہ ہو، اس سے پہلے علم حضوری سے معلوم ہو جائے گا۔ اور علم

حصولی سے بھی اعمال مدرکہ سے حاصل ہوتا ہے۔ جس کا ادراک بہت عمیق ہے۔ اس وقت نفس ناطقہ تمہارے اندر تشویش یا گدگدی پیدا کرتا ہے گویا اس سے بھی ہوتا ہے اور امر منزہ جس کی صفت ہم بیان کر چکے ہیں اپنی جگہ نہیں بیٹھتا ہے۔ اس وقت بر سبیل استبداد و استقلال تصرف کرتا ہے۔ چنانچہ

آنچہ ندید است دو چشم زماں
وآنچہ نہ بشنید دو گوش زمیں

''جس کو زمانہ کی دو آنکھوں نے نہیں دیکھا، اور جس کو زمین کے دو کانوں نے نہیں سنا۔''

درگل مارنگ گرفتہ است آں
خیز بیا در یوم گل ما آں ببیں

''ہمارے خمیر میں اس نے رنگ پالیا ہے، اٹھو، آؤ، ہمارے اس خمیر کو دیکھو۔''

اس کے بعد دورہ ولایت میں آخر تک پہنچو اور اگر دورہ معرفت و حکمت کریں تو یہ کام ارحم الراحمین اور اکرم الاکرمین کا ہے۔ اس فقیر کی وصیت یہ ہے کہ ہرگز ایک لحہ کے لیے فتور کو ذرا بھی موقع نہ دیں کہ یہ معنی بودنی ہے۔ لیکن اس کی کیفیتوں کا فرق مکمل طور پر بھی اور ناقص طور پر بھی جمع ہمت کو سونپا ہوا اور فناء نشاط اور دوام توجہ ہے

گوئی توفیق وسعادت درمیان افگندہ اند
کس بمید ان درنمی آید سواراں راچہ شد

''توفیق اور سعادت کی گیند کو درمیان میں ڈال دیا ہے، کوئی میدان میں نہیں آتا سواروں کو کیا ہو گیا ہے۔''

یا بخود آتش تواں زدیا دلی باید گداخت
گر دماغ عشق داری ایں قدر ہا کردنی است

''یا تو خود میں آگ لگا لو یا دل کو گھلا دو، اگر عشق کا داغ رکھتے ہو تو اس قدر کرنا ہی ہے۔''

۱۶۶۔تفہیم:

بندوں کا مختلف طبقات میں پیدا ہونا

جان لو! رحمک اللہ. "اللہ تم پر رحم فرمائے" کہ اللہ سبحانہ نے بندوں کو مختلف طبقات میں پیدا فرمایا ہے۔ چنانچہ ان میں سے بعض سختی میں پہاڑ ہیں اور بعض پوری طرح اس میں شامل ہیں۔ اور یہ انسانیت کے اعتبار سے اوسط نوع انسانی ہے۔ اور بعض بڑے بڑے پہاڑ ہیں اور بعض امیت پر ہیں، بعض پوست اتارنے یا کھال کھینچنے پر۔ بالجملہ یہ علم عمیق اور گھیرا ہوا راز ہے۔ اس کا احاطہ صرف فرد یلمعی، غیر معمولی شخص ہی کر پاتا ہے۔ اور ان میں سے ہر ایک کے لیے علیحدہ ایک تجلی ہوتی ہے جو اللہ سبحانہ فرماتا ہے۔ اور ہمارے زمانہ میں اس سے حاصل صرف یہ بتاتا ہے کہ اے راز پوشیدہ اور محفوظ موتی تمہاری جبلت مکمل کردی گئی ہے، اور تمہاری تجلی انشاء اللہ تعالیٰ مکمل ہوگی۔ مکمل تجلی کے ساتھ مختلف رنگوں میں ہوگی، نہ اس کی کوئی حد ہوگی اور نہ کوئی فریب ودغا۔ لیکن تم نے ایسے فرد سے حاصل کیا ہے جو اس کے لیے موزوں رنگ جیسے شیریں وصاف پانی اور صاف آئینہ میں رنگا ہوا نہیں ہے۔ چنانچہ اس سے زیادہ تیز رفتار اور زیادہ سیر کرنے والا ہوتا ہے حتیٰ کہ اس کی تمام تجلیوں کو خالص ذات کی طرف تعبیر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ تم بھی ایسے ہی ہو اور اگر تمہارے اوپر پوری تجلی ڈال دی تو شرف اضمحلال پر ہوگی۔ اگر نازل ہوگئی تو تجلی نے احاطہ کرلیا اور اگر دوسری تجلی میں گھر گیا یا اس کی طرف مائل ہوگیا تو ضروری ہے کہ لازمی طور پر تمہارے نزول کے وقت دو میں سے کوئی ایک امر ہو۔ اور بالجملہ واجب ہے کہ تم یہ جان لو کہ اس تجلی کی علامتوں میں سے یہ ہے کہ تم ایک ایسا امر پاؤ جس پر تمہارا قلب مطمئن نہ ہو اور تم یقین کرو کہ تم جس کو طلب کررہے ہو اور جس کی طرف تمہارا شوق مائل ہے، صرف وہی ہے جو تمہارے نزدیک حاصل ہو چکا اور ان میں سے ایک یہ ہے کہ تم تجلی کو کوئی ایسی چیز پاؤ جو تمہارے اوپر سے تمہارا احاطہ کرلے۔ یہ نہیں کہ تمہارے ذہن کے ظرف میں ہو۔ اور ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ تمہارا عین علم حضوری باللہ ہے جو تمہارے تقرر سے پہلے سے ہے۔ اور تمہارا عین علم حصولی ہے۔ تمہارے قلب اور تمہاری محبت کے اطراف سے اس کی طرف تمہاری توجہ سے پہلے۔

۱۶۷- تفہیم:

وحدت قصویٰ تک پہنچانے والا سفر اور اس سلسلہ میں حق امور ضروریہ کا قطع کرنا واجب ہے

اے میرے خلیل اور میرے حبیب! اگر حواس باطنہ توجہ تامہ کے وقت قوت شان اوپر کی جانب محسوس ہو تو کوئی خلل نہیں ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ تمہاری معرفت کا تعلق زمان ومکان سے مجرد ہے۔ اور اس کے بعد منبع حواس باطنہ ان کی جبلت سے اور اس معرفت کا علم العلم سے ملانا کہ غالباً تشویش سے خالی نہیں ہوتا، کیا ہوگا۔ اب وہ وقت ہے کہ پوری ہمت سے کام لیتے ہیں اور سینہ سے دوسراز ور لگا کر سانس نکالتے ہیں کہ ایک وقت ایسا آجاتا ہے جب مدرک (ادراک کرنے والا) اور مدرک (جس کا ادراک کیا جاتا ہے) دونوں ایک ہو جاتے ہیں۔ متوجہ ہونے والا اور جس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں ان کے تقابل کی زحمت اٹھ جاتی ہے۔ انتہائی حیرت پیدا ہو جاتی ہے۔ اضمحلال کلی سامنے آجاتا ہے۔ اس وقت جلوۂ الٰہیہ اس مشت خاک پر پڑتا ہے۔

حیف گر یک دانہ باشد حاصل دہقان ما

"بڑے افسوس کی بات ہے اگر ہمارے کسان کو ایک ہی دانہ حاصل ہو۔"

تمہارا قصہ ایک مجاہد امیر کی طرح ہے۔ اس نے تمام اسباب حرب سامان جنگ مہیا کر لیا اور اس کے مددگار ومعاون اس کی مدد ونصرت کے لیے تیار ہو گئے حتی کہ دونوں فریقوں کے درمیان مقابلہ آرائی اور قتل وقتال کا بازار گرم ہو گیا۔ اس دوران اس کے سینہ سے ایک تازہ زوردار جوش پیدا ہوا اور وہ اپنی جان پر کھیل گیا۔ ورنہ یہ تمام قتل اور لوگوں کا جمع کرنا فضول ولغو قرار پاتا۔ معاذ اللہ من ذلک. میرے دل کے اندر سے منزل مقصود کے حصول کی بشارت حاصل ہوتی ہے۔ واللہ علی ما نقول وکیل. اس عمل کی تدبیر یہ ہے کہ موجوں کے جوش کے دوران جمعیت وفتا گزر جاتی ہے توجہ کی باگ ڈور پوری طرح مدرک (ادراک کرنے والے) ادراک اور مدرک (جس کا ادراک کیا جائے) کے اتحاد کی طرف مصروف کریں اور

طرح طرح کے مردانہ خیال برآمد ہوتے ہیں اور ایسا کیوں نہ ہو جبکہ تمام موجودات اس وجود مطابق میں شریک ہوتے ہیں جو مفہوم انتزاعی ہے۔ اور وہ اجل بدیہیات نہیں ہے کہ یہ حقیقت ہی وحدت قصوی ہے جو اصلاً نہ متعدد ہوتی ہے اور نہ ہی کثیر ہوتی ہے۔ سوائے اس کے جو وہم، خیال اور اعتبار کے مشابہ ہوتا ہے۔ آخر ہم کب تک وہم سے وابستہ رہیں گے اور حقیقت الحقائق سے محروم بیٹھے رہیں گے۔ واحسرتا وواویلا۔ اگر ہم نادانی کی اس چادر کو نہیں پھاڑیں گے اور اس وحدت میں کہ اس جگہ مدرِک اور مدرَک کے تقابل اور مسابقۃ میں غوطہ نہ لگائیں گے۔ تو نہ عین باقی رہے گا اور نہ ہی اس کا اثر باقی رہے گا۔ اس طرح کہ دس سروں والے انسان کے اوہام جہالت وغیرہ جو اس کے نزدیک محض لاشئے ہیں، اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ صریح اور واضح ہیں۔ یہ دور خاپن اور من وتو کہ محض جہالت سے اٹھا ہے، حقیقت قصوی اور وحدت کبریٰ کے پہلو میں لاشئے محض ہے اور صرف وعدم بحث نہیں ہے۔ سبحان اللہ۔ ایک خیال ہماری راہ میں آتا ہے اور ہماری متاع سامان واسباب کو لوٹ لیتا ہے۔ اگر ہم ایک ہی حملہ میں اس خیال کے سر کو تن سے جدا نہ کر دیں اور اصل کی طرف رجوع کریں تو گویا ہم مرد نہیں ہیں۔ اور آخر ہمیں رجوع حال سے روکتا کیا ہے۔ حالانکہ اس کا نور اس کے ظاہری حسن کو نظروں سے دور کر دیتا ہے۔ اور جہالت کی ظلمت بدحال اور ذلیل پر اور وحدت قصوی کی تلوار اس پر حملہ کرتی ہے اور اس کے سر کو جسم سے جدا کرتی اور اس کی کمزوری کو ظاہر کرتی ہے۔ اس سے دور بھاگتی ہے اور غریق کے حکم سے ہر گھاس پھونس سے وابستہ ہو کر ہماری احادیث نفس سے مل جاتی ہے۔ اور دیکھنا چاہیے کہ احادیث نفس جو میں اور تو تراشتی ہیں، ان کی حقیقت کیا ہے اور کس حد تک ان میں زور وقوت ہوتے ہیں۔ اللہ اس فریادرس اور فریادی کو خیر سے دور کرے اور اگر ہم اس نالائق وبداصل کے ساتھ جو کہ بغیر استحقاق معاونت وسروری سے کھڑا ہو گیا، اٹھنا بیٹھنا کریں تو اللہ کی مخلوق میں سب سے زیادہ بزدل اور سب سے زیادہ ضعیف ہو جائیں گے۔ سبحان اللہ۔ احادیث نفس ہمیشہ ہمارا گریبان پکڑے رہتی ہیں اور ہمیں خواہشات سے باز رکھتی ہیں اور آج چاہتی ہیں کہ ہمیں اس سے دور کر دیں۔ شاہ وحدت رسوا کرتا ہے کہ اس کی تیاری میں ہم نے معاونت کی ہے۔ اور اپنے پردوں سے باہر نہیں آتا کہ ہمیں اس کی فنا میں بھیج دے۔ ہمیں اپنے مرنے کی اس رسوائی کے غم سے آسانی

فراہم کرتا ہے۔ ہم ایک خنجر مار لیتے ہیں اور اپنے حلقوم کو کاٹ لیتے ہیں یہ گنوار پن غیر معلوم النسب قبیح الحسب کیسی بلا ہوتی ہے کہ ہمیں اس بلا میں مبتلا کیا جاسکتا ہے کہ ہم اٹھیں اور وہی کریں جو فرہاد نے کیا تھا کہ خنجر اپنے گلے پر رکھیں اور ایک خنجر اس ملحد کے سینہ میں پیوست کردیں کہ ہم دوبارہ اس خجالت کا بار نہ اٹھائیں۔ اور نہ یہ مردود وکافر کیش رہے۔ اور شاہ وحدت بھی کہ جیسا اس کو جلال وکمال زیب دیتا ہے، تخت پر بیٹھے اور بادشاہی کرے

من وتو گر فدا شدیم چہ باک

غرض اندر میاں سلامت اوست

"اگر میں اور تم فنا ہوجائیں تو کیا حرج ہے، غرض تو اس کی سلامتی ہے۔"

جو شخص اپنے آپ سے ہاتھ دھولیتا ہے اور عدم کی راہ اختیار کرلیتا ہے، اس کی آرزو ہوتی ہے کہ خدایا میرا نہ رہنا رہنے سے بہتر ہے۔ کاش کہ اس طرح ہوجائے کہ نہ علم کی تدبیر ہم تک پہنچتی ہے اور نہ ہی خیر کی گولی ہم تک پہنچتی ہے۔ اس شئے کی تیاری کی امید کرتا ہوں، جو نہ اس کے ساتھ ہے نہ اس سے قبل اور نہ اس کے بعد ہے۔ اس کو یہ احادیث نفس کیا پھسلائیں گی اور کون سی محبت اس کے دل میں جگہ بنائے گی جس رکاوٹ کے مقابلہ میں مضمحل ہونے کی وجہ سے طبیعت میں جوش پیدا ہوتا ہے، وہ بھی حدیث نفس ہے۔ جب ہم اپنے آپ سے ہاتھ دھولیتے ہیں اور عدم کی راہ اختیار کرلیتے ہیں، اور کوئی چیز ہمارے نزدیک اپنے نفس سے زیادہ بغض وعداوت والی نہیں رہتی کہ شاہ وحدت کا شوق ہم پر غالب آجاتا ہے اور ہمیں اپنے آپ سے لے جاتا ہے اور ہمارا گریبان پکڑ لیتا ہے، کبھی زمین پر اور کبھی آسمان پر طاقت ور بناتا ہے، یہ حدیث نفس کیا ہوتی ہے۔ عقل تصدیق نہیں کرتی کہ وہ ہمارے عزم کی صحت کے نزدیک منع کرسکتی ہے یا اس میں رکاوٹیں پیدا ہوجاتی ہیں۔

ہمیں ترسم کہ حافظ محو گردد

کہ شور سخت در سردارم امشب

"میں اس سے ڈرتا ہوں کہ حافظ گم ہوجائے، کہ آج رات میرے سر میں سخت شور ہے۔"

شاہ راہ بیخودی راہم رہی درکار نیست

می بباید از وجود خود نظر پوشید ورفت

"شاہ راہ بے خودی کو کسی ہم راہی کی ضرورت نہیں ہے، چاہیے کہ اپنے وجود سے نظر کو چھپالے اور چلا جائے۔"

قلم حد سے گزر گیا اور جو کچھ رطب ویابس تھا اس نے کہہ دیا۔ سارے کلام کا حاصل یہ ہے کہ یہ سفر دوسرے سفروں کی طرح نہیں ہے بلکہ اس کی شان سب سے بڑی ہے۔ اور خواہشات کو ختم کرنے کی سب سے زیادہ ضرورت ہے جس میں کوئی شوق رکھنے والا امتیاز نہیں کرتا۔

۱۶۸۔ تفہیم:

ایک ساتھی کو اہم وصیت

اگر کوئی شخص بیعت کی نیت سے آئے تو تاخیر نہ کریں اور اگر کسی شغل کا متلاشی ہو تو تاخیر تجویز کریں۔ کہا گیا ہے لکل شئی آفة وللعلم آفات "ہر شئے کے لیے ایک آفت ہے اور علم کے لیے بہت سی آفتیں ہیں"۔ رات اور دن میں قریب چار گھڑی وقت ایسا چاہیے کہ اس میں اپنے نفس میں مشغول ہوں اور اس کو ازدہام خلق اور بکثرت بولنے سے بھی دور رکھنا چاہیے۔ اور اس وقت میں پوری قوت سے متوجہ ہو کر اپنے کام کی سعی کریں۔ اور ایک وقت تعلیم علم کے لیے ہونا چاہیے۔ اور ایک وقت اہل شوق کے قلوب ہیئت وجدانیہ کے القا کے لیے ہونا چاہیے۔ اور ایک وقت ایسا چاہیے کہ اس میں آمد و رفت کرنے والوں سے بات چیت کی جائے۔ اور ان کی خاطر تواضع کی کوشش کریں۔ اور جو شخص خلق اللہ کی دعوت کے مقام پر بیٹھے اور لوگ اس کی طرف متوجہ ہوں تو اس کو وہی کرنا چاہیے جو انبیاء علیہم السلام نے کیا۔ اس لیے کہ وہ اس مقام پر ان کا مقلد ہے اور ان کے پیچھے چلنے والا ہے۔ اس کو لازمی طور پر پانچ خصلتیں پیش نظر رکھنی چاہئیں اور اگر ان میں سے ایک خصلت کو بھی ترک کرتا ہے تو یہ حرارت کی صورت ہے۔ ایک علوم دینیہ کی تعلیم۔ دوسرے امر معروف ونہی منکر، نرمی اور سہولت سے، سختی وتندی سے نہیں۔ تیسرے سب پر شفقت کرنا، دینی امور سے نابلد افراد سے خاص طور پر، ہر ایک کی قدر کو پہچانتے ہوئے ان کی استعداد کے مطابق۔ اور یہ ممکن ہے کہ ناسمجھ آدمی نرم گفتاری جیسی باتوں سے خوش ہوتا ہے۔ دینی مزاج رکھنے والوں کی زیادہ تعظیم کریں۔ چوتھے لوگوں سے کوئی لالچ نہ رکھنا اور ان کے معاملات میں بالکل مداخلت نہ کرنا۔

پانچویں اگر استطاعت رکھتا ہو، اس کے ذریعہ بر آنے والے مسافر اور علم سلوک کے طلب گاروں کی تواضع اور ان کی مدد کرے اور احباب ہم خیال ہوں تو ان کو ان کے حق میں تواضع کی ترغیب دینا۔ "الدال علی الخیر کفاعلہ" "خیر کی طرف رہنمائی کرنے والا اس کے کرنے والے کی مانند ہے۔" اللہ آپ کو صراط مستقیم پر قائم رکھے۔

۱۶۹- تفہیم:

جہاد کی عظیم انواع

جان لو کہ جہاد کی کئی قسمیں ہیں۔ ان میں سب سے اعظم لوگوں کی ظاہرا اور باطنا رہنمائی کرنا ہے اور خود کو اس پر فخر ومباہات کرنے سے باز رکھنا ہے۔ یہ وہ عمل ہے جس کے لیے تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو مبعوث کیا گیا۔ اور ہر جہاد میں شدت کے ساتھ صبر کرنا ضروری ہے۔ اس کے بعد نصرت حاصل ہوتی ہے۔ جیسا کہ فرمایا ہے: انا لننصر رسلنا "ہم اپنے رسولوں کی مدد کرتے ہیں۔"

گویند سنگ لعل شود در مقام صبر
آرے شود ولیک بخون جگر شود

"کہتے ہیں کہ صبر کے مقام میں پتھر لعل گوہر ہو جاتا ہے، ہاں ہو جاتا ہے لیکن خون جگر سے ہوتا ہے۔"

اور لوگوں کے ساتھ دو شرطوں پر صحبت اختیار کرے۔ اول یہ کہ ان سے اور جو کچھ ان کے پاس ہے، اس سے کوئی لالچ نہ رکھے۔ انشاء اللہ تمہیں ان سے وہ کچھ حاصل ہو جائے گا جس سے تمہاری ضرورتیں پوری ہو جائیں گی۔ اور تمہاری طرف سے کسی عزم کے بغیر اس کا انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ اور دوسرے یہ کہ ہر ایک کے لیے خواہ کوئی متمول اور فقیر اور صاحب جاہ ومنزلت یا میدان عرفان کا خاص ہو، خیر خواہی، نصیحت، انبساط اور حسن خلق سے کام لے۔ ان میں سے ہر ایک کا ایک مرتبہ ہے۔ اور جو اس کے بعد تم سے دشمنی رکھے وہ خبیث النفس ظالم ہے۔ وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون "جن لوگوں نے ظلم کیا ہے، وہ جلدی ہی جان لیں گے کہ وہ کس کروٹ لیٹتے ہیں اور ان کا کیا انجام ہوگا۔"

۱۷۰- تفہیم:

لوگوں کی رہنمائی کے لیے طریق خاص کی تلقین

جب تم رات کو اٹھو تو وضو کرو اور دو رکعت تحیۃ الوضو پڑھو، پھر قبلہ کی طرف رخ کر کے بیٹھ جاؤ اور اس نواح کے لوگوں کی ضرورتوں اور غفلتوں کو اپنی نظروں کے سامنے لاؤ، پھر اللہ کی طرف متوجہ ہو اور ستر (۷۰) مرتبہ "یا ہادی" کہو یا جتنی بار کہنے کے لیے تمہارا نفس اس طرف راغب رہے۔ پھر اللہ سے ان کی ہدایت میں سکینہ کا سوال کرو۔ تمہیں ہر رات ایسا کرتے ہوئے ایک مہینہ نہیں گزرے گا کہ تم پر اور ان پر سکینہ نازل ہو جائے گی اور یہ عارفین کے اسرار میں سے ہے۔ ان کو مت چھوڑنا۔ میں نے تمہیں اللہ کے اذن اور اس کی توفیق سے ایک بار اعطاء روحانی کے طور پر وہ سب کچھ اجمالاً عطا کر دیا ہے جس کی تمہیں ہدایت وارشاد میں ضرورت ہے۔ البتہ تفصیل وقتاً فوقتاً انشاء اللہ ظاہر ہوتی رہے گی۔

اور جان لو کہ امر کے خارج میں پائے جانے سے قبل تعارف کی طرف توجہ کے تین مراتب ہیں۔ اول یہ کہ تم اپنے نفس کو ہر علم سے خالی کر لو اور اللہ تعالیٰ کو پکارتے ہوئے اس کے سامنے اس انتظار میں بیٹھو جس کو اللہ اس واقعہ میں کھولے۔ پھر جب تم پر کوئی غیبی امر ظاہر ہو، خواہ بیداری کے عالم میں ہی ہو تو یہ دیکھو کہ تم اپنے دل میں کیا پاتے ہو، تو جب بھی یقین بدیہی پاؤ تو حکم لگاؤ کہ یہ الہام ہے۔ دوسرے یہ کہ سورۃ الشمس، اللیل اور والتین ہر ایک کو سات (۷) مرتبہ پڑھو۔ پھر اللہ کی طرف متوجہ ہو اور پاک حالت میں خالی قلب کے ساتھ ذکر کرتے ہوئے سو جاؤ، پھر جو بھی خواب میں دیکھو اس پر حکم لگاؤ۔ تیسرے یہ کہ پاکی اختیار کرو، پھر اس واقعہ میں اللہ کی طرف متوجہ ہو۔ قرآن کریم کھولو اور دونوں صفحات میں اسم الذات شمار کرو کہ کتنے ہیں۔ اسی گنتی کے مطابق ورق پلٹو۔ مزید تین ورق پلٹو، پھر ان صفحات کے برابر سطور کی گنتی کرو۔ اب کون سی آیت نکلی، اس کا تعلق اپنے واقعہ سے جوڑو اور اس پر حکم لگاؤ۔ اگر علم یقینی حاصل نہ ہو اور ظن وگمان باقی رہ جائے تو اس کے ساتھ خواب اور فال ملاؤ۔ اب جس امر کے بارے میں تھا تو، اس پر حکم لگاؤ۔ اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے شب قدر کے باب میں فرمایا: مجھے تمہارے خواب دکھائے گئے۔ عشر آخر پر طے ہو گیا اور اذان میں فرمایا یہ رویائے حق ہیں۔

اور یہ جان لو کہ جمع ہمت کے دو مرتبے ہیں۔ اول یہ کہ ان مراتب مذکورہ میں سے ایک کو پہچانے کہ معاملہ ہونے والا ہے یا نہیں۔ جب تم پہچان لو کہ ہونے والا ہے، اگرچہ مشکل ہی سے سہی تو اکیلے خالی ذہن وقلب ہو کر بیٹھ جاؤ اور اللہ سبحانہ سے سوال کرو کہ جو تم چاہتے ہو، وہ کر دے۔ سوال کے بعد سوال کرتے رہو حتیٰ کہ تمہارے اوپر طلب غالب آ جائے تو ایسے ہو جاؤ جیسے پانی کی طلب میں پیاسا ہوا کرتا ہے۔ گویا کہ اس کے سوا تم نے کچھ اور طلب نہیں کیا اور تمہارے دل میں اس کے عدم وقوع کا احتمال بھی پیدا نہ ہو۔ اگر تم نے چند بار ایسا کر لیا تو امر ایسا ہی ہو جائے گا جیسا تم نے چاہا ہے، انشاء اللہ۔ اور جس کے بارے میں تم نے سمجھ لیا کہ یہ ہونے والا نہیں ہے تو اس میں تحکومت۔ کام بڑی مشقت سے ہی ہو سکتا ہے۔

دوسرے اسماء اللہ تعالیٰ الحسنیٰ سے وہ طلب کرو جو تمہاری مراد کے موافق ہو جیسے رزق طلب کرنا ہو تو کہو "یا رزاق" اور لڑکا طلب کرنا ہو تو "یا باریٔ یا مصور" کہو۔ اتنی بار پڑھو کہ تمہارے اوپر اس اسم کی معرفت کا انکشاف ہو جائے جیسے تمام مرزوقات میں اور جس کو اس نے روشن کیا ہو، سریان الدم کی طرح۔ پھر جب انکشاف ہو جائے تو گویا کہ معاملہ تمہاری مراد کے مطابق ہی ہونے والا ہے۔

۱۷۱- تفہیم:

حجاب کو وہم سے ڈھانپنا اور اس کا علاج

لکھتے ہیں کہ بعض احباب بھرپور طریقہ سے اشغال انجام دیتے ہیں لیکن انہیں ان کی لذت حاصل نہیں ہوتی۔ روزمرہ کے وظیفہ داروں کو جاننا چاہیے کہ لوگ جبلت میں یکساں نہیں ہوتے۔ ان میں سے بعض فطرت کے لحاظ سے وہم کے پردوں میں پوشیدہ رہتے ہیں۔ اس طبقہ کا علاج یہ ہے کہ ان کے حق میں توجہ الی اللہ کو وہم سے مخلوط کیا جانا چاہیے۔ مثلاً اپنے دل کو خالص چاندی کا ایک حصہ فرض کریں اور اس کے اوپر سفید گل صنوبر رکھیں اور اس پر کلمہ اللہ خط جلی سے سونے سے لکھیں۔ اور اس نقشہ کو قطروں کے سامنے لانے کی کوشش کریں۔ کوئی بعید نہیں ہے کہ اس شغل کے القا کے وقت میں ان کا نسمہ توجہ کرے۔ اس کا پوری طاقت کے ساتھ مقابلہ کریں یا لفظ لا کو زیر ناف سے نکالیں کہ وہ خالص چاندی کی صورت میں ایک نور

ہے، اوراس کوام الدماغ تک کھینچیں، اور پھر قلب پر اس کی ضرب ماریں، اور پھر ناف پر پہنچائیں، یعنی الا اللہ کے اشباع کو۔ اور چاندی کے اس دائرہ کو جانو کہ جو تمہارا احاطہ کرنے والا ہے، اور تمہارا دل وسینہ اس کے اندر ہے۔ اور اس دائرہ سے شعاعیں تمہارے قلب وسینہ پر پڑ رہی ہیں۔ اور شغل کا کمال یہ ہے کہ مرکز اور احاطہ کرنے والا دائرہ سورج یا چاند کی شکل میں ایک ہو جائے۔ یا جب تم میرے مقابل میں بیٹھتے ہو میری آنکھوں سے ایک سفید نور نکلتا ہے اور زمین میں منتشر ہوتا ہے، اسے اور کوئی نہیں جانتا، تم اس نور کی طرف متوجہ ہو" **وعلی ھذا القیاس والعاقل تکفیه الاشارہ**"

۱۷۲- **تفہیم:**

فرائض کے قرب کے کمال کا بیان

فرائض کے قرب کا کمال یہ ہے کہ نفس ناطقہ اور نسمہ سے تجلی قائم کی شعاعیں عین خارجیہ پر ضرب لگاتی ہیں۔ ان سے میری مراد وہ پہلی شئے ہے جو خارج میں نکلتی ہے۔ پھر ان دونوں سے آثار حقانیہ ظاہر ہوتے ہیں جیسا کہ عین میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اور جب حضرت موسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام پر قرب مکمل ہو گیا۔ اور اس کے آثار ان کی نسمہ میں ظاہر ہو گئے، تو اس کے لیے کمالات قدسیہ ہوئے۔ جن کا اکتساب کیا گیا۔ اور جب وہ نصاب کمال کو پہنچ گئے، انہوں نے حس مثالی کی شکل اختیار کر لی۔ اس کی یہ روح الٰہی ہے، اور چونکہ آپ کی نسمہ ناریۃ المزاج تھی تو اس کے لیے آگ کی صورت اختیار کرنا ہی مناسب تھا۔

۱۷۳- **تفہیم:**

عالم مثال کے دو مرتبے

عالم مثال کے دو مرتبے ہیں۔ ایک جو عالم ارواح سے قریب ہے۔ اور اس میں معاملہ متخیلات ومتوہمات کے مشابہ ہوتا ہے۔ اور دوسرے جو عالم اجسام سے قریب ہے، عرف عام میں اسے جسد کہا جاتا ہے۔ اور اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی آگ کا ظہور ہوا۔ اور مرتبۂ اولٰی کی حقیقت یہ ہے کہ عرش کا تخیل اس کے لیے مکان خاص میں اس کے ساتھ مخصوص نہیں

ہے۔اور مرتبہ ثانیہ کی حقیقت یہ ہے کہ وہ پانی کو قوت مقدسہ کے ساتھ عرش کے تخیل کے رنگ میں رنگ دیتا ہے۔اور پانی میں اعلیٰ موجودات کی اصل ہے۔عناصر کی یہ نوع نہیں۔فتدبر۔

۱۷۴-تفہیم:

حال عین اور اس کے کمال کی وضاحت

ہم تمہارے لیے ایک مثال بیان کرتے ہیں۔اس سے حال عین اور اس کے کمال کی وضاحت ہو جائے گی۔عین فوارہ کے مشابہ ہے تو جس طرح اس سے پانی نکلتا ہے اور اس وقت اس کی کوئی شکل متعین نہیں کی جا سکتی۔اسی طرح وجود، عین سے نکلتا ہے اور اس میں کسی امر کا امتیاز نہیں کیا جا سکتا۔اور جب فوارہ پر مسدس یا مربع آلہ رکھ دیا جاتا ہے تو پانی کی چھ یا چار شکلیں ہو جاتی ہیں۔اور اس طرح جب حق سے نفس کا تعین ہو جاتا ہے تو وہ اس کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔اور نفس دو شکلوں والی جبلت ہے۔اس کی دو صورتوں میں سے ایک شعور اور بیداری اور دوسری قوام۔اور اس کا اس متدنس عالم کے امور سے کوئی امر ہوتا ہے۔پھر جب نفس کی طرف متوجہ فیض نازل ہوتا ہے تو اس کی دو جہت ہوتی ہیں۔ایک جہت علم اور دوسری جہت حال۔چنانچہ جب اللہ سبحانہ اپنے کسی بندہ کی عین میں تجلی فرماتے ہیں تو حقانیت اس کے علم اور اس کے حال میں چلتی ہے۔تب اس کا قول شفا اور عمل دوا ہو جاتا ہے۔

۱۷۵-تفہیم:

قول اور خبر وغیرہ کی تحقیق

قول، خبر، خطب، امر، بنا اور صدق بہتان یہ سب لغت میں الفاظ کے نام ہیں۔لیکن عرف ان کو افعال کے مقابلہ میں رکھتا ہے۔چنانچہ اللہ تعالیٰ کے قول "بما کنتم تافکون، بما کنتم تعملون" کے معنی قولی و عملی قبائح ہیں۔

۱۷۶-تفہیم:

وعظ کے صیغوں کا بیان

وعظ کے کچھ صیغے ہیں۔ان میں کچھ تشنیع (برا کہنا اور لعنت و ملامت کرنا) اور کچھ تنویہ

(تعریف وتعظیم) ہیں۔اوران میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کی آیات کاان کی مصلحت، بشارت وانذار کا بیان ہے۔ان میں اللہ سبحانہ کے ذکر سے دعویٰ کی تاکیداوراس کے حوالہ کرنا ہے،اوران میں نافع اورشہید، گواہ یاثبوت میں پیش کیے جانے والے قصے ہیں۔اگرچہ لغت میں وہ ہوتے ہیں جو دعویٰ کی تصدیق کرتے ہیں تو عرف اس کوحکم کے لیے بھی بناتا ہے۔اسی قبیل سے یہ ہے "قل الله شهيد بيني وبينكم" اورارشادباری شهداؤكم یعنی خبرہ اورتجربہ والے ہیں۔

۱۷۷-تفہیم:

مسئلہ کی صورت اوراس کاحکم

مسئلہ کی ایک صورت وضع کی جاتی ہےاوراس پرکوئی حکم لگایا جاتا ہےتاکہ تعلیم آسان اور ذہن نشین ہوجائے۔اسی قبیل سے آیت 'ووصينا الإنسان' ہےتوجس سے مسئلہ کی صورت اوراس پرحکم قائم ہوااس کےعلاوہ نہیں۔اوراللہ تعالیٰ کےقول "ولما ضرب ابن مريم مثلاً" کا معنی ہمارے نزدیک واللہ اعلم یہ ہے کہ انہوں نے کہا کہ جب عیسیٰ علیہ السلام کی تعظیم پرجمہورعوام متفق ہوگئے اورمحمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کوالوہیت کےدرجہ سے معزول کردیا توجب اس طرح کےمعاملات میں جرأت ودلیری سے کام لیاتوہمارے معبود (یعنی کفاریا یہود کے معبود) ان کے سب وشتم کے لیے جرأت کےسلسلہ میں زیادہ مستحق ہیں۔یہاں ان کےکلام کاحاصل تشنیع ہے۔

۱۷۸-تفہیم:

دعااوروہ کہاں نفع دیتی ہے

دعاءکون وفساد کےاسباب میں سے ہے۔لیکن یہاں ایک امردقیق پایا جاتا ہےاور وہ یہ ہے کہ وہ ان امورمیں نفع دیتی ہے جوتقدیرمبرم سے متعلق نہیں ہوتے۔اورجوامورمبرم ہوتے ہیں ان میں نفع نہیں دیتی۔اورابراہیم علیہ السلام کی دعاان کے والد کےسلسلہ میں اور نوح علیہ السلام کی دعاءان کے بیٹے کےسلسلہ میں قبول نہیں ہوئی،اس لیے کہ ان دونوں کاکفر امرمبرم تھا۔اورصالح علیہ السلام کی بددعاان کی قوم کےسلسلہ میں اس وقت تک قبول نہیں ہوئی جب تک کہ ان کی خطائیں آسمان کی بلندیوں پرنہیں پہنچ گئیں۔

۱۷۹- **تفہیم:**

وجاہت کا مسمی کیا ہے؟

جس شئے کا نام وجاہت رکھا جاتا ہے، وہ حکمت کا زمانہ ہے۔ بعینہ اسی محدثیت کے زمانہ سے اسم حادث ہے۔ اور یہ اس لیے ہے کہ تجلی الٰہی اپنی وسعت سے پہلے صاحب تجلی کے نزدیک جذب، قبول اور الفت کی صورت میں متصور ہوتی ہے۔

۱۸۰- **تفہیم:**

حقیقت مطلقہ سے خطاب فقط مخاطب تک اکتفا نہیں کرتا بلکہ اس کا رجوع غیر کے لیے بھی ممکن ہوتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے قول والضحیٰ میں ہوا

جان لو کہ اللہ تعالیٰ جب اس حقیقت مطلقہ کو خطاب فرماتا ہے جو پوری طرح عاری اور وسیع الکمال ہو، تو یہ خطاب فقط اس تک محدود نہیں رہتا۔ بلکہ اس کی طرف اور اس کے بطن میں تیار جنین کی قسم سے جو کچھ ہوتا ہے، اس کی طرف بھی متوجہ ہوتا ہے جیسا کہ جب اونٹنی فروخت یا ہبہ کی جاتی ہے، تو اس کے پیٹ میں جو کچھ ہوتا ہے وہ بھی اس میں داخل ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حقیقت جامعہ محمدیہ علیہا الصلوٰۃ والسلام کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: والضحیٰ واللیل إذا سجی، ما ودعک ربک وما قلی "قسم ہے روز روشن کی اور رات کی جب کہ وہ سکون کے ساتھ طاری ہو جائے۔ (اے نبی!) تمہارے رب نے تم کو ہرگز نہیں چھوڑا اور نہ وہ ناراض ہوا"۔ تو یہ خطاب آپ کی امت میں سے ایک محدث کی طرف راجع ہوا۔ چنانچہ قسم اس ذات کی جس کے قبضہ میں میرا نفس ہے، آپ کے رب نے آپ کو کبھی بھی نہیں چھوڑا اور نہ ہی وہ آپ سے ناراض ہوا۔ اور اس نے آپ کے ساتھ وہی معاملہ کیا جو اس کی مشابہت کے لحاظ سے آپ کے ماں وباپ کے لیے زیادہ موزوں اور بہتر تھا۔ اور وہ دونوں اس کے بہترین بندے تھے۔ آپ کے وجود اور آپ کے کمال کے لحاظ سے ان خوابوں میں جو آپ کو دکھائے گئے۔ پھر آپ

کی بہترین تربیت کی جو کہ اس نے اپنے کسی بندہ کی کی تھی۔ یہاں تک کہ آپ مقام استحکام پر پہنچ گئے۔ تب آپ کو حکمت و وجاہت عطا فرمائیں، پھر آپ کو اس مقام تک ترقی عطا فرمائی جس کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا اور نہ ہی کسی کان نے سنا۔ اور فرمایا وللآخرة خیر لک من الاولیٰ "اور یقیناً تمہارے لیے ہر بعد کا دور پہلے دور سے بہتر ہے۔" چنانچہ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے۔ بعد کی جو بھی حالت آئی وہ پہلی والی سے ارفع تھی۔ پھر آپ سے وعدہ فرمایا کہ آپ کو مقام رفیع پر فائز فرما دے گا کہ زبانیں آپ کی نعت سے عاجز آجائیں گی۔ اس کے لیے فرمایا: ولسوف یعطیک ربک فترضی "اور عنقریب تمہارا رب تم کو اتنا دے گا کہ تم خوش ہو جاؤ گے"۔ اور پھر فرمایا: الم یجدک یتیما فاوی "کیا اس نے تمہیں یتیم نہیں پایا اور پھر ٹھکانہ فراہم کیا؟" کیوں نہیں! اے میرے رب! تو نے آپ کو یتیم پایا، حتیٰ کہ آپ کے والد وفات پا گئے اور آپ نہ ہی ظاہر کے لحاظ سے اور نہ ہی باطن کے لحاظ سے لوگوں کے مقام کو پہنچے تھے تو تو نے اپنے فضل سے آپ کو پالا۔ آپ کی تربیت فرمائی اور تو نے آپ کو ہر اس شئے اور عمل سے محفوظ رکھا جو حال اور علم کے لحاظ سے آپ کے لائق نہیں تھا۔ "فلک الحمد حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیه" اور فرمایا ووجدک ضالاً فهدی "اور تمہیں ناواقف راہ پایا اور پھر ہدایت بخشی"۔ ہاں! اے میرے رب! آپؐ اپنے رب سے ناواقف تھے پھر تو نے محض اپنے فضل سے آپؐ کو عصمت و حکمت اور وجاہت عطا فرمائی۔ پھر تو نے دوبارہ آپ کو تحدیث اور صلاح عطا فرمائی۔ اور آپ کی تائید روح القدس کے ذریعہ فرمائی تو کس زبان سے آپ تیری تعریف کر سکتے ہیں۔

ولو ان لی فی کل منبت شعرة
لسانا لما استوفیت واجب حمدکم

"اگر میرے ہر بال کے اگنے کی جگہ زبان ہو تب بھی میں تمہاری حمد کا حق ادا نہیں کر سکتا۔"

اور فرمایا ووجدک عائلاً فاغنی "اور تمہیں نادار پایا پھر مالدار کر دیا" یہ وعدہ ہے جو آپ کے رب نے آپ سے کیا۔ واللہ لا یخلف المیعاد "وہ وعدہ خلافی نہیں کرتا"۔ فاما الیتیم فلا تقهر "یتیم پر سختی نہ کرنا"۔ اور اللہ کی قسم! آپ نے تیری عصمت کی وجہ سے کبھی کسی یتیم پر سختی نہ کی۔ اور انشاء اللہ تیری تائید کی مہربانی سے آئندہ بھی کبھی سختی نہ فرمائیں گے۔ واما

السائل فلا تنهر "اور سائل کو نہ جھڑکنا۔" اور اللہ کی قسم! آپ نے کبھی بھی کسی سائل کو نہیں جھڑکا۔ اور انشاء اللہ آئندہ بھی ہرگز نہیں جھڑکیں گے۔ وأما بنعمة ربک فحدث "اور اپنے رب کی نعمت کا اظہار کرو۔" کیا جو کچھ آپ نے فرمایا وہ تیری نعمت کا بیان نہیں ہے؟

شکر لطف تو چمن چوں کند اے ابر بہار
کہ اگر خار وگر گل ہمہ پروردۂ تست

"اے ابر بہار تیرے لطف وکرم کا شکر، چمن کس طرح ادا کرسکتا ہے کہ خار ہو یا گل سب تو تیرے ہی پروردہ ہیں۔"

۱۸۱-تفہیم

قول باری تعالیٰ الم نشرح لک صدرک الخ اورخطاب ماضی کے صیغے سے ہے

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: الم نشرح لک صدرک "کیا ہم نے تمہارا سینہ تمہارے لیے کھول نہیں دیا!" کیوں نہیں؟ اے میرے رب! تو نے آپؐ کا سینہ اولاً حکمت سے اور دوبارہ محدثیت سے کھول دیا۔ تیری ثنا کوئی اس طرح نہیں کرسکتا جیسا کہ تو نے خود کی ہے۔ ووضعنا عنک وزرک الذی انقض ظهرک "اور ہم نے تم پر سے وہ بھاری بوجھ اتار دیا جو تمہاری کمر توڑے ڈال رہا تھا۔" ہاں! اے میرے رب! آپؐ کی عصمت یہ ہے کہ اپنی ساری عمر بہت زیادہ میل جول اور استقلال سے کام لیا اور جس سختی وتنگی نے بھی آپ کو گھیرا، تو نے اس میں کشادگی پیدا فرمادی، اور اس سے نکلنے کا راستہ پیدا فرمایا: لک الحمد حمداً یوافی نعمک ویکافی کرمک "تیرے ہی لیے حمد ہے جو تیری نعمتوں کے مطابق ہو اور تیرے کرم کے برابر ہو۔ ورفعنا لک ذکرک "اور تمہاری خاطر تمہارے ذکر کا آوازہ بلند کردیا۔" تو نے آپ کا ذکر بلند کردیا۔ جب تو نے آپؐ کو اپنے برگزیدہ بندوں کے خطاب میں شامل فرمادیا: فإن مع العسر یسراً ان مع العسر یسراً "بیشک تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے۔ بیشک تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے۔" آپؐ سے آپؐ کے رب عزوجل

نے وعدہ فرمایا کہ آپؐ کو انانیت کی تنگی سے اپنے انوار محمدیہ وعیسویہ کی طرف نکال دے گا۔ چنانچہ ایک تنگی دو فراخیوں کے ساتھ قبول کی گئی۔ فإذا فرغت فانصب "لہٰذا جب تم فارغ ہوتو عبادت کی مشقت میں لگ جاؤ۔" ہاں جب آپؐ فراخی کے لیے تنگی کا مقابلہ کرنے سے فارغ اور فراخی میں ظاہری طور پر بھی اور باطنی طور پر بھی مضمحل ہو گئے تو عنقریب آپؐ کا رخ تیری ہی طرف ہوگا۔ اور آپؐ کا قلب تیرے ہی پاس ہوگا۔ اس وقت آپؐ کا قلب اور قالب تیرے ہی لیے قائم ہوں گے اور آپؐ پورے کے پورے تیرے ہی لیے ہوں گے۔ والی ربک فارغب "اور اپنے رب ہی کی طرف راغب ہو۔" عنقریب تیری ہی طرف رغبت ہوگی، اور تجھ سے ہی ڈر و خوف ہوگا، تجھ سے، تیرے ہی لیے سب کچھ ہوگا۔ اس وقت تیری نعمت آپؐ پر تام ہو جائے گی۔

۱۸۲۔ تفہیم:

محدث اور مقرب کا ذکر

محدث مخلوق جب نصاب کمال کو پہنچ جاتا ہے اور اس اسم کے مقتضی میں مضمحل ہو جاتا ہے جو کہ اس کے قلب میں چمکتا ہے اور اس میں دو جامع اسموں کے نور کا عکس ظاہر ہوتا ہے، تو وہ افق کمال کے لیے سادہ اور اقلیم قرب کو ڈھانپنے والا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس کے بعد مقرب نہیں پایا جاتا اور محدث کی اس کی ظاہری و باطنی تربیت میں اور اس کے اوپر زمانہ کے معنیٰ میں دخل ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ عیسیٰ علیہ السلام نازل ہو جائیں۔

۱۸۳۔ تفہیم:

قول باری تعالیٰ "وجعلنا فی الأرض رواسی... الخ" کے معنیٰ

اللہ تعالیٰ کے قول وجعلنا فی الآرض رواسی ان تمید بکم "اور ہم نے زمین میں مضبوط پہاڑ بنائے کہ وہ تمہارے ساتھ نہ ہلے" اور اس کا قول ہے والجبال اوتادا "اور پہاڑوں کو میخوں کی طرح گاڑ دیا۔" ان کے معنی ہمارے نزدیک یہ ہیں کہ تنہا زمین ان کے مصالح کے لیے موزوں نہیں ہو سکتی۔ ایسی صورت میں اس میں قلعے محلات مضبوط مکانات اور

مستحکم قصروں کا بنانا، پہاڑوں کے اجراء کے استعمال کے بغیر ممکن نہیں ہو سکتا۔ اور جب ان کو سیلاب گھیر لیتا ہے، یا دشمن سے خوف لاحق ہوتا ہے، تو ان کے لیے پہاڑوں کے علاوہ کوئی جائے پناہ نہیں ہوتی۔ اس طرح اللہ نے اس کے لیے دو مثالیں دیں۔ چنانچہ فرمایا کہ زمین ان کے ساتھ حرکت کرتی ہے یعنی حرکت کرتی ہے اور ان کے مصالح کا ساتھ نہیں دیتی۔ اور فرمایا والجبال اوتاداً "تو جس طرح خیموں کو میخوں کے بغیر نہیں گاڑا جا سکتا اسی طرح زمین پہاڑوں کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی۔ اور یہ جو کہا گیا ہے کہ زمین حرکت کرتی ہے۔ تو وہ مستقبل کے لحاظ سے ہے۔

۱۸۴۔ **تفہیم:**

امر مجرد اور اس کے متعلقات میل جول اور استقرار کا بیان

حکما، ذوق سے جو کچھ جانتے ہیں وہ حق ہے۔ اس میں باطل کی آمیزش نہیں ہوتی۔ البتہ یہاں ایک دقیق امر ہے اور وہ یہ کہ امر بسیط حکماء پر ان کے ایمان کی طرف سے ظاہر ہوتا ہے اور مناسب میل جول سے مجرد اور صورتوں سے عاری ہوتا ہے۔ پھر اس کا تصور کیا جاتا ہے اور ان کے مدارک وہوا میں علوم کی ایک صورت بنتی ہے، جو ان کے نزدیک شکل اختیار کرتی ہے۔ اور مثالیں ہوتی ہیں۔ جو ان کے لیے ان کا علم تیار کرتا ہے۔ امر مجرد بہر حال حق ہے اور وہ متناسب و متعلق زمانوں، عادات اور مدارک کے اختلاف سے مختلف ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض دوسروں سے زیادہ حق، زیادہ لطیف اور زیادہ فصیح ہوتے ہیں۔ ہم اللہ کی حکمت والے لوگ امور مجردہ میں اختلاف نہیں کرتے۔ اختلاف صرف متعلقات میں ہوتا ہے۔

ہم امر مجرد اور اس کے متعلقات کے لیے ایک مثال بیان کرتے ہیں جس سے اس کے بھید کی حقیقت واضح ہو جائے گی۔ کیا ہمارا قول اجتماع نقیضین ممتنع ہے یا شریک باری ممتنع صادق ہے۔ اس کے صادق ہونے پر دانائی دلالت کرتی ہے۔ پھر اس بارے میں ان کے اوپر تشکیک وارد ہوئی کہ ممتنع وہ ہے جس کا کوئی وجود نہ ذہنا ہو، نہ خارجا۔ اور قضیہ موجبہ اس کے موضوع کے وجود کا تقاضہ کرتا ہے۔ اور اس قضیہ میں حکم حقیقی مطلق لگایا تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ محمول کے لیے نفس امر نہیں موضوع کے لیے خطاب ہے۔ اور نفس امر میں اس

قضیہ کا صادق ہونا عدم اختلاط کا تقاضہ کرتا ہے۔ اس لیے کہ ممتنع جس سے وہ ممتنع ہوتا ہے، اس سے خلط ملط نہیں ہوتا۔ اور اس سے خلط ملط ہوتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے وجدان سے رجوع کیا۔ اور اپنی عقل اول سے حکم لگایا تو اس کی متعدد صورتوں کا تصور کیا جاتا ہے چنانچہ ان میں سے بعض کے نزدیک یہ واقع ہوا کہ علم دو قسم کے ہیں۔ ایک علم نبی اور دوسرے علم غیر نبی۔ اور دوسرا علم امتناع کے تقاضہ سے متصادم نہیں ہوتا۔

اور ان میں سے بعض کے نزدیک یہ واقع ہوا کہ یہ موضوع موجود کے جزئیات کا ایک امر ہے، لیکن ذہن اس کو ممتنع کے مقابلہ میں کر دیتا ہے تا کہ اس کے ذریعہ اس کے حکم کو پہچانے اور اسی طرح محمول کا حال ہے جو دو موجودوں میں مخلوط ہے۔ اور ان دونوں سے دونوں ممتنع کا حکم پہچانا جاتا ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے "مِنْ" ایک حرف ہے اور ان میں سے بعض کے نزدیک یہ واقع ہوا کہ یہ حکم سلبی ہے، ایجابی نہیں ہے۔ اور بالجملہ امر واحد بسیط ہے۔ جو ہر ذہن میں مرکوز ہے، جس کا تصور متعدد صورتوں میں کیا جاتا ہے۔

دم بدم گر شود لباس بدل
شخص صاحب لباس راچہ خلل

"اگر ہر دم لباس بدلا جاتا رہے، تو صاحب لباس پر اس سے کیا اثر پڑتا ہے۔"

پھر جب حق پھیل گیا اور امر ثابت ہو گیا اور روح القدس سے تائید ہو گئی تو متعلقات کو بھی وہی حق حاصل ہو گیا جیسا کہ پہننے والے کو حاصل ہوا۔ ایسی صورت میں اصلاً کوئی خلط نہیں ہوا۔ اور یہ محدثیت اور اطلاق کے مواقع ہیں۔ اس پر غور کرو اور پہچانو۔

۱۸۵- **تفہیم:**

ایمان اور حکمت، عفت، تفرس اور سکینہ کے درمیان فرق اور ان کے معانی

جان لو کہ کمال جس کی طرف دعوت کے لیے انبیاء علیہم السلام کو مبعوث کیا گیا لازمی طور پر وہ ایمان ہے۔ اور ایمان اور حکمت کے درمیان فرق ہے کہ حکمت وہ کمال ہے جو عین خارجی میں راسخ ہے، اور ایمان نسمہ میں کمال ہے۔ اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے

انسان کے لیے ایک ہیئت بنائی ہے، جو اس کے ساتھ اس کے بدن میں مختص ہے، جیسے اس کا بادی البشرہ، مستوی القامت، چوڑے ناخن اور گول کاسئہ سر والا ہونا ہے۔

اور اسی طرح اس کی ایک ہیئت اس کے نسمہ سے مختص بنائی ہے۔ اس ہیئت سے عفت ہے جو حکیم میں عصمت کے مدمقابل ہے۔ اس سے میری مراد خلقاً وعملاً شرور میں مبتلا نہ ہونا ہے۔ اور شارع اس کا نام کبھی تقویٰ وصلاح رکھتا ہے اور کبھی ایمان۔ چنانچہ جب کسی قوم کے لیے کہا: "یتقون" تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کے لیے یہ خصلت قائم ہوتی ہے اور انہی میں سے تفرس یا فراست، توسم، علم اور عقل ہیں اور یہ حکمت کے مقابلہ میں ہیں۔ ان سے میری مراد ذہن کا آیات سے تیزی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے علم کی طرف منتقل ہونا اور ذہن کا واجب الوجود کے اثبات اور انبیاء کی بعثت کی طرف مائل ہونا ہے، اور بعثت جیسا کہ وہ ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "إن في ذلك لآيات للمتوسمين" اس میں اہل فراست کے لیے نشانیاں ہیں یا "لقوم يعقلون" عقل رکھنے والی قوم کے لیے۔ اس سے یہی خصلت مراد لی ہے۔

اور ان میں سے ایک سکینہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وأنزل سكينته على رسوله وعلى المؤمنين "اور اس نے اپنے رسول اور مؤمنوں کے اوپر سکینہ نازل فرمایا۔" اور یہ وجاہت کے مقابلہ میں ہے۔ اس سے میری مراد ہیئت راسخہ ہے جو آدمی کو احکام شرع کی اطاعت پر مجبور کرتی ہے۔ اور جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من صام رمضان ايماناً واحتساباً "جس نے رمضان کے روزے ایمان اور احتساب کے ساتھ رکھے۔" یہاں آپ نے اپنے اس قول سے اس امر کا اظہار فرمایا کہ جس نے رمضان کے روزے سکینہ کی قوت کے ساتھ اور اس کے اس حال کے غلبہ سے اور اس پر مالکیت سے رکھے۔ اور شریعت ساری انہی تینوں امور کی تفصیل ہے۔ اور لوگ اعمال قبیحہ اور اخلاق رذیلہ میں ملوث ہونے کی وجہ سے ان سے ذہول لاپرواہی وغفلت کر جاتے ہیں۔ اس لیے اللہ سبحانہ نے اپنی کتاب میں آیات، نشانیوں، طرح طرح کے اسلوبوں اور وعظ کے مختلف صیغوں سے ان کو یاد دہانی کرائی ہے۔ تاکہ اس سے ان کی طبیعتیں اس طرف مائل ہو جائیں۔ اور وہ نور چمکنے لگے، جو ان کی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے۔ اور ہمارے نزدیک ایمان کی اصل احساس کی

رکاوٹوں میں فنا ہوتا ہے۔اور شارع نے اس کے شعبے، اس کی جزئیات اور اس میں رکاوٹ بننے والے امور اور ان کا مقابلہ کرنے سے متعلق تدابیر کو بیان فرمایا۔

۱۸۶- **تفہیم:**

نماز کے اوقات اور ان کے مقرر و مخصوص کرنے کا راز

نبوت نے اولاً انسان کے مزاج کو دیکھا تو پایا کہ وہ دن کے اجالے میں اپنی معاش کے لیے چلے جاتے ہیں۔اس لیے اسفار، ضحیٰ، چاشت اور ظہر اور عصر اور مغرب کے وقت میں نماز کو مشروع فرمایا۔اور چونکہ اس کے محل کا وجوب ہو گیا اور اوقات کا تعین محض اندازہ اور تخمینہ پر رکھا گیا۔اور شریعت مصطفویہ علی صاحبہا الصلوٰت والتسلیمات نے گاؤں اور شہر والوں کی عادات کو مدنظر رکھا تو یہ طے کیا کہ لوگ صبح کی ابتداء سے شفق کے بعد تک بیدار رہیں گے۔ ان کی معاشیات باقی رہیں گی، اس لیے ضحیٰ (چاشت) کو عشاء سے بدل دیا اور وجوب اپنے محل پر پہنچ گیا اور وقت کی تحدید ہو گئی۔

بالجملہ توارث کے لیے اوقات کے تعین میں مکمل دخل ہے اور رمضان کا نام گویا کہ بھوک اور پیاس کی وجہ سے رکھا گیا ہے۔اور نہیں جانتا کہ نبوت اولیٰ کے لیے کس نے تیار کیا کہ وہ اس کا سبب بنے۔اور زکوٰۃ کی تحدیدات شریعت مصطفویہ کے اظہار سے ہوئیں کہ اس سے پہلے اہل دولت و ثروت پر مساکین و یتامیٰ کے لیے غیر محدود حقوق تھے۔ چنانچہ اولاً ذبح کرنے ،اونٹوں کے دودھ اور مسافروں کی ضیافت کے بارے میں احکام نازل فرمائے۔ پھر اللہ نے اپنی آیات کو محکم کیا۔

اور ابراہیم علیہ السلام وہ فرد ہیں جس نے مناسک حج میں اس کی بنیاد رکھی تو جو کچھ ان کے مطابق رہا اس کو سنت قرار دیا اور شریعت نے ان کو جاری و ساری رکھا۔اور ایک کے بعد ایک شارح ان کی تشریح کرتا رہا اور ایک کے بعد ایک ان کی تنقیح کرتا رہا۔حتیٰ کہ خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو آپ نے بہت وضاحت کے ساتھ تشریح فرمائی اور شریعت کو صاف ستھرا بنا کر پیش کیا۔اس لیے اب کسی کے لیے یہ گنجائش نہیں ہے کہ شرح یا تنقیح کی شکل میں اس پر کوئی اضافہ کرے۔

۱۸۷- **تفہیم:**

تنقیح کی دو قسمیں ہیں

تنقیح کی دو قسمیں ہیں۔ ایک مذہب اختیار کرنے والے کی تنقیح۔ اور یہ مجدد کا منصب ہے۔ اور اس کا متعین طور پر سو سال بعد ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ تقریباً کی بات ہے۔ اور ہمارے نزدیک سب سے زیادہ قریبی احتمال یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے اعتبار کیا جائے۔ اور یہ جو گمان کیا جاتا ہے کہ اس کا حساب ہجرت کے وقت سے لگایا جاتا ہے جیسا کہ بعض اہل ارشاد کا خیال ہے تو ایسا کچھ نہیں ہے۔ اور ہمارے نزدیک اس کا تعلق کسی بھی دوسرے واقعہ سے نہیں ہے۔ صرف وفات سے تخمینہ کے طور پر ہے۔ اور محدثین کے اوصاف میں سے یہ ہے کہ وہ شریعت کی موضوع اور ضعیف احادیث اور قیاس سے تنقیح کریں۔ اور مندوب اور وجوب، کراہت اور تحریم کو ان کی جگہ پر رکھیں۔

اور دوسری تنقیح ان عادات سے تنقیح ہے جن میں تشریح اور غلبات منعقد ہوتے ہیں۔ اور متشابہات اور ایمان کے مقتضی اور شریعت مصطفویہ سے ایسی تنقیح ہے جس پر اس تنقیح کے لحاظ سے کوئی زیادتی نہیں ہے۔

۱۸۸- **تفہیم:**

قرب فرائض کے مقامات کی دو قسمیں ہیں

قرب فرائض کے تمام مقامات اتفاقیات سے مشابہ ہوتے ہیں۔ اگرچہ ان کے اندر ایسا نظام پایا جائے جو اس سے تجاوز نہ کرے اور اس سلسلہ میں قول کلی یہ ہے کہ ان مقامات کی دو قسمیں ہیں۔ ایک اسم حادث کے انتشار کے وقت ظاہر ہوتی ہے حتیٰ کہ اپنے کمال کو پہنچ جاتی ہے۔ اور دوسری اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب روح اور نسمہ اس کی وسعت کے بعد اسم کی شعاعوں پر ضرب لگاتی ہیں۔ ان میں اول جسمانیت کی جدائی اور تذلل کی طرف اس میں نظر ہے۔ اور دوسری خود ان کے نفس کی طرف نظر ہے نہ کہ ان غایات کی طرف جو ان کی وجہ سے ہوتی ہیں۔

۱۸۹-**تفہیم:**

الحی القیوم کی تمثیلوں سے نماز

جان لو کہ نماز الحی القیوم کی تمثیلوں میں سے ہے۔ پہلی شکل قیام، رکوع، سجود اور دعا ہے۔ میری مراد ایسا امر کلی ہے جو قیام حقیقی اور اپنی جگہ بیٹھنے اور لیٹنے پر صادق آتی ہے۔ اور اس طرح رکوع اور سجود وہ امر ہے جو حقیقی اور مجازی پر صادق آتا ہے۔ اور دعا وہ ہے جو وقت اور صیغہ کے لحاظ سے عام ہو۔

اور بالجملہ نماز نشاۃ قدیمہ سے واجب ہے۔ یہ امر کلی ہے جو چار امور کلیہ سے مرکب ہے اور ترکیب اول تمثلات سے ہے اور شاید اس سے قبل تمثل بسیط وحدانی ہے۔ اس کی حقیقت معلوم نہیں ہوتی۔ چنانچہ شارح اس کی تجلی کے مقتضی کے مطابق اس کی تشریح کرتا رہا حتیٰ کہ خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم پائے گئے۔ پھر ان چاروں کلیات کے لیے جزئی صورتیں ظاہر ہوئیں۔ اور ہر جزئی کا وقت پر عین ہے۔ جیسے صحت وتندرستی کی حالت میں سیدھا کھڑا ہونا، اور بیماری کی حالت میں یا سوار ہونے یا نفل نماز میں بیٹھنا، اور شدید مرض یا نفل میں پہلو پر لیٹنا، اور استطاعت کی حالت میں سورۂ فاتحہ دعا ہے، اور امی کے لیے سبحان اللہ والحمد للہ الخ... ہے۔ اور ان چاروں امور سے حق اس کے اصل معنی میں اس کا موکد ہونا ہے، جیسے رکوع اور سجود میں اطمینان اور شروع کرتے وقت تکبیر اور جیسے قومہ، جلسہ، قعدہ، تشہد اور سلام۔ چنانچہ اولیٰ درجہ اولیٰ میں امور واجبہ ہیں اور دوسرے ثانیاً امور واجبہ اور بالعرض ہیں۔ یہ ہمارے قول کی تفسیر ہے۔ شارح نے اس کی شرح کی ہے۔ اور اس طرح روزہ کے اول تمثلات حبس نفس ہیں تو پہلے لوگوں نے اس کی شرح کلام اور تمام لذتوں سے رک جانے سے کی اور بعد والے جس کی طرف لوٹے، لوٹے۔ اور زکوٰۃ کا ہم نے ذکر کر دیا۔

۱۹۰-**تفہیم:**

صحابہؓ کی قسمیں

صحابہ رضی اللہ عنہم کی قسموں کے سلسلہ میں قول کلی یہ ہے کہ ان میں سے کچھ وہ ہیں جن

کا عین مائل ہوا۔ تو ان کا حظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی عین میں ہے۔ اور یہ وہ ہے جس کا نام ہم نے حکیم رکھا ہے۔ اور ان میں سے کچھ وہ ہیں جن کی نسمۃ مائل ہوئی تو وہ وسیع ہوئی۔ چنانچہ آپ کا حظ آپ کی نسمۃ میں ہے۔ اور وہ مومن ہے اور ان میں آپ کے نفس کے پہلو سے نہیں پایا جا سکتا۔ اور وہ اس لیے کہ آپ کی طبیعتوں سے ماخوذ حظ تین قسموں میں تقسیم کرتا ہے اور نفس اس کی وسعت نہیں رکھتا جیسا کہ ہم نے کہا ہے۔

۱۹۱۔ **تفہیم:**

ظہور کے مراتب

جان لو کہ ظہور کے کچھ مراتب ہیں اور ہر مرتبہ میں اس کے لحاظ سے حکمتیں ہیں۔ اگر شئے کا اعتبار اس کے مرتبہ سے پہلے کیا جائے تو اس شئے کی جو حقیقت وہ ہے اس سے پوری طرح سلب کر لی جائے گی۔ اور اگر شئے کا اعتبار اس کی مشیئت میقات کے حل سے پہلے اس کے اوصاف کے ساتھ کیا جائے گا تو وہ باطل ہوگا۔ اور اللہ سبحانہ نے جب انسان کو ظاہر کیا تو اس کا وجود درجات میں سے ایک درجہ میں تھا۔ اب اگر تم اس کا اعتبار اس درجہ سے پہلے کرتے ہو تو یہ کوئی شئے ہی نہیں ہوگی کہ انسان کی حقیقت کیا ہے۔ لیکن اس کی حقیقت اس کا عکس ہوگی۔ اور اگر تم اس کا اعتبار اس کے اوصاف کے ساتھ کرتے ہو تو انسان کی ماہیت اس کے اوصاف سے لاحق نہیں ہوتی۔

۱۹۲۔ **تفہیم:**

اشیاء کی نسبت اللہ اور بندہ کی طرف کرنے کا ضابطہ

اور جان لو کہ اشیاء کی نسبت اللہ یا بندہ کی طرف کرنے کا ضابطہ یہ ہے کہ فیض نشاۃ میں پیدا ہوتا ہے۔ جب اس کا اندازہ اس نمونہ پر کیا جاتا ہے جو اس کے تابع ہوتا ہے تو اس کی ماہیت کی نسبت اسی طرح اللہ کی طرف نہیں کی جاتی۔ اور جب اس کا اندازہ اس نمونہ پر کیا جاتا ہے جو اس کے اوپر ہے تو اس کی ماہیت کی نسبت اللہ کی طرف اس طرح کی جاتی ہے۔ اور قضایا جس طرح خارجی حقیقی اور ذہنی ہوتے ہیں، اسی طرح نشاۃ کے لحاظ سے تقسیم ہوتے

ہیں۔ تو جب تصویر کا قیاس انسان اور اس کے درجہ کی طرف کیا جاتا ہے تو اللہ سبحانہ کی صورت پر کہنا ممکن ہوتا ہے اور جب ملائکہ اور ان کے درجہ کی طرف قیاس کیا جاتا ہے تو اللہ سبحانہ کی صورت کہنا ممکن نہیں ہوتا۔

۱۹۳۔ تفہیم:

انسان کو اولا اور اس کے بعد کیا حاصل ہوتا ہے، اس کا بیان

انسان کو اولاً صورت علمیہ حاصل ہوتی ہے۔ اس صورت کے بعد علی سبیل الا یجاب صورت شوقیہ آتی ہے اور وہ اس وقت آتی ہے، جب ارادہ اس کے کمال کو پہنچ جاتا ہے اور وہ حرکت قولی وفعلی کے لیے بالفعل افاضہ ہے۔ اب ہم نے تمہیں جو کچھ سکھایا ہے اس سے حکم لگاؤ کہ ضابطہ کی نسبت بندہ کی طرف کی جاتی ہے اور ہم نے تمہیں جو وحدت الوجود کے سلسلہ میں بتایا ہے، وہ افاضہ کیا ہوا ہے، تو یہاں وہ متحقق ہو گیا جو شیخ ابوالحسن اشعری نے کہا ہے کہ افعال مخلوق ہیں، اور بندہ مختار ہے، اور اس کا اختیار مخلوق ہے۔

۱۹۴۔ تفہیم:

مصائب کی غرض

مصائب سے غرض یہ ہے کہ نسمہ اسم کے حکم کے تحت پوری طرح مطیع ہو جائے اور مکمل طور پر مطابقت اختیار کر لے۔ اور اس کے نزدیک سنت یہ ہے کہ نسمہ کو ایک دوسرے میں ضم کر دیا جائے اور بالاختیار اس کے موافق کر دیا جائے جیسا کہ وہ اس پر ضرور تاو بداہۃً ہے تو جب اطاعت مکمل ہو جائے اور حق کا آفتاب پوری قوت کے ساتھ طلوع ہو جائے تو نہ ان کے لیے کوئی خوف ہے اور نہ ہی انہیں کوئی حزن وملال ہوگا۔

۱۹۵۔ تفہیم:

اسم حادث کے اطلاق کی علامت

اسم حادث کے اطلاق کیلئے ایک علامت ہے اور وہ یہ کہ جب تفہیم یا وحی کے اعتبار

سے متوجہ ہوتا ہے۔نفوس اس کی اتباع اس میں محسوس کرتے ہیں۔اور جب شرع اور حق کے مقام پر قائم ہوتا ہے تو نفوس اس کے ساتھ قائم ہوتے ہیں۔اور یہ ارشاد و ہدایت کا راز ہے۔

۱۹۶-تفہیم:

انبیاء پر وحی اور ملائکہ مقربین پر قضا کس طرح نازل ہوتے ہیں؟

اور ہم تمہیں بتائیں گے کہ انبیاء پر وحی کس طرح نازل ہوتی ہے اور مقرب فرشتوں پر قضا کس طرح نازل ہوتے ہیں؟ جان لو کہ نشاۃ قدیمہ میں ایک مرتبہ ہے جس کو منبع الشریعت کہا جاتا ہے اور ایک مرتبہ کو منبع القضا کا نام دیا جاتا ہے۔اول سے میری مراد وہ جہت ہے جو رب سے کمال کے اعتبار سے صادر ہوتی ہے۔وہاں انسان نشاۃ کمالیہ کے اعتبار سے شکل اختیار کرتا ہے جس کا فیضان رب سے تمثل کلی مطلق کے لحاظ سے ہوتا ہے اور یہ تمثل منبع شریعت ہے اور اس کے مانند یہ ہے کہ نشاۃ کمال نشاۃ عالم فی نفسہ کی طرف نسبت سے نشاۃ جزئیہ ہے۔اور جب اللہ سبحانہ نے اعیان رسل میں تجلی فرمائی اور یہ تجلی دو وجہوں کے لیے جامع ہوئی تو قدیم، حادث اور مجرد متعلق ہوئی۔اور اس میں اس انسان کا عکس ایک بار نہیں بلکہ اس کے لیے منور کرنے والے اسم کے لیے وسیع تعداد کے اعتبار سے ہوا۔اور اس میں اس کا عکس اس لیے ہوا کہ وہ دونوں انسان ہیں تو اس علم اور حال کا امر منتظم ہو گیا۔چنانچہ اس کو یہ اسم جو فائدہ دیتا ہے وہ وحی اور ارشاد کا طلوع ہے جو کہ اس کے اطلاق اور اس کے عموم کے لیے ہے۔یہ تمثل امر یقینی اور نہی واجب بنایا گیا۔

اور ملائکہ میں سے کچھ وہ ہیں کہ ان کی عین سارا عالم ہوتا ہے تو ان کے اسم میں اس مرتبہ کلیہ کا عکس ہوتا ہے جو تیاری کے لحاظ سے پورے عالم کی صورت ہے اور وہ قضا ہے۔

۱۹۷-تفہیم:

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد ''العلم ثلاثۃ'' کی تشریح

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: علم تین ہیں، اس کے سوا جو کچھ ہے وہ فضل ہے۔ایک آیت محکم، دوسرے سنت قائم اور تیسرے فریضۂ عادلہ۔آیت سے مراد علم قرآن ہے۔اور سنت

عبادات اور آداب کا علم ہے۔ اور فریضۂ عادلہ علم قضا ہے جس میں عمل بالرائے جائز ہے۔ اور جب کسی شخص نے کسی امر کی ذمہ داری سنبھال لی اور وہ تمہارے خیال کے مطابق ہے تو اس سے تجاوز نہ کرو اور وہ دلیل ظنی کے لحاظ سے اجماع ہے اور اس کے سوا میں نہ کوئی قیاس ہے نہ اجماع۔

۱۹۸۔ **تفہیم:**

شرع کے دو اصول

اصول شرع دو ہیں۔ آیت محکم اور سنت قائم۔ ان دونوں سے زیادہ کچھ نہیں۔ اور یہاں ایک اور علم ہے جو علوم دنیا کے مشابہ ہے اور وہ علم قضا ہے۔ چنانچہ جب کسی کے سامنے کوئی معاملہ پیش کیا جائے تو اس کو چاہیے کہ اپنی رائے سے اس میں جدو جہد کرے اور راہ صواب کو تلاش کرے۔ چنانچہ اگر اس بارے میں پہلے کوئی جماعت کوئی فیصلہ کر چکی ہو تو اس سے تجاوز نہ کرے۔ اور وہ قیاس اور اجماع ہے۔ اور علوم شرع میں ان دونوں کے جزئیات میں کھلی غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ اور اس سلسلہ میں فقہاء کی دلیلیں محدود ہیں۔ جیسا کہ ہم نے کہا ہے مثلاً معاذ اور علی رضی اللہ عنہما کی حدیثیں اور یہ حدیث: المجتهد يخطى ويصيب "مجتہد سے کبھی غلطی بھی ہوتی ہے اور کبھی اس کا فیصلہ صحیح ہوتا ہے۔" اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ میری امت گمراہی پر مجتمع نہیں ہوگی۔ یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں سے ایک طبقہ ہمیشہ امر حق پر قائم رہے گا۔ آپ کی مراد اس سے اجماع نہیں ہے۔ اور بالجملہ دین میں رائے تحریف ہے اور قضا میں وہ نیکی ہے۔

۱۹۹۔ **تفہیم:**

آدم علیہ السلام کے اولاً جنت میں داخل ہونے اور بعد میں زمین پر استقرار کا راز

جب حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں یہ پایا گیا کہ بغیر سبب کے جھگڑا کیا گیا تو اہل جنت کا معاملہ کیا گیا کہ اگرچہ ان کو مٹی سے بنایا گیا تھا لیکن اپنے کمال اور فراخی و وسعت سے اخروی بدن حاصل کر لیا۔ چنانچہ جنت میں قیام پذیر رہے۔ اس وقت جسد مثالی کے

مشابہ ہو گئے اور کسی بھی جسم مثالی کو زمین میں استقرار نہیں ہوتا۔ یہاں استقرار صرف صاحب تخلیط کو ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ علم حق ہے اور جب حضرت آدم نے اس کی یعنی علم بالذوق کی تمنا کی تو شیطان نے آپ کو اس میں داخل کر دیا۔ چنانچہ ان کے نزدیک تخلیط نے معصیت کی صورت اختیار کی تو ان کے سینہ سے یہ جاری ہوا کہ اگر معصیت نہ ہو گی تو استقرار حاصل نہ ہو گا۔ "فعصیٰ آدم ربہ" آدم نے اپنے رب کی معصیت، نافرمانی کی۔ آیۃ۔

۲۰۰—تفہیم:

یونس علیہ السلام کی آزمائش کے راز کا ذکر

یونس علیہ السلام آغاز امر میں نبی محدث تھے، نبی مکلم نہیں تھے۔ چنانچہ شعیب علیہ السلام نے آپ کو اہل نینوا کی طرف بھیجا اور اس وقت آپ مستقل بنفسہ نہیں تھے۔ تب اللہ سبحانہ نے آپ کو خلعت حقانی بخشنے کا ارادہ کیا تاکہ صالح رسولوں میں سے ہو جائیں۔ چنانچہ آپ کو آپ کی امت کے معارضہ کے دوران آپ کے سینہ سے یہ ذوق جاری فرمایا کہ اللہ سبحانہ سے ان کی ہلاکت کے لیے دعا کریں اور جب ہلاکت کی گھڑی ظاہر ہو گئی اور وہ صحیفوں میں وجیہ قوی الاثر تھی تو آپ کی دعا سنی گئی تب ہلاکت کا انتظار کرتے ہوئے نکل کھڑے ہوئے۔ جبکہ ان کی توبہ قبول کر لی گئی تو شدید پچھتاوا پیدا ہوا۔ اور یہ محدث کے طبائع ہوتے ہیں کہ جب یہ ظاہر ہو گیا کہ آپ کی تفہیم یقینی طور پر حق نہیں ہے تو مختلف قسم کی آزمائشوں میں مبتلا کیے گئے حتیٰ کہ اسم کے تحت آپ کی مغلوبیت مکمل ہو گئی اور عموم اسم مکمل ہو گیا۔ اس وقت لباس حقانیت پہنایا گیا اور ان کو اپنی قوم کی طرف بنفسہٖ مبعوث کیا گیا۔ تب آپ پر نعمت تمام ہو گئی۔

۲۰۱—تفہیم:

تربیت باطنہ اور تربیت ظاہرہ کا بیان

اللہ سبحانہ نے مجھے سمجھایا کہ میں نے تمہیں سلوک کا ایک طریقہ عطا کیا ہے جو سب سے زیادہ قریبی اور معتبر راستہ ہے تاکہ تمہاری زبان کے ذریعہ جس کو چاہوں ہدایت دوں۔

اور وہ دو تربیتوں سے مرکب ہے۔ایک باطن میں دوسری ظاہر میں۔تربیت باطنیہ یہ ہے کہ جب کوئی تمہاری طرف راغب ہو یا اس کا قلب تمہاری طرف متوجہ ہو تو اس کو نفی اور اثبات کی تعلیم دو اور اس میں جانب نفی میں ماسوی اللہ تعالیٰ ہر ایک سے صرف برأت ہونے اور جانب اثبات میں اللہ عزوجل جلالہ کی طرف پوری رغبت کی شرط لگائی جاتی ہے۔حتیٰ کہ جب اس کے اندر محبت راسخ ہو جائے اور وسوسے زائل ہو جائیں، اس وقت اس پر حرف و آواز سے مجرد ہو کر اللہ سبحانہ کے حضور کا فیضان جاری کرو۔اور اس کا حضور دائمی ہو جائے اور اس کی طبیعتیں صالح ہو جائیں تو اس کو توحید کی تعلیم دو۔یہاں تک کہ جب اس کے نفس کی تیزی ٹوٹ جائے تو وہ اس وقت فنا والا ہے۔پس جب وہ اپنے فنا کے اثر سے نکل جائے تو اس پر حضور مجرد کا دوبارہ فیضان کرو۔اور اس پر وہ مسلسل عمل کرے تو اپنے نفس میں افاضہ کی قوت کو محسوس کرے گا۔اور کرامات اسماء کی تلاوت اور اس میں فنا سے حاصل ہوتی ہیں پھر اس پر واجب ہے کہ عبادات بہت زیادہ کرے۔ یہاں تک کہ وہ اس کی طبیعت میں راسخ ہو جائیں۔اور ظاہری تربیت یہ ہے کہ جب کوئی آپ کی طرف متوجہ ہو یا اپنے دل کو موڑے تو اس کو حکم دیں کہ وہ صرف اللہ کی عبادت کرے، اسی سے مانگے۔اس کے لیے قربانی کرے اور اس کے سوا کسی کو یاد نہ کرے۔اور آپ اپنے دوستوں اور مخلص لوگوں کو ختم پڑھوانے اور توشہ وغیرہ دینے سے منع کردیں اور انہیں نیکی کا حکم دیں اور گناہوں، نافرمانیوں اور بدعتوں سے جہاں تک ممکن ہو روک دیں اور جو آپ کی طرف اہل دنیا کے دروازوں سے متوجہ ہوں ان کو منع کر دیں۔

۲۰۲-تفہیم:

تفہیم اور محدثیت وغیرہ کے معنیٰ

تفہیم، محدثیت اور تمنی یہ سب الفاظ مترادف ہیں۔ان سے وہ امر مراد لیا جاتا ہے جو اللہ سبحانہ کے اسم سے نسمہ پر حال اور عزم کی ہیئت کی طرح نازل ہوتا ہے۔اور اس کے نزول کو صرف افاقہ کے بعد سمجھا جاتا ہے۔میرے رب نے مجھے سمجھایا کہ جو لوگ تمہاری طرف راغب ہوتے ہیں، ان کی دو قسمیں ہیں: ایک قسم ان کی ہے جن کی جبلت سابقین اولین کی

استعداد پر بنائی گئی ہے، اس لیے ان کو فنا اور بقا پر دلالت کرو۔ اور ایک قسم وہ ہے کہ ان کی جبلت اہل یمین کی استعداد پر بنائی گئی ہے۔ اس لیے ان کو سنت اور ایمان حقیقی پر دلالت کرو۔

۲۰۳- تفہیم:

اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص نعمتوں پر بشارت دیا جانا

میرے رب جل جلالہ نے مجھے سمجھایا کہ اگر تمہارے اندر دو جامع اسموں کے نور اسم مصطفوی اور اسم عیسوی علیہما الصلوات والتسلیمات کے انوار کا عکس پایا جائے تو ممکن ہے کہ تم افق کمال کو گھیرنے والے اور اقلیم قرب کو ڈھانکنے والے ہو جاؤ۔ تو تمہارے بعد جو بھی مقرب پایا جائے گا اس کی ظاہری اور باطنی تربیت میں تمہارا دخل ہوگا۔ حتیٰ کہ عیسیٰ علیہ السلام نازل ہو جائیں۔ اور قریب ہے کہ تمہارے اوپر نظام عالم کی طرح حق نازل ہو جائے۔ جس طرح بجلی نازل ہوتی ہے تو کھولو گے اور بند کرو گے جس چیز کو چھوڑ دو گے، اور تمہارے سامنے اور تمہارے پیچھے اور تمہارے دائیں سے اور تمہارے بائیں سے آیات ظاہر ہوں گی۔ اور حق کا سورج چمکتا دمکتا طلوع ہوگا۔ اور ایک دوسرے کو ملانے والے عالم کے شرور سے ہر تاریکی کو دور کرو گے۔ اور قریب ہے کہ وہ تمہارے لیے مکمل ہو جائے کہ زمین نورانی ہو جائے۔ اور اس سے جور و جفا ختم ہو جائے حتی کہ مہدی کی ضرورت جاتی رہے اور ان کا وجود ایک مدت طویل تک کے لیے متاخر ہو جائے۔ اور اس نعمت کبریٰ سے اوپر کا ارادہ نہیں کیا جا سکتا۔ تو اس تفہیم نے مجھے عاجز کر دیا تو میں حجاز کی طرف گیا جب میں ساحل پر پہنچا تو ایسے امور پیش آئے کہ ان کا شمار ایک بڑا کام ہوگا۔ شدید حالات پیش آئے تو میرے رب جل جلالہ نے مجھے سمجھایا کہ یہ منصب انتہائی جلال والا ہے۔ تم اس تک صرف اسی صورت میں پہنچ سکتے ہو کہ ان کلمات کو پورا کرو جن کا ہم تمہیں حکم دیں۔ اور اس سلسلہ میں اجمالی قول یہ ہے کہ تم ظاہرا اور باطنا انبیاء علیہم السلام کی راہ پر چلو اور لوگوں کی ایک جماعت کی رہنمائی کرو اور تمہارے اور کسی دوسرے کے درمیان محبت کا صرف وہ تعلق ہو جو اللہ سبحانہ کے رنگ میں رنگا ہوا ہو۔ اگر تم نے ان کو پورا کر دیا تو قریب ہے کہ تمہیں وہ عطا کر دے جس کی تم اس سے امید کرتے ہو۔ اور ہر امر کے لیے وقت مقرر ہے۔ وہ اس سے تجاوز نہیں کرتا۔

۲۰۴- تفہیم:

ذوق اور تفہیم اور وحی کے معنی کا بیان

یہاں تین امور ہیں: (۱) ذوق اور یہ اکیلے حکیم کا منصب ہے یعنی وہ علم کہ اس پر نازل ہوتا ہے جو اس کے وجود کے راز سے نازل ہوتا ہے۔ (۲) تفہیم اور وہ محدث کا منصب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے **ففہمناھا سلیمان** "ہم نے وہ سلیمان کو سمجھائے" اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم سے پہلے کچھ لوگ محدث تھے، وہ نبی نہیں تھے۔ تو اگر میری امت میں سے ایسا کوئی ہے تو وہ عمر رضی اللہ عنہ ہیں۔ اکیلے ان کا حال اور عزم اس مقام پر ہے جو اسم جامع اور نسمۃ کے مطابق ہے۔ (۳) وحی، اور وہ انبیاء صلوات اللہ علیہم کا منصب ہے۔ اکیلے ان کا علم دو امروں کے اتحاد سے نازل ہوتا ہے۔ قرب فرائض اور نسمہ حقہ پر قرب ملکوتی جس کا تحقق مکمل اور قطعی ہے۔ اور حکیم جب تفہیم کی طرف ترقی کرتا ہے تو اس سے ذوق ختم نہیں ہوتا۔ بلکہ تفہیم کا منصب اس کے چہرہ سے ہوتا ہے۔ اور ذوق اس کے چہرہ کے پیچھے ہوتا ہے۔ ایسے میں اگر چاہتا ہے کہ ذوق کے مطابق امر کی حقیقت کو پہنچ جائے، تو ایسا نہیں کر سکتا۔

۲۰۵- تفہیم:

ضحیٰ و تہجد کی نماز اور ہر مہینہ کے تین دن کے روزے جو انبیاء علیہم السلام کی وراثت ہیں

میرے رب جل جلالہ نے مجھے سمجھایا کہ ضحیٰ اور تہجد جو انبیاء کی وراثت ہیں محدث کے لیے ان سے غفلت کرنا مناسب نہیں ہے۔ اور ان دونوں کے لیے ان کے نزدیک وقت مقرر نہیں ہے۔ الا یہ کہ تخمین و اندازہ ہے۔ اور نہ سوائے استحباب کے ان کی کوئی تعداد ہے۔ اور ان دونوں کے سوا کوئی نماز سوائے فرائض کے ان کی وراثت نہیں ہے۔ آدمی کے لئے مناسب یہ ہے کہ فرائض کے ساتھ ان دونوں کی پابندی کرے۔ اور انبیاء وراثت میں روزے پاتے رہے ہیں۔ اور آدمی کے لئے مناسب یہ ہے کہ رمضان کے علاوہ ہر مہینہ کے تین دنوں کے روزوں کی پابندی کرے۔

۲۰۶- تفہیم:

چاروں ادوار کے احکام

چاروں ادوار یعنی ایمان حقیقی، قرب نوافل، قرب وجود اور قرب فرائض میں سے ہر دورہ کا ایک وزن ہوتا ہے اور ہر بشارت کے شروع میں مقصود کے وصول سے اجمالاً مشابہ ہوتا ہے اور بے سروپا شوق اور عجیب حیرت ہوتی ہے۔ اس کے بعد اس قرب اور اس کی بلندیوں کے مقدمات میں غور وخوض واقع ہوتا ہے اور اس وقت میں رجعت قہقری کی نظر دورہ مسابقہ کا احاطہ کرتی ہے اور اس کی ابتداء و اختتام اور آثار و احکام پائے جاتے ہیں۔ اس وقت استغراق اور اضمحلال حاصل ہوتا ہے اور ظاہراً وباطناً اور حالاً ومقالاً ہر لحاظ سے یہ دور ہوتا ہے اور بس۔ اور اس کے علوم ومعارف پیدا ہوتے ہیں۔ اس کے بعد ہم اس دورہ کی زبان سے اللہ کی مخلوق کو نصیحت وارشاد کرنے اور نظام طبیعی میں قطعی طور پر مداخلت کے لیے ہوتے ہیں۔ پھر اس سے دوسرے دورہ کی بشارت دیتے ہیں اور اس کا شوق پیدا کرتے ہیں۔

عشق شورے در نہاد ما نہاد
جان مارا درکف غوغا نہاد

"عشق نے ایک شور ہماری بنیاد میں رکھ دیا، ہماری جان کو شور وغوغا کے ہاتھ میں رکھ دیا۔"

۲۰۷- تفہیم:

علم تفسیر کی تعلیم آسان زبان میں

مجھے میرے رب جل جلالہ نے علم تفسیر آسان الفاظ میں سکھایا۔ اور وہ یہ ہے کہ ایمان حقیقی فطرت کے مطابق ہر نسمہ میں ودیعت کیا گیا ہے۔ لیکن لوگوں کے اوپر عالم تخلیط کا سرور غالب آ گیا۔ چنانچہ اللہ نے قرآن نازل کیا تاکہ ان کی طبیعتوں کو اس کے ذریعہ مغلوب کر دے۔ چنانچہ ان میں سے ایک جمہور کے نزدیک مشہور اور عام باتوں کی تنقید یا تعظیم کرنا ہے اور ان میں سے ایک ترغیب اور ترہیب ہے۔ اور انہی میں سے آیات عظمیٰ اور نعمائے کبریٰ کا بیان ہے۔ اور ان میں اللہ سبحانہ کے ذکر سے اس میں دعویٰ کی تاکید اور اس کے حوالہ

کرنا ہے۔ اوران میں قصص نافع اور فقر وزہد کے حالات کا بیان ہے اوران میں سے فاسد عادتوں اوران کی برائی کا بیان ہے۔ اوران میں سے تحریفات کارد ہے۔ اوران میں سے تمثیل ہے۔ اوران میں سے اللہ تعالیٰ کی وہ صفات ہیں جو ناسوت کی ضد ہیں۔ اس طرح یہ آیات کے مضامین کے لیے نظام طبیعی ہے۔

پھر سورتوں کا اسلوب ایک لحاظ سے رسالہ و پیغام کے اسلوب کے مشابہ، اور ایک لحاظ سے قصیدہ کے اسلوب کے مشابہ ہوتا ہے۔ اور آیات کا اسلوب اشعار کے اسلوب کے مانند اوران کے قوافی قدیم اعراب کے مذہب کے مطابق اشعار کے قوافی کے مانند ہوتے ہیں۔ چنانچہ وہ ایک شعر میں میم اور نون کو جائز قرار دیتے ہیں اور یہ بھی کہ ایک شعر میں واؤ اور ی ہوں۔ اس طرح یہ نظام نظم کا بیان ہے۔ اس سلسلہ میں ہم ایک مثال پیش کرتے ہیں۔ جس سے تمھیں قرب ملکوت کا درجہ واضح ہو جاتا ہے۔

کیا تم نے ایسے شخص کو دیکھا ہے جو کسی سے عشق کرتا ہے؟ اس کے عشق کے انتشار کے لیے کیسا ہوتا ہے؟ یہاں تک کہ وزن محدود نصاب کمال کو پہنچ جاتا ہے تو اس سے جو اول مقرب ہوتا ہے، وہ اس کے خیال میں معشوق کا استحسان ہے۔ اس کے بعد قلب کا میلان اور تعلق اور ملاقات کا شوق ہوتا ہے۔ پھر اس پر پپوٹوں کا خشک ہونا، چہرہ کا سیاہ پڑنا، قلق اور ملال ظاہر ہونا ہے۔ اوراس طرح سلطان الحکمت، خفی الحکم، ضعیف الاثر اور مقتضائے تفہیم ضروری ایجابی ہوتا ہے۔ اور قرب ملکوت کے وقت حق ظاہر ہوتا اور نور پھیلتا ہے۔

۲۰۸- تفہیم:

قرب کمال کے خصائص کا بیان

قرب کمال کے خصائص میں سے یہ ہے کہ اللہ سبحانہ بندہ کے لیے ظاہری اور باطنی طور پر ذمہ داری لے لیتا ہے۔ چنانچہ اس کی تدبیر حکمت الٰہیہ کے مقتضی پر جاری ہوتی ہے۔ چاہے وہ جانے یا نہ جانے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وھو یتولی الصالحین ''اور وہ نیک وصالح لوگوں کی ذمہ داری لیتا ہے۔'' اوراس قرب کے خصائص میں سے یہ ہے کہ ملائکہ اس کو اس طرح پکارتے ہیں جیسے مریم کو پکارا۔ اوران کی پکار آواز سے نہیں ہوتی بلکہ اشارات سے

ہوتی ہے۔اور یہ قرب وہ کمال ہے جس کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ فرمایا: کمل من الرجال کثیر "مردوں میں سے بہت سے لوگ باکمال ہوئے ہیں۔" (الحدیث) اور یہ وہ صلاح ہے جو اللہ نے یونس علیہ السلام کو پیش کی تھی۔ جب انہیں مچھلی نے پھینک دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فاجتباہ ربہ فجعلہ من الصالحین "ان کے رب نے انہیں چن لیا پھر انہیں نیک وصالح لوگوں میں سے بنا دیا" اور وحی اس سے اوپر ہے۔

۲۰۹- تفہیم:

کمالات اور شرور کے اکیلا ہونے کے معنی اور دجال کے خروج اور قیامت کے اسرار

ہمارے قول "کمالات ایک کمال کی صورت میں تنہا ہو گئے۔ یا شرور ایک شر کی صورت میں تنہا ہو گئے" کے معنی بہت عمیق ہیں۔ یہ ایک مثال کے بیان کے بغیر حاصل نہیں ہوتے۔ کیا ایسا نہیں ہے کہ عناصر اربعہ اپنی ممتاز صورتوں کے ساتھ جمع ہو گئے اور مل گئے۔ اور ان کے اجزاء بہت چھوٹے ہو گئے۔ حتیٰ کہ ان کے لیے ہیئت وحدانیہ ہو گئی۔ اور ہر ایک کی وحدت اللہ سبحانہ کی طرف سے آئی ہے۔ چنانچہ اس کے لیے قرب کی ایک قسم ہے۔ پھر جب قرب ہو گیا تو اس نے اپنے دونوں ہاتھ اللہ سبحانہ سے سوال کرتے ہوئے اس کی طرف بڑھائے۔ تو ایک دوسری لطیف صورت عطا کی۔ جو کہ معدنیہ ہے۔ اور اس طرح صورت معدنیہ اپنی جنسیت اور خصوصیت کے ساتھ شئے واحد تھی۔ تو میں نے اللہ سبحانہ سے دوسرے فیض کا سوال کیا تو صورت نباتیہ عطا فرمائی۔ اس طرح صورت نباتیہ کا سوال کیا تو صورت حیوانیہ پھر انسانیہ عطا فرمائی۔

اس طرح یہ تحقق ہو گیا کہ ممکن کی طبیعت بھوکی، فقیر ہے۔ اور اس کو سوال سے کثرت کے سوا کچھ نہیں روکتا۔ کوئی متوحد ایسا نہیں ہے جس نے دوسرے فیض خاص کا سوال کیا ہو اور اللہ سبحانہ کسی سائل کا سوال رد نہیں فرماتے۔ اسی پر نشاۃ کمال کو قیاس کرو کہ کمالات متکثرہ کو عین واحدۃ، نفس اور نسمہ کی استعداد نظام واحد اور ہیئت وحدانیہ میں جمع کر دیتی ہے۔ چنانچہ رب

العالمین سے استعداد کی زبان میں سوال کیا گیا اور اس کے اوپر دوسری صورت کا فیضان کیا گیا جو پہلی والی سے زیادہ لطیف ہے۔ اور اسی طرح ابدالآباد تک اور صورت کا فیضان ایک دوسری قسم سے خفیہ تعلق سے کیا جاتا ہے جس سے وہ جسموں کے اندر نقش ہو جاتی ہے۔ کیا تم نے دیکھا نہیں کہ پانی کی برودت، حرارت میں کس طرح بدل جاتی ہے کہ اس کے ہیولی کے اوپر صورت ہوائیہ کا فیضان ہوتا ہے، پھر ناریہ کا۔ کیا اس کا اعتبار نہیں کیا جاتا کہ آدمی کے اوپر جب صفرا کا غلبہ ہو جاتا ہے تو وہ کیسا پیلا پڑ جاتا ہے۔ بات جلدی کرتا ہے اور روشنی کو ناپسند کرتا ہے۔ چنانچہ محقق ہو گیا کہ اجسام اور اعراض کے درمیان ایک خفیہ تعلق ہوتا ہے۔ جس سے ایک امر دوسرے کی طرف منقلب ہوتا ہے۔ اور اس طرح جب بنی آدم کے شرور بکثرت ہو جاتے ہیں اور صحیفۂ عامہ میں مستقر ہو جاتے ہیں، تو عالم انتہائی شر میں آدمی کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ پھر وہ دجال ہو جاتا ہے اور وہ قیامت کا راز ہے۔

اور ہمارے ذوق سے یہ ہے کہ قوم اپنے شرور کی وجہ سے بعد میں ہلاک کر دی جائے گی جو کہ اس سے لاحق ہوتے ہیں، جیسا کہ عاد اور ثمود کو ہلاک کیا گیا۔ اور صحف خاصہ اور صحیفۂ عامہ کا اثبات لازم ہے۔ اور ان صحیفوں کی ماہیت ایک مشکل مسئلہ ہے۔ اور سب سے زیادہ قریب کی رائے یہ ہے کہ یہ امور مجردہ ہیں، اس لیے اس حکمت میں گھرے ہوئے ہیں۔ اور یہ کون و فساد کی اصل ہے۔

۲۱۰- تفہیم:

اعمال کی صورتوں کا صحیفوں میں قائم ہونا اور جنت و جہنم کا راز

جو شخص بھی کوئی عمل کرتا ہے، اس کے عمل کی صورت ایک صحیفہ میں نقش ہو جاتی ہے۔ پھر وہ ظاہر ہوتی ہے تو اس کے اوپر یا اس کے مال اور اہل وعیال پر فیضان ہوتا ہے۔ بری صورت اس عمل کے مطابق ہوتی ہے۔ مثلاً اگر اس کا بدن کثیر الاخلاط ہوتا ہے تو یہ بری عفونت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اور بخار ہو جاتا ہے۔ اور اگر پھسلن پر چلتا ہے تو اس کا پاؤں اس سے نکل جاتا ہے۔ اس طرح متعدد امور واقع ہوتے ہیں۔ تب بدی دوسری صورتیں اختیار کرتی ہیں۔ اور کبھی اس کا احاطہ اسباب میسرہ کر لیتے ہیں جیسے دعائیں اور صدقات۔ چنانچہ بخار بہت تھوڑے وقت میں زائل ہو جاتا ہے۔ یا بخار اس کے خواب میں ظاہر ہوتا ہے۔ اور سلب

مال نسیان کی صورت میں ظاہر ہو جاتا ہے۔ اور اس سے جنت اور جہنم کے راز ہیں۔

۲۱۱۔ تفہیم:

سلوک کا قریب ترین راستہ اور اس طریق کا امام ہونا

اللہ سبحانہ نے مجھ پر اور میرے اہل زمانہ پر اس طرح احسان فرمایا کہ مجھے سلوک کا ایک ایسا طریق عطا فرمایا جو سب سے زیادہ قریب ہے۔ اور وہ پانچ اقترابات سے مرکب ہے۔ میری مراد ایمان حقیقی، قرب نوافل، قرب وجود، قرب فرائض اور قرب ملکوت ہے۔ اور اس طریقہ کو غرض وغایت بنا دیا جو اس کا ارادہ کرتا ہے، اللہ اس کو دے دیتا ہے۔ اور اللہ جل جلالہ نے مجھے سمجھایا کہ ہم نے تمہیں اس طریقہ کا امام بنا دیا ہے۔ اور تمہیں اس کی بلندیوں پر پہنچا دیا ہے، اور ایک طریقہ کے علاوہ آج حقیقت قرب تک پہنچنے والے تمام طریقوں کو بند کر دیا۔ اور وہ تمہاری محبت اور تمہاری اتباع ہے۔ تو جو آسمان تمہارا دشمن ہے، اس کے اوپر آسمان نہیں ہے اور نہ ہی زمین کے اوپر زمین ہے۔ اہل مشرق اور اہل مغرب سب کے سب تمہاری رعیت ہیں۔ اور تم ان کے سلطان ہو خواہ وہ جانیں یا نہ جانیں۔ اگر جان لیں تو کامیاب ہوں گے اور اگر انجان رہے تو خسارہ میں رہیں گے۔

دور مجنوں گزشت ونوبت ما است
ہر کسے پنج روز نوبت اوست

"مجنوں کا دور گزر گیا اب ہمارے باری ہے، ہر شخص کی پانچ دن کی باری ہے۔"

۲۱۲۔ تفہیم:

خاص منقبت

میرے رب جل جلالہ نے مجھے سمجھایا کہ ساری زمین تمہارے ہاتھ میں دے دی گئی ہے اما ان تعذب و اما ان تتخذ فیھم حسنا "تم چاہے ان کو عذاب دو یا ان کے ساتھ بھلائی کرو"۔ چنانچہ میں نے کہا اما من ظلم فسوف نعذبه ثم یرد إلى ربه فیعذبه عذاباً نکراً "جس نے ظلم کیا ہم اس کو عذاب دیں گے پھر وہ اپنے رب کی طرف لوٹے گا تو

وہ اس کو زیادہ سخت عذاب دے گا۔" (الکھف:۶۷-۷۷) اور مجھے یہ سب کچھ، کچھ امور کا کفیل ضامن بنانے کے بعد سمجھایا۔ وہ سب ان کے کلیات اور جزئیات ہیں۔ پھر مجھے ایسا بنا دیا جیسے غسل دلانے والے کے ہاتھ میں میت ہوتی ہے۔ یا دودھ پلانے والی کی گود میں بچہ ہوتا ہے۔ چنانچہ میری مثال فوارہ جیسی ہے کہ اس سے پانی ہیئت مخصوصہ پر نکلتا ہے، اور اس کو نہ کوئی علم ہوتا ہے نہ کوئی اختیار۔ البتہ میری جبلت جمالی بنائی گئی ہے۔ عنقریب زمین میں جمال ظاہر ہو جائے گا اور جور و جفا محو ہو جائیں گے۔ اور میں اللہ سبحانہ سے امید رکھتا ہوں کہ اس کے اوپر کوئی آیت بینہ ظاہر فرمادے، جو جمال کے ظہور کے ساتھ بلند ہو اور وہ چشمہ اس عبد ضعیف کی اصل سے پھوٹتا ہے۔

۲۱۳- تفہیم:

مسرت یا مصیبت کے وجود سے پہلے تبشیر اور انذار اور ان دونوں میں راز

کبھی انسان موت یا مال کے ضیاع سے ہلاکت کے کنارہ پر ہوتا ہے۔ اس سے پہلے وحشت پیدا کرنے والے خواب نظر آتے ہیں یا تشتت خاطر، طبیعت پراگندہ ہو جاتی ہے۔ اور مقابر سے محبت کرتا ہے۔ اور بکثرت موت کا ذکر کرتا ہے یا تنہائی و پوشیدہ رہنے کو پسند کرنا یا ان دونوں باتوں سے کراہت کرتا ہے۔ اور اس کے لیے قرب سفر میں ہوتا ہے۔ وہاں اس کا احاطہ کر لیا جاتا ہے۔ اور یہاں اس کا نفس تشویش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اور جس نے اس کے نفس کا امتحان لیا اس نے نہ کوئی مصیبت پائی نہ مسرت۔ مگر یہ کہ انذار اور تبشیر ان پر مقدم رہے۔ تو اب کیا میں تمہیں بتاؤں کہ اس میں کیا راز ہے؟ جب اسباب سماویہ کسی واقعہ پر منعقد ہوتے ہیں۔ اس کے لیے وجود متحقق ہوتا ہے جو کہ متن میں واقع اس کے کمال کو پہنچنے سے پہلے ہوتا ہے۔ اور نفس کی جبلت شفاف ہوتی ہے اس میں ایک امر کا عکس عادتوں کی راہوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ چنانچہ نسمہ کے نزدیک ایسی صورت اختیار کرتا ہے، جو اس کے مناسب ہوتا ہے۔ انہوں نے ان علوم کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کی، تو ان کے لیے خوابوں کی تعبیر اور فال

ونحوست کے علوم ظاہر ہوئے۔اور انہوں نے انسان اور امراض معنویہ، اخلاص فراخی اور فقر وغیرہ کی جبلت کی دونشاتوں کے تناسب کا پتہ لگانے میں مبالغہ سے کام لیا۔تو ان کے لیے علم قیافہ ظاہر ہوتا ہے۔اور عالم سمندر کے نظام واحد میں اس کے انتظام کے مشابہ ہوتا ہے۔جب اس کی کوئی ایک جانب حرکت کرتی ہے تو اس کے تمام جوانب حرکت کرتے ہیں۔اور وہ نجوم اور فضائی وزمینی واقعات میں غور وفکر کرتے ہیں۔کیا تم نہیں دیکھتے کہ سورج کی جبلت گرم اور خشک بنائی گئی ہے اور چاند کی جبلت سرد وتر۔

جاننا چاہیے کہ ہر نجم وستارہ کی ایک طبیعت ہوتی ہے۔اور ہر طبیعت اعراض ومعانی وغیرہ مختلف احوال کے مناسب ہوتی ہے، جیسا کہ ہم نے صفرا کی مثال میں بیان کیا۔اس سے واقعات متحقق ہوتے ہیں۔اس طرح ان کے لیے علم نجوم ظاہر ہوجاتا ہے۔اب اگر تم کہو کہ طیرہ ونحوست اور نجوم کا کیا معاملہ ہے۔اور ان سے کیوں روک دیا گیا جبکہ یہ علوم حقہ میں سے ہیں؟ میں کہتا ہوں کہ نجوم سے ان لوگوں کو روکا گیا ہے جو تاثیر کی نسبت علم نجوم کے ماہرین کی طرف کرتے ہیں۔اور اس سلسلے میں خلاق مجید سے غافل رہتے ہیں۔یا ان کا علم ناقص ہوتا ہے۔اس لیے ظن وگمان میں تکلف سے کام لیتے ہیں۔اور ظن، حق سے ذرا بھی مستغنی نہیں کرتا۔اور طیرہ ونحوست سے اس وجہ سے روکا گیا ہے کہ جہلا بغیر دلیل وعلم کے اس کو اپنا لیتے ہیں جو ان حیوانات وپرندوں سے ہے، تم سمجھتے ہو کہ اگر وہ نہ ہوتا تو واقعات نہ ہوتے۔

اب اگر تم کہو کہ شعر کا کیا معاملہ ہے جس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نہیں جانتے تھے؟ تو میں کہتا ہوں کہ شعر بادی الامر میں وعظ سے ملتبس ہوتا ہے۔جب وہ دونوں نفس کو مغلوب کرنے میں مشترک ہوتے ہیں۔اور ظہور فطرت سے ممتاز ہوتے ہیں جس پر اللہ نے شعر میں نہیں وعظ میں لوگوں کی فطرت بنائی ہے۔اور یہ کہ مقدمات شعر وہمیہ ہوتے ہیں اور مقدمات وعظ کے لیے حق ہونا واجب ہے۔اس لیے قرآن کفار پر مشتبہ ہوگیا تو ان کے لیے حقیقت امر کا کشف ہوگیا۔اور جہاں تک اس شاعری کا تعلق ہے تو وہ عطا نہیں کرتا، اس لیے کہ وہ سلیقۂ حسیہ ہے، اس وقت قانون اور وزن سے حظ حاصل ہوتا ہے۔اور انبیاء ہر سلیقۂ حسیہ سے خالی ہیں۔

۲۱۴- تفہیم:

جو شخص عالموں کے مقابل کو سمجھتا ہے اس پر علم تکوین اور اس کی تفصیل سے کچھ پوشیدہ نہیں رہتا

جو شخص دنیاؤں کے مقابل اور بعض نشاتوں کے بعض سے پیدا ہونے کو سمجھتا ہے، اس کے اوپر علم تکوین سے کچھ پوشیدہ نہیں رہتا۔ کیا امتوں کے جمہور لوگ اس پر متفق نہیں ہیں؟ مثلاً ماہرین علوم طبیعی کا کہنا ہے کہ صفرا سے زردی نکلتی ہے۔ پھر سیاہی اور معانی سے غضب جرأت، بے چینی اور تیز گفتاری۔ اس طرح انہوں نے ہر مزاج گرم سرد، تر وخشک کے لیے متعین کیا ہے۔ خواہ وہ اصلی ہو یا عارضی۔ کچھ امور اس کے ساتھ خاص ہوتے ہیں اور اس سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور خلط میں ہر فساد کی آفتیں ہوتی ہیں جو معانی اور اعراض سے خاص ہوتی ہیں۔ یہاں تک کہ انہوں نے خوابوں، اخلاق، احادیث نفس اور اوصاف قلب کے لیے بھی ایسے اسباب بیان کیے ہیں، جو ان کے ساتھ مخصوص ہیں، اور ان سے پیدا ہوتے ہیں۔

کیا تمہارے کانوں میں یہ بات نہیں پڑی جو نسلوں کے بڑھنے کے بارے میں مذکر ومونث سے متعلق گمان کرتے ہیں۔ اور جو اوصاف بیان کرتے ہیں۔ اور یہ کہ صورت اور ہیئت سے کس طرح وراثت پاتے ہیں۔ حتیٰ کہ کاشتکار یقین رکھتے ہیں کہ یہ تربیت زراعت میں اس صفت کی وارث ہوتی ہے۔ اور پھلوں میں شیرینی کس طرح مختلف ہوتی ہے۔ اور کس لیے بیج وگٹھلیاں چھوٹی اور پھل بڑے ہوتے ہیں اور گلاب کے پھول کے رنگ کہاں سے خوشنما ہوتے ہیں۔ اور چرواہوں کو نسلوں کے بڑھانے میں ایسے تجربات ہوتے ہیں کہ بڑے بڑے ذہین لوگ ان پر تعجب کرتے ہیں۔

اور اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات سے متعلق گفتگو کرنے والے (الہیون) نے عقول کو ثابت کیا ہے اور عوالم اور ان کے سایوں کو بنایا ہے اور اہل نجوم کے لیے نجوم کی طبیعتوں، ان کی حرکتوں اور واقعات ارضی سے جو کچھ پیدا ہوتا ہے، ان سب کے سلسلے میں ایک مقام حاصل ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ علم رمل کے ماہرین کی رائے میں داڑھی کی شکل لمبی داڑھی والے آدمی کے

مانند ہوتی ہے۔ اور وہ اس طرح جسموں اور معانی میں سے ہر ایک شکل کے لیے کچھ امور متعین کرتے ہیں۔

اور بالجملہ عامۃ الناس ان دونوں مسلکوں کی اصل پر متفق ہیں۔ اور ان کے جزئیات کے بیان کے سلسلہ میں کوشش واجتہاد کرتے ہیں۔ البتہ ان کے خواص انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اور اولیاء کو اس سلسلہ میں ید طولیٰ حاصل ہوتا ہے کہ وہ معاد کے راز اور اسماء کی تاثیرات اور دعاؤں وغیرہ سے پردے اٹھاتے ہیں۔ کیا یہ امر ممکن ہے کہ عامۃ الناس اور خواص کسانوں اور چرواہوں کو نکالے بغیر ان امور میں متفق ہو جائیں۔ کہ امر ظہور سے اس کے مراتب بہت بلند ہیں، اور ہمارا قول صحیفوں کے اثبات میں بھی اسی طرح ہے۔

کیا تم نے دیکھا نہیں ہے کہ لوگوں کے عوام وخواص، اہل مشرق ومغرب اور ان کے درمیان والے بھی اس کا اقرار کرتے ہیں۔ جب وہ ظلم اور ہتک حرمات سے بچتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کو تجربہ سے یا مخبر صادق کے خبر دینے سے ثابت ہو گیا ہے۔ مخبر صادق سے مدت طویل ہو جانے کی وجہ سے اس سے کی گئی روایت ان کے نزدیک ناپید ہو جاتی ہے۔ سوائے مشائین کے کہ میں ان کے اندر اپنے دین کے تعلق سے بصیرت اور یقین نہیں پاتا۔ وہ اپنے ذہنوں پر بھروسہ کرتے ہوئے اور اپنی ذہانتوں کے حقوق ادا کرتے ہوئے، اپنے ادراک پر عمل کرتے ہیں۔

۲۱۵۔ تفہیم:

اللہ نے بندہ کو اپنی معاش کا ذمہ دار بنایا ہے

اللہ سبحانہ کے اپنے بندوں کی تقدیروں کے سلسلے میں مختلف معاملات ہیں۔ ان میں سے کچھ وہ ہیں جن کی جبلت جمال پر بنائی ہے۔ ان کے معاملات میں ایسا کچھ بھی نہیں پایا جاتا جس میں بالکل جمال نہ ہو۔ چنانچہ اگر وہ کسی ضرورت اور اس تربیت کے اطلاق سے، حلال کی قسموں میں مبتلا ہو گیا تو اس میں یقینی طور پر جمال کی آمیزش ہوگی۔ اس طرح کے شخص کو عنقریب اللہ سبحانہ اس کی معاش کا ذمہ دار بنا دے گا۔ اور اس پر کوئی مصیبت نہیں آئے گی۔ اور ممکن ہے کہ اس پر اس طرح سنت جاری فرما دے کہ اس پر زکوٰۃ واجب کر دے۔ اللہ سبحانہ

نے اپنے کچھ بندوں کی معاش و پرورش خود کی۔ ان کے اوپر بالکل زکوٰۃ واجب نہیں ہوئی، اور اس طرح کی ذمہ داری کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہتے ہوئے اشارہ فرمایا "إذا احب اللّٰہ عبدا" اللہ جب اپنے کسی بندہ سے محبت کرتا ہے...... الخ

۲۱۶- **تفہیم:**

آدمی کے اندر پانچوں قربتیں متعدد وجوہ سے ایک ہو جاتی ہیں

آدمی کے اندر یہ پانچوں قربتیں اس کی ذات کی وحدت، نفس کی وحدت اور نسمہ کی وحدت کی وجہ سے ایک ہو جاتی ہیں۔ تب اس کا ایک کیا ہوا کمال اللہ سبحانہ کی طرف اپنا ہاتھ بڑھاتا ہے۔ اس سے دوسری قسم کے فیض کا سوال کرتا ہے۔ اس بارے میں اصرار کرتا ہے۔ تو اس کا رب اس کو وہ عطا کر دیتا ہے جو وہ مانگتا ہے۔ اس وقت کے لیے یہ حق ہوتا ہے کہ فرشتوں کو دیکھے، ان کی باتیں سنے اور یہ مقام حقانیت ہوتا ہے۔

۲۱۷- **تفہیم:**

طریق کو ظاہر کرنا، جو کہ تمام طریقوں کی بنیاد اور سب سے زیادہ قریب ہے

کیا تم نے دیکھا نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے طریقہ کو کس طرح ظاہر فرمایا جو کہ تمام طریقوں کی بنیاد اور سب سے زیادہ قریب ہے۔ چنانچہ فناء اول کو شرح صدر کا نام دیا، اور اس کی علامتوں میں سے دار الغرور (دنیا) سے دور رہنے اور موت کے آنے سے قبل اس کے لیے تیار رہنے کو قرار دیا۔ اور قرب نوافل کی تفسیر وہ کی جو رب العالمین سے نقل کیا لا یزال عبدی یتقرب إلی بالنوافل حتی احبه فاذا احببته کنت سمعه الذی یسمع به "میرا بندہ نوافل کے ذریعہ میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے، حتیٰ کہ میں اس کو محبوب بنا لیتا ہوں جب میں اس کو محبوب بنا لیتا ہوں تو اس کی قوت سماعت بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے۔" (الحدیث) اور قرب وجود کو ابدال سے متعلق اپنے اسی قول کے ذریعہ بیان فرمایا: إنما فضلهم اللّٰہ سبحانه علی الخلق بسماحة النفس "اللہ سبحانہ نے ان کو مخلوق پر نفس کی سخاوت وفیاضی کے ذریعہ فضیلت عطا فرمائی۔" اور قرب فرائض کی شان کو اپنے اس قول کے ذریعہ

عظمت عطا فرمائی: ما تقرب إلي عبد احب إلي من قرب الفرائض "کسی بندہ نے میری قربت کسی ایسے عمل سے حاصل نہیں کی جو میرے نزدیک قرب فرائض سے زیادہ محبوب ہو۔ اور قرب ملکوت سے اپنے اس قول کے ذریعہ پردے اٹھائے إذا احب الله عبداً نادی جبرئیل "جب اللہ کسی بندہ سے محبت کرنے لگتا ہے، تو جبرئیل کو پکارتا ہے۔" (الحدیث)

۲۱۸۔ تفہیم:

دو مقدس افاضے جن سے تمام قربتوں کا نظام ہے

یہاں دو مقدس افاضے ہیں جن کی اصل ایک اور صورتیں مختلف ہیں۔ انہی سے نظام قرب قائم ہے۔ خواہ وہ کوئی بھی قرب ہو۔ اور وہ دونوں تمام عمدہ قربتوں کا مغز ہیں۔ ایک جذب ہے کہ بندہ قرب کے معدات کی طرف واقع ہوتا رہتا ہے۔ اور اس کے اختیار کے بغیر اس کی طرف دھکیلا جاتا ہے۔ دوسرے تولی، ذمہ دار بنانا۔ اور وہ تولی قربت کے بعد ہوتا ہے۔ بندہ اللہ سبحانہ کا عین اور اس کی عنایت وحمایت میں ہوتا ہے۔ اور انبیاء اور جو ان کے طریقہ پر ہوتا ہے، ان کا جذب تولی ہے، اور ان کا تولی جذب ہے۔ اور وہ جو ہیں وہ ہیں۔

۲۱۹۔ تفہیم:

طریق کا سالک، وحی کا خازن ہے

جس کو اللہ سبحانہ نے ہمارا طریق عطا فرمایا، اور وہ اس میں چلا یہاں تک کہ اس کو پورا کر دیا۔ تو وہ ان دونوں کے حسن وراست میں وحی کا خازن اور علم کا حامل ہے۔ اور اس کے ہاتھ میں دین کا جھنڈا ہے اور وہ عالموں اور جہانوں کے اجمال کی حقیقت کی طرف عزت پاتا ہے۔ چنانچہ اس کے لئے مبارک خیر وسعادت ہے۔ پھر اس کے لیے مبارک خیر وسعادت ہے، اس کے لیے مبارک خیر وسعادت ہے۔

۲۲۰۔ تفہیم:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کمال سے پیدا ہونے والے شعبے

جس کمال میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قائم کیے گئے، اس سے بہت سے شعبے پیدا

ہوتے ہیں۔ان میں سے ایک ملک اوراس کا راز ہے۔شمول باطنی کا انقلاب امر ظاہری ہے۔ چنانچہ یہ ابواب زکوٰۃ میں داخل ہوتا ہے۔اس کے اصول منعقد ہوتے ہیں،اورانہی میں سے قضا ہے۔اس کا مطلب جھگڑوں، مخاصمات اور تنازعات کوختم کرنا ہے،اوراس کا راز ہدایت عامہ ہے،جونسمہ کے اختلاط میں اس کے رنگ میں تجلی کرتا ہے۔اورانہی میں سے وعظ ہے۔اور یہ اس انتہائی مقام پر پہنچ گیا ہے کہ اس سے اوپر کا ارادہ نہیں کیا جاتا۔اوراس کے کچھ صیغے ہیں۔ ان کا احاطہ صرف وہی کرتا ہے جس کو خیر کثیر دیا گیا ہو۔اورانہی میں سے تولیہ ہے۔اور کتنی ہی آیتیں ہیں جن پر اس کی بنیاد ہے۔اوراس کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔اوران میں سے اہل کفر وفسق کی عداوت،ہجرت و جہاد یا خصومتیں ہیں۔اور تولیہ وولایت کے شعبوں میں سے دعا کی قبولیت،استغفار اور شفا طلب کرنا ہے۔جوان کو واضح اور روشن کردے۔اوروہ اسرار ہیں جن کی کنہ کو نہ پہنچے ہوں۔اور ہر وصی اس کے سارے بوجھ کو اٹھاتا ہے۔میں نے اشعار کہے ہیں

لقد بلوتک فی سلم وفی عتب
فما وجدتک الا خالص الذهب

”میں نے تمہاری آزمائش،سلامتی اور عتاب میں کی،تو تمہیں خالص سونا پایا۔“

ابشر بجنة عدن سوف تدخلها
من الوجاهة والتفهيم والادب

”تمہارے لیے جنت عدن کی بشارت ہے تم عنقریب وجاہت،تفہیم اور ادب کے ساتھ اس میں داخل ہوگے۔“

ولم تسم بنور الله إلا لانه
عما قريب تكون النور فارتقب

”اوراللہ کے نور کے ساتھ تمہارا نام اس لیے مخصوص کیا گیا کہ عنقریب تم نور ہوجاؤ گے پس اس کا انتظار کرو۔“

فان يک حقا ما علمت فانه
سيلقى إليک الامر لا بد سائغ

”اگر حق وہ ہے جو تم جانتے ہو تو عنقریب،تمہاری طرف ایسا امر القا کیا جائے گا جو

لازمی طور پر جائز اور کامل ہوگا۔"

سیاتیک امر لا یطاق بهاء ٥
إلى كل سر لا محالة بالغ

"جلد ہی تمہاری طرف ایسا امر آئے گا کہ کوئی اس سے مانوس ہونے کی طاقت نہیں رکھتا، وہ لامحالہ ہر راز کی طرف پہنچنے والا ہے۔"

وثلج وبرد يجمعان شتاتكم
يريحان هما في فؤادك لا دغ

"اور برف اور ٹھنڈ میں جو تمہارے بکھرے ہوئے امور کو جمع کرتے ہیں، آپ کے دل کو ڈسنے والے غم کو راحت پہنچائیں گے۔"

۲۲۱- تفہیم:

اولیا کی اقسام کا بیان

اولیاء کی بہت سی قسمیں ہیں۔ ان میں ایک وہ ہے جس کی نسمہ آگے بڑھ گئی اور نفس پیچھے رہ گیا۔ اور اس کو اس کی نسمہ کی جانب سے جذب دیا ہے۔ اور ان کی دو صنف ہیں۔ ایک صنف وہ ہے کہ اس کو جذب انوار طاعات سے دیا ہے۔ اور ایک صنف وہ ہے جس کو توحید محبت دی ہے۔ اور وہ اول کے تابع ہیں، اور نجم الکبریٰ اور خواجہ عبید اللہ احرار دوسری صنف سے ہیں۔ اور ان میں ایک قسم وہ ہے کہ اس کا نفس مقدم اور نسمہ موخر ہو گئی۔ اس کو جذب اس کے نفس کی جانب سے عطا کیا اور اس کے خصائص میں سے یہ ہے کہ اس کا علم اس کے حال سے زیادہ ہے۔ اور شیخ جنید پہلے شخص ہیں جس نے یہ طریقہ وضع کیا، اور اس کے قوانین بیان کیے۔ پھر اصحاب طریق کبھی ان قوانین کی تشریح کرتے رہے اور کبھی ان کا اختصار کرتے رہے۔ چنانچہ ان کے لیے قوت حال کی طرف باب کھول دیا۔ اور ان میں ایک قسم وہ ہے کہ جن کی عین مقدم ہو گئی اور شیخ ابن عربی انہی میں سے ہیں۔ یہ اس بنیاد پر ہے کہ ہر ولی کی فنا اور جذب اس کے نفس میں ہوتے ہیں پھر اللہ نے ایک شخص کو ہدایت عطا فرمائی تو اس نے نور نبوت کے قوانین ترتیب دیے۔ فالحمد للہ رب العالمین۔

۲۲۲-تفہیم:

واقعات سے پہلے بنیادوں کا آگے بڑھنا

ہر واقعہ سے پہلے ارہاص بنیادیں یعنی وقائع جزئیات ہوتے ہیں۔ان کی شکل ان کی ہیئت میں بنتی ہے۔اور ہر واقعہ سے پہلے اس کا وجود اجمالی ہوتا ہے جو شہادت میں ظاہر ہونے سے پہلے ہوتا ہے۔اور ان دونوں مسئلوں کا راز ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ مقرب فرشتے جب قضاء کو تقدیر کے منبع سے نیچے لاتے ہیں اور ان کا نیچے لانے کا عمل مکمل ہو جاتا ہے تو اس کے لیے عالم میں وجود متحقق ہو جاتا ہے کہ اس کے ادراک سے ادراک یعنی قوت مدرکہ ظاہر ہو جاتی ہے۔اور عالم، قضا کے آئینہ کے مانند ہوتا ہے۔چنانچہ وقائع جزئیہ اس سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔جن کی جبلت عکس بندی کی جلد پر ہوتی ہے۔اور یہ وجود اس کا وجود اجمالی ہوتا ہے۔اور جب ہمارے اوپر تسخیر عالم کے علم کا انکشاف ہوا تو ہم نے سمجھ لیا کہ دو رغبتیں ضروری ہیں۔ ایک اس کے اس وجود کے تحقق کے وقت کی رغبت۔اور دوسری اس کے وجود خارجی کے تحقق کے وقت کی رغبت۔اس کو اچھی طرح سمجھ لو۔

۲۲۳-تفہیم:

اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سب سے زیادہ محبوب

میرے نزدیک آج اللہ سبحانہ کے اسماء میں سب سے زیادہ محبوب سید ہے اور وہ اس لیے کہ اس نے میرے نزدیک ہر سید کی سیادت اور ہر ولی کی ولایت کی نفی کر دی۔تو جب بھی میں اس کو کہتا ہوں وہ میرے مقام کی طرف دقیق اشارہ ہوتا ہے۔اور اس کے معنی میں اثبات ونفی دونوں جمع ہیں۔

۲۲۴-تفہیم:

محدث کی مثال

المحدث پر خاص طور سے جب وہ محدث ہو، شرائع اجتہادیہ کی اتباع کرنا لازم نہیں ہے کہ صبح چراغ سے بے نیاز ہوتی ہے۔اور اس کی رہنما وحی اور رسول صلوٰت اللہ علیہم اجمعین

کے علوم ہوتے ہیں۔

۲۲۵- تفہیم:

وصایہ کی حقیقت اور یہ کہ ہر زمانہ کے لیے وصی کا ہونا ضروری ہے

ہر نبی کے لیے وصی کا ہونا ضروری ہے۔ اور ہمارے نزدیک وصایہ کی حقیقت حکمت ہے۔ پھر قرب ملکوتی، پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے علوم کی شرح کا تحمل اور آپ کی امت کے لیے دعا سے تکفل ہے۔ اور اس کا منصب یہ ہے کہ امت میں نبی کے علم کا خازن اور آپ کے علم کا حامل ہو۔ چنانچہ زمانہ اس کی حجت سے خالی نہیں ہوتا۔ ورنہ دلیل دے کر خاموش کر دیا جائے گا۔ تو زمانہ جاہلیت کا زمانہ ہو جائے گا اور یہ کہ وقائع میں اس کا نائب ہو۔ چنانچہ جس طرح نبی کی امت شئے واحد ہوتی ہے۔ وہ اس کی احدیت ہوتا ہے۔ چنانچہ آدمی کی تدبیر اس کے بدن اور جسد کی تدبیر کرتی ہے اس طرح یہ وصی ہے۔ وہ اللہ سبحانہ سے دعا کرتا رہتا ہے کہ اللہ سبحانہ ان سے تنگی کو دور کر دے۔ اور ہر زمانہ کے لیے ایک وصی کا ہونا ضروری ہے۔ اور وہ ملت کے امر سے قائم ہوتا ہے۔

اور وصی قطب نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ قطب سے وجود کا تعلق ہوتا ہے۔ وہ کسی بھی شئے میں نبوت کے وارثوں میں سے نہیں ہوتا۔ اور وصی سے ملت خاصہ کے امر کا تعلق ہوتا ہے۔ اور اس کا زمین میں خلیفہ ہونا ضروری نہیں۔ اس لیے کہ وہ اپنے علوم کا خازن ہوتا ہے۔ اور آپؐ کی امت کے لیے داعی کو صرف یہی ہوتا ہے۔

۲۲۶- تفہیم:

ہر نبی کے لیے مجدد کا ہونا ضروری ہے

اور ہر نبی کے لیے مجدد کا ہونا ضروری ہے جو اس کے دین کی مذہب اختیار کرنے والوں کی مذہبیت سے تنقیح کرتا ہے۔ اور وہ ایسا محدث ہوتا ہے جس کو سکینت کا لباس پہنایا جاتا ہے۔ چنانچہ وجوب، تحریم، کراہت، سنیت اور اباحت کو ان کے مقام پر رکھنے لگتا ہے۔ اور شریعت کی احادیث موضوعہ، قیاس کرنے والوں کی قیاس آرائی اور ہر افراط و تفریط سے تنقیح کرتا ہے۔ اور فقیہ مجدد نہیں ہوتا۔ اگر مجدد بعینہٖ وصی ہوتا ہے تو معاملہ مکمل ہو جاتا ہے۔

۲۲۷–تفہیم:

مجددیت

میرے دورۂ حکمت ختم ہونے پر اللہ سبحانہ نے مجھے خلعت مجددیہ پہنائی، پھر میں نے خلعت حقانیہ پہنی اور مجھ سے تمام علم فطری وفکری سلب کر لیے گئے۔ میں حیران وششدر رہ گیا کہ مجھے مجددیت کس طرح دی گئی۔ پھر میرے رب جل جلالہ نے طریق خاص کی وضاحت کی۔ اس کے ذریعہ بغیر نظر فکری کے امیت اور مجددیت کے درمیان جمع کرنا ہے اور میں اب تک مجددیت کی تفصیل نہیں پا سکا۔ البتہ اس کا اجمال مجھے عطا کر دیا گیا اور میں مختلف امور کے درمیان جمع کا طریقہ جان گیا۔ اور میں یہ بھی جان گیا کہ شریعت میں رائے زنی کرنا تحریف اور قضا میں قائل قدر ہے۔

۲۲۸–تفہیم:

قرب قیامت کا ذکر

مجھے میرے رب جل جلالہ نے بتایا کہ قیامت قریب آ گئی ہے۔ اور مہدی خروج کے لیے تیار ہیں۔ اور طریقۂ متاخرہ کے حامل کے بعد کمال کا نمو منقطع ہو گیا ہے۔ اور ممکن ہے کہ یہ وصی سب سے زیادہ طویل زندگیوں کی پرواہ نہ کرے۔ سبحان اللہ کمال کے امر کے لحاظ سے کیسے فتنے نازل ہوئے ہیں کہ اسی میں ان انوار کا عکس نظر آتا ہے جو وحی کے حامل ہیں۔ إنا للّٰه وإنا إليه راجعون.

۲۲۹–تفہیم:

عوام اور انبیاء کے درمیان فرق کا مبدأ

کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ دل ودماغ میں پھونکنے اور کشف جیسے امور میں عوام انبیاء کے ساتھ شریک ہوتے ہیں۔ خاص طور سے تکوینی امور میں۔ اور انبیاء ان کے درمیان کچھ امور میں مختص ہوتے ہیں۔ جیسے ان کی طرف فرشتے کا بھیجنا اور ان کا اس کو دیکھنا۔ لیکن ہمارے نزدیک معاملہ ایسا نہیں ہے۔ بلکہ عوام علم کے اخذ کرنے میں ان کے ساتھ بالکل بھی شریک نہیں ہوتے کہ ان کا وحی کو اخذ کرنا صرف اس لیے ہے کہ وہ اس پانی کی مانند ہے جس

سے درخت کے اگنے کی جگہ بھری ہوتی ہے کہ وہ شاخوں، پتوں اور کونپلوں میں منتقل ہوتا ہے۔
اس طرح ان کا وہ علم جس کو وہ دورۂ کمال سے حاصل کرتے ہیں جو کہ تمام دوروں کا اجمال ہوتا ہے کبھی نفث پھونکنا ہو جاتا ہے اور کبھی کشف، اور کبھی فرشتے کو بھیجنے کی صورت میں تصور کیا جاتا ہے اور کبھی اس کی رویت کی صورت میں تصور کیا جاتا ہے، اور عوام کبھی فرشتے کے بھیجنے سے حظ حاصل کرتے ہیں، کیا دیکھا نہیں کہ مریم نے جبرئیل کو کس طرح ایک مکمل مرد کی شکل میں دیکھا؟ اور کس طرح ان کو فرشتوں نے پکارا؟ اور حدیث میں ہے کہ ایک مومن نے اپنے بھائی کی گاؤں میں زیارت کی تو ایک فرشتہ گاؤں کے دروازہ پر انسانی شکل میں اس کے پاس آیا اور کہا کہ میں تیرے پاس اللہ کا بھیجا ہوا آیا ہوں۔ اور حدیث میں ہے کہ اگر تم ایک ہی حالت پر رہو تو فرشتے تم سے تمہارے بستروں میں مصافحہ کریں اور اسید بن حضیر نے فرشتوں کو بادلوں میں چراغوں کی شکل میں دیکھا۔ لیکن انہوں (مومنین) نے اس کو اس رویت میں نہیں دیکھا جو دورۂ کمال سے مستفاد ہوتی ہے۔

اس طرح عوام اور انبیاء کے درمیان فرق کا مبدأ کمال سے ایک قسط یا قرب سے ایک حصہ عطا کیے جانے کے بعد بعثت اور دعوت کی طرف جوش ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں، اور اس کے علاوہ جو فرق ہوتا ہے، وہ کلام میں تسامح اور کنارہ کشی ہے۔ جو شخص امت میں سے کسی امام کا مقلد ہو اور اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی بات پہنچے جو مسئلہ میں اس کے قول کے خلاف ہو۔ اور اس کا ظن غالب یہ ہو کہ وہ نقل صحیح ہے تو اس کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کو اس کے غیر کے قول کی وجہ سے چھوڑنے میں (آج) کوئی عذر نہیں ہے۔ اور مسلمانوں کا کیا حال ہے ایسا کرنے پر نفاق کا ڈر لگتا ہے۔

۲۳۰- تفہیم:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد:

''تم اپنے سے پہلے والوں کی اتباع کرو گے''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم لازمی طور پر ان کے طریقوں کی بالشت، بالشت اور ہاتھ ہاتھ پیروی کرو گے جو تم سے پہلے گزر چکے۔ حتیٰ کہ اگر ان میں سے کوئی گوہ کے

سوراخ میں گھسا ہے تو تم اس کی بھی پیری کرو گے۔ ہم نے کہا: اے اللہ کے رسول! کیا یہ یہود ونصاریٰ کی پیروی کی بات ہے۔ آپ نے فرمایا اور کون؟ (اس کو بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ فرمایا اور ہم نے ضعیف مسلمانوں میں سے کچھ لوگوں کو دیکھا ہے کہ صلحا کو اللہ کی جگہ اپنا رب بناتے ہیں اور ان کی قبروں کو مسجد بناتے ہیں جیسا یہود ونصاریٰ کیا کرتے تھے اور ہم نے ان میں سے کچھ لوگوں کو دیکھا کہ کلمات کو ان کی جگہ سے ہٹا کر تحریف کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں صالح لوگ اللہ کے لیے ہیں اور شریر، فسادی و بدکار میرے لیے ہیں جیسا کہ ان سے پہلے کے لوگوں نے کہا تھا۔ ہمیں آگ صرف چند دن کے لیے چھووے گی اور سچ بات تو یہ ہے کہ ہر طائفہ میں تحریف پھیل چکی ہے۔

صوفیا ایسے اقوال پیش کرتے ہیں جن کی کتاب وسنت سے کوئی مطابقت نہیں ہوتی۔ اور شریعت کی انہیں کوئی پرواہ نہیں ہے۔ اور فقہاء کے فقہ میں کتنے امور ہیں کہ کوئی نہیں جانتا، انہوں نے وہ کہاں سے لیے ہیں جیسے وہ دردہ (دس ہاتھ لمبا دس ہاتھ چوڑا) کا مسئلہ اور کنوؤں کا مسئلہ وغیرہ۔ اور عقل پسند لوگ اور شعراء اور اصحاب دولت اور عام لوگ جو طاغوتوں کی عبادت کرتے ہیں اور صلحا کی قبروں کو مساجد اور مقام عید بناتے ہیں، ان میں جو گمراہیاں ہیں، ان کا ذکر وہ کہاں سے کرتے ہیں۔

اور بالجملہ شریعت کا تحریف سے محفوظ رہنا ممکن نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس کی نقل ظاہر سے ظاہری ہے۔ خالص شریعت ان اوصیا کے پاس ہے جنہوں نے شریعت کا حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ سے یا ان کامل لوگوں سے لیا ہے جن کو دورۂ کمال سے حصہ عطا کیا گیا ہے۔ چنانچہ وہ شریعت پر آسودگی و آرام اور لطف ولذت کے ساتھ آئے۔

مصنف کی اہم مطبوعات

مجموعہ رسائل امام شاہ ولی اللہؒ (جلد اول)	مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی	325.00
مجموعہ رسائل امام شاہ ولی اللہؒ (جلد دوم)	//	300.00
مجموعہ رسائل امام شاہ ولی اللہؒ (جلد سوم)	//	300.00
مجموعہ رسائل امام شاہ ولی اللہؒ (جلد چہارم)	//	300.00
دلی کی تاریخی مساجد (حصہ اول)	//	200.00
دلی کی تاریخی مساجد (حصہ دوم)	//	100.00
پنجاب وہریانہ کی تاریخی مساجد	//	200.00
امام شاہ ولی اللہ اور ان کے افکار و نظریات	//	250.00
الواح الصنادید (حصہ اول)	//	150.00
الواح الصنادید (حصہ دوم)	//	100.00
مولانا عبدالماجد دریابادی، خدمات وآثار	//	200.00
ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کا حصہ	//	200.00
ہندو مندر اور اورنگ زیب کے فرامین (اردو)	//	20.00
ہندو مندر اور اورنگ زیب کے فرامین (ہندی)	//	20.00
نقوش خاطر (قلمی چہرے)	//	300.00
۱۸۵۷ء اور ہریانہ (ہریانہ کے مجاہدین آزادی کا تذکرہ)	//	250.00
المساجد التاريخيه بدهلی	//	500.00
معمار قوم ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی	//	300.00
مرد مومن ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی	//	300.00
شاہ ولی اللہ خصوصی نمبر (ماہنامہ براہین)	//	195.00
الامام الدہلوی خصوصی شمارہ (ماہنامہ براہین)	//	195.00
وقف ترمیمی بل ۲۰۱۰ء منظر، پس منظر	//	زیر طبع
ضمائر القرآن (ضمائر قرآن اور انکے مراجع)	ڈاکٹر ابونصر محمد خالدی — مرتبہ مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی	300.00
الاشباہ والنظائر فی القرآن الکریم (قرآن کے مرادف الفاظ اور امثال ونظائر)	//	350.00
وفیات اعیان الہند (امراء وسلاطین کی تاریخ ہائے وفات اور مختصر حالات)	//	300.00
مضامین خالدی (اسلامیات، قرآنیات اور دکنیات پر مشتمل مقالات)	//	300.00
قرآنی تشبیہات واستعارات	//	150.00

SHAH WALIULLAH INSTITUTE

Adjacent To Kaka Nagar Masjid, (Near NDMC Primary School)
Kaka Nagar, New Delhi-110003
Ph : 9811740661, 9811615455, 26953430
E-mail : shahwaliullah_institute@yahoo.in, swiinstitute26@gmail.com

مجموعہ

رسائلِ امام شاہ ولی اللہؒ

التفہیمات الٰہیہ، البدور البازغہ دراصل حضرت شاہ صاحبؒ کے واردات قلبی، مکاشفات روحانی، اسلامی احکام، معاشرتی مسائل، مصطلحات علوم اسلامی کا شاہکار نمونہ اور علوم الٰہیات کا نادر خزینہ ہیں۔

(جلد ہشتم)

(حصہ دوم)

تحقیق و تعلیق

مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی

شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی

مجموعہ

رسائل امام شاہ ولی اللہؒ

التفہیمات الٰہیہ، البدور البازغہ دراصل حضرت شاہ صاحبؒ کے واردات قلبی، مکاشفات روحانی، اسلامی احکام، معاشرتی مسائل، مصطلحات علوم اسلامی کا شاہکار نمونہ اور علوم الٰہیات کا نادر خزینہ ہیں۔

(جلد ہشتم)

(حصہ دوم)

تحقیق و تعلیق:

مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی

... ... ی انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی

نام کتاب : مجموعۂ رسائل امام شاہ ولی اللہ جلد ہشتم
مرتبہ : مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی
قیمت : 300
سن اشاعت : دسمبر ۲۰۱۵ء
تعداد : 500
کمپوزنگ : ریاض احمد
آئی ایس بی این : 978-93-84153-04-2
ناشر : شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ، مسجد کاکانگر، نزد (این، ڈی، ایم، سی پرائمری اسکول) کاکانگر نئی دہلی۔۱۱۰۰۰۳

بہ تعاون قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

Title : Majmua Rasail-e-Imam Shah Waliullah-VIII
Editing : Maulana Mufti Ataur Rahman Qasmi
First Edition : December 2015
Price : Rs.300/-
ISBN : 978-93-84153-04-2
Composing : Riyaz Ahmed

Published by

Shah Waliullah Institute
Masjid Kaka Nagar, Near (N. D. M. C.
Primary School) Kaka Nagar, New Delhi-110 003
Ph. : 011-26953430, Mob.9811740661
website : www.shahwaliullah.com
Email : shahwaliullah_institute@yahoo.in

فہرستِ کتب

صفحہ			نمبر شمار
۵	مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی	مقدمہ:	۱-
۲۳	شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ	التفہیمات الالٰہیہ جلد دوم:	۱-
	مولانا عقیدت اللہ قاسمی	ترجمہ:	
	ڈاکٹر خلیل الرحمٰن راز	نظر ثانی:	
۱۹۵	شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ	البدور البازغہ:	۲-
	ڈاکٹر قاضی مجیب الرحمٰن	ترجمہ:	
	جسٹس مولانا عبدالقدوس قاسمی	نظر ثانی:	

مقدمہ

شیخ الاسلام حضرت الامام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی المتوفی ۱۱۷۶ھ اٹھارویں صدی عیسوی کی نابغۂ روزگار شخصیت ہیں۔ آپ فی الحقیقت حجة اللہ فی الارض اور آیة من آیات اللہ ہیں۔ برصغیر میں تحریک رجوع الی القرآن والحدیث، اصلاح ودعوت اور اسلامی علوم وفنون کے احیاوتجدید کی تاریخ پر آپ نے بڑے گہرے اور دوررس اثرات چھوڑے ہیں۔ آپ نے امت کی اصلاح وتربیت کے لیے جو الہامی نقشہ اور لائحۂ عمل مرتب ومدون کیا تھا اور اپنی مساعی جمیلہ سے اس میں رنگ بھرے، اس کے نقوش وخطوط اور اثرات صدیاں گزرنے کے باوجود آج بھی زندہ وتابندہ ہیں اور آئندہ بھی مشعل راہ رہیں گے۔ آپ نے مختلف علمی میدانوں میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ چنانچہ آپ کے علمی وتجدیدی کارناموں کا دائرہ بہت وسیع الاطراف ہے۔ امام غزالیؒ اور علامہ ابن تیمیہؒ کے بعد امت میں کوئی ایسی شخصیت نظر نہیں آتی جو حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی جیسی جامعیت، ہمہ گیری اور ہمہ جہتی کی حامل رہی ہو۔

حضرت شاہ صاحب ایک کثیر التصانیف مصنف اور عظیم مفکر ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ نے جہاں حجة اللہ البالغہ تصنیف کی جو برصغیر ہی میں نہیں بلکہ پورے عالم اسلام میں بڑی عزت و وقعت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے اور بطور حوالہ پیش کی جاتی ہے۔ وہیں التفہیمات الالہیة جیسی معرکتہ الآرا کتاب لکھی جو تصوف کے اسرار ورموز اور احکام شریعت کے مسائل ومقاصد پر محیط ہے۔

التفہیمات الالہیة، حضرت امام شاہ ولی اللہؒ کی معرکتہ الآرا کتابوں میں ایک منفرد واچھوتی کتاب ہے، جس میں شاہ صاحب چند سطریں عربی میں تو چند سطریں فارسی میں اور

چند صفحات عربی میں تو چند صفحات فارسی میں لکھ دیتے ہیں اور اسی رنگ و آہنگ میں پوری کتاب تصنیف ہوئی ہے۔ جس کا کوئی خاص موضوع نہیں ہے بلکہ متنوع موضوعات پر محیط ہے۔ دراصل یہ نادر کتاب حضرت شاہ صاحب کے قلبی واردات اور روحانی مشاہدات کا شاہکار نمونہ ہے۔ جس میں قرآنی آیات و احادیث کی تشریح، محدثین وفقہائے امت کے آثار و اقوال کی توضیح، مکاشفات ورویا کی تعبیر اور مصطلحات تصوف کی تفہیم و تلمیح پیش کی گئی ہے۔

گاہ بگاہ اسلامی احکام وعقائد پر عائد اعتراضات واشکالات کا مدلل ومفصل جواب بھی دیا گیا ہے اور فرق باطلہ کی تردید بھی کی گئی ہے۔

التفهيمات الالهية کی دونوں جلدوں میں کل ۳۳۰ تفہیمات ہیں۔ ان میں سے ہر تفہیم میں قرآن وحدیث، فقہ وکلام اور تصوف واحسان کے کسی نہ کسی مغلق وادق مسئلہ کی توضیح وتشریح کی گئی ہے اور حضرت امام شاہ ولی اللہ کا قلم گوہر بار اور معارف آگاہ، حکمت و معرفت کے موتی بکھیرتا ہوا نظر آتا ہے۔ بالفاظ دیگر یہ تفہیمات، فلسفۂ الٰہیات اور مصطلحات تصوف کی عقدہ کشائی میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔

التفهيمات الالهية کی دونوں جلدیں پہلی مرتبہ ۱۳۵۵ھ مطابق ۱۹۳۶ء میں علامہ حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری سابق شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند اور شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی اور مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کی نگرانی میں المجلس العلمی ڈابھیل، سورت، گجرات سے شائع ہوئی تھیں۔ جب یہ اساتذۂ کرام تلامذہ شیخ اور مشائخ حدیث دارالعلوم دیوبند میں بعض امور پر اختلاف پیدا ہوجانے کی وجہ سے ڈابھیل چلے گئے تھے اور اس وقت جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل نے دارالعلوم ثانی کا درجہ حاصل کرلیا تھا۔ آج بھی اس جامعہ کا شمار گجرات کے اہم مدارس میں ہوتا ہے جس کے موجودہ مہتمم مولانا احمد بزرگ صاحب ہیں جن کے دادا حضرت مولانا احمد بزرگ صاحبؒ تھے جو حضرت شیخ الہندؒ اور مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے شاگرد تھے ان ہی کی دعوت پر شاہ صاحب ڈابھیل گئے تھے۔ مولانا موسیٰ افریقی صاحب بھی اس کے محرک تھے جو شاہ صاحب کے خادمِ خاص تھے۔ حضرت مولانا احمد بزرگ صاحب موجودہ مہتمم جن سے میری ملاقات

مولانا معز الدین قاسمی صاحب کے دسترخوان پر ہوئی تھی، ان کے ہمراہ مولانا مفتی ابوبکر پٹنی صاحب بھی تھے۔ علامہ انور شاہ کشمیری اور ان کے رفقائے کار نے التفہیمات الالٰھیۃ کے دستیاب مختلف مخطوطات (قلمی نسخوں) کے موازنے و تقابل کے بعد صحیح ترین نسخہ تیار کیا تھا اور صحت متن کے ساتھ دو جلدوں میں شائع کیا تھا۔

اس المجلس العلمی ڈابھیل سے سب سے پہلے الخیر الکثیر شائع ہوئی تھی، جب کہ مقدمہ میں فاضل ناشر کی طرف سے البدور البازغہ اور تفہیمات الٰہیہ کو شائع کرنے کا عزم وارادہ ظاہر کیا گیا تھا۔

چنانچہ مولانا سید محمد احمد رضا بجنوری سکریٹری المجلس العلمی ڈابھیل لکھتے ہیں:

قد كنا وعدنا فى اواخر مقدمة "الخير الكثير" ان نطبع المولفات الاخر المهمة لشيخ الاسلام الشاه ولى الله المحدث دهلوى قدس سره وقدذكر نا بخصوص فى هذالذيل اسماء الكتابين الجليلين له "البدور البازغه" و"التفهيمات الالهٰية" وهما من اعظم تاليفاته النادرة واجلها قدراً واكمل تصنيفاته الباهرة واتمهانفعاً.	''ہم نے "الخیر الکثیر" کے مقدمہ میں وعدہ کیا تھا کہ ہم شیخ الاسلام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی قدس سرہ کی دوسری مہتم بالشان تالیفات بھی شائع کریں گے۔ اس سلسلہ میں ہم نے شاہ صاحب کی دو اہم ترین کتابوں البدور البازغة اور التفهيمات الالهية کا ذکر کیا تھا، کہ یہ دونوں کتابیں آپ کی عظیم و نادر ترین کتابیں ہیں۔ قدر و منزلت کے لحاظ سے بہت بلند مرتبہ اور کامل ترین نیز نفع کے اعتبار سے مکمل ترین ہیں۔''

اس کے بعد مولانا محمد احمد رضا بجنوری التفهيمات الالهٰية کے دستیاب مخطوطات (قلمی نسخوں) کے موازنے و تقابل کے بعد صحیح ترین و مستند ترین نسخہ مرتب و مدون کرنے سے متعلق کلمۃ الناشر میں لکھتے ہیں:

توجهنا الى" التفهيمات الالٰهية" وقاسينا فى جمع عدة نسخ منها، والنسخ التى اعتمدنا عليها فى هذه المطبوعه، النسخة الخطية فى مكتبة مظاهر العلوم "السهارنفورية، وهذه نسخة كاملة جيدة النسق والترتيب عندنا، ولذا قد وضعنا ترتيب نسختنا فى الاكثر على ترتيبها بحسب التقديم والتاخير فى التفهيمات. ثم النسخة الخطية لصديقنا المحترم مولانا نورالحق الاستاذ فى كلية الالسنة المشرقية ببلدة لاهور (الهند) وهى نسخة حسنة الخط جيدة الضبط، استفدنا منها كثيراً فى تصحيح نسختنا ولكنها ناقصة، ليس فيها شطر من الكتاب ثم النسخة الخطية فى مكتبة "الجامعه الانكليزية الاسلاميه" ببلدة على گره (الهند) وهى نسخة كاملة جيدة النسخ والضبط ايضًا والنسخة الخطية الاخرىٰ ايضاً فى تلك المكتبة ، وهذه النسخة وان كانت ناقصة ، لها اهمية خاصة من حيث انها اقدم النسخ التى وجدنا هاالان واصحها عندنا،

''پھر ہم نے التفہیمات الالٰھیۃ پر کام شروع کیااوراس کے نسخے جمع کرنے لگے۔ اس سلسلہ میں ہم نے سب سے زیادہ اس قلمی نسخہ پر اعتماد کیا ہے جو مظاہر العلوم سہارنپور کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ یہ نسخہ ہمارے نزدیک نسق وترتیب کے لحاظ سے سب سے بہتر ہے۔اس لئے ہم نے اپنے نسخہ کی ترتیب یعنی تفہیمات کی تقدیم و تاخیر میں اسی کی ترتیب کو بنیاد بنایا ہے۔اس کے بعد ہم نے صدیق محترم مولانا نورالحق استاذ کلیۃ السنۃ المشرقیۃ لاہور کے قلمی نسخہ کو بھی پیش نظر رکھا۔ یہ نسخہ خوشخط ہے۔ ہم نے اپنے نسخہ کی تصحیح میں اس سے بہت زیادہ استفادہ کیا ہے لیکن یہ نسخہ ناقص ہے کہ اس میں کتاب کا ایک حصہ موجود ہی نہیں ہے۔ پھر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی لائبریری والے قلمی نسخہ کو سامنے رکھا، یہ نسخہ نسخ وضبط میں سب سے بہتر اور کامل ہے۔ ہمارے سامنے لائبریری کا دوسرا قلمی نسخہ بھی رہا ہے جو اگرچہ ناقص ہے پھر بھی اس کی اس حیثیت سے بڑی اہمیت ہے کہ اب تک ہمیں جو نسخے دستیاب ہوئے ہیں، ہمارے نزدیک ان میں یہ سب سے قدیم اور سب سے زیادہ صحیح نسخہ ہے۔ اس کے حاشیہ پر شیخ محمد عمر بن حضرت الشیخ محمد عمر بن

وان عليها تحريراً (فى صورة حاشية مختصرة) بيد الشيخ محمد عمر بن حضرة الشيخ مولانا محمد اسمعيل الشهيد الدهلوى قد سره وقدقابلنا نسختنا بهاتين النسختين كليهما ايضا من الاول الى الاخر"

حضرت الشیخ مولانا محمد اسمٰعیل شہید دہلوی قدس سرہ کے ہاتھ کی تحریر ہے۔ہم نے ان دونوں نسخوں کوشروع سے آخر تک اپنے لئے بنیاد بنایا ہے۔"

(صفحہ ۲ كلمة الناشر)

ان مخطوطات کے علاوہ التفهيمات الالٰهية کا ایک قلمی نسخہ رضا لائبریری رامپور میں بھی موجود ہے جس کے بارے میں ڈاکٹر ابوسعد اصلاحی لائبریرین رضا لائبریری رام پور لکھتے ہیں:

"مخطوطہ نمبر ۳۱۶۸ التفهیمات الالهیہ ، فن سلوک ورق ۱۵۷،بسطر ۲۶،سائز ۲۰+۳۲،خط نستعلیق،زمانہ بارھویں صدی ہجری مصنف کے عہد کی نہایت اہم کاپی ہے، یہ کتاب شاہ صاحب کے واردات قلبی و وجدانی مضامین پر مشتمل ہے۔"

امام شاہ ولی اللہ اور ان کے افکار ونظریات

ص ۱۹۶ مطبوعہ شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ مرتبہ مولانا عطاء الرحمٰن قاسمی۔

اس کے علاوہ اس کے قلمی نسخے کہاں کہاں ہیں۔اس کی تحقیق کی ضرورت ہے۔ اس کا ایک نسخہ غالباً ماسکو میں بھی موجود ہے۔میرے لیے سردست التفهيمات الالٰهية کے دستیاب مخطوطات کا موازنہ وتقابل کرنا مشکل ہے۔البتہ جب میں اس مجموعۂ رسائل امام شاہ ولی اللہ کی تحقیق وتدوین اوراشاعت سے فارغ ہوجاؤں گا تو پھر حضرت شاہ ولی اللہ کی عربی و فارسی کتابوں کوان کے مخطوطات عربی وفارسی سے موازنہ وتقابل کے بعد صحیح ترین نسخے تیار کر کے شائع کروں گا۔انشاءاللہ کیونکہ حضرت شاہ صاحب کی مطبوعہ کتابوں کو کمالِ صحت اور تحقیق متون کے ساتھ ازسرنو شائع کرنا شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کے علمی منصوبوں میں شامل ہے۔

التفهیمات الالٰہیة مطبوعہ المجلس العلمی ڈابھیل کا نسخہ میرے پیش نظر ہے، جو دو جلدوں میں ہے اور اسی مطبوعہ نسخہ ڈابھیل کا اردو ترجمہ کیا گیا ہے، جس کے شروع میں خطبۂ افتتاحیہ ہے، جس میں حضرت شاہ ولی اللہ نے خصوصیت کے ساتھ شیخ نور اللہ پھلتی ثم بڑھانوی کا ذکر کیا ہے۔ جنہوں نے حضرت شاہ صاحب سے علوم تصوف کے اکتساب کے لیے پر صعوبت سفر کیا تھا اور حضرت شاہ صاحب سے استفادہ کیا تھا: جو آپ کے اجل تلامذہ میں تھے، جن کے نام حضرت شاہ صاحب کے ۲۹ مکتوبات ہیں۔ ان میں زیادہ تر مکتوبات مسائل تصوف پر ہیں۔

التفہیمات کے خطبۂ افتتاحیہ کے مطالعہ سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت شاہ صاحب نے شیخ نور اللہ بڑھانوی کا انتخاب، اشارہ غیبی کی بنیاد پر کیا تھا اور اس میں ان کے والد کا روحانی تصرف بھی شامل رہا ہے۔ حضرت شاہ صاحب نے **التفھیمات الالٰھیة** میں شیخ نور اللہ پھلتی کا ذکر بڑے واضح الفاظ میں کیا ہے۔

اور ''اخینا الفاضل اللبیب الکامل الحبیب الشیخ نور اللہ بن معین الدین البھلتی'' لکھا ہے، اس کے بعد ایک مکاشفہ کا بھی ذکر کیا ہے'' چنانچہ لکھتے ہیں۔

ثم بعد ذالک انا جالس عند قبر سیدی الوالد صاحب الکرامات الجزیلة والمقامات الجلیلة المنوہ به فی اعلی السطور ضاعف الله له الاجور اذ لوحت روحه الکریمة تلویحاً روحا نیا تأ مرنی ان القن صاحبی المذکور ملاحظة التھلیل علی النمط المعتبر عند السادة النقشبندیة سقاھم ربھم من السلسبیل ففاتحته بھا من غیر ان یسبق منه	''اس کے بعد جب ایک روز میں اپنے والد صاحب کی قبر کے پاس بیٹھا ہوا تھا، جو بڑے صاحب کرامات اور قدر و منزلت کے حامل تھے۔ (اللہ تعالیٰ ان کے مرتبے و درجات مزید بلند فرمائے) ان کی روح نے اشارہ کیا کہ میں اخی مذکور کو نقشبندی بزرگوں کے نزدیک معتبر و مستند قرار دی جانے والی تسبیحات و وظائف کی تلقین کروں۔ چنانچہ میں نے اس کی طلب کے بغیر اس کو ان امور کی تلقین کا سلسلہ شروع کردیا جو مجھے

الطلب والسوال حيث كنت على بصيرة من تلويحات اكابر الرجال فكان ذلك ببركة نفسه.	میرے بزرگوں کی ہدایات ورہنمائی کے طور پر معلوم ہیں۔ اور یہ میرے والد قدس اللہ سرہ کی برکت کا نتیجہ تھا کہ اس میدان میں اس کو سہولتیں ملتی چلی گئیں۔"

حضرت شاہ صاحب جہاں متبحر عالم دین اور بلند پایہ صوفی کامل ہیں۔ وہاں عربی و فارسی کے صاحب اسلوب ادیب وشاعر بھی ہیں۔ آپ ان دونوں زبانوں پر یکساں طور پر عبور وکمال رکھتے ہیں۔ آپ نے شیخ نوراللہ پھلتی کے بارے میں دو شعر بھی کہے ہیں:

لقد بلوتک فی سلم و فی عتب

فما وجدتک الاخالص الذهب

میں نے تمہیں عیش وآرام اور سختی و پریشانی ہر میدان میں آزمایا اور پرکھا تو میں نے تمہیں خالص سونے جیسا ہی پایا:

ولم تسم بنورالله الا لانه

عما قليل تكون النورفارتقب

اور تمہارا نام صرف اس لیے نوراللہ نہیں رکھا گیا کہ نور تھوڑا ہے بلکہ اس کو بڑھاتے رہو۔

حضرت شاہ صاحب نے التفهيمات الالهية کے خطبۂ افتتاحیہ میں جس طرح شیخ نوراللہ پھلتی کا ذکر کیا ہے، اس سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ کتاب دراصل حضرت شیخ نوراللہ پھلتی کی روحانی تعلیم وتربیت کے لیے لکھی گئی ہے۔ اور اس کا سبب تصنیف شیخ نوراللہ کی ذات ستودہ صفات ہی ہے۔ جس کے لیے غیبی اشارات کئے گئے ہیں۔ جو آپ کے اوپر حضرت والد صاحب کی قبر پر معتکف ہونے کے دوران منکشف ہوئے تھے۔

حضرت شاہ صاحب نے تفہیم اول میں تین عظیم امور کی تفصیل بیان کی ہے، جن کی طرف رسولوں اور نبیوں نے دعوت دی ہے اور یہی کار نبوت اور بار نبوت ہیں جو انبیا ورسل کے خاتم اور آخری رسول حضرت ذی وقار صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی اصلاح کے لیے علما مصلحین کے سپرد ہوئے ہیں۔ اور اب یہی رجال کار اور اصحاب دعوت، مسئول وذمہ دار ہیں۔

حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں:

اما بعد فیقول خادم العلماء والصوفیه والمتمسک باذیالهم العلمیة ولی اللّٰه بن عبدالرحیم عاملهما اللّٰه بفضله العظیم ان من اجل نعم اللّٰه تعالیٰ التی لا یستطیع العباد شکرها ان بعث الانبیاء مترجمین عن الغیب لیهلک من هلک عن بینة ویحی من حی عن بینة ثم جعل لهم ورثة یقومون بعلمهم بین الناس و یحیون سننهم و یدعون الی رشدهم هادین الی طرق التقرب الی اللّٰه تعالیٰ ومعظم مادعت الی اقامة الرسل امور ثلاثة تصحیح العقائد فی المبدا والمعاد والمجازاة وغیرها وقد تکفل بهٰذا الفن اهل الاصول من علماء الامة شکر اللّٰه تعالیٰ مساعیهم و (۲)تصحیح العمل فی الطاعات المقربة والا رتفاقات الضروریة علی وفق السنة وتکفل بهذا الفن فقها إلامة فهدی اللّٰه بهم کثیر ین واقام بهم فرقة عوجا و (۳) تصحیح الاخلاص والاحسان الذین هما اصلاً للدین الحنیفی الذی ارتضاہ اللّٰه لعبادہ (صفحہ۱۱التفهیمات)

علما وصوفیا کا خادم اوران کی اعلیٰ روایات کا حامل ولی اللہ بن عبدالرحیم عاملهما اللّٰه بفضله العظیم . کہتا ہے، اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں میں سے جن کا بندے شکر ادا نہیں کر سکتے، یہ بھی ہے کہ اس نے ان انبیا کو مبعوث فرمایا جو غیب کی ترجمانی کی رہنمائی کرنے والے ہیں، تاکہ واضح دلائل کے سامنے آجانے کے کرنے والے اور اللہ تعالیٰ کی طرف تقرب کی راہوں بعد جس کو ہلاک ہونا ہے، اس کو ہلاک کردے اور جس کو حیات نو حاصل کرنی ہو، اس کو حیات نو عطا کردے۔ پھر ان کے ایسے وارث بنائے جو لوگوں کے درمیان ان کے علوم وروایات کے علم بلند کرتے ہیں، اور ان کی سنتوں کو زندہ کرتے ہیں، اوران کو رشد وہدایت کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ اور رسولوں کی تعلیمات وروایات کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ ان میں تین امور عظیم ہیں (۱) مبدا ومعاد اور مجازاۃ وغیرہ کے سلسلہ میں عقائد کی تصحیح۔ اس فن کی ذمہ داری علماء میں سے اہل اصول نے سنبھالی۔ اللہ تعالیٰ ان کی کوششوں و مساعی کو کامیاب فرمائے (۲) سنت کے مطابق

متبول طاعات اور ضروری فوائد والے
عمل کی تصحیح، اس فن کی ذمہ داری فقہائے
امت نے سنبھالی۔ چنانچہ اللہ نے ان
کے ذریعہ بیشمار لوگوں کو ہدایت عطا
فرمائی۔ اور ان کے ذریعہ راہ راست پر
چلنے والے فرقہ کو قائم فرمایا۔ (۳) اور
اخلاص و احسان کی تصحیح جو کہ اس دین
حنیف کے اصول و بنیاد ہیں جس کو اللہ
نے اپنے بندوں کے لئے پسند فرمایا ہے۔

التفہیمات الالٰہیة کے مندرجات میں خلافت ظاہرہ وباطنہ، عارف کا حال، کامل کے اوصاف، لاہوت وجبروت کی حقیقت، وجدان، انواع مکاسب، احکام ظاہرہ میں انبیاء ورسولوں کے درمیان فرق، ذات باری میں غور وفکر اور عجیب خطاب، حضور پر درود بھیجنے کے فائدہ کے انکار کا جواب، شیخ عبدالقادر جیلانی کے قول ''حنفیہ مرجیہ ہیں'' کے معنی، خوابوں کی تعبیر، باری تعالیٰ کا فیض، ایمان اور اس کی صفات کا بیان، شرح صدر کی حقیقت، رحمٰن کی تجلی، ابداع کی حقیقت، اوقات کی تاثیر، ذات الٰہی کا عکس، پردوں کا اصول، علم طلسمات، مقدس دائرہ، علم اور معلوم کا اتحاد، توجیہ حنفیؒ، نبوت اور فطرت، اقطاب مرشدین کا ذکر، فرد اور قطب، معارف جلیلہ کا ذکر وثبوت اور وجود کے درمیان فرق، ازل کا معنی، پوشیدہ معارف، مخلوقات میں کواکب کی تاثیر، حلول سرمدی، توکل کا مقام، عقائد حق، کلی اور جزئی، ملاء اعلیٰ کی حقیقت، حظیرۃ القدس، تجلی کی اصناف، ختم نبوت، اس کا راز، حکمت وعصمت اور سیادت کا راز، فنا النفس، حدوث عالم، محدث اور مقرب، صحابہ کی قسمیں اور علم تکوین کے اہم مباحث ومسائل زیر بحث آئے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی بہت ہی اہم مباحث شامل ہیں۔ جن کا ذکر یہاں طوالت کے خوف سے چھوڑ دیا گیا ہے۔

حضرت شاہ صاحب نے **التفہیمات الالٰہیة** میں قرآن وحدیث کی آیات،

صحابہ، صحابیات کے اقوال وآثار، فقہائے امت اور صوفیا ومشائخ طریقت کے فرمودات وآراء سے استشہاد واستدلال کیے ہیں، جن لوگوں کے کتاب مین حوالے منقول ہیں، ان میں حضرت جنید بغدادی، حضرت سفیان ثوری، حضرت عبدالقادر جیلانی، حضرت شیخ ابن عربی، شیخ امیر سید کلال، امام معروف کرخی، شیخ شہاب الدین نقشبندی، شیخ بہاءالدین زکریا، شیخ عفیف الدین تلمسانی، شیخ امام غزالی، شیخ صدرالعالم، عبدالوہاب شعرانی، جاراللہ زمخشری، جبائی معتزلی، جلال الدین سیوطی، ابوہاشم، شیخ قطب الدین بختیار کاکی، شیخ رفیع الدین، خواجہ باقی باللہ، حضرت مجدد الف ثانی، شیخ نوراللہ بڑہانوی ثم پھلتی اور شیخ محمد عاشق پھلتی وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

حضرت شاہ صاحب نے ان مباحث کو بڑے وجدانی، والہامی اسلوب میں لکھا ہے، اوران کا فلسفیانہ ومنطقیانہ تجزیہ پیش کیا ہے۔ اوران مسائل کا اتنی گہرائی سے جائزہ لیا ہے کہ ان کی گہرائی تک عام قارئین کے لئے پہنچنا محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

میں نے حضرت شاہ صاحب کی زیرتذکرہ کتاب کے علاوہ دوسری کتابوں کو بار بار پڑھا ہے۔ تاہم میں یہ دعوی نہیں کرسکتا کہ میں نے ان کی کتابوں کو کماحقہ سمجھ لیا ہے اوران کے بیان کردہ مطلب ومقصد کو پورے طور پر اخذ کرلیا ہے۔ حالانکہ حضرت شاہ صاحب کا اسلوب بیان عام فہم اور بامحاورہ ہوتا ہے۔ البتہ بعض فلسفیانہ اور منطقیانہ مباحث میں اپنی وضع کردہ اصطلاحات ضرور استعمال کرتے ہیں کہ جن کو سمجھنے کے لیے ان کی دوسری کتابوں کا مطالعہ ضروری ہوتا ہے۔ ورنہ ان کی وضع کردہ اصطلاحات کو سمجھنا خاصا مشکل ہے۔ چونکہ حضرت شاہ کا معمول ہے کہ وہ اپنی کسی نہ کسی کتاب میں اپنی وضع کردہ اصطلاحات کی تشریح وتوضیح ضرور کرتے ہیں اور دوسری جگہ ان اصطلاحات کو استعمال کرتے ہیں جن کو سمجھنے کے لیے صرف ان کا ترجمہ کافی نہ ہوگا اور جن مترجمین نے ان کی تشریح وتوضیح کو نظرانداز کرتے ہوئے ترجمہ کرنے کی جسارت کی ہے، انہوں نے دھوکہ کھایا ہے۔

تفہیمات کے آخر میں وصیت نامہ اور مختلف طبقات کے نام خطابات ہیں جو بڑے ہی موثر اور عبرت انگیز ہیں؟ حضرت شاہ صاحب صاحب نسبت بزرگ اور تصوف کے قائل

تھے، لیکن آپ نے متصوفین اور اپنے عہد کے نام نہاد مشائخ سے دور رہنے کا مشورہ بھی دیا ہے اوران سے بیعت نہ کرنے کی وصیت کی ہے۔

آنست کہ دست دردست مشائخ این زمان ہرگز نباید داد و بیعت بایشاں نباید کرد و بغلو عام مغرور نباید بود و نہ بکرامات زیرا کہ اکثر غلوعام بسبب رسم است و امور رسمیہ را بحقیقت اعتباری نیست وکرامات فروشان ایں زمانہ ہمہ الاماشاء اللہ طلسمات و نیرنجات راکرامات دانستہ اند۔

(صفحہ ۲۴۰ التفہیمات)

''یہ ہے کہ اس زمانہ کے مشائخ کے ہاتھوں میں ہاتھ ہرگز نہ دیا جائے، اوران کی بیعت نہیں کرنی چاہیے اور نہ غلوعام سے اور نہ ہی کرامات سے دھوکا کھائیں، اس لیے کہ اکثر غلوعام رسم کی وجہ سے ہے۔ اور امور رسمیہ کا حقیقت میں کوئی اعتبار نہیں ہے۔ اوراس زمانہ کے تمام کرامات فروش الاماشاء اللہ طلسمات و فریب کوکرامات سمجھتے ہیں۔''

حضرت شاہ صاحب کی دوسری کتابوں میں بھی متصوفین و نام نہاد مشائخ کی مخالفت اورتصوف میں درآئی بے اعتدالیوں اور غیر اسلامی طریقوں پر تنقید ملتی ہے۔ جس کے ثبوت میں بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے، لیکن یہاں اس کی گنجائش نہیں ہے، البتہ حضرت شاہ صاحب کی ہمہ جہت شخصیت کے متعلق ایک بات واضح طور پر محسوس کرتا ہوں کہ حضرت شاہ صاحب اپنے افکارونظریات میں بالکل منفرد ہیں، اور انہیں کسی مخصوص حلقہ اور مخصوص موضوع ومیدان میں محصورومقید کرنا نہ صرف غیر مناسب بات ہے بلکہ شاہ عدم شناسی بھی ہے۔

میں حضرت شاہ صاحب کی کتابوں کو پڑھنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ حضرت شاہ صاحب ایک مخصوص سوچ وفکر کے آدمی ہیں، ان کو اسی رنگ وآہنگ اور ذوق و مذاق میں دیکھنے پرکھنے کی کوشش کرنی چاہیے، اوران کی شخصیت کو کسی مخصوص مسلکی گروہ میں رکھنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ اور عجلت وجلدی بازی میں ان کی کسی کتاب یا کسی عبارت کے بارے میں یہ بدگمانی بھی نہیں کرنی چاہیے کہ یہ کتاب یا عبارت الحاقی ہے۔

میں **التفہیمات الالٰھیة** مطبوعہ المجلس العلمی ڈابھیل کے حال ہی میں کیے گئے اردو ترجمہ کے مطالعہ اور ترتیب وتقدیم میں مصروف تھا کہ ایک صاحب کی ایک تحریر نظر سے

گزری کہ التفهيمات الالهية مطبوعہ المجلس العلمی ڈابھیل میں ایک عبارت کے ذیل میں ایک لفظ الحاق ہے اور کسی مخطوطہ کا حوالہ بھی دیا گیا ہے۔ مخطوطات کی ایڈیٹنگ میں اس طرح کے امکانات ہوئے ہیں۔ اور ہو سکتے ہیں، مجھے اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

میں التفهيمات الالهية کے اردو ترجمہ (جو برصغیر ہندو پاک میں پہلی مرتبہ ہوا ہے) کی پروف ریڈنگ اور تنقیح میں اتنا مصروف تھا کہ مطبوعہ التفهيمات الالهية ڈابھیل کا موازنہ و تقابل مخطوطات التفهيمات الالهية سے نہ کر سکا۔ اس لیے سردست میرے لیے کسی تحریر کی تردید یا تائید مناسب نہیں ہے۔ البتہ التفهيمات الالهية مطبوعہ المجلس العلمی ڈابھیل حضرت علامہ انور شاہ کشمیری، شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا سید محمد احمد رضا صاحب کے اہتمام و نگرانی میں دستیاب مختلف مخطوطات کو سامنے رکھ کر التفهيمات الالهية کا یہ مستند نسخہ تیار کیا گیا تھا، جن کی دیانتداری و امانت اور تقوی و طہارت پر پورا پورا اعتماد و بھروسہ ہے۔ ان کی طرف سے کسی قسم کی علمی خیانت کا شبہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ والعلم عند الله۔

شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ نے سردست شیخ الاسلام حضرت امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے دستیاب تمام رسائل و کتب کو مجموعہ رسائل شاہ ولی اللہ کے نام سے شائع کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ جس کے تحت اب تک ٦ شائع ہو چکے ہیں۔

ان مجموعہ رسائل کی اشاعت و طباعت کے بعد شیخ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی تمام عربی و فارسی کتابوں کو ان کے دستیاب مخطوطات (قلمی نسخوں) کے موازنے و تقابل کے بعد صحیح ترین اور مستند ترین نسخے تیار کرنے اور شائع کرنے کا جامع منصوبہ ہے۔ جس کے لیے ابھی سے عربی و فارسی کتابوں کے مخطوطات جمع کئے جا رہے ہیں اور ایک حد تک ان پر کام بھی شروع ہو گیا ہے۔ اہل علم سے اس سلسلہ میں علمی تعاون کی درخواست ہے۔ جیسا کہ آپ کے علم میں ہے کہ شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ نے اپنے طویل المیعاد جامع منصوبہ کے تحت امام شاہ ولی اللہ کی تمام عربی و فارسی کتابوں اور رسالوں کے دستیاب اردو تراجم کو تحقیق و تنقیح اور تقدیم و حواشی کے ساتھ شائع کرنے کا جامع منصوبہ بنایا

ہے۔ جس کے تحت مجموعہ رسائل امام شاہ ولی اللہ کی ساتویں جلد آپ کے ہاتھوں میں پہنچ چکی ہے اور اس کی آٹھویں جلد بھی جلد پہنچنے والی ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی بیشتر عربی و فارسی کتابوں کے اردو تراجم ہو چکے ہیں۔ البتہ ان کی بعض اہم عربی و فارسی کتابوں کے ابھی اردو تراجم نہیں ہو سکے ہیں، ان میں ایک اہم و معرکۃ الآرا کتاب التفهيمات الالهية بھی ہے یہ کتاب جیسا کہ شروع ہی میں بیان کیا گیا پہلی مرتبہ ۱۳۵۵ھ/۱۹۳۶ء میں المجلس العلمی ڈابھیل گجرات سے شائع ہوئی تھی اور مدینہ برقی پریس بجنور یوپی میں چھپی تھی، اس کے بعد پروفیسر غلام مصطفیٰ قاسمی نے سندھ پاکستان سے شائع کی تھی۔ میرے سامنے المجلس العلمی ڈابھیل گجرات کا قدیم ترین مطبوعہ نسخہ ہے۔ پروفیسر غلام مصطفیٰ قاسمی صاحب کا ترتیب دیا ہوا نسخہ مجھے دستیاب نہیں ہوا ہے۔

حیرت ہے کہ عرصہ دراز بیت جانے کے باوجود کسی صاحب علم و فضل نے التفهيمات الالهية کا اردو ترجمہ کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ اس کے اسباب کچھ بھی ہو سکتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کا اردو ترجمہ علامہ انور شاہ کشمیری سابق شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند، شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی اور مولانا سید محمد احمد رضا بجنوری صاحب مقیم ڈابھیل کے دور مسعود میں ہو جاتا تو زیادہ معیاری و مستند ہوتا، لیکن ہر کام کے لیے ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔ جیسا کہ آپ کے علم میں ہے کہ التفہیمات الالٰہیہ اور البدور البازغہ یہ دونوں کتابیں المجلس العلمی ڈابھیل سے شائع ہوئی تھیں، اور حضرت انور شاہ صاحب کشمیری کی نگرانی میں ہوئی تھیں۔ یہاں ایک وضاحت طلب بات یہ ہے کہ التفہیمات اور البدور کے متون ان کے متعدد مخطوطات کو پیش نظر رکھ کر مرتب و مدون کیا گیا ہے اور ان میں کوئی حذف و اضافہ نہیں کیا گیا ہے۔ البتہ ان مضامین تفہیمات کے ذیلی عنوانات ناشر فاضل اور مرتب علام کی جانب سے لگائے گئے ہیں اور یہ عنوانات اصل مخطوطات تفہیمات، بدور میں موجود نہیں ہیں۔ شروع میں خود میرا ارادہ ہوا تھا کہ ان اضافی عنوانات کو حذف کر دوں اور مصنف کے ہی اصل متون ہی پر اکتفا کروں لیکن میں نے محسوس کیا کہ یہ اضافی عنوانات متون کے مطالب و مفاہیم کی تفہیم اور تعبیر میں بڑے معاون و مددگار ہیں۔ اس

کے پیش نظر ان اضافی عنوانوں کو باقی رکھا۔

قارئین سے التماس ہے کہ ابواب وفصول کے ان ذیلی عنوانات کو حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے قائم کردہ عنوانات تصور نہ کریں اور ناشراول کی جانب سے متعین کردہ عنوانات ہی خیال فرمائیں۔

آمدم برسر مطلب! مولانا ڈاکٹر خلیل الرحمٰن راز جو اردو وعربی زبان کے ادیب وشاعر ہیں اور ایک طویل عرصہ تک دوحہ قطر میں رہے ہیں۔ایک دن غریب خانہ پر تشریف لائے اور مجموعہ رسائل امام شاہ ولی اللہ کی مطبوعہ جلدیں طلب فرمائیں۔ میں نے ان کی خدمت میں یہ تمام جلدیں پیش کردیں تو بہت خوش ہوئے اور شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کی علمی کاوشوں کو سراہا۔ جو شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کے لئے یقیناً اعزاز وافتخار کی بات ہے۔

اس کے بعد ایک دن مجھے اپنے در دولت پر طلب فرمایا اور میرے سامنے التفہیمات الالٰہیہ کی دونوں جلدوں کا اردو ترجمہ رکھ دیا اور فرمایا کہ انہیں آپ شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ سے شائع کردیں۔ مولانا ڈاکٹر عقیدت اللہ قاسمی صاحب نے ان کا اردو ترجمہ کیا اور میں نے ان پر نظر ثانی کی ہے۔ میں نے کہا کہ جب مولانا عقیدت اللہ قاسمی صاحب نے اس کا ترجمہ کیا ہے اور آپ نے نظر ثانی کی ہے تو مجھے اس پر اطمینان ہے کہ اردو ترجمہ اچھا ہی ہوگا۔ مولانا خلیل الرحمٰن راز صاحب نے یہ کہتے ہوئے ترجمہ میرے حوالہ کردیا کہ پھر بھی دیکھ لیں۔

میں آپ کی ہدایت کے مطابق یہ اردو ترجمہ گھر لے آیا۔ ترجمہ کچھ دنوں تک یوں ہی رکھا رہا۔ میں عدیم الفرستی کی وجہ سے اس کو دیکھ نہ سکا۔ کچھ دن بعد ترجمہ کو دیکھا تو التفهيمات الالهية کا اردو ترجمہ پسند آیا۔ بڑا سلیس وشگفتہ اور بامحاورہ ترجمہ کیا گیا ہے۔ بڑی حد تک اس کی روح تک پہنچنے کی کوشش کی گئی ہے۔

شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کے ذمہ داروں سے برصغیر ہندوپاک کے اصحاب علم ودانش کی جانب سے برابر مطالبہ کیا جاتا رہا ہے کہ اس نادر ونایاب کتاب کا ترجمہ اردو زبان میں ہونا چاہیے تاکہ عوام وخواص اس کتاب کے اسرار ورموز اور مقاصد شریعت سے واقف ہوسکیں۔

مجھے خوشی ہے کہ مولانا ڈاکٹر عقیدت اللہ قاسمی صاحب اور مولانا خلیل الرحمٰن راز صاحب نے غیر معمولی کدوکاوش کے بعد اس کا اردو ترجمہ کیا ہے۔ میں تحدیث بالنعمۃ کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ التفہیمات الالٰہیہ کا یہ اردو ترجمہ بلند پایہ ومعیاری ہے اور یہ اس نئی صدی کا تحفۂ بیش قیمت ہے جو اہل علم ودانش کے ہاتھوں میں پہنچ رہا ہے۔

اس مجموعہ میں شامل دوسری کتاب البدور البازغہ ہے، جو حضرت شاہ صاحب کی اہم کتابوں میں شامل ہے۔ جس کے متعلق خود حضرت شاہ صاحب البدور البازغہ کے خطبۂ افتتاحیہ میں لکھتے ہیں:

''اما بعد! بندۂ عاجز ولی اللہ بن عبدالرحیم (اللہ تعالیٰ دونوں باپ بیٹے کو اپنے لطف وکرم سے نوازے) عرض کرتا ہے کہ زیرِ تالیف کتاب ان تفہیماتِ الٰہیہ پر مشتمل ہے جو خدائے مہربان کے فیضانِ عنایت سے پہلے میرے دل پر القا ہوئیں، پھر وہاں سے زبان اور پھر سرانگشت (پوروں) پر (تحریر وقلم کی صورت میں) ظاہر ہوئیں اور عصرِ حاضر (کی استدلالی ذہنیت) کا تقاضا ہوا کہ ان کو برہان ودلیل کے ساتھ پیش کیا جائے۔ میں نے اس کا نام ''البدور البازغہ'' رکھا ہے جو ایک مقدمہ اور تین مقالوں پر مشتمل ہے۔''

حضرت شاہ صاحب نے البدور البازغہ میں اسلام اور اسلامی ملک کے نظریۂ اقتصادیات، معاشیات، سیاسیات، سماجیات اور اخلاقیات سے بحث کی ہے۔ حضرت شاہ صاحب اسلامی معاشرہ اور اجتماعی زندگی کا سرچشمہ انسان کی ذات کو مانتے ہیں اور ان کا ماننا ہے کہ انسان کے فطری تقاضے اجتماعی زندگی ہی میں پورے ہو سکتے ہیں۔

جماعتیں کس طرح تشکیل میں آتی ہیں، اور اس کے فطری تقاضے کیا ہوتے ہیں، الگ الگ فصل میں تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ حضرت شاہ صاحب ماہر اقتصادیات اور ماہر عمرانیات بھی ہیں۔ اسی وجہ سے اس میں اقتصادی اور عمرانیاتی نقطۂ نظر سے بحث کی ہے۔ جو اقتصادیات اور عمرانیات کے اسکالروں کے لیے نہایت ہی مفید کتاب ہے۔

اس میں خطبۂ افتتاحیہ کے علاوہ تین مقالات ہیں، اور ایک مقدمہ ہے، مقدمہ کے اندر مندرجہ ذیل قابلِ ذکر مباحث ہیں، مبحثِ وجود، جواہر اور اعراض کا امتزاج، انسان کی صورتِ نوعیہ اور اس کے طبعی تقاضے۔

اس کے پہلے مقالہ میں ۲۴ فصول ہیں، ان فصول میں نسمہ کی حقیقت، حکمت کی تعریف، ارتفاقات چارگانہ کے حقائق پر مجمل بحث، ارتفاق اول، ارتفاق ثانی، ارتفاق ثالث، اور ارتفاق رابع کے مباحث بڑے اہم ہیں۔(شاہ صاحب کے نزدیک ارتفاق تدبیر منزل کے معنی میں ہیں)۔اور حضرت شاہ صاحب نے ارتفاق کو ایک اقتصادی فلسفہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔

کھانے کے آداب، زینت وزیبائش، آداب لطافت، مکان ومسکن، سفر، نشست و برخاست اور چلنے پھرنے کے آداب، صنفی تعلقات کے آداب، مرض کے آداب، تدبیر منزل، مرد اور عورت کی جسمانی اور ذہنی قوتوں میں اختلاف اور اس کے فائدے، مدارج معیشت میں اختلاف فطری امر ہے، ازدواج کی ضروریات اور آداب ان فصول میں حقوق وآداب برائے آقا وغلام، فنِ معاملات، اصول کسب، اہم ذرائع معاش، اختلاف مکاسب کے وجوہ، مبادلات وتبرعات، عقد مزارعت، عقد مضاربت۔

امام المسلمین کے فرائض، امام کے اخلاق سبعہ، امامت کے آداب، امیر کی سیرت وکردار، تعلیم وتربیت کی قسمیں، معلم کے اوصاف حمیدہ۔

متولی ونقیب کے آداب وفرائض، امام کے معاون، معاونوں کی ضرورت اور بنیادی شرائط، امام کے سات معاون۔

وزیر اعظم، سپہ سالار اعظم، امیر البحر، قاضی القضاۃ، شیخ الاسلام، حکیم وطبیب، ناظر خانہ، معاونین پر کڑی نظر رکھنا، امام کے فرائض میں ہے وغیرہ اہم مباحث ہیں۔

مقالہ ثانی میں معرفت باری تعالیٰ کا بیان، حیوانوں پر انسانوں کی فوقیت کی دو وجہیں، خداشناسی بذریعہ عقل معاشی، اللہ تعالیٰ کے اسماوصفات کا اجمالی اثبات، اسمائے حسنیٰ کی تشریح، ایمان بالقدر کے ثبوت، شرک کی حقیقت، تحریف کی حقیقت۔

تیسرے مقالہ میں ملتوں اور شریعتوں کا بیان، ملت کی حقیقت اور اس کے ظہور میں آنے کے اسباب، ملت حنیفیہ کی حقیقت، علم تشریع اور اس کے قوانین، تدابیر اصلاح، خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت مطہرہ کے مقاصد اور دینِ اسلام کے اصول وغیرہ مباحث زیر بحث آئے ہیں۔

حضرت شاہ صاحب نے البدور البازغہ میں گاہ بگاہ تصوف اور الٰہیات کے مسائل پر بھی گفتگو کی ہے۔ یہ کتاب بھی دراصل تفہیمات الٰہیہ کے جز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور ان دونوں کتابوں کے مسائل بڑی حد تک مشترک ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان دونوں کتابوں کے بارے میں عمومی طور پر کہا جاتا ہے کہ یہ شاہ صاحب کے وارداتِ قلبی اور مشاہدات روحانی کی عکاس ہیں۔

ان دونوں کتابوں کو مطالعہ کرنے والے اصحابِ علم اس نقطۂ نظر کو واضح طور پر محسوس کریں گے یہی وجہ ہے کہ میں نے ان دونوں کتابوں کو ایک ساتھ ہی شائع کیا ہے۔ اس کتاب کے اردو مترجم ڈاکٹر قاضی مجیب الرحمٰن صاحب ہیں، ڈاکٹر قاضی مجیب الرحمٰن صاحب کے حالات زندگی اور ان کے علمی کارناموں کے بارے میں مجھے زیادہ علم نہیں ہے لیکن ان کی ترجمہ نگاری اور شاہ شناسی سے اندازہوتا ہے کہ یہ عربی اور فارسی زبان کے ماہر اور فکر ولی اللّٰہی سے تعلق رکھنے والے صاحبِ علم بزرگ ہیں۔ جنھوں نے بڑا سلیس اور عمدہ ترجمہ کیا ہے۔ جس کے لیے میں ان کا شکر گزار ہوں۔ جسٹس مولانا عبدالقدوس قاسمی صاحب نے اس پر نظر ثانی کی ہے۔ یہ بھی صاحب نظر دانشور اور عالم معلوم ہوتے ہیں، اللہ ان کی خدماتِ علمی کو قبول فرمائے۔ یہ کتاب ادارہ مطبوعات اردو بازار لاہور سے ۲۰۰۰ء میں شائع ہوئی تھی۔ اور میرے پیش نظر نسخۂ لاہور ہی ہے۔ جسے حضرت مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی صاحب پاکستان سے لائے تھے، میں نے حضرت مولانا کاندھلوی صاحب سے کچھ دنوں کے لیے مستعار لی ہے۔ مولانا نورالحسن کاندھلوی صاحب میرے کرم فرما اور فکرِ ولی اللّٰہی کے ماہر عالم دین ہیں۔ اور ان کے ذاتی کتب خانے میں حضرت شاہ صاحب کی تمام نایاب کتابیں موجود ہیں۔ میں ان کا شکر گزار ہوں کہ آپ ازراہ کرم شاہ

صاحب سے متعلق کتابیں عنایت فرماتے ہیں۔ میں نے اپنے مقدمے کے شروع میں لکھا ہے کہ المجلس العلمی ڈابھیل سے حضرت شاہ صاحب کی تفہیمات الٰہیہ اور الخیر الکثیر شائع ہوئی تھیں۔ اور اسی مجلس علمی نے البدور البازغہ کو بھی مولانا محمد انور شاہ کشمیری اور ان کے رفقا وتلامذہ کی نگرانی میں شائع کی تھی اور شاہ صاحب کے تلامذہ میں مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاردی، مولانا بدرِ عالم میرٹھی، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، مولانا سعید احمد اکبر آبادی، اور مولانا سید احمد رضا بجنوری وغیرہ تھے۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ ان حضرات نے شاہ صاحب کی ان کتابوں کی تحقیق و ترتیب اور اشاعت میں ضرور دلچسپی لی ہوگی۔ میں یہاں ایک وضاحت حسب سابق کرنا ضروری خیال کرتا ہوں کہ **التفہیمات الالٰہیۃ** کی طرح البدور البازغہ میں بھی فاضل ناشر اول نے فہرست سازی اور عنوان سازی کی ہے، اور یہ فہرست مضامین اصل مخطوطہ میں موجود نہیں ہے۔ اس فہرست مضامین کو حضرت شاہ ولی اللہ کی طرف منسوب نہ کیا جائے۔ اور نا شرِ اوّل ہی کی طرف منسوب کیا جائے لیکن چونکہ یہ اضافی عنوانات البدور البازغہ کے مفاہیم ومطالب کی افہام وتفہیم میں بے حد مفید ہیں، اس کے پیش نظر ان اضافی عنوانات کو برقرار رکھا گیا ہے۔ امید ہے کہ قارئین حضرات دورانِ مطالعہ اس فرق کو ملحوظ رکھیں گے۔

بڑی ناسپاسی ہوگی اگر میں اپنے دوست مولانا محمد افتخار حسین مدنی شیخ الحدیث مدرسہ عبد الرب کشمیری گیٹ کا شکریہ ادا نہ کروں جنھوں نے اس کتاب کی تصحیح اور پروف ریڈنگ میں خاص مدد کی ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں شرور وفتن سے محفوظ رکھے۔

عطاالرحمٰن قاسمی

چیرمین

شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی

التفہیمات الالٰہیہ

(جلد دوم)

تصنیف:

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ

ترجمہ

مولانا عقیدت اللہ قاسمی

نظر ثانی:

ڈاکٹر خلیل الرحمٰن راز

تحقیق و تعلیق:

مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی

فہرست (جلد دوم)

۲۳۱-تفہیم	مقطعات کے معانی	۲۹
۲۳۲-تفہیم	تواجد کے بعض احوال کا بیان	۲۹
۲۳۳-تفہیم	نبی کی صفت اور اس کے شریعت لانے کا راز	۳۰
۲۳۴-تفہیم	ختم نبوت اور اس کا راز	۳۱
۲۳۵-تفہیم	انبیاء علیہم السلام کے اللہ تعالیٰ اور پانچ قربتوں سے مقربین کے درمیان....	۳۲
۲۳۶-تفہیم	اللہ سبحانہ سے نسمہ کی معرفت کی غایت کا بیان	۳۳
۲۳۷-تفہیم	مذہب حق	۳۴
۲۳۸-تفہیم	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ملت ابراہیمی میں ہونے کی تحقیق	۳۴
۲۳۹-تفہیم	سلوک کے معنی	۳۵
۲۴۰-تفہیم	رسول اللہؐ کے ارشاد نحن احق بالشک من ابراھیم کی شرح	۳۵
۲۴۱-تفہیم	رسول اللہؐ کی تمام انبیاء پر فضیلت اور اس کی سب سے اہم وجہ-وجہ الوجیہ	۳۶
۲۴۲-تفہیم	اوصیا اور مجددین کے درجات کا تفاوت	۳۸
۲۴۳-تفہیم	فائدہ تکوینیہ جلیلہ	۳۹
۲۴۴-تفہیم	قرب ملکوت میں تمام کمالات عطا کیے گئے	۳۹
۲۴۵-تفہیم	اقتراب میں طریقہ قویمہ کیا ہے؟	۴۱
۲۴۶-تفہیم	عالم عناصر میں کواکب کی تاثیر ہے یا نہیں؟	۴۳

۲۴۷- **تفہیم** دورۂ کمال کے خصائص کا بیان ۴۵

۲۴۸- **تفہیم** دورۂ کمال سے آگے بندہ کیلئے زیادتی قرب کا کوئی درجہ نہیں ہے ۴۶

۲۴۹- **تفہیم** نبوت کے بعد کی بشارتوں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد ۴۶

۲۵۰- **تفہیم** دورات سبع میں اولیاء اور ان کا حصہ ۴۷

۲۵۱- **تفہیم** دورۂ کمال کے جزئیات میں سے قرب اعمال ۴۷

۲۵۲- **تفہیم** بشر کامل کو مقرب ملائکہ پر فضیلت نہیں ہے ۴۸

۲۵۳- **تفہیم** توحید کی حقیقت جس کے ساتھ انبیاء کو مبعوث کیا گیا ۴۹

۲۵۴- **تفہیم** یونس علیہ السلام کی اپنی قوم کو بددعا ۴۹

۲۵۵- **تفہیم** اس مسخ کا راز جو داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں ہوا ۵۰

۲۵۶- **تفہیم** دعا کی قبولیت کا واقعہ ۵۰

۲۵۷- **تفہیم** حق میں بشارت کا خواب ۵۰

۲۵۸- **تفہیم** حرمین شریفین کا سفر اور مصنف کا اس کیلئے اللہ کی طرف سے مامور ہونا اور... ۵۱

۲۵۹- **تفہیم** بعض مریدوں کے دل کے حال سے باخبر ہونا ۵۲

۲۶۰- **تفہیم** قبولیت دعا کا واقعہ ۵۲

۲۶۱- **تفہیم** مریض کا شفا پانا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کی تولیت ۵۲

۲۶۲- **تفہیم** ولی اللہ اور قطب الدین نام رکھنے کی وجہ ۵۳

۲۶۳- **تفہیم** والدہ کا خواب اور اس کی تعبیر ۵۳

۲۶۴- **تفہیم** انبیاء علیہم السلام اس علم کے بارے میں خالص تھے جو ان کی مراد نہیں تھا ۵۴

۲۶۵- **تفہیم** اللہ تعالیٰ وتقدس کی تجلیات کا ذکر ۵۶

۲۶۶- **تفہیم** سالک کے بعض احوال کی مثال ۵۹

۲۶۷- **تفہیم** بعض احوال دل ربائی کی حکایت ۶۱

۲۶۸-تفہیم	دورۃ الایمان کے ارکان کا بیان اور شرح صدر کے دورہ کے احکام	۶۲
۲۶۹-تفہیم	مومن صادق اور جس کو دورۂ ایمان صحیح ہو گیا	۶۳
۲۷۰-تفہیم	شرح صدر کی بعض جزئیات	۶۴
۲۷۱-تفہیم	دورۂ حکمت کی بعض جزئیات	۶۴
۲۷۲-تفہیم	ازل صرف کا ذائقہ دوبار چکھا	۶۴
۲۷۳-تفہیم	ازل خالص کے ذوق سے بیمار کا شفا نہ پانا	۶۵
۲۷۴-تفہیم	کمالوں کے جمع کا کمال	۶۵
۲۷۵-تفہیم	ترمذی میں عدی بن حاتم کی حدیث	۶۵
۲۷۶-تفہیم	سالکوں کا سلب بحت تک پہنچنا	۶۶
۲۷۷-تفہیم	بعثت اور ہجرت کے راز	۶۷
۲۷۸-تفہیم	نفس اور عین کی حقیقت	۶۹
۲۷۹-تفہیم	اس عالم میں عین کے لیے احکام ہیں جن کو بحت نام دیا جاتا ہے	۶۹
۲۸۰-تفہیم	علم حق اور اس کی تفصیل	۷۰
۲۸۱-تفہیم	نسمی، نفسی اور عینی آثار کا بیان	۷۲
۲۸۲-تفہیم	مجردات کا علم اور اس کی کیفیت	۷۳
۲۸۳-تفہیم	قیامت کے قریب اہل نصرانیت کی طرف سے مسلمانوں پر سخت آزمائشیں آئیں گی	۷۴
۲۸۴-تفہیم	سیدنا و مولانا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم کی اقسام کا بیان	۷۵
۲۸۵-تفہیم	ہر آدمی کی تخلیق فطرت کی ایک خاص ہیئت پر کی گئی ہے اور اس کو....	۷۷
۲۸۶-تفہیم	حضرت عمر کا حجر اسود کو استلام اور اسکے بارے میں آپ کا مشہور قول	۷۷
۲۸۷-تفہیم	حضرت ابوبکر و عمر کے امت مرحومہ میں سب سے افضل ہونے کے معنی	۷۸
۲۸۸-تفہیم	صحابہ میں سے بشارت کے لیے دس کو مختص کرنے کی وجہ	۷۹

۲۸۹-تفہیم	مفسرین کے اختلاف کی وجوہ واسباب	۷۹
۲۹۰-تفہیم	حقائق پر مشتمل اشعار بہت ہیں	۸۱
۲۹۱-تفہیم	حقیقت اور مجاز کے درمیان مطابقت کا مسئلہ	۸۶
۲۹۲-تفہیم	سالک کی تشویش کے موجبات، ان کی اقسام اور معالجات	۸۶
۲۹۳-تفہیم	اللہ کی معرفت کے تین راستے ہیں	۹۰
۲۹۴-تفہیم	ولادت سے قبل کا حال، جب آپ شکم مادر میں تھے اور ولادت کے وقت آپ کی منقبت	۹۱
۲۹۵-تفہیم	انسان کے اطوار کا مفصل بیان	۹۱
۲۹۶-تفہیم	موت کے بعد واپسی کے واقعات اور ان کی تاویل	۹۴
۲۹۷-تفہیم	رونا صرف تین قسم کے لوگوں کو زیب دیتا ہے	۹۵
۲۹۸-تفہیم	یادداشت کے معنیٰ	۹۶
۲۹۹-تفہیم	تجلیات جلالی وجمالی	۹۷
۳۰۰-تفہیم	وصایت اور مجددیت کے مراتب کا جامع ہونا	۹۷
۳۰۱-تفہیم	مکہ مکرمہ اور ہردوار کے درمیان فرق	۹۸
۳۰۲-تفہیم	رحمان کی تجلی کا رابطہ اور اس سے بندہ کو جو کچھ حاصل ہوتا ہے	۱۰۱
۳۰۳-تفہیم	وحدت قصوی اور اس کی وجہ سے مدح کا ہونا	۱۰۲
۳۰۴-تفہیم	ذات وصفات میں فنا اور نفس کا اللہ واحد کی طاعت کو تسلیم کرنا	۱۰۳
۳۰۵-تفہیم	مولف قدس سرہٗ کی خاص حالت کا ذکر	۱۰۶
۳۰۶-تفہیم	وجوہ حق وباطل کا باہم اشتباہ	۱۰۷
۳۰۷-تفہیم	سالکوں کی استعداد کا بیان	۱۰۸
۳۰۸-تفہیم	سالک کے لیے ظاہری وظائف وغیرہ سے کیا واجب ہوتا ہے	۱۰۹
۳۰۹-تفہیم	افراد انسانی کے باہمی فرق کا بیان	۱۱۰
۳۱۰-تفہیم	گنہگار مومنوں کے احوال	۱۲۰

۳۱۱-تفهیم	وحدۃ الوجود اور فلاسفہ، اشراقیین، مشائین اور صوفیاء کے مذاہب کی تنقیح	۱۲۴
۳۱۲-تفهیم	ہمیشہ حقائق امور پر نظر رکھنا ضروری ہے	۱۲۵
۳۱۳-تفهیم	مسئلہ ترتیب الاسماء اور مسئلہ تنزلات کے درمیان مطابقت	۱۲۵
۳۱۴-تفهیم	قیام لیل اور ذکر میں اشتغال	۱۲۶
۳۱۵-تفهیم	یادداشت کی نسبت اور اس میں فنا ہونا	۱۲۶
۳۱۶-تفهیم	صبر اور شکر کی حقیقت	۱۲۷
۳۱۷-تفهیم	توحید میں استغراق	۱۲۹
۳۱۸-تفهیم	اولیاء کے سلوک کے لیے سات مقامات	۱۳۰
۳۱۹-تفهیم	وحدت قصوی اور اس کے حامل کے احوال	۱۳۲
۳۲۰-تفهیم	انبیاء اور اولیاء سب کو رشد و ہدایت کا حکم دیا گیا ہے لیکن انکے مامور ہونے میں فرق ہے	۱۳۳
۳۲۱-تفهیم	شیطان کا رسول اللہؐ کی صورت اختیار نہ کرنا اور خوابوں کی حقیقت	۱۳۵
۳۲۲-تفهیم	رسول اللہؐ کا ارشاد 'اتبعوا غرائب القرآن' اور اس کے معنی	۱۳۵
۳۲۳-تفهیم	اللہ تعالیٰ کا ارشاد 'وما أرسلنا من قبلک من رسول ولا نبي	۱۳۶
۳۲۴-تفهیم	قرب کے معنی	۱۳۸
۳۲۵-تفهیم	مسئلہ وحدت الوجود اور وحدت شہود کی تحقیق اور ان دونوں کے درمیان تطبیق	۱۳۹
۳۲۶-تفهیم	ایک آدمی کو بیعت وارشاد اور درس وغیرہ کی اجازت	۱۶۲
۳۲۷-تفهیم	انبیاء واولیاء کے انوار کے ظہور کی صورت	۱۶۶
۳۲۸-تفهیم	وصایا اپنی اولاد و احباب کے لیے	۱۶۶
۳۲۹-تفهیم	نبی کریم کے مبشرات	۱۷۵
۳۳۰-تفهیم	خطبات کے ذریعہ تفہیم	۱۷۹

۲۳۱- تفہیم:

مقطعات کے معانی

کیا ہم تمہیں مقطعات کے معانی نہ سکھائیں۔ جاننا چاہیے کہ حوامیم (حٰمٓ) لوامیم (الٓمٓ) طواسیم (طٰس و طٰسٓمٓ) اور لوامیر (الٓمٓرٰ) کے درمیان مذکور فرق امور اعتبار یہ کے مشابہ ہے۔ لیکن اس کا ایسا اثر ہے جو خارج میں اپنی حق داری کے مدعی ہوتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ حوامیم وہ کلام ہے جو اجمال پر مبنی ہے۔ اور لوامیم بھی ان کے مشابہ ہیں۔ البتہ یہ وہ کلام ہیں جو تفصیل پر مبنی ہیں۔ اور لوامیر شرور کی منزلوں میں اسماء متجددہ کے علوم ہیں۔ اور طواسیم ان سے مشابہت رکھتے ہیں۔ سوائے اس کے کہ یہ عین کی استعداد کے مطابق ہیں۔ غیر کے نہیں۔ اور میں نے الٓمٓرٰ کو لوامیم میں دیکھا اور ساتوں طوال مفصل ان لوامیم سے نہیں ہیں، نہ عتاق اول (پہلی آزاد) ہیں نہ مفصل اور احزاب ونور ہیں۔

۲۳۲- تفہیم:

تواجد کے بعض احوال کا بیان

صبا من حمی لیلیٰ یظل طفوح
فمن جذب ذاک الروح روحی تروح

''لیلیٰ کی چہار دیواری سے میری محبت جوش مارتی ہے، اس روح کے جذب سے میری روح رخصت ہورہی ہے۔''

ولا حت بوجھی من معالم دمعتی
لنص احادیث الغرام شروح

''میرا چہرہ میرے آنسوؤں کے نشانوں سے چمک اٹھا، شوق کی احادیث کی نص کے لیے شرحیں ہیں۔''

فدمع المشوق الصب ھاتک سترہ
متی ستر الاشواق فھو یبوح

''شوق کے آنسو بہانا ان کا پردہ کھولنا ہے، شوق پر پردہ ڈالا تو وہ ظاہر ہوگیا۔''

وإن كنتم العذال وجدا فوجهه
عليه علامات السقام تلوح

"اور اگر تم وجد وجنون پر ملامت کرنے والے ہو، تو اس کے چہرہ پر بیماری کی علامتیں چمکتی ہیں۔"

عليه يعاليل السحاب حزينة
عليه مثاكيل الرعود تنوح

"اس کے اوپر تہ بہ تہ بادل غمزدہ ہیں، اس کے اوپر بچوں کو گم کرنے والی گرج نوحہ کرتی ہیں۔"

كان الليالي السود فيه محدة
بها من تها ليک المشوق جروح

"اس میں سیاہ راتیں تیز ہیں، ان میں شوق کی ہلاکتوں سے زخم ہیں۔"

وشق تباشير الصباح جيوبها
عليها اصيلاً للدماء سنوح

"صبح کے نور نے اس کا سینہ چاک کر دیا، اس پر خون کے لیے شام کے وقت علامات وحادثات ہیں۔"

۲۳۳-تفہیم:

نبی کی صفت اور اس کے شریعت لانے کا راز

نبی وہ شخص ہوتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ مخلوق کے لیے شریعت کے احکام پہنچانے والا بنا کر اور ان پر اس کی نبوت کے اقرار اور اس کی طاعت کو لازم قرار دے کر مبعوث کرتا ہے۔ اور اس کا راز یہ ہے کہ جب ان کے لیے نوافل، فرائض اور ملکوت کے قرب مکمل ہو جاتے ہیں، اور ان کے لیے قربتیں ایک ہو جاتی ہیں، اور کمال کا دورہ حاصل ہو جاتا ہے، اور ان کا نسب اور ان کے ملکات فنا ہو جاتے ہیں تو قرب ملکوت میں ان کے نسمہ کے کمال کی ان کے

لیے تجلی ہوتی ہے تب ان پر شریعت نازل ہوتی ہے۔اور اس کا تحمل نسمہ میں ہوتا ہے، اور حکمت میں بھی بخشش کی جاتی ہے، پھر قرب فرائض میں اور پھر قرب ملکوت میں ہوتی ہے۔ اور یہ دوراے ہیں جن میں تقلید نہیں ہوتی۔ پھر ہم نے ان کی تعبیر کی، پھر جب ہم دورۂ کمال میں پہنچ گئے تو اس نے اپنا لباس صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ سے پہنا۔اور ہم نے نقص کی چہار دیواری دیکھی اور اس میں داخل ہونے کا ارادہ کیا لیکن ہم داخل نہیں ہو سکے۔اور اس کے دروازے پر ملک عرب کے کچھ لوگ تھے جو داخل ہونے سے منع کر رہے تھے۔اس لیے ہم اس میں داخل نہیں ہوئے۔حتیٰ کہ سید عربی نے اجازت دی اور ہمیں داخل کرنے اور ہمارے ساتھ عزت واکرام سے پیش آنے کا حکم دیا۔اور اس مسئلہ میں لوگوں کے کئی مذہب ہیں۔مگر ان میں سے صرف وہی حق ہے جو ہم نے تمہیں سکھایا ہے۔اس کو پہچان لو۔

کسی کو یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ میری اطاعت کرو، جب تک کہ اس کی طاعت حق کی طاعت میں فنا نہ ہو جائے، اور جب تک کہ اس کا ارشاد عام نہ ہو جائے، اور یہ قرب ملکوت سے ہے۔اور جب تک اس کے علوم، علوم نسمیہ میں نہ اتر جائیں۔اور یہ نسمہ کی تجلی سے ہے۔اور اس لیے تم ان علوم کو دیکھو گے جن کو رسولوں نے پوری طرح لوگوں کو نسمیہ لازم کیا۔اور قربتوں میں کوئی ایسا پوشیدہ مقام نہیں ہے جس تک پہنچنا کسی کے لیے جائز نہ ہو، سوائے اس مقام کے جس کی شان اعلیٰ اور برہان اعظم ہے۔چنانچہ اب یہ متحقق ہو گیا کہ مذاہب مشہورہ کے بارے میں جو یہ کہا جاتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کے لیے مختص ہیں کہ فرشتوں کو ان کی طرف بھیجا گیا یا شریعت سازی اس کے لیے اصل ہے۔اس کا حق ایسا نہیں (جیسا کہ مشہور ہے)

۲۳۴-تفہیم:

ختم نبوت اور اس کا راز

اللہ تعالیٰ کی سنت اس کی مخلوق کے سلسلہ میں یہ ہے کہ جب کسی نے درجہ کو مکمل کر لیا اور اس کی انتہا کو پہنچ گیا تو کسی کے لیے ممکن نہیں ہے کہ اس تک اس راستہ سے پہنچے۔اور اس کی انتہا پر قائم ہو جائے۔اور وہ عجیب الشان کے راز کے لیے ہے۔اور وہ یہ ہے کہ افاضۂ ایجادیہ بدئیہ جس طرح مفاض کی تشخیص کا تقاضہ کرتا ہے کہ اس میں اس کے غیر کا شریک ہونا ممکن نہیں ہوتا،

اسی طرح افاضۂ تکمیلیہ عودیہ، کمال کی تشخیص اور اس پر مفاض کے تشخص کا اس کمال کے لحاظ سے تقاضہ کرتی ہے۔ اس راستہ سے جان لو کہ وہ فیض جو اللہ اپنے کسی بندہ کو عطا فرماتا ہے، وہ کبھی بھی آدم سے اس آخری آدمی تک جو قیامت کے قریب پایا جائے گا، پیدا نہیں ہوا۔ ہم نے یہ بات اس وقت واضح طور پر بتادی تھی جب قرب ملکوت میں ان تمام کمالات کو جمع کیا تھا، اور نشاۃ عودیہ اعتبار سے مقدم ہے۔ چنانچہ انبیاء ایک کے بعد ایک کمال کو ختم کرتے رہے اور جو ان کے بعد ہے وہ صرف اس کے ایک شعبہ میں قائم ہوتا ہے۔ خواہ اس کے تابع ہو یا دوسرے کمال میں۔ حتیٰ کہ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم پائے گئے تو آخری درجہ قائم ہو گیا۔ اور وہاں سے وہ نشاتیں پیدا ہوئیں۔ جن کو تفصیل سے بیان کرنا مشکل ہے۔ اور اس دورہ کو ختم کرنے والے ہو گئے۔ اس لیے آپ صلوات اللہ علیہ وسلامہ کے بعد کسی نبی کا پایا جانا ممکن نہیں ہے۔

۲۳۵- تفہیم:

انبیاء علیہم السلام کے اللہ تعالیٰ اور پانچ قربتوں سے مقربین کے درمیان واسطہ ہونے کے معنی

اللہ سبحانہ اور ان پانچ قربتوں میں سے کسی ایک سے مقربین کے درمیان انبیاء کے واسطہ ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ ان پر کمال کا فیضان کرنے والے ہوتے ہیں، بلکہ یہ ہے کہ ان کی قربت اور توجہ کی سمت وہ ہے جس سے اس نبی کے کمال کی اصناف سے عود کے وقت تشخص ہے۔ اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ توسط کے دو معنیٰ ہیں۔ ایک مجازی سے مشابہ ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ متقرب جب اس قرب کے لحاظ سے اللہ سبحانہ کی طرف متوجہ ہوا تو یہ حرکت اور یہ توجہ اس دورہ سے اس نقطہ پر واقع ہو گئی جو مطلقاً سب سے بعید ہے اور اس سے ایک نبی کی حقیقت عود کے اعتبار سے متعین ہوئی۔ اور توسط کی یہ نوع نہ تحقق سے متصادم ہوتی ہے اور نہ ہی نبوت سے۔ اور اس قسم سے انبیاء ایک نبی کے تابع ہوتے تھے۔ جیسے بنی اسرائیل کے انبیاء موسیٰ علیہ وعلیہم السلام کے تابع تھے۔

اور دوسرا معنیٰ حقیقی کے مشابہ ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ متقرب کمال سے اپنا حصہ صرف نبی اور اس تجلی کے باطن سے لیتا ہے جو اس کے سینہ سے ظاہر ہوئی۔ اور یہ صحابہ کے

ساتھ مختص ہے۔اس لیے کہ اس کمال کو اس کے علاوہ کوئی نہیں جانتا جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھایا اور یہ اصحاب دورۃ الایمان اور شرح صدر کے ساتھ خاص ہے۔اور ان دونوں کے بعد صرف تحقیق ہے۔اور رسول اس کام کے لیے مبعوث نہیں کیے گئے کہ وہ اللہ اور اس کی مخلوق کے درمیان قرب نوافل میں اور اس کے بعد واسطہ ہوں۔ بلکہ وہ اپنے کمال کے قبیل سے اس لیے مبعوث کیے گئے کہ لوگوں کو طبیعت کی تاریکیوں سے نور ایمان اور شرح صدر کی طرف نکالیں، جس سے وہ جنت میں داخل ہو جائیں۔

۲۳۶-تفہیم:

اللہ سبحانہ سے نسمہ کی معرفت کی غایت کا بیان

اللہ سبحانہ سے نسمہ کی معرفت کی غایت تسبیح یعنی اس کی طرف توجہ ہے، ادراک اور وجدان سے نہیں بلکہ اس بنیاد پر کہ وہ اس سے اعلیٰ و بالاتر ہے کہ کوئی اس کا احاطہ کرے۔اور یہ علم تنزیہی غیر آلی ہے۔صرف اس امر کی مستحق ہے کہ اس کو تسبیح کا عنوان دیا جائے اور یہ درجہ انسان وغیرہ بہائم، پرندوں اور درندوں کو عام ہے۔اور اللہ تعالیٰ کے قول سبح للہ ما فی السموات والأرض "جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہیں، سب اللہ کی تسبیح کرتے ہیں۔" میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔اور انسان ان کے درمیان بلا شبہ صفات کے اثبات سے خاص ہے۔یعنی وہ سننے والا ہے، لیکن ہماری طرح نہیں، دیکھنے والا ہے لیکن ہماری طرح نہیں، جاننے والا، لیکن ہمارے علم کی طرح نہیں۔اور اللہ تعالیٰ کے قول "فسبح بحمد ربک" میں اسی طرف اشارہ ہے۔حاصل یہ کہ مغفرت تامہ اس طرح مل جاتی ہے کہ دورۂ ایمان میں ذکر سبحان اللہ وبحمدہ اور استغفر اللہ واتوب إلیہ ہے۔اور یہ دونوں لفظ انسانی شر کے دفاع کی طرف اشارے ہیں۔اور اعوذ باللہ بھی اسی کی طرف اشارہ ہے اور اسی وجہ سے تم دیکھتے ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی طرف راغب ہوتے ہیں اور آپ علیہ السلام سے منقول صبح وشام کی دعائیں، اس دورہ میں کافی ہوتی ہیں۔اور اس طرح فرض اور مسنون صلوات وصدقات اور روزے اور حج تصفیہ کی قوس (کمان یا نصف دائرہ) پورا کرتے ہیں۔اور تزکیہ کے قوس میں اخلاق سیئہ، کبائر، بدعات، سیئات اور زبان وقلب کی

آفات شامل ہیں۔ جیسا کہ حدیث کی کتابوں میں ذکر کیا گیا ہے۔

۲۳۷- **تفہیم:**

مذہب حق

ہمارے نزدیک مذہب حق یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دو دوروں، دورۂ ایمان اور دورۂ شرح کے اعتبار سے زیادہ فصیح ہیں۔ اور ان دونوں کے علاوہ سے کنایہ کیا ہے۔ جہاں تک ان دونوں کا تعلق ہے تو مجتہدین کے اجتہاد، عبادت کرنے والوں کی عبادت اور اہل تصوف کے تصور کی کسی آمیزش کے بغیر ان دونوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا واجب ہے، بلکہ آپ علیہ السلام سے جو کچھ نقل ہوا ہے، خالص اس میں اقتداء کریں۔ اور ان دونوں میں کسی قسم کا دخل کرنا تحریف ہے۔ جہاں تک دوسرے دوائر کا تعلق ہے تو ان کے بارے میں فصاحت ناممکن ہے کہ ان کے بارے میں اظہار گونگا پن اور بیان ابہام ہے۔ اس لیے آپ علیہ السلام نے ان سے سکوت اختیار فرمایا۔ اور اس کو سالک کی حالت کے حوالہ کر دیا۔

۲۳۸- **تفہیم:**

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ملت ابراہیمی میں ہونے کی تحقیق

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ملت ابراہیمی میں ہیں۔ اور اس کی تحقیق یہ ہے کہ اس کے دو معنی ہیں۔ ایک یہ کہ شرع میں ان کی ملت پر ہیں۔ اور آیت میں یہی مراد ہے اور اس وجہ سے ہم نے الخیر الکثیر میں کہا ہے کہ انبیاء کی عادات کا شریعت سازی میں دخل ہے۔ اور یہ کہ تشریع میں توارث کا دخل ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وراثت آپ کے جدامجد ابراہیم کی شریعت ہے۔ اور دوسرے یہ کہ قربتوں میں ان کی ملت پر ہیں۔ اور ہم نے خیر کثیر میں خزلنۃ الانبیاء میں جو کہا ہے، اس سے یہی مراد ہے۔ اور وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقت ابراہیم علیہ السلام کی حقیقت کی شرح ہے۔ چنانچہ آپ کے کمالات ان کی تفصیل ہیں۔

۲۳۹- تفہیم:

سلوک کے معنی

اہل اللہ کے طائفہ کے نزدیک یہ امر ہے کہ سلوک اس علم میں چلنے سے عبارت ہے جو کیف کا مقولہ ہے، جبکہ معاملہ ایسا نہیں ہے، بلکہ ہم نے الخیر الکثیر میں جو تمہید بتائی ہے، اس سے تمہیں معلوم ہوگا کہ علم قرب حقیقت کے لیے لازم ہے۔

۲۴۰- تفہیم:

رسول اللہؐ کے ارشاد نحن احق بالشک من ابراھیم کی شرح

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حضرت ابراہیم کے مقابلے میں شک کے ہم زیادہ حقدار ہیں جو کہ انہوں نے کہا تھا رب ارنی کیف تحی الموتی "اے میرے رب! مجھے دکھا کہ تو کس طرح زندہ کرے گا۔" اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اولم تؤمن "کیا تم ایمان نہیں رکھتے؟" انہوں نے عرض کیا: بلی ولکن لیطمئن قلبی "ایمان تو رکھتا ہوں مگر دل کا اطمینان درکار ہے۔" اور آپ نے فرمایا: اللہ لوط پر رحم فرمائے وہ کسی مضبوط سہارے کی پناہ چاہتے تھے۔ اور اگر میں کسی قید خانہ میں اتنی طویل مدت رہتا جیسا کہ حضرت یوسف رہے تھے، تو بادشاہ کے قاصد کے بلاوے پر چلا آتا۔ (بخاری) یہ علم یقین کے درجات میں سے ہے، پھر اطمینان ہے۔ چنانچہ جس طرح یقین کے مقابلہ میں شک کا نام دیا جاتا ہے، اسی طرح اطمینان کے مقابلہ میں بھی شک بولا جاتا ہے۔ اور اس شک نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل میں بھی خلجان پیدا کیا کہ وہ صاحب اقربیہ واجمال تھے۔ اس طرح کہ ان کو علم وحکمت خالص نہیں ہوتے تھے۔ اور تم ان کے حق میں قرب نوافل، قرب وجود اور قرب فرائض نہیں پاؤ گے۔ اور یہ شک ان نقاط کے بعد پیدا ہوتا ہے جن میں احاطہ کرنے والا فنا ہو جاتا ہے۔ اور وہ امثال اور عین کے جمع کرنے سے پوری طرح مطمئن ہوئے تو جو ان کے بعد ہیں ان کا کیا حال ہوگا۔ اور اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فان کنت فی شک "اگر تمہیں کوئی شک ہے۔" ولکن فی صدرک حرج "اور

تمہارے دل میں کوئی جھجک نہ ہونی چاہیے۔" اور اس میں ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے تعجب کا اظہار اور ان کے نفس کی تسکین ہے۔ اور لوط علیہ السلام کی تمنا میں شدید خواہش ہے کہ ان کے پاس کوئی قوت ہوتی یا وہ کسی مضبوط سہارے کی پناہ لے لیتے۔ اور اس میں اللہ کی طرف سے ذمہ داری دینے میں ڈھیل پر ان کے دل کی تنگی ہے۔ تو آپ علیہ السلام نے اس لفظ سے ان کے اس فعل پر تعریض کی اور فرمایا اللہ لوط پر رحم فرمائے وہ یا وی یعنی ایوا کی تمنا کرر ہے تھے۔ چنانچہ انہوں نے تمنی کی جگہ لیت کا صیغہ استعال کیا۔ اور اس طرح کی باتیں محاوروں میں بکثرت ہوتی ہیں۔ جیسے "وخرقوا له بنين وبنات" اور "جعلوا له اندادا" چنانچہ علمهم اياه على وجه ان کے آپ کو ایک طرح سے جاننے کی جگہ جعل خارجی کا صیغہ استعال کیا۔ اور اس تاخیر کی طرف اشارہ کیا۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: حتى اذا استيئس الوسل یہاں تک کہ جب رسول مایوس ہو گئے حالانکہ انبیاء اور ان کے طریقہ پر چلنے والے صرف اس وقت مایوس ہوا کرتے ہیں جب تولی سبب کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ ان کی ہمت اور کسب کی انتہا تولی کا انتظار اور نگرانی ہے۔ اور جب لوط نے دیکھا کہ تولی میں تاخیر ہو رہی ہے تو تمنا کی کہ کوئی ایسا سبب بن جائے۔ اور وہ بغیر تولی کے ایمان لے آئیں۔ جبکہ ان کا حال ایسا نہیں تھا۔ اور قید خانہ میں طویل مدت تک رہنے سے دل کو اضطراب ہوتا ہے اور اس پر صبر نہیں ہوتا۔ لیکن جب یوسف علیہ السلام نے دیکھا کہ تولی ان کے لیے برأت کی صورت میں ظاہر ہو رہی ہے تو انہوں نے خود کو مزید حبس میں روک لیا اور صبر سے کام لیا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اس فعل پر ان کی مدح وستائش کی۔ اور ان کے مقابلہ میں تواضع سے کام لیا کہ فرمایا اگر ان کی جگہ میں ہوتا تو اس کی طاقت نہ رکھ پاتا۔

۲۴۱۔ **تفہیم:**

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام انبیاء پر فضیلت اور اس کی سب سے اہم وجہ۔ وجہ الوجیہ

بہت سے اللہ والوں کے نزدیک یہ واقعہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حقیقت

میں تمام انبیاء پر فضیلت حاصل ہے۔ یہ مسئلہ اپنی اصل کی طرف لوٹ گیا۔ یعنی تجلی اول کی طرف فطری طور پر لوٹ گیا۔ اور عین صرف اسم کی مثالوں کی ایک قسم ہے۔ اس کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں ہے، حتیٰ کہ ان کے نزدیک یہ ثابت ہوا کہ اس عین کے لیے اس کی حقیقت میں اتحاد ہے۔ چنانچہ جس نے تجلی اول سے اپنا حصہ لیا تو لامحالہ اس نے اس عین سے لیا اور ہم نے حکمت سے اس کا کچھ ذائقہ چکھ لیا۔

اور جب ہم قرب ملکوت میں پہنچ گئے اور کمالات پوری طرح حاصل ہو گئے تو ہم نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے بھائی، رسولوں کے ساتھ مخلوق کو دعوت دینے اور رسالت کی تبلیغ سے متعلق کمالات سے شریعت سازی وغیرہ کے مقام پر پہنچ گئے ہیں۔ اور تمام کمالات خالص جو بندہ سے اخذ کرتے ہیں، اللہ سبحانہ کی ذات کی طرف منتہی ہوتے ہیں، تو امر متحقق ہو گیا اور ظاہر ہو گیا کہ انجاس یا فیضان کے اجرا کی دو قسمیں ہیں۔

ایک انجاس مقدس اسمائی، وہ بغیر مادہ کے ہوتا ہے۔ یہاں ایک صورت ہوتی ہے جس کا فیضان فقط اس کی شرح کرنے والے اسم سے ہوتا ہے تو جس کی حقیقت دوسرے کی حقیقت سے اعلیٰ واتم ہوتی ہے، اس کے ذریعہ اس پر فضیلت حاصل ہوتی ہے۔

دوسرے انجاس اعیان، اس حقیقت سے کہ اسماء منتہی ہو جائیں تو یہ مادہ میں صورت کے نقش ہونے کے مانند ہے اور جس کے سلسلہ میں ہم مادہ کو بطور کفایہ استعمال کرتے ہیں، وہ اس اسم کی وسعت رکھتا ہے، جس کا ارادہ کیا جاتا ہے اور جس کا کفایہ ہم صورت خصوصی سے کرتے ہیں۔ وہ الحی القیوم وغیرہ اسماء کی مانند ہے اور جب اسم مادہ میں نقش ہو جاتا ہے تو جو امر مادہ کے مناسب ہوتا ہے، اس کی طرف لوٹ جاتا ہے۔ اور اس کی صفا پر باقی نہیں رہتا۔ چنانچہ یہ مادہ کے لیے مناسب صورت سے مخلوط ہوتا ہے جو کہ عین ہے۔ چنانچہ اس کے لیے اس کی طرف کوئی راستہ نہیں ہوتا۔ اور نہ اس کی عین کی حکایت ہوتی ہے اور سبیل راستہ کے سوا کوئی تشبیہ بھی نہیں ہوتی۔ اور تشبیہ وحکایت دونوں تکون (ہو جانا) ہیں اور اس لیے ان کو اعیان کہا جاتا ہے۔ اور ان کا مرتبہ اسماء کے مرتبہ سے کم ہوتا ہے۔ چنانچہ عین کے کمالات اور ان کے فروع کے اصول جن سے ان کی صورت اور ان کا مادہ متعلق ہوتے

ہیں، وہ سب اس اسم سے فیضان حاصل کرتے ہیں جس کا ارادہ کیا جاتا ہے۔ البتہ قرب نوافل میں واسطوں کا اسقاط اور اللہ سبحانہ کی ذات میں ان کا فنا اور ان کے حقائق کی طرف جو ہر نفس کے انکسار کی طرف سب کا لوٹنا ثابت ہوتا ہے، اس وقت یہ گمان پیدا ہوتا ہے۔ لیکن معرفت سابقہ کلیہ تامہ وہ ہے جو ہم نے بیان کی ہے۔

اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آپ کے اخوان اور اقران میں تفصیل کے سلسلہ میں حق یہ ہے کہ اس سبیل تکوینی کے حقوق ضائع نہیں کیے جاتے۔ اور کہا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تشبیہ تکوینی کے مطابق نصیب تام اور حظ وافر لیا۔ چنانچہ آپ کو قرآن دیا گیا، اور آپ کی دعوت ثقلین کے لیے عام ہوئی، اور اس پر نبیوں نے مہر لگائی، اور آپ نے اپنی امت کی شفاعت کی۔ اور آدم اور ان کے بعد والے آپ کے جھنڈے تلے آئے۔ اور بالجملہ کمالات عودیہ سابقہ تامہ نے آپ کو ان کے درجہ کے اوپر فضیلت کا درجہ دیا۔ اور یہ معرفت انبیاء اور رسولوں کے درمیان متداول ہے۔ اس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو فضیلت دیتے ہیں۔ یہ ہم نے ان سے اخذ کیا ہے۔

۲۴۲-تفہیم:

اوصیا اور مجددین کے درجات کا تفاوت

تمہارے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ اوصیا اور مجددین درجات قرب کے کسی ایک درجہ پر نہیں ہیں، بلکہ ان میں سے کچھ وہ ہیں کہ ان کا چہرہ دورۂ ایمان یا شرح صدر کے مقابل ہوتا ہے۔ اور اس کا قلب وصایہ یا مجددیہ کی طرف پھرتا ہے۔ اور کچھ وہ ہیں کہ ان کا چہرہ اور قلب دونوں وصایہ مجددیہ کی طرف ہوتے ہیں۔ اور اکثر صحابہ کاملین اسی طریقہ پر تھے۔ یعنی ان کے چہرے وایمان کے مقابل، اور ان کے قلوب کمال کی نوع آخر کی طرف ہوتے تھے۔ اور جن لوگوں کو تم اس درجہ پر دیکھتے ہو، اہل علم وفضیلت میں سے وہ عنقریب تقریباً پچاس افراد ہو جائیں گے۔ اور ان میں اکثر مہاجرین اولین ہیں۔ اور جو ان سے احسان کے ساتھ بعد میں ملے ہیں، ان کا ٹھکانہ اور ماوی ایمان کے دو دورے اور شرح صدر ہوتا ہے، لیکن وہ صحت اور استقامت کی وضع پر ہوتے ہیں، اور تحقیق کے ساتھ تشبیہ ان کے غیر میں کبھی بھی متحقق نہیں

ہوتی اور وہ اس سیدھی (مستقیم) وضع میں سب سے زیادہ حق ہوتا ہے۔

۲۴۳- تفہیم:

فائدہ تکوینیہ جلیلہ

کیا تیری معرفت کے کان کے سوراخ میں یہ بات نہیں گونجی کہ حیوان کے مزاج کے حرارت، برودت، رطوبت اور یبوست میں مختلف طبقات ہیں۔ ان میں سب سے بارد نوع کے لیے مزاج سے محدود وزن ہے۔ اس پر اس کے تمام افراد وارد ہوتے ہیں۔ اس کے لیے ابتدا ہے، اور اس کے لیے انتہا ہے۔ ان دونوں سے اس کی نوع متعین ہوتی ہے، اور ان دونوں پر اس کی ہیئت، صورت، افعال و اخلاق متفرع ہوتے ہیں۔ تو جب گرم اسباب اس کی گرمی پر منعقد ہوتے ہیں تو وہ اس وزن سے نہیں نکلتے۔ بلکہ ممکن ہے کہ اس انتہا کو پہنچ جائیں جو حرارت کے قریب ہے۔ اور اس طرح گرم مزاج کو ٹھنڈے اسباب کا انعقاد اس کی تبرید تک نہیں پہنچتا۔ بلکہ اس غایت تک پہنچتا ہے جو برودت کے قریب ہے۔

اور اس معرفت پر احوال عین کو قیاس کرو کہ وہ اگرچہ مستقلۃ الحقیقت اور صافیۃ الہیئت ہوتے ہیں۔ وہ مطلق عین کی طبیعتوں اور اسم مرید کے استفاضہ سے نہیں نکلتے۔

اور اس پر مجددین اور اوصیا کے احوال کو قیاس کرو کہ صحابہ کا زمانہ چونکہ دورۂ ایمان کا زمانہ تھا۔ ان میں سے اوصیا اور مجددین اس دورہ سے نہیں نکلے۔ یہی معاملہ زمانہ شرح صدر، زمانہ قرب نوافل اور زمانہ حکمت کا ہے۔ یہاں تک کہ وہ ہمارے اس زمانہ تک منتہی ہو گئے جس میں باقی تمام کمالات جمع ہو گئے۔ اور منع کر دیا کہ اس سے وسیع و کشادہ پایا جائے۔

رم آہو بمیاں برزدہ دامانی را

"ہرنوں کے گلہ نے دامن کو درمیان سے پھاڑ دیا ہے۔"

۲۴۴- تفہیم:

قرب ملکوت میں تمام کمالات عطا کیے گئے

میں اللہ عزوجل کی حمد کس زبان سے کروں، اور کس لفظ سے اس کی ثنا بیان کروں کہ

اس نے قرب ملکوت میں تمام کمالات مجھے عطا کیے ہیں۔

ولو ان لی فی کل منبت شعرة

لسانا لما استوفیت واجب حمده

''اگر میرے ہر بال کی جڑ میں ایک زبان ہوتی، تو بھی میں اس کی حمد کے تعلق سے جو واجب ہے اس کو پورا نہیں کر پاتا۔''

اور یہ کمال صرف علم کے لحاظ سے نہیں ہے بلکہ تحقیق اور تلون رنگ میں رنگے جانے کے لحاظ سے بھی ہے۔ اور اس نے مجھے جو پہلی شئے عطا کی، وہ آسمان اور زمین کا علم قضا اور علم تدابیر ہے۔ چنانچہ مجھے ملائکہ میں سے مقربین کے رنگ میں رنگ دیا، اور میں نے خود کو ملک کے اندر قوت تصرف میں پایا اور ان میں سے بعض امور بالفعل واقع ہوئے۔ جب ہمارے اس سفر میں حیلے وتدابیر تنگ ہو گئے۔ جس کو فتح الباب کہا جاتا ہے۔

پھر منبع شریعت کے صادق آنے، اور ملائکہ سے حاملین شرع کے صادر ہونے، اور اسباب خارجیہ مترتبہ سے کمال کے اختلاط کی جانب سے سمت کی دعا میں علم شرع حاصل ہوا۔ جیسا کہ ہم نے دورۂ حکمت میں شرع کا ذائقہ چکھا۔ پھر ہم نے اس کو قرب فرائض میں سمجھا، پھر مجھے تمام انبیاء کے مقامات حاصل ہوئے۔ چنانچہ ایک دوسرے سے افضل کمالات کو ہم نے منفرد شکل میں اور غیروں سے ممتاز صورت میں جانا۔ اور ان کے علاوہ بھی ہمیں حاصل ہوئے۔ اگر چہ ہم ان کے بیان پر قادر نہیں ہیں، اور اس وقت ہم ان کی تشریعات پر آئے، اور ان کے رنگ میں رنگ گئے۔

پھر مجھے صحابہ، اولیاء اور علماء کے مقامات حاصل ہوئے۔ چنانچہ ہم مقام وصایہ، ارشاد اور مجددیہ وغیرہ پر قائم ہو گئے جن کو بیان کرنا مشکل ہے۔ پھر ہمیں دوسرے طریق دیئے گئے، جن کی مثالیں احوال ومقامات میں رسول ہیں۔ پھر ہم نے تنگ باغیچہ دیکھا کہ اس کے دروازہ پر عرب کے لوگ تھے جو ہمیں اس میں داخل ہونے سے روک رہے تھے، حتیٰ کی سید عربی نے ہمیں داخل کرنے اور ہماری عزت واکرام کرنے کا حکم دیا، تو ہم اس میں داخل ہوئے اور غیر ملک سے خالی ہوئے۔ اور جان لو کہ ہم نے مقامات کی تعبیر جماعت میں مستغرق ہونے کے

بعد ہی کی ہے۔اور ہفتہ میں یا اس سے زیادہ میں ایک بار اس میں مضمحل ہوئے۔ پھر افاقہ ہوا۔ اور ہم نے کسی مقام کی تعبیر تحقیق کے ساتھ اسماء ملائکہ اور اسماء قدیمہ کے ایک دوسرے پر صادق آنے کے بعد ہی کی۔ انسان کی نشاۃ اس سے زیادہ طاقت نہیں رکھتی۔

اور ہم نے انبیاء سے مقربین کے اسماء کے ایک دوسرے پر صادق آنے کے سلسلہ میں اور صحابہ و اولیاء کے حقائق کے عکس کے سلسلہ میں جو تعبیر کی ہے، وہ اس تقلید کے مشابہ ہے جو ان امور کے علاوہ ہے جن میں صرف تصادق واقع ہوا۔ چنانچہ وہ تحقیق تقلیدی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "فبھداھم اقتدہ" ان کی ہدایت کی پیروی کرو۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی کے بھی مقلد نہیں تھے، بلکہ محقق تھے۔

۲۴۵- تفہیم:

اقتراب میں طریقۂ قویمہ کیا ہے؟

جب ہم تمام کمالات کے رنگ میں رنگ گئے تو ہمیں واضح طور پر معلوم ہو گیا کہ اقتراب میں طریقۂ قویمہ و مستقیمہ وہ ہے جس پر رسول صلوات اللہ علیہم و سلامہ چلے، اور جو مشقت بھری طاعات مثلاً صوم دہر، آخر رات تک کے قیام، ہر دن رات میں ختم قرآن وغیرہ اور اخلاق دقیقہ جیسے اس کی طرف ریا و سمعہ کے دقائق اور قلب و زبان کی آفات سے احیاء و کیمیا ہدایت کرتی ہیں۔ دورۂ ایمان میں تعمقات عامہ سے حاصل ہوتا ہے، تو اس میں نفع کے لحاظ سے کچھ نہیں ہے، جس پر طاعات کی روایت سے صریح احادیث دلالت کریں اور جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نشاط اور فیاضی نفس وغیرہ کے تعلق سے کوئی نص بیان کی ہو۔

اور اس طرح جو کچھ اشغال قلبیہ اور قوانین سازی اور توکل سے حظ وافر اور تصرفات و بطش شدید سے نصیب کامل کے اخذ میں اہتمام سے قرب نوافل کے دورہ میں تعمقات اولیاء، اتلاف اور احیاء کی صورت میں حاصل ہوتی ہے، وہ طریق سے بچانا ہے اور وہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے طریق میں دشواری اور کیچڑ ہے۔ چنانچہ جس نے بنفسہ موخر کیا اور زمین کی طرف مائل ہوا وہ ٹخنوں اور گھٹنوں یا نرخرہ تک کیچڑ میں دھنس گیا۔ سعید

و نیک بخت وہ ہے جو طریق اور جو کچھ اس میں ہے، اس کے معاملہ میں کسی کی پرواہ نہیں کرتا۔ اور مقصود کا احاطہ کرتا ہے، اور تمام رات و دن بنفسہٖ سفر کرنے میں تیز رفتار سے کام لیتا ہے۔ حتیٰ کہ اپنی منزل پر پہنچ جاتا ہے۔

اور اس طرح الٰہیات، تکوینیات اور اقترابات کی جزئیات، تفصیلات اور براہین کے بیان میں حکما کے تعمقات سے جو کچھ حاصل ہوتا ہے، وہ ایسے امور ہیں جن کو علم قرار نہیں دیا جاسکتا کہ علم وہ ہے جس کا وجود شرف اور فقدان نقص ہے اور جس کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب سے یہ کہہ کر سوال کرتے تھے رب زدنی علما "اے میرے رب مجھے زیادہ علم عطا فرما"۔ اور جس کا وارث اللہ سبحانہ نے انبیاء میں سے اپنے چنیدہ بندوں اور ان کے طریق پر چلنے والوں کو بنایا۔ وہ صرف امور کا ذوق ہے اور ان کا اولاً نسمہ میں پھر کلام میں اتارنا کبھی بھی اختلاف اور سوء نظر سے خالی نہیں ہوتا۔ خواہ آدمی زبانً کے لحاظ سے سب سے زیادہ فصیح، فکر و نظر کے اعتبار سے سب سے بڑا نقاد، ادراک کے لحاظ سے سب سے زیادہ ذکی و فہیم اور فطانت کے لحاظ سے سب سے زیادہ بیدار مغز ہی کیوں نہ ہو۔ اور اس وجہ سے رسول صلوات اللہ علیہ والسلام نے ان علوم کے تعلق سے سکوت اختیار فرمایا۔ حالانکہ علوم آپ کے نسمہ میں اس طرح اتر گئے تھے جیسے درخت کے تنوں اور پتوں میں پانی اتر جاتا ہے۔

اور ہم صریح طور پر یہ بھی جان گئے کہ رسول جب اپنے کمال کو پورا کر لیتے ہیں تو کسی بھی ضرورت سے اس تشریع کی طرف بہاؤ کرتے ہیں جو نسمہ کے کمالات سے ہے اور وہ عجیب شان والا راز ہے۔ اور وہ یہ کہ ان کے اسم کے اطلاق اور اس کے ملائکہ کے اسماء پر صادق آنے اور ان کے نسب کی فنا اور ان کے اضافات اس تدبیر کے ساتھ ان کے کمال سے مخلوط ہوتے ہیں جو آسمان سے زمین کی طرف نازل ہوئی۔ اور قضا جو نظام عالم میں پختہ ہے اور جس کو فرشتوں کا صدور جمال بخشتا ہے جو درجہ بدرجہ گھیرے ہوئے اور بکھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کا مخلوق کی طرف بھیجنا لوگوں کو طبیعت کی تاریکی سے ایمان کے نور کی طرف نکالنے کی مصلحت کے تحت ہوتا ہے تاکہ لوگ جنت میں داخل ہو جائیں اور حیات ابدی میں کامیاب ہو جائیں۔

اور یہ مصلحت ان مصالح عالم کے مشابہ ہوتی ہے جن کی بنیاد خیرات پر ہوتی ہے۔

چنانچہ ان کے علوم نسمیہ دورۂ کمال میں نقش ہو جاتے ہیں۔ ان کے اوپر شرع عام لازم نازل ہوتی ہے۔ اور بالجملہ تشریع کمالات نسمہ میں اس کی سلطان ہوتی ہے اور دورات آخر غیر مشروعہ ہوتے ہیں۔ اور ان کے سلطان کے تحت نہیں ہوتے۔

اور اس لیے ہم کہتے ہیں کہ جب آدمی اس امر سے بیٹھ جاتا ہے، جس کی اولیاء پیروی کرتے ہیں تو اس میں اصلاً کوئی گناہ نہیں ہوتا، نہ کوئی نقصان ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی عتاب یا عقاب۔ اور یہ کہ انبیاء کا توسط کمالات اور ان کے استبداد میں ان کی تحقیق کے منافی نہیں ہوتا۔ ہاں انبیاء کی صحبت ان کمالات میں فائدہ دیتی ہے جن کی تفصیل ہم نے بیان کی ہے۔ یہ صحبت کی استعداد کے مطابق ہوتا ہے۔ جیسا کہ اس شخص کی صحبت جو ان کے طریق پر ہوتا ہے، اس کا فائدہ دیتی ہے۔

اور جان لو کہ شرع کی قدر اس وقت کم نہیں ہوتی جب دورۂ ایمان کے ماسوا شامل نہیں ہوتا۔ اور یہ کہ اقترابات اس وقت ضائع نہیں ہوتے جب تشریع ان میں شامل نہیں ہوتی، کہ ہر نشاۃ کے لیے ایک حکم ہوتا ہے، نہ ایک سے تعداد میں زیادہ ہوتا ہے اور نہ ہی اس سے تجاوز کرتا ہے۔ اچھی طرح تدبر سے کام لو کہ مسئلہ بہت عمیق ہے۔

۲۴۶- تفہیم:

عالم عناصر میں کواکب کی تاثیر ہے یا نہیں؟

حکماء ربانی اور عامۃ الناس سب کا اتفاق ہے کہ عالم عناصر میں کواکب کی تاثیر ہوتی ہے۔ البتہ حکماء کے نزدیک یہ تاثیر ان خاصیات کے ساتھ ہوتی ہے جو اللہ سبحانہ نے ہر شئے میں ودیعت کی ہیں۔ جیسے آگ میں حرارت اور پانی میں برودت، تاثیر کی صفت سے عالم میں امر منزہ کے سرایت کرنے سے نہیں ہوتی ہے۔ ہاں ان کے علاوہ کے نزدیک تسخیر کی صفت سے منزہ ان کی حقیقت کے سرایت کرنے سے ہوتی ہے۔ چنانچہ حکماء کے نزدیک اس کی مثال اس آگ کی سی ہے جس میں گرمی پائی جاتی ہے۔ جو اس کے اندر ہوتی ہے۔ اور یہ دونوں اس نشاۃ دنیوی سے ہوتی ہیں۔

اوراس میں راز یہ ہے کہ جس کوتم دریافت کر سکتے ہو کہ اگر تم عالموں اور جہانوں کے مدمقابل کواور انسان کبیر کے فی نفسہٖ اتصال کو جانتے ہواوراس کی مثال دوسروں کے نزدیک قضا جیسی ہے کہ کسی شئے کے لیے کہا کُن ہو جا، فکان ہو گیا۔ بغیر کسی مدمقابل اور بغیر اتصال کے بلکہ اس عالم محسوس میں تسخیر کی صفت سے وصف الٰہی کے سرایت کرنے سے ہوگئی۔ اسی طرح اولیاء کی ہمتوں کا مسئلہ ہے کہ حکماء ان کو عالموں اور جہانوں کے مدمقابل اور انسان کبیر کے اتصال پر رکھتے ہیں کہ ان کے نزدیک نفس ناطقہ اس عالم محسوس کی ایک شئے ہے جو قضاء کلی کی تشخیص کے لیے اس طرح تیار کرتی ہے جیسے نشاۃ کے خواص تیار کرتے ہیں۔

اوراس کا راز یہ ہے کہ منبع قدر سے ماخوذ امر صرف وجہ کلی عام پر ہوتا ہے پھر تشخیص معدات کے اعتبار سے ہوتی ہے، اور یہ کہ اولیاء کے نفوس پر جب شعاع الٰہی تسخیر کی صفت سے ضرب لگاتی ہے تو اس کی نشاۃ میں قوت واضحہ قوی ہو جاتی ہے اور عام لوگ اس طرح جاننے کی استطاعت نہیں رکھتے جیسے ہم جانتے ہیں۔ وہ ان کو تاثیر قدسی پر رکھتے ہیں اور اسی طرح طیرہ (نحوست، بدفالی)، کھوپڑی، مرض کا متعدی ہونا سب حکماء کے نزدیک ایک ہی معنی میں ہیں۔ لیکن نسمہ جب ان علوم سے تنگ ہوگئی اور اس کے اوپر سے ہر تاثیر بغیر فصل کے تاثیر قدسی ہوگئی اور نسمہ میں شرع آگئی تو یہ تمام امور اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک شمار کیے گئے۔

اوراسی طرح جب ہم شریعت کی زبان میں کلام کرتے ہیں تو یہ حکم لگاتے ہیں کہ نجوم، طیرہ، عدوی، ماہ صفر، اللہ سبحانہ کے علاوہ کی عبادت اور اس کے سوا سے استعانت اور اللہ کے علاوہ کے لیے نذور اور ایمان، سب اللہ کے ساتھ شرک ہیں۔ پھر جب عوام نے ہم سے ان کی تاثیرات کے بارے میں کہا تو ہم نے انہیں جواب دیا کہ کیا شراب میں بدن کی صحت کی تاثیر نہیں ہے، پھر بھی وہ حرام ہے جیسا کہ ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول سے جواب دیا کہ پہلے کو کس نے چھوت لگائی؟ جس نے اول یعنی تاثیر قدسی سے تجاوز کیا تو وہ اللہ کی طرف سے ہے اور اول وثانی اس کے اعتبار سے دونوں برابر ہیں۔ البتہ تاثیر عادی میں ہمیں کوئی کلام نہیں ہے۔

اور جس پر انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات نے ان کے آخر تک اتفاق کیا اور جو

احوال، سلوک اور مکاشفات میں ان کے طریق پر ہیں کہ اس عالم میں کوئی تاثیر قدس الٰہی سوائے ان اسماء کے نہیں ہے جو حادث ہیں جن کو مقرب فرشتوں کے صدور اٹھاتے ہیں۔ اور تاثیر عادی جہانوں کے مدمقابل کے حوالہ کر دی گئی ہیں۔

۲۴۷- **تفہیم:**

دورۂ کمال کے خصائص کا بیان

دورۂ کمال کے خصائص میں سے یہ ہے کہ اللہ سبحانہ بندوں کے معاملات، ان کے ظاہر کا بھی اور باطن کا بھی ذمہ دار ہو جاتا ہے۔ اور ولایت کا راز اس کے نام کا ملائکہ وغیرہ کے ناموں پر صادق آتا ہے، تو کوئی حرج نہیں ہے۔ اس کی طرف چلایا جاتا ہے جو اس میں اس کی دنیاوی واخروی جزا ہے۔ اور وجاہت کی مانند ہے اور اس کے لیے محبوبیت لازم آتی ہے۔ اور مجھے اس کی بشارت اس وقت دی گئی جب میرے والد صاحب قدس سرہ نے میرا نام ولی اللہ رکھا تھا۔ کیونکہ انہوں نے اس سے پہلے شیخ قطب الدین کو دیکھا تھا کہ ان کو ایک بیٹے کی بشارت دے رہے ہیں۔ اور ان کو اپنے نام کی طرح قطب الدین نام رکھنے کا حکم دے رہے ہیں۔ لیکن جب میں پیدا ہوا تو والد صاحب اس واقعہ کو بھول گئے۔ اس لیے انہوں نے میرا نام ولی اللہ رکھ دیا، پھر جب ان کو اور دوسرے لوگوں کو یاد آیا جنہوں نے ان سے اس واقعہ کے بارے میں سنا تھا تو میرا یہ نام رکھا۔

اور ان کے خصائص میں سے روحانی اسرار ہیں جو جاگنے اور سونے کی حالت میں ہوتے ہیں۔ اور فرشتوں کی اور ان بزرگوں کی سوتے جاگتے رویت جو مر چکے اور یہ حکمت کی مثال ہے۔ اور اس کے خصائص میں سے فناء، نسب اور اضافات اور موافقت خالص ہیں جن میں مخالفت کا کوئی شائبہ نہیں ہے اور یہ عصمت کی مانند ہے۔

تا ز میخانہ دمی نام ونشاں خواہد بود
سر ما خاک درِ پیر مغاں خواہد بود

''جب تک میخانہ کا کوئی نام ونشان باقی رہے گا، ہمارا سر پیر مغاں کے در کی خاک بنا رہے گا۔''

۲۴۸- تفہیم:

دورۂ کمال سے آگے بندہ کیلئے زیادتی قرب کا کوئی درجہ نہیں ہے

جب بندہ اس دورہ پر پہنچ جاتا ہے تو اس سے تحقیق پوری ہو جاتی ہے اور ولایت کی نشاۃ میں کسی ایسے درجہ کا تصور نہیں کیا جاتا جو اس سے زیادہ قریب ہو۔ اب اگر عنایت اس کے کمال کے نظام کے ساتھ ان فرشتوں سے ترتب کے لیے اختلاط کی طرف چلتی ہے جو مبنی علی الخیرات ہیں، اور اس دورہ میں نسمہ کے کمالات کی تجلی اور شرع عامہ کے نزول کی طرف چلتی ہے جو کہ لازم ہے، تو یہ خاتم النبیین کے بعد نہیں ہے سوائے اس کے کہ اس کے برعکس ہو۔

اور بالجملہ اس کے بعد صرف نبوت اور اس کے متعلقات کے کمالات ہیں جیسا کہ ہم نے اختلاط کے بارے میں بتایا اور تجلی اور اس کے بعد کمالات عزم ہیں جو مخاصمت وجہاد یا ہجرت اور ملک وسیاست اور ارشاد وہدایت کے لحاظ سے ہیں، اور ان کے بعد شارح کی شرح اور تعمق تام اور باب نبوت کا بند کرنا ہے۔ اور اس سے کمالات بشر منتہی ہوتے ہیں اور ان کے بعد مقرب ملائکہ کے قضاء عام اور اس تدبیر کے اتارنے میں کمالات ہیں، جو آسمان سے زمین کی طرف اترتے ہیں، اور لوح پر اطلاع وغیرہ ہیں۔

۲۴۹- تفہیم:

نبوت کے بعد کی بشارتوں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان بشارتوں سے جو نبوت کے بعد باقی رہیں وہ امر مراد لیا ہے جو شرع لازم ہونے سے قبل اسرار وغیرہ سے دورۂ کمال میں آسان ہوتا ہے۔ اور بشارت سے وہ شئے مراد لی ہے جو شرعاً لازم نہ ہو۔ خواہ وہ امر شرعی ہو جیسے عبداللہ بن زید کا خواب اذان کے سلسلہ میں، یا امر شرعی نہ ہو جیسے صحابہ کے خواب جب دوسرے اس کے موافق نہیں تھے، اور برابر ہے کہ صرف اس پر ہو یا نہ ہو۔

۲۵۰- تفہیم:

دورات سبع میں اولیاء اور ان کا حصہ

انبیاء اور سلوک میں ان کی اقتدا کرنے والوں کے طریقہ کی تشریح ان مقامات کا بالترتیب طے کرنا ہے جو ہم نے دورات سبع کے سلسلے میں تمھیں بتائے ہیں۔ پھر یہ جان لو کہ اولیاء کی جولان میں سے کچھ قسمیں ہیں۔ چنانچہ کبھی ان سے ایک دورہ مقدم ہو جاتا ہے اور کبھی موخر۔ اور کبھی دورہ کسی دوسرے کے ساتھ ترکیب پاتا ہے۔ چنانچہ ان کے آثار ان دوروں سے ہو جاتے ہیں۔ اور یہ ایسے ہی ہے جیسے شیخ عبدالقادر فنا فی اللہ ہوئے، تو ان کے لیے اللہ سبحانہ کی تجلی ان کے نفس ناطقہ کی ہیئت میں نازل ہوئی، تو وہ نفس پر ایک صورت تھی جیسا کہ نفس ہیولی پر صورت ہوتا ہے۔ اور ان کا نفس اپنی جبلت میں قوی تھا۔ اور اس طرح اس پر نازل ہونے والی ہیئت بھی قوی تھی۔ چنانچہ اس کے لیے ان اسماء کی طرف ایک طریق تھا جو مقرب ملائکہ کے سینوں میں طلوع ہوئے جیسے وجہ خاص۔ چنانچہ آپ اس میں فنا ہو گئے تو اس کے لیے بطش شدید سے آثار نظام کا جدا ہونا وغیرہ حاصل ہوئے۔ اور جب حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے قدم حکمت میں راسخ ہو گئے اور آپ کے لیے شرع واضح ہو گئی تو ان کو منبع شریعت کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شرح سے وہ شرع دکھائی گئی۔ چنانچہ ان کو اس کی طرف عروج حاصل ہوا اور اس سے وصایہ عطا کیے گئے۔

۲۵۱- تفہیم:

دورۂ کمال کے جزئیات میں سے قرب اعمال

میرے رب جل جلالہ نے مجھے سمجھایا کہ دورۂ کمال کے جزئیات میں سے قرب اعمال ہے۔ اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ اعمال صالحہ صحیفہ میں قائم ہوتے ہیں، پھر تصادق کے لیے اسم میں تجلی کرتے ہیں، پھر یہ تجلی پوری طرح نسمہ میں رنگ جاتی ہے۔ اور اس قرب پر قبول دعوت، پھر ظہور اشراقات موقوف ہوتے ہیں۔ اور اب میں اس امر کا استصواب کرتا ہوں کہ وہ مراد لیا جائے جو صحیح حدیث میں یہ قرب لفظ نوافل و فرائض سے

وارد ہوا ہے۔ اس لیے کہ اس پر استعاذہ سے اعاذہ اور قبول دعا متفرع ہوتے ہیں۔

اور جس کو یہ قرب پہنچ گیا اس کو صرف دنیا اور آخرت میں اللہ سبحانہ کے مواخذہ کے خوف کی عصمت ہی باقی رہی۔ جیسا کہ یحییٰ علیہ السلام نے کہا تھا۔ مجھے خوف ہے کہ کہیں میرے نیچے سے زمین نہ پھٹ جائے۔ اور اس قرب کا نام وسیلہ رکھا جاتا ہے۔ رب العالمین نے فرمایا "وابتغوا إليه الوسيلة" اس قرب کے اعظم اسباب میں سے اسماء سے دعا ہے، اور یہ علم عمیق الماخذ ہے۔

۲۵۲۔ تفہیم:

بشر کامل کو مقرب ملائکہ پر فضیلت نہیں ہے

اللہ والوں میں سے بہت سوں کے نزدیک یہ خیال واقع ہوا ہے کہ بشر کاملین، مقربین ملائکہ پر فضیلت رکھتے ہیں لیکن یہ بات درست نہیں ہے۔ اس لیے کہ رجحان یا تو وجوہ قرب میں ہوگا یا اس کے مقادیر میں یا وسائط یا وجہ خاص کے اعتبار سے جو کہ معیت ذاتی یا آثار تسخیریہ کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ اور ملائکہ ان سب میں انسانوں پر فضیلت رکھتے ہیں۔ ان کو یہ گمان دو وجہوں سے پیدا ہوا۔

ان میں سے ایک جماعت کو عشق میں محبت کا ہیجان عطا کیا گیا۔ اور انہیں اپنے بعض واقعات سے یہ واضح ہوا کہ ملائکہ کو یہ عطا نہیں کیا گیا ہے۔ اور انہوں نے یہ نہیں سمجھا کہ عشق اور قلق وصول کے متعلق ہونے سے قبل عالم تخلیط کی بدعات میں سے ہیں۔

اور ان میں سے ایک جماعت کو فنا سے قبل قرب معیت عطا کیا گیا اور انہیں اپنے طریق میں ملائکہ میں سے کوئی نہیں ملا۔ ان کے لیے قرب وسائط ہے۔ اور انہوں نے یہ نہیں سمجھا کہ ملائکہ کو قرب معیت سے حظ وافر اور نصیب تام ہے۔ یہ کیسے ہے جبکہ انہیں تمام اقترابات حاصل ہیں۔ اور اگر تم ان کے بارے میں اطلاع پاؤ گے تو حیرت انگیز امر اور شان ظاہر دیکھو گے اور تم ان کے فضل اور ان کے اقترابات پر یقین کر لو گے۔ اور تمہیں امر واضح ہو جائے گا۔ اور اس گمان نے لوگوں کی ایک جماعت کو ہلاک کر دیا۔ چنانچہ انہوں نے کہہ دیا کہ ولایت، نبوت سے افضل ہے۔ وہ اس حقیقت سے نابلد رہے کہ انہیں (یعنی انبیاء اور

فرشتوں کو) معیت سے حظ وافر حاصل ہے اور اس سلسلہ میں عوام کا قول ایسا نہیں ہے کہ جس میں کوئی کشش ہو۔ انہوں نے دیکھا کہ ان میں سے بشر کاملین نے اپنے نفسوں کو شرور سے روک لیا۔ اس کے ساتھ جوان کی طبیعت ہے۔ جبکہ ملائکہ کو اپنی مقدس طبیعتوں کی وجہ سے عفت حاصل ہے اور یہ شاعرانہ قول ہے۔ اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کے قول "فسجد الملائكة كلهم اجمعون" تمام فرشتوں نے سجدہ کیا، کو بے محل استعمال کیا ہے۔ انہوں نے اس کو عنصری و مادی وغیرہ پر عام کر دیا ہے۔ چنانچہ ان کے لئے اللہ تعالیٰ کے قول كان من الجن "وہ جنات میں سے تھا"۔ اور خلقتني من نار "تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے" کی تاویل مشکل ہوگئی تو انہوں نے اس کی وہ تاویل کی جو کبھی کہیں سنی نہیں گئی۔ اور کیا ان کے پاس کوئی ایسی حدیث ہے جو اس پر دلالت کرتی ہو؟ ہمارے پاس تو اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے علمه شديد القوى اور اس کا قول ہے کتنے ہی ہیں جن کو ہم نے پیدا کیا اور عام نہیں کیا۔

۲۵۳- تفہیم:

توحید کی حقیقت جس کے ساتھ انبیاء کو مبعوث کیا گیا

جس توحید کے ساتھ انبیاء کو مبعوث کیا گیا وہ ہے جو اسماء متجددہ کے مطابق ہو۔ وہ نہیں جو اسماء ازلیہ کے مطابق ہو۔ جیسا کہ اس پر ولایت کے اکابر نے نص کیا ہے۔ اور توحید اولیاء کی اصطلاح اور انبیاء کے مفہوم کے درمیان مشترک لفظ ہے تو جس نے دونوں امور کو مخلوط کر دیا، اس نے اندھیرے میں تیر چلایا اور وحدۃ الوجود شرک سے بالکل بھی نہیں بچاتا۔

۲۵۴- تفہیم:

یونس علیہ السلام کی اپنی قوم کو بددعا

جب یونس علیہ السلام نے اپنی قوم کو بددعا دی حالانکہ ان کی دعا صحیفہ میں درج و مطلوب دعا سے ہٹ کر تھی۔ پھر جب قوم نیک و صالح ہوگئی اور ان کی توبہ قبول کر لی گئی، تو تقاضہ یہ ہوا کہ ان کے عمل کو خارج میں نکالا جائے تاکہ اس کے ذیل میں کوئی اثر چھٹا ہوا نہ رہ جائے جو ان کے لیے عیب ہو، تو ان کے لیے زرع وغیرہ کے قصہ میں ان کے عمل کی ہیئت پر تین صورتیں تھیں۔

چنانچہ وہ شر سے پوری طرح پاک ہو گئے، یہ ان کے اوپر اللہ کا خاص کرم تھا۔

۲۵۵-تفہیم:

اس مسخ کا راز جو داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں ہوا

اس مسخ کا راز جو کہ داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں ان لوگوں میں ہوا جنہوں نے سبت کے سلسلے میں حد سے تجاوز کیا، اور وہ یہ کہ انہوں نے جو عمل کیا، وہ ان کے صحیفوں میں درج ہے۔ اور ان کو اپنے گھٹیا اعمال اور حسین اخلاق کے لحاظ سے بندر سے ایک مناسبت تھی۔ چنانچہ ان کے چہروں میں وہی صورت واقع فرما دی۔ کیا ہم نے تمہیں بتایا نہیں کہ صورت ایک عرض ہے۔ چنانچہ اس کا وقوع غیر پر ممکن ہوتا ہے۔

۲۵۶-تفہیم:

دعا کی قبولیت کا واقعہ

ہمارے قریہ پھلت پر راہزنوں نے غلبہ حاصل کر لیا۔ انہوں نے قریہ والوں پر اپنے جانوروں کے ذریعہ چڑھائی کر دی اور ان کے مال و اسباب لوٹ لیے حتی کہ لوگوں کا وہاں رہنا دشوار ہو گیا۔ چنانچہ میں نے اللہ عز و جل سے دعا کی کہ ان سے اس مصیبت کو دور فرما دے۔ تو میرے رب جلالہ نے مجھے الہام فرمایا کہ میں نے ان کو امان میں کر دیا۔ میں نے یہ بات اپنے بعض احباب کو لکھ بھیجی۔ چنانچہ وہی ہوا جو الہام کیا گیا تھا۔ **والحمد للہ رب العالمین.**

۲۵۷-تفہیم:

حق میں بشارت کا خواب

میں نے اپنے بھائی نور اللہ کو بعض ضرورتوں سے سونی پت بھیجا تو وہاں اس کے قیام کی مدت طویل ہو گئی۔ میرے رب جل جلالہ نے مجھے سمجھایا کہ ان کو تمہارے حق میں بشارت کاملہ دی گئی ہے۔ چنانچہ میں نے اس بارے میں اپنے بعض اجلہ اخوان کو خبر دی۔ جب وہ لوٹ کر ہمارے پاس آئے تو میں نے اس بارے میں ان سے سوال کیا تو انہوں نے مجھے بتایا کہ انہوں نے امام شہید ناصر الدین محمد کو خواب میں دیکھا کہ گویا وہ ہمارے پاس کھڑے ہوئے

ہیں اور ہم، میں، نوراللہ اور محمد عاشق اپنے سامنے رکھا ہوا کھانا کھا رہے ہیں۔ تو انہوں نے مجھے مخاطب کیا اور فرمایا کہ جان لو یہ دنیاوی کھانوں میں سے نہیں ہے، اور نہ ہی جنت کے کھانوں میں سے ہے۔ اور اللہ نے اس کو تمہارے لیے مخصوص کیا ہے۔ تو میں نے کہا، ہاں۔ والحمد للہ رب العالمین. اور اسی رات کو خواب کی موافقت اہل سونی پت کے ایک لڑکے نے کی۔

۲۵۸- تفہیم:

حرمین شریفین کا سفر اور اس کے لیے اللہ کی طرف سے مامور ہونا اور بعد میں اس کی تائید ہونا

اللہ نے میرے دل میں یہ بات ڈالی کہ میں بیت اللہ زادہ شرفا اور اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کا رخ کروں۔ اور اس عزم کو میرے دل میں زیادہ قوی اور شدید کر دیا، تو میں نے اس بارے میں اپنے اہل تعلق وقرابت کو بتایا اور یہ بتا دیا کہ اللہ تعالیٰ ہمارے اقربا کے دلوں میں یہ بات ڈالے گا۔ اور ان کی آنکھوں پر پردہ ڈالے گا تو وہ ہمارے اس طویل سفر پر جانے کو اچھا نہیں سمجھیں گے۔ چاہے کتنے ہی دلائل دیے جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا یہاں تک کہ ہم ان سے الگ ہو گئے تو انہیں معلوم ہوا اور انہوں نے ہمیں اس سلسلہ میں لکھا۔ تب میں نے ان کو لکھا کہ اس کا حکم مجھے اللہ نے دیا ہے اور جو کوئی بھی میرے اس سفر میں رکاوٹ ڈالے گا، اللہ تعالیٰ اس کو ذلیل ورسوا کرے گا۔ پھر بھی جو میں نے ان کو لکھا، وہ ان کے لیے کافی نہیں ہوا۔ وہ سوار ہو کر ہمارے پاس پہنچے اور ہر طرح کی کوشش اور ہر ممکن سعی وجد وجہد کی۔ اور ہم اطمینان کے ساتھ چلتے رہے۔ چنانچہ وہ ہم تک نہ پہنچ سکے اور ناکام ہو کر واپس لوٹ گئے۔

اور میرے رب نے مجھے سمجھایا کہ میں تمہارے لیے اس سفر میں آسانیاں پیدا کر دوں گا۔ اور تمہیں بہت کچھ دوں گا اور بڑے احسان کروں گا۔ چنانچہ اس نے اپنے وعدہ کو پورا کیا۔ اور ہمیں قرب ملکوت وقرب کمال وغیرہ عطا فرمائے جو اس کے بڑے احسانوں، عظیم نعمتوں میں سے ہیں۔ والحمد للہ رب العالمین.

۲۵۹- تفہیم:

بعض مریدوں کے دل کے حال سے باخبر ہونا

اس سفر کے دوران اللہ سبحانہ نے میرے دل میں یہ القا کیا کہ نور اللہ کا قلب اللہ سبحانہ کی تعظیم کے سلسلہ میں تفریط کی وجہ سے عظیم آفت میں مبتلا ہو گیا ہے۔ اس لیے اس کو حکم دو کہ اپنے نفس کا ادراک کرے۔ ورنہ اس کا دین اور دنیا دونوں خراب ہو جائیں گے۔ تو میں نے اس پر غیظ وغضب کا اظہار کیا اور میرے رب نے مجھے جو حکم دیا تھا میں نے اس کو بتایا۔ تب اس نے بعض وہ باتیں بتائیں جو اس کے دل میں خطرات کے طور پر راسخ ہو گئی تھیں۔ تب اللہ سے توبہ کی۔ چنانچہ اللہ نے اس کی توبہ قبول کی۔ اور اللہ کا اس کی توبہ قبول کرنا میری رعایت سے تھا۔ اس لیے میں نے اللہ عزوجل ذوالجلال والاکرام کا شکریہ ادا کیا۔

۲۶۰- تفہیم:

قبولیت دعا کا واقعہ

ہمیں اس سفر میں اپنے ایک بھائی کی بیماری کی وجہ سے پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جس سے میرے دل کو اضطراب ہوا۔ میں نے اپنے ایک بھائی کو ایک گاؤں کی طرف بھیجا کہ اس کے لیے سواری لائے۔ راستہ میں اس کو رات ہو گئی تو میں نے دعا کرنی شروع کی۔ میں کہہ رہا تھا "یا بدیع العجائب، یا بدیع العجائب، یا بدیع العجائب" تو اللہ نے میرے دل میں یہ بات ڈالی کہ دعا اپنے موقع پر پہنچ گئی ہے اور بند دروازہ کھل گیا ہے۔ میں نے اپنے بھائیوں کو اس کی خبر دی پھر جس کو ہم نے بھیجا تھا وہ ایک بیل لے کر آیا، جب کہ اس وقت یہ آسان نہیں تھا۔

۲۶۱- تفہیم:

توجہ سے مریض کا شفا پانا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کی تولیت

میرے رب جل جلالہ نے مجھے سمجھایا کہ تمہارے مریض کی شفا تمہاری توجہ اور

ہمارے تمہیں ذمہ دار بنانے میں ہے۔ کسی کی موت یا کوئی دوسرا ضیاع لازمی ہے حتیٰ کہ مریض کی ہلاکت کا عوض ہو جائے تو مجھے خوف لاحق ہوا اور میں نے کہا الامان. کہ اگر ضروری ہی ہے تو اس سے پریشان خاطری ہو گی۔ پھر واضح ہوا کہ یہ تفہیم گزرے ہوئے امر کے بارے میں تعلیم تھی۔

۲۶۲-تفہیم:

ولی اللہ اور قطب الدین نام رکھنے کی وجہ

میرے والد قدس سرہ فضائل ظاہری و باطنی کے جامع اور ولی عارف تھے۔ ایک بار وہ شیخ قطب الدین بختیار کاکی کے مرقد کی زیارت کے لیے تشریف لے گئے تو شیخ نے آپ سے کلام کیا اور ایک بیٹے کی ولادت کی بشارت دی۔ اور حکم دیا کہ اس کا نام ان کے نام پر قطب الدین رکھیں۔ جب میں پیدا ہوا تو اللہ سبحانہ نے یہ بات بھلا دی کہ وہ میرا نام قطب الدین رکھیں۔ انہوں نے میرا نام ولی اللہ رکھ دیا۔ اور یہ اسباب کے انعقاد کی وجہ سے تھا کہ میں صیغہ مفعول سے متولی ہوں پھر انہوں نے میرا نام قطب الدین بھی رکھا۔

۲۶۳-تفہیم:

والدہ کا خواب اور اس کی تعبیر

میری والدہ بارک اللہ فی عمرھا نے خواب میں دیکھا کہ ایک عجیب شکل والا پرندہ میرے والد قدس سرہ کی طرف آیا۔ وہ اپنی چونچ میں ایک کاغذ لیے ہوئے تھا۔ جس پر سونے سے اللہ کا نام لکھا ہوا تھا۔ پھر دوسرا پرندہ آیا اس کی چونچ میں بھی ایک کاغذ تھا جس پر لکھا تھا بسم اللہ الرحمن الرحیم لو کان النبوۃ بعد محمد صلی اللہ علیہ وسلم ممکنا لجعلناک نبیا ولکنھا انقطعت بہ "اللہ کے نام سے شروع جو رحمن و رحیم ہے۔ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت ممکن ہوتی تو ہم تمہیں نبی بناتے۔ لیکن یہ سلسلہ آپ پر ختم ہو گیا"۔ یہی الفاظ تھے یا ان سے ملتے جلتے معنی تھے۔ اور پہلے پرندہ کی چونچ لال اور اس کا سارا جسم کبوتر کی طرح غبار آلود تھا۔ اور دوسرے کا سارا جسم

طوطے کی طرح ہرا تھا۔ تو میرے والد قدس سرہ نے فرمایا تمہیں اپنے بیٹے کے بارے میں خوشخبری ہے۔ یہ اسی طرف اشارہ ہے جس کے بارے میں ہم نے تمہیں بتایا تھا کہ وہ ولی ہوگا۔ میری والدہ نے فرمایا اس خواب میں یہ بات میرے علم میں تھی کہ یہ بشارت تمہارے والد کے حق میں ہے۔ والد قدس سرہ نے فرمایا معلوم تو یہی ہوتا ہے کہ وہ تمہارے اندر ہے۔ معاملہ میری والدہ پر مشتبہ تھا۔ میں کہتا ہوں کہ تعبیر کا حق جس طرح حکمت کے قوانین تقاضہ کرتے ہیں، یہ ہے کہ پہلا کاغذ میرے والد قدس سرہ کے کمال کی طرف اشارہ ہے کہ وہ فانی فی اللہ اور اس میں مستغرق تھے۔ جہاں تک اس کے غبار آلود ہونے کا سوال ہے، وہ اس لیے تھا کہ وہ ذکر معارف میں مشغول نہیں تھے۔ اور اس طرح کبوتر اور فاختہ اچھی آواز والے ہوتے ہیں لیکن فصیح آواز نہیں ہوتے، اور جہاں تک دوسرے کاغذ کا سوال ہے تو یہ اس کمال کی طرف اشارہ ہے جو مجھے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے کمالات کی تشریح القا کے طور پر دی گئی اور اس کے چونچ میں لینے والے کا ہرا رنگ معارف میں فصاحت ہے۔ جیسا کہ طوطا فصیح ہوتا ہے اور اپنی آواز کی تقطیع کرتا ہے، اور یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں شیر خوار تھا۔ والحمد للہ رب العالمین الرحمن الرحیم.

۲۶۴-تفہیم:

انبیا علیہم السلام اس علم کے بارے میں خالص تھے جو ان کی مراد نہیں تھا

انبیاء صلوات اللہ علیہم وسلامہ نے اس علم کے تنقیہ سے چشم پوشی کی جو ان کی مراد نہیں تھے۔ چنانچہ انہوں نے اسماء قدیمہ ازلیہ کی اور ان کی اور زمانہ کے ساتھ اسماء معاصرہ کی تفصیل بیان نہیں کی کہ وہ حکم عدم میں اس کے حامل تھے۔ چنانچہ انہوں نے ان تمام کو ایک ہی درجہ میں رکھا۔ ان کی طرف تمام موجودات کے لحاظ سے نسبت

مستوی کی۔ چنانچہ اللہ عزوجل کے قول سے اس کی طرف اشارہ کیا گیا: **قل کل من عند اللّٰہ** ''تم کہہ دو سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے۔'' اور انہوں نے اسماء متجددہ متاخرہ کو ایجاد اور ارشاد کے لحاظ سے دوسرے درجہ میں رکھا۔ چنانچہ اللہ عزوجل کے قول سے اس کی طرف اشارہ کیا گیا: **ما اصابک من حسنة فمن اللّٰہ وما اصابک من سیة فمن نفسک** ''تمہیں جو بھلائی پہنچی ہے، وہ اللہ کی طرف سے ہے اور جو برائی پہنچی ہے تو وہ تمہارے اپنے نفس کی کمائی ہے۔ اور اس کی طرف مومنوں کی مدد اور ان کی ولایت منسوب کی گئیں۔ اور وہ اعیان اور نفوس ناطقہ کے ذکر سے رکے رہے۔ اور انہوں نے نسمہ کے کمالات کو اختیار کیا اور یہ نقشہ بنایا کہ ہر کمال ان کے اوپر استعداد عین یا نفس کی جانب سے امر ذہنی، صرف مستند کو مستعدات کا لحاظ کیے بغیر محض ارادہ مجردہ کی طرف نازل کرتا ہے۔ اور ان کے نزدیک ان کے اسماء، اسماء ملائکہ وغیرہ سے خلط ملط ہوگئے۔ چنانچہ تفصیل حرام ہوگئی اور دو مرتبوں کے علاوہ توحید قائم ہوگئی اور اس طرح وہ عالم تکوین میں ہر تیاری سے رکے رہے۔ اور انہوں نے فعل کو محض ارادہ کی طرف منسوب کر دیا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے نفسوں کو تمام لوگوں سے ممتاز نہیں کیا۔ سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی کی اور ان کے اوپر آیتیں جاری کیں۔ جو کسی غیر پر نہیں کیں اور یہی امیت ہے اور اس کے مقابلہ میں جنایت حکما اور وقاحت اولیا آتی ہے۔

اور جب ہمیں دورۂ کمال حاصل ہوگیا تو ہم نے اپنے وجدان کی جانب سے ہر تفصیل سے برأت کا اظہار کر دیا۔ اور اس میں ان کا مذہب اختیار کر لیا۔ اور ہماری اور ان کی امیت میں فرق یہ ہے کہ ہماری امیت کسب کی ہوئی ہے اور ان کی امیت فطری ہے۔ اور یہ کہ امیت تامہ ہے۔ وہ اس کی استطاعت نہیں رکھتے کہ اس کے ساتھ تفصیل کی طرف دیکھیں اور ہماری امیت ناقص ہے۔ ہم اس کے ساتھ تفصیل کی طرف نظر کی استطاعت رکھتے ہیں۔ اور شاید اللہ تعالیٰ ہمیں اس میں کمال عطا فرمادیں۔

۲۶۵-تفہیم:

اللہ تعالیٰ وتقدس کی تجلیات کا ذکر

جان لو کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح نظام عالم کے مطابق یکے بعد دیگرے تجلی فرمائی حتی کہ تمام موجودات وجود میں آگئیں، اسی طرح ان سے آگے اس کی دوسری تجلی ہیں۔ان کے مطابق مراتب قرب میں تفاضل واقع ہوتا ہے۔چنانچہ جب نفس ناطقہ کا جوہر ٹوٹ گیا، وہ اس وقت پائی گئیں جب اس عالم کی طرف رحمت وشفقت پائی گئی جن کے طریقے ان کے طریقوں کو ان کے اصولوں کی طرف منسوب ہیں۔حتیٰ کہ ان کے لیے نشاۃ اصول کے علاوہ دوسری نشاۃ مکمل ہوگئی۔پھر جب جذب کی ہوا چلی تو عالم مقدس کی طرف رحمت وشفقت ہوئی اور ان کے اوپر عالم مقدس کے لیے ان کے ہونے کا حکم غالب آگیا۔اور ان کے لیے ان کے اصولوں کی طرف وسیع کشادگی پیدا ہوگئی۔میں یہ نہیں کہتا کہ ان کا حکم، حکم عین میں مضمحل ہوگیا بلکہ اس کے اوپر کے حکم میں سفیدی پر مضمحل ہوا۔

اور اس انقلاب کی علامتوں میں سے ایک اس کے علم مطابق کی طرف علم مقید میں انقلاب اور توحید اور تقرر کا فنا ہے یا جو کچھ تم اس کو نام دو۔اور اللہ تعالیٰ کی اس کے لیے دوسری طرح تجلی ہے۔یہ تجلی نہ جوہر ہوتی ہے اور نہ ہی عرض۔بلکہ وہ دونوں اسی عالم سے ہوتی ہیں۔اور وہ اس کی ملائمت وتازگی اور جگہ کی کشادگی ہے۔ہاں نفس اس تجلی کے لیے ایک پیمانہ ہوتا ہے اور اس سے متعلق ہوتا ہے۔اور جب یہ تجلی پوری طرح مکمل ہوگئی تو بندہ کے لیے اللہ سے کلام کرنا اور اللہ کے ساتھ چلنا صحیح ہوگیا۔جیسا کہ حدیث صحیح میں آیا ہے۔

اور اس تجلی کی مثال آئینہ کے اس چھوٹے سے ٹکڑے جیسی ہے جو مٹی پر ڈال دیا گیا تو اس نے سورج کی نورانیت سے کئی گنا زیادہ اکتساب کیا جس کا تصور ساری زمین کے لیے کیا جاتا ہے۔اور اس کے واسطہ سے ان اسماء سے لحوق متحقق ہوا جس کو مقرب ملائکہ نے اٹھایا۔اس سے عالم میں تاثیر اور خرق عادت حق کے ساتھ حاصل ہوتے ہیں۔اور اس حالت کو ہم فنا کا نام دیتے ہیں۔اور کبھی کہتے ہیں کہ نفس اللہ سبحانہ کے رنگ میں رنگ گیا۔

اور بالجملہ ان سے مختلف عبارتوں سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان میں سے بعض بعض سے زیادہ فصیح ہوتی ہیں۔ اور کبھی ذاتیات کا کشف ہوتا ہے اور کبھی اس تجلی کے لیے معد امر اور لوازم کا بیان کافی ہوتا ہے۔ اس طرح کہ بندہ نص کے لحاظ سے اس امر کی طرف رحمت وشفقت ہوتا ہے کہ اس کے اوپر اس نشاۃ کا حکم غالب آجاتا ہے اور اس لیے تجلی نفس کے قیاس پر اور اس کے مدمقابل ہوتا ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ان کا نفس حکم کو واجب قرار نہیں دیتا بلکہ اس میں اس کی نشاۃ علیا کا حکم غالب ہوتا ہے۔ اور نفس اس کے لیے اس کے احکام میں شرح پاتا ہے۔ چنانچہ اس کے لیے جوہر نفس ہر ممکن طور پر جلدی ٹوٹ جاتا ہے۔ پھر اس کے لیے عین اور اس کے اصول روشن ہوتے ہیں۔ پھر اس کے لیے جوہر عین ٹوٹ جاتا ہے اور یہ انکسار دقیق الشان اور عظیم البرہان ہوتا ہے۔ اور اس کے اصولوں کی طرف اس کے راستوں کا انسداد، انسدادِ نفس کی طرح نہیں بلکہ دوسری قسم کا ہوتا ہے۔ اور اس کے عامل کی طرف اس کی رحمت اس کے عامل کی طرف نفس کی رحمت کی مانند نہیں ہوتی۔

اور وہ اس لیے ہے کہ ہیولی وہاں مرید کے اسم کی شعاعیں ہوتی ہیں جو کہ بالفعل افاضہ ہے اور صورت دوسرا اسم الٰہی ہوتا ہے جو کہ تقیید کی طرح مقید ہوجاتا ہے۔ چونکہ یہ نشاۃ ہیولی اور صورت کی جہت سے مقدس ہوتی ہے تو اپنے عامل کی طرف اس کی رحمت بھی مقدس ہوتی ہے۔ وہاں انکسار مقدس ہوتا ہے جس کی تفسیر کرنا اس سے زیادہ واضح طور پر ہمارے لیے ممکن نہیں ہے۔

پھر جب یہ انکسار واقع ہوجاتا ہے تو اللہ سبحانہ عین کے قیاس پر اور اس کے مدمقابل تجلی فرماتا ہے۔ یہ تجلی من جملہ عالم عین سے نہیں ہوتی بلکہ اس کی ملائمت وتازگی اور جگہ کی کشادگی پر اس سے زیادہ عالم اقدس ہوتا ہے اور ہم ان تجلیوں کا نام اسماء متجددہ رکھتے ہیں اور ان کا اسماء ہونا ان کے تقدس اور عالم عین پر ان کی برتری کی وجہ سے ہوتا ہے اور ان کا متجددہ ہونا اس تجلی کے اس کی ہیئت کے حدوث کی وجہ سے ہے جس ہیئت کی وجہ

سے تجلی ہے۔

اور عالم عین کی طرف نسبت کے لحاظ سے اس تجلی کی مثال گمراہی کی طرف نسبت کے لحاظ سے آئینہ کے اس چھوٹے ٹکڑے جیسی ہے جسے اس میں ڈال دیا گیا ہو کہ اگر عین کے ہزار نور ہوں تو بھی اس تجلی کی نورانیت کا ادراک نہیں ہوتا۔ پھر جب یہ تجلی ملائکہ مقربین کی تجلیات پر صادق آتی ہے تو وہ قرب ملکوت ہوتا ہے، پھر جب تصادق مکمل ہو جاتا ہے تو اللہ بندہ کو اس کے تمام ظاہری و باطنی امور میں ذمہ دار بنا دیتا ہے۔ پھر جب مصائب اس کی طرف رخ کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اس کو نجات دے دیتے ہیں جیسا ابراہیم علیہ السلام کے لیے آگ میں اور ایوب علیہ السلام کے لیے ان کی بیماری میں ہوا تھا۔ اور جب اللہ تعالیٰ سے اس شدت کے ساتھ دعا کی جو وہ اپنے دل میں پاتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمالی۔ جیسا زکریا علیہ السلام کے لیے ان کے بیٹے کے قصہ میں ہوا۔ اور جیسا عیسیٰ علیہ السلام کے لیے دستر خوان کے نزول کے وقت ہوا۔ اور وہ اس کے لیے ایسا فعل کرتا ہے جس میں اس کی جزا ہوتی ہے خواہ ظاہراً یا باطناً۔ حالانکہ وہ جانتا بھی نہیں جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ کی طرف گئے۔ حالانکہ آپ یہ نہیں جانتے تھے کہ تولی سے ان کے ساتھ کیا کیا جائے گا۔ چنانچہ صلح واقع ہوئی اور وہ فتح کے لیے مبدأ تھی۔ اور جیسا کہ بدر اور حنین وغیرہ کے وقت ہوا۔ اور لوگ اپنے اعمال کو ہلاکت کے قریب پہنچا دیتے ہیں۔ چنانچہ یہ بندہ ان کے عذاب کے قائم مقام ہو جاتا ہے۔ اور بالجملہ اس تولی کی قسمیں جو انبیاء کے لیے ظاہر ہوتی ہیں، حد شمار سے زیادہ ہیں، اور وہ ان کو جانتے ہیں جیسا کہ اولیاء سے خرق عادت کی بہت ساری انواع ہوتی ہیں۔

اور ہم قرب اول کے لیے یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے نفس میں تجلی فرمائی۔ اور ثانی کے لیے یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے عین میں تجلی فرمائی۔ اور اول کے بارے میں کہتے ہیں، حق کے آئینہ میں تیرے نفس کی رویت اور ثانی کے بارے میں تیرے نفس کے آئینہ میں حق کی رویت۔ اور ہمارے نزدیک یہ واقع ہوتا ہے کہ وہاں اسماء کا امر واحد ہے، گویا کہ وہ اسم ہادی ہے اور وہ ازلی ابدی ہے۔ لیکن کبھی شکل عین اختیار کرتا ہے اور کبھی شکل

نفس۔ اور اس کی مثال ہوا جیسی ہے کہ وہ اس وقت سے موجود ہے جب سے زمین اور آسمان پیدا کیے گئے۔ پھر وہ مسدس یا مربع برتن میں داخل ہوتی ہے۔ پھر جب میں جوہر ہوا کی طرف قیاس کرتا ہوں تو کہتا ہوں، وہ اس وقت سے موجود ہے جب آسمان اور زمین کو پیدا کیا گیا تھا۔ اور جب اس کی مسدسیت یا مربعیت کی طرف قیاس کرتا ہوں تو کہتا ہوں کہ فلاں دن حادث ہوئی۔ اور اس طرح یہ اسم ایک اعتبار سے ازلی اور ایک اعتبار سے متجدد ہے۔ اور ہماری زبان میں یہ واقع ہوتا ہے کہ متجدد کے لیے عین کی وسعت سے وسعت ثابت ہوتی ہے۔ اور اس سے ہماری مراد وہ ہوتی ہے جو ہم نے کہا ہے۔ اور ہمارے نزدیک یہ واقع ہوتا ہے کہ جس قدوسیت سے ہر ممکن کامیاب ہوتا ہے، وہ نشاۃ دنیا میں وسیع ہوتا ہے، پھر اس سے تجلی الٰہی ہوتی ہے۔ ولی، ولی ہو جاتا ہے، اور جو صورت الٰہیہ عالم عین میں شامل ہوتی ہے، وہ وسیع ہو جاتی ہے اور رنگ جاتی ہے تو آدمی نبی یا انبیاء کے طریقہ پر کامل ہو جاتا ہے۔ اور ہماری عبارتیں مختلف اور غرض واحد ہوتی ہے۔ تم ہماری عبارتوں سے دھوکہ میں نہ پڑو کہ ہماری نسبت تقریر اول سے رجوع یا اس کو بھولنے کی طرف کرنے لگو۔ بلکہ امر مقدس ہے جس کا اظہار اس سے زیادہ بہتر طریقہ پر ممکن نہیں کہ اس کے لیے عبارتیں وضع کی جائیں۔

۲۶۶-تفہیم:

سالک کے بعض احوال کی مثال

إذا راق في الاكوان شئی لعاشق

إذا غاب من يهواه ليس بصادق

''جب کائنات میں کوئی شئے عاشق کے لیے پسندیدہ ہو جاتی ہے، جب وہ غائب ہو جاتا ہے جو اس کی خواہش کرتا ہے تو صادق نہیں ہوتا۔''

ومـذنـدمنا من لـايـد جمـاله

كعـنقـاء ماالـراوق كان برائق

"اور جب ہم میں سے وہ جس کا جمال مثالی ہے، اس عنقا کی طرح جو پردے کے پیچھے ہے کم ہو گیا تو چمکدار رہا۔"

وما انفكت الإيام حربا فتية
بتنقيص مشتاق موافٍ موافق

"اور زمانہ ساری زندگی، ایسے مشتاق کی تنقیص میں جنگ میں مشغول رہا جو کہ وفادار موافق ہے۔"

كأن السحاب السود خافت فتونها
احدت على خضر القدود الرشائق

"گویا کہ سیاہ بادلوں کے جنون سے خوفزدہ ہیں، جنہوں نے پھرتیلے ہرے جسموں پر حملہ کیا ہے۔"

ومن نقض ميثاق الربيع تفرست
فناحت على الاوراد ثم الشقائق

"اور موسم ربیع سلماً بہار کے عہد کے ٹوٹنے سے فراست آئی، چنانچہ گلابوں اور گل لالہ پر نوحہ کیا۔"

فعش مانساك الدهر سلماً لاهله
نديما لا قداح نصوحا لشائق

"تو اس طرح زندگی گزار کہ زمانہ تجھے نہ بھولے، اہل زمانہ کے لیے سلامتی بن کر، پیالوں کا ساتھی بن کر اور مشتاق کا ہمدرد بن کر رہ۔"

وماالدين هل تدريه غير نصيحة
وما الغل الا من منافٍ موافق

"اور کیا تمہیں معلوم ہے ہمدردی کے سوا دین کیا ہے، اور دھوکہ مخالف اور موافق کے سوا کہاں سے آتا ہے۔"

۲٦۷-تفہیم:

بعض احوال دل ربائی کی حکایت

اشم عرف الرضا من نسمة السحر
لعلها كسيت من نشرة العطر

''میں رضا اور خوشنودی کو نسیم سحر سے سونگھتا ہوں، شاید اس کے پھیلنے سے عطر اور خوشبو پھیل گئی۔''

اری نعومة وجه الورد تجذبنی
سری به سره یوماً من العمر

''میں دیکھتا ہوں کہ گلاب کی نرمی مجھے کھینچ رہی ہے، اس نے زندگی میں ایک دن اپنا بھید بتا دیا۔''

والورق ينشد من ورق الهوى غزلاً
فهل محاسنه انبته عن خبر

''اور ہر یل (ورقاء) عشق کے پتوں میں سے غزل گاتی ہے، تو کیا اس کی خوبیوں نے اس کو خبردار کیا ہے۔''

والبان بان به وجديريحه
علی هواه له كاسا من الخمر

''اور بان کے درخت سے وارفتگی ظاہر ہوئی جس کی ہوا سے، شوق کو شراب کا پیالہ راحت دیتا ہے۔''

علی هواه يود الناس كل هویٰ
من الملاح ومن شمس ومن قمر

''اس کی تمنا کے اوپر لوگ ہر خواہش کو پسند کریں گے، دریا کی ہوا سے اور سورج اور چاند سے۔''

۲۶۸-تفہیم:

دورۃ الایمان کے ارکان کا بیان اور شرح صدر کے دورہ کے احکام

دورۂ ایمان کے ارکان یقین، توحید، محبت، فنا، توکل، عبادت، ذکر اور ان دوروں سے ماخوذ قدریں ہیں۔ اور یقین یہ ہے کہ ان امور پر بھروسہ کرے جن کا اللہ نے آخرت میں وعدہ کیا ہے۔ جس سے اس کے دنیاوی مصائب آسان ہو جائیں۔ اور توحید یہ ہے کہ اللہ کے ساتھ شرک کی تمام وجوہ عبادت، استعانت، ذکر، ذبح اور تاثیر کے لحاظ سے برات کا اظہار کرے اور ان سب کا ذکر ہم تفصیل سے کر چکے ہیں۔ اور محبت یہ ہے کہ جب ہر وہ چیز جس سے وہ لذت حاصل کرتا ہے، کھانے، ازدواجی امور، لباس، اہل وعیال، مال وجاہ وغیرہ اللہ کے غیظ وغضب سے قریب ہو جائیں تو ان کو کمتر جانے اور انہیں ترک کر دے۔ اور فنا یہ ہے کہ تمام کبیرہ گناہوں کو ترک کر دے اور صغیرہ گناہوں پر اصرار سے بچے اور ہر اس لذت سے بچے جس سے اللہ راضی نہ ہوتا ہو اور روش پر قائم رہے۔ اور توکل یہ ہے کہ بدفالی، فساد و بگاڑ، ہامہ محتاجی اور پستی وہلاکت پر اللہ کے فیصلوں کو غالب قرار دے۔ اور عبادات، نمازیں، روزے اور صدقات وغیرہ واجب اور مسنون ہیں اور ذکر مقررہ اوقات کی دعائیں۔

اور ذکر کے بہت سے ابواب ہیں جیسے نمازیں، اور اس کے بعد اور صبح وشام اور سونے کے وقت، بیدار ہونے کے وقت اور نکلنے اور داخل ہونے کے وقت اور مجلس سے اٹھنے کے وقت، سفر کے وقت اور اس سے واپسی کے وقت اور پریشانی وتکلیف اور مرض کے وقت اور استخارہ کے وقت اور نئی نعمت کے حصول یا استعمال کے وقت جیسے لباس، کھانا، مشروب اور قرآن کی تلاوت اس کے معنی کو سمجھتے ہوئے اور رسول اللہ پر درود اور استغفار۔

اور جب آدمی دورۂ ایمان سے دورۂ شرح صدر کی طرف ترقی کرتا ہے، اس کی توحید افعالی ہو جاتی ہے اور اس کو اسماء کا انکشاف باقی رہ جاتا ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **الاحسان ان تعبد اللّٰہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ**

یوں ایک ''احسان یہ ہے کہ اس طرح عبادت کرو گویا تم اللہ کو دیکھ رہے ہو، اگر یہ تصور نہ ہو سکے تو یہ ہو کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔'' اور انقلاب احوال کی قسموں رجاء، خوف، تجلی، پردہ اور اس کے علاوہ سے ہر خطرہ کے موقع پر اس کے ذکر کے ایثار کی محبت کرے جیسا کہ روایت میں ہے۔ انصار میں سے ایک شخص اپنے باغ کے احاطہ میں نماز پڑھ رہا تھا، اس نے باغ کو دیکھا تو وہ بہت خوش ہوا، تب چہار دیواری سے نکل گیا۔ اور فنا ذکر و مراقبہ کی لذت کے سوا ہر لذت کو فنا کرنا ہے حتیٰ کہ اس کے باطن کے اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے کی وجہ سے مناجات میں بھی لذت نہ رہے۔ اور توکل پوری طرح خود سپردگی ہے کہ جس کی وجہ سے اسباب اور عبادت پر سے بھی بھروسہ اٹھ جائے اور ذکر تمام اوقات میں اس کو یاد رکھنا بلکہ دائمی ذکر قلبی ہے۔ اور یہ دونوں دورے احادیث و آثار سے بھرے ہوئے ہیں۔ اور جو ان سے آگے ہے، ان کا ذکر لپیٹ دیا گیا ہے۔

۲۶۹- تفہیم:

مومن صادق اور جس کو دورۂ ایمان صحیح ہو گیا

جس شخص کی اللہ نے شرک، قتل، زنا، چوری، قطع رحمی اور ریاکاری وغیرہ کبیرہ گناہوں اور خواہشات نفسانی کے اتباع، خودرائی، جھوٹ اور بخل وغیرہ مذموم عادتوں سے جو ہلاکت میں ڈالنے والی ہیں، حفاظت فرمائی، اور نماز، صدقات، روزہ اور دعاؤں وغیرہ طاعات کو طیب نفس و بشاشت خاطر سے ادا کرنے اور حسن خلق، صدق و سچائی اور پاکدامنی کی توفیق دی، اور بدعات سے بچایا تو وہ مومن ہے۔ مجھے اس کے ایمان میں کوئی شک نہیں ہے۔ اور اس کے لیے دورۂ ایمان صحیح ہو گیا۔ اگر چہ وہ اپنے مال و اسباب اور اہل و عیال میں مشغول رہتا ہو اور اپنی ذات اور اپنے اعزاء کے لیے غصہ کرتا ہو۔ اور خواہ اس کے نفس کے نزدیک لذت کا حصول پسندیدہ ہو۔ اور جن امور میں اس کی طرف رجوع کیا جاتا ہو ان میں لڑتا جھگڑتا ہو، اور خواہ اپنے اہل و عیال اور مال و اسباب کے فوت ہونے سے روتا اور خواہ دور بینی اور تصرف دشوار ہوتا ہو۔

۲۷۰-تفہیم:

شرح صدر کی بعض جزئیات

شرح صدر کی جزئیات میں سے حال میں ذکا اور تیزی ہے۔ اور میں اس سے یہ مراد لیتا ہوں کہ نفس تاثیر کو اس کے علاوہ کے مقابلہ میں زیادہ قبول کرے۔ اور اس کی طرف اس قول سے اشارہ کیا گیا ہے جس میں کہتے ہیں فلان مستمع "فلاں بہت توجہ سے سننے والا ہے یا بہت سماع کرنے والا ہے۔ اگر تم ان کی کتابوں کو غور سے دیکھو گے تو پاؤ گے کہ ان میں سے بعض سماع کی وجہ سے اچانک مر گئے یا ان کے قلب میں کسی آیت نے اثر کیا تو وہ اچانک مر گیا۔

۲۷۱-تفہیم:

دورۂ حکمت کی بعض جزئیات

دورۂ حکمت کی جزئیات میں سے ازل محض کا ذوق ہے۔ اور وہ اسماء وذات سے علم حضوری ہے۔ اور ہم نے اس کو الگ سے دورہ قرار نہیں دیا۔ اس لیے کہ عین کمال کے اثبات سے درجات کمال ضروری ہیں۔ اور اس لیے کہ یہ ذوق حضوری ہے، اس پر زیادتی نہیں ہوتی۔

۲۷۲-تفہیم:

ازل صرف کا ذائقہ دو بار چکھا

میں نے ازل صرف کا ذائقہ دو بار چکھا۔ ایک بار ارادہ، رحمت، طول، عظمت، حیات اور ہویۃ صرفہ (خالص ذات) کے طریق سے۔ اور ایک بار علم، قدوسیت، سبوحیت اور ذات خالص کے طریق سے۔ علم سے میری مراد عووی ہے اور اس میں راز یہ ہے کہ ہمارے لیے اسماء سلبیہ کی طرف صرف تعینات سے ہمارے جدا ہونے کا طریقہ ہے۔ چنانچہ اول جو جدا ہوتا ہے اس کی جدا شخصیت باقی رہتی ہے، پھر مضمحل ہوتی ہے، پھر یقین واقع ہوتا ہے کہ جدا مشخص کیا ہے۔ پھر برف وقرار آتا ہے کہ وہ اللہ کے علم میں ہمارا وجود ہے۔

۲۷۳- **تفہیم:**

ازل خالص کے ذوق سے بیمار کا شفا نہ پانا

بیمار ازل خالص کے چکھنے سے شفا کیسے پا سکتا ہے جبکہ یہاں نفس توحید کی مغایرت نہیں ہے؟ گویا کہ وہ اجمالی وجدانی فیض ہے۔ چنانچہ اظہار گونگا پن اور بیان چھپانا ہے۔

۲۷۴- **تفہیم:**

کمالوں کے جمع کا کمال

یہ جو کہا جاتا ہے کہ کامل وہ ہے جو دونوں کمالوں کو جمع کرتا ہے۔ اور دونوں چشموں سے سیراب ہوتا ہے۔ پھر اللہ جل سبحانہ اولا اس کے عین میں تجلی فرماتا ہے، ثانیا اس کے نفس میں۔ اور اس مقام پر کئی اصحاب فضیلت انبیاء علیہم السلام پہنچے۔ اور جب یہ کمال شئے کے لیے ثابت ہو جاتا ہے تو نعمت مکمل ہو جاتی ہے اور رحمت عام ہو جاتی ہے۔ اور دونوں باریاں نگہبانی کرتی ہیں۔ اور چشمے شیریں ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ کبریت احمر، سرخ گندھک سے بھی زیادہ قوی اور تیز مشک سے بھی زیادہ خوشبودار ہو جاتے ہیں۔ اس کے لیے کوئی مقام اس سے زیادہ عالیشان نہیں ہوتا۔ اور نہ ہی اس سے زیادہ کوئی قوی دلیل ہوتی ہے۔ اور وہ فضل عظیم اور فوز جسیم ہے۔ اور یہ کمال بھی دورۂ کمال کے جزئیات سے ہے۔

پھر ہمیں معلوم ہوا کہ دورۂ کمال عیب دار عین کی مثالوں پر اسم طالع سے کمال کا نزول ہے۔ اس کی بہت سی قسمیں ہیں جن میں سے سب سے کامل یہ ہے کہ اس کے نفس میں تجلی الٰہی ثابت ہو جائے۔ اور ان میں سے ایک نسمہ کے اضمحلال کی ہیئت ہے، اور ان میں سے ایک نسمہ کی صفائی کی ہیئت ہے۔ اور کبار انبیاء علیہم الصلوٰات والتسلیمات کو جزئیہ اول حاصل ہوتا ہے۔ البتہ کچھ کو دوسرا اور تیسرا ہوتا ہے۔

۲۷۵- **تفہیم:**

ترمذی میں عدی بن حاتم کی حدیث

ترمذی نے عدی بن حاتم سے روایت کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نبی صلی اللہ

علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور میرے گلے میں سونے کی صلیب لٹکی ہوئی تھی۔ آپ نے فرمایا: اے عدی! اس بت کو خود سے الگ کر دو۔ اور میں نے سنا آپ پڑھ رہے تھے "اتخذوا احبارھم ورھبانھم ارباباً من دون اللّٰہ" انہوں نے اپنے احبار اور رہبان کو اللہ کے علاوہ رب بنا لیا۔" آپ نے فرمایا، وہ اپنے احبار و راہبوں کی عبادت نہیں کرتے تھے لیکن وہ جس چیز کو حلال قرار دے دیتے تھے اس کو یہ حلال مان لیتے تھے، اور جس کو وہ حرام قرار دیتے تھے اس کو حرام مان لیتے تھے۔

۲۷٦- تفہیم:

سالکوں کا سلب بحت تک پہنچنا

الا انما ھم للسلوب ظعائن
ومنھم افانین الوجود مبائن

"وہ سلب کے لیے پالکی ہیں، اور ان سے وجود کے انواع واقسام جدا ہیں۔"

وان انت فتشت المقام وجدتھم
الی السلب سیقوا ثم جاء السکائن

"اور اگر تم قیامگاہ ڈھونڈو گے تو ان کو پاؤ گے، کہ وہ سلب کی طرف ہانک دیئے گئے، پھر سکینت کا دور آیا۔"

ویالیت شعری ھل بسلب ھویۃ
تعاط وھل للنفی عین تعاین

"کاش میں سمجھ لیتا کہ کیا سلب کو بھی کوئی ماہیت عطا کی جاتی ہے، اور کیا نفی کی بھی آنکھ ہے جو دیکھتی ہے۔"

تغوصت قاموس الوجود مکررا
وتوجت تیجانا وقید الخزائن

"میں نے وجود کے سمندر میں دوبارہ غوطہ لگایا، اور مجھے تاج پہنائے گئے اور خزانے ساتھ لیے گئے۔"

وكنا غضيض العيش والبصر والمحى
قبيح النوى لما اميط الضعائن

''اور ہم زندگی اور نگاہوں میں متواضع رہے، اور بری نیتیں اور گٹھلیاں ختم ہوئیں جبکہ کجاوے والیاں روانہ کردی گئیں۔''

اديرت كؤوس الصحوصرفا فما بقى
هناک به الامصون وصائن

''بیداری کے گلاس تصرف کے ساتھ گردش میں لائے گئے، وہاں محفوظ اور متقی لوگوں کے سوا کوئی نہیں بچا۔''

دنونا وهبنا فى الدنو مهابة
وفى العلم اجلال وذو الجهل خائن

''ہم قریب ہوگئے کیونکہ قربت میں ہیبت ہے، اور علم میں بزرگی ہے جبکہ جہالت والا خائن ہے۔''

۲۷۷-تفہیم:

بعثت اور ہجرت کے راز

بعثت کا راز جب نظام مرتب سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کمال قرار دیا گیا تو مصلحت یہ ہوئی کہ لوگوں کو تاریکی سے نور کی طرف نکالا جائے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس منصب پر مقرر کیا گیا اور آپ کا کمال، ملکوت میں تجلی فرماتا تھا، اس لیے جبرئیل علیہ السلام کی زبان سے حکم دیا گیا۔ اور آپ کے وزن کا راز صرف اسم الٰہی کے لیے عالم سے آپ کی نسبت ہے۔ تو جب اسم، نفس اور نسمہ میں اتر گیا تو ایسا آدمی آیا جس کی طاقت نہیں رکھی جاتی۔ اور وہ ارشاد کا راز ہے۔ تو اس راز نے قرب کمال میں تجلی فرمائی تو وہ ہزار پر بلکہ سارے عالم پر بھاری ہوگیا۔ ہجرت کا راز یہ ہے کہ جب ابو طالب کی وفات ہوگئی اور مصائب عام ہوگئے تو تولی خالص ہوگیا۔ اہل یثرب میں سے ایک جماعت نے اطاعت اختیار کرلی۔ تب آپ کے دل میں ہجرت کا خیال پیدا کیا گیا۔ رب العالمین نے آپ کی

مراد پوری کی۔ اور آپ پر اپنی نعمت پوری کر دی۔ جہاد کا راز یہ ہے کہ جب شمس ارشاد مکمل ہو گیا تو اس سے مخاصمت اور جہاد کے سوتے پھوٹے اور مصلحت عامہ میں تجلی کی۔ اور اسم نے وسعت اختیار کی۔ اور وہ صفات بشریہ میں نازل ہو گیا۔ بدر کا راز اسم الٰہی میں مصلحت میں چلا۔ اور قبائح نے قتل اور قید کا تصور اختیار کیا۔ اللہ کے دشمنوں کو پچھاڑ دیا اور جس دن دونوں گروہ ملے فرقان نازل ہوا۔ اور تولی مختلف صورت میں آیا تو مصلحت مکمل اور نعمت عام ہو گئی۔ فترت وحی کا راز اس کا زمانہ عین کے نمونوں میں اس کے سرایت کرنے کا زمانہ ہے۔ حتیٰ کہ اس کی طرف لوٹا اور خالص ہوا جس سے سریان شروع ہوا۔

جان لو کہ معراج کا راز یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات انسانی نے آپ کے بدن مطہر کی ہیئت پر جسم کی شکل اختیار کی۔ اور آپ کے کمالات حیوانیہ نے ہیئت براق پر جسم کی شکل اختیار کی۔ اور اللہ نے آپ کے اوپر اپنی نعمت مکمل کر دی تو آپ کو آسمان سے زمین کی طرف نازل ہونے والے نظام مرتب سے بنایا۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ملائکہ سماویہ کے ساتھ مناسبت حاصل ہو گئی۔ تب مناسبت کا حق ادا فرمایا اور ان کی طرف چلایا۔ جہاں تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے شق صدر کا سوال ہے تو وہ آپ کے جسد کمال میں ہوا تھا۔ اور یہ امر اس روایت کے منافی نہیں ہے جو آپ کے بدن مطہر میں شق کے اثر سے متعلق وارد ہوئی ہے۔ اس لیے کہ مثال حوادث خارجیہ کا ایک سبب ہے اور نبی اپنی امت کا اجمال ہیں۔ اس لیے آپ نے فطرت کو اختیار کیا تو آپ کی امت نے بھی فطرت کو اختیار کیا۔ جیسا کہ آدم علیہ السلام کو بھول لاحق ہوئی تو آپ کی ذریت کو بھی بھول لاحق ہو گئی کیونکہ آدم پوری نشاۃ انسانیہ کا اجمال ہیں۔

اور ہم تمہیں اس سے قبل بتا چکے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام نے اپنے نسمہ میں علوم کا تحمل کیا۔ چنانچہ جب علوم ربانیہ متحقق ہو گئے تو ان علوم سے کلی تشخص ہو گیا۔ اور اس طریق سے نماز اور روزہ کے فرض کرنے کا عقدہ حل ہو گیا۔ اور موسیٰ علیہ السلام کا توسط شدید معالجہ اور خفیف استحسان کی جانب سے آپ کے ایک نسمۂ مطہرہ میں کمال کا عکس ہے۔ اور یہ راز وہ ہے جس نے سوال اور جواب کی شکل اختیار کی۔ اور ان کے

اختلاف میں حکم لگایا کہ معراج خواب میں ہے یا بیداری میں؟ جو ہم نے تمہیں بتایا کہ آپ مجسم کمالات ہیں۔ قنوت کا راز بئر مؤنہ کے قصہ میں ہے۔ اور انبیاء صلوات اللہ علیہم جب وہ امی تھے تو ان کے لیے جائز تھا کہ کسی بھی امر میں اپنی طبیعتوں کے مطابق عجلت سے کام لیں۔ اور وہ اس لیے کہ ان کے نزدیک کوئی خاص اسم تمام اسماء میں مضمحل ہے، علیحدہ سے نظر نہیں آتا۔ اور اس لیے کہ تولی کا ایک وزن ہے جس کو سمجھا نہیں جا سکتا۔ اور ان میں سے کچھ فراخی اور ذہانت میں واقع ہوئے، حتیٰ کہ قرآن نازل ہو گیا۔

۲۷۸- تفہیم:

نفس اور عین کی حقیقت

نفس وہ صورت شخصیہ ہے جو اسماء سے ہیولی پر فیضان کرتی ہے۔ اور عین اپنی ہیئت اور وزن پر نفس کا قانون ہے۔ نفس کو عالم تخلیط میں پیدا کیا جاتا ہے۔ اور عام لوگ صرف انواع کے اعیان کا ادراک کرتے ہیں۔ چنانچہ عین نفس سے عام ہے۔ اور تجلی جس پر اعتماد کیا جاتا ہے، اس تجلی سے زیادہ عام ہے جو نفس پر اعتماد کرتی ہے۔

شیخ بہاء الدین نقشبند قدس اللہ سرہ نے اپنے قول لكل مرآة لها وجهان ومرآتي لها ستة وجوه "ہر آئینہ کے دو پہلو ہوتے ہیں اور میرے آئینہ کے چھ پہلو ہیں۔" اور انا احفظ المرآة مذ اربعين سنة لم تكذب "میں آئینہ کو چالیس برس سے دیکھ رہا ہوں۔ اس نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔" سے یہی تجلی مراد لی ہے جو کہ نفس پر ہے۔ اس کے اکثر ثمرات، اشراف اور بعض اقویا ہیں۔ ان کے لیے تصرف اور تسخیر ہوتے ہیں۔

۲۷۹- تفہیم:

اس عالم میں عین کے لیے احکام ہیں جن کو بخت نام دیا جاتا ہے

جان لو کہ اس عالم میں عین کے لیے احکام ہیں جن کو بخت کہا جاتا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہے کہ جس سے جمہور لوگوں نے تجربہ کیا ہے کہ کچھ لوگ اپنے معاش میں سعید ہوتے ہیں اور

کچھ شقی، اور کسی کی معاش میں کشادگی ہوتی ہے اور کسی کی معاش میں تنگی۔ اور ان میں کوئی خوش اخلاق ہوتا ہے اور کوئی بد اخلاق اور کسی کی طرف احکام اس کے امر کی صلاح کے اعتبار سے جاری ہوتے ہیں۔ کوئی اس کے علاوہ ہوتا ہے۔ اور کوئی دعویٰ کرتا ہے کہ اس کو محاوروں اور واقعات پر عبور حاصل ہے۔ کوئی اس طرح کی دوسری باتیں کہتا ہے۔ ان تمام احکام میں تاریکی کی تلبیس پائی جاتی ہے۔ چنانچہ ان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ اور جب اللہ سبحانہ عین کے بالمقابل تجلی فرماتا ہے تو یہ حق ہو جاتے ہیں۔ اور حق یہ ہے کہ ان پر اس طرح اعتماد کیا جائے جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یقین کیا تھا کہ لامحالہ اپنی قوم پر غالب آجائیں گے اور آپ کا دین غالب آجائے گا۔

اور جان لو کہ نفس ناطقہ کے الگ احکام ہوتے ہیں۔ کیا ایسا نہیں ہے کہ کچھ لوگ قوی الفہم، زیرک و دانا اور قوی الہمت ہوتے ہیں جبکہ کچھ اس سے کم ہوتے ہیں۔ اور کچھ قوی الاشراف والعقل تو کچھ اس سے کم ہوتے ہیں۔ اور یہ ہمتیں اور اشرافات کبھی سچی ہوتی ہیں اور کبھی جھوٹی۔ تو بلاشبہ وہ اعتماد کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ چنانچہ جب اللہ سبحانہ اس پر نفس کے بالمقابل تجلی فرماتا ہے، صدق خالص ہو جاتا ہے۔ بندہ میں حوصلہ اور جرأت بیدار ہو جاتی ہے اور اس کو ہمت و تاثیر عطا کر دی جاتی ہیں۔

۲۸۰۔ تفہیم:

علم حق اور اس کی تفصیل

جان لو! اللہ تم پر رحم فرمائے کہ ہمارے نزدیک علم حق وہ ہے جو حال کے ساتھ مشترک ہو۔ اور قرآن ہمارے نزدیک علوم میں سب سے اعظم، اجل بڑی شان والا، انجل وسیع فراخ و کافی ہے۔ جو حال کے ساتھ نازل ہوا ہے۔ اس میں کچھ وہ ہے جو دورۂ کمال کی شرکت سے نازل ہوا ہے۔ اور علم حکمت، علم موعظت، علم فعل خیرات، علم الٰہیات، علم معاد، علم ذکر و دعوات اور علم مقامات اہل کمال ہے۔ اور اس میں وہ ہے جو نبوت کے ساتھ نازل ہوا وہ علم مخاصمت کفارہ، دنیا و آخرت میں مومنوں اور کفار کے جوابوں کا علم، شرع لازمی کا

علم، علم قضا و محاکمات، علم ترغیب و ترہیب اور علم جہاد و ہجرت ہے اور اس میں وہ ہے جو خلافت کی مشایعت سے نازل ہوا۔ وہ علم ملک ہے، جس کی طرف یہ کہتے ہوئے اشارہ کیا گیا إنا فتحنا لک فتحاً مبینا "ہم نے تمہیں فتح مبین عطا فرمائی ہے" اور دو افراد کو منقبت عظمت کے ساتھ مختص کیا گیا ہے۔ ایک ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام۔ اور وہ یہ کہ ان دونوں کی نبوت کو ان کی خلافت میں داخل فرمایا۔ جبکہ یوسف اور داؤد علیہما الصلوٰۃ والتسلیمات کی نبوت کو خلافت میں داخل نہیں فرمایا۔ اور اس کی نشانی یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام کی طرف ملک نہیں بڑھا، سوائے اس کے کہ ریان نے ان کو وزیر بنایا۔ اور نہ ہی داؤد علیہ السلام کی طرف بڑھا، سوائے اس کے کہ جب ان کے ملک کو طالوت نے جالوت کے قتل سے مشروط کیا، کہ ان کو ملک میں شریک کریں گے، اور نہ ہی سلیمان علیہ السلام کی طرف۔ الا یہ کہ ان کو ان کے باپ کا وارث بنایا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وورث سلیمان داؤد "اور سلیمان کو داؤد کا وارث بنایا"۔ جبکہ موسیٰ علیہ السلام کی طرف ملک تولی اور ان لوگوں پر منت کے ارادہ سے بڑھا جو زمین میں کمزور پڑ گئے تھے۔ چنانچہ جب ان کو نبی بنایا گیا تو کفار نے مخاصمت سے کام لیا۔ تب اللہ نے ان کی مدد فرمائی۔ اس طرح ان کو ملک حاصل ہوا۔ اور ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ملک تولی اور اس ارادہ سے بڑھا کہ امت کو قائم کریں گے۔ اور ان کا تزکیہ فرمائیں گے۔ چنانچہ کفار نے پورا زور لگا دیا تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی مدد فرمائی۔ کفر کو مٹایا جس سے ملک حاصل ہوا۔ اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس منقبت اعظم کے ساتھ خاص کیا جس سے بڑی کوئی منقبت نہیں ہے۔ اور وہ یہ کہ آپ کا کمال آپ کی خلافت میں داخل ہو گیا۔ چنانچہ ہم نے شریعت کے لیے اس کی شرح میں جو پایا اس میں یہ بھی ہے کہ نماز کو عید اور جمعہ بنایا۔ اور زکوٰۃ کی تمام اقسام مال سے بنائیں کہ بیت المال میں لائی جائیں۔ پھر ان کو محتاجوں، مولفۃ القلوب اور امام، عمال اور اہل اسلام کے ساتھ شرارت اور مکاری کرنے والوں سے مقاتلہ کرنے والوں کو تقسیم کر دیا جائے۔ اور ابراہیم علیہ السلام کی خلافت نبوت کے ساتھ ملی ہوئی نہیں تھی۔ اگرچہ کمال کے ساتھ ملی ہوئی تھی۔ چنانچہ نقل کیا گیا ہے کہ آپ نے معجزہ ظاہر کیا تو ملک آپ

کی ملکیت سے نکل گیا۔ چنانچہ ملک شام میں یہی ہوا۔ اور اس حکمت کا ماخذ بہت عمیق ہے۔ اس لئے اس کو غنیمت جانو۔

۲۸۱- تفہیم:

نسمی، نفسی اور عینی آثار کا بیان

تم اس وقت تک حکیم نہیں ہو سکتے جب تک آثار نسمی اور نفسی کو اور ان آثار کو جو مشارکت نفس سے حاصل ہوتے ہیں، نہ جان لو۔ اور نفس شرح صدر کے مقامات ہیں اور آثار عینیہ دوسروں سے ممتاز ہیں۔ جبکہ نسمہ کے شعبے ہیں۔ علم اور وہ حال جس میں کوئی علم نہیں ہے۔ اور تیسرا شعبہ وہ حال ہے جو علم پر جمع ہے اور علم تحت قوی حسیہ ظاہرہ و باطنہ ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک اس روح کا حامل ہوتا ہے، جو اس کے ساتھ مختص ہوتی ہے۔ اس کے لشکر ہوتے ہیں۔ وہ قوائے طبیعیہ اور ارواح حسیہ سے اس کی طرف نسبت کے لحاظ سے سلطان کی طرح ہوتی ہے۔ اس کا معدن دماغ ہوتا ہے۔ اور حال تحت قوی الطبیعت اپنے آپ میں مکمل اور غذا جسم کے حوالہ کرنے والا اور امراض کو دفع کرنے والی بنیادوں کا محافظ ہوتا ہے۔ اور اس کی ارواح کا معدن جگر ہوتا ہے۔ اور علم کے ساتھ مخلوط حال قوی المحرک وشجاعت وغیرت ہوتا ہے۔ اور ہم نے جو بیان کیے ہیں، وہ سب نسمہ کے فضائل ہیں۔ یہ علم طبیعی کی نظر ہے۔ پھر شریعت مصطفوی ان میں چلی۔ چنانچہ وہ نتائج برآمد ہوئے جن میں معاد کی صلاح ہے۔ اور بالجملہ کمالات نسمیہ انسان کی اس حالت پر بقا سے عبارت ہیں جس پر اس کی نسمہ کے شعبہ ثالثہ سے تخلیق کی گئی جو شرع کے مطابق ہے۔ اور نفس صورت شخصی ہے جو ہیولی ثالثہ پر فیضان کرتی ہے۔ ہمارے نزدیک وہ ام القوی، عاملات اور عاقلات ہے۔ جب ان کو ان کے جوہر میں رکھا گیا تو ان کی عقل عرفان واشراف ہوگئی اور ان کا عمل ہمت اور تاثیر و تسخیر ہوگئی۔

پھر جب اللہ سبحانہ نے ان پر تجلی کی تو ان کے آثار متحقق ہوگئے۔ اور عین قانون کلی مجرد ہے جو اس کے مطابق ارادہ سے پیدا ہوئی۔ اس کا وجود خارجی اور آثار خارجی ذاتی

واضافی ہوتے ہیں۔ چنانچہ ذاتی تو ظاہر ہیں اور جہاں تک اضافی کا سوال ہے تو کیا ہر موثر متاثر نہیں ہوتا۔ اس میں ایسی خصوصیت ہے جس سے موثر متاثر ہو جاتا ہے۔ اور عین کے لیے اس کے مطابق خصوصیت ہے جس کو عرف عام میں بخت کہا جاتا ہے۔ چنانچہ جب حق آ گیا تو یہ آثار حق ہو گئے۔ اور جس نے حقیقت عین کو نہیں سمجھا، وہ حقائق سے بہت زیادہ نابلد ہے، اور فلاسفہ نے ان کو نہیں سمجھا سوائے اس کے کہ یہ انواع کے اعیان کے حقائق سے ہیں۔ جب انہوں نے دیکھا کہ ان کے لیے ایسے آثار ہیں جو ایک دوسرے سے ممتاز ہیں اور جنت اور جحیم دونوں اس عین کے لیے متحقق ہیں، اور ہر چیز جس کو کرنے والے نے کیا ہے، وہ کسی بھی عالم میں ہو محفوظ ہے۔ اور یہ دوسری حقیقت ہے جس سے لوگ ناواقف ہیں اور ہم ان کو جانتے ہیں۔ اور وہ درحقیقت علم عودی کی مثال سے عبارت ہے، اور وہ ارادہ کی نشاۃ کے لیے آئینہ ہے، یا کوئی مقام اجمال ہے جو چاہیں آپ کہہ لیں۔ اس سے شعاعیں پیدا ہوئیں۔ تفارق بالذات اور تصادق بالعرض اسماء کی فصل کی طرح ہیں۔ چنانچہ اس کی وسعت ارادہ کی وسعت کی مانند ہو گئی۔ چنانچہ قدیم کلی کی حادث جزئی سے شرح ہو گئی۔ اور وہ ظرف حافظ ہے، پھر عین کا بطن اس سے بھر گیا جو اس کے آثار سے پایا گیا۔ اور آثار نفس اور آثار نسمہ اور اضافیات تحقق اخروی میں متحقق ہوئے تو ان میں شامل ان کے خواص ظاہر ہو گئے۔ اور وہ جنت اور جحیم ہیں اور ہمارے لیے دوسری حقیقت ہے جو کہ منبع شریعت ہے۔ اور اسم ہادی سے ہے کہ ہادی حق سے مشابہ ہوتا ہے پھر جب ہدایت نسمہ میں نازل ہو گئی تو وہ فعل خیر ہے۔

۲۸۲-تفہیم:

مجردات کا علم اور اس کی کیفیت

تم عوام سے بحث کرو گے تو دیکھو گے کہ وہ حسائس ظاہرہ یا حس مشترک جو کہ اس کے برابر ہے، کے محسوسات کے سوا کسی کا ادراک نہیں کرتے۔ پھر اگر تم ان سے کہو گے کہ شئے مجرد کا تجریداً علم حاصل کرو تو یہ ان کی طاقت سے باہر ہوگا۔ پھر جب اس سے ترقی ہوگی تو معانی مجردہ تجریداً حاصل ہوں گے۔ جیسے تعظیم، محبت، ڈر خوف اور امید ورجا، بغیر اس کے

کہ زبان سے ان کے بارے میں کچھ کہا جائے یا تخیل کیا جائے تو نفس کسی کیفیت کی طرف جاری ہوتا ہے۔ پھر جاننا چاہیے کہ وہ مدارک نسمہ کی طرف خالص ہو گئے، اور مدارک بدن کو پس پشت ڈال دیا۔ پھر ایک امران کی مدد کرتا ہے تو علم حضوری از سرِ نو خالص ہو جاتا ہے۔ چنانچہ نسمہ کے اس کے مدارک سے جدائیگی کے اوقات ہو جاتے ہیں اور نفس اس علم کے ساتھ مستقل ہو جاتا ہے۔ پھر اگر آدمی مجذوب ہوتا ہے تو اس کا تقرر، تقررِ حق میں مضمحل ہو جاتا ہے جس سے وہ لذت حاصل کرتا ہے۔ اور بعد میں صرف اس کے وجود اور جسموں میں ہوتا ہے، پھر ایک امران کی مدد کرتا ہے تو اس کے ادراک سے عین مستقل ہوتا ہے۔ اور علم نفس کو اس کے پیچھے چھوڑ دیتا ہے۔ اور وہ ذوق ہے۔ پھر اس کے ادراک سے لاہوت مستقل ہوتا ہے۔ اور ارادہ کی سطح وہ ہوتی ہے جس کی تشبیہ ہم نے ہیولی سے دی ہے۔ اور وہ ذوق ازل محض ہے، پھر اس کے بعد کمال ہوتا ہے۔

۲۸۳-تفہیم:

قیامت کے قریب اہل نصرانیت کی طرف سے مسلمانوں پر سخت آزمائشیں آئیں گی

جان لو کہ قیامت کے قریب فتنہ وفساد اور بگاڑ ہوگا۔ اور ذوق سے جو نتیجہ برآمد ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ روم مرتد ہو کر کفر کی طرف لوٹ جائے گا۔ اور نصرانیت پھیلائے گا اور دین اسلام مدینہ کی طرف سمٹ جائے گا جیسا کہ اس سے نکلا تھا۔ پھر دوبارہ مہدی کے عہد میں قسطنطنیہ کو فتح کیا جائے گا۔ اس طرح تین علامتیں ظاہر ہوں گی۔ اور روم کے اہل نصرانیت اور ان کے اتحادیوں کی طرف سے قیامت کے قریب مسلمانوں پر شدید آزمائشیں آئیں گی "اعاذنا اللّٰہ سبحانہ" اور کیا میں بتاؤں کہ نصرانیوں نے شوکت کے ساتھ اپنے اس قول کو کیوں مختص کیا کہ انا حزب عیسی بن مریم 'ہم عیسیٰ بن مریم کے گروپ کے لوگ ہیں۔' حالانکہ وہ اپنے اس دعویٰ میں جھوٹے ہیں۔ اور اسباب عیسیٰ علیہ السلام کے ظہور پر مطابق آگئے۔ چنانچہ باطل کے زمانہ میں ان میں بنیادی کمزوری ظاہر ہو جائے گی۔

۲۸۴- تفہیم:

سیدنا و مولانا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم کی اقسام کا بیان

سیدنا و مولانا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم سے لاحق ہونے والی تقسیم ان کی چند قسمیں کرتی ہے۔ اول شریعت کی سنت کا علم۔ اور اس قسم کی تاویل یہ ہے کہ تم علم تجدید کو جان لو۔ اور وہ چند قوانین کی طرف رجوع کرتا ہے جن کی پابندی نشاط میں پوری طرح اور جبہ جبر کی حالت میں کافی حد تک ضروری ہے۔ پھر جیسا کہ مجھے ثابت ہوا ہے۔ بندوں کے عذروں میں رخصت بھی لازمی ہے کہ دین کی اصل کی طرف دیکھے اور اس پر قائم رہے اور تجدیدات کی طرف دیکھے۔ اور تبدیلی کر لے اور شئے کے دواعی اور اس کے مکملات کی طرف دیکھنا ضروری ہے کہ اگر وہ حرام ہے تو یہ مکروہ ہیں اور اگر وہ واجب ہے تو یہ مندوب ہیں۔ اس میں جو کچھ ہے وہ اللہ کے امر کی تکمیل اور اس کی تثبیت ہے۔ اور اس کی نعمت کے لیے تیاری ہے۔ چنانچہ وہ ہدایت ہدیۂ صالح ہے۔ اور جس کی طرف اس کے نفس کی وسعت کے لحاظ سے وقار کا فیضان ہوا اور اس کے نفس میں اس کو بڑا کیا تو وہ ہدایت صالح ہے۔ اور جو امر بھی تمہیں تمہارے غیر کی دشمنی اس کی بدخواہی سے گھریلو یا شخصی یا اقلیمی مصلحتوں کے بگاڑ سے روکے اور راہ راست پر غور و خوض کرے تو وہ ہدایت صالح ہے۔ پھر یہ کہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوامر اور نواہی میں حکمتوں اور علتوں کا علم رکھتے ہو۔ اور ان کو ان قوانین کی طرف لوٹاتے ہو، اور حکم اور حدود اور ان میں جو کمزوریاں ہیں، ان کے اظہار میں نبوت علی اهلها الصلوات کی زبان کو سمجھتے ہو۔

دوسرے مواعظ و حکم اور ترغیب و ترہیب کا علم ہے۔ اور اس کی ترغیب و ترہیب دو اصلوں کے درمیان چکر لگاتی ہیں کہ اگر عمل بنفسہٖ اصل ہوتا ہے تو دنیا اور آخرت میں اس کے محاسن یا قبائح کو بیان کرتا ہے اور اگر کسی غیر کے لیے تکمیل یا ان آداب سے جن کو اچھا یا قبیح سمجھتا ہے اور ان دونوں کا اپنا رنگ ہوتا ہے۔ نمبر ایک ضرب الامثال یا محاورہ جیسے قرآن کے قاری کی مثال لیموں جیسی ہے۔ دوسرے تشبیہ اگرچہ ادنیٰ علاقہ سے ہی ہو، جیسے صلوٰۃ

اشراق والی حدیث۔ تیسرے مدح، فلاں آدمی کیسے اچھے عمل کرنے والا ہے۔ یا جس نے یہ سب کام کئے وہ بہت برا ہے۔ چوتھے ایسے شخص کی حکایت جس نے یہ عمل کیا تو اس کو بخش دیا گیا۔ یا پانچویں خوش بیانی کہ جس نے ایسا اور ایسا کیا وہ جنت میں داخل ہوگا اور جس نے ایسا اور ایسا کیا وہ جہنم میں جائے گا۔ اور آپ کے مواعظ مثالیں ہیں جو دنیا سے بیزار کرتی اور عمل اور بھلائی کے ساتھ احتساب میں میانہ روی پر ابھارتی ہیں۔ خواہ وہ تھوڑا ہی کیوں نہ ہو۔ اور شر خواہ معمولی ہی کیوں نہ ہو۔ اور اس علم کا حکم ہمیشہ حسن اخلاق اور نادر تجربات کے اظہار کا ہے۔

تیسرے علم دعوات (دعاؤں) کی تاویل دو اصلوں کے درمیان رہتی ہے۔ ایک ان صیغوں کا عرفان جن کے ذریعہ دعا کی جاتی ہے۔ اور وہ دس ہیں جیسا کہ ہم نے تمہیں دوسرے مقام پر بتایا ہے۔ اور دوسرے دعا کے اوقات کا عرفان اور وہ بیس ہیں۔ اور بات کے آداب اور احکام کی معرفت کے باب کی تکمیل۔

چوتھے علم مناقب اور ان میں بہتر آدمی کے اندر نجات دینے والی یا ردی صفات کا ادراک اور شاذ و نادر طور پر وحی اور جنت میں اپنا مقام دیکھنا وغیرہ ہے۔

پانچویں فتن و معاد اور ان میں پائے جانے والے امور کا علم ہے اور وہ علم کبیر الشان ہے۔ ہم نے اس کو خاص قرار دیا ہے۔ اور اس کا ذکر الحجۃ البالغہ میں کیا ہے۔ جس میں دیکھنے والوں کے لئے بہت سامان ہے۔

چھٹے علم سیر و تاریخ ہے۔ اور اس کی تاویل یہ ہے کہ تم ان صورتوں کو جان لو۔ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی علیہ السلام کی ذمہ داری کبھی غزوات میں لی اور کبھی دوسرے واقعات میں۔

ساتویں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کمال اخلاق کا علم ہے۔ اور وہ آپ کے شرح صدر کے آثار اور معجزات جزئیہ اور آپ کے اس نور کے آثار ہیں جو آپ کے نفس کے مدمقابل ہے۔ اور معجزات کلیہ آپ کے اس نور کے آثار ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عین کے مقابل ہے۔

۲۸۵- تفہیم:

ہر آدمی کی تخلیق فطرت کی ایک خاص ہیئت پر کی گئی ہے اور اس کو درجۂ کمال بعینہٖ اس میں حاصل ہوتا ہے

حضرت حق تبارک وتعالیٰ نے ہر شخص کی تخلیق ایک خاص ہیئت پر فرمائی ہے۔ اس شخص کی فطرت کی صفائی اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ وہ اس ہیئت پر قائم رہے۔ اس لیے کہ جو شخص سخاوت اور فیاضی پر پیدا کیا گیا ہے، اس کا کمال یہ ہے کہ فیاضی وسخاوت کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی مرضی میں استعمال کرے۔ اور عثمان رضی اللہ عنہ اسی طرح تھے۔ اور کبھی ایک شخص کی تخلیق حدت اور حرص وبخل پر ہوتی ہے۔ تو اس کا کمال یہ ہے کہ امر معروف اور اشاعت امر اللہ اور اس پر سختی میں حدت سے کام لے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایسے ہی تھے۔ اور کبھی اس کی ذکاوت وقت ذہن سے موصوف ہوتی ہے، اور اس کا کمال رسوخ فی العلم ہوتا ہے۔ ایسے علی رضی اللہ عنہ تھے۔ اور کبھی تقلید اور سلامتی ذہن سے متصف ہوتا ہے، اور اس کا کمال صدیقیت ہوتا ہے۔ ایسے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے۔ اور بالجملہ اللہ کی خلقت میں تبدیلی محال ہے۔ اور ہر شخص کا کمال اس کی جبلت کے مطابق ہی ہوسکتا ہے۔ غالباً طلب کرنے والوں کی نایابی اس سبب سے ہے کہ وہ کسی صفت سے مجبول ناواقف ہوتے ہیں۔ اور اپنے کمال کو دوسری صفت میں طلب کرتے ہیں اور یہ محال ہوتا ہے۔

۲۸۶- تفہیم:

حضرت عمرؓ کا حجر اسود کو استلام اور اسکے بارے میں آپ کا مشہور قول

ہم تک یہ بات پہنچی ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ نے جب حجر اسود کا استلام کیا تو فرمایا جان لے کہ تو ایک پتھر ہے، نہ تو کوئی نفع دے سکتا ہے اور نہ ہی ضرر پہنچا سکتا ہے۔ اور اگر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تجھے استلام کرتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا تو میں تجھے کبھی استلام نہ کرتا۔ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا وہ نفع بھی دیتا ہے اور ضرر بھی پہنچاتا ہے۔ وہ استلام کرنے والے

اوراس کوترک کرنے والے کے بارے میں شہادت دے گا۔تو یہ اختلاف مقامات کے اختلاف کی طرف راجع ہوتا ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ کا مقام شریعت کی تحریف سے حفاظت کرنا ہے۔اس لیے آپ نے یہ بات بت پرستوں اوران کے قبیل کے لوگوں پر رد کرتے ہوئے فرمائی تاکہ سنت کواس کے غیر محمل میں محمول کرنے سے بچا جائے۔اور علی رضی اللہ عنہ کا مقام عالم میں پوشیدہ اسرار کی معرفت کی طرف راجع ہوتا ہے۔اس لیے آپ نے یہ جان لیا کہ حجر اسود پر ایک ہیئت حیوانیہ فیضان کرتی ہے۔اوراس کی طرف اس قول سے اشارہ کیا گیا ہے کہ"وہ جنت سے آیا ہے" اس طرح اس ہیئت سے وہ قیامت کے دن انبیاء کی طرح شہادت دینے والا ہوگا۔

۲۸۷۔تفہیم:

حضرت ابوبکر وعمر کے امت مرحومہ میں سب سے افضل ہونے کے معنی

ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سب سے افضل ہیں۔اور فضل کے معنی یہ ہیں کہ اللہ سبحانہ نے جب انبیاء علیہم الصلوٰات والتسلیمات کے سینوں میں ارشاد وہدایت کے لیے تجلی فرمائی تو لامحالہ اس تجلی کے واسطہ سے ان کی امت میں سے حواریوں کے سینوں میں دین کی اقامت اوراس کو چلانے کی تجلی فرمائی۔اوراس تجلی کا اثر مسلمانوں کی نصرت اور کافروں کوذلت،رسوائی اور ہلاکت پر ہمت کا جمع کرنا ہے۔چنانچہ ان کے درمیان فضل اسی معنی کے لحاظ سے ہے کسی اور معنی کے لحاظ سے نہیں ہے۔اور ہم جب اس حکمت کی تعبیر علم ظاہر والوں کی زبان میں کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ وارد ہوا ہے۔ سب سے افضل شخص وہ ہے جولوگوں کونفع پہنچاتا ہے۔اوراشاعت دین وحق سے زیادہ مکمل نفع کیا ہوسکتا ہے۔اس لیے کہ دین کا معاملہ صرف اہل الرائے سے مکمل ہوتا ہے۔ان کی مثال وزراء جیسی ہے کہ سلطنت ان کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔اور وہ امت میں سب سے افضل ہوتے ہیں۔اوران کی شان وزراء جیسی ہوتی ہے کہ وہ قوم میں سب سے افضل ہوتے ہیں۔اگرچہ قوم میں ان سے زیادہ علم والے،ان سے زیادہ عقل مند وذہین اور شریف الاصل ہوتے ہیں۔

۲۸۸۔ تفہیم:

صحابہ میں سے بشارت کے لیے دس کو مختص کرنے کی وجہ

کیا تم سمجھتے ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ میں سے بشارت کے لیے دس افراد کو ایک حدیث میں کیوں مختص کیا۔ اور ان میں کون سا امر مشترک و جامع ہے جو کسی اور میں نہیں پایا جاتا۔ میں کہتا ہوں قریشی اپنے نسب کی نجابت سے نجیب الاصل ہیں، اسلام کے معاملہ میں سخت ہیں، قدیم الاسلام ہیں، انہوں نے رسول اللہ کی طرف اس وقت پیش قدمی کی جب لوگوں نے آپ سے منہ پھیر لیا تھا، اور آپ کا ساتھ دیا، وہ آخری سانس تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کرتے رہے حتیٰ کہ کلمۃ اللہ بلند ہو گیا۔ اور امر اللہ غالب آ گیا۔ اس طرح یہ تینوں امر ایسے ہیں جو انہی دس حضرات کے ساتھ خاص ہیں۔ ان کے علاوہ کسی میں نہیں پائے جاتے۔

حمزہ رضی اللہ عنہ نجیب اور قدیم ہونے کے باوجود اس کے غلبہ کے مشاہدہ کے وقت تک باقی نہیں رہے۔ اور عباس رضی اللہ عنہ قدیم الاسلام نہیں تھے۔ اور عمار و بلال رضی اللہ عنہما کے قدیم الاسلام ہونے اور غلبہ کے مشاہدہ تک رہنے کے باوجود اسلام نے ان میں نجابت والی گرمی پیدا نہیں کی۔

۲۸۹۔ تفہیم:

مفسرین کے اختلاف کی وجوہ و اسباب

مفسرین کے درمیان بہت سے امور میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ہم نے جب ان کے اقوال میں غور و فکر کیا اور ان کو گہری نظر سے دیکھا تو ان کو چند اقسام پر مشتمل پایا۔ ان میں ایک قسم غرائب قرآن کی شرح ہے۔ اور اس میں ان کا اختلاف لغت عرب میں تتبع اور ان کے استعمال کی طرف راجع ہوتا ہے۔ چنانچہ ہر شخص نے کلمہ کی تفسیر اس معنی سے کی جو ان کے محاوروں کے تعلق اور سیاق و سباق کی دلالت سے اس کے نزدیک ثابت ہوا۔ اور ان میں

سے ان کی قرأت کا اختلاف بھی ہے جو عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں قرآن کے جمع کرنے سے پہلے سے پایا جاتا تھا جو سات حرفوں کے جواز کی طرف راجع ہوتا ہے۔ اور زیادہ پسندیدہ امر یہ ہے کہ سات حروف جمل متقاربہ سے ایک ہی معنی کی تعبیر ہیں۔ جیسے قل یایها الکفرون اور قل للذین کفروا اور قل للکافرین اور جیسے قل هو اللّٰه احد اور انا الاحد الصمد، الذی لم الد اور قرآن کے جمع کے بعد پر اختلاف فاحش سے جو ملت ہونے سے نکالنے والا ہوتا، دین کی حفاظت کے لیے باقی حروف کے اسقاط پر متفق ہو گئے، جو تلفظ کے اختلاف تفخیم، امالہ، روم اور اشمام کی طرف یا تلفظ کے اس اختلاف کی طرف جو مصحف عثمان میں لکھا گیا۔ اور ان میں ان کا شان نزول میں اختلاف بھی ہے۔

اور میرے نزدیک حق یہ ہے کہ یہ اجتہاد اور استنباط کی وجہ سے ہے۔ اور یہ اس طرح ہے جیسے ہم نے قدیم وحدیث یہود کو دیکھا کہ وہ نسخ کا انکار کرتے ہیں۔ اور آیت ان کے قصوں میں ہمارے یقین کو بڑھانے کے لیے ہے کہ وہ ان کے شر کو دفع کرنے اور مسلمانوں کو اس میلان سے روکنے کی غرض سے جو ان کے کانوں میں شکوک پڑتے ہیں، نازل ہوئی ہے۔ اور جس پر یہ ظاہر ہو گیا، اس کے لیے یہ ممکن ہو گیا کہ آیت میں توجیہہ پائی جائے۔ اور سیاق وسباق کے ملاحظہ کے بعد اس کی شان بیان کی جائے۔ بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ ان متاخرین کی رائے ہو جنہوں نے اصول وسیر اور حدیث کی بنیادیں رکھنے کے بعد ان متقدمین کی رائے سے زیادہ موکد اور مستحکم کرتے ہوئے اپنی رائے قائم کی جو علوم اور فنون کی بنیاد رکھے جانے سے پہلے تھے۔

اور ان میں سے ان کا نسخ میں اختلاف ہے۔ اور میرے نزدیک حق یہ ہے کہ یہ اجتہاد اور استنباط سے ہے۔ اور اس لیے ائمۃ الاصول نے کہا ہے کہ ان کے قول پر نسخ کے سلسلہ میں سختی سے یقین نہیں کیا جا سکتا۔ حتیٰ کہ حال کا واضح ہونا بیان نہ کر دیں۔ اور یہ ظاہر نہ کر دیں کہ پہلی آیتیں فلاں دن اور دوسری فلاں دن نازل ہوئیں۔ جس سے دل پوری طرح مطمئن ہو جائے اور ان کے یہ کہنے کا مطلب کہ یہ آیت اس سلسلہ میں نازل ہوئی یہ ...رت ان تمام امور میں سے ہے جن پر یہ آیت دلالت کرتی ہے۔

۲۹۰-تفہیم:

حقائق پر مشتمل اشعار بہت ہیں

الا کل شئی ماخلا اللّٰہ زائل

وکل وجود دون مجلاہ باطل

''واضح ہو کہ اللہ کے سوا ہر شئے زائل ہونے والی ہے، اور اس کی شان و عظمت کے سوا ہر وجود باطل ہے۔''

ولیس نظام الرشد دون ظھورہ

یتم ولا نظم التحقق کامل

''اور اس کے ظہور کے بغیر نہ رشد کا نظام مکمل ہوتا ہے، اور نہ ہی تحقق کا نظم کامل ہوتا ہے۔''

تجلی علی الساعیر طورا وتارۃ

علی الطور ثم العین فی العرب مائل

''ساعیر پہاڑ پر تجلی قریب ہوتی ہے اور کبھی طور پر ہوتی ہے، پھر عرب میں عین مشابہ ہوتی ہے۔''

اری کل تنویر بنور کانہ

سماء من الارشاد للخلق شامل

''میں ہر نور کو ایسے نور سے دیکھتا ہوں کہ گویا وہ رشد و ہدایت کا آسمان ہے، جو مخلوق کے لیے چھایا ہوا ہے۔''

اذا ما یحاذی الشمس رأسک فی الضحی

فقد فزت بالمقصود والکل حاصل

''جب سورج چاشت کے وقت تمہارے سر کے اوپر آجاتا ہے، تو تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتے ہو اور سب کچھ حاصل ہو جاتا ہے۔''

يظل به العبد الضعيف مضلعا
ويصبح بحر العلم من هو جاهل

''اس سے کمزور بندہ سایہ پاتا ہے، اور جو جاہل ہوتا ہے وہ بحرالعلوم بن جاتا ہے۔''

كثوب على شكل الليوث نسيجه
يصول كما صال الهوى المتداخل

''اس کپڑے کی طرح جس کی بنائی شیروں کی شکل میں ہے، ایسے چلتا ہے جیسے تیز ہوس حملہ کرتی ہے۔''

فان ذهب الشئى الدخيل بوجهه
فلا لم حيوان ولا لم صائل

''اگر اس چہرے میں داخل ہونے والی شئے جاتی رہے، تو پھر نہ وہاں حیوان رہتا ہے اور نہ ہی حملہ کرنے والا۔''

ولست ارى ركن الركانة دونه
ومالم من امر تجشم عامل

''اور میں نے اس سے زیادہ کوئی وقار نہیں دیکھا، اور پھر کوئی امر ایسا نہیں ہے جس کو کرنے والے نے ایسی مشقت سے کیا ہو۔''

حيانا هدى نورا على العين قائماً
لا سراره متن النسيمة حامل

''ہمیں بطور نور ہدایت زندہ رکھا، عین پر قائم رکھا، پاک روح کا متن اس کے اسرار کا حامل ہے۔''

ولا بد هذا النور ثلج وفسحة
وشرح وافصاح و بالعلم نازل

''اور لازمی طور پر یہ نور خوش کن اور کشادہ ہے، اور شرح ہے اور فصیح ہے اور علم کے ساتھ نازل ہوا ہے۔''

ولا بد ارهاص لمعناه شارح
وللحق تفسير عن الحيف مائل

"اور لازمی طور پر بنیاد ہے اس کے معنیٰ کا شارح ہے، اور حق کے لیے تفسیر ہے، ظلم وزیادتی سے اعراض کرنے والا ہے۔"

ومن بعده یاتی المسیح فانه
إلی سره یهدی بما قال قائل

"اور اس کے بعد مسیح آئیں گے کہ، کہنے والے نے ان کے راز کی طرف رہنمائی کی ہے۔"

اتانا وهنانا العلوم صنوفها
هنیئا لکم قیدت إلیکم جلائل

"ہر قسم کے علوم ہمارے پاس آئے اور ہمارے لیے مبارک ہوئے، تمہارے لیے مبارک ہوں کہ تمہاری طرف بزرگی اور عظمتوں کو روانہ کر دیا گیا ہے۔"

فثلث اطواد العلوم بساحتی
رسوخ وتاویل وعلم عنابل

"علوم کی تین قسمیں میری کمائی ہیں، علوم یقین، تاویل اور علم عنابل حدیث وروایات۔ (عن بل)"

علمنا بتنجیم وعلم عرافة
وسر من الاسرار للکل ذاهل

"ہمیں علم نجوم اور علم عرافہ سکھایا، جو ہر غافل کے لیے ایک راز ہے۔"

فهمنا لسان الناس فی کل طبقة
إذا دار فیما بین قوم مسائل

"ہم نے ہر طبقہ کے لوگوں کی زبان کو سمجھ لیا، جو قوم کے درمیان مسائل کا دور ہوا۔"

رحلنا وخلفنا العلوم بغربة
تنوح کما ناحت نساء ثواکل

"ہم نے کوچ کیا اور غربت میں ان علوم کو چھوڑ دیا کہ وہ اسی طرح واویلا کرتے ہیں، جیسے وہ عورتیں روتی اور نوحہ کرتی ہیں جن کا بچہ گم ہو جائے۔"

تخلصت جدا من تخاليط ذا الورى
وسرت إلى الرحمن والجودها طل

"میں نے لوگوں کے میل جول سے بالکل تخلیہ اختیار کر لیا، اور رحمٰن کی طرف چلا اور جودوکرم کی بارش ہوئی۔"

ذهبنا إلى اقصى الوجود اعمه
تفوز به كالفاعلات القواہل

"ہم وجود کی انتہا کی طرف گئے جو سب سے زیادہ عام ہے، ہم اس سے ایسے کامیاب ہوئے جیسے بچہ جننے والیاں کامیاب ہوتی ہیں۔"

هو البحر لا قعر ولا ساحل له
احطت به خيرا بما نال نائل

"وہ ایسا سمندر ہے جس کی نہ کوئی تھاہ ہے نہ ہی کنارہ، میں نے اس کا اس طرح بھلائی سے احاطہ کیا جیسے مقصد کو حاصل کرنے والے کرتے ہیں۔"

شهدت تداوير الوجود جميعها
تدور كما دار الرحى المتمائل

"میں نے وجود کے تمام ادوار کو دیکھا، ایسے گھومتے ہیں جیسے جھکی چکی گھومتی ہے۔"

نظرت إلى الشخص الكبير كانه
إذا قيس للشخص الصغير مشاكل

"میں نے بڑے شخص کو ایسا دیکھا، جیسے چھوٹے شخص کی شکلوں پر قیاس کیا جاتا ہے۔"

قوى ثم افعال تكون بحسبها
تحول اياها القوى والهياكل

"قوتوں کے مطابق ہی افعال ہوتے ہیں، انہی کی طرف قوتیں اور ہیکل پلٹتے ہیں۔"

رايت نظاما ليس يعصم سلكهٔ
وإن قال بالانفصام والخرق عائل

''میں نے ایسے نظام کو دیکھا کہ اس کی ڈوری محفوظ نہیں رہتی اگرچہ کہا کہ ٹوٹنا اور جدائی محتاج ہیں۔''

فشافتها ان العروج متمم
فلا بأس ان كانت ستور وحائل

''اس کی شفافیت یہ ہے کہ عروج مکمل ہے، اس لیے کوئی حرج نہیں ہے اگر پردے اور رکاوٹیں ہوں۔''

تربصنا ودارينا الانام بوضعهم
فطابت مراقينا وطاب الشمائل

''ہم نے انتظار کیا اور مخلوق کے گرد ان کی وضع کے مطابق گھومے، تو ہمارے پیٹ اور جسم اچھے ہو گئے اور ہماری عادتیں اچھی ہو گئیں۔''

وقال لنا انا ظهرنا بمظهر
فمن لم يطعنا فيه ماهو عادل

''اور ہم سے کہا ہم نے ایک مظہر کو ظاہر کر دیا، تو اس میں جو ہماری اطاعت نہیں کرتا وہ عادل نہیں ہے۔''

نقوم على العهد القويم وان نوت
من القلب افزاع ونادت وصائل

''ہم عہد پختہ پر قائم ہیں، اگرچہ دل سے گھبراہٹ اٹھی، اور جوڑوں نے پکارا۔''

وعندى علوم لا يكاد يقلها
سماء ولا برو بحر وساحل

''اور میرے پاس علوم ہیں جن کو، نہ آسمان برداشت کر سکتے ہیں، نہ بحر و بر اور نہ ہی ساحل۔''

ويرجو ولي الله رحمة ربه
وفضلا لانواع العطا هو شامل

''اور ولی اللہ اپنے رب کی رحمت کی اور فضل کی امید رکھتا ہے جس میں مختلف قسم کے عطا شامل ہیں۔''

۲۹۱-تفہیم:

حقیقت اور مجاز کے درمیان مطابقت کا مسئلہ

میں نے خواب میں دیکھا کہ اکابر امراء میں سے ایک شخص مجھ سے حقیقت اور مجاز کے درمیان مطابقت کے سلسلہ میں سوال کر رہا ہے تو میں نے کہا جب کسی نے قسم کھائی کہ وہ فلاں کے گھر میں قدم نہیں رکھے گا تو طرفین کے نزدیک اس پر لازم ہے کہ اس میں داخل نہ ہو، نہ پیدل اور نہ ہی کسی سواری پر سوار ہو کر۔ مگر حنفیہ کہتے ہیں کہ یہ عموم مجاز ہے۔ اور شوافع کہتے ہیں کہ یہ حقیقت اور مجاز کے درمیان جمع و مطابقت ہے۔ اس سے وہ بہت زیادہ خوش ہوا۔ اور اس خواب کا راز یہ ہے کہ اولیاء اگرچہ کہتے ہیں کہ ہم نے ترقی کر لی اور ہمارے لیے حقیقت اور مجاز کے درمیان جمع و مطابقت ممتنع نہیں ہے۔ پھر بھی ان میں سے کوئی بھی اصحاب دولت وثروت کے گھروں میں قدم نہیں رکھتا۔ اور جو لوگ حقیقت اور مجاز کے درمیان جمع و مطابقت کو ممنوع قرار دیتے ہیں، ان کے نزدیک امر زیادہ ظاہر ہے۔

۲۹۲-تفہیم:

سالک کی تشویش کے موجبات، ان کی اقسام اور معالجات

سالک کو سلوک کے دوران تشویش لاحق ہوتی ہے۔ کچھ ایسا غم ہوتا ہے جس کا کوئی سبب معلوم نہیں ہوتا۔ پریشانی اور تنگ دلی محسوس کرتا ہے جس کی وجہ سے اپنی منزل پر نہیں پہنچ پاتا۔ اس کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ تشویش کے اسباب، اس کی اقسام اور علاج کے بارے میں غور و فکر کرے۔ ہم کہتے ہیں کہ اس کی دو وجہیں ہوتی ہیں۔ یہ حالت یا تو اللہ تعالیٰ

کے بارے میں فنا سے پہلے ہوتی ہے یا فنا کے بعد۔ فنا سے میری مراد نفس ناطقہ کا اللہ تعالیٰ کے رنگ میں رنگ جانا ہے۔ جیسا کہ ہم کئی بار بیان کر چکے ہیں۔

وجہ اول یہ ہے کہ تشویش فنا سے پہلے ہوتی ہے جو اکثر ہوتا ہے۔ اس کی چار قسمیں ہیں۔ ایسا کبھی محبت اور شوق کے فساد سے ہوتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ سرمایہ، نشاط اور اس کی بقا ہے لیکن وہ اللہ تعالیٰ کی ذات میں ہوتا ہے، کسی غیر میں نہیں۔ وہ عروج میں سبب ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی ذات میں اس کے انحصار سے فنا متحقق ہوتی ہے۔ چنانچہ بعض سالکوں کو ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ ریاضت بھاری پڑتی ہے۔ بھوک و پیاس لگتی ہے، اور اس ذات کے لیے حبس نفس ہوتا ہے جس سے ایک بار انسیت ہو چکی تھی۔ چنانچہ انقباض ہوتا ہے اور اس کو جو شوق و محبت تھا، وہ تشویش اور غم میں بدل جاتا ہے۔ اور وہ نہ اس تبدیلی کو محسوس کرتا ہے، نہ اس کے سبب کو۔ اور علاج یہ ہے کہ لگام کو ان مباح اشیاء کی طرف ڈھیلی چھوڑ دے جن کی خواہش ہو اور حبس و ریاضت کو اس وقت تک کے لیے چھوڑ دے جب تک کہ نشاط لوٹ نہ آئے۔ پھر توحید محبت کی جہت سے نفی و اثبات کی تکرار سے شوق کی تحصیل نئے سرے سے شروع کرے اور نشاط کی حفاظت کرے، اس کو باقی رکھے اور اللہ تعالیٰ کی ذات پر دھیرے دھیرے انحصار کرے، پھر فنا کی راہ اختیار کرے۔

اور کبھی اس میں بقیۃ النفس اور اس کی ظلمات باقی رہتی ہیں اور سالک کے جوہر میں ایسی ذکاوت ہوتی ہے کہ اپنے نفس کے لیے شہوت مخصوص کی طرف میلان مخصوص نہیں پاتا۔ لیکن خلود نفس کی جانب سے اس کے عالم کی طرف اس کے لیے ظلمت اجمالیہ دیکھنے کے درپے ہوتا ہے اور اس دقیقہ کو نہیں سمجھتا۔ چنانچہ حیران و پریشان رہتا ہے۔ اور اس کے نفس کو تاریکی ڈھانپ لیتی ہے اور اس پر تاریکی کی طرف سے غم و یاس غالب آجاتی ہے۔ اور وہ نہیں جان پاتا۔ اور اس کا علاج کسر نفس ہے۔ خواہ تزکیہ کے ذریعہ ہو یا تصفیہ کے ذریعہ۔ اور جس کے مزاج میں شدت ہو اور اس کی صورت مزاجیہ کی دو تدبیر کرنے والی ہو اور اس کے لیے وہ تزکیہ تلاش کرتا ہے تو ایسے امور چن لیتا ہے جن میں ذلت و رسوائی ہوتی ہے۔ جاہ و مرتبہ کی فنا اور مال کا خاتمہ ہے۔ اور اس تلاش کا نصاب یہ ہے کہ اپنے نفس پر سختی

سے کام لے اور اس پر بوجھ ڈالے۔ اور اس کے لیے انقباض اور کراہت محسوس کرے۔ اور جس کی صورت ضعیف ہوگی۔ اس کے مزاج کی اصلاح ہوگی۔ چنانچہ اس کے حق میں بہتر تصفیہ ہے۔ اس لیے کہ یہ ظلمت وتاریکی کمزور ہے۔ اس لیے اس کی تفصیل نہیں پاتا۔ تو ذکر دائم سے مضمحل کرے اور خلوت اس کی شرائط کے ساتھ کرے۔

اور کبھی سالک کی طبیعت میں تشویش جبن بزدلی وکمزوری کی وجہ سے ہوتی ہے۔ وہ طول مسافت کو ملاحظہ کرتا ہے اور طریق کے بعد مایوس ہوجاتا ہے۔ اور راس المال کو ترک کر کے اپنے نفس پر فیاضی ونرمی نہیں کرتا۔ چنانچہ ایسے غم میں مبتلا ہوتا ہے جس کا بیان طول کا متقاضی ہے۔ اور علاج یہ ہے کہ اس کی طرف مرغوبات ڈال دیئے جائیں، اور اس سے ایسا وعدہ کیا جائے کہ اس کے مقصود کا حصول جائز ہو، اور امید افزا حکایات سنے۔ اور اپنے حال کو اپنی نظر میں بہتر کرے تاکہ سلوک کی طرف بڑھے، اور اس کے سلسلہ میں جرأت سے کام لے سکے۔

اور کبھی سالک ان لایعنی رسوم اور احادیث اور ان اشیاء میں خلط ملط کر دیتا ہے جو سالک کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ اور نقوش کو نیہ دھیرے دھیرے اس کے ذہن کی لوح میں داخل ہوجاتے ہیں اور وہ محسوس نہیں کرتا۔ پھر جب وہ ایک مقررہ حد پر پہنچ جاتے ہیں تو اجمالاً ان سے اذیت ہوتی ہے۔ اور نقوش کے لیے تفصیل نہیں پاتا جن میں کہ محبت اور شوق پیدا ہوتے ہیں۔ اور علاج یہ ہے کہ عزلت وخلوت کی راہ اختیار کرے اور کسی کی صحبت نہ اختیار کرے اور ذکر دائمی اور خلوت پر دل جمعی سے کام لے تاکہ اس کے سینہ کی لوح میں سستی کم ہو۔ حتیٰ کہ فنا ہوجائے۔ اور اللہ تعالیٰ اس کے نفس پر تجلی فرمائے۔ تب اس کو کوئی چیز ضرر نہیں پہنچائے گی۔

اور وجہ ثانی یہ ہے کہ تشویش فنا کے بعد ہو۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ بقاء نفس سے ہو اور فنا اس کے ساتھ ہوتی ہے۔ چنانچہ اس کے لیے ترتیب واستحکام متحقق ہوتے ہیں۔ چنانچہ برائی بہت بڑھ جاتی ہے اور علاج دشوار ہوجاتا ہے۔ اور ایک شخص نے جس نے میرے نانا قدس سرہ کے دست مبارک پر سلوک کی راہیں طے کی تھیں اور اپنی ساری عمر اس عمل میں صرف کی تھی، مجھ سے بیان کیا کہ وہ رسوم دنیاوی میں مشغول تھا اور صاحب جاہ

و مال تھا، بھائی بند بھی بہت تھے، جن کی محبت میں وہ فریفتہ تھا۔ چنانچہ شوق پیدا کرنے والی بعض تقاریب کی وجہ سے اس کے نفس میں اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کی طرف بڑھنے کا شوق پیدا ہوا۔ جو وقتاً فوقتاً بڑھتا ہی رہا حتیٰ کہ اس پر غالب آ گیا۔ چنانچہ اس کی عنایت ازلی میرے نانا قدس سرہ کی طرف ہوئی۔ تب اس نے ان کے سامنے سلوک کی منزلیں طے کرنی شروع کیں اور ایک مدت تک اذکار وغیرہ میں مشغول رہا اور وہ دنیاوی مشقتوں، رسوم اور اپنے نفس کے غلبہ، اپنے اعزا و اقرباء کی جمیعت وغیرہ آفات دنیاوی کی اس حالت پر قائم رہا۔ تو اس کو یادداشت دائم حاصل ہوئی۔ پھر اس کو عروج حاصل ہوا تو توحید صفائی نے اس پر تجلی کی۔ اور اس پر زبردست غلبہ ہوا۔ پھر اس کو دوسرا عروج واقع ہوا۔ جس سے اس کو وہ قوی ہمت حاصل ہوئی کہ معاملہ اس کی مراد کے خلاف نہیں تھا، تو وہ اپنی ہمت سے بہت خوش ہوا، اور طویل مدت تک اس حالت پر رہا۔ پھر اس کو ایک طویل حادثہ پیش آیا اور وہ یہ کہ ایک رات وہ قبلہ رو ہو کر بنفسہٖ ذکر میں مشغول تھا کہ اس کو رات کی تاریکی میں ایک وجود نظر آیا۔ اس نے گمان کیا کہ وہ کوئی جن ہے جو اس کو ایذا پہنچائے گا تو اس کو دفع اور زیر کرنے کا ارادہ کیا۔ لیکن وہ اسی حالت میں رہا کہ تھوڑی ہمت سے کام لیا اور اس ہمت سے تعلق جوڑا جو اس کے سینہ سے خارج ہوئی تھی تو وہ بڑھتی رہی حتیٰ کہ اس کے دل کو ڈھانپ لیا اور اس کا حال تشویشناک ہو گیا۔ اس کی جمیعت خاطر پوری طرح جاتی رہی۔ چنانچہ وہ حقیر و ذلیل ہو کر رہ گیا۔ تب شیخ کی طرف رجوع کیا۔ انہوں نے پوری کوشش و سعی کی تب اس کو یادداشت حاصل ہوئی اور وہ ہمیشہ متردد رہا۔ پھر جب اس پر نفس غالب آ گیا جس نے اس کو دنیا کی محبت اور فسق بلکہ کفر کا حکم دیا اور جب اس کو مصیبتوں، فقر، اولاد کی موت اور ہم سروں میں ذلیل ہونے وغیرہ امور نے گھیر لیا تو اس کا حال صاف اور اس کا قول و بیان درست ہو گیا۔ اور پہلی حالت میں ضیق قلب تھا۔ جب اس میں شوق و محبت پیدا ہوا۔ اور دوسری میں کمزوری تھی جب اس میں نفس باقی رہا۔ چنانچہ اس کو دونوں میں سے کسی بھی حالت میں کبھی راحت میسر نہیں ہوئی حتیٰ کہ اس کا انجام یہ ہوا کہ اس کو اور اس کے بیٹے کو قتل کر دیا گیا، اور اس کا مال غصب کر لیا گیا، اور وہ اپنے ہم سروں میں ذلیل ہوا۔ رحمہ اللہ وعفی

عنہ۔اس طرح یہ فنا کے وقت نفس کی بقا کی مصیبتوں میں سے ایک شئے ہے، اور اس کا علاج وہ ہے جس کی طرف سید امیر کلال نے اپنی تصانیف میں اشارہ کیا ہے جیسے اس کو مارنا وغیرہ۔اور وہ قدسیہ میں مذکور ہے۔

اور حاصل یہ ہے کہ انجذ اب خاطر اور عروج کی طرف میلان کے سلسلہ میں غور وفکر کرے، پھر جب پاوے کہ رسوم، اموال اور اولاد وغیرہ سے علیحدگی کا حکم دیا گیا ہے، حتیٰ کہ اس کو کوئی تعلق باقی نہ رہے۔پھر محبت تامہ کی تحصیل کا حکم دیا گیا ہے، پھر کسب میں محنت ومشقت کا حکم دیا گیا ہے۔تو اس میں اس کو ایسی قوی ذلت ہوگی کہ اس پر اس کا تحمل دشوار ہو جائے گا۔اور محبت کی تقویت، صناعت مالوف کی تصویر اور اس کو اللہ کے ذکر سے روکنے کے تحمل میں تدبیر سے کام لینا ہوگا۔

۲۹۳-تفہیم

اللہ کی معرفت کے تین راستے ہیں

اللہ کی معرفت کے تین راستے ہیں۔اول مخبر صادق کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو مخلوق کی اصلاح ومصلحت اور ان کے عقائد واعمال میں سے شر کو دفع کرنے کے لیے مبعوث فرمایا، جیسے منارہ سے سفر کرنے والے استدلال کرتے ہیں، یا چراغ سے چلنے والے روشنی حاصل کرتے ہیں۔دوسرے کشف۔چنانچہ فنا، حکمت، قرب فرائض اور مفرد یہ ہر حقیقت کو پوری طرح کھول دیتے ہیں۔تیسرے برہان۔چنانچہ ہمارے نزدیک یہ متحقق ہوا ہے کہ ہر امر جو اپنے آپ میں صادق ہے برہان اس کی تصدیق کرتی ہے۔اور جو اپنے آپ میں جھوٹا ہے، برہان لازمی طور پر اس کی تکذیب کرتی ہے جو اس کا ادراک نہیں کرتا تو اس کا قصور ہے۔ان میں سے ہر راستہ دشوار ہے اس لیے کہ صادق کی معرفت مشکل ہوتی ہے۔اور اگر ہم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچان لیا تو آپ کی خبر کی تصحیح میں ثقہ راویوں کی نقل سے بغیر کسی وہم کے بہت ہی مشکل ہوتا ہے۔اور اس لیے کہ کشف کا دعویٰ حق وباطل ہر ایک کرتا ہے۔اور آدمی یہ نہیں جانتا کہ اس کے حال سے کیا تجاوز کرتا ہے۔چنانچہ وہ اپنے نفس کے لیے علم

عام کے شامل ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ اس طرح نہیں کہ اس کے آگے دوسرا کشف ہے۔ اور اس لیے کہ برہان کا ہم شکل ومشابہ وہم ہوتا ہے۔ اور شکوک وشبہات برہان کے مشابہ ہوتے ہیں۔ یہ اس لیے کہ حق ہر ایک کے لیے ایسی شریعت نہیں ہے کہ اس کو بغیر محنت ومشقت کے حاصل کر لے، اور ہم میں کامل وہ ہے جو اپنی خبر کی سند خبر دینے والے تک پہنچائے، اور برہان کی صحیح معنی میں تحقیق کر دے، اور کشف میں پوری کوشش کرے۔

۲۹۴- تفہیم:

ولادت سے قبل کا حال، جب آپ شکم مادر میں تھے اور ولادت کے وقت آپ کی منقبت

میرے والد رضی اللہ عنہ نے میرے اس دنیا میں ظاہر ہونے سے قبل کی میری حالت بیان کی۔ فرمایا تم اپنی ماں کے شکم میں تھے کہ ایک مسکینہ نے مجھ سے سوال کیا تو میں نے اس کو آدھی روٹی دینے کے لیے کہا۔ تب تم نے کہا حالانکہ تم جنین تھے کہ یہ مناسب نہیں ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کے نام سے سوال کرے اس کو آدھی روٹی دی جائے۔ اس طرح تم نے استدراک کر لیا۔ اور اس کو پوری روٹی دلائی۔ اور میرے والد اور ہمارے تمام گھر والوں نے مجھے میرے نانا کے حوالہ سے بتایا کہ انہوں نے کہا جب تم پیدا ہوئے تو میں نے تمہیں اپنی گود میں لیا تو میری نسبت اللہ سے زیادہ ہو گئی۔ میں اس کے رنگ میں رنگ گیا اور ترقی حاصل کی۔ اور میں کہتا ہوں کہ یہاں سے جاننا چاہیے کہ مفرد کے وجود کا کلمہ اس کے پائے جانے سے پہلے جس شئے کے اوپر سے بھی گزرتا ہے، اسے نفع پہنچاتا ہے اور مفرد کے لیے بیشمار عجائب ہیں۔

۲۹۵- تفہیم:

انسان کے اطوار کا مفصل بیان

انسان کے اطوار دورہ کے مشابہ ہوتے ہیں۔ اول اطوار امام الاعیان ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی تجلیوں میں سے ایک تجلی ہے جو افراد انسان کے حقائق پر اجمالی طور پر مشتمل ہوتی ہے اور یہاں کوئی شئے دوسری سے کم تر نہیں ہے۔ لیکن وہ ہر اس وجود کے لیے جس کو انسان

کہا جاتا ہے، بالقوہ فیاض ہے۔ اس طرح یہاں ہر شئے اپنے وجود مفیض کے ساتھ موجود ہے نہ کہ اپنے نفس کے لیے اپنے وجود سے۔ پھر عین انسانیہ وہ شئے ہے جو اس لیے پائی جائے تاکہ اول کے لیے تفصیل ہو جائے۔ اس لیے نہیں کہ برأسہ مستقل شئے ہو جائے۔ سوائے اس کے کہ یہاں ہر استعداد اپنی دوسری ساتھی سے اجمالی طور پر ممتاز ہے۔ اور وہاں ایک شئے دوسری سے کمتر ہے جو کہ امام کے اجمال کے لیے شرح ہے۔ اس طرح یہ اس اجمال عینی کے لیے شرح ہے، اور وہ اس کے لیے۔

پھر روح ہے اور وہ ایسی شئے ہے جس کا فیصلہ مرتبہ عقلیہ میں کیا گیا ہے اور اس سے میری مراد عرش کے پیچھے ہونا ہے کہ وہ شئے واحد تھی۔ اس لیے نہیں کہ وہ اس اعلیٰ یا اس اجمال کی تفصیل ہے بلکہ اس لیے کہ فی نفسہٖ شئے ہے۔

اور ہم نے جب حقائق کی تفتیش میں اچھی طرح غور وخوض کیا اور وجود کے وجوہ کے درمیان تمیز کی تو ہر وجود خاص طور سے ناسوت سے بلند وجود ایک کلمہ، ایک توجہ اور ایک صورت میں پائے گئے۔ چنانچہ ہم غور وفکر میں اس وقت تک واقف نہیں ہوتے جب تک کہ اس کلمہ کو جس سے پایا گیا کوئی نام نہ دے دیں۔ اس لیے جان لو کہ کلمۂ روح فی نفسہٖ ہے اور کلمۂ عین امام الاعیان کی شرح ہے۔

پھر وجود مثالی وہ شئے ہے جس کے بارے میں فیصلہ عرش کے خیال اور اس کے واہمہ میں کیا گیا۔ چنانچہ وہاں وہ تمام متعین ہیں جو ناسوت میں صفات، وقائع، کمال ظاہری وباطنی وغیرہ سے لاحق ہیں۔ اور سلسلہ اسی طرح چلتا رہتا ہے حتیٰ کہ تمام وجود اعتبارات کا احاطہ کر لیتا ہے نہ وجہ اجمالی کی بنیاد پر جیسا کہ روح میں ہوتا ہے۔ اور نہ ہی وجہ تفصیلی کی بنیاد پر جیسا کہ اس کے ناسوت میں ہونے کے وقت ہوتا ہے۔ بلکہ ان دونوں کے درمیان متوسط جیسا کہ عالم خیال اس کا تقاضہ کرتا ہے۔

پھر وجود خارجی شکم مادر میں نطفہ کے گوشت کا لوتھڑا بننے کے وقت اور صورت شخصیہ جو اس وقت فیضان کی جاتی ہے، وہ نفس ہے اور اس سے میں، میں اور وہ، وہ متحقق ہوتا ہے۔ یہ انسانیت اور یہ ہوئیت جو دونوں معنی میں تعمیری تجسد سے جدا نہیں ہوتے، کائنات کی

پیدائش کے لائق ہوتے ہیں۔

اور نفس کا پہلا خلیفہ یہی نسمہ ہے اور میں نسمہ سے جسم ہوائی مراد لیتا ہوں۔ جو تکون اخلاق، تدبیر نفس اور ان کے اس میں چلنے سے ہوتے ہیں۔ تو وہ ان میں سریان النفس ہیں۔ جن کو ہم نسمہ کہتے ہیں۔ اور نسمہ کے قوی اور اعضاء ہوتے ہیں اور ان کے امراء ہوتے ہیں اور ہر امیر کے وزیر ہوتے ہیں، جو اس میں اقامت پذیر ہوتے ہیں۔ ان میں پہلی قوت طبیعت ہے جو جگر میں ہوتی ہے۔ اور اس کے لشکر سارے جسم میں ثابت ہوتے ہیں۔ اور دل و دماغ اس سے مدد حاصل کرتے ہیں، جو طبیعت کی طرف آتا ہے اور طبیعت کی تدبیر غذا کے مطابق ہوتی ہے۔ اور ان کی دوسری قوت ادراک ہوتی ہے جو دماغ میں رہتی ہے، اور وہ علوم میں صاحب حل وعقد ہوتی ہے۔ گویا کہ وہ شہر کی حاکم ہوتی ہے جو اپنے ہر گھر میں ایک معلم کو بھیجتی ہے جو گھر والوں کو خیر اور بھلائی سکھاتا ہے۔ اور تیسری قوت قلب ہے جو گوشت کے مشہور ٹکڑے میں رہتی ہے اور وہ امیر الامراء اور امام اعظم ہوتی ہے۔

جب وہ اپنے دربار میں بیٹھتا ہے تو اس کے وزیر اور قاضی اس کے سامنے پیش ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب وہ کسی امر کا فیصلہ کرتا ہے تو ان میں سے ہر ایک اس کی طرف بڑھتا ہے۔ اس طرح طبیعت کے افعال طب میں جمع، خروج اور صاحب حق کو اس کا حق دینے اور اخلاط کو پیدا کرنے اور امراض کو دور کرنے اور نیند وغیرہ ناموں سے معروف ہیں۔ اور اسی طرح فلسفہ میں ادراک کے افعال قوی باطنہ وظاہرہ کے ناموں سے معروف ہیں کہ قلب کے افعال غضب وارادہ، غم وتکدر کے اظہار اور عشق وغیرہ ہیں۔ پھر بدن ارضی دیکھتا، سنتا اور چھوتا ہے۔ پھر جب آدمی مر جاتا ہے تو نسمہ اس سے جدا ہو جاتی ہے جس میں وہ رہتی ہے اور اس کے لشکر کمزور پڑ جاتے ہیں اور سوائے بادشاہ وزیر اور قاضی کے کوئی باقی نہیں رہتا۔ اور قاضی کبھی بادشاہ پر غالب آجاتا ہے اور کبھی اس پر زمیندار رئیس سردار غالب آجاتا ہے۔

اور جان لو کہ ہر نشاۃ لاحق، سابق سے پیدا ہوتی ہے۔ اور اس کے افعال اس کے ساتھ تخلیط میں بندہ کے غور وخوض کے مطابق ساتھ رہتے ہیں۔ اور یہ مقام روح ہے۔ پھر اس کے بعد امر مثال کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ سوائے اس کے کہ افعال حسیہ اس کے ساتھ رہتے ہیں،

اور وہ حشر ہے۔ اور ہمارے نزدیک جہنم حشر کا ایک خطہ ہے اور اسی طرح جنت اس کا ایک خطہ ہے۔ البتہ وہ بہت لطیف اور سب سے زیادہ قریب ہے۔ پھر امر اصحاب کے ساتھ روح کی طرف منتقل ہوتا ہے، پھر عین کی طرف اور پھر امام الاعیان کی طرف۔ اس طرح یہ ایک دورہ ہے، اگر اس کا احاطہ علم کے لحاظ سے کیا جاتا ہے تو انسان حق احاطہ پورا کر لیتا ہے۔

۲۹۶۔ تفہیم:

موت کے بعد واپسی کے واقعات اور ان کی تاویل

میرے والد قدس سرہ نے مجھے بتایا کہ ہمارے پڑوس میں ایک درزی رہتا تھا۔ ایک دن میں نے ارادہ کیا کہ کپڑے کٹالوں تو میں نے اپنے گھر والوں میں سے ایک آدمی کو اس کے پاس بھیجا تو اسے معلوم ہوا کہ درزی کا تو انتقال ہو گیا ہے۔ اور اس کے اعزاء واقرباء رو رہے ہیں۔ اور اس کے لیے کفن تیار کر رہے ہیں۔ تو جس کو میں نے بھیجا تھا وہ واپس آیا اور اس نے جو کچھ دیکھا تھا وہ بتایا۔ پھر کچھ دن کے بعد جب میں سوار ہو کر جمعہ کی نماز کے لیے جا رہا تھا تو اس کو بازار میں کھڑا ہوا پایا۔ تو میں نے کہا: مجھے تو بتایا گیا تھا کہ تمہارا انتقال ہو چکا ہے۔ اس نے کہا ہاں۔ ایسی ہی بات ہے اور میرا عجیب قصہ ہے۔ میں اس کو آپ کے سامنے یہاں بیان نہیں کر سکتا۔ پھر کسی وقت بیان کروں گا۔ والد صاحب نے کہا کہ میں اس کو چھوڑ کر جامع مسجد کی طرف چلا گیا۔ پھر جب نماز ادا کر کے واپس لوٹا تو وہ میرے گھر آیا اور بتایا کہ جس وقت وہ راستہ میں چل رہا تھا۔ دو آدمی اس کے پاس آئے جو بہت غیظ وغضب میں نظر آ رہے تھے۔ میں نے سمجھا کہ وہ ان کپڑوں کا تقاضہ کرنے والے ہیں جو انہوں نے سلائی کے لیے مجھے دیئے تھے۔ اس لیے میں نے کہا بھئی! غصہ دکھانے میں جلدی نہ کرو، میں نے تمہارے کپڑے سی دیئے ہیں۔ اور وہ میرے پاس رکھے ہوئے ہیں۔ لیکن میں نے جو کچھ کہا انہوں نے اس کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ ان میں سے ایک نے میرے طمانچہ مارا جس سے میں زمین پر گر گیا اور مجھ پر غشی طاری ہو گئی۔ مجھے اس کے سوا کچھ محسوس نہیں ہوا کہ وہ مجھے کہیں لے جا رہے ہیں تو وہ جہاں بھی لے گئے، میں چلا گیا۔ میں نے دیکھا کہ بہت سارے لوگ ہیں جن کی ہیئت ہم جیسی نہیں

ہے۔ان کا ایک سردار ہے۔ان دونوں نے مجھے اس کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا۔اس نے میری طرف دیکھا اور کہا یہ وہ نہیں ہے جس کے بارے میں، میں نے تمہیں حکم دیا تھا۔اس کو وہیں لوٹا دو جہاں یہ تھا۔اس نے بتایا کہ ان دونوں نے مجھے لوٹا دیا۔میں ان کو چھوڑ کر تھوڑی ہی دور چلا تھا کہ وہ مجھے لے کر اس کے پاس گئے۔میں ان کی طرف پلٹا تو اس نے کہا تو وہی ہے جس نے ......لیا تھا۔میں نے کہا اللہ کی قسم! میں نہیں لوٹوں گا۔اس نے کہا بلکہ تو یہ کہے گا کہ وہ خواب وخیال تھا، اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔اس کو پکڑو، اٹھاؤ اور گرم لوہے سے جلا دو۔اس نے کہا کہ وہ جلتا ہوا لوہا لے کر آئے اور اس کو میری ران پر رکھ دیا جس سے سخت تکلیف ہوئی، بدبو پیدا ہوئی اور میں بیدار ہو گیا اور لوگ مجھے اٹھا کر میرے گھر لے گئے۔انہوں نے میرے کپڑے پھاڑ دیئے، وہ مجھے غسل دینے کی تیاری کر رہے تھے۔والد صاحب نے کہا کہ اس نے اپنا ازار پھاڑا اور مجھے جلی ہوئی جگہ دکھائی۔تو میں نے داغ لگانے جیسی ہیئت دیکھی۔اور ہمیں اس قسم کی کچھ اور حکایتیں بھی پہنچی ہیں۔ان میں سے بعض حدیث کی کتابوں میں ہیں۔بعض مشائخ صوفیا کی کتابوں میں اور کچھ عجیب سی باتیں ہمیں اپنے کانوں سے سننے کو ملی ہیں۔ان سب میں موت کے بعد واپسی اور روح قبض کرنے والوں کی غلطی پر متنبہ ہونا مشترک ہے۔
اس لیے ہم کہتے ہیں کہ ان خبروں کی تاویل یہ ہے کہ یہ سکتہ میں مبتلا ہونے والے لوگ ہیں۔
اور سکتہ میں مبتلا ہونے والے کو کبھی کبھی ظاہری احساسات کے انسداد کے وقت ایسا امر لاحق ہو جاتا ہے۔موت کے بعد کے احوال وعلوم پر وہ اس طرح متنبہ ہوتا ہے جو میت کو اس کی قبر میں پیش آتے ہیں۔اور روح قبض کرنے والے کی غلطی موت کے وقت کی تمثیل اور مبتلا ہونے والے سے اس کے اسباب کا دور کرنا ہے۔اور اس کی روح کا قبض کرنا، پھر اس کا جسم کی پستی میں لوٹنا پھر اس کا صحت مند ہونا اور اس سے اسباب کا دور ہونا۔واللہ اعلم بالصواب۔

۲۹۷—تفهیم:

رونا صرف تین قسم کے لوگوں کو زیب دیتا ہے

میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک شخص ہمارے پاس آیا وہ ایک شعر گنگنا رہا تھا

جس میں عشق کا بیان تھا اور رو رہا تھا تو میں نے کہا: بھئی! یہ رونا صرف دو افراد کو زیب دیتا ہے۔ ایک وہ جس کو تجلی ذاتی عطا نہ کی گئی ہو۔ دوسرے وہ جس کو یہ تو عطا کی گئی ہو لیکن اس پر باہر سے خطرات کا ازدحام ہو۔ تب میرے والد قدس سرہ نے اس حالت میں کہ وہ بیٹھے ہوئے تھے کہا۔ اور ایک تیسرا آدمی بھی ہے جس کو شر کی سختی پیش آئی ہو۔ گویا وہ اس سے یہ مراد لے رہے تھے کہ جس نے اللہ کے دوست کو دشمن بنایا تو اللہ نے اس کو جنگ کی دعوت دی۔ پھر والد صاحب قدس سرہ نے فرمایا جو لوگ ہم سے پہلے گزر گئے ہیں وہ بھی روتے تھے لیکن ان میں سے اکثر عملی تھے۔ اصحاب کشف نہیں تھے، گویا کہ وہ عملی سے اس شخص کو مراد لیتے تھے جس کا کمال عمل ہو اور صاحب کشف سے اس کو مراد لیتے تھے جس کا کمال مکاشفات الٰہیہ اور تجلیات ہوں۔ وللہ الحمد اولاً و آخراً۔

۲۹۸- تفہیم:

یادداشت کے معنیٰ

یادداشت جس کو صوفیا بہت بڑا مانتے ہیں وہ توجہ ہے کہ جو شہود حصولی و حضوری کو اس معنی میں جامع ہو کہ ایک امر بسیط ہے کہ اگر اس کو حصولی کہیں تو درست ہو اور اگر حضوری کہیں تو بھی بجا ہو۔ اور چونکہ اس یادداشت کا ایک دائرہ ہے اور وہ معنی پیدا کرتی ہے اور روشن تر ہوتی ہے۔ اور جوہر نفس ناطقہ اس کے رنگ میں رنگا جاتا ہے، وہی بقا ہے۔ تم اس کو کبریت احمر قرار دو۔ اس کے بعد اس تجلی کی ہیئت ہے کہ اس کا نفس اس سے رنگا ہوا، بندہ کی ہمت، اس کے علوم اور اس سے انتساب رکھنے والے تمام امور میں سرایت کرتا ہے۔ چنانچہ یہ سرایت خوارق عادات کا پیدا ہونا ہے۔ مشائخ جس کام کو کرتے ہیں اور بزرگ جس راہ پر چلتے ہیں، وہ یہی ہے۔ اس میں ذرا بھی فرق نہیں ہے۔ لیکن یہاں ایک نکتہ ہے اور وہ یہ کہ جو شخص ابتداء حال میں جب راہ سلوک میں چلنا شروع نہیں کیا تھا، عادات کے راستوں میں قوی الہمت، عظیم الشہامہ، بہت بزرگی اور توانائی و شادمانی والا اور قوی المزاج ہو۔ اس کے احوال و آثار شہامت و بزرگی اور تسلط و غلبہ کے رنگ میں ہوں۔ اگر شروع میں ایسی فطرت نہیں رکھتا تو یہ آثار کہاں سے لائے گا؟

۲۹۹-تفہیم:

تجلیات جلالی و جمالی

چوں بدانستی کہ ظل کیستی
فارغی گر مردے وگر زیستی

"جب تم جان گئے کہ کسی کے سائے میں ہو، تو کام سے فارغ ہو جاؤ چاہے مر جاؤ یا زندہ رہو۔"

جب فاعل کے فعل کا مشاہدہ ہو گیا کہ وہ عین جمال ہے تو اس کا ہر فعل دوسرے کا جمال کیا ہوگا، سوائے اس کے کہ ہر جمال کا الگ تماشہ کرتے ہیں کہ جمال دوسرا جلال ہے اور جلال دوسرا جمال ہے۔ جب اس سے ہر فعل حقیقی باب میں آتا ہے تو تازہ ہیئت ہوتی ہے۔ سوائے رویت میں اضمحلال کے۔ ہاں اس سے لطف اندوز ہونے میں گم ہو جانا اور حیران رہنا کوئی کام نہیں ہے۔ رونا دوسری ہیئت ہے اور ہنسنا دوسری ہیئت ہے۔ جب جلالی جلوے ہر طرف سے دل کو گھیر لیتے ہیں، یکسو کر دیتے ہیں، تو ان کے لیے اسباب وصل بیان کیے جا سکتے ہیں، نہ کہ وحشت کے باعث۔

آب نیل است آن بقبطی خوں نمود
قوم موسیٰ را نہ خوں بود آب بود

"وہی نیل کا پانی ہے کہ وہ قبطیوں کے لیے خون، موت کا سامان بن گیا، جبکہ موسیٰ کی قوم کے لیے وہ خون نہیں پانی ہی تھا۔"

۳۰۰-تفہیم:

وصایت اور مجددیت کے مراتب کا جامع ہونا

فقیر کی طبیعت ان دنوں ان علوم ظاہری کی طرف مائل ہے جن کا چہرہ ظاہر ہے اور پشت باطن۔ اور تم اس کے برعکس ہو۔ اور وہ فردیت وگزر براہ ظاہر وجود ہے۔ باطن میں باطن ہے۔ اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا وصایہ اور عکس اسم تشریع ہے۔ حقیقت میں یہ بندہ

باطن میں ضعیف اور ظاہر میں مجددیت ہے۔ ظاہر میں یہ سب ان مراتب میں علی سبیل الاجتماع فقیر کا خاصہ ہے، اور تم اس کی تحقیق میں مایوس ہو کہ تمہارا نسمہ جشن مسرت چھچہ کی طرح نور ہو جاتا ہے۔ اور تمہاری روح مقام حکمت میں متحقق ہوتی ہے اگر تمہارے کاموں کا انجام تمہارے اجتہادوں کو آگے پہنچا دیتا ہے۔ اور وہ یہی ہے۔ لیکن انشاء اللہ تعالیٰ ان امور کے اجتماع سے جو ان کا خاصہ ہے بڑا حصہ پائیں گے۔ واللہ علی ما نقول وکیل۔

۳۰۱- تفہیم:

مکہ مکرمہ اور ہردوار کے درمیان فرق

مکہ معظمہ اور ہردوار کے درمیان جو کہ کفار کی عبادت گاہ ہے، فرق سے متعلق سوال کا جواب یہ ہے کہ ان دونوں کے معبود کے اسم کے مظہر ہونے کے باوجود ممکن کے دو اعتبار ہیں۔ ایک وجود اقصیٰ میں اس کے اضمحلال کا اعتبار ہے اور اس اعتبار سے تمام خیر و شر لازمی طور پر ایک شان الٰہی کے مظہر ہیں۔

لا تنکر الباطل فی طورہ

فانہ بعض ظھوراتہ

''اس کے طور اور طرز میں باطل سے انکار نہیں کیا جاتا، کیونکہ وہ بھی اس کا کوئی مظہر ہوتا ہے۔''

اور دوسرے احکام خاص کے ساتھ حقائق امکانیہ میں سے ہر حقیقت اختصاص کے اعتبار سے ہے۔ اس مسئلہ کی تفصیل یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک وجود خاص و امتیاز کا اثبات اپنے خواص سے ہونا لازم ہے۔ اس لیے کہ جب حالات پختہ و درست ظاہر ہوتے ہیں تو ہر ایک کے وجود کے ظاہر میں ایک فعلیت و تقرر، دوسری فعلیت کے بغیر پیدا ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے زنجبیل زنجبیل ہوتا ہے اور کافور، کافور۔ جبکہ ایک کا اثر تسخین (گرم کرنا) ہے اور دوسرے کا اثر تبرید (ٹھنڈا کرنا) ہے۔

چونکہ بے رنگی اسیر رنگ شد

موسوی با عیسوی در جنگ شد

”جب بے رنگی، رنگ کی قیدی ہوگئی، موسویت، عیسویت کے ساتھ برسر پیکار ہوگئی۔“

اور اس کو وحدت وجود کے خلاف نہیں سمجھا جاسکتا۔ اس لیے کہ اس غیریئت وامتیاز کی ایک الگ شان ہے۔ چنانچہ ہر چیز کا وجود اول کے اعتبار سے خیر محض ہے۔ اس میں شر کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اور دوسرے اعتبار سے خیر کے بعض حقائق آتے ہیں اور بعض شر کے۔ اور شر کی اصل متضاد شئے ہے خاص طور سے دوسری شئے کو۔ درحقیقت حق سبحانہ نے خواص اور طبائع سے اس میں ہر ایک کو ودیعت کیا۔ چنانچہ ہر شر کا ایک وزن ومعیار ہے کہ بعض اعتبارات سے اس برائی کی ضد ہے۔ مثلاً زہر انسان کے لیے برائی ہے اور سانپ کے لیے خیر ہے۔ اور اس کے شربت کے مصداق اس کے تحائف میں خاص طور سے انسان کے لیے مزاج کے اعتدال وغیرہ سے کہ ساری تفصیل حالات کی خاص شان ہے۔ اسی طرح جب کلمہ الٰہیہ کا تنزل شرع کی نشاۃ تک پہنچا، اور حلال وحرام پیدا ہوا تو لازمی طور پر اس مقام میں شر پسندی کا ایک معیار ہے۔ اور یہ بات بہت تفصیل طلب ہے۔ بالجملہ ان تمام کا معیار ہے۔ عمل ضد کا بالطبع خاص انسان کی صورت نوعیہ کے خواص کا شرک کی طرح۔ اور اس کی نظیر زہر ہے کہ وہ نوع انسانی کی طبیعت کی ضد ہوتا ہے۔ اور ان میں سے عمل کا اس اسم کے حکم کے مخالف ہونا ہے جو کہ اس عالم کا مدبر ہے۔ اور اس اسم کی تفصیل جو ہر ہزار کے بعد ہوتا ہے۔ چنانچہ عالم کی مصلحت کو تمہید فرماتا ہے اور ہر عمل کی خیر یا شر کی موافق یا مخالف نسبت پیدا ہوتی ہے۔ جب یہ مقدمہ معلوم ہوگیا تو اب میں اصل مسئلہ کی طرف آتا ہوں۔ سائل نے کہا تھا کہ دونوں عبادت گاہوں کے درمیان وہ فرق جس سے نفس الامر میں ایک کی حقیت اور دوسرے کا بطلان ہو، معلوم نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں کہ بعینہٖ یہی اعتراض ان دونوں وجہوں میں وارد ہوتا ہے جو احکام خاصہ کے ساتھ ممتاز ہیں جیسے نماز اور زنا اور زہر اور تریاق۔ اس طرح کہ میں کہتا ہوں کہ ہر موجود لازمی طور پر ایک شان الٰہیہ کا مظہر ہوتا ہے۔ چنانچہ دونوں کے درمیان وہ فرق کہ نفس الامر میں ایک کی حقیت اور دوسرے کا بطلان ہو، معلوم نہیں ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر ایک وجود میں ہر موجودیت وفعلیت اور تقرر

وتحقق اور اضمحلال میں فرق مطلوب ہے توان صفات میں موجودات ایک دوسرے کی مخالف نہیں ہیں۔لازمی طور پر تمام حق وباطل موجود ہیں اور وجود میں اشتراک رکھتی ہیں اور اس جہت سے حقیت اور بطلان کی کوئی وجہ نہیں ہے۔اور اگر ہر ایک کے احکام خاصہ میں فرق مطلوب ہے تو ہر موجود لازمی طور پر دوسرے موجود سے ممتاز ہے۔اور ہر ایک کا حکم دوسرے کے حکم سے ممتاز ہے۔سائل کو بھی اس اصل کا اعتراف ہے جیسا کہ اس نے کہا ہے۔ہاں من حیث الیقین متضاد آثار واحکام کا مظہر ہے۔چنانچہ جب خواص میں تضاد متحقق ہو گیا تو لازمی طور پر اپنے مخالف کی نسبت سے ایک شر آتی ہے۔اور شریعت نے جس جگہ بھی نسبت خاص کے اعتبار سے شر پسندی یا خیر ہونے کا اعتبار کیا ہے، وہ نوع انسانی کی صورت ہے یا مربی عالم کے اسم کا حکم فرمایا ہے۔چنانچہ ہر دوار جو کہ کفار کی عبادت گاہ ہے، اگر شرک کے شعائر میں سے ہے، اس کی شر پسندی تمام افراد بنی آدم کی نسبت سے متحقق ہے۔خواہ اس زمانہ میں ہو خواہ گزشتہ زمانہ میں۔اور لازمی طور پر اثر تحریف ہے۔اور اگر توحید کے شعائر سے ہے کہ اس سے ملت حنفیہ میں معبود حقیقی سے کعبہ کے مانند اپنے شوق سے حق کا تقاضہ پورا کرتے ہیں۔کہ اسم الٰہی مدبر عالم ہے۔شریعت کا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر نزول اس اسم عالی کے ظہور کے اسلوب میں کلمۂ حنفیہ ہوا جیسے اسکندر رومی کی دولت کی بلندی وغیرہ۔جو کہ اقالیم سبعہ کی شہنشاہی ہوتی ہے۔اور اس اسم عالی کی رضا مندی تمام ملتوں پر اس ملت کو آتی ہے۔اور اس مسئلہ میں راز یہ ہے کہ ہر ملت کی مصلحتیں ہوتی ہیں جو اس ملت کی روح کے مشابہ ہوتی ہیں۔اور جسم اور صورتیں اس ملت کے جسم کے مشابہ ہوتی ہیں۔اور چونکہ اسم الٰہی ایک ملت کا تعین چاہتا ہے، اس کی روح کو بھی ایجاد کرتا ہے۔اور اس کا جسم بھی اور اس کے جسم کا مادہ بھی ایک قوم کے علوم وعادات کے مطابق ہوتے ہیں کہ وضع فلکی کے مطابق ان کی شہرت اور ان کی دولت کے غلبہ کا مقتضی ہو گیا۔ چنانچہ ہر دوار کا بطلان اس مخالفت کی جہت سے جسمانی احکام میں ان امور میں بھی ہے کہ جو ملت کے ظہور کے وقت ضروری ہیں۔اس سلسلہ میں بہت سی باتیں ہیں۔یہ سطور ان کی متحمل نہیں ہو سکتیں۔بالجملہ معرفت سے کہ تمہارے لیے حکم وحدت کا انکشاف ہے۔حکم کے

انکشاف کے بغیر زیادہ مغرور ہونا خام لوگوں کا کام ہے۔

وکن طفیلیهم علی ادب

فما اری شافعا سوی الادب

"ادب میں ان کا طفیلی ہو جا، کہ میں نے ادب کے سوا کسی کو شفاعت کرنے والا نہیں پایا۔"

۳۰۲-تفهیم:

رحمان کی تجلی کا رابطہ اور اس سے بندہ کو جو کچھ حاصل ہوتا ہے

با آنکہ نخست قبلہ گاہ من وتست

ہرگز نشود رابطۂ عشق تو سست

"جو میرا اور تیرا پہلا قبلہ گاہ ہے، اس کے ساتھ تیرے، عشق کا رابطہ کبھی سست نہیں ہونا چاہیے۔"

صد جائے کنی گر سبق عشق درست

عشق تو بود درہمہ با یار نخست

"اگر عشق کا سبق سو جگہوں پر درست کرو گے، تو بھی تمہارا عشق دوست کے ساتھ پہلی بار ہی ہو گا۔"

کیا تم جانتے ہو کہ یہ حالت کب میسر آتی ہے؟ جس وقت بندہ رحمٰن کی تجلی کے ساتھ رابطہ قوی کرتا ہے؟ نہیں، نہیں بلکہ جب وحدت کی وجہ سے پردہ ڈال دیا ہو۔

وجوه إذا ما اسفرت عن جمالها

اضاءت لها الاکوان من کل جانب

"جب چہرے اپنے جمال سے روشنی کرتے ہیں، تو ان کی وجہ سے ہر طرف سے کائنات روشن ہو جاتی ہے۔"

اس وقت وحدت کے تنزل کا ہر نشاۃ میں مشاہدہ کیا اور اس کے نزدیک سب برابر

ہو گئے۔ یہ آدمی اگر فقہ کی تدوین میں یا معارف کی تحریر میں بلکہ اگر دشمنوں سے لڑائی جھگڑے، بحث ومباحثے اور دنیا کی محبت میں پڑ گیا، اس کے حق میں سب کچھ اعتکاف ہے۔ اور کسی غیر کے ساتھ نہیں صرف وحدت کبریٰ کے ساتھ شغل خاص اس کے لیے جلوت وخلوت سب یکساں ہے۔ سوائے اس کے کہ خلوت میں طبقات نسمی وروحی مہذب ہوتے ہیں۔ اور جلوت میں یہ طبقات غیر مہذب رہتے ہیں۔

۳۰۳-تفہیم:

وحدت قصوی اور اس کی وجہ سے مدح کا ہونا

من نیم واللہ یا رامن نیم

جان جانم سرسرم من تن نیم

"میں نہیں ہوں، اللہ کی قسم یار! میں نہیں ہوں، جان میری جان ہے، سر میرا سر ہے، میں جسم نہیں ہوں۔"

اللہ کی قسم! پھر اللہ کی قسم! میری مدح سرائی کرنے والا وہ ہے جو وحدت قصوی کی ثنا خوانی کرتا ہے، خواہ مجھے پہچانتا ہو یا نہیں۔ اور میرا معتقد وہ ہے کہ جو وحدت قصوی کا معتقد ہو، خواہ وہ مجھے پہچانتا ہو یا نہیں۔ اور میرا منکر وہ ہے جو وحدت قصوی کا منکر ہے۔ بلا کسی تصنع کے کہتا ہوں کہ وہی کیفیت جس کو لوگ اپنی ثنا واعتقاد یا ہجو اور انکار میں پاتے ہیں، وحدت کبریٰ اور ثنا واعتقاد میں اور ان دونوں معنی کی اضداد میں ایک جو کے دانے کے برابر بعینہٖ وہی کیفیت فرق کے بغیر پاتا ہوں۔ جو شخص اس بات کا مدعی ہے کہ وہ خاص اس قالب میں مصروف ہے، میرے نزدیک درخت یا پتھر کی مدح سے زیادہ نہیں ہے۔ واللہ علی ما نقول وکیل۔ اس نکتہ کو لوگ کم ہی سمجھتے ہیں کہ میرے کلام میں اغماض وچشم پوشی نہیں ہے کہ اگر کوئی معتقد پوری طرح اعتقاد رکھتا ہے تو اس اعتقاد سے ذرہ برابر بھی مجھ سے نہیں پھرتا۔ ورنہ استاذ کے چہرہ سے توجہ کے بعد اس کے مناسب حرکات اور تصویروں کی مدح سے پھر اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اور اگر کوئی منکر انکار کرتا ہے تو اس کے انکار سے

بھی مجھ پر کوئی فرق نہیں پڑتا، اور نہ ہی اس کے مثل سے۔'فتدبر ثم تدبر' ۔ میرے کلام میں کوئی نشہ مستی اغماض وچشم پوشی نہیں ہے اور نہ ہی کوئی مبالغہ ہے۔ جس کی لوگ امید کیا کرتے ہیں، جبکہ عملاً اس کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ اور وجود محض وحدت بحتہ اور تقرر صرف اس پر دشوار ہوتا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہے کہ اگر مجھے پہچانتے اور اعتقاد رکھتے تو بھی مجھ کو نہیں پہچانتے کہ میرا پہچاننا یہ ہے کہ مجھے ہر کمال کے ساتھ جو کہ وجود اور امکان کی حد میں پہچانیں۔ اور اگر کوئی اس طرح نہیں پہچانتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ مجھے نہیں پہچانتا۔ لازمی طور پر اگر کسی چیز کو پہچانتا ہے تو وہ پہچاننا تمہارا مجھے پہچاننا ہے۔

وکل مغری بمحبوب یدین له

جمیعهم لی وقد دانوا و ما فطنوا

''محبوب پر فریفتہ ہر شخص اس کا قرضدار اور مرہون ہے، وہ سب میرے ہیں اور وہ میرے مرہون منت ہیں مگر سمجھتے نہیں۔''

افسوس کہ فلاں کے ساتھ ہواؤں کے راستے چلے گئے اور زمینوں میں بہہ گئے (برباد ہو گئے)۔

قضت عیون مهات الرمل فی جسدی

ان لیس یبقی له عین ولا اثر

''میرے جسم میں ریگستانی وحشی نیل گایوں کی آنکھوں نے فیصلہ کر دیا، کہ نہ اس کے لیے کوئی آنکھ رہی اور نہ ہی اثر۔''

میرا کبھی کوئی عنوان نہیں ہے یعنی معاملہ کبھی بھی معدوم نہیں تھا خواہ کوئی بھی مصیبت آئی۔

۳۰۴۔ **تفہیم:**

ذات وصفات میں فنا اور نفس کا اللہ واحد کی طاعت کو تسلیم کرنا

ہوا اندر ہی اندر پیچ وتاب کھاتی ہے اور خود کو زمین پر دے مارتی ہے۔ اس مٹی سے اپنے لیے ایک گنبد بناتی ہے، یہ گنبد اس ہوا کے جسم کو اپنے اندر گھماتا ہے۔ اور ہوا ہر اس

حرکت کی روح کو جو کہ ظاہری طور پر اس گنبد سے دکھائی دیتی ہے، حقیقت کے اعتبار سے ہوا سے منسوب ہے۔ اس جگہ مٹی سے پیدا کی ہوئی خاکساری ہے کہ اسماء الٰہیہ کی تجلی کو ریاح اپنے اندر لپیٹ کر اپنے اس خاکدان پر مارتی ہیں۔ اس کو نیکی کرنا یا صنعت سازی کہتے ہیں۔ ان ریاح کے بغیر نہ اس کی کوئی حرکت ہوتی ہے، نہ ہمت، نہ قوت، نہ کوئی شئے اور نہ سکون۔ اگر اس کو کھولتے ہیں تو اس کو کھول کر نہیں رکھا جا سکتا۔ اگر اس کو جھوٹ کے ساتھ لاتے ہیں تو اس کو جھوٹ کے ساتھ رکھ نہیں سکتے کہ وہ آپ کو نہیں جھٹلاتے لیکن وہ ظالم ہیں۔ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں۔ اگر اس سے کہتے ہیں، تو ایسا کیوں ہے، ویسا کیوں نہیں ہے تو اس کا جواب پوری طرح خاموشی ہوتا ہے کہ وہ پوری طرح صاف وشفاف ہے اور نادان بحث ہے۔ ایک جسم ہے زمینی مقہور ہے۔ سفلی طبیعت والا، کام کرنے والا، اپنا کام کرتا ہے۔ یہ بے چارہ کس گنتی میں ہے۔

کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں
مصلحت را تہمتے برآ ہوئے چین بستہ اند

''تیری زلف کا کام مشک افشانی ہے لیکن عاشق لوگ، مصلحت کی وجہ سے تہمت چین کے ہرن کے سر تھوپ دیتے ہیں۔''

یہ بات کمال کے لحاظ سے اس خاکسار، بے اعتبار، نامراد کے نیچے جاتی ہے کہ اس کا حامل اس کا نفس ناطقہ ہے۔ ورنہ خدا جانتا ہے کہ دماغ میں کیا شورش وغوغا رکھتا ہے۔ شاہ نامرادی بے اعتباری کو اختیار کرتی ہے، اس کو خلعت فاخرہ پہناتی ہے، اپنے پہلو میں بٹھاتی ہے، اس کے جمال میں نظر گاڑتی ہے اور آنے والا اس سے راز کی بات کہتا ہے کہ سب کچھ تمہارے اوپر فدا ہے، ہر بال تمہارے عشق سے لبریز ہے، ہر قطرہ کا قوام تمہاری محبت ہے، میرا دل تمہارے لیے۔ میری نظر تمہارے لیے ہے، میری صورت تمہارے لیے ہے اور میری خاطر تمہارے اوپر ہے۔ اس نامرادی کی اس وقت میں مستی اور ناز ہے۔ کس زبان سے کہوں کہ سر سے پیر تک سب کچھ ناز کے اندر ناز ہے اور مستی کے اندر مستی ہے۔ یہاں نامرادی غریبی ہے کہ شاہ وجود خلعت فاخرہ محبوبیہ اس کو پہناتا ہے۔ بر لطف خطاب سے اس کو

مخاطب کرتا ہے۔اگراس کا بدن پھٹ جاتا ہے تو اس کی جگہ یہ ہے کہ یہ مستی اس کے حوصلہ میں نہیں ہے۔لیکن مضائقہ کیا ہے۔

کہ رستم را کشد ہم رخش رستم

رستم کو رستم کا گھوڑا ہی قتل کرتا ہے

میکدہ کا بھکاری ہوں، لیکن مستی کے وقت دیکھ میں فلک پر ناز اور ستارہ پر حکم کرتا ہوں۔ یہ سخن اس کے طبقۂ عینیہ کے مطابق چلتی ہے۔ ورنہ خدا جانتا ہے کہ اس کے دماغ میں کون سی شورشیں ہیں۔لوہار، تلوار کی اسناد تیار کرتا ہے۔ایک درہم صاف ڈھالتا ہے پھر ایک دوسرا درہم خراب کر دیتا ہے۔اور پھر مختلف قسم کے پانیوں میں غوطہ دیتا ہے۔اس کے بعد نکال لیتا ہے۔اس کی نمی اور ماہیت اس میں نہیں رہتی۔ ہر نشاۃ کے حکم کو رخصت کر کے اپنی آنکھوں کے سامنے رکھتا ہے اور کہتا ہے تو وہی ہے کہ میں نے جو کچھ پیدا کیا تیرے لیے پیدا کیا اور اگر تو نہ ہوتا تو نشاۃ اور اس کے علویوں اور سفلیوں کو پیدا نہیں کرتا۔تو کتنا حسین اور کتنا جمیل ہے۔ تیرے ذریعہ میری حدادیت، لوہاریت ظاہر ہوئی تو وہ ہے کہ تیرے سوا کوئی محبوب نہیں۔کوئی کیا جانے اس معمہ کی تعبیر کیا ہے۔

بالب دمساز خود گر جفتمی ہم چوں نے من گفتنیہا گفتمی

میں اگر اپنے ساتھی کے ساتھ جڑ جاتا تو بانسری کی طرح باتیں کرتا

تیز آندھی سرخ رنگ زمین پر پھیلاتی ہے تو سب کچھ سرخ ہو جاتا ہے۔ چند فرسخ اور میل کے بعد اس سرخی کو جو اس کے ساتھ رہنے سے اٹھ جاتی ہے، وداع کر کے سیاہ زمین کے اوپر سے گزرتی ہے۔اور سب کچھ سیاہ ہو جاتا ہے۔اس سیاہی کو چند میل کے بعد وداع کر دیتی ہے، اسی طرح سلسلہ چلتا رہتا ہے۔حتیٰ کہ ساری زمین کو پار کر جاتی ہے، پھر دریا پر پہنچتی ہے اور دریا سے بھاگنے والے اجزاء اس کے ساتھ جڑ جاتے ہیں اور بخارات کی شکل میں نکلتے ہیں۔اس کے بعد وہ دونوں یا ایک اپنے دائرہ میں لپٹ جاتے ہیں۔ مبدأ افعال کے سامنے حاضر ہوتی ہے اور کہتی ہے کہ میں نے تیرے اذن سے بحر و بر کا سفر کیا، تیرے امر سے غبار، سبزیاں، انسان اور درخت واجب ہو گئے۔ پھر کتنے مقامات ہیں کہ میں وہاں

سم قاتل ہوگئی اور کتنے مقامات ہیں کہ میں وہاں نسیم شافی ہوگئی۔ اور ان اسفار میں، میں اپنے نفس کے اعتبار سے نہیں تھی، سوائے ہوائے محض کے، جو ایک طور پر اور ایک فن کی شکل میں تھی تو اب تیرا کیا حکم ہے؟ مبدأ فعال فرماتا ہے۔ دوبارہ سفر کرو، اس سے بڑا اور عظیم۔ تو جب تک تیری ہستی کلی طور پر معدوم نہ ہو جائے متحقق نہیں ہوگا اور اگر تو دائرہ وجود میں نہ ہو تو بھی متحقق نہیں ہوگا۔ اس نے کہا میں تیری بندی ہوں۔ تیرا حکم ہے، تو جو کچھ فرمائے گا میں وہ کروں گی۔ اس نے کہا میرے سامنے چاہئے کہ نظر میرے جمال پر رکھ اور کان میری بات پر دھر اور دل کو میرے معنی کے سمجھنے میں لگا۔ اس طرح کہ مبدأ فعال کہے کہ پتھر ہو جا تو پتھر ہو جائے۔ باوجود یکہ خود سے نہیں دیکھتا۔ کوئی چیز پتھر کے بغیر نہیں پائی جاتی۔ اور اس پر انواع واشخاص کے اسماء بسیط کو قیاس کرو کہ ان کا کوئی نام نہیں تھا۔ وہ ہر حال میں گوش حال سے سنتا ہے نہ کہ گوش مقال سے۔ یعنی اس شکل میں سامنے آتا ہے کہ اس کا نام مذکور ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ جب تمام انواع واشخاص کا گھیراؤ کرتا ہے تو اس کو فعال پکارتا ہے کہ کیا تو سب کچھ ہوگیا؟ وہ کہتا ہے میں سب کچھ ہوگیا۔ وہ کہتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے یہاں تک کہ ایک قسم کی ہوا تمام صورتوں میں اس جھوٹ کی خجالت سے اپنے آپ میں لپٹتی ہے اور پوری طرح معدوم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد وجود نہیں رہتا۔ سوائے ہیولائے صرف کے جو کہ حال کے لحاظ سے ہوا اور فعلیت کے لحاظ سے ہیولی ہوتا ہے۔ اور اس کا تحقق ہو جاتا ہے۔ سفر طویل وعریض پیش آتا ہے۔ اور اپنے خیال میں ایک جہان منتظم ہو جاتا ہے۔ وتلک الأمثال نضربها للناس لعلهم يتفكرون "یہ وہ مثالیں ہیں جو ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ غور و فکر کریں۔"

۳۰۵۔ تفہیم:

خاص حالت کا ذکر

اس فقیر کی حالت ایسی ہے جیسی پھینکنے والے کے ہاتھ میں پتھر یا غسل دینے والے کے ہاتھ میں میت کی حالت ہوتی ہے۔ کہ تمام حرکات وسکنات میں اس کا اپنا کوئی دخل نہیں

ہوتا، وہ جو چاہتے ہیں کرتے ہیں۔ اور جس کام میں بھی چاہتے ہیں استعمال کرتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ علم حضوری علم واحد بسیط سے بدل جاتا ہے جو کہ تمام علوم کا جامع اور تحقق وتقرر ہوتا ہے۔ چنانچہ شب وروز کے حوادث کا اختلاف اپنے آپ میں پاتا ہوں۔ اس قصہ کی حقیقت کو پہچانو۔

۳۰۶۔ تفہیم:

وجوہ حق و باطل کا باہم اشتباہ

اے بھائی! جان لو کہ وجود حق، وجود باطل کے ساتھ باہم مشتبہ ہوتا ہے۔ اور وجود حضرت آدم علیہ السلام سے آج تک جو بھی حق ظاہر ہوا ہے ایک جماعت ہر زمانہ میں اس کا انکار کرنے والی رہی ہے کہ کہا گیا ہے لا یزال الإنسان عدواً لما جهل ''انسان جس چیز کو نہیں جانتا اس کا دشمن ہوتا ہے۔'' لیکن غور وفکر اور تامل کے بعد اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے ہدایت دے دیتا ہے۔ جس کو تم دیکھو کہ اپنے علم اور احوال میں متردد ہے، ایک قدم آگے بڑھاتا ہے اور ایک قدم پیچھے ہٹاتا ہے، رشد وہدایت کے ایک یا دو راستوں کو سمجھتا ہے، کوئی بھی شخص جمیع وجوہ کا احاطہ کرنے والا نہیں ہوتا۔ اس موقع کے سلسلہ میں روایت ہے کہ تمام وجود کا احاطہ کرنے والا اقترابات ہے۔ اور اس کا احاطہ کسی ایک خاص مقام میں استقرار سے مانع ہوتا ہے۔ بلکہ اس کا ہر مقام تجلیات برقیہ آنیہ (فوری چمکنے والی تجلی) کا حکم رکھتا ہے۔ اور قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، اس شخص کا سارے عالم میں مرتبہ صورت عالم میں وحدت صرفہ کے درجات کے مانند ہے۔ اس کے علوم اجمالی تفصیل کے ساتھ بالفعل درخت، پتھر، گھوڑے اور انسان ہو جاتے ہیں۔ وہ سب کا پوری طرح احاطہ نہیں کرتا اور نہ ہی اس سے اس کا دل تنگ ہوتا ہے۔ بلکہ یہ اس کے دل کے ایک گوشہ میں ہوتا ہے۔ اور اس کا دل اس سے لاکھوں گنا زیادہ وسیع ہوتا ہے۔ اور قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، اگر یہ شخص اپنے ڈنڈے کو بغل میں دباتا ہے اور اپنے نعرہ کو بلند کرتا ہے تو تمام لوگوں کو غلام بنا لیتا ہے۔ اور تم ان میں سے کسی بھی ایسے شخص کو اس سے قریب

ہوتے نہیں دیکھو گے جو عداوت فی اللہ اور حب فی اللہ رکھتا ہو۔ اگر اس مرتبہ سے جو محبت وعدوات کا مستقر ہے باہر آتے ہیں تو ان کی دشمنی اور محبت ناچیز ہو جاتی ہے۔ اور اسی طرح ہر مقام کا ایک خاص درجہ اور دائرہ ہے۔

ہر سخن وقتے وہر نکتہ مکانی دارد

''ہر بات کا ایک وقت اور ہر نکتہ کا ایک مقام وموقع ہوتا ہے''

چنانچہ تم اس شخص کے بارے میں کیا کہو گے جو وحدت کبریٰ کی طرف خلوت اختیار کر لیتا ہے۔ جو کچھ ہے وہی ہے اور جو کچھ ہے اس کی تفصیل ہے۔ پھر میں وہ نہیں ہوں کہ جو انکار کا ارادہ کروں، اور مجھے قبول سے خوشی ہوتی ہے بلکہ میرے نزدیک سب برابر ہیں۔ تو اگر ساری مخلوق اس امر پر مجتمع ہو جائے کہ مجھ سے محبت کرے تو ان سب میں اس کی استطاعت نہیں ہے۔ تو چاہیے کہ منکر پر نکیر کریں اور محبت کرنے والا مجھ سے محبت کرے۔ میرے نزدیک سب برابر ہیں۔ اور اللہ وہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ میں تمہارے درمیان اجنبی ہوں، تم مجھے نہیں پہچانتے اور میں وطن سے محبت کرتا ہوں۔ وطن سے محبت کرتا ہوں، صورت کے یہ پردے وحدت کے لیے رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ ورنہ کہاں میں کہاں تم؟

من از کجا غم یاراں ونرد باں ز کجا

''میں کہاں سے ہوں اور دوستوں کے معاملات اور شطرنج کے مہروں کی چوکیاں کہاں سے ہیں۔''

۳۰۷-تفہیم:

سالکوں کی استعداد کا بیان

خدا کی طرف رغبت رکھتے ہیں، ان میں سے اکثر کی استعداد اتنی نہیں ہوتی کہ حضور مجرد میں اس کے ساتھ تکلیف رکھیں، محبت اور دلبستگی کی خاطر ذکر کے معنی میں اپنا مطمح نظر بنائیں۔ ان کے لیے طریقہ یہ ہے کہ ان کے حق میں صبح وشام کے لیے ذکر کی مقدار مقرر کر دی

جائے۔ مثلاً کہہ دیا جائے کہ رات و دن میں چار ہزار بار کلمہ طیبہ دو تین ماہ تک پڑھیں۔ ان کے لیے یہی مقدار کافی ہے۔ جب ان کا دل اس ذکر سے آرام پانے لگے، تب محبوب اور ہیئت شوقیہ کا ملاحظہ اس کے ساتھ شامل کریں۔ جب یہ بھی مستقر ہو جائے، تو ذکر خفی سکھائیں۔ میں نے دیکھا کہ اکثر سالکوں کا اضطراب اسی میں ہوتا ہے کہ اگرچہ وہ معنی مجرد و شوق و توحید قسم کی استطاعت رکھتے ہیں لیکن حال کے لحاظ سے ان کی طبیعت سفلیات کی کشاکش میں پڑ جاتی ہے۔ اور اس سبب سے ان کے حال میں عقدہ پڑ جاتا ہے، اور مختلف قسم کے شکوک و ظلمات ان سے سر اٹھاتے ہیں۔ اور بالجملہ جاننا چاہیے کہ لوہاروں کو بادشاہوں پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔

۳۰۸-تفہیم:

سالک کے لیے ظاہری وظائف وغیرہ سے کیا واجب ہوتا ہے

سالک کے لیے حضرت حق سبحانہ کے جلال و کبریائی سے تعلق قلب کے باوجود کچھ وظائف ظاہرہ کی پابندی ضروری ہے۔ اس لیے کہ مرد کامل وہ ہے کہ جو طبقہ نفسیہ اور طبقہ نسمیہ ہر ایک سے ایک حصہ حاصل کر کے وجدان کی نظر سے احساس کرے کہ مجذوب خالص کو دار الجزاء میں سالک خالص کی نسبت سے کوئی وقعت و عظمت نہیں ہے۔ ہاں جو کمال اس کے نفس کی ویرانی ہے، وہ چیزے دیگر ہے۔ دار الکسب اور دار الجزا اس کمال کے لحاظ سے دونوں برابر ہیں۔ اس لیے کہ نہ قوی نسمیہ سے کسب کیا جاتا ہے اور نہ ہی نسمہ کے افعال پر پاک نفسی تجاوز کرتی ہے۔ اس لیے کہ عارف ایک ایک آدمی کے ساتھ جنگ کے میدان میں ہم رنگ ہوتا ہے اور غنیموں کی تقسیم کے وقت بھی اس کا عرفان ایک الگ ہی شئے ہوتا ہے کہ اس کی جزا نہیں چاہتا۔ بلکہ مطلوب لذاتہ ہوتا ہے۔ تمام وظائف جو ہمارے مختار اختیار کردہ ہیں، تین ہیں۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: صبح و شام اور رات کی ایک گھڑی میں استعانت کیا کرو کہ جب تہجد کے لیے اٹھیں، سات یا نو یا گیارہ رکعت پڑھیں۔ پھر سورہ یٰسین یا واقعہ یا یوسف پڑھیں۔ اس کے بعد جو اس کے وقت کے مناسب ہو ادعیہ ماثورہ میں سے کوئی دعا کریں کہ دعا کا وقت سورۃ ملک یا اس کے قریب پڑھنے کے

وقت کے برابر ہو۔ حصن حصین کا، جو وقت کی کسی تخصیص کے بغیر سب سے افضل دعا ہے، مطالعہ کرنا چاہیے۔ اس کے بعد دل کو تفکر و تعلق میں مشغول کریں۔ جب تک کر سکتے ہوں حتیٰ کہ فجر کا وقت ہو جائے۔ اس کے بعد سو بار کلمۂ طیبہ، سو بار سبحان اللہ وبحمدہ۔ اس کے بعد تعلق قلب سے حق سبحانہ میں مشغول ہوں، یہاں تک کہ آفتاب بلند ہو جائے۔ اس وقت دو رکعت پڑھیں۔ اور آفتاب کے گرم ہونے پر چار رکعتیں پڑھیں۔ تیسرے عشاء کے بعد سو بار لا الہ إلا اللہ ذکر خفی سے بلند اور جہر سے کم آواز میں پڑھیں۔ اس وقت سورۃ ملک یا سبحات (جن سورتوں کے شروع میں لفظ سبحان، سبح یا یسبح وغیرہ آئے ہیں) میں سے کوئی پڑھیں۔ اس کے بعد بستر پر جائیں اور تعوذات پڑھیں۔ اور ہاتھ پر دم کر کے سارے جسم پر پھیریں۔

۳۰۹- تفہیم:

افراد انسانی کے باہمی فرق کا بیان

الحمد لله الذى فتح على قلوب الافراد من عباده علوماً لا يطيقها السموات والارضون واحوالا لا تحيط الاعوام والسنون واسرارا لا تحوم حومها الاوهام والظنون وتدليات منازلات لا يستطيع وصفها الواصفون واستعظمها العارفون واستنكرها الجاهلون لم يزد المحجوبين الابلاء وعناء ولم يزد المحبوبين الإسناء وضياء "تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے اپنے کچھ بندوں کے دلوں پر ان علوم کے دروازے کھول دیئے جن کی طاقت آسمان اور زمین نہیں رکھتے۔ اور ان احوال کے دروازے کھول دیئے جن کا احاطہ سال و برس نہیں کر پاتے اور ان اسرار کے باب وا کر دیئے جن تک وہم و خیال کی بھی رسائی نہیں ہوتی۔ اور وہ تدلیات قربتیں و درجات عطا فرمائے جن کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ عارفوں نے ان کی عظمتیں بیان کی ہیں جبکہ جاہلوں نے ان کی نکیر کی ہے۔ جن پر پردے پڑے ہوئے ہیں ان پر صرف آزمائشیں اور مشقتیں زیادہ ہوتی ہیں اور محبوبین پر ضیاء و روشنیاں ہوتی ہیں۔" ان کی شان جتنی عظیم ہے اور ان کی برہان جتنی قوی ہے۔ پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے بندوں میں سے بعض افراد کو اس مقام پر ڈھونڈا جس پر وہ زمانہ سے پہلے تھے اور ان کو غیب

کے میدانوں میں اس مقام پر پایا کہ جہاں غیب کے جھاگ تھے جہاں کوئی جگہ اور مقام نہیں تھا۔ اور ان کو ان کے نفس کے سوا کچھ بھی عطا نہیں فرمایا۔ ان کے لیے نسب ہی کافی ہے کہ جس میں نہ وصل ہے نہ فصل، نہ عدل ہے نہ عدوان اور اس کے ساتھ کوئی معاملہ اس وقت سے ہی نہیں آیا جب سے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا گیا، سوائے اس کے کہ وہ معاملہ انہی کی طرف لوٹتا ہے اور انہی کے گرد گھومتا ہے۔ اور یہ سب کچھ اللہ کا احسان ہے۔ وہ ایسے موتی ہیں کہ ان کا مقام بہت بلند ہے۔ اور ان کا کلام بہت دقیق ہے۔ وہ جو کچھ ہیں وہ ہیں۔ وصلی اللہ علی رسولہ سیدنا محمد و آلہ وبارک وسلم، اما بعد. یہ علوم دل کے اوپر ایک ہی بار میں نازل ہوئے اور ان کے مطابق زبانیں کھلیں۔ حسبنا اللہ ونعم الوکیل، ولا حول ولا قوۃ إلا باللہ العلی العظیم. جان لو کہ افراد انسان اگرچہ انسانیت میں اور جن خواص کا ہم تتبع کر سکتے ہیں، ان میں باہم شریک ہیں لیکن جن باتوں کا ہم نے ذکر کیا ہے ان میں باہم شریک ہونے کے باوجود ان کے درمیان بہت سے اختلافات ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے مخالف اور متباین ہیں۔

ان میں سے بعض وہ ہیں کہ ان میں صورت نباتیہ کا غلبہ ہوا ہے جس سے ان پر کمالات ناسوتیہ پوری طرح ظاہر ہوتے ہیں۔ جس سے وہ دوسرے تمام افراد سے ممتاز ہو جاتے ہیں۔ اور ان میں سے بعض وہ ہیں کہ ان میں صورت حیوانیہ کا غلبہ ہوتا ہے۔ ان پر کمالات حیوانہ حس، حرکت، غضب، شہوت اور بھوک وغیرہ ظاہر ہوتے ہیں۔ جو ان سے افضل ہوتے ہیں جو ان کے علاوہ میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اور ان میں سے کچھ وہ ہیں جن میں صورت انسانیہ کا غلبہ ہوتا ہے جس سے ان میں شجاعت، فیاضی دسخاوت، حکمت اور فصاحت وغیرہ سب مترشح ہوتے ہیں، جن کو ہم نے حجۃ البالغہ میں بیان کیا ہے۔ اور ان میں بعض وہ ہوتے ہیں جن میں صورت شخصیہ کا غلبہ ہوتا ہے، جس پر فنا، بقا، قبض وبسط اور تدلیات عجیبہ مترشح ہوتے ہیں۔ اور ان میں کچھ وہ ہوتے ہیں جن میں صورت عینیہ کے لیے غلبہ ہوتا ہے۔ چنانچہ ان کے اعیان میں تجلی ہوتی ہے جس سے وحی متحقق ہوتی ہے۔ اور وہاں عظیم امور پیش آتے ہیں۔ ان میں کچھ ایسے ہوتے ہیں جن میں صوت مائیہ کا غلبہ ہوتا ہے، ان

سے میری مراد وہ جوہر ہے جو عناصر کی اصل ہوتا ہے۔ اور ان میں سے بعض ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں صورت عمائیہ کا غلبہ ہوتا ہے۔ اس سے میری مراد وہ جوہر ہوتا ہے جو رحموت سے پہلا صادر ہوتا ہے۔ کبھی کبھی ہم اس کو موجود کل بھی کہتے ہیں۔ اس کا خاصہ یہ ہے کہ ہر ایک پر ضرب واحد محمول ہوتی ہے اور موجودات میں سے ہر ایک پر کئی کئی ضربیں ان کے تعدد کے لحاظ سے ہوتی ہیں۔ اس کی طبیعت دونوں امور میں سے کسی سے زائل نہیں ہوتی۔ اور ان میں سے بعض وہ ہوتے ہیں کہ ان میں صورت رحموت کا غلبہ ہوتا ہے اور افراد انسانی میں مبدا سے قرب کے اعتبار سے اس سے اعلیٰ کوئی مقام نہیں ہوتا۔ سوائے خرق عادت اور بلند آواز کے اعتبار کے۔ ان کے علاوہ کتنے ہی لوگ ہیں جو ان امور کے اعتبار سے مکمل ہوتے ہیں۔ اور ان امور کو اور آخر والے تینوں کو ہم اپنی زبان میں اسم فرد اور مائی سے خاص کرتے ہیں۔ ان میں بعض ایسے ہوتے ہیں کہ ان کا کلام حکیم طبیعی کے کلام سے مشابہ ہوتا ہے۔ البتہ طبیع امر کا اس کے تمام جوانب سے احاطہ کرتا ہے اور یہ اس کے قلب کی جڑ اور اس کی حقیقت کی اصل سے ہے۔ اور ان میں سے عمائی اس پر اس کلام سے زیادہ ہوتا ہے جو حکیم ریاضی کے کلام سے مشابہ ہوتا ہے۔ اور ان دونوں میں فرق ایسا ہی ہے جیسا گزر چکا۔ اور ان میں سے رحمانی اس کلام سے دو فرد زیادہ ہوتا ہے جو حکیم الٰہی کے کلام کے مشابہ ہوتا ہے۔

پھر فرد، اشیاء کے حقائق کو صرف انہی حقائق سے جانتا ہے، نہ ان کی صورتوں سے جانتا ہے اور نہ ہی آلات کی مدد سے۔ اس لیے کہ اس کے علوم رحموت یا عمایا ماء سے مترشح ہوتے ہیں۔

اور اگر تم حال میں غور و فکر کرو تو جانو گے کہ اس سے عالم، رحموت یا عماء یا ماء میں سے کوئی جز ہے، اور باقی اجزاء اس علم میں لغو ہیں۔ اس کو کوئی علم مس نہیں کرتا۔ اور نہ ہی وہ سمندر کی فطرت کی طرح ہے۔ اور ہر ایک جو کچھ ہے دہر اور رحموت اور ان کے قریب والوں سے ہے۔ اس پر اشیاء کے حقائق کا انکشاف ہوتا ہے۔ اس لیے وہ اپنے نفس کے کمالات اور اپنی ذات کے تحولات، اپنی حقیقت کے تلونات ہیں۔ اور کمالات، تحولات اور تلونات کا مغز بعینہ متلون ہے۔ چنانچہ عالم اور معلوم واحد ہیں۔ اس کا علم اس وحدت کے اعتبار سے ہے۔

اب اگر تم کہو کہ جس نے علم حاصل کرلیا تو وہ اس کا حال ہے خواہ وہ فرد ہو یا نہ ہو۔ تو میں کہتا ہوں کہ احکام کی نسبت اس کی طرف جو اس میں غالب ہے، حقیقت ہے۔ اور اس کے علاوہ کی طرف مجاز ہے۔ اور تخیلات شعری کی ایک قسم ہے۔ پھر فردیت کے خواص سے دنیاوی نشاۃ میں لباسوں کا اتارنا ہے۔ پھر وہ ناسوت سے مرجاتے ہیں تو برزخ میں داخل ہوتے ہیں۔ پھر عالم محشر میں لوگوں کو دیکھیں گے کہ ان کا محاسبہ کیا جارہا ہے اور ان پر مواخذہ کیا جارہا ہے، پھر جنت میں داخل ہوں گے پھر حظیرۃ القدس میں۔ پھر اللہ کی طرف خاص صورت میں متوجہ ہوں گے، تو اس کے وجہ کریم کا مشاہدہ کریں گے۔ پھر اس موت سے مریں گے جس میں لوگ ان کے شریک ہوں گے۔ اس کی تفصیل صرف وہ ہوتی ہے کہ اس پر ان کا حال مشتمل ہوتا ہے۔ شیخ ابوسعید نے اپنی موت کے وقت اسی کی طرف یہ کہتے ہوئے اشارہ کیا تھا۔

چیست ازیں خوب تر درهمه آفاق کار
دوست رسد نزد دوست ، یار بنزدیک یار

''سارے آفاق میں اس سے بہتر اور کیا ہے کہ، دوست دوست کے نزدیک پہنچ جائے، یا ریار کے نزدیک۔''

آں همه اندوه بود ویں همه شادی
ایں همه گفتار بودویں همه کردار

''وہ سب رنج وغم تھا یہ سب کچھ خوشی وشادمانی، یہ سب کچھ گفتار تھا اور وہ سب کچھ کردار۔''

اور ان میں سے ایک یہ ہے کہ افراد کی موت کے وقت تجرد اور تنزہ کی طرف شوق ان کی مدد کرتا ہے، تو وہ ان کی موت کا سبب ہوجاتا ہے، اور اکثر ان کی عمریں پچاس سے ساٹھ سال تک ہوتی ہیں۔ وہ لوگوں میں سب سے زیادہ ذکی ذہین اور سخی وفیاض ہوتے ہیں۔ کسی صاحب مذہب پر اس کے مذہب کی نکیر صرف ملت خاصہ کے نظام کے مطابق اور ان کے قلوب کے اعتبار سے کرتے ہیں اور نصوص میں وارد ہونے والے عمومات ان

کا احاطہ نہیں کرتے بلکہ وہ ان کے درمیان مخصوص ہوتے ہیں۔

اور جان لو کہ جس کے کمال نے روح اعظم سے ترقی کر لی اس کے کمون وحجاب اور بروز وظہور ہوتے ہیں جبکہ اس کے برعکس نہیں ہوتا۔ اور روح اعظم سے میری مراد ہر صورت انسانی، حیوانی نباتی یا معدنی کا اجمالی فیض ہے کہ یہ اس اجمالی فیض کی شرح اور تفصیل ہے۔

اور کمون و بروز کی دو قسمیں ہیں: حقیقی اور مجازی۔

مجازی یہ ہے کہ اگر آدمی اس حقیقت عامہ تک پہنچ جاتا ہے جو تمام حقائق پر مشتمل ہوتی ہے تو وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ علم کی صورتیں تبدیل ہو گئی ہیں۔ اور اس کے کمالات نے رنگ اختیار کر لیا ہے۔ وہ اس میں ہے اور اس سے ہے۔ اور اس مجازی کے بہت سارے شعبے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ حقیقت مثال کی شکل اختیار کر لے تو اس کو بعض واقعات میں دیکھا جائے۔ گویا کہ اس نے عالم کو پیدا کیا ہے، پھر اس کو فنا کیا ہے اور اس طرح سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ اور ان میں سے ایک یہ ہے کہ اپنے دل میں یہ محسوس کرے کہ وہ، وہ ہے جس کی دعا سے طوفان ظاہر ہو گیا۔ اور وہ اس وقت نسل انسانی کی بقا میں منتظم ہے۔ اور وہ ہے جس کی دعا سے فرعون کا غرق ہونا ظاہر ہوا۔ اور اس طرح ایک کے بعد ایک ملت کی اقامت ہوئی۔ اور ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس کا نفس حقیقت ہیولانیہ کلیہ کو دیکھے۔ کوئی رہنمائی پانے والا اس کے تقرب کے بغیر راہ نہیں پاتا۔ اور نہ ہی کوئی مدد چاہنے والا اس کی حقیقت سے ہٹ کر مدد چاہتا ہے۔ بلکہ وہ ان واقعات کو پاتا ہے جو زمین کے مشرق ومغرب میں مریدوں پر ظاہر ہوتے ہیں۔ اور تمام فال اور جفر تمام ہیولانیہ کی حقیقت کی ہانڈی ہیں۔ اور یہ قرب مجازی افراد کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ بہت سے لوگ تو فرد بھی نہیں ہوتے۔ ان کمالات کی مثالیں بیہودہ ہوتی ہیں۔ اور وہ نہیں جانتا کہ اس کے اوپر یہ کس طرف سے مترشح ہو رہی ہیں۔

اور حقیقی کی بھی چند قسمیں ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ آدمی اس امر سے پوشیدہ ہو جاتا ہے کہ احکام ناسوت سے بلند ہو جائے۔ اور وہ ملکوت کے مشابہ ہو جاتا ہے تو لوگ اس کو نہیں دیکھتے، حتیٰ کہ اللہ اس کے ظہور کا فیصلہ فرماتا ہے، خواہ نوع انسانی کی نسل کی

ہلاکت کے بعد ان کے قیام کے لیے یا ملت کے ناپید ہونے کے بعد اس کے قیام کے لیے۔ جیسا کہ عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ معاملہ پیش آیا۔ یا حقیقت اجمالیہ الٰہیہ کا ظہور جو آدمی کی حقیقت سے مخلوط ہے۔ وہ کبھی ایک خاص ملت کا منتظم ہوتا ہے۔ اور کبھی آدمی کی حقیقت سے اس کی آل یا متوسلین سے مخلوط ہوتا ہے جیسا کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ظہور مہدی کی طرف نسبت سے ہے کہ جب نصرانیوں نے ملت اسلامی پر سرکشی کی تو اللہ کی حکمت یہ ہوئی کہ نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کی آل سے ایک ایسے شخص کو ظاہر کرے جو ان کی سرکشی کا قلع قمع کرنے والا ہو۔

اور ان میں سے ایک یہ ہے کہ فرد دنیاوی زندگی سے علیحدہ ہو جائے گا، پھر ہر رُخ کی سختی سے جان دے دے گا، پھر جنت میں داخل ہو جائے گا، پھر حظیرۃ القدس کی طرف خالص ہو جائے گا اور کلمہ الٰہیہ باقی رہ جائے گا۔ زمین پر اللہ کے جود وسخا کی بارش ہوگی، پھر کلمہ الٰہیہ اس سے جدا ہو کر صاف حالت میں ملے گا تو اس کی جود وسخا نوع انسانی کی طرف منتقل ہوگی۔ اور یہ کمون وبروز کا سب سے مکمل درجہ ہے۔

اور جان لو کہ دجال اکبر سے نیچے بہت سارے دجال ہیں۔ ان سب کو ایک ہی امر جمع کرتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ وہ اللہ کے نام کا ذکر کرتے ہیں، اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ لوگوں کو اللہ کی طرف دعوت دیتے ہیں، اور خرق عادت امور اور لوگوں میں قبولیت ان کا ساتھ دیتے ہیں۔ اور ان کے لیے گردنیں جھکتی ہیں اور وہ ایسے امور کی طرف دعوت دیتے ہیں جو عموم انسانیت کے خلاف ہوتے ہیں جو کہ ملت حنیفہ ہیں۔ اور ان منافع میں عیب جوئی کی طرف دعوت دیتے ہیں جن پر نظام بشر مبنی ہے۔

ان میں سے کوئی نبوت کا دعویٰ کرتا ہے اور یہ زعم رکھتا ہے کہ اس کے دل میں اشراقات، علوم، قتل، ہتک حرمات ووحی وعلم ربانی اور ان دونوں کے درمیان پائی جانے والی بہت سی باتوں میں سے شرور انسانیہ کی حقیقت سے مناسبت جبلیہ کی جانب سے کوئی برائی نہیں ہے۔ اور ان میں سے کوئی حلول کا دعویٰ کرتا ہے اور اپنے نفس کو طاغوت بنالیتا ہے کہ اللہ کو چھوڑ کر اس کی عبادت کی جاتی ہے۔ اس سے مدد طلب کی جاتی ہے۔ اور وہ زعم کرتا ہے

کہ وہ امور تدبیری رزق و شفا میں تصرف کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وہ جب کسی شئے کا ارادہ کرتا ہے تو کہتا ہے 'ہوجا' اور وہ ہوجاتی ہے۔

اور جو لوگ لذات جسمانی، حب مال، اطاعت، غضب، بخل، معصیت اور اللہ اور اس کے امر کے سلسلہ میں جہل کے ڈھیر وغیرہ میں انہماک کے ساتھ نرم امور میں نافرمانی کے ذریعہ زمین میں فساد پھیلاتے ہیں۔ وہ اللہ کے نام کا ذکر نہیں کرتے، نہ ہی وہ اللہ کی اطاعت میں مشغول ہوتے ہیں، وہ دجال نہیں فرعون ہیں۔ تو اے طالب! اس امر سے ہوشیار رہو کہ تمہیں دجال اور فرعون اللہ کے راستہ اور ملت حنیفہ سے گمراہ نہ کردیں۔

اور جان لو کہ اعتبار ان کمالات نسمیہ میں سے نہیں ہے جو طبیعت کے مخالف ہونے کے باوجود اسم سے حاصل کیے جاتے ہیں۔ بلکہ اعتبار ان کمالات میں سے ہے جو نفوس پر کسی موقع سے واقع ہوتے ہیں۔ اور ان سے کوئی کمال حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ کتنے ہی لوگ ہیں جنہیں حقیقت کے لحاظ سے کمالات نسمیہ میں سے کوئی شئے حاصل نہیں ہوتی۔ چنانچہ وہ حیوانی طبیعت کی نرمیوں کی طرف میلان رکھتے ہیں، خواہ ان پر ظاہر امر میں انسانی نرمی اور آدمیوں کے اخلاق غالب آجائیں۔ لیکن یہ کہ اسم سے عاری فرض کیا جاتا ہے جو کہ حیوان غیر ناطق ہوتا ہے۔ اور کتنے لوگ ہیں جو نرمیوں کے حواشی میں گہرائی سے غور وفکر کرتے ہیں۔ جیسے شاعر جو شعر گوئی میں بہت جید ہو، کاتب جو اپنی کتابت میں جید ہو، حداد لوہار جو اپنے لوہے کے کام میں مستغرق ہو اور نجار بڑھئی جو اپنے لکڑی کے کام میں مستغرق ہو حتی کہ اگر اس کو کھانے پینے، فریضۂ زوجیت کی ادائیگی سے بھی مستغنی سمجھ لیا جائے تو بھی وہ ان کاموں کو نہیں چھوڑے گا۔ اس لیے کہ اس کا دل ان سے لبریز ہے، اور اس عمل میں درجۂ استحسان حاصل کرنے کے لیے اس کا نفس فنا ہو چکا ہے۔ چنانچہ عرف عام میں کہا جاتا ہے، وہ کتنا ظریف اور کتنا عقلمند ہے۔ حالانکہ اس میں ذرہ برابر بھی انسانیت نہیں ہے۔

اور کتنے ہی لوگ ہیں کہ ان پر صورت جلیلہ الٰہیہ کا فیضان ہوتا ہے جو اپنے کمالات کے ساتھ انسانی صورت میں متفرع ہے، جیسے حیوانیت پر انسانیت کا تفرع ہوتا ہے۔ چنانچہ جب وہ زیادہ ہوجاتے ہیں اور افراد انسان، انسانیت سے افراط وتفریط میں تجاوز کر جاتے

ہیں تو گھریلو فتنے ظاہر ہوتے ہیں۔ ایسی حالت میں صاحب خانہ موت کی تمنا کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور چاہتا ہے کہ اگر اس کا نظام تنزلی دو قدم کی برابر بھی جدا ہو جائے تو وہ مر جائے۔ یا زبان درازی یا بیٹے کا گم ہو جانا یا اس جیسے دیگر حالات شہر کے فتنے، راہزنوں، چوراہوں، شہر پر زور وز بردستی سے غلبہ حاصل کرنے والوں اور غاصبوں کے ظہور سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس سے جھگڑے بڑھتے ہیں اور ہر آدمی اپنے نفس کو بڑھاتا ہے کہ کوئی اس کے اعزاء واقرباء میں سے اس کا مقابلہ نہ کر سکے۔ اور کسب وکمائی کے فتنے کہ اہل مجد وشرف سے رذیل کمائیوں پیشوں کے امتناع پر رسم منعقد ہو جاتی ہے اور شریف پیشوں کے راستے بند ہو جاتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ سلطان سے ملاقات پر موقوف ہوتے ہیں۔ اور اس ملاقات سے نیچے مسابقات مقابلہ آرائی، چھین جھپٹ اور حیلہ بازیاں ہیں۔ چنانچہ مقاصد کے حصول سے پہلے ان حیلوں اور اقلیمی فتنوں میں فنا ہو جاتے ہیں۔ رعایا کے لوگ تلخ کلامی کرنے والوں میں جو اس کے ارد گرد نہیں گھومتا اور میٹھا کھانے والوں میں بدل جاتے ہیں جو ایک لحہ کے لیے بھی نہیں چھوڑتے۔ اور بادشاہ ایسے ظالم ساتھیوں کے درمیان ہوتے ہیں جو درندے ہوتے ہیں۔ یا بکواس کرنے والوں میں بدل جاتے ہیں جن کے اوپر بکری پیشاب کرتی ہے۔ اس وقت ہر شہر کو غرق، لوٹ، زمین کے دھنسنے، زلزلوں اور رنج وغم کے عذاب میں مبتلا کیا جاتا ہے اور چوتھائی زمین باطل ہو جاتی ہے۔ زمین سخت ہو جاتی ہے، جس میں صرف ملعون لوگ ہی پائے جاتے ہیں۔ بڑے بڑے شہر چھوٹے ویران گاؤں میں اور گاؤں کھنڈروں اور جنگلوں میں بدل جاتے ہیں۔ گویا کہ میں ان کے قیام میں ٹٹو پر سوار ہوں جوان پر روتا ہے، اور ان کے لیے جلتا ہے، اور اس کے دل میں شعلے بھڑکتے ہیں، ان پر قبیلہ قبیلہ اور گاؤں گاؤں پھرتا ہے، وہ جو کچھ کرتے ہیں، اس سے ڈراتا ہے۔ ان کو معروف کا حکم دیتا ہے اور ان کو پکارتا ہے کہ رشد وہدایت کی طرف آجاؤ۔ تو وہ اس کی طرف نہیں بڑھتے۔ اس وقت اجتماعی حادثہ حل ہوتا ہے۔ اور بڑی پکڑ آتی ہے اور گویا کہ میں ایسا آدمی ہوں کہ خاموش رہتا ہوں جس کی کوئی پرواہ نہیں کی جاتی۔ اس کا درخت بلند ہو گیا اس کے ڈنڈے کو بغل میں دبا لیا گیا۔ کوئی اس کے برابر نہیں ہوتا اور نہ ہی کوئی اس کے قریب

ہوتا ہے۔اور وہ صرف مسخرہ پن اور بکواس کرنے والوں کے فنا ہونے کے بعد ہوتا ہے۔اور لوگ راہ راست پر چلنے والوں اور رہنمائی کرنے والوں کے محتاج ہیں۔خواہ کسی ایک اقلیم ہی میں کیوں نہ ہوں۔اور تفصیل کو اللہ جانتا ہے کہ وہ کون ہے اور وہ کہاں ہوگا۔

اور گویا کہ میں اس زمانہ میں ہوں جس میں علم کے سوتے خشک ہو گئے اور جہالت کے ہنر بلند ہو گئے۔تو جس زمانہ میں ہم اس حالت سے دوچار تھے اور اسلام کے مرکز میں کفار کی جانب سے زبردست مصیبت واقع ہوئی، ان کی ملت بہت قوی ہو گئی۔اس ظلمت کو دور کرنے کے لیے صرف چند اہل علم و رشد کھڑے ہوئے۔ان کا امام ایک رجل صالح ہوا۔ وہ ان کا دفاع کرتے رہے حتیٰ کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو گیا۔

اور گویا کہ میں ان شاہراہوں میں سے کسی ایک پر تھا جب انہوں نے ایک حیلہ سے کام لیا۔پھر ان پر ایک زوردار حملہ کیا تو کفر کا سر کچل دیا۔اور اس کی قوت و غلبہ کو کمزور کر دیا۔پھر ان کے اوپر فتح و غلبہ حاصل کر لیا۔تو ان علوم نے بروز و کمون کے ایک شعبہ سے استخراج کیا۔

اور گویا کہ میں آم کے پیڑوں کے درمیان ایک درخت پر ہوں جس کا نظام مکمل ہو چکا ہے تو درخت کی صورت جدا ہو گئی جو اللہ کی طرف راغب ہو گئی۔پھر خشکی کے جانوروں میں سے کسی حیوان کی صورت کے فیضان کے لیے تیار ہو گئی۔جیسے نیل گائے یا بہیمیت میں اس سے کم، جسم میں اس سے کمزور اور عقل میں زیادہ تیز۔تو وہ سن کہولت، ادھیڑ عمر کو پہنچا پھر حیوانی بنیادیں جدا ہو گئیں جو اللہ کی طرف راغب ہوئیں۔پھر صورت انسانی کے فیضان کے لیے تیار ہوئیں۔اس وقت اللہ نے انسان کو ایجاد کیا جس کے اخلاق انسانی نامکمل تھے اور آثار انسانی ظاہر نہیں ہوئے تھے۔اس کے معنی بہت جلیل القدر اور سریع السیر تھے۔پھر جب پچاس سال یا اس کے آس پاس کی عمر کو پہنچ گیا تو تجرد کا اشتیاق پیدا ہوا۔اور اس کا جسم بھاری ہو گیا۔پھر اس بھاری پن کی وجہ سے مر گیا۔

اور یہ تبدیلیاں تناسخ کے طور پر نہیں ہیں، بلکہ اللہ کے وجود کے فیضان کے لیے تیاری کے طور پر ہیں۔اور فیض ہر بار میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مبتدا ہے۔اور وہ فیض مثال کے طور پر نفس انسانی ہے۔چنانچہ اس کے اور تناسخ کے درمیان کتنا بعد ہے۔اس کا باطل ہونا

عقلی اور نقلی شواہد سے معلوم ہے۔ اور شاید یہی راز ہے جس کی طرف بہت سی قومیں مائل ہوگئیں۔ اور تناسخ کے چکر میں پڑ گئیں۔ اس طرح وہ خود بھی گمراہ ہوئیں اور انہوں نے دوسروں کو بھی گمراہ کیا۔ اور جان لو کہ اولیاء اللہ کے لیے معاش اور اللہ تعالیٰ سے ان کے قلوب کے تعلق کے سلسلہ میں بہت سے راستے ہیں۔ پھر ان میں سے کچھ کسب کرتے ہیں اور کچھ نہیں کرتے۔ اور ہم کسب کرتے ہیں لیکن طلب میں اجمال واختصار سے کام لیتے ہیں۔ اور کسب صرف وہ ہے جو کسی نہ کسی جہت سے عبادت ہے۔ جیسے غزوہ اور تدریس۔ اب اگر اللہ نے ہمارے اوپر اپنے بندوں کے ہاتھ کشادہ کردیئے تو ہم کسب سے مستغنی ہوگئے۔ اور ان میں سے کچھ وہ ہیں جو طاعات کی نوافل کی کثرت کرتے ہیں۔ اور کچھ وہ ہیں جو فرائض اور وظائف پر اکتفا کرتے ہیں۔ اور اپنے زیادہ تر اوقات اللہ کے ساتھ دل کے تعلق میں مشغول رہتے ہیں۔ اور ہم صرف وہی نقل کرتے ہیں جو مشہور و معتبر کتابوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح حدیث وارد ہوئی ہے۔ اور اس پر اکتفا کرتے ہیں۔ اور ان میں سے کچھ وہ ہیں کہ ان کی زیادہ تر کوششیں طاعات کے انوار، حسن اخلاق اور آداب اپنے قلب کی تہذیب پر مشتمل ہوتی ہیں۔ اور کچھ وہ ہیں کہ ان کی کوششیں توحید کے ذریعہ اپنے باطن کی اور شہود حق کے ذریعہ اپنے مظاہر کی تہذیب سے متعلق رہتی ہیں۔ اور ان میں سے کچھ وہ ہیں کہ ان کی زیادہ تر کوششیں اجمال اور تعلق بسیط میں اضمحلال سے متعلق ہوتی ہیں۔ اور ہم طاعات کے انوار اور حسن واقعات سے ایک حصہ نہیں چھوڑتے۔ اور یہ وہ حصہ ہے جو ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وراثت میں ملا ہے۔

اور زائد کا ہمارے نزدیک ترک کرنا اور اجمال وتفصیل سب برابر ہے۔ یہ ایک الگ طریقہ ہے۔ اور ہم رخصت کی بجائے عزیمت کے طور پر، جس کا شریعت حکم دیتی ہے اس سے زیادہ شبہات پیدا کرنے میں مشغول نہیں ہوتے۔ چنانچہ جس کو شریعت نے مباح قرار دیا ہے وہ حلال اور مباح ہے۔ اس سے آگے صرف وسوسے ہیں اور ہم فروع میں سے صرف ان امور کو لیتے ہیں جن پر علماء خاص طور سے ان دونوں بڑے فرقوں حنفیہ اور شافعیہ کا اتفاق ہے۔ خاص طور سے طہارت اور نماز کے سلسلہ میں۔ اب اگر اتفاق نہیں پایا جاتا اور ان کا آپس میں

اختلاف ہوتا ہے تو ہم اسے لیتے ہیں جس کی ظاہر حدیث اور اس کا عرف گواہی دیتی ہے۔

اور ہم علماء میں سے کسی کو رد نہیں کرتے کہ وہ سب حق کے طالب ہیں۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی کی معصومیت کا عقیدہ نہیں رکھتے۔ اور خیر وشر کی معرفت کے سلسلہ میں پیمانہ کتاب ہے۔ اس کی واضح تاویل کے مطابق اور معروف سنت ہے۔ نہ علماء کا اجتہاد ہے اور نہ ہی صوفیا کے اقوال ہیں۔ جو اللہ کی کتاب میں تدبر نہیں کرتا اور اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا۔ وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ اور جو علماء یعنی ان صوفیاء سے جن کو کتاب وسنت سے ایک حصہ حاصل ہے اور ان راسخین فی العلم سے جن کو صوفیت سے ایک حصہ حاصل ہے اور ان محدثین سے جن کو حدیث سے ایک حصہ حاصل ہے یا ان فقہاء سے جنہیں فقہ سے ایک حصہ حاصل ہے، ترک تعلق کرتا ہے، وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

اور جاہل صوفیا اور منکرین تصوف راہزن اور دین کے چور ہیں۔ تم خود کو ان سے بچاؤ۔ **جعلنا اللّٰہ سبحانہ ممن یطیعہ ویتبع رضوانہ ولا یشرک بہ شیئا** "اللہ سبحانہ ہمیں ان لوگوں میں شامل فرمائے جو اس کی اطاعت کرتے ہیں، اور اس کی رضا حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتے" کہ ہم اس کے ہیں اور اس کے لیے ہیں۔ والسلام

۳۱۰- تفہیم:

گنہگار مومنوں کے احوال

نصوص حکم کرتے ہیں کہ بعض گنہگاروں کو حق سبحانہ معاف فرمادیں گے۔ البتہ جن لوگوں کا معاملہ مشکل ہے حق سبحانہ نے عام لوگوں کے سلسلہ میں اپنے رسول پر نازل فرما دیا۔ اور عارف اور اطاعت گزار دونوں کو اس میں مخاطب فرمایا۔ اس راستہ میں رمز کے سوا کچھ نہیں دیا۔ جیسا کہ فرمایا: **یعذب من یشاء ویغفر لمن یشاء** "جس کو چاہے عذاب دے اور جس کو چاہے بخش دے۔" عذاب اور مغفرت کا دارومدار مشیت پر ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ لیکن خواص کے لیے اس مسئلہ کی تعلیم کے بعد ایک راز واضح کر دیا جس سے

وہ جانتے ہیں کہ دنیا اور آخرت کے تمام کاروبار لامحالہ مشیت کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اس کے ساتھ اسباب کی سببیت ظاہر نہیں فرمائی کہ اگر دنیا میں وہ نہ ہو تو تکلیف ومواخذہ باطل قرار پائے، اور آخرت میں اعمال کے سلسلہ میں حکم لگایا کہ وہ جہنم میں داخلہ کے اسباب ہیں۔ چنانچہ اگر خاص ان کی معافی کا قاعدہ مقرر کر دیں اور ضابطہ بیان کر دیں تو یہ نصوص کے خلاف نہیں ہوگا بلکہ ان کا باطن اور ان کے دماغ کا کشف ہوگا۔ جب یہ تمہید بیان کر دی گئی تو ہم کہتے ہیں کہ بندہ جو اعمال کرتا ہے، وہ سب اس کے جوارح ونسمہ کی مداخلت سے صادر ہوتے ہیں۔ اور صورت انسانی مجرد کا بھی یہی معاملہ ہے کہ وہ ایک مثال کا لباس پہنے ہوئے ہے۔ اس میں بالذات مداخلت نہیں ہے۔ لیکن اگر یہ انسانی صورت لباس مثالی میں بدن اور نسمہ میت سے مجرد یا لپٹا ہوا نہ ہو تو اس سے ملا ہوا اور اختلاط میل جول رکھتا ہوگا۔ ایسا میل جول کہ اس کے مطلق تجزیہ کی حالت یاد نہیں ہوگی، اور وہ سب بدنی مطابقت ونرمی اور لذت میں گیا ہوا ہے خواہ دنیا میں، خواہ آخرت میں۔ مثلاً اس کے سامنے حور سے مجامعت اور شراب طہور کا پینا رکھا جائے گا، اور جو اس سے وابستہ رہے گا اس شخص کو اس اچھے عمل کا نفع حاصل ہوگا کہ خواہ زبان سے کہے یا ہاتھ سے کرے۔ اور اس کی پیدائش بھی اعمال سے وابستہ ہے۔ اس کا غضب محض گالی دینا اور مارنا ہے۔ اور اس کی سخاوت محض عطیہ ہے کہ فقیر کے ہاتھ میں رکھ دے۔ اور جب اس حالت سے کچھ بلند ہوتا ہے تو اس کی ہمت نرمی ولذت نسمیہ میں چلی جاتی ہے، خواہ دنیا میں ہو خواہ آخرت میں۔ اس کی لذت نفس کے انبساط سے ہے۔ اگر چہ اس کے شاہد کے حضور کے بغیر ہاتھ آتی ہے۔ اور اس کا غضب محض نفس کا جوش ہے۔ اگر چہ گالی دینے، مارنے اور پھولنے سے رگیں خالی ہوتی ہیں اور اس کی سخاوت نفس کے خرچ کے لیے جوش ہے۔ اگر چہ فقیر قبول نہ کرے۔ اس قوم کو اس موت میں کہ اس کی قوت ادراکیہ میں اس کا خیال کہیں یا وہم نام رکھیں، یہ اعمال واخلاط کہ جو اس کی ہمت کا احاطہ کرنے والے ہیں، ہولناک شکلوں میں پیش کرتے ہیں۔ اور برے اعمال کرنے والوں کو عذاب سے دوچار کرتے ہیں۔ اور اچھی صورتوں میں انہیں انعام سے نوازتے ہیں۔ اور جب عالم برزخ سے گزر کر حشر کے میدان میں جائیں گے تو یہ تمام اعمال

واخلاص مثالی شکل اختیار کر کے سامنے لائے جائیں گے۔ خواہ اس کے حق میں بہتر ہو یا برا ہو۔ ہاں جو قبر کی پیدائش کو اس کے اوپر اور نیچے سے احاطہ کرتا ہے، اور اس طرح حشر کی پیدائش کو اختیار کرتا ہے، اس کو نہ عذاب سے دوچار کیا جا سکتا ہے، نہ انعام سے نوازا جا سکتا ہے کہ اگر عمومی حکم سے وہ مردہ ہیں، تھوڑا سا رنگ پیدا ہوتا ہے، اور پھر دور ہو جاتا ہے۔ یہ دوسری چیز ہے اور وہ ان لوگوں میں سے ہیں الذین سبقت لھم منا الحسنی اولئک عنھا مبعدون "جن کے لیے ہماری طرف سے پہلے ہی بھلائی کا فیصلہ ہو چکا ہوگا تو وہ یقیناً اس سے دور رکھے جائیں گے۔" (الأنبياء:۱۰۱)

اور یہ وہ لوگ ہیں کہ جسم اور نسمہ سے مردہ ہیں، ان کی موت عملی نہیں بلکہ فقط ایک حالت کی ہے۔ اور وہ ان سب سے گزر چکے ہوں گے۔ اور وحدت کبریٰ کے ساتھ آ کر پھر دیکھتے ہیں، اور ہر نشاۃ کے حکم کی تکمیل کرتے ہیں اور یہ اکثر لوگ معصوم ہیں۔ خاص طور سے کبیرہ گناہوں سے محفوظ ہیں۔ اور اگر کچھ گناہ صادر بھی ہو جاتے ہیں تو وہ فوراً ہی استغفار وندامت سے کام لیتے ہیں۔ لامحالہ شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس جماعت کا قصہ ان عام الفاظ میں بیان کر دیا ہے: التائب من الذنب کمن لا ذنب له "گناہوں سے توبہ کرنے والا اس شخص کی طرح ہے جس نے کوئی گناہ نہ کیا ہو۔" اور ان الفاظ میں بھی بیان کیا: خلطوا عملاً صالحاً وآخر سيئا "انہوں نے اچھے اور برے دونوں طرح کے ملے جلے عمل کیے۔" یقیناً اللہ اہل بدر کے بارے میں پہلے سے جانتا تھا۔ اس لیے فرما دیا: اعملوا ما شئتم فقد غفرت لکم "تم جو چاہے عمل کرو میں نے تمہیں بخش دیا۔"

اور جس جماعت کا ہم نے ذکر کیا ہے ان میں السابقون، اصحاب یمین اور اصحاب شمال ہیں۔ ان کی غایت ہمت افعال نسمیہ ہوتے ہیں، ان کا مواخذہ اخلاق ہے۔ اس لیے چاہیے کہ مفردیت سے وابستہ لوگ مغرور نہ ہوں۔ صدیاں گزر گئیں اور زمانے گزر جائیں گے کہ کوئی فرد آئے، کون جانتا ہے کہ وہ کیا ہے، وہ کون ہے جن احوال وتجلیات پر لوگ ناز کرتے ہیں، وہ ان سے بندھے ہوئے بے وقوف ہیں۔ کتنی بیہودہ باتیں مجھ سے صادر ہوئیں، ان سے میرے لیے قیامت قائم کر دی گئی، ان سے ایک اشارہ کیا گیا اور سختی سے

حساب لیا گیا، حتیٰ کہ میں نے سمجھ لیا کہ میں ہلاک ہونے والا ہوں، پھر مجھے بخش دیا گیا کہ میں اپنے نفس کی طرف لوٹ گیا۔ اور میں نے اس تجلی کا مبدا پا لیا۔ اس کے حکم نے میرا احاطہ کر لیا۔ تب میں غفور اور رحیم جیسے اسماء کی طرف متوجہ ہوا۔ اور ان میں فنا ہو گیا۔ اس کے بعد اللہ کے علم اور انشراح وانبساط آئے۔ من جملہ ان کے یہ ہے کہ ایک شخص میرے سامنے آیا۔ اور میں اور اہل مجلس ایک مٹھائی کھا رہے تھے۔ تقسیم کرنے والے نے اس کو بھی دی۔ اسی دوران اس شخص کے دل میں یہ بات آئی کہ اگر یہ شخص اس چیز کو جو اس کے ہاتھ میں ہے، مجھے دے دے تو مجھے یقین ہو جائے کہ وہ اولیاء اللہ میں سے ہے۔ اور اس سے راہ خدا میں استفادہ کروں۔ میں نے دیکھا کہ حضرت ہادی نے اس پر عنایت کی اور اس کے دل میں پیدا ہونے والی بات کو صورت اور معنی کے لحاظ سے میں نے آشکارا دیکھ لیا اور اس پر توجہ وعنایت بھی کی۔ اس سب کے باوجود میں نے اشارہ کیا ۔خود بھی آگے بڑھا اور اس کو ایک لقمہ مٹھائی یا حلوہ کا کھلا دیا۔ حضرت ہادی نے مجھ سے مواخذہ کیا اور جھگڑا دکھایا۔ اور اس اشارے کو جو میں نے اسے کیا، میری دوری کا سبب قرار دیا تو میں نے حقیقت میں پوری طرح التجا کی جو اس کے نزدیک گمراہی وہدایت میں برابر تھی۔ اور استغفار کیا تو مجھے بخش دیا۔ اور منجملہ ان کے یہ ہے کہ ایک شخص میری ملاقات کے لیے آیا، اس وقت کا تقاضہ یہ تھا کہ ماحضر اس کو پیش کر دیا جائے اور اس کے رات گزارنے کا انتظام کر دیا جائے۔ میں نے دیکھا کہ وہ اس معاملہ کو ضروریات میں شمار کرتا ہے۔ اگر ان امور کو نہ کیا جائے تو اس کا دل ٹوٹ جائے اور وہ مجھ سے قطع تعلق کر لے۔ اور یہ کنارہ کشی اس کے لیے مضر ہوتی۔ مگر میں نے پرواہ نہ کی اور ناز کرتا ہوا چلا گیا۔ نہ ماحضر طلب کیا، نہ اس کی خاطر مدارات کی، جب وہ میرے گھر سے اٹھ کر گیا تو میرا احتساب کیا گیا اور مجھ پر عتاب کیا گیا۔ اور مجھ سے کہا گیا۔ اے بے وقوف! یہ ناز نہیں حماقت اور بے وقوفی ہے۔ اس قسم کے اور خطابات دیئے گئے، میں کچھ دیر ٹھہرا رہا، پھر مجھے بخش دیا گیا۔ اس طرح چند واقعات پیش آئے اکثر ایسا ہدایت الی اللہ کے لیے جاذب قلوب کے امر میں ہوا۔

۳۱۱- **تفہیم:**

وحدۃ الوجود اور فلاسفہ، اشراقیین، مشائین اور صوفیا کے مذاہب کی تنقیح

وحدت وجود کے قائل صوفیا اور فلاسفہ اشراقیین دونوں وحدت وجود اور ان کے ممکنات مظاہر اور ان کے تلونات وتقیدات کے ہونے پر متفق ہیں۔ البتہ اشراقیین ان کو جزوی قرار دیتے ہیں اور صوفیا ان کو کلیت و جزئیت سے پاک مانتے ہیں۔ درحقیقت یہ فقط نزاع لفظی ہے کہ جو جزئی کہتے ہیں، ان کی غرض اثبات تشخص ہے جو کہ عین ذات ہے۔ اور ہر اس تقید اور جہت سے غیر مزاحم ہے جس کا وجود، اقصیٰ کا تقاضہ کرتا ہے۔ اور جس نے جزئیت سے منزہ قرار دیا ہے۔ اس کی غرض وہ جزئیت ہے جو ذات پر تشخص زائد ہوتی ہے۔ اور تقیدات وجہات سے مزاحمت کرتی ہے۔ ورنہ جو تشخص عین ذات ہے، کوئی بھی صاحب عقل اس کی نفی کو کس طرح جائز قرار دے سکتا ہے۔ البتہ یہاں ایک بات باقی رہ گئی اور وہ یہ کہ اشراقیین تعلیات ذات کا نام عقول رکھتے ہیں۔ اور تنزلات ذات کو اس لفظ کے ضمن میں تعبیر کرتے ہیں۔ اور صوفیاء اسماء وتجلیات کے ضمن میں اگر کوئی جماعت بیان کرتا ہے اور نکتہ دریافت کرتا ہے کہ دوسری جماعت کے ہاتھ میں نہ آئے تو اس کو تدافع نہیں کہا جا سکتا۔ مشائین کا ظاہر کلام تغایر کے ساتھ ہے لیکن نظر کی تنقیح وتدقیق کے بعد ان کی غرض بھی وہی مدعا ہے، اس لیے کہ وجود امر انتزاعی ہے۔ لامحالہ اس کی خارج میں ایک مطابقت ہے۔ اور اس کے انتزاع کا منشا وجود حقیقی کے مطابق ہے۔ اور وہ منشا حق کے وجود کے ساتھ اس کی استناد کا انتزاع ہے۔ اب میں استناد کو بیان کرتا ہوں کہ وجود حقیقی کے ساتھ اس کی کیا نسبت ہے۔ اگر اس وجود کے قلب کی جڑ اور کنہ کی اصل میں استناد داخل نہیں ہوگا تو ممکن نہیں ہوگا اور فی نفسہ باطل ہوگا۔ پس تحقیق نتیجہ خیز یہ ہے کہ سب کے وجود کا معلول یہی استناد ہے۔ اور کوئی اس وہم میں نہ پڑے کہ ہم اس جگہ اس استناد کو چاہتے ہیں جو معنی اضافی ہے، دو چیزوں کے درمیان۔ نہیں، بلکہ اس استناد کو چاہتے ہیں جو ایک جہت کے تمام ثبوت چاہتا ہے۔ اور اس کے اصل معنی جہات واجب وتقیدی سے اس جہت کا ہونا حضرت وجود کے اطلاق سے ہونا اور اس کے

شانوں میں سے ایک شان کا ہونا ہے۔اس کے علاوہ کچھ نہیں۔اس موقع پر اللہ کے لیے ولایت (ولی ہونا) ذمہ دار ثابت ہو گیا۔اس کے بعد ان جہتوں کی تفصیل اور بعض کے بعض پر تقدم میں پڑتے ہیں۔اس کو ایک رخ سے بیان کرتے ہیں اور بقیہ کو مہمل قرار دیتے ہیں۔جو کہتے ہیں کہ اثر ماہیت کو وجود سے متصف کرتا ہے اور وجود ممکن میں ماہیت سے زائد ہے۔ اور اس کی مثال سورج کی روشنی سے دیتے ہیں، یہ سب بھی وہی ہے کہ یہ سخن در پردہ معقولات ثانیہ کی بات کرتے ہیں۔ان پر غالب معقولات ثانیہ اور صورت ذہنیہ کا غور وفکر ہے۔اور ایسی صورت سے انتساب اور حقائق نفس الامری کی ایسی عبادت سے تعبیر کہ ان کی اصل یہ صورتیں ہیں۔اس لیے ہم نے تنقیح کی قید اور نظر کی تدقیق بحث کے شروع میں کی ہے۔

۳۱۲- تفہیم:

ہمیشہ حقائق امور پر نظر رکھنا ضروری ہے

جس طرح آدمی لڑکپن میں بعض امور کو مستحسن اور بعض امور کو مکروہ وعیب دار سمجھتا ہے اور جب زیادہ معمر ہو جاتا ہے تو وہ مستحسن اور مکروہ سمجھنا الٹا ہو جاتا ہے۔اور یہ لڑکپن کا نشہ ہوتا ہے جو اشیاء کی حقیقت کے ادراک میں مانع ہوتا ہے۔اس طرح نمو کے زمانہ میں کمال کے لحاظ سے بھی بعض اشیاء کو استحسان کی نظر سے اور بعض کو ناپسندیدگی وکراہت کی نظر سے دیکھتا ہے۔جب معمر تر ہو جاتا ہے تو حقیقت واضح ہوتی ہے۔

وسوف ترىٰ إذا انكشف الغبار

افرس تحت رجلك ام حمار

''اور تم دیکھ لوگے جب غبار چھٹ جائے گا، کہ تمہارے نیچے گھوڑا ہے یا گدھا۔''

مرد وہ ہے جو نشہ میں استغراق کے باوجود نظر اونچی اور دور تک رکھتا ہے اور حقیقت امر کی خبر رکھتا ہے۔

۳۱۳- تفہیم:

مسئلہ ترتیب الاسماء اور مسئلہ تنزلات کے درمیان مطابقت

مسئلہ ترتیب اسماء جس کا ذکر خیر کثیر میں ہوا اور مسئلہ تنزلات جو دیگر مسائل میں

واقع ہے، ان کے درمیان توفیق و مطابقت کے بیان میں ایک حکم یہ ہے کہ حقائق الٰہیہ کا صور امکانیہ میں نفوذ چاہے تشبیہ کے پہلو سے ہی کیوں نہ ہو، ادنی مشابہت سے کھلتا ہے۔ پس رحموت کو جو کچھ اہل میراث سے پہنچتا ہے، افاضہ کے وقت میں ان کے احکام کی تفصیل کو مہمل قرار نہیں دیا جاتا، خواہ وحدت کے گرداب ہی میں کیوں نہ پڑا ہو۔ حجۃ اللہ البالغہ میں تجلیات معنویہ سے برآمد مبادی اولیہ وایجاد کے اصول کی بحث واقع ہوئی ہے۔

۳۱۴- تفہیم:

قیام لیل اور ذکر میں اشتغال

قیام لیل اور اپنے باطن کی مسابقت میں رات بھر اور دن کے زیادہ حصوں میں مشغول ہونے کو نہیں چھوڑنا چاہیے۔ اگر کسی وقت خیالات زیادہ ہجوم کریں تو یہ ذکر کرنا چاہیے "سبحان اللہ وبحمدہ، سبحان اللہ" کی ضرب دل پر اس طرح لگائیں کہ 'سب' کی چوٹ دل پر پڑے اور 'حان اللہ' دل میں رکھیں اور 'بحمدہ' کو حق سبحانہ کے نور پر جو کہ عرش کے اوپر ساکن ہے ضرب لگائیں۔ سبحان اللہ صفات محدث سے تنزیہہ ہے اور 'بحمدہ' ان حمدوں کا اثبات ہے جو فطرت وجوب کے مناسب ہیں۔ اس ذکر کے درمیان فاصلہ نہ کریں۔ متواتر کریں۔ حتیٰ کہ اپنے اندر انشراح دیکھیں۔ اور اگر اس ذکر کے بعد نور اعظم کا اس طرح خیال کریں جو عرش کے اوپر ساکن ہے کہ اس میں غیب ہونے کا تخیل واقع ہو جائے تو یہ یاس کی نفی، غم واندوہ کو دور کرنے اور انشراح خاطر میں بہت زیادہ مفید ہے۔ اس نور کی حقیقت بہت عجیب ہے۔ بالجملہ حقیقی الٰہیت عالم مثال سے دور نہیں ہے کہ شیخ اکبر نے عرش سے اس کی تکوین مراد لی تھی۔ اس لیے کہ تکوین اس کو مخاطب کیے بغیر نہیں ہو سکتی۔

۳۱۵- تفہیم:

یادداشت کی نسبت اور اس میں فنا ہونا

کشف وکرامات اور علوم مکاشفات سب آنے جانے والے ہیں۔ صبح آتے ہیں اور شام کو چلے جاتے ہیں۔ جو لوگ اس کھیتی سے سرمایہ حاصل کر لیتے ہیں اور قبر میں اور اس کے بعد

جوان کا اپنا ہوتا ہے وہ بھی یادداشت ہے اور بس۔ لیکن وہ یادداشت نہیں کہ جو علم حصولی کا شعبہ ہے اور اس کا استحضار ایمان بالغیب ہے کہ جس کا کسب ابتدائے مسلمانی میں کیا گیا ہو بلکہ وہ یادداشت کہ جو ہر نفس کے انکسار اور توحید میں اضمحلال کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ وہ حضوری ہے نہ حصولی۔ اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ دونوں میں اس یادداشت میں خود کو گم کردینا چاہیے۔

بھر صفت کہ میسر شود بکن جھدی

کہ خویش راہسر کوی آن نگار کشی

"جو صفت بھی میسر آجائے اس میں جدوجہد کرو، کہ خود کو اس محبوب کی گلی میں سر کے بل کھینچو۔"

وہ یادداشت درحقیقت بیداری ہے اور تمہاری خبر وہی نقطۂ وجود ہے کہ جو کچھ ہوا اس سے ہوا۔ جس نے بھی اس نقطہ کے بغیر خدا کو پہچانا اس نے لامحالہ اندھیرے میں تیر چلایا۔

وانی وان خاطبت الف مخاطب

فانت الذی اعنی وانت المخاطب

"میں نے اگرچہ ہزار مخاطبوں کو خطاب کیا، میری مراد تو تم ہی ہو اور تم ہی مخاطب ہو۔"

۳۱۶- **تفہیم:**

صبر اور شکر کی حقیقت

شجاع و بہادر کو میدان جنگ میں پہچانا جاسکتا ہے، اور مومن کو کہ جس کی صفت صبار بہت زیادہ صبر کرنے والا اور شکار بہت زیادہ شکر ادا کرنے والا ہے، مصیبتوں کے ہجوم کے وقت، اس کے علاوہ کہیں نہیں۔ ہر بے سروپا خیال، ایمان وانقیاد فرماں برداری اپنے سر میں پیدا کرتا ہے۔ حدیث میں آیا ہے **إنما الصبر فی الصدمة الاولیٰ** 'صبر صرف صدمہ کی پہلی حالت میں ہوتا ہے۔" اور صبر سے مراد صرف جزع وفزع ترک کرنا ہی نہیں ہے بلکہ اس طرح خوش ہونا ہے کہ اگر اس کے حق میں یہ مصیبت نہ آتی اور یہ غم اس کے دل کو نہ پہنچتا تو یقینی بات ہے کہ اس کی جو جزا اب ملنے والی ہے وہ نہ ملتی۔ اگر اس کا دل پژمردہ ہوتا ہے،

جزع وفزع کرتا ہے تو وہ صبر نہیں بلکہ گویا خشک زمین میں سرسبزی پیدا کرنے والا پانی پہنچ گیا ہے اور میٹھے پانی سے پیاسوں کو ہر تازہ تکلیف کو غنیمت جان کر اس سے دقیق ماخذوں کے کچھ پردے اٹھانے میں استعانت طلب کی جاسکتی ہے۔ اے طالب! جب جزع وفزع سے تمہیں کوئی امر پیش آ گیا اور تمہارا بدن اور دل اس کے لیے مضطرب ہوتا ہے تو اس کے ذریعہ ایثار حق، مخلوق سے حق کی طرف بلکہ حق میں فرار میں استعانت کرو۔ اور مخلوق کو ایسی طلاق دے دو جس میں بعد میں رجعت کی گنجائش نہ ہو۔ کہ وہ جدائیوں اور مصیبتوں کو پیش کرنے والا ہے۔ کتنے ہی دوست، دوستوں میں جدائی ڈالنے والے ہیں۔

رفت آنکہ بقبلہ بتاں رو آرم
حرف غم شاں بلوح دل بنگارم

"وہ چلا گیا جو قبلہ میں تھا بلکہ میرے سامنے بت رہ گئے، میں نے ان کے غم کا حرف دل کی لوح پر نقش کر لیا۔"

اللہ سبحانہ نے یہ نکتہ ہمیں یہ کہہ کر سکھایا ما اصاب من مصیبة إلا باذن الله ومن يؤمن بالله يهد قلبه والله بكل شئی علیم "کوئی بھی مصیبت ہو وہ صرف اللہ کے اذن سے آتی ہے اور جو اللہ پر ایمان رکھتا ہے وہ اس کے دل کو ہدایت دیتا ہے اور اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔" (التغابن: ۱۱) یعنی جو اس مصیبت کے وقت میں اللہ پر ایمان رکھتا ہے، وہ اپنے دل پر سے بڑے بڑے پردے اٹھا دیتا ہے کہ اگر یہ مصیبت نہ ہوتی تو وہ پردے نہیں اٹھتے۔ اور مصیبت کے وقت ایمان یہ ہے کہ ہر ایک پر حق کو ترجیح دو۔ کسی کی طرف نسبت کے بغیر ایثار مکمل ہو جاتا ہے۔ پھر ایثار صمیم قلب سے اللہ عزوجل کی صنعت کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اور جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں میں سے بنایا ہے، ان کے ظواہر کو مصائب کا قلع قمع کرتے ہوئے دور کر دے گا کہ اللہ کی طرف ان کی پوری طرح رغبت ہو جائے۔

گر نیاید بخوشی سوئے کشاکش آرید

"اگر بخوشی نہیں آتا تو کشمکش کی طرف لے آؤ"

"اور کتنی ہی مراد راحت کی راہ سے دعوت دیتی ہیں تو وہ راحت میں راحت ہوتی

ہے اور وہ پوری طرح راحت ہوتی ہے۔"

اس کو یہ گمان نہ کرو کہ اس کو مصیبتیں نہیں پہنچیں گی بلکہ پہنچیں گی اور وہ مصیبتیں عین راحت ہوں گی۔ اس طرح کہ اس سے اس کی تربیت منقطع ہو جائے گی جس کے لیے ظاہر قول میں کہا گیا ہے کہ وہ مربی ہے۔ گویا کہ وہ اسی سے خوش ہے یا اپنے زمانہ میں شقی ہے۔ مرادوں کے لیے ان کی استعداد کی زبان حق سے کہتا ہے۔

دعوت الی الزیارۃ اهل وذی

ولم اطلب لها احداً سواهم

"میں نے ملاقات کے لیے اپنی محبت والوں کو بلایا، اور اس کے لیے میں نے ان کے سوا کسی کو طلب نہیں کیا۔"

فجاؤنی الی بیتی کراما

فاهلا للکرام ومن دعاهم

"تو وہ میرے پاس میرے گھر عزت وشرافت کے ساتھ آئے، مبارک ہے عزت وشرافت کے ساتھ آنے والوں کو بھی اور جس کو اس نے بلایا انہیں بھی۔"

۳۱۷- تفہیم:

توحید میں استغراق

حضرت امیر سید کلال ایک مثال بیان کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ جب تک گیلی مٹی سے بنا ہوا کوزہ خشک نہیں ہو جاتا، وہ اس قابل نہیں ہوتا کہ اس کو تصرف میں لایا جائے۔ اور کچھ لوگ تو اس کوزہ کو توڑ ہی ڈالتے ہیں۔ اس کا علاج یہ ہے کہ پھر سے مٹی کو گوندے اور اس میں دوسری مٹی ملائے کہ شاید اس بار خالص اور صاف ستھرا بن جائے۔ بالجملہ اگر کوئی شخص ایک بار توحید میں مستغرق ہو۔ اگرچہ فناء ناقص ہو، اس کو ایک قسم کا قرب پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کو دوبارہ تصرف میں، جو فنا سے عبارت ہے نہیں لایا جا سکتا۔ الا یہ کہ مال اور اولاد کے قوی ظاہری و باطنی مصائب سے ٹکرا کر طبیعت سے رجوع کے بعد ہو سکتا ہے۔ بالجملہ عود

کی انگیٹھی رجوع کا باعث ہوتی ہے۔

سا طلب بعد الدار عنکم لتقربوا
وتسکب عینای الدموع لتجمداً

''میں تم سے گھر کی دوری طلب کروں گا کہ قریب ہوجاؤ، اور میری آنکھیں آنسو بہاتی ہیں تاکہ خشک ہوجائیں۔''

کوئی بعید نہیں ہے کہ پوری طرح رجوع کے بعد از سر نو شوق پیدا ہوجائے اور اس بار عجز وقصور کے اعتراف کے بعد حضرت وہاب فضل فرمادیں۔ اطباء کہتے ہیں کہ آنکھ میں پانی کا اترنا جب تک مکمل نہ ہوجائے آنکھ کا علاج کرنا غلط ہے۔ اور مکمل ہونے کی علامت عدم یافت یا عدم شوق یافت اور عدم شوق پر عدم تاسف ہونا ہے۔ اس کے بعد از سر نو راہ کا پکڑنا ممکن ہوتا ہے۔

۳۱۸- تفہیم:

اولیا کے سلوک کے لیے سات مقامات

اول یہ راہ اشتغال ہے، پھر زبان وقلب کا کام ہے، اور یہ الف ب ت ہے۔ مقامات میں ان کی کوئی گنتی نہیں ہے۔ اس کے بعد حق سبحانہ کے ساتھ قلب کے تعلق کا دوام محبت کی شکل میں ہوتا ہے۔ اور اس مرحلہ میں مناسب احوال پیش آتے ہیں۔ جیسے واقعات صالحہ، غلبۂ خوف ورجا اور انس وہیبت وتجلی اور پردہ۔ اس کے بعد توحید فعلی کو کہ ہر فعل انعام، ملامت، منع کرنا اور عطا اور ہر تاثیر وتغیر کہ اپنے آپ میں یا اپنے سے غیر میں دیکھے۔ اس کو حق سبحانہ بوصف شہود وغلبہ رجوع قرار دیتا ہے۔ اس کے بعد توحید صفاتی ہے۔ حسن وکمال اور ان کی ضدور، میں سے ہر صفت، صفت حق مانی جاتی ہے جو ایک محل اور اس کے آئنوں میں ظاہر ہوتی ہے، اور انہی میں سے صفت وجود وتحقق اور تقرر ہے۔ اس کے بعد توحید ذاتی ہے اور وہ علم حضوری بسیط ہے کہ مدرِک (ر کے کسرہ کے ساتھ یعنی ادراک کرنے والا) اور مدرَک (رَ کے فتحہ کے ساتھ یعنی جس کا ادراک کیا جائے) اور ادراک اس جگہ سب ایک ہوجاتے ہیں۔ نہ ان میں تغایر، غیریت ہوتی ہے نہ کوئی حیرت کا امتیاز اور ماہیت سے

غفلت اور حقیقت الحقائق کا شعور۔اس کے بعد یادداشت ہے،اس معنی میں کہ علم حضوری اور علم حصولی دونوں کا احتمال رکھتا ہے۔اور یہ یادداشت فی الحقیقت تصوف کی زبان میں بیداری اور فطرت وجود کی طرف سے ایک قسط ہے کہ اس ذرہ کی پیدائش میں حسب تقاضہ اس کی استعداد اور تجلی کرتی ہے۔اور اشراق کی زبان میں ماہیت الماہیات کے احکام سے حکمی ہے کہ خاص جزئی صورتوں کے ساتھ مل جاتی ہے۔تم نہیں جانتے کہ انسان کا حکم لکھنا اور ہنسنا ہے۔اور حیوان کا حکم چلنا اور حرکت بالارادہ جداگانہ ہے۔اگرچہ عام لوگ اس میں فرق نہیں کرتے۔ اسی طرح ماہیت الماہیات کا بھی ایک حکم ہے۔ اس کے بعد اس یادداشت میں اضمحلال ہے۔اور اس میں اس طرح گم ہونا ہے کہ نفس ناطقہ ان کی روشنیوں میں چلا جائے۔ یہ سب محض روشنی اور تجلی تجلیات الٰہیہ ہو جاتی ہیں۔اس کے بعد مخلوق کی طرف نزول ہے۔اس سے میری مراد حق میں حق سے تصرف اور ان روشنیوں کی احکام نسمیہ میں آمیزش ہے۔ ہمت، تاثیر، اشراف اور علم کے لحاظ سے یہ ہے کہ مقامات ہفت گانہ جو اولیاءاللہ کے سلوک کی راہ ہے جس کو دست گیری کی توفیق دیتا ہے، وہ اس راہ پر چلتا ہے، ورنہ کسی ایک یا دو ہی میں رہ جاتا ہے۔اور اسی میں اس کی ساری عمر اور جذب ختم ہو جاتے ہیں اور مخلوق میں رجعت قہقری سے پڑ جاتا ہے۔"نعوذ باللہ من الحور بعد الکور" اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ یہ سب ظاہر ہوتے ہیں لیکن ضعیف حالت میں اور اجمال اور یہ ظہور ارادہ ازلیہ ہے۔ کسی کو اس میں دخل نہیں ہے۔اور گویا شاعر نے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے۔

ہفت شہر عشق را عطار گشت
ما ہنوز اندر خم یک کوچہ ایم

"سات عشق کے شہر عطار گھومے، اور ہم ابھی تک ایک گلی کے موڑ پر ہی کھڑے ہوئے ہیں۔"

واللہ الموفق ونعم المولی ونعم النصیر.

۳۱۹- **تفہیم:**

وحدت قصوی اور اس کے حامل کے احوال

با آنکہ نخست قبلہ گاہ دل تست
ہرگز نشود رابطہ عشق تو ست

''جس کے ساتھ پہلی ذات تیرے دل کا قبلہ گاہ ہے، اس کے ساتھ تیرے عشق کا رابطہ کبھی سست نہ ہوگا۔''

صد جائے کن گر سبق عشق درست
عشق تو بود درہمہ با یار نخست

''اگر عشق کا سبق سو بار بھی ٹھیک کرو گے، تمہارا عشق ہر حال میں پہلے دوست کے ساتھ ہی رہے گا۔''

کیا تم جانتے ہو کہ یہ کیا ہے؟ اور اس کا کرنے والا کون ہے؟ شخصی وحدت قصوی کو غیب الغیب سے شہادت میں ایک درہم دیتا ہے۔ اس کی مثال اونچے بید کے درختوں کی مانند ہے۔ ہر چند کہ اس کو مٹی، آلودگیوں اور ناپاکیوں میں ملوث اور گندہ کرتے ہیں اور پھر ایک حصہ ڈالتے ہیں وہ بانات (بید) خالص ہوتی ہے۔ اس کی نمی اور ایک رنگ اور چیزیں اس میں رکھو۔ گویا یہ عالم میں بالکل متحقق نہیں ہوتے۔ یا اس کی مثال دریا کے پانی کی طرح ہے کہ کبھی گندگیوں اور آلودگیوں کے اوپر سے گزرتا ہے اور نجس ہو جاتا ہے اور اس کی ساری صفتیں لے لیتا ہے۔ اس کے بعد میلوں زمین کے اوپر سے گزرتا ہے۔ آفتاب سے چمک کر صاف پانی ہو جاتا ہے۔ دھوبیوں کے پاس سے گزرتا ہے تو اس کا رنگ اور بو دوسرا ہو جاتا ہے۔ کچھ وقت کے بعد اس کی بو بھی جاتی رہتی ہے۔ یہ شخص اس کی طرف ذات میں فرداً بلند ہوتا ہے کہ جو وحدت میں وصف ہے۔ اس میں ایک بال کے برابر جگہ بھی ایسی نہیں ہے جو غیر منقسم ہو۔ اور اس نے سیر کی۔ بلکہ وہ چلا اور خط دوری کے گرد گھوما۔ چنانچہ اونچے نقطوں سے جدا ہو گیا حتی کہ کبھی دوبارہ اس کی طرف پہنچ گیا۔ اس شخص کو بعض اوقات اس

حالت کے وصول کا شوق پیدا ہوتا ہے اور کبھی سب چیزوں سے خوش ہوتا ہے جو چیز اس کے ہاتھ میں نہیں ہوتی اس کو طلب کرتا ہے کہ حالت اولیٰ نقد وقت ہے، ایک جو کے برابر تفاوت کے بغیر۔ اور کبھی حق کو باقی رکھنے کو اس سے ملا دیتا ہے۔ گویا کہ آدمی صرف معاشی العقل ہے کہ اس کی نظر اس معاش سے آگے نہیں جاتی۔ کیا تم یاد نہیں کرتے کہ سخن مدرکہ کی ماہیت کی تین قسم قرار دیتے ہیں۔ مخلوطہ، مجرد اور لا بشرط۔ اس شخص کو بھی لطافت سے ماہیت سے کم نہیں جان سکتے۔ یہ شخص تمام احوال و مقامات پر ناز کرتا ہے۔

۳۲۰۔ تفہیم:

انبیا اور اولیا سب کو رشد و ہدایت کا حکم دیا گیا ہے لیکن ان کے مامور ہونے میں فرق ہے

اولیاء کو ارشاد و ہدایت کا حکم دیا جاتا ہے جیسا کہ انبیاء صلوٰات اللہ علیہم کو حکم دیا جاتا ہے۔ البتہ انبیاء علیہم السلام کو اللہ عزوجل کی سنت میں لسان کلی کے ذریعہ حکم دیا جاتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ انسان الٰہی کا تصور اولا روح میں اور پھر مثال میں کیا جاتا ہے۔

اور اولیاء کو لسان خاص سے حکم دیا جاتا ہے جو لسان وقت و حال ہوتی ہے۔ میری مراد یہ ہے کہ جب نفس ناطقہ خوف، رجا یا قبض و انبساط میں سے حال الٰہی کا اکتساب کرتا ہے یا اس کے اوپر اللہ کے علوم میں سے کسی علم مثلاً توحید صفات یا کثرت میں ظہور وحدت وغیرہ کا رنگ چڑھ جاتا ہے تو نفس ان علوم کا تابعدار ہو جاتا ہے۔ اور ان کے ساتھ جو رقت اور صفائی ہیں، جو ظاہری اور باطنی ریاضتوں کی کثرت سے حاصل ہوتی ہیں، ان کے لیے دراز ہو جاتا ہے۔ خود ان کے شر اور ان کو پسند کرنے سے بچتا ہے کہ وہ جو ہیں سو ہیں۔ اور انہیں توحید اور اضمحلال حاصل ہوتے ہیں۔ پھر یادداشت کا الہام کیا جاتا ہے، حتیٰ کہ ایسا ہو جاتا ہے جیسے سر سے پیر تک اس کو زائل کرنے والا ہے۔ بلکہ وہ بعینہٖ وہی ہے۔

اور بالجملہ ان تینوں قسموں میں سے جو قسم بھی پوری طرح نفس اور کمال کی طبیعت سے مل جاتی ہے، اور ان کے درمیان خاص طور سے اوامر و نواہی اور واقعات و علوم،

اشرافات اور عجیب عجیب خرق عادت پیدا ہوتے ہیں۔ان کی پیدائش کی کیفیت جو ہم نے بیان کی ہے۔ واصلین میں سے یلمعی اور عبقری کے سوا اور ان سب کے نزدیک قدر متیقن کے سوا جو اس ازدواج سے پیدا ہوتی ہے۔کوئی اس سے زیادہ نہیں جان سکتا۔۔

اور اس کی مثال ان لوگوں جیسی ہے جو حدیث السن کم عمر اور بھوکے پیاسے اور لاغر دکمزور تھے، ان کے اندر ان کے جو کمال اور اخلاق تھے، انہوں نے ان سب کو بھلا دیا۔تب سلطان نے ان کی تربیت کی، ان کو اچھا کھانا کھلایا اور ان کے ساتھ ہر لحاظ سے بھلائی کرتا رہا۔ان سے کبھی تعرض نہیں کیا اور نہ ان سے کوئی سوال کیا یہاں تک کہ وہ بڑے ہو گئے اور سخت کام کرنے لگے۔تب ان کو طلب کر کے آزمایا تو ان میں سے کوئی عاقل اور شجاع، فیاض وسخی اور فصیح و پاکباز ثابت ہوا، اس کے اندر اعلیٰ اخلاق اور ریاسات کلیہ کی علامات پائی جاتی تھیں، اور اس پر علم ظاہر ہوئے اور وہ فہم اور گرفت کے لحاظ سے لوگوں میں سب سے زیادہ سخت تھا جو ملک اور عدل کے سوا کچھ نہیں چاہتا۔اور ان میں سے کوئی ڈرپوک، بزدل، کمزور، بناوٹی ودکھاوے کی محبت کرنے والا اور سخت دل تھا۔اس کی ہمت خسیس امور کی طرف مائل ہوئی۔اور ان میں سے کچھ ان دونوں کے درمیان تھے۔

اور جیسے باغ والا درختوں کی پوری طرح دیکھ بھال کرتا ہے تو ان کے ذائقے اور فوائد مختلف ہوتے ہیں۔اور اسی طرح پرندوں کے بچوں اور اونٹوں اور گھوڑوں کے بچوں کا معاملہ ہے کہ صاحب عقل ودانش دیکھتا ہے کہ تربیت، طبیعت سے میل کھا گئی ہے تو ان کے ملنے سے اوامر ونواہی جزئی پیدا ہوتے ہیں۔اور نبی کو لسان کلی سے حکم دیا جاتا ہے۔اگرچہ علت ایک امر کے ساتھ مخصوص ہوتی ہے۔کسی دوسرے کے ساتھ نہیں ہوتی۔طبیعت سے پیدا ہوتی ہے۔چنانچہ عارف جانتا ہے کہ ہر چیز میں فاعل کا حکم ہوتا ہے، اور دونوں کو قبول کرنے والی مراعات ہیں۔اور معاملہ ویسا نہیں ہے، جیسا کہ کچھ گمان کرنے والوں نے سمجھا ہے جو شئے کو ظن وتخمین سے لیتے ہیں کہ ریاضت اور بھوک اور قلب کی تطہیر احادیث سے ہے۔اور اللہ کی طرف جمع خاطر علم الٰہی کا فائدہ دیتی ہے۔اور مبدأ سے اس کے فیضان کے لیے تیار کرتی ہے، ایسا بالکل نہیں۔مبدا سے علوم کے فیضان کی صرف دو صورتیں ہوتی ہیں۔

ایک علم حصولی ہوتا ہے، خواہ اس کو اللہ سے اخذ کیا جائے، پھر وہ، وہ نہیں رہتا، اور دوسرا علم حضوری ہوتا ہے اور یہ صرف توحید میں فنا اور اضمحلال سے حاصل ہوتا ہے۔

۳۲۱- تفہیم:

شیطان کا رسول اللہؐ کی صورت اختیار نہ کرنا اور خوابوں کی حقیقت

کیا تم جانتے ہو کہ شیطان نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت اختیار نہیں کرتا؟ جان لو کہ خوابوں کی حقیقت مبدأ اعلیٰ سے ایک خاص جہت اور مقررہ ہیئت پر نفس ناطقہ کے مناسب ظاہر ہونا ہے۔ جو علم خاص کے فیضان کا تقاضہ کرتی ہے۔ تو یہ علم متعین ہو جاتا ہے۔ اور خیال میں جمع صورتوں اور دیو قامت شکلوں کو اختیار کرتا ہے۔ تو وہ صورتیں نفس پر پوری طرح حاضر ہو جاتی ہیں۔ جس سے ان حواس ظاہرہ کے نزدیک ایک واقعہ منظم ہو جاتا ہے۔ اور حواس باطنہ پر نسمہ کی قبولیت ہے تو علم بڑی بڑی صورتوں کے ساتھ ان کے اور اس کے درمیان صرف ایک جہت کی مناسبت سے متعین ہوتا ہے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت آپ کا ارحم الراحمین کی طرف سے اس کے بندوں کی طرف رحمت کے طور پر مبعوث ہونا، جہنم کی آگ سے نجات کے مقامات کی طرف ان کی ہدایت اور دین داری کی معرفت، حکمت اقترابی، ملی، معاشی، منزلی، گھریلو، معاملاتی اور اقلیمی حکمت کے قیام کے عارف مومن کے نزدیک یہ بری صورت اور فساد بالکل مناسب نہیں ہوتا۔ اس لیے برائی آپ کی شکل اختیار نہیں کرتی سوائے اس کے کہ بیداری کی حالت میں کوئی خیال کیا جائے اور اس کی تصویر ایک امر سے دوسرے امر میں بنتی ہے تو یہ خواب نہیں ہے۔

۳۲۲- تفہیم:

رسول اللہؐ کا ارشاد 'اتبعوا غرائب القرآن' اور اس کے معنی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: غرائب القرآن کا اتباع کرو۔ اور اس کے غرائب اوامر و نواہی ہیں، یا جیسا کہ فرمایا۔ اس حدیث کی تاویل یہ ہے کہ قرآن میں زیادہ تر انبیاء اور کفار کے قصے اور اللہ سبحانہ کی کفار کے ساتھ بعث و بعثت سے ان کے انکار اور اللہ

کی تعظیم، اس کی عبادت اور توحید سے اعراض کے سلسلہ میں دلیل و حجت ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک اوامر و نواہی پر جمع ہوتا ہے تو اللہ کی طرف سے جو کچھ آپ کے عمل کی مدح اور آپ کی تقریر کے سلسلہ میں وارد ہوا ہے۔ اس سب کا امر کیا گیا۔ اور جو کچھ ذم اور نفرت کے سلسلہ میں وارد فرمایا ہے، وہ سب منہی ہے۔ اور جو کچھ کفار کی طرف منسوب کیا ہے جس پر ان کے عقاب کا ذکر کیا گیا ہے وہ بھی منہی ہے، اور جو کچھ مومنوں کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور اس پر ثواب کا ذکر کیا گیا اس کا امر کیا گیا ہے۔ اور یہ سب غرائب القرآن ہیں۔ اس لیے کہ ان کے بارے میں کچھ کہے بغیر ان کو اشارہ سے سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ قاری اس کا انتظار کرتا ہے اور اس کا گمان کرنے والا اس کا انتظار کرتا ہے جیسا کہ پردیسی آدمی جو اپنے وطن میں نہیں ہوتا، مطلوبہ اشیاء کا انتظار کرتا ہے اور اس کا محل معلوم ہے۔

۳۲۳-تفہیم:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد 'وما أرسلنا من قبلک من رسول ولا نبی إلا اذا تمنی القی الشیطن فی امنیتہ'

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: **وما ارسلنا من قبلک من رسول ولا نبی إلا اذا تمنی القی الشیطن فی امنیتہ فینسخ اللّٰہ ما یلقی الشیطان ثم یحکم اللّٰہ آیاتہ واللّٰہ علیم حکیم** ”آپ سے پہلے ہم نے جو بھی رسول یا نبی بھیجا اس کے ساتھ یہی معاملہ پیش آیا کہ جب اس نے تمنا کی تو شیطان اس کی تمنا میں خلل انداز ہو گیا۔ اس طرح شیطان جو کچھ بھی خلل اندازیاں کرتا ہے، اللہ ان کو مٹا دیتا ہے اور اپنی آیات کو محکم کر دیتا ہے۔ اللہ علیم اور حکیم ہے۔“ (الحج:۲۵)

یہاں ابن عباس نے پڑھا ”**من رسول ولا نبی ولا محدث**“ اور فرمایا: محدثین میں سے ایک شخص وہ ہے جو شہر کے اس کنارہ سے دوڑتا ہوا آیا اور لقمان اور فرعون کے جادوگر اور آل فرعون کا مومن ہے۔

اللہ تم پر رحم فرمائے، جان لو کہ وحی کی چند قسمیں ہیں۔ ان میں سے ایک نفس فی

الروع ہے اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ نسمہ کے قوی اور علوم کی پیروی کی جائے۔ اور اس کا علم اس اسم کے لیے ہے جو عین عبد پر تجلی کرتا ہے جو کہ نسمہ اور شرائع کے علوم کا نظام ہے۔ چنانچہ اس کو وہ حال ڈھانک دیتا ہے جو احوال طبیعہ جیسے شدید غضب، جس سے چہرہ سرخ ہو جاتا ہے، اور کثیر جزع وفزع وغیرہ حواس کی غشی اور نسمہ کے احاطہ میں مشابہ ہوتا ہے۔ اور اس کا راز جبروت کی حکایت اور اس پر مطلع ہوتا ہے۔ پھر جب یہ حال منقطع ہو گیا تو نفس میں علوم اور خواطر اجمالیہ کلیہ جیسے بعض رذیل امور سے نفرت کرنا یا بعض فضائل کی طرف رغبت یا نفس کا جاننا اور بعض حالات کی طرف دیکھنا جن کے جزئیات جاری رہنے کو اللہ تعالیٰ نے مستقبل میں بندہ یا اس کے اعزاء کے لیے مقدر کیا، اور اس اخیر کو تمنی کہا جاتا ہے۔ اور یہ تمنی فی حد ذاتہ خیر محض اور حق صرف ہے۔ اس لیے کہ وہ وحی ہے جو منبع خیرات سے فیض پہنچانے والی ہے۔ لیکن آدمی کبھی اس حکم کو متعین کرتا ہے اور اس کے تحقق کی صورت اس کا تصور کرتی ہے جو اس پر اس کے حواس کی جانب سے داخل ہونے والے علوم سے اس کے لیے آسان ہوتا ہے۔ چنانچہ اس وقت یہ صورت جھوٹی ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہ وہ شیطان کے القا سے اور علم جبروتی کے علم ناسوتی کے ساتھ مل جانے سے ہوتی ہے۔ پھر اس پر کبھی دوبارہ امر منکشف ہوتا ہے، تو پتہ چلتا ہے کہ وہ صورت باطل ہے۔ اور اللہ کے نزدیک تمنی دوسری صورت میں متصور ہوتی ہے۔

اور اس مرحلہ کی طرف اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اشارہ فرمایا ہے۔ چنانچہ اس کا ارشاد ہے "إلا إذا تمنى" یعنی جب اس کے دل میں کسی حالت کی طرف دیکھنے کا خیال پیدا کیا گیا۔ چنانچہ اس کا نفس اللہ کی طرف سے رجا اور تمنی کے رنگ میں رنگ گیا۔ اس کا ارشاد ہے "الشيطان في امنيته" یعنی اس کے ساتھ کسی شئے باطل کو ملایا اور تمنا سے مرکب کیا۔ اور یہ ایک باطل صورت ہے۔ چنانچہ اس کی طرف اس کا وہم چلا جاتا ہے۔ چنانچہ اللہ اس کو منسوخ کر دیتا ہے جو شیطان القا کرتا ہے، یعنی باطل کو زائل کر دیتا ہے۔ اور اس پر اس امر کو واضح کر دیتا ہے جو حق ہے۔ پھر اللہ اپنی آیتوں کا حکم لگاتا ہے یعنی اس کے اوپر اس صورت حقہ کو ظاہر کر دیتا ہے جو واقعہ کے مطابق ہوتی ہے۔

اوراس کی مثال وہ ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی گئی ہے کہ آپ نے خواب میں دیکھا کہ آپ مکہ سے ایسی سرزمین کی طرف ہجرت فرمارہے ہیں جہاں کھجوروں کے باغ ہیں۔ اوراس ہجرت میں آپ کے دین کی سربلندی اور آپ کی دولت میں ترقی ہوگی۔ تو آپ کا خیال اس طرف گیا کہ وہ یمامہ ہے یا ہجرت (ہجرة) ہے۔ تو ایک زمانہ تک آپ کو اس کا یقین رہا۔ پھر اللہ نے آپ کے اوپر واضح فرمایا کہ وہ شہر یثرب ہے۔

اور جو روایت کیا گیا ہے کہ آپ علیہ السلام کو آپ کی قوم نے اذیت پہنچائی اور آپ نے نصرت کی خوشی ولذت محسوس کی تو آپ کا خیال طائف کی طرف گیا۔ اس لیے آپ نے اس کی طرف ہجرت فرمائی تو ان سے وہ دیکھا جو آپ کو برا معلوم ہوا۔ پھر بنی کنانہ کی طرف ہجرت فرمائی تو ان سے بھی وہی دیکھا جو آپ کو برا معلوم ہوا۔ اور آپ اپنے آپ کو مختلف عرب قبائل پر پیش فرماتے تھے۔ اور ان سے مدد طلب فرماتے تھے، اور چاہتے تھے کہ وہ آپ کو اپنے شہر میں رکھ لیں، اور اس میں آپ اپنے دین کی سربلندی کی تمنا فرماتے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس کو انصار کے لیے ظاہر فرمایا۔ ہمارے نزدیک اس آیت کی تفسیر ہے۔ تو اس پر ثابت قدم ہوجاؤ اور حیران وسرگرداں مت پھرو۔

۳۲۴- تفہیم:

قرب کے معنی

ہمارے نزدیک قرب، اللہ تعالیٰ کی ذات کے تعلق سے غفلت دور کرنا ہے۔ جو شیشہ کی طرف دیکھتے ہیں، ان کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ اس نے شیشہ اوراس سے آگے کی عرض کو دیکھنے کا ارادہ کیا۔ اور دوسرے یہ کہ اس نے شیشہ سے آگے اور بالعرض شیشہ کو دیکھنے کا ارادہ کیا۔ تو وہ دونوں ہی شیشہ اوراس سے آگے کی طرف دیکھتے ہیں، لیکن غفلت کو دور کرنے اور بیداری اور شعور اور التفات وتوجہ کے تعلق سے دونوں میں فرق ہے۔ اس مثال سے ہمارے قول غفلت دور کرنے کے معنی واضح ہوگئے۔ کیا ذکاوت اور خبردار ہونے اور متنبہ ہونے کی دو قسمیں نہیں ہیں؟ ایک یہ کہ ذکاوت علم میں ہے۔ تو کتنے لوگ ہیں کہ خفی کا ایک لحظہ میں ادراک

کر لیتے ہیں۔اور کتنے ہی لوگ ہیں کہ جو مقصود کا ادراک تردد، افکار اور تکرار کے بعد کرتے ہیں۔اور دوسرے ذکاوت فی الحال ہے۔تو کتنے ہی لوگ ہیں جب کسی مقصود کی طرف توجہ کر کے بیٹھتے ہیں تو ان کی طرف ارادہ وعزم بڑھ جاتا ہے۔یا نشاط کی طرف توجہ کرتے ہیں تو ان کی طرف نشاط بڑھ جاتی ہے۔اور کتنے ہی لوگ ہیں کہ ان کے لیے یہ بغیر تکرار کے نہیں ہوتا۔ اور ارتفاع غفلت سے ہماری غرض ارتفاع غفلت فی الحال ہے نہ کہ علم۔تو جس کو ہم نے اس سے مراد لیا ہے وہ تیقظ حالی ہے۔اور اس کے آثار میں سے تیقظ علمی ہے۔اس طرح حقیقت کو سمجھ لو کہ یہ بہت عمیق ہے۔

۳۲۵-تفہیم:

مسئلہ وحدت الوجود اور وحدت شہود کی تحقیق اور ان دونوں کے درمیان تطبیق

عبد ضعیف احمد، مدعو بولی اللہ بن عبدالرحیم دہلوی **عفاء اللّٰہ عنہ ووفقہ لما یحبہ ویرضاہ** کی طرف سے آفندی اسماعیل بن عبداللہ الرومی ثم المدنی **اوصلہ اللّٰہ تعالیٰ إلی ما یرجوہ ویتمناہ** کے نام۔اما بعد: میں تمہارے سامنے اس اللہ کی حمد وثنا بیان کرتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔اور اس کے نبی مصطفیٰ اور آپ کی تمام آل واصحاب پر درود وسلام بھیجتا ہوں۔ مجھے تمہارا خط موصول ہوا جس میں تم نے مجھ سے اس وحدت الوجود کے بارے میں جس کا ذکر شیخ اکبر اور ان کے پیروکاروں نے کیا ہے اور اس وحدت شہود کے بارے میں جس کا ذکر شیخ مجدد نے کیا ہے، سوال کیا ہے اور یہ کہ کیا ان دونوں **رضی اللّٰہ تعالیٰ عن الجمیع وارضاھم** کے معاملہ میں تطبیق کی جا سکتی ہے؟

میرے بھائیو! **رحمکم اللّٰہ تعالیٰ**، جان لو کہ ہر زمانہ کا ایک قرن ہوتا ہے۔اور ہر قرن کا ایک علم ہوتا ہے جو اللہ عزوجل کی رحمت کی تقسیم میں ان کو پہنچتا ہے۔اگر تم اس امت مرحومہ کے ابتدائی زمانہ کے احوال کے بارے میں غور وفکر کرو گے جب نہ شرعی علوم مدون ہوئے نہ فنون وادب اور نہ ان میں زیادہ بحثیں ہوئی تھیں، البتہ ان کے سینوں میں حق

کا الہام برابر ہوتا رہا تھا۔ پھر اس کی حکمت کے مطابق ہر دور میں ایک کے بعد ایک علم آتے رہے، اس لحاظ سے تم سے یہ امر مخفی نہ رہے گا۔ اور یہ کہ اس دور میں اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کی تقسیم سے ہمارے حصہ میں یہ دیا ہے کہ ہمارے سینوں میں اس امت کے علماء کے علم جمع کر دیئے۔ معقولات بھی اور منقولات ومکشوفات بھی۔ اور ان کو ایک دوسرے سے مطابقت وتطبیق بھی دے دی۔ اور ان کے درمیان اختلاف کو مضمحل کر دیا۔ اور ہر قوم کو اس کے مقام پر قائم کر دیا۔ چنانچہ یہ اصل علم کے فنون ومضامین فقہ، کلام اور تصوف وغیرہ سب پر صادق آتی ہے۔ **بحمد اللہ وتوفیقہ**

اور جان لو کہ حق کی معرفت جیسا کہ خضر علیہ السلام نے فرمایا: **بحر لجی** ''سمندر بے پایاں کی طرح'' ہے جس کی نہ کوئی ابتداء ہے، نہ انتہا اور یہ کہ اس کے بارے میں کلام کرنے والے سمندر میں ایک تنکے کو ڈبکی دینے والوں کی طرح ہیں جو سمندر میں کوئی کمی پیدا نہیں کرتے۔ یا ان چڑیوں کی طرح ہیں جو اپنی ضرورت کے مطابق سمندر میں سے پانی پی لیتی ہیں اور چلی جاتی ہیں۔ تو ہر کوئی صرف ایک کمال کے بارے میں بتاتا ہے، دوسرے کے بارے میں نہیں۔ اور صرف ایک جمال کا وصف بیان کرتا ہے، دوسرے جمال کا نہیں۔

وعلی تفنن واصفیہ بوصفہ

یفنی الزمان وفیہ ما لم یوصف

''اور ایک قسم کو بیان کرنے والا اپنے بیان سے گزر جاتا ہے، اور اس زمانہ میں وہ ہوتا ہے جو بیان نہیں کیا جاتا۔''

اور اس طرح کے مواقع پر سننے والوں کی بھی بہت سی جماعتیں ہو جاتی ہیں۔ ان میں کچھ ایسے ہوتے ہیں کہ محض اشاروں سے سب کچھ پالیتے ہیں، اور جس موقع کے بارے میں خبر دی جاتی ہے، اس سے متعلق ہر قول کو اس کے محل پر رکھتے ہیں۔ اور سب اپنی جگہ درست ہوتے ہیں۔ اور کچھ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے لیے عبارتیں مختلف ہوتی ہیں، اشارات کی نوعیتیں مختلف ہوتی ہیں، اور پھر بھی اس کی گہرائی میں پہنچنے کے قابل نہیں ہوتے۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ وہ حیران وپریشان ہی رہتے ہیں۔

اس کی مثال ان نابینا لوگوں جیسی ہے کہ ایک پیڑ کے چاروں طرف کھڑے ہو گئے اس کو چھوتے ہیں، اس کو چکھتے ہیں، کسی کے ہاتھ میں اس کے پتے آتے ہیں، کسی کے ہاتھ ٹہنی، کوئی پھولوں کو چھوتا ہے تو کوئی پھلوں کو اور کوئی تنے کو، پھر بیٹھ کر بات چیت کرنے لگتے ہیں تو کوئی کہتا ہے درخت ملائم جسم ہوتا ہے۔ دوسرا کہتا ہے وہ تو خوشبودار لکڑی ہوتا ہے، کوئی کہتا ہے وہ نرم و ملائم ہوتا ہے۔ دوسرا کہتا ہے وہ تو انتہائی سخت ہوتا ہے۔ ایک کہتا ہے، وہ انتہائی میٹھا ہوتا ہے۔ دوسرا کہتا ہے وہ انتہائی تلخ و کڑوا اور کسیلا ہوتا ہے۔ دوسرا کہتا ہے اس کا کوئی ذائقہ ہی نہیں ہوتا۔ ایک کہتا ہے، اس کی خوشبو بہت اچھی ہوتی ہے۔ تو دوسرا کہتا ہے، اس میں تو کوئی بو ہی نہیں ہوتی۔

جب ان کی باتوں میں اختلافات پیدا ہو گئے تو وہ ایک دوسرے کو جھٹلانے لگ گئے۔ ایک دوسرے کو گالیاں دینے لگے، اتنے میں ایک آدمی آتا ہے جو نظر و بینائی میں ان سے ممتاز ہے۔ اگرچہ بہت سے اوصاف میں ان سے کم تر ہے۔ وہ لوگوں کی ایک دوسرے سے تعریف کرتا ہے۔ خوش نوائی، قوت برداشت، کمال قوت سماعت، ذوق اور قوت ذائقہ اور قوت لمس کو جانتا سمجھتا اور بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے، اصل کے لحاظ سے تم سب کی باتیں صحیح ہیں۔ لیکن یہ جو کہتے ہو کہ تم جو کہہ رہے ہو وہی صحیح ہے، یہ غلط ہے۔ پھر اس نے ہر بات کی، وجہ بیان کی اور ہر اشارہ کو اس کے مقام پر چسپاں کیا۔

پھر علم ظاہر و باطن کے جامع عارفوں کا کشف صحیح ہوتا ہے۔ اور قدما کے کلام کی توجیہ اور ان کے مقصود کی تعیین میں کچھ غلطیاں ہوتی ہیں۔ اور یہ ان کی اللہ کی معرفت میں کوئی کمی نہیں کرتی۔ نہ ان کے کمال میں کوئی نقصان کرتا ہے۔ اس لیے کہ کلام کی توجیہ اور اس کے محل کی تعیین کشف کے دائرہ سے خارج ہے۔ یہ اجتہاد اور غور و فکر کا ایک شعبہ ہے، جس میں علماء اور ظاہر ہے کہ عوام بھی، ان کے ساتھ شامل ہوتے ہیں۔ اور جان لو کہ وحدت الوجود اور وحدت الشہود دو لفظ ہیں، جن کا اطلاق دو الگ الگ جگہوں پر ہوتا ہے، جو کبھی اللہ عزوجل کی طرف چلنے میں استعمال ہوتے ہیں۔ چنانچہ کہا جاتا ہے، اس سالک کا مقام وحدت الوجود ہے، اور اس کا مقام وحدت الشہود ہے، اور یہاں وحدت الوجود کا معنی

حقیقت جامعہ کی معرفت میں استغراق ہے، جس میں عالم اس حیثیت سے تعین کرتا ہے کہ اس سے فرق وامتیاز کے احکام ساقط ہو جاتے ہیں، جن سے خیر وشر کی معرفت کی بنیاد ہے۔ اور شریعت اور عقل اس کے بارے میں خبر دینے والی ہوتی ہیں۔ اس کو اچھی طرح بیان کرتی ہیں اور پوری طرح خبر دیتی ہیں۔ اور یہ وہ مقام ہے جس میں بعض سالک وہیں رہ جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ ان کو اس سے چھٹکارا دے دیتے ہیں۔ اور وحدت الشہود کا معنی جمع وتفریق کے احکام میں جمع کرنا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اشیاء ایک وجہ سے ایک ہی ہیں۔ اور دوسری وجہ سے بہت ساری ہیں، ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ اور یہ مقام پہلے والے سے زیادہ مکمل واعلیٰ وارفع ہے۔ اور یہ وہ اصطلاح ہے جس کو میں نے شیخ آدم بنوری قدس سرہ کے بعض پیروکاروں سے اخذ کیا ہے۔

اور کبھی یہ دونوں لفظ، اشیاء کی حقائق کی معرفت میں استعمال ہوتے ہیں، جو اس کی ماہیت ہے۔ اس لیے انہوں نے حادث کو قدیم سے مربوط کرنے کی ایک وجہ کے طور پر دیکھا، تو لوگوں کے سامنے یہ بات آئی کہ عالم اعراض ہیں۔ جو ایک حقیقت میں مجتمع ہیں۔ جیسے انسان کی صورت اور گھوڑوں کی صورت شمع پر وارد ہوتی ہیں اور طبیعت شمعیہ تمام حالات میں باقی ہے، لیکن شمع کو ان شکلوں کا نام نہیں دیا جاتا۔ سوائے اس صورت کے جو اس پر وارد ہوتی ہے بلکہ وہ صورتیں حقیقت میں وہ شکلیں ہیں۔ لیکن ان کو شمع سے ملانے کے سوا ان کا اپنا کوئی وجود نہیں ہوتا۔

اور دوسرے لوگوں کے نزدیک یہ بات ہے کہ عالم اسماء کے عکس ہیں۔ اور صفات ان اسماء اور صفات کے لیے عدم کے مقابلہ میں نظر میں نقش ہوتے ہیں۔ جیسے قدرت کے مقابلہ میں عدم ہے، اور وہ عجز ہے۔ چنانچہ جب قدرت کی روشنی کا عکس عجز کے آئینہ میں پڑتا ہے تو قدرت ممکن ہو جاتی ہے۔ اس طرح تمام صفات اور وجود بھی اس اسلوب پر ہوتے ہیں۔ چنانچہ مذہب اول کو وحدت الوجود اور دوسرے کو وحدت الشہود کہتے ہیں۔

اور ہمارے نزدیک یہ امر ہے کہ کشف میں آنے والی دونوں باتیں صحیح ہیں۔ لیکن یہ کہنا کہ شیخ عربی نے یہ نہیں کہا کہ وحدت الشہود کے یہ معنی ہیں، یہ بھول ہے اس لیے کہ شیخ

اوران کے پیروکار بلکہ حکماء بھی یہی کہتے ہیں۔اور وہ یہ کہ تہذیب اور مجازات واستعارات سے تخلیص کے بعد اس قول کا حاصل جو فہم کی دشواری کو واجب کرتی ہے، یہ ہے کہ حقائق امکانیہ ضعیف وناقص ہیں۔اور حقیقت وجو بیہ زیادہ مکمل اور قوی ہیں۔اس طرح ممکن ہوتا ہے کہ حقائق امکانیہ کے لیے یہ کہا جائے کہ وہ عدم ہیں۔ان میں موجودات کی صورتیں ظاہر ہوتی ہیں۔اور یہ مخفی نہیں ہے کہ یہ قول متفق علیہ ہے۔اور یہی وہ بات ہے جس کے بارے میں تم نے مجھ سے سوال کیا ہے۔وہ تفصیل کا محتاج ہے۔تو جو تمہارے سامنے بیان کیا جارہا ہے،اس کو شعور ودانش کے ساتھ سنو۔

رحمکم اللہ۔ جان لو کہ پہلی بات جس کو مسلمان سمجھتا ہے اور جو کتاب وسنت کی نصوص سے اس کے سامنے خالص ہو کر آتی ہے، بلکہ ہر صاحب ملت کی طرف خالص ہو کر آتی ہے، یہ ہے کہ حق عزوجل تمام جزئیات کی طرح موجود جزئی ہے۔البتہ وہ قدیم ہے، اور عالم میں موثر ہے،ان کا پیدا کرنے والا اور ان کو رزق دینے والا ہے۔اور یہ وہ علم ہے جس کو ہر عاقل ریاضت نفسانی برداشت کیے بغیر یا معقول میں مدد سے پہلے اپنے سینہ میں پاتا ہے۔اور شرع نے جس کو مکلف کیا ہے، وہ انسان ہیں۔اور شرع الٰہی نے لوگوں کو انہی امور کا مکلف بنایا ہے، جو اللہ عزوجل نے ان کی فطرت میں صورت نوعیہ کے لحاظ سے ودیعت کیا ہے۔چاہے وہ شئے جس کا مکلف کیا گیا ہے علم کے اعتبار سے ہو یا عمل کے اعتبار سے۔اور شریعت ان کے مقابلہ میں صرف اس دلیل کو لاتی ہے جس کی طرف ان کی فطرت ہدایت کرتی ہے۔اور وہ ان کے اندر پوشیدہ ہے۔اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا:فطرة الله التي فطر الناس عليها لا تبديل لخلق الله ”اللہ کی فطرت وہی ہے جس پر اس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔اللہ کی تخلیق میں کوئی تبدیلی نہیں ہے“۔(الروم ۳۰) اور رسول اللہ نے فرمایا: كل مولود يولد على الفطرة ”ہر پیدا ہونے والا فطرت پر ہی پیدا ہوتا ہے۔“(الحدیث)

اور یہ معرفت صحیح اور اشارۂ صادق ہے۔اس کا مرجع، حق عزوجل کی ایک تجلی ہے، جو قدیم ہے،اور نفس رحمانی کے قلب میں زمانہ کے تحقق سے پہلے ظاہر ہوگئی۔اور حدوث کی

حدیث آتی ہے، اور وہ اس لیے کہ نفوس بشریہ کے لیے اس کی طرف ویسی ہی کشش ہوتی ہے جیسی لوہے کی کشش مقناطیس کی طرف ہوتی ہے۔ اور اس کی طرف میلان اس طرح ہوتا ہے جیسے آگ کا میلان اوپر کی طرف۔ اور مٹی کا میلان نیچے کی طرف ہوتا ہے۔ اور کسی نے کیسی سچی بات کہی ہے۔

لقد صرت مقناطیسنا فقلوبنا

لجذبک إیاھا إلیک تمیل

"تو مقناطیس ہو گیا تو ہمارے دل تمہاری کشش کی وجہ سے تمہاری طرف مائل ہوتے ہیں۔"

تو اللہ عزوجل نے موت کے بعد اس تجلی کی طرف وصول کو لقاء اللہ سے موسوم کیا۔ اور ہر اس امر کو جو انسان کی اس وصول پر مدد کرے، اور اس کے نزدیک اس کا سینہ ٹھنڈا ہو، اس کو طاعت قرار دیا۔ اور ہر اس امر کو جس کو اس سے دور کرے یا اس کے نزدیک اس کے قلب میں قلق و اضطراب پیدا ہو، گناہ قرار دیا۔ اور اس معنی کی طرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرماتے ہوئے اشارہ کیا **إنکم سترون ربکم عزوجل کما ترون القمر لیلۃ البدر، لا تضامون فی رؤیتہ، فان استطعتم ان تغلبوا علی صلوٰۃ قبل طلوع الشمس وقبل غروبھا فافعلوا** "تم اپنے رب عزوجل کو اس طرح دیکھو گے جیسے لیلۃ البدر میں چاند کو دیکھتے ہو۔ اس کی رویت میں تم آپس میں مزاحمت نہیں کرتے۔ تو اگر تم اس کی استطاعت رکھتے ہو کہ سورج طلوع ہونے سے پہلے اور اس کے غروب سے پہلے نماز پر غالب آسکو تو اس کام کو کر لو۔"

اور یہ تجلی خیر و شر کی کسوٹی ہے جیسا کہ ہم نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اور یہی وہ تجلی ہے جس پر ۱۹۹ اسماء الٰہیہ کا انطباق ہوتا ہے۔ اور یہ وہی ہے جس کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت خبر دی تھی جب آپ سے سوال کیا گیا کہ ہمارا رب مخلوق کو پیدا کرنے سے قبل کہاں تھا؟ تو آپ نے فرمایا: وہ عماء (دھند) میں تھا جس کے اوپر ہوا ہے، اور اس کے نیچے ہوا ہے۔ اور یہ وہی ہے جس کے بارے میں صوفیا نے اپنے اس قول سے خبر دی تھی کہ وجود دو مظہروں میں ظاہر ہوا۔ ایک مظہر واجب جس کی تاثیر قہر و فعل اور تنزہ

ہے۔اور دوسرا مظہر ممکن ہے اس کا تاثر، انفعال اور کمزوری ہے۔

اور شیخ محی الدین عربی نے فرمایا: انبیاء اور اولیاء کا ذوق ان کی معرفت میں اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہاں ارادہ متجدد ہے۔

جس نے اس تجلی کو اس طرح ثابت کر دیا جیسے وہ ہے، تو اس نے اس فطرت کو درست کر دیا جس پر اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔اور انبیاء اور اولیاء سے اپنے رب کی معرفت میں مطابق ہو گیا۔اور جس نے اس کو ثابت نہیں کیا۔اس نے فطرت کو غلط کر دیا اور انبیاء اور اولیاء سے اپنے رب کی معرفت میں الگ ہو گیا۔اور ہمیشہ کے لیے زندیق، بے دین ہو گیا۔اور اسی طرح جس نے بھی اس علم کا انکار کیا جو حق تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں ودیعت کیا ہے، اور اس پر تکلیف کو لازم کیا تو وہ زندیق ہے۔

اور اسی طرح علوم فطریہ میں سے جن کا منکر زندیق ہوتا ہے، یہ ہے کہ اشیاء کے حقائق ثابت ہیں، اور اشیاء کے خاص وجود ہیں، جن پر خواص لازم ہوتے ہیں۔جیسے آگ جلاتی ہے، پانی آگ کو بجھاتا ہے، زنجبیل گرم اور کافور سرد ہے۔اور نماز خیر ہے اور زنا شر ہے۔تو جس نے یہ نہیں کہا، اس پر خود اس کے نفس کی طرف سے اس کے نفس پر حجتیں قائم ہو گئیں۔اور اس کو خود اس کے نفس کی طرف سے اس کے نفس پر دلائل نے جھٹلا دیا۔اور وہ لگاتار اقوال و آراء کی غلطیوں کی وجہ سے پستیوں میں گر گیا۔

اور ہم نے شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سنت سے یہ پہچان لیا کہ وہ فطرت کے طرز پر زیادتی سے منع کرتا ہے، اور اس کے سوا دوسرے امور میں غور و خوض سے روکتا ہے، الا یہ کہ صوفیاء اس امر کو پہچانتے ہیں کہ نہی عقل اور صورت انسانی پر جاری ہوتی ہے۔اب اگر انسان نے اس میں اپنی عقل کو استعمال کیا، اور اس میں اس لحاظ سے غور و خوض کیا کہ انسان کیا ہے، اس کو اس سے روکا جائے۔لیکن وہ اس طرح غور و خوض کرتے ہیں جو عقل کے طریقہ سے پرے ہے اور جس سے وہ موجود ہیں۔اس سے نہیں کہ جس خصوصیت سے وہ بشر ہیں۔

اور بالجملہ لوگوں نے اس اصل کے احکام کے بعد غور و خوض کیا جس پر دوسرے علم میں ان کی جبلت بنائی گئی ہے، اور وہ یہ ہے کہ اشیاء معقولہ اور محسوسہ وجود میں مشترک ہیں

اور یہ وہ معنی ہے جس سے یہ اشیاء معدومہ جدا ہوتی ہیں کہ مثلاً کبھی ہم مثلث کا تصور کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ موجود نہیں ہے۔ اور کبھی اس کا تصور کرتے اور سمجھتے ہیں کہ وہ موجود ہے۔ اور ضروری ہے کہ متصور ثانی متصور اولٰی سے جدا ہو۔ اور جس سے وہ جدا ہوتا ہے، وہ وجود ہے۔ اور یہ وہ ہے جو ان اشیاء میں قابلیت اور فاعلیت کے لیے مبدا ہوتا ہے۔ اور یہ اشیاء ماہیت میں ایک دوسرے سے ممتاز ہوتی ہیں۔ اور وہ اس وجود اور امور پر خصوصیات زائدہ ہیں۔ جن کو گھوڑے، انسان، گدھے اور اونٹ کا نام دیا جاتا ہے، اور جن کو ہم اپنے نفس میں مقدر کرتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کے لیے احکام اور آثار کی مقدار ہے۔

پھر اس وجود کی حقیقت اور ماہیتوں کے ساتھ ان کو شامل کرنے کی کیفیت کے بارے میں ایک دوسرے سے اختلاف کیا، تو کہا گیا کہ وجود امر انتزاعی ہے جس سے ماہیتیں متصف ہوتی ہیں۔ اور بنانے والے نے ماہیت کو ماہیت نہیں بنایا اور نہ ہی وجود کو وجود بنایا لیکن ماہیت کو موجود بنایا۔

میں کہتا ہوں کہ یہ قول فی نفسہ سچ اور اپنے وجود کی معرفت میں حصر کے اعتبار سے اور وجود حقیقی کی بحث میں اپنے ذکر کے اعتبار سے غلط ہے کہ ہم لامحالہ اس امر انتزاعی کا ادراک کرتے ہیں جس کو وجود کہتے ہیں۔ اور اس سے ماہیت کی صفت بیان کرتے ہیں۔ اور اس سے متصف ہونا۔ بنانے والے کے بنانے اور اس کے لیے سبب بننے والے کے آثار میں سے ایک اثر ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ بنانے والے نے ماہیت کو بنایا اور اس کو اپنے نفس سے صادر کیا۔ اور اس کے صادر ہونے کے بعد دیکھنے والوں نے فاعلیت اور قابلیت وغیرہ کے ظہور سے اس کے بعض احوال کی طرف دیکھا تو ان کے سینوں میں اس وقت وہ صورت نقش ہوئی جس کو وجود کہا جاتا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ بھی فی نفسہ قول صادق ہے اور اپنے وجود کی معرفت کے دو اعتبارات سے خطا ہے۔ ہم ان امور کا قطعی طور پر ادراک کرتے ہیں جو خارج میں ممتاز ہیں۔ ہم ان کو اسماء مختلفہ کہتے ہیں۔ اور بلاشبہ یہ ایک ایسا اثر ہے جس کو بنانے والے نے بنایا ہے۔ اور حق یہ ہے کہ وہاں کچھ خاص وجود ہیں جن کو ہم ماہیتوں کا نام دیتے ہیں۔ جو

دوسرے دو وجودوں کے درمیان گھرے ہوئے ہیں۔

ان میں سے ایک وجود وحدانی ہے، جو موجودات کے ہیکلوں پر پھیلا ہوا ہے۔ اور وہ وجودات خاصہ پر مقدم ہے۔ اور وجودات خاصہ اس کے بعض عموم کے لیے تنزلات اور تعینات ہیں، جو اس کے اور ماہیات کے درمیان معلوم آئینہ اور مجہول الکیفیت کے ربط سے حاصل ہوتے ہیں، جو اس پھیلے ہوئے وجود اور اس کی صورت علمی کے امور ہیں۔ اور دوسرے وہ وجود ہے جو اجمالی طور پر وجودات خاصہ کے ملاحظہ سے سامنے آتا ہے۔ تو یہ دونوں باتیں کہنے والوں میں سے ہر ایک نے حق بات کہی۔ لیکن اس اکتفا میں غلطی بیمار کو شفا نہیں دیتی اور نہ ہی پیاسے کی پیاس بجھاتی ہے۔

اور وحدت الوجود کے قائل صوفیا نے کہا ہے کہ جو شئے خارج میں ہوتی ہے، اور اس پر آثار خارجی مترتب ہوتے ہیں، وہ اس امر سے خالی نہیں ہوتی کہ خارج میں اس کے حصول میں اور آثار خارجیہ کے اس پر ترتب میں کسی ضمیمہ کے ملانے کے محتاج ہوں یا کسی ضمیمہ کے ملانے کے محتاج نہ ہوں۔ تو اول ممکن ہے اور دوسرا واجب۔ اور ہم نے اپنے ذوق سے یہ ادراک کیا ہے کہ یہ ضمیمہ وہ موجود ہے جو موجودات کے ہیکلوں پر پھیلا ہوا ہے۔ اور یہ وہ شئے ہے جو قائم بذاته اور مقوم لغیرہ ہے اور فی نفسہ متعین نہیں ہے بلکہ لوگوں کے نزدیک آثار معلومہ کی ایک نوع کے ساتھ مختص ہے۔ لیکن اس کے تنزلات علمی و عینی ہیں۔ اس لیے ان تنزلات سے آثار خاصہ معلومہ کے ساتھ مختص و متعین ہو جاتے ہیں۔

اور اس کی تجلی کے تنزل کے اول مراتب جو اس کے نفس سے اس کے نفس کے لیے شان کلی سے ہوتے ہیں، یقینی طور پر اس سے شان خارج نہیں ہوتی۔ پھر اس کا تنزل علم میں نہ کہ عین میں اس شان کلی کی تفصیلات کی طرف ہوتا ہے۔ پھر اس کا تنزل ان تفصیلات میں عین میں ہوتا ہے جیسا کہ علم میں ہوتا ہے۔

اور ان کے نزدیک ممکنات کے حقائق اعتبارات و امور سے متعلق ذات متکثرہ کی صورت ہے۔ پھر جب اس شان سے متعلق بنفسہ معلوم ہو گیا تو وہ ممکن کے لیے حقیقت ہو گئی۔ اور جب اس شان سے متعلق بنفسہ معلوم ہو گیا تو دوسرے ممکن کے لیے حقیقت ہو گئی

اور ممکنات کا وجود ان حقائق میں وجود کا ظہور ہے تو جب ممکن کے وجود کی شرائط جمع ہوگئیں اور اس کے وجود کے مواقع دور ہو گئے تو اس کے لیے نسبت خاصہ حادث ہوگئی جو اس وجود سے مجہول الکیفیت اور معلوم الآنیہ ہے، تو اس حقیقت کے لیے مخصوص آثار کے وجود سے صادر ہوا۔ اور اس نسبت خاص کے واسطہ سے اس کے وجود کا متقاضی ہوا۔ اس وقت کہا جاتا ہے "وجود کو تنزل ہوگیا، اور وہ متعین ہوگیا اور مظہر خاص میں ظاہر ہوگیا۔" اس لیے ظہور کا معنی آثار کی قسم کا اقتضا اس کی تمیز اور تعین ہے۔ اس کے سوا کچھ نہیں ہے، اور مظہر شئے صورت محتملہ کی وہ صورت ہے جس سے اس کے احکام اور آثار کا تعین اور تعلق ہوا۔

میں کہتا ہوں یہ قول عقلاً وکشفاً صحیح ہے۔ تم جب کہتے ہو کہ معرکۂ قتال میں متحقق صرف جسم ہوتا ہے، تو وہی قاتل ہوتا ہے، وہی مقتول، وہی آلۂ قتل ہے، وہی سوار اور وہی سواری، وہی زین ہے، وہی تلوار ہے، وہی تیر ہے، وہی کمان، وہی نیزہ، وہی پھینکنے والا ہے، وہی پھینکا جانے والا، وہی مصیبت ہے، وہی مصیبت زدہ، وہی ظالم وغالب ہے اور وہی مغلوب ومظلوم۔ لیکن جسم ان ناموں سے کسی نام کا صرف کسی خاص کیفیت اور خاص معنیٰ میں ہی مستحق ہوتا ہے۔

اور ہم نے جب ان کیفیات کی طرف، قطع نظر ان کے جسم سے ملنے کے، دیکھا تو وہ معدوم تھیں۔ اور ان سے ان کے آثار صادر نہیں ہوئے۔ اور جب ان کی طرف جسم مل گیا تو وہ موجود ہوگیا۔ اور ان سے ان کے آثار صادر ہو گئے۔ اور جسم ان کیفیات کا محل اور ان کا حامل ہے جو وجود خارجی سے پہلے عقل وتقدیر میں ان معانی کے لیے تیار ہوگیا، پھر ان اشیاء کا وجود خارجی ہوتا ہے۔

اگر ان بہت ساری صورتوں کو جسم سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو وہ عدم محض ہیں۔ ان کا کوئی تحقق نہیں ہے۔ صرف موہوم صورت ہوتی ہے۔ اور اگر ضمیمہ کو ملا کر دیکھا جائے جو کہ جسم ہے تو موجود ہوتی ہے۔ پھر جب کبھی جسم تلوار بن گیا اور کبھی نیزہ ہوگیا تو اس کے اسباب وسیع ہو گئے۔ یعنی بڑھئی، لوہار، لکڑی، لوہا، آگ، لوہار کی بھٹی، درہ یا کوڑا، کلہاڑی اور آرا وغیرہ یہاں تک کہ معدوم کے درمیان موہوم حادث ہوگیا جو کہ تلوار اور نیزہ

ہیں، اور موجود کے درمیان جو کہ جسم ہے، نسبت معلوم الانیہ اور مجہول الکیفیہ ہے۔ اس سے وہ معدوم وجود سے متصف ہو گیا۔ اس وقت تلوار اور نیزہ کے وجود کا معنی معدوم کا وجود سے اس طرح ربط ہونا ہے کہ اس کے لیے موجود سے اسم کا اشتقاق صحیح ہو جائے۔ اور جسم عام ہوگا جو بہت سی صورتوں کا احتمال رکھتا ہو۔ تو جب تلوار بن گئی اور تلوار ہونے کے احکام کاٹنا وغیرہ سے متعلق ہو گئی تو تعین خاص کے ساتھ متعین ہو گئی۔ اور احتمال والی کچھ صورتوں میں ظاہر ہو گئی، تو اس وقت کہا جاتا ہے، مظہر خاص میں ظاہر ہو گئی۔ اور وہ تلوار ہے۔ یہ سارا کلام صحیح ہوگا۔ کوئی سمجھدار اس سے انکار نہیں کر سکتا، سوائے اس کے کہ لفظی بحثیں وضع اور عرف کی طرف لوٹیں، جن کا ہمارے نزدیک کوئی اعتبار نہیں ہے۔ تو جب تم جسم میں اس قدر کو سمجھ گئے تو یہ بھی سمجھ لو کہ موجود اس سے اولی ہے۔

پھر موجود کا معنی وہ ہے جو وجود سے متصف ہوتا ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وجود صفت انتزاعی ہے، اس لیے ہم اس صفت انتزاعی کے بارے میں بحث کرتے ہیں کہ کیا اس کے لیے خارج میں منشاء انتزاعی ہے یا وہ بمنزلہ سانپ کے دانتوں یا چھلاوہ کے ہیں۔ بیشک بداہت عقل، اول کا حکم لگاتی ہے۔ اور احتمال ثانی سے منع کرتی ہے تو جب یہ حکم موجود ہوگا تو وہ وجود حقیقی کا حکم ہوگا۔ جو اولی سے انتزاع کا منشا ہے۔

اور جان لو کہ ثبوت وجود سے پہلے ہوتا ہے۔ اس لیے کتنے ہی معدوم ہیں جو ثابت اور متعین ہیں۔ اپنے احکام و آثار کے ساتھ مخصوص ہیں کہ حساب کرنے والا جب اعداد کے مراتب کو سمجھ لیتا ہے تو وہ اس میں طبعی قانون کے مطابق عمل کرتا ہے جو فی نفسہ ثابت ہوتا ہے کہ کسی چیز کو مرتبۂ وجود سے مقدم یا موخر کر دے، تو یہ بھی نہیں ہو سکتا۔ اور یہ وہ ثبوت ہے جس کے لیے ہم کہتے ہیں کہ وہ وجود سے پہلے ہے۔ اور وہ لامحالہ وجود خارجی کے علاوہ ہے۔ اگر غیر وجود ذہنی سے وہ تحقق مراد لیا جائے جو سمجھدار کی سمجھ سے حاصل ہوتا ہے، اور اگر اس سے اس کے علاوہ کچھ اور مراد لیا جائے تو اس کا احتمال ہے کہ وہ حقیقت ہو۔

اور جیسا کہ ہم نے اعداد کے مراتب میں ذکر کیا ہے، یہی حال ہر نوع وجنس کے احکام میں ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ لامحالہ اگر کھجور پایا جاتا ہے تو اس کے پتے ایسے اور ایسے

ہوتے ہیں۔ اور اس کی چھال ایسی اور ایسی ہوتی ہے۔ اور اگر بیری کا درخت پایا جاتا ہے تو اس کے پتے ایسے اور ایسے ہوتے ہیں، اور اس کا پھل ایسا اور ایسا ہوتا ہے۔ اس طرح ہر قسم سے وہ احکام متعلق ہو گئے جو اس کے ساتھ خاص ہیں، اور اس کے لیے لازم ہیں، خواہ خارج میں پائے جائیں یا نہیں جیسا کہ ہمارے قول میں یہ لازم ہے لو لم یشاء اللہ لم یخلق الخلق "اگر اللہ نہ چاہتا تو مخلوق کو پیدا نہ کرتا۔" صحیح ہے، اگر چہ یہ صورت بالکل بھی متحقق نہیں ہوتی تو یہ تعلق ظاہر ہے۔ اور یہ ملازمہ وجود خارجی سے پہلے نفس الامر میں واقع ہوتا ہے۔ اور جو چیز بھی خارج میں موجود ہے وہ یقینی طور پر ثابت ہے۔ اور ممتنع ثابت نہیں ہے، اس طرح ذہن کی اختراعات جن سے اختراع کا انقطاع منقطع ہوتا ہے، اور اس کا کوئی امام نہیں ہے جس کی اس کے تصور میں عقل اقتدا کرے، اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ اور بالجملہ وجود خارجی کا امر ثابت سے الحاق ہوتا ہے تو اس کو موجود کر دیتا ہے۔

اور ہم اس ثبوت اور اس وجود سے بحث کرتے ہیں خواہ ان دونوں کا منبع کچھ بھی ہو۔ تو جو ہمارے نزدیک واقع ہو گیا کہ وجود اس کا منبع ہے اور اس کا مصدر وہ وجود ہے جو موجودات کے ہیکلوں یا نفس رحمانی یا نفس کلیہ پر، ان کو تم جو چاہو کہہ لو، پھیلا ہوا ہے۔

عباراتنا شتی وحسنک واحد

وکل الی ذاک الجمال یشیر

"ہماری عبارتیں مختلف ہیں اور تمہارا حسن واحد ہے، اور ہر ایک اس جمال کی طرف اشارہ کرتا ہے۔"

اور وہ ذات الٰہیہ سے صادر ہے۔ اور یہ کہ ثبوت اس کا منبع ہے جو وجود خارجی سے پہلے عالم عقل میں عالم کے لیے ذات الٰہیہ کا اقتضا ہے۔ اور اس کو صوفیا تنزل علمی کا نام دیتے ہیں اور علم سے مراد اشیاء کی صورتوں کا نقش ہونا نہیں لیتے۔ لیکن وہ اس سے اشیاء کا ایک بار مرتبہ عقلیہ میں جو قائم بالواجب ہوتا ہے نہ کہ بنفسہ صدور، مراد لیتے ہیں۔ اور اس کو ہم ایک مثال سے بیان کریں گے۔

جب مہر کو پگھلے ہوئے موم میں رکھا جاتا ہے تو اس میں مہر میں لکھے ہوئے حروف نقش

ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ موم میں ظاہر ہونے والے حروف علت فاعلہ ہوتے ہیں اور وہ مہر ہے۔ اور علت قابلہ موم ہے۔ اور وہ ان دونوں کے اجتماع یا ایک کے دوسرے پر انطباق سے پائی جاتی ہے۔ لیکن مہر کے لیے استعداد ہوتی ہے۔ جو اس وقت سے اس میں قائم ہوتی ہے جب سے مہر بنی ہے کہ اگر اس پر کسی چیز کا انطباق کیا جائے، خواہ وہ موم ہو یا مٹی، اس سے اس شئے پر حروف کی صورت جاری ہو جاتی ہے۔ تو جو چیز بھی انطباق کے وقت پائی جاتی ہے، وہ اس سے پہلے نفس الامر میں ثابت موم میں قائم ہوگی۔ اس طرح جو چیز بھی زمانہ میں پائی جائے گی وہ ذات الٰہیہ کے ساتھ ثبوت کی حیثیت سے اور اس حیثیت سے کہ وہ واجب کے لیے کمال اور اس کا مقتضا ہے، قائم ہوگی۔ اور یہی ہے جس کو صوفیا فیض اقدس اور حکماء عقل نام دیتے ہیں۔

اور حق یہ ہے کہ عقل تمام موجودات خاصہ کو گھیرنے والی ہوتی ہے، سوائے اس کے کہ حکیم صرف عقول افلاک کو سمجھتا ہے۔ اور وہاں چار اصولوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ ذات الٰہیہ، اس سے صادر ہونے والی عقل، اس سے عقل کی شرط اور اس کے واسطہ سے صادر ہونے والا نفس کلیہ، اور وہ ہیولی جو نفس کلیہ کی شرط سے صادر ہوتا ہے۔ جیسا کہ مولانا عبدالرحمٰن جامی نے اپنے کسی کلام میں کہا ہے۔ "ذات صادر اول کے ساتھ اس موجود کی علت تامہ ہے جو مرتبہ ثانیہ میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس طرح ذات پہلی اور دوسری علت تامہ کے ساتھ تیسرا امر ہے۔"

اور جب بھی حس سے مشاہدہ کیا جاتا ہے یا عقل سے ادراک کیا جاتا ہے تو وہ ہیولی اور نفس کے درمیان واقع ہونے والے ملاپ سے حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ اس سے جو کہ نفس سے قریب ہے، اس میں اس کے احکام ظاہر ہوتے ہیں۔ اور اس سے وہ مراد ہے جس میں ہیولی کے اکثر احکام ظاہر ہوئے۔ اور ہیولی صرف تشخص ہے۔ تو جب ان اشیاء کے صدور کا وقت آیا اور اس کی علت مکمل ہوگئی تو وجود ذات الٰہیہ کے ساتھ قائم کی جانب سے ثابت ہونے والی استعدادوں کے لحاظ سے ظاہر ہوا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے قول سے اس معنی کو ظاہر کیا کہ ظاہر وجود باطن کے وجود کے حکم سے ظاہر ہوا۔ اور یہ کہ ظاہر وجود اور باطن وجود کے درمیان نسبت آئینہ واقع ہوئی جو مجہول الکیفیت ہے۔ اور انہوں نے کہا کہ اعیان نے وجود کی بو نہیں سونگھی۔ اور ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ اس سے جو آثار صادر ہوتے ہیں،

صرف وہ وجود ہیں لیکن وہ باطن وجود کے قانون پر ظاہر ہوتے ہیں۔

اس قدر وحدت الوجود عقلاً وکشفاً ثابت ہے، اور اس کے گرد اہل عقل ودانش کی تمام جماعتیں گھومتی ہیں۔ تو ان میں سے جو لوگ کہتے ہیں کہ ذوات ذاتیہ میں متحد اور اوصاف میں مختلف ہیں، انہوں یہی معنی مراد لیا ہے۔ اور کچھ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ عالم ہیولی اولی میں متعین ہے اور صورت عامہ جسمیہ اس قاعدہ سے پوری طرح دور نہیں ہوتی اور اس قاعدہ کے مقدمات کا اس حیثیت سے اعتراف کرتے ہیں کہ ان کا ادراک کرتے ہیں یا نہیں کرتے۔ اور ہم نے پیچھے اس قول کی طرف اشارہ کیا ہے کہ شئے کا وجود اس کی حقیقت کا عین ہے۔ اس مسئلہ میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ اور اس طرح کا یہ قول ہے کہ وجود وصفت انتزاعیہ ہے جو اس سے نہیں ٹکراتی اور ہر قول کا ایک محمل ہے، جس پر انطباق ہوتا ہے۔

یہاں ایک مشکل مسئلہ باقی رہ گیا جو وحدت الوجود کی قائل جماعت کے لیے بہت دشوار ہے۔ اور وہ یہ کہ یہ وجود عین ذات واجب ہے یا اس سے ابداع کے طور پر صادر ہوتا ہے۔ اس کے لیے محل نزاع کو بیان کرنا ضروری ہے۔ اس لیے کہ دونوں جماعتوں کا کلام تسامح، برداشت وچشم پوشی سے خالی نہیں ہے۔ تو دونوں قول خلط ملط ہو جاتے ہیں۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ انسان کا حال مختلف اعتبارات کی نسبت سے انسان سے ''شرط لا'' کے ساتھ ہو یا ''شرط شئے'' کے ساتھ اور ''لا بشرط شئے'' کے ساتھ، اس کے اس حال سے مختلف ہے جو اس کے افراد کی نسبت سے ہے۔ چنانچہ ہمیں اس میں شک نہیں ہے کہ حال اولی میں وحدت حقیقت اور کثرت اعتباریہ ہے۔ اور حال ثانیہ میں کثرت حقیقت اور وحدت اعتباریہ ہے۔ اور حال اولی میں انسان کلی ہوتا ہے۔ اور حال ثانیہ اس سے خارج ہوتا ہے۔ تو جب ہم نے شئے کے اپنے مظاہر اور اس کے بعض محتملات میں تعین کے ظہور کے مراتب میں غور وفکر کیا تو اس کو دو درجوں میں پایا۔ ایک وہ درجہ ہے جس سے صدور اور ابداع کو تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور دوسرے وہ درجہ جس کو تعین اعتباری سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اس کے بعد ہم کہتے ہیں کہ ان کے اقوال موجودات کے ہیکلوں پر پھیلے ہوئے وجود میں مختلف ہیں۔ چنانچہ شیخ صدر الدین قونوی نے اپنی کتاب مفتاح الغیب کے شروع

میں کہا ہے کہ وہ ذات الٰہیہ سے صادر ہوتا ہے۔ اور مولانا عبدالرحمٰن جامی نے کہا کہ ذات الٰہیہ اور صادر اول میں فرق اعتباری ہے۔ تو شرح لمعات میں اس بارے میں سوال و جواب پیش کرنے کے بعد کہا ہے۔ تحقیق یہ ہے کہ اس ذات کا فیض ممکنات کے حقائق پر پھیلنے اور عموم کی نسبت کے اعتبار سے جاری ہے اور یہ نسبت امور اعتباری ہے۔ اس لیے اس نسبت سے ماخوذ ذات امور اعتباری سے ہوگی اور فی نفسہ امور حقیقیہ سے۔

اور میرے نزدیک مذہب اول حق ہے۔ کیونکہ موجودات خاصہ کا امتیاز احکام اور ان کے فی نفسہ ثبوت میں اجلی بدیہیات میں سے ہے۔ چنانچہ جس تنزل سے یہ اشیاء حاصل ہوتی ہیں، لامحالہ وہ منزلہ ثانیہ سے ہے۔ اگرچہ تنزل اور تعین کا اسم اس کو شامل ہوتا ہے۔ ورنہ افراد اور اس کی نوع کے درمیان فرق صرف اعتباری ہوتا ہے، جو اعتبار کے منقطع ہونے سے منقطع ہو جاتا ہے۔ اور اسی طرح ہر خاص و عام کے درمیان ہوتا ہے یہاں تک کہ معاملہ ذات الٰہیہ تک پہنچ جاتا ہے۔

یہ نہ کہا جائے کہ صوفیا اس امر کا التزام کرتے ہیں کہ حقائق امکانیہ وجود کے ساتھ لاحق اعتبارات و اضافات ہیں۔ اس لیے کہ ہم کہتے ہیں کہ صوفیا یہ کہتے ہیں ''آگ پانی کا غیر ہے، اور وہ دونوں ہوا کا غیر ہیں، اور یہ کہ انسان، گھوڑے کا غیر ہے، اگرچہ وجود ان سب میں شامل ہے۔'' وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اس معنی کے اضافات اور اعتبارات مراد لیے ہیں جو اس تغایر سے مزاحم نہیں ہوتے جو احکام کے اختلاف کا منشا ہوتے ہیں۔ اور یہ معنی وہ ہے جس سے یہ تعبیر کی جاتی ہے کہ کثرت حقیقی ہے اور وحدت اعتباری۔ اس لیے کہ ہم حقیقت کثرت سے صرف احکام کا امتیاز، آثار کا اختلاف اور حقائق کا تغایر مراد لیتے ہیں جو کہ موجودات کے ہیکلوں پر پھیلے ہوئے وجود واحد کی طرف ان سب کے عدم رجوع اور اصل وجود میں ان کے اختلاف کے لیے وجودات خاصہ ہیں۔ ہرگز نہیں، ان کا یہ قول تنزل کے لیے اثبات ہے اور ظہور تنزل کے دونوں درجوں میں سے ایک کے بغیر دوسرے منزلہ کے لیے اثبات نہیں ہے۔

اور صوفیاء نے جو یہ کہا ہے کہ عالم عین حق ہے تو انہوں نے اس سے ان موجودات خاصہ کی نفی مراد لی ہے جو مختلف مراتب کی طرف وجود کے تنزل سے حاصل ہوتی ہے۔ بلکہ

انہوں نے تنزل اور ظہور کے معنی کا افادہ مراد لیا ہے۔تو جس طرح معقولی کہتا ہے کہ زید اور عمر ایک ہیں تو وہ اس سے نوع میں مماثلت مراد لیتا ہے، ہر اعتبار سے اتحاد مراد نہیں لیتا۔اور جب وہ کہتا ہے کہ انسان اور گھوڑا ایک ہیں تو حیوانیت میں اشتراک مراد لیتا ہے۔اور جب کہتا ہے کہ شجاع، بہادر اور شیر ایک ہیں تو اس سے شجاعت و بہادری میں مشابہت مراد لیتا ہے۔اسی طرح جب صوفیا کہتے ہیں کہ عالم عین حق ہے تو پھیلے ہوئے وجود میں پوری طرح عینیت مراد لیتے ہیں۔اور پھیلے ہوئے وجود کا حق اول جد مجدہ کے ساتھ قیام پوری طرح امتیاز کی نفی نہیں ہے۔کہنے والے نے کہا ہے۔

ہر مرتبہ از وجود حکمے دارد
گر حفظ مراتب نہ کنی زندیقی

”وجود کے ہر مرتبہ کا ایک حکم ہوتا ہے، اگر تم مراتب کا لحاظ نہیں کرتے تو کافر ہو۔“

اور جیسا کہ کہا ہے تنزل سے وہ معنی مراد لیتے ہیں جس میں دونوں مرتبے عام ہیں۔

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ فرض کرو تم نے حق اول اور اس سے صادر ہونے والے کو ثابت کر دیا تو ضروری ہے کہ وجود اور تحقق میں یہ دونوں شامل ہوتے ہیں۔اس لیے کہ یہ کہنا صحیح نہیں ہے کیونکہ وہ موجود نہیں ہے۔اور نہ اس لیے کہ وہ غیر موجود ہے۔اور جب وجود میں وہ شامل ہوتا ہے تو کلام اس وجود میں جاری ہوتا ہے۔اور لازمی امر ہے کہ وہ اول ہے اور یہ کہ وہ تمام مرتبوں میں ہے۔اس لیے کہ ہم کہتے ہیں کہ یہ وجود مفروضہ ہے جس کو عقل نے فرض کر لیا ہے جبکہ نفس الامر میں اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔سانپ کے دانتوں کے منزلہ میں ہے۔

اور اگر تم تفتیش کا حق ادا کرو گے تو اس مسئلہ کو یہ کہتا ہوا پاؤ گے کہ حادث اور قدیم کے درمیان تعلق صرف منزلۂ ثانیہ ہے۔جس کو تعین اعتباری سے تعبیر کرتے ہیں۔جس کو فطرت سلیمہ جو تصدیق پر عظیم الجثہ ہے، حقائق کے تحقق اور ان کے درمیان پائے جانے والے امتیاز سے رو کر دیتی ہے۔اور فطرت اس مطلق تنزل کو رد نہیں کرتی، جو ابداع اور صدور وغیرہ سے صادق ہے۔بلکہ اس کی طرف مجبور ہوتی ہے۔البتہ ان اصولوں یعنی عقل، نفس اور ہیولی میں سے ہر ایک، ایک لحاظ سے دوسرے کا عین ہے اور ایک لحاظ سے غیر۔اس طرح عقل ایک لحاظ سے عین

نفس ہے جیسا کہ ہم نے انگوٹھی میں قائم نقوش اور موم میں نقش، نقوش کی استعداد کے سلسلہ میں بیان کیا جو اس میں قائم ہوتے ہیں۔ اور اسی طرح نفس ایک لحاظ سے عین ہیولی ہے۔

اور اس کی ہم ایک مثال اور بیان کرتے ہیں کہ جب تم اپنے نفس میں کسی کا تصور کرتے ہو تو کلیات اس کا احاطہ کر لیتی ہیں۔ حتیٰ کہ عقل یہ حکم لگا دیتی ہے کہ اس کا مثل صرف فرد واحد میں پایا جاتا ہے۔ پھر وہ جزئیہ خارج میں پایا جاتا ہے۔ چنانچہ نفس اور ہیولی کے درمیان پایا جانے والا فرق اس طرح کا ہوتا ہے جیسا عقل کلی، جس پر عقل یہ حکم لگاتی ہے کہ وہ فرد واحد میں منحصر ہے اور فرد جزئی کے درمیان ہوتا ہے اور ہمارے نزدیک تشخص اور تعین کی صورت میں نفس کلیہ کے ظہور کے سوا ہیولی کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ تو یہ اس ظہور کے باوجود ہیولی ہے۔ چنانچہ عارف جب اس عینیت کے بیان کا ارادہ کرتا ہے تو لازم ہوتا ہے کہ اس کو استعمال کرے، جس کا وہم فرق اعتباری سے ہوتا ہے۔ اور بالجملہ وہ کلمۂ حق ہے، جس سے باطل مراد لیا جاتا ہے۔

پھر شیخ مجدد نے اپنے مکتوبات میں کہا ہے کہ خارج میں موجود آٹھ صفات لازمی طور پر خارج میں ذات واجب سے ممتاز ہیں۔ اور ہر صفت کا ایک عدم ہوتا ہے جو اس کے مدمقابل ہوتا ہے۔ تو علم کا ایک عدم ہے اور جو اس کے مدمقابل ہے وہ جہل ہے۔ اور قدرت کا عدم جو اس کے مدمقابل ہوتا ہے عجز ہے۔ اور ان عدموں کا علم حق میں امتیاز ہے۔ تو اس امتیاز سے اسماء صفات کے آئینے اور ان کے انوار کے میدان ہیں تو ممکنات کے حقائق ان اسماء وصفات کے عکس ہیں جو ان کے مدمقابل عدم میں نقش ہیں۔ تو عدم ان ماہیات کے لیے بمنزلہ مادہ کے ہے۔ اور اسماء وصفات کے عکس مادہ میں پائی جانے والی صورت کے درجہ میں ہیں۔

چنانچہ شیخ ابن عربی کے نزدیک ممکنات کے حقائق وہ اسماء اور صفات ہیں جو علم میں ممتاز ہیں۔ اور شیخ مجدد کے نزدیک وہ عدم ہیں جن میں اسماء اور صفات کے انوار کا عکس ہوتا ہے۔ اور وہ عدم اور وہ عکس علم میں ہوتے ہیں۔ لیکن فاعل مختار جل مجدہ جب چاہتا ہے کہ کوئی ماہیت خارج میں پائی جائے تو اس کو وجود ظلی سے متصف کر دیتا ہے تب وہ وجود ظلی

سے خارج میں موجود ہو جاتی ہے۔

اور عالم کے سلسلہ میں ان کے اقوال مختلف ہیں۔ چنانچہ ایک بار کہا کہ وہ خارج میں وجود ظلی کے اعتبار سے موجود ہے۔ اور دوسری جگہ کہا وہ وہم میں موجود ہے، الا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس مرتبہ میں مستحکم کیا تو وہ موہوم مستحکم ہو گئے۔

میں کہتا ہوں کہ لفظ حقائق الممکنات کا اطلاق چند معانی پر ہوتا ہے۔ ایک وجودات خاصہ کہ انسان کی ایک حقیقت ہے، اور گھوڑے کی ایک حقیقت ہے، اور گدھے کی ایک حقیقت ہے، اور یہ حقائق خارج میں امور متحققہ ہیں۔ اور اس طرح ممکنات کے حقائق وہ ہیں جن کا تعلق صاحب عقل آدمی اپنے نفس میں ان اسماء کے اطلاق کے وقت قائم کرتا ہے۔ اس کے سوا نہیں۔ اور اس اصل پر ان کا قول کہ "اشیاء کے حقائق کا وجود ثابت ہے" خارج ہو جاتا ہے۔

اور دوسرے امور ثابتہ جو حد ذاتہ میں موجود نہیں ہیں، اور نہ ہی معدوم ہیں تو جب یہ وجود ضمیمہ سے مل گیا تو موجود ہو گیا، ورنہ معدوم ہوتا۔ اور اس معنی میں حقائق وہ ہیں جن کو معقولی ماہیات کہتے ہیں۔ البتہ معقولی یہ سمجھتے ہیں کہ وہ ایسے امور ہیں جو نہ موجود ہیں اور نہ ہی معدوم۔ اور ان کا قول ان امور کے ثبوت کے لیے اس حیثیت سے ہے کہ وہ جانتے ہیں یا نہیں جانتے۔ اور نہ ہی ان کے تعلق کو اول اوائل سے سمجھا۔ اور ان کا ثبوت فیض مقدس کے ساتھ ان کے وجود سے پہلے فیض اقدس سے ہے۔ اور وحدت وجود کے قائل صوفی کو ان حقائق ثابتہ اور ایک کے دوسرے سے تعلق اور وجود خارجی سے قبل مرتبۂ عقلیہ ایک کے دوسرے سے مقدم ہونے کے بارے میں کشف ہوا، تو اس نے سمجھا کہ ذات مقدس نے اولاً اس کے نفس پر اس طرح تجلی فرمائی کہ خود ان کے نفس کو اور جو اس کے نفس اور اس کے ساتھ قائم اس کے کمال اور مختلف شکل میں ان کے مظاہر کے سامنے آنے کے امکان کو جانا اور ان کا یہ علم تحقیق کے وقت عین اقتضا ہے۔ اور علم سے مراد اشیاء کی صورتوں کا نفسوں میں نقش ہونا نہیں ہے۔

پھر جو مظاہر کلیہ فاعلہ، قاہرہ، مقدسہ کے لیے استعداد ہے ان کو اسماء کہا اور جو مظاہر جزئیہ، منفعلہ، مغلوب اور آلودہ کے لیے استعداد ہو اس کو اعیان ممکنہ کا نام دیا۔ اس اصطلاح کے اعتبار سے ممکنات کے حقائق، حق اول کے نزدیک صورت معلومہ ہیں۔

تیسرے معنی کے لیے ایک تمہیدی مقدمہ کی ضرورت ہے اور وہ یہ ہے کہ دونوں گروپوں میں سے ایک دوسرے پر منطبق ہے تو جو کچھ اسماء میں ہے وہ ممکنات کے حقائق میں ظاہر ہو گیا۔ چنانچہ ممکنات کے حقائق اور اسماء کے حقائق ان کے نزدیک ایک گروپ انتہائی قوت وکمال میں اور دوسرا انتہائی کمزوری اور نقصان میں مدمقابل ہے اور ضعف بعض ان قوتوں کا عدم ہے جو قوی میں پائے جاتے ہیں۔ اور نقصان بعض ان امور کا عدم ہے جو مکمل میں پائے جاتے ہیں۔ جبکہ اصل میں ایک لحاظ سے اشتراک پایا جاتا ہے۔ اس طرح بلاشبہ وہاں اصل امر دونوں جانبوں میں سے ایک میں بوجہ اتم ثابت ہے۔ جبکہ دوسری جانب میں عدم سے ملا ہوا ہے۔

پھر ہم کہتے ہیں کہ جس نے اس درجہ میں اسماء کے ملانے اور ممکنات کی فرعیت کی تعبیر کا ارادہ کیا، اس کے لیے دو عبارتیں ہیں، اور دونوں صحیح ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ ممکنات کے حقائق اسماء اور صفات ہیں۔ جو مرجہ علم میں ممتاز ہیں اور دوسرے یہ کہ ممکنات کے حقائق ان اسماء اور صفات کے عکس ہیں جو اس کے مقابلہ میں عدم میں نقش ہیں۔ اور دونوں عبارتوں میں صرف ایک ضعیف سا فرق ہے جس کا اشیاء کے حقائق کی تحقیق کرنے والوں کے نزدیک کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔

چوتھے معنی کے لیے بھی ایک مقدمہ کی تمہید کی ضرورت ہے۔ اور وہ یہ کہ صوفیاء اولیٰ کو معشوق کہتے ہیں۔ اور ثانی کو عاشق اور مرتبہ علیا تمام میں ظاہر ہے عشق ہے۔ اور یہ صاحب اللمعات کی اصطلاح ہے۔

پھر یہ کہ معشوق اپنے عاشق کے قریب ہوتا ہے اور اس کی طرف کشش رکھتا ہے۔ اس لیے جس سالک پر اس کا یہ حال غالب ہوتا ہے، اس کو مجذوب، مراد اور محبوب کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے قصہ میں ہے کہ مراتب وجوبیہ کی طرف عنایت نے ان کو اس طرح کھینچا کہ وہ جانتے نہیں تھے تو ان کو اس کی طرف ہدایت کی جس نے ان کو پیدا کیا۔ اور فنا ہونے والوں کا حال یاد دلایا کہ ان کا رب جس نے ان کو پیدا کیا، وہ ان مذموم امور سے پاک ومنزہ ہے۔

اور عاشق اپنے معشوق کی طرف ترقی کرتا ہے، اور ریاضات بدنی ونفسانی اور تجرید وجہ روح کے ذریعہ اس کی طرف چلتا ہے۔ چنانچہ جس سالک پر اس کا یہ حال غالب ہوتا ہے، اسے سالک، مرید اور محبّ کہا جاتا ہے۔ اور کبھی معشوق قریب ہوتا ہے اور عاشق ترقی کرتا ہے تو درمیان میں دونوں جمع ہو جاتے ہیں۔ اور اس سالک کو دونوں جانب کی قربت پیش آتی ہے۔ اس لیے اس کو سالک مجذوب، محبّ، محبوب اور مرید مراد کہا جاتا ہے۔

اور اس کلام کا مطلب یہ ہے کہ شخص اکبر کے قلب میں اللہ تعالیٰ کی تجلی ہوتی ہے اور اس تجلی کے لیے حظیرۃ القدس میں انبساط اور انشراح ہوتا ہے۔ اور اس کے لیے ملاء اعلیٰ میں عکس اور میدان ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس تجلی پر ننانوے نام منطبق ہوتے ہیں۔ اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کے لیے اس تجلی کے لحاظ سے وقتاً فوقتاً ارادہ ہوتا ہے۔ علم متجدد، رضاء متجدد اور ناراضگی متجدد ہے۔ تو یہ تجلی اپنے دائرہ میں موجود کے ساتھ وہی ہے جس کو وہ معشوق کہتے ہیں۔ اور وہ اس کو معشوق اس لیے کہتے ہیں کہ نفوس بشری اس کی طرف اس طرح کشش رکھتے ہیں جیسے لوہا مقناطیس کی طرف کشش رکھتا ہے۔ اور اس کا ذکر ہم نے اس مقالہ کے شروع میں کیا تھا۔ اور اس کی طرف سیر وسلوک ہوتا ہے۔ اور اس سے وہ وصال ہوتا ہے جس کو صوفیا چاہتے ہیں۔

اور اسباب نفی اس طرف چلتے ہیں کہ حق تعالیٰ بندہ کا انتخاب چاہتا ہے۔ اور وہ اس کے نفس کی حد سے گزرنے تک جاری رہتا ہے۔ اس سے جس امر کا ارادہ کیا جاتا ہے۔ اس کو نہیں سمجھتا، اس لیے اس کو مراد کہا جاتا ہے۔ اور اس سے ریاضات بدنیہ اور تجرید وجہ روح کا قصد کیا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ اتصال ظاہر ہوتا ہے جو اس کی اصل جبلت میں ودیعت کیا جاتا ہے۔ اس لیے اس کو مرید کہا جاتا ہے، اور وہ کبھی حق کی پسند کو محسوس کر لیتا ہے، اور اپنے نفس سے سعی کرتا ہے۔ اور اس کو بہت سے مراحل پیش آتے ہیں، ان میں سے بعض میں اس کی سعی متقدم ہوتی ہے، اور دوسرے بعض میں غیب سے خلاف مرضی ہونا غالب ہو جاتا ہے۔ اور اس کو دو جہت میں سے ایک حالت میں محسوس کرتا ہے۔ تو دونوں مرتبوں میں جامع اور دونوں مرتبوں میں امام ہو جاتا ہے۔

اس لیے ہم کہتے ہیں کہ کبھی اس پر اس تجلی کی کوئی وجہ غالب ہوتی ہے۔ اور وہ اس وجہ سے مجذوب ہوجاتا ہے۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ ایسے اور ایسے اسم سے متحقق ہوگیا۔ اور کہا جاتا ہے کہ اس کا رب اسماء کے درمیان سے ایسا اور ایسا اسم ہے۔

اور بالجملہ اعیان ثابتہ میں اس کی استعداد کی اصل کو پہچاننے والا سمجھتا ہے۔ اور جو اسم اسماء کے درمیان سے اس کے مقابلہ میں ہوتا ہے، اس کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، تو کہا جاتا ہے کہ اس کی حقیقت نے رحمٰن کے اسم کو متعین کردیا اور شیخ مجدد اپنے بہت سے مکتوبات میں اس قول کے معترف ہیں۔

اور بالجملہ یہ قول ''حقائق ممکنات اپنے مد مقابل عدم نقش اسماء کے عکس ہیں''۔ شیخ ابن عربی اور ان کے پیروکاروں کے کلام کے خلاف نہیں ہے۔ اور اس معنیٰ میں ان کی کتنی ہی تصریحات اور اشارے ہیں۔ اور ہم نے وجہ مسئلہ کی طرف اشارہ کردیا ہے۔ اس لیے ہمیں ان کا قول نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور تفصیل ان کی تصریحات اور اشاروں کے بیان میں موجود ہے۔ اور یہ قول کہ ممکنات کے حقائق اس معنی میں اسماء ہیں کہ اسماء وجود سے جڑے ہوئے ہیں۔ اور طرف مقابل میں ان کا سایہ ہے حتیٰ کہ اعیان ممکنات کہا جاتا ہے۔ اور اس معنی میں کہ اس کا پہچاننے والا اسماء کا رب ہے اور یہ اس کی حقیقت ہے جو اس کی طرف راجع ہے۔ شیخ مجدد کے کلام کے مخالف نہیں ہے۔ اور اگر ہم چاہیں تو ان کے کلام سے خود ان کے کلام کے خلاف بہت سے دلائل قائم کردیں۔

شیخ مجدد کے کلام کا محمل یہ ہے کہ انہوں نے شیخ ابن عربی اور ان کے پیروکاروں کے کچھ مقالات پائے، تو ان کو اپنے وجدان کے خلاف پر محمول کیا۔ اور یہ علمی لغزشیں ہیں، کشفی کمزوریاں نہیں ہیں۔ اس طرح کی لغزشوں سے علماء پاک وخالی نہیں ہوتے۔ اور نہ ہی ان کے مقامات کی بلندی پر ان سے کچھ اثر پڑتا ہے کہ ان کے کلام میں کوئی چھوٹی موٹی علمی لغزش پائی جائے۔ اور یہ جو ان کا قول ہے کہ آٹھ صفات کے امتیاز کو صوفیا تسلیم نہیں کرتے بلکہ وہ ان کے نزدیک عین واجب ہے، وہ اس معنی میں ہے کہ ذات اس کے لیے کافی ہے۔ اور متکلمین کے نزدیک کوئی ایسی دلیل نہیں ہے جو اس پر دلالت کرے، نہ نقلی اور نہ ہی عقلی۔ جہاں تک اول کا

تعلق ہے تو اس باب کی غایت یہ ہے کہ وہاں ایک ایسی حقیقت ہے جس پر عرف اور لغت کے لحاظ سے سمیع اور علیم وغیرہ کا اطلاق درست ہوتا ہے۔ ان کا صفات متغائر ہونا ہر گز نہیں ہے۔

اور جس نے اپنے نفس کے ساتھ انصاف کیا، اس نے سمجھ لیا کہ لوگ جب صفات کے افعال اور اسماء کا استعمال کرتے ہیں تو وہ صفات کے امتیاز اور اس کی ذات پر اصلاً زیادہ ہونے کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ وہ صرف آثار کے صدور کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو جو شخص کسی چیز کو دیکھتا ہے کہ وہ حرکت کرتی، چلتی اور احساس کرتی ہے تو ان آثار کی وجہ سے وہ کہتا ہے کہ یہ زندہ ہے۔ اور اس امر کی طرف التفات نہیں کرتا کہ حیات صفت زائد ہے یا یہ حیوان کے لیے ذاتی ہے، اسی طرح کی فلسفہ کی دوسری دقیق باتیں ہیں۔

اور دوسرے یہ کہ عقل یہ شہادت دیتی ہے کہ اس کا اس طرح موجود ہونا ہے جس سے یہ آثار صادر ہوں۔ اور وہ صفات کی زیادتی میں منحصر ہیں لیکن جس نے اپنے نفس کے ساتھ انصاف کیا، اس نے سمجھ لیا کہ صفات کا ان اعراض کے منزلہ میں ہونا جو اپنے محل میں ہیں، اور اپنے موصوفات کے ساتھ قائم ہیں، تشبیہ اعظم ہے۔ تو اگر کسی نے کہا کہ یہ اہل سنت کا مذہب ہے تو اس کا قبول کرنا ضروری ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک اہل سنت وہ اہل قرون ہیں جن کے لیے خیر کی شہادت دی گئی ہے۔

اور ان میں سے کسی سے جو یہ روایت کیا گیا ہے کہ اس نے صفات کے بارے میں کلام کیا کہ وہ زائد ہیں یا نہیں، اگر زائد ہیں تو کیا وہ امور انتزاعیہ ہیں یا خارجیہ؟ اور یہ متاخرین کا فرقہ ہے جس نے خود ہی یہ دعویٰ کیا ہے کہ وہ اہل سنت ہیں۔ تو اس بنیاد پر ان کا یہ قول دین میں بدعت اور اختراع نہیں ہوگی کہ سلف میں یہ بات کسی نے نہیں کہی۔ جبکہ ہم کثیر تعداد میں ہیں اور وہ بہت کم ہیں۔

اور اسی طرح ان کے اقوال کا اختلاف اس امر میں ہے کہ عالم وجود ظلی کے ساتھ موجود خارجی ہے یا موہوم مستحکم ہے، تھوڑے فائدہ والا اختلاف ہے، اس لیے کہ مقصود یہ ہے کہ وجودات خاصہ اس طرح متحقق ہیں کہ ان سے ان کے آثار صادر ہوتے ہیں، خواہ اس تحقق کو وجود خارجی کا نام دیا جائے یا وجود وہمی مستحکم کا۔

اور اگر تم خالص حق کے بارے میں مجھ سے پوچھتے ہو تو میں کہتا ہوں کہ ذات الٰہیہ اپنی ماہیت کے لحاظ سے زیادہ واضح ہے کہ وہ خارج میں ہو یا اعیان میں۔ اس لیے کہ خارج نفس رحمانی کا اسم ہے۔ اور اعیان میں اس سے کنایہ ہے۔ ہاں حق کے لئے تجلی عظیم ہے جو خارج میں ہے۔ اور حق کا یہ وصف بیان کیا جاتا ہے کہ وہ خارج میں ہے یا اس تجلی کی شرط کے ساتھ عماء میں ہے۔

اور اگر تم ان تمام اقوال کے بارے میں مجھ سے پوچھتے ہو تو میں ان میں سے صرف تعبیر کی جہت سے انکار کرتا ہوں یا شئے کے غیر محل میں ذکر کی حیثیت سے۔ ورنہ وہ کھو جس کی طرف صاحب کشف نے اشارہ کیا ہے۔ جس کی اصلاً کوئی حقیقت ہی نہیں ہے۔

آٹھ صفات والے قول کے لیے ایک وجہ وجیہ ہے۔ وہ یہ کہ نفس رحمانی کے اوائل میں ذکر کی ایک شکل ہے۔ اور تجلی اعظم کا نام اشاعرہ کے نزدیک صفات رکھا جاتا ہے۔ اور اس لیے انہوں نے ان کا صدور ایجاب سے قرار دیا ہے۔ اور ان کے قدیم ہونے کو زمانہ سے تعبیر کیا ہے۔ الا یہ کہ انہوں نے شئے واحد کے جہات اور اعتبارات کے لحاظ سے مختلف نام رکھے ہیں۔ اور جہات میں کتنے ہی اختلاف لوگوں کے دلوں میں متوجہ ہوتے ہیں حتیٰ کہ وہ اس کو حقائق کے اختلاف کے باب سے گمان کرتے ہیں۔ جیسے سفیدی اور سفید وہ دونوں حقیقت میں ایک ہیں۔ الا یہ کہ سفیدی اس کا نام اس حیثیت سے ہے کہ وہ بغیر کسی شرط کے ماخوذ ہے۔ اور ابیض سفید اس کا اس حیثیت سے نام ہے کہ وہ شئے کی شرط کے ساتھ ماخوذ ہے۔ اسی طرح انہوں نے اس کا نام اس حیثیت سے حیات رکھا ہے کہ وہ ایسی صفت ہے جو بنفسہ اور ممکنات کے حقائق سے علم کی اتباع کرتی ہے، اور علم اس حیثیت سے کہ اس میں حقائق الاشیاء اس کے خارج میں ہونے سے پہلے شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اور قدرت اس حیثیت سے کہ اس سے خلق الخلائق جاری ہوتی ہے اور ارادہ اس حیثیت سے کہ وہ تجلی اعظم ہے۔ اس سے متساوی اشیاء میں سے کسی ایک کی تخصیص ظاہر ہوتی ہے۔ اور کلام اس حیثیت سے کہ اس سے انبیاء اور ملائکہ کے قلوب پر وحی نازل ہوتی ہے اور سمع و بصر اس ہیئت سے کہ وہ دکھائی دینے والی اور سنی جانے والی اشیاء کے انکشاف کا مبدا ہے۔

اور اس طرح میرے نزدیک مولانا عبدالرحمٰن جامی کا کلام مسلم ہے۔ اس لیے کہ اس کا مقصود حقائق کے میدانوں میں ان کے ملنے کی نفی ہے اور اس کا مقصود یہ ہے کہ وہ اس معنیٰ میں وجود حق کے اضافات واعتبارات ہیں کہ وجود اس میں ظاہر ہوا اور اس سے متعین ہوا۔ فرق اعتباری کے معنی میں نہیں۔ اور جب ہم نے جواب مکمل کر دیا تو اب رسالہ کو ختم کرتے ہیں۔ والحمد لله رب العالمين اولاً وآخراً وظاهراً وباطناً وصلى الله تعالىٰ على خير خلقه محمد وآله واصحابه اجمعين. آمين

۳۲۶-تفهيم:

ایک آدمی کو بیعت وارشاد اور درس وغیرہ کی اجازت

الحمد لله رب العالمين الذى اصطفى من عباده العلماء الراسخين والعباد المخلصين، وجعلهم ورثة الأنبياء والمرسلين، واخذ منهم ميثاقاً ان يهتدوا بهدايتهم فى امر الدنيا والدين. نحمدهٗ ونستعينه ونستغفره ونعوذ بالله من شرور انفسنا، من يهده الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادى له، واشهد ان لا إله إلا الله وحده لا شريك له، واشهد ان سيدنا محمد اعبده ورسوله، ارسله بالحق بشيرا ونذيراً ،صلى الله عليه وعلى آله واصحابه وبارک وسلم تسليماً كثيراً تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جو تمام جہانوں کا رب ہے۔ جس نے اپنے بندوں میں سے پختہ علم والے علماء اور مخلص بندوں کو منتخب کیا اور انہیں انبیاء اور رسولوں کا وارث بنایا۔ اور ان سے یہ عہد لیا کہ دنیا اور دین کے معاملہ میں ان کی ہدایت سے رہنمائی حاصل کریں۔ ہم اس کی حمد وثنا بیان کرتے ہیں، اسی سے مدد طلب کرتے ہیں، اور اسی سے مغفرت چاہتے ہیں، اور اپنے نفسوں کی برائیوں سے اللہ کی پناہ چاہتے ہیں۔ جس کو اللہ ہدایت دے، اس کو کوئی گمراہ کرنے والا نہیں، اور جس کو وہ گمراہ کر دے پھر اس کو کوئی ہدایت دینے والا نہیں۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ سیدنا محمد اس

کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ آپ کو حق کے ساتھ بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا۔ اللہ درود و رحمت فرمائے آپ پر اور آپ کی آل اور آپ کے اصحاب پر۔ اور برکت فرمائے اور پوری طرح سلامتی فرمائے۔ اما بعد! عبد ضعیف، اللہ کریم کی رحمت کا محتاج ولی اللہ بن شیخ عبدالرحیم تغمدھما اللہ بفضلہ الجسیم کہتا ہے کہ اللہ عزوجل نے مولانا محقق و عالم و علم و زہد اور یقین و تصدیق میں مدقق راسخ پر جو اپنے نام ہی کی طرح بدر الحق ہیں، اور جو اللہ کے پاس ہے، اس کی سچی طلب، حسن جزاء اور سمت صالح و قویم سے کثیر، وافر نعمتیں فرمائیں۔ ان میں سے سب سے جلیل القدر کتاب و سنت کا علم اور دنیا کی آرائشوں میں زہد و قناعت، قویم اور صراط مستقیم کے سلوک میں عزیمت اور عمل میں اخلاص اور علم میں سلامتی ذہن اور اللہ عزوجل سے قلب کے تعلق سے جو کچھ اللہ کے پاس ہے، ان سب میں رغبت صادقہ ہے۔

اور ان میں سب سے زیادہ جلیل القدر وہ ہے جس کو اللہ نے ان کی طرف اولیاء کرام اور صالحین اخیار کی صحبت سے چلایا۔ خاص طور سے شیخ طریقت و امام حقیقت سیدی والدی جن کے اوپر عظیم احوال کا فیضان فرمایا۔ اور ان کے ہاتھ پر کرامات کبریٰ ظاہر فرمائیں۔ اور جو طریقت اور علم و تقویٰ میں اللہ کی آیات میں سے ایک آیت اور ہمارے شیخ اجل عبدالرحیم بن وجیہ الدین دہلوی اور میرے دادا، میرے والد، میرے بھائی جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں میں سے خلق کثیر کو علم و طریقت میں ہدایت فرمائی۔ اور شیخ محمد بن عاقل بن ابو الفضل پھلتی جزاھما اللہ عنا وعن سائر المستفیدین خیر الجزاء۔ اور یہ اللہ کی رحمت و ہدایت کی علامت ہے جیسا کہ کہا گیا ہے جس نے کامیاب کو نہیں دیکھا، وہ کامیاب نہیں ہوا۔ چنانچہ ان دونوں کی صحبت اور خدمت کا شرف ایک طویل زمانہ نے حاصل کیا۔ ان کے ذریعہ ادب سیکھا اور بہت سی چیزوں کا علم حاصل کیا۔

اور ان میں سے جلیل القدر وہ ہے جو میرے دل میں ڈالا کہ وہ سنت سنیہ کے داعیوں میں سے ہیں۔ اور وہ اس لائق ہیں کہ لوگوں کو تین چیزوں کی دعوت دیں۔ عقیدۂ صحیحہ: جس کا استنباط سنت اور عمل قدیم سے ہوا ہے جو صحیح احادیث، پھر ان کی تفسیر اور ان

فقہاء کرام کی، کی ہوئی ان کی شرح سے ماخوذ ہے جو سنت کے زیادہ مطابق ہے۔ اور ظاہر حدیث سے زیادہ قریب ہے اور اس شان واخلاق والوں کے نزدیک عبادت میں ان کا معروف طریقہ جس کو اللہ نے ان کی عادت بنایا یہ ہے کہ وہ صرف مشائخ طریقت سے منقول اشغال کی محنت اور دوام اور ان کے ساتھ صحبت اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ دل کے تعلق پر ایثار، محبت اور تعظیم کے معنیٰ میں پابندی کے سوا متحقق نہیں ہوا، یا کم متحقق ہوا۔

تو اب میں ان کو اجازت دیتا ہوں کہ توبہ کی توثیق اور عہد کی تاکید کرتے ہوئے بیعت کریں۔ جیسا کہ اللہ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم فرمایا۔ اور جس طرح مشائخ صوفیاء نے بیعت کی۔ اور یہ کہ ان اشغال کی تلقین فرمائیں جو ہمیں ہمارے مشائخ نقشبندیہ سے ملے۔ جیسا کہ مجھے میرے والد قدس سرہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بلاواسطہ روایت کرتے ہوئے، ان کی اجازت دی کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے مبشرات میں دیکھا اور آپ سے بیعت کی۔ اور آپ سے نفی واثبات اخذ کیا۔ اور آپ کی صحبت کے نور سے منور ہوئے۔ اور اس سے مخلوق کو حق کی طرف دعوت کا حکم فرمایا۔ اور مزید سید عبداللہ سے انہوں نے شیخ آدم بنوری سے اور انہوں نے شیخ احمد سرہندی سے روایت کیا۔

اور طریقہ نقشبندیہ شیخ خواجہ محمد باقی سے اور جیلانیہ (سلسلہ قادریہ) اپنے والد شیخ عبدالاحد سرہندی سے، انہوں نے شاہ کمال کیتھلی نیز خلیفہ ابوالقاسم سے، انہوں نے ملا ولی محمد سے، انہوں نے امیر کبیر ابوالجلا سے۔ نیز روحانیت اپنے جد مادری نانا شیخ رفیع الدین سے، انہوں نے اپنے والد قطب العالم سے، انہوں نے نجم الحق سے، انہوں نے شیخ عبدالعزیز سے، انہوں نے قاضی خاں یوسف ناصحی سے، انہوں نے مشائخ چشتیہ رضی اللہ عنہم اجمعین سے۔ اور میں نے انہیں یہ بھی اجازت دی کہ تفسیر، حدیث، فقہ، سلوک وغیرہ کا درس غور وفکر اور مطالعہ اور شروح اور فن کے اکابر کے کلام کے تتبع کے بعد دیں جیسا کہ مجھے اس کی اجازت میرے والد قدس سرہ نے اپنے سامنے صحیح بخاری سے کتاب العلم پڑھنے کے وقت دی۔ جو ان کی اسناد میر زاہد بروایت مرزا فاضل بروایت شیوخ کثیرہ سے ان میں

ملا یوسف کوسج بھی شامل ہیں۔اور جیسا کہ مجھے ثابت شدہ ثقہ الحاج محمد افضل نے شیخ عبدالرحمٰن سے، انہوں نے اپنے والد شیخ محمد سعید سے، انہوں نے اپنے دادا شیخ احمد سرہندی سے ان اسناد طویل سے اجازت دی جن کے لیے اس ورق میں گنجائش نہیں ہے۔اور وہ مشکوٰۃ المصابیح اور صحیح بخاری وغیرہ کتب ستہ پر ان کے مقامات میں مذکور ہے۔اور یہاں میں کہتا ہوں کہ ان کا ہاتھ میرے ہاتھ کی طرح ہے تو جس نے ان سے بیعت کی اور ان سے طریقہ اخذ کیا تو گویا اس نے مجھ سے بیعت کی۔اور جس نے مجھ سے اخذ کیا، اور مجھ سے بیعت کی تو گویا اس نے میرے والد سے بیعت کی۔اور ان سے اخذ کیا۔اور جس نے میرے والد قدس سرہ سے بیعت کی اور ان سے اخذ کیا تو گویا اس نے رسول اللہؐ سے بیعت کی اور آپ سے اخذ کیا۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **إن الذين يبايعونك انما يبايعون الله، يد الله فوق أيديهم، فمن نكث فإنما ينكث على نفسه، ومن اوفى بما عاهد عليه الله فسيؤتيه اجراً عظيماً** "اے نبی! جولوگ تم سے بیعت کرتے ہیں، وہ اللہ سے بیعت کرتے ہیں۔ان کے ہاتھ پر اللہ کا ہاتھ ہے۔اب جو اس عہد کو توڑے گا اس کی عہد شکنی کا وبال اس کی اپنی ہی ذات پر ہوگا۔اور جو اس عہد کو وفا کرے گا جو اس نے اللہ سے کیا ہے، اللہ عنقریب اس کو بڑا اجر عطا فرمائے گا۔(الفتح:۱۰)

اور میں ان پر سنت کے لیے حرص اور بدعت سے اجتناب اور دنیا میں زہد اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور سلف میں سے علماء اور صوفیا سے ادب وتہذیب اور اخلاق سیکھنے اور اپنے تمام امور میں ان کی سیرت سے اخذ کو لازم کرتا ہوں۔اور یہ کہ اللہ کے معاملہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں، اگر شرط کو پورا کریں گے تو یہ ان کے ساتھ میرے گمان کے مطابق ہے۔اور اگر عہد شکنی کریں گے تو **فسيعلم الذين ظلموا اى منقلب ينقلبون** "جن لوگوں نے ظلم کیا وہ جلدی ہی جان لیں گے کہ کس انجام کی طرف پلٹتے ہیں"۔**والحمد لله اولاً وآخراً وظاهراً وباطناً والصلوٰة والسلام على خير خلقه محمد وآله واصحابه اجمعين.** ہم نے یہ سطور ۲۲ ربیع الاول، بروز دوشنبہ ۱۱۴۲ھ کو لکھیں۔

۳۲۷-تفہیم:

انبیاء و اولیاء کے انوار کے ظہور کی صورت

اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک بندہ پر انوار الغیوب کا فیضان کیا، اور اس کو ہر جہت سے خیر کے لیے قانون بنا دیا، سوائے اس کے کہ اس صفت کا ظہور مخلوقات کے اوپر کچھ وقت کے بعد ہی ہوتا ہے۔ کیا تم دیکھتے نہیں کہ انبیاء صلوات اللہ علیہم کے معانی شدت اور مدت کے بعد ظاہر ہوئے۔ یہی معاملہ ان کے اہل کمال ورثاء کا ہے۔ اور کتنے نبی ہیں کہ ان کے انوار ان کے اپنے راستہ پر جانے کے بعد ظاہر ہوئے۔ کیا تم نے دیکھا نہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو روئے زمین کے مشارق و مغارب دکھائے گئے، پھر ان کی کنجیاں عطا کی گئیں، اور آپ سے کہا گیا کہ کسریٰ ہلاک ہو گیا تو آپ کے بعد کوئی کسریٰ نہیں ہوا۔ اور یہ کہ قیصر ہلاک ہو گیا تو آپ کے بعد کوئی قیصر بھی نہیں ہوا۔ اور یہ فتوح آپ کے اپنے راستہ پر جانے کے بعد ہی ہوئیں، تو جان لو کہ ہر شئے کے لیے ایک وقت مقرر ہے۔

مدتی ایں مثنوی تاخیر شد

مدتی بائست تاخوں شیر شد

''اس مثنوی میں ایک مدت کی تاخیر ہو گئی، خون کے دودھ بننے کے لیے ایک مدت چاہیے۔

۳۲۸-تفہیم:

وصایا اپنی اولاد و احباب کے لیے

الحمد للّٰہ ملھم الحکم ومفیض النعم والصلوٰۃ والسلام علی سید العرب والعجم۔ وعلی آلہ وصحبہ اھل الفضل والکرم۔ ''تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو حکمتوں کا الہام کرنے والا اور نعمتوں کا فیضان کرنے والا ہے۔'' اور صلوٰۃ وسلام ہوں سید العرب والعجم پر اور آپ کی آل و اصحاب پر جو اہل فضل و کرم ہیں۔ اما بعد! فقیر ولی اللہ عفی عنہ کہتا ہے کہ یہ چند کلمات ہیں کہ اپنی اولاد و احباب کو ان کے ذریعہ وصیت

کرتا ہوں۔ میں نے اس کا نام مقالہ وضیئہ فی النصیحۃ والوصیۃ رکھا ہے۔
حسبنا اللہ ونعم الوکیل وھو الھادی إلی سواء السبیل.

وصیّت اول: یہ فقیر اعتقاد و عمل میں کتاب وسنت پر اور دونوں کی تدبیر میں ہمیشہ مشغول رہنے اور روزانہ دونوں میں سے ایک حصہ پڑھنے پر زور دیتا ہے کہ اگر پڑھنا بس کا نہ ہو تو دونوں میں سے ایک ورق کا ترجمہ سنیں۔ عقائد و مذہب میں قدماء اہل سنت کا طریقہ اختیار کریں اور اسلاف سے جو تفصیل و تحقیق چلی آرہی ہے، اس میں نکتہ چینی نہ کریں۔ اعراض سے کام لیں، اور معقولیوں کے پیدا کردہ شکوک خام کی طرف التفات نہ کریں۔ اور فروع میں علماء محدثین کی پیروی کریں، جو فقہ و حدیث کے جامع ہیں۔ اور تفریعات فقہیہ کو کتاب وسنت پر پیش کریں، جو ان کے مطابق ہو۔ اس کو قبول کریں۔ ورنہ برائیوں کو پس پشت ڈال دیں۔ امت کو کسی بھی وقت اجتہادی امور کو کتاب وسنت پر پیش کرنے سے استغنا نہیں ہے۔ اور فقہاء کی آلودہ باتوں سے کسی عالم کی تقلید کے لیے سند لینا سنت کے تتبع کو ترک کرنا ہے، نہ انہیں سنیں اور نہ ان کی طرف التفات کریں۔ اور اس دور میں قربت خداوندی تلاش کریں۔

وصیّت دیگر: امر بالمعروف کی راہ اختیار کریں۔ چنانچہ اس فقیر کے نزدیک بہتر یہ ہے کہ فرائض اور کبیرہ گناہوں اور شعائر اسلام میں امر معروف و نہی منکر سے متعلق سختی سے کام لیں۔ اور اس باب میں جس سے بھی تساہل دیکھیں، اس کی صحبت اختیار نہ کریں اور اس کا دشمن ہو جانا چاہیے۔ اور تمام امور میں خصوصاً جن میں سلف یا خلف نے اختلاف کیا ہے، امر معروف و نہی منکر اس حدیث کا پہنچا دینا ہے، اور بس۔ اس میں سختی کرنا مستحسن نہیں ہے۔

وصیّت دیگر یہ ہے کہ اس زمانہ کے مشائخ کے ہاتھوں میں اپنا ہاتھ ہرگز نہ دیا جائے، اور ان کی بیعت نہیں کرنی چاہیے اور نہ غلو عام سے اور نہ ہی کرامات سے دھوکا کھائیں۔ اس لیے کہ اکثر غلو عام رسم کی وجہ سے ہے۔ اور امور رسمیہ کا حقیقت میں کوئی اعتبار نہیں ہے۔ اور اس زمانہ کے تمام کرامات فروش، الا ماشاء اللہ، طلسمات و فریب کو کرامات سمجھتے ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ زیادہ مشہور زیادتیاں بھلے لوگوں کے

خوارق دلوں پر ہیں۔ اور آئندہ کے واقعات کا انکشاف اور بھلی باتوں اور کشف کے بہت سارے طریقے ہیں۔ ان میں سے علوم نجوم ورمل کے باب میں اٹکل پچو کے طور پر گھمنڈ میں مبتلا نہ ہوں، کہ نجوم میں حکم، تسویۂ بیوت پر موقوف ہے۔ اور رمل کو زائچہ درکار ہے۔ ہم تجربہ کر چکے ہیں کہ فن نجوم کے ماہر کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت دن کے دقیقوں میں سے کون سا دقیقہ ہے، اس وقت سے اس کا ذہن نصیب وقسمت کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ اور کواکب کے تمام مواضع وبیوت اور ان کے احکام اس کے دل ودماغ میں صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ گویا کہ تسویۃ البیوت کا صفحہ اس کے سامنے آجاتا ہے۔ اور اس طرح فن رمل کا ماہر کبھی اپنے دل میں خود طے کر لیتا ہے کہ فلاں انگشت کو داڑھی قرار دیتا ہے، اور فلاں انگشت کو فلاں شکل مانتا ہے، اور ذہن میں اس کی ایک صورت مقرر کر لیتا ہے کہ ان شکلوں سے کیا بنتا ہے، حتیٰ کہ زائچہ اس کے سامنے حاضر ہو جاتا ہے۔ اور انہی میں سے اپنی تمام انواع کے ساتھ باب کہانت ہے، کبھی جن کو حاضر کر کے اور کبھی اس کے بغیر۔ اور انہی میں سے باب طلسم ہے کہ کواکب کو ایک صورت میں بند کرتے ہیں۔ اور اس سے بھلائی حاصل کرتے ہیں۔ اعمال جوگ کہ بعض ملاحظات جوگیہ کی اشراف وکشف میں ایک پوری خاصیت ہے۔ جو اس کی تحقیق چاہتا ہے، وہ ان فنون کی کتابوں کی طرف رجوع کرلے۔ اور کسی کام کی ہمت باندھنا، اور ہولناک شکل میں برآمد ہونا، اور دل کو کسی کے دل پر رکھنا، اور طالب کو مسخر کرنا سب طلسم وفریب کے فنون سے ہیں۔ ان کاموں میں کچھ ملاحظے ہیں جن سے کچھ مقصد حاصل ہوتا ہے۔ صلاح وفجور، سعادت وشقاوت اور مقبول یا مردود ہونا اس جگہ کوئی فرق پیدا نہیں کرتا۔

اور اس طرح اس حالت میں وجد وشوق اور قلق وتاثیر کا حاضرین میں منشا قوت بہیمیہ کی حدت ہے۔ لہٰذا جس کی قوت بہیمیہ جتنی زیادہ قوی ہوگی اس کا وجد بھی اتنا ہی زیادہ قوی ہوگا۔

ہاں ان اعمال اور احوال کو بعض صالح لوگ بھی نیک نیتی سے کرتے ہیں اور وہ ان کو اس حد تک نہیں گردانتے، جیسا کہ مخفی نہیں ہے۔ اور بہت سارے سادہ لوح افراد کو ہم نے دیکھا ہے کہ جب ان اعمال کو شیخی میں آکر سیکھتے ہیں تو ان کو عین کرامات سمجھتے ہیں۔

اس کا علاج یہ ہے کہ کتب حدیث مثلاً صحیح بخاری و مسلم و سنن ابوداؤد و ترمذی اور کتب فقہ حنفیہ و شافعیہ کو پڑھیں۔ اور ظاہر سنت پر عمل کی پابندی کریں۔ اگر حق سبحانہ ان کے دل میں شوق صادق پیدا فرمائیں، اور اس راہ کی طلب غالب ہو تو کتاب عوارف، نماز، روزہ و اذکار اور ہر وقت کی مصروفیت کے آداب کو پیش نظر رکھیں، اور رسائل نقشبندیہ سے یادداشت پیدا کرنے کے طریق میں سعی کریں۔ اور اس سلسلہ میں بزرگوں نے ان دونوں بابوں کو واضح شکل میں لکھا ہے کہ کسی مرشد کی تلقین کی کوئی ضرورت نہیں رہتی۔ جب عبارت کے نور کی کیفیت اور یادداشت کی نسبت حاصل ہو جائے تو اس کی پابندی کریں۔ اگر اس دوران کسی عزیز کو احساس ہو کہ اس کی صحبت کا نتیجہ جذب ہے۔ اور اس کی صحبت کی تاثیر لوگوں میں اختیار کی جانی چاہیے۔ تو اس کی صحبت اختیار کریں۔ حتیٰ کہ مطلوبہ حالت ملکہ بن جائے۔ اور اس کے بعد ایک گوشہ میں بیٹھ جائے اور اس ملکہ میں مشغول ہو جائے۔ اور اس زمانہ میں الا ماشاء اللہ کوئی شخص ایسا نہیں ہے کہ تمام اعتبارات سے کمال کا حامل ہو۔ اگر کسی شخص کو ایک لحاظ سے کمال حاصل ہے، تو دوسری وجہ سے خالی ہے۔ چنانچہ اس کمال کو حاصل کر لینا چاہیے اور دوسری چیزوں سے چشم پوشی کرنی چاہیے۔ خذ ما صفا ودع ما کدر۔ "جو اچھا ہے وہ لے لو اور گدلے کو چھوڑ دو۔" صوفیاء کی نسبت غنیمت کبریٰ ہے۔ اور ان کی رسوم و روایات کسی کو آزردہ نہیں کرتیں۔ یہ بات بہت سے لوگوں پر گراں گزرتی ہے لیکن میرا کام کہہ دینا ہے۔ اور حسب حال بات کہنی چاہیے اور زید و عمرو کی باتوں پر دھیان نہیں دینا چاہیے۔

وصیّت دیگر جاننا چاہیے کہ ہمارے اور اہل زمانہ کے درمیان اختلاف ہے۔ صوفی کہتے ہیں کہ اصل مطلوب فنا اور بقا، ہلاکت اور خالی کرنا ہے۔ اور معاش کی مراعات اور طاعات بدنیہ کا قیام کہ شرع الٰہی کے ساتھ وارد ہوئی ہے، اس کے لیے ہے کہ ہر شخص اس اصل کی بجا آوری نہیں کر سکتا۔ 'ومالا یدرک کله لا یترک کله' "جس کل کو حاصل نہیں کیا جا سکتا، اسے پورا بھی نہ چھوڑا جائے۔" اور متکلم کہتے ہیں کہ اس کے علاوہ جو کچھ شریعت میں وارد ہوا ہے، کوئی چیز مطلوب نہیں ہے۔ اور ہم کہتے ہیں کہ مطلوب انسان کی صورت نوعیہ کے اعتبار سے سوائے شریعت کے کچھ نہیں ہے۔ اور شارع نے اس اصل کا بیان خاص لوگوں

کے لیے کیا ہے۔اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ نوع انسان اس طرح پیدا ہوئی ہے کہ قوت ملکیہ وبہیمیہ کے درمیان جامع ہے۔اوراس کی سعادت تقویت ملکیہ میں ہے۔اوراس کی شقاوت تقویت بہیمیہ میں،اوراس طرح پیدا ہوئی ہے کہ اس کا نفس اعمال واخلاق کے رنگوں کوقبول کرتا ہےاوراپنی جڑ میں لے آتا ہے۔اورموت کے بعداس کواس طرح مصاحب بناتا ہے کہ اس کا بدن غذا کی کیفیتوں کوظاہر کردیتا ہے۔اوراپنے ساتھ ملالیتا ہے۔اوراس لیے تخمہ، بدہضمی اور بخاروغیرہ میں مبتلا ہوجاتا ہے۔اوراس طرح پیدا ہوتا ہے کہ حظیرۃ القدس سے لاحق ہوسکتا ہے۔اورالہام کاالقاءاس جگہ سے ہوتا ہے۔اور جوالہام کے حکم میں ہے سرور اورخوشی کے ملنے سے ہے۔اگران ملائکہ کی نسبت سے ہے جوملائمت ومناسبت رکھتے ہیں۔ اوراگرتنگی اوروحشت کاملناہےتو ان کی نسبت سے کوئی منافرت حاصل کی ہوگی۔

بالجملہ جب ان کی نوع اس طرح واقع ہوئی ہو کہ اگران کے ساتھ گزاریں تو نفسیاتی امراض اکثرافرادکوتکلیف پہنچاتے ہیں،حضرت حق سبحانہ تعالیٰ محض اپنے فضل وکرم سے ان کی کارسازی کرتا ہے۔اوران کے لیے راہ نجات کی تعیین کرتا ہے۔اورترجمان لسان غیب کہ حضرت پیغمبرعلیہ الصلوٰۃ والتسلیم ہیں،ان سے ان کوبھیجتا ہے،تاکہ نعمت مکمل ہوجائے۔اورجوربوبیت اولاًاس کی ایجاد کی مقتضی ہوتی ہے،اورپھران کاہاتھ پکڑتی ہے، پھرصورت نوعیہ زبان حال سے مبدأ فیاض کے آگے شریعت کی گدائی کرتی ہے،اوراس کا حکم نوع کے تمام افراد کے لیےصورت نوعیہ کے سریان کے حکم سے اس میں لازم ہےاور افرادکی خصوصیت کواس میں کوئی دخل نہیں ہے۔

اورفناوبقاءاورہلاکت وغیرہ افرادکی خصوصیت کے اعتبار سے مطلوب ہے۔اس لیے کہ بعض افرادتجرداورعلوکی انتہامیں مخلوق ہوتے ہیں۔اورخدائے تعالیٰ ان کوان کے راستہ سے دلالت فرماتا ہے،اوریہ ناموس اوردستاویزوں کاحکم نہیں ہے۔بلکہ اس فرد کے حال کی زبان خصوصیت فردیہ کی جہت سے اس کا تقاضہ کرتی ہے۔اورشارع کا کلام ان معانی پرکبھی بھی محمول نہیں ہے۔نہ صریحانہ اشارۃً۔

ہاں!ایک جماعت ان مطالب کوشارع کا کلام سمجھتی ہے۔اس طرح کہ جیسے کسی

نے لیلیٰ و مجنوں کا قصہ سن لیا۔ اور ہر بات کو اپنی سرگزشت پر محمول کر لیا۔ اور اس کو ان کے عرف میں اعتبار کہتے ہیں۔

اور بالجملہ ہلاکت اور عریانیت کے مقامات میں افراط اور ہر کس و ناکس کا اس بیماری میں مبتلا ہونا ملت مصطفویہ میں بہت دشوار ہے۔ اللہ ایسے شخص پر رحم فرمائے جو ان کی گمنامی میں سعی کرتا ہے۔ اگرچہ بعض استعدادات کے لحاظ سے وہ اصل ہوتی ہیں۔ ہر چند کہ یہ بات اس زمانہ کے بہت سے صوفیاء پر بہت گراں گزرتی ہے۔ بہر حال میرا کام کہنا ہے۔ میں اس کے مطابق ہی کہتا ہوں۔ مجھے زید و عمرو سے کوئی سروکار نہیں ہے۔

وصیت دیگر یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کے حق میں اچھا عقیدہ رکھنا چاہیے، اور ان کے مناقب کے سوا زبان سے کچھ نہیں کہنا چاہیے۔ اس مسئلہ میں لوگ دو قسم کی غلطیاں کرتے ہیں۔ ایک طبقہ یہ گمان کرتا ہے کہ ان کے سینے باہم بالکل صاف تھے۔ اور ان کے درمیان کوئی تنازعہ نہیں تھا۔ یہ صرف وہم ہے، اس لیے کہ ان کے تنازعات کے سلسلہ میں نقل مستفیض و مشہور روایات گواہ ہیں۔ اور نقل مستفیض کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اور ایک طبقہ نے جب ان سے یہ چیزیں منسوب دیکھیں، زبان لعن و طعن دراز کر دیں۔ اور ہلاکت میں مبتلا ہو گئے۔

اس فقیر پر یہ ظاہر ہوا ہے کہ اگرچہ صحابہ معصوم نہیں تھے اور ان کے بعض عوام سے ایسی چیزوں کا صدور میں آنا ممکن ہے کہ اگر دوسروں سے وجود میں آئیں تو لعن و طعن اور جرح کا سبب قرار پائیں۔ لیکن ہم ان جیسے لوگوں کے معاملہ میں زبان بند رکھنے کے لیے مامور ہیں۔ اور ان پر طعن و جرح سے ممانعت ایک مصلحت کے تحت تعبداً ہے۔ اور وہ مصلحت یہ ہے کہ اگر ان کے سلسلہ میں جرح کا باب کھول دیا جائے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روایت منقطع ہو جائے۔ اور روایت کا منقطع ہونا ملت کا انتشار ہے۔ اور جب ہر صحابی سے روایت کی جائے گی، اکثر احادیث مستفیض ہوں گی، اور امت کو ایک لحاظ سے تکلیف ہوگی۔ اور اس نقل کے سلسلہ میں کچھ جرح سے خلل واقع نہیں ہوتا۔

اس فقیر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روح پر فتوح سے سوال کیا کہ آپ شیعوں کے

بارے میں کیا فرماتے ہیں جو اہل بیت کی محبت کے مدعی ہیں اور صحابہ کے بارے میں بدگوئی کرتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کلام روحانی کے طور پر القا فرمایا کہ ان کا مذہب باطل ہے۔ اور ان کے مذہب کا بطلان لفظ امام سے معلوم ہوتا ہے جب مجھے اس حالت سے افاقہ ہوا تو میں نے لفظ امام میں غور وفکر کیا۔ معلوم ہوا کہ امام ان کی اصطلاح میں ایسا معصوم ہے جس کی اطاعت مخلوق پر فرض ہے۔ اور وہ امام کے حق میں وحی باطنی تجویز کرتے ہیں۔ تو درحقیقت 'ختم نبوت' کے منکر ہیں۔ اگرچہ زبان سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم الانبیاء کہتے ہیں۔ اور جس طرح اچھے لوگوں کے حق میں نیک عقیدہ رکھنا چاہئے، اسی طرح اہل بیت کے حق میں معتقد ہونا چاہیے۔ اور ان کے صالحین کو مزید تعظیم و تخصیص دینی چاہیے کہ **قد جعل الله لكل شيء قدراً** "اللہ نے ہر چیز کے لیے ایک تقدیر مقرر کر رکھی ہے۔" (الطلاق:۳)

اس فقیر کو معلوم ہوا ہے کہ ائمہ اثنا عشر رضی اللہ عنہم آپس کی رشتہ داریوں سے اقطاب نسبتی ہیں۔ اور تصوف کا رواج ان کے اختتام کے نزدیک پیدا ہوا۔ بہرحال عقیدہ اور شریعت کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے علاوہ حدیث سے نہیں لیا جا سکتا۔

ان کی قطبیت ایک امر باطنی ہے۔ تکلیف شرعی سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور ہر ایک کی نص اور اشارہ بعد والے پر اس قطبیت کے اعتبار سے ہے۔ اور وہ جن رموز امامت کے بارے میں کہتے ہیں، وہ انہی کی طرف راجع ہیں۔ اور بعض مخلص احباب خود کو ان پر مطلع مانتے ہیں۔ چنانچہ ایک زمانہ سے ایک جماعت نے اس بارے میں گہرائی سے غور کیا اور ان کے قول کو دوسرے مقام پر چسپاں کیا۔ **والیہ المستعان**.

وصیّت دیگر: تعلیم علم کا طریقہ جس طرح تجربہ سے محقق ہوا ہے، یہ ہے کہ اولاً صرف ونحو کے مختصر رسائل کا ہر فن کے تین تین یا چار چار رسائل طالب علم کے ذہن کے لحاظ سے درس دیا جائے۔ اس کے بعد ایک کتاب تاریخ یا حکمت عملی کی عربی زبان میں پڑھائی جائے اور اس درمیان تتبع کے طریقہ پر لغت کی کتابیں پڑھائیں۔ اور ان کی مشکلات سے مطلع کریں۔ جب عربی زبان پر قدرت حاصل ہو جائے یحییٰ بن یحییٰ مصمودی کی روایت سے موطا پڑھائیں۔ اور اس کو ہرگز ترک نہ کریں کہ اصل علم حدیث ہے۔ اور اس کے

پڑھنے کے بہت فیوض ہیں۔اور ہم نے ان سب کو مسلسل پڑھا ہے۔اس کے بعد قرآن عظیم کا اس طرح درس دیں کہ بغیر تفسیر و ترجمہ صرف قرآن پڑھائیں۔اور جو بات نحو کے حوالہ سے یا شان نزول کے تعلق سے مشکل ہو اس پر توقف کریں۔اور بحث کریں۔اس کے درس سے فراغت کے بعد تفسیر جلالین کو درس کے بقدر پڑھائیں۔اس صورت کو اختیار کرنے میں بہت سارے فیوض ہیں۔اس کے بعد ایک وقت صحیحین وغیرہ سے کتب حدیث اور فقہ و عقائد اور سلوک کی کتابیں اور ایک وقت کتب دانشمندی شرح ملا اور قطبی وغیرہ جہاں تک اللہ توفیق دے۔اور اگر ممکن ہو تو ایک روز مشکوٰۃ اور دوسرے دن شرح طیبی اسی قدر جتنی کہ پہلے دن پڑھائی ہے پڑھائیں، بڑی حد تک نفع بخش ہے۔

وصیّت دیگر: ہم لوگ جانتے ہیں کہ دیار ہندوستان میں ہمارے آباء واجداد غریب الوطنی میں آئے ہیں، اور عربیت نسب اور عربیت لسان دونوں ہمارے لیے باعث فخر ہیں کہ ہمیں سید الاولین والآخرین اور افضل الانبیاء والمرسلین وفخر موجودات علیہ وعلی آلہ الصلوٰۃ والتسلیمات سے نزدیک قرار دیا جاتا ہے۔اس نعمت عظمی کا شکریہ ہے کہ بقدر امکان عرب اول کے عادات و رسوم کو جو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا منشا ہے، ہاتھ سے نہ جانے دیں۔اور عجمیوں کی رسوم اور ہندوؤں کی عادات کو اپنے اندر داخل نہ ہونے دیں۔

بغوی نے ابوعثمان النہدی سے نقل کیا ہے کہ ہمارے پاس عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا گرامی نامہ عتبہ بن فرقد کے ذریعہ آیا جب ہم آذر بائیجان میں تھے **اما بعد فاتزروا وارتدوا وانتعلوا والقوا الخفاف واتقوا السرا ویلات وعلیکم بلباس ابیکم اسماعیل وإیاکم والتنعم وزی العجم وعلیکم بالشمس فإنها حمام العرب وتمعددوا واخشو شنوا واخشو شبوا واخلو لقوا واعلوا الرکب والنزوانزوا وارموا الاغراض وفی روایة وانزوا علی ظهور الخیل نزوا**

"یعنی جب اہل عرب جہاد کی خاطر اطراف عجم میں پھیلے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اندیشہ ہوا کہ کہیں وہ عجمیوں کی رسوم و رواج کو اختیار نہ کرنے لگیں کہ رسوم عرب کو ترک کردیں۔اس لیے آپ نے ان کو خطوط لکھے کہ ازار بند استعمال کریں۔چادر اوڑھیں اور چپل پہنیں اور

موزوں کو نکالیں۔ اور پاجاموں سے بچیں۔ اور اپنے باپ اسماعیل کے لباس اور پوشاک کو اپنے لیے لازم کریں اور ناز و نعم وعیش وعشرت اور عجمیوں کی پوشاک و وضع وقطع سے خود کو دور رکھیں۔ اور دھوپ میں بیٹھنے کو اپنے لیے لازم کریں، کہ دھوپ عربوں کے لیے حمام کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور موٹا کھردرا لباس پہنیں۔ اور سخت محنت ومشقت کی زندگی گزاریں۔ اور پرانے وسادہ لباس پہننے کی عادت بنائیں۔ اور اونٹوں کو مطیع وتابعدار بنائیں۔ اور گھوڑوں پر کود کر سوار ہوں۔ اور تیراندازی سے نشانہ لگائیں"۔

ہندوؤں کی ایک بری عادت یہ ہے کہ جب کسی عورت کے شوہر کا انتقال ہو جاتا ہے تو اس کو دوسرا شوہر نہیں کرنے دیتے۔ جبکہ یہ عادت عربوں میں کبھی بھی نہیں تھی۔ نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے، نہ آپ کے زمانہ میں اور نہ ہی آپ کے بعد۔ اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحمت فرمائے جو اس بری عادت کے پیچھے پڑ جائے اور اگر عام لوگوں میں سے اس کا ختم کرنا ممکن نہ ہو تو خود کو اپنی قوم میں اس عربی روایت کو قائم کرنا چاہیے۔ اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو کم از کم اس کو برا سمجھے۔ اور دل سے اس کا دشمن ہو کہ نہی منکر کا ادنی ترین درجہ یہی ہے۔ اور ہمارے لوگوں کی بری عادتوں میں سے ایک یہ ہے کہ مہر بہت زیادہ مقرر کرتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ دین ودنیا میں ہمارے لیے شرف آپ ہی پر منتہی ہے، اپنے اہل بیت کا مہر جو کہ بہترین افراد ہیں، بارہ اوقیہ اور نشی مقرر فرمایا تھا جو کہ پانچ سو درہم ہوتا ہے۔ اور ہمارے لوگوں کی بری عادتوں میں سے ایک خوشی، تقریبات اور بکثرت رسوم میں فضول خرچی ہے۔ جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مخصوص تقریبات مقرر کی ہیں۔ ان میں سے ولیمہ اور عقیقہ دونوں کو اختیار کرنا چاہیے۔ اور دوسری رسوم وروایات کو چھوڑ دینا چاہیے، یا ان کا اہتمام والتزام نہیں کرنا چاہیے۔ اور ہمارے لوگوں کی بری عادتوں میں سے ایک ماتموں، سوئم تیجہ، چہلم، چالیسویں اور ششماہی اور سالانہ فاتحہ میں اسراف ہے۔ اور ان سب کا ابتداء میں عربوں میں کوئی وجود نہیں تھا۔ بہتر یہ ہے کہ میت کے بعد وارثوں سے تین دن کی تعزیت اور انہیں ایک رات دن کھانا کھلانے سے زیادہ کوئی رسم نہ ہو۔ اور تین دن کے بعد خاندان کی عورتیں جمع ہوں اور میت کی خواتین کے کپڑوں میں

خوشبو لگائیں اور اگر بیوی موجود ہے تو وہ عدت گزارنے کے بعد خوشبو لگائے۔

سعید وہ شخص ہے کہ جو عربی زبان کی صرف ونحو اور کتب ادب سے مناسبت پیدا کرے، اور قرآن وحدیث کا ادراک حاصل کرے، اور فارسی وہندی کی کتابوں اور علم شعر ومعقولات اور جو چیز بھی خوارج نے پیدا کی ہیں، ان سے اشتغال نہ رکھے۔ اور تاریخوں اور بادشاہوں کی وارداتوں اور لوگوں کے جھگڑوں اور تنازعات کا ملاحظہ یہ سب گمراہی در گمراہی ہے۔ اور اگر رسم زمانہ ان میں اشتغال کی مقتضی ہو تو بھی ضروری ہے کہ ان کو علم دنیا جانیں۔ اور ان سے متنفر رہیں۔ اور استغفار وندامت کریں۔ اور ہمارے لیے لازم ہے کہ حرمین محترمین کے لیے جائیں اور اپنے چہروں کو ان کے آستانوں سے ملیں۔ ہماری سعادت اسی میں ہے، اور ہماری شقاوت وبدبختی اس سے اعراض میں ہے۔

وصیّت دیگر: حدیث میں آیا ہے کہ تم میں سے جو عیسیٰ بن مریم سے ملے، وہ ان کو میرا سلام پہنچائے۔ اس فقیر کی پوری آرزو رہی ہے کہ اگر حضرت روح اللہ کا دور پاوے تو یہ سلام پہنچانے والا پہلا شخص میں ہی ہوں۔ اور اگر میں ان کو نہ پاؤں تو اس فقیر بہجت نشان کی اولاد یا اس کے پیروکاروں میں سے جو بھی آں حضرت کا نشان پاوے سلام پہنچانے کی پوری کوشش کرے، تاکہ ہم ان کے آخر کے لشکر اور لشکر محمدیہ میں شامل ہوں۔ والسلام علی من اتبع الهدیٰ.

۳۲۹-تفہیم:

نبی کریم کے مبشرات

مبشرہ نمبر-۱: میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ گویا میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور آپ کے سامنے بیٹھ گیا، اور آپ مراقب ہیں، اپنی ٹھوڑی اپنے سینہ پر رکھے ہوئے ہیں۔ تو میرے اوپر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے تین مثالی صورتوں کا فیضان ہوا۔ پہلی جسم مخروطی، اس سے اوپر اور اس سے نیچے ہر ایک کے لیے عرض ہے اور اس سے نیچے والا اوپر والے کے مقابلہ میں عرض کے لحاظ سے زیادہ ہے۔ اور

دوسرے جسم مبطوح (پھیلا ہوا) پیالہ کی طرح گویا اس کے وسط میں لکڑی گاڑی ہوئی ہے۔
اور تیسرے لکڑی زمین پر کھڑی ہوئی ہے، اس کے اوپر پیالہ کی طرح ایک جسم ہے۔

پھر میرے اوپر یہ فیضان ہوا کہ پہلی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت کے لیے تمثیل ہے کہ وہ نچلے جسمانی اور اوپر والے روحانی مراتب کی تہذیب کا احاطہ کرنے والی ہے۔ اور دوسری سالکین کی نسبت کے لیے تمثیل ہے جن کی نسبت صرف اس میں پھیلی جو نیچے قریب ہے۔ اور تیسری مجذوبوں کی نسبت کی تمثیل ہے جن کی نسبت اس میں کشادہ ہوئی جو اوپر قریب ہے۔

پھر جب میں ان تینوں صورتوں کی مراد کو سمجھ گیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا سر مبارک اٹھایا، اور میری طرف مسکرائے، اور اپنے دونوں ہاتھ بڑھائے، اور بیعت کے لیے اشارہ فرمایا تو میں آگے بڑھا حتیٰ کہ میرے گھٹنے آپ کے گھٹنے سے مل گئے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں کے درمیان پکڑے۔ مصافحہ کیا، پھر اپنی ٹھوڑی اپنے سینہ پر رکھی، اور اپنی آنکھیں بند کیں تو میں نے بھی یہی سب کچھ کیا۔ تو میرے قلب پر اس نسبت کا فیضان ہوا، جس کو میں نے سب سے پہلے سمجھا تھا۔

مبشرہ نمبر-۲: جس وقت میں کھنبایت شہر کی مسجد میں عصر کے بعد مراقبہ میں تھا میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی روح کریمہ کا مشاہدہ کیا کہ وہ آئی اور مجھے ایک چادر اوڑھائی۔ اس دوران مجھ پر بعض علوم شرعیہ کے دقائق ظاہر ہوئے۔ پھر تھوڑی دیر میں بڑھتے رہے۔

مبشرہ نمبر-۳: میں نے خواب میں دیکھا کہ حسن اور حسین رضی اللہ عنہما نے میرے گھر میں نزول فرمایا۔ اور حسن رضی اللہ عنہ کے دست مبارک میں ایک قلم ہے جس کی نوک ٹوٹی ہوئی ہے۔ تو انہوں نے اپنا ہاتھ وہ قلم مجھے دینے کے لیے بڑھایا، اور فرمایا یہ میرے نانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قلم ہے۔ پھر اپنا ہاتھ روک لیا اور فرمایا پہلے اس کو حسین ٹھیک کریں گے تو انہوں نے اس کو ٹھیک کر دیا۔ اور انہوں نے وہ مجھے عطا فرما دیا۔ پھر ایک چادر لائی گئی حسین رضی اللہ عنہ نے اسے اٹھایا اور فرمایا: میرے نانا رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کی چادر ہے۔ پھر وہ مجھے اوڑھادی تو اس دن سے علوم شرعیہ میں تصنیف کے لیے مجھے شرح صدر حاصل ہو گیا۔ **والحمد للّٰہ**.

مبشرہ نمبر-۴: میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روحانی طور پر آپ کے اس ارشاد کے معنی کے سلسلہ میں سوال کیا **کنت نبیا و آدم منجدل بین الماء والطین** میں اس وقت بھی نبی تھا جب آدم پانی اور مٹی کے درمیان ایک کیاری میں تھے۔" تو میری روح پر آپ کی روح کریمہ نے اس مثالی صورت میں فیضان فرمایا جو عالم اجسام میں پائی جانے سے پہلے تھی۔ اور یہ کہ اس کا فیضان حضرت مثالی میں اس وقت تھا، جب آدم پانی اور مٹی کے درمیان ایک جدول کیاری میں تھے۔ اور یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اس حضرت میں ظہور تام تھا۔ اس حدیث میں اس سے ایک تعبیر کی گئی ہے۔ اور اس لیے جب آپ عالم جسمانی میں پائے گئے تو آپ کے ساتھ عالم جسمانی کی طرف قوی مثالی منتقل ہوئے تو علوم سے وہ ظاہر ہوا جو حساب میں نہیں تھا۔

مبشرہ نمبر-۵: میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کے اس ارشاد کے سلسلے میں روحانی طور پر سوال کیا **کان فی عماءٍ ما فوقه هواء وما تحته هواء** "وہ عما (دھند) میں تھا اس کے اوپر ہوا تھی اور اس کے نیچے ہوا تھی۔" آپ نے یہ اس شخص کے جواب میں فرمایا تھا جس نے کہا تھا ہمارا رب مخلوق کو پیدا کرنے سے پہلے کہاں تھا۔ تو میری روح پر آپ کی روح کریمہ سے ہیولانی کے بعد اعالی میں نور عظیم کی صورت کا فیضان ہوا۔ اس نے اس سارے بعد کا خطوط شعاعی سے احاطہ کر لیا۔ پھر کہا گیا، یہ نور وہ تجلی ہے جس کی طرف اس قول میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اور یہ بعد ہیولانی وہ عماء اور خطوط شعاعی ہے یہ احاطہ وہ قہر ہے جس کی طرف قول باری تعالیٰ "**ھو القاھر فوق عبادہ**" میں اشارہ کیا گیا ہے۔

مبشرہ نمبر-۶: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فقیر کو مخاطب کرتے ہوئے روحانی طور پر اشارہ فرمایا کہ تمہارے اندر حق کی مراد یہ ہے کہ امت مرحومہ کو تمہارے ساتھ پوری طرح شامل و جمع فرمادے۔

مبشرہ نمبر-۷: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روحانی طور پر سوال کیا کہ اسباب کے اختیار کرنے اور ترک کرنے دونوں میں سے میرے لیے کون سا بہتر ہے، تو میری روح پر ان کے اس فیض کا فیضان ہوا کہ اس کے سبب سے میرا قلب اسباب اور اولاد کو رو کر دے۔ پھر کچھ دیر کے بعد امر کا کشف ہوا۔ تو میں نے دیکھا کہ طبیعت اسباب کی طرف اعتماد کرتی ہے۔ اور میں نے دیکھا کہ روح تفویض پر اعتماد کرتی ہے۔

مبشرہ نمبر-۸: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت علی پر حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کی فضیلت کے راز کے سلسلہ میں روحانی طور پر سوال کیا۔ حالانکہ حضرت علی نسباً تمام صحابہ سے زیادہ اشرف، حکماً ان سے زیادہ اقضیٰ، بہتر فیصلے کرنے والے اور جسمانی اعضاء کے اعتبار سے ان سے زیادہ بہادر ہیں۔ اور ان کے بعد صوفیاء انہی کی طرف انتساب کرتے ہیں، تو میرے قلب پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہ فیضان ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے دو وجہیں ہیں۔ ایک وجہ ظاہر ہے اور دوسری وجہ باطن۔ تو وجہ ظاہر لوگوں میں عدل کی اقامت، ان کی تالیف وجمع اور ظاہر شریعت کی طرف ان کے ارشاد ورہنمائی کی طرف ہے۔ اور شیخین اس سلسلہ میں آپ کے لیے بمنزلہ جوارح کے ہیں۔ اور وجہ باطن فنا وبقا کے مراتب کی طرف ہے۔ اور آپ کے تمام علوم مرویہ وجہ ظاہر سے نکلتے ہیں۔

مبشرہ نمبر-۹: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شیعوں کے بارے میں روحانی طور پر سوال کیا تو میری طرف وحی کی گئی کہ ان کا مذہب باطل ہے۔ اور ان کے مذہب کے بطلان کو لفظ امام سے پہچانا جا سکتا ہے۔ اور جب میں اس حالت سے باہر آیا تو مجھے معلوم ہوا کہ ان کے نزدیک امام معصوم ہے۔ اس کی اطاعت فرض کی گئی ہے۔ اس کی طرف وحی باطن کی جاتی ہے۔ اور یہی نبی کے معنی ہیں۔ اس طرح ان کا مذہب ختم نبوت کے انکار کو مستلزم ہے۔ **قبحهم الله تعالیٰ**.

مبشرہ نمبر-۱۰: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان مذاہب اور ان طرق کے بارے میں سوال کیا کہ اس کے نزدیک ان میں سے اخذ کے لئے کون سا اولیٰ اور زیادہ پسندیدہ ہے تو میرے قلب پر یہ فیضان ہوا کہ تمام مذاہب اور طرق برابر ہیں، کسی کو

دوسرے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے۔

مبشرہ نمبر-۱۱: میں نے علماء محدثین اپنے علم پر عمل کرنے والوں، اپنی جماعت کی ظاہر طور پر تہذیب کرنے والوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک ان بہت سے صوفیاء کے مقابلہ میں زیادہ محبوب اور پسندیدہ پایا جو اپنے آپ کو اپنی جماعت کی باطنی تہذیب کی بنیاد پر افضل قرار دیتے ہیں۔ اور اپنی ظاہری تہذیب کے سلسلہ میں ان علماء کی تفضیل نہیں کرتے۔

مبشرہ نمبر-۱۲: مجھے سخت بھوک لگی تو میں نے اللہ سے دعاء کی کہ اس کو دور کردے تو میں نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی روح کریمہ کو دیکھا کہ وہ آسمان سے نازل ہوئی۔ اس کے ساتھ روٹی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو حکم دیا کہ وہ مجھے وہ روٹی کھلائے تو اس نے وہ مجھے عطا کی۔ اس طرح اس دن یا اگلے دن صبح سویرے میری ایک حاجت پوری ہوگئی۔ واللہ اعلم۔

مبشرہ نمبر-۱۳: ایک رات مجھے پیاس لگی تو ہمارے کسی ساتھی نے اشارہ کیا کہ دودھ کے ایک برتن کی طرف رہنمائی کرے تو میں نے اس کو پی لیا، پھر وضو کیا اور سو گیا تو میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی روح کو دیکھا۔ اس نے میری طرف اشارہ کیا کہ میں وہی ہوں جس نے دودھ بھیجا۔ اور ایک آدمی کے دل میں بات ڈالی۔

۳۳۰-تفہیم:

خطبات کے ذریعہ تفہیم

خطبہ نمبر ۱

بسم اللہ الرحمن الرحیم. الحمد لله الذی تقدس عن مشارکة المخلوقین فهام الاوهام دون الاصابه من حقیقته ساقطة★وتعالیٰ عن مشابهة المحتاجین فایدی الافهام عند تناول ذاله غالطة ★وتلطف عن مناسبة العالمین لعقول العالمین فی بیداء عظمته خابطة ★وتعاظم عن مشاکلة المتحیزین

فمدارک العارفین من اکتناہ کنہہ قانطة ★لا یصفه الواصفون ولا تبلغه الظنون ولا تدرکه العیون ولا تضبطه ضابطة ★دبرامور ملکه من غیر وزیر ولا مشیر ولا ظهیر ولا نصیر ولا واسطة ★عمت رحمته وتمت رأفته وخرجت من الاحصاء کلماته فکلت لاغیة ولاغطة ★واشهد ان لا إله إلا اللّٰه وحده لا شریک له شهادة لجمیع شوارد السعادة رابطة ★واستغفره من ذنوب الم بها لسان لاغ اوقلب طاغ او یدجانیة ولاقطة ★واشهد ان سیدنا محمد اعبده ورسوله الذی بعثه لیجاهد الذین اعمالهم فی الآخرة حابطة ★ویعلم الناس الکتب والحکمة ویزکیهم ویصلح منهم کل نفس للصالح بالسئی خالطة ★ففعل ما امر به وصدع بالحق حتی ظهر امر اللّٰه بعزکل راضیة وذل کل ساخطة ★صلی اللّٰه علیه وعلی آله واصحابه بعدد کل نفس صبیة اوشابة او شامطة★

تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جو مخلوقات کی شرکت سے پاک ہے۔اوہام کی سمجھ اس کی حقیقت تک پہنچنے سے ساقط ہے۔اور محتاجوں کی مشابہت سے بالاتر ہے۔چنانچہ عقلوں کے ہاتھ اس کی ذات کو پانے کے وقت غلطی کرنے والے ہیں۔اور عالموں کی مناسبت سے نرمی کرتا ہے۔چنانچہ ظالموں کی عقلیں اس کی عظمت کو ظاہر کرنے میں خبط ہوجاتی ہیں۔اور وہ دائروں میں محدود اشیاء کی مشابہت سے بہت عظیم ہے۔چنانچہ جن عارفوں نے اس کی حقیقت کا پتہ لگانے کی کوشش کی ان کے احساسات مایوس وناامید ہوگئے۔نہ وصف بیان کرنے والے اس کے اوصاف بیان کرسکتے ہیں،نہ ہی ظن وگمان اس کی حقیقت تک پہنچ سکتے ہیں،اور نہ ہی آنکھیں اس کا ادراک کرسکتی ہیں،اور نہ ہی کوئی ضابطہ اس پر غالب آسکتا ہے۔وہ اپنے امور مملکت بغیر کسی وزیر اور بغیر کسی مشیر کے اور بغیر کسی معاون ومحافظ اور بغیر مددگار ومعین کے اور بغیر کسی واسطہ کے انجام دیتا ہے۔اس کی رحمت عام ہے،اس کی مہربانی مکمل ہے اور اس کے کلمات حد شمار سے باہر ہیں۔چنانچہ تمام بیہودہ اور لغو حسابات تھک گئے۔اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے،وہ اکیلا ہے،اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ایسی گواہی جو تمام نادر سعادتوں سے تعلق رکھتی ہے،اور

میں اس سے ان تمام گناہوں کی معافی مانگتا ہوں جس میں بیہودہ باتیں کرنے والی زبان یا سرکشی کرنے والا دل یا گناہ کرنے والا اور گری پڑی چیزیں اٹھانے والا ہاتھ ملوث ہو۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ ہمارے آقا محمد اس کے بندہ اور اس کے رسول ہیں، جن کو اس نے اس لیے مبعوث کیا تا کہ ان لوگوں سے جہاد کریں جن کے اعمال آخرت میں رائیگاں جائیں گے۔ اور لوگوں کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیں اور ان کا تزکیہ کریں اور ان کے ذریعہ ہر نفس کی نیکی کی طرف اصلاح کریں جس میں برائی ملی ہوئی ہو۔ چنانچہ آپ نے وہ سب کچھ کیا جس کا آپ کو حکم دیا گیا اور حق کا بالکل اظہار کیا حتیٰ کہ اللہ کا امر ہر راضی ہونے والے کو عزت دے کر اور ہر ناراض ہونے والے کو ذلیل کر کے غالب ہو گیا۔ اللہ رحمت فرمائے آپ پر اور آپ کی آل واصحاب پر، ہر بچہ، جوان یا سفید بالوں والے کے ہر سانس کی تعداد کے برابر۔ اے ابن آدم! کیا تم اپنی دنیا میں محنت ومشقت نہیں کرتے کہ اپنے مالک کے حکم کے بھی خلاف کر ڈالتے ہو؟ کیا ان مشقتوں سے تمہارے ہاتھ کامیابی لگ جاتی ہے۔ فیصلے تمہارے خلاف ہوتے ہیں۔ خوشیاں تمہاری ایڑیوں پر گرتی ہیں اور تمہارے سفید کپڑے داغدار ہوتے ہیں۔ اور تمہاری خواہشات حق کے خلاف تجاوز کرتی ہیں۔ تم مسکین کے ساتھ ترشروئی، نفرت کرنے والے دل اور زیادتی کرنے والے ہاتھوں سے پیش آتے ہو۔ اور اپنے بھائیوں اور پڑوسیوں سے سخت مزاجی، بداخلاقی اور تنگ دستی کے ساتھ رہتے ہو۔ تمہاری سب سے بڑی خواہش ہنہنانے اور دور تک جانے والے گھوڑے اور اونٹ ہوتے ہیں۔ اور تمہارا سب سے بڑا خیال ہوتا ہے کہ یہ کہا جائے کہ تمہارے پاس بہت مال ودولت ہے۔ اور تم ان حقوق العباد کی پرواہ نہیں کرتے جن کو تم ضائع کرتے اور حقیر سمجھتے ہو۔ اور تم چاہتے ہو کہ اللہ کے دین سے اس طرح خارج ہو جاؤ گویا کہ تم قرامطہ (شیعوں کا ایک غالی فرقہ) میں سے ہو۔ تم اپنے نفس کا روزانہ اس طرح بناؤ سنگار کرتے ہو گویا تم ہمیشہ باقی رہنے کے لیے پیدا کیے گئے ہو، جیسا کہ دلہن کا بناؤ سنگار، مشاطہ کرتی ہے۔ جب تم پر خواہش کا مورد ظاہر ہوتا ہے تو چاہتے ہو کہ اس پر وارد ہو اور لتھڑ جاؤ۔ اور اگر تمہیں مقامات قرب کی طرف بلایا جاتا ہے تو تمہارے نفس پر کسلان طاری رہتا ہے، نشاط پیدا نہیں

ہوتا۔ ایسا نفس جو اپنے اوقات کو اس وقت ضائع کرتا ہے جب تم محاسن اخلاق کے لیے دیوار بن جاتے ہو۔ کیا ایسا نہیں ہے کہ قبریں تاریک، کیڑوں سے بھری، بدبودار، تنگ اور بھینچنے والی ہیں؟ کیا تم اس دن کو یاد نہیں کرتے جب تم رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوگے؟ نہ تم ان سے چڑھنے کی حالت میں ڈرتے ہو نہ اترنے کی حالت میں۔ کیا تم اس کو قبول نہیں کرتے کہ تمہیں کس نے پیدا کیا؟ کس نے متوازن اعضاء بنائے اور کس کا ہاتھ تم پر نعمتوں کی بارش کرتا رہتا ہے؟ کیا تم اپنے مالک کے احکام اور جس کا تم نے اس سے عہد کیا اور جس کی تم پر شرط لگائی گئی، ان سب کی محافظت نہیں کرتے؟ ہم اپنے رب سے دعا کرتے ہیں کہ ہم سے ہر شدت کو دور کر دے اور اسے ہم سے زائل کر دے اور مٹا دے۔ اور ہمارے گناہوں کو بخش دے۔ اور ہر مشکل و پریشانی میں ہماری مدد فرمائے۔

خطبہ نمبر-۲:

الحمد للّٰه الذی خلق الإنسان وقد اتی علیه حین من الدهر لم یکن شیئاً مذکوراً ★ فسواه وعدله وعلی کثیر ممن خلق فضله وجعله سمیعا بصیرا ★ ثم هداه السبیل ونصب له الدلیل اما شاکراً واما کفوراً ★ اما الکافرون فاعتدلهم سَلاسل واغلالا وسعیراً ★ یعذبون باصناف العذاب ینادون ویلا ویدعون ثبوراً ★ واما شاکرون فنعمهم وکرمهم ولقهم نضرة وسروراً ★ إن هذا کان لکم جزاء وکان سعیکم مشکوراً ★ فسبحان من بیده ملکوت کل شئی لم یزل ولا یزال علیماً قدیراً ★ واشهد ان لا إله إلا اللّٰه وحده لا شریک له واشهد أن محمداً عبده ورسوله بعثه بین یدی الساعة لیکون للعالمین نذیراً ★ واتاه جوامع الکلم ومنابع الحکم ووعده مقاماً محموداً وجعله سراجاً منیراً ★

تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے انسان کو پیدا کیا حالانکہ اس پر ایک زمانہ ایسا گزرا تھا کہ وہ کوئی قابل ذکر چیز نہ تھا۔ پھر اس کو متوازن و مساوی اعضا والا بنایا، اور اس کو معتدل بنایا، اور اپنی بہت ساری مخلوقات پر اس کو فضیلت دی۔ اور اس کو سننے اور دیکھنے والا بنایا۔ پھر اس کو راہ مستقیم کی طرف ہدایت فرمائی۔ اور اس کے لیے دلیلیں مقرر کیں کہ اب

چاہے شکر کرنے والا بن جائے یا ناشکرا کافر بن جائے۔ تو جو کافر ہیں ان کے لیے زنجیریں اور کھال اتارنے والی بیڑیاں اور گلے میں اٹکنے والی آگ کی لپٹیں تیار کیں۔ ان کو مختلف قسم کے عذاب دیئے جائیں گے۔ وہ ہلاکت کو پکاریں گے، اور موت کی دعا کریں گے۔ اور جو شکر کرنے والے ہوں گے، انہیں نعمتوں سے نوازے گا۔ عزت و تکریم سے سرفراز فرمائے گا، اور انہیں تازگی اور سرور بخشے گا کہ یہ تمہارے لئے جزا ہے۔ اور تمہاری سعی مشکور قابل قدر ٹھہری، قبول کی گئی۔ تو وہ ذات پاک ہے، جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی بادشاہی ہے۔ وہ ہمیشہ ہی علیم و قدیر رہا ہے، اور ہمیشہ ہی رہے گا۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ وہ اکیلا ہے اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اور گواہی دیتا ہوں کہ محمد اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ آپ کو قیامت سے پہلے مبعوث فرمایا تاکہ سارے عالموں کے لیے نذیر ڈرانے والے ہوں اور آپ کو جوامع الکلم (جامع کلمات) اور منابع الحکم (حکمتوں کے منبع) عطا فرمائے۔ اور آپ سے مقام محمود کا وعدہ فرمایا اور آپ کو سراج منیر روشن چراغ بنایا۔

امابعد: میں تمہیں اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے کی وصیت کرتا ہوں، اور آپ کو اس دن سے بچنے کی تلقین کرتا ہوں جو سخت مصیبت کا اور انتہائی طویل ہوگا۔ جب ہر نفس کو آزمائش میں ڈالا جائے گا۔ اور اس سے کوئی شفاعت قبول نہیں کی جائے گی۔ نہ ہی اس کو کوئی فدیہ لے کر چھوڑا جائے گا۔ اور نہ تم کوئی مددگار پاؤ گے۔ جس دن انسان ندامت کا اظہار کرے گا۔ اور ندامت اسے کوئی فائدہ نہیں دے گی۔ وہ دنیا کی طرف لوٹنا چاہے گا، بہت بعید ہے کہ وہ لوٹ سکے اور اس کے لیے کتاب نکل آئے جس کو وہ کھلا ہوا پائے گا۔

اے ابن آدم! جو دنیا پر رنجیدہ ہوا، اس کو اللہ کی طرف سے صرف دوری ہی بڑھی، اور دنیا میں صرف سختی اور آخرت میں صرف مشقت برابر نفرت اور دوری ہی ملے گی۔ اے ابن آدم! رزق کے معاملہ میں نرمی سے کام لو کہ رزق تو قسمت میں لکھا جا چکا ہے۔ اور حریص محروم رہتا ہے۔ اور حصول کی کوشش میں انتہا کو پہنچنا بدقسمتی ہے۔ اور موت یقینی ہے۔ اور وہ شخص کامیاب ہوا جس نے ظلم کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا۔

اے ابن آدم! خیر حکمت اللہ کی خشیت ہے، اور بہترین غنا قلب کا غنا ہے، اور بہترین زادِ راہ تقویٰ ہے، اور تمہیں جو بہترین عطیہ ملا وہ عافیت ہے، اور تمہارا رب قدیر ہے۔ بہترین کلام، اللہ کا کلام ہے، اور سب سے اچھی ہدایت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت ہے، بدترین امور بدعات ہیں، جس میں امانت نہیں اس کا ایمان نہیں۔ جس میں عہد نہیں، اس کا دین نہیں، اور تیرا رب اپنے بندوں کے گناہوں سے اچھی طرح باخبر اور دیکھنے والا ہے۔ میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں شیطان مردود سے۔ جو کوئی اس دنیا میں جلدی حاصل ہونے والے فائدوں کا خواہشمند ہوتا ہے، اسے ہم یہاں ہی دے دیتے ہیں، جو کچھ بھی اس کو دینا چاہیں۔ پھر اس کی قسمت میں جہنم لکھ دیتے ہیں۔ جسے وہ پائے گا ملامت زدہ اور رحمت سے محروم ہو کر۔ اور جو آخرت کا خواہش مند ہوتا ہے اور اس کے لیے سعی کرتا ہے جیسی کہ اس کے لیے سعی کرنی چاہیے اور وہ مومن ہو، تو ایسے ہر شخص کی سعی کی قدر کی جائے گی۔ اے اللہ! ہمارے گناہوں کو بخش دے، اور ہمارے عیبوں کو مٹا دے، اور ہماری شرمناک باتوں پر پردہ ڈال دے، اور ہمیں ڈر اور خوف سے امن عطا فرما، اور ہمارا مددگار، معین اور محافظ ہو جا، اور ہماری حاجتیں اور ضرورتیں پوری فرما، اور ہمیں آفتوں سے محفوظ فرما، اور ہمارے قرض ادا فرما، اور تو ہی کافی دعا قبول کرنے والا، قریب، جاننے والا اور خبر رکھنے والا ہے۔

خطبہ نمبر-۳:

تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں، جو اپنے جلال و کبریائی میں منفرد ہے۔ اپنی نعمتوں اور نشانیوں میں محمود ہے۔ نہ کوئی اس کے حکم اور فیصلے کو رد کرنے والا ہے اور نہ ہی اس کے جود و عطا کو منع کرنے والا ہے۔ نہ آنکھیں اس کا ادراک کرتی ہیں، نہ ظن و گمان اس کے مقام کو پہنچتے ہیں، نہ وصف بیان کرنے والے اس کا وصف بیان کرتے ہیں، نہ ہی بھلائی کرنے والے اس کو بدلتے ہیں۔ وہ گناہوں کو بخشنے والا، عیبوں کو چھپانے والا، دلوں کو بدلنے والا، کرب و اضطراب کو فرحت بخش بنانے والا ہے۔ پوشیدہ رازوں سے باخبر ہے۔ دلوں کے پوشیدہ حالوں کو جاننے والا ہے۔ اس کے ہاتھ میں نعمتیں اور دائرے ہیں۔ اس کی

انگلیوں کے درمیان دل اور قلب وخواطر ہیں۔ مضطر کی بات سنتا اور اس کی دعا قبول کرتا ہے۔ تکلیف اور ضرر کو دور کرتا ہے۔ ظاہر اور پوشیدہ کو دیکھتا ہے، اور اپنے بندوں کی نیکیوں اور گناہوں کی گنتی کرتا ہے۔ تو جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا ہے، وہ رشد وہدایت سے سرفراز ہوتا ہے اور نجات پاتا ہے۔ اور اس کے درجات بلند ہوتے ہیں۔ پھر اللہ کی رضا وخوشنودی اور اس کی رویت عظمی حاصل ہوگی۔ اور جو ان کی نافرمانی کرتا ہے۔ وہ منحرف اور گمراہ ہوا۔ اور جلدی ہی بڑی آگ میں ڈال دیا جائے گا۔ پھر نہ مرے گا۔ اور نہ ہی زندہ رہے گا اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ علی وکبیر ہے۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ سیدنا محمد اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں اور بشیر ونذیر ہیں۔ نبی رحمت، شفیع امت ہیں۔ مشکلات والے دن جب سہولت وآسانی نہ ہوگی۔ آپ غموں کو دور کرنے والے ہوں گے۔ صلی اللہ علیہ وعلی آلہ واصحابہ وبارک وسلم. اتنے زیادہ کہ ان کی گنتی علیم وقدیر کے سوا کوئی نہ کر سکے۔

اما بعد! میں تمہیں تقویٰ اختیار کرنے اور خواہشات نفسانی سے بچنے کی وصیت کرتا ہوں۔ اور تمہیں لذتوں کو جلدی کاٹنے والی موت اور بلا کی یاد دلاتا ہوں۔ مجھے اس شخص پر تعجب ہوتا ہے جو موت پر یقین رکھتا ہے پھر بھی کیسے خوشی کا اظہار کرتا ہے۔ اور مجھے اس شخص پر تعجب ہوتا ہے کہ جو حساب پر یقین رکھتا ہے، پھر بھی کیسے مال ودولت جمع کرتا ہے۔ اور مجھے اس شخص پر تعجب ہوتا ہے جو صبر پر یقین رکھتا ہے، پھر بھی وہ کیسے ہنستا ہے۔ مجھے اس شخص پر تعجب ہوتا ہے جو آخرت اور اس کی نعمتوں پر یقین رکھتا ہے، پھر بھی کیسے ان سے دور رہتے ہوئے راحت طلب کرتا ہے۔ اور مجھے وہ شخص عجیب لگتا ہے جو دنیا اور اس کے زوال کا یقین رکھتا ہے پھر بھی کیسے اس پر مطمئن رہتا ہے۔ اور مجھے وہ شخص عجیب لگتا ہے جو زبان کا عالم اور قلب کا جاہل ہے، اور وہ شخص بھی جو پانی سے طہارت حاصل کرتا ہے اور دل کو پاک نہیں کرتا۔ اور جو لوگوں کے عیوب تلاش کرنے کا شوق رکھتا ہے، اور اپنے نفس کے عیوب میں اشتغال نہیں رکھتا۔ اور جو شخص جانتا ہے کہ اللہ اس کے حال سے باخبر ہے پھر بھی وہ کیسے اس کی نافرمانی کرتا ہے۔ اور جو شخص جانتا ہے کہ وہ مرے گا اور اس سے تنہا حساب لیا جائے گا،

پھر وہ کیسے غیر اللہ سے مانوس ہو جاتا ہے۔اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ذہین وسمجھدار وہ ہے جس نے اپنے نفس کو کمزور رکھا اور موت کے بعد کے لیے عمل کیا۔اور عاجز وہ ہے جس نے اپنے نفس کی خواہشات کی اتباع کی، اور اللہ سے تمنا رکھی، اور فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، اے ابن آدم! تو خود کو میری عبادت کے لیے فارغ کر لے، میں تیرا سینہ غنیٰ سے بھر دوں گا۔اور تیرے فقر کا راستہ بند کر دوں گا، اور اگر تو ایسا نہیں کرے گا تو تیرے ہاتھوں کو مشغولیتوں سے بھر دوں گا لیکن تیرے فقر کا راستہ بند نہیں کروں گا۔اور فرمایا آخرت جس کا مقصود ہو گی، اللہ اس کے غنا کو دل میں مقرر کر دے گا۔ اور اس کے بکھرے امور کو جمع کر دے گا۔اور دنیا اس کے پاس آئے گی، اور وہ ذلیل ہو گی۔اور جس کا مقصود دنیا ہو گی اللہ اس کا فقر اس کی آنکھوں کے سامنے کر دے گا۔اور اس کی چادر پھاڑ دے گا۔اور اس کے پاس دنیا صرف اتنی ہی آئے گی جتنی اس کے مقدر میں لکھ دی گئی ہو گی۔ میں اللہ کی پناہ چاہتا ہوں شیطان مردود سے۔ دنیاوی زندگی کی مثال ایسی ہے جیسے پانی، ہم نے اس کو آسمان سے نازل کیا تو اس سے زمین کی نباتات مل گئیں۔اے اللہ! ہم تجھ سے پوری خیر کا سوال کرتے ہیں، اس کی جلدی والی کا بھی۔اور دیر والی کا بھی جس کو ہم جانتے ہیں اس کا بھی اور جس کو نہیں جانتے اس کا بھی۔اور ہم تیری پناہ چاہتے ہیں، شر سے پوری طرح اس کی جلد والی سے بھی اور دیر والی سے بھی۔جس کو ہم جانتے ہیں، اس سے بھی اور جس کو نہیں جانتے اس سے بھی۔اے اللہ! ہم تجھ سے اس خیر کا سوال کرتے ہیں جس کا تجھ سے تیرے بندہ اور نبی نے سوال کیا۔اور اس شر سے تیری پناہ چاہتے ہیں جس سے تیرے بندے اور نبی نے پناہ مانگی۔اے اللہ! میں تجھ سے جنت کا سوال کرتا ہوں، اور اس کا، جو قول یا عمل سے اس کے قریب ہو۔اور میں تیری پناہ طلب کرتا ہوں آگ سے اور جو اس سے قول یا عمل سے قریب ہو۔اے اللہ! ہماری حاجات پوری فرما۔اپنی رحمت سے اے ارحم الراحمین.

خطبہ عید الفطر

اللہ سب سے بڑا ہے۔اللہ سب سے بڑا ہے۔اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اللہ سب سے بڑا ہے۔اللہ سب سے بڑا ہے اور اللہ ہی کے لیے سب تعریفیں ہیں۔تمام تعریفیں

اللہ کے لیے ہیں جو نعمتیں عطا کرنے والا، احسان کرنے والا ہے، قاضی، حاکم، غلبہ والا، بدلہ دینے والا، حساب لینے والا ہے۔ فضل وکرم جود وسخا اور احسان کرنے والا ہے۔ کرم ومغفرت واحسان اور بھلائی کرنے والا ہے۔ اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ اور اللہ سب سے بڑا ہے۔ اللہ سب سے بڑا ہے اور اللہ ہی کے لیے تمام تعریفیں ہیں۔ تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جس نے ہمیں ماہ رمضان کے ذریعہ عزت بخشی۔ وہ مہینہ جس میں رحمت اور مغفرت نازل کی گئی۔ وہ مہینہ جس میں ایک رات ایسی ہے جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ اسی میں قرآن کا نزول ہوا۔ اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اللہ سب سے بڑا ہے اللہ سب سے بڑا ہے اور اللہ ہی کے لئے تمام تعریفیں ہیں۔ تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جس نے اس میں ہمیں قرآن پڑھنے کی توفیق عطا فرمائی، اور ہمارے لیے روزوں کی ادائیگی اور قیام حتی الامکان بہتر طور پر آسان فرمائے، اور ہمارے لیے تراویح اور تسبیحات کو آسان کیا۔ کیا ہی اچھا ہے وہ بھلائی کرنے والا۔ اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے اور اللہ ہی کے لیے تمام تعریفیں ہیں۔ تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جس نے روزہ داروں سے جنت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ کا وعدہ فرمایا۔ جس کا نام باب الریان ہے۔ اور ان کے لیے وہ سب کچھ نعمتیں تیار فرمائیں جن کا خیال بھی کسی انسان کے دل میں کبھی نہیں آیا۔ اور روزہ داروں کے منہ کی بو کو اپنے ملائکہ کے نزدیک مشک وزعفران سے زیادہ پسندیدہ وپاکیزہ بنایا۔ اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے اور اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے اور اللہ ہی کے لیے تمام تعریفیں ہیں۔
تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جس نے رمضان کے روزوں کو سیئات برائیوں کا کفارہ اور جہنم کی آگ سے نجات وآزادی بنایا اور روزہ داروں کا دو فرحتوں سے اکرام کیا۔ ایک فرحت افطار کے وقت اور ایک فرحت رحمٰن سے ملاقات کے وقت۔ اور فرمایا روزہ میرے لیے ہے اور میں خود ہی اس کی جزاء دوں گا۔ تو کیا ہی اچھا ہے وہ بلند مقام والا، اللہ سب

سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے۔ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے اور اللہ ہی کے لیے تمام تعریفیں ہیں۔ ہم اس کی تعریف بیان کرتے ہیں اور وہ ایسا ہے جس کی ہر مقام میں تعریف کی گئی ہے اور ہم اس کا شکر ادا کرتے ہیں، اور ہر زبان سے اس کا شکر ادا کیا جاتا ہے اور ہم اس سے مدد چاہتے ہیں ہر اس امر میں جس کا وہ معاش اور دین کے سلسلہ میں ہمارے لیے ارادہ فرماتا ہے اور ہم اس سے مغفرت طلب کرتے ہیں ہر اس معاملہ میں جس میں ہم سے غلطی اور نافرمانی سرزد ہو گئی۔ اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے۔ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور اللہ سب سے بڑا ہے۔ اللہ سب سے بڑا ہے اور اللہ ہی کے لیے تمام تعریفیں ہیں۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، ایسی گواہی جس سے گواہی دینے والا دار رضوان پاتا ہے۔ اور اس کے ذریعہ جہنم کی آگ سے نجات پاتا ہے۔ اور اس سے وہ خوش ہوتا ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی بادشاہت ہے، جو نگہبان اور سب کے ساتھ بھلائی کرنے والا ہے۔ اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اور اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے اور اللہ ہی کے لیے تمام تعریفیں ہیں، اور میں گواہی دیتا ہوں کہ سیدنا ومولانا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندہ اور اس کے رسول ہیں۔ جن کو اس وقت بھیجا گیا جب دنیا میں کفر کا غلبہ ہو گیا تھا۔ تو آپ نے مخلوق کو توحید اور ایمان کی طرف دعوت دی۔ اور شرک اور سرکشی کی رسیوں کو باطل قرار دیا۔ اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے اور اللہ ہی کے لیے تمام تعریفیں ہیں۔ اے اللہ! نبی کریم سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی آل واصحاب پر درود وسلام فرما، جو چاندوں کی طرح روشن وتابناک ہیں۔ اور جو آبادیوں اور ویرانوں وجنگلات میں ایک کے بعد ایک رنگ پھیلانے والے ہیں۔

اے لوگو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو کہ تقویٰ حسنات، نیکیوں کی بنیاد اور اعمال کا خلاصہ ہے۔ اور اللہ کی عبادت کرو کہ عبادت برائیوں، سیئات کو دور کرنے والی اور فساد وگمراہی سے روکنے والی ہے۔ کیا تم روزوں کے مہینہ کے فضائل جانتے ہو؟ اور کیا تم نے اس کا ادراک

کرلیا کہ ان دنوں میں تمہارے اوپر روزے کیوں فرض کیے گئے؟ اور کیا تم جانتے ہو کہ یہ مہینہ مہمان ہے؟ پھر تم نے اس کے اکرام کے لیے کیا کیا؟ اور کیا تم نے سمجھا کہ وہ تمہارے پاس سے تم سے راضی ہونے کی حالت میں گیا؟ یا ناراضی کی حالت میں کہ عزیز علام سے تمہاری شکایت کرے؟ ہائے میرا احساس! کوئی اپنے آپ کو کیسے روزہ دار شمار کر لیتا ہے جو دن بھر غیبت کرتا ہے؟ اور بھائیوں کا گوشت کھاتا ہے؟ یا کیسے اپنے آپ کو اعتکاف میں سمجھتا ہے جبکہ اس کا دل ایک جگہ اور جسم دوسری جگہ ہوتا ہے؟ یا اس کی نماز کیسے قبول کی جائے گی، جو نشہ میں غافل ہو؟ خواہشات نفسانی کے سمندروں میں غرق ہے؟ یا اس شخص کا قیام کیسے لکھا جائے گا جس نے اپنے نفس اور دل کو خطاؤں کے راستے میں رات بھر جگایا۔ ہمیں افسوس ہے کہ ایک مہمان جس کے آنے پر ہم نے اس کا احترام نہیں کیا۔ ہمیں افسوس ہے خیر و بھلائی کے اس موسم پر جس سے ہم نے نہ کوئی فائدہ اٹھایا، نہ امیدیں قائم کیں۔ اور نہر فرات پر ندامت کہ ہم نے اس سے وہ پانی نہیں پیا جو ہمیں پیاس میں سکون عطا فرمائے۔ اور حسرت ہے اس رفیق شفیق پر کہ ہم نے اس کو چھوڑ دیا اور وہ چلا گیا۔ الوداع الوداع! اے قلوب کی طہارت کے مہینے! الفراق الفراق! اے گناہوں کے کفارہ کے مہینے الوداع الوداع! اے تراویح اور تسبیحات کے مہینے! الفراق الفراق! اے قندیلوں اور چراغوں کے مہینے! الوداع الوداع! اے معاصی اور سیئات کے کفارہ کے مہینے! الفراق الفراق! اے بر و حسنات کو بڑھانے کے مہینے الوداع الوداع! اے رب العالمین کے سامنے روزہ داروں کے لیے گواہی دینے والے! الفراق الفراق! احسن الخالقین کے سامنے ان کی شفاعت کرنے والے! اے مسلمانوں کی جماعت! اللہ کے لیے ہر مصیبت سے تعزیت ہے اور ہر اطاعت کا بدل ہے۔ اس لیے اللہ ہی پر یقین رکھو اور اس سے امید رکھو اور جو کچھ فوت ہو گیا اس کا تدارک کرو۔ آنے والے امور کی اصلاح سے اور اللہ سے مغفرت طلب کرو کہ وہ توبہ قبول کرنے والا اور بہت زیادہ بخشنے والا ہے۔ اور اس کے مہلت دینے پر بے فکر ہو کر مت بیٹھو کہ وہ ہمیشہ غالب اور قہار رہا ہے اور رہے گا۔ میں اللہ کی پناہ چاہتا ہوں شیطان مردود سے۔ اور صبر کرنے والوں کو بشارت دو کہ ان پر جب کوئی مصیبت آتی ہے تو کہتے ہیں

إنا لله وإنا إليه راجعون۔ ہم اللہ ہی کے لیے اور اس کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ وہی ہیں جن پر ان کے رب کی طرف سے صلوات اور رحمت ہیں۔ اور وہی ہدایت پائے ہوئے ہیں۔ اور جان لو کہ صدقہ فطر واجب ہے ہر آزاد مسلمان پر جو اپنی ضرورتوں سے زیادہ کے نصاب کا مالک ہو۔ اگر چہ وہ ملکیت بڑھنے والی نہ ہو۔ اس پر ایک سال گزر چکا ہو اپنی طرف سے اپنے بچہ کی طرف سے اور اپنے غلام اور باندی کی طرف سے فی کس نصف صاع گیہوں یا ایک صاع جو، اور اس کی ادائیگی کا افضل ترین وقت عید کے دن فجر کے بعد سے دن چڑھنے سے پہلے ہے، نماز کے لیے جانے تک۔ تو جس نے اس کو ادا کر دیا بہتر ہے۔ ورنہ اس کو اب ادا کر دو، میں تم سے اپنی یہ بات کہتا ہوں۔ اور اللہ عظیم سے استغفار کرتا ہوں۔

خطبہ عید الاضحی

اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اللہ سب سے بڑا ہے۔ اللہ سب سے بڑا ہے اور اللہ ہی کے لیے تمام تعریفیں ہیں۔ پاک ہے وہ ذات جو لوگوں کو عدم سے وجود میں لائی اور ان پر احسان عام کیا۔ اور ان میں سے مسلمانوں کو آخرت کی نعمتوں اور جنت میں داخلہ کے لیے خاص کیا۔ اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اللہ سب سے بڑا ہے۔ اللہ سب سے بڑا ہے اور اللہ ہی کے لیے تمام تعریفیں ہیں۔ پاک ہے وہ ذات جس نے ان کی طرف خود انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کو مقامات عرفان کی ہدایت دے۔ اور ان کو اپنی زبان سے شریعت کے قوانین اور حکمتوں اور قرآن کی تعلیم دے۔ اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے۔ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ اور اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے اور اللہ ہی کے لیے تمام تعریفیں ہیں۔ پاک ہے وہ ذات جس نے آپ کی امت اور آپ کے دین کو تمام امتوں اور دینوں پر فضیلت بخشی۔ اور ان سے بوجھ اور دشواریوں کو دور کر دیا اور ان کو بتوں کی گندگی سے پاک کر دیا۔ اللہ سب سے بڑا ہے۔ اللہ سب سے بڑا ہے۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اللہ سب سے بڑا ہے۔ اللہ سب سے بڑا ہے اور اللہ ہی کے لیے تمام تعریفیں ہیں۔ پاک ہے وہ ذات جس نے قربانی کرنے والوں سے ہر بال کے

بدلہ اپنے فضل واحسان سے ایک نیکی کا وعدہ کیا، اور قربانی کے دن خون بہانے کو سب سے زیادہ پسندیدہ عمل قرار دیا۔ اس نے اس زمین کو قبول کر لیا جہاں یہ عمل واقع ہو۔ اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اور اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے اور اللہ ہی کے لیے تمام تعریفیں ہیں۔ پاک ہے وہ ذات جس کی نعمتوں کی گنتی نہیں کی جا سکتی، اگرچہ ہر انسان اپنا سارا زور لگا لے اور اس کے ہر بال میں ہزار منہ ہوں اور ہر منہ میں ہزار زبان ہوں۔ اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے اور اللہ ہی کے لیے تمام تعریفیں ہیں۔ پاک ہے وہ ذات جس کی عظمت سے آسمان چٹخنے لگے اور چاند وسورج اس کے حکم کے تابع ہو گئے۔ اور فرشتوں نے اس کے خوف سے تسبیح بیان کی۔ اور اسی کے جلال کے لیے دونوں بھاری مخلوق جھک گئیں۔ اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے اور اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے، اور تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں۔ پاک ہے وہ ذات جس کے لیے عظمت اور کبریائی ہے اور نعمتیں اور نشانیاں ہیں۔ اور وہ بہت مہربان ہے، اور وہ اپنے بندوں پر غالب ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ پاک ہے۔ غالب ہے، احسان کرنے والا ہے۔ اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور اللہ سب سے بڑا ہے۔ اللہ سب سے بڑا ہے اور اللہ ہی کے لیے تمام تعریفیں ہیں۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ وہ اکیلا ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔ یہ خالص گواہی ہے دل سے اور میں گواہی دیتا ہوں کہ سیدنا محمد اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ وہ سب سے افضل ہیں جن کو دلائل اور فرقان کے ساتھ بھیجا گیا۔ اللہ ان پر اور ان کی آل واصحاب پر اس وقت تک رحمتیں فرمائے جب تک زمانہ چلتا ہے اور رنگ بدلتے رہیں۔

اما بعد! میں تمہیں اللہ کے تقویٰ کی وصیت کرتا ہوں اور تمہیں اللہ کی نافرمانی سے بچنے کی تلقین کرتا ہوں۔ اور تمہیں یاد دلاتا ہوں جس حالت میں اللہ کے انبیاء تھے، اللہ کی اطاعت میں جان ومال صرف کرنے میں۔ روایت ہے کہ ابراہیم صلوات اللہ علیہ وسلامہ

کے پاس خواب میں رب العالمین کی طرف سے آنے والا آیا اور آپ کو حکم دیا کہ اپنی سب سے محبوب شے کو ذبح کر کے اللہ کا قرب حاصل کریں جیسا کہ رب عزوجل نے فرمایا: لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون. "تم نیکی اس وقت تک نہیں پا سکتے جب تک اپنی پسندیدہ شئے کو خرچ نہ کر دو۔" (آل عمران:۹۲) پھر آپ نے اپنے امر میں ترویہ کے دن سوچ بچار کیا۔ پھر عرفہ کے دن سمجھ لیا کہ مراد ان کے بیٹے کو ذبح کرنا ہے۔ اور یہ ایک پوشیدہ راز ہے۔ چنانچہ اسماعیل کو ذبح کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا۔ اور خوش دلی سے قبول کیا۔ اور ان کے بیٹے کی محبت رکاوٹ نہیں بنی۔ اور جو لوگ دوسروں پر بازی لے جانا چاہتے ہوں۔ ان کو اس چیز کو حاصل کرنے میں بازی لے جانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ پھر اسماعیل سے ذکر کیا تو انہوں نے اللہ کے حکم کے سامنے سر جھکا دیا۔ اور بہتر طور پر تسلیم کر لیا اور مخلص مشتاقین کا یہی طریقہ ہوتا ہے، اور جب چھری ان کے گلے پر رکھی۔ فرشتے ان پر رحمت کرتے ہوئے لرز اٹھے۔ اور ابراہیم نے جس امر کا ان کو حکم دیا گیا تھا، اس سے ہٹ کر کسی اور راہ پر چلنے سے انکار کر دیا۔ اور یہی فضل مبین ہے۔

اے اللہ کے بندو! تمہارے لیے لازم ہے کہ گناہوں سے تعلق ختم کر لو۔ دوسروں کو نصیحت کرنے سے پہلے خود اس پر عمل کرو۔ وقت آ گیا ہے کہ اولاً خود علام الغیوب کی طرف رجوع کرو۔ اس کے بعد ہی تمہارا اعتبار کیا جائے گا۔ انہوں نے اپنی جانیں اللہ کے لیے لڑا دیں اور تم درہموں میں بخل کر رہے ہو۔ انہوں نے اپنے قلوب کو اللہ کے لیے خالص کر لیا اور تم ہر وادی میں گم رہتے ہو۔ انہوں نے تو اپنے حصے اللہ کے لیے فنا کر دیئے اور تم اپنے حصوں میں کھوئے ہوئے ہو۔ انہوں نے اللہ کے ماسوئی سب سے برأت کر دی اور تم تعلقات کی کڑیوں میں مقید ہو۔ اور اللہ کی طرف سے اس وقت تمہاری فضیحت ہو گی جب تمہارے اسرار کی آزمائش کی جائے گی۔ اور جس کا تم دعویٰ کرتے ہو، اس کا امتحان لیا جائے گا۔ اور تمہیں اس کے سامنے توفیق دی گئی جب تم ننگے پاؤں، ننگے بدن اور غیر مختون تھے جیسے تمہیں شروع میں ظاہر کیا ویسے ہی تم لوٹو گے۔ اور تمہارے کانوں کے پردوں کو اس کے اس قول نے کھٹکھٹایا۔ افحسبتم انما خلقناکم عبثاً وأنکم إلینا لا ترجعون "کیا

تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم نے تمہیں فضول ہی پیدا کیا ہے اور تمہیں ہماری طرف کبھی پلٹنا نہیں ہے۔" (المومنون:۱۱۵)

ہر گز نہیں اللہ کی قسم! اگر ہمارا رب ہم پر رحم نہ کرے تو ہم ہلاک ہو جائیں۔ اور اگر ہمارا رب ہمیں نہ بخشے تو ہم خسارہ اٹھانے والوں میں ہو جائیں۔ بیشک سب سے اچھا کلام اللہ کا کلام ہے۔ اور سب سے اچھا راستہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت ہے۔ بہترین تصور عوازم (پختہ ارادے) ہیں اور بدترین امور محدثات بدعات ہیں۔ جس کے لیے امانت نہیں، اس کا ایمان نہیں۔ جس کا عہد نہیں، اس کا دین نہیں۔ اور تیرا رب اپنے بندوں کے گناہوں سے آگاہ ہونے کے لیے کافی ہے۔ میں اللہ کی پناہ چاہتا ہوں شیطان مردود سے۔ "پھر جب ان دونوں نے سر تسلیم خم کر دیا اور ابراہیم (علیہ السلام) نے بیٹے کو ماتھے کے بل گرا دیا اور ہم نے ندا دی کہ اے ابراہیم! تم نے خواب کو سچ کر دکھایا۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسے ہی جزا دیتے ہیں۔ یقیناً یہ ایک کھلی آزمائش تھی، اور ہم نے ایک بڑی قربانی فدیہ میں دے کر بچہ کو چھڑا لیا۔" (الصفت:۱۰۳تا۱۰۷) اور جان لو کہ ہر آزاد، مسلم، مقیم، غنی پر واجب ہے کہ وہ عید کی نماز کے بعد تین دن تک قربانی کرے۔ ایک فرد کی طرف سے ایک بکری کافی ہے، اور ایک گائے یا ایک اونٹ سات کی طرف سے کافی ہے۔ اور بکری ایک سال کی۔ گائے دو سال کی اور اونٹ پانچ سال کا کافی ہے۔ یہ سب جائز ہیں اگر پیدائش سے ہی ان کے سینگ نہ نکلے ہوں اور خصی بھی۔ اور اتنا کمزور جائز نہیں کہ جس کی ہڈی میں گودا ہی نہ ہو اور ایسا لنگڑا جو چل نہ سکے اور جس کے ایک تہائی سے زیادہ دونوں کان کٹے ہوئے ہوں یا آنکھ پھوٹی ہوئی ہو۔ اور شہر میں مقیم ہر شخص پر واجب ہے کہ یوم عرفہ کی فجر سے آخر ایام تشریق تک ہر فرض نماز کو جماعت کے ساتھ پڑھنے کے بعد ایک بار یہ کہے اللّٰہ اکبر اللّٰہ اکبر لا إله إلا الله والله أكبر الله أكبر ولله الحمد "اور میں اپنے لیے اور تم سب کے لیے بھی اور تمام مسلمانوں کے لئے استغفار، مغفرت طلب کرتا ہوں، تم بھی اس سے گناہوں کی بخشش کی دعا مانگو۔ وہ بہت بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

☆☆☆

البُدورُ البازغه

امام شاہ ولی اللہ الدہلویؒ

اردو ترجمہ
ڈاکٹر قاضی مجیب الرحمٰن

نظرثانی
جسٹس مولانا عبدالقدوس قاسمی

تحقیق وتعلیق:
مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی

شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی

موجوداتِ عالم کے مراتبِ کمال اور نوعِ انسانی کی فضیلت کا راز	۲۳۴
نامی، حیوانی اور دیگر صورتوں کے مداراتِ وجود	۲۳۵
ایک غلط فہمی کا ازالہ	۲۳۷
فصل: ۳	۲۳۸
انسان کی صورتِ نوعیہ اور اس کے طبعی تقاضوں کا بیان	۲۳۸
انسان کی طبیعت، اور رحمٰن جل وعلا سے فیضان کی کیفیت	۲۳۹
ہر طبیعت نوعی اپنے امام سے وابستگی رکھتی ہے	۲۴۰
عالم مجرد اور اجسام کے درمیان قوتِ متوسطہ	۲۴۱
امام الانسان اور اس کی تفصیل	۲۴۳
تقدیر کا مسئلہ	۲۴۴
عالمِ امر دعقل کی حقیقت	۲۴۵
عالمِ مجرد و عالمِ اسباب میں قوتِ متوسطہ کے مظاہر	۲۴۵
انسانی وجود چار عالموں میں ہے	۲۴۶
پہلا مقالہ:	۲۴۷
فصل: ۱	۲۴۸
ہر صورتِ نوعیہ حیوانیہ کی دو قسم کی خصوصیات ہوتی ہیں	۲۴۸
انسانوں کے باہمی تفوق کے اسباب	۲۵۱
شجاعت وغضب اور دیگر خصال کی حقیقت	۲۵۲
رائے کلی اور ظرافت کے آثار	۲۵۴
انسانی عقل کی دو قسمیں	۲۵۶

فہرست عنوانات

افتتاحیہ	۲۱۳
فصل:۱	۲۱۵
مبحثِ وجوداور تحقیق انیق	۲۱۵
جملہ موجودات بلاواسطہ وجود اقصی کے محتاج ہیں	۲۱۶
صادرِاوّل کی تحقیق	۲۱۷
اسمائے حسنی میں الرحمٰن ہی نظام وحدانی کا مبدأ ہے	۲۲۰
کائنات میں کارفرما قوتوں کی اقسام	۲۲۱
موجودات کے معرض وجود میں آنے کا دارومدار، اسباب وعلل پر ہے	۲۲۴
فصل:۲	۲۲۶
جواہر واعراض کا امتزاج اور کائنات کا انقسام	۲۲۶
نفوس پرصورتوں کا اطلاق نہ کرنا غلط نظریہ ہے	۲۲۸
موجودات کا ظہور نو اسباب اختلاف اور وجوہِ اختلاف کی بنا پر فیضانِ الٰہی سے ہوتا ہے	۲۳۱
موجودات میں فیضان الٰہی اور تفوق کے لیے استعداد ذاتی کی اہمیت	۲۳۳

فصل:۲	۲۵۸
نفسِ ناطقہ نسمہ پر اعتقاد رکھتی ہے	۲۵۸
نسمہ کی حقیقت	۲۵۸
پانچ ظاہری حواس اور پانچ باطنی حواس	۲۵۹
احکام قلب	۲۶۲
فخر اور بلند پروازی	۲۶۳
رضا اور ناراضگی	۲۶۴
خوشی اور غم	۲۶۴
فصاحات و دیانات	۲۶۵
فصل:۳	۲۶۹
حکمت کی تعریف	۲۶۹
فصل:۴	۲۷۱
ارتفاقاتِ چارگانہ کے حقائق پر مجمل بحث......	۲۷۱
ارتفاقات ثانی کے حکمِ خمسہ	۲۷۳
ارتفق ثالث	۲۷۴
ارتفاق رابع	۲۷۵
ارتفاقات کے بارے میں دو نا قابلِ فراموش نکتے	۲۷۶
ارکان ومکملات ارتفاقات کی تعریف وتشرح	۲۷۶
ھدی صالح	۲۷۸
ھدی صالح اور صالح معاشرہ کی روح باہمی محبت اور فلاحِ عام ہے	۲۷۸
نظام ارتفاقات میں خلل واقع ہونے کے اسباب دو وجوہ	۲۷۹

فصل:۵ ۲۸۱
ارتفاقِ اوّل کے لوازم ۲۸۱
غذائی اجناس کی پہچان اور اکل وشرب کے مناسب طریقوں کا علم ۲۸۲
جو پانی وگلہ بانی ۲۸۳
مکان ولباس ۲۸۳
زنِ منکوحہ کی تعیین ۲۸۳
فصل:٦ ۲۸۵
ارتفاقِ ثانی سے متعلق حکمتوں کی تفصیل،حکمت معاشی کی تعریف ۲۸۵
اصولی ابواب ۲۸۵
اقسام الناس بلحاظ حکمتِ معاشیہ ۲۸۵
حکمتِ معاشیہ کے اصولی ابواب کی تشریح طیب اشیا کھانا پینا ۲۸٦
تنعم پسندی کے بارے میں دو متضاد نظریے ۲۸۷
وجہ تطبیق ۲۸۷
کھانے کے آداب ۲۸۸
آداب نظافت ۲۸۹
زینت وآرائش ۲۸۹
لباس ۲۹۰
مکان ومسکن ۲۹۱
سفر ۲۹۱
نشست وبرخاست اور چلنے پھرنے کے آداب ۲۹۲
صنفی تعلقات کے آداب ۲۹۲

آدابِ نوم	۲۹۳
مرض کے آداب	۲۹۳
آدابِ کلام	۲۹۵
فصل: ۷	۲۹۶
الحکمة المنزلية (تدبیر منزل)	۲۹۶
حکمت منزلیہ کی تعریف	۲۹۶
تدبیر منزل کے حصے	۲۹۶
اسباب واسرار تعیین زنِ منکوحہ	۲۹۷
مرد اور عورت کی جسمانی اور ذہنی قوتوں میں اختلاف اور اس کے فائدے	۲۹۸
مدارجِ معیشت میں اختلاف فطری ہے	۳۰۰
والدین اور اولاد کا تعلق	۳۰۱
ازدواج کی ضروریات اور آداب	۳۰۲
تدبیر منزل کی خرابیوں کو دور کرنے کے طریقے	۳۰۳
حکمتِ عدت	۳۰۴
ضرورت قضائے قاضی	۳۰۵
حقوق وآداب برائے آقا وغلام	۳۰۵
اولاد کے حقوق وواجبات	۳۰۶
سربراہِ خاندان کے فرائض وحقوق	۳۰۸
انسان مدنی الطبع اور فطرتاً اجتماع پسند ہے	۳۰۹
فصل: ۸	۳۱۱
الحکمة الاکتسابية (فنِ معاملات)	۳۱۱

حکمتِ اکتسابیہ کا مفہوم	۳۱۱
مختلف پیشوں کا ظہور میں آنا	۳۱۳
اصولِ کسب اور اہم ذرائعِ معاش	۳۱۳
اختلافِ مکاسب کے وجوہ وعوامل	۳۱۴
پیشہ اختیار کرنے کے متعلق ہدایات	۳۱۴
فصل:۹	۳۱۷
مبادلات وتبرعات	۳۱۷
تبادلہ اشیا کے اہم جائز ذریعے	۳۱۷
تبادلہ اشیا کے لیے ضروری امور	۳۱۸
حرام ذرائع ومبادلات	۳۱۹
فصل:۱۰	۳۲۱
عقد مزارعت اور عقد مضاربت	۳۲۱
فصل:۱۱	۳۲۳
ارتفاق ثالث کی تحقیق اور اس کی اقسام کی تفصیل	۳۲۳
تمدن کی ضرورت	۳۲۳
امام المسلمین کے فرائض	۳۲۴
پہلی ضرورت۔محکمۂ قضا وعدلیہ	۳۲۴
دوسری حاجت۔شہری انتظامیہ	۳۲۵
تیسری حاجت۔جہاد	۳۲۵
چوتھی حاجت۔کوتوال (شہری نظم)	۳۲۶
پانچویں حاجت۔امور مذہبیہ کی نگرانی	۳۲۸

امام کی ضرورت، شرائط اور امتیازی صفات	۳۲۸
تمدن کے اقسام و مراتب	۳۳۰
فصل ۱۲:	۳۳۱
امام کے اخلاق سبعہ	۳۳۱
امامت کے آداب	۳۳۲
فصل ۱۳:	۳۳۵
ارتفاق ثالث کے اقسام پنجگانہ کے احکام کی تفصیل	۳۳۵
آداب قضا و قاضی	۳۳۵
چند اہم کلیاتِ قضا	۳۳۷
فصل ۱۴:	۳۳۹
شہری انتظام کے فساد اور خرابیوں کے اسباب و وجوہ	۳۳۹
شہری انتظام میں کئی وجوہ سے خرابی پیدا ہو سکتی ہے	۳۳۹
فصل ۱۵:	۳۴۲
امیر کی سیرت و کردار، اعداء سے اس کا برتاؤ	۳۴۲
تعیین لشکر اور دیگر امور لائقہ سے متعلق بحوث	۳۴۲
جنگ سے پہلے	۳۴۲
دوران جنگ	۳۴۳
فتح و کامرانی کے بعد	۳۴۵
فصل ۱۶:	۳۴۷
تعلیم و تربیت کی قسمیں	۳۴۷
معلم کے اوصاف حمیدہ	۳۴۸

وعظ وتذکیر کی بنا خطابیات پر ہے	۳۴۸
ارکان وعظ	۳۴۹
معلم الخیر کے اقسام	۳۴۹
فصل: ۱۷	۳۵۱
متولی ونقیب کے آداب وفرائض	۳۵۱
اموالِ متروکہ کی مناسب تقسیم	۳۵۱
فقراو مساکین کی اعانت	۳۵۲
ناتواں مسافروں کی دستگیری	۳۵۳
ضروری اجتماعی اداروں کی تشکیل وتعمیر	۳۵۳
فصل: ۱۸	۳۵۴
امام کے معاون	۳۵۴
معاونوں کی ضرورت اور بنیادی شرائط	۳۵۴
امام یا بادشاہ کے سات معاون	۳۵۴
معاونین پر کڑی نظر رکھنا امام کا فرض ہے	۳۵۶
امام اور معاونین امام کی تنخواہ قوم پر واجب ہے	۳۵۶
امام کے لیے بہترین ذریعۂ معاش	۳۵۷
فصل: ۱۹	۳۵۸
ارتفاقِ رابع	۳۵۸
خلیفۂ اعظم کی ضرورت	۳۵۸
خلیفۂ اعظم کے آداب، اخلاق	۳۵۹

فصل:۲۰	۳۶۲
تحقیق حقیقتِ رسم اور بہتر رسوم کا بیان	۳۶۲
تقلید فطری خاصہ ہے	۳۶۲
ائمہ ومقلدین	۳۶۳
تقلید ورسم کی پابندی خاصۂ حیوانی ہے	۳۶۳
پابندی رسم ورواج تہذیب انسانی کے لیے ضروری ہے	۳۶۳
تقلید رسم کے لیے خارجی مؤید کا ہونا ضروری ہے	۳۶۳
الناس علی دین ملوکھم	۳۶۴
افسادِ رسوم کے وجوہ واسباب	۳۶۴
بہترین رسوم	۳۶۶
معاشی رسوم کے مخالفین	۳۶۶
فصل:۲۱	۳۶۹
نظم ارتفاقات کے وجوہِ فساد واصلاح	۳۶۹
ان ارتفاقات میں دو وجہوں سے خرابی پیدا ہوتی ہے	۳۶۹
فصل:۲۲	۳۷۲
انسانی طبائع کا بیان	۳۷۲
فصل:۲۳	۳۷۸
لوگوں میں نظام ارتفاقات کے قیام کے سلسلے میں ایک اہم تنبیہ	۳۷۸
علوم اخلاق اور ارتفاقات فطرت انسانی کا خاصہ ہیں	۳۷۸
یہ علوم موروثی نہیں ہیں	۳۷۸
اخلاق وارتفاقات کے فطری ہونے سے انکار کرنے والے دو گروہ	۳۷۹

نظام تمدن کی صحت و بیماری	۳۸۰
معاشرتی زندگی کے مدارج اور ارتفاقات ثالث کے مراتب	۳۸۱
تمدن کی موت	۳۸۲
دوسرا مقالہ:	۳۸۳
فصل:۱	۳۸۴
معرفتِ باری تعالیٰ کا بیان جو فطرتِ انسانی میں ودیعت رکھی گئی ہے	۳۸۴
اسی قضیہ کے عدم اعمال کی استثنائی صورت اور اس کے وجوہات	۳۸۵
حیوانوں پر انسانوں کی فوقیت کی دو وجہیں	۳۸۵
استعداد خداشناسی انسانی فطرت میں ودیعت ہے	۳۸۷
اختلاف خداشناسی میں نہیں تعینِ خدا میں ہے	۳۸۷
معرفتِ الٰہی کے حصول کا ذریعہ عقل نارسا نہیں بلکہ قلب سلیم ہے	۳۸۹
باب ہذا کی تفصیل	۳۸۹
خداشناسی بذریعہ عقل معاشی	۳۹۰
توضیح مطلب بذریعۂ دلیل منطقی	۳۹۱
معرفت باری تعالیٰ بذریعہ عقل معاشی اور اخلاق وعلوم	۳۹۲
سومعرفت کے اسباب واقسام	۳۹۳
فصل:۲	۳۹۵
اللہ تعالیٰ کے اسماوصفات کا اجمالی اثبات اور زبان متعارف میں ان کی......	۳۹۵
وجودحق پر کلی وجزوی اطلاق نہیں ہوسکتا وہ کلی وجزئی سب پر محیط ہے	۳۹۵
اس معرفتِ تفصیلیہ کے ادراک کے دورُخ	۳۹۵
واجب الوجود کا علم اشیا ذاتی مقدس اور محیط ہوتا ہے	۳۹۶

الفاظِ مستعملہ کی حقیقت	۳۹۷
لسانی اور عقلی علوم کے ساتھ باری تعالیٰ کو متصف کرنے میں کوئی حرج نہیں	۳۹۸
معرفتِ الٰہی کی وجوہِ تعبیر	۴۰۱
فصل: ۳	۴۰۴
اللہ تعالیٰ کی صفات حسنہ کی تشریح	۴۰۴
فصل: ۴	۴۰۸
اسمائے حسنٰی کی مزید تشریح	۴۰۸
فصل: ۵	۴۱۵
"وکم من آیۃ فی السمٰوات والارض" کی تفسیر	۴۱۵
آیات الٰہیہ کے اقسام اور فوائد	۴۱۵
فصل: ۶	۴۱۸
ایمان بالقدر کے ثبوت	۴۱۸
اثبات تقدیر کی فطری اور عقلی دلیلیں	۴۱۸
عقلی دلیل	۴۱۸
فصل: ۷	۴۲۰
حقیقت انسان کی تحقیق، یا ایمان واحسان کا فرق	۴۲۰
درجۂ احسان پر فائز ہونے کا طریقہ	۴۲۱
احسان کے مراتب ثلاثہ	۴۲۲
فطرت انسانی کا مفہوم	۴۲۲
فصل: ۸	۴۲۳
معرفتِ الٰہی اور فطرتِ انسانی کی راہ میں حجاباتِ ثلاثہ	۴۲۳

حجب کوان حجابات ثلاثہ میں منحصر سمجھنے کا راز	۴۲۶
حجب ثلاثہ کا ازالہ	۴۲۶
فصل:۹	۴۲۸
احسان سے عبادات کے پیدا ہونے کا مجمل بیان	۴۲۸
فصل:۱۰	۴۳۲
احسان سے عبادات کے پیدا ہونے کا تفصیلی بیان	۴۳۲
بہترین نماز	۴۳۳
دعا (اس کی حقیقت وصیغے)	۴۳۴
بہترین اوقات دعا	۴۳۵
روزہ۔اس کا فلسفہ اور غرض وغایت	۴۳۶
خوشنودی محبوب حقیقی حاصل کرنے کے مختلف طریقے	۴۳۷
بہترین طریقہ	۴۳۷
زکوۃ۔اس کی حقیقت وفلسفہ	۴۳۸
حج۔اس کی حقیقت وفلسفہ	۴۳۹
بہترین صورت حج	۴۴۰
ایمان ونذور (قسمیں کھانا اور منت ماننا)	۴۴۰
استماع اخبار وتلاوت کتاب معبود	۴۴۱
فصل:۱۱	۴۴۲
شرک کی حقیقت اور اس کے اقسام	۴۴۲
شرک کی حقیقت اور اسباب	۴۴۵
مشرکین کے اقسام	۴۴۶

یہود ونصاریٰ اور مشرکین عرب ۴۴۷
متوغل پیر پرست ۴۴۷
فصل:۱۲ ۴۵۰
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث کی تاویل ۴۵۰
آمدم برسر مطلب ۴۵۴
تحریف کا صحیح مفہوم ۴۵۵
اندھی تقلید باعث شک ہے ۴۵۶
فصل:۱۳ ۴۵۸
قیامت سے پہلے پیش آنے والے فتنوں کی کیفیت اور قیامت کا اثبات ۴۵۸
کوئی چیز تصرف الٰہی کے بغیر ظہور میں نہیں آسکتی ۴۵۸
فیضان الٰہی مناسب اور مشابہ استعدادات پر منحصر ہے ۴۵۹
اللہ سے جو چیز صادر ہوئی وہ خیر مطلق ہے شر اضافی شے ہے ۴۶۱
اسباب ومسببات کا نظام حکمت پر مبنی ہے ۴۶۲
اسباب ومسببات کے متعلق اہل معرفت کا نظریہ ۴۶۳
ظہور واقعات کے بارے میں اہل معرفت اور..... ۴۶۴
فصل:۱۴ ۴۶۶
اللہ تعالیٰ کی ذاتِ اقدس جو خیر محض ہے کس طرح شر کا مصدر ہو سکتی ہے ۴۶۶
تیسرا مقالہ ۴۶۹
فصل:۱ ۴۷۰
ملتوں اور شریعتوں کا بیان ۴۷۰
ملت کی حقیقت اور اس کے ظہور میں آنے کے اسباب ۴۷۰

ملت کی حقیقت وتعریف ۴۷۰
ملتوں کے ظہور کے احکام ۴۷۲
انقیاد ملت کا جذبہ فطری ہے ۴۷۳
کسی خاص ملت کی پابندی کے وجوہات ۴۷۴
ہر ملت کے لیے کسی بنیادی دستور کی ضرورت ہے ۴۷۵
فصل:۲ ۴۷۶
ملتِ عالیہ کا بیان ۴۷۶
فصل:۳ ۴۸۲
واجب الاتباع ملت اور ماہیات ثلاثہ کا بیان ۴۸۲
کوۂ اسلامیہ (روزن) جو علوم وجدانیہ کا سرچشمہ ہے ۴۸۲
ابوالبشر آدمؑ اور دیگر انبیائے کرام کو...... ۳۸۲
جاہلیت اولی اور ظہور آدم ثانی ۴۸۴
ملت ہودؑ اور ملت صالحؑ کا ظہور ۴۸۵
دیگر اقوام عالم کا حال ۴۸۶
ملحدانہ ومشرکانہ ملتوں کا ظہور ۴۸۶
پہلی جاہلیت اور دوسری جاہلیت میں فرق ۴۸۸
ملتِ ابراہیمی کا ظہور ۴۸۸
ملت موسوی کا ظہور ۴۸۹
ملت محمدی کا ظہور ۴۹۰
فصل:۴ ۴۹۲
ملت حنیفیہ کی حقیقت (اور اس کی تعلیمات کا ملخص) ۴۹۲

ملت حنیفیہ کے ارکان اور اس کے اصول	۴۹۲
ملت حنیفیہ کے متوارث اشباح وصور	۴۹۶
فصل:۵	۴۹۷
علم تشریع اور اس کے قوانین	۴۹۷
صاحب شرع کے طرقِ علاج	۴۹۹
تدابیر	۵۰۴
فصل:۶	۵۰۵
خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت مطہرہ کے مقاصد	۵۰۵
دوسرا مقصد، رسوم کی اصلاح	۵۰۵
تیسرا مقصد، ارتفاق ثالث کا قیام ہے	۵۰۷
منجملہ ان مقاصد کے ایک مقصد (یعنی پانچواں)	۵۰۹
ساتواں مقصد: ایک مقصد لوگوں کو فتنۂ قبر اور فتنۂ محشر سے بچانا، یہ غلط ہے	۵۱۰
فصل:۷	۵۱۲
دین اسلام کے اصول	۵۱۲
اجزائے ایمان وشرائط دخول اسلام	۵۱۲
کفر ونفاق کی حقیقت اور اس کی دو قسمیں	۵۱۴
علامات نفاق	۵۱۵
علاج مرض نفاق	۵۱۶
دین محمدی کی تیسری اصل	۵۱۶
دین محمدی کا چوتھا اصول مشتبہات سے پرہیز کرنا ہے	۵۱۷
متشابہات کے بارے میں توقف سے کام لیا جائے	۵۱۹

فصل:۸	۵۲۰
نظافت کی تشریح	۵۲۰
طہارت کی قسمیں	۵۲۰
طہارت عن الخبث	۵۲۱
استنجا کے آداب	۵۲۱
نجات کی حقیقت اور اس کی تطہیر کا طریقہ	۵۲۲
حدث کا مفہوم اور اس کی صورتیں	۵۲۳
وضو کے ارکان وسنن	۵۲۴
غسل، اس کے ارکان اور اسبابِ وجوب	۵۲۶
تیمم - اس کے مقاصد واحکام	۵۲۸

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

افتتاحیہ

تعریف اس اللہ کی جس نے انسان کو پیدا کیا۔ حالانکہ اس سے قبل عالم وجود میں اس کا نام ونشان تک نہ تھا۔ اور اسے تحصیل معاش اور تدابیر نافعہ کے لیے مقرر کردہ الہامی علوم اور فطری طریقوں سے نوازا۔ اور (اس پر مزید انعام فرمایا کہ) باری تعالیٰ نے اس کو ان باتوں کا بھی الہام فرمایا، جن کے ذریعے وہ بارگاہ الٰہی کا قرب حاصل کر سکے۔ اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ ان فطری علوم اور موہوبہ الہامات کی بدولت خالقِ حقیقی نے نوعِ انسانی کو ابنائے جنس (یعنی دیگر حیوانات) سے ممتاز فرمایا۔ اور اپنی اکثر (بلکہ سب) مخلوقات (ارضی وسماوی) پر اس کو بڑی فضیلت عطا فرمائی۔ باری تعالیٰ نے مزید احسان یہ فرمایا کہ وقتاً فوقتاً حسب ضرورت انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام بھیجے۔ اور ان کی زبانی انسان کو باتیں یاد دلائیں، جو اس کی فطرت میں ودیعت کر رکھی تھیں۔ اور یہ سب کچھ پہلے سے مقدر ہو چکا تھا۔

میں (ولی اللہ) اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود حقیقی نہیں۔ اور وہ ایک ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ اور اس بات کی بھی گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے بندے اور پیغمبر ہیں۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے بشیر (عقائدِ صحیحہ اور اعمالِ صالحہ کے اچھے نتائج کا بشارت دینے والا) اور نذیر (عقائد فاسدہ اور اعمال شنیعہ کے انجامِ

بد سے ڈرانے والا) بنا کر بھیجا ہے۔ آپؐ کی ذات ستودہ صفات پر اور آپؐ کے آل واصحاب پر اللہ تعالیٰ کے ہزاروں ہزاروں درودوسلام ہوں۔

اما بعد! بندۂ عاجز ولی اللہ بن عبدالرحیم (اللہ تعالیٰ دونوں باپ بیٹے کو اپنے لطف وکرم سے نوازے) عرض کرتا ہے کہ زیر تالیف کتاب ان تفہیماتِ الٰہیہ پر مشتمل ہے جو خدائے مہربان کے فیضانِ عنایت سے پہلے میرے دل پر القا ہوئیں، پھر وہاں سے زبان اور پھر سرانگشت (پوروں) پر (تحریر وقلم کی صورت میں) ظاہر ہوئیں اور عصرِ حاضر (کی استدلالی ذہنیت) کا تقاضا ہوا کہ ان کو برہان ودلیل کے ساتھ پیش کیا جائے۔ میں نے اس کا نام ''البدور البازغہ'' رکھا ہے جو ایک مقدمہ اور تین مقالوں پر مشتمل ہے۔

اللہ تعالیٰ سے میری دعا ہے کہ وہ اس کتاب کو اپنے بندوں کے لیے نفع بخش بنادے۔ اللہ تعالیٰ میرے لیے کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے۔ اور وہی خدائے بلند وبرتر اور قوت وطاقت کا مالک ہے۔ غلطیوں سے بچنے اور سیدھی راہ پر چلنے کی توفیق اس کے سہارے سے ملتی ہے۔

فصل:۱

مبحث وجود اور تحقیق انیق

(یہ نظریہ غلط ہے کہ وجود ایک کلی ہے اور وجود اقصی اس کا ایک فرد ہے)

فلاسفہ کے وہم نادان نے جس مفروضے کو درست اور موجب اطمینان سمجھ کر یہ دعویٰ کیا ہے کہ ''وجود اقصیٰ'' (خدائے بزرگ و برتر کا وجود اور ہستی) وجود (ہستی) کا ایک فرد ہے۔ اور جس طرح کوئی ''کلی[1] '' اپنی جزئیات کا احاطہ کیے ہوئے ہوتی ہے۔ اسی طرح ''وجود اقصیٰ'' پر بھی مطلق وجود (بہ حیثیت کلی) حاوی ہے۔ یہ دعویٰ بالکل غلط ہے۔ اس لیے کہ ''وجود کا مفہوم ہر چند دوسرے اور کسی مفہوم میں بھی اتنی عمومیت نہیں پائی جاتی، بایں ہمہ ''وجود اقصیٰ'' نے اس پر بھی اوپر نیچے ہر جانب سے احاطہ کیا ہے۔ اور اس کے لیے اس گھیرے سے نکلنے کا کوئی راستہ باقی نہیں چھوڑا ہے۔

ہمارے اس دعوے کی دلیل یہ ہے کہ ''وجود'' کو مستقل مفہوم کی حیثیت تب حاصل ہوئی، جب مختلف حقائق کو، جو درحقیقت بے شمار مختلف آثار ونتائج کا مرجع ہیں، مجملاً ملحوظ رکھا گیا۔ جس کے نتیجے میں ہست اور نیست ایک دوسرے سے جدا جدا حقیقتیں نظر آنے لگیں۔ گوان حقائق کو باہم ایک دوسرے سے ممتاز نہیں کیا گیا۔ (کیونکہ حقائق کا باہمی امتیاز اجمالی ملاحظہ سے حاصل نہیں ہوسکتا) الغرض ''وجود'' کا مفہوم حقائق کے مختلف مظاہر میں جلوہ گر ہونے کے باوجود اس اختلاف کو مجمل طور پر ملحوظ رکھنے سے پیدا ہوا مگر حقیقت یہ ہے کہ جملہ حقائق کا مرجع ومآل ایک ہی حقیقت ہے۔ (یعنی حقیقت کبریٰ) اور دوسری تمام

---

[1] (Univrsal)

حقیقتیں اس کے اجمال کی شرح وتفصیل ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب تمام حقیقتیں اس ایک حقیقت کبریٰ میں پوری طرح جذب ہو گئیں تو کیا وجہ ہے کہ مفہوم ''وجود'' جو ان حقائق کی تصریفات، تحویلات، اور اُلٹ پھیر سے پیدا ہوا ہے، اپنے اصل یعنی ''وجود اقصیٰ'' کے مفہوم میں شامل نہ ہو؟

جملہ موجودات بلا واسطہ وجود اقصیٰ کے محتاج ہیں

نیز فلاسفروں کا یہ نظریہ بھی غلط ہے کہ ''وجود اقصیٰ'' کو اس لیے محتاج الیہ سمجھا جاتا ہے کہ سلسلۂ امکان کا انصرام وخاتمہ اسی پر ہوتا ہے۔ چنانچہ اگر اس سے ایک ہی ہستی (مثلاً عقلِ اوّل) صادر ہو، جس سے ایک اور ہستی (مثلاً انسان) صادر ہو۔ تو اس دوسری ہستی (یعنی انسان) اور وجود اقصیٰ (پروردگار) کے درمیان پہلی ہستی (عقل اوّل) حائل ہو جائے گی۔ اور دوسری ہستی کی تمام ضروریات اور لوازمِ حیات اس پہلی ہستی (عقلِ اوّل) سے وابستہ ہوں گی۔ ''وجود اقصیٰ'' سے اس کا کچھ سروکار باقی نہیں رہے گا۔ درآں حالانکہ اس (پہلی ہستی) کے وجود وبقا کا دار ومدار ''وجود اقصیٰ'' پر ہے۔ نہیں، یہ خیال غلط ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کسی ممکن کا ظہور خواہ خود بخود ہو، یا اس کو لبادہ وجود پہنا دیا گیا ہو[1] بہرصورت وہ اپنے تمام احتیاجات میں بلاواسطہ ''وجود اقصیٰ'' کا محتاج ہوگا۔ ہاں اس احتیاج کا تعلق ''وجود اقصیٰ'' کے ان شئون عالیہ سے جن کا تصرف تمام کائنات میں جاری وساری ہے کسی ایک شانِ خاص سے ہوتا ہے۔ ذرا غور وفکر سے کام لیجیے، کہ ایک چیز جو دوسروں سے نکل کر مختلف مگر مخصوص آثار وخواص رکھتی ہے، ان دونوں کے بارے میں ہم (ان کے مشترک خواص کے لحاظ سے) کہہ سکتے ہیں کہ وہ دونوں ایک ہیں۔ مگر جب ہم ان دونوں کے مخصوص آثار وخواص کو دیکھتے ہیں، تو کہہ سکتے ہیں کہ وہ جدا جدا حقیقتیں ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو نفی اور اثبات کے احکام کا ظہور نہ ہوتا، اور تمہیں یہ حکم لگانے کا حق نہ ہوتا کہ فلاں یہ نہیں، فلاں وہ نہیں۔ اور نہ ایک کے خواص کی تخصیص دوسرے سے ممکن ہوتی۔ اور اس صورت میں (جب کہ فلاسفروں کے نظریۂ شمولیت کلی کو صحیح مان لیا جائے،

تو) ''وجودِ اقصیٰ'' (خدائے بزرگ و برتر کی ذات) کو مرکب ماننا پڑے گا۔ وہ عالم ترکیب (اور کائنات) سے بالاتر نہیں ہو گا۔ اور ہم یہ نہیں کہہ سکیں گے، کہ وہ ایک ''حقیقت کبریٰ'' کثیرالوجود نہیں، یعنی یہ کہ وہ ''واحدِ مطلق'' اور ''وجودِ اقصیٰ'' ہے۔ جس پر کسی دوسری حقیقت کو ماورائیت کے لحاظ سے فوقیت حاصل نہیں۔ حق تو یہ ہے کہ ''وحدت حقیقی'' ایک جامع ترین کلمہ ہے۔ جس کا مفہوم کسی دوسرے کلمہ سے ادا نہیں ہو سکتا، اور نہ کوئی دوسری حقیقت اس کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ اگر اسے اسی حالت پر رکھا جائے اور کسی حیثیت سے مقید نہ کیا جائے تو اس کو کسی حکم کا موضوع (منطقی اصطلاح میں) نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اس میں ''یہ ہے'' اور یہ ''نہیں'' تک کی گنجائش نہیں اور کسی کا علم اور کوئی علم اس کے دامنِ ادراک تک نہیں پہنچ سکتا۔ کیونکہ علم درحقیقت تعیین کا دوسرا نام ہے، جو مقام ''اطلاق'' کے منافی ہے۔ جس سے ہر دو نقیض مسلوب ہوتے ہیں اور ضدّین سے اس کی نسبت مساوی ہوتی ہے۔

صادرِ اوّل کی تحقیق

اور یہ ''واحدِ حق'' جس کے کچھ اوصاف ہم نے ذکر کیے ہیں، اس سے صرف ایک ہی شے کا صدور ظہور ہو سکتا ہے اور وہ ہم (فلاسفہ) جس بات پر مطمئن ہے کہ یہ ''صادرِ اوّل'' حقائق میں سے ایک حقیقت ہے۔ بالکل حقیقت کے برعکس اور غلط ہے، مثلاً یہ کہنا کہ ''الف'' ایک حقیقت ہے اور ''ب'' دوسری حقیقت ہے۔ اور اس ''صادرِ اوّل'' کا دونوں کے موارِدِ استعمال پر اطلاق ہوتا ہے اور وہ متقابل خواص کے ساتھ تخصیص پاتا ہے، غلط ہے۔ اگر یہ نظریہ درست ہوتا تو اس سے اوپر ایک اور حقیقت ہونی چاہیے تھی، جو متفرق حقیقتوں کی جامع ہو۔ اور ''صادرِ اوّل'' کی نسبت وہ حقیقت اس بات کی زیادہ مستحق ہوتی کہ ''وحدت کبریٰ'' اور ''وجودِ اقصیٰ'' سے صادر ہو، لیکن ایسا ہرگز نہیں بلکہ یہ ''صادرِ اوّل'' ایک ''انیت''[1] (ہستی)

---

[1] اشراقیہ کے ہاں اشیا جعل بسیط سے ہست ہوتے ہیں اور مشائیہ کے ہاں مرکب کے ذریعہ ان کو لباس وجود پہنایا جاتا ہے۔ شاہ صاحب ان دونوں کی طرف اشارہ فرماتے ہیں۔

ہے۔ جو بہت سی ہستیوں پر مشتمل ہے۔ اور اس کو واحد اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ مطلق ہے۔ (کسی قید کے ساتھ مقید نہیں) اور کوئی دوسری حقیقت، اطلاق اور عدم تقیید میں اس کے برابر نہیں بلکہ اس نے دوسرے حقائق پر اوپر نیچے (ہر طرف) سے احاطہ کیا ہوا ہے۔ اور وہ ''حقیقت قصوی'' کا نمونہ ہے۔ اس سے کوئی دوسری ہستی مقابلہ و برابری نہیں کر سکتی۔ اور کسی ہستی کا اس سے بالاتر ہونا تصور میں نہیں آ سکتا۔ کاش میرے پاس کوئی ایسی مثال ہوتی۔ جس کے ذریعہ ان دونوں (صادرِ اوّل، اور حقیقتِ قصوی) کے باہمی تعلق کی توضیح کر سکتا۔ اس کی مثال (ناقص) ایسی ہے جیسے ''مطلق شے'' کے عنوان کی نسبت ''شے مطلق'' کی طرف ہو۔ جس میں کسی حیثیت اور لحاظ کا خیال نہ رکھا گیا ہو۔ حتیٰ کہ علم و آگہی اور تسمیہ کی بھی اس کے ساتھ کسی طرح کی نسبت ہو۔

جب ہم ''اِنیۃ اولی (یعنی صادرِ اول یا وجود) اور حقیقت قصوی'' کے باہمی تعلق کا جائزہ لیتے ہیں، تو معلوم ہوتا ہے کہ ہستی اول یا صادرِ اول ایک کلمہ ہے جو ایک ہی حیثیت کو ملحوظ رکھ کر اس کا صدور ہوا ہے۔ اگر اس ایک حیثیت یا اعتبار یا علاقہ سے قطع نظر کیا جائے تو وہ پھر ''صادرِ اوّل'' نہیں ہوگا بلکہ مستقل حقیقت متصور ہوگا۔ مثلاً لفظ ''مِن'' کو ہم صرف اس حیثیت سے کہتے ہیں کہ وہ دو لفظوں میں ارتباط پیدا کرنے کا سبب ہے۔ اگر اس حیثیت سے قطع نظر کر لی جائے، اور فی نفسہٖ اس کو پیش نظر رکھا جائے تو اس کی حرفیت زائل ہو کر وہ اسم بن جائے گا۔ کیا میں تمہیں یہ نہ بتاؤں کہ وہ ایک اعتبار یا ایک حیثیت کیا ہے جس کی وجہ سے صادرِ اوّل، صادرِ اوّل کہلایا۔ وہ اعتبار اور ملاحظہ اپنی نظر کو ''حقیقتِ قصوی'' تک پہنچانا ہے۔ اور یہ کہ ''صادرِ اوّل'' کے وجود اور ہستی کی حیثیت صرف عنوان کی ہے۔ مقصود بالذات اس کا معنون ہے۔ (یعنی اصل مقصود وہ ہستی ہے جس کا یہ عنوان ہے، لیکن عنوان کو اپنے معنون سے اس قدر اتصال ہے کہ نظر کی دوئی ان میں علیٰحدگی پیدا نہیں کر سکتی) ''حقیقت قصوی'' اور ''صادرِ اول'' کے متعلق تحقیقی بات یہی ہے۔ اندریں صورت اگر اس ''صادرِ اول'' کو اور ان تمام ظہوروں کو جو اس کے طرز پر وجود پذیر ہوں، ہم اپنی طرف سے (اصطلاح صوفیہ) کے مطابق تجلّی سے موسوم کریں۔ یا اس کو اپنی اصطلاح کے مطابق

(اسمائے حسنیٰ میں سے) کسی اسم (پاک) کا نام دیں، تو یقیناً یہ درست ہوگا۔

بعد ازیں اس صادر اول یعنی وجود میں درجہ بدرجہ تنزل واقع ہوتا ہے۔ اور مراتب وجود میں جو ترتیب ہوتی ہے اگرچہ اس کی کنہہ دریافت کرنا بے حد مشکل ہے، لیکن اتنا یقینی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ''تجلیات مطلقہ'' کی آخری تجلی تمام کائنات اور موجودات عالم کے ظہور میں آنے کا مبدأ اوّل اور سرچشمہ ہے[1]۔ جملہ حقائق کائنات شخص واحد کی طرح ایک ہی نظام میں منسلک ہیں اور سب اقوام عالم تدبیر وحدانی کی معترف ہیں۔

جو حقائق کائنات مشاہدے میں آتے ہیں، یا جن کی مستقل ہستی کو دلیل و برہان سے ثابت کیا گیا ہے، ان کے متعلق یہ خیال کرنا اور اس خیال پر یقین کرنا غلطی ہے کہ ان میں کوئی رابطۂ جامعہ نہیں۔ اور یہ سب کی سب حقیقتیں کسی ایک وحدت کے رشتۂ نظام میں منسلک نہیں۔ برعکس اس کے کائنات کے نظام میں ایسی مستحکم وحدت پائی جاتی ہے، جس کو ہم اس متحد المقصد اور باہم مربوط نظام سے تشبیہ دے سکتے ہیں، جو شخص واحد کے مختلف اعضا اور قویٰ میں موجود و نمایاں ہے اور جس کا مبدأ صرف ایک ہے۔ مثلاً: نباتات میں کسی پودے میں غذا رسانی اور ہضم کا جو نظام (پرورش) ایک ہی روحِ مدبرہ کا مرہونِ منت ہے۔ ممکن نہیں کہ ان کا مجموعی نظام ایک نہ ہو۔ اور اس کو شخص واحد تصور نہ کیا جائے، کیونکہ اس کا صدور ایک ہی کلمہ سے ہوا ہے، جس کو ہم اپنی اصطلاح میں خاتم الاسما کہتے ہیں۔ اور جو ایک کلمہ سے صادر ہوا ہو۔ وہ ایک ہی تو ہوگا۔ اس لیے یہ خیال کرنا سراسر وہم و گمان ہے کہ حقائق کائنات میں کوئی اتصال اور رابطۂ جامعہ نہیں۔ یا وہ ایک ہی نظامِ وحدت میں منسلک نہیں ہیں۔ اس وہم باطل کی مثال بعینہٖ یہ ہے، جس طرح یہ خیال کرنا کہ اجرام سماویہ میں ہر ایک کا نظام حرکت جداگانہ

---

[1] ابن رشد فرماتے ہیں، "الانية فی الحقيقة فی الموجودات هی معنی ذهنی وهو كون الشيئ خارج النفس علی ماهو عليه فی النفس" (تهافت، ص۲)

دراصل موجودات میں ''انیت'' ایک معنی ذہنی کو کہتے ہیں۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ ایک چیز کا خارجی وجود ایسا ہی ہو جیسا وجود اس کا نفس میں ہے۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں: الانية التی هی عبارة عن الوجود غير الماهية مقاصد، ص۳۰)

انیت عبارت ہے وجود سے اور وہ ماہیت کے علاوہ اور حقیقت ہے۔

ہے، اور ادوارِ فلکیہ کا اختلاف کسی ایک نظام کے ماتحت نہیں۔ لیکن جب علم کی ترقی ہوتی ہے تو یہ خیال خود بخود زائل ہو جاتا ہے۔ اور جیسے جیسے کسی کا علم بڑھتا ہے اس کے لیے ازدیادِ یقین کا موجب ہوتا ہے کہ ان سب اجرامِ فلکیہ میں ایک ہی نظام کارفرما ہے۔

دنیا میں کوئی بھی (مہذب و تعلیم یافتہ) قوم ایسی نہیں جس کے علوم میں عالمِ کون ومکان کی وحدتِ نظام، اور تدبیرِ واحد کا اعتراف (شعوری یا) غیر شعوری طور پر نہ پایا جاتا ہو۔ کیا (قدما فلاسفہ) نہیں کہتے کہ فلک الافلاک جس کے اوپر کوئی دوسرا فلکِ دوّار نہیں۔ اپنی روزانہ حرکت سے تمام دوسرے افلاک کو حرکت میں لاتا ہے۔ اور یہ اس تدبیرِ معنوی کا نتیجہ ہے جو تمام اجرامِ فلکیہ میں جاری وساری ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ زمین میں تغیر وتبدل کے اصل اسباب وہ باہمی اتصالات وروابط ہیں، جو اجرامِ فلکیہ میں پائے جاتے ہیں۔ افلاک کا ہر ایک اتصال اس کرۂ ارض میں جداگانہ انقلاب اور علیحدہ تغیر پیدا کرنے کا باعث ہوتا ہے۔ حتی کہ حوادث یومیہ کی تخلیق انہی افلاکی اتصالات کی بدولت ہوتی ہے، پس فلاسفہ اور اربابِ برہان اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ جملہ کائنات جو ہمارے مشاہدے اور عقلی تجربے کی زد میں ہے۔ ان سب میں ایک ہی نظام کارفرما ہے۔ اور اس رابطۂ جامعہ کے دائرۂ عمل سے کوئی چیز خارج نہیں ہے۔ فلاسفہ اور اہلِ معقول کے مقابلہ میں انبیائے کرام علیہم السلام کے متبعین کا نظریہ زیادہ واضح اور روشن ہے ان کے نزدیک روزمرہ کے حقائق اور واقعاتِ عالم کا ظہور مشیت قاہرہ اور قضا وقدر کی وحدانی تدبیر کے ساتھ اسی طرح وابستہ ہے۔ (سرِ مو تفاوت نہیں) جس طرح حیوانات کے بچے اپنی ماؤں کے ساتھ پیوست رہتے ہیں۔

اسماء حسنیٰ میں الرحمٰن ہی نظامِ وحدانی کا مبدأ ہے

بہرحال اسماء حسنیٰ میں وہ اسم جو اس نظامِ وحدانی کا مبدأ ہے اور جس کے بعد اور کوئی اسم

۱؎ شاہ صاحب فلاسفۂ یونان کے نظریۂ عقول عشرہ (جن کے لحاظ سے افلاک تسعہ اور نفوس فلکیہ کا وجود عالم عناصر پر مقدم مانا گیا ہے کے مقابلہ پر ایسا نظریہ پیش کرنا چاہتے ہیں جن میں تمام کائنات اور عالم مشاہدہ کی نسبت الرحمٰن کی طرف ایک ہی ہو۔

نہیں، وہ "الرحمٰن" ہے۔ میں "الرحمٰن" کی عمومیت اور علوم و معارف بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ ہاں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ عالم بالا و اسفل کا تمام فعل و انفعال، تمام حقائق کائنات کا عدم سے منصۂ شہود پر جلوہ گر ہونا، اور ہر ایک چیز میں مختلف آثار و خواص کا ودیعت کیا جانا، حتیٰ کہ عالم ارض و سما کے تمام تغیرات اسی اسم پاک کی تجلی ہیں۔ اور اس اسم پاک کی نسبت تمام اجناس و انواع اور اشخاص و افراد سے یکساں ہے۔ اس کے فیضان کی حیثیت ایک کلّی کی ہے جس کو اپنے تمام افراد اور جزئیات سے یکساں نسبت ہے۔ اور اس فیضان کا مبدأ ذات اقدس کی رحمانیت مطلقہ ہے۔ یا اس کے شئون میں سے کوئی شانِ خاص ہے۔ مثلاً ایسے مخصوص اسباب اور علتوں کا جمع ہونا جو انسان کے عدم سے وجود میں آنے کے متقاضی ہوں۔ ہماری اصطلاح میں اسم پاک "الرحمٰن" کے شئون میں سے ایک شانِ خاص کی تجلی کہلائے گا۔ جو در حقیقت رحمانیت مطلقہ کے ضمن میں مضمر تھا۔ اور جس کا ظہور اب انسان کی شکل میں ہوا ہے۔ لیکن یاد رکھو جب تک الرحمٰن کے مفہوم کو مختلف صادرات کے ساتھ نسبت نہ دی جائے۔ اس میں کسی قسم کا تکثر نہیں ہوتا۔

وحد اندر وحدت اندر وحدت است

فعل اور انفعال ہی اس کی شئون میں تکثر پیدا ہونے کا واسطہ ہے۔ جب کسی نوع یا اس کے کسی فرد کے ظہور میں آنے کے مخصصات اور اسباب و علل فراہم ہوں، تو رحمانیت کا فیضان نازل ہونے میں ذرا بھی دیر نہیں ہوتی[1] اس کے اضافہ میں کسی قسم کا بخل نہیں۔

ہر چہ ہست از شامت ناسازی اندام ماست
ورنہ تشریف تو بر بالائے کس کوتاہ نیست

کیا ایسی ہستی میں بخل کا تصور کیا جا سکتا ہے جس کا چشمۂ فیض اس حد تک لبریز ہو چکا ہو؟

کائنات میں کار فرما قوتوں کی اقسام اور اسباب و مسببات کا قیام

اور کیا میں تجھے یہ نہ بتاؤں کہ یہ مخصصات (اسباب اور علتیں) کہاں سے پیدا ہوئیں؟ (جواباً عرض یہ ہے کہ) مجموعۂ کائنات کا ذاتی تقاضا یہ ہے کہ اس میں تین قسم کی

[1] اذا قضیٰ أمراً فانما یقول له کن فیکون (البقرۃ، آیۃ ۱۱۷) آل عمران آیۃ ۴۲، مریم آیت ۳۵) میں اس کی صراحت موجود ہے۔

قوتیں اوران کے موضوعات اوراجسام واعضا ہوں۔

۱۔ پہلی قسم وہ طبعی قوتیں[1] ہیں جواس کے مختلف اعضا اور حصوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔

۲۔ دوسری قسم وہ قوائے ادراکیہ[2] ہیں جوموجودکل (کائنات) کی جسمانی قوتوں میں داخلی سریان کے طور پرنہیں بلکہ خارجی (طریان) کے طور پر ودیعت رکھی گئی ہیں۔

۳۔ تیسری قسم وہ الٰہیاتی قوتیں[3] ہیں۔ جوعالم جبروت کی ہستیوں میں ودیعت کی گئی ہیں۔ ان میں سے قضاوقدر بھی ہے۔

جب ان قوتوں نے جداگانہ طور پر "مستقل ہستی یا وجود" اختیار کیا، اور جبلی ہم آغوش اور فطری تلازم کی وجہ سے ان پران کے مناسب حال احکام ظاہر ہونے شروع ہوئے، اوران کے خواص وآثار ایک دوسرے کے اندر داخل مزاج اوران کے احکام ایک دوسرے کے دائرۂ وجود میں شامل ہونے لگے اس صورت حال میں ان قوتوں کے آثار وخواص میں تصادم اور ٹکراؤ ہوا۔ اور وجودالٰہی نے (جوش رحمت میں آکر) ان پر فیض فرمایا اورانہیں افلاک وعناصر کی صورتوں میں نوازا اوران میں سے ہرایک کے لیے جداگانہ احکام مرتب کیے، بعدازاں افلاک وعناصر کے احکام اور خاصیتوں میں تصادم واتصال کا دور شروع ہوا۔ جس کے نتیجہ میں (باری تعالیٰ کی مہربانی سے موالید (آسمان وزمین کے اندر مخلوقات) معدنیات اور جمادات اورنباتات وحیوانات وغیرہ) کو پیدا کیا گیا۔

جب صوفیائے کرام نے (مقامات سلوک طے کرتے ہوئے) اتنا عروج حاصل کیا، کہ حقیقت مجردہ کا ادراک کرنے لگے، جن کو وہ عالم ارواح (یا عالم اسرار) سے تعبیر کرتے ہیں، لیکن ہم ان کو (اصطلاح شیخ اکبر ابن عربیؒ کے مطابق) "اعیان" سے موسوم کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ عالم اسماالٰہی کی تجلیات کا پہلا مرحلہ تعین ہے۔ اور کائنات کے بالفعل وجود میں آنے کا پہلا مرتبہ ہے۔ یہاں پہنچ کرانہوں نے (صوفیہ نے) باطنِ وجود میں سلوک کی کوشش کی۔ مگراس اسم الٰہی کی تجلیات میں انھیں قدم آزمائی نصیب نہ ہوئی۔ اورنہ انھیں وجود

---

[1] (Physical Powers)

[2] (Faclity of Perception)

[3] (Spiritual of Theological Powers)

اقصیٰ (ذات باری تعالیٰ) تک رسائی حاصل کرنے کے لیے کوئی سہل و آسان راہ ملی۔ اس لیے انھوں نے اس کلام سے خاموشی اختیار کی۔ جو اس وقت ہم پیش کر چکے ہیں۔

انھوں نے صرف ان صورتوں کے علم پر اکتفا کیا، جو اللہ تعالیٰ کے علم محیط میں معلوم ہیں۔ اور جن کا وجود اللہ تعالیٰ کے باطنی اسمائے حسنیٰ میں مضمحل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے کائنات کے سب اعضا اور حصوں کو انہی اسمائے پاک سے منسوب کیا۔

وللناس فیما یعشقون مذاھب

نظر اپنی اپنی پسند اپنی اپنی

(یہ تو صوفیہ کا حال ہوا) لیکن اشراقیوں[1] کے علوم مشائین[2] کے فتنہ میں گم ہو گئے اور جو کچھ رہ گیا ہے وہ "دِمنة لم تتکلم من ام اوفی" (کھنڈرات کے غیر واضح آثار) کی مثل بہت کم رہ گیا ہے۔ چونکہ ہم ایک ایسے علم سے بحث کر رہے ہیں، جس کا تعلق اس مسئلہ سے نہیں، نیز اس کی تفصیل مستقل بحث و کلام اور قطعی دلیل و برہان چاہتی ہے۔ اس لیے سر دست ہم اس سے کوئی تعرض نہیں کرتے۔ ان شاء اللہ ہم کسی دوسرے موقع پر اس کی تشریح کریں گے۔

۱؎ اشراقیہ (Illuminists): نسبته الی الاشراق الذی هو ظهور الانوار العقلية و لمعا فيها وفيضانها بالاشراقات على النفوس عندتجردها) "عالم تجرد میں نفوس انسانی پر انوار عقلیہ کے ظہور و فیضان کے قائل لوگ۔

قطب الدین شیرازی نے مقدمہ شرح حکمة الاشراق میں یہ لکھا ہے: ان الاشراقين لاينتظم امرهم دون سوانح نورية ای لوامع نورية عقلية تكون مبنى الاصل الصحيحة التی هی قواعد الاشراقية۔ اس عبارت کی تشریح کرتے ہوئے محمد علی ابوریان نے اصول الفلسفة الاشراقية ص ۶۲ پر لکھا ہے: ومعنى هذا النص ان المعرفة الاشراقية تقوم على الحدس الذی يربط الذات العارفة بالجواهر النورانية ونسمى بالعلم الحضوری ای حصول العلم بالشئ بدون حصول صورته فی الذهن كعلم زيد لنفسه۔ (المعجم الفلسفی ص ۱۵) دراصل ذات عارفہ کو نورانی جواہر سے علم حضوری کے ذریعہ ہم آغوش کرنے کا الہیاتی فلسفہ بہت قدیم ہے۔ کہتے ہیں کہ یونانی فلاسفر افلاطون (۴۲۷ تا ۳۴۷ قبل مسیح) کا فلسفہ الٰہی ہے۔ جسے شیخ الاشراق شہاب الدین سہروردی مقتول نے اپنایا۔ اور انہی سہروردی کی طرف منسوب الہیاتی فلسفہ اور مکتب فکر کو "اشراقیہ" کہا جاتا ہے۔ ان دونوں کے پیروکاروں کو اشراقین کہا جاتا ہے۔

۲؎ مشائینہ: وہ لوگ جو یونانی فلسفی ارسطو (۳۸۴ تا ۳۲۲ قبل مسیح) کے فلسفہ الٰہی کے قائل تھے۔ جنھیں Peripatetics کہا جاتا ہے۔

موجودات کے معرض وجود میں آنے کا دار و مدار اسباب وعلل موجبہ پر ہے

روز مرہ کے رونما ہونے والے واقعات وحوادث کے متعلق اس بدیہی نظریہ اور ضروری قضیہ کی تکذیب نہیں کی جا سکتی کہ موجودات عالم میں سے کوئی چیز اس وقت تک معرض وجود میں نہیں آتی اور نہیں آسکتی جب تک اوپر نیچے (ہر طرف سے) اس کو اسباب اور علل واجبہ اس طرح نہ گھیر لیں، جو اس کے ایجاب وجود کا باعث ہوں۔ اندریں صورت اس ممکن الوجود چیز کا وجود واجب الظہور رہوتا ہے۔ اور وہ تمام اسباب وعلل جو مل کر اس کے ایجاب وجود کا باعث ہوتی ہیں، مجموعی حیثیت سے اس ممکن کے وجود کی علت تامہ ہے۔ یہ معرض وجود میں آئی ہوئی چیز درحقیقت اسی علت تامہ کے مختلف شئون واحوال میں سے ایک شان ہے۔ اور اس کے مخفی کمالات میں سے ایک کمال ہے اور اس کا وجود اس علت تامہ سے کبھی متاخر متراخی نہیں ہوتا، پس ہر موجود (یا واقعہ) اور حادثہ (ہماری اصطلاح میں) حادثۂ یومی کہلاتا ہے۔ اور اجتماع اسباب وعلل کے باعث کمال علل کی حیثیت سے اس کا واجب الوجود قرار پانا اس حادثۂ یومی کا "سرِ ظہور" اور جہت وجود ہے۔

بایں ہمہ ہم یقین کامل اور اعتقاد جازم کے ساتھ کہتے ہیں، کہ اس چیز کو خواہ وہ جوہر ہے یا عرض وجود عطا فرمانے والا "الرحمٰن" جل وعلا ہے۔ اور یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ "الف" کو خاص صورت وجود اور کمال عطا کرتا ہے۔ اور "ب" کو بھی انہی کمالات سے نوازتا ہے۔ پھر یہ کہا جائے کہ "الف" کو کمالات عطا کرنے والا "وہاب رحمٰن" ہے اور "ب" کو عطا کرنے والا کوئی اور ہے۔ حاشا وکلا "وہاب" (کا مفہوم اتنا محدود نہیں بلکہ وہاب تو وہ ہے جو سب اشیا اور ہستیوں کے کمالات وخواص کے وجود اور ظہور پر قادر وحاوی ہے۔ اور کوئی چیز اس کی رحمت وبخشش کے دائرہ سے باہر نہیں۔[1]

---

[1] بدور بازغہ کی عبارت یہ ہے: وکیف یهب "آ" وهو صورة خاصة لاتکون مندرجة فيها ويكون صورة مندرجة فيها "ب" وهو صورة خاصة اخرى مثلها؟ كلا انما الوهاب هو الذى لا يغادر صورة الالفها وكل مندرج فيه على انه كمال من كمالا تها، اس عبارت میں ذرا ابہام ہے، مترجم نے اس کی تشریح اس طرح کر لی ہے۔

نیز ہم یہ بھی یقین کامل کے ساتھ کہتے ہیں کہ اگرچہ خدائے وہاب کو فی نفسہ سب اشیا اور موجودات عالم سے یکساں نسبت ہے لیکن ہر ایک چیز کا بعض معین خاصیتوں کے ساتھ مخصوص ہونے اور اس کے جداگانہ امتیازی اوصاف اور کمالات کے ظہور کا انحصار ایک طرف تو اس فطری استعداد و عنصری صلاحیت پر ہے، جو ابتدائے تخلیق کے وقت اس کو بخشی گئی۔ دوسری طرف ان مختلف اوضاع اور ہیئتوں پر ہے۔ جو پیدائش کے بعد اس پر طاری ہوئیں اور تیسری طرف افلاک ثمانیہ کے درمیان موجود (کشش) اتصال سے اس کی ہم آہنگی پر ہے[1]

ان شرائط کے ساتھ یومیہ واقعات وحوادث کے وقوع کو ہم ''قضا'' کہتے ہیں۔ اس قضا کے بہت سے خدائی احکام ہیں، جنھیں ارباب معقول نے نظر انداز کر دیا ہے۔ اور جس کے نتیجہ میں الٰہیات کے علوم کا ایک اچھا خاصہ حصہ وہ گم کر چکے ہیں۔ مگر انبیائے کرام علیہم السلام کے پیروکاروں نے اپنی تمام توجہ اس علم (دقائق قضا الرحمٰن) پر صرف کی ہے۔ فلاسفہ اور اہل معقول اپنے عقلی استدلال کے ذریعہ قضا کے اجمالی وجود کا اعتراف کر چکے ہیں۔ (یعنی وہ یہ کہتے ہیں کہ عالم اسباب میں تکوین کائنات اور ظہور واقعات میں ''قضا'' کا بھی ہاتھ ہے) اور پیروکاران انبیا کرام علیہم السلام کو دلائل شرعیہ نے اس بات کے اعتراف پر مجبور کیا ہے کہ یہ تمام تصرف ''کلمہ کلیہ'' یعنی دستِ قضا کا ہے۔ جس کی حقیقت کا ادراک خدائے رحمٰن جل وعلا کے ہر فیصلے یا قضا میں نہیں ہوسکتا۔ بہر حال ان دونوں میں سے ہر فریق نے دوسرے فریق کے علم کو بطور اجمال لے لیا ہے۔ اور یہ اجمال بھی ایک ایسے آسان کلمہ میں بیان ہوا ہے، جو اللہ تعالیٰ کی عنایت ومہربانی کے نتیجہ میں ان کے مسلک (اور استعداد واحوال) کے مطابق سمجھا دیا گیا ہے۔ اس لیے تمھیں چاہیے کہ علوم کی تحصیل میں اس وقت تک کمزوری نہ دکھاؤ جب تک حقیقت اپنی واضح ترین صورت میں تمہارے سامنے جلوہ گر نہ ہو۔

---

[1] وتحاذی للاتصالات الفلکیۃ کی ایک تعبیر یہ بھی ہے۔

فصل-۲

جواہرواعراض کا امتزاج اور کائنات کا انقسام

کیا یہ ایک مسلمہ حقیقت نہیں کہ طبائع عرضیہ (اعراض) کے وجود و بقا کا مدار طبائع جوہریہ سے پیوستگی اور ہم آغوشی پر ہے۔ چنانچہ (یہ دیکھا گیا ہے کہ) آثار و خواص کا ہر مجموعہ جس میں چند ایک موجودات کا اشتراک ہوتا ہے، لازماً کسی ایسی صورت جوہریہ سے پیوست و متعلق ہوتا ہے جس میں یہ موجودات متبادل طور پر پائے جاتے ہیں۔

اس اصول کی بنا پر ہم کہتے ہیں کہ سب سے زیادہ عام صورت، صورت جسمیہ ہے۔ اور یہی درحقیقت ان آثار و خواص کا سرچشمہ ہے جو سب اجسام میں مشترک (پائے جاتے) ہیں۔ اور کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے مثلاً کسی جسم کا کسی شکل و صورت میں ظہور پذیر ہونا، اس کا کسی مکان یا زمان میں مقید ہونا اور کسی مقدار (پیمانہ اور وزن میں محصور ہو کر) ظاہر ہونا۔ (یہ تمام آثار و خواص صورت جسمیہ سے تعلق رکھتے ہیں)۔

اسی (صورت جسمیہ) سے نیچے صورت وہ ہے جو ان آثار و خواص کا مبدأ و سرچشمہ ہے، جو (عناصر میں سے کسی) معیّن عنصر سے مخصوص ہیں۔ چنانچہ پانی کی ایک مخصوص صورت ہے۔ اور اس کے مخصوص آثار و خواص ہیں۔ یعنی اس کے اندر بہنے، سرد و تر رہنے اور رطوبت کی خاصیتیں پائی جاتی ہیں۔ اسی طرح آگ کی خاص صورت اور خواص ہے؛ یعنی یہ کہ آگ اوپر کی طرف مائل صعود رہتی ہے۔ حرارت و گرمی رکھتی ہے۔ خشک اور مجفّف رطوبات ہے۔ اور چیزوں کو جلاتی ہے، اسی پر باقی سب عناصر اربعہ اور عناصر افلاک کو قیاس کیجئے۔

اس (پہلے اور دوسرے) سے کم نچلے درجہ میں وہ صورت ہے جو ان آثار کا سرچشمہ

ہے جو ایسے اجسام کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں جن کی ترکیب وساخت عناصر ارضیہ سے ہوئی ہے۔اوران کے معنویات اور تحولات یعنی مزاج اور اس کے توابع کا مبدأ عناصر فلکیہ ہوں (یعنی کائنات الجو)۔

مندرجہ بالا صورت جسمیہ سے نچلے درجہ میں وہ صورت ہے، جو ان آثار کا سرچشمہ ہے جو جسم نامی کے خواص میں سے ہیں۔یعنی پانی غذا اور وجود بقائے نوع کے لیے توالد و تناسل یا اس قسم کے اور مشابہ آثار، موالید کی جملہ اقسام میں یہ قسم افضل ہے۔

اسی طرح وہ صورت جس کے آثار وخواص کا دائرہ محدود تر ہے، ''حیوان مطلق'' کی ہے، جو حس وحرکت، مشیت وارادہ، وجدان قلب اور قوتِ فکر وفیصلہ کی خصوصیات کا حاصل ہے۔اجسام نامیہ میں برتر اور بہترین یہی جسم نامی (حیوان مطلق) ہے۔(یعنی اشجار وغیرہ دیگر نباتات کا درجہ اس سے کم تر ہے)۔

اس (حیوان مطلق) سے اخص وکم تر شامل وہ صورت ہے، جو ان خصوصیات کا مبدأ وسرچشمہ ہے۔جو انسان سے مختص ہیں، یعنی یہ کہ انسان (اپنے جذبات واحساسات، قلبی واردات، اور مافی الضمیر کے اظہار کے لیے) قوت نطق وگویائی رکھتا ہے۔(معلومات کے ذریعہ مجہولات کا علم حاصل کرنے کے لیے) قوت عقل وادراک رکھتا ہے۔(معاشرت اور تہذیب وتمدن کے اعلیٰ معیار کو برقرار رکھنے کے لیے) ارتفاقِ کامل کی تدابیر نافعہ کی جبلی استعداد رکھتا ہے، اور (اپنے خالق ومالک سے) قرب حاصل کرنے کے بہترین طریقوں اور صفاتِ الٰہیہ سے مکمل انصاف کی فطری والہامی قوت رکھتا ہے۔انواع حیوانات میں سب سے اشرف وافضل یہی انسان ہے۔

اور اس سے نچلے درجہ میں وہ صور ہیں جو افراد کے ساتھ مختص ہیں اور وہ نفوس کہلاتے ہیں اور یہ ان خصوصیات کا سرچشمہ ہیں جن سے اشخاص متصف ہوتے ہیں اور جو زید کو زید، عمرو کو عمرو، تم کو تم میں سے متصف ومشخص کرتے ہیں۔بعینہ اس طرح جس طرح انسان کی صورت نوعیہ سے انسان، انسان کہلاتا ہے۔اور جیسے حیوانی صورت سے حیوان، حیوان کہلاتا ہے۔

نفوس پر صورتوں کا اطلاق نہ کرنا غلط نظریہ ہے

عام طور پر حکما اس خیال کو قابلِ اعتماد و اطمینان سمجھتے ہیں کہ نفوس پر صورتوں کا اطلاق نہیں ہوتا، مگر یہ بالکل غلط ہے۔ جن قوموں نے ظن و گمان پر یہ نظریہ قائم کیا کہ تمام اجسام طبیعت جوہریہ کے لحاظ سے ایک دوسرے کے مشابہ ہیں۔ ان کے درمیان جو افتراق واختلاف پایا جاتا ہے، وہ فقط طبائع عرضیہ کی حیثیت سے ہے۔ گویا کہ یہ مختلف قسم کے رنگ ہیں جو اجسام پر ان کی طبیعت جوہریہ کے اختلاف کے بغیر چڑھا دیے گئے ہیں، اور ان رنگوں کو طبائع عرضیہ سے موسوم کیا گیا۔ اب وہ طبائع جوہریہ طبائع عرضیہ کی طرف مائل رہتی ہیں، اور ان کی تابع فرمان رہتی ہیں یہ کہہ کر ان لوگوں نے حکما کے اصل مذہب کو باطل کر دیا، اب میں تم سے خدا کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں کہ عام حکما ان لوگوں کے اس نظریہ کو کس دلیل سے ردّ کرتے ہیں؟ یہ کہہ کر ان کے قول و نظریہ کو ردّ کرتے ہیں کہ اس سے کمزور ترین دلیل (سفسطہ) نہیں ہے کہ اس بات کا اعتراف کر لیا جائے کہ حیوان بداہت حسّی کے اقتضا کے مطابق ان مستقل و موجود حقائق میں سے ایک مستقل حقیقت ہے اور پھر ساتھ ہی یہ ادعا (بھی) کیا جائے کہ حیوان کی حیوانیت کا انحصار چند اعراض کے جمع ہونے پر ہے۔ (اور جب وہ اعراض جمع و یکجا ہوئے تو) ان کے حقیقت میں شامل ہوئے بغیر اس مجموعہ کا نام حیوان ہوا۔ (یہ تناقض نہیں تو اور کیا ہے؟

جس طرح حکما اپنے مخالفوں کے نظریہ کو سفسطہ (یا بودا فلسفہ) سمجھتے ہیں، میں بھی ان (کم فہموں) سے یہ کہوں گا کہ اس سے زیادہ کوئی کمزور ترین دلیل دوسری نہیں ہو سکتی کہ یہ اعتراف کر لیا جائے کہ زید بداہت حسّی کے اقتضا کے مطابق حقائق موجودہ میں سے ایک حقیقت ہے، مگر ساتھ ہی ساتھ یہ نظریہ قائم کیا جائے کہ زید کی شخصیت کا انحصار چند مشخصات کے جمع ہونے پر ہے۔ جن کے مجموعہ کو زید کے نام سے یاد کیا گیا۔ اور اس کی کوئی مستقل حیثیت نہیں،) یہ پہلے مفروضے کی طرح تناقض و تضاد پر مبنی خیال ہے)۔

میں تجھے خدا کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا صورت جوہریہ کے یہ معنی نہیں کہ وہ ایسی چیز ہے کہ جس کی وجہ سے کوئی شے جو حقیقت ثابتہ ہو مستقل حقیقت کا مالک سمجھا جاتا

ہے اسی طرح صورت عرضیہ کے یہ معنے ہیں کہ کوئی چیز جو مستقل ہستی کی مالک ہے اس صورت عرضیہ کی حامل ہو سکتی ہے۔ لیکن بعینہٖ وہ چیز نہیں۔ اب کوئی وجہ نہیں کہ میں یہ نہ کہوں کہ زید جو ایک مستقل ہستی ہے اس کی زیدیت بعینہٖ اُس کی صورت جو ہر یہ ہے۔

عالم وجود میں جو حقائق ظہور پذیر ہوتے ہیں وہ صورتیں ہی ہوتی ہیں اور کسی صورت میں بھی دائرۂ صور سے متجاوز و خارج نہیں کیونکہ ''مطلق صورت'' ایک مستقل صورت ہے جس میں یہ استعداد و قابلیت ہے کہ وہ ہر ایک صورت کو جو اس پر طاری ہو، قبول کر سکتی ہے۔ یہی حالت ہر صورت کی اپنے ماتحت صورتوں کے ساتھ ہے کہ وہ انہیں قبول کر کے ماتحت حقائق کو وجود بخشتی ہیں۔ (صورت جسمیہ صورت نامیہ کو قبول کر کے جسم نامی کو وجود بخشتی ہے۔ صورت نامیہ، صورت حیوانیہ کو قبول کر کے حیوان کو وجود میں لاتی ہے۔ صورت حیوانیہ صورت انسانیہ کو قبول کر کے انسان کو وجود میں لاتا ہے۔ اور صورت انسانیہ نفوس کو قبول کر کے افراد کو وجود دیتی ہے)۔

''مطلق صورت'' اور ''ہیولیٰ'' سے امتزاج کا فلسفیانہ نظریہ غلط ہے
کیونکہ جسم میں دوئی نہیں آسکتی

اہل معقول کا یہ نظریہ بھی غلط ہے کہ ''مطلق صورت'' ہیولیٰ[1] سے پیوست ہوتی ہے، اور ہیولیٰ بذات خود کوئی صورت نہیں۔

میری دلیل یہ ہے کہ اشیائے کائنات اور سب اجسام و موجودات کی عام ترین خاصیت اور شامل ترین اثر یہ ہے کہ وہ کسی نہ کسی تشکل[2] تحیز، توقیت اور مقدار خاص کے ساتھ رونما ہوتے ہیں۔ بس ''مطلق صورت'' جب ہیولیٰ کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے اس وقت بھی ہیولیٰ کی خاص شکل اور خاص مقدار ہوتی ہے۔

---

[1] مقدمہ جرجانی نے تعریفات میں ''ہیولیٰ'' کے معنی یوں لکھے ہیں: ''لفظ یونانی بمعنی الاصل و المادۃ۔ وفی الاصطلاح ھی جوھر فی الجسم قابل یعرض لذلک الجسم من الاتصال والانفصال محل للصورتین الجسمیۃ والنوعیۃ۔

[2] تشکل Form: تحیز (مکان) Dimension of Space، توقیت (زمان) Time، مقدار (Quantity)۔

وراس کا مخصوص زمان ومکان ہوتا ہے۔اب جب کسی جسم کے اجزا میں باہمی ربط واتصال ٹوٹ جائے یا اندرونی طور پر اس میں کوئی تبدیلی رونما ہو جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے ایک خاص مقدار اور خاص وضع کو چھوڑ کر دوسری مقدار اور وضع اختیار کر لی۔اور اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ اس جسم نے انفکاک اجزا اور انفصال داخلی کی وجہ سے مقدار اور وضع کی طبیعت ہی چھوڑ دی ہے اور اس کا تعلق ان میں سے کسی سے نہیں رہا۔حقیقت یہ ہے کہ وہ اتصال جو صورت جسمیہ کے ساتھ پیوست ہے وہ اس انفکاک وانفصال سے زائل نہیں ہوا۔اگر اس کا زوال ممکن ہے تو کسی ایسے انفصال کے ذریعے ہوگا جس کے بعد اتصال کا کوئی وجود ہی باقی نہ رہے اور اتصال کا کوئی فرد بھی باقی نہ رہے لہٰذا اس میں ہرگز شک نہ کرو کہ ایسے انفصال او اتصال کا کوئی وجود نہیں جو صورت جسمیہ کے ساتھ پیوست اتصال کی ضد ہو۔جس میں ایسی دوئی نہیں جس کی بنا پر ہم ایسے ''ہیولیٰ'' کا اثبات کر سکیں جو ہیولیٰ تو ہو لیکن صورت نہ ہو۔وہ شخص جو یہ کہتا ہے کہ ''الرحمٰن'' کی شانوں میں سے کوئی شان ایسی بھی ہے کہ وہ تمثل تو اختیار کر لیتی ہے لیکن وہ صورت نہیں ہوگی؛ غلط کہتا ہے۔اس قسم کی باتوں پر تجھے کان نہیں دھرنا چاہیے۔حقیقت یہ ہے کہ صورت بعینہٖ اس موجود کا نام ہے جو کسی خاص وضع کے ساتھ مقید ہو یا أین (مکان) سے تعلق رکھتا ہو۔یا کسی اور عرض (مادّی کیفیت) کے ساتھ ملوث ہوا ہو جو ''وضع'' اور ''این'' کی مزید تخصیصات ہیں۔

درست بات یہ ہے کہ ''تجلی جبروتی'' (مظاہرۂ صفات قاہرہ الوہیت) جو ''الرحمٰن'' سے اس کے فرع کے طور پر ظہور میں آتی ہے وہ ایک ایسا موجود ہے جس میں کسی قسم کی تلویث و آمیزش نہیں۔اور صورت وہ موجود ہے جو کسی عرض کے ساتھ ملوث ہو۔بایں ہمہ وہ سرّ جو ''الرحمٰن'' سے نازل ہوتا ہے وہ تخصیصات لاحقہ کے مطابق دونوں قسموں میں محفوظ ہے۔

البتہ صورتیں بلحاظ شرف وخست ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔اس لیے صورتِ انسانیہ صورت حیوانیہ سے اشرف ہے۔اور صورت حیوانیہ صورت نامیہ سے افضل ہے۔اور صورتِ نامیہ صورتِ مولّدہ (موالید ثلاثہ یا معدنیات کی صورت) سے بہتر ہے۔(ہر کسی انسانی شخصیت کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ) ہر ایک انسان میں صورت مولّدہ،صورت

نامیہ صورت حیوانیہ، صورت انسانیہ اور صورت شخصیہ (ذاتیہ) سب کے سب شیر وشکر بن کر ایک دوسرے میں گھل مل گئی ہیں۔ اور بادی النظر میں یہ ناممکن نظر آتا ہے، کہ کسی بھی صورت کا علیحدہ تحقق ایسا ہو سکے کہ اس کی طرف مستقل اشارہ کیا جا سکے۔ صرف نظر غائر ہی حقیقتِ حال کو ظاہر اور ہر صورت کو اپنے آثار وخواص کے ساتھ دوسری صورتوں سے ممیز کر سکتی ہے۔

موجودات کا ظہور نو اسبابِ اختلاف اور وجوہ اشتراک کی بنا پر فیضانِ الٰہی سے ہوتا ہے

میں اس وقت تک تجھ سے خوش نہیں ہو سکتا، جب تک ان دونوں مسئلوں (اشتراک واختلاف موجودات) کی حقیقت اور راز سے آشنا نہ ہو۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ اس مادہ نے جس میں صورت مولدہ (موالید ثلاثہ کی صورتِ جوہریہ) کے اختیار کرنے کی استعداد و قابلیت تھی، اپنے سب اجزا کے ساتھ جمع ہو کر ایک امتزاجی کیفیت حاصل کر لی۔ اس نے اپنی اس استعداد و قابلیت کے ساتھ ''الرحمٰن'' کی طرف رجوع کیا۔ جس کے نتیجہ میں (فیضانِ الٰہی اور وجودِ لامتناہی سے) اجتماع شروط اور وجوہ استعداد کی بنا پر اس پر صورتِ مولدہ فائض ہوئی۔ اور اس نئی خلقتِ مزاج کے ساتھ اس کا ظہور ہوا، جس کی خصوصیات وقتاً فوقتاً کارفرما اور ظاہر ہونے لگیں۔ ان کو (بہر صورت) بالذات اسی صورت مولدہ کا اثر ونتیجہ سمجھنا چاہیے۔ اگرچہ اس صورت کا وجوب فیضان رحمٰن سے اجتماع عناصر اور اس کی استعداد پر منحصر تھا، پھر اس (صورت مولدہ) نے دوسری قابلیت واستعداد حاصل کر لی۔ (ایک بار) پھر اس نے ''رحمٰن'' کی طرف رجوع کیا اور اللہ تعالیٰ کے سامنے دست سوال پھیلا دیے، اور خداداد موہوب استعداد اور مکتسب قابلیت کی موجودگی کی بنا پر اس پر حکم صورت نامیہ فائض ہوئی، جس سے زندگی کی ناقص صورت کا ظہور ہوا۔ اس ناقص زندگی سے خاص اثرات ونتائج رونما ہونے لگے۔ جو صرف اسی کی طرف بالذات ارتقا کرتے ہیں۔ اگرچہ اس کا وجود پہلی صورت (صورت مؤلدہ) کی موجودگی پر منحصر ہے۔

ارتقا کی اس دوسری منزل میں رہ کر اس (ناقص صورت نامیہ) نے مزید استعداد اور قابلیت حاصل کر لی۔ پھر "الرحمٰن" کی طرف مڑ گئی۔ (اور فیضان الٰہی سے فیضیاب ہونے کے لیے دستِ سوال پھیلا دیئے)۔ چنانچہ مخصوص شرائط کے اجتماع اور موجود خاص استعداد کی بنا پر (نئی) صورتِ حیوانیہ اس پر فائض ہوئی اور اسے حیات ناقص کی بجائے حیاتِ کامل عطا ہوئی۔ اور اس (نئی زندگی) کے اثرات وقتاً فوقتاً اس سے ظاہر ہونے لگے۔ ان اثرات کو یقیناً اسی صورت حیوانیہ کا بالذات اثر و نتیجہ سمجھا جائے گا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس کے وجود کے لیے پہلی (یعنی ناقص صورتِ نامیہ) کا وجود شرط ہے۔

ارتقا کی اس تیسری منزل میں رہ کر اس (کامل صورتِ حیوانیہ) نے مزید استعداد و قابلیت حاصل کر لی، بعد ازاں اس نے "الرحمٰن" کی طرف رجوع کیا۔ اور (حسب سابق دامنِ سوالات پھیلا دیا۔ تو مخصوص شرائط کے اجتماع اور اس ترقی یافتہ استعداد و قابلیت کی بنا پر صورت انسانیہ پر فائض ہوئی۔ جس کی وجہ سے اس میں مبدأ (یعنی ذاتِ اقدس) کے ساتھ (تا بحد امکان بشری) تشبہ حاصل کرنے کی جبلت و استعداد پیدا ہوئی۔ اس استعداد کے مخصوص اثرات اس سے صادر ہوتے رہے، اب ان کی نسبت بالذات اسی صورت انسانیہ کی طرف ہوتی ہے۔ اگرچہ یہ اثرات درجہ اوّل کے حصول پر مبنی ہوتے ہیں، اسی صورت حال کے پیش نظر اتصال و اشتراک کیوں اور کیسے نہیں ہوگا؟

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر (ترقی یافتہ) صورت کا فیضانِ وجود، اسبق (پہلی غیر ترقی یافتہ) صورت کے وجود کی بدولت قائم رکھا ہے۔ اگر پہلی (ابتدائی) صورت کے شروط ظہور میں نہ آتے تو اس دوسری یعنی (آخری درجہ کی) صورت انسانیہ کا ظہور ہی نہ ہوتا اور کوئی وجہ نہیں کہ اس آخری درجہ (اور ترقی یافتہ صورت) کو سب پر تفوق حاصل نہ ہو، کیونکہ (ان میں سے) ہر صورت اپنے سے ترقی یافتہ صورت میں جا کر "الرحمٰن" سے جداگانہ اور نئے کمال سے متصف ہوتی رہی ہے۔

موجودات میں فیضانِ الٰہی اور تفوق کے لیے استعداد ذاتی کی اہمیت

ابھی ٹھہرو، اور ان معانی کو اچھی طرح ذہن نشین کر لو، جو ان مذکورہ صورتوں میں سے ہر ایک صورت کو (مراتب ارتقا میں یکے بعد دیگرے) حاصل ہوتے رہے ہیں۔ اور جن کی وجہ سے نامی کو مولد پر شرف حاصل ہے۔ (اور حیوان کو نامی سے افضل و برتر سمجھا جاتا ہے) اور یہی حالت دوسرے معانی جدیدہ کی ہے۔ جس کے صحیح مفہوم ظاہر کرنے کے لیے ہماری زمینی اور معاشی زبان میں وضع شدہ الفاظ نہیں ہیں۔ اس کے لیے سوائے اس کے اور کوئی چارہ کار نہیں کہ ان کی حقیقت خود جلوہ نما ہو جائے۔ البتہ تمثیل (کی کسی قسم) کے ذریعہ اس کی توضیح کی جا سکتی ہے اور سمجھنے والے (کان) اسے سن کر ایک حد تک حقیقت کو پا سکتے ہیں۔ اگرچہ یہ حقیقت تک مکمل وصول نہیں ہوتا۔

کیا یہ ایک مسلمہ حقیقت نہیں ہے کہ جب جسم کے اعضا جمع ہو کر ٹھوس شکل اختیار کر لیں، اور ان کے درمیان عمدہ ربط و اتصال پیدا ہو جائے، اور ان کی سطحیں بغیر کسی کجی کے بالکل ہموار ہو جائیں، تو یقیناً یہ جسم صیقل اور شفاف ہوگا۔ جس میں روشنی منعکس ہوگی، اور اشیا کے رنگ و عکس نظر آئیں گے۔ (یہ یاد رکھیے کہ) کثافت (ٹھوس ہونے) ہمواری سطح اور اتصال و ربط کے مختلف درجے ہیں۔ (اور انھیں ہر کسی جسم کے صیقل اور شفاف ہونے کے درجوں کا مدار ہے)۔ چنانچہ اشیا میں بعض چیزیں زیادہ ٹھوس یا زیادہ سیدھی، زیادہ مربوط و متصل اور زیادہ صیقل و شفاف ہوتی ہیں۔ اور بعض کم۔ اس لیے ہم ان مختلف مراتب کو وحدات[1] کہتے ہیں۔ (اگر صقالت اور شفافیت بہت معمولی ہے تو یہ) پہلا درجہ ہے، جسے ہم ایک وحدت کہیں گے۔ (اور اگر اس سے بہتر یا دو چند ہے تو یہ) دوسرا درجہ ہے، جس میں دو وحدتیں شامل ہیں۔ اور اس سے زیادہ یعنی سہ چند ہے۔ تو یہ درجۂ ثالث ہے۔ جس میں تین یونٹ شامل ہیں۔ اور (اسی اضافے کے ساتھ) چوتھے درجہ میں چار وحدتیں شامل ہیں۔ اسی پر خدائے رحمٰن جل وعلا کے افاضات خاصہ کو قیاس کر لیجیے۔ کہ اجزائے جوہریہ کے تکاثف، استوا اتصال اور ثقالت میں فرق مراتب کے مطابق کم

---

[1] (Units)

استعداد والے پر کم فیض نازل ہوتا ہے اور جن میں استعداد زیادہ ہوتی ہے اس پر نسبتاً زیادہ فیض نازل ہوتا ہے۔ دراصل یہی اوصاف کثافت وصقالت ہی ہیں۔ جو عالم ابداع (کے معرض وجود میں آنے) کے بعد عالم خلق میں افاضہ رحمٰن کے باعث وموجب ہیں۔ کیونکہ عالم ابداع کا یہ خاصہ ہے کہ وہاں سے امور نازل ہوتے ہیں۔ اور عالم خلق کی یہ خصوصیت ہے کہ یہاں سے مجسم، کثیف اور محسوس اشیا کا صعود ہوتا ہے۔ (اور نظام کائنات میں اسی تنزل وصعود کا سلسلہ جاری ہے۔ اور زندگی کے بقا اور استمرار کا انتظام کیا گیا ہے)۔

موجوداتِ عالم کے مراتب کمال اور نوع انسانی کی فضیلت کا راز

الغرض مولدات میں جو کمال ودیعت کیا گیا ہے، وہ ابتدائی درجہ کا کامل ہے یعنی وہ بسیط (غیر منقسم) ہیئت جس سے تعبیر صورت مولدہ کے ذریعے کی جاتی ہے، اس کمال (صورت مولدہ) کے خواص واعراض یہ ہیں کہ آثار کو صورت نوعیہ کی طرف منسوب کیا جائے، نہ کہ اجزائے عنصریہ کی طرف، صورت عنصریہ اجزا سے الگ ہوتی ہے اور اس کے اثر کے طور پر سب اجزا پر متشابہ رنگ اور خاصیت طاری ہوتی ہے۔ (کیونکہ عناصر کے جداگانہ خواص ہوتے ہیں اور جب وہ کسی مرکب کی شکل میں جمع ہو کر ظاہر ہوں تو ان کے آثار وخواص بالکل علیحدہ ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر پانی جو آکسیجن اور ہائیڈروجن گیسوں سے مرکب ہے اس کے خواص ان کے دونوں عنصروں سے جداگانہ اور مختلف ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس دوسری مرکبات ومولدات اور ان کے عناصر ترکیبی کا حال ہے)۔ عوام الناس کا منتہائے نظر ومقصود تو ان مولدات کے یہی ظاہری خواص وآثار ہوتے ہیں اور ان سے ماورا حقائق تک رسائی نہیں رکھتے۔ مگر جو اہل علم وتحقیق ہیں، وہ اگرچہ دوربین نگاہ رکھتے ہیں مگر ان کی (زمینی ومعاشی زبان اتنی فصیح وبلیغ نہیں جو ان حقائق کو بیان کر سکے۔ اس لیے انھوں نے اس کو مولدات کا کمال خصوصی (یعنی صورت عنصریہ) قرار دیا ہے۔

نباتات اور نامی اشیا کا کمال دوسرے درجے (نسبتاً بلند درجہ کے کمالی اوصاف ہیں۔ جو اوّل الذکر درجہ سے نسبتاً زیادہ ہیں۔ ان نامی اجسام کے آثار وخصوصیات میں (موالید کی صفات کے علاوہ) نمود وبالیدگی، تغذیہ وپرورش، پیدائش مثل اور اس کو خاص

شکل دینا ہے اور افرادِ نوع کے تشخص کو دوسرے اشکال مقادیر اور صورتوں سے تمیز کرنے کا قانون (ان اشکال و مقادیر کے علاوہ جن میں تمام افرادِ نوع مشترک ہیں) اور ان مراحب عروج و انحطاط کی رعایت کرنے کی خصوصیات پائی جاتی ہیں، جو ابتدائے آفرینش سے فنا و زوال کے وقت تک پیش آتے ہیں۔ اس (درجۂ تہذیب و تمدن) کو محققین درجۂ ثانیہ کہتے ہیں (جو پہلے کے مقابلہ میں زیادہ بلند ہے)۔

اسی طرح حیوان کے اندر جو کمال ودیعت رکھا گیا ہے، تیسرے درجہ کا کمال ہے۔ چنانچہ اس درجہ ثالثہ میں (پہلے اور دوسرے درجہ کے کمالات کے آثار کے ساتھ ساتھ یہ (زائد) آثار و خواص بھی پائے جاتے ہیں۔ (جن سے نباتات یا نامی اجسام محروم ہیں)۔ حواس ظاہرہ و حواس باطنہ حصول نفع اور دفع ضرر کی طرف انگیخت، وہ ارادے جذبات اور تصورات وغیرہ جو دل سے صادر ہوتے ہیں، وجدانیات اور قلبی واردات جو نور قلب کے انکسار کے نتیجہ میں پیدا ہوتے ہیں، اس کمال کو محققین نے صورت حیوانیہ سے تعبیر کیا ہے۔

اسی طرح انسان میں جو کمال ودیعت کیا گیا ہے (گزشتہ تین درجوں سے بلند تر) چوتھے درجے کا کمال ہے۔ اس کے خواص شرف میں سب سے بالاتر ہیں۔ مثلاً انسان میں رائ کلی[1] (قضایائے کلیہ کو قائم کرنے اور عقل و ذہن سے معلومات کے ذریعہ مجہولات تک پہنچے) اور صورت ناسوتیہ (وجود جسمانی) کے انسلاخ (موت) سے پیشتر مبدأ (ذات اقدس) کے ساتھ بقدر امکان بشری تشبیہ حاصل کرنے کی استعداد پائی جاتی ہے۔ پھر (ان مذکورہ کمالات کے بعد) ہر فرد میں جو مخصوص آثار و خواص پائے جاتے ہیں، وہ ہر فرد کے ساتھ مختص کمال (نفس) ہے اور یہ درجۂ پنجم کا کمال ہے، خوب سوچ کر ان حقائق کو پہچان لو۔

نامی، حیوانی اور دیگر صورتوں کے مداراتِ وجود

کیا اصحاب علم باللہ (اہل معرفت) نے تجھے یہ بتا دیا ہے کہ ہر صورت کے انعقاد (عقیدے) کا مدار کوئی اور شے ہوتی ہے۔ اس لیے ہر صورت نامیہ کا مناط ایک قوت نامویہ ہوتی ہے جو مولدہ (جسم عنصری) کی تکمیل کرتی ہے، پھر (قوت نامیہ) کا اکمالی و تکمیلی عمل

---

[1] (Public will)

مدبر وحکمران کی حیثیت سے اس جسم عنصری کے اندر جاری رہتا ہے اور اپنے تصرف خاص سے مختلف غذاؤں کو جمع کر کے انہیں مناسب انداز سے تحلیل کرتی ہے اور انہیں موافق جسم بنا کر جزء جسم بناتی ہے۔ جس کے نتیجہ میں وہ منتہائے کمال تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر جب جسم تحلیل ہوتا ہے تو صورت نامیہ بھی فنا ہو جاتی ہے۔ کیونکہ ہر صورت کی ہستی اپنے محل کے ساتھ ربط ووابستگی پر منحصر رہتی ہے کسی غیر پر نہیں اور ہر ربط ووابستگی ایک عقدہ (انعقاد) ہوتی ہے۔ جس کا کوئی مناط ضرور ہوتا ہے اور قاعدہ یہی ہے کہ جہاں مناط باطل ہو جائے، وہاں "عقدہ" بھی باقی نہیں رہتا۔ اور جب "عقدہ" تحلیل ہو جاتا ہے تو صورت لامحالہ باقی نہیں رہتی۔

صورت حیوانیہ (کی ہم آہنگی وابستگی) کا مناط یہ عمل ہے کہ متولد کے جسم میں نسمہ (روح ہوائی) مکمل ہو اور اس کی قوتیں جسم میں جاری وساری ہوں۔ جسم کی تخلیق صرف اس لیے ہوتی ہے کہ وہ روح ہوائی کی جولان گاہ اور اس کے تغذیہ کے لیے کھیتی ہو۔ صورت حیوانیہ کی بقا کا دار ومدار جسم پر قطعاً نہیں۔ صرف اتنی بات ہے کہ وہ (جسم) اس (صورت حیوانیہ) کی زینت عروس (اور زیبائش لیلیٰ) کے لیے بمنزلہ اسٹیج کے ہے۔ اس لیے جب جسم فنا ہو جاتا ہے تو صورت حیوانیہ فنا نہیں ہوتی۔ ہاں جب نسمہ (روح ہوائی) تحلیل ہو جاتی ہے تب صورت (حیوانیہ) بھی باقی نہیں رہتی۔

اسی طرح انسانی صورت (کی وابستگی) کا مناط یہ ہے کہ اس کی شخصیت (ہویت) اتنی مکمل ہو کہ وہ مبادی عالیہ میں جو "امام الانسان"[1] ہے اس کے لیے شرح بسیط بن سکے، اور اس شخصیت پر امام انسان کے خواص وآثار واضح طور پر ظاہر ہو سکیں، اس لیے جب نسمہ (روح ہوائی) فنا ہو جاتی ہے، تو صورت انسانیہ فنا نہیں ہوتی۔ مگر جب وہ نسمہ (عام برزخ کے جملہ مدارج سے گزر کر) "امام الانسان" کے حضور پہنچ جاتی ہے تو فنا ہو جاتی ہے۔

---

[1] امام الانسان سے مراد انسان کے وجود نوعی کا تمثل ہے۔ جو عالم مثال میں اہل کشف کو عیاناً نظر آتا ہے۔ اور جو تمام افراد انسانی کا اجمال ہے۔ حدیث معراج اور دیگر روایات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت آدم علیہ السلام کو اس حالت میں دیکھنا کہ اس کی اولاد کی تمام سعید وشقی روحیں اس کے دونوں جانب موجود تھیں، (واللہ اعلم) اس امام انسان کا مشاہدہ تھا۔

صورت شخصیہ (جو مطلق صورت انسانیہ کا فرد ہے) کا مناط ''رحمٰن'' کے اسم پاک سے نازل شدہ کلمہ ہے جو تمام ارتقائی منازل میں محفوظ رہتا ہے۔ یہ کلمہ ایک امر فرد ہے۔ جس میں رحمانیت کی صفت عالیہ کی تجلی نمایاں ہوتی ہے۔ جب کوئی سالک طریقت مقامات سلوک کو طے کرتے ہوئے صورت شخصیہ کے اطلاق میں پہنچ جاتا ہے تو اس کلمۂ نازلہ محفوظ کی بدولت اس پر خاص علوم نازل ہوتے ہیں۔ اور وہ یہ نہیں جانتا کہ ان علوم کا نزول کہاں سے ہو رہا ہے لیکن وہ فردِ کامل جو تمام منازل ارتقا سے پوری طرح باخبر ہو۔ اس سے کوئی بات پوشیدہ نہیں رہتی۔ اور ان ارتقائی منازل کی ہر منزل کو طے کر کے بالآخر مسیر طریقت میں ''الرحمٰن'' تک پہنچ جاتا ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

فلاسفہ کا یہ زعم غلط ہے، کہ انسان اور گھوڑا جنسِ حیوان کی دو شاخیں ہیں، بعینہٖ اسی طرح جس طرح حیوان اور درخت جنس نامی کی دو شاخیں ہیں، حاشا وکلاّ ایسا ہرگز نہیں۔ بلکہ خدائے رحمٰن جلّ وعلا نے اسمائے حسنیٰ کے تنزلات اور صورِ موجودات کے تصاعد کے لیے حرکت دوریہ کا نظام قائم فرمایا ہے۔ جس کا ظہور مختلف مناطات کے مطابق ہوتا ہے۔ چنانچہ اگر عالم نامی میں فاسد مادّہ موجود نہ ہوتا، جس کا ضروری نتیجہ نباتات کی ایسی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، جو اوپر جانے کی استعداد سے محروم اور سفلی استعداد سے ہم آہنگ معلوم ہوتی ہے، تو سب نباتات حیوانات کی شکل وصورت میں تبدیل ہو جاتے، اسی طرح (اگر استعداد مکمل ہوتی) تو تمام حیوانات انسان بن جاتے۔

کوئی شخص منازل ارتقا سے بری ہو کر عارف الٰہی نہیں بن سکتا جب تک کہ وہ اپنے اندر کسی درخت مثلاً کھجور یا بیری کو نہ دیکھے گا۔ اور یا اس کو اپنے نفس کے اندر کسی حیوان مثلاً گھوڑے یا گائے کی صورت نظر نہ آئے گی۔ پھر اس کے باوجود وہ اس بات سے واماندہ[1] نہ ہو کر مقامات سلوک طے کر کے ''حقیقت قصوی'' یعنی باری تعالیٰ تک پہنچ جائے جو ہر موجود کے لیے اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔

---

[1] واماندہ بقا، قیام

فصل-۳

انسان کی صورت نوعیہ اور اس کے طبعی تقاضوں کا بیان

جاننا چاہیے کہ نوع انسانی کی طبیعت کے لیے جس کا تقاضا یہ ہے کہ تمام افراد انسان نطق، ضحک وغیرہ سب خصوصیات کے حامل ہوں یہ ضروری ہے۔ کہ اس کی ایک مستقل ہستی اور وحدت دوسرے اشخاص وافراد کی وحدتوں اور ہستیوں سے الگ جداگانہ ہو اور اس ہستی اور وحدت کی بنا پر اسے جداگانہ حیثیت حاصل ہو۔ اور یہ بھی ضروری ہے کہ طبیعت نوع انسانی اس وقت تک باقی رہے گی جب تک نوع انسانی کا کوئی ایک فرد بھی باقی ہو بلکہ اگر کسی فرد کی بقا کا امکان بھی ہو اگر تم یہ باور کر سکو کہ فانیات زمانیہ اپنی فنا کے بعد بھی دہر (غیر متناہی) میں باقی رہتی ہیں۔ اسی طرح طبیعت نوع انسانی کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ خاص مقدار سیدھی قامت (حیوان کے گھنے بالوں کے مقابلہ میں) صاف جلد اور اس قسم کی دوسری خصوصیات (جو اس کے سب افراد میں بلا تخلف فرد پائی جاتی ہیں) کے بارے میں اس کی معین حد ہو۔ اگرچہ سرسری نظر میں یہ صورت (نوعیہ) دوسری (افرادی) صورتوں سے علیحدہ کر کے مجرد نہیں دیکھی جا سکتی۔ لیکن نظر غائر تو اس کو اپنے (نوعی) خواص سے اور آثار کے ذریعہ دوسری (افرادی) صورتوں سے جدا کر سکتی ہے۔ یوں سمجھیں کہ جس وجود کی بنا پر زید زید ہے، اس میں انسان کی صورت نوعیہ زید کی صورت شخصیہ سے متمیز نہیں لیکن جس وجود کے ذریعہ انسان انسان ہے۔ اس کے لحاظ سے اس کی صورت نوعیہ کسی دوسری چیز سے خلط ملط نہیں ہو سکتی۔

یہی حال زمان کے ظرف ولبادہ کا ہے۔ جس میں اگرچہ ایک وحدت میں مختلف صورتیں پوری طرح بغل گیر ہو کر جمع ہو گئیں۔ یہ وحدت دنیوی زندگی کے تقاضوں کے مطابق وجود میں آتی ہے۔ جس میں گردش اور ہیر پھیر (اور ارتقائی تغیرات) کی استعداد موجود ہے۔ لیکن

(لامتناہی) دہر کے ظرف میں ہر ایک صورت دوسری صورت سے متمیز ہو کر محفوظ ہے، جو اس کی نشاۃ قصوی کا تقاضا ہے اور جو اپنے مبدأ ہی سے فیض قبول کرتی ہے۔ یہ یاد رکھیے کہ ہر ایک موجود کا مبدأ دوسرے موجود کے مبدأ سے مختلف ہوتا ہے، ورنہ سب موجودات ایک ہی موجود ہوتے ہیں۔ ان میں سے کوئی دوئی اور مغائرت کبھی نہ ہوتی۔ دہر کو ملحوظ نظر رکھ کر یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ہر صورت کی حقیقت دوسری صورت کی حقیقت اور اصل سے متمیز نظر آتی ہے۔[1]

جب تحقیق اس درجہ تک پہنچ گئی، تو کیا وجہ ہے کہ طبیعت انسانیہ (انسان کی صورت نوعیہ) کو ایک مستقل ہستی کے طور پر آپ اپنی آنکھوں کے سامنے نہیں لا سکتے جس میں جنس اور فرد کے احکام کا شائبہ تک موجود نہ ہو۔[2]

انسانی طبیعت اور رحمٰن جل وعلا سے فیضیابی کی کیفیت

میں تم سے اس وقت خوش ہوں گا جب ہر چیز کی اصل خلقت کو ان اصول کی روشنی میں ملاحظہ کرو جو ہم نے ذرا پہلے بیان کیے ہیں ہم نے تجھے یہ سمجھا دیا تھا کہ "الرحمٰن" اسم پاک کی ہر حقیقت پر مشتمل ہے اور حقائق (اشیائے کائنات) اپنی فطری استعدادات کے مطابق فیضانِ رحمٰن سے بہرور ہوتے ہیں۔ اور انسان کی صورتِ نوع کا فیضان بھی صورت حیوانیہ کی استعداد کے مطابق "الرحمٰن" سے ہوتا ہے۔ یہ افاضہ ایک معلوم درجہ، مخصوص اندازہ، مقررہ اصول اور محدود حد کے ساتھ ان فطری استعدادات کے مطابق ہوتا ہے، جو بارانِ جود الٰہی سے استدعائے فیض کرتی ہیں۔ جس کے نتیجے میں اس پر صورت انسانی فائض ہو جاتی ہے۔[3]

---

[1] اس عبارت میں پروفیسر آئن سٹائن کے نظریہ اضافت کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

[2] حضرت شاہ ولی اللہ انسانی صورت نوعیہ کی مستقل ہستی کے نظریہ کے قائل ہیں، اور یہاں فلاسفۂ یونان کے اس خیال کی تردید کی ہے کہ انسانی نوع کی ہستی صرف افراد کے ضمن میں متصور ہو سکتی ہے اور "مطلق انسان" کا مفہوم انتزاعی ہے۔ جس کا خارج میں کوئی وجود نہیں۔

[3] یہ درحقیقت قرآن مجید کی اس آیت کریمہ کی فلسفیانہ تشریح ہے۔ وان من شيئى الا عندنا خزائنه وماننزله الا بقدر معلوم حضرت شیخ سعدیؒ نے اس مضمون کو یوں ادا کیا ہے:

باراں کہ در لطافت طبعش خلاف نیست
درباغ لالہ روید ودر شورہ بوم وخس

اور معلوم وزن وحد سے متصف یہ افاضہ شئون رحمٰن میں سے ایک شان اور اس کے مختلف جہات مندرجہ میں سے ایک جہت ہے، جو طبیعت انسانی کی صورت میں جلوہ گری سے پہلے لم یکن شیئاً مذکوراً کا مصداق تھا اور جلوہ گری کے بعد "اسم جزی" کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔ کیونکہ اس کا درجہ بلحاظ نزول اسمائے مطلقہ (تجلیات) اسمائے پاک کے درجہ سے کم تر ہے۔ اسم جزی یا تجلی یہ ہمارے (صوفیا) کی اصطلاح میں ہے ورنہ فلاسفہ کی اصطلاح میں اسے "عقل طباعی" کہتے ہیں۔[1]

ہر طبیعت نوعی اپنے امام سے پیوستگی ووابستگی رکھتی ہے

اور اس بات کی توقع اور طمع مت کرو کہ شریعت اسلام کے بانی جو مخلوق کے لیے معلم اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت بھیجے گئے ہیں۔ اس اسم خاص کے جاری وساری ہونے سے متعلق علوم کے سوا کسی اور بات کا ذکر کرے، وہ بھی اس طرح کہ اجمالی سریان کے بجائے جو عام لوگوں کے فہم واستعداد سے بعید ہوتا ہے، صرف تفصیلی سریان کا ذکر کیا گیا ہے جو عام فہم ہے۔

اس شخص سے زیادہ ظالم اور کون ہوسکتا ہے جو یہ بات تو تسلیم کرے کہ افلاک میں سے ہر فلک اپنی حرکت دوریہ کے سلسلہ میں اور اُن اثرات کے سلسلہ میں جو اس سے زمین

---

[1] تنزل کے سلسلہ میں اس حدیث شریف پر غور کرنا چاہیے "ینزل ربنا کل لیلة الی السماء الدنیا" الخ

غالب شاہ صاحب عقل طباعی سے مراد وہی عقل لیتے ہیں جو ابن رشد نے تلخیص مابعد الطبیعیہ ص ۲۹ میں ذکر کر چکے ہیں۔ اماالعقل فان شانه ان ینتزع الصور من الهیولیٰ ویتصورها مفردة علی کنهها وذالك امره بین۔

یا پھر ارسطو کی "عقل فعال" مراد لیتے ہیں جس کو معجم فلسفی ص ۱۱۱ پر یوں کیا گیا ہے:

"یحب ان یکون فی النفس تمیز یقابل التمیز التام بین العادة وبین العلة الفاعلیة التی تحدث الصور فی العادة، اسی قوت عقل اور تمیز نفس کو اس جزی یا تجلی کہنا شاہ صاحب کی مخصوص اصطلاح ہے۔ ہاں تجلیات کے تنزل کے سلسلے میں قرآنی آیات اور احادیث نبویہ سے استشہاد کیا جاسکتا ہے۔

پر نازل ہوتے ہیں۔اپنے امام (عقل) کے تابع ہوتا ہے اور پھر اس حقیقت سے انکار پر اصرار کرتا ہے کہ ہر نوعی صورت وزن و مقدار معلوم کے لحاظ سے اپنے امام کی تابع ہوتی ہے۔ یہ قصور نظر، سو فہم اور عدم تحقیق کا نتیجہ ہے (کہ وہ اس حقیقت سے انکار کرتا ہے) ورنہ اہل معرفت جن کے سامنے طبیعت نوعیہ کے آثار و خواص متمثل ہو کر نظر آتے ہیں اس کی صداقت میں ذرہ بھر شک نہیں کرتے۔اس لیے تم کبھی آنکھوں کے سامنے اس (صورت نوعیہ) کی مستقل ہستی کے جلوہ گر ہونے میں شک نہ کرو۔اور کیوں نہ ہو جس کو ہم اسمائے حسنٰی میں سے اسم پاک کہتے ہیں، اور فلاسفہ کے نزدیک وہ عقل طباعی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔وہ شئون رحمانیہ میں سے ایک شان ہوتی ہے جو بالاترین مقام میں ان (شئون) کے اجمالی ادغام کے بعد ظہور پذیر ہوتی ہے گویا کہ وہ عنوان ہے جسے عنوانیت کے درجہ میں پیدا کیا گیا ہے اور نوع کے افراد میں جو کچھ بعد میں آتا ہے وہ معنون اور تفصیل ہوتی ہے)۔

تمثیل اسم کے بارے میں یہ توقع نہ رکھیے کہ وہ امام (یعنی شان خاص) اسے زیادہ تفصیل کے ساتھ متمثل ہو سکے گی۔

عالم مجرد اور اجسام کے درمیان قوت متوسطہ

اب میں تم کو یہ بھی بتانا چاہتا ہوں کہ اس اسم پاک کا سریان طبیعت انسانیہ (صورت نوعیہ انسانیہ) میں کس طرح ہوتا ہے اور ہر طبیعت نوعیہ اشخاص و افراد میں کس طرح سرایت و نفوذ کرتی ہے قریب ترین تشبیہ یہ ہے کہ اسم پاک گویا ایک روح کلی[1] ہے۔ طبیعت نوعیہ روح حیوانی یا نسمہ[2] اور مجموعۂ افراد سب بمنزلہ شخصِ واحد کے ہے اور اس سرایت کے بعض اثرات تو (ظاہری آنکھ اور) سرسری نظر سے محسوس ہوتے ہیں مثلاً کسی فرد کی تخلیق کے اسباب فراہم ہو جائیں تو اسم پاک یک بارگی اس فرد کی شکل میں اتر کر رونما ہوتا ہے۔ پھر دوسرے شخص کی تخلیق کے اسباب و علل فراہم ہو جاتے ہیں۔تو اس رنگ میں منصۂ شہود پر جلوہ گر ہو جاتا ہے۔اور یہ ظہور اس طرح ہوتا ہے جس طرح کلی اپنی جزئیات

۱۔ (Uninersal Soul)

۲۔ (Nesmie Body)

میں ظہور کرتی ہے۔ (اس طرح نہیں جیسے کل اپنے اجزا میں ظہور کرتا ہے) یعنی کلی کی جزئیات اسی طرح ظہور میں آتے ہیں۔ اور جب یہ افراد واشخاص عالم خلق میں قدم رکھتے ہیں تو اس اسم پاک کے آثار ان افراد میں کلی طور پر سرایت کرتے ہیں۔ اس کے برعکس بعض دوسری خاصیتیں ہیں جن کا احساس وادراک دقیق وعمیق نظر کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ مثلاً

نمبر۱: وہ تدبیر کلی ہے جسے کوئی اسم پاک ایک ہی مرتبہ سب اشخاص میں جاری کرتا ہے اور جس کے نتیجہ میں سب افراد (ایک وحدانی نظام وتدبیر کے ذریعہ) شخص واحد کی طرح ہوجاتے ہیں۔ اور اس کی صحت وبیماری حرارت وبخار اور دیگر عوارض کا ظہور اسی تدبیر کلی یا وحدانی نظام سے وابستہ ہوتا ہے۔

یا نمبر۲ جیسے کہ اشخاص انسانیہ کی استعداد کے مطابق کسی شخص کا کسی صورت ظاہری، صورت نوری، صورت ذاتی یا مکاشفہ کے طور پر کسی صورت (ذوقی) میں متمثل ہونا (بھی گہری نظر کے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتا)۔

ان صورتوں میں سے کوئی صورت اختیار کرنے کے بعد اُس پر ان کی استعداد کے مطابق اسم پاک کی تجلیات مرکوز ہوجاتی ہیں۔ عوام کا علم (اور احاطۂ نظر) اس اسم پاک کی تجلی سے بالاتر (حقائق کی طرف) نہیں جاتا لیکن کامل افراد کو وحدت کبریٰ اور اس کے بعد کی تجلیات تمام کے تمام اسی اسم پاک کی راہ سے مشاہدہ ہوتے ہیں جس کی راہ سے وہ خود ظہور میں آئے ہیں کوئی بات اُن سے پوشیدہ نہیں ہوتی۔

یا (۳) اُن جزی اسما کی حقیقت کا فہم وادراک بھی نظر غائر سے ہوسکتا ہے جو اُس تصادم وکشمکش کے نتیجہ میں ظہور پذیر ہوتے ہیں جو اس تدبیر الٰہی (جس کا دوسرا نام حق ہے) اور عالم کون وفساد کے اندر جزئی حوادثات اور سلسلۂ مرض وصحت کے درمیان ہوتی ہے۔ جیسے وہ جزوی اسم جس کی تفصیل ملت حنیفیہ ابراہیمیہ کی صورت میں ظاہر ہوئی، بعد ازاں وہ اسم جزوی جس کی تفصیل دین موسوی اور شریعت محمدی کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ ان تین علوم کی حقیقت کا ادراک صرف علماحق اور اہل معرفت ہی کرسکتے ہیں۔

اہل معرفت اس سریانی کیفیت کو مختلف ناموں سے یاد کرتے ہیں جب اس کا تعلق نوع سے ہو تو اس کو "عنایت رحمانی" کا نام دیتے ہیں اور جب اس کا تعلق اُن عوارض سے ہو جو نوع پر عالم خلق میں طاری ہوتے ہیں، تو اسے "تدبیر رحمانی" سے موسوم کرتے ہیں اور جب کشمکش وتصادم سے اس کا تعلق ہو تو اسے باطل کو توڑنے کے لیے "حق دامغ" کہتے ہیں۔ اور پھر عنایت الٰہی اور حق کو جن کا نزول اسم الرحمٰن سے ہوتا ہے آثار ظاہرہ کے لحاظ سے مناسب حال اسما مثلاً رزاق، مصور، قابض اور باسط وغیرہ ناموں سے یاد کرتے ہیں۔ یہ اسما (اپنے اجمالی مفہوم میں) مفردات ہیں اور عالم امر وخلق میں جو قوائے عاملہ اُن کے مظاہر ہیں وہ ان کے مرکبات ہیں۔

امام الانسان اور اس کی تفصیل

اور اس تحقیق جلیل میں تمہاری مزید امداد ہماری اس دلیل وبیان سے ہوسکتی ہے کہ "امام الانسان" کے لیے ضروری ہے کہ نوع انسانی کے جملہ افراد کے اس کی وحدت میں مندرج ہوں اور ہر فرد انسانی بحیثیت مطلق انسان اس کے دائرہ شمولیت سے باہر نہ ہو۔ زید، عمرو اور بکر کی اس میں کوئی خصوصیت نہیں، کیونکہ زیدیت اور عمرویت عارضی خصوصیت واحوال ہیں جو حسب استعداد افراد پر طاری ہوتی ہیں۔ یہ بات امکان وتجویز کے دائرہ کے اندر رہتی ہے کہ اگر وہ اسباب وعلل یا استعدادات جمع ہوں جو زیدیت کی متقاضی ہیں تو وہ شخص زید بن جاتا ہے۔ اور اگر عمرویت کے متقاضی ہیں تو وہ شخص عمرو بن جاتا ہے۔ پس امام الانسان کے پاس زید کو زیدیت اور عمرو کو عمرویت کی صورت بخشنے کی قوت حد امکان تک تو ہے لیکن ان کو بالفعل ان صورتوں سے نوازنے کے لیے احوال وظروف اور معدات کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی پر ان خاص احوال وظروف کو قیاس کیجیے جو بعد میں (دنیوی زندگی میں) ان افراد واشخاص پر طاری ہوتے ہیں۔ جب زید اور عمرو عالم وجود میں قدم رکھتے ہیں تو وہ باتیں جو پہلے دائرہ امکان کے اندر تھیں اب ایک ہی دفعہ فعل (وعملی صورت) کا لبادہ پہن لیتی ہیں۔

اسی طرح وہ حالات وکوائف ہیں جو تمام کائنات عالم بالا و اسفل پر ابتدائے آفرینش سے انتہائے عالم کون وفساد تک طاری ہوئے ہیں یا ہوتے ہیں، یا ہوں گے اور جن کا ظہور ان لوگوں کے نزدیک جو زمان کے قید میں محبوس ہیں، مختلف اوقات میں یوماً بعد یوم ہوتا ہے اور اس خدائے قدوس کے نزدیک جو مکان وزمان کے قیود سے منزہ اور برتر ہے، ایک دم ظہور میں آتے ہیں۔ بہرحال یہ سب حالات اور واقعات دائرۂ امکان میں رہتے ہیں۔ اور اسباب وعلل موجبہ کے جمع ہونے پر قوۃ سے فعل میں آتے ہیں۔ اور یہ تمام حوادث جو ایک ایک فرد کو پیش آتے ہیں دونوں حالتوں میں یعنی جبکہ وہ دائرہ امکان کے اندر ہوں اور پھر جب وہ بالفعل کا لبادہ پہن لیں، خدائے بزرگ وبرتر کے مقرر نظام میں شامل ہیں۔

تقدیر کا مسئلہ

کیا اہل معرفت الٰہی نے تجھے اس حقیقت سے روشناس کیا ہے کہ موجودات عالم میں ہر روز جو انقلابات وتغیرات رونما ہوتے ہیں وہ دو مرتبہ وجوب (یعنی لازماً وجود میں آنے کے تقاضے) سے متصف ہوتے ہیں۔ ایک مرتبہ قبل از وجود (جبکہ ابھی درجۂ اجمال میں ہوتے ہیں) اور دوسری مرتبہ بعد از وجود (جب عالم کون وفساد میں) اس کا ظہور ہوتا ہے۔ یہی حال ان کے علل موجبہ کا بھی ہے۔ چاہے وہ حادث ہوں یا قدیم[1] دونوں پر یہ نظریہ حاوی ہے۔ اور یہ سلسلہ کائنات میں ابتدا کی طرف اسی طرح ممتد ہے یہاں تک کہ یہ تمام حوادث وموجودات اس سر میں مندرج ہیں جو الرحمٰن سے نازل ہوتا ہے۔ اس لیے کائنات کا معاملہ وقتاً فوقتاً پیدائش کا نہیں بلکہ ہر چیز کے وجود کا حتمی فیصلہ پہلے سے ہو چکا ہے جو کچھ وجود میں نہیں آئے گا۔ اس کے موجود ہونے کا امکان ہی نہیں۔ اور جس شے کے وجود کا امکان ہے وہ لامحالہ وجود میں آئے گی۔ یہ اور بات ہے کہ امکان کا یہ مفہوم لیا جائے کہ حق کے ظہور سے پہلے جب آدمی دائیں بائیں عقلی گھوڑے دوڑاتا ہے تو وہ ذہنی احاطہ

---

[1] حادث کے معنی یہ ہیں کہ کوئی چیز ایک وقت نہیں تھی، پھر ہو گئی، ظاہر ہے کہ ایسی چیز اس بات کی محتاج ہے کہ کوئی اسے وجود میں لائے۔ قدیم وہ چیز جس کے وجود کے لیے زمانی ابتدا نہ ہو۔

کے اعتبار سے صفتِ شیی ا۔ رکر لیتا ہے اور وہ اس صورت ذہنی پر ممکن کا اطلاق کرتا ہے مگر اہل حق سے حقیقت پوشیدہ نہیں رہ سکتی اور وہ یہ ہے کہ اس نظام واجب الوجود (غیر وجوب ذاتی) کا ظہور خدائے رحمٰن جلّ وعلا کی صفت عالیہ سے ہے، جو اس کے ظہور سے قبل بھی اس میں موجود تھا۔

انسان کے افراد پر جو کچھ بھی فیض نازل ہوتا ہے وہ یا تو امام الانسان سے ہوتا ہے یا دیگر ائمہ انواع میں سے کسی نوع کے امام سے ہوتا ہے۔ پھر جب کوئی حادث ظہور پذیر ہوتا ہے تو ان دونوں کے احکام آپس میں گھل مل جاتے ہیں۔

عالم امر و عقل کی حقیقت

پھر خدائے رحمٰن کی حکمت بالغہ کا تقاضا یہ ہے کہ یہ ممکنات ''امور مجردہ'' کی متعینہ بالفعل کا درجہ حاصل کر کے ''موجود کلی'' کی قوت عقل و ادراک میں نازل ہوں پھر جب بھی (اسباب اور علل موجبہ کے جمع ہونے پر) اس کے عالم وجود میں آنے کا وقت آتا ہے تو خدائے رحمٰن جلّ وعلا کی طرف سے اس کے ایجاد و ایجاب یعنی معرض وجود میں لانے میں کوئی تاخیر نہیں ہوتی گویا ایجاد و ایجاب عالم مجرد تک محدود ہو جس کو اکثر صوفیا کرام عالم امر بھی کہتے ہیں اور فلاسفہ کے نزدیک اس کا دوسرا نام عالم عقلی ہے اور ہمارے اس قول ''درّاکۃ الموجود الکل'' (یعنی ممکنات جن کا بالفعل تعین موجود کلی کی قوت عقل و ادراک میں ہو) کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم ان اشیا کو خارج کرنا چاہتے ہیں، جن کا وجود ذہنی ہو بلکہ مقصد صرف یہ ہے کہ موجود کلی کے درّاکہ میں وجود کے وقت وہ مجردات میں سے ہوتے ہیں اور عالم مادی سے اس کے تجرد اور تنزہ کی توصیف و تصریح مقصود ہے۔

عالم مجرد و عالم اجسام میں قوت متوسطہ کے مظاہر

پھر یہ بھی ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ موجود کلی کی قوتوں میں ایک ایسی قوت بھی ہے جو عالم مجرد اور عالم اجسام کے درمیان قوت متوسطہ کا کام دیتی ہے جس کی شان یہ ہے کہ اس کی بدولت مجردات عالم بالا مادہ کے احکام سے متصف ہوتے ہیں اور مادیات پر مجردات کے

احکام کا اجرا ہوتا ہے۔ اگر یہ درمیانی قوت نہ ہوتی تو اشیا کے آثار و خاصیتیں ان کی صورتوں سے جبلی طور پر وابستہ نہ ہوسکتیں۔ اور کسی کے ذہن میں زید کی جو صورت ہوتی وہ زید کی متعین صورت نہ بن سکتی۔ اور نہ خدائے رحمٰن جل و علا سے جو تجرد محض سے متصف ہے کوئی مادی صورت صادر ہوسکتی۔

اور انہی وجوہ کی بنا پر فلاسفہ مشائین نے بھی افلاک کے لیے بھی متوسط قوت کا اثبات کیا۔ جو خدائے رحمان کی طرف سے مختلف صورتوں کے فیضان کے لیے برزخ کا کام دیتی ہے۔ اور افلاک کی علل کلیہ کے احکام کو جزوی حرکات میں تبدیل کرنے کے لیے واسطہ اور ذریعہ ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ قوت متوسطہ (صرف افلاک تک محدود نہیں بلکہ وہ) تمام کائنات (الموجود الکل) پر ایک محمول کی طرح احاطہ کیے ہوئے ہے اور اس کے اپنے مظاہر ہیں جن میں اس کی تجلی ہوتی ہے چنانچہ اس کا کامل ترین مظہر عرش بریں کی قوت متخیلہ ہے۔ اس کے بعد دوسرا مظہر افلاک کی قوت متخیلہ ہے اور تیسرا مظہر انسان کی قوت متخیلہ ہے۔ ان میں سے ہر ایک مظہر میں جداگانہ آثار و احکام اس سے اوپر کی قوتوں کی مناسبت سے ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ احکام کے مجردات (ارواح) اس قوت پر نازل ہوتے ہیں اور اس قوت میں اس کے اشکال والوان ظاہر ہوتے ہیں پھر یہ اشکال والوان، عالم امر سے عالم اجسام پر نازل ہوتے ہیں۔

انسانی وجود چار عالموں میں ہے

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ انسان کا ایک وجود وہ ہے جس کا فیصلہ علم جبروت میں ہوا اور دوسرا وجود وہ جس کا فیصلہ عالم ارواح میں ہوا پھر تیسرا وجود وہ جس کا فیصلہ عالم مثال میں ہوا۔ اور سب سے آخری وجود وہ ہے جو اس عالم اجسام میں ظاہر ہوا۔

(عوالم اربعہ میں مختلف صورتوں میں انسانی وجود کے اس نظریہ کو) اچھی طرح جان لو۔

پہلا مقالہ

(۱)

امام الانسان کے ان احکام کا بیان جن کا ظہور بنی نوع انسانی کی طبائع میں ہوتا ہے اور ان سے وہ اپنے اخلاق، ارتفاقات، اور رسومات میں ہدایت اور رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔

پہلی فصل

ہر صورت نوعیہ حیوانیہ کی دو قسم کی خصوصیات ہوتی ہیں

حیوانی انواع کی نوعی صورتوں میں سے ہر یک صورت نوعیہ کی خصوصیتیں دو قسم کی ہیں:

۱-پہلی قسم اس کی ظاہری خصوصیات ہیں جیسی خلقت اور بناوٹ یعنی شکل وصورت، رنگ اور مقدار اور آواز میں دیگر انواع مخلوقات سے جداگانہ اور ممتاز ہے مثلاً انسان کی قد و قامت سیدھی ہوتی ہے وہ نطق و گفتگو کرتا ہے، سمجھتا ہے۔ وہ بالوں سے صاف ستھری جلد رکھتا ہے، اس کے برعکس گھوڑے کو دیکھیے وہ کج قامت (اور زمین پر چار پاؤں سے چلتا ہے) ہنہناتا ہے، گھنے بالوں والا (گچھ وار دُم) کا مالک ہے اور اس پر دوسرے حیوانات اور انواع کے خواص کے باہمی تمایز کو قیاس کرلو۔ تھوڑے سے غور وامعان کے بعد تمہاری نظروں کے سامنے وہ سب امتیازی صفات وخصوصیات آجائیں گی جن سے ہر نوع کے افراد دوسرے انواع کے افراد کے مقابلہ میں امتیازی حیثیت سے متصف ہیں۔

۲-دوسری قسم کی خصوصیات باطنی خصوصیات ہیں۔ جن کی وجہ سے انسان دیگر حیوانات سے ممیز ہو جاتا ہے مثلاً: اس کو اللہ تعالیٰ نے قوت ادراک اور معلومات ومحسوسات کے ذریعہ مجہولات کا علم حاصل کرنے کی استعداد سے نوازا ہے۔ اور وہ اپنی زندگی کو مخصوص طریقے پر بسر کرنے کی قابلیت رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر نوع کو جداگانہ ادراک اور طریقۂ معاش سے نوازا ہے اور ان کے مدارج بھی مقرر ہیں مثلاً شہد مکھیوں کو اس کی فطرت کے مطابق یہ الہام کیا گیا ہے کہ وہ اپنی فطرت کے تقاضوں سے ہم آہنگ مناسب درختوں کی

تلاش بھی کریں، اور ایک گھر بنائیں جس میں اس کی نوع کے افراد جمع ہوں اور مختلف پھولوں اور پھلوں کا رس چوس چوس کر وہاں شہد تیار کریں۔

اس طرح چڑیا چڑے کو دیکھیے کہ شہوت کے وقت ''نر'' اپنی ''مادہ'' سے کس طرح مباشرت اور اس کا پیچھا کرتا ہے پھر کس طرح وہ دونوں رہنے سہنے کے لیے پہاڑوں میں آشیانہ بناتے ہیں۔ اور انڈوں کی حفاظت کرتے ہیں اور مدت ختم ہونے پر انڈوں کو چونچوں سے مارتے ہیں۔ اور بچے نکالتے ہیں۔ جب انڈوں سے بچے نکلتے ہیں تو کس طرح وہ ان کو دانے اور غذا بہم پہنچاتے ہیں؟ پھر کس طرح آہستہ آہستہ ان کو پرواز کے لیے چھوڑتے ہیں۔ بعد ازاں بچوں کو بلّی، شکاری اور جال سے بچنے کی تربیت دیتے ہیں۔ اور انھیں سکھاتے ہیں کہ غلہ، پانی اور غذا وہ کہاں کہاں سے حاصل کریں۔ اور ان مقامات میں دشمنوں سے کس طرح حفاظت کریں۔ نیز یہ کہ وہ اپنی نوع کے دوسرے پرندوں کے ساتھ رہیں اور حصول نفع و ضرر کے لیے کس طرح لڑیں۔

وعلی ہذا القیاس دوسری باتیں ملاحظہ کیجئے تاکہ تمہارے سامنے وہ تمام الہامات وجبلّی تقاضے متمثل ہو جائیں جو کسی ایک نوع کے افراد کے لیے مخصوص ہیں اور وہ دوسرے انواع کے افراد میں نہیں پائے جاتے۔ پھر اس سے زیادہ کم عقلی اور بے وقوفی کیا ہو سکتی ہے کہ وہ احکام، آثار و خواص جو سب افراد نوع سے مختص ہیں ان کے بارے میں یہ خیال قائم کیا جائے کہ وہ صورت نوعیہ اور امام النوع کا تقاضا نہیں ہیں۔

انسان کی امتیازی خصوصیات: جہاں تک انسان کا تعلق ہے تو اس کو دوسری انواع سے اس بات میں تفوق و امتیاز حاصل ہے کہ اس کی خصوصیات اکمل، اتم اور افضل ہیں، مثلاً یہ کہ انسان رائے کلی اور انجام کار کو ملحوظ رکھ کر کوئی عمل کرتا ہے اور مافی الضمیر اور قلبی جذبات اور باطنی احساسات کو کلام سے ادا کرتا ہے اور (اپنے اور دوسروں کے کلام کو (سمجھ، بول اور) لکھ سکتا ہے۔ اس میں سلیقہ اور جذبۂ لطافت و زیبائش بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اور اگرچہ یہ خاصیتیں بے شمار و لامحدود ہیں مگر ان سب کا مرجع تین بنیادی باتیں، بنیادی خصوصیات ہیں۔

انسان رائے کلی کے ماتحت قصد و عمل کرتا ہے مثلاً جلب نفع و رفع ضرر کے لیے

غضبناک ہو کر کامیابی کے موانع کو راستہ سے ہٹانا اگرچہ انسان اور حیوان دونوں میں مشترک ہے لیکن چوپایہ کو اس کی تحریک کسی امر محسوس یا موہوم سے ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے انسان کا غیظ و غضب (ان محسوس و موہوم موانع کو ہٹانے کے علاوہ) بعض اوقات شہریت اور تمدن و تہذیب انسانی کو برقرار رکھنے کے لیے کسی کامل قانون اور ضابطہ و نظام کی تشکیل کی خاطر بھی ظہور میں آتا ہے۔ اسی طرح چوپایہ اپنی اغراض و خواہشات کی تسکین و تحصیل کے لیے اپنے آپ کو تھکاتا ہے۔ لیکن اس کی جدوجہد کا نصب العین بھوک اور پیاس کو رفع کرنے اور صنفی خواہش یا اس قسم کی سفلی اور حیوانی خواہش کے پورا کرنے تک محدود ہوتی ہے۔ مگر انسان بعض اوقات ایسے مقاصد کے حصول کے لیے مصائب و تکالیف برداشت کرتا ہے۔ جن کے لیے کوئی جسمانی خواہش اور جسدی محرک نہیں ہوتا بلکہ کسی عمل میں اس کی سعی اور جدوجہد اس لیے ہوتی ہے کہ یا آخرت (کی نجات و سعادت) کا مقصد یا دنیا میں ارتفاقات و اداروں کی تشکیل کا مقصد حاصل کرے جن کے اثرات دیر میں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

۲-انسان کی دوسری امتیازی خصوصیت اس کی ظرافت (سلیقہ) ہے، یعنی حس لطافت و زیبائش ہے، چوپایہ شدت بھوک اور پیاس، اور گرمی و سردی کی شدت سے بچنے کے لیے بقدر ضرورت و کفایت کھانے پینے اور سر چھپانے کے لیے جگہ بنالیتا ہے اور شکم سیری کے لیے غلیظ گھاس پھوس اور گدلا پانی کھاپی لیتا ہے اور کسی درخت کی پناہ لینے یا کسی غار میں گھس جانے پر اکتفا کرتا ہے لیکن انسان اپنے ماکولات و مشروبات اور رہائش و مسکن میں صرف کفایت اور دفع ضرورت پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ وہ اس میں اپنے جمالیاتی ذوق کی تسکین اور لطف اندوز ہونے کا پورا پورا خیال رکھتے ہوئے لطافت و زیبائش کو بھی مدنظر رکھتا ہے۔ اور سکون قلب و نظر حاصل کرتا ہے۔

۳-تیسری امتیازی خصوصیت انسان کی حیوانات کے مقابلہ پر یہ کہ چوپایہ کو جو الہامی جبلتیں دی گئی ہیں وہ اس کی معاشی زندگی کے لیے امدادی آلات اور ذریعوں کا کام دیتی ہیں۔ اور ان کی ضرورت صرف اس وقت محسوس و ظاہر ہوتی ہے جب اسے کوئی حاجت

پیش آتی ہے۔اس لیے چوپایوں کوعلم کی تحصیل کی ضرورت نہیں ہوتی، مگرانسان تحصیل علم کو تکمیل ذات کے لیے لازمی اور ضروری سمجھتا ہے اور صفت ایجاد وتقلید کی وجہ سے الہامی علوم کے مؤید اکتسابی علوم وفنون سے اپنی دنیوی، تہذیبی اور تمدنی زندگی کو ترقی کے عروج پر پہنچانے میں کوشاں رہتا ہے۔یہی تین اصول ہیں جن پر نوع انسانی کی ان تمام خصوصیات کا مدار ہے جن کی بدولت انسان دوسرے انواع مخلوقات سے ممتاز نظر آتا ہے۔

انسانوں کے باہمی تفوق کے اسباب

یہ بھی جاننا چاہیے کہ جس طرح حیوانات میں ایک دوسرے سے امتیاز وتفاوت کا مدار ان کے اجزائے ترکیبی میں باہمی ربط واتصال، صلابت وبستگی اور صفائی ونظافت کے اختلاف پر ہے جس کے نتیجہ میں بعض کامل الخلقت ہوتے ہیں۔اور بعض متوسط اور بعض ناقص الخلقت ہوتے ہیں۔بعینہٖ اسی طرح نوع انسانی کے افراد بھی ان اوصاف کے تفاوتِ مراتب کی وجہ سے ایک دوسرے سے ممتاز ہوتے ہیں چنانچہ بعض انسان صلابت، صفائی اور اتصال اجزائے ترکیبی میں ایک دوسرے سے زیادہ کامل الخلقت ہوتے ہیں اور ان مذکورہ اوصاف ثلاثہ میں کمال کے مطابق ان میں تفاوت مراتب ہوتا ہے۔مگر کامل ترین انسان وہ ہے جس میں صلابت صفائی اور اتصال اجزا کے اوصاف بہ درجۂ اتم موجود ہوں اور پھر ان اوصاف سہ گانہ کے کمال کے اثرات ان کی قلبی، طبعی اور نفسانی، روحانی تین قوتوں میں نمایاں ہوں اور نتیجہ ان قوائے ثلاثہ میں اشتباک اور کامل وابستگی وتلازم ظہور پذیر ہو اس لیے کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ حقیقی شرف وفضیلت کا مدار ان صفات ثلاثہ میں زیادتی واضافہ ہی پر ہوتا ہے۔اس قسم کا کامل ترین انسان ایک قانون ومثال[1] کا حکم رکھتا ہے اور حکمت خلقیہ (فلسفہ اخلاق) میں اس کو معیار[2] مانا جاتا ہے، وہ اخلاق قابل تقلید اور پسندیدہ خیال کیے جاتے ہیں جو اس کے نمونہ اخلاق کے مطابق ہوں اور جو اخلاق اس کے کردار کے مخالف ہوں ان کو اخلاق ذمیمہ اور قابل نفریں سمجھا جاتا ہے پھر یہ بھی یاد رکھو کہ حکمت خلقیہ

---

[1] (Ideal)　[2] (Slandasd)

(فلسفہ اخلاق) دوسرے سب اقسام حکمت وفلسفہ مثلاً حکمت معاشیہ (اقتصادیات) تدبیر منزل[1] اور سیاست مدنیہ[2] وغیرہ کے لیے بمنزلہ قانون ومعیار کے ہے۔

نیز اس قسم کے کامل ترین انسان کو معرفت باری تعالیٰ اور مجازات اعمال کے مسائل میں بھی سند ومعیار مانا جاتا ہے اور اس معرفت باری کے ساتھ جو عبادات وابستہ ہیں ان کے لیے اعضا کے (مخصوص طریقہ سے) استعمال کا جو قاعدہ مناسب ہے اس کی پہچان کے لیے بھی اس کامل ترین انسان کا طرز عمل معیار کا کام دیتا ہے۔

شجاعت وغضب اور دیگر خصال کی حقیقت

کیا تم نے کبھی اس بات پر غور کیا ہے کہ چوپایوں میں جو سانڈ ہر طرح کی آسودگی اور خوشحالی میں پل کر حد کمال تک پہنچ جائے اور اسے مزاج جسم کے مطابق غذا (طعام وشراب) میسر ہو اور اس کو نشست وبرخاست اور چلنے پھرنے میں پوری آزادی وغیرہ حاصل ہو تو وہ اپنی نوع کے دوسرے چوپایوں سے دو باتوں میں نمایاں امتیاز حاصل کر لیتا ہے۔

۱- پہلی امتیازی صورت اس کی ظاہری اور جسدی خصوصیتوں کی حامل ہوتی ہے مثلاً یہ کہ اس کا سینہ فراخ اس کا رنگ شوخ، اس کا بدن قوی اس کے اعضا جسمانی مضبوط اس کے بال گھنے اس کے بدن کی بو، تیز، اس کی ہڈیاں چوڑی اور مضبوط اس کے جوڑ نمایاں اس کی رگوں میں خون تیز۔ اس کی آواز بلند وشدید، اس کی گرفت سخت اور اس کی قوت شہوانیہ زبردست ہوتی ہے۔ وہ مادہ کے ساتھ عظیم محبت کرتا ہے۔ (اگر چہ یہ محبت کسی خاص مادہ کے ساتھ نہیں بلکہ مطلق مادہ کے ساتھ ہوتی ہے) اس کی گردن موٹی اور اس کے بدن پر گوشت زیادہ ہوتا ہے۔

۲- دوسری امتیازی خصوصیت (شان) اس کی روح حیوانی کے آثار وخواص میں نمایاں ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ بہت جلد غصہ میں آجاتا ہے۔ بڑا دلیر اور بہادر ہوتا ہے اور حملہ کرنے میں پیش رفت کرتا ہے۔ کینہ ور اور غیرت مند ہوتا ہے۔ اور وہ یہ برداشت نہیں

---

[1] (...conomics) [2] (Political Science)

کر سکتا کہ اس کی نوع کا کوئی دوسرا فرد گرفت و سرکشی میں اس پر فائق رہے وہ ارادہ کا پختہ ہوتا ہے اور اپنے ارادے کی تنفیذ چاہتا ہے اور کوئی چیز اسے اپنے عزم و ارادے کی تنفیذ سے پھیر نہیں سکتی۔ جب وہ کسی چیز کی طرف دیکھتا ہے تو بنظر ہیبت دیکھتا ہے اور جب چلتا ہے تو نہایت وقار کے ساتھ چلتا ہے جب اسے کوئی خوفناک چیز درپیش ہو تو وہ یا تو حملہ آورانہ انداز میں اس سے نمٹتا ہے اور یا بے خوفی کے ساتھ اسے نظر انداز کر کے چلا جاتا ہے۔ وہ ہر وقت تفوق اور ریاست کا خواہاں رہتا ہے اگر چہ یہ ریاست و حکمرانی اس کے طبقہ اناث (مادوں) تک محدود کیوں نہ ہو اور اسے یہ قطعاً ناگوار خاطر ہوتا ہے کہ کوئی دوسرا نر اس کا ہم پلّہ اور مقابل ہو۔ تام الخلقت سانڈ میں یہ سب ظاہری اور باطنی اوصاف موجود ہوتے ہیں۔ ہاں بعض ناقص الخلقت سانڈوں میں یہ اوصاف کم ہوتے ہیں یا نہیں ہوتے (اور اس اندازے سے اس کے تفوق و برتری کا معیار بھی کم ہو جاتا ہے) اور ان اوصاف میں کمی یا فقدان کے بنیادی اسباب یہ ہوتے ہیں کہ یا

۱۔ شکم مادر میں ان جمع شدہ مواد میں نقص و کمی ہوتی ہے۔ جن سے اس کی تخلیق ہوتی ہے اور نتیجہ اس کی ناقص الخلقی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

۲۔ یا اس تدبیر و تربیت کا قصور ہے جو اس کی نشو و نما اور اس کو اپنی صورت نوعیہ کے تقاضوں کے مطابق مرتبہ کمال و بلوغ تک پہنچانے کی باعث ہوتی ہے۔

جس طرح حیوانات میں ان صفات کی مثال دے دی گئی ہے بعینہٖ اسی طرح ان صفات کو نوع انسانی میں قیاس کیجیے اور وہ مذکورہ اصول ثلاثہ جو خصوصیات انسان میں سے ہیں یعنی رائے کلی عواقب امور پر نظر رکھنا، ظرافت (جمالیاتی ذوق یا جذبہ لطافت و زیبائش) اور تکمل بالاخلاق والعلوم (یعنی علوم و اخلاق کو ضرورت سے قطع نظر کر کے صرف تحصیل کمال کی خاطر حاصل کرنا) کو بھی مدنظر رکھیے۔

جاننا چاہیے کہ جب قوت غضبیہ کا محرک ''رائے کلی'' ہو تو اس کا جو نتیجہ ظہور میں آئے گا اس کا نام شجاعت ہوگا، اور یہ ایک وصفِ محمود ہے کیونکہ ایسے شخص کا اقدام اس وجہ سے ہوتا ہے کہ اسے یقین یا گمان غالب رہتا ہے کہ اگر وہ انتقام لے لے تو مستقبل

میں اسے کوئی نفع حاصل ہوگا یا کسی ضرر سے وہ بچ جائے گا۔ پھر اپنے ایک خلق پر (یعنی شجاعت پر) اعتماد کرتے ہوئے اور اس کے ذریعہ اپنی شخصیت کی تکمیل کرتے ہوئے وہ جنگجوئی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور محرک اس کی طبیعت میں کام نہیں کرتی۔

رائے کلی اور ظرافت کے آثار

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جب علوم کی تدوین ''رائے کلی'' اور تکمیل بالاخلاق (اخلاق کے ذریعہ کمال حاصل کرنا) پر مبنی ہوتو وہ حکمت (فلسفہ) بن جاتے ہیں، اور جب ان کی تحصیل میں سلیقہ اور جذبۂ لطافت وتحسین کا دخل ہوتو علوم میں تنوع پیدا ہوتا ہے اور ان کے مسائل میں باریکیاں اور نکتہ سنجیاں پیدا ہوتی ہیں۔ بعینہ اس طرح جس طرح بلند آواز میں جب ظرافت اور جمالیاتی ذوق داخل ہوجائے تو وہ حروف سے مرکب کلام اور سمجھانے والے بول بن جاتے ہیں۔ اور جب اس میں ''رائے کلی'' اور ''تکمل بالاخلاق'' کا عمل دخل شروع ہوجائے تو وہ فصاحت کی شکل اختیار کرلیتی ہے، جو مخفی اسرار وافکار اور جذبات وعواطف کے اظہار کا بہترین ذریعہ بن جاتا ہے۔ اس طرح خود بینی وخود پسندی (جو بہ ظاہر مذموم اوصاف ہیں) کو جب ''رائے کلی'' مہذب وشائستہ بنادے تو وہ سماحت (فیاضی اور عالی منش) جیسے قابل تعریف اخلاق کی صورت اختیار کرلیتی ہے اور جب اس میں ذوق جمال کی کارفرمائی شروع ہوجائے تو اس سے عفو ودرگزر اور سخاوت وغیرہ مختلف اوصاف ظہور میں آجاتے ہیں۔ اسی طرح محبتِ نسواں جس میں غلبہ وتفوق ملحوظ ہو اور اس کی بنا انقیاد واطاعت پر نہ ہو یعنی زن مریدی کی حد تک نہ پہنچی ہو، اگر اس میں ''رائے کلی'' سے اصلاح کی جائے تو اس کیفیت کو عفت وپاک دامنی کہیں گے۔

کیا میں تمھیں اس قانون سے روشناس نہ کروں کہ کس طرح ایک ہی صفت مختلف حیثیتوں کے لحاظ سے محمود بھی ہوسکتی ہے اور مذموم بھی بادشاہ اور فقیر دونوں مانگتے ہیں۔ بادشاہ اپنی رعیت سے مانگتا ہے اور بھکاری اپنی قوم کے اغنیا اور مالداروں سے مانگتا ہے۔ ان دونوں میں خطِ فاصل قوت وغلبہ اور عجز ونیاز کی صفتیں ہیں۔ بادشاہ کا مطالبہ چونکہ قہر و

غلبہ پر مبنی ہوتا ہے وہ قوم کا سردار کہلاتا ہے اور بھکاری چونکہ مغلوب اور عاجز ہوتا ہے اس لیے فقیر سمجھا جاتا ہے۔ الحاصل حسن وقبح میں اس خط تمیز کو اصول قانون کے طور پر یاد رکھو اور ان شکوک وشبہات سے بچو جو اخلاقِ محمودہ اور اخلاقِ ذمیمہ میں بظاہر التباس سے عوام الناس کے ذہنوں میں پیدا ہو جاتے ہیں کیونکہ تم نے ان کو یہ کہتے ہوئے سنا ہوگا کہ جو شخص انتقام لیتا ہے لوگ اسے ظالم کہتے ہیں اور جو شخص ظلم کا بدلہ نہیں لیتا ان کے نزدیک وہ بزدل ہے۔ اور جو شخص بے دریغی سے اپنا مال اُڑاتا ہے، لوگوں کے نزدیک مسرف اور فضول خرچ ہے اور جو مال خرچ نہیں کرتا، ان کے نزدیک وہ کنجوس ہے، کاش کہ ان لوگوں کی طعنہ زنی سے بچنے کی کوئی صورت معلوم ہوتی؟ ہمارا جواب یہ ہے کہ اخلاق (محمودہ اور مذمومہ) میں اگر چہ بظاہر تشابہ اور یکسانی معلوم ہوتی ہے پھر بھی ان کے حقائق ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہوتے ہیں۔ اخلاقِ محمودہ کی شناخت کا یہ گر یاد رکھیے کہ ہر وہ وصف جس کا منبع علو نفس وحوصلہ اعتدال مزاج اور قلب کا کمال ہو وہ ستودہ صفات کے زمرہ میں شامل ہوگا اور ان صفات حمیدہ میں بھی افضل اور مفضول کے لحاظ سے مختلف مدارج ہوتے ہیں۔ کوئی بہتر اور زیادہ پسندیدہ اور کوئی کچھ کم۔ اس کے برخلاف ہر وہ وصف جو خسّت نفس، تنگ دلی اور ضعفِ قلب سے صادر ہو، اس کو اخلاق مذمومہ میں سے گردانیے۔ اور ان مذموم اخلاق میں بھی مدارج ذم مختلف ہوتے ہیں بعض بہت زیادہ برے اور بعض نسبتاً کم برے ہوتے ہیں۔ بہر حال یہ مسلمہ بات ہے کہ مدح وتعریف کا دارومدار صفت حمیدہ کے مذکورہ حقائق اربعہ (کبری نفس، سفِ صدر، تمام مزاج اور سبوغ قلب) پر ہے۔ اور میں نے کسی کو کسی کی تعریف ومدح کرتے ہوئے نہیں سنا، مگر وہ یقیناً انہی حقائق اربعہ کی طرف اشارہ کرتا ہے خواہ وہ اپنے اندازہ میں درست ہو یا غلطی پر۔ اس طرح میں نے کسی کو کسی (کے اخلاق) کی مذمت کرتے ہوئے نہیں سنا الاّ یہ کہ وہ حقائق ذم (ضیق نفس، انخداج قلب) کی طرف اشارہ کر رہا ہوتا ہے یہ اور بات ہے کہ ان اندرونی اوصاف کی تطبیق میں اس کا اندازہ صحیح ہو یا غلط (اور قطع نظر اس کے کہ وہ اس اصول کو واضح طور پر جانتا ہو یا کہ علم اجمالی کی طرح اس کے ذہن میں محفوظ ہو)۔

انسانی عقل کی دو قسمیں

انسان میں عقل دو طرح کی ہوتی ہے ایک عقل معاش: جو ہر انسان میں جبلّی طور پر ودیعت رکھی گئی ہے، اور اس کی بدولت وہ دوسرے حیوانات کی طرح معیشت سے متعلقہ امور کی رہنمائی حاصل کر کے زندگی بسر کرتا ہے اگرچہ اس عقل معاشی میں بھی وہ دوسرے حیوانات سے ممتاز ہوتا ہے اس لیے کہ اس میں (رائے کلی، ظرافت اور اکتساب) زائد اوصاف پائے جاتے ہیں۔

دوسری عقل اس کو رب رحمٰن کی طرف سے اس وقت عنایت ہوتی ہے جبکہ وہ اس حیاتِ فانیہ کی ظلمت اور تعلقات کو پس پشت ڈال کر اپنے مثالی وجود کے ذریعہ جو اس کی مثالی حیات کے ساتھ ایک خاص وقت تک وابستہ و پیوستہ ہوتا ہے اور کچھ عرصہ کے بعد ان میں علیٰحدگی واقع ہوتی ہے بارگاہ اقدس کا قصد کرتا ہے، اس کے بعد اس کا ذریعہ قرب اس کا وجود روحانی ہوتا ہے جو اس کی حیات مثالی کے ساتھ پیوستہ ہوتا ہے اور کچھ عرصہ بعد ان میں علیٰحدگی واقع ہوتی ہے۔ بعد ازاں اس کے قرب وارتقا کا ذریعہ ''وجود عینی'' ہوتا ہے جو اس کی حیات روحانی کے ساتھ مخروج ہوتا ہے۔ اور کچھ عرصہ کے بعد ان کا اتحاد ٹوٹ جاتا ہے۔

یہ تینوں مراتب اس کی حیات حیوانیہ کے مراتب یا احکام میں شامل نہیں بلکہ ان مراتب کا حصول مشار الیہ غیر حیوانی نشا کے آثار میں سے ہے جو بارگاہ خداوندی میں انسان کے لیے مخصوص ہوتی ہے اور نوع انسان کے سب افراد میں لازماً پائے جاتے ہیں، اس نکتہ کو خوب اچھی طرح سمجھ لو اور اپنی نظر کو صرف عقلی حیوانی تک محدود (نہ) رکھو تا کہ جو کچھ ہم تمہاری خدمت میں عرض کرنے والے ہیں، اسے اچھی طرح سمجھ سکو۔

یہ مذکورہ علوم والہامات جو سب انواع کائنات میں بالعموم اور نوع انسانی میں (بالخصوص) ودیعت رکھے گئے ہیں، خدائے رحمٰن جلّ وعلا کی عنایت کا نتیجہ ہیں۔ اگر تم اس تحقیق میں زیادہ گہری نظر وفکر سے کام لو تو تجھے یہ حقیقت معلوم ہو جائے گی کہ انبیا علیہم السلام اور اولیا کرام کو جو علوم عطا کیے گئے ہیں وہ سب عنایت ازلی کا نتیجہ ہیں جن کا تعلق

بالاجمال نوع انسانی (کے جملہ افراد) سے ہے اور مختلف افراد میں یہ کمالات فلکی عنصری، فضائی اور مثالی (عوالم میں رونما ہونے والے) اسباب وعلل کے مطابق تفصیل کے ساتھ تقسیم ہوتے ہیں۔ان کمالات شخصیہ کا ظہور مختلف زمانوں میں مختلف انداز سے ہوتا ہے جسے تجدد زمانی کہا جاتا ہے صرف ظاہری نظر کا نتیجہ ہے (حقیقتاً عنایت ازلی کا تعلق اجمالاً تمام نوع وافراد نوع سے ہے)۔

اگر دوررس نگاہوں سے دیکھا جائے تو یقیناً معلوم ہوگا کہ (موہوبی علوم کو تو چھوڑیے) اکتسابی علوم بھی عنایت ازلی کے نتیجہ میں حاصل ہوتے ہیں، اس لیے کہ حقیقت یہ ہے کہ عنایات الٰہی کے تاثر سے انسانی قوتوں ادراک کے ذریعوں اور کسی خاص مقصد ومطلب پر ابھارنے والے محرکات میں صلاحیت ابھرتی ہے جو بعد میں کسب اور جدوجہد کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور پھر آہستہ آہستہ کسی اور شکل میں نمودار ہوتی ہے اس لیے ان مختلف مراتب ظہور کو عنایت ازلی کے ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں سمجھیے۔حقیقت میں استیناف امر یعنی کسی پہلے سے طے شدہ پروگرام کے بغیر کسی حادثے کے ظہور کا اصول کائنات میں کارفرما ہی نہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ عنایت ازلی اس تدبیر اجمالی کا نام ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے ابتدائے آفرینش میں انواع کائنات سے متعلق فرمایا ہے اور ہر ایک تفصیلی تدبیر کو جو بعد میں کارفرما ہو، اسے اسی تدبیر اجمالی کی شرح سمجھیے اور یہ اجمالی تدبیر (ازل وابد میں) ہمیشہ یکساں رہتی ہے۔اور اس کا وجود بعینہٖ انواع کائنات کا وجود ہے اور ان انواع کی صورتیں درحقیقت اس تدبیر کی مختلف صورتیں ہیں جو وقت اور ضرورت کے مطابق ظہور میں آتی رہتی ہیں۔

دوسری فصل

نفس ناطقہ نسمہ پر اعتماد رکھتی ہے

یہ بھی جاننا چاہیے کہ نفس ناطقہ یعنی صورتِ شخصیہ جس کی وجہ سے انسان کا کوئی فرد وہی فرد کہلاتا ہے، سب سے پہلے اس کا سہارا اخلاط کے بخار سے بنا ہوا لطیف جسم ہوتا ہے کیونکہ صورتوں کا طبعی تقاضا یہ ہے کہ ان کا سہارا وہ ''ہیولیٰ'' ہو جس کو اس سے جبلّی مناسبت ہے اور اس ''ہیولیٰ'' میں ایسی استعداد ہو جس کے باعث وہ صورت خاص اس پر طاری ہو سکے اور چونکہ نفس ناطقہ (روح انسانی) جملہ صورتوں میں لطیف ترین، صاف ترین اور مضبوط ترین صورت ہے، اس لیے اس کے وجود کا سہارا بھی ایسے لطیف ترین جسم پر ہوتا ہے جو لطافت واعتدال (یعنی مبدأ کے ساتھ تجرد کی طرف میلان میں مشابہت کے لحاظ سے) اپنی مثال آپ ہو۔ نفس ناطقہ کے حامل ہونے کے لیے ایسا ہی جسم ہیولیٰ کا کام دے سکتا ہے۔ یہ جسم لطیف جو کثیف کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے ہے اور کمالات نفس ناطقہ کے اظہار کا ذریعہ ہے، ہمارے نزدیک ''نسمہ'' کہلاتا ہے۔ ہماری اس اصطلاح کو اچھی طرح یاد رکھیے۔

نسمہ کی حقیقت

''نسمہ'' ایک لطیف ترین جسم ہے جو انسان کے نفس ناطقہ (روح) سے (اسی طرح) متصل اور جسد عنصری میں جاری وساری ہے (جس طرح پھول میں اس کی خوشبو بسی ہوئی ہوتی ہے) تمام افعال اور قوتوں کا حامل بھی نسمہ ہے اس کی تکوین و پیدائش اس طرح ہوتی ہے کہ جب غذا معدہ میں پہنچ جاتی ہے تو وہاں پکنے لگتی ہے اور اس کا لطیف حصہ جگر میں

پہنچ جاتا ہے اور وہاں دوبارہ اس کا انطباخ (پکنا) ہوتا ہے۔ پھر یہ پکا ہوا جز اور چار اخلاط میں تقسیم ہو جاتا ہے، چنانچہ ان اخلاط میں سے لطیف خون دل کی طرف چلا جاتا ہے اور اس کے ایک جوف میں جمع ہو جاتا ہے اور لطیف ہوا کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور یہ ہوا پھر دوسرے جوف قلب میں جمع ہو جاتی ہے اور ان کا ایک حصہ (جو لطیف ترین ہوتا ہے) دماغ کی طرف صعود کرنے لگتا ہے اور یہاں دس قسموں میں تقسیم ہوتا ہے۔

پانچ ظاہری حواس اور پانچ باطنی حواس

پانچ ظاہری حواس یہ ہیں: دیکھنے، سننے، سونگھنے، اور چکھنے کے، چار حواس جو مخصوص جگہوں (یعنی آنکھ، کان، ناک اور زبان) سے متعلق ہیں جن میں ''نسمہ'' کا ایک حصہ سرایت کیے ہوئے ہے اور وہی ان حواس اور قوتوں کا حامل ہوتا ہے اور پانچواں حس چھونے کا حس ہے جو نسمہ کے ایک حصہ میں شامل ہو کر تمام بدن یا بدن کے اکثر حصے میں سرایت کرتا ہے۔

پانچ باطنی حواس یہ ہیں: (۱) حس مشترک (جو ظاہری حواس خمسہ کے محسوسات کے نتائج کو ایک دوسرے سے ملا کر احساس کرتا ہے۔ (۲) قوت خیال جو صورت محسوسات کا تصور ذہن میں بند رکھتی ہے۔

(۳) قوت واہمہ: جو جزئیات کا احساس کرتی ہے۔ (۴): قوت حافظہ (تمام محسوسات، متخیلات، موہومات اور معانی کو اپنے خانہ میں ضرورت کے وقت کے لیے جمع رکھتی ہے اور قوت مدرکہ جو ان سب قوائے باطنہ کو جمع کرتی ہے اور ان میں تصرف کرتی ہے اور یہ پانچ باطنی حواس جو اگرچہ دماغ میں مخصوص جگہوں سے اختصاص رکھتے ہیں ہمارے نزدیک ان کی حکومت (صرف ان مراکز پر نہیں بلکہ) تمام جسم پر ہے۔

اسی طرح لطیف خون کا کچھ حصہ جگر کی طرف اُترتا ہے اور اعضا جسمانی اور بدن میں جاری قوتوں مثلاً قوت تولید و تناسل، قوت افزائش و نمو، قوت تغذیہ و پرورش اور قوت مصورہ کی بقا و تقویت کے لیے تقسیم ہوتا ہے۔ قوائے مذکورہ کے لحاظ سے دماغ اور قلب دونوں جگر کے

محکوم ہوتے ہیں۔ اگرچہ بعض دوسری قوتوں کے اعتبار سے جگر، قلب و دماغ کے تابع ہوتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جگر اور دل کی قوتیں ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہتی ہیں۔

اور نسمہ کا ایک حصہ دل میں باقی رہتا ہے اور دماغ اور جگر کی قوتوں میں تصرف کرتا ہے، جب انسان کی قوت غضبیہ میں انگیخت پیدا ہوتی ہے تو وہ عقل جو اس کی اس حالت غضبیہ کے بارے میں سوچتی ہے معلوم کر لیتی ہے کہ اس کے قوت غضبیہ میں شدت پیدا ہونے کا سبب دراصل وہ ضرر ہے جو وہ "مغضوب علیہ" میں محسوس کرتا ہے اور اسے اس بات کا احساس ہوا ہے کہ انتقام لینے سے اسے لذت حاصل ہوگی۔ اس کے بدن میں خون جوا ترا ہے اور چہرہ سرخ ہوا ہے اور رگیں پھول گئی ہیں، جسم کی حرارت غیر معمولی طور پر بڑھ گئی ہے۔ اس کا سبب طبیعت کے متعدد افعال اور حرکات ہیں، عقل یہ بھی معلوم کر لیتی ہے کہ غضب کی ابتدا تو ایک مصدر سے ایک کلمہ کے صدور کے ساتھ ہوئی ہے اور پھر ایک ہی ہیجان کے بعد یہ تمام اثرات ظاہر ہوئے ہیں۔ اور کتنے لوگ ایسے بھی ہیں جن کے دل و جگر کی قوتیں وافر درست ہوتی ہیں لیکن ان کے قوائے قلبیہ میں ضعف و کمزوری ہوتی ہے اور ان کا غصہ برانگیختہ نہیں ہوتا۔ ان ملاحظات سے محققین اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ حقیقی معنوں میں جسم پر حکومت صرف قلب اور قلبی جذبات کی ہے اور ان جذبات کی تکمیل جگر و دماغ دونوں کی اعانت سے ہوتی ہے اس لیے قلب اور قلبی تصرفات کی اچھائی کا انحصار اس پر ہے کہ جگر و دماغ اور قلب تینوں کے قوی مضبوط ہوں۔

نسمہ (جسم انسان کی روح ہوائی جس کی کچھ تفصیل گزر چکی) ایک چھوٹی سی منظم سلطنت کے مشابہ ہے۔ جس میں جگر گویا وزیر مال ہے جو قلمرو کی آمد و خرچ کا نگراں رہتا ہے اور اعضا اور ان کے افعال اور تمام قوائے طبعیہ کی جو بمنزلہ افراد سلطنت کے ہوتے ہیں خبر گیری کرتا ہے۔ دماغ کی مثال ایک مدبر حکیم کی ہے جو بادشاہ کا مشیر ہو اس کے ماتحت حواس (خارجہ) بمنزلہ اس فوج کے ہیں جو باہر کے اخبار و اطلاعات اس کو پہنچاتے رہتے ہیں (اور حواس باطنہ) بمنزلہ داخلی مشیران کار کے ہیں، جو طبیعت کے افواج کے خیر خواہ اور ہوا خواہ رہتے ہیں۔ قلب کی مثال ایک خود مختار، مطلق العنان حکمراں کی ہے جس کا فیصلہ قطعی

اور نافذ العمل (ہوتا ہے) وہ جب کوئی فیصلہ کرتا ہے اور کسی کام کو قطعی قرار دیتا ہے تو اپنے احکام کی تنفیذ شاہی سطوت وشان سے کرتا ہے اور تمام اعضائے جسمانی اور قوائے طبیعیہ کو اس کی اطاعت کے بغیر چارہ نہیں، ہاں یہ اور بات ہے کہ نظام بدن میں فساد پیدا ہوا اور وہ حد اعتدال سے دور پڑ جائے۔

بات یہ ہے کہ قلب اگرچہ بادشاہ ہے لیکن احکام کی تنفیذ میں دیگر معاونوں کا محتاج ہے (بعینہٖ جس طرح بادشاہ اپنے وزرا اور اعیانِ مملکت اور لشکروں کا محتاج ہوتا ہے) چنانچہ مشورہ دماغ سے لیتا ہے اور غذا جگر سے حاصل کرتا ہے اور اختلاف علوم (اور مشوروں کے اختلاف) سے احکام واوامر میں اختلاف رونما ہوتا ہے اور غذا کی فراوانی سے سطوت شاہی میں اضافہ ہوتا ہے تو وہ (قلب) اندر ہی اندر ان کے زیر نفوذ ہونے کا احساس کرتا ہے۔ اگرچہ بہ ظاہر سب پر اس کا حکم چلتا ہے جیسے کہ کسی ملک کا بادشاہ نافذ الکلمہ ہونے کے باوجود اپنے وزرا اور اعوان کا محتاج ہوتا ہے اور ان کے لیے اپنے باطن میں انقیاد وتسلیم کے آثار محسوس کرتا ہے۔ اگرچہ ظاہر میں وہی حاکم نظر آتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر نفسانی خواہش اور حیوانی مقتضیات کی فوج مضبوط ہوگی تو قلب کے تمام فیصلوں پر اس کا اثر نمایاں ہوگا۔ اور وہ (قلب) ان کے مقتضیات کی تعمیل کی طرف مائل رہے گا۔ لیکن اگر دماغی قوتیں مضبوط تر ہوں تو قلب ہمیشہ جواسیس اور دُخَلا (حواس خمسہ ظاہرہ وباطنہ) کی نیرنگیوں کی طرف مائل ہوگا۔

اور جب کبھی ان لشکروں میں سے کوئی فوج مغلوب وکمزور ہو جائے تو ''قلب'' اس کے ضعف سے پریشان ہوتا ہے جیسے (عموماً) بھوک اور پیاس کی حالت میں یا پُرخوری اور نیند کی حالت میں یا حواس کی سستی اور اضطراب کی حالت میں اس کے اعمال میں اختلال آجاتا ہے اور اگر اس کا کوئی لشکر اس سے بغاوت پر آمادہ ہو، مثلاً حواس اور جذبات وعواطف سرکشی اختیار کرلیں یا حیوانی طبیعت شاہراہ معصیت پر گامزن ہو کر تولید میں اسراف اور شہوت میں غلبہ حاصل کرے تو ان صورتوں میں اگر دل کا استعداد قوی ہے تو خوب زجر وتوبیخ کرکے راہ راست پر لے آتا ہے لیکن اگر دل ضعیف الارادہ ہے تو وہ بھی اس اشارہ (بغاوت وسرکشی کے غلط رویوں) کی طرف مائل ہو کر اسے مستحسن قرار دیتا ہے۔

ا۔ احکام قلب

ا۔ ارادہ: قلب کے جملہ احکام میں سے ایک اس کا ارادہ ہے۔ چنانچہ جب دماغ کو جو قلب کا مشیر ہے کسی چیز کی بابت یہ یقین ہوتا ہے کہ اس میں اس کے لیے نفع اور فائدہ ہے اس لیے اس کا حاصل کرنا لازمی یا کم از کم مستحسن ہے۔ یا یہ کہ اس میں ضرر اور نقصان ہے اور اس سے احتراز کرنا ضروری ہے تو وہ قلب کو مشورہ دیتا ہے کہ وہ اپنی قوتوں کو تحصیل مراد کے لیے متوجہ کرے چنانچہ قلب اس کے حسب مشورہ ایسا ہی کرتا ہے اور اس کے تمام اعضا اور قوائے طبعیہ مصروف تعمیل ہو جاتے ہیں۔

۲۔ عقل: منجملہ ان احکام کے ایک اس کی عقل ہے چنانچہ جب قلب سریر آرائے مملکت ہوتا ہے اور اس کے جنود (اعضائے جسمانی اور قوائے طبعیہ) سب اس کے حضور دست بستہ حاضر ہوتے ہیں (اور کسی درپیش مسئلہ کو حل کرنا چاہتے ہیں) تو قلب اپنے مشیر دانا کی طرف رجوع کرتا ہے اور پوچھتا ہے کہ فلاں فلاں مسئلے کے باب میں تمہاری کیا رائے ہے؟ مشیر حکیم کے پاس جو علم ہوتا ہے وہ جواباً پیش خدمت بادشاہ کر دیتا ہے۔ قلب اس کے لمیت وانیت (علل ونتائج) کے بارے میں یکے بعد دیگرے سوال اور بحث وتمحیص کرتا ہے، حتی کہ کثرت مراجعت یا دلیل کی قوت سے مشیر کی بات پر اس کا ذہن مطمئن ہو کر یہ بانگ دہل اعلان کرتا ہے کہ مشیر دانشمند تم نے ٹھیک کہا، یہ میرا مقصد ومذہب ہے (اور پھر حکم صادر فرما دیتا ہے جسے) سب لشکر سن کر دل کی روش کا اتباع کرتے ہیں، کیونکہ لوگ اپنے بادشاہ کے دین وطریقے پر چلتے ہیں۔ اس وقت یہ علم عقل وحکمت کی صورت اختیار کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عقل بھی ''احوال'' میں سے ایک حال ہے۔ اور فہم واردات میں سے ایک وارد ہے جو انسان کے لوح قلب پر وارد ہوتے ہیں۔

عشق: قلب کے احکام میں سے ایک حکم اس کا عشق ہے۔ جب طبیعت کا لشکر (نفسانی شہوات اور حیوانی خواہشات) بغاوت پر آمادہ ہوتا ہے اور جذبات وعواطف پر اثر انداز ہوتا ہے تو دماغ بھی ان کے تقاضے سے سرتابی نہیں کرتا اور وہ اپنے جواسیس (حواس

عشرہ) کو حکم دیتا ہے کہ اس جوش آتش شہوت کو بجھانے کے لیے مناسب جگہ تلاش کریں۔ اور جب بعد از تلاش ایسی جگہ مل جاتی ہے تو دماغ اسے درست قرار دیتا ہے اور قلب کو مشورہ دیتا ہے کہ وہ بھی اسے پسندیدہ قرار دے کر اسے حاصل کرنے کے لیے اس کے قریب جائے اب اگر دل مضبوط اور قوی الارادہ ہے تو امور کے نتائج و عواقب پر غور کرتا ہے اور غالب قاہر بن کر دماغ کا مشورہ مسترد کر دیتا ہے اور کسی مناسب جگہ کی تلاش کے لیے صرف حکم کلی صادر فرماتا ہے لیکن اگر وہ ضعیف اور کمزور ہوتا ہے تو وہ دماغ کے مشورہ کو قبول کر کے اس کی پیروی کرتا ہے اور اعضائے جسمانی اور قوائے طبعیہ کو حکم دیتا ہے کہ میں فلاں شخص سے محبت کرتا ہوں تم بھی اس کی محبت میں مگن ہو جاؤ۔ پھر تمام قوی بھی اس کی محبت میں مبتلا ہو کر قلب و دماغ کے تابع ہو جاتے ہیں۔ (اس طرح اس انسان پر قلب کی کمزوری کی وجہ سے ایک جنونی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

فخر اور بلند پروازی

جب جگر دل کو نہایت قوی اور طاقتور غذا مہیا کر دیتا ہے، اور دماغ کے جواسیس (حواس ظاہرہ و باطنہ) میں ایک قوت اور استقرار کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور دماغ کا ادراک نہایت قوی اور وسیع ہو تو دماغ ایسے علوم کی طرف مائل ہو جاتا ہے جو قوت اور وسعت کے تقاضا کرتے ہیں۔ ایسے علوم کی تحصیل کر کے وہ انھیں دل تک پہنچا دیتا ہے۔ دل کے اندر بھی ان علوم کی طرف میلان کا داعیہ پیدا ہو جاتا ہے۔ پھر جب کبھی مناسب موقع آتا ہے، دل اپنے لشکروں کو جمع کرتا ہے اور اپنے دانائے راز مشیر (حکیم) دماغ سے مشورہ لیتا ہے تو وہ ایسے فیصلے کا مشورہ دیتا ہے جو اظہار قوت فخر اور بلند پروازی اور پھیلاؤ کے ساتھ مناسبت رکھتا ہو۔ یہ مشورہ دل اور اس کے عساکر کی منشا کے مطابق ہوتا ہے اور دل اپنے پختہ عزم کو اس مشورہ کے مطابق خوب پختگی سے نافذ کرتا ہے۔ ایسے حالات میں اگر حکیم دماغ، صاحب تقویٰ ہو یا اس کی قوت معنوی اور حقیقی ہو تو اس کا میلان ایسے امر خیر کی طرف ہوتا ہے جو کلی اور نفع عام سے تعلق رکھتا ہو۔ اور حقیقی خیر ہو اور اگر یہ مشیر (دماغ) غبی

اور اپنی فطرت میں حیوانی ہو تو صرف ایسے امر خیر کی طرف مائل ہوتا ہے جس کا خیر ہونا جزئی اور وقتی ہو اور اس کی خوبی سرسری ہو۔

اگر دل کو جگر کی طرف سے غذا کمزور اور کم ملے اور دماغ کے جو اسپس کا اندرونی احساس کمزوری کا ہو تو دماغ کا مشورہ دل کو اور دل کا فیصلہ اس مشورہ کے مطابق فخر اور بلند پروازی کی بجائے کمزوری خودسپردگی اور تسلیم کا ہوتا ہے۔

رضا اور ناراضگی

حکیم دماغ کو جب معلوم ہو جاتا ہے کہ کوئی اور ہمارے ساتھ نفع کے حصول یا ضرر سے بچاؤ کے سلسلے میں مزاحمت کر رہا ہے اور اسے یہ احساس ہو جائے کہ اس کی یہ مزاحمت ہمارے مطلوب خیر کے لیے مناسب نہیں، تو دل کو اپنا مشورہ پیش کرتا ہے۔ دل اپنے تخت شاہی پر بیٹھا رہتا ہے اور اس کے لشکر اس کے زیرِ فرمان حاضر ہوتے ہیں جب حکیم دماغ اپنا مشورہ بار بار پیش کر کے دل کو مطمئن کر لیتا ہے اور دماغ کے مشورہ کے بارے میں اس کا یقین پختہ ہو جاتا ہے تو اپنے لشکر کو بیانگ دہل آواز دیتا ہے کہ میں فلاں سے ناراض ہوں تم بھی اس سے ناراض ہو جاؤ۔

اس کے برعکس اگر اسے یقین ہو جائے کہ یہ شخص میرا خیر خواہ اور صاحب نعمت ہے اور اس میں ایسے اوصاف محسوس کرے جنھیں وہ اچھا سمجھتا ہے تو اپنے لشکر کو آواز دیتا ہے کہ میں فلاں سے راضی ہوں تم بھی اس سے راضی ہو جاؤ۔

خوشی اور غم

کبھی دل تختِ شاہی پر بیٹھ کر اپنے قوی کے لشکر کو حاضر کرتا ہے، اگر دل اپنے حکیم (مشیر دماغ) کے ساتھ بار بار مشورہ کیا کرتا ہو اور اس کی بات مانتا ہو تو وہ اس کی طرف بہت مائل ہوتا ہے ایسے اوقات میں اگر دماغ کو باہر سے کچھ اشیا کا ایسا علم حاصل ہو جائے، جو اس کے لیے خوش آئند ہو تو دل کو دماغ میں مسرت اور انبساط کی لہر نظر آتی ہے۔ اس کی مسرت سے دل بھی مسرت و انبساط اور وارفتگی کا اظہار کرتا ہے اور حکیم کے لشکر (حواس

ظاہرہ وباطنہ) کو اشارہ کرتا ہے کہ آلات طرب لے کر آجاؤ۔ چنانچہ وہ تعمیل کر کے رباب لے کر آتے ہیں اور حسب حال اور مناسب موقع غزل یا نظم گا لیتے ہیں قلب کیف ومستی کا جام نوش کر لیتا ہے اور یہ دن اس کے لیے جشن کا دن ہوتا ہے اس کے برخلاف اگر مشیر کو کوئی چیز ناپسندیدہ وناگوارِ خاطر گزرتی ہے تو قلب (کو بھی مشیر یعنی دماغ کے اس مشورہ کو قبول کرنے میں پس وپیش نہیں ہوتی بلکہ اس) میں بھی غم والم کی کیفیت پیدا ہوگی اعضا اور قوی کو غمگین وملول ہونے کا مشورہ دیتا ہے۔ وہ سب روتے چیختے چلاّتے اور نوحہ گری کرتے ہیں کیونکہ افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را) اس صورت حال سے متاثر ہو کر دل پر رقت طاری ہو جاتی ہے۔ اور وہ سیاہ لباس غم میں ملبوس ہوتا ہے یہ قلب کے لیے ماتم دغم کا دن ہوتا ہے۔

اگر ''دل'' اپنے معاملات میں عموماً اپنے وزیر مال قوائے جگر کی طرف رجوع کرتا ہے اور اس کے مشورہ کی طرف کان لگا کر میلان طبع کا مظاہرہ کرتا ہے تو اس حالت میں وزیر مال کے سرور ونشاط اور حزن وملال سے پوری طرح متاثر ہوتا ہے بہر حال وزیر مال (جگر) کے کارندے ہوتے ہیں جو ''حکیم (دماغ) کے لیے انس ومحبت رکھتے ہیں۔ اور اسی ''حکیم'' (دماغ) کے کارندے ہوتے ہیں جو ''وزیر مال'' جگر سے الفت رکھتے ہیں ان دونوں کے آپس میں دوستانہ تعلقات ہیں اس لیے کہ دونوں معاونت میں ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔ (اس لیے دل پر دماغ وجگر کے انبساط یا ملال کا اثر تقریباً یکساں ہوتا ہے۔

فصاحات ودیانات

من جملہ دل کے احکام کے فصاحات ودیانات (یعنی اقوال واعمال) ہیں اس کا مظاہرہ اس طرح ہوتا ہے کہ قلب اپنے عرش سلطنت پر بیٹھ جاتا ہے اور اس کے تمام اعوان وانصار اور لشکر اس کے سامنے حاضر ہوتے ہیں۔ حکیم (دماغ) پہلے سے قلب کو ضروری معلومات فراہم کر چکا ہوتا ہے اس دل کے باطن (لاشعور) میں اس کی طرف میلان پہلے سے موجود رہتا ہے اس حالت میں حکیم اٹھ کر اپنے لشکر کے ساتھ صف بستہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور وزیر مال (جگر اپنے قوی کے لشکر کو اپنے پیچھے صف بستہ لگا کر دست بستہ کھڑا

ہو جاتا ہے۔اور سریر سلطنت ان دونوں کے رہتا ہے۔ چنانچہ حکم وزیر مال (جگر) کو حکم دیتا ہے کہ اپنے لشکروں کو زبان یا دیگر جوارح کی طرف حرکت دو اور فلاں حکم کی تعمیل کرادو۔ قلب اس حکم پر مہر تصدیق ثبت کرتا ہے۔اور جگر بامر مجبور (بسر وچشم) اس کی اطاعت کرتا ہے۔اور زبان یا دیگر جوارح سے وہی کچھ صادر ہوتا ہے جس کا صدور قلب کو اپنے وزیر کے مشورہ سے منظور ہوتا ہے۔

یہ یاد رکھو کہ انسان میں سید وحکمراں صرف قلب ہے۔ اور وہی اپنی رعیت (دیگر اعضائے جسمانی) کی نگرانی کا ذمہ وار ہے۔اور وہی جسم انسانی کے عالم کا کرتا دھرتا ہے۔ علمانفس اس کے احوال وکوائف سے بحث اور اسی کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور وہی انسانی علوم اور انسانی انانیت کا مرکزی موضوع اور محور گفتگو رہتا ہے۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ جو شخص ریاضت کے ذریعے اپنے قلب کی تہذیب واصلاح کرنا چاہتا ہے، وہ بالتبع اس کے عساکر کو بھی بعض اوقات موضوع بحث بنا دیتا ہے۔ مثلاً سالک پر جب عشق نفسانی یا حرص مال وجاہ غلبہ کرلیتا ہے اور اس کو ریاضت کی مشق دینے والا اس مرض کا علاج کرنا چاہتا ہے اور دوران علاج اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ چونکہ طبیعت (نفس شہوانی) اس قدر طاقتور ہو چکی ہے کہ قلب اس کے تقاضا کو رد نہیں کرسکتا۔ اور اس پر طبیعت کے لشکروں کا یہ میلان راسخ ہو چکا ہے تو وہ کم خوری اور شب بیداری کے ذریعے اس کی طاقت کو کمزور کرتا ہے۔ اور اسی طرح اس کا غلبہ کمزور پڑ جاتا ہے۔ اور قلب کو پھر از سر نو اقتدار اور نفاذ حکم نصب ہوتا ہے۔اور اس طرح سالک کا معاملہ درست ہو کر اعتدال پر آ جاتا ہے۔

اسی طرح جب دماغ کے جواسیس یعنی حواس خمسہ سالک کے دل میں خطرات اور وساوس پیدا کرتے ہیں اور اس کو رب الٰہی کی پاکیزہ محبت میں منہمک ہونے کا موقع نہیں ملتا۔ تو ریاضت کرانے والا مرشد حواس خمسہ کو قید کر لینے کا حکم دیتا ہے کہ وہ اپنی آنکھوں کو دلکش مناظر سے لطف اندوز نہ کرے۔ کانوں کو فضول اور گندی باتیں سننے نہ دے اور اپنی قوتِ متخیّلہ اور قوت واہمہ کو کھلے بندوں نہ چھوڑے بلکہ جہاں تک ہو سکے انھیں امور مطلوبہ میں مصروف رکھے۔ اگر وہ اپنی مرضی سے اپنے قوائے متخیّلہ اور واہمہ کو امر مطلوب میں مشغول رکھنے پر قادر

نہیں تو ان کو کسی ایک کام پر کوئی سا بھی ہوایسا مرکوز کرتا ہے کہ اس سے انھیں فراغت نہ ہو۔تا کہ ان کی جولانیاں موقوف ہو جائیں اور اس طرح حواسیں کے کمزور پڑنے سے قلب کو (فارغ ہوکر) اپنے مقصد کی طرف ملتفت ہونے کا موقع میسر آجاتا ہے۔

چشم بند و گوش بند و لب ببند
گر نیابی سرّ حق بر من بخند

یہ بھی یادرکھیے کہ قلب کے اعمال اور قضایا لاتعداد اور بے شمار ہیں اور ہر جنس عمل کا محرک و متمم اس میں ایک خاص ملکہ ہوتا ہے، جو اس میں مستحکم ہوتا ہے اور اس کے تقاضے کے مطابق اس کے اعمال وقضایا میں موزونیت پیدا ہوتی ہے جس طرح رنگوں کے وزن اور مقدار ہوتے ہیں اور خاص تناسب کے ساتھ رنگوں کو ملانے سے مختلف رنگ پیدا ہوتے ہیں مثلاً جب زرد رنگ، سیاہ رنگ پر غالب آجائے تو اس سے پیازی رنگ ظہور میں آئے گا اور اگر دونوں برابر مقدار و وزن میں ملا دیئے جائیں تو زنگاری رنگ کا ظہور ہوگا۔لیکن اگر بالعکس سیاہی زردی پر غالب آجائے تو گاڑھے سبز (جس میں سیاہ بھی ہوگا) رنگ کا ظہور ہوگا۔دوسرے تمام رنگوں کی ترکیب (یا دیگر مرکبات) کو انہی پر قیاس کرلو۔اسی طرح دماغ اور جگر کے رنگ ہیں جو اپنی اپنی جگہ پر مستقل حیثیت رکھتے ہیں مگر ایک دوسرے سے بالکل جدا جدا ہیں اور ان کی ترکیبی صورتوں کی حد متعیّن اور حالت مقرر ہے۔قضایائے قلب کی نوعیت میں قلب کی طاقت اور کمزوری کو بڑا دخل ہے، نیز دماغ اور جگر کی حالت سے بھی وہ اثر پذیر ہوتا ہے۔یہ تو ضروری ہے کہ قلب کے جملہ افعال میں سے ہر عمل کی ایک خاص حد مقرر ہو، جس سے اس کے سب افراد (جزئیات عمل) باہر نہیں جاتے۔جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ کلی طور پر تمام اعمال میں ایک دوسرے کے ساتھ گونہ مماثلت پائی جاتی ہے ملکات راسخہ کے بارے میں تحقیق یہی ہے۔

ہر ملکہ راسخہ کو "خلق" سے تعبیر کیا جاتا ہے اور سب اخلاق اُس وقت پسندیدہ اور ستودہ ہوتے ہیں جب نفس ناطقہ (روح انسانی) میں صلابت، صفائی اور باطنی اتصال کے اوصاف پائے جائیں۔کیونکہ ان کی موجودگی سے جسم انسانی میں ان کے مماثل مزاج پیدا

ہوتا ہے اوران کے مشابہ روح ہوائی (نسمہ) قلب وجگراور دماغ پیدا ہوتے ہیں۔اوران کے ہم رنگ صاف ستھرے اور پختہ و پاکیزہ اخلاق پیدا ہوتے ہیں۔پس ان کا معاملہ ایک دوسرے سے مشابہ اور مماثل نظر آتا ہے۔

اور جب تم اخلاق فاضلہ کے حقائق کی تحمیص غور وفکر سے کرنا چاہو تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ اخلاق فاضلہ سات ہیں:

۱۔ حکمت، ۲۔عفت، ۳۔سماحت، ۴۔شجاعت، ۵۔فصاحت، ۶۔دیانت، ۷۔سمت صالح، آگے تفصیل کا انتظار کریں۔

تیسری فصل

حکمت کی تعریف

حکمت قلب کی ایسی ذکاوت ہے جس کی بدولت آدمی ان علوم صحیحہ پر یقین کرتا ہے جو بدیہیات میں سے ہوں۔ یا استدلال اور فکر ونظر سے حاصل ہوں یا اس نورِ الٰہی سے ماخوذ ہوں جو خدائے رحمٰن کی طرف سے عالم ناسوت میں نازل فرمایا گیا ہے اور جسے عالم ظہور میں شریعت الٰہیہ کہا جاتا ہے اور پھر ان علوم کو جمع کرتا اور خزانہ دماغ میں محفوظ کر لیتا اور ان سے کام لیتا ہے۔

اگر تم نوع انسانی کے جملہ افراد کا بہ غور وفکر، دقیق مطالعہ کر کے استقرا کے ذریعے نتائج حاصل کرنا چاہو تو یقیناً تم کو انسانی معاشرہ میں (مندرجہ ذیل) مختلف قسم کے اشخاص نظر آئیں گے۔

الف- وہ کند ذہن اور ثقیل الروح شخص جو خفیہ اشاروں کو قطعاً نہیں سمجھ سکتا۔ اور اگر کوئی ایسا کلام اس کے سامنے پیش کیا جائے جس سے معلوم ہوتا ہو کہ متکلم کو کوئی خاص کیفیت یا حالت درپیش ہے تو وہ اس کلام کی باریکیوں اور مخفی تقاضوں کو نہیں سمجھ سکتا مثلاً اگر اس کے سامنے شکایت آمیز کلام پیش کیا جائے جس سے متکلم کے انقباض روحانی کا پتہ چلتا ہے یا ہجو اور طعن وتشنیع جو اس کے قائل کا غصہ ظاہر کرتے ہیں یا مدحیہ کلام جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بولنے والے کے دل میں ممدوح کی محبت راسخ ہے، تو وہ اس کلام (کی تلمیحات وتشبیہات اور معانی ومطالب) کے سمجھنے سے قاصر رہتا ہے (اور نافہمی کی وجہ سے اس کلام کی طرف توجہ دینے سے غافل رہتا ہے) اس کے مقابلہ میں ذکی اور ''زیرک'' شخص ہوتا ہے (جو ہر نوع کے کلام کے اسرار ومعانی اور فصاحت وبلاغت کو سمجھتا ہے اور اس کے

اشاروں سے لطف اندوز ہوتا ہے)۔

ب۔ (معاشرے میں تم کو اس کے علاوہ) ایسا بے وقوف (بھی ملے گا) جو فائدہ اور ضرر میں تمیز نہیں کر سکتا اور اگر اس کو زجر و توبیخ، پند و نصیحت یا تخویف و انذار کے ذریعے راہ راست پر لانے کی کوشش بھی کی جائے اور اسے سمجھایا جائے کہ اگر وہ اپنے کردار کو درست نہیں کرے گا تو اسے مستقبل میں اس کے برے نتائج بھگتنے پڑیں گے۔ تو اس کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی اور وہ سنی اَن سنی کر کے چلا جاتا ہے کیونکہ اس کے ذہن میں مفید اور مضر کا ایسا صحیح مفہوم نہیں بیٹھتا کہ مفید اور مضر ایک دوسرے سے ممتاز ہو کر اس کے سامنے آئیں۔ اور قلب ان دونوں میں امتیاز کرنے کی طرف متوجہ ہو سکے۔

اس '''سفیہ'' کے مقابلہ پر جو شخص سمجھ دار ہوتا ہے وہ ''متفہم'' اور ''متبصر'' کہلاتا ہے۔

چوتھی فصل

ارتفاقات (ا) چار گنہ کے حقائق پر مجمل بحث اور ان کی اقسام کی کیفیتِ استنباط

نوع انسانی پر خدائے عزوجل کی یہ عنایت ہے کہ اس نے انسان کے اندر کھانے پینے کی فطری خواہش و جبلتیں پیدا کی ہیں۔ جن پر اس کی حیاتِ جسمانی اور قوتِ بدنی کی بقا کا انحصار ہے۔ اسی طرح افراد انسانی کے اندر جماع اور جنسی تعلق کا فطری داعیہ ودیعت کر رکھا ہے تاکہ وہ پیدائش و افزائشِ نسل کا انتظام کر سکیں جس کے نتیجہ میں نسل انسانی اپنی مقررہ مدت تک صفحہ ہستی پر موجود و باقی رہے، نیز یہ بھی لطف الٰہی میں سے ہے کہ انسانوں کو اس فطری تقاضے سے نوازا کہ وہ (گرمی، سردی اور چوروں، ڈاکوؤں اور دشمنوں کی دست بُرد سے محفوظ رہنے کے لیے) گھر اور لباس بنائیں، یہ انسان کی وہ ضروریات ہیں جن کی ہر فرد انسان محتاج ہے اس کے ساتھ ساتھ ہر شخص جبلّی طور پر دوسرے کے مقابلہ میں ان ضروریات کے حصول میں برتری بھی چاہتا ہے اور زیادہ کا خواہاں رہتا ہے (جس کے نتیجہ میں کشمکش اور تصادم کا بھی خطرہ رہتا ہے) تو ان ضروریات کا اس طرح پورا ہو جانا کہ ہر شخص نوعی تقاضوں کے مناسب اپنی جبلی اور فطری خواہشات کو پورا کرے (اور ایک دوسرے کے ساتھ مزاحمت کرنے سے پرہیز کرے)۔ یہی درجہ (اجتماعی اداروں کی تشکیل اور تمدنی و تہذیبی زندگی کا پہلا درجہ ہے جسے شاہ صاحب کی اصطلاح میں) ارتفاق اول کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ (ارتفاق اول جس میں انسان اپنی ضروریات اور فطری و جبلی خواہشات کو نوعی تقاضوں کے مطابق حیوان کا مقابلہ پر بہتر تدبیروں اور طریقوں سے مہیا کرتا ہے ان میں سے مثال کے طور پر زراعت اور امداد باہمی (نافع تدبیریں ہیں اسی طرح مافی الضمیر

اور اندرونی خیالات وافکار کے لیے) قابل فہم کلام بھی ہے اور اسی زمرہ میں کھانا پکانا بھی آتا ہے۔اور اسی میں زن (منکوحہ) کی تعین بھی ہے۔ تاکہ کوئی دوسرا اس بارے میں اس کی مزاحمت نہ کر سکے۔

(چونکہ نوع انسانی دیگر تمام انواع سے رائے کلی[1]، ظرافت اور ذوق جمال و لطافت[2] اور ایجاد وتقلید یا اکتساب الاخلاق بالعلوم کی خصوصیات کی وجہ سے بلند مرتبہ ہے۔اور اس کے افراد شاہراہ زندگی میں عقلی، اخلاقی، جمالیاتی اور جسمانی میدانوں میں خوب سے خوب تر کے متلاشی رہتے ہیں اس لیے قدرتی امر ہے کہ وہ منازل حیات میں کسی منزل پر ٹھہر نہیں سکتے۔یہی وجہ ہے کہ تہذیبی زندگی کے ابتدائی مرحلے میں ان امتیازی خصوصیات ثلاثہ نے دوسری بلند تر منزل حیات کی طرف پیش رفت کی ہے) پھر جب انسان کے اخلاق، اُس کے فطری علوم اور وہ اکتسابی علوم جو اُس نے تجربہ، ذوقِ جمال تأنق وترفہ، اور رائے کلی کے ذریعہ حاصل کیے، سب کے سب ارتفاق اول کے ساتھ پوری طرح پیوست ہو جاتے ہیں تو اس بات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ارتفاق اول کے شعبوں کو ان امور اور خصوصیاتِ انسانی کے تقاضوں کے مطابق ڈھال دیا جائے۔ کیونکہ اگر ایسا نہ کیا جائے تو پھر نفس انسانی میں درد والم اور کرب و بے قراری کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔اس لیے کہ نفس انسانی کو وہ راحت اور آرام نہیں ملتا جو ان علوم و اخلاق اور ان خصوصیات کے لحاظ سے اس کے مناسبِ حال ہے۔اگر ان ضروریات کو پورا کرنے کا انتظام معاشرہ میں اس طرح ہو جائے جو نوع انسانی کی مذکورہ بالا کیفیات کے مناسب حال ہوں، تو معاشرہ کی حالت ارتفاق ثانی (دوسری ترقی یافتہ منزل زندگی) کہلاتا ہے ارتفاق ثانی کی منزل تک نفس انسانی کا پہنچنا تب ہی ممکن ہو سکتا ہے جب وہ بھوک پیاس، صنفی خواہش اور اُن تمام (حیوانی) خواہشات کے غلبہ سے نجات حاصل کرے جو اسے ارتفاق اول میں رہنے پر مجبور کرتی ہیں۔

---

[1] (Public will)

[2] (Aesthetic Sense)

ارتفاقِ ثانی کے حِکَمِ خمسہ

استقرا سے معلوم ہوا ہے کہ ارتفاقِ ثانی کے علوم پانچ فنون میں منحصر ہیں:

(۱) حکمت معاشیہ (یا فن معاش): یہ حکمت اُس وقت معرض وجود میں آتی ہے جب انسان اپنے کھانے پینے، لباس و پوشاک، رہنے، سہنے، اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، بات چیت، سفر و حضر وغیرہ میں اچھی وضع کا پابند ہو جائے اور صحیح تجربوں (اور فضائلِ اخلاق) کی کسوٹی پر انھیں پرکھ لے۔

(۲) حکمتِ اکتسابیہ (صنعت وحرفت): یہ حکمت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب صنعت و حرفت کی مختلف اقسام مثلاً کھیتی باڑی، زراعت، نجاری آہنگری وغیرہ میں سے ہر ایک شخص وہ پیشہ اختیار کرے جس کی اس میں صلاحیت وقابلیت ہے اور عام طور پر اس کے حصول کے ذرائع و اسباب بھی اس کو میسر ہوں۔ اور کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو کسی جسمانی نقص کی بنا پر یا سہل پسندی اور راحت طلبی کی وجہ سے صنعت وحرفت کی پُر مشقت قسموں سے منحرف ہو کر اپنی جسمانی ساخت کی بنا پر یا اسباب کے مہیا نہ ہونے کی وجہ سے گداگری، چوری اور فریب دہی جیسے رذیل پیشے اختیار کر لیتے ہیں۔

(یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ) جہاں جہاں اور جیسے جیسے طبیعتوں میں شائستگی، تمدن اور راحت وآسائش کا خیال پیدا ہوتا ہے اور وہ معاش کے (گونا گوں) گوشوں کی احتیاج محسوس کرتی ہیں ویسے ہی مختلف قسم کے پیشے، صنعتیں اور ہنر نکلتے چلے جاتے ہیں جن کا شمار میں لانا مشکل ہے۔ ہاں اس قدر کہا جا سکتا ہے کہ بعض جگہوں اور بعض زمانوں میں وہ بہت زیادہ ترقی پر ہوتے ہیں اور بعض جگہوں اور بعض زمانوں میں ان کی تعداد کم ہوتی ہے۔ مگر ہر حالت میں خواہ وہ کم ہوں یا زیادہ ایک ہی درجۂ تدبیر اور منزلِ حیات (ارتفاق ثانی) کے زمرہ میں آتے ہیں۔

(۳) حکمت منزلیہ: اس حکمت وفن میں ازدواج، ولادت، تدبیر منزل، ملکیت، قرابت داروں کے باہمی حقوق اور آداب صحبت کے متعلق بحث کی جاتی ہے۔

(۴) حکمت تعاملیہ: جس میں لین دین کے قواعد، مسائل اور آداب شامل ہوتے ہیں مثلاً خرید وفروخت، ہبہ اور اجارہ، رہن اور قرض کے معاملات۔

(۵) حکمتِ تعاونیہ: اس میں کفالت، مضاربت، شرکت، وکالت، اور اجرت یا اجارہ طلبی کے معاملات زیر بحث آتے ہیں۔

ارتفاق ثالث

جب ارتفاق ثانی کے ان اصول کے ساتھ انسان کے اخلاق حسنہ اور اخلاق سیئہ شامل ہوجاتے ہیں تو (تمدن کو شائستہ بنانے کے لیے) ایک اور ضرورت پیدا ہوجاتی ہے اور اس کو صرف ارتفاق ثالث (یعنی تیسری اعلیٰ منزل حیات اور اس کے علوم اور حکمتوں) کے ذریعہ پورا کیا جاتا ہے۔

ارتفاق ثالث کی ضرورت یوں پیش آتی ہے کہ ارتفاق ثانی کے اصول کی بنا پر انسان کے لیے شہریت واجب ولازمی ہے، اور شہریت صرف فصیل، بازار اور سر بفلک عمارتوں کا نام نہیں۔ بلکہ تمدن وشہریت اس باہمی ربط وتعلق کا نام ہے جو انسانوں کے مختلف گروہوں اور جماعتوں کے درمیان زندگی میں پایا جاتا ہے۔ یہ ربط وتعلق فطری ہے۔ جو انسانوں کی مذکورہ خصوصیات، امتیازی صفات، اور مدنی الطبع ہونے کا لازمی نتیجہ ہے۔ اور ان مذکورہ اصولِ تعارف اور حکم تعامل کے مطابق جماعتیں شخص واحد کی مانند ہوتی ہیں کہ (اختلاف رنگ وبو اور کثرت عدد وجسم کے وجود) اُن میں ایک معنوی وحدت پائی جاتی ہے اور یہ وحدت (جسم انسان کی طرح) صحت اور مرض کے اسباب سے متاثر ہوتی ہے اور کبھی داخلی اسباب کی وجہ سے اور کبھی خارجی اسباب کی وجہ سے اس میں خلل پڑتا ہے اس لیے ضروری ہے کہ اس تمدن کی صحت کو برقرار رکھنے اور اسے اندرونی اور بیرونی اسباب خلل اور بیماریوں سے بچانے کے لیے کوئی طبیب حاذق ہو، تمدن کا یہ ''طبیب'' امام بہ شمولیت اعوان ہوتا ہے جو زندگی کی اس منزل میں نوع میں نوع انسانی کی تہذیبی حیات اور متمدن زندگی کو درست رکھتا ہے اور تمدن کے اس درجہ کا نام ارتفاق ثالث ہے۔

ارتفاقِ رابع

جب ارتفاق ثالث کے یہ اصول انسانی طبیعتوں سے وابستگی اختیار کر لیتے ہیں تو ایک اور ضرورت اُبھر آتی ہے جس کو ارتفاقِ رابع میں پورا کیا جاتا ہے۔اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب مختلف علاقوں اور گروہوں میں چھوٹے چھوٹے پیانہ پر تمدن ظہور میں آتے ہیں تو تصادم اغراض کے باعث ان میں فساد جھگڑے اور مناقشات پیدا ہوتے ہیں۔اور قتل ومقاتلہ تک نوبت پہنچ جاتی ہے اور نفرت وعداوت کی آگ بھڑک اُٹھتی ہے اور ایسی بے شمار (معاشرتی اور اخلاقی) بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں جن کا علاج وہ خود نہیں کر سکتے اس لیے وہ ایک "طبیب اعظم" (طبیب الاطبا) اور کنفیڈریٹر اعلیٰ[1] کے محتاج ہوتے ہیں جو ان بیماریوں کا استیصال کرے اور سب وحدتوں کو ایک تمدنی کنفیڈریشن میں منسلک رکھے۔اسی کا نام ارتفاق رابع ہے۔اور اسی کی تشریح وتفسیر سے نظام عالم کی تکمیل ہوتی ہے۔

انسانی معاشرے کے ارتفاق اوّل کی عمارت کی بنیاد چوپاؤں کی حیوانی زندگی پر قائم ہے ہاں انسانوں نے ،اس (حیوانی زندگی) کو اپنی نفاست پسندی، تسلسل اور ذوق نظافت وپاکیزگی کی وجہ سے بہتر بنا دیا، بعینہٖ اسی طرح جس طرح معدنیات کے وجود کا سنگ اوّل عناصر وموالید کو قرار دیا جا سکتا ہے انسانی معاشرے میں ارتفاق ثانی، ارتفاق اول پر مبنی ہوتا ہے اتنی بات ہے کہ اول الذکر میں صفائی، صلابت، لطافت اور ذوق جمال کے اضافے شامل ہو جاتے ہیں اس کی مثال ایسی ہے، جیسے کہ نباتات کی بنیاد معدنیات کے وجود پر رکھی گئی ہے۔

ارتفاق ثالث: ارتفاق ثانی پر مبنی ہوتا ہے جیسے کہ حیوانی زندگی کا وجود نباتی زندگی پر مبنی ہے۔

ارتفاق رابع: ارتفاق ثالث پر مبنی ہے جیسے کہ انسانی زندگی کا وجود حیوانی زندگی پر مبنی ہے۔

---

[1] (Confederater)

یہ بھی یاد رکھیے کہ ہر ایک ارتفاق دوسرے ارتفاق کے ضمن میں داخل اور اس کا گویا اجمال ہوتا ہے۔ ارتفاق اول بہائم کے ارتفاق کے تحت آتا ہے فرق اجمال و تفصیل کا ہے، بہائم میں اجمال ہے تو ارتفاق اول میں تفصیل علی ہذا القیاس ارتفاق اول میں اجمال ہے اور ارتفاق ثانی میں اس کی تفصیل، پھر ارتفاق ثانی میں اجمال ہے، ارتفاق ثالث میں اس کی تفصیل، پھر ارتفاق ثالث میں اجمال ہے اور ارتفاق رابع میں اس کی تفصیل ہے۔

ارتفاقات کے بارے میں دو ناقابل فراموش نکتے

جب ہم مذکورہ ارتفاقات چہارگانہ کے احکام وعلوم کی گہرائیوں میں جائیں گے تو تم کو دو نکتوں کا اچھی طرح ملحوظ خاطر اور پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

(الف) جب کبھی ہم کسی مسئلہ کی صورت باندھ کر اسے پیش کرتے ہیں تو صرف وہی صورت ہمارے پیش نظر نہیں ہوتی بلکہ ہمارا مقصد ایسی ایسی وہ صورت بھی ہوتی اور اس کے ہم مثل اور اس کے قریب دوسری صورتیں بھی ہوتی ہیں۔ جن کی صحت پر وہ قواعد کلیہ دلالت کرتے ہیں جن کا ہمیں علم ہوا ہے یہ صورتیں ان قواعد کلیہ میں دخول کے باوجود ہر ایک قوم کے علوم و عادات کے مختلف ہونے کی وجہ سے مختلف ہوتے ہیں۔

(ب) ارتفاق اول کا معیار و میزان بنی نوع انسان کے ہر ضرورت مند انسان کی طبعی ضرورت و حاجت ہوتا ہے۔ ارتفاق ثانی کا معیار یہ ہے کہ ارتفاق اول کے احکام وعلوم کے ساتھ علوم تجربیہ اور اخلاق صالحہ شامل ہو جائیں۔ اسی طرح باقی ارتفاقات یعنی ارتفاق ثالث و رابع کو قیاس کیجیے (ارتفاق ثالث کا معیار یہ ہوگا کہ ارتفاق ثانی کے احکام وعلوم کے ساتھ علوم تجربیہ، اخلاق صالحہ اور ظرافت و لطافت شامل ہو جائیں اور ارتفاق رابع کا میزان و معیار یہ ہوگا کہ ارتفاق ثالث کے احکام وعلوم اور قواعد کے ساتھ علوم تجربیہ، اخلاق صالحہ اور ذوق لطافت شامل ہو جائیں)۔

ارکان و مکملات ارتفاقات کی تعریف و تشریح

یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ان ارتفاقات (چہارگانہ) میں سے ہر ارتفاق کے ارکان و

ستون ہوتے ہیں (جو طاس کے وجود و بقا کے لیے عناصر لازمہ کی حیثیت رکھتے ہیں حتی کہ) اگر وہ ارکان نہ رہیں تو سرے سے ارتفاق کا وجود ہی نہیں رہتا۔ اسی طرح ہر ارتفاق (کی تعمیر وتحسین وجود) کے لیے بعض باتیں متمم ومکمل ہوتی ہیں (جن کے نہ ہونے سے وجود ارتفاق میں کوئی خاص ضرر ونقصان تو پیدا نہیں ہوتا لیکن) اگر وہ موجود ہوں تو یہ ارتفاق ممکن حد تک مکمل ترین اور خوبصورت ترین مثالی صورت وہیئت اختیار کر لیتا ہے۔ لیکن اگر ان مکملات وتحسینات کا فقدان ہے، تو اسی اندازے کے مطابق (اس ارتفاق کے ظاہری حسن وجمال میں) نقصان رونما ہوگا۔

ارکان سے مراد وہ امور ہیں جن کا ظہور وحدوث اس وقت ہوتا ہے جب نوع بشری کے اندر سرتاسر پھیلے ہوئے فطری اخلاق اور معیشت انسانی کے وقوع پذیر لوازمِ حیات اور اقوام عالم کے ہاں مسلمہ علوم آپس میں اس طرح مل جاتے ہیں کہ ان پر راسخ وجمع ہونا طبعی تقاضوں کا فطری نتیجہ معلوم ہوتا ہے جب یہ ارکان ارتفاق اُن کے دلوں میں راسخ ومضبوط ہو جاتے ہیں تو دین حق (فطرت) کے احکام بھی اُن کے مطابق نازل ہوتے ہیں۔

مکملات ومتممات سے مراد وہ باتیں ہیں جو کسی نافع تدبیر اجتماعی ادارہ یا درجہ معاشرت سے منسلک کسی معتدل مزاج، سلیم الطبع اور اوصاف حمیدہ واخلاق فاضلہ سے متصف شخص سے صادر ہوں۔ اور اس نظام کی صحت سے پیدا ہوں جو ایسے باکمال شخص کا پیدا کردہ ہو۔ یا جزئیات کو پیش نظر رکھنے سے حاصل ہوں۔ یا وہ حقائق جو خشوع وخضوع اور انابت وانکساری کے ساتھ بارگاہِ غیب کی طرف توجہ کے دوران منکشف ہوتی ہیں۔ اور وہ اُمور جو ضروریات زندگی کو مکمل طور پر پورا کرنے کے لیے عمیق ودقیق فکر ونظر کے نتیجہ میں پیدا ہوتے ہیں، یہ سب کے سب متممات (تکمیل وتحسین کنندہ امورِ حیات) کے زمرہ میں شامل ہیں۔ بہرکیف ان امور تحسینیہ وتکمیلیہ کے بھی مخصوص ضابطے ہیں جن کا تفصیلی ذکر کرنا ضروری ہے تاکہ ارتفاقات سے متعلقہ مسائل میں غور وخوض کے وقت تمہاری بصیرت افزائی ہو۔

ہدی صالح

(۱) سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ انسان اشیا کے اسباب و دواعی پر غور وفکر کرے۔ اگر کوئی شے بذات خود غیر مشروع وحرام ہے تو اس کے اسباب ودواعی بھی مکروہ ورناپسندیدہ ہوں گے۔ برخلاف اس کے اگر شرع نے کسی امر کو فرض یا واجب قرار دیا ہے ذ ایسے لازم امور کے دواعی اور اسباب بھی مستحب اور پسندیدہ ہوں گے۔

(۲) اصل یہ ہے کہ جس چیز میں اللہ تعالیٰ کے حکم کا عمل میں لانا یا اس کی تکمیل ہو یا اس کی نعمت واحسان کا اعتراف واعتداد ہو تو یقیناً وہ "ہدی صالح" (نیک طریقہ) ہے۔

(۳) اسی طرح جس بات میں وقار وسنجیدگی، اعتماد نفس وعالی منشی اور بلند ہمتی پائی جائے وہ بھی "نیک طریقہ" یا "ہدی صالح" ہے۔

(۴) ہر وہ بات جو باہمی عداوت اور بغض ودشمنی سے اس طرح نجات دے کہ جس سے گھریلو، شہری اور ملکی مصالح وفوائد کو نقصان بھی نہ پہنچے اور اس کی بنا، اعتدال، میانہ روی اور نیک نیتی پر ہو "ہدی صالح" میں شامل ہوتی ہے۔

(۵) نیز وہ ہر چیز جو تمہیں موہوم آفات اور احتمال تباہیوں سے مامون ومحفوظ رکھے "ہدی صالح" میں سے ہے۔

ہدی صالح اور صالح معاشرہ کی روح باہمی محبت اور فلاح عام ہے

ان سب ارتفاقات اور مفید تدبیروں کے سلسلہ میں منعقدہ اجتماعات اور مجالس کا سنگ بنیاد یا مدار انعقاد باہمی محبت اور ایک دوسرے سے الفت پر ہونا چاہیے۔ ایسی الفت ومحبت جس میں ان محافل ومجالس سے پیوست مناسب آداب ولوازم کا بھی خیال رکھا گیا ہو، مثلاً امام اور خلیفہ کا شکوہ اور عظمت، شریک (تجارت، بیع وغیرہ) اور اجیر ومزدور کی ضروریات کو پورا کرنے کی کامیاب کوشش۔

ہر وقت اس امر کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ کون سے امور ہیں جو الفت ومحبت کو برقرار رکھتے ہیں اور کون سے امور ہیں جو اس رشتہ الفت ومحبت کو برقرار رکھتے ہیں اور کون

سے امور ہیں جو اس رشتہ الفت ومحبت کو نقصان پہنچاتے ہیں اور پھر اول الذکر امور (موجبات ازدیاد محبت کو اختیار کرنا چاہیے اور موخر الذکر امور (موجبات نقصان محبت) سے اجتناب وپرہیز کرنا چاہیے۔ (ہاں یہ بات یاد رکھنی ضروری ہے کہ) ہر شخص کا ارتفاق اس کی طبیعت کے مناسب حال ہوتا ہے اور شاید اس مقالہ کے آخر میں ہم بشری طبائع کے موضوع پر مفصل تحریر پیش کر سکیں۔

نظام ارتفاقات میں خلل واقع ہونے کے اسباب دو وجوہ

روئے زمین میں جتنے معاشرتی فسادات اور نقصان دہ واقعات رونما ہوتے ہیں ان کی بنیادی دو وجہیں ہیں۔

(الف) یہ کہ لوگ ارتفاق کی ایسی نوعیت اختیار کرتے ہیں جو ان کی طبیعتوں کے مناسب اور مزاجوں سے ہم آہنگ نہیں ہوتی۔ یا تو اس لیے کہ وہ طریقہ خود انھیں پسند ہوتا ہے (جیسے مستغربین ومتنورین زمانہ کرتے ہیں) یا وہ اپنے آباو اجداد اور اقران واماثل کے اختیار کردہ ارتفاق کو چھوڑنے سے گریز کرتے ہیں۔ (اور مناسب حال ارتفاق کے مقابلہ میں قدیم غیر مفید ارتفاق کی اندھی تقلید وپیروی کرتے ہیں۔ جیسے عصر حاضر میں رواج پرستوں کا شیوہ ہے۔ حالانکہ راہِ صواب اعتدال ومیانہ روی کی راہ) ایک مرتبہ مجھ پر ارتفاق ثانی کے سلسلہ میں عنایت ازلی سے روشنی الہام کی جھلک ہوئی اور وہ فارسی زبان اس جملہ کے ذریعہ تھی کہ

''اہل خاندان قدیم زیان کارانند در آنہا شومی ہست''

(قدیم اہل خاندان نقصان دہ ثابت ہوئے ہیں ان میں بدبختی مضمر وپوشیدہ) ہے۔ مجھے اس الہام کی تاویل اس وقت سمجھ میں آئی جب ہم پر یہ حقیقت واشگاف ہوئی کہ ہر وہ شخص جسے اپنی طبیعت کے مطابق ومناسب ارتفاق نہیں ملا (اور وہ اپنے آباو اجداد کے قدیم مگر غیر مفید (ارتفاقات سے چمٹا رہا) وہ قلبی سکون وقرار اور ذہنی سعادت سے کبھی ہمکنار نہیں ہوا۔

(ب) معاشرتی زندگی کی پہلی منزل یا ارتفاق اول کی تکمیل سے پہلے لوگوں کا دوسری منزل یا ارتفاق ثانی کی طرف مشترک پیش رفت کرنا تہذیب وتمدن انسانی کے لیے ضرررساں ہے مثلاً یہ کہ تدبیروارتفاق منزلی (کے ارکان، مکملات اور تحسینی امور) کی تکمیل سے وہ جاہ ومنصب کے درپے ہوجاتے ہیں یا یہ کہ ارتفاق اکتسابی صنعت وحرفت کو چھوڑ کر شاہی خزانے اور بیت المال پر بوجھ ڈالنے کی کوشش کریں۔ (مدارج زندگی یا ارتفاقات چہارگانہ کی قدرتی ترتیب کو ہر حال میں ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ اور بلاضرورت نچلے درجہ کی معاشرت نامکمل چھوڑ کر اونچے درجہ کی معاشرت اختیار کرنا سوسائٹی اور تہذیب انسان کے لیے سخت مضر ہے۔ (۱)

حدیث:

(۱) حدیث میں قرب قیامت کی علامات میں سے ایک علامت یہ بتائی گئی ہے کہ ''ایسے لوگ جو پیروں ننگے، بدن کے لباس میں ادھورے اور تمدن میں بھیڑوں کے چرواہے ہوں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر عمارات بنانے کا اہتمام کریں یہ اس تمدنی ناہمواری کی طرف اشارہ ہے کہ ایک معاشرہ کو ابھی ابتدا کی ضروریات مہیا نہ ہوں اور وہ تمدن کے اونچے مدارج اختیار کرنے میں ترقی یافتہ معاشروں کی نقل اتارنے لگے۔

پانچویں فصل

ارتفاقِ اوّل کے لوازم

ا۔زبان (کلام): ارتفاق اول یعنی معاشرتی زندگی کے پہلے درجہ کے لوازمات حیات میں سے ایک لازمہ یہ ہے کہ انسان کو (اللہ تعالیٰ نے) تقطیع اصوات (اور تشکیل حروف وکلمات) کی فطری استعداد سے نوازا ہے جس کی بدولت وہ ذہنی افکار وصورتوں (اندرونی احساسات، باطنی کیفیات اور مافی الضمیر) کی تعبیر وترجمانی بلاتکلف طبعی انداز میں کرتا ہے۔ (ابتدا میں مفہوم کلام کا دائرہ محدود تھا) پھر (جوں جوں نوع انسانی توسع اور تکثر سے متصف ہونے لگی اور باہمی تعلقات وضروریات زندگی میں اضافہ ہونے لگا توں توں) الفاظ میں مجاز کی وجہ سے دائرہ کلام وسیع تر ہوتا گیا۔ زبان کی وسعت میں اشیا کے درمیان مجازی علاقوں کے ساتھ ساتھ آلات صوت (زبان، حلق وغیرہ) اور طبائع کے اختلاف نے بھی نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ حتی کہ ان اسباب کی وجہ سے مختلف زبانیں اور بھانت بھانت کی بولیاں ظہور میں آئیں اور یہ کہا جانے لگا کہ فلاں لفظ فلاں زبان میں فلاں مفہوم کے لیے وضع کیا گیا ہے۔ (حالانکہ یہ استعمال ان زبانوں میں وضعی نہیں بلکہ طبعی ہے)۔

زبان کی اصل یہ ہے کہ بہائم بھی اپنے قلبی احوال اور شعوری کیفیتوں کو ظاہر کرنے کے لیے خاص قسم کی طبعی آوازوں سے کام لیتے ہیں۔ ان کے غیظ وغضب اور خوف وہراس کے اظہار کے لیے مخصوص قسم کی آوازیں ہوتی ہیں۔ اسی پر دوسری کیفیات، احساسات اور احوال کو قیاس کیجئے۔ انسان کو بہائم پر یہ فوقیت حاصل ہے کہ وہ اپنے ذہنی افکار وخیالات اور قلبی کیفیتوں کا اظہار واضح عبارت میں حکایت کی صورت میں کرسکتا ہے۔ انسان کے تختۂ

ذہن پر جو تصورات منقوش ہوتے ہیں وہ یا تو باہر سے حاسئہ سامعہ کے ذریعہ دماغ میں داخل ہوتے ہیں ان ذہنی تصورات کی نقل و حکایت اور دوسروں تک پہنچانے کا طریقہ یہ ہے کہ ان محفوظ اصوات کو بعینہٖ یا اس کے قریب قریب الفاظ کا لباس پہنا کر مخاطب تک پہنچایا جائے۔ اور یا وہ تصورات حاسئہ باصرہ کے ذریعہ اس کے دل و دماغ کے تختوں پر منقوش ہوتے ہیں ان کو ایسے الفاظ کے قالب میں ڈھالا جائے کہ ان الفاظ کا مخاطب کے سامعہ پر وہی اثر ہو جو متکلم کے حاسئہ باصرہ پر کسی چیز کو یا کسی واقعہ کو دیکھ کر ہوا تھا۔ اور جس کا اثر بالواسطہ اس کے دل و دماغ نے قبول کیا تھا اور اگر انسان کو کسی اپنی قلبی کیفیت کے اظہار کی ضرورت درپیش ہوئی تو اس کا اظہار اسی طرح کیا جس طرح بہائم اپنے قلبی احوال کو مخصوص آوازوں کے ذریعہ ظاہر کرتے ہیں۔ پھر انسان کی طبیعت میں ان آوازوں میں اجزا بنانے (تقطیع) کی قوت ودیعت کی گئی ہے۔ اور اس طرح ہر منقطع آواز ایک حروف کی شکل و صورت اختیار کرلیتی ہے جو معانی میں سے کسی ایک معنیٰ کا حامل ہوتا ہے۔ پھر معانی اور حروف کی باہمی ترکیب ہوتی ہے جس سے جملہ یا کلام حاصل ہوتا ہے اور کلام کے موضوع پر ہم نے اپنی بعض تصنیفات میں شرح و بسط کے ساتھ کلام کیا ہے۔ (مثلاً حجۃ اللہ البالغہ باب الارتفاقات، ارتفاق اول)۔

غذائی اجناس کی پہچان اور اکل و شرب کے مناسب طریقوں کا علم

یہ بھی ارتفاق اول کے لوازمات میں سے ہے کہ آدمی ان غذائی دانوں (اور اناجوں) کا علم رکھتا ہو جو اس کی طبیعت کے موافق اس کی غذائی ضروریات پوری کریں۔ وہ اس اناج کے استعمال کا وہ طریقہ بھی جانے جس کے ذریعہ وہ اس کے معدہ تک پہنچایا جائے اور یہ کہ کس طرح انھیں پکایا جائے وہ ان کی کاشت کاری، آب پاشی اور کٹائی اور دانوں کو بھوسہ سے الگ کرنے کے طریقوں سے بھی واقف ہو۔ وقت ضرورت کے لیے ان کو محفوظ رکھنا اور ذخیرہ کرنا بھی جانتا ہو۔ ان کو بھوننے یا پکا کر روٹی بنانے اور روٹی کے معاون کے طور پر حیوانات اور نباتات سے تیار کردہ سالن مثلاً گوشت، دودھ، دہی، مکھن

اور گھی، دالیں اور ہر قسم کی ترکاریوں کے مناسب حال و مزاج استعمال کرنے کے طریقے بھی جانتا ہو۔

دریاؤں، نہروں اور چشموں سے پینے کے قابل پانی کی پہچان بھی ضروری ہے۔ نیز یہ کہ جب پانی تک رسائی نہ ہو تو کس طرح (کنوئیں کھودنے یا نہروں کے ذریعہ) پانی حاصل کیا جائے گا۔ اسی طرح ماکولات اور مشروبات کے استعمال اور ان کو محفوظ رکھنے کے لیے مناسب برتنوں، ڈولوں اور مشکیزوں کا مہیا کرنا بھی ارتفاق اول کے لوازمات میں سے ہے۔

چوپانی وگلہ بانی

اسی ارتفاق اول کے لوازمات میں سے ایک لازمہ وہ الہام ہے جو انسان کو تسخیر بہائم اور ان کے پالنے اور سدھانے پر اُبھارتا ہے اور اس (گلہ بانی) کے ذریعے اس کی بڑی بڑی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں انہی چوپایوں کے ذریعے وہ زمین کو زراعت اور کھیتی باڑی کے لیے تیار کرتا ہے۔ اور دور و دراز کے کٹھن سفر اُن پر سوار ہو کر طے کرتا ہے اور تجارتی مال اُن پر لاد کر ایک ملک سے دوسرے ملک میں لے جاتا ہے اور ان کے دودھ، گوشت، اون اور بالوں سے فائدہ اٹھاتا ہے۔

مکان ولباس

اسی ارتفاق کے لوازمات میں سے ایک مسکن اور لباس بھی ہیں۔ گرمی سردی (اور دشمن) سے محفوظ رہنے کے لیے (مناسب) مسکن بنانا اور جانوروں کی کھالوں، درختوں کے پتوں یا دیگر مصنوعات سے ایسا لباس بنانا جو انسان کو ایسا کام دے جیسے حیوانات کو بال کام دیتے ہیں اور اسے عریانی بدن اور شدائد موسم سے محفوظ رکھے۔

زن منکوحہ کی تعیین

اسی ارتفاق میں سے ایک لازمہ زن منکوحہ کی تعیین بھی ہے۔ تاکہ کوئی دوسرا اس بارے میں اس کی مزاحمت نہ کر سکے۔ اور پھر اس سے وہ اپنی خواہش پوری کرے اور اس کے ذریعہ اپنی نسل بڑھائے۔ انسان کے سوا دیگر حیوانات (ان مقاصد کو مدنظر رکھ کر دوامی

طور پر) اپنے جوڑے کو متعین نہیں کر سکے محض اتفاقیہ طور پر بعض اسباب کی وجہ سے ان کا جوڑا قائم ہو جاتا ہے۔ یہ اسباب یا تو خارجی ہوتے ہیں اور یا وہ دونوں توامین (جڑواں) ہوتے ہیں اور بلوغ تک ان میں پرانی باہمی رفاقت رہی ہوتی ہے اور اتفاقاً ان کا جوڑ قائم ہو جاتا ہے۔

اور جب انسان کی اولاد پیدا ہو جاتی ہے تو اس کی طبیعت میں اولاد کی محبت، شفقت اور ان کی مناسب پرورش و تربیت کا جذبہ پیدا کر دیا جاتا ہے حتی کہ وہ اولاد بلوغ تک پہنچ کر زندگی کے فرائض کے قابل ہو جائے۔

چھٹی فصل

ارتفاق ثانی سے متعلق حکمتوں کی تفصیل، حکمت معاشی کی تعریف

حکمت معاشی (فن معاشیات) یہ ہے کہ اپنی ضروریات کو اخلاق فاضلہ مثلاً دیانت، اچھی وضعداری (سمت صالح) وغیرہ کے تقاضوں، اور علوم تجربیہ اور رائے کلی کے تقاضوں کا لحاظ رکھتے ہیں پورا کیا جائے (یعنی ارتفاق اول کی تدبیروں کو صحیح تجربہ اور رائے کلی پبلک ول[1] کی کسوٹی پر کسا جائے جو نقصان سے بعید اور نفع سے قریب تر ہوں اور جو فلاح نوعی اور اصلاح عمومی سے وابستہ ہوں جنھیں ارباب علم ودانش اور اصحاب اعتدال پسندیدہ قرار دے چکے ہوں، ان امور وتدبیر کو اختیار کیا جائے اور باقی ہیئتوں کو چھوڑ دیا جائے تو اس صورت کو ارتفاق ثانی کی حکمت معاشی کہیں گے۔

اصولی ابواب

اس معاشی حکمت کے اصولی ابواب اور بنیادی اہم ترین مسائل یہ ہیں: کھانا، پینا، نظافت وصفائی، زینت وآرائش، لباس وپوشاک، مسکن ومکان، چلنا پھرنا، نشست وبرخاست، سفر وسیاحت، باہمی گفتگو، خواب واستراحت، جنسی خواہشات ومباشرت، امراض وآفات (اور شادی بیاہ، موت و وفات، خوشیوں کے ایام و وقائع اور حوادث اجتماعیہ) یہ اس کے ستون اور اصول ہیں۔

اقسام الناس بلحاظ حکمت معاشیہ

حکمت معاشیہ کے لحاظ سے لوگوں کے حالات تین مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ پہلی قسم

---

[1] Public will

ان لوگوں کی ہے جو بے انتہا آسائش پسند اور ہر قسم کی عیش وعشرت کے دلدادہ ہوتے ہیں۔

دوسری قسم متوسط طبقہ ہے جو نہ زیادہ آسائش پسند ہوتے ہیں اور نہ مفلوک الحال زندگی بسر کرتے ہیں اور ہر قسم کی عیش وعشرت کے دلدادہ ہوتے ہیں۔

تیسری قسم ان لوگوں کی ہے جو پہلی قسم کے بالکل برعکس ضروریات زندگی کو چوپایوں کے قریب قریب نہایت سادگی کے ساتھ پورا کرتے ہیں۔

اور ہم عنقریب بیان کریں گے کہ حکمت معاشیہ کا معیار لازماً درمیانی قسم یعنی متوسط طبقہ کو بنانا چاہیے جو افراد وتفریط سے پاک ہے (یہی صراط مستقیم، خیر الامور اور قوام اصلی ہے)۔

حکمت معاشیہ کے اصولی ابواب کی مختصر تشریح، طیب اشیا کھانا پینا

مذکورہ اصولی ابواب ومسائل میں ہر ایک کے آداب مختصراً درج ذیل ہیں:

ضروری ہے کہ کھانے کی چیزیں طیب اور پاکیزہ ہوں خبیث اور گندی نہ ہوں۔ خبیث سے میری مراد وہ اشیا خورد ونوش ہیں جن سے آسائش اور تجربہ کے لحاظ سے متوسط طبقہ کے میانہ رو اشخاص کی سلیم طبیعتیں نفرت کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر بدبودار طعام، مردار جانور کا گوشت، حشرات الارض خنزیر (سؤر) اور وہ درندہ جانور جو پھاڑنے چیرنے میں بے ڈھنگے ہیں اور ان سے بدبو آتی ہے) جیسے کتا شیر وغیرہ یہ سب خبیث اور غیر طیب ہیں۔ نیز آدمی کو چاہیے کہ اس تنعم اور عیش پرستی سے احتراز کرے جو اس کے درجۂ معیشت سے بالاتر ہو۔ کیونکہ اس میں کئی ایک خرابیاں ہیں۔

(۱) ایک یہ کہ عیاش اور عشرت پرستانہ زندگی تکلیف اور مشقت شاقہ سے خالی نہیں ہوتی۔

(۲) دوسرے یہ کہ مال (جو قوام زندگی ہے) ضائع ہوتا ہے۔

(۳) تیسرے یہ کہ ضروریات کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوتا ہے۔

(۴) چوتھی بات یہ ہے کہ فقر وافلاس کی جڑیں مضبوط ہوتی ہیں۔ ہاں عیش پسندی کے لحاظ سے معاشرہ میں انسانوں کے طبقے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ہر ایک کا علیحدہ معیار تنعم ہوتا ہے۔ مثلاً امرا اور سلاطین کے ہاں عموماً مال ودولت کی فراوانی

اور خادموں کا لشکر ہوتا ہے اس لیے ان کے لیے کوئی حرج نہیں کہ ان کے درباروں میں دستر خوانوں پر متعدد لذیذ کھانے ہوں اور دل پسند سامان عیش و عشرت ہو لیکن فقرا اور غریب اگر ایسی معیشت کا قصد کریں تو یہ (نہ صرف اسراف ہوگا بلکہ) ان کے معاشرتی و معاشی حالات کی تباہی اور ان کی فکری اور قلبی دنیا کی بے قراری کا باعث ہوگا۔

تنعم پسندی کے بارے میں دو متضاد نظریئے

یہاں پر دو مختلف اور متعارض دلیلیں پیش کی جاتی ہیں:

ایک یہ تنعم پسندی اچھی صفت ہے کیونکہ فطرت سلیم اس کا تقاضا کرتی ہے اور اس سے مزاج اور دل ودماغ میں اعتدال پیدا ہوتا ہے اس سے سیرت و کردار کی تعمیر اور اخلاق و علوم کی تحسین و درستگی ہوتی ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ کند ذہنی اور بد خلقی جیسی صفات رذیلہ بری غذا اور مضر طریقوں سے کھانے کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہیں۔ اور کھانے پینے کے بارے میں اچھی تدبیر اختیار کرنے سے ذہن میں تیزی، اخلاق میں شائستگی اور مزاج میں لطافت پیدا ہوتی ہے۔

دوسری دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ ترفہ اور تنعم پسندی بری اور قبیح چیز ہے کیونکہ عیش وعشرت اور تنعم کی زندگی کے لیے سخت کدوکاوش کرنی پڑتی ہے۔ اور دوسروں کے ساتھ تنازعات اور خصومتیں شروع ہوتی ہیں۔ مادّیت پرستانہ اور جنگ و جھگڑوں سے بھرپور زندگی میں مستغرق انسان (اللہ تعالیٰ اور) عالم غیب کی جانب سے غافل اور آخرت کی زندگی و تدبیر کو بھول جاتا ہے۔ (اس لیے ترفہ اور تنعم پسندی کو مستحسن سمجھنا غلط ہے)۔

وجہ تطبیق

ان دو متضاد دلیلوں یا نظریوں میں جمع و تطبیق کا طریقہ ہونا چاہیے۔ ہم کہتے ہیں کہ وہ طریق جمع و تطبیق یہ ہے کہ اگر تنعم سے یہ قباحتیں پیدا ہوں جو مؤخر الذکر فریق نے بیان کی ہیں تو یقیناً وہ تنعم اچھا نہیں لیکن اگر ان قبائح سے دور رہ کر کوئی شخص تنعم کی بدولت وہ محاسن

حاصل کر سکتا ہے جن کا ذکر فریق اول نے کیا ہے تو اس سے بہتر کون سی چیز ہو سکتی ہے۔

عموماً جو وقوع پذیر ہو سکتی ہے وہ یہ ہے کہ متوسط آسائش و تنعم اختیار کیا جائے اس صورت میں تجھے کچھ نقصانات پہنچیں گے مگر زیادہ نہیں پہنچیں گے۔ اور کچھ فوائد بھی حاصل ہوں گے اگرچہ پورے حاصل نہ ہو سکیں گے۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عنایت سے بغیر کسی محنت، مشقت اور تکلیف کے انسان کو فراخ روزی ملتی ہے اور یہ قسمت کی یاوری کا نتیجہ ہوتا ہے جس کے اصل اسباب کی تہ تک صرف وہ لوگ پہنچ سکتے ہیں جو معرفت الٰہی اور معرفت تجلیات الٰہی کے مقام پر فائز ہوتے ہیں۔

اکل (کھانے) کے آداب

انسان کو چاہیے کہ کھانے سے پہلے ہاتھ منہ دھو کر، ناک صاف کر کے اور کلی کر کے اطمینان کے ساتھ بیٹھ جائے اور طعام کو نہ زمین پر اور نہ کسی میز پر بلکہ دستر خوان پر رکھ دے اور کھانا اپنے سامنے سے کھائے۔ بدحواسی کے عالم میں جلدی جلدی کھانے سے احتراز کرے۔ بڑے بڑے لقمے نہ اٹھائے کیونکہ اس میں حرص اور بے ادبی پائی جاتی ہے۔ جب تک کھانے پینے کی اشتہا صادق نہ ہو اور خوب بھوک یا پیاس نہ لگی ہو، اس وقت تک کھانے پینے سے گریز کریں۔ بہترین کھانا پینا وہ ہے جو آسانی کے ساتھ میسر ہو سریع الہضم اور معدہ سے ہم آہنگ ہو۔ کھانے پینے کے لیے مٹی کے پکے ہوئے یا لکڑی کے بنے ہوئے برتن استعمال کیے جائیں۔ خالص سونے چاندی اور کچی مٹی کے برتنوں سے احتراز کیا جائے۔

مشروبات میں سب سے بری چیز نشہ آور مشروب ہے کیونکہ اس میں عقل انسانی زائل ہوتی ہے۔ سمت صالح اور متانت میں فساد پیدا ہوتا ہے بچے اور جاہل، تمسخر و استہزا کرتے ہیں۔ مال ضائع و برباد ہوتا ہے اور گھریلو اور شہری زندگی کے مصالح و فوائد کو زبردست نقصان پہنچتا ہے۔ پیتے وقت برتن میں (منہ ڈال کر) سانس نہ لے بلکہ برتن کو منہ سے الگ کر کے سانس لے۔ نہ بدحواسی کے ساتھ سانس لیے بغیر غٹ غٹ کر کے ایک ہی

گھونٹ میں پیئے۔اور نہ حوض یا بڑے برتن وغیرہ میں منہ ڈال کر پیئے۔ کیونکہ یہ انسانی وقار ومتانت کے خلاف ہیں۔علاوہ ازیں ان سے جگر میں خرابی پیدا ہوتی ہے۔ پانی کو آہستگی کے ساتھ تین دفعہ سانس لے کر پینا چاہیے کیونکہ اس کا معدہ پر بھی خوشگوار اثر ہوتا ہے اور وقار ومتانت کا اظہار بھی ہوتا ہے۔

آداب نظافت

انسان کے لیے اپنے بدن اور کپڑوں کو نجاستوں سے پاک وصاف رکھنا لازم ہے۔ یہ صفائی مٹی یا پانی سے کی جاسکتی ہے اس لیے جب کوئی شخص قضائے حاجت کے لیے (بیت الخلا) آتا ہے تو چاہیے کہ کم از کم تین ڈھیلوں سے نظافت حاصل کرے۔اور اگر وہ پانی سے مزید طہارت حاصل کرے تو اطہر وابلغ یعنی اچھی طہارت ہے اور جسم کو میل کچیل سے پاک رکھے اور کم از کم ہفتہ میں ایک بار (مثلاً جمعہ کے دن غسل کر کے) بدن کو مل لیا کرے تو یہ افضل ہے۔ (گندہ دہنی دور کرنے کے لیے مسواک اور (ناک کی صفائی استنشار (جھاڑے) کرے)، زیر ناف اور بغل کے بالوں کو بھی دور کرے، اسی طرح ان غیر حسی نجاستوں سے پاک وصاف رہے جس کی نجاست کا حکم ذہنی ہوتا ہے جیسے جنابت (جس کے بعد نہانا لازم ہے) اور رفع حاجت (جس کے بعد وضو کرنا لازم ہے)۔

زینت وآرائش

(زینت سے مراد زنانہ طرز پر کنگھی پٹی کرنا نہیں) زینت کے معنی یہ ہیں کہ انسان لوگوں کے درمیان صاف اور پسندیدہ حالت میں رہے۔وہ پگڑی طرحدار اور لباس خوشنما پہنے اس نے سر اور داڑھی کے بال کنگھی سے درست کیے ہوئے ہوں۔داڑھی کے گھنے بالوں میں شانہ کرے اور ہاتھ میں شریفانہ انداز کی چھڑی رکھے، کیوں کہ ایسی شکل وصورت وقار وسنجیدگی اور شہامت وبزرگی کی علامت ومظہر سمجھی جاتی ہے۔

اور شادی شدہ عورت کے لیے چاہیے کہ اس کے ہاتھ مہندی سے رنگین رہیں وہ سر کے بالوں میں (خوشبودار کریم اور) تیل لگا کر شانہ کرے۔اس کے کپڑے رنگین ومنقش

ہوں اور ہمیشہ وہ رنگ استعمال کرے جو اس کے خاوند کے لیے جاذب نظر اور پسندیدہ ہوں وہ اپنے آپ کو سونے کے زیورات اور دوسری مناسب اشیا زینت سے آراستہ رکھے۔

لباس

عقلائے روزگار کا اس پر اتفاق ہے کہ برہنگی عیب ہے۔ اور لباس زینت ہے۔ اس لیے شرم گاہوں اور رانوں کو کھلا رکھنا بے شرمی ہے۔ سب سے افضل لباس وہ ہے جو سب اعضائے بدن اور تمام جسم کو چھپائے اور اس میں شرم گاہوں کو چھپانے والا (کپڑا) اس کپڑے سے جدا ہو جو باقی اعضائے بدن کو چھپانے کے لیے استعمال ہو اور لباس ایسا ہو کہ انسان اپنے ہاتھوں کو آزادانہ حرکت دے سکے۔ اور اپنی ضروریات کو پورا کرتے وقت انھیں یہ محسوس نہ ہو کہ وہ گردن سے معلق اور بندھے ہوئے ہیں۔ مردوں کو ایسے کپڑوں سے احتراز کرنا چاہیے جو عشرت پرستی، بدمستی، بے راہ روی اور مسخرہ پن کا مظہر ہوں۔ جیسے ریشمی ارغوانی اور زعفرانی کپڑے اور نہ اتنا چست کپڑا پہنیں جس سے جسم کا حجم نظر آ رہا ہو البتہ عورت اگر اس قسم کے کپڑے پہن لیا کرے تو چنداں مضائقہ نہیں کیونکہ تنعم پسندی، نزاکت بینی اور زینت خواہی اس کی جبلّت میں رکھی گئی ہے۔ اور خاوند بیوی کی نزاکت پسندی کی طرف راغب ہوتا ہے۔

مرد مونث (یعنی جو مرد لباس وغیرہ میں عورتوں سے مشابہت پیدا کرنا چاہتا ہے) اور مرأۃ مترجلہ (جو عورت لباس وغیرہ میں مردوں کی مشابہت پیدا کرنا چاہتی ہے) دونوں راندۂ بارگاہِ الٰہی ہیں اور کوئی (ذی عقل سلیم شخص) انہیں محبوب و پسند نہیں کرتا (کیونکہ قدرت نے مرد اور عورت دونوں کو مخصوص جسمانی اور نفسیاتی صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ اور جس طرح ان دونوں کی جسمانی ساخت میں اختلاف ہے اسی طرح ان دونوں کے جداگانہ فرائض و واجبات میں فرق ہے۔ مرد، عورت بننے کی خواہش کرے اور عورت مرد، تو ایک طرف تو یہ فطرت کے خلاف جنگ ہوگی اور دوسری طرف انسان کی نوعی تمدنی اور تہذیبی زندگی میں کوئی پیش رفت نہیں ہوگی۔ کمال ذاتی اور کمال نوعی کے لیے مرد اور عورت کو اپنے اپنے دائرہ میں رہ کر تعاون و تناصر کے جذبہ کے ساتھ زندگی بسر کرنی ہوگی۔

مکان و مسکن

مسکن کے سلسلہ میں یہ ضروری ہے کہ وہ آدمی کو گرمی، سردی کی شدت اور چوروں کے حملوں سے بچا سکے۔ اور گھر والوں اور ان کے سامان کی حفاظت کر سکے۔ ارتفاق منزل کا صحیح مقصود یہی ہے۔ چاہیے یہ کہ مسکن کی تعمیر میں استحکام کے توغل و تکلف اور اس کے نقش و نگار میں اسراف بے جا سے احتراز کیا جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ مکان حد درجہ تنگ بھی نہ ہو (جس سے رہنے والوں کی بنیادی ضروریات سادہ طریق سے بھی پوری نہ ہو رہی ہوں) بہترین مکان وہ ہے جس کی تعمیر بلا تکلف ہوئی ہو۔ جس میں رہنے والے مناسب طور پر آرام و راحت کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں۔ فضا وسیع و عریض ہو، ہوادار ہو اور اس کی بلندی بھی متوسط درجہ کی ہو۔

مکان ہو یا دیگر ضرورتیں، ان سب کا مقصود تو یہ ہوتا ہے کہ پیش آمدہ ضرورتوں کو اس طور سے پورا کیا جائے جو طبع سلیم اور رسم صالح کے تقاضوں کے مطابق ہو۔ لیکن بدقسمتی سے بعض لوگ شاندار عمارتیں بنوانے میں ہوائے نفس کے تابع ہوتے ہیں۔ اور ان کی تعمیر میں نفسانی خوشی محسوس کرتے ہیں اور ان کو مقصود بالذات چیز سمجھتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے، اس قسم کے لوگ نہ تو دنیا کی کدّ و کاوش سے نجات پا سکتے ہیں اور نہ انہیں فتنۂ قبر اور فتنۂ محشر سے نجات مل سکے گی۔

سفر

اگر چہ سفر میں انسان کو خوف و وحشت اور وطن سے اور بھائیوں سے دوری اور کتنی اور قسم کی تکلیفیں پیش آتی ہیں، پھر بھی اہم مقاصد اور اعلیٰ اغراض کے حصول کے لیے سفر کرنا ہی پڑتا ہے، چاہیے یہی کہ بلا ضرورت حتی الامکان سفر سے احتراز کیا جائے لیکن جب ضرورت پڑے تو سفر پر جانے سے پہلے ''اچھے ساتھی'' کی تلاش ضروری ہے کیونکہ ''اکیلا مسافر ایک بھٹکا ہوا شیطان ہے جو شاید اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو''۔ یہ بات کامیاب تجربات سے ثابت ہوئی ہے۔

سفر کے دوران پڑاؤ کرتے وقت اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ جاری اور کھلے راستے میں یا ندی، نالے کے پیٹ میں نہ اُتریں، خشک اور بے آب وگیاہ علاقے سے جلد نکلنے کی کوشش کرنی چاہیے اور اگر سرسبز وشادات وادی ہے تو اطمینان کے ساتھ منزل طے کرنا چاہیے اور درمیان میں آرام کر کے اپنی سواری کو آزاد چھوڑنا مناسب ہے تاکہ وہ گھاس پھوس کھائے، چوپایوں پر رحم اور ان کی صحت کے لیے یہ طریقہ کار زیادہ درست ہے۔ جہاں بھی قیام کرے ہمیشہ چوروں سے چوکنا ہو کر رہے۔ خیموں کو بلند جگہوں اور ٹیلوں پر نصب کرنا چاہیے تاکہ سیلاب اور طوفان سے حفاظت بھی ہو سکے اور کسی آفت یا دشمن کے خطرہ کے وقت اجتماعی مدافعت کا سامان بھی فراہم ہو سکے۔

نشست وبرخاست اور چلنے پھرنے کے آداب

چلتے وقت اعضائے جسمانی کو زائد از ضرورت حرکت وجنبش نہیں دینا چاہیے اور زیادہ تیز چلنا اور بہت آہستہ چلنا آداب مشی کے خلاف ہے۔ کیونکہ ان ہر دو افراطی وتفریطی صورتوں سے حماقت خفیف الحرکتی اور کمزوری ظاہر ہوتی ہے۔ حلقہ یاراں میں عین درمیان میں بیٹھنا زیادہ اچھا نہیں بہترین محفل ومجلس جس میں بیٹھنا افضل واحسن ہے وہ ہے جس میں ان امور کی طرف توجہ پیدا ہوتی ہے جن سے آدمی دین ودنیا کا کوئی معتد بہ فائدہ حاصل کرے۔ سب سے بدترین نشست گاہ وہ ہے جو راستہ میں ہو جہاں سے عورتوں کے پُرکشش حصوں پر نظر پڑتی ہے اور نتیجہ پردۂ ذہن پر تشویش انگیز تصویریں بن جاتی ہیں۔

صنفی تعلقات کے آداب

میاں بیوی کے درمیان صنفی تعلقات میں تستر اور حیا کو ہر حالت میں ملحوظ رکھنا ہے ہم بستری سے پہلے میاں بیوی کے درمیان ہنسی خوشی اور کھیل وملاعبت کی سازگار فضا قائم ہونی چاہیے کیونکہ اس طرح استفراغ منی میں سہولت وآرام رہتا ہے۔ ہم بستری کے وقت غیر ضروری باتیں نہیں کرنی چاہیے کیونکہ شریفانہ اخلاق کے منافی امر ہے۔ ہم بستری کے وقت یہ بھی ضروری ہے کہ استفراغ منی کے بعد بھی میاں اپنی زوجہ پیٹ پر رہے تاکہ اس کی زوجہ

بھی اسی طرح لطف اندوز ہو جس طرح وہ اپنی صنفی خواہش پوری کر کے لطف اندوز ہوا ہو۔

آداب نوم

سوتے وقت دائیں جانب پر لیٹنا اور اپنے دائیں ہاتھ سے سر کو سہارا دینا چاہیے کیونکہ اس طرح سونے سے قلب بیدار رہتا ہے۔ آرام وراحت زیادہ ملتی ہے اور جگر کی کارکردگی زیادہ بہتر ہوتی ہے (سونے کے اوقات کے سلسلہ میں) چاہیے کہ آدمی یا دوپہر کو قیلولہ کرے، یا عشا کے بعد آرام، ہاں ضرورت کی بات اور ہے۔

سوتے وقت مناسب ہے کہ طہارت (غسل یا وضو یا تیمّم) کر کے سوئے اور اپنے دماغ کو پریشان کن ذہنی خیالات اور تصوروں سے صاف رکھے اور اس کا وسیلہ یہ ہے کہ سونے سے پہلے قصہ کہانی اور گپ شپ نہ سنے۔ سوتے وقت چند آیات قرآن پاک پڑھ لینا انسان کو پراگندہ خوابوں اور ہیبت ناک بے ترتیب خیالات سے محفوظ رکھتا ہے۔

پھر جب انسان کوئی خواب دیکھے تو اس کی کئی قسمیں ہوتی ہیں:

ایک یہ کہ عالم بیداری میں خیالات وتصورات لوح ذہن پر منقوش ہوتے ہیں، اور جن کا اثر حس مشترک میں باقی رہ جاتا ہے وہ عالم خواب میں منتقل ہو کر سامنے آتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ طبیعت کے حیوانی اثرات کا غلبہ اپنا عمل کر جاتا ہے جو کبھی شہوات کی بنا پر احتلام کی صورت میں نمودار ہوتا ہے اور کبھی امور طبیعیہ کا مظاہرہ ہوتا ہے مثلاً غلبۂ صفرا کی حالت میں انسان دیکھتا ہے کہ آگ بھڑک اٹھی ہے۔ اور اس سے شعلے اٹھ رہے ہیں اس قسم کے خوابوں کو ''انزار الشیطان'' (بھوت پریت کے ڈراوٴنے) اور ''اضغاث الاحلام'' کہتے ہیں جن کی کوئی تعبیر نہیں ہوتی۔ اور تیسری قسم یہ ہے کہ عالم مجردات اور عالم محسوسات کے درمیان قوت متوسط یعنی عالم مثال کے فیضان کے نتیجہ میں نفس ناطقہ انسان میں خواب متمثل ہوتے ہیں تو اس صورت میں خواب کی کوئی نہ کوئی تعبیر ہوگی۔

مرض کے آداب

جو شخص کسی مرض میں مبتلا ہو جائے تو ایک طرف وہ (جاہلی اور جاہلانہ جھاڑ پھونک کی

بجائے مکمل اور پورے جھاڑ پھونک یعنی قرآن پاک کی آیت اور اسمائے حسنیٰ سے توسل کرے۔ کیونکہ یہ اسمائے پاک ان قوی پر دلالت کرتے ہیں جو قوائے سماویہ اور قوائے ارضیہ کے باہمی ارتباط کے بعد معنوی طور پر اس عالم کون وفساد میں ایسے کارفرما ہوتے ہیں کہ یہ دونوں (اسمائے حسنیٰ میں مضمر قوی اور عالم کون وفساد) باہم دیگر مل کر ایک کل کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اور ان اسباب طبیعیہ اور قوائے مخفیہ کی تسخیر میں آیات اللہ اور اسمائے حسنیٰ کا اثر ونفوذ معنوی طور پر ہوتا ہے اس کی تفصیل ہم انشاء اللہ (عنقریب) بیان کریں گے۔ اور دوسری طرف اس کے ساتھ ہی ساتھ طبی اصول کے مطابق مجرب مفید دواؤں سے علاج معالجہ بھی کرتا رہے۔

ہر مصیبت زدہ دو حالتوں سے خالی نہیں۔

یا تو (۱) وہ مخلوقات وموجودات عالم میں خدائے رحمٰن جل وعلا کے فیصلوں پر اپنے نفس کو راضی ومطمئن کرے گا اور علم یقین سے جانتا ہوگا کہ کارخانہ ہستی اور کائنات کا نظام جس حکمت بالغہ پر مبنی ہے اس کا تقاضا یہی تھا۔ رضا بقضائے الٰہی اور کون ومکان میں حکمت بالغہ کی کارفرمائی پر یقین کامل سے اس کے قلب میں ایسی الٰہیاتی وجدانی کیفیت پیدا ہوگی جو اسے دنیاوی پریشانیوں سے نجات دے گا اور اسے مادی آلائشوں سے پاک کر کے اپنے پروردگار کے قریب کر دے گی۔ دنیا میں وہ سمت جمیل سے موصوف ہوگا اور آخرت میں اس کو اجر جزیل اور ثواب کامل ملے گا۔

اور یا (۲) وہ مصیبت سے گھبرا کر پریشان ومتردد ہوگا۔ اور (عالم ملکوں وجبروت کے بجائے عالم دنیا کے پست ترین حصہ) زمین سے پیوست رہے گا۔ اور ہر آن کھوئی ہوئی چیز (صحت مال، اولاد وغیرہ) اور اس کے حسن وجمال کو یاد کر کے دست تأسف ملتا رہے گا جو اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کو اس دنیا اور دنیا کے مزخرفات سے دل بستگی ہے اور اپنے پروردگار (کی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ سے عملی انکار ہے۔ اور اسے یوم آخرت میں اُمید نجات سے محرومی اور دوسروں کے احسان ومہربانی سے ناامیدی کا احساس پریشان کر رہا ہے حتیٰ کہ اس دنیا میں اس کے فزع وجزع اور اضطراب کا یہ عالم ہوتا ہے گویا اس پر جنون کا دورہ پڑ گیا ہے یا اسے جنات نے حواس باختہ کر دیا ہے۔ ہمارے اس بیان سے تمھیں وہ راز معلوم

ہو گیا ہوگا کہ شریعت محمدیہ نے میت پر نوحہ وزاری اور مرثیہ خوانی کو کیوں منع فرمایا ہے۔

آداب کلام

ضروری ہے کہ کلام فصیح و بلیغ ہو اور اجمال و ابہام و لکنت یعنی بندش و رکاوٹوں سے خالی ہو۔ اور ان کے لب و لہجہ میں رکاکت و کرختگی نہ ہو۔ اس میں آب رواں کی طرح تسلسل و روانی ہو اور وہ ان معانی پر مشتمل نہ ہو جن سے سننے والے کو ذہنی کوفت اور قلبی رنجش ہو مثلاً کج بحثی، نکتہ چینی، عیب جوئی اور چغل خوری وغیرہ۔ کلام مخاطب کی ذہنی حالت و استعداد اور اس کے درجۂ ذکاوت و غباوت کے مطابق ہونا چاہیے۔

حکمت معاشیہ کے متعلق مشتے نمونہ خروارے یہاں اتنا کافی ہے۔

ساتویں فصل

الحکمة المنزلیة (تدبیر منزل)

حکمت منزلیہ کی تعریف

حکمت منزلیہ (یا فنِ تدبیر منزل) کا مفہوم ہے اہل منزل یعنی ایک گھر کے رہنے والوں اور احباب اور ساتھیوں کے ساتھ معاملات میں اس قسم کا ربط و تعلق قائم کرنا اور سلوک روا رکھنا جو ''اخلاق فاضلہ'' ''علوم تجربیہ'' اور ''رائے کلی'' کے تقاضے کے مطابق ہو اور جس نتیجہ میں تیرا رہنا سہنا اچھے طریقے اور باعزت میل جول کے ساتھ ہو (بالفاظ دیگر ان میں سے ہر ایک کے ساتھ بہترین اور معزز ترین برتاؤ اور اس برتاؤ کی حفاظت کی تدبیروں کا نام حکمت منزلیہ ہے)۔

تدبیر منزل کے حصے

اس حکمت کے تین حصے یا نظام ہیں:

(۱) ازدواج و نکاح (۲) ولادت و اولاد (۳) مالک و مملوک یا آقا و ماتحت۔

نکاح: انسان کے حق میں ایک عنایت الٰہی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو مروجہ طریقہ پر نکاح کرنے کا الہام فرمایا یعنی یہ کہ نکاح غیر محرموں کے ساتھ ہو اس میں ایجاب و قبول ہو (یعنی فریقین کی رضامندی ہو) اور عورت کے سرپرستوں سے درخواست اور ان کی نگرانی اور گواہوں کی موجودگی میں عقد نکاح پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے۔ خطبہ (منگنی اور خطبہ (بوقت نکاح) کے ذریعہ اس کا اعلان کیا جائے اور مہر کی مقدار مقرر کی جائے۔ (نکاح کے بعد) عورتوں کا یہ فرض ہے کہ وہ شوہروں کی فرماں برداری کریں اور ان کی خدمت میں کوئی

وقیقہ فروگذاشت نہ کریں۔ اور امور خانہ داری اور شوہروں کی گھریلو ضروریات پورا کرنے کی فکر کریں۔ شوہروں کا فرض یہ ہے کہ وہ گھر سے باہر اکتساب معاش میں مشغول رہ کر عیال داری کی ضروریات پورا کرنے کی فکر کریں۔

اسرار و اسباب تعیین زن منکوحہ

اس (تعیین زن منکوحہ) کا ایک (۱) راز یہ ہے کہ انسان فطرتاً امر نکاح میں غیرت مند واقع ہوا ہے اور دوسرے چوپایوں کے غیور (سانڈوں اور) نروں کی طرح یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی دوسرا امرد اس کی منکوحہ بیوی سے صنفی تعلقات اور ازدواجی روابط قائم کرے۔ اور منافستِ باہمی کی صورت میں زور آزمائی، قتل وخوں ریزی اور فساد و بدامنی تک نوبت پہنچ جائے۔ علاوہ بریں انسان کی حمیت وغیرت یہ بھی برداشت نہیں کر سکتی کہ کوئی اس کی بیٹیوں بہنوں اور جگر گوشوں کو اس کی موجودگی میں عریاں و برہنہ کرے اور (جس طرح جی چاہے) سانڈوں کی طرح ان سے صنفی تعلقات قائم کرے۔

(۲) اس (حمیت اور غیرت) کی (دوسری وجہ) ایک طبعی وجہ ہے۔ اور وہ یہ کہ مرد بالطبع پسند نہیں کرتا کہ کوئی اس کے ساتھ غیر فطری معاملہ کرے۔

اس فطرت کے ساتھ جب وہ خود اپنی اولاد کی تربیت کرتا ہے اور حصول منفعت اور دفع ضرر کے اصولوں کے لحاظ سے ان کو اپنی جیسی حیثیت دیدیتا ہے تو اپنی جبلت اور ذات کے احکام کے ساتھ اس غیرت کا جذبہ اولاد کے حق میں بھی محسوس کرتا ہے۔

(۳) نکاح کے بارے میں اس اہتمام کا ایک سبب صفت حیا بھی ہے جو مردوں اور عورتوں دونوں میں پائی جاتی ہے۔ نیز عقل سلیم بھی اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ تعیین ہو جانے کے بغیر کسی سے اس کے صنفی تعلقات نہ ہوں ان اسباب کی بنا پر انسان کو غیب سے الہام ہوا کہ (صنفی تعلق) کو راز داری کے ساتھ انجام دے۔ اور حکم دیا گیا ہے کہ صنفی مباشرت کو (صراحت کے ساتھ ذکر نہ کیا جائے بلکہ اس کو) شادی کے لوازم و رسومات اور عروج (عورت کو اپنی جانب مائل کرنے) کے ایسے طریقوں میں مخفی رکھا جائے جن کی ان

دونوں (مرد اور عورت) سے توقع کی جاتی ہے۔ گویا کہ دونوں کے وجود سے بظاہر یہی (یعنی رسم شادی) مقصود ہے۔ لوگ اس رسموں اور رواجوں کو موجب اطمینان پا لیتے ہیں اور جماع ومباشرت کو کان لم یکن سمجھ کر بھول جاتے ہیں۔ امر نکاح و جماع میں یہی طریقہ شروع سے جاری ہے (اور لوگ شادی کو خاص رسوم کے ساتھ بجالا کر بیٹیوں اور بہنوں کا نکاح کراتے ہیں)۔

(۴) زندگی کی دوڑ میں دوسروں سے مقابلہ کرنا اور ان پر سبقت حاصل کرنا انسان کی جبلت ہے۔ یہ جبلت اپنے جگر گوشوں کے سلسلہ میں بھی کارفرما رہتی ہے اور دیکھا یہ گیا ہے کہ جس چیز سے جگر گوشوں کو اذیت پہنچتی ہے وہ ماں باپ کے لیے بھی باعث اذیت ہوتی ہے اور جو چیز ان کو سرور وخوشی بخشتی ہے اس سے والدین کے دلوں کو بھی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عقد نکاح سے پہلے مہر، خطبہ اور اعزاز پیش کرنا ضروری سمجھا گیا ہے تاکہ یہ معلوم ہو کہ شوہر اس رشتہ کا سچے دل سے طالب ہے۔

مرد اور عورت کی جسمانی اور ذہنی قوتوں میں فطری اختلاف اور اس کے فائدے

یہ بھی فطری امر ہے کہ مرد خوددار، خود پسند اور اقتدار پسند واقع ہوا ہے، اس کی جسمانی قوت اور ذہنی صلاحیت دونوں (صنف نازک کے مقابلہ میں) بہتر ہیں۔ اور وہ روزی کمانے کے طریقوں پر زیادہ قادر ہے۔ اور اس قابل ہے کہ اِدھر اُدھر دوڑ دھوپ کر کے خوب کمائے، خود بھی کھائے اور دوسروں کو بھی کھلائے۔ (اس کے برعکس) عورت فطرتاً حقیر اور ادنیٰ چھوٹے چھوٹے امور کو خود سمجھتی اور انجام دیتی ہے۔ وہ بمقابلہ مرد کے زیادہ اطاعت کیش اور جسمانی و ذہنی قوتوں کے لحاظ سے اس سے ضعیف تر ہوتی ہے۔ معیشت بترا (کم درجہ کے وسائل معاش) اور تنگدستی وزبوں حالی میں بھی بہتر معیشتی تدبیریں اختیار کرنے پر قادر ہوتی ہے (مگر بعض خلقی کمزوریوں کی وجہ سے اس قابل نہیں ہوتی کہ وہ مردانہ افعال واعمال بجالا سکے) اس لیے (تمام سلیم الطبع اقوام کا) اس بات پر اتفاق ہے کہ مرد گھر کے اندر کے کاموں مثلاً جھاڑو دینے، کھانے سالن پکانے، آٹا پیسنے اور

بچے پالنے کے کاموں کے لیے کم فارغ ہوتا ہے اور عورتوں کو گھر کی چار دیواری کے اندر رہ کر خانہ داری کے فرائض انجام دینے چاہیں کیونکہ وہ نرم مزاج اور کمزور دل ہوتی ہیں۔

عورت کی فطرت میں یہ بات بھی ہے کہ عفیف عوتیں جماع و مباشرت کی خواہش کو ظاہر نہیں کرتیں بلکہ اس کو بوجہ حیا کے دوسروں سے پوشیدہ رکھتی ہیں۔ مردوں کو عورتوں کی یہ بات اچھی لگی ہے۔ اور ہمیشہ اس صفت کو نظر استحسان سے دیکھا گیا ہے۔ اس لیے ان کے نکاح کا معاملہ ان کے سرپرستوں کے سپرد کیا گیا اگر وہ سرپرستوں کی وساطت چھوڑ کر براہ راست اس قسم کی کارروائی کریں تو یہ سخت معیوب اور بے حیائی کا کام سمجھا جاتا ہے۔

نکاح محارم کی حرمت میں یہ حکمت ہے کہ انسان ماں بہن کی گود میں پرورش پاتا ہے اور بیٹیاں اس کی گود میں تربیت و پرورش پاتی ہیں۔ اور (اس طرح قریبی رشتہ داروں یعنی مردوں اور عورتوں کے درمیان ایسا گہرا تعلق رہتا ہے جو) راہ نکاح اور ترغیب ازدواج میں مانع ہوتا ہے جب تک خَلق وخُلقِ انسان سلامت اور درست ہیں اس وقت تک قریبی رشتہ دار عوروں سے نکاح میں رغبت کا اظہار بالکل نہ ہوگا۔ ایسی سخت مجبوری اور ضرورت پیش آجائے (جو مصلحت عامہ اور ارتفاق انسانی پر مبنی ہو) تو اور بات ہے۔ (یہاں شاہ صاحب اس واقعہ کے لیے عذر تلاش کرنا چاہتے ہیں کہ ابتدائے آفرینش میں جب حضرت آدم وحوا سے نسل چلی تھی، تو ابتدائی توام جوڑوں کو دوسرے توام جوڑوں کے ساتھ نکاح کرنے کی اجازت دی گئی تھی)۔

نکاح محارم کی حرمت میں ایک مصلحت بھی ہے وہ یہ کہ محارم کے ساتھ ہر وقت اور ہر حال میں انسان کا نہایت گہرا تعلق رہتا ہے اور اختلاط اور بے تکلفانہ صحبتوں میں فساد (بے راہ روی اور کج روی) کے اندیشے لاحق رہتے ہیں۔ اس لیے اگر ابتدا سے نکاح محارم کی حرمت وتقدس لوگوں کے ذہن نشین نہ کیے جائیں تو صنفی بے راہ روی کے عام ہونے کا خدشہ رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کم وبیش ہر معتدل المزاج قوم نظریہ تحریم نکاح محارم کی قائل اور اس پر عامل ہے۔ یہ محرم عورتیں کون کون سی ہیں؟ اس بارے میں بہر حال مختلف اقوام میں اپنی عادات کے لحاظ سے اختلاف موجود ہے (جیسے ہندو سوسائٹی چچازاد کو بھی بہن سمجھتی ہے)۔

مدارج معیشت میں اختلاف فطری ہے

یہ بھی خدائے بخشندہ کی بخشش وعنایت ہے کہ سب انسانوں کو یکساں طبیعت سے نہیں نوازا بلکہ انھیں مختلف مراتب ومدارج کے ساتھ پیدا کیا۔ (اس لیے مشاہدہ سے یہ بات ثابت ہے کہ) بعض اشخاص بالطبع غلامی اور ماتحتی کے خوگر ہوتے ہیں اور کم ہمتی اور ضعف قوی کی وجہ سے آزادانہ طور پر اکتساب معاش نہیں کر سکتے۔ وہ سرداروں کے تابع فرمان اوران کے عیال میں شامل ہوکراوامر کی تعمیل میں تسلیم وانقیاد کا شیوہ اختیار کرتے ہیں۔ اس قسم کے بالطبع غلاموں کواس وقت تک آرام محسوس نہیں ہوتا جب تک وہ کسی آقا کے) ماتحت نہ ہوں۔ خواہ وہ آقا ان کا مالک ہو یا مالک جیسا طرز عمل اختیار کرنے والا (حاکم وغیرہ) ہو۔

اس کے برعکس بعض لوگ بالطبع سرداراور آقا ہوتے ہیں، وہ عالی ہمت اور سیادت وقیادت کی صلاحیت رکھتے ہیں وہ اپنے معاش ومکاسب میں نہ صرف مستقل وخودکفیل ہوتے ہیں بلکہ وہ دوسروں کی ضروریات کا بوجھ برداشت کر سکتے ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ زمام سیاست وقیادت ان کے ہاتھوں میں رہے۔ پھر انسانی معاشرہ کے ان کے افراد نے ایسے واقعات اور ارتقاقات (جنگ وجدل یا حملہ وغارت کے) برپا کیے کہ ان میں لوگوں نے ایک دوسرے کو غلام بنانا شروع کیا اور ان غلاموں کی گردنوں کے مالک بنے اوران کی گردنوں کو طوقِ تملیک میں جکڑا اور ان سے اس طرح کام لینے لگے، جس طرح جانوروں سے کام لیا جاتا ہے۔ (یعنی آقا وغلام کا ایک رشتہ اورادارہ معاشرہ میں پیدا ہوا اور ضرورت پیدا ہوئی کہ ان کا باہمی تعلق کے لیے بھی کوئی اصول وضع کیا جائے) مرورِ وقت کے ساتھ ساتھ آقاؤں اور غلاموں کی معاشرتی اور معاشی زندگی میں بعض ایسی ضرورتیں پیدا ہوئیں جو ایک دوسرے کے تعاون اور ہاتھ بٹانے کے بغیر پوری ہی نہیں ہوسکتی تھیں اس لیے ضروری ہوا کہ زندگی کو پُرسکون وخوشگوار رکھنے کے لیے ان دونوں کے باہمی تعلقات کو آپس میں اُستوار ہوں۔ اس قدرتی تدبیر کی بنا پر انسانوں کی معیشت کا

کاروبار اچھی طرح چلنے لگا۔[1]

والدین اور اولاد کا تعلق

انسان پر اللہ کا یہ ایک عظیم احسان ہے کہ اس نے اولاد کو والدین اور آبا و اجداد کا مطیع و فرماں بردار بنا دیا ہے اس کا بنیادی سبب والدین کا وہ طرزِ عمل اور طریقۂ پرورش ہے جو وہ اپنی اولاد کی تربیت و خبر گیری کرتے وقت اختیار کرتے ہیں۔ وہ بچپن ہی سے اپنے بچوں بچیوں کی تربیت ایک طرف قوت اور بالادستی کے ساتھ اور دوسری طرف شفقت و مہربانی اور طبعی محبت و احتیاط کے ساتھ کر کے ان پر ان کے بچپن میں ہی اپنی قیادت کا سکہ بٹھا لیتے ہیں۔ اور جب اولاد سنِ بلوغ کو پہنچتی ہے تو وہ دیکھتے ہیں کہ ان کے مقابلہ میں ان کے بزرگ (باپ) کی عقل و فہم اور اس کا تجربہ زیادہ ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اولاد جب بڑی ہو جاتی ہے تو وہ طبعًا والدین کی فرماں برداری اور خدمت گزار رہنا پسند کرتی ہے۔ احسان شناسی کے تحت اور جذبہ ان کے احسانات کو یاد کرتی ہے اور اپنی عقل و فہم اور تجربہ کے مقابلہ میں ان کی پختہ رائے کا سہارا لے کر مسائلِ زندگی حل کرتی ہے۔ چوپائے بھی فطری طور پر وفادار ہوتے ہیں اور ان کے دلوں میں جو محبت آہستہ آہستہ گھر کر جاتی ہے۔ وہ اس پر قائم رہتے ہیں۔ ان میں بھی احسان شناسی کا جذبہ موجزن رہتا ہے۔ اور اپنے منعم و مربی کے حسنِ سلوک اور احسان و انعام کا خیال کر کے اس سے محبت کرتے ہیں۔ (گویا انسان کی حیوانی جبلّت کا بھی یہ تقاضا ہے کہ اولاد اپنے والدین کے ساتھ محبت اور ان کی اطاعت کریں)۔

بہر حال خارجی اسباب کے علاوہ بھی آبا کی طبیعت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی اولاد سے محبت اور ان پر شفقت ڈالی ہے۔ اور ابنا کی طبیعت میں یہ ڈالا ہے کہ اپنے آبا کے تابع اور مطیع فرمان رہیں۔ اور ان کے ساتھ ادب و احترام سے پیش آئیں۔ (یہ بھی ایک عام جبلّت ہے) چوپایوں میں بھی یہ اوصاف نمایاں نظر آتے ہیں۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ

---

[1] شاہ صاحب یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ارتفاق ثانی کی منزل پر غلامی انسانی معاشرہ کی ضرورت تھی اور اس ادارہ کی بدولت انسانوں کو دوطرفہ ضروریات کے پورے ہونے کی سبیل نکل آتی تھی۔

ازدواجی تعلقات پدرانہ وفرزندانہ روابط اور آقا وغلام کے تعلقات کو معقول اور شرعی حدود کے اندر رکھنے کے لیے جو نظام قائم ہے اس کو ہم تدبیر منزل کہتے ہیں کیونکہ منزل صرف چار دیواری، دروازوں، کمروں اور چونے پتھر کی بنی ہوئی عمارت کا نام نہیں۔ (بلکہ اس ادارہ کا نام ہے جس کے تحت یہ تعلقات پیدا ہوتے ہیں)۔

ازدواج کی ضروریات اور آداب

اس ارتفاق کا کمال اس میں ہے کہ جن اغراض ومقاصد اور ضرورتوں کی تکمیل کے لیے ازدواج ونکاح کی مشروعیت کی گئی ہے، وہ بہ طریق احسن پوری ہو جائیں۔ چنانچہ پسندیدہ امر یہ ہے کہ جس عورت کو رفیقۂ حیات کی حیثیت سے منتخب کیا جائے وہ خوبصورت ہو، کنواری ہو، اولاد پیدا کرنے کی پوری استعداد وصلاحیت رکھتی ہو، عفیف وپاکدامن ہو، اپنی اولاد سے قلبی لگاؤ رکھتی ہو۔ اس کے دل میں شوہر کی محبت ہو، اور اس کے مال ودولت کی حفاظت کنندہ اور امانت دار ہو، امور خانہ داری سے پوری طرح واقف وماہر ہو۔ غصیلی اور کمزور طبیعت کی نہ ہو۔ وغیرہ وغیرہ۔

شوہر کے انتخاب میں مندرجہ ذیل اوصاف کو مدنظر رکھنا چاہیے۔ وہ فقیر وقلاش نہ ہو اور نہ بے جا غصہ کرنے والا، اور نہ مار پیٹ کا عادی ہو، اس کے مزاج میں طیش (چھچھورا پن) نہ ہو نہ وہ قوت مردی سے محروم ہو اور نہ کسی متعدی مرض میں مبتلا ہو۔ مثلاً وہ کوڑھی نہ ہو، اور نہ کوئی ایسی بیماری (مثلاً برص وغیرہ) اسے لاحق ہوگئی ہو۔ جو نا قابل علاج یا قابل نفرت ہو۔ نہ وہ مجنوں ودیوانہ ہو۔ اور نہ وہ اکتساب معاش اور طلب رزق سے جی چرا کر دوسروں پر بوجھ بن کر رہتا ہو۔

پھر یہ بھی ضروری ہے کہ تمام ممکن ذرائع سے متعاقدین (زوجین) میں الفت پیدا کی جائے اور اس الفت کو باقی اور پائدار رکھنے کی سعی کی جائے۔ (ان ذرائع میں سے ایک اتنا مہر دینا ہے جو مرد کے صدق رغبت پر دلالت کرے اور دوسری چیز ولیمہ (شادی کی تقریب پر ضیافت دینا ہے) ہاں اگر ان ذرائع سے زوجین کے درمیان الفت پیدا نہ ہو سکے

یا اس پر کوئی آفت ناگہانی پڑ کر اس کو باقی نہ رکھے تو ان ذرائع مذکورہ کے علاوہ دوسرے مناسب ذرائع اور تدبیریں اختیار کی جائیں۔

ولیمہ کے اندر کئی اہم نکتے پوشیدہ ہیں مثلاً

(۱) اس سے نکاح کا اعلان ہو جاتا ہے اور نہایت لطیف انداز سے عقد نکاح کی توثیق ہو جاتی ہے۔

(۲) ولیمہ دراصل عہد طفولیت کے اختتام اور رشد و کمال تک پہنچنے اور نظام منزل میں قدم رکھنے کی توفیق عطا کرنے پر (جو گویا مقصود زمانہ بلوغ ہے) منعم حقیقی کا شکر نعمت اور اعتراف احسان ہے۔

(۳) زنِ منکوحہ کی طرف خاوند کی رغبت کا اظہار بھی اسی ضیافت سے ہوتا ہے (اور دلہن کی عزت افزائی بھی اس سے ہوتی ہے)۔

(۴) نیز انسان قلبی مسرت کا اظہار بھی کرتا ہے اور خوشی کے موقع پر مال خرچ کرنے کی فطری خواہش بھی اس سے پوری ہوتی ہے۔

مرد اور عورت کے درمیان جو الفت پیدا ہوتی ہے اس کو باقی رکھنے کی ایک تدبیر یہ بھی ہے کہ عورت کی بدمزاجی کو حوصلہ کے ساتھ برداشت کیا جائے اور اشیائے خورد و نوش کے بارے میں عورت کے لیے فراخی کا سامان مہیا کیا جائے۔

دوسری طرف عورت کا یہ فرض ہے کہ حتی المقدور زیورات اور جواہرات سے آراستہ ہو کر رہے۔ اور ہمیشہ ظاہری نظافت و پاکیزگی اور جسمانی صفائی کا پورا پورا خیال رکھے اور اپنی نشست و برخاست اور آداب زندگی کے وہ طریقے معلوم کر کے انہیں اختیار کرتی رہے جو شوہر کو پسند ہوں۔ اور اس کی محبت قلبی میں روز افزوں اضافہ کی تاثیر رکھتے ہوں۔

تدبیر منزل کی خرابیوں کو دور کرنے کے طریقے

جب میاں بیوی کے ازدواجی تعلقات اور گھریلو زندگی میں خرابی اور ناچاقی پیدا ہو تو باہمی صلح صفائی کے لیے ایک ثالث شوہر کے خاندان سے اور ایک ثالث بیوی کے گھر والوں

سے مقرر کریں مگر ضروری ہے کہ ثالث ایسے ہوں کہ وہ ان دونوں کے حالات سے پوری طرح واقف ہوں اور ان کے درمیان موجود اختلاف کے اسباب و وجوہ بھی انہیں معلوم ہوں۔ نیز یہ کہ وہ میاں بیوی سے مخلصانہ ہمدردی رکھتے ہوں اور عادل و منصف مزاج ہوں۔ ان صفات سے متصف ثالثوں کو سیاہ وسفید کا اختیار دیدیں، کیونکہ جب دلوں میں بخل اور کنجوسی گھر کر جائے تو حق بات یہ ہے کہ جانبین کو نہ بہتر تدبیر نظر آتی ہے اور نہ وہ عدل و انصاف کے تقاضے پورے کر سکتے ہیں۔ ان ثالثوں کو سب سے پہلے ناچاقی کے بنیادی سبب یا اسباب معلوم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے کیونکہ بعض اوقات میاں بیوی کے درمیان ناچاقی کی اصل وجہ ان کی تنگدستی ہوتی ہے۔ بعض اوقات بیوی کی قلت شہوت اور بے رغبتی ہوتی ہے اور بعض اوقات کسی دوسرے انسان کے حسن پر فریفتگی ہوتی ہے۔ (یا اس قسم کے اور اسباب جن میں دینی، سیاسی اور فکری ناہمواریاں بھی ہوسکتی ہیں) اسباب معلوم ہونے کے بعد ثالثوں کو آسان ترین تدبیر اختیار کرنی چاہیے جس کے ذریعہ وہ میاں بیوی کے درمیان رشتہ اُلفت کو بحال کرسکیں۔ لیکن مصالحت کی تدبیر نہ ہوسکے اور وہ دونو ں مصالحتی کوشش کے کامیاب ہونے سے انکار کریں۔ اور سوائے تفریق وجدائی کے کوئی اور چارۂ کار نظر نہ آئے تو (بحکم الضرورات تبیح المحظورات) ان دونوں کو جھگڑوں کے دباؤ اور لاحق پریشانیوں سے نجات دیدی جائے اور (شرعی طریقہ کے مطابق) معاوضہ یا بغیر معاوضہ طلاق دلوادی جائے۔ ثالثوں کو چاہیے کہ وہ عدل وانصاف سے کام لیں اور کسی پر ظلم وجور نہ کریں۔

حکمت عدت

طلاق کے بعد عدت لازمی قرار دی گئی ہے۔ جس میں (ایک) یہ حکمت ہے کہ عقد نکاح کی شان کو برقرار رکھا جائے اور نکاح کو بچوں کا کھیل نہ سمجھا جائے کہ جب چاہا عقد کرلیا اور جب چاہا توڑ دیا، بلکہ اس کو ایک قابل احترام رشتہ تصور کیا جائے کہ جب عقد نکاح منظور ہو تو بذل مال اور جمع رجال کے بعد قائم کیا جائے اور جب یہ مستحکم ومقدس رشتہ ٹوٹے تو فوراً نہیں بلکہ کافی مدت کے بعد اور قیود وشروط کی رعایت کے ساتھ ٹوٹے (اس لیے

تو بیوی کو طلاق کے بعد کافی مدت تک دوسرے شوہر کرنے کی اجازت نہیں اور اس پر گھر سے باہر رہنے کی اجازت نہیں ملتی)۔

عدت میں دوسری حکمت یہ بھی ہے کہ یہ بھی معلوم ہو جائے کہ حمل موجود ہو تو وضع حمل تک انتظار کیا جائے تاکہ نسب میں کسی قسم کا اشتباہ پیدا نہ ہو۔

ضرورت قضائے قاضی

(اگر مصالحت کی سب کوششیں ناکام ہو جائیں اور میاں بیوی کے درمیان) جدائی کے سوا کوئی دوسری صورت کارگر نہیں ہو سکتی مگر شوہر لالچ اور طمع کی وجہ سے آسانی کے ساتھ اپنی بیوی کو طلاق دینے پر آمادہ نہیں ہوتا اور خواہ مخواہ اس کو تنگ کرنے کے لیے اپنے عقد نکاح میں رکھنا چاہتا ہے تو اس صورت میں قاضی یا حاکم وقت شوہر کا مقام لے کر ان دونوں کے درمیان جدائی کے احکام صادر کرے۔

حقوق وواجبات وہدایات وآداب برائے آقا وغلام

آقا اور غلام کے تعلقات کے لیے بہترین نظام عمل یہ ہے کہ غلام ایسا چن لیا جائے جو بالطبع عبد اور خدمت گزار ہو۔ نہ یہ کہ صرف ایک جبر کی بنا پر اسے غلام بنایا گیا ہو کیونکہ آزاد منش اور حریت پسند انسان کو پابند ضوابط وسیاست رکھنا عام طور پر دشوار رہتا ہے۔ صرف امیر الامرا یا شہنشاہ (جس کے پاس ہر قسم کی عسکری قوت اور وسائل ضبط موجود ہوں) ہی آزاد لوگوں سے معاونین کی حیثیت سے مناسب حال اور موافق طبیعت خدمت لے سکتا ہے۔ ذہین اور تعلیم یافتہ لوگوں کو حساب کتاب کے لیے منشی اور محاسب کی حیثیت سے اور جسمانی طور پر تندرست اور مضبوط لوگوں کو بوجھ اٹھانے پر مامور کیا جا سکتا ہے اور اسی پر دوسرے کاموں اور صلاحیتوں کو قیاس کیجئے۔

جو لوگ بالطبع خدمت گزاری کے پیشہ سے رغبت رکھتے ہیں اگر انھیں اپنے لیے آقاؤں میں سے کسی ایک آقا کا انتخاب کرنا پڑے تو چاہیے کہ وہ ایسے شخص کی خدمت اختیار کرے جو سخی اور فیاض ہو۔ بخیلی اور کنجوسی اس کی طبیعت میں نہ ہو۔ اور کھانے پینے کے سلسلے

میں دریادل واقع ہوا ہو، صاحب عقل ودانش، بامروّت اور عالی ہمت ہو کیونکہ خسیس آدمی کا نوکر بھی خسیس وحقیر رہتا ہے۔

ان دونوں کے درمیان تعلقات کی اساس احسان، ہمدردی اور شراکت پر ہونا چاہیے اس لیے آقا کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے خادموں کو اپنے ساتھ (دسترخوان پر لگے ہوئے) لذیذ کھانوں میں اور (شادی بیاہ اور عید وغیرہ کے موقعوں پر) خوبصورت وقیمتی کپڑوں میں شریک کرلیا کرے گو یہ شرکت ہر وقت اور ہمیشہ نہ ہو مگر خاص اوقات، ایام ومواقع پر تو ضرور ہو۔ اوران سے گفتگو خندہ پیشانی سے کرے اور اسی طرح زندگی کے باقی معاملات میں اسے بھائی سمجھ کر سلوک کرے۔

اس کے مقابلہ میں غلام اور نوکر کو چاہیے کہ وہ ظاہر وباطن میں اپنے آقا کا مطیع فرمان رہے۔ اوراس کی موجودگی ہو یا غیر حاضری ہر حالت میں وفادار وخیر خواہ رہے۔ اس کے مال میں خیانت نہ کرے، اور ہر حالت میں اپنے آقا کو خوش رکھنے کی کوشش کرے۔ جو لوگ آقا کے خیر خواہ اور دوست ہیں ان کو دوست سمجھے اوراس کے دشمنوں کو دشمن سمجھ کر زندگی بسر کرے۔ علیٰ ہذا القیاس دوسرے معاملات میں بھی آقا کی خیر خواہی کا خیال رکھا کرے پھر اگر آقا اپنے غلام میں رشد وذکاوت کی حس ترقی پذیر یا برسرعمل دیکھے تو سمجھ لے کہ یہ شخص بالطبع آزاد منش ہو گیا ہے تو اس کو مال کے بدلے یا بغیر مال کے جس طریقے میں اس کا اور غلام کا فائدہ ہو، آزاد کردے۔ کیونکہ انسانی شرافت کا یہی تقاضا ہے، نیز اس باب (عتق) کو بند رکھنے سے مصالح منزل میں خلل پڑنے اور فساد وبگاڑ عام ہونے کا ڈر ہے۔

اولاد کے حقوق وواجبات

نظام منزلی کے لیے یہ بھی لائق ہے کہ (والدین) اپنے بچوں کے لیے اچھے نام انتخاب کریں اور جانور ذبح کر کے عقیقہ کی سنت بجالائیں جس میں یہ نکتے ہیں:

۱۔ (نومولود) بچے کی صحیح نسبی کا اعلان اور خوشگوار طریقہ سے اس کا اقرار ہے۔

۲۔ زچہ بچہ کی خیریت پر خوشی ومسرت کے اظہار اور شکر نعمت کے اعتراف کا ذریعہ ہے۔

۳۔ (نومولود) بچے اور اس کی ماں سے پیار کا ظاہری ثبوت ہے۔

۴۔ بچے کا فدیہ ہے۔

بچوں کی مناسب نشوونما کے لیے تربیت اور پرورش کی مناسب تدبیر والدین کا فرض ہے۔ان کی جسمانی صحت کو درست رکھنے کے لیے مناسب کھیل اور تفریح کا انتظام ہونا چاہیے اور ان کو ایسے مواقع سے بچانا ضروری ہے جہاں مار پیٹ یا اعضا کے ٹوٹنے اور ان کے ضائع ہونے کا غالب گمان یا وہمی احتمال بھی موجود ہو۔

پھر جب وہ سنِ تمیز کو پہنچ جائیں اور تعبیر پر قادر ہو جائیں تو سب سے پہلے ان کو فصیح و بلیغ زبان کی تعلیم دی جائے تاکہ ان کی زبان لکنت اور رکاوٹوں سے صاف ہو جائے۔ انھیں پاکیزہ اخلاق کا خوگر بنایا جائے۔ اور ایسے آداب کی تعلیم دی جائے جو شرفا اور سرداروں کے لیے مناسب ہیں۔ ذلت و مہانت اور تکبر و تعلّی دونوں کی افراطی و تفریطی طرفوں سے بچائے رکھیں۔ کھانے پینے اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے اور بزرگوں کے سامنے گفتگو کے آداب و اخلاق سے ان کو آگاہ کریں۔

نصاب تعلیم میں اس بات کا خیال رکھا جائے کہ بچوں کو ان علوم و فنون کی تعلیم دی جائے جو ان کے لیے معاش و معاد اور دین و دنیا دونوں میں فائدہ پہنچائیں (صرف ذہنی عیاشی یا علم برائے علم کے نظریہ کے تحت نہیں کیونکہ علوم و فنون زندگی کو بہتر بنانے کے لیے ذرائع ہیں ان کے ذریعہ زندگی کی گراں قدر دولت کو فضول باتوں میں صرف کرنے کی قطعاً اجازت نہیں ہے)۔

جب بچے حدّ بلوغ تک پہنچ جائیں تو ان کے دو حق والدین کے ذمہ واجب ہو جاتے ہیں ایک یہ کہ انھیں حلال طریقے سے روزی کمانے کے مناسب پیشے یا ہنر سکھائیں (جو انھیں دوسروں کے سامنے دست سوال پھیلانے یا بھوک و افلاس سے دوچار ہونے سے بچائیں)۔ اور دوسرا حق یہ ہے کہ ان کی شادی کرائیں۔

اولاد پر فرض ہے کہ وہ والدین کی خدمت کریں اور ان کی تعظیم بجالانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کریں۔ انھیں کی صوابدید پر عمل کریں اور کبھی ان کے سامنے اُف تک نہ

کریں۔ حتی المقدور والدین کی نافرمانی سے بچنا چاہیے (کیونکہ ان کی نافرمانی کبیرہ گناہوں میں سے ہے)۔

سربراہ خاندان کے فرائض وحقوق

ہر نظام میں ایک ایسے سربراہ کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کو چلانے اور نافذ کرنے والا ہو نظام منزل کو (خوش اسلوبی سے) چلانے والا رب المنزل یعنی گھر کا مالک اور سربراہ ہی ہوتا ہے۔ سیاست منزلی میں سربراہ خاندان کو وہی طریقہ کار اختیار کرنا چاہیے جو ماہر وہوشیار چابک سوار، اپنے گھوڑے کو سدھانے کے لیے اختیار کرتا ہے۔ سب سے پہلا فرض سائیس کا یہ ہوتا ہے کہ اسے رفتار کی مختلف اقسام اور دوڑ کی مختلف انواع مثلاً سست رفتاری، تیز رفتاری، دلکی اور پو یہ اور سرپٹ دوڑ وغیرہ سے اچھی طرح واقفیت ہو اور اسے گھوڑے کی ناپسند اوصاف وعادات کا اچھی طرح علم ہو مثلاً چلتے چلتے اٹک جانا، پانی اور کیچڑ میں گھسنے کی بے ہمتی اور ہاتھی یا اس کے مشابہ دیگر حیوانات سے گھبرانا یا اس قسم کی دوسرے عیوب (اور وہ ان عیوب کو علاج کرنے کا ماہر ہو)۔

گھر کے سربراہ کو زجر وتوبیخ یا کوڑے اور چھڑی کے مفید اور شائستہ استعمال سے پوری واقفیت حاصل ہونی چاہیے۔ اور جب کبھی اس کے سامنے ایسی (ناشائستہ حرکات اور افعال کیے جائیں جو اس کی نظر میں پسندیدہ نہ ہوں یا وہ دیکھے کہ مقاصد منزلیہ اور نظام منزل کے مطلوبہ کاموں میں، جس کو وہ پورا دیکھنا چاہتا ہے کمی کی گئی ہے تو وہ ان طرق تادیب وسزا کے استعمال پر آمادہ ہو جائے اور سزا ایسے طریقے پر دے کہ سزا پانے والے کو اس کا احساس ہو کہ یہ اس کی ناشائستہ حرکت کی پاداش ہے، سزا دینے میں اس طرح کا ابہام نہ ہو کہ بچے کا ذہن مشوش ہو اور وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ اس پر یہ غصہ کیوں نکالا جا رہا ہے۔ بلکہ مناسب یہ ہے کہ خاندان کا سربراہ بچے سے جو کام کرانا چاہتا ہے اس کے بارے میں بچے کے ذہن میں واضح لائحہ عمل موجود ہو۔

بچوں کے دلوں میں یہ عقیدہ قائم ہو کہ اگر والد (یا سربراہ) کے حسب مرضی کام نہ کیا گیا تو نتیجہ کے طور پر ایک نہ ایک دن کسی نہ کسی صورت میں سزا ضرور ملے گی۔ جب ناپسندیدہ عمل سے احتراز اور مطلوب وپسندیدہ عمل کو کرنے کی اصلاحی صورت حاصل ہو

جائے (اور اس کا طرز عمل درست ہو جائے) تب بھی اس کی نگرانی سے غافل نہیں ہونا چاہیے بلکہ مسلسل اس کو ایسے اعمال کی مشق کرائی جاتی رہے تا آں کہ خُلق مطلوب اس کی طبیعت ثانیہ بن جائے اور یہ کیفیت ہو کہ اگر اس کے دل میں سزا کا خوف نہ بھی ہو، تو بھی وہ اس خُلق مذموم یا عادت قبیحہ کا ارتکاب نہ کرے جس سے اس کو منع کیا گیا ہے اور کسی مامور بہ امر کے ترک کرنے کی جرأت نہ کرے۔ الغرض صاحب خانہ کو اپنی بیوی اور اپنی اولاد اور نوکروں کے ساتھ اسی قسم کا حکیمانہ طرز عمل اختیار کرنا چاہیے کہ گھر کا انتظام صحیح اور درست طریقے پر چلے۔ (مردوں کی طرح) عورتوں میں بھی بعض عورتیں اطاعت پسند اور کنیز طبع ہوتی ہیں اور بعض کنیزائیں بالطبع حریت پسند اور آزاد منش ہوتی ہیں۔ چنانچہ ہر ایک کے ساتھ اس کی مخصوص طبیعت کے مطابق سلوک کرنا چاہیے۔ اور خلاف طبیعت جبر واکراہ سے احتراز کرنا چاہیے۔ (ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ کبھی کبھی ایک ایسی عورت کو بھی جو بالطبع کنیز ہو اس لیے کنیز یا نوکر نہ رکھا جائے کہ اس کا اس طرح رکھنا باعث عار ہو)۔

انسان مدنی الطبع اور فطرتاً اجتماع پسند ہے

انسان کا مدنی الطبع ہونا بھی اللہ تعالیٰ کی عنایتِ ازلیہ کا کرشمہ ہے۔ اجتماعی زندگی کے بغیر اور ابنائے نوع کے تعاون سے بے نیاز ہو کر وہ اپنی زندگی کی تدبیر، تعمیر اور تحسین نہیں کر سکتا۔ (وہ تادم مرگ اپنی ضروریاتِ زندگی کو پورا کرنے کے لیے دوسروں کا محتاج رہتا ہے۔ اور جسمانی ضروریات کے ساتھ ساتھ ذہنی اور روحانی ضروریات کا انحصار بھی دوسروں پر یعنی اساتذہ اور بزرگوں پر ہوتا ہے) معاشرتی زندگی ایسے آداب کے بغیر بسر ہو نہیں سکتی۔ جو افراد کے آپس میں باہمی محبت، تعاون وتناصر کا رشتہ پیدا بھی کریں اور پھر اس رشتہ کو برقرار اور اُستوار بھی رکھیں۔

اگر ان پر برے عوامل اثر انداز ہو کر ان میں فساد پیدا کریں تو ان عوامل کا استیصال کرنا چاہیے۔ اور ایک بار پھر نفرت ودشمنی کے بجائے باہمی الفت ومحبت کی طرف لوٹنے کی تدبیر کرنا چاہیے اس لیے کہ باہم میل جول کے مفید نتائج تب ہی ہاتھ آتے ہیں جب آپس

میں محبت اور الفت کا رشتہ قائم ہو۔

معاشرتی زندگی میں انسان کا جن لوگوں سے زیادہ قریبی تعلق رہتا ہے وہ اس کے ذوی الارحام (قریبی رشتہ دار) پڑوسی اور دیگر دوست آشنا اور متعلقین ہوتے ہیں مثلاً ہم درس، ہم پیشہ اور ایک ہی حلقہ خدمت وارادت کے ہم نشین وغیرہ وغیرہ۔ ان کو چاہیے کہ آپس میں ملاقات کا سلسلہ جاری رکھیں، مناسب موقعوں پر ایک دوسروں کو ہدیہ اور پیشکش دیا کریں۔ اور ایک دوسرے سے دوری کے وقت خط وکتابت کے ذریعہ حال واحوال معلوم کیا کریں۔ اور امور معاش میں ایک دوسرے کی حتی المقدور اعانت وامداد کریں۔ مصیبت کے وقت ہمدردی سے دریغ نہ کریں۔ گفتگو میں خوش طبعی اور شیریں زبانی کو ملحوظ رکھیں اور تکالیف وشدائد میں ایک دوسری کی غمگساری کریں۔ انہی باتوں سے الفت باہمی بڑھتی اور محبت زیادہ ہوتی ہے اور انہی پر عمران وتمدن کی بقا کا دارومدار ہے۔

آداب صحبت میں یہ بھی ضروری ہے کہ ایک دوسرے کو عندالملاقات سلام کیا جائے۔ اسی طرح ایک دوسرے کے کمروں یا گھروں میں داخل ہوتے وقت اجازت حاصل کرنا چاہیے۔ غیر محرم اور اجنبی عورتوں سے اپنی نظروں کو نیچا رکھنا چاہیے اور ان مخفی اور باریک نکتوں سے احتراز کرنا چاہیے جو (غیر مرئی طور پر) چیونٹی کی چال چل کر آہستہ آہستہ دلوں میں نفرت پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً گفتگو میں پیش دستی کرنے، آگے چلنے کی کوشش کرنے اور بات بات پر تنقید ونکتہ چینی کرنے اور خودنمائی کے لیے دوسروں کی تحقیر کرنے سے ساتھیوں کے دلوں میں نفرت پیدا ہوتی ہے۔

معاشرتی زندگی میں انسانوں کے حقوق کے مختلف درجے ہیں۔ سب سے مقدم والدین کا حق ہے۔ اس کے بعد بھائیوں اور قرابت داروں اور زوجین اور پڑوسیوں کے حقوق ہیں۔ اس کے بعد نوکروں چاکروں کے حقوق ہیں اور پھر عام مسلمانوں (اور انسانوں) کے حقوق ہیں۔

آٹھویں فصل

الحکمۃ الاکتسابیۃ (فن معاملات)

حکمت اکتسابیہ کا مفہوم

حکمت اکتسابیہ (فن معاملات) کا مفہوم یہ ہے کہ تحصیل معاش میں رفاہیت اور خوشحالی سے زندگی بسر کرنے کے ساتھ لطافت وزیبائش اور خوش اسلوبی کو ملحوظ رکھا جائے چنانچہ کوئی ایسا ذریعۂ معاش اختیار کیا جائے جس کے ذریعہ معاش کی جملہ ضروریات بوجہ احسن پوری ہوسکیں اور آدمی خوش وخرم اور فارغ البالی کی زندگی بسر کرسکے۔ اگر حکمتِ اکتسابیہ کے اصول مہیا نہ ہوں تو محنت اور تکلیف سے دن رات کاٹنے ہوں گے اور اتنی زیادہ ضرورتیں پیش آئیں گی کہ ان میں سے کوئی بھی خوش اسلوبی کے ساتھ پوری نہیں ہوگی۔

پیشوں کے اختلاف کے اسباب اور تمدن کی بنیاد

یہ حقیقت معلوم ہونی چاہیے کہ لوگوں کا مختلف پیشوں میں تقسیم ہونے کا سبب وحید ان پر ضروریات زندگی کا ہجوم ہے کیوں کہ ارتفاق ثانی یا تہذیب وتمدن کے درجہ ثانیہ میں رہنے والے کسی گھر کے افراد اپنے دوسرے ابنائے نوع کی اعانت وامداد کے بغیر زندگی کی سب ضرریات پوری نہیں کرسکتے مثلاً جب انھیں کھانے کی ضرورت محسوس ہوئی تو انھوں نے زراعت اور کھیتی باڑی کے مختلف طریقے ایجاد کیے اور اچھی اور بہتر زراعت اور کھیتی باڑی کے لیے چوپائے مہیا کرنے اور ان سے کام لینے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں جو ابتداً ان کو میسر ہی نہ تھا۔ اسی طرح اگر زراعت اور مویشیوں سے کام لینے میں بہترین طریقہ استعمال کرنا ہو تو اس ضمن میں آلات کشاورزی کی ضرورت پڑتی ہے جو نجاری (بڑھئی

کے پیشہ) اور آہنگری کے بغیر مہیا نہیں ہوتے۔

ان سب پیشوں میں مہارت حاصل کرنے کے لیے عمل پیہم اور ضروری علوم وفنون کے سیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے اور انسانی دماغ ان سب کو ایک ہی وقت میں جمع نہیں کر سکتا۔ اسی طرح کھانا روٹی اور سالن کا محتاج ہے اگر کسی گھر کا ایک فرد یا افراد تنہا روٹی اور سالن دونوں وافر اور اچھی مقدار میں حاصل کرنا چاہتے ہیں، تو یہ دشوار ہے جب تک وہ اپنی عمر کو اسی غرض کے لیے وقف کریں۔

علاوہ ازیں لباس بھی انسان کی ایک ضرورت ہے جس کے حصول کے لیے روئی وغیرہ کی کاشت پھر روئی کو صاف کر کے کاتنا اور بننا مقدم شرطیں ہیں۔ اور یہ کام کوئی ایک فرد خوش اسلوبی کے ساتھ انجام نہیں دے سکتا۔

اسی طرح انھیں پانی پینے کی اشد ضرورت ہے جس کے حاصل کرنے کے لیے کنویں اور نہریں کھودنا پڑتی ہیں، بعض اوقات اس کو مشک یا کسی اور برتن میں بھر کر دور سے لانا ہوتا ہے (لیکن تم جانتے ہو کہ مشک تیار کرنے اور برتن بنانے کے لیے موچی اور کمہار کی حاجت پڑتی ہے جو ہر ایک آدمی کا کام نہیں) اسی طرح انھیں مکان کی ضرورت ہوتی ہے ،(لیکن وہ مکان کی عمارت اور تعمیر کے لیے معمار کارکنوں اور مزدوروں کی ضرورت محسوس کرتے ہیں) مختصراً یہ کہ ایک فرد یا ایک گھر کے افراد کے لیے زیادہ سے زیادہ یہ تو ممکن ہوسکتا ہے کہ ارتفاق اول (غیر متمدن زندگی) کی ضروریات نہایت سادہ صورت میں پوری کر سکیں مگر ارتفاق ثانی (متمدن زندگی) کے قابل حسین وخوبصورت انداز ہ سے ان ضروریات کو پورا کرنا یقیناً ایک گھر کے افراد کے بس کی بات نہیں۔ اسی بنا پر انھوں نے حسب ضرورت ان کاموں کو مختلف پیشوں میں تقسیم کر لیا اور ہر شخص نے مستقل طور پر جداگانہ پیشہ اختیار کر لیا اور اس میں ذاتی لگن اور تکرار عمل کے ذریعہ کافی مہارت پیدا کر لی اور بحیثیت ماہر کے اس سب نکتوں اور باریکیوں سے واقفیت حاصل کر لی۔ اور اسی ایک پیشہ کو اپنی جملہ ضروریات حیات کو پورا کرنے کا ذریعہ بنایا۔ اسی طرح ہر شخص نے تمدن کے دوسرے درجہ کے مطابق خوشحال زندگی بسر کرنا شروع کیا، اور اجتماعی اور معاشرتی زندگی کی تنظیم ہونے لگی۔

مختلف پیشوں کا ظہور میں آنا

اور جب انسانی ضروریات کی کثرت ہوئی اور اکثر و بیشتر موقعوں پر لین دین کرنے والے دو شخص ایک دوسرے کی ضرورت پوری نہ کر سکے (مثلاً ایک کو ایک چیز مرغوب اور دوسری غیر مرغوب ہو مگر اسے اس وقت کوئی ایسا شخص نہیں ملتا جس سے لین دین کر سکے) چنانچہ اپنی اپنی ضروریات مہیا کرنے اور اپنی اپنی اغراض کی تکمیل کے لیے کسی جوہرِ معدنی کو ذریعہ تعامل ٹھہرانے پر مجبور ہو گئے۔ ضروری تھا کہ وہ جوہر معدنی ایسی چیز ہو جو بذاتِ خود انسان کے کام نہ آئے صرف معاوضہ کے طور پر مستعمل ہو۔ اس میں عرصۂ دراز تک باقی رہنے کی صلاحیت ہو (اس کا حجم چھوٹا اور ان کے اقسام میں باہمی یکسانیت و مماثلت بھی پائی جاتی ہو۔ جسم انسانی کے لیے بھی زیادہ نفع بخش ہو اور سبب آرائش و زینت ہو) ان صفات کو ملحوظ رکھ کر لوگوں نے حجرین (دو پتھروں یعنی سونے اور چاندی) کو نقدین قرار دے کر ان کو تعامل اور معاملات باہمی کا ذریعہ قرار دیا۔

چونکہ ارتفاق ثالث میں امامت (وخلافت) اور حکومت قائم ہوتی ہے اس لیے اہل صنعت وحرفت کے علاوہ ایسے مختلف اشخاص کی ضرورت پیدا ہوتی ہے، جو حکومت کو درست طریقہ پر چلانے میں مدد دیں اس سے کئی ایک نئے پیشے نکل آئے مثلاً سپہ گری، کلرکی، چوکیداری وغیرہ وغیرہ۔

اصول کسب اور اہم ذرائع معاش

انسان کے اصول کسب اور اہم ذرائع معاش یہ ہیں:

وہ مکاسب جن کا تعلق حکومت سے ہوتا ہے مثلاً جہاد اور فتوی وغیرہ اور وہ جن کا تعلق اکل وشرب، لباس و پوشاک، مکان و مسکن وغیرہ سے ہوتا ہے اور وہ جن کی مناسبت پیشہ تجارت سے ہے چنانچہ تاجر لوگ مختلف قسم کی اشیائے خورد ونوش، مصنوعات اور ضروریات زندگی ایک ملک سے دوسرے ملک میں لے جاتے اور لے آتے ہیں اور اس پر نفع کماتے ہیں۔ اور بعض وہ پیشے ہیں جن کا مقصد زیادہ تر قدرتی وسائل سے براہ راست

اپنی حاجتوں اور ضرورتوں کو پورا کرنا ہوتا ہے۔

برّ و بحر اور جبل و سہل سے ضروریات کی فراہمی کے مکاسب (مثلاً شکار کھیلنا، لکڑی جمع کرنا، شہد اکٹھا کرنا، چوپایوں کی جوپانی، دریا و سمندر میں ماہی گیری اور کشتی رانی وغیرہ پہاڑوں میں کان کنی اور جواہر سازی، زراعت اور باغبانی یا معماری، نجاری، پارچہ بافی وغیرہ) شامل ہیں۔

اختلاف مکاسب کے وجوہ و عوامل

مختلف لوگوں کا مختلف پیشوں کو اختیار کرنا دو عوامل کی بنیاد پر ہے:

(ا) طبعی قوی اور فطری استعداد کی مناسبت: چنانچہ شجاع و بہادر اور مجاہد و جنگجو آدمی، امام و حاکم کا (بہترین فوجی) معاون (اور غزوہ و جہاد کے لیے موزوں) ہوا کرتا ہے۔ اس کے برعکس اگر وہ طاقتور ہے لیکن جوہر شجاعت اور جذبہ جہاد سے محروم ہے، تو اس کے لیے بار برداری اور جسمانی محنت و مشقت کے کام زیادہ موزوں ہیں۔ اسی طرح جو شخص تجارت و بیوپاری کے باریک نکتوں سے واقف ہے وہ اچھا تاجر بن سکتا ہے وہ شخص جو شکار کرنے کی استعداد رکھتا ہے اور شکار کے ذریعے اپنی ضروریات پوری کر سکتا ہے اس کے لیے ماہی گیری وغیرہ جیسے پیشے کرنا سہل و مفید ہوتا۔

(ب) اتفاقات ماحول کی مناسبت: یعنی ماحول کچھ اس قسم کا مہیا ہوتا ہے کہ اس کو کوئی خاص پیشہ اختیار کرنا پڑتا ہے اور آلات و اوزار یا استاد و سرپرست اس قسم کے ملے ہیں جو اس کو کسی خاص پیشہ کے اختیار کرنے پر مجبور کرتے ہیں، (مثلاً جو لوگ ساحل سمندر پر رہتے ہیں ان کے لیے ماہی گیری اور دریائی شکار کرنا دوسرے کاموں کی نسبت زیادہ سہل ہوتا ہے)۔ اور یا وہ لوگ جن کے باپ دادا کا پیشہ مثلاً آہنگری ہے ان کے لیے اس پیشہ سے زیادہ مناسبت ہوتی ہے، علی ہذا القیاس ماحول کے زیر اثر پیدا شدہ دوسرے پیشے۔

پیشہ اختیار کرنے کے متعلق ہدایات

زندگی بسر کرنے کے لیے پیشے خواہ اچھے ہوں یا برے مجبوراً اختیار کرنے پڑتے ہیں

اور بقول عرب لکل ساقطة لا قطة (ہر ذلیل و پست کو اٹھانے والی بھی ہوتی ہے) مگر ایک شریف و با مروت آدمی کے لیے مناسب نہیں کہ تحصیل معاش کے لیے کوئی ایسا ذریعہ اختیار کرے جس میں اس کی تذلیل و تحقیر ہو۔

انسان کی دانش مندی یہ ہے کہ وہ اپنی ضروریاتِ زندگی کو دیکھے اور پھر ایسا پیشہ اختیار کرے جو اس کی سب ضروریات کو پورا کر سکے۔ (اور کچھ مستقبل کے لیے پس انداز بھی کر سکے) ہم نے بعض بھوکے لوگوں کو دیکھا ہے کہ وہ حصول معاش کے لیے کوئی ایسا ذریعہ اختیار کرتے ہیں جن سے ان کی ضروریاتِ جوع پوری نہیں ہو سکتیں اور گداگری پر اتر آ کر (دوسروں کے سامنے دست نگر ہو کر) ذلت و مشقت سے دوچار ہوتے ہیں۔

بعض مغلوب الغضب لوگ ایسے پیشے اختیار کرتے ہیں جن میں بعض ناگوار باتیں سنی سہنی پڑتی ہیں لیکن وہ اپنی طبیعت سے مجبور ہو کر لوگوں سے لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔

بعض شہوت پسند اور قوت باہ سے معمور لوگ صرف اتنا کمانے پر اکتفا کرتے ہیں جو ان کی ذات کے لیے کافی ہو سکے۔ وہ (صنفی خواہش کی تسکین کے لیے صحیح طریقے سے نکاح کرنے سے گریز کر کے) حرام کاری کا ارتکاب کرتے اور بے شرمی پر اتر آتے ہیں۔ اگر وہ اپنی ضرورت کے مطابق کمانے کی کوشش کرتے اور اس میں کامیاب ہوتے تو انھیں ذلت اٹھانی نہ پڑتی۔

لوگوں کی حالت بگڑنے کی بڑی وجہ سوچے سمجھے بغیر باپ دادا کی تقلید کرنا اور لکیر کے فقیر بنا رہنا ہے جن کی وجہ سے وہ (اپنے لیے سوچ سمجھ کر کوئی موزوں پیشہ اختیار نہیں کرتے بلکہ) اپنے رشتہ داروں کے اختیار کردہ پیشوں میں گتھم گتھا رہتے ہیں۔ حالانکہ وہ پیشے ان کے لیے کبھی موزوں نہیں ہوتے (یہ اور بات ہے کہ کبھی انسان کے لیے بعض پیشے حقارت آمیز ہوتے ہیں تو وہ کوئی ایسا پیشہ اختیار کر لیتا ہے جس کے ذریعہ عار سے چھٹکارا حاصل ہو) عقلمند آدمی سے یہ اصول مخفی نہیں کہ کمائی کے محدود ہونے سے رزق کی تنگی پیدا ہوتی ہے اور فراخیٔ رزق سے کمائی میں وسعت آ سکتی ہے۔ اگر خاص کسب میں آدمی کو کامیابی حاصل نہ ہو تو اس کو چھوڑ کر کسی دوسرے پیشے پر ہاتھ ڈالنا چاہیے اور ہر مردے

وہر کارے کے اصول کو ہمیشہ مدنظر رکھنا چاہیے۔

کمانے والے کے لیے دو مقامات ایسے ہیں جن میں ذوق لطافت اور رائے عمیق سے کام لینا چاہیے:

(۱) اس کو چاہیے کہ ایسے صنعت وحرفت یا پیشہ وہنر کو اختیار کرے جو (اس کی طبعی قوی اور ارتفاقات ماحول سے ہم آہنگ ہو کر) اس کی ضروریات زندگی کو پورا کرنے کا ضامن وکفیل ہو۔

(۲) اپنی کمائی اچھی طرح سوچ سمجھ کر میانہ روی کے ساتھ خرچ کرے (تا کہ ضروریات سے زائد وفاضل کمائی تحسینات اور تعمیر زندگی میں خرچ کی جاسکے)۔

جب کوئی شخص کسی میدانِ معاش میں داخل ہو جائے تو اس پر واجب ہے کہ وہ اس کے اصول وارکان اور آلات میں خوب غور وفکر سے کام لے۔ جب وہ ان سے پوری طرح واقف ہو کر ان میں مہارت حاصل کرے، تب اس کی باریکیوں اور مزید متعلقہ حاشیوں کی طرف متوجہ ہو، اسی طریقِ کار میں کامیابی وکامرانی کا راز مضمر ہے۔

نویں فصل

مبادلات وتبرعات

جب ہر شخص نے جداگانہ پیشہ اختیار کرلیا اور سب پیشے یکے بعد دیگرے انفرادی طور پر اختیار کر لیے گئے اور ظاہر ہے کہ کوئی پیشہ بذاتِ خود تمام ضروریات کا کفیل نہیں ہوتا تھا (کیونکہ ایک کے پاس ایک چیز اپنی ضروریات سے فاضل رہتی ہے اور دوسرا اس کا محتاج ہوتا ہے۔ دوسرے کے پاس کی زائد از ضرورت چیز کی، تیسرے کو ضرورت ہوتی ہے) لامحالہ ارتفاق کی تکمیل کے لیے اشیا باہمی کے تبادلے کی ضرورت پیش آئی۔ اور (زائد از ضرورت اشیا میں) تبرعات کا سلسلہ بھی جاری ہوتا کہ (خالق کی خوشنودی کے ساتھ ساتھ) بندوں (قرابت داروں اور دوستوں کے حقوق ادا کر کے ان) کو خوش کیا جا سکے (اور رشتہ محبت کو استوار کیا جا سکے) کیونکہ (سعادت دارین اور ترقی تہذیب وتمدن کے لیے) باہمی محبت ایک معاشرتی ضرورت اور ارتفاق کا ذریعہ ہے۔ یہی وہ حال ہے جس کے ذریعہ بنیادی ضروریات اور تحسینات زندگی کا حصول ہوتا ہے۔ بعض اوقات فیاضی، وفا شعاری یا شفقت کے طبعی تقاضے انسان کو اموال ومنافع کی بخشش وعطا پر ابھارتے ہیں۔

تبادلہ اشیا کے اہم جائز ذریعے

ان سب امور ضروریہ کے پیش نظر لوگوں کو مختلف معاملات اور لین دین کے طریقے الہامی طور پر سکھائے گئے۔ ان میں (تبادلۂ اشیا کا اہم ترین ذریعہ):

بیع: اور خرید وفروخت ہے جس میں مال کے بدلے مال لیا دیا جاتا ہے۔

اجارہ: ہے جس میں کسی چیز کا نفع مال کے بدلے دیا جاتا ہے۔

ہبہ: یعنی بخشش ہے۔اس میں بغیر عوض کے کوئی چیز دی جاتی ہے(بیع کا مدّ مقابل ہے)اس معاملہ کو دنیوی یا اُخروی ضروریات خفیفہ کی خاطر عمل میں لایا جاتا ہے۔

اعارہ: یعنی کوئی چیز عاریت دینا ہےاس میں بغیر عوض کے کسی چیز سے نفع اٹھانے کی اجازت دی جاتی ہے(اجارہ کا مدّ مقابل ہے) یہ بھی مذکورہ خفیف ضروریات دنیویہ واُخرویہ کے لیے کیا جاتا ہے۔

دَین: یعنی قرض دینا،اس مبادلہ میں بیع واعارہ دونوں کا مفہوم پایا جاتا ہے۔جب اس کے بدلے میں کوئی جنس لینا مقصود ہو جیسے سَلَم تو اس میں بیع کی کیفیت زیادہ مرجح ہوتی ہے اس کے برعکس نقدین (دراہم ودینار) کے قرض حسنہ میں اعارہ اور رعایت کا پہلو راجح ہوتا ہے۔(اوراس صورت میں آدمی کے پیش نظر کوئی نہ کوئی ثواب عاجل وآجل ہوتا ہے۔

تبادلہ اشیا کے لیے ضروری امور

چونکہ ہر ایک مبادلہ کی بنا کسی حاجت معین کے پورا کرنے یا نقدین (دنانیر ودراہم) کے حاصل کرنے پر ہے جن کے ضمن میں سب ضروریاتِ زندگی مجملاً آجاتے ہیں اور چونکہ یہ حاجات تب پوری ہوں گی کہ شے کی تعیین بھی ہو اور معاملہ کے درست ہونے میں فریقین کا غور وفکر بھی شامل ہو اور اس شے سے ضرورت بھی پوری ہو سکتی ہو۔اس لیے شریعت (یا باہمی اصطلاح) نے یہ بات لازم قرار دی ہے کہ بیع، (شئے برائے فروخت) قیمت، اُجرت، عمل اور نفع شئے کسی صورت میں غیر معین اور نا معلوم نہ ہو۔اسی طرح عقود میں دھوکے (اورغرر یا اٹکل اور قسمت) سے بھی احتراز کی تلقین کی گئی ہے کیونکہ اس صورت میں اس کا غالب گمان رہتا ہے کہ (کسی فریق کی) ضرورت پوری نہ ہو (اوریا کسی کو گھاٹے اور نقصان کا خطرہ ہو۔اور (شریعت محمدی کی رو سے) یہ واجب ہے کہ عقود میں ایجاب وقبول یا لین دین (برضا ورغبت) ہو۔تاکہ دونوں جانب سے مبادلے پر رضامندی کا اظہار ہو سکے اور یہ بھی ضروری قرار دیا گیا ہے کہ جب تک مجلس قائم ہے عقد بیع (وغیرہ) میں غور وفکر کی اجازت ہےاور عیب کی صورت میں عقد کو فسخ کر کے چیز واپس کی جاسکتی ہے

اور کبھی شرط خیار اور شرط تعیین کی اشد ضرورت محسوس ہوتی ہے۔اس لیے اس کی بھی اجازت دی گئی ہے۔اجارہ میں مدت کی تعیین اور سَلَم میں جنس اور معیار وغیرہ کی پوری توصیف اور علم ضروری ہیں اور یہ بھی ضروری ہے کہ عقد بیع کرنے والے دونوں عقل مند ہوں اور اچھے برے میں تمیز کر سکتے ہوں[1]

لالچ اور حرص بھی انسان کی سرشت میں داخل ہے اس لیے قرضوں کی ادائیگی کے سلسلے میں ٹال مٹول اور لیت ولعل سے کام لیا جاتا ہے اور ادائیگی حق سے انکار ہوتا ہے اس لیے الہامی طور پر یہ لازمی قرار دیا گیا کہ لین دَین کے عقود میں دستاویز لکھ دینا اور گواہوں کے سامنے عقد طے ہونا چاہیے یا رہن کے ذریعہ قرض کی واپسی کا اعتماد حاصل کیا جائے۔

حرام ذرائع ومبادلات

قمار: اور جُوا ایک حرام اور باطل معاملہ ہے کیونکہ جوا وہ مال ہے جو صرف عقد کے ذریعہ کسی عوض کے بغیر حاصل کیا جاتا ہے حالانکہ اس میں ہمدردی کے جذبے کے تحت دل کی مرضی

---

1. نوٹ: شاہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں اس کی ضروری تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھا ہے ''معلوم ہونا چاہیے کہ تبادلۂ اشیا کے لیے چند امور واجب وضروری ہیں (۱) عاقدین یعنی لین دین کرنے والوں کا ہونا ضروری ہے (۲) عوضین یعنی آمنے سامنے دو معاوضوں کا موجود ہونا ضروری ہے (۳) نیز عاقدین کے باہمی تبادلہ کی رضامندی کی ظاہری دلیل اور واضح علامت بھی ضروری ہے (۴) عقد لین دین کو عاقدین پر لازم کرنے والی چیز بھی جو منازعت ومخاصمت کا دروازہ بند کردے۔

عاقدین کے لیے ذیل کی چیزیں بھی شرط ہیں:

(الف) ہر دو عاقدین آزاد ہوں، عاقل وبالغ ہوں، نفع ونقصان کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہوں۔

(ب) عقد مبادلہ پورے فہم وبصیرت اور ثبات واستقامت کے ساتھ کر سکتے ہوں۔

تبادلہ عوضین کے لیے ذیل کی باتیں شرط ہیں:

(۱) ہر دو عوض مال کی قسم سے ہوں جس سے انتفاع حاصل کیا جا سکتا ہو (۲) تبادلہ کے لیے ہر دو عوض قابل رغبت ہوں اور لوگ اس قسم کے مال کی خواہش وآرزو رکھتے ہوں (۳) وہ اس قسم کا مال نہ ہو جو عام لوگوں کے لیے مباح ہوا کرتا ہے۔(۴) وہ اس قسم کا مال نہ ہو کہ جس کے اندر قابل اعتماد نفع اور فائدہ نہ پایا جائے۔مذکورہ بالا باتیں جس عقد میں نہ پائی جائیں گی وہ غیر مشروع اور عبث نہ ہوگا۔

شامل نہیں ہوتی۔صرف حرص اور غلط آرزو کے اندھے جذبے کے تحت دوسرے کو دھوکہ وفریب دے کر مال چھین لیا جاتا ہے۔

ربوا: اور سود بھی حرام ہے کیونکہ قرض دینے والا قرض مانگنے والے بھائی کے احتیاج ومجبوری سے فائدہ اٹھا کر بغیر کسی محنت وتکلیف کے مال بٹورتا ہے اور مقروض ناچاری کی بنا پر فاحش اور ناقابل برداشت شرح سود کو قبول کرنے پر آمادہ ہوتا ہے جس کی ادائیگی اس پر بارِ گراں کی طرح ناقابلِ برداشت اور دشوار ہو جاتی ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ لیکن دین کے عقود میں مباح اور جائز صورتیں صرف وہ ہیں جن میں مال کے بدلہ مال (بیع) یا نفع کے بدلہ میں مال یا باہمی رضامندی اور طیب خاطر سے خرچ وصرف (ہبہ، اعارہ) ہو، ان صورتوں کے علاوہ کسب مال کے سب طریقے ناجائز اور باطل ہیں۔

ان ناجائز صورتوں میں سے ایک رشوت کی لین دین ہے۔رشوت دراصل اس مال کا نام ہے جو دوسرے کے اموال پر قبضہ جمانے کے لیے خرچ کیا جائے۔

ہر عقد صحیح کرتے وقت بھی اس بات کا خیال رہے کہ معاملہ کی پوری وضاحت کی جائے تاکہ ٹال مٹول جھگڑے اور فساد تک نوبت نہ پہنچے اور معاً جس عقد میں عادتاً اس قسم کے جھگڑے پیدا ہوتے ہوں (وہ شرعاً ممنوع ہے اور) چاہیے کہ ارتفاق ثالث کی تمدنی زندگی میں (قانوناً) اس کے انعقاد کی ممانعت کی جائے۔

دسویں فصل

عقد مزارعت اور عقد مضاربت

چونکہ سب لوگ (جسمانی، عقلی اور روحانی استعدادوں میں) یکساں اور برابر نہیں ہوتے، کوئی غبی و کند ذہن ہے تو کوئی ذکی و تیز ذہن والا۔ کسی کے پاس مال و دولت ہے (مگر کام نہیں جانتا یا نہیں کرنا چاہتا) اور دوسرا تہی دست اور مفلس ہے۔ مگر کام کی قدرت وطاقت رکھتا ہے۔ کوئی معمولی اور چھوٹے چھوٹے کاموں میں ہاتھ ڈالنا پسند نہیں کرتا اور بعض ایسے بھی ہیں کہ جو کسی بھی خسیس کام سے منہ نہیں موڑتے۔ بعض لوگوں کی ضروریات زندگی بہت زیادہ ہوتی ہیں (اور کام سے فراغت نصیب نہیں ہوتی) اور بعض بالکل فارغ اور بیکار و بے روزگار رہتے ہیں۔ اس لیے معاشی زندگی میں ناہمواری پیدا ہوتی اور اکتساب معاش میں بھی باہمی تعاون اور امداد کی ضرورت پیش آتی ہے اور مخصوص عقود وجود میں آتے ہیں مثلاً مزارعت مضاربت، شراکت اور وکالت کی بنیاد اسی پر پڑی ہے۔

مزارعت یہ ہے کہ ایک شخص کے پاس زمین ہوتی ہے لیکن یا تو اس کو زراعت کے لیے فرصت نہیں ہوتی یا وہ کھیتی باڑی کے اعمال شاقہ کے انجام دینے کے قابل ہی نہیں ہوتا اور ضروری سامان زراعت مثلاً بیل، ہل وغیرہ یا تخم پاشی وغیرہ تمام وسائل یا بعض وسائل کا مالک نہیں ہوتا، اس لیے وہ دوسرے کو پیداوار میں شریک کر کے زمین اس کے حوالے کر دیتا ہے۔ اس کو مزارعت کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ مال و دولت یا نقد سرمایہ کو مضاربت سے وہی نسبت ہے جو زمین کو مزارعت سے ہے، یعنی ایک شخص کے پاس مال ہے مگر وہ تجارت کے لیے فارغ نہیں ہے اور نہ اس میں دُور دراز کی مسافتیں طے کرنے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ مال لے جانے، لے آنے کی طاقت ہے۔ اور اس قسم کے اعمال تجاریہ سے اسے کوئی

قلبی شغف نہیں ہے تو وہ اپنا مال دوسرے کو دے کر اسے نفع میں شریک کر لیتا ہے۔ بعض اوقات کسی کو مذکورہ دونوں صورتیں میسر نہیں ہوتیں۔ تو اسے وکالت (کسی کو اپنا کردار بنانے) اور کفالت (کسی کو کسی کی طرف سے ذمہ داری لینے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ کبھی دو آدمی کسی معاملہ میں اشتراک کرتے ہیں، یا اس لیے کہ وراثتاً ان کو یہ ملکیت حاصل ہوئی ہوتی ہے۔ اور بلا ارادہ شراکت کی صورت پیدا ہو جاتی ہے اور کبھی اشتراک عاقدین کے قصد و ارادہ کے نتیجہ میں ظاہر ہوتا ہے۔

گیارہویں فصل

ارتفاق ثالث کی تحقیق اور اس کی اقسام کی تفصیل

تمدن کی ضرورت:

ظاہر ہے کہ جب لوگ آپس میں یہ معاملے برتیں گے اور ہر شخص کسب معاش کے لیے کسی پیشہ اور ہنر کو جداگانہ طور پر اختیار کرے گا، اور وہ ضروریات زندگی کی فراہمی (اور خوشحال اجتماعی زندگی بسر کرنے) کے لیے باہمی امداد وتعاون کریں گے اور اس کے نتیجہ میں مبادلات اور امداد باہمی کے مختلف طریقے ایجاد ہوں گے، تو ضرور مختلف طبقات مثلاً کاشت کاروں، تاجروں، بافندوں اور دیگر اہل صنعت وحرفت کے درمیان تعلقات پیدا ہوں گے۔

ان جماعتوں کے درمیان باہمی ربط اور تعلق کا نام ہی مدنیہ (شہر) ہے۔ مدنیہ یا شہر، فصیل، بازار اور قلعے کا نام نہیں۔ بلکہ یہ تو تعامل وتعاون پر مبنی روابط کا نام ہے۔ اس لیے اگر قریب قریب آباد ہونے والی چھوٹی چھوٹی بستیاں ہوں اور ان میں کچھ اجتماعی گروہ ایسے ہوں جن کے آپس میں معاملات جاری ہوں تو ہم اس کا نام بھی شہر (مدنیہ) رکھیں گے۔ اس باہمی ربط کی وجہ سے شہر شخص واحد کے مشابہہ ہوتا ہے، اور اس کے اندر کا ایک گھرانہ جسم کے ایک عضو کے مانند ہوتا ہے۔

تمدنی وحدت کو درست رکھنے کے لیے امام المسلمین کی ضرورت ہے

(اس اصطلاحی) شہر میں لازمی طور پر ایک وحدت پائی جاتی ہے جس کو مطلوبہ (درست) حالت میں قائم رکھنا اور اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانا ضروری ہے۔ اب جس

تدبیر سے یہ مقصد حاصل ہو (خواہ منتخب افراد کی جماعت اس کا اہتمام کرے یا ایک ہی قابل ہستی کو یہ مہم تفویض کی جائے۔ بہر حال اس قوت قاہرہ کو جس کے تصرف میں مدنیت کا نظم ونسق ہے) اور اس کے ذریعہ اس کے قیام وبقا کا انتظام ہو سکے حقیقت میں وہی امام کہلائے گا۔ ہمارے نزدیک امام سے مراد صرف فرد واحد نہیں، ہاں اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اگر کوئی شخص واحد اس امر کو اپنے ہاتھ میں لے لے اور پوری استعداد وقوت اور حسن تدبیر اور غیر معمولی قابلیت کی بدولت تمدنی زندگی کو احسن طریقہ پر چلائے تو بلاشبہ انتظام میں پوری صلاحیت پیدا ہوگی اور ایسا شخص واضح طور پر امام کہلانے کا مستحق ہوگا۔

امام المسلمین کے فرائض

امام حق کو چاہیے کہ نظام تمدن پر غائر نظر ڈال کر دیکھے کہ اس وحدت کو بقائے حیات اور استحکام ذات کے لیے کن کن چیزوں کی ضرورت ہے اور کون کون سے امور ہیں جو اس کے اندر عدم استحکام اور فساد پیدا کرتے ہیں اور وہ نافع تدبیریں کونسی ہیں جو ہر ضرورت کو پورا اور ہر مفسدہ کا مناسب حال انسداد کر سکتی ہیں۔ تمدنِ صالح کے ان لوازم اور تدابیر نافعہ کو ہم ذیل میں کچھ تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

(پہلی ضرورت) محکمۂ قضا وعدلیہ

تمدنی زندگی میں لوگوں کے درمیان مختلف قسم کے معاملات اور لین دین کے عقود ہوتے رہتے ہیں اور اکثر طبائع میں حرص ولالچ، حسد وتغلب اور ٹال مٹول یا انکار کی طبعی صفات ہوتی ہیں جو عقود ومعاملات پر بری طرح اثر انداز ہوتی ہیں۔ اس صورت میں اجتماعی زندگی میں اختلافات اور تنازعات کا ظہور ناگزیر ہو جاتا ہے اور اگر بروقت ان کا تدارک نہ کیا جائے، تو باہمی جنگ وجدال اور قتل وقتال کا سلسلہ گرم ہو جائے گا۔ اور تمام نظام درہم برہم ہو جائے گا۔

جو قوم یا جماعت جس قدر بخل وحسد سے مغلوب ہو اسی قدر اور اسی انداز سے اسے

امام کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ بہرحال ایک ایسا ضابطہ یا قانون (شفوی یا تحریری) ہونا چاہیے جو جمہور اور اکثریت کے لیے قابل قبول ہوتا کہ باہمی جھگڑوں اور مقدمات کو اسی کے مطابق فیصلہ کرا سکیں۔

جب غضب، بخل اور حسد کا ہیجان اور غلبہ ہوتا ہے تو بخیل اور تند و تیز آدمی عدل و انصاف کے قانون پر نہیں چلتا یا اس وقت ایسے لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے جو مجتمع ہو کر اس تند و تیز شخص پر قابو پالیں اور اسے ان کی بات ماننے کے سوا اور کوئی چارہ نہ ہو۔ یا کسی ایک ایسے شخص کی ضرورت ہوتی ہے جس کی بات مانی جاتی ہو اور اس کے حکم سے کوئی روگردانی نہ کر سکے۔ اس نافع تدبیر کو محکمہ قضا یا عدلیہ کہا جاتا ہے۔

دوسری حاجت، شہریاریہ (شہری انتظامیہ یا پولیس)

نوع انسانی کے عام افراد اخلاقِ فاضلہ اور اعمال صالحہ کے زیور سے آراستہ نہیں ہوتے، اور حیوانی خواہشات، ردّی اخلاق اور تخریبی اعمال کی شکل اختیار کر کے ان پر غالب ہوتی ہیں۔ اس لیے عموماً ان سے ناشائستہ حرکات سرزد ہوتے ہیں جن کا شہریت و مدنیت کے نظام صالح پر بُرا اثر پڑتا ہے اور اس میں مختلف قسم کی معاشرتی اور اخلاقی فساد اور بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ ایسے لوگوں کی اصلاح ضروری ہوتی ہے اور وہ زجر و توبیخ کے محتاج ہوتے ہیں اور ان کی اصلاح کے لیے عدل و انصاف پر مبنی قانونِ سزا کی ضرورت ہوتی ہے۔ چونکہ ہر شخص ہر آدمی کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کرتا، اور نہ ہر شخص کے حق میں معمولی زجر و توبیخ مفید و کارگر ثابت ہوتی ہے اس لیے بعض اوقات قوت کا استعمال ضروری ہو جاتا ہے، خواہ اس کی تنفیذ کوئی جماعت کرے جو مفسد کو قابو کرے۔ یا شخصِ واحد جس کا لوگوں پر اس قدر تسلّط اور دبدبہ ہو کہ اس کے حکم سے انحراف کرنا ان کے لیے تقریباً ناممکن ہو اس کا نام ہمارے نزدیک شہریاریت (یا پولیس اور شہری انتظامیہ) ہے۔

تیسری حاجت، جہاد (قوتِ مسلّحہ)

انسانی معاشرہ میں جہاں بھی لوگوں کی اجتماعی زندگی بسر ہو رہی ہو وہاں لوگ عموماً

کینہ پروری، حسد اور حرص ولالچ جیسے غیر پسندیدہ اخلاق وصفات سے خالی نہیں ہوں گے اور اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنی ناجائز خواہشات اور غیر انسانی منصوبوں کو دھڑلے سے پورا کرنے کے لیے جمگھٹا بنانے اور قتل وغارت برپا کرنے کی جرأت بھی کرتے ہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کے اموال زبردستی چھینے جاتے ہیں اور کشت وخون کا بازار گرم ہوجاتا ہے۔اور مدنی نظام صالح میں فساد پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔اکثر اوقات ان مفسدوں کے پیش نظر حصولِ مال وجاہ اور اراضی وجائداد یا بعض دیگر دنیوی اغراض ہوتی ہیں۔لیکن بعض اوقات دین ومذہب کی آڑ میں اور ظلم وجور کے انسداد کے نام پر فساد انگیز باتوں کا ارتکاب کرتے ہیں ان لوگوں کی مفسدانہ قوت کو توڑنے ان کی سرکشی کو ختم کرنے اور شہری زندگی کو ان کے شر وفساد سے محفوظ رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ امام کے پاس بہادروں کی ایک طاقتور فوج ہو جو اُن کا مقابلہ کرسکے۔فوج یا تو کسی ایسے قانون اور قاعدے کے مطابق تیار کی جائے جس پر انسانی معاشرہ اطمینان کا اظہار کرچکا ہو (اور اس کی قیادت کسی ایسی جماعت کے ہاتھوں میں ہو جس کو جمہور نے ان کی استعداد قابلیت سے مطمئن ہوکر نظام مدنیت کو قائم رکھنے کا اہتمام سپرد کیا ہو) اور یا اُن میں سے کوئی شخص ایسا ہو جس کے سامنے ہر شخص سر تسلیم خم کرے۔اور وہ حکمت ودانائی اور صولت وجواں مردی کے ساتھ جنگ کی قیادت کرتا رہے۔اس تدبیر نافع کو شریعت کی زبان میں جہاد کہتے ہیں۔

چوتھی حاجت، تولیت ونقابت شہر (کوتوالی)

شہر کا اصطلاحی مفہوم تو وہ ہے جس کا ذکر ہم کرچکے یعنی معاشرہ کا ایک خاص نظام زندگی، تاہم عملاً اس نظام کے لیے چند (مخصوص) شکلیں اور صورتیں ایسی ہوا کرتی ہیں کہ اگر وہ نظام اُن صورتوں میں قائم رہے تو یقیناً بہترین اور اکمل ترین ہوتا ہے اور اگر اس نظام کی وہ شکلیں مفقود ہوں تو نظام شہریت میں نقصان وکمی رونما ہوگی۔اس میں کوئی شک نہیں کہ سب لوگ حقیقت میں یہی چاہتے ہیں کہ اُن صورتوں کو قائم رکھا جائے اور درحقیقت ان صورتوں کا قیام معاشرہ کے افراد ہی کے ذریعہ وجود میں آتا ہے۔تاہم ان میں سے کوئی

ایک فرد ایسا ضرور ہونا چاہیے جس کو وہ ان صورتوں کے قیام کا معاملہ سپرد کردیں۔ اور وہ اپنی صحیح حکمت عملی اور دور رس عقل ورائے کے ساتھ ان امور کو سرانجام دے۔ کیونکہ ہر فردِ معاشرہ کے بس سے باہر ہے کہ وہ ان صورتوں کو قائم رکھ سکے یا کم ازکم ہر ایک کے لیے یہ آسان نہیں کہ نظام کے مشترک منافع کی خاطر جو شکل اختیار کرنا ہو اس کی تمام اخراجات اپنی طرف سے ادا کرسکے (یہ اس فرد واحد کا کام ہوگا جس کو معاشرے نے یہ کام سپرد کیا ہوگا کہ) ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے جمعیت بہم پہنچانے کی ضرورت ہو) تو جمعیت بہم پہنچانے، عدل وانصاف قائم کرنے کے لیے معاشرہ اسے اختیارات سپرد کرے اور اس سلسلہ میں اس کے مطیع فرمان رہے۔

شہری نظام کے ان صورو اشکال میں سے کچھ یہ ہیں: (۱) سرحدات پر چوکیاں قائم کرنا اور سرحدات کو محفوظ رکھنا۔ (۲) فوج کے لیے مضبوط قلعوں کی تعمیر۔ (۳) شہروں کے اردگرد فصیلوں کا کھڑا کرنا۔ (۴) تجارت کو فروغ دینے اور ضروریات زندگی کو مہیا کرنے کے لیے بازاروں اور تجارتی منڈیوں کا قیام۔ (۵) (زراعت اور کھیتی باڑی اور آمد ورفت کے لیے) نہریں کھودنے اور دریاؤں پر بند اور پل باندھنے کا انتظام۔ (۶) (بیواؤں کے حقوق اور) یتیموں کی خانہ آبادی اور اُن کے اموال اور جائدادوں کی دوسروں کے دست تعدی سے حفاظت۔ (۷) (بیت المال میں جمع شدہ مال و) صدقات کی مدّ سے حاجت مندوں کی اعانت، وارثوں کے درمیان (شرعی قانونِ وراثت کے مطابق) مال متروکہ تقسیم کرنا۔ (۸) پوری قوم کی پسندیدہ اسباب ترقی، اور دیگر اجتماعی امور خیر سے خبردار رہنا۔ (۹) مالیہ (اور دیگر ٹیکس) وصول کرنے اور ان کو ٹھیک طور سے خرچ کرنے کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا وغیرہ وغیرہ۔

یہ ضرورت اصطلاحاً تولی اور نقابت کہلاتی ہے اور جس صاحب اختیار حاکم کو اس کا انتظام سپرد ہوتا ہے وہ متولی اور نقیب کہلاتا ہے۔ (ہماری موجودہ اصطلاح میں وزیر داخلہ بہ شمول وزیر عدلیہ و وزیر رفاہ عامہ ان امور کا نگراں ہوتا ہے)۔

پانچویں حاجت۔ وعظ وارشاد (اُمور مذہبیہ کی نگرانی)

اگر چہ دین حق یعنی اسلام کی حقانیت کے دلائل وشواہد اس قدر واضح ہیں کہ عقل سلیم رکھنے والے اس کی حقانیت اور خوبیوں کے معترف ہیں۔ پھر بھی مبلّغوں کی ضرورت ہے جو عام لوگوں تک خدائے برتر واعلیٰ کے احکامات اور پیغامات پہنچائیں، کیونکہ اکثر فاسد مزاج لوگ حبّ دنیا اور اتباع شہواتِ نفسانیہ کے باعث دین حق کی پاکیزہ تعلیمات کی مخالفت کرتے ہیں۔ اس لیے انھیں حکمت ودانائی کے خدائی قوانین اور دین اسلام کے احکام وفرامین، (اور ان کے اندر مخفی اسرار ورموز اور باریک معانی ومطالب) کو سمجھنے کے لیے (امین ودیانتدار) مبلّغ ومعلّم کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ ایک ایسے واعظ ومرشد کے محتاج ہوتے ہیں جو ان کو مکارم اخلاق کی تعلیم دے۔ اعمال صالحہ کی خوبیاں ان کے ذہن نشین کردے اور حیات منزلی کے حقوق وواجبات اور باہمی لین دین اور دیگر شعبہ ہائے زندگی میں ان آداب مطلوبہ سے انہیں آگاہ کرے جن کا ذکر ہم کر چکے۔ مرشد کا پیرایۂ بیان نہایت مؤثر اور طریقۂ خطابت نہایت دل نشین ہو۔ اور ترغیب وترہیب کی دونوں صورتوں میں بہترین تذکیر اور اُصول تذکیر پیش نظر رکھے۔ اس محکمہ کو وعظ وارشاد (یا مذہبی امور کا شعبہ) کہا جاتا ہے۔

امام کی ضرورت، شرائط اور امتیازی صفات

یہ ایک حقیقت ہے کہ مدنیت کا کامل نظام بہت سے افراد یا مجموعہ ہائے افراد سے وجود میں آتا ہے۔ لیکن جب اجتماع کی کثرت ہو تو اختلاف طبائع، تباین اغراض اور تشتت آرا کی وجہ سے اس نظام کا صالح طور پر قائم رکھنا مشکل ہوتا ہے، اس لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسے مرد کو منتخب کریں جو اپنی قابلیت اور حسن تدبر وتدبیر سے ان سب امور کو بہ یک وقت انجام دیا کرے۔ ایسا ہی شخص حقیقت میں امام (المسلمین) کہلاتا ہے۔ مگر یہ ہوتا کم ہے کہ ایک ہی آدمی سب اُمورِ مملکت کو بخوبی سرانجام دے۔ وسیع پیمانہ پر مہذب ومتمدن لوگوں میں عموماً نظام حکومت مختلف شعبوں میں تقسیم ہوتا ہے۔ اور ہر شعبہ کا علیحدہ

علیحدہ سربراہ ہوتا ہے یا کسی کے پاس دو یا تین کام ہوتے ہیں اور باقی اُمور دوسروں کے پاس ہوتے ہیں (اور سب شعبے ایک ہی منتظم یا ناظم اعلیٰ کی نگرانی میں کام کرتے ہیں) بلکہ ناقص تمدن میں بھی ہر ضرورت کے مطابق کوئی نہ کوئی اپنا قاعدہ وقانون ہوتا ہے یا ہر ایک پیشہ والوں کی جماعت کا ایک سردار ہوتا ہے جس کے حکم اور رائے کے سب افرادِ صنعت پابند ہوتے ہیں۔ بعض اوقات قوم کے سربرآوردہ اور عقل مند لوگوں کی جماعت (پنچوں کی جماعت) ان کے نظام زندگی کو پُر امن طور پر چلاتی ہے۔ بعض اوقات کوئی ایسی جلیل القدر ہستی ان کے اجتماعی نظام کو قائم رکھتی ہے۔ جس کو تائیدِ غیبی حاصل ہوتی ہے اور جس کی حقانیت وصداقت کو تسلیم کر کے اس کی مخالفت اور اس کے مشورہ سے غفلت کے نقصانات کو وہ آزما چکے ہوں اور یہ دیکھ چکے ہوں کہ اس سے اعراض وانحراف میں قتل وفساد یا غیبی نقصان سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

جب کسی کو امام منتخب کرنا ہو تو چند خاص شرائط کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ کیونکہ جب تک وہ شرطیں اس میں پوری نہ ہوں اس کے انتخاب وتقرر سے مطلوبہ تدابیرِ نافعہ اور نظام مدنیت قائم ہی نہیں ہو سکتا۔ (مثلاً وہ ہر لحاظ سے جسمانی اور ذہنی استعدادات کا مالک ہو، اس کی علمی، عملی، سیاسی اور اخلاقی حالت دوسروں کے لیے قابل تقلید ہو۔ وہ فنونِ حرب وضرب اور اُصول جنگ وصلح سے پوری طرح واقف ہو وہ عدل وانصاف قائم رکھنے اور مختلف شعبوں کے لوگوں کو کنٹرول میں رکھنے کی صلاحیت رکھتا ہو) فرائض منصبی کو کما حقہ پورا کرنے کے لیے اسے معاونوں اور مددگاروں کی بھی ضرورت ہوگی، ان اعوان وانصار اور لشکر ورعایا کو خوشگوار ربط میں رکھنے کے لیے انصاف پر مبنی قوانین ہونے چاہئیں اور جملہ مددگاروں اور فوجیوں کو ضروریات زندگی فراہم کرنے کے لیے اس کے پاس مالیہ اور ٹیکس وصول کرنے کے ساتھ شاہی خزانے یا بیت المال کا انتظام ہو۔ اور چونکہ مسلح افواج اور سرکاری ملازمین ہر وقت سربکف ہو کر قوم وملک کی خدمت کرتے ہیں اس لیے یہ ضروری ہے کہ اُن کی ضروریات زندگی کا بوجھ عوام پر پڑے (اور بالخصوص ان لوگوں پر پڑے جن کے پاس دولت اور ذرائع

دولت ہیں۔ اور ضروریات زندگی سے فاضل وزائد سرمایہ ان کے پاس بیکار پڑا ہے)۔

تمدن کے اقسام و مراتب

جب کوئی تمدنی وحدت اس قدر انسانی افراد پر مشتمل ہو کہ قوم پر مصائب ونوائب کے ہجوم کے وقت کم از کم چار ہزار جنگجو اور لڑائی کے قابل) افراد کی جمعیت فراہم کر سکے اور اس کے علاوہ معاشرہ میں کسان، بننے والے دوسرے پیشہ ور لوگ بھی ہوں تو اُس کامل تمدن اور اس معاشرے کے سربراہ متصرف اور منتظم اعلیٰ کو امام حقیقی سمجھا جائے گا۔ لیکن اگر اس تعداد نفوس اور استعداد مدافعت سے کم تمدنی یونٹ ہے، تو اسے ناقص تمدن سمجھا جائے گا۔

تمدن تام کے مختلف مراتب ہیں جو قد وقامت اور جسامت وصلاحیت میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں جس امام کے پاس بارہ ہزار باقاعدہ فوج ہو جو ہر وقت جہاد کے لیے تیار ہو، اور ملک کی اس قدر آمدنی ہو کہ اس کے مالیہ سے ان کے اخراجات مکمل پورے ہوسکیں (اور دوسری حکومتوں کے ساتھ ان کے تعلقات مساویانہ ہو) تو حکمت ودانائی کا تقاضا ہے کہ اس کو خلفا میں سے شمار کیا جائے۔

اسی طرح خلفا بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں اگر کسی خلیفہ کے پاس ایک لاکھ کی پوری طرح مستعد و مسلح فوج ہے اور وہ ایک وسیع وعریض خطہ زمین کا مالک ہے جس سے وافر مقدار میں مال ودولت اور پیداوار وغیرہ حاصل ہوتی ہے، جو ملک وقوم اعوان وانصار اور فوج وسپاہ کے اخراجات مکمل برداشت کر سکتی ہے۔ تو ایسے خلیفہ کو خلیفہ اعظم کے نام سے موسوم کرنا مناسب ہے، اس کے اوپر کوئی دوسرا خلیفہ یا حکمراں نہیں ہوسکتا۔ ہاں اگر خلافت کو ان معنوں میں لیا جائے کہ اصطلاحی طور پر کسی بڑے خلیفہ کو برائے نام سب کا مطاع سمجھا جائے لیکن حقیقی معنی میں وہ خلیفہ نہ ہو یعنی تمام خلافتوں میں جن کو اس سے وابستہ سمجھا جاتا ہے اس کے احکام کی کما حقہ، تنفیذ نہ ہوتی ہو ایسی حالت میں اس بڑے خلیفہ کو خلیفۂ اعظم کہنا ہماری اصطلاح کے مطابق درست نہ ہوگا۔ ہاں اسے خلیفۃ الخلفا کہا جائے گا۔

بارھویں فصل

امام کے اخلاق سبعہ

امام یا خلیفہ کو اخلاق[1] سبعہ جس کا ذکر ہم (اس مقالے کی دوسری فصل کے آخر میں) کر چکے ہیں، کا جامع ہونا چاہیے بصورت دیگر اس کا وجود نظام مدنیت پر بوجھ ہوگا۔ اور تمدنی نظام کا سنبھالنا اس کے لیے ایک ناقابل برداشت بوجھ ہوگا اور اس طرح دونوں کی حالت خراب و دگرگوں رہے گی۔

مثلاً اگر اس میں خلق شجاعت نہیں ہے تو وہ ہمیشہ دشمنوں اور مزاحمت کرنے والوں سے دبتا رہے گا، اور اپنی رعیت کی نظروں میں بھی ذلیل ہوگا اور (ہر کس و ناکس حتی کہ بزدل (سے بزدل) بھی اس پر پھبتیاں کسے گا۔ اور اگر اس میں جوہر سماحت و فیاضی نہیں تو اس کی تنگدلی اور بخل کی وجہ سے وہ ان کو ایسی مصیبت میں ڈال دے گا جس کی تلافی اور علاج مشکل ہوگا۔ اگر وہ صفت حکمت و تدبر سے متصف نہیں تو تمدن کے صلاح و ترقی کی مفید تدبیریں اور اچھے اجتماعی اداروں کی تشکیل نہیں کر سکے گا۔

اس طرح یہ بھی ضروری ہے کہ وہ جاہ و حشمت کا مالک اور شان و شوکت والا ہو۔ اور یہ کہ لوگ اس کے اور اس کے آباواجداد کے فضائل و مآثر دیکھ چکے ہوں ورنہ لوگوں کے دلوں پر اس کی عظمت و رعب کا سکہ نہیں بیٹھے گا، یہی درحقیقت سیادت و قیادت کا اصل ہے کہ لوگ یا تو اس شخص کے اندر اخلاق فاضلہ: خیر خواہی اور کفایت کلی (ہر کام کر سکنے کی صلاحیت) دیکھ کر اس کی امامت پر یقین کامل اور ایمان جازم رکھتے ہیں۔ اور یا ان صفات محمودہ کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھ لیتے ہیں کہ اس شخص کو تائید غیبی حاصل ہے جس کا اقتضا یہی

---

[1] حکمت، عفت، سماحت، شجاعت، فصاحت، دیانت سمت صالح

ہے کہ اس کی شخصیت (اور اس کی امامت) کو تسلیم کر لیا جائے۔

امامت کے آداب

ہر امامت خواہ وہ ناقص ہو یا کامل، ہر صورت میں نفوذ اور جاہ وحشمت کی صفت سے ضرور متصف ہونی چاہیے جو شخص نفوذ اور جاہ وحشمت کا خواہاں ہو اس کے لیے دو طریقے اختیار کرنے ہوں گے: (۱) جو آدمی ان مذکورہ پانچ اقسام امامت (تمدن ناقص تمدن تام خلیفہ، خلیفۃ الخلفا اور خلیفہ اعظم) میں سے جس کسی منصب کا ارادہ رکھے اسے چاہیے کہ وہ اسی امامت کے مناسب حال جاہ وحشمت کے وسائل اختیار کرے اور بتدریج تھوڑا تھوڑا اضافہ کر کے نصاب مطلوب اور مقام اعلیٰ تک پہنچنے کی کوشش کرے۔

(۲): جاہ وحشمت کا جو درجہ حاصل ہو جائے اس کی حفاظت کرے اور مناسب تدبیروں کے ذریعہ اُن خدشات اور خطروں کا انسداد کرے جو اس کی راہ میں پیش آ سکتے ہوں۔

بنا بریں لوگوں میں سے جو شخص صاحب جاہ وحشمت نہیں ہے اور وہ سربراہ یا امام بننا چاہتا ہے اسے سب سے پہلے اخلاق فاضلہ اور اوصاف حمیدہ سے آراستہ ہونا چاہیے اگر اس کو ان اوصاف کا حصول میسر نہ ہو تو بہتر ہے کہ وہ (اس امامت مطلوبہ کے مناسب حال) مطلوبہ جاہ سے متعلق اچھی خصلتوں کا اظہار شروع کر دے مثلاً داد و دہش اور سخاوت و فیاضی کا مظاہرہ کرے۔ ظالموں کو معاف کرے تواضع و انکساری کا شیوہ اختیار کرے، بہادری اور شجاعت سے کام لے اور حکمت و دانائی کے ساتھ اُمور کا فیصلہ کرے۔

لوگوں کے ساتھ اس کو وہ برتاؤ کرنا چاہیے جو صیاد (شکاری) وحشی جانوروں کے ساتھ کرتا ہے اس کا پہلا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ جنگل میں جا کر شکار کی جگہ تلاش کرتا ہے۔ وہ (مثلاً) ہرنوں کو دیکھتا ہے اور اُن کی جگہ متعین کر لیتا ہے۔ بعد ازاں ہرنوں کی طبائع و عادات کے مناسب ہیئت اور شکل اختیار کرنے پر غور کرتا ہے۔ چنانچہ وہ سبز لباس پہنتا ہے اور اپنے آپ کو کسی درخت کے سبز پتوں سے ڈھانپ لیتا ہے (تاکہ ان ہرنوں کو یہ شک نہ ہو کہ وہ ان کو شکار کرنا چاہتا ہے)۔ اس ہیئت و شکل کے ساتھ وہ دور سے ان کے سامنے آتا ہے ان کے کام اور نگاہوں کی طرف اپنی نگاہ جمائے رکھتا ہے۔ جب ہرن کو چوکنا

،خبردار اور بدکتا ہوا دیکھتا ہے تو فوراً دبک جاتا ہے۔ اور اس طرح دبک جاتا ہے گویا پتھر (یا مٹی کا تودہ) ہے۔ گویا اس کے اندر نقل و حرکت کا مادّہ ہی نہیں ہے۔ اور جب دیکھتا ہے کہ ہرن غافل ہے تو دبے پاؤں آگے بڑھتا ہے اور جب دیکھتا ہے کہ اب اس میں کوئی خوف و نفرت نہیں ہے، تو اس کو خوش کن آوازوں سے خوش کرتا ہے۔ اور اس کے سامنے اس کی پسندیدہ گھاس یا چارہ اس طرح ڈالتا ہے گویا وہ طبعًا صاحب جود و کرم واقع ہوا ہے۔ اور شکار کا ارادہ ہی نہیں رکھتا۔ اور یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ احسان دلوں میں محسن کی محبت پیدا کر ہی دیتا ہے اور جب اس طرح اس کی محبت ان کے دلوں میں گھر کر جائے تو پھر انھیں جس طرح قید و بند رکھنا چاہے گا وہ دل و جان سے تسلیم کا شیوہ اختیار کریں گے کیونکہ محبت کی زنجیریں لوہے کی بیڑیوں سے زیادہ مضبوط ہوا کرتی ہیں۔

بعینہٖ اسی شکاری کی طرح اُس شخص کا طرزِ عمل بھی ہونا چاہیے جو لوگوں میں ممتاز درجہ (اور زمام حکومت و قیادت ہاتھ میں لینا) چاہتا ہے۔

اس کے لیے لازم ہے کہ وہ وہی ہیئت اختیار کرے جس سے لوگوں کے قلوب اس کی طرف مائل ہوں۔ لباس بھی ایسا ہو جو لوگوں کو مرغوب ہو، گفتگو بھی ایسی ہو جو پسندیدہ ہو، آداب و اخلاق اور وضع و قطع بھی ایسے ہوں جن سے لوگ اس سے مانوس ہوں پھر آہستہ آہستہ نرمی کے ساتھ ان کے قریب ہوتا جائے اور نصائح و محبت سے ان کو اپنا گرویدہ بنا لے اور نصیحت و محبت کا اندازہ ایسا ہو کہ اس میں مزاح اور شیخی کی بو نہ آتی ہو۔ کوئی قرینہ ایسا ان کے سامنے ظاہر نہ ہونے پائے جس سے وہ خیال کرنے لگیں کہ ہمیں شکار بنانے کے لیے ایسا کیا جارہا ہے۔ پھر اس کا یہ فرض ہے کہ ان پر اپنی فضیلت و برتری کا اظہار اس طریقہ سے ظاہر کرے جس طرح اس کا مقصود ہے اور اس طرح یہ امور انجام دے کہ لوگوں کے دلوں میں اس کی افضلیت و برتری مسلّم اور باعث اطمینان ہو جائے اور وہ خود بخود اس کے احکام کے سامنے سر اطاعت خم کریں۔ اور پھر جب اس طرح وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے تو پھر ان امور کی پوری طرح حفاظت کرے۔ کوئی کام اس سے ایسا سرزد نہ ہونے پائے جس کی آڑ لے کر کوئی اس کی مخالفت پر اُتر آئے اور اگر کہیں کسی امر کے متعلق کسی قسم کی

کچھ کوتاہی ہو جائے تو فوراً لطف واحسان سے تدارک کرے اور واضح کر دے کہ جو کچھ کیا گیا ہے ان کی ضروریات کی تکمیل اور مصلحت عمومی کے لیے کیا گیا ہے۔ اسے یہ یقین بھی دلانا چاہیے کہ اس جیسا قائد وامام انھیں میسر ہی نہیں آسکتا۔ اور جب یہ سب کچھ ہو جائے تو لوگوں کے دل اس کے اطاعت اور وفاداری کے جذبات سے معمور اور ان کے اعضائے جسمانی اور جوارح بدن خشوع وخضوع اور انکساری کے ساتھ جھکنے پر مجبور ہوں گے۔

امام تام (یعنی مستقل مملکت کے سربراہ اور بادشاہ) کو اس کی بھی ضرورت ہے کہ رعایا پر اپنی اطاعت لازم اور برقرار رکھنے کے لیے اپنے دشمنوں باغیوں اور ایسے سرکشوں کو (جن کے دلوں میں اس کے ساتھ عداوت مضمر ہے) خوب تادیبی سزا دے لیکن اجرائے عقوبت کے بعد ان سے مہر ومحبت سے پیش آکر ان کی دلجوئی اور اشک شوئی کر لیا کرے۔ اور لوگوں پر یہ ثابت کر دے کہ مجرموں کے ساتھ اس کا سلوک منتقمانہ نہیں بلکہ مصلحانہ ہے۔

امام یا بادشاہ کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ سب لوگوں کے مقابلہ میں زیادہ دولت مند اور مالدار ہو (اور اس کا خزانہ بھرا پڑا ہو) کیونکہ لوگ دولت کے دلدادہ ہوتے ہیں اور ان کا یہ وطیرہ ہے کہ وہ بھرے خزانوں اور فراخ آمدنی کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور وفاداری پر آمادہ ہوتے ہیں۔

یہ بھی ضروری ہے کہ امام یا بادشاہ منع وعطا پر پوری طرح قادر ہو۔ اور کوئی اسے روک نہ سکے، ہاں بخشش وعطا میں مصلحت وقت کا خیال رکھے، اگر وہ کسی کی میدان جنگ میں یا تحصیل خراج میں (یا تدبیر سلطنت میں) حسن خدمات اور بہتر کارکردگی دیکھ لے تو اس کی حوصلہ افزائی کے لیے اس کی تنخواہ بڑھا دے اور اس کی قدر ومنزلت میں اضافہ کرے۔ لیکن اگر کسی سے اطاعت گزاری میں کوتاہی، فرض منصبی کی ادائیگی میں غفلت اور کام میں کسی طرح کی نالائقی دیکھے تو اس پر انعام وبخشش کی مقدار اور اس کی قدر ومنزلت کم کر دے۔

امام یا بادشاہ کے لیے بہت ضروری ہے کہ اس کے پاس پوری طرح باخبر اور بیدار جاسوس ہوں جو اس کو اپنی رعیت اور فوج کے احوال وظروف سے ٹھیک طور پر آگاہ کرتے رہیں۔

تیرھویں فصل

ارتفاق ثالث کے اقسام پنجگانہ کے احکام کی تفصیل

آداب قضاو قاضی

جب قاضی لوگوں کے مقدمات کا فیصلہ کرنے کے لیے کچہری لگاتا ہے تو ضروری ہے کہ وہ نہایت بارعب اور پُر وقار لباس میں ملبوس ہو۔ اور اس کا دل دماغ مقدمات کے فیصلہ کے وقت دوسری پریشانیوں سے فارغ ہوں۔ وہ مجلس میں کوئی ایسی بات نہ کرے جس سے فریقین میں سے کسی فریق کو دوسرے پر دست درازی یا کسی قسم کی بالادستی حاصل کرنے کی جرأت ہو سکے۔ وہ اولاً مدعی سے دعویٰ سنے جو وہ مدعی علیہ پر کرتا ہے اور یہ کہ اس سے اس کا پہلا واسطہ کیا پڑا تھا۔ کوئی معاملہ (عقد) آپس میں طے ہوا تھا یا کوئی اور رابطہ تھا، مدعی اپنے دعویٰ کے حق میں جو دلیل پیش کرتا ہے وہ بھی معلوم کرے، پھر وہ مدعی علیہ سے اس کا جواب سنے اور یہ کہ اس کا اس کے ساتھ کیا سابقہ رہا تھا۔ اور یہ کہ وہ جو کچھ کہتا ہے اس کے بارے میں اس کی دلیل کیا ہے۔ (غرض یہ کہ قاضی مدعی اور مدعیٰ علیہ سے مفصل بیان لے جس سے مقدمہ کی حقیقت اور فریقین کا عندیہ واضح ہو جائے اور قاضی ہر ایک کی مالہ وما علیہ سن کر صورت حالات سے اچھی طرح واقف ہو جائے) یہاں تین باتوں میں غور و خوض اور امعان نظر کی ضرورت ہے۔

اوّل: ہر فریق کا ارادہ کیا ہے؟ یہ معلوم کرنا اشد ضروری اس لیے ہے کہ دعویٰ اور جواب دعویٰ دونوں کی حقیقت متعین کرنے کا مدار اسی پر ہے۔ ہاں بعض اوقات ان کا نزاع لفظی قسم کا ہوتا ہے اور جب وہ اپنی اپنی بات پر قائم رہ کر کسی مزید شے کی طلب سے کنارہ

کش ہو جائیں تو ہر ایک کو (نزاع لفظی کی صورت میں) اپنی مطلوبہ چیز خود بخود مل جائے گی۔ اور جھگڑا طے ہو جائے گا۔

دوم: جس معاملہ پر دعویٰ کی بنیاد ہے اگر اس کی کیفیت بیان میں دونوں فریق متفق ہوں تو سمجھ لو کہ اس مقدمہ کا تعلق قاضی سے نہیں مفتی سے ہے (اس لیے مناسب یہ ہے کہ وہ مقدمہ مفتی دیار کے پاس بھیج دیا جائے) لیکن اگر فریقین کا اس میں اختلاف ہے تو نصیحت کے طور پر ان سے کہا جائے کہ تم دونوں نے بیان عقد میں اختلاف کیا ہے اور تم جانتے ہو کہ تم میں سے ایک یقیناً جھوٹا ہے اور جھوٹے کا مآل وانجام دنیا اور آخرت میں یوں یوں ہے (یعنی ہلاکت وتباہی، آتش جہنم اور خدا کی نظر کرم سے محرومی وغیرہ وغیرہ) اس لیے تمہاری دنیاوی سعادت اور اخروی نجات کے پیش نظر حقیقت حال صریح الفاظ میں بیان کردو۔ کیونکہ بعض اوقات لوگ آپس میں اختلاف کسی وہم اور شبہہ کی بنا پر کرتے ہیں، اور جب اپنا مطلب صاف صاف بیان کردیتے ہیں تو حقیقت ان پر خود ہی واضح ہو جاتی ہے اور بعض اوقات لوگ ویسے جھوٹ بولنے کی چنداں پرواہ نہیں کرتے، لالچ نے ان کو اندھا کر دیا ہوتا ہے لیکن ممکن ہے کہ سمجھانے اور وعظ ونصیحت سے متاثر ہو کر وہ اصل حقیقت کا اقرار کردیں اگر اس طرح ان میں باہم مصالحت ہو جائے تو بہتر ورنہ تیسری صورت یہ ہوگی۔

سوم: جس فریق کا بیان ظاہری قرائن اور حالات گردوپیش کے خلاف ہو قاضی اس سے دو یا دو سے زیادہ معتبر گواہ طلب کرے۔ اگر وہ کم از کم دو گواہ بھی پیش نہ کر سکے تو اس کے صرف ایک گواہ پر اکتفا کرے لیکن ساتھ ہی اس کو قسم بھی دلائے[۱] یہ بھی میسر نہ ہو تو مدعی علیہ کے حلف سے انکار کرنا اور مدعی کا قسم کھالینا بھی کافی ہوگا۔

قاضی کو چاہیے کہ حقیقت حال سے باخبر ہونے کے لیے قرائن کا تتبع کرے اور دوسروں سے استفسار واستکشاف کرے لیکن شرط یہ ہے کہ فریقین کو اس کی (خفیہ تفتیش کی)

---

۱ ایک حدیث کا بظاہر مفہوم یہی ہے کہ ایک گواہ اور مدعی کی قسم سے بھی مدعی کے حق میں فیصلہ ہو سکتا ہے۔ تاہم حنفیہ مشہور اصول (البينة على المدعي واليمين على من انكر) پر عمل کرتے ہوئے ایک گواہ کو نا کافی سمجھنے اور مدعی علیہ کی قسم پر مقدمہ کا فیصلہ مدعی علیہ کے حق میں خود بخود فیصلہ ہو جاتا ہے۔

اطلاع نہ پہنچے۔اب اگر وہ آزادانہ تحقیقات ذاتی طور پر حاصل کردہ نتیجہ اور گواہوں کے بیانات میں تناقض واختلاف پائے تو گواہوں کی بابت خوب چھان بین کرے۔ بصورت دیگر جب بظاہر کوئی تضاد وتفضانہ ہو گواہوں کی عدالت کے بارے میں خفیہ رپورٹ طلب کرنے اور مزید تحقیق وکاوش کی ضرورت بھی نہیں بلکہ گواہوں کی ظاہری عدالت واعتبار کو کافی سمجھا جائے۔

جب مقدمہ کی حقیقت واضح ہو جائے تو قاضی کو فریقین کے دلائل سننے چاہئیں۔اب اگر کسی ایک کے پاس قوی دلیل موجود ہے اور کتاب (وسنت) سے اس کو تقویت ملتی ہے اور وہ عرف عام کے منشا کے مطابق ہے تو اس کا حکم واضح ہے (اور فیصلہ دیدینا چاہیے)۔اگر صورت حال یہ ہے کہ دونوں فریقوں کے دلائل قوت واستدلال میں برابر ومساوی ہوں یا دونوں ضعیف اور کمزور ہوں تو پھر اُن اُصول کا اتباع کرے جو معاملات اور مبادلات کے باب میں ہم پہلے ہی عرض کر چکے ہیں۔یعنی فریقین کو سمجھایا جائے کہ جہاں تک ممکن ہو، صلح وصفائی اچھی چیز ہے۔ان کو باہمی رضا مندی پر آمادہ کیا جائے اور یہ کہ دونوں فریقین اپنی مرضی سے تشدد سے باز آجائیں۔ کچھ لو کچھ دو کے اُصول سے یا کسی ایک فریق کی پوری فراخدلی سے باہم مصالحت کرلیں۔کیونکہ یہ حقیقت مسلّمہ ہے کہ باہمی صلح میں ہر قسم کی خیر وبرکت ہے۔ہاں اگر صلح بالکل نہیں ہوسکتی اور ان کی باہمی رضا مندی حاصل نہیں ہوسکتی اور مقدمہ کی نوعیت وصورت بالکل واضح ہو تو قاضی کو چاہیے کہ وہ بلا تاخیر فیصلہ سنادے۔اور اگر صورت بالکل واضح نہ ہو بلکہ غالب گمان کے درجہ میں ہو تو فیصلہ بھی غالب گمان کے مطابق صادر کرنا چاہیے۔ جیسے چوری کے معاملہ میں ہاتھ کاٹنے کی بجائے صرف مال کی واپسی کا فیصلہ اور قتل میں قصاص کی بجائے دیت کا فیصلہ ظنی نوعیت کے فیصلے ہیں۔

چند اہم کلیاتِ قضا

قضا کے لیے چند کلیات اور اُصولی باتیں ہیں، جنھیں احاطۂ علم میں لانے والے جج کو فیصلوں میں شک وتردد سے دوچار ہونا نہیں پڑتا ان میں چند درج ذیل ہیں۔

۱-**الغُنم بالغرم:** یعنی فائدہ کے ساتھ تاوان بھی قبول کرنا ہوتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ اگر آدمی کسی چیز سے فائدہ اٹھائے گا تو نقصان کی صورت میں تاوان بھی برداشت کرے گا۔

۲-**تحکیم کل شرطٍ وبیان وقع بینھم الخ:** یعنی جس شرط یا بیان پر فریقین نے اتفاق کیا ہے اس کی پابندی کرنا اور اس کے مطابق فیصلہ سنانا ضروری ہے۔ اور اگر کسی چیز یا بات کے بارے میں انھوں نے سکوت وخاموشی اختیار کر لی ہے تو عرف وعادت یا مسلّمہ رواج کے مطابق فیصلہ کیا جائے۔

۳-**الاستیفا لکل رجل ماقصد بعقدہ من نفع وربح الخ:** یعنی جو عقد کسی شخص نے اپنے فائدے کے لیے منعقد کر لیا ہے۔ اس شخص کو اس فائدہ سے محروم نہ رکھا جائے اور جو چیز وہ دوسرے کے لیے بطور حق تسلیم کر چکا ہے وہ اس سے پورا پورا وصول کیا جائے۔

۴-**فک الربط وبقا کل رجل علی ما کان علیہ عندفساد باب التفتیش:**

یعنی ظاہر ہے کہ بنائے مخاصمت یا تو روابط منزلی ہوں گے یا مبادلہ اور لین دین کا قضیہ ہوگا۔ یا آپس میں تعاون (اجارہ، کرایہ، اور ہبہ وتبرعات میں سے کسی ایک قسم) کا قضیہ ہوگا۔ اب اگر تفتیش وتحقیق سے صحیح صورت حال سامنے نہیں آتی تو بہتر یہ ہے کہ اس ربط یا عقد کو فسخ کر دیا جائے جس سے وہ جھگڑا پیدا ہوا اور ہر شخص کو اپنی اصلی حالت کی طرف لوٹا دیا جائے۔ اس اثنا میں اگر کسی ایک نے دوسرے کے حق میں زیادتی کی ہو تو عدوان وزیادتی کا اندازہ لگایا جائے گا اور عدل وانصاف کے ساتھ تلافی مافات کی جائے گی نہ کم اور نہ زیادہ لیا یا دیا جائے گا۔

۵-**اتباع العرف الغالب:**

اقرار، شہادتوں، دعووں اور دیگر مبہم باتوں کی تشریح وتوضیح میں عرف غالب اور مسلّمہ رسم ورواج سے کام لیا جائے اور اگر قرائن سے معلوم ہو کہ کسی فریق کے حق سے انکار کیا جا رہا ہے تو قاعدہ اور عرف کے مطابق فیصلہ کیا جائے۔

چودھویں فصل

شہری انتظام کے فساد اور خرابیوں کے اسباب و وجوہ

شہری انتظام میں کئی وجوہ سے خرابی پیدا ہو سکتی ہے:

ایک وجہ یہ ہو گئی ہے کہ ان کے آپس میں کوئی ظاہری مذہبی اختلاف ہو۔ اکثر اوقات تفریق واختلاف میں باطل کی آمیزش ہوتی ہے۔ اگر ان کا اختلاف عبادات میں ہے تو یہ اختلاف ان کی آخرت کے لیے خراب و مضرت رساں ہوتا ہے۔ اور اگر اختلاف معاملات میں ہے تو دنیوی زندگی میں انتشار و نقصان ہوگا۔ ان اختلافات سے عموماً جھگڑے فساد بلکہ کشت وخون تک کی نوبت پہنچ جاتی ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ حاکم وقت مرتدین اور زنادقہ کو توبہ وانابت پر مجبور کرے اگر وہ تنبیہ اور تادیبی سزاؤں کے بعد بھی باز نہیں آتے اور ان کی سرکشی وتمرد برابر بڑھتی جاتی ہے تو ان مفسدوں کو قتل کر دیا جائے (تاکہ خس کم جہاں پاک، پر عمل ہو جائے)۔

دوسری وجہ فساد یہ ہے کہ شہریوں کے اندر خفیہ تخریبی کارروائیاں اور پوشیدہ اسبابِ فساد مصروفِ عمل ہوں مثلاً ساحروں کی جادوگری کی فتنہ پردازیاں (شباب پر) ہوں، دوسروں کو زہر کھلانے والوں کی مذموم کوششیں جاری ہوں، عیاری اور فریب جیسے غیر اخلاقی طریقوں سے (مثلاً اپنے پاس کچھ بھی نہ ہو اور عیاری سے خرید وفروخت کا سلسلہ جاری ہو) لوگوں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے والوں کی فریب کاریاں جاری ہوں، ان کے اندر ایسے غیر ذمہ دار اور شریعت کو مذاق بنانے والے جج قاضی اور مفتی موجود ہوں جو شرعی احکام سے بچنے کے حیلے بہانے اور آپس میں لڑنے کے طریقے بتاتے ہوں۔ مملکت کے اندر دشمنان ملک کے جاسوس اپنی مذموم حرکتوں میں مصروف ہوں تو اس قسم کے تخریبی عناصر کو تعزیراتی قوانین کے تحت قید بند یا قتل اور پھانسی کی سزا دی جائے تاکہ شہر ان کے فساد سے محفوظ رہے۔

تیسری وجہ فساد یہ ہے کہ لوگوں کے اموال و جائداد پر غصب، چوری اور رہزنی کے ذریعے دست درازی اور زیادتی کی جائے۔ ان سب قسموں کی تعدّی اور ظلم کو روکنے کے لیے حسب حال اور مناسب وقت سزائیں دی جائیں۔ (جس میں جرمانہ، قید و بند اور دوسری قسم کی تادیبی و تعزیری سزائیں شامل ہیں)۔

چوتھی وجہ فساد یہ ہے کہ لوگوں کے (محترم و حرام) خون کو ناحق بہایا جائے خواہ اس کی شکل قتل عمد، قتل خطا، یا شبہ خطا میں سے کوئی بھی ہو۔ یا اعضائے جسمانی کو زخمی و مجروح کر کے فساد و بے چینی پیدا کی جائے۔ (بہر حال جو لوگ قتل و خوں ریزی اور مار پیٹ یا جرح و ضرب کے ذریعہ لوگوں کو ناحق جسمانی تکلیف یا بدنی اذیت میں مبتلا کرتے ہیں ان کو مناسب تعزیرات اور حدود کے مطابق سزائیں دی جائیں تاکہ معاشرہ میں امن قائم ہو)۔

پانچویں وجہ فساد یہ ہے کہ لوگوں کی آبروؤں اور نسبوں کو تخریب کا نشانہ بنادیا جائے اور ان کو بہتان، گالی گلوچ، بدزبانی اور غلط بیانی کے ذریعے ذلیل و خوار کیا جائے (اس کے استیصال کے لیے بھی مقررہ سزاؤں اور تعزیراتی سزاؤں میں سے جو مناسب حال ہوں وہ سزائیں دی جائیں)۔

چھٹی وجہ فساد یہ ہے کہ فطرت کے خلاف حیوانی خواہشات کی تسکین کی جائے اور زنا کے ذریعہ فطری حمیت اور تعیین منکوحہ کے جبلّتوں کو بری طرح مجروح کیا جائے۔ کیونکہ ایک ہی عورت سے مباشرت پر ہجوم ایک ناپسندیدہ غیر فطری امر ہے۔ نیز اس سے ایک دوسرے سے جنگ اور لڑائی کے دروازے کھل جاتے ہیں اور نسل انسانی میں نسب کی خرابی رونما ہوتی ہے۔ حالاں کہ نسب کی حفاظت بہت ضروری بات ہے جس کا قصد ہر ابن آدم کو کرتا ہے۔ اور بدکاری میں نکاح سے بے نیازی ظاہر ہوتی ہے۔ حالانکہ معاشرتی زندگی کے دوسرے درجہ بلکہ پہلے درجہ میں نکاح نہایت اہم ارتفاق اور ادارے کی حیثیت رکھتا ہے۔

زنا کے مشابہ، لواطت و اغلام بھی ہے۔ کیونکہ یہ بھی فطرت کی تبدیلی کی ایک مذموم کوشش ہے۔ نفسیات رجال سے واقف لوگوں سے مخفی نہیں ہے کہ یہ مرد کی فطرت نہیں کہ اس سے غلمان بازی کی جائے۔ اسی زمرہ میں جوئے اور سودی لین دین بھی آتے ہیں کیونکہ ان دونوں سے اموال میں فساد پیدا ہوتا ہے۔ اور لاتعداد جھگڑے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ بعینہٖ شراب نوشی بھی اسی کیفیت کی حامل ہے۔ اس سے دینی اعمال میں بھی خرابی رونما ہوتی ہے

اور یہ (عقل انسانی کو بری طرح متاثر کر کے) جھگڑوں اور لڑائیوں کو جنم دیتی ہے۔

ساتویں وجہ فساد یہ ہے کہ مرد اور عورت دونوں اپنے مخصوص فطری تقاضوں کے خلاف ایک دوسرے کے عادات واطوار اور لباس وطریقے اختیار کر لیتے ہیں مثلاً مرد اپنے مردانگی کے اوصاف کو چھوڑ کر زنانہ پن اختیار کرے اور عورت شرم وحیا اور تستر کے فطری جذبوں کو ترک کر کے مردوں کے اطوار اختیار کرے۔ یہ نہایت ہی ضروری ہے کہ مردوں کے شایان شان جو لباس اور طور طریقے ہیں وہ ان کو بالکل نہ چھوڑیں اور عورتیں اپنے لباس شرم اور طریقوں کو نہ چھوڑیں نظام تمدن میں فساد کے ممکنہ وجوہ مذکورہ بالا ہی ہو سکتے ہیں۔ ارباب حل وعقد کا یہ فرض ہے کہ وہ مدنیتِ صالحہ کے حدود میں اس قسم کے اسباب فساد کو ظہور میں نہ آنے دیں۔ ان مجرمانہ ذہنیت رکھنے والے مفسدوں کی طرف توجہ دینے والے معالج د مصلح کو چاہیے کہ وہ سزا دیتے وقت اس بات کو ملحوظ خاطر رکھے کہ جب یقینی طور پر کسی شخص کا جرم ثابت ہو جائے تو اس کو مقررہ شرعی سزا پوری کی پوری دے۔ لیکن صرف تہمت کی صورت میں، جبکہ جرم کے ارتکاب کا صرف شائبہ ہو، صرف ایسی تنبیہ اور زجر وتوبیخ پر اکتفا کرے جو کارگر ثابت ہو۔

ان جرائم میں سے ہر ایک جرم (کبیرہ ہو یا صغیرہ) اپنا خاص اثر فساد دکھاتا ہے اور اس کی تاثیر کے مدارج وکیفیات میں اختلاف ہوتا ہے اور قوم میں اس جرم کے کثرت سے صادر ہونے یا کبھی کبھار سرزد ہونے میں فساد کا پیمانہ بھی علیحدہ علیحدہ رہتا ہے (اور اس کی کثرت وقلت سے قوم کے مزاج میں اسی اندازے سے بگاڑ ہوتا ہے)۔ اس لیے شہر یار (یعنی کوتوال یا انتظامیہ) کو چاہیے کہ ان سب باتوں کا خیال رکھے اور کسی کو سزا دیتے وقت جرم کی نوعیت کا بہ نظر عمیق مطالعہ کرے۔

منتظم شہر کو چاہیے کہ وہ اپنی رعیت کے سب افراد سے اپنی اولاد کی طرح محبت کرے اور ان کے حق میں وہی بات پسند کرے جو وہ خود اپنے لیے پسند کرتا ہو۔ بہر حال وہ پورے معاشرے کی مصلحت اور ان کے حق میں محبت وشفقت کو مقدم رکھے۔ اگر اس کا نقطۂ نظر معاشرہ کی بہتری ہو تو بہترین علاج کی طرف اس کی رہ نمائی غیب سے خود بخود ہوتی جائے گی اور اگر امیر وقت کسی معاملے میں شک وشبہہ میں پڑ جائے تو اس پہلو کو اختیار کرے جس میں رعیت کو (بہ حیثیت مجموعی) سہولت وآرام میسر ہو۔

پندرھویں فصل

امیر کی سیرت و کردار، اعدا سے اس کا برتاؤ
تعیین لشکر اور دیگر امور لائقہ سے متعلق بحوث

جنگ سے پہلے

جنگ کے موقع پر مجاہدین اسلام کے سربراہ کو مندرجہ ذیل اصول ملحوظ خاطر رکھنے چاہئیں:

۱۔اس کو دفاع کا وہ طریقہ اختیار کرنا چاہیے جو قوم و ملک اور فوج وسپاہ کے لیے سہل ترین اور حصول مقصد کے لیے بہترین اور مناسب حال ہو۔ اور جب تک صلح کا امکان ہو وہ صلح سے منہ نہ موڑے اور جنگ کی طرف سبقت نہ کرے، الا یہ کہ اگر جنگ کے بغیر فتنہ وفساد کا استیصال ناممکن ہو۔ یا ملک وقوم اور امام کے دامن غیرت وشجاعت پر بزدلی اور عار کے سیاہ داغ کے طول عہد تک باقی رہنے کا خدشہ ہو (تو اس صورت میں اپنے پروردگار عزّ وجل پر بھروسہ کرکے بہادری اور پامردی کے ساتھ جہاد کا فرض انجام دے۔

۲۔وہ مقاصد جنگ سے پوری طرح باخبر ہو، اور اسے یہ معلوم ہو کہ وہ اس جنگ سے ظلم و جور کا خاتمہ کرنا چاہتے ہیں یا توسیع سلطنت، ملک گیری اور مال غنیمت حاصل کرنا چاہتے ہیں یا رعایا کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں۔ یا باغیوں اور سرکشوں کو خوفزدہ یا نیست ونابود کرنا چاہتے ہیں۔ یا بدخواہوں کو ذلیل وخوار کرنا اور انہیں قتل وسلب اور قید وبند کے ذریعے اپنی زندگیوں، مالوں اور حریتوں سے محروم کرنا چاہتے ہیں یا ان کے سرغنوں کو قتل

کرنا چاہتے ہیں۔ان مقاصد میں سے جس جس مقصد کے لیے جو جنگ لڑی جاتی ہے اس کے جدا جدا آداب ہیں۔ چنانچہ اگر جنگ کا مقصد فقط حصول مال غنیمت ہے تو اس میں حتی المقدور وحتی الامکان اتلاف جان سے احتراز کرنا چاہیے۔

۳- اسے ہر قسم کے ضروری آلات حرب وضرب اور ساز وسامان جنگ ورسد مہیا رکھنے چاہئیں اور اس کے پاس بہادر جوانمرد سپاہیوں پر مشتمل مسلح وتربیت یافتہ فوج ہر وقت تیار رہنی چاہیے۔اسے مردم شناسی اور فراست ایمانی سے متصف ہونا چاہیے تاکہ ہر شخص کی اس کی ذہنی وجسمانی استعداد اور کارکردگی کے مطابق قدردانی کرے۔اور کسی کو ایسا کام سپرد نہ کرے جس کے انجام دینے کی اس میں صلاحیت وقابلیت ہی نہیں۔

۴- جہاں تک ممکن ہو جنگ سے پہلے اور جنگ کے دوران دشمن کی جنگی چالوں اور حربی منصوبوں سے باخبر ہو کر انسدادی تدابیر اختیار کرے،اس غرض کے لیے محکمہ جاسوسی کو خوب منظم کر کے دشمن کے کیمپوں سے معلومات حاصل کرے اور حریف کے جاسوس سے محتاط رہے۔

۵- امام المجاہدین سپہ سالار اعظم جب جہاد کے لیے میدان جنگ میں اتر جائے تو اسے اپنی فوجوں کی مناسب صف بندی کرنی چاہیے اور میمنہ (دائیں جانب متعین دستہ) میسرہ (بائیں جانب متعین دستہ) کو اپنی اپنی جگہ لائق سپہ سالاروں کی قیادت میں کھڑا کر دے۔

دورانِ جنگ

(الف) جب وہ معرکہ آرا ہو کر میدان کارزار میں جنگ کی کمان کرے تو وہ اپنی حفاظت کا خیال رکھے اور خوب چوکنا رہے۔گویا کہ اس کی چار آنکھیں ہیں، جو ہر طرف ان دشمنوں پر لگی رہتی ہیں۔جو اس کی ذات پر حملہ کرنا چاہتے ہیں کیونکہ ایسے لوگوں کی تعداد بکثرت، اور وافر ہوتی ہے جو خود امیر پر حملہ کرنا چاہتے ہیں امام یا سپہ سالار اعظم کو حتی الامکان خود عملی طور پر لڑائی میں شریک نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ کسی ایسے محفوظ مقام پر بیٹھ کر

جنگ کی تنظیم اور فوجی کارروائی کرے جہاں سے وہ اپنی فوج کی حرکات وسکنات کو بخوبی دیکھ سکتا ہو۔ یا ان کو اپنی نظر کے سامنے رکھ کر قیادت کرسکتا ہو۔ اور پانچوں کے پانچوں فوجی دستے اس کی ہدایات واحکام حاصل کر سکتے ہوں۔ ایک طرف سے لوگوں کے سامنے آشکارا بھی ہونا چاہیے اور دوسری طرف خوب بچاؤ کا بھی اہتمام کرنا چاہیے۔ اسی میں حکمت ودانائی ہے کہ دونوں باتوں کا اہتمام ہو۔

(ب) اگر لڑائی طریق قدیم کے مطابق مبارزت کے طریقے پر ہو رہی ہو۔ تو اس کو چاہیے کہ ہر مبارز پر اس کی نظر رہے۔ جب دشمن کی فوج سے کوئی آگے بڑھ کر للکارے تو امام اس شخص اور اس کے خاندان کی حیثیت کو دیکھ کر اس کے مقابلہ پر ایسے جانباز کو میدان جنگ میں آنے کا حکم دے، جو حریف سے قوی تر اور فنون جنگ سے زیادہ واقف ہو۔ بشرطیکہ وہ ایسا نہ ہو کہ اپنی فوج کا اسی پر دارومدار ہو۔

امیر کو چاہیے کہ دوران جنگ مناسب موقعوں پر لسان حال وقال سے فوجیوں کی حوصلہ افزائی کرے۔ اور انھیں استقلال وپامردی کی ترغیب دے اور بہادرانہ کارناموں پر خوشنودی کا اظہار کرے۔ اور مستحق لوگوں کو انعام واکرام سے نواز کر دوسروں کا حوصلہ بڑھائے۔ نیز انھیں خوش آئند ترغیبات اور ترقی واحسان کے اچھے وعدوں کے ذریعے جنگ پر آمادہ رکھنے کی کوشش کرے۔

(ج) جب دشمن کا کوئی دستہ مجاہدین (کے پانچ دستوں میں سے کسی دستہ) پر حملہ کا ارادہ کرنے لگے، تو بہتر یہ ہے کہ بلاتاخیر اس کے مقابلہ کے لیے مجاہدین کا ایک دستہ اس طاقت کا روانہ کردے اور دشمن کو حتی الامکان یہ موقع نہ دے کہ اچانک حملہ سے پورے اسلامی لشکر میں کسی قسم کی بے ترتیبی رونما کردے۔ کیونکہ چھوٹی ٹکری کی بے ترتیبی کا علاج ہوسکتا ہے اور پوری فوج میں بے ترتیبی پیدا ہو تو اس کا سنبھالنا مشکل ہے۔ نفسیاتی رعب ڈالنے کے لیے ہر مجاہد کا زور زور سے چیخنا چلاّنا (اور اللہ اکبر کے نعرے بلند کرنا) اور لمبے چوڑے بہادرانہ دعوے کرنا پچاس بہادروں کی خاموش لڑائی سے زیادہ مفید ثابت ہوتے ہیں۔

(د) امام کو ایسی ثابت قدمی اور استقلال دکھانا چاہیے کہ دوسرے اس کو موجب اطمینان اور قابل تقلید سمجھ کر پیروی کریں۔ نیز اس کی عقل وتدبر کی یہ کیفیت ہو کہ ہر ایک مشکل کا علاج شافی اس کے پاس ہو۔ اور اس کے وقوع سے بہت پہلے اس نے انسدادی یا دفاعی تدبیر سوچی ہو۔ اپنے لشکر اور دشمن کی برسر پیکار فوج دونوں پر اس کی کڑی نظر ہو۔ کیونکہ دونوں اپنے مدمقابل کو شکست دینے کے لیے حریف کے حرکات وسکنات، غفلت وبیداری اور قوت وضعف کا اندازہ لگانے کے لیے تاک میں بیٹھے رہتے ہیں۔ اس لیے امام جب بھی دشمن کی صفوں میں کوئی کمزوری دیکھے، ان میں غفلت پائے تو فوراً وہاں دھاوا بول دینے کا حکم دے وہ ایک لمحہ بھی حریف کی چالبازیوں سے غافل نہ ہو۔ اس کو بھیڑیے کی چال چلنا ہوگا چنانچہ جب ایک تدبیر کارگر ثابت نہ ہو تو اس کی بجائے دوسری تدبیر عمل میں لائے۔ اس کے پیش نظر سب سے مقدم یہ بات ہو کہ دشمن کی اجتماعی قوت میں انتشار پیدا کر کے ان کے دلوں میں بزدلی اور پست ہمتی پیدا کرنے کی کوشش کرے اور ان کے دماغوں میں یہ بات بٹھا دی جائے کہ اب ان کی نجات ناممکن ہے جب اس میں کامیاب ہو تو یکدم ان پر بھرپور حملہ کر کے معرکہ کا حتمی فیصلہ کر دے۔

فتح وکامرانی کے بعد

(ناکامی کی صورت میں مایوسی کا شکار نہیں ہونا چاہیے بلکہ مسلمانوں کو از سر نو تنظیم عساکر ، فراہمی اسباب جنگ اور تربیت فنون عسکری کی طرف توجہ دینی چاہیے، ماضی کی غلطیوں کی اصلاح کریں اور مستقبل میں ظاہری اور معنوی قوتوں کو یکجا کر کے نبرد آزمائی کے لیے مناسب وقت کا انتظار کریں) ہاں جب امیر المومنین دشمن کو شکست فاش دیدے، اور ان کی قوت وشوکت کو پوری طرح توڑ دے اور دشمن کے سر برآوردہ لوگوں کو تہ تیغ کر کے باقی ماندہ کو خوف وہراس میں رکھنے میں کامیاب ہو جائے تو پھر اپنے ان منصوبوں کو جو جنگ سے پہلے وہ تیار کر چکا تھا، عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرے۔ امام کو چاہیے کہ اس وقت تک قتل لوٹ مار، قید وبند اور تذلیل وتسخیر اعدا کا سلسلہ جاری رکھے جب تک وہ سب اس کے سامنے دست بستہ

غلاموں کی طرح سر تسلیم خم نہ کر دیں۔ اور امام کو ان کے حق میں ہر طرح کا تصرف کرنے کا حق حاصل ہو جائے اور کوئی اس کو روکنے والا باقی نہ رہے۔ اس کلی انقیاد و تسلیم کی حالت میں امام اگر چاہے تو احسان کر کے ان کے قیدیوں کو آزاد کر دے، لیکن ضروری یہ ہے کہ ان پر ایک ہزیمت کی کیفیت اور اپنے اقتدار کا دبدبہ کافی عرصہ تک جاری رکھے۔ اس کی ایک شکل یہ ہوگی کہ ان پر جزیہ یا ٹیکس (یا تاوانِ جنگ) مقرر کر دے یا یہ کہ ان کو غلامی کے طوق میں جکڑے رکھے اور ان کے قلعوں اور جنگی تنصیبات کو مسمار کر دے اور یہ بھی ضروری ہے کہ ان کو ایسی حالت پر رکھا جائے کہ دوبارہ امام کے خلاف قوت جمع کرنے اور جنگ کرنے کے مواقع کا امکان کم باقی رہے اور وہ بار بار نبرد آزمائی کے قابل نہ ہوں۔

بہر حال دشمن پر فتح حاصل کرنے میں جو مشکلات پیش آتی ہیں فتح و ظفر کے بعد مسلسل قابو میں رکھنا اور فرماں بردار بنائے رکھنے کی تدابیر ان سے بھی مشکل تر اور دقت طلب ہوتی ہیں۔

سولھویں فصل

تعلیم وتربیت کی دو قسمیں

لوگوں کی خیر و بھلائی کی تعلیم دینے والے کو دو مختلف طریقوں سے تعلیم دینی پڑتی ہے

ایک یہ کہ لوگوں کو ان باتوں کی تعلیم دے جو ان کے اخلاق کو درست کریں اور اقامتِ خیر اور رائے سلیم پر مبنی معاشرتی زندگی بالخصوص ارتفاق ثانی وثالث کے نظام کو اس طریقہ سے قائم کرنے میں مدد دیں جو رائے صواب کے مطابق ہو۔

دوسرے یہ کہ ان کو ان باتوں کی تعلیم دے جن کے ذریعہ وہ خدائے بزرگ و برتر کا قرب حاصل کریں اور دارِ آخرت میں ان کی نجات وسعادت کے باعث ہوں، مؤخر الذکر کی تفصیل ہم آگے بیان کریں گے ان شاءاللہ تعالیٰ۔

ایک دوسری تقسیم کے مطابق خیر کی تعلیم دو طریقوں سے دی جا سکتی ہے:

(الف) جن باتوں کے ذریعہ ان کی دنیا سنورتی ہے اور جن باتوں سے ان کو بارگاہ الٰہی میں تقرب حاصل ہوتا ہے ان تمام باتوں کی تعلیم دینا، جو زبانی وعظ و تذکیر کے ذریعہ بھی دی جا سکتی ہے اور قلم وتحریر کے ذریعہ بھی ان مسائل کی اشاعت کی جا سکتی ہے۔

(ب) (صوفیائے کرام کے طرز پر لوگوں کا تزکیہ نفس کر کے) ان کے باطن میں پاکیزہ حالت پیدا کر دینا جس کو سکینہ یا طمانیت قلب کہا جاتا ہے اور جس کی تشریح ہے کہ آدمی کا دل ہر وقت آخرت کی طرف متوجہ رہتا ہے اور دار الغرور یعنی دنیا سے اعراض اور بے تعلقی پیدا ہوتی ہے نیز ان امور سے بھی لاتعلقی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے جو دنیاوی زندگی سے

نفس کی کلی وابستگی کے ذرائع ہیں۔ یہ پاکیزہ حالت معلم کبھی تو مؤثر پند ونصیحت کے ذریعہ پیدا کرتا ہے اور کبھی اپنی پاکیزہ مجلس وصحبت اور روحانی توجہ کے ذریعہ پیدا کرتا ہے۔

معلم کے اوصاف حمیدہ

معلم ان دونوں میں سے جو بھی قسم یا طریقہ تعلیم اختیار کرے اس کے لیے لازمی شرط یہ ہے کہ وہ خود عادل ومنصف مزاج اور کامل ترین نمونۂ اخلاق ہو۔ اور آخرت کی نجات وسعادت کو دنیا اور دنیا کی عیش وعشرت پر ترجیح دینے والا ہو۔ لوگوں کے بہی خواہ ہونے کا حکم دینے والا اور برائی سے روکنے والا ہو۔ کتاب اللہ اور سنّتِ رسول کا حافظ ہو، اور قرآن وحدیث کے احکام ومعانی سے پوری طرح واقف ہو۔ عالی ہمت اور بلند ظرف کا مالک ہو، سیدھی راہ چلنے والا اور چلانے والا ہو، میانہ رو اور زندگی میں افراط وتفریط سے گریز پا ہو۔ خوش مزاج وخوش اخلاق ہو، پکا دیندار ہو، اور عمیق حکمت ودانائی سے سرفراز ہو چکا ہو۔ ان اسباب میں غور وفکر کرتا ہو جن کی بدولت لوگ اس کی اطاعت کے لیے آمادہ ہوں۔ بہر حال یہ بہت ضروری ہے کہ وہ لوگوں سے افضل وبرتر ہو یا دینداری کی کیفیت میں یا علم میں یا ایسے غیر معمولی خارق عادت امور کے سرزد ہونے کے لحاظ سے جو دوسروں میں یا تو یکسر مفقود ہیں یا بہت کم پائے جاتے ہیں۔

وعظ وتذکیر کی بنا خطابیات پر ہے

لوگوں کو بھلائی کی تعلیم دینے والے کو چاہیے کہ وہ وعظ وتذکیر میں (منطقی دلائل کی بجائے خطابیات سے کام لے کر) لوگوں کی سطح فہم کے مطابق بات کرے اور کلام (وبیان اور علم کلام) کے دقیق وباریک مسائل میں الجھنے سے گریز کرے کیوں کہ اس صورت میں یا تو وہ لوگوں کو سمجھانے کے لیے غلط بیانی سے کام لے گا اور اس سے لوگوں کے اذہان وقلوب منتشر ہوں گے یا اگر اپنے علم کے مطابق ٹھیک ٹھیک بات کہے گا تو اس کے علم کا فائدہ مخاطبین کو حاصل نہ ہوگا بہر حال یہ مسلّمہ امر ہے کہ وعظ وتذکیر کے سلسلہ میں مؤثر ترین طریقہ اور عوام پر پوری طرح اثر انداز ہونے والا طرز بیان منطقی استدلال نہیں بلکہ خطابیات ہے۔

ارکان وعظ

وعظ وتذکیر کا پہلا رکن یہ ہے کہ واعظ سامعین کو ایسے عبرت انگیز واقعات سنائے جن کو سن کر دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھنچ جائے۔ دنیا کی ہوس رانیوں سے دل بیزار ہو جائے اور توشۂ آخرت جمع کرنے کا خیال دل میں جم جائے اور نفسانی خواہشات کے درپے رہنے سے دل ہٹ جائے۔ لیکن قصص بیان کرتے وقت یا ترغیب و ترہیب کی روایت سناتے وقت یہ احتیاط رہے کہ کوئی جعلی قصہ یا موضوع روایت ذکر نہ کیا جائے جیسے کہ اس عصر کے واعظین کرتے ہیں کیونکہ یہ تو ہدایت وروشنی کے بجائے گمراہی وتاریکی سے زیادہ قریب ہے۔ یہ ترغیب وترہیب اس انداز سے ہو کہ زمانہ کی گردش کی سرعت اور اس کے ایک نہج پر عدم ثبات کو اچھی طرح واضح کرے اس طرح (صحیح قصص انبیا، ایام اللہ اور آلا اللہ کے ذریعہ) تذکیر ووعظ سے لوگوں کی جبروتی ذہنیت اور سرکشی پاش پاش ہو جاتی ہے۔

وعظ کا دوسرا رکن یہ ہے کہ واعظ لوگوں کو نظام شرعی کی پابندی کے فوائد اور اس کی خلاف ورزی کے مفاسد ونقصانات سمجھائے۔ معاشرتی زندگی میں نظام کے فوائد اور اس کی خلاف ورزی کے مفاسد بیان کرتے وقت ماوراالعقل کلیات بیان کرنے سے گریز کر کے زیادہ تر جزئیات اور فروعی باتوں کا ذکر کرے اس طرز خطابت کا فائدہ زیادہ حاصل ہوگا۔

وعظ کا تیسرا رکن یہ ہے کہ اپنی تقریر وبیان میں دل نشین تشبیہات اور اثر آفریں استعارات اور اصناف سخن میں سے مجازات استعمال کرے اور اپنے بیان میں اسے بلند و عالی افکار وخیالات کو پیش کرے جو لوگوں کے دلوں کو تسلیم ورضا پر مجبور کریں اسے چاہیے کہ وہ مسلّمات اور مشہور روایات سے تمسک کرتا رہے۔

معلم الخیر کے اقسام

معلم یا تو براہ راست (الہام کے ذریعہ) عالم غیب سے علم حاصل کرتا ہوگا، اور غیب سے منصب تبلیغ وتعلیم پر مامور ہوگا، یا کسی ایسے ہی دوسرے معلم الخیر کے فیض صحبت کا

تربیت یافتہ ہوا اور اس سے سب الہامی علوم وفنون غور وفکر اور بحث ونظر کی کامل ترین شکل میں حاصل کر چکا ہوگا، اور ان وجوہ سے پوری طرح باخبر ہوگا جس کا قصد معلم اول کر چکا تھا، اور جن پر اس کی تعلیم کی بنیاد قائم ہے اس کو اسے معلم اول سے وہی نسبت ہوگی جو مجتہد فی المذہب کو مجتہد مطلق سے ہوتی ہے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ معلم خیر اس معلم اول سے راوی کے درجہ میں ہو، جو اپنے شیخ کے اسباق و دروس کے پوشیدہ اسرار کا علم رکھے بغیر اس کی باتوں کو بلاکم وکاست روایت کرتا ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگرچہ شریعت حقہ انبیا سے تواتر کے ساتھ نقل ہوئی ہے لیکن اس کی شرح (احکام) اسے قانونی شکل دینے اور اس کی اقامت واجرا کی صورت ہمیشہ مختلف رہی ہیں۔ اب جس کو (شریعت حقہ کی بنیادی اور اصلی صورت یعنی) اسلام وسنت ثابتہ کا تفصیلی علم حاصل ہوا اور ان میں ہر بات کی اصل وماخذ معلوم کر سکا تو اسے علم نبوت کے بعد دوسرے اعلیٰ ترین قسم کے علم پر فائز ہونے کا شرف حاصل ہوا اور جس نے سنت محمدیہ کو شریعت حقہ کے استناد کے بغیر پالیا (یعنی وہ نہیں جانتا کہ مسائل کے ماخذ کیا ہیں تو وہ اگرچہ اس رتبہ عالیہ سے محروم رہا پھر بھی اس کا وجود غنیمت ہے۔ ہمارے نزدیک ان دو درجوں کے بعد علما کا تیسرا درجہ نہیں ہے، بلکہ اس کے بعد متعلمین کے مراتب شروع ہوتے ہیں۔ علما اور طلاب علم دونوں کے متعلق بہت سے اصولی اور فروعی آداب ہیں جن کو اگر بیان کیا جائے تو اختصار کے اس دائرہ سے ہم آگے نکل جائیں گے۔ جس کی شرط ہم نے اس کتاب میں لگادی ہے۔ (اس لیے اسی پر اکتفا کی جاتی ہے۔

سترھویں فصل

متولی ونقیب کے آداب وفرائض

ضروری ہے کہ متولی یا نقیب اپنی قوم کا عادل ومعتبر آدمی ہو جو اپنی قوم کے مصالح و مفادات اور مفاسد ومضرت رساں امور کو اچھی طرح جانتا ہو، اسے اپنی قوم کی حالت کا علم ہو اور جن حالات سے اس کی قوم دوچار ہے ان حالات (کے اسباب ووجوہ) میں دوررس نگاہوں سے کام لینے والا ہو۔

اموال متروکہ کی مناسب تقسیم

نقیب شہر کے فرائض میں سے ایک فرض یہ ہے کہ جب کوئی فوت ہو جائے اور مال چھوڑ جائے وہ اسے مناسب مصرف میں لگادے کیونکہ عدم تقسیم یا عدم صرف کی صورت میں مال کے ضائع ہو جانے کا اندیشہ ہو جس وقت متولی مال متروکہ تقسیم کرے تو دو باتوں کا خیال رکھے۔

پہلے یہ کہ اس مال سے وہ لوگ مستفید ہوں جو مرنے والے کی زندگی میں اس کے شریک رنج وراحت رہے ہوں۔ اور دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ مددگار اور نفع رساں ثابت ہوئے ہوں نیز میت ان کے ساتھ سچی ہمدردی اور محبت حقیقی کے روابط میں منسلک تھا اور وہ مالی لین دین اور مبادلات کے ذریعے ایک دوسرے کی اعانت کرتے تھے۔

دوسرے یہ کہ ان لوگوں کا حق ہے جن کے متعلق یہ گمان غالب ہو کہ اگر میت زندہ ہوتا اور اسے مال کی خود ضرورت نہ ہوتی اور اس سے پوچھا جاتا کہ اس کا مال کن لوگوں کو دینا مناسب ہے تو وہ انہیں کی طرف اشارہ کرتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مال کا اصل مالک تو میت ہی ہے۔ اور تقسیم کا اختیار اسی کو حاصل ہونا چاہیے۔ (لیکن یہ اور بات ہے کہ وہ اس مال میں اس وقت تصرف کرنے پر قادر نہیں ہے) علاوہ ازیں جب اقربا اور رشتہ داروں کو چھوڑ کر دوسروں کو مال متروکہ دیا جائے گا تو ان کے دلوں میں (میت کی زندگی میں اس سے اور میت کے بعد

دوسرے وصول کنندگان سے) عداوت اور دشمنی پیدا ہوگی۔ بعبارت دیگر زندگی میں مواساۃ و غمگساری اور تعاون وتناصر کی حقیقت میت کے مال سے دولت مند ہونے کی امید سے وابستہ ہے مگر جب یہ گمان پیدا ہوجائے کہ مرنے والے کا مال دوسروں کو دیا جائے گا تو رشتہ داروں کے دلوں میں یہ خیال جاگزیں ہوگا کہ ان سے اپنا ہی مال زبردستی چھین لیا گیا ہے۔

یہ جو قاعدہ ہم نے اوپر بتایا اس کے مطابق اجمالاً یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قرابت کی ترتیب میں سب سے مقدم اولاد ہے۔ اس کے بعد ابوت کا رشتہ ہے۔ پھر زوجیت کا تعلق ہے۔ بعد میں بھائی اور چچے کا رشتہ ہے، پھر اس اجمال کی تفصیل اشخاص کے اختلاف حال کے ساتھ مختلف رہتی ہے جس کو ضبط تحریر میں لانا دشوار ہے۔

فقرا و مساکین کی اعانت

نقیب کا یہ بھی فرض ہے کہ جب اس کی عملداری میں کوئی مہمان یا فقیر و مسکین داخل ہوجائے اور وہ روزی کے اکتساب سے عاجز ہو تو اس صورت میں لوگ (خود اپنی مرضی سے یا بذریعہ ٹیکس) چندہ کرکے معقول رقم جمع کریں اور اسے (فقرا، مساکین اور مہمانوں پر خرچ کرنے کے لیے) اس کے حوالہ کریں۔

نیز اس میں معاشرہ اور آبادی کی پُرامن زندگی کے لیے بے شمار فائدے مضمر ہیں کیونکہ یہ تو نہیں ہوسکتا کہ تمدن کی یہ حالت ہو اور وہاں اس قسم کے حاجت مندوں کا ورود و وجود نہ ہو اور جب ان کے فقر و افلاس اور خورد و نوش یا سر چھپانے کی ضروریات کا انتظام نہ ہو تو وہ شدت احتیاج سے تنگ آئیں گے اور تخریبی کاموں میں پڑنے اور غیر اخلاقی باتوں کے ارتکاب سے کبھی گریز نہیں کریں گے۔ اور اس طرح چوری، ڈاکہ زنی، قتل و زنا وغیرہ جرائم ہوں گے) اسی ہمدردی اور ایثار پر آمادہ کرنے والی دوسری بات یہ بھی ہے کہ انسان کی فطرت میں ابنائے نوع انسانی سے سخاوت و مہربانی کا جذبہ رکھا گیا ہے اور وہ سخاوت اور ہمدردی کو مستحسن بھی سمجھتا ہے۔

چونکہ ہر وقت اس قسم کا سرمایہ جمع کرنا مشکل ہوتا ہے اس لیے ارتفاق ثالث (یعنی حکومتوں کے ارباب حل وعقد) کا یہ فیصلہ ہے کہ اس کا مناسب اور بہترین وقت غلّہ اور

فصل کے اٹھانے کے دن ہیں۔

ناتواں مسافروں کی دست گیری

نقیب کا یہ بھی فرض ہے کہ جب وہ کسی سفر پر قوم کے ساتھ ہو تو سب سے کمزور مسافر کی حالت کو ملحوظ رکھ کر چلے اور عام طور پر کمزوروں اور پیدل چلنے والوں کا خاصا خیال رکھے اور ان کا بوجھ ہلکا کر کے ان کی دست گیری کرے (وہ سردار قوم کی حیثیت سے خادم قوم ہوتا ہے)۔

ضروری اجتماعی اداروں کی تشکیل و تعمیر

نقیب کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ جب اس کی قوم تمدن کی اس اونچی منزل (ارتفاق ثالث) پر پہنچ کر زندگی بسر کرنے کے لیے تیار ہو جائے تو وہ شہر کے اردگرد فصیل تعمیر کرائے اور شہر کے عین وسط میں بازار بنوائے جس کا فاصلہ اور فائدہ شہر کے سب گوشوں کے لیے یکساں ہو۔ جو لوگ قریبی رشتہ دار یا ایک قبیلہ کے ہوں یا ایک ہی پیشہ سے منسلک ہوں ان کی آبادی علیحدہ ہو، چوپال یا مرکز کی طرح ان کے لیے ایک جائے اجتماع بھی ہو جس میں بوقت ضرورت وہ اکٹھے بیٹھ سکیں۔ شہر کے قریب کوئی ایسا میدان ہونا چاہیے جس میں وہ خود بھی اجتماعی رنگ میں جمع ہو سکیں) مثلاً عید کی نماز پڑھ سکیں، یا کوئی اجتماعی تقریب منعقد کر سکیں اور جہاں ان کے چوپائے بھی پناہ لے سکیں۔ ہر محلّہ میں ایک مسجد ہو جس کے ساتھ (وضو اور غسل کے لیے) پانی وغیرہ کا انتظام ہو، ہر محلّہ کی مسجد میں امام، مؤذن وغیرہ کا انتظام بھی لازم ہے۔ نیز ہر ایک محلّہ میں ایک درس گاہ ہو جس میں اس محلّہ کے بچوں کو تعلیم دی جائے اور پڑھانے کے لیے قابل اساتذہ بھی میسر ہوں۔

بعض علما نے امور مذکورہ (مسجد، درس گاہ، اساتذہ وغیرہ کے انتظام) کو معلم الخیر کے فرائض میں سے شمار کیا ہے۔

مرجع العوام عند النوائب

بہر حال قوم کو جو بھی مشکل پیش آئے وہ اپنے سربراہ یا متولی کی طرف رجوع کریں اور اس کی اعانت حاصل کریں۔

اٹھارھویں فصل

امام کے معاون

معاونوں کی ضرورت اور بنیادی شرائط

چونکہ امام ان سب مصالح اور امور خلافت کو تنہا انجام نہیں دے سکتا اس لیے یہ ضروری ہے کہ وہ نظام تمدن کے ان شعبہ ہائے پنجگانہ میں سے ہر ایک شعبہ کے لیے معاونین مقرر کر لے، معاونوں کے لیے بنیادی شرائط یہ ہیں کہ وہ عادل ہوں ان میں مفوضہ شعبہ کے چلانے کی پوری قابلیت ہو اور ظاہر و باطن میں امام کی ہدایات کے پابند اور احکام کے فرماں بردار ہوں اور کسی قسم کی روگردانی اور اعراض نہ کرتے ہوں۔ (جو معاون ان مذکورہ اوصاف سے متصف نہ ہو وہ اس لائق نہیں کہ اس کا تقرر کیا جائے) اور جو معاون تقرر کے بعد ان شرائط میں سے کوئی شرط کھو بیٹھے تو وہ منصب سے ہٹائے جانے کا مستحق ہے (اسے ہٹانا چاہیے) کیونکہ اگر امام یا بادشاہ اس کو منصب سے نہ ہٹائے تو نظام میں بگاڑ پیدا ہو جائے گا۔ عقل مندی کا تقاضا یہ ہے کہ ان لوگوں کو معاونین کی حیثیت سے تقرر نہ دیا جائے۔ (جو نہایت ہی بارسوخ واثر والے ہوں اور) جن کو معزول کرنا مشکل و دشوار ہو یا امام پر بوجہ قرابت داری یا احسان ان کے کچھ حقوق عائد ہو چکے ہوں جن کے پیش نظر بعد میں انھیں منصب سے معزول کرنا اخلاقاً مناسب نہ ہو۔ بہتر یہ ہے کہ امام، صاحب استطاعت ہے تو اس قسم کے لوگوں کے ساتھ اپنی ذاتی جائیداد سے یا کسی اور مناسب طریقے پر احسان کرے۔

امام یا بادشاہ کے سات معاون

امام کو نظام حکومت چلانے کے لیے سات معاونوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان ساتوں معاونوں کے اوصاف لازمہ یہ ہیں کہ وہ وفادار و فرماں بردار ہوں، خیر خواہ اور

خیر اندیش ہوں، (استعداد و صلاحیت کے ساتھ ساتھ) امام سے بے پناہ دلی محبت رکھتے ہوں۔ یہ سات معاون درج ذیل ہیں:

(۱) وزیر (وزیر اعظم) جو تمام ماتحت حاکموں کے لیے ذمہ دار ہوگا، اسے لوگوں سے اموال جمع کرنے اور ان کو مناسب طور پر شعبوں میں تقسیم و خرچ کرنے میں ماہر ہونا چاہیے۔ اور نظام ملک میں اقتصادیات آمد و خرچ وغیرہ کی ذمہ داری اس پر عائد ہوگی۔

(۲) امیر الغزاۃ سپہ سالار اعظم (یا کمانڈر ان چیف) جو غازیوں اور مجاہدوں کو جمع و منظم رکھنے کا ذمہ دار ہوگا۔ کمانڈر ان چیف کو فوجوں کے حالات و کوائف زندگی کے بارے میں پوری معلومات ہونے چاہئیں۔ اور ان کو باہمی الفت و مؤدت کے رشتہ میں پرونے میں پُر وقار ہونا چاہیے۔ اس کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ اس کے پاس کتنی مسلح فوج ہے اور ہر ایک فوجی (یا فوجی یونٹ) کی حربی صلاحیت کیا ہے۔ اور جنگی ساز و سامان کے لحاظ سے ان کی استعداد کتنی ہے۔

(۳) امیر الحرس (پولیس جرنیل) جس کا فرض منصبی یہ ہوگا کہ وہ (لوگوں کی جانوں، مالوں اور آبروؤں کی حفاظت کرنے کے لیے) شہر و ملک کے ظالموں اور تعدی کرنے والوں پر کڑی نگرانی رکھے اور ان کے ظلم و جور اور طغیان و سرکشی کے خلاف (قانونی چارہ جوئی اور) تادیبی کارروائی سے گریز نہ کرے۔

(۴) قاضی (قاضی القضاۃ یا چیف جسٹس) جو لوگوں کے مقدمات اور خصومات کے فیصلہ کرنے کا ذمہ دار ہوگا بہتر یہ ہے کہ وہ لوگوں کو اس بات کا پابند بنائے کہ وہ اپنے معاملات اور عقود اور معاہدہ بھری مجلسوں میں منعقد کیا کریں۔ جن میں عقد کے لیے گواہ، گواہوں کے تصدیق کرنے والے معتمد لوگ اور عقود کی جملہ شرائط کو دستاویز کی شکل میں ترتیب دینے والے کاتب (یا عرضی نویس) موجود ہوں۔

(۵) شیخ الاسلام: جس کا فرض منصبی یہ ہوگا کہ وہ اقامت دین اور اشاعت اسلام کے ساتھ ساتھ تبلیغ دین کے اہم شعبوں کا انتظام کرے۔ اس کے ساتھ رفقائے کار اور معاونین بھی ہونے چاہئیں جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے مقدس فرض کی تکمیل میں اس کا ہاتھ بٹا سکیں۔

(۶) حکیم (ناظم علوم ادبیہ وطبیہ) امام کے دربار میں ایک ناظم علوم افادیہ ادبیہ

وطبیہ بھی ہونا چاہیے جو (علوم وفنون متداولہ مثلاً) علم طب، فن شعر وشاعری، علم النجوم، تاریخ، حساب اور انشا وادب سے واقف ہو۔ مشاہدہ سے یہ امر واضح اور ثابت ہے کہ امام کو اپنے دربار میں ان علوم کی (اور اس قسم کی شخصیت کی) ضرورت محسوس ہوتی ہے (جو ان علوم وفنون سے باخبر اور ان کی صحت واصلاح، تعلیم وتعلم اور درس وتدریس پر قادر ہو)۔

(۷) وکیل (خان ساماں وناظر خانہ) اس کا اپنا ذاتی وکیل اور خان ساماں ہونا چاہیے۔ جو اس کے آمد وخرچ کے حسابات کی نگرانی کرے یہ اس لیے ضروری ہے کہ امام رعیت کے امور اور نظام حکومت میں اس قدر مشغول رہتا ہے کہ وہ اپنے معاشی مسائل کی طرف ذاتی توجہ مبذول نہیں رکھ سکتا اور اس طرح بے انتظامی کی وجہ سے اس کے معاشی وسائل کے استحکام میں خلل پڑتا ہے۔

معاونین پر کڑی نگرانی رکھنا، امام کا فرض ہے

امام کو اپنے نائبین اور معاونین سے غافل نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس کو چاہیے کہ وہ ہر روز، دو روز (یا مناسب وقفوں) کے بعد ان عہدہ داروں کے حالات اور کارکردگی کے بارے میں پوچھا کرے اور اپنی ذاتی رائے اور عقل وفراست کے ساتھ ان کی مناسب رہنمائی کرے۔ ان کو بے لگام آزادی نہیں دینی چاہیے اگر ان کی کارکردگی اور فرض منصبی کی ادائیگی واضح طور پر اچھی ہے تو ان سے خوشنودی کا اظہار کر کے ان کی قدر افزائی کرے تاکہ وہ مزید بہتر کارکردگی دکھانے کی سعی کریں۔ اگر ان سے کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو ان کی اصلاح کے لیے مؤثر زجر وتوبیخ سے کام لیا جائے۔

اگر کسی شخص کے متعلق امام کو یہ خوف ہو کہ عالی منصب ملنے پر اس کا مزاج بگڑ جائے گا اور طوق اطاعت پھینک دیگا تو ایک بہتر تدبیر یہ ہے کہ اس کے سپرد محکمہ اور منصب کو مصلحت کے مطابق دو یا دو سے زیادہ اشخاص کے سپرد کرے۔ اس طرح کی باغیانہ کیفیت مزاج کی شدت ٹھنڈی پڑ جائے گی۔

امام اور معاونین امام کی تنخواہ قوم کے ذمہ واجب

چونکہ امام اور اس کے ساتھ کام کرنے والے عہدہ داروں نے اپنی زندگیاں قوم کی

خدمت اوران کی ضروریات پوری کرنے کے لیے وقف کررکھی ہوتی ہیں۔اس لیے ضروری ہے کہ ان کے لوازم حیات اور معاشی حاجتوں کا بوجھ قوم پر ڈالا جائے ان کی مثال اجیروں (اُجرت پر مزدوری کرنے والوں) کی ہے جو قوم وملت کے لیے مفید خدمات انجام دے کر اس کا معاوضہ حاصل کرتے ہیں۔اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے عام لوگوں سے مالیہ (اور ٹیکس) وصول کرنے کی ضرور پڑ جاتی ہے تاہم ٹیکس کی شرح ومقدار معین کرنے میں امام ظلم وجور سے اجتناب کرے اور عدل وانصاف (اور احسان وشفقت) سے کام لے تاکہ کسی کے لیے اس کا ادا کرنا بارگراں اور ناقابل برداشت نہ ہو۔بہتر تو یہ ہوگا کہ مالیہ کی وصولی کا ایک مقرر ضابطہ ہو (جسے ہر خاص وعام جانتا ہو اور) جو ایک طرف معاونین کے اخراجات کے لیے کافی ہو،اور دوسری طرف عوام کے لیے ضرررساں نہ ہو۔

ایسا قاعدہ یا قانون ہر جگہ اور ہر قوم کے لیے یکساں نہیں ہوسکتا۔کسی جگہ طریقۂ وصولی ایک قسم کا ہوگا اور شرح ومقدار بھی مخصوص ہوگی اور دوسری جگہ طریقہ اور شرح ومقدار مالیہ کی دوسری صورت ہوگی (بارانی اور نہری زمین کی پیداوار میں فرق قدرتی امر ہے۔اسی طرح شہری اور بدوی زندگی میں فرق بھی واضح ہے)۔

امام کو چاہیے کہ ایک بیت المال بنائے جس میں مالیہ وغیرہ وصول کردہ اموال کو بحفاظت جمع کرسکے اوران میں سے بوقت ضرورت مناسب طریقہ پر خرچ کرسکے۔

امام کے لیے بہترین ذریعۂ معاش

بہتر یہ ہے کہ امام بیت المال یا سرکاری خزانہ سے لینے کے بجائے ایک غیر آباد زمین منتخب کرے جس کو آباد کرا کے اس کی آمدنی ذاتی ضروریات میں صرف کرے اسی طرح اس کے پاس چوپاؤں کے ریوڑ ہوں اوران سے فائدے حاصل کرے کیونکہ یہ اس کے لیے سب سے زیادہ نفع بخش اور سودمند ذریعہ ہے۔اور قوم کے لیے بھی آسان اور قابل برداشت ہے۔

جب امام کو یہ معلوم ہوجائے کہ اس کے عزیز واقارب اس کی حمایت اور آمدنی کے لیے دل وجان سے حاضر ہیں تو ان کی قدردانی میں کوئی کسر باقی نہ رکھے کیونکہ دوسروں کی نسبت قرابت داروں کی اعانت دوچند اعتماد کی موجب بنتی ہے۔

انیسویں فصل

(ارتفاق رابع)

خلیفۂ اعظم کی ضرورت

جب ہر ایک سربراہ کو کسی ایک شہر یا متعدد شہروں میں انفرادی حیثیت واقتدار حاصل ہو جاتا ہے اور لوگوں کے اموال وذرائع دولت اس کے ہاتھ میں آجاتے ہیں۔اور جنگجو اور شجاع افراد اس سے محبت وحمیت کے جذبے سے سرشار ہو کر اس پر جان نثار کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔تو ہوس ملک گیری اور باہمی بغض وعداوت ان کے اندر بھڑک اٹھتی ہے۔ اور سربراہوں کے درمیان کشمکش اور لڑائیاں شروع ہو جاتی ہیں اس طرح (بیش قیمت) انسانی جانیں فنا اور اطمینان کی زندگی ختم ہو جاتی ہے۔اور تہذیبی اور تمدنی زندگی کے ہر شعبہ میں زبردست خلل وفساد پیدا ہوتا ہے اس کا علاج صرف یہ ہے کہ ان سربراہوں میں ایک خلیفۃ الخلفا ہو جس کے پاس اتنا ساز وسامان ہو،اس کی حمایت کے لیے اتنی صاحب حمیت رعیت ہو، اس کے لشکر میں اتنے بہادر جمع ہوں کہ کسی دوسرے شخص کے بارے میں یہ ناممکن ہو کہ اس سے حکومت وامامت بزور شمشیر چھین سکے۔اور اگر کسی طرح یہ فرض بھی کیا جائے کہ اس کا اقتدار چھین سکتا ہے۔تو یہ صرف اس صورت میں ممکن ہوگا۔جب کوئی بڑا فتنہ بپا ہو جائے اور اس کے خلاف مختلف علاقوں میں بار بار بڑے ہنگامے برپا ہوں۔اور مخالف بے دریغ مال ودولت خرچ کرے اور بہت سخت مشقت اور بڑی جدوجہد سے کام لے تب ہو سکتا ہے کہ اس قسم کا کوئی مخالف امام سربراہ کو منصب سے ہٹا کر تختِ حکومت پر بیٹھ جائے۔اور یہ طرز حکومت (یعنی خلیفۃ الخلفا) یا اس کے خلاف اسی طرح کے واقعات ہر جگہ یکساں نہیں

ہوتے بلکہ اشخاص اور عادات کے اختلاف کی بنا پر اس کی صورتیں مختلف ہوا کرتی ہیں۔

جب یہ چھوٹے چھوٹے امیر اور حاکم خلیفہ نصب کرنے کے معاملہ میں ایک دوسرے سے برسر پیکار ہوں اور کسی ایک کو خلیفۃ الخلفا مقرر کرنے پر طوعاً و کرہاً کسی صورت میں متفق نہ ہو سکتے ہوں تو یہ (طوائف الملو کی یا فوضویت) لا علاج مرض ہے۔ سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت سے کوئی ایسا قاہر و جابر شخص پیدا کرے جس کو تائید غیبی حاصل ہو اور طالع سعید اس کا معاون ہو۔ اور اس کے دل میں اس طوائف الملو کی کے خلاف غیظ و غضب کی زبردست آگ بھڑک اٹھتی ہو۔ اور وہ اپنی جاذب شخصیت و شجاعت کی بدولت زبردست جنگجو اور فرماں بردار فوج تیار کر کے ان سربراہوں کے خلاف برابر جہاد کرے۔ اور زمین کی انتہائی سرحدوں اور دُور دراز گوشوں میں بھی ان کی سرکشی کو پاش پاش کرے، مگر یہ صورت ہر آن پیش نہیں آتی، اس لیے ضروری ہے کہ سربراہان ممالک اسلامیہ ارتفاق رابع یعنی بین البراعظمی اور بین المملکی سطح پر حکومت کے طریقے اور خلیفۂ اعظم کے انتخاب و تقرر کے اصول و آداب کی پابندی کریں۔ تا کہ نوع انسانی کے تمدن زندگی میں فساد پیدا نہ ہو۔

خلیفۂ اعظم کے آداب و اخلاق

خلافت عظمیٰ نہایت ہی سخت کٹھن اور مشکل کام ہے اس لیے اس پر جو شخص فائز ہوگا اسے اخلاق فاضلہ کے زیور سے بدرجۂ کمال و تمام آراستہ ہونا چاہیے۔

اسے چاہیے کہ ہر صوبہ یا ہر حصۂ خلافت کی طرف کسی کو امیر اور حاکم بنا کر بھیجے اور دیکھے کہ اس کا حاکم غیب و شہود ہر حالت میں اس کا بہی خواہ ہو اور اس کا قلب و دماغ اپنے خلیفۂ محسن کی محبت سے لبریز ہو۔ جب وہ اپنے کسی حاکم کو اعراض و بے رخی پر آمادہ دیکھے تو فوراً اس کو راہ راست پر لانے کے لیے مناسب تادیبی سزا دے اور زجر و توبیخ سے کام لے۔

خلیفہ اعظم کو چاہیے کہ وہ اپنی فوجوں کے فرائض و لوازم کو معین اور منضبط رکھے۔ استقرا سے معلوم ہوتا ہے کہ فوج کے بڑے بڑے دو فرض ہیں:

(الف) بنیادی فوجی اور عسکری خدمات و فرائض یعنی بادشاہ یا امام یا حکومت کے

لیے (دشمنوں سے جزیہ یا مال غنیمت اور رعایا سے مالیہ وغیرہ) تحصیل اموال۔ اور

(ب) مملکت کو (اندرون وبیرونی ایسے باغیوں سے جو گروہ بندیوں کے عادی ہوتے ہیں، محفوظ رکھنے کے لیے جہاد و جنگ کرنے کا فرض۔

خلیفہ ان فرائض کو بھی متعین اور منضبط رکھے جو فوج سے متعلق نہیں یعنی پولیس، تعلیم وتربیت، قضا وانصاف اور احتساب اور نگرانی کے محکمے، ہر ایک محکمہ جو فوج سے متعلق نہیں اس کے انتظام کے لیے ایک قابل واقف کار شخص ایسا مقرر کرے جو عادل بھی ہو اور لوگ بھی اس کے تقرر پر راضی ہوں اور وہ قوم میں سیادت اور عز وجاہ کے مالک ہوں۔

(یعنی مناسب یہ ہے کہ امام نظم حکومت کے غیر فوجی شعبوں کے انتظام کے لیے بھی ایسے قابل آدمی مقرر کرے جو اپنے فرائض کو نہایت خوبی کے ساتھ انجام دے سکیں۔ اس صورت میں تعلیم وارشاد، افتا وقضا، اور نقابت وحسب وغیرہ ہر ایک شعبہ کے لیے جداگانہ قابلیتوں اور استعدادوں والے اشخاص کی ضرورت ہوگی۔ یہ ایسے اشخاص ہوں جو لوگوں کی نظر میں پسندیدہ ہوں کسی معزز و با اثر خاندان سے تعلق رکھتے ہوں اور قابل افراد ہوں)

ان سب شعبوں کے عہدہ داروں سے حلفیہ بیان اور سخت غلیظ قسم لیا جائے کہ وہ کبھی سیف وتفنگ کا استعمال نہ کریں گے اور اگر صاحب الحسبۃ اور پولیس کو بھی کسی سے قصاص لینے اور راہزنوں کو پھانسی پر چڑھانے کی ضرورت پڑے تو یہاں بھی وہ ہتھیار کا استعمال فوج کے سربراہ کی مدد اور اس کی اجازت کے بغیر نہ کرے گا۔ (یعنی ہتھیار کا استعمال اصولاً فوج تک محدود ہو)

خلاصہ یہ کہ فوج کے علاوہ دوسرے لوگوں کے لیے یہ گنجائش نہ چھوڑے کہ وہ ہتھیار اور اسلحہ سے کام لیں۔ (تاکہ فوجی ٹریننگ تنظیم اور ضبط وغیرہ میں کوئی فرق نہ آئے)۔

اور اگر کہیں یہ نظر آئے کہ کسی شخص کے اردگرد لوگ بکثرت جمع ہونے لگے ہیں۔ تو امام کو غافل نہیں رہنا چاہیے۔ بلکہ بغیر کسی تاخیر یا تضیع وقت کے اس کے حلقہ کو توڑ ڈالے اور اس کی موہوم بغاوت کے اسباب ووسائل کو ختم کر کے سانس لے۔

جب وہ مطلوبہ بنیادی خدمات کے لیے فوج کو مختلف حصوں میں تقسیم کر دے تو اس کو یہ بھی چاہیے کہ ان سب پر کڑی نگرانی رکھے اور جاسوسوں کا جال پھیلا کر صورت حال

سے مطلع رہے اور اس معاملے میں پوری فراست اور تدبر سے کام لے۔ پھر جب کبھی کسی کی طرف سے خلافت کے منصب پر خود فائز ہونے کی طلب یا خلیفہ کی مخالفت کے آثار دیکھے تو امام کو چاہیے کہ وہ (اس کی اس مذموم کوشش کو ناکام بنادے اور) اسے کیفر کردار تک پہنچاوے۔ جب کسی فرد یا افرادِ لشکر کے پاس (معاندانہ) محفلوں کا انعقاد ہو (جس سے اندیشہ ہو کہ امام کے خلاف سازش یا بغاوت پر آمادہ ہوں گے) تو ان کی ہمت شکنی اور استیصال قوت کے لیے مدمقابل اور مخالف کی حیثیت سے کوئی دوسرا گروہ ایسا کھڑا کرنا چاہیے کہ ان کے آپس میں اختلافات اور لاینحل مناقشات ایسے ہوں کہ وہ انہی میں الجھ کر رہ جائیں اور عادتاً یہ ناممکن ہو کہ یہ دونوں گروہ امام کے خلاف ریشہ دوانیوں اور منصوبہ بندیوں کے لیے آپس میں متفق ہوسکیں۔

یہ وہ آداب ہیں جن کو انعقادِ خلافت کے بعد ملحوظ رکھنا پڑتا ہے۔ رہا تحصیل منصب خلافت کا مسئلہ، تو اس میں اس وقت تک کامیابی نہیں ہوسکتی جب تک بڑے بڑے سربرآوردہ لوگ مدبرین سیاست اور سپہ گری اور امور حرب کے ارباب بصیرت اس کے ساتھ مل کر پُرخلوص اعانت نہ کریں۔ اور وہ سب اس کی فضیلت و برتری کے قائل ہو کر اطاعت نہ کریں۔ اور جب تک اس کی حمایت کے لیے دو تلواریں نہ ہوں۔ یعنی ایک سیف القہر (غلبہ اور جنگ کی تلوار) جو دشمن کو نیست و نابود کرتی ہے اور دوسری سیف المحبت (محبت کی تلوار) جو دشمنوں کو احسان اور حسن سلوک کی بیڑیوں میں جکڑ کر زیر کرتی ہے۔

امام کو ان دونوں سے بوقت ضرورت کام لینا اور ان دونوں کو واضح طور پر سامنے لانا چاہیے (کہ اس میں قہاریت اور غفاریت دونوں اوصاف کی جھلک موجود ہے)۔

بیسویں فصل

تحقیق حقیقت رسم اور بہتر رسوم کا بیان

(اس موضوع کا تعلق ارتفاق ثانی وثالث کے قواعد کلیہ کے بعد کے مباحث سے ہے)

تقلید فطری خاصہ ہے

نوع انسانی پر اللہ تعالیٰ کی یہ بھی ایک بڑی عنایت ہے کہ ان کی سرشت میں تقلیداً اخلاق اور ارتفاقات قبول کرنے کا مادّہ رکھا ہے (کہ وہ دوسروں کے طریقوں اور عملی تدبیروں، اور اچھے نمونوں کی پیروی پر قادر ہیں۔ اور ان کی نقل اتار سکتے ہیں ورنہ) اگر انسانوں کو اپنی حیوانی طبیعت پر آزاد چھوڑ دیا جاتا اور ان میں سے کوئی بھی کوئی عمل اس وقت تک انجام نہ دے سکتا جب تک اس کی طرف اس کی فطرتِ انسانیہ، علوم الہامیہ واکتسابیہ، تجارت ذاتیہ ونوعیہ اور اس کے ملکات واخلاق اس کی رہنمائی نہ کرتے اور وہ کسی کی تقلید نہ کرتا، تو ان پاکیزہ اخلاق اور بہترین وجوہ معاش وارتفاقات کا سراغ انسان کو یکے بعد دیگرے (گاہ گاہ) ملتا (صرف اِکے دُکّے افراد ان سے مستفید ہوتے) اور دنیا کے عام لوگ ارتفاقات کو عام کرنے سے محروم رہتے۔ بلکہ انسانوں کی اکثریت بہیمی سطح زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوتی لیکن چونکہ ایسا نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو صرف بہیمی طبیعت پر آزاد ومہمل نہیں چھوڑا بلکہ اس نے ان کی عقلوں کو آئینوں کی طرح اس قابل بنایا کہ دوسروں کا علم، تجربہ اور مختلف علمی وعملی تدبیروں کی صورتیں ان میں منعکس ہوتی ہیں اور وہ ان کے مطابق تقلیداً اسی قسم کے اعمال صادر کرتے رہیں۔ اگرچہ ان کو اخلاق وارتفاقات کا راز اپنے اکتسابی علوم کے ذریعہ معلوم نہ بھی ہوا ہو۔

ائمہ ومقلدین

پھر اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو جو (اُن) ہفت گانہ اخلاق فاضلہ سے کامل طور پر متصف ہیں (جن کی تفصیل پہلے ہو چکی ہے) فطری طور پر ائمہ اور سیادت وقیادت کا حقدار بنایا ہے اور باقی سب لوگوں کو بالطبع اُن کا مقلّد اور مطیع وفرماں بردار بنا دیا ہے۔ اور جب تک کوئی رسم فاسد ان کی طبیعتوں میں کوئی تغیر فاسد پیدا نہ کرے، ائمہ ومقلّدین کی یہ تقسیم برابر جاری رہے گی (اصحاب اخلاق سبعہ ہمیشہ امام رہیں گے اور باقی لوگ پیروکار مقلّدین)۔

تقلید ورسم کی پابندی خاصۂ حیوانی ہے

دوسروں کی یہ پیروی کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو صرف انسان کے لیے خاص ہے۔ اگر بنظر امعان وتحقیق دیکھا جائے تو رسم وتقلید سے چوپائے بھی خالی نہیں ہیں۔ مثلاً ایک کبوتر کو دیکھ کر دوسرا کبوتر بھی وہی کرتا ہے۔ اور اس کی مثال کی تقلید کرتا ہے۔ یہ بات بدیہی طور پر معلوم ہے کہ جس حالت پر کبوتر نے اپنے دوست کو کام کرتے ہوئے دیکھا تھا اور جس کی تصویر اس کے تختۂ ذہن پر منقوش ہوتی ہے، اسی نقشہ نے اس میں اس کام کا شوق پیدا کیا ہے۔

پابندی رسم ورواج تہذیب انسانی کے لیے ضروری ہے

رسم ورواج کی فطری پابندی اس سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ تم بہت سے آدمیوں کو ان مروجہ طریقوں کے مطابق نکاح کرتے ہوئے پاؤ گے جن کا ذکر ہم تدبیر منزل کے مباحث میں کر چکے ہیں۔ لیکن اگر ان سے پوچھا جائے کہ نکاح کے ان مخصوص شرائط وحدود کی رعایت برتنے پر کس چیز نے تم کو آمادہ کیا؟ ہزار میں سے ایک بھی اس کا جواب سوائے اس کے نہ دے سکے گا کہ ہمارے آبا واجداد ایسا ہی کرتے چلے آرہے ہیں۔ اگر نکاح کے شرائط وحدود میں سے کوئی ایک بھی نظر انداز ہو جائے تو لوگ اسے معیوب سمجھتے ہیں۔ اس قسم کا شخص اگر آبائی رسم ورواج کا پابند نہ رہے تو وہ چوپاؤں کی سطح پر زندگی گزارنے پر اتر آئے گا۔

تقلید رسم کے لیے خارجی مؤید کا ہونا ضروری ہے

انسانی طبیعت میں رسم کا پابندی کے اس فطری داعیہ کے علاوہ رسم کے ساتھ پوری

وابستگی اور اس کی مکمل پابندی کے لیے خارجی مؤید کی بھی ضرورت ہے اور وہ یہ کہ یا اس کی ابتدا کسی جلیل القدر سیاسی ہستی اور مقتدر بادشاہ سے ہوئی ہو جس کے اثر ونفوذ سے سب مرعوب اور اس کے سامنے سب سرنگوں ہوتے ہیں۔ یا اس کی اجرا کسی ماہر حکیم اور روشن دماغ فیلسوف نے کی ہو۔ (اور لوگوں کو یقین ہو کہ اس حکیم کا کوئی کام خالی از حکمت نہیں ہوتا) یا اس رسم کے اندر ایسی حکمتیں اور فائدے مضمر ہوں کہ اس کے چھوڑنے سے بیکراں نقصانات کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اور لوگوں نے بارہا اس کا تجربہ بھی کیا ہو کہ اس رسم کے چھوڑنے سے آپس کے تعلقات بگڑ جاتے ہیں۔ اور یا ان کا عقیدہ ہو کہ اس رسم کی پابندی نہ کرنے سے غیب سے عقوبت وعذاب نازل ہوگا۔

(یہی وجہ ہے کہ) ہر ملک وقوم میں گفتگو، لباس اور شادی بیاہ اور غم والم کے موقعوں پر مخصوص رسمیں ہوتی ہیں جنھیں لوگ ترک کرنے کے لیے بالکل تیار نہیں ہوتے۔ اور پھر ان رسموں اور رواجوں کا باہمی اختلاف اور تنوع ایک ایک شہر ایک ایک قبیلہ اور ایک ایک شاخ تک ممتد ہوتا ہے۔

الناس علی دین ملوکھم

تمدن کی نوعیت اور رسوم ورواج کے طریقے ہر معاشرہ کے مقتدا کی اُفتادِ طبیعت کے مطابق ہوتے ہیں مثلاً اگر کسی شہر میں ایسا سردار ہو جس کی بات مانی جاتی ہو (اور وہ علم وامن دوست ہو) اور لوگوں کو علم واخلاق اور رشد وہدایت کی تعلیم دے (اور اپنے اسوۂ حسنہ سے اُن کو نیکی پر مائل رکھے) تو یہ معاشرہ (اور مدنیہ) مدنیہ راشدہ باصلاح معاشرہ) بن جائے گا۔ لیکن اگر اس سید مطاع (مسلّم سردار) کی طبیعت میں جنگ وجدل کی طرف رجحان پایا جائے تو اس کی رعیت میں بھی جنگ جوئی اور لڑائی مار کٹائی کے رجحانات اُبھرتے ہیں۔ اور اگر اس سردار کا شیوہ دوسروں کے سامنے جھکنے اور ذلت قبول کرنے کا ہو، تو یہ پورا معاشرہ اور مدنیہ ذلت وخواری میں مبتلا ہوتا ہے۔

افسادِ رسوم کے وجوہ واسباب

اگرچہ رسم ورواج کی ابتدا جب پڑتی ہے تو وہ اصل میں سرتاپا خیر ہوتا ہے۔ کیونکہ ہر

اسم اخلاق فاضلہ اور ارتفاقات صالحہ کی حفاظت کے لیے رائج ہوتی ہے۔ لیکن بعض اوقات بعض عوارض کے پیش آنے سے رسوم برائی کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اس انقلاب وتبدیلی کے کئی وجوہ واسباب ہیں۔ ان میں اسے مندرجہ ذیل قابل ذکر ہیں:

۱- جب رسم کی پابندی سے مطلوبہ فضائل اخلاق کا ظہور ہی نہیں ہوتا۔ مثلاً جب رسم کی بنیاد مناقشہ اور قومی تنازعہ یا قوم کے دلیروں اور قائدوں کی تقلید پر رکھی گئی ہو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سیدھے اور معتدل انسان کے اندر سماحت اور فیاضی اور سیادت وقیادت کی تخلیقی صلاحیتیں پیدا ہی نہیں ہوتیں، اس کے برعکس اگر اس رسم کی بنیاد سماحت وفیاضی اور سیادت وقیادت صالحہ پر اُستوار کی گئی ہو تو کج رو وکج خو آدمی کی فطرت پابندی رسم سے اس رسم کی پابندی رک جاتی ہے۔ اور یہی حالت اس شخص کی بھی ہوتی ہے جو آفات سماویہ اور مصائب افلاکیہ کی زد میں آ کر ناقابلِ اصلاح معاشی زبوں حالی کا شکار ہو چکا ہو۔ اس کی حالتِ زار کی اصلاح صرف اس وقت ہو سکتی ہے جبکہ وہ یا تو کسی کا تابع ہو کر اپنا گزارہ چلاتا رہے اور خرچ میں جزرسی اور دوسروں کے ساتھ چھوٹی چیزوں پر مناقشہ کیا کرے۔ اسی طرح جب رسم کا انعقاد حد سے زیادہ داد ودہش اور بخشش واکرام پر مبنی ہو اور سخت طویل تکلیف ومشقت کے بعد بھی اس رسم کے تقاضے پورے نہ ہو سکیں، اسی طرح جب رسم کی بنا مسرفانہ لباس وپوشاک اور عیاشانہ شان وشوکت پر رکھی گئی ہو اور یہ رسمی ہوس پرست آدمی اپنی ظاہری پوزیشن کو قائم رکھنے کے لیے محافل ادب وشاعری اور مجالس طعام وقیام کا انتظام کرکے کثیر تعداد میں نوکروں، چاکروں کو رکھے۔ (تو یہ رسوم بجائے خیر کے شر کا وسیلہ بن جاتی ہیں۔ اور ان کی اصلاح لازم ہو جاتی ہے)۔

۲- جب رسم بذاتِ خود اخلاق فاضلہ اور معقول ارتفاقات کے خلاف ہو مثلاً زنا اور ناجائز صنفی تعلقات کو رسماً قبیح وناشائستہ نہ سمجھا جائے یا (رسم وقانون کی رُو سے) لواطت وغلمان بازی کو روا رکھا جائے (جیسے یورپ کے اکثر ممالک میں زمانۂ حاضر میں عام ہے) یا مثلاً عورتوں کے لیے مردانہ پن اور مردوں کے لیے زنانہ پن قطعاً معیوب نہ سمجھا جائے۔ (جیسے عصر حاضر کی مغربی قوموں اور ان کے نقالوں کی تمدنی حالت ہے) اور یا وہ سب رسوم

جو غیر ضروری تکلیف و مشقت کی طرف لے جاتی ہیں اور زندگی کو غیر فطری اور تکلیف دہ بنا دیتی ہیں۔

۳- جب رسم قرب الٰہی کے ذرائع اور عبادات کے لیے باعث فساد ہو۔ اور یہ اس وقت ہوتی ہے جب رسم کی بنیاد دنیاوی امور اور معاشی شعبوں میں انہماک واستغراق اور اللہ تعالیٰ (اور ملاء اعلیٰ کی روحانیات) سے اعراض پر رکھی گئی ہو۔

بہترین رسوم

(اس لیے) بہترین رسمیں وہ ہیں جن سے اخلاق درست ہوں اور تمدنی زندگی کی تدابیر نافعہ کی اصلاح میں ممد ومعاون ہوں۔ ان کا دائرہ اخلاق وسیع وکشادہ ہو جس کی پابندی کرنے سے کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔ اور نہ ان پر ایسا تمسک ہو کہ ان کو چھوڑنے پر معاشرے کے لوگ ناقابلِ برداشت حد تک سزا دینے اور ملامت کرنے سے دریغ نہ کرتے ہوں۔ ان کی بنا اعتدال ومیانہ روی پر ہو نہ وہ اسراف وفضول خرچی پر منتج ہو اور نہ ان سے انتہائی تنگی وعسرت کی حالت پیدا ہو، اہل حجاز کے ہاں زمانہ جاہلیت میں جو رسوم مروّج تھیں وہ افراط وتفریط پر مبنی تھیں، ہمارے ہاں اپنے ملک میں انیسویں صدی کے غیر منقسم ہندوستان کے) آباد شہروں میں رسمیں رفاہیت بالغہ اور تقشف بالغ میں کسی ایک پر مبنی ہوتی ہیں۔

معاشی رسوم کے مخالفین

جن رسموں کا تعلق معاش ومعیشت سے ہے اس کی مخالفت دو قسم کے اشخاص کر سکتے ہیں:

ایک تو وہ شخص جو صاحب عقل ودانش اور مالک عزت وقیادت ہو۔ اور وہ اپنی عقل خداداد اور عطا شدہ قابلیت سیادت کی بدولت ایک ایسی رسم ایجاد کر لیتا ہے جو رسم قدیم سے زیادہ اچھی، بہتر اور مفید تر ہوتی ہے (اور قدیم رسم کو چھوڑ دیتا ہے۔ دوسرے اس کو دیکھ کر اس کی ایجاد کردہ نئی رسم کو قبول کر لیتے ہیں)۔

دوسرا وہ شخص رسوم کی مخالفت کرسکتا ہے جو بدمعاش و بدقماش ہو، اور اس کی اخلاقی حالت ناگفتہ بہ ہو۔ اور وہ اپنی بے شرمی و بیبا کی کی وجہ سے دوسروں کے معیار مدح وذم سے آزاد ہو اور اپنے اخلاق میں کسی اصول، ضابطے یا معیار کا پابند نہ ہو۔ اس دوسری قسم کے لوگوں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اذالم تستحیی فاصنع ماشئت یعنی جب کسی کا شرم وحیا تمہارے دامن گیر نہ ہو تو جو کچھ جی میں آئے کرگزرو۔

مگر ان دونوں مخالفت کے نتائج مختلف نکلتے ہیں۔ اول الذکر یعنی صاحب علم ودانش کی ایجاد کردہ رسم نو کے محاسن لوگوں کی نظروں کے سامنے ہوتے ہیں اور لوگ اس کی اختیار کردہ رسم کی خوبیوں کو دیکھ کر قدیم رسم کو چھوڑ دیتے ہیں۔ اگرچہ کچھ عرصہ کے بعد کیوں نہ ہو مگر مؤخر الذکر تو اس کا مستحق ہے کہ اس کی خوب تذلیل کی جائے اور اس کو راہ راست پر لانے کے لیے وعظ وارشاد اور پند ونصیحت کی جائے اور اس کے اختیار کردہ غلط نمونہ رسم کو چھوڑ کر قدیم اچھی رسم سے وابستگی ظاہر کی جائے اور اس طرح لوگوں کے دلوں سے نئی قبیح رسم کی تصویر ہی مٹادی جائے۔

جو شخص بادشاہ مطاع یا حکیم ودانا ومرشد یا اپنی قوم کا سردار ہو، اس پر فرض ہے کہ وہ اچھی اور بری رسموں میں فرق وتمیز کرے اور ہر رسم کے فوائد اور عیوب اسے معلوم ہوں اور لوگوں کو اس کا پابند کرے کہ وہ نیک رسم پر عمل کریں۔ اور بری رسم کو چھوڑ دیں اور جو لوگ اچھی رسموں کو بلاوجہ چھوڑنے یا نظر انداز کرنے کی کوشش کریں، ان کو تنبیہ اور ملامت کرے۔ اگر وہ اس فرض منصبی میں سستی یا غفلت کرے گا تو وہ عظیم خیانت کا مرتکب ہوگا جس کے نتیجہ میں وہ معزول ہونے کا مستحق ہوجائے گا۔ اسی قبیل سے یہ مشہور مقولہ بھی ہے کہ "الناس علی دین ملوکھم" (لوگ اپنے بادشاہوں کے دین اور نقش قدم پر چلتے ہیں)۔ اس لیے جب بادشاہوں میں خرابی پیدا ہوجاتی ہے تو لوگوں میں فساد وبگاڑ خود بخود پیدا ہوتا ہے (اس لیے سربراہوں اور بڑوں کو محتاط رہنا چاہیے کہ قولاً یا فعلاً دوسروں کے لیے کوئی بری مثال قائم نہ کریں)۔

رسموں کے اختیار کرنے یا ان کی پابندی کرنے میں لوگوں کے مختلف طریقے

اور مراسلے ہیں۔

ایک مکتبِ فکر ان لوگوں کا ہے جو اپنی رسموں میں اجرام فلکیہ، نجوم وغیرہ کے خواص و آثار کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ ان کے نومولودوں کے نام ستاروں کے خواص و اثرات کو ملحوظ رکھ کر رکھے جاتے ہیں۔ اور ان کا لباس و پوشاک بھی ان اثرات کے مطابق بدلا اور پہنا جاتا ہے، جیسے کہ اہل ایران کے نزدیک یہ مسلّمہ رسم ہے چنانچہ بہرام و دلآرام کی داستان ہائے عشق سے ظاہر و واضح ہوتا ہے۔

دوسرا مکتبِ فکر ان لوگوں کا ہے جو ارواح مجردہ یا عقول (عشرہ و منیرہ) کے خواص اور ان کے سامنے انقیاد کو پیش نظر رکھ کر رسم اختیار کرتے ہیں جیسے کہ مجوس و آتش پرست کیا کرتے ہیں۔

اور تیسرا مکتبِ فکر ان لوگوں کا ہے جو خالص توحید الٰہی اور اللہ تعالیٰ کے سامنے حسنِ عبادت اور خلوص نیت کی بنیادوں پر رسموں کو اختیار کرتے ہیں (یہ انبیا اور مفہمین کا گروہ ہے)۔ انشاء اللہ اس کی مزید تشریح و تحقیق ''الملل'' کے ضمن میں کریں گے۔

اکیسویں فصل

نظمِ ارتفاقات کے وجوہ فساد و اصلاح

ان ارتفاقات میں دو وجہوں سے خرابی پیدا ہوتی ہے

ایک تو یہ کہ جو ہستی نظام ارتفاقات کو قائم رکھنے کی ذمہ دار ہے وہ ان کے قائم رکھنے میں اہمال (تساہل) اور غفلت برتے۔

دوسری یہ کہ ارتفاق ثانی کے نظام پر لوگوں کی رسم و رغبت بڑھ جائے اور ارتفاق اوّل کو نسیاً منسیاً کر کے کلی طور پر پس پشت ڈال دیں یا ارتفاق ثانی کے آداب و اصول کو پس پشت ڈال کر ارتفاق ثالث کو اس بھروسہ پر اختیار کریں کہ ارتفاق ثالث کا محافظ (حاکم) ارتفاق ثانی کے آداب و اصول کو بہ جبر رائج کر سکے گا۔ بہر حال جو بھی وجہ یا سبب ہو، (ہر اونچے درجے کے ارتفاق کے فساد کے وقت اس سے نچلے درجے کے ارتفاق کا اہتمام ضروری ہے)۔ اگر ارتفاق رائج کا نظام درہم برہم ہو کر رہ جائے تو لوگوں کی صلاح و خیر اس میں ہے کہ وہ نچلے درجے کی تہذیبی منزل یعنی ارتفاق ثالث کو اور خصوصاً اس کے ان آداب کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ لیں جو ارتفاقِ رابع کی اصولی حقیقت پر مشتمل ہیں۔ اگر چہ شکل وصورت میں اس کا انعقاد نہیں ہوا۔ مثلاً جب کسی قوم کے افراد آپس میں کسی سنت عادلہ کی پابندی پر متفق ہو جاتے ہیں تو پھر اس کی مخالفت کرنے سے فتنے برپا ہوتے ہیں اور آپس میں خوں ریزی کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔ اور اپنی توقعات سے زیادہ اُن پر مصائب و آلام ٹوٹ کر آپڑتے ہیں۔ قانون وسنت عادلہ سے انکار و اعراض کے یہ نتائج دیکھ کر ان کے دل و دماغ اس بات پر پوری طرح مطمئن و آمادہ ہو جاتے ہیں کہ ان کی خیر و بھلائی اسی سنت کی

پیروی میں ہے۔اور خلیفہ اس نظام کا نگراں اور مشخص شکل اور پیکر ہے۔ جب اس مشخص پیکر میں خرابی واقع ہو جائے تو ضروری ہے کہ سنّت عالی کی بنیاد کو مضبوطی کے ساتھ پکڑے رکھیں۔اسی پر ارتفاق ثالث کے نظام کو قیاس کیجئے کہ جب وہ خراب ہو جائے (اور کوئی حاکم نہ رہے تو) اس صورت میں ارتفاق ثانی کے آداب کو مضبوطی کے ساتھ پکڑے رکھنا چاہیے کہ اونچے درجے کا ارتفاق ثانی دراصل ارتفاق ثالث پر مشتمل ہوتا ہے۔گو کہ تعبیر و تفسیر یا شکل وصورت میں ارتفاق ثالث ظاہر نہیں ہوا۔ اگر بفرض محال ارتفاق ثانی خراب ہو جائے تو ارتفاق اول کے آداب واحکام پر کار بند ہونا مناسب ہے۔مثلاً جس قسم کا کھانا ارتفاق ثانی کے مطابق آدمی کو کھانا چاہیے اگر وہ میسر نہ ہو تو قرین مصلحت یہ ہے کہ دیر پا سخت اور موٹا کھانا ذخیرہ کرلیا جائے جیسے ملک حجاز میں ردّی کھجوریں اور ہمارے ہاں براعظم ہندوستان میں گاجر وغیرہ وقت ضرورت کے لیے جمع کر کے رکھے جاتے ہیں۔ جب ارتفاق تام یعنی ارتفاق ثانی کے مطابق کھانا میسر نہ ہو تو اسی (ذخیرہ شدہ خشک وردّی اشیائے خوردنی) پر اکتفا کیا جائے۔سمجھ دار شخص تو ایسا ہی کرے گا لیکن کسی میں عقل کا فقدان ہے تو وہ جس ارتفاق کا عادی ہے اس کی نایافت کے وقت بھی اسی ارتفاق (مثلاً بہترین طعام) کی طلب کرتا پھرے گا۔نتیجہ یہ ہوگا کہ پریشان وسرگرداں رہ کر آخر فاقہ کی موت مرے گا۔

اسی طرح ایک شخص فطرتاً قیادت وامامت کے لائق ہوتا ہے مگر کسی ظالم کے ظلم یا تمدن کے دوسرے عوارض کی وجہ سے وہ امامت سے محروم ہو جاتا ہے۔اس صورت میں اگر وہ اپنی تدبیر معاش میں سمجھ دار ہے تو وہ بلا تاخیر ارتفاق ثانی کی سطح پر آ کر زندگی بسر کرنے لگے گا اور اس وقت کا انتظار کرے گا جب وہ دوبارہ زمام خلافت ہاتھ میں لے سکے۔لیکن اگر وہ عقل وفراست کا مالک نہیں تو نامساعد حالات میں گھر کر بھی منصب پر فائز ہونے کی طمع میں مبتلا رہے گا اور امامت اس سے کوسوں دور بھاگتی ہوگی وہ اسی حالت طمع میں بھوک و پیاس اور دیگر مصائب میں مبتلا ہو کر ہلاک ہو جائے گا۔ یہی کیفیت اس شخص کی بھی ہوتی ہے جس کا پیشہ جہاد اور سپہ گری ہے بسا اوقات سامانِ جنگ اس کے پاس مہیا ہوتا ہے لیکن ارتفاق ثالث کے مطابق ابھی جہاد اور جنگ کا موقع نہیں آیا۔ یہ مجاہد اگر صاحب عقل ودانش

ہے تو یقیناً وہ ارتفاق ثانی کی سطح پر آ جائے گا اور ارتفاق ثانی کے صنائع وحرف پر مائل ہوگا۔ اور وقتِ مناسب کا انتظار کرے گا لیکن اگر وہ سمجھ دار نہیں تو (ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر) جہاد میں جانے کی تمناؤں میں ڈوبا رہے گا اور جہاد کا میدان اس سے دور ہوتا جائے گا۔ حتیٰ کہ وہ اسی امید میں بھوک اور پیاس سے دوچار ہو کر جان دے دے گا۔

عربی میں کسی شاعر حکیم نے یہ مشہور شعر کہا ہے

اذا لم تستطع امرا فدعه

وجاوزه الی ما تستطیع

جب تو کوئی کام نہ کر سکے تو اس کو چھوڑ کر کوئی دوسرا کام کر جسے تو آسانی سے کر سکے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جب کسی ایک کام کا موقع نہ ہو تو بہ مجبوری کسی اور ذریعہ معاش کو اختیار کرنا مناسب ہے۔

یاد رکھو یہ نہایت غلط رسم اور فاسد خیال ہے کہ ایک پیشہ کو چھوڑ کر دوسرا پیشہ اختیار کرنا اور اپنے عادی طریقۂ معاش میں تنگی کرنا باعث شرم وعار ہے۔ اپنے پروردگار کے فضل سے مرد دانا عار اور بھوک سے بچنے کے لیے معقول تدبیریں اور دلیلیں اختیار کرتے رہتا ہے۔

خرابی کی اصل جڑ یہ ہے کہ لوگ سوائے اپنے ایک معیّن پیشہ کے دوسرے انواع صنعت وحرفت سے ناواقف ہوں اور اپنے آبائی پیشہ پر شدت کے ساتھ جمے رہیں۔

بائیسویں فصل

انسانی طبائع کا بیان

کیا تم امزجہ انسانی، طبائع اور ان کے اندر باہمی اختلاف کو چشم بصارت وبصیرت دونوں کے ذریعہ ایسا مشاہدہ وملاحظہ کر سکتے ہو کہ ہر ایک طبیعت ومزاج کے خواص واحکام تمہارے سامنے نمایاں ہو کر سامنے آئیں؟

اس سلسلہ میں ہم تمھیں استقرا ومشاہدہ کا آسان طریقہ بتا کر تمہاری مناسب رہنمائی ومدد کرتے ہیں اور مندرجہ ذیل چند باتیں بطور نصیحت پیش کرتے ہیں:

۱۔ سب سے پہلے تم کو نظر تفتیش عناصر ترکیبیہ کی سختی وصلابت اور حسن وصفائی کے معیار پر مرکوز کرنی چاہیے۔ اور اس انداز و پیمانہ پر خوب غور کرنا چاہیے جس انداز سے اخلاق ان عناصر ترکیبیہ سے جنم لیتے ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو کامل مزاج آدمی وہ ہوگا جو ظاہری شکل و صورت میں مکمل اور ہفت گانہ اخلاق اور ان کے اصول میں درجۂ کمال پر فائز ہو۔

دوسرے درجہ پر وہ شخص ہوگا جس کے اکثر ظاہری محاسن اور معنوی اوصاف مکمل ہوں اور جو محاسن واوصاف مکمل نہ بھی ہوں ان میں بھی وہ کامل مزاج کے بیشتر محاسن سے مشابہت رکھتا ہو۔

تیسرے درجہ میں وہ شخص ہوگا جو اکثر حیثیتوں سے کامل اور باقی حیثیتوں میں (مشابہ بھی نہ ہو بلکہ) ناقص ہو، اور چوتھے درجہ پر وہ شخص ہوگا جو اکثر حیثیتوں سے ناقص ہوتا ہے مگر کچھ ایسے بھی محاسن واوصاف ہوں جن میں اگر چہ وہ کامل نہیں ہوتا، ہم کامل سے تھوڑی بہت مشابہت ضرور رکھتا ہے۔

ان قسموں میں سے ہر قسم کی جزئیات اس قدر زیادہ ہیں کہ ان کی تعداد ایک لاکھ

سے بھی زیادہ ہو سکتی ہے پھر ان میں سے ہر ایک مزاج کے مخصوص آثار و خواص ہیں جو انسان سے طبعی ضرورت کے تقاضے کے تحت مجبوراً صادر ہوتے ہیں اور وہ آثار و خصوصیات گویا انسانی مزاج کے لوازم ہیں۔ جس طرح پتھر زمین کی طرف (کشش ثقل کی وجہ سے) مجبوراً گرتا اور آگ (اور اس کا دھواں) خود بخود اوپر آسمان کی طرف اٹھتا ہے۔ ہم نے ان آثار و خواص میں سے بعض کا ذکر اخلاق (ہفت گانہ) کے باب میں کیا ہے ان پر غور و خوض کرو۔ مثلاً (ہم نے تنبیہ کی ہے کہ) جو شخص بہادر و شجاع ہے وہ بے ساختہ دوسروں سے ٹکرا کر ثابت قدم رہتا ہے۔ اور کشت و خون پر اقدام کرنے سے کبھی نہیں گھبراتا اور ہر حال میں مدمقابل کو شکست دے کر خود فتح و غلبہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص بزدل وڈرپوک ہے وہ ہمیشہ خوفزدہ رہتا ہے اور کبھی حملہ میں پہل اور پیش قدمی نہیں کرتا اور جہاں اسے موت و ہلاکت کا خطرہ محسوس ہوتا ہے وہاں سے کنارہ کشی کرتا ہے۔ ان ایک لاکھ مزاجی کیفیتوں میں ہر مزاج کے خاص خاص آثار و خواص ہیں جو ان کے مناسب حال اعمال و حرکات کی طرف لے جاتے ہیں اور انسان سے صرف انہی اعمال کا صدور ہوتا ہے جو اس کے مزاج کے خواص کا تقاضا ہیں۔

۲- دوسری بات یہ ہے کہ تم نے ارتفاقات کے اقسام اور ان کے مناسب حال امزجہ انسانی کو بنظر تفتیش و تحقیق دیکھنا ہے۔ مثلاً یہ کہ ارتفاق ثالث و رابع میں نظام حکومت چلانے اور قیادت و سیادت کے عنان سنبھالنے کے لیے کون قابل ہے؟ ہر مزاج و ہر انسان تو لائق و قابل نہیں ہو سکتا کیونکہ امامت کبریٰ کے عہدہ پر صرف وہ شخص فائز ہو سکتا ہے جو مزاج کے لحاظ سے جملہ اوصاف کمالیہ سے متصف ہو، اور اخلاق ہفت گانہ کے زیور سے پوری طرح آراستہ و پیراستہ ہو شجاعت و بہادری کے ساتھ ساتھ دور اندیش اور دور رس نگاہ بھی رکھتا ہو، آہنی گرفت رکھتا ہو لیکن ساتھ ہی شفقت و رحم دلی سے اس کا قلب و صدر لبریز ہو، تحقیر نفس اور غرور ذات میں مبتلا ہوئے بغیر اپنے مقام عالی اور شان و شوکت پر فخر کرتا ہو، اسی طرح امامت کبریٰ یا خلافت عظمیٰ کے ذیلی شعبوں مثلاً نقابت و قضا وغیرہ کو سنبھالنے کے لیے جس مزاج کے اشخاص و افراد موزوں ہیں ان کی طرف ہم اشارہ کر چکے ہیں۔

سیاست منزلی کو بہتر طریقے پر چلانے کے لیے ضروری یہ ہے کہ گھر کا سربراہ کم از کم نسبتاً متوازن انسانی اخلاق و آداب زندگی سے بے بہرہ نہ ہو۔ جہاد، تجارت، ہنر و صنعت اور دیگر شعبہائے زندگی کو بھی اسی پر قیاس کیجئے کہ ہر ایک فن کے لیے مناسب مزاج ہوتے ہیں اس لیے (ہر مردے و ہر کارے) کے اصول پر عمل کر کے اپنے مناسب پیشہ اختیار کرنا چاہیے۔

۳۔ تیسری بات یہ ہے کہ علو ہمت اور پست ہمتی کے مختلف درجوں میں نظر تفتیش سے کام لینا چاہیے۔

میں اپنی قوت متخیلہ میں ہمت کو، لوہے کا بنا ہوا ایک گنبد سمجھتا ہوں جس کے پار نہ تو نظر جاتی ہے اور نہ کوئی اشارہ مفہوم ہوتا ہے۔ مثلاً چھوٹا بچہ جب وہ کسی قدر صاحب عقل وہوش بن جاتا ہے تو اس کی ہمت کھانے پینے اور کھیلنے تک محدود ہوتی ہے۔ اس کو والدین سے محبت و دل بستگی ہوتی ہے وہ ان کو چھوڑ کر دوسروں کے پاس اپنی ضرورتیں پورا کرنے کے لیے دامن سوال نہیں پھیلاتے، بلاشبہ یہ بچہ دیکھتا ہے کہ بادشاہ سریر مملکت پر بیٹھا ہوا ملک میں شان و شوکت دکھا رہا ہے اور گھر کا بزرگ اہل خاندان پر اپنا حکم چلا رہا ہے اور اسی طرح گرد و پیش کے سیاسی، معاشرتی، سماجی اور مذہبی احوال زندگی کو دیکھتا ہے مگر بنظر امعان نہیں بلکہ بنظر لعب یعنی یہ سب باتیں اس کی نظروں سے گزرتی ہیں مگر اس کی نظر میں قابل اہتمام نہیں ہوتیں، کیونکہ یہ اس کے قبہ ہمت سے ہی خارج دباہر ہیں۔

لیکن جب وہ بالغ ہو جاتا ہے (اور اس کی جسمانی، ذہنی اور نفسیاتی صلاحیتوں کو تکمیل کا لبادہ پہنا دیا جاتا ہے) تو عہد طفولیت سے نکل کر بلند تر درجہ یعنی درجۂ شباب و رشد میں قدم رکھتا ہے اس میں جسمانی قوت شجاعت و بہادری حکمت و دانائی اور عشق و محبت کے آثار ظاہر ہونے لگتے ہیں اگرچہ اس کیفیت میں کمال وثبات کا فقدان ہوتا ہے مگر وہ اپنی ان جبلتوں کا مناسب حال اظہار ضرور کرتا ہے۔ عنفوان شباب میں جوانی کے (جسمانی، جنسی، ذہنی اور نفسیاتی) تقاضوں کے مطابق اعمال و افعال کا صدور بالکل فطری امر ہے۔ تاہم ابھی اس کی ہمت میں عدم ثبات اور کسی قدر نقصان ہوتا ہے اور جب وہ رشد و ہدایت کے درجہ کمال تک پہنچ جاتا ہے یعنی ادھیڑ عمر کا دور شروع ہو جاتا ہے تو اس کے جملہ کمالی اوصاف کی تکمیل

ہوتی ہے۔اور(گزشتہ دونوں عہدوں کے خلاف)اس میں خلافت یا نظام خلافت کے کسی شعبے کی سربراہی یا تمدنی زندگی کے دوسرے مدارج وارتقاقات کی اہلیت ابھر آتی ہے اس لیے میری رضا وخوشنودی اس میں ہوگی کہ تم میری یہ نصیحت گوش دل سے سن لو کہ ان مدارج ثلاثہ (عہد طفولیت،عہد شباب،عہد کہولت) میں سے ہر ایک کی قبہ ہمت اور جملہ خواص کو اچھی طرح دیکھ لو۔اگرچہ وہ رسم ورواج کے پردوں اور اکتسابی علوم وفنون کے لبادہ میں نظروں سے اوجھل بھی رہیں کیونکہ بعض اوقات ایک بچہ ہی ہوتا ہے اور اس کی سربراہی اور شیخوخت دراصل قبہ صبیان کے اندر ہی رہتی ہے۔اوراسی طرح بعض اوقات ایک بوڑھا بہ تکلف کثیر بچوں یا جوانوں کی سی حرکتیں شروع کرتا ہے مگر حقیقت الامر یہی ہے کہ اس کے اس مصنوعی بچپنے میں بھی شیخوخت وبڑھاپے کا رنگ پایا جاتا ہے اور وہ قبہ شیخوخت سے باہر نہیں جاسکتا۔

یہی صورت اہل المنازل کے ان بھولے بھالے بے نفس قانع اشخاص کی ہے جن کو کلام پاک میں ''غیر اولی الاربۃ'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ان کا بھی ایک مخصوص قبہ ہمت اور دائرہ پرواز ہے۔وہ زیادہ سے زیادہ پیٹ بھرنے اور ستر عورت کے انتظام سے آگے نہیں بڑھتا۔پھر ادنیٰ درجے کی معیشت رکھنے والے نچلے طبقہ کے لوگوں کا قبہ ہمت غیر''ذی الاربۃ'' قانع سے وسیع تر ہوتا ہے اور اس طرح قبہ ہمت کے آفاق ودوائر میں بتدریج اضافہ ووسعت ہوتی رہتی ہے حتیٰ کہ ہمتوں کے دائرے ملوک اور شہنشاہوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔(ہم دیکھتے ہیں کہ) کتنے بادشاہ ہیں جو عام لوگوں میں دولت مندترین انسانوں سے دوچند سہ چند زیادہ مالدار ہوکر بھی قانع نہیں ہوتے۔اور عام لوگ ان کی اس ملک گیری اور ہوس زرطلبی کی وجہ سے ان پر نکتہ چینی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ قناعت کیوں نہیں کرتا۔وہ فلاں فلاں فارغ البال زندگی بسر کرنے والے اور مالداروں کو دیکھ کر اپنی حالت پر راضی کیوں نہیں ہوتا؟ مگر یہ لوگ اپنے اس اعتراض میں یقیناً غلطی پر ہیں کیونکہ بادشاہ اپنے قبہ ہمت کی وجہ سے فطری طور پر مجبور ہے کہ وہ زرطلبی اور ہوس ملک گیری کے جذبہ سے سرشار ہوکر زیادہ سے زیادہ ممالک فتح کرے۔اور خزانے بھر دے۔یہی حال ہر صاحب ہمت شخص کا ہوتا ہے۔اس کے علوم،ترجیحات اور شواہد ودلائل اس کے قبہ ہمت کے مطابق

ہوتے ہیں۔ اوران کے باہم مناظروں اور مناقشوں کی بھرمار ہوتی ہے اور آزمودہ کار حکیم جس کو قبۂ ہمت اور دائرۂ کار کی حقیقت صاف نظر آتی ہے اور وہ ان کے سلوک کو ان کے قبہ ہمت کے مطابق سمجھتا ہے۔

۴- چوتھی بات یہ ملحوظ رہے کہ تیری نظر تحقیق انسانی فطرت پر مرکوز رہے، جیسے کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ انسان تین مختلف صورتوں سے مرکب اور بنا ہوا ہے۔

(۱) حیوانی (۲) انسانی (۳) شخصی یا انفرادی

لیکن با ایں ہمہ اشتباک ان تینوں میں سے کبھی ایک کا غلبہ ہوتا ہے اور کبھی دوسری اور تیسری کا۔ اگر صورت حیوانیہ اپنی دوسری بہنوں (یعنی انسانی اور شخصی صورتوں) پر غالب آجائے تو اس کو مزاج آدمی (منسوب بہ حضرت آدم علیہ السلام) کہیں گے۔ اس کا راز عقلی استدلال سے دریافت نہیں ہوسکتا۔ بلکہ اس کی حقیقت (ذوق وجدان اور) مکاشفہ کے ذریعہ عیاں ہوسکتی ہے۔ ہاں اس مزاج کے کچھ مناسبات اور آثار ہیں جن کو مرد عارف اس مزاج والے شخص اور اس کے اعمال میں جلوہ گر دیکھتا ہے۔ اگر صورت انسانیہ کا غلبہ ہو تو اس کے مزاج کو مزاج ادریسی کہیں گے اور صورت شخصیہ کے غلبہ کی صورت میں اس کا نام مزاج نوحی ہوگا۔

ہم کسی موقع پر تمہیں یہ بھی سکھا چکے ہیں کہ انسانی وجود مختلف حیثیتوں میں رہتا ہے۔ ایک وجود روحی کہلاتا ہے دوسرا وجود مثالی اور تیسرا وجود خارجی۔

پھر یہ وجود یا تو کامل ہوگا (اور یا ناقص) اور یا فولادی ہوگا (اور یا دوسرے عناصر ماڈی سے ترکیب یافتہ ہوگا)۔

پس معلوم ہونا چاہیے کہ جس وجود انسانی پر روح کا غلبہ ہوگا وہ مزاج ابراہیمی کہلاتا ہے جس پر "مثال" کا غلبہ ہوگا۔ اس کو مزاج عیسوی کہتے ہیں۔ جس پر فولاد دلوہے کا عنصر غالب ہوکر اس میں شدت کی تیزی پیدا کرے اس مزاج کو مزاج موسوی کہتے ہیں اور کامل وسانع وجود انسانی پر جب زمینی عناصر کی مدد غالب ہو تو وہ مزاج داؤدی کہلاتا ہے اور جب اس پر آسمانی عناصر کی مدد غالب ہو تو وہ مزاج محمدی (صلی اللہ علیہ وسلم) کہلاتا ہے۔ مختصراً یہ کہ

یہ ایک ایسا علم ہے جس کی تفصیل لکھنا بے سود ہے۔ اس کا تعلق مشاہدہ اور مکاشفہ سے ہے۔

یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ ہماری مراد حدت سے یہ ہے کہ جس نوعیت کے اخلاق اسی قسم کے عام مزاج کے لوگوں میں پائے جاتے ہیں۔ اور وہ اخلاق پوری شدت وصورت میں کسی میں پائے جائیں تو ہم اس کو ''حدت'' یا تیزی مزاج کہتے ہیں۔ اولاً ''سبوغ'' (کمال) کا مفہوم یہ ہے کہ اس کے اخلاق اس کے بدن کے عناصر ترکیبی اور اس کے امداد ساوی کے مطابق ہوں۔ کیونکہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ نسمہ (روح ہوائی) سے اخلاق پیدا ہونے کا انحصار نسمہ کی اس کیفیت پر ہے جو اس میں بدن کے عناصر ترکیبی اور اعضائے جسمانی کے مناسبات سے بغل گیر ہونے پر پیدا ہوتی ہے چنانچہ تجربہ سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ جس شخص کا سینہ فراخ وکشادہ ہو تو لامحالہ وہ بہادر وشجاع ہوگا اور ہمیشہ پُر امید رہے گا لیکن جس شخص کا سینہ تنگ ہو وہ بلاشبہ بزدل وڈرپوک ہوگا اور ہمیشہ شکستہ خاطر اور نا اُمید ہوگا۔

جب اخلاق، جسمانی اعضا اور نسمہ تک پہنچنے والی امداد اپنے اندازوں میں اور دوسری کیفیات میں پوری طرح ہم آہنگ اور متوازن ہوں تو ایسی ہم آہنگی کو ''سبوغ'' یا ''کمال'' کہا جائے گا۔ لیکن جب اخلاق پیش رفت کریں اور اعضائے جسمانی اور امداد نسبتاً پیچھے رہ جائیں اور ان میں ہم آہنگی نہ ہو تو اس صورت کو ہم ''حدت'' یا تیزی مزاج سے موسوم کرتے ہیں۔ چنانچہ اگر تم اپنی نظر کو تھوڑی سی وسعت دے کر مشاہدہ کرو تو استقرا سے معلوم ہو جائے گا کہ بعض اوقات نہایت کمزور عناصر ترکیبی اور ضعیف بدن والا آدمی جوہر شجاعت میں اپنے سے دو چند یا سہ چند جسیم اور مضبوط جسم والے سے قوی اور بہادر ثابت ہوتا ہے اس قسم کا نحیف وکمزور شخص اگر بوڑھا ہو جائے یا بیمار پڑ جائے تب بھی جوہر شجاعت کا بڑا حصہ باقی رہتا ہے اور اس کی شجاعت وبہادری میں کوئی خاص فرق نہیں آتا۔ بعض اوقات اس کے مقابلہ میں ایک بالکل دوسرا شخص دیکھو گے جس کی بدنی ترکیب اور اعضائے جسمانی بالکل درست ہیں اور وہ نہایت قوی ومضبوط بھی ہے اور اس کی شجاعت بھی صرف اسی نسبت سے ہے زائد نہیں۔ اس قسم کا شخص جب بوڑھا ہو جائے یا بیمار پڑ جائے یا زندگی کی تدبیروں میں درماندہ ہو جائے تو اس کی شجاعت وبہادری میں بھی اسی نسبت سے کمی واقع ہوتی ہے۔

تیئسویں فصل

لوگوں میں نظام ارتفاقات کے قیام کے سلسلے میں ایک اہم تنبیہ

علوم اخلاق اور ارتفاقات فطرت انسانی کا خاصہ ہیں

علم اخلاق اور علم ارتفاقات کے متعلق جو کچھ ہم نے گزشتہ صفحات میں لکھا ہے اس کی صحت بدیہی ہے محتاج دلیل و برہان نہیں، یہ باتیں بطریق اجمال انسان کی فطرت میں اس طرح مرکوز ہیں جس طرح جملہ چوپاؤں اور پرندوں کی طبیعتوں میں معیشت و معاش اور زندگی بسر کرنے کے طریقوں کے الہامی علوم ودیعت رکھے گئے ہیں۔ فطرت انسانی میں ان علوم (اخلاق وارتفاقات) کے ودیعت ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ ان کے بارے میں عمومی اور اصولی طور پر اقوام عالم میں سے کسی قوم کو بھی اختلاف نہیں ہے۔ تمام اقوام ان لوگوں کے مدح خواں ہیں جو ان کو پایۂ تکمیل تک پہنچاتے ہیں اور ان کی مذمت کرتے ہیں جو ان کو نظر انداز کر کے چھوڑ دیتے ہیں۔

یہ علوم موروثی نہیں ہیں

میں نے بعض نادانوں کو جنہیں عقل سلیم سے کوئی بہرہ نہیں ملا، کہتے ہوئے سنا ہے کہ یہ نظام ارتفاقات اور مدارج تمدن میں اپنے اسلاف اور بزرگوں سے ملے ہیں۔ اگر وہ نہ ہوتے تو ہمیں اس کا کچھ پتہ نہ ہوتا۔ اگر اس قول سے مراد یہ ہے کہ انسان کی تہذیبی زندگی کی دوسری منزل (ارتفاق ثانی) اس سے قبل گزری ہوئی منزل (ارتفاقِ اوّل) پر مبنی ہے تو بلا شبہ یہ درست ہے اور اس کی معقول وجہ (ماضی وحال کا باہمی ربط و تسلسل یا سبب ومسبب کا سلسلہ ہے۔ لیکن اگر اس کی مراد یہ نہیں ہے تو یہ کہنا بالکل غلط ہے اور اس کے غلط

ہونے کی دلیل ونشان یہ ہے کہ فرض کیجئے کوئی آدمی کسی دور ودراز صحرا یا جنگل میں پیدا ہوا اور وہاں کسی دوسرے انسان کو ساتھ زندگی بسر کرتے ہوئے نہیں دیکھا تب بھی وہ مذکورہ اخلاق وارتفاقات کے مطابق زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوگا۔ اس کی آواز میں بہر صورت تقطیع حروف اور اس کے بعد تشکیل الفاظ و جملہ ہوگی اور ارتفاق اول کی تمام شاخوں کا وہ محتاج وطلب گار رہوگا۔ مثلاً اگر اس کے جنس سے مادہ اس کے پاس نہ ہوتو وہ تکلیف محسوس کرے گا اور جب رفیقۂ حیات ساتھ ہوتو انس ومحبت اور سکون وقرار کے ساتھ رہے گا۔ اس کی عدم موجودگی کی حالت میں اس کی طلب میں سرگرداں پھرے گا اور اگر اسے مل جائے تو طبعاً اس سے مانوس ہوگا اور لازماً اس سے ہم کلام ہوگا اور بات چیت میں افہام وتفہیم کے پہلو کو مدنظر رکھے گا۔ (اس طرح ان کی ازدواجی زندگی اور منزلی دورِ حیات شروع ہو جائے گا۔ اور آہستہ آہستہ پیدائش وافزائش نسل کے ذریعہ مختلف گھر اور خاندان معرض وجود میں آجائیں گے) پھر مختلف خاندان ایک دوسرے مل جائیں گے۔ اور باہمی معاملات اور تمدنی تعلقات کا سلسلہ جاری ہوجائے گا اور پھر اسلاف سے اخلاف کو وہ سب طریقے منتقل کر دیئے جائیں گے۔

ہم نے پہاڑوں اور صحراؤں میں لوگوں کو زندگی بسر کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ جو نہ تو کسی الہامی یا غیر الہامی دین سے وابستہ ہیں اور نہ کسی مذہبی فرقے سے ان کا کوئی تعلق رہا ہے اور نہ وہ اپنے آباواجداد کے مقرر کردہ قوانین اخلاق اور ضوابط کے پابند ہیں۔ بلکہ وہ کسی ضابطہ اور قانون کے پابند ہی نہیں ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ تمدنی زندگی میں عملی مفید تدبیروں اور اجتماعی اداروں کی تشکیل کرتے ہیں اور معاملات واخلاق کے بہترین اصول وآداب کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ البتہ یہ درست ہے کہ ان کے ارتفاقات اور اخلاق کے اصول اور ان کے بنیادی آداب میں رفعت وکمال نہیں ہوتا۔

اخلاق وارتفاقات کے فطری ہونے سے انکار کرنے والے دو گروہ

پس یہ ثابت ہوا کہ ارتفاقات اور اخلاق کی تحصیل کا ملکہ انسان کی فطرت کا تقاضا ہے۔ اس نظریہ سے انکار کرنے والے دو قسم کے لوگ ہیں:

ایک وہ جو نرے بے وقوف ہیں جن کی تمدنی زندگی بہائم اور چوپایوں سے بدتر نہیں تو اچھی بھی نہیں ہوتی۔ وہ دانستہ یا نادانستہ طور پر ان علوم اخلاق وارتفاقات کے اصولوں پر کسی حد تک کاربند ہیں اور وہ ان سے چھٹکارا حاصل نہیں کرسکتے لیکن بہ تکلف انکار اور اصرار علی الانکار کرتے ہیں۔ ان کے اس انکار کی مثال اس شخص کے انکار کی ہے جو آنکھ، کان، اور عقل رکھتا ہے اور ان کے وجود وآثار کو ملاحظہ بھی کرتا ہے مگر ان کے وجود سے پھر بھی منکر ہوتا ہے۔

دوسری قسم کے لوگ ''سوفسطائی'' ہیں جو علوم ارتفاقات واخلاق کے اصول سے بتکلف انکار کرتے ہیں حالانکہ وہ ان علوم کے ساتھ وابستہ ہیں۔

خبردار، یہ دونوں فرقے انسانی مزاج کے لحاظ سے ناقص مزاج رکھتے ہیں اور ان دونوں کی مثال اس چوپایہ کی ہے جو ناقص الخلقت اور خالی از عقل ہے اور جو تدبیر ناقص کی وجہ سے معاشی زندگی میں ناقص ثابت ہوتا ہے اور مثلاً وہ پیدائش وافزائش نسل کے فطری تقاضوں سے خالی ہوکر جوڑے کی تلاش نہیں کرتا اسی طرح تمدنی زندگی میں ارتفاقات واخلاق کے اصولوں کی پابندی سے گریز اور منزلی تدبیروں سے فرار اختیار کرنا اس سوفسطائیوں اور بیوقوفوں کا شیوہ ہے۔ (کہ وہ بھی عام انسانوں کی بہ نسبت ناقص پیدا ہوئے ہیں)۔

نظام تمدن کی صحت وبیماری

یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ جس طرح جسم انسانی کی صحت اور بیماری کی حالتیں ہوتی ہیں اسی طرح) انسان کی تمدنی زندگی پر یہ مختلف کیفیتیں وارد ہوتی ہیں۔ اس کی ایک کیفیت تو صحت کاملہ ہے۔ دوسری حالت صحت ناقصہ (یا بیماری) کی ہے اور تیسری حالت مرض مدنف کی ہوتی ہے جس کی وجہ سے صحت مکمل گر جاتی ہے۔ انسانی تمدنی وعمرانی زندگی کی طبیعت کا تقاضا ہے کہ اس کی صحت کامل ہو، مگر جب اس ڈھانچہ میں انتشار کے خارجی اور داخلی عوامل اثر کر جاتے ہیں تو اس وقت اس کی صحت ناقص ہو جاتی ہے۔ اور بعد ازاں

تمدنی فسادوں کی وجہ سے موذی اور مدنف مرض کی شکل رونما ہوتی ہے۔جس کے بعد شر ہی شر پر خاتمہ ہوتا ہے۔

معاشرتی زندگی کے مدارج اور ارتفاق ثالث کے مراتب

چنانچہ زمین کا کوئی گوشہ جہاں انسان آباد ہو، ارتفاق اول سے خالی نہیں ہوسکتا اور اسی طرح دنیا کے اکثر ممالک اور قوموں میں تمدنی زندگی کی دوسری ارتقائی منزل (ارتفاق ثانی) کا متوسط درجہ ضرور پایا جاتا ہے۔

ہاں بعض اوقات وبعض مواقع میں سوء المزاجی اور صحت معاشرت میں خرابی پیدا ہو جاتی ہے۔جس کی وجہ سے ارتفاق ثانی کو پھلنے پھولنے کا موقع نہیں ملتا۔یہی حال ارتفاق ثالث اور تمدنی زندگی کی تیسری اعلیٰ منزل کا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے خود بخود لازماً وجود وظہور میں آتا ہے۔اور اس کے ظہور میں لانے کے مندرجہ ذیل طریقے ہوتے ہیں:

۱۔ظہور خلیفہ الٰہی: اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی ایسا شخص ظہور میں آتا ہے جس پر اس کا الہام ہوتا ہے اور اس کی روح میں ارتفاق ثالث کی مصلحتوں کا راز رکھ دیا جاتا ہے جس کے مطابق وہ ارتفاق ثالث کی تنظیم کرتا ہے۔

۲۔ظہور خلیفۂ خلیفہ الٰہی: یا کوئی ایسا شخص اس نظام کو سنبھالتا ہے جو خلیفہ الٰہی (پیغمبر وغیرہ) کا جانشین کامل اور خلیفہ ہو اور اس کی ہمت عزیمت اس پر مرکوز ہو کہ اس کے نقش قدم پر چلے اور اس کے علوم اخلاق وارتفاقات کی تقلید اور پیروی کرے۔

۳۔ظہور ملوک وسلاطین عادلہ: یا پھر اس نظام کو ایسے ملوک وسلاطین کے ہاتھ میں دیدیتا ہے، جو انصاف پسند اور عادلانہ اصول حیات پر کاربند رہتے ہوں اور انتظام مملکت اور انصرام حکومت کے لیے عالموں، داناؤں اور تجربہ کار لوگوں کو مشیر و وزیر بنادیتے ہیں۔ جن کی وجہ سے مملکت میں صلاح پیدا ہوتی ہے۔

۴۔ظہور ملوک وسلاطین جابرہ: یا پھر اس نظام کو ان لوگوں کے حوالہ کردیتا ہے جو مقتدر اور جابر ہوں ۔لیکن ان کی طبیعت میں یہ میلان ہوتا ہے کہ صرف مباح کاموں کی طرف

آگے بڑھتے ہیں اور پرانے بادشاہوں کے جاری کردہ رسموں کی پیروی کرتے ہیں۔ان کی اس جدوجہد کے نتیجہ میں وہ نظام ظہور میں آتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی مشیت اور تدبیر میں مضمر ہوتا ہے ان لوگوں کے نفوس فساد کی طرف مائل نہیں ہوتے اور مرنجان مرنج زندگی گزارنے اور اقتدار نہ بڑھانے کے عادی ہوتے ہیں اور اس طرح اللہ تعالیٰ کی سرزمین میں عدل وسکون اور اطمینان کی فضا قائم رہتی ہے۔

تمدن کی موت

اللہ تعالیٰ کی سرزمین میں ارتفاق ثالث (ہوتو ان صورتوں میں سے کسی نہ کسی صورت میں ہوگا،اور) درجہ بدرجہ ان سے خالی نہ ہوگا) یہ تمام صورتیں ایسی ہیں جن کے بغیر نظام تمدن قائم ہی نہیں ہوسکتا اور جو قوم وملک ارتفاق ثالث کے اس آخری مرتبہ یعنی وجودِ طبقۂ جابرہ سے بھی خالی ہوتو سمجھ لیجئے کہ نظام تمدن کا اعتدال صحی برقرار نہیں رہا اور وہ ایسی بیماریوں میں مبتلا ہوگیا جس کا نتیجہ بحران کی صورت میں ظاہر ہوگا (اور بحران کے بعد یا دوبارہ صحت نصیب ہوتی ہے اور بیماری فنا پر منتج ہوتی ہے)۔

دوسرا مقالہ:

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ

(۱) یہ مقالہ امام الانسان کے اُن احکام سے بحث کرتا ہے جو ابنائے آدم کی فطرت وشرست میں اس لیے ودیعت رکھے گئے ہیں تا کہ وہ ان کی بدولت علم وعمل کے شعبوں میں اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کر کے اپنے آپ کو ہر قسم کے شرور، فتنۂ قبر، عذاب النار اور دیگر تکلیفات متعلقہ سے بچانے کی صلاحیت واستعداد پیدا کریں۔

(۲) اس مقالہ میں ہم، (مسئلہ کو دو طریقوں سے بیان کرنے کی کوشش کریں گے۔

(الف) براہین اور دلائل عقلیہ کے ذریعہ ماخوذ طریقہ۔

(ب) عقل معاشی (روزہ مرہ کے معاملات کی سمجھ بوجھ) کا تجرباتی طریقہ اس لیے تجھے اس بحث میں اپنی بصیرت (اور نظر ذہنی) سے کام لینا ہوگا۔

پہلی فصل

معرفت باری تعالیٰ کا بیان جو فطرتِ انسانی میں ودیعت رکھی گئی ہے

یہ حقیقت ناقابل تردید عقلی دلیلوں سے ثابت ہو چکی ہے کہ اس عالم وجود میں ایک واجب الوجود ہستی ہے جو تمام ممکنات اور موجودات عالم کے ظہور و بقا اور حیات و قیام کا اصلی سبب اور علت العلل ہے۔ نفس انسانی اور اس کی عقل کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے پروردگار کی وحدانیت اور اس کی دوسری صفاتِ کاملہ کی معرفت دلائل و براہین سے حاصل کرے اور یہ یقین پیدا کرے کہ کائنات میں جو بھی تغیر و تبدل واقع ہوتا ہے وہ تنہا خدائے رحمٰن کی کارفرمائی ہے، جو خود ہر طرح کے انقلاب و تحول سے منزہ اور بالاتر ہے۔

ہم یہاں یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ اس طریق معرفت کی تفصیل بیان کریں۔ جو اللہ رحمٰن نے انسانوں کی سرشتوں میں ودیعت رکھا ہے جس کے ذریعہ وہ اپنے آپ کو اس کے لیے فارغ کر کے اپنے اللہ تعالیٰ (اور اس کی صفات) کو پہچانتے ہیں، کان لگا کر سنو!

رجحان بلا مرجح واقع نہیں ہوسکتا اور نوع حیوانی اور نوع انسانی دونوں کو یہ جبلی علم حاصل ہے کہ کائنات میں وجود اشیا اور تحول و تصرف علت مؤثرہ کے بغیر ظاہر نہیں ہوتے۔

تخلیق کے وقت اللہ تعالیٰ نے اپنے فیضان عنایت سے نوع حیوانی اور نوع انسانی کی فطرتوں میں یہ علم جبلی طور پر ودیعت رکھا کہ رجحان بلا مرجح واقع نہیں ہوتا۔ اور نیست سے ہست میں آنے والی ہر چیز کا وجود اور موجود اشیا میں ہر قسم کا تغیر و تبدل کسی علت مؤثرہ اور سبب موجد اور موجب کے بغیر ہرگز نہیں ہوسکتا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب کوئی جانور کوئی غیر مانوس و غیر معمولی آواز سنتا یا کوئی غیر معمولی حرکت یا حادثہ دیکھ لیتا ہے تو وہ چونکا ہوجاتا ہے۔ اگر اس کی اس حالت تنفر کا ناقدانہ جائزہ لو اور تنقیح کرو تو تمھیں یہ معلوم ہوجائے گا کہ (اس کی تہہ میں شر سے بچنے کی تدبیر اور شعور حیوانی کا فطری احساسِ بچاؤ مضمر

ہے) اور حیوان یہ جانتا ہے کہ کوئی واقعہ بغیر علّت مؤثرہ کے ظہور میں نہیں آتا۔ (اس لیے ضرور کوئی نیا حادثہ ہوا ہے پھر وہ اس کا سبب معلوم کرنے کے لیے چوکنا ہو جاتا ہے اور کان کھڑے کر کے ادھر اُدھر دیکھتا ہے)۔

اسی قضیہ کے عدم اعمال کی استثنائی صورت اور اس کے وجوہات

یہ الگ بات ہے کہ بعض حالات و اوقات میں قضیہ کلیہ من وعن کے ساتھ پوری طرح عمل پذیر نہیں ہوتا جیسے کہ دوسرے قضایائے کلیہ کی بھی یہی حالت ہے۔ مگر عمل پذیری نہ ہونے کی کئی وجوہات ہوسکتی ہیں۔ یا تو کسی خاص جزئی پر اس کلیہ کا حاوی ہونا اس عالم کے دائرہ علم و تنبیہ سے باہر ہے یا اس خاص جزئی کے متعلق چھان بین نہیں کی جاتی (ورنہ چھان بین کے بعد اس کا حاوی ہونا واضح ہو جاتا) اور یا بعض اوقات اس کو اس کلیہ کا خیال ہی نہیں ہوتا (حاوی ہونے یا نہ ہونے کا تو ذکر ہی نہیں)۔

جانوروں کی طرح انسان میں بھی رجحان بلا مرجح کے ناممکن ہونے کا فطری علم کلی پایا جاتا ہے بلکہ اگر دیکھا جائے تو لوگوں کے اکثر و بیشتر خیالات اسی قبیل سے تعلق رکھتے ہیں۔ (اور وہ سبب و مسبب اور علّت و معلول کے سلسلے پر نظر رکھتے ہیں)۔

حیوانوں پر انسانوں کی فوقیت کی دو وجہیں

(اسی اصل شعور میں تو انسان اور حیوان دونوں شریک ہیں لیکن) انسان کو دیگر حیوانات پر دو وجہ سے فوقیت و برتری حاصل ہے۔

ایک یہ کہ انسان اس نظریہ کو بہت دور دور تک لے جاتا ہے۔ اور اسے ایسی صورتوں پر چسپاں کرتا ہے۔ جہاں تک پہنچنے سے چوپایہ کی سمجھ قاصر رہتی ہے۔ یہ اس لیے کہ انسان حیوان کے مقابلہ میں بہت زیادہ بیدار مغز اور تیز ذہن کا مالک ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ انسان اس نظریہ کو مہمل اور غیر کارآمد رہنے نہیں دیتا ہے اور نہ حیوان کی طرح اس سے صرف یہ کام لیتا ہے کہ اپنی معیشت اور زندگی کے کاروبار کو سمجھ لے وہ اس شعور و علم کے ذریعہ (زندگی کی تعمیر و تحسین کے علاوہ) اپنی ذات کی تکمیل بھی کرتا ہے (اور دیگر علوم وفنون کی تکمیل، حربی علوم وفنون اور دفاعی آلات اور ساز وسامان کی ایجاد وغیرہ

بھی اسی شعور کے نتیجہ میں کرتا ہے) چوپایہ مغایرت شخصی کا احساس رکھتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی ذات کو اور اپنے بچوں کو اپنے جنس کے دوسرے جانوروں سے متمیز کرسکتا ہے اسی طرح اس کو مغایرت صنفی کا بھی احساس ہوتا ہے وہ نر اور مادہ میں تمیز کرسکتا ہے اور نر، مادہ سے صنفی تعلق قائم کرتا ہے اور کسی نر کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ اسی طرح وہ مغایرت نوعی کا بھی علم رکھتا ہے چنانچہ وہ اپنے نوع کے جانوروں کو دوسرے انواع حیوانات سے متمیز کرکے پہچان سکتا ہے اور صرف اپنی نوع کے چوپایوں کے ساتھ انس و محبت کے ساتھ رہتا ہے۔ دوسرے انواع سے تعلق نہیں رکھتا۔ اس کو یہ بھی علم ہوتا ہے کہ درندے کون سے جانور ہیں اور غیر درندے کون سے۔ چنانچہ چرندہ جانور یہ جانتا ہے کہ بھیڑیا اور شیر درندہ جانور ہیں اور وہ اس کے دشمن ہیں۔ اسی طرح وہ اپنی جنس کو دوسری جنسوں سے علیحدہ کرکے پہچان لیتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ نباتات اور جمادات کی شان یہ ہے کہ وہ بالارادہ حرکت اور دشمن کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔

خلاصہ یہ ہے کہ تمام مختلف صورتوں (جنسوں، نوعوں، صنفوں اور شخصوں) میں وہ فرق کرسکتا ہے لیکن اس کے اس علم و معرفت کا اثر صرف اس وقت ظاہر ہوتا ہے جبکہ اس کو کوئی ایسی ضرورت پیش آئے جو بغیر اس علم کے حل نہ ہوسکے۔ اس کے علاوہ اور صورتوں کے متعلق اس کا علم اجمالی رہتا ہے اور اس کا کوئی خارجی اثر نہیں ہوتا۔ اور نہ وہ اس علم اجمالی میں نظر تحقیق و امعان سے کام لیتا ہے۔

انسانوں میں اس کی مثال ایک بادیہ نشین عرب کی ہے۔ جو بولتے وقت جملہ کے فاعل و مفعول اور ان کے لوازم و خواص تو یقیناً جانتا ہے اور اس لیے وہ اعراب اور قواعد عربیہ کے صحیح استعمال میں کبھی غلطی نہیں کرتا، لیکن بایں ہمہ وہ قواعد صرف و نحو میں کمال ذاتی حاصل کرنے اور ان میں تحقیقی نظروں سے کوشش کرنے کو غیر ضروری سمجھتا ہے برخلاف اس کے ایک نحوی عالم کے ذہن میں قواعد عربیہ کا جو علم مرکوز ہوچکا ہے وہ اس میں مزید غور و فکر کرتا ہے اور اس کے جملہ اصول و فروع کو تنقیح کرکے ان کو اپنی عقل و ادراک کا نشانہ بناتا ہے۔

ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ چوپایہ عالم ناسوت اور عالم خارج ناسوت (یعنی ملکوت) کے درمیان تمیز کرسکتا ہے لیکن اس ادراک کا کوئی ظاہری اثر اس پر نمایاں نہیں ہوتا ہاں اگر عالم غیب کے اثرات نظام متعارف و رائج میں کوئی خارق عادت کیفیت پیدا کریں تو اس

صورت میں چوپایہ کو بھی اس کا احساس ہو جاتا ہے۔اس کے برعکس انسان کے ذہن میں وقت ضرورت پیش آئے بغیر بھی متغایر اشیا اوران کی صورتوں کا علم اور نقشہ ہر وقت محفوظ رہتا ہے۔اور عالم ناسوت اور عالم ملکوت متمیز رہتے ہیں۔

انسان کے مخصوص اعمال میں سے حکمت و دانائی کا ایک عمل جو دوسرے چوپایوں میں نہیں پائی جاتی، یہ ہے کہ وہ زمانہ کی مقدار کو طول اور کمی کے لحاظ سے پوری طرح جانتا ہے اسی طرح اطراف وجہات اور مسافتوں کے پیانوں پر بھی اس کا علم حاوی ہے اور سیاروں اور آسمانوں کے متعلق بھی اس نے بڑی طویل کوشش، پوری محنت اور لمبی عمر صرف کر کے حقائق دریافت کر لیے ہیں۔علیٰ ہذا القیاس وہ اپنے علم سے کائنات کے ان گوشوں کو بھی مسخر کرنا چاہتا ہے جو اس کے ابنائے نوع (ابنائے جنس) کے دسترس اور احاطہ سے باہر ہیں۔

استعداد خدا شناسی انسانی فطرت میں ودیعت ہے

خلاصہ کلام یہ ہے کہ جب اس طرح انسان نے اپنے علم کا دائرہ وسیع کیا اور اس نے دیکھا کہ خود اس کی ذات اور اندرونی باطنی اور جسمانی دنیا میں اور اس کی ذات سے خارج تمام کائنات میں ایک منظم تدبیر اور پُر حکمت نظام موجود ہے، اور یہ بھی معلوم کیا کہ تمام عوالم سماویہ اور ارضیہ کا نظام مقررہ قوانین پر چل رہا ہے جس میں ذرہ برابر بھی خلل نہیں آتا۔(اور تمام اشیائے کائنات طوعاً وکرہاً ان حکیمانہ قوانین کی اس حد تک پابند ہیں کہ سرمو اس سے انحراف اور اس کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے)۔تو وہ اپنی فطرت سے اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ اس نظام کے لیے وجود میں لانے والا موجب کوئی اور ہے۔ جو اس عالم سے خارج ہے۔یہ اجمالی معرفت نوع انسانی کے تمام افراد کی جبلّت میں مرکوز ہے لہٰذا مشرق ومغرب میں کوئی بھی سلیم الطبع، قوم نہیں جس کا یہ عقیدہ نہ ہو۔

اختلاف خدا شناسی میں نہیں تعیین خدا میں ہے

یہ اور بات ہے کہ ان میں اس موجب اور مدبر کی تعیین میں اختلاف پیدا ہوا۔اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ بعض کا علم اس نظام کے متعلق محدود و نامکمل رہا چنانچہ ان کو صرف یہ ضرورت

محسوس ہوئی کہ موالید ثلاثہ اور کائنات الجو کا جو نظام ان کے مشاہدہ میں آ رہا ہے اس کے اندر ایک فعال قوت کا اثبات کریں کیونکہ اسی نظام مرئی و مشاہد کے اسباب و مسببات کا علم ان کے نزدیک حقیقی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے برعکس نظام غیر مرئی اگرچہ ان کے نزدیک اجمالی طور پر ثابت شدہ امر ہے۔ لیکن یہ خیال ان کے دلوں میں اس قدر راسخ نہیں ہوا کہ اس کی حقیقت دریافت کرنے کی طرف متوجہ ہوں اور اس کے اسباب کی طلب کے لیے مضطرب و بے قرار ہوں۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ایک عام بازاری آدمی بادشاہوں کے تمدنی تنعم اور پُرلذت زندگیوں سے اجمالی طور پر واقف ہوتا ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ ان کی زندگی اس کی اپنی زندگی سے بدرجہا بہتر ہے۔ لیکن کبھی کبھی وہ یہ خیال بھی نہیں کرتا کہ اس کا دل بھی ان کے درجہ تنعم تک پہنچنے کی طلب و سعی کرے اور اس کے بغیر اطمینان کا سانس نہ لے۔ اس لیے وہ اپنے اس سادہ طریق زندگی پر قانع رہتا ہے جس پر اس کے دوسرے ہم رتبہ اور ہم طبقہ ہوتے ہیں۔ اس کے برخلاف شہزادوں اور عالی ہمت لوگوں کا شیوہ یہ ہوتا ہے کہ وہ تنعم پسندی کے جذبے کے تحت پُر تکلف زندگی کے حصول کے لیے موروثی خواہش اور بے قراری رکھتے ہیں۔ اور جب تک وہ اس کو حاصل نہ کر لیں رات کی نیند اور دن کے آرام سے لطف اندوز نہیں ہوتے۔ خلاصہ یہ کہ جو لوگ وسیع النظر نہیں ہیں اس مسرتی و خوشنما مگر نامکمل نظام کائنات کے اندر ایک فعال قوت کے متلاشی ہیں۔ ان کی نظر ظاہری اسباب اور علل قریبہ سے ماوراء علة العلل کی طرف متجاوز نہیں ہوتی چنانچہ ان میں سے بعض تو عناصر کے قوائے طبیعیہ کو تخلیق و تحویل کا منبع سمجھتے ہیں اور ان کو قوت فعال سے موسوم کرتے ہیں۔ بعض لوگ اس کو سیاروں اور اجرام فلکیہ کی حرکتوں کی طرف منسوب کرتے ہیں اور بعض دوسروں کا یہ خیال ہے کہ دنیاوی حوادث کچھ صلحا کی روحوں اور ان کے علاوہ دیگر برگزیدہ لوگوں، دیوتاؤں، قدوسیوں اور اولیا کے دستِ تصرف میں ہیں۔ اس لیے کہ ان کے قدس (اندازہ) اور بحث و نظر نے جو ان کے پیمانہ علم کے مطابق تھے، اتفاقیہ طور پر ان کے تجربہ ہی چند ایسے امور مشاہدہ اور وہ ان اولیاء و صالحین کو سید و آقا کی حیثیت دے کر ان کی ربوبیت کے قائل ہوئے اس نتیجہ پر ان کو آمادہ کرنے والا انکا توبہ تو جہل ہوتا ہے (جو ان کو اللہ واحد و قہار کی معرفت تک پہنچنے نہیں دیتا)۔ ایسے لوگوں کا انجام دو طرح سے ہوتا ہے یا تو وہ اسی قبیح اعتقاد پر مر جاتے ہیں جبکہ چاروں طرف سے جہالت کی تاریکی ان کو

گھیرے ہوئے ہوتی ہے۔ اس طرح یہ لوگ مخلوق الٰہی میں حق کی معرفت اور اللہ تعالیٰ کی رحمت شاملہ سے دور ترین مخلوق رہ جاتے ہیں۔ اور یا دوسری صورت یہ ہے کہ خدائے رحمٰن عزّ و جلّ ان پر نظر عنایت فرمالے۔ ان کے ذہن میں وسعت و ہمہ گیری پیدا ہو اور وہ نظام کائنات کو اپنے اس تصور سے زیادہ وسیع شکل میں دیکھنے کی کوشش کریں۔ اور اس طرح اپنے پہلے غلط اعتقاد کو مٹادیں اس طرح ہوتے ہوتے ان کا دائرہ علم وسیع ہوتا جائے۔ اور جب تک اللہ تعالیٰ چاہے وہ مسلسل غور وفکر کرتے رہیں۔ ایسے لوگ مسلسل حیرت میں رہتے ہیں اور یہ وہ لوگ ہیں جو معرفت الٰہی کے حاصل کرنے کا انحصار صرف اپنی عقل ورائے پر کرتے ہیں۔

معرفت الٰہی کے حصول کا ذریعہ عقل نارسا نہیں بلکہ قلب سلیم ہے

اس کے برعکس وہ شخص جو دین حنیف کا قائل اور شرک وبت پرستی کی ساری نجاستوں سے پاک اور خدائے واحد کے لیے دنیا اور دنیا والوں سے یکسر ہو کر تلاش حق کر رہا ہے اس کے قلب سلیم سے یہ صدا اٹھتی ہے لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ (یعنی اگر میرا پروردگار مجھے ہدایت نہ دے تو میں گمراہوں کے زمرے میں شامل رہ جاؤں گا) اس لیے وہ اپنی فطرت کے تقاضوں اور ضمیر کی صداؤں کی طرف گریبان میں منہ ڈال لیتا ہے تو اسے یہ حقیقت معلوم ہو جاتی ہے کہ پروردگار عالم نے اس کی سرشت میں معرفتِ الٰہی کا ٹھیک علم ودیعت رکھا ہے۔ اور اس کو اس کی انسانی فطرت کے عین مناسب سچی معرفت کی استعداد سے بھی نوازا ہے۔

باب ہٰذا کی تفصیل

اس بات کی تفصیل یہ ہے کہ انسان کو دو قسم کی عقل مرحمت فرمائی گئی:

ایک تو عقل حیوانی ہے جو امور معاش میں کام آتی ہے اور جس میں جملہ حیوانات اس کے شریک وسہیم ہیں پھر بھی اس کی عقل معاش کو دوسرے چرند پرند پر خاص فوقیت حاصل ہے۔ کیونکہ اس کی ترکیب جسمانی میں صفائی، صلابت اور اتصالِ عناصرِ حیات بدرجہ اتم موجود ہیں۔

دوسری عقل انسانی ہے۔ جو عقل حیوانی سے اس قدر مختلف ہے گویا کہ وہ اصلاً اس کی جنس میں سے نہیں ہے۔ یہ انسان کو اس وقت عنایت ہوتی ہے جب وہ ناسوتی (مادی) حالت کو فنا کر کے عالم جبروت میں قدم رکھتا ہے۔ معرفت الٰہی جس کا تخم انسان کی فطرت میں موجود ہے اور جس کے ذریعہ اس کو دنیا و آخرت کی نجات و سعادت نصیب ہوتی ہے۔ وہ عقل معاشی کا نتیجہ ہے، جس میں حیوانات بھی اس کے ساتھ شریک ہیں، مگر انسان کو قدرے زیادہ عقل معاشی دی گئی ہے۔

خداشناسی بذریعہ عقل معاشی

دین حنفی (یعنی اسلام کا لب لباب) یہ ہے کہ تم اپنے رب کو عقل معاشی کے ذریعے اس طرح پہچان لو جس میں کسی قسم کا شک وارتیاب نہ رہے۔ اور جو کچھ تم نے اپنے رب کے کمال اور صفاتِ حسنیٰ کو اپنی عقل سے سمجھا ہے، تمہاری زبان کی تعبیر اس ادراک کے مطابق ہو یعنی تصدیق بالجنان واقرار باللسان ہو۔ اپنے رب کی معرفت عقلِ معاشی کے ذریعہ حاصل کرنا مستبعد اور تعجب خیز نہیں ہے۔ کیونکہ جس حد تک وہ رسائی حاصل نہیں کر سکے گا وہاں وہ اپنے عجز و تقصیر کا اعتراف کر کے نور ایمان سے منور ہو جائے گا اور جہاں وہ تفصیلی معرفت تک نہیں پہنچ سکے گا وہاں اجمالی پر اکتفا کرے گا اور اپنے مطلب (باری تعالیٰ) کا کوئی نہ کوئی ذہنی تصور باندھ کر اپنے رب کو پہچان لے گا اور اس موثر اجمالی مقدمہ کے ذریعے کہ "اللہ کی طرح کوئی چیز نہیں ہے۔ اپنی عقل سلیم کو سر اطاعت ختم کرنے پر مجبور پائے گا۔ جب وہ معرفت الٰہی کی اس ذہنی صورت کے ساتھ قدم آگے بڑھائے گا اور کسی وقت اس پر حق واضح اور منکشف ہو جائے خواہ یوم آخرت میں کیوں نہ ہو تو اپنے پہلے سے قائم کردہ ذہنی اور اجمالی صورت کو چھوڑ کر اور اس اجمالی مقدمہ کی بدولت کہ اللہ تعالیٰ کی طرح کوئی چیز نہیں، ایک اور حقیقی معرفت تک عروج کر جائے گا اور معرفتِ الٰہیہ کے بلند ترین مدارج پر فائز ہوگا۔ یہ اجمالی معرفت اللہ تعالیٰ کا ایک مخفی راز ہے اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے کہ دریائے معرفت کو عقل معاشی کے کوزے میں اس طرح بند کر دیا گیا ہے جس میں کسی قسم کا اختلاط نہ ہو۔ ان دونوں (معرفت اجمالی فی الدنیا والآخرت اور معرفت حقہ)

کے درمیان فرق صرف اجمال اور تفصیل کا ہے (جس طرح تخم میں درخت کا برگ و بار جو بعد میں تفصیلاً عالمِ وجود میں آتا ہے پہلے سے تخم میں اجمالاً موجود ہوتا ہے۔

توضیح مطلب بذریعہ دلیل منطقی

اسی کو ہم ایک اور مثال کے ذریعہ بیان کر سکتے ہیں۔ تمہیں معلوم ہے کہ ذہن انسانی ہر چیز کا تصور باندھ سکتا ہے اور ایک گونہ اس کا ادراک کر سکتا ہے خواہ وہ چیز موجود ہو یا معدوم ممکن ہو یا ممتنع یا واجب الوجود۔ جس وقت ہم معدومِ مطلق پر حکم لگاتے ہیں مثلاً یہ کہتے ہیں کہ معدوم مطلق یا ممتنع (کا وجود محال ہے یا وہ) ایسا ویسا ہے تو ہم نے اس طرح معدوم کا تصور باندھ لیا ہے۔ کیونکہ اگر ایسا نہیں تو ہم اس پر محال یا ایسے ویسے کا حکم کیسے لگا سکتے کیا یہ تصور ذہنی معدوم محض کے مطابق، ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ مطابق ہے کہ اس صورت میں معدوم محض نہیں ہوگا یا کیا تصور معدوم محض کے مطابق ہیں، ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ اس صورت میں ہم اس پر وہ احکام کیسے لگا سکتے ہیں جو صرف معدوم کے لیے مخصوص ہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ جب ہم اس تصور ذہنی پر غائر نظر ڈالتے ہیں تو اس سے معدومِ محض کے وہ سب احکام ہماری نگاہوں کے سامنے ظاہر ہوتے ہیں جو معدومِ محض پر ان قضایا میں لگائے جاتے ہیں جن کی صحت حتمی طور ثابت شدہ ہوتی ہے اور وہ تمام قضایا حقیقت پر مبنی ہیں۔ اس جیسے احکام میں حقیقت یہ ہے کہ ذہن میں جن امور کے ادراک کی فطری قوت رکھی گئی ہے ان کے ادراک کی استعداد اور سامان بھی اس کو فراہم کیا گیا ہے۔ وہ جب کسی چیز کی ضرورت محسوس کرتا ہے، تو اس چیز کی ایسی تصویر اپنے نہاں خانۂ دل اور اس کا ایسا تصور اپنے سینہ میں بنا لیتا ہے۔ جو امر مطلوب کے ادراک کا آئینہ ہوتا ہے۔ اپنے اس تصور کی ماہیت کو بعینہٖ اسی چیز کی ماہیت سمجھتا ہے۔ اور اس کے احکام بھی اس پر جاری کرتا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ یہ اجمالی قاعدہ بھی جانتا ہے کہ کسی معدوم محض کے مشابہ کوئی اور چیز نہیں ہو سکتی اور اس طرح وہ جہل مرکب سے نجات پاتا ہے۔ حتی کہ اگر معدوم محض تک پہنچنے اور اس سے پردہ خفا ہٹانے کو بھی فرض کر لیں تب بھی وہ کسی وجہ سے اسے اپنے تصور کے خلاف نہیں پائے گا۔ یہی حال ان سب امور و احکام کا ہے جو انسان کی قوت ادراک کی

رسائی سے باہر ہیں۔ (کہ اگر اس کے ذیلی تصور کے ساتھ ساتھ یہ عقیدہ بھی شامل ہو کہ اس کے ذہنی تصور اور اس چیز کی اصل تصویر میں بڑا فرق ہے۔ اور وہ آپس میں ایک دوسرے کے مشابہ نہیں ہیں تو اس کو بھی ہم معرفت کہیں گے)۔

یہ بھی یاد رہے کہ معدوم کے لیے ذہن میں ایک مخصوص صورت کا قائم کرنا خود انسان کا اکتسابی کمال نہیں ہے اور نہ یہ اس کے فکر ونظر کے استعمال کا نتیجہ ہے بلکہ یہ تو اللہ تعالیٰ کی دین ہے جو انسان کی جبلّت میں بطور استعداد کے رکھی گئی ہے جیسے کہ شہد کی مکھی اور چڑیا وغیرہ کو معاش اور مرافق حیات حاصل کرنے کی فطری تلقین کی گئی ہے۔

معرفت باری تعالیٰ بذریعہ عقلِ معاشی اور اخلاق وعلوم

اسی طرح رب تعالیٰ کی معرفت کماحقہ کسی فرد بشر کو حاصل نہیں ہو سکتی کیونکہ پروردگار کی ذات انسان کی عقل نارسا سے ماوراذات ہے۔ اللہ تعالیٰ کا تصور ایک اجمالی آگہی، بیداری، اور اس کی طرف التفات فکر ونظر سے زیادہ کچھ نہیں۔ جب وہ اس کلّیہ کو عمل میں لانے کی طرف ملتفت ہو کہ ہر موجود کے لیے کوئی نہ کوئی موجد ضرور ہوتا ہے اور ہر نئی صورت گری کسی محول کی مرہون منت ہوتی ہے۔ معرفت الٰہی کا یہ درجہ اسے ذاتی محنت و اکتساب سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ وہ تو پروردگار عالم کی بخشش وعنایت ہوتی ہے جو بندے کی فطرت کے ذریعہ جاری ہوتی ہے۔ اکتساب کو اگر دخل ہے تو صرف اس قدر کہ فطرت کو بیدار کیا جائے اور اس فطرت کو اپنا کمال سمجھا جائے۔ کیوں کہ اخلاق اور علوم کے ذریعے کمال حاصل کرنے کا شوق انسان میں فطری ہے۔

معرفت خداوندی کو حاصل کرنے اور اس کو مذکورہ قاعدہ کلیّہ (لکل موجود موجد) سے مستنبط کرنے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ کارخانہ ہستی میں جو نظام ہم دیکھ رہے ہیں، یا جس کی صحت پر عقل سلیم کے دلائل قائم ہیں، اس کا کوئی موجد اور بنانے والا ضرور ہے۔ جس نے اس کو نیست سے ہست کر دیا ہے۔ وہ ایجاد کنندہ ہستی عالم مادّی سے خارج (مستقل اور مطلق) بالاتر وجود رکھتی ہے۔ اس کے اوصاف مخلوقات کے اوصاف سے بالکل مختلف ہیں۔ اس کی مثل کہیں نہیں۔ اس کی حقیقت کے ادراک سے سب لوگ

قاصر ہیں اور وہ بالفعل اس کی معرفت تک رسائی نہیں رکھتے۔ وہ پروردگار و مربی ہے اور وہ سب امور میں تصرف کرتی ہے اور وہ کسی طرح اس نظام کائنات کے مشابہ نہیں ہے۔ پھر جب وہ محسوس سے ترقی کر کے تخیل یعنی عالم مشہودات و موجودات سے عالم خیال میں قدم رکھتا ہے تو نظام کائنات کے چلانے والے کو واہمہ اور متخیلہ کے سب تصوروں اور تصویروں سے منزہ کر لیتا ہے اور جب وہ عالم شہادت سے ترقی کر کے عالم غیب میں قدم رکھتا ہے تو وہ اپنے رب کو عالم غیب کی ہیئتوں سے اسی طرح منزہ سمجھ لیتا ہے۔ جس طرح عالم شہادت کی ہیئتوں سے پاک و منزہ سمجھا تھا۔ (اور لیس کمثله شئی کو اپنے ذہن میں قائم رکھتا ہے) اور اس طرح جب ارتقا کی بلند ترین منزل پر پہنچ کر جملہ کائنات اور اس کے اندر کارفرما نظام کا احاطہ کر لیتا ہے تو وہاں بھی ذہنی تصور الٰہی کے ساتھ ساتھ لیس کمثله شیئی کو قائم رکھتا ہے۔ غرض وہ ذہنی ارتقا کی جس حالت میں بھی پہنچتا ہے وہاں اسے معرفت اولی یعنی اجمالی معرفت سے رجوع یا اس کی تکذیب کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ اس ہمہ گیر نظام میں جو آثار و ظہورات اسے باہم منظم نظر آئیں گے وہ ان کو اسی ایک ذات اقدس کے حکیمانہ تصرف کے کرشمے سمجھے گا اور اسی طرح بعد کے تمام منظم انکشافات کو بھی ذات الٰہی کی تدبیر کی طرف راجع کرے گا اور اس کی یہ معرفت اس کی پہلی اجمالی معرفت کی تفصیل ہوگی۔ (بعینہٖ جس طرح درخت کی شاخیں اور اس کے پتّے اور پھول پھل سب اس کے تخم کے اجمال کی تفصیل ہوتی ہیں۔ ممکن ہے الدنیا مزرعة الاخرة کے ایک معنی یہ بھی ہوں) اور پہلی معرفت میں ذرّہ بھی گڑبڑ اور تخلیط نہیں ہوگی اور نہ اس میں جہل کی آمیزش ہوگی۔

سوءمعرفت کے اسباب واقسام

وہ لوگ جنھوں نے پورے نظام کائنات کو نہیں سمجھا تو (وہ سوءمعرفتِ الٰہی کے شکار ہو گئے اور) انھوں نے اس نظام کے ظاہری اسباب کو علۃ العلل سمجھ کر خدائے خالق و مدبر کی پہچان میں غلطی کی چنانچہ علما طبعیات نے اس نظام کو عناصر کے طبائع سے منسوب کیا۔ صائبین نے اس کو سیارات اور اجرام فلکیہ کی گردش کا نتیجہ قرار دیا اور وہ ان سیاروں اور ستاروں کی ربوبیت کے قائل ہو گئے۔ اور مشرکوں نے اس نظام کے بعض آثار کو اپنے

اسلاف کے عظما اور مقدس ہستیوں سے جن کو وہ اللہ تعالیٰ کے شریک سمجھتے ہیں منسوب کیا۔ ان سب کے جاہلانہ نظریۂ معرفت کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے خالص فطرتِ انسانی کی طرف رجوع نہیں کیا۔ اور ان کے سینوں میں جو مکمل معرفت مرکوز تھی اس کو نظر انداز کر کے اس کے ساتھ دوسری اشیا مخلوط کر ڈالیں، محسوسات کے ساتھ اور مالوف عادتوں کے ساتھ معرفت الٰہی کے اختلاط اور موروثی عقائد و رسومات کی تقلید نے ان کو ورطہ ضلالت میں ڈالا۔

یہ خیال تمہارے ذہن و دل میں پیدا نہیں ہونا چاہیے کہ جب اجمالی طور پر معرفت حقہ ان کی فطرت میں موجود تھی تو تفاصیل میں انھوں نے کیوں غلط راستہ اختیار کیا؟ میں تمہارے سامنے ایک مثال سے اس کی توضیح کرتا ہوں۔ مثلاً ایک شخص کو ڈاکٹر یا حکیم کے کہنے سے یا اپنے تجربہ کی بنا پر یہ یقین ہوتا ہے کہ یہ کڑوی اور تلخ دوائی میری بیماری کا علاج ہے بشرطیکہ وہ اسے کھالے لیکن وہ اپنی طبعی نفرت کی وجہ سے وہ دوائی نہیں کھاتا۔ اسی طرح انسان بعض ان اخلاق حسنہ کے حسن و کمال کا جبلی طور پر قائل ہوتا ہے، وہ جسم کے عناصر ترکیبیہ کے کمال اتصال و صلابت سے پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن بعض خارجی عوامل اور گرد و پیش کے حالات کی وجہ سے وہ ان اخلاق کی خوبیوں کا قائل ہو کر بھی ان پر عمل پیرا نہیں ہوتا۔ شاید اس کا راز یہ ہے کہ انسانی طبیعت، عادات و تقالید اور محسوسات و مشہودات سے وابستگی انسان کے دل و دماغ اور فطرت سلیمہ کے تقاضوں پر غالب آتی ہے اور وہ اپنی نظر عقلی کو اس معرفت پر مرکوز نہیں کر سکتا جو فطرتاً اس کے ذہن کے اندر محفوظ ہے۔

الغرض یہی معرفت اجمالی تسبیح بحمدہ کی تفسیر ہے جس کی وجہ سے انسان اپنے ابنائے جنس (حیوانات و نباتات و جمادات) میں ممتاز ہے۔ یہ معرفت ہر آدمی کے ذہن میں مرکوز ہے یہ اور بات ہے کہ بعض لوگوں کو اس فطری معرفت اجمالی کے خلاف عمل کرتے ہوئے دیکھا جائے جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ مادیات کی طرف جھک کر انہیں میں مستغرق ہوتے ہیں۔ اور کبھی اندرون سینہ مخفی داعیۂ توحید کی طرف یکسو ہو کر دھیان نہیں دیتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جن نظریوں کی بنا انسان کے وجدان پر ہوتی ہے، وہ علم حصولی کی طرح (ہر وقت پیش نظر اور ادراک پر مسلّط) نہیں ہوتے۔

دوسری فصل

اللہ تعالیٰ کے اسماو صفات کا اجمالی اثبات اور زبان متعارف میں ان کی کیفیت تعبیر سے آگاہی

وجودِ حق پر کلی و جزی کا اطلاق نہیں ہوسکتا وہ کلی و جزئی سب پر محیط ہے

کیا دلیل قطعی سے یہ بات ثابت نہیں ہوچکی کہ وجوب قطعی (جو اللہ تعالیٰ کی صفت خاص ہے) نہ تو کلی ہے اور نہ جزئی کیونکہ (درحقیقت) وہ تمام موجودات و کائنات کا مبدا حیات ہے۔ سب کی نسبت اس سے برابر ہے اور سب کو اس کی وحدت نے گھیر رکھا ہے۔ وہی وجود حق تقرر ناجز اور ثبات دائم سے متصف ہے وہ ناتمام و ناقص کلیات اور مقید و تنگ بلکہ پوری طرح محدود جزئیات سے ہر لحاظ سے مختلف ہے، حقیقت تو یہ ہے کہ کلی اور جزئی کا مفہوم عقل کی ایجاد اور قوت مدرکہ کا اختراع و صنعت گری ہے۔ جس حقیقت سے بالاتر کوئی دوسری حقیقت ہی نہیں وہ ان دونوں کے ساتھ موصوف و متصف ہونے سے مبرا ہے۔

خدائے رحمٰن جل وعلا کا فیض کلی ہے جو سب پر محیط ہے۔ کوئی موجود خواہ وہ جوہر ہو یا عرض اور کوئی حادث شے جو ظہور میں آئے یا اور کسی حالت کو چھوڑ کر دوسری حالت میں تبدیل ہو (غرضیکہ کائنات کی جملہ تصریفات اور تبدیلیاں) اسی ہمہ گیر فیض کے سرچشمہ سے سیراب ہوتی ہیں۔

اس معرفت تفصیلیہ کے ادراک کے دو رخ

اس حقیقت کا ادراک کرنے کے دو رخ ہیں:

ایک یہ کہ اس کو اوپر کی جانب سے دیکھا جائے اور اس وجدانی حقیقت کو چشم بصیرت سے مشاہدہ کیا جائے جو مظاہر مختلفہ میں سرایت کیے ہوئے ہے۔

دوسرا یہ کہ اس کو نیچے کی طرف سے دیکھا جائے اور ہر ایک مظہر کو مستقل طور پر اس طرح مشاہدہ کیا جائے کہ اس میں فیض رحمانی کی جھلک صاف نظر آتی ہو۔

اب ہر ایک مظہر میں ظہور فیض کی جو حالت ہے اس کو جداگانہ نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لہٰذا جتنے مظاہر ہوں گے اتنے ہی اسما ہوں گے تفصیلی معرفت الٰہی کے لیے دوسرا رخ زیادہ مناسب ہے۔

واجب الوجود کا علم اشیا ذاتی، مقدس اور محیط ہوتا ہے

"واجب ومطلق" سے جو کچھ بھی صادر ہوتا ہے اس کا اس کو علم ہوتا ہے اور اس کا یہ علم اس کے علم ذات میں مندرج ہوتا ہے اور ہر ایک معلوم کے تمام صفات ومتعلقات پر حاوی ہوتا ہے اور کیوں نہ ہو؟ سب اس کے معلول اور اس کی ذات اقدس کے شؤون اور کمالات نفسی کے پرتو ہی تو ہیں۔ اس کا علم ہمارے علم کی طرح نہیں ہے۔ کیوں کہ ہم حواس کے ذریعے عوارض اور ظاہری صورتوں کو دیکھ کر کسی چیز تک رسائی حاصل کرتے ہیں اور اسی طریق سے اس کو پاتے ہیں جس طریق سے ہم اس تک رسائی کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن واجب تعالیٰ ہر چیز تک اس چیز کے علل اور اس کے وجود کے پیدا کرنے کے اسباب سے متعلق اپنے علم مقدس کی جانب سے آتا ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس کا علم مقدس تمام معلومات پر محیط ہے۔ خواہ وہ معلومات کلیات ہوں یا جزئیات ہوں لیکن یہ نکتہ ہر وقت ملحوظ رہے کہ اس کا علم مقدس ہمارے علم حواس وناسوت کی طرح نہیں ہوتا۔ بعینہٖ اس طرح جس طرح اس کی دیگر صفات عالیہ اصول ومبادی میں ہماری مادیت کی گندگی سے آلودہ ناسوتی صفات سے کسی قسم کی مماثلت ومشابہت نہیں رکھتیں ہاں نتائج اور آثار کے لحاظ سے دونوں کی صفات میں مشابہت پائی جاتی ہے۔ اس نظریہ کو فلاسفہ اور اہل ملت سب یکساں طور پر مانتے ہیں۔ ان کے درمیان اختلاف لفظی نزاع سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا اور وہ نزاع

لفظی تحقیق کے وقت مضمحل (اور نابود) ہو جاتا ہے۔

الفاظ مستعملہ کی حقیقت

تم جن الفاظ کو روزمرہ کی گفتگو میں استعمال کرتے ہو کبھی تم نے ان کے حقائق پر غور وفکر کیا ہے؟ اگر کرتے تو تمھیں یہ معلوم ہوتا کہ ہر اسم اور صفت کا اطلاق تم کسی چیز پر اس وقت کرتے ہو جبکہ تم ایک قسم کے آثار وعلامات اس سے ظہور میں آتے ہوئے دیکھتے ہو جن پر اس اسم اور صفت کی بنیاد ہوتی ہے۔ جن کی بنا پر اس وقت یہ اطلاق وتسمیہ درست ہوتا ہے لیکن اس کے بعض آثار وعلامات اور نشانیاں اس قسم کی ہوتی ہیں جن کو تم کسی اسم یا وصف کا اطلاع کرتے وقت ملحوظ نہیں رکھتے۔ مثلاً قتل کا وقوع جس طرح تلوار کے مارنے سے ہوتا ہے، اس طرح گلا گھونٹنے یا کسی اور مہلک ہتھیار کے استعمال سے بھی موت واقع ہو سکتی ہے۔ جس کو قتل ہی کہیں گے۔ تحقیق سے ظاہر ہوتا ہے کہ قتل کے اطلاق میں ان مختلف شکلوں کے تصور کو دخل نہیں قتل کا اطلاق روح کو جسد عنصری سے جدا کرنے پر ہوتا ہے جب بھی کسی کی روح کسی آلۂ جارحہ سے یا کسی غیر کے فعل سے جسم سے پرواز کرے گی اس فعل کو قتل کہا جائے گا۔ بالفاظ دیگر قتل ازہاقِ روح کا نام ہے۔

اس طرح لفظ ''الرحیم'' ہے اس کا مفہوم حقیقی یہ ہے کہ جس ذات کو اس اسم سے پکارا یا موسوم کیا جائے تو ضروری ہے کہ وہ لوگوں کی خبر گیری کرتا اور ان کی ضروریات وحوائج پورے کرتا ہو اس کی مثال ایک مشفق باپ کی ہوتی ہے جو اپنے بیٹے پر شفقت فرماتا ہے۔ رحمت کا نام درحقیقت رافت ورقت قلب کے معنی کے لیے وضع نہیں کیا گیا ہے لیکن بعد میں جب ماہرین لغات نے ''رحمت'' کی جامع ومانع قسم کی توضیح کی طرف توجہ دی تو رقت کے سوا کوئی دوسرا لفظ قریب ترین مفہوم کے ساتھ ان کو نہیں ملا ورنہ حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی متکلم رحمت کا لفظ یا اس لفظ کے مشتقات استعمال کرتا ہے اس وقت اس کے ذہن میں رقت قلب کا مفہوم آبھی جائے تو وہ صرف اس لیے ہوگا کہ اس سے عام طور پر رحمت کا تصور واضح ہو جاتا ہے۔ اس لیے نہیں کہ رحمت رقتِ قلب ہی کا نام ہے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص بغیر اس

کے کہ دل میں رقت پیدا ہو مشفقانہ طریقہ پر اور پدرانہ محبت کی صورت میں لوگوں کے حوائج اور ضروریات پوری کرتا رہے تو رحیم کے بغیر اور کسی لفظ کا اطلاق اس پر موزوں نہ ہوگا۔

الغرض الفاظ کو وضع کرنے کی ضرورت مختلف حقائق کا مفہوم ذہن نشین کرنے کی وجہ سے پیش آئی اسی طرح ہم کو حقائق میں تعدد اور کثرت کا احساس بھی ان کے آثار و علامات اور نشانیوں کی کثرت کے مشاہدے سے ہوتا ہے۔ ہم ہر حقیقت کو اپنے آثار و علامات کے ذریعے پہچان لیتے ہیں اور ہر لفظ کسی ایسی حقیقت کے لیے وضع کیا جاتا ہے جس سے مخصوص آثار رونما ہوتے ہیں۔ اس تحقیق سے میں اس حقیقت پر پہنچا ہوں کہ مادیات سے بالاتر حقائق کے لیے ان اسما وصفات کا استعمال کرنا جو ہماری معاشی زبان میں انہی جیسے حقائق کے لیے وضع کیے گئے ہیں۔ نتائج اور آثار ہی کے لحاظ سے ہے۔ اور مبادی کا کچھ بھی لحاظ نہیں رکھا گیا۔ یہ استعمال حقیقی ہے مجازی نہیں۔ اور زبان کے محاورہ کے عین مطابق ہے۔ خواہ مخواہ مبادی کی طرف ذہن کو منتقل کرنا ان لوگوں کی فضول موشگافی ہے جو اپنے آپ کو علما کہتے ہیں اور جو غیر متعلقہ گفتگو میں پڑ کر متکلمین کہلاتے ہیں۔ خالص اہل زبان کے نزدیک اس قسم کی لغو باریک بینی پسندیدہ نہیں ہے۔ اگر (متکلمین کو اپنی بات پر اصرار ہو اور) ہم ان کی خاطر کچھ نیچے اتر کر بات کریں تو ہم کم از کم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس قسم کا اطلاق (یعنی رحیم کا اطلاق اس ذات پر ہے جس سے رحیمانہ افعال صادر ہوں) کلام متعارف میں جائز اور مقبول سمجھا جاتا ہے اور کوئی بھی اس کو قابلِ اعتراض خیال نہیں کرتا۔

لسانی اور عقلی علوم کے ساتھ باری تعالیٰ کو متصف کرنے میں کوئی حرج نہیں

کیا تم نے اپنی اس عقل اور قوت مدرکہ کے متعلق تحقیق کی ہے جس کی مدد سے تمہاری زبان بنی ہے؟ اگر اس سلسلہ میں تم تحقیق سے کام لو تو جان لو گے کہ تمہارے ادراک کی باطنی آنکھ کی بینائی میں عالم لاہوت کے خدوخال کو دیکھتے وقت نقص اور بھینگا پن پایا جاتا ہے۔ جب تک تم صرف اس عالم مشہود کے نظام کو پہچانتے اور اسی سے مانوس ہو اس وقت تک تم اپنے موجودہ انداز اور علم کے ساتھ اپنے پروردگار کا وصف بیان کر سکتے ہو۔ اس میں

کوئی مضائقہ نہیں بلکہ یہ معرفت الٰہی تمہارے لیے کافی ہے اور جب آخرت میں تمہارا بھینگا پن دور ہو کر سب حقائق اپنی اصلی شکل میں جلوہ گر ہوں گے تو تمہاری یہ معرفت بعینہٖ علوم حقہ کی صورت میں ظاہر ہوگی۔ کاش کہ میرے پاس کوئی ایسی مثال ہوتی جو میرے اس کلام کے مضمرات کو پوری طرح واضح کر سکتی۔ (بہر حال ایک مثال سن لیجئے) جو شخص دور سے درختوں کے جھنڈ پر نظر ڈالتا ہے تو وہ جھنڈ اس کو ایک مبہم شکل اور سیاہی کی صورت میں دکھائی دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اسے کچھ سیاہ اور کوئی شکل دکھائی دیتی ہے (درخت کا ذکر نہیں کرتا) تو وہ اپنے اس کلام میں کاذب اور جھوٹا نہیں ہے۔ کیونکہ وہ تو زبان کے محاورہ کے مطابق آنکھوں میں سیاہی کی تصویر کی صحیح ترجمانی کر رہا ہے۔ جو ظاہراً درست ہے۔ ایک دوسری مثال لیجئے، اگر کوئی شخص جنوب کی طرف بہت دور چلا جائے اور قطب شمالی اس کی نظروں سے غائب ہو جائے تو وہ اس حالت کو قطب شمالی کے سقوط یا غروب سے تعبیر کرے گا۔ حالانکہ کرہ زمین سے قطب شمالی کی نسبت اب بھی وہی ہے جو پہلے تھی، اس میں ذرّہ بھر فرق نہیں آیا فرق اگر ہے تو وہ جنوب کی طرف جانے والے کا اس حد تک بڑھنا ہے جہاں پر اس کو ستارے حالت غروب میں نظر آتے ہیں۔ اسی طرح تمہارا یہ قول کہ سورج بادلوں کے اندر چھپ گیا، حقیقت کے خلاف ہے کیوں کہ حق تو یہ ہے کہ آفتاب تو بادلوں کے اوپر ہے اور بادل تمہارے اوپر لیکن تم کو سورج بادلوں کے نیچے دکھائی دیا ہے تو اس قسم کی غلط بیانی، خلاف واقعہ اور جھوٹ کو محاورات زبان میں درست سمجھا جاتا ہے۔ اس کی مثال سرخ گلاس کی ہے جس میں سے ہر ماوراچیز سرخ نظر آتی ہے اس قسم کا ادراک کرنے والے کے سامنے دو صورتیں ہوتی ہیں:

ایک یہ کہ مدرک (بفتح الرا) پر نظر رکھے اور نفس ادراک کو وہ مقصود اولین خیال نہ کرے چنانچہ خالص اہل زبان ایسا ہی کرتے ہیں اس قسم کا ادراک رکھنے والا اگر اس دنیوی حالت سے نکل جائے یا علم کامل کے درجہ پر فائض ہو جائے تو اس کو اپنے پہلے نظریہ کی تغلیط و تنقیص نہیں کرنی پڑے گی (کیوں کہ وہ نظریہ اگرچہ حقیقت سے بہت دور تھا لیکن بظاہر جو صورت حال تھی اس کی صحیح ترجمانی کر رہا تھا)۔

دوسری صورت یہ ہے کہ مشبہہ و متکلمین کی طرح اس کی نظر اور توجہ مدرک پر نہ ہو بلکہ نفس ادراک پر مرکوز ہو وہ اس کو ذریعہ نہیں بلکہ مستقل چیز خیال کرے۔ اور اس کو غیر متبدل عقیدہ کے طور پر مان لے تو اس قسم کا شخص جہل متراکم میں مبتلا ہوتا ہے اگر اس کو اس دنیوی حالت سے نکل کر آخرت میں قدم رکھنے کا موقع ملے یا علم کامل کے درجہ پر فائز ہو کر ترقی کرے تو اس کو اپنا پہلا نظریہ لازماً جھٹلانا پڑے گا۔

پس مومن اگر چہ اس کا عقیدہ ہے کہ "الرحمٰن علی العرش استوی" اور ساتھ ہی اس کے ذہن میں جانب فوق کا تصور بھی آتا ہے۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا مقصد اپنے رب کو مادیات کی ہر ایک وصف مدنس سے منزہ اور مبرا سمجھنا ہے۔ لیکن خالص تنزیہہ کا تصور کرنے سے وہ قاصر رہتا ہے۔ اس لیے وہ اس کو جانب فوق میں تصور کرنے پر مجبور ہوتا ہے اور اسی تصور کو وہ اصل حقیقت کے قائم مقام سمجھتا ہے۔ تاہم تنزیہہ کا اعتقاد اس کے رگ وریشہ میں سرایت کیے ہوئے ہے اور فوق کا تصور اس کے نزدیک مقصود بالذات نہیں بلکہ اس کے علو اور تصرف فی العالم کا وہ کسی اور طریقہ پر تصور کر ہی نہیں سکتا اس لیے وہ مجبوراً اس خیال کو اپنے ذہن میں آنے دیتا ہے ایسے شخص کا علم جب کامل ہوگا اور اصل حقیقت اس کے سامنے جلوہ گر ہوگی تو وہ اس کو اپنے پہلے علم کے متناقض نہیں پائے گا۔ (اور اس لیے اس کو کسی قسم کی پریشانی کا سامنا کرنا نہیں پڑے گا) برخلاف اس کے وہ شخص جو (اپنے آپ کو عالم متکلم کہتا ہے اور اس کا تعلق) فرقہ مشبہہ سے ہے اور وہ علما کے ساتھ بحث وجدال میں پڑ کر تشبیہ کے عقیدہ کو بزعم خود قطعی دلائل سے ثابت کرتا ہے اور اسی کو غیر متبدل حقیقت سمجھتا ہے۔ اس قسم کا نام نہاد عالم متکلم جہل متراکم کی تہ بر تہ تاریکیوں میں بھٹکتا پھرتا ہے۔ ہمارے اس بیان کی تصدیق خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث سے ہوتی ہے جس میں آپ نے بنی اسرائیل کے ایک فاسق وفاجر کا قصہ بیان فرمایا ہے کہ مرتے وقت اس نے اپنے گھر والوں کو وصیت کی کہ "جب میں مر جاؤں تو میرے جسم کو آگ میں جلا کر اور راکھ بنا کر ہوا میں اُڑا دو"۔ اس شخص کے دل میں خوف تھا کہ مرنے کے بعد اگر اللہ نے دوبارہ اس کو زندہ کیا تو اس کو عذاب سے نجات نہیں ملے گی، صرف یہی ایک صورت ہے کہ اس کی راکھ کو ہوا میں بکھیر

دیا جائے تا کہ اس کے منتشر اجزا کو یکجانہ کیا جا سکے (اللہ تعالیٰ نے اس کو اس عقیدہ کی بنا پر بخش دیا حالانکہ یہ حقیقت الامر کے خلاف تھا) اسی طرح ایک سیاہ فام لونڈی کے ایمان ونجات کا قصہ بھی ہے جب وہ حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پوچھا: اللہ کہاں ہے؟ تو لونڈی نے جواب میں آسمان کی جانب اشارہ کیا۔ (اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ مومن ہے اس تصور کا ثبوت سورۃ الملک کی آیت ءَاَمِنْتُمْ مَنْ فِي السَّمَآءِ سے بھی ملتا ہے) الغرض تحقیق کا دامن پکڑو اپنے عقیدہ میں نور بصیرت سے کام لو۔

معرفت الٰہی کی وجوہ تعبیر

جب تم تحقیق کے اس عظیم درجہ تک پہنچ جاؤ تو پھر یہ کیوں کر نہ ہو کہ تم اس نتیجہ پر بھی پہنچ جاؤ کہ عقل معاشی اپنے رب کی تفصیلی معرفت اور اپنی معرفت کے مطابق اس سے تعبیر حسب حال مختلف طریقوں سے کرتی ہے (ان میں سے مندرجہ ذیل طریقے اور وجوہ قابل ذکر ہیں)۔

ایک تو یہ کہ تم کوئی ایک آثار ونتائج متفق المعنی نظر آئیں، تو تم ان آثار کے ظہور کے وقت مافی الضمیر کو اپنی ناسوتی زبان میں خاص الفاظ سے تعبیر کرتے ہو۔ اسی طرح رحمٰن خدائے عزو جل کے فیض کا جو جلوہ تمہیں انہیں آثار ونتائج کی صورت میں نظر آتا ہے۔ اپنے مبلغ علم کے مطابق اس کو بھی انہی الفاظ سے تعبیر کرو۔ مثلاً تخلیق کائنات اور اجسام اشیا کی صورت بندی دیکھ کر اللہ تعالیٰ کو مصور کے اسم سے موسوم کرلو۔ اپنی مخلوق کو جس طرح اور جن اقسام وانواع کے ذرائع سے روزی پہنچاتا ہے اور کمزوروں کو قوت بخشتا ہے اس کا جلوہ ملاحظہ کرکے اللہ کو رزاق اور مقیت کے اسماء سے یاد کرو۔ وعلیٰ ہذا القیاس دوسرے آثار کو دیکھ کر اسماء سے موسوم کرلو۔

دوسری صورت تعبیر یہ ہے کہ تو عالم مادی کی نجاستوں اور گندگیوں کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ عزّ وجل کو ان ادناس، انجاس سے مبرا سمجھنے کے لیے کوئی تعبیر استعمال کرتے ہو، مثلاً یہ کہتے ہو کہ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ (نہ اس سے کوئی پیدا ہوا اور نہ وہ کسی سے پیدا ہوا اور کوئی اس کا ہم سر و برابر نہیں)۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کو پھٹے پرانے کپڑے پہننے اور ردّی

قسم کا کھانا کھانے اور بھوک سے بے قرار ہونے کی کیفیتوں سے دوچار ہونے سے منزہ سمجھا جائے (کیونکہ یہ مالکِ دوجہاں کی شان کے شایان نہیں ہے)۔

تیسری صورت یہ ہے کہ تو اپنی (ناسوتی) زبان میں بہترین خوبصورت ترین اور عظیم ترین کلمات اور مدح و تعریف دیکھ لو اور ان کے ذریعہ اپنے پروردگار کی تعریف و توصیف کرتے رہو۔ ان الفاظ سے تمہارا مقصد ناسوتی مقاصد کا استعمال نہ ہو بلکہ صرف حسن و رونق اور جلالتِ شان ہی ہو۔ بس تم یہ کہو کہ **اللہ عزّ و جل العظیم العلیٰ الکبیر الواسع** (وغیرہ) ہے یہ بھی اسماحسنیٰ میں سے ہیں۔

چوتھی صورت یہ ہے کہ تم اپنی عقل و ادراک کے مطابق نظام کائنات کا ملاحظہ کرو، اور اس میں اللہ تعالیٰ کی کارفرمائی دیکھو تو تم اس نظام کے مناسب اللہ تعالیٰ کو کوئی نام دے دیتے ہو۔ لیکن اگر تعمق و امعان کے ساتھ تحقیق کی جائے اور آدمی کا علم نظام کامل کے تمام اطراف و جوانب پر حاوی ہو تو اس وقت وہ اس کو کسی دوسرے نام سے موسوم کرنا زیادہ پسند کرتا ہے۔

مثلاً عام طور پر قدرت کا یہ مفہوم لیا جاتا ہے کہ جب کوئی شخص کسی کام کے کرنے اور نہ کرنے پر برابر اختیار رکھے، عقل معاشی نے قدرت کا یہ مفہوم سمجھ کر ایک عمیق مسئلہ کو نظر انداز کر دیا ہے اور یہ کہ ممکن کے دو پہلوؤں میں ایک پہلو "واجب" ہوتا ہے اور یہ ایک امر واقع ہے کہ جو چیز بھی معرض وجود میں آتی ہے اس کی علت فاعلیہ حتماً اس کا سببِ وجوب ہوتا ہے۔ سلسلۂ اسباب کے بغیر اشیا کا وجود میں آنا متصور ہی نہیں جو لوگ الہامی مذاہب و شرائع کے قائل ہیں کیا وہ تقدیر اور قضائے مبرم کا انکار کر سکتے ہیں جس کے اثبات میں سینکڑوں آیاتِ کریمہ اور احادیث شریفہ موجود ہیں؟ اور کیا وہ اس بات سے انکار کر سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ہر فعل و ہر تصرف کسی نہ کسی ایسی حکمت بالغہ پر مبنی ہوتا ہے جس کو نظر انداز کرنا جہل و بیوقوفی کی دلیل ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خداوند عزّ و جل کے ہر فعل میں حکمت بالغہ کارفرما ہے۔

الغرض عقل معاشی میں قدرت کا مفہوم اس سے زائد نہیں کہ فعل اور ترک سے اس کی نسبت مساوی ہو۔ لیکن اس نے الرحمٰن کے تجلیات افاضہ کو ملحوظ نہیں رکھا جو کسی فعل کے صدور کو واجب بنا کر چھوڑتی ہیں۔ اس لیے عقل معاشی کو یہ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی کام کیا

حالانکہ وہ اس کو ترک بھی کر سکتا تھا۔اس لیے اللہ تعالیٰ کی اس صفت کو اس نے قدرت الٰہی سے موسوم کیا ہے۔ بہرحال اس قسم کی (اجمالی) معرفت سے غافل نہ رہنا۔ کیونکہ جو لوگ مدارج حیات اور منازل زندگی (دنیوی واُخروی) کا عرفانِ حقیقی رکھتے ہیں وہ اس معرفت کی حقیقت سے پوری طرح باخبر ہیں۔لیکن وہ لوگ جن کی جبلتوں میں ایک ہی استعداد پائی جاتی ہے(اور ان کو ماوراالعقل یا مابعدالدین کیفیات کا علم نہیں دیا گیا)۔ان کے لیے یہ کیسے جائز ہوسکتا ہے کہ وہ اس اجمالی معرفت کو چھوڑ دیں جو نسمہ (روح ہوائی) کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔حالانکہ یہ دنیاوی زندگی میں سب سے قریب ترین یا ادنیٰ ترین درجہ ہے۔اور اس کا حصول اسی فانی زندگی میں ممکن ہے۔خلاصۂ کلام یہ ہے کہ (اجمالی معرفت کے ساتھ ساتھ) تفصیل معرفت بھی انسان کی اصل فطرت میں ودیعت رکھی گئی ہے۔اور اس کا حصول صرف اس بات پر منحصر ہے کہ آدمی خالص اپنی فطرت کی طرف رجوع کرے (اور معرفتِ اجمالی کے ذریعہ معرفتِ تفصیلی حاصل کرنے کی کوشش کرے)۔

تیسری فصل

اللہ تعالیٰ کی صفاتِ حسنہ کی تفصیلی تشریح

مؤمن کا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ وہ اس عقیدہ کو اپنے دل ودماغ میں راسخ کرے کہ اللہ تعالیٰ مستقل ہستی، متعین وجود اور متحقق ومتقرر ذات ہے۔ تاکہ صفاتِ کاملہ سے اس کے موصوف کرنے اور اس کے احکام کے سامنے سر اطاعت خم کرنے کا مفہوم بھی اس کی سمجھ میں آ جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ روحِ ہوائی اشیا کا علم صرف دو ہی محدود مفہوموں کے ساتھ حاصل کرتی ہے کسی تیسری صورت سے نہیں۔

ایک ناقص اور ادھوری "کلّی" جس کا فی ذاتہ مستقل علیحدہ وجود ہی نہیں۔

دوسرا مفہوم "جزئی" ہے جس کا اگرچہ مستقل وجود ہے لیکن اس کا مفہوم مقیّد ومحدود ہے۔

اس لیے نسمہ کو اپنے رب کی معرفت کا اظہار کرنے میں کچھ ایسے ہی الفاظ شامل کرنے پڑتے ہیں مثلاً یہ کہ وہ ایک موجود مستقل ہستی کا مالک ہے۔ جو واحد لاشریک ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی اعتقاد رکھتا ہے کہ وہ اپنے جملہ اوصاف میں بے مثل اور بے مانند ہے۔ حتیٰ کہ وحدت کے وصف میں بھی اس کو بے نظیر ماننا ضروری ہوتا ہے۔ اس کلّی کا اطلاق سب سے بڑا کلمۂ کفر اور اس کی شانِ کبریائی کے لیے سب سے بڑا عیب ہے۔ جس سے وہ یقیناً منزہ ومبرا ہے۔ (اسی طرح اس کو جزئی بھی نہیں کہا جا سکتا) حقیقت یہ ہے کہ وہ نہ تو کلّی ہے نہ جزئی بلکہ اس کی ذات دونوں سے برتر و بالاتر ہے اور اس کی شانِ کبریائی ان دونوں سے بلند تر ہے۔

اپنی اس بات کو بغور ملاحظہ فرمائیے جب تم کہتے ہو کہ یہ زندہ ہے وہ مردہ ہے۔ وہ جماد و پتھر ہے تو تمہارا مقصد ہی (زندہ) سے یہ ہوتا ہے کہ وہ چیز حساس ذی علم اور متحرک

بالا رادہ ہے اور میت سے مراد ایسی چیز ہوتی ہے جس میں موجودہ حالت میں احساس وشعور اور ضروریات زندگی کو پورا کرنے کے لیے حرکت پذیری نہ ہو حالانکہ پہلے وہ ان اوصاف سے متصف ضرور تھی اور جماد تم اس چیز کو کہتے ہو جس میں سرے سے یہ اوصاف و استعدادات موجود ہی نہ ہوں۔ اب جب تم اللہ تعالیٰ کے افعال وتصرفات اور اوصاف پر نظر ڈالتے ہی تو ان کے آثار ونتائج تم کو زندہ چیز کے افعال وتصرفات کے آثار ونتائج کے مشابہ نظر آتے ہیں۔ میت اور جماد کی طرح نہیں، اور چونکہ تمہاری محدود زبان میں ان تین الفاظ کو چھوڑ کر اور کوئی لفظ ہی وضع نہیں ہوا اس لیے جب تم اپنے رب کی صفات کاملہ بتانے لگتے ہو تو اس کو حی کے نام سے یاد کرتے ہو، اور میت و جماد کے اطلاق سے اس کو منزہ ومبرا سمجھتے ہو لیکن تمہارا اس کی ذات اقدس پر حی کا اطلاق کرنا ان افعال وتصرفات کے لیے ایک عنوان ہے۔ جو اس سے صادر ہوتے ہیں جو اپنے اندر ایسا حسن وخوبی رکھتے ہیں۔ کہ جن کا صدور تم اپنے رب تعالیٰ سے مستحسن سمجھتے ہو اور یہی خیال مخاطب کے دل میں بٹھانا چاہتے ہو۔ لیکن اگر کوئی حیات کا یہ مفہوم سمجھتا ہے کہ وہ ایک صفت عارض ہے جو اللہ تعالیٰ کو اسی طرح پیش آتی ہے، جیسے دوسرے اعراض اپنے محل کے ساتھ پیوست ہوتے ہیں۔ تو اس مفہوم کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کو اس سے موصوف کرنا یقیناً باطل ہے۔ اس سے اس کے قائل کی جہالت ثابت ہوتی ہے اور وہ اس مسلمہ نظریہ کے منافی ہے جس کا اقرار وہ خود زبان سے کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اوصاف کاملہ اور مخلوق کے اوصاف میں کوئی مماثلت نہیں (لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ)۔

اسی طرح جب تم کہتے ہو کہ فلاں شخص کو اس بات کا علم ہے تو اس سے تمہاری مراد یہ ہوتی ہے کہ اس کی صورت اس کے ذہن میں مرتسم ہے لیکن غالباً اس خاص ادراک کو علم سے موسوم کرنے کا راز صرف یہ ہے کہ وہ شخص اس بات کی طرف تنبیہ اور اس سے باخبر ہے باقی اس کی ذہنی تصویر وتصور کا اس تسمیہ سے زیادہ سروکار نہیں ہوتا۔ علم کی یہ خصوصی تعریف کہ وہ ''حصول صورۃ الشئی فی الذہن'' ہے۔ یہ متکلمین کی جدت ہے۔ چنانچہ تم اپنے رب کو اسی بنا پر علیم کہہ سکتے ہو کہ وہ ہر ایک چیز کی خبر رکھتا ہے اور کسی چیز سے غافل وبے خبر

نہیں۔ بلکہ وہ غفلت، سہو اور جہل سے بالکل پاک ہے۔

اسی طرح سمع کی حقیقت ہے۔ جس کا مفہوم ہے ''تمام مسموعات کا کامل طور پر انکشاف اور بصر کے معنی ہیں ''جملہ مرئیات کا کامل طور پر انکشاف'' اس کے علاوہ آنکھ کھولنا مرئی چیز کا سامنے ہونا اور ایک خاص فاصلہ پر ہونا وغیرہ وغیرہ اشیا اس انکشاف کو ابصار کا نام دینے میں دخیل نہیں یہ فاضل باتیں ہیں (ان کو ابصار کے لوازم سمجھنا متکلمین کی جدت طرازی ہے۔ اصل مفہوم سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔

ذرا اس پر بھی غور کیجئے جب تم کہتے ہو کہ فلاں شخص نے ارادہ کیا تو اس کے معنی اس واردِ علم کے ہوتے ہیں جو قلب میں اتر کر کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا عزم مصمم پیدا کرتا ہے۔ اب اس سے کس کو انکار ہوسکتا ہے کہ خدائے رحمٰن عزّ وجل کے افعال جو پہلے ظہور میں نہیں آئے ہوتے، ظہور میں آجاتے ہیں تو کیا ان کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کا فعل اور تصرف بغیر علم کے ہوتا ہے یا یہ کہ اس کے ظہور میں آنے کے لیے جو شروط سنت اللہ میں مقرر ہیں اور جو استعداد حادث شے میں اس کے لیے شرط ہے وہ فعل ان شروط و استعداد کے بغیر رونما ہوتا ہے تو پھر تم یہ کیوں نہیں کہتے کہ اللہ تعالیٰ کے فعل پر ارادہ کا اطلاق کیا جاسکتا ہے۔ متکلمین نے ارادہ اور ایجاب کی جو بحث چھیڑ رکھی ہے، اور اس کلامی مسئلہ میں اختلاف کیا ہے تو یہ تو عقلی اشکالات اور ذہنی مسائل تصورات میں سب سے آسان ترین اشکال ہے، جس ایجاب سے اللہ تعالیٰ کی ذات کو منزہ کرنا مقصود ہے وہ ایجاب ہے جو خارجی اثر کی بنا پر آئے اور اس کے ارادہ اور فعل پر اثر انداز ہو لیکن اگر ایجاب خود اس کی طرف ہو اور اس کا اپنا ذاتی فعل ہو تو اس میں کوئی قباحت و برائی نہیں۔ افسوس ہے کہ یہ لوگ ایسی کھلی باتیں بھی نہیں سمجھ سکتے۔

ذرا پہلے اس قول پر غور کیجئے کہ فلاں شخص اس بات پر قادر ہے، اس سے تمہاری مراد یہی ہوتی ہے کہ وہ اس کے کرنے اور نہ کرنے میں اختیار رکھتا ہے اور اس کے مطابق دونوں میں سے جس پہلو کو پسند کرے، اختیار کرسکتا ہے خارج سے کوئی اس کو اپنی پسند و اختیار سے روک نہیں سکتا۔ اگر قادر کسی ایک پہلو کو ترجیح دے کر اپنی مرضی کے مطابق اس پر عمل پیرا ہوجاتا ہے تو یہ بات اس کی قادریت پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ ورنہ کوئی قادر شخص جب کوئی کام

عمل میں لاتا اس وقت اسے قادر نہ کہہ سکتے (اس لیے کہ اس وقت تو فعل واجب ہوتا ہے اور ترک و فعل برابر نہیں رہتے)۔ بحالیکہ اس حالت میں بھی تم اپنی زبان میں اس کو قادر کہتے ہو (عاجز کا اطلاق اس پر نہیں کرتے)۔ اس کا راز اچھی طرح سمجھ لو اور یقین کر لو کہ فریقین کا اختلاف صرف نزاع لفظی ہے۔ جو تحقیق کرنے پر مضمحل ہو جاتا ہے۔

خداوند قدوس کی صفت کلام کے بارے میں ہم اس آیت کریمہ کو حتمی اور وافی شافی سمجھتے ہیں کہ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا۔ یعنی کسی فرد بشر کے لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے ہم کلام ہو سوائے اس کے کہ (الف) اس پر وحی نازل ہو جس کا مفہوم یہ ہے کہ جب کوئی نبی یا رسول عالم غیب کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی تفہیم ہوتی ہے اور اس کے باطن میں اس بات کا علم ڈال دیا جاتا ہے جس پر اس نے اپنی توجہ مرکوز کی تھی۔ یا عالم رویا (خواب) میں اس کو کسی نہ کسی طرح حقیقتِ حال اور مراد مطلوب سے آگاہی ہو جاتی ہے۔

(ب) او من وراء حجاب۔ یا یہ کہ اس کے ساتھ پس پردہ کلام کیا جائے۔ اور بنا بنایا کلام اس کے کانوں اور قوتِ سامعیہ میں ڈال دیا جاتا ہے۔ (جس پر اس کو یقین کامل ہوتا ہے کہ وہ خدائے عزّ وجل کا مقدس کلام ہے لیکن) اس کو کلام کہنے والا نظر نہیں آتا۔

(ج) او یرسل رسولا فیوحی باذنه مایشاء یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے (کسی فرشتہ کو) رسول و پیامبر (بنا کر) بھیج دے۔ اور وہ رسول بشری کو خدا کے پیغام و کلام کے ساتھ کسی شکل میں نمودار ہو جائے اور اس کے قلب وسمع میں امرِ الٰہی اور روحِ ایزدی کا القا فرما دے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ صفتِ کلام کے بارے میں بھی وہ نکتہ ہمیشہ یاد رکھو جو صفتِ رحمت اور غضب اور دیگر صفاتِ کاملہ الٰہی سے متعلق (بار بار بیان کیا گیا) ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حق میں ان صفات کا اثبات مبادی کے لحاظ سے نہیں بلکہ غایات (آثار و نتائج) کے لحاظ سے ہے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ متکلمین کس چیز کو کلامِ نفسی کہتے ہیں۔ میرے خیال میں تو کلام نفسی کا علم اور ارادہ سے علیحدہ اور مغایر کوئی اور واضح معنی نہیں۔

چوتھی فصل

اسمائے حسنیٰ کی مزید مختصر تشریح

هُوَ اللّٰهُ الَّذِىْ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ

لفظ "اللّٰہ" اس ذات اقدس کا اسم علم اور خاص نام ہے جس نے نظام کائنات کو واجب اور اس کا ایجاد کیا۔ جاہلیت اور اسلام دونوں میں اس بات پر اختلاف کبھی نہیں ہوا کہ اس ذات اقدس کا نام اللہ ہے اور اس نام کا اطلاق صرف اس ایک ذات پر ہوتا ہے

لَآ اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ کے یہ معنی ہیں کہ تخلیق عالم اور تنفیذ قضا میں کوئی اس کا شریک وسہیم نہیں ۔ برخلاف اس کے دنیا کے شہنشاہوں کو نظامِ سلطنت درست رکھنے کے لیے اعوان وانصار اور مددگاروں کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اور ان کے ہم سر دوسرے مدمقابل بھی ہوتے ہیں نیز لَآ اِلٰـهَ اِلَّا هُو کے معنی میں یہ بھی شامل ہے کہ صرف وہ ذات اقدس ہماری عبادت کو مستحق ہے اور صرف اس کی انتہائی تعظیم کرنا ہے اور اس کے سامنے سرِ اطاعت خم کرنا ہے۔

الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْم تمام موجودات وکائنات کی ضرورتوں کو پورا کرنے والا ہے اور اس کی مثال اس آقا کی ہے جو اپنے غلاموں پر بے حد مہربان ہو۔ (اور وہ لوگ جو اس پر ایمان لے آتے ہیں ان پر الرحیم اور خصوصی طور پر نوازش فرمانے والا ہے)

"الملک" تمام مخلوقات (ارض وسما) اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے وہی ان کے امور کی تدبیر فرماتا ہے اور اسی کا ان پر حکم چلتا ہے۔ ان میں سے کوئی بھی اس کے حکم سے ذرّہ بھر سرتابی نہیں کرسکتا۔ جس طرح نہایت محدود پیمانہ پر یہ اختیار دنیا میں ان لوگوں کو حاصل ہوتا ہے جن کو ہم اپنی زبان میں بادشاہ کہتے ہیں۔

"القدوس" مادیات کی آلودگیوں سے پاک ومبرا ہے۔

"السلام "ضرر،ضرورات اور آفات وعیوب سے سالم ومحفوظ ہے۔

"المُؤمِن المُھَیمِن" بسا اوقات انسان کو ہر طرف ہلاکت ہی ہلاکت نظر آتی ہے، وہ چاروں طرف نظر دوڑاتا ہے تو وہ مناظر دیکھتا ہے جو اس کے حق میں مضر ہیں اور اسے ان سے کسی طرح مخلص اور چھٹکارا نظر نہیں آتا اس حالت میں اللہ تعالیٰ غیبی طریقہ پر اس کی مدد اور سامانِ نجات مہیا فرماتا ہے۔ یا کسی کو اس کی دست گیری کے لیے کھڑا کر دیتا ہے اور پھر وہ بے خوفی اور امن وامان سے ہمکنار ہو کر فزع وخوف سے نجات پا لیتا ہے۔

"العَزِیزُ الجَبّارُ المُتکَبِّر" بسا اوقات ہم اپنے دل ودماغ میں منصوبے باندھتے ہیں۔ اور ہمیں اپنی مکمل کامیابی میں ذرہ بھر بھی شک نہیں ہوتا اور اپنے آپ کو ان کی تکمیل پر پوری طرح قادر محسوس کرتے ہیں لیکن جب عملی قدم اٹھاتے ہیں تو ہزار میں سے ایک منصوبہ بھی پایۂ تکمیل تک پہنچتا ہوا نظر نہیں آتا۔ اور ایسا معلوم ہوتا کہ کسی زبردست روکنے والی اور طاقتور ہستی نے ان منصوبوں کی تکمیل کے لیے ضروری تاثیر کو روک لیا ہے۔ اور وہ اپنی مخلوق میں سے ہر ایک کے ارادوں اور تدبیروں پر غالب وجابر ہے جس طرح (محدود پیمانہ پر) زبردست جابر بادشاہ اپنی رعیت کے کمزور فرد کے حق میں اپنا ارادہ نافذ کر سکتا ہے۔

"الخَالِقُ البَارِئُ المُصَوِّرُ" جب کوئی بچہ پیدا ہوا اور تم یہ کہو کہ اس کی تخلیق وپیدائش اس کے والدین کے قوائے تولید کا نتیجہ ہے تو تمہارا یہ کہنا بالکل درست ہوگا۔ اسی طرح تمہارا یہ کہنا بھی درست ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ماں کے پیٹ میں اس کو پیدا کیا کیونکہ اس عالمِ کون وفساد میں جو کچھ بھی ظہور ووجود میں آتا ہے وہ خدائے پاک جل وعلا کی رحمانیت کا فیض اور اس کا مظاہرہ ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ اس عالم کے اجزا میں مضبوط ربط وتعلق اور سبب ومسبب کا سلسلہ پایا جاتا ہے اس لیے ان دونوں اقوال میں کوئی تناقض نہیں۔

"الغفّار" بہت ایسے بندگان خدا ہیں جو اپنی روح ہوائی کو فسق وفجور کی گندگیوں سے آلودہ کر چکے ہیں مگر ان پر عنایتِ الٰہیہ کی نظر کرم اور التفات ہوتا ہے تو وہ رشد وہدایت کی راہ پر لگ جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ عفو وبخشش کر کے ان کو دنیا اور آخرت کے عذابوں سے

نجات دلاتا ہے، جو ان گناہوں کی پاداش میں ملنے والے تھے۔

"القھار" وہ متکبروں اور منکروں کی سرکش گردنوں کی کج روی کو توڑ کر انھیں جھکا دیتا ہے اور وہ کافروں اور نافرمانوں کو مختلف انواع کی شدائد و تکالیف میں مبتلا کر دیتا ہے۔

"الوھّاب الرّزّاق الفتّاح" دنیا اور آخرت کی کوئی بھی ایسی بھلائی نہیں جو اس کے فیضانِ رحمت اور بخشش سے نہ ہو۔

"العلیم" یہ مرتب نظام کائنات عبث اور فضول پیدا نہیں کیا گیا۔ کیونکہ ہر ایک چیز اس وقت (دنیا میں) معرضِ وجود میں آتی ہے جب اس کا وجود واجب قرار پاتا ہے تو یہ پورے کا پورا نظام کائنات اپنے کل پرزوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہے اور اس کا ایک ذرّہ بھی اس کی نظر سے اوجھل نہیں۔

"القابض الباسط الخافض الرافع المعزّ المُذِلّ": قبض و بسط، خفض و رفع، اعزاز اور اذلال اللہ تعالیٰ کے متقابل افعال و تصرفات ہیں جو اس عالم میں ظہور میں آتے ہیں۔ کچھ اشیا میں ایک صفت ظاہر ہوتی ہے تو کچھ اور میں اس کی مقابل دوسری صفت۔ انہی افعال و تصرفات کو ملحوظ رکھ کر اس کو ان اسما حسنیٰ سے موصوف کیا گیا ہے۔

"السمیع البصیر" جب کسی مرئی چیز کا کامل انکشاف ہو جائے تو کہیں گے کہ وہ چیز دیکھی گئی اسی طرح مسموعات کے انکشاف تام کو سمع کہیں گے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس پر سمیع و بصیر کا اطلاق اسی لیے کیا گیا ہے۔

یہ جائز نہیں کہ اس پر ذائق (چکھنے والا) اور لامس (چھونے والا) کا اطلاق کیا جائے کیونکہ ان دونوں اسما سے ناسوتی ضرورت و احتیاج کی بو آتی ہے۔ اور عالم جبروت کے مناسب معانی کا انتزاع ان سے بہت مشکل ہے۔ اس لیے ان دونوں (اور ان کی طرح دوسرے اسما) سے اللہ تعالیٰ کو منزہ سمجھنا لازمی ہے۔

"الحَکَمُ العَدْل" وہ عادل اور حکم ہے۔ اور اپنے بندوں کے معاملات میں جملہ فیصلے عدل و انصاف کے ساتھ کرتا ہے۔ اور احکام اور فیصلوں کے نفاذ میں حکمت و دانش کو ملحوظ رکھتا ہے۔ بعینہٖ اس طرح جس طرح (چھوٹے پیمانے پر) عادل بادشاہوں کا وطیرہ

ہے کہ ان کے فیصلے عدل وحکمت کے قوانین کے خلاف نہیں ہوتے۔

"اللطیف" کبھی اس کے معنی رحیم کے ہوتے ہیں اور کبھی علیم کے۔

"الخبیر" اس میں باریک بینی اور مبالغہ کا وہ مفہوم ہے جو علیم سے متبادر نہیں ہوتا۔

"الحلیم" بہت سے ظالم وسرکش ہیں جو اس کے غضب وعقوبت سے بچے ہوئے ہیں اور وہ ان سے انتقام نہیں لیتا۔ بلکہ ڈھیل دیتا ہے۔

"العظیم" اس سے بڑھ کر شرف اور جلالتِ قدر والا زیادہ خوبیوں والا اور بڑی قدر ومنزلت والا کوئی بھی نہیں ہے۔

"الغفور" اس کے معنی الغفار کے ہیں۔

"الشکور" جس طرح کوئی بادشاہ یا آقا اپنے خدمت گاروں اور نوکروں سے خوش ہوکر ان کو انعام واکرام سے سرفراز کرتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی اپنے فرماں بردار بندوں کی قدر دانی فرماتا ہے۔ ان کو انعام واکرام سے نوازتا ہے اور بلا اجر وثواب کے نہیں چھوڑتا۔

"العلی الکبیر" اس کی شان عالی اور بڑی ہے۔

"الحفیظ" حافظ ونگہبان ہے۔

"المقیت" روزی رساں اور رزق دینے والا ہے۔

"الحسیب" اپنے بندوں کی حاجتیں پوری کرنے والا ہے۔(الیس اللہ بکاف عبدہ)۔

"الجلیل" بہت بڑی قدر وشان رکھتا ہے صاحب جلال وجلالت ہے۔

"الکریم" اپنے بندوں کے احوال کا نگراں ہے، ان سے غافل نہیں ہوتا اور ان کے اعمال کی جزا وسزا دینے میں سستی نہیں کرتا۔

"المجیب" جب کوئی بندہ اخلاص کے ساتھ اس کی بارگاہ اقدس میں اپنی حاجت پیش کرتا ہے تو وہ اس کی دعا قبول کرتا ہے۔ اس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

"الواسع" اس کا علم ودولت لامحدود ہیں۔

"الحکیم" اس کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ یا اس کے معنی العلیم کے ہیں۔

"الودود" جو کوئی اس کی اطاعت کرتا ہے وہ اس کے ساتھ محبانہ سلوک کرتا ہے اور اس پر احسان وانعام فرماتا ہے۔

"المجید" سب سے بڑھ کر شرف و بزرگی رکھتا ہے۔

"الباعث" اپنے بندوں کو دوسری زندگی بخشے گا۔

"الشہید" وہ ہر جگہ حاضر و ناظر اور سب کچھ جاننے والا ہے۔

"الحق" اس کا وجود حقیقی اور ثابت ہے۔ بتوں کی طرح نہیں جن کے اسما ہیں لیکن حقیقی مسمیات نہیں۔

"الوکیل" اپنے بندوں کے تمام امور کا کارفرما ہے۔

"القوی المتین" اپنے ارادے کو نافذ کر کے رہتا ہے کوئی اس کے فیصلے کی تنفیذ کو روک نہیں سکتا۔ اور نہ ہی اس کے حکم کو ٹال سکتا ہے وہ قوی ہے۔

"الولی" یہ کبھی ودود کے معنی میں آتا ہے اور کبھی وکیل کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے۔

"الحمید" مستحق ستائش ہے اس کی کسی بات کو معیوب قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ اس سے نظام خیر کے سوا اور کوئی چیز صادر نہیں ہوتی۔ وہ عیوب سے پاک و برتر ہے اور اس پر کسی قسم کی آفت طاری نہیں ہو سکتی۔

"المحصی" اپنی مخلوقات کے جملہ احوال سے پوری طرح باخبر ہے۔

"المبدی المعید المحی الممیت" دونوں جہاں میں اس کا تصرف ہے۔ حیات اور موت اس کے تصرف کے بعض مظاہر ہیں۔

"الحیّ" اس پر نہ تو میت کا اطلاق ہو سکتا ہے اور نہ جماد کا۔

"القیوم" عالم بالا اور عالم اسفل کی ابتدا و بقا اسی کی ذات اقدس سے ہے یا اس کی صنعت اور کاریگری ہے۔

"الواجد" غنی ہے۔

"الماجد" شرف و بزرگی کا مالک ہے۔

"الواحد" جس ذات پر اللہ کا اسم علم اطلاق ہوتا ہے وہ ایک ہے ایسا نہیں کہ دو اشیا مشترک ہوں اور ان دونوں پر اللہ کا اطلاق ہوتا ہو۔

"الصمد" آقا اور مالک ہے۔

"القادر المقتدر" ہر چیز پر قادر ہے۔

"المقدم المؤخر الاول الاخر الظاهر الباطن" کوئی موجود نہیں جس سے آگے اور پیچھے وہ موجود نہ ہو، وہی اول ہے وہی آخر وہی ظاہر ہے کہ اس کے افعال ظاہر اور اس کے وجود کے دلائل واضح ہیں۔ جن کے ذریعہ اس کی پہچان ہو سکتی ہے اور وہی باطن ہے کہ عقل و حواس کے ذریعہ اس کی حقیقت تک رسائی نہیں ہو سکتی۔ وہ ماورا العقل والحواس ہے۔

"الوالی" بادشاہ ہے۔

"المتعالی" سب سے برتر اور مقدس ہے۔

"البر" اپنے بندوں کے ساتھ احسان کرنے والا ہے۔

"التواب" (توبہ قبول کرنے والا ہے) جب کوئی بندہ اس کے دربار میں دست بدعا ہوتا ہے۔

"المنتقم العفو" کبھی مناسب مناسب وقت پر انتقام لیتا ہے اور کبھی عفو و درگزر فرمانے والا ہے۔

"الرؤوف" رحیم و مہربان ہے۔

"مالک الملک ذوالجلال والاکرام" المقسط: اس کے سب تصرفات میں جلال و اکرام اور عدل و انصاف کی جھلک ہوتی ہے۔

"الجامع" یوم حشر میں لوگوں کو جمع کرنے والا ہے۔

"الغنی" غنی ہے آسمانوں اور زمین کے سب خزانے اس کے ہاتھ میں ہیں۔ اسے کسی چیز کی کمی و فقدان کی تشویش نہیں ہوتی۔

"المغنی (غنی کرنے والا) المانع" مانع اس کو کہتے ہیں جو دینے کی قدرت رکھتا

ہو اور کسی وجہ سے نہ دے۔

"الضار النافع" (ضرر و نفع دینے والا ہے)

"النور الہادی" (وہ منبع نور اور سرچشمہ ہدایت ہے جو) اپنے بندوں کو حق کی طرف ہدایت دیتا ہے۔

"البدیع" کبھی فاطر (پیدا کرنے والے) کے معنی میں آتا ہے اور کبھی نرالی شان والے کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے کہ کوئی اس کی مانند نہ ہو۔

"الباقی" اس پر زوال طاری نہیں ہوتا۔

"الرشید" اس کے احکام و اوامر سب حکمت کے تقاضوں کے مطابق ہیں۔

"الصبور" حلیم کے معنی میں ہے۔

پانچویں فصل

"وَكَمْ مِنْ آيَةٍ فِي السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ" کی تفسیر

آیت کی تعریف

آیات (جمع آیۃ) قدرت الٰہیہ کی ان کھلی نشانیوں کو کہتے ہیں جن کو دیکھ کر انسان کی طبیعت وفطرت اور اس کا دل ودماغ مغلوب ہو کر سر اطاعت خم کرنے پر مجبور ہو۔ ان نشانیوں کو دکھانے کی دو وجہیں ہوتی ہیں:

یا تو (۱) طبیعت انسانی کا عدم انقیاد اور اس کی سرکشی ہوتی ہے، جو ان آیات الٰہیہ کے بغیر مقہور ومغلوب نہیں ہو سکتی۔ جن کو دیکھ کر سرکشی طبیعت متحیر وحیران ہو جاتی ہے اور پھر اپنی بے بسی کو دیکھ کر عالم جبروت کی طرف متوجہ ہوتی ہے اور اس کی ہیبت سے متاثر ہو کر اس کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور عالم خوف ودہشت میں ذکر وفکر الٰہی میں مشغول ومنہمک ہو جاتا ہے۔

اور یا (۲) ان آیات باہرہ کو دیکھ کر خود بخود اس کے دل میں ان کی عظمت بیٹھ جاتی ہے۔

آیات الٰہیہ کے اقسام اور فوائد

آیات الٰہیہ کی کئی قسمیں ہیں۔ سماویہ: ارضیہ، نفسیہ (یا آیات کونیہ اور آیات نفسیہ) ان شواہد کونیہ، براہین عقلیہ، حقائق تاریخیہ اور آیات نفسیہ کا اصل فائدہ یہ ہے کہ ان کو دیکھ کر انسان عالم جبروت کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور یا ان کو دیکھنے کے بعد خالق ومالک کی عظمت کے سامنے اپنے آپ کو ذلیل وحقیر سمجھتا ہے۔ اس مقصد سے ہٹ کر آیات کو دیکھنا یا مشاہدہ

کرنا چنداں مفید نہیں (بلکہ اس قسم کا مادہ پرستانہ مشاہدہ جو عصر حاضر میں یورپ کے سائنس داں کررہے ہیں، انسان کو کفر والحاد اور مادہ پرستانہ زندگی کا قائل کر کے انسانیت کو اصل مقصدِ حیات سے دور لے جانے کا باعث اور دنیا وآخرت میں باعثِ ہلاکت ہوتا ہے۔ایک مسلمان کے مشاہدہ آفاق وانفس اور غیر مسلم کے مشاہدہ میں یہی بنیادی فرق ہے)۔

یہ بات انسانی فطرت کے خواص میں سے ہے، کہ وہ جب کسی غیر معمولی اور بڑے حادثہ کو دیکھتا ہے تو اس کے اندر بیداری ضمیر اور آگاہی باطن کے آثار رونما ہوتے ہیں۔اور وہ اس واقعہ یا حادثہ (کے اسباب، واقعات اور نتائج) اور اس کے خالق وباری پر غور وخوض کرتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ (اپنے رب کے ساتھ ذہنی وابستگی، قلبی تعلق اور نفسیاتی نسبت میں منسلک ہو کر) الہیاتی حال کی کیفیت سے دوچار ہوتا ہے اور عالم مادیات سے بیزاری ولاتعلقی سے پیدا ہوجاتی ہے۔(اور یہی راہ ہے معرفت تفصیلی کے حاصل کرنے کی) یہ بات یادرکھو کہ (یہ کارخانہ ہستی اسباب ومسببات کے سلسلہ میں جکڑی ہوئی ہے اس لیے) آیاتِ الٰہیہ کا ظہور نظامِ عالم کی مخالفت کے لیے نہیں ہوتا، ہاں جس نظام سے ہم مانوس ہوچکے ہیں، آیات الٰہیہ کا ظہور کبھی اس سے مخالف ہوتا ہے۔اور کوئی حادثہ خلافِ معمول پیش آتا ہے۔جس سے اصل نظام زندگی اور علت ومعلول کے سلسلہ کو ختم کرنا مقصود نہیں ہوتا بلکہ قدرتِ کاملہ کا اظہار اور مصلحتِ مخلوق کی تکمیل ہوتی ہے۔مثال کے طور پر سورج گرہن (یا چاند گرہن وغیرہ) کے جو غیر معمولی واقعات وحادثات پیش آتے ہیں ان کو آیاتِ الٰہیہ قرار دینے میں ہمارے علمائے الٰہیات وعقلیات ایک دوسرے کے اختلاف بلکہ باہمی نزاع میں مبتلا ہوچکے ہیں۔ایک گروہ کہتا ہے کہ اس کا ظہور حسب معمول نوامیس فطرت کے مطابق ہوتا ہے، اس لیے قدیم علما ہیئت بھی اور عصر حاضر کے ہیئت داں بھی سورج گرہن اور چاند گرہن کے وقوع کی قبل از وقت اطلاع دیتے رہے ہیں ان حوادث کا وقوع اسباب ومسببات کے دائرہ میں آتا ہے) اس لیے ان کو آیاتِ الٰہی میں شمار کرنا بے معنی ہے۔مگر دوسرا گروہ کہتا ہے کہ (ظہور کے اسباب سے قطع نظر کر کے نفس کسوف الشمس (یا خسوف القمر) آیت خارقہ ہے۔(مگر ان کا اختلاف جو تعجب خیز ہے یقیناً لفظی

نزاع سے زیادہ نہیں۔ہاں میرے نزدیک فریق ثانی کا نظریہ زیادہ درست اور ثابت شدہ ہے)اور یہ کہنا کہ یہ معمول کے مطابق ہے فاسد ہے۔میری دلیل یہ ہے کہ خود شارح رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے موقعوں پر فزع وگھبراہٹ کا اظہار فرمایا ہے(حسب عادت،اور مطابقت نوامیس طبعیہ" کی دلیل کو اگر تسلیم کیا جائے تو)ممکن ہے کہ یہ لوگ رات اور دن کو بھی آیات کہنے سے گریز کریں(حالانکہ خود قرآن کریم میں تصریح ہے کہ **ومن آیاته اللیل والنهار والشمس والقمر**"اور"**جعلنا اللیل والنهار آیتین فمحونا آیة اللیل الخ**)۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو آیات الٰہیہ میں تفکر وتدبر کرتے ہیں۔اوراس کے ذریعہ اپنے رب کے ساتھ وابستگی پیدا کرتے ہیں۔اگر تمہیں یہ سعادت نصیب ہوئی ہے اور اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں تفکر وتدبر کا موقع وفرصت ملی ہے اور اس کے نتیجہ میں طبیعت کی باغیانہ سرکشی کا استیصال کر چکے ہو تو یہ بہت بڑی غنیمت ہے مگر جو لوگ آیات الٰہیہ پر کوئی توجہ نہیں دیتے اور وہ اعراض وروگردانی کا شیوہ اختیار کر کے اس کو ہیچ سمجھتے ہیں اور صرف مادّی زندگی میں مستغرق رہتے ہیں ان کی حالت پر سخت افسوس ہے۔

چھٹی فصل

ایمان بالقدر کے ثبوت

اثبات تقدیر کی فطری اور عقلی دلیلیں

تقدیر ایک امر حق اور واقعی حقیقت ہے، جس کو مشرق و مغرب کے تمام لوگ اور تمام اہل مذاہب و ادیان یکساں طور پر مانتے ہیں۔ انسان کے علوم نسمیہ اور فطریہ کے بموجب تقدیر کے اثبات کی فطری دلیل یہ ہے کہ کبھی لوگ کسی امر متوقع کے سلسلہ میں عالم غیب کی طرف قلبی رغبت اور فکری توجہ مرتکز کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر کوئی الہام ہو جاتا ہے۔ یا اس متوقع امر کی صورت عالم رویا میں دکھائی دیتی ہے۔ اگر حوادث عالم کا فیصلہ پہلے مقدر نہ ہوتا، تو کبھی ایسا نہ ہوتا اس کی دوسری دلیل یہ ہے کہ بعض اوقات انسان ایک کام کے کرنے کا مصمم ارادہ اور پختہ عزم کر لیتا ہے لیکن وہ (باوجود استعمال ذرائع اور ارادۂ مصمم کے) اس کام کو سرانجام نہیں دے سکتا۔ گویا کہ کسی غالب و جابر طاقت نے روک کر اس کے دست تدبیر کو توڑ دیا ہے۔ اور اس کی تدبیر کو خاک میں ملا دیا ہے۔ کیونکہ وہ پہلے سے کوئی فیصلہ کر چکا تھا جسے فعلاً نافذ کر کے چھوڑا ہے۔

عقلی دلیل

تقدیر کے اثبات کی تسلی بخش عقلی دلیل ہے کہ اس عالم میں جو چیز بھی معرضِ وجود میں آئی ہے یا آئے گی اس کو اوپر نیچے سب اطراف سے ایسے اسباب و علل نے گھیر رکھا ہے کہ ان اسباب کی وجہ سے اس چیز کا موجود ہونا واجب قرار پاتا ہے اور اس کے وجود کے بغیر کوئی چارہ نہیں، یہ نظریۂ اسباب و مسببات ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، اب بات یہ ہے کہ ہر

ایک سبب اور علّت بجائے خود گویا ایک امر حادث ہے۔ اس لیے اس کو معرض وجود میں لانے کے لیے بھی اسباب وعلل ہوں گے جن کی وجہ سے یہ سبب اور علّت لامحالہ وجود میں آئی اس طرح علل واسباب کا یہ سلسلہ لزوم ووجوب باہم مربوط اور مضبوط بہت دور تک چلا جاتا ہے۔ اگر ان کا وجوب ثابت نہ ہوتا تو یہ وجود میں نہ آتا۔ اگر تم اس سلسلہ کے حلقہ حاضرہ اور موجودہ کڑی پر نظر ڈالو اور اس کے اطراف وجوانب پر غور وخوض کرلو تو تم کو اس کے ساتھ ملحقہ کڑی کا حال معلوم ہو جائے گا۔ وعلیٰ ہذا القیاس دوسرے اور تیسرے حتی کہ لامتناہی کڑیوں کا سراغ حقیقت لگالو گے۔ اس کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ تمام واقعات ایک دوسرے سے نہایت مضبوطی کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اور کوئی چیز سبق اسباب وعلل کے بغیر ظہور میں نہیں آتی ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کسی واقعہ یا نئی چیز میں استیناف نہیں، اور وہ دوسری کڑیوں سے جدا ہو کر نئے سرے سے ظہور وجود میں نہیں آئی۔

بعض لوگ جسارت کر کے کہتے ہیں کہ تقدیر اور مجازات عمل میں تناقض ہے۔ اور تقدیر ماننے کی صورت میں مجازات کو گویا ظلم سمجھتے ہیں۔ مگر ہم تو یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے بندے ان کے افعال واعمال اور ان پر جو جزا وسزا مرتب ہوتی ہے سب تقدیر کی کڑیاں ہیں ۔ یہ نہیں کہ بندگان خدا اور ان کے افعال کی کوئی جدا مستقل ہستی ہے جس کے ساتھ جابر اور مجبور کرنے والی تقدیر ٹکرا رہی ہے۔ اور ان سے افعال کے صدور کو واجب ولازمی قرار دیتی ہے۔ اگر تم عالمِ مثال کا مطالعہ امعان وتعمق کے ساتھ کرو تو تم وہاں پر ایک ایسی حقیقت پاؤ گے جس کی بنیاد وہ راز ہے جو خدائے رحمٰن جلّ وعلا کی وحدت میں مضمر وپوشیدہ ہے۔ اور اس کے تحقق مثالی کو لوحِ محفوظ کہا جاتا ہے۔

ساتویں فصل

حقیقت انسان کی تحقیق یا ایمان واحسان کا فرق

ہر چیز اپنی نوع کے مطابق خاص معیارِ کمال رکھتی ہے۔ انسان کے کمال کی دو صورتیں ہیں:

ایک یہ کہ اس کو ایسی قوت مدرکہ اور استعدادِ علمی وعقلی عطا کی گئی ہے کہ اس کے لوح قلب پر وہ الٰہی تصورات منقوش ہوتے ہیں جن کا نقش قبول کرنے کی استعداد بنی آدم کے بغیر کسی مخلوق میں نہیں ہے۔ یہ تصور اس قسم کا ہوتا ہے کہ اس کی سچائی کا انسان کو یقین ہوتا ہے (اس کیفیت قلب کو ایمان کہتے ہیں)۔

دوسرے یہ کہ اس کے قلب میں یہ خاصیت رکھی گئی ہے کہ وہ صبغۃ اللہ میں ڈوب جائے اور لاہوتی رنگ میں رنگا جائے جس طرح قلب پر ناسوتی احوال اور مادی عوامل کا اثر پڑتا ہے اور وہ پریشانی، غصہ، خوشی وغم اور دیگر کیفیات وجذبات کا شکار اور ان سے متاثر ہوتا ہے۔ اسی طرح اس پر الٰہی احوال کا رنگ بھی چڑھ جاتا ہے اور وہ لاہوت کے احوال کی نقل اور پیروی کرتا ہے اور لاہوت کی طرف متوجہ ونگراں رہتا ہے۔ اس حالت کو ہم احسان کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اور پہلی کیفیت کو ایمان کہتے ہیں۔ احسان ایمان کا مغز و جوہر اور غایت ونتیجہ ہے اور ایمان اس کا مقدمہ اور سنگ بنیاد ہے۔ اگر تم مومن ہو تو میں تمہارا دامن اس وقت تک نہیں چھوڑوں گا جب تک تم نے احسان کا درجہ حاصل نہیں کیا۔ تمہارے نفس، باطن وروح کی تکمیل کامل اسی درجۂ احسان پر فائز ہونے میں ہے۔ عالم لاہوت کے مالک کا تم پر یہ حق ہے کہ تم اسی کا رنگ اختیار کرو، اور دیگر تمام عاجل وآجل اغراض کو اس کے مقابلہ میں پس پشت ڈال دو۔ قلب پر اُن کا رنگ نہ چڑھنے دو۔

درجۂ احسان پر فائز ہونے کا طریقہ

جو شخص درجۂ احسان پر فائز ہونا چاہے اس کو چاہیے کہ وہ اپنے قلب و دماغ کو خارجی پریشانیوں اور طبعی تشویشوں سے پوری طرح خالی رکھے اور اپنے ایمان کو ٹھیک طور پر درست کرے، بعدازاں پوری ہمت کے ساتھ لاہوت کی طرف متوجہ ہو اور دوسری سب اشیا سے توجہ ہٹا کر صرف لاہوت پر ایمانِ کامل رکھے۔ اور اس کے احکام کے سامنے سرِ تسلیم خم کرے اور لاہوت کی عظمت اور انعامات و اکرامات پر دلالت کرنے والی آیات اور نشانیوں میں تفکر و تدبر کی طرف منعطف ہو اور اپنے اعمال خیالات اور افکار کے ان آداب کی طرف متوجہ ہو جو لاہوت سے مطابقت اور مناسبت رکھتے ہیں۔ ان ریاضتوں اور مراقبوں میں ایک زمانہ گزار دے گا تو اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی طرف رغبت اور توجہ پیدا ہو جائے گی۔ اور اس پر ایک ایسا حال طاری ہو جائے گا جس میں وہ اللہ کو دور سے دیکھتا ہوا پائے گا۔ اور وہ اسی حالت میں جب خدا کی عبادت کرے گا تو حالت ایسی ہوگی گویا کہ وہ خدائے پاک کو اپنے آنکھوں سے مشاہدہ کر رہا ہے۔ اور اس کے حضور میں کھڑا ہے اور جب وہ کائنات پر نظر ڈالے گا تو ہر چیز سے پہلے اس کے ساتھ متصل اور اس کے بعد ہر سو خدا ہی خدا نظر آئے گا۔ اس کے دل میں باری تعالیٰ کی طرف توجہ و تطلع بعینہٖ وہی شکل اختیار کر لے گا، جیسے آنکھ میں قوتِ بصارت اور کان میں قوتِ سماعت رہتی ہے۔ اس قلبی کیفیت کے ساتھ جب بھی اور جدھر بھی اس کی نگاہ اٹھتی ہے اس کی سمت خدا کی طرف ہوتی ہے۔ اس کا دل سب امور و قضایا میں حق کی طرف متوجہ رہنے کا حق ادا کرتا رہے گا۔ اور اس کا شیوہ توکل و رضا بقضا اور سپردن بخدا ہوگا۔ اس کی زبان اور اعضائے جسمانی سے یہی قلبی کیفیت مترشح ہوگی۔ اور اس پر انوار الٰہیہ اور سکینہ و اطمینان کی بارشیں ہوں گی۔ نورِ خدا ہر چہار سو سے اس کو ڈھانپ لے گا۔ جب کسی کو یہ مقام حاصل ہو جائے تو سمجھ لو اس کو پوری کامیابی اور سعادت حاصل ہو گئی۔ اور اگرچہ وہ ظاہر میں ایک دنیاوی آدمی ہے لیکن باطن و حقیقت میں وہ ''باخدا'' آدمی ہے۔ اسی کو خدا رسیدہ انسان کہا جاتا ہے۔

احسان کے مراتب ثلاثہ

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ احسان کے تین درجے ہیں جس کا اجمالی ذکر ہم ابھی کر چکے ہیں، یعنی ابتدائی، درمیانہ، آخری۔

درجۂ احسان پر فائز ہونے والا جب عالمِ قدس کی نقل اتارتے ہوئے دور تک چلا جاتا ہے تو اس سے ایسے افعال و اعمال اور نتائج و خواص ظاہر ہونے لگتے ہیں جو احسان سے محروم شخص کے خیال میں بعید از عقل ہوتے ہیں اور صاحبِ احسان کی نظر میں وہ قابلِ تعظیم ہوتے ہیں۔

محسنین کے کئی مراتب و مدارج ہیں: ان میں سے بعض (اونچے درجے پر پہنچ جاتے اور) اس عالم ناسوت و مادی سے کلّی طور پر لاتعلق ہو جاتے ہیں۔ اور بعض اُن سے کچھ کم درجہ پر علائق دنیویہ سے تعلق توڑتے ہیں۔ وعلیٰ ہٰذا القیاس ان کے مدارج و مراتب احسان میں تفاوت و باہمی فرق ہوتا ہے۔

ادنیٰ ترین درجۂ احسان درجۂ ایمان کے قریب ہوتا ہے اس درجہ میں بھی دل پر اذعان و انقیاد کی کوئی نہ کوئی کیفیت ضرور طاری ہوتی ہے۔ اور احسان کے اعلیٰ ترین درجہ کی بلندی و محویت کی انتہا نہیں ہوتی۔

فطرتِ انسانی کا مفہوم

اس دنیا کی مثال لوہے کی بنی ہوئی گنبدِ بے درکی ہے۔ جس میں انسان کو ہر طرف سے محبوس و مقیّد کر کے رکھا گیا ہے۔ اور اس کے لیے نکلنے کی کوئی راہ اور دروازہ نہیں چھوڑا گیا ہے۔ اس صورت حال میں جو شخص عمر کے کسی حصہ میں بھی تھوڑے ہی اوقات میں بھی احسان (اور توجہ الی اللہ) کے ادنیٰ مرتبہ پر عمل پیرا ہو جائے تو اس قبۂ بے در میں اسی درجہ کے مطابق روزن کھل جاتا ہے۔ اور وہ عالم لاہوت کی طرف پہنچنے کے لیے کسی قدر چھٹکارا پا لیتا ہے اسی چھوٹے سے روزن کا اثر بھی اس پردارِ آخرت میں ظاہر ہوگا لوگوں پر بالعموم جو بات فرض کی گئی ہے وہ صرف یہ ہے کہ وہ دنیا میں احسان کے مراتب میں سے کوئی نہ کوئی درجہ ضرور حاصل کر لیں جس کا اثر اُن کے اعمال و جوارح اور باہمی معاملات میں نمایاں ہو اسی کا نام فطرت ہے (جس کی طرف اس حدیث میں اشارہ ہے کُلُّ مَوْلُوْدٍ یُوْلَدُ عَلَی الْفِطْرَۃِ ہر بچہ فطرت کے مطابق پیدا کیا جاتا ہے۔ پھر اس کا ماحول اسے بگاڑتا ہے)۔

آٹھویں فصل

معرفت الٰہی اور فطرت انسانی کی راہ میں حجابات ثلاثہ

اس وجدانی کیفیت اور فطرت انسانی کے ظہور میں تین چیزیں مانع ہوتی ہیں جن کو حجب (جمع حجاب) سے تعبیر کرتے ہیں۔

پہلا : حجاب طبیعت کا ہے۔

دوسرا : حجاب رسم کا ہے۔

تیسرا : حجاب جہل (عدم معرفت یا سوء معرفت) کا ہے۔

حجاب طبیعت کی حقیقت یہ ہے کہ انسان بقائے جان اور حفظ نفس کے ساتھ ساتھ پیدائش وافزائش نسل اور حفظ نوع کے لیے بالطبع کھانے پینے اور صنفی تعلق وغیرہ پیدا کرنے کی خواہش رکھتا ہے۔ جس کے نتیجہ میں عموماً نفس انسانی انہی خواہشات کے تابع ہو کر رہتا ہے اور ان اعمال کی محبت اپنی سرشت میں مضمر و پوشیدہ رکھ کر اپنی اصلی خصوصی فطرت جس میں لاہوت کی طرف توجہ اہم عنصر ہے کو بالکل بھول جاتا ہے۔ وہ شخص جو تقاضائے طبیعت کے تحت مغلوب ومقہور ہو جب اس کے دل میں کسی خاص لذیذ خوراک کے کھانے یا خوشگوار شربت نوش کرنے یا کسی خاص طریقہ سے صنفی خواہش پورا کرنے کا خیال پیدا ہوتا ہے تو اپنی شہوت نفسانی پورا کرنے کے راستہ میں شرع ورسم کو کبھی حائل نہیں سمجھتا اور کسی قید وبند کی پروا نہیں کرتا۔ اگر بالفرض معاشرہ اس کے اس فعل کو ہزار بار معیوب سمجھے اور اس کی قوم میں کسی ایک فرد واحد نے بھی کبھی ایسا جرم نہ کیا ہو (یا شریعت میں اس کا کرنا حرام اور ممنوع ہو) تب بھی وہ ان سب باتوں سے قطع نظر کر کے اپنی خواہشات نفسانی اور

مقتضیات طبیعت کو پورا کر کے رہتا ہے۔ ایسے شخص کے حق میں یہ کہا جائے گا کہ معرفت خداوندی اور فطرت انسانی کی تحصیل و تکمیل میں حجاب طبیعت مانع اور سنگ راہ ثابت ہوا۔ اس سے پہلے اس کی توضیح ہو چکی ہے اور تم اچھی طرح جانتے ہو کہ طبیعت کو دل و دماغ پر حیرت انگیز تسلط حاصل ہے۔ اور جب بھی خواہشات نفسانی اور مقتضیات طبیعت غالب آجاتے ہیں تو دل و دماغ شیوۂ تسلیم و رضا اختیار کر لیتے ہیں۔

ایسے مغلوب الطبیعۃ لوگ اپنے قلبی احوال و ظروف اور دماغی افکار و خیالات میں طبیعت کی تاثیر سے بچ نہیں سکتے۔ ویسے تو ہر فرد و بشر میں طبعی تقاضے اور نفسانی خواہشات موجود و کارفرما رہتی ہیں لیکن ہم اس کو محجوب طبیعت اس وقت تک نہیں کہتے جب تک کہ اس پر خواہشات کا پورا تسلّط اور غلبہ نہ ہو۔ اور جب تک اس کے بدن کی سب قوتیں خواہشات کے زیر اثر اور مطیع و منقاد نہ بنیں۔

حجاب رسم: اس کی حقیقت یہ ہے کہ ہر قوم گفتگو، لباس و پوشاک کھانے پینے اور شادی بیاہ وغیرہ میں ایک خاص وضع اور روش کی پابند ہوتی ہے۔

پھر مذہبی احکام آتے ہیں اور اس مانوس وضع اور روش پر اثر انداز ہوتے ہیں مگر (جو شخص حجاب رسم میں محبوس ہوتا ہے وہ اس قومی وضع و روش کو اس قدر محبوب اور منظور نظر رکھتا ہے کہ اس کا نفس اس کے سوا کسی دوسری روش زندگی اور طریقہ حیات کو صمیم قلب سے اپنانے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتا۔ اور اس کی خوگری کا یہ عالم ہوتا ہے کہ اگر اس کو نفسا و نفیسا آزاد چھوڑ دیا جائے تو وہ اسی وضع و رسم کی طرف مائل ہوگا۔ اور اس کے برخلاف کسی اور چیز کو قبول نہیں کرے گا۔

یاد رکھنا چاہیے کہ جس شخص پر رسم و رواج غالب آجائے تو بسا اوقات وہ اس کے مقابلہ میں اپنی نفسانی خواہشات حیوانی جذبات اور جسمانی تقاضوں کی بھی پرواہ نہیں کرتا مثلاً بعض اوقات اس کو سخت بھوک لگی ہوتی ہے یا صنفی خواہش کی تسکین کے لیے بے قرار ہوتا ہے مگر رسم و رواج اس کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہوتا ہے اور طبعی خواہشیں مغلوب ہو کر رہ جاتی ہیں۔

حجاب جہل اور عدم معرفت یا سوء معرفت: اس کی حقیقت یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے رب کو ویسے نہیں پہچانتا جیسے کہ وہ ہے کیونکہ اس کی قوت فہم وادراک محسوسات ومشہودات سے ماورا مجرد حقیقتوں تک رسائی حاصل نہیں کرسکتی اور اس کی عقل ودانش اور اندازہ وحدس کا دائرہ کار محدود اور ناقص ہے اس لیے وہ اللہ تعالیٰ کو مجرد عن المادہ متصور ہی نہیں کرسکتا یا یہ کہ وہ کسی دوسری ہستی کو انہی صفات سے متصف سمجھتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے لیے خاص ہیں یا اس کو اسی طرح عزت وشرف کا مالک سمجھتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہے یا خدا کی ہدایت، امر ونہی اور سخط ورضا کو کسی خاص شخص مطاع کے اقوال میں منحصر سمجھ کر حق کو انہی میں مقید ومنحصر سمجھے جیسے کہ مذاہب فقہ اور مکاتیب فلسفیہ اور علمائے اہل کلام کے جامد مقلدین اور اندھی پیروی کرنے والوں کا طریقہ ہے) اس کا راز یہ ہے کہ انسان کے طبیعت میں یہ بات ودیعت کی گئی ہے کہ جب وہ کسی کے ہاتھ پر ''خوارق عادت'' ظہور میں آتے ہوئے دیکھتا ہے تو اس کو (کسی مصدر کی طرف منسوب کیے بغیر) بیکار نہیں چھوڑتا بلکہ اس کو اس قوت غیبی کا مظہر سمجھتا ہے جو ایسے خوارق کی مصدر ہوسکتی ہے۔ پھر جب اس شخص اور اس قوت غیبی کے درمیان نسبت قائم کرلیتا ہے تو اس سے بیکراں قلبی محبت اور تعظیم اختیار کرتا ہے۔ (یُحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ) اس مقام پر پہنچ کر وہ اس کو اس کی شان سے بعید وبالا مقام عطا کرتا ہے جو دراصل اللہ کا مقام ہوتا ہے (اور اس طرح وہ شرک وبت پرستی میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ اس حالت میں وہ اسی ہستی کی عبادت شروع کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف التفات ہی نہیں کرتا اور اگر کبھی اس کی طرف توجہ کرتا بھی ہے تو وہ بالکل غیر مفید وناکافی ہوتی ہے۔ بعض اوقات وہ معبود حقیقی کی عبادت اور ذکر وفکر بھی کرتا ہے اور اس کے احکام وفرامین کے سامنے سر تسلیم بھی خم کرتا ہے مگر اس شرط پر کہ خداوند بذات خود اس شخص میں حلول کر کے نمودار ہوجائے جس سے وہ خوارق عادت کے بعد عقیدت رکھتا ہے۔ عدم معرفت الٰہی یا سو معرفت خداوندی کی یہ بڑی بڑی شکلیں ہیں۔ ان کے علاوہ جہل کی اور بھی بیشمار صورتیں ہیں۔ (جھوٹے پیروں اور جعلی درویشوں کی خانقاہوں میں شرک وبت پرستی کی بدترین صورتیں آنکھوں سے مخفی نہیں ہونی چاہئیں)۔

حجب کو ان حجابات ثلاثہ میں منحصر سمجھنے کا راز:

حجابات کو ان تین کلیات میں منحصر سمجھنا چاہیے کیونکہ انسان کی حالت ابتدائی عمر میں چوپایوں جیسے ہوتی ہے اور بہیمیت وحیوانی تقاضے اس پر غالب ہوتے ہیں اس لیے وہ حجاب طبیعت میں مبتلا ہوتا ہے۔ بعدازاں جب وہ ترقی کرتا ہے اور اس میں ذرہ عقل اور تمیز پیدا ہوتی ہے تو اس کی نظر گردوپیش اور ماحول پر پڑتی ہے اور وہ اپنے آباواجداد اور رفقا واحباب کو دیکھتا ہے تو انہیں رسم ورواج کے طوق وسلاسل میں مقید پاتا ہے، اب اگر وہ اپنی عقل خداداد سے بہتر رسم ورواج اور مفید تر تدبیر اختیار کرے یا اپنی رند مشربی اور بیبا کی مزاج کی بدولت راہ ورسم کی پروا کیے بغیر تیشۂ خودی سے جادۂ خویش تراش کر رسم ورواج کی مخالفت کرے تو یہ اور بات ہے ورنہ وہ یقیناً رسوم کا پابند ہوگا۔ اور حجاب رسم اس کی معرفت میں سدِ راہ ثابت ہوگا۔ بعدازاں جب وہ رشد وعقل کے درجۂ کمال تک پہنچ جائے گا اور اپنی ساخت اور تخلیق میں غور وخوض کرے گا یا اپنے کسی رفیق حیات سے باری تعالیٰ کا علم تقلیداً حاصل کرے گا یا روزمرہ کے بول چال اور محاوروں میں کسی سے یہ سن لے کہ ہمارا رب یوں ہے یوں ہے اور پھر اپنی عقل خداداد سے عالم تیقظ وبیداری میں اس کی موافقت ومطابقت پر یقین کامل رکھے گا تو وہ اپنے پروردگار پر ایمان لے آئے گا۔ مگر اس عالم میں وہ حجاب جہالت اور سوء معرفت سے دوچار ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں اگر کسی کو یہ توفیق خداوندی عطا ہو کہ اس حجاب سے نکلنے پر قادر ہو جائے وہ بلاشبہ مومن صادق رہتا ہے اور اس فطرت انسانی پر باقی وقائم رہتا ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔

حجت ثلاثہ کا ازالہ:

بہر حال ان حجابات سہ گانہ کا چاک کرنا لازمی ہے (حجاب طبع کا علاج یہ ہے کہ) اعتدال کے ساتھ روزے رکھنے، کم خوابی وکم خوری اور کم گوئی کے ذریعہ نفسانی خواہشات کی شدت وسرکشی کو توڑا جائے اسی طرح پریشان کن اشیا اور الوان کی طرف سے بے توجہی وبے اعتنائی اختیار کرنے اور بیہودہ اور گندی باتیں سننے سے احتراز کیا جائے۔

حجاب رسم کا علاج یہ ہے کہ رسم کی نوعیت کو دیکھنا چاہیے اگر وہ رسم صالح ہے تو اس کی پوری پوری پابندی کی جائے۔ مگر اس پابندی میں اخلاص و نیک نیتی اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی مطلوب و مقصود ہو نہ کہ رسم و رواج کی بقا، ہاں اگر رسم فاسد اور بری ہے تو اس کو یکسر چھوڑنا چاہیے اور اس کے بدلے میں کسی اور رسم صالح کو اختیار کرنا چاہیے۔

سو معرفت کا علاج یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی یاد اور تکرار ذکر و فکر کے ذریعہ اپنے ذہن کا تزکیہ کرے اور اس پر دوام اختیار کرے کیونکہ ذکر الٰہی سے قلب میں رقت پیدا ہوتی ہے اور وہ عالم جبروت کی طرف پیش رفت کرتا ہے اور اس پر لاہوت کا رنگ چڑھنے لگتا ہے۔ اسی طرح تدبیر کے ساتھ قرآن مجید کی تلاوت کرنا آیات قدرت میں صحیح طریقہ پر غور وخوض کرنا اور پند و نصیحت سننا بھی سو معرفت کی بیخ کنی میں مد ثابت ہوتے ہیں۔

نویں فصل

احسان سے عبادات کے پیدا ہونے کا مجمل بیان

جب انسان اپنے رب کو صحیح طریقہ پر پہچان لیتا ہے اور یقین حاصل کر لیتا ہے کہ تمام چھوٹی بڑی نعمتیں اس کے ظاہر و باطن پر اسی کی طرف سے فائض ہوتی ہیں اور یہ کہ اس کا منعم جل شانہ جو اپنے انعام واکرام سے بندوں کو سرفراز فرماتا ہے۔ شرافت و بزرگی کے لحاظ سے تمام دوسرے محسنوں اور منعموں سے اس قدر بڑھا ہوا اور بالاتر ہے کہ انسان کے لیے اپنی محدود عقل سے اس کا اندازہ کرنا دشوار ہے تو اس کے دل میں خود بخود اپنے منعم حقیقی کی محبت پیدا ہوتی ہے جس کے ساتھ اس کی عاجزی وانکساری اور اس کے دل میں اپنے رب کی پوری تعظیم اور کامل ادب شامل ہوتا ہے۔

اس کا فلسفہ یہ ہے کہ انسان بلکہ سب بہائم اور چوپائے بلا استثنا اپنے منعم، خبر گیری کرنے والے اور چارہ وغیرہ کھلانے والے سے جبلی اور فطری محبت رکھتے ہیں۔ کیا تم نے کبھی اس پر غور کیا ہے کہ شکاری لوگ جنگلی وحشی اور درندہ جانوروں کو کس طرح احسان وانعام سے رام کر لیتے ہیں (چڑیا گھروں اور سرکسوں میں نگراں عملے اور درندہ حیوانوں کا حال ملاحظہ کیجیے) بعینہٖ اسی طرح وہ شخص جو تام مزاج رکھتا ہے اس کو اپنے منعم سے محبت اور وفائے کامل ہوتی ہے اور وہ اس کے لیے جان و مال کی گراں بہا قربانی دینے سے بھی گریز نہیں کرتا بلکہ یہ سب کچھ قربان کر دیتا اس کے لیے اپنے محسن وولی نعمت کو ذلیل دیکھنے یا اس کی ہستی کے مٹ جانے کے مقابلہ میں نہایت آسان معلوم ہوتا ہے۔ (یعنی اپنے ولی نعمت کی حیثیت کو قائم رکھنے کے لیے زندگی کی سب آسائشوں اور راحتوں سے دستبردار

ہوتا ہے) اگر یہ حقیقت نہ ہوتی کہ انسان فطرتاً اپنے محسن و منعم کا غلام بے زر رہنا پسند کرتا ہے تو کوئی شخص دوسرے کی امداد وحمایت کے لیے کبھی کھڑا نہ ہوتا (مگر تاریخ انسانی اس پر گواہ ہے کہ لوگوں نے اپنے محسنوں اور مربیوں کی حمایت کے لیے جان، مال اور عزت ہر قسم کی قربانی دی ہے)۔

جب انسان اپنے محسن و مربی کی محبت میں سرشار ہوتا ہے اور یہ محبت و دل بستگی اس کے رگ وپے اور خون میں روح کی طرح دوڑنے لگتی ہے تو وہ ایک حال کی صورت اختیار کر لیتی ہے جو بے ارادہ اور بغیر استدلال وفکر ونظر کے قلب پر طاری ہوتا ہے۔ راہ محبت اور منزل عشق میں منطقی دلیل وبرہان اور عقلی توجیہ کا سہارا لینا کج روی اور منزل مقصود سے گمراہی کے مترادف ہے اور اس فطرت سے انحراف واعراض ہے جو قلب کی واردات اور احوال کا تقاضا کرتی ہے اور وہ عبارت ہے اس سے کہ عملی استدلال سے جو صورت ذہنی حاصل ہو وہ فطری نہیں ہوتی بلکہ وہ قلبی یا حقیقی صورت حال سے بعید ترین صورت ہوتی ہے۔ (مثلاً ایک شخص کو کسی مرض کی کیفیت کا علم ہے لیکن اگر وہ خود مریض نہیں تو اس کو صاحب حال نہیں کہیں گے)۔ اس سلسلہ میں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ انسان دوسرے حیوانوں کی طرح اندرونی واردات اور باطنی احوال سے متصف ہے۔ نہ یہ کہ اس نے علمی اور ذہنی صورتوں کا احاطہ اپنے علم سے کیا ہے۔ کسی چیز پر اپنے علم سے احاطہ کرنا اور بات ہے اور کسی حال سے موصوف ہونا دوسری بات ہے ان دونوں میں نمایاں ظاہری فرق پایا جاتا ہے۔ الغرض جب منعم کی محبت انسان کی حال بن جاتی ہے تو اس کے اثرات اس کی زبان اور جسم کے دیگر اعضا پر نمایاں ہونے لگتے ہیں۔ ''فصاحت'' اور ''دیانت'' کی تشریح کرتے ہوئے ہم کہہ چکے ہیں کہ زبان اور دل کے درمیان بلکہ قلب وجوارح کے درمیان ایک عجیب رابطہ اور تعلق ہوتا ہے۔ جب دل میں بلندی ہوتی ہے تو زبان وجوارح میں بھی علو کے آثار نمایاں ہوتے ہیں اور جب دل میں پستی وانحطاط پیدا ہوتا ہے تو زبان اور اعضائے جسمانی بھی گواہی دینے لگتے ہیں۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ جب جانور میں تکبر وغرور پیدا ہوتا ہے تو وہ گردن اٹھا دیتا ہے اور اکڑ کر چلتا ہے برخلاف اس کے ذلت اور انقیاد کی حالت میں

گردن جھکا دیتا ہے۔ انسان پر جب غصہ غالب آتا ہے تو اس کا چہرہ سرخ ہو جاتا ہے۔ گردن کی رگیں پھول جاتی ہیں اور زبان پر سب وشتم اور گالی گلوچ کے بے ربط الفاظ جاری ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ اس کے ہاتھ سے اس حالت میں قتل صادر ہوتا ہے۔ یا اپنے حریف سے مشت گریباں ہوتا ہے۔ اسی طرح نفسانی شہوت کے غلبہ کے وقت وہ اپنی محبوبہ سے میٹھی میٹھی باتیں کرتا ہے اور اس سے بوس وکنار اور پیار ومحبت میں مشغول ہوتا ہے۔

جب محبت کے ساتھ تعظیم کا عقیدہ بھی شامل ہو جاتا ہے تو تم دیکھو گے کہ انسان محبوب کے سامنے عاجزی وانکساری کرتا ہے اور اس کے قدموں میں اپنا سر نیاز اور جبین عجز رکھتا ہے۔ (یہی عبادت کی بنیاد ہوتی ہے)۔

طبائع، ذہنیتوں اور معبودوں میں اختلاف کے باوجود دنیا کے تقریباً سب لوگ عبادت کے قائل ہیں۔ ہم نے دیکھا ہے کہ بعض لوگ جب اپنے محسن ومربی کے پاس اپنی حاجت پیش کرتے ہیں یا ان نعمتوں کی طرف نظر دوڑاتے ہیں جو ولی نعمت نے اسے عطا کی ہوتی ہیں تو خواہ مخواہ عبادت کی کیفیت سے دوچار ہوتے ہیں اور حصول مقصد کے لیے مختلف انواع عبادات اور دینی طریقے ایجاد واختراع کر لیتے ہیں۔ بعض اوقات اس کے سامنے اپنا ماتھا زمین پر رگڑتے ہیں یا قدم بوسی کے بعد اپنے ہاتھوں کو تعظیماً سر پر رکھ لیتے ہیں گویا کہ وہ زبان حال سے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہم آپ کو سر اور آنکھوں پر بٹھانے کے لیے تیار ہیں۔ ان کی یہ کیفیت پرندوں اور چوپایوں کی طرح بالکل فطری ہوتی ہے۔

اور جب یہ تعظیمی کیفیت کسی نہ کسی درجہ میں حال تک پہنچ جاتی ہے تو فطرت ان کو مجبور کرتی ہے کہ اپنے حال کو مطابق ومناسب حرکات وسکنات سے ظاہر کرے۔ ہر ایک حال کا یہی حال ہے کہ فطرت میں اس کے اظہار کے لیے خاص صورتیں ودیعت رکھی گئی ہیں۔ جیسے کہ نفسانی شہوت اور ہم بستری کی خواہش جبلی ہوتی ہے کہ جب یہ خواہش پیدا ہوتی ہے تو پرند وچرند میں نر اپنی مادہ کے گرد چکر کاٹتا ہے اور اس کے قریب ہوتا ہے اور یہ سب اس کی جبلّت وفطرت کے تقاضوں کے تحت ہوتا ہے (اسی طرح پروانہ شمع وغیرہ کو ملاحظہ کریں)۔

یہ معلوم ہونا چاہیے کہ عبادت کی دو قسمیں ہیں:

ایک یہ کہ کسی کی عظمت دل میں سماجائے جس کے ساتھ محبت وعقیدت اور تعظیم شامل ہو، جس کے نتیجہ میں خود بخود اپنی کم مائیگی اور عجز وانکسار کا اظہار ہو۔

دوسری یہ کہ کسی کو قاضی الحاجات سمجھے اور اس سے اپنی حاجت پوری کرنے کی استدعا کرتا ہو۔ کیونکہ یہ بھی انسان کی سرشت میں ہے کہ جب اس کو کوئی حاجت اور ضرورت ستاتی ہے اور وہ دیکھتا ہے کہ ایک ہستی ہے جس کے ہاتھ میں ان ضرورتوں کو پورا کرنے کی استعداد وقوت ہے اور وہ اپنی صفت جود وکرم کی بدولت احسان وانعام بھی کرتا ہے تو وہ اس کے سامنے اپنے آپ کو انتہائی تذلیل وانکساری پر مجبور پاتا ہے۔ تو معبود کی عظمت جب بھی دل میں محسوس ہوگی یا بندہ کے دل میں کسی مقصد کے حصول کی تمنا بھی پیدا ہوگی اور وہ اپنے معبود کے سامنے اظہار تذلیل اور عبادت پر اپنی طبیعت سے مجبور ہوگا۔

دسویں فصل

احسان سے عبادات کے پیدا ہونے کا تفصیلی بیان

عبادتوں کے انواع اور تعظیم تعبدی کے اصناف تو بے شمار ہیں مگر ان میں سے مشہور اور کثیر الوقوع صورتیں جن کو انسان بہ تقاضائے فطرت وضمیر عمل میں لاتے ہیں اور جو مسلم اور غیر مسلم قوموں اور ملتوں میں یکساں طور پر مروج ہیں حسب ذیل ہیں:

(۱) صلوٰۃ (نماز): اس کی حقیقت یہ ہے کہ جب انسان کا دل ودماغ اپنے معبود کی تعظیم یا اس کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے جذبے سے معمور وسرشار ہوتے ہیں یا وہ اپنے محسن ومربی کے سامنے اپنی کسی ضروری حاجت کو جس کی نفس کو طلب ہوتی ہے پیش کر کے حاجت براری کی درخواست کرتا ہے تو وہ اپنی اس انتہائی نیاز مندی اور معبود ومنعم کی انتہائی تعظیم کا اظہار چند افعال اور ہیئتوں کے ساتھ کرتا ہے۔ اس کو صلوٰۃ یا نماز کہتے ہیں۔

نماز، دعائیں اور دوسری عبادات کیفیت ایمانی اور حالت انقیاد وتعظیم کے لیے اسی طرح لازم ہیں جس طرح غصہ کے ساتھ ضرب وشتم (یا رنگ میں تغیر) لازم ہوتا ہے۔ یا شہوت نفس کے ساتھ مناسب حال ہیئتیں ہوتی ہیں۔

عبادت کرنے والے دو قسم کے ہوتے ہیں:

(۱) یا ان میں سے کسی پر کیفیت ایمان کا فیضان ہوتا ہے جس کے نتیجہ میں حقیقت نماز کے مناسب افعال اور ہیئتوں کا صدور لازماً ہوتا ہے۔

اور یا (۲) وہ اس ہیئت ایمانیہ کا طالب ہوتا ہے اور اس کو اپنے اندر پیدا کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ وہ نماز کے افعال وہیئات کو اختیار کر کے ان پر پوری طرح کاربند ہوتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ حال تعبدی کے رنگ میں رنگ جاتا ہے کیونکہ یہ انسان کی سرشت میں ہے

کہ وہ لازم سے ملزوم کی طرف اور ایک ہم جواز سے اس کے دوسرے ہم جواز کی طرف جا کر نتائج اخذ کرتا ہے[1]

جن افعال وہیات سے انسان کا تذلل اور اس کی نیازمندی ظاہر ہوتی ہے ان میں کامل ترین اور بہترین صورت جبین نیاز کو زمین پر لگانے اور خاک آلود کرنے کی ہے کیونکہ جسم انسانی میں شریف ترین عضو چہرہ ہے۔ اور اسی کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ (معرفت الٰہی کے) ذرائع حسیہ یعنی (قوت بصارت قوت سماعت، قوت ذائقہ، قوت شامہ وغیرہ) سب یا اکثر حواس اس میں جمع ہو چکے ہیں۔ نیز انسانی فطرت میں یہ بات بھی رکھی گئی ہے کہ جب وہ اپنی لڑائی کا اظہار کرتا ہے یا غرور وتکبر کرتا ہے تو گردن کو اٹھاتا اور اکڑتا ہے۔ برخلاف اس کے جب کسی کے سامنے اپنی عاجزی، نیازمندی اور ذلت کا اظہار کرتا ہے تو وہ اپنا سر جھکا لیتا ہے۔ یہ طریقہ اپنے مواقع ومظان میں لامحالہ بلا استثنا اختیار کرتا ہے۔ (تذلل اور نیاز مندی کی انتہائی صورت اور عبادت واخبات کی اعلیٰ ترین شکل سجدہ ہے) اس سے کم تر یعنی دوسرے درجہ پر رکوع آتا ہے جس میں (زمین بوسی تو نہیں ہوتی البتہ) جھکاؤ پورا کا پورا ہوتا ہے اور تیسرے درجہ معبود کے سامنے دست بستہ اور باادب ہو کر کھڑے ہونے یعنی قیام کا آتا ہے۔

بہترین نماز:

وہ نماز جس میں یہ تینوں مذکورہ صورتیں (قیام، رکوع اور سجدہ) پائی جائیں اور جس میں ترتیب یعنی ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف جانے کا خیال رکھا جائے (یعنی سب سے پہلے دست بستہ یا خشوع قیام کے بعد انحنا کامل سے متصف رکوع اور سب سے آخر میں جبین

---

[1] محسوس ومقرون سے مجرد کی طرف جانے کا اُصول نہ صرف نفسیات کا مسلمہ اصول ہے بلکہ دنیا کے سب ماہرین تعلیم اس کو بنیادی اصول کے طور پر تسلیم کیا ہے۔ نیز تصبر (صبر کے تکلف) سے صبر کی صفت پیدا ہوتی ہے اور تجمع (شجاعت کے تکلف) سے شجاعت کا ملکہ ظہور میں آتا ہے۔ آنحضرت کے دو قول اس سلسلہ میں بہت ہی قابل غور ہیں ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ "مَنْ يَتَصَبَّرْ يُصَبِّرْهُ اللهُ وَمَنْ يَسْتَغْنِ يُغْنِهِ اللهُ" اور دوسری حدیث میں ارشاد ہے "مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ" ممانعت بالغیر کا فلسفہ یہی ہے کہ تشبہ سے ملکہ سیئہ پیدا ہوتا ہے اس لیے تشبہ سے بچنا چاہیے۔

نیاز کو زمین پر رگڑ نا یعنی سجدہ کرنا، یہ ترتیب فطری ترتیب ہے) تو وہ نماز سب سے اچھی نماز کہلائی جائے گی۔

نماز میں مشغولیت اگر "حال" کے تقاضے کے تحت ہے (اور ایسا حال نمازی پر طاری ہو چکا ہے جس کا تقاضا نماز ہی سے پورا ہو سکتا ہے) تو اس "حال" کے وارد ہونے کا وقت ہی اس نماز کا وقت ہوگا اور اگر نمازی کے قلب و سینہ میں کسی چیز کی آرزو و خواہش کی تکمیل کے لیے بے قراری اور حاجت براری کی طلب موجزن ہو تو قلق و تطلب کے وارد ہونے کا وقت نماز و دعا ہے۔ ہاں اگر مقصود اس قسم کا "حال" حاصل کرنا ہے جو مشغولیت صلاۃ کے لیے لازم ہے یا تحصیل حال کے بعد اس کو قائم رکھنا ہے تو رات دن میں تقریباً ایک ایک پہر یا اس کے برابر وقفہ کے بعد نماز کا تکرار و اعادہ مناسب ہے اور اسی طرح کی نماز طہارت و نظافت، ترکیز توجہ و جمع ہمت اور حضور قلب و اقبال خاطر کے بعد ادا کرنا چاہیے۔

(۲) دعا (اس کی حقیقت و صیغے):

عبادت کا ایک طریقہ دعا ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ جب انسان اپنے رب کی عظمت اور جلالت شان کی معرفت حاصل کرتا ہے اور یا وہ حصول نفع اور دفع ضرر کے سلسلہ میں اپنے محسن اور ولی نعمت کے حضور جس کو وہ کامل تصرف کا مالک سمجھتا ہے خشوع و خضوع کے ساتھ اپنی حاجت پیش کرنے پر مجبور ہوتا ہے تو اس کی زبان سے خود بخود کلمات و الفاظ نکلتے ہیں۔ ان کلمات و اقوال کو دعا سے موسوم کیا جاتا ہے۔ غور کرنے پر تمھیں معلوم ہوگا کہ اعضا کے ذریعہ جس تعظیم اور تذلیل و نیاز مندی کا بھی اظہار ہوتا ہے اس کے مماثل زبان کے پاس بھی الفاظ ہوتے ہیں جو وہی اثرات رکھتے ہیں جو اعضا کے افعال کرتے ہیں۔

استقرا اور تلاش سے دعا کے اظہار کے دس صیغے یا دس صورتیں سامنے آتی ہیں۔ (جو درج ذیل ہیں):

نظری (۱) لَاۤ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ (۲) اَللّٰهُ اَکْبَر۔ ان دونوں سے حقیقت ایمان میں جلا اور قوت پیدا ہوتی ہے اور محبت آمیز انقیاد و تسلیم کا جذبہ ابھرتا ہے۔

تذکیری (۳) سُبْحَانَ اللّٰه (۴) اَلْحَمْدُ لِلّٰه۔ ان دونوں میں عظمت تنزیہہ

اور اعتراف نعمت الٰہیہ کی ترجمانی ہے اور جیسے کہ پہلے گزر چکا ہے ان دونوں کے ذریعہ معبود حقیقی سے محبت اور ان کے احکام کے سامنے سر اطاعت خم کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ (اور ان پر مواظبت سے ان کو تقویت پہنچتی ہے)۔

استمدادی (۵) تعوذ (۶) سوال وطلب: ان دو کا تعلق احتیاج وضرورت کو پورا کرانے سے ہے۔ اور احتیاج وضرورت ان دو محرکات میں سے ایک محرک ہے جو انسان کو عبادت پر ابھارتے ہیں۔

فطری (۷) توکل علی اللہ۔ یہی انسانی فطرت ہے جو رفع احتیاج کے لیے انسان کو خداوند عزیز وقادر پر بھروسہ رکھنے کی تحریک کرتی ہے۔

تعبیری (۸) خشوع وخضوع۔ عاجزی وانکساری اور عبودیت وبندگی کو ظاہر کرنے والے اقوال واوصاف جو عبادت کی روح وحقیقت کی تعبیر اور عبودیت کے اقرار کی دلیل اور نشانی کے مترادف ہوتے ہیں۔

رجوع (۹) استغفار۔ توبہ وانابت وغیرہ: درحقیقت یہ اقوال نامناسب وناموافق امور سے انسان کے اختلاط اور ناسوتی آلائشوں سے ملوث ہونے کے بعد لاہوت کی طرف رجوع کا کام دیتے ہیں۔

تبرکی (۱۰) اسمائے حسنٰی سے تبرک حاصل کرنے کے لیے ان اسما کا استعمال جس کا مفہوم یہ ہے کہ اس طور پر انسان اپنے پروردگار کی عظمت وتنزیہہ کا اعتقاد کامل رکھتا ہے اور ان اسما مبارکہ ومنزیہ کے ذریعہ پروردگار کو جائے پناہ مانتا ہے۔

بہترین اوقات دعا:

دعا کا بہترین وقت یا تو وہ ہوتا ہے جس میں تجدد نعمت خداوندی کا یقین ہو، یا وہ جس میں اللہ تعالٰی کی نشانیوں میں سے کوئی نشانی ظاہر ہو چکی ہو۔ اور یا وہ جس میں انسان اپنی بے بسی کو روئے اور پروردگار سے ضروری حاجت پوری کرانے کی درخواست کرے۔ لیکن اگر ''حال'' کا حاصل کرنا مقصود ہے تو ضروری ہے کہ صبح وشام دعا میں مصروف رہے۔ صبح کو اس لیے کہ اس وقت انسان دنیاوی دھندوں میں مصروف ہونے سے پہلے فارغ

اور مجتمع الہمت ہوتا ہے اور اپنی توجہ کو خدائے واحد کی معرفت پر مرکوز کرسکتا ہے اور شام کا وقت اس لیے کہ دن بھر دنیا کے دھندوں میں مصروف رہ کر اس کا آئینہ دل غبار آلود ہو جاتا ہے جس کا غبار اتارنے کے لیے دعا صیقل کا کام دیتی ہے۔

روزہ اور اس کا فلسفہ وغرض وغایت:

عبادت کا ایک طریقہ روزہ ہے۔ روزہ کی حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنے معبود کے لیے شدید وثقیل مشقت اٹھانے کے لیے تیار ہو جائے اس کا فلسفہ یہ ہے کہ انسان جب کسی سے سخت دل بستگی اور قلبی محبت کرتا ہے تو پھر اس بات کی پرواہ نہیں کرتا کہ اس کی اپنی زندگی اور مرافق حیات درست ہیں یا نہیں اور وہ عیش وآرام میں ہے یا تکلیف ورنج میں بلکہ ہمیشہ ایک ہی خیال اس کو دامن گیر رہتا ہے کہ وہ تن من دھن غرض ہر عزیز ترین متاع زندگی اپنے محبوب کی خوشنودی کے لیے قربان کرے۔ اس علم کے ساتھ کہ اس کا محبوب اس کے اس ایثار اور قربانی کو پسند کرتا ہے اور اس کی اس تکلیف کو وہ دیکھ رہا ہے اور (اگر زبان سے وہ کچھ کلمات ادا کر رہا ہے تو محبوب انہیں) سن رہا ہے۔

انسان کی جبلت ہے کہ اس کو کسی سے والہانہ عقیدت ہو جاتی ہے تو اس کے بارے میں اس کا یہ پختہ اعتقاد ہوتا ہے کہ وہ سب کچھ جانتا سنتا اور دیکھتا ہے۔ اور اگر تم نے لوگوں کے افعال وحرکات کا استقرا کر کے ان کا مطالعہ کیا تو تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ جب کسی شخص پر کسی غائب محبوب کی محبت غالب ہو جاتی ہے تو وہ اسے حاضر مانتا ہے اور اس کو اس میں لذت محسوس ہوتی ہے کہ اپنے عیش وعشرت اور آرام وراحت کو اس کی خاطر قربان کردے، خصوصاً جب اس کو یقین ہو کہ اس کے محبوب کو اس کا علم ہے۔ اور وہ اس کو دیکھ اور سن رہا ہے۔ اور یہ کہ اس کے ایثار اور قربانی سے محبوب کو یہ قطعی ثبوت ملے گا کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے۔ اس کے سوا کسی اور سے اس کی محبت نہیں۔ (یہی وجہ ہے کہ ایک مومن جو نور ایمان سے منور اور زینت احسان سے مزین ہے اور اپنے پروردگار سے والہانہ محبت وعقیدت رکھتا ہے، اپنے حاضر وناظر محبوب حقیقی کو خوش کرنے کے لیے بھوک پیاس اور دیگر خواہشات سے دستبردار ہوتا ہے۔ اور روزہ کی جسمانی شدائد ومصائب کو برداشت کرتا ہے)۔

خوشنودی محبوب حقیقی حاصل کرنے کے مختلف طریقے:

محبوب حقیقی کی رضا (روحانی سعادت) حاصل کرنے کے لیے اقوام عالم نے مختلف مسالک اختیار کیے ہیں۔ بعض لوگوں نے سخت سے سخت جسمانی تکلیف اٹھانا موجب سعادت اور باعث رضائے الٰہی سمجھتا ہے اور اپنے متاعب شاقہ کو ضروری سمجھا ہے۔ جن میں فطرت انسانی اور خلق اللہ کی تبدیلی نظر آتی ہے۔ مثلاً (بدھ مت کے بھکشوؤں، ہندو دھرم کے سادھوؤں، عیسائیت کے راہبوں وغیرہ نے نفس کشی اور ترک علائق کا جو طریقہ اختیار کیا ہے کہ) وہ کسی عضو شریف مثلاً ہاتھ، پاؤں وغیرہ کو ایک ہی حالت میں رکھ کر اس کو خشک کر دیتے ہیں۔ (یا کانٹوں کی سیج پر سوتے ہیں۔ یا برہنہ جسم جوہڑوں اور دلدلوں میں کھڑے رہتے ہیں) یا عمر بھی تجرد کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ بلکہ عضو تناسل کو کاٹ ڈالتے ہیں اور قوت مردی کا کلی استیصال کرتے ہیں یا اس قسم کی اور بے شمار دوسری باتیں جو (ایک طرف) سنت الٰہی کے خلاف ہیں، (اور دوسری طرف نوع انسانی کی تہذیبی، تمدنی اور عمرانی ترقی سے متصادم ہیں)۔ **وللناس فیما یعشقون مذاھب**۔ نظر اپنی اپنی پسند اپنی اپنی۔

یہ یاد رکھو کہ یہ سب طریقے جاہلانہ طریقے ہیں۔ اور ان پر عمل پیرا ہونے والے عابدوں کو (حقیقی سعادت ونجات اور) معبود حقیقی کی خوشنودی حاصل نہیں ہو سکتی کیونکہ ان سے خلق اللہ اور سنت الٰہی کی تغیر و تبدیلی آتی ہے۔

بہترین طریقہ:

اس کی سب سے اچھی اور بہترین صورت وہی ہے (جو اسلامی روزے کی ہے) جس میں بڑی بڑی نفسانی خواہشات ولذات مثلاً کھانا پینا اور صنفی تعلق کو اتنی دیر کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے جو نہ تو بہت کم ہو جس کا کچھ اثر ظاہر و محسوس نہ ہو۔ اور نہ اتنی دیر تک خواہشات مذکورہ کو ترک کیا جائے کہ ریاضت کرنے والے کے جسم اور اس کے قوائے بدنیہ پر مضر اثر پڑے اور فساد مزاج کا باعث ہو (چنانچہ شریعت اسلامیہ نے متوسط راہ یعنی طلوع صبح سے غروب آفتاب تک کا وقت اس کے لیے اختیار کیا ہے اور چونکہ ایک یا دو دن کے

روزہ رکھنے سے مطلوبہ اثرات پیدا نہیں ہوتے اس لیے ایک مہینہ تک اس عمل کو جاری رکھنے کا حکم دیدیا گیا ہے)۔

روزہ کے لیے مناسب وقت وہ ہے جب انقیاد وتسلیم کا جذبہ غالب ہو یا وہ وقت جب نفس کی سرکشی کو کم کرنے کے لیے روزہ رکھنا ضروری قرار پائے (جیسے کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ ومن لم یستطع فعلیه بالصوم الخ) یا شکر نعمت کا اظہار مقصود ہو، یا کسی نعمت کے حصول کی تمنا ظاہر کرنا ہو یا اگر انقیاد وتسلیم اور تشابہ باللاہوت وغیرہ کیفیات کا پیدا کرنا مقصود ہو (اور وہ کسی خاص وقت میں پیدا ہوتے ہوں) تو مقررہ وقت اس کا وقت ہوتا ہے۔

(۴) زکوٰۃ۔ اس کی حقیقت وفلسفہ:

عبادت کا ایک طریقہ زکوٰۃ ہے۔ زکوٰۃ کی حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنے معبود کی خوشنودی کی خاطر مال ودولت خرچ کرنے کی تکلیف برداشت کرنے کو تیار ہو جائے اسی طرح معبود کی خاطر غلاموں کو آزاد کرنا اور ذبیحہ کی قربانی دینا وغیرہ بھی زکوٰۃ کے ملحقات میں سے ہیں۔ جب آدمی کو کوئی تکلیف ومصیبت پیش آتی ہے، اور اس کو دور کرنے کے لیے اپنے معبود حقیقی کی طرف گھبرا کر رجوع کرتا ہے تو پہلے بارگاہ اقدس میں صدقہ یا اعتاق یا قربانی پیش کرتا ہے۔

زکوٰۃ کی بہترین صورت یہ ہے کہ وہ اموال میں حق معلوم اور حصہ مقرر ہو۔ یا شارع اس کی تجدید وتعیین نو کے لیے مبعوث ہو[۱]

انسان کے اموال واملاک میں بنیادی چیزیں یہ ہیں: (۱) نقدیں (سونا چاندی) (۲) مویشی (۳) اشیائے تجارت اور (۴) زراعت اور کھیتی باڑی۔ ان اموال میں نصاب کا تعین بھی ضروری ہے۔ جس کی مقدار اتنی قلیل بھی نہ ہو جس کے نکالنے میں تکلیف وحرج ہو اور نہ اتنی زیادہ ہو کہ لوگوں کے پاس اس مقدار کے نصاب کا اکٹھا ہو جانا بہت نادر ہو۔ اسی طرح میعاد کا بھی خیال رکھنا چاہیے اس میں بھی اوسط مقدار ملحوظ رکھنی ہوگی۔ یہ سب کچھ

---

[۱] اصل عبارت یہ ہے "اما یعینه او الشارع یحث للتجدید" (غالباً اس عبارت میں کاتب سے کوئی غلطی ہوئی ہے۔

اس لیے ضروری ہے کہ صاحب مال سے زکوٰۃ لینے کا کام آسان ہو جائے اور اس کے فوائد زیادہ سے زیادہ رہیں۔

(۵) حج: اس کی حقیقت وفلسفہ:

عبادت کا ایک طریقہ حج کرنا ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنے معبود کے حق میں اپنے داخلی شوق اور قلبی اشتیاق کو پورا کرنا چاہتا ہے اور اس کا وسیلہ یہ سوچتا ہے کہ وہ اپنے معبود کے ان مقامات کی زیارت کرے جہاں اس کی صفات کاملہ کا ظہور ہوا ہے۔ مثلاً اس کی خاص برکتیں اور رحمتیں وہاں پر نازل ہوئی ہوں اور اپنے بندوں کو مغفرت و بخشش سے نوازا ہو یا وہاں پر ایسے آثار ہوں جن کو دیکھ کر معبود کی یاد فوراً دل میں اتر آتی ہو یا اس کے حکم سے اس جگہ کا تعین کیا گیا ہو۔ (جیسے مسلمانوں کے لیے بیت اللہ الحرام)۔

ہر قوم حج کے لیے مخصوص جگہ پر جاتی ہے کسی کے لیے کوئی مکان مخصوص ہے۔ (جیسے بیت المقدس اور بیت اللہ الحرام، بنی اسرائیل اور مسلمانوں کے لیے مخصوص ہیں) کسی نے دریا اور سمندر کو پسند کیا ہے۔ (مثلاً ہندو لوگ دریائے گنگا کی یاترا کے لیے حاضر ہوتے ہیں) بعض لوگوں کا قبلہ مقصود کوئی درخت (جیسے بدھ مت میں بڑ کا درخت) یا صحرا یا قبر یا استھان یا چبوترہ یا زاویہ وغیرہ ہوتا ہے۔ جہاں اچھے آثار اور مظاہر واقع ہوئے ہوں یا متبرک اجتماعات واقع ہوئے ہوں (اور ان مظاہر حسنہ اور برکات کثیرہ کی وجہ سے وہ اپنے خیال میں انہیں مقدس و متبرک سمجھتے ہوں۔ حالانکہ عام طور پر زمانہ کے دستور اور عادات کے مطابق ایسے آثار اور مظاہر ہر جگہ ظہور میں نہیں آتے۔

اور ہر آدمی جس کو کسی سے بحیثیت معبود یا محبوب والہانہ دل بستگی ہو وہ تمام اطلال و آثار اور مقامات کو مقدس و متبرک خیال کرتا ہے جو اس کے خیال میں اس کے محبوب سے کسی قسم کا اختصاص رکھتے ہوں۔ یا وہ حج و زیارت کے لیے کسی ایسی جگہ کا انتخاب کرتا ہے جہاں پر کوئی قوم ایسی رہتی ہو، جس کا وقت ذکر و فکر میں بسر ہوتا ہو اور مقصود یہ ہوتا ہے کہ ان مقدس ہستیوں کی برکت سے اس کی عبادت بھی شرف قبولیت حاصل کرے گی، چنانچہ اسی بنا پر حلقہ

ہائے ذکر میں شامل ہونا اور مساجد اور عبادت گاہوں اور دعا کے مقامات میں حاضری دینا بھی حج کی فروعات میں سے ہے۔

بہترین صورت حج:

حج کی بہترین صورت یہ ہے کہ کسی ایسی مسجد (عبادت گاہ) کا قصد کرے جس میں معبود حقیقی کی آیات باہرہ نمایاں ہوں، اور اس کو کسی ایسی صالح شخصیت نے خود اللہ تعالیٰ کے حکم سے تعمیر کیا ہو جس کے برگزیدہ بندۂ خدا ہونا امم واقوام کے نزدیک مسلمہ ہو اور اس کا محل وقوع بے آب وگیاہ اور لق ودق صحرا ہو جس میں آباد ہونے کی استعداد اور گنجائش نہ ہو۔ اس کی تفصیل بحث ملل میں آئے گی۔ انشاءاللہ تعالیٰ)۔

(٦) ایمان ونذور (قسمیں کھانا اور منت ماننا):

عبادت کا ایک طریقہ ایمان (جمع یمین) ونور ہیں۔ یمین (قسم) کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی اپنے افعال واقوال اور اعمال میں معبود حقیقی کا مقدس نام لے کر اپنے عزم وارادہ کی تاکید وپختگی کا اظہار کرتا ہے، انسان کی جبلّت یہ ہے کہ جب وہ اپنے معبود یا کسی قابل احترام ہستی کا نام لے کر کوئی عزم کرتا ہے تو اس کی مخالفت اس کے لیے ناگوار ہوتی ہے (پھر وہ نہ جھوٹ بولنے کی جرأت کرتا ہے اور نہ ہی اس فعل کے کرنے میں کوتاہی کرتا ہے) کیونکہ قسم کھا کر جھوٹ بولنا اور معبود کا نام لے کر کسی فعل کا عزم بالجزم کرنا اور پھر اس میں تساہل کرنا معبود کے تقدس کے خلاف اور اس کی اہانت سمجھتا ہے، اور یہ خیال کرتا ہے کہ عزم پر معبود کا نام لینے کے بعد اسے پورا نہ کرنا محبوب کی بے قدری، اس کی محبت سے انکار واعراض اور دوسروں کو اس پر ترجیح دینے کے مترادف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان اپنے معبود ومحبوب کے نام کی قسم کھا کر اپنی فطرت کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے وہ بطور عادت یا خارجی رسم وراہ کے تحت نہیں بلکہ فطری تقاضوں کے تحت ایسا کرتا ہے۔

نذور اور منتوں کی حقیقت یہ ہے کہ یہ بھی انسان کی فطرت ہے کہ جب اس کو کوئی مشکل پیش آتی ہے جس سے وہ گھبرا جاتا ہے تو ایسے موقع پر وہ مال کو ہیچ سمجھ کر قربان کرتا ہے

اور اعمال شاقہ کا بجالانا اس کو آسان معلوم ہوتا ہے۔اب اگر اس کے دل میں معبود کی تعظیم مفرط موجود ہے تو وہ اپنے مال وزر کو راہ معبود میں (حج وزیارت وغیرہ کے لیے) بخوشی صرف کرتا ہے اور اپنا سب کچھ اس کے دربار میں (بطور صدقہ خیرات وغیرہ) پیش کرنے کا عزم وارادہ کر لیتا ہے۔اور پھر اس ارادہ سے منحرف ہونا اس کے لیے ناگوار ہوتا ہے۔

(۷) استماع اخبار وتلاوت کتاب معبود:

معبود کی یاد میں مشغول ہونا، اس کے بارے میں مواعظ وقصص سننا اور اس کتاب کی تلاوت کرنا جس میں معبود کی صفات اور اس کے شئون وآیات کا تذکرہ ہو۔یہ بھی انواع عبادات میں سے ہے۔اس کی حقیقت یہ ہے کہ جب آدمی اپنے محبوب کی محبت میں ہیجانی کیفیت سے دوچار ہو جاتا ہے تو وہ قدرتی طور پر اپنے محبوب کی یاد اور ذکر وفکر میں مشغولیت پر مجبور ہوتا ہے اور اس کا دل محبوب کے محاسن، اوصاف اور کمالات سننے کے لیے بے قرار و مضطر ہوتا ہے (کیونکہ بقول شاعر:

ذکر حبیب کم نہیں وصل حبیب سے

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ یہ سات قسم کی عبادات ایسی ہیں کہ تم دنیا میں ہر ایک قوم اور امت کو ان کا معتقد اور ان طریقہ ہائے عبادت پر عمل کرتے ہوئے پاؤ گے۔اگرچہ ان کے معبود الگ الگ ہوں اور ان عبادات کے ادا کرنے میں ان کے طریقے ایک دوسرے سے جدا جدا ہوں۔

گیارھویں فصل

شرک کی حقیقت اور اس کے اقسام

سومعرفت کے باب میں ایک لاعلاج اور مزمن بیماری جس کی ہلاکت آفرینیوں میں دنیا کی تقریباً ہر قوم مبتلا رہی ہے وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ عالم ناسوت کے مادی اشیا میں سے کسی شے کو شریک ٹھہرانا ہے۔یہی شرک کی حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس کو مادیات کے مشابہ سمجھا جائے۔

اگر انسان خالی الذہن ہو کر اپنی ذات وفطرت کی طرف رجوع کرے تو وہ یقیناً اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ کسی صفت کے کمال اور معیار فضیلت کے دو درجے ہیں:

ایک وہ جس کو وہ اپنے ابنائے جنس (ابنائے نوع) کے لیے مخصوص سمجھتا ہے۔وہ جانتا ہے کہ نوع انسانی کا کوئی فرد چاہے کتنا ہی فضل وکمال کا مالک ہو اس کی ایک حد مقرر ہے۔جس سے وہ تجاوز نہیں کر سکتا۔

دوسرا درجہ وہ ہے جو عالم ناسوت سے بالاتر ہستی کے لیے مخصوص کیا گیا ہے۔(اور کوئی فرد بشر اس درجۂ کمال پر فائز ہونے کی استعداد وصلاحیت ہی نہیں رکھتا)۔ہاں یہ اور بات ہے کہ ناسوتی اور ناسوت سے بالاتر ہستی کے درجۂ کمال کو معین کرنے کے بارے میں لوگوں کو اپنے اپنے معیار علم کے مطابق مختلف راہیں اختیار کرنا پڑی ہیں۔لیکن بہر حال ہر شخص کے ذہن میں یہ فطری نظریہ راسخ ہو چکا ہے کہ ناسوت سے بالاتر ہستی اس شرف اور کمال کی مالک ہے کہ ان کی نسبت عالم ناسوت کی اشیا کے ساتھ قائم ہی نہیں کی جاسکتی اس بالاتر ہستی کی عظمت کا یہ تصور کرنے کے بعد وہ اپنی جانب سے ایسا اظہار عجز کرتا ہے اور اس

کی اس درجہ کی تعظیم کرتا ہے۔ جو اس کی شایان شان ہے۔ کوئی ناسوتی ہستی اس کی مستحق نہیں ہو سکتی۔

وہ سب معانی جو کائنات میں تاثیر قدرت کی غمازی کرتے ہیں مثلاً خلق وابداع (اشیا کو بغیر سبب اور سلسلہ اسباب کے ذریعہ نیست سے ہست کرنے) شفا بخشی، برکت نوازی اور عظمت جبروتی وغیرہ۔ ان تمام معانی کے (حسب مندرجہ بالا) دو درجے ہیں (ایک وہ جس کا تصور انسان اپنے ابنائے جنس میں کر سکتا ہے اور دوسرا وہ جو ناسوت سے بالاتر ہستی کے لیے مخصوص ہے) مثلاً:

ایک درجۂ عظمت وہ ہے جس کا اعتقاد انسان اپنے ماں باپ استاد و مربی کے حق میں رکھتا ہے اور اس لیے ان کے سامنے سر نیاز خم کر کے آتا ہے۔ اس نیاز مندی کا اصل راز یہ ہے کہ اگرچہ باپ اور بیٹا استاد اور شاگرد ایک جیسے انسان ہیں اور دونوں عالم ناسوت سے تعلق رکھتے ہیں مگر استاد اور والد کو قدرے زیادہ کمال اور تقدم حاصل ہے۔ کیونکہ باپ کو یہ فضیلت حاصل ہے کہ اس نے بیٹے کی تربیت و پرورش کی اس کے بوجھ اٹھائے، اسی طرح استاد کی فوقیت کا سبب اس کا علم و فضل ہے اور وہ اپنے شاگرد سے علم و فضل میں اعلیٰ درجہ پر فائز ہے۔ یہ تمام ناسوتی صفات ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے بعض کو بعض پر بہت سے متناسب برتری عطا فرمائی ہے۔ یہ تفاضل درجات بالکل امر طبعی ہے اور اس کی مثال بعینہٖ ویسی ہے جیسے قدرت نے جسمانی قد و قامت میں لوگوں کے باہم تفاوت کو برقرار رکھا ہے۔ کسی کو لمبے قد و قامت سے نوازا ہے۔ تو کسی کو کوتاہ قد دے کر پیدا کیا ہے (اس لیے استاد و والدین دونوں کمال ناسوتی قسم کا ہے۔ جس پر شاگرد اور بیٹا دونوں فائز ہو سکتے ہیں) تاہم بچے اور شاگرد نے جب اپنے باپ اور استاد میں اس قسم کی فضیلت پائی تو ان کے سامنے عاجزی اختیار کی ان کے مقابلے پر اپنے کو ناچیز کے برابر سمجھا اور ان کے سامنے جھک گئے کیونکہ پرورش اور علم کے سامنے خضوع اور تذلیل بالکل فطری امر ہے۔

دوسرا درجۂ عظمت تعظیم الٰہی کا ہے اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنی فطرت سے جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ اقدس ناسوت سے بالاتر ہے۔ اور ذاتِ اقدس اور عالم

ناسوت میں کسی قسم کی مماثلت ومشابہت نہیں ہے۔حق تعالیٰ کی برتری انسانی عقل وقیاس سے ماورا ہے۔اوران دونوں کے درمیان برتری کا موازنہ ہی نہیں ہوسکتا کیونکہ حق تعالیٰ کی برتری ایسی نہیں جس کا کوئی اندازہ لگایا جاسکے (چہ نسبت خاک را با عالم پاک) اس لیے اپنے اس فطری عقیدہ کے نتیجہ میں اسی ہستی بالاتر کے سامنے انتہائی تذلل وعاجزی اور انقیاد و تسلیم اختیار کرنا اس کے لیے ضروری ولازمی ہوتا ہے۔اس انتہائی تذلل واظہار عجز کو جو بالاتر ہستی کی اس معرفت کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں عبادت کہتے ہیں۔عجز وانقیاد کا یہ اعتقاد و یقین ایک اندرونی کیفیت ہے جو ایسے حالات میں متحقق ہوتا ہے کہ انسان ظاہر میں اپنے اعضا سے کوئی عمل بھی اس قسم کا نہ کرے جس سے معبود کی انتہائی تعظیم اور خود اس کا اپنا انتہائی تذلل ظاہر ہو بہر حال ظاہری اعمال اندرونی اعتقاد اور قلبی اذعان کے لیے بمنزلہ شواہد اور علامات کے ہیں۔اور کسی شخص میں ظاہری اعمال کا پایا جانا ہی اس امر کا ثبوت ہے۔کہ اس کا قلب عجز وانقیاد کی کیفیت سے آراستہ ہے۔اسی طرح (یعنی سمع وبصر اور علم وارادہ پر قیاس کرکے) روزی دینا اور شفا بخشنا بھی دو درجے رکھتا ہے۔مخلوق سے بھی ان کو نسبت دی جاسکتی ہے اور خالق کو بھی اُن سے موصوف سمجھا جاتا ہے۔مثلاً کہا جاتا ہے کہ ''رزق الامیر الجند'' یعنی امیر نے اپنے لشکر کو روزینہ دیا۔اس کا مفہوم یہ ہے کہ جو مال امیر نے ناسوتی ذرائع اور طاقتوں سے جمع کیا تھا اس کو اس نے اپنے سپاہیوں میں تقسیم کیا۔یا مثلاً یہ کہتے ہیں کہ 'شفی الطبیب المریض' یعنی طبیب نے بیمار کو شفا بخشی۔اس کا مفہوم یہ ہے کہ طبیب نے اسی انسانی قوت فکر کو جو مریض کو بھی دی گئی ہے استعمال کرکے بیماری کی تشخیص اور اسباب معلوم کیے اور ادویہ کے خواص وآثار کو سمجھنے کی بھرپور کوشش کی اور پھر عالم ناسوت کے مناسب حال خواص حرارت وبرودت وغیرہ وغیرہ کو معین مقدار میں استعمال کیا جس کے نتیجہ میں بیمار شفایاب ہوا۔(بذاتِ خود نہ تو امیر رازق ہے اور نہ طبیب شافی) لیکن اگر انہی دو الفاظ رزق وشفا کی نسبت ہم اللہ تعالیٰ کی طرف کریں اور کہیں: ''رزق اللہ تعالیٰ خلقه و شفی اللہ تعالیٰ عبده'' تو اس کے معنی کچھ اور ہوں گے یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ نے وہ اسباب اور خواص پیدا کیے بغیر جن سے ناسوتی اعمال کی ملابست ہوتی ہے یا اس سے مشابہت ہوتی ہے بغیر اسباب

ظاہری کے یہ ارادہ فرمایا کہ اس پر مخلوق کے پاس مال جمع ہو اور وہ مال اس کے پاس آ گیا، یا یہ کہ اس بندہ کا مرض زائل ہو جائے اور مریض کو شفا حاصل ہو گئی اور جو ارادہ ذاتِ اقدس کا تھا اسی طرح ظہور میں آیا (اس کے تنفیذِ امر میں کسی قسم کی روکاوٹ نہیں آتی مگر انسان کبھی کامیاب ہوتا ہے کبھی نہیں ہوتا اور یہی فرق ہے عبد و معبود میں)۔

بعینہٖ اسی طرح کسی چیز کو حلال کیا یا حرام کیا کہ اصطلاح دو معنوں میں استعمال ہوتی ہے:

ایک یہ کہ حلال یا حرام بتانے والا تحلیل و تحریم کے کسی حکم کو رسول سے سنے یا اپنی قوت فکر و نظر سے اجتہاد کے ذریعہ معلوم کرلے کہ فلاں چیز حلال ہے اور فلاں حرام یہ ایسا کام نہیں جسے کوئی دوسرا انسان نہ کر سکے)۔

دوسرے یہ کہ خود اس نے کسی چیز کو حلال قرار دیا یا حرام ٹھہرایا اور اگر کوئی اس کا ارتکاب کرے گا تو ماخوذ ہوگا۔ گویا اس کی حیثیت ناقل یا مجتہد کی نہیں۔ حالاں کہ ایسا شارع تو اللہ تعالیٰ ہی ہوسکتا ہے دوسرا کوئی نہیں۔

شرک کی حقیقت اور اسباب

یہ بھی نفس ہوائی یا نسمہ کی فطرت میں سے ہے کہ وہ حقائق اشیا کے دریافت کرنے میں لگا رہتا ہے۔ اور ہر ایک چیز کے امتیازات اور خواص معلوم کرتا رہتا ہے۔ کیونکہ اس میں قوتِ علمیہ ودیعت رکھی گئی ہے۔ اب اگر اس کی کوئی خارق عادت عجیب و غریب تاثیر نظر آئے جس کی معقول توجیہ کرنے سے اس کی عقل عاجز ہے تو جس سے وہ صادر ہوئی ہے اس کے حق میں وہ غیر معمولی شرف اور عظمت کا اعتقاد قائم کر لیتا ہے۔ اور اس ہستی سے اس کو زبردست دل بستگی اور محبت پیدا ہوتی ہے اس کا اعتقاد کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر وہ اس قسم کے خوارق کا اپنے ابنائے جنس سے صادر ہونا بعید یا ناممکن خیال کرتا ہے۔ تو اس کے نتیجے میں اس مظہر کے شرف مقدس اور غیر متناہی فضیلت کا عقیدہ اور اس کے ساتھ کامل محبت خود بخود وجود میں آتے ہیں۔ اور جب وہ خارق یا خوارق بار بار اس مظہر سے صادر ہوں یا وہ ان کی

یاد بار بار تازہ کرنے کی محنت کرتا ہے تو وہ محبت اور تعظیم جو اس نے اس مظہر کو خدا کے ساتھ وابستہ کر کے اس کے ساتھ قائم کی تھی۔اس کے دل میں راسخ ہو جاتی ہے (اور وہ اس ہستی سے وہی سلوک کرنے لگتا ہے جو ذات اقدس کے لائق اور شایان شان ہوتا ہے) اس طرح نادانستہ طور پر شرک باللہ اس کے عقیدہ اور رگ وپے میں سرایت کر جاتا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کی خداشناسی کا دارومدار یہ ہے کہ انسان ان دونوں (انسان اور خدا) کے جنس کی علیٰحدگی کا یقین رکھے جس کے نتیجہ میں وہ یہ جانتا ہو کہ عالم ناسوت غیر ناسوتی فطرت رکھنے والی قوت قاہرہ کے سامنے مقہور ومغلوب رہتا ہے۔لیکن جب وہ کسی ہستی کی عظمتِ مقدسہ کا اعتقاد پیدا کر لیتا ہے اور اس سے مقدس محبت کرنے لگا ہے تو اس کے ضمن میں اس ہستی کی جنس ناسوتی سے تفوق وبرتری کا غیر شعوری طور پر اقرار کرتا ہے۔

مشرکین کے اقسام

اس بیماری (شرک) میں مبتلا مریضوں کی کئی قسمیں ہیں:

۱- مجوس وصابی:

ان مشرکوں میں سے بعض وہ ہیں جنھوں نے اللہ تعالیٰ کو بھلا دیا ہے اور اس کی عظمت ومحبت مقدسہ کو دلوں سے نکال لیا ہے۔اور اس کی عبادت اور احکام وفرامین سے پوری طرح غافل ہیں۔وہ جب بھی عبادت کرتے ہیں (تو اس کو چھوڑ کر) صرف اپنے ان معبودوں کی عبادت کرتے ہیں جو انھوں نے اللہ تعالیٰ کے شریک ٹھہرا دیے ہیں۔وہ جب حاجتیں پوری کرنے کے لیے دامن سوال اور دست استعانت پھیلاتے ہیں تو ان شرکا کے پاس جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک لحظہ کے لیے بھی التفات وتوجہ نہیں کرتے۔اگرچہ وہ نظری طور پر عقل انسانی اور دلیل برہانی کے ذریعہ اس حقیقت سے اچھی طرح آگاہ ہیں کہ موجوداتِ عالم کا سلسلۂ تخلیق کسی ایک نقطۂ آغاز اور خالقِ واحد کا متقاضی ہے لیکن عملی زندگی میں وہ اس ''ایک ہستی'' کے تصرف کو مطلقاً معطل سمجھتے ہیں۔اس صنفِ شرک کے حامل مجوسی اور صابئین کا ایک فرقہ ہے۔

۲۔ یہود ونصاریٰ اور مشرکین عرب:

ان مشرکوں میں سے بعض وہ ہیں جن کا اعتقاد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی حقیقی معنوں میں صاحب شرف وفضل اور آقا و مالک ہے۔ اور وہی ذات ہے جو مدبر کائنات ہے مگر (وہ کہتے ہیں کہ) اللہ تعالیٰ بعض ہستیوں کو لباس شرف اور خلعتِ خدائی پہنا دیتے ہیں، اور ان کو کائنات کے ایک عالم میں متصرف اور تدبیر کنندہ بنا دیتے ہیں جیسے کہ کوئی شہنشاہ اپنے بعض خدمت گزاروں کو خلعتِ بادشاہت سے نواز کر اپنی سلطنت کے کسی حصہ پر اسے اپنا نائب و حکمراں بنا دیتا ہے۔ وہ خود شہنشاہ ہوتا ہے اور اس کی طرف سے مامور سلطان اور بادشاہ ہوتے ہیں۔ اسی طرح وہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو الٰہ الالہہ اور معبودِ معبودان کی حیثیت اور ان شرکا کو چھوٹے خداؤں کا درجہ حاصل ہے۔ معبودِ اعظم اور الہ الالہہ کے نزدیک ان چھوٹے خداؤں کی بڑی عزت وتوقیر ہوتی ہے۔ اور وہ معبود اعظم کی طرف سے کارخانۂ ہستی اور عالم کون ومکان میں تصرف بھی کرتے ہیں۔ اور خدائے عزّ وجلّ کی بارگاہ میں سفارش کا حق بھی رکھتے ہیں۔ چنانچہ وہ ان کو بندگانِ خدا کے نام سے موسوم کرنے سے ہچکچاتے ہیں اور ان کی زبانیں یہ نہیں کرسکتیں کہ ان کو دوسروں کے ساتھ مساوی درجۂ مدحت پر فائز رکھیں اس لیے انھوں نے ان کو ابناء اللہ (اللہ تعالیٰ کے فرزند) محبوب اللہ (اللہ تعالیٰ کے محبوب) معشوق اللہ (اللہ تعالیٰ کے معشوق) وغیرہ مقدس ناموں اور لقبوں سے موسوم کیا۔ اور باقی سب لوگوں کو ان کے بندوں کی حیثیت اور مقام دیدیا۔ اس لیے انھوں نے اپنے اور اپنے بچوں کے نام عبدالمسیح غلام فلاں، غلام فلاں اسفندیار (آتش پرستوں کے دیوتا اسفند کا ساتھی) وغیرہ رکھ کر اپنے انتہائی تذلل کا اظہار کیا۔ اس صنفِ شرک میں یہود ونصاریٰ مشرکین عرب اور عصر حاضر میں امت محمدیہ کے غالی منافق بری طرح مبتلا ہیں۔

۳۔ متوغل پیر پرست:

ان مشرکوں میں بعض لوگ وہ بھی ہیں جن کا یہ عقیدہ ہے کہ اس عالم میں اللہ تعالیٰ کا

ہی تصرف ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی اعتقاد رکھتے ہیں کہ: اللہ کے کچھ برگزیدہ بندے فنا فی اللہ ہو کر یہ درجہ حاصل کر لیتے ہیں کہ ان کی رضا مندی میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی مضمر اور پوشیدہ ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رضا میں ان کی رضا مضمر ہوتی ہے اور ان کا کوئی فعل ایسا نہیں جس میں خدائے پاک کے فعل وتصرف کی جھلک نہ ہو (بالفاظ دیگر ان کا فعل خدائے عزّ وجل کا فعل ہے)۔ یہ لوگ اگر جانتے کہ یہ عقیدہ شرک ہے اور اللہ تعالیٰ اس کو پسند نہیں کرتا تو وہ ایسا اعتقاد رکھنے سے یقیناً اجتناب کرتے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی آنکھوں پر پردے ڈال دیئے ہیں۔ (اور وہ حق کو اپنی اصل حقیقت وحسن کے ساتھ دیکھنے سے قاصر ہیں)۔

یہ بھی جاننا چاہیے کہ شرفِ مقدس اور شرفِ ناسوتی دونوں کے لیے جو الفاظ استعمال ہوتے ہیں وہ قریب قریب ایک جیسے ہوتے ہیں چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا تھا: ''تم طبیب نہیں ہو، طبیب تو اللہ تعالیٰ ہے تم کو رفیق کہنا چاہیے''۔ لیکن دوسرے معنی یعنی ناسوتی معنی میں طبیب کا اطلاق بھی بنی آدم کے کسی فرد پر جائز ہے۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر فرمایا: ''سید وآقا تو اللہ تعالیٰ ہے، لیکن ناسوتی معنی میں یہی فرمایا کہ انا سید ولد آدم (میں بنی آدم کا سردار ہوں) بہر حال اگرچہ الفاظ میں اشتراک پایا جاتا ہے پھر بھی انبیا کی تاریخ میں ہر پیغمبر نے جو اپنی قوم میں مبعوث ہوا شرک کی سب صورتوں سے زجر وتوبیخ کے ساتھ سختی سے منع کیا۔ اور اپنی امت کے دلوں کو شرک کی آلودگیوں اور آسائشوں سے پاک کیا۔ چنانچہ وہ الفاظ کے اشتباہ کے باوجود مقدس شرف کی حقیقت کو پہچاننے میں کامیاب ہوئے۔ مگر اس پیغمبر کے بعد جب اس کے رفقا کار میں سے اصحاب حلقہ، حواریوں، دین کے وصیوں اور علمبرداروں اور علم سماوی کے حاملوں کا عہد زرّیں گزر گیا، اور لوگوں کے دلوں میں امامت ودیانت کا جذبہ باقی نہ رہا تو نا اہل جانشین مسند دین وعلم پر آ کر بیٹھ گئے جنھوں نے (دین کے بنیادی اصول وشعائر اور نظام صلوٰۃ وعبادت کو تباہ کیا اور وہ خواہشات نفسانی اور شہوات حیوانی کے درپے ہو گئے اور اس پیغمبر کے کلام وپیغام کو اصل مقام سے ہٹانے کے لیے تحریف وتبدیل کی مذموم کوششیں کیں اور شفاعت ومحبوبیت وغیرہ کو جو پیغمبر نے اپنے اور اپنے خواص امت کے لیے ثابت

مخصوص کر دیئے تھے دوسرے معنی پہنا دیئے۔اس طرح اصل دین الٰہی مسخ ہو گیا اور ایک بار پھر جاہلیت کا عہد عود کر آیا۔(اور ہر طرف ظلم و فساد برپا ہوا۔اور زمانہ ظهر الفساد فی البر والبحر بما کسبت ایدی الناس کا مصداق ٹھہر گیا)۔ایسی حالت میں اللہ تعالیٰ ایک اور پیغمبر کو مبعوث فرما دیتا تھا۔جو شرک (وبت پرستی) سے منع فرماتا اور شرک کی جملہ مروجہ صورتوں سے لوگوں کو روکتا اور اس راہ میں زبردست سعی و کوشش کرتا اور مزاحم فرقوں سے جنگ و جہاد کیا کرتا تھا۔

جہاں تک اسلام اور شریعتِ محمدی کا تعلق ہے (تو اگرچہ پیغمبر آخرالزماں حضرت محمدؐ اس دنیا سے رخصت ہو گئے ہیں مگر) برابر اس میں وصیِ نبی (اور علما) موجود ہیں جو علم دین اور پیغام وحی کو اپنی شکل وصورت (اور اپنی اصل عربی زبان) میں محفوظ رکھتے ہیں۔(اور دین کی تجدید اور اصلاح امت کا فریضہ ادا کرتے ہیں) اور حق و باطل کی باہم تخلیط واقع ہونے نہیں دیتے۔اگر لوگ ان مجددین اور اوصیا کی باتوں پر کان دھرتے رہیں اور ان کے نقش قدم پر چلتے رہیں تو وہ کامیاب و کامران رہیں گے لیکن اگر انہوں نے ان کے وعظ و نصیحت کو پس پشت ڈال کر اعراض کا شیوہ اختیار کیا تو دنیا و آخرت میں ناکامی اور نامرادی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔چنانچہ رسول اکرم خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰؐ کی پیشین گوئی کے مطابق اس کی امت میں ہمیشہ ایک ایسی جماعت پیدا ہوتی رہتی ہے اور ہوتی رہے گی جو دین کو اپنی اصلی شکل وصورت میں محفوظ رکھتی ہے اور مخالفوں کی مزاحمت و مخالفت ان کو کسی قسم کی گزند نہیں پہنچا سکتی ہے[1]۔اس طرح دین محمدی میں جاہلیت عود نہیں کر سکتی ہے۔اور نہ اس میں کسی دوسرے نبی کی بعثت کی ضرورت محسوس ہو سکتی ہے۔واللہ اعلم باسرارہ۔

---

[1] جنھیں مجددین کہتے ہیں، (قاسمی)

بارھویں فصل

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث کی تاویل

صادق مصدوق حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں سے مخاطب ہوکر پیش گوئی کے طور فرمایا تھا کہ "تم پہلی قوموں کے نقش قدم پر چلو گے اور ہر شعبۂ زندگی میں قدم بہ قدم دست در دست اور بالشت بر بالشت پوری تقلید کرو گے۔ یہاں تک کہ اگر وہ گوہ کے سوراخ میں داخل ہوئے ہوں۔ تو تم بھی اس میں داخل ہو گے۔" صحابہ نے عرض کیا: "پہلی قوموں سے آپ کی مراد یہود و نصاریٰ ہیں"؟ حضور نے فرمایا: "تو اور کون"؟ (حضور کی پیش گوئی حرف بہ حرف سچی ثابت ہو چکی ہے) میں تمہارے سامنے کہاں تک یہ رونا رووں کہ اُمتِ محمدیہ کے منافقین نے کیا کیا شوشے[1] دین میں پیدا کیے ہیں اور کن کن صورتوں کے ساتھ شرک میں مبتلا ہیں۔ اور عصر حاضر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصی (غالباً مراد شاہ صاحب کی اپنی ذات ہے) کے دل میں غیظ و غضب کی آگ بھڑکا دی ہے اور حضور کے علم و وحی کے حامل (شاہ صاحب) کے سینہ میں ضیق و تنگی پیدا کر لی ہے۔ ہم بچشم خود دیکھتے ہیں کہ ضعیف الایمان مسلمانوں نے مشائخ اور دینی پیشواؤں کو ارباباً من دون اللہ ٹھہرالیا ہے اور ان کی قبروں سے مسجدیں بنا رکھی ہیں۔ اور ان بزرگوں کی قبروں آثار و تبرکات اور ان کی نشست گاہوں کے آثار اور زاویوں کو زیارت گاہوں کی حیثیت دیدی ہے۔ بعینہٖ اسی طرح جس طرح امت محمدیہ سے پہلے کی امتیں یہود و نصاریٰ ایسے اعمال کیا کرتے تھے، (اور تحلیل و تحریم اور استعانت و عبادت کے جو طریقے یہود و نصاریٰ کے ہاں

---

[1] الہام و القا

مروج تھے۔ان ضعیف الاعتقاد مسلمانوں میں بھی رائج ہو گئے ہیں۔یہ تو برا عظم ہند کے کمزور ایمان والوں یعنی عام مسلمانوں کا حال ہے) ان کے علما کا حال یہ ہے کہ) ہم نے ان کے کئی افراد کو دیکھا ہے کہ وہ (علما یہود کی طرح دنیاوی اغراض ومقاصد جاہ ومنصب، مال وزر وغیرہ وغیرہ کی خاطر) کلام پاک میں تحریف کرتے ہیں مثلاً ان سے بعض کہتے ہیں: "الصالحون للہ والطالحون لی" نیک وصالح لوگ تو اللہ کے بندے ہیں اور گنہگار میرے لیے ہیں" (گویا وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ وہ شفیع مذنبین ہیں۔اور گنہگاروں کو آتش دوزخ سے نجات دلانے والے ہیں) ان کا یہ کہنا بعینہٖ یہود علما کے اس دعویٰ کے مشابہ ہے۔کہ "لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّا اَیَّامًا مَّعْدُوْدَۃً" کہ آتش دوزخ ان کو چند دنوں کے علاوہ زیادہ نہیں چھوسکتی۔ان علما سو نے شفاعت اور محبوبیت کے معنی اختیار کرنے میں پیش رو یہودیوں اور مسیحیوں کی پوری پوری اندھی تقلید کی ہے اور ان دونوں لفظوں کو الٹے معنی میں استعمال کرنا شروع کیا ہے۔ان مسلمانوں نے بدقسمتی سے یہود اور مجوسیوں کی ملت سے (اور غالباً ہندوؤں سے بھی) بہت سی باتیں اخذ کی ہیں اور ان پر پوری مضبوطی کے ساتھ کاربند ہیں۔انہوں نے مختلف ٹولیاں بنا رکھی ہیں۔(اور اس نص قرآنی کے مصداق ٹھہر گئے ہیں: فَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا ؕ كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ۔انہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر لیا ہے اور ہر گروہ اپنے عقائد واعمال پر نازاں ہے) ان کے علماو مشائخ نے ان احکام کے مقابلہ میں جن کی تصریح کتاب وسنت میں ہوئی ہے اپنے قیاس سے احکام بنائے ہیں (اور پھر ان کی کتابوں میں رطب ویابس جو کچھ بھی لکھا ہوا ہے اس کو دینِ منزل سمجھا ہے) نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خود بھی راہ راست سے بھٹک گئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کر دیا ہے۔

کیا تم نے اس حقیقت کی جستجو کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہود ونصاریٰ کو جب انھوں نے احبار ورہبان کو اربابا من دون اللہ ٹھہرایا کافر کیوں قرار دیا؟ کیا اس وجہ سے کہ ان یہود ونصاریٰ نے کسی ایسے آدمی کو قدیم اور ازلی الوجود کہا ہے جس کے ماں باپ کو وہ اچھی طرح جانتے ہیں یا کیا اس وجہ سے کہ انھوں نے کسی ایسے شخص کو واجب الوجود سمجھا ہے جس

کا پہلے نام ونشان ہی نہ تھا اور وہ نیست سے ہست ہو گیا؟ یا اس وجہ سے کہ وہ سلسلۂ وجود کی انتہا کو کسی ایسے شخص کی طرف منسوب کرتے ہیں جس کے بارے میں وہ یہ اعتراف کرتے ہیں کہ اس کے وجود سے پہلے کئی صدیاں اور لوگ گزر چکے ہیں؟ یقیناً یہ اس قسم کے گھٹیا متناقض ناگفتہ بہ نظریات ہیں کہ جو شخص اپنے آپ کو انسان سمجھتا ہے ایسا عقیدہ نہیں رکھ سکتا۔ (اس سے زیادہ قبیح بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ انسان یہ اعتقاد رکھے کہ ایک دوسرا اس کی طرح کا انسان ازلی الوجود ہے)۔

تم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ یہود ونصاریٰ حلول کے قائل ہیں۔ اگر وہ حلول کے قائل ہوتے تو یہ کیوں کہتے کہ اللہ تعالیٰ نے فلاں کو مبعوث فرمایا۔ یا اس پر فلاں وفلاں وحی نازل فرمائی، یا فلاں بزرگ مر گیا۔ یا فلاں ولی خدائے پاک کے ہاں ہماری شفاعت کرے گا اور اس کی شفاعت منظور کی جائے گی یہ یا اس قسم کے دوسرے الفاظ وکلمات جو وہ اپنی روزمرہ گفتگو میں استعمال کرتے ہیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ذات کو ان انبیا سے بالکل جدا مانتے ہیں۔ (اگر یہ یہود ونصاریٰ اپنے علما ومشائخ کو واجب الوجود یا حقیقی خدا مانتے تو بایں ہمہ عقل ودانش یہ باتیں کہہ کر خود اپنے کلام میں تناقض پیدا نہ کرتے) حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے اپنے انبیا اور صالحین کی قبروں کو مساجد کی طرح جائے عبادت و استعانت ٹھہرا لیا تھا۔ اور شیطان نے ان پر غلبہ حاصل کر کے اوران کو راہ راست سے بھٹکا کر خدائے واحد کے ذکر وفکر کو ان کے دلوں سے بھلا دیا تھا۔ اور مقدس ہستیوں کی الوہیت اور شرف تقدس (اور استعانت بالغیر) کی اعتقادی کیفیت نے یہ عالم اختیار کر لیا تھا کہ ان کی زبانیں یہ گواہی دینے سے ہچکچاتی تھیں، (اور اسے وہ گستاخی اور بدعقیدگی سمجھتے تھے) کہ کہیں کہ:

"فَمَنْ يَمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُهْلِكَ الْمَسِيْحَ بْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا" (اگر اللہ تعالیٰ مسیح بن مریم اور ان کی والدہ کو اور روئے زمین کے تمام انسانوں کو ہلاک کرنا چاہے تو کون ہے جو اللہ تعالیٰ کے اس ارادے کے آڑے آ سکے) حالانکہ (ان کو معلوم ہونا چاہیے تھا کہ) وہ تو بشر و مخلوق سے زیادہ حیثیت نہیں

رکھتے۔ اگر ان پیغمبروں کو دوسرے ابنائے بشر پر کوئی فضیلت حاصل ہے تو وہ صرف یہ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انھیں وحی و نبوت سے نوازا گیا ہے اور لوگوں کو اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ وہ ان پیغمبروں کے احکام و نواہی کے سامنے سر اطاعت خم کر کے اوامر کی تعمیل کریں اور نواہی سے اجتناب برتیں کیونکہ پیغمبروں کا گفتہ گفتہ اللہ ہی ہوتا ہے۔ ان انبیا اور پیغمبروں کو جو شرف و عظمت حاصل ہوئی ہے وہ اسی منصبِ نبوت و رسالت سے پیدا ہوتی ہے۔ کسی اور بالذات طاقت و قوت یا بالاتر از ناسوت سے نہیں ہوتی ہم نے شرک کی تردید اور اپنے بیان کی تائید و ثبوت کے لیے روشن دلائل و شواہد پیش کر دیئے جن کو دیکھ کر اور سن کر کسی انسان کو شرک میں مبتلا ہونے کے کسی عذر کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی خواہ وہ اپنے لیے کتنے بہانے کیوں نہ تراشے۔ اس بیان کو اچھی طرح سمجھ لو۔

مشرکین مکہ اللہ کو واجب الوجود اور خالق کون و مکان مانتے تھے مگر تصرف و عبادت میں دوسروں کو اس کے ساتھ شریک کرتے تھے۔

کیا تمھیں یہ تاریخی حقیقت معلوم نہیں کہ مشرکین مکہ (بھی اپنے معبودوں کو واجب الوجود اور خالقِ کائنات نہیں مانتے تھے اور نہ ہی اس بات کے منکر تھے کہ زمین و آسمان کا پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ کے بغیر کوئی اور نہیں وہ بھی) یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ سلسلۂ وجود اللہ تعالیٰ پر منتہی ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے آنحضرت کو مخاطب فرما کر ارشاد فرمایا ہے:
"وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ" (اگر تو ان مشرکین عرب سے یہ پوچھے کہ آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والا کون ہے، اللہ یا اس کے معبودانِ باطل؟ تو وہ ضرور یہی جواب دیں گے کہ "اللہ تعالیٰ") لیکن باوجود اس عقیدے کے وہ خداوند تعالیٰ کی نظروں میں مشرک ہیں (کیونکہ توحید کے ان دو عناصر یعنی وجود مطلق اور خالقیت کے علاوہ کچھ اور عناصر بھی ہیں جن کا ماننا ضروری ہے اور وہ تدبر و تدبیر کائنات اور استحقاق عبادت و تسلیم قانون بھی ہیں)۔

شاید تم نے واقعات و حکایات میں جو لوگوں کی زبان زد ہیں یہ حکایت بھی سنی ہوگی کہ قیامت سے پہلے علم اٹھا لیا جائے گا حتیٰ کہ دو شخص اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کے طریق ادا میں

اختلاف کریں گے۔ایک کہے گا: یہ اِیَّاکَ سِتِّیْنَ ہے دوسرا کہے گا: نہیں یہ اِیَّاکَ سَبْعِیْنَ ہے جب وہ دونوں اپنا مقدمہ کسی عالم کے پاس پیش کریں گے تو فیصلہ یوں صادر ہوگا نہ تو یہ اِیَّاکَ سِتِّیْنَ ہے اور نہ اِیَّاکَ سَبْعِیْنَ ہے بلکہ اِیَّاکَ تِسْعِیْنَ ہیں۔(جہل ونادانی کا یہ عالم ہوگا کہ بر خود غلط عالم خود حقیقت حال اور اصلِ صورت علم سے واقف نہیں ہوں گے۔اور جہالت عام ہو جائے گی) میں اس ذات کی قسم کھا کر کہتا ہوں جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے کہ عصر حاضر میں دوسری آیات کریمہ میں جہال اور برائے نام علما کا اسی قسم کا اختلاف فی الواقع رونما ہو چکا ہے۔اور اب تو ایسا عالم طاری ہو گیا ہے کہ ہر شخص کسی نہ کسی صورت میں شرک میں مبتلا ہے۔اور ہمارا معاشرہ اس آیت کی عملی تفسیر پیش کر رہا ہے۔وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ إِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ۔ان میں اکثر لوگ جو اللہ کے واجب الوجود ہونے اور خالق کل ہونے) پر ایمان رکھتے ہیں۔ان کا حال یہ ہے کہ وہ (تصرف وتدبیر اور عبادت میں) شرک کی کسی نہ کسی صورت میں مبتلا ہیں۔(تم کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ) عرب میں ایک سخی اور فیاض آدمی تھا جو حج کے موسم میں حاجیوں کو ستو گھول کر پلاتا تھا۔(اس لیے وہ لات یعنی ستو گھولنے والا کہلاتا تھا) مکہ کے مشرکوں نے اس کو الوہیت کا مظہر قرار دیا (اس کا مجسمہ بنایا) اور تکلیف ومصیبت کے وقت میں اس کو پکارنا شروع کیا اور اس بنا پر ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے کافر قرار دیا۔

آمدم بر سر مطلب

صادق ومصدوق حضرت محمد علیہ افضل الصلوٰۃ وایمن التحیات سے جامع ترمذی میں ایک روایت ہے جس میں عدی بن حاتم کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ آیت تلاوت کرتے ہوئے سنا: اِتَّخَذُوْا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ جس کی تشریح کرتے ہوئے آپ نے فرمایا: ’’اس میں کوئی شک نہیں کہ یہود ونصاریٰ اپنے علما مشائخ کو پوجتے نہیں تھے بلکہ یہ بات تھی کہ جب وہ کسی چیز کو حلال کہتے تو وہ لوگ اس کو حلال سمجھتے اور جس چیز کو حرام کہتے اس کو وہ بھی حرام کہنے لگے‘‘۔(اس توضیح سے صاف ظاہر

ہوتا ہے کہ شرک صرف اس کو نہیں کہتے کہ کسی کی عبادت کی جائے بلکہ اس طور پر کسی کی تحلیل وتحریم کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی طرف سے منسوب کیے بغیر شرعی نصوص کی طرح قطعی اور اٹل سمجھا جائے تو یہ بھی شرک کی ایک صنف ہے)۔

تحریف کا صحیح مفہوم

ممکن ہے کوئی عریض القفا (بیوقوف اور موٹی سمجھ والا شخص) یہ کہہ دے کہ اس کو شرک کا نام کیسے دیا جاسکتا ہے جبکہ کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ وہ تحلیل وتحریم کا مالک ہے۔ میں اس کو سمجھانے کی غرض سے کہوں گا کہ اچھا پہلے تو معلوم ہونا چاہیے کہ عام طور پر تحریف سے جو معنی مراد لیے جاتے ہیں یعنی ایک لفظ کے بدلے میں دوسرا لفظ رکھ دینا یا کسی عبادت کو دوسری عبادت سے بدل دینا، وہ کچھ زیادہ وسیع نہیں تحریف کا مفہوم اس سے زیادہ خطرناک ہے اور اس کی کئی قسمیں ہیں اور سب سے زیادہ اور کثیر الوقوع قسم یہ ہے کہ کسی لفظ یا کسی جملے یا کسی عبارت کا ایسا معنی ومفہوم لیا جائے جو آدمی کے اپنے نفس کی خواہشات اور اس کے اشارات وہوا جس کے مطابق ہو (اور کلام کا مفہوم متعین کرنے میں مخاطبین کلام کے فہم یا عرف محاوروں، قرینوں اور سیاق وسباق کا لحاظ نہ رکھا جائے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ایک حدیث شریف میں اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے:

آخر زمانہ میں ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو شراب اور زنا کا نام بدل کر کچھ اور ناموں سے پکاریں گے اور پھر یہ فتویٰ دیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب (قرآن مجید) میں ان ناموں کی چیزوں کو حرام نہیں ٹھہرایا۔ اس لیے ان کے استعمال پر کوئی پابندی عائد نہیں ہوتی۔" کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو یہ کہتے ہیں کہ وہ نشہ آور شراب جو (انگور کے سوا) شہد یا شہد کی طرح دوسری چیز سے کشید کی گئی ہو وہ خمر نہیں اور اس لیے اس کا استعمال حلال ہے۔ یہی لوگ ہیں جن کے بارے میں حضور نے (مذمت اور توبیخ کے انداز میں) بہت کچھ کہا ہے۔

اسی طرح بعض لوگ کہتے ہیں کہ کوئی شخص اپنے بیٹے کی لونڈی سے ہم بستری کرے

تو یہ اس کے لیے جائز ہے (گویا وہ "انت ومالک لا بیک" تو اور تیرا مال تیرے باپ کا ہے" کی غلط تاویل کر رہے ہیں) یہ وہ لوگ ہیں جو منہ کے بل گر پڑے ہیں۔ اور ان کی آرزوؤں نے جو سبز باغ انھیں دکھائے تھے، وہ ان کے دھوکے میں آ گئے ہیں (اس دنیا میں تو سمجھانے والوں کو لام کاف کہہ کر دھتکار دیتے ہیں لیکن) عنقریب کل قیامت کے دن جب حقائق بے نقاب ہوں گے تو انھیں معلوم ہوگا (کہ کون حق پر تھا، اور کون باطل پر اور) کہ جھوٹا متکبر کون تھا۔

اندھی تقلید باعث شک ہے

پھر تم دیکھتے ہو کہ (ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں) جاہل مسلمان ان علما سو کے اقوال کو سند سمجھتے ہیں اور سچ مچ ان چیزوں کو حلال وجائز سمجھتے ہیں جو انھوں نے شریعت حقہ کی تحریف کر کے ان کے لیے حلال اور جائز ٹھہرائی ہیں۔ یہاں تک کہ اگر ان کے سامنے کلام مجید کی آیات پڑھی جائیں تو وہ ان کے مقابلہ میں آ کر مشت وگریبان ہوتے اور آستینیں چڑھا لیتے ہیں (جیسے کہ قرآن کریم میں مشرکوں کے بارے میں آیا ہے۔ "وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ آیَاتُنَا بَیِّنَاتٍ تَعْرِفُ فِیْ وُجُوْهِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا الْمُنْكَرَ یَكَادُوْنَ یَسْطُوْنَ بِالَّذِیْنَ یَتْلُوْنَ عَلَیْهِمْ آیَاتِنَا" جب ان کے سامنے ہماری واضح آیات تلاوت کی جاتی ہیں تو تمھیں ان کافروں کے چہروں میں بگاڑ کے آثار محسوس ہوں گے کہ وہ قریب قریب حملہ کرنے کے لیے تیار ہیں ان لوگوں پر جو ان کو ہماری آیات سناتے ہیں)۔

اور کیا تو نے ان کی کتاب وسنت سے اعراض کرنے کی یہ حالت نہیں دیکھی کہ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ لوگوں کے اقوال بلاسند کو چھوڑ کر قرآن کی طرف اور صادق ومصدوق علیہ السلام (کی بیان کردہ وحی غیر متلو) کی طرف آؤ کیونکہ دوسرے لوگ اپنے اجتہاد میں غلطی اور درستی دونوں سے متصف ہو سکتے ہیں تو جواب میں کہتے ہیں "اِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَ نَا عَلٰی اُمَّةٍ وَاِنَّا عَلٰی اٰثَارِهِمْ مُقْتَدُوْنَ" (ہم نے اپنے آبا واجداد کو اسی مذہب پر عمل پیرا پایا ہے اور ہم انہیں کے نقش قدم پر چلتے ہیں)۔

اگر ان کا بس چلے تو اس قول کے قائل کو (جو ان کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی طرف بلاتا ہے۔ جھٹلانے پر اکتفا نہ کریں بلکہ اس کو قتل کر دیں۔ یہ لوگ یقیناً مشرک ہیں۔

اور میرے تو بدن پر رونگٹے کھڑے ہوئے جب میں نے یہ کہانی سنی کہ ایک صاحب جس کی فضیلت ان لوگوں میں مسلّم ہے یہ کہتے ہیں کہ اگر قیامت کے دن اللہ تعالیٰ (میرے پیر و مرشد) فلاں کی صورت میں نہیں بلکہ کسی اور شکل و صورت میں جلوہ نما ہو، تو میں اس کو دیکھنا پسند نہیں کروں گا۔ اگر یہ روایت جو مجھے پہنچی ہے درست ہے تو اس کے قائل نے اللہ تعالیٰ کے درجہ کو اپنے پیر سے نیچے رکھ دیا ہے اور ایسا شخص اللہ تعالیٰ کے ہاں معذور نہیں ہے جس کو معاف کر دیا جائے۔

---

(۱) سورۂ زخرف کی آیت سے اقتباس ہے۔

تیرھویں فصل

قیامت سے پہلے پیش آنے والے فتنوں کی کیفیت اور قیامت کا اثبات

کوئی چیز تصرف الٰہی کے بغیر ظہور میں نہیں آسکتی

کیا دلیل عقلی اور برہانِ فکری نے تمہارے اندر یہ جزم ویقین پیدا نہیں کیا کہ سلسلۂ علل ومعلولات کا یہ ثابت نظام جو اس عالم کو قائم رکھنے کے لیے آسمانوں سے زمین پر اترتا ہے اور عناصر حیات کے وہ طبعی خواص جو ان سے متصاعد ہو کر نظام مذکور کی تکمیل کرنے میں مدد دیتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ دونوں چیزیں مستقل بالذات باعث تخلیق وتکوین نہیں۔ بلکہ ہر صورت کا، جوہر یہ ہو یا عرضیہ ظہور میں آنا اس بات پر منحصر ہے کہ اس وہابِ مطلق کا فیضان اس پر نازل ہو جو عالم ناسوت کے جواہر اور اعراض سے مقدس منزہ اور بالاتر ہے۔ اور تمام صورتوں سے اس کی نسبت یکساں ہے۔ چنانچہ جب ماں کے پیٹ میں والدین کے مادہ اور قوائے تولید سے بچے کی تخلیق ظہور میں آتی ہے تو یہ اس بات کے لیے کافی نہیں کہ اس پر نفس انسانی فائض ہو جب تک خدائے رحمٰن جلّ وعلا کا اس پر فیضان جود ورحمت نہ ہو۔ اس نظریہ کی دلیل وبرہان اور اس کے نتائج کے لیے اپنا دل ودماغ (دوسرے غلط نظریات سے) فارغ کرلو اور اس طرح تم یہ علم حاصل کرلوگے کہ کائنات میں ہر حادثہ اور تغیر اور اس عالم کے تمام تحویلات اور اشیا کی مختلف صورتوں میں ظہور (خروج بالفعل الی مالم یکن یعنی) ہست سے نیست کی طرف عملی خروج ہے اور کائنات میں یہ تغیر وتبدل یا تصرف اس وہابِ مطلق کا فیضان جود ورحمت ہے جس کی ذاتِ اقدس مادہ اور مادّیات سے مبرا ہے اس عقیل پر مضبوطی کے ساتھ قائم ومستقیم رہو۔

فیضانِ الٰہی مناسب اور مشابہ استعدادات پر منحصر ہے

اور کیا اہل علم نے تم کو یہ تعلیم دی ہے کہ کسی خاص مادہ پر کسی ایک صورت کا فائض ہونا اور دوسرے مادہ پر دوسری صورت کا فائض ہونا وہاب جلّ وعلا کی تخصیص بخشش وسخاوت سے نہیں۔ حاشا وکلا الرحمٰن کی نسبت تو سب سے یکساں ہے۔ یہ فرق استعدادِ مادہ کے تنوع اور اختلاف سے پیدا ہوتا ہے جس کی مختصر تفصیل یہ ہے۔

رحمٰن جلّ وعلا کے بے شمار شئون وکیفیات ہیں، اسی طرح مادّہ کی بھی مختلف استعدادات (بہ لحاظ ترکیب) پائی جاتی ہیں۔ لٰہذا مادہ کی استعداد جس شان رحمانی سے مناسبت رکھتی ہو، اسی شانِ خاص کا فیضان اس پر نازل ہوتا ہے، مثلاً جو مادہ بہ لحاظ اپنی استعداد خاص کے اس تجلی الٰہی سے مشابہت رکھتا ہو، جس کا نام ہم نے انسانِ اکبر یا ایام نوع الانسان رکھا ہے تو اس پر انسانی صورت فائز ہوتی ہے مادّہ کی مشابہت نوع فرس کے امام سے پائی جائے تو اس کو گھوڑے کی صورت عطا ہوتی ہے وعلیٰ ہذا القیاس فیضان رحمٰن کا ایک کسی خاص شکل میں صادر ہونے کے لیے شبکہ (جال اور سبب) مادے کی استعداد کی وہ مشابہت ہے جو وہ شئون رحمٰن میں سے کسی خاص شان کے ساتھ رکھتی ہو اور یہ تمام تنوع اور اختلاف جو کائنات عالم میں دکھائی دیتا ہے استعدادِ خصوصی اور شانِ خاص کی مشابہت کا نتیجہ ہے (یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مشابہت کا اصول مسلّم لیکن استعدادات میں تنوع اور اختلاف کیونکر پیدا ہوا۔ اس کا جواب یہی ہوسکتا ہے کہ ”وَمَاۤ اُوۡتِیۡتُمۡ مِّنَ الۡعِلۡمِ اِلَّا قَلِیۡلًا“)۔

اس کی مثال یہ ہے کہ اگر تم پانی کی حقیقت کو ہوا میں بدلنا چاہو تو اس کی تدبیر یہ ہے کہ پہلے پانی کے ترکیبی ہیئت اور اس کے خواص دریافت کرو۔ اسی طرح ہوا کی ہیئت ترکیبی اور خواص بھی دیکھ لو۔ خواص مادّہ کے ان صورتوں کے لوازمات ہیں۔ جہاں خواص ولوازم میں تبدیلی نظر آئے گی وہاں شکل وصورت میں بھی تغیر وتبدیلی رونما ہوگی۔ اور پانی کے خواص وہیئتوں کو ہوا ہیئت ترکیبی اور خواص سے ہم آہنگ کردو اور جب یہ ہم آہنگی اور مقادیر خواص

اپنے مقرر نصاب وحد مقررہ تک پہنچ جائیں تو پانی ہوا میں بدل جائے گا۔ اور ہوا کے خواص، حرارت، لطافت، پانی کے مقابلے میں کم رطوبت اور تخلخل (بھربھراہٹ)[1] ہیں پانی میں یہ خواص بتدریج پیدا ہونے چاہئیں۔ یہاں تک کہ یہ خواص ہوا کہ خواص کے معیار تک پہنچ جائیں پھر تم مشاہدہ کرو گے کہ پانی ہوا میں تبدیل ہوگیا۔ اسی ایک مثال پر اکتفا کرلو اور موجب بالذات (علیم وقدیر) کی جملہ تصریفات وتقلیبات عالم کو اسی قاعدہ کی جزئیات میں شمار کرلو کہ وہ اشیا کے خواص وہیئتوں کو بدل کر اشکال وصور کا ظہور فرماتا ہے۔

اسی طرح اگر تم کسی چیز میں حیات پیدا کرنا چاہو تو اس کی تدبیر یہ ہے کہ کوئی ایسا تریاق تلاش کرو جو قوت حیات کے موافق ہو اور لازماً وہ تریاق رحمٰن جلّ وعلا وہاب صور کی شان خاص یعنی شانِ احیا سے مشابہ ہوگا (اگر ایسا تریاق ہاتھ آجائے تو حیاۃ کا نمو ضرور ہوگا) اسی طرح اگر تم کسی زندہ چیز کو موت دینا چاہو تو ایسا زہر ڈھونڈو جو قوتِ حیات کے مخالف و متضاد ہو۔ چنانچہ حیات قائم رکھنے کے لیے رطوبت اور حرارت کا ہونا لازمی ہے اس لیے جو دوا انتہا درجہ کی گرم خشک ہوگی وہ یقیناً زہر قاتل ہوگی۔

یہی حال اس نظام انسانی کا ہے جو الرحمٰن سے صادر ہوتا ہے جس میں یہ ضروری ہوتا ہے کہ تجلی الٰہی جو ہماری اصطلاح میں امامِ نوع انسانی کہلاتا ہے اور وہ شان من شئون الرحمٰن ہے کی فیض یابی کے لیے مادہ میں مناسب استعداد اور مشابہ صلاحیتیں پیدا ہونی چاہئیں (مراد یہ ہے کہ جس نوع کا فیضان چاہو اسی کے مناسب اور مشابہ استعدادات پیدا کرنے کی سعی وکوشش کرو بلکہ) میں تو اس وقت تک تم سے راضی نہیں ہوں گا جب تک تم ان مناسبات اور مشابہات کی طلب نہ کرو جن پر نظام انسانی اور نظام عالم کے بقا کا دارومدار ہے، اور جن کے فوت ہونے سے پورے نظام میں فساد توڑ پھوڑ اور انفکاک پیدا ہوگا۔ اگر جستجو میں کامیابی سے ہمکنار ہوجاؤ اور ان استعدادات کی حقیقتوں کا علم تجھے حاصل ہوجائے تو یقیناً تم طبیب الٰہی کہلانے کے مستحق ہوجاؤ گے اور یہ تمہاری بہت بڑی کامیابی ہوگی۔

---

[1] Rarefication

اللہ سے جو چیز صادر ہوئی وہ خیر مطلق ہے شر اضافی شے ہے

کیا تم کو علماء راسخون کے اس نظریہ کا یقین محکم اور علم یقین حاصل ہوا ہے کہ علیم اور خبیر تام اللہ تعالیٰ سے جو نظام صادر ہوگا وہ نظام خیر ہوگا۔ اس میں اگر شر کا کوئی شائبہ ہے تو وہ مقصود بالذات نہیں ہوگا۔ بلکہ بالعرض اور اضافی ہوگا، کیا تم مشاہدہ وملاحظہ کرنے کی یہ استعداد رکھتے ہو کہ تمھیں یہ بات معلوم ہوجائے کہ انسانی نظام کا ایک حقیقی اعتدال ہے۔ جو تقریباً ناممکن الوجود اور ممتنع الوقوع ہے۔ اس سے کم درجہ کا ایک اعتدال ایسا ہے جس کا وقوع ممکن ہے پھر اس کے بعد تیسرا درجہ ضعف کا ہے۔ اور پھر چوتھا درجہ فسادِ نظام کا ہے اور پانچواں درجہ فکِ نظام اور تباہی کا ہے۔ اور تمھیں یہ بھی معلوم ہو کہ وہ کون سے عوارض ہیں جن کے نتیجہ کے طور پر اپنے وقت پر نظام میں ضعف کی استعداد پیدا ہوتی ہے اور کن عوارض کے نتیجہ میں اپنے وقت پر فساد پیدا ہوتا ہے۔

اور کیا تم میں یہ استعداد ہے کہ تم یہ یقین کرلو کہ نظامِ انسانی پر کتنا ہی ضعف اور فساد طاری کیوں نہ ہوجائے پھر بھی خدائے بخشندہ وہاب اپنی نظر جود وعنایت سے اس کو محروم نہیں فرماتا۔ اگر خیرِ مطلق اس نظام میں باقی نہ رہے تو اس کی تدبیر یہ ہے کہ وہ اپنے جود وکرم سے اس پر اس کے ہر مرتبہ کے مطابق اس زمانے کے حالات کے موافق خیر اضافی کا اضافہ فرماتا ہے۔ اسی تدبیر کا نام "حق" ہے (وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا اِلَّا بِالْحَقِّ) میں غالباً یہی معنی مراد ہیں اور اس کے بارے میں فرمایا گیا ہے: (بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَی الْبَاطِلِ فَیَدْمَغُهُ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ) یہ حق ہمیشہ باطل کو مٹاتا اور مغلوب و مقہور کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ جب باطل پورے طور سے مقہور ومغلوب ہوجاتا ہے تو وہ کسی دوسری بری شکل میں ظہور کرتا ہے لیکن حق کب اس کا پیچھا چھوڑتا ہے اس کو مٹانے کے لیے ایک دوسرا حق نازل ہوتا ہے اسی طرح حق برابر باطل کو مٹاتا رہتا ہے (تاہم نظامِ انسان میں بتدریج ضعف وفساد بھی پیدا ہوتا رہتا ہے)۔ جب تک نسل انسانی صفحۂ ہستی پر باقی ہے حق وباطل کے تصادم کا سلسلہ قائم رہے گا اور اللہ تعالیٰ کا بندوں سے یہی سلوک قائم

رہے گا۔ بالآخر نسلِ انسانی منقطع ہو جائے گی۔ زمین کو کچھ مدت تک سکون وقرار ملے گا، تم اس وقت تک آفاق رسیدہ طبیب الٰہی نہیں بن سکو گے جب تک یہ معلوم نہ کرو کہ ہر درجہ کے معدات اور ہر مرتبہ میں نزول حق کی نوعیت کیا کیا ہوتی ہے اور ہوگی اور جب تک ابتدائے آفرینش سے نوع انسانی کا خاتمہ ہونے تک کا وہ پورا دور اور نظام جس کا وجود اور تحقق الٰہی کیفیات کے ساتھ لازم ہے۔ اور ارادۂ ازلیہ اس کے واجب الوقوع ہونے سے مغلوب متعلق منعقد ہو چکا ہے اور اس کی تفصیلات مع اس کی حکمت ہائے بالغہ کے تمہاری آنکھوں کے سامنے متمثل نہ ہو جائیں۔

اسباب ومسببات کا نظام حکمت پر مبنی ہے

اس بارے میں تحقیق یہ ہے کہ روز مرہ کے حوادث اور واقعات کے لیے ایسے اسباب وعلل کا ہونا ضروری ہے جن کے تام ہونے کی وجہ سے ان کا معلول ان سے پیچھے اور مختلف نہیں ہوتا۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ قدرت کے افعال مبنی بر حکمت نہیں اور ترجیح بلا مرجح جائز ہے اور بغیر علتِ موجبہ کے بھی کوئی چیز وجود پذیر ہو سکتی ہے۔ ان حوادث کو محض اتفاق پر وہ شخص محمول کرتا ہے جس کے سامنے یہ نظام ذرا قاصر شکل میں آتا ہے اور اس نظام قاصر کے لحاظ سے وہ اس کے لیے کوئی نام تجویز کرتا ہے۔

اب یہ ممکن نہیں کہ روز مرہ کے حوادث اور ان کے ظہور اور وقوع کی علتِ تامہ خود رحمٰن تعالیٰ شانہ کو قرار دیا جائے کیونکہ مختلف صور وانواع اور مختلف مقامات اور مختلف اوقات کی نسبت اس کے ساتھ مساوی ہے۔ اس لیے تحقیق کے لیے یہ ضروری معلوم ہوا کہ اس تنوع اور اختلاف کے لیے مادہ کی مختلف استعدادوں اور قابلیتوں کو اور انواع واقسام کے شرائط کو تلاش کیا جائے۔ چنانچہ بعض لوگوں نے عناصر کی طبائع اور مادہ پر طاری ہونے والے مختلف احوال پر نظر ڈالی تو انھیں معلوم ہوا کہ کسی نئی چیز کے حادث ہونے اور کسی نئی حالت کے پیدا ہونے میں ان کو دخل ضرور ہے۔ بعض دوسروں نے سیاروں کی مختلف حرکتوں اور ان کے گوناگوں اتصالات پر غور کیا تو وہ اسی نتیجہ پر پہنچے کہ عالمِ محسوسات میں

ان کے کچھ کے اثرات تو نمایاں ہیں۔ چنانچہ آفتاب کے مختلف بروج ہیں جن کی وجہ سے گرمی وسردی کا اختلاف رونما ہوتا ہے۔ اور رطوبات کے مائع یا منجمد ہونے پر چاند کا اثر پڑتا ہے۔ البتہ بعض باتیں ایسی ہیں جن کا اثبات حدس اور فراست کی بناپر کیا جاتا ہے۔ مثلاً زحل، مریخ، مشتری، اور دوسرے سیاروں کی حرکات لوگوں کے اخلاق، طبائع اور ان کے حالاتِ زندگی پر اثر انداز ہوتی ہیں بہرحال انہوں نے اپنے ان نظریوں اور مشاہدوں کو علوم کی شکل میں مدون کیا (اور اس موضوع پر کتابیں لکھیں)۔

اسباب ومسببات کے متعلق اہل معرفت کا نظریہ

لیکن علما اہل معرفت اس سلسلے میں خاص امعانِ نظر اور دقتِ تفکر رکھتے ہیں۔ اور مشاہدہ کرتے ہوئے اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ہر صورت جوہریہ اور عرضیہ کو شئون مقدسہ رحمانیہ میں سے کسی ایک شان کے ساتھ مشابہت حاصل ہے اور جو فیض رحمانی کا نزول اسی کے مطابق ہوتا ہے بعد ازاں جب انھوں نے اس تشبہ کی شرح وتفصیل بیان کرنی شروع کی تو انھیں معلوم ہوا کہ بعض کا تعلق عالم مثال سے ہے۔ اور مشابہت کی بنا ان اعتبارات اور نامناسبات کے ملحوظ رکھنے پر ہے جو عالم مذکور سے پیدا ہوتے ہیں۔ بعض مشابہتوں کی بنا افلاک وسماوات پر ہے (۱)۔ بعض کی علت وہ خواص اور طبائع ہیں جو عالم کون وفساد کے عناصر ترکیبی میں ودیعت رکھے گئے ہیں۔ بعض کی نوعیت افعال، اعمال اور ہیئات کی ہے۔ اور بعض مشابہتیں ان قوائے الٰہیہ کا نتیجہ ہیں جو اس عالم میں کسی اسم جزئی کی تفاصیل کے طور پر پھیلی ہوئی ہیں جس کا نزول رحمٰن تعالیٰ وتقدس سے ہوتا ہے اور جس کی جڑیں شئون الٰہی میں سے کسی ایک خاص شان کے اندر مستحکم ہوتی ہیں۔ اس کی بنیاد تو جود رحمانی کے مطابق اس کی ایک شان سے پڑتی ہے۔ اور پھر اس کا ثمرہ اور نتیجہ اس منظم اور مرتب شکل میں ظہور پاتا ہے۔ بالفاظ دیگر اسم مذکور اجمال ہے اور یہ منظم نتیجہ اور ترتیب اس کی تفصیل ہے۔ اس نزول اور تفصیلی صورت اختیار کرنے کے بعد اس کا عروج پھر رحمٰن تعالیٰ وتقدس کی طرف ہوتا ہے (۱) اور پھر اسی طرح دوسرا اور تیسرا اسم الٰہی نازل ہوتا ہے یا بالفاظ دیگر متجلی ہوتا ہے

اوران سے یہ قوی اطراف واکناف عالم میں پھیلتے رہتے ہیں۔ اشخاص مثالیہ الفاظ اور امکنہ ومقامات میں ان کی قرارگاہ ہوتی ہے جس کو عارف باللہ پہچانتے ہیں۔ اب اگر خداوند قدوس کا کوئی عارف بندہ (جو قرارگاہ کو پہچانتا ہو) اس قرارگاہ کو کسی چیز کی طرف مائل کردے تو وہ قوت (جس کی وہ قرارگاہ ہے) بھی ادھر مائل ہوگی۔ اور جب بھی کسی مادّہ پر انسان کی صورت فائض ہوتی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس مادہ نے ان امور کے لحاظ سے انسان الٰہی یعنی اس تجلّی کے ساتھ مشابہت پیدا کرلی ہے جو اس خاکی انسان کے ظہور میں آنے کا سرچشمہ ہے۔ اور وہی انسان الٰہی اس نوع انسانی کے احوال، اخلاق اور خواص کے نظام کا معیار ہے جو اس کرۂ ارض پر آباد ہے۔

اہلِ معرفت نے یہ بھی دیکھا ہے کہ قوائے سماویہ اور ارضیہ کو بھی اس میں دخل ہے اور دونوں قسم کے قوی یعنی قوائے الٰہیہ اور قوائے طبعیہ کے مؤثر ہونے میں کوئی تناقض نہیں، ہر ایک میں سے ایک خاص قسم کا فعل ظہور میں آتا ہے جس کے اجتماع سے کوئی چیز حادث ہوتی ہے۔ یا کوئی واقعہ رونما ہوتا ہے۔ جس طرح آئینہ میں جب کوئی صورت دکھائی دیتی ہے تو آئینہ کی استعداد اور دیکھنے والے کی قوتِ بصارت دونوں کے اجتماع سے یہ رویت حاصل ہوتی ہے۔ البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ ان قوتوں میں سے کوئی ایک قوت علّت موجبہ ہو، دوسری اس کی مساعد ہو۔ اور علّت موجب کی حد تک نہ پہنچی ہو یہی وجہ ہے کہ عارف باللہ کبھی تو کہتا ہے کہ یہ حادثہ قوت الٰہی سے ظہور میں آیا اور کبھی کہتا ہے کہ فلاں عمل اور فعل کا نتیجہ ہے۔

ظہور واقعات کے بارے میں اہل معرفت اور سائنس والوں میں اختلاف نہیں ہے

اس تمام تقریر سے میرا مقصد یہ ہے کہ علما باللہ اور لوگوں (سائنس دانوں) کے درمیان کوئی تناقض اور تضاد نہیں۔ اتنا فرق ضرور ہے کہ ایک فریق (اہل معرفت) کی نظر وسیع ہے اور اس کو مزید تحقیق اور تفصیل کی توفیق ملی ہے۔ اور دوسرے فریق یعنی سائنس

دانوں کی نظر مشہودات ومحسوسات کے دائرے کے اندر محدود ہے اوران کو ماوراالعقل حقائق کی تحقیق ومشاہدہ کے مواقع نہیں ملے۔لیکن ہم تو یہاں ان اعمال کی بابت گفتگو کررہے ہیں جو یکے بعد دیگرے افراد انسانی سے صادر ہوتے ہیں۔اورانہی کی مطابقت اور مشابہت سے جودالٰہی تعالیٰ شانہ کا نزول ہوتا ہے۔جس سے نظام کے استحکام یا اس کی تحلیل اورانتشار اجزا کا فیصلہ ہوتا ہے۔یہ سب اس زبان زدِعوام مقولہ کی تفصیل ہے کہ احوالِ انسانی کو واقعات کے نزول میں دخل ہے۔

یہ بات کہ فیضان جودالٰہی کا دارومدار استعداد ومشابہت پر ہے اور انسان کی ہیأت اورافعال کو اس میں دخل ہے، یقینی ہے۔تاہم اگر مزید توضیح وتشریح چاہتے ہو تو اس پر غور کرو کہ رحم میں مادّہ منویہ قرار پاتا ہے تو یکے بعد دیگرے وہ علقہ اور مضغہ کے مدارج تخلیق اور منازل ارتقا سے گزرتا ہے تب اس پر انسانی صورت فائض ہوتی ہے۔اس طرح آدمی غصہ سے مغلوب ہوتا ہے تو گالی دینے پر اتر آتا ہے اور جب وہ شخص جس کو گالی دی جاتی ہے اس کے سبّ وشتم کو سنتا ہے تو وہ اس کا سر پھوڑ دیتا ہے۔کیا تم یہ کہہ سکتے ہو کہ (اول الذکر صورت میں والدین کے مادۂ منویہ اور قوائے تولید کو جنین کی تخلیق میں کوئی دخل نہیں اور یہ کہ مؤخر الذکر صورت میں) سب وشتم کو سر پھوڑنے میں کوئی دخل نہیں۔(یقیناً ایسی باتوں کا انکار کرنا سفسطہ ہے اور بدیہی باتوں سے انکار کے مترادف ہے) ہمارے نزدیک تو حقیقت یہ ہے کہ انسان کا ارادہ ایک گونہ طبعی ایجاب اور لزوم ہوتا ہے جس پر انسان اس وقت خود بخود آمادہ ہوتا ہے۔اور جب انسان کے قوی میں اس ارادہ کے اسباب کی بنا پر اس کی استعداد پیدا ہوتی ہے تو انسان اس ارادہ پر خود بخود (گویا بلا اختیار) آمادہ ہوتا ہے (میری یہ بات سمجھ لیجیے اور) خبط میں مبتلا لوگوں (کی طرح حقیقت سے بعید رایوں) کے ساتھ کوئی سروکار نہ رکھیے۔

چودھویں فصل

اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس جو خیر محض ہے کس طرح شر کا مصدر ہو سکتی ہے

کیا تم نے کبھی اس پر غور کیا کہ انسان کے جسم میں پھوڑے پھنسیاں اور زخم کے دانے کیوں ظاہر ہوتے ہیں۔ اور بخار اور دوسری بیماریاں کیوں کر پیدا ہوتی ہیں؟ تحقیق اور غور کرنے کے بعد تمھیں معلوم ہوگا کہ جسم میں ایک طبیعتِ مدبرہ ہے، لیکن اس کی یہ تدبیر ارادی واختیاری نہیں ہے۔ بلکہ ایجابی ہے۔ (جس طرح نباتات کی قوت نامیہ بغیر ارادہ کے ایجاب کے طور پر ان کے نشوونما کا باعث ہوتی ہے) جب تک جس میں رمق حیات باقی ہے طبیعت کی یہی تدبیر اس کے نظام کو قائم رکھنے کے لیے کارفرما رہتی ہے اس کا فعل اس طبیعت کی طرح ایک ہے لیکن یہی فعل واحد جب بدن کے اخلاط پر اثر انداز ہوتا ہے تو وہ مختلف افعال کی صورت میں رونما ہوتا ہے۔ طبیعت کی اس تدبیر اور اس عمل کا مقصد یہ ہے کہ جسمانی ترکیب کو محفوظ اور اس کے نظام کو قائم رکھے اور ہر قسم کی مضرتوں سے اسے بچائے اور چوں کہ جسمانی ترکیب میں اعضا واوضاع مختلف ہیں اس لیے ہر عضو اور اس کی وضع خاص کو قائم رکھنے کی نوعیت لامحالہ مختلف ہوگی۔ مثلاً دماغ کی حفاظت اور اس کو مطلوبہ کیفیت پر قائم رکھنے کے لیے اس کے مناسب حال رطوبت اور برودت کو پہنچانا لازم ہے۔ اسی طرح قلب کو غیر صحی حالت سے محفوظ رکھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کی حرارت اور خشکی کو خاص معیار پر قائم رکھا جائے وعلیٰ ہذا القیاس دوسرے اعضائے بدن کو برقرار رکھنے کے لیے مناسب اور وضع خاص میں رکھنے کے لیے عناصر کو خاص ترکیب اور مقدار کے ساتھ رکھنا ہوگا)۔

جب بدن میں مطلوب تناسب ومعیار ومقدار کو چھوڑ کر اخلاط کسی ایک مقام پر جمع ہو جاتے ہیں تو حتی الامکان طبیعت کی قوت مدبرہ اس کی اصلاح وعلاج کر لیتی ہے لیکن اگر ایسا کرنا اس کے لیے ممکن نہ ہو تو پھر وہ کسی طرح نکسیر یا قے یا دست واسہال یا پسینہ یا ادرار بول کے

ذریعہ خلط زائد کو نکالنے کا انتظام کرتی ہے اور اگر ترکیب جسمی یا خلط زائد اس کی تدبیر کو قبول نہ کرے تو پھر اس کو پھوڑوں، پھنسیوں کی صورت میں باہر نکالنے کی کوشش کرتی ہے اگر یہ تدبیر بھی ناکام ہو جائے تو پھر وہ حرارت جو خالصتاً انسان کے فائدہ کے لیے اس کے بدن میں ودیعت رکھی گئی ان اخلاط زائدہ کو متعفن وگندہ کر دیتی ہے اور آدمی کو بخار چڑھ جاتا ہے۔ بعبارت دیگر وہ چیز جو خیر محض تھی فاسد اخلاط کے اجتماع سے اور قوت مدبرہ کی تجویز کردہ راہ سے عصیان وانحراف کی وجہ سے شر کی صورت میں تبدیل ہو گئی۔ اس عفونت اور بخار کی حالت میں طبیعت سے عجیب وغریب افعال ظاہر ہوتے ہیں جن میں سے ایک مشہور کیفیت بحرانوں کی ہے (یعنی مرض کی وہ انتہائی حالت جس میں انسانی طبیعت کا تصادم اخلاط فاسدہ سے ہو، اسے سخت بخار ہو اور اس کی زبان سے بے قابو و بے لگام غیر مربوط کلام غیر شعوری طور پر صادر و سرزد ہو)۔

یہ سب باتیں ایسی ہیں جن سے کوئی بھی صاحب عقل ودانش انکار نہیں کر سکتا۔ اور باوجودیکہ طبیعت ایک ہے۔ اور اس کا فعل بھی ایک ہے (مگر اخلاط کی موجودگی میں اس کا امر مختلف اعضائے جسمانی سے مختلف صورتوں میں رونما ہوتا ہے) اسی کو مثال کے نمونہ کے طور پر پیش نظر رکھو اور طبیعتِ کلیۂ انسانیہ یعنی انسانِ کبیر کے افعال کو حفظ اشخاص کے بارے میں اس پر قیاس کرو کیونکہ انسان کے افراد بحیثیت مجموعی اس طبیعت کلیہ انسانیہ کے لیے بمنزلہ اعضائے جسم کے ہیں جن کو سوء مزاج سے محفوظ رکھنا ہے اس (طبیعت کلیہ انسانیہ) کا فرض ہے۔ اور ہر ایک فعل جو ہر مرتبہ میں اس انسان کبیر سے صادر ہوتا ہے اسے ہم حق نازل عن الانسان الکبیر یعنی انسان کبیر سے صادر ہونے والے حق کا نام دیتے ہیں اگر افراد انسانی کے نظام کو بطور اجمال من حیث المجموع اس طبیعت کلیہ سے منسوب کیا جائے تو ہمیں کہنا ہوگا کہ یہ نظام اس (انسان کبیر) سے بغیر ارادہ کے بطریق ایجاب ذاتی صادر ہوا ہے (جس طرح آفتاب سے حرارت اور روشنی بغیر اس کے ارادے کے بطریق ایجاب صادر ہوتی ہے) لیکن اگر افعال جزئیہ کے اس کی نسبت دیکھی جائے جو ہر ایک مرتبہ وجود میں اس سے صادر ہوتے ہیں تو ہم یہی کہیں گے کہ حق کا نزول بالارادہ ہوا ہے۔ کیونکہ ارادہ کا مفہوم عرف عام میں یہی ہے کہ کسی فعل جزئی کے عمل میں لانے کی رغبت پیدا ہو، یہی ارادہ یقیناً اس فعل جزئی کے

صدور کا موجب ہوتا ہے علاوہ ازیں وہ امور جو ہماری نظروں سے اوجھل ہیں (جن میں سے ایک انسان کبیر بھی ہے) علم حضوری سے خالی نہیں۔

الغرض انسان کبیر کے جسم (وشخص) کو (افراد انسانی کی طرح کئی قسم کے امراض از قسم بثرات (پھوڑے پھنسیاں) وحمیات (بخار) لاحق ہوتے ہیں مگر سب سے بدترین مرض بخار ہے جو تعفن کی شکل وصورت اختیار کرتا ہے۔ جب اس کا علاج کیا جاتا ہے یا اسے بحران کی کیفیت پیش آتی ہے تو اس کے تعفن کی شدت اور علاج کے باوجود اس کی بیماری اور بخار کی تکلیف اور بھی بڑھ جاتی ہے (نہ علاج اثر پذیر ہوتا ہے اور نہ بحران کا خاتمہ بخار کے اٹھ جانے پر ہوتا ہے) اس صورت میں موجودہ نظام انسانی کی مشابہت انسان الٰہی کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نوع انسانی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اندریں صورت اللہ تعالیٰ کسی اور مخلوق کو پیدا کرنے کا ارادہ کرسکتا ہے۔ اور اللہ یقیناً ہر چیز پر قادر ہے۔

یہ بھی یاد رکھو کہ انسان کبیر کے امراض کا کائنات جو یہ سے بھی تعلق ہے۔ اور جس طرح انسانِ صغیر کے جسم میں بعض اوقات معدہ کمزور پڑ جاتا ہے لیکن جس کی نظر دقیق وغائر نہ ہو وہ اس کو محسوس نہیں کرسکتا اسی حالت میں وہ کوئی ثقیل غذا کھالیتا ہے اور اس کو ہیضہ ہو جاتا ہے اور وہ ضعف جو پہلے غیر محسوس تھا، نمایاں ہو جاتا ہے۔ اسی طرح عارف کو محسوس و معلوم ہوتا ہے کہ انسانِ کبیر مرض میں مبتلا ہے لیکن بادی النظر میں وہ مرض دکھائی نہیں دیتا صرف اس وقت پتہ چلتا ہے جب وہ خف ومسخ اور کلّی بگاڑ وفساد میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ جس کے نتیجہ میں وہ پورا کا پورا ہلاک وبرباد ہو جاتا ہے یا اس کا کوئی ایک حصہ تباہ وبرباد ہو جاتا ہے ابتلا کی پہلی صورت کو شرع کی زبان میں لعنت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے جیسے کہ کہتے ہیں کہ فلاں قوم پر اللہ کی پھٹکار پڑ گئی ہے۔ اور وہ ہلاک ہونے والی ہے۔ مؤخر الذکر حالت کا نام عذاب ہے۔ جو اعمال مذکورہ پر مرتب شدہ نتیجہ ہے۔ اپنے اعمال پر انسانِ کبیر کے تمام افراد یا بعض افراد کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سزا دینے کی مثال ایسی ہے کہ ایک آقا کو اس کے غلام (اپنی نافرمانیوں سے غصہ دلاتے ہیں اور وہ برداشت کیا کرے اور بالآخر جب اس کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا تو اس نے ان کو مارا اور ان کے سر پھوڑ دیئے۔

تیسرا مقالہ

پہلی فصل

ملتوں اور شریعتوں کا بیان

ملت کی حقیقت اور اس کے ظہور میں آنے کے اسباب

ملت کی حقیقت وتعریف

کیا تم یہ جاننے کی قدرت رکھتے ہو کہ وہ ارتفاقات خصوصاً ارتفاق ثانی وارتفاق ثالث اور وہ اقترابات جن پر نوع انسانی کی اجتماعی اور انفرادی زندگی قائم ہے اور جو (انسان کی اکتسابی فضیلت وکمال نہیں بلکہ) بنی نوع انسان پر عنایت الٰہی کا احسان بے کراں اور عطیہ عظیمہ ہیں کہ یہ سب عطیاتِ ربانی انسانی طبیعتوں اور سرشتوں میں ودیعت رکھے گئے ہیں بالخصوص قرب الٰہی کے ذرائع اور طریقے مثلاً احسان، عبادت، معاصی سے پرہیز وغیرہ وغیرہ سب امور کلیہ جو مختلف صورتوں اور شکلوں میں رونما ہوتے ہیں۔

مثلاً ایک نکاح اور عقد ازدواج کو لے لیجئے جس کو دھوم دھام سے منانا، دف اور ساز وآواز کے ذریعہ خوشی کا اظہار کرنا، قیمتی اور بیش قیمت کپڑوں کا پہننا جو عقد نکاح کے علاوہ کسی اور موقع پر بہت کم پہنے جاتے ہیں اور لوگوں کو (طعام وولیمہ پر دعوت دے کر) کھانا کھلانا جو عموماً اس قسم کے تقریبات پر کھلایا جاتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ تمدنی زندگی کے دوسرے بلند درجہ کے تقاضوں کے تحت لوازم نکاح سمجھے جاتے ہیں، جو اسے اس طرح ادا کرے اس نے بھی اس کا حق ادا کر دیا۔ اسی طرح عقد نکاح میں الفاظ کے ساتھ ایجاب وقبول اور گواہوں کی موجودگی بھی ایسی شرطیں ہیں جن کو ارتفاق ثانی نے لازم قرار دیا ہے۔ یہ صورتیں دراصل نکاح کی شرطیں اور ظاہری صورتیں ہیں۔ مقصد حقیقی اور اصولی طور پر لازم بات تو یہ ہے کہ

نکاح کے ذریعہ منکوحہ کی تعیین ہو جائے جس میں بہ لحاظ زوجیت اور کسی کی شرکت نہ ہو۔ اور نہ ہی کسی بھی صورت میں شرکت کا احتمال ہو۔ اور عقد ازدواج کو مہتم بالشان تقریب سمجھا جائے جیسے کہ تدبیر منزلی کے فصل میں ہم اس کی تشریح کر چکے ہیں۔ چونکہ یہ مقصد اصلی اور غایت حقیقی ان دونوں مذکورہ صورتوں سے حاصل ہوتی ہے اس لیے ان صورتوں میں سے کسی ایک کو لوازم نکاح قرار دینے اور ان کو برقرار رکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے کئی ظاہری طریقے اور صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ انسان سب بشری تقاضوں کو پوری طرح ترک کرے اور دنیوی علائق کو چھوڑ کر تجرد اور تنہائی کی راہبانہ زندگی اختیار کرے (جو بدھ مت، مسیحیت، جدید اور غالی متصوفین کا پسندیدہ طریقہ ہے)۔

دوسری ممکنہ صورت یہ ہے کہ اصل انسانیت اور اس کے (نوعی وجنسی) خواص کو برقرار رکھ کر اعضاء وجوارح کو ان عبادات اور ان اعمال میں لگایا جائے جو ذات باری تعالیٰ سے قریب کرنے کے موجب ہیں۔

اسی پر ارتفاقات اور اقترابات کے دوسرے بنیادی مسائل کو قیاس کیجئے وہ بھی مختلف صورتوں میں حاصل ہو سکتی ہیں۔ اگر ہم نے گزشتہ ابواب وفصول میں اس قسم کے مسائل کو ملّت حنیفیہ یعنی دین اسلام کی تعلیمات کے مطابق بیان کیا ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ ان امور کے مقاصد اور لازمی اصول کا حصول انہی صورتوں، طریقوں اور کیفیتوں تک محدود ہے۔ ہم نے تو ان کو فقط تمثیل ونظیر کے طور پر استعمال کیا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ روئے زمین پر کوئی ملّت ایسی نہیں ہو سکتی جو ان اصولی عبادات سے متعلق بنیادی لوازم کو نظر انداز کر دے اور نہ کوئی سلیم الطبع بشر خواہ وہ کتنا ہی گنہگار کیوں نہ ہو ان سے انکار کر سکتا ہے۔ سب ابنائے آدم اس واجب اصلی پر متفق ہیں ان کا اختلاف ونزاع اس اصل میں نہیں، بلکہ خاص صورت اور خاص شکل کی تعیین میں ہے۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اس صورتِ معیّنہ اور وضع خاص کو ملّت کہتے ہیں جس کے ذریعہ ارتفاقات اور اقترابات کی اصولی باتوں کا اظہار کیا جاتا ہے۔ (ملّت عربی میں نظام حیات اور دین کو کہتے ہیں۔ اور شاہ

صاحب اسے اسی معنی میں استعمال کر رہے ہیں۔قوم کے لیے ملّت کے لفظ کا استعمال ایرانی اختراع ہے)۔

ملتوں کے ظہور کے احکام

چونکہ اکثر آدمیوں کے لیے یہ آسان نہیں کہ وہ ارتفاقات واقترابات اوران کے اصول درست طور پر حاصل کر سکیں۔اس لیے اللہ تعالیٰ کے لطف وعنایت نے نوع انسانی کی رہنمائی کے لیے (انبیا اور پیغمبروں کے ذریعہ) ملتوں کو ظاہر و متعین فرمایا۔اور ان کے دلوں میں ان ملتوں میں سے کسی ایک ملت کے سامنے سر اطاعت خم کرنے کی فطری استعداد بخشی اور ایسے ارتفاقات اختیار کرنے کی صلاحیت عطا کی جو کسی خاص ملت کی مجملاً پابندی کو لازم قرار دیں۔

ملتوں کے ظہور کی کتنی قسمیں ہیں: جن میں سے مندرجہ ذیل (قابل ذکر) ہیں:

ایک: یہ کہ اس کی اقامت واشاعت کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی عالم و معلم مبعوث ہوا ہو اور اس (نبی یا رسول) کو ارتفاقات واقترابات کے اصول ومبادی کا پورا پورا علم حاصل ہو اور اس طرح وہ ایک جامع اور ہموار ملّت اور طریقہ عبادت کی تشکیل کرے تشکیل ملّت کی یہ قسم سب میں اعلیٰ وارفع ہے۔

دوسری یہ کہ:

(الف) کسی قوم میں انصاف پسند بادشاہ پیدا ہو جائے جو رعیّت کی فلاح و بہبود کا خیال رکھ کر اپنی عقل خداداد کے ذریعہ عدل وانصاف پھیلائے اور اس کے اصول کو پھیلائے۔اسی قسم کا عادل ومنصف مزاج حکمراں اپنی افواج ورعایا سے جو سلوک کرے گا اور وہ (جرائم کی بیخ کنی اور حوصلہ شکنی کے لیے اور مجرموں کی تادیبی سزا دینے کے لیے) جن حدود وتعزیرات کا نفاذ کرے گا، اور وہ لوگوں کے درمیان مقدمات جس طرح فیصلہ کرے گا اور دشمن کے مقابلہ میں میدانِ جنگ کے لیے فوج (اور ساز وسامان حرب) کو تیار کرنے کے جو طریقے اختیار کرے گا، وہ نہایت ہی مستحسن؛ معقول اور قابل تقلید نمونے ہوں گے۔

جن کی پیروی بعد میں آنے والے ملوک وسلاطین کریں گے۔

(ب) اسی طرح ہر قوم میں ارباب علم ودانش اور غیر معمولی عقل رکھنے والے افراد پیدا ہوتے ہیں، جو اجتماعی زندگی اور معاشرتی شعبوں مثلاً ازدواج ونکاح، ولیمہ وضیافت وغیرہ وغیرہ میں مخصوص عادات واطوار اور وضع وقطع اختیار کرتے ہیں (جن کی بنا ارتفاقات و اقترابات کے اصول ومبادی پر ہوتی ہے اور) جو ہر لحاظ سے معقول وپسندیدہ ہوتے ہیں، اور لوگ ان کو قابل تقلید سمجھ کر ان کی عادات ورسوم کو اختیار کرتے ہیں۔

(ج) اسی طرح ہر صنعت وحرفت اور دیگر پیشوں میں امام اور سربراہ پیدا ہوتے ہیں (جو عقل، علم اور فن میں دوسرے ابنائے حرفت سے ممتاز ہوتے ہیں اور جو اصول ارتفاقات واقترابات سے مقابلتاً زیادہ باخبر ہوتے ہیں وہ بھی مخصوص پسندیدہ طور طریقے اپنا لیتے ہیں اور) دوسرے ہم پیشہ لوگ ان کی پیروی کرتے ہیں۔

(د) اسی طرح بعض اوقات کوئی ایسا صاحب رشد وہدایت پیدا ہوتا ہے جو قربات کی نوعیت اور ان کے اقسام کو بخوبی جانتا ہے اور ان پر عمل کر کے درجۂ کمال حاصل کرتا ہے۔اس کے آثار کمال اور قربت کے تقاضوں کو دیکھ کر لوگ اسے قابل تقلید نمونہ عمل بنا لیتے ہیں۔اور ان کے بتلائے ہوئے یا کیے ہوئے طریقۂ عبادت کو اختیار کر کے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مختصر یہ کہ اس دوسری قسم کے سب اماموں کے علوم ورسوم سے مجموعی طور پر ایسی ملّت کا وجود تشکیل پاتا ہے جس سے انحراف واعراض کی جرأت نہیں کی جاسکتی۔اور یہ قسم ایسی ہے کہ جس سے دنیا کا کوئی ملک وقوم اور کوئی زمانہ کبھی خالی نہیں رہا ہے۔

انقیاد ملّت کا جذبہ فطری ہے

انقیادِ ملت کا جذبہ نوع انسانی کے سب افراد میں فطری طور پر اس طرح ودیعت کیا گیا ہے کہ وہ ارتفاقات اور اقترابات کی اصولی باتوں کو فطرت کے تقاضوں کے تحت تسلیم کرتے ہیں اور یہ بھی مسلمہ بات ہے کہ ان میں سے ہر شخص ان اصولوں کو ظہور میں لانے کے لیے خاص وضع اور معینہ صورت کی تشکیل پر قادر نہیں ہے۔(بلکہ یہ تو ان میں سے

منتخب لوگوں کا کام ہوتا ہے جن پر اللہ تعالیٰ نظر عنایت فرماتا ہے۔ ہاں یہ بالکل حقیقت ہے اصول ارتفاقات واقترابات کا علم ہر ایک کو فطرتاً دیا گیا ہے) ان کے قلوب اور سینوں میں ان علوم کا وجود بعینہٖ ایسا ہے جیسے کسی بادیہ نشین خالص عرب کے سینہ میں اعراب اور صرف کے علوم ودیعت ہوتے ہیں۔ چونکہ وہ اپنے کلام و گفتگو میں کبھی اعراب و گرامر کی غلطی نہیں کرتا تو لازمی امر ہے کہ اس کے دل میں ایسا علم جاگزیں ہو جس کے ذریعہ فاعل کو مفعول سے جدا کر کے پہچان سکتا ہو کہ فاعل ہمیشہ مرفوع اور مفعول منصوب ہوتا ہے۔ اور اس طرح وہ روزمرہ کی گفتگو میں غلطی کا مرتکب نہیں ہوتا۔ اسی طرح افراد انسانی کے دلوں میں ارتفاقات واقترابات کا اصولی اور اجمالی علم موجود ہے لیکن وہ اس کی تعبیر و تشریح سے قاصر ہیں۔ ہاں جب کسی ملت کے ظہور کی بنا پر اس کی بلیغ تشریح اور واضح تعبیر سن یا دیکھ لیتے ہیں تو ان کے دلوں میں اس کی وقعت بیٹھ جاتی ہے۔

کسی خاص ملت کی پابندی کے وجوہات

کسی خاص ملت کی پابندی پر مائل و راغب کرنے والی وجوہات و تدابیر یہ ہیں:

(جب ائمہ ملّت (انبیا و رسل، امرا و سلاطین، ارباب علم و دانش اور حکمائے اہل حرف) کی اچھی شہرت دنیا کے اطراف و اکناف میں پھیلی ہوئی ہو، ان کے ہاتھوں خوارق (معجزات و کرامات) کا ظہور ہوا ہو وہ دقیق علوم اور باریک مسائل دین میں یدطولیٰ اور مہارت کلیہ رکھتے ہوں ان کے اعمال عجیب و غریب شان والے ہوں اور لوگ ان کی جلالتِ شان کے معتقد ہوں، تو ایسی صورت میں اس ملت کی پابندی خود بخود کی جاتی ہے۔

(۲) حوادث و واقعات کے استقرا سے خواہ یہ استقرا تام ہو یا ناقص مگر اس سے یہ ظن غالب یا یقین کامل حاصل ہو چکا ہو کہ اس ملت سے سرتابی کا نتیجہ دنیا و آخرت میں دردناک عذاب کی صورت میں رونما ہوتا ہے، یا سرتابی کرنے والی قوم کے اندر لامتناہی لڑائی جھگڑے اور فتنے سر اٹھا لیتے ہیں (جو قوم کی اجتماعی زندگی کو آتش دوزخ کی مانند ناقابل برداشت بنا دیتے ہیں)۔

ہر ملت کے لیے کسی بنیادی دستور و آئین کی ضرورت ہے

یہ بھی جاننا چاہیے کہ ہر ملت کی حیاتِ ملّیہ کی تعمیر و تحسین کے لیے بنیادی دستور اور آئین ہونا ضروری ہے۔ اگر کسی قوم میں ملت کا بانی اور قائم کرنے والا شخص واحد ہے تو جو علوم اس نے اللہ تعالیٰ سے اپنے کمال استعداد کے مطابق حاصل کیے ہیں ان کا ایک خاص میزان اور معیار ہوگا اور وہی علوم (اپنے اسی میزان و معیار کے مطابق) ملت کے لیے دستور حیات ہوں گے۔ لیکن اگر ایک سے زیادہ امام اور پیشوا موجود ہیں اور ہر شعبہ زندگی کے لیے علیحدہ پیشوا ومقتدی کام کر رہا ہے تو ان میں سے ہر ایک پیشوا کے علمی یا عملی کمال کا ایک خاص درجہ ہوگا اور اس درجہ کو اس شعبہ سے متعلق لوگوں کے لیے دستور حیات بنا دیا جائے گا اور کوئی شخص کامل حکیم نہیں ہو سکتا جب تک وہ مختلف ملتوں کے ان علوم سے اچھی طرح واقف نہ ہو۔ جو ان کی دساتیر حیات کا لازمی حصہ ہیں اور بعد ازاں سب ملتوں میں بہترین دستور حیات کی حامل ملت کا انتخاب نہ کرے (کیونکہ علوم اور دساتیر اقوام کا جاننا کافی نہیں ہے بلکہ مقارنہ کے بعد بہترین کا انتخاب کر کے ارتفاقات واقترابات صحیحہ کے مطابق زندگی بسر کرنا ضروری ہے)۔ جو باتیں ہم نے تم کو ابھی بتائیں اگر ان میں سے کسی ایک بات کو بھی نظر انداز کرو گے تو ممکن ہے کہ دین و دنیا میں بھٹکتے پھرو گے۔

دوسری فصل

ملت عالیہ کا بیان

اس بارے میں تحقیق اور قابل اعتماد بات یہ ہے کہ سب ملتوں میں ایک ایسی ملت ضرور ہو جو تمدن عالی و تہذیب ارفع کی علمبردار ہو، جس کے ہر شعبۂ حیات کی بنیاد دور رس اور عمیق علوم پر رکھی گئی ہو۔ لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تم بھی اس سلسلہ میں اپنی تحقیق ازسرِ نو ع کرلو اور خود فیصلہ کرنے کے قابل ہو۔ تمہیں معلوم ہوگا کہ عالم بالا اور عالم اسفل کے سب موجودات میں سے کسی چیز کا تقرر یا وجود بالفعل متحقق نہیں ہوتا جب تک اوپر اور نیچے سے اسباب و علل اس پر محیط ہو کر اسے گھیر نہ لیں۔ اس لیے اس چیز کی اصل حقیقت اس وقت تک سمجھ میں نہیں آتی جب تک کہ اس کے تمام علل کا علم حاصل نہ ہو۔

نیز یہ بھی جان لو کہ قلب انسانی پر جو بھی حال وارد ہوتا ہے اس کے دو پہلو ہوتے ہیں ایک ظاہر اور دوسرا اس کا باطن۔ اس کا باطنی پہلو یہ ہے کہ وہ اپنے علل کی وجہ سے وجود میں آتا ہے جس شخص نے اس کی حقیقت علل کے ذریعہ معلوم کی تو بلاشبہ اس نے اس کے باطنی پہلو کا ادراک کرلیا۔

اس کے ظاہری پہلو میں اس کے وہ خواص، رنگ اور کیفیات اور صورتیں آتی ہیں جو اس عالم میں ظاہر ہوتی ہیں۔ اس لیے جس نے اس چیز کی حقیقت اس کے خواص اور ظاہری علامتوں کے ذریعہ پہچان لی تو اس نے (اس کی باطنی صورت نہیں بلکہ) ظاہری شکل وصورت کا ادراک کرلیا۔ اس حقیقت کو سمجھانے کے لیے آپ کے سامنے ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔ بصارت سے متعلق کوئی شخص گفتگو کرنا چاہتا ہے تو اس کے احوال کی توضیح دو طرح کی جاسکتی ہے:

ایک تو یہ کہ یہ ایک ایسی قوت ہے جو روح (ہوائی) کے اس حصے میں ہے جو

دوخولدار پٹوں کے اندر رواں دواں ہے جو آنکھ کے ڈھیلے میں پہنچ کر نہایت باریک ہو جاتی ہے اور وہ آنکھ کے سات پردوں کے اندر محصور رہتی ہے جب آنکھ کھولی جاتی ہے تو اس سے ایک قسم کی شعاعیں نکلتی ہیں اور سامنے جا کر جسم مخروطی کے قاعدے کی ہم شکل قاعدے پر جا پڑتی ہیں۔ یا اس[1] میں وہ سب خارجی رنگ اشکال اور روشنیاں جو اس کے سامنے ہوتی ہیں، اس کے پردۂ سیمیں پر اترتی جاتی ہیں۔ بعینہٖ اس طرح جس طرح صاف وشفاف آئینوں میں عکس اترتے جاتے ہیں۔ بعدازاں حس مشترک جس میں طبعاً وجبلتاً یہ استعداد رکھی گئی ہے کہ وہ اشکال اور مرئی اشیا کو ایک دوسرے سے ممیز کر سکتا ہے ان الوان واشکال کا ادراک کما حقہ کر لیتا ہے۔ یہ طرز تحقیق باطنی پہلو سے آنکھ اور بصارت کی حقیقت معلوم کرنے کا طرز ہے۔

دوسرا طرز توضیح یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ آنکھ وہ آلہ ہے جس کے ذریعہ، سرخ سبز اور سفید رنگ کا احساس کیا جا سکتا ہے۔ اس آنکھ کے ذریعہ روشنیوں کی کمی بیشی معلوم ہو سکتی ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ کسی چیز کی شکل گول ہے یا مربع ہے یا مسدس ہے۔ اسی طرح آنکھ سے جو علم بھی حاصل ہوتا ہے اس کا احاطہ کیا جائے اور ادراک بصری کے جتنے خواص ہیں ان کو ایک ایک کر کے گنا جائے۔ یہ ابصار یا نظر کا ظاہری وجود کے لحاظ سے احاطہ ہے۔

تمہیں یہ بھی فیصلہ کرنا ہوگا (اس کے بغیر تمہیں چارہ نہیں) کہ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ کوئی انسان عالم ناسوت و مادیات کی گندگیوں سے ملوث نہیں ہوا تو اس کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کوئی چیز بھی حجاب نہیں بن سکتی۔ مادی گندگیوں کی کئی قسمیں ہیں: بعض میں زیادہ کثافت ہوتی ہے اور بعض میں کچھ کم۔

خلاصہ یہ ہے کہ تقرب الٰہی کے راستوں اور طریقوں کی تعداد اتنی ہی ہے کہ جتنی استعدادوں کی تعداد ہوتی ہے (اہلِ معرفت کا ایک مشہور مقولہ ہے کہ "الطرق الی اللہ

---

[1] شاہ صاحب نے ابصار (نظر) کی حقیقت کے متعلق قدیم فلاسفہ کے دو نظریے پیش کیے ہیں۔ ایک فعلی ہے اور دوسرا انفعالی ہے۔ عصر حاضر صرف دوسرے نظریے کو صحیح تسلیم کرتا ہے۔

بعد الفاس الخلائق) اور ہر طریقِ تقرب خاص علمی اور عملی عبادت (اور حال) پر مشتمل ہوتا ہے۔

روزمرہ کے پسندیدہ وناپسندیدہ واقعات کے چاہنے یا اُن سے بچنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہر اس امر کو ہاتھ میں لیا جائے جسے مادہ میں یہ استعداد پیدا کرنے کا دخل ہو کہ اس پر الرحمٰن کی طرف سے جود کا فیضان (کسی رُخ سے بھی) ہو سکے۔ اور ان تمام امور سے استناد اور مدد حاصل کی جائے۔ کسی ایک امر یا شعبہ کو نظر انداز نہ کیا جائے۔ اس کو دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے پکڑ لیا جائے اور (اس طرح ان تمام اسباب اور علل کا علم حاصل کیا جائے جن کو اس مقصد کے حصول میں کچھ بھی دخل ہے) خواہ وہ عالم مثال ہے یا طبائع عنصریہ یا قوائے سماویہ یا قوائے الہیہ اسمائیہ۔

مختصر یہ کہ ملّت عالیہ جس پر کسی اور ملّت کو فوقیت حاصل نہیں ہوگی وہ ہوگی جس سے ایسے جامع علوم اور ہمہ گیر اور دقیق ملحوظات ظہور میں آتی ہیں۔ اور جو شخص کسی ایسی ملّت کا بانی و قیم ہو اس کے لیے ضروری ہے کہ اس نے اللہ تعالیٰ کی مخلوق پر اور ان قوانین پر جو اس کائنات میں نافذ ہیں۔ اجمالاً اور تفصیلاً ظاہراً اور باطناً بلحاظ تجربہ اور بلحاظ عقل احاطہ کیا ہو، وہ علوم کی تفصیلات پر خوب غور وخوض کرنے والا ہو۔ اور اس کے علوم کا منبع و سرچشمہ قبۂ علوم انسانیہ ہو اور وہ اُن علوم پر بھی اور ان کے لواحق وتوابع مشابہہ علوم پر بھی پورے طور سے حاوی ہو۔

ایسی ملّت کے شایانِ شان یہ ہے کہ پہلے ارتفاقات کی اُصولی باتوں پر توجہ دلائے اور کسی خاص صورت اور وضع کی تعیین نہ کرے اس کے بعد دوبارہ اس پر نظر ڈالے اور ان صورتوں اور شکلوں کو مفصل اور بالاستیعاب بیان کرے جو ان اصول کے مظاہر اور مظان میں پھر وہ ان مختلف صورتوں کو افراد انسانی پر اُن کی استعدادات مزاج، ان کی عادات اور اُن کی قوتِ اخلاقی کے مطابق تقسیم کردے اور ہر ایک کے لیے اس کی استعدادِ مزاج اور ملکۂ اخلاق کے مطابق طریق عمل بھی متعین کردے۔ شرط یہ ہے کہ وہ ان کی صفات کو کامل طور سے جانتا ہو اور تمام افراد کی حالت کو ایک دوسرے سے ممیّز کر کے سمجھ سکتا ہو۔

الٰہیات کے بیان کرنے میں اس ملت کا طریقہ یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات عالیہ کاملہ کو ممکن سے ممکن صریح ترین عبارت میں بیان کرے۔ نہ صرف عرفی زبان میں ان باتوں کی توضیح کرے بلکہ دلائل عقلیہ اور براہین منطقیہ کو بھی اپنے بیان میں استعمال کرے۔ کوئی نکتہ یا دقیقہ خواہ وہ خفی ہو یا جلی اس کی نظر بالغ سے اوجھل نہ ہو۔ اور اس کے مالہ، وماعلیہ پر اس کو پورا احاطہ حاصل ہو۔ پھر لوگوں کو یہ بھی سمجھائے کہ ان معارف غامضہ اور حقائق خفیہ سے کن الفاظ میں تعبیر کی جاتی ہے اور مختلف پیرایہ ہائے بیان کو مختلف اشخاص پر تقسیم کرے، ہر ایک کو اس طریقہ کی تعلیم دے جو اس کے مناسب حال ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر شخص کی معرفت اور اس کی تعبیر و اظہار کا طریقہ جدا گانہ ہوگا۔

قرب باللہ کے جتنے مراتب نسمہ اور روح سے متعلق ہیں ان کی بابت یہ ملت وہ پوری تفتیش کرے۔ اور لوگوں کی استعدادات کے مطابق ان کی ٹولیاں بنا دے۔ کیونکہ ہر ایک سے جس کمال تک پہنچنے کی توقع کی جاتی ہے وہ مختلف ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ ہر ایک ذی استعداد کو تقرب الی اللہ کا وہی طریقہ بتائے، جو اس کے مناسب حال ہو۔ اس کا منصب یہ ہوتا ہے کہ قربات میں سے ہر ایک قرب کے آداب اس کے خواص، اور اس کے حصول کے اسباب بوضاحت تمام بیان کرے۔ خلاصہ یہ ہے کہ وہ اشخاص انسانی کی کثرت عدد کے مطابق بیشمار اور قسم قسم کی عبادتیں شروع فرمائے، ان میں سے بعض کی نوعیت روحانی ہو اور بعض کی بدنی اور جسمانی۔

یہ ملت مختلف قسم کی برائیوں ان کے مراتب اور ان کے اسباب و علل کی تفتیش و جستجو کرتی ہے اور وہ طریقے اور حیلے بتاتی ہے جن سے شرور اور برائیاں وجود میں آتی ہیں اور یہ بھی بتاتی ہے کہ ان برائیوں کو کس طرح مٹایا اور رفع کیا جا سکتا ہے اس بارے میں اس کی تعلیم ہر استعداد اور ہر ماحول و زمانہ کے مطابق ہو۔ اور یہ تعلیم ان امور کو ملحوظ رکھنے پر مبنی ہو۔ اسی طرح اس ملت میں عالم قبر اور عالم حشر کی بھی گہری اور تفصیلی تحقیق ہوتی ہے۔ جن فتنوں کے بارے میں یہ خوف ہوتا ہے کہ بنی آدم کو پیش آئیں گے اور جو امراض اور آفات ان کو پیش آچکی ہیں اور جن اچھے مقاصد کی طلب بنی آدم کو ہوتی ہے۔ ان تمام کے بارے میں

ان کے فرائض اس ملّت میں متعین ہوں۔

اور اس ملت میں یہ بھی بتایا گیا ہو کہ وہ کون سے اسباب ہیں جو ان حوادث خیر وشر کو وجود میں لاتے ہیں یا ان کو وجود میں آنے کے بعد نابود کرتے ہیں۔ وہ اسباب بھی بتائے گئے ہوں جو مؤثر ہوتے ہیں اور وہ اسباب بھی بتائے گئے ہوں، جو متاثر ہوتے ہیں اور وہ اسباب بھی جو تاثیر اور اثر پذیری کے موجب بنتے ہیں۔

ملّت قصوی کے جو اوصاف ہم نے ابھی بیان کیے ہیں وہ صرف اپنے مجمل اور محدود علم کی بنا پر بیان کیے ہیں ورنہ ع

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

الغرض ملّت عالیہ اور ملّت قصوی (جو ہر لحاظ سے مکمل ہو) وہ ہے جو نوع انسانی کے امام کی جامع شرح ہو اور اس کے تمام احکام ہر ایک فرد کی حالت واستعداد کے مطابق امام انسان کے جو احکام ہوں ان تمام احکام پر یہ ملّت مشتمل ہو۔ (بہر حال) ایسی ملّت عالیہ کا موجود ہونا اور عالم خارج میں ظاہر ہونا ناممکن ہے اور اس کی کئی وجہیں ہیں۔

ایسی ملّت کا بانی لازمی طور پر ایسا شخص ہونا چاہیے جس کا ہر ایک کمال بہمہ وجود بالفعل متحقق ہو چکا ہو اور وہ ہر ایک کمال میں انتہائی درجہ تک پہنچ چکا ہو اور اب اُس کے اور اُس کے رب تعالیٰ کے درمیان کوئی حجاب یا پردہ نہ ہو، بنی آدم میں ایسے شخص کا وجود تقریباً مستحیل ونا ممکن ہے۔

(۲) وہ لوگ جو ہر زمانے میں اس ملّت کے بانی سے روایت کرتے ہوں یا اس ملّت (کے بنیادی اور کلی احکام) سے دوسری جزئی اور خصوصی ملّتوں کا استخراج کرتے ہوں اور وہ لوگ جن کے سپرد خصوصی ملتوں میں فتویٰ دینے کا منصب ہو، ان سب کے لیے ضروری ہے کہ جملہ درجات ارتقا کے عالم اور تمام علوم پر ان کو کامل احاطہ حاصل ہو اور یہ بھی ناممکن ہے۔

(۳) یہ بھی ضروری ہے کہ تمام لوگ ذکی القلب ہوں جو اس راوی اور مفتی سے ان کے علم کو ٹھیک طریقے پر اخذ کر سکیں۔

پس خلاصہ یہ کہ اس قسم کی ملّت عالیہ شخص کبیر اور نوع انسانی کے نظام اجمالی کے لیے بمنزلہ صحت حقیقی ہے۔ اور جس طرح انسان صغیر میں صحت جسمانی حقیقی کا وجود محال ہے۔ اسی طرح انسان کبیر کے لیے بھی صحت حقیقی کا وجود ممتنع ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کے لطف بے پایاں اور اس کی عنایت بیکراں کا تقاضا یہ ہے کہ ایسی ملّت عالیہ جامعہ کو (صرف) عالم مثال میں محفوظ رکھا جائے جس کو شرع کی زبان میں امام مبین کہتے ہیں اور عالم جبروت الٰہی میں اس کے لیے ایک اسم کلّی مختص ہو (اور اس کی جزئیات اور تفاصیل دوسری تدابیر عالم کی طرح اسما جزئیہ کے واسطے سے صادر ہوں کما مرّ)۔ پھر ہر ایک عصر کے لیے اس کا ایک جامع حصہ مخصوص ہو۔ جس کو ملّت خاصہ سے موسوم کیا جاتا ہے۔ وہ ملّت خاصہ یا تو لوگوں پر بطریق عموم مترشح ہوتی ہے بشرطیکہ ان میں کوئی اس قسم کا مانع نہ پایا جائے کہ وہ شیطان کے منقاد ہوں یا ان کی فطرت میں برائی ہو بصورت دیگر کسی ایک شخص کامل پر اس کا نزول ہوتا ہے جس کے علوشان اور ارتفاع منزلت کا فیصلہ ہو چکا ہوتا ہے۔ لوگ شوق سے اس کی طرف رجوع کرتے ہوں۔ اس کے علوم اس سے اخذ کرتے ہوں، اور اس طرح ان علوم کی روایت کا سلسلہ جاری رہے۔ یہ اس حالت کا ذکر ہے جبکہ مصلحت کا تقاضا بدستور اسی طرح قائم ہو، ورنہ بعض اوقات یہ ملّت خصوصی متعدد اشخاص پر ہر ایک کی استعداد کے مطابق مترشح ہوتی ہے۔ اور ان سب کے مجموعہ اس عصر کے لیے ملت قرار دیا جاتا ہے۔ ملت خاصہ یا کسی ایسی حالت کے ساتھ ظہور میں آتی ہے جو بہ لحاظ اصل معنی مذکورہ صورتوں کے مشابہ ہو۔

جو اصول ہم نے آپ کو سمجھائے ان کو سمجھ کر اپنے آپ کو سیدھا رکھو، اور ان پر استقامت کرو۔

تیسری فصل

واجب الاتباع ملت اور ماہیات ثلاثہ کا بیان

کوۂ اسلامیہ (روزن) جو علوم وجدانیہ کا سرچشمہ ہے

اللہ تعالیٰ کی یہ بڑی عنایت ہے کہ اس نے ہر انسان کی فطرت میں ایک روزن رکھا ہے، جس سے وہ جھانک کر ملّت حنیفیہ خصوصاً اس ملت خاصہ کا مشاہدہ کر سکتا ہے جو امام مبین میں محفوظ ہے۔ اور اس پاک الٰہی کے ضمن میں موجود ہے۔ یہ روزن یا روشندان انسان کی صورت انسانیہ اور اس صورت کے خواص و احکام ہیں۔ جو نسمہ پر پھیلے ہوئے ہیں۔ اگر کوئی دوسرے خیالات سے خالی الذہن اور الگ ہو کر اپنی توجہ اپنے اسی روزن یا روشندان پر مرکوز کر دے، تو وہ اس میں سے ملت حنیفیہ کا عموماً اور اس ملّت خاصہ کو جو خود اس کے لیے مخصوص ہے خصوصاً ملاحظہ کر سکتا ہے۔ اس علم کی ایک قسم تو وجدانیات کے مشابہ ہے جیسے کہ بھوک و پیاس کا احساس اور طعام اور آب شیریں سے ان کو رفع کرنے کا علم وجدانی ہے اور ہر سلیم الطبع انسان اسے جانتا ہے۔

اس کی دوسری قسم وہ ہے جو عالم بالا سے انسان پر فائض ہوتی ہے، بعینہٖ اس طرح جس طرح رؤیا کے واقعات اور علوم موہوبہ کے ذریعہ انسان علم حاصل کرتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس روزن کے ذریعہ آدمی ملّت جامعہ (وہ ملّت حنیفیہ عالیہ جو سب ملتوں کی جامع ہے) کا اس حد تک مشاہدہ کر سکتا ہے جو اس کے نسمہ کے علوم کے مناسب حال ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اور اس کی رضا مندی و خوشنودی اس میں ہے کہ ہر ایک آدمی اپنی توجہ کو اس کے لیے مخصوص اور دیگر اطراف سے فارغ کر دے۔

بہر حال اس حقیقت کو جس نے جان لیا، جان لیا، اور جو جاہل رہ گیا وہ جاہل ہی رہے گا۔

ابوالبشر آدمؑ اور دیگر انبیائے کرام کو اسی کوۂ انسانیہ اور کوۂ وجود کے ذریعہ علوم سے نوازا گیا ہے

اس قدر جان لینے کے بعد یاد رکھیے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام کو نیست سے ہست کر دیا گیا۔ تو اللہ تعالیٰ کی عنایت نے اس کی دست گیری اور اعانت کی، اور اس کو عالم تجرد اور اس روزن کی طرف رہنمائی کی جس کے نتیجہ میں اس روزن مذکور سے وجدانیات کی طرح اس پر ارتفاق اول کے علوم مترشح ہوئے اور کچھ علوم ارتفاق ثانی اور ثالث کے بھی اس کو دیدیے گئے۔ برخلاف اس کے عبادات کی علمی و عملی تدبیریں طریقے اور شیطان کے شرور و وسوسوں سے اجتناب اور اس قسم کی دوسری باتیں اس کو بذریعہ وحی بتائی گئیں۔ گویا کہ وہ دیگر علوم وہبیہ کی طرح غیر اکتسابی ہیں۔ مگر ان دونوں قسموں (وجدانی یا جبلی اور وہبی علوم) کا منبع و سرچشمہ کوہ انسانیہ (مذکورہ روزن یا روشندان) ہے۔ (جب حضرت آدم علیہ السلام کو اٹھالیا گیا تو ان کے یہ علوم بطور روایت اور طریقہ تفویض لسانی کے مطابق نوع انسانی تک بحفاظت منتقل ہوتے رہے۔ یہاں تک حضرت ادریس علیہ السلام کی تخلیق ہوئی اور اس نے بھی حضرت آدم علیہ السلام کی طرح پوری یکسوئی اور توجہ کے ساتھ کوۂ انسانیہ کی طرف رجوع کیا تو اُن کو وہ علوم بھی عطا ہوئے۔ جو حضرت آدم علیہ السلام پر نازل ہوئے تھے۔ اور ان کے علاوہ ارتفاق ثانی اور ارتفاق ثالث کے دیگر علوم اور ملائکہ کے ساتھ مشابہت حاصل کرنے کا علم وغیرہ علوم بھی ان پر فائز ہوئے۔ بعد ازاں عالم لاہوت میں فنا ہونے کے بعد ان کو "امام مبین" اور "اسم جامع" کی طرف عروج نصیب ہوا۔ اور جب وہ عالم بیخودی میں جس کو بندگان خدا میں سے صرف خاصان خاص یعنی "افراد" (جو اہل معرفت کے نزدیک ایک خاص طبقہ کا نام ہے) ہی جانتے ہیں (دوسروں کو یہ سعادت نصیب نہیں ہوتی) فنافی اللہ کے حال سے متصف ہوئے تو وہ حتی المقدور حسب استطاعت ملّت عالیہ کی علمی تشریح و توضیح میں مصروف ہوئے چنانچہ میں جملہ دیگر علوم کے انہوں نے

لوگوں کو علم نجوم، افلاک میں ان کی سیر وگردش اور اس عالم میں قوائے کواکب ونجوم کے ظاہری آثار سے روشناس کرایا۔ اور یہ کہ مصائب ونوائب کے موقعوں پر ان قوائے نجوم اور آثار کواکب سے کس طریقہ پر فائدہ اٹھایا جائے۔ نیز انھوں نے لوگوں کو علوم طبیعیہ سے آگاہ کیا۔ اور ساتھ ہی ساتھ ان کو علم طب وتشریح اعضائے جسمانی کی تعلیم بھی دی۔ اور امراض بدنیہ وغیرہا، شدائد ونوائب کے موقعوں پر ان سے استفادہ کرنا بھی سکھایا۔ ان علوم ظاہری کی تعلیم دینے کے علاوہ انھوں نے منصب ہدایت وارشاد کا بھی حق ادا کیا؛ چنانچہ انھیں بتایا کہ بندہ اللہ تعالیٰ کے رنگ میں کس طرح رنگا جا سکتا ہے اور وہ اپنے نفس سے فنا ہو کر بقا باللہ کا مقام کیسے حاصل کر سکتا ہے؟ اور مخلوق الٰہی میں تصرف کرنے کے لیے وہ کس طرح جارحہ حق تعالیٰ بن سکتا ہے۔ اسی طرح حضرت ادریس نے ان کو اللہ تعالیٰ کے اسمائے کلیہ وجزئیہ کا علم سکھایا اور ان اسماپاک کا باہمی فرق بیان کیا اور اس قسم کے دوسرے وہ علوم بھی سکھائے جو ''امام مبین'' میں ودیعت رکھے گئے تھے۔ انھوں نے علوم کی بارشوں کی طلب اور ان سے استفاضہ صرف کوہ انسانیہ کے ذریعہ نہیں کیا بلکہ وہ کوہ وجود وتحقیق کے راستے سے بھی علوم اخذ کیا کرتے تھے (یعنی انہوں نے علوم وہبیہ کے ساتھ علوم اکتسابیہ کا ذخیرہ بھی حاصل کیا) جب وہ اس مؤخر الذکر کوہ سے جھانکتے تھے تو گویا اُن کو علم انسانی کی کوتاہیوں کا احساس ہوتا تھا، نہ یہ کہ وہ اس علم کو نیچے سے صرف صرف ظاہری طور پر لیتے رہے۔

جاہلیت اولی اور ظہور آدم ثانی (نوع)

حضرت ادریس کو جن علوم سے نوازا گیا تھا۔ لوگ اس سے وہ علوم حاصل کرتے رہے۔ اور اس کے اٹھائے جانے کے بعد کچھ مدت روایت کے ذریعہ یہ علوم محفوظ رہے۔ (جس کو قرآن مجید نے ''اثارۃ من علم'' سے تعبیر کیا ہے) کچھ عرصہ کے بعد زمانہ کے حالات میں انقلاب آ گیا۔ اور وہ علم جہل سے بدل گیا اور لوگوں نے علوم کی غلط توجیہیں شروع کر دیں اور خدائے لاشریک کی عبادت متروک ہوگئی اور ارباباً من دون اللّٰہ کی عبادت کو سرمایۂ فوز وفلاح سمجھا جانے لگا۔ اور لوگ ہر طرح سے (عقیدتاً اور عملاً) شیطان

کے مطیع فرمان ہونے لگے۔ اور حالت اس حالت تک پہنچی جس کا نام شریعت محمدی کی زبان میں جاہلیت اولیٰ ہے۔

قریب تھا کہ یہ لوگ (اپنے اعمال کی پاداش میں) ہلاک ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے ابر کرم ودریائے جود میں تموّج پیدا ہوا کیونکہ اللہ تعالیٰ کی نوع انسانی پر خاص نظر عنایت ہے۔ اس مرتبہ اس کے جود و رحمت کا مظہر حضرت نوح علیہ السلام کا قلب مبارک قرار پایا، جو اس وقت کے تمام لوگوں میں ظاہر و باطن اور خلق وخُلق کے لحاظ سے کامل ترین تھے۔ اور اللہ تعالیٰ کو اُن کا علوّ شان ، بلندی مرتبت اور شہرت منظور تھی چنانچہ اُن کو ظہور فتن اور طرق انداز و تربیت کا علم دیا گیا اور یہ کہ ان فتنوں اور مہالک سے کس طرح نجات حاصل کی جاسکتی ہے، انھوں نے دعوت الی الحق کا حق پورا پورا ادا کیا۔ (اور اس راہ میں ان کو سخت ترین تکلیفیں دی گئیں۔ اور قوم نے راہ راست پر گامزن ہونے سے انحراف کر کے کفر وشرک پر اصرار کیا) تو اللہ تعالیٰ نے اپنا فیصلہ صادر فرمایا۔ اور (حضرت نوح کی دعا کو قبول کرتے ہوئے) کافروں کو نیست ونابود کیا اور کچھ افراد اور ان کی نسل و اولاد کو زمین کے شرق وغرب اور اطراف واکناف میں پھیلا کر باقی رکھ دیا۔ حضرت نوح علیہ السلام نے حضرت ادریس کے علوم سے نفیاً و اثباتاً کچھ بھی تعرض نہیں کیا۔ اس کا طریقہ اس بارے میں حضرت آدم علیہ السلام کے مشابہہ تھا۔ کہ اس کے علوم کا مآخذ فقط کوہ انسانیہ تھا۔ (کوہِ وجود و تحقیق سے اس نے کچھ بھی اخذ نہیں کیا)۔

ملّتِ ہود وملّتِ صالح کا ظہور

حضرت نوح علیہ السلام کی روایات بھی حضرت ادریسؑ کی روایات کی طرح اس کی وفات کے بعد محفوظ اور باقی رہیں۔ لیکن ابھی کچھ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ لوگوں نے عقائد و اعمال کے لحاظ سے الگ الگ ٹولیاں بنالیں۔ تمدن وارتقاقات میں پست ترین زیادہ عاصی، گنہ گار اور سرکش قوم عاد کی تھی اور اس کے بعد قوم ثمود تھی، جن کے انذار کے لیے بالترتیب حضرت ہود اور حضرت صالح علیہما السلام کو بھیجا گیا۔ ان دونوں پیغمبروں نے حضرت نوح کے نقش قدم پر چل کر حضرت ادریسؑ کے علوم سے کچھ بھی تعرض نہیں کیا۔

کیونکہ ان کا منصب فقط ڈرانے والے کا تھا۔

دیگر اقوام عالم کا حال

باقی اقوام عالم کی حالت مختلف تھی، ان میں سے بعض تو چوپایوں کی زندگی بسر کرتے تھے، اورانھوں نے تمدنی اور تہذیبی زندگی کے بدائی اور دوسرے درجہ کے کچھ حصہ پر اکتفا کیا ہوا تھا۔ اکثر عجمیوں کی یہی حالت تھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان میں حکما اور ارباب رشد و دانش پیدا کیے جنھوں نے ان کو انسانی علوم سکھائے۔

بعض دوسری وہ قومیں تھیں جو اپنی قدیم روایات پر قائم تھیں اور بعض ایسی قومیں بھی تھیں جو شر و فساد میں مبتلا تھیں۔ مگر ان کا شر و فساد اضطراب کن اور متعدی قسم کا نہ تھا۔

ملحدانہ ومشرکانہ ملتوں کا ظہور

بعد ازاں زمین میں ایک بار پھر فساد برپا ہوا اور کئی ایک ملتیں پھیل گئیں۔

ملت ستارہ پرستانہ: منجملہ ان کے ایک ملت ستارہ پرستوں کی تھی، انھوں نے ارتفاق ثانی اور ارتفاق ثالث کے لیے ستاروں کے قوی اور خواص کو ملحوظ رکھ کر اپنی ملت کی بنیاد ڈالی اور اپنے تیوہاروں اور اپنے وضع لباس وغیرہ میں اور اپنے بچوں کے نام رکھنے اور تمام عادات و رسوم میں اس کا لحاظ رکھا، انھوں نے اپنی تمام تر توجہ ستاروں اور ان کے قوی اور خواص پر مبذول رکھی، مستقبل کے واقعات کو انہی کے ذریعہ دریافت کرنے کی کوشش کی اور جس حادثہ کے وقوع کا خوف ان کے دامن گیر ہوتا تھا، اس کے رفع کرنے کے لیے ستاروں کے خواص سے مدد لیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے لیے ان کے ہاں مختلف طریقے تھے مثلاً یہ کہ اُن کی تمام تر توجہ ستاروں کے خواص ان کی روحانیت اور روحانیت کے ذریعہ کائنات میں تصرف کرنے پر مرکوز رہتی تھی۔ ان کے مقام فنا و بقا کا مرکز ستارے تھے۔ اور ان کو وہ تمام کائنات میں اشرف اور افضل سمجھتے تھے۔ اسی طرح ان کے اعضا و جوارح کے اعمال تعبدی کا مقصد بھی ستاروں کی تعظیم تھی چنانچہ آفتاب و مہتاب اور مشتری کے نام پر ان کے معابد بنانے سے اس مقصد و تعظیم کا اظہار ہوتا ہے۔

ملّت مجوس: منجملہ ان ملتوں کے ایک ملت مجوس کی ہے۔(جس کا بانی زرتشت کو سمجھا جاتا ہے)اس ملت کے لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ ان کے ارتفاق ثانی وثالث کے اصول خواص ارواح مجردہ یعنی خواص عقول پر مبنی ہیں۔ان عقول میں سے بعض ان کے نزدیک عقول کلیہ ہیں جو اللہ تعالیٰ اور ان کی مخلوق کے درمیان واسطے ہیں۔اور بعض عقول جزئیہ ہیں جن میں سے ہر ایک انواع عالم کی ایک ایک نوع کا مدبر ہے۔(رب النوع اس کو کہتے ہیں)ملت مجوس نے اس "عقل" کے لیے جو نوع انسان کا مدبر ہے کچھ آداب (طریقے اور عبادات) ایجاد اور مقرر کیے ہیں۔اور وہ اسی مدبر نوع انسانی سے علوم نازل ہونے کی توقع کرتے ہیں۔ ان مختلف عقول کا قرب حاصل کرنے کی وہ کئی وجوہات بتائے ہیں۔

مثلاً پوری یکسوئی اور توجہ کے ساتھ ان کی طرف رجوع کرتے ہیں، اور ان کے مشاہدہ میں اپنے آپ کو فنا کر دیتے ہیں چنانچہ ان کے اعمال جوارح انہی عقول کے مظاہر کی مناسبت سے معین کیے جاتے ہیں ان کے ہاں شیطان کے شر سے بچنے کا ایک خاص طریقہ ہے شیطان ان کی اصطلاح میں اہرمن کہلاتا ہے(جو شرور عالم کا مظہر ومنبع ہے) ملت مادہ پرستان منجملہ ان ملتوں کے ایک ملت مادّہ پرستوں کی ہے(جن کو شاہ صاحب طبیعین[1] کہتے ہیں)اس ملت کی یہ خصوصیت ہے کہ ان کے ارتفاقات کی بنا خواصِ طبعیہ اور نوامیس فطرت پر ہے۔اور ان کے نزدیک ہر ایک شخص کا کمال اس میں ہے کہ جو اس کی طبیعت کا تقاضا ہے،اس کو کما حقہ،پورا کرے۔قربات الٰہی سے ان کو کچھ بھی سروکار نہیں۔

غرض یہ کہ روئے زمین پر بسنے والے سب لوگ ان مذکورہ ملتوں میں سے کسی نہ کسی ملت کے دائرہ میں شامل ہو گئے۔ان میں سے بعض کو اماموں اور پیشواؤں کا مقام حاصل ہوا جنھوں نے ملت کے اصول ومبادی کا استنباط واستخراج کیا۔اور بعض ان اماموں کی تقلید و پیروی کرنے لگے۔یہ زمانہ(جس میں کفر والحاد اور شرک وبت پرستی کا چرچا رہا اور پیغمبروں کی عملی سیرتوں اور مقدس کتابوں کے الہامی علوم ضائع ہو چکے تھے) جاہلیت ثانیہ کہلاتا ہے۔اس عصر کا سب سے افضل شخص وہ ہے جس نے توحید کی تقلید اور اشاعت سے کفر و

---

[1] Naturist

شرک وسرکشی کی شوکت وسرکشی کو توڑا۔ سب کو توحید کا بھلایا ہوا سبق یاد دلایا، اوران کو خدائے بزرگ وبرتر وحدہٗ لاشریک کی طرف پھیر دینے کی کوشش کی۔

پہلی جاہلیت اور دوسری جاہلیت میں فرق:

جاہلیت اولی اور جاہلیت ثانیہ میں فرق یہ ہے کہ جاہلیت اولی میں لوگوں نے ارتفاقات اور تہذیبی زندگی کے صالح اصولوں اور عملی تدبیروں کو ترک کرنے میں خوب تجاوز کیا تھا اور معاصی اور گناہوں کے ارتکاب میں توغل کیا تھا وہ چوپایوں جیسے (بے لگام، بے قید وقانون) زندگی بسر کرتے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ (کے بتلائے ہوئے قانون اور طریقہ زندگی) سے اعراض وانکار اور کفروشرک کرتے تھے۔ اوران امور (نازیبا وناشائستہ) میں شیطان کے تابع تھے۔

جاہلیت ثانیہ کی یہ کیفیت تھی کہ ملت کے بارے میں انہوں نے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اوراس کے استحسان ملت کو نظر انداز کر دیا تھا۔ کوہ انسانیہ کے راستہ سے بصیرت حاصل کرنا ترک کر دیا تھا۔ غیر اللہ کو الوہیت کا درجہ دے کر ان کے قرب کو نجات اور فوز و فلاح کا ذریعہ سمجھ رکھا تھا اور انہیں کے فرماں بردار ومطیع بن گئے تھے۔

ملت ابراہیمی کا ظہور

الغرض جب جاہلیت دنیا میں روئے زمین میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیل گئی، تو اس عہد کے علمانے بھی اس کے اثرات قبول کیے اور دنیا والوں نے انھیں اپنا مقتدا و پیشوا سمجھ کر ان کی اندھی پیروی اور تقلید کی، تو ملت حقہ کے ظہور کے لیے جودِ الٰہی نے روح ابراہیم (علیہ السلام) جو تخلیق و وجود سے پہلے عالم مثال میں موجود تھی، پر نزول کیا۔ اور ملت حنیفی کے قیام واشاعت کا منصب جلیل اس کے سپرد کیا گیا۔ کیونکہ وہ اپنے وقت کے تمام بنی آدم میں ظاہر و باطن کے لحاظ سے کامل ترین انسان تھے۔ جب حضرت ابراہیم عمر کے درجۂ کمال کو پہنچے تو ملت مذکورہ کی تلقین واشاعت پر مامور کیے گئے۔ آپ نے شرک کا قلع قمع کیا مجوسیوں، ستارہ پرستوں اور مادیین کے گھڑے ہوئے مذاہب اور ملتوں کی

بنیادیں جڑ سے اکھیڑ ڈالیں۔ انھوں نے یکسوئی کے ساتھ توجہ کے ذریعہ کو انسانیہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کیا۔ انھوں نے ارتفاق ثانی وثالث کی بنا عادات پر نہیں رکھی بلکہ اس کی بنیادیں اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کی تعظیم وعبادت پر قائم کی۔ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے طریقے نسمۂ انسانیت کی معرفت کے مطابق مرتب کیے۔ اور الٰہیات کو نسمہ کی تعبیر کے مطابق بیان کیا۔ بالفاظ دیگر عقائد وعبادات کو نسمہ کی مقدار تعبیر تک محدود رکھا لہٰذا کوئی ملت اس کی ملت سے بڑھ کر واجب الاتباع نہیں اور نہ ہی کوئی ملت اس سے آسان تر تم کو ملے گی نجات اور فوز وفلاح کا یہی قریب ترین راستہ ہے۔

ملت موسوی کا ظہور

اس کے بعد وہ زمانہ آیا جب کہ فرعون نے تمرد وسرکشی اختیار کی اور بنی اسرائیل کو غلام بنالیا اور قریب تھا کہ ملت حنیفیہ مضمحل ہو کر مٹ جائے۔ یا سوسمار کی مانند کسی سوراخ میں نظروں سے اوجھل ہو کر چھپ جائے (اس صورت حال کو دیکھ کر رحمت خداوندی ایک بار پھر جوش میں آگئی اور) اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو پیغمبر بنا کر مبعوث فرمایا اور ملت حنیفیہ کو (دلائل عقلیہ ونقلیہ اور معجزات اور اعجازی قیادت کے ذریعہ) غالب بنا کر اس کی تشکیل نو فرمائی۔ اس کی حدود متعین فرمائیں، اس کے منتشر اجزا کی شیرازہ بندی کی اور اس کے قوانین کی نئے سرے سے تدوین وتقنین فرمائی اور ارتفاق ثالث کے درجۂ زندگی کے مطابق دین الٰہی اور طریقہ حنیفیہ کو ظاہر ورائج کیا۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ابتدائے دعوت کے لیے بنی اسرائیل کو مختص کر دیا اور (ان کو نبوت کے علوم وقوانین سے نوازا اور آپ علیہ السلام کے بعد حاملانِ دین اور پیشوایان مذہب ملت حنیفیہ کی اس توضیح وتشریح کو جو خود حضرت موسیٰ علیہ السلام تعلیم فرمائی تھی اور ملّت حنیفیہ کی یہ صورت توضیح یہودیت کے نام سے موسوم ہوتی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد یکے بعد دیگرے متعدد ادوار سے روایت کے ذریعہ نقل کرتے رہے اور بنی اسرائیل میں اس قسم کے سربراہ جو گویا حضرت موسیٰ کے بعد اس کے خلفا اور اوصیا کافی مدت تک پیدا ہوتے رہے۔ مگر رفتہ رفتہ علم

اور علما اٹھتے گئے اور بالآخر علم کی جگہ جہالت کا دور دورہ ہوا اور تمام ادیان و مذاہب میں کجی پیدا ہوگئی۔اور یہ جہالت ثالثہ تھی۔اس کی حقیقت اور ملخص یہ ہے کہ کوئی قوم اپنی ملت نازلہ پر قائم نہ رہے اور حق اور باطل میں اس قدر آمیزش ہو کہ حق کا باطل سے تمیز کرنا مشکل ہو جائے۔

مشرکین عرب اگرچہ دین حنیف کے مدعی تھے لیکن (توحید کو انھوں نے قطعاً چھوڑ دیا تھا جو دین مذکور کا طغرائے امتیاز تھا) اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ (حقیر مخلوقات کو) شریک ٹھہراتے تھے۔

یہودی نے دین موسوی کی پابندی چھوڑ دی تھی اور اللہ تعالیٰ کے احکام اور تعلیمات میں بڑی تحریفات کر دی تھیں۔تحریف سے میری مراد صرف تحریف الفاظ نہیں بلکہ تحریف کی خوفناک ترین صورت یہ ہے کہ الفاظ تو برقرار رہوں لیکن کلام کا غلط مفہوم لیا جائے (اور اس کو کھینچ تان کر انہی معانی پر محمول کیا جائے جو ہوائے نفس کا تقاضا ہے)۔

نصاریٰ نے رہبانیت اختیار کر کے نجات و سعادت کو ترکِ علائق اور اختیار گوشۂ مراقبت میں مضمر سمجھا تھا اور مسیح علیہ السلام کو معبود بنا لیا تھا۔اور حلال و حرام نیز تشریع سازی کا مکمل اختیار اپنے رہبان، زاہدوں اور درویشوں اور علما کو دے کر ان کو اربابا من دون اللہ کا درجہ دیا تھا۔

عجم (ایرانیوں، یونانیوں، ترکوں اور ہندوستانیوں وغیرہ) کی حالت تو ناگفتہ بہ تھی اور انھوں نے ملت حقہ کی جگہ مجوسیوں، ستارہ پرستوں، مادہ پرستوں اور مشرکوں کے آراو افکار، افعال و اعمال اور طریقوں کی معجون مرکب بنالی تھی اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک جلی کے مرتکب ہو کر باہمی ظلم و ستم کا شیوہ اختیار کر چکے تھے ان کی باہمی عداوت اور دشمنی کی آگ نے (انسانیت، اخوت اور ملت کے) سب رشتوں کو خاکستر بنا دیا تھا۔

ملت محمدی کا ظہور:

ایسی صورت حال میں اللہ تعالیٰ کی رحمت نے جوش مارا اور تمام عالم کی اصلاح کے

لیے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا۔ اور ملت کا ظہور ارتفاق رابع (بین الاقوامی سطح) کے مطابق ہوا اور وہ بات پوری ہوئی جس کا پورا کرنا اللہ کو منظور تھا۔ (یعنی هُوَالَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ)۔ حضرت محمد مصطفیٰ نے نہایت سادہ واضح اور عام فہم طریقہ پر اور بلیغ اسلوب بیان کے ساتھ دین حق کی تشریح فرمائی اور جاہلیت کی باتوں کا ابطال کیا۔ رسالت مآب کی دعوت رسالت، سب اطراف واکناف عالم میں پھیل گئی۔ ذَالِکَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُوالْفَضْلِ الْعَظِيْمِ۔

چوتھی فصل

ملت حنیفیہ کی حقیقت (اور اس کی تعلیمات کا ملخص)

ملت حنیفیہ کے ارکان اور اس کے اصول

اگر تم کو ملت حنفی کی حقیقت اور ماہیت معلوم کرنے کی تلاش و جستجو ہے تو (سن لیجیے)

رکن اول:

اس کی حقیقت یہ ہے کہ ارتفاق ثانی اور ثالث کی بنیاد تین اشیا پر رکھی جائے:

ایک وہ امور جو بنی آدم کے طبعی تقاضے ہیں یعنی ان کے علوم ان کی ضروریات، ان کے حوصلے، ان کا وقار اور فارغ البالی اور خوشحال زندگی بسر کرنے کے متعلق ان کی خواہش وغیرہ۔

دوسرے اللہ تعالیٰ کے احکام کا احترام، اس کے دین حق کے شعائر کی تعظیم اس کے رسولوں کے ساتھ ان کے اختیار کردہ آداب و اعمال میں موافقت کرنا اور اس کی نشر و اشاعت اور اقامت میں سعی بلیغ۔

تیسرے تجارب حیات ہیں اور جن امور کو تجربہ ثابت کر دیتا ہے کہ وہ نقصان دہ اور ضرر رساں ہیں ان سے احتراز کرنا اور جن امور کی پابندی تجربہ کے لحاظ سے ضروری ہے ان کا التزام کرنا۔

ان مذکورہ تینوں امور پر ملت حنیفیہ کی بنیاد رکھی جاتی ہے اور اسے ترتیب دیا جاتا ہے ان اصولوں کو مدنظر رکھنے کے سوا ستاروں کی خصوصیات اور اثرات اور علم نجوم میں تفکر و غور کرنا یا عقول مجردہ سے بحث کرنا اور اسرار طبیعت کا کھوج لگانا سب نا قابل التفات باتیں

ہیں۔ہاں تجربوں سے جو علوم ثابت ہوں (اور صرف نظری اور ذہنی غور و خوض اور فلسفیانہ اندازے نہ ہوں) وہ ملت حنیفیہ کی بنیاد بن سکتے ہیں۔

رکن ثانی:

ملت حنیفیہ کی حقیقت کا دوسرا رکن یہ ہے کہ ایمان کی بنیاد اس معرفت پر اُستوار کی جائے جو نسمہ کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔اس ایمان میں اللہ کی پہچان اور (جملہ صور شرک اور آلائش تشبیہ و تجسیم اور عیوب و نقائص سے) اس کو منزہ و پاک جاننا اور نسمہ انسانی سے ہم آغوش و مطابق (قلبی اذعان کا) اپنی زبان سے اقرار کرنا شامل ہے۔

ملت حنیفیہ کے اصول میں (ایمان صحیح اور توحید کامل کے ساتھ ساتھ) یہ بھی شامل ہے کہ (تبلیغ دین اور اصلاح معاشرہ کے ذریعہ) اُن علوم و اعمال کے خلاف محاذ قائم کرے جو لایعنی اور فضول اور تہذیبی زندگی کے لیے بے فائدہ ہے۔اور ان علوم کے خلاف نبرد آزما ہو جو عوام الناس کے ذہنوں میں تشویش اور اشتباہ پیدا کرنے کا ذریعہ اور گمراہ کن ہوں۔ چنانچہ اس کے لیے یہ ضروری ہوا کہ اسماء الٰہیہ میں تعدد اور اس تعدد کی وجہ سے نتائج و احکام میں جو اختلافات رونما ہوتے ہیں ان کو یکسر ختم کر دے اور سب صفات عالیہ کو صرف ایک ذات باری تعالیٰ عزّ وجل اور اسی کے ارادہ اور حکمت کی طرف موڑ لیا جائے (اور کثرت سے وحدت کی طرف لی جائے)۔یاد رکھیے وہ اختلاف جو اسمائے الٰہی تعالیٰ شانہ میں واقع ہوسکتا ہے یہ ہے کہ ان میں بہ یک وقت تصادق بھی ہو اور تفارق بھی۔اس سے مراد ہماری یہ ہے کہ اسمائے حسنیٰ جن صفات عالیہ کے مظہر ہیں، ان میں باہم ایک ایسی نسبت عالیہ بھی ہے جو عالم ناسوت کی نسبتوں سے بہت اعلیٰ و ارفع ہے اور اس نسبت کی تعبیر تصادق و تفارق سے کی جاسکتی ہے۔لیکن نسمہ جب اس اختلاف کا اثبات کرے گا تو ایسے پیرایۂ بیان میں کرے گا جس سے وہ اختلاف ثابت ہوگا۔جس کا اثبات جناب قدس کے لیے جائز نہیں۔اور اس ذات سے اس کی نفی لازم ہے۔اس لیے نسمہ کا ایمان اسی صورت میں صحیح و درست ہوسکتا ہے اور اس شرط سے حق پر قائم رہ سکتا ہے کہ اس اختلاف سے خاموشی اختیار کرے اور سب

باتوں کو اللہ تعالیٰ کے ارادہ اور اس کی حکمت کی طرف راجع کرے۔اس اجمال میں تمام اسما حسنٰی اوران کے معدات واسباب وقابلات وصلاحیتوں کے اختلاف سے متعلق علوم مندرج ہوجاتے ہیں۔

رکن ثالث:

ملت حنیفیہ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ایمان اور احسان کے مقامات اور عبادات کی تفصیل کو ایسی باتوں پرمبنی کرے جونسمہ کے مناسب حال ہیں جبکہ نسمہ اپنی صفات پر باقی ہو،ایسی باتوں پر یہ مقامات اور عبادات مبنی نہ ہوں جو اس وقت نسمہ کے مناسب حال ہوسکتی ہیں جبکہ وہ اپنی صفات کو فنا کردے اسی اصل پر ملت مذکورہ نے نماز، روزہ، حج، زکوٰہ اوراذ کار ودعوات دغیرہ کے قوانین اورارکان مرتب کیے ہیں۔

رکن چہارم:

ملت حنیفیہ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس نے حجب ثلاثہ کے نتائج سیئہ سے نجات پانے کا طریقہ اور علاج یہ تجویز کیا ہے کہ انسان اپنی طبیعت کے تقاضوں کو پورا کرنے میں افراط سے پرہیز کرے۔یہ نہ ہو کہ جسمانی خواہشات کی بیخ کنی اوراستیصال کیا جائے مثلاً یہ کہ ہرقسم کا کھانا پینا اور صنفی تعلقات کلیہ ترک کرائے جائیں۔اپنے آپ کو خصی کردینے یا اعضائے تناسل کو کاٹ کر رکھ دینے یا اس قسم کے دوسرے (رہبانی اعمال و افعال جوترک دنیا اوراستیصال خواہشات نفسانی کا مظہر ہوں) کورواج دیا جائے،ملت حنیفیہ (کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ) سرے سے رسوم کوترک کردینے کا حکم نہیں دیتی بلکہ یہ کہ رسوم باطلہ کوایسی رسوم صالحہ سے بدل دینے کی تجویز کرتی ہے جودنیا اور آخرت میں نفع بخش وسودمند ہوں۔اس کی ہدایت یہی ہے کہ شرک کے جملہ اقسام سے سختی کے ساتھ پرہیز کی جائے، براہین اوردلائل عقلیہ میں خوض نہ کیا جائے اورصرف اس نورِ ہدایت اور روشنی وحی پر اکتفا کیا جائے جواللہ تعالیٰ نے لوگوں کوہدایت کے لیے نازل فرمایا ہے (يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا) جس کواصطلاح میں''شرع''

کہتے ہیں۔ معرفت الٰہی، فتن وشرور کی پہچان اوران سے بچاؤ کی تدبیروں کا علم اورمعاد میں اعمال پر سزا وجزا مرتب ہوتی ہے۔ان کی حقیقت سے آگاہی کے لیے نبی اور رسول کی تعلیمات کافی ہوتی ہیں۔ملتِ حنیفیہ کے یہی اصول وارکان ہیں۔

ملت حنیفیہ کی متوارث اشباح وصُور

ملت حنیفیہ کی وہ باتیں جو عہد نبوت تک اہل عرب میں متوارث چلی آتی تھیں حسب ذیل تھیں: جنابت سے غسل وطہارت حاصل کرنا،اور(نماز کے لیے)وضو کرنا،اور ختنہ کرانا اور وہ تمام باتیں جن کو خصال فطرت کہتے ہیں،نماز کوارکان اربعہ قیام،رکوع،سجود اور دعا کے ساتھ ادا کرنا، مدعیان دین حنیف کے نزدیک متفقہ اور بغیر کسی اختلاف کے تسلیم کیا جاتا تھا۔اسی طرح قریش، یہود اور نصاریٰ سب کے نزدیک روزہ رکھنا ضروری تھا۔ چنانچہ دین حنیف کے پیروکار پورے ایک دن کا روزہ خوشنودی الٰہی کے لیے رکھتے تھے۔ اسی طرح گناہوں کی آتش فروزاں کو ٹھنڈا کرنے اور آفات وبلیات کو دفع کرنے کے لیے صدقات دینا بھی متوارث تھا۔اسی طرح حج بیت اللہ بھی ملت حنیفیہ میں متوارث چلا آرہا تھا اذکار مثلاً استغفار اور دوسری دعائیں،قسمیں کھانا،منتیں ماننا اوران کا احترام کرنا،مُردوں کی تجہیز وتکفین اور قبر میں اسے دفن کرنا،نماز جنازہ یا دعا برائے میت کرنا، جانوروں کو ذبح کرنا اوران جانوروں اور چوپایوں کا گوشت کھانا جن سے طبع سلیم کراہیت محسوس نہ کرے، مہر اور خطبہ کو لوازم نکاح ماننا ، اوران عورتوں کے ساتھ جن سے نسبی رشتہ یا رضا (دودھ پلانے) کے رشتے کی وجہ سے نکاح مناسب نہیں نکاح کو حرام سمجھنا، یہ تمام باتیں جو مذکور ہوئیں، ملت حنیفیہ کا ظاہری ڈھانچہ ہے۔اور جو لوگ ملت مذکورہ کے اتباع کے دعویدار تھے وہ ان امور کے پابند تھے۔شرع موسوی اور شرع محمدی نے ان تمام امور کو دین کا جز قرار دیا ہے اور ملت حنیفیہ کے جملہ امور متوارثہ کو بطور دین کے مان لیا ہے۔

یادرکھو کہ اس زمانہ میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا انحصار اسی میں ہے کہ ملت حنیفیہ ہی کی پابندی کی جائے (جس کا دوسرا نام اسلام ہے ثُمَّ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ

اِبْرَاهِیْمَ حَنِیْفًا) کیونکہ اس کی بنا صورت انسانیہ کی موافقت پر ہے۔ اور یہ کہ علوم اور معارف کا مآخذ اسی کو قرار دیا جائے۔ شر ثانی اور شر ثالث سے احترام کیا جائے۔ لیکن شرِ اوّل سے اجتناب کرنا شرط نہیں۔ کیونکہ جب شیطان معرض وجود میں آچکا اور اس کی ہستی متحقق ہو چکی تو پھر اس سے احتراز کرنا مفید نہیں[1]۔ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے اور اس کے اوامر کا احترام کرنے میں سعی بلیغ کی جائے۔ دوسری ملتوں میں شرک کی آمیزش ہو ہی جاتی ہے کیونکہ عوام کی سمجھ اس شرف وعظمت میں جو مقدس اور فوق البشر ہے، اور اس شرف اور عظمت میں جو عالم ناسوت سے تعلق رکھتا ہے فرق کرنے سے قاصر ہے۔ اور دونوں کو ایک سمجھتے ہیں۔ اور مؤخر الذکر کے انقیاد اور اطاعت کو اول الذکر کی اطاعت اور انقیاد سے کم نہیں سمجھتے اور یہی شرک کی بنیاد ہے۔ (اتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ...... الخ) اسی لیے دینِ حق نے معرفت کی بنیاد معقولات ثانیہ اور براہین کی تفتیش پر نہیں رکھی، اس کی بنا ادراک بسیط اور معقولات اوّلیہ ہے۔ تمہیں چاہیے کہ اس بات کا علانیہ اظہار کرو کہ نوع انسانی کے حق میں اللہ تعالیٰ کو اسی دین حنیف کی اشاعت اور غلبہ مقصود ہے اور بس۔ جس کا ظہور کبھی تو ارتفاق ثالث کے طرز اور کبھی ارتفاق رابع کے طور پر ہوتا ہے۔

---

[1] یعنی یہ تو ناممکن ہے کہ شر کا وجود ہی باقی نہ رہے۔ تاہم یہ ضروری ہے کہ شر کا مقابلہ ایسا کیا جائے کہ نہ تو جاہلیت ثانیہ باقی رہے کہ لوگ اللہ تعالیٰ کی لطافت کو چھوڑ کر دوسری راہیں اختیار کریں اور نہ جاہلیت ثالثہ کا وجود رہے کہ مختلف ملل کی آپس میں خلط ملط ہو جائے۔ اور ملت حنیفیہ اپنی اصلی شکل میں باقی نہ رہے۔

پانچویں فصل

علم تشریع اور اس کے قوانین

انبیائے کرام علیہم السلام کے مختلف اطوار واقسام مثلاً نبی حکیم، نبی خلیفہ وغیرہما سے جو علوم وفنون متوارث چلے آرہے تھے، ہم نے اس کتاب کے گزشتہ ابواب میں بنیادی مسائل اور جزئیات کے مراجع واصول سے تم کو آگاہ کرنے میں بخل سے کام نہیں لیا، ہاں صرف علم تشریع اور اس کے قوانین کے متعلق کچھ کہنا باقی ہے اور اگر تمہیں اس کے سننے کا شوق ہے تو توجہ کے ساتھ سنیے اور جانیے کہ انسان جب اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور جو خارجی پردے اس کی انسانی فطرت پر جس پر اس کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے چھائے ہوئے ہیں اور اس کے علوم واحکام کے ظہور سے مانع ہیں ان سب کو اٹھانے کا عزم کرتا ہے تو تین موٹے موٹے پردے (حجب ثلاثہ، حجاب طبیعت، حجاب رسم اور حجاب سومعرفہ) اس کے سامنے آتے ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کی سرشت میں کھانے پینے، لباس وپوشاک، مکان ومسکن کی ضرورت اور عورتوں سے صنفی تعلق کی خواہش رکھی گئی ہے اور شہوانی اور غضبی قوتوں جیسے دو معاونوں کے جو قدرت نے اس کے قلب کو عطا کیے ہیں۔ غیر فطری تقاضا کے نفاذ یا عدم نفاذ کے لحاظ سے مختلف احوال قلب پر طاری ہوتے ہیں، چنانچہ وہ اکثر اوقات تقاضائے طبع کے پورا کرنے اور قوت شہوانی اور قوت غضبی کے آمرانہ احکام کی تنفیذ میں اس قدر منہمک ومستغرق ہوتا ہے گویا وہ کسی قوی الاثر مخدر ومسکر کے نشہ سے مخمور ہو کر دنیا ومافیہا سے بے خبر ہو گیا ہے۔ اس کو ہم حجاب طبع کہتے ہیں۔ یہ ہمہ گیر حجاب ہے جس میں نوع انسانی

حیوانات کے ساتھ مشترک ہے۔ انسان کبھی ایسا سوجاتا ہے کہ اس کو کسی چیز کی شدھ بدھ نہیں رہتی۔ بھوکا ہوتا ہے تو سوائے کھانے کی چیزوں کے وہ کسی اور چیز کی اہمیت کو خاطر میں نہیں لاتا۔ پیاسے کو اسی پر قیاس کر لیجیے اسی طرح اس پر عشق کا غلبہ ہوتا ہے تو اس کی تمام تر توجہ صنف نازک کے ساتھ ہم نشینی اور ان کے قرب پر مرکوز ہوتی ہے۔ غم کی کیفیت اس پر مسلّط ہو جائے تو وہ اس میں مستغرق رہتا ہے اور اگر خوشی کی لہر موجزن ہو جائے تو اس کی تمام تر توجہ طرب و مسرت کی طرف ہوتی ہے۔ الغرض اسی طرح دن رات گزرتے ہیں۔ اور وہ تقاضائے طبع کے کسی نہ کسی شعبہ میں اپنے اوقات عزیز کو گنواتا رہتا ہے۔ کوئی کام کی بات اس سے نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ ہر وقت ایک خاص طبعی تقاضا آراستہ ہو کر اس کے سامنے آتا ہے اور دوسرے مطالبے پیچھے رہ جاتے ہیں۔

لیکن اگر وہ عقل کے کمال کا درجہ حاصل کر لیتا ہے اور اس کا دل بیدار اور فطرت جاگ جاتی ہے تو وہ اپنے اوقات میں سے فرصت کا موقع نکال کر طبعی خواہشوں اور جسمانی تقاضوں کے علاوہ دوسرے علوم کی طرف بھی متوجہ ہوتا، اور شوق سے اپنی قوت عاقلہ اور قوت عاملہ کی تکمیل کی فکر کرتا ہے پھر وہ عز وجاہ اور فخر ومباہات کا طالب ہوتا ہے، وہ اپنی قوم کے ارباب علم ودانش کو دیکھ کر ان کے لباس وپوشاک فخر ومباہات، ترفہ وخوشحالی اور طرق معاش پر غور کرتا ہے تو ان سب باتوں کا اس کے فکر ونظر اور قلب وذہن پر بڑا اثر ہوتا ہے اور اس کے دل میں اس طبقہ کی تقلید کا ایک بے پناہ جذبہ پیدا ہوتا ہے جس کے نتیجہ میں وہ عزم بالجزم کر کے ان کے ساتھ شریک کار اور رفیق سفر ہوتا ہے اس کو ہم حجاب رسم کہتے ہیں کیونکہ یہ شوق وجذبہ اس کے دل میں سوسائٹی کے دیگر افراد کو دیکھ کر پیدا ہوا ہے اور بعض افراد ایسے بھی ہیں جو مرتے دم تک اسی تگ ودو اور تقلید رسم میں مستغرق رہتے ہیں اور ان کا انجام نقصان وخسران پر ہوتا ہے۔

لیکن اگر کوئی شخص صاحب دل ہے اور بیدار ضمیر کا مالک ہے اور اس کی عقل دوررس ہے تو اسے لاہوت کا احساس ہو جاتا ہے۔ اور ذات الٰہی کے ساتھ ربط پیدا کرنے اور مقدس

کمال حاصل کرنے کا احساس ہوجاتا ہے۔تب وہ قرب الٰہی حاصل کرنے کے لیے سعی اور کوشش کرتا ہے اور اپنے سر عجز کو اسی کے آستانہ عالیہ پر رکھ کر اس کی بارگاہ اقدس سے قضائے حاجات کا ملتجی ہوتا ہے۔اس مرحلہ پر پہنچ کر بعض لوگوں کو سیدھے راستے پر چلنا نصیب ہوتا ہے اور بعض صراط مستقیم سے بھٹک جاتے ہیں۔اس بھٹک جانے کو ہم حجاب سوء معرفت کہتے ہیں۔اگر تم نوع انسانی اور افراد بنی آدم کی اچھی طرح چھان بین کرو تو تمھیں معلوم ہوگا کہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں وہ بالکل درست ہے اور اس میں کسی قسم کا فرق و تفاوت نہیں، ہر ایک شخص خواہ وہ کسی دین وملت کا پابند ہو کسی نہ کسی وقت لزوماً حجاب طبع میں مستغرق ہو ہی جاتا ہے بعض دوسرے اوقات میں وہ حجاب رسم میں منہمک ہوتا ہے اور وہ دوسرے ہمعصروں اور عقلمندوں کے ساتھ دنیاوی مراتب، دنیاوی خوشحالی، بلند اخلاق، فصیح وبلیغ کلام بہتر خوشنما لباس اور اعلیٰ معاشرتی زندگی کے حصول کے لیے مقابلہ میں منہمک ہوتا ہے۔

اس طرح بعض اوقات ایسے پیش آجاتے ہیں کہ وہ شریعت کے امور کی طرف متوجہ ہوجاتا ہے اپنے فہم اور عقل کے مطابق عالم جبروت اور الٰہیاتی امور (وہ امور جن کے بارے میں وہ پہلے سنتا بھی تھا تو کان نہیں لگاتا تھا) کی طرف کان لگا کر متوجہ ہوتا ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ تشریع اور الٰہی قانون سازی کا دارومدار[1] اس پر ہے کہ مذکورہ حجب ثلاثہ کو توڑا جائے اور کافی طویل زمانوں میں (پوری تربیت کا ساتھ) اقوام عالم میں سے کسی قوم یا ملت کو ان حجابوں سے پوری طرح پاک کیا جائے۔

صاحب شرع کے طرقِ علاج:

ان مذکورہ تحقیقات اور تمہیدی اصولوں کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد تمہارے لیے یہ سمجھنا بھی بہت آسان ہوگا کہ ان حجابات ثلاثہ کو توڑنے کے لیے جو صاحب شریعت تدبیر کرے گا، اس کے لیے تین مقامات یا تین طریقہ ہائے علاج ضروری ہیں۔

پہلا مقام (حجاب طبیعت کا علاج) سب سے پہلے اس کو حجاب طبیعت کا علاج و

ل (Enenteal prerequsets)

اصلاح کرنا ہوگا۔اس کا لب لباب یہ ہے کہ طبیعت کو اپنی فطرت پر باقی رکھنا ضروری ہے کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ طبیعت کو اپنی فطرت وجبلت سے جدا کر کے اس کی فطرت کے تقاضوں سے قطعاً محروم کردیا جائے،اس کی کئی ایک وجوہات ہیں:

اولاً یہ کہ طبیعت کو خواہشات وجبلتوں سے یکسر محروم کرنا بہت بڑا (اجتماعی) فساد ہے۔کیوں کہ تم جانتے ہو کہ نوع انسانی کے درمیان معاشرتی روابط واجتماعی تعلقات کا انحصار ومدار طبعی ضروریات اور جبلی تقاضوں پر ہے اور اگر ان ضروریات کی پوری بیخ کنی یا استیصال کیا جائے اور وہ معدوم ہو جائیں تو باہمی انسانی ربط اور اجتماعی بھائی چارگی کا تعلق بھی معدوم ہو کر رہ جائے گا (اور اس سے بڑا اجتماعی فساد دوسرا نہیں ہو سکتا)۔

ثانیاً اس قسم کی تعلیم یعنی نفس کشی یا خواہشات کی بیخ کنی کی ہدایت کو تمام افراد بشری قبول ہی نہیں کر سکتے (اور نہ اس کے لیے تیار ہوتے ہیں۔اس لیے اگر ان کو طبیعت کے تقاضوں سے باز آنے اور خواہشات کے استیصال کا مکلف اور پابند بنا دیا جائے تو یہ بات کبھی ان سے پوری نہ ہو سکے گی۔نتیجہ یہ ہوگا کہ اس قسم کی تعلیم سے تشریع کا مقصد فوت ہو جائے گا۔(کیونکہ جو لوگ مزاج کے لحاظ سے مستعد ہوں گے وہ تو قبول کر لیں گے اور جو غیر مستعد ہوں گے وہ پیچھے رہ جائیں گے۔حالانکہ مطالبہ سب سے کرنا اور سب کو ایک قانون کے لیے آمادہ کرنا تشریع کا مقصد ہوتا ہے،تشریع میں ہمیشہ عمومیت پائی جاتی ہے)۔

ثالثاً: مقام نبوت جس کی حقیقت یہ ہے کہ انسان الٰہی کے ساتھ مشابہت حاصل کی جائے۔دراصل اس قسم کی تعلیم کا تقاضا ہی نہیں کرتا ان تین وجوہ کی بنا پر حجاب طبیعت کے نقصانات ومضار سے بچنے کی مناسب تدبیر یہی ہے کہ طبیعت کو اپنی مقتضیات سے قطعاً جدا کردینے کی بجائے اس کی تہذیب واصلاح کی جائے اور اس کے تقاضا کو اس حد تک پورا کیا جائے جس سے ایمان میں خلل نہ آئے۔چنانچہ ہر وہ امر جس کا طبیعت انسانی تقاضا[1] کرتی ہے،اس کے لیے مدارج مقرر کیے جائیں اور کوشش کی جائے کہ ہر تقاضا کو پورا

[1] کتاب میں عبارت "لا یقتضیه الطبیعة" مگر بہ ظاہر یہ کتابت کی غلطی ہے۔اور عبارت "تقتضیه الطبیعة" ہے۔

کرنے میں اعتدال کو مدنظر رکھا جائے، یہی وجہ ہے کہ شریعت غرّا نے پاکیزہ اور لذیذ اشیا خورد و نوش کو جائز و حلال قرار دیا ہے اور خوبصورت نوجوان دوشیزاؤں اور عورتوں سے نکاح کو حرام نہیں ٹھہرایا اور اس قسم کے دوسرے حیوانی جذبات اور جبلّی تقاضوں کی تسکین کے لیے طریقے اور ذریعے تجویز کیے یہاں تک کہ حسد، بغض، عداوت و تکبر اور سخت گیری کے جذبات کی بیخ کنی نہی کی بلکہ ان کو مختلف مناسب صورتوں کے ساتھ جائز رکھا۔ (خلاصۂ کلام ہے کہ طبیعت کے ہر ایک تقاضا میں افراط سے منع کر کے اعتدال کی تلقین فرمائی اس کا نتیجہ یہ ہے کہ شریعت محمدی کے اصول و احکام کی پابندی کے باوجود انسان کو اپنے طبعی تقاضوں اور جسمانی خواہشوں کو پورا کرنے میں کوئی خلش اور خلجان محسوس نہیں ہوتا۔

عدوان طبیعت کے لیے انسدادی تدابیر: طبیعت کے تعدی و عدوان کو روکنے کے لیے دو قسم کی انسدادی تدبیروں اور امتناعی ذریعوں کو استعمال کیا جاتا ہے۔ علمی و عملی اور ان میں سے ہر ایک کی دو قسمیں ہیں۔ خارجی و داخلی۔

ا۔ علمی ذریعہ اصلاح داخلی: علمی ذریعۂ اصلاح اور تدبیر کے سلسلہ میں ضروری ہے کہ چند ایسے مقدمات مستحضر ہوں جن سے چند وجوہ (تین) کی بنا پر جوش طبیعت اور عدوان مزاج کی شدت کو مقہور و مغلوب ہونے میں مدد ملتی ہو اور وہ عقل کے نزدیک بھی مسلّم اور مقبول ہوں۔ وہ تین وجوہ یہ ہیں:

(الف) اس (علمی مقدمہ) کے ذریعہ عقل کو حرکت میں لایا جاتا ہے تو وہ (عقل) طبیعت کی گرفت اور بندش حکم سے آزاد ہو جاتی ہے (اور ملکیت کو بہیمیت سے ایک قسم کی آزادی حاصل ہو جاتی ہے) چنانچہ ہم نے اس حقیقت کو تفصیل سے بیان کیا ہے کہ محض طبیعت (اور بہیمیت) کی حکمرانی اس وقت رہتی ہے جب تک عقل حرکت میں نہیں آتی۔ جونہی عقل میں کسی قسم کی تحریک پیدا ہوتی ہے تو طبیعت اس کے مطابق مقہور و مغلوب ہو جاتی ہے۔

(ب) ہم نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ طبیعت کے احکام قلب پر صرف اس صورت میں غلبہ پاتے ہیں، کہ دماغ کے جاسوس اس کی طرف مائل اور اس کے ہمراز ہو جائیں لیکن اگر قوائے دماغیہ کو علوم سے بھر دیا جائے اور وہ ان کا استحضار ہمیشہ کرتے ہیں تو اسی استحضار

کی نسبت سے جواسیس دماغ کی معاونت میں کمی ظاہر ہوگی اور طبیعت یک وتنہا ملکیت کا مقابلہ نہ کر سکے گی۔

(ج) بلاشبہ یہ بدیہی امر ہے کہ مقدمات کے بار بار اور یکے بعد دیگرے استحضار و ادراک کو مناسب حال خاص حالت کے پیدا کرنے اور اس کو برقرار رکھنے میں دخل ہوتا ہے۔ جب اس مناسب حال خاص حالت کو انسانِ اکبر سے مشابہت حاصل ہو جائے اور اس کا اثر نفسِ انسانی پر نمایاں ہو جائے گا۔ گو کہ وہ اثر حروف، اصوات، خیالات اور اعضائے جسمانی کے مختلف اعمال کے ساتھ مخلوط و ممزوج کیوں نہ ہو، تو بھی اس قسم کا اثر بالخاصیت مفید و نافع ہوگا جس طرح تریاق زہر کا اثر زائل کرنے کے لیے بالخاصیت مفید اور نفع بخش ہے۔

خارجی: (حجاب طبیعت کو دور کرنے کے لیے انبیا کرام کے طریقے مختلف اور جدا گانہ ہیں)۔

ان مقدمات اور بنیادی تمہیدی باتوں کی تعیین میں انبیائے کرام کے مسلک جدا جدا رہے ہیں، چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان مقدمات کو ترجیح دی ہے جن میں عقیدۂ توحید کو استحکام حاصل ہو اور شرک اور مشرکانہ ذہنیت کا قلع قمع ہو اور اس کی بدولت عبادات میں مشغول ہونے کا جذبہ دل میں پیدا ہو۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس پر ایسے مقدمات مستزاد فرمائے جن سے قلب میں خوف وخشیتِ الٰہی کا جذبہ پیدا ہو اس لیے اس کی نبوت کا جزاعظم تذکیر بایام اللہ[۲] تھا۔

حضرت محمد صلی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے علاوہ چند ایسے مقدمات کا اضافہ فرمایا جن کو پیش نظر رکھنے سے اس حیات فانیہ کی بے ثباتی آنکھوں میں بھر جائے اور یہ بات گویا رای العین سے نظر آنے لگے کہ مرنے کے بعد انسان کا تعلق ان امور سے منقطع ہو جائے گا۔ جن سے وہ اس دنیا میں لطف اندوز رہتا ہے۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے

---

۲ ایام اللہ سے مراد وہ بڑے بڑے واقعات ہیں جو کسی قوم کی ہلاکت کا موجب ہوئے یا اس پر زوال آیا۔ اور جن کا سننا عبرت کا باعث ہوتا ہے۔ تذکیر بایام اللہ ان علوم پنج گانہ میں سے ایک ہے جن کا تفصیلی ذکر شاہ صاحب نے الفوز الکبیر فی علوم التفسیر میں کیا ہے۔

التذکیر بھاذم اللذات (موت) ومابعدہ کومسلک اصلاح بنادیا۔

مستحقین عتاب پر اپنی عقوبت نازل فرماتا ہےاور مقدس حسن وبہا کے اثبات کی طرف رجوع کریں گے۔ وعلیٰ ہذاالقیاس دوسری صفات الٰہیہ کی توجیہہ بھی اسی طرح کی جائے گی جس میں ذم کا پہلو بالکل نہ ہو۔اور یہ علم (معرفت الٰہی) جیسے کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں،انسان کی فطرت کی گہرائیوں میں ودیعت رکھا گیا ہے۔

دوسری قسم یہ ہے کہ بعض اشخاص ایسے بھی ہیں، کہ جب وہ ذات اقدس اوراس کی صفات عالیہ کا اثبات کرنے لگتے ہیں تو وہ اپنے ذہن میں تصدیق کے لیے تجرید وفراغت نہیں پاتے اور وہ ذات اقدس کوتلوثیات عالم ناسوت یابالفاظ دیگر مادّی کثافتوں سے منزہ اورمتعالی سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔اسی طرح جب وہ مادّی دنیامیں کسی جلیل القدر ہستی کی عظمت کاتصور کرتے ہیں تو وہ اس کی ذات گرامی کوتقدس اورتألہ (ذات الہ) کے اوصاف سے متصف خیال کرتے ہیں۔اگرچہ ان کواس خیال (مشرکانہ اعتقاد) کا احساس نہیں ہوتا کیونکہ یاتو وہ طبیعت کے تقاضوں کی تعمیل میں مشغول ومستغرق رہتے ہیں یارسم ورواج کے علوم واحوال کارنگ ان پرغالب رہتا ہے۔اوروہ آزادانہ طور پر قطعی فیصلہ اوراستدلال نہیں کرسکتے۔اس کی مزید تحقیق یہ ہے کہ جس یقین اورعقیدہ کوشرع نے قابل اعتباراور بنائے تعمیر قرار دیاہے اس کی تحصیل براہین اور دلائل عقلیہ کے ذریعہ نہیں ہوتی کیونکہ شرع کے نزدیک ان دلائل و براہین کی کچھ بھی قدر و قیمت نہیں یہ تو ایک ناقص الادراک اور ناقص الایمان قوم (عقلائے یونان اوران کے ہم مشربوں) کا سہارا ہے اوربس۔جو یقین واذعان مطلوب ہے وہ کتاب اللہ کی تلاوت وتذکاراورتدبراور نیک لوگوں کی اچھی صحبت سے فیض یاب ہونے کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔اس یقین کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عالم لاہوت سے نسمہ پر پختہ یقین کی ایسی ہیئت راسخہ مترشح ہوگی کہ اس کے خلاف کے لیے کوئی گنجائش ہی نہیں رہے گی۔اوروہ علم ناقص جس سے قلب کوکما حقہ ارتباط اوروابستگی نہ ہو، اوراس کی نوعیت دوسرے خطرات نفس اور وسوسوں کی سی ہو۔شرع کے نزدیک ایمان وایقان نہیں،شک اوروہم ہے۔چاہے اس کے اثبات کے لیے مغز کھپا کر کتنے ہی عقلی دلائل

اور منطقی قیاسات پیش کیے گئے ہوں۔ اس قسم کا شک تھا جس سے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کافروں کو موصوف بتایا ہے۔ اور سورۂ کہف میں واضرب لھم مثلا رجلین کا رکوع اس کا ایک نمونہ ہے۔

تدابیر

اس کی تدبیر یہ ہے کہ طبیعت کو معتدل ریاضتوں مثلاً روزہ، اعتکاف اور نماز کے ذریعہ مغلوب کیا جائے۔ اور ایسے مواد کے اجتماع سے پرہیز کیا جائے جس کے ثوران و ہیجان کے وقت قلب کو طبیعت کے تابع ہو جانے کے سوا کوئی چارہ ہی نہ ہو مثلاً شکم پروری اور پُرخوری جس کا علاج یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو بھوکا رکھے یا مثلاً موادِ منویہ کا غلبہ، جس کا علاج شرعی طور پر نکاح کرنا ہے۔ یا مثلاً یہ کہ تشویش آفریں صورتوں کو دیکھ دیکھ کر اور فضول گپ شپ اور رسمی واہیات باتیں سن سن کر لوحِ دماغ کو بھر دینا (کہ سنجیدہ باتوں کو سوچنے کی گنجائش ہی باقی نہ رہے) اس کا علاج یہ ہے کہ لوگوں کی صحبت کو ترک کر کے خلوت نشینی اختیار کرے۔ اور اپنی آنکھوں کو ضبط میں رکھے اور محسوسات کے روابط سے قطع تعلق کر کے اپنے قوائے عقلیہ کو اضطراب و تشویش سے روکے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ محسوسات کے علاوہ دیگر حقائق کے ادراک کی صلاحیت و استعداد اس میں قوی تر پیدا ہو جائے گی اگرچہ یہ ادراک تنزیہہ، تسبیح و تقدیس تک محدود کیوں نہ ہو اسی طرح وہ اپنی قوت مدرکہ قوی سے قوی ترک کرتا رہے حتیٰ کہ اس میں ''دیانت'' (ظاہر و باطن کی یکسانگی) کی خلق پیدا ہو جائے اور دوسرے سب اخلاق فاضلہ کا ظہور ہو۔

اگر تم لوگوں کے مختلف طبقوں کا حال معلوم کرنے کی کوشش کرو تو تمھیں ایسے لوگوں سے بھی واسطہ پڑے گا کہ جو کچھ علم انھیں ملا ہے اس کی وہ مطلق پروا نہیں کرتے کیوں کہ وہ اپنے مدرکہ کو ادھر متوجہ ہی نہیں کرتے۔ اس قسم کے لوگوں کے لیے علاج یہ ہے کہ وہ دل و زبان سے اللہ تعالیٰ کی یاد کرتے رہیں۔ اس ذکر قلب ولسان سے ان کو یہ فائدہ ہوگا کہ محسوسات اور مادیات سے ان کا استغراقی تعلق منقطع ہوگا۔ (اور یہی مطلوب و مقصود ہے۔

چھٹی فصل

خاتم النبیین حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت مطہرہ کے مقاصد

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت اور نظام زندگی کے اسرار ورموز اور حقیقت کے متلاشی کے لیے سب سے پہلے جس چیز کا جاننا واجب وضروری ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور رسالت مآب کو ملت حنیفیہ کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے تاکہ آپ اس کے اندر جو کجی آئی تھی، اسے درست کریں اور جو تحریفات اور تبدیلیاں لائی گئی تھیں ان کی اصلاح فرما کر اس کی اصلی روشنی اور آب وتاب کو پھیلائیں۔ اس لیے ضروری تھا کہ جن مقامات پر ملت حنیفیہ کی بنیاد رکھی گئی ہے وہ ایسے ہوں کہ سب کے نزدیک مسلمہ ہوں۔ اس کے بعد اس کی تفاصیل میں غور وخوض کیا جائے۔ اسی طرح وہ ظاہری اشکال اور صورتیں جو اس ملت کے پیروکاروں کے ہاں متوارث چلی آرہی ہوں سب کے نزدیک مسلمہ ہوں۔

وہ بڑے بڑے مقاصد جو حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی شریعت میں متعین کرنا چاہتے تھے یا (صحیح تعبیر کے ساتھ) جنھیں اللہ تعالیٰ آپ کے لسان مبارک سے ظاہر کرنا چاہتے تھے۔ (مندرجہ ذیل) چند امور ہیں:

ان میں سے ایک ارتفاق ثانی کی اصلاح ہے کیونکہ یہ ارتفاق تمام اقوام عالم میں عموماً اور ملک عرب میں خصوصاً شائع وذائع تھا۔ لیکن ان میں جور وظلم اور کجی وبدعنوانیاں پیدا ہوگئی تھیں۔ رسالت مآب نے ارتفاق ثانی کو درست کیا اور جور وکجی کا پورا پورا ازالہ کیا چنانچہ ارتفاق کی بنیاد انسانی خواص اور علوم تجربیہ پر رکھی اور اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس کی تعظیم کو اس کے ساتھ ملا دیا (اور یہ معجون مرکب اصلاح تہذیب وتمدن کے لیے نہایت ہی نافع ثابت ہوا) اور اس اصلاحی کوشش میں نجومیوں (ستارہ پرستوں) اور طبیعین (مادہ پرستوں یا نیچر

پرستوں) اور مجوس (آتش پرستوں) کے مذاہب اور طرق اصلاح سے کنارہ کشی (جو انبیا کا وطیرہ ہے) مجدداً اختیار کی۔ چنانچہ اس طریقہ سے ارتفاق میں چند مفید امور حاصل ہوئے، جو اس ارتفاق کے لیے بمنزلہ ارکان کے ہیں۔ ان امور کی پابندی واجب قرار دی گئی انھیں اختیار کرنے کی تاکید کی گئی اور ان کو چھوڑنا ملت حنیفیہ سے خروج کے مترادف قرار دیا گیا۔ ان ارکان یا ضروریات کے علاوہ بعض دوسری باتیں ایسی تھیں جو ارتفاق ثانی کے نظام زندگی کو تکمیل، تحسین، تعمیر اور تتمیم کے مدارج تک پہنچاتی ہیں۔ اس قسم کے امور کو استحباب کے درجہ میں رکھا جس کے یہ معنی ہیں کہ آپ نے ان پر کاربند رہنے کی ترغیب دی لیکن ان کے چھوڑنے کو چنداں قابلِ ملامت قرار نہیں دیا۔ ان دونوں (ضروریات اور تحسینات) کے علاوہ کچھ امور ایسے بھی ہیں جن کے ارتکاب سے نظام مذکور باطل ہو جاتا ہے۔ ان کو حرام قرار دیا اور ان کو ترک کرنے کی سخت تاکید فرمائی۔ بعض دوسرے امور ایسے بھی ہیں جن سے ان مفاسد کے پیدا ہونے کا احتمال ہے جو ارتفاقِ ثانی کو باطل کر دیتے ہیں، اگرچہ وہ براہِ راست ارتفاق کو مٹاتے نہیں۔ اور کچھ امور ایسے ہیں جن سے ارتفاق ثانی میں نقصان پیدا ہونے اور اس میں خلل کے آنے کا اندیشہ اور احتمال ہے۔ ان کو شرع محمدی کی اصطلاح میں مکروہات کہتے ہیں۔ جن امور میں کوئی ایسی بات نہیں تھی ان کو اجازت دیدی اور وہ مباحات کے نام سے یاد کیے جانے لگے، اسی طرح شارح علیہ السلام نے ان امور کا قلع قمع کیا جو موادِ فساد کی حیثیت رکھتے تھے، اور لوگوں میں جن باتوں سے جھگڑا فساد پیدا ہوتا تھا، اس کو منع فرمایا۔

ان میں سے دوسرا مقصدِ شریعت رسوم کی اصلاح ہے

جس کا ملخص یہ ہے کہ ان مروجہ رسموں کو ایسی شکلیں [illegible] دی جائیں جو [illegible] اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ مبذول کرانے کی مؤید اور معاون ہوں اور کبھی اس کے مخالف اور نقیض نہ ہوں۔ نیز ان رسموں کو اس طرح بنایا جائے کہ جمہور کے لیے مفید اور نفع بخش بن جائیں اور ان میں توسع اور لچک ہو، تنگی بالکل نہ ہو اور نہ وہ جمہور کے لیے موجب ضرر اور باعث نقصان ہوں۔

ان میں سے تیسرا مقصد ارتفاق ثالث کا قیام ہے۔

یعنی یہ کہ ہر ایک ظلم و دست درازی کے لیے کما حقہ مناسب حال، عقوبت اور سزا مقرر کی جائے۔ لوگوں کو فتنہ وفساد اور لڑائی جھگڑوں سے روکا جائے اور ان کے اندر منازعات اور مقدمات کو عدل وانصاف سے فیصلہ کیا جائے۔ زمین میں فساد پھیلانے والے لوگوں پر ظلم کرنے والوں اور تخریب کاروں اور تفرقہ پردازوں کے خلاف جہاد کیا جائے اور قوت استعمال کی جائے۔ شعائر الٰہیہ اور دین اسلام کے اظہار اور نشر واشاعت کا اہتمام کیا جائے اور کفر وشرک اور فسق وفجور کی اہانت کی جائے اور ملک خدا کو ان سے پاک وصاف کر دیا جائے۔ تبلیغ دین، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اہتمام کیا جائے اور لوگوں کے وعظ وارشاد اور پند و نصیحت کا انتظام کیا جائے اور علوم وفنون کی اشاعت وترویج کی جائے۔

ان میں سے چوتھا مقصد دین اسلام کو ارتفاق رابع کے مطابق غالب ونافذ کرنا ہے۔

تا کہ روئے زمین پر کوئی شخص ایسا باقی نہ رہے، جو دین حق سے مغلوب نہ ہو اور یہ غلبہ اس قسم کا ہو جس کا کوئی مقابلہ نہ کر سکے (اسلام کے جھنڈے تلے) صرف تین قسم کے لوگ ہوں گے:

(۱) مومن مخلص جو ظاہراً اور باطناً اللہ تعالیٰ کے احکام کا مطیع وفرماں بردار اور ملت حنیفیہ کا پابند ہو۔

(۲) ضعیف الایمان جو ظہراً اسلام کے احکام سے سرتابی نہ کرتا ہو، اگر چہ اس کے باطن میں ایمان اور ایقان کی روشنی نہیں۔

(۳) وہ جو علانیہ کافر ہے لیکن جزیہ دیتا اور اسلامی حکومت کے تابع ہو کر محکومانہ زندگی بسر کرتا ہے۔ اس کو اسی طرح کام میں مصروف رکھا جائے جس طرح چوپایوں سے کام لیا جاتا ہے۔ اور جس طرح بیل سے کھیتی باڑی اور فصل کی کٹائی اور صفائی وغیرہ کا کام لیا جاتا ہے اسی طرح اس کافر کو بھی مصروف رکھا جائے۔

چونکہ اس قسم کی اسلامی حکومت وخلافت بعینہٖ سکندر اعظم ذوالقرنین جیسے ذو اقتدار

کی حکومت کی طرح ہے جن کی بدولت ارتفاق رابع کا نظام قائم تھا اور اس پر مستزاد یہ کہ اس سے دین اسلام کو مدتوں تک قائم رکھنا مطلوب ہے کہ عرصۂ دراز کے بعد بھی وہ اسی طرح تر و تازہ ہو جس طرح وہ عہد سلف میں تھا۔

لہٰذا مندرجہ ذیل امور کی ضرورت پڑی: کہ دوسرا کوئی مذہب باقی نہ رہے۔ اور مسلمانوں کو دیگر مذاہب کی محرف تعلیمات میں غور وخوض کرنے کا موقع نہ دیا جائے اور ان کے مطالعہ سے منع کیا جائے۔

ثانیاً یہ کہ:

جو کوئی بھی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور اس کی رضا مندی چاہتا ہو اس کو اسی دین کا پابند ہونا پڑے گا اور اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ یہودیوں اور عیسائیوں میں سے کوئی شخص دین ابراہیمی پر اب تک قائم ہے اور اس نے دین ابراہیمی میں عقیدتاً یا عملاً کسی قسم کی تخلیط و آمیزش نہیں کی ہے تو اگرچہ قرب اور کمال حاصل کرنے کی حیثیت سے اس کے لیے یہ ضروری قرار نہیں پاتا کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین میں داخل ہو، اس کے احکام کی پابندی کرے اور اس کی رسالت کا اقرار کرے لیکن اس کے لیے شریعت محمدی پر ایمان و ایقان لانا اس لیے ضروری ہوتا ہے کہ چوں کہ اللہ تعالیٰ کو دین حنیفی کا اس طریقہ پر ظہور میں لانا مقصود ہے اس لیے خوشنودی الٰہی اسی دین محمدی کی پیروی اور پابندی میں ہے۔ اور اس سے اعراض کرنا معصیت اور مخالفت تصور ہوگی اور اعراض کرنے والا شخص خدائے پاک کی رحمت سے محروم رہ کر لعنت کا مستحق ہوگا۔ علاوہ ازیں یہ صورت جو فرض کی گئی ہے (کہ اب بھی کوئی شخص ملت ابراہیمی حنفی پر قائم پایا جائے گا) محض ایک احتمال عقلی ہے۔ واقعہ میں ایسا کبھی نہیں ہوسکتا (کیونکہ ملتوں میں اور ان کی روایات میں فساد واقع ہوا ہے) اور تورات، انجیل اور دیگر مقدس کتابوں کا وجود اصلی مفقود ہے اور موجود ہی نہیں ہے تو دین ابراہیمی پر قائم رہنے کا دعویٰ باطل اور خیال غلط ہے)۔ اور حق اور روایات ایک دوسرے کے ساتھ ایسے مخلوط ہو چکے ہیں کہ ان میں سے ایک کو دوسرے سے جدا کر کے پیش ہی نہیں کیا جاسکتا (اور انسانی آمیزش اور خدائی کلام میں فرق کرنا مشکل ہوگیا ہے) اس لیے اللہ تعالیٰ کی رضا

مندی وخوشنودی کو دین محمدی (صلی اللہ علیہ وسلم) اور آپ کی رسالت پر اقرار جلی میں منحصر سمجھا گیا ہے (قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ الخ)۔ (آل عمران)

ثالثاً یہ کہ کسی کی یہ حرکت برداشت نہ کی جائے کہ وہ اللہ تعالیٰ، اس کے رسول یا اس کی کتاب اور دین کے حق میں گستاخی اور بے ادبی کرے خواہ یہ گستاخی اور بے ادبی دل لگی کے طور پر ہو یا پوری سنجیدگی کے ساتھ ہو (قُلْ اَبِاللّٰهِ وَ آيَاتِهٖ وَرَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ) نیز کسی کو اس بات کا موقع ہی نہ دیا جائے کہ وہ کسی مشروع چیز میں کسی طرح پر تغیر وتبدل کرے۔ (اور حلال کو حرام ٹھہرا سکے اور حرام کو حلال کہہ سکے) اور نہ کوئی اللہ تعالیٰ کو ایسے نام سے پکار سکے جو تنزیہہ وتقدیس الٰہی کے خلاف ہو، یا اس میں شرک کی کسی صورت کی ایجاد و آمیزش ہو یا کسی غیر اللہ کو مقدس سمجھ کر اس کی اطاعت کی جائے یا کوئی شخص شعائر اللہ کو ترک کرے (یا ان کی بے حرمتی کرے) یا دین حنیفی کے ساتھ کسی دوسرے مذہب وطریقے کو ملانے (کی کوشش کرے یا ملانے) کا مرتکب ہو۔ الغرض دینی حنیفی کو ارتفاق رابع کے طرز پر قائم رکھنے کے لیے ان مذکورہ امور کو ملحوظ رکھنا لازم ہے۔ اس زمانہ میں (بعد از رسالت محمدؐ تا قیامت) اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی انہی امور (یعنی دین اسلام) کی پابندی میں محصور ہے (یہی تقریر بالا کا ملخص ہے)۔

منجملہ ان مقاصد کے ایک مقصد (یعنی پانچواں)

حجب ثلاثہ کو توڑ کر لوگوں کو مقام احسان پر فائز کرنا ہے۔

جس کی تفصیل فصل التشریع (اسلامی قانون سازی) میں گزر چکی ہے نیز (مقربین کے لیے) تسکین وطمانیت حاصل کرنے کے طریقے معلوم کرنا اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنے پر ترغیب وتحریص دلانا بھی مقاصد میں سے ہے۔ اسی طرح اصحاب الیمین کو ان کے مناسب حال تلقین کرنا بھی ان مقاصد میں شامل ہے۔

چھٹا مقصد منجملہ ان مقاصد کے "شر ثانی" کے آفات سے لوگوں کو بچانا ہے

اور یہ اس طرح پر کہ شیطان کے القا اور وسوسوں کی مخالفت کی جائے اور ان ہیئتوں

اور طریقوں سے کنارہ کشی اختیار کی جائے جو القائے شیطان کے مناسب حال ہوتے ہیں اوران ہیئتوں کو اختیار کیا جائے جو ملکی الہام سے موافق اور ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ تاکہ وہ (اس دین کو اختیار کرنے والا) ان دونوں ہیئتوں اوران کے موافق احوال وظروف سے باخبر ہو۔ وحی والہام کی مختلف صورتوں سے بھی اور شیطان ونفس امارہ کے مکائد اور شرارتوں سے بھی آگاہ ہو، پھر اسے ان مکائد سے بچنے کی راہیں، اور شعائر اللہ کی تبلیغ اوران کی تعظیم کی اشاعت کرنے اور شعائر شرک، فسق وفجور اور نفاق کے اسباب اور لوازم کو مٹانے کے طریقوں سے بھی واقفیت ہو۔

ساتواں مقصد: منجملہ ان مقاصد کے ایک مقصد یہ بھی ہے کہ لوگوں کو فتنۂ قبر اور فتنۂ محشر اور فتنۂ عذاب النار سے نجات دلائی جائے۔

یہ اس طرح ہوسکتا ہے کہ جو واقعات ہونے والے ہیں شارع ان سے ان کو آگاہ کرے، ان کے اسباب سے ان کو مطلع کرے اور پھر ان سے بچنے کی ان کو تلقین کرے۔ شریعت حقہ کے بڑے بڑے مقاصد یہی ہیں جو اوپر مذکور ہیں۔ اب اگر یہ مقاصد اسی قسم کے اوصاف ہوں جو ضبط میں آسکیں اور بالکل ظاہر ونمایاں ہوں تو شارع ان کو بعینہٖ علل و اسباب کے درجہ میں رکھتا ہے۔ اور انہی پر احکام کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ اوران احکام کے وجود وعدم کا ارتباط انہی علّتوں کے وجود اور عدم سے ہوتا ہے۔ اگر یہ اوصاف منضبط اور نمایاں نہ ہوں تو ان کے لیے لوازم اور مظان تلاش کرتا ہے۔ یہاں لوازم سے میری مراد لزوم عقلی نہیں بلکہ وہ لوازم مراد ہیں جن کا لزوم، لزومِ عادی ہے اور مظنّۃ سے بھی مراد یہ نہیں ہے کہ علّت اس کے ساتھ استقرار تام رکھتا ہے بلکہ مقصود صرف یہ ہے کہ اس میں اس مقصد کے حاصل ہونے کا ظن غالب ہے۔

الغرض تم اس وقت تک اپنے آپ کو فقیہ فی الدین نہ سمجھو جب تک تم کو ان مذکورہ مقاصدِ شریعت کا علم نہ ہو۔ اور یہ کہ ان مقاصد کو ظہور میں لانے کا طریقہ کیا ہے۔ احکام کے علل کیا ہیں اور مقاصد کے ساتھ ان کا ارتباط کس طرح ہے۔ جب ان سب باتوں کو تم جان لو، (تو تمھیں اسرار ورموز دین سے واقفیت ہو جائے گی اور) تم اس دین کے صحیح طور پر حامل ہو اور پھر یہ حدیث

شریف تمہارے حق میں صادق ہوگی: اِذَا اَرَادَ اللّٰہُ لِعَبْدٍ خَیْراً یُفَقِّھَهُ فِی الدِّیْنِ۔ جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے کے ساتھ نیکی کا ارادہ کرے تو وہ اس کو دین کا فہم عطا کردیتا ہے۔

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

بُعِثْتُ بِالْمِلَّةِ السمحة الحنیفیة البَیْضَاء۔ مجھ کو ملت سمحہ حنیفیہ بیضا کے ساتھ مبعوث کیا گیا ہے۔ ملّت حنیفیہ کی تحقیق تو تم سن چکے۔ السمحة سے مراد یہ ہے کہ (وہ آسان اور قابل عمل ہے اور) اس کے احکام ظاہر امور پر مبنی ہیں اور امعان اور تعمق کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ اور ہر عذر کے پیش آنے پر حکم کا دوسرا پہلو رخصت کا موجود ہوتا ہے اور ہر مشکل کو آسان طریقے پر ادا کرنے کی تلقین ہو۔ اور رہبانیت (ترک دنیا علائق اور عزلت نشینی) اور تکلیف دہ عبادتوں کو (غیر شرعی قرار دے کر) مٹایا گیا ہو۔ البیضا (روشن) اس سے مراد یہ ہے کہ ہر شخص اس کے واضح احکام اور اوامر کو سمجھ سکتا ہے اور اس کے علل اور اسباب احکام کو معلوم کرسکتا ہے اور ان اسباب وعلل کو ان کے مطلوبہ مقاصد شریعت کی طرف راجع کرسکتا ہے۔

ہم نے اس کتاب میں تم کو مسالک ومسائل کا اس قدر علم دیا ہے کہ اگر تم نے اس کو ٹھیک طور پر سمجھا ہے تو تم کو کسی مسئلہ میں شک وشبہ لاحق نہیں ہوگا لیکن ہم تم پر مزید احسان کرتے ہوئے شریعت محمدی کے اصول وفروع کی مزید توضیح وتشریح کرتے ہیں۔ اور انشاء اللہ تعالیٰ مقاصدِ شریعت اور ان کے اسباب وعلل پر قلم آزمائی کریں گے۔ اس لیے اپنے کام میں عقل ودانش سے کام لو۔

---

۱ قرآن مجید میں ارشاد ربانی ہے ھُوَالَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهُ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَهُ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهِ وَلَوْکَرِهَ الْمُشْرِکُوْنَ (سورۃ الصف: آیت)
ملاحظہ ہو مشکوٰۃ المصابیح کتاب العلم حدیث نھی عمر عن قراء ۃ التوراۃ

ساتویں فصل

دین اسلام کے اصول

اجزائے ایمان وشرائط دخول اسلام

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دین حق کے اصول میں سے ایک یہ ہے کہ ملت حنیفیہ میں داخل ہونے اور اس کی پابندی قبول کرنے کو چند امور کے ذریعہ منضبط کر دیا ہے۔ اس طرح کہ حضور نے (تصدیق قلبی کے ساتھ ساتھ) توحید الٰہی کے اقرار لسانی کو بھی شرط قرار دیا ہے، جس سے کہ دائرہ اسلام میں داخل ہونے والے کی حالت باطنی کا محسوس طریقہ پر اظہار ہوتا ہے۔ یعنی اس بات کا اقرار کرنا ضروری ٹھہرایا کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات، صفات تصرفات و معبودیت میں واحد ولاشریک ہے۔ تمام عیوب اور نقائص سے منزہ ومبرا اور تمام کمالات اور قابل ستائش اوصاف سے موصوف ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہر قسم کے شریک کو ممنوع ٹھہرایا۔ عبادت میں استعانت میں، مطلق ذکر میں، اور حلف یا نذر و ذبح وغیرہ میں، (غرض ہر قسم کا شرک حرام ہے) اللہ تعالیٰ کی ذات کو بیوی اور اولاد، عاجزی ولاعلمی، سہو و نسیان اور بخل و ظلم کی نسبت سے اقدس، ارفع واعلیٰ جاننا لازم قرار دیا ہے۔ اسی طرح اسی کے اسمائے حسنیٰ کو بھی ایسے معانی کے اظہار سے دور رکھنا واجب ٹھہرا دیا ہے جو اللہ تعالیٰ کے حق میں عیب و نقص کا باعث ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اسمائے حسنیٰ کو توفیقی بنا دیا ہے تا کہ ہر کس و ناکس کو من گھڑت اور پُرعیب اسما کی ایجاد کی جرأت نہ ہو سکے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

اِنَّ لِلّٰہِ تَعَالٰی تِسْعَۃً وَتِسْعِیْنَ اِسماً منْ احصاھا دخل الجنّۃ۔ ''اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں جس نے ان کو یاد کر لیا، اور ان کو ضبط میں لایا وہ جنت میں داخل ہوگا۔''

احصا سے مراد اسمائے حسنٰی کے معانی کا صحیح مفہوم، اوران اسمائے حسنٰی سے ثابت شدہ صفاتی مفہومات کی تصدیق قلبی ہے۔

(توحید کے ساتھ ساتھ دائرۂ اسلام میں داخل ہونے کے لیے) انبیا ورسل کی بعثت انزال کتب سماویہ اور وجود ملائکہ کا (تصدیق قلبی کے ساتھ) لسانی اقرار واظہار کرنا بھی ضروری ہے اور شریعت نے یہ بھی ضروری قرار دیا ہے کہ ان کو آلائشوں اور گناہوں سے پاک سمجھا جائے اور ان کے حق میں کسی قسم کی بے ادبی نہ کی جائے۔

ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ روزِ قیامت اور آخرت پر ایمان رکھنے کا اقرار کیا جائے۔ یہ دونوں دراصل دین محمدی میں دوز بردست تازیانے ہیں عبرت کے، اور جو کوئی ان دونوں پر ایمان نہیں رکھتا اس کے لیے دین حنیفی کی ظاہری پابندی اور اس ملت اسلامیہ کے اصول ومبادی اور دیگر ضروری امور (ظاہری اقرار کرنا) بے مقصد اور بلا فائدہ ہے۔

ایمان کی دو قسمیں ہیں: چونکہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ارتقاق رابع کے طور پر ہوئی ہے اس لیے یہ قدرتی امر تھا کہ آپ کے دین اور پیروؤں میں مختلف قسم کے لوگ شامل ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان وجوہ فرق بتادیں۔ نیز جو لوگ سچ مچ ہدایت یافتہ ہیں، اور جو بظاہر تو دین حنیف کے پابند ہیں لیکن ایمان ان کے دلوں کی تہہ (جذب قلوب) تک نہیں پہنچا۔ ان دونوں فریقوں میں بھی خطِ تمیز کھینچ لیں۔ چنانچہ آپ نے ایمان کی دو قسمیں قرار دیں:

(۱) وہ ایمان جس پر دنیاوی احکام کا دارومدار ہے یعنی یہ کہ اس کے سبب سے آدمی کا مال وجان (معاشرے میں دوسروں کے دست برد سے) محفوظ رہیں۔

آپ نے اس قسم کی ایمانی کیفیت کے لیے احکام شرع کی ظاہری اطاعت وانقیاد کو کافی سمجھا اس لیے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ اَكَلَ ذَبِيْحَتَنَا وَصَلّٰى صَلَاتَنَا وَاسْتَقْبَلَ بِقِبْلَتِنَا فَذَالِكَ الْمُسْلِمِ الَّذِىْ لَهٗ ذِمَّةُ اللّٰهِ وَذِمَّةُ رَسُوْلِهٖ فَلَا تَخْفِرُوْا اللّٰهَ فِىْ ذِمَّتِهٖ۔

جو شخص ہمارا ذبیحہ کھاتا ہے، ہماری طرح نماز پڑھتا ہے اور ہمارے قبلہ کی طرف رُخ کرتا ہے وہ مسلمان ہے اور اس (کے جان و مال اور آبرو) کی حفاظت اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ واجب ہے۔ اس لیے (اے مسلمانو! ایسے شخص کی حفاظت کرو اور) اللہ تعالیٰ کی ذمہ داری کو مت توڑو"۔

(۲) دوسرا ایمان وہ ہے جس پر احکام آخرت کا انحصار ہے یعنی جس سے کہ آخرت میں نجات وسعادت ملتی اور آدمی بڑے بڑے درجات حاصل کرتا ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ایمان کا رکن یہ بتایا ہے کہ آدمی کا عقیدہ حق وصحیح ہو اور اس کا عمل اللہ کے قوانینِ رضا کے مطابق صالح اور پسندیدہ ہو اور وہ اخلاق فاضلہ کا مالک ہو۔

الغرض ایمان ایک جامع کلمہ ہے۔ جس کے مفہوم میں خیر اور نیکی کے جملہ انواع اور اقسام شامل ہیں۔ اس میں کمی وبیشی آسکتی ہے اس کی مثال ایک درخت کی ہے جس کے مفہوم میں (اس کی جڑ) اس کا تنہ، اس کی ٹہنیاں، اس کے پتے اور اس کے پھول اور پھل سب ہی شامل ہیں۔ اگر اس کا میوہ چن لیا جائے اور اس کی شاخیں توڑ دی جائیں تب ہی اس پر درخت کا اطلاق ہوتا ہے۔ اس پر درخت کا اطلاق اس وقت نہیں ہو سکے گا جب اس کے تنہ کو بیخ وبُن سے اکھیڑ لیا جائے۔ اسی پر شجرۂ ایمان کو قیاس کر لیجئے (ایمان کی کمی وبیشی پر تصریح آیات قرآنی سے بھی ملتی ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيٰتُهُ زَادَتْهُمْ إِيمَانًا۔ (۲)

"بیشک مومن وہ لوگ ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل ڈر جائیں اور جب ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھی جائیں تو اس سے ان کا ایمان بڑھ جائے"۔

کفر ونفاق کی حقیقت اور اس کی دو قسمیں

ایمان کی پہلی قسم کے مقابلہ میں (انکار واعراض) کو (اصطلاحاً) کفر کہا جاتا ہے اور دوسری قسم کے مقابلہ میں نفاق آتا ہے۔

نفاق کی بھی دو قسمیں ہیں: ایک یہ کہ کسی کے دل میں ایمان سرے سے متحقق ہی نہ ہو بلکہ اس کی جگہ تکذیب اور انکار نے لی ہو۔ اور اس کا لسانی اقرار (توحید و رسالت وغیرہ سے متعلق) کسی اور وجہ سے نہیں بلکہ صرف خوفِ شمشیر سے ہو (یعنی اذعان و تسلیم حقیقی کی وجہ سے نہ ہو) اس قسم کے لوگ (جن کے دل ایمان سے خالی ہوں، اور زبان سے اقرار کریں) جہنم کے طبقۂ اسفل میں ہوں گے۔ (جیسے کہ قرآن مجید نے اشارہ کیا ہے کہ: اِنَّ الْمُنَافِقِیْنَ فِی الدَّرْکِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ یعنی بلاشبہ منافق فی العقیدہ آتش دوزخ کے سب سے زیریں حصہ میں ہوں گے)۔

دوسرا نفاق یہ ہے کہ دل میں کفر و تکذیب نہ ہو لیکن حجابات ثلاثہ یعنی حجاب طبع، حجابِ رسم اور حجاب سو معرفت کی وجہ سے قلبی تصدیق اور دلی اعتراف میں ضعف و کمزوری پیدا ہو چکی ہو یا وہ دنیا کی محبت میں اس قدر مستغرق ہو چکا ہو کہ اس کے دل میں یوم آخرت سے ایک گونہ انکار اور یہ خیال سرایت کر گیا ہو کہ اس کا واقع ہونا بعید اور بہ ظاہر ناممکن ہے۔ اگرچہ اسے اپنے اس انکار کا بھی احساس نہ ہوتا ہو۔ یا اسلام میں داخل ہونے کے بعد راہ دین کے شدائد اور صعوبات کو دیکھ کر اسلام سے اس کی طبیعت متنفر ہو اور اس کا دل (قیود و پابندیوں سے دور) آرام و آسائش کی طرف مائل ہو اور اس طرح دین اسلام کی اہمیت و افادیت کی اس کی نظروں میں وقعت ہی باقی نہ رہے یا یہ کہ کافروں کے ساتھ اس کے ذاتی تعلقات ہوں جو اس کے لیے کلمۃ اللہ کی اعلا اور مجاہدین کی سعی و کوشش سے ہم آہنگی میں مانع ہو۔

علامات نفاق

نفاق کی اس قسم ثانی کی علامتوں میں چار خصلتیں (جو ایک حدیث شریف میں بیان ہوئی ہیں زیادہ مشہور) ہیں جب وہ بات کرتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے۔ کسی سے (بحث و مباحثہ یا مقدمہ میں فریق کی حیثیت) جھگڑتا ہے تو (دین و دانش اور اخلاق کے مسلمہ آداب کو چھوڑ کر) گالی گلوچ پر اتر آتا ہے۔ عہد و پیمان کرتا ہے تو اس کو توڑنے میں تامل نہیں کرتا، اور وعدہ کرتا ہے تو اس کی خلاف ورزی کا مرتکب ہوتا ہے۔

علاج مرض نفاق:

جس شخص کو ایمان ایسا محبوب ہو کہ کفر اختیار کرنے کے مقابلہ میں بھڑکتی آگ میں جھونکے جانے کو ترجیح دے اور راہِ خدا میں (دین حق کی حمایت وتائید اور ملت اسلامیہ کی صیانت وحفاظت کے لیے) دارالحرب سے ہجرت کرے اور کفار اور دشمنانِ اسلام سے جہاد کرے اور راہ جہاد میں پیش آمدہ تکالیف وشدائد کو (بخوشی) جھیلے اور مسجدوں میں عبادت گزاری پر مداومت رکھے۔ اور صدقات وخیرات اور داد ودہش کا سلسلہ برابر جاری رکھے تو وہ مرض نفاق سے مامون ومحفوظ رہے گا۔

دین محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری اصل کاہنوں، منجموں، اور نیچریوں کے تخمینوں اور نیچریوں کے فلسفیوں کی تصدیق نہ کرنا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اصول دین میں سے ایک اصول یہ بھی ہے کہ کاہن[1] منجم[2] اور طبیعی[3] کی تصدیق کو (کلی طور پر) ترک کرنا ضروری ہے اور ان کے علوم کی طرف (اس طرح) مائل ہونا اور ان سے محبت کرنا (کہ وحی ووجدان سے انکار پر منتج ہو) واجب الترک ہے۔ اور شریعت کے ثابت شدہ حقائق میں عقل نارسا کے غور وخوض کو چھوڑنا (بھی) لازمی ہے۔ اختلاف فی الدین سے پرہیز کرنا بھی ضروری ہے، تاکہ ملت حنیفیہ اپنی اصلی صورت میں باقی رہے اور اس میں (غلط آرا وافکار کی آمیزش اور اس کے الفاظ ومعانی میں کوئی) تحریف وتبدیلی واقع نہ ہو۔

دین محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی تیسری اصل

(اعمال کے حسن وقبح اور ثواب وعذاب کا انحصار ومدار نیتوں پر ہے)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اصول دین میں سے ایک اصل یہ ہے کہ اعمال کا

---

[1] Sooth sayer; Fortnre teller

[2] Astrologer

[3] Naturalist

مدار نیتوں پر ہے۔ حسن نیت کے معنی یہ ہیں کہ انسان ہر کام میں اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کا ارادہ کرے۔ خواہ اس کی صورت یہ ہو کہ توحید الٰہی کا عقیدہ (اس کے دل میں) راسخ ہو چکا ہو اور اس کے نتیجہ کے طور پر وہ اللہ تعالیٰ کی عبادات (واجبہ ونافلہ) میں مشغول رہتا ہو، یا یہ صورت ہو کہ اپنی حاجتوں کو پورا کرنے کے لیے وہ بارگاہ ایزدی میں دامن سوال پھیلاتا ہو، یا یہ صورت ہو کہ اس کی عبادات اور دیگر اعمال حسنہ کا محرک مصائب دنیا کے پیش آنے کا اندیشہ یا دنیاوی فتوحات میں کامرانی کی توقع ہو یا آتشِ دوزخ سے خوف اور نعیم جنت کی آرزو پیش نظر ہو یا محض شارع کی تقلید سے وہ ایسا کرتا ہو اور اس کا ایمان ہو کہ ان عبادات کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے اور جس چیز کا شارع نے حکم دیا ہے، اس کا عمل میں لانا لازم ہے۔ یہ سب امور رضائے الٰہی کے ضمن میں آتے ہیں۔

دین محمدی کا چوتھا اصول مشتبہات سے پرہیز کرنا ہے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اصول دین میں سے ایک یہ بھی ہے کہ: **الحلال بَیِّنٌ والحرام بینٌ وبینهما مشتبهات فمن اتّقى الشُبهَات فَقَدْ استبرالِدِیْنه۔** (شریعت محمدی میں حلال بھی ظاہر وواضح چیز ہے اور حرام بھی ظاہر وواضح چیز ہے اور ان دونوں کے درمیان چند امور مشتبہ بھی ہیں جن کی حلت وحرمت کے بارے میں شبہ پیدا ہوتا ہے تو جس نے ان مشتبہ امور سے پرہیز کیا اس نے اپنے دین کو محفوظ رکھا) چنانچہ مشتبہات کو ترک کرنا سنّت مؤکدہ ہے۔

مشتبہ کی قسمیں: شک وشبہ میں ڈالنے والی چیزیں مختلف قسم کی ہیں، مثلاً (الف) جب لفظ کے معنی واضح اور معیّن نہ ہوں تو اس کے مفہوم میں شک لاحق ہو سکتا ہے۔ یہ اس طرح کہ اس لفظ کے بارے میں تین قسم کے مواقع پائے جاتے ہوں ایک وہ مواقع جن پر یہ لفظ یقیناً صادق آتا ہے۔ دوسرے وہ مواقع جن پر اس لفظ کا اطلاق قطعاً نہیں ہو سکتا لیکن کچھ تیسری قسم کے مواقع ایسے بھی ہوتے ہیں جہاں اس لفظ کا استعمال مشکوک ہوتا ہے۔ ہمارے اس بیان کی توضیح لفظ ''سفر'' سے ہو سکتی ہے۔ عربی زبان میں ''سفر'' یقیناً اس

قطع مسافت کو کہتے ہیں جو کئی مراحل پر مشتمل ہو اور جس کے لیے زادِ راہ، سواری اور رفیق و مددگار کی ضرورت ہو اور مسافر کے لیے اس کا بآسانی اختیار کرنا دشوار ہو۔ اس کے برعکس سفر کا اطلاق اس آمد و رفت پر بالکل نہیں ہوتا جو بازار یا منڈی یا شہر کے باہر مضافات میں کسی کام کے سلسلہ میں ہو۔ ہاں سفر کا اطلاق اس آمد و رفت پر مشتبہ اور مشکوک ہے جو ایک دن یا ایک دن کے اکثر حصہ کی مسافت کے برابر ہو کیونکہ ہم یقیناً یہ لفظ سن کر اس کے لوازمات کے طور پر زادِ راہ لینے، مشقت و تکلیف اٹھانے، اجنبی زمین میں قیام کرنے (وغیرہ وغیرہ) کو فوراً ذہن میں لے آتے ہیں جس طرح یتیم کے لفظ سے کسی کی کمائی سے عاجزی اس کا فقر و افلاس اور اس کی بے کسی مفہوم ہوتی ہے۔ اب چونکہ ایک دن کے سفر میں سفر کا اصلی مفہوم تو موجود ہے لیکن اس کے لوازم مفقود ہیں اس لیے ہم اس پر سفر کا اطلاق کرنے میں شک کرتے ہیں کیونکہ لفظ سفر کی ذاتی وضع سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ کوئی گھر سے ایسا نکلے کہ اسی روز گھر کو واپسی نہ ہو، کیونکہ جو شخص صبح گھر سے نکل کر شام کو واپس ہوتا ہو اس کے اس آمد و رفت کو سفر نہیں بلکہ تکمیل حاجت کے لیے باہر نکلنا کہیں گے۔ تو جب اس دن واپس نہ ہو (بلکہ دوسرے دن ہو) تو سفر کی ذاتیات تو موجود ہیں اس لیے اشتباہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسے سفر کو سفر کہہ سکیں گے یا نہیں (اور پھر یہ اشتباہ احادیث کے ذریعہ رفع ہوتا ہے جہاں سفر کے لیے کم از کم مسافت کی تعیین کی گئی ہے۔

(ب) اشتباہ کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ جب کسی حکم کا کسی علّت پر یقینی انحصار ہو اور وہ علّت کسی ثابت شدہ یقینی مقصد کے ظہور میں آنے کا مظنہ سمجھا جاتا ہو، مگر بعض ایسی صورتیں بھی ہوتی ہیں کہ علّت کو علّت ٹھہرایا گیا ہے وہ موجود نہیں اس لیے شبہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس صورت میں بھی علّت کے وجود پر حکم کو جاری سمجھا جائے۔ مثلاً نئی خرید کی ہوئی لونڈی کے لیے استبرا کا حکم تبدّل ملکیت پر منحصر ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ اختلاط نسب واقع نہ ہو۔ اب اگر وہ مشتراۃ (نوخرید لونڈی) کسی نابالغ لڑکے سے خریدی گئی ہے یا اس کا آقا عرصۂ دراز سے غائب ہے (اور اس سے ہم بستری ہی نہیں ہوئی) تو اس صورت میں اختلاط نسب کا یقیناً احتمال نہیں۔ بایں ہمہ وہ مشتبہات میں سے ہے۔ (اس لیے کہ اصلِ علّت یعنی خرید موجود ہے)۔

دین محمدی کی پانچویں اصل یہ ہے کہ:

متشابہات کے بارے میں توقف سے کام لیا جائے

اور وہ متشابہات کے بارے میں عقل نارسا سے کلام نہ کرے۔ متشابہات کی صورتوں میں سے چند ایک جن کا ذکر احادیث وقرآن میں آیا ہے یہ ہیں:

(مابعد الموت کے امور مثلاً) میت کا قبر میں بٹھانے، اس سے سوال کرنے، (اس کے جواب کی نوعیت کے مطابق) اس کی قبر کو وسیع کرنے یا اس کو اتنا تنگ کرنے کہ میت کی چیخ وپکار سنائی دے۔ ان سب کی کیفیت وحقیقت عقل سے معلوم نہیں ہوسکتی اس لیے متشابہات میں سے ہیں۔ حشر ونشر اور بعث بعد الموت کے متعلق جتنی روایات احادیث میں آئی ہیں ان میں تقدم وتأخر واقعات کی وجہ سے اس قدر اختلاف رونما ہوا ہے کہ اس سے تقریباً ایک سو مختلف اقوال یا وجوہ استنباط اخذ کیے جاسکتے ہیں۔ اس لیے ایک مسلمان کا شیوہ یہ ہے کہ اس قسم کے ماوراالعقل امور کے بارے میں اپنی طرف سے غیر متعلق گفتگو نہ کرے بلکہ ان کی حقیقت کا علم اللہ تعالیٰ کے حوالہ کرے۔ (مذہب تفویض علمائے محدثین اور سلف صالحین کا رہا ہے)۔

آٹھویں فصل

نظافت (جسم ولباس اور مکان کی صفائی کی) تشریح

(انسانی زندگی میں) نظافت وطہارت ایسی غذا کے درجہ میں ہے جو علاج کا کام دیتی ہو۔ یہ شعبہ حیات ارتفاق ثانی کے مطابق بسر کی جانے والی تہذیبی وتمدنی زندگی کا فطری تقاضا ہے۔ شیطانی ہیئتوں کے ازالہ اور ملکی اوصاف کی تحصیل کے لیے نظافت و پاکیزگی ضروری ہے۔ شرع کی زبان میں اس حقیقت کو پیرایہ کنایہ میں اس طرح یاد کیا جاتا ہے کہ طہارت سے سیئات کا ازالہ ہوتا ہے اور طہارت کے صلہ میں انسان کے نامہ اعمال میں حسنات لکھے جاتے ہیں۔ قبر وحشر کے فتنوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے بھی طہارت لازمی شعبہ ہے اس لیے کہ (ایک حدیث شریف کی رو سے) قبر کا عذاب اکثر پیشاب کے بارے میں بے احتیاطی کرنے کا نتیجہ ہوتا ہے اور چونکہ نظافت ظاہری ومعنوی نجاست سے طہارت حاصل کرنے کا موجب ہے اور اس سے جمعیت خاطر حاصل ہوتی ہے اور انسان کی طبیعت میں شگفتگی آجاتی ہے۔ اس لیے وہ حجاب سومعرفت کے لیے مفید علاج ہے۔ اس کی مثال یہ ہے جیسے کہ کوئی شخص کسی شہنشاہ کے دربار میں حاضر ہونے کے لیے (تنظیف جسم اور تزئین لباس کا) پورا پورا اہتمام کرتا ہے۔ (طہارت والا بھی اللہ تعالیٰ کے دربار کے ساتھ وابستگی پیدا کرتا ہے)۔

طہارت کی قسمیں:

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے طہارت ونظافت کو جز شریعت بنا کر اس کے لیے حدود اور اقسام مقرر کیے چنانچہ آپ نے طہارت کی دو قسمیں متعین فرمائی ہیں:

(۱) طہارت عن الخبث اور (۲) طہارت عن الحدث۔

طہارت عن الخبث:

خبث ونجاست کے ازالے کو زیادہ تر لوگوں کے عرف وعادت پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ البتہ اصول تشریح کے مطابق ان کی رسم وعادت پر ایک نظر ڈال کر آپ نے فاسد رسم ورواج کو باطل قرار دیا۔اور تشریع کے اصول کے مطابق سقیم اور ناقص رسم کی اصلاح فرمائی۔

اس طہارت کی مندرجہ ذیل صورتیں ہیں:

استنجا: استنجا میں نجاست کے ازالہ کے لیے یا تو پانی کا استعمال کرنا چاہیے یا ڈھیلے استعمال کیے جائیں۔ بہتر صورت یہ ہے کہ پانی اور ڈھیلوں دونوں کا استعمال کیا جائے کیونکہ طہارت حاصل کرنے کے لیے یہ زیادہ مناسب ہے۔

استنجا کرنے والے کے لیے مناسب یہ ہے کہ وہ لوگوں سے دور چلا جائے اور دیوار وغیرہ کی آڑ لے کر ازالہ نجاست کرے۔نیز اگر کھلے میدان میں ہے تو قبلہ کی طرف رُخ یا پیٹھ کر کے نہ بیٹھے۔آبادی اور گھروں اور بیت الخلا میں اس کی پابندی ضروری نہیں۔اس میں حکمت یہ ہے کہ صحرا میں انسان جدھر چاہے اس طرف منہ کرسکتا ہے لیکن آبادی میں اور بیت الخلا میں عموماً یہ بات نہیں ہوتی (بلکہ انسان ایک خاص طرف رخ کرنے کا پابند ہوتا ہے) علاوہ ازیں صحرا عموماً نجاستوں سے محفوظ وپاک ہوتا ہے اور اس میں نماز ادا کی جاسکتی ہے اس لیے قبلہ کی طرف بحالت قضائے حاجت منہ یا پیٹھ کرنا سوادب خیال کیا جاتا ہے۔ برخلاف اس کے آبادی میں یا کسی ایسی جگہ میں جو قضا حاجت کے لیے مخصوص ہے یہ احتمال نہیں۔

استنجا کے آداب:

ایسی جگہ استنجا کرنا (پاخانہ کرنا یا پیشاب کرنا) جائز نہیں ہے۔ جہاں پر اس کی نجاست سے ملوث ہونے کا احتمال ہو یا دوسروں کو اس سے تکلیف وضرر پہنچے مثلاً کسی درخت کے سایہ کے نیچے یا جہاں لوگ بات چیت، کے لیے جمع ہوتے ہوں یا عام گزرگاہ ہو، اسی طرح کھڑے پانی میں استنجا کرنا منع ہے۔اور کھڑے پانی میں (اور عام گزرگاہوں پر) غسل کرنا بھی جائز نہیں کیونکہ اس سے پانی خراب وفاسد ہوتا ہے۔اگر غسل کرنا ہوتو

کھڑے پانی سے کسی برتن میں میں پانی لے کر استعمال کرنا چاہیے۔ تین ڈھیلوں سے کم پر اکتفا نہ کرے۔ کیونکہ نظافت انہی (تین) سے پوری ہوتی ہے۔ عدد میں وتر (طاق) کی رعایت برتی جائے کیونکہ عادتاً سب اہم دینی امور میں رسم شریعت نے عدد وتر کو پسند فرمایا ہے۔ کسی قابل احترام اور معزز چیز سے استنجا نہ کرے اور نہ دائیں ہاتھ سے عمل استنجا کرے، کیونکہ (شریعت محمدی میں) عادتاً سنت یہی رہی ہے کہ دایاں ہاتھ صرف (وضو میں) تطہیر کے لیے استعمال ہوتا ہے (استنجا میں ازالۂ نجاست کے لیے نہیں)۔

نجاست کی حقیقت اور اس کی تطہیر کا طریقہ

نجاست اس چیز کا نام ہے جس کو انسان کی طبع سلیم گندی اور قابل نفرت خیال کرے جیسے خون، گوبر، بول و براز، مذی، منی اور شراب (یا شراب آلود ماکول و مشروب، ان سب کو شریعت محمدی میں نجس قرار دیا گیا ہے)۔

نجاستوں کی تطہیر کا بنیادی اصول یہ ہے کہ عین نجاست بھی زائل ہو اور اس کا اثر مثلاً اس کا ذائقہ، رنگ، اور بو بھی باقی نہ رہے ہاں "ماجعل علیکم فی الدین من حرج" کا اصول بھی پیش نظر رہے (تو جہاں اثر کا مٹانا ناممکن ہو وہاں اصل نجاست کا ازالہ کافی سمجھا جائے گا) انسانی منی اگر چہ محل پیشاب سے خارج ہوتی ہے لیکن بدبوئی اور تغیر رنگ کے لحاظ سے پیشاب سے مختلف ہے نیز اکثر اوقات منی گاڑھی اور مجسم ہوتی ہے (اور پیشاب کی طرح مائع نہیں) اس لیے اگر یہ خشک ہو تو اس کا کھرچ لینا کافی ہے۔ چھوٹے بچے کے پیشاب پر پانی چھڑک دینا اس لیے کافی سمجھنا چاہیے کہ اس کا پیشاب بدن یا کپڑے پر دور دور تک پھیل جاتا ہے لہٰذا اس کے دھونے میں تکلیف ہے۔ برخلاف اس کے بچی کا پیشاب کہ بہت زیادہ نہیں پھیلتا، اور جب پیشاب زمین پر کیا گیا ہو اور وہ خشک ہو جائے حتیٰ کہ اس کا کوئی اثر باقی نہ رہے تو زمین پاک سمجھی جاتی ہے۔ اس طرح اگر اس پر کثرت سے پانی بہہ جائے اور پیشاب کے اثر کو زائل کر دے تو بھی وہ پاک ہو جاتی ہے۔ بدبودار تازہ چمڑا دباغت سے پاک ہو جاتا ہے اور گلیوں کوچوں کے کیچڑ سے آلودہ ہونے کو اس لیے نجس قرار نہیں دیا گیا کہ یہ ابتلائے عام ہے (اور دین کی بنا یُسر و آسانی

پر رکھی گئی ہے) جوتے کی نجاست کو رگڑ کے ذریعہ دور کرنے پر اکتفا کیا جائے۔ ہاں جس نجاست کے دور کرنے میں بہت زیادہ تکلیف ہو اس کا ازالہ ضروری نہیں (شریعت کی رو سے) وہ معاف ہے۔

پانی کو رسم و عادت اور لوگوں کے عرف عام پر رکھا گیا ہے جس پانی کو لوگ ان نجاسات کے اختلاط کی وجہ سے نجس و پلید سمجھیں گے وہ نجس ہے اس کا استعمال جائز نہیں خصوصاً دوسری چیزوں کی تنظیف و تطہیر کے لیے اسے استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ اور جس پانی کو عرف عام میں نجس نہیں کہا جاتا اور نجاستوں کی وجہ سے اس کے ذائقہ اور رنگ (و بو) میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں آئی تو وہ طاہر اور پاک ہے۔ چونکہ بعض اوقات تغیرِ رنگ و بو کے متعلق اشتباہ واقع ہوتا ہے اس لیے دو بڑے مٹکوں کی مقدار کو مقرر کیا گیا ہے۔ اور یہ دلیل ہے اس بات پر کہ اتنا پانی اس نجاست سے اثر پذیر نہیں ہوتا جو عام طور پر صحراؤں اور بیابانوں میں پائی جاتی ہے۔ اسی طرح گھروں میں بڑے بڑے مٹکوں اور مشکیزوں میں بھی کبھی کبھی آجاتی ہے۔ (بشرطیکہ ذائقہ، رنگ اور بو میں تغیر رونما نہ ہوا ہو)۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نظافت کے سلسلہ میں یہ بھی مسنون قرار دیا ہے کہ ناف کے نیچے بالوں کو (زیادہ سے زیادہ چالیس دن سے پہلے) دور کرنا چاہیے اسی طرح ہر جمعہ کے دن (نماز جمعہ سے پہلے) میل کچیل کو غسل سے دور کرنا سنّت ٹھہرا دیا ہے۔

حدث کا مفہوم اور اس کی صورتیں

حدث ہر اس گندی ہیئت اور نفرت انگیز صورت کو کہتے ہیں جس کی گندگی سے نفس انسانی پر ناپسندیدہ رنگ چڑھ جائے جیسے دونوں شرمگاہوں سے خارج ہونے والی نجاست یا اس سے ملحق و متعلق نجاست (اخراج ہو) یا مثلاً ہم بستری اور جماع سے جو تلویث معنوی اور نفسانی آلودگی حاصل ہوتی ہے وہ بھی حدث کے مفہوم میں آتی ہے۔ صنفی خواہش کی تسکین کے وقت جو حالت انسان پر طاری ہوتی ہے وہ عالم جبروت اور خدائے بزرگ و برتر سے بعد و دوری کی سخت ترین حالت ہوتی ہے (اور اس سے انسانی ذہن اور قوت ملکیہ میں ناپسندیدگی پیدا ہو جاتی ہے) چونکہ جماع اور حیض (ماہواری) کی حالتوں میں عالم جبروت

سے دوری بہت زیادہ ہوتی ہے اور ان کا وقوع بھی عام نہیں ہوتا اس لیے ان دونوں حالتوں سے طہارت ونظافت حاصل کرنے کے لیے شریعت محمدی نے سارے بدن کے کامل و شامل غسل کو ضرورت قرار دیا ہے۔

ان کے برعکس دونوں شرمگاہوں سے جو نجاست خارج ہوتی ہے وہ عالم جبروت سے کم تر دوری کا باعث ہے اور وہ اکثر واقع ہوتی ہے اس لیے شریعت نے ان اعضائے جسمانی کو دھونے کا حکم دیا ہے جو عام طور پر کھلے رہتے ہیں۔ اس کی علت یہ ہے کہ انسان کی فطرت میں ہے کہ وہ لباس وپوشاک پسند کرتا ہے اور ایسا لباس پہننا چاہتا ہے جو اس کے بدن کو ڈھانکے مگر وہ اپنے چہرے ہاتھوں اور پاؤں کو ہمیشہ کے لیے ڈھانکنا نہیں چاہتا۔ نیز ان اعضائے ثلاثہ کو کپڑوں میں (ہمہ وہر وقت) اوڑھے رکھنا باعث تکلیف وتنگی ہے۔ عام طور پر (انسانی معاشروں میں) ملوک وسلاطین کے پاس جانے والوں کا پسندیدہ طریقہ اور محبوب عادت یہی رہی ہے کہ وہ ایسے موقعوں پر چہروں، ہاتھوں اور پاؤں کو دھو کر صاف ستھری حالت میں پیش ہوتے ہیں۔

شارع علیہ السلام نے ان عذروں کو بھی پیش نظر رکھا جو لوگوں کو اکثر وبیشتر پیش آسکتی ہیں، تو ان حالات (بیماری وسفر وغیرہما) کے لیے (غسل ووضو کے بجائے تیمم کو مشروع بنا دیا۔ پس اس طرح طہارت کی تین قسمیں ہوگئیں (وضو۔ غسل۔ تیمم)۔

وضو کے ارکان وسنن

وضو کے چار ارکان ہیں (جو قرآن مجید کی اس آیت کریمہ میں مذکور ہیں:

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ (المائدہ:۵: آیت ۶) اے مسلمانو! جب تم نماز کے لیے اٹھو تو چاہیے کہ اپنے (۱) منہ اور (۲) ہاتھ کہنیوں تک دھولو (۳) سروں پر (آب سے تر) ہاتھ پھیر لو اور (۴) پاؤں ٹخنوں تک دھولیا کرو)۔

اور وضو کی صحت ودرستی کے لیے نیت شرط ہے اور اس کے مکمل کرنے والے چند امور ہیں جن کے ذریعے پوری طہارت حاصل ہو جاتی ہے ان امور تکمیلیہ میں سے مندرجہ

ذیل (قابل ذکر) ہیں:

ایک مسواک کرنا ہے۔ اس کا فلسفہ وحکمت یہ ہے کہ منہ کو بدبو اور عقل وطبیعت میں فساد وبگاڑ پیدا کرنے والے بلغمی مواد سے صاف کر دیا جائے (اور دانتوں کی صفائی ہو جائے)۔

دوسرا وضو کو تسمیہ یعنی بسم اللہ سے شروع کرنا ہے۔ اس میں حکمت یہ ہے کہ زبان پر اللہ تعالیٰ کا اسم پاک جاری کرنے سے قلبی نیت کو استحکام وتوثیق ملتی ہے (اور برکات حاصل ہوتی ہیں)۔[1]

تیسرا استنشاق (ناک میں پانی ڈالنا) استنثار (ناک میں پانی ڈال کر اس کو جھاڑنا) اور مضمضہ (کلّی کرنا) بھی ہیں۔ کیونکہ یہ (منہ اور ناک اور گلا) وہ مواضع ہیں کہ جن کی صفائی کے لیے چہرے کی ظاہری طہارت اور دھونا کافی نہیں ہوتا (اس لیے ان میں پانی ڈال کر انھیں صاف کرنا پڑتا ہے)۔ نیز استنشاق اور استنثار سے ناک کی غلاظت اور وہ بدبوئیں بھی دور ہو جاتی ہیں جو حس مشترک کو حضور قلب سے روکتی اور دوسری طرف مشغول رکھتی ہیں۔ ان غلاظتوں کے اس اثر کا ذکر حدیث نبوی میں کنایۃً یوں کیا گیا ہے کہ الشیطان یبیت علی المنخرین یعنی شیطان ناک کے دونوں نتھنوں پر بسیرا لیتا ہے۔"

(ہاتھ دھو لینے سے پہلے) پانی میں ہاتھ ڈبونے سے اس لیے منع کیا گیا ہے کہ ہاتھ سے ہر قسم کے کام کیے جاتے ہیں اس لیے ان پر میل کچیل جم جانے اور اس کے نجس ہونے کا ہمیشہ احتمال ہوتا ہے۔ تین تین مرتبہ اعضا جسمانی کو دھونے کا مقصد اچھی طرح صفائی حاصل کرنا ہوتا ہے۔ منہ اور ہاتھ پاؤں کو مقررہ حدود سے زیادہ دور تک دھو لینا بھی یہی معنی رکھتا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کرنے والے کے لیے دعائے ماثورہ مشہور کا پڑھنا سنّت قرار دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نفس پر دو قسم کی خبیث کیفیتیں طاری ہوتی ہیں۔

---

[1] حدیث شریف میں آتا ہے کہ "کُلُّ اَمرِذی بالٍ لم یُبْدَأْ اَفِیْه بِاسمِ اللّٰہِ فَھُوَ اَبتَر" یعنی ہر وہ ضروری کام جس کو بسم اللہ سے شروع نہ کیا جائے تو وہ باعث خیر واجر نہیں ہوگا۔

ایک عملی کیفیت ہوتی ہے جس کا ازالہ وضو سے ہو جاتا ہے۔
دوسری علمی ہیئت ہوتی ہے، جس کو دفع کرنے کے لیے ماثورہ دعائیں پڑھی جائیں۔
موزوں پر مسح کو جائز قرار دیا ہے کیونکہ موزوں کے پہننے کے بعد پیر ظاہری اعضا کی فہرست سے خارج ہو کر اعضا داخلہ میں شمار ہونے لگتے ہیں۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تعبیر ان الفاظ میں فرمائی: "اَلْحَدَثُ لَمْ يَدْخُلْهُمَا" یعنی "پاؤں پر حدث کا اثر ہی نہیں ہوا۔"
اور چونکہ وضو میں اکثر اوقات پاؤں کو دھویا جاتا ہے اس لیے اس کا قائم مقام مسح قرار پایا تاکہ حتی المقدور شدائد و تکالیف میں سہولت و یسر کا حکم باقی رہے۔ مقیم کے لیے ایک دن اور ایک رات اور مسافر کے لیے تین دن، تین رات کی مدت رخصت مقرر ہوئی ہے۔ یہ مدت تیسیر کے اصول پر مبنی ہے۔ اور ان وقفوں کے بعد دھونے کی طرف مراجعت معقول ہے۔ اعضائے نہانی سے نجاست خارج ہونے پر اس لیے وضو ٹوٹ جاتا ہے کہ نجاست سے عملاً وابستگی اور ملابست نجاست پیدا کرتی ہے اور نفس میں ایک ناپسندیدہ کیفیت پیدا ہوتی ہے اس طرح نیند میں چونکہ اعضائے جسمانی میں سستی اور ڈھیلا پن پیدا ہوتا ہے اور وہ اعضائے نہانی سے خروج نجاست کا مظنّہ ہے۔ اس لیے اس کو ناقض وضو کے اسباب پر حمل کیا گیا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ملامستِ نسا اور سینگی لگوانے کے بعد وضو کرنا تکمیل طہارت کے لیے مسنون قرار دیا ہے۔

غسل، اس کے ارکان اور اسبابِ وجوب

غسل کا رکن پورے بدن کو اور بدن کے تمام اعضا کو دھونا ہے۔ کیونکہ غسل کامل طہارت ہے جس سے حدث اکبر (بڑی باطنی نجاست) کا ازالہ مقصود ہوتا ہے۔ وضو کی طرح یہاں بھی نیت شرطِ صحت ہے۔ غسل کرنے سے پہلے ہاتھوں کا دھونا اور ظاہری نجاست کا دور کرنا لازمی ہے۔ کیونکہ اگر یہ نہ ہو تو نجاست سارے جسم پر بہہ جائے گی۔ جسم پر تین بار پانی بہانا تکمیل غسل کا موجب ہے۔ جس کی حد ایک صاع (پونے چار سیر پختہ) پانی کا استعمال کرنا ہے۔

حائضہ عورت کے لیے یہ حکم ہے کہ وہ خون کے اثر (رنگ وبو وغیرہ) کو مشک و کستوری سے مٹائے۔ اس کی کئی وجوہ ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ مشک (وغیرہ وغیرہ) کے استعمال سے اس کا شوہر اس کی طرف زیادہ راغب ہوگا۔

جنبی (ناپاک اور جنابت سے دوچار) آدمی جب کچھ کھانا پینا یا سونا چاہے تو چاہیے کہ وہ وضو کرے۔ کیونکہ وضو اور غسل سے مقصود دراصل ازالۂ نجاست حسی نہیں بلکہ ان میں یہ راز مضمر ہے کہ نجاست سے نفس انسانی پر جو کیفیت فاسدہ طاری ہو جاتی ہے (اور وہ عالم جبروت کی طرف کما حقہ، متوجہ نہیں ہوسکتا، وضو اور غسل کے ذریعہ اس کا ازالہ کیا جائے اور طہارت و پاکیزگی پیدا کی جائے۔ اس نکتہ کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ان الفاظ سے بیان کیا ہے: "وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ "(سورہ التوبہ: آیت ۱۰۸) یا "وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ" (البقرہ: آیت ۲۲۲) یعنی اللہ تعالیٰ خوب پاک وصاف رہنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔

پھر شرع کی نظر میں حدث کی دو قسمیں قرار دی گئی ہیں:

(۱) حدث اصغر اور (۲) حدث اکبر

شریعت کی رو سے ان دو صورتوں میں تقسیم کا طریقہ اس لیے رائج کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان پر دین میں تنگی اور سختی نہیں رکھی۔ دونوں صورتوں میں مسنون طریقہ کو پیش نظر رکھا گیا کہ "وما جعل عليكم في الدين من حرج" (اللہ تعالیٰ نے دین میں تم پر طاقت سے باہر یا تکلیف میں مبتلا کرنے والے امور کو سرے سے مقرر ہی نہیں فرمایا۔ یُسر اور آسانی کا اصول پیش نظر رکھا)۔ اس لیے حدث اکبر کے پیش آنے پر فوراً غسل کرنے کی فرصت یا موقع نہ ہو تو غسل فوراً ضروری نہیں (کیونکہ یہ اصول حرج کے خلاف ہے) تاہم یہ مناسب ہے کہ طہارت صغیرہ (یعنی وضو) میں تاخیر نہ کی جائے۔ اور یہ حکم وضو اس لیے بھی مصلحت آمیز ہے کہ حتی المقدور انسان کو ضروریات زندگی کی تکمیل کے لیے حالتِ حدث میں بے لگام نہ رہنے دیا جائے۔

وجوب غسل کا باعث یا تو حالت بیداری میں جماع ہے یا سوتے وقت صنفی خواہش

کے ساتھ انزال ہے۔ اور یا عورت کے حیض اور نفاس کی بیماری ہے۔ کیونکہ ان صورتوں میں انسان پر ایک ایسی کیفیت طاری ہوتی ہے جو عالم ملکوت کی کیفیات سے متضاد اور مخالف ہوتی ہے۔

تیمّم: اس کے مقاصد و احکام

تیمّم کا مقصد حصول نظافت و طہارت نہیں بلکہ نمازوں کے لیے طہارت کی صورت کو باقی رکھنا مقصود ہے۔ تاکہ نفس طہارت کے ترک کے ساتھ مانوس نہ ہو جائے اور اس طرح کی نجسی کیفیت کے ساتھ گزارہ کرنا شروع نہ کرے۔ تیمّم کے لیے زمین کے ساتھ ہاتھ لگانا مناسب قرار دیا گیا کیونکہ زمین ایک گونہ بعض اشیا میں اور بعض اوقات میں طہارت کا کام دیتی ہے۔ مثلاً تلوار، شیشہ، پتھر، اور موزوں کو زمین سے رگڑ کر پاک کیا جاتا ہے۔ اس لیے زمین کے مسح کو طہارت کو قائم مقام ٹھہرایا گیا۔ تیمّم کو غسل کا قائم مقام ٹھہراتے وقت تمام اعضا پر گرد آلود ہاتھ پھیرنا اور اس طرح تیمّم کو وضو کا قائم مقام ٹھہراتے وقت چہرہ دونوں ہاتھوں اور دونوں پیروں (غرض پانچوں اعضا) پر گرد آلود ہاتھ پھیرنا ضروری قرار نہیں دیا گیا۔ اس لیے کہ مقصود تو طہارت حاصل کرنا نہیں بلکہ سنّت طہارت کو ظاہراً باقی رکھنا مقصود ہے۔

تیمّم جن اعذار کی بنا پر جائز ہے ان کا تعین ضروری تھا۔ چنانچہ تین اعذار میں سے ایک تیمّم کے لیے ضروری سمجھا گیا۔ اولاً پانی کا موجود نہ ہونا کہ انسان سفر کے وقت نہ پانی کے کنارے پر ہو اور نہ اس کے لیے پانی مہیا کرنا میسر ہو، ثانیاً ایسا مرض جس کو پانی سے نقصان پہنچتا ہو یا یہ خطرہ ہو کہ مریض ہلاک ہو جائے گا۔ یا یہ کہ اس کے کسی عضو میں عیب پیدا ہو جائے گا، یا مرض کے لمبے ہو جانے کا خطرہ ہو۔ ثالثاً یہ کہ مرض کے پیدا ہونے کا خطرہ ہو۔ ایسی سردی جس سے ضرر پہنچنے کا احتمال ہو تیسری قسم میں شامل ہے۔

مصنف کی اہم مطبوعات

مجموعہ رسائل امام شاہ ولی اللہؒ (جلد اول)	مولانا مفتی عطاء الرحمن قاسمی	325.00
مجموعہ رسائل امام شاہ ولی اللہؒ (جلد دوم)	//	300.00
مجموعہ رسائل امام شاہ ولی اللہؒ (جلد سوم)	//	300.00
مجموعہ رسائل امام شاہ ولی اللہؒ (جلد چہارم)	//	300.00
دلی کی تاریخی مساجد (حصہ اول)	//	200.00
دلی کی تاریخی مساجد (حصہ دوم)	//	100.00
پنجاب وہریانہ کی تاریخی مساجد	//	200.00
امام شاہ ولی اللہ اوران کے افکار ونظریات	//	250.00
الواح الصنادید (حصہ اول)	//	150.00
الواح الصنادید (حصہ دوم)	//	100.00
مولانا عبدالماجد دریابادی۔خدمات وآثار	//	200.00
ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کا حصہ	//	200.00
ہندومندر اوراورنگ زیب کے فرامین (اردو)	//	20.00
ہندومندر اوراورنگ زیب کے فرامین (ہندی)	//	20.00
نقوش خاطر (قلمی چہرے)	//	300.00
۱۸۵۷ء اورہریانہ (ہریانہ کے مجاہدین آزادی کا تذکرہ)	//	250.00
المساجد التاریخیه بدهلی	//	500.00
معمار قوم ڈاکٹر اخلاق الرحمن قدوائی	//	300.00
مردمومن ڈاکٹر اخلاق الرحمن قدوائی	//	300.00
شاہ ولی اللہ خصوصی نمبر (ماہنامہ براہین)	//	195.00
الامام الدہلوی خصوصی شمارہ (ماہنامہ براہین)	//	195.00
وقف ترمیمی بل ۲۰۱۰ء منظر،پس منظر	//	زیرطبع
ضمائر القرآن (ضمائر قرآن اوراُنکے مراجع)	ڈاکٹر ابونصر محمد خالدی — مرتبہ مولانا مفتی عطاء الرحمن قاسمی	300.00
الاشباہ والنظائر فی القرآن الکریم (قرآن کے مرادف الفاظ اورامثال ونظائر)	//	350.00
وفیات اعیان الہند (امراء وسلاطین کی تاریخ ہائے وفات اور مختصر حالات)	//	300.00
مضامین خالدی (اسلامیات،قرآنیات اوردکنیات پر مشتمل مقالات)	//	300.00
قرآنی تشبیہات واستعارات	//	150.00

SHAH WALIULLAH INSTITUTE

Adjacent To Kaka Nagar Masjid, (Near NDMC Primary School)
Kaka Nagar, New Delhi-110003
Ph : 9811740661, 9811615455, 26953430
E-mail : shahwaliullah_institute@yahoo.in, swiinstitute26@gmail.com

ISBN : 978-93-84153-04-2